سرکش

1

محمود احمد مودی

پیش لفظ

کہانیاں ہر دور میں لکھی جاتی رہی ہیں' سنی جاتی رہی ہیں' پڑھی جاتی رہی ہیں' اور یہ سلسلہ شاید ابد تک جاری ہے۔ زمانے کے ساتھ ساتھ انداز بدلتے رہے۔ ہر انگ' ہر رنگ اور ہر ڈھنگ سے کہانیاں سامنے آئیں۔ کوئی تسلیم کرے یا نہ کرے لیکن یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے' کہ ڈائجسٹوں نے کہانی نویسی اور داستان طرازی کو بہت سے نئے اسلوب دیئے' جو وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں سے ہم آہنگ بھی رہے اور اپنی اپنی جگہ ایک نئی روایت بھی بنے۔ ادب کا کوئی غیر متعصب مورخ اگر کبھی ادب کی دیانتدارانہ اور غیر جانبدارانہ تاریخ مرتب کرنے بیٹھے گا' تو افسانہ طرازی میں ڈائجسٹوں کی طویل خدمات اور ان کے ناقابل فراموش کردار کا تجزیہ کرنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ ہمارے ملک میں جہاں پہلے تو خواندگی کی شرح شرمناک حد تک کم ہے' پھر لوگوں میں قوت خرید اس سے بھی زیادہ شرمناک حد تک کم ہے اور پھر کتابیں رسالے خرید کر پڑھنے کا رجحان اس سے بھی زیادہ شرمناک حد تک کم ہے وہاں ڈائجسٹوں کی اشاعت لاکھ ڈیڑھ لاکھ سے بھی اوپر گئی جبکہ لاکھوں افراد انہیں لائبریریوں سے کرائے پر لے کر بھی پڑھتے رہے ...... تو بلاشبہ یہ ڈائجسٹ نکالنے والوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے بشرطیکہ تعصب اور جہالت کی عینک اتار کر اس حقیقت کا جائزہ لیا جائے۔ ڈائجسٹوں نے بہت بڑی ریڈر شپ پیدا کی۔ لوگوں میں پڑھنے کی عادت پیدا کی۔ ایسے حالات پیدا کیے کہ کم از کم دس بیس لوگ لکھنے لکھانے کو کل وقتی پیشے کے طور پر اختیار کر سکیں۔

سلسلے دار کہانیاں ڈائجسٹوں کا طرہ امتیاز رہی ہیں اور پرچوں کی کمی یا زیادہ کامیابی میں ان کا بڑا کردار رہا ہے۔ ان میں سے بعض نے تو مقبولیت اور طوالت کے حیرت انگیز ریکارڈ قائم کیے ہیں۔ میری زیر نظر کہانی "سرکش" جاسوسی ڈائجسٹ میں سلسلے وار شائع ہوتی رہی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ بنیادی طور پر میں بہت طویل کہانیاں لکھنے کا اہل نہیں ہوں۔ تحریر کی طوالت سے میں خود اکتا جاتا ہوں خواہ وہ میری اپنی ہی تحریر کیوں نہ ہو اور خواہ اس سے مجھے معقول آمدنی بھی کیوں نہ ہو رہی ہو۔ اس کے باوجود "سرکش" جولائی 90ء سے لے کر جنوری 98ء تک' یعنی تقریباً" ساڑھے سات سال شائع ہوتی رہی تو اس میں میرا کچھ ایسا زیادہ کمال نہیں ------- اس کا زیادہ کریڈٹ ادارہ "جاسوسی ڈائجسٹ" پبلی کیشنز کے مالک' چاروں پرچوں کے ایڈیٹر اور روح رواں جناب "معراج رسول" کو جاتا ہے اور وہ اس طرح کہ معراج صاحب اپنے لکھنے والوں کو کھلا میدان' کھلی فضا فراہم کرتے ہیں جس میں مصنف اپنی پرواز تخیل کو آزما سکے۔ وہ اس کے کام میں بے جا مداخلت نہیں کرتے' کوئی فضول قدغن نہیں لگاتے' خوامخواہ کی مین میخ نہیں نکالتے۔ وہ مصنف کو اپنی صلاحیتیں آزمانے کا پورا موقع دیتے ہیں۔ اب یہ مصنف پر منحصر ہے کہ وہ اپنے لیے کتنی داد و تحسین سمیٹتا ہے' کامیابی کے کون سے ریکارڈ قائم کرتا ہے۔ مروجہ جائز حدود میں رہتے ہوئے وہ مصنف کو جتنی آزادی اظہار اور فراغت تخلیق مہیا کرتے ہیں اس کی مثال ملنا ذرا مشکل ہی ہے۔

لکھنے کے ضمن میں ہمیشہ میری کوشش رہی ہے کہ میری تحریریں زندگی سے قریب تر ہوں۔ میں اپنے کردار اپنی گلی کوچوں سے ہی لیتا ہوں۔ وہی گلی کوچے جن میں آپ اور میں زندگی بسر کرتے ہیں۔

یہ سب کردار ہمارے ارد گرد کہیں نہ کہیں بکھرے ہوتے ہیں۔ تھوڑی بہت رنگ آمیزی بہرحال مصنف کا حق اور داستان طرازی کا تقاضا ہے۔ اس طویل کہانی میں متعدد کرداروں کے بارے میں آپ کو گماں گزرے گا کہ آپ زندگی میں کہیں نہ کہیں ان سے مل چکے ہیں' یا انہیں دور سے دیکھ چکے ہیں۔ اس کہانی میں کہیں طنز و مزاح کا مدوجذر آپ کے محسوسات کو گدگدائے گا تو کہیں زندگی کی برہنہ حقیقتیں آپ کو خون کے آنسو رلائیں گی۔

"سرکش" ایک سادہ دل اور معصوم نوجوان کی کہانی ہے جسے وقت کا دھارا اپنے ساتھ بہاتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں لے گیا۔ زندگی نے اسے کیا سے کیا بنا دیا لیکن بنیادی طور پر وہ سادہ و معصوم اور نیک طینت ہی تھا اور یہی رنگ اس پر غالب رہا۔ موقع میسر آتے ہی اس نے رخش حیات کو اپنی خواہش کے مطابق مثبت راستوں پر ہی چلایا۔ مجھے معلوم ہے پند و نصائح کو کوئی پسند نہیں کرتا اس کے باوجود میں نے ہمیشہ کسی نہ کسی رنگ' کسی نہ کسی ڈھنگ سے اپنی تحریروں میں مقصدیت برقرار رکھنے کی پوری پوری شعوری کوشش کی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میری یا مجھ جیسے دوسرے مصنفوں کی تحریروں نے اس معاشرے سے خباثت کم کرنے یا قاری کو EDUCATE کرنے میں کوئی کردار ادا کیا ہے یا نہیں' لیکن اپنے اپنے وسائل اور مواقع کی مناسبت سے اپنی سی کوشش کیے جانا ہر باضمیر تخلیق کار کا فرض ہے البتہ کہانی نویسی میں اپنے ذاتی سیاسی نظریات کی جھلک یا واضح عکس لے آنے کا میں قائل نہیں ہوں۔ یہ چیز مجھے دوسروں کی تحریر میں بھی بری لگتی ہے کیونکہ یہ بہت ٹٹ پونجیا قسم کا عمل ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ پچاس برس سے ہمارے ملک میں ٹٹ پونجیا سیاست ہی ہو رہی ہے۔ منافقت' مکروفریب اور اپنے سوا باقی سب کو برباد کر دینے کے منصوبوں کا نام ہمارے ہاں سیاست ہے۔

میں "سرکش" کے بارے میں کبھی کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہا۔ میرے خیال میں یہ کوئی بہت تہلکہ خیز' معرکہ آرا یا چاروں طرف دھوم مچا دینے والی تحریر نہیں تھی۔ اس میں نشیب و فراز بھی آتے رہے۔ کچھ لوگوں نے ہمیشہ اسے بہت پسند کیا۔ کچھ نے کبھی پسند کیا تو کسی قسط کو ناپسند کیا اور آگے چل کر پھر پسند کرنے لگے۔ یوں ملا جلا معاملہ چلتا رہا جیسا کہ زیادہ تر قسط وار کہانیوں کے بارے میں چلتا ہے لیکن جب اسے بند کیا تو ایک عجیب کہرام برپا ہو گیا۔ اس کے اختتام پر جس قسم کے خطوط ادارے کو موصول ہوئے اور جس طرح کے کچھ خطوط مجھے ذاتی طور پر براہ راست بھی موصول ہوئے انہیں پڑھ کر میں سخت حیرت زدہ ہوا۔ ان میں سے بعض تو تقریباً" ناقابل یقین تھے اور اس بات کا حیرت انگیز ثبوت تھے کہ بعض کہانیاں لوگوں کی ذاتی زندگی پر کس شدت سے اثر انداز ہوتی ہیں اور تبھی مجھے یہ گماں بھی گزرا کہ یہ بہرحال اپنے دور کی ایک بے پناہ پسند کی جانے والی کہانی تھی ......

لیکن بہرحال ہر داستان کو ...... یا پھر داستان نویس کو ایک نہ ایک روز ختم ہونا ہی ہوتا ہے۔ اب یہ کہانی مکمل اور کتابی صورت میں پیش خدمت ہے۔ ایک تسلسل کے ساتھ نئے سرے سے پڑھنے کا لطف اپنی جگہ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کبھی کسی سے کچھ قسطیں مس ہو گئی ہوں اس کے لیے بھی یہ کتابی سلسلہ خوش آئند ہو گا ...... اور نئے قارئین کے لیے تو بہرحال یہ ایک خصوصی تحفہ ہی ہو گا۔

دعاؤں میں یاد رکھیے گا--- ---آپ کا اپنا---

☆ محمود احمد مودی ☆

بچپن کی ہر یاد میرے ذہن میں ستارے کی طرح جھلملاتی ہے حالانکہ موجودہ زمانے کے معیار کے مطابق اُن یادوں میں کوئی دلکشی نہیں۔ وہ ایک سرحدی قصبہ تھا جہاں میں نے ہوش سنبھالا۔ شکر گڑھ اس کا نام ہے۔

ہمارے گھر میں خدا کا دیا سب کچھ تھا میرا مطلب ہے کہ دولت و خوشحالی کے علاوہ سب کچھ۔ میرے دو چچا بھی اسی گھر میں رہتے تھے اور ان کے درمیان گویا زیادہ سے زیادہ بچوں کا باپ بننے کا مقابلہ جاری تھا۔

میری دونوں چچیوں کی حالت عبرتناک تھی۔ دونوں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکی تھیں جسم میں گویا خون کی رمق تک نہ تھی۔ بیٹھ جاتی تھیں تو اُٹھا نہیں جاتا تھا اور اُٹھ جاتی تھیں تو لگتا تھا کہ ابھی گر پڑیں گی لیکن بچوں کے معاملے میں انھوں نے ہمت نہیں ہاری تھی۔

گھر کیا تھا بس ایک بڑا سا نیم پختہ ہال نما کمرا تھا جس کے وسط میں ڈیڑھ دو گز اونچی ایک دیوار کھڑی کر دی گئی تھی جو پردہ داری کا نہیں محض حد بندی کا کام دیتی تھی۔ دونوں بھائی ایک ایک حصے میں رہائش پذیر تھے۔ وہیں سب بچوں سمیت سونا، وہیں کھانا پکانا اور وہیں نہانا دھونا۔

احاطے میں چھپر نما ایک چھوٹا سا کمرا بھی تھا۔ یہ میری اور والد صاحب کی خواب گاہ تھی۔ میں اپنے والد کا اکلوتا لڑکا تھا۔ آپ کو شاید حیرانی ہو رہی ہو گی کہ میرے والد صاحب ولدیاتی مقابلے میں اپنے بھائیوں سے اتنا پیچھے کیونکر رہ گئے تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ میری والدہ مجھے یعنی پہلے بچے کو جنم

دیتے ہی اس دُنیا سے رخصت ہوگئی تھیں۔

ابا جی جو کچھ کماتے تھے پھوپھی جی ہی کے ہاتھ میں دیتے تھے اور اسی لیے وہ ہمیں ہنسی خوشی برداشت کر رہی تھیں۔ ہفتے میں ایک آدھ مرتبہ وہ ہمارے اعزاز میں خصوصی ڈنر کا بھی بندوبست کرتی تھیں یعنی اس روز بصد اہتمام ایک ہانڈی گوشت پکایا جاتا تھا جس کے لیے اتنا بڑا دیگچا استعمال کیا جاتا تھا جتنی بڑی آج کل دیگ بھی نہیں ہوتی۔

قصور ہم کا بھی نہیں تھا میرے ابا اور چچا کی جتنی آمدنی تھی اس میں یہی کچھ ہو سکتا تھا۔ تینوں بھائی دراصل ملک اسلم زمان صاحب کے مزارعے تھے۔ سو روپے مہینہ، سال میں دو جوڑے کپڑوں کے اور ہر فصل پر چند بوریاں غلّے کی ملتی تھیں۔ اب میں سوچتا ہوں تو بڑی حیرت ہوتی ہے کہ ان اُجرتوں پر ہم سب کا گزارا کیونکر ہو رہا تھا اور ہم زندہ کس طرح تھے؟ وجہ یہی سمجھ میں آتی ہے کہ اس وقت چونکہ پرائس کنٹرول کمیٹیاں وغیرہ نہیں بنی تھیں اس لیے ہر چیز کی پرائس کنٹرول میں تھی۔

ناقص خوراک، عسرت زدہ ماحول اور تمام تر غریبانہ رہن سہن کے باوجود میری اُٹھان اور صحت گھر بھر میں سب سے بہتر تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ میں اپنی ماں پر گیا تھا۔ اللہ اُنھیں جنت میں جگہ دے، میں نے سنا ہے وہ خاصی حسین اور جاہ و جلال والی خاتون تھیں۔ وہ اس گاؤں کی نہیں تھیں، کشمیری تھیں۔ میاں بیوی میں بہت پیار تھا۔ شاید اسی وجہ سے ابا جی نے ان کے بعد دوسری شادی نہیں کی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اصل وجہ یہ رہی ہو کہ دوبارہ کوئی لاوارث خاتون میسر ہی نہ آئی ہو۔ کیا کہا جا سکتا ہے، دل کے بھید اللہ ہی جانے۔

ابا جی کو مجھے تعلیم دلانے کا بہت شوق تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کروں یعنی میٹرک کرلوں۔ ہمارے قصبے میں مڈل اسکول تو موجود تھا۔ ابا جی کا ارادہ تھا کہ اگر میں مڈل اسکول کا مرحلہ سر کرنے میں کامیاب ہوگیا تو وہ مجھے میٹرک کے لیے سیالکوٹ بھیج دیں گے خواہ اس کے لیے انھیں اپنا سارا اثاثہ بیچنا پڑے۔ میں اُن سے کبھی یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکا کہ وہ اثاثہ تھا کیا؟ جھلنگا سی وہ دو چارپائیاں جن پر ہم سوتے تھے یا لوہے کا وہ ٹرنک جس میں ہم اپنی دھوتیاں اور کُرتے رکھتے تھے؟ یا پھر وہ مُردار سی گائے جو ہر وقت چرتی رہتی تھی لیکن دودھ چند قطروں سے زیادہ نہیں دیتی تھی۔

بہرحال... ابا جی کے پاس کوئی اثاثہ تھا یا نہیں میرے لیے ان کا جذبہ ہی ناقابلِ فراموش ہے۔ آج بھی اُن کی باتیں یاد آتی ہیں تو میری آنکھیں جو اب بے حد سفاک، نامہرباں اور بے مُروّت ہو چکی ہیں، نم ہو جاتی ہیں۔ ابا جی کا خیال تھا کہ میں میٹرک کر کے کسی دفتر میں کلرک بابو بن کے خاندان کا نام روشن کروں گا۔

میں اُن کی خواہش کی تعمیل میں بڑی باقاعدگی سے اسکول جاتا تھا اور بڑی باقاعدگی سے ماسٹر صاحب کی ٹانگیں دبا کر اُن کے گھر کا سودا سلف لا کر اور دیگر چھوٹے موٹے کام کر کے گھر آجاتا تھا۔ کبھی کبھی انھیں اونگھنے سے فرصت ملتی تھی تو وہ ازراہِ کرم کچھ پڑھا بھی دیا کرتے تھے۔ قصور اُن کا بھی نہیں تھا۔ اسکول سرکاری تھا۔ انھوں نے ایک مرتبہ مجھے بتایا تھا کہ ان کی تنخواہ مزارعے سے بھی کم یعنی چوہتر روپے پچاس پیسے مہینہ ہے اور اس کی وصولی کے لیے بھی انھیں شہر کے چوہتر چکر لگانے پڑتے ہیں۔

اسکول سے فارغ ہونے کے بعد میرے پاس وقت ہی وقت ہوتا تھا۔ گھر میں اس قدر دھما چوکڑی رہتی تھی کہ کسی کو میرا خیال نہیں آتا تھا کہ میں کہاں ہوں اور کیا کر رہا ہوں۔ ابا جی اور دونوں چچا شام ڈھلے تھکے ہارے آتے تھے اور ہینڈ پمپ کے نیچے بیٹھ کر باری باری نہاتے تھے اور پھر کھانے پر ٹوٹ پڑتے تھے۔ کھاتے ہی لیٹ جاتے تھے اور رات کا اندھیرا گہرا ہونے تک ہمارے گھر پر ہی نہیں پورے قصبے پر سکوت چھا جاتا تھا۔ انسان خاموش ہو جاتے تھے اور کتے بھونکنا شروع کر دیتے تھے۔

اس یکسانیت سے اُکتا کر کبھی کبھی میں قصبے سے نکل جاتا تھا۔ سیالکوٹ کو جانے والی سڑک کے قریب سیم زدہ زمین میں ایک گندہ نالا تھا جس پر چھوٹی سی پُلیا بنی ہوئی تھی۔ اس پُلیا کی دیوار پر بیٹھ کر میں آتی جاتی لاریوں اور ناریوں کو دیکھا کرتا اور نہ جانے کیا کچھ سوچا کرتا۔ یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکا ہوں کہ سوچنے کی بیماری مجھے بچپن سے لاحق تھی۔ پُلیا کی یہ دیوار گویا میرا مرکزِ غور و فکر تھی۔

پرائمری اسکول سے نکل کر میں مڈل اسکول میں آیا تو ایک لڑکے سے میری بڑی گہری دوستی ہوگئی۔ نام تو اُس کا ریاض تھا مگر چونکہ قصبوں، دیہاتوں کی دیرینہ روایت چلی آرہی ہے کہ کسی کو اس کے صحیح اور اصل نام سے نہ پکارا جائے۔ اس لیے اُسے بھی راجو کہا جاتا تھا۔ خود میرا اپنا بھی یہی معاملہ تھا کہ نام تو افضل تھا مگر پکارا "فجے" کے نام سے جاتا تھا۔

راجو منحنی سا لڑکا تھا۔ قد کاٹھ میں مجھ سے تقریباً آدھا لیکن تھا بہت بدمعاش۔ اس کے باپ کی کریانے کی دُکان تھی جہاں عموماً راجو کو بھی بیٹھنا پڑتا تھا۔ سب سے پہلا کام

وہ یہ کرتا تھا کہ ابتدائی آمدنی کے دو تین روپے جیب میں ڈالتا تھا بعد میں پیسے گلّے میں ڈالنا شروع کرتا تھا۔

اسکول میں وہ بڑا شریف زادہ بن کر رہتا لیکن شام کو جب ہم پُلیا پر ملتے تو اس کے کلّے میں پان دبا ہوتا اور انگلیوں میں بگلے کا سگریٹ۔ پُلیا کی دیوار پر وہ میرے قریب ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ جاتا اور لمبے لمبے کش لے کر چٹکی بجا بجا کر راکھ جھاڑتا اور جب کوئی اکیلی دُکیلی لڑکی یا عورت پگڈنڈی سے گزرتی تو اس طرح اُسے آنکھ مارتا کہ وہ تو نہ دیکھنے پائے لیکن میں ضرور دیکھ لوں۔

فلمیں دیکھنے کا راجو بڑا رسیا تھا۔ اُس نے مستقلاً مجھے اپنا فلم بینی کا ساتھی بننے کی دعوت دے دی۔ پیسے تو اس کے پاس ہوتے ہی تھے، ایک کی جگہ دو ٹکٹ خریدنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں اس کا مقصد تو سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے ایک طرح سے باڈی گارڈ کے طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میں قد کاٹھ میں کلاس میں سب سے بڑا تھا اور وقت سے پہلے ہی میری مسیں بھی بھیگنے لگی تھیں۔ مجھے کلاس روم میں پہلی بار دیکھنے والا تو یہی سمجھتا تھا کہ شاید میں دو چار سال فیل ہوتا رہا ہوں۔

بہرحال مجھے راجو کے ساتھ فلم دیکھنے کے لیے جانے میں کوئی عذر نہیں تھا۔ وقت میرے پاس بہت تھا۔ لڑائی بھڑائی کا اتفاق مجھے کم ہی ہوا تھا لیکن ایک بات بہرحال طے تھی کہ میں کسی سے ڈرتا کم ہی تھا۔ زندگی کی یکسانیت سے میں پہلے ہی بیزار تھا۔

قصبے کے نواح میں ایک سینما ہاؤس موجود تھا۔ تعمیر تو اس کی اینٹوں اور گارے ہی سے عمل میں آئی تھی لیکن نام اس کا شیش محل تھا۔ اس کے نہایت بدحال قسم کے ہال میں پلائی ووڈ کی کرسی پر اندھیرے میں بیٹھ کر میں نے جب اپنی زندگی کی پہلی فلم دیکھنی شروع کی تو مجھے جس قدر سنسنی محسوس ہو رہی تھی اتنی شاید کولمبس کو پہلی بار امریکا کی سرزمین دیکھ کر بھی نہ ہوئی ہو۔

کئی مناظر پر میں سیٹ سے اس حد تک اُچھلا کہ اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ کئی مناظر پر راجو نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے ردِعمل کے اظہار سے باز رکھا گو کہ ہمارے ارد گرد جذبات کا اظہار جاری تھا۔ بڑکیں، سیٹیاں اور ب... ببب... با... کی آوازیں وقفے وقفے سے سُنائی دے رہی تھیں۔ ایک مرتبہ تو ہیروئین جو غالباً صبیحہ تھی، نے جالی دار نقاب پہن کر رقص شروع کیا تو ساتھ ہی ایک دھوتی پوش نوجوان نے بھی اسکرین کے چبوترے کے پاس ناچنا شروع کر دیا۔ ہم تھرڈ کلاس میں بیٹھے تھے اور وہی کھچا کھچ بھری ہوتی تھی۔

انٹرول کے دوران ہمیں صرف اِکا دُکا مونچھوں والوں نے گھورنے پر اکتفا کیا۔ کسی نے کچھ کہا نہیں۔ ویسے میں احتیاطاً واسکٹ کی جیب میں ایک چھوٹا سا چاقو ڈال لایا تھا۔ ہم نے ہال ہی میں بیٹھے بیٹھے کچھ گنڈیریاں چوسیں پھر راجو نے بگلے کی دو سگریٹیں سلگا کر ایک مجھے دی۔ مجھے سگریٹ پینی تو نہیں آتی تھی لیکن میں بھی راجو کے انداز میں کش لے کر محض دھوئیں کے غرارے کرتا رہا اور چٹکی بجا بجا کر راکھ جھاڑتا رہا۔ ایک بار میں نے دھواں حلق سے اُتارنے کی کوشش کی تو پھندا لگ گیا اور آنکھیں باہر کو نکلنے لگیں چنانچہ میں نے دھواں نگلنے کی کوشش ترک کر دی۔ آج میں پہلی بار خود کو کچھ جوان جوان سا محسوس کر رہا تھا۔

فلم دیکھ کر اور راجو کو خدا حافظ کہہ کر میں گھر آیا تو سب سو چکے تھے۔ حجرہ نما کمرے میں ابا جی بھی خراٹے لے رہے تھے لیکن میں اپنی چارپائی پر لیٹنے لگا تو انھوں نے اچانک سر اُٹھا کر کہا۔ "بیٹا! رات کو دیر سے گھر نہ آیا کرو۔ فلم دیکھنی ہوا کرے تو اتوار کو تین سے چھ والا شو دیکھ لیا کرو۔" یہ کہہ کر انھوں نے دوبارہ سر تکیے پر رکھا اور خراٹے لینے لگے۔

میں سردی کے مارے ہوئے چوہے کی طرح چارپائی میں دبک گیا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ آخر انھیں کس طرح علم ہوا کہ میں فلم دیکھنے گیا تھا۔ اُس رات مجھے بہت دیر میں جا کر نیند آئی۔ میری رگ رگ میں اس طرح سنسنی دوڑ رہی تھی جیسے میں نے واقعی کوئی نئی دُنیا دریافت کر لی ہو۔ فلم کے مناظر میرے ذہن سے محو ہی نہیں ہو رہے تھے۔ میری یکسانیت بھری زندگی میں پہلی بار دلچسپی کی ایک لہر آئی تھی۔

بڑی مشکل سے نیند آئی۔ اُس رات میرے سپنوں

کی نوعیت بھی بدل گئی۔ پہلے عموماً خوابوں میں گتے، بھالو، گیدڑ اور گھوڑے وغیرہ نظر آیا کرتے تھے لیکن اس رات صبیحہ خانم سے مشابہ لڑکیوں کے جھرمٹ کے جھرمٹ نظر آتے رہے۔ گھوڑا بھی نظر آیا لیکن اس پہ زرق برق شاہانہ لباس زیب تن کیے اور سر پر تاج سجائے میں خود بیٹھا ہوا تھا۔ پہلو میں تلوار بھی لٹک رہی تھی۔ غالباً میں نے لڑکیوں سے کورس کی شکل میں گانے سننے میں کچھ زیادہ ہی وقت ضائع کر دیا۔ کیونکہ جب کشتوں کے پشتے لگانے کی نوبت آئی تو کسی نے مجھے جگا دیا۔

وہ چچی تھیں جو حسب معمول بالٹی لیے میرے قریب کھڑی تھیں اور حکم دے رہی تھیں کہ میں گائے کا دودھ دوہ لوں۔ پہلی بار میں اس وقت جگائے جانے پر پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ اس کمبخت گائے کے تھنوں سے دودھ نکالنا، صحراؤں سے تیل نکالنے کی نسبت زیادہ مشکل کام تھا۔

بہرحال گھر کے معمولات اپنی جگہ جاری رہے لیکن اس دن کے بعد راجو سے میری دوستی اور بھی مضبوط ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے کے دوست ہی نہیں، ایک دوسرے کی ضرورت بھی تھے۔ میں اُس کا باڈی گارڈ تھا، وہ میرا سرمایہ کار اور مشیر۔ فلم بینی کا شغل بڑے تواتر سے جاری تھا۔ اب تو مجھے تمام اداکاروں کی شناخت بھی ہو چکی تھی۔

شام کو کبھی کبھار میں اور راجو بازار میں موچھے کے چائے خانے پر بھی بیٹھتے تھے۔ موچھا چائے بھی بیچتا تھا اور ساتھ ساتھ سائیکلوں کے پنکچر بھی لگاتا تھا۔ ان دونوں کاموں میں کیا قدرِ مشترک تھی یہ میں کبھی نہیں سمجھ سکا۔ شاید قدرِ مشترک آمدنی تھی۔ دونوں ہی کام اچھے چلتے تھے۔ موچھے کے ہاں اخبار آتا تھا اور کبھی کبھار دُنیا جہان کے دھکے کھاتا ہوا کوئی فلمی رسالہ بھی آپہنچتا تھا۔

کبھی کبھار میں اور راجو کھیتوں کے پاس یا پلیا پر ویرانی دیکھ کر شوٹنگ بھی کیا کرتے۔ تمام کردار ہم آپس میں بانٹ لیا کرتے۔ کبھی راجو ہیرو بن جاتا اور میں ولن، کبھی میں ہیرو بنتا اور راجو ہیروئن۔ وہ اپنے گلے میں پڑے ہوئے رومال کو آنچل بنا کر اس کا سرا انگلی پر لپیٹتے اور کھوتے ہوئے غمزدہ اور باریک سی آواز نکالتے ہوئے پوچھتا: "تم مجھے چھوڑ کر تو نہیں جاؤ گے شہری بابو؟"

میں بھاری لیکن رومینٹک آواز بنا کر کہتا "کیسی باتیں کرتی ہو گاؤں کی گوری! ہم نے تو اپنی زندگی تمہارے نام لکھ دی ہے۔ تمہیں چھوڑ کر جانے سے تو بہتر ہے کہ ہم دُنیا ہی چھوڑ جائیں۔"

جب راجو ہیرو کا اور میں ولن کا کردار ادا کر رہا ہوتا تھا تو راجو زمین پر گری ہوئی غیر مرئی ہیروئن کی طرف اشارہ کر کے غصے سے کانپتی ہوئی آواز میں کہتا "بے غیرت! تجھے اس لڑکی کی عزت پر ہاتھ ڈالتے ہوئے شرم نہیں آئی؟ میں تجھے کچا چبا جاؤں گا۔"

میں ایک حقارت آمیز قہقہہ لگاتا اور راجو مجھ پر جھپٹ پڑتا۔ میں جھوٹ موٹ مار کھانے لگتا۔ ایک بار اُس نے سچ مچ مجھے گھونسا رسید کر دیا جو اتفاق سے میرے گھٹنے پر لگا اور وہ ہاتھ تھام کر بیٹھ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ہلکی سی موچ آ گئی تھی۔

کبھی کبھی ہم کھیتوں میں غیر مرئی گھوڑے بھی دوڑاتے اور کھیتوں میں کام کرتی ہوئی کسی غیر مرئی لڑکی کو اُٹھا کر گھوڑے پر ڈال کر فرار ہونے کی کوشش کرتے۔ اس قسم کی شوٹنگ میں ایک مرتبہ تو ہم اتنے محو ہوئے کہ سیدھے نہر میں جا گرے۔ وہ تو شکر ہے کہ ہم دونوں ہی کو تیرنا آتا تھا، ورنہ اس وقت تو آس پاس کوئی بچانے والا بھی نہیں تھا اور اس مقام پر نہر تھی بھی کچھ زیادہ ہی گہری۔

٭٭٭

ہم آٹھویں جماعت میں پہنچ چکے تھے اور دُنیاداری کی ہمیں خاصی سمجھ آنے لگی تھی۔ ویسے بھی عام لڑکوں کی نسبت ہم دونوں ہی کی ذہنی سطح بلند تھی۔

ایک روز میں پلیا پر بیٹھا گنا چھیل کر چوس رہا تھا کہ نہ جانے کس طرف سے ایک نہایت مترنم اور شیریں آواز سنائی دی "آج تمہاری ہیروئن نہیں آئی کیا؟"

میں گنے سمیت دیوار پر سے نالے میں گرتے گرتے بچا۔ سنبھل کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو پلیا کے سرے پر نیچے وہ مصلّی کی لڑکی کھڑی نظر آئی۔ وہ سر اُٹھائے میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور اس کے ہموار سفید دانت، دنداسے سے رنگے ہوئے رسیلے سانولے ہونٹوں کے عقب سے جھانک رہے تھے۔

دیہاتوں وغیرہ میں ہم جیسے مزارعوں اور ان کے بال بچوں کو بھی کمی کمین ہی سمجھا جاتا ہے بلکہ کمی کم اور کمین زیادہ... لیکن مصلّی تو ہم سے بھی کمتر مخلوق شمار ہوتے ہیں۔

دینا مصلّی، ملک صاحب کے اصطبل میں کام کرتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں اس کی عزت تھی یا نہیں لیکن اس کی لڑکی تاجاں کے بارے میں ہمیشہ یہی سُنا تھا کہ مصلّی ہوتے ہوئے بھی اس میں نخرہ ملکانیوں جیسا تھا۔ ملک کے گھر میں کام کرنے جاتی تھی مگر

کیا مجال جو مالکوں اور ملازموں میں سے کوئی ٹیڑھی نظر سے دیکھ لے ورنہ ملکوں کے ڈیروں پر تو اس طبقے کی لڑکیاں گھر کی مرغی ہی ہوتی تھیں۔

تاجاں کی شہرت بڑی اچھی تھی۔ ہمیشہ یہی سنا تھا کہ ناک پہ مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ کام سے کام رکھتی ہے اور کام ختم کر کے گھر آجاتی ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ شاخ نرم ہو تبھی جھکائی جاتی ہے۔ اگر کوئی طاقت استعمال بھی کرے تو جھکو مت، ٹوٹ جاؤ۔ یہ باتیں میں اپنے چچاؤں اور چچیوں کو کرتے سُنتا تھا۔

تاجاں مجھ سے چھ سات سال بڑی ہو گی۔ وہ بھرے بھرے جسم کی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ آنکھیں موٹی موٹی تھیں اور جسم میں گولائیاں کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھیں۔ تیل میں چپڑے ہوئے بال ہمیشہ پیچھے کو کھنچے ہوئے ہوتے تھے۔ چٹیا بڑی سخت گوندھی ہوتی۔ دانت ہمیشہ دنداسے سے چمکائے رکھتی تھی اور دنداسے ہی کے رنگ سے اس کے بھرے بھرے رسیلے ہونٹ کچھ زیادہ رسیلے نظر آتے تھے۔ آنکھوں میں کاجل کے بغیر بھی ڈوروں سے کھنچے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔

اس وقت وہ وائل کی تنگ اور اونچی سی قمیص جو شاید اُسے کسی ملکانی نے دی ہوگی، پہنے ہوئے تھی۔ شلوار کی جگہ سیاہ دھوتی تھی اور پیروں میں گھسے تھے۔ جس بلندی اور جس زاویے پر میں بیٹھا تھا وہاں سے اُسے دیکھنا خاصا خوشگوار عمل تھا۔ میں گرتے گرتے تو سنبھل گیا تھا مگر اب جیسے کچھ کھو سا گیا تھا۔

وہ پلیا پر چڑھتے ہوئے بولی "میں نے کچھ پوچھا تھا۔"

"ایں...؟" میں نے چونکتے ہوئے کہا "ہاں... وہ کون سی ہیروئن...؟"

"وہی بدمعاش... راجو کا بچہ!" اُس نے گویا ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اُسے بدمعاش کیوں کہہ رہی ہو؟" میں نے ہلکی سی خفگی ظاہر کرنے کی کوشش کی "وہ دوست ہے میرا... اور بہت شریف لڑکا ہے۔"

"واقعی بہت شریف ہے۔" وہ اپنی قمیص کو کھینچ کر گویا لمبا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے گہری سانس لے کر بولی "ایک روز مجھے گلی میں روک کر رقعہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے کہا: بچے! میں تو ان پڑھ ہوں، خود ہی پڑھ کر سُنا دے کیا لکھا ہے۔ کانپتے ہاتھوں سے اُس نے رقعہ کھول کر پڑھنا شروع کیا۔ جانِ من تاجاں! تمہیں دیکھ کر جانے کیوں میرا دل دھڑکنے لگتا ہے۔ میں نے وہیں اُسے چپ کراتے ہوئے پوچھا: کیوں بچے مجھے دیکھنے سے پہلے تمہارا دل نہیں دھڑک رہا ہوتا کیا؟ ابے اُلّو! دل کا تو کام ہی دھڑکنا ہے۔ البتہ اگر آئندہ تو نے مجھے یوں گلی میں روک کر یہ پڑھے لکھوں والا عشق جھاڑنے کی کوشش کی تو ایسی

پٹائی لگاؤں گی کہ دل کے ساتھ ساتھ گردے اور پھیپھڑے وغیرہ بھی دھڑکنے لگیں گے۔ اُس دن کے بعد سے مجھے تاجاں باجی کہتا ہے۔"

"چہ... چہ... چہ...!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "عشق کا ایسا دردناک انجام۔ اے سانولی حسینہ! تجھے اُس کم عمر عاشق کا یوں دل نہیں دکھانا چاہیے تھا۔" مجھے حیرت تھی کہ راجو نے یہ واقعہ مجھے نہیں بتایا تھا حالانکہ وہ مجھ سے کوئی بات چھپاتا نہیں تھا۔

"ٹھڈا سا تو وہ ہے۔" تاجاں بولی "اور باتیں کرتا ہے اتنی بڑی بڑی۔"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے گنا دیوار پر رکھ کر سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے کہا "میں تو ٹھڈا سا نہیں ہوں۔"

اُس نے گنا اُٹھا کر میرے کندھے پر مارا اور بدستور ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی "یہ تم دونوں اتنی چھوٹی چھوٹی عمروں میں اتنے بدمعاش کیوں ہو گئے ہو؟ میں نے سُنا ہے تم فلمیں بہت دیکھتے ہو۔"

"قصور فلموں کا نہیں سانولی حسینہ!" میں نے دردناک لہجے میں کہا "قصور ہماری رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کا ہے۔" پھر میں نے لہجہ بدل کر سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا "تم نے راجو کو میری ہیروئن کیوں کہا تھا؟"

"تم دونوں یہاں شوٹنگ جو کرتے رہتے ہو۔" اُس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے حیرت سے پوچھا "ہم تو شوٹنگ شروع کرنے سے پہلے اطمینان کر لیتے ہیں کہ دُور دُور تک کوئی موجود تو نہیں۔"

"میں وہاں ہوتی ہوں۔" اُس نے کافی فاصلے پر موجود ایک

درخت کی طرف اشارہ کیا۔ "درخت پر چڑھ کر شاخوں میں چھپ جاتی ہوں، اس لیے تمھیں نظر نہیں آتی۔ بلندی سے شوٹنگ بھی ذرا اچھی طرح نظر آتی ہے۔"

"اُلّو کی پٹھی!" میں نے دل میں سوچا۔ مجھے اس تصور سے ندامت ہو رہی تھی کہ ہماری نہ جانے کیسی کیسی مضحکہ خیز حرکتیں وہ دیکھتی رہی تھی۔ تاہم میں نے دل کی دل ہی میں رکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم درخت پر چڑھ لیتی ہو؟"

"کیوں نہیں، میں تو گھوڑے پر سواری بھی کر لیتی ہوں، نہر میں تیر بھی لیتی ہوں۔" وہ قدرے بے پروائی سے بولی۔ "یہ کوئی مشکل کام تو نہیں ہیں۔" پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی۔ "شام پڑ رہی ہے، اب میں چلوں۔" وہ قصبے کی طرف نہیں، سڑک کی طرف جا رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"چک بیالیس۔" اس نے جواب دیا۔ چک بیالیس سڑک کے پار تقریباً ڈیڑھ میل کے فاصلے پر تھا۔ "میں اپنی ماسی کو بُلانے جا رہی ہوں۔" وہ بولی۔ "ابا کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے ملکوں کے ہاں کام پر بھی جانا ہوتا ہے۔ ابا نے کہا ماسی کو بُلا لا۔ کچھ دن گھر کا کام وہ سنبھال لے گی۔ ویسے بھی وہ آ کر کچھ دن رہنے کو کہہ رہی تھی۔"

"تم اکیلی جا رہی ہو؟ چلو میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے دیوار سے اُترتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی ایک فلمی مکالمے کا اضافہ کیا۔ "آخر تم ہمارے گاؤں کی عزت ہو مٹیارے! تمھاری حفاظت ہم نہیں کریں گے تو کون کرے گا۔"

"میں خود کر لوں گی۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "تمھیں میرے ساتھ آنے کی ضرورت نہیں۔ لوگ دیکھیں گے تو باتیں بنائیں گے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی۔ میں مبہوت کھڑا اُسے جاتے دیکھتا رہا۔ اُس کی کمر کی لچک، اُس کی لہراتی چوٹی، سب کچھ بہت بھلا لگ رہا تھا۔

وہ سڑک پار کر کے کھیتوں میں اُتر چکی تو میں نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ گویا میں اتنا بڑا ہو چکا تھا کہ کوئی جوان بلکہ میری اور راجو کی اصطلاح میں 'فل جوان' لڑکی میرے ساتھ چلتے وقت یہ اندیشہ محسوس کرنے لگی تھی کہ لوگ دیکھیں گے تو باتیں بنائیں گے۔ یہ تصور بڑا سنسنی خیز تھا۔ میں نے اپنے رگ پٹھے ٹٹول کر دیکھے۔ بازوؤں کی مچھلیوں کا جائزہ لیا۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہی تھا۔

"خوش رہ فتّے پتّر!" میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو دعا دی۔ "اب تھوڑی سی کسرت بھی شروع کر دے تاکہ تو جلدی سے وینڈ کا گھبرو جوان بن جائے۔"

کچھ دیر بعد راجو آ گیا تو میں نے اُسے بتایا کہ ہمیں شوٹنگ وغیرہ کے لیے کوئی اور 'لوکیشن' تلاش کرنی پڑے گی۔ یہ جگہ کچھ محفوظ نہیں رہی تھی۔

ہم نے 'لوکیشن' بدل دی۔ بہرحال تاجاں سے اس کے بعد بھی کبھی کبھار سامنا ہوتا رہا۔ گلی محلے میں تو میری اس سے مڈبھیڑ ہوتی ہی رہتی تھی لیکن ان موقعوں پر وہ بات نہیں کرتی تھی بس مسکرا کر، سر کو خفیف سی حرکت دے کر گزر جاتی تھی۔ البتہ قصبے سے باہر کبھی ملتی تھی تو دو چار منٹ رُک کر بات کر لیتی تھی۔ وہ تھوڑے تھوڑے دنوں بعد چک بیالیس جاتی نظر آتی رہتی تھی۔ کبھی ماسی کو لینے جا رہی ہوتی تھی، کبھی اُس کی خیریت پوچھنے اور کبھی اس کے بچے کے لیے کوئی دوا پہنچانے... تاہم میں نے اس کی ماسی کو کبھی دیکھا نہیں۔

آٹھویں جماعت میں ہمارے آخری مہینے تھے جب ہمارے اسکول کو ترقی دے کر ہائی بنا دیا گیا۔ ان دنوں مڈل اور میٹرک کی حد تک یہ سہولت حاصل تھی کہ جن لڑکوں کو ماسٹر صاحبان ذرا لائق خیال کرتے تھے انھیں بورڈ کے تحت امتحان میں بٹھاتے تھے اور جنھیں ذرا کمزور سمجھا جاتا تھا ان کا امتحان اسکول ہی کی سطح پر ہو جاتا تھا۔ عموماً سب ہی کو اگلی کلاس میں دھکا دینے کی کوشش کی جاتی تھی۔ کوئی بہت ہی پھسڈی ہوتا تھا تو وہ جاتا تھا۔ اسی لیے اسکول سے امتحان پاس کرنے والے کی نسبت بورڈ سے امتحان پاس کرنے والے کی ذرا زیادہ قدر تھی۔

میں نے ایک ماسٹر صاحب کی منت خوشامد کر کے بورڈ کے تحت امتحان دیا تھا حالانکہ وہ مجھے اسکول ہی سے امتحان دلوانے پر تُلے ہوئے تھے۔

جس روز میرا رزلٹ اخبار میں آنا تھا اُس روز کے لیے میں نے قصبے کے اکلوتے بک اسٹال والے کو تاکید کر رکھی تھی کہ میرے لیے ایک کاپی ضرور رکھے لیکن جب میں اور اباجی اس روز ہانپتے کانپتے اس کے پاس پہنچے تو پتا چلا کہ وہ سارا اخبار بلیک میں بیچ چکا تھا۔ مجھے بڑا طیش آیا۔ میں نے اس کا گریبان پکڑ لیا اور اسٹال سے نیچے اُتار کر گھونسا رسید کرنے ہی لگا تھا کہ اباجی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

اسٹال والا اپنی ٹوپی سنبھالتے ہوئے بولا۔ "مجھے زیادہ بدمعاشی دکھائی تو ایس ایچ او کو کہہ کر اندر کرا دوں گا... غنڈہ گردی کی خبر لگوا دوں گا... تمھیں معلوم نہیں میں روزنامہ 'بوستان' کا ایجنٹ بھی ہوں اور نمائندہ بھی ہوں۔"

مجھے کچھ زیادہ اچھی طرح معلوم نہیں تھا کہ ایجنٹ کیا ہوتا ہے اور نمائندہ کیا۔ میں، تو اُسے اُٹھا کر پٹخنے پر تُلا ہوا تھا لیکن اباجی ڈانٹ ڈپٹ کر کے ایک طرف کو لے گئے پھر ہم اخبار کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔

موچیوں کے چائے خانے پر، شیدے ٹِلیاں والے کی دکان پر جہاں ٹِلیوں یعنی گھنٹیوں کے بجائے کپڑا فروخت ہوتا تھا اور مکھو حلوائی کے ہاں... کہیں بھی اخبار نہیں تھا۔ جہاں جاتے یہی پتا چلتا کوئی مانگ کر لے گیا ہے۔

مجھ سے زیادہ اباجی بے تاب تھے اور ایک ہاتھ سے پگڑی اور ایک ہاتھ سے دھوتی سنبھالے مجھ سے آگے آگے دوڑے جا رہے تھے۔ شوق اور اضطراب گویا انھیں اُڑائے لیے جا رہا تھا۔ مجھے ان کا وہ انداز آج تک نہیں بھولا۔ ماں باپ کے سوا کون کسی کی کامیابی و ناکامی کے بارے میں جاننے کے لیے اتنا مشتاق و مضطرب ہو سکتا ہے؟

بالآخر ایک گلی میں راجو ہمیں اپنے گھر کے سامنے کھڑا مل گیا۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا۔ میں نے لپک کر اباجی کے برابر ہو کر جھک کر دیکھا۔ کمبخت فلموں کے اشتہار دیکھ رہا تھا۔

"رزلٹ دیکھا، راجو؟" میں نے اور اباجی نے مختلف لہجوں اور مختلف لفظوں میں ایک ہی سوال کیا۔ اباجی نے تو اس کے ہاتھ سے اخبار ہی چھین کر مجھے تھما دیا۔

"دیکھ لیا ہے یار رزلٹ۔" وہ منہ بنا کر بولا۔ "ہم دونوں پاس ہو گئے ہیں، تھرڈ ڈویژن میں۔"

"اللہ تیرا شکر ہے۔" اباجی نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا۔ "کہ تُو نے آج ہمیں یہ عزت اور کامیابی بخشی۔ خدایا تیرا بڑا کرم ہے کہ ہمارے خاندان میں بھی کوئی لڑکا مڈل پاس ہے۔" پھر انھوں نے کئی مرتبہ میری پیشانی چومی۔ اُن کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو چھلک رہے تھے جو اُن کی خشخشی سی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ پھر انھوں نے صدری کی جیبیں ٹٹولیں۔ ایک ایک روپے کے دو نوٹ اور چند آنے برآمد ہوئے۔ اس وقت اُن کی جیب میں بس یہی موجود تھے۔ وہ انھوں نے مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "مکھو کے ہاں سے کچھ لڈو لے کر اپنے دوستوں کا اور کچھ معصوم بچّوں کا منہ میٹھا کرا دینا۔ میں کام پر جا رہا ہوں۔ بڑی دیر ہو گئی ہے مجھے۔"

اباجی کے جاتے ہی راجو نے ایک نظر میری مٹھی میں دبے ہوئے نوٹوں پر ڈالی اور آنکھ مار کر بولا۔ "آج کی فلم تو تیری طرف سے رہی استاد۔"

ان پیسوں سے ہم نے لڈو بانٹنے کے بجائے فلم ہی دیکھی۔

شب و روز یونہی گزر رہے تھے۔ اُن دنوں میں میٹرک میں تھا جب ایک روز اسکول میں وقفے کے دوران ایک لڑکے نے آ کر مجھے بتایا کہ ہیڈ ماسٹر صاحب مجھے بُلا رہے ہیں۔ مجھے گھبراہٹ سی ہونے لگی۔ نہ جانے کیا بات تھی؟ آج تو میں نے کوئی شرارت بھی نہیں کی تھی۔ بہرحال دل مضبوط کر کے ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں پہنچا۔ میرے اُردو کے استاد بھی وہاں بیٹھے ہوئے تھے۔

"تمھارا نام ہے افضل؟" ہیڈ ماسٹر صاحب نے عینک کے شیشوں کے اوپر سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ہیڈ ماسٹر صاحب جیسی معزز ہستی مجھے میرے درست نام سے مخاطب کر رہی تھی۔

"جی ہاں۔" میں نے تھوک نگل کر جواب دیا۔

"تمھارے پاس کوئی صاف شلوار قمیص ہے؟" انھوں نے میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ اس غیر متوقع سوال نے مجھے پریشان کر دیا۔ اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید صاف شلوار قمیص نہ رکھ سکنے کے جرم میں مجھے اسکول سے نکالنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔

"جی ہاں... ایک ہے تو سہی... میں اُسے اچھی طرح

ڈھلوا لوں گا۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ "مگر کیا ..." میں سوال مکمل کرنے کی ہمت نہ کر سکا۔

"پتر ... میرا مطلب ہے برخوردار ..." ہیڈ ماسٹر صاحب نے کھنکھار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "ہم دراصل تمھیں لاہور بھیجنا چاہ رہے ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے گویا میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ سارے فلم اسٹوڈیو لاہور میں ہیں، ساری ہیروئینیں بھی لاہور ہی میں رہتی ہیں۔ ہیروز سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔

ہیڈ ماسٹر صاحب اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذات کے پلندے کو الٹتے پلٹتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ "بھئی، وہ مسئلہ یہ ہے کہ لاہور میں کوئی میلہ شیلہ ہو رہا ہے، کئی دن چلے گا۔ اس میں اسکولوں کے درمیان مختلف مقابلے بھی ہوں گے۔ ہمارے اسکول سے بھی ایک ایک کھلاڑی کبڈی، ہاکی، اور ہائی جمپ کا جائے گا۔ مصیبت یہ ہے کہ دعوت ایک مقرر کے لیے بھی آئی ہے کیونکہ وہاں تقریری مقابلے بھی ہوں گے۔ کھلاڑی تو ہم نے سب منتخب کر لیے ہیں، مقرر کوئی نہیں ہے۔ جو ایک آدھ ہے اس کی اردو مجھ سے بھی زیادہ خراب ہے۔ اردو کے ماسٹر صاحب نے تمھارا ہی نام تجویز کیا ہے لہٰذا ہم نے سوچا ہے کہ مقرر کے طور پر تمھیں بھیج دیں۔"

"لیکن سر ... میں نے تو کبھی تقریر کی ہی نہیں۔" میں نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

اس کے بعد ہیڈ ماسٹر صاحب نے اس موضوع پر کچھ دیر تقریر کی کہ تقریر کا فن کیا ہوتا ہے پھر کہنے لگے۔ "ویسے بھی ہم کون سا تمھیں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی میں تقریر کرنے کے لیے بھیج رہے ہیں۔ تمھارا فائدہ یہ ہے کہ اسکول کے خرچ پر لاہور کی سیر کر آؤ گے۔ مجھے دراصل تمھارے ماسٹر صاحب نے بتایا ہے کہ تمھاری آواز بڑی رعب دار ہے۔ ماسٹر صاحب تمھیں تقریر لکھ دیں گے اور رٹوا بھی دیں گے، کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے، بس تیار رہنا۔ ایک ہفتے بعد تمھیں ماسٹر صاحب کے ساتھ جانا ہے۔ ہم نے تمھارا نام لکھ لیا ہے۔"

آج کل جس طرح کسی کے ڈیوٹی جانے یا حج پر جانے کی تیاری ہوتی ہے اسی زور و شور سے میرے لاہور جانے کی تیاری شروع ہوئی۔ اس میں تیاری کم تھی اور زور و شور زیادہ۔ تیاری کرنے کے لیے تھا ہی کیا؟ ایک شلوار قمیص تھی جسے میں نے خود تین مرتبہ دھو کر دھوبی سے استری کروایا۔ جوتے موچی سے مرمت اور پالش کروا کے رکھے۔ ایک دوست سے شیشی میں تھوڑا سا خوشبودار تیل مانگ کر رکھا کہ لاہور جاتے ہوئے لگا کر جاؤں گا۔

تقریری مقابلوں وغیرہ کی تاریخ سے ایک دن پہلے ہم چند لڑکے ماسٹر صاحب کے ساتھ لاہور روانہ ہوئے۔ ہماری بس جب لاہور کی حدود میں داخل ہوئی تو فرطِ اشتیاق سے میرا دل اس کمسن دُلہا کی طرح دھڑک رہا تھا جو حجلۂ عروسی کی طرف روانہ ہونے لگا ہو۔

ماسٹر صاحب ہمیں بتاتے جا رہے تھے۔ "یہ شاہی مسجد ہے ... اس کے برابر میں شاہی قلعہ ہے ... یہ بھاٹی گیٹ ہے ... یہ دائیں ہاتھ پر گلی میں دربار داتا صاحب ہے۔"

اگلی سیٹوں سے دو تین آدمیوں نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا پھر ان میں سے ایک نے قدرے نیچی آواز میں دوسرے سے کہا۔ "ایہہ وی بتیاں ویکھن آئے نیں۔" (یہ بھی بتیاں دیکھنے آئے ہیں) اس کے ساتھی نے زوردار قہقہہ لگایا گویا یہ کوئی عمدہ لطیفہ تھا۔ ماسٹر صاحب کھسیانے سے ہو کر چپ ہو گئے۔ وہ بارہا لاہور آ چکے تھے مگر اشتیاق ان کا بھی قابلِ دید تھا تاہم اس شخص کا فقرہ سننے کے بعد ان پر بھی گویا اوس سی پڑ گئی تھی۔

ان دنوں ریلوے اسٹیشن پر ہی بیشتر بسوں کا ٹرمینل ہوتا تھا لیکن ہم بھاٹی گیٹ کے چوک میں ہی اتر گئے۔ ہمارے قیام کا بندوبست دوسرے شہروں سے آئے ہوئے بہت سے لڑکوں کے ساتھ گورنمنٹ کالج کے ہوسٹل میں کیا گیا تھا، جو ان دنوں خالی تھا۔ اس ہوسٹل میں قیام کرنے کا سب سے بڑا فائدہ ہمیں یہ ہوا کہ ہم نے فلش سسٹم کا استعمال سیکھ لیا۔

رات کو ہمیں میس میں کھانے کے لیے بلایا گیا۔ شفٹوں میں لڑکوں کو بھگتایا جا رہا تھا۔ ہماری شفٹ میں بیشتر لڑکے دیہاتی اور نیم دیہاتی قسم کے ہی تھے جبکہ کھانا شہری قسم کا تھا۔ میں نے جب چھ روٹیاں چٹ کرنے کے بعد تیسری مرتبہ سالن طلب کیا تو بیرا نما شخص نے ناپسندیدگی کی نظر سے ہم سب کو گھورتے ہوئے کہا۔ "اگلی شفٹ کے لیے بھی کچھ چھوڑ دو گے یا نہیں؟"

اس کے بعد دبی دبی زبان میں ماسٹر صاحب نے ہمیں سمجھایا کہ ہمیں اپنے آپ کو بے حد مہذب، شائستہ اور نفاست پسند ظاہر کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے چوتھی مرتبہ سالن مانگنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

میلے کے سلسلے کی سرگرمیوں کا انتظام یونیورسٹی گراؤنڈ پر تھا اور تقریری مقابلوں میں ہمارا نمبر رات کو آنا تھا۔ ماسٹر صاحب تو دیگر تفصیلات وغیرہ معلوم کرنے کے لیے صبح ہی کمرے سے رخصت ہو گئے۔ البتہ ہمیں تاکید کر گئے کہ ان کی واپسی تک ہم کہیں نہ جائیں۔ باقی لڑکے تو کھڑکی میں لٹک کر ٹریفک دیکھ کر ہی اپنا سیر کا شوق پورا کرنے لگے لیکن میں چپکے سے کمرے سے کھسک لیا۔

نیچے آ کر میں سڑک پار کر کے سانس درست ہی کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ مجھے کہاں اور کیسے جانا چاہیے کہ ایک ڈبل ڈیکر بس مست ہاتھی کی طرح جھومتی جھامتی میرے قریب آ رکی۔ وہ ایک طرف کو اتنی زیادہ جھکی ہوئی تھی کہ میں سہم کر پیچھے ہٹ گیا کہ کہیں مجھ پر ہی نہ آن گرے۔

اس میں سے اترنے والے بیشتر لوگ جن میں کالے کوٹوں والے دو تین وکیل بھی شامل تھے، ضلع کچہری کی طرف بڑھ رہے تھے۔ اسی دوران کنڈیکٹر نے آواز لگائی۔ "شاہ نور ... شاہ نور!"

اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ شاہ نور ایک اسٹوڈیو کا نام ہے لیکن میں نے اطمینان کرنے کے لیے کنڈیکٹر سے پوچھ ہی لیا۔ "شاہ نور اسٹوڈیو ہی جا رہی ہے نا؟"

اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا، مسکرایا اور بس میں گھس کر مسافروں کو آگے دھکیلنے لگا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ہی بس میں چڑھ گیا۔ میری صدری کی جیب میں تین روپے چار آنے موجود تھے جو اباجی نے بمشکل اپنے بجٹ میں گنجائش نکال کر مجھے دیے تھے۔ میں نے سن رکھا تھا، بہت سی کہانیوں میں بھی پڑھا تھا اور فلموں میں بھی دیکھا تھا کہ شہر میں عموماً بسوں میں سفر کرنے والوں کی جیب کٹ جاتی ہے خصوصاً نئے آنے والوں کی، اس لیے اس جیب پر سختی سے ہاتھ رکھا ہوا تھا جس میں تین روپے چار آنے تھے۔

سفر مجھے بہت طویل محسوس ہو رہا تھا۔ خدا خدا کر کے ہانپتی کانپتی بس ایک مقام پر رکی۔ وہاں پہنچتے پہنچتے تمام مسافر اتر گئے۔ مجھے کنڈیکٹر نے آ کر اتارا۔ یہ بتا کر کہ شاہ نور اسٹوڈیو آ گیا ہے۔

میں نے بس سے اتر کر اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے کہیں اسٹوڈیو کے آثار دکھائی نہ دیے۔ دراصل میرے ذہن میں اسٹوڈیو کا تصور کچھ عجیب سا تھا کہ شاید وہ کوئی محل نما بہت لمبی چوڑی اور چم چم کرتی عمارت ہوتی ہو گی۔ اس میں کھیت، جنگل، نہریں سب سجے سجائے ڈرائنگ روم، گلیاں، بازار، دکانیں، طوائف کا کوٹھا وغیرہ سب کچھ تیار ہوتا ہو گا۔ کسی گوشے میں کوئی چیز، کسی حصے میں کوئی چیز، کھیت میں شوٹنگ کرنی ہوئی تو کیمرا اٹھا کر اُدھر کو لے گئے، ڈرائنگ روم میں کرنی ہوئی تو کیمرا اٹھا کر اِدھر کو لے آئے۔

مجھے ایسی کوئی عمارت آس پاس نظر نہیں آ رہی تھی جو اس تصور پر پوری اترتی محسوس ہوتی۔ سامنے ایک عام سی عمارت کا گیٹ نظر آ رہا تھا مگر اس پر نیم دائرے کی شکل میں ایک گرل پر باری اسٹوڈیوز کے انگریزی حروف چسپاں نظر آ رہے تھے۔ ایک صاحب سے معلومات کرنے پر پتا چلا کہ شاہ نور اس کے قریب ہی ایک بغلی گلی میں اندر جانے کے بعد نظر آتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی بائیں ہاتھ پر ایک سڑک مڑتی تھی، وہ ایورنیو اسٹوڈیو میں جاتی تھی۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ یہاں تین اسٹوڈیو ساتھ ساتھ تھے۔ گویا زیادہ بھٹکنے کی ضرورت نہیں تھی، کم وقت میں ہی سارے اسٹوڈیوز کی سیر کی جا سکتی تھی۔

گیٹ کے پاس لوہے کی ایک کرسی پر ایک روایتی قسم کا پٹھان چوکیدار موجود تھا۔ مجھے شبہ ہوا کہ فلموں میں میں نے کئی بار جو چوکیدار خان بابا، دیکھا تھا، وہ شاید یہی تھا۔ وہی موٹی موٹی مونچھیں، وہی کلاہ اور وہی کرسی سے لٹکا ہوا موٹا سا ڈنڈا۔ تاہم وہ موصوف اس وقت اپنی نسوار کی ڈبیا والے آئینے میں دیکھ دیکھ کر اپنی مونچھوں کے سنگھار میں مصروف تھے۔ لوگ بے تکلفانہ اندر آ جا رہے تھے۔

میں بھی اپنے انداز سے بے پروائی اور بے نیازی ظاہر کرتے ہوئے اندر جانے لگا لیکن خان صاحب کی یا تو کوئی اضافی آنکھ بھی تھی جو آنے جانے والوں کا جائزہ لے رہی تھی اور انھیں سب کے چہروں سے اندازہ تھا کہ کون متعلقہ آدمی ہے اور کون غیر متعلقہ ... یا پھر وہ آنے جانے والوں کو ان کی بو سے پہچانتے تھے کیونکہ جیسے ہی میں ان کے سامنے پہنچا، ان کی مونچھیں یوں پھڑ پھڑائیں جیسے کسی حساس میٹر کی سوئیاں کسی گڑبڑ کی نشاندہی کے لیے لرز اٹھی ہوں۔ میری بو پا کر شاید ان کی ناک میں سرسراہٹ ہوئی تھی۔

خان صاحب نے فسولر کی ڈیبار کھ کر اپنا بھاری ڈنڈا اُٹھایا اور اپنی جگہ سے اُٹھے بغیر میری راہ میں حائل کر دیا: "کدھر جا با بڑا لے بالی ہے"

"اندر" میں نے جواب سے کہا۔

"اندر کدھر؟ کس سے ملنے؟ کس کام کی خاطر؟" اُس نے مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بیٹھے ہی بیٹھے پوچھا۔

اب میں گڑبڑا گیا۔ ان سوالوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا: "شوٹنگ دیکھنے۔"

میرا جواب سنتے ہی خان صاحب کو جیسے جلال آ گیا۔ وہ ڈنڈا لہراتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے اور حقارت سے میری نقل اُتارتے ہوئے بولے: "شوٹنگ دیکھنے آیا ہے اور ہم سے پوچھے بغیر اندر جاتا ہے... خانہ خراب، اُدھر دیکھو۔" خان صاحب نے اپنے بائیں ہاتھ سے اشارہ کیا۔

میں نے دیکھا اُدھر آٹھ دس آدمی کندھے سے کندھا جوڑے گویا کسی کے استقبال کے لیے تیار کھڑے تھے۔ کسی کا حلیہ معقول تھا، کوئی بہت ہی شکستہ حال نظر آ رہا تھا، کسی کا چہرہ ستا ہوا تھا اور کوئی بیمار نظر آ رہا تھا۔ ان میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ یہ کہ سب کے چہروں پر اُمید کا پرتو تھا اور جیسے زندگی سے ان کا ناتا بس اسی اُمید کے سہارے قائم تھا۔

"یہ سب بھی شوٹنگ دیکھنے کے واسطے آیا ہے۔" خان صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا، "اور آج کا نہیں بہت مدت سے آیا ہے... ان میں سے کوئی صبیحہ کا عاشق ہے، کوئی شمیم آرا کا عاشق... کوئی نیلو پر جان دیتا ہے اور کوئی مسرت نذیر کے لیے زندگی قربان کرنے کو تیار ہے... ابھی تو ہم نے ان میں سے کسی کو اندر جانے نہیں دیا... تم تو ابھی پہلی دفعہ آیا ہے تو منہ اُٹھا کر اندر جانا چاہتا ہے؟ پیچھے ہٹو خانہ خراب!" خان صاحب نے ڈنڈے سے مجھے پیچھے دھکیل دیا۔

میں کچھ یا محض اپنی خجالت مٹانے کے لیے چند منٹ وہاں کھڑا رہا اور اس دوران احساسات معمول پر آ گئے۔ لوگ بدستور اسکوٹروں پر آ جا رہے تھے، دو ایک گاڑیاں بھی اسٹوڈیو سے باہر آئیں اور خان صاحب نے لپک کر ان کے لیے پورا گیٹ کھولا۔ میں گاڑیوں میں باہر آنے والوں کو پہچان نہیں سکا۔

چند منٹ بعد میں وہاں سے ہٹا اور قریبی گلی میں گھس گیا۔ چند قدم چل کر میں ایک موڑ مڑتے ہی کھلی سی جگہ پر پہنچ گیا۔ سامنے ایک عمارت کا لمبا چوڑا گیٹ تھا جو کھلا ہوا تھا اور اس پر کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا۔ میں جھجکتے ہوئے اندر چلا گیا۔ یہ شاہ نور اسٹوڈیو تھا۔

بائیں ہاتھ پر طویل لان تھا اور اس کے مقابل ستونوں والے برآمدے میں دروازوں کی قطاریں نظر آ رہی تھیں، سب کمرے بند تھے۔ لان کے دوسری طرف بھی اسی طرح ستونوں والے برآمدے تھے۔ ان میں جو دروازے نظر آ رہے تھے، وہ کمروں کے دروازے معلوم نہیں ہوتے تھے، بہت اونچے اونچے سرمئی دروازے تھے جیسے عموماً فلموں میں جیلوں یا پھر قلعوں کے دکھائے جاتے تھے۔ ان دروازوں پر نمبر بھی پڑے ہوئے تھے۔ یہ عمارت دو منزلہ تھی اور اوپر بھی تقریباً نیچے ہی کا سا نقشہ تھا۔

یہاں کچھ ویرانی اور سکوت تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ بھی ہو رہا تھا، بند دروازوں کے پیچھے ہو رہا تھا۔ اِکّا دُکّا آدمی اِدھر اُدھر پھر رہے تھے، کوئی شناسا صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ یہ سب کچھ میرے تصورات سے کافی مختلف تھا۔ میرے ذہن میں کچھ ایسا نقشہ تھا کہ اسٹوڈیو میں داخل ہوتے ہوں گے تو کہیں چھوٹی سی نہر کے کنارے نیلو نیم دراز نظر آتی ہو گی، کچھ آگے بڑھتے ہوں گے تو گھاس پر شیریں محوِ رقص دکھائی دیتی ہو گی، مزید آگے چلتے ہوں گے تو مسرت نذیر گھوڑے پر سوار تلوار لہراتی اِدھر اُدھر پھرتی دکھائی دیتی ہو گی، کچھ اور آگے بڑھتے ہوں گے تو نیر سلطانہ کسی گوشے میں درپن سے سرگوشیوں میں مصروف نظر آتی ہو گی لیکن یہاں ان میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔

میں آوارہ گتّے کی طرح اِدھر اُدھر پھر رہا تھا اور مایوس ہو کر واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا کہ اونچے سرمئی دروازوں میں سے ایک دروازہ اچانک کھلا اور ایک دراز قد عورت جو پہلی نظر میں مجھے مرد معلوم ہوئی، تیزی سے باہر آئی۔ وہ سیاہ چست پتلون قمیص اور لقرئی سے رنگ کی چمکیلی جیکٹ پہنے ہوئے تھی۔ پیروں میں فل بوٹ تھے۔ اس کے تراشیدہ بکھرے بال پٹے کندھوں پر جھول رہے تھے۔ بڑے مردانہ انداز میں وہ ٹھک ٹھک کرتی برآمدے میں آ رہی تھی۔

اُس کے چہرے پر سُرخی پاؤڈر اس قدر تھپا ہوا تھا جیسے کسی نے برش سے باقاعدہ پینٹ کیا ہے۔ اس کی آنکھیں خوبصورت تھیں مگر انھیں اتنے زیادہ کاجل سے سجایا گیا تھا کہ وہ مصنوعی معلوم ہونے لگی تھیں۔ اس کے دائیں بائیں دو مرد تھے۔ ایک نے کلپ بورڈ پکڑا ہوا تھا جس پر کاغذوں کا پلندہ اٹکا ہوا تھا۔ وہ شخص اس عورت سے قدم ملا کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی وہ اپنی عینک سنبھالتا تھا اور کبھی کاغذات... ان کاغذات کو اُلٹ پلٹ کر وہ عورت کو کچھ بتلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اور شخص قدرے پیچھے تھا لیکن لپکا چلا آ رہا تھا اور "میڈم... میڈم" کی گردان کر رہا تھا۔ اس سے پیچھے ایک مجھ سے قدرے

چھوٹا لڑکا تھا جو ایک خوبصورت سُرخ باکس اُٹھائے ہوئے تھا۔ سب سے پیچھے ایک معمر عورت لنگڑاتی ہوئی چلی آ رہی تھی۔ مردانہ انداز میں چلتی ہوئی عورت کسی کی طرف بھی متوجہ نہیں تھی۔ وہ بار بار اپنی گھڑی دیکھ رہی تھی۔ اسے جیسے کہیں پہنچنے کی جلدی تھی۔

ٹھک ٹھک کرتی وہ میرے قریب سے بھی گزر گئی اور خوشبو کا ایک جھونکا اپنے پیچھے چھوڑ گئی۔ میں غیر ارادی طور پر اُسی سمت گھوم گیا جدھر وہ جا رہی تھی۔ وہ مزید چند قدم چل کر کسی کمرے کا چھوٹا سا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ باقی لوگ بھی اندر جا چکے تو دروازہ بند ہو گیا۔ جب وہ چہرہ میرے سامنے نہیں رہا تب میں نے پہچانا کہ وہ تو مسرت نذیر تھی۔

میرا دل کچھ زیادہ ہی زور سے دھڑکنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے کچھ پچھتاوا سا محسوس ہوا کہ میں نے بروقت مسرت نذیر کو کیوں نہیں پہچانا پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اگر بروقت بھی پہچان لیتا تو کیا کر لیتا؟

اسی اثنا میں ایک اور بڑا دروازہ کھلا اور بھاری بدن اور قدرے چھوٹے قد کے ایک صاحب شاہی لباس زیب تن کیے باہر آ گئے۔ چلتے چلتے ہی وہ اپنا ڈھیلا ڈھالا شاہی لبادہ جس پر بے تحاشا گوٹا لگا ہوا تھا، اُتارتے جا رہے تھے اور تب میں نے دیکھا کہ شاہی لبادے کے نیچے انھوں نے تھری پیس سوٹ پہنا ہوا تھا۔ لبادہ اُتار کر انھوں نے ایک شخص کو تھما دیا جو اُن کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اب وہ کچھ اور زیادہ عجیب لگنے لگے۔ یعنی تھری پیس سوٹ، سر پر تاج اور ناک پر موٹے فریم کی عینک... جب انھوں نے گتّے کا شاہی تاج بھی اُتار کر کسی نوجوان کو پکڑا دیا تب میں نے پہچانا کہ وہ آغا طالش تھے۔ میں انھیں سلام کرنا چاہتا تھا مگر انھوں نے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔

اِدھر اُدھر گھومتا پھرتا میں اسٹوڈیو کے ایک الگ تھلگ سے حصے میں جا پہنچا جہاں لکڑی کے ایک گیٹ کے عقب میں پھولوں بھری بیلوں سے ڈھکا ہوا ایک مکان سا دکھائی دے رہا تھا۔ مکان کے بائیں طرف بھی نرسری ہوئی گھاس کا فرش اور پھول دار پودوں کی کیاریاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ایک مالی ایک کیاری کے پاس بیٹھا کھرپی سے زمین کھود رہا تھا اور نہایت پُراسرار انداز میں زیرِ لب اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو ہاتھ روک کر چلّایا: "اے کدھر منہ اُٹھائے چلا آ رہا ہے؟ تجھے معلوم نہیں صاحب نے منع کیا ہوا ہے کہ کوئی ان کے گھر کے سامنے سے نہ گزرے؟"

مجھے واقعی نہیں معلوم تھا کہ وہ کن صاحب کا ذکر کر رہا تھا بلکہ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ کوئی گھر تھا۔ بہرحال میں نے تیزی سے پلٹ پڑنے میں ہی عافیت سمجھی۔ میں واپس لان کی طرف آیا تو وہاں اب دس پندرہ لڑکیاں بیٹھی نظر آئیں، مختلف عمروں اور مختلف جسامتوں کی لڑکیاں مگر ان کے لباس یکساں تھے۔ پرانی طرز کے جمپر نما کُرتے اور چوڑی دار پاجامے... ان میں سے بیشتر کے چہرے اُجڑے اُجڑے

سے تھے مگر وہ آپس میں خوب چہلیں کر رہی تھیں۔ دو ایک
تو نہ جانے کس بات پر ہنس ہنس کر دُہری ہوئی جا رہی تھیں۔
میں لان کے قریب پہنچا تو میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ
کر پہچاننے کی کوشش کی کہ شاید ان میں بھی کوئی ہیروئن
موجود ہو مگر کوئی صورت مجھے شناسا محسوس نہیں ہوئی پھر
مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہ لڑکیاں تھیں جو بعض گانوں کے
دوران، ہیروئن کے عقب میں کھڑی ہوتی تھیں۔ ہیروئن اگر
دائیں طرف سر جھکاتی تھی تو یہ بھی دائیں طرف سر جھکاتی تھیں
اور اگر ہیروئن بائیں طرف کو جھکتی تھی تو یہ بھی بائیں طرف کو
جھک جاتی تھیں۔ اگر ہیروئن گھاس پر لوٹنے لگتی تھی تو یہ
بھی گھاس پر دراز ہو کر ایڑیاں رگڑنے لگتی تھیں۔ میں نے
اخباروں کے فلمی ایڈیشنوں وغیرہ میں پڑھا تھا کہ انھیں ایکسٹرا
گرلز کہا جاتا ہے۔ میں بڑی حیرت سے سوچا کرتا تھا کہ کیا
کوئی لڑکی بھی فالتو ہو سکتی ہے؟

میں انھیں گھورتے ہوئے شاید کافی ہونق معلوم ہو رہا
تھا کیونکہ ان میں سے دو تین میری طرف دیکھ کر ہنستے سر سے
سر ملا کر کھی کھی کرنے لگیں گویا اب کوئی نیا لطیفہ شروع ہو گیا
ہو۔ ایک بولی "عمر دیکھو اور انداز دیکھو... معلوم ہوتا ہے
آنکھوں ہی آنکھوں میں نگل جائے گا معلوم نہیں کون ہے؟
بہت ہی زیادہ نئی شکل معلوم ہو رہی ہے۔"

ایک اور سانولی اور سوکھی سڑی سی لڑکی جس کے
ہنسلیوں کی ہڈی کچھ زیادہ ہی اُبھری ہوئی تھی، پہلی لڑکی کی
کمر پر دھپ رسید کرتے ہوئے بولی "ہائے اتنی مدت ہو گئی تجھے
گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے مگر بندے کی پہچان نہ آئی۔ اری
اس کی تو شکل سے صاف ظاہر ہے کہ شوٹنگ دیکھنے کے لیے
آیا ہوا ہے۔"

نہ جانے کیوں مجھ پر بدحواسی طاری ہو گئی اور میں سیدھا
گیٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ لڑکیوں کے تیز اور تیکھے قہقہے میرے
تعاقب میں تھے۔

اسٹوڈیو سے باہر آ کر مجھ پر پچھتاوے کا دورہ پڑا۔ میرا
جی چاہا کہ اپنا بھاری تلے کا جوتا اتار کر دو چار مرتبہ اپنے ہی
سر پر رسید کروں بھلا لڑکیوں کے سامنے اتنا نروس ہونے
کی کیا ضرورت تھی؟

دفعتاً مجھے یاد آیا کہ ماسٹر صاحب نے سختی سے ہدایت
کی تھی کہ کوئی لڑکا ہوسٹل کے کمرے سے باہر نہ جائے اور میں
کہاں گھومتا پھر رہا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں سڑک پار کرنے
کے لیے لپکا

دفعتاً میرے عین قریب ایک کار کے بریک چرچرائے
میں نے بدحواس ہو کر دیکھا۔ چمکیلے سبز رنگ کی وہ لمبی سی گاڑی
مجھ سے محض چند انچ کے فاصلے پر رکی تھی اور اگر نہ رکی ہوتی
تو میرا ملیدہ بن چکا ہوتا۔ گاڑی ایک بھاری بھرکم سا شخص
چلا رہا تھا۔ میں اُسے سر تا پا تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن جس حد تک
بھی دیکھ پا رہا تھا اسی سے اس کی دولت مندی کا اندازہ کر کے
مرعوب ہو سکتا تھا۔

اس کے برابر ایک عورت بیٹھی تھی جس نے زیبرے کی
کھال جیسے فریم اور گہرے رنگ کے شیشوں والا چشمہ لگایا
ہوا تھا۔ وہ چونکہ قدرے انسانی میک اپ میں تھی اور اسی
قسم کے چشمے کے ساتھ میں حال ہی میں اُسے ایک فلم میں بھی
دیکھ چکا تھا اس لیے میں نے اسے فوراً پہچان لیا، وہ نیلو تھی۔
مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کا رنگ سانولا تھا۔ میرا خیال
تھا کہ تمام ہیروئنیں سرخ و سپید ہوں گی۔ ان دنوں عروج
مسرت نذیر اور نیلو ہی کو حاصل تھا اور مجھے خوشی یہ تھی کہ میں
نے دونوں ہی کو دیکھ لیا تھا۔ اب تو میری نظر میں یہ سوال بھی
اہم نہیں رہا تھا کہ اگر میں گاڑی کے نیچے آ گیا ہوتا تو کیا ہوتا؟

ان دونوں نے بیک وقت اپنی اپنی طرف کی کھڑکی سے
سر نکالا۔ بولنے میں مرد نے پہل کی "مرنے کے کچھ اور بھی طریقے
ہیں کاکا! جن میں وقت بھی کم لگتا ہے اور جان بھی آسانی سے
نکلتی ہے۔" اُس کی آواز شاید نیند کے خمار سے بوجھل تھی۔ میں
نے کوئی جواب نہ دیا، بس ایک نظر نیلو کو دوبارہ دیکھا اور دوڑ
کر سڑک پار کر لی کیونکہ شہر کی طرف واپس جانے والی بس نکلی
جا رہی تھی۔

میں سہ پہر کے قریب ہوسٹل واپس پہنچا اور گویا بروقت
ہی پہنچ گیا کیونکہ میرے پہنچنے کے چند منٹ بعد ہی ماسٹر صاحب
بھی واپس آ گئے۔ میس میں کھانا ختم ہو چکا تھا اور اب میں ماسٹر
صاحب سے کہہ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے سخت بھوک لگی ہے
ورنہ وہ پوچھتے کہ کھانے کے وقت کہاں تھا؟ ان کے ساتھ
ایک اور شخص بھی تھا۔ دوسرے لڑکوں کو تو انھوں نے اس شخص
کے ساتھ بھیج دیا کیونکہ اس کا تعلق کھیلوں کے مقابلوں کی
نگرانی سے تھا۔ مجھے انھوں نے اپنے ساتھ ہی رکھا اور کچھ
دیر بعد ہم نیچے آ گئے۔

ماسٹر صاحب کا کہنا تھا کہ ہمیں کوئی گاڑی لینے آئے گی
لیکن ایک گھنٹا ہمیں سڑک کے کنارے کھڑے گزر گیا اور
کوئی گاڑی نہ آئی۔ دوسرے بہت سے لڑکے اور ان کے
ٹیچرز وغیرہ اپنے طور پر تانگوں، بسوں اور ٹیکسیوں میں لد لد کر

رخصت ہوتے رہے۔ بالآخر ماسٹر صاحب نے بھی ایک
تانگے والے کی خدمات حاصل کیں۔ اس تانگے میں پہلے ہی
اتنے آدمی لدے ہوئے تھے کہ تانگہ کہیں سے نظر ہی نہیں آ رہا
تھا بس ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ گھوڑا انسانوں کے ایک ڈھیر کو
کھینچے لیے چلا جا رہا ہے۔ میں اور ماسٹر صاحب پائیدانوں
پر لٹکے تو گھوڑا ہوا میں معلق ہوتے ہوتے رہ گیا مگر آفرین
ہے کوچبان پر.. کہ اس نے ہمیں یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچا کر
چھوڑا۔ اس وقت تک بھوک سے میری حالت بھی اُس
گھوڑے ہی جیسی ہو چکی تھی مگر نہ جانے کیوں آج مجھے ماسٹر
صاحب کے سامنے لب کھولتے کچھ زیادہ ہی شرم آ رہی تھی۔

یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچ کر ہمیں رات تک انتظار کے مرحلے
سے گزرنا پڑا۔ بھوک پیاس سے میری حالت تباہ تھی پھر بھاڑ
میں منتظمین قسم کے کئی لوگوں کو میں نے پانی کے لیے کہا مگر کسی
نے کان نہیں دھرا۔ کبھی ہمیں کہیں بٹھایا جاتا تھا کبھی کہیں، بالآخر
ہمیں ایک بڑے سے ٹینٹ میں پہنچا دیا گیا جہاں درحقیقت تقریری
مقابلہ منعقد ہونا تھا۔ نشستیں سامعین سے بھری ہوئی تھیں۔
مجھے اسٹیج پر بھیج دیا گیا جہاں درمیان میں تین کرسیوں پر جناب
صدر وغیرہ بیٹھے تھے اور ان کے دائیں بائیں دس دس کرسیوں
کی قطاریں تھیں۔ موضوع کے حق میں بولنے والے مقررین
ایک قطار میں تھے اور مخالفت میں بولنے والے دوسری
قطار میں۔ مجھے دوسری قطار میں سب سے آگے بٹھایا گیا۔
اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چند سیکنڈ بعد میں اپنے آپ کو اندھا
محسوس کرنے لگا کیونکہ اسٹیج کے کنارے نہایت بڑی
بڑی لائٹس فٹ تھیں۔ بہت ہی تیز روشنی براہ راست ہمارے
چہروں پر پڑ رہی تھیں اور اگر ہم منہ پھیر لیتے تب بھی تیز زرد
روشنی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ سامعین تو اب مجھے نظر
ہی نہیں آ رہے تھے۔ مجھے گویا ایک تاریک خلا کے
سامنے تقریر کرنی تھی۔

بڑی بڑی لائٹس کے عین سامنے بیٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا
کہ جسم تو پسینے میں تر ہو گیا اور حلق جو پہلے ہی خشک تھا اب
مزید خشک ہو گیا۔ ہاتھ پیروں پر ویسے ہی خفیف سی لرزش
طاری تھی۔ میں دل ہی دل میں رٹی رٹائی تقریر کے نکات ترتیب
دینے کی کوشش کر رہا تھا جو بار بار بے ترتیب ہوئے جا رہے
تھے۔ ساتھ ہی ماسٹر صاحب اور ہیڈ ماسٹر صاحب کے بارے
میں بھی کچھ غلط سلط قسم کے خیالات دل میں آ رہے تھے آخر
وہی تو تھے جنھوں نے مجھے اس مصیبت میں دھکیلا تھا۔
اسٹیج سیکرٹری نے مائیک پر میرا نام پکارا۔ میں ابھی ڈائس

تک پہنچا ہی تھا اور ٹانگوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش
کر رہا تھا کہ ایک تیز آواز سنائی دی "ارے... ازار بند لٹک
رہا ہے۔" میں نے گھبرا کر ازار بند سنبھالا تو زوردار قہقہہ پڑا۔

"جناب صدر اور خواتین و حضرات!" میں نے ماسٹر صاحب
کی حسب ہدایت اپنی دانست میں گرج دار آواز میں تقریر شروع
کی لیکن بھوک، پیاس، گرمی اور گھبراہٹ سے میری اور خصوصاً
میرے گلے کی جو حالت تھی اس کے باعث آواز کچھ ایسی
ہی نکلی جیسے کوئی چوہا، چوہے دان میں پھنستے ہی آخری بار
چلایا ہو۔

ساتھ ہی اندھیرے سے آواز آئی "خواتین یہاں کہاں
ہیں بھائی؟" پچاسوں آدمیوں نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا۔
میں نے بے بسی سے جناب صدر کی طرف دیکھا، وہ گھوڑے
پر چڑھے ہوئے دولہا کی طرح منہ پر رومال رکھے بیٹھے تھے۔
شاید اس کی اوٹ میں مسکرا رہے تھے۔

حاضرین کو شاید میری صورت دیکھتے ہی مجھ سے کوئی خاص
عداوت ہو گئی تھی کہ انھوں نے میرے آتے ہی زور و شور سے
ہوٹنگ شروع کر دی تھی ورنہ پہلی تقریر کے دوران دو تین
مرتبہ صرف بھنبھناہٹ کی سی آوازیں ہی سنائی دی تھیں۔

میں اب بالکل بھول چکا تھا کہ کس مقام پر مجھے کیا ایکشن
دینا ہے، لہجے میں کس طرح اتار چڑھاؤ لانا ہے۔ میں نے
ڈائس پر بلاوجہ ہی گھونسا رسید کیا اور وہ بھی اتنے زور سے
کہ وہ گرتے گرتے بچا۔ اسے سنبھال کر میں نے تقریر کیا بس
رٹا رٹایا سبق دہرانا شروع کر دیا۔ آوازے کسے جاتے رہے،
قہقہے پڑتے رہے لیکن میں فر فر بولتا چلا گیا۔ سانس لینے کے

لیے بھی میں دس بارہ جملوں کے بعد کہیں جا کر رُکتا تھا اور تبھی مجھے احساس ہوتا تھا کہ قہقہے جاری ہیں۔ رفتہ رفتہ میری آواز گھلتی جا رہی تھی اور شور شرابے پر حاوی آتی جا رہی تھی۔

بالآخر مجھے احساس ہوا کہ پنڈال میں صرف میں ہی گرج رہا ہوں اور چاروں طرف ہُو کا سکوت طاری ہے۔ مجھے شبہ ہوا کہ شاید تمام حاضرین اُٹھ کر چلے گئے ہیں۔ میں نے خاموش ہو کر آنکھیں سکیڑتے ہوئے اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی تو یک لخت فلک شگاف قہقہے گونج اُٹھے۔ میں نے بدحواس ہو کر دوبارہ رٹّو طوطے کی طرح بولنا شروع کر دیا۔

ایک تو ماسٹر صاحب نے تقریر اتنی لمبی لکھ دی تھی کہ ختم ہی ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ میرے عقب میں بار بار گھنٹی بجا کر مجھے احساس دلایا جا رہا تھا کہ وقت ختم ہو چکا ہے لیکن میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ تقریر ختم کر کے ہی چھوڑوں گا۔ تقریر میں ثقیل الفاظ کی بھی بھرمار تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ بعض جگہوں پر اٹک کر میں نے پنجابی شروع کر دی تھی۔ بڑی مشکل سے میں نے سنبھل کر اپنے آپ کو اُردو کے ٹریک پر رکھا۔

خدا خدا کر کے تقریر ختم ہوئی۔ مجھ سے زیادہ اس کے ختم ہونے کی خوشی شاید سامعین کو تھی کیونکہ انھوں نے تالیاں بجا بجا کر آسمان سر پر اُٹھا لیا تھا۔ میری سزا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی مجھے پھر وہیں لائٹس کے سامنے بیٹھ کر باقی اٹھارہ مقررین کی تقریریں سننی تھیں۔

جب یہ سلسلہ ختم ہوا تو میری حالت یہ تھی کہ آوازیں کبھی دُور سے آتی محسوس ہوتی تھیں اور کبھی قریب سے... آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے دائرے ناچ رہے تھے۔ مقابلے کے اختتام تک نتائج ترتیب دے لیے گئے تھے۔ جنھیں کپ ملنے تھے انھیں مل گئے۔ کچھ کو تعریفی اسناد ملیں۔ مجھے بھی جنابِ صدر کی میز کے قریب بلایا گیا اور سنہرے حروف میں چھپا ہوا ایک سرٹیفکیٹ تھما دیا گیا۔ اس پر خالی جگہوں میں میرا نام وغیرہ قلم سے لکھا گیا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ کر بمشکل پڑھا۔ مفہوم یہی تھا کہ موصوف محمد افضل ولد محمد اجمل نے واقعی اس مقابلے میں شرکت کی تھی اور بس۔

یہی غنیمت تھا ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ کوئی ایسی سند نہ تھما دیں جس پر لکھا ہو کہ آج کے مقابلے کا بدترین مقرر محمد افضل تھا اور آئندہ اسے اس قسم کے مقابلوں میں حصہ لینے سے باز رکھا جائے۔

میں جب اسٹیج سے اُترنے لگا تو مجھے سیڑھیاں بھی نظر نہیں آ رہی تھیں۔ شکر ہے ماسٹر صاحب نے عقل مندی کی تھی کہ آگے آ گئے تھے۔ انھوں نے مجھے ہاتھ پکڑ کے اُتارا اور یوں تیزی سے ایک طرف کو لے چلے گویا اندیشہ ہو کہ لوگ آگے آ کر مجھے مارنا شروع کر دیں۔

کچھ دیر بعد ہم رُکے اور میری بینائی کچھ بحال ہوئی تو میں نے دیکھا کہ ہم ایک لمبی میز کے قریب کھڑے تھے اور میز پر کئی قسم کے کھانے سجے ہوئے تھے۔ بہت سے لوگ تیزی سے میز کی طرف لپکے چلے آ رہے تھے اور بعض کھانا پر لوٹ بھی پڑے تھے۔ میں نے بھی آؤ دیکھا نہ تاؤ، آستین چڑھا کر پل پڑا۔

جوں جوں کھانا پیٹ میں پہنچتا گیا، حواس کی کارکردگی بحال ہوتی گئی۔ معلوم نہیں میں کتنے ڈونگے صاف کر چکا تھا جب کسی نے میرا ہاتھ روک لیا۔ میں نے مُڑ کر دیکھا، وہ ماسٹر صاحب تھے۔ وہ کھسیانی سی نظر سے اِدھر اُدھر دیکھ کر میرے کان میں بولے۔ ”بس کرو یار! ہم یہاں تقریری مقابلے میں آئے تھے، بسیار خوری کے مقابلے میں نہیں۔“

اس وقت مجھے بسیار خوری کا مطلب معلوم نہیں تھا لیکن اتنا تو بہرحال میں سمجھ ہی گیا کہ وہ مزید کھانے سے باز رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر ان کا حکم مانا اور ان کے ساتھ ہوسٹل واپس آ گیا۔ باقی لڑکے بھی واپس آ چکے تھے۔ ہمارے ایک لڑکے نے باکسنگ کے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ اس کے منہ پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، دو دانت غائب تھے اور ہونٹ سوجے ہوئے تھے۔ ماسٹر صاحب نے اس سے مقابلے کا نتیجہ معلوم کیا تو بولا۔ ”باکسنگ کا مقابلہ تو میں ہار گیا لیکن کشتی کا جیت گیا۔“

”لیکن تمھیں کشتی کے مقابلے میں کس کمبخت نے بھیجا تھا؟“ ماسٹر صاحب نے حیرانی سے پوچھا۔

”وہ جی... اُس لڑکے نے جب مجھے تین چار گھونسے مارے تو مجھے غصہ آ گیا اور میں نے اس سے کشتی شروع کر دی۔“ ہمارے باکسر نے بتایا۔ ”میں نے اسے اُٹھا اُٹھا کر خوب پٹخا مگر وہ ذلیل پھر بھی مجھے گھونسے مارتا رہا۔“

”چہ... چہ... بڑا افسوس ہوا۔ اس کمبخت کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ ماسٹر صاحب نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”اُسے تو چاہیے تھا کہ تمھیں پھولوں کے ہار پہناتا، تمھاری بلائیں لیتا۔“

ہمارے اسکول کے لڑکوں میں سے صرف ایک نے کوئی

پوزیشن حاصل کی تھی اور وہ تھی ریس میں تیسری پوزیشن۔ ماسٹر صاحب نے اسی پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اس لڑکے کی پیٹھ ٹھونکی لیکن اس کے بعد کافی دیر تک افسردہ بیٹھے رہے۔

دوسرے روز گو کہ ہم خاصی تاخیر سے قصبے واپس پہنچے لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب، دیگر اسٹاف اور میٹرک کے لڑکے ہمارے استقبال کے لیے اسکول میں ہی موجود تھے۔ انھیں ہماری آمد کی اطلاع تھی۔ ہماری کارکردگی سن کر ہیڈ ماسٹر صاحب کا بھی منہ لٹک گیا لیکن کچھ زیادہ نہیں۔

وہاں سے جان چھوٹی تو گھر پہنچا۔ اباجی کام پر سے واپس آ چکے تھے۔ انھیں میں نے سنہرے حروف میں چھپا ہوا سرٹیفکیٹ دکھایا تو خوشی سے پھولے نہیں سمائے۔ گھر کے ہر فرد کو دکھانے کے بعد اسے حفاظت سے طاق میں رکھتے ہوئے بولے۔ ”کل اسے بازار سے فریم کروا لانا... مہمان آیا کریں گے تو دیکھا کریں گے... عزت بنے گی۔“

معلوم نہیں وہ کن مہمانوں کا ذکر کر رہے تھے۔ میں نے تو جب سے ہوش سنبھالا تھا گھر میں کوئی مہمان آتے نہیں دیکھا تھا۔ بہرحال سرٹیفکیٹ میں نے حفاظت سے رکھ دیا۔ نہا دھو کر کھانا کھانے کے بعد میں اباجی کی نظر بچا کر راجو سے ملنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس سے باتیں کرنے اور اسٹوڈیو کی سیر کا احوال سنانے کو دل مچل رہا تھا۔

اُس کے گھر کے قریب پہنچ کر میں نے اُلّو کی آواز کا سگنل دیا۔ حالانکہ ہمارے گھر والوں میں سے کوئی بھی ہمیں ایک دوسرے سے ملنے سے منع نہیں کرتا تھا مگر معلوم نہیں ہمیں کیوں ایک دوسرے کو خفیہ سگنل کے ذریعے بلانے میں مزہ آتا تھا اور یہ سگنل کس حد تک خفیہ تھا، اس کا اندازہ اس سے کر لیجیے کہ ایک روز راجو کا بڑا بھائی جو ٹاؤن کمیٹی میں کلرک تھا، مجھے بازار میں ملا تو پوچھنے لگا۔ ”یہ تم راجو کو کس قسم کی آواز نکال کر بلاتے ہو؟“

”اُلّو کی۔“ میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

”بہت خوب!“ وہ مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”پھر تو تمھیں آواز بدلنے کی ضرورت نہیں پڑتی ہوگی۔ اپنی اصل آواز میں بلاتے ہو۔ میں کچھ اور سمجھا تھا۔“

میرا سگنل سنتے ہی راجو باہر آ گیا۔ میری جیب میں کچھ پیسے باقی تھے، اس لیے میں نے فیاضی سے کہا۔ ”آؤ چل کر مودے کے اسٹال پر بیٹھتے ہیں۔ چائے بھی پئیں گے اور گپ شپ بھی کریں گے۔“

اسٹال پر پہنچ کر میں نے مودے کو ملائی والی چائے کا آرڈر دیتے ہوئے فرمائش کی۔ ”یار! ذرا گراموفون پر وہ ریکارڈ تو لگا دینا۔ ’مینوں رب دی سَوں تیرے نال پیار ہو گیا وے چنّا سچّی مُچّی‘۔ اور ہاں چائے میں چینی ذرا زیادہ ڈالنا۔“

مودے کا گراموفون بھی مودے ہی کی طرح عجوبۂ روزگار تھا۔ اس پر نورجہاں کا ریکارڈ لگایا جاتا تھا تو آواز سہگل کی نکلتی تھی اور سہگل کو سننے کی کوشش کی جاتی تھی تو لگتا تھا کہ لتا بین کر رہی ہے۔ اس پر ستم یہ کہ مودا فرمائش کے مطابق کبھی ریکارڈ نہیں لگاتا تھا، کم از کم فوری طور پر تو نہیں لگاتا تھا۔ مثلاً اس وقت میری فرمائش ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالتے ہوئے جو ریکارڈ لگایا وہ یہ تھا۔

جا اپنی حسرتوں پہ آنسو بہا کے سو جا

راجو نے لکڑی کی بھدی کرسی پہ پاؤں اوپر کر کے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”اور سناؤ یار! کیسی رہی تقریر شقریر؟“

”تقریر کو گولی مارو۔“ میں نے میز پر جھکتے ہوئے کہا۔ ”میں تو تمھیں یہ بتانے کے لیے لایا ہوں کہ میں اسٹوڈیو کی سیر کر کے آیا ہوں، بڑی اچھی طرح۔“

”اسٹوڈیو کی سیر؟“ راجو المونیم کے جگ سے پانی انڈیلتے انڈیلتے اچھل پڑا اور جگ اُس کے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ ”کسی سے ملاقات ہوئی؟“ اُس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

”سب ہی سے ہوئی۔“ میں نے ایک شانِ بے نیازی سے جواب دیا۔ ”صبیحہ، سنتوش، درپن، نیّر سلطانہ، مسرت نذیر، نیلو، لیلیٰ، فردوس، شمیم آرا، اسلم پرویز سبھی تو وہاں موجود تھے۔“

”کسی سے بات چیت ہوئی؟“ راجو میرے قریب کھسک آیا۔

”سبھی سے ہوئی۔“ میں نے چند گھونٹ پانی پینے کے بعد کہا۔ ”یار! میں تو اُن کے اخلاق سے بہت ہی متاثر ہوا۔ بہت ہی ملنسار لوگ ہیں۔ میں نے جب انھیں بتایا کہ میں ان سب کا بڑا مدّاح ہوں اور بڑی دُور سے ان سے ملنے آیا ہوں تو بہت ہی خوش ہوئے۔ پوچھنے لگے ’مسٹر افضل! تمھارے لیے چائے یا لسّی وغیرہ منگوائیں؟‘ میں نے تکلف میں انکار کر دیا کہ کہیں ندیدہ نہ سمجھیں۔ میں چلنے لگا تو نیلو نے یہ تک پوچھا کہ تمھارے پاس سواری نہیں ہے تو میں اپنی گاڑی میں چھوڑ آؤں لیکن میں بس شکریہ ادا کر کے اسٹوڈیو سے نکل آیا... اور وہ جو آج کل نیا ہیرو بہت چڑھ رہا ہے... محمد علی اور وہ جو نئی ہیروئن ہے نا.... بہت ہی خوبصورت... وہ جو بلوری آنکھوں کی وجہ سے انگریزنی

سی لگتی ہے، زیبا... ان دونوں سے بھی ملاقات ہوئی بلکہ محمد علی سے تو بہت باتیں ہوئیں۔ کہہ رہا تھا میں کبھی تمہارے قصبے میں آؤں گا اور تمہارے دوستوں سے بھی ملوں گا۔"

راجو کی آنکھیں بہت پھیل چکی تھیں میں نے انھیں مزید پھیلانا مناسب نہیں سمجھا اور گپ بازی کا یہ سلسلہ روک لیا دھیرے دھیرے راجو کی آنکھیں معمول پر آئیں لیکن اب بھی وہ کچھ ایسی سحر زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا، جیسے میں کوہ قاف کی سیر کر کے آیا ہوں۔

بالآخر وہ سنبھل کر بولا "یار! کیا نیلو کالی ہے؟ میں نے سنا ہے یہ عورتیں فلم میں جیسی گوری چٹی اور خوبصورت نظر آتی ہیں حقیقت میں ایسی نہیں ہوتیں۔"

اسٹوڈیو کے قریب جب میں گاڑی کے نیچے کچلے جانے سے بال بال بچا تھا اور نیلو نے کھڑکی سے سر نکال کر غصے سے میری طرف دیکھا تھا تو میک اپ کی تہوں کے باوجود مجھے اس کی رنگت گندمی سی ہی لگی تھی لیکن میں جانے کیوں اسے گوری چٹی ثابت کرنے پر تل گیا "نہیں یار!" میں نے زور دے کر کہا "وہ تو سرخ و سفید ہے کالی یا سانولی تو کوئی ہیروئن بھی نہیں ہے۔ میں کو سب کو اتنے قریب سے دیکھ کر آیا ہوں جتنے قریب اس وقت تم بیٹھے ہو۔" میں اس طرح ہیروئنوں کے رنگ و روپ کا دفاع کر رہا تھا گویا اسی پر میرے مستقبل کا دارومدار ہو اور ان کے حسن پر حرف آنے کی صورت میں مجھے کوئی ناقابل تلافی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو میں کچھ اتنے خلوص دل سے ہانک رہا تھا کہ مجھے خود بھی یہی محسوس ہونے لگا تھا کہ میں سچ ہی بول رہا ہوں۔

اس دن کے بعد راجو پر میری دھاک کچھ زیادہ ہی بیٹھ گئی۔ اب وہ میرا دوست سے زیادہ چیلا نظر آتا تھا۔
شب و روز غیر محسوس طور پر گزرتے جا رہے تھے۔

میٹرک کے امتحان قریب تھے تو مجھے عشق ہو گیا۔ زندگی کا پہلا عشق... پہلا عشق انسان کو کبھی نہیں بھولتا۔ مجھے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ میں اس لڑکی پر عاشق ہو گیا ہوں حالانکہ میں کافی عرصے سے اسے دیکھتا آ رہا تھا کہ وہ ہماری گلی میں ہی سامنے چند مکان چھوڑ کر رہتی تھی اور اس طرف سے چونکہ گلی بند تھی، اس لیے کہیں آتے جاتے وقت اسے ہمارے ہی گھر کے سامنے سے گزرنا پڑتا تھا۔ میں نے بہت کم لڑکیوں کو برقع لیتے دیکھا تھا۔ وہ انھی میں سے ایک تھی، ورنہ بیشتر لڑکیاں عموماً کھیتوں وغیرہ پر کام کاج میں حصہ لیتی تھیں اور برقع نہیں پہنتی تھیں مگر کسی کی مجال نہیں تھی کہ راہ چلتے انھیں گھورتا اور چھیڑ چھاڑ کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ بیشتر لوگ ایک دوسرے کے شجرۂ نسب تک سے واقف تھے، فوراً گھر شکایت پہنچ جاتی تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ تقریباً چوبیس گھنٹے کام کاج کرنے والی یہ لڑکیاں ایسی مردمار اور منہ پھٹ ہوتی تھیں کہ ذرا سی خلاف منشا بات پر آستینیں چڑھا لیتی تھیں اور جوتی اتار لیتی تھیں گو کہ ان میں بہت کم ہی ایسی تھیں جن کے پاؤں میں جوتی ہوتی تھی۔

جس لڑکی کا میں ذکر کر رہا ہوں اس کا نام شمیم تھا۔ ان کا رہن سہن کچھ کچھ شہری قسم کا تھا۔ شمیم کے متعلق میں آپ کو کیا بتاؤں... آپ نے کبھی چنبیلی کا پھول دیکھا ہے؟ ضرور دیکھا ہوگا، وہ بالکل ویسی ہی تھی۔ سفید، نازک اور خوشبو میں بکھرتی ہوئی۔ برقع سے بھی اس کے وجود کی نزاکتیں اڈتی رہتیں، خوشبو بکھرتی رہتی۔ اب ایسی لڑکی سے کوئی پیار نہ کرے تو کیا کرے؟

وہ کبھی کبھار ہی گھر سے نکلتی تھی اور جب بھی نکلتی تھی، حسینوں کا صبر و قرار لوٹ کر لے جاتی تھی۔ جس روز وہ اسکول جاتے وقت نظر آ جاتی اس روز تو اسکول میں بیٹھنا ہی دشوار ہو جاتا۔ ہر طرف اسی کی صورت دکھائی دیتی، ہر چیز سے اس کی خوشبو آتی۔

ایک روز تو میں کتابیں بغل میں دبائے اسکول جانے کے لیے گھر سے نکلا اور وہ آگے جاتی نظر آ گئی تو میں گویا نیند کی سی کیفیت میں اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ معلوم نہیں میں کب تک چلتا رہا۔ ہوش مجھے اس وقت آیا جب وہ اچانک ہی میرے سامنے سے غائب ہو گئی۔ میں نے سر جھٹک کر ادھر ادھر دیکھا تو اپنے آپ کو ایک چار دیواری میں کھڑے پایا۔ سامنے ایک چھوٹی سی عمارت پر ایک دھندلا سا بورڈ جھول رہا تھا جس پر لکھا تھا "دستکاری مرکز" ایک خرانٹ سی بڑھیا کمر پر ہاتھ رکھے میرے سامنے کھڑی مجھے گھور رہی تھی اور کرخت سی آواز میں پوچھ رہی تھی "کہاں منہ اٹھائے چلے جا رہے ہو؟ کس سے ملنا ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ لیا مجھے یہ تو معلوم ہو گیا کہ کبھی کبھار وہ دستکاری کے اسکول جاتی تھی لیکن اس کا کوئی وقت مقرر تھا اور نہ دن... جانے کیوں باقاعدگی سے نہیں جاتی تھی بہرحال

جس دن بھی مجھے وہم سا ہو جاتا کہ آج وہ گھر سے نکلے گی، اس دن میں بہار جا گھنٹے گلی میں کھڑا رہتا۔ بالوں میں تیل چپڑ کر اور کنگھی پٹی کر کے میں اپنی دانست میں پورا اچھا نظر آنے کی کوشش کرتا۔ کپڑے بھی حتی الامکان صاف رکھنے کی کوشش کرتا۔ اگر کبھی کبھار چچی وغیرہ بروقت دھو کر نہ دیتیں تو خود ہی دھو لیتا۔ غرضیکہ عشق نے شخصیت میں بڑا نکھار پیدا کر دیا تھا۔

مگر وہ کمبخت چھانٹ کر اللہ میاں کے ہاں سے پتھر کا دل لے کر آئی تھی۔ کبھی اس کی آنکھوں میں اس جذبے، اس التفات کی رمق تک نظر نہ آئی جس کی آرزو نے میرے ننھے سے دل میں آگ لگا رکھی تھی۔

بالآخر میں نے اپنی استعداد کے مطابق خوبصورت ترین الفاظ جمع کر کے اس کے نام ایک خط لکھا۔ دل ہی دل میں نہ جانے کتنے دن تک میں اس خط کی ترتیب و تالیف میں مصروف رہا اور جب لکھنے بیٹھا تو میرا خیال تھا کہ خط بہت لمبا ہو جائے گا لیکن کاپی کا ایک صفحہ پورا ہوتے ہی ذخیرۂ الفاظ ختم ہو گیا، اس لیے اسی پر اکتفا کرنا پڑا۔

خط کے اصل الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ویسا خط میں اب نہیں لکھ سکتا، اس لیے کہ محبت کے اظہار میں سچائی، خلوص اور لگن کی خوشبو صرف ایک بار ہی آتی ہے، باقی سب لفاظیاں ہوتی ہیں، افسانے ہوتے ہیں۔ منافقت اور خود فریبی ہوتی ہے۔ وہ میری پہلی محبت تھی اور پہلا محبت نامہ، تبھی تو اس میں سچائی کی خوشبو تھی۔

خالی خط بھیجنا مجھے آداب محبت کے کچھ خلاف نظر آیا اس لیے کئی روز کا جیب خرچ بچا کر محمود بساطی سے چار آنے والی عطر کی ایک شیشی اور بارہ آنے والا ریشمی رومال خریدا۔ ان تینوں چیزوں کو ایک چھوٹے سے لفافے میں لپیٹا اور کئی دن تک بڑی حفاظت سے جیب میں لیے پھرتا رہا۔ کوئی مناسب موقع نہ ملا۔

بالآخر ایک روز موزوں موقع میسر آ ہی گیا۔ وہ کہیں سے آ رہی تھی اور میں گھر سے نکل رہا تھا۔ عام طور پر وہ یوں میرے قریب سے گزرتی تھی جیسے اُسے علم ہی نہیں کہ میں بھی کہیں موجود ہوں یا اگر میرا کوئی وجود ہے بھی تو محض راستے کے ایک طرف کھڑے ہوئے کسی ٹنڈ منڈ درخت یا [illegible] خت جھاڑی کی طرح۔ جن کی طرف کوئی نظر اُٹھا کر دیکھنے [illegible] ی بھی زحمت نہیں کرتا۔ چنانچہ مجھے آگے بڑھ کر اس کا رستہ روکنا پڑا۔ اس کا آدھا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ پلکوں کی جھالریں

اٹھا کر اُس نے میری طرف دیکھا۔ میرے سامنے کھڑی وہ بہت چھوٹی اور نرم و نازک سی لگ رہی تھی لیکن وہ بالکل پُرسکون تھی جبکہ میری ٹانگوں میں ہلکی سی لرزش تھی حالانکہ میں نے ادھر اُدھر دیکھ کر اطمینان کر لیا تھا کہ گلی میں کوئی نہیں ہے۔ وہ شاید عمر میں بھی مجھ سے بڑی تھی۔ ایک عجیب سی تمکنت اور وقار تھا اس کے انداز میں۔

میں نے جیب سے ننھا سا پیکٹ نکال کر تقریباً زبردستی اس کے نازک اور گداز ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "آپ کی یہ ایک امانت تھی میرے پاس۔" اور فوراً ہی میں ڈگمگاتے قدموں سے آگے بڑھتا چلا گیا۔ گلی کے سرے پر پہنچ کر بھی مجھے مُڑ کر یہ دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ اس نے پیکٹ ہاتھ میں ہی رکھا ہے یا پھینک دیا ہے، وہ وہیں کھڑی ہے یا اپنے گھر میں داخل ہو چکی ہے۔

خط میں میں نے اُسے جواب مجھ تک پہنچانے کا طریقہ بھی بتا دیا تھا چنانچہ اُس دن کے بعد جواب کا انتظار شروع ہو گیا۔ پہلے دن تو اندیشوں ہی نے دہلائے رکھا کہ کہیں خط اس نے پڑھنے کے بعد اپنے باپ کو نہ دے دیا ہو جو شاید لاٹھی لے کر ہمارے گھر آ جائے۔ آدمی گو کہ وہ دھان پان ہی تھا مگر غصے کا تیز لگتا تھا۔ پھر اندیشہ محسوس ہوتا کہ میرا ابھی راجو والا ہی انجام نہ ہو کہ لڑکی میرا خط واپس میرے منہ پر دے مارے۔ مگر کچھ بھی نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی جواب دیا۔

میں نے ایک بار پھر کاغذ پر رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے، قسم کا خط لکھا۔ وہ بھی پہلے ہی خط کے سے انداز میں اس تک پہنچ گیا مگر اس کے جواب میں بھی خاموشی رہی۔ ناراضگی نہ برہمی، توجہ نہ التفات، کچھ بھی ظاہر نہیں ہوا البتہ یہ ستم ضرور ہوا کہ اب اس سے سامنا شاذ و نادر ہی ہونے لگا۔ غالباً اُس نے گھر سے نکلنا بہت کم کر دیا تھا۔

میں کبھی کبھی ادھر اُدھر کھڑا ہو کر اس کا انتظار کیا کرتا اور مجھے یوں لگتا جیسے میں صدیوں سے انتظار ہی کر رہا ہوں۔ میری ٹانگیں شل ہو چکی ہیں، آنکھیں پتھرا گئی ہیں اور زندگی کی آخری رمق بھی میرے جسم سے نکل کر فضاؤں میں تحلیل ہو چکی ہے... اور یہ انتظار ایسا انتظار تھا جس کے لیے کوئی وعدہ نہیں کیا گیا تھا، جس کے پیچھے ملن کی کوئی آس نہیں تھی، بے وجہ، بے وعدہ اور لاحاصل انتظار۔

بالآخر انتظار کا یہ سورج ڈوب گیا۔ میرے میٹرک کے امتحان شروع ہو چکے تھے اور میں حتی الامکان کوشش کرنے لگا تھا کہ پڑھائی کے علاوہ کوئی بات میرے دماغ میں نہ آئے۔

لیے بھی اب شمیم نے گویا گھر سے نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نے بھی اس کے تصور کو دل کے نہاں خانے میں دھکیل کر اس پر فراموشی کا قفل ڈال دیا۔ میرا خیال تھا کہ یہی تشنگی ناکامی اور محرومی میرے عشق کا انجام ہے اور میں نے اس پر صبر کر لیا تھا۔

میٹرک میں نے سیکنڈ ڈویژن میں پاس کر لیا تو ابا جی کو شوق چڑھا کہ وہ مجھے مزید اعلیٰ تعلیم دلوائیں گے۔ انہیں بھی احساس ہو چکا تھا کہ اب زمانہ بدلتا جا رہا تھا۔ میٹرک کی کوئی خاص قدر نہیں رہی تھی اور انہیں یہ بھی پتا چل چکا تھا کہ کلرکی کوئی بہت اونچا قسم کا عہدہ نہیں ہوتا بلکہ کلرکی سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔ دوسرے وہ اپنے ہمسروں کے بچوں کو بھی کالج میں داخلہ لینے کی تیاریاں کرتے دیکھ رہے تھے۔ چنانچہ میں بھی اُن کے اصرار پر معلومات وغیرہ کے لیے سیالکوٹ چلا گیا۔ جب میں نے خرچ وغیرہ کا حساب لاکر ان کے سامنے رکھا تو وہ چپ سے ہو گئے۔

اس زمانے میں گو کہ تعلیم بہت سستی تھی لیکن ہم جیسے لوگوں کے لیے تیس چالیس روپے مہینے کا خرچ بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ غالباً ابا جی کو کوئی گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی لیکن وہ ہمت ہارنے والے نہیں تھے۔ گول میز تو چونکہ گھر میں دستیاب نہیں تھی، اس لیے اس رات انھوں نے چارپائی اور موڑھا کانفرنس بلائی جس میں دونوں چچا اور ان کی بیگمات شریک تھیں۔

ابا جی نے مسئلہ ان کے سامنے رکھا کہ لڑکے کو تعلیم ہر حال میں دلانی ہے اور اس کے لیے انہیں بھائیوں اور بھابیوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ چاروں شرکائے کانفرنس نے منہ بنا کر باری باری یہی جواب دیا۔ "ہم تو اپنے بچوں میں سے کسی کو تعلیم نہیں دلا سکے، تمہارے بچے کے لیے کیا تعاون کریں۔"

ابا جی اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ کانفرنس یونہی ختم ہو گئی اور اس رات ابا جی معمول سے کچھ پہلے ہی چادر میں منہ چھپا کر لیٹ گئے۔

دوسرے روز وہ کام پر سے واپس آئے تو ان کے چہرے پر گزشتہ روز کا سا اضمحلال نہیں تھا۔ میں اس وقت اپنی چارپائی کس رہا تھا جب انھوں نے میرا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم فارم وغیرہ بھر کر رکھ لینا۔ داخلے کی تاریخ آنے سے پہلے میں تمہیں پیسے دے دوں گا۔ داخلہ ضرور لینا اور کتابیں وغیرہ بھی لے آنا، فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

معلوم نہیں وہ کس طرح بندوبست کر رہے تھے، اپنی جان کو کس عذاب میں ڈال رہے تھے۔ میں نے چارپائی کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ابا! آخر آپ مجھے مزید تعلیم کیوں دلانا چاہتے ہیں؟ یہیں رہ کر یا پھر شہر جا کر چھوٹی موٹی نوکری تو میں اب بھی کر سکتا ہوں اور ہم پر کوئی اتنے زیادہ بوجھ تو ہیں نہیں کہ ہمیں بہت زیادہ کمائی کی ضرورت ہو۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے بیٹا!" انھوں نے پگڑی اُتار کر کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ "بات صرف کمائی کی ہی نہیں ہوتی... انسان کے کچھ خواب بھی ہوتے ہیں... میری تمنا ہے کہ روپیا بھی تم ضرور کماؤ لیکن ساتھ ہی کوئی مشہور اور بڑے آدمی بنو... روپیا تو بہت سے لوگوں کے پاس ہے لیکن وہ سب بڑے اور مشہور آدمی تو نہیں ہیں نا۔" پھر جیسے ان کی نظر اپنے خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگی۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ شہر میں تمہارا بڑا سا بنگلا ہو۔ تمہاری بیوی کوئی پڑھی لکھی میم قسم کی عورت ہو۔ فصل آنے پر میں تم لوگوں کے لیے کبھی پیاز کی اور کبھی لہسن کی بوری یا پھر گنّوں کا گٹھڑ لے کر آیا کروں اور بنگلے کے باغیچے میں کھیلتے ہوئے میرے گول مٹول پوتے پوتیاں شور مچایا کریں، دادا جی آ گئے... دادا جی آ گئے، پھر وہ دوڑ کر میری ٹانگوں سے چمٹ جایا کریں۔"

ابا جی کے چہرے پر اس مسرت آگیں تصور سے سُرخی سی آ گئی۔ ان کی آنکھیں دُور ہواؤں میں نہ جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ میں نے سر ملانے کی کوشش کی لیکن کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی۔ میں نے دھیمی سی آواز میں کہا۔ "ابا جی! اگر میں بڑا اور امیر آدمی بن گیا اور شہر میں میرا بنگلا ہوا تو کیا آپ میرے ساتھ نہیں رہا کریں گے؟ آپ بھلا پھر کس طرح لہسن پیاز کی بوری یا گنّوں کا گٹھڑ لے کر آیا کریں گے؟"

"نہیں بیٹا..." ابا نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "میں تو بالکل سیدھا سادا دیہاتی سا آدمی ہوں۔ میں بھلا بنگلے میں رہتا کہاں اچھا لگوں گا۔ میں تو یہیں رہا کروں گا۔ بس مہینے دو مہینے بعد ملنے آ جایا کروں گا۔ تم بس اتنی مہربانی کرنا کہ اپنے دوستوں وغیرہ کو یہ مت بتانا شروع کر دینا کہ یہ بڈھا ہمارا نوکر ہے جیسا کہ کئی پڑھے لکھے اور دولت مند بیٹے اپنے دیہاتی والدین کے بارے میں کہنے لگتے ہیں۔ تم مجھے ابا جی ہی کہا کرنا۔ اکیلے میں بھی اور سب کے سامنے بھی تاکہ میں بھی جی بھر کے اس خوشی کو محسوس کر سکوں کہ میں ایک لائق، مشہور اور سعادت مند لڑکے کا باپ ہوں۔"

میں ایک ٹک ابا جی کی طرف دیکھتا رہا۔ اب میرا قد ان سے اونچا ہو چکا تھا لیکن اس وقت وہ مجھے بہت بلند قامت لگ

رہے تھے، بہت ہی اوبنچے۔ وہ بہت کم باتیں کرتے تھے لیکن جو بھی کرتے تھے گویا دل میں کھُب کر رہ جاتی تھیں میرا جی چاہا کہ اُٹھ کر ان کے سینے سے چمٹ جاؤں اور کسی ننھے بچے کی طرح زور زور سے رونے لگوں لیکن ایک عجیب سی جھجک مانع رہی اور اس دوران وہ حجرہ نما کمرے سے باہر چلے گئے۔

میں نے کالج میں داخلہ لے لیا اور تقریباً دو سال غیر محسوس سے انداز میں گزر گئے۔ ان دو برسوں میں زندگی میں کوئی خاص تلاطم نہ آیا۔ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تقریباً وہی پہلے سے معمولات رہے، وہی صورتیں دکھائی دیتی رہیں۔ ایک چھوٹا سا اتفاق یہ ضرور پیش آیا کہ اس دوران مجھے ایک بار پھر لاہور کا چکر لگانا پڑا۔ بدقسمتی سے اس بار راجو میرے ساتھ تھا۔ وہ اصرار کرنے لگا کہ اسٹوڈیوز کی سیر ضرور کی جائے۔ مجھے یاد تھا کہ میں اس کے سامنے خاصی گپیں ہانک چکا ہوں اس لیے میں نے اسے ٹالنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ مانا۔

انسان کے مقدر میں جو ذلت ہوتی ہے وہ تو اٹھانی ہی پڑتی ہے چنانچہ ہمیں بھی اٹھانا پڑی۔ ریسر تو ہم باری، باری ایورنیو اور شاہ نور اسٹوڈیونز کی کر آئے لیکن چوکیداروں کے ہاتھوں خاصا ذلیل ہونا پڑا۔ شاہ نور میں تو ہم نادانستگی میں ایک سیٹ پر بھی جا پہنچے جہاں چند منٹ تو ہم شمیم آرا پر ایک گانا پکچرائز ہوتے دیکھتے رہے پھر ہُوا یہ کہ فرش پر رکھے ہوئے بڑے بڑے سوئچ بورڈز اور ادھر اُدھر پھیلی ہوئی بجلی کی موٹی موٹی تاروں میں اُلجھ کر راجو گر پڑا۔ وہ اُٹھنے لگا تو اس کا ہاتھ کسی ایسی جگہ پڑ گیا جہاں سے اُسے کرنٹ کا خاصا زوردار جھٹکا لگا اور وہ اچھل کر سیدھا شمیم آرا پر جا گرا جو اس وقت ہارڈ بورڈ کی ایک حویلی کی دیوار سے لگی، گلیسرین آنکھوں میں ڈال کر المیہ گانا پکچرائز کرا رہی تھی۔ دیوار، شمیم آرا اور راجو تینوں ہی ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے۔

اس کے بعد ہمارے ساتھ خاصی بُری ہوئی۔ ڈائریکٹر، لائٹ مینوں اور دیگر چمچگان وغیرہ نے پہلے تو یہ تصدیق کی کہ ہم کسی متعلقہ آدمی کے ساتھ نہیں آئے پھر انھوں نے ہماری پٹائی لگانے کا ارادہ کیا اور ایک صاحب نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ انہیں پولیس کے حوالے کر دیا جائے لیکن شمیم آرا ہی کی بدولت ہماری جان بچ گئی۔ اس نے نہایت بیزاری سے کہا کہ وہ جلد از جلد یہ سین ختم کر کے گھر جانا چاہتی ہے اس لیے کسی فالتو چکر میں اُلجھ کر وقت نہ ضائع کیا جائے۔ یوں ہماری جان بچی اور انھوں نے ہمیں صرف ڈنڈا ڈولی کر کے فلور سے باہر پھینکنے پر اکتفا کیا۔

مجھے اپنی بے عزتی کا ملال تو بہت تھا اور شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ ایک آدھ کا جبڑا توڑ دوں مگر پولیس کا سُن کر میں اندر ہی اندر کچھ سکڑ سا گیا تھا۔ ہمارا تو لاہور میں کوئی جاننے والا بھی نہیں تھا۔ میں تو یہی سوچ کر خدا کا شکر ادا کر رہا تھا کہ راجو کے لیے کرنٹ کا جھٹکا جان لیوا ثابت نہیں ہوا تھا، ورنہ میں راجو کی لاش لے کر کس مُنہ سے گھر واپس جاتا لیکن راجو نے اس پہلو پر سوچا تک نہیں تھا۔ وہ تو باہر آ کر میرا مذاق اُڑانے لگا تھا۔ وہ مجھے وہ باتیں یاد دلا رہا تھا جو میں نے پچھلی مرتبہ لاہور سے جانے کے بعد اسے سُنائی تھیں۔

میں خاموش رہا اور دل ہی دل میں شرمندہ ہوتا رہا تاہم اس واقعے کے بعد میرے ذہن میں اس خواہش کی جڑیں کچھ اور گہری ہو گئیں کہ کبھی میں اس مقام پر پہنچوں کہ اپنے دوستوں کے ساتھ اسٹوڈیو میں داخل ہوؤں تو لائٹ مین سے لے کر ہیروئن تک ہماری راہ میں آنکھیں بچھایا کرے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کون لوگ اس حیثیت کے مالک ہوتے تھے اور میں کس طرح اس مقام تک پہنچ سکتا تھا۔ میرا شعور مجھے اس خواہش پر ہنسنے پر مجبور کرتا تھا لیکن دل اُکساتا تھا کہ اس خواہش کی آبیاری کیے جا، بیج تو کب کا پھوٹ چکا تھا۔

شیو میں کافی دن ہوئے بنانے لگا تھا۔ شیو بناتے وقت میں اکثر دھندلے سے آئینے میں مختلف زاویوں سے بار بار اپنے چہرے کا جائزہ لیتا اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھا کرتا کہ اس چہرے کا مستقبل کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن مجھے کوئی واضح جواب نہ ملتا۔ کبھی میں اپنے آپ سے سوال کرتا، کیا میں ہیرو بن سکتا ہوں؟ اپنی شکل ہر کسی کو اچھی لگتی ہے لیکن میں حتیّ الامکان غیر جانبدار بن کر اور خود پرستی سے بالاتر ہو کر دیکھتا تو مجھے اپنا چہرہ پاکستانی ہیرو کے مروجہ معیار پر پورا اُترتا دکھائی نہ دیتا۔

میری جسمانی ساخت ہیرو کے طور پر بُری نہیں تھی کسی حد تک میں باڈی بلڈر نظر آتا تھا۔ بہرحال میرا دل کہتا تھا کہ ہمارے ہاں ہیرو کا جو تصور رائج ہے میں اس پر پورا نہیں اُترتا۔ البتہ کسی جابر اور سفاک چوہدری کے کردار کے لیے میری شخصیت بے حد موزوں تھی پھر میں اپنے دل کو ٹٹولتا تو احساس ہوتا کہ ہیرو تو میں بننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اس سے بھی کوئی اونچی چیز بننا چاہتا تھا... نہ جانے کیا؟

راجو کالج میں میرے ساتھ نہیں تھا۔ فرسٹ ایئر سے اس نے پڑھنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کا باپ اکثر بیمار رہنے لگا تھا اور اُس نے راجو کو مستقلاً دکان پر بٹھا دیا تھا۔ اسکول کے زمانے

کے اور بھی کئی ساتھی اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے۔ ان کی جگہ اردگرد کے دیہات کے بہت سے لڑکے کالج میں دکھائی دیتے تھے۔

میرا اب پڑھائی میں زیادہ دل نہیں لگتا تھا۔ بس گویا کوئی رسم سی نبھا رہا تھا۔ یہ مجھے بڑا سُست سا کام لگتا تھا جبکہ میری رگوں میں لہو گویا دوڑتا نہیں تھا، کھولتا تھا۔ کوئی آتش فشاں تھا جو جسم میں مقید تھا۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کوئی ہنگامہ خیز، ولولہ انگیز کام۔ زندگی کی سُست روی سے مجھے کبھی کبھی چڑ ہونے لگتی تھی۔

انہی دنوں میں نے کسی سے سُنا کہ شمیم کی شادی ہو رہی ہے، بارات لاہور سے آئے گی۔ میرے دل میں اس کے عشق کی آگ سرد ہوئے تین برس ہونے کو آ رہے تھے مگر یہ خبر سُن کر جیسے راکھ میں دبی ہوئی کوئی چنگاری ہوا پا کر شعلہ بننے لگی۔ کوئی بھولی بسری سی کسک اُبھر آئی۔ کوئی خوابیدہ زخم جاگ اُٹھا۔

تین برس بڑا طویل عرصہ ہوتا ہے۔ اس عرصے میں لوگ جانے کیا کیا بھول جاتے ہیں۔ میرے ذہن میں بھی اس کی یاد کسی تاریک گوشے میں پڑے گرد آلود موتی کی طرح چھپ چکی تھی مگر اس کی شادی کی خبر سُن کر جیسے یاد کا یہ موتی ایک بار پھر جھلملا اُٹھا۔ میرا جی چاہا کہ اسے ایک سخت قسم کا خط لکھوں جس میں اسے بے وفا، ہرجائی، دھوکے باز اور ایسے ہی بیسیوں دوسرے القابات سے نوازوں... مگر پھر مجھے اپنے آپ پر ہی کچھ عجیب ترحم آمیز سے انداز میں ہنسی آ گئی۔ مجھے فوراً ہی خیال آ گیا تھا کہ اُس نے بھلا مجھ سے وفا کا وعدہ یا محبت کا اقرار کیا ہی کب تھا جو وہ بے وفا اور منکرِ محبت ہو گئی۔

ایک مدت سے میں نے اس کی جھلک تک نہیں دیکھی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی تہہ خانے میں رہتی تھی۔ اب جبکہ اُس کی شادی کے چرچے سُننے میں آ رہے تھے تب بھی ان کے گھر میں کوئی خاص ہلچل یا لوگوں کی آمد و رفت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ سو ہی پہلے کا سا سکوت طاری رہتا تھا۔ اس کا باپ صبح ہی صبح ترکی ٹوپی سر پر رکھے کام پر نکل جاتا تھا۔ وہ کسی وکیل کا منشی تھا اور بہت کم گو شخص تھا۔ شاذ و نادر ہی کسی سے بات کرتا تھا۔ میں نے اُسے ہمیشہ سے ایک ہی شیروانی میں دیکھا تھا جو اب گھس گھس کر ململ کے اس کُرتے سے مشابہ دکھائی دینے لگی تھی جسے سیاہ رنگ دے دیا گیا ہو۔

کبھی کبھی وہ شمیم کی ماں کو ساتھ لے کر نفافے ہاتھ میں اُٹھائے کہیں جایا کرتا تھا۔ میں نے سُنا تھا کہ شمیم کی ماں کو کوئی لاعلاج قسم کی بیماری تھی مگر وہ اس کے علاج کے لیے کوشاں تھا۔ کئی شہروں کے اسپتالوں کے چکر لگا چکا تھا۔

اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ جب میں شمیم کی محبت میں مبتلا ہُوا تھا تو میں نے اس کے گھر شادی کا پیغام کیوں نہیں بھیجا؟ لیکن اپنی اس سوچ پر بھی مجھے خود استہزائی سے ہنسنا پڑا۔ بھلا میرا رشتہ لے کر کون جاتا؟ اور میں اس وقت عمر کے لحاظ سے اتنا چھوٹا تھا کہ میرے مُنہ سے شادی کی بات سُن کر ابّا اور چچا وغیرہ شاید مجھے دو چار چانٹے رسید کر دیتے۔ اس کے علاوہ شمیم نے بھلا التفات ہی کب ظاہر کیا تھا جو مجھے اتنی شہ ملتی۔

اُس روز میں گلی میں کھڑا یہی سب کچھ سوچ رہا تھا اور اپنی اُداسی کو دل میں چھپائے شمیم کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ کبھی کبھی کواڑوں میں خفیف سی حرکت پیدا ہوتی تھی۔ شاید ہوا سے کواڑ ہل رہے تھے یا پھر یہ میرا وہم تھا۔ دفعتاً ایک بچی کپڑے کے تھیلے میں اپنے اسکول کی کچھ کتابیں اور چھوٹی سی تختی ڈالے دروازہ کھول کر نکلی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ بچی کس کی تھی لیکن اتنا میں جانتا تھا کہ یہ شمیم کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔

میرے قریب رُک کر بچی نے اچانک مٹھی کھول کر ایک مُڑا تُڑا کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ شمو باجی نے دیا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے تو مجھے جیسے سکتہ سا ہو گیا پھر میں نے کاغذ بچی کے ہاتھ سے جھپٹ لیا اور وہ ایک گہری سانس لے کر آگے دوڑتی چلی گئی۔ میں نے کاغذ کو اسی طرح مٹھی میں چھپا لیا جس طرح بچی چھپا کے لائی تھی۔ میں نے ایک بار پھر شمیم کے گھر کی طرف دیکھا۔ دونوں پٹ تقریباً ملے ہوئے تھے معمولی سی درز تھی بیچ میں... اور اس کے پیچھے ڈیوڑھی کا اندھیرا تھا مگر مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اس درز سے وہی کنول آنکھیں مجھے دیکھ رہی ہیں جن میں کبھی مجھے التفات کی شبنم جھلملاتی نظر نہیں آئی تھی۔ کیا دمِ رخصت یہ آنکھیں مجھ پر مہربان ہو رہی تھیں مگر اب کیا فائدہ؟ پھر دل نے کہا، احمق کہیں کے فائدے نقصان کو گولی مار... کسی کی محبت تو سرمایۂ حیات ہوتی ہے۔ زندگی کے کسی موڑ پر بھی ملے سمیٹ لینی چاہیے اور خیر... ابھی سے اتنی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے، ذرا اندر چل کر دیکھ تو سہی، کاغذ کے اس پُرزے پر لکھا کیا ہے۔

اپنے کمرے میں آ کر دھڑکنوں کو اعتدال پر رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے رقعہ کھولا۔ چھوٹے چھوٹے خوابیدہ اور ہموار الفاظ کا خزانہ میرے سامنے بکھرا ہُوا تھا۔

سنانپوں کی ایک پر اسرار سلطنت کی حسین زہریلی ملکہ

ناگ نگر کی نگینہ

مصنف: ایم اے راحت

- ماورائے عقل واقعات سے مزین ایک ایسی داستان، جو لفظ لفظ پر قاری کے رونگٹے کھڑے کرتی ہوئی اپنی دلچسپی کے ساتھ آگے بڑھتی ہے۔
- ناگ نگر کی پراسرار زمین پر چار انسانوں کی موجودگی، اور ان کے ساتھ لمحہ لمحہ نئے اور عجیب و غریب واقعات کا تسلسل قاری کو ناگ نگر کے سحر سے باہر نہیں نکلنے دیتا۔
- ناگ نگر کی ملکہ منتخب ہونے کے لئے ناگ نگر کے قوانین کے ایک مقابلہ حسن کی روداد، اپنے اندر سنسنی خیزی اور ڈرامائی مناظر سے اس قدر بھرپور ہے کہ پڑھنے والا اگلا منظر جاننے کے لئے بے تحاشہ تجسّس کے باعث اپنے آپ کو پوری طرح تحریر میں گم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

خوبصورت سرورق، سفید کاغذ، عمدہ طباعت، مضبوط جلد

قیمت -/200 روپے

اسٹاکسٹ

مکتبہ القریش سرکلر روڈ، اردو بازار، لاہور۔ فون: 7668958

میرے اپنے!

تم حیران تو ہو گے کہ تم نے تقریباً تین برس پہلے خط لکھا تھا اور میں آج جواب دے رہی ہوں۔ بس کچھ مجبوریاں تھیں جنھوں نے اتنے عرصے تک میرے پیروں میں زنجیریں ڈالے رکھیں۔ تم کیا جانو کہ پیار کی جن شدتوں کا اظہار تم نے اپنے خط میں کیا تھا، اس سے کہیں زیادہ شدت سے میں نے تمھیں چاہا ہے۔ تمہارے متعلق سوچتے سوچتے نہ جانے کتنی راتیں جاگ کر گزار دی ہیں۔ کتنا جی چاہتا ہے کہ تم سے ملوں، تمھیں دیکھوں، تم سے ان گنت باتیں کروں۔

تاخیر تو بہت ہو گئی ہے لیکن سوچتی ہوں اب بھی کچھ گھڑیاں باقی ہیں، جانے سے پہلے کیوں نہ ایک ملاقات کی یادیں اس خالی دامن میں سمیٹ لے جاؤں۔ کل میرے امّی ابّو صبح ہی صبح سیالکوٹ چلے جائیں گے اور رات گئے واپس آئیں گے۔ کل اتوار ہے تمھیں بھی کالج سے چھٹی ہو گی، ہو سکے تو اس تشنہ محبت کو دلاسا دینے آ جانا۔ میں پچھلے دروازے کی کنڈی کھلی رکھوں گی۔ نو اور دس بجے کے درمیان موقع مناسب دیکھ کر اندر آ جانا۔ احتیاط کی تلقین اس لیے نہیں کروں گی کہ مجھے معلوم ہے میری عزت تمھیں اپنی عزت سے زیادہ پیاری ہو گی۔ محبت کرنے والوں کا یہی دستور ہوتا ہے — تمہاری!

شمیم

اس کے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا اس کا نام پڑھ کر نہ جانے کیوں ذہن میں چھناکا سا ہوا جیسے چاندی کے برتن ہاتھ سے چھوٹ کر پتھریلی زمین پہ جا پڑے ہوں۔ ایک من موہنی سی صورت ذہن کے دھندلائے افق پر یوں ایک لمحے کے لیے چمک کر غائب ہو گئی جیسے تاریک فضا میں ٹوٹا ہوا تارا یا جیسے سمندر کی کسی لہر پہ چاندنی کی جھلمل۔

میرے اردگرد چنبیلی کی خوشبو پھیل گئی۔ دل کے اہرام میں مقید جذبوں کی حنوط شدہ لاشیں جیسے انگڑائیاں لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انھیں نئی زندگی مل گئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو وہی لو عمر لڑکا محسوس کیا جس کی معصومیت پر جوانی چپکے سے شب خون مار چکی تھی۔ وہ زمانہ یاد آیا جب میں شمیم کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے گھنٹوں گلی میں کھڑا انتظار کیا کرتا تھا۔

جب ہر وقت دل میں ایک میٹھی سی خلش، ایک ہلکا سا سوز اور ایک مدھم سی آنچ محسوس ہوا کرتی تھی۔

ایک لمحے کے اندر اندر ان سب جذبوں نے دوسرا جنم لیا اور میرے حواس پر چھاتے چلے گئے۔ وہی جذبہ، وہی لگن، وہی اشتیاق اور وہی جوش و خروش عود کر آیا۔ رات بھر اسی سنسنی کے باعث نیند نہ آئی۔

صبح ابا جی کے جانے کے بعد میں نے اپنی اکلوتی پتلون اور رلیش شرٹ پہ کوئلوں والی استری بڑی محنت سے پھیری، شیلو دو مرتبہ بنائی اور لال صابن کی پچی کھچی ٹکیا نہانے میں ختم کر کے چھوڑی۔ آج اس جانِ جاں نے بلایا تھا جس کا نام ذہن میں آتے ہی دھڑکنیں تیز ہو جاتی تھیں۔ حسبِ مقدور اہتمام تو ضروری تھا۔

تقریباً سوا نو بجے میں نے پچھلی گلی کا چکر لگایا تو موقع مناسب نظر آیا۔

عقبی دروازے کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور غیر محسوس طور پر ہاتھ بڑھا کر دروازے پہ ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ دونوں پٹ کھلتے چلے گئے۔ میں سر جھکا کر جلدی سے اندر گھسا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس کمرے کا فرش بہت نیچا تھا۔ میں جیسے تہ خانے میں اتر گیا تھا۔ یہاں تہ خانے جیسی ہی سیلن اور ملگجا اندھیرا تھا۔ ایک طرف چارپائی پڑی تھی جس پر سلیقے سے بستر لگا ہوا تھا۔ ایک دیوار میں چند تختے لگا کر الماری نما کوئی چیز بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں کتابیں، کاپیاں اور اخبار وغیرہ بھرے ہوئے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹی سی تپائی رکھی تھی جو کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھی اور اس کے پاس ہی مونڈھے پر شمیم بیٹھی ہوئی تھی، یہ شاید اسی کا کمرا تھا۔

میری آنکھیں اب کم روشنی سے مانوس ہو چکی تھیں اور میں اسے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی تھی اور نہ ہی اس کے چہرے پر تغیر آیا تھا۔ وہ تو بس جیسے سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھی تھی۔ میں پہلی بار اتنے قریب سے اسے سراپا دیکھ رہا تھا۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھولتا جا رہا تھا۔

چنبیلی کا پھول کچھ کملایا ہوا سا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہی مائل حلقے اور پیشانی پر شکنیں یوں ساکت تھیں جیسے سطحِ آب پر لہریں یک لخت کسی جادوئی عمل سے منجمد ہو گئی ہوں۔ گہری آنکھوں میں دھواں دھواں سا پھیلا ہوا تھا جیسے اس نے کافی دن تفکرات کی آگ میں جلتے ہوئے گزارے ہوں۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا لباس کافی پرانا اور مسکا ہوا سا لگ رہا تھا۔ میں نے ایک عجیب سا دکھ محسوس کیا، جیسے میرے من پسند کھلونے کو کسی نے بے توجہی اور بے پروائی سے غیر مناسب سی جگہ پر پھینک دیا ہو۔ اگر اس کے جسم پر کوئی خوبصورت سی ساڑی ہوتی، محض چہرے کی تھکن چھپانے کے لیے اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوتا تو وہ کسی بھی فلمی ہیروئن سے زیادہ حسین نظر آتی۔

چند لمحے ہم بت بنے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر اس نے یوں طویل سانس لی جیسے ہوا میں آکسیجن کی شدید کمی واقع ہو چکی ہو۔ لیکن وہ بولی اب بھی کچھ نہیں۔ میں بھی بدستور خاموش تھا۔ میرا دل گویا سینے کے بجائے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کی بھی یہی کیفیت تھی مگر وہ بہت گہری جھیل تھی۔ ذات کی تہ میں جانے کیا کچھ چھپائے ہوئے تھی۔

بالآخر میں نے اپنی توانائی مجتمع کی اور اس کے قریب چلا گیا۔ تب اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”خوش آمدید۔“ وہ اسی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھے مونڈھے پر بیٹھی تھی اور میں اس کے سامنے مجرم کی طرح کھڑا تھا۔

”خوش آمدید اس طرح نہیں کہتے۔“ میں نے بھی سرگوشی میں کہا۔

”تو پھر کس طرح کہتے ہیں؟“ اس نے سر اٹھا کر آنکھوں میں معصوم سی حیرانی لیے میری طرف دیکھا۔ اس کی مرمریں گردن کچھ اور لمبی ہو گئی۔

”میں بتاتا ہوں۔“ میں نے جھک کر اس کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا پھر میں نے اسے بتایا اور وہ جھرجھری سی لے کر سر جھکا کر رہ گئی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کے جھاگ جیسے نرم ہاتھ برف کی طرح سرد تھے تاہم اس کا رویہ سرد نہیں تھا۔ ہم چارپائی پر آ بیٹھے۔

میں نوآموز سہی لیکن بہرحال مرد تھا اور مرد کو ذرا سی شہ ملے تو ریس کے گھوڑے کی طرح سرپٹ دوڑنے لگتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ میں جس کا ارادہ لے کر نہیں آیا تھا، جس کی مجھے تمنا نہیں تھی وہ سب کچھ ہو گیا پھر چند لمحے بعد میں نے دیکھا، وہ تکیے میں منہ چھپائے پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ میں نے تکیے سے اس کا سر اٹھایا، آنسو گویا اس کے دل میں کسی چشمے کی طرح مدفون تھے اور اب راہ پاتے ہی یہ چشمہ پھوٹ پڑا تھا، اس کا چہرہ تر تھا۔

میں پریشان ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں، کیسے اسے چپ کراؤں۔ میں نے بڑی اپنائیت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور سہلاتے ہوئے کہا۔ ”شمو... دیکھو اس میں صرف میرا ہی تو قصور نہیں... آخر ایسی رونے یا پریشان ہونے والی کیا بات ہے... کچھ نہیں ہوتا... بس تمھیں...“

اس نے میری بات کاٹ دی اور بھیگی پلکیں اٹھا کر بولی۔ ”نہیں، میں اس وجہ سے نہیں رو رہی۔ مجھے اس پر کوئی دکھ یا پچھتاوا نہیں... میں تو تم سے ایک بات پوچھنا چاہتی ہوں۔ تم گواہ ہو نا کہ میں نے اپنے کردار کی کس طرح حفاظت کی تھی؟ جب سے جوانی کے خارزاروں میں قدم رکھا تھا تب سے نہ جانے کس کس نے مجھ پر جال پھینکے لیکن کیا میں نے کسی کی طرف توجہ کی؟ کیا میں نے کسی کو اپنے آپ تک پہنچنے کی اجازت دی؟ میں نے اپنی خواہشوں پر پہرے لگائے رکھے۔ میں اپنی تنہائی کا عذاب جھیلتی رہی، طلب کی آگ میں جلتی رہی۔ میں نے کچھ بھی تو نہیں کیا۔ کانٹوں میں رہ کر دامن کو بچائے رکھا حالانکہ جوانی کا ایک ایک پل کڑی آزمائش ہوتا ہے مگر میں ان آزمائشوں میں پوری اترتی رہی اور اسی طرح میں ستائیس سال کی ہو چکی ہوں۔ میں چاہتی تو اس سے پہلے بھی نہ جانے کتنی مرتبہ تمھیں یہاں بلا سکتی تھی۔ یہ میرا کمرہ ہے، تم نے دیکھ ہی لیا ہے کہ پچھلی گلی میں بھی اس کا دروازہ ہے۔ رات کو میں تنہا یہاں سوتی ہوں۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ سوتے سوتے آنکھ کھلی تو احساس ہوا کہ میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے ہیں، جسم پسینے میں تر ہو چکا ہے اور ہاتھ پاؤں مڑنے لگے ہیں تب میں پچھلی گلی میں نکل کر دیر تک ٹھنڈی ہوا میں ٹہلی ہوں لیکن کسی کو کبھی میرے وجود کا صحیح طور پر احساس تک نہیں ہو سکا کہ اس گھر میں کوئی لڑکی بھی رہتی ہے... میں نے اپنے آپ پر یہ بندشیں کیوں لگائے رکھیں؟ صرف اس لیے کہ مجھے ماں باپ کی عزت پیاری تھی... اور اب ماں باپ نے میرا رشتہ ایک ایسے لکھ پتی سے طے کیا ہے جس کی بیٹیاں عمر میں تقریباً میرے برابر ہیں۔ صرف ایک مرتبہ ہم اپنے دور کے کچھ عزیزوں کے ہاں لاہور گئے تھے، وہاں نہ جانے کس سلسلے میں وہ بھی موجود تھا... اس نے صرف ایک مرتبہ مجھے دیکھا اور تب سے میرے والدین کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ اس نے انھیں نہ جانے کیا پٹی پڑھائی ہے، کیا جادو کیا ہے یا کیا لالچ دیا ہے کہ وہ راضی ہو گئے ہیں۔ چند دن بعد ہم لاہور چلے جائیں گے، وہیں شادی ہو گی اور شاید میں اب کبھی پھر کبھی واپس نہ آ سکوں۔“

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی اور بستر کی چادر سے آنسو پونچھنے لگی۔ میں دم بخود تھا۔ وہ اپنی ہذیانی سی کیفیت سے قدرے سنبھلتے ہوئے بولی۔ ”میں نے بہت سوچا... بہت سوچا... خود کو احتساب کی سولی پر چڑھایا، اپنے آپ سے جواب مانگا کہ آخر میں نے کون سا گناہ کیا تھا جس کی پاداش میں مجھے اس جہنم میں دھکیلا جا رہا ہے مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا... آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اس جہنم میں پہنچنے سے پہلے ایک گناہ تو کر لوں تاکہ عمر بھر خود کو یہ سمجھا کر تسلی دے سکوں کہ یہ عذاب میرے گناہ کی سزا ہے... بغیر گناہ کے سنگسار ہونا تو بہت ہی اذیت ناک ہے نا... تم بتاؤ کیا میں نے غلط کیا؟“

میں اسے کیا جواب دیتا؟ میں تو برف کا بت بنا بیٹھا تھا۔ میرا ذہن بہت چھوٹا تھا اور اس کی باتیں بہت بڑی۔ میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ میرا ذہن سنسنا رہا تھا۔ میں تو صرف ایک خوبصورت لڑکی سے ملنے، اسے اپنی محبت کا احساس دلانے، اس کے تغافل کے گلے شکوے کرنے اور اس کے وجود کو بہت قریب سے محسوس کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ محض نوجوانی کا سنسنی خیز اشتیاق اور جوش و خروش میرا ہمسفر تھا۔ میں عقل و دانش کا پتلا نہیں تھا۔ انجانے میں میرے قدم نہ جانے کس دنیا کی طرف اٹھ گئے تھے۔ اس نے مجھے نہ جانے کیوں ایسے ظالم سوال کی سولی پر لٹکا دیا تھا۔

میں اسے کبھی کوئی جواب نہ دے سکا۔

اس کے ہاں سے مجھے جلد واپس آنا پڑا۔ اس نے خود ہی بصد اصرار مجھے رخصت کر دیا۔ گھر آ کر میں گھنٹوں مردہ چھپکلی کی طرح اپنے بستر پر پڑا رہا۔

اس دن کے بعد اس نے مجھے کبھی نہیں بلایا حالانکہ دوبارہ اس سے ملنے کا اشتیاق جلد ہی میرے دل میں ازسرنو تقویت پکڑ گیا تھا۔ پہلی ملاقات کے اختتام کی درماندگی اور تھکن کو میں بھول گیا تھا اور صرف سنسنی خیزی یاد رہ گئی تھی مگر وہ جیسے مجھے بھول ہی گئی تھی۔ کبھی اس کی جھلک دکھائی دی نہ کوئی پیام آیا۔ اب تو اس سے اپنی ملاقات بھی محض تخیل کی اختراع محسوس ہونے لگی تھی۔ میں بھی سوچنے لگا تھا کہ شاید میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔

اس خواب کی تجدید نہ ہو سکی حتیٰ کہ وہ لوگ مکان بیچ کر ایک رات خاموشی سے رخصت ہو گئے۔ عجیب لوگ تھے... سارا گھرانہ ہی عجیب تھا! شمیم تو چلی گئی مگر میرے دل کی خلش نہ گئی۔ بہرحال جو نقش قدم وہ سوچ کی رہگزر پر چھوڑ گئی تھی، اس پر رفتہ رفتہ لمحوں کی دھول جمتی چلی گئی۔

ان دنوں میں ایف اے کا امتحان دے کر فارغ ہو چکا تھا۔ رزلٹ کا انتظار تھا۔ عموماً غلیل سے پرندوں کا شکار کرتے، نہر میں تیراکی کرتے یا اسی طرح کے کسی اور مشغلے میں دن گزرتا تھا۔

ایک روز سہ پہر کے وقت میں نہر کے کنارے غلیل سے نشانہ بازی میں مشغول تھا ــــــ مجھے قصبے کی طرف سے ایک لڑکا منظور آتا دکھائی دیا۔ منظور عمر میں مجھ سے کچھ چھوٹا تھا اور ہمارے برابر والی گلی میں رہتا تھا۔ اس کی مجھ پر نظر پڑی تو دوڑنے لگا۔ قریب آیا تو میں نے دیکھا اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”افضل!“ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”تمھارے باپ کو قتل کر دیا گیا ہے!“

ان الفاظ کا فوری طور پر تو مجھ پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا کیونکہ مجھے اپنی ذات سے ان کا کوئی تعلق ہی محسوس نہیں ہوا۔ اباجی فقیر منش انسان تھے۔ کسی سے ان کی دوستی تھی نہ دشمنی۔ انھیں کون قتل کر سکتا تھا؟ پھر مجھے خیال آیا کہ اس روز اپریل کی پہلی تاریخ تھی۔ شاید منظور نے مجھے اپریل فول بنانے کا یہ بھونڈا طریقہ اختیار کیا تھا لیکن جب میں نے اس کے خشک ہونٹ اور خوفزدہ آنکھیں دیکھیں تو میرا دل گویا ڈوبنے لگا۔

”اس قسم کی بکواس پر میں تمھاری گردن بھی توڑ سکتا ہوں۔“ میں نے اس امید پر کہا کہ وہ بات بدل لے گا، تسلیم کر لے گا کہ وہ جھوٹ بول رہا تھا، مذاق کر رہا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر تھوک نگل کر بولا۔ ”میں مذاق نہیں کر رہا، لاش ملک اسلم زماں کی حویلی میں رکھی ہوئی ہے... تمھارے چچا وغیرہ بھی وہیں موجود ہیں، پولیس بھی آئی ہوئی ہے۔“

تب مجھے چپ لگ گئی۔ میرا ذہن جیسے سن ہو گیا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ معلوم نہیں کس طرح میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ”کس طرح ہوا یہ سب کچھ؟ صبح تو وہ اپنے بھلے زمینوں پر گئے تھے... کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہوئی تھی۔“

”مجھے صحیح طور پر تو معلوم نہیں۔“ منظور بولا۔ ہم دونوں تیز تیز قدموں سے قصبے کی طرف چل دیے تھے۔ ”سننے میں آیا ہے کہ رات چوہدری کمال دین کے آدمیوں نے ملک اسلم زماں کی زمینوں سے پانی کا رخ اپنی زمینوں کی طرف کر لیا تھا۔ آج صبح ملک نے ان لوگوں کو ڈرانے دھمکانے کے لیے اپنے کچھ بندے ان کی زمینوں پر بھیجے، ان میں تمھارا باپ بھی تھا۔ ملک نے اسے بندوق دے کر بھیجا تھا۔ وہاں بات بڑھ گئی۔ بہت جھگڑا ہوا۔ تمھارے باپ کو تو گولی

کا موقع ہی نہ ملا . . . انھوں نے . . . " منظور نے معذرت خواہانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا " انھوں نے گنڈاسوں سے اُسے کاٹ کر رکھ دیا . . . اور بھی لوگ زخمی ہوئے ہیں۔"

زمیندارانہ زندگی میں یہ انوکھی یا تعجب خیز بات نہیں۔ روز ہی لڑائیاں ہوتی ہیں، روز ہی گولیاں اور گنڈاسے چلتے ہیں، روز ہی آدمی مرتے ہیں اور زخمی ہوتے ہیں اور وہ عام طور پر زمینداروں کے مزارعے ہی ہوتے ہیں۔ آپ شہروں میں رہنے والے لوگ اخبار کے کسی کونے کھدرے میں اس قسم کی چند سطری خبر سرسری نظر سے دیکھتے ہیں "زمین کے تنازع پر چھ افراد قتل" آپ شاید اس بارے میں کچھ سوچنے کی بھی زحمت نہیں کرتے ہوں گے۔ خود ہم لوگ بھی اس قسم کی خبروں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتے۔ خبر کی اگر کوئی اہمیت ہوتی ہے تو وہ صرف مقتولوں کے لواحقین کے لیے ہوتی ہے۔ جس کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ جائے، جس کا سہاگ اُجڑ جائے، جس کی آنکھوں کا نور چھن جائے اس سے پوچھیے کہ صرف ایک شخص کا قتل ہو جانا کیا معنی رکھتا ہے، کس طرح ایک فرد کے رخصت ہونے سے ایک خاندان اُجڑ جاتا ہے، کس طرح جہدِ حیات کی ایک داستان ادھوری رہ جاتی ہے، کس پر کیا قیامت گزر جاتی ہے۔

ستم ظریفی تو یہ ہے کہ عموماً نہ تو زمین قتل ہونے والے کی ہوتی ہے اور نہ ہی تنازع سے اس کا کوئی تعلق ہوتا ہے۔ وہ تو بس حکم کا غلام ہوتا ہے . . . اور غلام بھی وہ جسے بن مول خرید لیا گیا ہوتا ہے۔

چوہدری کمال دین اور ملک اسلم زماں . . . یہی دو ہمارے علاقے کے بڑے زمیندار تھے۔ دونوں میں نہ جانے کس زمانے سے چپقلش چلی آ رہی تھی۔ بڑے زمینداروں کو چونکہ کوئی خاص کام نہیں ہوتا، اس لیے شاید چپقلش پالنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ مُنہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کبھی اس نے اُس کے دو چار آدمی مروا دیے اور کبھی ماحول کا جمود توڑنے کے لیے اُس نے اِس کے دو چار آدمیوں پر گولی چلوا دی . . . اِس کا کچھ بگڑتا ہے نہ اُس کا . . . جیل جانے کے لیے بھی آدمی موجود ہوتے ہیں اور پیشیاں بھگتنے کے لیے بھی، ہر مرحلے پر خرچ کرنے کے لیے دولت ہوتی ہے، رونا تو صرف ان کا مقدر ہوتا ہے جن کے سر کا سائیں قتل ہوتا ہے۔

ملک اسلم زماں کی حویلی تک پہنچتے پہنچتے میں نہ جانے کتنی کیفیتوں سے گزرا۔ کبھی مجھ پر غیظ و غضب کا دورہ پڑتا تھا، جی چاہتا تھا راہ میں آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کر دوں،

سامنے آنے والے ہر شخص کی گردن اڑا دوں۔ کبھی دل ڈوب جاتا تھا اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ جاتے تھے جیسے مجھے سزائے موت دینے کے لیے کہیں لے جایا جا رہا ہے۔ کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے کو جی چاہا۔

میں تو کچھ ایسی کیفیت میں ملک اسلم زماں کی حویلی میں داخل ہوا جس کا صحن کسی طویل و عریض میدان سے مشابہ تھا۔ اس وقت صحن میں نہ جانے کتنے آدمی بھرے ہوئے تھے۔ ملی جلی آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی جو میری آمد کی خبر پھیلتے ہی تھم گئی۔ ہجوم نے مجھے خاموشی سے راستہ دے دیا اور میں سیدھا اس چارپائی تک جا پہنچا جس پر سفید چادر سے ڈھکی ہوئی ابا جی کی لاش پڑی تھی۔ میرے وجود کی عمارت آج اپنی بنیاد سے محروم ہو چکی تھی۔

چارپائی کے قریب ہی تھانے دار اور چند سپاہی کرسیوں پر بیٹھے بوتلیں پی رہے تھے۔ ان کے قریب ہی کچھ لوگ فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان میں سے کسی کے بازو پر اور کسی کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ سامنے ہی ملک اسلم زماں بھی کرسی پر بیٹھا تھا۔

میں چارپائی پر جھکا۔ تھانے دار نے مجھے روکنے کے لیے اپنا بید بڑھایا۔ میں نے پلٹ کر اُس کی طرف دیکھا اور اس کا بید ہوا میں معلق رہ گیا۔ اُس نے سوالیہ نظروں سے ملک اسلم زماں کی طرف دیکھا اور پھر بید ہٹا لیا۔ میں نے چادر اٹھائی۔ میرے سامنے ابا جی کا چہرہ نہیں، چہرے کے کئی ٹکڑے تھے۔ ایک طرف سے کھوپڑی سے مغز اور کٹی ہوئی نسیں جھانک رہی تھیں۔ بکھرے ہوئے نقوش مٹی اور لہو میں لتھڑے ہوئے تھے۔

چادر میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور یہ شکستہ چہرہ چھپ گیا۔ میں نے شاید اُسے ایک یا دو سیکنڈ کے لیے دیکھا تھا مگر آج بھی وہ میرے ذہن پر اسی طرح نقش ہے۔

میں رونا چاہتا تھا مگر آنسوؤں کے سوتے خشک ہو چکے تھے۔ اسی لمحے نہ جانے کس طرف سے دو آدمی بڑھے اور مجھ سے لپٹ کر رونے لگے۔ میں نے انھیں قدرے پیچھے ہٹاتے ہوئے دُھندلائی نظروں سے ان کی طرف دیکھا، وہ میرے چچا تھے۔ انھیں ایک طرف دھکیلتے ہوئے میں ملک اسلم زماں کی طرف بڑھا۔ وہ ایک لمبے تڑنگے لیکن بھاری بھرکم، دراز قد اور بارُعب آدمی تھا۔ اس کے جبڑوں کا گوشت لٹکا ہوا تھا اور سر پر کلف لگے طرے والی موٹی سی پگڑی تھی۔

اس وقت وہاں موجود تمام افراد کو گویا سانپ سونگھ گیا، جب میں نے ملک اسلم زماں کو گریبان سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اُٹھا لیا اور گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا "ملک! تمھیں تو اچھی طرح معلوم تھا کہ میرے باپ کو گولی چلانا نہیں آتی پھر تم نے انھیں لڑنے کے لیے کیوں بھیج دیا؟"

میرا خیال تھا کہ اس کا جواب یہی ہوگا کہ اس وقت جو بھی آدمی میسر تھے انھیں بھیج دیا گیا لیکن اس کے بجائے وہ غرایا "کون کہتا ہے کہ میں نے اسے بھیجا تھا؟ وہ تو خود ہی نہ جانے کس وقت ڈیرے سے بندوق اٹھا کر اور دو چار آدمیوں کو ساتھ لے کر جوش میں چل دیا تھا کہ میں چوہدری کمال دین کے آدمیوں کو سبق سکھاتا ہوں . . . میں تو اس وقت ڈیرے پر تھا بھی نہیں۔" پھر اس نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا "میرے پاس کیا بندوق چلانے والوں کی کمی تھی جو میں اللہ میاں کی گائے کو بھیجتا؟ کون کہتا ہے میں نے اُسے بھیجا تھا؟"

اُس نے سوالیہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ گریبان میری گرفت میں ہونے کی وجہ سے وہ آسانی سے گردن نہیں گھما پا رہا تھا لیکن جہاں جہاں تک بھی اُس کی نظر گئی، لوگوں نے سر جھکا لیے گویا بہ زبانِ خموشی کہہ رہے ہوں "مائی باپ! جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہی درست ہے۔"

اسی دوران تین چار بندوق بردار آدمی آگے بڑھے اور اُنھوں نے ایک جھٹکے سے مجھے ایک طرف کھینچ لیا، لیکن اس کے باوجود بھی ملک اسلم زماں کا گریبان میرے ہاتھ سے نہ چھوٹ سکا۔ اس کے کُرتے کا ایک خاصا چوڑا ٹکڑا "چرر" کی آواز کے ساتھ میرے ہاتھ میں آ گیا۔ بندوق برداروں نے سوالیہ نظروں سے ملک کی طرف دیکھا گویا اجازت طلب کر رہے ہوں کہ میرا دماغ درست کر دیا جائے لیکن خلافِ توقع ملک اسلم زماں مربیانہ انداز میں مسکرا دیا۔ اسی دوران میں نے ایک بندوق بردار کے پیٹ میں گھونسا رسید کر دیا تھا اور وہ دُہرا ہونے کے بعد اوندھے منہ فرش پر گر پڑا تھا۔

اُسی لمحے تھانے دار صاحب نے اُٹھ کر سرزنش کے سے انداز میں بید میرے ہاتھ پر مارتے ہوئے کہا "بس کر، چھوکرے! زیادہ دنگا فساد مت مچا، مانا کہ تیرے لیے بڑے صدمے کا مقام ہے مگر یہ بھی تو دیکھ کہ غلطی تیرے باپ ہی کی تھی۔"

میں نے تھانیدار کی طرف قطعاً توجہ نہیں دی! اور ایک ٹک ملک کو گھورتا رہا جس کا گریبان چاک ہو چکا تھا اور

دُم نما سینہ نظر آ رہا تھا۔ اُس نے مشفقانہ انداز میں تھانیدار کا بازو تھپکتے ہوئے کہا۔ "اس پر ناراض ہونے کی ضرورت نہیں کھرل صاحب! موقع ہی ایسا ہے... اور پھر اس کا خون ابھی گرم ہے... نوجوان ہے نا..."

اس دوران میرے دونوں چچا بھی مجھے پکڑ کے کھڑے ہو گئے تھے تاکہ میں ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکوں۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔ "میرے باپ کے قاتل تم ہو اسلم زماں... اور یاد رکھنا کہ یہ قتل تمھیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

وہ ایک بار پھر مربیانہ اور قدرے مغموم انداز میں مسکرایا گویا کسی بچے کی لنترانی سے محظوظ ہونا چاہتا ہو مگر صورتِ حال اس کی اجازت نہ دے رہی ہو۔ تھانے دار نے بید سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ملک کو مخاطب کیا۔ "چھوکرا بہت بڑھتا جا رہا ہے... کیا خیال ہے احتیاطاً اس کے خلاف دھمکیاں دینے کے الزام میں پرچا درج نہ کر لوں؟ کبھی وقت پڑنے پر اس قسم کی ایف آئی آر کام آ جاتی ہے۔"

"نہیں... نہیں... اس کی ضرورت نہیں۔" ملک اسلم نے ہاتھ ہلا کر کہا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے ایک طرف لے جا کر بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد بڑی طویل کارروائیاں ہوئیں، پولیس بیٹھی نہ جانے کیا کچھ قلم بند کرتی رہی۔ مجھ سے کسی نے کچھ پوچھا نہ مجھے کچھ بتایا۔ پھر لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے مقامی اسپتال میں لے جایا گیا۔ میرے دونوں چچا ساتھ گئے۔

تھوڑی دیر بعد ہی لاش واپس مل گئی اور ملک اسلم ہی کی زیرِ نگرانی تدفین کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شام ڈھلے تک تدفین بھی عمل میں آ گئی۔ سب لوگ ملک کی حویلی پر ہی واپس آ گئے جہاں کھانے کا انتظام ہو چکا تھا۔ دیگیں اُتر چکی تھیں۔ صحن ہی میں دریاں بچھا کر کھانا کھلایا جانے لگا۔

ذرا ہی دیر میں وہاں شادی کا سا سماں ہو گیا۔ لوگ ہنس رہے تھے، ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے، کوئی کھانا لانے والوں کو پکار رہا تھا۔ "یار! میرے پیالے میں بوٹیاں تو ڈالو شوربہ ہی شوربہ ڈال دیا ہے۔" کوئی آواز دے رہا تھا۔ "گلاسے! ذرا ٹھنڈا پانی تو لانا... اور ہاں اِدھر گرم روٹیاں بھی پکڑانا۔"

یہ سب دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ تھوڑی دیر پہلے یہاں موت کی سوگواری سایہ فگن تھی۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میرے سامنے بھی کھانا سجا دیا گیا تھا اور ایک بزرگ بڑے بڑے نوالے نگلنے کے ساتھ ساتھ مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ "بیٹا! موت تو برحق ہے... صدمہ اپنی جگہ ہے لیکن کسی کے سوگ میں کھانا پینا تو نہیں چھوڑا جا سکتا... یہ تو خودکشی کے مترادف ہے اور خودکشی حرام ہے۔"

میرے حلق میں آنسوؤں کی نمکینی پھیلی ہوئی تھی۔ میں گھٹنوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بزرگ میری کمر تھپکتے رہے اور کھانا کھاتے رہے۔ کچھ دیر بعد میں اُٹھ کر باہر آنے لگا تو ملک کے تین آدمیوں نے میرا رستہ روکتے ہوئے کہا۔ "ملک صاحب، تمھیں اندر بلا رہے ہیں۔"

میں خاموشی سے اُن کے ساتھ چل دیا۔ میں کچھ تھک سا گیا تھا۔ سرِ دست مجھ میں کسی بات پر احتجاج کرنے کی سکت نہیں تھی۔ وہ مجھے اونچی چھت والے ایک طویل و عریض کمرے میں لے گئے جہاں فرش پر دبیز سرخ قالین اور کھڑکیوں پر سرخ ہی پردے تھے۔ ملک اسلم زماں ایک بھاری بھرکم صوفے پر نیم دراز تھا۔ اس کے سامنے تپائی پر نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی رکھی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "دیکھو برخوردار! جانی نقصان کی تلافی تو ممکن نہیں... تمھارا باپ گوکہ اپنی غلطی سے قتل ہوا لیکن میرا رویہ اپنے آدمیوں کے ساتھ ہمیشہ سرپرستوں والا ہی رہا ہے۔ میں نے ان کی زندگی میں ان کے ساتھ اور ان کے مرنے کے بعد ان کے لواحقین کے ساتھ ہمیشہ اچھے سے اچھا سلوک کرنے کی کوشش کی ہے۔ جو ہوا سو ہوا... میں تمھاری جو مدد کر سکتا ہوں اس کے لیے حاضر ہوں۔"

اُس نے تپائی سے نوٹوں کی گڈی اٹھائی جس پر ربر کا چھلا چڑھا ہوا تھا۔ اس کے ایک آدمی نے گڈی مجھے تھمائی۔

"یہ دس ہزار روپے ہیں۔" ملک بولا۔ "اس رقم سے تم ایک نئی زندگی شروع کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ تمھارے مرحوم باپ پر میرا کوئی ڈھائی تین ہزار روپے کا قرض تھا، میں وہ بھی معاف کرتا ہوں۔"

میں نے ایک نظر نوٹوں کی گڈی کی طرف دیکھا۔ میں نے زندگی میں کبھی اتنی رقم نہیں دیکھی تھی لیکن اس وقت وہ مجھے محض غلاظت محسوس ہو رہی تھی۔

"صرف دس ہزار روپے میں ایک بیٹے سے اس کا باپ خرید رہے ہو؟" میں نے ملک اسلم زماں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ وہ آنکھیں سکیڑے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، میں نے گڈی اُس کے منہ پر کھینچ ماری۔

نوٹ پرانے تھے اور ربر بینڈ ڈھیلا تھا۔ اس کے چہرے سے ٹکرانے سے پہلے ہی نوٹ ہوا میں بکھر گئے۔ مزید کچھ کہے بغیر میں تیزی سے کمرے سے نکل آیا۔ کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

میں سیدھا گھر آ گیا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا۔ سب لوگ حویلی ہی میں تھے۔ گھر میں جیسا سناٹا پھیلا ہوا تھا اس سے زیادہ سناٹا میرے دل میں تھا۔ میں اپنے کمرے میں چارپائی پر جا گرا اور تکیے میں منہ چھپائے دیر تک روتا رہا۔ غیرارادی طور پر میں بار بار سر اُٹھا کر اباجی کی خالی چارپائی کی طرف دیکھتا اور ہر بار پہلے سے زیادہ شدت سے رونا آتا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ چارپائی اب ہمیشہ خالی رہے گی۔ اباجی گوکہ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے لیکن ان کے وجود سے ہی گویا ساری رونقیں تھیں۔ اب وہ نہیں تھے تو در و دیوار بھی کاٹنے کو دوڑ رہے تھے۔ اپنا آپ بڑا غیر محفوظ سا لگ رہا تھا جیسے سر سے کوئی سائبان ہٹ گیا ہو۔

شام کے سائے گہرے ہوئے تو سب لوگ واپس آ گئے۔ چچا وغیرہ میرے پاس ہی آ بیٹھے۔ وہ خود رو رہے تھے لیکن مجھے تسلیاں دے رہے تھے اور جوں جوں وہ تسلیاں دے رہے تھے توں توں میرے آنسوؤں میں روانی آتی جا رہی تھی۔ جانے کہاں سے آنسوؤں کے چشمے پھوٹ پڑے تھے۔ بالآخر رات بیت گئی اور سب اپنے اپنے ٹھکانے پر جا کر سو گئے۔ اب پھر وہی میں تھا اور میری تنہائی۔ نیند جانے کس طرح ہر حال میں آ جاتی ہے۔ میں بھی بالآخر اپنے دُکھ کو سینے سے لگائے ہچکیاں لیتے لیتے سو گیا۔

سوئم ہو چکا تو میرے سوا گویا سب دھیرے دھیرے اس صدمے، اس واقعے کو بھولنے لگے۔ چچا اُسی طرح زمینوں پر جانے لگے، چچیاں اُسی طرح گھرداری میں جُت گئیں، بچے اسی طرح دھما چوکڑی مچانے لگے۔ بس ایک میں تھا جس کے سینے میں زخم ہرا تھا۔

تقریباً ایک ہفتے بعد ایک روز بڑے چچا رات کو میرے کمرے میں آئے۔ اباجی والی چارپائی پر بیٹھ کر کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولے۔ "میں نے سنا ہے ملک اسلم زماں تمھیں دس ہزار روپے دے رہا تھا؟" اُن کے لہجے میں دبی دبی سی شرمساری تھی جیسے انھیں یہ تذکرہ اچھا محسوس نہ ہو رہا ہو لیکن کسی وجہ سے وہ بات کرنے پر مجبور ہوں۔

"ہاں... دے تو رہا تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"پھر تم نے کیا کیا؟" اُن کے لہجے میں کسی حد تک اشتیاق جھلک آیا۔

"میں نے اُس کے منہ پر دے ماری وہ رقم۔" میں نے جواب دیا۔

بڑے چچا کا چہرہ بجھ سا گیا۔ "تمھارے اس طرح کرنے سے جانے والا تو واپس نہیں آ سکتا تھا۔" وہ دبی دبی سی آواز اور ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں بولے۔ "لے ہی لی ہوتی رقم... کچھ کام ہی سنور جاتے۔"

میں ایک ٹک اُن کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہے تھے۔ میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں مسل کر رکھ دیا۔ پیسا... پیسا... پیسا... سب کو اسی کی ہوس پڑی ہوئی تھی۔ تعلق، ناتے حتیٰ کہ خون کے رشتے سب اس کے سامنے ہیچ تھے۔ کسی کا خون کسی کے لیے بیئرر چیک تھا جسے کیش کرانے کا موقع وہ کھونا نہیں چاہتا تھا۔ موقع ملتا تو بھائی، بھائی کی لاش پر بیٹھ کر سودے بازی کر سکتا تھا۔ آخر یہ سب کیا تھا؟ کیا پیسے میں واقعی اتنی طاقت تھی یا لوگ ہی اندر سے کچھ زیادہ کھوکھلے ہو گئے تھے؟

اباجی کی موت کے صدمے سے میں کچھ سنبھل چکا تھا۔ میری آنکھیں خشک رہنے لگی تھیں لیکن بڑے چچا کی یہ بات سن کر جانے کیوں میرا چیخ چیخ کر رونے کو جی چاہنے لگا۔ دل جیسے یکایک ہی دُنیا سے اُچاٹ ہو گیا۔ میں نے صرف ایک نظر بڑے چچا کی طرف دیکھا اور وہ خاموشی سے اُٹھ کر چلے گئے۔

وقت گزرتا رہا۔

میں سمجھتا تھا کہ اباجی کی موت کا زخم میری جان لے لے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ میں نے صرف کتابوں کہانیوں میں پڑھا تھا کہ وقت سب سے بڑا مرہم ہے لیکن اس کا تجربہ مجھے انھی دنوں میں ہوا۔ جوں جوں دن گزرتے گئے سینے کا گھاؤ بھرتا گیا۔ میں حجرہ نما کمرے میں تنہا رہنے کا عادی ہوتا چلا گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں ہمیشہ سے تنہا ہی رہ رہا ہوں... اباجی گویا ایک بھولی بسری سی کہانی بن گئے۔

رفتہ رفتہ میری کیفیت اعتدال پر آ گئی۔ ہنسی کی بات پر ہنسی بھی آنے لگی ——— اور زندگی دوبارہ کم از کم اس حد تک ضرور دلچسپ محسوس ہونے لگی کہ اب مرنے کو جی نہیں چاہتا تھا گوکہ شب و روز کچھ عجیب ہی انداز میں گزر رہے تھے۔ دن بھر میں آوارہ گائے کی طرح منہ اٹھائے پھرتا۔ کبھی

یہاں بیٹھ گیا تو کبھی وہاں۔۔ کبھی اس سے گپ شپ کر لی تو کبھی اُس سے۔۔۔ میرا ایف اے کا رزلٹ آ چکا تھا اور میں سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہو چکا تھا مگر مستقبل سے عدم دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ میں مارکس شیٹ یا سرٹیفکیٹ تک لینے کالج نہیں گیا تھا اور نہ ہی بی اے میں داخلے کی کوشش کی تھی۔ کوئی مشورہ دینے والا تھا نہ رہنمائی کرنے والا۔ کسی کو اس امر سے دلچسپی نہیں تھی کہ میرا کیا بنے گا۔

میری خود بھی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ کبھی میں سوچتا کہ وہیں کوئی نوکری کر لوں لیکن سیالکوٹ روڈ پر جو دو تین چھوٹے موٹے کارخانے قائم ہوئے تھے، ان میں بھی دوسرے ہی شہروں اور دیہاتوں سے لوگ آ کر ملازم ہوئے تھے۔ ہمارا علاقہ صرف اَن پڑھ مزدوروں کے معاملے میں خود کفیل تھا اور ان کی پہلے ہی اتنی فراوانی ہو چکی تھی کہ سرکار خانے کے گیٹ پر موٹے موٹے لفظوں میں لکھا ہوتا تھا، بھرتی بالکل بند ہے، کوئی سفارش لے کر آنے کی کوشش نہ کرے۔

قصبے کے جو لڑکے تھوڑا بہت پڑھ لکھ جاتے تھے، ظاہر ہے وہ مزدوری نہیں کر سکتے تھے۔ وہ ملازمتوں کے لیے لاہور سیالکوٹ یا دوسرے شہروں کا رُخ کرتے تھے اور ڈھائی تین سو روپے کی کلرکی یا کرسی میز والی کسی اور نوکری کی خاطر گھر بار چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔

میں بھی کبھی کبھی لاہور جانے کا سوچتا لیکن جب مجھے یہ خیال آتا کہ وہاں میرا تو کوئی اس حد تک شناسا بھی نہیں کہ مجھے دو چار راتیں اپنے مکان کے تھڑے پر ہی سونے کی اجازت دے دے تو میں دل مسوس کر رہ جاتا اور پھر مسئلہ یہ بھی تھا کہ نوکری ملنے تک میں کھاتا کہاں سے اور کہاں سے دیگر اخراجات پورے کرتا؟ ظاہر ہے وہاں لوگ میرے لیے اپنے دفتروں میں کرسیاں خالی رکھے تو نہیں بیٹھے تھے کہ مجھے دیکھتے ہی کہہ اٹھتے۔ "آئیے آئیے افضل صاحب! ہم آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ یہ سنبھالیے دفتر اور یہ لیجیے تین مہینے کی پیشگی تنخواہ۔"

خدا کا شکر ہے کہ میں کم عقل تھا یا کم تعلیم یافتہ مگر خوش فہم نہیں تھا۔ بعض لوگوں کی نظر میں صورتِ حال کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک روشن پہلو اور دوسرا زیادہ روشن پہلو۔ مجھے آج بھی اس بات کی خوشی ہے کہ میں بھی لڑکپن ہی سے صورتِ حال کے دو پہلوؤں کا قائل تھا مگر ان میں سے ایک تاریک ہوتا تھا۔ میں اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوتا تھا۔

دن اسی طرح گومگو کے عالم میں گزر رہے تھے۔ کبھی کبھی میں ملک اسلم زماں کی حویلی کے قریب سے گزرتا تو سینے میں جیسے کسی خوابیدہ آتش فشاں کا دہانہ کھل جاتا۔ نس نس میں زہر سا گھل جاتا اور میں حویلی کے بلند و بالا در و دیوار پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا کرتا کہ ایک روز میں اپنی آتشِ انتقام سے اس حویلی کو خاکستر کر دوں گا اور اس میں رہنے والوں کو ٹھوکروں سے اُڑا کر رکھ دوں گا لیکن پھر وہی حقیقت پسندی عود کر آتی اور میں اپنے آپ سے پوچھنے لگتا، کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟ کیا کبھی میں اس قابل ہو سکوں گا؟ میرا شعور مجھے کوئی جواب نہ دیتا۔ منفی نہ مثبت۔۔۔ بس دل میں ایک پُراسرار سا سناٹا پھیل جاتا تھا۔

ابھی میں بے مقصدیت کے اس عذاب سے گزر رہا تھا کہ گھر میں چھوٹی چچی کا رویہ بھی بدلنا شروع ہو گیا۔ اگر میں رات کو ذرا بھی دیر سے گھر آتا تو کھانا موجود ہی نہیں ہوتا تھا۔ اگر چچی جاگ رہی ہوتی تھیں تو بڑی بے نیازی سے کہہ دیتی تھیں۔ "بچا ہی نہیں تھا۔۔۔ میں نے سوچا شاید باہر ہی کھا کر آؤ گے!" حالانکہ انھیں معلوم تھا کہ میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ہوتی تھی۔ باہر اگر کبھی کبھار راجو سے ملاقات ہو جاتی تھی تو کھانے پینے کی کچھ عیاشی ہو جاتی تھی۔

اب میں کوشش کرتا تھا کہ جس وقت سب کھانا کھائیں میں گھر پر ہی موجود رہوں۔ ان موقعوں پر بھی میرے ساتھ جو سلوک ہونے لگا وہ بھوک مٹا دینے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ چچی ایک چنگیر میں الگ ہی دو روٹیاں اور پیالی میں بہ مشکل اتنا سالن ڈال کر جس سے محض چند نوالے کھائے جا سکیں، یوں پکڑا دیتیں جیسے وہ برہمن ہوں اور میں اچھوت۔۔۔ پکڑاتی کیا تھیں گویا منہ پر مارتی تھیں۔ اس وقت ان کی پیشانی پر سو بل پڑے ہوتے تھے۔

اگر میں غلطی سے دوبارہ سالن مانگ لیتا تو پھاڑ کھانے والے لہجے میں کہتیں "میں نے یہاں دیگ پکا رکھی ہے کیا؟ یہاں کوئی لنگر کھلا ہوا ہے؟ اپنے بچوں کو تو میں اس سے بھی کم دیتی ہوں۔" حالانکہ ان کے بچے جن میں سے بیشتر میری ٹانگ سے بھی چھوٹے تھے، جتنا کھاتے تھے اس سے مجھے اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر ہمارے علاقے میں کبھی خوراک کے ذخیرے ختم ہوئے تو اس کی بڑی وجہ وہی ہوں گے۔

ایک روز جبکہ میں اپنے کمرے میں موجود تھا اور یہ بات چھوٹی چچی کو بھی معلوم تھی، میں نے انھیں بہ آوازِ بلند بڑی چچی سے باتیں کرتے سنا۔ "کام کا نہ کاج کا۔۔۔ دشمن اناج کا۔۔۔ اتنی بھی حرام خوری اچھی نہیں ہوتی۔۔۔ کوئی لنگڑا لولا بھی نہیں ہے کہ انسان ترس کھا کر ہی کھلاتا رہے۔ چھ فٹ کا قد نکال لیا ہے۔۔۔ سانڈ جیسی کاٹھی ہے مگر لگتا ہے کام نہیں کریں گے۔۔۔ آوارہ گردی کریں گے یا نواب صاحب گھر میں پڑے ایڈتے رہیں گے یا ملنگے تلنگے کی کتابیں اور رسالے پڑھتے رہیں گے۔ میں تو تنگ آ گئی ہوں اس عذاب سے۔"

"میں نے تو شروع سے اسی لیے یہ عذاب پالا ہی نہیں تھا بہن!" بڑی چچی نے بہ آوازِ بلند جواب دیا۔ "اللہ جنت نصیب کرے جیٹھ جی کو۔۔۔ پہلے انھوں نے ہمارے ساتھ ہی چپکنے کی کوشش کی تھی لیکن میں سو پچاس روپلی مہینے کے لالچ میں نہیں آئی۔ میں نے یہی سوچا کہ سو پچاس دے کر یہی سمجھیں گے کہ انھوں نے ہمیں خرید لیا ہے۔"

"بس آپا ہمیں تو انھی کے شرم اور لحاظ نے مار رکھا۔" چھوٹی چچی نے گوہر افشانی فرمائی۔ "اللہ بخشے جب تک وہ زندہ رہے ان کی خدمت میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور اب ان کی اولاد کو بھی بھگت رہے ہیں۔"

میں حساس ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن جن حالات سے میں گزر چکا تھا اور گزر رہا تھا ان میں تو ایک سانڈ بھی اگر یہ گفتگو سنتا تو اس کا کلیجہ بھی شاید چھلنی ہو جاتا۔ بعض سوکھی سڑی عورتوں کی زبان بڑی سفاک ہوتی ہے۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا جی چاہا کہ جا کر چچی کو یاد دلاؤں کہ یہ مکان جس کی چھت کے نیچے آج وہ سب سر چھپائے بیٹھے تھے، میرے باپ نے ہی خریدا تھا اور گو کہ اس وقت اس کی قیمت سیکڑوں ہی میں تھی مگر انھیں وہ قرض اتارتے برسوں لگ گئے تھے اور میرا باپ قابلِ رہائش حصہ ان کے حوالے کر کے خود اس حجرہ نما کمرے میں زندگی گزارتا رہا تھا مگر میں یہ بات ان سے نہیں کہہ سکا۔ میں اپنے آپ کو اتنی کمینگی پر آمادہ نہیں کر سکا۔ پھر میرا جی چاہا کہ جا کر ان کی ککڑی نما گردن مٹھی میں دبا کر کڑک سے توڑ دوں مگر اس کی بھی ہمت نہ پڑی۔ ابا جی نے مجھے ہمیشہ ان کا احترام کرنا سکھایا تھا اور ابھی ابا جی کو اس دنیا سے رخصت ہوئے چند مہینے ہی تو ہوئے تھے۔ ابا جی کی ذات کو تو میں بھول چلا تھا مگر ان کی ہر بات کو بھولنے میں شاید ابھی وقت لگنا تھا۔

حرام خوری مجھے خود بھی پسند نہیں تھی مگر میرا مسئلہ یہ تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ کاشت کاری مجھے آتی نہیں تھی، مزدوری ملتی بھی نہیں تھی اور شاید مجھ سے ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ بارہ برس کی تعلیم نے مجھے اس قابل نہیں چھوڑا تھا۔۔۔ مزدوری کچھ دل کو نہیں بھاتی تھی۔ میں نہ ادھر کا رہا تھا اور نہ اُدھر کا۔۔۔ بیچ میں لٹک گیا تھا تاہم اس دن کے بعد سے میں اس معاملے میں زیادہ اُدھیڑ بُن میں رہنے لگا۔

ایک روز میں راجو سے ایک روپیا اُدھار، جس کے واپس کیے جانے کی اُسے یا مجھے قطعاً کوئی اُمید نہیں تھی، لے کر موچی کے چائے خانے پر جا بیٹھا۔ اس قسم کا اُدھار راجو اکثر و بیشتر ہی مجھے دیتا رہتا تھا اور ایک طرح سے میری خستہ حالی کے ان دنوں کا وہی ایک ٹوٹا پھوٹا سا سہارا تھا۔ وہ دکانداری میں پھنس کر خالصتاً دکاندار ہی لگنے لگا تھا۔ اب اس کے پاس میرے ساتھ آوارہ گردی کرنے کا وقت نہیں ہوتا تھا اور میں نے اُسی کی زبانی سُنا تھا کہ گھر میں اس کی شادی کی تیاریاں بھی ہو رہی تھیں۔

اس روز میں بہت ہی اُداس تھا۔ اپنے چاروں طرف مجھے اندھیرا ہی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا۔ جلد از جلد پھر کر گزرنے یا کسی سمت میں نکل کھڑے ہونے کو جی چاہ رہا تھا لیکن کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں گرم پانی جیسے کے بعد ٹھنڈی چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے اپنے خیالات میں غلطاں تھا کہ نہ جانے کس طرف سے عبدالستار اُٹھ کر میرے قریب آ بیٹھا۔ عبدالستار ہماری گلی سے کچھ فاصلے پر ہی نئے بازار کے قریب رہتا تھا۔ وہ تھا تو میرے چھوٹے چچا کا ہم عمر اور انھی کے ساتھ بچپن میں کھیلا کودا تھا لیکن وہ ابھی تک غیر شادی شدہ تھا اور بقول اس کے یہ اس کی خوش قسمتی تھی۔ بہت ہنس مکھ اور خوش مزاج آدمی تھا۔ شناسا نوجوانوں سے بالکل ہم عمروں کی طرح بے تکلفی سے پیش آتا تھا۔ میں نے کبھی صحیح طور پر جاننے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن سُنا تھا کہ وہ پیر مٹھل شاہ کے ہاں منشی ہے۔ اس کی زمینوں کا حساب وغیرہ رکھتا ہے۔

وہ اپنا کپ میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے بڑے بڑے لٹکے ہوئے منہ دیکھے ہیں لیکن اتنا لٹکا ہوا منہ آج تک نہیں دیکھا۔ اس نوجوانی میں اتنی اُداسی؟ خیریت تو ہے؟"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن شاید مجھے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ بولنے کی کوشش کی تو آواز بھی یوں کھرکھراتی ہوئی نکلی جیسے حلق میں ریت پھنسی ہوئی ہو۔ "خیریت ہی ہے۔۔۔ میں تو ایسے ہی کچھ سوچ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"برخوردار!" اُس نے کھیر جیسی گاڑھی چائے کا ایک گھونٹ حلق سے اُتارنے کے بعد کہا۔ "ہمارا تو کام ہی چہرے پڑھنا ہے۔ جہاں میں ہوتا ہوں وہاں کا نظام ہی اسی فن پر چل رہا ہے۔۔۔ اور تم یہ مت سوچو کہ میں کوئی غیر ہوں۔ مجھے اپنا جگری یار ہی سمجھو۔۔۔ اور یہ خیال بھی دل میں مت لاؤ

کہ میں تمہارے کسی کام نہیں آسکوں گا۔ میں بظاہر بڑا معمولی لیکن درحقیقت بڑے کام کا آدمی ہوں۔ معاملہ اپنے کسی خاص آدمی کا ہو تو میں بہت طریقوں سے کام آسکتا ہوں اور تم سے تو میں خود بھی آج کل میں ملاقات کا ارادہ رکھتا تھا۔ اچھا ہوا تم یہاں بیٹھے مل گئے۔ تم بلا تکلف بتاؤ مسئلہ کیا ہے۔ شاید ہم دونوں ہی ایک دوسرے کے کام آسکیں۔"

مجھے اس کی باتیں قدرے مبہم سی لگیں لیکن اس کا لہجہ اس قدر دلنشیں اور اپنائیت آمیز تھا کہ میں نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں اُسے سب کچھ بتا دیا کہ زندگی کی بے مقصدیت اور بے معاشی میرا مسئلہ تھا اور یہ بھی کہ گھر میں میرے ساتھ کیا سلوک ہو رہا تھا۔ میری گفتگو ایک ایسے شخص کی گفتگو تھی جو اس نامہرباں دُنیا میں بالکل بے اماں رہ گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ آخری جملوں پر شاید میری آواز بھی بھرا گئی تھی۔

عبدالستار نے ادھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ ہم طویل مُستطیل نما چائے خانے کے ایک کونے میں بیٹھے تھے۔ اُس نے میری کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ ہم ایک دوسرے کے کام آسکتے ہیں۔ حالات کی اتنی سی خرابی سے تم جیسے کڑیل نوجوان کو اس طرح دل شکستہ ہونا زیب نہیں دیتا، جوماں باپ کے سائے سے محروم ہو جاتے ہیں عموماً ان پر تو اس سے بھی زیادہ بڑی بڑی مصیبتیں ٹوٹتی ہیں۔ بہرحال میرے پاس تمہارے لیے ایک تجویز ہے، جو تمہارے لیے کسی بھی باضابطہ قسم کی نوکری سے زیادہ مفید ثابت ہو سکتی ہے لیکن ایک بات ذہن میں رکھنا کہ اگر تمہیں اس تجویز سے اتفاق نہ بھی ہوا اور میری پیش کش تمہیں نامنظور ہو تب بھی کسی سے اس کا تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں، بس اس بات کو یہیں ختم سمجھنا اور سمجھ لینا کہ ہماری ملاقات ہوئی ہی نہیں تھی، ورنہ تمہیں کوئی بھاری نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ سمجھ گئے نا؟"

"سمجھ گیا!" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں اشتیاق جھلک آیا۔ "بات کیا ہے؟"

"میں نے سُنا ہے، جب تم خاص طور پر موڈ میں آکر بولتے ہو تو تمہاری آواز بڑی بارعب محسوس ہوتی ہے اور یہ بھی کہ تم کسی طرح کے لہجے اختیار کر سکتے ہو؟" اُس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے تصدیق چاہی۔

"ہاں کافی حد تک درست ہے یہ بات!" میں نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں نے یہ بھی سُنا ہے کہ اگر تم غصے میں بولو تو اچھے بھلے آدمی کے پیروں تلے سے زمین نکال دیتے ہو۔" اُس نے مزید تصدیق چاہی۔

"شاید..." میں نے اب بھی ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں کہا۔ "میں نے کسی کے قدموں تلے سے زمین نکلتی دیکھی تو نہیں لیکن محسوس کیا ہے کہ سُننے والا کسی حد تک گھبرا ضرور جاتا ہے۔" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد پوچھا۔ "لیکن بات کیا ہے؟ تم مجھ سے اتنے تجسس میں کیوں مبتلا کر رہے ہو؟"

اُس نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھا اور اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ "دراصل ہمیں ایک جنّ کی ضرورت ہے!" اُس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔ "ہمارا جنّ بھاگ گیا ہے!"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ "میں تمہیں کس طرف سے جنّ نظر آتا ہوں؟"

"میں تمہیں قدرے وضاحت سے سمجھاتا ہوں!" وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "تم نے یہ تو سُن ہی رکھا ہوگا کہ پیر مٹھل شاہ کے قبضے میں جنّ ہیں؟"

"ہاں، میں نے سُنا تو ہے لیکن کبھی ان باتوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی!" میں نے کہا۔

"حقیقت یہ ہے کہ پیر مٹھل شاہ کے قبضے میں کم از کم ایک جنّ ضرور تھا۔ اس کا نام وحید تھا لیکن مسئلہ یہ ہوا کہ پچھلے دنوں اُسے دبئی کا ویزا مل گیا اور وہ دبئی بھاگ گیا۔ پیر صاحب نے اُسے بڑا لالچ دیا... تنخواہ بڑھانے کی پیش کش کی مگر اُس نے ایک نہیں سنی!" عبدالستار مغموم سے انداز میں خاموش ہو گیا۔ میں اب بھی اُسے گھور رہا تھا۔

"تمہاری باتیں میری سمجھ سے باہر ہیں!" بالآخر میں نے کہا۔

"ابھی سمجھ میں آجائیں گی!" وہ ہاتھ اُٹھا کر گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "دراصل ہم نے بڑی محنت سے پیر مٹھل شاہ کی شخصیت کا تاثر بنایا ہے۔ کئی افراد کی مشترکہ محنت اور کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج پیر مٹھل شاہ اس قدر باکمال اور کرشمہ ساز شخصیت کے طور پر مشہور ہے اور اس کے ہاں معتقدین کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ جنّ کا قصہ یہ ہے کہ... لیکن پہلے یہ بتاؤ تم نے پیر صاحب کا ڈیرا دیکھا ہے؟"

"باہر ہی سے دیکھا ہے... وہی... ان کی زمینوں پہ وہ جو خاصا لمبا چوڑا دو منزلہ مکان ہے... اسی کی بات کر رہے ہو نا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "وہاں ایک تو طویل و عریض انتظار گاہ ہے جہاں جا کر معتقدین بیٹھتے ہیں...

باری آنے پر ایک ایک کر کے سائل اندر جاتے ہیں، جہاں ایک کمرۂ خاص میں پیر صاحب ایک اونچے تخت پر تشریف فرما ہوتے ہیں۔ تخت پر آرام دہ گدا اور اس پر بہت بڑا اور بھاری سا سیاہ کپڑا بچھا ہوتا ہے جو تخت کے چاروں طرف فرش تک لٹکا ہوتا ہے۔ جنّ تخت کے نیچے بیٹھا ہوتا ہے۔ موٹے سیاہ کپڑے میں ایک چھوٹا سا سوراخ ہوتا ہے جس سے آنکھ لگا کر جنّ اچھی طرح سائل کو دیکھ سکتا ہے۔ روشنی کا نظام کچھ ایسا ہے کہ زیادہ روشنی پیر صاحب پر ہی رہتی ہے۔ فرش تک پہنچے ہوئے کپڑے پر روشنی کم پڑتی ہے اور اگر پڑے بھی تو سرسری نظر میں یہ دیکھنا ممکن نہیں ہوتا کہ اس میں ایک ننھا سا سوراخ ہے اور اس سے آنکھ لگا کر کوئی باہر جھانک رہا ہے، خصوصاً ایک معتقد کا ذہن تو اس طرف جا ہی نہیں سکتا!"

"تمہارا مطلب ہے کہ جنّ دراصل کوئی عام سا آدمی ہوتا ہے... میری طرح؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا اب بھی وضاحت کی ضرورت باقی ہے؟" عبدالستار نے گویا بُرا مناتے ہوئے پوچھا۔

میں خاموش رہا تو وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "جنّ کے پاس ایک مائیک موجود ہوتا ہے جو کم طاقت کے ایک ایمپلی فائر اور چار اسپیکروں سے منسلک ہوتا ہے۔ چاروں اسپیکر چاروں دیواروں میں فٹ ہیں۔ جنّ جب حکم ملنے پر قدرے عجیب سی آواز میں بولتا ہے تو اس کی آواز مزید عجیب سے انداز میں سائل پر چاروں طرف سے گویا حملہ آور ہوتی ہے اور وہ دم بخود رہ جاتا ہے!"

"جنّ کیا کہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خاموشی سے سُنتے جاؤ!" اُس نے مجھے جھڑک دیا۔ "ہوتا یہ ہے کہ جس سائل کی باری ہوتی ہے ...... ہمارا آواز لگانے والا کارندہ پہلے ہی آکر جنّ کو اس کے بارے میں کسی نہ کسی حد تک معلومات فراہم کر دیتا ہے، مثلاً یہ کہ اس کا کوئی عزیز یا بیٹا وغیرہ فلاں حادثے میں مر گیا تھا یا زخمی ہو گیا تھا، اگر وہ عورت ہے تو اس کے شوہر کا نام اور اگر مرد ہے تو اس کے بیوی بچوں وغیرہ کا نام... اس علاقے میں ایک دوسرے کے بارے میں ایسی چھوٹی موٹی معلومات رکھنا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ دوسرے اس مقصد کے لیے دو نہایت حرّافہ قسم کی بوڑھی عورتیں بھی ہمارے ہاں ملازم ہیں جن کا کام آنے بہانے سے دن بھر مختلف گھروں میں گھومنا اور معلومات جمع کرنا ہوتا ہے۔ وہ بھی ہماری مدد اور رہنمائی کے لیے ان اوقات میں ڈیرے پر ہی موجود ہوتی ہیں جب پیر صاحب معتقدین کو شرفِ ملاقات بخشتے ہیں۔ سائل جب پیر صاحب کے حضور پیش ہوتا ہے تو پیر صاحب صرف ایک لمحے کے لیے پُرجلال نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہیں اور دو مرتبہ تخت پر ہاتھ مار کر کہتے ہیں۔ 'حاضر ہو جا اے یاقوت جنّ! اور مجھے اس سائل کے بارے میں کچھ بتا...!' تب جنّ صاحب مائیک پر سیٹی سی بجا کر آندھی چلنے کی سی آواز پیدا کرتے ہیں اور پھر ایک خاص انداز میں بولنا شروع کرتے ہیں۔ 'یہ عورت فلاں بنتِ فلاں جس کے تن پر سبز پھولوں والا لباس ہے، اپنی غلطی سے ایک بار گندے نالے میں گر گئی تھی۔ آج بھی یہ حالات کی دلدل میں پھنسی ہوئی ہے... اسے روپے پیسے کی اُلجھن درپیش ہے...' جنّ کی باتوں کے دوران پیر صاحب سر جھکائے آنکھیں بند کیے مراقبے کی سی حالت میں بیٹھے رہتے ہیں اور سادہ لوح سائل یا سائلہ عموماً تھر تھر کانپتی رہتی ہے۔ جنّ کے پاس معلومات کا ذخیرہ ختم ہو جاتا ہے تو وہ خاموش ہو جاتا ہے یا درمیان میں ہی کہیں پیر صاحب کسی مصلحت کے تحت اسے خاموش کرانا بہتر سمجھتے ہیں تو تخت پر ایک بار پُرجلال انداز میں ہاتھ مار کر خود بات سنبھال لیتے ہیں۔ اگر تم اس کام کے لیے رضامند ہو گئے تو تمہیں تقریباً ایک ہفتہ اس کام کی تربیت دی جائے گی... ریہرسل کرائی جائے گی۔ صوتی تاثرات دینا اور موقع محل کے لحاظ سے لہجے بدلنا سکھایا جائے گا جس کے بعد تم تربیت یافتہ جنّ بن جاؤ گے۔ جس سائل کو تم پہچانتے ہو گے اور اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو گے اُس کا اظہار بھی کر دیا کرنا... مجھے اُمید ہے کہ تم اس کام کو بڑی عمدگی سے سرانجام دینے لگو گے۔ اس کے علاوہ بھی کچھ شعبدے ہیں جو وہاں دکھائے جاتے ہیں مثلاً پانی میں آگ لگا دینا یا گلاس میں ہاتھ ڈال کر پھیکے پانی کو میٹھا بنا دینا... لیکن ان سے تمہارا کوئی تعلق نہیں... یہ ایک شعبہ ہے!"

میں چند لمحے خاموش رہا پھر میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "مجھے تنخواہ کتنی ملے گی؟"

"کامیابی سے تربیت مکمل کر لینے کے بعد پانچ سو روپے مہینہ۔" عبدالستار نے جواب دیا۔ "اور اگر باس... میرا مطلب ہے پیر صاحب تمہاری کارکردگی سے خوش رہے تو وقتاً فوقتاً انعام و اکرام بھی ملتا رہے گا!"

"کیا واقعی؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ پانچ سو روپے ماہوار اس زمانے میں خاصی بڑی تنخواہ تھی۔ "پیر صاحب کی اتنی آمدنی ہے؟"

"تم تو صرف اپنی ہی تنخواہ سن کر پیر صاحب کی آمدنی کے بارے میں سوال کرنے لگے۔" وہ فخریہ انداز میں مسکرا دیا۔ "وہاں آٹھ آدمی ایسے ہیں جن کی خدمات صرف پیری مُریدی والے دھندے سے ہیں اور اُن میں سے دو ایک کی تنخواہ اس سے بھی زیادہ ہے جو تمہاری ہوگی۔ اس کے علاوہ زمینوں پر کام کرنے والے کچھ آدمی بھی ہیں جو پارٹ ٹائم پیری مُریدی والے کام میں ہاتھ بٹاتے ہیں۔ انھیں اس کا معاوضہ الگ ملتا ہے۔ آمدنی کا تو تم اندازہ نہیں کر سکتے برخوردار! دولت آبشار کی طرح گرتی ہے... اسی کمائی سے تو پیر صاحب نے زمینیں خریدی ہیں۔ ابھی چار ہی مربعے ہیں آہستہ آہستہ بڑھتے جائیں گے۔ اِدھر پیری مُریدی کا حلقہ بھی وسیع سے وسیع تر ہوتا جائے گا۔ چند برس کی بات ہے، بڑی توپ چیز بن جائیں گے وہ... میں تو ان کا منشی ہوں نا... مجھے تو ہر چیز کا اندازہ ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر کبھی پیر صاحب نے مجھے ملازمت سے نکال دیا یا کسی وجہ سے مجھے خود الگ ہونا پڑا تو میں کسی دور دراز علاقے میں جا کر یہی دھندا شروع کر دوں گا۔ وقت تو لگے گا لیکن اگر دھندا چمک گیا تو نسلیں سدھر جائیں گی۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا۔" میں نے کہا۔

"تم یقینی اور بے یقینی کو چھوڑو۔" عبدالستار ناگواری سے بولا۔ "یہ بتاؤ کہ کام کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

میں نے اُس کے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے پوچھا۔ "جس سائل کے بارے میں جن کو یا پیر صاحب کی جاسوسہ وغیرہ کو بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا اس کے بارے میں جن کیا کہتا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" عبدالستار نے جواب دیا۔ "اس سے پیر صاحب براہِ راست مسئلہ پوچھ لیتے ہیں پھر اگر ضروری سمجھتے ہیں تو جن کو طلب کرتے ہیں اور اُس سے دریافت کرتے ہیں کہ مسئلہ حل ہو جائے گا یا نہیں۔ ظاہر ہے جن کا جواب معمولی سی ہچکچاہٹ کے بعد ہمیشہ اثبات میں ہوتا ہے۔"

میں نے چند لمحے غور کیا اور کہا۔ "ٹھیک ہے ستار بھائی، میں تیار ہوں۔"

عبدالستار نے ایک گہری سانس لی گویا کوئی بوجھ سر سے اُتر گیا ہو۔ "پیر صاحب معتقدین سے ملاقات دوپہر کے کھانے کے بعد شروع کرتے ہیں۔ آج کل وہ جن کے بغیر ہی کام چلا رہے ہیں لیکن اس طرح دھندا کچھ مندا جا رہا ہے اور شہرت پھیلنے کا عمل بھی کچھ سست پڑ گیا ہے۔ گو کہ پیر صاحب نے مشہور بھی کر رکھا ہے کہ ان کا جن آج کل کسی سائل کا مسئلہ حل کرنے کے سلسلے میں کہیں دور دراز گیا ہوا ہے اور کچھ شیطانی قوتوں کے اثر کی وجہ سے اسے واپسی میں دیر ہو رہی ہے۔"

اُس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر کہا۔ "تم صبح ہی صبح پہنچ جایا کرو تاکہ ہم معتقدین کی آمد کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے ہی تمہیں مشق وغیرہ کرا دیا کریں۔ اس کے بعد دل چاہے تو گھر چلے جایا کرو اور ہو سکے تو رات میں ایک دو گھنٹے کے لیے آ جایا کرو۔ جتنی زیادہ محنت کرو گے اتنا ہی وقت کم صرف ہوگا۔"

"ٹھیک ہے، میں آ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ وہ گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گیا۔

دوسرے روز میں آٹھ بجے کے قریب پیر مٹھل شاہ کے ڈیرے پر پہنچا۔ دو منزلہ یہ مکان آبادی سے کافی دُور اور چاروں طرف سے کھیتوں میں گھرا ہوا تھا۔ قریب ہی ٹیوب ویل بھی لگا ہوا تھا۔ دائیں ہاتھ پر کوئی سو قدم کے فاصلے پر ملک اسلم زماں کی زمینیں شروع ہوتی تھیں۔ ان سے متصل ہی چوہدری کمال دین کے فارم اور زمینیں تھیں۔

مکان باہر سے تو محض ڈیرا ہی نظر آتا تھا لیکن اندر پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کسی حویلی سے کم نہیں تھا۔ سڑک اور گلیاں یہاں سے بہت دور تھیں مگر بجلی یہاں تک پہنچی ہوئی تھی۔

پختہ احاطے کے پار سامنے برآمدے میں چقیں لٹکی نظر آ رہی تھیں۔ احاطے میں ایک بہت بڑی چارپائی پر ایک بھاری بھر کم دھوتی پوش بیٹھا حقہ گڑگڑا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی حقہ چھوڑ کر لپک کر میرے قریب آیا، گویا اُسے اندیشہ ہو کہ میں چق اُٹھا کر سیدھا اندر نہ چلا جاؤں۔

میں نے اُسے اپنا نام بتایا اور وہ مزید کچھ سُنے بغیر ہی اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد ہی عبدالستار اُس کے ساتھ باہر آیا اور میرا ہاتھ تھام کر اندر لے گیا۔ وہ خاصا خوش نظر آ رہا تھا۔

وہ مجھے جس کمرے میں لے گیا وہ بیک وقت خواب گاہ بھی معلوم ہوتی تھی اور کمرا نشست بھی۔ ایک چوڑی چکلی... خوبصورت مسہری پر ایک شخص ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ عبدالستار نے اُس سے میرا تعارف کرایا تو مجھے پتا چلا کہ وہ پیر مٹھل شاہ تھا۔ میرے ذہن میں اس کا تصور یہی تھا کہ وہ لمبی سی داڑھی والا کوئی بھاری بھر کم بزرگ ہوگا مگر وہ جوان تھا... اور بہت ہی خوبصورت جوان۔

اُس کی رنگت سُرخ و سپید، آنکھیں موٹی موٹی، شانوں تک پہنچے ہوئے بھورے بال اور نقوش بے حد دلکش تھے۔ چہرے مہرے سے وہ بے حد نفیس اور نازک مزاج لیکن جسمانی اعتبار سے کڑیل جوان معلوم ہوتا تھا۔ اُس نے مجھ سے ہاتھ ملایا تو

مجھے اس کی طاقت کا کچھ کچھ اندازہ ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں کسی حد تک انسان کو مسحور کر دینے والی طاقت تھی۔

وہ ایک لمبا سا ریشمی چغہ پہنے بیٹھا تھا اور اس کے قریب ہی مسہری پر ایک ریڈیو پڑا تھا جس کا سوئچ اُس نے ہمیں دیکھتے ہی آف کر دیا تھا۔ اُس نے ہمیں سامنے ہی گدیلی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ہم بیٹھ چکے تو اُس نے ایک خوبصورت سنہرے پیکٹ سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور پیکٹ ہماری طرف بھی بڑھایا۔ میں نے تو شکریے کے ساتھ انکار دیا لیکن عبدالستار نے سگریٹ سلگا لی۔

ایک کش لے کر مٹھل شاہ نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ میں حتی الامکان پُر اعتماد نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا تاہم اپنے معمولی لباس اور پرانے جوتوں کی وجہ سے مجھے کسی حد تک کمتری اور شرم محسوس ہو رہی تھی۔

"افضل میاں!" بالآخر مٹھل شاہ نے میٹھے لہجے میں کہا۔ "عبدالستار نے مجھے بتایا ہے کہ وہ تم سے تمام ضروری باتیں طے کر چکا ہے، اس لیے میرے کچھ کہنے کی تو ضرورت باقی نہیں رہ جاتی۔ تمہارا خاندانی پس منظر وغیرہ بھی میں نے معلوم کرا لیا ہے۔ اب میں صرف ایک بات واضح کرنا چاہتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تم بہت ہی اچھی طرح اسے ذہن نشین کر لو۔ مجھے اور کسی بھی بات کی پروا نہیں ہوتی، سوائے اس کے کہ میرے آدمی اس قابل ہوں کہ میں آنکھیں بند کر کے ان پر بھروسا کر سکوں... راز داری ان کی اولین صفت ہو۔ ان کا سینہ سمندر ہو۔ اوچھے لوگوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ ان آدمیوں سے محبت ہے جو بڑی سے بڑی سختی میں بھی میرا کوئی راز افشا نہ کریں.... یہاں تم بڑے بڑے تماشے دیکھو گے، تمہارا دل چاہے تو کچھ تماشوں میں تم شریک بھی ہو سکتے ہو لیکن کبھی بھول کر بھی میرے اور عبدالستار کے سوا کسی تیسرے شخص کے سامنے بیٹھ کر کوئی لفظ زبان پر نہ لانا۔ میں یہ جتانا اچھا تو نہیں سمجھتا لیکن مجبوراً واضح کرنا پڑ رہا ہے کہ میری اس ہدایت کی خلاف ورزی کرنے والے کی سزا موت بھی ہو سکتی ہے۔ ایسی موت جس میں لاش بھی لواحقین کو نہیں ملتی۔ میرے ہاں انسان کی باقی سب خطائیں معاف ہیں۔ سمجھ گئے نا؟"

اس وقت تک میری جھجک بھی کافی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا مقصد بڑی اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ آپ مجھے اپنی توقعات سے بڑھ کر کھرا پائیں گے۔"

مٹھل شاہ نے مسکراتے ہوئے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور عبدالستار سے کہا۔ "اسے کمرا خاص دکھا دو اور چاچا برکت کی مدد سے آج سے ہی اس کی ٹریننگ شروع کر دو۔"

عبدالستار کا اشارہ پا کر میں اُٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ خواب گاہ ہی کی ایک دیوار میں موجود دروازہ کھول کر وہ متصل کمرے میں داخل ہوا۔ یہی کمرا خاص تھا۔ اس میں ویسے تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس کھڑکیوں اور دروازوں کی ساخت کچھ اس قسم کی تھی کہ کافی حد تک ساؤنڈ پروف معلوم ہوتا تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ جانے کیوں یہاں پہنچتے ہی مجھے خنکی اور سکون کا احساس ہوا حالانکہ چھت میں لٹکے ہوئے دونوں پنکھے بھی بند تھے۔

ایک دیوار کے قریب وہ تخت رکھا تھا جس کے بارے میں عبدالستار مجھے بتا چکا تھا۔ اس پر دو گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ عبدالستار نے تخت کے چاروں طرف پردوں کی طرح لٹکا ہوا کپڑا اُٹھا کر مجھے دکھایا۔ نیچے ایک مخملی گدی پڑی تھی جس پر مجھے بیٹھنا تھا۔ اس پر سیاہ تار سے منسلک مائیک بھی پڑا تھا۔ قریب ہی ایک صراحی اور گلاس بھی رکھا تھا کہ اگر ڈیوٹی کے دوران جن صاحب کا گلا خشک ہو جائے تو انھیں باہر آنے کی زحمت نہ کرنی پڑے۔

میں نے چند منٹ کے لیے تخت کے نیچے بیٹھ کر بھی دیکھا۔ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں کسی تاریک خیمے میں بیٹھا ہوں۔ کپڑے میں موجود ایک ننھے سے سوراخ سے میں باہر کا منظر اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ چند لمحے بعد ہی اندر کی تاریکی سے میری آنکھیں مانوس ہو گئیں۔ عبدالستار بولا۔ "مائیک کا بٹن آن کر کے آزمائش کے طور پر کچھ بولو۔"

میں نے شہنشاہی انداز میں ایک مکالمہ بولا اور کمرے میں گونجنے والی آواز سن کر میں خود ہی متاثر ہو گیا۔ ان دنوں ویسے ہی آواز سے متعلق برقی آلات کچھ زیادہ عام نہیں ہوئے تھے، خصوصاً ہمارے پسماندہ علاقے میں... اور پھر اسپیکر بھی یقیناً کچھ خاص ہی قسم کے تھے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ان کی آواز اسپیکروں سے نکلنے والی آواز معلوم نہیں ہوتی تھی، نہ ہی اس کی سمت کا اندازہ ہوتا تھا۔ آواز بس جیسے ہوا سے پھوٹتی تھی۔ میں نے کئی قسم کے لہجوں میں بول کر دیکھا اور کئی قسم کی آوازیں نکالیں۔ نتیجہ واقعی بے حد متاثر کُن تھا اور ابھی تو میری تربیت نہیں ہوئی تھی۔ یکایک ہی یہ کام مجھے بے حد آسان محسوس ہونے لگا۔

میں باہر آیا تو عبدالستار نے مجھے دیواروں پر آویزاں وہ چار تصویریں دکھائیں جن کے پیچھے مائیک فٹ تھے۔ یہ سارا

سلسلے بے حد عمدہ اور اپنے وقت کے لحاظ سے خاصی ذہانت کا حامل کرنے کا معائنہ مکمل کرانے کے بعد عبدالستار نے حلوہ پوری اور لسی سے میری تواضع کی اور اس کے بعد میری تربیت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک عرصے کے بعد چونکہ مجھے ڈٹ کر دل پسند ناشتا کرنے کا موقع ملا تھا، اس لیے اس کے بعد طبیعت بڑی چونچال ہو گئی تھی۔

تربیت کے دوران میرا تقریباً سارا دن ہی متھل شاہ کے ہاں گزرنے لگا۔ اس عرصے میں میں ماحول سے مانوس بھی ہو گیا اور مجھے متھل شاہ کے دھندوں کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملی۔

اس کے معتقدین میں ہمارے قصبے ہی کی جتنی خواتین اور مرد شامل تھے میں تو اُن سب کو بھی نہیں پہچان سکتا تھا جبکہ اِرد گرد کے قصبوں اور دیہاتوں سے بھی نہ جانے کتنے لوگ آتے تھے۔ ان میں سے یقیناً کچھ کی اغراض خدا کی منشا سے پوری بھی ہوتی ہوں گی مگر وہ اسے پیر صاحب کی کرامت ہی سمجھتے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ متھل شاہ کی شخصیت میں سحر تھا۔ بعض عورتیں محض اس سے تبادلہ خیال کرنے کے لیے ہی آتی تھیں۔ انھیں کوئی مسئلہ درپیش نہیں ہوتا تھا۔ بعض باقاعدہ متھل شاہ پر عاشق تھیں اور اس کی عنایات خصوصی کی طالب رہتی تھیں۔ کسی کو مایوس کرنا متھل شاہ کے مسلک میں شامل نہیں تھا، اس لیے وہ انھیں بھی مایوس نہیں کرتا تھا۔ کسی کو ایک دن وقت دیتا تھا اور کسی کو دوسرے دن۔

اس قسم کے تماشوں سے میرے اعصاب اتھل پتھل رہنے لگے تھے لیکن اب میری ڈیوٹی شروع ہو چکی تھی اور میری کوشش تھی کہ کچھ عرصہ محنت اور یکسوئی سے اپنا کام انجام دے لوں۔ پانچ سو روپے ماہوار کے تصور سے مجھے اپنی یکسوئی برقرار رکھنے میں بڑی مدد ملتی تھی۔ متھل شاہ میری کارکردگی سے بے حد خوش تھا۔ اس کی رائے میں میں اس کے سابقہ جنّ سے زیادہ عقل رکھتا تھا اور آواز کے شعبدے دکھانے میں بھی زیادہ ماہر تھا۔

میرے علم و عقل میں اضافہ کرنے میں چاچا برکت کا بھی بڑا ہاتھ تھا جنھیں عبدالستار کے ساتھ میری تربیت پر مامور کیا گیا تھا۔ موصوف ایک ریٹائرڈ پہلوان تھے لیکن لگتا تھا کہ اپنے دور میں مردوں سے کشتیاں انھوں نے کم ہی لڑی تھیں۔ انھوں نے مجھے عورت کی نفسیات اور قیافہ شناسی کے ایسے ایسے گُر بتائے تھے کہ میں خواب میں بھی اُن کی مشق کرتا رہتا تھا۔

کچھ تربیت اور کچھ غور و فکر کی بنا پر میں چند ہی دن میں اس قابل ہو گیا کہ تقریباً پچاس فیصد سائلوں کا چہرہ دیکھ کر ہی ان کی غرض بھانپ لیتا تھا لیکن سٹی تو میری اُس روز گم ہوئی جب میں نے سائلہ کے طور پر چھوٹی چچی کو سامنے کھڑے پایا۔ ان کے ہمیشہ سوکھے رہنے والے ہونٹ کچھ زیادہ ہی سوکھے ہوئے تھے اور چندھی چندھی آنکھیں مرعوبیت سے پھیلی ہوئی تھیں۔

ایک لمحے کے لیے تو میں ایسا گھبرایا کہ اُٹھ کر بھاگنے ہی لگا تھا مگر فوراً ہی خیال آ گیا کہ وہ مجھے تھوڑا ہی دیکھ سکتی ہیں۔ میں فیصلہ نہ کر پایا کہ انھیں کون سا مسئلہ یہاں لے آیا تھا۔ ویسے تو خیر زندگی ان کے لیے اور وہ زندگی کے لیے ایک مجسّم مسئلہ تھیں مگر خاص طور پر ان کی غرض کا تعیّن کرنا مشکل تھا۔ انھیں کسی بھی چیز کی غرض ہو سکتی تھی سوائے موت کے... اس کے باوجود میرے خیال میں جنّ کا رول پلے کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔

حیرت مجھے اس بات پر بھی تھی کہ وہ پیر متھل شاہ کے ہاں آنے کی متحمل کیسے ہوئی تھیں؟ جس طرح ڈاکٹروں کے ہاں ایک مقررہ فیس تو ہوتی ہی ہے خواہ مریض مرے یا زندہ رہے اور اس کے علاج کے علاوہ دیگر خرچ اپنی جگہ ہوتے ہیں اسی طرح متھل شاہ کے ہاں آنے والوں سے دس روپے

کا نذرانہ تو دروازے پر ہی دھروالیا جاتا تھا اور یہ وصولی ایسے روح پرور اور پُر تقدس ماحول میں عمل میں آتی تھی کہ دینے والے کو ذرا بھی نہیں کھٹکتی تھی بلکہ اس کا دل چاہتا تھا کہ جیب وہیں خالی کردے۔

اس کے بعد اکثر حاجت مندوں پر تعویز یا عملیات اور وظیفوں وغیرہ کے ضمن میں زعفران، کالی مرغی یا کالے بکرے وغیرہ کا جو خرچ پڑھتا تھا وہ الگ تھا۔ اس کے بعد بھی اگر سکت باقی رہ جاتی تھی تو بعض لوگ جوشِ عقیدت میں از خود نذرانے پیش کرنے سے باز نہیں آتے تھے، خصوصاً جن کی مُراد بر آتی تھی، وہ تو بار بار آتے تھے اور پیر صاحب کے قدموں میں لوٹتے تھے۔

چچی اگر دس روپے کا نذرانہ دے کر اندر آئی تھیں تو میرے لیے بلاشبہ یہ حیرت کا مقام تھا کیونکہ میں نے ان کے پاس یکمشت دس روپے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

مٹھل شاہ نے مجھے سگنل دیتے ہوئے کہا "حاضر ہوجا اے یاقوت جنّ! اور مجھے اس عورت کے بارے میں کچھ بتا!"

میں نے پہلے تو فلم گل بکاؤلی کے جن کی طرح ایک ہیبت ناک قہقہہ لگایا پھر چچی کے شجرۂ نسب کا کافی حصہ بیان کر ڈالا کہ یہ عورت فلاں کی بیوی، فلاں کی بیٹی اور اتنے بچّوں کی ماں ہے۔ آخر میں میں نے کہا "اے بدبخت بڑھیا..."

حالانکہ وہ کوئی ایسی بوڑھی بھی نہیں تھیں۔ ان کا دسواں اور تازہ ترین بچہ صرف دو سال کا تھا۔ "تیرا ایک نوجوان بھتیجا بھی ہے اور تو اس یتیم و لسیر کے ساتھ بہت بُرا سلوک روا رکھتی ہے، اسی لیے خدائے بزرگ و برتر تجھ پر نامہربان ہے اور جب تک تو یہی رویّہ اپنائے رکھے گی تیرے حالات خراب ہی رہیں گے۔ تو سدا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر روتی رہے گی۔ تجھے نہیں معلوم، وہ یتیم بچّہ بڑا بھاگوان ہے۔ اس کی دعائیں لے گی تو تیرا بڑھاپا بڑے سکھ میں گزرے گا۔"

میں نے دیکھا، چچی تھر تھر کانپنے لگی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر قالین پر تقریباً اوندھے منہ گرتے ہوئے بولیں "جنّ سائیں! مجھ سے بڑی خطا ہوئی۔ بڑی بھول ہوئی۔ میں اللہ تعالیٰ سے معافی مانگوں گی اور آئندہ اپنے مجازی خدا سے بھی زیادہ اس یتیم کی خدمت کروں گی۔ اسے اپنے بچّوں سے زیادہ پیار دوں گی۔"

"اسی میں تیری بھلائی ہے بڑھیا!" میں نے انہیں جلانے کی خاطر لفظ 'بڑھیا' پر دوبارہ زور دیتے ہوئے کہا لیکن شاید اس وقت ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر جلنے کی ان میں سکت نہیں تھی۔

دل تو چاہ رہا تھا کہ ان کی حالت پر چند ہیبت ناک قہقہے اور لگاؤں مگر خود پر ضبط کرتے ہوئے میں نے کہا "اب میرے آقا کو اپنا مسئلہ بتا۔ وہ چٹکی بجاتے ہی اسے حل کر دیں گے اور ہمیں حکم دیں گے تو ہم پھر حاضر ہوجائیں گے..." یہ کہہ کر میں نے ایسی ہلکی سی آواز پیدا کی جیسے کوئی پرندہ اُڑا ہو۔ پھر میں نے مائیک کا سوئچ آف کر دیا۔

سکوت چھا چکا تو چچی کی کچھ ہمت بندھی۔ وہ دوزانو بیٹھ کر ہاتھ باندھتے ہوئے بولیں "حضور! میرا ایک ہی مسئلہ ہے۔ غربت سے میں تنگ نہیں، گھر کے دردسے میں تنگ نہیں لیکن اتنے بچّوں سے میں تنگ آگئی ہوں۔ میرے دس بچّے ہیں اور آجکل میرا پھر کھٹائی کھانے کو جی چاہنے لگا ہے حضور! مجھے اور بچّہ نہیں چاہیے، خدا کے لیے مجھے کوئی ایسا تعویز دیں جس سے میرا یہ دھڑکا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دُور ہوجائے۔"

"عجیب ناشکری عورت ہے تو..." مٹھل شاہ کی بارعب آواز سنائی دی "عورتیں میرے پاس ایسے تعویز مانگنے آتی ہیں کہ ان کی گود ہری ہوجائے اور تو مجھ سے اس کا اُلٹ تعویز لینے آئی ہے۔ خیر... ہم تجھے مایوس نہیں کریں گے..."

مٹھل شاہ نے گھنٹی بجا کر منشی نثار کو بلایا۔ یہ بزرگ اپنے دعوے کے مطابق شاعر تھے، شعلہ تخلص کرتے تھے اور مٹھل شاہ کے ہاں تعویز لکھنے پر مامور تھے۔ پانی میں کتھا ملا کر تعویز لکھتے تھے اور سائل کو بتاتے تھے کہ یہ مشک و زعفران اور عرقِ گلاب کا مرکب ہے۔

"منشی جی! اس عورت کو اولاد کی بندش والا تعویز لکھ دیں" مٹھل شاہ نے ہدایت کی "اور لکھنے کے بعد اس پر مجھ سے دَم ضرور کروالیں۔"

منشی جی جا چکے تو مٹھل شاہ دوبارہ چچی سے مخاطب ہوا۔ "تعویز تو اپنی جگہ ہے ہی، لیکن تو ہیلتھ سینٹر جا کر لیڈی ڈاکٹر شیریں خان سے بھی ضرور مل لے۔ تبھی تیرا مسئلہ مستقل طور پر حل ہوگا۔ سمجھی؟ اب جا... باہر جا کر بیٹھ جا۔ تیرا تعویز وہیں پہنچ جائے گا۔"

چچی اُلٹے قدموں باہر چلی گئیں۔

اس دن کے بعد تو گھر میں گویا میری حیثیت ہی بدل گئی۔ حالانکہ پہلے بھی میں نے چچی کو بتایا تھا کہ میں ایک فلور مل میں ملازم ہوگیا ہوں اور مجھے خاصی معقول تنخواہ ملا کرے گی۔ مقصد یہی تھا کہ وہ مجھے ذلیل کرنا چھوڑ دیں اور کسی حد تک انسانوں والا سلوک کریں مگر ان کے رویّے میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ان کا کہنا یہی تھا کہ میں نے اپنی پوزیشن بنانے کے لیے خواہ مخواہ جھوٹ بولا ہے اور وہ تبھی میری بات کا یقین کریں گی جب میں تنخواہ لا کر ان کے ہاتھ پر رکھوں گا۔

اب خود بخود ہی انہیں میری بات کا یقین آگیا تھا۔ میں گھر پہنچتا تو وہ دُور ہی سے بلائیں لیتیں "ہائے... میرا بچّہ کام پر سے آیا ہے... تھک گیا ہوگا... لے دودھ کی پیالی پی لے... اچھا چل چائے پی لے... اچھا میں روٹی گرم کرتی ہوں... میں نے ذرا سا مکھن بچا کر رکھا ہے تیرے سالن میں ڈالنے کے لیے۔" اس قسم کے مکالمات سے میرا استقبال ہوتا۔ کپڑے دُھلے ہوئے اور بستر بچھا ہوا ملتا۔ غرضیکہ باہر بھی عیش — اور گھر میں بھی۔

دو تین راتیں میں نے مٹھل شاہ کے ڈیرے پر بھی گزاریں، تب بھی گھر میں کسی نے مجھ سے نہ پوچھا کہ میں کہاں رہا اور کیا کرتا رہا۔ ڈیرے پر گزرنے والی راتیں میری زندگی میں انقلاب لا رہی تھیں۔ میں شغلِ مے نوشی اور عیش کوشی سے متعارف ہونے لگا تھا۔ مٹھل شاہ مجھ پر مہربان تھا اور ہر شغل میں مجھے شریک کرنے لگا تھا۔

جس روز منشی عبدالستار جو درحقیقت منشی نہیں ایک طرح سے مٹھل شاہ کا جنرل منیجر تھا، نے پہلی تنخواہ میرے ہاتھ پر رکھی اس روز خوشی سے میرے ہاتھ کانپنے لگے اور ایک بار تو رقم میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی... اور جب اس رقم میں سے تین سو روپے اپنی جیب میں اور دو سو روپے میں نے لے جا کر چھوٹی چچی کے ہاتھ پر رکھے تو چند لمحے کے لیے تو انہیں گویا سکتہ ہوگیا پھر انھوں نے میری اتنی بلائیں لیں، اتنی بلائیں لیں کہ میرے پاس بلاؤں کا سارا اسٹاک ختم ہوگیا اور پہلی بار میں نے اپنے آپ کو انسان محسوس کیا۔ ورنہ پہلے مجھے اُود بلاؤ بھی اپنے سے زیادہ باعزت لگتا تھا۔

جسم پر ڈھنگ کا لباس اور چہرے پر قدرے آسودہ حالی کی چمک آئی تو احساس ہوا کہ دنیا کچھ اتنی زیادہ بری بھی نہیں۔ غیر محسوس طور پر اندازِ گفتگو میں اعتماد بھی جھلکنے لگا تھا اور ساتھ ہی گویا ذہن کے کچھ زنگ آلود سے پُرزے بھی رواں ہوگئے تھے، عُمدگی سے کام کرنے لگے تھے۔ معاملات کی سمجھ آنے لگی تھی اور عقل پہلے کی طرح بہت ہی محدود محسوس نہیں ہوتی تھی۔ کاغذ کے یہ بے وقعت سے پُرزے جنھیں نوٹ کہتے ہیں، واقعی بڑی تاثیر رکھتے ہیں۔ دولت غالباً دنیا کا سب سے بڑا جنرل ٹانک سب سے اچھا شربتِ فولاد ہے۔ بڑے بڑے سست جسموں

اور ناکارہ ذہنوں میں جان ڈال دیتا ہے۔ آدمی میں رکھ رکھاؤ آجاتا ہے۔ سلیقے سے بات کرنی آجاتی ہے۔ ذہن خود بخود ہی گتھیاں سلجھانے لگتا ہے۔ میں ماحول کے کنوئیں سے نہ سہی لیکن ذہن کے کنوئیں سے ضرور دھیرے دھیرے باہر آنے لگا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ایک مفلوک الحال انسان کی زندگی میں صرف پانچ سو روپے کی رقم اتنے بڑے بڑے انقلابات لا سکتی ہے۔

ایک رات میں مٹھل شاہ ہی کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس رات میرا ڈیرے پر ہی قیام کرنے کا پروگرام تھا۔ عبدالستار بھی وہیں موجود تھا۔ دَور چل رہا تھا۔ ہم تینوں بڑی ترنگ میں تھے۔ تینوں کی عمروں میں نمایاں فرق تھا۔ مگر ہم ایک دوسرے کو 'تم' سے مخاطب کرنے لگے تھے اور جب دَور چلتا تھا تب کی تو بات ہی کچھ اور تھی۔ ایسی ہی ایک محفل کے دوران مجھے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ مٹھل شاہ کا اصل نام عادل بخش تھا۔ اس نام کو وہ خود بھی تقریباً بھول چکا تھا۔

جب ان دونوں کی آنکھوں میں بھی سرخی گہری ہوگئی تو میں نے مٹھل سے کہا "ایک بات پوچھوں؟"

مٹھل شاہ خاموشی سے مجھے گھورنے لگا۔ انداز سوالیہ تھا۔ اس کے ترنگ میں آنے کی نشانی یہی تھی کہ اسے چپ لگ جاتی تھی لیکن کچھ خبر نہیں ہوتی تھی کہ کس بات پر چھڑ جائے اور داستان گوئی یا پھر خطابت کا سماں باندھ دے۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں مٹھل شاہ..." میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "کہ تم جو یہ جعلی پیر بنے ہوئے ہو۔ لوگوں کے معصوم اعتقاد سے کھیلتے ہو۔ تمہیں کبھی اپنے آپ پر افسوس یا پچھتاوا محسوس نہیں ہوتا؟ کبھی کوئی چبھن یا خلش تمہیں نہیں ستاتی؟"

اس نے ایک طویل ہنکارا بھرا، سگریٹ سلگائی اور کش لے کر چھت کی طرف دیکھا۔ پھر گلاس خالی کرتے ہوئے بولا "ہلکی سی ایک خلش تو ہمیشہ ہی ذہن کی گہرائی میں رہتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی گہری اور پُرسکون جھیل کی تہ میں ایک ننھی سی مچھلی ہمیشہ تیرتی رہے لیکن ایک بار اپنا آپ بہت ہی بُرا لگا تھا۔ بہت گہرا زخم لگا تھا دل پر۔ مگر دھیرے دھیرے بھر گیا۔ اب صرف کبھی کبھار ٹیس اٹھتی ہے..." وہ خاموش ہو کر چھت کو گھورنے لگا۔

عبدالستار نے اس کے لیے نیا جام تیار کیا تو وہ ایک گھونٹ بھر کر بولا "کافی عرصہ پہلے کی بات ہے، ایک عورت میرے پاس آئی۔ بہت ہی خوبصورت عورت۔ لیکن اس کی خوبصورتی ایک عجیب سی اداسی میں ملفوف تھی۔ اس کا رُواں رُواں اداس تھا۔ بعض عورتوں کو دیکھتے ہی انسان سحر زدہ سا ہوجاتا ہے۔ وہ

انھی میں سے ایک تھی۔ میرے لیے سنسنی کی بات یہ تھی کہ میں ہی نہیں وہ بھی مجھے دیکھ کر سحر زدہ سی نظر آ رہی تھی۔ کہنے لگی کہ بے اولادی اس کا مسئلہ ہے۔ اس نے لیڈی ڈاکٹر سے بھی مشورہ لیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ نقص اس میں نہیں، ممکن ہے شوہر میں ہو مگر شوہر ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا تھا۔ خاندانی اَنا اور معلوم نہیں کس کس چیز کا سوال پیدا ہو جاتا تھا۔ ساس نے زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ شاید اسے بہو کی زندگی تلخ کرنے کا صرف بہانا چاہیے تھا۔ وہ کہتی تھی کہ اسے ہر قیمت پر پوتا چاہیے۔ ورنہ وہ بیٹے کی دوسری شادی کر دے گی۔ عورت نے دوا دارو، تعویز گنڈے سب کر کے دیکھ لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے تعویز گنڈا نہیں مشورہ یا شاید مدد لینے آئی تھی۔ اس کا مسئلہ صرف یہی تھا کہ اپنی ازدواجی زندگی کو بچانے کے لیے وہ کسی طرح اپنی ساس کو ماں بن کر دکھا دے۔ بانجھ پن کا خواہ مخواہ کا داغ پیشانی سے مٹا دے۔

اس نے اپنی داستان سنانے میں چونکہ بہت دیر لگا دی تھی، اس لیے میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ رات کو آسکتی ہے۔ کسی قدر ہچکچاہٹ کے بعد اس نے ہامی بھر لی کہ کسی بہانے سے یا موقع پا کر چوری چھپے وہ آجائے گی اور وہ واقعی آگئی۔

وہ مجبور نہیں خوش نظر آ رہی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے معمولی سا سنگھار بھی کیا ہوا تھا۔ آنکھوں میں کاجل کے ڈورے، چہرے پر ہلکا سا غازہ اور ہونٹوں پر سرخی۔ خاص اہتمام سے سنورے ہوئے بال اور کسی عطر کی خوشبو میں بسا ہوا لباس۔ اس کی لمبی پلکیں حیا کے بوجھ سے جھکی پڑ رہی تھیں اور ہر جنبش پر رخساروں پر گلاب کھلے پڑ رہے تھے۔

میں مبہوت سا ہو گیا۔ مجھے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ قدرت مجھ پر اتنی بھی مہربان ہو سکتی ہے۔ یا پھر جیسے یہ زندگی کا پہلا اتفاق تھا۔

سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے بہت پہلے وہ واپس جانے لگی تو دروازے کے قریب پہنچ کر اس پر جیسے اختلاج کا سا دورہ پڑا۔ بار بار سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی تھی اور تھر تھر کانپنے لگتی تھی۔ میری موجودگی کا جیسے اسے احساس ہی نہیں رہا تھا۔ زیرِ لب وہ اپنے آپ سے باتیں کیے جا رہی تھی "یہ میں نے کیا کیا... یہ میں نے کیا کیا... میں تو اپنے شوہر کی وفادار تھی۔ اس سے محبت کرتی تھی... اسے دغا دینے کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا... میرا ضمیر... میرا خدا کیسے مجھے معاف کرے گا...!" میں نے اسے بہت سمجھایا بجھایا اور تسلیاں دے کر رخصت کر دیا۔ مگر اس رات وہ گھر واپس نہیں گئی۔" مٹھل شاہ خاموش ہو گیا اور ایک بار پھر چھت کو گھورنے لگا۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"پھر وہ کہاں گئی؟" بالآخر میں نے گویا کسی سحر سے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"صبح اس کی لاش ایک کنوئیں میں پائی گئی تھی۔" مٹھل شاہ نے جواب دیا۔ دنیا بھر کی افسردگی اس کے لہجے میں سمٹی ہوئی تھی۔ "اس کے گھر والوں اور دیگر لوگوں نے یہی سمجھا کہ اس نے بے اولادی کے صدمے سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کی ہے۔ اس واقعے کے بعد اپنے آپ سے بڑی نفرت محسوس ہوئی تھی اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کسی طرف کو نکل جانے کو جی چاہنے لگا تھا۔ مگر میں اس عورت کے مقابلے میں بہت بزدل تھا۔ اپنے آپ کو سزا نہ دے سکا۔ تھوڑے سے تعطل کے بعد زندگی کی ساری خباثتیں اسی طرح جاری رہیں مگر ذہن سے اس کا تصور آج تک نہیں نکلا۔ وہ یہاں زخم چھوڑ گئی ہے۔" مٹھل شاہ نے سینے پر دل کی جگہ ہاتھ رکھا۔

مجھے شمیم یاد آگئی اور میرے سینے میں بھی جیسے کوئی خوابیدہ سی خلش جاگ اٹھی۔ سپردگی اور پچھتاوا۔ کچھ عورتوں میں جانے کیوں یہ دونوں جذبے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اس رات محفل ختم ہوئی تو میں مہمان خانے میں جا کر سونے کے بجائے دیر تک کھیتوں میں ٹہلتا رہا اور مٹھل شاہ کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ تجربات کا سمندر تھا اور بڑا ہی عجیب کردار تھا۔

لوگ اس کے پاس اپنے سبھی دکھوں کی دوا لینے آتے تھے۔ اس کے ہاں کام کرتے ہوئے اگلے مہینے میں میں نے ایک اور ایسی شخصیت کو اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے دیکھا جس کو میں تقریباً بھول چکا تھا مگر جس پر نظر پڑتے ہی سارا لڑکپن ذہن میں تازہ ہو گیا۔

وہ تاجاں تھی۔ وہی تاجاں جو کبھی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتی تھی مگر اس وقت اس کی حالت ایسی ابتر تھی کہ کوئی مکھی شاید خود ہی اس پر بیٹھنا پسند نہ کرتی۔ میں نے اسے ڈھائی تین برس بعد دیکھا اور ان برسوں میں اس پر نہ جانے کیا کیا قیامتیں بیت گئی تھیں۔ قدرے زیادہ فاصلے سے تو شاید میں اسے پہچان ہی نہ پاتا۔

اس کی صحتمندی، رسیلا پن اور اکڑ سب ختم ہو چکی تھی۔ شکست اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ وہ کھنڈر ہو چکی تھی۔ اس کا چہرہ ڈریکولا کا زنانہ ایڈیشن لگ رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سوکھے سوکھے، کمر خمیدہ، ہونٹوں پر پپڑیاں اور سانولی رنگت میں مریضانہ سی زردی کا امتزاج۔ جانے کیوں وقت اس پر اس قدر

نامہرباں ہو گیا تھا۔

مٹھل شاہ یقیناً اسے جانتا تھا کیونکہ اس نے مجھے بولنے کا سگنل دیے بغیر حیرت سے کہا تھا "تاجاں! تیری یہ حالت... ہو تُو ہمارے پاس کیسے آگئی؟ ہمیں تو تُو خاطر میں ہی نہیں لاتی تھی۔"

"میں تو کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتی تھی شاہ جی!" وہ مضمحل سے انداز میں مسکراتے ہوئے کمزور سی آواز میں بولی۔ "عشق کے نشے میں جو تھی...!"

"ہم نے تجھ سے کہا تھا نا کہ عشق تیرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔" مٹھل شاہ کی آواز آئی۔ "مگر اس وقت تجھے ہماری بات کا اعتبار نہیں آیا تھا۔ تو نے ہمیں جھوٹا پیر کہا تھا۔"

"عشق تو کسی کے لیے بھی اچھا نہیں ہوتا شاہ جی!" وہ بولی۔ "باپ نے مجھے بہت منع کیا تھا کہ شکورے کے ساتھ پینگیں مت بڑھا مگر اس وقت میں پوری پوری ہیر بنی ہوئی تھی اور شکورا میرا رانجھا تھا۔ باپ نے شادی کی اجازت نہیں دی تو میں اس کے ساتھ بھاگ گئی۔ ہم لاہور چلے گئے تھے شاہ جی! کچھ دن تو آرام سے گزرے مگر جب سر چھپانے کا کوئی صحیح ٹھکانا نہ ملا اور فاقے بھی ہونے لگے تو سارا عشق رفو چکر ہو گیا اور ایک روز رانجھا اپنی ہیر کو ایک دلال کے ہاتھ پانچ ہزار میں بیچ گیا۔ اسی دوران ایک بچہ بھی ہوا جو مہینے سے مر گیا۔ ڈیڑھ سال کوٹھے پر گزارا۔ وہاں بڑی جان لیوا بیماری لگ گئی شاہ جی! نائیکہ نے بڑا علاج کرایا۔ آپ کو تو پتہ ہے شاہ جی کہ آدمی جس مشین سے پیسہ کماتا ہے، وہ خراب ہو جائے تو اس کی مرمت اچھی طرح کراتا ہے۔ میں بھی ان کی روپیہ کمانے کی مشین تھی۔ مگر جب مقدر خراب ہو تو علاج بھی خراب ہوتا ہے۔ مرض حد سے بڑھ گیا تو انہوں نے دھکے دے کر نکال دیا...!"

اسے کھانسی آگئی یا شاید وہ عجیب سے انداز میں ہنسی تھی۔ "زمانہ آدمی کے ساتھ بڑا مذاق کرتا ہے شاہ جی! جب میں کوٹھے سے بھاگ جانا چاہتی تھی تو وہ لوگ مجھے بید سے مارتے تھے اور جب میں وہیں سر چھپا کر رہنا چاہتی تھی تو انہوں نے مجھے دھکے دے دے کر نکال دیا۔ میں باپ کے پاس واپس آگئی مگر اب باپ بھی مجھے نہیں رکھتا۔ میں زبردستی گھر میں گھسی پڑی ہوں مگر باپ صبح شام اٹھتے بیٹھتے کڑکڑ کرتا ہے، گالیاں دیتا ہے۔ اس کا رویہ دیکھ کے کبھی کبھی تو مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ وہی باپ ہے جو میرے بچپن میں مجھے سینے پہ ڈال کر لوری سناتا تھا۔" وہ ایک بار پھر عجیب سے انداز میں ہنس کر خاموش ہو گئی اور پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کو کریدنے لگی۔

کئی لمحے تک مٹھل شاہ کی آواز سنائی نہ دی۔ اس کے پاس آنے والے سبھی لوگ کسی نہ کسی اعتبار سے دکھیارے ہی ہوتے تھے اور روزانہ وہ ایک سے ایک بڑھ کر دلخراش داستان سنتا تھا اور کسی سے متاثر نہیں ہوتا تھا صرف اپنے نذرانوں کا حساب دیکھتا تھا مگر ان چند سادہ سے جملوں نے شاید اسے بھی اندر سے اتھل پتھل کر دیا تھا۔

"اب ہمارے پاس کس لیے آئی ہے؟" بالآخر اس نے پوچھا۔ صاف ظاہر تھا کہ اسے اپنے لہجے کا دبدبہ اور کرارا پن برقرار رکھنے میں خاصی دقت پیش آ رہی ہے۔

"ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے شاہ جی!" وہ سر اٹھا کر اسی مضمحل سے انداز میں مسکرائی۔ اس کا یہ اضمحلال دیکھ کر میرے دل کو کچھ ہو رہا تھا۔ "میں بھی تنکے کا سہارا لینے آئی ہوں۔ میں نے سوچا شاید آپ کے پاس دلوں کو موم کرنے والا کوئی تعویز ہو جس کے اثر سے میرا باپ پھر مجھ سے اسی طرح پیار کرنے لگے۔"

"تجھے فی الحال اس تعویز کی ضرورت ہے؟" میں نے مٹھل شاہ کی آواز سنی اور پھر سو سو کے تین یا شاید چار نوٹ تاجاں کے پیروں کے قریب آگرے۔ "یہ لے جا کر اپنے باپ کی ہتھیلی پر رکھ۔ اس کا دل پھر سے موم ہو جائے گا۔"

تاجاں نے عجیب سی نظروں سے اوپر دیکھا۔ اس کے سوکھے سوکھے ہونٹ لرز اٹھے۔ "آپ سمجھے نہیں شاہ جی! ہم غریبوں کا ہر مسئلہ ہی پیسے سے نہیں سلجھتا۔ بابا تو میرے ہاتھ سے روٹی بھی نہیں لیتا، رقم کیسے لے گا؟ اور پھر میں اسے کیا بتاؤں گی کہ کہاں سے لائی ہوں؟ آپ غلط سمجھے شاہ جی! میں آپ کے پاس اس قسم کی مدد لینے نہیں۔ بس دل کی تسلی کے لیے آئی تھی۔ تعویز مل جاتا تو دل کو ڈھارس ہو جاتی۔" وہ گویا مایوس ہو کر کندھے جھکائے واپسی کے لیے مڑنے لگی تو مٹھل شاہ کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہے... جا منشی نثار سے تعویز بھی لیتی جا۔ میں سوچوں گا کہ میں تیرے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"

"بہت بہتر۔" وہ آہستگی سے بولی اور نوٹوں پر نظر ڈالے بغیر رخصت ہو گئی۔ میں دم بخود بیٹھا تھا۔ مجھے بہت تاخیر سے معلوم ہوا تھا کہ جس زمانے میں میں تاجاں کو قصبے سے نکل کر چک بیالیس کی طرف جاتے دیکھتا تھا، ان دنوں درحقیقت وہ کس سے ملنے جا رہی ہوتی تھی۔ مجھے ان دنوں سمجھ نہیں تھی۔ ورنہ اس کی آنکھوں میں جھلملاتے ستارے دیکھ کر ہی سمجھ جاتا کہ ان دنوں وہ زمین پر نہیں عشق کے آسمان پر تھی۔

وہ جا چکی تو میں نے اپنی کمین گاہ کا پردہ اٹھا کر گردن

نکال کر اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس لڑکی کو جانتا ہوں مٹھل شاہ! میں آج رات جا کر اس کے باپ سے بات کروں گا اور اگر وہ سیدھا نہ ہوا تو دو چار ہاتھ بھی جڑ دوں گا۔"

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔" مٹھل شاہ مسکرایا۔ "یہ کوئی زیادہ اہم معاملہ نہیں۔ چند دن میں اس کا باپ نارمل ہو جائے گا۔ اولاد چھوٹی بڑی ہر طرح کی خطائیں کرتی ہے اور ماں باپ بالآخر انھیں معاف کر دیتے ہیں۔ بڑی خطاؤں کو بھولنے میں ذرا زیادہ دن لگتے ہیں اور اب جلدی سے سر اندر کر لو۔ اگلا ضرورت مند آ رہا ہوگا۔" میں نے سر اندر کر لیا اور ایک بار پھر بطور جنّ اپنے فرائض انجام دینے لگا۔

اسی قسم کے نشیب و فراز کے ساتھ خاصی عیش و عشرت اور خیر و عافیت سے دن گزر رہے تھے۔ تاجاں والے واقعے کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد کا ذکر ہے، ایک روز ایک لڑکی کمرۂ خاص میں آئی۔ بیس بائیس سے زیادہ عمر نہیں ہوگی اس کی۔ حلیے، لباس اور رکھ رکھاؤ سے کسی اچھے گھر کی لگتی تھی۔ چہرے پر بھی آسودہ حالی کی چمک تھی۔ بڑی سی ریشمی چادر لیے ہوئے تھی۔ صورت سے بھولپن ٹپکتا تھا۔

اس قسم کی نکھری نکھری شخصیات مٹھل شاہ کے ڈیرے پر کبھی کبھار ہی آتی تھیں۔ میں دلچسپی سے اس کا سراپا جائزہ لینے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اوپر تخت پر مٹھل شاہ بھی سنبھل کر بیٹھ گیا تھا۔ لڑکی کچھ متوحش اور پریشان نظر آ رہی تھی۔

مٹھل شاہ کے سوالوں کے جواب میں لڑکی نے جو 'انٹرویو' دیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ وہ ایک غریب اور بے سہارا لڑکی ہے کچھ رشتے داروں نے اس کی پرورش کی ہے۔ اسے ایک لڑکے سے محبت ہے لیکن جن رشتے داروں نے اسے پالا ہے۔ وہ اس کی شادی کسی حال میں بھی اس لڑکے سے کرنے پر تیار نہیں ہیں بلکہ انھوں نے لڑکے کو ڈرایا دھمکایا بھی ہے۔ لڑکا ذرا بزدل قسم کا ہی ہے۔ وہ بڑی مشکل سے موقع نکال کر کسی کو بتائے بغیر یہاں آئی ہے اور کسی ایسے تعویز گنڈے کی طلبگار ہے جو اس کے رشتے داروں کے خیالات بدل دے۔

باقی تو سب ٹھیک تھا لیکن اس کی یہ بات میرے دل کو نہیں لگی تھی کہ وہ ایک غریب اور بے سہارا لڑکی ہے۔ پہلے وہ اپنی غربت اور ناداری پر زور دیتی رہی تھی۔ بعد میں رشتے داروں کا رونا رونے لگی تھی۔ مجھے امید تھی کہ مٹھل شاہ نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا ہوگا لیکن وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر مغز کھپانے والا آدمی نہیں تھا۔ اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔

"اپنے محبوب کی خاطر تم ہر قربانی دینے کو تیار ہو؟" اس نے بارعب آواز میں پوچھا۔

"ہاں!" لڑکی نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"ہمیں خوش کرو گی تو من کی مراد مل جائے گی۔" اچانک مٹھل شاہ نے کہا۔ میں نے اسے اس قدر عجلت سے اور غیر محتاط انداز میں حرفِ مدّعا زبان پر لاتے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس لڑکی کو دیکھ کر وہ آپے میں نہیں رہا تھا۔

"جی...؟" لڑکی نے حیران حیران سی آنکھوں سے اوپر دیکھا۔

"یاقوت جنّ!" مٹھل شاہ نے مجھے پکارا۔ "اسے بتاؤ کہ ہمیں خوش کرنے والے کو کیا ملتا ہے۔"

"من کی مراد۔" میں نے خاص انداز میں نہایت بھاری آواز میں کہا۔ یہ الفاظ ایک طویل مشق کے زیرِ اثر خود بخود ہی میرے منہ سے نکل گئے تھے۔ ورنہ میں کہنا کچھ اور چاہتا تھا۔

تب مٹھل شاہ تخت سے کود پڑا۔ اب میں ان دونوں کو دیکھ سکتا تھا۔ مٹھل نے لڑکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ "اس لڑکے سے تمہارے تعلقات رہے ہیں نا؟"

لڑکی نے آنکھیں چرا لیں اور سر جھکا کر چادر کا پلو انگلی پر لپیٹتے اور کھولتے ہوئے گویا بادلِ ناخواستہ اثبات میں سر ہلایا اور نہایت دھیمی آواز میں بولی۔ "اسی لیے تو میں زیادہ پریشان ہوں۔ ورنہ شاید صبر بھی کر لیتی۔"

"تب پھر ہمیں خوش کرنے میں کیا قباحت ہے؟" مٹھل شاہ نے اطمینان سے کہا اور اس کی کلائی پکڑ کر اسے متصل خوابگاہ کے دروازے کی طرف لے چلا۔ لڑکی نے مڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ گویا کوئی راہِ فرار تلاش کر رہی تھی۔ اس نے غالباً احتجاج کے لیے منہ بھی کھولا لیکن تذبذب میں رہ گئی اور جب تک وہ کسی فیصلے پر پہنچتی تب تک مٹھل شاہ اسے لے کر متصل کمرے میں جا چکا تھا اور دروازہ بند ہو چکا تھا۔

میرا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا اور یہ تیزی جذبات کے باعث نہیں، تشویش کے باعث تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ لڑکی کی موجودگی میں میں تخت کے نیچے سے نکل نہیں سکتا تھا اور اب نکلنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

خاصی دیر بعد متصل کمرے کا دروازہ کھلا اور لڑکی خاص کمرے میں آ گئی۔ مٹھل شاہ باہر آتا دکھائی نہیں دیا۔ لڑکی کے بال پریشان تھے اور وحشت میں اضافہ ہو چکا تھا۔ کمرے کے وسط میں پہنچ کر اس نے اپنے آپ کو اچھی طرح چادر میں چھپا لیا۔ صرف آنکھیں کھلی رہنے دیں۔ پھر اس نے زخمی شیرنی کی سی نظروں سے متصل کمرے کے کھلے دروازے کی طرف دیکھا اور تیز تیز

چلتی ہوئی باہر جانے کا دروازہ کھول کر غائب ہو گئی۔

اس کے غائب ہوتے ہی میں تخت کے نیچے سے نکل آیا اور میں نے بڑھ کر دروازے کی کنڈی لگا دی تاکہ کوئی اور سائل اندر نہ آ جائے۔ اس دوران مٹھل شاہ خوابگاہ سے باہر آ چکا تھا۔ اس کے چہرے پر سرشاری اور فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

میں نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔ "تم نے اچھا نہیں کیا مٹھل شاہ! اتنی جلد بازی اور تقریباً زبردستی اچھی نہیں ہوتی۔ جانے کیوں میرا دل ڈوب رہا ہے۔"

"ابھی تک تمہارے دل نے تیرنا نہیں سیکھا...؟ ڈوبتا ہی رہتا ہے۔" وہ مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مسکرایا "گھبراؤ مت۔ کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں سے جانے کے بعد عام طور پر کوئی زبان نہیں کھولتی اور اگر کھولے بھی تو تمھیں شاید اندازہ نہیں کہ ہمارے پاس ہر طرح کا بندوبست ہے۔ تم آرام سے اپنی جگہ پر بیٹھو۔ میں نے ہدایت کر رکھی ہے کہ تم کسی بھی حال میں اپنی جگہ مت چھوڑا کرو۔ تم کسی روز یہ سارا ڈرامہ ہی فلاپ نہ کروا دینا۔"

اس کا اطمینان دیکھ کر میں بھی مطمئن ہو گیا اور اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ مٹھل شاہ نے کنڈی کھول دی اور اپنے تخت پر بیٹھ کر گھنٹی کا بٹن دبا کر عبدالستار کو سگنل دیا کہ وہ اگلے سائل کو اندر بھیج دے۔

میں اور مٹھل شاہ مل جل کر ضرورت مندوں کی دل جوئی میں لگ گئے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا تو میرے دل سے اندیشوں کے سائے چھٹنے لگے اور دو گھنٹے بعد میں اس واقعے کو تقریباً بھول چکا تھا اور غالباً مٹھل شاہ کی بھی یہی کیفیت تھی۔

اس وقت جبکہ میں ایک معتقد کو اپنی خاص جناتی آواز میں کچھ ہدایات دے رہا تھا کہ اچانک دروازہ اس طرح کھلا جیسے کسی نے پوری قوت سے اس پر لات رسید کی ہو۔ ایک باوردی پولیس والا اندر آ گیا۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ وہ علاقے کا تھانیدار تھا لیکن یہ وہ تھانیدار نہیں تھا جس نے میرے اباجی کے قتل کی بے مثل تفتیش کے فرائض انجام دیے تھے۔ یہ نوجوان تھا اور خاصی بارعب شخصیت کا مالک تھا اور اس سے بھی زیادہ بارعب وہ بھاری ریوالور تھا جو اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے پیچھے تین کانسٹیبل بھی تھے۔ انھوں نے بھی بندوقیں اٹھائی ہوئی تھیں۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ تھانیدار عین میرے سامنے آ رکا اور اوپر مٹھل شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے گرجا۔ "نیچے اتر فراڈیے! میں تیری پیری فقیری نکالتا ہوں۔" مٹھل شاہ تخت سے کود پڑا۔ وہ اگرچہ گھبرا چکا تھا۔ تب بھی یہ بات اس کے چہرے سے ظاہر نہیں تھی۔

"زبان سنبھال کر بات کر پولیسیے!" مٹھل شاہ بھی دہاڑا۔ "تجھے ہمارے مرتبے کا علم نہیں؟"

"تجھے تیرے مرتبے پر تو میں ابھی پہنچاتا ہوں۔" تھانیدار نے کہا۔

میرا مکالمہ ادھورا رہ گیا تھا اور میں مائیک تھامے دم بخود بیٹھا تھا۔ مٹھل شاہ کا معتقد پولیس کو دیکھ کر الٹے قدموں کمرے سے کھسک چکا تھا۔ مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ مٹھل شاہ کے ساتھ ساتھ میں بھی بے نقاب ہو چکا ہوں۔ تھانیدار نے جھک کر بھاری سیاہ کپڑا الٹ دیا اور بائیں ہاتھ سے میرا گریبان پکڑ کر مجھے باہر گھسیٹ لیا۔

اس نے میرے جسم کے ایک ایسے حصے پر ٹھڈا رسید کیا۔ جہاں ٹھڈا کھانا شرفا قطعاً پسند نہیں کرتے۔ اسی لمحے مٹھل شاہ کو جانے کیا سوجھی۔ اس نے بڑھ کر تھانیدار کی ٹھوڑی پر ایک گھونسا رسید کر دیا۔ تھانیدار دور جا گرا اور مٹھل شاہ کے گھونسے نے گویا اس کا صبر و ضبط ختم کر دیا۔ اس نے اندھا دھند دو فائر کیے۔ فائروں کی گونج سے در و دیوار لرز کر رہ گئے۔

میں نے یہ سوچ کر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید میرا انتقالِ پُرملال عمل میں آ چکا ہے لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ تھانیدار کے ریوالور کا رخ تو میری طرف تھا ہی نہیں۔ میں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر اپنی سلامتی کا یقین کیا اور مطمئن ہونے کے بعد آنکھیں کھول کر مٹھل شاہ کی طرف دیکھا۔

وہ بھی خیر و عافیت ہی سے تھا۔ البتہ کافی خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ شاید کوئی گولی اسے چھوتے ہوئے گزر گئی تھی۔ تھانیدار اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹ سے خون کی پتلی سی لکیر ٹھوڑی تک آ گئی تھی جسے صاف کرتے ہوئے وہ غضبناک لہجے میں بولا۔ "یہ گھونسا تمھیں بہت مہنگا پڑے گا۔"

میرے خیال میں تو مٹھل شاہ کو وہ گھونسا چند لمحے پہلے ہی بہت مہنگا پڑ چکا ہوتا۔ بشرطیکہ تھانیدار کا نشانہ ذرا اچھا ہوتا۔ اس کے ریوالور کی حالت بتاتی تھی کہ برس ہا برس سے اس نے گولی چلانے کی زحمت نہیں کی۔

تھانیدار نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر مٹھل شاہ کو ہتھکڑیاں لگا دیں۔ میں اس دوران غیر ارادی طور پر چوپایوں کی طرح دروازے کی طرف کھسکنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن تھانیدار میری طرف سے غافل نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر نہایت غیر شریفانہ انداز میں میرے جسم کے ممنوعہ علاقے پر ٹھوکر رسید کی۔

اس بار مجھے بھی شدید غصہ آیا۔ دل تو یہی چاہا کہ اٹھ کر

بدبخت کو زمین پر دے ماروں مگر اسی اندیشے سے باز رہا کہ اس بار بھی اگر وہ اپنا آثارِ قدیمہ قسم کا ریوالور استعمال کر بیٹھا اور گولی نشانے پر لگ گئی تو یہ غنچہ بن کھلے ہی مرجھا جائے گا۔

میرا ذہن اس حقیقت کو قبول نہیں کر رہا تھا کہ بیٹھے بٹھائے یوں اچانک ہمارا تختہ بھی الٹ سکتا ہے۔ یقین مجھے مکمل طور پر اس وقت آیا جب میرے ہاتھوں میں بھی ہتھکڑیاں ڈال دی گئیں۔ ٹھوس اور سرد آہنی کڑوں کے لمس نے یک لخت ہی میری بے یقینی رفع کر دی اور میں ان گنت اندیشوں کے احساس سے سُن ہو کر رہ گیا۔

تھانیدار نے نہایت حقارت سے پہلے مجھے اور پھر مٹھل شاہ کو دروازے کی طرف دھکیلا۔ ہم باہر آئے تو اندازہ ہوا کہ ہمارا تختہ خاصے منظم انداز میں الٹا گیا تھا۔ وہ لڑاکے اور باڈی گارڈ قسم کے گرگے جن کی بندوقیں اور پستول ہر وقت لوڈ رہتے تھے، چند سپاہیوں کے گھیرے میں بے بس سے بیٹھے تھے۔

سپاہیوں کی زنگ آلود سی بندوقیں تو ان کے لیے شاید اتنی اہمیت نہیں رکھتی تھیں لیکن وردی کی اہمیت بہرحال مسلم تھی۔ سب سے زیادہ وہ کچھ تذبذب کا شکار نظر آ رہے تھے۔ جیسے فیصلہ نہ کر پا رہے ہوں کہ کوئی جوابی کارروائی کریں یا نہیں۔ انھوں نے سوالیہ نظروں سے مٹھل شاہ کی طرف دیکھا۔

مٹھل شاہ نے غالباً آنکھوں ہی آنکھوں میں انہیں سرِ تسلیم خم کیے رکھنے کا حکم دیا اور وہ اژدہوں پر بیٹھی ہوئی مرغیوں کی طرح بے حس و حرکت ہی رہے۔ مٹھل شاہ کا باقی اسٹاف، مثلاً منشی عبدالستار، منشی نثار احمد شکلہ اور چاچا برکت وغیرہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے۔

سپاہیوں نے گرگوں کو بھی کھڑے ہونے کا اشارہ کیا اور وہ اس بھاری چارپائی سے اتر آئے جس پر قصبے کی کبڈی ٹیم چاہتی تو کبڈی کھیل سکتی تھی۔ ان میں سے صرف ایک کے پاس اس وقت بندوق نظر آ رہی تھی۔ باقی گرگوں کے ہتھیار غالباً چارپائی کے نیچے کاٹھ کباڑ میں دبے ہوئے تھے۔ یہ لوگ جب گپ شپ کرنے اور حقہ پینے اس چارپائی پر بیٹھتے تھے تو ہتھیار نیچے ہی رکھ دیتے تھے جس کے پاس بندوق موجود تھی۔ اس کا نام ارشاد تھا اور وہ ایک طرح سے چیف گرگا تھا۔ مٹھل شاہ کے خصوصی باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتا تھا۔

ہم سب ایک جگہ کھڑے ہوئے تو گویا ایک چھوٹا سا جلوس تیار ہو گیا۔ تھانیدار نے آج شاید ہمارا جلوس ہی نکالنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ اس نے ہمیں حویلی کے صدر دروازے کی طرف چلنے کا اشارا کیا تو چیف گرگا ارشاد مؤدبانہ لہجے میں تھانیدار سے مخاطب ہوا۔ "ہمیں کس جرم میں پکڑا جا رہا ہے مائی باپ؟ ہم تو یہاں تعویز لینے آئے ہوئے تھے۔"

تھانیدار نے پہلے تو اسے ایک نہایت نستعلیق قسم کی گالی دی پھر اس کے سینے پر بید رسید کرتے ہوئے کہا۔ "اب تم تھانے چل کر مجھ سے تعویز لینا۔ میں تمھیں ایسا تعویز دوں گا کہ ساری عمر تمھیں کوئی تکلیف نہ ہو گی۔"

ارشاد کے چوڑے چکلے اور ٹھوس سینے پر بید کی ضرب کا گویا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر تھانیدار کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں جی۔ ہم لوگ تو پیر صاحب سے تعویز لینے آئے تھے... یہ کوئی جرم تو نہیں ہے ناجی؟ تھانے جاتے وقت انسان کو اس کے جرم کا تو پتا ہونا چاہیے ناجی... کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟" وہ گویا ایک ایک لفظ پر زور دے رہا تھا۔

"مجھے معلوم ہے..." نوجوان تھانیدار اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "کہ تم بدمعاشوں کا ٹولا بڑا منظم اور مضبوط ہے تمھیں قانونی پشت پناہی کا زعم بھی ہے اور بدمعاشی کا تکبر بھی۔ لیکن میں تمھاری ساری اکڑ فوں نکال دوں گا۔" پھر اس نے بید سے ارشاد کی بندوق کو چھوتے ہوئے کہا۔ "اس بندوق کا لائسنس ہے تمھارے پاس؟"

"بندوق...؟" ارشاد نے نہایت حیرت سے اپنے کندھے سے لٹکی ہوئی بندوق کی طرف دیکھا۔ گویا اب تک اس کی موجودگی سے لاعلم رہا ہو۔ "یہ تو میری نہیں ہے... معلوم نہیں کس نے میرے کندھے پر لٹکا دی ہے۔" اس نے نہایت معصومیت سے کہا۔

مجھے اندیشہ تھا کہ تھانیدار گرمی کھا کر وہیں اس کی کھوپڑی نہ کھول دے مگر خلافِ توقع تھانیدار اسے گہری سنجیدگی سے گھورنے لگا جیسے نظروں ہی نظروں میں تول رہا ہو۔ بالآخر وہ دانت پیس کر بولا۔ "تم چلو تو سہی کاکا! میں تمھیں بتاتا ہوں کہ کندھے پر رائفلیں لٹکا کر دودھ پیتا بچہ کیسے بنتے ہیں۔"

"اچھا مائی باپ۔" ارشاد نے سعادت مندی سے سر جھکا کر کہا۔ "جیسے تمھاری مرضی۔"

ہم حویلی سے باہر آئے تو دو تانگے تیار کھڑے تھے۔ تھانیدار نے ہمیں ایک تانگے میں بیٹھنے کا اشارا کیا۔

مٹھل شاہ نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تھانیدار صاحب! اُدھر میری جیپ کھڑی ہے۔ ہمیں اس میں لے چلو۔ باقی لوگ تانگے میں آ جائیں گے۔"

"تمھارا ہی تو میں نے قصبے والوں کو دیدار کرانا ہے۔" تھانیدار بولا۔ "اس لیے تمھیں تانگے میں چلنا پڑے گا۔ باقی لوگوں کی تو مجھے کوئی پروا نہیں۔ وہ تو بے شک برقعے پہن کر تھانے آ جائیں۔"

تھانیدار مٹھل شاہ سے کچھ زیادہ ہی خار کھائے ہوئے تھا۔ اس نے ہمیں اگلے تانگے کی اگلی نشست پر بٹھایا اور خود ایک سپاہی کے ساتھ پچھلی نشست پر بیٹھنے لگا۔ دفعتاً میں نے چاروں گرگوں کو نہایت تیزی سے حرکت میں آتے دیکھا۔ جسامت کے اعتبار سے وہ ہاتھی تھے مگر چیتے کی سی پھرتی سے مختلف سمتوں میں دوڑ پڑے تھے اور وہ سپاہی جو انھیں گھیرے میں لیے ہوئے تھے، زمین پر قلابازیاں کھاتے نظر آ رہے تھے۔

جب تک تھانیدار کو صورتحال کا اندازہ ہوا اور سپاہی سیدھے کھڑے ہونے میں کامیاب ہوئے، تب تک چاروں گرگے غائب ہو چکے تھے۔ کوئی فصلوں میں گھس کر غائب ہو گیا تھا، کوئی مزارعوں کے مکانوں کے عقب میں غائب ہو گیا تھا اور کوئی چھلاوے کی طرح کسی سمت میں دوڑا تھا اور پھر اس راستے پر صرف خاک ہی اڑتی نظر آئی تھی۔ وہ خود نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

میں ان چاروں کو نہایت سست انسان سمجھتا تھا اور میرا خیال تھا کہ انھیں دن رات پڑے اینڈتے رہنے اور کھانے پینے کے سوا کوئی کام نہیں آتا اور ضرورت پڑنے پر وہ آسانی سے ہل بھی نہیں سکتے مگر اس وقت تو انھوں نے مجھے حیران کر دیا تھا۔

سپاہیوں نے بمشکل اپنی گری ہوئی بندوقیں اٹھائیں پھر ان کے نمبر دیکھ کر ایک دوسرے پر چیخنے لگے۔ "امام دین یہ تو تیری بندوق ہے!"

"اوئے... امام دین کی بندوق تو میرے پاس ہے... وہ تو شریفے کی ہے... اور میری بندوق کس کے پاس ہے؟" دوسرے سپاہی کی آواز آئی۔

وہ شاید کافی دیر تک بندوقوں کے تبادلے کے سلسلے میں ڈیگ و پکار کرتے رہتے۔ تھانیدار نے ڈپٹ کر انھیں چپ کرایا اور برہمی سے پوچھا۔ "تم نے ان لوگوں پر گولی کیوں نہیں چلائی؟"

"بندوقیں ہمارے ہاتھوں میں رہی کہاں تھیں سر!" ایک سپاہی نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ "اور پھر آپ نے فائر کا آرڈر بھی نہیں دیا تھا۔" پھر اس نے ایسی نظروں سے تھانیدار کے ریوالور اور پھر اس کے چہرے کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "آپ کے پاس بھی تو ریوالور موجود تھا۔ آپ نے کیوں گولی نہیں چلائی؟"

تھانیدار نے اس کی نظروں کا مطلب سمجھ کر مٹھل شاہ کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا۔ "میری ساری توجہ تو گرو کی طرف تھی..." پھر وہ گویا بات ختم کرتے ہوئے بولا۔ "خیر... کوئی بات نہیں۔ گرو ہمارے قبضے میں ہے تو چیلے خود بخود ہی آ جائیں گے۔" پھر اس نے مجھے اور مٹھل شاہ کو شعلہ بار نظروں سے گھورا اور کوچبان کو تانگا چلانے کا حکم دیا۔ چاروں سپاہی دوسرے تانگے میں بیٹھ گئے تھے۔

بڑا حیرت ناک منظر تھا۔ جدھر جدھر سے بھی ہم گزرے راستے کے دونوں طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ میں اور مٹھل شاہ تانگے کی اگلی نشست پر ہتھکڑیاں پہنے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میں سر اٹھا کر کسی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ دو رویہ کھڑے ہوئے لوگوں میں میرے تمام شناسا اور چچا چچی وغیرہ سب ہی شامل تھے۔ قصبے میں جیسے آناً فاناً ہماری گرفتاری کی خبر پھیل چکی تھی اور سب ہی ہماری رسوائی کے گواہ بننے کے لیے آ گئے تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ سب دم بخود سے کھڑے تھے۔ ورنہ کیا بعید تھا کہ جو لوگ کل تک فرطِ احترام سے مٹھل شاہ کے سامنے آنکھ نہیں اٹھاتے تھے۔ آج ہم پر سنگباری شروع کر دیتے۔

تھانہ مٹھل شاہ کے ڈیرے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا لیکن آج جیسے راستہ میلوں لمبا ہو گیا تھا۔ خدا خدا کر کے زرد رنگ میں لپٹی ہوئی تھانے کی عمارت دکھائی دی۔ سچی بات یہ ہے کہ تھانے میں داخل ہوتے وقت میں نے سکھ کی سانس لی تھی۔ کم از کم لوگوں کی گھورتی ہوئی آنکھوں سے تو نجات ملی تھی۔

میں نے مٹھل شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ اب بالکل پُرسکون اور پُراعتماد نظر آ رہا تھا بلکہ شاید کسی قدر غصے میں بھی تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر کھنچاؤ سا تھا۔

تھانیدار نے ہمیں اندر لے جا کر اپنی میز کے قریب پڑی ہوئی بنچ پر بٹھا دیا اور خود بڑی تمکنت سے اپنی کرسی پر جا بیٹھا اور دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر بید گھماتے ہوئے یوں پُرخیال نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا گویا کوئی میزبان فیصلہ نہ کر پا رہا ہو کہ مہمانوں سے کس موضوع پر گفتگو شروع کی جائے۔ اب وہ اس طرح جذباتیت میں گرفتار نظر نہیں آ رہا تھا جس طرح ہمیں گرفتار کرتے وقت تھا۔ تمام سپاہی اس کمرے سے باہر ہی رک گئے تھے۔

بالآخر مٹھل شاہ نے ہی سکوت توڑا۔ "کیا سوچ رہے ہو ملک صاحب؟" اس نے غالباً تھانیدار کی میز پر رکھی ہوئی تختی پر اس کا نام پڑھ لیا تھا۔ پورا نام ملک محمد حیات تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں پہلے تم دونوں کو الٹا لٹکا کر چھتر لگوائے جائیں یا پہلے ایف آئی آر کاٹی جائے۔" تھانیدار نے

نہایت سنجیدگی اور رسانیت سے جواب دیا۔

"دیکھو بھائی محمد حیات" مشعل شاہ نے نہایت شیریں لہجے میں کہا گویا تھانیدار نے چھتروں سے نہیں قورمہ اور شیرمال سے ہماری خاطر تواضع کے ارادے کا اظہار کیا ہو۔ "میں کوئی لاوارث اور مفلس مزارع تو ہوں نہیں اور نہ ہی میں بس اسٹینڈ پر جیبیں کاٹنے والا کوئی معمولی جیب کترا ہوں جس پر تم اپنا چھتر آزمائی کا شوق پورا کرو۔ میرے جیسے آدمیوں کا معاملہ بہت آگے تک جاتا ہے جس میں تم جیسے افسروں کو کئی عدالتوں اور کئی وکیلوں کا سامنا کرنا ہوتا ہے جہاں چھتروں کا حساب بھی دینا پڑ جاتا ہے۔ اس لیے میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ یہ خیال تو دل سے نکال ہی دو۔ یہ مشورہ دینے کی ایک وجہ اور بھی ہے جو جلد ہی تمھاری سمجھ میں آجائے گی۔ باقی رہا ایف آئی آر کا مسئلہ تو مجھے بتادو کہ تم چارج کیا لگانا چاہتے ہو؟"

"دھوکے بازی، جعلسازی، سرکاری کارندے پر قاتلانہ حملہ سرکاری فرائض کی بجا آوری میں رکاوٹ پیدا کرنا وغیرہ وغیرہ... آٹھ دس دفعات تو سوچ لی ہیں میں نے تمھارے لیے" تھانیدار نے بتایا۔

مشعل شاہ نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ تھانیدار فوراً بولا "تمھیں شاید خوشی ہو رہی ہے کہ میں نے زنا بالجبر کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ میں بنانا تو یہی کیس چاہتا تھا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اس لڑکی کو عدالت میں کھینچنا نہیں چاہتا اور نہ ہی اس کی تصویریں اخباروں میں چھپتے دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ وہ میرے واقف کاروں کی لڑکی ہے۔ بہرحال اس کے بغیر بھی میں تمھیں ایسا سبق سکھاؤں گا کہ تم اس دھندے سے توبہ کر لو گے۔"

"توبہ تو میں ویسے ہی کرنے کو تیار ہوں بھائی محمد حیات" مشعل شاہ نے بڑے خلوص سے کہا "بلکہ یوں سمجھو کہ توبہ کر ہی چکا ہوں۔ اب اس علاقے میں دھندا چلنے کا امکان ہی کیا رہ گیا ہے۔ منہ دکھانے کے قابل تو چھوڑا نہیں تم نے۔ اس لیے اب یہ نو عمر چھوکروں والی جذباتی گفتگو تو چھوڑو۔ تمھیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ جو جرائم تم گنوا رہے ہو انھیں اگر تم ثابت کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے تب بھی مجھے چند مہینے سے زیادہ سزا نہیں ہوگی اور اس سے کہیں زیادہ لمبے عرصے تک عدالتوں میں تم بھی گھسٹو گے اور ہم بھی۔ اس لیے عقل سے کام لو اور لینے دینے کی بات کرو۔"

"لینے دینے کا مرحلہ گزر گیا ہے" تھانیدار ملائمت سے بولا "سارے قصبے کو تمھاری گرفتاری کا علم ہے۔ وہ جو ایک خدائی فوجدار قسم کا اخباری نمائندہ ہے جس نے سارے اخباروں کی نمائندگی کا ٹھیکہ لے رکھا ہے... وہ بھی دوڑا آرہا ہوگا میں کس کس کا منہ بند کروں گا؟" تھانیدار کا رویہ مکمل طور پر مصالحانہ ہو چکا تھا اور وہ اب بڑے صبر و سکون سے مذاکرات پر اتر آیا تھا۔ مجھے اس کے طرزِ عمل کی یہ تبدیلی بہت ہی عجیب لگ رہی تھی۔ وہ تو ذرا ہی دیر میں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا حالانکہ اب ہم اس کی چار دیواری میں تھے اور کافی حد تک اسی کے رحم و کرم پر تھے جبکہ باہر اس نے جس طرح آنکھیں دکھائی تھیں، مجھے اندیشہ تھا کہ وہ تھانے پہنچتے ہی ہماری کھال اُدھیڑنا شروع کر دے گا۔ مگر یہاں تو الٹا ہی حساب تھا۔

"میں تمھیں اتنا دے دوں گا کہ سب کام ٹھیک ہو جائے گا" مشعل شاہ بولا "تمھارا منہ بند ہو جائے تو باقی سب کے منہ بھی بند ہو جائیں گے..."

مذاکرات چلتے رہے۔ میرے ذہن میں جو گرہیں سی پڑی ہوئی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے کھل گئیں۔ مذاکرات بالآخر کامیابی سے اختتام پذیر ہوئے۔ پچاس ہزار پر سودا طے پا گیا۔ تاہم تھانیدار نے دو شرطیں رکھیں۔ پہلی یہ کہ ایک رات ہمیں بہرحال حوالات میں رہنا پڑے گا۔ علی الصباح وہ ہمیں چھوڑ دے گا۔ تاکہ تاثر پیدا ہو کہ ہم ضمانت پر رہا ہوئے ہیں۔ دوسری شرط یہ تھی کہ مشعل شاہ آئندہ اس علاقے میں صورت نہیں دکھائے گا۔ کم از کم اس وقت تک کہیں گوشہ نشین رہے گا جب تک تھانیدار کا تبادلہ نہیں ہو جاتا۔

"یہ شرط رکھنے کی تو ضرورت ہی نہیں" مشعل شاہ تھکے ہوئے لہجے میں بولا "میں تو پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہم شکل دکھانے کے قابل ہی کب رہے ہیں" پھر اس نے تھانیدار کی اجازت سے ایک سپاہی کو ڈیرے پر بھجوایا کہ جا کر کسی کو بھی پیغام دے آئے کہ صبح سے پہلے مطلوبہ رقم تھانے پہنچا دی جائے۔

اس کے بعد تھانیدار نے ازراہِ کرم ہمیں حوالات کے بجائے اوپر ایک کمرے میں بھجوا دیا جہاں دو بستر لگے ہوئے تھے اور ٹرنک وغیرہ بھی پڑا ہوا تھا۔ شاید وہاں کوئی پولیس والا ہی رہتا تھا۔

مشعل شاہ بہت اداس نظر آرہا تھا۔ میں نے تخلیہ میسر آنے کے باوجود اس سے باتیں شروع نہیں کیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ جانے کیوں میں اس بری طرح تھکا ہوا تھا جیسے سخت مشقت کی ہو۔

میری سونے کی کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں کیونکہ جونہی رات ذرا گہری ہوئی عین ہمارے کمرے کے نیچے سے کربناک چیخوں کی گونج سنائی دینے لگی۔ پھر ایسا محسوس ہوا جیسے ان چیخوں کو دبانے کی کوشش کی جارہی ہو۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے خوفزدہ سے لہجے میں مشعل شاہ سے پوچھا۔

"یہ تفتیش ہو رہی ہے" مشعل شاہ نے تلخ لہجے میں کہا۔ "اگر ہمارے پاس پیسے کا جھرلو نہ ہوتا تو اس وقت ہم بھی اسی طرح زیرِ تفتیش ہوتے" پھر وہ بیزاری آمیز انداز میں کروٹ بدل کر لیٹ گیا۔ اس کا تو مجھے معلوم نہیں لیکن میں ایک منٹ کے لیے بھی نہ سو سکا۔

تھانیدار اپنے گھر چلا گیا تھا لیکن آدھی رات کے قریب وہ ہمارے کمرے میں آگیا۔ بڑا خوش نظر آرہا تھا مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بولا "تمھارا آدمی رقم لے کر آگیا ہے، اگر چاہو تو تم اسی وقت جا سکتے ہو۔"

ہم اس کے ساتھ نیچے آئے۔ منشی عبدالستار ایک بریف کیس گود میں رکھے تھانیدار کی میز کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ مشعل شاہ کو دیکھ کر وہ احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

"آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی سرکار؟" اس نے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔ پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا "میں ذرا وکیل صاحب کو اطلاع کرنے شہر چلا گیا تھا۔ انھوں نے صبح حبسِ بے جا کی درخواست دائر کرنے کی تمام تیاریاں مکمل کر لی تھیں لیکن وہیں مجھے رقم کی بابت پیغام ملا۔ اچھا ہی ہوا یہ سارا معاملہ خوش اسلوبی سے نمٹ گیا۔ کام تو دوسری طرح بھی ہو ہی جاتا لیکن ہمارے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ آپ کو ذرا سی بھی تکلیف نہ ہو۔"

"بہرحال... جو ہوا سو ٹھیک ہوا" مشعل شاہ نے بیزاری آمیز لہجے میں کہا "رقم ملک صاحب کے حوالے کرو تاکہ ہم گھر چلیں، نیند سے آنکھیں بند ہوئی جارہی ہیں۔"

ملک محمد حیات صاحب نے نہایت شریفانہ انداز میں رقم وصول کر کے فوراً ہی ایک سپاہی کے ہاتھ کہیں بھجوا دی اور ہم ان سے ہاتھ ملا کر یوں باہر آگئے گویا چند شرفا کسی کاروباری معاہدے پر تکلدر آمد کے بعد رخصت ہو رہے ہوں۔ زیرِ تفتیش ملزموں کی دبی دبی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔ میں اس وقت تک آسودگی کی سانس نہیں لے سکا جب تک ہم تھانے کی عمارت سے کافی دور نہیں نکل آئے۔ شاید تفتیش کا دائرہ وسیع رکھنے کے لیے ہی تھانہ ایسی عمارت میں بنایا گیا تھا جس کے اردگرد کافی فاصلے تک کوئی مکان وغیرہ نہیں تھا۔

"کام بڑا خراب ہو گیا جی" راستے میں منشی عبدالستار نے تبصرہ کیا۔ رات کے سناٹے میں کچے راستے پر ہم تینوں بدروحوں کی طرح چلے جا رہے تھے۔

"کبھی کبھی انسان کی ذرا سی غلطی سے اس کی ساری بادشاہت الٹ جاتی ہے" مشعل شاہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "خیر... تم یہ ذکر چھوڑو... یہ بتاؤ کہ ہمارے پہلوان واپس آگئے یا نہیں؟" پہلوانوں سے اس کی مراد اس کے گرگے تھے۔

"جی ہاں۔ گھر بیٹھے تاش کھیل رہے ہیں" منشی عبدالستار نے بتایا "ارشاد نے تو ایک اور ہی کام کی تیاری مکمل کر لی تھی۔ واپس آیا تو کہنے لگا میں تھانیدار کا گھر دیکھ آیا ہوں۔ تھانے سے کچھ ہی دور سرکاری کوارٹر میں رہتا ہے جس کی چار دیواری سات فٹ چھ انچ اونچی ہے اور اسے بھی پھلانگنے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ تھانیدار کا چھ سالہ لڑکا باہر ہی کھیلتا رہتا ہے۔ اگر آج رات تک کوئی بات نہ بنی تو اس کے بچے کو اٹھا لاؤں گا۔ پھر اس سے پوچھیں گے کہ شاہ جی کو چھوڑتا ہے یا نہیں۔ لیکن میں نے اسے منع کر دیا کہ ابھی اس حد تک جانے کی ضرورت نہیں۔ کہیں بات زیادہ ہی نہ بگڑ جائے۔"

"اچھا کیا جو تم نے اسے منع کر دیا" مشعل شاہ بولا۔ "میں خود بھی اس معاملے کو صلح صفائی سے نمٹانا چاہتا تھا۔ بات تو پہلے ہی بہت بگڑی ہوئی تھی۔ وہ تو ہماری کوئی نیکی کام آگئی۔"

گھر پہنچتے ہی مشعل شاہ اپنی خوابگاہ میں ایک آرام کرسی پر ڈھیر ہو گیا اور تھکے تھکے لہجے میں عبدالستار سے مخاطب ہوا۔ "بوتلیں اور گلاس منگواؤ اور سب ساتھیوں کو بلا لو۔"

تھوڑی دیر میں ملازموں نے پینے پلانے کے تمام لوازمات سجا دیے اور کمرا آدمیوں سے بھر گیا جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ گیا۔ ایک غیر رسمی سے اجلاس کا منظر تھا۔ میں مشعل شاہ کے عین سامنے بیٹھا تھا۔ نہایت ہی خاموشی سے پینے کا شغل شروع ہو گیا گویا کوئی ضروری فرض انجام دیا جا رہا ہو۔ ماحول پر سوگواری سی طاری تھی۔

بالآخر مشعل شاہ نے سکوت توڑا اور خمار سے بوجھل لہجے میں سب کو مخاطب کیا "دوستو! میں تم سب کا شکر گزار ہوں کہ تم نے مختلف حیثیتوں میں میرے لیے ہمیشہ قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ مجھے یہ اعلان کرتے ہوئے بے پناہ دکھ محسوس ہو رہا ہے کہ تم میں سے بیشتر ساتھیوں کی رفاقت اب مجھے حاصل نہیں رہے گی۔ تم لوگوں کو یہ اندازہ تو ہو ہی گیا ہو گا کہ اب میں یہاں کم از کم چند سال کے لیے تو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔ چند سال بعد لوگ بہرحال سب کچھ بھول جائیں گے لیکن فی الحال افسانے گردش کرتے رہیں گے۔ حالانکہ صحیح بات کسی کو بھی معلوم نہیں ہوگی۔ بہرحال اب کافی عرصے کے لیے

میرا یہاں نہ رہنا ہی بہتر ہے۔ ویسے بھی میرا دل بہت عرصے سے اس دھندے سے اور اس علاقے سے کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہے۔ چنانچہ میں ایک طویل آوارگی کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔ میری زمینیں یہیں رہیں گی اور منشی عبدالستار بدستور ان کا نظام سنبھالے رکھے گا۔ مجھے فی الحال خود بھی نہیں معلوم کہ میں کہاں جاؤں گا۔ بہرحال میں منشی عبدالستار سے رابطہ رکھوں گا اور روپیہ [illegible] ہے۔ اسی سے [illegible] ممکن ہے کہ سکونِ قلب کی تلاش میں میں بہت ہی دور نکل جاؤں اور یہ بھی ممکن ہے کہ میں کبھی لوٹ کر ہی نہ آؤں۔ ان حالات میں مجھے تقریباً تم سب لوگوں کو فارغ کرنا پڑے گا۔ بہرحال میں تم میں سے کسی کو بھی بے روزگار نہیں ہونے دوں گا۔ سب کو رخصت ہوتے وقت کم از کم چار ماہ کی تنخواہ ملے گی اور سب کو میں اپنے دوستوں اور شناساؤں کے نام رقعے دے کر جاؤں گا۔ یہ وہ دوست اور شناسا ہوں گے جو میری بات کبھی ٹالیں گے نہیں اور میرے بھیجے ہوئے آدمی کو کہیں نہ کہیں کام پر ضرور لگا لیں گے۔ یہاں جیسی بے فکری اور عیاشی تو شاید تم لوگوں کو میسر نہ آ سکے لیکن روٹی پانی تو چلتا رہے گا۔ میں نے یہ بھی سوچا تھا کہ تم لوگوں کو یہیں رہنے دوں۔ زمین کی آمدنی میں سے تم لوگوں کو تنخواہیں ملتی رہیں گی۔ تمہیں اندازہ ہی ہوگا کہ میں مالی بوجھ کو بوجھ شمار نہیں کرتا۔ ہمیشہ ہی میں نے جس شاہانہ انداز میں دولت حاصل کی ہے اسی شاہانہ انداز میں خرچ بھی کی ہے لیکن میں نے اس خیال کے تحت اپنا یہ فیصلہ بدل دیا کہ میری سرپرستی کے بغیر تم لوگوں کو تحفظ حاصل نہیں رہے گا اور نہ ہی یہاں کا نظام درست رہے گا اس لیے میں تم لوگوں کو فارغ کرنے کا ناگوار فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ دوستو! میں اچھا ہوں یا برا ہوں بہرحال تمہارا ساتھی رہا ہوں۔ مجھ سے اگر کوئی غلطی ہوئی ہو، میں نے کسی کا دل دکھایا ہو تو مجھے معاف کر دینا..."

اس نے شراب کا گلاس میز پر رکھ کر سب کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ آخری جملے اس نے ایسے جذباتی انداز میں کہے تھے کہ میرا بھی دل بھر آیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میری کوئی بہت ہی عزیز ہستی مجھ سے جدا ہونے لگی ہو۔ حالانکہ میرا اور اس کا ساتھ محض چند ماہ کا تھا۔

میں تو اپنے محسوسات کو دبائے ہی بیٹھا تھا لیکن دو آدمی تو دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔ شراب کے گلاس انہوں نے اپنے سر پر الٹ لیے اور پھر سینہ کوبی کرنے لگے جیسے ان کا کوئی قریبی عزیز ہی انتقال کر گیا ہو۔

مٹھل شاہ کا خاص الخاص گرگا ارشاد اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ وہ کئی پیگ پی چکا تھا اور اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ چہرہ تپے ہوئے تانبے سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔

دفعتاً وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے نیفے سے نہایت ہی خوفناک سی ساخت کا ایک خنجر نکال لیا اور ہوا میں لہراتے ہوئے کہا "مرشد! اگر آپ کسی کے خوف سے علاقہ چھوڑ کر جا رہے ہیں تو مجھے حکم کریں۔ میں چند منٹ میں اس کا سر لا کر آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔ وہ تھانیدار بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ حکم کریں تو اسے بھی..." اس نے خنجر لہراتے ہوئے دانت پیس کر کچھ کی آواز نکالی۔

"اس سے بات بنے گی نہیں، زیادہ بگڑے گی ارشاد پیارے! ورنہ میں تمہیں کبھی کا یہ حکم دے چکا ہوتا۔" مٹھل شاہ مشفقانہ انداز میں مسکرایا۔ اس کی مخمور آنکھوں میں نمی کی جھلملاہٹ تھی۔ "میں اپنی بساط کے مطابق کسی بھی طاقت سے ٹکر لینے کے لیے تیار ہوں لیکن قانون سے اتنی علانیہ ٹکر لینے کے میں حق میں نہیں۔ بس... میں نے جو فیصلہ کیا ہے میں اس پر کاربند رہوں گا۔"

میں گم صم بیٹھا تھا اور سب سے کم پی رہا تھا۔ میرا خیال ہے، میں مٹھل شاہ سے بھی زیادہ اداس تھا۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس کا شمار اچھے لوگوں میں کروں یا بروں میں۔ بڑا ہی عجیب کردار تھا۔ اسی طرح وہ واقعہ بھی عجیب ہی تھا جس کی بدولت بیٹھے بٹھائے اچانک ہی ہماری یہ چھوٹی سی دنیا تہ و بالا ہو گئی تھی۔ روزانہ ہر جگہ اس سے کہیں زیادہ سنگین واقعات رونما ہوتے رہتے تھے۔ مگر ان سے شاید ہی کسی کو اتنا نقصان پہنچا ہو جتنا ہمیں پہنچا تھا۔

خود مٹھل شاہ زندگی میں جانے کتنی مرتبہ اس جرم کا مرتکب ہوا تھا مگر اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ شاید قدرت کو اسی طرح آخرکار ایک نہ ایک روز کسی بھی معمولی چیز سے کسی سیلاب کے آگے بند باندھنا ہوتا ہے، کسی عمل کو انجام تک پہنچانا ہوتا ہے۔

مجھے اس لڑکی پر بھی حیرت ہو رہی تھی جس کی وجہ سے دراصل ہماری بساط لپیٹی گئی تھی۔ وہ خود مٹھل شاہ کے سامنے اعتراف کر چکی تھی کہ وہ کوئی ایسی پاکباز دوشیزہ بھی نہیں تھی اور خواہ محبوب کے قدموں میں ہی سہی لیکن بہرحال دوشیزگی کا چڑھاوا تو چڑھا چکی تھی اور شاید اس کی کوکھ میں گناہ کا پھل بھی پل رہا تھا تبھی وہ اتنی حواس باختہ تھی۔

اس کے باوجود اس نے جا کر اپنے وارثوں کو مٹھل شاہ کی کارستانی بتا دی تھی اور وہ بھی بات چھپانے کے بجائے اپنے واقف کار تھانیدار تک جا پہنچے تھے لیکن بعد میں ساری کارروائی کے دوران وہ لڑکی یا اس کے والی وارث کہیں نظر نہیں آئے تھے اگر تھانیدار واقعی کارروائی آگے بڑھانے کا ارادہ رکھتا تھا تو ان کی موجودگی کے بغیر تو نہیں بڑھا سکتا تھا۔

مجھے مٹھل شاہ پر بھی حیرت تھی کہ اپنے خاص کمرے میں اس لڑکی کو دیکھ کر یک لخت ہی کس طرح ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ اس لمحے مجھے یہ خیال بھی آیا تھا کہ اس آدمی کے مسائل کا ایک حل یہ بھی ہے کہ اسے دو تین شادیاں کر لینی چاہئیں۔

مجھے اس تھانیدار پر بھی حیرت تھی۔ شروع شروع میں وہ گویا ریل کا کالا انجن بنا ہوا تھا جس کا بھاپ کا والو کھل گیا تھا اور بھاپ کا ایک پھنکارتا ہوا طوفان اس کے وجود سے برآمد ہو رہا تھا لیکن ہمیں تانگے میں قصبے کا چکر لگوانے اور لوگوں کو ہماری رسوائی کا تماشا دکھانے کے بعد دھیرے دھیرے اس کی انقلابی روح کو جیسے قرار آ گیا تھا اور پھر لینے دینے کی بات شروع ہوتے ہی گویا اس کے بوائلر کی ساری بھاپ ختم ہو گئی تھی۔

دن چڑھے میں سو کر اٹھا اور ناشتے سے فارغ ہو کر مٹھل شاہ کے کمرے میں پہنچا تو اسے بے حد مصروف پایا۔ وہ عبدالستار کو تمام معاملات نہایت تفصیل سے سمجھا رہا تھا کہ اسے کس طرح تمام انتظامات چلانے ہوں گے۔

کچھ دیر بعد میں بور ہو کر لوگوں کے جھمگٹے سے نکل کر مٹھل شاہ کی زمینوں کی طرف آ گیا۔ مزارعے کاموں میں مصروف تھے۔ سب لوگ مجھے مٹھل شاہ کے خاص آدمیوں میں سے ایک سمجھتے تھے اور عموماً مجھے دیکھ کر مسکین سے انداز میں دانت ضرور نکالتے تھے لیکن آج سب نے گویا منہ پھلایا ہوا تھا اور میری طرف کینہ توز سی نظروں سے دیکھ کر سر جھکا کر پہلے سے زیادہ جوش و خروش سے کام میں مصروف ہو گئے تھے جیسے [illegible]دوں اور مٹی پر کسی بات کا غصہ نکال رہے ہوں۔

مزارعوں میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ وہ تو مجھے دیکھ کر یوں سکڑ سمٹ گئیں اور سر کو اس حد تک جھکانے کی کوشش کرنے لگیں کہ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ ان کی گردنیں نہ ٹوٹ جائیں۔

معلوم نہیں ان لوگوں کو میری اور مٹھل شاہ کی گرفتاری کا پس منظر کس حد تک معلوم تھا، کسی اہل واقفِ حال نے انہیں بتایا تھا یا نہیں۔ بہرحال ان کا غصہ ایک طرح سے مجبور غصہ تھا جس پر انہیں غصہ آ رہا تھا۔ اس کی زمینوں پر کام بھی جاری رکھے ہوئے تھے۔ مجبوری جو ٹھہری۔

میں نے بھی اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ معلوم نہیں مجھے اب یہاں رہنا بھی تھا یا نہیں اور معلوم نہیں ان کی سست رفتار کھرپیاں میری بات کو قبول بھی کرتیں یا نہیں۔ میں نے ان میں سے کسی سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی اور ٹہلتا ٹہلتا واپس چل دیا۔ دوبارہ ڈیرے کے قریب سے گزرتا ہوا میں اس پلیا تک جا پہنچا جس کے ایک سرے پر گویا میرا بچپن تھا اور دوسرے سرے پر جوانی۔ یہ پلیا ان دونوں کناروں کو ملائے ہوئے تھی۔

سورج زرد ہو چلا تھا اور کندنی دھوپ میں نالے کا گدلا پانی بھی سیال سونے کی طرح چمک رہا تھا اور میں اس آئینے میں گزرے ہوئے ایام کا دھندلا دھندلا عکس دیکھ رہا تھا۔ وہ راجو کے ساتھ شوخ شنگی... وہ تاجاں کے ساتھ مکالمہ... وہ دوڑ بھاگ... وہ خوش فکری کے دن۔ اتنے تھوڑے سے عرصے میں جیسے سب کچھ خواب ہو کر رہ گیا تھا۔

راجو کی شادی ہو گئی تھی اور وہ گویا اپنی موت آپ مر گیا تھا۔ بیشتر خاندانوں میں اور خصوصاً دیہاتیوں نیم دیہاتیوں میں چونکہ خاندان کا ایک ہی گھر میں رہنا ناک کا مسئلہ ہوتا ہے۔ خواہ حالات کیسے ہی نامناسب کیوں نہ ہوں۔ اس لیے شادی کے بعد میرا بچپن کا یار بھی یہی روایت نبھا رہا تھا اور اپنی ننھی سی جان پر کھیل رہا تھا۔

ساس اور بہو میں سے تو نہ جانے کسے جنت میں جانا تھا اور کسے جہنم میں۔ بہرحال جسے جہاں بھی جانا تھا مرنے کے بعد ہی جانا تھا لیکن راجو تو جیتے جی ہی جہنم رسید ہو چکا تھا۔ مصیبت یہ تھی کہ یہ شادی اس کی اپنی پسند کی بھی نہیں تھی۔ ماں ہی بڑے چاؤ سے بہو پسند کر کے لائی تھی۔

ایک دو بار راجو نے الگ ہونے کی بات کی تو بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے باپ نے دھمکی دے دی کہ وہ خون کی ندیاں بہا دے گا اگر اس میں ناکام رہا تو خودکشی کر لے گا اور اگر اس میں بھی ناکام رہا تو راجو کو عاق کر دے گا اور قیامت کے روز اس کا گریبان پکڑے گا۔ خلاصہ اس کی گفتگو کا یہ تھا کہ اس کی زندگی میں راجو الگ نہیں ہو سکتا۔

چند دن پہلے ہی راجو مجھے موچھے کے چائے خانے میں ایک نیم تاریک سے گوشے میں بیٹھا ملا تھا۔ اس وقت چائے خانے میں ہم دونوں کے سوا کوئی گاہک نہیں تھا۔ اس کے سامنے اسپیشل چائے کے برتن سجے ہوئے تھے۔

میں اس کے سامنے جا کر بیٹھا تو وہ اچھل پڑا جیسے اس

کا لنگوٹیا نہیں بلکہ ساس سامنے آ بیٹھی ہو۔ نیم تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر مجھے دیکھنے کے بعد اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا اور آنکھیں اس الو کی آنکھوں سے مشابہ نظر آ رہی تھیں جسے کافی عرصے سے آشوبِ چشم کی شکایت چلی آ رہی ہو۔

کسی قسم کی رسمی گفتگو کیے بغیر اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور نہ جانے کہاں سے دیسی وسکی کا ایک پوا نکالا۔ ایک کپ اس نے اپنے لیے اور ایک میرے لیے بھرا لیکن میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا: "شکریہ پیارے! یہ تم ہی پیو۔ ہم تو آجکل ولایتی پیتے ہیں۔"

"ہوں" اس نے پُرخیال انداز میں سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے ہنکارا بھرا۔ "آجکل بڑی اونچی ہواؤں میں ہو۔"

"وہ تو مجھے معلوم نہیں" میں نے کہا۔ "تم بتاؤ کہ اتنی نیچی ہواؤں میں پرواز کرنے کی تمہیں کیا ضرورت پیش آ گئی؟ ابھی تو تمہاری شادی کو آٹھ نو ماہ ہی ہوئے ہیں۔"

"آٹھ نو ماہ؟" اس نے حیرت سے دہرایا۔ "مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے آٹھ نو صدیاں گزر چکی ہیں مجھے اس عذاب میں گرفتار ہوئے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ وسکی کے کپ میں گرنے لگے۔

میں نے اس سے پوچھا: "یہ تم نے شراب کیوں پینی شروع کر دی؟ اس سے کیا تمہارے مصائب میں کمی ہو جائے گی؟"

"معلوم نہیں" وہ سادگی سے بولا۔ "میں تو غم بھلانے کے لیے پیتا ہوں۔" یہ مکالمہ ہم شوشنگوں میں بھی کئی مرتبہ استعمال کر چکے تھے۔

"ابے الو کے پٹھے" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "شراب پی کر غم تو صرف فلموں میں ہی بھولتا ہے۔ وہ بھی پرانی فلموں میں۔ حقیقی زندگی میں تو شراب پی کر وہ قرض بھی یاد آنے لگتے ہیں جنھیں ہم نے بصد کوشش بھلایا ہوتا ہے۔"

وہ مجھے بتانے لگا کہ اس کے گھر میں کیا کچھ ہوتا ہے اور وہ کس قدر پریشان تھا۔ حالات کسی طرح اس کے قابو میں ہی نہیں آتے تھے۔ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ کئی مثالیں دیں۔ کئی مشورے دیے کہ یا تو اسے ہمارے ایک پڑوسی محمد فیاض کی طرح بے حس، بے پروا اور اپنے آپ میں مگن انسان بن جانا چاہیے۔

محمد فیاض کے گھر میں بھی یہی کچھ ہوتا تھا۔ مگر وہ بھی ایک ہی اللہ کا بندہ تھا۔ جھٹے، تھالیاں اور دوسری چیزیں اس کے سر کے قریب سے پرواز کرتی رہتی تھیں مگر وہ بیٹھا آرام سے کھانا کھاتا رہتا تھا یا پھر میرے خیال میں راجو کو ہمارے ایک اور شناسا مردان علی کی طرح بن جانا چاہیے تھا جو بیوی کے تیور بدلتے ہی پہلے خود آستینیں چڑھا لیتا تھا اور اس کی ایسی دھنائی کرتا تھا کہ اس میں اگلے مہینے تک کسی سے منہ ماری کرنے کی سکت نہیں رہتی تھی اور گھر کے باقی افراد پر بھی ایسی دہشت طاری ہو جاتی تھی کہ وہ سرحدی جھڑپیں شروع کرنے کا خیال دماغ سے نکال دیتے تھے۔ آخر میں میں نے گویا خلاصے کے طور پر کہا: "میاں راجو! شیر بنو شیر!"

تب اس بے وقوف راجو نے بڑے پتے کی بات کی۔ کہنے لگا: "انسان بنیادی طور پر تقریباً وہی رہتا ہے جو قدرت نے اسے بنا دیا ہے۔ اگر اپنے آپ کو کتابوں، لیکچروں اور نصیحتوں کے ذریعے بدلنا ممکن ہوتا تو ہر شخص ہی مثالی انسان نہ بن جاتا؟ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ جب سے میں نے ڈیل کارنیگی کی کتاب 'پریشان ہونا چھوڑیے، جینا شروع کیجیے' پڑھی ہے تب سے میں اور بھی زیادہ پریشان رہنے لگا ہوں۔"

"اور اگر اسی طرح کونے کھدروں میں چھپ چھپ کر گھٹیا شراب پینے کا سلسلہ جاری رہا تو جینا بھی جلد ہی ترک کر دو گے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"تمہارے منہ میں گھی شکر" وہ جلدی سے بولا۔ اب ایسے آدمی کو کوئی کیا سمجھاتا؟ چنانچہ میں اسے چائے کے کپ میں وسکی پیتے چھوڑ کر اٹھ آیا تھا۔

پلیا پر بیٹھے بیٹھے مجھے پھر شمیم یاد آئی اور میرے دل پر جیسے کسی نے کند چھری سے گہری سی خراش ڈال دی۔ وہ میرا پہلا عشق... وہ میری تشنۂ تکمیل محبت... وہ ایک پُراسرار سی کہانی جس کا شروع ہونا بھی خواب لگتا تھا اور ختم ہونا بھی۔

مجھے تاجاں یاد آئی۔ اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا مگر جانے کیوں اس کی یاد سے دل میں درد سا ہوتا تھا۔ شاید اس کی بربادی دیکھ کر دل دکھتا تھا۔

ایک عجیب سی اداسی رگ و پے میں اُتر آتی تھی اور میں یوں گرد و پیش پر نظر ڈال رہا تھا جیسے دوبارہ یہ سب کچھ دیکھنا نصیب نہیں ہو گا۔ حالانکہ ابھی یقینی طور پر معلوم نہیں تھا کہ مجھے قصبے میں رہنا ہو گا یا یہاں سے کوچ کرنا ہو گا۔

میں جذبات و احساسات کے اسی مدوجزر میں کبھی ڈوب جاتا تھا اور کبھی ابھر آتا تھا۔ دفعتاً میں نے سڑک کی طرف سے ایک شخص کو پوٹلی کندھے پر لٹکائے آتے دیکھا۔ قریب آنے پر میں نے دیکھا کہ وہ میرے چھوٹے چچا تھے۔

پلیا کے پاس پہنچ کر وہ رک گئے اور ایسی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے جیسے ان کے اور میرے درمیان صرف نفرت کا رشتہ تھا۔ میں نے انھیں سلام کیا لیکن وہ جواب دیے بغیر بولے: "بڑا نام روشن کیا ہے تو نے خاندان کا... ہمارے گاؤں میں بڑے بڑے بدمعاش پیدا ہوئے مگر کسی کی عزت کی طرف کبھی کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ ہر عیب کیا مگر کسی کی آبرو کبھی نہیں لوٹی۔ تو نے تو ان نامی گرامی بدمعاشوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ اس بدمعاش جعلی پیر کے ساتھ مل کر لڑکیوں کی عزتیں لوٹتا رہا اور ہمیں کانوں کان پتا نہ چلا ورنہ میں تجھے ایک لمحے کے لیے بھی گھر میں رہنے نہ دیتا۔ جوان جہان بیٹیاں ہیں ہماری... وہ تو خدا کا شکر ہے کہ تیری اصلی شکل سے شرافت اور معصومیت کا نقاب اتر گیا۔ اگر اپنے باپ کا بچہ ہے تو آئندہ ہمیں شکل نہ دکھانا!"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا۔ وہ کسی مغرور مرغے کی طرح پگڈنڈی پر دھول اڑاتے آگے بڑھتے چلے گئے۔ میں ان سے کہنا چاہتا تھا: "پیارے چچا! آپ خواہ مخواہ اسلوتین کا جانشین بنانے پر تلے ہوئے ہیں اور قصبے میں افواہیں پھیل چکی ہیں۔ ان پر یقین کر بیٹھے ہیں۔ مجھ سے کچھ پوچھ تو لیجیے۔ میں نے عزتیں تو کیا ایک عزت بھی نہیں لوٹی۔ میں تو محض تخت کے نیچے چھپا ہوتا تھا۔ کوتکوں کی [illegible]ی میں مارا گیا ہوں۔ باقی جہاں تک خاندان کا نام ڈبونے کا تعلق ہے تو نام اس سے پہلے بھی میں نے کبھی تیرتے نہیں دیکھا۔ ہم تو نہ تین میں تھے نہ تیرہ میں۔ قصبے میں ہماری حیثیت کتے بلیوں سے زیادہ نہیں تھی۔ میرا باپ اور آپ کا بھائی قتل ہو گیا۔ اس کے الزام میں کوئی ایک گرفتاری تک عمل میں آ نہیں سکی۔ آپ کی خوش فہمیاں آپ کو مبارک۔"

میں چچا کو یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ قصبے کے بدمعاشوں نے کسی کی عزت کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تھا یا نہیں، یہ تو مجھے معلوم نہیں تھا بہرحال قصبے کے شرفا کیا کچھ کرتے تھے، یہ مجھے مٹھل شاہ کے ہاں رہ کر کافی حد تک معلوم ہو گیا تھا۔

چچا نے یہ بھی خوب کہی تھی کہ گھر میں جوان جہان بیٹیاں ہیں۔ میرے دونوں چچاؤں کی صرف ایک ایک ہی بیٹی تھی۔ ان میں سے ایک کی عمر غالباً چھ سات سال اور دوسری کی آٹھ نو سال تھی۔ میرے خیال میں تو انھیں جوان جہان کہلانے کے لیے ابھی کئی سال درکار تھے اور میں نے ان سے ہمیشہ ایسا ہی مشفقانہ سلوک کیا تھا جیسا کوئی بزرگ بچوں سے کر سکتا ہے۔ بہرحال اب ان باتوں کا نہ کوئی فائدہ تھا اور نہ ضرورت۔ میرا خود کون سا اس گھر کی طرف جانے کو دل چاہ رہا تھا؟ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔

میں جب کافی بیزار ہو چکا تو اٹھ کر واپس ڈیرے پر آیا۔ مٹھل شاہ تمام معاملات سے فارغ ہو چکا تھا۔ اس کے دو سوٹ کیس پیک کیے جا رہے تھے۔ جن لوگوں کو وہ سفارشی رقعے لکھ کر دینا چاہتا تھا انھیں دے چکا تھا۔ میرا رقعہ بھی تیار رکھا تھا اور اس کے ساتھ ہی دو ہزار روپے بھی۔

رقم اور رقعہ میرے حوالے کر کے مٹھل شاہ نے مجھے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع ایک گاؤں کا محل وقوع اور وہاں تک پہنچنے کا طریقہ بتانے کے بعد کہا: "یہ علاقہ سرحد سے خاصا قریب ہے۔ یہاں نہر پر سجاد اینڈ کمپنی کے نام سے ایک کنسٹرکشن کمپنی خاصا بڑا پُل بنا رہی ہے۔ اس کمپنی کے مالک سجاد صاحب خود ہی کمپنی کے چیف انجینئر بھی ہیں اور کسی نہ کسی حوالے سے میرے دوست ہیں۔ تم سیدھے انھی سے جا کر ملنا۔ وہ تمھیں کسی نہ کسی خانے میں فٹ کر لیں گے۔"

میں مٹھل شاہ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ وہ قالین پر گاؤ تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ فرشی نشست جمی ہوئی تھی۔ مٹھل شاہ خلافِ توقع اب ملول نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے بولا: "نوجوان دوست! حالات سے گھبرانا نہیں۔ زندگی رہی تو پھر کبھی ملیں گے... اور ہاں... کبھی مدد کی ضرورت ہو تو منشی عبدالستار یہاں موجود ہو گا۔ تم کسی وقت بھی اس کے پاس آ سکتے ہو۔"

میں "شکریہ" کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔ ماحول بڑا شگفتہ تھا۔ باتوں باتوں میں مٹھل شاہ نے یہ بھی کہا: "چلو اچھا ہی ہوا ہم بھی اس بہانے کچھ آوارہ گردی کر لیں گے۔ ورنہ پیری فقیری کے چکر میں الجھ کر ہم تو بھول ہی گئے تھے کہ سورج کدھر سے نکلتا ہے کدھر ڈوبتا ہے۔"

"ویسے پیر سائیں! آپ نے ایک دم ہی یوں اکھڑنے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے؟" باڈی گارڈز کے سردار ارشاد نے پوچھا۔ "ٹھیک ہے پیری فقیری چھوڑ دیں لیکن زمینداری تو ہے۔ آپ اپنی بادشاہت پر موجود تو رہیں۔ آپ کو کون سا ڈیرے سے باہر جانا ہوتا ہے جو لوگ آپ پر انگلیاں اٹھائیں گے؟"

"بس یار دل ہی نہیں مان رہا" مٹھل شاہ نے جواب دیا۔ "جہاں لوگ ہمارے پاؤں دھو دھو کر پیتے رہے ہوں وہاں اب اس عالم میں رہنے کو دل نہیں چاہتا کہ لوگ ہمیں جعلی پیر، فراڈیا، عقیدتوں کا لٹیرا اور نہ جانے کیا کیا کہیں اور پیٹھ پیچھے ہزار طرح کے افسانے گھڑیں۔ بے شک ہم زیادہ تر

ڈیرے پر ہی رہتے ہیں لیکن کبھی کبھی باہر بھی جانا پڑ جاتا ہے پہلے ہم باہر جاتے تھے تو لوگ راہوں میں آنکھیں بچھاتے تھے تعظیم سے جھک جاتے تھے۔ اب کہیں ہم پر انڈے، ٹماٹر یا پرانی جوتیاں نہ پھینکیں۔"

"یہ افواہیں تھوڑا عرصہ رہیں گی شاہ جی!" منشی عبدالستار نے کہا۔ "آپ کے خلاف جو پروپیگنڈا ہو چکا ہے اس کا توڑ کیا جا سکتا ہے۔ تھوڑے عرصے پیری فقیری کا دھندا ذرا ٹھنڈا رہے گا لیکن رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

منشی عبدالستار کو تو میرے خیال میں خوش ہونا چاہیے تھا کہ مٹھل شاہ کے جانے سے سب کچھ اس کے ہاتھ میں آ رہا تھا مگر وہ بھی اسے روکنے کے لیے کوشاں تھا۔ مٹھل شاہ کے آدمی واقعی بڑے وفادار تھے۔

مٹھل شاہ ایک شانِ بے نیازی سے بولا۔ "جب سب ٹھیک ہو جائے گا تو شاید ہم بھی لوٹ آئیں۔"

اسی اثنا میں دو ملازم بوتلوں اور گلاسوں کی کشتیاں اٹھائے کمرے میں آگئے پھر برف لائی گئی اور دَور چلنے لگا۔

"یہ ہماری الوداعی محفل ہے۔" مٹھل شاہ نے اعلان کیا حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر وہ اپنا گلاس بلند کرتے ہوئے بولا۔ "ہم سب کی خوبصورت رفاقتوں کے نام۔"

مٹھل شاہ کی منشا پر دَور ہلکا پھلکا ہی رہا۔ اس لیے جب سب لوگ اٹھے تو برقائمی ہوش و حواس تھے۔ کھانے کا انتظام دوسرے کمرے میں تھا۔ سب آستینیں چڑھا کر انواع و اقسام کے کھانوں پر ٹوٹ پڑے۔ آج جانے کیوں سب کو غیر معمولی بھوک لگی ہوئی تھی۔ نوکر کھانا لاتے لاتے تھک گئے تب کہیں جا کر کھانے والوں نے جبڑوں کو بریک لگائے۔

کھانے کے بعد سگریٹوں اور حقوں کا دور چلا۔ اس وقت تک رات گہری ہو چکی تھی۔ بالآخر مٹھل شاہ جانے کے ارادے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا تمام ضروری سامان جیپ میں لادا جا چکا تھا۔ وہ جیپ میں ہی جانے کا ارادہ رکھتا تھا اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کہاں جا رہا تھا۔ خود اسے بھی نہیں۔

مٹھل شاہ فرداً فرداً سب سے گلے ملنے لگا۔ گرگوں کا سردار ارشاد اس کے گلے لگ کر ایک بار پھر بچوں کی طرح بھوں بھوں کر کے رونے لگا۔ "پیر سائیں! آپ کے بغیر ہم یتیم ہو جائیں گے۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔ مٹھل شاہ نے اسے مشفقانہ انداز میں ڈانٹ کر چپ کرایا۔

مجھ سے گلے ملتے ہوئے مٹھل شاہ بولا۔ "میں جعلی پیر ہوں لیکن تمہارے متعلق میری پیشگوئی ہے کہ تم دنیا میں ضرور کچھ کر گزرو گے۔ ان سارے لوگوں میں سے میں نے صرف تمہارے سینے میں کسی آگ کی تپش محسوس کی ہے۔ یہ کسی چیز کی طلب کی آگ ہے۔"

اس آگ کی تپش کبھی کبھی مجھے بھی محسوس ہوتی تھی مگر میں ہمیشہ اسے ناآسودہ خواہشوں کا الاؤ سمجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا مگر یہ کمبخت مٹھل شاہ بھی عجیب آدمی تھا۔ عجیب وقت پر کوئی عجیب بات کر دیتا تھا۔ انسان کو پڑھنا بہرحال اسے آتا تھا۔ اگر اس نے تھوڑی سی نفس کشی، مطالعہ اور عبادت و ریاضت کی ہوتی تو شاید سچ مچ پیر بن جاتا۔

بالآخر مٹھل شاہ جیپ میں ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ انجن اسٹارٹ کرنے سے پہلے اس نے سیٹ کے نیچے پڑی ہوئی اپنی رائفل چرمی خول سے نکال کر چیک کی پھر اسے واپس وہیں رکھ دیا۔ انجن اسٹارٹ کر کے اس نے ہاتھ ہلایا اور دوسرے ہی لمحے طاقتور جیپ دھول اڑاتی سڑک کی طرف چل دی۔

سڑک پر پہنچنے کے کچھ دیر بعد اس کی عقبی سرخ بتیاں بھی نظر آنی بند ہو گئیں اور انجن کی خفیف سی گھوں گھوں بھی معدوم ہو گئی۔ رات نے ایک بار پھر سکوت و سناٹے کا کفن پہن لیا۔ سب یوں سر اٹھائے اب بھی منتظر سی نگاہوں سے سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے مٹھل شاہ دو چار میل کا چکر لگا کر واپس آجائے گا اور سب کا منہ یوں لٹکا ہوا تھا جیسے انہوں نے ابھی ابھی کسی قریبی عزیز کی میت دفن کی ہو۔

میرا اندازہ ہے کہ سب سے زیادہ اداس شاید میں تھا لیکن اگر میں آئینہ دیکھتا تو مجھے یقین ہے کہ میرا چہرہ کسی اداس و محزون انسان کا چہرہ نظر نہ آتا۔ میرا مسئلہ یہی تھا کہ میں اداسی کو صرف محسوس کر سکتا تھا۔ اسے نہ تو لفظوں میں بیان کر سکتا تھا اور نہ ہی اس کا کوئی خاص تاثر میرے چہرے پر آتا تھا بلکہ میں اس دوران کسی سے کوئی بات کرنے کی سوچتا تھا تو ذہن میں الفاظ بھی غیر سنجیدہ سے ہی آتے تھے۔

بالآخر سب لوگ ڈیرے کی طرف چل دیے۔ آج رات تو سب کو حویلی میں ہی رہنا تھا۔ صبح اپنی اپنی منزلوں کی طرف روانہ ہونا تھا۔ میں اپنی جگہ ہی کھڑا رہا تو منشی عبدالستار نے رک کر مڑتے ہوئے کہا۔ "تم نہیں آؤ گے کیا؟ دو چار راتوں کے لیے تو شاہ جی سب کو ہی حویلی میں رہنے کی اجازت دے گئے ہیں۔"

"لیکن میرا دل اب یہاں ٹھہرنے کو نہیں چاہ رہا۔" میں نے کہا۔ "میں اسی وقت جا رہا ہوں۔" میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ دل کی خلش مجھے کسی بھی طرف کو چل پڑنے پر مجبور کر رہی

ہے اور مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے کہ دُور ویرانے میں کھڑا جیسے کوئی مجھے بُلا رہا ہے لیکن میں یہ نہیں کہہ سکا مجھے معلوم تھا کہ یہ ان کی سمجھ میں آنے والی باتیں نہیں۔

"لیکن اس وقت کہاں جاؤ گے؟" منشی نے حیرت سے پوچھا۔

"شاہ جی نے کہا تھا کہ چونڈہ کی طرف جانے والی آخری بس عموماً بارہ بجے یہاں سے گزرتی ہے" میں نے جواب دیا۔ "اگر بس مل گئی تو میں آج ہی اس طرف نکل جاؤں گا جہاں شاہ جی نے مجھے جانے کے لیے کہا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، میں تیزی سے گھوما اور سڑک کی طرف چل دیا۔ کچھ دیر بعد میں سڑک پر پہنچ گیا اور ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف تاریکی اور سناٹے کا راج تھا کبھی کبھار کوئی کتا فریادی سے انداز میں بھونک اٹھتا یا کوئی گیدڑ نہ جانے کس الیے پر گریہ زاری سی کرنے لگتا اور ان سے شہ پا کر کوئی جھینگر بھی اپنا راگ شروع کر دیتا لیکن یہ محض چند لمحے کے لیے ہوتا۔ اس کے بعد پھر وہی پُر ہول سناٹا۔

میری جیب میں دو ہزار روپے تھے۔ میں چاہتا تو لاہور بھی جا سکتا تھا جو میری پرانی آرزو تھی۔ میرا دل مجھے اس کی ترغیب بھی دے رہا تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ میں کوئی معقول ذریعہ معاش تلاش کرنے سے پہلے ہی یہ رقم کھا پی کر برابر نہ کر دوں۔

بل کھاتی سڑک پر ایک طرف سے دو ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں جو چند لمحے بعد قریب آ گئیں۔ وہ ایک بس تھی۔ پنڈی سے براستہ سیالکوٹ، لاہور جانے والی بس۔ اس وقت اس کا رخ لاہور کی طرف تھا۔

میں ہیڈ لائٹس کی زد میں آیا تو ڈرائیور نے رفتار بالکل کم کر لی اور کنڈیکٹر نے دروازے سے لٹکتے ہوئے چیخ کر پوچھا۔ "کتھے جانا اے باؤ جی؟"

میرا بڑی شدت سے دل چاہا کہ کہہ دوں "لاہور" اور لپک کر بس میں چڑھ جاؤں لیکن جانے کون سی طاقت مجھے وہیں جکڑے کھڑی رہی۔ میں کچھ بھی نہ بولا۔ بالآخر کنڈیکٹر نے گاڑی پر ہاتھ مار کر گرین سگنل دیا اور رفتار تیز ہونے سے پہلے چِلّا کر چلایا۔ "باؤ نے کتھے وی نئیں جانا۔ لگدا اے بیگم نے چھتیاں مار کے کہروں کڈ دِتا اے۔" (بابو کو کہیں نہیں جانا لگتا ہے بیگم نے جوتے مار کر گھر سے نکال دیا ہے)

مجھے کنڈیکٹر پر غصہ نہیں آیا۔ اس وقت میری سوچوں میں تیزی و تندی نہیں تھی، میں سڑک پار کر کے دوسری طرف کھڑا ہو گیا۔ اب میں فیصلہ کر چکا تھا۔ میرے لیے بہتر یہی تھا کہ ایک بار مٹھل شاہ کا رقعہ لے کر سجاد اینڈ کمپنی میں چلا ہی جاؤں اگر کوئی معقول نوکری مل گئی اور کچھ بچت ہوتی نظر آئی تو مزید کچھ رقم پس انداز کر کے لاہور چلا جاؤں گا۔

کھڑے کھڑے میرے پیروں میں خون جمنے لگا اور ٹھنڈ محسوس ہونے لگی تو میں آہستہ آہستہ اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ عین اس وقت جبکہ میں تھک ہار کر حویلی کی طرف واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا، دوسری طرف سے دو ہیڈ لائٹس جھر جھریاں لیتی ہوئی قریب آتی دکھائی دیں۔ میں نے دوڑنا بند کیا اور جیسے ہی روشنی مجھ پر پڑی، بس کو رکوانے کے لیے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا۔

ان دنوں چونکہ ڈاکو حضرات کی تجارتی سرگرمیاں۔۔ معاف کیجیے گا، مذموم سرگرمیاں چونکہ زوروں پر نہیں تھیں۔ اس لیے ویرانے میں بھی کسی کو ہاتھ ہلاتے دیکھ کر ڈرائیور حضرات فوراً گاڑی روک لیتے تھے اور اس اندیشے میں مبتلا نہیں ہوتے تھے کہ ارد گرد جھاڑیوں میں اس کے ساتھی بندوقیں لیے چھپے ہوئے ہوں گے۔

بس میں جب میں ایک پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا اور اونگھتے ہوئے مسافر گردنیں موڑ موڑ کر چندھیائی ہوئی سی آنکھوں سے میرا معائنہ کر چکے تو میں نے اطمینان کی سانس لی اور کرایہ ادا کرتے ہوئے کنڈیکٹر کو تاکید کی۔ "ٹھیکری نام کے گاؤں کے پاس مجھے خود ہی یاد سے اتار دینا۔۔۔ مجھے اس جگہ کا پتا نہیں ہے۔۔۔ پہلی بار جا رہا ہوں۔"

"فکر نہ کرو بادشاہو۔ چاہو تو آرام سے سو جاؤ۔ میں جگا دوں گا۔" کنڈیکٹر نے اطمینان دلایا۔ سونا تو مجھے کیا تھا بہرحال گرم چادر اچھی طرح لپیٹ کر اور سر تیہوڑا کر بیٹھ گیا۔ تن کے کپڑوں اور اس گرم چادر کے علاوہ اس وقت میرے پاس ایک دقیانوسی تھیلے میں دو جوڑی شلوار قمیص اور لنڈے سے منگوایا ہوا ایک کوٹ تھا۔

اسلحے کے طور پر میری واسکٹ کی جیب میں ایک گراری دار چاقو تھا جس کی موجودگی میں مجھے ویران مقامات پر راتوں میں گھومتے ہوئے بھی زیادہ خوف نہیں آتا تھا۔

بس ایک خاص سُر میں کھڑ کھڑ کرتی رواں رہی اور نہ جانے کب مجھے غنودگی سی آ گئی۔ میں نے پاؤں سیٹ پر ہی رکھ کر گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔ میں اس وقت چونکا جب کنڈیکٹر نے زور سے میرا کندھا ہلایا۔ ٹھیکری آ گیا تھا۔

میں غنودگی میں لڑکھڑاتا بس سے اترا اور بس فوراً ہی چل پڑی۔ تاہم کنڈیکٹر نے چلتے چلتے ایک طرف اشارہ ضرور کیا تھا۔ "اودھر ہے ٹھیکری۔"

بس کے جاتے ہی مجھے احساس ہوا کہ چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا اور جدھر کنڈیکٹر نے اشارہ کیا تھا، ادھر کم از کم مجھے تو کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید کسی صاحب بصیرت کو کچھ دکھائی دے جاتا۔

میں نے ذہن میں نقشے کو تازہ کرنے کی کوشش کی جو مٹھل شاہ نے مجھے سمجھانے کے لیے ایک کاغذ پر بنایا تھا۔ نقشہ ذہن میں آ گیا لیکن مٹھل شاہ نے یہ نہیں بتایا تھا کہ جب گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا ہو تب اس نقشے سے کیونکر استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ دُور دُور تک کوئی ذی روح تو کیا کسی ذی روح کی موجودگی کے آثار بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

کچھ لمحے بعد میں نے غور کیا کہ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور کہیں ایک تارا بھی جھلملاتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اسی لیے اندھیرا اس قدر گہرا تھا۔ شکر ہے ہم دیہاتیوں کو پانی اور ہوا کی خوشبو بھی محسوس ہوتی ہے اور مختلف علاقوں کے پانی اور ہوا کی خوشبو میں فرق بھی محسوس ہو جاتا ہے۔

یہاں قریب ہی کہیں سے مجھے کسی نہر کی بُو آ رہی تھی اور مٹھل شاہ نے یہی سب سے بڑی نشانی بتائی تھی کہ بس مجھے نہر کے آس پاس ہی کہیں اتارے گی۔ میں نے ناک کے سہارے نہر کی تلاش شروع کی اور کچھ دیر بعد ناک ہی کے بل اس میں گرتے گرتے بچا۔

عجیب خاموش طبع قسم کی نہر تھی۔ میں ایک کچے پشتے پر چڑھا تو مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے عقب میں نہر ہو گی لیکن جب مجھے پانی کی سرسراہٹ سنائی نہیں دی تو میں پسلی طرف ڈھلان سے اترتا چلا گیا اور گرتے گرتے بچا۔ کیچڑ وغیرہ کی بُو سے اور پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ نہر میں پانی برائے نام تھا۔ موسم جو سردیوں کا تھا۔

میں واپس نشیب میں آ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جس طرف بس گئی تھی ادھر نہر پر پل بھی تھا اور اسے پار کر کے میں نہر کے متوازی ایک چھوٹی سی سڑک پر پہنچ سکتا تھا لیکن مٹھل شاہ نے بتایا تھا کہ اس طرف سے مجھے کافی بڑا چکر کاٹنا پڑے گا۔ کچا راستہ ایک طرح سے شارٹ کٹ تھا۔ اس شارٹ کٹ پر میں کچھ دُور تک ہی چلا تھا کہ بارش شروع ہو گئی اور وہ بھی نہایت زور و شور سے۔ میں بوکھلا گیا اور پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑنے لگا۔ مجھے دراصل فکر یہ تھی کہ میری واسکٹ کی جیب میں رکھے ہوئے نوٹ اور مٹھل شاہ کا دیا ہوا رقعہ بھیگ کر بیکار نہ ہو جائے۔

یہ کچھ اچھا معلوم نہ ہوتا کہ میں اپنی مطلوبہ جگہ پر جا پہنچتا اور ایک سادہ کاغذ نکال کر کہتا "جناب! یہ جو آپ کو اس کاغذ پر کہیں کہیں نیلے دھبے نظر آ رہے ہیں یہ دراصل الفاظ تھے اور یہ کاغذ دراصل مٹھل شاہ کا دیا ہوا سفارشی رقعہ ہے۔"

کسی بوکھلائے ہوئے چوپائے کی طرح پناہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر دوڑتے ہوئے یکایک مجھ پر انکشاف ہوا کہ مجھے اب سمت کا تعین نہیں رہا لیکن سرِ دست مجھے اس پر کوئی خاص تشویش نہیں رہی تھی۔ میرے کپڑے خاصے بھیگ چکے تھے اور مجھے یکایک ہی ٹھنڈ بھی لگنے لگی تھی۔ اس لیے فی الحال میری نظر میں اہمیت صرف پناہ کی تھی۔

بالآخر میں کسی ٹھوس چیز سے ٹکرایا۔ شکر ہے کہ زیادہ زور سے نہیں ٹکرایا۔ ورنہ شاید کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی اور مجھے ہمیشہ کے لیے ہی پناہ مل جاتی۔ ٹٹول کر دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ وہ ایک درخت تھا۔

کوئی درخت مجھے زندگی میں کبھی اتنا پیارا محسوس نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت وہ درخت محسوس ہوا۔ ایسا لگا جیسے کوئی بچھڑا ہوا بھائی مل گیا ہو۔ حالانکہ مجھے کسی بھائی کے بچھڑنے کا تجربہ نہیں تھا کیونکہ میرا کوئی بھائی تھا ہی نہیں لیکن اس وقت مجھے یہی تشبیہ سوجھی تھی۔

اسی لمحے شاید قدرت کو خیال آیا کہ اس شخص کو اتنا بھی

زیادہ اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہیے۔ اس لیے بجلی چمک اٹھی اور اس مختصر سے وقفے میں میں نے دیکھ لیا کہ میں جہاں کھڑا تھا وہاں وہ درخت تنہا نہیں تھا اس کے اور بھی بہت سے بھائی بند موجود تھے۔ ذرا آگے درختوں کا ایک جھنڈ تھا۔ وہاں میں بارش سے زیادہ محفوظ رہ سکتا تھا۔ اس لیے میں آگے بڑھ گیا۔

برق کئی بار کوندی اور وقفے وقفے سے میں آگے بڑھتا رہا۔ پھر اندھیرے میں بھی میں نے حفاظتی انداز میں بازو آگے کو پھیلا کر سفر جاری رکھا حتیٰ کہ میں ایک ایسے مقام پر پہنچ گیا۔ جہاں درخت اتنے گھنے اور گنجان تھے کہ بارش کا ایک قطرہ بھی نیچے نہیں پہنچ رہا تھا اور نہ ہی تیز ہوا جسم کو چیر رہی تھی۔

یہاں پہنچ کر میں نے سکون کی سانس لی اور غور کرنے لگا کہ میری یہ درگت کیوں بن رہی تھی۔ کافی غور و خوض کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ غور و خوض کا کوئی فائدہ نہیں جن کی درگت بنی ہوتی ہے' وہ ہر حال میں بنتی ہے جسے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جاتا ہے کہ تقدیر میں جو لکھا ہو' وہ تو سہنا ہی پڑتا ہے۔

بارش جس تیزی سے آئی تھی شاید اسی تیزی سے ختم بھی ہو گئی۔ ایک جگہ رک کر مجھے سوچنا پڑا کہ اگر میں سمت تبدیل کروں بھی تو کس طرف جاؤں؟ ایسا نہ ہو کہ جنگل سے نکل کر کھائی میں جا گروں یا جنگل کے کسی ایسے حصے میں جا پہنچوں جہاں کوئی فاقہ کش قسم کا لگڑ بھگا یا بھیڑیا گھات لگائے بیٹھا ہو۔

بالآخر میں نے چاقو کھول کر دائیں ہاتھ میں تھاما' تھیلا بائیں ہاتھ میں لٹکایا اور ناک کی سیدھ میں چلنے کا فیصلہ کیا۔ چند منٹ میں میں نے بمشکل چند گز کا فاصلہ طے کیا اور ٹھٹھک کر رہ گیا۔ کافی آگے ایک جگہ مجھے غالباً لمبی لمبی گھاس کے عقب میں ایک لمحے کے لیے روشنی یوں متحرک نظر آئی تھی جیسے چند جگنو جھلملائے ہوں یا پھر کچھ چنگاریاں اڑ کر معدوم ہو گئی ہوں۔

میں اندازاً اس مقام پر پہنچا جہاں میں نے روشنی کی جھلک دیکھی تھی۔ چاقو میرے ہاتھ میں تیار تھا اور میرے اعصاب تنے ہوئے تھے' اچانک اندھیرے کی دیوار کی اوٹ سے جیسے توپ کا ایک روشن گولا میرے چہرے پر آن پڑا۔

میں لڑکھڑا کر پیچھے ہٹا۔ بعد میں میں نے خدا کا شکر ادا کیا تھا کہ میں نے چاقو سے اندھا دھند وار نہیں کر دیا۔ بات کچھ بھی نہیں تھی' صرف تاریکی اور جنگل کا پر ہیبت ماحول اپنی شعبدے بازیاں دکھا رہا تھا۔

بات صرف اتنی تھی کہ اونچے اور گھنے جھاڑ جھنکار کی دیوار کے عقب میں کوئی چھپا ہوا تھا اور اس نے اچانک اٹھ کر ایک چھوٹی سی لالٹین میرے چہرے تک بلند کر دی تھی۔ غالباً وہ میرے چہرے کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔

گھور اندھیرے کے بطن سے نکل کر اچانک ہی یہ چھوٹی سی لالٹین سامنے آئی تو اس کی معمولی سی روشنی سے بھی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ جب تک میری آنکھوں کی چندھیاہٹ دور ہوئی تب تک لالٹین بردار گھوم کر جھاڑیوں کے عقب سے میرے عین سامنے آ چکا تھا۔ تب میں نے دیکھا وہ ایک لڑکی تھی۔

اللہ تیری شان!

رات کا یہ پہر۔ گھنا جنگل' سناٹا' ویرانی اور ایک لڑکی ایسا تو صرف فلموں میں ہوتا تھا۔ وہ بھی کسی کسی فلم میں۔ تاہم لڑکی ویسی نہیں تھی جیسی فلموں میں دکھائی جاتی ہیں۔

وہ غالباً خانہ بدوش تھی۔ بنجارن قسم کی کوئی چیز۔ اس کا رنگ سانولا' رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ پورے چہرے پر صرف اس کی آنکھیں ایسی تھیں جن کی تعریف میں شاعر غزلیں لکھتے ہیں۔ کوئی کوئی لڑکی ایسی ہوتی ہے کہ صرف آنکھوں کی وجہ سے اس کا پورا چہرہ بہت دلکش معلوم ہوتا ہے اور اگر وہ آنکھیں بند کر لے تو دل سے اترنے لگتی ہے۔ تاہم اس لڑکی میں آنکھوں کے علاوہ بھی کئی چیزیں

قابلِ ذکر تھیں۔

اس کی سڈول کلائیاں کہنیوں تک چاندی کی میلی میلی چوڑیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے جو لہنگا اور عجیب و غریب ڈیزائن کی میلی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ ان کے کپڑے سے بلاشبہ ایک خیمہ تیار ہو سکتا تھا مگر اتنا بھاری بھرکم لباس بھی اس کے جسم پر ناکافی محسوس ہو رہا تھا۔ بڑا باغی قسم کا جسم تھا۔

اس کے ہاتھ بڑے مضبوط نظر آتے تھے۔ بالوں کی لٹیں کندھوں پر بکھری ہوئی تھیں۔ فلموں میں میں نے جو خانہ بدوش لڑکیاں اور بنجارنیں وغیرہ دیکھی تھیں ان کا حلیہ بھی کافی حد تک ایسا ہی ہوتا ہے' بس فرق صرف یہ تھا کہ ان کی چولی اور گھاگھرا عموماً بڑا زرق برق ہوتا ہے' گوٹے کناری والا اور اس کے سر پر عموماً ایک نوکیلی سی ٹوپی ضرور ہوتی ہے۔ شاید فلمساز اور ہدایتکار کی نظر میں یہ تاج ہوتا ہے۔ معلوم نہیں یہ تاج خانہ بدوش لڑکی کے پاس کہاں سے آتا ہے اور رقص کے دوران بھی وہ جس طرح اسے سر پر جمائے رکھتی ہے' وہ ایک الگ آرٹ ہے۔

میں ہی اس کا نہیں وہ بھی میرا سر تا پا جائزہ لے رہی تھی اور ہتھیار صرف میرے ہاتھ میں ہی نہیں اس کے ہاتھ میں بھی تھا۔ ایک ہاتھ میں لالٹین اور دوسرے ہاتھ میں ایک بالشت کی چھری جو چمکیلی نہیں تھی مگر مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی دھار یقیناً اتنی تیز تھی کہ بوقتِ ضرورت اس سے شیو بھی بنایا جا سکتا تھا بشرطیکہ وہ کسی مرد کے پاس ہوتی۔

بالآخر مجھے ہی شرم آئی کہ میں مرد ہو کر ایک لڑکی کے سامنے چاقو نکالے کھڑا تھا۔ چنانچہ میں نے اسے بند کر کے واسکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ تب اس نے بھی چھری اپنے لہنگے کی کسی پراسرار سی جیب میں ڈال لی۔ جیب کیا' شاید عمرو عیار کی زنبیل تھی جس میں ایک لمحے کے لیے کہنی تک اس کا بازو بھی غائب ہو گیا تھا۔

"شکل سے کافی بے وقوف لگتے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ مجھے ایک جھٹکا سا لگا اور غیر ارادی طور پر میں نے یوں چہرے پر ہاتھ پھیرا جیسے اس پر سے حماقت کی علامات مٹا رہا ہوں۔ پہلی ملاقات اور پہلا تبصرہ... اور وہ بھی ایسا ہمت شکن۔

وہ خود ہی گویا اپنے تبصرے کی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "میرا مطلب ہے اس وقت تو زیادہ بے وقوف نہیں لگ رہے تھے۔ میں لالٹین کو گھاس میں چھپا کر جھاڑیوں کے درمیان سے تمہیں دیکھ رہی تھی۔"

"کیا ایسے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں تمہیں میری شکل اور اس پر برستی ہوئی حماقت نظر آ رہی تھی؟" میں نے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔

"اندھیرے میں بھی زیادہ دور سے نہ سہی لیکن قریب سے تو ہم ہر چیز صاف دیکھ لیتے ہیں۔ ہماری آنکھیں عادی ہیں اندھیرے کی۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی۔

"تم تنہا ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ کیوں؟ حملہ کرنا ہے مجھ پر؟" اس نے بدستور شوخی سے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ "نقصان میں رہو گے۔"

ایک لمحے کے لیے تو میرے دل میں آئی کہ الٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ رسید کر کے اور دو چار پٹخنیاں اسے دے کر پہلے تو اس کی اکڑ فوں نکالوں پھر آگے بات کروں مگر اس خواہش کو دباتے ہوئے میں نے حتی الامکان نرمی اور ملائمت سے کہا۔ "میرا پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ رات کو اس وقت تنہا اس جنگل میں آتے ہوئے تمہیں ڈر نہیں لگا؟"

"ڈر؟ جنگل سے کیسا ڈر؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "یہاں تو یہ بے ضرر سے درخت ہوتے ہیں یا چھوٹے موٹے جنگلی جانور جو اس وقت تک عموماً کچھ نہیں کہتے جب تک انہیں چھیڑا نہ جائے۔ انسان کو ڈرنا ہی ہو تو شہروں سے ڈرے اونچی اونچی عمارتوں والے شہروں سے۔ جہاں لوگ بغیر چھیڑے ہی ایک دوسرے کے خون کے پیاسے رہتے ہیں۔ دھوکے سے حملہ کرتے ہیں اور طاقتور ہمیشہ کمزور کو کچل رہا ہوتا ہے۔"

کمبخت فلسفہ بگھار رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔ وہ ایک گہری سی سانس لے کر بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "جنگلوں سے کیا ڈرنا... جنگل ہی تو ہم جیسے لوگوں کا گھر ہوتے ہیں۔ زندگی جنگلوں میں گزر گئی ہے بلکہ میری ماں... اللہ اسے جنت نصیب کرے' بتاتی تھی کہ میری تو پیدائش بھی جنگل میں ہوئی تھی۔ وہ اس وقت لکڑیاں چننے گئی ہوئی تھی۔"

"اور تم یہاں کیا کر رہی تھیں؟ کیا تم بھی لکڑیاں چننے آئی ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ میرا مطلب سمجھتے ہوئے مجھے اس نے غالباً گھونسا رسید کرنے کا ارادہ کیا مگر نہ جانے کیا سوچ کر ملتوی کر دیا۔

"میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔" اس نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ جانے کیوں اس نے یہ وضاحت ضروری سمجھی تھی گو کہ یہ اندازہ میں خود بھی کر چکا تھا۔ دفعتاً میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔ "تم یہاں کر کیا رہی تھیں؟" یہ سوال میں سب سے پہلے کرنا چاہتا تھا مگر گفتگو کا آغاز ہی جانے کس ڈھب پر ہوا تھا۔

"حالات دراصل ایسے ہیں کہ مجھے اپنے باپ کے ہاتھ کا پکایا ہوا کھانا کھانا پڑتا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"اور وہ گو کہ برسوں سے کھانا پکا رہا ہے مگر ابھی تک اسے معلوم نہیں ہوسکا کہ چیزوں کو گلایا کیسے جاتا ہے اور دن بھر کی محنت مشقت کے بعد میرا پیٹ چونکہ واقعی دوزخ بنا ہوا ہوتا ہے اس لیے میں جو کچھ سامنے آتا ہے کھا جاتی ہوں اور بہت زیادہ کھا جاتی ہوں۔ عام طور پر میں لکڑ ہضم پتھر ہضم کی مثال بنی رہتی ہوں لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ علی الصباح کے بجائے رات کے کسی پہر جنگل کا رخ کرنا پڑ جاتا ہے۔۔۔"

"میں سمجھ گیا۔ میں سمجھ گیا۔" میں نے جلدی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

"سمجھ گئے ہو تو اب مجھے بھی سمجھاؤ کہ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں راستہ بھول گیا ہوں۔" میں نے کہا۔

"وہ تو میں اسی وقت سمجھ گئی تھی جب میں نے تمھیں کسی شکی مزاج لومڑ کی طرح منہ اٹھائے جھاڑی کے قریب آتے دیکھا تھا۔" وہ بولی۔ "میں پوچھنا دراصل یہ چاہتی تھی کہ کہاں سے آئے ہو، کہاں جانا ہے؟"

"شاید تم سمجھ نہ سکو۔۔۔" میں نے یہ سوچ کر کہ وہ ایک چٹی ان پڑھ لڑکی ہے، ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "اس علاقے میں سجاد اینڈ کمپنی کے نام سے ایک کمپنی۔۔۔ کمپنی سمجھتی ہو نا؟ تو وہ کمپنی پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔ کوئی سڑک اور پل بنا رہی ہے۔ مجھے اس کے مالک سجاد صاحب سے ملنا ہے۔"

"اچھا؟" اس کی آنکھیں نہ جانے کیوں کچھ پھیل سی گئیں۔ "تمھاری واقفیت ہے سجاد صاحب سے؟ دوست ہیں تمھارے؟"

"ہاں۔ دوست ہی سمجھ لو۔" میں نے یہ معمولی سا جھوٹ بولنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

"میرا خیال ہے اگر تم انھیں اپنے ابا کا دوست کہو تو زیادہ مناسب ہوگا کیونکہ وہ عمر میں تم سے تقریباً تین گنا بڑے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

میں جھینپنے یا شرمندہ ہونے کے بجائے اس خیال سے اچھل پڑا کہ وہ سجاد صاحب کو جانتی تھی۔ "تم ان سے واقف ہو؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"اس علاقے میں کون ان سے واقف نہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ویسے وہ خود بہت کم لوگوں سے واقف ہیں، حتیٰ کہ مجھ سے بھی واقف نہیں ہیں۔ شاید ان کی عمر کا تقاضا ہے۔۔۔ ورنہ یہاں تقریباً ہر شخص مجھ سے واقف ہے یا واقف ہونے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔"

"ایک تو تم باتیں بہت کرتی ہو۔" میں نے کہا۔ میں اب اس کی فالتو باتوں پر بالکل دھیان نہیں دے رہا تھا۔ "یہ بتاؤ کہ تم مجھے سجاد صاحب تک پہنچا سکتی ہو؟"

"اس وقت؟" وہ گویا سوچ میں پڑ گئی۔ "وہ ناراض ہوں گے۔"

"نہیں ہوں گے۔" میں نے وثوق سے کہا۔ "اور اگر تمھیں اتنا ہی ڈر ہے تو تم دور سے مجھے ان کا ٹھکانا دکھا کر اپنے گھر چلی جانا۔۔۔" پھر جیسے اچانک ہی مجھے خیال آیا۔ "گھر کہاں ہے تمھارا؟"

"گھر؟" وہ خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرائی۔ "پرانے چیتھڑوں اور ٹاٹ کے پیوندوں سے بنے ہوئے خیمے کو اگر تم گھر کہتے ہو تو اس عزت افزائی پر میں تمھاری شکر گزار ہوں۔" وہ بڑی شستہ پنجابی میں گفتگو کر رہی تھی۔ "بہرحال میرا وہ 'شاندار' گھر سجاد صاحب کے ٹھکانے سے زیادہ دور نہیں ہے اور تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ سجاد صاحب کا ٹھکانا بھی یہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔ میرے پیچھے آجاؤ۔" وہ اچانک ہی مڑی اور لالٹین کو قدرے احتیاط سے دھیرے دھیرے جھلاتی آگے چل دی۔

مجھے اس کے لفظوں کے سحر سے آزاد ہونے میں چند سیکنڈ لگے اور میں لپک کر اس کے پیچھے ہو لیا۔ گھنے جنگل میں سمت کا اندازہ نہیں رہتا۔ مگر وہ جیسے ہر درخت اور راستے کے حدود اربعہ سے واقف تھی اور یوں تیزی سے کبھی دائیں کبھی بائیں مڑتی جا رہی تھی جیسے کوئی صبا رفتار مچھلی پانی کے مخالف بہاؤ میں اپنا راستہ بناتی جا رہی ہو۔

روشنی بہت مدھم تھی اور اس کا لباس بے حد بھاری بھر کم۔ اس کے باوجود اس کی چال دیکھنا اپنے آپ کو آزمائش میں ڈالنے والی بات تھی۔ میں کوشش کرنے لگا کہ نظر جھکا کر صرف اس کے پیروں تک محدود رکھوں جو جوتوں سے محروم تھے۔ اس کے باوجود زیادہ ہو نما یا بے ہنگم نہیں تھے۔

ہم زیادہ نہیں چلے۔ اچانک ہی جنگل سے نکل آئے۔ میں نے اپنے آپ کو چٹیل میدان میں پایا۔ بادل چھٹ چکے تھے اور نامکمل سا چاند گویا لنگڑاتا ہوا ان کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ بارش کا پانی زمین جذب کر چکی تھی اور اب خنک ہوائیں مٹی کی سوندھی خوشبو رچی ہوئی تھی۔

دھندلی چاندنی میں دور مجھے ایک وسیع رقبے میں عجیب عجیب سے ہیولے بکھرے ہوئے نظر آ رہے تھے اور لڑکی کا رخ اسی طرف تھا۔

"نام کیا ہے تمھارا؟" میں نے اس کے شانہ بہ شانہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"لالی۔" اس نے جواب دیا اور مزید کچھ نہ بولی۔ وہ اب بے حد سنجیدہ نظر آ رہی تھی اور جیسے کسی اور ہی خیال میں الجھی ہوئی تھی۔ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

کچھ اور آگے پہنچے تو وہ ہیولے قدرے صاف دکھائی دینے لگے۔ میں نے دیکھا کہ بہت وسیع رقبے پر چار دیواری کے سے انداز میں خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں۔ اس جنگلے سے باہر قطاروں میں چھوٹے چھوٹے ٹیلوں کی طرح پتھروں کی پچاسوں ڈھیریاں لگی ہوئی تھیں۔

خاردار جنگلے میں کہیں تارکول کے ڈرم کھڑے تھے اور کہیں قطار میں دیوہیکل مشینیں کھڑی تھیں۔ کرین، روڈ رولر، مکسر، ٹرک، بلڈوزر، جیپیں اور نہ جانے کیا کیا الابلا۔ کہیں لوہے کے گارڈرز ترتیب سے چنے ہوئے تھے تو کہیں سریے کے انبار لگے تھے۔ غرضیکہ تعمیراتی سلسلوں میں استعمال ہونے والا نہ جانے کیا کیا سامان اور کیسی کیسی مشینری وہاں موجود تھی۔

خاردار تاروں کے اندر ہی ایک مقام پر گویا ساز و سامان کی حدود ختم ہو رہی تھی۔ اس سے آگے ترتیب سے چھوٹے بڑے اور قدرے رنگا رنگ قسم کے خیمے لگے ہوئے تھے۔ ایک گوشے میں چند ایسے کمرے بھی نظر آ رہے تھے جیسے ایک عارضی رہائش گاہ تیار کرنے کی کوشش کی گئی ہو۔

اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد میں نے لالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کچھ عجیب سا نام ہے تمھارا۔ لالی کا مطلب تو غالباً سرخی ہوتا ہے؟" میں نے آسان لفظ کے مشکل معنی ڈھونڈ لیے۔

"اور اب تم کہو گے کہ مجھ میں تو سرخی کا کہیں نام و نشان بھی نہیں ہے۔" وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "میں تو کالی ہوں۔"

"نہیں خیر۔۔۔ کالی تو نہیں البتہ سانولی ہو تم۔ بنگالن لگتی ہو۔ خاص کر ان ساحر آنکھوں کی وجہ سے۔" میں نے اس کی آنکھوں کی طرف اشارا کیا۔ چلتے چلتے ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں درحقیقت اس کی تعریف کرنا چاہتا تھا اور میں نے جو کچھ بھی محسوس کیا تھا، صدقِ دل سے کہہ ڈالا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے الفاظ کو اس نے تعریف پر محمول کیا تھا یا تذلیل پر۔ وہ خوش تھی یا برہم۔ یہ بھی میں اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ بس ایک لمحے کے لیے میری طرف گہری نظر سے دیکھ کر وہ دوبارہ چل پڑی تھی اور جھیل کی طرح پرسکون رہی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی۔ "ہم خانہ بدوشوں میں نام ایسے ہی ہوتے ہیں کچھ عجیب و غریب سے۔ بعض اوقات تو وہ نام نہیں شخصیت پر طنز معلوم ہوتے ہیں۔ ایک لڑکی ہے اس کا نام نور جہاں ہے مگر وہ آنکھوں کے نور سے محروم ہے۔ میں نے سنا ہے نور جہاں ہندوستان کی ملکہ تھی۔ ہماری برادری کی نور جہاں بھیک مانگتی ہے۔"

کم بخت نے پھر دل پر برچھی سی مار دی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے اس سے مزید گفتگو سے حتی الامکان پرہیز کرنا چاہیے۔ یہ میری صحت کے لیے اچھا نہیں تھا۔

اسی دوران میں نے دیکھا کہ خاردار تاروں کی حد بندی سے کافی آگے مزید بہت سے خیمے لگے ہوئے تھے لیکن یہ صحیح معنوں میں خیمے نہیں تھے بس پھٹے پرانے کپڑوں اور کمبلوں وغیرہ کے ٹکڑوں کو جوڑ کر کچھ مڑی تڑی لکڑیوں کے ڈھانچوں پر ڈال لیا گیا تھا۔ لالی یقیناً انھی میں سے کسی میں رہتی تھی۔ خانہ بدوشوں کے اس قسم کے خیمے میں بارہا دیکھ چکا تھا۔

دفعتاً خاردار تاروں کے قریب شلوار قمیص میں ملبوس ایک لمبا تڑنگا شخص نہ جانے کس طرف سے برآمد ہوا۔ اس کے ایک ہاتھ میں رائفل تھی اور دوسرے میں ٹارچ۔ اس نے دور ہی سے ہم دونوں کے چہروں پر ٹارچ سے روشنی ڈالی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

"لالی" نے زیرِ لب اس شخص کو ایک عجیب و غریب گالی دی جس کی معنویت پر غور کرنے سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو سکتے تھے۔

ہم خاردار حد بندی کے قریب پہنچے تو میں نے دیکھا' اس میں تاروں ہی کے جال سے تیار شدہ ایک بڑا سا دروازہ بھی تھا۔ جسے کھول کر وہ چوکیدار قسم کی شخصیت باہر آگئی۔ وہ ادھیڑ عمر تھا اور گویا مقابلۂ مونچھ پروری میں حصہ لینے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی مونچھیں کیا تھیں' بس دو صحت مند گلہریوں کی دُمیں تنی ہوئی تھیں۔

اس نے عجیب انداز سے ہمارا استقبال کیا۔ چُندھی چُندھی آنکھوں سے لالی کو گھورتے ہوئے بولا "اچھا... تو یہ ہے تیرا یار، جس کی خاطر تو کسی کو گھاس نہیں ڈالتی۔ میں بھی کہوں، یہ ہر چوتھے پانچویں روز آدھی رات کو کیوں جنگل کی طرف دوڑی جاتی ہے۔ آج اسے روشنی میں لے ہی آئی!" پھر اس نے مجھے مشرفِ جائزہ بخشا اور غالباً زیرِ مونچھ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "لونڈا تو ٹھیک ٹھاک ہی تاڑا ہے... کڑیل جوان ہے۔ شکل صورت کا

بھی بُرا نہیں... کہاں سے گھیرا ہے یہ بکرا؟"

میں اگر نوکری کی تلاش میں نہ آیا ہوتا تو اس کی رائفل اور تن و توش کی پروا کیے بغیر اس توہین آمیز طرزِ تکلم پر میں اس کی مونچھیں اکھاڑ کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا لیکن لالی نے اسی لمحے اسے جو تین چار فصیح و بلیغ قسم کی گالیاں دیں' وہ اس کے آباو اجداد کی روحوں کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی تھیں مگر وہ انھیں بڑے صبر و سکون سے پی گیا۔

لالی نے گالیوں سے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "یہ میرا یار نہیں، بڑے صاحب کا مہمان ہے۔ بارش میں راستہ بھول کر جنگل میں بھٹکتا پھر رہا تھا... اتفاقاً مجھ سے آ ٹکرایا تو اِدھر لے آئی۔ اب تم جانو اور تمھارا کام۔ میں نے اسے صحیح جگہ تک پہنچا دیا۔ آگے تم بڑے صاحب تک پہنچاؤ یا نہ پہنچاؤ، یہ تمھاری ذمے داری ہے۔" یہ کہہ کر وہ مڑی اور اپنے اسی بلیّوں والے انداز میں گویا ہلکورے لیتی خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ اُدھر کو چل دی جدھر خانہ بدوشوں کے خیمے نظر آ رہے تھے۔

"بڑے صاحب" ان دو الفاظ میں گویا جادو تھا جس سے چوکیدار نہ صرف ایک جھٹکے سے انسانیت کے جامے میں آ گیا بلکہ اس نے ہڑبڑا کر دونوں ایڑیاں جوڑ کر اور رائفل سیدھی کر کے مجھے ایک زوردار سیلوٹ بھی دے مارا۔

زندگی میں یہ میرے لیے پہلا "گارڈ آف آنر" تھا۔ میں نے نہایت تپاک سے اس کا جواب دیا اور نہ صرف چوکیدار کی غلط کلامی کو معاف کر دیا بلکہ اس سے گرمجوشی سے معانقہ بھی کیا جس پر اس کی جان میں جان آئی۔

میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ فوراً مجھے سجاد صاحب کے پاس پہنچا دے تو اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا "صاحب! وہ ناراض تو نہیں ہوں گے؟ وہ آج رات ہی خود کار ڈرائیو کر کے لاہور سے یہاں پہنچے ہیں اور شاید ابھی سوئے ہیں۔ تھوڑی دیر پہلے تک ان کے کمرے میں بتی جل رہی تھی۔"

"بھئی ناراض ہوں گے تو مجھ پر ہوں گے۔ تم بس مجھے پہنچا کر کھسک آنا۔" میں نے کہا۔ اس نے یوں سر ہلایا گویا یہ کوئی بے حد اہم نکتہ ہو جو بڑی مشکل سے اس کی موٹی عقل میں آیا ہو پھر اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

میں اس کی رہنمائی میں خاردار تاروں کی حد بندی میں مختلف چیزوں کے درمیان چکراتا ہوا چل دیا۔ ایک جگہ میں نے لکڑی کی بلیوں پر بجلی کے موٹے موٹے تار بھی تنے ہوئے دیکھے جو تار شاید دُور کہیں کسی کھمبے سے منسلک تھے۔

بالآخر ہم اسی گوشے میں آ پہنچے جہاں عارضی سی رہائش گاہ کے انداز میں تعمیر شدہ چار کمرے موجود تھے۔ چوکیدار نے ان میں سے ایک کے دروازے پر دستک دی۔ دستک اس نے آہستہ ہی دی تھی لیکن دروازہ چونکہ لوہے کی چادر کا تھا' اس لیے رات کے سناٹے میں آواز کچھ زیادہ ہی بلند محسوس ہوئی۔

فوراً ہی اندر سے ایک گونجیلی آواز آئی "کون ہے؟"

"صاحب جی! یہ آپ کا کوئی مہمان آیا ہے۔" چوکیدار نے صرف اتنا کہا اور فوراً وہاں سے کھسک لیا۔ آواز سے میں نے اندازہ لگایا کہ سجاد صاحب ابھی سوئے نہیں تھے۔ اس احساس سے میری کچھ ڈھارس بندھی۔

کمرے کی چھوٹی سی سلاخ دار کھڑکی میں پردے کے عقب میں روشنی نظر آنے لگی اور اسی لمحے کمرے کی پیشانی پر لگا ہوا ایک بلب بھی روشن ہو گیا جس سے میں روشنی میں نہا گیا۔ لوہے کا دروازہ زنگ آلود قبضوں کی گھر گھر کے ساتھ کھلا اور خوبصورت نائٹ گاؤن میں ایک پختہ العمر شخص میرے سامنے آن کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی دھیمی دھیمی مردانہ سی خوشبو کا جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔

وہ ایک وجیہہ اور دراز قد شخص تھا۔ مجھ سے بھی کچھ نکلتا ہوا۔ رنگت سرخ و سپید تھی اور لمبے لمبے بال جو اس وقت بکھرے ہوئے تھے' ان میں سفیدی غالب تھی۔ وہ بھاری بھرکم اور بارعب تھا، انھی لوگوں میں سے ایک جن کا بڑھاپا بھی قابلِ رشک معلوم ہوتا ہے۔

"تو یہ ہیں سجاد صاحب!" میں نے سوچا۔ وہ بھی بغور میرا جائزہ لے رہے تھے۔ پیشانی پر شکنیں تھیں اور انداز سے صاف ظاہر تھا کہ وہ سوچ رہے ہیں "کیا ایسا بھی میرا کوئی مہمان ہو سکتا ہے؟"

میں نے خاموشی سے مشعل شاہ کا رقعہ ان کی طرف بڑھا دیا۔ انھوں نے رقعہ پڑھا۔ ایک نظر میری طرف دیکھا اور پھر شاید از سرِ نو پورا رقعہ پڑھا۔ بالآخر انھوں نے ایک طویل سانس... ایسی سانس عموماً انسان اسی وقت لیتا ہے جب وہ لفظوں میں "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" نہیں کہہ پاتا۔

انھوں نے انگلیوں سے اپنے منتشر بالوں میں کنگھی کی پھر دونوں ہاتھ گاؤن کی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے بولے "عملی زندگی میں آئے مجھے تیس سال ہو چلے ہیں۔ آج تک میں نے ہزاروں آدمیوں کو ملازم رکھا ہے اور بڑے بڑے عجیب حالات میں بڑے بڑے عجیب آدمی میرے پاس ملازمت کی درخواستیں لیے ہوئے آئے ہیں لیکن رات کے اس پہر آج تک کوئی شخص اس طرح رقعہ لے کر ملازمت کے لیے نہیں آیا اور وہ بھی ایک

ویرانے میں اس قسم کے پروجیکٹ کے دوران، سائٹ پر کیا تم صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے؟"

میں خجل سا ہو گیا۔ میرے پاس ان کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میں وقت کا احساس کیے بغیر اچانک ہی منہ اٹھا کر مٹھل شاہ کے ڈیرے سے کیوں چل پڑا تھا۔ سجاد صاحب نے شاید میری خجالت کو محسوس کر لیا اور گویا اس کی تلافی کے لیے مشفقانہ انداز میں مسکرائے "خیر... اندر آجاؤ" وہ مڑتے ہوئے بولے۔ میں ان کے پیچھے اندر چلا گیا۔

کمرے کو باہر سے دیکھ کر میں نے جو اندازہ قائم کیا تھا اندر سے وہ اس سے بہت مختلف تھا اور بے حد وسیع بھی۔ وہ ایک "صاف ستھرا کباڑ خانہ" معلوم ہوتا تھا۔ ایک کونے میں تپائی پر ایک بڑا سا سوٹ کیس کھلا پڑا تھا جس سے نفیس قسم کے ملبوسات جھانک رہے تھے۔ ایک طرف اسٹینڈ پر کچھ ہینگر لٹکے ہوئے تھے جن میں سے دو پر سوٹ اور ٹائیاں موجود تھیں۔ دیواروں پر بڑے بڑے نقشے آویزاں تھے۔

ایک میز پر غالباً پلاسٹر آف پیرس سے بنے ہوئے کچھ ماڈلز بھی رکھے تھے۔ ایک گوشے میں موٹے سے میٹرس والا بیڈ لگا ہوا تھا جس پر ولایتی کمبل یوں سمٹا ہوا پڑا تھا جیسے کوئی چیتا گول مول سا ہو کر گھات لگائے بیٹھا ہو۔

کمرے میں سب سے زیادہ بڑی چیز ایک میز تھی جس پر ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا اور دنیا بھر کے کاغذات، فائلیں، رجسٹر، کتابیں، نقشے، اسٹیشنری اور نہ جانے کیا کیا الا بلا قسم کی چیزوں کا انبار تھا۔ ایک کھلی فائل پر موٹے سے فریم کی نظر کی عینک بھی پڑی تھی۔ کمرے میں لوہے کے فریم کی کئی کرسیاں بھی موجود تھیں۔

سجاد صاحب نے میز سے ایک ڈبا اٹھا کر ایک سگار نکال کر سنہرے لائٹر سے سلگایا اور اپنے بیڈ پر جا بیٹھے۔ مجھے انھوں نے قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کپڑے کا تھیلا میرے ہاتھ میں ہی تھا۔ سجاد صاحب نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ اپنا دیہاتیوں والا ٹریڈ مارک تو کہیں رکھ دو یا اس میں کوئی بہت ہی قیمتی چیز ہے؟"

میں نے قدرے کھسیانا ہو کر تھیلا ایک کرسی پر رکھ دیا۔ سجاد صاحب گویا میری حالت سے محظوظ ہو رہے تھے اور جان بوجھ کر ایسے جملے بول رہے تھے۔ ہنسی ان کے ہونٹوں کے گوشوں سے چھلکی پڑ رہی تھی۔ ان کے منہ سے استہزائیہ فقرے بھی برے محسوس نہیں ہوتے تھے۔ وہ کافی خوش مزاج آدمی معلوم ہوتے تھے۔ کوئی استہزائیہ بات کرتے تھے تو دل جلن کر نہیں کرتے تھے۔

"تو تمھیں مٹھل شاہ نے بھیجا ہے؟" انھوں نے سگار کا کش لے کر اس انداز سے کہا گویا ہمارے درمیان کافی دیر سے گفتگو جاری تھی "وہ بدمعاش ابھی تک جیل نہیں پہنچا؟ میں تو ہر ملاقات پر اس کے بارے میں یہی پیشگوئی کرتا ہوں کہ ایک نہ ایک روز وہ جیل کی روٹیاں توڑ رہا ہوگا۔" ان کے لہجے میں اس بڑے بھائی کی سی شفقت تھی جو شریر چھوٹے بھائی کا تذکرہ کر رہا ہو۔

"آپ کی پیشگوئی پوری ہونے میں بس تھوڑی سی ہی کسر رہ گئی تھی۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ سجاد صاحب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ان کے چہرے پر فکر مندی جھلک آئی۔

"کیا ہوا تھا؟" انھوں نے تیزی سے پوچھا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ حقیقتِ حال بتا دینے میں مجھے کوئی حرج محسوس نہیں ہوا۔ میں نے مختصراً انھیں سارا قصہ سنا دیا جس کے دوران ان کے چہرے کے تاثرات بدلتے رہے۔ مٹھل شاہ کے چھٹکارے کی سن کر انھوں نے غیر محسوس طور پر اطمینان کی سانس لی۔

"بدمعاش بچ ہی گیا۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب معلوم نہیں کہاں گیا ہوگا۔ عجیب ہی آدمی ہے۔ اس کا کچھ پتا نہیں ہوتا کس وقت کیا کر گزرے۔ میرے پاس ہی آجاتا... میں چار پانچ روز بعد پیرس جا رہا ہوں۔ میرے ساتھ ہی چلے چلتا۔ کچھ آوارہ گردی ہو جاتی۔" وہ مجھ سے نہیں گویا اپنے آپ سے باتیں کر رہے تھے۔

مٹھل شاہ کے قریب رہتے ہوئے اور اس کی بے تکلفی دیکھتے ہوئے مجھے کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ وہ کوئی خاص آدمی تھا۔ اس کے باصلاحیت ہونے میں مجھے کوئی شک نہیں تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ خاصے بڑے علاقے میں اس کے نام کا چرچا تھا لیکن میرے خیال میں بس وہ پسماندہ علاقے میں لوگوں کو بے وقوف بنانے اور ان کے اعتقاد سے کھیلنے والا ایک شاطر آدمی تھا جس نے اس دھندے میں اور کچھ زمینوں سے کا[...] دولت کمائی تھی لیکن مجھے یہ احساس کبھی نہیں ہوا تھا کہ پڑھے لکھے معزز اور دولتمند لوگوں کے حلقوں میں بھی اس کی بے تکلفانہ آشنائی اور دوستیاں ہوں گی کیونکہ میں نے اپنے مختصر سے دو[ر] ملازمت میں اس کے پاس کبھی کسی ڈھنگ کے آدمی کو آتے نہیں دیکھا تھا۔

میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کب کہاں اور کیونکر مٹھل شاہ کے دوست بنے لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اس قسم کے سوالات کو کسی اور موقع کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔

سجاد صاحب جیسے اپنے خیالوں سے چونکتے ہوئے بولے "ویسے تم ہو خوش قسمت۔ ایسے موقع پر پہنچے ہو جو کئی پہلوؤں سے تمھارے لیے مناسب ترین تھا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ میں یہا[ں]

موجود ہوں اور آج ہی پہنچا ہوں۔ ورنہ میں کبھی کبھار ہی یہاں ہوتا ہوں۔ میرا گھر لاہور میں ہے اور عام طور پر بیک وقت تین چار مقامات پر میرا کوئی نہ کوئی پروجیکٹ زیرِ تکمیل ہوتا ہے۔ میں کام اور حسابات کا جائزہ لینے کے لیے اچانک ہی دو چار دن کے لیے کبھی کسی سائٹ پر اور کبھی کسی سائٹ پر جا پہنچتا ہوں۔ زیادہ تر میں دفتری کاموں اور ٹھیکوں کے حصول کے سلسلے میں مصروف رہتا ہوں۔ اگر میں یہاں موجود نہ ہوتا تو محض اس رقعے کی بنیاد پر کوئی تمھیں گھاس نہ ڈالتا۔ دوسری اہم بات یہ کہ آج آتے ہی مجھے یہ خبر سننے کو ملی ہے کہ ٹائم کیپر بھاگ گیا ہے۔ کیشیئر اتفاق سے چھٹی پر تھا۔ وہ جاتے جاتے ٹائم کیپر کو اختیار دے گیا کہ مزدوروں کو اس ہفتے کی مزدوری وہی ادا کر دے کیونکہ کارگزاری کا حساب بھی اسی کے پاس ہوتا ہے۔ ایک ہفتے کی مزدوری وغیرہ کی صرف تیس ہزار کی رقم تھی۔ ٹائم کیپر نے اسے ہی غنیمت سمجھا اور لے کر بھاگ گیا۔ نقصان تو جو ہوا سو ہوا، میں یہی سوچ رہا تھا کہ ٹائم کیپر کے نہ ہونے سے بڑی گڑبڑ ہو جائے گی۔ مزدور کاہل اور حرامخوری پر اتر آتے ہیں۔"

وہ بہت روانی سے بات کرتے تھے۔ میں ان کے الفاظ کے بہاؤ میں تھا کہ اچانک انھوں نے پوچھ لیا "تم کتنا پڑھے ہوئے ہو؟"

"ایف۔ اے۔" میں نے سنبھل کر کہا۔

"اوہ... تم تو خاصا پڑھے ہوئے ہو بھئی۔" وہ مسکرائے۔ "میرا کام تو پرائمری پاس سے بھی چل جاتا۔ خیر... اچھا ہی ہے۔ تمھارے لیے ترقی کے مواقع موجود رہیں گے۔ بس تو سمجھ لو کہ ابھی اور اسی وقت سے اس پروجیکٹ پر میری کمپنی کے ٹائم کیپر ہو گئے۔ تنخواہ تمھاری سات سو روپے مہینہ ہوگی۔ رہائش کے لیے تمھیں یہیں کہیں ایک عدد خیمہ مہیا کر دیا جائے گا۔ کھانا اور دیگر اخراجات تمھارے اپنے ہوں گے۔ یہاں ہماری کمپنی کے پڑاؤ کی وجہ سے قریب ہی کھوکھوں میں تقریباً ہر چیز کی چھوٹی چھوٹی دکانیں کھلی ہوئی ہیں۔ ضرورت کی ہر چیز تمھیں مل جایا کرے گی۔ اس ویرانے میں یہ ایک چھوٹی سی دنیا آباد ہے۔ اگر تمھارا دل لگ گیا اور تم نے دیانتداری سے کام کیا تو دو سال کے لیے تو تمھاری نوکری پکی ہے۔ دو سال بعد میرا یہ پروجیکٹ ختم ہو رہا ہے۔ کام مکمل ہو جائے گا۔ بہرحال اس کے بعد بھی اگر تمھاری مرضی ہوئی تو میں تمھیں اپنے کسی دوسرے پروجیکٹ پر بھیج دوں گا۔ ٹھیک ہے؟ تمھیں منظور ہے؟"

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟" میں نے کہا۔

سجاد صاحب ایک بار پھر خود کلامی کے سے انداز میں بولے "بجائے اس کے کہ تم اور سائٹ انجینئر صبح اٹھ کر ایک دوسرے سے مغز ماری کرو، میں تمھیں تمھارا کام بھی ابھی خود ہی سمجھا دیتا ہوں۔"

وہ اٹھے اور بڑی میز پر بکھرے ہوئے انباروں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر انھوں نے زرد رنگ کا ایک کارڈ نکالا جس پر خانے بنے ہوئے تھے۔

"میدان میں تمھاری میز لگی ہوا کرے گی اور صبح آٹھ بجے تمام مزدور تمھارے سامنے قطار میں کھڑے ہوا کریں گے۔" سجاد صاحب کارڈ میرے سامنے رکھتے ہوئے بولے "ہر ایک کے پاس ایسا کارڈ ہوگا جس پر اس کا نام وغیرہ درج ہوگا۔ ہر تاریخ کے خانے میں اس کے کام کے اوقات اس طرح درج کیے جائیں گے۔" انھوں نے قلم لے کر مجھے سمجھانا شروع کیا اور پھر کہا "اس کارڈ کو دیکھ کر ہی کیشیئر ہر مزدور کو ادائیگی کرے گا۔"

پھر انھوں نے مجھے وہ تمام ضروری باتیں بتائیں جن کا مجھے خیال رکھنا تھا۔ وہ یقیناً ایک کامیاب ایڈمنسٹریٹر تھے۔ میں ان کی کمپنی میں ایک معمولی کارندہ بننے والا تھا۔ مگر وہ اس انہماک سے مجھے میرا کام سمجھا رہے تھے۔ گویا ان کی کمپنی کا سارا دارومدار ہی مجھ پر ہو۔ آدھے گھنٹے میں میں سب کچھ سمجھ گیا بلکہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں کافی عرصے سے سجاد اینڈ کمپنی میں ٹائم کیپر چلا آ رہا ہوں۔

جب سجاد صاحب کو اطمینان ہو گیا کہ میں کام سمجھ چکا ہوں تو وہ بولے "اب اس وقت میرا خیال ہے کہ کسی اور کو جگانا تو مناسب نہیں۔ تم ایسا کرو کہ میرے بیڈ کے نیچے ایک گدا اور کمبل لپٹا ہوا پڑا ہے۔ وہ نکالو اور فرش پر بچھا کر فی الحال سو جاؤ۔ صبح میں تمھاری رہائش کا انتظام کرا دوں گا۔ خیال رہے کہ صبح تمھیں ڈیوٹی سنبھالنی ہے۔ منہ اندھیرے اٹھ جانا تاکہ آرام سے تیار ہو سکو اور گھوم پھر کر تمام ضروری چیزیں اور یہاں کا ماحول

دیکھ سکو میں بھی منہ اندھیرے ہی اٹھتا ہوں۔ اگر میں تمہیں جگاؤں تو برا مت منانا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔" میں ان کی انکساری سے شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔" اگر آپ حکم دیں تو میں سوئے بغیر بھی گزارا کر سکتا ہوں۔"

" میں اب اپنے ملازموں کو اتنا بھی مستعد دیکھنا نہیں چاہتا۔" انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر کمبل لپیٹ کر کروٹ لیتے ہوئے بولے "سونے سے پہلے ٹیبل لیمپ بجھا دینا۔"

میں نے ان کے بیڈ کے نیچے سے کمبل اور گدا نکال کر ایک گوشے سے کچھ چیزیں ہٹا کر بچھایا اور لیمپ بجھا کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ سونے سے پہلے میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ مجھے اس دوسری نوکری میں بھی باس غیر روایتی ملا تھا۔ میری طبیعت میں سرکشی تھی اور میں محسوس کرتا تھا کہ میں روایتی قسم کے باس جس کے مزاج میں حاکمیت اور نخرے بازی کا غلبہ ہو، کے ہاں نوکری نہیں کر سکتا۔

میری خواہش تھی کہ صبح منہ اندھیرے میں خود ہی اٹھتا لیکن مجھے سجاد صاحب نے ہی جگایا۔ ایک نوکران کی خدمت میں آن موجود ہوا تھا۔ اسی نے مجھے باتھ روم وغیرہ دکھایا۔ اسٹاف کے خاص خاص آدمیوں کے لیے وہاں فلش سسٹم، باتھ روم، کچن سبھی کچھ موجود تھا۔

نوکر ہی نے میرے لیے ناشتہ تیار کیا، میرے کپڑے استری کیے اور جب میں سجاد صاحب سے بلیڈ مانگ کر شیو بنا کر تیار ہو کر ان کے ساتھ ہی باہر آیا تو ہونق اور دیہاتی نہیں خاصا سمجھدار اور سلیقہ مند شہری معلوم ہو رہا تھا۔

میں اور سجاد صاحب باہر آئے تو بہت سے افراد خاردار تاروں کے پاس کھڑے تھے۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ اپنے اپنے کام پر جانے کے لیے تیار ہیں۔ سجاد صاحب نے ان سب سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں کوئی سائٹ انجینئر تھا، کوئی سرویئر، کوئی ڈرافٹسمین، کوئی اسٹور کیپر، کوئی اکاؤنٹنٹ، کوئی کیشیئر اور نہ جانے کون کون۔

سجاد صاحب نے سائٹ انجینئر جن کا نام سبحانی تھا، کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہاں اصل باس یہ ہیں۔ تقریباً سب لوگ ان کو جواب دہ ہیں۔ میں تو کبھی کبھی آتا ہوں۔"

سبحانی صاحب خاصے بارعب آدمی معلوم ہوتے تھے اور پیسے تلے انداز میں مسکراتے تھے۔ وہ اپنی بغل میں دبے ہوئے کاغذات کا پلندہ درست کرتے ہوئے بولے "ویسے سجاد صاحب! آپ ہیں خوش قسمت آدمی۔ آپ کا کوئی بھی کام کتنے ہی غیر متوقع طور پر خائب ہو جائے، دوسرا اسی طرح آن موجود ہوتا ہے۔ آپ کو نہ کہیں اشتہار دینا پڑتا ہے، نہ کہیں کارکن تلاش کرنا پڑتا ہے اور حتیٰ کہ کسی سے ذکر بھی کرنا نہیں پڑتا۔"

"یہ سب اوپر والے کا کرم ہے۔" سجاد صاحب نے انگلی آسمان کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا "شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ میں خود کبھی کسی کو نہیں نکالتا۔ جانے والا عموماً خود ہی جاتا ہے اور اکثر مجھے کوئی نہ کوئی نقصان پہنچا کر جاتا ہے لیکن میں کبھی اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرتا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ خود ہی میرے مفادات کا خیال رکھتا ہے۔ پریشانی چھوٹی ہو یا بڑی، میں اس سے بخیر و عافیت نکل ہی آتا ہوں۔"

اس کے بعد سجاد صاحب نے ایک شخص کو میری رہائش وغیرہ کے بارے میں کچھ ہدایات دیں اور خود دیگر لوگوں کے ساتھ اصل سائٹ پر روانہ ہو گئے۔ وہ شخص جس کا نام محمد نواز تھا، مجھے اپنے ساتھ میدان میں لگے ہوئے ایک چھپر کی طرف لے گیا جس کے نیچے لوہے کی ایک چھوٹی سی میز اور کرسی پڑی تھی۔ میز پر ایک رجسٹر اور قلم پنسل وغیرہ پڑے تھے اور سامنے مزدوروں کی بہت لمبی قطار لگی ہوئی تھی جس میں خانہ بدوش عورتیں بھی شامل تھیں۔

جانے کیوں یہ دیکھ کر مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا کہ قطار میں سب سے آگے لالی کھڑی تھی۔ وہ بھی اپنے زرد لیبر کارڈ کا کونا ہونٹوں میں دبائے گہری گہری نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ دن کی روشنی میں وہ گزشتہ رات سے کہیں بہتر، خوش شکل اور پرکشش نظر آ رہی تھی لیکن ایسے پھول کی طرح جو دھول میں لتھڑا ہوا ہو۔

میں جانے کہاں کھو گیا تھا۔ اس وقت چونکا جب ساتھ آنے والے شخص محمد نواز نے کہا "آپ یہاں بیٹھ کر کام کریں۔ اس کے بعد میرا کام شروع ہو جائے گا۔ میں ان لوگوں کی نگرانی پر مامور ہوں۔"

میں کرسی پر جا بیٹھا، قلم سنبھال کر جب میں نے اپنی میز کے سامنے محنت کشوں کی اتنی لمبی قطار کو دیکھا تو اپنے آپ کو بڑا با اختیار اور کوئی ایگزیکٹو قسم کا افسر محسوس کیا۔ لالی نے کارڈ میری طرف بڑھایا اور دھیمے سے لہجے میں کہا "تو تم ہو نئے ٹائم کیپر۔ تم تو خود ٹائم پر نہیں آئے۔ ہمارا ٹائم کیا صحیح لکھو گے۔"

"پہلا دن تھا نا۔" میں نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا۔ گویا مجھے کسی افسر نے جھاڑ پلائی ہو "تم یہاں کیا کرتی ہو؟"

"میں یہاں پتھر توڑتی ہوں۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا، اور ساتھ ہی ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو مجھے اکیلی دیکھ کر چھیڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

جو مجھے اکیلی دکیلی پا کر چھیڑنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

دفعتاً اس کے عقب سے کوئی شخص جھلاتے ہوئے لہجے میں بولا "ارے اب ہٹ بھی — جب بھی ٹائم کیپر آتا ہے اس سے لمبی لمبی باتیں شروع کر دیتی ہے۔"

لالی نے مڑ کر قہر آلود سی نظر سے اس شخص کی طرف دیکھا اور دانت پیس کر بولی "صبح ہی صبح میں تیرے منہ نہیں لگنا چاہتی۔ سارا دن خراب گزرے گا۔"

میں نے اس کے کارڈ پر وقت کا اندراج اور دستخط کر دیے اور وہ اس میدان کی طرف چل دی جہاں بڑے بڑے پہاڑی پتھروں کے انبار تھے۔ قریبی پہاڑیوں سے یہ پتھر توڑ کر یہاں لائے جاتے تھے اور مزدور انھیں توڑتے تھے۔ ڈھیریاں لگتی رہتی تھیں اور بعد میں ٹرک انھیں قریب ہی سائٹ پر پہنچاتے تھے۔

میں کام سے جلد ہی فارغ ہو گیا۔ تھوڑا سا پیپر ورک بھی میرے ذمے تھا۔ اسے مکمل کرنے کے بعد میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ گیا لیکن زیادہ دیر بیٹھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں کھنچنے لگتے تھے۔ چنانچہ میں ذرا ماحول کا جائزہ لینے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

سجاد صاحب نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ یہاں واقعی ایک چھوٹی سی دنیا آباد تھی۔ کہیں مزدور پتھر توڑ رہے تھے، کہیں ٹرکوں پر لدائی ہو رہی تھی اور کہیں اتروائی۔ انسان اور مشینیں ایک جگہ سے دوسری جگہ آ جا رہی تھیں۔

ایک طرف قطار میں کچھ کھوکھے تھے جن میں نائی، کنجڑا، نانبائی سب ہی موجود تھے۔ کسی اونچی جگہ کھڑے ہو کر اصل سائٹ کو بھی دیکھا جا سکتا تھا جہاں نہر کا رخ موڑ کر پل کی بنیاد ڈالی جا چکی تھی۔ پل کی سیدھ میں دور سے سڑک بھی بنتی آ رہی تھی جس کا کافی کام مکمل ہو چکا تھا۔ دور ایک طرف ایک کچے راستے پر ایک بس دھول اڑاتی جا رہی تھی۔ اس کی چھت پر بھی لوگ بیٹھے ہوئے تھے اور بس کسی بدمست ہاتھی کی طرح جھوم رہی تھی۔ ماڈل بھی غالباً اس زمانے کا تھا جب بسیں نئی نئی ایجاد ہوئی تھیں۔ اس طرف غالباً قریب ہی کہیں آبادی تھی جدھر بس جا رہی تھی۔

میں جب راؤنڈ مکمل کر کے آیا تو کھانے کا وقفہ ہو چکا تھا۔ سورج سر پر آ چکا تھا اور دھوپ میں تیزی آ چکی تھی۔ محمد نواز نے مجھے بتایا تھا کہ کچھ مزدور قریبی آبادیوں سے آتے تھے۔ غالباً وہی اس وقت ایک طرف درختوں کے نیچے بیٹھے پوٹلیاں کھولے کھانا کھا رہے تھے۔

خانہ بدوشوں کے خیمے تو بہت زیادہ تھے لیکن ان میں سے بہت کم لوگ مزدوری کرتے تھے۔ باقی نہ جانے کیا کچھ کرتے تھے۔ کوئی کاٹھ کباڑ جمع کرتا تھا۔ کوئی بھیک مانگتا تھا اور کوئی کچھ اور۔ تاہم زیادہ تر لوگ جن میں بچوں والی عورتیں بھی شامل تھیں، علی الصباح خیموں سے نکل جاتے تھے اور نہ جانے کہاں غائب ہو جاتے تھے، شام ڈھلے واپس آتے تھے۔

لالی اپنے خیمے کی طرف جا رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں ہتھوڑی تھی اور دوسرے پر ربر کی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ ایک بار پھر گہری گہری نظروں سے میری طرف دیکھتی ہوئی گزری۔ میں نے محسوس کیا کہ جب وہ اس انداز میں میری طرف دیکھتی تھی تو مجھ پر ایک عجیب بے خودی سی طاری ہونے لگتی تھی۔ میں گرد و پیش سے بے نیاز سا ہو جاتا تھا اور آسمان اور زمین کے درمیان کہیں ہلکورے لینے لگتا تھا۔ ایک عجیب سا جادو تھا اس کی آنکھوں میں۔

"کھانا کھانے جا رہی ہو؟" غیر ارادی طور پر میں نے پوچھ لیا۔

"ظاہر ہے۔" وہ تیکھے سے لہجے میں بولی۔ رسیلے ہونٹوں کے گوشوں سے ہنسی چھلکی پڑ رہی تھی۔" ہمارے خیمے میں انسان کھانا کھانے جا سکتا ہے یا پھر سونے۔ اور تو وہاں کوئی ایسی تفریح ہے نہیں جس کے لیے کوئی دوڑا جائے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ قدرے شوخ لہجے میں بولی "چاہو تو تم

بھی چل سکتے ہو کھانے کے لیے۔ ہم لوگ پردیسیوں کو ایک آدھ وقت کا کھانا کھلانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔"

میں نے دزدیدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا بہت دُور درختوں کے نیچے بیٹھے ہوئے مزدوروں کی گردنیں ہماری طرف مڑی ہوئی تھیں لیکن جیسے ہی میں نے ان کی طرف دیکھا وہ جلدی سے سر جھکا کر کھانے میں منہمک ہو گئے۔

میری میز کے قریب محمد نواز کھڑا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا ہے لیکن میں اس وقت جس سے باتیں کر رہا تھا' اس کی آواز میری رگ و پے میں سنسنی دوڑا رہی تھی اور میرا دل گویا کنپٹیوں میں دھڑک رہا تھا۔ اس لیے میں نے محمد نواز کو نظر انداز کر دیا اور دوبارہ لالی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"بھئی تمہارے ہاں کھانا کھانے کو دل نہیں مانتا۔" میں نے کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ تم لوگ کتا، بلی اور مُردار سب کچھ کھا جاتے ہو۔"

پہلی بار میں نے اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی کی جھلک دیکھی۔ "ہم وہ خانہ بدوش نہیں ہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔" وہ مجروح سے لہجے میں بولی۔ "ہمارا عقیدہ بھی مختلف ہے اور قبیلہ بھی۔ ہم لوگ اس ملک میں بہت تھوڑی تعداد میں ہیں۔ ہمارا رہن سہن بہت صاف ستھرا اور مہذبانہ ہے۔ ہم میں اور تم میں سوائے روپے پیسے کے فرق کے اور کوئی فرق نہیں ہے یا پھر ایک تھوڑا سا فرق یہ ہے کہ تم لوگ کسی ایک ہی جگہ رہائش پذیر ہونے کی کوشش کرتے ہو اور ہم سفر میں رہتے ہیں۔"

اس نے مجھے مطمئن کر دیا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تم جیسے کھانے کی دعوت دو اس کی خوش قسمتی میں بھلا کیا شک ہو سکتا ہے۔"

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ اس وقت دنیا بھر کی خوشیاں میری ہمرکاب تھیں۔ تعارف اور گھر تک رسائی کے لیے جو بہانے جو طریقے میں نہ جانے کتنی دیر تک سوچتا رہا تھا' ان میں سے کسی کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ یہ مرحلہ تو خود ہی طے ہو گیا تھا۔ پیش قدمی کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی پیش قدمی اُدھر سے ہو گئی تھی اور یہ میری خوش قسمتی کی دلیل تھی۔ میں اِدھر اُدھر نہیں دیکھ رہا تھا۔ مبادا کوئی شکی یا حاسدانہ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا ہو۔

خیمے میں پہنچتے ہی ایک دیو مجھے مٹی کے تیل کے چولہے پر رکھی ہوئی ہنڈیا میں ڈوئی گھماتا نظر آیا۔ وہ تقریباً دیو ہی تھا۔ صرف سینگوں کی کمی تھی۔ اتنا لحیم شحیم آدمی ہنڈیا پکاتا بڑا

باندھے ہوئے تھا اور اس کے بازو اور پنڈلیاں دیکھ کر خوف آتا تھا۔ بس ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے موٹے موٹے شہتیر لے کر ان کی کہیں کہیں سے معمولی چھلائی کر دی ہے۔

اس نے مُڑ کر میری طرف دیکھا تو ایک لمحے کے لیے مجھ جیسا نڈر انسان بھی ڈگمگا گیا۔ اس کا چہرہ کسی بڑے سے تھال سے مشابہ تھا جس پر انسانی نقوش ابھر آئے تھے۔ لمبے لمبے کھچڑی بال وحشیوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے اور سرخ سرخ آنکھیں گویا ابلی پڑ رہی تھیں۔

لالی حسین ہرگز نہیں تھی لیکن اگر اس کے باپ کو دیکھا جاتا تو بجا طور پر کہا جا سکتا تھا کہ دیو کے گھر میں پری پیدا ہو گئی تھی۔

لالی کا خیمہ دیگر خیموں کی نسبت کافی بڑا تھا۔ میرے خیال میں اس کی وجہ اس کا باپ ہی تھا۔ آدھا خیمہ تو اسے سمانے کے لیے چاہیے تھا۔ خیمے کی حالت بھی ویسی نہیں تھی جیسی میں تصور کر رہا تھا۔ ہر طرف سے صفائی اور قرینہ جھلک رہا تھا۔ ایک گوشے میں ایک چارپائی اور اس کے قریب ہی ایک تخت پڑا ہوا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دونوں پر خاصی حد تک صاف ستھری چادریں بچھی ہوئی تھیں تخت پر ایک بینڈ کا ریڈیو بھی رکھا تھا جو ان دنوں دیہاتوں میں بڑا مقبول ہو رہا تھا۔

اس کے علاوہ گھر گرہستی کی تقریباً وہ تمام چیزیں خیمے میں موجود تھیں جن کی توقع کسی 'معزز' خانہ بدوش کے ہاں کی جا سکتی ہے۔ مثلاً ٹرنک، بالٹی، جھاڑو، برتن اور مُوڑھے وغیرہ حتیٰ کہ چارپائی کے نیچے ایک خاصا بلورڈ واقسم کا کتا بھی اگلے پنجوں پر تھوتھنی ٹکائے سو رہا تھا جس نے میری آمد پر نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا لیکن غالباً لالی کو میرے ساتھ دیکھ کر مجھے 'اپنا ہی آدمی' قرار دے کر بے نیازی سے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ خیمے کے اندر کچا فرش بھی صاف ستھرا اور ہموار نظر آ رہا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ یہاں بے حد سکون کا احساس ہو رہا تھا۔

دیو نما انسان اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ لالی نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ میرے بابا ہیں۔" حالانکہ صحیح معنوں میں 'بابا' کہلانے کے لیے ابھی اسے کافی سال درکار تھے۔ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولی۔ "اور یہ ہمارے نئے ٹائم کیپر ہیں۔"

یہ سن کر بابا کی پیشانی سے شکنیں غائب ہو گئیں اور موٹے موٹے ہونٹوں پر گھنی مونچھوں کے سائے میں مسکراہٹ ابھر آئی۔ اس نے مصافحے کے لیے بیلچہ نما ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں حالانکہ عام قد کاٹھ کا آدمی نہیں ہوں مگر اس

ہاتھ میری گرفت میں نہیں آ رہا تھا اور اس کا قد بھی مجھ سے نکلتا ہوا تھا۔ مصافحہ کرتے وقت اس کے انداز میں معمولی سی انکساری تھی۔

اس نے مجھے تخت پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے میری ہی نہیں میرے بال بچوں کی خیریت بھی دریافت کی... اور جب اسے معلوم ہوا کہ بچے تو کیا ابھی بچوں کی متوقع ماں کا بھی کہیں دُور دُور تک پتا نہیں ہے تو اس نے گویا غیر محسوس طور پر قدرے اطمینان کی سانس لی۔

بابا کھانا تیار کر چکا تھا۔ لالی نے وقت ضائع کیے بغیر تخت پر کھانا سجا دیا اور ہم تینوں ہی کھانے بیٹھ گئے۔ خاصا معقول کھانا تھا۔ کھانے کے دوران باتوں کا دور چل رہا تھا۔ لالی تقریباً ہر نوالے پر میری طرف ضرور دیکھ لیتی تھی اور جانے کیوں ہر بار اس کی آنکھوں میں شوخی سی جھلک آتی تھی۔

بابا بہت جلد بے تکلف ہونے والا آدمی تھا اور ایسے آدمی مجھے بہت پسند تھے کیونکہ میں خود انھی میں سے تھا جنھیں انگلی تھما دی جائے تو جلد ہی وہ پہنچے تک جا پہنچتے ہیں۔ اسی بے تکلفی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے پوچھا۔ "بابا! تم کام کیوں نہیں کرتے؟"

مجھے بجا طور پر حیرت تھی کہ بابا جو پتھر تو کیا تھوڑی بہت کوشش سے چٹانیں بھی توڑ سکتا تھا' وہ تو گھر میں بیٹھا روٹی ہانڈی اور جھاڑو برتن کرتا رہتا تھا اور وہ دلربا جسے یہ کام زیب دیتے تھے' جا کر دن بھر پتھر توڑتی تھی۔ وہ اپنی کومل جوانی کو سنگ و خشت کی نذر کر رہی تھی۔

"میں اسی لیے لوگوں سے ملتے ہوئے کتراتا ہوں۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "کہ وہ کسی نہ کسی موقع پر مجھ سے یہ سوال ضرور کرتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میری پسلیوں میں درد رہتا ہے۔ اس لیے میں نے لالی کے حصے کا کام سنبھال لیا ہے اور اپنا کام لالی کو دے دیا ہے۔ ویسے بھی لالی کی ماں اسے چھوٹی ہی چھوڑ کر مر گئی تھی۔ تب سے مجھے گھرداری کی عادت سی بھی پڑ گئی ہے۔"

"لیکن پتھر تو ہاتھوں سے توڑنے پڑتے ہیں۔ پسلیوں سے تو نہیں۔" میں نے شرارت آمیز لہجے میں کہا۔

"تم ابھی میری عمر کو نہیں پہنچے کاکا!" وہ نوالا چباتے ہوئے بولا۔ "تمہیں نہیں معلوم پسلیوں کا درد کسے کہتے ہیں۔ کوئی بڑی محنت کا کام مسلسل اور زیادہ دیر کروں تو بڑی تکلیف میں پڑ جاتا ہوں۔" اس کا لہجہ ہمدردی طلب تھا۔

"میں نے ہی بابا کو گھر بٹھایا ہے۔" لالی نے گویا باپ کا تنازع کیا۔ "مجھے سخت محنت کرنا اور گھر سے باہر کام کرنا اچھا

لگتا ہے۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ گھر بیٹھے بھی بابا کی دہشت دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ زبانی کلامی تو لوگ مجھ سے چھیڑ چھاڑ کر لیتے ہیں یا دو گالیاں دے کر چار مجھ سے سُن لیتے ہیں لیکن اس سے آگے بڑھنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ جس نے بھی ایسی ویسی کوئی کوشش کی' وہ بعد میں مہینوں کمر پر ہاتھ رکھ کر روتا رہا۔ ایسے موقعوں پر بابا پسلیوں کا درد بھول جاتا ہے اور ایسے آدمیوں کو ککڑی کی طرح درمیان سے توڑنے پر تُل جاتا ہے۔ بابا ہی کے بھروسے پر میں اتنی بے خوفی سے منہ اٹھائے اِدھر اُدھر پھرتی رہتی ہوں۔ ورنہ اس ویرانے میں کب کا کوئی بھیڑیا مجھے کھا گیا ہوتا۔ میرا مطلب ہے دو ٹانگوں والا بھیڑیا۔"

"بے شک۔ بے شک۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔

اس دوران کھانا ختم ہو چکا تھا۔ آخر میں بابا فارغ ہوا تھا۔ وہ کپڑے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولا۔ "ویسے کوئی زیادہ ہی سنگین مسئلہ آن پڑے تو میرے پاس ایک بندوق بھی ہے۔ آٹھ دس کے لیے تو میں نہتا ہی کافی ہوں۔" اس کے اس خیال سے میں متفق تھا۔

مجھے کچھ زیادہ ہی اچھی طرح متاثر کرنے کے لیے اس نے جھک کر تخت کے نیچے ہاتھ ڈالا اور نہ جانے کہاں سے کھینچ کھانچ کر ایک بندوق نکال لی۔ پہلے تو مجھے یہ جاننے کے لیے کہ وہ بندوق ہی ہے' آنکھوں پر کافی زور دینا پڑا۔ اس کی حالت بتاتی تھی کہ شاید پہلی جنگِ عظیم کی پہلی گولی اسی سے چلائی گئی تھی اور اب اگر اس سے کوئی گولی چلائی گئی تو وہ چلانے والے کی زندگی کی آخری گولی ہو گی کیونکہ اس کے بعد نہ بندوق رہے گی اور نہ چلانے والا۔

"بابا! نشانہ کیسا ہے تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

"نشانے کی مت پوچھو۔" وہ پیار سے بندوق پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "اڑتی ہوئی مکھی کو نشانہ بنا سکتا ہوں۔"

"ویسے آپس کی بات ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اڑتی ہوئی مکھی نظر آ جاتی ہے تمہیں؟"

"مذاق مت اڑاؤ کاکا!" وہ خوشدلی سے بولا "نظر میری اب بھی تم جیسے جوانوں سے بہتر ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ تخت سے اترا اور نیچے رکھا ہوا پانی سے بھرا ہوا گلاس اس نے ٹھوکر مار کر گرا دیا کیونکہ وہ اسے نظر نہیں آیا تھا۔

"بابو صاحب! آپ کے لیے چائے بناؤں؟" لالی نے پوچھا۔ وہ جب مجھے بابو صاحب کہتی تھی تو میری نس نس میں گویا جلترنگ سے بجنے لگتے تھے۔

"چائے میں بالکل نہیں پیتا۔" میں نے کہا۔ جملے کے آخر میں 'جانِ من' کہتے کہتے میں بروقت رک گیا تھا۔ اچھا ہی ہوا کہ زبان کو بریک لگ گئی تھی۔ مانا کہ وہ بے تکلف لوگ تھے لیکن اب پہلی ہی ملاقات میں اتنا زیادہ پھیلنا بھی اچھا نہیں تھا۔ بابا کی بندوق خواہ بے ضرر تھی، بابا خود تو بے ضرر نہیں تھا بلکہ بندوق کے بغیر وہ زیادہ خطرناک تھا۔

"وقت کیا ہوا ہے؟" لالی نے پوچھا۔

"پونے دو۔" میں نے گھڑی کا شیشہ قمیص کے دامن سے صاف کرتے ہوئے بتایا۔

"کھانے کا وقفہ ختم ہو رہا ہے۔ اب چلنا چاہیے۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"جب تک ہم ٹائم کیپر ہیں تمھیں وقت کی پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔۔" میں ایک بار پھر جانِ من کہتے کہتے رک گیا۔ ایک تو بعض اوقات کوئی لفظ جانے کیوں ذہن میں پھنس کر رہ جاتا ہے جیسے ریکارڈ پر سوئی اٹک گئی ہو۔

"مہربانی ہے آپ کی۔" وہ میرے شاہانہ لہجے کے جواب میں مغلیہ دور کی کنیزوں کی طرح آداب بجا لاتے ہوئے شرارت سے مسکرا کر بولی "لیکن وہاں دوسرے لوگ بھی ہوتے ہیں، بدنام کرتے ہیں۔"

"دوسرے لوگوں کی ایسی کی تیسی۔ پیٹھ پیچھے وہ جو کہتے ہیں کہنے دو۔ پیٹھ پیچھے تو لوگ بادشاہوں کو بھی گالیاں دے لیتے ہیں بلکہ اچھا ہے اس طرح ان کے دل کا کچھ غبار نکل جاتا ہے۔ سامنے کسی نے کچھ کہا تو میں اس کے دانت نکال دوں گا اور اگر کوئی مجھ سے زیادہ طاقتور ہوا تو بابا کو بلا لوں گا۔" میں نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے کسی کو کیا معلوم کہ میں تمھارے کارڈ پر کیا وقت درج کر رہا ہوں؟"

"اچھا بابا! تم بابو لوگوں کو تو باتوں کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ میں تو چلی۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولی اور خیمے کا پردہ اٹھا کر باہر چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے ساتھ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ حالانکہ آتے ہم دونوں ساتھ ہی تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ آتے وقت ہمیں اکا دکا لوگ دیکھ رہے تھے اور اب میرا اندازہ یہی تھا کہ سب لوگ واپس آ چکے ہوں گے، میں نے یہی سوچ کر خود بھی اس کے ساتھ جانے کی کوشش نہیں کی۔

بابا اس دوران بڑے انہماک سے اپنے حقے کی چلم تیار کر رہا تھا۔ چلم حقے پر رکھ کر وہ دوبارہ میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولا "دوپہر کا کھانا کھانے تو تم روز یہیں آ جایا کرو۔ کینٹین کا کھانا تو بڑا واہیات ہوتا ہے۔ لالی کو تو خیر میرے ہاتھ کا کھانا بھی کچھ زیادہ پسند نہیں.......اس کی وجہ تو یہ ہے کہ وہ خود بہت اچھا پکا لیتی ہے۔ اس لیے کسی دوسرے کے ہاتھ کا اس کے من کو نہیں بھاتا لیکن تم ایمانداری سے کہو کیا میں خراب پکاتا ہوں؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے واقعی دیانتداری سے کہا۔ میرے اس خیال کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں اس سے بھی کہیں زیادہ عبرتناک کھانے کھا چکا تھا۔

ٹھیک دو بجے میں بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ بابا نے ایک بار پھر اپنی پیشکش کو دہرایا تو میں نے ازراہِ تکلف کہا "روز روز آنا اچھا نہیں لگتا بابا! آدمی بوجھ بن جاتا ہے۔" حالانکہ دل میرا یہی چاہ رہا تھا کہ اس سہولت پر خدا کا شکر اور بابا کا شکریہ ادا کروں اور پھر لالی جیسی میزبان میسر ہو تب تو دن میں ایک بار کیا، دس بار آنے کو جی چاہتا ہے۔

"کھانے کا کوئی بوجھ نہیں ہوتا برخوردار!" بابا نے خلافِ عادت گہری سنجیدگی سے کہا "کھانا سب اپنے مقدر کا کھاتے ہیں اور پھر دو آدمیوں کے کھانے میں تیسرے کی گنجائش تو نکل ہی آتی ہے۔ بشرطیکہ وہ تیسرا مجھ جیسا نہ ہو۔" وہ توند پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مسکرایا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور واپس آ گیا۔

محمد نواز میری میز کے قریب میرے انتظار میں ہی کھڑا تھا۔ میں بیٹھ کر اس سے پوچھ کر رجسٹر میں سب مزدوروں کی حاضری مکمل کر چکا تو وہ شرمیلی کنواری لڑکیوں کی طرح ناخن کترتے ہوئے بولا "صاحب! برا نہ مانیں تو ایک بات کروں؟"

مجھے کافی حد تک اندازہ تھا کہ وہ کیا بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے فلمی مغلِ اعظم کا سا لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تمھیں جو کچھ کہنا ہے بلا خوف و خطر کہو محمد نواز۔"

وہ اپنی سنجیدگی کے شکنجے میں گرفتار تھا۔ میرے لہجے سے ذرا بھی محظوظ ہوئے بغیر بدستور دانت کترتے ہوئے بولا۔ "آپ یہاں نئے ہیں جی... بھلے بھانس معلوم ہوتے ہیں... میں آپ کو اپنا سمجھ کر مشورہ دینا چاہتا تھا... یہ جو لڑکی ہے نا لالی! اس کے چکر میں آپ نہ پڑیں۔ اس کا کام ہی مردوں کو بے وقوف بنانا ہے۔ وہ جو پچھلے ٹائم کیپر تھے ناشاہد صاحب، وہ بھی شروع دن سے اس کے چکر میں آ گئے تھے۔ اسی لیے وہ نہ تو کبھی جم کر کام کر سکے اور نہ ہی اس لڑکی سے انھوں نے کوئی فیض پایا۔ آپ نوجوان ہیں۔ آپ کا خون گرم ہے، اس عمر میں ایسے بُلاوے بہت اچھے لگتے ہیں مگر عشق کے ساتھ ساتھ تھوڑا بہت عقل سے بھی کام لینا چاہیے۔ آجکل کے زمانے کا تقاضا یہی ہے۔"

"میں تمھارے خلوص، محبت اور اپنائیت کے لیے بے حد شکر گزار ہوں محمد نواز۔" میں نے بھی اسی کی طرح سنجیدہ ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم نے مجھے اس قابل جانا کہ پہلے ہی دن مخلصانہ مشورے سے نوازا۔ یہ تمھاری عنایت ہے۔ عرض یہ ہے کہ میں شکل سے شاید بے وقوف نظر آتا ہوں مگر اتنا بے وقوف ہوں نہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں لڑکیوں کے ہاتھوں بے وقوف بننے کا ذرا شوقین واقع ہوا ہوں۔ اگر لالی مجھے بے وقوف بنا رہی ہے تو بنانے دو۔ لالی جیسی لڑکیوں کے ہاتھوں بے وقوف بننا روز روز تو نصیب نہیں ہوتا نا؟"

وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ناخن کترنا بھی بھول گیا۔ اس نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ کیا مگر پھر ملتوی کر دیا اور میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس نے شاید مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے خیال میں یہ اس کا عقلمندانہ فیصلہ تھا کہ اس نے ایک شخص کو بے وقوف بننے کے لیے کھلا چھوڑ دیا تھا۔

اس شام رہائش کے لیے مجھے ایک خیمہ الاٹ کر دیا گیا جس میں لوہے کا ایک پلنگ، ایک چھوٹی سی تپائی اور کرسی موجود تھی۔ ضرورت کی دوسری چند چھوٹی موٹی چیزیں میں نے کیبنوں پر مشتمل عظیم الشان 'شاپنگ سینٹر' سے خرید لیں اور رات کو آرام سے ٹانگیں پسار کر سو گیا۔ روٹی، سر چھپانے کو جگہ اور عشق کے مواقع۔ یہ تین چیزیں مجھے میسر تھیں۔ اب مجھے کسی چیز کی فکر نہیں تھی۔

اس دن کے بعد سے میرا یہ معمول بن گیا کہ دوپہر کا کھانا میں لالی کے خیمے میں کھاتا۔ اتنی احتیاط البتہ میں ضرور کرتا تھا کہ جب وہ کھانے کے وقفے میں اپنے خیمے کی طرف روانہ ہوتی تو میں اس کے ساتھ نہیں جاتا تھا البتہ بعد میں ٹہل قدمی کے سے انداز میں وہاں جا پہنچتا تھا۔

بابا مجھ سے اب اور بھی زیادہ بے تکلف ہو چکا تھا۔ ہم لنگوٹیے دوستوں کی طرح گفتگو کرتے تھے۔ باقاعدگی

سے کھانا کھلا کر وہ مجھ پر جو احسان کرتے تھے، اس کا بدلہ چکانے کی میں اس طرح کوشش کرتا تھا کہ کبھی پکانے کے لیے مرغی، مچھلی یا کوئی اور اچھی چیز لے جاتا تھا۔ جو ویسے ان کے ہاں نہیں پکتی تھی۔ کبھی مٹھائی کا ڈبا بھی لے جاتا۔ مٹھائی لالی کو بہت پسند تھی حالانکہ وہ خود مصری کی ڈلی تھی۔ کبھی میں بابا کے لیے مہنگی سگریٹ کا پیکٹ لے جاتا جنھیں وہ بڑے اہتمام سے پیتا اور ہر کش پر یوں واہ واہ کرتا جیسے کسی صاحبِ ذوق نے کوئی عمدہ شعر سن لیا ہو۔

بابا اس حد تک بے تکلف ہو چکا تھا کہ کبھی کبھی دو چار روپے ادھار بھی مانگ لیتا تھا اور میں اسے دو چار کے بجائے دس بیس دے دیا کرتا تھا اور یہ ایک ایسا ادھار تھا جس کے متعلق ہم دونوں کو ہی معلوم تھا کہ کبھی چکایا نہیں جائے گا۔

ان سب باتوں سے میرا مقصد محض احسان کا بدلہ چکانا نہیں تھا بلکہ میں ان عنایتوں کے بوجھ تلے اس بھاری بھرکم عفریت کو دبانے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ بھی اللہ کا بندہ ایک ہی شاہکار تھا۔ اس شانِ بے نیازی سے میرے تمام نذرانے قبول کرتا تھا جیسے میری آنے والی نسلوں پر احسان کر رہا ہو اور محض میرا دل رکھنے کے لیے انھیں شرفِ قبولیت بخش رہا ہو۔

ایک بار سرسری انداز میں میں نے باپ بیٹی کے سامنے سابق ٹائم کیپر کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا "سنا ہے وہ بھی دوپہر کا کھانا آپ ہی کے ہاں کھاتا تھا؟"

میرا خیال تھا کہ بابا پہلے تو پوچھے گا "تمھیں کس نے بتایا؟" پھر وہ تردید کرنے کی کوشش کرے گا لیکن اس کے برعکس وہ بلا تامل بولا "ہاں کھاتا تھا۔" اس کے پھولے پھولے چہرے پر میں نے پہلی مرتبہ سختی و درشتی کے آثار دیکھے "ہم نے اسے بھی پردیسی جان کر اپنی مروت اور جذبۂ مہمان نوازی سے مجبور ہو کر اسی طرح کھانے کی دعوت دی تھی جس طرح تمھیں دی لیکن وہ بدبخت سمجھا کہ کھانے میں لالی بھی شامل ہے۔ وہ جلد ہی اس پر بھی ہاتھ صاف کرنے کی فکر میں مبتلا ہو گیا۔"

لالی کے گندمی رخساروں پر ہلکی سی سرخی دوڑ گئی اور اس نے یوں باپ کی طرف دیکھا گویا کہہ رہی ہو "بابا! کاش تم ایسے بے ہودہ انداز میں گفتگو کے عادی نہ ہوتے۔"

بابا کے تاثرات اور لب و لہجے کو محسوس کرتے ہوئے ایک بار تو میں بھی اپنے بارے میں سوچ میں پڑ گیا کہ کہیں میں بھی اپنی شامت کو تو دعوت نہیں دے رہا؟

لالی میرے ذہن پر اس حد تک سوار ہو چکی تھی کہ زیادہ فاصلے سے مجھے درخت اور کھمبا بھی لالی نظر آتا تھا۔

تین مہینے یوں گزر گئے جیسے کسی دلچسپ فلم کا میٹنی شو۔ میں کمپنی کے ماحول میں خوب رچ بس گیا تھا اور میرا وہاں اچھی طرح دل لگ گیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں کسی لمبی پکنک پر آیا ہوا ہوں۔

نہروں میں پانی آ گیا تھا۔ فاضل وقت میں میں تیراکی کرتا۔ علی الصباح دوڑ لگاتا، دوسری ورزشیں کرتا۔ جنگلوں اور ویرانوں میں صبح کا سماں بے حد فرحت بخش ہوتا ہے۔ دن بھر کے لیے انسان کو تازہ دم کر دیتا ہے۔

میرا ایک لمحے کے لیے بھی فارغ بیٹھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے ڈیوٹی کے علاوہ بھی دن بھر کے لیے کوئی نہ کوئی مصروفیت ڈھونڈ لی ہوئی تھی۔ ڈرائیوروں کو چائے پانی سے خوش رکھ کر میں نے ہلکی بھاری ہر طرح کی گاڑیاں چلانی سیکھ لی تھیں اور اب دن بہ دن ان کی ڈرائیونگ میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چوکیدار وہاں دو تھے۔ ان میں سے ایک جس سے میرا پہلے ہی روز سامنا ہوا تھا، اس سے میری سُر تال ذرا مل گئی تھی۔ کبھی کبھی میں اسے بھی چائے پانی اور دیگر بہانوں سے بہلا پھسلا کر جنگل میں لے جاتا اور اس کی رائفل سے نشانے بازی کی مشق کرتا لیکن اس کے لیے مجھے گولیوں کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی اور گولیاں خاصی مہنگی تھیں۔ بہرحال جتنی بھی گنجائش نکل پاتی تھی، اس حد تک میں اس مہنگے مشغلے کو بھی جاری رکھتا تھا۔ نشانہ میرا خاصا ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا۔

کبھی کبھی میں سوچتا تھا کہ شاید لاہور کا رُخ نہ کر کے میں نے اچھا ہی کیا تھا۔ فلمی دنیا اور دیگر رونق میلوں کی کشش اپنی جگہ لیکن عین ممکن تھا کہ میں اپنی کل پونجی یعنی دو ہزار خرچ کرنے کے بعد نوکری کی تلاش میں جوتیاں چٹخا رہا ہوتا یا پھر اسٹیشن پر قلیوں کے جمِ غفیر میں شامل ہو چکا ہوتا اور ڈرائیونگ، نشانے بازی یا دیگر دفتری کام سیکھنے کے بجائے مسافروں کے بازو ان کے کندھوں سے علیحدہ کرنے کی تربیت حاصل کر رہا ہوتا۔

یہاں تقریباً سبھی لوگ میرے دوست بن چکے تھے، مجھے جاننے لگے تھے۔ سجاد صاحب کو میں نے اپنی آمد کے بعد مزید صرف دو مرتبہ یہاں دیکھا تھا۔ ان کی عدم موجودگی میں عملاً دو آدمی میرے باس ہوتے تھے۔ سائٹ انجینئر اور پروجیکٹ منیجر صاحب۔

سائٹ انجینئر صاحب کو تو سر کھجانے کی بھی فرصت نہیں ہوتی تھی۔ بے خیالی میں وہ عموماً سر کی جگہ گھٹنا کھجا لیتے تھے۔ چنانچہ انھیں کچھ علم نہیں ہوتا تھا کہ میں ڈیوٹی انجام دے رہا ہوں یا نہیں اور اگر دے رہا ہوں تو کس طرح۔ پروجیکٹ منیجر صاحب البتہ کبھی کبھی میری کارکردگی کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔

بہرحال مجھ سے افسران اور دیگر ملازمین سب ہی خوش تھے۔ سچی بات یہ ہے کہ افسران کے لیے میں نہایت ہی تابعدار قسم کا ملازم تھا اور وہ غلطیاں بھی تسلیم کر لیتا تھا جو میں نے نہیں کی ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ میں حتی الامکان خوبصورتی اور چابکدستی سے انھیں وقتاً فوقتاً مکھن بھی لگاتا رہتا تھا جس سے انھیں کافی فرحت حاصل ہوتی تھی کیونکہ اس ویرانے میں وہ خشک قسم کے فرائض انجام دیتے ہوئے کافی تنگ آ چکے ہوتے تھے۔

ساتھی ملازمین کے لیے میں کافی یار باش آدمی تھا۔ ہر ایک کی سننے والا، ہر ایک کو چائے پانی کی دعوت دینے والا اور عملی طور پر نہ سہی لیکن لفظی طور پر ہر ایک کا دکھ بٹانے والا۔ اس لیے وہ بھی مجھ سے خوش رہتے تھے۔ میں اپنی جگہ خوش تھا اور میری خوشیوں میں اضافہ لالی کو دیکھ کر ہوتا رہتا تھا۔

مجھے لالی سے اظہارِ عشق کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ میں اس کے بارے میں کیا کچھ سوچتا ہوں، کیوں سوچتا ہوں۔ انھی سوچوں کا نتیجہ تھا کہ کبھی کبھی رات کو سوتے میں اچانک میری آنکھ کھل جاتی تھی۔ میرا جسم پسینے میں تر ہوتا تھا لیکن حلق میں کانٹے پڑے ہوتے تھے۔ میں اٹھ کر ٹھنڈے پانی کے کئی گلاس پیتا تھا اور بہت دیر کروٹیں بدلتا تھا، تب کہیں جا کر نیند آتی تھی۔

منظّل شاہ کے ہاں مجھے پینے پلانے کی تھوڑی سی عادت پڑ گئی تھی۔ اس عادت نے دو ایک بار مجھے معمولی سا تنگ کیا۔ ایک ڈرائیور سے ذکر کیا تو ایک بار اس نے ٹھرا پلایا۔ بڑا بکواس لگا۔ میں نے دوبارہ پینے کی کوشش نہیں کی۔ تاہم طلب باقی رہی لیکن اسی طرح جیسے راکھ میں چنگاری دبی ہو اور رفتہ رفتہ اپنی معمولی سی حرارت بھی کھو رہی ہو۔

ایک روز لالی کام پر نہیں آئی۔ دوپہر تک میں یوں بے چین رہا جیسے میری کمر پر کوئی بچھو چڑھا ہوا ہو۔ میرا کاغذی کام اب کافی بڑھ چکا تھا۔ ورنہ شاید میں دوپہر سے پہلے ہی خیمے میں جا کر وجہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔

لنچ بریک ہوتے ہی میں گویا رسّی تڑا کر اس کے خیمے کی طرف بھاگا۔ وہ سر پر کپڑا باندھے رضائی لپیٹے پڑی تھی اور... اور خیمے میں تنہا تھی۔ حتیٰ کہ وہ ناہنجار بورشٹ قسم کا کتا بھی خیمے میں نہیں تھا۔

لالی نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور میں گویا وہیں قتل ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور گو کہ یہ سرخی طبیعت کی

خرابی کے باعث تھی لیکن یہ بات مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ مجھے تو یہ خمار ہی کی سرخی محسوس ہوئی تھی اور میرا دل اچھل پچھل ہو کر رہ گیا تھا۔ اس کی رنگت بھی اس وقت تپے ہوئے تانبے سے مشابہ نظر آ رہی تھی۔

"کیا ہوا لالی تمھیں؟" میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔

"کچھ نہیں..." وہ دلکش انداز میں مسکرائی۔ "بس ذرا بخار چڑھ گیا ہے۔ بابا میرے لیے پنڈ سے دوائی لینے گیا ہے۔" قریبی گاؤں یہاں سے تقریباً تین میل کے فاصلے پر تھا جہاں سے ضرور وغیرہ چھوٹی موٹی بیماری کی صورت میں دوا لے آتے تھے۔ ایک شخص وہاں ڈسپنسری کرتا تھا جس کی کوالیفکیشن یہ تھی کہ کچھ عرصہ وہ ایک ڈاکٹر کے ہاں کمپاؤنڈر رہ چکا تھا۔

"اور موتی کہاں ہے؟" میں نے کتے کے بارے میں بھی یوں دریافت کیا جیسے وہ گھر کا ایک فرد بھی ہو اور مجھے اس کی عدم موجودگی پر خاصی تشویش ہو۔

"وہ بھی بابا کے ساتھ گیا ہے۔ تمھیں شاید علم نہیں کہ بابا جب باہر جاتا ہے تو موتی اس کے ساتھ ضرور جاتا ہے۔" لالی نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے اس کی مسکراہٹ میں شرارت کی جھلک سی محسوس کی۔ میں نے سکون کی سانس لی تو اس کی آنکھوں میں شرارت کا رنگ گہرا ہو گیا۔

"تم نے مجھے اطلاع کر دی ہوتی۔ میں تمھیں دوا منگوا دیتا اور اگر بابا ہی کا جانا ضروری ہوتا تو اسے کمپنی کی کسی گاڑی میں بھجوا دیتا۔" میں نے پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لاؤ نبض دکھاؤ، کتنا بخار ہے؟"

اس نے کلائی مجھے تھما دی۔ کلائی واقعی تپ رہی تھی اور نبض بھی تیز چل رہی تھی۔ میں کلائی تھامے رہا حتیٰ کہ بخار میری طرف بھی منتقل ہو گیا۔

میری طرف بغور دیکھتے ہوئے وہ بولی "واضح رہے کہ بابا بندوق بھی لے کر گیا ہوا ہے اور میرے اندازے کے مطابق اس کی واپسی میں زیادہ دیر نہیں ہے۔" اس کے الفاظ ایسے ہی تھے جیسے مجھے خبردار کر رہی ہو، باز رکھنا چاہتی ہو لیکن لہجے میں شرارت تھی اور آنکھوں میں دعوت... اور پھر وہ کوئی مزاحمت بھی نہیں کر رہی تھی۔

"بابا کے پاس بندوق کا لائسنس ہے کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بابا کو دیکھ کر اور پھر بندوق کی حالت دیکھ کر کوئی اس سے لائسنس طلب نہیں کرتا۔ زیادہ پُررونق علاقوں میں وہ جاتا ہی نہیں۔" لالی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں نشیلا پن آ چلا تھا۔

"بندوق ساتھ رکھنے کا تو وہ تکلف ہی کرتا ہے۔" میں نے کہا۔ "لڑنے کے لیے اسے بندوق کی کیا ضرورت ہے۔"

"بڑے آدمیوں کو اپنا رعب شوب بھی تو رکھنا ہوتا ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولی۔ اس میں تو کوئی شک نہیں تھا کہ بابا بہت بڑا آدمی تھا۔ جسامت میں۔

کافی دیر بعد خیمے کے قریب ہی کہیں بابا کی آواز یوں ابھری جیسے رات کے سناٹے میں کہیں شیر دہاڑ اٹھا ہو۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ کوئی خوشخبری لے کر آیا ہو اور لالی کو سنانے کے لیے بے چین ہو۔

ہم اس وقت کچھ زیادہ باعزت حالت میں نہیں تھے۔ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں اور ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ گئے۔ میں احمقانہ انداز میں چارپائی سے اتر کر جوتے پہننے لگا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ مرنے سے پہلے انسان کا جوتے پہننا کچھ زیادہ ضروری نہیں ہوتا لیکن میں بابا کی بندوق کا کندا اپنے سر سے ٹکرانے تک اپنے آپ کو مصروف رکھنا چاہتا تھا۔

اسی عالم میں خیمے کا پردہ اٹھا اور بابا نے اندر قدم رکھا۔ مجھے صرف دو ہی چیزیں نظر آئیں۔ ایک تو اس کی پھڑپھڑاتی ہوئی مونچھیں اور دوسری اس کے کندھے سے جھانکتی ہوئی بندوق۔

اس لمحے میں نے انتہائی مایوسی کے عالم میں فیصلہ کیا کہ مجھے مقابلہ کرنا چاہیے۔ ڈوبتا ہوا آدمی بھی کسی حد تک ہاتھ پاؤں تو مارتا ہے۔ اسی ارادے سے میں نے سنبھلتے ہوئے اٹھنے کی کوشش ہی کی تھی کہ بابا کی آواز سنائی دی "کوئی بات نہیں... کوئی بات نہیں... میں تو جا رہا ہوں بابو صاحب! پھر آ جاؤں گا۔"

وہ اطمینان سے مڑا اور مونچھیں مروڑتا باہر چلا گیا۔ حیرت کی زیادتی سے شاید میں اس وقت اتنا ہونق نظر آ رہا تھا کہ لالی بے اختیار دانتوں میں چادر دبا کر کھی کھی کرنے لگی۔ کئی لمحے بعد میرے اوسان کچھ بحال ہوئے تو میں نے بے پناہ طویل سانس لی اور وہ بھی اس انداز سے گویا کسی اسٹیم انجن کا والو کھل گیا ہو۔

چند لمحے پہلے اس خیال سے میرے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑ چکے تھے کہ بابا نہ جانے کیسا ہنگامہ مچائے گا اور میں اس کے ہاتھ سے بچوں گا بھی یا نہیں لیکن اب جبکہ بلا سر سے ٹل چکی تھی تو میں شکر ادا کرنے سے پہلے حیرت میں مبتلا ہو چکا تھا۔

"کمال ہے... بابا کی غیرت جوش میں نہیں آئی۔" میں خودکلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

"ایک دفعہ ایک ڈاکٹر نے مجھے بتایا تھا کہ بعض انسانوں کے جسم میں خون کی کمی ہوتی ہے۔ بعض میں چونے کی اور بعض میں فولاد کی۔ بابا میں ذرا غیرت کی کمی واقع ہوئی ہے۔" لالی نے خوش دلی سے ہنستے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تلخی یا طنز کا شائبہ تک نہیں تھا۔ جس وقت میں بابا کی آواز سن کر سخت حواس باختہ ہو چکا تھا، اس وقت بھی وہ اسی طرح اطمینان سے تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے بابا کے ردِ عمل کا پہلے ہی سے اندازہ تھا۔

میں محض تھوک نگل کر رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہوں۔ وہ چادر کا کونا انگلی میں لپیٹتے اور کھولتے ہوئے بولی۔

"بابا دراصل میرا سگا باپ نہیں ہے۔"

ایک بار پھر میری کھوپڑی ہل کر رہ گئی۔ میں نے تھوک نگل کر پوچھا۔ "تو پھر وہ کون ہے؟"

"بس کوئی ہے..." اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "بہرحال ہے بہت اچھا آدمی... مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں کہ میرے ماں باپ کون تھے۔ کب اور کن حالات میں وہ مجھ سے جدا ہوئے۔ اس وقت وہ زندہ تھے یا مر چکے تھے جب میں بابا کو ملی۔ بابا کا کہنا ہے کہ میں نے اس وقت بولنا بھی نہیں سیکھا تھا اور میں ایک خارش زدہ بلی کی طرح کوڑے کے ڈھیر پر بیٹھی گلی سڑی چیزیں اٹھا کر کھا رہی تھی جب بابا نے مجھے اٹھایا۔ بہت دیر تک وہ اِدھر اُدھر میرے کسی وارث کو تلاش کرتا رہا اور جب کوئی نہ ملا تو اپنے خیمے میں لے آیا۔ بڑی محبت اور شفقت سے اس نے مجھے پالا ہے۔"

"سگا باپ نہ سہی..." میں نے واسکٹ پہنتے ہوئے کہا۔ "بہرحال جیسا کہ تم بتا رہی ہو کہ اس نے تمہیں کافی محبت و اپنائیت سے پالا ہے، اس صورت میں اسے کچھ تو اعتراض کرنا چاہیے تھا۔ میں تو چشمِ تصور سے کل پرسوں کے اخباروں میں کونے کھدرے میں لگی ہوئی خبر کی سرخی بھی دیکھ چکا تھا۔ 'باپ نے بیٹی اور اس کے آشنا کو قابلِ اعتراض حالت میں پا کر قتل کر دیا۔' اب اس سے زیادہ قابلِ اعتراض حالت کیا ہو سکتی تھی؟"

"دراصل بابا کچھ عجیب سا آدمی ہے۔" وہ بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ "اگر میں اس وقت صرف اتنا کہہ دیتی کہ تم میری مرضی کے خلاف خیمے میں گھسے ہو اور میری عزت پر حملہ آور ہوئے ہو تو وہ تمہیں جان سے مارنے کی کوشش کرتا۔ میری مرضی کے خلاف کوئی میری طرف انگلی بھی اٹھائے تو بابا کے ہاتھوں اس کی جان جا سکتی ہے لیکن...؟" وہ ایک بار پھر شرمیلے انداز میں انگلی پر چادر لپیٹنے اور کھولنے لگی۔ "تمہارے بارے میں تو اسے معلوم ہے نا کہ میں تمہیں پسند کرتی ہوں... تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔"

میں تو روزِ اوّل سے ہی اس کی محبت میں گرفتار تھا لیکن میں نے یہ بات کبھی اس سے کہی نہیں تھی۔ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا۔

تاہم اس دن کے بعد سے مجبوریاں کچھ زیادہ نہ رہیں۔ میں دوپہر کو کھانا کھانے لالی کے خیمے میں پہنچتا تو بابا اکثر ہی غائب ہوتا تھا یا غائب ہونے کی تیاریاں کر رہا ہوتا تھا۔ اسے کوئی نہ کوئی کام یاد آ جاتا تھا۔

وقت سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ان دنوں کوئی مجھ سے سیکھتا۔ ابتدا میں چند دن تک بابا سے نظریں چراتا رہا۔ میرا خیال تھا، وہ بھی مجھ سے نظر نہیں ملایا کرے گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس کا رویہ ایسا ہی تھا جیسے اسے علم ہی نہ ہو کہ اس کی عدم موجودگی میں کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے بھی نظر چرانا چھوڑ دیا۔

لالی گویا لڑکی نہیں ایک نشہ تھی۔ سگریٹ، چرس یا شراب وغیرہ سے کہیں زیادہ طاقتور نشہ۔ وہ میرے خون کے ذرات میں شامل ہو گئی تھی اور مجھے لگتا تھا کہ میں اس سے محروم ہوا تو میرے دماغ کی شریانیں پھٹ جائیں گی، میں مر جاؤں گا۔ میں جتنی دیر اس سے دور رہتا اس کی طلب میں تڑپتا رہتا۔

میں نے جب یہاں آنے کا قصد کیا تھا تو مجھے گمان بھی نہیں تھا کہ زندگی کی اتنی مسرتیں اور لذتیں اس ویرانے میں میری منتظر ہوں گی۔ اب تو میں دن میں نہ جانے کتنی بار شکر کرتا تھا کہ میں نے لاہور کا رخ نہیں کیا تھا۔ شہر شاید میرے حق میں اتنا اچھا ثابت نہ ہوتا جتنا اچھا ویرانہ ثابت ہوا تھا۔

عیش کوشی کے اس دور کے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک روز جبکہ بابا خیمے میں موجود تھا اور لالی کھانا کھا کر جا چکی تھی تو بابا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "بابو صاحب! ایک بات کہوں... بُرا مت منانا... تمہیں اپنا سمجھ کر کہہ رہا ہوں۔"

میرا دل ڈوبنے لگا کہ شاید بابا مجھے اپنا سمجھتے ہوئے نہایت اپنائیت سے درخواست کرے گا کہ برخوردار کل سے یہاں کھانا کھانے قطعاً نہ آنا۔ اس میں تمہارا اور میرا دونوں ہی کا فائدہ ہے، بس بہت ہو چکی، اب ہمیں بخش دو۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "حکم کرو بابا! میرے خیال میں اب ہمارے تعلقات ایسے تو ہیں نہیں

کہ اتنے تکلف سے یوں اجازت لے کر گفتگو کی جائے۔"

"خوش رہو بابو صاحب!" وہ میرا کندھا تھپک کر بولا۔ "میں تمھیں گھر کا ایک فرد سمجھ کر ہی زبان کھول رہا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ میں شوگر کا مریض ہوں..."

مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ اس نے اس اہم 'راز' سے مجھے آگاہ کرنا کیوں ضروری سمجھا تھا۔ پھر مجھے گمان گزرا کہ شاید وہ مجھ سے فرمائش کرے گا۔ "بابو صاحب! شوگر کے علاج کا کوئی کارگر نسخہ تمھارے علم میں ہو تو ذرا بتا دو۔" لیکن شکر ہے اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "میں نے ایک ڈاکٹر سے بات کی ہے۔ وہ مکمل اور شرطیہ علاج کے دو ہزار روپے مانگتا ہے۔ بہت عرصے سے میں اس مرض کو نظرانداز کرتا آرہا تھا لیکن اب ہمت جواب دے رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے، میں گھل گھل کر مر نہ جاؤں۔ یہ میری زندگی اور موت کا سوال ہے بابو صاحب! اگر کہیں سے مجھے دو ہزار روپے قرضِ حسنہ مل جائے تو میری زندگی بچ سکتی ہے۔ جیسے ہی میرے پاس کہیں سے رقم آئی یہ پیسے واپس کر دوں گا۔"

میں نے سکون کی ایک طویل سانس لی کہ بات وہ نہیں تھی جو میں سمجھ رہا تھا۔

میں نے نہایت مخلصانہ اور سعادت مندانہ لہجے میں کہا۔ "اتنی سی بات کے لیے تم اتنی شرم اور جھجک میں مبتلا تھے بابا؟ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ کل ہی لا دوں گا دو ہزار روپے۔ میں بھلا کیسے گوارا کر سکتا ہوں کہ میرا اور لالی کا پیارا بابا محض دو ہزار روپے نہ ہونے کی وجہ سے گھل گھل کر ختم ہو جائے۔ تم نے پہلے ہی کیوں نہیں بتا دیا؟ اتنا عرصہ بیماری جھیلتے رہے۔"

"خوش رہو برخوردار!" وہ گویا جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے بولا۔ "میں دراصل یہی سوچ کر چپ رہا کہ معلوم نہیں تم اتنی رقم کا بندوبست کر سکو یا نہیں۔"

"بابا! مانا کہ میری نوکری معمولی ہے لیکن میں آدمی معمولی نہیں ہوں۔" میں نے اس موقع پر تھوڑی سی شیخی بگھارنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا۔ "نوکری تو بس میں اپنے بُرے دن گزارنے کے لیے کر رہا ہوں۔ بہرحال مجھے یقین ہے کہ بُرے دن اب زیادہ نہیں رہے۔"

بابا نے مجھے تھوک کے حساب سے دُعائیں دیں جو بھکاری کی دعاؤں کی طرح خلوص سے خالی تھیں۔ پھر چند منٹ اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے میں چلا آیا۔ میں شکر کر رہا تھا کہ شکر گڑھ سے میں جو دو ہزار کی رقم لے کر چلا تھا، وہ جوں کی توں محفوظ تھی۔

چھوٹے موٹے کام میں اوپر کے پیسوں سے چلاتا آیا تھا اور پھر مجھے تنخواہ ملنی شروع ہوگئی تھی۔

دوسرے دن جب دوپہر کے کھانے کے بعد لالی کام پر واپس چلی گئی تو میں حسبِ معمول چند منٹ کے لیے وہیں ٹھہرا رہا تاکہ اس کے بعد روانہ ہو سکوں۔ اسی وقفے میں میں نے رقم بابا کے حوالے کی۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ اس معاملے کو لالی سے مخفی رکھنا چاہتا ہے۔ مجھے بھی کیا ضرورت پڑی تھی کہ اسے بتاتا۔ میرا کام اس کے بغیر بھی چل رہا تھا بلکہ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ بات معلوم ہونے کے بعد وہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے اور بے رخی نہ اختیار کر لے کہ شاید میں اس کی نوازشات اور خلوص کا حساب روپے پیسے سے برابر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

رقم وصول پانے کے بعد بابا بڑے تواتر سے خیمے سے غائب رہنے لگا جس پر میں دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کرتا۔ کافی دن نہایت خوبصورت انداز میں گزر گئے۔ اس کے بعد بابا دوبارہ کھانے کے وقفے کے دوران خیمے میں موجود رہنے لگا۔ اب اس کا منہ کچھ لٹکا ہوا نظر آتا تھا۔

ایک روز تنہائی میسر آنے پر میں نے پوچھا۔ "کیا بات ہے... علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیا؟"

"فائدہ کیا خاک ہونا تھا جی... الٹا نقصان ہو رہا ہے۔" وہ ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔ "اب تو مجھے اٹھتے بیٹھتے چکر آنے لگے ہیں۔"

قدرے توقف کے بعد وہ بولا۔ "ایک اور ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے۔ وہ جرمنی سے خاص طور پر منگوائی ہوئی دواؤں سے علاج کرتا ہے لیکن وہ مکمل اور شرطیہ علاج کے چار ہزار روپے مانگتا ہے۔ اب میری تو ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ تمھارے سامنے ہاتھ پھیلاؤں۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں اور آواز رُندھ سی گئی۔ "مجھے اپنی تو کوئی فکر نہیں۔ میں گھل گھل کے مر جاؤں گا تو کون سا فرق پڑ جائے گا لیکن مجھے لالی کی فکر ہے۔ وہ کہاں جائے گی؟ کس کے آسرے پر رہے گی؟ میرے بغیر وہ تو دنیا میں چار دن بھی نہیں گزار سکتی۔"

میں کہتا تو یہ چاہتا تھا، 'بابا! لالی کی تم فکر نہ کرو۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔ آخر اب بھی اس طوفانِ بلا خیز کو میں نے ہی سنبھالا ہوا ہے۔' لیکن آدمی کو اب اتنا صاف گو بھی نہیں ہونا چاہیے۔

ادھر بابا نے کہنے کو تو کہہ دیا تھا کہ وہ میرے سامنے ہاتھ پھیلانا نہیں چاہتا لیکن درحقیقت ہاتھ اس نے پھیلا دیا تھا اور بڑے

طریقے سے پھیلایا تھا۔ میں چکرا کر رہ گیا تھا۔ شیخی بگھارنا مجھے کچھ مہنگا پڑ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ بے وقوف میں بن رہا تھا یا بابا۔ لیکن میری نظر میں اس سوال کی کوئی خاص اہمیت بھی نہیں تھی۔ اہم بات تو یہ تھی کہ مجھے ہر حال میں بابا کو خوش رکھنا تھا۔

سوال یہ تھا کہ میں چار ہزار روپے کہاں سے لاتا؟ اس سوال پر زیادہ تفصیل سے غور و خوض کیے بغیر میں نے حاتم طائی کی قبر پر ایک نہیں، دونوں لاتیں مارتے ہوئے کہا۔ "تم فکر ہی نہ کرو بابا! رقم کا تو کوئی مسئلہ نہیں۔ جہاں تمھارا دل مانے، علاج ضرور کراؤ۔ البتہ اس مرتبہ رقم کا انتظام کرنے کے لیے مجھے چند دن کی مہلت دے دو۔"

وفورِ جذبات سے بابا کی مونچھیں پھڑپھڑانے لگیں لیکن اس سے پہلے کہ وہ خوشی سے بے قابو ہوتا، میں لڑکھڑاتا ہوا خیمے سے باہر آگیا۔ بابا دراصل وہ دیو تھا جس کے قبضے میں میری لعل شہزادی تھی مگر یہ دیو ذرا کچھ مختلف قسم کا دیو تھا۔ خراج طلب کرتا تھا۔

میں واپس ڈیوٹی پر پہنچا تو مجھے ہر چیز کچھ دُھندلی دُھندلی سی نظر آرہی تھی اور کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بمشکل تمام اپنے دماغ کو درست رکھتے ہوئے میں رجسٹروں کی خانہ پُری میں مصروف رہا۔ اس دوران اکاؤنٹنٹ نے یونہی گھومتے پھرتے میری طرف دو چکر لگائے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ فارغ وقت میں وہ اِدھر اُدھر چکر لگاتا رہتا تھا۔ کبھی کسی کے پاس بیٹھ کر چائے والے پی لی۔ کبھی کسی سے گپ شپ کر لی۔

دوسرے چکر میں اس نے میری میز پر جھک کر بغور میری شکل دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ آج میرے رانجھے کا منہ کیوں لٹکا ہوا ہے؟ کس نے تمھارے جذبات پر دولتی مار دی ہے؟"

میں نے سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس وقت مجھے وہ بھی زہر لگ رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس کے بے ڈھنگے منہ پر ایک گھونسا رسید کر کے دانت پیٹ میں پہنچا دوں اور اس کی موٹے موٹے شیشوں والی عینک اتار کر کسی بھینس کے لگا دوں۔ مگر ہوتا عموماً یہی تھا کہ غصہ مجھے ان لوگوں پر آتا تھا جن پر میں اتار نہیں سکتا تھا۔ عموماً وہ میرے ساتھی اور مہربان ہی ہوتے تھے۔

بڑی مشکل سے میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ایک تو تم لوگ معلوم نہیں کیوں آجاتے ہو زخموں پر نمک چھڑکنے۔ جاؤ جا کر کسی گھوڑے کے ساتھ مل کر تھوڑی بہت گھاس چرلو۔ شکل سے لگ رہا ہے کہ بھوکے ہو۔"

"باتوں میں مت ٹالو میری جان! مسئلہ کیا ہے؟" وہ میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور موٹے موٹے شیشوں کے عقب سے اس کی آنکھیں یوں نظر آرہی تھیں جیسے ابھی نکل کر میز پر گر پڑیں گی۔

"مسئلہ بتا بھی دوں تو کیا فائدہ؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "تم کون سا حل کر دو گے۔"

"تم بتاؤ تو سہی میری جان۔" وہ کرسی کھینچ کر میرے قریب ہی بیٹھ گیا۔ "ہماری طاقت آزمائے بغیر ہی تم نے یک طرفہ فیصلے کرنے شروع کر دیے۔ تمھیں کیا معلوم کہ ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں۔"

"مجھے چار ہزار روپے کی ضرورت ہے۔ دے سکتے ہو؟" میں نے بات کو گھمائے پھرائے بغیر استہزائیہ لہجے میں کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اب کان دبا کر چلا جائے گا یا کمزور سی آواز میں پوچھے گا۔ "تمھیں کیا ضرورت آن پڑی چار ہزار روپے کی؟ چھڑے چھانٹ تو تم ہو۔ کہیں تمھیں کچھ بھیجنا نہیں ہوتا۔ تنخواہ میں تمھاری اچھی بھلی گزر بسر ہو جاتی ہے۔"

اس کے بجائے وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ انداز میں بولا۔ "میں تو خود تم سے اس موضوع پر بات کرنے کا موقع تلاش کر رہا تھا۔ ضرورتیں ہر شخص کو ہوتی ہیں اور ضروریات پوری کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ موجود ہوتا ہے لیکن اس کے لیے دفتری زندگی میں ایک دوسرے کے تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم نئے آدمی تھے اس لیے بات کرتے ہوئے ہم بھی ہچکچا رہے تھے۔"

"ہم سے مراد کون کون ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹ کر پوچھا۔

"میں اور کیشیئر۔" اکاؤنٹنٹ نے جواب دیا۔ "تمھارے آنے سے پہلے ہمارے چھوٹے موٹے سلسلے آرام سے چل رہے تھے۔ اب بھی باقی سلسلے تو چل رہے ہیں لیکن وہ سلسلہ جس میں تمھارے تعاون کی ضرورت ہے، رُکا ہوا ہے۔ اگر تم تعاون کے لیے تیار ہو تو کیشیئر سے چار ہزار روپے تو میں تمھیں ابھی دلا دیتا ہوں۔ اس کا حساب ہم بعد میں پورا کر دیں گے۔ تینوں کا فائدہ ہے۔ سب کو آئندہ بھی اپنا اپنا حصہ ملتا رہے گا اور کسی کا کچھ بگڑے گا بھی نہیں۔ کیا ارادہ ہے؟"

"مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے متذبذب لہجے میں پوچھا۔

"تمھیں روزانہ پچیس تیس ایسے مزدوروں کے کارڈز کی انٹری کرنا ہوگی جن کا کوئی وجود نہیں ہوگا۔" اکاؤنٹنٹ نے اطمینان سے کہا۔ "میں ان کا حساب بنا کر واؤچر منظور کر دیا

کروں گا اور کیشیئر ادائیگی کر دیا کرے گا۔ اس کے علاوہ مزدوروں کے لیے بعض اوزاروں کی خریداری اور اس کے ساتھ ساتھ اوور ٹائم کا حساب بھی تمہارے ہی توسط سے بنتا ہے۔ اگر تم اصل ضروریات کے ساتھ پانچ دس فرضی ضروریات کی فہرست بھی بنا کر آگے بڑھا دیا کرو تو میں اور کیشیئر آنکھیں بند کر کے باقی کام کر دیا کریں گے۔ منظور ہے؟"

میں خاموش رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ بابا کا مطالبہ پورا کرنے کے لیے میرے سامنے کوئی جائز طریقہ نہیں ۔۔ اور مطالبہ پورا نہ ہونے کی صورت میں کالا دیو میرے اور لعل شہزادی کے درمیان حائل ہو سکتا تھا اور میری رگوں میں چونکہ جوانی کا آتش فشاں کچھ زیادہ ہی آفت مچائے ہوئے تھا، اس لیے مجھے شہزادی سے ترکِ تعلق گوارا نہیں تھا۔

ہچکچاہٹ مجھے اس لیے نہیں تھی کہ میرا کردار یا اخلاق بہت بلند تھا۔ میں بالکل آپ جیسا یا آپ کے دوستوں جیسا عام سا آدمی تھا۔ خواہشیں مجھے بھی اسی طرح ترغیب دیتی تھیں جس طرح ہمارے معاشرے کے بیشتر انسانوں کو دیتی ہیں۔ میں ان نایاب لوگوں میں سے نہیں تھا جو لالچ اور ترغیبات کے سیلاب میں چٹان بن کر کھڑے رہتے ہیں۔ میں بہت ہی معمولی اور حقیر سا آدمی تھا۔

میری ہچکچاہٹ کی وجہ صرف سجاد صاحب تھے۔ وہ شریف آدمی تھے۔ ان کے چہرے پر میں نے ہمیشہ سب کے لیے شفقت، محبت اور مہربانی کا سایہ دیکھا تھا۔ مزدور سے لے کر سائٹ انجینئر تک، وہ سب ہی کے کام آنے کی کوشش کرتے تھے۔ مجھ پر ان کا یہ احسان کیا کم تھا کہ جب میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح حالات کے دوش پر ادھر اُدھر بھٹکنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا تو انھوں نے ہی میرا ہاتھ تھام کر گویا مجھے سنبھلنے کا موقع دیا تھا۔

وہ سب پر حتی الوسع اعتماد کرتے تھے اور انھیں نقصان پہنچانے پر میرا دل آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپنی ہچکچاہٹ کی یہی تفصیلی وجہ اکاؤنٹنٹ کو بتا دی۔

وہ کرسی کچھ اور آگے کھسکاتے ہوئے بولا "سجاد صاحب کے بارے میں ہم سب کے بھی یہی جذبات ہیں جو تمھارے ہیں لیکن ہم اپنی دانست میں انھیں نقصان نہیں پہنچا رہے ہوتے بلکہ فاضل کام کیے بغیر تھوڑا سا فاضل معاوضہ حاصل کر رہے ہوتے ہیں۔ سجاد صاحب کو جس نوعیت کے ٹھیکے ملتے ہیں، ان میں انھیں لاکھوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ اس میں سے اگر سال میں ایک دو لاکھ ہم تم جیسے لوگ اِدھر اُدھر کر لیتے ہیں تو اس سے انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ رقم ان کی جیب سے یعنی اصل سرمائے سے تو نہیں نکلتی، منافع ہی میں سے کم ہوتی ہے۔ چنانچہ اسے سجاد صاحب کا نقصان نہیں سمجھا جا سکتا۔"

اس بدمعاش کی یہ دلیل کام کر گئی۔ دل میں شیطان تو ویسے ہی قلابازیاں کھا رہا تھا۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ جس اسامی پر میں کام کر رہا تھا، وہ کسی خاص اہمیت کی حامل تھی۔ اب اکاؤنٹنٹ نے راستہ دکھا دیا تھا تو میرے جسم میں سنسنی سی دوڑنے لگی تھی۔

بالآخر میں نے تعاون کی ہامی بھر لی اور دوسرے روز اکاؤنٹنٹ نے مجھے چار ہزار روپے لا دیے جنھیں لے کر میں کھانے کے وقفے میں دوڑا دوڑا لالی کے خیمے میں پہنچا۔ کھانا اور گپ شپ کے بعد جب لالی واپس کام پر چلی گئی تو میں نے رقم نکال کر بابا کے حوالے کی۔

دو ہزار ملنے پر بابا کی مونچھیں جذبۂ تشکر سے جس حد تک پھڑپھڑائی تھیں، اب اس سے زیادہ زور سے پھڑپھڑائیں۔ آخر رقم بھی تو زیادہ تھی۔

میرا بہت دل چاہ رہا تھا کہ لالی کو بھی علم ہونا چاہیے کہ میں اس کے بابا کو کیا کچھ عنایت کر رہا ہوں لیکن بابا نے پہلے ہی مجھے منع کر دیا تھا کہ ہمارے درمیان جو بھی لین دین ہو، لالی کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے۔

"وہ بڑی خوددار لڑکی ہے۔" بابا نے کہا تھا "اگر اسے معلوم ہو گیا کہ میں نے تم سے مدد طلب کی تھی اور تم مدد کر رہے ہو تو وہ ہم دونوں ہی سے روٹھ جائے گی۔ اس کی خودداری کا اندازہ تم اسی بات سے لگا لو کہ وہ ایسی نرم و نازک لڑکی ہوتے ہوئے بھی پتھر توڑ کر یا پھر اینٹیں ڈھو کر اپنا ہی نہیں، میرا بھی پیٹ پالتی ہے۔ حالانکہ جس طرح وہ تمہارے ساتھ سیٹ ہے اگر کسی امیر آدمی کے ساتھ سیٹ ہو جاتی تو عیش و آرام سے گزر بسر کر سکتی تھی لیکن وہ محض اپنا اُلو سیدھا کرنے کی قائل نہیں ہے۔ اپنے دل کے کہنے پر چلتی ہے۔ تم پر اس کا دل آ گیا ہے تو اپنا سب کچھ تم پر نچھاور کرنے لگی ہے جس سے اسے کوئی دلچسپی نہ ہو وہ ٹیڑھی آنکھ سے اس کی طرف دیکھ بھی لے تو ہزار گالیاں سناتی ہے۔ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔"

چنانچہ میں بڑی فرمانبرداری سے نہایت خفیہ انداز میں بابا کو امداد بہم پہنچا رہا تھا۔ لالی کو متاثر کرنے کی کیا ضرورت تھی، وہ بیچاری تو پہلے ہی مجھ سے بہت بری طرح متاثر تھی اور کوئی بھی موقع میسر آنے پر مزید متاثر ہوتی رہتی تھی۔

چار ہزار وصول پا کر بابا نے میری توقع کے مطابق ایک

بار پھر آئے دن خیمے سے غائب رہنا شروع کر دیا۔ کھانا وہ پکا کر رکھ جاتا تھا۔ بڑا ہی مہربان بابا تھا۔ ہماری ہر طرح کی ضروریات کا خیال رکھتا تھا۔

اکاؤنٹنٹ اور کیشیئر سے میرے تعلقات بہت گہرے اور معاملات نہایت عمدگی سے طے ہو چکے تھے۔ چار ہزار کا حساب بھی برابر ہو چکا تھا اور مزید تھوڑا بہت حصہ بھی مجھے وصول ہونے لگا تھا۔ ضمیر کی خلش نے بہت کم عرصہ مجھے بے چین کیا تھا۔ اس کے بعد روپے پیسے کی کشش نے یہ خلش دبا دی تھی۔ میرے پاس رقم پس انداز ہونے لگی تھی۔ گو کہ مجھے معلوم تھا کہ یہ رقم میرے نہیں، غالباً بابا ہی کے کام آئے گی پھر بھی بہر حال روپے کی موجودگی کا ایک الگ ہی خمار ہوتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کچھ اکڑ کے چلنے لگا تھا لیکن جب کبھی سجاد صاحب سائٹ پر آتے تھے اور میرا ان سے سامنا ہوتا تھا تو میں جاڑے کی ماری ہوئی بلی کی طرح اپنی کھال میں سکڑ کر رہ جاتا تھا۔

کافی عرصہ ہمیں غریبی دعوے کی عیش و عشرت کے مواقع فراہم کرنے کے بعد بابا ایک بار پھر خیمے میں پایا جانے لگا۔ اب وہ کچھ ہشاش بشاش نظر آتا تھا۔ ایک روز مجھے بتانے لگا کہ ڈاکٹر نے اس کے فلاں فلاں ٹیسٹ لینے کے بعد فیصلہ دے دیا ہے کہ اس کا شوگر کا مرض بالکل دور ہو چکا ہے۔

ابھی مبارکباد کے الفاظ میرے منہ میں ہی تھے کہ وہ پہلے کی نسبت کہیں کم ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا "اب تو میں بھی سوچنے لگا ہوں کہ لوگ کیا کہتے ہوں گے۔ بیٹی کام کرتی ہے اور ہٹا کٹا باپ گھر میں پڑا رہتا ہے۔ اگر کہیں سے تھوڑے سے پیسے مل جائیں تو میں بھی میدان میں کیبن لگا کر کچھ سودا سلف رکھ لوں۔ دکانداری تو بیٹھنے کا کام ہے اور بیٹھنے کا کام میں آسانی سے کر سکتا ہوں۔"

مجھے اب زیادہ گھما پھرا کر بات کرنا ضروری محسوس نہیں ہوا۔ میں نے سیدھے سادے طریقے سے پوچھا "کتنی رقم چاہیے بابا؟"

"تین ہزار کافی ہوں گے۔" اس نے بھی نہایت سیدھے سادے طریقے سے جواب دیا۔

"مل جائیں گے۔" میں نے اختصار سے کہا "چند دن صبر کرو۔"

چند دن بعد میں نے یہ رقم بھی اسے مہیا کر دی جس کے بعد اس نے بالا بالا ہی میدان میں کوئی کھوکھا پسند کر لیا جو حال میں ہی خالی ہوا تھا جس کا مجھے علم ہی نہیں تھا۔ اس کے بعد وہ سودا سلف لینے شکر گڑھ چلا گیا۔

شام کو وہ منہ لٹکائے اور سر میں کچھ خاک ڈالے اس چھپر میں آیا جہاں بیٹھ کر میں کام کرتا تھا اور اس نے تقریباً روتے ہوئے مجھے بتایا کہ بس میں اس کی جیب کٹ گئی... اور وہ کرایہ ایک راہگیر سے مانگ کر بمشکل واپس پہنچا ہے۔

مجھے کچھ اسی قسم کے افسانے کی توقع تھی لیکن یقین نہیں تھا۔ اب تک میں تذبذب میں رہتا تھا کہ شاید بابا جو ضرورت بیان کر رہا ہے، وہ واقعی اسے درپیش ہو لیکن اب میرا ذہن ایک طرف ہو چکا تھا۔ بابا ذرا قدرے مختلف قسم کا دلال تھا۔ لالی ایک طرح سے اس کی ملکیت تھی، بیٹی تو تھی نہیں۔ وہ اس سے جتنا فائدہ اٹھا سکتا تھا اٹھا رہا تھا۔

گویا اب ہمارے درمیان 'کچھ لو کچھ دو' کا اصول مبہم نہیں رہا تھا، واضح ہو چکا تھا۔ مجھے اس سمجھوتے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہاں ایک ہلکی سی خلش ضرور تھی کہ جس بے چاری کی جوانی کا خراج کھایا جا رہا ہے اسے علم ہی نہیں تھا کہ بالا بالا کیا ہو رہا تھا۔ وہ تو اپنی دانست میں عشق میں تن من وار چکی تھی۔

مجھے حیرت تھی کہ بابا اتنی رقموں کا کرتا کیا تھا؟ کہاں ٹھکانے لگا کر آتا تھا؟ میں نے پوچھ کر اس پر یہ تو ظاہر کرنا نہیں تھا کہ میں اس پر اعتبار نہیں کرتا اور اس کا طریقۂ واردات سمجھ چکا ہوں۔ میں نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ شاید وہ کوئی مہنگا قسم کا نشہ کرتا ہو، کہیں بازارِ حسن میں گانا وانا سنتا ہو یا ممکن ہے ایک لڑکی کا خراج وصول کر کے کسی دوسری عورت کے قدموں میں جا رکھتا ہو۔ کچھ بھی ممکن تھا۔

بابا گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا "کام کا خیال میں نے اب دماغ سے نکال دیا ہے۔ میری کوشش یہی ہو گی کہ آئندہ میں تمہیں تکلیف نہ دوں۔ میں تمھارے احسانات کے بوجھ تلے دب چکا ہوں۔"

"ایسے نہ کہو بابا! تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم مجھے اپنا سمجھتے ہو۔ اس صورت میں تمھیں مجھ سے تکلف نہیں برتنا چاہیے۔ تمہیں جب بھی اور جیسی بھی ضرورت ہو، تم بلاجھجک مجھ سے کہہ سکتے ہو۔" میں نے یہ بات اسی طرح کہی تھی جس طرح کوئی اداکار کیمرے کے سامنے مکالمہ بولتا ہے۔ رٹا رٹایا، خلوص اور وابستگی سے عاری مکالمہ۔

بابا نے اس کے بعد واقعی خاصے طویل عرصے تک کوئی فرمائش نہیں کی لیکن اس دوران ایک نئی مصیبت اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک روز لالی نے روتے ہوئے مجھے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ چند دن پہلے تک تو اسے محض اندیشہ تھا لیکن اب پختہ یقین ہو چکا تھا۔

میں بے حد پریشان ہوگیا "لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟ میں نے متوحش لہجے میں کہا "ہم نے تو ہر ممکن احتیاط..." اشارتاً اسی نے مجھے بہت کچھ سکھایا تھا اور اسی لیے میں فکر میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔

"بے احتیاطی سرزد ہوتے کیا پتا چلتا ہے" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ وہ سر جھکائے تخت پر بیٹھی تھی اور پاؤں کے انگوٹھے سے کچے فرش کو کُرید رہی تھی۔

"اب کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔ میری آنکھوں کے آگے نیلے پیلے تارے سے ناچ رہے تھے۔ مجھے یہ فکر نہیں تھی کہ مجھ پر یا لالی پر کیا الزام آئے گا، اگر یہ راز کھل گیا تو قبیلے والوں کا کیا ردِعمل ہوگا؟ لالی کو کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا یا میرے لیے کیا الجھن کھڑی ہوگی۔

مجھے تو صرف اور صرف ایک ہی تشویش تھی کہ اگر وہ بے گناہ روح اس دنیا میں آگئی تو کیا وہ لاوارثوں کی طرح ان دریدہ و شکستہ خیموں میں پرورش پائے گی؟ ناجائز سہی، ہوگا تو وہ میرا خون۔ اس کا کیا بنے گا؟ اس سے تو بہتر تھا کہ وہ دنیا میں نہ ہی آئے۔

"میں نے اس پہلو پر لالی سے بات کی تو وہ انگلیاں مروڑتے ہوئے بولی "سوچا میں نے بھی یہی تھا... یہاں خیموں میں ایک عورت ہے... وہ میری رہنمائی کرسکتی ہے... وہ ایک عورت کو جانتی ہے جو شاید کچھ کچی قسم کی ڈاکٹر ہے یا شاید پڑھی لکھی دائی ہے... لیکن مسئلہ یہی ہے کہ وہ بہت پیسے مانگتی ہے... اور پھر مجھے چند دن چھٹی بھی کرنی پڑے گی... بیماری کا ڈھونگ رچانا پڑے گا..."

"ان سب باتوں کی تم کوئی فکر نہ کرو" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں کہا "رپے پیسے کی بھی کوئی فکر نہ کرو میں یہ سب بندوبست کردوں گا۔ تم کسی بھی طرح اس مصیبت کو ٹالو"

اس بار مجھے تین ہزار کا بندوبست کرنا پڑا۔ رقم لالی کے حوالے کرنے کے بعد میں نے کئی دن تک اس کے خیمے کا رخ نہیں کیا اور وہ بھی کام پر نہیں آئی۔ رقم اس نے بہت ہی ہچکچاتے ہوئے لی تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

لرزتی ہوئی آواز میں اس نے کہا تھا "افضل! سنا ہے اس معاملے میں جان بھی چلی جاتی ہے۔ میرے لیے دعا کرنا... ہم بہت گناہگار ہیں لیکن اللہ تو گناہگاروں پر بھی رحم کھاتا ہے۔ بندے معاف نہیں کرتے"

اس کے آنسوؤں اور لہجے کی لرزش سے میرا دل کٹ کر رہ گیا تھا لیکن ساتھ ہی میرے دل میں ایک عجیب سا خوف بھی بیٹھ گیا تھا۔ اسی خوف کے تحت میں نے اس کے خیمے کا رخ نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اسے دیکھنے کو، اس کا حال جاننے کو اور اس کی ڈھارس بندھانے کو بہت جی چاہتا تھا۔

بابا ایک بار ایک جگہ مجھے راستے میں ملا۔ اچھا بھلا ہشاش بشاش چلا جارہا تھا لیکن مجھے دیکھ کر سوکھے چھوارے جیسا منہ بنائے ہوئے بولا "لالی کی حالت سنبھل تو گئی ہے لیکن سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہوگئی ہے بیچاری"

اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی لیکن جھوٹی وضعداری اور تکلف کا ایک ہلکا سا پردہ بہرحال ہمارے درمیان حائل رہتا تھا۔ مبہم لفظوں میں گفتگو ہوتی تھی۔

میں نے کچھ رقم بابا کو دیتے ہوئے کہا "تم اس کے آرام کا خیال رکھنا اور اسے اچھی خوراک کھلانا"

خوف پھر بھی دل میں جاگزیں رہا اور میں اسے دیکھنے نہ گیا لیکن اس کے تین دن بعد وہ خود ہی کام پر آگئی۔ حسبِ معمول صبح ہی صبح وہ سب سے آگے قطار میں کارڈ لیے کھڑی تھی اور مسکرارہی تھی۔

بابا نے بتایا تھا کہ سرسوں کے پھول کی طرح زرد ہوچکی ہے بیچاری، میرے خیال میں وہ زرد تو نہیں البتہ کچھ گوری ہوچکی تھی۔ پہلے کی نسبت وہ خوب کھلی کھلی اور نکھری نکھری سی نظر آرہی تھی۔ حیرت انگیز طور پر اس کی صحت تو پہلے سے اچھی ہوچکی تھی۔ بہرحال میں نے زیادہ حیران ہونے کے بجائے سکھ کی سانس لی۔

چند دن میں سب کچھ معمول پر آگیا، مع بابا کی فرمائشوں کے۔ نت نئے ہتھکنڈوں سے اس نے مجھ سے رقمیں اینٹھنے کا سلسلہ دوبارہ شروع کردیا تھا۔

ایک بار میں نے یونہی سرسری سا حساب کیا تو پتا چلا کہ میں تقریباً تیس ہزار روپے بابا کی توند میں جھونک چکا تھا اور میری اپنی یہ حالت تھی کہ میرا کُل سرمایہ وہی چند جوڑے کپڑے اور روزمرہ کے استعمال کی چند چھوٹی موٹی چیزیں تھیں جو میں نے اپنی تنخواہ میں سے خریدی تھیں۔

کچھ عرصہ پہلے تک میں خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ تیس ہزار روپیہ میرے ہاتھ آسکتا ہے اور اب ہاتھ آنا تو اپنی جگہ، میں بڑے جدی پشتی رئیسوں کی طرح یہ رقم تھوڑی تھوڑی کرکے اپنی خانہ بدوش محبوبہ کے نام نہاد باپ کی نذر کرچکا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر بڑی حیرت ہوئی کہ میں خاصی مہنگی عیاشی کا مرتکب ہورہا تھا۔ اتنے پیسوں میں تو لوگ جانے کیا کچھ کرلیتے تھے۔

شاید میں اوّل درجے کا احمق تھا۔ مجھے خوامخواہ چالاک ہونے کا زعم تھا۔ ادھر کمپنی کا کام بھی ختم ہورہا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا کہ زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی ماہ تک کمپنی بستر بوریا لپیٹ رہی تھی۔ اس کے بعد بعض لوگ جنھیں عارضی بنیادوں پر ملازم رکھا گیا تھا، انھیں فارغ کردیا جاتا۔ کچھ لوگ ہیڈ آفس میں لاہور واپس چلے جاتے اور کچھ لوگوں کو نئے اسٹاف کے ساتھ مل کر ہیڈ بلوکی کے قریب کہیں جانا تھا جہاں نیا پروجیکٹ شروع ہورہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا شمار ان میں سے کون سے لوگوں میں تھا۔ بہرحال جو دو ڈھائی ماہ باقی تھے، ان میں میں احتیاطاً اپنے لیے کچھ پس انداز کرلینا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں آگے کیا حالات پیش آنے تھے۔ اس لیے میں نے بابا کی طرف سے ہاتھ کھینچ لیا تھا اور یہی بات تو یہ تھی کہ اب لالی سے بھی میرا دل بھرتا سا جارہا تھا۔

دو سال ہونے کو آرہے تھے۔ انسان ایک ہی کتاب کہاں تک پڑھتا رہے ادھر اب مستقبل کا کچھ معلوم نہیں تھا کہ کسے کدھر جانا تھا۔ اِدھر میں نے بابا پر نوازشات سے ہاتھ کھینچا، اُدھر اس نے ہمزاد کی طرح خیمے میں موجود رہنا شروع کردیا۔

ایک روز لالی کھانا کھاکر خیمے سے نکلی ہی تھی کہ بابا بولا "افضل میاں! اس بار میں تم سے بہت ہی چھوٹا سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔ صرف ایک ہزار رپے کی ضرورت ہے۔ ہو جائے گا کوئی بندوبست؟"

"نہیں" میں نے بلا تامل نہایت سپاٹ لہجے میں جواب دیا "اور آئندہ کبھی تم مجھ سے ایک پیسے کی بھی اُمید نہ رکھنا۔ اس درخت سے جتنے نوٹ جھاڑنے تھے، وہ تم جھاڑ چکے"

اس نے مجھ سے بھی زیادہ سپاٹ لہجے میں کہا "تو پھر آئندہ تم کبھی اس خیمے کا رخ نہ کرنا۔ تمھیں جتنی عیش کرنی تھی وہ کرچکے"

میں سمجھتا تھا کہ اپنی تمامتر بے غیرتی کے باوجود بابا جیسے لوگوں میں تھوڑی بہت وضعداری موجود ہوتی ہے مگر شاید میرا خیال غلط تھا۔ مجھے اب لالی سے مراسم رکھنے کی کوئی خاص خواہش نہیں رہی تھی لیکن بابا کے دھونس دینے کے انداز سے مجھے غصہ آگیا۔ میں نے اسے انا کا مسئلہ محسوس کیا۔

"تم کون ہوتے ہو مجھے روکنے والے؟" میں نے مشتعل ہوکر کہا "میں لالی کی اجازت سے آتا ہوں... وہ مجھے پسند کرتی ہے۔ تمھاری حیثیت کیا ہے کہ مجھے منع کرو۔ تم تو خود اس کے ٹکڑوں پر پلتے ہو ہاتھی کے بچے!"

وہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرایا اور میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے خود کلامی کے سے لہجے میں بولا "اونہہ! پسند کرتی ہے... لالی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ یہ نوجوان پورا چغد ہے"

پھر وہ قدرے بلند آواز میں بولا "زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔ آئندہ خیمے کے قریب بھی نظر آئے تو لوگ چارپائی پر ڈال کر ہی واپس لے جائیں گے"

"تمھیں شاید اپنے اس بادی زدہ جسم پر کچھ زیادہ ہی ناز ہے" میں نے حقارت سے کہا "ایسا نہ ہو کہ مجھے چاقو مار کر تمھارے اس غبارے سے ساری ہوا نکالنی پڑے"

وہ دانت پیس کر اٹھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر میں اپنی جنگی حکمتِ عملی طے کرچکا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ دایاں گھونسا میں اس کی ناک پر رسید کروں گا اور بایاں کنپٹی پر اور جیسے ہی وہ لڑکھڑائے گا، اس کے گھٹنے پر بھاری بوٹ کی زوردار ٹھوکر رسید کروں گا۔ جسم کے نازک حصوں پر ہی ضرب لگانے سے اس کا کچھ بگڑ سکتا تھا۔ گدیلے جسم پر گھونسے برسانے سے تو شاید اس کا بال بھی بیکا نہ ہوتا۔ مجھے حتیٰ الامکان پھرتی سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی گرفت میں آنے سے بچانا تھا۔ اگر میں اس کی گرفت میں آجاتا تو پھر میری خیر نہیں تھی۔

مجھے اپنی یہ حکمتِ عملی آزمانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ خیمے کا پردہ اٹھاکر اچانک لالی اندر آئی اور ہم دونوں کے درمیان حائل ہوگئی۔

"بس... بس..." وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی "زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ اتنے خوبصورت ڈرامے کا اتنا بھونڈا انجام نہیں ہونا چاہیے"

میں نے اس کے الفاظ پر خاص توجہ دیے بغیر کہا۔ "اپنے بابا کو کچھ سمجھاؤ لالی! یہ..."

"میں تو تمھیں سمجھانے کے لیے خیمے میں واپس آئی ہوں۔ ورنہ آرام سے باہر کھڑی تم دونوں کو سوکنوں کی طرح لڑتے سُن رہی تھی" وہ اطمینان سے تخت پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ پھر اس نے نہایت سنجیدگی سے مجھے مخاطب کیا "بابا ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے جناب افضل صاحب! اب تمھیں یہاں آنے کی ضرورت ہی کیا ہے جب تمھارے پلے ہی کچھ نہیں رہا۔ ویسے بھی اب کمپنی کا ٹھیکا ختم ہونے والا ہے۔ اس کے بعد ہمارا قبیلہ تو چیچہ وطنی یا جوڑیاں کی طرف چلا جائے گا۔ تم اور تمھاری کمپنی نہ جانے کہاں جائے۔ ہماری راہیں جُدا تھیں اور جُدا ہی رہیں گی تو پھر وبالِ جان بننے سے کیا فائدہ؟"

میں نے سمجھا شاید میرے کان بج رہے ہیں۔ "پلّے ہی کچھ نہیں رہا...! اور "وبالِ جان" جیسے الفاظ کیا واقعی لالی کے منہ سے نکلے تھے؟ میں جیسے برف کا بت بن کر رہ گیا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ میرے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکی تھی تو لالی ہی۔ لیکن شاید اس کے جسم میں کوئی اور روح حلول کر گئی تھی۔

اس قسم کی صورتِ حال میں انسان عموماً بے بسی کی سی کیفیت میں صرف یہی کہہ پاتا ہے "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میرے منہ سے بھی غیر ارادی طور پر یہی الفاظ سرگوشی کے سے انداز میں برآمد ہوئے "تم تو کہا کرتی تھیں کہ میری محبت میں تمہیں دنیا جہان کا کوئی ہوش نہیں رہا... اور جانے کیا کچھ..."

"محبت..." وہ کچھ ایسے انداز میں ہنسی کہ میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی "محبت تو مجھے صرف تیرہ چودہ سال کی عمر میں ایک شخص سے ہوئی تھی لیکن وہ بس اپنا مطلب نکال کر مجھے روتی دھوتی چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد سے مجھے کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ اب تو بس ایک ہی مقصد ہے جس کے تحت زندگی بسر ہو رہی ہے۔" وہ اب ٹانگ پر ٹانگ رکھے مہارانیوں کی سی تمکنت سے بیٹھی تھی اور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ ذرا بھی جھجک نہیں رہی تھی۔

میں حیرت کے جھٹکے سے کچھ سنبھل چکا تھا۔ لالی نے مجھے خوش فہمیوں کی دنیا سے اٹھا کر اس طرح حقائق کی دنیا میں پھینکا تھا جس طرح قلی مال گاڑی سے آلوؤں کی بوری اٹھا کر پلیٹ فارم پر پھینک دیتے ہیں۔

"اور وہ مقصد کیا ہے؟" میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

"زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنا اور ایک روز قبیلے سے الگ ہو کر کسی شہر میں آرام سے بیگمات کی طرح زندگی بسر کرنا۔" اس نے بلا تامل جواب دیا "آخر ہم بھی انسان ہیں۔ ہماری بھی کچھ خواہشات ہیں۔ کیا ضروری ہے کہ میں اسی طرح میلے کپڑوں میں ویرانوں میں محنت مزدوری کرتی رہوں۔ پھٹے پرانے خیمے میں رہوں اور راہ چلتا ہوا ہر شخص مجھے گھر کی مرغی سمجھ کر دست درازی کی کوشش کرے یا فحش آوازے کسے؟"

"روپیہ کمانے کے لیے اگر تم نے اپنے آپ کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو ذرا ڈھنگ سے کرو۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "شہر جانا ہی ہے تو ابھی سے کیوں نہیں چلی جاتیں؟ اتنا روپیہ تو جمع ہو چکا ہوگا تمہارے پاس۔ وہاں کوئی مکان لے کر صفائی ستھرائی اور سلیقے سے کوئی اڈا شروع کر دو اور صرف دولتمند گاہکوں کے لیے دروازے کھلے رکھو۔ جلد ہی بہت دولت جمع ہو جائے گی۔"

"میں باقاعدہ طوائف کہلانا نہیں چاہتی۔" وہ بُرا منائے بغیر اطمینان سے بولی۔

"تو پھر یہاں بھی کسی زیادہ مالدار اور بڑے عہدے والے کو پھانسنا تھا۔ کم وقت میں زیادہ رقم جمع ہو سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"زیادہ مالدار یا زیادہ بڑے عہدے والے زیادہ چالاک ہوتے ہیں۔ ہم جیسی لڑکیوں پر وہ کہاں رقمیں خرچ کرتے ہیں۔" وہ صاف گوئی سے بولی "البتہ اگر میں شہر میں سیٹ ہو گئی تو پھر میری شان دیکھنا۔ بڑے بڑے میری دہلیز پر ناک رگڑیں گے۔"

"ہاں۔ اگر لڑکی ناک کٹوا لے تو اس کی دہلیز پر ناک رگڑنے والے بہت مل جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔ حیرت انگیز طور پر میں اب بے حد پُرسکون ہو چکا تھا اور غصے کے بجائے خاصی حد تک تجسس سے بات کر رہا تھا "ویسے اپنی بات ہے... بے وقوف بننے والوں میں میرا نمبر کون سا تھا؟"

"صرف دوسرا۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ اس دوران بابا بڑے اطمینان سے ایک طرف بیٹھا ناخنوں سے میل نکال رہا تھا، بالکل اس طرح جیسے اس کے قریب گھر کے دو افراد بیٹھے اخلاقیات پر تبادلہ خیال کر رہے ہوں۔

"اس صورت میں بھی بھلا تمہیں یہ پتھر توڑنے کی مشقت اٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ گھر بیٹھے کھایا کرو۔ تھوڑی بہت رقم کم ہو جائے گی تو کیا ہوا۔ کچھ زیادہ عرصے انتظار کر لینا۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں مشورہ دیا۔

"میں لوگوں کی نظر میں اور خصوصاً قبیلے والوں کی نظر میں محنت کش لڑکی ہی رہنا چاہتی ہوں۔ اس میں حرج بھی کیا ہے۔ روزمرہ کی زندگی کے اخراجات اس طرح چلتے رہتے ہیں۔ انسان تندرست بھی رہتا ہے۔ باقی رقم ساری کی ساری بینک میں جوں کی توں جمع ہوتی رہتی ہے۔" اس نے بڑے اطمینان سے بتایا "ویسے بھی ہمارے قبیلے میں چھوٹی موٹی آوارگی پر تو نظر نہیں رکھتے لیکن باقاعدہ قسم کی دھندے بازی کو بہت بُرا سمجھا جاتا ہے۔"

"فرض کرو..." میں نے ملائمت سے کہا "جس طرح تم نے اطمینان اور صاف گوئی سے بتا دیا ہے کہ کس خوبصورتی سے تم نے مجھے بے وقوف بنایا... اس پر میں آپے سے باہر ہو جاؤں، دنگا فساد برپا کروں... شور مچا دوں کہ تم نے مجھے لوٹ کھایا ہے۔ تو کیا ہوگا؟"

"تمہاری ذلت ہوگی اور کیا ہوگا۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"تم ایک معمولی تنخواہ دار ملازم ہو۔ مجھ پر لمبی رقمیں خرچ کرنے کا

دعویٰ کرو گے تو سب سے پہلے سوال یہ پیدا ہوگا کہ رقمیں تمہارے پاس آئیں کہاں سے؟ ظاہر ہے تم نے غبن اور ہیرا پھیری کی ہوگی سے بھی چھوڑو۔ دوسری بات یہ ہے کہ شور مچانے کی پوزیشن میں مرد نہیں عورت ہوتی ہے۔ اگر میں نے ایک چیخ بھی مار دی کہ یہ شخص میری عزت پر حملہ آور ہوا ہے تو تمہیں نہ جانے کتنی راتیں کسی تھانے میں الٹے لٹک کر گزارنی پڑیں۔ پہلے یہاں بابا اور میرے قبیلے والوں کے ہاتھوں جو پٹائی لگے گی وہ الگ ہوگی۔"

اُلّو کی پٹھی بہت چالاک اور عیار تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس قسم کے خیموں میں ایسی نادر روزگار ہستیاں بھی پائی جاتی ہوں گی۔

مجھے روپے پیسے کا افسوس نہیں تھا جس راستے آیا تھا اسی راستے چلا گیا۔ البتہ انا کو ایک دھچکا سا ضرور لگا تھا۔ انسان کو بڑا خمار سا ہوتا ہے اگر اسے یہ معلوم ہو کہ کوئی لڑکی ــ خانہ بدوش ہی سہی... اس پر عاشق ہے... اور اس وقت اپنی نظر میں بھی بڑی خواری سی ہوتی ہے جب پتا چلے کہ وہ ان پڑھ سی لڑکی آپ کو بے وقوف بنا رہی تھی۔

لالی اب ویسے بھی مجھے کچھ اچھی نہیں لگتی تھی اس وقت تو بالکل ہی گندی مچھلی لگ رہی تھی مجھے خود پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں اب تک اس لڑکی کے پیچھے پاگل تھا؟ لعنت ہے مجھ پر۔

وہ گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "ویسے تمہیں زیادہ بُرا بھی نہیں منانا چاہیے۔ آخر کسی نہ کسی موڑ پر تو یہ کہانی ختم ہونی ہی تھی۔ تم مجھ سے شادی تو نہیں کر سکتے تھے نا؟"

پہلے وہ مجھ سے یہ سوال کرتی تو شاید میں سوچ میں پڑ جاتا لیکن اس وقت میں نے بلا تامل جواب دیا۔ "نہیں۔"

"تو پھر اتنی چیں چیں کی کیا ضرورت ہے؟" وہ تیزی سے بولی۔ "جاؤ جاکر آرام سے زندگی گزارو۔ جو وقت گزر گیا سو اچھا گزر گیا۔ اچھا وقت بھی انسان کا سرمایہ ہی ہوتا ہے۔"

اس کے اپنے چہرے پر خوشی تھی نہ تاسف۔ گزرے لمحوں کی کوئی نشانی، کوئی نقش، کوئی پرچھائیں اس کے چہرے پر باقی نہیں تھی۔ چہرہ کیا تھا، بہت گہری جھیل تھی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "مجھے یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ بابا کے وہ بیماریوں کے قصے، وہ دکانداری کا شوق سب بہانے تھے۔ مجھ سے روپیہ اینٹھنے کے حیلے تھے۔ بابا کو تو شاید زندگی میں کبھی زکام تک نہیں ہوا ہوگا اور دکانداری کی بھی اسے بھلا کیا ضرورت ہو سکتی تھی جبکہ اس کی دکان تو گھر میں ہی اچھی چل رہی ہے... لیکن میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ جو تم نے ہمارے گناہ کے پھل کا چکر چلایا تھا، وہ بھی محض افسانہ ہی تھا نا؟"

"ظاہر ہے۔" اس نے نہایت اطمینان سے مختصر سا جواب دیا۔

میں چند لمحے خاموش کھڑا اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس نے آنکھ نہیں جھپکی۔ میں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں معاف نہیں کروں گا لالی!"

وہ قدرے استہزائیہ سے لہجے میں بولی۔ "آج کل کون کسے معاف کرتا ہے؟ آج اگر تم کسی کی انگلی سے ایک قطرہ خون نکال لو تو کل طاقت حاصل ہونے کے بعد جب تک وہ تمہارے پورے خاندان کو کولہو میں نہیں پلوا دے گا تب تک اسے چین نہیں آئے گا۔ وہ زمانے گزر گئے جب لوگ انتقام کی طاقت رکھتے ہوئے بھی معاف کر دیا کرتے تھے۔ اب تو لوگ طاقت نہ رکھتے ہوئے بھی انتقام کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ اندر ہی اندر گُھل کھاتے رہتے ہیں۔ میں بھی جب کسی کے ساتھ کوئی ایسی ویسی حرکت کرتی ہوں تو جوابی حملے کے لیے تیار رہتی ہوں۔ تم جب بھی مجھ پر وار کرنے کے لیے آؤ گے، مجھے اپنے دفاع کے لیے تیار پاؤ گے۔"

میں نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا اور خیمے سے نکل آیا۔ مجھے یہ محسوس کر کے بے حد حیرت ہوئی کہ میں کچھ زیادہ چراغ پا نہیں تھا بلکہ میرے وجود میں ہلکی سی افسردگی اور یخ بستگی سی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اتنی چڑچڑاہٹ اور جھنجلاہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی جتنی میرے خیال میں ہونی چاہیے تھی۔

مجھے کچھ تعجب سا ہو رہا تھا۔ عورت کے کیا کیا روپ ہیں؟ کیا میں عورت کو کبھی سمجھنے کے قابل ہو سکوں گا؟ ایک وہ شمیم تھی... وہ بھی بڑا عجیب سا جذباتی جھٹکا دے گئی تھی۔ دل کی لوح پر خراش سی ڈال گئی تھی... اور ایک یہ لالی تھی...

اس نے بہت بلندی پر پہنچا کر نیچے سے سیڑھی کھینچ لی تھی۔

"ایک بات بہرحال طے ہے!" میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ "کہ عورت پر کسی حال میں بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اپنے آپ کو بھروسے کے قابل ثابت کر دے تو بات دوسری ہے لیکن تم ذہنی طور پر اس کی طرف سے ہر دھوکا کھانے کے لیے تیار رہو۔ ہاں پر اس حد تک تکیہ مت کرو کہ وہ تمہاری مجبوری بن جائے اور اسے اس حد تک اپنی زندگی کا جزو مت بناؤ کہ اس کے جانے کے بعد زندگی میں خلا محسوس ہونے لگے اور تم تو خوش قسمت ہو افضل میاں کہ تمہیں اس نوجوانی میں ہی بڑے متنوع تجربات حاصل ہو رہے ہیں ورنہ

لوگ تو زندگی بھر ایک ہی عورت کو سمجھنے میں لگے رہتے ہیں اور سارے بال سفید ہو جانے کے بعد انہیں احساس ہوتا ہے کہ وہ تو ابھی تک دیوار سے ہی سر ٹکرا رہے تھے!"

اپنے آپ کو یہ عبرت آموز لیکچر دینے اور اسے ذہن نشین کرنے کے بعد میں اپنی میز پر جا بیٹھا اور ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد میں نے اپنی اداسی اور یاسیت دور کرنے کے لیے جاکر نہر میں چھلانگ لگا دی اور اس وقت تک تیرتا رہا جب تک جسم شل نہیں ہو گیا اور دل و دماغ سے فالتو خیالات چھٹ نہیں گئے۔

رات تک مجھے سب کچھ نہایت غیر اہم محسوس ہونے لگا۔ میں اس فیصلے پر پہنچ چکا تھا کہ لالی میری کتاب زندگی کا ایک غیر ضروری ورق تھی ــــ مجھے اس ورق کو پھاڑ کر پھینک دینا چاہیے ــــ اور اس پر زیادہ مغز نہیں کھپانا چاہیے۔

شکر ہے کہ جب میں کسی چیز کے بارے میں ایسا کوئی فیصلہ کر لیتا تھا تو وہ مزید میرے ذہن سے چپکی نہیں رہتی تھی۔ میں آرام کی نیند سویا اور صبح تازہ دم اٹھا۔

اپنی میز پر پہنچ کر جب میں نے قطار میں حسب معمول سب سے آگے کھڑی ہوئی لالی کو دیکھا تو مجھے رنج، تاسف یا غصہ کچھ بھی محسوس نہیں ہوا۔ دل میں اس کے خلاف کینہ ضرور تھا لیکن بس اسی طرح جیسے جھیل کی تہ میں پڑا ہوا کوئی چھوٹا سا کنکر۔ رفتہ رفتہ ایسے کنکر میرے دل کی جھیل میں جمع ہوتے جا رہے تھے۔

لالی کا چہرہ سپاٹ اور آنکھیں شیشے کی مصنوعی آنکھوں کی طرح ہر تاثر سے عاری نظر آ رہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے چہرے کو یوں پتھرایا ہوا سا ظاہر کرنے کے لیے بڑی محنت کر رہی تھی۔ بے چاری! خواہ مخواہ اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال رہی تھی۔ مجھے اب اس کے تاثرات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اجنبیت کا راستہ شروع ہو ہی چکا تھا تو میں لالی سے دو قدم آگے رہنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے اس پر دوسری نظر ڈالے بغیر اور ایک لفظ بھی کہے بغیر اس کے کارڈ پر اندراجات کر کے کارڈ واپس اسے تھما دیا۔ 'خدا حافظ لالی!' میں نے دل میں کہا۔ 'وہ باتیں تری وہ فسانے ترے... وہ سرگوشیاں... وہ چاہتیں... وہ زندگی کے دامن سے چرائے ہوئے عیش بردوش لمحے... سب ہوا ہوئے... سب کو ہمارا سلام!'

میری طبیعت کی تازگی زیادہ دیر برقرار نہ رہی۔ دوپہر کا کھانا میں نے ایک طویل عرصے بعد کینٹین پر جاکر کھایا۔ واپس آیا تو میری میز پر اکاؤنٹنٹ محمد بشیر میرا منتظر تھا۔ اس کا چہرہ اُترا ہوا تھا اور آنکھیں بھی موٹے موٹے عدسوں کے عقب میں اتنی ابھری ہوئی نظر نہیں آ رہی تھیں جتنی عموماً نظر آتی تھیں۔

"ہم تو آج کل بہت پریشان ہیں یار!" اس نے رسمی باتوں کے بعد کہا۔

"ہم سے مُراد کون ہے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"میں اور عزیز عالم۔" اس نے جواب دیا۔ عزیز عالم کمپنی کے کیشیئر کا نام تھا۔

"کیوں پریشان ہو؟" میں نے نیم استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔ "کیا تمہارا ضمیر بیدار ہو گیا ہے؟"

"نہیں ــ ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔ "تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ دو ڈھائی مہینے میں کام ختم ہو رہا ہے۔ ٹھیکا ختم ہونے پر سارے حسابات آڈٹ بھی ہوں گے۔"

"پھر؟" میں اب بھی اس کا مقصد نہ سمجھ سکا۔

"پھر یہ کہ ہم تینوں نے جو جو ہیرا پھیریاں کی ہیں وہ پکڑی جائیں گی۔" وہ متوحش لہجے میں بولا۔

"مگر تم نے تو کہا تھا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں... ہمارا طریقۂ واردات ایسا ہے کہ کوئی ہمیں نہیں پکڑ سکتا۔ وغیرہ وغیرہ۔" میں نے تیکھے لہجے میں کہا حقیقت یہ ہے کہ اس کی بات سن کر میرا دل بھی ڈوبنے لگا تھا۔ شاید اب چاروں طرف سے ہی بری خبریں آنے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

"میں نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اس سے پہلے کبھی سائٹ پر حسابات آڈٹ ہوتے ہی نہیں تھے۔" وہ بولا۔ "ہیڈ آفس میں سالانہ آڈٹ ہوتا تھا۔ اس وقت تک ہمارے کام پکے ہو جاتے تھے اور آڈیٹرز بھی ہمارے جانے پہچانے ہوتے تھے۔ زیادہ باریک بینی نہیں کرتے تھے لیکن اس مرتبہ میں نے سنا ہے بڑا سخت آڈٹ ہوگا۔ سجاد صاحب کو بھی شبہ ہو چلا ہے شاید کہ نچلی سطح پر گھپلے ہو رہے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم سے کچھ غلطیاں بھی ہوئی ہیں۔"

میں حساب کتاب کی باتیں کچھ زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میں نے متوحش ہو کر پوچھا۔ "اب کیا ہوگا؟"

"میں اور عزیز عالم تو ایک ایک کر کے کھسکنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "لیکن ہماری پوزیشن ایسی ہے کہ ہم فرار نہیں ہو سکتے۔ فوراً ہمارے خلاف پرچا درج ہو جائے گا اور ہم مفرور مجرم قرار پائیں گے کیونکہ ہمارے گھپلے فوراً ہی سامنے آ جائیں گے لیکن اگر ہم آرام آرام سے اپنا کام دوسروں کو ہینڈ اوور کر کے، استعفا دے کر جائیں گے تو ہمارے کارنامے کافی دنوں

بعد جاکر سامنے آئیں گے۔ تب تک ہم سجاد صاحب یا قانون کی دسترس سے بہت دُور جا چکے ہوں گے۔ میں تمھیں اندھیرے میں نہیں رکھوں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ اگر ہم پکڑے گئے تو شریکِ جرم کے طور پر تمھارا نام بھی لیے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ ویسے تمھاری پوزیشن اس وقت تک سب سے زیادہ صاف ہے۔ اس لیے تمھارے حق میں یہی بہتر ہے کہ آج کل میں ہی کھسک لو۔ استعفا وغیرہ دینے کی ضرورت نہیں۔ بس سجاد صاحب کے نام ایک رسمی سی اطلاع چھوڑ جانا۔ ظاہر یہ کرنا جیسے تمھاری کسی عزیز ہستی کی طرف سے اچانک ہی تمھیں کوئی بُری خبر ملی ہے اور شاید تم واپس نہ آسکو۔ ویسے بھی کام تو ختم ہو ہی رہا ہے۔ کہہ دینا کہ نئے پروجیکٹ پر جانا تمھیں سُوٹ نہیں کرتا۔ تمھارے حالات اجازت نہیں دیتے۔"

"میں سوچوں گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"سوچنے کا اب وقت نہیں ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "ہر گزرنے والا لمحہ بے حد قیمتی ہے۔ میں نے تمھیں ساری صورتحال سمجھا دی ہے اور بہترین دوستانہ مشورہ دے دیا ہے۔ اب اپنا بچاؤ کرنا تمھاری اپنی ذمے داری ہے۔"

وہ چلا گیا اور مجھے سوچوں میں گرفتار چھوڑ گیا۔ مجھے قانون، سزا، لوگوں کی انگشت نمائی وغیرہ کی کوئی خاص فکر نہیں تھی۔ میرا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ میں بددیانت، چور اور خائن ثابت ہونے کے بعد سجاد صاحب کا سامنا نہیں کرسکتا تھا۔ باقی تمام تفکرات ضمنی تھے۔

سوال یہ تھا کہ یہاں سے بھاگ کر میں جاؤں کہاں؟ کیسا بے ٹھکانا تھا میں۔ ایک بے آشیاں پنچھی۔ کم عمری میں ماں باپ کے سائے سے محروم ہونے والا بھی دنیا میں کیسا تنہا ہوجاتا ہے۔ پہلی بار مجھے اپنی حالت پر کچھ زیادہ ہی افسوس ہوا۔ کرب کی حد تک۔

وقت کو پلٹا کھاتے ذرا بھی تو دیر نہیں لگتی۔ کل صبح تک میں بے حد خوش اور اندر سے بے حد مضبوط تھا۔ آج چند لمحوں کے اندر اندر میں بے حد متفکر اور اندر سے کھنڈر ہوچکا تھا۔ کہاں جاؤں؟ کہاں کا رخ کروں؟ یہی سوال ڈس رہا تھا۔ جب یہاں آیا تھا تب تو دو ہزار روپے پلے بھی تھے اور ان کی وجہ سے دل کو کافی ڈھارس بھی تھی مگر اس وقت تو جیب میں کُل دو ڈھائی سو روپے تھے۔ چند دن پہلے ہی تنخواہ ملی تھی۔ کچھ اُدھار اُتار دیا تھا، کچھ رقم شاہانہ انداز میں ٹھکانے لگا دی تھی۔

ڈیوٹی کا وقت ختم ہوا تو میں نہر کے اس دو [illegible] حصے کی طرف چل دیا جہاں میں تیراکی کرتا تھا۔ عام حالات میں تو میں تیراکی کا ناغہ بھی کرلیتا تھا لیکن جس روز میں ناخوش، پریشان یا متفکر ہوتا تھا، اس روز تیراکی کے لیے ضرور جاتا تھا۔ ذہن بٹ جاتا تھا۔

نہر کا پاٹ بہت چوڑا تھا۔ دفاعی نقطۂ نظر سے یہ نہر بہت اہم تھی اور جو پُل ہماری کمپنی نے تعمیر کیا تھا، وہ بھی دفاعی نقطۂ نظر سے بہت اہمیت کا حامل تھا۔ سرحد یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ رات کے سناٹے میں کبھی کبھار ہمیں فوجی مشقوں کے دھماکوں کی مدھم سی گونج سنائی دیتی رہتی تھی۔ دن میں کبھی کبھی نہر کے اس پار رینجرز کی اکا دُکا گاڑیاں کہیں آتی جاتی نظر آجاتی تھیں لیکن ان کی نقل و حرکت شاید نہر کے اس طرف تک ہی محدود رہتی تھی۔ میں نے کبھی کسی کو نہر کے اس طرف آتے نہیں دیکھا تھا۔

میں بہت دیر تک تیرتا رہا۔ شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا اور پانی میں ٹھنڈ محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اس وقت مگرمچھ کی طرح نہر کے تقریباً وسط میں تیر رہا تھا جب میں نے نہر کے دوسرے کنارے کے اونچے پشتے پر ایک شخص کو اس طرح نمودار ہوتے دیکھا جیسے کسی اداکار کو اچانک ہی اسٹیج پر دھکا دے دیا گیا ہو۔

وہ میلی سی خاکی پتلون قمیص اور چمڑے کی جیکٹ میں تھا اور اس کے سینے پر کینوس کا ایک تھیلا بندھا ہوا تھا۔ جیکٹ کی زپ کھلی تھی۔ وہ جوان اور صحت مند تھا اور اس وقت بے حد پریشان اور بدحواس نظر آرہا تھا۔

وہ تیزی سے پشتے کی ڈھلان سے نیچے آنے لگا۔ معلوم نہیں پشتے کی کچی مٹی میں اس کے پاؤں دھنس رہے تھے یا کسی اور وجہ سے وہ بُری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ نیچے پہنچنے تک شاید وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکا یا پھر شاید جان بوجھ کر لیکن نہایت بے ڈھنگے انداز میں نہر میں کُود پڑا۔

میرا خیال ہے اسے تیرنا تو آتا تھا لیکن اس وقت اس کی حالت تیرنے کے قابل نہیں تھی۔ شاید وہ بہت دُور سے دوڑتا ہوا آیا تھا اور اس کی سانس قابو میں نہیں تھی۔ شاید اس کی ایک ٹانگ اور بازو میں چوٹ بھی لگی ہوئی تھی۔

چند گز تو وہ تیرا۔ اس کے بعد ڈبکیاں کھانے لگا۔ نہر بہت گہری تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ چند لمحے کے اندر اندر وہ ڈوب جائے گا۔ میں تیزی سے اس کے قریب پہنچا اور غوطہ لگا کر اسے پشت پر لے کر ابھر آیا۔ میں اپنی گردن اس کے ہاتھوں سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ عموماً ڈوبتا ہوا آدمی اس بُری طرح گلے کا ہار ہوجاتا ہے کہ بچانے والے کا بھی سانس رُک

دیتا ہے اور اپنے ساتھ اسے بھی لے ڈوبتا ہے۔

اس شخص نے اس عالم میں بھی خاصی سمجھ داری کا مظاہرہ کیا اور میری کمر سے لپٹ گیا۔ اس کا کینوس کا تھیلا میری کمر میں چبھ رہا تھا۔ کمر پر لادے میں اسے دوسرے کنارے پر لے آیا۔

وہ خود ہی میری کمر سے اتر کر اوندھا لیٹ گیا۔ اس کے ناک منہ سے پانی بُل بُل کر کے نکل رہا تھا۔ چند لمحے کھانسنے، تھوکنے اور چھینکیں لینے کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دہشت زدہ نظروں سے میری طرف اور پھر چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے میری جان بچائی ہے بھائی... لیکن اس وقت میں صحیح طور پر تمھارا شکریہ بھی ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں... دشمن میرے پیچھے لگے ہوئے ہیں... خدا حافظ... اللہ تمھارا بھلا کرے..."

وہ ہانپتا اور لنگڑاتا ہوا ایک طرف کو بھاگتا چلا گیا اور چند لمحے بعد ٹیلوں کے عقب میں غائب ہوگیا۔

میں دوبارہ نہر میں اتر گیا اور الٹا تیرنے لگا۔ میں کافی حد تک پُرسکون ہوچکا تھا اور اس شخص سے ٹکراؤ کے بعد بھی میں پریشان ہونے کے بجائے مزید پُرسکون ہوگیا تھا۔ مجھے دراصل یہ اطمینان حاصل ہوا تھا کہ کچھ لوگ دنیا میں مجھ سے کہیں زیادہ پریشان ہیں۔

چند لمحے بعد ہی ایک جیپ گھر گھراتی ہوئی پشتے پر نمودار ہوئی اور سیدھی ہوکر رُک گئی۔ یہ رینجرز کی جیپ تھی۔ اس میں تین آدمی موجود تھے۔ ایک ڈرائیو کر رہا تھا، دو پچھلی سیٹوں پر تھے۔ ان کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔

کھلی جیپ میں کھڑے ہوکر انھوں نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ پہلے تو انھوں نے ایک جھٹکے سے رائفلوں کا رخ میری طرف کرلیا اور میں نے اپنے آپ پر فاتحہ پڑھ لی لیکن ناکافی روشنی میں شاید انھیں بروقت ہی احساس ہوگیا کہ میں ان کا مطلوبہ آدمی نہیں ہوں ورنہ شاید ان کی جلد بازی کے باعث میں زندگی سے محروم ہوچکا ہوتا۔

"جوان!" ان میں سے ایک نے بھاری آواز میں مجھے پکارا۔ "تم نے ادھر خاکی پتلون اور کالی جیکٹ والے کسی آدمی کو تو نہیں دیکھا؟"

"دیکھا تو ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی ابھی نہر پار کر کے اُدھر کو دوڑا ہے۔" میں نے ٹیلوں کی طرف اشارہ کیا۔ ٹیلوں کے عقب میں تقریباً دو میل تک چٹیل میدان تھا۔ پھر جنگل شروع ہوجاتا تھا۔

"مہربانی۔" رینجر نے کہا اور ڈرائیور کو اشارہ کیا۔ جیپ گھرگھراتی ہوئی پرانے پُل کی طرف چل دی۔ ہماری کمپنی کا تیار کیا ہوا پُل ابھی آمد و رفت کے لیے نہیں کھلا تھا۔ جیپ کو کافی لمبا چکر کاٹ کر اس طرف آنا تھا۔

رینجرز کو تو میں نے اشارہ کر دیا تھا لیکن اس کے فوراً بعد ہی افسوس شروع ہوگیا تھا کہ میں نے ناحق ہی رینجرز کی رہنمائی کی۔ اس شخص کی جو حالت میں نے دیکھی تھی، اسے یاد کرتے ہوئے اس پر ترس آرہا تھا۔ پھر میں نے یہ سوچ کر خود کو بہلانے کی کوشش کی کہ اگر رینجرز کو اس کی تلاش تھی تو یقیناً وہ کوئی مجرم ہی ہوگا۔ کوئی اسمگلر یا جاسوس وغیرہ۔ اس صورت میں اس کا پکڑے جانا ہی بہتر تھا۔

اپنی اس سوچ پر مجھے خود ہی ہنسی آگئی۔ میں تو کچھ اس طرح اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا جیسے میں خود کوئی بڑا پارسا، عابد و زاہد اور دیانت دار انسان تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ خیال بھی گزرا کہ شاید معاشرے میں بیشتر انسان مجرم ہی ہیں، کوئی قانون کا مجرم، کوئی خدا کا مجرم، کوئی بندوں کا مجرم اور کوئی ضمیر کا مجرم۔ بات بس اتنی ہے کہ جس کا جرم ظاہر ہوجائے وہ مطعون ہوجاتا ہے۔ جس کا جُرم چھپا رہے وہ معزز بنا رہتا ہے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ وہ شخص اگر اپنی شکستہ حالی اور لنگڑاہٹ کے باوجود دو میل لمبا میدان عبور کر کے جنگل تک پہنچنے کی کوشش میں مصروف رہا تو شاید مارا جائے۔ اس کے جنگل تک پہنچنے سے پہلے ہی رینجرز شاید اس کو جالیں۔ البتہ اس نے اگر کہیں اِدھر اُدھر نکل کر کوئی جائے پناہ تلاش کرلی تو شاید رینجرز کو غچہ دے جائے۔

چند منٹ بعد اندھیرا پھیل گیا اور میں نہر سے نکل آیا۔ کپڑے پہن کر اور جیبی کنگھے سے بال بنا کر میں واپس اپنی خیمہ بستی کی طرف چل دیا۔

راستے میں ایک جگہ درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب ایک ٹوٹا پھوٹا چھپر سا تھا جس میں ایک بینچ پڑی تھی اور گارے سے بنی ہوئی ایک بھٹی استادہ تھی۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ کافی عرصہ پہلے یہاں ایک شخص نے کوئی کام شروع کیا تھا جو چلا نہیں تھا۔ بالآخر ایک دن وہ کسی سے بس کا کرایہ ادھار لے کر اپنے گاؤں واپس چلا گیا۔

اس چھپر کے سامنے سے گزرتے ہوئے مجھے اندر نیم شکستہ بینچ پر ایک ہیولا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں سلگتی ہوئی سگریٹ تھی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ یہ وہی شخص ہے جسے میں نے نہر میں ڈوبنے سے بچایا تھا۔ اس نے بھی یقیناً مجھے دیکھ لیا تھا لیکن چھپنے کی کوشش کرنے کے بجائے وہ مجھے متوجہ کرنے کے سے انداز میں کھنکارا اور تب میں نے پہچان لیا۔ وہ مفرور شخص

نہیں، ہماری کمپنی کا ایک ڈرائیور نیاز حسین تھا۔

"اوئے! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" میں نے چھپر میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ دفعتاً ایک خاص بو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ کمبخت اندھیرے میں بیٹھا بھری ہوئی سگریٹ پی رہا تھا۔

"میں جی ذرا غور و فکر کر رہا ہوں۔" اس نے بھاری آواز میں نہایت متانت سے جواب دیا۔ "یہ جگہ غور و فکر کے لیے بڑی موزوں ہے۔ میں اکثر شام کو یہیں آجاتا ہوں۔"

"اوئے! تم غور و فکر بھی کرتے ہو؟" میں حیرت سے تقریباً چلا اٹھا۔

"کیوں... کیا میں انسان نہیں ہوں افضل صاحب؟" اس نے گویا برا مناتے ہوئے پوچھا۔

"میرا خیال تھا کہ تم ڈرائیور ہو۔" میں نے اسے چھیڑا۔ "ویسے کیا غور و فکر کرتے ہو تم؟"

"یہی کہ آج سے ستر اسی سال بعد جب تیل کے ذخیرے ختم ہو جائیں گے تو ہم ڈرائیوروں کا کیا بنے گا؟" اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

"اگر تم اس وقت زندہ ہوئے تو کسی اونٹ پر ڈرائیور لگ جانا۔" میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے مشورہ دیا۔ "بہت سے جھنجٹ ختم ہو جائیں گے۔ نہ ڈرائیونگ کا امتحان، نہ لائسنس کا چکر۔ نہ اسے رینیو کرانے کی فکر۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ لوگوں کی جانیں تمہاری برادری کے ہاتھوں محفوظ رہیں گی!"

"افضل بابو! ایک تو تم کسی مسئلے میں کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے۔" وہ گویا میری حالت پر افسوس کرتے ہوئے بولا پھر جیسے اچانک اسے خیال آیا۔ "تمہارے لیے بھی سلگاؤں سگریٹ؟ میں نے پیکٹ میں بھری بھرائی تیار رکھی ہوئی ہیں۔"

"نہیں یار! فی الحال تم ہی پیو۔ میں اس وقت تمہاری طرح غور و فکر کے موڈ میں نہیں ہوں۔" میں چھپر سے نکل آیا۔ آسمان پر تارے نمودار ہو چکے تھے۔

میں نے پہلے کینٹین سے جا کر کھانا کھایا۔ پھر ذہن میں اس رقعے کا مضمون ترتیب دیتے ہوئے جو میں سجاد صاحب کے نام چھوڑ کر جانا چاہتا تھا، خیمے کی طرف چل دیا۔

خاردار تاروں کے گیٹ پر چوکیدار ابھی نہیں آیا تھا، تاہم اس کی ٹارچ اس کی کرسی پر رکھی تھی۔

میرا خیمہ سب سے پیچھے خاردار تاروں کے عین قریب تھا۔ پردہ اٹھا کر جب میں گنگناتا ہوا خیمے میں داخل ہوا تو اچانک ہی تاریک خیمے میں میری آنکھوں کے سامنے گویا پھلجڑی سی چھوٹ گئی۔ میرے سر پر جیسے نہایت بے آواز طریقے سے توپ کا گولا آن گرا تھا۔

غالباً کسی نے ٹھوس چیز سے میری کنپٹی پر وار کیا تھا۔ آخری بات جو مجھے یاد رہی وہ یہ تھی کہ میرے گھٹنے کچے فرش سے ٹکرائے تھے۔ اس کے بعد خیمے میں پھیلی ہوئی تاریکی میرے حواس پر بھی چھا گئی۔ مجھے احساس نہیں کہ کتنی دیر بعد میں ہوش میں آیا۔ تاہم یہ احساس ضرور ہے کہ ہوش میں آتے ہی دوبارہ بے ہوش ہونے کو جی چاہنے لگا تھا۔ سر میں تکلیف ہی اتنی تھی، معلوم ہو رہا تھا کہ کوئی لمبے قسم کا لوہار میرے سر کو لوہے کا گولا سمجھ کر اس پر ہتھوڑے برسا برسا کر اس سے کوئی چیز بنانے کی فکر میں ہے۔

میں نے غیر ارادی طور پر ہاتھ سر کی طرف لے جانا چاہا تو احساس ہوا کہ میرے ہاتھ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر رہے تھے۔ چند لمحے بعد جب میری آنکھوں کی دھندلاہٹ دُور ہوئی تو دیکھا کہ میں اپنے خیمے ہی میں تھا اور میرا پیٹرو میکس لیمپ بھی روشن تھا۔ میں لوہے کے پائپوں والے پلنگ پر دراز تھا اور میرے جسم پر چادر بھی پڑی ہوئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں پلنگ سے بندھے ہوئے تھے اور منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور اس پر پٹی بھی بندھی ہوئی تھی۔

میرے قریب لوہے کی کرسی پر ایک شخص اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک فلمی رسالے کی ورق گردانی کر رہا تھا۔ اس کی انگلیوں میں سلگتی ہوئی سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ کسی فلمی تصویر کو دیکھتے ہوئے اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی۔ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ بڑے ہی انہماک سے مطالعے میں مصروف تھا۔

اُسے دیکھتے ہوئے کئی بار میں نے غیر ارادی طور پر پلکیں جھپکائیں حتیٰ کہ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ میرا واہمہ نہیں ہے۔ وہ شخص کمبخت وہی تھا جس کی میں نے اس وقت جان بچائی تھی جب وہ کسی قریب المرگ اور لاوارث کتے کی طرح نہر میں ڈوب رہا تھا۔ اس وقت اس کی حالت دیکھنے کے قابل تھی جب اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں نہر میں چھلانگ لگائی اور اس وقت بھی اس کا چہرہ قابلِ دید تھا جب میں نے اسے نہر سے نکال کر کنارے پر لٹایا تھا۔ اس کے ناک اور منہ سے بھل بھل پانی بہہ رہا تھا۔ آنکھیں کسی بیمار اُلّو کی آنکھوں سے مشابہ نظر آ رہی تھیں۔ منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

مگر اب وہ گریڈ ۲۱ کے افسر کی طرح ٹھاٹ سے بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی جیکٹ تو چمڑے ہی کی تھی۔ پانی سے اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ اب اس کی پتلون وغیرہ بھی سوکھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ کمبخت نے کنگھی پٹی تک کر لی تھی۔ حد تو یہ تھی کہ

بدمعاش سگریٹ بھی میرے ہی پیکٹ سے پی رہا تھا جو اس نے اپنے سامنے ہی تپائی پر رکھا ہوا تھا۔ میں سگریٹ پیتا تو نہیں تھا لیکن خیمے میں آنے والے یار دوستوں کی تواضع کے لیے ایک دو پیکٹ رکھتا تھا۔ کبھی کبھار خود بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے دو چار کش لگا لیتا تھا۔

میں کہنا چاہتا تھا کاش میں نے تجھے اس نہر میں ہی ڈوبنے دیا ہوتا۔ لیکن میں چونکہ منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس لیے میں نے محض کسمسانے پر اکتفا کیا۔ یہ آواز بھی صرف اتنی ہی تھی کہ میں خود بھی مشکل سے سن سکا۔ شکر ہے اس شخص کو احساس ہو گیا کہ میں کسمسا رہا ہوں۔ وہ میری طرف متوجہ ہو گیا۔

مجھے ہوش میں دیکھ کر وہ نہایت ہی شرمسار نظر آنے لگا اور لکنت زدہ سے لہجے میں بولا۔ "معاف کرنا یار! اندھیرے میں پتا ہی نہیں چلا کہ میں اپنے محسن پر ہی وار کر رہا ہوں۔ ویسے بھی خیر! اپنی جان بچانے کا مسئلہ درپیش تھا۔ لیمپ جلانے کے بعد جب میں نے تمہاری شکل دیکھی تو بہت ہی شرم محسوس ہوئی۔ خصوصاً اس لیے کہ میں نے ڈنڈا تمہارے سر پر کچھ زیادہ ہی زور سے رسید کر دیا تھا۔"

اُس نے سگریٹ کا ایک کش لیا اور میں اس دوران ایک بار پھر کسمسایا۔ وہ میری بے چینی کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ہاتھ پاؤں باندھنے اور منہ میں کپڑا ٹھونسنے کی زیادتی میں نے صرف احتیاطاً کی ہے کہ کہیں تم ہوش میں آتے ہی چیخنا چلانا شروع کر دو یا ہاتھا پائی شروع کر دو۔ اگر تم مردوں والا وعدہ کرو کہ شور شرابا نہیں کرو گے تو میں تمہارے منہ سے کپڑا نکال سکتا ہوں تاکہ ہم کچھ بات چیت کر سکیں۔"

مجھے میرے سر میں اٹھتی ہوئی ٹیسوں نے جس حد تک اجازت دی اس حد تک میں نے زور زور سے اثبات میں سر ہلانے کی کوشش کی۔ اس کے نرم اور دوستانہ لہجے سے میرا غصہ کافی حد تک ختم ہو گیا تھا۔ اُس نے اُٹھ کر میری زبان کو آزاد کر دیا اور میں گویا آدھے سے زیادہ آزاد ہو گیا۔ میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی۔ میری تکلیف خود بخود کافی حد تک ختم ہو گئی۔

"تم یہاں گھس کیسے آئے؟" میں نے پوچھا۔ میری آواز نحیف سی اور کمزور نکلی۔

"رینجرز سے بچنے کے لیے ادھر آ نکلا تھا۔" وہ ایک بار پھر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "لوگوں کی نظر سے بچتا بچاتا خاردار تاروں تک آن پہنچا اور پھر سینے کے بل رینگ کر اس حد بندی کے اندر آ گیا اور سب سے پہلے جو خیمہ نظر آیا اس میں گھس گیا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے سب سے پہلے یہاں سگریٹ اور ماچس آسانی سے مل گئی۔ دیا سلائی جلا کر میں نے سارے خیمے کا جائزہ لیا اور ایک ڈنڈا سنبھال کر سگریٹ سلگا کر پردے کے قریب ہی بیٹھ گیا۔ میرا چونکہ رات گئے تک اس خیمے ہی میں رہنے کا ارادہ تھا اس لیے پہلے مکین کا بندوبست کرنا ضروری تھا... اس کے بعد کیا ہوا ہو گا تم اندازہ کر ہی سکتے ہو۔" وہ معذرت خواہانہ سے انداز میں مسکرایا۔ "کچھ دیر پہلے چاروں طرف سناٹا اور سکوت پھیل گیا تو میں نے پیٹرومیکس لیمپ روشن کر لیا۔ اب تو مجھے تشویش ہونے لگی تھی کیونکہ تمہیں بے ہوش ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ گزر چکے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے چھپنے کے لیے جنگل کا رُخ نہیں کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں پاگل تھوڑا ہی ہوں۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "اس وقت میری حالت ایسی تھی کہ چند گز کا فاصلہ طے کرنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ جنگل تو بہت دُور تھا۔ اگر میں جنگل کا رُخ کرتا تو رینجرز یقیناً میری کھوپڑی اُڑا دیتے ورنہ ٹانگ وانگ میں گولی مار کر لنگڑا لُولا تو کر ہی دیتے۔ میرا ریوالور ویسے بھی راستے میں کہیں گر گیا تھا۔ بہرحال رینجرز سے اس قسم کی آنکھ مچولی کا مجھے بڑا تجربہ ہے۔"

"گویا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ تم اسمگلر ہو؟" میں نے حتی الامکان شائستہ انداز اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"بے شک... لیکن نہایت معمولی قسم کا۔" اُس نے انکساری سے جواب دیا۔ "میری ایک کھیپ اور گاڑی اس وقت نہر کے پرلی طرف کے جنگل میں پھنسی ہوئی ہے۔ اپنی دانست میں تو میں اسے بڑی محفوظ جگہ پر چھپا کر آیا ہوں لیکن اگر وہ رینجرز کے ہتھے چڑھ گئی یا کوئی حریف اسمگلر اسے لے اُڑا تو میں دیوالیہ ہو جاؤں گا۔ ایک بار پھر مجھے خطرہ مول لینا ہے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر جنگل میں جانا ہے۔ سب سے بڑی مصیبت یہ ہے کہ میں تنہا ہوں۔ آج تک کوئی ڈھنگ کا ساتھی ہی نہیں ملا، جو ملا پھنسوانے والا ہی ملا۔ اپنی دراصل تقدیر ہی بڑی ڈھیلی ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ اس مرتبہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی کھیپ نہایت خیریت سے سرحد پار پہنچا کر وہاں سے سب سے بڑی کھیپ لے کر آ رہا تھا تو رینجرز پیچھے لگ گئے۔ دراصل نیا چوکی انچارج آیا ہے جو کچھ زیادہ ہی مستعد ہے، اس سے کوئی بات نہیں بن سکی۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ چند ہی لمحے میں وہ کوئی پرانا شناسا سا معلوم ہونے لگا تھا۔ سر میں ٹیسیں کچھ کم ہو چلی تھیں۔ تاہم ہاتھ پاؤں ایک ہی پوزیشن میں رہنے کے باعث شل ہوئے جا رہے تھے۔

"اب تمہارے ارادے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اُس نے اپنی گھڑی دیکھی، اسے جھٹکا دیا پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "بند ہو گئی ہے۔ واٹر پروف نہیں ہے نا۔ اس مرتبہ مجھے تجربہ ہوا ہے کہ اسمگلروں کو ہمیشہ واٹر پروف گھڑی رکھنا چاہیے۔"

اُس نے چادر ہٹا کر میری کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور ایک لمحے کے لیے کچھ سوچ کر بولا۔ "دو گھنٹے بعد میں یہاں سے نکل جاؤں گا۔ تمہیں میری وجہ سے جو تکلیف اٹھانا پڑی اس پر میں سخت شرمندہ ہوں۔ تمہارا احسان میں زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ رقم کے ذریعے اس کا صلہ تو نہیں دیا جا سکتا لیکن میں اپنی شرمندگی کم کرنے کے لیے کچھ رقم یہاں رکھ رہا ہوں میرے جانے کے بعد اٹھا لینا۔"

اُس نے ہاتھ بڑھا کر تپائی پر رکھا ہوا کینوس کا تھیلا اٹھایا۔ جب میں نے اُسے نہر سے نکالا تھا تو یہی تھیلا اس کے سینے پر بندھا ہوا تھا۔ اُس نے تھیلے کی زپ کھولی۔ میں لیٹا ہوا ہونے کے باوجود یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ اس میں نوٹوں کی کئی گڈیاں تھیں۔ اس نے سو سو کے نوٹوں والی ایک گڈی نکال کر پانچ نوٹ گن کر گڈی سے علیحدہ کر کے تپائی پر رکھ دیے اور ان پر ایک کپ رکھ دیا۔ مبادا ہوا کا کوئی جھونکا آئے اور وہ اُڑ جائیں۔

اُس نے شاید محسوس کر لیا کہ میں اس کے رقم کے بیگ کو غور سے دیکھ رہا ہوں۔ مسکراتے ہوئے بولا۔ "یہ رقم میری نہیں، کسی کی امانت ہے۔ مجھ سے بڑے ایک اسمگلر کی۔۔۔ خدا کا شکر ہے کہ میں رقم بچانے میں کامیاب ہو گیا ورنہ معلوم نہیں وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرتا۔۔۔ میری بات کا یقین بھی کرتا یا نہیں۔"

"لیکن تمہارے پاس کہاں سے آ گئی اس کی رقم؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"تمہیں یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ معتبر قسم کے اسمگلروں کے درمیان اُدھار بھی چلتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "میں جس اسمگلر کا ذکر کر رہا ہوں، اسمگلنگ کے میدان میں اُس کا نام مجی شاہ ہے۔ پچھلے دنوں اُس کی ایک کھیپ اُدھار گئی تھی۔ پارٹی یہی تھی جسے آج میں مال دے کر آ رہا ہوں۔ مجی شاہ کے پاس آج کوئی کارندہ نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ رقم لیتے آنا۔ دونوں طرف کے لوگوں کے لیے میں بڑا بھروسے کا آدمی ہوں۔ جتنی اُجرت مجی شاہ اپنے کسی کارندے کو دیتا، اتنی ہی رقم بطور کمیشن مجھے دے دے گا لیکن یہ رقم لانے کا کام ہے خطرناک۔۔۔ مال لانے سے بھی زیادہ خطرناک۔۔۔"

"تو وہاں سے ادائیگی پاکستانی کرنسی میں ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جس کرنسی میں چاہو اسی میں ہو سکتی ہے۔ بس اسی حساب سے مال کی قیمت میں فرق پڑ جاتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم یہ سب کچھ مجھے کیوں بتا رہے ہو؟" میں نے جانے کیوں سوال کر دیا۔

"وقت گزاری کے لیے۔" اُس نے سادگی سے جواب دیا۔ "میں اس وقت اندر ہی اندر کچھ نروس ہوں۔ مجھے بہت زور کی بھوک بھی لگی ہے۔ میں دھیان بٹائے رکھنا چاہتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں مزید دو گھنٹے تک اسی طرح لیٹا رہوں گا جس طرح آپریشن ٹیبل پر مریض پڑا ہوتا ہے۔" میں نے پوچھا۔ "میرے تو اعضا شل ہو گئے ہیں۔ اگر تم مجھے کھول دو تو میں مردوں والا وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروں گا بلکہ میں اطمینان سے بیٹھ کر تم سے کچھ مذاکرات کرنا چاہتا ہوں۔ تمہاری باتیں سن کر جانے کیوں میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئی ہیں۔ تمہاری بھوک کا بھی میں شاید کچھ مداوا کر سکوں۔"

وہ چند لمحے گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے تولتا رہا پھر گہری سانس لے کر بولا۔ "صورت تو یہی بتاتی ہے کہ تم مرد بچے ہو۔ تم پر بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال احتیاط ضروری ہے۔"

اُس نے اپنی پتلون کا پائنچا ذرا اوپر تک اُٹھایا۔ اس کی پنڈلی پر چمڑے کی تقریباً بالشت بھر لمبی نیام سی بندھی ہوئی تھی جس سے ہاتھی دانت کا دستہ جھانک رہا تھا۔ اس نے دستہ پکڑ کر کھینچا اور لش لش کرتا ایک خنجر نیام سے نکل آیا۔ اس کا پھل بالشت بھر سے نکلتا ہوا ہی تھا۔

"میں تمہیں کھولنے لگا ہوں اور احتیاطاً بتا رہا ہوں کہ خنجر میرے ہاتھ میں ہو تو مجھ سے پنگا لینے والے کو پچھتانے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "اور اس وقت میں اندر ہی اندر نروس بھی ہوں، یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں اور جب میں نروس اور بھوکا ہوتا ہوں تو باتیں بہت کرتا ہوں اور اگر کسی کو ذرا بھی بری نیت سے حرکت میں آتے دیکھتا ہوں تو بالکل اسی طرح اس کی شہ رگ کاٹ ڈالتا ہوں جیسے تم کسی اسپرنگ کو پوری قوت سے کھینچتے رہو اور وہ ٹوٹ کر اچانک

تمہارے منہ پر آ لگے۔"

وہ واقعی بہت باتیں کر رہا تھا۔ خنجر گو کہ اس نے ماہرانہ انداز میں پکڑا ہوا تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ اس نے کبھی کسی کی شہ رگ کاٹی ہو گی۔ وہ خونی لگتا نہیں تھا۔

اُس نے میرے ایک ہاتھ کی بندش کاٹی اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ شاید اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری نیت میں کوئی خرابی آئی ہے یا نہیں حالانکہ میرا اپنے آپ کو خواہ مخواہ زحمت دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اگر وہ مجھے کوئی نقصان پہنچا رہا ہوتا تب میں کچھ کرنے کی سوچتا۔

دوسرے ہاتھ کی بندش کاٹ کر اُس نے دوبارہ میری طرف دیکھا۔ کمبخت کچھ زیادہ ہی محتاط تھا۔ ہاتھ کھلتے ہی میں نے اپنا سر ٹٹول کر دیکھا۔ گُدی کے قریب ایک اور چھوٹا سا سر نمودار ہو چکا تھا لیکن افسوس کہ اس میں عقل نہیں، صرف درد تھا اور کچھ خون بھی رس رس کر بالوں کی جڑوں میں جم چکا تھا۔

"تمہاری اتنی زیادہ باتوں اور دوستانہ رویے کی بدولت میرا دل تمہاری طرف سے اتنی جلدی صاف ہو گیا ہے۔" میں نے چوٹ کو سہلاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ شاید میں اس ضرب کا انتقام لینے کے لیے تمہارے اس کھرپی نما خنجر کی پروا کیے بغیر تم پر ٹوٹ پڑتا۔"

وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر خنجر تھامے محتاط انداز میں کھڑا تھا۔ میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور اُٹھ کر پہلے لوہے کے ایک شیلف سے سر درد کی دو گولیاں نکال کر پانی سے کھائیں پھر مٹی کے تیل کا چولہا روشن کیا جو میں نے کبھی کبھار کے چھوٹے موٹے کاموں کے لیے رکھا ہوا تھا۔

میں نے دو انڈے اُبال کر اور دودھ کی ایک پیالی گرم کر کے اس کے سامنے رکھی تو وہ خاصا حیران نظر آنے لگا۔ شاید اسے میری طرف سے کسی قسم کی میزبانی کی توقع نہیں تھی۔ کچھ سوچ کر اُس نے بالآخر احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے خنجر نیام میں رکھ لیا اور انڈے ہڑپ کرنے لگا۔ تاہم اُس کی نظر مجھ پر ہی تھی۔ میں پلنگ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

پچھلے کئی منٹ سے خیمے میں سکوت طاری تھا۔ میں اس دوران مسلسل سوچ رہا تھا۔ کچھ ان باتوں کے بارے میں جو اس نے بتائی تھیں اور کچھ اپنے مستقبل کے بارے میں۔۔۔ بالآخر میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

وہ انڈے نگل چکا تھا اور اب بے صبری سے گرم دودھ کے بڑے بڑے گھونٹ بھر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے رک کر وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ "مجھے تم اشرف خان کہہ سکتے ہو۔ آپس کی بات ہے۔۔۔ ویسے یہ میرا اصلی نام نہیں ہے۔"

"اصلی نام سے مجھے کوئی غرض بھی نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے تو صرف تمہیں مخاطب کرنے کے لیے کوئی نام چاہیے تھا۔ ہاں تو اشرف خان! تم مجھے اپنا ساتھی کیوں نہیں بنا لیتے؟ میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں اور میرا دعویٰ ہے کہ میں خاصا کام کا آدمی ہوں۔"

اُس نے دودھ کا پیالہ خالی کر کے تپائی پر رکھا اور چند لمحے خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ "کیا تم سنجیدہ ہو؟" بالآخر اُس نے پوچھا۔

"موت کی حد تک۔" میں نے جواب دیا۔

"یہاں تمہیں کیا تکلیف ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں نے تمہیں اس لیے شراکت کی پیش کش نہیں کی کہ تم میرا انٹرویو لینے لگو۔" میں نے قدرے رکھائی سے کہا۔ "بہت سی باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں اور نہ ہی ان کے اظہار کا کوئی فائدہ ہوتا ہے۔ بہرحال تمہاری تسلی کے لیے تھوڑی سی وضاحت کر دیتا ہوں۔ میرا خیال تھا کہ تم خود ہی اس بات کو سمجھ جاؤ گے۔ میں یہاں ایک معمولی ملازم ہوں اور آثار یہی ہیں کہ اگر اس کھیتی میں رہا تو معمولی ملازم ہی رہوں گا کیونکہ میرے پاس نہ تو کوئی ہنر ہے اور نہ ہی خاص تعلیم جبکہ میں بہت سی دولت کمانا چاہتا ہوں اور بہت زیادہ دولت کا کوئی جائز راستہ مجھے نظر نہیں آتا۔ میں نے لائن بدلنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"روپیہ کمانا ہماری لائن میں بھی آسان نہیں۔" وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا۔ "اس میں بھی جائز کاروبار ہی کی طرح محنت ہے، مشقت ہے، درجہ بندیاں ہیں۔ ہمارے درمیان بھی سرمایہ دار طبقہ، غریب طبقہ، مڈل کلاس ہے، غرضیکہ ہر طرح کی مخلوق پائی جاتی ہے۔ کاروباری رقابتیں، ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا اور آگے بڑھنے کے لیے ہر حربہ استعمال کرنا۔ یہ سب کچھ ہمارے ہاں بھی ہوتا ہے۔ ہمارے دھندے میں بھی قسمت بعض کا ساتھ دیتی ہے بعض کا نہیں دیتی۔ غرضیکہ سب کچھ اسی طرح ہے جس طرح جائز کاروبار کی دنیا میں ہوتا ہے لیکن بہرحال ہمارا کاروبار ناجائز ہے اس لیے ہم وطن کے دشمن بھی ہیں، مجرم بھی۔ قانون کی راہ کا روڑا بھی ہیں اور اپنے ضمیر کے مطعون بھی۔ اگر تم میرے ساتھ شامل ہونا چاہتے ہو تو مجھے کوئی انکار نہیں لیکن اس لائن کو چھوڑ لیں کی سیج سمجھ کر مت آنا اور یہ بھی مت سمجھنا کہ آج اس دھندے

یں پڑو گے تو آج ہی سے تم پر ہُن برسنے لگے گا۔"

"اگر یہ سب کچھ درست ہے تو تم اپنی لائن کیوں نہیں بدل لیتے؟" میں نے پوچھا۔ "اگر جائز کاروبار جتنی ہی خواری اٹھانی ہے تو پھر جان ہتھیلی پر کیوں رکھی جائے؟"

"یہی میں بھی آج تک نہیں سمجھ سکا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "میں نے خود بھی بارہا جائز کاروبار کی طرف جانے کا سوچا لیکن مجھے کبھی حالات مناسب نظر نہیں آئے۔ شاید بات بس اتنی ہے کہ جو جس لائن میں رچ بس گیا اس کا اس سے نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ شاید کچھ چھوٹے اسمگلر سوچتے ہیں کہ بہت سا روپیہ آ جائے تو وہ ذرا شان سے کوئی کاروبار کریں لیکن جب وہ اس سطح پر پہنچ کر کوئی کاروبار شروع کرنے کی سوچتے ہیں تو بے شمار دشواریاں راستے میں حائل نظر آتی ہیں اور پھر اس وقت تک ان کا اپنا دھندا اتنا آسان، وسیع اور منافع بخش ہو چکا ہوتا ہے کہ جائز کاروبار میں زیادہ کشش نظر نہیں آتی۔ اس کے باوجود بہرحال بہت سے بڑے اسمگلر اپنے دھندے کو قانونی آڑ فراہم کرنے کے لیے بہت سے کاروبار بھی کرتے ہیں لیکن اس کے لیے بھی پہلے بہت سی قانونی دیواریں پھلانگنی پڑتی ہیں۔"

"بہرحال ترقی کی امید تو کی جا سکتی ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، بشرطیکہ آدمی سخت جان ہو اور جان کی اسے کوئی پروا نہ ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"جان کی پروا کر کے ہمیں کیا کرنا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اپنا کون سا کوئی دنیا میں رونے والا بیٹھا ہے۔ باقی رہی سخت جانی... تو وہ تم خود ہی دیکھ لینا۔"

"مجھے اپنے متعلق کچھ اور بتاؤ۔" اس نے فرمائش کی۔

"تم پوچھتے جاؤ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کروں گا۔" میں نے کہا۔ اس نے مجھ سے یوں سوالات کرنے شروع کر دیے جیسے وہ میری سوانح عمری مرتب کرنے کا ارادہ رکھتا ہو۔ میں نے حتی الامکان سچائی سے ہر سوال کا جواب دینے کی کوشش کی یعنی اس حد تک سچ بولا جس سے مجھے نقصان پہنچنے کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔

وہ میرے بارے میں تقریباً سب کچھ جان چکا تو مطمئن انداز میں سر ہلانے کے بعد ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "ملاؤ ہاتھ، آج سے ہم ففٹی ففٹی کے پارٹنر ہوئے۔ کیا تم آج رات ہی میرے ساتھ روانہ ہونا چاہتے ہو؟" مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے پوچھا۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگا تھا۔

"ہاں۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

"تخت یا تختہ قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہو جو سوچ بچار میں زیادہ وقت ضائع نہیں کرتے۔" وہ مسکرایا۔ "تمہاری یہ خوبی پسند آئی۔" پھر اس نے آگے آ کر جھک کر میری کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور واپس جا کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں ابھی ایک گھنٹا اور یہیں گزارنا چاہتا ہوں۔ اس دوران بہتر ہے کہ گپ شپ کرنے کے بجائے میں تمہیں اس دھندے کے مزید نشیب و فراز سمجھا دوں جس میں تم شریک ہونے جا رہے ہو۔ اگر تمہارا ذہن تھوڑا سا بھی تیکھا ہے اور تجربات سے پہلے ہی تم نے ان باتوں کو ذہن نشین کر لیا تو بہت فائدے میں رہو گے۔ بجائے اس کے کہ انسان خود مار کھا کر وہ تجربات حاصل کرے بہتر ہوتا ہے کہ کسی اور کے تجربات سے استفادہ کر لیا جائے۔"

وہ کسی بوڑھی روح کی طرح میرے ذہن کی سوچ پر تجربات رقم کرنے لگا۔ مختلف داؤ پیچ، مختلف سرکاری و غیر سرکاری لوگوں سے معاملہ سازی، حالات سے نمٹنے کے طریقے اور نہ جانے کیا کچھ۔ آدھ پون گھنٹے ہی میں مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں نے کوئی تربیتی کورس مکمل کر لیا ہے۔ اشرف خان بالکل ہی جتنا عقل مند لگتا تھا، شکل سے نہیں لگتا تھا۔ لفظوں کی حد تک تو وہ دانش مندی اور تجربات کا ایک سمندر معلوم ہوتا تھا۔ میں حتی الامکان یکسوئی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور ذہن نشین کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ جب خاموش ہوا تو میں اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ "یار! باتوں سے تو تم اس میدان کے بے تاج بادشاہ لگتے ہو لیکن..." میں نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا۔ "بظاہر اچھی طرح درویش ہی لگتے ہو۔"

"میں سمجھ گیا۔" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "تم کہنا یہ چاہتے ہو کہ بظاہر تو میں کنگلا نظر آتا ہوں۔ حقیقت میں بھی میں اپنی لائن میں اسمگلروں کے حساب سے کنگلا ہی ہوں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مجھ میں ایک بہت بڑی خامی ہے۔ میں بہت جلد دوسروں پر اعتبار کر لیتا ہوں۔ کم از کم ایک اسمگلر میں یہ خامی ہرگز نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے علاوہ وضع داری اور مروت وغیرہ جیسی بیماریاں بھی اسے لاحق نہیں ہونی چاہئیں۔ لوگوں سے حتیٰ کہ اپنے ساتھیوں تک سے معاملات میں اسے خاصی حد تک شکّاک ہونا چاہیے۔" اس نے ایک گہری سانس لی ہو کہا۔ "ہم نے بھی بہت لیکن لوگوں نے ہمارے پاس رہنے نہیں دیا۔ بہرحال... اس میں لوگوں کا زیادہ قصور نہیں، میری اپنی خامیوں کا زیادہ دخل ہے۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "اب ہمیں چلنے کی تیاری کرنی چاہیے۔ تم اپنی جو انتہائی ضروری چیزیں ساتھ لے جانا چاہتے ہو وہ پیک کر لو۔ کوشش کرنا کہ تمہارے ساتھ ایک سوٹ کیس کے علاوہ کچھ نہ ہو۔"

"میرے پاس ایک سوٹ کیس بھی نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں بڑا تہی دست قسم کا انسان ہوں۔ صرف ایک بیگ لے کر چلوں گا اور وہ تیار کرنے میں مجھے چند منٹ لگیں گے۔"

میں بیگ تیار کر چکا تو اشرف خان سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔ "تمہارا یہاں سے جانے کا کیا طریقہ ہو گا؟ چپ چاپ ہی غائب ہو جاؤ گے یا کسی کو اطلاع دے کر جاؤ گے؟"

"اطلاع دے کر جاؤں گا۔" میں نے کہا اور تپائی سامنے رکھ کر کاغذ قلم لے کر سائٹ انجینئر صاحب کے نام ایک رقعہ لکھنے لگا۔ رقعہ لکھ کر تہہ کر کے میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اشرف خان بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ کینوس کا تھیلا اس نے دوبارہ سینے سے باندھ لیا تھا اور جیکٹ کی زپ بند کر لی تھی۔

میں نے الوداعی نظر خیمے پر ڈالی۔ میرا بیشتر سامان اس وقت بھی روزمرہ کی سی بے ترتیبی سے بکھرا پڑا تھا اور ہر چیز گویا حیرت سے مجھے تک رہی تھی، بہ زبانِ خموشی پوچھ رہی تھی، "یہ تم نے اچانک ہی ہمیں چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا؟ عجب سیلانی آدمی ہو تم بھی۔ زندگی کے کتنے بڑے بڑے فیصلے یوں چٹکی بجاتے ہی کر لیتے ہو۔ ہجرت کی تو گویا تمہیں عادت سی پڑ گئی ہے۔ ابھی ایک در تم پر بند نہیں ہوتا لیکن تم اپنی گٹھڑی کندھے پر لاد کر دوسرے در کی تلاش میں نکل کھڑے ہوتے ہو۔"

میری زندگی کا یہ ایک اور باب تھا جسے میں آج خود ہی بند کر رہا تھا۔ ہر وہ جگہ جہاں آپ نے دو چار دن گزارے ہوں اس سے ایک عجیب انسیت سی ہو جاتی ہے خواہ وہ ایک خیمہ ہی ہو۔ یہ انسیت میرے دل میں بھی ایک کسک سی جگا رہی تھی مگر ساتھ ہی ایک عجیب سی بے کلی بھی تھی جو مجھے اکسا رہی تھی کہ یہاں سے نکل چلو۔ یہاں اب تمہارے لیے بہتری کا کوئی امکان نہیں رہا۔ آگے بڑھتے رہو۔ تمہاری منزل کہیں اور ہے جس روز منزل پر پہنچ جاؤ گے تمہیں خود بخود ہی قرار آ جائے گا۔

یہاں سے کچھ دور ایک اور شکستہ سا خیمہ تھا، جس میں بڑے مضبوط دل والی لالی نام کی ایک لڑکی رہتی تھی — اس کے خیمے میں بھی میری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش اور سنسنی خیز باب لکھا گیا تھا جس کے انجام نے ایک بار تو مجھے قلابازیاں کھلا دی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے گمان گزرا کہ شاید یہ لالی ہی کے آنکھیں پھیر لینے کا اثر تھا کہ ہر چیز نے آنکھیں پھیر لی تھیں، ہر چیز سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ وہ مہربان تھی تو گویا سارا جگ مہربان تھا۔

جانے کیوں میرے سینے کی گہرائیوں سے ایک آہ سی نکل گئی اور میں اپنے ذہن سے تمام خیالات جھٹک دینے کی کوشش کرتے ہوئے اشرف خان کی طرف مڑا۔ وہ بغور مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اسے خیمے سے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ باہر آ کر میں نے پوچھا۔ "ہم اب جا کہاں رہے ہیں؟"

"جہاں میں نے گاڑی چھپائی تھی، وہ وہیں موجود ہے۔ اس میں پچاس ہزار کے سونے کا ایک چھوٹا سا پیکٹ اور جعلی ولایتی شراب کی چند پیٹیاں موجود ہیں۔ کار سے اتر کر بھاگتے وقت میں سونے کا پیکٹ تو ساتھ لے ہی سکتا تھا لیکن وہ میں نے کچھ زیادہ ہی حفاظت سے چھپا کر رکھ دیا تھا، نکال ہی نہیں سکا۔ شراب کے آئٹم میں بھی میں نے کچھ عرصے سے خواہ مخواہ ہی ہاتھ ڈال دیا ہے۔ منافع تو کہ اس میں بھی کافی ہے مگر یہ جگہ بہت گھیرتی ہے۔ مجھ جیسے کم وسائل والے آدمی کے لیے بڑے پیمانے پر اس کی نقل و حرکت مشکل ہے۔"

ان دنوں چونکہ اپنے ہاں بھی اصلی اور جعلی ہر طرح کی شراب آسانی سے دستیاب تھی، اس لیے اسمگل کرنے کی کیا تک تھی؟ یہ میری سمجھ میں نہ آیا تو میں نے اشرف خان سے پوچھا۔ وہ بولا۔ "اپنے ہاں جو جعلی ولایتی شراب بنتی ہے وہ صاف پہچانی جاتی ہے کہ یہ جعلی ہے۔ پڑوسی ملک میں جو جعلی ولایتی شراب بنتی ہے، وہ بڑے آرام سے ولایتی کے دھوکے میں نکل جاتی ہے۔"

"تمہیں یہ کیسے یقین ہے کہ گاڑی رینجرز کے ہتھے نہیں چڑھی ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"انہیں دراصل یہ تاثر ملا تھا کہ گاڑی میں ہم دو آدمی ہیں اور جب ہم نے دیکھا کہ گاڑی کی وجہ سے ہم کہیں نہ کہیں پھنس جائیں گے تو ایک گاڑی لے کر نکل بھاگا اور دوسرا مال لے کر جنگل میں روپوش ہونے کی کوشش کرنے لگا۔"

میں خاموش رہا۔ ہم نہر کے پرانے پل کی طرف جا رہے تھے۔ بادلوں کے ٹکڑوں سے چھیڑ چھاڑ کرتا ہوا نامکمل سا چاند آسمان پر رینگ رہا تھا۔ دھندلی دھندلی چاندنی چاروں

طرف گویا سفید راکھ کی طرح بکھری ہوئی تھی۔ میں نے مڑ کر دیکھا میری اور لالی کی خیمہ بستیاں، دیوہیکل مشینیں، پتھروں کے انبار سب کچھ بہت پیچھے رہ گیا تھا اور اب ان کے ہیولے بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ ہم لوگ کچھ نشیب کی طرف جا رہے تھے۔

پُل پار کر کے ہم کچے راستے پر چلنے لگے، ویرانے میں بھٹکتی ہوئی دو بدروحوں کی طرح۔ ایک موڑ پر پہنچ کر وہ بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا ”اس طرف فوجی بیرکس ہیں۔ ناجائز مال پاس ہو تو کبھی بھول کر بھی اس طرف نہ جانا۔ یہ راستے، یہ سمتیں سب اچھی طرح ذہن نشین کر لو۔ پندرہ بیس میل کا یہی علاقہ ہم چھوٹے اسمگلروں کی کائنات ہے۔ ساری آنکھ مچولی ہمیں اسی علاقے میں کھیلنی ہوتی ہے۔ وہ سامنے تقریباً چار میل لمبا اور ڈھائی تین میل چوڑا گھنا جنگل پھیلا ہوا ہے جس کے کچھ حصے میں درخت اتنے گھنے ہیں کہ سورج کی کرنیں بھی زمین پر نہیں پہنچتیں۔ اسی جنگل میں ہم اسمگلروں، ڈاکوؤں اور جاسوسوں کی بہت سی پناہ گاہیں موجود ہیں۔“

پھر وہ کسی ماہر انسٹرکٹر کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک اشارہ کرتے ہوئے اور انگلی سے ہوا میں لہریا سا بناتے ہوئے بولا ”وہاں تک یوں لہریے کی سی شکل میں سرحدی علاقہ ہے۔ اگر تم کنارے کنارے چلو تو کبھی سرحد تمہارے اتنے قریب ہوگی کہ ایک قدم بڑھایا تو دوسرے ملک میں اور کہیں سرحد کئی میل دُور ہوگی۔“

وہ جدھر جدھر اشارہ کر رہا تھا، مجھے ان اطراف میں سوائے جھاڑیوں، درختوں، ٹیلوں اور ناہموار میدان کے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اشرف خان میری نظروں کے خالی پن کو محسوس کرتے ہوئے بولا ”دور دور سے تمہاری کچھ سمجھ میں نہیں آئے گا۔ میرے ساتھ رہو گے تو یہ علاقہ تمہارے لیے اپنا گھر بن جائے گا۔“

وہ ایک بار پھر چلنے لگا۔ میں اس کے ساتھ تھا لیکن میرا ذہن نہ جانے کہاں تھا۔ میں اپنے بارے میں غور کر رہا تھا کہ منہ اٹھا کر اس نئی راہ پر چل تو نکلا تھا، یہ مجھے راس بھی آئے گی یا نہیں؟

کچھ دیر بعد ہم جنگل میں داخل ہو گئے لیکن زیادہ دُور تک درختوں کے درمیان نہیں چلے، جلد ہی دوبارہ کھلے میں نکل آئے۔ پھر ہم نے ایک نالا عبور کیا جو تھا تو تقریباً خشک ہی لیکن پھر بھی اس سے گندے نالے جیسی بدبو اُٹھ رہی تھی۔

ہم دوسری طرف ڈھلان میں اُترے تو جیسے پہاڑی سا علاقہ شروع ہو گیا۔ کہیں نشیب، کہیں فراز، کہیں مسطح راستہ، کہیں ٹوٹی پھوٹی سی چٹانیں اور نیم پختہ زمین۔ یہاں کہیں تو بہت ہی گھنی جھاڑیاں اور کہیں قدِ آدم گھاس کے جُھنڈ موجود تھے اور ان کے درمیان برساتی پانی نے ٹیڑھی میڑھی پٹیاں سی کھینچ دی تھیں۔ یہ علاقہ کسی ویران جزیرے سے مشابہ تھا، ویسے ہی ویران جزیرے جیسے میں نے کبھی کبھار انگریزی فلموں میں دیکھے تھے۔

مزید تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ہم ایک بار پھر ناہموار جنگل ہی سے مشابہ علاقے میں پہنچ گئے، لیکن یہاں درخت اور جھاڑیاں بہت چھدری تھیں۔ ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ہم ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں سامنے ہی پُرانے پُرانے درختوں کا ایک بڑا سا جُھنڈ نظر آ رہا تھا۔

دفعتاً اشرف خان نے میرے بازو کو جھٹکا دیتے ہوئے سرگوشی کی ”ہوشیار...!“ وہ گھٹنوں کے بل گر کر چوپایا سا بن گیا۔ میں نے اس کی تقلید کی اور بیگ ریت پر رکھ کر اس کا فیتہ انگلیوں میں پھنسا لیا۔

اشرف خان کسی غصیلے بکرے کی طرح نتھنے پھلائے سامنے جُھنڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی اب توجہ دی تو احساس ہُوا کہ جُھنڈ کے درمیان کہیں کہیں سے روشنی پھوٹ رہی تھی اور شاید یہ روشنی متحرک بھی تھی۔

”وہاں کوئی موجود ہے؟“ اشرف خان نے سرگوشی کی۔ ”یہ رینجرز نہیں ہو سکتے کیونکہ اس علاقے میں انھوں نے میرا سُراغ کھو دیا تھا۔ دوبارہ انھوں نے مجھے اس وقت دیکھا تھا جب میں کار چھپا کر پگڈنڈی پر پہنچا تھا۔ ویسے بھی یہ لوگ چوروں کی طرح حرکت کر رہے ہیں۔“

”کار اسی جُھنڈ میں موجود ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اشرف خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں حیران رہ گیا۔ اگر وہ اس علاقے میں اس جُھنڈ تک کار لے آیا تھا اور وہ بھی اس حالت میں کہ رینجرز کی جیپ اس کے تعاقب میں تھی، تو میرے خیال میں اسے بہترین ڈرائیور کا ایوارڈ ملنا چاہیے تھا۔

”آؤ ذرا دیکھیں کون ہے۔“ اشرف خان نے اشارہ کیا اور ہم چوپایوں کی طرح آگے بڑھنے لگے۔ بیگ کو میں اپنے ساتھ گھسیٹے جا رہا تھا۔ جوں جوں ہم جُھنڈ کے قریب پہنچتے جا رہے تھے، برگدوں کی لٹکی ہوئی جڑوں کے درمیان سے اندر کا منظر کچھ کچھ دکھائی دینے لگا تھا۔

مزید قریب پہنچ کر ہمیں اندازہ ہُوا کہ جُھنڈ میں تین آدمی موجود تھے۔ تینوں کے پاس طاقت ور ٹارچیں موجود تھیں اور وہ بڑے انہماک سے کار کا معائنہ کر رہے تھے جیسے انھوں نے

زندگی میں پہلی بار کار دیکھی ہو۔ وہ مٹیالے رنگ کی کئی سال پُرانے ماڈل کی ایک فورڈ ویگنیئر تھی۔

وہ تین آدمی جو اس کا معائنہ کر رہے تھے گہرے گہرے رنگوں کی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیصوں میں تھے۔ سروں پر بڑی بڑی پگڑیاں تھیں اور ہر ایک کی کمر میں کارتوسوں کی پیٹی بندھی ہوئی تھی ـــــ کندھوں سے بندوقیں لٹکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک کی مجھے شکل بھی نظر آئی۔ اس کی داڑھی جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھی اور مونچھیں بھی اس میں اس طرح مدغم تھیں کہ دہن نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ ان کے گھوڑے بھی قریب ہی کھڑے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً ڈاکو تھے۔

ان میں سے دو تو مجہول سے ہی تھے البتہ ایک طاقتور اور مضبوط نظر آتا تھا۔ طاقت ور شخص کھڑکی کے شیشے سے روشنی کار میں ڈالتے ہوئے بولا ”یہ تو بہرحال طے ہے کہ کار کسی اسمگلر کی ہے۔“

”عین ممکن ہے کہ کار میں وھسکی کے علاوہ بھی کچھ مال ہو۔“ ایک مجہول شخص بولا۔

”نکلے تھے گھوڑوں کو پانی پلانے۔“ دوسرا مجہول ڈاکو بولا۔ ”آ گئے مل گئی وھسکی۔“

”کوئی بات نہیں گھوڑوں کو آج وھسکی ہی پلا دیتے ہیں۔ انھیں بھی عیش کرنے دو، کیا یاد کریں گے کیسے نواب قسم کے مالکوں سے واسطہ پڑا تھا۔“ پہلا مجہول بولا۔ ”شاید وھسکی پی کر یہ ترنگ میں آ کر ہمیں کسی ایسی سمت میں لے جائیں جہاں کوئی موٹا شکار ہاتھ آ جائے۔ کافی دنوں سے رُوں رُوں ہی ہو رہی ہے۔ معمولی چور اچکوں کی طرح راہگیروں سے گھڑیاں اور سو دو سو روپے چھین کر کب تک گزارا ہوگا۔“

جسیم شخص کار کا معائنہ کرتے کرتے مُڑ کر بولا ”میں تو کب سے کہہ رہا ہوں کہ چل کر کوئی بس وغیرہ لُوٹتے ہیں۔“

دوسرا مجہول سا شخص بولا ”تو لشیرے اور سردار کے زخم بھر جائیں پھر صحیح طرح کام شروع کریں گے۔ فی الحال تو صرف گزارا کرنے والی بات ہے۔“

”اچھا یار! باتوں کو چھوڑو۔“ جسیم شخص سیدھا ہوتے ہوئے بولا ”اب مسئلہ یہ ہے کہ اس مال کو ڈیرے تک کس طرح لے چلیں۔ شراب کی پیٹیاں گھوڑوں پر لاد کر لے جانا تو مشکل ہے اور پھر کار کی اندر سے اچھی طرح تلاشی بھی لینی ہے۔ کیا خیال ہے کھڑکی کا شیشہ توڑ کر دروازہ کھول لوں؟“

”ہاں، میرا خیال ہے توڑ ہی لو۔“ ایک مجہول سے ڈاکو نے پُرخیال لہجے میں کہا ”کار ہی کو ڈیرے پر لے چلتے ہیں۔“ اُس نے سر کی حرکت سے باریش مجہول کی طرف اشارہ کیا ”یہ قدامین کو ڈرائیونگ تو آتی ہی ہے۔“

”مگر چابی کے بغیر گاڑی اسٹارٹ کیسے ہوگی؟“ جسیم ڈاکو نے پوچھا۔

”یہ کوئی مسئلہ نہیں۔“ باریش ڈاکو بولا ”میں سوئچ توڑ کر اگنیشن کی تاریں جوڑ لوں گا۔“

اسی لمحے میرے قریب ہی اشرف خان نے سرگوشی کی۔ ”سالے باتیں تو اس طرح کر رہے ہیں جیسے باپ کا مال ہے۔ وکھ سہیں بی فاختہ، کوّے انڈے کھائیں۔ ہم تو اس مال کی خاطر مرتے مرتے بچے ہیں۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر دوبارہ یہاں تک آ گئے ہیں اور یہ آرام سے اسے لیے جا رہے ہیں۔“

میں نے دیکھا اُس کا خنجر نیام سے باہر آ چکا تھا۔ وہ کچھ آگے کو کھسکتے ہوئے پہلے سے بھی دھیمی سرگوشی میں بولا ”تم صرف اس جسیم ڈاکو کو سنبھال لینا، باقی دونوں کو میں دیکھ لوں گا۔ کوشش کرنا کہ تمہارا شکار ہلاک نہ ہونے پائے۔ میں بلاوجہ کی خون ریزی پسند نہیں کرتا۔“

وہ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے میرے ہاتھ میں کوئی بہت ہی تباہ کن ہتھیار موجود ہے اور میں جاتے ہی اس شخص کے پرخچے اُڑا دوں گا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ مجھے خود اس ڈاکو کے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا اندیشہ تھا کیونکہ وہ مجھ سے کہیں زیادہ جسیم تھا اور اس کے ہاتھوں میں بندوق بھی تھی جبکہ میں خالی ہاتھ تھا۔ بہرحال یہ ایک طرح سے اشرف خان کی نظر میں شاید میری قابلیت کا امتحان تھا اور میں اس پہلے ہی امتحان میں اپنے آپ کو نااہل ثابت نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے بیگ چھوڑ دیا اور ہم دونوں درندوں کی طرح جھاڑ جھنکاڑ کو دھیرے دھیرے چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اگر وہ تینوں کار کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو ہماری حرکت سے پیدا ہونے والی سرسراہٹ سُن سکتے تھے۔

میں نے عین اُس وقت جسیم ڈاکو پر چھلانگ لگائی جب وہ بندوق کا بٹ مار کر کار کی کھڑکی کا شیشہ توڑ چکا تھا۔ اشرف خان نے بھی میرے ساتھ ہی چھلانگ لگائی تھی، لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کس حال میں تھا۔ میں نے البتہ اپنے آپ کو اس لحاظ سے خوش قسمت محسوس کیا کہ میرا چھلانگ لگانے کا انداز میرے لیے کارآمد رہا تھا۔ اسی کی بدولت وہ بھینسا میرے قابو میں آ گیا۔

دراصل جب میں نے اس پر چھلانگ لگائی تو وہ جھکا ہُوا تھا۔ اس کی گردن سیدھی اسی کھڑکی میں چلی گئی جس کا اُس نے شیشہ

توڑا تھا۔ کناروں پر اُبھری ہوئی نوکیلی کرچیوں نے اُس کے چہرے اور گردن کو نہ جانے کس حد تک چیر ڈالا تھا۔ وہ بُری طرح چیخا اور بندوق اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

مَیں اُس کی کمر پر سوار تھا۔ مَیں نے اُسے کھڑکی میں کچھ اور آگے تک ٹھونسا پھر اس کی کمر سے اُتر کر زمین پر گری ہوئی اس کی بندوق اُٹھالی۔ جیسے ہی وہ کھڑکی سے سر نکالنے میں کامیاب ہُوا مَیں نے اُس کی کنپٹی پر بندوق کا بٹ رسید کیا اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اُس کا چہرہ اور گردن لہو میں تر تھی اور مزید خون اُبل رہا تھا۔ بہرحال وہ زندہ تھا۔ مَیں نے اشرف خان کی ہدایت کا خیال رکھا تھا اور اس پر گولی نہیں چلائی تھی۔ میرے خیال میں اس میں میری طاقت کو کم اور خوش قسمتی کو زیادہ دخل تھا کہ مَیں محض چند لمحے ہی میں اس پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

مَیں نے پلٹ کر دیکھا۔ اشرف خان خون میں لتھڑا ہُوا خنجر لیے کچھ حیران پریشان سا کھڑا نظر آیا۔ دونوں مجہول ڈاکو چت پڑے تھے اور اُن پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے معلوم ہوگیا کہ وہ مر چکے ہیں۔ ان کے چہروں وغیرہ پر کہیں خراش تک نہیں تھی۔ بس ان دونوں کے پہلو سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔

عجیب آدمی تھا یہ اشرف خان بھی۔ مجھے بے وجہ خونریزی سے پرہیز کرنے کی تلقین کر کے خود اس نے چشم زدن میں دونوں ڈاکوؤں کا صفایا کر دیا تھا۔

وہ گویا صفائی پیش کرتے ہوئے بولا ”اگر مَیں ان دونوں کو نہ مارتا تو ان میں سے ایک یقیناً مجھے مار ڈالتا۔“

مَیں نے کوئی جواب نہ دیا اور کپڑے جھاڑ کر اس طرف بڑھا جہاں مَیں اپنا بیگ چھوڑ کر آیا تھا۔ دفعتاً مَیں نے ہنہناہٹ کی ایسی خوفناک آواز سُنی جس نے مجھے لرزا دیا۔ گھوڑوں کی ہنہناہٹ مَیں نے زندگی میں جانے کتنی بار سُنی تھی مگر اس میں کوئی عجیب ہی بات تھی۔ ایک عجیب سی درندگی۔

مَیں نے بروقت ہی پلٹ کر دیکھ لیا۔ وہ تین گھوڑے جنھیں مَیں نے ایک طرف کھڑے دیکھا تھا اُن میں سے عنابی رنگ کا ایک گھوڑا اگلے دونوں پاؤں اٹھائے مجھ پر جھپٹ رہا تھا۔ اُس کے مُنہ سے کف بہہ رہا تھا اور چوڑے چوڑے دانت خوفناک انداز میں جھانک رہے تھے۔ اس وقت وہ گھوڑا نہیں، کوئی اور ہی خوفناک مخلوق لگ رہی تھی۔

مَیں نے اُس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھی۔ دوسرے ہی لمحے اضطراری انداز میں اپنی جان بچانے کے لیے مَیں زمین پر گرا اور لڑھکتا چلا گیا۔ اگر مَیں بروقت اپنی جگہ سے نہ ہٹا ہوتا تو گھوڑے نے یقیناً مجھے ٹاپوں سے کچل اور دانتوں سے بھنبھوڑ ڈالا ہوتا۔

گھوڑے نے جب دیکھا کہ مَیں بچ گیا ہوں تو وہ بجلی کی سی پھرتی سے اُچھلا اور ایک بار پھر اُس نے اپنے پورے وزن سے مجھے ٹاپوں تلے کچلنے کی کوشش کی لیکن اس بار بھی مَیں حتی الامکان پھرتی سے ایک طرف کو ہوگیا تھا۔ مَیں اُٹھنے لگا تو گھوڑے نے گھوم کر بجلی کی سی تیزی سے مجھے دولتی رسید کرنے کی کوشش کی۔ یہ دولتی گاڑی پر پڑی اور اس میں دو ڈینٹ پڑ گئے۔ جس دولتی نے تو رڈ جیسی گاڑی میں ڈینٹ ڈال دیے تھے، اگر وہ مجھے پڑ گئی ہوتی تو نہ جانے میرا کیا حال ہوتا۔ رائفل مَیں خود لڑائی ختم ہوتے ہی نہ جانے کہاں رکھ چکا تھا اور اب واقعی مَیں خاصا بدحواس ہو چکا تھا۔ ڈاکوؤں سے نمٹنا تو ہمارے لیے کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہُوا تھا۔ ہم بجلی کی طرح اُن پر ٹوٹ پڑے تھے اور معرکہ صرف چند سیکنڈ کا ثابت ہُوا تھا لیکن اس ایک گھوڑے نے مصیبت کھڑی کر دی تھی۔

وہ گھوڑا یقیناً اس جسیم ڈاکو کا تھا جسے مَیں نے صرف بے ہوش کیا تھا جبکہ دوسرے دو گھوڑے جن کے مالک اشرف خان کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے، قدرے لاتعلقی سے ایک طرف کھڑے تھے۔

مَیں نے گھوڑے کی وفاداری کے بہت سے قصّے سُ

رکھے تھے۔ مَیں نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھی تھیں لیکن یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی گھوڑا مالک کو گزند پہنچتے دیکھ کر اس قدر جذباتی بھی ہو سکتا ہے۔ اُس کی غضب ناکی نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اشرف خان نہ جانے کہاں چھپ گیا تھا۔ مَیں تیزی سے گھوم کر کار کے دوسری طرف پہنچا۔ گھوڑا بھی میرے تعاقب میں وہیں پہنچ گیا۔

مجھے اتنا احساس ضرور تھا کہ اگر مَیں ادھر اُدھر بھاگا تو گھوڑا میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا چنانچہ مَیں تیزی سے کار کے نیچے گھس گیا۔ گھوڑے نے پہلے گھوم کر کار کو دو تین دولتیاں رسید کیں پھر جھک کر خود بھی کار کے نیچے گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر وہ بیٹھ گیا۔ سر تو اس نے کار کے نیچے گھسیڑ ہی لیا تھا۔ باقی جسم کو بھی اندر لانے کے لیے زور لگا رہا تھا۔

ایک تو ویگنیر کار کا اپنا وزن، اوپر سے اس میں شراب کی پیٹیاں بھی لدی ہوئی تھیں، اس کے باوجود گھوڑے کی زور آزمائی سے وہ اوپر نیچے ہونے لگی تھی۔ گھوڑے کی باچھوں سے جھانکتے ہوئے چوڑے چوڑے دانت مجھ سے بمشکل ایک بالشت کے فاصلے پر تھے اور دھونکنی کی طرح چلتی ہوئی اس کی سانس میرے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ مَیں دوسری طرف کو کھسکتا جا رہا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ اگر گھوڑے کی غضب ناکی کا یہی عالم رہا اور وہ یونہی زور لگاتا رہا تو کوئی بعید نہیں کہ وہ گاڑی کو اُلٹ ہی دے، اس لیے مَیں نے اُسے گاڑی کے نیچے پھنسا ہُوا چھوڑ کر دوسری طرف سے نکل جانا ہی بہتر سمجھا مگر ساتھ ہی آتشِ انتقام سے جھلستا ہوا وہ حیوان بھی گاڑی کے نیچے سے نکل آیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ گاڑی کے گرد گھوم کر مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرتا، ایک زوردار دھماکا ہُوا اور اُس کی تقریباً آدھی کھوپڑی اُڑ گئی۔

وہ گر پڑا لیکن مجھے جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس سے مجھے چھٹکارا مل چکا ہے۔ چند لمحے تک مَیں گاڑی کا سہارا لیے کھڑا ہانپتا رہا پھر مَیں نے مُڑ کر دیکھا۔ اشرف خان رائفل ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔

وہ گویا کسی خیال سے چونک کر مسکراتے ہوئے بولا ”معاف کرنا یار! تمھیں اتنی تکلیف اس لیے اٹھانا پڑی کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرنا کیا چاہیے۔ انسانوں کے معاملے میں تو مجھ جیسے لوگ ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصّے میں بھی کوئی نہ کوئی فیصلہ کر لیتے ہیں لیکن اس گھوڑے نے تو واقعی مجھے بھی بوکھلا دیا تھا۔ پہلے تو مَیں خنجر ہی لیے اس پر جھپٹنے لگا تھا لیکن بروقت مجھے احساس ہوگیا کہ خنجر سے اُسے مارتے مارتے مَیں خود ہی نہ مارا جاؤں۔“

اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رائفل کندھے سے لٹکالی اور دوسرے ڈاکو کی رائفل اُٹھا کر مجھے دیتے ہوئے بولا ”میرا خیال ہے اب ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکل لینا چاہیے، بہت وقت ضائع ہو چکا ہے۔“

میرا حلیہ ایسا ہو رہا تھا جیسے مَیں کپڑوں سمیت اکھاڑے میں اُتر گیا تھا اور کسی مشّاق پہلوان نے مجھے خوب پٹخنیاں دی تھیں۔ مَیں نے کپڑے اچھی طرح جھاڑے۔ درختوں، جھاڑیوں اور لٹکی ہوئی جڑوں کے حلقے سے نکل کر اپنا بیگ اٹھایا اور واپس کار کے قریب پہنچا۔

اشرف خان دوسری طرف کھڑا مُردہ گھوڑے کو عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مَیں بھی اس طرف چلا گیا۔ گھوڑا آڑا ترچھا پڑا تھا۔ اُس کی گردن تشنّجی سی کیفیت میں مڑی ہوئی تھی۔ آدھی کھوپڑی کے ساتھ اس کی ایک آنکھ بھی غائب ہو چکی تھی مگر دوسری آنکھ کُھلی تھی اور اس میں مجنونانہ انتقام کی چمک اب بھی ماند نہیں پڑی تھی۔ اس کی شکستہ کھوپڑی سے خون اور بھیجے کا ملغوبہ بہہ بہہ کر زمین پر جمنے لگا تھا۔

مجھے کراہت سی محسوس ہوئی اور مَیں نے نظر پھیر لی۔ مجھے ماحول میں کسی تبدیلی کا احساس ہُوا۔ اِدھر اُدھر دیکھا تو اس تبدیلی کا ادراک ہوگیا۔ دونوں گھوڑے غائب ہو چکے تھے۔

”ان دونوں لاشوں اور اس زندہ ڈاکو کا کیا کرنا ہے؟“ مَیں نے اشرف خان سے پوچھا۔

”جو جہاں ہے اور جیسا ہے اسے وہیں اور اسی حالت میں پڑا رہنے دو۔“ اشرف خان نے جواب دیا اور چابی نکال کر کار کا دروازہ کھولنے لگا۔

اُس نے رائفل کار کے فرش پر ڈال دی اور دوسرا دروازہ کھول کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ مَیں نے بھی رائفل سیٹ کے آگے فرش پر ہی رکھ دی اور اشرف خان کے برابر بیٹھ کر پیچھے دیکھا۔ کار میں صرف دو ہی سیٹیں تھیں۔ پچھلا حصّہ نشستوں سے خالی تھا۔ اس میں کارٹن بھرے ہوئے تھے اور ان پر خوبصورت لیبل بھی چمک رہے تھے۔

”ان پر سے کپڑا ہٹ گیا ہے، وہ ذرا صحیح کر دو۔“ اشرف خان نے ہدایت کی۔ مَیں ان پیٹیوں کو اچھی طرح کپڑے سے ڈھانپ چکا تو اشرف خان نے کار اسٹارٹ کی اور چند لمحے بعد ہم جھنڈ سے باہر آ چکے تھے۔

ہچکولے اور لہریے کھاتی ہوئی کار بالآخر پگڈنڈی پر آئی اور ڈھائی تین میل کے سفر کے بعد ہم اچانک ہی ایک

تنگ سی سڑک پر پہنچ گئے۔ سڑک پر پہنچتے ہی فورڈ فرانٹے بھرنے لگی۔ اشرف خان واقعی بڑا مشاق ڈرائیور تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ اُس نے ایک شہر کا نام لیا۔ نام تو کچھ اور تھا لیکن میں مصلحتاً اسے شہزاد کوٹ کہوں گا۔ اس شہر کا نام میں نے بارہا سنا تھا۔

"وہاں میرا گھر ہے۔" اشرف خان نے بتایا۔ "میرے بہت سے بھائی بند وہاں رہتے ہیں۔ مال کی وصولی اور سپلائی کا وہاں معقول انتظام ہے۔"

"کیا میں تمہارے ساتھ ہی رہوں گا؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے اور کہاں رہو گے؟" اُس نے عجیب سے انداز میں ایک نظر میری طرف دیکھا۔ میں خاموش رہا۔ اب میں بے فکر ہو چکا تھا۔ روٹی اور رہائش میرے یہ دو ہی مسئلے زیادہ سنگین ہوتے تھے، یہ حل ہو جاتے تھے تو مجھے کوئی خاص فکر نہیں رہتی تھی۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے تیز رفتار سفر کے بعد ہم شہزاد کوٹ میں داخل ہوئے۔ صبح صادق کے آثار ابھی نمودار نہیں ہوئے تھے۔ تاہم کسی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ شہر کی سڑکیں اور گلیاں سونی نظر آ رہی تھیں۔ ایک سڑک کے کنارے میں نے ایک چوکیدار کو چارپائی پر بستر بچھاتے دیکھا۔ جب دُنیا کے بیدار ہونے کا وقت ہو رہا تھا تو اس بے چارے کا سونے کا وقت شروع ہو رہا تھا۔

یہاں بیشتر مکان بلند و بالا لیکن پُرانی طرز کے تھے۔ چوڑی چکلی اور تنگ و تاریک، ٹیڑھی میڑھی اور سیدھی گلیوں میں چکراتی ہوئی کار بالآخر کھلے کھلے سے علاقے میں نکل آئی۔ اس گلی کا فرش اینٹوں کا تھا اور گلی میں مکان درحقیقت تین چار ہی تھے۔ باقی پلاٹ خالی پڑے تھے۔ گلی کے اختتام پر نشیب میں ایک وسیع میدان سا تھا اور اس سے آگے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ شاید یہ شہر کا آخری حصّہ تھا۔

اشرف خان نے کالے گیٹ والے ایک مکان کے سامنے گاڑی روکی اور انجن بند کیے بغیر مجھے جیب سے ایک چابی نکال کر دیتے ہوئے بولا۔ "گیٹ کے ساتھ ہی گیراج کا جو دروازہ نظر آ رہا ہے اس کا تالا کھولو۔ کوشش کرنا کہ دروازہ کھولتے وقت کوئی آواز پیدا نہ ہو۔"

میں نے گیراج کا دروازہ کھول دیا اور اشرف خان نے گاڑی اندر پہنچا دی۔ وہ باہر آ چکا اور میں گیراج کو دوبارہ مقفل کر چکا تو مکان کا چھوٹا گیٹ جیسے خود بخود ہی بے آواز طریقے سے کھل گیا۔ اس کے پیچھے مجھے ایک عورت کی جھلک نظر آئی لیکن روشنی ناکافی ہونے کی وجہ سے میں اس کے متعلق کوئی اندازہ قائم نہ کر سکا۔

اشرف خان کا اشارہ پا کر میں اس کے پیچھے پیچھے جھکا کر چھوٹے گیٹ سے اندر پہنچا۔ عورت نے گیٹ بند کر دیا اور قریب ہی دیوار پر موجود ایک سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھا کر برآمدے کی بتی روشن کر دی۔

وہ درمیانے قد کی ایک پختہ العمر اور پُرکشش عورت تھی۔ اس کے جسم پر شب خوابی کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ تھا مگر اس کی کشش کو چھپانے کے بجائے اُجاگر کر رہا تھا۔ اس کے تراشیدہ بال زیادہ منتشر اور پریشان نہیں تھے اور آنکھوں میں نیند کا خمار بھی زیادہ گہرا نہیں تھا۔ اس کی رنگت کھلی کھلی، چہرہ بیضوی اور ہونٹ بھرے بھرے تھے۔ مجموعی طور پر اسے دیکھ کر یہی احساس ہوتا تھا کہ اشرف خان بیوی کے معاملے میں خاصا خوش قسمت ہے۔

اشرف خان نے اس سے صحیح طور پر میرا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ بس اتنا کہا۔ "یہ محمد افضل ہے۔ یہ ہمارے ساتھ یہیں رہے گا۔"

عورت نے میرا سر تا پا جائزہ لیا۔ اُس کی بڑی بڑی آنکھوں میں ایک عجیب سی اُداسی جاگزیں تھی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ ہولے سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گئی۔

مکان خاصا کشادہ معلوم ہوتا تھا۔ جہاں ہم کھڑے تھے وہ جگہ راہداری سے مشابہ تھی۔ ایک طرف دو کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔ ان کے مقابل غالباً فاضل غسل خانہ، باورچی خانہ وغیرہ تھا۔ آگے وسیع صحن تھا اور اس سے آگے برآمدہ۔ برآمدے کے پیچھے مزید کمرے نظر آ رہے تھے۔

عورت جیسے کسی اَن پوچھی بات کے جواب کا انتظار کر رہی تھی اور اشرف خان سر کھجا رہا تھا۔ دونوں میاں بیوی جیسے گومگو کے عالم میں تھے۔ بالآخر عورت نے پوچھ ہی لیا۔ "اسے کہاں ٹھہرانا ہے؟"

اس وقت تک اشرف خان گویا فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ آگے قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ "مہمان خانے میں۔" گیٹ سے متصل کمرا غالباً ڈرائنگ رُوم تھا۔ اشرف خان نے اس سے اگلے کمرے کی کُنڈی کھولی اور اندر پہنچ کر لائٹ آن کر دی۔ یہ ایک کشادہ کمرا تھا جس کی کھڑکیوں اور دروازوں پر بھاری پردے پڑے ہوئے تھے۔ دو بیڈ، سنگھار میز اور صوفے وغیرہ بھی موجود تھے حتیٰ کہ ایک تپائی پر ٹیلی فون سیٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ یہ پہلا معقول اور آراستہ و پیراستہ کمرا تھا جس میں میں قیام کرنے جا رہا تھا۔ پھر بھی میں نے گویا تصدیق کی خاطر پوچھ لیا۔ "یہاں ٹھہرنا ہو گا مجھے؟"

"بے شک۔" اشرف خان نے جواب دیا۔ "آج سے اس کمرے کو اپنا کمرا اور اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو۔ ایک چھوٹی سی تکلیف تمہیں اُٹھانا پڑے گی کہ باتھ روم اس کمرے سے ملحق نہیں ہے بلکہ وہ دروازے کے سامنے ہے۔" اس نے اشارے سے بتایا۔ "ذرا کچھ فرصت ملے اور کچھ فالتو رقم آئے تو اس مکان میں بھی کچھ تبدیلیاں کراؤں گا۔"

وہ کمرے کے مقابل بنے ہوئے باتھ روم کی وجہ سے سمجھ رہا تھا کہ مجھے زحمت ہو گی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے ہوش ایسے گھر میں سنبھالا تھا جہاں سرے سے باتھ رُوم کا تصور ہی موجود نہیں تھا۔

میں نے کمرے میں داخل ہو کر بیگ ایک طرف رکھ دیا۔ اشرف خان کی بیوی بغلوں میں ہاتھ دیئے دہلیز پر کھڑی سپاٹ سی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔

"اب تم کپڑے بدل لو... منہ ہاتھ دھو لو۔" اشرف خان بولا۔ "تب تک میں بھی اپنا حلیہ درست کرتا ہوں۔ زرینہ اتنی دیر میں ناشتے کا بندوبست کر لے گی۔ ہم ڈٹ کر ناشتا کریں گے اور اس کے بعد دن بھر سوئیں گے۔ رات کو اُٹھ کر ہم جائزہ لیں گے کہ گلشن کا کاروبار کیسا چل رہا ہے۔"

میں نے ذہن نشین کر لیا کہ اشرف خان کی بیوی کا نام زرینہ تھا۔ اُس نے اب تک صرف ایک ہی جملہ بولا تھا۔ اس کی آواز اور لب و لہجہ اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتا تھا۔ آواز بے رس اور کچھ کھردری سی تھی اور لب و لہجے سے اس کے تقریباً اَن پڑھ ہونے کا اندازہ ہوتا تھا جبکہ ظاہری شخصیت کے اعتبار سے وہ ایک رسیلی اور سلجھی ہوئی عورت معلوم ہوتی تھی۔

وہ میاں بیوی مجھے کمرے میں چھوڑ کر رخصت ہو گئے تو میں نے دروازہ بند کر کے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ جوتوں سمیت بیڈ پر دراز ہو گیا اور گہری گہری سانسیں لینی شروع کر دیں۔ ایک طویل عرصے بعد اتنی تھکن سے واسطہ پڑا تھا اور ایک طویل عرصے بعد ایسا آرام دہ بیڈ نصیب ہُوا تھا۔

پون گھنٹے بعد جبکہ دن کی روشنی اچھی طرح پھیل چکی تھی، ہم تینوں کافی بہتر حلیے میں مکان کے برآمدے میں پڑی ہوئی ڈائننگ ٹیبل پر موجود تھے۔ گھر میں کوئی ملازم وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اکیلی زرینہ نے ہی اس تھوڑے سے وقت میں بھرپور ناشتے کے لیے نہ صرف بہت سی چیزیں تیار کر ڈالی تھیں بلکہ اپنا حلیہ بھی مزید نکھار لیا تھا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے ناشتہ کر رہی تھی۔ وہ بہت کم گو عورت معلوم ہوتی تھی۔ شاید یہ گھر میں ایک اجنبی کی، یعنی میری موجودگی کا اثر تھا یا پھر اسے احساس تھا... کہ بولنے سے اس کی شخصیت کا تاثر مجروح ہوتا ہے۔

ہم ناشتے سے ہاتھ کھینچ چکے تو زرینہ نے اُٹھتے ہوئے براہِ راست مجھ سے پوچھا۔ "تم چائے پیو گے یا کافی؟"

کافی میں نے کبھی نہیں پی تھی، سوچا کہ آج اسے ہی ٹرائی کرنا چاہیے۔ ذرا رعب بھی پڑ جائے گا کہ ہم بدولت ناشتے میں کافی پینے کے عادی ہیں۔

"کافی مل جائے تو مناسب رہے گا۔" میں نے لہجہ انتہائی شائستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ کچن میں چلی گئی تو اشرف خان محض گفتگو برائے گفتگو کے انداز میں بولا۔ "ملازم میں نے احتیاطاً نہیں رکھا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے ملازم وغیرہ رکھنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ زرینہ بڑی اچھی عورت ہے۔ اُس نے بڑی عمدگی سے ساری گھرداری، مہمان داری وغیرہ سنبھال رکھی ہے۔ ہنگامی حالات سے بھی اچھی طرح نمٹ لیتی ہے۔ سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ غیر ضروری سوالات نہیں کرتی اور عام عورتوں کی طرح مغز نہیں کھاتی۔"

میں صرف شائستگی انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ مجھے کسی کے

خانگی معاملات پر تبصرہ کرنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ اندیشہ ہی رہتا تھا کہ کوئی نامناسب بات منہ سے نہ نکل جائے۔ اس لیے ایسے مواقع پر میں خاموش رہنا ہی بہتر سمجھتا تھا۔

چند منٹ بعد زرینہ میرے لیے کافی اور اشرف خان کے لیے چائے لے کر آگئی۔ ناشتے کے اس حرف آخر سے فارغ ہو کر اشرف خان پائپ سلگاتے ہوئے بولا۔ ”اب تم جا کر آرام سے جب تک دل چاہے سوتے رہو۔ طوائفوں کی طرح ہم لوگوں کی بھی عموماً راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔“

اس وقت وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا، ٹانگ پر ٹانگ رکھے، ایک ہاتھ نائٹ گاؤن کی جیب میں ڈالے اور پائپ کے کش لگاتے ہوئے خاصا معتبر آدمی لگ رہا تھا۔ کوئی ڈاکٹر یا درمیانے درجے کا کوئی پڑھا لکھا تاجر۔ اس وقت اسے دیکھ کر گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ اس شخص کی راتیں ویرانوں، جنگلوں اور سرحدی علاقوں میں جان ہتھیلی پر رکھے گزرتی ہیں۔

میں اسے وہیں بیٹھا ہوا چھوڑ کر اپنے کمرے میں آیا اور بیڈ پر گر کر اس گھوڑے کی طرح سو گیا جو کئی دن آوارہ گردی کر کے اور کئی دن کانجی ہاؤس میں گزار کے گھر واپس پہنچی ہو۔ میں شاید زیادہ دیر نہیں سویا تھا، جب میں نے خواب میں لالی کو دیکھا اور میری نیند گہری ہونے کے بجائے اچاٹ ہو گئی۔ مجھ پر جھنجلاہٹ سی طاری ہو گئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس ہرجائی اور بدبخت عورت کو خواب میں دیکھوں۔

لیٹے لیٹے پہلو بدلتے ہوئے میرا دل چاہا کہ اٹھ کر کوئی چیز توڑ ڈالوں۔ اپنی اس خواہش پر بہ مشکل قابو رکھتے ہوئے میں اٹھا اور پردہ ہٹا کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر چمکیلی دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ صبح کے ملگجے اندھیرے میں میں نے جو کھیت سے دیکھے تھے، وہ دراصل لاوارث قسم کے سبزہ زار معلوم ہوتے تھے۔ ان میں کوئی فصل تھی نہ کاشت کاری۔ بس اونچی اونچی گھاس پھیلی ہوئی تھی جو مویشیوں کے رات میں خاص طور پر استعمال ہوتی ہے۔ بیچ میں کہیں کہیں پگڈنڈیاں اور نالے بھی نظر آ رہے تھے۔ اس بور منظر سے اکتا کر میں پردہ کھینچ کر دوبارہ بیڈ پر آ گرا اور سر منہ لپیٹ کر کچھ دیر کی کوشش کے بعد سو گیا۔

دوبارہ میری آنکھ رات گئے کھلی۔ اشرف خان مجھ سے پہلے بیدار ہو چکا تھا اور کھانے پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر اس نے مجھے بتایا۔ ”میں نے پارٹی کو فون کر دیا ہے۔ گیارہ بجے کے قریب کارندے آ کر مال لے جائیں گے۔“

ٹھیک گیارہ بجے کال بیل بجی۔ اشرف خان کی ہدایت کا انتظار کیے بغیر زرینہ نے جا کر چھوٹا گیٹ کھول کر باہر جھانکا اور پھر واپس آ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں اشرف خان کو اشارہ کیا۔ اشرف خان میرا ہاتھ تھامتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

باہر آ کر میں نے دیکھا، گیٹ کے سامنے نیلے رنگ کا ایک چھوٹا پک اپ ٹرک کھڑا ہوا تھا۔ اگلے حصے میں ڈرائیور اور اس کے ساتھ ایک اور شخص موجود تھا۔ انھوں نے اتر کر نہایت ہی گرم جوشی اور محبت سے اشرف خان سے معانقہ کیا اور ایک دوسرے کا حال چال پوچھنے لگے۔ اشرف خان نے باتوں کے دوران مجھے چابی دیتے ہوئے ہدایت کی کہ گیراج کا دروازہ کھول دوں۔

گیراج کا دروازہ کھل چکا تو پک اپ کے ڈرائیور نے گاڑی الٹے رخ اس طرح گیراج میں آدھی داخل کر دی کہ گلی میں آتا جاتا کوئی شخص نہ دیکھ سکے کہ پک اپ میں کیا لادا یا اتارا جا رہا ہے۔ ویسے بھی خیر گلی میں آمد و رفت ہی کہاں تھی۔ تین چار ہی کل مکان تھے اور وہ بھی کچھ اجاڑ اجاڑ سے ہی نظر آتے تھے۔ اشرف خان نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا تھا کہ محلے میں جو اکا دکا لوگ سرسری طور پر اسے جانتے تھے، وہ اسے کوئی تاجر ہی سمجھتے تھے۔

میں نے دیکھا کہ پک اپ میں پہلے سے بھی کچھ کارٹن موجود تھے لیکن یہ کارٹن گھریلو اشیائے ضرورت کے تھے، مثلاً صابن، تیل کی شیشیاں اور منجن وغیرہ۔ نوواردوں نے اشرف خان کی گاڑی سے وسکی کی پیٹیاں نکال کر اس طرح پک اپ میں رکھیں کہ وہ اشیائے صرف کے کارٹنوں میں چھپ کر رہ گئیں۔ قرینے اور ترتیب سے گاڑی بھرنے کے بعد انھوں نے ٹیل گیٹ بند کر دیا اور ہلکی رسیاں کھینچ دیں۔

اس کے بعد اشرف خان نے اپنی گاڑی کے ایک خفیہ خانے سے ایک چھوٹا سا چرمی پیکٹ نکال کر ڈرائیور کے حوالے کیا جسے اس نے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ ڈرائیور کے ساتھی نے ایک موٹا سا لفافہ نکال کر اشرف خان کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ ”باس نے کہا ہے کہ ہم نے جو مال بھیجا تھا اس کی قیمت کاٹ کر یہ کمیشن بنا ہے۔ اب اگلے سودے تک حساب بے باق ہے۔“

اشرف خان نے لفافہ کھول کر دیکھے بغیر گاؤن کی جیب میں رکھ لیا اور ایک دوسرا لفافہ نکال کر ڈرائیور کو تھماتے ہوئے کہا۔ ”یار! ذرا راستے میں یہ نفیس خان کی امانت بھی دیتے جانا۔ اس سے کہنا کہ کمیشن میں نے رکھ لیا ہے۔“

وہ لوگ جا چکے تو ہم اندر آ بیٹھے۔ زرینہ چائے بنا لائی۔ چائے ہمیں دے کر وہ خود اندر جا کر کوئی کام کرنے لگی۔ ہم ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے چائے کی چسکیاں لینے کے ساتھ ساتھ

گپ شپ بھی کر رہے تھے۔ اشرف خان بتا رہا تھا کہ اس کی برادری کے لوگ اپنے دھندے کو امپورٹ ایکسپورٹ کہتے ہیں۔ اشرف خان کا کاروبار دو طرفہ تھا یعنی وہ امپورٹر بھی تھا اور ایکسپورٹر بھی اور اس کا کام بارٹر سسٹم پر چلتا تھا یعنی مال کے بدلے مال ... اور مال بھی دوسروں کا ہوتا تھا، اس لیے اس کے کام میں خطرات بہت زیادہ تھے اور آمدنی کم۔ اسے مال لے جاتے وقت بھی خطرات کا سامنا ہوتا تھا اور مال لاتے وقت بھی۔

اس کا زیادہ تر کاروبار، پڑوسی ملک سے تھا جس میں منافع کی شرح زیادہ نہیں تھی۔ جو چیزیں لائی اور لے جائی جاتی تھیں، ان کا حجم زیادہ ہوتا تھا اور قیمت کم ... اس کا کہنا تھا کہ ایک دوسرے پڑوسی ملک سے کاروبار کرنے میں زیادہ فائدہ تھا۔ وہ اسی کوشش میں تھا کہ وسائل بڑھ جائیں اور کچھ کام کی پارٹیوں سے رابطے قائم ہو جائیں تو اسی ملک سے منشیات امپورٹ کی جائیں۔ کچھ لوکل مارکیٹ میں دی جائیں اور وسائل بڑھیں تو امیر ممالک کی طرف ایکسپورٹ کی جائیں یا پھر کراچی میں سیٹ ہو کر بحری راستے سے چھوٹے حجم کی مگر قیمتی اشیاء امپورٹ کی جائیں۔ غرضیکہ اس کے ذہن میں ترقی کے بڑے منصوبے تھے اور اب میری ذات سے اس نے بڑی امیدیں وابستہ کر لی تھیں۔ اسے یقین ہو چلا تھا کہ ایک جاں نثار ساتھی میسر آنے کے بعد اس کے کام کی رفتار دگنی ہو جائے گی۔

ایسی ہی باتیں کرتے کرتے اس نے جیب سے رقم کا وہ لفافہ نکالا جو مال لے جانے والی پارٹی اسے دے گئی تھی۔ رقم نکال کر اس نے گنی پھر آدھے نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ ”یہ چھ ہزار روپے ہیں آدھا حصہ ... یہ تم رکھ لو۔“

میں نے ہاتھ بڑھائے بغیر قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا۔ ”اس کھیپ میں یقیناً تمہارا حصہ زیادہ بنتا تھا۔ درحقیقت تمہاری ہی بدولت میری واپسی ممکن ہوئی ہے، ورنہ میں پرائے مال، پرائی رقم اور اپنی جان تک سے بھی ہاتھ دھو چکا ہوتا۔ ویسے بھی خیر اب ہم ففٹی ففٹی کے پارٹنر ہیں، اس لیے اپنے حصے کی رقم رکھ لو اور جو تمہارا جی چاہے کرو۔“

”لیکن میرا تو فی الحال ایسا کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا جس میں رقم کی ضرورت ہو۔“ میں نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ زرینہ اس دوران برآمدے میں لگے ہوئے واش بیسن پر آ کھڑی ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ ہاتھ دھو رہی تھی۔ وہ جیسے اپنے آپ میں مگن تھی اور اس کے خیال میں شاید ہم وہاں موجود ہی نہیں تھے۔ اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میرے حصے کی رقم بھی فی الحال تم ہی اپنے پاس رکھو۔ مجھے جب اور جتنی رقم کی ضرورت ہوا کرے گی، میں تم سے لے لیا کروں گا۔ باقی رقم تم چاہو تو کاروبار میں لگاتے رہا کرو۔ اگر ہم منافع ساتھ کے ساتھ کھاتے رہیں گے تو کاروبار کو بڑھانے کی نوبت کہاں آئے گی۔“

اس نے بے یقینی کے سے انداز میں میری طرف دیکھا اور گرم جوشی سے میرا ہاتھ دباتے ہوئے بولا۔ ”تم صحیح معنوں میں ویسے ہی پارٹنر ہو جیسے کی مجھے تلاش تھی۔ تم بے فکر رہو۔ میں تمہاری ایک ایک پائی کا حساب رکھوں گا۔“

اس لمحے زرینہ نے مڑ کر سپاٹ سی نظر سے میری طرف دیکھا اور تولیے سے ہاتھ پونچھ کر اپنے مخصوص لاتعلق سے انداز میں میز پر آ بیٹھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے میز پر پڑی ہوئی لمبی لمبی نسواری سگریٹوں کا پیکٹ اٹھایا اور ایک سگریٹ نکال کر سلگا لی۔ اپنے تراشیدہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اس نے دو تین گہرے گہرے کش لیے اور ایک بار پھر نیم وا لیکن سپاٹ سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ میرے ہی بارے میں سوچ رہی تھی لیکن اسے اپنی آنکھوں، اپنے لہجے اور اپنے چہرے کو سپاٹ رکھنے کا فن آتا تھا۔ میرا دل کہتا تھا کہ خلوت میں وہ ایسی سپاٹ عورت نہیں تھی۔

”تمہیں تاش کھیلنی آتی ہے؟“ دفعتاً اشرف خان نے پوچھا۔ ”رمی، کوٹ پیس یا فلاش؟“

”آتی تو ہے لیکن زیادہ نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کوئی بات نہیں، کام چلے گا۔“ اشرف خان بولا۔ ”لیکن ہم پیسوں کے بغیر نہیں کھیلتے، اس لیے کچھ رقم رکھ ہی لو۔“ اس نے گن کر کچھ نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیے۔

میں ان دونوں کے ساتھ اٹھ کر بیڈ روم میں آ گیا۔ یہ ایک آراستہ و پیراستہ کمرا تھا۔ فرنیچر کے پھیلاؤ سے جو جگہ بچ گئی تھی اس میں دبیز قالین پر گاؤ تکیے رکھے ہوئے تھے۔ ہم قالین پر ہی بیٹھ کر تاش کھیلنے لگے۔

سگریٹ زرینہ کے ہونٹوں میں دبی ہوئی تھی اور اس سے دھوئیں کی پتلی سی لکیر ہوا میں بلند ہو رہی تھی۔ باتیں زیادہ تر اب بھی میں اور اشرف خان ہی کر رہے تھے۔ زرینہ بہت

کم بولتی تھی۔ کبھی کبھی وہ دھوئیں کی لکیروں کے عقب سے ایک نظر میری طرف دیکھ لیتی۔ اس کی سگریٹ کی طرح اس کی آنکھوں کی گہرائی میں بھی کوئی چیز دھیرے دھیرے سُلگ رہی تھی، جب یہ چنگاری لَو دے اُٹھتی ہوگی تو اس کی آنکھیں یقیناً بہت خوبصورت لگتی ہوں گی، ایک بار میں نے سوچا۔

ہم تقریباً دو ڈھائی گھنٹے کھیلتے رہے۔ اس دوران زرینہ نے کئی سگریٹیں پھونک ڈالیں اور دو مرتبہ اپنی لپ اسٹک درست کی۔ اس نے مجھ سے اور اشرف خان سے تقریباً تین چار سو روپے جیت لیے۔ مجھے ہارنے کے باوجود کھیل میں لطف آرہا تھا۔

بالآخر اشرف خان نے کھیل ختم کرنے کا اعلان کیا اور زرینہ سے گویا سفارش کرتے ہوئے کہا، "بھئی افضل کے پیسے تو واپس کردو، یہ بے چارہ تو نیا اور اناڑی تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ کھیلنا کیا معانی رکھتا ہے۔"

"ہاری ہوئی چیز واپس لینے میں میرے خیال میں تو ہارنے والے کو بھی لطف نہیں آتا۔" زرینہ نے بھاری سی آواز میں کہا، پھر وہ براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "کیا خیال ہے مسٹر افضل؟"

"جی... جی ہاں... آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔ "میں بھلا کب ہاری ہوئی رقم واپس مانگ رہا ہوں... یہ تو اشرف خان صاحب میری ہمدردی میں مدعی سست گواہ چست والا کردار ادا کر رہے ہیں۔"

"بس؟" زرینہ، اشرف خان کی طرف دیکھ کر دھیرے سے ہنس دی۔ اشرف خان نے بے پروائی سے کندھے اُچکا دیے اور پتے سمیٹ کر پیکٹ میں ڈالنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ زرینہ جب براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوئی تھی تو میری دھڑکن کچھ تیز ہوگئی تھی۔ اگر وہ اشرف خان کی بیوی نہ ہوتی تو میں دل ہی دل میں اس کے بارے میں واضح طور پر کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ مجھے اچھی لگ رہی تھی یا بُری۔ میرے ضمیر میں چونکہ تھوڑی بہت زندگی باقی تھی، اس لیے میں اپنے میزبان، مہربان اور نئے نئے کاروباری حصے دار کی بیوی کے بارے میں اپنے محسوسات غیر جانبدارانہ رکھنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد میں اپنے کمرے میں آگیا اور ریڈیو پر کلاسیکل موسیقی کا ایک نہایت خواب آور قسم کا پروگرام سنتے سنتے سو گیا۔

اس دن کے بعد سے خاصے عرصے تک ہماری مصروفیات کچھ اسی قسم کی رہیں۔ کھانا، پینا، سونا، تاش یا کوئی اور اسی قسم کا کھیل کھیلنا، اخبار رسالے پڑھنا اور کبھی کبھی باہر جانا۔ شہر میں ریوز کے نام سے ایک خاصا معیاری قسم کا ہوٹل تھا۔ اس کے ریسٹورنٹ میں عموماً شام کو اسمگلنگ، بلیک مارکیٹنگ، قمار بازی اور قبضہ گری کے دھندوں سے وابستہ افراد جمع ہوتے تھے اور عام کاروباری اصطلاحات میں کام کی باتیں یا پھر گپ شپ کیا کرتے تھے۔ بظاہر یہ سب معززین نظر آتے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ یہ سب لوگ آپس میں بے انتہا بے تکلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے سائے سے بھی محتاط رہتے تھے۔ ان میں سے بیشتر کو ایک دوسرے کے اصل ٹھکانوں یا گھر بار کا کبھی علم نہیں تھا۔ تاہم ان کی گویا ایک غیر رسمی اور بے ضابطہ سی انجمن قائم تھی۔ وہ ہر معاملے میں حتی الوسع ایک دوسرے کے کام آنے کی کوشش کرتے تھے۔ ریسٹورنٹ ہی میں ایک دوسرے سے نئے نئے کاروباری معاملات بھی طے پاتے تھے۔ ایک دوسرے سے لین دین اور کاروباری تعاون کے لیے مقامات کا تعین کیا جاتا تھا... اشرف خان نے بہت سے اہم آدمیوں سے میرا تعارف کرا دیا تھا۔

اس دوران میں نے اشرف خان کے طریقِ کار اور اس کی فطرت کا بغور مشاہدہ کیا۔ اس کے ساتھ ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ درحقیقت خود مختار اسمگلر نہیں تھا۔ اس کی حیثیت ایک طرح سے آرڈر پر کام کرنے والے کی تھی۔ کبھی کبھی اسے آرڈر ہی خاصے طویل وقفے کے بعد ملتا تھا اور کبھی کام نہ کرنے میں اس کی اپنی سستی آڑے آتی تھی۔ ہر کھیپ پہنچانے اور لانے کے بعد وہ کافی دنوں تک گھر میں پڑا یوں آرام کرتا رہتا تھا جیسے کوئی بہت ہی ناقابلِ یقین مہم انجام دے کر آیا ہے۔ حتیٰ کہ پڑے پڑے اسے احساس ہونے لگتا تھا کہ رقم تیزی سے خرچ ہو رہی ہے اور پھر اس کی بیوی نے دبا لی ہے تب وہ انگڑائی لے کر اُٹھ کھڑا ہوتا تھا اور بھاگ دوڑ میں لگ جاتا تھا کہ اُسے کوئی نیا آرڈر مل جائے۔ کبھی کبھار اسے خود مختارانہ طور پر کام کرنے کا شوق چڑھتا تھا تو رقم کی کمی کا مسئلہ آڑے آجاتا تھا۔

اسی لیے میں نے اس سے اپنا حصہ لینا شروع نہیں کیا تھا کہ وہ اسے کاروبار میں لگانا شروع کرے تاکہ ہم خود مختار بننے کی کوشش کریں لیکن عام طور پر سوچ بچار کے دوران ہی اس کے اپنے حصے کا صفایا ہوجاتا تھا۔ پھر وہ یہ دلیلیں پیش کرنے لگتا تھا کہ اتنی تھوڑی رقم سے ہم کیا ذاتی کاروبار کریں گے۔ چھوٹی کھیپ لے کر جانے میں بھی اتنا ہی خطرہ ہے جتنا بڑی کھیپ لانے لے جانے میں۔ اس لیے وہ بڑی کھیپ لانے کی تیاریوں میں لگا رہتا تھا اور ہماری وہ مثال رہتی تھی

کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔

بہرحال میں خاموشی سے اُس کے ساتھ لگا ہوا تھا اور میری یہ اُمید قائم تھی کہ ہمیں ترقی کے مواقع ضرور حاصل ہوں گے۔ ویسے بھی میں کسی قسم کے نقصان سے تو دوچار تھا نہیں۔ اپنے معیار کی مناسبت سے میں گویا شاہانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ رہنے کو شاندار کمرا، کھانے کو من پسند خوراکیں اور پہننے کو بھی من بھاتا مل رہا تھا۔ جتنے پیسوں کی ضرورت ہوتی تھی وہ مجھے اشرف خان سے مل جاتے تھے۔ کام کا تجربہ میں الگ حاصل کر رہا تھا، بھلا اور مجھے کیا چاہیے تھا؟

میں اس دوران چند مہمات پر اشرف خان کے ساتھ گیا تھا۔ ایک بار تو میں گویا صرف اسسٹنٹ کے طور پر اس کے ساتھ رہا تھا۔ دوسری بار میں نے ڈرائیور کے فرائض انجام دیے تھے جس سے مجھے راستے صحیح طور پر سمجھنے میں مدد ملی تھی۔ تیسری مرتبہ ہم کسی پارٹی کے لیے پورا ٹرک لے کر آئے تھے اور اس دوران میری ذمے داری یہ رہی تھی کہ میں ٹرک کو کہیں بھی گھیرے میں نہ آنے دوں۔

میں مال کے اوپر اور ترپال کے نیچے رائفل لیے لیٹا رہا تھا۔ اشرف خان کی ہدایت تھی کہ خطرہ نظر آتے ہی وہ ٹرک کے پچھلے حصے میں لگی ہوئی ایک گھنٹی کے ذریعے مجھے سگنل دے گا جس کے بعد میرا کام صرف یہ ہوگا کہ اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دوں۔

یہ کھیپ بھی ہم بخیر و عافیت ڈلیور کرنے میں کامیاب ہوگئے اور اس میں ہمیں خاصی موٹی رقم بطور کمیشن ملی۔ اب ہم اس پوزیشن میں تھے کہ چھوٹے پیمانے پر اپنا کام بھی شروع کرسکتے تھے تاہم اس کے لیے ابھی سرحد پار کی پارٹیوں سے مذاکرات ضروری تھے۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ جب ہم کسی کی آئندہ کھیپ لے کر جائیں گے تو اپنے معاملات بھی طے کرکے آئیں گے۔

اس دوران شروع کے دو تین دن تو ہم اپنی اس بڑی کامیابی کا جشن ہی مناتے رہے اور پی پی کر گھر میں اوندھے پڑے رہے۔ اس مرتبہ تو میں نے بھی جام لنڈھانے کے معاملے میں اپنا حوصلہ خاصا بڑھا لیا۔ زرینہ بھی تھوڑی بہت پیتی تھی۔ وہ دونوں جب اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے تو میرے لیے اپنے کمرے میں آکر نہ جانے کیوں سونا دشوار ہو جاتا تھا۔ اپنی تمام تر مدہوشی کے باوجود میرے ذہن کا کوئی حصہ بیدار رہتا تھا اور کوئی چیز مجھے کنکھجورے کی طرح ڈنک مارتی رہتی تھی۔

اس عالم میں میں اور تو بہت سی چیزوں کو بھول جاتا تھا لیکن لالی مجھے بار بار یاد آنے لگی تھی۔ میں اس کا تصور ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا تو میری سوچیں زرینہ کی طرف بہک جاتیں۔ بہ وجوہ میں ان دونوں کے بارے میں ہی سوچنا نہیں چاہتا تھا لیکن اور تھا ہی کون جس کے بارے میں میں سوچتا اور ذہن کو بہلاتا۔ ایک شمیم تھی تو وہ بھولا بسرا خواب بن چکی تھی۔

ایک روز میں صبح تیار ہوکر ناشتے کی میز پر پہنچا تو اشرف خان میز پر نہیں تھا۔ عموماً اس وقت وہ میز پر اخبارات پھیلائے بیٹھا ہوتا تھا۔ کرسی وغیرہ کھینچے جانے کی آواز سن کر زرینہ بیڈروم سے باہر آئی۔ وہ حسبِ معمول ایک ریشمی گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ بال کھلے تھے اور ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ اشرف خان کسی کام کے سلسلے میں باہر گیا ہوا ہے اور ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔

"تم ناشتے میں کیا پسند کرو گے؟" اس نے ہوٹل کے بیروں کی طرح پیشہ ورانہ سے لہجے میں پوچھا۔ میرے یہاں قیام کے دوران یہ پہلا موقع تھا کہ میں تنہا ناشتا کر رہا تھا۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ میں کن چیزوں کا ناشتا کرنا چاہتا تھا اور وہ اپنے گاؤن کی بیلٹ درست کرتی ہوئی کچن میں چلی گئی۔

وہ ناشتا تیار کرکے لے آئی اور برتن میرے سامنے سجانے کے بعد خود میز کے ایک سرے پر بیٹھ کر چائے کی چسکیاں لینے لگی۔ میں منہ چلاتے ہوئے بار بار اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ سلگتی ہوئی ایک نئی سگریٹ اب بھی اس کی انگلیوں میں دبی ہوئی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ سگریٹ کے کش بہت کم لیتی تھی۔ عام طور پر سگریٹ اس کی انگلیوں یا ہونٹوں میں دبی یونہی سلگتی رہتی تھی۔ بعض اوقات وہ پوری سگریٹ سے صرف ایک آدھ ہی کش لیتی تھی اور اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے پُرخیال نظروں سے تکتی رہتی تھی حتیٰ کہ سگریٹ ختم ہو جاتی تھی۔

اس وقت ماحول پر بے پناہ سکوت طاری تھا لیکن میری رگ رگ میں ایک عجیب سا شور برپا تھا۔ میں کوئی بات کرنا چاہتا تھا لیکن الفاظ نہ جانے کیوں ہرجائی ہوگئے تھے۔ مجھے آج تک گھر میں کوئی بچہ نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی میں نے کبھی کسی بچے کا تذکرہ سنا تھا۔ کئی بار میرا اشرف خان یا زرینہ سے پوچھنے کو جی چاہا تھا کہ کیا ان کا کوئی بچہ نہیں تھا؟ اس وقت میں نے بالآخر اسی موضوع سے بات شروع کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس کے لیے پہلے یہ جاننا ضروری تھا کہ ان کی شادی کو کتنا عرصہ گزر چکا تھا۔ ویسے تو خیر اشرف خان تقریباً چالیس سال کا لگتا تھا اور زرینہ بھی تیس سے اوپر ہی تھی اور دونوں کافی پرانے شادی

شدد لگتے تھے لیکن کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا۔ بعض لوگ حماقتوں کے سلسلے میں جلد باز نہیں ہوتے، عیش و آرام سے زندگی گزارتے ہیں اور عمر کے آخری حصے میں شادی کر لیتے ہیں۔

"اشرف خان سے تمھاری شادی کو کتنا عرصہ گزر گیا ہے؟" بالآخر میں نے گھبرائی سی آواز میں پوچھا۔ جانے کیوں میں اشرف خان اور زرینہ سے شروع ہی سے آپ جناب کے تکلفات میں نہیں پڑا تھا اور نہ ہی انھوں نے کبھی اس کا بُرا منایا تھا۔

اُس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد جواب دینے کے بجائے اُلٹا سوال کر دیا۔ "تمھارا خیال ہے کہ میں اشرف خان کی بیوی ہوں؟"

"تو پھر اور کیا ہو؟" میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اُس نے میرے سوال کا براہ راست جواب نہیں دیا۔ پلکیں جھکا کر دھیمے لہجے میں بولی۔ "میں اشرف خان کی بیوی نہیں ہوں۔"

میں بدستور احمق بنا ہوا تھا۔ میں نے احمقوں کی طرح اپنا سوال دُہرایا۔ "تو پھر اور کیا ہو؟"

وہ گویا میری ناسمجھی پر قدرے زچ ہو کر بے بسی سے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی۔ "میں بس ایسے ہی ہوں... میں کچھ بھی نہیں ہوں۔... بچپن میں یتیم ہو گئی تھی۔ رشتے داروں اور کچھ عزیزوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتی رہی۔ ننھے ننھے ہاتھوں سے گھر کا سارا کام کاج کرنے کے معاوضے کے طور پر تھپڑ اور لاتیں کھاتی رہی۔ بالغ ہوتے ہی ایک ادھیڑ عمر شخص کے ہاتھ فروخت کر دی گئی۔ وہ ذہنی طور پر بیمار تھا۔ اپنے نہ جانے کون سے جذبے کی تسکین کے لیے مجھے عجیب عجیب جسمانی سزائیں دیتا تھا۔ اس کے ہاں سے بھاگی تو ایک قسم کی ایک عورت کے ہتھے چڑھ گئی۔ اُس نے جسم فروشی کے رستے پر لگا دیا۔ وہ میری آدھی سے زیادہ کمائی تو ضرور رکھ لیتی تھی لیکن ویسے اس نے ہر طرح کا عیش و آرام مہیا کیا اور تھا دراس نے مجھ میں عزتِ نفس بھی بیدار کرنے کی کوشش کی۔" زرینہ استہزائیہ سے انداز میں ہنس دی۔ "وہ عورت مر گئی تو میں بس یونہی اِدھر اُدھر آوارہ پھرنے لگی۔ پھر مجھے اشرف خان مل گیا۔ اس نے مجھے ساتھ رہنے کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔ میری حیثیت کچھ بھی سہی لیکن میں خوش اور مطمئن ہوں کہ میرے پاؤں کچھ مضبوط ہو چکے ہیں اور مجھے ایک چار دیواری کی پناہ میسر ہے۔ یہ مکان اشرف نے میرے نام کیا ہوا ہے۔ تقریباً تین سال ہو گئے ہیں مجھے اس کے ساتھ رہتے ہوئے۔ میں پہلی عورت نہیں ہوں۔ مجھ سے پہلے بھی دو عورتیں کچھ عرصے کے لیے اس کے ساتھ رہ چکی ہیں۔ کہیں نہ کہیں سے اسے اپنے مطلب کی عورت مل جاتی ہے۔ اسے میری یا مجھے اس کی کوئی خاص پروا نہیں ہے لیکن ہم ایک دوسرے کی ضرورت ہیں۔ تاہم ہمارے درمیان کسی بھی قسم کا کوئی بندھن موجود نہیں ہے۔ کسی وقت بھی کوئی پٹڑی بدل سکتا ہے۔"

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ زمانے نے مجھے تجربات و حوادث کی شکل میں بہت کچھ دے دیا تھا۔ میں دُنیا کے اسرار و رموز اس سے کہیں زیادہ جان چکا تھا جتنا عموماً میری عمر کا کوئی نوجوان جان سکتا تھا لیکن آج میرے خزانۂ علم میں یہ عجیب ہی اضافہ ہوا تھا۔

"اشرف خان تم سے شادی کیوں نہیں کر لیتا؟" میں نے قدرے سنبھل کر پوچھا۔

"اس کی مرضی۔" وہ بے پروائی سے کندھے اچکا کر بولی اور سگریٹ کا کش لینے لگی۔ اُس کے چہرے کا تناؤ کافی حد تک دُور ہو گیا تھا اور لہجے کی شگفتگی بھی لوٹ آئی تھی۔ مسکراتے ہوئے بولی۔ "اب تو صحیح معنوں میں اُس نے مجھے نہیں بلکہ میں نے اُسے رکھا ہوا ہے۔"

میں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ میرے دل میں عجیب اتھل پتھل سی مچی ہوئی تھی۔ زرینہ یوں میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے نظروں ہی نظروں میں تولنے کی کوشش کر رہی ہو یا پھر میرے اندر جھانکنا چاہتی ہو۔ اب میری طرف دیکھتے وقت اس کی نظریں پہلے کی طرح سپاٹ نہیں ہوتی تھیں۔ عموماً وہ کسی سوچ میں ڈوبی نظر آتی تھی اور شاید یہ میرا وہم تھا کہ وہ میرے ہی بارے میں سوچتی تھی لیکن کیا سوچتی تھی، اس کا مجھے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

چائے ختم کر کے میں خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں آ لیٹا اور ایک رسالہ منتخب کر کے اس کی ورق گردانی کرنے لگا۔ میں اپنی سوچوں کا رُخ بدلنا چاہتا تھا لیکن مجھے اس میں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ جھنجلا کر بالآخر میں نے رسالہ پھینک دیا اور دو چار کروٹیں لینے کے بعد دوبارہ باہر آ گیا۔ میں نے برآمدے کی طرف دیکھا۔ زرینہ اب ڈائننگ ٹیبل پر نہیں تھی۔ اس نے بیڈ روم میں جا کر دروازہ بند کر لیا تھا۔ میں چند لمحے بے کلی سے کتے کی طرح صحن میں ٹہلتا رہا۔ چاروں طرف سکوت طاری تھا لیکن میری کنپٹیوں میں دھماکے ہو رہے تھے۔

آخر کار میں دوبارہ کمرے میں آ لیٹا اور بے خوابی کے مریض کی طرح کروٹیں بدلنے لگا۔ میری کروٹوں کا سلسلہ اس وقت رُکا جب اشرف خان گھر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے کسی دوست کا ڈرائیونگ کے چالان سے متعلق

کوئی کام تھا جس کے سلسلے میں وہ کہیں گیا تھا۔ کام ہو نہیں سکا تھا۔ دوسرے روز اُسے پھر جانا تھا۔

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پھر اس کے ساتھ تاش کھیلنے لگا اور میرے اندر دھیرے دھیرے جیسے جھاگ سی بیٹھتی چلی گئی۔

دوسرے روز صبح حسبِ معمول تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل پر پہنچا تو میں نے محسوس کر لیا کہ اشرف خان گھر سے جا چکا ہے۔ زرینہ اس وقت واش بیسن پر ہاتھ دھو رہی تھی۔ اس کی سلگتی ہوئی سگریٹ آئینے کے ریک پر رکھی ہوئی تھی۔ میں اُس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میری موجودگی کا احساس ہو جانے کے باوجود اس نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔ بڑے اطمینان سے ہاتھ خشک کرنے کے بعد تولیہ لٹکانے لگی۔

میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ تب اُس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی۔ "میں نے محسوس کیا ہے کہ کل سے تم کچھ کہنا چاہ رہے ہو... کیا بات ہے؟"

میں نے ایک طویل سانس لی جس سے میرے اعصاب کو کچھ سکون ملا اور میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "بات یہ ہے زرینہ بیگم کہ میں اشرف خان کا ففٹی ففٹی کا پارٹنر ہوں۔ اس کی ہر چیز میں برابر کا شریک ہوں۔ تم بھی ایک طرح سے اس کی املاک میں شامل ہو۔ تمھارے معاملے میں بھی میری حصے داری تسلیم ہونی چاہیے۔ کیا تمھیں اس پر کوئی اعتراض ہے؟"

وہ چند لمحے پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتی رہی جیسے میرا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میرا خیال تھا کہ مطلب سمجھ کر وہ بھڑکے گی یا کم از کم بھڑکنے کی اداکاری ضرور کرے گی لیکن اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور بڑے تحمل سے بولی۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نوٹوں کی کوئی گڈی، سونے چاندی کا کوئی زیور یا جائداد وغیرہ نہیں ہوں کہ جس کا بٹوارہ ہو سکے یا جس میں پارٹنرشپ ہو سکے۔ میں ایک زندہ سلامت عورت ہوں اور محض گوشت پوست سے بنے ہوئے ایک جسم ہی کی مالک نہیں ہوں۔ میرے سینے میں دل بھی دھڑکتا ہے اور کھوپڑی میں تھوڑی سی عقل بھی موجود ہے۔ میری اپنی ایک سوچ ہے، میری کوئی پسند ناپسند بھی ہے اور اس کی کچھ اہمیت بھی ہے۔ تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے تمھیں جو حقائق بتائے ہیں ان سے تم نے کچھ غلط اندازے قائم کر لیے ہیں۔ اشرف خان کے ساتھ میری رفاقت کتنی ہی بے وقعت اور بے بنیاد سہی لیکن اس نے کبھی مجھے اپنی املاک کی طرح نہیں سمجھا۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں، جب چاہوں اسے چھوڑ کر جا سکتی ہوں، وہ کچھ نہیں کر سکتا اور نہ ہی کچھ کرنا چاہے گا... کچھ آئی سمجھ میں؟"

"لیکن... لیکن میں..."

"لیکن ویکن کچھ نہیں۔" اُس نے میری بات کاٹ دی۔ "میں ایک وقت میں ایک ہی تھان سے بندھ کر رہنے والی گائے ہوں، کسی زمانے میں، میں شاید ایک آوارہ گائے تھی مگر اب نہیں ہوں۔"

مجھ پر جھنجلاہٹ سوار ہونے لگی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کرسیاں اُٹھا کر توڑنی شروع کر دوں یا زرینہ کو بالوں سے پکڑ کر اس کا سر دیوار میں دے ماروں لیکن میں خود پر ضبط کرتے ہوئے اور مزید کوئی دلیل بازی کیے بغیر تیزی سے گھوما اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

"سنو!" دفعتاً عقب سے اُس کی آواز سن کر میں ٹھٹک گیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا اور مجھے ایک سنسنی خیز سی حیرانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اُس کے ہونٹوں کے گوشوں سے شریر سی ہنسی پھوٹ پڑ رہی تھی۔ میں دوبارہ اُس کے قریب جا پہنچا۔

"بس... اتنی ہی ہمت تھی؟" اُس نے شریر لہجے میں پوچھا۔ میں عجیب مخمصے کے سے عالم میں کھڑا تھا۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ بولوں تو کیا بولوں؟

اُس نے خود ہی میری مشکل حل کر دی۔ سر جھکا کر ایک انگوٹھے کے ناخن سے دوسرے انگوٹھے کا ناخن کریدتے ہوئے بولی۔ "میں نے کہا تھا کہ میں ایک وقت میں ایک ہی تھان سے بندھ کر رہنے والی گائے ہوں۔ میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں ہمیشہ ایک ہی تھان سے بندھ کر رہنے والی گائے ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے، اشرف خان کی چھٹی...؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"ہاں، اشرف خان کی چھٹی..." اس نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اس سے پہلے کہ وہ میری چھٹی کرا دے، میرے حق میں بہتر یہی ہے کہ میں اُسے چھٹی دے دوں۔"

میرے انسانی وجود میں چھپا ہوا حیوان خوشی سے قلابازیں بھرنے لگا۔ میں نے ایک مسرت بھری چیخ مارنے کے لیے منہ کھولا لیکن زرینہ نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد جب کہ ہم بیڈ روم سے نکل کر دوبارہ ڈائننگ ٹیبل پر آ بیٹھے تھے، کال بیل بجی۔ اشرف خان واپس آ چکا تھا۔ کال بیل بجانے کا اس کا مخصوص انداز تھا۔ زرینہ نے جا کر دروازہ کھولا۔ اشرف خان اندر آ چکا تو وہ اس کے آگے آگے چلتی ہوئی واپس ڈائننگ ٹیبل تک پہنچ کر بلا ہچکچاہٹ

میرے برابر والی کرسی پر بیٹھ گئی جس پر وہ چند لمحے پہلے بیٹھی تھی۔

اشرف خان ہمارے مقابل آن کھڑا ہوا اور ایک کرسی کے پشتے پر ہاتھ جما کر ہمارے چہروں کا جائزہ لینے لگا۔ میں اس سے نظر چرا رہا تھا لیکن زرینہ اطمینان سے بیٹھی سگریٹ کے کش لیتی ہوئی نیم وا اور نیم اجنبی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظر ذرا بھی گریزاں نہیں تھی۔

اشرف خان نے یقیناً تبدیلی محسوس کر لی تھی۔ تبدیلی میری یا زرینہ کی آنکھوں میں اور چہروں پر ہی نقش نہیں تھی۔ تبدیلی تو در و دیوار سے بھی جھانکتی نظر آ رہی تھی۔ تبدیلی ہوائیں سرگوشیاں کر رہی تھی۔ اشرف خان اب ایسا الّو بھی نہیں تھا۔

چند لمحے ماحول پر عجیب سا سکوت طاری رہا۔ میں اپنی دھڑکنوں کی دھمک کنپٹیوں میں سن رہا تھا۔ بالآخر اشرف خان کرسی کھینچ کر یوں بیٹھ گیا جیسے اس کی ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو۔ اس کا منہ اتر گیا تھا۔ میں اس وقت شدت سے چاہ رہا تھا کہ کوئی نہ کوئی کچھ نہ کچھ بولے۔ سکوت کسی نہ کسی طرح ٹوٹے، خواہ اشرف خان گالیاں بکتے ہوئے مجھ پر ٹوٹ ہی پڑے۔

سکوت اشرف خان نے ہی توڑا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"میرا خیال ہے میرا تختہ الٹ چکا ہے۔"

زرینہ نے مجھے جواب کی زحمت سے بچا لیا۔ وہ بے پروائی سے بولی۔ "معلوم نہیں تمہارا تختہ الٹا ہے یا میرا دماغ الٹ گیا ہے۔ میرے خیال میں بات صرف اتنی ہے کہ میں نے وفاداریاں تبدیل کر لی ہیں۔ تم مردوں کو بھی تو جائز یا ناجائز ہر طرح کے بندھن محض چند لفظوں کی مدد سے توڑ دینے کا اختیار حاصل رہتا ہے۔ میں نے سوچا میں بھی کیوں نہ اپنی پوزیشن سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسا ہی حق حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ ویسے بھی اب تمہیں مجھ سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی اشرف خان!"

"ٹھیک ہے... ٹھیک ہے۔" اشرف خان کھسیانے سے انداز میں ہنسا۔ "جو کچھ ہو چکا ہے میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ ہمارے باقی معاملات حسب معمول چلتے رہیں، ہمارے دلوں میں کوئی فرق نہ آئے۔ میں آج ہی اپنا سامان افضل کے کمرے میں منتقل کر لوں گا اور افضل اپنا سامان تمہارے کمرے میں لے آئے گا۔" وہ ایک بار پھر کھسیانے سے انداز میں ہنس دیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں جس روز تمہیں لے کر اس گھر میں داخل ہوا تھا، میرے دل نے اسی روز کہہ دیا تھا کہ ایک نہ ایک دن ایسا ہو گا۔"

"مجھے افسوس ہے اشرف خان!" میں نے نظر جھکا لی۔

"ارے... تم تو بلاوجہ ہی شرمندہ ہو رہے ہو۔" اس مرتبہ وہ قدرے جاندار انداز میں ہنسا۔ "ہم جیسے لوگوں میں ایسے نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں۔ زرینہ سے میرا کوئی ایسا ناتا تو تھا نہیں کہ جس پر عزت یا بے عزتی کا سوال پیدا ہو یا تمہیں شرمسار ہونے اور مجھے مشتعل ہونے کی ضرورت پیش آئے۔ ہم تینوں اپنی اپنی مرضی کے مالک و مختار ہیں۔ اب اس موضوع کو چھوڑ کر کام کی بات کرتے ہیں۔ زرینہ! ذرا چائے تو بنا لاؤ۔"

وہ ٹانگیں پھیلا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر جو تناؤ اور آنکھوں میں جو وحشت چند لمحے پہلے تک نظر آ رہی تھی وہ اب مفقود ہو چکی تھی۔ بہت جلد ہی وہ نارمل ہو گیا تھا۔

زرینہ چائے بنانے کچن میں چلی گئی تو اشرف خان پائپ بھر کر سلگاتے ہوئے بولا۔ "یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ چھوٹی موٹی سطح پر ہم اس وقت بھی اپنا ذاتی کام شروع کرنے کی پوزیشن میں ہیں لیکن آج جب میں باہر گیا تو ایک بہت بڑی کھیپ کا آرڈر مل گیا۔ اس کھیپ میں ہمیں چالیس پچاس ہزار روپیہ بچ سکتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ 'ایکسپورٹ' کے مال کا ٹرک ہمیں لاہور سے لے کر چلنا ہو گا اور امرتسر کے قریب نکلنے والے ایک خفیہ سرحدی راستے سے مال اس پار پہنچانا ہو گا۔ وہیں سے 'امپورٹ' کا مال لے کر ہمیں لاہور پہنچانا ہو گا۔ یعنی ہمیں روٹ بدلنا ہو گا اور اس روٹ پر خطرات زیادہ ہیں۔ ایک آدمی بطور گائیڈ ہمارے ساتھ جائے گا۔ باقی ساری ذمے داری ہماری ہو گی۔ میں نے ابھی کوئی حتمی جواب نہیں دیا۔ میں نے پارٹی سے کہا ہے کہ میں اپنے پارٹنر سے مشورہ کر کے جواب دوں گا۔"

"اس میں مشورہ کرنے والی کیا بات تھی؟" میں نے سنبھل کر جسموں کے الجھاوے اور جذبوں کے گورکھ دھندے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ "کاروباری اختیارات میں نے مکمل طور پر تمہارے سپرد کر رکھے ہیں۔ تم جس معاملے کو بھی اپنے لیے بہتر سمجھو اس میں میری طرف سے بھی ہامی بھر سکتے ہو۔ ویسے بھی جب تک ہم بڑے آرڈر نہیں پکڑیں گے، نئے روٹوں پر نہیں نکلیں گے، جرأت مندانہ قدم نہیں اٹھائیں گے، تب تک ترقی کیسے کریں گے؟ اگر ہم نے اپنا حوصلہ نہ کھولا اور نت نئے خطرات مول نہ لیے تو ہم ترقی کیسے کریں گے؟"

"بہت خوب!" وہ اطمینان کی سانس لے کر بولا۔ "تم

نے نہ صرف مجھے تذبذب کی کیفیت سے نکال لیا بلکہ میرا حوصلہ بھی بڑھا دیا۔ اگر ہم یہ چکر مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ذاتی کام شروع کرنے کے لیے ایک نئے روٹ پر قدم رکھیں گے۔ ہم یک طرفہ کاروبار کریں گے۔ صرف امپورٹ۔ ہم طورخم کے نقلی راستوں سے دوسرے پڑوسی ملک سے مال لائیں گے۔ برقی سامان کے چھوٹے پرزے، ولایتی سگریٹ، اصلی ولایتی شراب اور دوسری بہت سی چیزیں۔ ایک ہی چکر میں سب کچھ۔"

"یہ آرڈر والی کھیپ کب لے کر جانا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔

"انتظامات مکمل ہونے میں ہفتہ دس دن تو لگ جائیں گے۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے، مجھے تم تیار ہی سمجھو۔" میں نے کہا۔ درحقیقت میں نے ہفتہ دس دن کی مہلت کا سن کر اطمینان کی سانس لی تھی۔ میری زندگی میں جو نیا موڑ آیا تھا اور میں نے جو نیا قلعہ فتح کیا تھا، ابھی میں جی بھر کے اس کی بھول بھلیوں میں بھٹکنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا اور اشرف خان کی طرف سے مجھے ایسے معمولی سے رد عمل کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ کہ جس سلطنت میں میں محض حصے دار بننا چاہتا تھا، وہ پوری کی پوری مجھے ہی مل جائے گی۔

چائے کے دوران ہم نے مزید چند کاروباری تفصیلات طے کیں۔ شطرنج کے کسی مہرے کی طرح یکایک ہی میں جیسے کسی دوسرے خانے میں آ گیا تھا۔ میں صرف نام کا افضل نہیں رہا تھا، حقیقتاً میری حیثیت کچھ افضل سی ہو گئی تھی۔ مجھے کچھ کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں اشرف خان کی جگہ پر آ گیا تھا اور اشرف خان میری جگہ پر چلا گیا تھا۔ حقیقت بھی کافی حد تک یہی تھا۔

اس کے بعد آٹھ دن جیسے کسی سہانے خواب کی طرح بیت گئے۔ زرینہ بہت ہی عجیب عورت تھی۔ میں حیران تھا کہ اشرف خان نے اس سے دستبردار ہونا اس قدر آسانی سے کیوں قبول کر لیا تھا۔ اس عورت کے لیے تو قتل ہو سکتے تھے مگر شاید میرے اس خیال کی وجہ میری نوجوانی تھی... اشرف خان کی عمر کو پہنچ کر شاید میری رائے یہ نہ رہتی۔

نویں دن ہم دونوں ضروری سامان سے لیس ہو کر لاہور چلے گئے۔ میرے سپنوں کا شہر۔ یہاں ہم اندرون شہر کے ایک نہایت گھٹیا اور گمنام سے ہوٹل میں پہنچے جس کے تنگ و تاریک کمروں کی دیواروں پر نسوار کی پیکوں سے بچی ہوئی جگہ بہت کم تھی اور جس کے بستروں میں اتنے کھٹمل تھے کہ اگر وہ مل جل کر کوشش کرتے تو شاید ہمیں گھسیٹ کر کہیں ادھر ادھر لے جاتے۔

مجھے اس بار بھی اپنے سپنوں کے شہر میں زیادہ گھومنے پھرنے کا موقع نہیں ملا۔ اشرف خان نے مجھے ہوٹل تک ہی محدود رہنے کی ہدایت کی تھی۔ رات گئے ایک شخص جس کے نفیس سوٹ سے نہایت پیاری خوشبو پھوٹ رہی تھی، ناک پر رومال رکھے ہم سے ملنے آیا۔

اس سے بہت دیر تک سرگوشیوں میں باتیں ہوتی رہیں۔ وہ رخصت ہوا تو ہم نے بھی رخت سفر باندھا۔ ہوٹل کا کمرا چھوڑ کر ہم ایک ٹیکسی میں راوی روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔ اپنی منزل سے اندازاً دو تین فرلانگ پہلے ہی ہم نے ٹیکسی چھوڑ دی اور باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔

ٹرکوں کے ایک اڈے کے پچھلے شیڈ میں ترپال سے ڈھکا ہوا ایک ٹرک تیار کھڑا تھا۔ یہی وہ ٹرک تھا جسے ہم لے کر جا رہے تھے۔ اسٹیئرنگ وہیل پر موجود شخص ڈرائیور بھی تھا اور گائیڈ بھی۔

دوسرے روز تقریباً اسی وقت ہم ایکسپورٹ کا مال پہنچا کر، امپورٹ کا مال لا کر مقررہ جگہ پر بخیر و عافیت پہنچا کر اور اپنی رقم لے کر فارغ بھی ہو چکے تھے۔

اشرف خان نے کہا تھا کہ اس چکر میں خطرات زیادہ ہوں گے لیکن مجھے تو یہ دورہ اپنے معمول کے دوروں سے زیادہ آسان محسوس ہوا تھا۔ پہلی بار یہ احساس ہوا تھا کہ میں ہی نہیں، اشرف خان بھی ابھی تک کنویں کا مینڈک ہی تھا ورنہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی تھے۔

یہ دورہ میرے لیے بے پناہ تجربات کا مرقع تھا۔ نت نئے لوگ، نت نئے راستے، نت نئے طور طریقے۔ یہ تجربہ تو مجھے پہلے بھی بارہا ہو چکا تھا کہ دولت یا بندوق کی نال کس طرح بند دروازوں کو بھی چشم زدن میں کھول دیتی ہے لیکن اس دورے میں یہ تجربہ کچھ زیادہ ہی وسیع پیمانے پر حاصل ہوا۔ دولت یا طاقت... کٹھن راستوں پر چلنے کے یہی دو سہارے تھے اور جو لوگ ان دونوں سہاروں کو استعمال کرنا جانتے تھے، منزل خود آگے بڑھ کر ان کے قدم چومتی تھی۔

میں نے اس دورے کے بعد اپنے آپ کو بڑا با حوصلہ محسوس کیا۔ یہ روٹ خاصا زرخیز تھا اور لطف کی بات یہ تھی کہ جس سکھ پارٹی سے ہم مال لے کر آئے تھے ان کے ساتھ دو ڈھائی گھنٹے بھی ہم نے یوں مزے مزے کے مشاغل میں گزارے،

گویا ہم وہاں اسمگلنگ کے نہیں پکنک کے لیے گئے ہوئے تھے۔ سکھوں نے ہماری بڑی خاطر مدارت کی تھی، ہر طرح کی خاطر مدارت۔

تیسرے روز ہم واپس شہزاد کوٹ پہنچ گئے اور حسبِ معمول آرام کرنے لگے۔ یہ مہم تو بڑی بارآور رہی تھی، اس لیے میرے خیال میں آرام بھی کچھ زیادہ طویل وقفے کے لیے ہونا چاہیے تھا۔ یہ بھی میرے اندر ایک تبدیلی تھی ورنہ اس سے پہلے میں آرام سے بڑا چڑتا تھا۔ خصوصاً مہم سے واپس آنے کے بعد میرے اعصاب پر ہیجان سا طاری ہوتا تھا اور شدت سے میرا دل چاہتا تھا کہ فوراً ہی کسی اور مہم پر نکل جاؤں لیکن میرے سامنے کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ مجبوراً میں ریکارڈ پلیئر پر للیہ گانے سن کر، اخبار رسالے پڑھ کر، اشرف خان اور زرینہ کے ساتھ تاش کھیل کر یا پھر کبھی کبھار باہر ادھر اُدھر آوارہ پھر کر وقت گزارتا تھا۔

اس مرتبہ عجیب عالم رہا۔ اشرف خان عموماً گھر سے غائب رہتا اور میرا گھر سے نکلنے کو دل نہ چاہتا۔ معاملہ اُلٹ ہو گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ پر کاہلی اور موٹاپا غلبہ پانے لگا ہے۔ ادھر زرینہ نے مجھے خصوصی اہتمام سے پکائے ہوئے کھانے کھلا کھلا کر کسی حد تک صاحبِ توند بنا دیا تھا۔ بالآخر میں نے علی الصباح اُٹھ کر کھیتوں کے پار دریا کنارے کی طرف دوڑ لگانے کے لیے جانا شروع کر دیا۔

روزانہ کئی میل کی دوڑ لگانے سے بالآخر کس بل ٹھیک جگہ پر آنے شروع ہوئے ورنہ میں تو آپ کو وہ ریچھ محسوس کرنے لگا تھا جو برفباری کا موسم گزارنے کے لیے کسی غار میں آن سویا تھا۔

اشرف خان اس دوران ذاتی کاروبار کے انتظامات میں مصروف رہا۔ وہ نت نئے رابطے تلاش کر رہا تھا، معلومات جمع کر رہا تھا اور جو بھی ضروری کام تھے انھیں نمٹا رہا تھا۔ جیب خرچ کے نام پر وہ زرینہ کو تین ہزار روپے ماہانہ دیا کرتا تھا۔ وہ اس مرتبہ اس نے میرے حساب میں سے دیے تھے۔ حساب کتاب کا وہ بے حد کھرا تھا۔

ایک روز میں نے دو تین پیگ چڑھائے ہوئے تھے اور رات کا کھانا بھی ڈٹ کر کھایا ہوا تھا۔ اچانک ہی مجھ پر انکشاف ہوا کہ زرینہ کی طبیعت ناساز ہو چکی ہے۔ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ موسم بے حد سہانا تھا۔ خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ میں بڑی ترنگ میں تھا۔ تیسرے اوسط درجے کے اس شہر میں تفریح کی کوئی خاص جگہ نہیں تھی اور یہ چیز بعض اوقات مجھے بہت کھلتی تھی۔ لے دے کے بس

پانچ سینما ہاؤس تھے جن میں گھسی پٹی سی فلمیں چلتی تھیں۔ فلموں کے بارے میں اب میرا ذوق کچھ بلند ہو چکا تھا۔ پہلے والی بات نہیں رہی تھی کہ خواہ کوئی بھی فلم لگی ہو، منہ اُٹھا کر دیکھنے چل دیے۔

میں نے گھنٹا گھر جا کر ایک مشہور قسم کی دکان سے خوشبودار پان کھایا اور ادھر اُدھر آوارہ گردی کرنے لگا۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ شہر کے ایک سرے پر میلہ لگا ہوا ہے جس میں تھیٹر، سرکس، موت کا کنواں اور اس طرح کے دوسرے بہت سے کھیل تماشے موجود ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میرے اندر کے دیہاتی نے انگڑائی لی اور میرا رُخ میلے کی طرف ہو گیا۔

شہر سے باہر کی طرف ہائی وے پر تقریباً ایک میل چل کر میں اس طویل و عریض میدان تک جا پہنچا جہاں اس وقت زندگی کے ہنگامے جوان تھے۔ چاروں طرف چوبی کھمبوں پر بڑی بڑی لائٹس نصب تھیں۔ ہر طرف جہازی سائز کے بڑے بڑے رنگا رنگ بورڈ نظر آ رہے تھے۔ کہیں موت کا کنواں نظر آ رہا تھا، کہیں سرکس، کہیں پنڈال میں سر کٹی عورت اور نیر کنگشن کے نلکے سے پانی آنے کا نظارہ دکھایا جا رہا تھا۔ کسی پنڈال میں نامعلوم سیاروں کے جانور دکھانے کا دعویٰ کیا جا رہا تھا

سب اعلانات لاؤڈ اسپیکروں پر ہو رہے تھے۔ بیچ بیچ میں فلمی ریکارڈ بھی چل رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔

تقریباً ہر پنڈال کے باہر بلندی پر نصب شدہ ایک تختے پر ٹکٹ کلرک اپنے صندوقچے لیے بیٹھے تھے۔ ان کے پاس ہی ایک دو جوکر اور ایک دو لڑکیاں گانوں کی دھن پر رقص نما اچھل کود میں مصروف تھیں۔

جن کمپنیوں کو لڑکیاں میسر نہیں تھیں وہ تیسری جنس سے ہی کام چلا رہی تھیں۔ یہ جنس چونکہ سنسر کی پابندیوں سے آزاد قسم کا شو پیش کرتی تھی اور ہر قسم کے مکالموں کا منہ توڑ جواب دیتی تھی، اس لیے ان کے گرد اس سے زیادہ ہجوم تھا جتنا لڑکیوں والے تختوں کے گرد تھا۔

ارد گرد کے دیہات سے لوگ جوق در جوق پہنچے ہوئے تھے۔ بڑکیں، آوازے اور عجیب و غریب صدائیں سننے میں آ رہی تھیں۔ میدان گو کہ بے کنار قسم کا تھا اور ہوا بھی خوب چل رہی تھی، اس کے باوجود فضا میں پسینے کی بو چکرا رہی تھی۔

جگہ جگہ چھوٹے موٹے کھیل تماشے بھی جاری تھے۔ کہیں مشین پر زور آزمائی کی دعوت دی جا رہی تھی تو کہیں نشانہ بازی کی۔ ایک کے بدلے دس پیسے کے انعام کے اعلانات کیے

جا رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ پیسے خرچ کر کے ان مقابلوں میں حصہ لینے والوں یا ٹکٹ لے کر پنڈالوں کے اندر جانے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ بیشتر لوگ یونہی گھوم پھر کر دل خوش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ غربت اور حسرت ان کے چہروں سے عیاں تھی مگر وہ پھر بھی خوش تھے۔ ہر چیز کے نظارے پر ہی اُچھل اُچھل کر اور حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکال کر ہی اپنا ہیجان کم کرنے کی کوشش کر رہے تھے... بے چارے سادہ لوح۔

مجھ پر ایک عجیب سا سرور طاری تھا اور میرے اندر کا دیہاتی پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ میں حالانکہ خاصے معزز حلیے میں تھا لیکن اسی سمندر کا ایک قطرہ بن کر رہ گیا تھا۔ میں ہر کھیل تماشے میں پوری دلچسپی لے رہا تھا۔ ایک تھیٹر کے باہر نمائشی تختے پر قدرے گوارا شکل و صورت کی ایک لڑکی کو محوِ رقص دیکھ کر میں نے بڑکیں بھی ماریں۔

ایک جگہ ایک تختے پر مجھے خاصی خوبصورت اور گوری چٹی لڑکی تھرکتی دکھائی دی۔ رقص کیا کر رہی تھی جان توڑ رہی تھی۔ میرے خیال میں وہ پورے میلے کی حسین ترین لڑکی تھی۔ بے اختیار دل چاہا کہ اس کی توجہ حاصل کی جائے لیکن اس کے گرد نہ جانے کتنے پروانے دل و جان اور نہ جانے کس کس چیز کے نذرانے لیے موجود تھے۔ بہرحال میں قسمت آزمائی سے باز نہ رہ سکا۔

رنگ رنگ کے انسانوں کو چیرتا ہوا میں بلندی پر نصب شدہ اس تختے کی طرف بڑھا۔ بازاری آوازیں اور سوقیانہ جملے میرے اندر کے حیوان کو گدگدی کر رہے تھے مگر بعض آوازے تو حد سے ہی بڑھے ہوئے تھے اور سماعت کو مکدر کر رہے تھے۔

لوگوں کا جو حلقہ تختے کے زیادہ قریب تھا ان میں سے کچھ منچلے ہاتھ بلند کر کر کے ایک ایک کے نوٹ رقاصہ کی نذر کر رہے تھے۔ ہر نوٹ لینے کے لیے وہ ایک نئی ادا سے پروانوں کی طرف جھکتی تھی اور چاروں طرف ایک شور برپا ہو جاتا تھا۔

میں نے اس کے قریب جگہ بنا کے پہلے تو منہ میں انگلیاں دے کر زوردار سیٹی بجائی اور پھر سو کا ایک کڑکڑاتا ہوا نوٹ اس کی نذر کرنے کے لیے بلند کیا۔ ہجوم کے سروں پر لہراتے ہوئے ایک ایک روپے کے چند مریل سے نوٹوں کے درمیان میرا سو کا نوٹ گویا فتح کے جھنڈے کی طرح بلند ہوا تھا۔

رقاصہ نے نوٹ دیکھا تو ساری ادائیں بھول کر عقاب کی طرح اس پر جھپٹی۔ ترچھی نظر کی کٹاری، پتلی کمر کی لچک، وہ شاخِ گل کا سا جھکاؤ، وہ مرمریں انگلیوں کے اہرینے... گھبراہٹ میں گویا وہ سب کچھ بھول گئی۔ بس نوٹ اُچکنے کے لیے جھک پڑی۔ شاید اُسے اندیشہ تھا کہ میں محض مذاق کر رہا ہوں اور اس کا ہاتھ بڑھتا دیکھ کر نوٹ واپس کھینچ لوں گا۔

وہ جھکی تو تیز روشنی اس کے چہرے اور جسم پر کچھ ایسے زاویے سے پڑی کہ سارا طلسم ٹوٹ گیا۔ فاصلے نے جو سراب باندھا تھا، اس کی حقیقت کھل گئی۔ جسے میں لڑکی سمجھا تھا وہ بھی تیسری جنس کا ہی ایک نمونہ تھا۔ قدرے نفیس قسم کا نمونہ۔

میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور سو کا نوٹ اس نخلِ بے ثمر پر نچھاور کر کے ہجوم سے نکل آیا۔ ایک طرف کو ہو کر میں نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مل کر ادھر اُدھر دیکھا اور اپنی نظر کو قدرے بہتر محسوس کیا۔ اسکاچ کے جو تین ڈبل پیگ میں نے معدے میں انڈیلے تھے شاید ان کا اثر ابھی تک باقی تھا۔ شاید یہ اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ چند لمحے پہلے میں اس تیسری جنس کو میلے کی حسینۂ اوّل سمجھ کر لپک پڑا تھا۔ اب بھی وقفے وقفے سے میری کھوپڑی گویا ہوا میں ہلکورے لینے لگتی تھی۔

کم ظرف کہیں کے! ذرا سنبھل کر چلو، تم تو کچھ زیادہ ہی ترنگ میں آ گئے ہو۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا۔

اس جگہ سے کچھ آگے ایک درخت کے نیچے لکڑی کی ایک بھاری بھر کم سی میز بچھی تھی۔ اس پر دو پیٹرومیکس لیمپ رکھے تھے۔ آدھی آستینوں والی اسپورٹس شرٹ پہنے ایک باڈی بلڈر اپنے بازو کی مچھلیاں اُبھارے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے سمیت تمام جسم کے عضلات یوں کھنچے ہوئے تھے اور آنکھیں کسی بھی قسم کے تاثر سے یوں عاری تھیں کہ وہ انسان کے بجائے مجسمہ معلوم ہو رہا تھا۔

اس کے قریب ہی ترچھے کھڑے ہوئے ایک بورڈ پر اعلان درج تھا کہ کوئی بھی شخص صرف دس روپے کے مقابلے میں سو روپے کی شرط لگا کر اس سے پنجا لڑائے۔ اگر باڈی بلڈر ہار گیا تو وہ دس کے مقابلے میں سو روپے ادا کرے گا۔ ایک منحنی سا جوکر یہی اعلان میگا فون پر بار بار دہرا رہا تھا اور ارد گرد کھڑے ہوئے لوگوں کو جوش دلانے کی کوشش کر رہا تھا حتیٰ کہ دبے دبے لفظوں میں وہ ان کی غیرت کو بھی للکار رہا تھا۔ ارد گرد کافی لوگ کھڑے تھے۔ ان میں کچھ گبھرو جوان بھی تھے

مگر کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہل رہا تھا۔

مجھے حیرانی تھی کہ اگر باڈی بلڈر کا چیلنج قبول کیے جانے کی یہی رفتار تھی تو اس بے چارے کا خرچ کیسے چلتا تھا؟ جسم کی اس لمبی چوڑی عمارت کو وہ کیونکر قائم رکھے ہوئے تھا؟ شاید یہی سوچ کر میں نے دس کا ایک نوٹ اُس کے سامنے میز پر رکھ دیا اور اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

نوٹ جلدی سے اس کے جوکر اناؤنسر اور پروپیگنڈا سیکرٹری نے اُٹھا کر جیب میں رکھ لیا اور باڈی بلڈر نے قدرے جُھک کر کہنی میز پر ٹکا لی۔ میں نے بھی اُس کی سیدھ میں کہنی ٹکا کر پنجہ اُس کے پنجے میں پھنسایا۔ اُس کی گرفت آہنی تھی۔ بلاشبہ اس کا جسم محض دکھاوے کا نہیں تھا۔ اُس نے یقیناً جسمانی ریاضت جاری رکھی ہوئی تھی۔

ہائی اسکول اور کالج کے زمانے میں اس طرح پنجہ لڑانا اور طاقت آزمائی کرنا ہمارا مشغلہ ہُوا کرتا تھا مگر اب تو ایک عرصہ گزر چکا تھا کسی سے زور آزمائی کیے۔

جوکر نے پہلے تو میری جُرأت مندی کی تعریف میں دو چار جُملے بولے پھر وَن، ٹو، تھری کی ہانک لگائی اور ہمارے درمیان زور آزمائی شروع ہو گئی۔ مجھے احساس تھا کہ بیسیوں آنکھیں مجھے دیکھ رہی تھیں۔ لوگ شاید دم سادھے کھڑے تھے۔

کچھ تو اس احساس سے کہ اتنی آنکھیں میری جانب نگراں ہیں اور کچھ میں نے بیٹھتے وقت باڈی بلڈر کی آنکھوں میں قدرے استہزائیہ سی چمک نمودار ہوتی دیکھی تھی۔ ان دونوں باتوں نے مجھے بڑی مضبوطی بخشی۔ مجھے میرے اندازے سے زیادہ دیر تک ٹھہراؤ حاصل رہا۔

کئی سیکنڈ تک ہمارے بازو ساکت رہے اور طاقت کو جواباً برابر کی طاقت ملتی رہی لیکن وہ پیشہ ور باڈی بلڈر تھا۔ پنجہ آزمائی اس کا دن رات کا کام تھا۔ بلاشبہ وہ مجھ سے زیادہ طاقت ور بھی تھا تبھی یوں کھلے میدان میں چیلنج دیے بیٹھا تھا۔ لیکن بالآخر اس کے بازو میں کپکپاہٹ آنی شروع ہو گئی اور پھر سیکنڈ کی سوئی کی سی رفتار سے بازو جُھکنے لگا۔ کیفیت تو یہی رہی کہ مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا! آخر کار میں نے اس کا بازو پوری طرح میز پر ٹکا دیا۔ تاہم اس کی ہی نہیں میری پیشانی پر بھی پسینے کی بوندیں اُبھر آئی تھیں۔

اِردگرد موجود لوگوں نے تالیاں بجائیں اور میں پیشانی سے پسینہ پونچھ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ میں جانے کے لیے مڑنے لگا تو باڈی بلڈر نے ایک عجیب حرکت کی۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے روکا پھر اپنے جوکر پبلسٹی سیکرٹری کے دیے ہوئے انعام کے علاوہ مزید ایک سو کا نوٹ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ میری طرف سے لے جاؤ جوان! بڑی مدت کے بعد کسی سے پنجہ لڑانے میں لطف آیا ہے۔"

"مجھے خیال نہیں رہا تھا..." میں نے دونوں نوٹ اُسے واپس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "انعام تو تمھاری خدمت میں مجھے پیش کرنا چاہیے تھا، اس بات پر کہ تم اپنی طاقت کو شرافت کی حدود میں رکھتے ہوئے روزی کما رہے ہو۔ تم میدان کے مرد ہو لیکن افسوس کہ مجھے یہاں زیادہ تعداد میں تمھارے قدردان نظر نہیں آ رہے۔" میں نے سو کے ان دو نوٹوں کے ساتھ ایک نوٹ اپنی طرف سے ملا دیا۔ نوٹ اُس کی میز پر رکھ کر اور اُسے ہکا بکا چھوڑ کر میں تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

کافی آگے مجھے تھیٹر اور سرکس سے ملتی جلتی ایک چیز نظر آئی۔ پنڈال بہت بڑا تھا اور باہر خاصا سلیقے کا ایک چھوٹا سا اسٹیج بنا ہُوا تھا۔ اس پر ٹکٹ فروش اور جوکروں کے علاوہ بھرے بھرے جسم کی ایک سانولی لیکن خاصی پُرکشش لڑکی جس کے تراشیدہ بال، بڑی خوبصورتی سے کندھوں پر جُھکے ہوئے تھے، ادائے بے نیازی سے ایک صندوقچے پر بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ لوگ اُسے متوجہ کرنے کے لیے حسبِ مقدور حرکتیں کر رہے تھے مگر وہ کسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ تاریک اُفق پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔

ایک جوکر اس کی طرف اشارہ کر کے مائیک پر بار بار اعلان کر رہا تھا "یہ ہیں مس بجلی جو لکڑی کے تختے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوں گی اور ماسٹر منظور آنکھوں پر پٹی باندھ کر ان پر خنجروں کی بارش کریں گے۔ خنجر اس کے سر سے پاؤں تک جلد کو چھوتے ہوئے تختے میں پیوست ہوں گے۔ خنجروں کی اس یلغار کے سامنے کھڑے ہونا بڑا دل گردے کا کام ہے صاحب۔ جلدی آئیے... چند منٹ بعد مس بجلی اور ماسٹر منظور یہ سنسنی خیز کھیل آپ کے سامنے پیش کریں گے۔ اس کے علاوہ گھوڑے کے کرتب... ایک پہیے کی سائیکل پر حیرت انگیز کارنامے... جھولوں پر کھیل تماشے... سب کچھ صرف تین روپے میں... جلدی ٹکٹ لیجیے اور اندر آئیے۔ سوچ بچار میں وقت ضائع مت کیجیے، شو شروع ہونے میں صرف چند منٹ باقی ہیں۔"

پنڈال پر چند بورڈ بھی آویزاں تھے جن پر ان کھیل تماشوں کی منظر کشی کی گئی تھی جن کا اناؤنسر ذکر کر رہا تھا۔ یہ بورڈ شاید برس ہا برس سے کوئی ایک ہی پینٹر بناتا آ رہا تھا۔ بچپن سے

لے کر آج تک ہر میلے ٹھیلے، ہر سرکس میں، ہر جگہ میں نے ایسے ہی بورڈ اسی حالت میں دیکھے تھے کہ ان پر بنی ہوئی تصویروں میں یہ تمیز کرنا مشکل ہوتا تھا کہ آدمی کون سا ہے اور گھوڑا کون سا، لڑکی کہاں ہے اور جوکر کہاں ہے۔

اس پنڈال پر ٹکٹ معقول تعداد میں فروخت ہوتے دکھائی دے رہے تھے۔ مس بجلی کو دیکھ کر میرے دل میں بھی کچھ گدگدی سی ہونے لگی تھی، اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ اس کا شو ضرور دیکھوں گا لیکن اس سے پہلے مجھے شدت سے وہ ضرورت محسوس ہو رہی تھی جس کے لیے دیہاتی اسکولوں میں بچے ایک انگلی اُٹھا کر ماسٹر صاحب سے اجازت طلب کرتے ہیں۔

میں کسی گوشۂ تنہائی کی تلاش میں چل دیا۔ کافی دُور جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں جہاں تاریکی بھی تسلی بخش تھی اور لوگوں کی آمدورفت بھی نظر نہیں آ رہی تھی، پہنچ کر بیٹھ گیا۔ میں بدستور سرور اور ترنگ میں تھا۔ شاید کچھ گنگنا بھی رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد جب کہ میں اُٹھنے لگا تھا، اپنے آس پاس مجھے عجیب سی بُو محسوس ہوئی۔ میں ابھی ادھر اُدھر دیکھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ اس بُو کا منبع ہی گویا میری ناک پر آن ٹکا۔ یہ کوئی گیلا کپڑا تھا جسے کسی نے مضبوطی سے میری ناک پر جما دیا تھا۔ اس کپڑے سے حواس کو مختل کرنے والی بُو پھوٹ رہی تھی۔

میری گردن کسی کے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں تھی اور اوپر سے ناک منہ پر رومال کی وجہ سے بالکل ہی دم گھٹا جا رہا تھا۔ اس عالم میں بھی میں نے کسی نہ کسی طرح ازاربند کو گرہ لگا لی اور اپنے آپ کو گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک میرے حواس پر دُھند چھانے لگی تھی۔

میں نے بہت زور آزمائی کی لیکن مجھے قابو میں کرنے کی کوشش کوئی ایک شخص نہیں کر رہا تھا، وہ یقیناً کئی تھے اور ان کی مدد کے لیے وہ رومال بھی موجود تھا جو غالباً کلوروفام میں بھیگا ہُوا تھا۔

چند سیکنڈ کے اندر اندر میرے ہاتھ پاؤں بے جان سے ہو گئے لیکن میں بے ہوش اب بھی نہیں ہُوا تھا۔ دفعتاً کسی نے میری کنپٹی پر گھونسا رسید کیا جو اُس وقت مجھے ہتھوڑے کے برابر محسوس ہُوا۔ حواس نے مکمل طور پر میرا ساتھ چھوڑ دیا۔ میلے کا شور شرابا... روشنیاں... مس بجلی سب کچھ کہیں دُور اندھیرے پس منظر میں چلا گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر بعد مجھے دھیرے دھیرے ہوش آیا۔ کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش کی تو معلوم ہُوا کہ وہ کھردری رسیوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر بعد مجھے..... اپنے حدود اربعہ کے بارے میں کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔

میں کسی ٹرک میں موٹی چٹائی پر پڑا تھا۔ میرے دائیں بائیں، اوپر اور سرہانے پائنتی سب طرف بڑی بڑی جوٹ کی پیٹیاں تھیں۔ ان کے درمیان تھوڑی سی جگہ چھوڑ کر مجھے بھی کسی بے کار اور بے جان چیز کی طرح ڈال دیا گیا تھا۔ ٹرک پر غالباً ترپال بھی تنی ہوئی تھی۔ میں گُھپ اندھیرے میں پڑا تھا۔ کبھی کبھی غالباً کوئی اور ٹرک یا گاڑی وغیرہ قریب سے گزرتی تھی تو ادھر اُدھر سے اِکا دُکا سوراخوں کے راستے لمحے بھر کے لیے کچھ روشنی اندر پہنچ جاتی تھی۔ ٹرک یکساں رفتار سے کسی طرف رواں دواں تھا۔

میرا سر بھاری تھا اور زبان جیسے خشک روئی کا گولا بن کر رہ گئی تھی۔ جسم کا جوڑ جوڑ دُکھ رہا تھا اور بھوک سے معدے میں ٹیسیں سی اُٹھ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا جیسے مجھے بن کھائے پیے شدید [illegible]ت کرتے کرتے کئی دن گزر گئے ہیں۔ میری حالت بتا رہی تھی کہ وہ رات یقیناً کب کی بیت چکی تھی، جس رات مجھے شہزادکوٹ کے میلے سے اغوا کیا گیا تھا۔ یہ شاید دوسری رات تھی۔ معلوم نہیں کتنے گھنٹوں سے میں بے ہوشی کی حالت میں سفر میں تھا۔

مجھے اس وقت کچھ سوچنا بھی بے حد دُشوار کام محسوس ہو رہا تھا، اس کے باوجود میں نے ذہن پر حتی الامکان زور دیا لیکن میں ذرا بھی اندازہ نہیں لگا سکا کہ مجھے اغوا کرنے والے کون ہو سکتے ہیں اور میری ان سے کیا دُشمنی تھی جو انھوں نے یہ زحمت کی ہے؟ جہاں انھوں نے مجھے بے ہوش کیا تھا وہاں تو شاید انھیں میری شکل بھی نظر نہ آئی ہو پھر انھوں نے کیوں مجھے اغوا کیا تھا؟ کیا مقصد ہو سکتا تھا ان کا؟

جب مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہ ملا اور کھوپڑی کا بھاری پن بڑھ گیا تو میں نے جھنجلاہٹ آمیز انداز میں چیخنا شروع کر دیا لیکن میری چیخ و پکار کی وجہ صرف بھوک تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی میری طرف متوجہ ہو تو اس سے کہوں "کمبختو! مجھے جہاں دل چاہے لے جاؤ لیکن کچھ کھلا پلا تو دو۔"

شاید میرے حلق سے آواز کچھ زیادہ زوردار نہیں نکل رہی تھی یا پھر جس جگہ اور جس انداز سے میں تقریباً زندہ درگور قسم کی حالت میں پڑا تھا اس کی وجہ سے چلتے ٹرک کے شور میں میری آواز ٹرک کے اگلے حصے تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ جلد ہی مجھے احساس ہُوا کہ میرا مسئلہ صرف بھوک ہی نہیں ہے مجھے سردی بھی لگ رہی تھی۔

میرے ہاتھ پاؤں اس طرح باندھے گئے تھے کہ میں اُٹھ کر بیٹھ سکتا تھا گو کہ کھردری رسّی کی بندشوں سے ہاتھ پاؤں سُن ہو چکے تھے تختے کی طرح اکڑے ہوئے جسم کو کسی نہ کسی طرح حرکت میں لا کر آخر کار میں اُٹھ ہی بیٹھا اور میں نے اپنی تمام تر بچی کھچی توانائی مجتمع کر کے ایک نئے عزم سے گلا پھاڑنا شروع کر دیا۔

بالآخر میں نے محسوس کیا کہ ٹرک کی رفتار کم ہو رہی ہے پھر شاید اسے سڑک سے اُتار لیا گیا۔ چند ہچکولوں کے بعد بالآخر ٹرک رُک گیا۔ ڈرائیونگ کیبن کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی پھر ٹرک کا ٹیل گیٹ کھول کر لٹکا دیا گیا اور کوئی ٹرک کے عقبی حصے میں چڑھ آیا۔

میرے پیروں کی طرف سے ایک پیٹی کھسکائی گئی اور ٹھنڈی ہوا کا ایک زیادہ تیز جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا پھر کسی نے کوئی سوئچ دبایا اور ٹرک کے عقبی حصے میں ایک ہوا اور بن جھولتا ہوا چھوٹا سا بلب روشن ہو گیا۔ اس وقت اس کی کمزور سی روشنی سے بھی میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

دو لحیم شحیم آدمی میرے سامنے کھڑے تھے جن کے چہرے اس کمزور اور زرد روشنی میں بھی تپے ہوئے تانبے کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بہت بڑے بڑے گھیر کی شلواریں، قدرے میلی قمیصیں اور صدریاں پہنے ہوئے تھے۔ ایک کے سر پر پگڑی بھی تھی۔ دوسرے کی مونچھیں اتنی گھنی تھیں کہ ہونٹ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

پگڑی والے نے پہلے تو مجھے ایک موٹی سی گالی دی جو اُس کے منہ سے کچھ زیادہ ہی موٹی محسوس ہوئی پھر اس نے ٹوٹی پھوٹی اردو میں پوچھا "کیا تکلیف ہے؟"

اُس نے مجھے جو گالی دی تھی پہلے تو میں اس کے جواب میں اس کے دانت معدے میں پہنچانا چاہتا تھا لیکن یہ ممکن نہیں تھا چنانچہ میں صرف یہ پوچھنے پر اکتفا کرنا چاہتا تھا کہ کیا وہ مجھے کھانے پینے کے لیے کچھ دینے کا ارادہ رکھتے ہیں یا نہیں؟ اس کے بعد اگر ان کا موڈ زیادہ خوفناک نظر نہ آتا تو میں شاید یہ بھی پوچھ لیتا کہ آخر میرا قصور کیا تھا جو وہ مجھ سے قربانی کے جانور کا سا سلوک کر رہے تھے۔

میں نے اپنی آواز اور لہجے کو حتی الامکان نرم اور عاجزانہ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "دو بھائی صاحب! مجھے سخت بھوک اور سردی لگ رہی ہے۔"

انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں تبادلۂ خیال کیا۔ میرا خیال تھا کہ میری درخواست کو شرفِ قبولیت حاصل ہو چکا ہے مگر دوسرے ہی لمحے گھنی مونچھوں والے نے صدری کی جیب میں ہاتھ ڈال کر دھات کی ایک لمبوتری سی ڈبیا نکالی۔

ڈبیا کھول کر اُس نے ایک بڑی سی سرنج نکالی اور اس پر موٹی سی سوئی فٹ کر لی۔ دوسری جیب سے اُس نے چھوٹی سی ایک شیشی نکالی جس میں تقریباً بے رنگ سا کوئی سیال نظر آ رہا تھا۔ نہایت پھرتی سے اُس نے سوئی ربر کے ڈھکن سے گزار کر سیال کو سرنج میں منتقل کیا۔

میں احمقوں کی طرح اُسے دیکھنے میں اس حد تک منہمک تھا کہ مجھے صحیح طور پر احساس ہی نہیں ہو سکا کہ اس دوران پگڑی والے نے میرے قریب بیٹھ کر میری آستین اوپر چڑھا دی ہے۔ میں اُس وقت چونکا جب گھنی مونچھوں والا سرنج لیے مجھ پر جھکا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ یہ اہتمام میرے لیے ہو رہا تھا۔ یہ میری درخواست کا اچھا جواب تھا۔ میں نے کھانے کے لیے کچھ مانگا تھا اور وہ مجھے نہ جانے کس چیز کا انجکشن لگانے پر تل گئے تھے۔

میں بہت کسمسایا، مچلا لیکن میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ پگڑی والے نے مجھے پکڑے رکھا اور مونچھوں والے نے بے دردی سے سوئی میرے بازو میں گھونپ دی۔ بے اختیار میرے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اس انداز سے میں نے کئی بار مویشیوں کو انجکشن لگتے دیکھے تھے۔ میری اپنی حالت اس وقت شاید کسی مویشی سے بھی بدتر تھی۔

سیال میرے جسم میں منتقل کر کے مونچھوں والے نے سوئی میرے بازو سے نکالی، اُسے روئی کے ایک پھاہے سے صاف کیا اور سرنج سے اُتار کر دونوں چیزیں نہایت مشاقی و مہارت سے دوبارہ ڈبیا میں رکھ لیں۔ اس کے بعد اُنھوں نے لائٹ بجھائی، پھرتی سے پیٹی واپس وہیں کھسکائی جہاں سے ہٹائی تھی پھر غالباً ترپال کا پردہ اُٹھا کر اور نیچے اُتر کر وہ ہر چیز کو پہلے ہی والی حالت میں لانے کے بعد ڈرائیونگ کیبن میں لوٹ گئے تھے۔ چند لمحے بعد ٹرک دوبارہ چل پڑا۔

یہ سب کچھ چند سیکنڈ کے اندر اندر ہو گیا۔ ایسا لگا جیسے میں نے ان دونوں کو اسی کام کے لیے بُلایا تھا جسے وہ نہایت تندہی اور انہماک سے انجام دینے کے بعد لوٹ گئے تھے۔ میرے ذہن پر ایک بار پھر غنودگی کا حملہ ہونے لگا تھا اور میں اس سے لڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں لمحوں کے مدوجزر میں ڈوب اُبھر رہا تھا۔ افراد اور مناظر میری آنکھوں میں کبھی جھلملا اُٹھتے تھے اور کبھی معدوم ہو جاتے تھے۔ اشرف خان... زرینہ... وہ گھر... وہ بیڈروم... کیا وہ سب میرے منتظر رہ جائیں گے؟ اشرف اور زرینہ کس قدر پریشان ہوں گے... وہ میلہ... وہ مِس نگلی... وہ اس کا پُرکشش سراپا... ابھی تو مجھے اس سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش کرنی تھی۔ یہ مجھ پر کیا اُفتاد ٹوٹ پڑی ہے؟ کاش میں اپنے آپ پر ضبط کیے رکھتا۔ پیشاب کرنے کے لیے لوگوں کے ہجوم سے دور نہ آیا ہوتا لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اندھیرے گوشوں میں ایسی مصیبتیں بھی انسان کی گھات میں ہوتی ہیں اور عین اس وقت اس پر چھاپہ مارتی ہیں جب اسے گمان تک نہیں ہوتا۔

دھیرے دھیرے میری سوچوں کے آوارہ گھوڑے بھی لڑکھڑانے لگے اور میں ایک بار پھر اندھیری وادیوں میں اُتر گیا۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو میں اپنے آپ کو برسوں کا مریض محسوس کر رہا تھا۔ نقاہت کا یہ عالم تھا کہ آنکھیں جھپکنے میں بھی دشواری پیش آ رہی تھی۔ چاروں طرف نہایت دھندلے سے اُجالے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اتنا احساس البتہ ضرور ہو گیا تھا کہ میں اس وقت حالتِ سفر میں نہیں ہوں۔

کئی بار پلکیں جھپکنے پر جب نظر کی دھندلاہٹ دور ہوئی تو میں نے دیکھا کہ میں ایک عجیب اور شکستہ سے چھپر نما کمرے میں خشک گھاس پھوس کے فرش پر پڑا تھا۔ اس کمرے کی دیواریں بے ہنگم پتھروں کی تھیں اور چھت بھی کیا تھی، محض چند شکستہ سے تختوں پر مشتمل تھی۔ ایک دیوار میں کھڑکی کے طور پر خاصا بڑا شگاف تھا جس سے صبح کی روشنی اندر آ رہی تھی۔

سردی بے پناہ تھی لیکن میرے جسم پر صرف ایک پتلا سا، بوسیدہ اور انتہائی غلیظ کمبل پڑا ہوا تھا۔ عام حالات میں شاید میں اسے چھونا بھی پسند نہ کرتا لیکن اس وقت میرا دل چاہ رہا تھا کہ منہ بھی اس میں چھپا لوں اور اچھی طرح اس کے نیچے سکڑ سمٹ جاؤں لیکن جسم میں اتنی بھی سکت نہیں تھی۔ میرے گرد اور خشک گھاس پھوس کی حرارت نے میرے جسم کو اکڑنے سے تو بچایا ہوا تھا لیکن نقاہت بہرحال اپنی جگہ تھی۔

میں اس چھپر نما کمرے میں تنہا نہیں تھا۔ اس مختصر سے رقبے میں پندرہ سولہ نفوس موجود تھے۔ ایک ایک کمبل میں دو دو تین تین سکڑے سمٹے پڑے تھے اور کچھ ایسے تھے جو بیدار ہو چکے تھے اور کمبل اپنے ساتھیوں پر چھوڑ کر خود بغلوں میں ہاتھ دیے دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔

میرے جسم میں ایک خوفناک سی سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ لہر ٹھنڈ کی پیداوار نہیں تھی۔ اپنے ارد گرد موجود چہروں کو دیکھ کر میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ ان میں سے بیشتر کمسن لڑکے تھے۔ کوئی کوئی لڑکا ہی چودہ پندرہ سے اوپر کا تھا، ورنہ باقی اس سے بھی کم ہی عمر کے تھے۔ یکے بعد دیگرے سب ہی کسمساتے ہوئے بیدار ہو رہے تھے۔

سب کے سب نحیف اور لاغر تھے۔ چہروں سے مریض نظر آتے تھے۔ ان کے بال بے تحاشا بڑھے ہوئے اور مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔ آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ کسی کے تن پر صحیح سالم لباس نہیں تھا۔ آنکھوں میں وحشت، انتہائی مایوسی اور موت کی سی ویرانی جاگزیں تھی۔

میرے دیکھتے دیکھتے وہ سب کے سب ہی بیدار ہو گئے۔ میں ہی ان کی نگاہوں کا مرکز تھا۔ شاید وہ سب یہاں کافی عرصے سے تھے اور میں ان کے درمیان نیا چہرہ تھا لیکن وہ مجھے تجسس سے نہیں، بس یونہی بے مقصد سے انداز میں دیکھ رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں شاید ترحم کی جھلک تو تھی لیکن ہمدردی کی نہیں۔ شاید ان کے احساسات شل ہو چکے تھے۔ ان میں سب سے بڑا غالباً میں ہی تھا۔

مجھ پر ایک عجیب سی مُردنی طاری تھی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ دو مرتبہ کی بے ہوشی نے میرے جسم کو ہی نہیں، میرے ذہن، میری روح اور میری قوتِ ارادی کو بھی بے انتہا مضمحل کر دیا تھا۔ مجھ میں جیسے زندگی کا تموّج ختم ہو گیا تھا۔ کوئی لگن، کوئی خواہش حتیٰ کہ بقا کی خواہش بھی نہیں رہی تھی۔

کافی دیر تک میں کسی بیمار کچھوے کی طرح پڑا رہا۔ جب مجھ میں کسی حد تک ہلنے کی سکت پیدا ہوئی تو احساس ہوا کہ معدے میں بھوک کا جو عفریت سو چکا تھا وہ بھی دھیرے دھیرے بیدار ہو رہا تھا اور معدے کی دیواروں کو اپنے خوفناک پنجوں سے کُھرچنے لگا ہے۔

ہاتھ پاؤں ہلانے تو سب سے زیادہ تکلیف دہ ٹیس بازو میں وہاں اُٹھی جہاں مونچھوں والے اس شخص نے سرنج کی موٹی سی سوئی گھونپی تھی۔ باقی جسم ویسے ہی اکڑا ہوا تھا تاہم اس احساس سے خوشی ہوئی کہ میرے بازو آزاد تھے مگر دوسرے ہی لمحے یہ خوشی آدھی رہ گئی۔ جب کمبل ہٹا کر میں نے دیکھا کہ میرے پیروں میں بیڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ میرے ہی نہیں وہاں موجود ہر لڑکے کے پاؤں میں بیڑیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا۔ تاہم میں کسی نہ کسی طرح اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

"یہ... یہ کون سی جگہ ہے...؟ ہم سب کے پیروں میں بیڑیاں کیوں پڑی ہوئی ہیں؟" میں نے خاص طور پر کسی

...ں کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔ اپنی آواز مجھے خود بھی اجنبی سی محسوس ہوئی کمزور، بیٹھی بیٹھی اور کھرکھراتی ہوئی سی۔

چند لمحے تو سب لڑکے خاموشی سے بدستور مجھے گھورتے رہے جیسے انھوں نے میری بات سُنی ہی نہ ہو پھر چند لڑکوں نے یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھا جیسے جواب دینا بہت بڑی ذمے داری ہو جسے وہ ایک دوسرے کے کندھوں پر ڈالنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

بالآخر ایک سانولے سے لڑکے نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بے حد دھیمی آواز میں بولا۔ ”یہ خرکار کیمپ ہے!“

”خرکار کیمپ!“ میں تقریباً چیخ اٹھا۔

”آہستہ بولو۔“ سانولے لڑکے نے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ”باہر دروازے کے آس پاس چوکیدار موجود ہوگا، وہ اونچی آواز میں بات کرنے والوں پر بہت ناراض ہوتا ہے۔“

مجھے اب خوف سے زیادہ حیرانی تھی۔ میں نے یہ تو سُنا تھا کہ بردہ فروش اور اسی قبیل کے دوسرے خبیث لوگ کمسن لڑکوں کو اٹھا کر خرکار کیمپوں میں پہنچا دیتے ہیں لیکن میں نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ مجھ جیسے چھ فٹ کے جوانوں کو بھی اٹھا کر خرکار کیمپوں میں پہنچایا جا سکتا ہے۔ گویا بات دراصل صرف مناسب موقع محل کی تھی۔ مناسب موقع میسر آنے پر اغواء کرنے والے کسی کو بھی اغوا کر سکتے تھے۔

مجھے خرکار کیمپوں کے متعلق کوئی خاص معلومات حاصل نہیں تھیں کہ یہ کن علاقوں میں پائے جاتے ہیں، کیوں پائے جاتے ہیں؟ اور یہاں مغویان سے کیا کام لیا جاتا ہے؟ انھیں اغواء ہی کر کے کیوں لایا جاتا ہے؟ اور بعض خرکار کیمپوں کی موجودگی کا علم ہو جانے کے بعد قانون نافذ کرنے والے بڑے بڑے گرو گھنٹال انھیں ختم کیوں نہیں کر پاتے؟ مجھے کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ مجھے زندگی میں خرکار کیمپ سے واسطہ بھی پڑ سکتا ہے اور وہ بھی زندگی کے حسین موڑ پر... جبکہ عیش و آرام کا ایک نیا سفر شروع ہو چکا تھا۔

”کیا یہاں کُل بس ہم ہی لوگ ہیں؟“ میں نے آہستگی سے چاروں طرف گردن گھما کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

”نہیں...“ سانولے لڑکے نے اس مرتبہ تھکے تھکے سے لہجے میں جواب دیا۔ ”یہاں ایسی چار کوٹھریاں ہیں کُل اڑتالیس لڑکے ہیں۔“

ابھی میں کچھ اور پوچھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ دروازہ دھڑ سے کھلا اور ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں دو قد آور آدمی ڈرامائی سے انداز میں اندر آ گئے۔ ایک کے ہاتھوں میں بالٹی اور ایک میلی سی باسکٹ تھی دوسرے شخص کے ایک ہاتھ میں سب مشین گن اور دوسرے میں چمڑے کا چابک تھا۔ چابک کی چرمی رسی خاصی موٹی تھی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ جس کے یہ چابک پڑتا ہوگا چمڑی اُدھیڑ کر رکھ دیتا ہوگا۔

ان دونوں کو دیکھ کر سہمے ہوئے چہرے کچھ اور سہم گئے۔ لڑکے ایک خاص انداز میں دیواروں سے ٹیک لگا کر اکڑوں بیٹھ گئے۔ ان دونوں آدمیوں کے آتے ہی ان میں یوں بھگدڑ سی مچ گئی تھی جیسے بھیڑوں کے گلے میں دو بھیڑیے آن گھسے ہوں صرف میں ہی تھا جو اپنی جگہ بیٹھا رہ گیا تھا۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ دیواروں کے ساتھ ساتھ کسی دھات کی پلیٹیں اور کچھ غلیظ سے مگ قطار میں رکھے ہوئے تھے ہر لڑکے نے ان میں سے ایک ایک پلیٹ اور ایک ایک مگ اپنے سامنے رکھ لیا تھا۔ میں چونکہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا شاید اسی لیے بندوق اور چابک بردار نے قریب آ کر مجھے ایک لات رسید کی۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ میں آلوؤں کی بوری کی طرح لڑھک کر نہایت آسانی سے دیوار سے جا لگا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں سجدے کی سی حالت میں جا کر گرا تھا۔

چند لمحے کی کوشش کے بعد میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میں نے نفرت اور بے بسی آمیز غصّے سے اُس شخص کی طرف دیکھا جس نے مجھے لات رسید کی تھی۔ وہ اب پیچھے ہٹ کر دروازے پر اس طرح کھڑا ہوا تھا کہ بیک وقت سب پر نظر رکھ سکے۔ مجھے یوں دیکھتے پا کر اُس نے چابک کو ایک جھٹکا دیا اور ”چٹاک“ کی سی آواز پیدا ہوئی۔ میں نے نظر جھکا لی۔ اس وقت مجھ میں دوسری لات یا چابک کھانے کی ہمت نہیں تھی۔

دوسرے شخص نے باسکٹ اور بالٹی کمرے کے وسط میں رکھ دی تھی۔ اب میں نے دیکھا کہ بالٹی میں مٹیالے پانی سے مشابہ چائے تھی اور باسکٹ میں موٹے موٹے نان۔ میرے قریب سے کسی لڑکے نے ایک پلیٹ اور ایک مگ میری طرف بھی کھسکا دیا تھا۔

راشن بردار شخص نے نہایت پھرتی سے سب کے مگ چائے سے بھر دیے اور سب کی پلیٹوں میں ایک ایک نان رکھ دیا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہی دونوں باہر چلے گئے اور دروازہ کھڑکھڑاہٹ کی سی آواز کے ساتھ دوبارہ بند ہو گیا۔

لڑکے ندیدوں کی طرح نان کے لقمے چائے کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے اُتارنے لگے تھے۔ میرے پاس والے لڑکے نے مجھے ٹھوکا دیا۔ ”جلدی ناشتہ ختم کر لو... کام پر جانے کا وقت ہو رہا ہے، اگر دیر لگاؤ گے تو چابک پڑیں گے۔“

میں نے اُس کے مشورے کی بدولت نہیں بلکہ بھوک کے عفریت سے شکست کھا کر پلیٹ اور مگ کی طرف ہاتھ بڑھا دیے۔ نان اور چائے دونوں ہی چیزیں ٹھنڈی تھیں۔ کافی عرصے سے میں جن حالات کا عادی ہو چکا تھا ان میں اگر اس قسم کی چائے اور نان میرے سامنے رکھا جاتا تو میں نظر بھر کر ان کی طرف دیکھ بھی نہ پاتا لیکن اس وقت میں نے رغبت سے لقمہ چبانا شروع کر دیا۔

پہلے دو تین لقمے چبانے اور نگلنے میں مجھے دقت پیش آئی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے مُنہ میں گویا روئی سی بھری ہوئی تھی۔ زبان سُوجی سُوجی سی تھی لیکن ٹھنڈی چائے کے دو تین گھونٹ بھرنے کے بعد مُنہ کے عضلات کچھ رواں ہو گئے اور وہ خشک نان کسی لذیذ ڈش کی طرح تیزی سے معدے میں منتقل ہونے لگا۔

میں نے تقریباً دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہی یہ عظیم ناشتا ختم کر لیا۔ معلوم نہیں میرا معدہ کب سے خالی تھا۔ پیٹ میں ایک دم ہی ٹھنڈا نان اور ٹھنڈی چائے پہنچی تو طبیعت متلا سی گئی لیکن پھر خود بخود ہی سنبھلنے لگی اور چند لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ میری نقاہت بھی کم از کم پچاس فیصد تو ختم ہو چکی تھی۔

میں نے گھڑی میں وقت دیکھنا چاہا تو معلوم ہُوا کہ کلائی پر گھڑی ہی نہیں ہے۔ غیر ارادی طور پر میں نے کوٹ اور قمیص کی جیبیں ٹٹولیں۔ میں گھر سے خاصی رقم لے کر سیر و تفریح کے لیے نکلا تھا مگر اب میری کسی جیب میں کچھ نہیں تھا اور تفریح بھی نہایت لاجواب میسر آ چکی تھی۔

بیٹھے بٹھائے یوں ایک لمحے کے کسی عمل سے کسی انسان کی زندگی یوں تہ و بالا بھی ہو سکتی ہے، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ در اصل ہم اس قسم کے واقعات و حادثات کے بارے میں پڑھتے ہیں یا کسی سے ذکر سُنتے ہیں تو بس وہ ہمارے لیے محض ایک قصہ ہوتا ہے۔ دوسروں کی سرگزشت۔ ہمیں گمان تک نہیں ہوتا کہ اس قسم کا کوئی واقعہ، کوئی حادثہ ہمیں بھی پیش آ سکتا ہے۔

میں ابھی سوچوں ہی میں گُم تھا کہ وہی دونوں آدمی ایک بار پھر دندنانہ دار کمرے میں آ گئے۔ اب چابک ان میں سے ایک نے اُٹھا رکھا تھا اور سب مشین گن دوسرے نے۔

چابک والے نے چابک ٹھکاتے ہوئے کُھردرے اور خونخوار لہجے میں کہا۔ "تم سب حرام خور کا بچہ ابھی تک آرام سے بیٹھا ہے... اُٹھو... خانہ خراب۔"

سب لڑکے قطار بنا کر کمرے سے نکلنے لگے۔ سب سے پیچھے میں بھی نکل آیا۔ باہر اسی وضع قطع کے اور مختلف عمروں کے پچیس تیس لڑکے اور کھڑے نظر آ رہے تھے۔ مجھ سمیت سب کے پیروں میں اسی قسم کی بیڑیاں تھیں جن کی موجودگی میں بہت چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا کر آہستہ آہستہ چلا جا سکتا تھا۔ تیز چلنے یا دوڑنے کی کوشش میں انسان مُنہ کے بل گر سکتا تھا۔

میں نے غیر محسوس سے انداز میں اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا۔ یہ کوئی پہاڑی علاقہ تھا۔ ہم غالباً کسی چھوٹی سی وادی کے وسط میں تھے۔ جس کوٹھری سے ہم نکلے تھے اُس سے متصل تین اور کوٹھریاں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف اصطبل نما طویل و عریض رقبہ تھا جس کے گرد خار دار تاریں لگی ہوئی تھیں مگر اس حصے میں کوئی مویشی وغیرہ موجود نہیں تھا البتہ کافی دُور بہت سے گدھے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے اور چھدری چھدری جھاڑیوں پر مُنہ مار رہے تھے۔

کم عمر لڑکوں نے ہلکے بیلچے اُٹھائے ہوئے تھے اور جو لڑکے قد سے زیادہ عمر کے اور نسبتاً مضبوط تھے، ان کے کندھوں پر کدالیں تھیں۔ کچھ بیلچے اور کدالیں زمین پر انبار کی سی شکل میں پڑی تھیں۔ ہم جہاں کھڑے تھے وہ ناہموار اور نیم پتھریلا سا میدان تھا۔ چاروں طرف خاصی اونچی اونچی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ پہاڑیاں تو سُرخی مائل مٹی ہی کے بلند و بالا ڈھیر معلوم ہوتی تھیں اور کچھ پہاڑیاں پختہ تھیں۔ ان کے دامن سے غالباً پتھر توڑا جاتا تھا۔ تانبے کے سے رنگ کا لیکن کچھ سیاہی مائل پتھر تھا۔

ٹیلوں اور پہاڑیوں کے اس دائرے کے عقب میں کیا تھا، یہ دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ کم از کم وہاں سے نہیں جہاں ہم کھڑے تھے۔ چابک اور سب مشین گن والے کے علاوہ بھی یہاں اشخاص موجود تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں لمبا سا بید تھا اور کندھے پر رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ کمر کے گرد گولیوں کی پیٹی بندھی تھی۔ دوسرا خالی ہاتھ تھا لیکن رائفل اُس کے کندھے پر بھی موجود تھی۔

قیدی لڑکوں کے علاوہ فی الوقت یہاں یہ چار اشخاص ہی نظر آ رہے تھے۔ چاروں ہی چوکنے اور درندہ صفت نظر آتے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں ان سے جھگڑا شروع کر دیتا اور تمام قیدی لڑکے بھی دل و جان سے میرا ساتھ دیتے تب بھی ان میں سے کسی کو بھی قابو کرنے سے پہلے پہلے ہمارے جسم چھلنی ہو جائیں گے۔ وہ اناڑی یا احمق نہیں تھے۔ قیدیوں

کو ہنکائے رکھنے کا انھیں نہ جانے کتنا طویل تجربہ حاصل تھا۔ وہ ذرا بھی سُست یا بے پروا نظر نہیں آ رہے تھے اور کچھ اس انداز میں ہمارے گرد گھوم پھر رہے تھے کہ کسی سر پھرے کو ان پر جھپٹنے یا حملہ کرنے کا موقع نہ مل سکے۔ حالانکہ یہاں مجھے کوئی سر پھرا نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ شاید ان قیدیوں کو کافی تجربہ حاصل ہو چُکا تھا اور انھوں نے نہ جانے کیسی کیسی سختیاں برداشت کی تھیں کہ ان کی ہمت ٹوٹ چکی تھی اور ان کی روح تک شکست قبول کر چکی تھی۔

چابک والے نے ایک بار پھر چابک کو ٹھپکایا۔ یہ گویا ایک اشارہ تھا۔ لڑکے فوراً تین سیدھی قطاروں میں تقسیم ہو گئے۔ میں بھی ایک قطار میں سب سے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ مجھے بطورِ خاص کوئی حکم نہیں دیا جا رہا تھا اور نہ ہی کوئی مجھے نووارد کی طرح دیکھ رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھے ان سب میں گُھل مل کر چلنا ہو گا۔ سرِ دست حالات کا تقاضا یہی تھا۔

چابک والے نے ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے انگلی ہلا ہلا کر قیدیوں کی گنتی کی، مجھے ذرا گہری نظر سے دیکھا اور پھر چابک کو جھٹکا دیا۔ سب لڑکے گھومے اور ایک سمت میں روانہ ہو گئے۔ اب میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

چابک والا میرے قریب آیا اور چابک کو جھٹکا دے کر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولا۔ "تم اِدھر نیا ہے... اگر سیدھا رہیں گا تو ہم تمھارے ساتھ نرمی کریں گا... ابھی گینتی اُٹھاؤ اور جدھر دوسرا لڑکا لوگ پتھر توڑے گا اِدھر تم بھی پتھر توڑو، سمجھا؟"

میں نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ اس وقت میری دسترس میں تھا لیکن کوئی خیال دل میں لانا فضول تھا۔ سب مشین گن والا کچھ دُور کھڑا پلکیں جھپکائے بغیر چمکیلی آنکھوں سے مجھے گھور رہا تھا۔ گن کی نال گو کہ جھکی ہوئی تھی لیکن اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

میں نے دل ہی دل میں واضح فیصلہ کر لیا تھا کہ پہلے مجھے کچھ وقت یہاں کے ماحول کا جائزہ لینے اور حالات کو سمجھنے میں صرف کرنا ہو گا اور اس کے بعد کسی موقع کا انتظار کرنا ہو گا۔

میں نے بیلچہ اُٹھایا اور لڑکوں کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ نگرانی کرنے والوں میں سے ایک کوٹھریوں کے پیچھے کہیں چلا گیا۔ ایک گدھوں کو ہانک کر پہاڑیوں کی طرف لے جانے لگا۔ چابک والا اور سب مشین گن والا ہمارے پیچھے آ رہے تھے۔ لڑکے دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے تھے۔ ایک گروہ نے پہاڑ سے پتھر توڑنے شروع کر دیے تھے۔ دوسرا گروہ ایک ٹیلے کے دامن سے مٹی کھودنے لگا تھا۔ مجھے بھی ایک لڑکے نے اشارے سے جگہ بتا دی جہاں سے میں پتھر کھود سکتا تھا۔

گینتی سے چند ہاتھ مار کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مجھے جن دواؤں کی مدد سے دو مرتبہ بے ہوش کیا گیا تھا انھوں نے میرے اعصاب پر بہت ہی بُرا اثر ڈالا تھا اور پرسے خوراک نہ ملنے کے سبب جان ویسے ہی آدھی رہ گئی تھی۔

بہر حال رفتہ رفتہ میرے کام میں روانی آتی گئی۔ جلد ہی میرے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے لیکن میں نے کام جاری رکھا۔ کچھ لڑکے پہاڑی سے ٹوٹنے والے پتھروں کو ڈھو کر نشیب میں لے جا رہے تھے جہاں کچھ لڑکے ہتھوڑوں سے انھیں مزید چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر رہے تھے۔ بالکل اسی طرح جس طرح میں سچا دا اینڈ کمپنی میں ملازمت کے دوران سائٹ پر مزدوروں کو پتھر توڑتے دیکھتا تھا۔ مزدور... جن میں لالی بھی شامل تھی۔ اس وقت لالی کی یاد سے بھی دل کے کسی گوشے میں کسک نہ اُبھری۔ پریشانیوں، تفکرات اور مصائب نے گدگدانے والی یادیں، بچھڑنے والوں کا درد اور محرومیوں کی کسک، سب کچھ چھین لیا تھا۔

کچھ لڑکے چھوٹے ٹوٹے ہوئے پتھروں کو گدھوں پر لٹکے ہوئے بوروں میں بھر رہے تھے۔ جدھر مٹی کی کھدائی ہو رہی تھی اُدھر بھی کچھ اسی طرح کے مرحلوں میں کام جاری تھا۔ دو جالیاں زمین پر کھڑی تھیں۔ بیلچوں سے ان پر اچھال اچھال کر مٹی چھانی جا رہی تھی اور پھر گدھوں پر لٹکے ہوئے بوروں میں بھری جا رہی تھی۔

جس گدھے پر بھی لدائی مکمل ہو جاتی تھی اسے لڑکے آگے ہانک دیتے تھے اور وہ نہایت سعادت مندی سے سدھائے ہوئے انداز میں ایک طرف کو چل دیتا تھا۔ یوں آگے پیچھے گدھوں کی روانگی کا سلسلہ جاری تھا۔ میدان عبور کر کے یہ گدھے ایک پہاڑی کے گرد گھومتے نظر آتے تھے پھر اس کے عقب میں کہیں غائب ہو جاتے تھے۔ ہر گدھا دس پندرہ منٹ بعد خود ہی لوٹ آتا تھا۔ اس کا بورا خالی ہو چکا ہوتا تھا۔ یوں ایک تسلسل سے گدھوں کے جانے اور واپس آنے کا عمل جاری تھا۔ تعداد میں وہ ساٹھ ستر رہے ہوں گے۔ معلوم نہیں وہ کہاں جا رہے تھے۔

میں نے قریب ہی کام کرتے ہوئے ایک لڑکے سے پوچھ ہی لیا۔ "یہ گدھے آخر جاتے کہاں ہیں؟"

لڑکے نے میری طرف دیکھے بغیر ایک لمحے کے لیے گینتی روک کر پیشانی سے پسینہ پونچھا اور اس طرح بولا کہ اس

کے ہونٹ ہلتے نظر نہ آئیں "یہ تو مجھے نہیں معلوم... مجھے یہاں آئے چار ماہ ہو چکے ہیں مگر آج تک مجھے پتا نہیں چلا کہ یہ گدھے کہاں جاتے ہیں اور میرا خیال ہے کسی بھی لڑکے کو نہیں معلوم...!" وہ ہانپ رہا تھا لیکن فوراً ہی اُس نے دوبارہ کام شروع کر دیا۔

میں کوٹ بھی اُتار چکا تھا اور قمیص بھی۔ اس کے باوجود میرا جسم پسینے میں تر تھا۔ میں نے جلد ہی محسوس کر لیا تھا کہ پتھر توڑنے کے کام میں طاقت تو درکار تھی ہی لیکن اس کی اپنی ایک تیکنیک بھی تھی جس سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے زیادہ طاقت صرف کرنی پڑتی تھی۔

میدان میں جو قیدی لڑکے کام کر رہے تھے، صحت ان میں سے کسی کی بھی قابلِ رشک نہیں تھی مگر معتوبیں سہے سہمے کردہ سخت جان ہو چکے تھے اور انھیں کام کی تیکنیک بھی آ چکی تھی۔ بہت کم وقت میں، میں بھی تیکنیک سے واقف ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی دانست میں، میں حتی الامکان جانفشانی سے کام کر رہا تھا اس کے باوجود ایک بار چابک والا ٹہلتا ٹہلتا میرے قریب آیا اور حقارت سے بولا "مُردار ٹے... تم اتنا لمبا چوڑا جوان ہے اور ابھی تک تم نے دو چھٹانک پتھر نہیں توڑا...!"

حالانکہ میں پہاڑی کے جسم سے جتنے پتھر جُدا کر چکا تھا ان کے انبار میں اس جیسے دو آدمی دفن ہو سکتے تھے مگر وہ سب پتھر نشیب میں منتقل ہو چکے تھے۔ میں نے اس شخص کو گھورا تو نہایت غیر متوقع طور پر اس نے شائیں سے چابک میرے جڑ دیا۔ میرے پہلو اور کمر پر گویا کسی نے کند چھری سے لکیر کھینچ دی۔ اگر میں فوراً سختی سے دانت نہ بھینچ لیتا تو شاید بُری طرح بلبلا اُٹھتا۔

اُس نے دوبارہ چابک جھٹکتے ہوئے تحقیر آمیز انداز میں کہا "گھورتا کیا ہے؟ نظر جھکا کر بات کر دخانہ خراب"!

میں نے رگ و پے میں اُٹھتی ہوئی اشتعال اور نفرت کی لہر کو بہ مشکل دبایا اور کن انکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نشیب میں دوسرا خرکار سب مشین گن سنبھالے ایک پتھر پر چوکنا بیٹھا تھا۔ سب مشین گن گو کہ اُس نے بظاہر بے پروائی سے گود میں رکھی ہوئی تھی لیکن انگلی بدستور ٹریگر پر تھی اور گن کا رُخ بھی ہماری ہی طرف تھا۔

میں نے نظر جھکا لی۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا تھا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ابتدا میں اس طرح بات بے بات سرزنش کر کے دراصل وہ اپنے قیدی کی سرکشی اور خودداری کا خاتمہ کرتے ہوں گے لہٰذا میرے لیے یہی ظاہر کرنا بہتر تھا کہ مجھ میں کوئی خاص سرکشی یا عزتِ نفس کا احساس ہے ہی نہیں۔ بلاوجہ اذیت برداشت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں دوبارہ کام میں لگ گیا۔

دوپہر کو کھانے کا وقفہ ہُوا، ہم سب کوٹھڑیوں میں واپس آ گئے۔ کچھ دیر بعد صبح ہی کے سے انداز میں کھانا آ گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس مرتبہ بالٹی میں چائے کی جگہ چائے ہی جیسی پتلی دال تھی لیکن جتنی مشقت میں کر کے آیا تھا اس کے بعد درندوں کی کھوہ سے مشابہ وہ کوٹھڑی مجھے گوشۂ فردوس اور وہ واہیات کھانا من و سلویٰ سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ سب کے لیے کھانے کی ایک ہی مقدار مقرر تھی خواہ کسی کی خوراک زیادہ تھی یا کم۔

صرف آدھے گھنٹے بعد، ہمیں دوبارہ کام پر جانا پڑا۔ اس کے بعد مشقت اس وقت تک جاری رہی جب تک شام کا دھندلکا پھیلنا شروع نہیں ہو گیا۔ رات کو لالٹین کی معمولی سی روشنی میں بیٹھ کر ہم نے دوپہر جیسا ہی کھانا کھایا اور کسی بے زبان مخلوق کی طرح خاموشی سے کمبلوں میں گھس گئے۔ کبھی کبھی کوئی لڑکا کروٹ لینے کی کوشش کرتا تھا تو اس کی کراہ نکل جاتی تھی یا پھر اس کی بیڑیاں چھنک اُٹھتی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ لڑکوں میں بیزاری، شکستہ دلی اور مایوسی دُور کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ اپنے قریب لیٹے ہوئے ایک لڑکے سے میں نے سرگوشی میں بات شروع کرنے کی کوشش کی "اگر ہم مل کر رات کو یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں!"

وہ میری بات کاٹ کر بولا "رات کو باہر نکلنے کی کوشش مت کرنا... بہت مار پڑتی ہے۔"

میں نے کہا "میں نے دیکھا ہے باہر صرف ایک چوکیدار ہوتا ہے، اگر ہم کوئی حکمتِ عملی تیار کر لیں تو اس پر قابو پا کر یہاں سے نکل سکتے ہیں۔"

لڑکے نے جواب نہ دیا اور کروٹ بدل کر میری طرف پیٹھ کر کے سو گیا۔ یہ بیزاری اور شکستہ دلی کی انتہا تھی۔

دوسرے روز میں نے کام کے دوران غیر محسوس طور پر آہستہ آہستہ پہاڑی پر کچھ بلندی تک جا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس جگہ سے مجھے دو پہاڑیوں کے درمیان کچھ فاصلہ نظر آیا اور اسی راستے سے مجھے دُور کہیں سرسبز درختوں کے جھنڈ دکھائی دیے۔ ان درختوں کے درمیان اور آس پاس مجھے اونچے نیچے اور کچے پکے مکانوں کی جھلک دکھائی دی۔ شاید اُدھر کوئی بستی تھی۔ شاید ان خرکاروں کا تعلق اسی بستی سے ہے۔ میں اس طرف ایک مرتبہ بھی نظر بھر کر نہیں دیکھ سکا۔ چابک والا لنگور کی طرح اُچھلتا ہُوا میرے پیچھے آ پہنچا تھا۔ اس نے بلا تامل میری کمر پر چابک رسید کیا۔ ایک بار پھر جیسے جلد میں انگارے سے اُتر گئے۔ ابھی تو چابک کی کل والی ضرب ہی کی تکلیف کم نہیں ہوئی تھی کہ ایک اور پڑ گئی تھی۔ اگر میں کسی طرح اپنی کمر پر نظر ڈال سکتا تو یقیناً اس وقت مجھے اس پر کراس کا نشان نظر آتا۔

"حرام خور...!" وہ بدشکل اور رکیک صفت شخص غرایا۔ "اتنا اوپر کس لیے چڑھا ہے...؟ اور یہ اِدھر اُدھر کیا دیکھتا ہے...؟ بھاگنے کا خیال دل سے نکال دو دال خور! اِدھر سے آج تک کوئی نہیں بھاگا... اِدھر کام ختم ہوگا تو ہم تم کو دوسری جگہ بھیجے گا... باقی سب خیال کھوپڑی سے نکال دو...!"

اُس نے بات کا اختتام تین چار موٹی موٹی گالیوں سے کیا اور میں خون کے گھونٹ پی کر اپنی جگہ پر آ گیا۔

خرکار چابک جھٹکتے ہوئے بولا "یہ مت سمجھو کہ ہم اپنے لوگوں پر نظر نہیں رکھ سکتا... ہماری ہزار آنکھیں ہیں، ہزار کان ہیں!"

اُسی لمحے میں بُری طرح اُچھل پڑا۔ ترٹ... ترٹ... ترٹ کی خوفناک سی آواز کے ساتھ میرے پیروں کے قریب ہی چنگاریاں اڑی تھیں اور سنگلاخ چٹانوں کا ایک اُبھرا ہُوا سا کونا اُڑ گیا تھا۔ سنگریزے میرے جسم سے بھی ٹکرائے تھے۔ سب مشین گن والے نے ہلکا سا برسٹ مارا تھا۔ میرے اُچھلنے کے انداز پر دونوں خرکاروں نے خوفناک انداز میں قہقہہ لگایا۔ میں جتنا خوفزدہ ہُوا تھا میں نے اپنے آپ کو اس سے کہیں زیادہ خوفزدہ ظاہر کیا۔ چابک والا واپس نیچے چلا گیا۔

وہ دن بھی گزشتہ دن کی طرح گزر گیا۔ اس کے بعد مزید تین دن اسی انداز میں گزر گئے۔ حالات میں کوئی تبدیلی آئی نہ میری معلومات میں کوئی اضافہ ہُوا۔ مجھے ان چند دنوں میں ہی یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہمیشہ سے میری زندگی کا یہی معمول چلا آ رہا ہے۔

وہ اشرف خان کے گھر میں عیش و آرام میں گزرا ہُوا وقت، وہ اس کے ساتھ مال لانے لے جانے کی مہمات پر جانا اور پھر وہ زرینہ کی نوازشات... سب کچھ جیسے خواب ہو کر رہ گیا تھا۔

دن بھر کی مشقت سے ٹوٹتا جسم لے کر رات کو جب میں خشک گھاس پھوس اور بوسیدہ و غلیظ کمبل پر مشتمل بستر میں سکڑ سمٹ کر لیٹتا تو آنکھوں میں یادوں کی کرچیاں چبھنے لگتیں۔ چوبی تختوں کی چھت پر نظر جمائے میں رات گئے تک لیٹا یہی سوچتا رہتا کہ میری اچانک گمشدگی پر زرینہ اور اشرف خان کا ردِعمل کیا رہا ہوگا؟ کیا زرینہ میرے لیے متفکر و بے چین ہو گی؟ کیا اشرف خان بھی میری گمشدگی سے پریشان ہوگا؟ یا خدا کا شکر ادا کر رہا ہوگا؟ اب تو ہم ذاتی کاروبار شروع کرنے والے تھے۔ ترقی کے کیسے کیسے منصوبے بنائے تھے ہم نے... پھر میں سوچتا کہ کیا اب مجھے کبھی یہاں سے رہائی نہیں نصیب ہو گی؟ کیا میں یونہی مشقت کرتے کرتے مر جاؤں گا؟ اس سوال سے آگے مجھے اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا اور میں مایوسی کے سمندر میں ہاتھ پاؤں مارتے مارتے سو جاتا۔

خرکار کیمپ میں مجھے دسواں دن تھا۔ اس روز علی الصباح میری آنکھ کھل گئی۔ کوٹھڑی کے ایک گوشے سے دبی دبی سسکیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی اور شاید اسی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔

کوٹھڑی میں ایک ہی چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے پٹ ہم کھلے ہی رکھتے تھے گو کہ اس وجہ سے ہمیں رات کو سردی محسوس ہوتی تھی لیکن اگر ہم اسے بند کرتے تھے تو کوٹھڑی میں اصطبل جیسی بُو محسوس ہونے لگتی تھی۔

اس کھڑکی کے راستے صبحِ صادق کا دھندلا دھندلا اُجالا کوٹھڑی میں قدم رکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ لالٹین بھی روشن تھی حالانکہ رات کو حسبِ معمول ایک لڑکے نے اسے بجھا دیا تھا۔ میں نے دیکھا کونے میں ایک لڑکا گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا، وہی رو رہا تھا۔ وہ اپنی آواز کو دبانے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا مگر ہچکیاں تھیں کہ تھم نہیں رہی تھیں۔

اُس کا چہرہ گو کہ گھٹنوں اور بازوؤں کے حلقے میں چھپا ہُوا تھا لیکن میں نے اس پر نظر ڈالتے ہی محسوس کر لیا تھا کہ وہ یہاں اجنبی تھا... نووارد تھا... اس جہنم میں آن پھنسنے والا نیا معتوب... نیا قیدی۔

مجھے یقین تھا کہ جن لڑکوں نے کمبلوں سے سر نکالے ہوئے تھے وہ بھی آنکھیں ذرا ذرا سی کھولے نووارد لڑکے کی طرف دیکھ رہے ہوں گے لیکن وہ ظاہر یہی کر رہے تھے جیسے سو رہے ہوں۔

میں رینگتا ہُوا اُس لڑکے کے قریب پہنچا لیکن میں نے اُسے مخاطب نہیں کیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں نے کچھ کہا تو وہ حوصلہ پا کر خاموش ہونے کے بجائے اور زیادہ زور زور سے رونا شروع نہ کر دے۔ اُسے رات میں نہ جانے کس وقت کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب اس کی ہچکی تھمنے لگی اور میں نے محسوس کر لیا کہ اس کے دل کا غبار نکل چکا ہے تو میں نے حوصلہ دینے والے انداز میں اس کا بازو تھپتھپایا۔ تب اس نے سر اُٹھا کر خوفزدہ سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ مجھے جانے کیوں حیرت کا سا جھٹکا لگا۔ لڑکا بے حد خوبصورت تھا۔

صاف ستھری جلد، موٹی موٹی آنکھیں، بھورے بال، تیکھے نقوش اور نازک نظر آنے والے ہاتھ پاؤں، اس کی عمر پندرہ سال سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اس کے جسم پر اس وقت صرف کرتا پاجاما تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کسی بہت اچھے گھرانے کا فرد تھا۔

وہ دیوار سے ٹیک لگا کے اکڑوں بیٹھا تھا۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سُرخ ہو چکی تھیں۔ مجھے قریب پا کر وہ خوفزدہ سے انداز میں قدرے پرے کو کھسک گیا۔ اس کے پیروں میں بھی بیڑیاں پہنائی جا چکی تھیں۔

”ڈرو نہیں۔“ میں نے سرگوشی کی۔ ”کم از کم مجھ سے تمھیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تمھیں کہاں سے اغوا کیا گیا ہے؟ سرگوشی ہی میں جواب دینا۔“

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر اٹک اٹک کر سرگوشی میں بولا۔ ”لاہور سے... لیکن میں رہنے والا کراچی کا ہوں... چھٹیاں گزارنے چچا کے ہاں لاہور آیا ہوا تھا۔“

”اغوا کیسے ہو گئے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں گھر والوں کے منع کرنے کے باوجود اکیلا سیر سپاٹے کو نکل کھڑا ہوا تھا...“ وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے بولا۔ ”ٹیکسی میں شالا مار باغ چلا گیا... وہاں سے واپسی پر جو ٹیکسی کی اس کا ڈرائیور مجھے نہ جانے کن کن راستوں سے کہاں لے گیا۔ مجھے شہر سے باہر کے راستوں کی زیادہ پہچان نہیں تھی... جب مجھے گڑبڑ کا احساس ہوا تو بہت دیر ہو چکی تھی... میں نے ڈرائیور پر چیخنا شروع کیا تو اس نے ایک ویران سڑک پر گاڑی روکی اور مڑ کر میری ناک پر کلون جیسی ایک شیشی سے نہ جانے کس دوا کی پھوار کر دی... جیسے اسپرے کرتے ہیں... میں بے ہوش ہو گیا۔ آنکھ کھلی تو میں یہاں تھا... میں کئی گھنٹے سے یونہی بیٹھا ہوں۔“

”گھبراؤ مت، سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ میں بھلا اُسے تسلی دی۔ میں جو اپنے لیے کچھ کرنے پر قادر نہیں تھا، اُسے تسلیاں دے رہا تھا۔

میری تسلیاں محض طفل تسلیاں ہی رہیں۔ دن چڑھا تو بالکل اسی طرح جیسے میں قیدیوں کے گلّے میں شامل ہوا تھا، اس نو وارد لڑکے کو بھی مشقت کے لیے دھکیل دیا گیا۔ اس کا نام راشد تھا۔

راشد ویسے تو صحت مند تھا لیکن ظاہر ہے اس نے زندگی میں کبھی اس قسم کی مشقت نہیں کی تھی۔ چند بار گینتی چلا کر وہ روہانسا ہو گیا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔ چابک والا مکروہ شکل خرکار اس کے پاس آیا۔ خلافِ معمول اس نے راشد پر چابک نہیں برسایا۔ حد تو یہ ہے کہ وہ مسکرا بھی رہا تھا۔

”یہ کام نہیں ہوتا تو چل مٹی ڈھونے کا کام کر۔“ خرکار نے راشد کو حکم دیا اور بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے گیا۔

اب اس نے راشد کو جس کام پر لگایا وہ یہاں کا آسان ترین کام تھا مگر راشد کے لیے یقیناً وہ بھی آسان نہیں تھا تاہم وہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں کبھی کبھی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ لیتا تھا۔ اتنی دور سے بھی میں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔

چابک والا مکروہ شکل خرکار یوں تو سبھی کمسن لڑکوں سے فحش مذاق کرتا رہتا تھا بلکہ اکثر و بیشتر معیوب حرکات کرنے سے بھی نہیں چوکتا تھا لیکن راشد کی تو وہ جان کو آ گیا تھا۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے سو بالآخر راشد نے مٹی اٹھانے والی ٹوکری اس کے منہ پر دے ماری اور بے بسی سے روتے روتے اسے گالیاں دینے لگا۔

بدشکل خرکار کو تو جیسے بہانہ مل گیا۔ اس نے خونخوار انداز میں چہرہ پونچھا، چابک جھٹکایا اور دوسرے ہی لمحے راشد پر برسانا شروع کر دیا۔ راشد فریادی سے انداز میں چیخ رہا تھا مگر سب لڑکے سپاٹ چہرے لیے یوں اپنے اپنے کام میں مصروف تھے جیسے کسی نے ان کے کانوں میں سیسہ بھر دیا ہو۔

راشد کی چیخوں سے میرا دل دہلنے لگا۔ میری رگوں میں لہو گویا جمنے لگا تھا لیکن کنپٹیوں میں دھمک سی ہو رہی تھی۔

میرے بازو تو پہلے ہی سُست پڑ چکے تھے۔ اب میں نے ہاتھ روک لیا اور پہاڑی سے نیچے آنے لگا۔ بیڑیوں کی وجہ سے میں بہت چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھانے پر مجبور تھا۔ خصوصاً ڈھلان پر۔

نشیب میں بیٹھا ہوا لحیم شحیم دوسرا خرکار سب مشین گن سنبھالے تمسخرانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی توجہ ویسے بھی کافی دیر سے صرف میری ہی طرف تھی گویا اُسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ تھوڑا بہت ردِعمل صرف میری طرف سے ہی ظاہر ہو سکتا ہے۔

جب اس نے دیکھا کہ میں رک نہیں رہا ہوں تو اس نے سب مشین گن سیدھی کر لی۔ میں تب بھی نہ رکا تو اس نے

ایک بار پھر میری آمد کے پہلے روز والے انداز میں میرے پیروں کے قریب ہلکا سا برسٹ مارا۔ مجھے رکنا پڑا لیکن اسی لمحے میں نے اپنی گینتی اس پر کھینچ ماری۔

ظاہر ہے گینتی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اتنے فاصلے پر کسی کا نشانہ لیا جا سکتا اور پھر وہ کوئی ایسا غافل بھی نہیں تھا۔ ذرا سی جھکائی دے کر صاف بچ گیا پھر وہ نپے تُلے قدم اُٹھاتا میری طرف بڑھا۔ راشد کی چیخیں اب بھی سُنائی دے رہی تھیں لیکن میرے سوا جیسے کوئی بھی انھیں نہیں سُن رہا تھا۔

خرکار مجھ سے کچھ فاصلے پر ہی رُک گیا۔ میں نے ہمیشہ یہ محسوس کیا تھا کہ وہ کسی کے بھی زیادہ قریب نہیں جاتا تھا۔ میں اکثر و بیشتر اس کی حرکات و سکنات پر نظر رکھتا تھا۔ اس کے قبضے میں رہنے والی سب مشین گن ہی میری اُمیدوں کا مرکز تھی لیکن اسے حاصل کرنے کا کوئی امکان مجھے نظر نہیں آتا تھا۔ میں آج تک کوئی بھی ایسا طریقہ نہیں سوچ سکا تھا جس سے یہ گن میرے ہاتھ لگ سکتی یا یوں کہیے کہ ہر طریقے میں جان جانے کا امکان موجود تھا اور اسی خوف نے مجھے کسی بھی طریقے پر عمل درآمد سے باز رکھا تھا۔ ہر انسان کی طرح مجھے بھی جان پیاری تھی لیکن اس وقت میں نے اندھا دُھند خرکار پر جھپٹنے کی کوشش کی۔

وہ صرف ذرا سا پیچھے ہٹا اور میری رسائی سے نکل گیا اور جب میں اپنی جھونک میں لڑکھڑایا تو اُس نے ایک قدم بڑھا کر میری پسلیوں میں گن کی نال ماری۔ درد کی شدید لہر سے میں کراہ اُٹھا۔ بیڑیوں کی وجہ سے میں اپنے آپ کو گرنے سے نہ بچا سکا۔ میری پسلیوں پر سے کھال پھٹ گئی تھی اور خون میری میلی قمیص کو بھگونے لگا تھا۔

ابھی میں سنبھل نہیں پایا تھا کہ اُس نے میری پسلیوں میں دوسری طرف ٹھوکر رسید کی۔ میں نے اُس کا پاؤں گرفت میں لینے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اُس کے پیروں میں کم از کم چار انچ موٹے تلے کی پشاوری چپلیں تھیں اور اس کی ٹھوکر سے مجھے یہی محسوس ہوا تھا جیسے میری کوئی پسلی ٹوٹ گئی ہے۔

اُس نے ایک نہیں کئی ٹھوکریں رسید کیں جن میں سے ایک میرے چہرے پر بھی پڑی جس سے چند لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ یہ اندھیرا چھٹا تو میں نے اپنے آپ کو اوندھے منہ زمین پر پڑا پایا۔ خرکار واپس اپنے مخصوص مسطح پتھر پر جا بیٹھا تھا اور پہلے ہی کی طرح تمسخرانہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

راشد کو مار پڑنی بند ہو چکی تھی، وہ ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہا تھا۔

چابک والے خرکار کی نظر اس وقت تک مجھ پر پڑ چکی تھی، اس لیے وہ راشد کو وہیں چھوڑ کر تیزی سے آگے آ گیا۔ اس وقت تک میں اُٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ اُس نے سب مشین گن والے سے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ پھر میرے قریب آ کر طیش میں ہاتھ گھمانا شروع کر دیا۔ شائیں شائیں کی آوازوں کے ساتھ تابڑ توڑ کئی چابک میرے جسم پر پڑے اور میں ایک بار پھر لڑکھڑا کر گر گیا۔

اس نے چابک جھٹکتے ہوئے مجھے اُٹھنے کا حکم دیا۔ جوں توں میں اُٹھ چکا تو وہ غضب ناک انداز میں ہی چابک لہراتے ہوئے چلایا۔ ”چلو... چل کر کام کرو۔“

میں لرزاں و ترساں ایک بار پھر جا کر پتھر توڑنے لگا۔ کچھ دیر بعد راشد کو بھی دوبارہ کام پر دھکیل دیا گیا حالانکہ اس کی حالت غیر تھی۔ کانپتے ہاتھ پیروں سے وہ جس قدر بھی ممکن ہو سکا کام لیتا رہا تاہم چابک والا اب اس پر تشدد کر کے اسے کام کرنے پر مجبور نہیں کر رہا تھا۔

راشد اب کسی کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ کسی سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ خدا خدا کر کے شام کو کام ختم ہوا اور ہم حرماں نصیب اپنی کوٹھریوں کی طرف جانے لگے تو میں نے راستے میں راشد سے بات کر کے اُسے حوصلہ دینے کی کوشش کی لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا اور منہ پھیر کر چل دیا۔

اُس رات اُسے ہماری کوٹھری میں نہیں آنے دیا گیا۔ چابک والا بدشکل خرکار اُسے اپنے ساتھ ہی لے گیا۔ اُس رات میں سو نہیں سکا۔ معلوم نہیں میری یہ بے خوابی میرے جسم میں اُٹھتی ہوئی ٹیسوں کی وجہ سے تھی یا راشد کی ان کربناک گھٹی گھٹی چیخوں کی وجہ سے جو رات کے ایک حصے میں چند منٹ کے لیے سُنائی دی تھیں۔

اس وقت میں حتی الامکان احتیاط سے رینگتا ہوا دروازے تک پہنچا تھا اور میں نے ایک جھری سے جھانک کر دیکھا تھا۔ کوٹھریوں کے سامنے دھندلی چاندنی میں حسبِ معمول تیسرا خرکار رائفل لیے ٹہل رہا تھا۔ یہ خرکار عموماً صرف رات کو ہی نظر آتا تھا۔

یونہی تین دن گزر گئے۔ ان تین دنوں میں میری پسلیوں کا زخم کچھ بھر گیا اور چوٹوں کی تکلیف بھی کم ہو گئی لیکن راشد ان تین دنوں میں برسوں کا مریض نظر آنے لگا تھا۔ رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہی نمودار ہو چکی تھی اور ہونٹوں پر پپڑی جمی رہتی تھی۔ اس سے مشقت چھڑا دی گئی

تھی۔ اس کی حتی الامکان ناز برداری کی جانے لگی تھی مگر اس کی حالت مشقت کرنے والوں سے بدتر تھی۔

اب وہ کم نظر آتا تھا اور اس کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی تھی لیکن اس کی صورت ہر وقت میری آنکھوں کے سامنے سوالیہ نشان بنی رہتی تھی۔ نفرت کا زہر میری رگ و پے سے قطرہ قطرہ کسی ایک نقطے پر سمٹ رہا تھا لیکن اس کے اخراج کا کوئی راستہ نہ تھا۔

راشد کی آمد کے غالباً ساتویں یا آٹھویں دن ایک بار پھر اس سے نرم سلوک بند کر دیا گیا اور اس کی چیخ و پکار سنائی دینے لگی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ چابک والا پھر اس پر چابک برسا رہا تھا۔

گینتی چلانا میرے لیے دشوار ہو گیا۔ گینتی کی ہر ضرب گویا میری اپنی ہی کھوپڑی پر پڑ رہی تھی۔ نفرت کا وہ زہر جو قطرہ قطرہ کہیں جمع ہو رہا تھا۔ آتشِ سیال بن گیا تھا اور میرا سینہ گویا پھٹ پڑنے کو تھا۔

میرے اندر کوئی سرگوشیاں کر رہا تھا: بے غیرت! ایک معصوم کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے اور تو محض اس لیے خاموش تماشائی بنا ہوا ہے کہ تجھے جان سے ہاتھ نہ دھونے پڑ جائیں۔ یاد رکھ کہ تجھ جیسے بزدل جنہیں جان اتنی ہی پیاری ہوتی ہے ان کا مقدر بیڑیاں اور ٹھوکریں ہی ہوتی ہیں۔ آج تو کسی مظلوم کی پکار پر لبیک نہیں کہہ رہا۔ اس کی سزا یہی ہو گی کہ تیری زندگی اسی طرح بیڑیاں پہنے مشقت کرتے اور درندہ صفت انسانوں کے ٹھڈے کھاتے گزر جائے گی۔ تھو! تھو کتا ہوں میں تیرے اوپر... لعنت ہو تجھ پر!

ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ یہ اندھیرا چھٹتے ہی مجھے فیصلے کی روشنی مل گئی۔ ایک طریقہ میں نے کئی دن پہلے سوچا تھا لیکن قسمت آزمائی کا فیصلہ نہیں کر سکا تھا۔ آج جب یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ زندگی کوئی ایسی بھی چیز نہیں کہ اسے اس قدر بے غیرتی سے بسر کیا جائے تو باقی سب کچھ بھی زیادہ مشکل نظر نہیں آ رہا تھا۔ چابک والا اس وقت کوٹھری میں جا چکا تھا۔

میرا ایک پاؤں ایسے پتھر پر ٹکا ہوا تھا جو اپنی جگہ سے اُکھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس پر خوب طاقت صرف کی۔ بالآخر وہ میرے پاؤں کے نیچے سے نکل گیا اور لڑھکتا ہوا نیچے جانے لگا۔ اس کے ساتھ ہی میں بھی پہاڑی سے لڑھک گیا۔ میں نے یہی ظاہر کیا تھا کہ میں اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا ہوں۔ لڑھکتے وقت میری کوشش یہی تھی کہ مجھے زیادہ چوٹیں بھی نہ آنے پائیں اور ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھی برقرار رہے۔ گینتی میں نے چھوڑ دی۔ زمین پر میں چت گرا اور وہیں بے حس و حرکت ہو گیا۔ پلکوں کے درمیان خفیف سی جھری سے میں دیکھ رہا تھا کہ میری پرفارمنس کامیاب رہی تھی۔ بیگار میں مصروف تمام لڑکے مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن کسی نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی تھی۔

سب مشین گن والا خرکار اپنی جگہ سے اٹھا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا میرے قریب آ گیا۔ میرے اتنے قریب وہ اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔ غالباً مجھے ہلانے جلانے کے ارادے سے اس نے گن ایک ہاتھ میں پکڑی اور دوسرا ہاتھ میرے چہرے کی طرف بڑھاتے ہوئے جھکا۔

میں نے اس سے بہتر موقعے کی آس میں وقت ضائع نہیں کیا اور اپنے دل میں پلتی ہوئی تمام تر نفرت کو گویا اپنی مٹھی میں سمیٹ کر بجلی کی سی تیزی سے اس کی ناک پر گھونسا رسید کیا۔ میری نفرت کی شدت اور میری خواہشِ انتقام نے شاید مجھے کئی گنا طاقتور بنا دیا تھا۔ میں نے ہڈیاں ٹوٹنے کی واضح آواز سنی۔ مجھے یقین تھا کہ کم از کم اس کی ناک کی کوئی ہڈی سلامت نہیں رہ گئی ہو گی۔

وہ بُری طرح لڑکھڑایا۔ اُس نے ایک ہی ہاتھ سے گن سیدھی کرتے ہوئے فائر کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس وقت تک اُٹھ چکا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھوں سے گن کو پکڑا اور اس کے چہرے پر ٹکر رسید کی۔

گن اُس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور میرے ہاتھوں میں آ گئی۔ وہ چت گر پڑا تھا اور اس کا آدھے سے زیادہ چہرہ خون میں لتھڑ چکا تھا۔ ناک کی جگہ محض ایک لوتھڑا سا نظر آ رہا تھا۔ میں نے گن کا رخ اُس کی طرف کرتے ہوئے ٹریگر پر انگلی کا ہلکا سا ہی دباؤ ڈالا تھا کہ خرکار کا جسم چھلنی ہو کر رہ گیا۔ وہ درمیان سے تقریباً دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

میں مڑا اور جتنی تیزی سے چل سکتا تھا کوٹھری کی طرف چلا۔ آپ نے شاید کبھی ان گایوں بھینسوں کو دوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے دیکھا ہو جن کے مالک ان کی اگلی ٹانگوں میں رسی باندھ دیتے ہیں۔ میرا انداز بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

میں نے ابھی چند گز کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ کوٹھریوں کے عقب سے وہ خرکار دوڑتا ہوا سامنے آیا جو رات کو پہرہ دیا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اُس نے اندھا دھند فائر کیا...... شکر ہے گولی کسی کو نہیں لگی۔ اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال کو سمجھ سکتا میں نے اُسے بھی چھلنی کر دیا۔

چابک والے بدبخت اور بدشکل خرکار کی تلاش میں، میں

کوٹھری میں گھسا تو وہ کھوہ میں چھپے ہوئے درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ کوٹھری میں ایک طرف دیوار پر ایک رائفل بھی لٹکی ہوئی تھی لیکن شاید اس خبیث کو اس تک پہنچنے کی فرصت ہی میسر نہیں آئی تھی۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے گن کا رُخ اُس کی طرف کر کے ٹرائیگر دبایا اور دوسرے ہی لمحے وہ میرے قریب ہی آن گرا۔

اُس کے جسم سے خون بھل بھل بہہ رہا تھا اور مجھے اس سے گھن آ رہی تھی۔ وہ مجھے انسان کے بجائے کوئی عفریت لگ رہا تھا جس کے بوجھ سے زمین کو نجات مل گئی تھی۔

میں تیزی سے اُٹھا تو دیکھا کہ راشد کوٹھری کے دروازے پر کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اُس کے پیروں میں اس وقت بھی بیڑیاں موجود تھیں۔ ہم سب قیدیوں کی بیڑیاں قفل دار تھیں اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ ہر ایک کی چابی علیحدہ ہے، اور چابیوں کا گچھا چابک والے کی صدری کی جیب میں ہوتا ہے۔

چابک والے کی صدری خون میں تر ہو چکی تھی تاہم میں نے اس کی جیبوں میں ہاتھ مار کر دیکھا۔ ایک جیب میں واقعی چابیوں کا گچھا موجود تھا۔ میں نے گچھا نکال کر چابیاں پہلے راشد کی بیڑیوں پر آزمانی شروع کیں۔ یہ وقت ضائع کرنے والا مرحلہ تھا اور مجھ پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔

مجھے یقین نہیں تھا کہ یہاں صرف یہی تین خرکار موجود رہے ہوں گے جو روزانہ یہاں نظر آتے تھے اور جو میرے ہاتھوں مر چکے تھے۔ آس پاس یقیناً ان کے اور ٹھکانے اور سلسلے موجود تھے۔ اس کے علاوہ میں نے کافی دُور ایک سرسبز سی پہاڑی کے دامن میں ایک بستی کی جھلک بھی دیکھی تھی۔ ممکن ہے فائرنگ کی آواز وہاں تک بھی پہنچی ہو یا ان لوگوں کا ویسے ہی کوئی نظام موجود ہو جس کے تحت کسی گڑبڑ کی صورت میں ان کے دوسرے نامعلوم ساتھی وغیرہ خبردار ہو جاتے ہوں۔

دفعتاً میں نے دیکھا کہ ہر چابی پر ایک نمبر کھدا ہوا تھا اور بیڑیوں پر بھی نمبر موجود تھے۔ میں نے گھبراہٹ میں یہ نمبر دیکھے ہی نہیں تھے۔ اب مجھے ہر چابی کو آزمانے کی ضرورت نہیں تھی۔ راشد کی بیڑی پر بیالیس نمبر کندہ تھا۔ میں نے بیالیس نمبر کی چابی دیکھ کر اس کے تالے میں گھمائی اور بیڑی فوراً کھل گئی۔

اسی طرح میں اپنی بیڑیاں بھی کھول چکا تو میں نے راشد کا ہاتھ پکڑا اور باہر کو دوڑا۔ اب راشد کی حالت کچھ سنبھل چکی تھی۔ فرار کی اُمید نے اُسے تقویت بخش دی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور باہر کو لپکا۔

باہر تمام لڑکے کام چھوڑ چھاڑ کر کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ میں نے چابیوں کا گچھا ان کے سامنے پھینکا اور چلا کر کہا ”اس میں نمبروں کے حساب سے ہر ایک کی بیڑیوں کی چابی موجود ہے... جو بھی فرار ہونا چاہتا ہے وہ قسمت آزمائی کر دیکھے۔“

مجھے یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ وہ سب تذبذب کے عالم میں کھڑے تھے اور خوفزدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ کوئی ایسا خطرہ جو چاروں طرف سے عفریتوں کی طرح منہ کھولے لیکن نہایت ہی خاموشی سے بڑھتا چلا آ رہا تھا۔

چاروں طرف کچھ زیادہ ہی سکوت طاری تھا۔ ایسا سکوت جس سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ پھر ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا اور مجھے وہم سا ہوا کہ دُور کہیں سے گھوڑے کی ٹاپوں کی سی آواز اُبھری تھی لیکن فوراً ہی معدوم ہو گئی تھی۔

میرے خیال میں میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں لڑکوں سے مزید باتیں کرنے میں ضائع کرتا یا ان کی ہمت بڑھانے کی کوشش کرتا۔ راشد البتہ بھاگنے کے لیے تیار بلکہ بے چین تھا۔ میرے لیے یہی کافی تھا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اُسے اشارہ کیا اور ہم ایک سمت میں دوڑ پڑے۔

مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ جدھر کا میں نے رُخ کیا ہے ادھر پہاڑوں کے عقب میں کیا ہے لیکن اسمگلنگ کی لائن میں رہ کر میری حسیات گویا کچھ تیز ہو گئی تھیں۔ میں کسی نہ کسی حد تک یہ اندازہ ضرور کر سکتا تھا کہ کس طرف خطرے کے امکانات زیادہ ہیں اور کس طرف کم۔

ایک چھوٹے سے ٹیلے کے گرد گھوم کر جب ہم اس پیالہ نما وادی سے نکلے تب بھی سامنے ہمیں کوئی راستہ، کسی آبادی کے آثار یا کوئی اور اُمید افزا چیز نظر نہ آئی۔ بس سنگلاخ پہاڑیاں ہی تھیں اور ان کے درمیان بل کھاتی اونچی نیچی گزرگاہیں۔ تاہم میں تن بہ تقدیر ہو کر راشد کا ہاتھ تھامے دوڑتا رہا۔

راشد بہت جلد ہی تھک گیا۔ بُری طرح ہانپنے لگا تاہم وہ گرتا پڑتا کسی نہ کسی طرح میرے ساتھ چلا جا رہا تھا۔ راستے بہت ہی دشوار گزار تھے۔ کہیں کہیں تو اچانک ہی ہم کسی کھائی کے کنارے پہنچ جاتے جہاں دو چٹانیں دیواروں کی طرح آمنے سامنے عمودی کھڑی ہوتی تھیں اور درمیان کئی فٹ چوڑا اور نہ جانے کتنا گہرا خلاء سا ہوتا تھا۔ ان کھائیوں کو پھلانگنے میں راشد کی وجہ سے بڑی دشواری پیش آتی تھی۔ وہ اتنا چھوٹا نہیں تھا کہ میں آسانی سے اُسے اُٹھا کر کھائیاں پھلانگ سکتا۔ اندازے کی

معمولی سی غلطی سے پاؤں پھسل سکتا تھا اور دونوں ہی موت کے منہ میں جا سکتے تھے۔ اکیلا چھلانگ لگاتے ہوئے وہ کانپنے لگتا تھا۔

اسی اثنا میں، میں نے عقب میں کہیں سے فائروں کی بازگشت سنی اور میری دھڑکن کچھ اور تیز ہوگئی۔ ہماری رفتار جو کچھ دھیمی پڑ چکی تھی اسے اس کو تیز تر کرنا پڑا۔ راشد اب میرے ساتھ تقریباً گھسٹ رہا تھا۔ اس کی حالت غیر تھی۔ اسی کی بدولت میں نے موت کے منہ میں چھلانگ لگائی تھی لیکن اب میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ فرار کے کٹھن مرحلوں میں ثابت قدم بھی رہ سکتا تھا یا نہیں۔

اگر اس کی توانائی اس کا ساتھ دے بھی جاتی تب بھی یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ منزل ہمارے مقدر میں ہوگی یا نہیں کیونکہ ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں، کس سمت میں بھاگ رہے ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟ عین ممکن تھا کہ انہی پہاڑیوں میں بھٹکتے بھٹکتے بالآخر ہم بھوک پیاس اور تھکن سے دم توڑ دیتے۔ کئی جگہ میں اسے کندھے پر اٹھا کر بہت دور تک دوڑتا رہا۔

ہم ایک ایسے علاقے میں پہنچ چکے تھے جہاں غالباً بارشوں کے پانی کی وجہ سے کائی جمی ہوئی تھی۔ یہاں اس قدر پھسلن تھی کہ قدم اٹھانا دشوار تھا۔ اگر اندازے کی ذرا سی غلطی سے گر پڑتے تو ناک منہ برابر ہو سکتا تھا۔ ایک مصیبت یہ تھی کہ راشد کے پیروں میں جوتے نہیں، نیبی قسم کے سینڈل تھے جو ٹوٹ چکے تھے اور ان کی وجہ سے بھی اسے چلنے میں اور زیادہ دشواری پیش آ رہی تھی، لیکن میں اس بات کے بھی حق میں نہیں تھا کہ وہ ان سینڈلوں کو اتار کر پھینک دے۔ مجھے معلوم تھا کہ ننگے پاؤں تھوڑی ہی دور چل کر اس کے پاؤں لہولہان ہو جائیں گے۔

خدا خدا کر کے کائی زدہ علاقہ ختم ہوا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ہم تدریجاً نشیب میں اتر رہے ہیں۔ ایک جگہ تو بالآخر راشد گر ہی پڑا اور تقریباً روتے ہوئے بولا "بھائی جان! اب نہیں چلا جا رہا..."

"اتنی جلدی ہمت مت ہارو بھئی" میں نے ہانپتے ہوئے کہا "ابھی تو معلوم نہیں کتنا سفر باقی ہے؟"

میرے الفاظ اسے توانائی نہیں بخش سکے۔ وہ بدستور مضمحل اور نڈھال رہا۔ ہماری حالت پیاس کی وجہ سے بھی کچھ زیادہ خراب تھی۔ زبانیں باہر کو نکلی پڑ رہی تھیں اور حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔

آگے راستہ کچھ زیادہ دشوار گزار نظر آ رہا تھا اس لیے

میں نے راشد کو ایک بار پھر کندھے پر اٹھا لیا اور ایک عزم نو سے اپنی توانائیاں مجتمع کر کے چل پڑا۔ اس طرح میں نے تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک بار پھر میری غیر معمولی حسیات میں کچھ ہلچل سی پیدا ہوئی۔ فضا میں خطرے کی بو محسوس ہونے لگی لیکن میں خطرے کی سمت کا تعین کرنے سے قاصر تھا۔

میں نے راشد کو کندھے سے اتار دیا اور وحشت کے عالم میں چاروں طرف دیکھا لیکن میرے چاروں طرف چٹانیں ہی چٹانیں تھیں۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کس چٹان کے عقب میں کیا تھا۔ دفعتاً میرے اعصابی نظام نے کسی حساس آلے کی طرح خطرے کا سگنل وصول کیا۔ خطرہ یقیناً ادھر ہی تھا جس طرف ہم رواں تھے۔ شاید کچھ لوگ کسی اور راستے سے ہم سے آگے پہنچ چکے تھے۔ شاید وہ ہمیں دیکھ بھی چکے تھے اور گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میری جلد کے نیچے سرسراہٹ سی ہونے لگی۔ میرے انداز سے شاید راشد نے بھی بھانپ لیا تھا کہ ہمیں کس خطرے کا سامنا ہے۔ اس پر ایک بار پھر کپکپی سی طاری ہونے لگی تھی۔

"گھبراؤ مت" میں نے سرگوشی میں اسے تسلی دی "بس سائے کی طرح میرے ساتھ لگے رہو"

میں نے سب مشین گھماتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ ساکت اور سنگلاخ چٹانیں گویا نادیدہ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھیں اور دھیرے دھیرے میری طرف کھسک رہی تھیں۔ معلوم نہیں وہ کون سی حس تھی جس نے مجھے یک لخت گھٹنوں کے بل بیٹھنے پر مجبور کر دیا۔ راشد کو تو میں نے دھکیل کر تقریباً گرا ہی دیا تھا۔ اسی لمحے تقریباً ایک ساتھ کئی فائر ہوئے اور ہمارے سروں کے قریب ایک پتھریلی دیوار سے بے شمار

چنگاریاں اڑیں۔

میں رینگ کر ایک بڑے سے پتھر کی آڑ میں ہوگیا۔ راشد میرے پیچھے تھا۔ مجھے اب یقینی طور پر معلوم ہو چکا تھا کہ میری جان کے دشمن کس سمت میں ہیں لیکن میں نے فائر نہیں کیا۔ نظر ہی کچھ نہیں آ رہا تھا۔ محض چٹانوں پر گولیاں چلانے کا کیا فائدہ؟

میں نے چند لمحے انتظار کیا۔ بالآخر ایک چٹان کے عقب سے مجھے ایک نال اور اس کے پیچھے ایک سر ابھرتا دکھائی دیا۔ میں نے چار پانچ گولیاں چلائیں۔ سر وہاں سے غائب ہو گیا مگر اس کے جواب میں بہت سی گولیاں چٹانوں سے ٹکرائیں۔ میرا اندازہ تھا کہ چٹانوں کے عقب میں کم از کم چار آدمی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کو شاید گزند پہنچی تھی۔

دو پتھروں کے درمیان ایک خفیف سی دراڑ میں، میں نے معمولی سی حرکت دیکھی اور اس دراڑ پر گولیاں برسا دیں۔ گھٹی گھٹی سی ایک چیخ سنائی دی لیکن اس کے ساتھ ہی میرا دل بیٹھ گیا۔ گن کا بیلٹ خالی ہو چکا تھا۔

اب بقا کا راستہ ایک ہی ہو سکتا تھا کہ اس سے پہلے کہ میرے نادیدہ دشمنوں کو اس امر کا احساس ہو کہ میرے پاس ایمونیشن ختم ہو چکا تھا، میں وہاں سے کھسک لوں۔ میں نے الٹے قدموں کھسکنا شروع کر دیا۔ راشد میرے ساتھ تھا۔ گن میں نے وہیں پھینک دی حالانکہ وہ اب بھی مجھے کم از کم لاٹھی کا کام تو دے ہی سکتی تھی لیکن رائفلوں اور خودکار گن کے سامنے ایک لاٹھی کی کیا اہمیت تھی؟ اور پھر اس کے وزن سے چھٹکارا پا کر مجھے دشوار گزار راستوں پر بھاگ دوڑ میں قدرے آسانی ہو سکتی تھی۔

راشد خاصی عمدگی سے میرا ساتھ دے رہا تھا۔ جان کے خوف نے اس کے تھکے ہارے جسم میں ایک نئی توانائی بھر دی تھی۔ ہم الٹے قدموں چلتے ہوئے جب نشیب میں پہنچ گئے اور چٹان کے گرد گھوم چکے تو ہم نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اب ہم اس سمت میں نہیں جا رہے تھے جس طرف پہلے رواں تھے۔ اپنی دانست میں، میں حملہ آوروں سے کترا کر حتی الامکان آگے نکل جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ انہیں ہماری غیر موجودگی کا احساس ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

میں سورج کی مدد سے سمت کا اندازہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا صرف اس لیے کہ کہیں ہم ان بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے عین حملہ آوروں کے سامنے ہی نہ جا نکلیں۔

دوڑتے دوڑتے راشد ہی کی نہیں میری بھی حالت خراب ہو چکی تھی۔ راشد تو اب ہر ہر قدم پر گر رہا تھا۔ تاہم میرا دل کہہ رہا تھا کہ اپنے خون کے پیاسوں کو کافی پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ اگر انہیں یہ اندازہ نہ ہوتا کہ ہم کس سمت میں نکلے ہیں تو ہماری بقا کے کچھ امکانات پیدا ہو سکتے تھے۔

اب ہم جس علاقے میں پہنچ چکے تھے یہاں کچھ سبزہ نظر آنے لگا تھا پھر ہم ایک شور مچاتے پہاڑی نالے کے قریب جا پہنچے اور بے دم ہو کر اس کے کنارے پر گر گئے۔ کافی دیر تک ہم وہیں پڑے بری طرح ہانپتے رہے۔ ہر سانس پر گویا پسلیوں میں چھریاں سی چبھ رہی تھیں۔

میری حالت کچھ سنبھلی تو میں نے اوندھے ہو کر نالے میں جھانکا۔ نالہ چار پانچ فٹ چوڑا تھا اور اس میں بہتا ہوا پانی گو کہ شفاف تھا مگر اس تیزی سے بہہ رہا تھا کہ ناہموار کھائی سے مشابہ اس گزرگاہ میں سمندر جھاگ سی پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے مویشیوں کی طرح گردن جھکا کر پانی پینے کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی البتہ چہرہ اور بال پانی میں تر ہو گئے۔ بالآخر میں نے دونوں ہاتھ لٹکائے اور چلو میں بھر بھر کر پانی پینے لگا۔ راشد نے دیکھا تو وہ بھی سینے کے بل رینگتا ہوا کنارے تک آنے کی کوشش کرنے لگا مگر اس میں کھسکنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

بالآخر مَیں نے ہی چلّوؤں میں بھر بھر کر اُسے بھی پانی پلایا۔

سیر ہو کر پانی پینے کے بعد ہم چت لیٹے رہے۔ گرد اب تک ہمارے چہرے گویا شفاف پانی سے دُھل چکے تھے اور دہکتے معدے کو بھی اس تازہ اور لمکیاتی پانی سے ٹھنڈک سی میسر آ چکی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ جلد ہی ہم نے اپنے آپ کو کافی حد تک تازہ دم محسوس کیا۔ خالی پیٹ میں پانی ذرا چبھا تو تھا لیکن جلد ہی تکلیف معدوم ہو گئی۔

بالآخر ہم اُٹھ بیٹھے۔ مَیں نے جوتے اُتارے اور پاؤں نالے میں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ دُکھتے ہوئے پیروں کو ٹھنڈے ٹھنڈے پانی کی ٹکور سے بڑا آرام سا محسوس ہُوا۔ شہروں میں بیمار اور نیم بیمار لوگ نیم گرم پانی سے جسم کے دُکھتے ہوئے حصّوں کی ٹکور کرتے ہیں لیکن مجھے پہلی بار تجربہ ہُوا کہ دُکھتے ہوئے جسم پر شفاف پہاڑی پانی کی ٹکور کیا معانی رکھتی ہے۔

راشد اُدھر دیکھ رہا تھا جدھر پانی کی راہ میں رکاوٹیں ذرا کم تھیں سو اُدھر پانی پر جھاگ بھی کم تھی، وہ کچھ اور آگے کو کھسک کر غور سے اُدھر دیکھنے لگا۔ دفعتاً وہ خوفزدہ انداز میں چیخ اُٹھا۔ ایک بار پھر وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔

میں جلدی سے کھسک کر راشد کے قریب پہنچا۔ میں نے جب پہاڑی نالے کے اس حصے کی طرف دیکھا جس طرف راشد ایک ٹک دیکھ رہا تھا اور خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا تو مجھے بھی ایک بار تو جھرجھری سی آ گئی۔

شفاف پانی میں پتھروں کے درمیان ایک لاش اٹکی ہوئی تھی۔ لاش کسی عورت کی تھی اور اس پر لباس کی جگہ محض چند دھجیاں تھیں۔ اس کا سر، دھڑ سے تقریباً علیحدہ ہی تھا۔ محض چند نسوں اور تھوڑی سے کھال کی بدولت وہ جڑا ہوا تھا اور مکمل طور پر الگ نہیں ہوا تھا۔ عورت یقیناً خوبصورت اور سرخ و سپید رہی ہو گی مگر اب جبکہ وہ زندگی سے محروم ہو چکی تھی، اس کی نس نس خون سے خالی ہو چکی تھی اور نہ جانے کب سے پانی میں پڑے رہنے کی وجہ سے اس کی جلد بھیگے اور گلے ہوئے لٹھے سے مشابہ ہو چکی تھی تو اسے دیکھ کر اسی طرح خوف آ رہا تھا جیسے ویرانے میں اچانک ہمارا سامنا کسی بدروح سے ہو گیا ہو۔ اس کی کٹی ہوئی گردن سے خالی خالی نسیں اور نرخرہ ڈراؤنے سے انداز میں جھانک رہا تھا۔

جانے اسے کس جرم کی ایسی بہیمانہ سزا دی گئی تھی! شاید کمزور ہونا یا عورت ہونا ہی اس کا سب سے بڑا جرم تھا۔ اس علاقے میں موت دینے بھی گویا قطعی عام سی چیز تھی۔ کمزور یہاں شاید طاقتور کے لئے محض بار برداری کا ایک جانور تھا۔ یہاں جنگل کا قانون رائج تھا اور اس علاقے کا غالباً کسی مہذب معاشرے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاید ملک کا قانون یہاں لاگو نہیں ہوتا تھا۔

مجھے اس احساس سے بھی ابکائی سی آ رہی تھی کہ ہم نالے میں جس جگہ سے پانی پی چکے تھے اس سے چند گز پیچھے ہی یہ لاش پھنسی ہوئی تھی اور پانی کا بہاؤ بھی ہماری ہی طرف تھا۔ راشد پر صرف خوف ہی کا غلبہ تھا۔

میں نے اپنی تھکن اور شکستگی کو بھول کر راشد کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنا سفر جاری رکھیں۔ یہاں بیٹھ کر ایک تو خواہ مخواہ اس لاش کی موجودگی کے احساس سے طبیعت خراب ہوتی رہے گی، دوسرے یہ بھی خطرہ ہے کہ ہمارا پیچھا کرنے والے ہم تک نہ آ پہنچیں۔"

راشد نے اثبات میں سر ہلایا اور بغیر کچھ بولے میرے ساتھ چل پڑا۔ ایک بار پھر ناہموار پہاڑی راستوں پر ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ دھوپ اب ڈھلنے لگی تھی۔ راشد کچھ دیر تو خاصی چستی سے میرا ساتھ دیتا رہا لیکن بالآخر اس پر پھر تھکن اور شکستگی غلبہ پانے لگی۔ وہ تنویمی سی حالت میں ایک ٹک افق کی طرف دیکھتا ہوا گرتا پڑتا میرے ساتھ چل رہا تھا۔ نیم وا ہونٹوں پر پپڑیاں جم چکی تھیں اور چہرہ ستا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کی حالت بھوک سے بھی خراب ہو گی۔ خود میرے پیٹ میں ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ اس کے باوجود میں حتی الامکان چوکنا رہنے کی کوشش کر رہا تھا تاہم اب کسی طرف سے خطرے کی بو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ ہم امداد غیبی کے سہارے اپنے خون کے پیاسوں کو چکر دینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

تقریباً دو گھنٹے کے سفر کے بعد جبکہ راشد چلتے چلتے بار بار لڑکھڑا کر گرنے لگا تھا، تقریباً معجزانہ طور پر ہم ایک سڑک پر پہنچ گئے۔ کچھ دیر پہلے ہم ایک ٹیڑھی میڑھی پہاڑی کھوہ میں چل رہے تھے۔ اس کے اختتام پر ہمیں یوں لگا جیسے آگے عمیق کھائیوں کے سوا کچھ نہیں مگر جب ہم نے جھانک کر دیکھا تو تقریباً پندرہ فٹ نیچے خاصی چوڑی سڑک نظر آئی۔ اس سڑک کے دوسری طرف البتہ کھائیاں ہی تھیں۔ اب مسئلہ پندرہ فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگانے کا تھا۔ انسان پر جب شکستگی طاری ہو تو چھوٹی چھوٹی مصیبتیں بھی بہت بڑی معلوم ہوتی ہیں۔

راشد تو نیچے جھانکنے کے بعد خشک ہونٹوں پر خشک زبان پھیر رہا تھا۔ گو کہ ایک امید نو کی روشنی اس کی آنکھوں میں جھلک آئی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ چھلانگ لگانا کم از کم اس وقت اس کے بس کی بات نہیں۔ بالآخر میں سینے کے بل کھائی میں لیٹ گیا۔ میں نے بہ ہزار دقت پہلے راشد کو نیچے لٹکایا اور جب اسے سڑک اپنے پیروں سے کافی قریب محسوس ہونے لگی تو میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ خیریت سے نیچے کود گیا۔ اس کے بعد میں نے حتی الامکان محتاط ہو کر آنکھیں بند کر کے پنجوں کے بل چھلانگ لگائی۔ ایک بار تو میرا بھیجا ہل کر رہ گیا اور خالی معدہ گویا حلق کے راستے باہر آ گیا۔ اس کے باوجود میں نے آنکھیں کھولنے سے پہلے خدا کا شکر ادا کیا کہ کسی آبادی کی طرف پہنچنے کی کچھ امید تو بندھی۔

چند لمحے ہم سڑک کے کنارے بیٹھے سانس درست کرتے رہے پھر اٹھ کر کنارے ہی کنارے ڈھلان کے رخ پر چل دیے۔ بل کھاتی سڑک پر ابھی ہم زیادہ دور نہیں گئے تھے اور نیم دائرے سے مشابہ ایک موڑ مڑ رہے تھے کہ عقب سے گھر گھر کی آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک ٹرک آتا دکھائی دیا۔ ٹرک کے کیبن میں ڈرائیور کے علاوہ بھی دو آدمی نظر آ رہے تھے۔

"میرا خیال ہے قدرت نے اب صحیح طور پر ہی ہماری مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے رکتے ہوئے کہا۔ "مجھے امید ہے کہ اس ٹرک میں ہمیں لفٹ مل جائے گی۔"

دفعتاً میں نے راشد کی طرف دیکھا۔ وہ ٹرک کی طرف دیکھتے ہی اسی طرح سہم کر رہ گیا تھا جیسے خرگوش نے ویرانے میں بھیڑیے کو دیکھ لیا ہو۔ وہ سرسراتی سی آواز میں بولا۔ "بھائی جان! یہ لوگ بھی تو بالکل ویسے ہی لگ رہے ہیں.... خرکاروں جیسے.... ہم اتنی تکلیف اٹھا کر ایک مصیبت سے نکلنے کے بعد دوسری مصیبت میں نہ پھنس جائیں۔"

"ہر قومیت میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں راشد میاں!" میں نے مربیانہ انداز میں اسے سمجھایا۔ "خطرہ تو ہمیں مول لینا ہی پڑے گا، ورنہ ویسے بھی شاید ہم اس علاقے میں بھٹکتے بھٹکتے بھوک پیاس سے مر جائیں۔"

اس سے پہلے کہ راشد مزید کچھ کہتا، ٹرک ہمارے قریب آن رکا اور ڈرائیور نے کھڑکی سے سر نکال کر پشتو میں کچھ پوچھا۔ میری ہچکچاہٹ دیکھتے ہوئے وہ فوراً اردو میں بولا۔ "کون ہے

تم لوگ ؟ کدھر سے آیا ہے ؟ کدھر جانا ہے ؟ ؟"

میں فوری طور پر کوئی فیصلہ نہ کرسکا کہ اسے کیا بتانا مناسب رہے گا۔ کسی غیبی طاقت نے گویا خود بخود ہی میرے منہ سے سچ نکلوادیا۔ "بھائی صاحب! ہم بہت مصیبت زدہ ہیں۔ خرکار کیمپ میں پھنس گئے تھے۔ بڑی مشکل سے نکل کر بھاگے ہیں۔ اگر آپ، ہمیں کسی شہر تک پہنچادیں تو آپ کا بڑا احسان ہوگا۔"

چند لمحے وہ کچھ نہ بولا۔ ایک بار تو مجھے افسوس بھی ہوا کہ میں اتنی تیزی سے سچ کیوں بول گیا۔ ڈرائیور پر خیال نظروں سے ہمارا جائزہ لے رہا تھا اور اس کے ساتھی بھی جھک جھک کر ہمیں سرتاپا دیکھنے کی کوشش کررہے تھے۔ راشد کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور میں محسوس کررہا تھا کہ اس کے جسم پر کپکپی سی طاری ہے۔

بالآخر ڈرائیور نے گویا کسی خیال سے چونکتے ہوئے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ ٹرک سے اترے اور ہمارا جائزہ لیتے ہوئے ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف چلے گئے۔ وہ دونوں نوجوان تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ راشد ٹرک میں بیٹھنے سے گریزاں تھا لیکن میں نے بہرحال تن بہ تقدیر ہونے اور جواء کھیلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ راشد میرے ساتھ تقریباً گھسٹتا ہوا ڈرائیور کیبن میں آبیٹھا۔

ڈرائیور کو میری بات سن کر جیسے چپ سی لگ گئی تھی یا پھر شاید اس میں جذبہ تجسس ہی نہیں تھا۔ اس نے مجھ سے مزید کچھ بھی نہیں پوچھا۔ کسی قسم کی تفصیلات جاننے کی کوشش نہیں کی اور ٹرک کو گیر لگادیا۔

کافی دیر تک وہ سڑک پر نظر جمائے خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ بالآخر میں نے خود ہی اس ناگوار سے سکوت کو توڑتے ہوئے پوچھا۔ "تم اس وقت کہاں جارہے ہو؟"

"پشاور۔" اس نے جواب دیا۔ "تین چار گھنٹے کا سفر باقی ہے۔ پشاور میں ہم دو رات ٹھیرے گا پھر پنڈی کے لئے روانہ ہوگا تم لوگ کو کدھر جانا ہے ؟"

میں نے راشد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ لاہور جائے گا۔ میں اس کو وہاں چھوڑ کر سیالکوٹ جاؤں گا۔"

ٹھیک ہے...." وہ اب بھی ہماری طرف دیکھے بغیر پر خیال لہجے میں بولا۔ "ہم تم کو پشاور ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ دے گا۔ وہاں سے تم لوگ ٹرین سے لاہور چلے جانا۔"

اس کے لہجے نے میری تشویش کافی حد تک کم کردی۔ وہ واقعی ہماری مدد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ راشد کی بھی کچھ جان میں جان آگئی تھی۔

ذہن اور جسم کو کچھ آرام اور سکون میسر آجائے تو دوسرے مطالبے جاگ اٹھتے ہیں۔ ٹرک والوں کی طرف سے کچھ اطمینان ہوا تو بھوک کے عفریت نے ایک بار پھر معدے کو کھرچنا شروع کردیا اور اس کا احساس اب پہلے سے زیادہ شدت سے ہونے لگا۔ تاہم میں ضبط کئے بیٹھا رہا۔ راشد کی حالت مجھ سے بھی زیادہ خراب تھی۔ نقاہت کے مارے اس کی آنکھیں باربار بند ہونے لگتی تھیں اور سر دائیں بائیں ڈھلکنے لگتا تاہم وہ چونکہ دوسرے دروازے کی طرف بیٹھا تھا اس لئے ڈرائیور اس کی کیفیت سے بے خبر تھا۔

بل کھاتے پہاڑی راستے پر سفر خاصی سست رفتاری سے طے ہورہا تھا تاہم اندھیرا پھیلنے تک ہم بلندیوں سے اتر آئے اور تنگ سی سیدھی سڑک پر سفر کرنے لگے جس کے دونوں طرف پتھریلے سے میدان تھے اور ٹرک کی روشنیوں کی جہاں تک رسائی تھی، وہاں تک تو کوئی کھائی وغیرہ نظر نہیں آرہی تھی۔

اب بھوک کی اذیت میری برداشت سے بھی باہر ہوگئی تھی اور بھوک بڑی ظالم چیز ہے۔ ساری انسانی خصوصیات چھین لیتی ہے۔ شرم، جھجک، حیا، نفاست، شائستگی سب دھری رہ جاتی ہے۔ میں نے بھی بالآخر اجنبیت کی جھجک کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ڈرائیور سے کہا "خان صاحب! آپ کے پاس کھانے کے لئے کچھ ہوگا؟ ہم دونوں بھوک کے مارے قریب المرگ ہیں۔"

"ہم کو اس کا اندازہ تھا۔" ڈرائیور مشفقانہ لہجے میں بولا۔ "اسی لئے ہم ان خطرناک راستوں پر بھی گاڑی تیز چلا رہا تھا۔ بس اب تھوڑی دیر میں ہم ایک ہوٹل پر پہنچنے والا ہے.... جب تک تم لوگ یہ کھاؤ۔" اس نے محتاط انداز میں ایک ہاتھ سے اسٹیرنگ تھام کر قدرے جھک کر دوسرے ہاتھ سے سیٹ کے نیچے سے کپڑے کا ایک چھوٹا تھیلا نکالا اور میری گود میں رکھ دیا۔

میں نے تھیلے میں ہاتھ مار کر دیکھا۔ اس میں کچھ سیب تھے۔ میں اور راشد ندیدوں کی طرح سیبوں پر ٹوٹ پڑے۔ سیب کل پانچ چھ ہی تھے۔ وہ ہم نے چٹ کردیئے۔ پیٹ میں کچھ گیا تو انسانی جذبے بھی لوٹ آئے۔ دنیا بھی نسبتاً بہتر لگنے لگی اور منزل بھی کچھ قریب نظر آنے لگی، ورنہ اب تک یہی لگ رہا تھا کہ ہم ایک تاریک پٹی پر چل رہے ہیں جو شاید پاتال کی طرف جارہی ہے۔

کچھ دیر بعد کم از کم مجھے یہ اندازہ ہوا کہ بھوکوں مرتے آدمی کے لئے سیب شاید اتنی اچھی چیز نہیں کیونکہ آدھے ہی گھنٹے بعد پہلے سے زیادہ شدت سے بھوک جاگ اٹھی تاہم غنیمت یہ رہا کہ زیادہ دیر یہ اذیت برداشت نہیں کرنی پڑی۔

ویرانے میں سڑک سے کچھ ہٹ کر قدرے نشیب میں اچانک ہی کچھ روشنیاں زمین کا سینہ چیر کر نکل آئی تھیں۔ یہ کچھ پٹرومیکس لیمپ تھے جو دو بڑے بڑے چھپروں میں اور ان کے سامنے زمین میں گڑی ہوئی لکڑی کی بلیوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ ان چھپروں میں تندور، چولھے، میز کرسیاں وغیرہ موجود تھیں۔ چھپروں کے سامنے کھلے آسمان تلے موٹے موٹے پایوں والی اتنی بڑی بڑی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں کہ ان میں سے ہر ایک کسی چھوٹے موٹے اکھاڑے کا کام دے سکتی تھی۔ ان چارپائیوں کے درمیان لکڑی کی بے ہنگم اور بھاری بھرکم میزوں پر جگوں کی جگہ پانی کے چھوٹے چھوٹے گھڑے اور المونیم کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ٹرک چھپروں کے قریب رک چکا تھا۔ یہاں کئی ٹرک پہلے ہی سے کھڑے تھے۔ چارپائیوں پر چند ڈرائیور اور کلینز وغیرہ کھانے پینے یا خوش گپیوں میں مصروف تھے اور چند نیم دراز تھے۔ چھپروں میں تندور پر روٹیاں لگ رہی تھیں۔ دیگچوں میں چمچے کھنکھنا رہے تھے اور ہوا میں دنیا کی سب سے سوندھی خوشبو.... دال کی خوشبو چکرا رہی تھی۔

ایک چھپر کی پیشانی پر ایک چھوٹا سا بورڈ بھی آڑا ترچھا لٹکا ہوا تھا۔ دھوئیں سے یہ بورڈ تقریباً سیاہ ہوچکا تھا تاہم اس پر اردو کے جلی حروف میں لکھا ہوا 'ڈرائیور ہوٹل' پڑھا جاسکتا تھا۔ اس کے نیچے قدرے کم جلی حروف میں یہ اعلان بھی پڑھا جاسکتا تھا کہ یہاں ڈرائیور بھائیوں کے لئے ہر چیز دیسی گھی میں تیار کی جاتی ہے۔ ملاوٹ ثابت کرنے والے کو ایک ہزار روپے نقد انعام۔

اس ویرانے میں یہ خالص دیسی قسم کا ریستوران اس وقت مجھے جنت ارضی محسوس ہورہا تھا۔ میں اور راشد اپنے محسن ڈرائیور کے ساتھ ٹرک سے اتر آئے۔ ڈرائیور کے دونوں ساتھی بھی ٹرک کے پچھلے حصے سے اتر آئے تھے۔ ڈرائیور نے غالباً دانستہ طور پر ایک ایسی چارپائی بیٹھنے کے لئے منتخب کی جس پر روشنی کی صحیح طور پر رسائی نہیں تھی۔ میں ایسی ہی جگہ پر بیٹھنا چاہتا تھا۔ اگر ہم روشنی میں بیٹھتے تو اس ماحول میں میری اور راشد کی شکستہ حالی اور اجنبیت ہر ایک کو کھٹکتی۔ شاید کوئی ہمارے محسن ڈرائیور سے سوالات ہی کرنا شروع کردیتا جبکہ اس بندۂ خدا نے خود ہم سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

ڈرائیور نے سب کے لئے فراخدلی سے کھانے کا آرڈر دیا اور کچھ دیر بعد جب گرم گرم روٹیاں اور بھنے ہوئے گوشت کی کڑاہی ہمارے درمیان رکھی گئی تو اس کی خوشبو سے مجھ پر ریشہ خطمی کی سی کیفیت طاری ہونے لگی۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے اور ایک لمحے کے لئے تو مجھے شبہ ہوا کہ خوشی کے مارے میں کہیں بچوں کی طرح قلقاریاں نہ مارنے لگوں۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا۔ اپنے کھانے کی رفتار پر قابو رکھنے کے لئے مجھے اس سے بھی زیادہ جدوجہد کرنی پڑی۔ شکر ہے، روشنی کم ہونے کی وجہ سے کوئی میری حرکات و سکنات اور تاثرات صحیح طور پر نہیں دیکھ پارہا تھا ورنہ شاید یہ اس کے لئے ایک عجیب وغریب نظارہ ہوتا۔

مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ مجھے اس وقت شدید بھوک لگی ہوئی تھی بلکہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ کتنے ہی دن بعد میں نے ایسے کھانے کی شکل دیکھی تھی جسے کھانا کہا جاسکتا تھا۔

ڈرائیور غالباً میری کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ ملائمت سے بولا۔ "تھوڑا ہاتھ روک کر کھانا۔ ایسا حالت میں جبکہ تم ضرور بہت سارے فاقے کاٹ کر آرہا ہے ایک دم ڈٹ کر کھانے سے طبیعت خراب ہوجاتا ہے۔ سمجھا؟ ویسے آگے تمہارا مرضی.... ہمارا تم کو کھانے سے منع کرنے کو دل نہیں چاہتا لیکن تمہارا فائدے کے لئے بولتا ہے۔"

بات اس کی درست تھی تاہم اس پر عمل کرنے کے لئے مجھے اپنی اونگھتی ہوئی قوت ارادی کو بڑی مشکل سے بیدار کرنا پڑا۔ کھانے کے بعد قہوے کا دور چلا جس سے میرے حواس میں چستی آنے کے بجائے خمار طاری ہوگیا۔

ڈرائیور نے ادائیگی کی اور کچھ دیر بعد ہم اٹھ کر دوبارہ ٹرک میں بیٹھ کر چل دیئے۔ وہی ٹرک کی گھوں گھوں، وہی گرد و پیش کی ویرانی، وہی بل کھاتی سیاہ پٹی سے مشابہ سڑک۔ دھیرے دھیرے غنودگی میرے ذہن پر غالب آگئی۔ راشد مجھ سے پہلے ہی دروازے سے ٹیک لگائے آڑا ترچھا پڑا سو رہا تھا اور کسی بلی کی طرح خرخرا رہا تھا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اسی پر تقریباً ڈھیر ہوگیا اور جانے کب پریوں کے ہنڈولے میں جھولے لیتا ہوا سو گیا۔

معلوم نہیں کتنی دیر سوتے رہنے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ کوئی مجھے جھنجوڑ رہا ہے۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ ڈرائیور مجھے اور راشد کو جھنجوڑ رہا تھا۔ ہم دونوں آنکھیں ملتے ہوئے سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ ٹرک ایک سڑک کے کنارے رکا ہوا تھا۔ سامنے ہی سالخوردہ سی اینٹوں کی ایک عنابی دیوار نظر آرہی تھی جس میں ایک محرابی دروازے پر زرد اور کمزور سی روشنی بکھیرتا ہوا ایک بلب جھول رہا تھا۔

"وہ سامنے ریلوے اسٹیشن ہے۔" ڈرائیور نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "تم ادھر جا کر اتا پتا کرو۔ ہمارا خیال ہے، ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد ایک گاڑی لاہور کی طرف روانہ ہوگا۔ تم لوگ اسی سے نکل جاؤ۔" پھر وہ اپنی صدری سے سو سو کے دو نوٹ نکالتے ہوئے بولا۔ "بغیر ٹکٹ جانے کا کوشش مت کرنا، ورنہ اتنا مصیبت اٹھا کر بھی شاید دو چار مہینے اور گھر نہ پہنچ سکو۔ جیل بھی خرکار کیمپ سے کچھ کم نہیں۔"

میں نوٹ لیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا چنانچہ وہ اس نے میری میلی کچیلی قمیص کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ پھر جیسے اسے کچھ اور خیال آیا، سیٹ پر رکھی ہوئی تہ شدہ دو گرم چادریں اٹھا کر میری گود میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "تم لوگوں کا تو حلیہ اتنا خراب ہے کہ ٹکٹ ہونے کے باوجود تم کو کوئی آوارہ گرد یا چور اچکا سمجھ کر نہ پکڑلے۔ تمہارا بات تو لوگ بعد میں سنیں گا۔ اس لئے تم دونوں ایک ایک چادر لپیٹے رکھنا۔ سردی سے بھی بچے گا اور یہ میلا کچیلا کپڑا بھی کافی حد تک چھپا رہے گا۔"

میں نے غیرارادی طور پر اس شخص کا ہاتھ تھام لیا اور گلوگیر سے لہجے میں کہا۔ "خان صاحب! تم انسان نہیں، فرشتہ ہو۔"

اس نے کھسیانے سے انداز میں قہقہہ لگایا۔ "یہ بھی تم نے عجیب بات کیا برادر! ہم تو ابھی صحیح طریقے سے انسان بھی نہ بنا۔ تم نے ہم کو فرشتہ بنادیا۔"

اس کے دونوں ساتھی ٹرک کے پچھلے حصے سے اتر کر دروازے کے قریب آکھڑے ہوئے تھے اور غالباً ہمارے اترنے کے منتظر تھے۔ میں نے ڈرائیور سے الوداعی مصا[فحہ] کرتے ہوئے کہا۔ "ہمیں ابھی تک اپنے محسن کا نام بھی معلو[م] نہیں ہوسکا....."

"نام کو چھوڑو بھائی۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "ہم تو [ا]دھیان کام پر رکھتا ہے۔ ہمارا خیال میں ہمارا جو کام تھا، ہم نے بھی صحیح طریقے سے پورا نہیں کیا کیونکہ ہمارا بھی کچھ مجبو[ری] ہے۔ ہم کو معاف کردینا۔ ہم بس تمہارا اتنا ہی خدمت کر[سکتا] تھا..... اور ہاں، جس علاقے میں تم کو اتنا تکلیف اٹھانا پڑا وہ ہما[را] ہی علاقہ تھا..... اس کے لئے بھی ہم کو معاف کردینا۔ ہمارا علا[قے] میں بڑا عجیب کام ہوتا ہے..... ہم کو بہت غصہ آتا ہے لیکن کیا کرے...؟ ہم مجبور ہے۔" اس کے لہجے میں مجبور[ی کا] [ظ]لم شامل تھا۔

وہ سر جھٹک کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس نے اسٹیرنگ سنبھال لیا تھا۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ تھا کہ اب ہم[یں] رخصت ہوجانا چاہیے۔ میں نے دل ہی دل میں اسے نہ جا[نے] کتنی دعائیں دیں اور ٹرک سے اتر آیا۔ راشد مجھ سے پہلے اتر چکا تھا۔ ہم نے ڈرائیور کے ساتھیوں سے بھی ہاتھ ملا[یا]۔ وہ بس خاموشی سے ہمیں گھورے جارہے تھے جیسے ہم [کوئی] عجوبہ ہیں۔ ہم چادریں لپیٹ کر چل پڑے تو وہ دونوں ٹرک [میں] سوار ہوگئے۔ دوسرے ہی لمحے انجن بیدار ہوا، ہیڈلا[ئٹس] روشن ہوئیں اور ٹرک حرکت میں آگیا۔

میں راشد کو ساتھ لئے ریلوے اسٹیشن کی طرف چل د[یا]۔ پلیٹ فارم پر خاصی چہل پہل تھی۔ ایک قلی کو روک کر [میں] نے ٹرینوں کے متعلق معلومات حاصل کیں۔ تقریباً آ[دھے] گھنٹے بعد خیبر میل، کراچی کے لئے روانہ ہونے والی تھی۔ ا[س] میں ہم لاہور جاسکتے تھے۔ تھرڈ کلاس کے دو ٹکٹ خرید کر [ہم] آہنی سائبان تلے ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔

ایک طویل خاموشی کے بعد راشد بولا۔ "بھائی جان! [مجھے] اب بھی یقین نہیں آرہا کہ ہم اس جہنم سے نکل آئے ہیں۔ کیا ہم واقعی اب گھر پہنچ جائیں گے؟" اس کے لہجے میں [ایک] بے عنوان خوف کی جھلک تھی۔

"انشاء اللہ۔" میں نے وثوق سے کہا۔ میں اس وقت [بہت] بہت سی باتوں پر غور کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد میں نے پاؤں [...] [پھیلاتے] ہوئے کہا۔ "دیکھو راشد! تم بڑے گھر کے لڑکے ہو..... میرا [خیال] ہے تمہاری گمشدگی پر خاصا ہنگامہ برپا ہوگا۔ پولیس وغیرہ [بھ]ی بھاگ دوڑ میں مصروف ہوگی۔"

"شاید۔" اس نے متذبذب لہجے میں کہا۔

"میں یہ چاہتا ہوں کہ گھر پہنچ کر تم خرکار کیمپ سے اپنے [ف]رار کی کہانی تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ سناؤ، جس میں تمہارا [ب]ھی فائدہ ہے اور میرا بھی۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے [م]یں کہا۔ "مثلاً ایک تو تمہیں وہ سب کچھ بیان کرنے کی [ض]رورت نہیں جو تمہارے ساتھ ہوتا رہا۔"

"جی..... جی ہاں۔" اس نے نظریں جھکا کر دھیمے اور شرمسار لہجے میں کہا۔

"اور میرے بارے میں بھی یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ [م]یں نے تین افراد کو قتل کیا تھا، تب ہم فرار ہونے میں کامیاب ہوسکے تھے۔" میں نے اسے سمجھایا۔ "زیادہ سے زیادہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ میں نے رات میں کسی وقت موقع پا کر چوکیدار کے سر پر پتھر یا کچھ اور مار کر اسے بے ہوش کردیا تھا اور اس طرح ہم [ف]رار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ تمہیں کسی کی ہلاکت وغیرہ کا [ذکر] کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"وہ کیوں؟" اس نے سر اٹھا کر قدرے حیرت سے پوچھا۔ "[اس] سے تو آپ کی بہادری ظاہر ہوتی ہے۔" اس کے لہجے میں [بچ]پن کی معصومیت جھلک آئی۔

"مجھے اپنی بہادری ظاہر کرنے کا کوئی شوق نہیں۔" میں [نے] ملائمت سے کہا۔ "دراصل مجھے معلوم ہے کہ پولیس اس [سلس]لے میں کرے کرائے گی تو کچھ نہیں۔ کوئی خرکار کیمپ اس [سے] پہلے پولیس نے ختم کیا ہے نہ آئندہ کرے گی۔ یہ تو خیر [ایک] دور دراز علاقے کا کوئی خرکار کیمپ تھا، ان کی تو بغل میں [بھ]ی کوئی ایسا خرکار کیمپ ہو تو وہ ادھر کا رخ نہیں کرتے لہٰذا وہ [تو] ان ہمارے خیریت سے لوٹ آنے پر ہی خدا کا شکر ادا کریں [گ]ے اور جو کچھ بھی پوچھ گچھ کریں گے وہ محض خانہ پری ہوگی [لیک]ن میرے ہاتھوں تین خرکاروں کے قتل کی بات سن کر شاید [وہ] اپنی تفتیش لمبی کردیں اور مجھ سے کچھ زیادہ ہی سوال جواب کرنے لگیں..... اور میرے حالات کچھ ایسے ہیں کہ میں زیادہ [لم]بی تفتیش اور سوال و جواب کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ میری [ب]ات سمجھ رہے ہو نا؟"

"جی..... جی ہاں۔" اس نے جلدی سے سر ہلایا۔

"اس لئے بہتر ہوگا کہ اپنے فرار کی کہانی کو قدرے سادہ بنا کر سناؤ۔" میں نے کہا۔ "اول تو میں سوچ رہا ہوں کہ تمہیں بس تمہاری گلی میں ہی چھوڑ کر لوٹ آؤں۔ تم چاہو تو میرا کوئی ذکر ہی نہ کرنا..... ہاں..... یہی ٹھیک ہے۔ میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر نہیں جاؤں گا۔" یہ خیال اچانک ہی میرے ذہن میں آیا تھا اور میرے دل کو بہت ہی بھایا تھا۔ مجھے یک لخت ہی احساس ہوا تھا کہ واقعی مجھے اس کے ساتھ اس کے گھر جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ میں اسے بہ حفاظت گھر تک پہنچانا اپنی اخلاقی ذمے داری محسوس کر رہا تھا۔ اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا کہ میں اسے اس کی گلی میں چھوڑ آتا۔ پیشے کے لحاظ سے میری زندگی جس ڈگر پر آچکی تھی، اس کی وجہ سے اب میں غیر ضروری طور پر زیادہ لوگوں کے سامنے جانے اور زیادہ سوال وجواب سے کترانے لگا تھا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا بھائی جان۔" راشد بے تابی سے بولا۔ "آپ کو ایک آدھ دن کے لئے تو میرے چچا کے ہاں رہنا پڑے گا۔ آپ ہی کی وجہ سے تو مجھے نئی زندگی نصیب ہوئی ہے۔ میرے چچا چچی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔ بہت اچھے لوگ ہیں وہ..... بلکہ میں تو سوچ رہا تھا کہ آپ کو اورنگزیب صاحب سے بھی ملواؤں گا۔ اورنگزیب صاحب میرے چچا کے بہت اچھے دوست ہیں۔ اخبار سنڈے ایڈیشن کے لئے خصوصی فیچر لکھتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہم دونوں کے اس فرار کی کہانی پر بڑا زبردست فیچر بنائیں گے۔ ہم دونوں کی تصویریں اخبار میں چھپیں گی۔"

"وہ تو تم اکیلے بھی اپنی کہانی سناؤ گے تو اخبار میں فیچر چھپ جائے گا۔ میری موجودگی ضروری نہیں۔" میں نے قدرے رکھائی سے کہا۔" مجھے اپنی تصویریں اور داستان شجاعت اخبار میں چھپوانے کا اتنا زیادہ شوق نہیں۔ بہرحال، تم اپنی کہانی اس طرح سنانا جس طرح میں نے کہا ہے اور مجھے اپنے گھر لے جانے پر اصرار مت کرو۔ دراصل میرے انکار کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اگر میں تمہارے ساتھ گھر چلا گیا تو لمبا ہی چکر شروع ہو جائے گا اور جس طرح تمہیں گھر پہنچنے کی جلدی ہے اسی طرح مجھے بھی ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا ہے۔ میرے گھر والے بھی جانے کس قدر پریشان ہوں گے۔ کیا حال ہو گا ان کا.... اور پھر مجھے تو تمہیں گھر پہنچانے کے بعد بھی کافی طویل سفر کرنا ہو گا۔ ان سب باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے تمہیں اسی طرح کرنا چاہئے جس طرح میں کہہ رہا ہوں۔" میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک بار پھر اصرار کرنے کا ارادہ رکھتا ہے اس لئے میں نے جلدی سے کہا۔" اور اگر تم میری بات ماننے کے لئے تیار نہیں ہو تو پھر ہم یہیں سے اپنا اپنا راستہ لیتے ہیں۔ تم خیبر میل سے لاہور چلے جاؤ، میں کوئی اور ٹرین پکڑ لوں گا جس سے مجھے اپنے علاقے کی طرف جانے میں آسانی رہے۔"

راشد کا منہ اتر گیا۔ مردہ سی آواز میں بولا۔" اب اتنی بے رخی اختیار مت کیجئے۔ ٹھیک ہے، میں آپ کو گھر لے جانے پر اصرار نہیں کرتا لیکن مجھے میرے گھر تک ضرور چھوڑ آیئے۔ تنہا تو مجھ میں اب ایک قدم بھی چلنے کی ہمت نہیں رہی۔ مجھے تو اس تصور سے ہی خوف آ رہا ہے۔ اگر آپ مجھے اکیلا چھوڑ گئے تو میں شاید ہی گھر پہنچ سکوں۔"

وہ درست ہی کہہ رہا تھا۔ مجھے اس کے انداز پر بے پناہ ترس آیا۔ میرا اسے تنہا رخصت کرنے کا قطعاً ارادہ نہیں تھا۔ وہ تو میں نے محض اس سے اپنی بات منوانے کے لئے دھمکی دی تھی۔ اس کے بعد ہمارا بیشتر وقت خاموشی ہی میں گزرا۔ راشد نے معصومانہ سے اشتیاق کے تحت میرے بارے میں جاننے کے لئے کئی سوالات کیے۔ میں نے ان کے جواب گول مول سے ہی دیئے۔ ظاہر ہے، میرا اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بالآخر وہ بولا۔" بعد میں معلوم نہیں یاد رہے یا نہ رہے، آپ اپنا ایڈریس تو لکھ کر مجھے دے دیں۔ میں جب لاہور سے اپنے گھر کراچی چلا جاؤں گا تو آپ کو خط لکھا کروں گا۔ کبھی آپ میرے گھر بھی آیئے گا۔ میں [illegible] ممی اور ڈیڈی کو آپ کے متعلق بتاؤں گا تو شاید وہ مجھے [illegible] نہیں کہ میں آپ کو ساتھ لے کر کیوں نہیں آیا۔"

اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ مجھے تو صحیح طور پر اپنا ایڈریس معلوم ہی نہیں تھا۔ آج تک کبھی کسی کو ایڈریس بتانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی تھی۔ دنیا میں کوئی ایسی ہستی نہیں رہ گئی تھی جو مجھے خط لکھتی۔ اشرف خان کا مکان جس میں رہ رہا تھا، اس کا نمبر وغیرہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اشرف خان یا زرینہ کے نام بھی میں نے اس مکان پر کوئی خط وغیرہ آتے نہیں دیکھا تھا البتہ شہر کے مرکزی علاقے میں رینوز ہوٹل کے قریب ہی ایک پان والے کی دکان تھی جہاں سے اشرف خان پان سگریٹ اور سگار وغیرہ لیا کرتا تھا اور فارغ وقت میں دو چار منٹ کے لئے کھڑا ہو کر دکان دار سے تھوڑی بہت گپ شپ بھی کر لیتا تھا۔ اس دکاندار کی معرفت میں نے کبھی کبھار اشرف خان کے خط آتے دیکھے تھے۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ گھر کے پتے پر خط منگانا خلاف مصلحت سمجھتا تھا چنانچہ میں نے ایک کینٹین والے سے قلم مانگ کر راشد کو اسی پان والے کا ایڈریس دے دیا۔

"اس دکان کی معرفت تم مجھے خط لکھ سکتے ہو۔" میں نے کہا۔ "مکان تو کرائے کا ہے اور کوئی پتا نہیں کب ہم لوگ چھوڑ جائیں۔ یہ ایڈریس بہرحال، مستقل ہے۔"

راشد نے سگریٹ کی ڈبیہ کا وہ ٹکڑا جیب میں رکھ لیا جس پر میں نے ایڈریس لکھا تھا۔ کچھ دیر بعد شیڈ سے ٹرین پلیٹ فارم پر آ گئی اور پلیٹ فارم پر یکایک ہی بھگدڑ سی مچ گئی۔ نیم ویران سا ریلوے اسٹیشن یکدم ہی پرہجوم نظر آنے لگا۔ جانے کون کون سے کونے کھدروں سے لوگ نکل آئے اور ٹرین پر یوں ٹوٹ پڑے گویا اس سے خاندانی دشمنی چلی آ رہی ہو۔

بڑی مشکل سے میں نے اپنے اور راشد کے لئے لکڑی کے تختوں والی دو سیٹوں پر قبضہ کیا اور یوں سکھ کی سانس لی گویا بے کراں سمندر میں ڈوبتے ڈوبتے ہمیں تیرنے کے لئے [illegible] لائف بوٹس میسر آ گئی ہوں۔

سفر ہمارا تقریباً اسی طرح طے ہوا جس طرح تھرڈ کلاس میں ہوتا ہے۔ پشاور سے اس کلاس میں سفر کرنے کا البتہ ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اپنے حلیے کی وجہ سے ہم جس احساس کمتری میں مبتلا تھے وہ ہمارے دل سے نکل گیا۔ ٹرین میں بیٹھنے کے بعد ہم اپنے حلیے کی طرف سے خاصے بے پروا ہو گئے کیونکہ اس ڈبے میں کئی آدمیوں کے حلیے ہم سے ملتے جلتے ہی تھے۔

لاہور پہنچ کر بھی میرے پاس تقریباً سوا سو روپے بچے ہوئے تھے۔ اس نیک دل ڈرائیور نے جس طرح ہماری مدد کی تھی، اسے یاد کرتے ہوئے میرے دل سے اس کے لئے بے اختیار

ہر قدم پر دعائیں نکل رہی تھیں۔ گو ان باتوں کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا مگر پھر بھی وہ زمانہ آج کے زمانے سے بدرجہا بہتر تھا۔ جیسا کہ اپنے ہاں کچھ روایت سی بن چکی ہے کہ ہر زمانہ آنے والے زمانے سے کچھ بہتر ہی ہوتا ہے اور بعد میں لوگ اسے یاد کر کر کے آہیں بھرا کرتے ہیں۔ ہم چاہتے تو سوا سو روپے کی اس معمولی سی رقم سے کراچی بھی پہنچ سکتے تھے۔

لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر ان دنوں عام رواج تھا کہ بٹے کے ٹیکسی ڈرائیور اور کوچبان، مسافر کو پکڑ کر مختلف سمتوں میں کھینچتے تھے۔ ہوتا عموماً یہ تھا کہ مسافر کا کوٹ یا کمبل کسی ایک تانگے میں پہنچ جاتا تھا اور صندوق دوسرے تانگے میں اور اسے خود کسی تیسرے تانگے میں بیٹھ کر ان دونوں کا تعاقب کرنا پڑتا تھا یا پھر دائیں آستین ایک ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ میں آ جاتی تھی اور بائیں آستین دوسرے کے ہاتھ میں اور وہ دونوں انہیں فتح کے جھنڈوں کی طرح لہراتے اپنی اپنی ٹیکسی کی طرف دوڑ لیتے تھے جبکہ مسافر کو کوئی تیسرا ہی ٹیکسی ڈرائیور کندھے پر اٹھا کر اپنی ٹیکسی کی طرف لے جاتا تھا۔

بات سے بات نکل آئی۔ میں یہ بتا رہا تھا کہ جب ہم ویٹنگ لاؤنج میں آئے تو ہمارے حلیے دیکھ کر ٹیکسی ڈرائیوروں نے ہمیں قطعاً لفٹ نہیں دی البتہ تانگے والوں کے سامنے ہمیں پوری طرح سینہ سپر ہونا پڑا۔ تانگے میں جانے کے ہم متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ راشد نے مجھے بتا دیا تھا کہ اگر ہم نے تانگے میں بیٹھ کر اسٹیشن سے گلبرگ جانے کی کوشش کی تو شاید ہم اگلی صبح ہی پہنچیں۔ میں خود گو کہ لاہور سے ابھی صحیح طور پر آشنا تو نہیں تھا لیکن چند چکر لگانے کے بعد اتنا اندازہ مجھے بھی ہو چکا تھا کہ کونسا علاقہ کس سمت میں ہے اور کہاں سے کتنے فاصلے پر ہے۔

باہر آ کر میں نے ایک ٹیکسی تلاش کی جس کا ڈرائیور کھڑکی میں کہنی ٹکائے اونگھ رہا تھا۔ یہ شخص یا تو کاہل الوجود تھا اور اس کا مقدر بھی اسی کی طرح اونگھ رہا تھا یا پھر اس کی خودی بہت بلند تھی اور اس نے اندر جا کر سواریاں تلاش کرنے کو شان کے خلاف سمجھا تھا۔ یہ بھی عین ممکن تھا کہ وہ بہت دیر گاڑی چلا چکا ہو اور اب تھک چکا ہو۔ بہرحال وہ آدمی شریف معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے خواب نیم خرگوش سے جگایا اور گلبرگ چلنے کی فرمائش کی۔ ڈرائیور نے اپنی حیرت کا قطعاً اظہار نہیں کیا البتہ یہ ضرور بتا دیا کہ کرایہ میٹر کے مطابق نہیں، مرضی کے مطابق ہو گا۔ اس کی مرضی کے مطابق۔ ہم اس بات کی ذرا بھی پروا کیے بغیر جلدی سے ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور اسے فوراً چلنے کی ہدایت کی کیونکہ پولیس کا ایک سپاہی ہمیں عجیب مشکوک سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بہرحال وہ پھر بھی بھلا زمانہ تھا، ورنہ محض اپنی شکستہ حالی کی وجہ سے مشتبہ قرار پا کر ہم نہ جانے کب کے اسی قسم کی کسی شخصیت کے ہتھے چڑھ چکے ہوتے اور ہمارے قبضے سے جانے کیا کچھ برآمد ہو چکا ہوتا اور ہم حوالات میں درآمد ہو چکے ہوتے۔

گلبرگ پہنچنے میں ہمیں زیادہ دیر نہیں لگی۔ نہر والا پل پار کرنے کے بعد راشد کو اپنے چچا کے گھر کا راستہ اچھی طرح یاد تھا۔ لبرٹی مارکیٹ کے قریب سے ایک گلی میں مڑنے کے بعد راشد نے ایک جگہ ٹیکسی رکوائی اور اشارے سے بتایا۔" وہ رہا چچا کا گھر۔ سفید چار دیواری والا۔"

وہ ایک شاندار کوٹھی تھی۔ میں مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا گیٹ کھلا ہوا تھا اور ڈرائیو وے میں غالباً کئی کاریں کھڑی تھیں۔ تین کاریں باہر باؤنڈری وال کے ساتھ کھڑی تھیں۔ انہیں غالباً اندر جانے کے لئے راستہ نہیں ملا تھا۔

میں نے راشد سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔" اب تم جاؤ، زندگی رہی تو پھر کبھی انشاء اللہ اچھے حالات میں ملیں گے۔"

راشد ٹیکسی سے اتر کر قدرے بے دلی سے گھر کی طرف چل دیا۔ وہ مڑ مڑ کر دیکھتا جا رہا تھا جس سے مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہو رہی تھی۔ میں نے ڈرائیور سے کہا۔" بس اب جلدی سے گاڑی ریورس کر کے نکالو اور مجھے پرائیویٹ لاری اڈے لے چلو۔"

شام ڈھل رہی تھی اور مجھے اندیشہ تھا کہ زیادہ رات ہو گئی تو سیالکوٹ جانے والی بس شاید ہی ملے لیکن بہرحال میں اچھے وقت پر لاری اڈے پہنچ گیا جس کے بعد میرے سفر کا دوسرا مرحلہ شروع ہو گیا۔

میری وہ رات بھی تقریباً پوری ہی سفر میں گزر گئی۔ حلیہ تو میرا جو تھا سو تھا لیکن نیند کی کمی، تھکن، گرد و غبار اور اچھے بھلے انسانوں کو قریب المرگ کر دینے والے کھانوں نے مجھے بالکل ہی بے حال کر کے رکھ دیا تھا۔ علی الصباح شہزاد کوٹ کے لاری اڈے پر اتر کر میں نے پہلے ایک چائے خانے میں کچھ کھا پی لینا ضروری سمجھا۔ اس چائے خانے میں ہاتھ دھوتے وقت میں نے سیمنٹ کے غلیظ سنک کے اوپر لگے ہوئے آئینے کے بچے کھچے دھندلے سے ٹکڑے میں اپنی شکل دیکھی اور خود ہی ڈر گیا۔ میں زمانہ غار کا کوئی ایسا شخص دکھائی دے رہا تھا جو پیدل صحرائے گوبی عبور کر کے آیا ہو۔

چائے خانے سے میں تقریباً ایک میل پرانے اور لکڑی کی

طرح سخت کیک پیس چبانے میں ناکام ہو کر اور تارکول جیسی چائے حلق سے اتارنے میں کسی قدر کامیاب ہو کر نکلا تو طبیعت پہلے سے بھی زیادہ بدمزہ تھی۔ میں اپنے آپ کو کوستا رہا تھا کہ ان چائے خانوں کی حالت سے واقف ہوتے ہوئے بھی خواہ مخواہ یہاں رکا۔ جہاں اتنی خواری برداشت کی تھی، تھوڑی دیر اور تکلیف برداشت کر کے گھر پہنچ کر زرینہ کے ہاتھ سے بنی ہوئی کوئی لذیز اور گرما گرم خوشبودار کافی پیتا۔ بے صبری انسان کو عموماً ذلیل ہی کراتی ہے۔

تانگے میں بیٹھ کر میں گھر پہنچا، اس وقت صبح صادق کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ میں نے کال بیل بجائی۔ توقع یہی تھی کہ زرینہ گیٹ کھولے گی۔ کال بیل بجتے پر ہمیشہ وہی گیٹ پر آتی تھی خواہ وقت کچھ بھی ہوتا لیکن اس وقت چھوٹا گیٹ اشرف خان نے کھولا مگر اس طرح جیسے اسے اندیشہ ہو کہ گیٹ اگر کچھ زیادہ کھول دیا کوئی سیلاب بلا گھر میں در آئے گا۔ کسی پردے دار بی بی کی طرح اس نے پٹ کی اوٹ سے جھانکا۔ باہر روشنی بہت کم تھی اور کچھ میرا حلیہ زیادہ ہی شاندار تھا۔ پہلی نظر میں اس نے مجھے نہیں پہچانا اور درشت لہجے میں پوچھا "کون ہے؟"

"وہ جو تاریک راہوں میں مارا گیا۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔ میری آواز سے اس نے مجھے پہچان لیا اور گیٹ پورا کھولتے ہوئے مجھے ہاتھ سے پکڑ کر اندر گھسیٹ لیا۔ راہداری میں روشنی تھی۔ گیٹ بند کر کے وہ میرے دونوں بازو تھامے چند لمحے تو یوں میرا چہرہ دیکھتا رہا جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ پھر ایک جھٹکے سے اس نے مجھے سینے سے لگا لیا حالانکہ میں اس کے اتنا قریب ہونا نہیں چاہ رہا تھا کیونکہ مجھے خود اپنے جسم سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے کسی آوارہ اور غلاظت پسند بیل کے جسم سے آ سکتی ہے لیکن اشرف خان کو گویا اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کا انداز ایسا ہی والہانہ تھا جیسے بچپن کا بچھڑا ہوا دوست کسی اجنبی دیس میں مل گیا ہو۔ اس کے خلوص اور گرم جوشی نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ میری گمشدگی نے اسے بہت پریشان کیا تھا۔

ہمارا معانقہ ختم ہوا تو میں نے دیکھا، زرینہ بھی آنکھیں ملتی بیڈ روم کی طرف سے چلی آ رہی تھی۔ وہ اشرف خان کی طرح ملتی تو کوئی بات بھی تھی مگر وہ کمبخت دو قدم دور ہی رک کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ اسے بھی جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان دونوں ہی کو میری واپسی کی امید نہیں رہی تھی۔

"اب اندر آ جاؤ۔ ہونقوں کی طرح کب تک یہیں کھڑے رہو گے۔" بالآخر زرینہ نے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئی۔ اس کے پیچھے پیچھے میں اور اشرف خان بھی بیڈ روم میں پہنچے۔ میں تو جاتے ہی ڈبل بیڈ پر ڈھیر ہو گیا جس میں زرینہ کے وجود کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ اشرف خان ایک طرف کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ زرینہ نے تپائی سے پیکٹ اٹھا کر ایک سگریٹ سلگائی اور سنگھار میز کے قریب کھڑی ایک بار پھر گہری نظروں سے مجھے تکنے لگی۔

ماحول پر عجیب سا سکوت طاری تھا۔ ایسا سکوت جس کے دوران سب کے ذہنوں میں سوالات کا سیلاب مچل رہا ہوتا ہے اور لفظوں کا لاوا ابل پڑنے کو بے تاب ہوتا ہے مگر بولنے میں کوئی پہل نہیں کر پاتا۔

"زرینہ!" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اس سے پہلے کہ تم کوئی سوال کرو اور میں اپنی رام کہانی شروع کروں، بہتر ہو گا کہ تم بجلی کی سی تیزی سے میرے لئے کچھ کھانے پینے کو لے آؤ۔"

اس نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا اور باہر چلی گئی۔ میں جس بیڈ پر لیٹا تھا وہ کوئی غیر معمولی بیڈ نہیں تھا لیکن اس وقت مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں روئی کے گالوں سے بنے ہوئے کسی ہنڈولے میں ہلکورے لے رہا ہوں۔

اشرف خان سگار سلگاتے ہوئے بولا "زرینہ بے چاری تمہاری فکر میں تقریباً پاگل ہو رہی تھی۔ پہلے تو اسے مجھ پر ہی شک رہا کہ شاید میں نے تمہیں غائب کرا دیا ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کہ محض عورت کی خاطر کسی کے خلاف اس طرح دل میں کینہ رکھنا میری فطرت نہیں۔ پھر جب زرینہ نے خود مجھے بھی بے پناہ پریشان دیکھا تو اسے بھی میری بات کا یقین آ گیا۔"

وہ سگار کو انگلیوں کے درمیان گھمانے لگا۔ میں نے وہ واحد تمباکو نوش دیکھا تھا جو کبھی سگریٹ پینے لگتا تھا، کبھی سگار اور کبھی پائپ۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "میں نے تمہاری تلاش کے سلسلے میں پولیس میں رپٹ درج کرانے کے سوا ہر وہ کوشش کر ڈالی جو میرے بس میں تھی۔ پولیس میں رپٹ درج کرانے کا نہ تو کوئی فائدہ تھا اور نہ ہی ہم جیسے لوگ اس قسم کے چکروں میں پولیس کے سامنے آنے کا خطرہ مول لے سکتے ہیں تاہم میں نے نجی طور پر کتنے ہی جاسوس اور کھوجی قسم کے آدمیوں کو شاہانہ خرچ اور گاڑیاں وغیرہ دلوا کر ادھر ادھر دوڑائے

رکھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اپنے ہی ہم پیشہ لوگوں کے ایک گروہ سے میری پرانی دشمنی چلی آ رہی ہے جو کافی عرصے سے ٹھنڈی پڑی ہوئی ہے۔ میں نے سوچا، شاید انہیں بھنک پڑ گئی ہو کہ مجھے ایک کام کا ساتھی مل گیا ہے اور اس کی وجہ سے میں کچھ ترقی کرنے لگا ہوں اس لئے انہوں نے ہی تمہیں اغوا نہ کر لیا ہو۔ چنانچہ میں نے ان کے ایک آدمی کو قابو میں کیا اور ایک دوست کے اڈے پر لے گیا جہاں میں نے اس پر سختی اور تشدد کر کے حقیقت اگلوانی چاہی لیکن وہ کسی طرح بندشوں سے آزاد ہو گیا اور مجھ سے مقابلے میں اتفاقاً میرے ہاتھوں مارا گیا۔ حالانکہ میرا اسے مارنے کا ارادہ قطعاً نہیں تھا۔ اب اس گروہ کو بھی معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا آدمی میرے ہاتھوں مرا ہے چنانچہ وہ الگ خون کے پیاسے ہو رہے ہیں۔ بھولی بسری دشمنی پہلے سے زیادہ شدت سے ابھر آئی ہے۔"

"کس کا گروہ ہے وہ؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا "تم نے پہلے تو اس کا کوئی ذکر نہیں کیا؟"

"پہلے کبھی کوئی موقع ہی نہیں آیا ذکر کرنے کا۔" وہ بولا۔ "ماسٹر لبھو کا گروہ کہلاتا ہے وہ۔ آٹھ دس خاصے خطرناک آدمیوں کا ٹولا ہے۔ لبھو ان کا سردار ہے۔ کسی زمانے میں یہ شخص جوہڑوں اور نہروں سے مچھلیاں پکڑا کرتا تھا۔"

"میرا خیال تھا کہ ہماری برادری آپس میں دشمنی نہیں رکھتی ہو گی۔" میں نے کہا "ہم لوگ آپس میں دشمنی کے متحمل کس طرح ہو سکتے ہیں جبکہ ہمارے پہلے ہی اتنے طاقتور دشمن موجود ہیں۔ رینجرز، کسٹم والے، ایکسائز والے، پولیس والے اور نہ جانے کون کون۔"

"ہمارے درمیان لڑائیاں دراصل چھوٹی چھوٹی باتوں پر شروع ہوتی ہیں جو بڑھتے بڑھتے انا کا مسئلہ بن جاتی ہیں اور لڑائیاں چھوٹے سے چھوٹے اور بڑے سے بڑے اسمگلروں کے درمیان ہوتی ضرور ہیں۔" اشرف خان نے مربیانہ لہجے میں سمجھایا "انسان چونکہ میری رائے میں بنیادی طور پر درندہ ہے اس لئے لڑائی اس کی فطرت میں شامل ہے۔ مذہب پرستوں میں مسلک اور فرقے کی بنا پر، خاندانوں میں دولت اور جائداد کی بنا پر، پڑوسیوں میں حسد و رقابت اور بے مروتی کی بنا پر اور کئی طبقوں میں طاقت و اقتدار کی چھینا جھپٹی کی بنا پر۔ غرضیکہ کسی نہ کسی بہانے سے انسان کی انسان سے لڑائی چلتی ہی رہتی ہے۔ ملکوں کے درمیان لڑائیاں تو چلتی ہی ہیں لیکن میں نے ایک ہی شہر کے اندر کہیں دو گلیاں بھی ایسی نہیں دیکھیں جن میں رہنے والے تمام لوگ ایک دوسرے سے

متفق' ایک دوسرے سے پیار کرنے والے اور باہم سیروشکر ہوں اور بس یہی آج کے انسان کا المیہ ہے ....."

"یار... خدا کے لئے فلسفہ کم جھاڑو۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کمزور سی آواز میں کہا "اور کام کی بات کرو۔ اس وقت فلسفہ مجھ سے ہضم نہیں ہو رہا۔ میرے پیٹ میں کیلیں سی چبھ رہی ہیں۔"

"میں بتانا یہ چاہ رہا تھا۔" اشرف خان قدرے کھسیانا ہو کر بولا "کہ قانون کے مقابلے میں بہرحال' ہم اسمگلر لوگ خاصی حد تک متحد ہی ہوتے ہیں۔ اگر ہماری کسی ہم پیشہ پارٹی کو ایسی صورتحال سے واسطہ پڑ جائے کہ اس کے سامنے اس کا ذاتی دشمن بھی ہو اور قانون کے نمائندے بھی تو وہ پارٹی ذاتی دشمن کے کندھے سے کندھا جوڑ کر قانون کے نمائندوں کا مقابلہ کرے گی۔"

"بہرحال .... یہ تم نے اچھی خبر نہیں سنائی کہ ماسٹر لبھو کا ٹولا ہمارا دشمن ہو گیا ہے۔ میں نے ہوٹل میں اکثر گپ شپ کے دوران ان لوگوں کا ذکر سنا ہے۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "اور ان تذکروں سے مجھے یہی اندازہ ہوا تھا کہ یہ کچھ زیادہ اجڈ' وحشی اور خونخوار قسم کے لوگ ہیں۔ اسمگلر سے زیادہ ڈاکو معلوم ہوتے ہیں بلکہ ڈاکوؤں سے بھی کچھ نچلی سطح کے لوگ.... کیونکہ ڈاکوؤں کا بھی کوئی نہ کوئی ضابطہ اخلاق ہوتا ہے مگر یہ کچھ مادر پدر آزاد قسم کی چیز ہیں حتیٰ کہ کوئی فائدہ نظر آئے تو یہ اپنے ہم پیشہ لوگوں کی مخبری کرنے سے بھی نہیں چوکتے۔ کیا یہ سب کچھ درست ہے؟"

"ہاں.... تم نے ٹھیک ہی سنا ہے۔" اشرف خان نے دھیمے لہجے میں کہا "ہر جگہ' ہر پیشے میں ایسی کچھ کالی بھیڑیں موجود ہوتی ہیں۔ یہ جو تم کبھی کبھار اپنے ہم پیشہ بھائی بندوں کے غیر متوقع طور پر پکڑے جانے کی خبریں سنتے ہو' وہ گرفتاریاں ایسی کالی بھیڑوں کی غداری کی وجہ سے ہی عمل میں آتی ہیں' ورنہ ہماری برادری میں تنہا کام کرنے والے معمولی اسمگلر سے لے کر بڑے سے بڑے گروہ تک میں مخبری کو بہت ہی قبیح فعل سمجھا جاتا ہے لیکن یہ ماسٹر لبھو کا ٹولا کچھ الگ تھلگ قسم کی چیز ہے۔ یہ تقریباً ایک ہی جیسی طبیعت کے لوگوں پر مشتمل ایک خاندان سا بن کر رہ گیا ہے۔ ان لوگوں میں بیک وقت لومڑی کی سی مکاری بھی ہے اور بھیڑیئے کی سی درندگی بھی۔"

"جب تمہیں یہ سب کچھ معلوم تھا تو میرے خیال میں تم نے ان سے دشمنی کی تجدید کر کے حماقت ہی کی ہے۔" میں نے بیڈ پر کروٹ لیتے ہوئے کہا۔

"دراصل تمہاری اچانک گمشدگی سے میری عقل خبط ہو کر رہ گئی تھی۔" وہ قدرے شرمندگی سے بولا "بہرحال' تم آ گئے ہو۔ اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم مل کر سب کچھ سنبھال لیں گے۔"

وہ عمر میں مجھ سے کہیں بڑا تھا۔ اس لائن میں اس کا تجربہ زیادہ تھا اور مجھے اس لائن میں لانے والا وہی تھا۔ میں نے اس سے اس کی رفیق شب بھی چھین لی تھی اس کے باوجود اس کے خلوص اور اعتماد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ میری تمام ترکم عمری اور ناتجربے کاری کے باوجود وہ کتنے حوصلے سے میری تقریباً ڈانٹ پھٹکار کی حد کو پہنچی ہوئی باتیں بھی سن لیتا تھا۔ اسے مجھ پر مان بھی کتنا تھا۔ کیسے اپنائیت بھرے اعتماد سے کہہ رہا تھا 'اب تم آ گئے ہو.... اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ہم مل کر سب کچھ سنبھال لیں گے۔' مجھ جیسے نالائق آدمی کو ایسے ساتھی کا میسر آ جانا خوش نصیبی نہیں تو اور کیا تھی؟

وہ سگار کا کش لینے کے بعد کہہ رہا تھا "تمہاری گمشدگی سے بہت ہی زیادہ نقصان ہوا۔ پیسہ پانی کی طرح بہنے لگا' کام ٹھپ ہو کر رہ گیا' جو منصوبے تمہارے ساتھ بنائے تھے وہ دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ظاہر ہے' وہ سب کام اب کافی آگے جا پڑے ہیں۔ تمہاری حالت تو کافی خراب نظر آ رہی ہے۔ آخر کار ہوا کیا تھا؟ کیا بیتی تم پر؟ میں یہ سب کچھ جاننے کے لئے اب تک جانے کس طرح اپنے تجسس کو دبائے بیٹھا تھا لیکن میرا خیال ہے' اب تو شروع ہو ہی جاؤ۔"

"نہیں....." میں نے کراہ کر کہا "زرینہ کو بھی آ جانے دو' ورنہ بعد میں اس کی فرمائش پر یہ داستان غریب حمزہ دوبارہ شروع کرنا پڑے گی اور مجھ میں اس بے ہودہ داستان کو دہرانے کی ہمت نہیں.... اور ہاں.... ذرا زرینہ کو آواز تو دو' کہاں مر گئی۔ میں نے تو اسے ہنگامی طور پر کچھ تیار کرنے کو کہا تھا مگر وہ شاید بکرا روسٹ کرنے بیٹھ گئی ہے۔"

"تم خود ہی آواز دو بابا۔" وہ کاؤچ پر گویا کچھ سکڑتے ہوئے بولا "اپنا اب اس پر کوئی رعب نہیں رہ گیا ہے۔"

الفاظ ابھی اس کی زبان پر ہی تھی کہ زرینہ ایک بڑی سی ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ ٹرے میں رکھے ہوئے ہر برتن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ اشرف خان نے ایک تپائی بیڈ کے قریب کھسکا دی اور زرینہ نے ٹرے اس پر رکھ دی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ آرام دہ ماحول میں پہنچتے ہی میری ہمت یک لخت ٹوٹ کر رہ گئی ہے۔ اب تک میں گویا جوش و خروش اور

روانی میں صعوبتیں برداشت کرتا آ رہا تھا مگر منزل پر پہنچتے ہی جیسے مجھ میں اٹھنے کی بھی ہمت نہیں رہی تھی لیکن جوں ہی پراٹھوں' انڈوں' کافی اور نہ جانے کس کس چیز کی خوشبو میرے نتھنوں تک پہنچی' میری روح جھرجھری لے کر بیدار ہو گئی اور میں اسپرنگ والے گڈے کی طرح ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

پیٹ کا دوزخ سرد ہوا تو میں نے زرینہ اور اشرف خان کو تفصیل سے بتایا کہ مجھ پر کیا بیتی تھی۔ زرینہ اس دوران حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں خاموش ہوا تو اشرف خان بولا "کیا ستم ظریفی ہے.... ہم لوگ موت کا سامنا کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں لیکن ایسی باتوں کے متعلق ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوتا۔" پھر وہ جھرجھری سی لے کر بولا "خیر.... کوئی بات نہیں۔ ہمارے ذرا پاؤں مضبوط ہو جائیں۔ ان خرکاروں میں سے جو بچ گئے ہوں گے' ان کے بھی پرخچے اڑا کر آئیں گے۔ چھوڑیں گے نہیں ان خبیثوں کو....."

"پرخچے تو تب اڑائیں گے نا جب اس خرکار کیمپ تک پہنچ سکیں گے۔" میں نے کہا "مجھے تو اس کے محل وقوع کا ذرا بھی اندازہ نہیں۔"

"اوہ....." اشرف خان نے مایوسی سے کہا۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "اب تم آرام کرو۔ کم از کم تین چار دن تمہیں آرام ہی کرنا چاہیے۔ اس کے بعد بیٹھ کر کاروبار کی بات کریں گے۔" وہ اٹھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ زرینہ کاؤچ سے ٹیک لگائے قالین پر بیٹھی تھی۔ اشرف خان کے جانے کے بعد بھی وہ وہیں بیٹھی بدستور عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

"تم کیوں دور بیٹھی کسی الو کی مادہ کی طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھے جا رہی ہو؟" میں نے مصنوعی خفگی سے کہا "کچھ بول رہی ہو نہ بتا رہی ہو اور نہ حال چال سنا رہی ہو۔ کیا تمہیں سانپ سونگھ گیا ہے؟"

"مجھے سانپ نہیں بلکہ اژدہا سونگھ گیا ہے۔" وہ طویل سانس لے کر بولی اور اٹھ کر میرے قریب آ بیٹھی "میں اب کسی بھی چیز یا کسی بھی انسان کو عزیز نہیں سمجھتی اور نہ ہی کسی چیز سے محرومی یا کسی انسان سے بچھڑنے کا مجھے ذرا بھی ملال ہوتا ہے مگر تمہاری گمشدگی نے واقعی مجھے حواس باختہ کر کے رکھ دیا تھا۔ مجھے خود اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ کیا میں کسی کے لئے اتنی پریشان ہو سکتی ہوں اور..... اور اب میں نے تمہاری طرف سے صبر کر لیا تھا۔ مجھے امید نہیں رہی تھی کہ تم واپس آؤ گے لیکن اب جبکہ تم لوٹ آئے ہو تو مجھے اس تصور سے ہنسی آ رہی ہے کہ تمہاری اس دوران کیا درگت بنتی رہی ہو گی۔" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر واقعی ہنسنے لگی۔

"یہ بھی دراصل خوشی محسوس کرنے کا ایک انداز ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "مجھے خود بھی اب وہ سب کچھ خاصا مضحکہ خیز محسوس ہو رہا ہے۔ انسان جب کسی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوتا ہے تو جان گلے میں اٹکی ہوتی ہے لیکن جب غیر متوقع طور پر اس مصیبت سے نکل آتا ہے تو وہ سب کچھ مضحکہ خیز محسوس ہونے لگتا ہے.... لیکن تم اب یہ کھی کھی بند کرو اور میرے لئے کپڑوں کا کوئی صاف ستھرا جوڑا نکالو۔ میں شیو بنا کر' نہا دھو کر اور کپڑے بدل کر انسانی جون میں آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس طرح تو مجھے نیند بھی نہیں آئے گی!"

میرا وہ دن سوتے ہوئے اور رات جاگتے ہوئے گزری۔ اس کے بعد مزید تین دن نہایت غیر محسوس انداز میں گزر گئے۔ آرام' آسائش' عمدہ خوراک' زرینہ کی قربت اور خدمت گزاری۔ ان سب چیزوں نے مجھے بہت جلد تازہ دم اور پہلے کی طرح توانا کر دیا۔ خرکار کیمپ میں گزرے ہوئے دن مجھے محض ایک ناگوار خواب محسوس ہونے لگے۔ میں تو جیسے اس گھر سے کبھی کہیں گیا ہی نہیں تھا۔

پانچویں دن البتہ اس خواب کا اعادہ قدرے شدت سے ہوا۔ اس روز اتوار تھا۔ میں اور اشرف خان ناشتے کے لئے ڈائننگ ٹیبل پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ زرینہ کچن میں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ میں حسب عادت اخبارات الٹ پلٹ رہا تھا تبھی ایک اخبار کے رنگین سنڈے ایڈیشن کے صفحات پر مجھے ایک مانوس چہرے کی جھلک نظر آئی۔ میں نے جلدی سے وہ صفحہ اپنے سامنے پھیلایا۔

اس صفحے پر دراصل راشد کی کئی چھوٹی بڑی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ یہ ایک خصوصی فیچر تھا جس کی شہ سرخی تھی۔ 'راشد خرکار کیمپ سے کس طرح فرار ہوا۔'

ایک صفحے کے اس فیچر میں کئی ضمنی سرخیاں اور ہائی لائٹس بھی نظر آ رہی تھیں۔ کہیں لکھا تھا۔ 'ماؤں کے جگر گوشے کب تک خرکار کیمپوں میں پہنچائے جاتے رہیں گے؟' کہیں چوکھٹے میں بڑا سا سوالیہ نشان بنا کر پوچھا گیا تھا۔ 'خرکار کیمپوں پر قانون کا اطلاق کیوں نہیں ہوتا؟'

ایک گوشے میں ایک اور سوال منہ پھاڑے کھڑا تھا۔ 'بچوں اور بڑوں کے اغواء کا سلسلہ کب تک جاری رہے گا؟ اس مہذب معاشرے میں جنگل کا قانون کب تک چلے گا؟'

مہذب معاشرہ.... ہونہہ' میرا دل چاہا کہ اخبار پھاڑ کر ایک

طرف پھینک دوں لیکن محض تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہائی لائٹس پر نظر دوڑاتا رہا۔ ایک سرخی تھی 'اس یخ بستہ رات کا قصہ جب ناز و نعم میں پلے ہوئے راشد کے پیروں میں بیڑیاں ڈال کر اسے چارپائی کے ساتھ کسی جانور کی طرح باندھ دیا گیا۔'

ایک جگہ نمایاں لفظوں میں لکھا تھا 'سنگلاخ راستوں پر دوڑتے دوڑتے اس کے پاؤں لہولہان ہو گئے اور وہ بھوک پیاس سے بے دم ہو کر گر پڑا۔'

اسی طرح کی دوچار ہائی لائٹس اور تھیں۔ فیچر کو سنسنی خیز بنانے کی ہر ممکن کوشش کی گئی تھی۔ کافی عرصے پہلے اخباروں کے خصوصی ایڈیشنوں میں اسی طرح نازی کیمپوں سے انحلاوی قیدیوں کے فرار کی داستانوں کے ترجمے چھپا کرتے تھے۔ الحمدوللہ کہ آزادی کے بعد ملک اس معاملے میں خود کفیل ہو گیا تھا اور اب اس قسم کی طبعزاد داستانیں وافر مقدار میں میسر آنے لگی تھیں۔ اگر اخبارات کوشش کرتے تو ہر اخبار روزانہ ہی اس طرح کی دوچار کہانیاں تلاش کر سکتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ فیچر رائٹر نے بڑے جوش وجذبے سے یہ فیچر لکھا ہو گا اور غالباً یہ بھی تصور کیا ہو گا کہ اس فیچر کی اشاعت کے بعد کھلبلی مچ جائے گی' حکام کے ایوانوں میں زلزلہ آجائے گا' ایک دو دن کے اندر اندر تمام خرکار کیمپوں کا قلع قمع ہو جائے گا.... وغیرہ وغیرہ.... لیکن اگر فیچر رائٹر پرانا اور گھاگ ہو گا تو اس نے محض ڈیوٹی پوری کرنے اور اخبار کی اشاعت بڑھانے کی نیت سے فیچر لکھا ہو گا۔ جو سوال اس نے اٹھائے تھے ان سب کے جواب اسے خود بھی بخوبی معلوم ہوں گے اور یہ بھی معلوم ہو گا کہ اس کے فیچر کا ردعمل ارباب اختیار کے حلقوں میں صرف اتنا ہی ہو گا جتنا کسی بڑی سی جھیل میں ننھا سا کنکر پھینکنے کا ہوتا ہے یعنی سطح پر چند لہروں کے دائرے پھیلے اور معدوم ہو گئے۔ کل تک اخبار بھی پرانا ہو جائے گا اور بات بھی۔

راشد کی تصویریں بھی بڑے اہتمام سے چھپی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر تو اسی حال میں تھی جس حال میں' میں نے اسے اس کے گھر کے قریب چھوڑا تھا۔ باقی تصویریں اس نے غالباً خوب اچھی طرح تیار ہو کر سوٹ پہن کر' ٹائی لگا کر اور پوز بنا بنا کر کھنچوائی تھیں۔ فوٹوگرافر نے اس کی تصویر کشی میں اپنی صلاحتیں آزمانے کی یقیناً پوری پوری کوشش کی تھی۔

یہ سب چیزیں گہری نظر سے دیکھنے کے بعد میں نے سرسری نظر سے فیچر پڑھا۔

راشد نے عقل مندی سے کام لیا تھا اور واقعات اسی طرح بیان کیے تھے جس طرح میں نے اسے ہدایت کی تھی۔ تین خرکاروں کے قتل وغیرہ کا اس نے کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ اس قسم کے واقعات کے بغیر ہی فیچر رائٹر نے فیچر میں سنسنی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ فیچر سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ راشد نے سب سے میرا ذکر بھی کر دیا تھا تاہم زیادہ وضاحت سے کام نہیں لیا تھا۔ فیچر رائٹر نے اس کے اپنے الفاظ میں کچھ اس طرح لکھا تھا۔ ".... میری رہائی میں درحقیقت میری اپنی عقل مندی یا جرأت کو زیادہ دخل نہیں ہے بلکہ اس کا سہرا محمد افضل صاحب کے سر ہے جو ایک بڑے بھائی کی طرح مجھ پر مہربان ہو گئے تھے۔ تمام قیدی لڑکوں میں صرف انہوں نے ہی فرار ہونے کی جرأت کی۔ رات کو انہوں نے ہی پتھر سر پر مار کر پہرے دار کو بے ہوش کیا اور میری اور اپنی بیڑیاں توڑیں۔ وہی مجھے اس سرحدی علاقے سے یہاں لاہور میں میرے چچا کے گھر تک چھوڑ کر گئے لیکن وہ اس قدر وضع دار اور کچھ شرمیلے آدمی تھے کہ انہوں نے میرے گھر والوں کے سامنے آنا بھی گوارا نہیں کیا' مبادا یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ احسان جتانے آئے ہیں۔ وہ مجھے دروازے تک چھوڑ کر واپس لوٹ گئے۔ میں نے بہرحال گھر میں آتے ہی ان کے متعلق اپنے چچا کو بتا دیا تھا۔ میرے ابو بھی کراچی سے لاہور پہنچے ہوئے تھے۔ انہیں جب افضل بھائی کے متعلق معلوم ہوا تو انہوں نے ان کی تلاش میں آدمی دوڑائے لیکن تب تک بہت دیر ہو چکی تھی اور افضل بھائی جا چکے تھے۔ بہرحال ان کا ایڈریس میرے پاس موجود ہے۔ ہم خود کبھی نہ کبھی جا کر ان سے ملیں گے۔ میں اور میرے گھر والے زندگی بھر ان کے احسان کا بوجھ نہیں اتار سکیں گے۔ شاید یہ سطور ان کی نظر سے گزریں لیکن ان سے انہیں اندازہ نہیں ہو سکے گا کہ ان کے لئے ہم سب کے دل کس قدر عقیدت' احترام اور احسان مندی سے لبریز ہیں.... وغیرہ وغیرہ۔

میں فیچر کی آخری سطر پر پہنچا تو آگے لکھا تھا بقیہ صفحہ فلاں پر'۔ میں ابھی وہ صفحہ تلاش کرنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ زرینہ کی قدرے تیز آواز میرے کانوں سے ٹکرائی "کیا اب تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے مجھے کافی کا مگ تمہارے سر پر توڑنا پڑے گا؟"

میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ نہ جانے کب ناشتا میرے سامنے رکھ چکی تھی۔ اشرف خان نے تو ناشتا شروع بھی کر دیا تھا اور میری محویت ہی کی وجہ سے وہ منہ چلاتے ہوئے بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ زرینہ بھی کپ تھامے مصنوعی خفگی

سے مجھے گھور رہی تھی۔ "آخر ایسی محویت سے تم پڑھ کیا رہے تھے؟" اشرف خان نے پوچھا۔ میں نے اخبار اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اخبار میز پر پھیلا لیا۔ وہ ناشتا بھی کرتا رہا اور فیچر بھی پڑھتا رہا۔ اس دوران میں نے بھی ناشتا شروع کر دیا اور فیچر کا بقیہ حصہ بھی تلاش کر کے پڑھ لیا۔ اشرف خان پڑھ چکا تو اخبار اس کے سامنے سے زرینہ نے اپنی طرف کھسکا لیا۔

"لڑکا تو خاصے دولت مند گھرانے کا معلوم ہوتا ہے۔" اشرف خان نے سرسری سے لہجے میں تبصرہ کیا۔

"ہاں۔" میں نے تائید کی "مجھے اس نے بتایا تھا کہ اس کا باپ کوئی صنعت کار قسم کی چیز ہے۔ اس کا باقی خاندان بھی کافی آسودہ حال لگتا ہے۔ میں اسے اس کے چچا کی کوٹھی تک چھوڑ کر آیا تھا۔ کافی شاندار کوٹھی تھی۔"

"ویسے تمہیں اس سے اتنی بے نیازی بھی نہیں برتنی چاہیے تھی۔" اشرف خان سگار سلگا کر بولا "اس کے ساتھ جا کر گھر والوں سے مل لینا چاہیے تھا۔ تعلقات استوار ہو جاتے۔ وقت پڑنے پر آدمی کبھی کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے۔"

"تم میرے اس وقت کے محسوسات کو نہیں سمجھ سکتے۔" میں نے ملائمت سے کہا "میں زندگی میں پہلی بار تین آدمیوں کو قتل کر کے آ رہا تھا۔" صعوبتوں نے میرا جسم شل اور دماغ ماؤف کر رکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ راشد کے گھر پر مجھے بڑے ہجوم کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ان میں پولیس والے بھی ہوں گے اور اخبار والے بھی۔ میں اپنے اندر اتنے لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں پا رہا تھا۔ تمہیں تو اندازہ ہونا چاہیے کہ ہم جیسے لوگوں کے دل میں ویسے ہی چور ہوتا ہے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میرے منہ سے کوئی ایسی ویسی بات نہ نکل جائے یا کوئی ویسے ہی میرے بارے میں کسی قسم کی چھان بین نہ شروع کر دے۔ جن تین بدبختوں کو میں قتل کر آیا تھا وہ بے شک موت سے بھی بڑی کسی سزا کے مستحق تھے لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ کسی کو اس سلسلے میں راشد کی یا میری ہی کسی زبانی تمالت کی وجہ سے کچھ علم ہو گیا تو بجائے میری دلیری پر مجھے شاباش ملنے کے میری کھنچائی نہ شروع ہو جائے۔ بس کچھ اسی قسم کی مبہم سی سوچوں کی بناء پر میری احتیاط پسندی نے مجھے وقتی طور پر گریز اور کنارا کشی ہی کا مشورہ دیا تھا۔ باقی رہا تعلقات استوار ہونے کا سوال۔ تو وہ بعد میں بھی ہو سکتے ہیں' جب یہ معاملہ پرانا ہو چکا ہو گا۔"

"ہاں... یہ باتیں تو تمہاری ٹھیک ہیں۔" اشرف خان نے اثبات میں سر ہلایا۔ اب وہ مجھے عمر میں بڑا اور تجربے کار ہونے کے باوجود زیادہ عقل مند نہیں لگتا تھا۔ میری عدم موجودگی میں اس نے جو طرز عمل اختیار کیا تھا اور راشد کے متعلق جان کر جس طرح بات کی تھی اس سے وہ مجھے کافی سادہ لوح بلکہ کسی حد تک گاؤدی سا لگنے لگا تھا۔ میں نے ایک اندازہ یہ بھی قائم کیا تھا کہ ہنگامی حالات میں معقول فیصلے کرنے اور ان سے نمٹنے کی صلاحیت بھی اس میں کچھ زیادہ نہیں تھی' لیکن مجموعی طور پر وہ قابل قدر آدمی تھا۔ اور دوست' ساتھی اور شریک کار کے طور پر تو بہت ہی بے نظیر شخص تھا۔

اس روز سے ہم نے کام شروع کر دیا۔ مالی حالت چونکہ ایک بار پھر کچھ کمزور ہو چکی تھی اس لئے ذاتی کھیپ لانے کا پروگرام ہم نے مزید کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر دیا اور آرڈر کے کام کی تیاری کرنے لگے۔ چرس کی ایک بہت بڑی کھیپ لے جانے اور سونے اور جعلی ولایتی شراب کی ایک کھیپ لانے کا کام مل رہا تھا۔

روانگی کی تیاریوں کے دوران اشرف خان نے ایک مرتبہ کہا۔ "یہ خیال رکھنا محمد افضل کہ اس مرتبہ جاتے وقت بھی اور آتے وقت بھی کھیپ' ہائی جیک ہونے کا سخت خطرہ موجود ہے۔ اگر ایسے کوئی آثار دیکھو تو جان لڑا دینا لیکن مال نہ چھوڑنا ورنہ مال کی مالک پارٹیاں ہماری بوٹیاں نوچ کر کھا جائیں گی اور ہمیں اس دھندے سے بے دخل کر کے چھوڑیں گی اور اگر ہم نقصان پورا کرنے کی کوشش کریں گے تو دیوالیہ ہو جائیں گے لیکن نقصان پورا نہیں ہو گا۔"

"کس کی طرف سے ہائی جیکنگ کا خطرہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ماسٹر لبھو کے ٹولے کی طرف سے۔" اس نے جواب دیا "ہائی جیکنگ بھی ان کے کاروبار کا ایک اہم حصہ ہے اور عام طور پر وہ دشمنوں پر یہ داؤ بھی آزماتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ دیکھا جائے گا۔" میں نے اپنا جرمن لیوگر صاف کرتے ہوئے کہا۔ یہ ریوالور پچھلے چکر میں ہمیں ہندوستان میں رہائش پذیر ایک افغان نے دیا تھا۔ وہ اس پارٹی کے ساتھ تھا جس سے ہم نے مال لیا تھا۔ مجھے اشرف خان نے بتایا تھا کہ شکرگڑھ' چونڈہ' چھمب' جوڑیاں اور لاہور کے آس پاس سے وہ شخص یوں سرحد عبور کرتا رہتا تھا جیسے اپنے گھر کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا جائے۔ ادھر افغانستان سے ہمارے آزاد علاقوں میں آتا اور دو میل چوڑی اس سرحدی پٹی میں سفر کرتے ہوئے ملک کے کسی بھی حصے میں داخل ہو جاتا یا پھر افغانستان سے تاشقند کے راستے روس

چلا جانا اس شخص کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ وہ آج کہیں ہوتا تھا اور کل کہیں۔ سرحدی راستوں اور ان کے چور دروازوں پر وہ شخص اتھارٹی تھا۔

اشرف خان کی رائے میں وہ بہت ہی کام کا آدمی تھا اور اشرف خان اس سے تعلقات بڑھانے کا سخت خواہش مند تھا لیکن اس سے ملاقات شاذونادر ہی ہوتی تھی اور اس کا رویّہ ہم جیسے اسمگلروں سے ایسا ہی ہوتا تھا جیسا کالج کے لڑکوں کا پرائمری اسکول کے بچوں سے ہوتا ہے۔

مجھ سے مل کر اور تھوڑی دیر باتیں کر کے وہ نہ جانے کیوں بہت خوش ہوا تھا۔ اجڑین علاقے کے ایک کھنڈر میں ہماری محفل جمی تھی۔ پینے پلانے کا دور بھی چلا تھا۔ یہ کھنڈر بڑے کام کی جگہ تھی۔ آئے دن یہاں معلوم نہیں کس کس کی محفلیں جمتی تھیں۔ عموماً یہاں کونوں کھدروں میں پتھروں اور اینٹوں تلے کسی ایک پارٹی کے دوسری پارٹی کے نام چھوڑے ہوئے رقعے وغیرہ بھی ملتے تھے۔ ان تحریری پیغامات کو وہ پارٹیاں خود ہی سمجھ سکتی تھیں۔

یہیں اس شخص حکمت اللہ تاجک نے کسی بات پر ترنگ میں آکر مجھے یہ نیا لیوگر تحفتاً دیا تھا حالانکہ میری نظر اس کے مشین پسٹل پر تھی۔ وہ چھوٹے سائز کا بہت ہی خوبصورت اور بہت ہی کام کی چیز تھی۔ میں نے اجنبیت اور تکلف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے لئے دست سوال دراز بھی کردیا تھا مگر اس نے نہایت شائستگی سے انکار کردیا تھا حالانکہ میں نے قیمت کی بھی پیشکش کردی تھی۔

حکمت اللہ جو فارسی، پشتو، اردو، انگریزی، روسی اور تین چار دوسری علاقائی زبانیں روانی سے بولتا تھا مجھے بتانے لگا تھا کہ وہ مشین پسٹل اس کے پاس کافی عرصے سے ہے اور بہت ہی وفادار' ہتھیار ثابت ہوا ہے۔ اس سے اسے ایک جذباتی سا لگاؤ محسوس ہونے لگا ہے اس لئے وہ کسی بھی قیمت پر نہیں دے سکتا البتہ وہ کوشش کرے گا کہ اگلے کسی چکر میں ملاقات کا امکان ہو تو ویسا ہی ایک اور مشین پسٹل میرے لئے لیتا آئے یا کسی کے ہاتھ بھجوادے۔

اس چکر میں حکمت اللہ تاجک سے ملاقات ہونے کی موہوم سی امید تھی۔ جس پارٹی سے ہم مال لینے جارہے تھے اس سے اس کی خاصی دوستی تھی اور کبھی کبھار اگر وہ انڈیا میں ہوتا تھا تو ان کی 'اعزازی سرپرستی' کی غرض سے ان کے ساتھ چلا آتا تھا۔

دوسری رات ہم مہم پر روانہ ہوئے اور تیسری رات خیریت سے واپس بھی آگئے۔ حکمت اللہ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کسی نے ہمارا مال ہائی جیک کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ غرضیکہ کوئی بھی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ بس معلومات میں تھوڑا سا اضافہ ہوا اور وہ یہ کہ کبھی کبھار ہمیں راستے میں جو 'تعاون پسند' قسم کے سرکاری لوگ ملتے تھے انہوں نے رشوتوں کے ریٹ کچھ بڑھادیئے تھے۔

اس کھیپ کا منافع کیش کی صورت میں ہم تک پہنچنے میں تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا۔ اس دوران ہم حسب معمول عیش و آرام کرتے رہے۔ اس ٹرپ سے ہماری مالی حالت خاصی بہتر ہوگئی اور ہم افغانستان سے 'کاروبار' کرنے کا پروگرام بنانے لگے۔ اس سلسلے میں جن پارٹیوں سے ہماری بات چیت ہوئی ان کا مشورہ یہ تھا کہ اگر ہم ان اطراف میں کاروبار کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پشاور میں رہائش اختیار کرنی چاہیے لیکن ہم اپنا اصل اڈا 'ہیڈ کوارٹر اور رہائش شہزاد کوٹ میں ہی رکھنا چاہتے تھے۔ ہمارا مکان ہی ہمارا اڈا' ہیڈ کوارٹر اور رہائش گاہ غرضیکہ سب کچھ تھا۔ اشرف خان تو اس شہر میں خاصے طویل عرصے سے رہ رہا تھا' میں خود تھوڑے ہی عرصے میں اس شہر سے اتنا مانوس ہوچکا تھا کہ کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ یہاں بے پناہ سکون بھی تھا اور نہ جانے کیوں بے پناہ تحفظ کا بھی احساس ہوتا تھا۔ یہاں ہم اپنے آپ کو کسی پرسکون جھیل کی تہ میں بیٹھے ہوئے کچھوؤں کی طرح محفوظ محسوس کرتے تھے۔ بہرحال ہم پشاور میں اپنے کاروبار کے سلسلے میں ایک برانچ آفس قائم کرنے پر غور کررہے تھے۔

ابھی ہم اس سلسلے میں انتظامات میں مصروف تھے کہ ایک اور بڑی کھیپ کا آرڈر مل گیا۔ یہ کھیپ لانا اتنا آسان تھا کہ اس کے لئے انکار کیا ہی نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے بعد ہماری مالی حالت مزید بہتر ہوسکتی تھی۔ چنانچہ ہم صرف تین دن کے وقفے کے بعد ہی اس کاروباری دورے پر روانہ ہوگئے۔ اس مرتبہ یک طرفہ تک ٹرپ تھا۔ مال صرف امپورٹ کرنا تھا۔ کچھ لے کر نہیں جانا تھا۔ حجم کے اعتبار سے یہ بہت چھوٹی سی کھیپ تھی لیکن تھی بے حد منافع بخش۔ مال سارا کا سارا اشرف خان کی گاڑی ہی میں آگیا تھا۔ چاندی کی سلاخیں تھیں اور مارفین کے انجکشن۔ مارفین کے انجکشن پر ان دنوں پاکستان میں کسی وجہ سے غیر معینہ مدت کے لئے پابندی لگ گئی تھی اور یہ انجکشن بلیک میں دس پندرہ گنا قیمت پر بک رہے تھے۔ اس کھیپ کے ساتھ روسی ساخت کے پلاسٹک بموں کی ایک چھوٹی سی پیٹی بھی تھی جو آرڈر دینے والی پارٹی

نے نہ جانے کس مقصد کے تحت منگوائی تھی۔

ہم عام طور پر جس قسم کا مال لاتے اور لے جاتے تھے' یہ کھیپ اس سے ذرا مختلف تھی۔ اور ہمارا یہ ٹرپ بھی غیر معمولی طور پر خوشگوار اور آسان رہا تھا۔ مال ہمیں ایک دو دن کے لئے اپنے ہاں گیراج ہی میں رکھنا تھا۔ مال کی وصولی کے لئے ایک شخص کو لاہور سے آنا تھا اور ایک قسم کے کوڈ ورڈ کے ذریعے اپنی شناخت کرا کے ہمیں ہماری رقم کی ادائیگی کر کے مال لے جانا تھا۔

جس روز ہم مال لے کر آئے اس روز بہت خوش تھے۔ شام کے کھانے سے پہلے پینے پلانے کا دور چلنے لگا۔ کاغذوں پر ہم اپنی جمع پونجی اور متوقع رقم کا حساب کتاب کر کے انوسٹمنٹ کا طریقہ کار طے کررہے تھے۔ ہمارے بیشتر کام برآمدے میں پڑی ہوئی ڈائننگ ٹیبل پر ہی ہوتے تھے۔ زرینہ ایک طرف بیٹھی لاتعلقی سے سگریٹ کے کش لے رہی تھی۔ دفعتاً ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔

زرینہ اٹھی اور کونے میں تپائی پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی طرف بڑھی۔ میں نے گلاس میز پر رکھ دیا اور بغور زرینہ کو دیکھنے لگا جو ریسیور اٹھا کر کان سے لگارہی تھی۔ اشرف خان شاید کسی اور سوچ میں گم تھا۔ وہ سگار کے کش لیتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے برآمدے کے ایک ستون کو گھور رہا تھا۔ ہم نے ابھی بہت کم پی تھی لیکن سرور محسوس ہونے لگا تھا۔ سرور شاید ہمارے اندر سے پھوٹ رہا تھا۔

زرینہ نے صرف چند لمحے کے لئے کچھ سنا پھر بولی۔ "ایک سیکنڈ ہولڈ کیجئے۔ میں ابھی بات کراتی ہوں۔"

اس نے ٹیلی فون سیٹ اٹھا کر اشرف خان کے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر لا رکھا اور ریسیور اسے تھماتے ہوئے بولی۔ تمہارے مخبر کا فون ہے... نہایت اہم ہنگامی قسم کا پیغام ہے۔"

اشرف خان ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ریسیور اس نے زرینہ کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ "ہیلو۔" کہتے ہی وہ خاموش ہوگیا اور پوری توجہ سے دوسری طرف سے بولنے والے کی بات سننے لگا۔ میں نے ہوا میں خطرے کی بو محسوس کرلی تھی اور میرے اعصاب میں تناؤ سا آگیا تھا۔

دوسری طرف جو کوئی بھی تھا اس نے خاصی طویل بات کی بالآخر اشرف خان نے ریسیور کریڈل پر پٹخا اور یوں اٹھ کھڑا ہوا جیسے کرسی میں لگے ہوئے کسی طاقتور اسپرنگ نے اسے اچھال دیا ہو۔ میں اس سے پہلے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ چکا تھا۔ وہ نہایت بدحواسی سے بولا۔ "پولیس' کسٹم اور ایکسائز....

تینوں محکموں کے آدمی مربوط پروگرام کے تحت چھاپا مارنے یہاں آرہے ہیں۔ میرے مخبر کا کہنا ہے کہ اسے اطلاع دینے میں بھی تاخیر ہوگئی ہے۔ وہ لوگ اب یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس مرتبہ رشوت سے کام نہیں چلے گا۔ کوئی لمبا ہی چکر ہے۔ اوپر سے دباؤ پڑا ہے۔ ہمارے تمام رابطے اور ذرائع دریافت کرلئے گئے ہیں اور کچھ لوگوں کو گرفتار بھی کیا گیا ہے۔ مجھے حیرت یہ ہے کہ کسٹم والوں کو تو... غالباً اس شہر کے وجود کا بھی علم نہیں تھا۔ چہ جائیکہ ہمارا ٹھکانہ۔ آخر وہ کس طرح یہاں تک آپہنچے؟ اور پھر اس طرح چھاپا جیسے ہم بہت ہی بڑے... بہت اونچے درجے کے اسمگلر ہیں!!"

"اب یہاں کھڑے سوچ بچار ہی کرتے رہو گے یا نکل بھاگنے کی فکر بھی کرو گے؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"ہاں۔ میں اپنی کچھ چیزیں لے لوں۔" وہ تیزی سے اپنے کمرے کی طرف دوڑا۔ اسی لمحے باہر کوئی گاڑی رکنے کی آواز آئی اور پھر گیٹ دھڑ دھڑایا جانے لگا۔ دھڑ دھڑانے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ گیٹ چند لمحے بعد قبضے سے اکھڑ کر فرش پر آرہے گا۔

اشرف خان چند لمحے بعد اپنے کمرے سے صرف ایک بریف کیس اٹھائے دوڑتا ہوا نکلا۔ اس وقت تک میں بھی خواب گاہ سے اپنا ریوالور نکال لایا تھا۔ اور اسے میں نے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ مجھے اور کیا لینا چاہیے تھا۔ میرے پاس اور تھا ہی کیا؟

اسی لمحے میں نے گیٹ والی دیوار پر ایک شخص کا سر نمودار ہوتے دیکھا۔ انہوں نے دیوار پھاند کر اندر آنے کے لئے چڑھنا شروع کردیا تھا۔ وہ شخص جسے میں اوپر چڑھتے دیکھ رہا تھا بائیں ہاتھ سے دیوار پر گرفت رکھنے کی کوشش کررہا تھا اور اس

کے دائیں ہاتھ میں ریوالور تھا۔ جیسے ہی وہ کچھ اور اوپر ہوتا اس کے لئے ہمیں نشانہ بنانا ذرا بھی مشکل نہ ہوتا کیونکہ ہم گویا کھلے میدان میں کھڑے تھے۔ ادھر شاید اشرف خان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے؟ فرار کی کوشش کرے، مقابلہ کرے یا گرفتاری دے۔

چنانچہ میں نے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کیا اور ریوالور نکال کر دیوار پر چڑھتے ہوئے شخص کی کھوپڑی کا نشانہ لے کر گولی چلادی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ابھرتا ہوا سر دیوار پر سے غائب ہوگیا۔

اس وقت تک اشرف خان غالباً فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور خواب گاہ کی طرف دوڑا۔ زرینہ کی طرف اس کی ذرا بھی توجہ نہیں تھی۔ میں نے مڑ کر ایک نظر زرینہ کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپید پڑ چکا تھا اور وہ واش بیسن کے قریب کھڑی بھیڑیوں کے نرغے میں گھری ہوئی ہرنی کی طرح ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید اس کی اس کیفیت پر میرا دل خون ہوجاتا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس وقت اپنی جان کے تحفظ کا مسئلہ سب سے زیادہ اہم معلوم ہورہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ اشرف خان کی فکر کی جاسکتی تھی جو اپنے ہاتھ پیروں اور اپنی ہمت کے بل پر ساتھ دوڑ سکتا تھا۔

"آؤ زرینہ... جلدی آؤ۔" میں نے ہاتھ ہلا کر گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ اس نے متذبذب سے انداز میں قدم اٹھایا۔ اس کی قوت فیصلہ جواب دے چکی تھی۔ موت یا کسی اور سنگین خطرے سے خوفزدہ ہوکر دوڑنا جبلی اور فطری سی بات ہے۔ لیکن اس وقت وہ جبلی ردِ عمل ظاہر کرنے سے بھی قاصر تھی۔ اس نے دو لمبے لمبے ڈگ بھرے پھر فرش پر پڑی ہوئی کسی چیز سے الجھ کر گر گئی۔ شاید وہ کوئی برتن تھا اور اس کے اپنے ہی ہاتھ سے گرا تھا۔

زرینہ گری تو دوبارہ اٹھ نہیں سکی۔ ہم اس وقت تک خواب گاہ میں پہنچ چکے تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے رک کر زرینہ کا انتظار کرنا چاہا لیکن اسی لمحے گیٹ کی طرف سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ گولی غالباً کسی ڈائننگ چیئر سے ٹکرائی تھی کیونکہ میں نے لکڑی کے پرخچے اڑنے کی آواز سنی تھی۔

اس وقت تک اشرف خان عقبی کھڑکی کھول چکا تھا۔ اس طرف بھی دور دور تک جھاڑ جھنکاڑ پھیلے ہوئے تھے۔ اشرف خان اندھا دھند باہر چھلانگ لگانے لگا۔ لیکن میں نے لپک کر اس کا بازو پکڑا اور پہلے باہر جھانک کر اطمینان کیا کہ ادھر کوئی موجود تو نہیں۔ عین ممکن تھا کہ مکان کو گھیرے میں لے لیا گیا ہو۔ مگر اس طرف کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ قد آدم گھاس بھی ساکت تھی۔ اشرف خان نے باہر نشیب میں چھلانگ لگادی۔ زرینہ کے خیال کو بالائے طاق رکھتے ہوئے میں بھی اس کے پیچھے کود پڑا۔ سیم زدہ کچی زمین کی پٹی عبور کرکے ہم قد آدم گھاس میں کبڑے ہوکر دوڑتے چلے گئے۔

دفعتاً میں نے ایک گونج دار آواز سنی۔ غالباً کوئی میگافون پر بول رہا تھا "اشرف خان! بھاگنے کی کوشش فضول ہے... اپنے آپ کو ہمارے حوالے کردو۔ تمہارے ساتھ نرمی برتی جائے گی۔"

اتنا تو خیر مجھے بھی اندازہ تھا کہ جن محکموں سے ان لوگوں کا تعلق تھا ان سے کس قسم کی نرمی کی توقع کی جاسکتی تھی جبکہ ان کے ایک آدمی کی کھوپڑی بھی میرے ہاتھوں اڑ چکی تھی۔

میں نے ایک لمحے کے لئے گھاس سے سر ذرا نکال کر مڑ کر دیکھا۔ خواب گاہ کی جس کھڑکی سے ہم کودے تھے اس میں دو آدمی آدھے دھڑ سے لٹکے ہوئے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں میگافون تھا اور دوسرے کے ہاتھ میں ریوالور۔ کھڑکی میں صرف دو ہی آدمیوں کے لئے کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔ باقی لوگ شاید ان کے پیچھے تھے۔ ہمارے دوڑنے سے گھاس بری طرح ہل رہی تھی اس لئے انہیں یقیناً یہ تو اندازہ تھا کہ ہم کہاں ہیں اور کس طرف دوڑ رہے ہیں لیکن انہوں نے ہمارا تعاقب ابھی تک شروع نہیں کیا تھا۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ شاید ابتداء ہی میں میرے ہاتھوں اپنے ایک ساتھی کے مارے جانے کی وجہ سے وہ کافی محتاط یا شاید خوف زدہ ہوگئے تھے۔ انہوں نے غالباً تین سیکنڈ انتظار کیا اور جب ہمیں رکتے نہیں دیکھا تو ریوالور والے نے ریوالور چوکھٹ پر ٹکا کر اور قدرے جھک کر فائر کیا۔ کمبخت ریوالور کیا تھا گویا چھوٹی سی توپ تھی۔ دھماکے سے میرے کان جھنجھنا اٹھے۔ غنیمت تھا کہ اس وقت میں پیچھے مڑ کر دیکھ چکا تھا اور اس شخص کے پوزیشن لیتے ہی پہلو کے بل گھاس میں گر چکا تھا۔

اشرف خان البتہ اپنی رو میں رکوع کی سی حالت میں اور ناک کی سیدھ میں دوڑتا جارہا تھا۔ ظاہر ہے میں گولی کو دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن مجھے اتنا اندازا ضرور ہوگیا کہ گھاس کو چیرتی ہوئی وہ وہاں سے گزری تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اشرف خان کو لڑکھڑاتے، گرتے دیکھا۔

میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں مزید فائرنگ کے قوی امکان کو نظر انداز کرتے ہوئے اٹھ کر اشرف خان کی طرف لپکا لیکن

[...]ں تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ اٹھ کر بری طرح لنگڑاتا ہوا [...]ک بار پھر دوڑنے لگا۔ مجھے یہ تو اندازہ ہوگیا کہ اسے گولی لگ [...]ی ہے لیکن میں یہ نہیں دیکھ سکا کہ لگی کہاں ہے۔

[...]اس کے بعد بھی بہت سے فائر کئے گئے لیکن گولیاں [...]ہمارے قریب سے گزرتی رہیں۔ گولیوں سے بچنے کے لئے [...]ہم ممکن حد تک حکمت عملی سے بھی کام لیتے جارہے تھے۔ [...]ں اشرف خان کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ میں نے دیکھا اس کی [...]انگ پر کوٹ سے ذرا نیچے پتلون پر ایک سرخ لکیر پھیلتی جارہی [...]ی۔ کئی بار وہ بری طرح لڑکھڑایا لیکن دوڑتا رہا۔ بالآخر میں نے اس کے قریب پہنچ کر اس کا ہاتھ تھاما اور ہم شانہ بشانہ دوڑنے لگے۔ اس طرح ہمارے گولیوں کے زد میں آنے کا امکان زیادہ تھا مگر جانے کیوں ہم پر اب فائرنگ نہیں کی جارہی تھی۔ ریوالوروں کی رینج سے تو ہم نکل آئے تھے لیکن ان لوگوں کے پاس یقیناً بڑی رینج کے ہتھیار بھی ہوں گے۔ جانے کیوں انہوں نے ایسا کوئی ہتھیار استعمال نہیں کیا تھا اور نہ ہی کوئی ہمارے تعاقب میں آتا دکھائی دیا تھا۔

اندھیرا پھیل چکا تھا اور ہمارے عقب میں جیسا سکوت چھایا ہوا تھا اس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ اپنے ایک ساتھی کی موت سے خوف زدہ ہوگئے تھے اس لئے اندھیرے میں ہمارے تعاقب میں نہیں آرہے تھے یا پھر ہمیں گھیرنے کے لئے وہ کوئی حکمت عملی اختیار کررہے تھے۔

ہم اس قطعہ اراضی پر ترچھے رخ بھاگ رہے تھے۔ جو گھاس سے بھرا ہوا تھا۔ اس طرح ہم ایک چھوٹی سی سڑک کے [...]رے تک پہنچ سکتے تھے جس کے دونوں طرف خالی مکانات تھے۔ اگر ہم بخیر وعافیت اس سڑک تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتے تو آبادی کی بھول بھلیوں میں گم ہونے کی کوشش کرسکتے تھے بشرطیکہ کسٹم یا پولیس وغیرہ کا کوئی آدمی ہم سے پہلے ہی صحیح راستے سے چکر کاٹ کر وہاں ہمارے استقبال کے لئے موجود نہ ہوتا۔

میرا اندیشہ بے جا نہیں تھا۔ گھاس سے نکل کر اور کچے [...]ے گزر کر جب ہم قدرے بلندی پر بنی ہوئی چھوٹی سی سڑک [...]پر پہنچے اور اس کے ایک کنارے پر پھیلی ہوئی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے ایک میں گھسنے لگے تو اچانک ہی سامنے سے تیز روشنی نمودار ہوئی۔ وہ غالباً کوئی جیپ تھی جس کی ہیڈ لائٹس اچانک ہی آن کی گئی تھیں۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم صحیح طور پر روشنی کی زد میں نہیں آئے تھے۔ ہیڈ لائٹس آن ہوتے ہی ایک ساتھ کئی فائر کئے گئے۔

غالباً ہماری ٹانگوں میں گولیاں مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ان گلیوں کا فرش اینٹوں کا تھا۔ اینٹوں کے ٹکڑے اڑ کر مجھے اپنے جسم سے ٹکراتے ہوئے محسوس ہوئے۔ روشنی کی سیدھ میں نہ ہونے کی وجہ سے ہم بال بال بچ گئے۔ البتہ اشرف خان یکدم واپس مڑنے کی کوشش میں گرتے گرتے بچا۔ غنیمت تھا کہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہی تھا ورنہ اگر وہ ایک بار گر جاتا تو اسے اٹھانے کے لئے رکنا غالباً ہم دونوں کی موت کا باعث بنتا۔

اشرف خان کی کیفیت اس وقت کیا تھی اس کا تو مجھے اندازہ نہیں تھا لیکن اپنے بارے میں اس وقت یہ محسوس کرکے مجھے خود بھی حیرت ہورہی تھی کہ میرے حواس معمول سے کچھ بہتر طور پر ہی کام کررہے تھے۔ میں قطعاً بد حواس نہیں تھا۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ درندوں کے حواس اس وقت زیادہ مستعد ہوجاتے ہیں جب وہ مصیبت میں ہوتے ہیں۔ انسان بھی میرے خیال میں بنیادی طور پر کافی حد تک درندہ ہی ہے۔ البتہ شہری زندگی اور جدید تمدن نے اس سے درندوں والے بیشتر اوصاف اور اچھی خصوصیات چھین لی ہیں اور ان کی جگہ زیادہ بری خصلتیں بھردی ہیں۔ اشرف المخلوقات ہونے کے ناتے خدا نے اسے جن اعلا خوبیوں سے نوازا تھا اور جن کی مدد سے اس کی درندگی کو دبایا گیا تھا وہ کافی تیز رفتاری سے معدوم ہورہی ہیں۔

میں اشرف خان کا ہاتھ تھامے اس طرح گھوما کہ روشنی کی زد میں نہ آنے پاؤں۔ جیپ گلی کے دوسرے سرے پر کھڑی تھی۔ اس نازک لمحے میں بھی میں ان لوگوں کی غلطی کا تجزیہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔ گلی میں کوئی خاص روشنی نہیں تھی، اگر لوگ خاموشی سے چند سیکنڈ اور انتظار کرلیتے اور ہیڈ لائٹس آن نہ کرتے تو ہم اپنی جھونک میں کم از کم گلی کی وسط میں پہنچ چکے ہوتے۔ اس وقت اگر وہ لائٹس آن کرکے فائرنگ کرتے تو ہمارے بچنے یا واپس بھاگنے کے امکانات بہت کم ہوتے لیکن انہوں نے بے صبری اور حکمت عملی کی کمزوری کا مظاہرہ کیا اور ہمارے گلی میں قدم رکھتے ہی ایکشن میں آگئے۔

فائر دوبارہ کئے گئے۔ غالباً دو ریوالور اور ایک رائفل استعمال کی جارہی تھی۔ تاہم اس سے قبل ہی ہم گلی کا موڑ مڑ چکے تھے۔ دوڑتے ہوئے ہم دوسری گلی میں داخل ہوئے۔ اشرف خان غالباً ناک کی سیدھ ہی میں دوڑتے رہنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ جیپ ہمارے تعاقب میں آئے گی جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ ایک بار پھر ہمیں سامنے سے آکر پکڑنے کی

کوشش کریں گے اور اگر وہ ہمارے تعاقب میں بھی آتے تب بھی ہمارا محض دوڑتے رہنا کوئی دانشمندی نہیں تھی۔ جیپ کیے آگے آگے ہم کہاں تک دوڑ سکتے تھے۔ خصوصاً جبکہ اشرف خان زخمی بھی ہو چکا تھا۔

ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم انہیں چکر دے کر چند منٹ کی مہلت حاصل کرتے اور پھر کسی ایسی سمت میں نکلنے کی کوشش کرتے کہ وہ لوگ الجھن میں پڑ جاتے اور کوئی فیصلہ نہ کر پاتے کہ ہم کدھر گئے ہوں گے۔ اگر ہم انہیں چکر دینے کے لئے اسی گلی میں کہیں غائب ہو جاتے تو اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ لوگ صحیح نتیجہ اخذ کر لیتے کہ ہم یہیں کہیں چھپے ہوئے ہیں اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ وہ سمجھتے ہم آگے اور کسی گلی کی طرف نکلے ہیں۔

شہزاد کوٹ ایک چھوٹا شہر تھا۔ شام گہری ہوتے ہی یہاں گلی کوچوں میں ویرانی چھانے لگتی تھی۔ تین چار جو بڑے بازار تھے ان میں البتہ رات گہری ہونے تک رونق رہتی تھی۔

ایک عسرت زدہ سے مکان کا دروازہ مجھے کھلا نظر آیا۔ دروازہ سالخوردہ، بے ہنگم مگر اب بھی مضبوط نظر آتا تھا۔ دروازہ ایک کشادہ راہداری میں کھلتا تھا جس کے وسط میں تار کے سرے پر چھوٹا سا ایک زرد بلب لٹکا ہوا تھا جس کے پس منظر میں مکڑی کے جالے جھول رہے تھے۔

راہداری میں ایک طرف دو دروازے نظر آرہے تھے جن پر بھاری تالے پڑے ہوئے تھے۔ دوسری طرف جنگلے دار چوبی زینہ اوپر جا رہا تھا۔ راہداری کے دوسرے سرے پر زینے کے عقب میں اگر مکان کے نچلے حصے کا دروازہ تھا تو وہ نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ وہاں تک روشنی کی رسائی نہیں تھی۔ میں اشرف خان کا ہاتھ پکڑ کر اسی مکان میں گھس گیا۔ مکان میں قدم رکھتے ہی میں نے سب سے پہلے تو اشرف خان کی پشت بلب کی طرف کرتے ہوئے یہ جائزہ لیا کہ اس کے جسم سے خون ٹپکتا تو نہیں آرہا۔ خون کے دھبے ہمارا سراغ دے سکتے تھے۔

پشت پر اس کی پتلون خون میں بھیگ چکی تھی اور دائیں ٹانگ پر خون پھیلتا ہوا آرہا تھا لیکن ابھی پتلون میں ہی جذب ہو رہا تھا، زمین پر ٹپکنا شروع نہیں ہوا تھا تاہم یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ جلد ہی پتلون کی کم از کم ایک ٹانگ ضرور تر ہو جائے گی اور پھر خون زمین پر ٹپکنے لگے گا۔

اس طرف سے وقتی طور پر مطمئن ہو کر میں نے دو قدم آگے بڑھ کر اچھل کر اس چھوٹے سے بلب پر ریوالور کا دستہ مار کر اسے توڑ دیا جو اس راہداری میں بیمار سی روشنی پھیلائے ہوئے تھا۔ پھر میں نے دروازے کی بھاری کنڈی چڑھا دی اور اشرف خان کا ہاتھ پکڑ کر چوبی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اشرف خان کو سیڑھیاں چڑھنے میں کافی دشواری پیش آرہی تھی۔ دو تین مرتبہ تو وہ بے ساختہ کراہ اٹھا لیکن آدمی حوصلے والا تھا، ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکا۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اب تک گر چکا ہوتا۔

میں اوپر پہنچا تو سامنے ہی ایک کمرے کا بڑا سا دروازہ کھلا نظر آیا۔ کمرے میں خاصی تیز روشنی تھی۔ سامنے ہی دیوار کے ساتھ لوہے کا ایک بڑا سا پلنگ تھا جس پر ایک گھریلو سی عورت دس بارہ سال کے ایک لڑکے کا ہاتھ تھامے بیٹھی تھی۔ دونوں ہی کی آنکھیں پھیلی پھیلی سی تھیں اور وہ خوف زدہ نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہوں نے قریبی گلی میں چند لمحے قبل ہونے والی فائرنگ کی آوازیں اور پھر اپنے مکان کی نچلی منزل سے ہماری آمد کا شور سن لیا تھا۔ وہ غالباً ماں بیٹا تھے۔ خوف کے مارے شاید ان میں اپنی جگہ سے ہلنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔

میں سیدھا کمرے میں جا گھسا۔ ریوالور میرے ہاتھ میں تھا۔ عورت نے چیخنے کے لئے منہ کھولا لیکن اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ لڑکا اس سے چمٹ گیا۔ میں نے ریوالور سے عورت کو ڈرانے کے بجائے ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ عورت کے خوف میں اضافہ ہوا تو شاید یک لخت اس کے حلق سے فلک شگاف چیخ بلند ہو جائے۔

میں نے ان کے قریب جانے کی بھی کوشش نہیں کی اور نہ ہی درشت اور دھمکی آمیز لہجہ اختیار کیا۔ میں نے حتی الامکان شیریں لہجے میں اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن جتنی دور سے ہم دوڑتے ہوئے آرہے تھے اور جس طرح ہانپ رہے تھے اس کی وجہ سے مجھے اپنے لہجے میں شیرینی پیدا کرنے میں خاصی دقت پیش آئی۔

"بہن!" میں نے جلدی سے کہا۔ "ہم سے گھبرانے اور ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ ہم چور، ڈاکو وغیرہ نہیں ہیں۔ ہماری ذات سے تمہیں یا تمہارے بچے کو قطعاً کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ صرف دشمنی کے چکر میں کچھ بدمعاش اور کچھ پولیس والے ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں..... ویسے ہم شریف آدمی ہیں..... تمہیں ہم سے کوئی خطرہ نہیں... خدا کے لئے شور مت کرنا ورنہ مجبوراً ہمیں سختی کرنی پڑے گی۔"

التجا نے دھمکی سے بہتر اثر دکھایا۔ عورت کے چہرے کے عضلات جو بری طرح کھنچے ہوئے تھے، کچھ ڈھیلے پڑنے

حتیٰ کہ لڑکے پر بھی میری بات کا خوشگوار اثر ہوا تھا۔ عورت نے تھوک نگل کر گہری سانس لی اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ "کیا چاہتے ہو تم .....؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "بس تم خاموش بیٹھی رہنا اور کوشش کرنا کہ تمہارا بچہ بھی کوئی آواز نہ نکالے خواہ ہم یہاں کچھ بھی کرتے پھریں اور خواہ تم باہر کسی کو کچھ بھی کہتے سنو۔"

قریبی دیوار پر مجھے سوئچ بورڈ نظر آگیا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سوئچ آف کردیا۔ کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ میرے اندازے کے مطابق پورا مکان ہی تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔ مکان کا نچلا حصہ غالباً گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ ہوا میں پیاز' چاول اور چند دوسری چیزوں کی ملی جلی بو پھیلی ہوئی تھی۔ اوپر کی منزل پر بھی اگر کوئی اور کمرا زیر استعمال تھا تو اس وقت وہاں روشنی نہیں تھی۔

اس کمرے میں گلی کے رخ پر بھی تین محرابی دروازے بنے ہوئے تھے جن میں پٹ نہیں تھے۔ ان دروازوں سے آگے خاصی لمبی بالکونی تھی جو گلی کی طرف نکلی ہوئی تھی۔ اس بالکونی پر چقیں پڑی ہوئی تھیں۔

اشرف خان ابھی تک بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اس کی سانسوں کی آواز کسی بلی کی خرخراہٹ سے مشابہ محسوس ہورہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی مجھے کہیں دور سے کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔ یقیناً یہ اسی جیپ کی آواز تھی جس میں موت کے ہرکارے ہماری تلاش میں پھر رہے تھے۔ جیپ کبھی سست رفتاری سے آگے جاتی ہوئی محسوس ہورہی تھی اور کبھی اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ پیچھے آرہی ہے۔ وہ لوگ یقیناً بری طرح ہماری تلاش میں سرگرداں تھے اور کسی صورت بھی یہ مہم ترک کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتے تھے۔

چند لمحے بعد میں نے جیپ کی آواز زیادہ قریب آتے محسوس کی۔ شاید وہ لوگ بہت سی گلیوں میں ایک سرے سے جھانکنے کے بعد واپس آرہے تھے۔ اشرف خان کا ہاتھ اب تک میرے ہاتھ میں تھا اور میں محسوس کررہا تھا کہ اس کے جسم میں ایک عجیب سا ارتعاش آچکا ہے۔ وہ یوں مضبوطی سے میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھا گویا اسے خطرہ ہو کہ ہاتھ چھوڑا تو گر پڑے گا۔

"تم بھی اسی آہنی پلنگ پر ایک طرف کو بیٹھ جاؤ۔" میں نے نام لئے بغیر اشرف خان کو مخاطب کیا۔

"میں .... میں بیٹھ نہیں سکوں گا۔" وہ مرتعش اور بوجھل آواز میں بولا۔ "میں شاید صرف لیٹ سکتا ہوں۔ وہ بھی اوندھا' پہلو کے بل۔"

"ٹھیک ہے۔ تم لیٹ جاؤ۔ میں ذرا بالکونی سے گلی میں دیکھتا ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا پھر میں نے نہایت ادب' احترام اور ملائمت سے عورت کو مخاطب کیا۔ "باجی! اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو اپنے بچے کو لے کر ادھر دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ جائیں۔ ہم بس آپ کو کچھ دیر تکلیف دیں گے۔"

اس عورت نے یقیناً سوچا بھی نہیں ہوگا کہ کبھی دو آدمی اس حالت میں کہ ان میں سے ایک زخمی ہوگا اور ایک ریوالور بدست' درانہ وار اس کے مکان میں گھسیں گے' پولیس ان کے تعاقب میں ہوگی مگر وہ اس کے ساتھ اس قدر تہذیب' شائستگی سے پیش آئیں گے۔

"ہم دوسرے کمرے میں چلے جائیں؟" اندھیرے میں عورت کی سرگوشی ابھری۔ میں نے اس آواز میں اشتیاق کی جھلک محسوس کی۔ اب میں اس پر اس حد تک بھی اعتبار کرنے پر تیار نہیں تھا کہ اسے اس کے مکان کے دوسرے کمرے میں جانے کی اجازت دے دیتا جس کا حدود اربعہ بھی مجھے معلوم نہیں تھا۔

"نہیں ... اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے بدستور ملائمت سے کہا۔ اندھیرے میں دو ہیولوں کی حرکت سے میں نے اندازہ کرلیا کہ ماں بیٹا کرسی پر منتقل ہوگئے ہیں تب میں نے اشرف خان کو پلنگ پر لٹا دیا۔ اس وقت تک جیپ کی آواز سے اندازا ہونے لگا تھا کہ وہ گلی میں داخل ہوچکی ہے۔

میں پنجوں کے بل چلتا ہوا بالکونی میں پہنچا اور چق اٹھائے بغیر اس کے عقب سے گلی میں جھانکنے لگا۔ ریوالور ایک بار پھر میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ جیپ واقعی گلی میں آرہی تھی۔ اس کی رفتار رینگنے کی حد تک کم تھی۔ جس سرے سے وہ گلی میں داخل ہوئی تھی صرف اسی طرف دیواروں میں لگے ہوئے ایک ہک میں اسٹریٹ لائٹ آویزاں تھی جس کی روشنی آدھی گلی کے لئے بھی ناکافی تھی۔ جیپ اس لائٹ سے خاصی آگے آچکی تھی اس لئے میں اس میں موجود افراد کی صورتیں تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن ان کی تعداد اور ان کی تمام حرکات و سکنات کا جائزہ ضرور لے سکتا تھا۔

جیپ کا ہڈ گرا ہوا تھا۔ پچھلی نشست پر موجود دو افراد باوردی تھے اور ان کے ہاتھوں میں ریوالور تھے۔ ڈرائیور کے ساتھ

بیٹھا ہوا شخص سادہ لباس میں تھا مگر اس کے پاس رائفل تھی۔ ڈرائیور کی توجہ صرف ڈرائیونگ پر تھی مگر باقی تینوں اشخاص نہایت چوکنا تھے اور شکار پر نکلے ہوئے چیتوں کی طرح مستعد نظر آرہے تھے۔ وہ مشکوک نظروں سے ہر کونے کھدرے' ہر کھڑکی اور ہر دروازے کا جائزہ لیتے جارہے تھے۔

ایک بار تو انہوں نے اس بالکونی کی طرف بھی دیکھا جس میں میں کھڑا ان کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کی چھٹی حس شاید انہیں میری موجودگی کا احساس دلا رہی ہے۔ ریوالور کے ٹرائیگر پر میری انگلی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا۔ میں چاہتا تو ایک لمحے میں ان تینوں کو گولی کا نشانہ بنا سکتا تھا لیکن جانے کیوں اب میں خوں ریزی سے گریز کررہا تھا۔ شاید اس کی وجہ لاشعوری خوف اور مصلحت بھی تھی۔ میرے ریوالور میں اب صرف پانچ گولیاں تھیں۔ فاضل گولیاں میرے پاس نہیں تھیں۔ اگر کچھ گولیاں ضائع ہوجاتیں تو پھر ہمارے بچنے کا امکان بہت کم تھا کیونکہ ان جیپ والوں کے علاوہ بھی نہ جانے کتنے آدمی ہماری گھات میں تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ شاید وہ اس لئے مکان کو زیادہ مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ وہ مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا جبکہ دروازہ باہر سے مقفل بھی نہیں تھا لیکن پھر مجھے یہ دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا کہ آس پاس کے تین چار اور مکانات بھی اسی طرح تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لوگوں نے یقیناً اطراف میں فائرنگ کی آوازیں سن لی تھیں لیکن ابھی تک کوئی گلی میں نہیں نکلا تھا بلکہ مکانوں کی کھڑکیاں' دروازے بھی بند نظر آرہے تھے۔ اگر لوگ گلی میں جھانک بھی رہے تھے تو شاید میرے ہی جیسا کوئی طریقہ استعمال کررہے تھے جس کے باعث باہر سے انہیں دیکھا نہیں جاسکتا تھا۔

جیپ کی نمبر پلیٹ پر تھوڑی سی روشنی پڑ رہی تھی۔ نمبر پلیٹ پر خاصے جلی حروف میں 'پولیس' لکھا ہوا نظر آرہا تھا۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے آدمیوں کی نظریں بالکونی سے ہٹ گئیں اور وہ دوسرے دروازوں اور کھڑکیوں کا جائزہ لینے لگے۔ جیپ رینگتی ہوئی بالکونی کے نیچے سے گزرتی چلی گئی۔

میں نے انگریزی فلموں میں جرمنوں کو اسی طرح اپنے مفتوحہ اور مقبوضہ علاقوں میں گشت کرتے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں ہمیں تلاش کرنے کا یہ ان کا کیسا انداز تھا۔ شاید انہیں یہ توقع تھی کہ ایک بار پھر ہم خود ہی اچانک کسی کونے کھدرے سے نکل کر ان کے سامنے آجائیں گے۔

گلی کے دوسرے سرے پر پہنچ کر جیپ ریورس گیر میں واپس آنے لگی۔ اس وقت تک کچھ لوگوں نے ہمت کرکے کھڑکیاں دروازے کھول لیے تھے۔ کھڑکیوں میں مردوں کے عقب میں خواتین کے سر بھی دکھائی دے رہے تھے۔ پھر ایک مکان سے ایک شخص نے بہ آواز بلند پنجابی میں جیپ والوں سے پوچھ ہی لیا۔ "خیریت تو ہے جی؟"

جیپ میں سے کسی نے براہ راست اس کے سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ رائفل بردار نے قدرے جھک کر جیپ میں رکھا ہوا میگافون اٹھایا اور بائیں ہاتھ میں اسے تھامتے ہوئے باقاعدہ اعلان کرنا شروع کردیا۔ "خواتین و حضرات! اینٹی اسمگلنگ اسکواڈ اور ایکسائز و کسٹم کے افسران محکمہ پولیس کے تعاون سے اس وقت دو خطرناک اسمگلروں کی تلاش میں مصروف ہیں۔ یہ اسمگلر ایک کسٹم آفیسر کو قتل بھی کرچکے ہیں۔ معزز اور شریف شہریوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ ہوشیار رہیں' کھڑکیاں دروازے بند رکھیں... امید ہے کہ کوئی معزز اور شریف شہری ان اسمگلروں کو پناہ دینے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اگر یہ دونوں کسی کے گھر میں گھس بھی آئے ہوں اور ڈرا دھمکا کر پناہ لینے کے لئے کوشاں ہوں تو گھبرانے کی ضرورت نہیں... موقع ملتے ہی مدد کے لئے پکاریں۔ ہماری پوری کوشش ہوگی کہ یہ دونوں کسی کو نقصان نہ پہنچانے پائیں اور ہم جلدی ہی انہیں قابو میں کرلیں۔ کچھ دیر تک بہت وسیع پیمانے پر ان کی تلاش شروع کی جائے گی۔"

جیپ رینگتی ہوئی واپس گلی کے سرے تک چلی گئی۔ قدرے کشادہ اور پختہ گلی میں پہنچ کر جیپ نے ریورس گیر میں ہی موڑ کاٹا اور پھر قدرے تیز رفتاری سے سیدھی آگے بڑھتی ہوئی میری نظر سے اوجھل ہوگئی۔

لوگوں نے بآواز بلند ایک دوسرے کو کچھ قیمتی مشوروں سے نوازا پھر اپنے اپنے دروازے اور کھڑکیاں بند کرنے شروع کردیئے۔ شکر ہے انہوں نے سرکاری کارندے کے مشورے پر عمل شروع کردیا تھا اور ٹولیاں بنا کر کھڑے ہونے کے لئے گلی میں نہیں نکل آئے تھے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ انہی مشوروں پر عمل کرتے ہوئے میرے عقب میں کمرے میں بیٹھی ہوئی عورت جسے میں نے فوراً اپنی 'باجی' ہونے کا شرف بخش دیا تھا' شور مچانا شروع نہ کردے کیونکہ اس وقت اسے اس کام کا سنہری موقع میسر تھا۔ میں اس سے کافی فاصلے پر بالکونی میں کھڑا تھا اور اشرف خان پلنگ پر اوندھا پڑا ہوا تھا۔ میں ابھی تک اس سے یہ بھی نہیں پوچھ سکا تھا کہ اس کے پاس کوئی

ہتھیار موجود ہے یا نہیں ؟

میں واپس کمرے میں آیا۔ اندھیرا اب اتنا گہرا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس عورت اور اس کے بچے کی طرف دیکھا۔ وہ آرام سے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ اعلان یقیناً انہوں نے بھی سن لیا تھا مگر فی الحال ان کا کوئی گڑبڑ کرنے کا ارادہ معلوم نہیں ہو تا تھا۔ ہمارے نکلتے ہی وہ شور مچا دیتے تو بات دوسری تھی۔

" بی بی! گھر میں اور کوئی نہیں ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

" نہیں.. " عورت نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا " میرا میاں ایک کام سے اپنے گاؤں گیا ہوا ہے۔ صبح آئے گا۔ "

اشرف خان فوراً مجھ سے مخاطب ہوا " لیکن تم بہرحال رات بھر یہاں ٹکنے کا پروگرام مت بنانا۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے محض نفسیاتی حربے کے طور پر وہ دھمکی نہیں دی تھی بلکہ واقعی جلد ہی یہاں وسیع پیمانے پر ہماری تلاش شروع کی جائے گی۔ دو چار گلیوں میں تو شاید ایک ایک گھر کی تلاشی بھی لی جائے۔ "

" بیٹھے بٹھائے یکایک ہی ہماری تلاش شروع ہو گئی ہے اور وہ بھی اس طرح جیسے ملک کے سب سے بڑے اسمگلر ہم ہی ہیں۔ " میں نے تعجب سے کہا۔

" میں خود بھی بے حد حیران ہوں... " اشرف خان کراہ کر بولا۔ " یہاں خاصے بڑے بڑے گرگے پڑے ہیں لیکن آج تک اس طرح کسی کی تلاش شروع نہیں ہوئی۔ اینٹی اسمگلنگ اور کسٹم والوں نے تو کبھی ادھر کا رخ ہی نہیں کیا تبھی ہم لوگوں نے اس شہر کو اپنی کمین گاہ بنایا ہوا تھا۔ کبھی کبھار ایکسائز یا پولیس والے حرکت میں آجاتے تھے تو ان میں ہمارے مخبر اور بھتہ خور موجود ہیں۔ ہمیں کبھی پریشانی نہیں ہوئی تھی۔ یک دم ہی جانے کیوں زلزلہ سا آگیا ہے۔ "

" اس کی دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ " میں نے کہا " یا تو کسی محکمے میں کوئی نیا یا بڑا افسر آیا ہے جس نے تہلکہ مچانے کا پروگرام بنایا ہوا ہے یا پھر اس معاملے کی تہ میں وہی تمہارا ماسٹر لبھو بیٹھا ہوا ہے۔ "

" میرا ذہن بھی انہی دونوں امکانات کی طرف جا رہا تھا۔ " اشرف خان بولا اور ایک بار پھر کراہا۔

" تمہیں گولی کہاں لگی ہے؟ " میں نے پوچھا۔

" کیا بتاؤں... " وہ شرمسار سے لہجے میں بولا " ایک شریف اور گھریلو عورت کی موجودگی میں بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ " پھر وہ گویا موضوع بدلتے ہوئے بولا " اب ارادہ کیا ہے؟ میری تو عقل خبط ہو گئی ہے.... خدا کا شکر ہے میرے ساتھ تم موجود ہو۔ "

" میرا خیال ہے سردست تو ہم انہیں چکر دینے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ اب ہمیں نکل لینا چاہیے۔ " میں نے کہا اور اشرف خان کو اٹھنے میں مدد دینے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ پلنگ سے اتر آیا۔ بریف کیس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

" تمہارے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ موجود ہے؟ " میں نے پوچھا۔

" ہتھیار کا مجھے معلوم نہیں کیوں خیال ہی نہیں آیا۔ " وہ بولا۔ " کسی بھی مصیبت کے وقت راہ فرار اختیار کرتے ہوئے مجھے سب سے پہلا خیال یہ آتا ہے کہ میرے پاس کچھ نہ کچھ رقم موجود ہونی چاہیے۔ میرے خیال میں پیسہ بھی دراصل ایک طرح کا ہتھیار ہی ہے... اپنا بریف کیس اٹھانے کے چکر میں مجھے ریوالور لینے کی مہلت ہی نہیں ملی۔ رائفل بیڈ کے نیچے پڑی تھی لیکن خیر... رائفل تو ایسے وقت میں ساتھ لے کر بھاگنا ویسے ہی مشکل رہتا... بس ایک خنجر ہے جو میری ٹانگ سے بندھا ہوا ہے۔ "

" چلو خیر... اللہ مالک ہے۔ " میں نے بڑے اعتقاد سے کہا۔ " آؤ چلیں۔ " پھر میں نے مڑ کر عورت کو مخاطب کیا " آپ کے تعاون اور مہربانی کا بہت شکریہ باجی! اگر آپ ہمارے جانے کے بعد بھی شور و غل نہ مچائیں تو یہ آپ کی اعلیٰ ظرفی اور دوراندیشی کا ثبوت ہو گا۔ ویسے بھی آپ کے شور مچانے سے ہمیں تو جو نقصان پہنچے گا سو پہنچے گا لیکن آپ بھی کچھ زیادہ فائدے میں نہیں رہیں گی۔ ظاہر ہے پولیس تھانے کی پوچھ گچھ سے آپ کو بھی گزرنا پڑے گا... اور پھر ہم اکیلے تو ہیں نہیں۔ ہمارے ساتھی بھی ہیں۔ ہم اگر پکڑے بھی گئے تو ہمارے ساتھی ان لوگوں کو معاف نہیں کریں گے جنہوں نے ہمیں پکڑوانے میں مدد کی ہو گی۔ مجھے یقین ہے آپ میری بات سمجھ رہی ہوں گی... اور پھر آپ کا تو یہ پیارا سا بیٹا بھی ہے جس کی زندگی اور مستقبل کا آپ کو خیال رکھنا ہے۔ خدا حافظ۔ "

میں اشرف خان کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا۔ عورت غالباً دم بخود بیٹھی تھی۔ امید تو مجھے یہی تھی کہ وہ بعد میں بھی شور نہیں مچائے گی۔ میرے خیال میں لوگوں کو زیادہ دلچسپی اپنے ذاتی تحفظ سے ہوتی ہے۔ اگر ان کی اپنی ذات کو کوئی نقصان نہ پہنچے تو عموماً وہ خاموش تماشائی ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔

نیچے آکر میں نے آہستگی سے دروازے کی کنڈی کھولی اور سر نکال کر گلی میں جھانکا۔ لائن کلیئر ہی نظر آرہی تھی۔ ہم باہر نکلے اور مکانوں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ گلی کے سرے تک ہم خیریت سے پہنچ گئے۔ موڑ سے جھانک کر میں نے قدرے کھلی سڑک پر اس طرف دیکھا جدھر جیپ گئی تھی۔ اس طرف اب کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

ہم سڑک پار کر کے دوسری طرف کی گلیوں میں گھسنا چاہتے تھے لیکن جیسے ہی ہم سڑک کے وسط میں پہنچے، بائیں طرف دور کہیں سے پولیس وسل سنائی دی اس کے ساتھ ہی ریوالور سے فائر کیا گیا۔ گولی نہ جانے کس طرف سے چلائی گئی اور کس طرف گئی اور فائر کرنے والا بھی کوئی دکھائی نہیں دیا لیکن ہم بے تحاشا دوڑنے لگے۔

دوسری طرف کی گلیاں نسبتاً ٹیڑھی میڑھی اور پرپیچ تھیں اور ہم حتی الامکان تیزی سے دوڑ رہے تھے اس کے باوجود مختلف نوعیت کی آوازیں گویا ہمارے تعاقب میں تھیں۔ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ہم تعاقب کرنے والوں کو ڈال دینے میں کامیاب نہیں ہو رہے۔

دوڑتے دوڑتے اشرف خان بے دم ہو گیا اور بار بار لڑکھڑانے لگا تو میں ایک نیم کھنڈر مکان کے شکستہ چھجے کے قریب رک گیا۔ اشرف خان بری طرح ہانپ رہا تھا اس کی پتلون کی دوسری ٹانگ بھی خون سے تر ہوتی جا رہی تھی۔

" اس طرح کام نہیں چلے گا دوست! " وہ بری طرح ہانپتے ہوئے بولا " اب ذرا کچھ دور تک تم میری رہنمائی میں چلو... میرا خیال ہے ہمیں اس شہر سے ہی فرار ہونا پڑے گا اور اس کے لیے گاڑی کا بندوبست کرنا ضروری ہے... "

اس کا خیال درست تھا۔ ہمیں اس وقت گاڑی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ شہزاد کوٹ میں ٹیکسیاں تو چلتی نہیں تھیں ورنہ کسی ڈرائیور سے ٹیکسی چھیننے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ رکشے بھی کچھ ہی عرصہ قبل چلنا شروع ہوئے تھے اور وہ بھی اکا دکا نظر آتے تھے۔ گاڑیاں لوگوں کے پاس بہت کم تھیں اور وہ بھی رات کے وقت تو صرف مین بازاروں میں ہی نظر آتی تھیں۔

چند لمحے ستا کر اشرف خان لنگڑاتا ہوا ایک بار پھر چل پڑا۔ اس بار میں اس کی رہنمائی میں چل رہا تھا۔ کئی گلیوں میں چکرانے کے بعد ہم شہر کی خوشحال آبادی کے پہلو میں آباد کچی بستی میں پہنچ گئے اور تب میں سمجھ گیا کہ اشرف خان کہاں جا رہا تھا۔ یہاں ایک کھلے پلاٹ پر بڑے سے چھپر میں جمی کی ورکشاپ تھی۔ جمی ایک نوجوان موٹر مکینک تھا۔ وہ ایک خوش مزاج کرسچین تھا اور غالباً شہر کا بہترین موٹر مکینک تھا چند ایک شاگرد بھی اس کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ورکشاپ کے قریب ہی ایک نیم پختہ مکان میں رہتا تھا۔ اشرف خان کو جب کبھی گاڑی کا کوئی کام کرانا ہوتا تو اسی سے کراتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ جمی ہمارے اصل پیشے سے واقف ہے۔ ہمارے ہی نہیں بلکہ دوسرے بھی کئی لوگوں کے اصل دھندوں سے واقف ہے مگر وہ ایک کشادہ دل نوجوان ہے، کبھی کسی کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا۔

جمی کا غیر رسمی گیرج جسے وہ ہمیشہ ورکشاپ ہی کہتا تھا، خاصے وسیع رقبے پر پھیلا ہوا تھا۔ مفت کی زمین تھی۔ اس بستی والے سبھی ناجائز تجاوزات کے مالک تھے۔ جمی نے اس طویل و عریض چھپر کے گرد خاردار تار لگا رکھی تھی اور اس کی حد بندی لکڑی کی بلیوں سے بنا ہوا ایک گیٹ بھی تھا۔

ورکشاپ میں بے اندازہ کاٹھ کباڑ بکھرا ہوا تھا۔ دو گاڑیاں بھی کھڑی تھیں لیکن وہ اچھی حالت میں نظر نہیں آرہی تھیں۔ کئی گاڑیوں کے ڈھانچے بھی پڑے تھے۔ جمی کے مکان میں روشنی نظر آرہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر دستک دی تو وہ جلد ہی نکل آیا۔ شاید وہ سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ نیکر اور بنیان پہنے ہوئے تھا۔ اس کا سانولا کسرتی جسم کمزور روشنی میں بھی چمک رہا تھا۔

وہ گھر میں اپنے پورے کنبے کے ساتھ رہتا تھا۔ ہم نے اسے بلایا تو ٹاٹ کے پردے کے عقب سے باری باری چند بچوں، بڑوں حتیٰ کہ ایک بڑے میاں نے بھی جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی کہ جمی کو بلانے والے کون ہیں۔ ہم اسے اس طرف لے گئے جدھر روشنی کچھ اور کم تھی۔ دور کہیں سے پس پردہ موسیقی کی طرح پولیس وسل اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسی عموماً فلموں کے ڈرامائی مناظر میں سنسنی پیدا کرنے کے لیے سنوائی جاتی ہیں۔

اشرف خان کی پتلون گو کہ پیچھے کی طرف سے خون میں بھیگ رہی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ جمی نے پہلی ہی نظر میں یہ چیز نوٹ کر لی تھی اور وہ ایک لخت ہی کچھ چپ سا ہو گیا تھا ورنہ اس نے ہمیں خوش آمدید تو بڑی گرمجوشی سے کہا تھا۔

" ہمیں کوئی گاڑی چاہیے جمی! " اشرف خان نے بلا تمہید کہا " کوئی سی بھی گاڑی جو کسی نہ کسی حد تک قابل اعتبار ہو۔ "

"پولیس پیچھے لگی ہوئی ہے؟" جمی نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔ اشرف خان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"گاڑی اس وقت میرے پاس صحیح حالت میں تو کوئی نہیں۔" جمی بولا "پچھلے تین دن میں صرف ایک ٹویوٹا اور ایک فوکس آئی ہے۔ دونوں کے انجن ڈاؤن کئے ہوئے ہیں۔ گاہکوں کی گاڑیاں ہیں۔"

"میں مفت میں نہیں مانگ رہا جمی!" اشرف خان بولا۔ "قیمت دوں گا۔ تم کہہ دینا چوری ہو گئی... پیسے بھر دینا۔ اگر ہم خدانخواستہ پکڑے بھی گئے تو تم پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔"

"اس صورت میں..." وہ گویا کسی سوچ میں پڑ گیا پھر جیسے فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا "میری اپنی اسکوڈا ہے۔ گھر کے پیچھے کھڑی ہوئی ہے۔ ساٹھ کا ماڈل ہے لیکن بہرحال مکینک کی گاڑی ہے۔ بہترین کنڈیشن میں ہے۔ وہ لے جاؤ۔ جہاں تک جانا چاہو گے ساتھ دے گی۔ اس آڑے وقت میں بھی محض تمہاری لحاظ داری میں تم سے میں اس کے پچیس ہزار لے لوں گا۔"

"ساٹھ کے ماڈل کی گاڑی... اور وہ بھی اسکوڈا... اور پچیس ہزار روپے میں؟" میں تقریباً چلا اٹھا۔ ساتھ ہی میں نے ریوالور نکال لیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ نوجوان موقع پرست ہے۔ ہماری مجبوری دیکھتے ہی فائدہ اٹھانے پر تل گیا ہے' سودے بازی پر اتر آیا ہے۔

میں نے ریوالور کی نال اس کی پسلیوں میں چبھوتے ہوئے کہا "چابی کہاں ہے؟"

"چابی گھر میں ہے۔" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ وہ خوفزدہ ضرور ہو چکا تھا لیکن حتی الامکان مضبوط نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اشرف خان کی طرف دیکھ کر کہا "تم یہیں ٹھہرو۔ میں اسی طرح اسے اندر لے کر جاتا ہوں اور چابی لے کر آتا ہوں۔ زیادہ گڑبڑ کرے گا تو لٹا دوں گا۔ ہم اسے ایک پیسہ بھی نہیں دیں گے۔ ہم اس وقت مفرور اور قاتل ہیں' شاپنگ پر نکلے ہوئے عرب شیخ نہیں۔"

"نہیں... نہیں..." اشرف خان نے سختی سے میرا ریوالور والا ہاتھ پیچھے ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جمی شریف نوجوان ہے۔ تھوڑا بہت لالچ سب میں ہوتا ہے۔ ہر انسان ایسے موقعے کی تلاش میں ہوتا ہے جو اسے فوراً کسی نہ کسی حد تک دولت مند بنا دے۔ اگر جمی بھی حسب توفیق فائدہ اٹھانے پر تل گیا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں روپیہ پیسہ ویسے بھی کام ہی سنوارنے کا ایک ذریعہ ہے اور کچھ بھی نہیں۔ انسان کام نہیں رکنا چاہیے۔ ویسے بھی میں جمی کو قتل کر کے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس کے گھر والے بھی ہمیں دیکھ چکے ہیں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟" میں نے بدمزگی سے کہا۔ "خون تو ویسے بھی ہمارے ہاتھوں پر ہے۔ اگر ہم جمی کو قتل کیے بغیر بھی پکڑے گئے تو کیا تمہارے خیال میں بچ جائیں گے! ہمارے اپنے جرائم کے علاوہ بھی معلوم نہیں کس کس کے جرائم ہمارے کھاتے میں ڈالے جائیں گے۔"

اس کے باوجود میں تمہیں جمی کو ہلاک کرنے کی اجازت نہیں دوں گا۔ جمی بہت بڑے کنبے کا واحد کفیل ہے... میں اور تم بہت پہلے اس نکتے پر متفق ہو چکے ہیں کہ خون صرف اس وقت بہایا جائے جب اس کے بغیر چارہ نہ ہو۔ آگے تمہاری مرضی... میں کمزور پڑ رہا ہوں... موت مجھے اپنی جھلکیاں دکھا رہی ہے... تم چاہو تو ابھی سے خود مختاری اختیار کر سکتے ہو!

اشرف خان نے بظاہر سپاٹ سے لہجے میں یہ بات کی تھی لیکن اس کی تہ میں بے بسی کا جو کرب تھا اسے صرف میں ہی محسوس کر سکتا تھا۔

"ہماری لائن میں تم جیسے شریف النفس اور وضعدار انسان بھی کم ہی آئے ہوں گے۔" میں نے بدمزگی سے کہا اور ریوالور جیب میں رکھ لیا۔ "اب اپنے اس چہیتے سے کہو کہ دوڑ کر چابیاں لے آئے۔"

میں نے محسوس کیا کہ جمی نے گہری سانس لی تھی۔ وہ ہم دونوں کی طرف ایک نظر دیکھ کر مسکرایا اور پھر مجھ سے مخاطب ہوا "پرانا آدمی اور پرانی شراب۔ دونوں کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ پرانا آدمی مصلحتوں اور موقع محل کو زیادہ اچھی طرح سمجھتا ہے۔"

"اچھا اب اشرف خان کو زیادہ مسکا لگانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے جمی کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "جاؤ جا کر چابیاں لے آؤ۔" پھر میں نے اشرف خان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "اور اگر یہ اندر جا کر بیٹھ ہی گیا تو...؟"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔" اشرف خان نے اپنی تمام تر تکلیف کے باوجود پر اعتماد انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔ "ہم لیفٹ بزنس کر رہے ہیں۔ جمی کو رقم کی ضرورت ہے۔" اس نے اپنا بریف کیس تھپتھپایا۔

جمی دوڑتا ہوا اندر چلا گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ دیر لگائے گا جبکہ ہمارے لیے ایک ایک پل بھاری تھا۔

شرف خان کو شاید کھڑا ہونے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ وہ مین میں... گڑی ہوئی ایک ٹلی کا سہارا لیے کھڑا تھا۔ اس کا ہرہ پسینے میں تر تھا اور رنگت زرد پڑتی جا رہی تھی۔ اس کے ونٹ یقیناً خشک ہوئے جا رہے تھے تبھی وہ بار بار ان پر زبان یر رہا تھا۔

بالآخر جمی گھر سے نکلتا دکھائی دیا۔ میرے خیال میں یہ بھی نیمت ہی تھا کہ وہ دوبارہ باہر آ گیا تھا۔ تاہم اس بار وہ ہمارے قریب نہیں آیا۔ دور ہی سے چابیاں ہماری طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ "اشرف خان! میں تم پر اعتبار کرتے ہوئے چابیاں دے رہا ہوں۔ اب تم بھی مردوں کی طرح بات نبھانا۔ رقم دیئے بغیر بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ معذرت کے ساتھ بتاتا چلوں کہ تھوڑی سی احتیاط میں نے بھی کر لی ہے۔ میرے پاپا اس وقت ڈبل بیرل گن لیے اس چھوٹی سی کھڑکی میں بیٹھے ہیں..." اس نے اپنے مکان کی چھوٹی سی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس میں چند لمحے پہلے تک روشنی نظر آ رہی تھی مگر اب غائب ہو چکی تھی "اگر تم دونوں میں سے کسی نے مجھے نقصان پہنچانے یا گاڑی کی قیمت دیئے بغیر بھاگنے کی کوشش کی تو پاپا مجبوراً گن استعمال کریں گے اور یہ گن پاپا کو انگریزوں کے زمانے میں ان کے باس نے تحفتاً دی تھی مگر پاپا کا کہنا ہے کہ وہ چاہیں تو اب بھی اس سے شیر کا شکار کر سکتے ہیں۔"

"بشرطیکہ شیر چڑیا گھر کے پنجرے میں بند ہو۔" میں نے لقمہ دیا۔

اشرف خان مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تمہیں معلوم ہے جمی کہ ہم لوگوں کی لائن میں زبان کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔" پھر اس نے بریف کیس بلی پر ٹکا کر کھولا اور پچاس پچاس کے نوٹوں کی پانچ گڈیاں جن پر ربڑ کے چھلے لپٹے ہوئے تھے' نکال کر یکے بعد دیگرے جمی کی طرف اچھال دیں جنہیں اس نے بے تابانہ سے انداز میں دونوں ہاتھوں میں اٹھا لیا۔ وہ اب خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔

"گاڑی عین مکان کے پیچھے ایک کچی چار دیواری میں کھڑی ہے... اور یاد رہے کہ تم اسے چرا کر لے جا رہے ہو۔" وہ بولا۔

"پیٹرول کی کیا پوزیشن ہے؟" اشرف خان نے پوچھا۔

"ٹنکی فل ہے۔ اگر کہو تو دو ڈبے اور دے دوں۔ ورکشاپ میں رکھے ہیں۔" جمی نے بڑے خلوص سے کہا۔

"دے ہی دو۔" اشرف خان بولا۔ جمی پہلے مکان کے اندر جا کر نوٹوں کی گڈیاں کسی کو تھما کر آیا پھر اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر خاردار تاروں کے درمیان بنے ہوئے چوبی گیٹ کا تالا چابی سے کھولا اور جلدی سے چھپر میں سے دو مڑے تڑے اور گریس میں لتھڑے ہوئے ڈبے اٹھا لایا۔ ڈبے اس نے خود گاڑی تک پہنچائے۔

کریم کلر کی وہ اسکوڈا اپنی ظاہری حالت سے ہی کسی مکینک کی گاڑی نظر آتی تھی۔ عام حالات میں اس کی مارکیٹ ویلیو شاید چار پانچ ہزار روپے سے زیادہ نہ ہوتی لیکن یہ وقت گاڑیوں کی مارکیٹ ویلیو کا اندازا لگانے کا نہیں' دنیا کی مارکیٹ میں اپنی جان کی ویلیو دیکھنے کا تھا۔

اشرف خان کار کی پچھلی نشست پر ڈھیر ہو گیا۔ اب تک وہ اپنی ہمت کا اثاثہ سنبھالے ضبط سے کام لیتا ہوا دوڑا چلا آیا تھا۔ اب سہارا میسر آیا تو کٹے ہوئے تنے کی طرح گر پڑا۔ میں نے اسٹیئرنگ سنبھالا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ جمی نے مجھے گاڑی کی عادات و اطوار کے بارے میں چند ضروری باتیں بتائیں اور میں گاڑی کو کچی چار دیواری سے باہر لے آیا۔ گاڑی کی ظاہری حالت کے برعکس اس کا انجن اتنی بری حالت میں نہیں تھا۔

"گڈ لک" جمی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلا کر کسی جگری دوست کی طرح ہمیں خدا حافظ کہا۔ میں اسٹیئرنگ ہاتھ میں آتے ہی اپنے آپ کو پہلے کی نسبت کچھ زیادہ پر اعتماد محسوس کرنے لگا تھا۔

گندے نالے کی پلیا عبور کر کے ہم خوش حال لوگوں کی مختصر سی آبادی میں آ گئے۔ یہاں کی گلیاں کشادہ' صاف ستھری اور مکان سلیقے کے تھے۔ ان میں لان وغیرہ بھی تھے۔ ازراہ مروت انہیں کوٹھیاں بھی کہا جا سکتا تھا۔

میں نے ابھی تک ہیڈ لائٹ آن نہیں کی تھی۔ ایک مکان کی باؤنڈری وال کے قریب گاڑی روک کر میں نے مڑ کر اشرف خان کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "ہمیں چلنا کہاں چاہیے؟"

اشرف فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ آنکھیں بند کر کے ہونٹ بار بار دانتوں میں بھینچ رہا تھا۔ چہرے پر پسینے کی نمی بہت بڑھ گئی تھی۔ وہ یقیناً بڑی مشکل سے تکلیف برداشت کر رہا تھا جب وہ بولا تو آواز اس کے حلق سے اذیت بھری کراہ کی طرح نکلی۔

"تکلیف اب میری برداشت سے باہر ہو گئی ہے۔" وہ ٹوٹتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "پہلے عظیم پورہ کی طرف چلو... اور یہ خیال رکھنا کہ انہی اطراف میں ہماری تلاش جاری ہے۔ عین ممکن ہے کہ خاص راستوں پر گشت شروع ہو گیا ہو تم گلی

کوچوں ہی کے راستے چلنا۔"

"عظیم پورہ میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر دنبہ... اس وقت میرا ڈاکٹر دنبہ سے ملنا ازحد ضروری ہے۔" وہ کراہا۔

"یہ کوئی کوالیفائڈ ڈاکٹر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' بہت زیادہ۔" اشرف خان نے جواب دیا۔ "اس کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے آڑے وقت میں بہت کام آتا ہے جب ہم اس قسم کے حالات میں زخمی ہوجاتے ہیں کہ پوچھ گچھ کے ڈر سے کسی اسپتال یا کسی دیانتدار ڈاکٹر کے کلینک وغیرہ کا رخ نہیں کرسکتے تو وہی ہماری مدد کرتا ہے۔ اس کی دوسری بڑی خوبی..... یہ ہے کہ اس نے کبھی میڈیکل کالج جانے کی زحمت نہیں کی۔ گھر بیٹھے ہی معلوم نہیں کس طرح اچھا خاصا ڈاکٹر بن گیا ہے... حتیٰ کہ سرجری میں بھی عمل دخل رکھتا ہے۔ پہلے ایک اسپتال میں آپریشن تھیٹر اسسٹنٹ تھا اور ایک نرس کی عزت لوٹنے کی کوشش میں ناکام ہو کر لوگوں سے ہڈی پسلی تڑوانے سے پہلے وہاں سے بھاگ نکلا تھا۔"

"ڈاکٹر دنبہ...! عجیب نام ہے۔" میں نے گیر لگاتے ہوئے کہا۔

"جس وقت اس کا یہ نام پڑا ہے سنا ہے کہ اس وقت وہ واقعی کسی پلے ہوئے دنبے کی طرح موٹا تھا۔" اشرف خان کراہتے ہوئے بولا۔ "لیکن اب تو محض دنبے کی ایک ٹانگ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ اشرف خان باتیں کرکے اپنی تکلیف کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ پچھلی سیٹ پر پہلو کے بل نیم دراز تھا اور میں دیکھ چکا تھا کہ اب خون اس کی پتلون سے ٹپک ٹپک کر کار کے فرش پر پڑی ہوئی گندی سی میٹ میں جذب ہو رہا تھا۔

میں حتی الامکان تیز رفتاری سے کار چلانے لگا۔ چند لمحے بعد میں نے عقب سے اشرف خان کو کراہوں کے درمیان کہتے سنا۔ "اگر اسی رفتار سے میرا خون بہتا رہا تو کچھ دیر بعد میں تو نچڑا ہوا آم ہو کر رہ جاؤں گا۔"

غیر ارادی طور پر ایک بار پھر میں نے گاڑی روک لی۔ اس گلی میں اندھیرا تھا اس لیے میں نے سوئچ تلاش کرکے اندر کی لائٹ آن کی جو خوش قسمتی سے آن ہو ہی گئی۔ جمی نے واقعی گاڑی کو خاصی اچھی حالت میں رکھا ہوا تھا۔

میں نے مڑ کر ایک بار پھر اشرف خان کا جائزہ لیا۔ اس نے حسب سابق ایک حوصلہ مند انسان کی طرح مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس بار اس کی مسکراہٹ محض ہونٹوں کے کھنچاؤ تک محدود رہی۔ اس کے پورے چہرے پر ہی کھنچاؤ سا آچلا تھا۔

اس کی پتلون کی ایک ٹانگ تو تقریباً پوری ہی خون میں تر ہوچکی تھی اور اب بھی بدستور خون ٹپک رہا تھا۔ دوسری ٹانگ پر بھی خون پھیل رہا تھا۔ میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ اب تک گویا موت ہمارے تعاقب میں رہی تھی مگر مجھے خوف محسوس نہیں ہوا تھا اور نہ ہی میرے دل کو گویا کچھ ہوا تھا جس طرح اشرف خان کا دھڑ خون میں تر دیکھ کر ہونے لگا تھا۔

مجھے احساس تھا کہ اس وقت دل مضبوط رکھنے کی بہت زیادہ ضرورت تھی چنانچہ میں نے اس کی طرف سے نظر ہٹالی اور گاڑی آگے بڑھادی۔ میں نے اس سے تسلی کا بھی کوئی لفظ نہیں کہا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے موقع پر تسلی کے الفاظ انسان کو خواہ مخواہ جذباتی کردیتے ہیں اور جس درد کو وہ دبانے کی کوشش کررہا ہوتا ہے وہ کچھ اور ابھر آتا ہے۔ وہ مواقع کچھ اور ہوتے ہیں جب تسلی و تشفی سے درد آدھا رہ جاتا ہے۔

اس علاقے کے راستوں سے مجھے کچھ زیادہ واقفیت نہیں تھی لیکن میں اندازے سے عظیم پورہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے ایک گلی میں گاڑی موڑی تو اچانک ہی سامنے سے دو باوردی پولیس والے آتے دکھائی دیئے۔ دونوں کے کندھوں پر بندوقیں تھیں۔ ان میں سے ایک باریش تھا۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر بڑے غور سے گاڑی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ میں نے ابھی تک گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن نہیں کیں حالانکہ اب انہیں آف رکھنے کا کوئی خاص فائدہ بھی نہیں تھا۔ اضطراری طور پر میں نے لائٹس آن کردیں۔ میری اس حرکت نے شاید انہیں اور زیادہ شک میں مبتلا کردیا۔ وہ سڑک کے کنارے رک کر پوری توجہ سے گاڑی کی طرف دیکھنے لگے۔ تاہم انہوں نے ہمیں کوئی اشارہ وغیرہ نہیں دیا۔ بس خاموشی سے کھڑے دیکھتے رہے۔ ان کے قریب سے گزرتے وقت میں نے چہرہ ترچھا اور کسی قدر تاریکی میں رکھنے کی کوشش کی تاہم یہ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں ان سے چہرہ چھپانے کی کوشش کررہا ہوں۔

گلی کا موڑ مڑتے وقت میں نے ایک لمحے کے لیے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ دونوں اب بھی وہیں کھڑے گاڑی ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اشرف خان چونکہ پہلو کے بل لیٹا ہوا تھا اور اب اس نے آنکھیں بھی بند کرلی تھیں اس لیے وہ سپاہیوں کو نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں نے بھی کوئی ذکر نہ کیا۔

چند لمحے بعد ہم عظیم پورہ میں داخل ہوگئے۔ تب میں نے رفتار کم کرتے ہوئے پوچھا "کس طرف جانا ہے؟"

اشرف خان نے کراہ کر کہنی کے بل ذرا اونچا ہو کر کھڑکی سے ادھر ادھر دیکھا اور راستوں کے بارے میں ایک ساتھ ہی چند ہدایات دینے کے بعد ایک بار پھر تھکے تھکے انداز میں لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے پھر سر اٹھا کر دیکھا اور کہا۔ "آگے دائیں ہاتھ پر جو گلی آئے گی اس میں دائیں ہاتھ پر ایک ہی دو منزلہ مکان ہے۔ اس کے سامنے گاڑی روک لینا۔"

میں نے اس کی ہدایت کے مطابق دو منزلہ مکان کے سامنے گاڑی روکی اور اتر کر دروازے پر دستک دی۔ جلد ہی ایک شخص نے دروازہ تھوڑا سا کھول کر پردہ دار خاتون کی طرح جھانکا۔

"ڈاکٹر دنبہ....؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ اشرف خان سے اس کا اصل نام تو پوچھ لینا چاہیے تھا۔ ممکن ہے وہ اس نام سے مخاطب کیے جانے پر برا ہی منا جائے۔

خلاف توقع وہ فوراً باہر آگیا اور نہایت ہی شائستگی سے بولا۔

"جی فرمایئے؟"

"اشرف خان آپ سے ملنا چاہتا ہے۔" میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ ایک پستہ قد آدمی تھا۔ کسی زمانے میں یقیناً کافی موٹا رہا ہوگا۔ اب چربی اور گوشت غائب ہوجانے کی وجہ سے کھال ڈھیلی ہو کر اس کے چہرے اور جسم پر لٹک سی گئی تھی تاہم وہ بوڑھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی رنگت سانولی اور موٹے موٹے ہونٹ فالسے کی سی رنگت کے تھے۔ گول گول آنکھوں سے لالچ ٹپک رہا تھا۔ وہ ایک اونچی سے دھوتی اور کئی جیبوں والی واسکٹ پہنے ہوئے تھا اور پہلی نظر میں خالصتاً دہقان نظر آتا تھا۔

وہ پُراشتیاق انداز میں گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے اندر کی لائٹ آن کردی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر اشرف خان کو دیکھا۔ اشرف خان آنکھیں کھول کر اسی مضمحل سے انداز میں مسکرایا۔

"کافی دیر کردی تم نے آنے میں۔ خون کافی بہہ گیا ہے۔"

ڈاکٹر دنبہ نے کسی تمہید یا سلام دعا کے بغیر کہا۔ "کون سی گولی ہے؟ ریوالور کی یا رائفل کی؟"

"ریوالور کی۔" اشرف خان کے بجائے میں نے جواب دیا۔

"اور غالباً پولیس بھی تمہارے پیچھے لگی ہوئی ہے؟" ڈاکٹر دنبہ نے میری طرف دیکھے بغیر اشرف خان کو مخاطب کیا۔

"فی الحال تو ہم پولیس کو چکر دے آئے ہیں۔" اس بار بھی میں نے ہی جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب بولنا بھی اشرف خان کے لیے کوئی خوشگوار عمل نہیں رہا۔

"بہرحال..... ان حالات میں کھوج لگاتے ہوئے پیچھا کرنا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں ہوتا۔" ڈاکٹر دنبہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ پھر جیسے وہ اصل موضوع پر آگیا۔ "میں سرجری کی کوشش کروں گا' ورنہ خون کا بہاؤ روکنے کا بندوبست تو کرہی دوں گا۔ پانچ ہزار روپے فیس ہوگی۔ ایڈوانس۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر۔" اشرف خان کراہا۔ "جلدی کرو۔"

ڈاکٹر دنبہ نے ہاتھ کھڑکی سے اندر پھیلادیا۔ اشرف خان نے کار کے فرش پر رکھا ہوا بریف کیس کھول کر ایک گڈی نکالی اور اس کے ہاتھ پر رکھ دی جو اس نے جلدی سے ویسٹ کوٹ کی جیب میں ٹھونس لی۔

"دو منٹ ٹھہرو' میں ابھی آتا ہوں۔" وہ کسی مسرور مرغ کی طرح پھدکتا ہوا مکان میں چلا گیا۔ میں نے کار کے اندر کی لائٹ بجھادی اور ادھر ادھر کا جائزہ لیا۔ اکا دکا مکانوں میں روشنی نظر آرہی تھی تاہم گلی میں آمدورفت نہیں تھی۔

ڈاکٹر دنبہ جلد ہی دوبارہ باہر آگیا۔ اب وہ پتلون بش شرٹ میں تھا اور سیاہ رنگ کا بڑا سا میڈیکل بیگ اٹھائے ہوئے تھا۔

"چلو۔" اس نے قریب آکر کہا۔

"کہاں؟" میں نے ہکا بکا ہو کر پوچھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں اندر مکان میں بلائے گا جہاں اس نے غریبی دعوے کا کوئی چھوٹا موٹا آپریشن تھیٹر بنا رکھا ہوگا۔

"شہر سے نکل کر کسی ویران سے مقام پر درختوں وغیرہ کی اوٹ میں گاڑی روک لینا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"تو کیا سرجری گاڑی ہی میں ہوگی؟" میں نے سرسراتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

"بے شک۔" اس نے بدستور اطمینان سے جواب دیا۔

"میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ گھر پر اس قسم کے کاموں کا خطرہ مول نہیں لیتا۔ ویسے جب کوئی مجرم پولیس مقابلے کے بعد فرار ہوتا ہے اور پولیس کو یہ علم بھی ہوتا ہے کہ وہ زخمی ہوچکا ہے تو عموماً وہ لوگ ایک چکر میرے غریب خانے کا بھی لگالیتے ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ پولیس عام طور پر مجھ جیسے شرفاء کو تنگ کرتی رہتی ہے' انہیں خدمت خلق کا موقع نہیں دیتی۔"

"باتوں میں وقت ضائع مت کرو افضل۔" اشرف خان کمزور سی آواز میں بولا۔ "اور جیسے ڈاکٹر کہتا ہے' کرتے جاؤ۔"

میں نے خاموشی سے کار میں بیٹھ کر اسٹیئرنگ سنبھال لیا۔ ڈاکٹر میرے برابر بیٹھ گیا۔ میڈیکل بیگ اس نے سیٹ کے نیچے رکھ دیا۔ ایک بار پھر ہماری کار گلیوں میں چکرانے لگی۔ گلیوں سے نکل کر میں نے شہر سے باہر جانے والی سڑک کا رخ کیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر ناکہ بندی نہ کردی گئی ہو اس لیے سڑک پر میں بہت ہی ہوشیاری سے گاڑی چلا رہا تھا تاہم مجھے کہیں دور دور تک ناکہ بندی کے آثار دکھائی نہ دیئے۔ شاید ابھی اس کی نوبت نہیں آئی تھی یا ابھی اس مقصد کے لیے اتنی پولیس فورس میسر نہ تھی۔

قدرت نے ایک اور مہربانی کی۔ اس راستے سے باہر جاتے وقت شہر کی حدود میں ہی ایک ریلوے کراسنگ بھی آتی تھی جس کا پھاٹک عموماً بند ہی ملتا تھا اور کافی کافی دیر اس کے کھلنے کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس وقت وہ بھی کھلا ہوا تھا۔ پھاٹک عبور کرنے کے بعد دائیں بائیں کہیں کہیں کھیت نظر آتے تھے اور کہیں کہیں غیر آباد زمینیں اور ان پر درخت اور جھاڑ جھنکاڑ۔

ایک مناسب سی جگہ دیکھ کر میں نے کار روک لی اور ڈاکٹر میڈیکل بیگ اٹھا کر پچھلے حصے میں چلا گیا۔

"لائٹ جلادو۔" اس نے حکم دیا۔ اس ویرانے میں کار کا اندرونی حصہ اس ذرا سی لائٹ سے گویا جگمگا اٹھا۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر نے بھی اپنے میڈیکل بیگ سے سیلوں سے چلنے والا ایک چھوٹا سا لیمپ نکال کر اگلی سیٹوں کے پشتے میں پھنسا دیا۔ پچھلی سیٹ پر وہ خود پھنس پھنسا کر اس طرح بیٹھ گیا کہ اشرف خان بھی اس کی مطلوبہ پوزیشن میں لیٹا رہے اور وہ خود بھی اپنا کام انجام دینے کے لیے حرکت کرسکے۔

میں نے یہ دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے کم از کم اس حد تک تو احتیاط کرنے کی زحمت کرلی تھی کہ سرجنوں والے پتلی ربڑ کے دستانے چڑھا لیے تھے۔ اس کے سرجری کے آلات بھی بظاہر کچھ صاف ہی معلوم ہوتے تھے اور اسٹرلائزنگ کٹ میں رکھے ہوئے تھے لیکن معلوم نہیں یہ کٹ خود بھی جراثیم سے محفوظ تھی یا نہیں۔

اس نے جب اشرف خان کا زخم عریاں کیا تو اس کی تو سسکاریاں ہی نکل گئیں۔ میں بھی سختی سے دانت بھینچے بغیر نہ رہ سکا۔ پتلون کی رگڑ اور دوڑ بھاگ سے زخم پھیل گیا تھا اور بہت مکروہ نظر آرہا تھا۔ خون اب بھی یوں وقفے وقفے سے رس رہا تھا جیسے اندر سے کوئی طاقت سمیٹ سمیٹ کر اسے باہر دھکیل رہی ہو۔

ڈاکٹر دنبہ جھک کر چند لمحے زخم کا معائنہ کرتا رہا پھر غالباً وہ اس کے اردگرد جسم کو سن کرنے والی دوا لگانے لگا۔ چند لمحے بعد جب اس نے نشتر سے زخم کو چھیڑا تو اشرف خان کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی جس کا اس نے نہ جانے کس طرح درمیان میں ہی گلا گھونٹ دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں یہ کارروائی نہیں دیکھ سکوں گا اس لیے میں منہ پھیر کر کار سے اترنے لگا لیکن ڈاکٹر دنبہ نے فوراً پوچھ لیا "کہاں جارہے ہو؟"

"یہیں آس پاس کہیں ٹہلتا ہوں، تم اپنا کام کرو۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ تم اسٹیئرنگ پر ہی موجود رہو اور الرٹ رہو۔ ذرا بھی خطرہ محسوس کرو تو فوراً گاڑی بھگا لینا۔ خواہ میرا کام کسی بھی مرحلے میں ہو، اس کی تم پروا نہ کرنا۔" ڈاکٹر کے لہجے میں سفاکی کی حد تک خود غرضی کی جھلک تھی۔ اسے صرف اپنی فکر تھی۔

میں منہ پھیر کر گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ عقب سے سنائی دینے والی اشرف خان کی آوازیں کچھ ایسی ہی تھیں جیسے کسی بکرے کو کند چھری سے ذبح کیا جارہا ہو لیکن ساتھ ہی اس کے منہ پر سختی سے کچھ باندھ دیا گیا ہو۔ میں ہونٹ بھینچے اندھیرے میں گھورتا رہا۔

لمحے جیسے اپاہجوں کی طرح گھسٹ رہے تھے۔ میں اپنے اعصاب کو حتی الامکان پرسکون رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں جس پیشے میں آچکا تھا، اس میں قدم قدم پر اعصابی جنگ سے ہی واسطہ پڑتا تھا لیکن کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو اعصابی مضبوطی کے بغیر ہی کام چلا رہے تھے یا شاید اعصابی مار سہہ کر وقت کے ساتھ ساتھ ان کا یہ حال ہوگیا تھا۔ شہزادکوٹ میں ہی اشرف خان کے توسط سے میری ایک ادھیڑ عمر اسمگلر سے ملاقات ہوئی تھی۔ بظاہر وہ... اوسط درجے کا ایک معزز دکاندار تھا۔ اچھا بھلا گھر تھا اس کا لیکن عالم یہ تھا کہ رات گئے اگر کوئی کال بیل بجا دیتا تھا تو وہ فوراً چارپائی کے نیچے گھس جاتا تھا۔ یہ جانے بغیر کہ آنے والا کون ہے۔

میرا ذہن وحشی گھوڑے کی طرح جانے کون کون سے دشتِ خیال میں بھٹکتا رہا۔ مجھے وقت کا احساس نہیں رہا تھا اور شاید یہ اچھا ہی تھا۔ جانے کتنی دیر بعد عقب سے ڈاکٹر دنبہ کی آواز سنائی دی "گولی بہت گہری چلی گئی ہے۔ شاید اس کی نوک کسی ہڈی میں پیوست ہے۔ صحیح اوزاروں کے بغیر اور آپریشن تھیٹر سے باہر اس گولی کو نکالنا تقریباً ناممکن ہے۔ جان جانے کا خطرہ ہے۔ میں نے پینسلین بھر کر زخم سی دیا ہے۔ خون اب برائے نام رس رہا ہے اور امید ہے کہ کچھ دیر بعد بالکل تھم جائے گا۔ مناسب موقع ملتے ہی تم کسی صحیح جگہ پر سرجری

ے یہ گولی نکلوا لینا۔ فی الحال یوں سمجھو کہ ابتدائی طبی امداد مل
ئی ہے۔ میں نے ضروری انجکشن بھی لگا دیئے ہیں۔ اشرف
ان کی پتلون کی حالت دیکھ کر میں گھر سے ایک پاجاما بھی لے
یا تھا جو میں نے اسے پہنا دیا ہے۔ خون آلودہ پتلون میں نے باہر
پھینک دی ہے۔"

میں نے دل کڑا کرکے مڑ کر دیکھا۔ اشرف خان سیٹ پر آڑا
ترچھا پڑا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ سیٹ سے نیچے تھی۔ وہ
آنکھیں بند کیے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ چہرے سے
پسینہ باقاعدہ بوند بوند کرکے ٹپک رہا تھا۔ اس کے جسم میں شاید
ب پسینہ ہی رہ گیا۔ خون کی تو گویا رمق بھی نہیں رہی تھی۔

ڈاکٹر دنبہ نے روئی اور پٹیوں کا ایک پیکٹ اور دو شیشیاں
مجھے دکھاتے ہوئے کہا "یہ چیزیں میں گاڑی میں ہی چھوڑ رہا
ہوں۔ اگر اشرف کے زخم پر روئی اور پٹی خون میں بھیگ جائے
تو یہ نیلی شیشی والا پاؤڈر اچھی طرح چھڑک کر دوبارہ بینڈیج
کردینا اور آدھے گھنٹے کے وقفے سے اس دوسری شیشی
سے دو دو گولیاں اسے دیتے رہنا۔ پانی میسر نہ بھی ہو تو یوں
ہی منہ میں ڈال دینا۔ ہیں تو یہ گولیاں لیکن انجکشن کا اثر رکھتی
ہیں۔ اس سے زیادہ فی الحال اس کے لیے کچھ نہیں کیا جاسکتا۔"

اس کی آواز اس وقت مجھے ایسی ہی محسوس ہورہی تھی
جیسے ویرانے میں کوئی گدھا رینک رہا ہو حالانکہ وہ کمبخت
بہت دھیمے اور پرسکون لہجے میں بول رہا تھا جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے
کلینک میں بیٹھا معمولی سے زکام میں مبتلا کسی شخص کو دوا اور
ہدایات دے رہا ہو۔ میں اس کے کام سے مطمئن نہیں تھا۔
میرے خیال میں اس کی خدمات حاصل کرنے کا کوئی خاص
فائدہ نہیں ہوا تھا۔ پانچ ہزار خرچ کرکے کچھ اور بھی کیا جاسکتا
تھا لیکن بہرحال .... وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔

"اب تمہیں واپس چھوڑنے کا مسئلہ ہے۔" لیکن میں
نے خشک لہجے میں کہا "میں واپس شہر کی طرف جانے کا خطرہ
مول نہیں لے سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ اب تک شہر کی ناکہ
بندی ہوچکی ہوگی۔"

میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر دنبہ کافی احتجاج کرے گا مگر شاید وہ اس
قسم کی صورتحال کا عادی تھا، اطمینان سے بولا "کوئی بات نہیں۔
میں سڑک پر چلا جاتا ہوں۔ اگر کوئی گاڑی شہر کی طرف جاتی
نظر آئی تو کوئی بہانہ کرکے لفٹ لے لوں گا.... بلکہ بہتر ہے کہ
پیدل ہی چلا جاؤں۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تو لگ جائے گا لیکن پیدل
جانا زیادہ محفوظ طریقہ ہے۔ پیدل چلنے والوں کے لیے تو ریلوے
کراسنگ کے پاس سے شہر میں داخل ہونے کے بیسیوں
راستے ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو۔"

وہ یوں سنجیدگی سے کہہ رہا تھا جیسے میں واقعی اس کی فکر میں دبلا ہوا جارہا تھا۔ گدھا کہیں کا۔ اس نے اپنا بیگ اٹھایا اور گاڑی سے اتر کر سڑک کی طرف چل دیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر اشرف خان نے آنکھیں کھولیں اور نحیف آواز میں بولا "چلا گیا؟"

"ہاں۔" میں نے کہا "تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟" میں نے روانی میں پوچھ تو لیا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ یہ سوال نہایت غیر ضروری بلکہ تکلیف دہ تھا۔ اس کی طبیعت کا احوال تو اس کے چہرے پر لکھا ہوا تھا۔

"اب کہاں چلنا چاہیے؟" میں نے جواب کا انتظار کیے بغیر جلدی سے پوچھا۔

"میری عقل تو یہی کہہ رہی ہے کہ ہمیں لاہور چلنا چاہیے۔" اشرف خان نے اٹک اٹک کر کہا "بریف کیس میں اب صرف پانچ ہزار کی ایک گڈی رہ گئی ہے.... جلدی میں، میں صرف بریف کیس ہی اٹھا سکا تھا۔ باقی کچھ رقم تجوری میں تھی۔ وہ نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ اب ہمیں کسی مضبوط سہارے کی ضرورت ہے جس کی امید مجھے کہیں سے نظر نہیں آرہی....لاہور میں میرا ایک دور کا رشتے دار ہے۔ ہماری ہی لائن کا آدمی ہے لیکن وہ بہت بڑا آدمی ہے.... عام حالات میں اس سے گزشتہ دو تین برسوں میں دو تین ہی ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ویسے تو کوئی خاص لفٹ نہیں کراتا لیکن شاید اس مصیبت کے وقت میں کام آجائے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے..... خصوصاً ہم لوگوں میں.... الٹ معاملہ.... کہ عام حالات میں رشتے دار زیادہ اچھی طرح نہیں ملتے لیکن آڑے وقت میں تھوڑا بہت کام آنے کی کوشش کرتے ہیں۔" وہ سانس درست کرنے کے لیے خاموش ہوگیا۔

اگر اس کی یہ موہوم سی امید سراب تھی تب بھی فی الحال میں اسے اس کا احساس دلانا نہیں چاہتا تھا بلکہ میں خود بھی اپنی تمام تر حقیقت پسندی کے باوجود اس وقت تاریک پہلو سے نظر چرانے میں ہی عافیت محسوس کررہا تھا۔

"اسے تم میرا کزن ہی سمجھ لو۔" اشرف خان چند لمحے کراہنے کے بعد سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "قاسم خان اس کا نام ہے۔" پھر اس نے ایڈریس مجھے سمجھایا۔

"اگر بہت تیز رفتاری سے بھی چلیں تب بھی لاہور کا سفر کم از کم چار گھنٹے کا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "وہ بھی اس صورت میں کہ قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور ہمیں

راستے میں کہیں رو کا نہیں گیا۔" میں اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ اگر راستے میں دوران سفر اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تو ہم کیا کریں گے لیکن یہ بات مجھے اس سے پوچھنے کا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا۔

وہ میرا مطلب سمجھ گیا۔ حسب عادت مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "میری طبیعت تو اگر خراب ہونی ہے تو بس ہونی ہی ہے.... ادھر ادھر بھاگتے دوڑتے ہوئے تو ہم اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکیں گے..... اس لیے بہتر ہے کہ کسی خاص سمت میں ہی کسی مقصد کے تحت سفر شروع کیا جائے.... صبح سے پہلے ہم انشاء اللہ لاہور پہنچ ہی جائیں گے.... تم بس اب دل میں یہ ٹھان کر' یہ دھن ذہن میں بسا کر روانہ ہونا کہ تمہیں ہر حال میں لاہور پہنچنا ہے.... تمہیں تو تجربہ ہو ہی چکا ہے کہ جب ہماری قوت ارادی پوری طرح بیدار ہوتی ہے تو ہم بڑی سے بڑی رکاوٹ پھلانگ جاتے ہیں۔ میں تمہیں قاسم خان کا ایڈریس سمجھا دیتا ہوں تاکہ اگر میں راستے میں بےہوش بھی ہو جاؤں تب بھی تم سیدھے اس کے گھر تک پہنچ سکو۔ اسے ساری بات بتا دینا..... میرا دل کہہ رہا ہے کہ وہ اگر زیادہ نہیں تو تھوڑی بہت ہماری مدد ضرور کرے گا.... میرے ذہن پر اب غنودگی سی طاری ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں تکلیف برداشت کرتے کرتے میرے اعصاب جواب دینے لگے ہیں یا ڈاکٹر دنبہ نے مجھے جو انجکشن لگائے ہیں ان میں کوئی خمار آور انجکشن بھی شامل تھا۔ میرا خیال ہے' اب تم اللہ کا نام لے کر چل ہی پڑو۔"

میں نے محسوس کیا کہ ہم لوگ اچھے تھے یا برے لیکن ہر کام خدا کا نام لے کر کرتے تھے۔ اللہ کو ہم تقریباً ہر بات میں یاد کر لیتے تھے۔ اللہ پر دراصل سب ہی کو بڑا مان ہوتا ہے کیونکہ اللہ صرف اچھے لوگوں کا ہی نہیں' برے لوگوں کا بھی ہوتا ہے۔ ان سے ناراض ہوتا ہے' تب بھی انہیں اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا۔ یہ صرف بندے ہی ہیں جو کسی سے ناراض ہوتے ہیں اور ذرا سی بھی طاقت کے مالک ہوتے ہیں تو ان کی کوشش ہوتی ہے کہ اپنے معتوب کا رزق بند کر دیں' اسے جلا دیں' مار دیں' فنا کر دیں۔

میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور کچھ دور تک کچے میں چلنے کے بعد سڑک پر آ گیا۔ یہی سڑک چار پانچ میل آگے جا کر لاہور جانے والی سڑک سے ملتی تھی۔ سڑک کچھ ہموار نہیں تھی۔ ہموار اور صحیح حالت میں تو خیر میں نے کبھی ان سڑکوں کو بھی نہیں دیکھا تھا' جنہیں ہائی وے کہا جاتا تھا' یہ تو پھر بھی ذیلی سی سڑک تھی' اس لیے اس کی حالت کچھ زیادہ ہی خراب تھی لہٰذا میں نے رفتار کم رکھی۔

اشرف خان اٹک اٹک کر بولا "ذرا تیز رفتاری سے چلو.... میری تکلیف کی پروا نہ کرو۔ اگر تکلیف برداشت سے باہر ہو گی تو میں بتا دوں گا۔"

اس کی ہدایت پر میں نے رفتار بڑھا دی۔ ہائی وے پر پہنچ کر دھچکوں میں کچھ کمی آ گئی اور میں نے رفتار مزید بڑھا دی۔ اب ہم طوفانی انداز میں لاہور کی طرف محو سفر تھے۔ رات کی تاریکی میں راستہ ایک سرنگ کی طرح میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ جب کوئی بس سامنے سے آتی تھی تو گرد و غبار کا ایک بگولا سا اڑا جاتی تھی جو ہیڈ لائٹس کے سامنے کچھ دیر تک کہکشاں کی طرح متحرک رہتا تھا۔ پھر گاڑی اسے پیچھے چھوڑ جاتی تھی۔

ایکسیلیٹر میں نے پورا ہی دبا رکھا تھا اور اس رفتار پر گاڑی کا انجر پنجر بری طرح کھڑکھڑانے لگا۔ پھر رفتہ رفتہ یہ کھڑکھڑاہٹ جیسے دور ہوتی چلی گئی اور کچھ دیر بعد کسی نامعلوم مقام پر ابھرتی ہوئی مدھم مدھم موسیقی کی طرح سنائی دینے لگی۔ اس موسیقی کی تال پر میرے ماضی کا ہر لمحہ تھرکتا ہوا میرے سامنے سے گزرنے لگا۔

وہ عسرت زدہ بچپن' وہ گناہ گار جوانی' وہ بے مقصد شب و روز۔ خدایا میں انسان تھا یا کٹی ہوئی پتنگ؟ میری قسمت میں کیا لکھا تھا؟ گردش دوراں مجھے کہاں لے جانا چاہتی تھی' مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ دیر تک میں نہ جانے اندر ہی اندر کس کس سے باتیں کرتا رہا۔ جانے کن کن مرئی' غیر مرئی چیزوں کو چیلنج دیتا رہا۔ پھر مجھے زرینہ یاد آئی۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں ہو گی؟ کس آسانی سے ہم اسے چھوڑ کر بھاگ آئے تھے.... لیکن نہ بھاگتے تو کیا کرتے؟ اسے ساتھ لینے کے چکر میں اس کے ساتھ ہم بھی کہیں اور ہی پہنچ جاتے۔

بہرحال وہ عورت ہیرا تھی۔ اندر اور باہر سے ایک جیسی۔ سخت' بے حس مگر شفاف۔ بے کردار تھی مگر دنیا کی بیشتر عورتوں کی طرح ریاکار اور کھوکھلی نہیں تھی۔ مجھے اپنے دل میں کسک سی محسوس ہونے لگی۔ مجھے اس وقت ہی یقین ہو گیا کہ ایک نہ ایک دن بلکہ شاید بہت جلد ہی میں اس کی تلاش میں واپس آؤں گا۔

سفر میں ہمواری آئی تو دیگر محسوسات جن کی طرف اب تک دھیان نہیں گیا تھا' سر ابھارنے لگے۔ پیاس بہت شدت سے محسوس ہونے لگی' حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ بھاگ دوڑ میں کہیں میری کلائی پر چوٹ لگی تھی' اس میں اب

ٹیسیں ابھر رہی تھیں۔ اشرف خان بے چارے کا تو معلوم نہیں کیا حال تھا۔ اندر ہی اندر اس پر جو کچھ گزرتی تھی' وہ پوری کوشش کرتا تھا کہ باہر سے کسی کو اس کا اندازہ نہ ہونے پائے۔

میں نے اسے آواز دے کر اس کا حال پوچھا۔ پہلے تو کوئی جواب نہ آیا۔ دوبارہ پکارنے پر اس کی آواز جیسے کہیں میلوں دور سے آئی "میں.... بس ٹھیک ہی.... ہوں.... تکلیف کم اور.... پیاس زیادہ ستا رہی ہے.... میرا خیال ہے' ڈاکٹر دنبہ نے مارفیا کا انجکشن تو لگایا تھا مگر تکلیف کچھ زیادہ ہی ہے.... غنودگی غلبہ نہیں پا رہی.... بیچ میں لٹک کر رہ.... گیا ہوں.... نیند بھی نہیں آ رہی.... اور ذہن.... پوری طرح جاگ بھی.... نہیں رہا۔"

"میرا خیال ہے' چار چھ میل کے بعد ڈرائیوروں والا ایک بھٹیار خانہ آنے والا ہے۔" میں نے کچھ دیر پہلے دیکھے ہوئے سنگ میل کے حوالے سے اندازہ لگاتے ہوئے کہا "وہاں میں تمہیں پانی کے ساتھ گولیاں بھی دوں گا اور کچھ کھانے کی بھی کوشش کریں گے۔"

وہ بھٹیار خانہ میرے اندازے سے کافی دور نکلا۔ اس تک سفر خاموشی سے کٹا۔ اس کی پیشانی پر مستانہ ہوٹل' کا بورڈ آویزاں تھا حالانکہ اسے ہوٹل تو کیا صحیح طور پر ریستوران بھی نہیں کہا جا سکتا تھا البتہ اس کے مستانہ ہونے میں کوئی شک نہیں تھا۔ اس کے دو تین بیرے مستانوں ہی کی طرح ادھر ادھر چکراتے پھر رہے تھے۔ اینٹوں سے بنے ہوئے کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا شخص بھی خاصا مستانہ معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھیں دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کی رگ و پے میں غالباً بھرے ہوئے سگریٹ کی مستی رچی ہوئی ہے۔

میں نے گاڑی چھپروں سے کچھ فاصلے پر اندھیرے ہی میں کھڑی کی تاکہ بیرے اندر زیادہ تاک جھانک نہ کریں۔ میں جب اپنی مطلوبہ چیزیں منگا چکا اور بیرا واپس جا چکا تو میں نے اشرف خان کو آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔

میں نے پیچھے جھک کر ملگجے اندھیرے میں اس کا جائزہ لیا۔ وہ کہنی سر کے نیچے رکھے' آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ٹانگیں بھی اس نے کسی نہ کسی طرح موڑ کر گھٹنے تقریباً پیٹ سے لگائے ہوئے تھے اور بائیں کروٹ لیٹا ہوا تھا۔ پہلے اس نے مجھے بتایا تھا کہ دائیں ٹانگ اس سے موڑی نہیں جا رہی تھی لیکن اب شاید تکلیف کا احساس کچھ کم ہو چکا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے جگاؤں یا سونے دوں' گولیاں اسے کھلاؤں یا رہنے دوں۔ میں نے ذرا بہتر طور پر اس کا جائزہ لینے کے لیے لائٹ آن کی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اب اس کے چہرے پر پسینے کا ایک قطرہ تک نہیں تھا اور چہرہ جو کچھ دیر پہلے لٹھے کی طرح سفید تھا' اب تمتما رہا تھا جیسے بچا کھچا سارا خون وہیں سمٹ آیا ہو۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی پیشانی چھو کر دیکھی' وہ بری طرح تپ رہی تھی۔ میں نے اسے آہستگی سے ٹٹولا۔ اس کا سارا جسم ہی ایسا ہو رہا تھا جیسے دہکتے تنور سے نکالا گیا ہو۔ سانسوں کی آواز کسی خوفزدہ بلی کی خرخراہٹ سے مشابہ تھی۔ میرے چھونے اور ٹٹولنے سے وہ ذرا بھی نہ کسمسایا۔ وہ دنیا ومافیہا سے بے خبر تھا۔

میں نے مناسب سمجھا کہ فی الحال اسے اسی طرح پڑا رہنے دیا جائے۔ لائٹ بجھا کر میں نے بیرے کو بلایا۔ کولڈ ڈرنکس کی دو بوتلیں خریدیں اور کچھ کھانے کی چیزیں لفافوں میں پیک کرائیں اور خود بھی کچھ کھائے بغیر یہ چیزیں گاڑی میں رکھ کر آگے روانہ ہو گیا۔ پانی البتہ میں نے خوب پی لیا تھا۔ پانی گو کہ کھارا تھا مگر پینے سے کوئی بدمزگی محسوس نہیں ہوئی تھی اور اب میں اپنے آپ کو کافی حد تک تازہ دم محسوس کر رہا تھا لیکن اشرف خان کی طرف سے مجھے تشویش تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس کی حالت زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اب میں جلد از جلد لاہور پہنچنا چاہتا تھا۔

اشرف خان اس انداز سے لیٹا ہوا تھا کہ اس کے سیٹ سے گرنے کا خطرہ نہیں تھا' اس لیے میں نے رفتار کم نہیں کی تھی البتہ ہر آٹھ دس میل بعد میں گاڑی ایک طرف روک کر اس کا جائزہ لے لیتا تھا۔ وہ بدستور گہری نیند میں تھا یا شاید بے ہوش تھا۔ میں نے دیکھا' اس کے زخم پر رکھی گئی بہت سی روئی اور پٹیوں کی کئی تہیں بھی خون میں بھیگنے لگی تھیں لیکن میں نے بینڈج تبدیل کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ مبادا وہ بے آرام نہ ہو جائے۔ اس کے جسم سے اب گویا آنچ آ رہی تھی۔ راستے بھر میرا کھانے پینے کو دل نہیں چاہا اور اشرف خان نے بھی آنکھ نہیں کھولی۔ میں خیر و عافیت سے لاہور کی حدود میں داخل ہو گیا۔ راستے میں ایک جگہ پولیس کی جیپ بھی نظر آئی لیکن وہ لوگ بہت تیزی سے میری مخالف سمت میں کہیں جا رہے تھے۔ انہوں نے میری طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔

اشرف خان کو ابھی تک ہوش نہیں آیا تھا البتہ اس کے چہرے سے کی سرخی غائب ہو چکی تھی اور اس کی جگہ غیر معمولی پیلاہٹ نے لے لی تھی۔ مجھے یہ شبہ بھی ہوا کہ اس کے چہرے پر ورم آنے لگی تھی یا شاید یہ محض میرا وہم تھا۔ اس کی سانس بھی اب کچھ بے ربط سے انداز میں چل رہی تھی۔

اشرف نے مجھے قاسم خان کا جو ایڈریس بتایا تھا' وہ گلبرگ کا تھا۔ گلبرگ بھی میں کسی رہنمائی کے بغیر ہی پہنچ گیا البتہ اب یہاں مطلوبہ فیز میں مطلوبہ کوٹھی تلاش کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی اور سڑکوں پر آمدورفت نہ ہونے کے برابر تھی۔ اکا دکا گاڑیاں ہی آتی جاتی دکھائی دی تھیں۔ پیدل چلنے والا کوئی نظر نہیں آیا تھا جسے روک کر میں راستہ پوچھتا۔

اکا دکا کوٹھیوں کے صدر دروازوں یا چار دیواری کے آس پاس مجھے چوکیدار نظر آئے اور بالآخر میں نے انہی سے مدد لی۔ انہیں میری بات اور مجھے ان کی بات سمجھنے میں دقت تو کافی پیش آئی لیکن بہرحال کچھ نہ کچھ رہنمائی تو مل ہی گئی۔ ان میں ایک چوکیدار تو ایسا بھی تھا جسے اس کوٹھی کا نمبر بھی معلوم نہ تھا جس کی وہ چوکیداری کر رہا تھا۔ بہت کم کوٹھیوں پر نمبر یا نیم پلیٹیں نظر آ رہی تھیں۔

تقریباً پون گھنٹے کی خواری کے بعد میں بالآخر مطلوبہ کوٹھی پر پہنچ گیا۔ اس کے گیٹ کے ایک پلر پر ماربل کے ٹکڑے میں قاسم خان کا نام کندہ تھا۔ میں نے سکون کی ایک طویل سانس لی اور گاڑی گیٹ کے عین قریب لے گیا۔ موٹی موٹی سلاخوں والا یہ گیٹ زیادہ اونچا نہیں تھا مگر اس پر اندر کی طرف موٹا سا تالا جھول رہا تھا اور کچھ دور ایک باڑھ کے قریب کرسی پر چوکیدار صاحب بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ بندوق کرسی کے سہارے کھڑی تھی۔

میں نے ہارن سے ہلکی سی بیپ کی آواز پیدا کی تو چوکیدار چونکا اور اٹھ کر گیٹ کے قریب آیا۔ وہ چھ فٹ سے بھی اونچا کڑیل جوان تھا۔ پھولی پھولی مونچھیں اور ڈھیلی ڈھالی سیاہ شلوار قمیص' روایتی قسم کا بارعب چوکیدار۔ کوٹھی بھی اسی کی طرح بارعب اور قدرے قدیم طرز کی تھی۔ آگے طویل و عریض لان تھا۔ اصل عمارت کافی پیچھے ہٹ کر تھی۔ میں نے گاڑی سے اتر کر گیٹ پر پہنچ کر دھیمی آواز میں کہا "مجھے قاسم خان صاحب سے ملنا ہے ... بہت ضروری کام ہے۔ انہیں فوراً اطلاع کر دو۔"

"بیکار بات مت کر۔" چوکیدار نے رکھائی اور کرختگی سے کہا "رات دس بجے سے لے کر صبح آٹھ بجے تک گھر والوں کے سوا کوئی اس گیٹ سے اندر نہیں آسکتا۔ یہ خان صاحب کا حکم ہے کہ جس کے لیے انہوں نے پہلے سے خود نہ بولا ہو' اس کے لیے کسی بھی حالت میں گیٹ نہ کھولا جائے اور نہ ان سے پوچھنے کے لیے انہیں جگایا جائے۔ چاہے پولیس بھی ان کے وارنٹ لے کر آجائے' ان کو بھی صبح تک باہر بٹھایا جائے۔"

'خیر۔۔۔۔ اب ایسی توپ چیز بھی نہیں ہوں گے تمہارے خان صاحب۔' میں نے دل میں سوچا۔ ایک تو ان نیچے والوں کو ہر جگہ' ہر مقام پر اپنی اہمیت اور غیر ضروری مستعدی دکھانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ انہیں احساس نہیں ہوتا کہ بعض اوقات کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے اور یہ درمیان میں چٹان بنے کھڑے رہتے ہیں۔

"میں خان صاحب کے رشتے کے ایک بھائی کو لے کر آیا ہوں۔" میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "وہ زخمی ہے ... بے ہوش پڑا ہے ۔۔۔۔ اس کی حالت اچھی نہیں ہے ۔۔۔۔ اسے فوری طور پر خان صاحب کی مدد کی ضرورت ہے۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

چوکیدار نے مشکوک سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پہلے سے بھی زیادہ بے مہر لہجے میں کہا "اب تو تم بالکل ہی الٹا بات کرتا ہے۔ خان صاحب کا تو کوئی رشتے کا بھائی نہیں ہے۔ ان کا تو کوئی رشتے دار ہی نہیں ہے۔ تم کدھر سے اس وقت صبح صبح فجر کے ٹیم ان کے رشتے دار کو اٹھا کر لے آیا ہے؟"

مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ بدبخت پہاڑی بکرا کسی صورت میں بھی معقولیت پر آمادہ نہیں ہوگا' میری بات نہیں مانے گا۔ اسی لمحے میں نے ایک ہنگامی فیصلہ کیا۔ میں نے سرسری سی نظر سے ادھر ادھر دیکھا۔ کشادہ گلی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا سوائے ایک آوارہ کتے کے جو ایک پودے کے قریب کھڑا ٹانگ اٹھائے فحاشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حوائج ضروریہ سے فارغ ہو رہا تھا۔

اچانک میں نے پوری قوت گویا ایک نقطے پر مرکوز کرتے ہوئے چوکیدار کی ناف کے قریب گھونسا رسید کیا۔ یہاں گھونسا رسید کرنا انسان کے لیے خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ پتہ پھٹ سکتا ہے اور انسان کی موت بھی واقع ہو سکتی ہے لیکن مجھے معلوم تھا کہ قد کاٹھ میں مجھ سے بھی نکلتا ہوا وہ سانڈ نما دو پایہ اتنی آسانی سے نہیں مرے گا۔

میرا بازو نہایت صفائی سے دو سلاخوں کے درمیان سے گزر کر اس کے پیٹ تک پہنچا تھا اور اس وقت میرے گھونسے کے پیچھے میرے وجود کی ساری طاقت ہی کام کر رہی تھی' اگر اس دوران میرا ہاتھ ذرا بھی کسی سلاخ سے مس ہو جاتا تو شاید کوئی ہڈی ٹوٹ جاتی یا کم از کم کھال تو ادھڑ ہی جاتی۔

چوکیدار 'اوغ' کی زوردار آواز کے ساتھ ہوا میں اچھلا' دہرا ہوا' سجدے کی سی حالت میں پختہ روش پر گرا پھر الٹ کر چت ہو گیا۔ اس کے بعد اس نے مزید حرکت نہیں کی۔ آنکھیں بند کیے چاروں خانے چت ہی پڑا رہا۔

"واہ بے گھونسے! خوب کام دکھایا۔" میں نے خود ہی اپنا ہاتھ چوم لیا کیونکہ اس وقت اس مشاقانہ گھونسے کی داد دینے والا کوئی اور نہیں تھا۔ پھر میں اس بھوکے بندر کی سی پھرتی سے گیٹ پر چڑھا جسے دوسری طرف کھانے کی کوئی چیز نظر آ رہی ہو۔ پرلی طرف کود کر میں نے چوکیدار کی صدری ٹٹولی۔ اس کی جیب میں تین چار چابیوں کا ایک گچھا موجود تھا۔ ان میں سے ایک چابی گیٹ کے تالے کی بھی تھی۔

گیٹ کھولنے سے پہلے میں نے چوکیدار کو گھسیٹ کر ایک باڑھ کی اوٹ میں لٹا دیا۔ گاڑی اندر لا کر میں نے گیٹ یونہی بھیڑ دیا' تالا نہیں لگایا۔ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ بیل نہ جانے کہاں بجی' مجھے اس کی خفیف سی آواز بھی سنائی نہیں دی۔ دروازہ جلد ہی کھل گیا۔ آنکھیں ملتے ہوئے ایک منحنی سے شخص نے باہر جھانکا۔ یہ بھی کوئی گھریلو ملازم قسم کی ہی چیز تھا۔ اہل خانہ معلوم نہیں کون سے خانے میں سوئے ہوئے تھے۔

میں نے اس ملازم کے سامنے بھی اسی قسم کا مکالمہ دہرایا جو میں جناب چوکیدار کی خدمت میں عرض کر چکا تھا۔ حسب توقع انہوں نے بھی میری گزارش کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور کم و بیش اسی قسم کا جواب دیا جیسا چوکیدار دے چکا تھا۔ دل تو یہی چاہا کہ ان موصوف کے ساتھ بھی وہی سلوک کروں جو میں چوکیدار کے ساتھ کر چکا تھا اور اس کے بعد خود ہی ڈھونڈتا ڈھانڈتا قاسم خان کی خواب گاہ میں جا گھسوں لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا کہ مجھے اب قاسم خان کے ہر ملازم سے ہی ایسا سلوک نہیں کرنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ اگر اس کا میری مدد کرنے کا امکان ہو تو وہ بھی ختم ہو جائے۔ صورتحال بہت سنجیدگی کی متقاضی تھی اور مجھے اپنی خاطر نہ سہی' اشرف خان کی خاطر تحمل' بردباری اور قوت برداشت کا مظاہرہ کرنا تھا۔

دفعتاً نوکر کو جیسے خیال آگیا اور وہ کسی احتیاط پسند چوہے کی طرح چونکتے ہوئے ایک قدم پیچھے ہٹ کر مجھے گھورتے ہوئے بولا "تمہیں چوکیدار نے اندر کیسے آنے دیا؟" پھر اس نے آنکھیں سکیڑ کر گیٹ کی طرف دیکھا جہاں ظاہر ہے' اسے چوکیدار کی کوئی جھلک نظر نہ آئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ میرے جوتے خاصے مضبوط تھے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے دروازے میں پاؤں پھنسا لینا چاہیے۔ دفعتاً اس کے عقب میں راہداری سے آہٹ سنائی دی۔

وہ مڑ کر دیکھنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میں نے بھی اس کے پہلو سے جھانک کر دیکھا' راہداری کا فرش ٹائلوں کا تھا اور پالش کی وجہ سے مدھم روشنی میں بھی آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھ جیسا آدمی تو شاید اس فرش پر چلتے وقت ہر قدم پر دو مرتبہ پھسلتا۔ کشادہ راہداری کے دونوں طرف کمروں کے دروازے نظر آ رہے تھے۔

اس راہداری کے موڑ سے ایک کتے کا خوفناک سر برآمد ہوا۔ اس کی بالشت بھر کی زبان باہر کو لٹکی ہوئی اور نوکیلے دانت دور ہی سے چمک رہے تھے۔ میں نے پہلی بار اتنا زبان دراز' کتا دیکھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پورا کا پورا سامنے آگیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ جسامت کے اعتبار سے بھی وہ بے حد غیر معمولی کتا تھا۔ جسامت کے اعتبار سے وہ کتا کم اور ایسا گدھا زیادہ معلوم ہوتا تھا جس کی صحت معمول سے کچھ کم ہو گئی تھی اور کیلشیم کی کمی سے قد ذرا چھوٹا رہ گیا تھا۔

شکر کا مقام ہے کہ اس کتے کے گلے میں زنجیر موجود تھی جس کا سرا ایک قوی ہیکل شخص کے ہاتھ میں تھا اور وہ قوی ہیکل شخص رات کے پچھلے پہر بھی یوں تمام تر لوازمات کے ساتھ سوٹ پہنے ہوئے تھا جیسے ابھی ابھی کسی دفتر سے اٹھ کر آ رہا ہو۔ تھوڑی سی حیرت مجھے اس خیال سے بھی ہوئی کہ کتوں کو تو لوگ عموماً رات کے وقت چار دیواری کے بجائے کھلے میں چھوڑتے ہیں لیکن یہ عجیب کتا تھا جسے مالکوں نے اندر رکھا ہوا تھا اور اب بھی اسے زنجیر سے پکڑ کر لایا جا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ کتا انسانی معمولات کا عادی رہا ہو۔ یعنی دن میں گھر کی چوکیداری کرتا ہو اور رات کو خوابگاہ میں کسی شاندار قسم کے بیڈ پر سوتا ہو۔

جس شخص کے ہاتھ میں کتے کی زنجیر تھی وہ لمبا تڑنگا اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اس کی رنگت تپے ہوئے تانبے جیسی تھی۔ اس کی چندیا بالکل صاف تھی اور روشنی میں چمک رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ قدرتی گنجا تھا یا بصد کوشش ٹنڈ کو اس حالت میں رکھے ہوئے تھا۔ وہ بالکل اسی قسم کا اسمگلر معلوم ہوتا تھا جیسے عموماً ہندوستانی اور پاکستانی فلموں میں دکھائے جاتے ہیں۔

اس کے پیچھے پیچھے ناٹے قد کا ایک ادھیڑ عمر شخص بھی سلیپر گھسیٹتا ہوا آ رہا تھا۔ اس کے جسم پر دھاری دار سلیپنگ سوٹ تھا۔ کھچڑی بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے جن میں وہ انگلیوں سے کنگھی کر رہا تھا۔

دروازے پر کھڑا ہوا نوکر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ دراز قد

شخص نے کتے کی زنجیر کا کچھ اور حصہ ہاتھ پر لپیٹ کر مٹھی میں دبالیا تاکہ کتے کی رسائی کسی دوسرے شخص تک نہ ہوسکے اور وہ دوسرا شخص غالباً میں ہی تھا۔ قریب پہنچ کر کتے نے شعلہ بار نظروں سے ایک بار میری طرف اور پھر دراز قد گنجے کی طرف دیکھا گویا پوچھ رہا ہو کہ اس اجنبی کا کیا کرنا ہے؟ چیر پھاڑ کرنی ہے یا صرف شہ رگ چبانی ہے؟

دراز قد گنجا شخص جو یقیناً قاسم خان تھا' آنکھیں سکیڑے سوالیہ انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔ اس کے دونوں بازو قدرے غیر فطری انداز میں ذرا اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس کی دونوں بغلوں میں ہولسٹروں کے ساتھ ریوالور موجود تھے۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتا' میں نے تیزی سے کہا۔ قاسم خان صاحب! میں شہزادکوٹ سے آیا ہوں۔ آپ کا کزن اشرف خان میرے ساتھ ہے لیکن وہ ....."

دراز قد گنجے شخص نے غراتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔ قاسم خان صاحب میں نہیں' یہ ہیں ...." اس نے اپنے پیچھے کھڑے ہوئے ناٹے آدمی کی طرف اشارہ کیا" میں ان کا باڈی گارڈ ہوں۔"

میں اپنے اندازے کی غلطی پر ذرا گڑبڑا گیا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ پستہ قد شخص اب آگے آگیا تھا اور قدرے ناپسندیدگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے نقوش قطعی عامیانہ' ہونٹ موٹے موٹے اور رنگت قدرے سانولی تھی۔ اس کی صرف آنکھیں قدرے غیر معمولی تھیں' ان میں لومڑی کی آنکھوں جیسی مکارانہ چمک تھی۔ وہ کسی بھی اعتبار سے' دور پار سے بھی اشرف خان کا رشتے دار بلکہ سرے سے خان ہی نظر نہیں آتا تھا۔ اشرف خان گوراچٹا اور دراز قد تھا۔ اس کے بال بھورے اور آنکھیں نیلاہٹ کی طرف مائل تھیں۔

میرا سلسلہ کلام جہاں سے ٹوٹا تھا' وہیں سے جوڑتے ہوئے میں نے بات جاری رکھی اور نہایت اختصار سے سارا قصہ قاسم خان کو سنایا جس کے دوران وہ بار بار اپنا وزن مضطربانہ انداز میں ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتا رہا تاہم اس کے چہرے پر اضطراب یا تشویش کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ قدرے بے زاری آمیز تحمل سے میری بات سن رہا تھا۔

میرے خاموش ہوتے ہی وہ بولا" تمہیں یقین ہے کہ پولیس نے یہاں تک تمہارا پیچھا نہیں کیا؟"

"جی ہاں۔ مجھے یقین ہے۔" میں نے جواب دیا" پولیس سے تو ہم نے شہزادکوٹ میں ہی پیچھا چھڑا لیا تھا اور یہاں تک راستے میں کسی نے مجھے شک کی نظر سے نہیں دیکھا۔"

تب اس نے گویا غیر محسوس طور پر اطمینان کی سانس لی پھر گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے مجھ سے ہی پوچھا" چوکیدار کہاں ہے؟"

"وہ مجھے کسی قیمت پر اندر آنے نہیں دے رہا تھا۔ میں معذرت خواہ ہوں کہ اسے ایک گھونسا رسید کرنا پڑا.... وہ ادھر باڑھ کے قریب لیٹا ہوا ہے۔"

قاسم خان نے ناگواری سے باڈی گارڈ کی طرف دیکھا اور کہا "یہ حال ہے.... ہم ان لوگوں کے بھروسے پر بھرا پرا گھر چھوڑ کر سوئے رہتے ہیں اور ان کی حالت یہ ہے کہ ایک گھونسے میں چیت ہوجاتے ہیں۔"

اب مجھے قاسم خان پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس کمبخت نے ایک بار بھی نہیں پوچھا تھا کہ اشرف خان کی حالت کیسی ہے اور نہ ہی وہ اسے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا تھا۔ پہلے یہ اطمینان کرنے میں لگ گیا تھا کہ میرے پیچھے پولیس تو نہیں لگی ہوئی۔ پھر چوکیداروں کی اہلیت پر تبصرہ کرنے بیٹھ گیا۔ ہماری آمد سے وہ کچھ کچھ بے زار بھی نظر آرہا تھا جیسے خواہ مخواہ ہی بیٹھے بٹھائے کسی شخص پر کوئی بے گار پڑ گئی ہو۔

چند لمحے وہ خاموشی سے ہوا میں گھورتے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتا رہا گویا کچھ سوچ رہا ہو پھر اس نے کونے میں سکڑ سمٹ کر کھڑے ہوئے نوکر کو مخاطب کیا" جاؤ .... جاکر سرونٹ کوارٹر سے علی محمد کو بلا کر ساتھ لے لو اور اس چوکیدار کے بچے کو جوتا سنگھا کر بلکہ چار جوتے سر پر مار کر ہوش میں لاؤ۔"

پھر اس نے گویا بادل ناخواستہ برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر کار کا دروازہ کھول کر چند لمحے اشرف خان کا جائزہ لیا۔ اشرف خان ابھی تک بے ہوش تھا اور اب مجھے یقین ہوچکا تھا کہ اس کے چہرے پر مجھے سفر کے دوران جو تبدیلی محسوس ہوئی تھی وہ درحقیقت ورم ہی کی وجہ سے تھی۔ اب اس کے چہرے پر نمایاں طور پر ورم آچکا تھا اور خون صرف اس کی بینڈج پر دکھائی دے رہا تھا۔ جسم میں کہیں اس کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

"اس کی حالت بہت خراب ہوچکی ہے۔" اس نے سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے تبصرہ کیا۔

وہ تو مجھے بھی نظر آرہا ہے جناب' میں یہ کہنا چاہتا تھا مگر خاموش رہا۔ قاسم خان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا" گھر میں اپنے پیشے یا اس قسم کے دیگر مسائل وغیرہ کی رسائی نہیں

[illegible] دیتا اور نہ ہی یہاں ان معاملات کے سلسلے میں کچھ کرتا [illegible]۔ بہرحال' تم فکر مت کرو' سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اس کے بعد وہ اپنے باڈی گارڈ سے مخاطب ہوا" اعظم خان! کچھ وقت تمہارے بغیر بھی گزارنے کی کوشش کرتا ہوں۔ [illegible]ا کرو کہ اس نوجوان کے ساتھ چلے جاؤ۔ انہیں تم دو نمبر [illegible]ے پر لے جاؤ۔ جمیل اور شرفو سے کہنا کہ ان کی ہر ضرورت [illegible] آرام کا خیال رکھیں۔ اشرف خان کو سنبھالیں۔ انہیں [illegible]ڑ کر تم فوراً واپس آؤ۔ تب تک میں تیار ہوتا ہوں۔ اس [illegible]ے بعد ہم کچھ ضروری انتظامات کرکے ان کے پاس پہنچیں [illegible]' سمجھ گئے؟"

اعظم خان نے بڑے بردباری سے اثبات میں سرہلایا اور مجھے [illegible]ڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک بار پھر میں نے اسٹیئرنگ [illegible]یل سنبھالا اور اعظم خان کی رہنمائی میں ایک اور سفر شروع [illegible]یا۔

کچھ دیر بعد ہم جس علاقے میں داخل ہوئے وہاں قدم قدم سڑکوں کے درمیان سبزے کے قطعات تھے اور بڑی بڑی کوٹھیوں کے باغیچوں میں یا باہر کچے راستوں پر گھنے درخت [illegible]ا رہے تھے۔ یہاں بیشتر سڑکیں دائروں کی سی شکل میں تھیں۔

"یہ کون سا علاقہ ہے؟" میں نے یونہی ازراہ تجسس پوچھا۔

"تم لاہور کے علاقوں سے واقف نہیں ہو!" اعظم خان [illegible] عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"واقف تو ہوں مگر سب علاقوں اور سب راستوں سے [illegible]ں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ ماڈل ٹاؤن ہے۔" اس نے اختصار سے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کی ہدایات کے مطابق دائیں بائیں [illegible]ڑتے ہوئے بالآخر میں نے گاڑی ایک ایسی کوٹھی کے پورچ [illegible] جا روکی جسے باہر سے دیکھ کر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا [illegible]ہ یہاں کوئی انسان رہتا ہوگا۔ وہ بدروحوں کا مسکن لگتی تھی۔ [illegible]ویل دعریض لان پر گھاس جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی [illegible]ی۔ ڈرائیوے کا فرش بری طرح ٹوٹا ہوا تھا۔ ہر طرف سوکھے [illegible]وں کے انبار لگے ہوئے تھے اور دیواروں پر رنگ روغن کا تو [illegible]ہیں نام ونشان تک نہیں تھا۔ اس کی جگہ سیاہ کائی سی جمی [illegible]وئی تھی جو کہیں گہری تھی اور کہیں ہلکی۔ حتیٰ کہ کھڑکیوں کے شیشوں پر بھی یہی سیاہی اور گرد وغبار جما ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کے پار دیکھنا ممکن نہیں تھا۔

[illegible] میں نے گاڑی روکی تو اعظم خان نے اتر کر سب سے پہلے [illegible]

بھی سیاہی مائل ہوچکا تھا لیکن ایک چیز میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ گیٹ اس قدر زنگ آلود تھا مگر بند کرتے وقت اس کے قبضوں سے ذرا سی چوں کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔

گیٹ بند کرکے واپس آکر اعظم خان نے سیاہی مائل چوبی دروازے ہی میں لگا ہوا کال بیل کا بٹن دبایا جو سرسری نظر میں دکھائی بھی نہیں دیتا تھا۔ جلد ہی ایک شخص نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی آنکھوں سے نیند جھانک رہی تھی۔ وہ جوان ہی تھا تاہم عمر میں مجھ سے بڑا تھا اور خاصا مضبوط نظر آتا تھا۔ بنیادی طور پر میری ہی طرح وہ بھی ایک ایسا دیہاتی ہی معلوم ہوتا تھا جس نے شہر آکر شہری رہن سہن سیکھ لیا تھا اور بہت سی چالاکیاں بھی اس میں آگئی تھیں۔

اعظم خان کو دیکھ کر وہ یک لخت کچھ مستعد سا نظر آنے لگا۔

"باہر آؤ۔" اعظم خان نے اسے حکم دیا" ایک بندے کو اندر گیسٹ روم میں پہنچانا ہے۔ زخمی ہے۔"

وہ شخص باہر آگیا اور ہم تینوں برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گاڑی کے پاس آئے۔ میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ اشرف خان کی حالت دیکھ کر اس شخص کے چہرے پر کوئی تغیر نمودار نہ ہوا۔ اس قدر صبروسکون سے وہ اعظم خان کے ساتھ مل کر اشرف خان کو گاڑی سے نکالنے لگا جس طرح پیشہ ور مزدور کہیں سے بوری اٹھاتے ہیں۔

میں بھی ان کے ساتھ لگ گیا۔ اشرف خان کے جسم کو میں نے جہاں بھی ہاتھ لگایا' انگارے کی طرح تپتے ہوئے ہی پایا۔ اس کے چہرے پر ورم نمایاں نظر آنے لگا تھا اور رنگت میں کہیں کہیں نیلاہٹ جھلکنے لگی تھی۔ سانسیں بھی اکھڑی اکھڑی سی تھیں۔ نہایت احتیاط سے اسے اٹھا کر ہم اندر لے چلے۔

اس کوٹھی کی اندر اور باہر کی حالت میں اتنا ہی فرق تھا جتنا کسی درویش کے ظاہر اور باطن میں۔ اندر سے اس کے فرش آئینوں کی طرح چمک رہے تھے اور درودیوار پر میل یا گندگی کا نام ونشان تک نہیں تھا۔

ایک ہال اور ایک ڈرائنگ روم سے گزر کر ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ ایک آراستہ بیڈ روم تھا۔ اشرف خان کو ہم نے ایک آرام دہ بیڈ پر اوندھا لٹا دیا۔ اس دوران ایک اور شخص بھی کمرے میں آگیا۔ وہ ادھیڑ عمر تھا لیکن فیشن زدہ نوجوانوں کی طرح جینز جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ بال لمبے لمبے تھے۔ شرٹ بڑے بڑے رنگین پھولوں والی تھی۔ اس کا جسم کسرتی تھا اور [illegible]

صورت حال کو دیکھ کر کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ خاموش تماشائی کی طرح ایک طرف کو کھڑا ہوگیا تھا۔

اشرف خان اپنی اس منتقلی کے دوران کسمسایا تک نہیں تھا۔ اب بستر پر بھی وہ بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اس کے کپڑوں کا بیشتر حصہ ایک بار پھر خون میں تر ہوچکا تھا بلکہ اب تو بعض جگہوں سے خون خشک بھی ہوچکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے زخم سے مزید خون نہیں رس رہا تھا۔ جتنا خون نکلنا تھا نکل چکا تھا، شاید اس کے جسم میں اب خون رہا ہی نہیں تھا اور اگر رہ بھی گیا تھا تو صرف اتنا کہ زندگی سے اس کا ناتا قائم تھا۔

"تم اسی کمرے میں اشرف خان کے پاس بیٹھو۔" اعظم خان ایک خوبصورت کاؤچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آرام کرنا چاہو تو دوسرے بیڈ پر لیٹ جاؤ۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو وہ سوئچ بورڈ پر ایک کال بٹن لگا ہوا ہے، اسے دبا دینا۔ کوئی نہ کوئی ضرور آجائے گا۔ میں واپس قاسم خان کے پاس جارہا ہوں۔ ہم جلد از جلد کسی کو لے کر یہاں آئیں گے۔ اوکے؟"

"اوکے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

وہ تینوں کمرے سے باہر چلے گئے۔ دروازہ بند ہوگیا اور کمرے میں سکوت چھا گیا۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور کاؤچ پر دراز ہوگیا۔ میری کمر جیسے اکڑ کر تختہ ہوگئی تھی۔ ایک دم لیٹا تو بے اختیار کراہ نکل گئی۔ چھت پر نظریں جمائے میں ستانے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔

چند گھنٹوں کے اندر اندر گزرے ہوئے واقعات خواب پریشاں کی طرح میری چشم تصور میں پرچھائیوں کی مانند رقصاں تھے۔ بیٹھے بٹھائے تقدیر کا صرف ایک تھپڑ انسان کو کہاں سے کہاں پھینک دیتا ہے۔ اب تو خیر میں پھر بھی کچھ سکون محسوس کررہا تھا لیکن جب میں ایک طرح سے پل صراط عبور کرکے قاسم خان کے گھر پہنچا تھا تو اس کے رویے نے پہلے تو میرے گھٹنوں سے جان ہی نکال دی تھی اور اس کی سرد مہری و لاتعلقی دیکھ کر میں سوچ میں پڑ گیا تھا اور اپنے آپ سے پوچھنے لگا تھا کہ یہ ہے وہ شخص جس سے میں جانے کتنی امیدیں وابستہ کیے ہانپتا کانپتا دوڑا چلا آیا تھا؟'

شکر ہے قاسم خان نے جلد ہی سرد مہری کی نقاب اتار دی تھی یا شاید زندگی کے معاملات میں اس کا انداز یہی ہوتا تھا۔ یعنی اس کے تاثرات سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بات توجہ سے نہیں سن رہا اور نہ ہی اس میں دلچسپی لے رہا ہے لیکن درحقیقت اس وقت وہ اسی سلسلے میں اپنے ذہن میں لائحہ عمل تیار کرنے میں لگا ہوتا تھا۔

میں نے ایک نظر اشرف خان کی طرف دیکھا۔ اس نے افراتفری کے لمحوں میں قاسم خان کے پاس آنے کا فیصلہ ٹھیک ہی کیا تھا۔ اب ہم خاصے مضبوط حصار میں تھے۔ مجھے تحفظ اور اعتماد کا احساس ہونے لگا تھا۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب اشرف خان بھی ٹھیک ہوجائے گا۔ اسے صحیح وسائل کے ساتھ علاج میسر آجائے گا۔

کسی قدر آرام اور سکون میسر آتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگیں۔ غنودگی سے پلکیں بوجھل ہوئی جارہی تھیں۔ شاید کچھ دیر کے لیے میری آنکھ لگ ہی گئی تھی کیونکہ جب میں نے اپنے کان کے عین قریب ایک تیز سی نسوانی آواز سنی تو میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ آنکھیں مل کر میں نے سامنے دیکھا مجھ سے ایک قدم کے فاصلے پر ایک جوان اور تقریباً سیاہ فام عورت کمر پر دونوں ہاتھ رکھے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکنیں تھیں۔ وہ منی اسکرٹ، لمبے سفید موزے اور اونچی ایڑی کی جوتیاں پہنے ہوئے تھی۔ اس کے نقوش بے حد تیکھے اور جسم بے حد متناسب تھا۔ ہمارے ملکی معیار حسن کے مطابق۔ اس میں بس یہی ایک کمی تھی کہ اس کی رنگت تقریباً سیاہ تھی، ورنہ اسے خاصی حسین عورتوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ اس کے چہرے پر کہیں کہیں پسینے کے دھبے چمک رہے تھے جو اس کی آبنوسی رنگت پر خاصے بھلے لگ رہے تھے۔

وہ روانی سے انگریزی میں بولی "میں نے ناشتا لگا دیا ہے۔ اگر تمہیں کچھ کھانا ہے تو ڈائننگ روم میں آجاؤ۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے اپنے محسوسات پر غور کیا۔ بھوک سے میرے پیٹ میں ٹیسیں تو اٹھ رہی تھیں اور نقاہت بھی محسوس ہورہی تھی لیکن کچھ کھانے کو قطعاً دل نہیں چاہ رہا تھا۔ تاہم میں نے بہتر سمجھا کہ معدے میں تھوڑی بہت خوراک ٹھونس لی جائے۔ ابھی نہ جانے کتنی بھاگ دوڑ باقی تھی اور اگر پیٹ خالی ہو تو انسان کا جسم کیا، حواس بھی صحیح طور پر کام نہیں کرتے۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ میں تقریباً ایک گھنٹا سویا رہا تھا جبکہ مجھے یہی محسوس ہورہا تھا کہ میں نے بس آنکھ ہی جھپکی ہے۔ میں نے اشرف خان کی پیشانی اور رخسار وغیرہ چھو کر دیکھے۔ اس کا جسم بدستور آگ بنا ہوا تھا۔ چہرے پر ورم اس قدر بڑھ چکا تھا کہ شکل ہی بدلی بدلی لگ رہی

اور نیلاہٹ میں بھی اضافہ ہورہا تھا۔ مزید تشویش کی بات تھی کہ گھنٹوں سے اس نے ایک لمحے کے لیے بھی آنکھ نہیں کھولی تھی اور از خود جنبش تک نہیں کی تھی۔ سانس بھی اتنی مدھم چل رہی تھی کہ کوشش کے بعد ہی محسوس کی جاتی تھی۔

اس کی کیفیت پہلے سے بدتر پاکر ایک بار پھر میرے دل کو کچھ ہونے لگا۔ اعظم خان کو یہاں سے گئے ایک گھنٹا ہو چلا تھا اور ابھی تک وہ واپس نہیں آیا تھا۔ معلوم نہیں وہ لوگ کس کے انتظامات میں مصروف تھے۔

آبنوسی رنگت والی وہ عورت کمر پر ہاتھ رکھے بدستور جواب طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی پیشانی کی شکنیں گہری ہوتی جارہی تھیں گویا اپنے سوال کا جواب نہ پاکر ناگواری محسوس کررہی ہو۔

"دل تو نہیں چاہ رہا۔" میں نے گزارے لائق انگریزی میں کہا۔ "بہرحال میں کوشش کرتا ہوں کہ تھوڑا بہت ناشتا کرلوں۔ کیا میں تمہارا نام پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے اپنی لنگڑی انگریزی کے ساتھ ساتھ انگریزوں والا ہی مینرازم (Mannerism) اختیار کرنے کی کوشش کی اور فوراً ہی تعارف کی فرمائش کرڈالی۔ خلاف توقع اس نے نہایت ہی سرد مہری سے میری طرف دیکھا اور مجھے گھورتے ہوئے رکھائی سے کہا۔

"میرا نام جاننا کچھ ضروری تو نہیں.... اور اگر تم مجھے نام سے مخاطب کرنا بہت ہی ضروری سمجھتے ہو تو پھر مس ٹریپ کہہ سکتے ہو۔"

"ٹریپ! یعنی پھندا۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "عجیب سا نام ہے۔"

"میں عورت بھی بہت عجیب ہوں۔" اس نے رکھائی سے کہا۔ وہ کھٹ کھٹ کرتی ہوئی میرے شانہ بہ شانہ چل رہی تھی۔ قد میں وہ مجھ سے کچھ ہی چھوٹی تھی۔ ایک راہداری سے گزر کر ہم جس کمرے میں داخل ہوئے، وہ تھا تو ڈائننگ روم ہی لیکن اس کا ماحول بیڈ روم سے زیادہ خوابناک تھا۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے گرے ہوئے تھے۔ چھت کے وسط میں ایک خوبصورت فانوس لٹکا ہوا تھا جس سے کئی رنگوں کی خوابناک سی روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔

بڑی سی میز اشیائے خورونوش کے برتنوں سے بھری پڑی تھی۔ میز سولہ افراد کے لیے تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ناشتے کا انتظام بھی سولہ افراد کے لیے ہی کیا گیا ہے۔ فی الحال تو کمرے میں میرے اور اس عجیب عورت کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

میرا اب بھی کچھ کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن ایک گلاس جوس کا پیا تو جیسے مدت سے کھڑی ہوئی کسی گاڑی کے زنگ آلود پرزوں کو تیل مل گیا۔ معدے کی مشینری میں کچھ روانی آگئی تو میں نے تھوڑا بہت ناشتا کرلیا۔ یہی نہیں بلکہ میز پر غیر ملکی سگریٹوں کا ایک پیکٹ پڑا دیکھ کر میں نے ایک سگریٹ بھی سلگالی اور دھوئیں کے غرارے کرنے لگا۔

میں سگریٹ ختم کرچکا تھا جب وہ عجیب عورت، دوبارہ کمرے میں آئی اور پہلے کی نسبت ذرا مودبانہ لہجے میں بولی "اگر آپ مناسب سمجھیں تو دوبارہ اسی کمرے میں جاکر بیٹھ جائیں جہاں آپ کے زخمی ساتھی موجود ہیں۔"

میں خود اسی ارادے سے اٹھنے ہی لگا تھا۔ میں اس کی رہنمائی کے بغیر ہی گیسٹ روم میں واپس آگیا۔ اشرف خان بدستور مومی مجسمے کی طرح ساکت پڑا تھا۔ ایک بار پھر جان لیوا انتظار کا مرحلہ شروع ہوگیا۔

کچھ دیر بعد میں نے گھڑی دیکھی۔ اعظم خان کو گئے دو گھنٹے ہوچکے تھے۔ میری بے چینی بڑھتی جارہی تھی۔ ایک جگہ بیٹھے رہنا میرے لیے دشوار ہوتا جارہا تھا۔ میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔

دفعتاً جینز جیکٹ والے کاؤبوائے ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا اور اطلاع دی "باس کا فون ہے، آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔"

میں لپک کر اس کے ساتھ ہال میں آیا۔ میرے ہیلو کہتے ہی قاسم خان کی آواز سنائی دی۔ وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بول رہا تھا "نوجوان! میں نے سب انتظام کرلیا ہے۔ ایک پرائیویٹ لیکن بہت بڑے اسپتال کے آپریشن تھیٹر میں اشرف خان کا آپریشن ہوگا۔ کوئی تم سے پوچھے گا تو کچھ نہیں لیکن پھر بھی یاد رہے کہ اشرف خان کو حادثتاً گولی لگی ہے۔ گو کہ حادثے کا بھی میڈیکولیگل کیس بنتا ہے لیکن اس حادثے کا نہیں بنے گا۔ میں جلد ہی ایک ڈاکٹر اور ایک گاڑی لے کر پہنچ رہا ہوں جو ایمبولینس کا کام دے گی تاہم اس پر ایمبولینس کا نشان نہیں ہوگا۔ تم لوگوں کو رخصت کرکے میں تو آفس چلا جاؤں گا، میرا ایک آدمی تمہارے ساتھ رہے گا جو کام سنبھالے گا۔ میں نے سوچا، تمہیں اطلاع دے دوں۔ اب تم بس تیار ہی رہنا۔"

"میں تو تیار اور منتظر بیٹھا ہوں۔" میں دھیمی آواز میں کہا۔

اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میں نے سکون کی سانس لی۔

بالآخر سب کچھ ٹھیک ہو گیا تھا۔

ریسیور رکھ کر میں مڑا تو ادھیڑ عمر کا ویٹر میری طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں مسکرا رہا تھا "ہمارا ابھی تک تعارف ہی نہیں ہوا۔ مجھے شرفو کہتے ہیں۔ میں باس کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔"

"مجھے محمد افضل کہتے ہیں اور میں باس کا ادنیٰ خادم نہیں ہوں بلکہ سرے سے خادم ہی نہیں ہوں۔" میں نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔

"بہت خوب۔" اس نے مزید دانت نکالے "آپ تو خاصے زندہ دل نوجوان معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال' باس آپ کے لیے خاصے پریشان معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے کبھی انہیں کسی کے لیے بہ نفس نفیس کہیں جاتے نہیں دیکھا۔ وہ تو صرف احکامات جاری کرتے ہیں۔"

"وہ دراصل میرے لیے نہیں' میرے اس ساتھی کے لیے پریشان ہیں جو زخمی حالت میں کمرے میں بے ہوش پڑا ہے۔ وہ دور پار کے رشتے سے خان صاحب کا کزن ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ اس کوٹھی میں بلند آواز میں بولتے ہوئے اندیشہ سا محسوس ہوتا تھا جیسے سارا سکون درہم برہم ہو جائے گا "بہرحال' خان صاحب کی مہربانی ہے کہ وہ بہ نفس نفیس اتنا تردد کر رہے ہیں' ورنہ آجکل صاحب حیثیت اور طاقتور لوگ اپنے دور پار کے رشتے داروں کو کب پوچھتے ہیں۔ خصوصاً مصیبت زدہ رشتے داروں کو۔"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ پھر اس نے سرسری سے لہجے میں پوچھا "باس آرہے ہیں نا؟"

"ہاں' کہا تو انہوں نے یہی ہے۔" میں نے بتایا۔

"آؤ' باہر ہی کھڑے ہو کر ان کا انتظار کرتے ہیں۔" اس نے تجویز پیش کی۔

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ راہداری سے گزرتے وقت مجھے ایک طرف کچن نظر آیا۔ اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور مس ٹریپ اندر کھڑی دونوں ہاتھ کمر پر رکھے خانساماں کو کسی بات پر ڈانٹ رہی تھی۔

"یہ عورت کون ہے؟" میں نے سرسری لہجے میں شرفو سے پوچھا۔

"یہ اس گھر کی نگراں ہے۔ آفس منیجر کا عہدہ تو تم نے سنا ہو گا۔ اس کے مقابلے میں باس نے اسے ہاؤس منیجر کا عہدہ دیا ہوا ہے۔ بڑی بدبخت چیز ہے۔ اچھے بھلے آدمی کو مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دیتی ہے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو؟" وہ مجھے آنکھ مار کر مسکرایا "اور جس پر مہربان نہ ہو اسے آنکھ اٹھا کر بات بھی نہیں کرنے دیتی۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سرہلایا اور پوچھا "اس کا نام کیا ہے؟"

"نام تو جولی ہے لیکن کئی ناموں سے جانی جاتی ہے۔ مس ٹریپ بھی کہلاتی ہے اور باس کے کچھ ملازم جل کر اسے کلو بلا بھی کہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ ہم برآمدے میں آکھڑے ہوئے اور اسی طرح ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ شرفو مجھے کریدنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں بظاہر بے حد معصوم بنا رہا لیکن اس کے سوالوں کے جواب اس طرح گول کرتا رہا کہ اسے شک بھی نہ ہونے پائے کہ میں اسے کچھ بتانے سے کترا رہا ہوں اور اسے کوئی قابل ذکر بات بھی معلوم نہ ہونے پائے۔

بالآخر گیٹ کے سامنے کوئی گاڑی رکنے کی آواز آئی اور شرفو نے لپک کر گیٹ کھولا۔ آگے پیچھے دو گاڑیاں پورچ میں آگئیں۔ ایک تو نیلی اور سفید اسٹیشن ویگن تھی اور دوسری ایک چم چم کرتی مرسیڈیز جسے باوردی ڈرائیور چلا رہا تھا۔ اس کی پچھلی نشست پر قاسم خان نیم دراز تھا اور اعظم خان پاس ہی مستعد بیٹھا تھا۔ اسٹیشن ویگن میں ڈرائیور کے علاوہ صرف ایک ہی شخص تھا۔

دونوں گاڑیوں کے دروازے کھلے۔ اسٹیشن ویگن سے چھوٹے قد کا فربہی مائل ایک شخص اتر آیا جو درمیانے درجے کے سوٹ میں بھی خاصا معزز اور خوشحال نظر آرہا تھا۔ وہ موٹے سے فریم کی نظر کی عینک لگائے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں بریف کیس تھا۔

مرسیڈیز سے قاسم خان اور اعظم خان بھی اتر آئے اور ہم سب خاموشی سے اندر آگئے۔ سلام دعا' تعارف یا رسمی کلمات وغیرہ کا قطعاً تبادلہ نہیں ہوا۔ ہم سب گیسٹ روم میں آگئے۔

عینک والا شخص ڈاکٹر تھا۔ اس نے بریف کیس سے اسٹیتھسکوپ اور چھوٹی ٹارچ نکالی اور کسی سے پوچھے بغیر اشرف خان کا معائنہ شروع کر دیا۔ پہلے اس نے زخم دیکھنے کے لیے بینڈیج کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا لیکن پھر جانے کیا سوچ کر اسٹیتھسکوپ سے چیک کرنا شروع کر دیا۔ آنکھوں کی پتلیاں دیکھیں' نتھنوں میں روشنی ڈالی۔

کافی دیر بعد وہ سیدھا ہو کر ہماری طرف مڑتے ہوئے بولا "اسے تو مرے ہوئے کم از کم آدھا گھنٹہ ہو چکا ہے۔"

میرے پیروں تلے سے گویا زمین نکل گئی تھی۔ لب بام پہنچ کر کمند ٹوٹنا کیا معنی رکھتا ہے' اس کا اندازہ مجھے اسی لمحے ہوا۔ اس سے پہلے میں نے یہ مفہوم صرف شعر میں ہی پڑھا تھا مگر شعر پڑھنا اور بات ہے اور عملی طور پر اس کیفیت سے گزرنا اور بات۔ ان میں اتنا ہی فرق ہے جتنا زہر کو چھونے اور زہر کو کھانے میں۔

اب تک میں اندر سے بہت مضبوط تھا' اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا اور بے خوفی سے ہر صعوبت برداشت کرتا آرہا تھا کیونکہ امید کی شمع دل میں روشن تھی۔ توقع تھی کہ بالآخر کٹھن وقت گزر جائے گا۔ اشرف خان ٹھیک ہو جائے گا تو ان تمام صعوبتوں کی یاد بھی ذہن سے محو ہو جائے گی لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ میں محض ایک بے منزل سفر کے لیے اپنے آپ کو تھکا رہا ہوں۔

ایک لمحے کے لیے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ شاید مجھ سے مذاق کیا جا رہا ہے لیکن پھر اپنے اس خیال کے بے تکے پن پر دل ہی دل میں مجھے خود بھی خفت محسوس ہوئی۔ چند لمحوں کے اندر اندر میں نہ جانے کتنی کیفیات سے گزرا اور بالآخر جب میں نے اپنے آپ کو اس حقیقت پر یقین کرنے کے لیے آمادہ کر لیا تو یکلخت مجھے ہولناک تنہائی کا احساس ہوا۔

میں بے جان سے انداز میں ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ اشرف خان میرے لیے بے حد اہم آدمی تھا۔ میں اپنی جگہ' اپنی دانست میں بہت مضبوط سہی' بے خوف سہی اور ہر طرح کے حالات میں گزارہ کر لینے کا اہل سہی لیکن وہ گویا میری ذات کا سائبان تھا۔ مجھ پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ ایسے کاروباری شریک روز کہاں ملتے ہیں جو دوستی کو دنیا کی ہر چیز پر مقدم رکھتے ہیں۔ میں واقعی دنیا میں تنہا رہ گیا تھا۔ میرا اب کوئی دوست نہیں تھا۔ میں رونا چاہتا تھا لیکن آنسو جیسے سینے کی گہرائیوں میں اتر گئے تھے اور انگارے بن کر دل کو خاک کر رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ سب میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر قاسم خان آگے بڑھا۔ اس نے ہمت بندھانے والے انداز میں میرے کندھے پر تھپکی دی۔ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ اس کے خیال میں شاید میرے غم کا بس یہی مداوا تھا۔ ڈاکٹر کی طرف مڑ کر وہ بولا "آپ اب جائیں۔ بعد میں مجھ سے مل لیجیے گا۔"

ڈاکٹر کے جانے کے بعد وہ جمیل اور شرفو سے مخاطب ہوا۔ "رات میں کسی وقت لاش ٹھکانے لگا دینا۔"

آخر میں وہ ایک بار پھر میری طرف متوجہ ہوا "تم فی الحال آرام کرو' تمہارے اعصاب کو سکون کی ضرورت ہے۔ کسی بھی چیز کی ضرورت محسوس کرو تو شرفو' جمیل یا مس ٹریپ سے کہہ دینا۔ دو ایک روز بعد ہم مزید بات کریں گے۔"

ان چند مختصر سے جملوں میں اس نے گویا سارے فیصلے کر دیے اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ اشرف خان کی لاش کی طرف اس نے دوبارہ آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ باہر جانے کے لیے وہ میرے قریب سے گزرنے لگا تو میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"خان صاحب! کیا اشرف کے لیے آخری غسل.... نماز جنازہ وغیرہ کا کوئی بندوبست نہیں ہو گا؟ آخری رسوم انجام نہیں دی جائیں گی اس کی؟" میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔

قاسم خان نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ گویا اسے مجھ سے ایسی کسی بات کی توقع نہیں تھی۔ جب وہ بولا تو اس کے لہجے میں ہلکی سی ناگواری چھپی ہوئی تھی۔ "کیسی بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ ہماری لائن کے آدمیوں میں آخری رسوم کا اہتمام تو صرف انہی کے لیے کیا جا سکتا ہے جو طبعی موت مریں۔" اس نے اشرف خان کی لاش کی طرف اشارہ کیا "اس قسم کے حالات میں اگر ہم آخری رسوم کے چکر میں پڑ جائیں تو ساتھ ساتھ ہمیں اپنی آخری رسوم کا بھی بندوبست کرنا پڑے۔"

میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور سر جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا "دراصل میں بنیادی طور پر تو دیہاتی ہی ہوں نا خان صاحب.... بڑا عجیب سا لگ رہا ہے مجھے.... کل تک اشرف خان میرا ایک بازو تھا.... آج مر گیا ہے تو جیسے غلیظ چیز کی طرح نوچ کر پھینکنا پڑ رہا ہے۔"

"ابھی نو آموز ہو۔ آہستہ آہستہ ان باتوں کے عادی ہو جاؤ گے" قاسم خان نے ایک بار پھر میرا کندھا تھپتھپایا۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق بھی محسوس کی۔ "بہرحال زیادہ کبیدہ خاطر ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ عین ممکن ہے کہ میونسپل کارپوریشن کی طرف سے اشرف خان کی آخری رسوم کا انتظام ہو جائے" دفعتاً اسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چونکتے ہوئے بولا "حیرت ہے' مجھے ابھی تک تمہارا نام ہی نہیں معلوم۔"

"محمد افضل" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

قاسم خان نے شرفو کی طرف دیکھا اور کہا "افضل صاحب کو کوئی کمرا دکھا دو جہاں یہ دو چار دن ٹھہر سکیں۔"

شرفو نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ میں اب اس کمرے میں موجود رہوں۔ میں نے ایک نظر اشرف خان کی لاش کی طرف دیکھا۔ نیلا اور پھولا پھولا سا چہرہ اشرف خان کا چہرہ تو لگ ہی نہیں رہا تھا۔

الوداع اشرف خان.... میرے دوست! میں نے دل ہی دل میں کہا اور اپنے پہلو میں اٹھتی ہوئی ایک عجیب سی ٹیس کو دباتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اب کوشش کر رہا تھا کہ ماحول سے کچھ دیر کے لیے لاتعلق ہو جاؤں اور بے حسی کی چادر اوڑھ لوں۔ کیا ہو چکا ہے اور کیا کچھ ہونے کی توقع ہے' سب کچھ بھول جاؤں۔

شرفو کی رہنمائی میں میں ایک کمرے میں پہنچا۔ جو کمرے میں اب تک دیکھ چکا تھا' یہ ان کی نسبت کافی چھوٹا تھا اور معقول قسم کے کسی ہوٹل کے کمرے سے مشابہ تھا۔

شرفو کے جانے کے بعد میں نے دروازہ بند کیا اور بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ کچھ دیر تک میرے ذہن میں سنسناہٹ سی ہوتی رہی اور رہ رہ کر کچھ واقعات کا عکس یوں جھلملاتا رہا جیسے اندھیرے میں جگنو۔ پھر میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو گیا۔ میں نے گویا سب سوچوں کی گٹھری سی باندھ کر کسی تاریک گوشے میں پھینک دی اور گہری نیند سو گیا۔

کوئی میرے آرام میں مخل نہیں ہوا۔ جب میں پوری طرح بیدار ہوا تو مجھے معلوم ہوا کہ دوسرے دن کی دوپہر قریب ہے۔ میں تقریباً چوبیس گھنٹے سوتا رہا تھا۔ شرفو کی ہدایت کے مطابق میں نے سائڈ ٹیبل میں لگا ہوا ایک کال بٹن دبایا۔

کچھ دیر بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور میری اجازت پا کر مس ٹریپ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ اس وقت جینز اور شرٹ میں تھی۔ بالوں کی پونی ٹیل بنا رکھی تھی۔ خوشبو کے جھونکے اس کے وجود سے پھوٹ رہے تھے۔ پکی سانولی رنگت سے بھی بلا کی تازگی جھلک رہی تھی۔ وہ اونچی ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے تھی۔ کمبخت کا قد پہلے ہی اونچا تھا۔ اب تو پوری اونٹ کی اونٹ لگ رہی تھی۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ اونٹ کالے بھی ہوتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ اس کی ہر جنبشِ قدم کے ساتھ دل اوپر نیچے ہوتا تھا۔

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے کسی مریض کی طرح گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "سب سے پہلے تو میں پیٹ بھر کر کھانا کھانا چاہتا ہوں۔ جو کچھ بھی تیار ہو' یہیں کمرے میں بھجوا دو۔ اس کے علاوہ میرے کپڑوں کی حالت بالکل تباہ ہے۔ اگر ہو سکے تو میرے لیے ایک جوڑے اور ایک سوئیٹر کا بندوبست کر دو۔ سائز میں تھوڑا بہت فرق ہو تو کوئی پروا نہیں۔ مجھ میں ایک بری عادت بھی ہے اور وہ یہ کہ میں دو تین اخبار ضرور پڑھتا ہوں" میں نے اسے اخبارات کے نام بتائے "اگر یہ اخبار یہاں آتے ہیں تو اچھی بات ہے۔ اگر نہیں تو کسی کو بھیج کر منگوا دو۔"

اس کا چہرہ تاثرات سے عاری رہا تاہم وہ اثبات میں سر ہلا کر دروازے کی طرف واپس جانے لگی تب میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا "سنو.... وہ میرے ساتھی کی لاش کا کیا بنا؟"

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی کنول جیسی آنکھیں بھی ہر قسم کے تاثر سے خالی تھیں۔ دھیمے سے لہجے میں بولی "یہ میرا شعبہ نہیں ہے۔ اس سلسلے میں کچھ بھی پوچھنا ہو تو شرفو یا جمیل سے پوچھنا۔"

"اچھا.... میرے خیال میں اتنا تو تم کر ہی سکتی ہو کہ جس کمرے میں میرے ساتھی کی لاش پڑی تھی وہاں میرا ایک بریف کیس رکھا ہے۔ وہ مجھے پہنچا دو" میں نے کہا۔ بریف کیس ویسے تو اشرف خان کا تھا لیکن اس وقت تو میں ہی اس کا مالک کہلا سکتا تھا۔ اس میں تھوڑی بہت رقم باقی تھی اور شاید کچھ کاغذات یا دوسری کوئی کام کی چیز بھی موجود رہی ہو۔

"بریف کیس تو پہلے ہی یہاں پہنچایا جا چکا ہے" اس نے دوسری بیڈ سائڈ ٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ بریف کیس موجود تھا۔ میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور مس ٹریپ کھٹ کھٹ کرتی دروازے کی طرف چل دی۔ میرا دل ایک بار پھر اتھل پتھل ہونے لگا۔ دروازہ بند ہونے پر میں نے اطمینان کی سانس لی۔ اس عورت کا میرے سامنے آنا میرے حق میں اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ آتے وقت اتنی قیامت نہیں ڈھاتی تھی جتنی جاتے وقت۔ معلوم ہوتا تھا کہ کلیجہ نکال کر ساتھ لے جا رہی ہے۔ شب دیجور کی بچی!

کچھ دیر بعد میری مطلوبہ چیزیں مجھے پہنچا دی گئیں۔ میں تیار ہو کر کمرے سے نکلا۔ میں اب اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ قدرت کی مجھ پر یہ ایک بڑی نوازش تھی کہ بڑے بڑے صدمات کا اثر میرے ذہن سے بہت جلد دور ہو جاتا تھا۔

راہداری میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے راستے میں اس کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جھانکا جہاں گزشتہ شام تک اشرف خان کی لاش موجود تھی۔ لاش اب وہاں نہیں تھی۔ بیڈ پر نئی اور بے شکن چادر اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے کئی دن سے یہ بستر اسی طرح کسی کی آمد کا منتظر ہو۔

اشرف خان کی یاد آتے ہی میرے دل میں ہلکی سی ٹیس اٹھی لیکن میں نے فوراً اس کے تصور کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میں اب مزید دکھی ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ذہن کو گزشتہ روز جتنا شدید جھٹکا لگ چکا تھا' وہی کافی تھا۔ جیسے حالات میں بھی سہی لیکن بہرحال قدرت نے مجھے میرے خوابوں کے شہر پہنچا دیا تھا۔ بریف کیس سے نکالی ہوئی کچھ رقم بھی میری جیب میں تھی اور کار کی چابیاں بھی۔ میں اب کسی حد تک پختہ بھی ہو چکا تھا اور زمانے نے تجربات و حوادث کی شکل میں بھی مجھے بہت کچھ دے دیا تھا۔ میں اب اپنے اسکول ٹیچر کے ساتھ دیہات سے آیا ہوا نوعمر لڑکا نہیں تھا۔ میں اب ایک نئے زاویہ نظر سے' ایک نئے اہتمام سے شہر کی سیر کرنا چاہتا تھا۔ کل کیا ہو گا؟ یہ میں فی الحال سوچنا نہیں چاہتا تھا۔

ویسے بھی میں نے اپنی چھوٹی سی عمر میں جو چند چھوٹے موٹے تجربے حاصل کئے تھے ان میں ایک یہ بھی تھا کہ اکثر آپ کے یہ سوچنے سے آپ کو کوئی خاص فائدہ نہیں ہوتا کہ کل کیا ہو گا۔ کل وہی ہو گا جو منظورِ خدا ہو گا۔

میں اپنے خیالات کے بے لگام گھوڑے کو قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے باہر آیا۔ شرفو اسی طرح برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا جس طرح ایک بار پہلے وہ مجھ سے باتیں کرتے وقت کھڑا تھا۔ شاید یہ اس کی پسندیدہ جگہ اور اس طرح کھڑا ہونا اس کا پسندیدہ پوز تھا۔ اگر وہ ایکٹر ہوتا تو شاید اس پوز میں اس کی تصویر اس عبارت کے ساتھ اکثر چھپا کرتی۔ دو دوست' دو فنکار..... شرفو اور ستون۔'

میں محض ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ کر آگے بڑھنے لگا تو وہ قدموں میں پھندا اڑانے والے لہجے میں بولا "کہاں جا رہے ہو برادر عزیز؟"

اس کا حلیہ اب بھی کاؤبوائز والا ہی تھا۔ ادھیڑ عمری کے باوجود وہ اس حلیے میں جچتا تھا۔ صرف اس کا نام اس حلیے کے ساتھ نہیں جچتا تھا اور حیرت کی بات تھی کہ اس نے اب تک اسے بدلنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی خود وہ اپنا تعارف کراتے وقت اپنا پورا نام بتاتا تھا۔ شرفو ہی کہتا تھا۔

"میں ذرا شہر کی سیر کرنے جا رہا ہوں" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے' آپ شہر کے راستوں سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہیں۔ میں گائیڈ کے فرائض انجام دے سکتا ہوں۔ بالکل

فارغ ہوں۔ بور ہو رہا ہوں۔ ویسے بھی باس نے کہا تھا کہ آپ کو تنہا کہیں نہ جانے دیا جائے تو بہتر ہی ہے۔"

اس کے آخری جملے پر مجھے کچھ ناگواری سے محسوس ہوئی۔ اس کا باس کون ہوتا تھا میرے لئے ہدایات جاری کرنے والا؟ لیکن اس کے لہجے کی ملائمت اور گائیڈ والی تجویز نے مجھے خاموش رہنے پر مجبور کر دیا۔ میرے حق میں یہ بہتر ہی تھا کہ شہر کا ایک بھیدی میرے ساتھ ہوتا۔

"گائیڈ بن رہے ہو تو ڈرائیور کا عظیم عہدہ بھی سنبھال لو" میں نے گاڑی کی چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ہم آج صاحب بہادر بن کر بیٹھیں گے۔ آخر ہمارا بھی حق بنتا ہے کہ کبھی کبھی آرام سے ذرا ٹانگیں پھیلا کر بیٹھیں۔"

"کیوں نہیں صاحب جی!" اس نے فوراً مودب ہوتے ہوئے کہا "آپ چاہیں تو ٹانگیں کیا' بازو وغیرہ بھی پھیلا کر بیٹھیں" پھر اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور بہت ہی تابعدار قسم کے ڈرائیوروں کے انداز میں بولا "تشریف رکھیے حضور!"

ہم دونوں نے بیک وقت قہقہہ لگایا لیکن اسی لمحے میری نظر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر پڑی اور میرا قہقہہ ادھورا رہ گیا۔ ایک

عجیب سے احساس جرم نے میرا دل سرد کردیا۔ اسی گاڑی کی پچھلی سیٹ پر میں کل اشرف خان کو لٹا کر لایا تھا۔ میں لاہور کی طرف آرہا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا یار دھیرے دھیرے ایک دوسری ہی دنیا کی طرف محو سفر تھا۔

میں نے توجہ بٹانے کے لیے فوراً ادھر ادھر کی چیزوں کی طرف دیکھنا شروع کردیا اور پھر اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ شرفو گاڑی ریورس کرکے گیٹ سے باہر لے آیا۔ کچھ دور تک گاڑی ڈرائیو کرنے کے بعد وہ بولا "یہ گاڑی ہے یا گدھا گاڑی ؟"

"جن حالات میں یہ میسر آئی ہے' ان حالات میں ہمیں صرف گدھا بھی قبول ہوتا۔ اسے تو پھر بھی کم از کم گاڑی تو کہا جاسکتا ہے۔ خواہ گدھا گاڑی ہی سہی" میں نے آہ بھر کر کہا۔

مین روڈ پر آکر شرفو نے مجھے بتایا "یہ فیروز پور روڈ ہے" چوراہے پر پہنچ کر اس نے رفتار بالکل کم کرتے ہوئے مجھے ہر سڑک کے بارے میں بتایا کہ اس کا نام یہ ہے' اس کا نام وہ ہے۔ فلاں سڑک فلاں علاقے سے گزرتی ہوئی فلاں سڑک سے جاکر ملتی ہے۔ شہر کا نقشہ کچھ یوں ہے اور اب ہم فلاں سڑک پر جارہے ہیں۔ وہ مجھے سمجھاتا جارہا تھا اور میں سب کچھ ذہن نشین کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

ایک بارونق چوراہے پر پہنچ کر اس نے سروس روڈ پر گاڑی روکتے ہوئے کہا "یہ گلبرگ کی مین مارکیٹ ہے" پھر وہ ایک چھوٹی سی دکان میں جاگھسا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک لفافہ لیے جلدی سے گاڑی میں آبیٹھا۔ لفافے میں بوتل لپٹی ہوئی تھی۔

تب میں نے دیکھا' وہ شراب کی دکان تھی۔ ان دنوں شراب کی فروخت پر کوئی خاص پابندی نہیں تھی۔

"میں نے سوچا کہ میری کرنی ہے تو پھر ذرا پرلطف انداز میں کی جائے" وہ بوتل گلوو کمپارٹمنٹ میں رکھ کر گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولا "آپ کو ایسا شاندار گائیڈ' ڈرائیور اور حکم کا غلام شاید کہیں نہ ملے صاحب جی!" ہم ایک بار پھر ہنس دیے۔

میں گردوپیش کا جائزہ لیتا جارہا تھا اور وہ مجھے راستوں کے بارے میں اور قابلِ ذکر عمارتوں کے بارے میں بتاتا جارہا تھا۔ جلد ہی ہم ایک نہر کی چھوٹی سی پلیا پر پہنچے جہاں سے اس نے گاڑی بائیں ہاتھ موڑلی اور نہر کے متوازی چلنے لگا۔

یہاں چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ نکھرا نکھرا سبزہ۔ نہر کے دونوں طرف سڑکیں تھیں۔ کم چوڑی مگر خوبصورت اور ہموار۔ ان کے ایک طرف فٹ پاتھ بھی تھا۔ نہر کے کنارے ڈھلان پر بھی سبزہ تھا اور سڑکوں کے دونوں طرف درخت سایہ کیے کھڑے تھے۔ شہر پر شام اتر آئی تھی اور یہاں تقریباً رات ہی جیسا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ کہیں کہیں الیکٹرک پول موجود تھے اور ان میں سے کسی کسی پر بلب ٹمٹمارہے تھے۔

ناکافی روشنی میں تاحد نظر پھیلی ہوئی یہ سڑک' نہر کا کنارہ' ہوا میں رچی ہوئی رات کی رانی کی مہک' یہ سب کچھ مجھے بہت بھلا لگ رہا تھا۔ میں گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ کھلی' تازہ اور مہکتی ہوائیں صحیح معنوں میں انسان کو آزادی اور خدا کی دیگر نعمتوں کا احساس ہوتا ہے۔ خصوصاً جب جیب میں چار پیسے بھی موجود ہوں۔ گھٹن' تاریکی' تعفن اور تفکرات میں گھرے ہوئے انسان کو آپ لاکھ بتاتے رہیں کہ وہ آزاد ہے مگر اس کے چہرے پر رونق مشکل سے ہی آئے گی۔ جسم میں سنسنی بھی مشکل سے ہی دوڑے گی۔

"میری رائے میں یہ لاہور کی خوبصورت ترین سڑک ہے۔ دنیا خواہ کچھ بھی کہے" شرفو بولا۔ اس نے رفتار بالکل کم کردی تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے نہر کے دونوں طرف پھیلے ہوئے نو تعمیر شدہ عمارتوں کے سلسلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

"یہ نیو کیمپس اور یونیورسٹی کے ہوسٹلز ہیں۔"

ان سے کچھ آگے پہنچنے کے بعد ویرانہ سا شروع ہوگیا۔ دونوں طرف کچھ دور تک تو کھیت پھیلے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ان سے آگے کیا تھا' یہ اندازہ کرنا مشکل تھا۔ تاروں کی موہوم سی روشنی میں بہت کم فاصلے تک کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔ وہ بھی محض ہیولوں کی سی شکل میں۔

ایک جگہ شرفو نے گاڑی روک دی اور ہم اتر کر نہر کے کنارے پر پھولدار پودوں کے ایک جھنڈ کے قریب بیٹھ گئے۔ شرفو نے بوتل کی سیل توڑتے ہوئے کہا "یونہی چلے گی" پہلا گھونٹ بھرتے ہوئے وہ بولا "نئی دوستیوں کے نام۔"

اپنی باری پر میں نے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا "نہیں... پرانی دوستیوں کے نام۔"

اس شب اس ویرانے میں بیٹھے بیٹھے دھیرے دھیرے اداسی کی دھند میرے ذہن پر جمنے لگی۔ خمار نے مجھے اداسی دور کرنے میں مدد نہیں دی' اسے اور بھی گہرا کردیا۔ اداسی کے اس گڑے مردے کو تحت الشعور کے اندھیروں سے اکھاڑ کر شعور کی جلتی بجھتی روشنیوں میں لا پھینکا۔ تاروں کی مدھم روشنی میں کبھی کبھی نہر کا پانی سیال چاندی کی طرح جھلملا اٹھتا تھا۔ کبھی دور کہیں جھاڑیوں میں کوئی جگنو چمکتا اور غائب ہوجاتا۔ اسی طرح بھولے بسرے کچھ لوگ بھی میرے ذہن میں ایک لمحے کے لیے اپنی یاد کا لشکارا دیتے اور پھر جانے کہاں چھپ جاتے۔ جانے کون کس حال میں تھا؟

میں بالکل چپ تھا۔ شرفو خاصی ترنگ میں آچکا تھا اور ہر موضوع پر میری معلومات میں اضافہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مثلاً یہ کہ جب مینڈک ٹراتا ہے تو اس کے گلے میں جو تھیلیاں سی پھولتی ہیں' انہیں انگریزی میں کیا کہتے ہیں اور یہ کہ کس قسم کی آواز والی لڑکی کن خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ شیو کون سے بلیڈ سے بنانی چاہیے۔

اچانک اس نے یوں ہڑبڑا کر سگریٹ کا پیکٹ نکالا جیسے سگریٹ پینا کوئی بہت ہی ضروری کام تھا جسے انجام دینا وہ بھول گیا تھا۔ جلدی میں اس نے سگریٹ فلٹر کی طرف سے جلا لی۔ اسے نہر میں پھینک کر اس نے دوسری سگریٹ سلگائی اور پیکٹ میری گود میں ڈال دیا۔ میں ایک لمحے پیکٹ کو دیکھتا رہا بالآخر میں نے بھی ایک سگریٹ سلگا ہی لی۔ آج صاحب بہادر کا پوری عیاشی کا دن تھا۔

ایک طویل کش لے کر شرفو فیصلہ کن لہجے میں بولا "اب تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"میں..." میں نے برائے نام روشنی میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی "میں بہت اختصار سے باتیں کرنے کا عادی ہوں۔ طالب علمی کے زمانے میں بھی جب زبانی امتحان میں مجھ سے کسی چیز کی تفصیل پوچھی جاتی تھی تو خلاصہ بتاتا تھا اور خلاصہ پوچھا جاتا تھا تو خاموش رہتا تھا۔"

شرفو نے ایک گھٹا گھٹا سا قہقہہ لگایا۔

میں نے بات جاری رکھی "میں دیہاتی گھرانے کی پیداوار ہوں۔ میں چھوٹا تھا تو ماں مرگئی۔ تھوڑا بڑا ہوا تو باپ مرگیا۔ تھوڑا اور بڑا ہوا تو دونوں چچاؤں کی آنکھ کا پانی مرگیا اور انہوں نے مجھے گھر سے نکال باہر کیا۔ ادھر ادھر دھکے کھاتا ہوا بالآخر اشرف خان سے آٹکرایا اور اس کے ساتھ مل کر چھوٹے پیمانے پر ادھر کا مال ادھر کرنے لگا۔ ہم تیزی سے ترقی کررہے تھے لیکن فلک کج رفتار کو ہماری ترقی ایک آنکھ نہ بھائی اور اشرف خان مرگیا۔ یہ ہے فدوی کی کل داستان حیات" میں نے بھی قہقہہ لگانے کی کوشش کی اور اپنے قہقہے کے کھوکھلے پن پر خود ہی حیران رہ گیا۔

"پھر بھی تم خوش قسمت ہو یار!" وہ یکلخت ہی حد سے زیادہ سنجیدہ ہوگیا "کم از کم پیچھے کہیں تمہارا کوئی گھربار تو نہیں' کسی کو تمہارا انتظار تو نہیں رہتا' تمہیں کسی سے جھوٹ تو نہیں بولنا پڑتا۔ میں بھی دیہاتی ہوں لیکن میرا دیہات میں ایک بھرا پرا گھر ہے' میرا چھوٹا بھائی ہے جو کالج میں پڑھ رہا ہے' بوڑھی ماں ہے جو میرے سر پر سہرے کے پھول دیکھنے کے انتظار میں موت کے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ نو سال قبل میں بالکل فلمی انداز میں اپنی بہن کی شادی کے لیے روپیہ جمع کرنے کی غرض سے شہر آیا تھا لیکن میرے ساتھ جو ٹریجڈی ہوئی وہ شاید فلمی ٹریجڈی سے کچھ مختلف ہے اور وہ یہ ہے کہ اب جبکہ میری بہن کی شادی کے لیے روپیہ جمع ہوچکا ہے' جہیز تیار ہے تو کوئی رشتہ نہیں مل رہا کیونکہ اس کی عمر زیادہ ہوچکی ہے۔ ماں مجھے کہتی ہے کہ میں کچھ کوشش کروں اور شہر میں ہی اپنی برادری کا کوئی لڑکا ڈھونڈنے کی کوشش کروں۔ وہ اس لیے معصومیت کے ساتھ مجھے یہ تاکید کرتی ہے کیونکہ اسے علم ہی نہیں کہ میرا واسطہ کن لوگوں سے ہے' کن لوگوں میں روز و شب گزرتے ہیں اور میں کیا کام کرتا ہوں۔ انہیں تو یہی معلوم ہے کہ میں شہر میں ایک چھوٹی سی فرم میں منیجر لگا ہوا ہوں۔"

"درحقیقت تم کیا کرتے ہو؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"میں بہت کچھ کرتا ہوں اور بظاہر دیکھا جائے تو کچھ بھی نہیں کرتا" وہ چٹکی بجا کر سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ "میں اس ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں تقریباً ہر وقت موجود رہتا ہوں۔ باس کو جب بھی کوئی ایمرجنسی پڑتی ہے' وہ اس کا رخ ادھر ہی کو موڑ دیتا ہے۔ میں ہر ایمرجنسی کو سنبھالتا ہوں۔ میں صرف مال لانے لے جانے کے لیے کہیں نہیں جاتا۔ اس کے علاوہ باس کسی وقت کسی بھی کام کے لیے مجھے طلب کرسکتا ہے' کہیں بھیج سکتا ہے یا میرے پاس آسکتا ہے۔ میں بڑی کثیرالمقاصد قسم کی چیز ہوں" وہ خود اپنا مذاق اڑانے کے سے انداز میں ہنس دیا۔

اسے یقیناً ایک طویل عرصے کے بعد اپنے دل کا بوجھ کم کرنے کا موقع ملا تھا۔ مجھے اس سے ہمدردی تھی۔ خصوصاً اس بنا پر کہ اس نے اتنے کم وقت کی شناسائی میں اپنا آپ میرے سامنے بے نقاب کردیا تھا۔ اپنی ذاتیات اور گھریلو مسائل سے بھی پردہ اٹھا دیا تھا۔

"زندگی اسی کا نام ہے پیارے" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا "سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"میں بھی اسی یقین کے ساتھ زندہ ہوں" وہ مسکرایا "بس کبھی کبھی یہ مجھے دل گرفتہ کردیتی ہے" اس نے بوتل ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا۔ میرے خیال میں یہ بوتل ہی کا کمال تھا کہ وہ اتنی جلدی مجھ پر کھل گیا تھا۔

اچانک ہی وہ اٹھتے ہوئے بولا "آؤ' چلیں۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی اصل شہر کی سیر تو باقی ہے۔" وہ گاڑی کی طرف چل دیا۔ میں اس کے پیچھے لپکا۔

اگلی پلیا سے نہر پار کرنے کے بعد اس نے گاڑی دوسری طرف کی سڑک پر واپس موڑلی۔ ایک بار پھر کسی مستعد گائیڈ کی طرح وہ مجھے ہر موڑ' ہر سڑک کے بارے میں بتانے لگا۔

خاصے طویل سفر کے بعد وہ ایک موڑ کاٹتے ہوئے بولا "وہ سامنے سیکریٹریٹ ہے .... میرے خیال میں تو اصل لاہور بس یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ مجھے یہاں پہنچ کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ کچھ رونق میلہ نظر آتا ہے اور میں ٹھہرا تمہاری طرح ہی بنیادی طور پر دیہاتی.... رونق میلے کا دلدادہ۔ جینز پہن لی تو کیا ہوا۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مغربی ممالک میں جینز دیہاتی ہی پہنتے ہیں یا پھر شہر میں رہنے والے غریب غربا' جو اچھا لباس افورڈ نہیں کرسکتے۔ ہمارے ہاں شاید یہ شہری اور فیشن ایبل ہونے کی علامت ہے" میں نے اس پر اپنی علمیت کا رعب جھاڑنے کی کوشش کی۔

"ہمارے ہاں اگر جینز شہری اور فیشن ایبل ہونے کی علامت ہے تو ٹھیک ہی تو ہے" وہ منہ بنا کر بولا "کیونکہ ہمارا عام دیہاتی تو بے چارہ ٹخنوں سے ایک بالشت اونچی دھوتی بھی مشکل سے افورڈ کرتا ہے۔"

اب ہم جس تنگ سی سڑک پر تھے وہاں ٹریفک کا عجب ہی عالم تھا۔ تانگوں کے گھوڑے سائیکل سواروں سے بغل گیر ہونے کی کوشش کررہے تھے۔ بسیں اور کاریں گویا ایک دوسرے سے 'دست وگریباں' ہونے کے لیے بیتاب تھیں اور اسکوٹر سوار ان سب کے درمیان سے اپنا راستہ بنانے کے لیے کوشاں تھے۔ پیدل چلنے والے گویا ان سب کو ہی شکست فاش دینے کے خواہاں تھے۔ وہ سارے ہنگامے سے بے نیاز' جہاں سے دل چاہتا تھا اچانک ہی سڑک پار کرنے لگتے تھے۔ سڑک پار کرنے کے دوران غالباً انہیں خیال آجاتا تھا کہ مسئلہ فیثاغورث یا فلسفہ ارشمیدس پر غور کرنے کے لیے یہ بہترین مقام ہے چنانچہ وہ گہری سوچ میں ڈوب جاتے تھے اور اسی دوران غالباً انہیں غنودگی آجاتی تھی۔ سڑک پار کرتے ہی البتہ وہ مستعد اور چاق چوبند نظر آنے لگتے تھے۔

کئی بار مجھے خدشہ محسوس ہوا کہ کوئی گھوڑا ہماری کار کی کھڑکی سے گردن اندر لا کر میرا کالر چباتے ہوئے پوچھے گا "اور سناؤ یار' کیا حال ہے" چنانچہ میں نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا لیا۔ میں بھولا نہیں تھا کہ میں بھی بنیادی طور پر دیہاتی ہی تھا لیکن شاید میں اتنا بھی دیہاتی نہیں تھا کہ اس 'رونق میلے' سے محظوظ ہوسکتا۔ مجھے اس سے خوف محسوس ہورہا تھا۔

میں نے اپنے خوف کا اظہار شرفو پر بھی کردیا۔ وہ بولا "اسی لئے تو میں تمہارے ساتھ آیا ہوں۔ ویسے خیر' دو چار دن کی بات ہے' تم بھی اس ٹریفک کے عادی ہوجاؤ گے۔"

کچھ دیر بعد اس نے گاڑی ایک تنگ سے بازار میں موڑ لی اور پھر ایک گلی میں ذرا سی جگہ پاکر روک لی۔ گاڑی سے اتر کر وہ میرا ہاتھ تھامے بازار میں آیا اور آگے چلنے لگا۔

اس نے بتانے کی ضرورت محسوس کی نہ میں نے پوچھنے کی۔ میں نے اندازہ کرلیا تھا کہ وہ بازار حسن تھا۔ وہ ایک لمبی سی خم دار سڑک تھی جس کے اطراف میں جانے کتنی پرپیچ گلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔

کچھ بنی سنوری طوائفوں کے جھرمٹ ابھی اپنی رہائش گاہوں سے نکل کر کوٹھوں کی طرف آرہے تھے۔ کچھ اپنی دکانیں سجا چکی تھیں۔ اکثر کوٹھوں کے دروازے کھلے تھے اور سازندے ابھی اپنے ساز درست کررہے تھے۔ کہیں کہیں سے طبلے کی ادھوری 'تھپ تھپ' یا ہارمونیم کی 'روں روں' کسی زخمی کی کراہ کی طرح ابھرتی اور معدوم ہوجاتی۔

کسی کسی بالاخانے پر بھی کوئی رقاصہ بن سنور کر کھڑی ہوئی تھی اور متلاشی نگاہوں سے گزرتی ہوئی ٹولیوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پان سگریٹ اور اشیائے خورونوش کی دکانوں والے اپنی دکانوں کو آخری رنگ دے رہے تھے۔ یہاں کی دکانیں بھی شاید طوائف دکانیں تھیں۔ رات کا رنگ گہرا ہونے پر ان کی تزئین و آرائش ہورہی تھی۔

پھولوں کے گجرے والے قدم قدم پر کھڑے تھے اور ہر آنے جانے والے کو روکنے کی کوشش کررہے تھے۔ بازار میں خوب چہل پہل تھی۔

قدرے عجیب سے انداز میں کچھ لوگ یکے بعد دیگرے ہمارا تعاقب کررہے تھے۔ ان میں کوئی ناٹا تھا' کوئی لمبا۔ کوئی مجہول تھا اور کوئی خوب گٹھا ہوا۔ کوئی سیاہ فام تھا اور کوئی خوب گورا چٹا۔ کوئی کلین شیو تھا اور کوئی گھنی مونچھوں' چوڑی چھاتی والا۔ کسی کی باچھوں سے پان کی پیک بہہ رہی تھی تو کسی کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔

کوئی تن کر چل رہا تھا تو کسی کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں لیکن ایک بات ان سب میں مشترک تھی اور وہ یہ کہ سب بیٹھی بیٹھی سی آواز میں سرگوشیاں کررہے تھے۔ کبھی ایک ہمارے قریب آتا اور قدم ملا کر چلنے کی کوشش کرتے ہوئے ان دیکھی حسیناؤں کے الف لیلوی حسن کی کہانیاں سنانے لگتا۔ کبھی دوسرا قریب آتا اور ہمیں پرستان میں لے چلنے کا وعدہ کرنے لگتا۔ کبھی کوئی اور تعاقب میں آتا اور ہمیں صاحب ذوق نواب زادے قرار دیتے ہوئے ہمارے ذوق کی تسکین کے لیے اپنی خدمات پیش کرتا۔

شرفو بڑے مشاقانہ انداز میں ان سب کو ٹالتا چلا جارہا تھا۔ بالآخر ہم ان سب کو پیچھے چھوڑ آئے۔ اب کوئی بھی سرگوشی ہمارے تعاقب میں نہ تھی۔ شرفو نے رک کر متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ میرا گلا خشک ہورہا تھا۔ اس بازار میں داخل ہونے سے پہلے مجھے محسوس ہورہا تھا کہ خنک سی ہوا چل رہی ہے لیکن اب یوں لگ رہا تھا جیسے لو چل رہی ہے۔ مجھے اپنے چہرے پر تپش محسوس ہورہی تھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

سامنے ہی ایک کوٹھے پر بیٹھی ہوئی رقاصہ مسکرائی۔ وہ سمجھی کہ شاید میں نے اسے دیکھ کر ہونٹوں پر زبان پھیری ہے۔ میں نے اس کے بے تحاشا میک اپ کی وجہ سے بگڑے ہوئے چہرے سے گھبرا کر رخ بدل لیا۔

ایک دوسرے کمرے میں بھی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کمرے میں اتنی تیز روشنی تھی کہ آنکھیں خیرہ ہورہی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ پانچ چھ سازندے بیٹھے ساز درست کررہے تھے۔ ان کے قریب ہی ایک فربہی مائل سانولی سی نائکہ بیٹھی بڑے جوش وخروش سے پان چبا رہی تھی۔ کمرے کے عین وسط میں چاندنی پر وہ پتلی سی لڑکی منتظر انداز میں بیٹھی تھی۔

شکل وصورت تو اس کی کوئی غیر معمولی نہیں تھی مگر ایک بات غیر معمولی ضرور تھی کہ اس نے میک اپ بہت ہلکا کیا ہوا تھا' ورنہ اب تک مجھے جتنے چہرے نظر آئے تھے ان سب کے اصل نقوش دریافت کرنے کے لیے شاید باقاعدہ کھدائی کرنی پڑتی۔ جانے کیوں اتنے زیادہ اور سستے قسم کے میک اپ سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ غنیمت تھا کہ شرفو بھی ابھی تک ایسے کسی چہرے کی طرف نہیں لپکا تھا۔

میں جس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا' اس کے چہرے پر اس قدر ہلکا میک اپ مجھے ایک انہونی محسوس ہورہا تھا۔ شاید اس کے پاس میک اپ کا سامان ختم ہوگیا تھا۔ وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ پاکر پیروں میں گھنگرو باندھنے لگی۔ شرفو میرا ہاتھ پکڑ کر اسی کوٹھے کی طرف بڑھ گیا۔

نائکہ نے یوں اٹھ کر ہمارا استقبال کیا جیسے وہ ہمارے ہی انتظار میں اس عمر کو پہنچ گئی تھی۔ حتیٰ کہ اس نے ہماری بلائیں بھی لیں۔ اس کے رویّے میں مصنوعی جوش وخروش اور خلوص کی اس قدر فراوانی تھی کہ میں کچھ شرمندہ سا ہورہا تھا۔ لڑکی بھی جھک کر آداب بجالائی۔ ہم ایک طرف بیٹھ گئے۔

باہر چبوترے پر ایک مدقوق سا لڑکا بیٹھا بڑے انہماک سے سگریٹ پی رہا تھا۔ نائکہ نے اسے دوڑایا اور ہمارے لیے کولڈ ڈرنکس اور پان منگوائے۔ کولڈ ڈرنک پینے کے بعد میرے اوسان کچھ بحال ہوئے اور میں اپنے آپ کو اس قابل محسوس کرنے لگا کہ جو کچھ میرے سامنے تھا اس سے محظوظ ہوسکوں۔

نائکہ نے دروازہ بند کردیا تھا اور لڑکی نے رقص کے ساتھ ایک غزل شروع کردی تھی۔ ادھر شرفو مجھے نیچی آواز میں کوٹھے کے آداب بتا رہا تھا۔ نوٹ کس طرح دیئے جاتے ہیں۔ رقاصہ کی کونسی ادا کا مطلب کیا ہوتا ہے اور اس کے جواب میں کیا کرنا چاہئے۔ آتے اور جاتے وقت کوٹھے پر موجود دیگر افراد سے کیا سلوک کرنا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔

اس کے بعد وہ نائکہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "نو آموز ہے۔ پہلی بار آیا ہے۔ اسے طور طریقے سکھا رہا ہوں۔"

"چھوڑیں جی۔ خود ہی سیکھ جائیں گے" پچاس سالہ نائکہ پندرہ سالہ دوشیزہ کی طرح اٹھلا کر بولی "ان کی پریشانی مجھے بتارہی ہے کہ اب یہ آئندہ اس بازار میں آتے جاتے ہی رہیں گے البتہ ایک اندیشہ ضرور ہے" وہ نہایت ہی سرد آہ بھر کر بولی۔ "کہ جب تک یہ پختہ کار ہوں گے تب تک ہماری بساط نہ لپیٹ دی جائے۔ ہمارے پیشے پر دن بہ دن سختیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ فن دم توڑ رہا ہے۔"

نائکہ کے منہ سے لفظ 'فن' کا استعمال سن کر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر اس کی مراد انگریزی والا FUN تھا تو شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی ورنہ جس انداز میں لڑکی مرزا غالب کی غزل کو ایک فلمی گانے کی طرز پر گارہی تھی' اس سے تو یہی پتا چل رہا تھا کہ اردو والا فن کافی عرصے پہلے ہی کم ازکم اس کوٹھے پر تو دم توڑ چکا ہے۔

رقاصہ مجھ پر زیادہ مہربان تھی۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ میرے پاس زیادہ رقم موجود ہے۔ مجھے آتے وقت پتا ہی نہیں چلا تھا کہ شرفو بوتل بھی ساتھ لے آیا تھا۔ غزل کے بعد لڑکی اپنی اوقات پر یعنی فلمی گیتوں پر آگئی اور یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ خواہ مخواہ ماحول کو جو 'اے ٹچ آف کلاس' دینے کی بھونڈی کوشش کی جارہی تھی اس سے نجات مل گئی تو سب اپنی اپنی جگہ ترنگ میں آگئے۔

بازار حسن کا تصور میرے لئے ہمیشہ ایک عجیب اور پراسرار سی دنیا کا رہا تھا اور میں کافی حد تک خوش تھا کہ آج میں نے یہ دنیا دیکھ ہی لی تھی۔

اچانک ایک ہلکا دھماکا سا ہوا۔ دراصل کسی نے لات مار کر دروازہ کھولا تھا۔ ساتھ ہی چار پانچ آدمی دھڑ دھڑ کرتے اندر آگئے۔

وہ مٹی میں لتھڑے ہوئے جوتوں سمیت بے داغ چاندنی پر آن کھڑے ہوئے۔ ان میں سے تین تو اچھے خاصے کیم شحیم تھے۔ سب کے گریبان کھلے ہوئے تھے اور سب کے گلے میں مفلر تھے۔ سب کی شلوار قمیصیں ڈھیلی ڈھالی اور

بھڑکیلے رنگوں کی تھیں۔

ان کے جسموں سے پسینے کی اور سانسوں سے سستی شراب کی بو کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ وہ غالباً خالص روایتی قسم کے ویسے ہی گلی کوچوں کے بدمعاش تھے جیسے عموماً پنجابی فلموں میں ولن کے ساتھ نظر آتے ہیں۔

ان میں سے ایک نے رقاصہ کی پتلی سے کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر عجیب احمقانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ ساز تو ان لوگوں کی آمد کے ساتھ ہی خاموش ہوچکے تھے۔ اب لڑکی بھی خاموش تھی تاہم بے چاری حتی الامکان دلیری سے مسکرانے کی کوشش کررہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں۔

ان میں سے ایک قدرے مجہول اور ایک گیم سخیم شخص میرے اور شرفو کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر سرخ سرخ آنکھوں سے یوں ہمیں گھور رہے تھے جیسے ہپناٹائز کرنے کی کوشش کررہے ہوں مگر شاید ان کے علم میں کچھ کمی تھی کہ ہم ہپناٹائز نہیں ہو پارہے تھے بلکہ الٹا ہمارے ذہنوں پر جو خمار سا طاری تھا وہ بھی دور ہونے لگا تھا۔

کمرے کا منظر یک لخت ساکت ہوکر رہ گیا تھا' جیسے کوئی فلم چلتے چلتے رک گئی ہو۔ کئی سیکنڈ تک سب کچھ یونہی رہا۔ معلوم نہیں وہ کمبخت چاہتے کیا تھے۔ بس یوں اپنی اپنی پوزیشن سنبھال کر بے حس و حرکت کھڑے ہوگئے تھے جیسے ابھی ان سب کی تصویر اتاری جائے گی۔ بالآخر شرفو جیسے اس سکوت سے بور ہوگیا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے اس نے اپنے سامنے کھڑے ہوئے نامعلوم گیم سخیم بدمعاش کو بڑی شائستگی سے مخاطب کیا "بھائی صاحب! اگر آپ لوگوں نے گانا ہی سننا ہے تو آپ آرام سے بیٹھیں۔ ہم چلے جاتے ہیں۔"

اس بدمعاش نے گویا شرفو کی بات سنے بغیر اس کے پاس رکھی ہوئی بوتل اٹھائی اور للچائی ہوئی نظروں سے روشنی میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے بہ آواز بلند بولا۔

"اوئے دتے! ولایتی ہے... آدھی سے زیادہ بھری ہوئی ہے۔"

"رکھ لے.... رکھ لے۔" اس بدمعاش نے بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر حکم دیا جس نے ابھی تک اسی انداز میں رقاصہ کی کلائی پکڑی ہوئی تھی۔

"بے شک رکھ لیں بھائی صاحب!" شرفو نے ملائمت سے کہا "آپ لوگ اپنا شوق پورا کریں اور ہمیں جانے دیں۔"

اس نے بدمعاشوں کے درمیان سے راستہ بنا کر گزرنا چاہا دھت تھے۔

"شہری بابو ہیں۔ بیچاروں کا دم خشک ہو رہا ہے۔" دتے نے کھرکھراتی آواز میں کہا اور سب نے ہم آہنگ قہقہہ لگایا۔ صوتی تاثر کچھ اس قسم کا تھا جیسے کمرے میں بہت سے کتے بلیاں لڑ پڑی ہوں۔

"بیٹھ جا! بیٹھ جا۔" مجہول بدمعاش نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے پیچھے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ اس کے دھکیلنے سے میں واقعی دھکیلا جاتا۔ مجھے بہت بدمزگی محسوس ہورہی تھی۔ ان بدبختوں نے نہ جانے کیوں آکر سارا لطف غارت کردیا تھا۔

مجھ سے زیادہ بدمزگی شاید مجہول بدمعاش کو محسوس ہوئی تھی کیونکہ میں اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر پہلے سے زیادہ دباؤ ڈالتے ہوئے بولا "ابے بیٹھ جا! ہم تو روز ہی ناچ گانا دیکھتے ہیں۔ ہم تو تمہیں ناچ دکھانے آئے ہیں۔ پھرکی کا ناچ۔"

اس بار بھی میں پیچھے نہ ہٹا تو اس نے مجھے الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کرنے کے لیے بازو گھمایا۔ اس کا وار میں نے کلائی پر روک لیا۔ ماحول کا سکوت یک لخت ہی ٹوٹ گیا جیسے کسی مشینی نظام کا بٹن دبادیا گیا ہو اور ہر چیز حرکت میں آگئی ہو۔

ادھر میں نے مجہول بدمعاش کے پیٹ میں گھونسا رسید کیا اور وہ دہرا ہوا اور ادھر شرفو نے نہ جانے کیا داؤ آزمایا کہ اس کے سامنے راستہ روک کر کھڑا ہوا گیم سخیم بدمعاش یوں دروازے سے ہوتا ہوا باہر سڑک پر جاگرا جیسے کسی لڑاکا بیوی نے شوہر کے لائے ہوئے ناقص آلوؤں کا تھیلا اٹھا کر گھر سے باہر پھینک دیا ہو۔ بوتل بھی اس کے ساتھ ہی باہر جاگری اور سڑک پر اس کی کرچیاں بکھر گئیں۔

شرفو ایک دوسرے بدمعاش کی طرف متوجہ ہوچکا تھا۔ اسی دوران اتفاقاً میں نے دیکھ لیا کہ ایک دوسرا بدمعاش تپائی اٹھا کر اس کے سر پر رسید کرنے لگا تھا۔ میں نے بروقت کالر پکڑ کر اسے پیچھے کھینچ لیا اور اس کی کمر میں گھٹنا رسید کرکے پسلیوں میں گھونسا مارا اور سنبھلنے کا موقع دیے بغیر گھٹنے تک اسے اوپر اٹھا کر پٹخ دیا۔ فرش پر قالین ہونے کے باوجود اس کی ریڑھ کی ہڈی پر اتنی چوٹ ضرور لگی کہ وہ بری طرح بلبلا کر اچھلا اور اوندھا ہوگیا اور اسی حالت میں قے کرنے لگا۔

اس دوران شرفو دوبارہ اپنا خاص داؤ استعمال کرتے ہوئے ایک اور بدمعاش کو باہر پھینک چکا تھا۔ اس کے لیے وہ اپنی ایک ٹانگ اور دونوں بازوؤں کو بیک وقت ایک خاص انداز میں

یہ سب کچھ گویا چشم زدن میں ہوگیا تھا۔ اگر وہ ہم سے زیادہ نشے میں نہ ہوتے تو شاید ان سے نمٹنا ہمارے لیے اتنا آسان نہ ہوتا۔ اب صرف جناب دتا صاحب رہ گئے تھے جو نہایت جنونانہ انداز میں قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کے چاقو نکال چکے تھے مگر یہ چاقو کھولنے کا انہیں موقع نہ مل سکا۔ شرفو نے اس کے پیٹ میں لات ماری۔ وہ لڑکھڑا کر میری طرف آیا تو میں نے اس کی گدی پر کھڑا ہاتھ رسید کیا۔ وہ جھکولا کھا کر شرفو کی طرف گرنے لگا تو اس نے منہ پر ایسا گھونسا رسید کیا کہ ہڈی ٹوٹنے کی آواز مجھے بھی سنائی دی۔ غالباً اس کی ناک سپاٹ ہوگئی تھی۔ چند لمحے کے لیے وہ ہمارے درمیان گویا والی بال بن کر رہ گیا۔

اس کا بن کھلا گراری دار چاقو اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ شرفو نے چاقو اٹھالیا۔ دتے نے غالباً اسے اپنی موت کا پیغام سمجھا اور لڑکھڑاتا ہوا باہر بھاگا۔ قالین پر بظاہر بے ہوش پڑے ہوئے دونوں بدمعاش بھی شاید کن انکھیوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے اور غالباً اسی انتظار میں تھے کہ کب ان کا سردار راہ فرار اختیار کرے اور کب وہ اس کی تقلید کریں۔ وہ اس کے پیچھے بگٹٹ دوڑے اور اس لمحے میں نے دیکھا کہ وہ دونوں بدمعاش جو سڑک پر جاکر گرے تھے' پہلے ہی غائب ہوچکے تھے۔

ہم نے اپنے کپڑے جھاڑے' بال درست کیے اور نائیکہ اور لڑکی کی طرف دیکھا۔ دونوں کے چہروں پر رونق لوٹ آئی تھی۔ شرفو ناگواری سے بولا "تمہارے ہاں آنے والے سب لوگوں کو کیا اسی طرح اٹھا پٹخ کرنی پڑتی ہے؟"

"ارے بابو جی! توبہ کریں۔ ہمارے کوٹھے کی طرف تو آج تک کسی ایسے ویسے آدمی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں ہوئی۔" نائیکہ فوراً اپنے لہجے میں رعب اور دبدبہ سمونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "یہ تو شاید شہر میں نئے تھے اور نئے نئے ہی بدمعاش بنے ہیں۔ شراب ہضم نہیں ہوسکی اس لیے منہ اٹھا کر آگئے ورنہ ان کی بھلا کیا جرأت تھی۔ ہم پکے ڈیرے دار ہیں۔ کوئی خانہ بدوش نہیں ہیں۔ اس بازار میں اپنی بڑی عزت ہے۔ ایسے اوچھے بدمعاشوں کا ہمارے پاس بڑا پکا بندوبست رہتا ہے لیکن بس اتفاق ہی ہے کہ آج ہمارے آدمی ذرا فلم دیکھنے گئے ہوئے ہیں ورنہ دروازے پر ہی ان کا بھرتا بنادیتے۔"

"بے شک۔ بے شک۔" شرفو نے تائید میں سر ہلایا۔

"یہ جو لڑکی آپ کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کررہی ہے یہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے..." اس نے اس وقت کی ایک مشہور فلمی ہیروئن کا نام لیا۔ "اس کی سگی بہن ہے جی یہ۔"

"بے شک۔ بے شک۔" شرفو نے ایک بار پھر سعادت مندی سے گردن ہلائی۔

"بیٹھیں جی۔ آپ تشریف رکھیں۔" بائی جی' شرفو کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولیں۔ ان کے لہجے میں رضعداری کی بوجھل تہوں میں لپٹی ہوئی ایک التجا تھی۔ "ابھی تو رات پڑی ہے۔ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو آپ حکم کریں' میں آپ کو یہیں منگا دیتی ہوں۔"

"بس بائی جی! ہمیں آپ اجازت دیں۔" شرفو انتہائی ملائمت سے بولا "ہم شریف اور ذرا بزدل سے لوگ ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ لڑائی اور دھینگا مشتی کی خبر پاکر کوئی گشتی سپاہی وغیرہ اس طرف نہ آنکلے یا وہ لوگ خود ہی فریاد لے کر تھانے نہ جا پہنچیں۔ آپ کو معلوم ہے ہم جیسے شریف لوگ تھانے کچہری کے چکر سے ذرا گھبراتے ہیں۔"

بائی جی نے ایک لمحے کے لیے متذبذب سے انداز میں میری اور پھر شرفو کی طرف دیکھا گویا فیصلہ نہ کرپا رہی ہوں کہ شرفو کی بات پر یقین کریں یا نہ کریں۔ اگر ہم اتنے ہی شریف آدمی ہوتے جتنا کہ شرفو ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا تو بدمعاشوں کی آمد پر ایک لمحہ بھی ضائع کیے بغیر جوتیاں چھوڑ کر بھاگ چکے ہوتے یا پھر اس وقت کوٹھے سے باہر پڑے اپنی ہڈیاں سہلا رہے ہوتے۔

خود فریبی' سادگی یا پھر مصلحت کوشی کی انتہا تھی کہ بائی جی نے شرفو کی بات پر یقین ظاہر کرنے کا فیصلہ کیا اور جلدی سے بولیں "تھانے کچہری سے آپ مت گھبرائیں بابو جی! اللہ کے فضل سے بڑی عزت ہے اپنی تھانے کچہری میں۔ ہم نے سب سے بنا کر رکھی ہوئی ہے... اور پھر ہماری یونین بھی ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں اس غنڈہ گردی کا معاملہ اپنی یونین کے سامنے بھی پیش کردوں گی۔"

"بس بائی جی! میں نے عرض کیا نا کہ ہم اب کسی قیمت پر نہیں ٹھہر سکتے۔" شرفو قدرے رکھائی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ "ہمارا اب مزہ کرکرا ہوگیا ہے۔ دوسرے مجھے ایک کام بھی یاد آگیا ہے۔ آپ ایسا کریں... آپ یہ رکھ لیں۔" شرفو نے میری جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کر بائی جی کی طرف بڑھایا۔

میرا خیال تھا کہ اب بائی جی کی باچھیں کھل جائیں گی اور وہ بہ آسانی ہمیں جانے کی اجازت دے دیں گی کیونکہ لالچ کی پرچھائیاں گویا مستقلاً ان کے چہرے پر ڈیرا ڈالے ہوئے تھیں لیکن خلاف توقع یہ پرچھائیاں گہری سنجیدگی کی تہ میں چھپ گئیں۔ انہوں نے عجیب سی نظروں سے شرفو کی طرف دیکھا اور عجیب سے ہی انداز میں مسکرائیں۔

"بابو جی' آپ تو اس نوجوان کو کوٹھے کے آداب سکھا رہے تھے

مگر خود بھی شاید بھول گئے۔" بائی جی دھیمے لہجے میں بولیں "ہم یونہی بھلا رقم کیوں لیں۔ ہم بھیک تو نہیں کھاتے۔" شرفو نے گھبرا کر نوٹ میری جیب میں ٹھونس دیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے دروازے کی طرف چل دیا۔ باہر آنے سے قبل میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھکائے سازندوں کے قریب کھڑی تھی اور اپنے ناخنوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں نے جس لمحے اس کی طرف دیکھا عین اسی وقت اس نے سر اٹھایا۔ ایک ثانیے کے لیے ہماری نظریں ملیں۔ اس کی آنکھیں سپاٹ تھیں۔ ہر تاثر سے عاری۔

ہم باہر آگئے۔ کچھ لوگ جو کوٹھے پر ہونے والے ہنگامے کی طرف متوجہ ہوگئے تھے ادھر ادھر کھڑے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ تتر بتر ہوگئے۔ شرفو تیز قدموں سے اسی طرف واپس چل دیا جدھر سے ہم آئے تھے۔

چند لمحے پہلے بائی جی کی باتیں سن کے میرا ارادہ تھا کہ باہر جا کر خوب قہقہے لگاؤں۔ شاید میں اور شرفو شکل سے اتنے ہی.... بیوقوف نظر آتے تھے کہ انہوں نے بے تکان گپیں ہانک دی تھیں۔ میں اپنے بارے میں تو یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ عین ممکن ہے میری شکل پر حماقت برستی محسوس ہوتی ہو لیکن شرفو تو خاصا معقول آدمی معلوم ہوتا تھا اور اس کے بالوں میں سفیدی کی جھلک بھی تھی۔ اس کے علاوہ بائی جی یہ بھی دیکھ چکی تھیں کہ وہ بازار حسن میں نیا نہیں تھا اس کے باوجود انھوں نے خوب اونچی ہانکی تھی۔ مگر اب باہر آ کر مجھ میں ان کی باتوں پر ہنسنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

بائی جی کے آخری جملے سے مجھے دھچکا سا لگا تھا۔ خصوصاً یہ الفاظ۔ "ہم بھیک تو نہیں کھاتے۔" اس جملے نے میرے خیالات میں عجیب سی ہلچل برپا کردی تھی اور میری سوچیں جانے کس کس سمت میں بھٹکنے لگی تھیں اور میں جانے کیسے کیسے فلسفوں کی گہرائی میں چلا گیا تھا۔ طوائف اپنی طرف بڑھا ہوا نوٹ واپس کردے یہ تو میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

"معاف کرنا یار..." شرفو بولا "آج اپنے مقدر میں تفریح نہیں تھی۔"

"میرے خیال میں تو کافی تفریح ہوگئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے مطمئن لہجے میں کہا "تم تو اس طرح معذرت طلب کر رہے ہو جیسے وہ بدمعاش تمہارے اپنے ہی بھیجے ہوئے تھے۔"

وہ ہنس دیا۔ اس کی ہنسی بھی پھیکی سی تھی۔ وہ بھی کچھ کھویا کھویا سا تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر ہم واپس چل دیے۔ واپسی میں شرفو نے روٹ بدل دیا اور مجھے کچھ اور راستوں کے بارے میں بتایا۔ میں کچھ زیادہ ہی تیزی سے شہر سے مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ لاہور شہر تو ایک مدت سے میرے خوابوں میں بسا ہوا تھا۔ پہلی بار یہاں آیا تھا تب بھی اس شہر کی ہر چیز مجھے شناسا سی لگی تھی۔ اب تو شناسائی گویا کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ میں ابھی یہ فیصلہ تو نہیں کرسکا تھا کہ میں کروں گا کیا... لیکن یہ فیصلہ بہرحال ضرور کرچکا تھا کہ اب میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ اسی شہر میں رہوں گا۔ میری کہیں جڑیں تھیں نہ شاخیں۔ کسی شہر میں میرا کوئی دوست تھا نہ کہیں کوئی ایسا رشتے دار جو میری رفاقت کی طلب میں بے چین ہوتا۔ میں تو کہیں بھی ڈیرا ڈال لیتا، میرے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس صورت میں بہتر یہی تھا کہ وہاں رہا جائے جہاں رہنے کا روح مطالبہ کرتی تھی۔ اب یہاں خواری میرے حصے میں آتی تھی یا خوشحالی اور مسرت، دونوں ہی صورتیں مجھے قبول تھیں۔

ہم واپس پہنچے تو جمیل برآمدے میں کھڑا تھا۔ گاڑی سے اترنے سے پہلے میں نے شرفو سے پوچھا "اس شخص کا یہاں کیا مصرف ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔ اسے معمولی کاموں کے لیے رکھا گیا ہے۔ ایک طرح سے تم اسے میرا مددگار سمجھ سکتے ہو۔" شرفو بولا۔

گاڑی سے اتر کر ہم برآمدے میں پہنچے تو جمیل مودبانہ انداز میں شرفو سے مخاطب ہوا "سر! تقریباً دس منٹ پہلے باس کا فون آیا تھا۔ آپ سے کوئی بہت ضروری کام ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ جیسے ہی آپ آئیں انھیں فون کرلیں۔"

"تم نے باس کو یاد نہیں دلایا کہ سنیچر کی رات میری اپنی ہوتی ہے، اس رات میرے اپنے کچھ پروگرام ہوتے ہیں۔" شرفو قدرے ناگواری سے بولا۔ مجھے اس کے لہجے پر حیرت ہوئی۔ میں تو اسے محض سر تسلیم خم کرنے والا ایک معمولی کارندہ سمجھتا تھا۔

"باس کو یاد دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔ انہیں یاد تھا۔" جمیل بولا "خود ہی کہہ رہے تھے کہ ایک خاص ہی معاملہ ہے جس میں صرف شرفو ہی کو بھیجا جاسکتا ہے۔ اگر کوئی اور اس کام کو کرسکتا تو وہ سنیچر کی رات تمہیں ہرگز طلب نہ کرتے۔"

"ہم..." شرفو نے پرخیال انداز میں ہنکارا بھرا پھر میری طرف دیکھ کر بولا "تم چل کر ڈائننگ روم میں بیٹھو۔ میں باس سے بات کرکے آتا ہوں۔"

میں نے پہلے اپنے کمرے میں جا کر منہ ہاتھ دھویا، اپنا حلیہ درست کیا پھر ڈائننگ روم میں پہنچ گیا۔ شرفو ابھی تک نا لبا کسی کمرے میں فون پر مصروف گفتگو تھا۔

میں نے ابھی کرسی سنبھالی ہی تھی کہ مس ٹریپ کھٹ

کھٹ کرتی کمرے میں آگئی۔ میں نے گھر میں داخل ہونے کے بعد اس کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑائی تھیں مگر وہ کہیں نظر نہیں آئی تھی۔ وہ جیسے کسی خفیہ گوشے میں بیٹھی سب لوگوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتی رہی تھی۔

"کھانا لگاؤں؟" اس نے جھک کر کچھ پلیٹیں میز پر رکھتے ہوئے پوچھا۔ اس کے لباس سے اسی مخصوص کلون کی خوشبو اُڑ رہی تھی جو غالباً اسے کچھ زیادہ ہی پسند تھا لیکن اس خوشبو میں اس کے اپنے وجود کی بھی خوشبو شامل تھی۔

"ہاں... لگادو۔" میں نے تھوک نگل کر جواب دیا۔

وہ کھانا لگانے لگی۔ میں خاموش بیٹھا اس کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیتا رہا۔ اس نے ایک بار بھی آنکھ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا۔ کمبخت بڑی کٹھور تھی۔ کھانا لگ چکا تو شرفو بھی آگیا۔ وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوا نظر آرہا تھا۔ وہ بیٹھ کر جلدی جلدی پلیٹیں اپنی طرف کھسکاتے ہوئے بولا "بھئی میں کھانا کھاتے ہی جا رہا ہوں۔ شاید علی الصباح ہی واپسی ہو... اور ہاں... باس نے کہا ہے کہ کل رات نو بجے وہ تم سے ملاقات کریں گے، تیار رہنا اور کہیں جانے کا پروگرام مت بنانا۔ میں تمہیں لے کر چلوں گا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے سر ہلایا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب مجھے یہ سوچنے کی ضرورت نہیں پڑے گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے ورنہ ہی مجھے از خود اس موضوع پر قاسم خان سے بات کرنے کی ضرورت تھی۔ یقیناً وہ خود ہی اس موضوع پر آرہا تھا۔

شرفو تو جلدی جلدی کھانا کھا کر رخصت ہوگیا۔ میں خاصی دیر تک بیٹھا ہر ڈش سے انصاف کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ہر ڈش بے حد لذیذ تھی۔

کھانا کھا کر میں اٹھا تو ذہن پر عجیب سا خمار طاری ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جب پی تھی اس وقت اس نے کوئی خاص اثر نہیں دکھایا تھا، اب چڑھ رہی تھی۔ یا پھر شاید یہ کھانے کا خمار تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدل کر میں کسی پٹھو مگرمچھ کی طرح بستر پر چت ہوگیا اور اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ برخوردار افضل صاحب! کھانے لذیذ ہوں تو یوں ندیدوں کی طرح مت ٹوٹ پڑا کرو۔ ایک تو کئی دن سے تم ورزش وغیرہ نہیں کر رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا پیٹ انجانی راہوں پر آگے نکل جائے کہ پھر اسے واپس بلانا ممکن نہ رہے۔"

نیند بھی نہیں آرہی تھی اور آنکھیں کھلی رکھنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔ ذہن گویا آسمان اور زمین کے درمیان کہیں معلق تھا۔ اس دوران مس ٹریپ نے دروازہ کھول کر کمرے میں جھانکا اور سپاٹ لہجے میں پوچھا "کسی چیز کی ضرورت تو

نہیں ؟"

"نہیں ۔" میں نے کہا اور مجھے اپنی آواز خود بھی عجیب محسوس ہوئی "بس ذرا وارڈ روب کھول کر میرا بریف کیس مجھے دیتی جاؤ ۔"

آہستگی سے اپنے عقب میں دروازہ بند کر کے وہ وارڈ روب سے بریف کیس نکال کر بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر واپس جانے لگی تو میں نے اس کی کلائی پکڑ لی "مجھے دراصل تمہاری ضرورت ہے ۔" میں نے خالص لفنگوں والے انداز میں کہا۔ "آخر تم اتنی مغرور کیوں ہو ؟"

اس کے بعد معلوم نہیں کیا ہوا ۔ جو کچھ بھی ہوا وہ بہرحال کوئی عجیب ہی عمل تھا جس کے تحت میں نے اچانک بستر سے اچھل کر ہوا میں قلابازی کھائی اور یوں اوندھا بیڈ پر آن گرا جیسے میں کوئی بھاری بھرکم ، کڑیل جوان نہیں بلکہ محض ایک آملیٹ تھا جسے خانساماں نے فرائنگ پین میں تلتے وقت ہوا میں اچھال کر پلٹ لیا تھا ۔

اس کے بعد میری کنپٹی پر ہتوڑا سا پڑا اور چند لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا ۔ جلد ہی میری آنکھیں دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں بے ہوش نہیں ہوا ۔ میں منتظر رہا کہ ابھی کوئی اور چھوٹی موٹی قیامت بھی ٹوٹے گی لیکن خیریت ہی رہی ۔

مجھ میں اتنی سکت نہیں تھی کہ سیدھا ہو سکتا ۔ اوندھا ہی لیٹا آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا اور مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا ہے وہ مس ٹریپ نے ہی کیا ہے ۔ کیا وہ کم بخت جوڈو جانتی تھی ؟

بڑے اطمینان سے وہ سنگھار میز کا اسٹول کھینچ کر میرے قریب بیٹھ گئی ۔ میں نے کروٹ لینا چاہی لیکن کامیاب نہ ہو سکا ۔ الو کی پٹھی نے شاید کسی خاص ہی رگ پر ہاتھ مار دیا تھا کہ جسم ہی جیسے بے جان ہو کر رہ گیا تھا ۔

"کہو ... مزہ آیا؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا ۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا ۔ میری پلکیں خود بخود ہی تیزی سے جھپکے جا رہی تھیں ۔

"تم نے پہلی بار جب میری طرف دیکھا تھا تب سے میں تمہاری آنکھوں میں فسطور کی پرچھائیاں دیکھ رہی ہوں ۔" وہ سنجیدگی سے بولی "میرا خیال تھا کہ میری سرد مہری دیکھ کر تم باز آ جاؤ گے لیکن تم بہت ڈھیٹ آدمی ہو ۔" اس نے اپنی مردانہ قمیص کا کالر درست کیا "تمہارا خیال شاید یہ رہا ہوگا کہ میں چونکہ مشکوک قسم کے لوگوں کے لیے کام کرتی ہوں اور چوبیس گھنٹے تم جیسے مفرور قسم کے لوگوں کے درمیان رہتی ہوں ۔ ان کی خدمت گزاری کرتی ہوں اس لیے میری حیثیت کھلونے کی سی ہوگی ۔ جس نے چاہا بازو پکڑ کر کھینچ لیا اور میں چونکہ کلی ہوں اس لیے اس پزیرائی پر دل ہی دل میں خوش ہوتی ہوں گی ۔" اس نے اپنے ہاتھوں کو مسلنے کے بعد ان پر پھونک مار کر گویا نادیدہ گرد اڑائی اور گہری سانس لی۔ "بہرحال ایسا نہیں ہے ۔ اپنی یہ غلط فہمی ہمیشہ کے لیے دور کر لو۔ دوسری بات یہ کہ میں مس نہیں مسز ہوں ۔ کافی عرصہ پہلے جب میں اس گھر میں آئی تھی تو مس تھی ، تب سے سب کو عادت پڑی ہوئی ہے کہ میرے نام کے ساتھ مس لگائے رکھتے ہیں ۔ ویسے بھی سب مجھے ہمیشہ تنہا ہی دیکھنے کے عادی رہے ہیں اس لیے انہیں شاید یاد ہی نہیں رہتا کہ میرا ایک شوہر اور ایک چھوٹی سی بچی بھی ہے ۔"

یک لخت وہ اٹھ کھڑی ہوئی "ذرا میرے ساتھ آؤ ۔" اس نے اشارہ کیا ۔

میری طرف سے جب آنکھیں پٹ پٹانے کے سوا کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا تو اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر ایک خاص انداز سے ہلکا سا جھٹکا دیا ۔ میرے پرزے شاید کچھ ہل گئے تھے ۔ اس جھٹکے سے وہ گویا کسی حد تک اپنی اپنی جگہ پر واپس آئے اور میرے جسم میں کچھ جان بھی آئی ۔ اس نے محسوس کر لیا کہ سہارے کے بغیر میں نہیں چل سکوں گا ۔ میرا ہاتھ تھام کر وہ باہر لے چلی ۔ میں کسی انڈر ٹریننگ فقیر کی طرح اس کا سہارا لیے لڑکھڑاتا ہوا چلا جا رہا تھا ۔ وہ پچھلے راستے سے کوٹھی کی اصل عمارت سے باہر آئی ۔ پچھلی طرف بھی کوٹھی کی چار دیواری میں کافی جگہ خالی پڑی ہوئی تھی ۔ اس طرف ایک انیکسی تھی جو شاید سرونٹ کوارٹر کا کام دیتی تھی ۔

وہ مجھے اسی طرف لے جا رہی تھی لیکن میں نے پہلے رک کر کھلی ہوا میں چند گہری گہری سانسیں لینا بہتر سمجھا ۔ اس عمل سے مجھے اپنے اوسان بحال کرنے میں بڑی مدد ملی ۔ اب میں اپنے آپ کو تقریباً نارمل محسوس کر رہا تھا البتہ کنپٹی ابھی بدستور دکھ رہی تھی ۔

بالآخر ہم انیکسی کی ایک کھڑکی کے قریب جا پہنچے ۔ اس کمرے میں روشنی تھی ۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور پٹ بھی تھوڑا سا کھلا تھا ۔ مس ٹریپ نے پہلے خود محتاط انداز میں اندر جھانکا اور پھر مجھے اشارہ کیا ۔

میں نے جھانک کر دیکھا وہ اوسط درجے کا ایک صاف ستھرا بیڈ روم تھا ۔ ڈبل بیڈ پر سنہری بالوں اور گلابی چہرے والی ایک پھول سی بچی لیٹی تھی ۔ اس کی عمر ڈیڑھ دو سال ہوگی ۔ قریب ہی ایک شخص بیٹھا بڑے انہماک سے اسے فیڈر پلا رہا تھا ۔ وہ

[آ]لتی پالتی مارے بیٹھا تھا ۔ مگر میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کا [قد] چھ فٹ سے کم نہیں تھا ۔ بچی کی طرح وہ بھی بے پناہ [خو]بصورت تھا ۔ سنہری بال ، سرخ و سپید رنگت ، غلافی آنکھیں [ت]یکھے نقوش اور خوبصورت گھنی مونچھیں ۔ اس کا جسم کسرتی [او]ر سینا چوڑا تھا ۔

[و]ہ بچی کو دودھ پلاتے ہوئے وہ بچوں ہی جیسی آواز بنا کر اس [س]ے باتیں بھی کرتا جا رہا تھا ۔ فیڈر تقریباً خالی ہو چکا تھا ۔ بالآخر [فی]ڈر لے کر وہ شخص کمرے سے باہر چلا گیا ۔

مس ٹریپ میرا ہاتھ پکڑ کر دوسری کھڑکی پر لے آئی ۔ یہ [کھ]ڑکی ایک کشادہ کچن کی تھی ۔ اس کھڑکی سے میں نے دیکھا ، وہ [شخ]ص نہایت نفاست سے فیڈر کو سنک پر دھو رہا تھا ۔ فیڈر دھو [ک]ر اس نے ابلتے ہوئے پانی کے ایک برتن میں ڈال دیا ۔ سنک پر چائے کا ایک کپ پڑا تھا ۔ اسے بھی اٹھا کر اس نے [ن]ہایت مشاقی اور نفاست سے دھو کر کپڑے سے خشک کر کے [ک]راکری کیس میں رکھا ، چولھا بند کیا اور ناقدانہ نظر سے کچن کا جائزہ لے کر باہر چلا گیا ۔

ایک بار پھر ہم بیڈ روم کی کھڑکی پر آ گئے ۔ اب وہ شخص وارڈ روب سے کپڑوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر نکال چکا تھا ۔ استری کی میز پر کھڑا ہو کر وہ بڑی دلجمعی سے کپڑے استری کرنے لگا ۔ ان میں بیشتر کپڑے مردانہ ہی تھے لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ مس ٹریپ ہی کے تھے ۔

بچی سونے کی کوشش میں کروٹیں بدل رہی تھی ۔ میں کھڑکی سے ہٹ گیا ۔ مس ٹریپ مجھے بازو سے تھام کر کچھ دور لے گئی ۔

"یہ سگھڑ اور سلیقہ شعار شخص کون تھا؟" میں نے نیچی آواز میں پوچھا ۔

"میرا شوہر ۔ اور کون؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا ، گویا بہ زبان خموشی کہہ رہی ہو ۔ کیا ابھی اس سوال کی ضرورت باقی تھی ؟ '

میں نے تھوک نگل کر ایک نظر اس کی طرف اور ایک نظر انیکسی کی طرف دیکھا ۔ مجھے شرفو کی بات یاد آئی ۔ مس ٹریپ کے بارے میں اس نے بتاتے ہوئے کہا تھا "یہ عورت ، مرد کو مکھی بنا کر دیوار سے چپکانے کا فن جانتی ہے ۔"

مجھے اس کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں تھا اس لیے میں اس کے دیگر 'کارناموں' کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن بہرحال جو مثال میں دیکھ چکا تھا وہ کافی تسلی بخش تھی ۔

"وہ بچی بھی تمہاری ہے ؟" میں مزید ایک احمقانہ سوال کیے بغیر نہ رہ سکا ۔

"ظاہر ہے ۔" وہ اطمینان سے بولی "خدا کا شکر ہے کہ میری بچی باپ پر گئی ہے ۔ مجھ پر نہیں گئی ۔"

میں ایک لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر اچانک میں نے پوری قوت مجتمع کر کے بجلی کی سی تیزی سے اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کیا ۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر پڑی ۔ میں نے چند لمحے انتظار کیا لیکن وہ نہیں اٹھی ۔ آنکھیں بند تھیں ۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور اپنے کمرے میں آ گیا ۔ مجھے امید تھی کہ کچھ دیر بعد وہ خود ہی ہوش میں آ جائے گی اور اٹھ کر اپنی انیکسی میں چلی جائے گی ۔

اپنے کمرے میں آ کر میں اطمینان سے سو گیا ۔ میرے دماغ پر جو بخار چڑھا ہوا تھا وہ اتر گیا تھا ۔

دوسری صبح میں سو کر اٹھا تو ذہن کافی حد تک ہلکا پھلکا تھا ۔ تازہ اخبارات میرے قریب ہی رکھے تھے ۔ معلوم نہیں کون رکھ گیا تھا ۔ تینوں اخباروں کی شہ سرخیاں میرے لیے غیر دلچسپ تھیں ۔ میرے لیے سب سے اہم خبر وہ تھی جو سنگل کالم میں ایک کونے میں چھپی ہوئی اور صرف چند سطروں پر مشتمل تھی ۔

دریائے راوی کا ایک کٹا ہوا حصہ جسے بڈھا دریا کہا جاتا تھا اس میں گزشتہ روز ایک لاش پائی گئی تھی ۔ بری طرح پھولی ہوئی ایک مرد کی لاش جس کے کولہے میں گولی پیوست تھی ۔ لاش کا مختصر سا حلیہ درج کرتے ہوئے اپیل کی گئی تھی کہ اگر اس کا کوئی وارث ہو تو شام تک پولیس سے رابطہ قائم کرے ورنہ اسے لاوارث قرار دے کر دفن کرا دیا جائے گا ۔ تاہم پولیس تفتیش جاری رکھے گی ۔

میں نے اخبار فرش پر پھینک دیا اور دیر تک گھٹنوں میں سر دیئے بیٹھا رہا ۔ خیالات کا پنڈورہ بکس ایک بار پھر کھل گیا تھا ۔ ذہن میں جیسے ان گنت کن کھجورے ، سنپولیے رینگ رہے تھے ۔ نس نس کو ڈس رہے تھے ۔

اشرف خان ! کیا واقعی تم لاوارث دفنائے جاؤ گے؟ ' پھر اس آئینے میں ، میں نے اپنے مستقبل کا عکس دیکھنے کی کوشش کی۔ کیا میرا انجام بھی یہی ہوگا؟ ایک لاوارث لاش ... پھولی ہوئی ... مسخ شدہ لاش ... جسم کے کسی حصے میں پیوست شدہ گولی ... اخبار کے کونے میں چند سطری خبر ۔ بس؟ کیا یہی زندگی کا مآل تھا؟ یہی حاصل تھا ۔ ساری بھاگ دوڑ اور ساری جدوجہد کا ۔ '

پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی ۔ خود ہی اپنا دل بڑھایا ' نہیں ... محمد افضل ! تیرے تیور بتاتے ہیں کہ تو ایک طاقتور آدمی بنے گا اور طاقتور آدمی کی موت بھی ان کی زندگی کے

شایان شان ہی ہوتی ہے۔ کسی طرح بھی ہوسکے طاقتور بننے کی کوشش کرو اور فی زمانہ سب سے بڑی طاقت دولت ہے۔'

مجھے نہیں معلوم کہ کب دروازہ کھلا اور کب مس ٹریپ دونوں ہاتھ کمر پر ٹکائے میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ میں اس کی آواز سن کر چونکا۔

"میں چاہتی تو اس بے خبری کے عالم میں تمہاری کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم کرسکتی تھی۔" وہ کہہ رہی تھی "لیکن میں اب مزید ہنگامہ آرائی نہیں چاہتی کیونکہ اس طرح تو ہنگامہ آرائی کا سلسلہ ختم ہی ہونے میں نہیں آئے گا۔ لیکن تم مجھے اتنا ضرور بتادو کہ رات تم نے مجھے گھونسا کیوں مارا تھا؟"

"یہ بتانے کے لیے کہ میں اتنا کمزور نہیں ہوں جتنا تم نے سمجھ لیا تھا۔" میں نے گہری سانس لے کر اپنے خیالات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں نے کب کہا کہ تم کمزور ہو۔ طاقت میں تو ظاہر ہے میرا تم سے کوئی جوڑ نہیں۔" وہ ہلکی سے مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میں نے تمہیں طاقت سے نہیں ٹیکنک سے مارا تھا۔"

"ٹیکنک سے نہیں تم نے مجھے بے خبری میں مارا تھا۔" میں نے کہا "اگر میں خبردار ہوتا تو تھوڑی بہت ٹیکنک میں بھی دکھا سکتا تھا۔"

"بے خبر کہاں تھے تم؟" وہ خفگی سے بولی "میرے علاوہ تو تم کسی چیز کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔"

"وہ تو درست ہے۔ لیکن میں تم سے حملے کی توقع نہیں کررہا تھا اور یہ بھی بے خبری ہی کی ایک قسم ہے مس ٹریپ!" میں نے کہا۔

"اوہ... خدا کا واسطہ..." اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ "مجھے ٹٹ پونجیے قسم کے جاسوسی ناولوں والے اس نام سے مت پکارو... اور میں کل تمہاری غلط فہمی اچھی طرح دور کرچکی ہوں کہ میں مس نہیں مسز ہوں مسز اینڈرسن ویسے میرا نام جولی ہے اور میں اسی نام سے پکارے جانا پسند کرتی ہوں۔"

"تمہارا شوہر ادھر ہی کا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"رہنے والا ادھر ہی کا ہے نسلاً یوریشین ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا جولی! اب تم جاؤ۔" میں نے اطمینان سے کہا "مجھے جب کسی چیز کی ضرورت ہوگی' میں تمہیں زحمت دوں گا۔ میں نے تمہیں اس نظر سے دیکھنا بند کردیا ہے جس سے اب تک دیکھ رہا تھا۔ اب تم میری طرف سے اطمینان رکھو۔ اب میری نظر میں تم میں اور سامنے رکھی ہوئی تپائی میں کوئی خاص فرق نہیں۔"

"گڈ۔" اس نے طمانیت سے گردن ہلائی "اس کا مطلب ہے تم بالکل ہی گدھے نہیں ہو۔"

"نہیں۔ میں اس کا کزن ہوں۔" میں نے کہا "اب تم جاؤ اور میرے لیے ناشتے کا بندوبست کرو۔ میں تیار ہوکر آرہا ہوں"

وہ اپنے سر کا وہ حصہ سہلاتی باہر چلی گئی جہاں میں نے گزشتہ شب اسے گھونسا رسید کیا تھا۔ وہ دن میں نے پڑھنے اونگھنے' سوچنے اور کھانے میں گزارا۔ سہ پہر کو جب ماحول پر ویرانی سی چھاگئی تو میں نے لان پر جاکر تھوڑی سی دوڑ لگائی اور چند منٹ تک ڈنڈ بیٹھکیں بھی لگائیں۔ طبیعت پر چھائی ہوئی کسل مندی کسی حد تک دور ہوگئی۔

شرفو سارا دن مجھے نظر نہیں آیا۔ رات کے کھانے پر وہ پہنچ گیا۔ وہ ایک نیلی فوکس ویگن میں آیا تھا۔ کھانے کے بعد اس نے گھڑی دیکھی اور مجھے ساتھ لے کر اسی گاڑی میں قاسم خان کی کوٹھی کی طرف چل دیا۔

مجھے یہ دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی کہ قاسم خان کے چوکیدار نے مجھے نہیں پہچانا یا پھر شاید اس نے چہرہ سپاٹ رکھنے ہی میں عافیت سمجھی تھی۔

اس گھر کے کتے بلیاں بھی شرفو کو اچھی طرح پہچانتے تھے وہ بالکل گھر کے فرد کی طرح مجھے ساتھ لیے سیدھا اسٹڈی میں جا پہنچا۔ اسٹڈی کے دروازے پر کھڑے ہوئے ایک معمر سے ملازم نے اطلاع دی "صاحب چند منٹ میں آرہے ہیں آپ کے لیے کیا لاؤں؟ چائے یا کافی؟"

"چائے۔" شرفو نے اندر پہنچ کر ایک چرمی کرسی پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے کہا "یہ ایک طویل و عریض کمرا تھا اور اس کی ترتیب و آرائش کچھ عجیب سی تھی۔ یہ بیک وقت لائبریری بھی معلوم ہوتا تھا' کانفرنس روم بھی اور ایک طرح سے کسی کا دفتر بھی۔

ہم چائے سے فارغ ہی ہوئے تھے کہ قاسم خان ایک عمدہ سوٹ زیب تن کئے ایسی متانت اور بردباری چہرے پر لیے کمرے میں داخل ہوا جیسے کوئی پروفیسر کسی اہم موضوع پر کسی سیمینار سے خطاب کرنے کے لیے آڈیٹوریم میں داخل ہورہا ہو۔ اس کے دائیں ہاتھ پر اعظم خان تھا اور بائیں ہاتھ پر ایک ایسی حسین عورت کہ اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار جھٹکا سا لگا۔ ایک تو آج کل پرکشش خواتین کو دیکھ کر مجھے کچھ زیادہ ہی جھٹکے لگنے لگے تھے۔ میرے خیال میں تو یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ مجھے ہر حال میں نارمل رہنے کا فن سیکھنا چاہیے تھا

وہ عورت قد میں قاسم خان سے کچھ نکلتی ہوئی تھی۔ گوری چٹی اور یونانی دیویوں کے سے حسن کی مالک۔ اس کے سیاہ

...ہی بال کمر پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ ہلکے نیلے رنگ کا کافتان ...ے ہوئی تھی۔ وہ لباس یا میک اپ کے سلسلے میں قطعاً کوئی ...نام کئے ہوئے نہیں تھی لیکن اپنے صاف ستھرے چہرے ...ادہ لباس کے ساتھ۔ اگر وہ اس وقت سیکڑوں بنی سنوری ...ات کے ہجوم میں بھی ہوتی تو سب سے بہتر نظر آتی۔ اس ...مر پینتیس کے قریب رہی ہوگی۔ اس کے آنے سے کمرا ...منور سا ہوگیا۔

"یہ میری بیوی ہے۔ سلمیٰ۔" قاسم خان نے اندر آتے خاص طور پر مجھ سے یوں اس کا تعارف کرایا جیسے اسے ...یشہ رہا ہو کہ اگر یہ بات مجھے نہ بتائی گئی تو میں اس خاتون کو کچھ ...سمجھ لوں گا۔ میں نے شائستگی سے اسے سلام کیا۔ اس نے ...ے لہجے میں جواب دیا اور ایک ہی لمحے میں میرا سرتاپا جائزہ ...لیا۔ اس ایک لمحے میں اس نے گویا میرا ظاہر ہی نہیں ...ن بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھیں کیا تھیں گویا ایکسرے ...تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ گویا ماحول سے لاتعلق سی ...ئی۔

ہم شیشے کے ٹاپ والی ایک میز کے گرد بیٹھ گئے۔ اس میز ...گرد رکھے ہوئے صوفے بھی گول ہی تھے اور بہت ہی نرم ...۔ انسان اس طرح ان میں دھنس جاتا تھا کہ گمان گزرتا تھا ...انسان صوفے پر نہیں بیٹھا بلکہ صوفہ انسان پر بیٹھا ہے۔

"میں تمہید میں وقت ضائع نہیں کروں گا افضل میاں!" ...م خان نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "میں نے تمہارے ساتھ ...یٹنگ نہایت اہم کاروباری امور طے کرنے کے لیے رکھی ...۔ تمہاری باتوں سے اور کچھ اپنے طور پر میں نے یہ اندازہ ...ہے کہ تم اور اشرف خان پارٹنرشپ میں دوسروں کے لیے ...کررہے تھے۔ اب جبکہ اشرف خان مرچکا ہے اور تم نہایت ...ناموافق حالات میں شہزاد کوٹ سے بھاگے ہو' اس کے بعد ...رہے تمہارا واپس جانے کا کوئی پروگرام نہیں ہوگا۔ کیا میرا ...زہ درست ہے؟"

"جی ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"میرا ایک اندازہ یہ بھی ہے کہ تمہارے پاس کوئی خاص ...یہ نہیں ہے اور تمہارے ذہن میں کوئی واضح پروگرام بھی ...ہے۔" قاسم خان بولا۔

"یہ بھی درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"ان حالات میں ایک تو یہ میرا اخلاقی فرض بھی بنتا ہے ...رے مجھے ضرورت بھی ہے کہ میں تمہیں اپنے لیے کام ...رنے کی پیشکش کروں۔" وہ صوفے کے پشتے سے ٹیک ...ے ہوئے بولا "یہ مت سمجھنا کہ تمہارے حالات اور تمہاری مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں تمہیں کوئی ناروا سی پیشکش کروں گا۔ میں اتنا موقع پرست نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میری پیشکش تمہیں باعزت محسوس ہوگی۔ میں تمہارے متعلق زیادہ نہیں جانتا لیکن میری نظر کہتی ہے کہ تم کام کے آدمی ہو اور پھر یہ کام لینے والے پر بھی منحصر ہوتا ہے کہ وہ ناتراشیدہ پتھر کو تراش کر ہیرا بنالے۔ تمہیں شاید اندازہ ہوگیا ہو کہ میرا کام خاصے وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا ہے لیکن میرا گروہ اتنا بڑا نہیں ہے۔ میں نے محض زیادہ نفری دیکھ دیکھ کر خوش ہونے کے لیے نتھو خیرے بھرتی نہیں کررکھے جو آئے دن میرا مال پکڑوا کر میرے لیے دردِ سر کا باعث بنے رہیں۔

میرے پاس بہت ہی کم آدمی ہیں لیکن ہیں چنے ہوئے۔ اپنی جگہ ہر شخص ہر قسم کی صلاحیتوں کے اعتبار سے دس بیس آدمیوں پر بھاری ہے۔ خاصے طویل عرصے کے بعد ایسا اتفاق ہوا ہے کہ میں اپنے ایک قیمتی ساتھی سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔ کل رات وہ رینجرز کے ہاتھوں مارا گیا۔ مجھے شبہ ہے کہ اس کی موت کسی سازش کا نتیجہ ہے۔ سازش کس نے کی ہے یہ بھی مجھے جلد ہی معلوم ہوجائے گا۔ اس کی موت کی وجہ سے میرے لیے کچھ الجھنیں پیدا ہوگئی ہیں۔ میں ان سے نمٹ لوں تو پھر سازش کرنے والوں سے بھی نمٹ لوں گا۔ خیر... یہ ایک الگ موضوع ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری لائن میں بھروسے کا آدمی بہت مشکل سے ملتا ہے۔ ایک ٹریجڈی اگر تمہیں مجھ تک لے ہی آئی ہے تو اب میری تجویز یہ ہے کہ تم میرے لیے بھروسے کے آدمی بن جاؤ۔ میرے ساتھی کی جگہ لے لو جسے میں کھو بیٹھا ہوں۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہیں بھی اس ساتھی کی کمی محسوس نہ ہو جسے تم کھو بیٹھے ہو۔ تمہیں میری تجویز سے کوئی دلچسپی ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

میں نے اس کی طویل تقریر کا ایک ایک لفظ غور سے سنا تھا لیکن میں فوری طور پر کوئی ردِ عمل ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اگر یہ معلوم ہوجائے کہ مجھے کیا ملے گا تو میں زیادہ آسانی سے کوئی جواب دے سکوں گا۔"

"ہر کھیپ کے اخراجات نکال کر خالص منافع میں سے دس فیصد تمہارا ہوگا اور یہ بڑی معقول پیشکش ہے۔" وہ بولا۔ "میرا کام چونکہ چھوٹے پیمانے پر نہیں ہے اور میرے ساتھی اکثر مصروف رہتے ہیں اس لیے بہت جلد تم اپنے آپ کو آسودہ حال محسوس کرو گے۔"

"ہوں۔" میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہنکارا بھرا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ میں اس کی پیشکش پر غور کررہا

ہوں۔ حالانکہ میں اس پر قطعاً غور نہیں کر رہا تھا۔ میں تو اس کی خوش قسمتی پر رشک کر رہا تھا۔ کبخت کو بہت ہی خوبصورت بیوی میسر تھی۔

"چند ایک موٹی موٹی باتیں اور بتاتا چلوں۔" قاسم خان بولا "تمہاری رہائش کا انتظام میرے ذمے ہوگا اور تمہیں ایک ہفتے کی ٹریننگ لینی ہوگی۔ ٹریننگ بس یہ ہوگی کہ کچھ لوگوں سے ملنا ملانا ہوگا تاکہ وہ تم سے اور تم ان سے واقف ہو سکو۔ ذہن نشین کرنا ہوگا کہ کس وقت کس شخص سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ ہمارے روٹ سمجھنے ہوں گے اور یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ کس صورت میں کیا قدم اٹھایا جائے گا۔ ہر پارٹی کے اپنے کچھ طور طریقے ہوتے ہیں۔ میرا طریقہ کار دوسروں سے ذرا مختلف ہے اس لیے میں نے بہت کم عرصے میں اپنے حریفوں سے کہیں زیادہ ترقی کی ہے۔ میرے ہاں تمہیں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملے گا اور میں اپنے ساتھیوں کو پھلنے پھولنے کا موقع دینے کے معاملے میں بےحد فراخ دل واقع ہوا ہوں۔ خصوصاً ان ساتھیوں کو جو میرے لیے کام کرنے کے دوران، مجھ سے الگ ہونے کے بعد، یہاں تک کہ کسی سازش کا شکار ہو کر گرفتار ہو جانے کے بعد بھی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ گو کہ میرا انتظام ایسا ہے کہ کسی ساتھی کی طرف سے اس کی تمام تر کوشش کے باوجود مجھے نقصان پہنچنے کا امکان کم ہی ہوتا ہے لیکن انسان کو بہرحال خوش فہمیوں میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ ہر وقت چوکس رہنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ میں نے تقریباً ہر پہلو تمہارے سامنے واضح کر دیا ہے۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

"ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"بہت خوب۔" اس نے طمانیت سے سر ہلایا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، میں نے جلدی سے کہا۔ "لیکن ٹریننگ شروع کرنے سے پہلے میں کم از کم تین دن کی مزید مہلت چاہوں گا۔ میں ابھی جی بھر کر لاہور کی سیر کرنا چاہتا ہوں۔ یہاں کی ہر گلی، ہر کوچے سے آشنا ہونا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں پوری تندہی سے کام میں جت جاؤں گا۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" قاسم خان بولا "تین دن ضروری نہیں ... جب تک تمہارا موڈ نہ بنے تم آرام کرو، گھومو پھرو۔ جب کام کا موڈ ہو مجھے فون کر دینا۔ ایک شخص آئے گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا۔ یوں سمجھو کہ اس سے ملاقات ہوتے ہی تمہاری ٹریننگ شروع ہو جائے گی۔ بہرحال اپنے نئے ٹھکانے پر تم کل ہی منتقل ہو جاؤ۔ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی صرف ہنگامی ضروریات کے لیے وقف ہے۔ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ وہاں ہر وقت کم سے کم لوگ موجود رہیں۔ شرفو کل تمہیں تمہارا نیا ٹھکانا دکھا دے گا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

"اسی خوشی میں چائے کا ایک دور اور چل جائے تو اچھا ہے۔" طویل گفتگو کے بعد قاسم خان مسکرایا "گھر پر بیگم کی طرف سے ہمیں ایسے ہی مشروبات کا دور چلانے کی اجازت ہے۔ چائے، کافی، شربت، اسکواش وغیرہ... بیگم کا کہنا ہے کہ ہم لوگ باہر ہی معلوم نہیں کیا کچھ پیتے پلاتے رہتے ہیں اس لیے گھر پر تو بوتل سے پرہیز رہنا چاہیے۔ چنانچہ میرے گھر میں اور سب کچھ موجود ہے مگر بار نہیں ہے۔"

اس کی بیوی جو اس دوران ٹانگ پر ٹانگ رکھے نہایت انہماک سے نیل کٹر کی ننھی سی ریتی سے اپنے ناخن نہایت نفاست اور نزاکت سے گھس رہی تھی، سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی اور ایک بار پھر اسی کام میں مصروف ہو گئی۔

مجھے قاسم خان کی بات سن کر قدرے حیرت ہوئی۔ اگر اس کی بیوی ایسی ہی روایتی اور گھریلو قسم کی خاتون تھی تو پھر اس کے ناجائز کاروبار کو کیونکر برداشت کر رہی تھی؟ نہ صرف برداشت کر رہی تھی بلکہ اس سے متعلق میٹنگ میں بھی بہ نفس نفیس آکر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے تو اس کی موجودگی کا کوئی جواز نظر نہیں آیا تھا۔ تمام گفتگو قاسم خان نے ہی کی تھی۔ اس کی بیوی نے تو موافقت یا مخالفت میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا اور نہ ہی قاسم خان نے اس سے کسی مرحلے پر رائے طلب کی تھی۔ پھر آخر اسے آکر ہمارے ساتھ بیٹھنے کی ضرورت کیا تھی؟ پھر میں نے سوچا، بعض اوقات بیویاں یونہی بلا مقصد شوہر کے ساتھ آبیٹھتی ہیں یا منہ اٹھا کر ان کے ساتھ چل دیتی ہیں۔

چائے اس انداز میں پی گئی گویا یہ ایک اہم فریضہ تھا۔ کپ رکھتے ہی قاسم خان اٹھ کھڑا ہوا "اب تم آرام کرو۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو شرفو کو بتا دینا۔ مجھے اب ایک جگہ جانا ہے۔"

اس امر سے مجھے خوشی ہوئی کہ میٹنگ برخواست کرتے وقت اس نے یہ نہیں کہا تھا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔" اس بات کی بھی مجھے خوشی تھی کہ قاسم خان کے انداز و اطوار سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ وہ باس بننے کی کوشش کرتا ہے۔ بعض فلمیں دیکھ کر اور ناولیں پڑھ کر میرے ذہن میں اس لائن کے "بگ باس" کا جو تصور تھا، کم از کم ویسا وہ قطعاً نہیں تھا۔ گفتگو اور شخصیت دونوں ہی کے اعتبار سے وہ میرے تصور سے مختلف تھا۔

باہر آکر ہم گاڑی میں بیٹھے اور ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کی

طرف چل دیے۔ راستے میں شرفو بولا "تم بہت خوش قسمت ہو۔ قاسم خان کے گروہ میں تو چھوٹی سے چھوٹی پوزیشن حاصل کرنے کے لیے بھی بہت سے لوگ ترستے ہیں۔ جبکہ تمہیں تو وہ ایک دم ہی اپنے ایک پرانے ساتھی کی جگہ دے رہا ہے۔ معلوم نہیں کیوں وہ تمہارا کام دیکھے بغیر ہی ... تم سے متاثر ہو گیا ہے۔ آدمی بہرحال جوہر شناس ہے۔ اس کا انتخاب غلط نہیں ہو سکتا۔"

"ان ڈائرکٹ تعریف کا شکریہ۔" میں نے کہا "ویسے یہ شخص تھا کون اور کس طرح مارا گیا جس کی جگہ مجھے لایا جا رہا ہے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" شرفو معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "میرا اس لائن سے کوئی تعلق نہیں۔"

میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ وہ واقعی لاعلم تھا یا مصلحت کوشی سے کام لے رہا تھا۔ بہرحال دونوں صورتوں میں مجھے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ قاسم خان کا طریقہ کار ابھی سے مجھے کافی حد تک سمجھ میں آنے لگا تھا۔ ہر شخص کا ایک دوسرے سے صرف ضروری حد تک رابطہ۔ ہر اہل شخص پر اعتماد۔ فوری فیصلے ... اور اسی قسم کی دیگر بہت سی خصوصیات تھیں جن کی جھلکیاں مجھے نظر آنے لگی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ شخص مجھے بہت تیز اور طوفانی انداز میں کام کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ایک مشینری سیٹ کر دی تھی۔ ہر پرزہ اپنا کام کر رہا تھا۔ وہ صرف اس مشینری کو آپریٹ کرنے کے سلسلے میں دوڑ بھاگ میں مصروف رہتا تھا۔ تاہم میرے خیال میں شرفو سے کچھ دوسری چیزوں کے بارے میں پوچھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس بارے میں میں نے براہ راست سوال نہیں کیا۔ سرسری سے لہجے میں کہا "قاسم خان اور اس کی بیوی کی جوڑی بڑی بے جوڑ سی لگتی ہے۔ قاسم خان بالکل عام سا آدمی لگتا ہے اور اس کی بیوی کچھ غیر معمولی سی عورت لگتی ہے... ہے نا؟"

"اس میں کچھ ہاتھ تمہارے تصور کا بھی ہے۔" شرفو گہری سانس لے کر بولا "تمہاری عمر ہی ایسی ہے، اس عمر میں گھر کی مہترانی بھی بہت غیر معمولی عورت لگتی ہے۔ بہرحال تمہارا خیال یکسر غلط بھی نہیں ہے۔ میں تمہیں اس کے بارے میں بتانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا کیونکہ جلد یا بدیر تمہیں خود بھی معلوم ہو جائے گا تقریباً سب ہی پرانے کارکن اس کے بارے میں جانتے ہیں اور خود قاسم خان نے بھی اس بات کو چھپانا زیادہ ضروری نہیں سمجھا۔ اس نے اب بھی سلمیٰ کے دور ماضی کی بعض نہایت خوبصورت تصویریں فریم کروا کے گھر میں سجا رکھی ہیں۔ سلمیٰ دراصل اونچے درجے کی ایک کلب ڈانسر تھی۔ کچھ عرصے بیروت میں بھی رہی... مجھے ذرا ایک سگریٹ سلگا کر دینا۔" اس نے ڈیش بورڈ پر پڑے ہوئے پیکٹ اور لائٹر کی طرف اشارہ کیا۔

سگریٹ کا ایک کش لے کر وہ بولا "جہاں تک مجھے معلوم ہے، قاسم خان نے بیروت ہی کے ایک ہوٹل میں اس کا رقص دیکھا تھا اور وہیں مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپنے لگا تھا۔ اس زمانے میں اس کے پاس زیادہ مال وال نہیں تھا۔ خود ہی ادھر ادھر پھیرے لگایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی لمبا ہاتھ بھی پڑ جاتا تھا۔ اس چکر میں اس کے پاس جو کچھ بھی تھا، لے کر سلمیٰ کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ہوٹل کے ایک سوئٹ میں مقیم تھی۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ ڈانس تو درحقیقت اس قسم کی ڈانسروں کا سائڈ بزنس ہوتا ہے۔ قاسم خان کے پاس جو کچھ تھا وہ اس نے سلمیٰ کے قدموں میں رکھ دیا اور سلمیٰ نے اسے شرف میزبانی بخشنا منظور کر لیا۔ رات کے کسی حصے میں غالباً نہایت حسرت بھرے لہجے میں سلمیٰ نے کہا ہوگا کہ اس کے جسم کے تو سب دیوانے ہیں۔ اس کی ایک ایک جنبش پر قربان جاتے ہیں اور اس کے ساتھ وقت گزاری کے لیے مرے جاتے ہیں لیکن اسے شریک زندگی بنانے کے لیے کوئی تیار نہیں حالانکہ وہ مجمع کے سامنے جسم کی نمائش کا یہ دھندا اور ملک ملک، شہر شہر بھٹکنے کی یہ عادت ترک کرنا چاہتی ہے۔ کسی ایک جگہ گھر بسا کر بیٹھنا چاہتی ہے مگر ہر وہ شخص جو سلمیٰ کی نظر میں ذرا بھی معقول تھا، اس سوال پر بدک جاتا تھا البتہ چھوٹے موٹے آوارہ گرد اور لفنگے فوراً تیار ہو جاتے تھے مگر ان کے لیے خود سلمیٰ کا دل نہیں مانتا تھا کہ کہیں گڑھے سے نکل کر کھائی میں نہ جا گرے۔ سننے میں آیا کہ جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں دونوں ڈرنک تھے۔ سلمیٰ ہچکیاں لیتے ہوئے کہہ رہی تھی کہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ وہ خالص مشرقی انداز میں دلہن بنتی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہ آرزو دل ہی میں لیے ایک روز قبر میں جا سوئے گی۔ اس کی باتیں سن کر قاسم خان بھی زار و قطار رونے لگا۔ پھر یکایک وہ اٹھا اور دیوانوں کی طرح باہر چلا گیا۔ رات کے اس پہر اس نے جانے کہاں سے ایک عروسی لباس خریدا، معلوم نہیں کہاں سے پھولوں اور دوسری آرائشی چیزوں کا بندوبست کیا۔ ایک جسٹس آف پیس کو پکڑا۔ ایک انٹیریئر ڈیکوریٹر کی خدمات حاصل کیں۔ تقریباً ڈھائی گھنٹے بعد کمرا گزارے لائق انداز میں آراستہ ہو چکا تھا اور سلمیٰ سرخ جوڑا پہنے گھونگٹ نکالے بیٹھی تھی اور... ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ چند دن بعد وہ یہاں آ گئے۔

قاسم خان بہرحال عہد کا پکا رہا۔ بہت اچھی طرح اس نے اپنی بات نبھائی اور اس عورت نے بھی اپنے آپ کو بالکل بدل لیا۔ اب تو مکمل طور پر ایک گھریلو عورت معلوم ہوتی ہے۔ وہ قاسم خان کے لیے خوش بخت بھی بہت ثابت ہوئی ہے۔ سنا ہے اس نے ترقی ہی شادی کے بعد کی ہے اور اب تو اس نے اپنا جائز کاروبار بھی خوب سیٹ کرلیا ہے۔"

"اولاد...؟" میں نے پوچھا۔

"دو لڑکے ہیں' کم عمر ہی ہیں۔ ایک امریکا میں پڑھ رہا ہے' دوسرا یہاں ہے۔" شرفو نے بتایا۔ ہم ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر پہنچ چکے تھے۔ ڈرائیو وے میں شرفو گاڑی سے اترتے ہوئے انگڑائی لے کر بولا "آج میں بہت تھکا ہوا ہوں ورنہ تمہیں تھوڑی سی سیر اور کراتا۔ اب کل دوپہر کو ہی ملاقات ہوگی۔ خدا حافظ' شب بخیر۔" وہ یک لخت ہی گویا مجھ سے لاتعلق سا ہو کر اندر چلا گیا۔ شرفو کے رویّے میں یہی ایک خاص بات تھی کہ اچانک کھٹ سے گویا اس کے ذہن میں کوئی سوئچ دب جاتا تھا اور اس کی سوچوں کا ٹریک بدل جاتا تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور پہنچ جاتا تھا۔ جمیل دروازہ کھولے میرا منتظر کھڑا تھا۔ میں بھی اندر آکر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔

دوسرے روز شرفو نے دوپہر کے وقت مجھے ساتھ لیا اور گلبرگ کے ایک مکان میں لے گیا۔ مکان زیادہ بڑا نہیں تھا اور درمیان سے دو حصوں میں تقسیم تھا۔ دونوں حصوں کے دو الگ الگ چھوٹے چھوٹے گیٹ تھے۔ دونوں پر تالا پڑا ہوا تھا۔ ایک گیٹ پر کسی شفیق احمد خان کے نام کی تختی لگی ہوئی تھی۔ نام کے نیچے تین چار ڈگریاں اور الیکٹریکل انجینئر کا عہدہ بھی لکھا ہوا تھا۔

شرفو دوسرے گیٹ کا دروازہ کھولنے لگا جس پر کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی۔ "تم تو مجھے کسی شریف آدمی کے پڑوس میں ڈالنے لگے ہو۔" میں نے کہا۔

"تم بھی ایک شریف آدمی ہو۔" شرفو میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا "تمہارے پورشن کے گیٹ پر تمہارے نام کی بھی تختی لگے گی جس کے مطابق تم ایک نام نہاد کمپنی کے سیلز منیجر ہوگے۔"

"تو کیا وہ شخص بھی...؟" میں نے دوسرے پورشن کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ نہیں۔" شرفو جلدی سے بولا "وہ واقعی کوئی شریف آدمی ہے۔ مطلب یہ کہ ہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ یہ دونوں کرائے کے پورشن ہیں۔ تمہارے پورشن کا دو سال کا کرایہ دیا جاچکا ہے۔ تمہیں اپنے پڑوسی سے زیادہ قری ہونے کی ضرورت نہیں۔ اوّل تو وہ خود بھی ایسی کوشش نہیں کرے گا بلکہ یہاں کوئی بھی تمہارے سکون میں مخل ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا' وہ ایک مختصر لیکن معقول اور صاف ستھرا پورشن تھا۔ کمرے صرف دو تھے لیکن کشادہ تھے۔ صحن' برآمدہ ہی نہیں بلکہ چار چھ گز کا ایک مختصر سا لان بھی موجود تھا۔ ہلکا پھلکا فرنیچر اور ضرورت کی دیگر چیزیں بھی موجود تھیں۔ فون بھی تھا۔

اس خیال سے مجھے عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا کہ میں خود مختارانہ انداز میں یہاں رہوں گا۔ مجھے یاد آیا کہ قصبے میں رہائش کے دوران جب میں کالج چھوڑ کر گھر میں بچیوں کے سامنے اور باہر قرض خواہوں کے سامنے ذلیل ہوتا تھا تو اپنے خوابوں کی انتہا بس یہ ہوتی تھی کہ کاش شہر میں ہزار آٹھ سو کی نوکری مل جائے' رہنے کے لیے اپنا ایک صاف ستھرا سا کمرا ہو جس میں ایک بیڈ اور دو کرسیوں کے علاوہ چھت کا پنکھا بھی موجود ہو تو پھر کیا ہی بات ہے۔ مزے آجائیں۔ زندگی کیسی عیش و عشرت میں گزرے۔ اور اب جو کچھ مجھے مل رہا تھا اور مل چکا تھا' میری توقعات بلکہ میری 'اوقات' سے زیادہ تھا تاہم زندگی کا راستہ ذرا بدل گیا تھا۔ اس بارے میں کبھی دل میں کچھ کھٹک سی محسوس ہوتی تھی لیکن میں اس طرف دھیان نہیں دیتا تھا۔ "دو تین روز تک میں تمہارے لیے کسی ملازم کا بھی بندوبست کردوں گا۔" شرفو کہہ رہا تھا "اس کی تنخواہ تمہارے ذمے ہوگی اور اس پورشن کا کرایہ بھی ماہ بہ ماہ تمہارے حساب سے کٹتا رہے گا۔ قاسم خان حساب کا بہت کھرا ہے۔"

"آمدنی معقول ہو اور میری گزر بسر عیش آرام سے ہو رہی ہو تو مجھے کسی قسم کا حساب کتاب اور کٹوتی وغیرہ کھلتی نہیں۔" میں نے کہا۔

"اب تم آرام سے یہاں رہو اور اس مکان سے مانوس ہونے کی کوشش کرو۔" شرفو بولا "میں اب چلتا ہوں' فرصت ملی تو شام کو چکر لگاؤں گا۔ اگر تم زیادہ دیر کے لیے کہیں جانے لگو' آٹھ دس گھنٹے یا ایک آدھ رات کے لیے تو ماڈل ٹاؤن والے فون نمبر پر کسی کو بھی اطلاع ضرور دے کر جایا کرو۔ نمبر میں لکھ کر دے جاتا ہوں۔ شام کو گھر سے نکل کر ادھر ادھر گھومنا۔ جب تک میں نوکر نہیں بھیجتا تب تک گزارا کرنے کے لیے تمہیں کھانے پینے کے کئی ٹھکانے اور ریستوران نظر آجائیں گے لیکن یہاں نہیں۔ مین مارکیٹ کے قریب۔ تمہاری گاڑی میں یہیں چھوڑے جارہا ہوں۔ فی الحال تم اسی سے گزارا کرو۔ بر سبیل تذکرہ اس گاڑی کے کاغذات موجود ہیں نا؟ کسی

چھینی ہوئی یا چرائی ہوئی تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔ خریدی ہوئی ہے تاہم میرے نام پر نہیں ہے۔"

نے بتایا "لائسنس مجھے شہزاد کوٹ میں اشرف خان نے

یا تھا۔" "آہ... اشرف خان!" میں نے جلدی سے اس کا خیال

ے جھٹک دیا۔ "بس اتنا ہی کافی ہے۔" وہ بولا "دراصل

بھی اس قسم کی قانونی کارروائیوں کا خطرہ مول نہیں لیتا جو

نچلے درجے کے چور اچکوں کے خلاف ہوتی ہیں۔" مزید

سوال کرنے اور کچھ دیر ہدایات دینے کے بعد بالآخر شرفو

ت ہوگیا۔

میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ باتیں۔ باتیں۔ ایک

دوسرے اور دوسرے سے تیسرے شخص کے پاس جانا۔

ات سننا۔ زندگی میں کوئی ہلچل ہی نہیں رہی تھی۔ سر درد

بوریت کی پیداوار تھا۔

میں گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا اور بہت دیر تک ادھر ادھر

ارہ گردی کرتا رہا۔ راستے ذہن نشین کرتا رہا۔ گرد و پیش کو

ھنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک جگہ دودھ دہی کی دکان نظر آئی

میں نے لسی کا ایک کنگ سائز گلاس بنوا کر پیا اور ذہن پر اس کا

رلئے آکر سو گیا۔ شام ڈھلے بیدار ہو کر میں دیر تک چھت پر

ریں جمائے چت لیٹا رہا۔ ہر طرف سکوت پھیلا ہوا تھا۔ یہ

انہ کچھ زیادہ ہی پرسکون تھا۔ شاید اس لیے کہ یہ گلبرگ کا

خری سرا معلوم ہوتا تھا۔ کبھی کبھار گلی سے کسی گاڑی کے

زرنے کی آواز فضاء میں ارتعاش سا پیدا کرجاتی تھی۔ اس کے

د پھر وہی سناٹا۔ میری رگوں میں ایک عجیب سی بے کلی کا

ولیا سرسرا رہا تھا۔

بالآخر میں ایک بار پھر اٹھا اور گاڑی نکال کر مین مارکیٹ جا

نچا۔ کھانا کھا کر میں مارکیٹ کے قریب ہی واقع ایک سینما میں

گھسا۔ پنجابی فلم لگی ہوئی تھی۔ کافی دنوں سے کوئی فلم نہیں

یکھی تھی۔ خنک اور تاریک سینما ہال میں بیٹھ کر دل کو کچھ

رسا ملا۔ فلم خاصی نکل چکی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ آغاز

س طرح ہوا ہوگا بلکہ یہ بھی معلوم تھا کہ انجام کیا ہوگا' اس

کے باوجود میں فلم سے لطف اندوز ہوتا تھا کیونکہ میں لطف

دوز ہونے کی نیت لے کر آتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہیرو جو پیشے کے اعتبار سے کوچبان واقع ہوا تھا'

گیردار کو یوں ٹھوکریں مار مار کر ہوا میں اچھالنے لگا جیسے وہ جاگیر

ر نہ ہو بلکہ سیالکوٹ کی بنی ہوئی کوئی فٹ بال ہو۔

ایک جاگیردار کا مجھ پر بھی بہت بھاری قرض باقی تھا اور میں

ں کا وہ قرض کچھ اسی انداز میں چکانا چاہتا تھا۔ میری صحت بھی

لم کے ہیرو سے کچھ بہتر تھی اور میں ضرورت پڑنے پر کم از کم

ایک کوچبان سے زیادہ اثر رسوخ کا مظاہرہ کرسکتا تھا لیکن میں فی الحال اس جاگیردار کو فٹ بال کی طرح نہیں اچھال سکتا تھا کیونکہ میں فلمی ہیرو نہیں تھا۔ ملک اسلم کے ساتھ جو کچھ میں کرنا چاہتا تھا اس کے لیے مجھے ابھی بہت طاقت درکار تھی۔ جسمانی طاقت نہیں' کچھ اور ہی طرح کی طاقت۔ ایسی طاقت جس کے بل پر میں بھی سماج کے سینے پر چٹان کی طرح جم کر کھڑا ہوسکوں۔

اسکرین پر کہانی کا کولہو مزید دو تین چکر کاٹ چکا تھا۔ جاگیردار اپنی حویلی میں پٹیاں لپیٹے پڑا تھا اور ہیرو سے بدلہ لینے کے لیے اپنے حواریوں سے صلح مشورہ کررہا تھا جبکہ ہیرو اپنے تانگے میں ہیروئن کو بٹھا کر نہر کے کنارے سیر کراتے ہوئے دوگانا گانے میں مصروف تھا۔

میں نے اکثر اپنے گاؤں میں کوچبانوں کو محض اس لیے جاگیرداروں کے سامنے زمین پر ناک سے لکیریں نکالتے اور جوتوں سے پٹتے ہوئے دیکھا تھا کہ انہوں نے پگڈنڈی پر جاتے وقت کسی جاگیردار کی جیپ یا کار کے سامنے سے تانگہ ہٹانے میں ایک آدھ سیکنڈ کی تاخیر کردی تھی۔

بہرحال اسکرین پر جو کچھ ہو رہا تھا اس سے محظوظ ہونا بھی میرا اخلاقی فرض تھا۔ کیونکہ میں نے اس کے لیے پیسے خرچ کیے تھے اور ان مناظر کا کم از کم اتنا فائدہ ضرور تھا کہ رگوں میں خون کی گردش کچھ تیز ہوجاتی تھی اور زندگی سے کیے ہوئے کچھ وعدے یاد آجاتے تھے۔

فلم دیکھ کر میں واپس آیا اور ایک بار پھر مریضوں کی طرح

بستر پر لیٹ گیا۔ سکوت سے اب میرا دل گھبرانے لگا تھا۔ رگ و پے میں سرسراتی ہوئی بے کلی لحہ بہ لحہ شدت اختیار کرتی جارہی تھی۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ ایک خلش تھی جو مجھے ہر مسام جاں سے ڈس رہی تھی۔ ایک عجیب سی آگ تھی جو میرے اعصاب کو جھلسارہی تھی۔ کوئی نادیدہ پرچھائیں میرے قریب سرگوشیاں کررہی تھی کہ مجھے کوئی ضروری کام کرنا ہے مگر میں اسے بھول رہا ہوں۔

بیڈ پر چت لیٹے چھت کی طرف تکتے تکتے اچانک میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ بے کلی کا باعث کیا تھا۔ مجھے کونسا ضروری کام کرنا تھا جسے میں اب تک بھولا ہوا تھا۔ کمرے کی سفید اور ہموار چھت جسے میں ایک ٹک دیکھ رہا تھا گویا سینما کی اسکرین بن گئی اور اس پر کلوزاپ میں ایک چہرہ ابھر آیا۔ زرینہ کا چہرہ۔

کیسے خود غرض تھے ہم۔ میں اور اشرف خان کس طرح اسے چھوڑ کر بھاگ آئے تھے۔ اس وقت یہ بات قطعی منطقی لگی تھی کہ اسے ساتھ لینے کے چکر میں ہم بھی مارے جائیں گے۔ فائدہ کیا ہوگا؟ کچھ بھی نہیں۔ یہ ایک بے مقصد قربانی تھی۔ لیکن اب یہ باتیں بہت خود غرضانہ لگ رہی تھیں۔ خود غرضی کی انتہا یہ تھی کہ پچھلے چند دنوں میں اس کے متعلق میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اس پر کیا گزری ہوگی؟ میں کس طرح اس کی مدد کو پہنچ سکتا تھا؟ اس قسم کا کوئی خیال میرے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔

میں بے تابانہ انداز میں اٹھ بیٹھا۔ اب اگر ذہن میں یہ چھناکا ہو ہی گیا تھا تو اب میں ایک لمحے بھی صبر نہیں کرسکتا تھا۔ وہ عورت خواہ کیسی بھی تھی اور اس کا مجھ سے جو بھی تعلق تھا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے طرز عمل میں محبت کا گداز شامل تھا۔

مجھے امید تھی کہ وہ مجھے گھر پر ہی مل جائے گی۔ پولیس نے اگر اسے پکڑا بھی ہوگا تو آخر کار چھوڑ دیا ہوگا کیونکہ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ ہمارے دھندوں سے درحقیقت اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

اس کی ہی نہیں اپنی نظر میں بھی سرخرو ہونے کے لیے میرا اس کے پاس جانا ضروری تھا اور اگر میں اسے اپنے ساتھ یہاں لے کر آتا تو میرے روز و شب بھی اچھے گزر سکتے تھے۔ وہ اس قسم کی عورت تھی کہ ساتھ رہتی تھی تو زندگی کا اہم جزو بن جاتی تھی اور اگر اس سے ترک تعلق مقصود ہوتا تو وہ نہ کسی کو پریشان کرتی تھی اور نہ خود پریشان ہوتی تھی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ میں اسی وقت شہزاد کوٹ جاؤں گا۔ اگر وہاں میرا وقت ضائع نہ ہوتا اور میں تیز رفتاری سے سفر کرتا تو کل دن چڑھے تک واپس آسکتا تھا۔ ابھی چونکہ میں نے ہم خان کے لیے کام شروع نہیں کیا تھا اس لیے میں نے کسی کو اپنے جانے کی اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا اور گاڑی میں بیٹھ کر شہزاد کوٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔

رات کے پچھلے پہر میں شہزاد کوٹ پہنچا۔ میں شہر میں داخل ہوا تو میرا دل کچھ زیادہ ہی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ایک عجیب سا خوف ذہن پر سوار تھا۔ چند دن پہلے تک یہ شہر مجھے آغوشِ مادر کی طرح مہربان محسوس ہوتا تھا لیکن آج دشمنوں کا شہر لگ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کبھی کبھار ایک پولیس جیپ رات کے وقت گشت پر نکلی ہوتی ہے... اس وقت مجھے امید تو یہی تھی کہ اس سے سامنا نہیں ہوگا کیونکہ رات ڈھل چکی تھی۔ تاہم میں حتی الامکان احتیاط برت رہا تھا۔

گاڑی میں نے گھر سے کچھ دور ہی ایک محفوظ سی جگہ پر چھوڑ دی۔ اندیشہ تھا کہ مکان کی نگرانی نہ ہورہی ہو اس لیے میں پچھلی طرف سے داخل ہونا چاہتا تھا اور پچھلی طرف گاڑی لے جانے کے لیے راستہ ٹھیک نہیں تھا۔ اگر پچھلی طرف بھی نگرانی کے لیے کوئی موجود ہوتا تو دور ہی سے اس کا سراغ لگانا اور اسے چکر دے کر بھاگنا یا مقابلہ کرنا آسان تھا۔

میں کھیتوں کی طرف سے مکانوں کی آخری قطار کے عقب میں پہنچا۔ کافی دیر تک میں قد آدم گھاس میں دبکا گرد و پیش کا جائزہ لیتا رہا۔ کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آئے تو میں گھاس میں چلتا ہوا مکان کی طرف بڑھا۔ گھاس کا سلسلہ ختم ہوا تو میں کچھ اور محتاط ہوگیا۔

اونچی نیچی کچی زمین میں کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے گڑھے بھی تھے جن میں بارش کا پانی بھرا ہوا تھا۔ کہیں کہیں مینڈک ٹرٹراتے ہوئے ایک گڑھے سے دوسرے گڑھے میں چھلانگیں لگارہے تھے۔

مکان کی بڑی سی عقبی کھڑکی اب مجھے صاف نظر آرہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ خواب گاہ میں روشنی ہے لیکن کھڑکی بند تھی اور پردہ نہایت ہی احتیاط سے پھیلادیا گیا تھا کہ ذرا سی بھی روشنی باہر نہ جانے پائے۔

میں کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے خیال میں بہتر یہی تھا کہ میں کسی طرح نہایت خاموشی سے اندر پہنچتا اور جائزہ لیتا کہ وہاں میرے لیے کوئی پھندا تو موجود نہیں؟ اگر کوئی پھندا موجود ہوتا اور میں اس کے آثار محسوس کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو اسی خاموشی سے واپس آسکتا تھا۔

کھڑکی کے قریب پہنچ کر میں نے سن گن لینے کی کوشش کی۔ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میں نے جوتے اتار کر کھڑکی کے قریب رکھے اور کھڑکی کا چھجا پکڑ کر جسم کو سمیٹتے ہوئے چھجے پر چڑھ گیا۔ وہاں سے گرنے کا پورا پورا خطرہ مول لیتے ہوئے میں دیوار پر پہنچا جو بمشکل ڈیڑھ بالشت چوڑی تھی۔

دیوار پر ہاتھ جما کر میں دوسری طرف لٹک گیا پھر پنجوں کے بل راہداری نما لمبوترے صحن میں کود گیا۔ بیڈ روم کی جو کھڑکی مکان کے اندر کھلتی تھی اس کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور روشنی باہر آرہی تھی۔ یہی نہیں دروازے کا ایک پٹ بھی کھلا ہوا تھا۔

اسی لمحے میں نے ہلکی ہلکی سسکیوں کی آواز سنی۔ ایسی سسکیاں جنہیں ہونٹوں میں دبائے رکھنے کی پوری کوشش کی جارہی تھی۔ ان سسکیوں میں ہلکی ہلکی آہیں بھی شامل تھیں۔ میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس آواز کو صحیح طور پر پہچاننا تو مشکل تھا لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ آواز زرینہ کے علاوہ کسی کی نہیں۔ چند لمحے میں دیوار سے چپکا بے حس و حرکت کھڑا رہا پھر پنجوں کے بل کھڑکی کے قریب پہنچا۔ محتاط انداز میں کمرے میں جھانکا۔ زرینہ اندر موجود تھی اور تنہا ہی تھی لیکن اسے پہچاننے میں مجھے خاصی دقت پیش آئی اور جب میں نے اسے پہچان لیا تو میرا جسم سن ہوگیا۔

وہ بیڈ پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ اس گڑیا کی طرح جسے بہت سے فساد پسند بچوں نے بری طرح نوچ کھسوٹ کر ایک طرف پھینک دیا ہو۔ اس کے ہونٹ کٹے پھٹے اور سوجے ہوئے تھے۔ رخساروں اور پیشانی کی جلد پھٹی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد نیلاہٹ اور ورم تھی۔ آنکھیں تقریباً چھپ گئی تھیں' بال بری طرح الجھے ہوئے تھے اور اس کے باوجود کچھ چھدرے چھدرے سے لگ رہے تھے۔

بازوؤں اور گردن وغیرہ کا بھی جتنا حصہ نظر آرہا تھا اس پر نیل تھے یا پھر ایسے نشانات جیسے اس کے جسم کو سگریٹوں یا تپتے ہوئے لوہے سے داغا گیا ہو۔ ان تمام نشانات پر کہیں سرخ' کہیں پیلی اور کہیں کوئی بے رنگ دوا لگی ہوئی تھی۔

وہ گرم پانی کی بوتل لیے کہیں کہیں ٹکور کرنے کی کوشش کررہی تھی لیکن اسے اس میں بھی دقت پیش آرہی تھی۔ اس سے کسی کروٹ بھی لیٹا نہیں جارہا تھا۔ وہ ذرا سا کسی طرف کو بھی ہلتی تھی تو کراہ اٹھتی تھی۔ بے اختیار اس کے حلق سے سسکیاں نکل جاتی تھیں جنہیں وہ مسخ شدہ ہونٹ بھینچ کر روکنے کی کوشش کرتی تھی لیکن پھر غالباً ہونٹوں کی تکلیف کے باعث یہ بھی ممکن نہیں رہتا تھا۔ آنسو اس کی متورم آنکھوں سے اُمڈے چلے آرہے تھے۔

چند لمحے تک تو میں خود کو یہی فریب دینے کی کوشش کرتا رہا کہ یہ ایک ڈراؤنا خواب ہے جو ابھی ٹوٹ جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ بالآخر میں اندر چلا گیا۔

وہ مجھے دیکھ کر قطعاً حیران نہیں ہوئی۔ شاید اس میں حیران ہونے کی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ تاہم اس کے آنسوؤں کی طغیانی کچھ اور بڑھ گئی۔ سسکیاں رک گئیں مگر کچلے مسلے چہرے پر ایک ایسی اذیت کے آثار ابھر آئے جو شاید اس کی اب تک کی تمام اذیت پر بھاری تھی۔

بیڈ پر سکڑا سمٹا اس کا مجبور جسم یوں لرزنے لگا جیسے اس کے وجود میں ہزاروں زلزلے مقید ہوں۔ اس نے شاید چیخنے کی کوشش کی تھی مگر حلق سے محض ایک پھٹی پھٹی سی' بے معنی سی آواز نکلی۔ بمشکل وہ بول پائی "کیا لینے آئے ہو اب یہاں؟ دفع ہوجاؤ ... میں تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"تم اپنی نفرت میں حق بجانب ہو۔" میں نے سنبھل کر دھیمے لہجے میں کہا "لیکن خدارا چند لمحے کے لیے غیر جذباتی ہو کر مجھے سب کچھ بتادو۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں اس حال میں بھی غیر جذباتی رہ سکتی ہوں؟" اس نے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا اور ایک بار پھر کراہ اٹھی۔ اس دوران میں نے دیکھا' اس کی دو انگلیوں کے ناخن بھی غائب تھے اور ایک انگلی بری طرح سوجی اور مڑی ہوئی تھی۔

"خدا کے لیے مجھے میرے سوال کا جواب دے دو۔" میری آواز بے اختیار رندھ سی گئی۔ میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور اس کے قریب گھٹنوں کے بل .... قالین پر بیٹھ گیا۔ چند لمحے وہ ہچکیاں لیتی رہی۔ اس کا جسم جھٹکے کھاتا رہا۔ بالآخر ٹوٹتی ہوئی سی آواز میں بولی "تین محکموں نے باہمی اشتراک سے چھاپا مارا تھا۔ تم اور اشرف یکایک گویا ان کے لیے بہت اہم ہوگئے تھے۔ یقیناً کسی نے انہیں ٹپ دی تھی۔ ٹپ ہی نہیں اور بھی بہت کچھ دیا ہوگا۔ تمہارے فرار کے بعد انہیں یہ تو معلوم ہوگیا تھا کہ اشرف خان زخمی ہوا ہے اور جانے کیوں انہیں قوی امید تھی کہ وہ زندہ نہیں بچے گا ..."

"ان کا خیال درست ہی نکلا زرینہ..." میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

زرینہ کے بگڑے ہوئے چہرے پر ایک لمحے کو تغیر آیا مگر اس نے بات جاری رکھی "وہ مجھے پکڑ کر لے گئے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ دوسرا کون تھا اور اس نے کدھر کا رخ کیا ہوگا' کہاں سے اسے پکڑا جاسکتا ہے؟ میں بھلا کیا بتاتی؟ مجھے خود بھی یہ بتاتے ہوئے بڑا عجیب لگ رہا تھا کہ میں تمہارے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔ واقعی کچھ بھی نہیں جانتی تھی... مگر

کون یقین کرتا؟ میں نے تمہارے بارے میں کبھی جاننے کی کوشش ہی نہیں کی تھی ..."

وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اسے بچوں کی طرح سینے سے لگاؤں' پچکاروں' چپ کراؤں مگر مجھ میں اسے ہاتھ لگانے کی ہمت نہیں تھی۔ محض اس کی طرف دیکھتے ہوئے ہی میرا دل خون ہوا جارہا تھا۔

قدرے سنبھل کر وہ بولی "پہلے انہوں نے اطمینان کیا کہ میرا کہیں کوئی اثر ورسوخ نہیں... میرا کردار' میرا ماضی کچھ ایسا قابل فخر نہیں... پھر تو میں ان کے لیے ٹوٹی ہوئی پتنگ بن گئی... میں کوئی عزت دار عورت نہیں ہوں افضل لیکن اتنی ذلت کا تو میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ آخر کار آج وہ اپنی تفتیش سے تھک گئے اور مجھے یہاں پٹخ گئے۔ میں نہیں کہہ سکتی' شاید مکان کی نگرانی بھی ہو رہی ہو۔ یا شاید بس... اب ان کی دلچسپی ختم ہوگئی ہو۔ جو کچھ ہو چکا ہے ان کے خیال میں یہی کافی ہو..." وہ خاموش ہوگئی۔

"جو کچھ بھی کیا ہے بہرحال تم اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔" میں نے ڈرتے ڈرتے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ سہارا دے کر اسے اٹھا سکوں۔

"نہیں... نہیں۔" وہ دہشت زدہ ہو کر کچھ اور سمٹ گئی۔ "مجھے ساتھ لے جانا تو درکنار خدا کے لیے تم میرے پاس زیادہ دیر بیٹھو بھی مت۔ چلے جاؤ یہاں سے۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ جس طرح چند دن قبل چھوڑ گئے تھے۔ میں خود ہی اپنے آپ کو سنبھال لوں گی۔ خود ہی اپنے معاملات سلجھا لوں گی۔ خدا اس گناہ گار کی مغفرت کرے۔۔ اشرف خان نے یہ مکان میرے نام کردیا تھا۔ یہاں اب زیادہ نقدی یا کوئی کام کی چیز تو باقی نہیں رہی لیکن بہرحال سر چھپانے کا ٹھکانا تو ہے۔ میں کسی نہ کسی طرح گزارہ کرلوں گی۔ تم بس فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ مجھے کسی کی مدد... کسی کے سہارے کی ضرورت نہیں۔ خدا کے لیے مجھے تنہا چھوڑ دو۔"

میرا خیال تھا اس کی برہمی اور جذباتیت آنسوؤں کے ساتھ بہہ جائے گی۔ میں اسے روتا دیکھتا رہا حتیٰ کہ اس کے آنسو تھم گئے۔ شاید آنسوؤں کے سوتے خشک ہوگئے تھے۔ آنسوؤں نے اس کے اور میرے درمیان فاصلے گھٹانے کے بجائے بڑھا دیے۔ اس کا ارادہ پہلے سے زیادہ مضبوط محسوس ہونے لگا۔

بیگانگی بھرے لہجے میں وہ بولی "خدا کے لیے اب چلے بھی جاؤ۔ مجھے تمہاری موجودگی سے وحشت ہو رہی ہے۔ میں نے ان لوگوں کے سامنے بہت بڑی قسم کھا کر وعدہ کیا تھا کہ تم نے اگر مجھ سے رابطہ قائم کیا تو میں تمہیں پکڑوانے کی کوشش کروں گی۔ ایک فون نمبر بھی دیا تھا انہوں نے مجھے... تمہاری خاطر میں اب بھی اتنا کررہی ہوں کہ اپنی قسم پوری نہیں کررہی ہوں... لیکن خدارا تم چلے جاؤ۔ میری بھلائی چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔ ہمارا تمہارا ساتھ بس اتنا ہی تھا۔ اب اسے بھول جاؤ۔"

اس نے بصد کوشش کروٹ لی اور منہ پھیر کر اس طرح لیٹ گئی کہ اس کے گھٹنے پیٹ سے لگ رہے تھے اور گرم پانی کی بوتل اس نے پسلیوں پر رکھی ہوئی تھی۔ اس کا جسم اب بھی ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

"یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" میں نے گلوگیر آواز میں پوچھا۔

"ہاں.. ہاں۔" وہ اذیت زدہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی۔ اس کے لہجے نے مجھے بتادیا کہ مجھے اپنی کتاب زندگی سے یہ ورق اب پھاڑ کر پھینکنا ہی ہوگا۔ وہ فیصلہ کرچکی تھی اور ایسا فیصلہ کرنا اس کا حق بنتا تھا۔

"میں جارہا ہوں۔" بالآخر میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا "کیا میں تمہارے لیے کسی ڈاکٹر کا بندوبست کرتا جاؤں؟"

"میں نے کرلیا ہے۔" وہ رکھائی سے بولی "سردست اس سے جو کچھ ہوسکتا تھا کرگیا تھا۔ صبح دواؤں کا بندوبست کرکے آئے گا۔ میں نے کہا تا کہ مجھے تمہاری کسی بھی قسم کی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اگر میری کچھ مدد کرسکتے ہو تو یہی کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

میں کمرے سے نکل آیا۔ میرے کندھوں پر جیسے منوں وزن لدا ہوا تھا۔ بمشکل میں اسی راستے سے باہر پہنچا جس راستے سے آیا تھا۔ میں نے بیڈ روم کی کھڑکی کھول کر کودنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اس کے لیے مجھے زرینہ کے سامنے جانا پڑتا جبکہ وہ مجھ سے منہ پھیرے لیٹی ہوئی تھی۔

باہر کھڑکی کے پاس رکھے ہوئے جوتے پہن کر میں واپس چل دیا۔ میں دکھوں اور غموں کا ظاہری طور پر ہی نہیں دل میں بھی ہمیشہ مضحکہ ہی اڑانے کا عادی رہا تھا تاکہ وہ میرے اعصاب کو توڑ پھوڑ نہ سکیں لیکن اس وقت میرا دل جتنا بوجھل تھا میں ہی جانتا تھا۔ کوشش کے باوجود مجھے کوئی مزاحیہ بات یاد نہیں آرہی تھی۔ صورت حال کے لیے کوئی مزاحیہ تشبیہہ نہیں سوجھ رہی تھی۔

سپیدہ سحر نمودار ہو رہا تھا اور خاصی خنک ہوا چل رہی تھی مگر مجھے فضا میں بے حد حبس محسوس ہو رہا تھا۔ گھٹن شاید فضا میں نہیں میرے سینے میں تھی۔

میں گاڑی میں آبیٹھا۔ چاروں طرف پرندوں کی چہکار سنائی دینے لگی تھی۔ اجالا پھیل رہا تھا۔ میں نے گلوو کمپارٹمنٹ

سے چھجے دار ٹوپی اور تاریک شیشوں کی عینک نکال لی۔ یہ دونوں چیزیں میں نے لاہور میں آوارہ گردی کے دوران خریدی تھیں۔ مجھ جیسے آدمی کے لیے یہ بڑی کارآمد چیزیں تھیں۔

ٹوپی پہننے اور عینک لگانے کے بعد میں نے عقب نما آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ آنکھیں اور بال چھپنے سے چہرے میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ گہری سانس لے کر میں سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کار اسٹارٹ کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ میرے ذہن میں کھچڑی سی پک رہی تھی' میرے وجود میں کہیں جیسے کوئی چنگاری سی پھوٹی تھی اور شعلہ بنتی جارہی تھی۔ میں سراپا مبتلائے اذیت تھا۔ میرا رواں رواں جل رہا تھا۔ ہر مسام جیسے آگ اگل رہا تھا۔

جان من! یہ تو زندگی کا کوئی قرینہ نہ ہوا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ یوں تو لوگ زمین کے سینے پر تمہارے پاؤں کبھی جمنے نہیں دیں گے۔ میں بہت دیر تک سوچتا رہا۔ بالآخر مجھے امید کی ایک کرن دکھائی دے گئی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے ایک طرف روانہ ہوگیا۔

شہر کے مضافات ہی میں واقع ایک بہت بڑا کباڑ خانہ میری منزل تھا۔ کباڑ خانے تک پہنچنے میں مجھے زیادہ دیر نہیں لگی۔ کار میں نے ایک پرانے اور تناور درخت کے نیچے روک دی۔ کباڑ خانے کے گرد ایک نیچی سی چار دیواری احاطہ کیے ہوئے تھی۔ اندر ایک طرف چھپر سا تھا۔ کچھ ساز و سامان اور کاٹھ کباڑ اس چھپر میں ہوتا تھا اور باقی کھلے آسمان تلے بکھرا رہتا تھا۔

اس چار دیواری کی ایک دیوار کے ساتھ ایک جھونپڑی کندھا جوڑے کھڑی تھی۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس جھونپڑی تک پہنچا۔ جھونپڑی کا نام نہاد دروازہ چوپٹ کھلا دیکھ کر مجھے مایوسی سی ہوئی کہ شاید اب یہاں کوئی نہیں رہتا لیکن کچھ آگے بڑھا تو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ آثار قدیمہ سے تعلق رکھنے والی وہ چارپائی اب بھی جھونپڑی میں موجود تھی جو میں ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا جب اشرف خان کے ساتھ یہاں آیا تھا۔

یہ چارپائی درحقیقت چارپائی بھی نہیں 'تین پائی' تھی۔ چوتھے پائے کا صرف تھوڑا سا حصہ ہی باقی تھا اور کمی اینٹوں کے ذریعے پوری کی گئی تھی۔ یہ چارپائی کسی دانشور کے خیالات کی سی گہرائی لیے ہوئے تھی اور اس پر لیٹنے کے بعد انسان کٹورے کی پتل جیسی شکل اختیار کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھدری اتنی تھی کہ کتے بلیاں تو اس کے بانوں کے درمیان سے گزر سکتی تھیں۔

اس پر لیٹنا یقیناً ایک آرٹ تھا جو صرف بابا بخشا کو ہی آتا تھا جو اس جھونپڑی کا مکین تھا۔ اس بابا بخشا کی تاریخ مغلوں کی تاریخ سے کچھ ہی کم پرانی تھی۔ کسی زمانے میں بابا بخشا ایک موچی تھا۔ شہر کی ایک سڑک پر بیٹھا کرتا تھا۔ جانے کب اور کس طرح چھوٹے موٹے اسمگلروں نے اسے اپنے مخبر اور پیامبر کے طور پر استعمال کرنا شروع کردیا۔

سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے اس بے ضرر سے بوڑھے موچی کے پاس چھوٹے موٹے اسمگلر جوتے پالش کرانے کے بہانے رکتے اور کہہ جاتے کہ فلاں آئے تو اسے بتادینا کہ فلاں وقت فلاں جگہ سے مال وصول کرلے یا فلاں جگہ پر مال اس وجہ سے نہیں پہنچ سکا۔ آئندہ پروگرام یہ ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

چھوٹے موٹے سرکاری اہلکار بھی جوتے مرمت کرانے یا پالش کرانے کے لیے اس کے پاس رکتے تھے۔ بابا بخشا باتوں باتوں میں کبھی کبھار ان سے بھی کوئی کام کی خبر حاصل کرلیتا تھا اور اسے اسمگلروں تک پہنچادیتا تھا۔ ان خدمات کے عوض اسمگلر اسے تھوڑی بہت رقم دیتے رہتے تھے اور شاید ان ہی دنوں بابا بخشا کو ایل ایس ڈی کے کیپسول کی لت لگ گئی جسے نشے باز راکٹ کہتے ہیں۔

اس راکٹ نے بہت کم وقت میں بابا بخشا کو قبر کے کنارے پہنچادیا۔ اسے روٹی کی نہیں' راکٹ کی فکر رہتی تھی۔ جو کچھ بھی اس کے پاس ہوتا اس سے وہ راکٹ خریدتا' خواہ کسی بھی قیمت پر ملتا۔ نشہ ٹوٹتا تو دیوانوں کی طرح وہ ہر چیز کو نوچتا کھسوٹتا' ادھر ادھر پھرتا اول فول بکتا۔ کام کاج کے قابل نہ رہا۔ اسمگلروں کے لیے بھی بھروسے کے قابل نہ رہا۔ کبھی کبھار وہ شہر کی کسی سڑک کے کنارے یا کسی نالی میں منہ دیے پڑا ہوا نظر آجاتا۔ کوئی ترس کھا کر کسی طرح اسے اٹھا کر اس کی جھونپڑی میں پہنچادیتا' کوئی ترس کھا کر کھانا یا تھوڑے بہت پیسے دے دیتا۔

جھونپڑی میں داخل ہوتے ہی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے مرغیوں کے کسی بڑے دڑبے میں گھس گیا ہوں۔ عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی وہاں۔ ایک کونے میں بابا بخشا کے ماضی کی یادگار چند زنگ آلود اوزار اور مڑے تڑے' کٹے پھٹے کچھ جوتے پڑے تھے۔ ایک کونے میں چولھا' ایلمونیم کے دوچار ٹیڑھے میڑھے برتن اور گھڑا وغیرہ اوندھا سیدھا پڑا تھا۔

جھلنگا سی چارپائی کی قبر میں بابا بخشا گٹھری بنا پڑا تھا۔ پہلے تو مجھے گمان گزرا کہ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کرچکی ہے۔ اس کا پوپلا سا منہ کچھ اسی انداز میں کھلا ہوا تھا۔ رال بہہ بہہ کر اس کے رخساروں پر خشک ہوچکی تھی۔ اس کی رنگت سیاہ اور چہرہ جھریوں بھرا تھا۔ ہاتھ پیروں پر نسیں رسیوں کی طرح ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے استخوانی جسم پر ایک میلی

جیکٹ واسکٹ اور مختصر سی دھوتی تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور آنکھوں کے گوشوں میں میل جمی ہوئی تھی۔

مجھے اس پر رحم بھی آیا اور ایک لمحہ کے لیے کراہیت بھی محسوس ہوئی لیکن پھر ایک اور ہی جذبہ ان تمام کیفیات پر غالب آگیا۔ میں اسے ہلانے جلانے کے لیے ہاتھ بڑھانے ہی لگا تھا کہ یک لخت اسے جھرجھری سی آئی اور اس کے جسم کو یوں جھٹکے لگنے لگے گویا بجلی کا کوئی ننگا تار جس میں کرنٹ بھی دوڑ رہا ہو، بار بار اس کے جسم سے مس ہو رہا ہو۔

چند لمحے بعد اس کی حالت کچھ اعتدال پر آئی اور وہ خرخراہٹ کی آواز کے ساتھ لمبی لمبی سانسیں لینے لگا۔ آنکھیں بدستور بند تھیں۔

میں نے کافی دیر اسے ہلایا جلایا تب اس نے بمشکل آنکھیں کھولیں اور نہایت ہی بیزاری سے میری طرف دیکھا۔

"کون ہے؟ کیا بات ہے؟" اس نے نہایت ہی ضعیف آواز میں پوچھا۔

میں وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا تھا اور میرے خیال میں بات اس کی دلچسپی کے موضوع سے شروع کی جاتی تو شاید جلد مقصد پورا ہو جاتا۔

"راکٹ چاہیے؟" میں نے پوچھا۔

اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں امید کی کرن لہرائی اور اس نے چارپائی کی پٹی تھام کر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں نے سہارا دے کر اسے بٹھایا۔

"تم راکٹ لائے ہو؟" اس نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

"نہیں، لیکن میں تمہیں کچھ رقم دے سکتا ہوں جس سے تم کئی دن کا کوٹا خرید سکتے ہو۔" میں نے کہا اور دس دس کے چند نوٹ اس ہاتھ میں تھما دیئے۔

وہ کانپتے ہاتھوں سے انہیں گننے لگا۔ پھر اس نے پاگلوں کی طرح اپنے ایک ہاتھ پر کاٹا اور میری طرف دیکھ کر گھبراہٹ زدہ سے انداز میں ہنستے ہوئے بولا "یقین کرنے کی کوشش کر رہا تھا ... کہ میں خواب ... نہیں دیکھ رہا..." اس نے ایک بار پھر پاگلوں کی طرح نوٹ گنے۔ اس مرتبہ اس کے ہاتھ پہلے سے زیادہ کانپ رہے تھے۔

"تم مجھے بتا سکتے ہو کہ استاد لبھو کا ٹھکانا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"استاد لبھو کا ٹھکانہ...؟" اس نے سرسراتی ہوئی سی آواز میں دہرایا۔ ایک لمحہ پہلے اس کی آنکھوں میں امید کی جو کرن لہرائی تھی، دم توڑ گئی۔ حد سے زیادہ ابھرے ہوئے اس کے نرخرے نے کئی بار نیچے اوپر حرکت کی۔ شاید وہ مزید کچھ بولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مگر آواز حلق میں پھنس رہی تھی۔

بالآخر اس نے نفی میں سر ہلایا اور سرگوشی نما آواز میں پوچھا "کیا اب تم یہ رقم واپس لے لوگے؟" اس کے لہجے میں بلا کی حسرت تھی۔

میں فوری طور پر اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس کا سارا جسم ہی ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ وہ گویا مجھے قائل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "استاد لبھو کا ٹھکانا شاید تمہیں کوئی بھی نہ بتا سکے۔"

"اس کے کسی ساتھی کا اتا پتا؟" میں نے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے اس کے تباہ شدہ ذہن پر زیادہ بھروسہ تو نہیں تھا لیکن کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

بالآخر بابا بخشا نے سر اٹھایا اور کانپتی آواز میں بولا "کافی عرصہ پہلے کی بات مجھے یاد پڑتی ہے... ایک نوجوان ... غلام احمد اس کے لیے کام کرتا تھا... ان دنوں تو اس کا خاص آدمی تھا... اگر زندہ ہو گا تو اب بھی یقیناً اسی کے لیے کام کر رہا ہو گا.. بات زیادہ پرانی بھی نہیں ہے میں تمہیں بتاتا ہوں کہ وہ کہاں رہتا تھا۔" وہ ہانپنے لگا تھا لہٰذا خاموش ہو کر سانس درست کرنے لگا۔

کچھ دیر بعد اس نے مجھے ایڈریس سمجھانا شروع کیا جو بالآخر میری سمجھ میں آ ہی گیا۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور جھونپڑی سے نکل آیا۔

مجھے یقین تھا کہ ہماری مخبری کرنے اور ہمارے ساتھ بے انتہا سخت سلوک کروانے میں استاد لبھو کے سوا کسی کا ہاتھ نہیں تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اشرف خان کچھ ہی عرصہ قبل مجھے اس کے بارے میں کافی کچھ بتا چکا تھا اور اس حقیقت سے بھی آگاہ کر چکا تھا کہ ان کے درمیان پرانی دشمنی کی ایک گرہ چلی آ رہی ہے۔

اشرف خان مر چکا تھا اور اس طرح گویا استاد لبھو کی خواہش انتقام کی تسکین کا سامان ہو چکا تھا اور اب یہ سلسلہ یہیں ختم ہو سکتا تھا لیکن اشرف خان کی موت اور پھر زرینہ کا حشر دیکھنے کے بعد میرے دل میں انتقام کا شعلہ بھڑک اٹھا تھا۔ استاد لبھو کی کمینگی اور سفاکی کا بدلہ لینے کی ذمے داری میں نے اپنے سر لے لی تھی۔

فی الحال میں اپنے آپ کو اس پوزیشن میں تو محسوس نہیں کر رہا تھا کہ استاد لبھو کو اگر تلاش کر بھی لیتا تو براہ راست جا کر اس سے ٹکرا جاتا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس جگہ وہ کسی بادشاہ سے کم نہیں تھا۔ بہرحال میں اس کے دل پر ایسی ہی کوئی خراش ضرور لگا سکتا تھا جیسی اس نے میرے دل پر لگائی تھی۔

مجھے گویا یہ ایک قسم کی سہولت حاصل تھی کہ میرے

میں کسی کو بھی صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ سب جن سے مجھے کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا، میرے نام تک بے خبر تھے۔ میں اس وقت تک ان کی دسترس سے رہ سکتا تھا جب تک میں خود ان کے سامنے آنے کا فیصلہ کر لیتا اور ظاہر ہے ایسا فیصلہ میں اسی وقت کر سکتا تھا جب آپ کو اس قابل محسوس کرتا۔

کار میں بیٹھ کر میں کچھ دیر بعد جس گلی میں پہنچا یہاں ...وں کے نچلے حصوں میں دکانیں تھیں مگر وہ اس وقت بند تھیں۔ میں نے گاڑی کچھ آگے وہ مکانوں کے درمیان ایک ...ے سے خالی پلاٹ پر روکی اور پیدل واپس آیا۔

ایک تنگ سی بغلی گلی میں داخل ہو کر میں نے وہ دروازہ ...ش کیا جس کے قریب ہی سیڑھیاں اوپر جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ اوپر پہنچ کر میں نے ایک تنگ سی راہداری کے ...ام پر موجود دروازے پر دستک دی۔

دوسری مرتبہ دستک دینے پر ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ ...شلوار اور بنیان میں تھا۔ ایک ہاتھ سے وہ دروازہ تھامے ہوئے تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے آنکھیں ملیں، بالوں ...ا سینہ کھجایا اور سوالیہ نظر سے میری طرف دیکھا۔ وہ یقیناً نیند سے اٹھ کر آیا تھا لیکن ایک اجنبی کو سامنے پا کر فوراً چوکنا ہو گیا تھا۔ اس کی عمر تیس کے قریب ہو گی۔ چھوٹے قد اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔

مجھے یاد آ گیا، میں نے اس شخص کو دو تین مرتبہ ... ریسٹورنٹ میں دیکھا تھا لیکن اس وقت مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کون ہے اور کس کے لیے کام کرتا ہے۔

وہ راستہ روکے کھڑا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ وہ سیدھی طرح مجھے اندر نہیں آنے دے گا چنانچہ میں نے جیکٹ کی جیب میں پھنسا ہوا ہاتھ نکال لیا۔ میرا پسندیدہ جرمن لیوگر میرے ہاتھ میں موجود تھا۔ دوسرا ہاتھ میں نے اس کے سینے پر جماتے ہوئے اسے دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے وسط میں پہنچا اور ایک تپائی سے الجھ کر گر پڑا۔

میں اس دوران کمرے میں داخل ہو کر مڑ کر دیکھے بغیر کنڈی چڑھا چکا تھا۔ مختصر سا یہ کمرا ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔ سامنے کسی اور کمرے کا دروازہ نظر آ رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ غلام احمد شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ۔ تنہا رہتا ہے یا کسی کے ساتھ۔

"گھر میں اس وقت اور کون ہے؟" میں نے اس کے سینے کا نشانہ لیتے ہوئے پوچھا "کون کون تمہارے ساتھ رہتا ہے؟" میرا لہجہ دھیما تھا لیکن مجھے امید تھی کہ وہ اس لہجے کی تہ میں سرسراتی ہوئی سفاکی کی لہر کو محسوس کر سکتا تھا۔ میرا دل اس وقت نفرت سے لبریز تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا تھا اس میں اس نوجوان کا انفرادی طور پر کوئی حصہ تھا یا نہیں لیکن میری نفرت کو دوچند کرنے کے لیے یہی احساس کافی تھا کہ وہ اس شخص کا کارندہ تھا جس کا نام میں اپنے دشمنوں کی مختصر سی فہرست میں لکھ چکا تھا۔

"کوئی نہیں۔" اس نے تھوک نگل کر جواب دیا "میں ایک دوست کے ساتھ یہاں رہتا ہوں، وہ دو تین روز کے لیے کہیں گیا ہوا ہے۔" سردست وہ کچھ زیادہ خوف زدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ خوف سے زیادہ اس پر حیرت غالب تھی۔

میرا اندازہ تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا تاہم ممکن حد تک تصدیق کر لینا بہتر تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ غلام احمد کو بدستور ریوالور کی زد پر رکھتے ہوئے میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا اسے تنبیہہ کی اپنی جگہ سے ہلنا مت۔

میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ دوسری طرف بیڈ روم تھا۔ اس کا دوسرا دروازہ کھلا ہی تھا اور آگے صحن نظر آ رہا تھا۔ گھر خالی ہی معلوم ہوتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غلام احمد کو جو ہدایت کی تھی وہ اس پر عمل کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ میرے منہ پھیرتے ہی اس نے قسمت آزمائی کی ٹھان لی۔ ایک دیوار پر چھوٹے چھوٹے دستوں والی دو کلہاڑیاں آرائشی انداز میں کیلوں پر ٹکی ہوئی تھیں۔ غلام احمد یک لخت ٹوٹ جانے والے اسپرنگ کی طرح اچھل کر ان کی طرف لپکا مگر میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔

گو کہ میں دوسرے کمرے میں جھانک رہا تھا مگر میں نے اسے اچھلتے دیکھ لیا تھا۔ میں ایڑی کے بل گھوما، کمرے کے وسط میں پہنچا اور اس سے پہلے کہ اس کا ہاتھ کلہاڑی تک پہنچ پاتا، میں نے اس کی ناف پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ ابکائی سی لے کر دوہرا ہو گیا پھر گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ میری دوسری ٹھوکر اس کے منہ پر پڑی۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے اور منہ خون میں لتھڑ گیا۔ شاید ایک آدھ دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔

وہ ایک بار پھر تقریباً پہلے ہی والی پوزیشن میں بیٹھ چکا تھا۔ اب بھی وہ خوف زدہ نہیں تھا۔ نفرت سے مجھے گھور رہا تھا۔ تکلیف کی وجہ سے اس کے چہرے پر کھنچاؤ آ چکا تھا۔

"فی الحال میں نے تم سے نرمی برتی ہے۔ دوبارہ حرکت کرو گے تو زیادہ نقصان اٹھاؤ گے۔" میں نے ملائمت سے کہا اور صوفے پر بیٹھ کر ریوالور والا ہاتھ گھٹنے پر ٹکا لیا۔ ریوالور کا رخ

اب بھی اس کے سینے ہی کی طرف تھا۔ اسے لات رسید کرنے کے دوران میرے تاریک شیشوں کی عینک ناک پر کچھ نیچے تک پھسل آئی تھی۔ میں نے اسے صحیح جگہ بنانے کے بجائے اتار کر گود میں رکھ لیا۔

غلام احمد نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے گھورا اور یکدم ہی اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے اتر آئے "تم... تم اشرف خان کے ساتھی تو نہیں؟" اس نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ ہونٹ پھٹے ہونے کے باعث اس کی آواز بدلی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ خون کے کچھ چھینٹے بھی ہوا میں اڑے۔

"بالکل ٹھیک پہچانا تم نے۔" میں نے کہا "مجھے امید ہے کہ اب تم میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے زیادہ ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرو گے۔"

وہ خاموش رہا' اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے تھے۔

"استاد لبھو کہاں مل سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔ وہ بدستور خاموش رہا تو میں صوفے سے اٹھنے لگا۔ وہ خوف زدہ انداز میں دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "تم جو قسم کہو میں کھانے کے لیے تیار ہوں... میں واقعی نہیں جانتا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ تاہم اتنا مجھے معلوم ہے کہ آج وہ شہر میں نہیں ہے۔ ایک آدھ دن میں آجائے گا۔"

میں نے دوبارہ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا "تم مجھے الو بنانے کی کوشش کر رہے ہو؟ شاید تم بھول رہے ہو کہ میں بھی لائن ہی کا آدمی ہوں۔ ہم جن کے لیے کام کرتے ہیں کیا ہم ان کے ٹھکانوں سے واقف نہیں ہوتے؟ استاد لبھو کوئی فلمی اسمگلر تو نہیں ہے کہ اس کے قریبی ساتھی بھی اس کی شخصیت سے ناواقف ہوں۔ وہ کسی نامعلوم تہ خانے میں بیٹھتا ہو' صرف ٹیلی فون پر احکامات جاری کیے جاتے ہوں اور کوڈ ورڈز میں گفتگو کی جاتی ہو۔"

"بخدا... تقریباً ایسا ہی ہوتا ہے۔" غلام احمد لرزتی سی آواز میں بول اٹھا۔ "استاد لبھو کا نام سن کر ذہن میں کسی جاہل اور ان پڑھ سے آدمی کا تصور آتا ہے۔ وہ ہے بھی ایسا ہی... لیکن اس کا طریق کار ایسا نہیں ہے۔ کم از کم اب ایسا نہیں رہا۔ اس کا ذہن بہت تیز ہے... اور اب تو ایک اور شخص بھی اس کے ساتھ شامل ہو گیا ہے۔ وہ یہیں کا کوئی ایم ایس سی پاس نوجوان ہے۔ کچھ عرصہ امریکا میں بھی رہا ہے۔ سنا ہے وہ وہاں زیادہ تر جیلوں میں ہی رہا ہے۔ جب سے وہ استاد لبھو کے ساتھ شامل ہوا ہے' اس کے طور طریقے ہی بدل گئے ہیں۔ اب صرف وہ دونوں ہی ایک دوسرے کی بات سے واقف ہوتے ہیں۔ ہم جیسوں کو تو صرف احکامات ملتے ہیں۔ میں اب استاد لبھو کے قریبی ساتھیوں میں شمار نہیں ہوتا۔ بلکہ قریبی ساتھی اب کوئی رہا ہی نہیں۔ وہ دونوں ہی بس ایک دوسرے کے قریبی ساتھی ہیں۔ ہم نے اس تبدیلی کو اس لیے زیادہ محسوس نہیں کیا کہ ہمارے کمیشن بڑھ گئے ہیں..." وہ الٹے ہاتھ سے خون پونچھنے لگا "اس نوجوان کا نام کیا ہے؟" میں نے محض معلومات کی خاطر پوچھا۔

"علی مراد۔" غلام احمد نے جواب دیا۔

"تم نے کبھی اسے دیکھا ہے؟ کس قسم کی چیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چھریرے جسم کا لمبا نوجوان ہے۔ گھنی داڑھی ہے۔ بال گھنگریالے ہیں۔ آنکھیں ہر وقت سرخ رہتی ہیں۔ سنا ہے جدید اسلحہ کے استعمال میں اس کا جواب نہیں۔ بہت جلد غصے میں آجاتا ہے۔ استاد لبھو سے بھی کچھ بڑھ کر سفاک اور بے رحم ہے۔ میں نے صرف دو مرتبہ اسے دیکھا ہے اور... بے پناہ خوف محسوس کیا ہے۔"

"اور یہ استاد لبھو کس قسم کا جانور ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بن مانس قسم کی چیز ہے۔ سیاہ فام۔ پستہ قد اور سانڈ کی طرح مضبوط۔ اس کی آواز بیٹھی بیٹھی سی ہے۔ اس کے نام سے اس کے رکھ رکھاؤ اور پہناوے کا صحیح تصور ذہن میں نہیں آتا۔ وہ سوٹ وغیرہ پہنتا ہے۔ سگار پیتا ہے۔ تھوڑی بہت انگریزی بھی بول لیتا ہے۔" غلام احمد نے بتایا۔

"ہوں... تو تمہیں واقعی اس کا ٹھکانا معلوم نہیں؟" میں اٹھ کر اس طرح کمرے میں ٹہلنے لگا کہ اس کے اور میرے درمیان زیادہ سے زیادہ فاصلہ رہے۔ وہ اب گو کہ بیچارگی کی تصویر بن بیٹھا تھا لیکن میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ وہ اب مجھ پر حملہ نہیں کرے گا البتہ اتنا مجھے یقین تھا کہ مزید مار پیٹ سے بچنے کے لیے وہ میرے سوالوں کے جواب میں سچ بول رہا تھا۔

"نہیں۔ مجھے واقعی اس کے ٹھکانے کا علم نہیں۔" وہ تیزی سے بولا "میں نے کہا نا کہ علی مراد کے آنے کے بعد استاد کے طور طریقے ہی بدل گئے ہیں۔ اب اسے جب بھی ہماری ضرورت ہوتی ہے وہ خود ہم سے رابطہ قائم کرتا ہے۔ میری معلومات کے مطابق میرے علاوہ صرف چار آدمی اور اس کے لیے کام کر رہے ہیں اور ان کی حیثیت کارندوں ہی کی سی ہے۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ استاد ہر طرح سے ہمارا خیال رکھتا ہے۔ مصیبت کے وقت ہم سے لاتعلق نہیں ہوتا..." وہ مزید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"مثلاً۔" میں نے رک کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا "وہ جب تمہارا یہ بگڑا ہوا چہرہ دیکھے گا تو بہت تلملائے گا اور مجھے تلاش کرنے کی ہر ممکن کوشش کرے گا؟"

"عین ممکن ہے۔" غلام احمد نے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"اچھا یہ بتاؤ..." میں نے گویا اس بات کو غیر اہم سمجھ کر ختم کرتے ہوئے کہا "اگر تمہیں اچانک استاد لبھو سے رابطہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آجائے تو تم کیا کرتے ہو؟"

"کچھ عجیب سا سلسلہ ہے... شاید تم یقین نہ کرو۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "ایک فون نمبر ہے جو اس نے ہمیں دے رکھا ہے۔ میں نے جب بھی اس پر فون کیا تو کھردری سی ایک نسوانی آواز سنائی دی ہے۔ فون استاد نے کبھی ریسیو نہیں کیا لیکن میں نے اس نمبر پر جو بھی پیغام دیا ہے وہ چند منٹ کے اندر اندر استاد کو مل گیا ہے۔ میں نے تجسس سے مجبور ہو کر ایک مرتبہ پتا چلانے کی کوشش کی تھی کہ یہ نمبر کس کا ہے۔ ڈائرکٹری میں یہ نمبر موجود نہیں ہے۔ بہرحال میرے خیال میں اس کا سراغ لگانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ یہ کوئی زیادہ بڑا شہر نہیں ہے۔ آٹومیٹک ایکسچینج بھی کچھ ہی عرصہ پہلے یہاں لگا ہے۔ میں نے ایکسچینج میں ایک واقف کار تلاش کیا۔ اس سے کام نہیں چلا تو ایک اور اچھے خاصے عہدے دار کو اچھی رقم کی بھی پیشکش کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ معلومات کر کے دو ایک دن میں جواب دے گا۔ دوسرے دن استاد لبھو میرے پاس آیا اور سرد مہری سے لہجے میں بولا۔ میں نے تمہیں جو نمبر دے رکھا ہے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے تم کئی دن سے مارے مارے پھر رہے ہو۔ ایسی کیا ضرورت آن پڑی ہے تمہیں؟ بڑی مشکل سے میں نے اسے یقین دلایا کہ میں محض تجسس سے مجبور ہو کر ایسا کر رہا تھا تو وہ بولا "مجھے تجسس پسند لوگ بالکل اچھے نہیں لگتے۔ میرے نزدیک ان کا صحیح مقام گندہ نالا ہے جس کی تہ میں لیٹ کر وہ اطمینان سے قیامت تک غور و فکر کر سکتے ہیں۔ تجسس پسندوں کو ہمارے دھندے میں نہیں' کسی لیبارٹری وغیرہ میں ریسرچ آفیسر ہونا چاہیے' مجھے اس کی یہ باتیں لفظ بہ لفظ یاد ہیں۔ بہرحال میری معذرت پر اس کا دل صاف ہو گیا تھا اور وہ پہلے ہی کی طرح عزت اور محبت سے پیش آنے لگا تھا۔"

"وہ نمبر بتاؤ۔" میں نے کہا۔ اس نے نمبر بتایا جسے میں نے ذہن نشین کر لیا۔

"اشرف خان کے متعلق مخبری استاد لبھو نے ہی کی تھی نا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

وہ ہچکچایا تو میں ہونٹ بھینچ کر اس کی طرف بڑھا۔ وہ جلدی سے بولا "ہاں... مجھے پتا چلا تھا۔ استاد نے اس معاملے میں خصوصی دلچسپی لی تھی۔ روپیہ بھی خرچ کیا تھا اور کسی اثر و رسوخ والے آدمی کی مدد بھی حاصل کی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ تم دونوں سرکاری آدمیوں سے مقابلے میں مارے جاؤ۔"

میں اب غلام احمد کے قریب ہی کھڑا تھا۔ وہ سہمی سہمی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید سمجھ بھی نہ پایا ہو کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ میرا ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت میں آیا تھا کہ میں خود بھی حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ ریوالور کا دستہ غلام احمد کی کنپٹی پر پڑا تھا اور وہ دوسری طرف کو لڑھک گیا تھا۔ میں چند لمحے وہیں کھڑا رہا۔ وہ بے حس و حرکت ہی رہا۔

میں اس کے بیڈ روم میں آیا اور اپنی ضرورت کی چند چیزیں تلاش کرنے لگا جو بالآخر مجھے مل گئیں۔ ایک مضبوط ریشمی ازاربند' ایک قلم اور ایک رائٹنگ پیڈ۔

ازاربند کا پھندا میں نے غلام احمد کے گلے میں ڈال کر اسے یک لخت کس دیا اور گرہ لگا دی۔ اس کی سانس رکی تو بیہوشی ختم ہو گئی اور وہ بری طرح مچلنے لگا لیکن پھندا اپنے گلے سے نہ ہٹا سکا۔ اس کی گردن اور چہرے کی نسیں یوں پھول گئیں گویا ابھی پھٹ پڑیں گی۔ آنکھیں ابل آئیں۔ بالآخر وہ ساکت ہو گیا اور دہشت ان آنکھوں میں منجمد ہو کر رہ گئی۔

"سوری ڈیئر غلام احمد..." میں نے زیر لب کہا۔ "تمہارا قصور صرف اتنا ہی تھا کہ تم استاد لبھو کے لیے کام کرتے تھے۔ میں اگر تمہارے ساتھ یہ سلوک نہ کرتا تب بھی ایک نہ ایک روز تم کسی نہ کسی کے ہاتھ سے مرتے ہی۔"

اس کے بعد ایک کرسی میں نے تپائی کے قریب کھینچی اور بیٹھ کر نہایت توجہ اور انہماک سے لکھنے لگا۔

استاد جی! اپنے ایک نادیدہ شاگرد کی طرف سے یہ حقیر تحفہ قبول فرمائیے۔ اشرف خان مر چکا ہے۔ اس خبر سے آپ کو بے حد خوشی ہوئی ہے نا؟ میں نے سوچا اس موقع پر چھوٹی موٹی خوشی ہم بھی منا لیں۔ اس طرح حساب بھی برابر ہو جائے گا۔ ایک لاش کے بدلے ایک لاش۔ گو کہ مجھے معلوم ہے کہ غلام احمد کی آپ کے لیے وہ حیثیت نہیں تھی جو اشرف خان کی میرے لیے تھی۔ بہرحال جلدی میں یہی بندوبست ہو سکا ہے کیونکہ میں اس وقت ملک سے باہر جا رہا ہوں لیکن یہ مت سمجھیے گا کہ ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں۔ جس قدر جلد ممکن ہو سکا

'میں واپس آؤں گا اور آپ کو کسی ایسی ہستی کی لاش کا تحفہ پیش کروں گا جو آپ کو بہت ہی پیاری ہوگی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ دل چھوٹا مت کیجئے گا۔

میں سمجھتا تھا کہ ہماری لائن میں کافی نڈر اور مرد میدان قسم کے مجرم پائے جاتے ہیں۔ سینہ تان کر آمنے سامنے کھڑے ہونے والے۔ اپنے جھگڑے خود نمٹانے والے... لیکن جس انداز سے تم نے مخبری کرکے اور دوسرے چکر چلا کے اشرف خان اور اس کا ساتھ دینے والوں کو کچلنے کی کوشش کی اس سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ ہماری لائن میں تم جیسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جن کا شمار مردوں میں کیا جاسکتا ہے نہ عورتوں میں۔ اگر تم میں غیرت کی کوئی رمق باقی ہوگی تو یہ رقعہ لے کر دوڑتے ہوئے پولیس کے پاس نہیں جاؤ گے اور اگر تمہارے رگ پٹھوں میں ذرا بھی جان ہوگی تو اپنی جنگ خود ہی لڑنے کی کوشش کرو گے۔ بہرحال تم خواہ کوئی بھی طریقہ اختیار کرو' میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے تم سے جو وعدہ کیا ہے وہ ضرور پورا کروں گا۔ منتظر رہنا... اور بعد میں شکوہ نہ کرنا کہ خبردار نہیں کیا تھا۔ امید ہے تم سمجھ چکے ہوگے کہ میں کون ہوں۔ خدا حافظ۔

خط لکھ کر میں نے تنقیدی زاویہ نظر سے اسے پڑھا۔ ٹھیک ہی لکھا گیا تھا۔ میرے مفہوم کا اب اگر استاد لبھو پر وہی اثر ہوتا جو میں چاہتا تھا تب بات تھی۔

وہ ورق میں نے رائٹنگ پیڈ سے علیحدہ کرکے غلام احمد کے گریبان میں پھنسایا اور کمرے سے نکل آیا۔ دروازہ میں نے نہایت اطمینان سے بند کرنے کے بعد نیچے آکر گلی میں نکلنے سے پہلے اطمینان کرلیا کہ کوئی باہر موجود تو نہیں۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں اس گلی سے نکلا تو میرا ارادہ ٹیلی گراف آفس جانے کا تھا جہاں پبلک ٹیلی فون بوتھ بھی موجود تھے۔ میں شہر کے ایک بازار سے گزر رہا تھا کہ میری نظر نوشے پنواڑی پر پڑی۔ وہ اپنی پان سگریٹ کی دکان کھول کر اسے جھاڑنے پونچھنے کے بعد بیٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔

میں نے گاڑی اس کی دکان سے کافی آگے لے جا کر ایک جگہ روک دی جہاں اس کی نظر نہ پڑسکے۔ پھر میں پیدل واپس آیا اور تاریک شیشوں کی عینک اتارنے کے بعد میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ سگریٹوں کا ایک ریک درست کرتے کرتے وہ چونک کر مڑا اور مجھے دیکھ کر اس نے یوں باچھیں پھیلائیں جیسے کوئی بچھڑا ہوا دوست مل گیا ہو۔ وہ تمام لوگ۔ جو اس سے کبھی کوئی چیز ادھار نہیں لیتے تھے ان سے وہ اسی طرح ملتا تھا۔

"کہاں تھے میری جان؟" مصافحے اور معانقے سے فارغ ہوکر اور ایک ہی سانس میں کئی رسمی جملے بولنے کے بعد اس نے گدی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔"تمہارے تو دو خط بھی آئے پڑے ہیں۔"

میں یہی جاننے کے لیے نوشے کے پاس رکا تھا۔ خط راشد کے سوا کسی کے نہیں ہوسکتے تھے۔ خط و کتابت کے لیے میں نے اسی کو نوشے کا ایڈریس دیا تھا اور نوشے پر نظر پڑتے ہی مجھے یہ بات یاد آگئی تھی ورنہ میں اب تک راشد کو بھولا ہوا تھا۔

نوشے نے دو خوبصورت لفافے نکال کر مجھے تھمادیے جن پر کئی جگہ اس کے کتھئی فنگر پرنٹس' نہایت عمدگی سے ثبت ہوچکے تھے۔ میں نے نوشے کا شکریہ ادا کیا اور جذبہ ممنونیت سے ہی مغلوب ہوکر نہ صرف ایک صحت مند قسم کا میٹھا پان بنوا کر کھا لیا بلکہ سگریٹ کا ایک پیکٹ بھی خرید لیا۔ کافی عرصے بعد آج دھوئیں کے غرارے کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔

نوشے کو میرے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا قطعاً علم نہیں تھا۔ وہ بڑے جوش و خروش سے میری اور اشرف خان کی خیریت دریافت کر رہا تھا۔ وہ وقت یاد کرکے میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی جب میں اور اشرف خان اکٹھے اس دکان پر آیا کرتے تھے۔

میں نے گپ شپ کے انداز میں نوشے کو بتایا کہ اشرف خان ملک سے باہر چلا گیا ہے اور اب میں بھی جارہا ہوں' فی الحال یہ طے نہیں ہوا کہ مستقل قیام کہاں ہوگا۔

"خیر جب بھی کہیں سیٹل ہوجاؤ' خط ضرور لکھنا افضل جانی۔" اس نے قدرے ملتجیانہ سے انداز میں تاکید کی۔ شاید اس نے دل ہی دل میں ان چیزوں کی فہرست بھی بنانی شروع کردی تھی جو وہ مجھ سے منگوانا چاہتا تھا۔

میں نے دونوں خطوط جیب میں ٹھونسے اور اسے خدا حافظ کہہ کر آگے چل دیا۔ عینک اور ٹوپی میں نے دوبارہ پہن لی۔ بازار میں چہل پہل شروع ہوچکی تھی۔ بیشتر دکانیں کھل چکی تھیں۔

ٹیلی گراف آفس پہنچ کر میں نے ایک پبلک بوتھ میں کھڑے ہوکر وہ نمبر ڈائل کیا جو غلام احمد نے مجھے بتایا تھا۔ دوسری گھنٹی پر ہی ریسیور اٹھالیا گیا۔ "جی فرمایئے؟" دوسری طرف سے پوچھا گیا۔ آواز نسوانی لیکن کھدری تھی۔ غلام احمد نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔

"استاد لبھو جیسے ہی واپس آئے اسے ایک پیغام دے دینا:..." میں نے آواز بدلنے اور لہجہ حتی الامکان سپاٹ رکھنے کی

ٹش کرتے ہوئے کہا۔

"کون بول رہا ہے؟" دوسری طرف سے فوراً محتاط لہجے میں چھا گیا۔ وہ جو کوئی بھی تھی یقیناً چونک اٹھی تھی

"استاد لبھو کو جب تم میرا پیغام دو گی تو وہ خود ہی سمجھ جائے ا کہ کون بول رہا تھا۔" میں نے سرد مہری سے کہا۔"اس سے کہنا لہ غلام احمد کے مکان میں اس کے لیے ایک تحفہ موجود ہے۔ س قدر جلد ممکن ہو اسے وصول کرلے۔ اس سے پہلے کہ ولیس اس تک پہنچے' استاد لبھو کم از کم ایک نظر اسے دیکھ لے تو بہتر ہوگا۔ خدا حافظ۔" میں نے فون بند کردیا۔

مجھے جہاں بھی رکنا ہوتا تھا' گاڑی احتیاطاً اس جگہ سے کافی در کھڑی کرتا تھا۔ پیدل میں گاڑی تک پہنچا اور مزید ایک لمحہ ں ضائع کیے بغیر ہائی وے کی طرف چل دیا۔

میں لاہور واپس پہنچا تو دن کے دو بج رہے تھے۔ مجھے اپنے ازے سے زیادہ دیر ہوگئی تھی اور میں خاصا تھک چکا تھا۔ گھر ہنچا تو فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف ے شرفو کی آواز سنائی دی۔

"شکر ہے خدا کا..." وہ طویل سانس لے کر بولا۔"کہاں تھے ھائی تم؟ میں تو سمجھا تھا کہ شاید تمہارا ارادہ بدل گیا اور تم واپس لے گئے یا کسی اور طرف کو نکل گئے۔"

"اپنا اب تک کا ریکارڈ تو یہی ہے برادر محترم شرفو صاحب..!!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔"کہ جس مقام کو خیرباد کہہ یا اس کی طرف لوٹ کر نہیں گئے۔ مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا تھا۔ فرار ہوتے وقت میں اور اشرف خان ایک جگہ کچھ سراغ چھوڑ آئے تھے۔ میں نے بہتر سمجھا کہ نئی زندگی شروع رنے سے پہلے انہیں بھی مٹا آؤں۔"

"یہ تو بہت اچھا کیا تم نے۔" اس نے طمانیت سے کہا۔ پھر یک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔"شام کا کیا پروگرام ہے؟ مجھے ایک صاحب سے ملنے جانا ہے جن سے شاید مستقبل یں بھی تمہیں اکثر واسطہ پڑے۔ میں نے سوچا ہے' تمہیں بھی ساتھ لیتا چلوں۔ واپسی پر کچھ دیر کے لیے ایک جگہ رکیں گے۔ وہ ایک آسیب زدہ سی کوٹھی ہے مگر وہاں چند بہت ہی حسین قسم کی بدروحیں رہتی ہیں۔ ہم جیسے مہمانوں کی بہت قدر کرتی ہیں بے چاری۔ اگر تم مناسب سمجھو تو انہیں شرف میزبانی بخش دیا جائے۔"

"فی الحال تو میں بہت تھکا ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔"ریسیور مجھے اتنا بھاری معلوم ہو رہا ہے جیسے ورزش کے لیے ڈمبل اٹھایا ہوا ہے۔ میں سونے لگا ہوں۔ تم روانہ ہونے سے آدھا گھنٹا پہلے مجھے فون کرلینا۔ اگر میں ہوش و حواس میں ہوا تو تیار ہوکر بیٹھ جاؤں گا۔"

"بالکل ٹھیک۔" اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ بستر پر گرتے وقت میں نے اس بات پر خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے دیگر مسائل حل ہونے کے ساتھ ساتھ شرفو جیسے آدمی سے بھی میری ملاقات ہوگئی تھی اور وہ میری کسی خاص کوشش کے بغیر میرا دوست بھی بن گیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے ساتھ رہ کر زندگی کافی دلچسپ اور رنگین محسوس ہونے لگتی ہے۔

فون کی گھنٹی نے مجھے گہری نیند سے جگادیا۔ دوسری طرف شرفو تھا۔ پوچھ رہا تھا کہ میں اس کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوسکتا ہوں یا نہیں۔ ویسے تو میرا اس وقت بستر سے ہلنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا اسے یاد کرکے میں فوراً چاق و چوبند ہوگیا۔

"ٹھیک ہے۔ تم آدھے گھنٹے بعد آجاؤ۔ میں تیار ملوں گا۔" میں نے کہا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ پہنچ گیا اور ہم اس کی کار میں بیٹھ کر مزنگ روڈ پر ایک وکیل کے دفتر میں پہنچے جہاں شرفو کے مذاکرات تقریباً پون گھنٹے تک جاری رہے۔ اس دوران معمولی سی گرما گرمی بھی ہوئی۔ کچھ فائلیں بھی اٹھا اٹھا کر کبھی پٹخی گئیں اور کبھی کھول کر دیکھی گئیں۔ معاملہ میری سمجھ میں آر.. تھا اور اس قابل تھا کہ اس میں دلچسپی لی جاسکے اور چند عجیب و غ..ب قانونی موشگافیوں کو سمجھا جاسکے لیکن اس وقت میں اس قسم کی چیزوں میں دلچسپی لینے کے لیے تیار نہیں تھا تاہم کسی نہ کسی طرح اپنی جماہیوں کو روکے ہوئے تھا۔

خدا خدا کرکے یہ بحث تمام ہوئی۔ شرفو نے نوٹوں کی ایک گڈی وکیل صاحب کے حوالے کی اور ہم آراستہ و پیراستہ ایئرکنڈیشنڈ دفتر سے باہر آگئے۔

"یار..." میں نے سیڑھیاں اترتے وقت تحسین آمیز لہجے میں کہا۔"تم تو ہر معاملے میں بہت ہی منجھے ہوئے آدمی لگتے ہو۔ یقین نہیں آتا کہ دیہات سے آیا ہوا کوئی شخص نو سال میں ایسی شاطر چیز بن سکتا ہے۔"

وقت کا صحیح استعمال کیا جائے تو نو سال بہت طویل مدت ہوتی ہے۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔"اور بہت کم لوگوں کو یہ اندازا ہوتا ہے کہ ہم دیہاتی زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ ہم تن آسان نہیں ہوتے اور جدھر کا رخ بھی کرتے ہیں برمے کی طرح سوراخ کرکے گھستے چلے جاتے ہیں۔ سخت جان ہوتے ہیں۔ اپنی جگہ خود بنالیتے ہیں۔ اگر تم کبھی سراغ لگانے کی کوشش کرو تو تمہیں اندازہ ہوگا کہ اچھائی اور برائی' جائز اور

ناجائز دونوں سطحوں پر جو لوگ بہت اوپر گئے ہیں وہ بنیادی طور پر دیہاتی تھے ..."

پھر اس نے مجھے دیہاتی اور شہری کی نفسیات اور دونوں کے پس منظر کا فرق سمجھایا اور اپنے لیکچر کے اختتام پر کہا "میں چاہتا ہوں تم' اس سے بھی کم وقت میں منجھ جاؤ۔ تمہارے اندر لگن مجھ سے بھی زیادہ ہے اور تمہیں مجھ سے کہیں کم عمری میں مضبوط سہارے میسر آگئے ہیں۔ تمہاری عمر میں' میں سو ڈیڑھ سو کی نوکری ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ دفتروں سے مجھے دھکے دے کر نکالا جاتا تھا۔ میں چاہتا ہوں کہ تم کم سے کم وقت ضائع کرو اور میرے تجربات سے استفادہ کرو۔ مجھے تم ایک چھوٹے بھائی کی طرح اچھے لگنے لگے ہو۔ گو کہ میں اپنے چھوٹے بھائی کو کبھی اس لائن میں ڈالنا پسند نہیں کروں گا جس میں ہم پڑ گئے ہیں لیکن اب پڑ ہی گئے ہیں تو کم از کم تم تو زندگی سے اپنے شایان شان خراج وصول کرلو۔"

باتوں کے دوران ہم گلشن آباد پہنچ چکے تھے۔ شرفو نے ایک چھوٹی سی کوٹھی کے پورچ میں گاڑی روکی۔ اس کوٹھی پر غالباً کئی برس پہلے پیلا پینٹ کیا گیا تھا جو اب جگہ جگہ سے اکھڑ رہا تھا اور ملیالا سا ہو چکا تھا۔ مگر اب بھی آنکھوں کو چبھتا تھا۔ کوٹھی کسی کی رہائش گاہ کے بجائے پی ڈبلیو ڈی کا دفتر معلوم ہوتی تھی۔

شرفو نے کال بیل بجائی۔ سانولے سے ایک لڑکے نے دروازہ اس حد تک کھولا کہ ہماری شکلیں دیکھ سکے۔ دروازے میں زنجیر لگی ہوئی تھی۔

"ارے شرفو دادا ہیں۔" وہ مسکرایا۔ وہ یقیناً بنگالی تھا اور خانساماں معلوم ہوتا تھا۔ اس کے لباس پر ایپرن بندھا ہوا تھا۔

اس نے دروازے کی زنجیر ہٹادی اور ہم اندر چلے گئے۔

بائیں ہاتھ پر ایک معقول قسم کا ڈرائنگ روم تھا۔ شرفو بےتکلفی سے ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا کیا تقریباً لیٹ ہی گیا خانساماں اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

"میں میڈم کو جاکر بولتا ہوں۔" تھوڑی دیر بعد فربہ اندام سی ایک ادھیڑ عمر عورت مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ خوشبو کا ایک جھونکا سا اس کے ہمقدم تھا۔ اس کا لباس' میک اپ سب کچھ بڑے سلیقے کا تھا اور وہ ہر اعتبار سے ایک معزز عورت معلوم ہوتی تھی لیکن جب وہ بولی تو اس کا لہجہ مجھے انہی خاص عورتوں والا محسوس ہوا جنہیں اب میں بھی کافی حد تک پہچاننے لگا تھا۔

"کہاں تھے شرفو دادا اتنے دنوں سے؟" میڈم اپنے لہجے میں اپنائیت سمونے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "نصیب دشمناں طبیعت تو ٹھیک تھی؟"

"طبیعت تو اپنی ٹھیک ہی رہتی ہے۔" شرفو انگڑائی لیتے ہوئے بولا "مگر تمہیں معلوم ہے اپنی علوت کا۔ اکیلے تو کہیں تفریح پر جانے کو دل ہی نہیں چاہتا اور کافی دنوں سے کوئی معقول کمپنی میسر ہی نہیں تھی۔ بس اب زندہ دل نوجوان سے دوستی استوار ہوئی ہے تو شاید کبھی کبھار تمہارے در دولت پر حاضری دیتے رہیں۔"

"زہے نصیب۔ زہے نصیب۔" میڈم نے پہلو بدلتے ہوئے قدرے بے دھیانی سے کہا "ویسے آج آئے ہو تو کچھ زیادہ ہی جلدی آگئے ہو۔ لڑکیاں ابھی تیار ہو رہی ہیں۔ میک اپ کر رہی ہیں۔"

"ہمیں گھر جانے کی ایسی کوئی جلدی نہیں۔" شرفو بولا "تم اگر مصروف ہو تو مصروف ہی رہو۔ ہمارے لیے پینے کو کچھ بھجوا دو۔"

"میں ابھی بھجواتی ہوں۔" میڈم اٹھتے ہوئے ممونیت آمیز انداز میں مسکرائی۔ وہ یقیناً اس وقت کسی چکر میں الجھی ہوئی تھی۔ مروتاً ہمارے پاس بیٹھی تھی۔ وہ چلی گئی اور کچھ دیر بعد ایک اور نوکر جو اپنی حرکات و سکنات سے گونگا بہرا معلوم ہوتا تھا' پینے پلانے کا سامان رکھ گیا۔

ہم کچھ ترنگ میں آئے تو میں نے شرفو سے کہا "تم اپنا حلیہ ایسا کیوں رکھتے ہو؟ قاسم خان کے گینگ میں تم جتنی اہمیت کے حامل ہو... اور پھر عمر کے جس دور میں ہو... اس میں یہ جینز جیکٹ۔ یہ گلے میں بندھا ہوا رومال اور ہاتھ میں کڑا وغیرہ کچھ جچتا نہیں۔ تمہیں معززانہ حلیے میں رہنا چاہیے۔ تم ایک مختصر لیکن طاقتور تنظیم کے ایگزیکٹو ہو۔"

وہ ہنسنے لگا اور کافی دیر تک ہنستا ہی رہا۔ بالآخر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "اس قسم کی چیزیں مجھے اب احساس کمتری میں مبتلا نہیں کرتیں۔ میری ذات سے اس طرح کے نفسیاتی الجھاوے تو ختم ہوگئے ہیں۔ میں اپنا حلیہ جان بوجھ کر ایسا رکھتا ہوں۔ میں خود چاہتا ہوں کہ میری شخصیت کا تاثر کچھ ایسا ہی بنے کہ میں وہ گاؤدی ہوں جسے پکی عمر میں چار پیسے میسر آئے ہیں تو فیشن ایبل شہری نوجوان بننے کے شوق میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ اس طرح میرے بارے میں لوگ عموماً غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں۔ انہیں تبھی پتا چلتا ہے جب میں ان کی گردن ناپتا ہوں۔"

"سچی بات تو یہ ہے کہ پہلی بار دیکھ کر میں بھی تمہیں ذرا گاؤدی ہی سمجھا تھا۔" میں نے قدرے کھسیانی ہنسی کے ساتھ اعتراف کیا۔ "شکر ہے اس تاثر کے تحت میں نے کوئی حماقت نہیں کی ورنہ شاید آج ہم دوست نہ ہوتے۔"

"شاید۔" اس نے مبہم سے لہجے میں کہا اور پھر قدرے تکتے ہوئے بولا "اور ہاں یہاں قاسم خان کا نام لینے اور یہ گینگ وغیرہ جیسے الفاظ استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں میں ٹھیکیدار ہوں۔ مختلف فرموں کو بلڈنگ میٹریل اور لیبر سپلائی کرتا ہوں۔ سمجھے؟" وہ مجھے آنکھ مار کر مسکرایا "اور خود اپنے بارے میں بھی محتاط رہا کرو۔ تخلیئے میں بھی۔"

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں سر ہلایا۔ کچھ دیر بعد چار لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ان کے ساتھ خوشبوؤں کا ایک ریلا بھی کمرے میں در آیا۔ میری نظر میں تو وہ چاروں ہی حسین تھیں۔ ان میں صرف ایک ہی کمی تھی کہ بنی سنوری ہونے کے باوجود ان کے چہروں پر زندگی کی چمک نہیں تھی۔

میں نے ان میں سے کم عمر ترین کو اپنی ساتھی کے طور پر منتخب کیا اور ایک دوسرے کمرے میں پہنچ کر تخلیئے میسر آنے کے بعد ایک مرحلے پر بڑی ترنگ میں پوچھا "تم اس زندگی میں کیسے آگئیں؟"

"اف... خدا کی پناہ" اس نے بیزاری سے سر تھام لیا "کیا تم مردوں کے پاس پوچھنے کے لیے کوئی اور سوال نہیں ہوتا؟ وہ زمانہ بیت گیا جب میں جگر تھام کے اس سوال کے جواب میں اپنی دکھ بھری کہانی سنایا کرتی تھی۔ تم مرد لوگ یہاں اچھا وقت گزارنے آتے ہو۔ تمہیں چاہیے کہ اچھا وقت گزارو اور دفع ہوجاؤ۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ ہم جیسی لڑکیوں کی کہانی کیا ہوتی ہے یا کیا ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود شاید تم لوگ صرف چسکے لینے کے لیے پوچھتے ہو۔ ورنہ اس تردد کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ وہ جو کتابوں میں لکھا ہوتا ہے کہ ہر بڑے آدمی کی کامیابی کے پیچھے ایک عورت کا ہاتھ ہوتا ہے یا یہ کہ عورت ہی کسی شخص کو بڑا آدمی بناتی ہے۔ تو میرے خیال میں اس کی ہم وزن ایک اور بات بھی کتابوں میں لکھی جانی چاہیے اور وہ یہ کہ ہر عورت کی ذلتوں کے پیچھے ایک مرد کا ہاتھ ہوتا ہے۔ بس اتنی سی کہانی ہے۔ اسے بار بار دہرانے سے کیا فائدہ؟"

میں اگر اس وقت آئینہ دیکھتا تو شاید اپنی آنکھیں مجھے ٹینس کی گیند کی طرح گول نظر آتیں۔ میں نے بجا طور پر حیرت سے کہا "اس کم عمری میں اتنی تلخی؟"

"کوٹھی خانے میں گزارے ہوئے تین سال کسی شریفانہ گھر پر گزارے ہوئے تیس برس پر بھاری اور ان سے کہیں زیادہ کٹھن ہوتے ہیں۔" وہ پہلے سے زیادہ تلخی سے بولی۔

اس کا موڈ بگاڑ کر اپنی شام خراب کرنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سردست میں چونکہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا' سوائے کھسیانا ہونے کے۔ چنانچہ میں نے اس کے مشورے پر عمل کرنا ہی بہتر سمجھا کہ اچھا وقت گزارو اور دفع ہوجاؤ۔

رات کے تقریباً بارہ بجے میں اور شرفو وہاں سے دفع ہوگئے۔ ہم بڑی ترنگ میں تھے۔ مزنگ چونگی پر کڑاہی گوشت کی ایک دکان پر ہم نے ڈٹ کر کھانا کھایا۔ اس کے بعد شرفو نے مجھے گھر چھوڑا اور چلتے چلتے پوچھا "صبح کا کیا پروگرام ہے؟ میں تو کل دن میں بہت مصروف رہوں گا۔"

"میں بھی اب مصروف ہوجانا چاہتا ہوں۔ چھوٹی موٹی تفریح تو ساتھ ساتھ چلتی رہے گی۔" میں نے کہا "قاسم خان مجھے جو ٹریننگ دلوانا چاہتا ہے میرا خیال ہے وہ میں صبح ہی سے شروع کردوں۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" شرفو نے کندھے اچکائے اور رخصت ہوگیا۔

دوسری صبح مجھے قاسم خان کو فون کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں سو کر اٹھا ہی تھا کہ شیطان سی شکل والا ایک بوڑھا میرے ہاں آن پہنچا۔ وہ سفید شرٹ اور کینوس کے سفید ہی جوتے پہنے ہوئے تھا۔ جادوگروں جیسی اس کی نکیلی سی داڑھی بھی سفید تھی اور جانے کیوں مصنوعی مصنوعی نظر آرہی تھی۔

"میرے بچے! میں وہ شخص ہوں جس نے بیسیوں پتھروں کو تراش کر ہیرا بنایا ہے۔" اس نے گیٹ سے میرے ساتھ چل کر کمرے میں پہنچ کر کہا "تمہیں بھی ہیرا بنانے کی ذمے داری قاسم خان نے مجھے سونپی ہے۔ چلو... میرے ساتھ چلو۔" اس کی آواز کسی حد تک طوطے جیسی تھی۔

میرے ذہن سے ابھی نیند کا خمار صحیح طور پر نہیں اترا تھا۔ میں نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا "مجھے ہیرا بننے میں کوئی اعتراض نہیں چچا میاں! مگر ابھی تو میں نے غسل ... ناشتا کچھ بھی نہیں کیا۔"

"ناشتے کی ضرورت نہیں۔" بڑے میاں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "بس اگر ٹھنڈا یخ پانی دستیاب ہے تو اس سے نہالو تاکہ تمہارا ذہن پوری طرح بیدار ہوجائے۔ ناشتا تم میرے ساتھ کرنا۔ ایسا لاجواب ناشتا کراؤں گا کہ اس کے بعد روزانہ ناشتا کرنے میرے پاس دوڑے آؤ گے۔ تمہیں میرے ساتھ میرے گھر چلنا ہوگا۔ میرا تربیت کا طریقہ بڑا سائنٹیفک قسم کا ہے۔ تمہیں اس طرح سنجیدگی سے کچھ دن میرے ساتھ گزارنے ہوں گے جیسے کوئی کلاس اٹینڈ کررہے ہو۔ کچھ پریکٹیکلز... بھی ہوں گے۔ تمہاری ذہانت اور بہادری کے امتحان بھی ہوں گے۔ بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوں

گی۔ اگر تم میرے مطلوبہ معیار کو پہنچ گئے تو تم قاسم خان کے خاص الخاص آدمی بن جاؤ گے۔"

میں تیار ہو کر اس کے ساتھ نکلا اور اس کے بعد تقریباً بیس دن کے دوران مجھے دو یا شاید تین مرتبہ ہی گھر آنے کا موقع ملا۔ میری ٹریننگ کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گئی۔

اس دوران مجھے دو پڑوسی ملکوں کی سرحدوں پر وہ محفوظ مقامات بھی دکھائے گئے جن سے قاسم خان کا مال آتا اور جاتا تھا۔ آزمائشی طور پر ایک کھیپ میری نگرانی میں بھی منگوائی گئی۔ میں اور اشرف خان تو جان کی بازی لگا کر کام کرتے رہے تھے۔ ہماری کھیپ بہت چھوٹی ہوتی تھی اور خطرات بہت زیادہ۔ اس کے مقابلے میں مجھے تو قاسم خان کا کام کم خطرناک لگا تھا حالانکہ اس میں مال کی نقل و حرکت بڑے پیمانے پر تھی۔

مجھے کام پہلے کی نسبت آسان لگ رہا تھا اور قاسم خان میری کارکردگی پر پھولا نہیں سما رہا تھا۔ وہ بزرگوار جنہوں نے کچھ دن کے لیے میرے کوچ کے فرائض انجام دیئے تھے' انہیں صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں کہاں دھکے کھاتا رہا ہوں اور کیسے کیسے حالات میں اپنی بقا کی جنگ لڑتا رہا ہوں اس لیے وہ میری تمام تر کارکردگی کا سہرا اپنے ہی سر باندھتے رہتے تھے کہ یہ سب کچھ ان کی تربیت کا نتیجہ تھا اور یہ کہ میں بے حد ہونہار شاگرد تھا' انہوں نے اپنی زندگی میں کسی شاگرد کو اتنی جلدی ٹرینڈ ہوتے نہیں دیکھا تھا۔

اس دوران میرا پاسپورٹ بھی بنوا دیا گیا تھا۔ قاسم خان کا ارادہ تھا کہ سیدھے راستوں سے بھی مجھے دو تین پارٹیوں کے ساتھ چند ممالک کے چکر لگوائے جائیں گے۔ ان اطراف میں صرف یک طرفہ پھیرا ہوتا تھا۔ کم حجم کی منشیات لے جائی جاتی تھیں۔ قاسم خان کا خیال تھا کہ اگر میں نے اس سائڈ پر بھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا تو اس کا بڑا مسئلہ حل ہو جائے گا لیکن یہ نوبت آنے کی اسے کم ہی امید تھی۔ خفیہ سرحدی راستوں سے ہی مال لانے لے جانے کا کام اتنا زیادہ تھا کہ کسی اور طرف توجہ دینا میرے لیے مشکل تھا۔

قاسم خان کے پاس قابلِ اعتبار آدمیوں کی کمی تھی اس کے باوجود وہ مجھ پر زیادہ بوجھ بھی نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ کام کے دوران مجھے معقول وقفوں کے لیے عیش و آرام بھی میسر رہنا چاہئے ورنہ میرے اعصابی طور پر کمزور پڑنے کا خطرہ بھی پیدا ہو سکتا ہے۔

قاسم خان کا امپورٹ ایکسپورٹ کا چھوٹا سا جائز کاروبار بھی تھا۔ وہ اپنے اسی دفتر میں بیٹھتا تھا جہاں سے یہ بزنس ڈیل کیا جاتا تھا۔ وہ کھیلوں کا سامان باہر بھیجتا تھا اور اس کا دفتر نہایت شاندار تھا۔ وال ٹو وال کارپٹ' چمکتا ہوا فرنیچر' ایئر کنڈیشنڈ کمرے' نہایت چلبلی قسم کی سیکریٹری وغیرہ۔ غرض یہ کہ ایک معقول دفتر کے تمام ہی لوازمات موجود تھے گو کہ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس دفتر سے اتنا بزنس ہوتا تھا جتنی اس کی شان شوکت تھی۔

اس دفتر کے ایک کمرے میں اپنی کرسی کے عقب میں ایک دیوار گیر شوکیش میں ایک آدھ ریکٹ' ایک گیند اور کھیلوں کی دو تین اور چیزیں سجائے قاسم خان بیٹھا ہوتا تھا۔ میں صرف ایک مرتبہ اس سے ملنے اس دفتر میں جا پہنچا تھا اور وہ بھی بلا اطلاع۔ تبھی اس نے نہایت ملائمت سے مجھے سمجھایا تھا کہ اپنے کالے دھندے سے متعلق کسی بھی شخص سے وہ اس دفتر میں قطعاً ملاقات نہیں کرتا حتیٰ کہ ان لوگوں میں سے کسی کو اس دفتر کے نمبر پر فون کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اگر کوئی ایمرجنسی ہوتی بھی تو فون پر اس سے صرف اتنا کہا جاتا تھا کہ وہ دو نمبر پر پہنچ جائے اور وہ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر آ جاتا تھا۔ کالے دھندے سے متعلق تمام معاملات طے کرنے کا وقت رات نو بجے کے بعد شروع ہوتا تھا اور اس سلسلے میں تمام ملاقاتیں اس کے گھر پر اسٹڈی میں ہوتی تھیں اور ان تمام ملاقاتوں کے دوران اس کی بیوی موجود رہتی تھی۔ معلوم نہیں وہ خاموش طبع اور گھریلو قسم کی خاتون اتنی تکلیف کیوں اٹھاتی تھی یا شاید قاسم خان کو ہی اسے ساتھ بٹھائے رکھنے کا شوق تھا۔ ہر قسم کی میٹنگ یا کارروائی کے دوران وہ خاموش اور لاتعلق سی بیٹھی رہتی تھی۔

تقریباً بیس دن کے تربیتی کورس کے بعد مجھے چند دن آرام کرنے کا موقع ملا۔ شرفو کی ہمراہی میں دو تین شامیں حسین انداز میں بھی گزریں۔ گھر میں نوکر آ گیا تھا اس لیے اب گھر میں بھی کچھ دل لگنے لگا تھا۔

ایک رات میں نہ جانے کیا تلاش کر رہا تھا کہ میری نظر دراز میں پڑے ہوئے دو۔ خطوط پر پڑی۔ یہ راشد کے خطوط تھے جنہیں میں نے کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے انہیں کھول کر پڑھا تو اپنے آپ پر بڑی شرم آئی کہ اس بیچارے نے اتنے خلوص سے اتنے طویل طویل دو خطوط لکھے تھے اور میں نے آج تک انہیں کھول کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

خطوں میں ویسے تو کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن ہر جملہ راشد کے خلوص اور اپنائیت کا مظہر تھا۔ اس نے یہی لکھا تھا کہ وہ خیر و عافیت سے اپنے گھر پہنچا تو اس کے والدین کی خوشی کے مارے کیا حالت ہوئی اور یہ کہ میرے بارے میں جاننے کے بعد اس کے والدین مجھ سے ملنے کے کس قدر مشتاق تھے۔

اس نے دونوں خطوں میں مجھے کراچی آنے کی دعوت دی تھی اور کئی بار اس کا اعادہ کیا تھا۔

پہلی بار کسی نے اس قدر معصومانہ خلوص کے ساتھ مجھے خط لکھا تھا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس وقت میں فارغ تھا اور مجھے کوئی مصروفیت نہیں سوجھ رہی تھی۔ میں اسی وقت اسے جواب لکھنے بیٹھ گیا۔

میں نے تاخیر سے خط لکھنے پر معذرت کی اور لکھا کہ میں نے لاہور منتقل ہو کر اپنا ذاتی کاروبار شروع کر دیا ہے۔ انہی مصروفیات کی وجہ سے میں خط نہیں لکھ سکا تھا اور یہ کہ آئندہ وہ مجھے لاہور ہی کے ایڈریس پر خط لکھا کرے۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ جیسے ہی موقع ملا میں اس کے ہاں ضرور آؤں گا' مجھے خود بھی اس کے اہلِ خانہ سے ملنے کا شوق ہے۔ حالانکہ ایسا قطعاً نہیں تھا۔ بہرحال اس قدر خلوص کے جواب میں مجھے کچھ تو لکھنا تھا۔

اس خط کا جواب آنے تک میں کافی مصروف ہو گیا۔ سرحد پار کے دو پھیرے لگے۔ بڑی مصروف راتیں گزریں اور دونوں ہی پھیرے نہایت پر خطر ثابت ہوئے۔ ایک پھیرے میں کسی پارٹی نے ہمارا مال ہائی جیک کرنے کی کوشش کی اور دوسرے پھیرے میں کسی کی مخبری کی باعث رینجرز کے ہاتھوں میں اور میرے دو ساتھی مرتے مرتے بچے۔ بہرحال دونوں چکروں میں میں مال سمیت عافیت سے نکل آیا۔

قاسم خان اب تو میری کارکردگی سے بہت ہی خوش تھا۔ میرے کمیشن کی رقم میرے حوالے کرتے ہوئے اس نے کہا۔ "آج رات تم میرے اکاؤنٹنٹ سے اس کے گھر پر مل لینا۔ وہ تمہیں سمجھا دے گا کہ تم کس طریقے سے اکاؤنٹ کھلواؤ گے اور کتنی رقم کو کس طریقے سے استعمال کرو گے اور باقی رقم کہاں رکھو گے۔ ظاہر ہے یہ رقم اتنی ہی تو نہیں رہے گی۔ بڑھتی جائے گی اور رقم بڑھنے کے ساتھ ساتھ مسائل بھی بڑھیں گے۔ بہتر ہے کہ شروع سے ہی طریقے سے چلو۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ اس کے بعد چند دن فرصت رہی۔ اس دوران میں نے راشد کے تیسرے خط کا بھی مختصر سا جواب تحریر کر دیا۔

ہماری اگلی کھیپ ملک سے باہر جانی تھی۔ ہم اس کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ قاسم خان کو اطلاع ملی کہ گورنر کی ہدایت پر اسمگلنگ کے خلاف ایک خصوصی مہم شروع کی جا رہی ہے جس میں بلا امتیاز ہر اسمگلر اور اس کی پشت پناہی کرنے والوں کو رگڑ دیا جائے گا۔

قاسم خان نے اپنی تمام سرگرمیاں غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیں اور اپنے کارندوں کو ہدایت کر دی کہ وہ روز مرہ زندگی میں بھی بیحد احتیاط برتیں اور نہایت بے ضرر اور شریف شہری بن کر شب و روز بسر کریں۔ اس مقصد کے لیے اس کے خیال میں یہ بھی ضروری تھا کہ ہم لوگ بازارِ حسن اور عشرت کدوں وغیرہ کا رخ نہ کریں۔

زندگی میں عجیب بے کیفی آ گئی۔ میرا بیشتر وقت گھر پر پڑے جمائیاں لینے میں گزرتا۔ اسی دوران راشد کا ایک اور خط آ گیا۔ اپنے مخصوص مخلصانہ انداز میں اس نے ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ایک بار پھر اپنی دعوت کا اعادہ کیا تھا کہ زندگی کی مصروفیات تو چلتی ہی رہتی ہیں' بہتر ہو گا کہ میں خود وقت نکال کر کراچی کا چکر لگا لوں ورنہ ویسے تو شاید کبھی فرصت نہ ملے۔

اس رات میں نے سنجیدگی سے سوچا کہ واقعی میں فرصت کے ان دنوں میں کراچی کا چکر کیوں نہیں لگا آتا؟ کراچی دیکھنے کا مجھے ویسے بھی اشتیاق تھا جو مصروفیات میں دب کر رہ گیا تھا اور اب تو مجھے راشد کے والدین سے بھی ملنے کا کچھ کچھ اشتیاق ہو چلا تھا۔ راشد کے ہر خط میں ان کی طرف سے میرے لیے دعائیں لکھی ہوتی تھیں۔

دوسری صبح میں نے شرفو سے کہہ کر جہاز میں کراچی کے لیے ریزرویشن کرا لی۔ شام کو میں نے فون پر قاسم خان کو اطلاع دی کہ میں چند روز کے لیے کراچی جا رہا ہوں تو اس نے کراچی میں دو تین کام میرے ذمے لگا دیئے۔ ان کی تفصیل سمجھانے کے بعد وہ بولا "ان کاموں کے بارے میں مجھے گھر کے نمبر پر فون کر کے رپورٹ ضرور دے دینا اور اپنا وہاں کا کوئی رابطے کا نمبر بھی بتا دینا تاکہ اگر اچانک یہاں تمہاری ضرورت پڑ جائے تو تمہیں بلایا جا سکے۔"

"بہت بہتر۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی روز میں نے راشد کو ٹیلی گرام بھی دے دیا تھا کہ میں فلاں دن ڈھائی بجے والی پرواز سے پہنچ رہا ہوں۔ یہ ٹیلی گرام دیتے وقت میں نے اپنے آپ کو بے حد اہم ہستی محسوس کیا۔ جناب محمد افضل صاحب بذریعہ جہاز کراچی تشریف لے جا رہے تھے۔ یہ بھی گویا زندگی کا ایک اہم موڑ تھا۔

تیسرے روز مجھے روانہ ہونا تھا۔ شرفو مجھے ایئرپورٹ تک چھوڑنے آیا۔ وہ کئی بار ہوائی سفر کر چکا تھا۔ میں نے اس سے تمام طور طریقے اچھی طرح سمجھ لیے تاکہ ہم سفروں اور خصوصاً ایئر ہوسٹس کو احساس نہ ہونے پائے کہ میں پہلی بار ہوائی سفر کر رہا ہوں۔

طیارہ فضائے بسیط میں بلند ہوا تو چند لمحے بعد ہی مکان ماچس کی ڈبیوں جتنے دکھائی دینے لگے اور مزید کچھ دیر بعد طیارہ

بادلوں سے بھی اوپر آگیا۔ تب میرا دل ایک عجیب سی مسرت سے لبریز ہوگیا۔ پہلی بار مجھے فضاء کی وسعتوں کا احساس ہوا۔ اس کم سن پرندے کی خوشی شاید ایسی ہی ہوتی ہوگی جو ماں سے اڑنا سیکھنے کے بعد پہلی بار خود پنکھ پھیلا کر ہوا میں نکلا ہو۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے طیارہ فضا میں نہیں اڑ رہا بلکہ میں خود بازو پھیلائے بادلوں سے اوپر تیر رہا ہوں۔ یونہی آزاد فضاؤں میں اڑنا اور عام لوگوں سے کہیں زیادہ بلندی پر رہنا میرا خواب تھا۔

میں مسرور تھا کہ خدا نے مجھے شکر گڑھ کی گلیوں میں رینگتا ہوا کیڑا بننے سے بچالیا تھا۔ کسی نہ کسی ذریعے سے میں کچھ اوپر آہی گیا تھا اور ابھی میں مزید اوپر جانا چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے بیس منٹ کا سفر خوابوں کی ایک عجیب ہی دنیا میں ہلکورے لیتے لیتے یوں کٹ گیا کہ ایک نسوانی آواز نے جب اعلان کیا کہ چند منٹ بعد ہم کراچی ایئرپورٹ پر لینڈ کرنے والے ہیں اور سگریٹ نوشی کرنے والوں کو اپنی سگریٹیں بجھا کر سیفٹی بیلٹ باندھ لینی چاہئے تو مجھے یہ مذاق سا محسوس ہوا۔

کیا واقعی میں کراچی پہنچ گیا تھا؟ کسی زمانے میں کراچی کا تصور میرے ذہن میں ایسا ہی تھا جیسے وہ کوہ قاف کے آس پاس واقع کوئی بستی ہے۔ کراچی تو کراچی کسی زمانے میں شکر گڑھ سے لاہور آنا کوئی بہت بڑی خلیج عبور کرنے سے زیادہ مشکل محسوس ہوتا تھا۔ بے وسیلہ ہونا بھی کیسا المیہ ہے کہ چند کوس کا فاصلہ بھی سمندر وں پار کا سفر محسوس ہوتا ہے اور ایک وہ بھی لوگ ہیں جنہیں گھومنے پھرنے کے لیے دنیا بہت چھوٹی محسوس ہوتی ہے۔

خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹکتا میں طیارے سے اتر کر بس میں کھڑے ہو کر لاؤنج تک پہنچا۔ میرے ساتھ چونکہ کوئی سامان نہیں، صرف ایک بیگ تھا اور وہ میرے ہاتھ میں تھا اس لیے مجھے کنویئر بیلٹ کے قریب کھڑے ہونے کی ضرورت نہیں پڑی اور میں بیگ ہلاتا دروازے کی طرف چل دیا۔

شیشے کی دیوار کے پار کچھ لوگ، آنے والے کچھ لوگوں کو ریسیو کرنے کے لیے کھڑے تھے مجھے کسی حد تک امید تھی کہ اگر میرا ٹیلی گرام راشد کو مل چکا ہوگا تو شاید وہ مجھے ریسیو کرنے آئے لیکن وہ مجھے ان لوگوں میں کہیں نظر نہ آیا۔ پھر میں نے دیکھا ریلنگ کے پائپ کا سہارا لیے ایک نہایت خوبصورت لڑکا جانے کسے دیکھ کر نہایت پرجوش انداز میں ہاتھ ہلا رہا تھا۔

میں نے دو قدم آگے پہنچ کر قدرے توجہ سے دیکھا تو بے اختیار زیر لب کہہ اٹھا "ارے ... ! یہ راشد ہی تو ہے۔"

وہ واقعی راشد تھا لیکن سرسری نظر میں میں اسے پہچان نہیں پایا تھا۔ میرے ذہن میں اس کی اسی وقت کی تصویر تھی جب میں اپنے ساتھ اسے بھی خرکار کیمپ سے رہائی دلا کر فرار ہوا تھا۔ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا ایک زرد، نحیف اور تھر تھر کانپتا ہوا لڑکا۔

اپنے گھر اور اپنے ماں باپ کے پاس واپس پہنچنے کی خوشی، آرام و آسائش اور ایسے ہی دیگر عوامل نے اتنے کم عرصے میں اسے بہت زیادہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ اب تو وہ مجھے پہلے سے خاصا بڑا بڑا بھی لگ رہا تھا۔ عمر میں محض چند ماہ کا اضافہ بھی خاصی تبدیلیاں لے آیا تھا۔

اب وہ نیلی جینز اور سفید شرٹ میں ملبوس اٹھتی عمر کا ایک سرخ و سپید لڑکا تھا جس پر سرسری نظر ڈال کر ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ کسی دولت مند گھرانے کا فرد ہے۔ اس کے بھورے بال کھلنڈرانہ انداز میں بکھرے ہوئے تھے اور کچھ لٹیں پیشانی پر بھی جھکی ہوئیں تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ دو چار سال بعد وہ صنف مخالف میں بے حد مقبول رہے گا گو کہ اس کی شخصیت میں مردانہ کرختگی کی کمی رہے گی۔

میں باہر آیا تو راشد نہایت گرم جوشی سے مجھ سے گلے ملا۔ ہمارے درمیان رسمی جملوں کا تبادلہ ہوا اور راشد میرے ہاتھ سے بیگ لے کر ایک طرف بڑھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ راشد کے ساتھ کوئی اور بھی آیا ہوگا اس لیے اس وقت مجھے خوشگوار سی حیرت ہوئی جب اس نے سیڑھیوں کے پاس رک کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ان سے ملئے افضل بھائی! یہ میرے والد ہیں ... اور یہ میری بڑی بہن ہیں راحیلہ۔"

میں نے ان دونوں شخصیات کو دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ اپنی اپنی جگہ وہ دونوں ہی نہایت خوبصورت اور آئیڈیل قسم کی شخصیتیں تھیں۔ راشد کے والد کا قد تقریباً میرے ہی جتنا یعنی چھ فٹ سے نکلتا ہوا تھا۔ چوڑے کندھے، سرخ و سپید رنگت، گھنگریالے بال، چمکیلی آنکھیں اور دلکش نقوش۔ ان کے بچوں کی عمریں دیکھتے ہوئے اندازہ ہوتا تھا کہ ان کی اپنی عمر پینتالیس سے کم نہیں ہوگی لیکن وہ پینتیس سے زیادہ کے نہیں لگتے تھے۔ موسم معمولی سا خنک تھا لیکن وہ تھری پیس سوٹ میں تھے جیسا کہ عام طور پر بزنس مین ہوتے ہیں۔

میرے ذہن میں ایک آئیڈیل باپ کا جو تصور تھا وہ بالکل اس کے مطابق لگتے تھے۔ لڑکپن میں اپنے والد کو جب میں بوسیدہ سی دھوتی، کرتے اور میلی پگڑی میں قدرے خمیدہ کمر کے ساتھ، تھوڑا تھوڑا سا کھانستے ہوئے کھیتوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھتا تھا تو کبھی کبھار راشد کے والد سے ملتی جلتی

کوئی شخصیت میرے ذہن میں آتی تھی اور میں سوچا کرتا تھا کہ خدا نے اگر مجھے ایسے کسی شخص کے گھر پیدا کر دیا ہوتا تو کیا حرج تھا لیکن پھر جب میں اپنے والد کی شفقت اور محبت کو دیکھتا تھا تو مجھے اپنے اس خیال پر شرمندگی سی محسوس ہوتی تھی اور میں سوچتا تھا کہ اگر میں کسی اور شخص کے ہاں پیدا ہوا ہوتا تو شاید وہ مجھ سے اتنی محبت نہ کرتا۔

راشد کا شاید پورا کنبہ ہی خوبصورت لوگوں کا کنبہ تھا۔ راحیلہ اپنے باپ اور بھائی سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی یا شاید اس لیے زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی تھی کہ وہ لڑکی تھی دراز قد، نازک اندام۔ رنگت نہایت ہی صاف اور اجلی اجلی اور اس کے لمبے لمبے بھورے بال کسی حد تک سنہرے پن کی طرف مائل تھے جو ریشم کے سلجھے ہوئے تاروں کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ بھی اپنے بھائی کی طرح جینز اور شرٹ میں ہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی جینز ویلوٹ کی تھی۔ اس مخملیں کپڑے سے اس کی شخصیت کی نزاکت کا تاثر اور گہرا ہو گیا تھا۔

وہ اتنی نکھری نکھری سی لڑکی تھی کہ اس کے گرد روشنی کا ایک ہالہ سا رقص کرتا محسوس ہوتا تھا اور ہوا میں جیسے اس کے وجود سے تازگی اور خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر کچھ اسی طرح فرحت کا احساس ہوتا تھا جیسے آپ نے علی الصباح صاف ستھری ہوا میں چہل قدمی کرتے ہوئے کسی سرسبز کیاری میں شبنم سے نہائے ہوئے نو شگفتہ پھولوں کو دیکھ لیا ہو۔

اس کی خوابناک سی آنکھوں پر لمبی پلکوں کی جھالر نے حرکت کی، گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ تھرتھرائے اور اس نے دھیمی اور مترنم آواز میں کچھ کہا جو میں صحیح طور پر سن ہی نہیں سکا کیونکہ میں اس کی شخصیت کے سحر میں کچھ زیادہ ہی الجھ گیا تھا۔ راشد کے والد نے مضبوطی سے مصافحہ کرتے ہوئے میرے ہاتھ کو ہلکا سا جھٹکا دیا تو میں چونکا اور گزشتہ لمحے کی محویت پر مجھے شرمندگی سی ہوئی۔

راشد کے ابو بے تکلفی سے کہہ رہے تھے "بھئی تم سے ملنے کا تو اس قدر اشتیاق تھا کہ اگر تم چند دن اور نہ آتے تو ہم سب خود لاہور آنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ ان ہی دنوں اچانک ریحانہ بیمار ہو گئی اور ... میرے کاروبار میں کچھ ایسا چکر شروع ہوا کہ ہم میں سے کسی کا بھی شہر سے باہر جانے کا پروگرام ہی نہیں بن سکا اور ہاں ... یہ بھی بتاتا چلوں کہ ریحانہ ان دونوں بچوں کی ماں کا نام ہے۔ وہ گھر پر بڑی بے تابی سے تمہارا انتظار کر رہی ہے۔"

"مجھے بھی آپ لوگوں سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور مجھے یہ محسوس کر کے حیرت ہوئی کہ میرے بولنے کے انداز میں ایک طرح کا شرمیلا پن شامل تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "راشد کے خطوط سے جس قدر خلوص جھلکتا تھا وہ مجھے بھی بہت دنوں سے مجبور کر رہا تھا کہ آ کر آپ لوگوں سے ملوں لیکن انہی دنوں میں نے بھی ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کر لیا تھا اور آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ نئے نئے کاروبار میں کتنی محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"بے شک ... بے شک۔" راشد کے والد نے سر ہلایا۔ "جہاں تک خلوص کی بات ہے تو راشد ہی کے نہیں ہم سب کے دل میں تمہیں دیکھے بغیر ہی تمہارے لیے خلوص اور ممنونیت کے جو جذبات موجود ہیں ان کا اظہار مشکل ہے۔ تم نے ایک طرح سے ہمارے پورے ہی خاندان کو نئی زندگی دی ہے۔ راشد میرا ایک ہی لڑکا ہے۔ اگر یہ ہمیں دوبارہ نہ ملتا تو میں، اس کی ماں اور بہن تینوں ہی زندہ درگور ہو جاتے۔ خصوصاً مجھے تمہارے اس انداز نے تو بہت ہی متاثر کیا کہ تم نے ہمارے لیے اتنا بڑا کارنامہ انجام دینے کے بعد احسان جتانا تو درکنار، ہمارے سامنے آنے کی بھی کوشش نہیں کی اور لاہور میں راشد کو میرے بھائی کے گھر کے دروازے پر ہی چھوڑ کر چپکے سے چلے گئے۔ اس وقت ہم اور ہمارے دیگر کئی عزیز رشتے دار بھی وہیں موجود تھے اور سب ہی تمہاری اس بے نیازی پر حیران رہ گئے تھے اور سب ہی کے دلوں میں تم سے

ملاقات کی حسرت سی رہ گئی تھی۔"

"بس جی... وہ تو وقت ہی عجیب تھا۔ اس کا تو اب تذکرہ ہی چھوڑیں۔" میں نے نظر جھکاتے ہوئے کہا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ راحیلہ کی خوابناک سی آنکھیں مسلسل مجھے ہی تک رہی تھیں اور عجیب بات یہ تھی کہ اس احساس سے میری دھڑکن تیز ہوئی جارہی تھی اور میں اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کررہا تھا حالانکہ میں ان مردوں میں سے تھا کہ جو نظر بھر کسی خاتون کی طرف دیکھ لیتے ہیں تو ایک لمحے بعد وہ بغلیں جھانکنے لگتی ہے اور یوں بے چین سی ہوجاتی ہے جیسے اس کے جسم پر چیونٹیاں رینگ رہی ہیں۔

میرے لئے خود بھی اپنی یہ کیفیت ناقابلِ فہم تھی کہ میں راحیلہ سے نظر ملاتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ پھر میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ اس وقت اس کے والد سامنے کھڑے تھے۔

"میرا خیال ہے اب چلنا چاہئے۔ کافی دیر دھکم پیل کا نظارہ کرلیا۔" راشد کے والد بولے۔ ہم چاروں پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیئے۔

پارکنگ لاٹ میں ان کی سفید مرسیڈیز موجود تھی۔ ڈرائیور بھی پاس ہی کھڑا تھا۔ اس نے فوراً ہمارے لیے دروازے کھولے۔ راشد کے والد نے پہلے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"سر! پہلے آپ تشریف رکھیئے۔" میں نے اپنی دانست میں مینرازم کا مظاہرہ کیا۔ راحیلہ اور اس کے والد جانے کیوں بے ساختہ ہنس دیئے۔

گاڑی میں بیٹھتے ہوئے راشد کے والد ملائمت سے بولے۔ "اگر تم مجھے سر اور جناب وغیرہ کے بجائے صرف انکل کہو تو بہتر رہے گا۔ برسبیل تذکرہ میں اپنا نام بھی بتادوں۔ مجھے زاہد علی کہتے ہیں۔"

"میں بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اتنا حق دیا کہ آپ کو اپنائیت سے مخاطب کرسکوں۔" میں نے قدرے کھسیاہٹ سے کہا۔

اس بار صرف راحیلہ ہنسی اور اس کی ہنسی پہلے سے زیادہ مترنم تھی۔ وہ بدستور مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "آپ بہت تکلف پسند انسان ہیں افضل صاحب!"

"پہلی ملاقات ہے نا۔" میں نے بمشکل اس سے نظر ملاتے ہوئے کہا۔ اس کی نیلگوں آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

"لیکن ہمیں تو یوں محسوس ہورہا ہے جیسے برسوں سے آپ کو جانتے ہیں۔" وہ بلا تامل بولی۔

میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں "خلوص ہے آپ لوگوں کا... نوازش ہے آپ کی..." میں صرف یہی کہہ پایا۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہم گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ مین روڈ پر پہنچ کر راشد مجھے بتانے لگا "یہ ڈرگ روڈ ہے۔ بس سیدھے اسی پر چلتے ہوئے ہم گھر پہنچ جائیں گے... سوسائٹی میں ہے ہمارا مکان... اب تو ہمارے مکان کے قریب ایک پہاڑی پر ایک پارک بھی بن گیا ہے۔ ہل پارک نام رکھا گیا ہے اس کا... آپ کو شاید ہمارے مکان کا محل وقوع پسند آئے..."

"راشد!" راحیلہ اس کی بات کاٹتے ہوئے شریر لہجے میں بولی "تم تو اس طرح افضل صاحب کو متاثر کرنے کی کوشش کررہے ہو جیسے ہمارا مکان، مکان نہیں کوئی ہوٹل ہے اور تم ایئرپورٹ سے افضل صاحب کو نہیں بلکہ کسی سیاح کو بڑی مشکل سے گھیر گھار کر لائے ہو اور فکرمند ہو کہ یہ اکلوتا گاہک بھی نکل نہ جائے۔"

انکل زاہد نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ راحیلہ کے لہجے میں قدرے سنجیدگی آگئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "ویسے بھی ہم افضل صاحب کو اپنے مکان پر نہیں اپنے گھر لے جارہے ہیں۔ مکان اور گھر میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تمہیں معلوم ہے؟"

"نہیں۔ مجھے نہیں معلوم منشی فاضل صاحبہ!" راشد نے مصنوعی خفگی سے کہا "اور میں جاننا بھی نہیں چاہتا۔"

"جان لو۔ شاید مستقبل میں کسی کلاس فیلو لڑکی پر علمیت کا رعب ڈالنے کی ضرورت پیش آجائے۔" راحیلہ چھیڑنے والے انداز میں بولی "مکان تو محض در و دیوار کے مجموعے کا نام ہے اور گھر اسے کہتے ہیں جو ان در و دیوار کے اندر ہوتا ہے۔ افضل صاحب ہم سے ملنے آئے ہیں، ہمارے مکان سے نہیں۔"

"تم اپنی قابلیت جھاڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا کرو۔" راشد بولا۔ اس کے لہجے کی مصنوعی خفگی برقرار تھی۔ "بہرحال میں تمہاری قابلیت سے کبھی متاثر نہیں ہوں گا۔ تم کوشش جاری رکھو۔ کوشش جاری رکھنے میں کوئی حرج نہیں۔"

اسی قسم کی خوشگوار نوک جھونک میں راستہ کٹ گیا۔ راحیلہ گوکہ سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی لیکن اس کی گفتگو میں زبردست گہرائی اور گیرائی تھی۔ تاہم اس کے مزاج کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرنا کم از کم فی الحال میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ کسی لمحے اس کے انداز گفتگو میں بچوں کی سی معصومیت جھلک آتی۔ کسی لمحے وہ گفتگو کے اعتبار سے اسی سالہ خاتون محسوس ہونے لگتی اور کسی لمحے وہ عین اپنی

عمر کے مطابق ایک شوخ و شنگ، الھڑ اور آسودہ حال لڑکی نظر آنے لگتی جسے دنیا کے کسی بھی مسئلے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ جو ہر چیز کو صرف سطحی نظر سے دیکھ سکتی تھی اور جس کا مطمع نظر بس یہی تھا کہ کھیلو کودو، کھاؤ پیو، عیش کرو اور دنیا کی تمام آسائشوں سے لطف اندوز ہو کر رخصت ہو جاؤ۔

بہرحال اتنے مختصر سے وقت میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کرنا تو ویسے بھی مناسب نہیں تھا۔ راستے میں میں نے اس کی شخصیت سے ذہن ہٹا کر کچھ دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنے کی کوشش کی لیکن یہ کام مجھے کافی کٹھن محسوس ہوا۔ اس لڑکی میں کوئی بات ضرور تھی۔ میرے خیال میں یہ تقریباً ناممکن تھا کہ اس سے ملنے، اس کے پاس بیٹھنے حتیٰ کہ اس سے صرف چند لمحے بات کر لینے کے بعد بھی کوئی شخص اس کے بارے سوچنے سے اپنے آپ کو باز رکھ سکتا۔

انکل زاہد کا وہ مکان یا گھر جس کے بارے میں راستے میں بحث ہوتی رہی تھی، دراصل ایک دو منزلہ شاندار کوٹھی تھی جس میں بے تحاشہ ماربل استعمال کیا گیا تھا۔

انکل زاہد نے بتایا تھا کہ راشد کی امی گھر پر بے تابانی سے میرا انتظار کر رہی تھیں۔ میں اسے محض ایک رسمی سی بات سمجھا تھا لیکن وہاں پہنچ کر میں نے دیکھا کہ وہ خاتون واقعی لان پر کرسی ڈالے میرے انتظار میں بیٹھی تھیں۔ وہ اس طرح مجھ سے ملیں جیسے میں بھی ان کا کوئی بچھڑا ہوا بیٹا تھا۔ ان لوگوں کے خلوص نے مجھے تقریباً پریشان ہی کر دیا تھا۔ میں بیک وقت اتنے افراد کی طرف سے اتنے خلوص کا سامنا کرنے کا عادی نہیں تھا۔

ایک بات میں محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔ راشد کے والدین کی جوڑی کچھ بے جوڑ سی تھی۔ آنٹی ریحانہ انکل زاہد سے عمر میں بھی کچھ بڑی معلوم ہوتی تھیں اور غالباً کچھ زیادہ پڑھی لکھی بھی نہیں تھیں۔ وہ غالباً کافی عرصہ پہلے ہی مٹاپے کی حدود میں قدم رکھ چکی تھیں۔ رنگت بھی سانولی تھی اور شاید بیچاری بیمار بھی رہتی تھیں۔ کچھ عرصے سے ان کا بلڈ پریشر ہائی رہتا تھا اور جوڑوں کا درد بھی جاگ اٹھا تھا جس کی وجہ سے وہ ایئرپورٹ نہیں آسکی تھیں ورنہ وہ بھی مجھے ریسیو کرنے کے لیے آنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔"

تاہم ان تمام باتوں کے باوجود مجھے جانے کیوں ان کی شخصیت انکل زاہد کے مقابلے میں زیادہ من موہنی محسوس ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کے خلوص میں بے ساختگی تھی۔ ان کے طرز عمل میں حیرت انگیز حد تک سادگی تھی۔ وہ سراپا معصومیت تھیں اور یہی معصومیت ان کی شخصیت کا حسن بن کر رہ گئی تھی جس نے دیگر خامیاں چھپالی تھیں۔ مثلاً میں نے تو انہیں صرف سلام کرنے پر ہی اکتفا کیا تھا مگر انہوں نے مجھے بچوں کی طرح سینے سے چمٹا کر پیار کیا۔ یہی نہیں، جانے کیوں ان کی آنکھوں میں آنسو بھی آگئے۔ شاید ان کے سینے میں خلوص اور محبت کا ایسا بے پایاں دریا موجزن تھا جس پر بند باندھنا ان کے بس میں نہیں تھا۔ مجھے جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں پہلی بار اس خاتون سے مل رہا ہوں۔

خلوص سے تو انکل زاہد بھی پیش آئے تھے لیکن وہ بہرحال ایک بزنس مین تھے اور ظاہر ہے بزنس مین بھی کوئی چھوٹے موٹے یا ناکام قسم کے نہیں تھے۔ شاید اسی لیے ان کی کسی بھی بات میں بے ساختگی نہیں تھی۔ ان کی تمام حرکات و سکنات گویا ایک خاص تربیت کی پیداوار اور ہر جملہ نپا تلا محسوس ہوتا تھا۔ ان کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ جو بھی بات کر رہے ہیں وہ ان کے دل کی آواز ہے۔ تقریباً ہر کامیاب بزنس مین کا معاملہ کچھ یہی ہوتا ہے۔

وہ اچھے زمانے تھے۔ لاہور سے کراچی تک کے سفر میں بھی اگر کھانے کا وقت ہو جاتا تھا تو جہاز پر کھانا پیش کیا جاتا تھا گو کہ اسے کھانا بڑے حوصلے کی بات تھی۔ میں محض چند لقمے زہر مار کر کے آیا تھا اور اب تین بج رہے تھے۔ سخت بھوک لگ رہی تھی۔

آنٹی نے میرے دل کی بات کر دی۔ انکل کے بازو کا سہارا لے کر چلتے ہوئے بولیں "بیٹا! سب سے پہلے ہاتھ منہ دھو کر کھانا کھالو، تمہارے انتظار میں ہم میں سے کسی نے بھی نہیں کھایا۔"

دروازے سے داخل ہوتے ہی معطر سی خنکی نے ہمارا استقبال کیا۔ دائیں ہاتھ پر طویل و عریض ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا نظر آیا لیکن ہم اس کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ اس سے آگے ایک بیضوی لان تھا۔ اس کی آرائش بھی ڈرائنگ روم سے کم نہیں تھی۔ اس کے مقابل ڈائننگ روم تھا۔

ڈائننگ ٹیبل پر برتن کچھ اسطرح سجائے جا رہے تھے جیسے کسی بارات کی آمد کا اہتمام ہو۔ میرا بیگ ایک نوکر لے جا چکا تھا۔ میں ان کے ساتھ کھانے بیٹھا تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ چاروں اپنی اپنی پسند کے تمام کھانے میرے معدے میں ٹھونس دینا چاہتے ہیں۔

یہ لیجئے، یہ کھائیے، یہ تو آپ نے چکھا ہی نہیں۔ اس قسم کی آوازیں بڑے تواتر سے میرے آس پاس سے بلند ہوتی رہیں۔ میں بھی مختلف ڈشوں کے ساتھ ہر ممکن انصاف

کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ کافی دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے اور دوسرے لوگوں کے کھانے کی رفتار میں وہی فرق تھا جو گدھا گاڑی اور ٹرین کی رفتار میں ہوتا ہے۔ میں نے قدرے کھسیاہٹ محسوس کرتے ہوئے رفتار کم کی لیکن اب تو دیر ہو چکی تھی۔ مجھ سمیت غالباً سب ہی شکم سیر ہو چکے تھے اور کھانے سے ہاتھ کھینچ رہے تھے۔

کھانے کے بعد میری پسند پر کافی کا دور چلا جس میں گپ شپ بھی ہوتی رہی۔ انکل زاہد نے سرسری سے لہجے میں اچانک ہی پوچھ لیا "کیا بزنس کر رہے ہو برخوردار؟"

ایک لمحے کے لیے میں گڑبڑا سا گیا۔ میرے ذہن سے یہی نکل گیا کہ ایسے موقعوں کے لیے عموماً ہمارا ایک گھڑا گھڑایا جواب ہوتا ہے۔ ایک لمحہ کے سکوت کے بعد میں کہہ سکا۔ "امپورٹ ایکسپورٹ۔"

"بہت خوب۔" انکل نے سرہلایا "بھئی ہم بھی پہلے اسی میدان میں تھے لیکن پارٹنر شپ تھی۔ ساجھے کی ہنڈیا بیچ چوراہے پر پھوٹ گئی ہم صنعت کاری کی طرف آگئے تو سنا ہے کہ اب امپورٹ ایکسپورٹ میں حالات بہت اچھے ہو گئے ہیں۔ لوگوں نے نائیلون کے دھندے میں ہی کروڑوں بنا لیے۔ کیا ربیٹ مل رہا ہے آج کل نائیلون کی ساریوں پر؟"

مجھے ربیٹ کے لفظی معنی تو معلوم تھے لیکن یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ بزنس کی دنیا میں اس لفظ کا کیا عمل دخل ہے چہ جائیکہ میں ربیٹ کی شرح بتا سکتا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں جیسے بولنا ہی بھول گیا۔ مجھے احساس تھا کہ سب ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے ہیں۔

بمشکل سنبھل کر میں نے کہا "میں نے تو محدود سے پیمانے پر ابھی نیا نیا کام شروع کیا ہے۔ نائیلون کی ساریاں بھیجنے کا مجھے ابھی اتفاق نہیں ہوا۔ میں نے تو ڈبوں میں بند اشیائے خورد و نوش سے کام کا آغاز کیا ہے..."

"تمہارا مطلب ہے ٹن فوڈ؟" انکل گویا بے یقینی سے تقریباً چلا اٹھے "اس کا آرڈر تمہیں کہاں سے مل گیا؟ ہمارے ٹن فوڈز کی ڈیمانڈ کہاں نکل آئی؟"

میں نے ایک بار قاسم خان کے ہاں ڈبوں میں بند اشیائے خورد و نوش کا کچھ ذکر سنا تھا۔ معلوم نہیں بات کیا ہو رہی تھی لیکن اس وقت یہی آئٹم میرے ذہن میں آیا تھا اور میں نے سنا جڑ دیا تھا۔

"وہ جی... مڈل ایسٹ سے ایک چھوٹا سا آرڈر مل گیا تھا۔" میں نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

"اچھا... اچھا..." زاہد صاحب نے سرہلایا لیکن میں نے محسوس کیا کہ ایک ثانئے کے لیے انہوں نے عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھا تھا۔ میرے دل میں ایک چبھن سی بیٹھ گئی۔ میرے بارے میں ان کی سوچ میں یقیناً کوئی تبدیلی آئی تھی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ گہری سانس لے کر پہلے ہی جیسے ہموار اور خوشگوار لہجے میں بولے "ایکسپورٹر خواہ چھوٹا ہو یا بڑا، اسے معلومات زیادہ سے زیادہ رکھنی چاہئیں۔ معلومات پر بھی بڑی حد تک اس کی کامیابی کا دارومدار ہوتا ہے۔"

"ابھی مجھے آپ جیسے لوگوں سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔" میں نے حتی الامکان انکساری سے کہا "حقیقت میں تو ابھی میں نے بزنس شروع ہی نہیں کیا، ابھی تو ایک طرح سے میں ابتدائی اصول ہی سیکھ رہا ہوں۔"

اس کے بعد موضوع تبدیل ہو گیا۔ میری ذات کے بارے میں باتیں ہونے لگیں۔ وہ چاروں مجھے بہت اچھی طرح جان لینا چاہتے تھے۔ میں انہیں اپنے بارے میں ہر بات حتی الامکان سچ سچ بتانے کی کوشش کر رہا تھا اور صرف وہیں جھوٹ کی آمیزش کر رہا تھا جہاں مصلحتاً ایسا کرنا میرے خیال میں ضروری تھا۔

وہ دن اسی طرح گپ شپ، آرام اور کچھ ان ڈور تفریحات میں گزر گیا۔ دوسرے روز ناشتے کی میز پر انکل زاہد بولے۔

"افضل میاں! میری تو آج سے بے پناہ مصروفیات شروع ہو رہی ہیں البتہ یہ دونوں بچے آجکل کالج سے فارغ ہیں۔ ان کے ساتھ مل کر تم جو چاہو تفریحی پروگرام بناتے رہو۔ یہ تمہیں کراچی کا چپہ چپہ دکھادیں گے۔ تمام قابل ذکر مقامات کی سیر کرادیں گے۔ اپنے دوستوں سے ملوائیں گے اور جس طرح بھی تم چاہو گے پکنک وغیرہ کے پروگرام بنالیں گے۔ ان کاموں میں یہ دونوں بہن بھائی بہت تیز ہیں۔ امید ہے یہ تمہیں بور نہیں ہونے دیں گے۔ البتہ اگر میں نے تم لوگوں کو کمپنی دینے کی کوشش کی تو تم بور ہو جاؤ گے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم ان کے ساتھ رہو اور کراچی میں اپنے قیام کا لطف اٹھاؤ۔ اس گھر کو بھی اپنا گھر ہی سمجھ کر رہنا۔ مہمانوں کی طرح تکلف مت برتنا ورنہ خواہ مخواہ الجھن ہوگی۔ اوکے؟"

"اوکے سر!" میں نے بیٹھے بیٹھے انہیں سیلوٹ کیا اور وہ مسکرا دیئے۔

ناشتے کے بعد انکل زاہد تو اس طرح رخصت ہو گئے جیسے انہیں کوئی ٹرین پکڑنی ہو اور ان کے جانے کے بعد راحیلہ نے مجھے اور راشد کو تیار ہونے کا حکم دیا۔ ساتھ ہی اس نے وضاحت کی "افضل صاحب! اب میں نے آپ کی میزبانی کا چارج سنبھال لیا ہے۔ سب پروگرام میری مرضی سے بنیں گے۔ میں آپ سے صرف یہ پوچھ لیا کروں گی کہ آپ کو

میرے بنائے ہوئے کسی پروگرام پر کوئی اعتراض تو نہیں؟ سب سے پہلے تو یہ بتادیں کہ آپ کو میری اس بات پر تو کوئی اعتراض نہیں جو میں نے ابھی کی ہے؟"

میں کہنا چاہتا تھا۔ ایسا حسین میزبان میسر ہو تو کس کمبخت کو کسی بھی پروگرام پر اعتراض ہوسکتا ہے؟ لیکن قریب ہی آنٹی بیٹھی ہماری طرف دیکھتے ہوئے شفقت سے مسکرارہی تھیں اس لیے میں یہ کہہ نہ سکا تاہم میں نے محسوس کیا کہ راحیلہ نے میری آنکھوں میں یہ جواب پڑھ لیا تھا۔

"بھئی مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "میں تو یونہی فرصت کے چند دن گزارنے کراچی آگیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ میرا یہ دورہ توقعات سے کہیں زیادہ پرلطف بلکہ یادگار رہے گا۔"

"بھئی ہم جس پر مہربان ہوجاتے ہیں اس کے لیے ہم ہر چیز کو یادگار بنادیتے ہیں۔" راحیلہ نے بے باکی سے کہا "اور جس سے ہماری ٹھن جائے اس کا ہم جینا حرام کردیتے ہیں۔ کیوں راشد؟"

"بے شک۔ بے شک۔" راشد نے تائید میں سرہلایا۔

آنٹی نے بطور خاص راحیلہ کو مخاطب کیا "بیٹی! جہاں کہیں بھی جاؤ اور جو بھی پروگرام بناؤ' یہ خیال رکھنا کہ کہیں کوئی شرارت نہ ہو۔ تم میں سے کوئی کسی لڑائی جھگڑے میں الجھنے کی کوشش نہ کرے.... مطلب یہ کہ مجھے کوئی بری خبر سننے کو نہ ملے۔ خیال رکھنا کہ تمہاری ماں مستقل مریض ہے۔"

"ممی! آپ قطعاً فکر نہ کریں۔ ایک عرصہ ہوگیا ہے' آپ نے میری طرف سے کوئی ناگوار خبر سنی؟" راحیلہ نے اٹھ کر پیار سے اپنی ماں کے رخسار پر بوسہ دیا۔

راشد میری طرف جھکتے ہوئے قدرے نیچی آواز میں بولا۔ "راحیلہ اب تک جوڈو سے دو بدمعاش لڑکوں کے کندھے اور پسلیاں توڑ چکی ہے اور دو مرتبہ یہ ہاکس بے اور پیراڈائز پوائنٹ پر ریوالور سے تین بدمعاشوں کو زخمی کرچکی ہے۔ ایک مرتبہ تو ایک ایف آئی آر میں باقاعدہ اس کا نام بھی آگیا تھا۔ پہلے یہ بھرا ہوا ریوالور اپنے پاس رکھتی تھی۔"

میں نے قدرے حیرت سے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ اس کے نام میں بھی بے پناہ مشرقیت اور نسوانیت تھی اور اس کی شخصیت بھی شبنم میں نہائے ہوئے پھول سے مشابہ نظر آتی تھی تاہم میں نے اس گھر میں اپنے اب تک کے مختصر سے قیام کے دوران ہی اس کے بارے میں چند باتیں محسوس کرلی تھیں جو اس تاثر کی نفی کرتی تھیں۔

وہ لڑکوں والے کپڑے پہنتی تھی اور مطالعے' سیر و تفریح' فلم' ٹی وی پروگرام اور گپ شپ غرضیکہ ہر چیز کے بارے میں اس کا جھکاؤ ان پہلوؤں کی طرف ہوتا تھا جن میں مردانگی کی جھلک پائی جاتی تھی۔

کل باتوں باتوں میں اتفاقاً آنٹی اس کے پس منظر کی طرف بھی اشارہ کرچکی تھیں۔ انہوں نے بتایا تھا کہ زاہد صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے ہاں پہلی اولاد لڑکا ہو لیکن جب لڑکی ہوگئی تو انہوں نے اسے لڑکوں جیسے کپڑے پہنانے شروع کردیئے' ہمیشہ لڑکوں والے کھلونے لاکر دیئے۔ کافی عرصے تک انہوں نے گویا اس بات کو بھی بھلائے رکھا کہ لڑکی کا نام راحیلہ رکھا گیا ہے۔ وہ اسے ٹونی کے نام سے پکارتے رہے۔ راشد کی پیدائش کے دو تین سال بعد تک ان کا یہ شوق تو ختم ہوگیا لیکن راحیلہ کے ننھے سے ذہن میں شاید اس کے کچھ اثرات جڑ پکڑ گئے۔

میں دل ہی دل میں اس خیال سے متفق نہیں تھا۔ میرے خیال میں ان باتوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ بس قدرت ہی کی طرف سے عطا کردہ کچھ رجحانات ہوتے ہیں۔ اگر راشد کی مثال سامنے رکھی جاتی تو دیکھا جاسکتا تھا کہ اسے کسی نے زنانہ رجحانات کی طرف مائل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی مگر اس کے انداز و اطوار میں بے پناہ ملائمت اور دھیما پن تھا۔ یہ بات بھی نہیں تھی کہ اس کے انداز و اطوار میں نسوانیت کی جھلک ملتی تھی۔ بس ویسے ہی جانے کیوں اس کی نوعمری اور اچھی صحت کو دیکھتے ہوئے اس میں تندی و تیزی اور جارحانہ سی ولولہ خیزی کی کمی محسوس ہوتی تھی جو اس عمر کے لڑکوں کا خاصہ ہوتی ہے۔

اس کی حرکات و سکنات میں بڑا ٹھہراؤ تھا اور میرا خیال ہے' وہ جب کسی کو پسند کرتا تھا تو اس کے انداز میں ایک طرح کی عقیدتمندی اور والہانہ پن سا ہوتا تھا۔ لڑکپن یا لاابالی پن اس میں کہیں نظر نہیں آتا تھا۔

بظاہر تو راحیلہ کی شخصیت میں بھی سبک روی کا سادھیما پن نظر آتا تھا لیکن کچھ وقت اس کے قریب رہنے کے بعد اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ہیرے سے مشابہ کوئی ہشت پہلو پتھر تھا۔ ایک پل میں کوئی پہلو جھلملا اٹھتا تھا تو دوسرے پل میں کوئی اور پہلو۔ کبھی اس کی ذات سے کسی رنگ کی روشنی پھوٹتی تھی اور کبھی کسی رنگ کی۔

بات کرتے کرتے اچانک اس کی نیلگوں آنکھیں قمقموں کی طرح چمک اٹھتیں اور گلابی چہرہ سرخ ہوجاتا۔ کسی بات پر جوش میں آکر وہ میز پر گھونسا ماردیتی تو ساری کراکری کھنک اٹھتی۔ بظاہر اس کے ہاتھ اتنے نرم و نازک نظر آتے تھے کہ برانٹیک کی بھاری بھرکم ڈائننگ ٹیبل پر اس انداز سے گھونسا رسید کرنا اس کے بس کی بات معلوم نہیں ہوتی تھی۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا تھا کہ اسے گھر میں آزادی بھی خوب حاصل تھی۔ اپنے بارے میں کسی بھی قسم کے فیصلے کرنے میں وہ کافی حد تک خود مختار معلوم ہوتی تھی۔ کوئی اس پر اپنی رائے ٹھونسنے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ انکل زاہد بھی نہیں۔

راشد کو کہ اسے باجی' آپا یا اس قسم کے کسی اور القاب سے نہیں پکارتا تھا' سیدھی طرح نام لیتا تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ بے چارہ اس سے بہت دبتا تھا۔ اگر وہ ایک خاص انداز سے اس کی طرف دیکھ لیتی تھی تو چوہے کی طرح دبک جاتا تھا۔

وہ مجھے بہت ہی عجیب لڑکی محسوس ہوئی تھی۔ حیران کردینے والی' مسحور کردینے والی۔ بگولے کی طرح انسان کو لپیٹ لے لینے والی۔

میں اور راشد تیار ہو کر باہر آئے تو راحیلہ ڈرائیو وے میں ایک نیلی اور سفید اسٹیشن ویگن اسٹارٹ کیے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی تھی۔ ناک پر بڑے بڑے تاریک شیشوں کا چشمہ ٹکا ہوا تھا اور بال کھلے تھے۔

اس نے مجھے اپنے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ راشد پیچھے بیٹھ گیا۔ میں اپنے لباس اور حلیے کے بارے میں کبھی زیادہ محتاط یا فکرمند نہیں رہا لیکن اس وقت راحیلہ کے برابر بیٹھتے ہوئے مجھے اپنا آپ کچھ ناموزوں سا لگا۔ میں شاید کچھ دیہاتی سا لگ رہا تھا۔

اس سے پہلے میں نے جب بھی یہ محسوس کیا تھا کہ میری شخصیت سے کچھ دیہاتی پن سا جھلک رہا ہے تو میں کسی قسم کے احساس کمتری میں مبتلا نہیں ہوا تھا لیکن اس وقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ کاش میں اپنے لباس اور رکھ رکھاؤ سے راحیلہ اور راشد ہی کے طبقے کا فرد لگ رہا ہوتا۔

یہ کچھ ایسا مشکل بھی نہیں تھا۔ میں اب لباس تو اچھے سے اچھا افورڈ کرسکتا تھا۔ صرف انتخاب میں سلیقہ برتنے اور رکھ رکھاؤ پر تھوڑی سی توجہ دینے کی ضرورت تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اگر آج آوارہ گردی کے دوران موقع ملا تو ذرا جدید تراش خراش کے کچھ ریڈی میڈ کپڑے خریدوں گا۔

میرے اور راشد کے بیٹھتے ہی راحیلہ ایک جھٹکے سے کلچ چھوڑ کر گاڑی بڑھاتے ہوئے بولی "پہلے میرے پاس شیورلٹ کنورٹیبل تھی لیکن اب میں نے اپنے لیے یہ واکس ویگن رکھی ہے۔ اس میں شریفانہ طریقے سے چودہ

آدمیوں کے بیٹھنے اور ٹھونس ٹھانس کرنے کے لیے بیس بائیس آدمیوں کی گنجائش ہے۔ مجھے اکثر اپنی دوستوں اور پھر ان کے دوستوں کو تھوک کے حساب سے لاد کر ادھر ادھر لے جانا پڑتا ہے۔ اس لیے یہ گاڑی بڑی موزوں رہتی ہے۔"

"ویسے اگر تم نے اسی حساب سے دوستوں کی باربرداری جاری رکھی تو جلد ہی تمہیں ایک ٹرک خریدنا پڑے گا راحیلہ!" راشد نے لقمہ دیا۔ میں بے ساختہ ہنس دیا۔

راحیلہ نے ایک ہاتھ سے عینک ناک پر ذرا نیچے کو کھسکاتے ہوئے ایک لمحے کے لیے مڑ کر راشد کی طرف دیکھا اور طنزیہ انداز میں بھویں اچکائیں "اب تو تمہیں بھی بولنا آتا جارہا ہے بلبل ایسٹ کراچی یا پھر شاید افضل صاحب کی آمد سے کچھ حوصلہ مل گیا ہے؟"

"نہیں۔ میں نے دراصل صبح ناشتے میں تمہارا جھوٹا جوس پی لیا تھا۔" راشد نے سادگی سے جواب دیا "یہ اسی کا اثر ہے۔ خیر.... تم اس کا برا مت مناؤ۔ میں تو سال میں ایک آدھ ہی جملہ مارتا ہوں۔ تم تو سارا سال جملے بھی مارتی ہو اور گھونسے بھی۔"

"چلو معاف کیا۔" راحیلہ پیشانی پر جھک آنے والے بالوں کو ایک خفیف جھٹکے سے ہٹاتے ہوئے بولی۔ گاڑی اس وقت غالباً سوسائٹی ہی کے علاقے میں ادھر سے ادھر مڑتی جارہی تھی۔ راحیلہ مجھ سے مخاطب ہوئی "سب سے پہلے تو میں آپ کو اپنی چند دوستوں سے ملواؤں گی۔ ان میں سے دو غیر ملکی بھی ہیں۔ شاید ان کے بوائے فرینڈ بھی ساتھ ہوں۔ آپ برا تو نہیں منائیں گے نا؟"

"میں کیا ان کا گارجین ہوں جو برا مناؤں گا؟" میں نے.... بے پروائی سے کہا۔

"ان کے گارجین تو اس وقت برا مناتے ہیں جب لڑکی کوئی بوائے فرینڈ نہیں رکھتی۔" راحیلہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی اور اس کے ایک لمحے بعد ہی اس نے گاڑی قدرے پرانی اور مختصر سی ایک کوٹھی کے پورچ میں جا روکی۔

لان پر دو کتے اچھل کود میں مصروف تھے جو سرسری نظر میں الجھی ہوئی اون کے دو گولے معلوم ہوتے تھے۔ وہ مختصرالوجود ہی تھے لیکن ان کا اصل جسم شاید اس سے بھی کہیں زیادہ مختصر تھا جتنا بظاہر دکھائی دے رہا تھا۔ ان کے بال اس قدر لمبے اور گھنے تھے کہ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ ان کے منہ کس طرف ہیں اور دمیں کس طرف۔

غالباً گاڑی کی آواز سن کر ہی جالی دار دروازے کے عقب سے ایک سفید فام لڑکی نکل آئی۔ وہ شرٹ پینٹ میں تھی۔ تراشیدہ سنہری بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔ دوڑتی ہوئی وہ

گاڑی کے قریب آئی اور مٹھیاں بھینچ کر گھٹی گھٹی پرجوش آواز میں انگریزی میں بولی "ہائے رائیلا! تم کہاں مرگئیں تھیں؟" لہجہ خالصتاً امریکی تھا۔

راحیلہ گاڑی سے اتر کر اس سے ملی۔ گلے شکووں کا تبادلہ ہوچکا تو راحیلہ نے اس سے میرا تعارف کرایا "یہ ہمارے مہمان مسٹر افضل ہیں.... اور یہ میری دوست کلارا ہے۔"

کلارا نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ روئی کے گالے کی طرح نرم تھا۔ وہ کچھ زیادہ خوش مزاج لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ بغیر کسی بات کے ہی اس کی باچھیں یوں کھلی جارہی تھیں کہ پورے دانت گنے جاسکتے تھے جو بے حد خوبصورت تھے۔ اس کے چہرے پر زندگی کی بھرپور چمک تھی۔

راحیلہ اس کے بارے میں مزید کچھ بتانے ہی لگی تھی کہ ناریل کے درخت کی طرح لمبا اور کچھ اسی طرح قدرے خمیدہ سا ایک بارلیش سفید فام نوجوان بھی جالی دار دروازہ کھول کر باہر آگیا۔ وہ سگریٹ کا دھواں اڑاتا آرہا تھا۔ اس کے جسم پر گوشت بہت کم تھا لیکن ڈھانچا خاصا چوڑا چکلا تھا۔ اس کا حلیہ کافی حد تک معززانہ ہی تھا مگر جانے کیوں اس نے گلے میں موٹے موٹے منکوں کی ایک مالا ڈالی ہوئی تھی۔

"تم نے ابھی تک اس بوجھ سے پیچھا نہیں چھڑایا؟" راحیلہ نے زیرلب کلارا سے کہا۔

"کیا کہہ رہی ہو رائیلا؟" کلارا بھی زیرلب بولی "وہ میرا منگیتر ہے۔ اب بھلا اس سے پیچھا چھڑانے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؟"

"اس سے تو بہتر تھا کہ تم نے کسی الیکٹرک پول سے منگنی کرلی ہوتی۔ وہ کم از کم روشنی تو دیتا" راحیلہ آہ بھر کر بولی۔ اس دوران وہ نوجوان اونٹ کی طرح ہچکولے سے لیتا ہوا قریب آچکا تھا۔

کلارا کے بجائے راحیلہ نے مجھ سے اس کا تعارف کرایا۔

"ان سے ملیے افضل۔ ان کا نام ذرا ٹیڑھا سا ہے۔ البرٹ تھارٹکنن۔ ہم کچھ دوستی کے ناتے اور کچھ اپنی سہولت کی خاطر انہیں البی کہتے ہیں۔ یہ بدقسمتی سے شاعر ہیں اور صرف کیمونزم کے خلاف نظمیں لکھتے ہیں۔ دن میں پچاس ساٹھ سگریٹ پیتے ہیں اور تقریباً اتنی ہی نظمیں لکھتے ہیں۔ جس دن نظمیں، سگریٹوں سے کچھ کم رہ جائیں اس روز انہیں کھانا ہضم نہیں ہوتا بشرطیکہ کھانا انہوں نے کھالیا ہو۔"

"تم تو کچھ مبالغے سے کام لے گئیں رائیلا!" البی سنجیدگی سے بولا "میں دن میں پچاس ساٹھ نظمیں تو نہیں لکھتا۔ زیادہ سے زیادہ چالیس لکھتا ہوں۔"

"اچھا اب بکواس کافی ہوچکی۔ چلو تم دونوں گاڑی میں بیٹھ جاؤ" راحیلہ نے حکم دیا۔ انہوں نے اندر جاکر نہ تو کسی کو مطلع کرنے کی ضرورت محسوس کی اور نہ ہی کسی سے اجازت طلب کی بلکہ جس جگہ کھڑے تھے وہیں سے اچک کر گاڑی میں چڑھے اور نہایت سعادتمندی سے بیٹھ گئے۔ انہوں نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ قصد کدھر کا ہے۔

روش کی بجری نہایت فریادی انداز میں ٹائروں تلے چرچرائی اور گاڑی سڑک پر آگئی۔ اس کے بعد گاڑی جس کوٹھی میں جاکر رکی وہاں سے بھی تقریباً اسی انداز میں ایک ترک لڑکی کو ساتھ لیا گیا۔ اس کا نام جوریا تھا۔ وہ تنہا تھی اور بے حد حسین تھی۔ اس کے مزاج میں کچھ سنجیدگی تھی۔ معلوم نہیں راحیلہ سے اس کی دوستی کیونکر نبھ رہی تھی۔

اس کے بعد ایک پاکستانی لڑکی کو ساتھ لیا گیا۔ اس کا نام مصباح تھا۔ چھوٹے قد کی سانولی سی لڑکی تھی مگر بے پناہ تیز و طرار۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ اس کی آمد کے بعد یوں محسوس ہونے لگا جیسے گاڑی میں بیک وقت چار پانچ افراد کا اضافہ ہوگیا ہو۔

اس کے بعد دو اور لڑکیوں کے گھروں پر چھاپا مارا گیا مگر وہ موجود نہیں تھیں۔ گاڑی معلوم نہیں کن کن سڑکوں پر فراٹے بھر رہی تھی۔ راحیلہ نہایت جارحانہ انداز میں ڈرائیو کررہی تھی۔

"آخر پتا تو چلے تم چاہتی کیا ہو؟ پروگرام کیا ہے؟" مصباح غالباً پندرھویں مرتبہ چلائی۔

"یہی تو میں فیصلہ کرنے کی کوشش کررہی ہوں" راحیلہ گویا دانت پیس کر بولی "اور اسی لیے میں گاڑی تیز چلا رہی ہوں۔ گاڑی تیز چلتی ہے تو میرا دماغ بھی تیزی سے کام کرنے لگتا ہے لیکن آج کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ یوں کہو کہ تجاویز تو ذہن میں کئی ہیں مگر میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پارہی۔"

"شاید گاڑی کی طرح تمہاری کھوپڑی کو بھی سروس ٹیوننگ وغیرہ کی ضرورت ہے" مصباح منہ بنا کر بولی "کچھ اندازہ تو ہو کہ آخر تم کس نوعیت کا پروگرام بنانا چاہتی ہو؟"

"میں صرف ایڈونچر کی متلاشی ہوں" راحیلہ نے جواب دیا۔ پھر اچانک خود ہی چٹکی بجاتے ہوئے بولی "سمجھ میں آگیا ایک ایڈونچر۔"

"کیا؟" کلارا نے عقبی سیٹ سے سارس کی طرح گردن بڑھاتے ہوئے پراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

گاڑی روک کر راحیلہ نے گردن موڑ کر پیچھے دیکھا۔ کلارا، اس کا منگیتر البی، ترک لڑکی جوریا اور پاکستانی لڑکی مصباح سب ہی مؤدبانہ انداز میں بیٹھے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ راحیلہ کا بھائی راشد تو ویگن کے فرش پر نیم دراز تھا۔

راحیلہ ایک لمحے خاموش رہی تو کلارا منمنائی "رائیلہ! فار گاڈ سیک... اب تو سسپنس کا وقفہ کافی طویل ہوگیا ہے۔ بتا بھی چکو... آخر تم کیا چاہتی ہو؟ کیا اس سینما کی تھرڈ کلاس میں سب سے اگلی قطار میں بیٹھ کر فلم دیکھنی ہے؟"

"نہیں۔ یہ سینما بہت گندہ ہے۔ یہاں کسی ایڈونچر میں مزہ نہیں آئے گا" راحیلہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم سوئمنگ کے لئے سمندر پر چلیں گے... گڈانی بیچ پر... جہاں شپ بریکنگ ہوتی ہے نا... اس سے دو میل ادھر بہت ہی صاف ستھرا ساحل ہے۔ وہاں پانی اتنا صاف ہوتا ہے کہ تہ میں تیرتی ہوئی ننھی ننھی مچھلیاں بھی صاف نظر آتی ہیں... اور اس طرف جا تا بھی کوئی شاذ و نادر ہی ہے۔ قسم سے بڑا مزہ آئے گا۔ ہم آپس میں تیراکی کے مقابلے منعقد کریں گے اور جیتنے والوں کو انعام کے طور پر دہی کے کیکڑے پکڑ کر دئے جائیں گے۔"

"لعنت ہے تم پر" مصباح بولی "میں سمجھی تھی کہ تم کوئی ایسی تجویز پیش کرنے لگی ہو جو تاریخ میں نہ سہی تو کم از کم جغرافیے میں ضرور سنہرے حروف میں لکھی جائے گی۔ مگر یہ تو وہی حساب ہوا کہ کھودا پہاڑ اور نکلا چوہا۔ وہ بھی مرا ہوا... تم نے تو گویا ہی ڈبو دی... وہ بھی گڈانی بیچ پر لے جاکر... بھئی اگر سوئمنگ ہی کرنی ہے تو پچیس تیس میل دور جاکر دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ انٹرکان کے سوئمنگ پول پر جاکر کرلیتے ہیں۔"

راحیلہ نے بری طرح اسے گھورا "کچھ لوگ کنویں کے مینڈک ہوتے ہیں۔ تم سوئمنگ پول کی مینڈکی ہو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہے کہ ایڈونچر کسے کہتے ہیں۔ اسی لئے تمہیں یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہوٹل کے سوئمنگ پول میں اور ایک دور افتادہ ویران ساحل پر سوئمنگ کرنے میں کیا فرق ہے۔ افسوس ہے تمہاری نالائقی پر کہ اتنا عرصہ میری صحبت میں رہ کر بھی تم نے کچھ نہیں سیکھا۔"

"مسئلہ سوئمنگ کاسٹیوم کا بھی تو ہوگا" کلارا پریشان سی ہوکر بولی۔

"ایک تو میں تم امریکیوں کی اس عادت سے بڑی پریشان ہوں..." راحیلہ پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی "کہ جب تک کسی بھی کام کے لئے مخصوص لباس، مخصوص اوزار یا مخصوص ماحول میسر نہ ہو تم لوگ ہاتھ نہیں ہلاتے۔ اب تک تو تمہیں معلوم ہوجانا چاہئے کہ ہمارے ہاں سمندر پر لڑکیاں سوئمنگ کاسٹیوم میں نہیں نہاتیں۔ یونہی تیراکی کرنے میں کیا حرج

ہے؟" اس نے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا "تھوڑی سی وقت پیش آئے گی تو آنے دو۔ کپڑے بھیگ جائیں گے تو اس میں بھی فکر کی کوئی بات نہیں۔ آنے سے پہلے کچھ دیر ساحل پر دوڑ بھاگ کریں گے تو کپڑے سوکھ جائیں گے اور اگر نہ سوکھے تو آتے وقت گاڑی کی سب کھڑکیاں کھلی رکھیں گے۔ راستے میں کپڑے خشک ہو جائیں گے اور اگر نہیں بھی ہوں گے تب بھی کیا فرق پڑتا ہے؟ ہمیں اپنی گاڑی میں اپنے ہی گھروں کو آنا ہے۔ میری اس تمام بکواس کے باوجود اگر تم سوئمنگ کاسٹیومز کے لئے بضد ہو تو تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرا اور راشد کا سوئمنگ کاسٹیوم تو اسی ویگن میں دیگر چھوٹی موٹی ضروری چیزوں کے ساتھ ہی موجود رہتا ہے۔ باقی لوگوں کے لئے ہم ابھی صدر چل کر خرید سکتے ہیں۔"

"ہمارے پاس تو پیسے بھی نہیں ہیں۔ ہم تو ایسے ہی اٹھ کر چل دیئے تھے" کلارا اپنے منگیتر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ تمہارے لئے ہم چندہ کرلیں گے" راحیلہ اطمینان سے بولی۔

"چلو خیر چھوڑو..." کلارا بالآخر جیسے فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولی "اسی طرح ٹھیک ہے جس طرح تم نے بتایا ہے۔"

اس پر راحیلہ نے بازو لہرا کر مسرت بھرا ایک نعرہ بلند کیا۔ راہ چلتے کئی آدمیوں نے مڑ کر ہماری گاڑی کی طرف دیکھا لیکن راحیلہ کو جیسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ اس نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اگلے راؤنڈ اباؤٹ سے ہم لوگ واپس مڑ گئے اور اسٹیشن ویگن ایک بار پھر گاڑیوں کو پیچھے چھوڑتی اور طوفانی انداز میں ٹریفک میں راستہ بناتی ہوئی ان راستوں پر بڑھنے لگی جو میرے لئے اجنبی تھے۔

گنجان آباد علاقوں سے نکلنے کے بعد ویران راستوں پر بھی خاصی دیر تک سفر جاری رہا اور راستے میں ایک دوسرے پر فقرے کسنے کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔ بالآخر راحیلہ نے گڈانی بیچ پر ریتیلے ٹیلوں کے قریب گاڑی لے جا روکی اور سب نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ نرم ریت میں ہمارے پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔

چار سو ایک عجیب سا سکوت اور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ گو کہ لہروں کا مدھم سا شور اور پرندوں کی کچھ مخصوص آوازیں سنائی دے رہی تھیں اس کے باوجود گمبھیر خاموشی کا احساس ہو رہا تھا۔ کافی فاصلے پر چند کشتیاں پانی میں کھڑی تھیں اور پھٹے پرانے' میلے کچیلے کپڑوں میں چند بوڑھے سے مچھیرے کنارے پر بیٹھے اپنے جال مرمت کر رہے تھے۔ انہوں نے چندھیائی ہوئی متجسس سی آنکھوں سے ہماری طرف دیکھا اور آپس میں کچھ باتیں کرنے لگے تاہم ان کی آوازیں ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

سامنے نیلگوں سمندر پھیلا ہوا تھا۔ یہاں ساحل کے قریب واقعی پانی بہت شفاف تھا اور اگر اس میں موجوں کا تلاطم نہ ہوتا تو اس پر بہت بڑی جھیل کا گماں گزرتا۔ جانے کیوں ایک لمحے کے لئے مجھے گماں گزرا جیسے ہم کسی دوسرے سیارے پر آ گئے ہیں۔ یہاں کی کھلی' پرسکون اور مرطوب سی فضا میں دل ایک انجانی سی مسرت سے سرشار ہوا جا رہا تھا۔

میں نے ابھی تک کسی ہوٹل کے سوئمنگ پول میں تیراکی تو نہیں کی تھی لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ واقعی اس فضا میں وقت گزارنے اور ہوٹل کے سوئمنگ پول میں اپنے آپ کو بہلانے میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ راحیلہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ وہ کمبخت ایڈونچر کے مفہوم سے ضرور واقف تھی۔ شاید اس کے وجود میں بھی میری ہی طرح ایک بپھری ہوئی روح مقید تھی۔ خطر پسندی' فطرت کے زیادہ سے زیادہ قریب جا کر اس کی سنسنی خیزی سے محظوظ ہونا' موقع پاتے ہی تصنع اور تکلفات کی دنیا سے نکل بھاگنا' دوسروں کو کم ہی خاطر میں لانا۔ یہ اور اسی قسم کی دوسری بہت سی خصوصیات اس میں اور مجھ میں بڑی حد تک مشترک معلوم ہوتی تھیں۔ وہ ایک عام لڑکی ہرگز نہیں تھی۔

کبھی کبھی میں نیم بیداری کے عالم میں ایک الف لیلوی سی لڑکی کی شخصیت کا تانا بانا بنتا رہتا تھا اور سمجھتا تھا کہ اس قسم کی لڑکی کا دنیا میں ملنا بہت مشکل ہے لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ اس قسم کی لڑکی مجھ سے چند سو میل کے فاصلے پر اس شہر میں موجود ہے جہاں سے مجھے کئی بلاوے آ چکے تھے۔

میں جب بھی راحیلہ کی طرف دیکھتا تھا میرا ذہن سوچوں کی ایسی ہی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگتا تھا اور میری رگ و پے میں چیونٹیاں سی رینگنے لگتی تھیں۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے حتی الامکان احتراز کرتا تھا مبادا وہ میری زندگی کی حسرت نہ بن جائے۔

ایک آدھ بار تحت الشعور کے اندھیروں میں اس مبہم سے سوال نے بھی سر ابھارا تھا کہ کیا میں اسے حاصل کر سکتا ہوں؟ لیکن جب میں نے اپنا جائزہ لیا تو اپنے آپ کو بے حد کمتر سا محسوس کیا۔ میں عملی زندگی کے میدان میں غلط راستے سے داخل ہونے والا ایک نیم دیہاتی اور اجڈ سا نوجوان تھا۔ میری عمر بھی کم تھی۔ ابھی مجھے غلط ملط راستوں پر معلوم نہیں کب تک دھکے کھانے تھے۔ میرے اور اس کے درمیان بہت ہی بڑی خلیج حائل تھی۔ اسی لئے میں ہر لمحے اسی کوشش میں مصروف رہتا تھا کہ اس کی شخصیت میرے شعور پر زیادہ حاوی نہ ہونے پائے۔ اس کے باوجود یہ عالم تھا کہ اس سے میری ملاقات کو پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے اور میرا بیشتر وقت اس کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے بارے میں سوچتے ..... وقت سستی اور سطحی خواہشوں سے ذہن بالکل پاک ہوتا تھا۔ اسے پانے کے لئے میں نہیں' میری روح پکار کرتی تھی اور یہ تجربہ میرے لئے بالکل نیا تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس بات نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود میں اس کی طرف دیکھے بغیر رہتا بھی نہیں تھا۔

اس وقت بھی میں اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ انجن بند کر کے وہ ایک سرکش شہزادی کی سی شان سے نیچے اتری۔ تاریک شیشوں کا چشمہ اس نے سیٹ کی طرف اچھال دیا۔ سب اپنے جوتے وغیرہ اتار رہے تھے۔ میں نے بھی جوتے اتارے اور جیبوں سے چیزیں نکال کر گاڑی کی سیٹ پر رکھیں اور راحیلہ نے گاڑی کو مقفل کر دیا اور چابیوں کا گچھا گاڑی کے نیچے ہی ریت میں چھپا دیا۔

اس نے مٹھیاں بھینچ کر دونوں بازو ہوا میں بلند کر کے ایک بار پھر فلمی ریڈ انڈینز کے سے انداز میں بے معنی سا نعرہ لگایا۔ میرے سوا سب نے اس کا ساتھ دیا پھر وہ سب مویشیوں کے ایک چھوٹے سے ریوڑ کی طرح سمندر کی طرف دوڑ پڑے۔ میں ہچکچاہٹ کے سے عالم میں ایک لمحے وہیں کھڑا رہا لیکن پھر ان کی تقلید میں دوڑا اور ان سب سے آگے نکل گیا۔ یکے بعد دیگرے سب نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔

کچھ مچھیرے دور بیٹھے یوں ہماری طرف دیکھ رہے تھے جیسے ہم پاگل ہیں یا پھر واقعی کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہیں جس نے اچانک ان کی پرسکون دنیا پر حملہ کر دیا ہے۔ ہمارے آتے ہی سکوت میں ڈوبے ہوئے اس ساحل پر گویا ہلچل مچ گئی تھی۔

البی اپنی منگیتر کے آس پاس ہی اونٹ کی طرح گردن پانی سے نکالے تیر رہا تھا۔ چند لمحے بعد وہ اپنی آنکھوں پر چپکے ہوئے بال ہٹاتے ہوئے بہ آواز بلند بولا "واہ ... کتنے عرصے بعد سمندر پر نہانا نصیب ہوا ہے ..."

"یہ سمندر کا حوالہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟" راحیلہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی "تم سیدھی اور سچی بات کرنے کے لئے یوں بھی کہہ سکتے تھے۔ آہ! کتنے عرصے بعد نہانا نصیب ہوا ہے۔"

البی سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا "ابھی ابھی میں نے ایک نظم کہہ ڈالی ہے۔ نظم کچھ یوں ہے۔

یہ زمیں یہ ہوا یہ فضا سب ہمارے لئے ہے

یہ پرسکون ساحل ......"

راحیلہ نے اسے نظم ختم کرنے کی مہلت نہیں دی اور پانی میں الٹا تیرتے ہوئے چلائی "خدا کے لئے بند کرو یہ نظم۔ اس قسم کی کم و بیش ڈیڑھ ہزار نظمیں تقریباً انہی الفاظ میں تم سے پہلے بھی بہت سے شعراء کہہ چکے ہیں اور ان میں سے بیشتر بچوں کی کتابوں میں چھپی ہیں۔ ایک تو تمہاری کھوپڑی میں معلوم نہیں نظموں کی فیکٹری فٹ ہے۔ ادھر بٹن دبایا اور ادھر کھٹ سے نظم باہر۔"

"میں بھی اسے بہت منع کرتی ہوں کہ اتنی نظمیں نہ کہا کرے" کلارا بولی "کہیں شادی کی نوبت آنے سے پہلے ہی دماغ نہ چل جائے۔"

"خیر تمہارا یہ اندیشہ تو بالکل فضول ہے" راحیلہ بولی۔ "نظمیں کہنے کے لئے وہ کیا دماغ استعمال کرتا ہے؟ بڑی بھولی ہو تم۔ البتہ یہ امکان ضرور موجود ہے کہ نظمیں سنتے سنتے تمہارا دماغ چل جائے گا۔"

میں نے محسوس کیا تھا کہ راحیلہ البی کا بہت ہی مذاق اڑاتی تھی مگر وہ نہایت ہی فراخدل اور خوش مزاج نوجوان تھا۔ قطعاً برا نہیں مناتا تھا۔ زود رنج نہیں تھا۔ بظاہر بڑا سنجیدہ اور فلسفی ٹائپ نظر آتا تھا مگر درحقیقت حسِ مزاح اس میں بھی موجود تھی۔

اس نے آہ بھرنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کچھ پانی اس کی ناک میں چلا گیا۔ زوردار چھینک لے کر وہ سوں سوں کرتا ہوا بولا "راحیلہ! ایک تو تمہارے ملک میں شاعروں کی قدر نہیں۔ بہت ناقدری کرتے ہو تم لوگ شاعروں کی۔"

"نہیں ... نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ شاعروں کی تو ہمارے یہاں بہت قدر ہے" راحیلہ نے زور دے کر کہا' پھر وہ بڑی معصومیت سے بولی "لیکن تم شاعر ہو کیا؟"

"تم لوگوں کی سنگدلی دیکھ کر میرا جی چاہ رہا ہے کہ یہیں ڈوب مروں" البی غوطہ لگاتے ہوئے بولا "حد ہو گئی ناقدری کی!"

"یہاں تو پانی کم ہے۔ ذرا آگے جا کر ڈوبنا" راحیلہ چلائی۔ "اور اگر مدد کی ضرورت ہو تو ہم بھی ساتھ چلتے ہیں۔ ڈوبنے میں تمہاری مدد کریں گے۔"

البی اپنے مخصوص انداز میں تیرتا ہوا دور چلا گیا۔ تقریباً ایک گھنٹے تک تیراکی کا شغل جاری رہا۔ ایک بار جب ہم لہروں کی تیزی کے باوجود کافی آگے تک نکل گئے تو راحیلہ نے ایک

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کچھ عرصہ پہلے تک یہ علاقہ اسمگلروں کی سب سے بڑی گزرگاہ تھا لیکن جب سے ادھر شپ بریکنگ کے باقاعدہ انتظامات ہوئے ہیں اور علاقہ ایک طرح سے صنعتی سا ہوگیا ہے تب سے اسمگلروں نے راستے بدل لئے ہیں۔"

اسمگلر! راحیلہ کی زبان سے یہ لفظ سنتے ہی جانے کیوں ایک لمحے کے لئے میری دھڑکن تیز ہوگئی۔ میں نے دزدیدہ نظر سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ کسی اور طرف دیکھ رہی تھی۔

بالآخر ہم تھک کر پانی سے نکلے اور ریت پر آلیٹے۔ کلارا بولی "مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔"

مصباح بولی "بھوک تو سبھی کو لگ رہی ہوگی یا عنقریب لگ جائے گی۔ یہ راحیلہ کی بچی ایک دم منہ اٹھاکر دوڑ پڑی۔ کھانے پینے کا کوئی بندوبست کرنے کے متعلق اس نے سوچا ہی نہیں... اور کچھ نہیں تو کم ازکم کسی ہوٹل سے لنچ باکس ہی ساتھ لے لیتے۔"

"تم یہ سمجھ لو کہ بھوک برداشت کرنا بھی ایڈونچر میں شامل تھا" راحیلہ بے پروائی سے بولی۔

"بھئی میرے لئے تو یہ کوئی مسئلہ نہیں" البی نے اطمینان سے کہا "مجھے تو اگر بھوک لگتی ہے اور کھانا میسر نہیں ہوتا تو میں دو سگریٹ پی لیتا ہوں" وہ اس وقت تک گاڑی سے اپنا سگریٹ کا پیکٹ نکال لایا تھا اور ایک سگریٹ سلگا چکا تھا۔

"اسی لئے تمہاری حالت حقے سے مشابہ ہوتی جارہی ہے" راحیلہ فوراً بولی۔ وہ البی کو خوار کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی تھی۔

"سگریٹ پینے والے کو حقے سے تشبیہہ دینے میں کوئی مناسبت نہیں ہے" البی اطمینان سے بولا "تمہارا خیال ہے کہ میں نے حقہ دیکھا نہیں ہے؟ کافی عرصہ ہوگیا ہے مجھے تمہارے ملک میں رہتے ہوئے۔"

راحیلہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ جانے کیا دیکھ کر خاموش ہوگئی اور قدرے متذبذب سے انداز میں اٹھ بیٹھی۔ وہ ہونٹ سکیڑے ایک طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔ باقی سب نے بھی اسی سمت میں دیکھا جدھر وہ دیکھ رہی تھی۔ سبھی گویا کچھ چونکے سے ہوگئے۔

دراصل ہمیں احساس ہی نہیں ہوسکا تھا کہ کب اور کس طرف سے وہ پانچ سیاہ فام اور کیم شحیم نوجوان وہاں آگئے تھے اور کافی فاصلے پر ایک ریتیلے ٹیلے کے قریب کھڑے کچھ زیادہ ہی متجسس نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہونٹ موٹے موٹے اور بال گھنگھریالے تھے۔ ان میں سے صرف ایک ہی کچھ پست قد تھا باقی چاروں دراز قد اور کسرتی جسم کے مالک تھے۔ پست قد بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ بھی گینڈے کی طرح گٹھا ہوا تھا۔

ہمیں اپنی طرف متوجہ پاکر انہوں نے اپنی نظروں کا زاویہ کچھ بدل لیا۔ ان میں سے ایک نے خاصی اونچی آواز میں کچھ کہا جس پر باقی چاروں نے ہم آہنگ ہوکر گونج دار سا قہقہہ لگایا۔ زبان کم ازکم میرے لئے اجنبی تھی اس کے باوجود مجھے اس نوجوان کا مفہوم سمجھنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ اس نے لڑکیوں کے بارے میں نہایت شرمناک سا تبصرہ کیا تھا۔ میری کھوپڑی ایک لمحے کے لئے گھومی لیکن میں خاموش اور منتظر رہا۔

وہ پانچوں ٹہلنے کے سے انداز میں ایک طرف کو چل دئے لیکن مڑ مڑ کر دیکھتے جارہے تھے اور ان کا مرکزِ نگاہ صرف لڑکیاں تھیں۔ مجھے، البی یا راشد کو تو انہوں نے گویا درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا تھا۔ آپس میں وہ کچھ باتیں بھی کرتے جارہے تھے تاہم اب ان کی آوازیں صحیح طور پر ہم تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔

وہ کچھ دور چلے گئے تو راحیلہ نے میری طرف دیکھ کر ایک گہری سانس لی۔ میں بھی جواباً محض مسکرا کر اور ایک گہری سانس لے کر ہی رہ گیا۔ البی کسی سارس کی طرح اکڑوں بیٹھ کر سگریٹ کا کش لیتے ہوئے بولا "تمہارے ملک میں نوے فیصد مرد اب بھی اسی طرح لڑکیوں کی طرف دیکھتے ہیں جیسے انہوں نے اس سے پہلے کبھی لڑکی نہیں دیکھی۔"

ہم خاموش رہے۔ کیا کہتے؟ بالآخر میں نے ہچکچاتے ہوئے انگریزی میں کہا "ممکن ہے انہوں نے لڑکی تو دیکھی ہو لیکن چار حسین لڑکیاں ایک وقت میں ایک ہی جگہ پر نہ دیکھی ہوں۔"

"ان ڈائریکٹ تعریف کا شکریہ مسٹر افضل!" ترک لڑکی جویریا فوراً بولی۔

"شکر ہے آپ بھی بولے" راحیلہ نے گویا اطمینان کی سانس لی "ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید آپ کی زبان کی سرجری کرانی پڑے گی۔ شاید تالو سے چپک گئی ہو۔"

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ مجھے انگریزی آتی تو اچھی خاصی تھی لیکن بولتے ہوئے جھجک محسوس ہوتی تھی۔ عادت جو نہیں تھی۔

ہم سمجھ رہے تھے کہ وہ پانچوں نوجوان جلد ہی ہماری نظروں سے اوجھل ہوجائیں گے لیکن وہ کچھ دور جاکر جیسے

...اح مشورہ سا کرکے لوٹ آئے۔ انداز اب بھی چہل قدمی کا تھا۔ اس بار وہ ٹہلتے ہوئے عین ہمارے سامنے سے ...زرے۔ ان کا گویا بس نہیں چل رہا تھا کہ آنکھوں ہی ...نکھوں میں لڑکیوں کو نگل جاتے۔ بڑی ڈھٹائی سے وہ ایک ...ں کا سرتاپا جائزہ لے رہے تھے۔ موٹے موٹے ہونٹوں پر ...ب وحشت آمیز سا کھنچاؤ تھا۔

اس بار انہوں نے صنفِ کرخت پر بھی ایک نظر ڈالنے ...زحمت کی تھی۔ راشد کو تو انہوں نے گویا بچہ سمجھ کر صرف ...بار ہی دیکھ کر نظرانداز کردیا تھا۔ البرٹ کا استخوانی سا جسم اور ...ے لمبے بال دیکھ کر انہوں نے اسے بھی کوئی اہمیت نہیں دی ...ا۔ غالباً وہ اسے کوئی مریل سا ہپّی سمجھے تھے۔

...صرف مجھے انہوں نے نظروں ہی نظروں میں تولا تھا۔ اگر ...کا بدمعاشی دکھانے کا کوئی ارادہ تھا تو غالباً انہیں صرف میری ...ے سے تھوڑی بہت مزاحمت کا خطرہ تھا۔

وہ ہم سے تھوڑے ہی فاصلے پر نیم دائرے میں کھڑے ...گئے۔ ان میں سے دو نے بیڑیاں سلگالیں اور پے در پے کئی ...سالے کر چٹکی بجا کر راکھ جھاڑنے لگے۔ وہ سب یوں... ...ری طرف دیکھ رہے تھے جیسے ہم چڑیا گھر کے پنجرے میں جانور ہیں اور وہ ٹکٹ خرید کر ہمارا نظارہ کرنے آئے ہیں۔

میں نے محسوس کیا کہ اب مزید خاموش رہ کر گزارا نہیں ...سکتا تھا لیکن میں ابھی اٹھا ہی تھا کہ راحیلہ مجھ سے پہلے اٹھ ...ان کے قریب جا پہنچی اور بڑے مؤدبانہ لہجے میں وہ بولی "کیا ...لوگ کہیں اور جاکر کھڑے نہیں ہوسکتے؟"

ان میں سے ایک حتی الامکان شوخ لہجے اور خاصی صاف ...میں بولا "کیوں؟ کیا یہ جگہ تم لوگوں نے خرید لی ہے؟"

اس سے پہلے کہ راحیلہ کچھ کہتی ایک اور نوجوان اس کی ...ئی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "غصہ چھوڑ د ...ریز کی بچی! چلو ہم تمہیں اپنے اڈے کی سیر کرا کے لاویں۔ ...رتیرس مرس بھی بہت ہے۔"

وہ شاید ہم سب کو ہی چرسی اور ہپّی سمجھ رہے تھے۔ ...بہرحال اس نوجوان کو وہ جملہ بہت مہنگا پڑا۔ راحیلہ نے اس ...بڑھتے ہوئے بازو پر کراٹے کا ہاتھ مارا پھر اس کے گھٹنے پر ...کر رسید کرکے اس کا توازن خراب کرتے ہوئے یوں اسے ...ٹایا کہ میں بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کب اور کس طرح منہ کے ...میرے پاس آگرا۔ اس کی ناک، منہ اور آنکھوں میں ریت ...بھر گئی۔

اس سے پہلے کہ وہ خود اٹھ پاتا میں نے بالوں سے پکڑ کر ...سے اٹھایا اور ایک زوردار لات رسید کرکے اس کے ساتھیوں

کی طرف دھکیل دیا جو ہکا بکا کھڑے تھے۔ انہیں شاید یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ان کے ساتھی کے ساتھ جو کچھ ہوا تھا وہ بظاہر نرم و نازک نظر آنے والی اسی لڑکی نے کیا تھا جسے غالباً انہوں نے دوسری لڑکیوں سمیت موم کی گڑیوں کی طرح اٹھا کر لے جانے کا ارادہ کیا تھا۔

میری لات کھا کر ان کا ساتھی ان سے جا ٹکرایا اور ان میں سے دو کو ساتھ لیتا ہوا ڈھیر ہو گیا۔ باقی دو گویا ہوش میں آکر ایک ساتھ راحیلہ پر جھپٹے لیکن وہ یوں ان کے درمیان سے نکل گئی کہ کوئی اسے چھو بھی نہ سکا۔ وہ دونوں آپس میں ٹکرا گئے اور راحیلہ نے بیک وقت ان دونوں کی گردنوں پر کراٹے کے ہاتھ رسید کئے۔

مجھے نہیں معلوم کہ ان دونوں پر اس وار کا کیا اثر ہوا کیونکہ میں ایک اور نوجوان کی طرف متوجہ ہو چکا تھا جو ریت سے اٹھتے ہوئے اپنی واسکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا سا چاقو نکال چکا تھا (آج لکھتے ہوئے میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ وہ ناجائز اسلحہ کا موجودہ دور نہیں تھا) اس سے پہلے کہ وہ چاقو کھول پاتا یا کھڑا ہو سکتا میں دوڑ کر اس تک پہنچا اور اس کے چاقو والے ہاتھ پر پوری قوت سے ٹھوکر رسید کی۔ دوسروں کی طرح میں بھی چونکہ ننگے پاؤں ہی تھا اس لئے میری ٹھوکر سے اس کا ہاتھ تو ناکارہ نہیں ہوا تاہم یہی غنیمت رہا کہ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر دور جا گرا۔

وہ بدبخت آکٹوپس کی طرح میری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور میں بھی ریت پر گر گیا۔ ہمارے درمیان زور آزمائی ہونے لگی۔ اس کی کوشش تھی کہ کسی طرح میری گردن گرفت میں لے سکے۔

اسی کشمکش کے دوران میں نے ایک نہایت حیران کن منظر دیکھا۔ استخوانی جسم کا مالک البرٹ اب تک بڑی لاتعلقی سے کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا گویا اس کے سامنے کوئی جھگڑا نہیں بلکہ بچوں کا کھیل تماشا ہو رہا ہو۔ کلارا، جویریا اور مصباح بھی ایک طرف کو ہو کر بیٹھ گئی تھیں۔

میری نظر البی پر پڑی تو اس نے سگریٹ ایک طرف اچھالی اور اپنے مخصوص انداز میں اونٹ کی طرح ہچکولے لیتا ہوا ایک نوجوان کے قریب پہنچا جو راحیلہ کو زیر کرنے کی کوششوں میں مصروف اپنے دو ساتھیوں کا ہاتھ بٹانے کے لئے لپک رہا تھا۔ البی نے اسے کندھے سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف کیا پھر بجلی کی سی پھرتی سے اس کی کمر اپنے بازوؤں کے حلقے میں جکڑ لی۔ اس کے سوکھے سوکھے سے بازوؤں کی گرفت یقیناً آہنی شکنجے سے کم نہیں تھی کیونکہ اس میں پھنستے ہی وہ ہٹا کٹا نوجوان ذبح ہوتے ہوئے کسی بکرے کی طرح ڈکرانے اور مچلنے لگا تھا۔

میری توجہ ایک لمحے کے لئے ادھر کیا ہوئی وہ نوجوان جس نے مجھے دبوچا ہوا تھا خاصی حد تک مجھ پر غالب آگیا۔ عین ممکن تھا کہ وہ میری گردن دبوچنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن خوش قسمتی سے مجھے ایک ثانیے کے لئے اس کی گرفت سے نکلنے کا موقع مل گیا اور میں نے فوراً ہی اسے اپنے گھٹنوں پر اچھال کر دور پھینک دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھ پاتا میں نے اسے جا دبوچا۔ کنپٹی کے ایک خاص حصے پر خاص انداز میں رسید کیا ہوا ایک ہی گھونسا اس کے لئے کافی رہا اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو میدان تقریباً صاف ہی تھا۔ دو نوجوان راحیلہ کے قدموں میں اوندھے پڑے تھے۔ دونوں کی ناکیں پچکی ہوئی سی لگ رہی تھیں اور ہونٹ پھٹ چکے تھے۔ ان کے چہرے خون اور ریت میں لتھڑے ہوئے تھے اور وہ گہری گہری سانسیں لے رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں۔

البی نے جس نوجوان کو بازوؤں کے شکنجے میں جکڑا تھا اب وہ بھی ریت پر چت پڑا تھا اور بے ہوش نظر آرہا تھا۔ راحیلہ نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے البی سے پوچھا "تم نے اسے مار تو نہیں ڈالا؟"

"نہیں... بس گردوں پر ہلکا سا دباؤ ڈالا تھا" البی نے سادگی سے جواب دیا۔

پانچواں نوجوان جو قد میں سب سے چھوٹا تھا سب سے عقلمند رہا تھا۔ اس نے زعم میں مبتلا رہ کر مزید مار کھانے کی حماقت نہیں کی تھی اور بھاگ نکلا تھا۔ جس وقت میں نے اس کی طرف دیکھا وہ بہت دور نکل چکا تھا۔ وہ نرم ریت پر بھی ایسی برق رفتاری سے دوڑ رہا تھا کہ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جلد ہی وہ ایک ٹیلے کے عقب میں غائب ہو گیا۔

"ایک تو ہمیں اس قسم کے بدبخت لوگ کہیں بھی چین سے تفریح ہی نہیں کرنے دیتے" راحیلہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولی "جہاں چلے جاؤ وہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔"

مصباح، جویریا اور کلارا بدستور ایک طرف اطمینان سے بیٹھی تھیں جیسے دھوپ سینک رہی ہوں۔ مصباح انگلی سے ریت پر کارٹون بناتے ہوئے بولی "تم تفریح کے لئے ہمیشہ جگہ بھی تو ایسی منتخب کرتی ہو... اللہ میاں کے پچھواڑے... تم خود جھگڑے کو دعوت دیتی پھرتی ہو۔ تمہاری پیشانی پر لکھا ہے آیئے آیئے حضرات! دنگا فساد کیجئے میں آپ کو خوش آمدید کہتی ہوں، تم خود ایسی جگہوں پر آکر اور ساتھ ہمیں بھی لا کر بدمعاشوں کو غنڈہ گردی کی اجازت دیتی ہو۔"

"دراصل میں چاہتی ہوں کہ ایسی جگہیں بھی کسی طرح تمام شرفاء کے لئے تفریح کے قابل ہو جائیں" راحیلہ گہری سنجیدگی سے بولی "میری خواہش ہے کہ بدمعاشوں میں ایسی دہشت پھیلے کہ آئندہ وہ سیدھی سادی فیملی کے بھی قریب آتے ہوئے ڈریں کہ مبادا ان کی لڑکیاں جوڈو کراٹے کی ماہر ہوں، مبادا ان کے مرد بھی ہڈی پسلی ایک کرنے میں مہارت رکھتے ہوں۔"

"منہ دھو رکھو اپنا" مصباح جلے کٹے سے انداز میں بولی۔ "تمہارا یہ خواب کبھی پورا نہیں ہوگا۔ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑے گا۔ تم ادھر ویرانوں سے غنڈہ گردی ختم کرنے کا ارمان لئے پھر رہی ہو اور ادھر عالم یہ ہے کہ بھرے پرے بازاروں میں غنڈے کمزور اور مجبور لڑکیوں کو چھیڑتے ہیں، بے عزت کرتے ہیں۔"

"میرا جہاں تک بس چلے گا میں تو وہیں تک کر سکتی ہوں" راحیلہ بال جھٹک کر بے نیازی سے بولی۔

البی ایک نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "اب ہمیں یہیں کھڑے ہو کر باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ وہ نوجوان دوڑتا ہوا جس طرف گیا ہے مجھے خطرہ ہے کہ اس طرف اس کا کوئی قبیلہ وغیرہ نہ رہتا ہو... وہ دیکھو... مچھیرے بھی دوڑتے ہوئے اسی سمت میں جا رہے ہیں۔ شاید ان کا تعلق بھی اسی قبیلے سے ہو۔ کہیں بہت زیادہ تعداد میں لوگ اسلحہ وغیرہ لے کر نہ آجائیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہم بھاگ چلیں۔"

"کھوپڑی خالی ہونے کے باوجود کبھی کبھی تم بڑی عقل کی بات کر جاتے ہو" راحیلہ بولی۔ پھر اس نے مڑ کر سب کو اشارہ کیا "آؤ ساتھیو! اس سے پہلے کہ ہمیں چٹنی بنانے کی کوشش کی جائے بہتر یہی ہے کہ ہم دم دبا کر بھاگ لیں۔"

ساحل پر ایک کچی سی چار دیواری اور اس کے وسط میں ایک چھپر بنا ہوا تھا۔ البی اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "جانے سے پہلے ہم ان بے ہوش آدمیوں کو اس چھپر میں نہ لٹا جائیں۔"

"عقل کی صرف ایک بات کر کے فوراً ہی اپنی اوقات پر آگئے اور کرنے لگے وہی احمقوں والی باتیں" راحیلہ گویا جل کر بولی "بھائی! یہ لوگ ہمارے اعلیٰ اخلاق سے متاثر ہو کر بعد میں ہمیں شکریے کا خط نہیں لکھیں گے۔ یہ جہاں پڑے ہیں انہیں وہیں پڑے رہنے دو اور چلو۔"

البی لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا نہایت سعادتمندی سے ہمارے ساتھ ہو لیا۔ چند لمحے بعد ہماری اسٹیشن ویگن دھول اڑاتی ہوئی واپس سڑک کی طرف جا رہی تھی۔ میں حسب سابق راحیلہ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔

راحیلہ مڑتے ہوئے بولی "ذرا کچھ دیر پیچھے کا خیال رکھنا کہ کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں تو نہیں آرہی۔"

"تمہیں آگے نکلنے کے لئے جتنی مہلت مل چکی ہے اس کے بعد کوئی گاڑی تمہاری گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتی" البی بولا۔

البی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ مضافاتی علاقے میں تو ٹریفک برائے نام ہی تھا اس لئے راحیلہ اپنی گاڑی سے ہوائی جہاز کا کام لینے کی کوشش کرتی رہی۔ مصروف سڑکوں پر پہنچ کر اس نے رفتار کچھ کم کی۔ بالآخر گاڑی ایک نہایت مشہور ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں جا رکی۔

ہمارے کپڑے اس وقت تک اچھی طرح خشک ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود ہمارے حلیے معقول ہرگز نہیں تھے۔ میں اکیلا شاید اس حلیے میں اس ہوٹل کا رخ کرنے کی بھی ہمت نہ کرتا لیکن اس وقت گروپ کی لیڈر راحیلہ تھی اور وہ جس بے فکری اور اعتماد سے گاڑی سے اتر کر ریوالونگ ڈور کی طرف چل دی تھی اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ باقاعدگی سے یہاں آتی رہی ہے۔ چنانچہ اس کی قیادت اور دوسرے ساتھیوں کی ہمراہی میں مجھے بھی اندر جاتے ہوئے قطعاً جھجک محسوس نہ ہوئی۔ ہم ہوٹل کے ریستوران میں جا بیٹھے۔

اس وقت ریستوران میں کھانا کھانے والے اِکا دُکا ہی تھے۔ ان سے زیادہ تو ویٹر موجود تھے۔ ان سب نے بڑی انکساری سے دانت نکال نکال کر راحیلہ کو سلام کیا۔ یقیناً وہ سب راحیلہ کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ ہم نے ایک بڑی میز سنبھال لی۔

کھانے کے دوران بھی ایک دوسرے پر فقرہ بازی ہوتی رہی۔ راشد سب سے کم بولتا تھا تاہم اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ وہ بور ہرگز نہیں ہو رہا۔ راحیلہ اٹالین سینڈوچ کا ایک لقمہ چباتے ہوئے بولی "ویسے خیر... آج کا ایڈونچر بھی برا نہیں رہا۔"

"ہاں۔ اگر وہ لوگ تعداد میں زیادہ ہوتے اور ہمیں اٹھا لے جانے میں کامیاب ہو جاتے تب تو اس ایڈونچر میں چار چاند ہی لگ جاتے" مصباح منہ بنا کر بولی "فلمی ہیروئن کی طرح ہمارا تو کوئی بھائی بھی نہیں تھا کہ ہم منہ پر ہاتھ سے بھونپو بنا کر زوردار آواز لگاتیں "ویرا...!" اور ڈیڑھ سو میل دور بیٹھا ہوا ہمارا بھائی جو اتفاق سے فلم کا ہیرو بھی ہوتا، بیل گاڑیوں اور تانگوں کو الٹتا ہوا ہم تک آن پہنچتا اور اپنی بہن کی عزت پر ہاتھ ڈالنے والوں کا بھرتا بنا دیتا۔"

"تم مجھے اپنا بھائی سمجھو" راشد نے سینے پر ہاتھ رکھ کر

بڑے خلوص سے کہا۔

"تمہیں؟" منصاح نے استہزائیہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "کتنا شوق ہے تمہیں بھائی بننے کا" پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تمہارا قصور نہیں۔ تمہاری عمر ہی ایسی ہے۔ اس عمر میں لڑکوں کو بڑا شوق ہوتا ہے لڑکیوں کو بہن بنانے کا لیکن تم جیسے بھائی کا ہونا نہ ہونا تو برابر ہی ہے۔ اب وہاں ساحل پر اتنی اٹھا پٹخ ہوئی مگر مجال ہے جو تم نے انگلی بھی ہلائی ہو' ہمارے ساتھ ہی کندھے سے کندھا جوڑے بیٹھے رہے۔"

راشد کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے کھسیاہٹ کی سرخی آئی لیکن پھر وہ گویا ڈھیٹ بن کر راحیلہ کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے بولا "مجھے لڑنے کی کیا ضرورت تھی۔ میرا شیر جو لڑ رہا تھا میدان میں۔"

منصاح گویا میری معلومات میں اضافہ کرنے کی غرض سے میری طرف مڑتے ہوئے بولی " ان بھائی بہن کا معاملہ بھی الٹ قسم کا ہی ہے۔ میں انہیں بچپن سے جانتی ہوں اور بچپن سے ہی ان کا یہ عالم ہے کہ راشد کا کسی لڑکے سے جھگڑا ہو جاتا تھا تو یہ روتا ہوا سیدھا راحیلہ کے پاس جاتا تھا کہ فلاں لڑکے نے مجھے مارا ہے اور راحیلہ جا کر اس لڑکے کی پٹائی کیا کرتی تھی۔"

راحیلہ اس گفتگو میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ اس نے چٹکی بجا کر ویٹر کو بلایا اور حکم دیا "بل لاؤ"

ویٹر ایک فولڈر میں لپٹا ہوا بل تھالی میں رکھ کر لے آیا تو میں نے اپنی دانست میں اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی غرض سے ادائیگی کے لئے جیب میں ہاتھ ڈال کر پرس نکالا اور پلیٹ اپنی طرف کھسکانے کی کوشش کی۔ راحیلہ اور منصاح جانے کیوں ہنس دیں۔ راحیلہ نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر مجھے بل اٹھانے سے روک دیا۔ اس گرم و گداز ہاتھ کے لمس سے میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ مجھے یقین نہ آیا کہ یہی وہ ہاتھ تھا جس نے دو تنومند نوجوانوں کی شکلیں بگاڑی تھیں۔

"آپ شاید بھول گئے ہیں کہ آپ ہمارے مہمان ہیں" راحیلہ بولی "ویسے تو خیر ہم بوقت ضرورت مہمانوں سے بھی چندہ وصول کر لیتے ہیں لیکن فی الحال ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

ویٹر اس کے لئے قلم بھی لایا تھا۔ راحیلہ نے بڑے اطمینان سے بل پر دستخط کر دیئے اور ویٹر بل واپس لے گیا۔ راحیلہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "یہاں آپ کی اس حقیر خادمہ کے سائن چلتے ہیں" جس شیریں لہجے میں اس نے "آپ کی اس حقیر خادمہ" کہا تھا اس نے جانے کیوں ایک لمحے کے لئے میری دھڑکن تیز کر دی۔

"اتنی انکساری اور کسر نفسی بھی کس کام کی جو مجھ جیسے پینڈو کا دماغ خراب کر دے" میں نے کہا اور فوراً ہی پوچھ لیا۔ "سمجھتی ہیں نا آپ .... کہ پینڈو کسے کہتے ہیں؟"

"کیوں نہیں سمجھتی" وہ گویا میری سادگی پر ہنستے ہوئے بولی "خاندانی طور پر ہم خود بہت بڑے پینڈو ہیں۔ میرے والد کا تعلق مشرقی پنجاب کے ایک بہت چھوٹے سے گاؤں سے ہے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھی بات ہے" میں نے خوشی کا اظہار کیا۔ "گویا وہی معاملہ ہو گا کہ ... خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے پینڈو دو۔"

"مصرع وزن سے گر گیا ہے" وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔ "اس سے تو بہتر تھا کہ آپ اس طرح ترمیم کرتے۔ خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیہاتی دو۔"

"گویا آپ کو مصرعوں کا وزن بھی درست کرنا آتا ہے؟" میں واقعی حیرت زدہ رہ گیا" اس چھوٹی سی عمر میں آپ کو کیا کچھ آتا ہے؟"

"دیکھتے جایئے" وہ اٹھتے ہوئے بولی "ویسے برسبیل تذکرہ میں کچھ ایسی چھوٹی بھی نہیں' اکیس سال عمر ہو چکی ہے میری۔"

"حیرت ہے!" میں نے بھی دوسروں کے ساتھ اٹھتے ہوئے کہا "میں تو آپ کو سترہ اٹھارہ سے زیادہ کی نہیں سمجھ رہا تھا۔"

"میری عمر' اہلیت' شخصیت' خیالات اور نظریات کے بارے میں اکثر لوگ دھوکا کھا جاتے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

میں خاموش رہا۔ ایک بار پھر میرا یہ احساس جاگ اٹھا تھا کہ میں جب سے اس سے ملا تھا میرا زیادہ تر وقت اسی کے بارے میں سوچتے ہوئے گزرا تھا۔

واپسی میں راحیلہ نے سب کو باری باری ان کے گھروں پر اتارا اور پھر اپنے گھر کا رخ کیا۔ گھر پہنچ کر اپنے کمرے کی طرف جاتے ہوئے وہ بولی "اب میں ذرا اپنا یونیورسٹی کا کچھ کام کروں گی۔ اس کے بعد مجھے ایک پروفیسر صاحب کے گھر جانا ہے۔ رات کے کھانے پر ملاقات ہو گی۔ اس کے بعد تاش کی محفل جمے گی۔"

میں گیسٹ روم کی طرف جانے کے لئے مڑا۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ اب تک مجھے قاسم خان کو فون کر کے اطلاع دے دینی چاہئے تھی کہ میں کہاں موجود ہوں۔

"راحیلہ! مجھے لاہور ایک فون کرنا ہے" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"تو اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" وہ بڑی حیرانی سے بولی "آپ کے کمرے میں ایک فون کا ایکسٹینشن موجود ہے۔" وہ مسکرائی۔

اپنے کمرے میں ایکسٹینشن میں بھی دیکھ چکا تھا۔ میرا مقصد راحیلہ سے یہی تصدیق کرنا تھا کہ میں اسے استعمال کر سکتا ہوں۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور کچھ دیر آرام کرنے کے بعد دوبارہ باہر آنے سے پہلے فون پر قاسم خان سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی۔ فون پر ایک انتہائی مترنم آواز نے مجھے بتایا کہ قاسم خان گھر پر موجود نہیں ہے۔ اور ساتھ ہی پوچھا "آپ محمد افضل بول رہے ہیں نا؟"

میں حیران رہ گیا۔ اتنی مترنم آواز والی کسی ہستی کے لئے میری آواز اتنی شناسا کب سے ہو گئی تھی کہ فون پر بھی پہچان لی تھی؟

"جی ہاں" میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا "اور آپ کون ہیں؟"

ایک مترنم ہنسی نے میرے کانوں میں رس گھولا "حیرت ہے آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ اور قیاس لگانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں مسز خان ہوں۔"

"اوہ...." میں نے ایک گہری سانس لی' بلاشبہ اس عورت کی آواز بھی بے پناہ خوبصورت تھی۔ میں نے اسے چند ایک مرتبہ قاسم خان کے گھر پر میٹنگ کے دوران بیٹھے دیکھا تھا لیکن وہ ہمیشہ نہایت لاتعلقی اور خاموشی سے بیٹھی رہتی تھی بلکہ ہر بار میں حیران ہوتا تھا کہ اگر اسے اسی طرح لاتعلق اور خاموش رہنا ہوتا تو وہ میٹنگوں میں بیٹھتی ہی کیوں تھی؟ شرفو سے اس کے بارے میں تھوڑا بہت جان لینے کے بعد میرے ذہن میں اس کا تصور ایک ایسی عورت کا تھا جو بہت بھٹکنے کے بعد بالآخر اپنی منزل پا کر نہایت آسودگی و سکون اور پاکبازی سے ایک طرف بیٹھی سپاٹ زندگی گزار رہی تھی جس کی ایک علامت یہ تھی کہ قاسم خان اس کی خوشنودی کی خاطر گھر میں اس کے سامنے شراب کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا بلکہ گھر میں اس نے شراب نوشی کا کوئی بندوبست ہی نہیں رکھا تھا۔ گروہ کے تمام ارکان کی میٹنگ کے دوران بھی کافی یا چائے وغیرہ کا دور چلتا تھا۔

"آواز سے نہ پہچاننے میں میرا زیادہ قصور نہیں میڈم!" میں نے اپنے لہجے میں حتی الامکان مٹھاس سموتے ہوئے کہا۔ "میری زندگی میں آپ پہلی اور شاید آخری خاتون ہیں جنہیں میں نے جب بھی دیکھا ہے خاموش ہی دیکھا ہے۔"

مترنم ہنسی نے ایک بار پھر میرے اعصاب کو گدگدایا۔ "میں بلا ضرورت بولنے کی قائل نہیں۔" اس نے پہلے سے زیادہ شیریں لہجے میں کہا پھر غالباً وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "کیا آپ کراچی میں سیٹھ واحد سے مل چکے؟"

مجھے ایک بار پھر حیرت کا خاصا زوردار جھٹکا برداشت کرنا پڑا۔ میرا خیال تھا کہ میری کراچی میں موجودگی بھی اس کے علم میں نہیں ہونی چاہئے تھی جبکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ قاسم خان نے مجھے کراچی میں سیٹھ واحد سے ملنے کی ہدایت کی تھی۔ مجھے ایک چھوٹا سا پیکٹ جس پر ایک قسم کی سیل بھی لگی ہوئی تھی' سیٹھ واحد کے حوالے کرنا تھا اور کچھ گفتگو کرنی تھی۔ وہ جو بھی جواب دیتا اسے قاسم خان تک پہنچانا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس معاملے سے میرے اور قاسم خان کے علاوہ کوئی واقف نہیں تھا۔

"میں سمجھ رہا تھا کہ یہ بات صرف میرے اور خان صاحب کے درمیان ہے میڈم!" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بے شک" وہ ملائمت سے بولی۔ "یہ بات آپ دونوں کے ہی درمیان ہے۔ مجھے اس کا کوئی سرپیر نہیں معلوم۔ اور نہ ہی میں معلوم کرنا چاہتی ہوں۔ مجھے تو خود ہی خان صاحب کہہ گئے تھے کہ اگر ان کی عدم موجودگی میں آپ کا فون آجائے تو پوچھ لوں کہ آپ سیٹھ واحد سے مل چکے ہیں یا نہیں۔"

"اوہ..." میں نے اطمینان کی سانس لی۔ "آپ انہیں بتا دیجئے گا کہ آج تو کراچی پہنچے ہوئے مجھے صحیح معنوں میں پہلا ہی دن ہے۔ ایک آدھ دن میں مل لوں گا اور اس کے بعد دوبارہ فون کروں گا۔"

"بہت بہتر۔"

"احتیاطاً آپ میرا فون نمبر نوٹ کر لیجئے" میں نے کہا اور فون نمبر اسے نوٹ کرانے کے بعد خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ریسیور رکھنے کے بعد جانے کیوں میں دیر تک اس عورت کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس میں کوئی عجیب بات ضرور تھی بلکہ بہت سی باتیں عجیب تھیں۔ آج اس کے لہجے نے بھی مجھے چونکا دیا تھا۔ اپنے گھر میں میٹنگوں کے دوران اس نے کبھی صحیح طور پر نظر اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا لیکن آج سیکڑوں میل دور سے فون پر بات کرتے وقت اس کا لہجہ بے حد مہربان تھا نہ جانے کیوں؟

بالآخر اپنے خیالات کو ذہن سے جھٹک کر میں نے اپنا

بیگ ٹٹول کر ایک چٹ نکالی۔ اس پر کچھ فون نمبر لکھے ہوئے تھے۔ میں نے سیٹھ واحد کے گھر کا نمبر ڈائل کیا۔

"سیٹھ واحد کی رہائش گاہ۔" دوسری طرف سے ایک مردانہ آواز نے ٹیلیفون آپریٹروں کے سے لہجے میں کہا۔ "فرمائیے آپ کو کس سے بات کرنی ہے؟" مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میری کال کسی گھر سے نہیں بلکہ ٹیلیفون ایکسچینج سے ریسیو کی گئی ہے۔

"سیٹھ واحد سے۔" میں حتی الامکان پُر وقار لہجے میں بولا۔

"میں ان کی سیکریٹری سے ملاتا ہوں۔ وہی سیٹھ صاحب سے آپ کی بات کرا سکیں گی۔" اس شخص نے کہا اور فون پر کلک کلک کی آواز سنائی دینے لگی۔

"خدایا! یہ کس قسم کا آدمی ہے جس نے گھر پر بھی سیکریٹری رکھی ہوئی ہے؟" میں نے سوچا۔ اسی لمحے دوسری طرف سے ایک خوش گوار نسوانی آواز سنائی دی۔ "جی فرمائیے۔"

میں نے اپنی درخواست دُہرائی تو اس نے گویا میرا انٹرویو لینا شروع کر دیا۔ میں کون ہوں، کس سلسلے میں سیٹھ واحد سے بات کرنا چاہتا ہوں وغیرہ وغیرہ۔

"بی بی" میں نے قدرے اکتا کر کہا۔ "آپ سیٹھ صاحب سے فقط اتنا کہہ دیں کہ لاہور سے سیٹھ قاسم کا آدمی آیا ہے اور کاروباری سلسلے میں آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

اس کے بعد جلد ہی سیٹھ واحد سے میرا رابطہ ہو گیا۔ اس نے بغیر کسی تعارف کے یوں سرسری انداز میں خیریت دریافت کی جیسے اسے جلدی کہیں جانا ہو۔ مجھے قاسم خان نے بتا دیا تھا کہ اس بات کا قوی امکان ہے کہ سیٹھ واحد کے فون ٹیپ ہوتے ہوں اس لئے میں نے حتی الامکان محتاط لہجے میں کہا۔ "سیٹھ صاحب! پچھلے ماہ آپ لاہور تشریف لائے تھے تو ایک ڈنر میں سیٹھ قاسم خان نے آپ سے ایک نئے آئٹم کی ایکسپورٹ کا ذکر کیا تھا اور آپ نے اس میں دلچسپی ظاہر کی تھی، میں اسی سلسلے میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔ نمونہ بھی ساتھ لایا ہوں۔ سیٹھ قاسم کو اصل میں نئی منڈیوں کی تلاش ہے اور اب وہ آپ جیسے بڑے لوگوں کا تعاون یا پارٹنرشپ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں۔"

دوسری طرف ایسا سکوت طاری رہا کہ مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید سیٹھ واحد نے سلسلہ منقطع کر دیا ہے لیکن اس سے پہلے کہ میں اس کی تصدیق کرتا سیٹھ کی آواز سنائی دی۔ "آپ کل علی الصبح میرے دفتر میں آ جائیے...." اس کا لہجہ ہر تاثر سے عاری تھا اور وہ کچھ اکھڑی اکھڑی سی اردو بول رہا تھا۔ "میں تو تقریباً آٹھ بجے دفتر پہنچ جاتا ہوں۔ اس وقت میرے اسٹاف میں سے کوئی بھی نہیں آیا ہوتا۔ میں اپنے اہم معاملات اسی وقت طے کرتا ہوں۔ آپ میری سیکریٹری کو اپنا ایڈریس لکھوا دیں۔ صبح میرا ڈرائیور آپ کو آپ کی قیام گاہ سے لے لے گا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا کلک کی سی آواز سنائی دی اور ایک لمحے کے سکوت کے بعد سیکریٹری کی آواز ابھری "اپنا ایڈریس لکھوا دیجئے۔"

میں نے بادل ناخواستہ ایڈریس لکھوا دیا۔

.......○.......

دوسری صبح جلد اٹھنے کے لئے میں ٹیبل کلاک میں الارم لگا کر سویا تھا۔ الارم بجنے پر میں اٹھ تو گیا لیکن تیار ہونے میں پھر بھی دیر لگ گئی۔ اس وقت میں جوتے پہن رہا تھا جب انکل زاہد کے ملازم نے آ کر مجھے بتایا کہ ایک گاڑی مجھے لینے کے لئے ڈرائیو وے میں کھڑی ہے۔

میں جب عقبی روش سے گزر کر چکر کاٹتے ہوئے گیٹ کی طرف جا رہا تھا تو میں نے راحیلہ کو ٹریک سوٹ پہنے ورزش اور جوڈو کراٹے کی مشق کرتے دیکھا۔ وہ ہوا میں اتنی بلندی تک قلابازیاں کھا رہی تھی کہ دیکھنے والا بے اختیار دل تھام لے۔ مجھ پر نظر پڑی تو وہ ایکشن ترک کر کے روش کے قریب آتے ہوئے بولی۔ "یہ آپ کو کس کی گاڑی لینے آئی ہے؟" اس کی سانس پھولی ہوئی نہیں تھی، صرف معمولی سا ارتعاش تھا آواز میں۔ گو کہ چہرہ تمتما رہا تھا۔

"سیٹھ واحد کی۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

"سیٹھ واحد کو آپ سے یا آپ کو سیٹھ واحد سے کیا کام پڑ گیا؟" اس نے پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں پوچھا۔ میری دھڑکن قدرے تیز ہو گئی۔

"آپ جانتی ہیں سیٹھ واحد کو؟" میں نے زبردستی مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"افضل صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "ہماری فیملی تقسیم کے بعد سے ہی یہاں آباد ہے۔ تھوڑے بہت لوگوں کو تو ہم جانتے ہی ہیں۔"

"بس ان سے تھوڑا سا کاروباری مسئلہ بن رہا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ کو تو معلوم ہو ہی گیا ہو گا کہ وہ کتنے بڑے ایکسپورٹر ہیں۔"

اس نے آہستگی میں سر ہلا دیا۔ بولی کچھ نہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شاید وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی بھی تھی۔ پھر وہ خاموشی سے مڑی اور لان کے ایک گوشے میں جا کر اچھل کود کرنے لگی۔

میرا دل کچھ بجھ سا گیا۔ میرے شعور کے کسی دور افتادہ

گوشے میں خطرے کی مدھم سی گھنٹی بج رہی تھی۔ آج دوسری مرتبہ مجھ سے غلطی سرزد ہوئی تھی۔ پرسوں میں جب یہاں پہنچا تھا تو کھانے کی میز پر انکل زاہد نے مجھ سے میرے کاروبار کے بارے میں پوچھ لیا تھا اور میں نے فوراً گھڑا گھڑایا جواب دے دیا تھا۔ امپورٹ ایکسپورٹ ...... لیکن جب انہوں نے یونہی سرسری سے انداز میں نائیلون کی ساڑیوں پر ریبیٹ کے بارے میں پوچھا تھا تو میں گڑبڑا گیا تھا اور اب میں نے راحیلہ کے سامنے سیٹھ واحد کے ہاں جانے کی بات کر دی تھی۔ انسان لاکھ چالاک اور محتاط ہو لیکن قدرت جب اس سے غلطی کرانا چاہتی ہے تو اس کی زبان سے کوئی نہ کوئی غلط بات نکلوا دیتی ہے۔

گیٹ کی طرف جاتے وقت میں یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میری ان مبہم سی غلطیوں سے مجھے کیا نقصان پہنچ سکتا ہے؟ فوری طور پر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میں خوامخواہ ہی پریشان ہو رہا تھا۔ میں شاید انکل زاہد اور راحیلہ کے طرز عمل کے جو معانی اخذ کر رہا تھا وہ میرے اپنے ہی اندرونی خوف کی پیداوار تھے۔ چور کی داڑھی میں تنکا والا معاملہ تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ انکل زاہد یا راحیلہ کے دل میں میرے پیشے کے متعلق کوئی شک پیدا ہوا ہو۔

میں ڈرائیو وے میں پہنچا تو گاڑی دیکھ کر ایک بار تو میری آنکھیں چندھیا گئیں۔ وہ گہرے سرخ رنگ کی ایک چم چم کرتی سرخ مرسڈیز تھی جس کا باوردی ڈرائیور پاس کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں نے ٹائی کی گرہ درست کی اور خوامخواہ ہی کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے گاڑی کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور نے سلام کر کے لپک کر میرے لئے دروازہ کھولا اور میں پچھلی نشست پر جا بیٹھا۔

گاڑی کیا تھی، آرام و آسائش کے بہت سے انتظامات سے آراستہ گویا ایک چھوٹا سا گھر تھا جو سڑکوں پر ہچکولے لے رہا تھا۔ باہر کی آوازیں اندر نہیں پہنچ رہی تھیں اور اس کے اپنے انجن کی آواز سوتی ہوئی بلی کی خرخراہٹ سے مشابہ تھی۔

کچھ دیر بعد گاڑی غالباً شہر کے مرکزی علاقے میں جا پہنچی۔ یہاں سڑکیں زیادہ چوڑی نہیں تھیں اور ہر جگہ گاڑیوں کا ہجوم تھا۔ ہر سڑک کے دونوں طرف بلند و بالا عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں اور یہ سب مرکزی دفاتر معلوم ہوتے تھے۔ بالآخر گاڑی ایسی ہی ایک خوبصورت اور نو تعمیر شدہ عمارت کی پارکنگ لاٹ میں داخل ہوئی اور آہنی زنجیروں سے گھری ہوئی ایک ایسی جگہ پر جا رکی جو غالباً صرف اسی کے لئے مخصوص تھی۔

میں ڈرائیور کی رہنمائی میں ایک لفٹ تک پہنچا۔ ڈرائیور لابی ہی میں رکتے ہوئے لفٹ بوائے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مودبانہ لہجے میں بولا۔ "یہ آپ کو سیٹھ صاحب کے دفتر تک لے جائے گا۔"

"آئیے آئیے سر!" لفٹ آپریٹر انکساری سے دانت نکالتے ہوئے بولا۔ اس وقت عمارت میں اکا دُکا لوگ ہی آتے جاتے نظر آ رہے تھے۔

سیٹھ واحد کا دفتر چھٹی منزل پر تھا اور غالباً پورا فلور ہی اس کے پاس تھا۔ لفٹ آپریٹر مجھے دروازے پر چھوڑ کر چلا گیا۔ دروازے کی خوبصورت ناب پر ہاتھ رکھتے وقت میرے دل کی دھڑکن معمول سے کچھ تیز ہو چکی تھی۔ میں اس شخص سے ملنے جا رہا تھا جو ہماری مخصوص دنیا میں ایک افسانوی کردار کی طرح مشہور تھا۔ اس کے گرد اتنے افسانوں اور کہانیوں کا جال بُنا ہوا تھا کہ اصل شخصیت کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ معلوم نہیں ان افسانوں اور قصے کہانیوں میں مبالغہ آرائی کس حد تک تھی۔ سیٹھ واحد کے بارے میں بہت کچھ مجھے اپنے طور پر معلوم تھا اور بہت کچھ قاسم خان نے مجھے بتا کر بھیجا تھا۔ قاسم خان ہماری نظر میں بہت بڑا دولت مند آدمی تھا، ہمارا بگ باس لیکن سیٹھ واحد...... کا ذکر وہ یوں کرتا تھا جیسے کوئی طفل مکتب کسی بہت بڑے استاد کی بات کر رہا ہو۔ میرے ذہن میں اس کا خاکہ بے حد متاثر کن تھا۔

دروازہ کھول کر میں نے اندر قدم رکھا تو خود کو ایک طویل و عریض ہال میں پایا۔ میرے بائیں ہاتھ پر ایک خوبصورت ریسپشن کاؤنٹر تھا جس پر تین ٹیلی فون سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ ہر ایک کا رنگ اور ساخت دوسرے سے مختلف تھی۔ اسی کاؤنٹر سے ملحق ایک اور چھوٹا سا کاؤنٹر تھا جس کے عقب میں چھوٹا سا داخلی ایکسچینج کا بورڈ نصب تھا۔

ہال میں دونوں طرف شیشے اور پلائی ووڈ کی دیواروں سے چھوٹے بڑے کیبن بنے ہوئے تھے جن میں میزیں کرسیاں اور دیگر تمام دفتری لوازمات سجے ہوئے تھے۔ ہال کے اختتام پر سامنے تین دروازے نظر آ رہے تھے جن پر پیتل کی نیم پلیٹیں چمک رہی تھیں۔ ہال میں کہیں بھی کسی نشست پر کوئی بھی کارکن نظر نہیں آ رہا تھا۔ غالباً ابھی آنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔

ہال کے اختتام پر تینوں دروازے بند تھے تاہم ایک دروازے پر تھری پیس سوٹ میں ایک تنومند اور دراز قد شخص کھڑا تھا۔ سوٹ اس کے مضبوط اور ورزشی جسم پر کچھ پھنسا پھنسا سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ پختہ العمر ہی تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ جیسے میرا ہی منتظر تھا اور جیسے

ہی میں نے ہال میں قدم رکھا اس کی عقابی نظروں نے میرا سرتاپا جائزہ لے لیا تھا۔

میں کیبنوں کے درمیان سے گزرتا ہوا اس کی طرف بڑھا۔ کہیں سے ائیر کنڈیشنر کی مدھم سی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس شخص نے آگے بڑھ کر میرا استقبال کیا اور گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے سوالیہ لہجے میں بولا۔ "مسٹر افضل ؟"

میں نے اثبات میں سرہلایا تو وہ جواباً اپنا تعارف کرائے بغیر بولا "سیٹھ صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے عقب سے یوں میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا گویا اپنائیت کا اظہار کرنا مقصود ہو پھر وہ ہاتھ پھسلتا ہوا میرے کوٹ کی جیب تک چلا گیا مجھے یہ سمجھنے میں قطعاً کوئی دشواری نہیں ہوئی کہ اس شخص نے حقیقتاً سرسری لیکن نہایت مشاق انداز میں یہ جاننے کی کوشش کی تھی کہ میرے پاس کوئی آتشیں ہتھیار تو موجود نہیں۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد ایک لمحے کے لئے مجھے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ بالکل اسی طرح ...... جیسے قاسم خان کو پہلی مرتبہ دیکھنے پر مجھے مایوسی ہوئی تھی۔ اس وقت میں نے اس کے باڈی گارڈ اعظم خان کو پہلے دیکھ لیا تھا اور میں اسی بارعب اور خونخوار انسان کو قاسم خان سمجھا تھا۔

کمرے میں ایک بڑی سی خوبصورت میز کے عقب میں کھڑکی کے قریب ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ اسٹینڈ پر رکھا ہوا ایک خوبصورت بریف کیس کھولے کسی چیز کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ وہ ایک میانہ قامت اور قطعی عام سا آدمی تھا۔ اس کے جسم پر ایک معمولی سا سوٹ تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس نے کئی دن سے پہنا ہوا ہے۔

کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا اور روشنی میں اس کے خمدار بال خوب چمک رہے تھے اور کمرے میں چنبیلی کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے سر میں یقیناً چنبیلی کا تیل چپڑ رکھا تھا۔ اس کی بریسٹ پاکٹ سے ایک سستا سا قلم جھانک رہا تھا۔ اس قسم کے قلم اس انداز میں کلرک بابوؤں نے جیب میں سجا رکھے ہوتے ہیں۔

اس کی گاڑی اور اس کے آفس کا سیٹ اپ وغیرہ دیکھنے کے بعد مجھے امید تھی کہ اس کی شخصیت اگر متاثر کن نہیں بھی ہوگی تب بھی اسے دولت کی چمک دمک نے کافی حد تک سنوار اور نکھار دیا ہوگا اور اس کے سراپا اور رکھ رکھاؤ سے نفاست اور وضع داری جھلکتی ہوگی۔ شخصیت تو چلئے خدا نے بنیادی طور پر جیسی بھی بنائی ہوتی ہے لیکن میرا خیال تھا کہ دولت کی مدد سے انسان کچھ نہ کچھ پرکشش سا ضرور نظر آتا ہے۔ شخصیت کتنی ہی کمتر کیوں نہ ہو اس میں ایک عجیب سی ملاحت اور کشش ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اچھا کھانا' اچھا پہننا اور عمدہ آسائشوں کا استعمال انسان کے سراپا میں نکھار ضرور پیدا کرتا ہے۔

میں خود اپنے بارے میں غور کرتا تھا تو مجھے اپنے اس نظریے کا ثبوت ملتا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ میں لڑکپن میں جب گاؤں میں اپنے عسرت زدہ ماحول میں کبھی دھندلے آئینے میں اپنا عکس دیکھتا تھا تو مجھے بالکل ایک عام سا لڑکا سامنے کھڑا نظر آتا تھا جس پر قدرت نے صرف اتنی مہربانی کی تھی کہ اس کی اٹھان اچھی تھی۔ لیکن اب میں کہیں بھی جانے کے لئے تیار ہو کر قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا ہوتا تھا اور خود پرستی کو ہر ممکن حد تک ذہن سے نکال کر اپنا جائزہ لیتا تھا تو اپنے آپ کو بہتوں سے بہتر محسوس کرتا تھا اور خدا کا شکر ادا کرتا تھا۔

میرا نظریہ یہی تھا کہ انسان تمامتر جائز یا ناجائز ذرائع سے دولت اسی لئے حاصل کرتا ہے کہ اپنے آپ کو سنوار سکے... لوگوں میں نمایاں کر سکے اور اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے آسائشیں خرید سکے۔ اگر یہی مقاصد حاصل نہ ہوں تو پھر تجوریوں یا بینکوں میں منجمد پڑی ہوئی دولت کا کیا فائدہ؟ سیٹھ واحد ہم جیسوں کی نظر میں بہت "بڑا آدمی" تھا۔ اس کے تن پر ایک معمولی سوٹ اور بالوں میں چنبیلی کا تیل چپڑا ہوا دیکھ کر مجھے خاصی مایوسی ہوئی تھی۔

تاہم میں نے دوسرے ہی لمحے اس مایوسی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں کالج کی کوئی فرسٹ ائیر فول قسم کی لڑکی نہیں ہوں جو اپنے پسندیدہ ہیرو' ادیب یا شاعر سے ملنے آئی ہو اور اس کی شخصیت کو اپنے تصوراتی خاکے سے بہت مختلف پا کر مایوس ہو گئی ہو۔ مجھے یاد آ گیا تھا کہ میں کون ہوں اور کس لئے سیٹھ واحد سے ملنے آیا ہوں۔ باقی باتوں سے مجھے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے تھی۔

سیٹھ واحد نے مجھے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر بریف کیس بند کر دیا تھا۔ میں میز کے قریب پہنچا تو اس نے قدرے جھک کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ خاصا کمزور اور سرد تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔

اس کا اشارہ پا کر میں اس کے مقابل ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ چکا تو وہ بھی اپنی ریوالونگ چیئر میں دھنس گیا اور نہایت دھیمے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "میں معذرت خواہ ہوں مسٹر افضل کہ مجھے اچانک بلجیم جانا پڑ رہا ہے اور تقریباً پون گھنٹے بعد مجھے ائیرپورٹ پہنچنا ہے اس لئے ہم بلا تمہید گفتگو کریں گے اور مجھے افسوس ہے کہ اس وقت میں آپ کی کوئی

خاطر مدارت بھی نہیں کرسکوں گا۔ آپ کی میزبانی مجھ پر ادھار رہی۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے کہ ہم وقت ضائع کئے بغیر ہی کام کی بات کر سکیں گے۔" میں نے اپنا بریف کیس میز پر رکھا اور بریف کیس سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکال کر میں نے... میز پر رکھ دیا۔ "یہ ہے نمونہ۔"

"مجھے معلوم ہے کہ مال اچھا ہی ہوگا۔" وہ پیکٹ کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ "لیکن میں چند باتوں کی وضاحت کر دوں تو بہتر ہوگا۔" اس نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی پوری شخصیت میں قابل ذکر آنکھیں ہی تھیں۔ موٹی موٹی اور گہری سیاہ آنکھیں۔ ان آنکھوں کی تہہ میں جیسے کوئی چیز دھیرے دھیرے سلگ رہی تھی۔ دھیمی دھیمی آنچ تھی ان آنکھوں میں شاید یہ کسی جذبے یا کسی لگن کی آنچ تھی۔

اس نے ایک لمحے کے لئے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے غالباً کچھ سوچا اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "کوکین' ہیروئن اور دیگر منشیات کی مارکیٹ تو بہت اچھی ہے لیکن آج کل میری دلچسپی اس طرف بہت کم ہے اور اگر مجھے مال کی ضرورت بھی ہو تو میرے اپنے وسائل کچھ کم نہیں۔ مال کی سب سے زیادہ آمد سرحدی علاقوں کی طرف سے ہے اور ہر سرحدی شہر میں میرے ٹھکانے اور میرے آدمی موجود ہیں۔ لاہور میں بھی میرا خاصا بڑا اڈا موجود ہے۔ میرا مطلب ہے کہ مجھے کسی قسم کے تعاون یا پارٹنرشپ کی ضرورت نہیں۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ نے دلچسپی ظاہر کی تھی؟"

"ہاں" اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلایا۔ "میں یہی بتانے لگا تھا۔ دراصل اس پارٹی میں قاسم خان صاحب مجھ سے اس محبت اور خلوص سے پیش آئے تھے کہ میں بے حد متاثر ہوا تھا۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں مسٹر افضل کہ میں محبت' خلوص اور احترام کا بھوکا ہوں۔ جب کوئی مجھ سے محبت یا خلوص سے پیش آئے تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس کے لئے کچھ کروں۔ محض اسی لئے میں نے قاسم خان کو تعاون کا اشارہ دیا تھا۔"

"گویا اب آپ کا ایسا کوئی ارادہ نہیں؟" میں نے قدرے جھینپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔" وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ کمبخت کو گفتگو کا ڈھب خوب آتا تھا۔ ٹھہر ٹھہر کر دوسرے کے مطلوبہ موڑ کی طرف آتا تھا۔

"مجھے ان لوگوں سے مراسم بڑھانے کا شوق ہے جو مجھ سے عزت سے پیش آئیں۔" وہ سلسلۂ کلام جوڑتا ہوا بولا۔ "ویسے بھی صاحب کیا پتا زندگی میں کون کس وقت آپ کے کام آ جائے۔ اس لئے میں بعض اوقات دوسروں کی خاطر ایسے کام بھی کرلیتا ہوں جن میں مجھے ....کوئی فائدہ نہیں ہوتا یا برائے نام ہوتا ہے۔ میں اپنی شناسائیوں اور اپنے وسائل سے قاسم خان کو فائدہ پہنچانے کے لئے تیار ہوں۔ اس کے عوض میں اس سے کچھ مانگوں گا نہیں۔ اگر وہ خود مجھے کچھ دینا چاہے گا تو اسے میں اس کی نوازش سمجھوں گا۔" اس کے لہجے میں غضب کی انکساری تھی۔ بڑے طریقے اور سلیقے سے وہ گفتگو کو اس موڑ تک لایا تھا۔ میں اس کے انداز سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے بعد شرائط' طریق کار اور دیگر معاملات بڑی عمدگی سے اور بہت کم وقت میں طے پا گئے۔ میں اپنے آپ کو اس قسم کی باتوں کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ لیکن آج مجھے معلوم ہوا تھا کہ مجھ میں اپنے میدان کے "بڑے" لوگوں سے معاملات طے کرنے کی اہلیت بھی موجود تھی۔

میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے رخصت کرنے کمرے کے دروازے تک آیا اور دروازے پر کھڑے ہوئے ایک شخص سے مخاطب ہوا۔ "دوسری گاڑی کے ڈرائیور سے کہنا انہیں واپس چھوڑ آئے۔"

میں واپس گھر پہنچا تو راحیلہ ڈائننگ روم میں بیٹھی اکیلی ناشتا کر رہی تھی۔ اس نے گہری سنجیدگی سے میری طرف دیکھا اور سر کی جنبش سے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ چکا تب بھی وہ خاموش ہی رہی اور یوں سر جھکا کر ناشتا کرنے لگی جیسے میری موجودگی سے بے خبر ہو چکی ہے۔

مجھے اس کے انداز میں بے اعتنائی کی جھلک محسوس ہوئی اور جانے کیوں اس احساس سے میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھے اپنی

اس کیفیت پر بڑی حیرت ہوئی' میں بڑا حقیقت پسند آدمی تھا۔ ایک لڑکی جس سے میری شناسائی کو پورے دو دن بھی نہیں گزرے تھے' اگر مجھ سے سرد مہری برت بھی رہی تھی تو اس میں میرے لئے تشویش کی کیا بات تھی؟ اور پھر بات صرف حقیقت پسندی' دلیل یا منطق کی بھی نہیں تھی۔ اس کم عمری میں ہی زندگی نے مجھے اس سے کہیں گہرے زخم دیئے تھے' بڑی بڑی محرومیوں کے صدمے میں جھیل چکا تھا۔ اس اعتبار سے تو یہ صدمہ میرے لئے بے انتہا معمولی ہونا چاہئے تھا۔ اول تو اس میں میرے لئے صدمے والی کوئی بات نہیں ہونی چاہئے تھی۔ بھئی اگر راحیلہ کے رویئے میں کوئی ڈھکی چھپی بے گانگی تھی تو مجھے اس سے کیا' میرا کون سا اس سے کوئی تعلقِ خاطر تھا لیکن اپنی تمامتر دلیلوں اور منطق کے باوجود میں اپنے آپ کو نہیں سمجھا سکا۔ میں نے یکلخت اپنے آپ کو ملول وافسردہ محسوس کیا۔

"کیا بات ہے' بڑا سناٹا چھایا ہوا ہے؟" میں نے پژمردہ سی آواز میں پوچھا۔

"یہاں تو ہمیشہ سناٹا رہتا ہے۔" وہ گہری گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ نے یہاں شور وغل کب سنا ہے؟"

"نہیں .... میرا مطلب ہے کوئی نظر نہیں آرہا.... کہاں گئے سب لوگ؟" میں کچھ گڑبڑا سا گیا۔

"ابو آفس گئے۔ راشد کو اپنے کسی دوست سے کام تھا۔ امی کا آج ایک اسپیشل قسم کا ایکسرے اتروانے کے سلسلے میں .... ڈاکٹر سے اپائنٹمنٹ تھا۔ وہ وہاں گئی ہیں۔ باقی رہ گئی میں۔ تو میں یہاں آپ کے سامنے بیٹھی نئے خانساماں کا بنایا ہوا یہ بدذائقہ قسم کا آملیٹ چبا رہی ہوں۔ یہ تو ہوگئی گھریلو صورتحال کی کمنٹری۔ اب یہ بتایئے کہ میرے سامنے بیٹھتے ہی آپ کا منہ کیوں لٹک گیا ہے؟" اس کے لہجے میں اچانک ہی اس کی مخصوص شوخی لوٹ آئی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ سیکڑوں بجھے ہوئے قمقمے یک لخت روشن ہو گئے ہوں۔

"میں دراصل تمہارے لہجے اور تمہاری آنکھوں سے جھانکتی ہوئی گہری سنجیدگی بلکہ سرد مہری دیکھ کر ڈر گیا تھا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

وہ بے ساختہ ہنس دی۔ "میں چند منٹ کے لئے بھی سنجیدہ ہوتی ہوں تو جانے کیوں لوگ سہم سے جاتے ہیں۔"

"بھئی سورج سے تو لوگ صرف روشنی اور حرارت کی ہی توقع رکھتے ہیں نا۔" میں نے ایک آسودہ سی سانس لے کر کہا۔ "اگر سورج بھی تاریکی اور ٹھنڈک پھیلانے لگے تو لوگ خوفزدہ تو ہوں گے نا۔"

وہ ایک بار پھر بے ساختہ ہنسی۔ "لڑکیوں کو چاند سے تشبیہہ تو بہت سے لوگ دیتے آئے ہیں لیکن آج پہلی بار کسی لڑکی کے لئے سورج کی تشبیہہ سنی ہے .... اور عجیب اتفاق ہے کہ وہ لڑکی میں ہوں۔"

"میرے نزدیک حسن ہی نہیں اور بھی بہت سی خوبیوں کی علامت سورج ہے۔ چاند نہیں۔" میں نے کہا "چاند مجھے یاسیت کی علامت لگتا ہے۔ جو ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی دیتا ہے برسات کی سونی راتوں میں۔"

"واہ .... یہ تو مصرعہ ہو گیا۔" راحیلہ گویا محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"اتفاق سے یہ ایک مصرعہ ہی ہے لیکن شاعر نے یہ جگنو کے لئے کہا تھا۔ میں نے چاند پر جڑ دیا ہے۔" میں نے بتایا

"بہرحال سلیقے سے جڑا ہے۔" اس نے گویا مجھے داد دی۔

"کاش مجھے اور بھی باتیں کہنے کا سلیقہ ہوتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"مثلاً ...؟" اس نے شریر نظروں سی میری طرف دیکھ

اس دوران میں ملازم نے میرے لئے ناشتا لگا دیا تھا۔ وہ ناشتا لگا کر جا چکا تو میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں نے کہا نا کہ اگر سلیقہ ہوتا تو ہم بھی بات کرتے۔ جب سلیقہ ہی نہیں تو بات کرنے کا کیا فائدہ؟ بات کرکے دراصل بات خراب ہی کرنی ہے؟"

"پھر بھی آپ کہیں تو سہی۔" اس کے لہجے میں دبا دبا سا اشتیاق تھا۔ "بعض باتیں بے ساختگی میں ہی اچھی لگتی ہیں۔ ان میں اگر ناپ تول کر الفاظ استعمال کئے جائیں اور بڑی کوشش کے ساتھ شاعرانہ سلیقہ پیدا کیا جائے تو ان کا حسن جاتا رہتا ہے۔ کیونکہ ان میں سے خلوص کی مہک اڑ جاتی ہے۔

باتیں وہ خود بھی حقیقتاً بے ساختہ ہی کرتی تھی پھر بھی ان میں اتنی درستی اور سلیقہ نظر آتا تھا کہ تیر کی طرح دل میں ترازو ہو جاتی تھیں اور جب وہ غیر سنجیدہ ہوتی تھی تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دل کو چھو لینے والی باتیں بھی کر سکتی ہے۔ چند لمحے پہلے وہ مجھے سرد مہر اور سنجیدہ نظر آئی تھی تو میرا دل ڈوب سا گیا تھا اور اب اس کی حسین وشفاف آنکھیں میری جانب نگراں تھیں' وہ پورے انہماک واشتیاق سے میری بات سن رہی تھی تو میرا دل بلیوں اچھل رہا تھا اور میں اپنے رگ وپے میں یوں سنسنی محسوس کر رہا تھا جیسے میں بالکل ہی نوعمر لڑکا ہوں اور اپنے سے کہیں بڑی اور بقراط قسم کی لڑکی سے اظہارِ محبت کرنے کے لئے بیتاب ہوں مگر مجھے موزوں الفاظ نہیں مل رہے۔ میں خود بھی حیران تھا کہ دو راتوں میں ہی یہ کیا

انقلاب آگیا تھا کہ اس لڑکی کی جنبشِ ابرو سے میرے محسوسات میں اتھل پتھل ہونے لگی تھی۔ میرے جذبات گویا اس کے اشاروں کے تابع ہو گئے تھے؟

"اب تم مجھے سلیقے کے بغیر بات کرنے کی اجازت دے ہی رہی ہو تو سنو....؟" میں نے دونوں کہنیاں میز پر رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے کہا۔ "بات صرف اتنی سی ہے کہ میں تمہاری محبت میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ بہت بری طرح اور مجھے اندیشہ ہے کہ میری شدت کا یہی عالم رہا تو میں ذہنی توازن کھو بیٹھوں گا کیونکہ مجھ جیسا کمتر اور حقیر آدمی یہ توقع تو کر نہیں سکتا کہ میری محبت کے جواب میں تم جیسی لڑکی بھی مجھے پسند کرنے لگے گی۔ میں خوش فہم قطعاً نہیں ہوں۔ چنانچہ اپنی اس نیم مجنونانہ کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جتنی جلد بھی یہاں سے چلا جاؤں بہتر ہے۔ اپنے دل ودماغ اور اعصاب کو خوامخواہ کی ہیجان خیزی میں رکھنے کا کیا فائدہ؟"

وہ چند لمحے ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی اور میرا دل امید وبیم کی سی کیفیت میں دھڑکتا رہا کہ معلوم نہیں اب وہ کیا کہہ دے۔ جب وہ پوری طرح میرا مفہوم سمجھی تو اس نے کسی نہایت ہی شرمیلی لڑکی کی طرح سر جھکا لیا۔ اس کے رخساروں پر سرخی اور گہری ہو گئی اور پنکھڑیوں جیسے ہونٹ یوں کپکپائے جیسے اس نے کچھ کہنا چاہا ہو مگر کہنے میں کامیاب نہ ہو سکی ہو مگر اس کا یوں شرما کر سر جھکا لینا خود اپنی جگہ ایک جواب تھا۔

"اف میرے خدا....!" میں بے ساختہ بول اٹھا۔ میں حقیقتاً حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ "تو تم شرمانا بھی جانتی ہو؟"

"کیوں' کیا میں لڑکی نہیں ہوں؟" اس نے سر اٹھا کر نہایت سادگی ومعصومیت سے پوچھا۔ لمبی پلکوں کی جھالروں کے تلے اس کی نیلی آنکھوں میں حیرانی تھی۔

اس کا سوال واقعی لاجواب کر دینے والا تھا۔ میں ایک بار پھر گڑبڑا سا گیا۔ "نہیں ... نہیں ... میرا مطلب یہ تھا کہ تم اتنی تیز طرار لگتی ہو .... اتنی راست گو .... اتنی آزاد خیال .... جوڈو کراٹے کی ماہر .... مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ تمہارے رخساروں پر بھی یوں گلاب کھل سکتے ہیں۔ تمہاری پلکیں بھی بوجھل ہو سکتی ہیں۔ مگر اب یہ سب کچھ دیکھا ہے تو تم پہلے سے بھی زیادہ بھلی لگی ہو۔ نیزے کی انی کی طرح میرے دل میں اور بھی گہری اتر گئی ہو۔"

"میری ایک دوست ہے ...." وہ جذبات کے گرداب سے نکل کر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "عمر میں مجھ سے کچھ بڑی ہے۔ اسکول اور کالج میں مجھ سے سینیئر تھی۔ بس اتفاقاً ہی میری دوست بن گئی تھی مگر کچھ ادھوری تعلیم چھوڑ کر والدین کے ساتھ انگلینڈ چلی گئی .... وہاں پڑھتی رہی۔ پھر والدین خاص طور پر اس کی شادی کرنے کے لئے پاکستان آئے۔ اس کی شادی ہوئی تو رخصتی کے موقع پر وہ بھی ایک عام مشرقی لڑکی کی طرح عروسی جوڑا پہنے اپنے والدین سے گلے مل مل کر دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھی' یہ منظر دیکھ کر ہماری ایک ذرا کم پڑھی لکھی قسم کی رشتے دار خاتون بڑی حیرت سے اپنی سہیلی سے بولیں' بھئی کمال ہے... اتنی ماڈرن لڑکی .... اتنی پڑھی لکھی .... اتنا عرصہ ولایت میں رہی مگر بالکل عام لڑکیوں کی طرح رو دھو رہی ہے۔' مجھے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ بات وہ لڑکی کی تعریف کے طور پر کہہ رہی تھیں یا اپنی دانست میں اس کے عیب کی نشاندھی کر رہی تھیں بہرحال ان کے لہجے سے جھلکتی ہوئی حیرانی کو محسوس کرکے مجھے بڑی ہنسی آئی۔ ان خاتون کے خیال میں شاید میری دوست جیسی لڑکیوں میں شرمانے کی اہلیت باقی نہیں رہتی یا پھر انہیں شرمانے کا حق حاصل نہیں رہتا ـــ کچھ اسی قسم کی بات آج آپ نے کی ہے۔ بھئی لڑکی تو ہر حال میں لڑکی ہی رہتی ہے نا۔ اس کے ان گنت جذبے تو اچھوتے ہی رہتے ہیں نا۔"

میں ناشتا کرنا بھول گیا تھا اور دم بخود بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں جیسے چونک کر کسی اور ہی دنیا سے حقائق کی دنیا میں واپس آیا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "اس کم عمری میں تمہارے خیالات میں سمندروں جیسی گہرائی ہے اور جوں جوں تمہاری شخصیت پرت در پرت میرے سامنے منکشف ہوتی جا رہی ہے میں زیادہ سے زیادہ تمہاری ذات کا اسیر ہوتا جا رہا ہوں۔ میں تم جیسی ایک لڑکی کے بارے میں اکثر سوچا کرتا تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ دنیا میں ایسی کسی لڑکی کا وجود بھی ہو گا۔ تمہارا ملنا مجھے ایک خواب سا لگتا ہے۔ اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی آنکھ کھلے گی اور یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔ یہ سب باتیں تو اپنی جگہ لیکن میری اصل بات کا تو جواب رہ ہی گیا۔ ہماری ملاقات کو اتنا کم وقت گزرا ہے کہ مجھے تم سے یہ پوچھنا بھی عجیب محسوس ہو رہا ہے کہ کیا تم نے بھی میرے لئے کچھ محسوس کیا ہے؟"

ایک بار پھر اس کے رخسار گلابی سے سرخ ہو گئے۔ وہ سر جھکا کر بے مقصد سے انداز میں پلیٹ کو گھماتے ہوئے بولی۔ "دل تو اپنا فیصلہ ایک لمحے میں دے دیتا ہے۔ مزید دیر تو عقل اور دماغ کی وجہ سے لگتی ہے جو ہمارے سامنے شعوری قسم کے سوالات کھڑے کئے رہتا ہے کہ ہاں فلاں انسان میرا آئیڈیل تو ہے لیکن کیا اس کے ساتھ میرا گزارا ہو جائے گا؟ ہم اسے پا کر کھو دینے پر مجبور تو نہیں ہو جائیں گے؟ یہ اور اس قسم کے

سیکڑوں سوالات۔"

"میں تو دل کا فیصلہ جاننا چاہ رہا تھا۔" میں نے قدرے مضطربانہ لہجے میں کہا۔

"دل کا فیصلہ تو آپ کے حق میں ہے۔" وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بولی پھر اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ گویا وضاحت کرنے کی کوشش کی۔ "افضل .... مجھے دراصل تمہارے 'کھرے پن' نے بہت متاثر کیا ہے۔ تم جو کچھ بھی ہو اپنے آپ کو اس سے زیادہ ظاہر کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کرتے۔ تمہارے انداز واطوار میں کسی بھی اعتبار سے تصنع یا بناوٹ نہیں ہے جو اس امر کا ثبوت ہے کہ تم کسی کے مقابلے میں احساسِ کمتری میں مبتلا نہیں ہوتے' بس کچھ ایسا ہی میرا آئیڈیل تھا۔ تمہیں میرے دل نے ہی نہیں میرے دماغ نے بھی قبول کر لیا ہے۔"

"راحیلہ!" شدتِ جذبات سے میری آواز گلے میں اٹکنے لگی۔ "زندگی مجھ پر کبھی بہت ہی نامہرباں رہی ہے اور کبھی بہت ہی مہرباں۔ بہرحال میں نے اس کی مہربانیوں کو ہی یاد رکھا ہے اور نامہربانیوں کو بھلاتا چلا آیا ہوں .... اور میرا خیال ہے زندگی کی سب سے بڑی نوازش آج میرے حصے میں آئی ہے تو خوشی کی شدت سے میری عجیب حالت ہے ... یوں لگ رہا ہے جیسے میری روح پھڑپھڑا کر جسم کے قفس سے آزاد ہو جائے گی۔"

وہ دھیرے سے ہنس دی۔ وہ جب آہستہ ہنستی تھی تو اس کی ہنسی بے حد مترنم اور کھنک دار ہوتی تھی۔ بالکل جلترنگ کی طرح .... یا پھر جیسے پیتل کی تھال میں یکدم بہت سے ننھے ننھے موتی آن گرے ہوں۔ پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔"

ہمارے درمیان خاصی چوڑی ڈائننگ ٹیبل حائل تھی مگر اس کا مرمریں ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ مختصر سا یہ سپید ہاتھ اس وقت روئی کے گالے کی طرح نرم تھا مگر جب وہ جوڈو یا کراٹے کے ایکشن میں آتی تھی تو یہی ہاتھ گویا کلہاڑی کا .... پھل بن جاتا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی۔ "اپنے طبقے کے بہت سے لڑکوں سے مختلف مواقع پر میری ملاقات ہوتی ہے۔ ان میں سے کچھ سنجیدگی سے اور کچھ محض تفریح طبع کے خاطر میری جانب بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ سب کے سب مجھے جعلی لگتے ہیں۔ مصنوعی اور سطحی سے۔ ان کی اٹھان اس قدر مادیت پرستانہ ماحول میں ہوئی ہے کہ جذبات اور محسوسات ان کے نزدیک محض اداکاری کا دوسرا نام ہے۔ وہ دل اور دل کے زیرو بم کی بات کرتے ہیں تو صاف لگتا ہے کہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ میرے طبقے کے لوگوں میں سب ... ہے مگر بے ساختگی اور کھرا پن نہیں ہے جو میری نظر میں ... زیادہ اہم ہے۔"

"میں لمبی چوڑی بات نہیں جانتا۔" میں نے اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ "میں تو محض ایک پتھر ہوں۔ یہ خوش نصیبی ہے کہ میں اپنی اصل شکل صورت میں تمہیں اچھا لگا ہوں۔ تمہاری ایک نظر نے مجھے ہیرا بنا دیا ہے۔"

ملازم کی آہٹ سن کر میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ملازم ٹرے میں کافی لئے آ رہا تھا۔ ہم نے ناشتے سے صرف چھیڑ چھاڑ ہی کی تھی۔ کھایا کچھ نہیں تھا اور اب تو مجھے کھانے کی کوئی خواہش نہیں رہی تھی اور شاید یہی حال راحیلہ کا تھا۔

ملازم کے جانے کے بعد وہ گویا سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "میرے طبقے کے لڑکوں میں سے کچھ کو شاید میں شکل وصورت کی وجہ سے اچھی لگتی ہوں گی اور کچھ کو اپنے اوصاف اور سرگرمیوں کی وجہ۔ کچھ کی نظر میں میری اہمیت محض اسٹیٹس کی وجہ سے ہوگی۔ وہ اپنے ذہن کے کمپیوٹر پر حساب کتاب لگاتے ہوں گے کہ مجھے حاصل کر کے ان کی موروثی دولت میں کتنے فی صد اضافہ ہوگا اور دیگر کیا فوائد حاصل ہوں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے کسی کے دل میں میری کسک نہیں ہے۔ کوئی یہ محسوس نہیں کرتا ہوگا کہ اگر میں اسے نہیں ملی تو اس کی زندگی ویران ہو جائے گی بلکہ سب اس انداز میں سوچتے ہوں گے کہ اگر راحیلہ نہ ملی تو فلاں ٹھیک رہے گی اور اگر فلاں بھی نہ ملی تو پھر فلاں ٹھیک رہے گی۔ اس لئے ان میں سے مجھے کوئی اچھا نہیں لگتا۔"

"لیکن میں تو ...." میں نے کہنا چاہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" وہ میری بات کاٹتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "مجھے معلوم ہے آپ میرے بارے میں کیا محسوس کرنے لگے ہیں۔ اسی لئے تو میں نے دو دن کی شناسائی میں یہ ہاتھ آپ کے ہاتھ میں دے دیا ہے ورنہ اس ہاتھ کو تھامنے کی حسرت میں جانے کتنوں نے منہ کی کھائی ہے۔"

"آج مجھے یقین آگیا ہے کہ جذبے سچے ہوں تو ناممکن بھی ممکن ہو جاتا ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"سچے اور کھرے انسانوں کے درمیان رہ کر اور خود بھی سچ اور کھرا بن کر انسان بڑا سکھی رہتا ہے۔" وہ مہربانہ لہجے میں بولی "تم نے دیکھا ہوگا کہ میری دوست لڑکیاں اور ان کے ساتھی بھی اسی قسم کے لوگ ہیں۔ وہ اگر دولت مند بھی ہیں تب بھی ان میں تکلف، تصنع یا لالچ نہیں ہے اور نہ ہی انہیں ہر وقت اپنے اسٹیٹس کی حفاظت کرنے کی فکر لگی رہتی ہے۔"

"... جتنوں سے میں ملا ہوں انہیں تو میں نے ایسا ہی پایا ..." میں نے تسلیم کیا "اور واقعی تم لوگوں کے ساتھ وقت ... کر مجھے پہلی بار احساس ہوا کی زندگی کی اصلی مسرت کیا ہے۔"

... دفعتاً میرے ذہن کے کسی اندھیرے گوشے میں سے جیسے کوئی سنپولیا ... شعور میں رینگ آیا۔ میری ذات کے گنبد میں اندر ہی ... جیسے کوئی آواز گونجی۔ "دوغلے انسان! اپنی محبت اور اپنے ... ات کے بارے میں تو بہت سچ بول رہا ہے مگر اپنی ذات ... گنبد میں سب سے بڑی سچائی چھپائے بیٹھا ہے۔ اسے یہ ... بتا کہ تو درحقیقت کون ہے؟ تیرا پیشہ کیا ہے؟ وہ اتنی ... یت اور سادگی سے ذات کی سچائی کا فلسفہ بتا رہی ہے اور ... اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہے مگر اپنی ذات کے بارے میں ... ار رہا ہے ...."

مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اندر ہی اندر گویا اپنے آپ کو ... یا "محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ میں راحیلہ کی ... میں تو سچا ہوں نا؟ باقی باتیں پھر دیکھی جائیں گی۔ پیشے کی ... کیا اہمیت ہے؟ اگر میں اس کی نظر میں اچھا ہوں تو مجھے اس ... کو توڑنا نہیں چاہئے۔ اس سے اسے بھی صدمہ ہوگا اور ... بھی اسے کھونے کا صدمہ برداشت نہیں کر سکتا۔"

... یوں میں خاموش رہا اور تقریباً مطمئن بھی۔ دل میں ایک ... ی خلش تھی مگر میں نے اسے دبائے رکھا۔

راحیلہ پلیٹیں اپنے سامنے کھسکاتے ہوئے بولی "اپنے ... محبت کی ہر بات کی تان چونکہ شادی پر آکر ٹوٹتی ہے اس ... ئے میں ایک اور بات کی وضاحت کرتی چلوں۔ شادی کے ... لے میں' میں اپنے ڈیڈی کے فیصلے سے کبھی اختلاف نہیں ... وں گی اور یہ بات طے ہے کہ ڈیڈی میری شادی کسی ہم پلہ ... دان میں ہی کریں گے۔ وہ لڑکے کی دولت مندی کو بہرحال ... ت دیں گے اس لئے میں چاہتی ہوں کہ آج کے بعد سے ... اپنا نصب العین بنالو کہ تمہارا جو بھی کاروبار ہے اسے ترقی ... نے کے لئے جتنی بھی زیادہ سے زیادہ محنت ممکن ہوگی تم ... ئے اور جلد از جلد ہماری سطح پر آنے کی کوشش کرو گے ... ... تو تم نے کی ہوئی ہے اب مسئلہ صرف معمولی سے تیز ... ئے۔ بہرحال وقت ہمارے پاس کافی ہے۔ ابھی ہماری ... عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں ہیں۔"

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ جلد از جلد آگے آنے کے ... میں خود کتنا بے چین تھا۔ اس کے بجائے میں نے پُرعزم ... میں کہا "تمہاری محبت کی شہ پا کر تم دیکھنا کہ میں کتنی تیزی ... ابھرتا ہوں۔ میں ریس کا وہ گھوڑا ثابت ہوں گا جو بظاہر ... سب سے پھسڈی نظر آتا ہے مگر دیکھتے ہی دیکھتے سب سے

آگے نکل جاتا ہے " ویسے یہ حقیقت تھی کہ اس کے اقرارِ محبت سے میرے عزائم کو نئی زندگی ملی تھی۔ جس کام کے لئے میں نے اپنے ذہن میں ایک سال کا ہدف رکھا ہوا تھا اس کے بارے میں اب میں سوچ رہا تھا کہ اسے ایک ماہ میں ہی کرلینا چاہئے۔ تاہم ترقی تو میں اب اسی کام میں کرسکتا تھا جو میں کر رہا تھا۔ کوئی شریفانہ کام کرنے کی تو مجھ میں صلاحیت تھی اور نہ ہی نئے سرے سے تجربے کرنے کی جرأت۔ میرے خیال میں مجھے جو کچھ بننا تھا میں بن چکا تھا۔ اب بات صرف چھوٹے سے بڑا بننے کی تھی۔

اسی دوران آنٹی یعنی راحیلہ کی امی لوٹ آئیں اور ہمارے درمیان اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہوسکی۔ مگر اب مزید کسی بات کی ضرورت بھی کیا تھی؟ ہم تو گویا مستقبل بعید تک کے پروگرام بھی طے کرچکے تھے اور میں گویا ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ آنٹی کافی تھکی تھکی لگ رہی تھیں۔ میں نے ان کی خیرو عافیت پوچھی۔ وہ اپنی کسی نامعلوم بیماری کی وجہ سے پریشان تھیں۔ شہر کے نہ جانے کتنے بڑے بڑے ڈاکٹر کتنے برسوں سے ان کا علاج کر رہے تھے اور بیماری کے بارے میں ہر ایک کی رائے مختلف تھی۔

میں نے نہایت خلوص سے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ یوں تو میں ان سے ملتے ہی ان کے لئے اپنے دل میں اپنائیت محسوس کرنے لگا تھا لیکن اب تو اس اپنائیت میں کچھ زیادہ ہی اضافہ ہوچکا تھا۔

ان سے باتیں ختم ہوئیں تو مجھے احساس ہوا کہ میں نے ناشتا تو کیا ہی نہیں تھا۔ راحیلہ معذرت کرکے ناشتے کی میز سے اٹھ کر جاچکی تھی۔ میں نے ٹھنڈی ہوجانے والی چیزیں واپس کرکے ملازم سے دوبارہ ناشتا منگایا اور اسی لمحے مجھے احساس ہوا کہ آنٹی نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا تھا۔ شاید ایک لمحے کے لئے انہوں نے سوچا تھا کہ آخر میرے سامنے رکھا ہوا ناشتا کیوں ٹھنڈا ہوگیا تھا؟ کونسی ایسی ضروری باتوں میں مصروف رہا تھا میں؟ تاہم میں نے ان کی نظر کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ راحیلہ کی نظر میں اپنی محبت کی قبولیت کے بعد مجھے دوسری باتوں کی پروا کم رہ گئی تھی۔

میں ناشتے سے فارغ ہوکر اپنے کمرے کی طرف جانے کے لئے سیڑھیوں کے قریب پہنچا تو راحیلہ سے سامنا ہوا۔ وہ تیار ہوکر کمرے سے نکل رہی تھی۔ مجھے سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر بولی " آپ کہاں گوشہ نشین ہونے جارہے ہیں؟ ہم تو آپ کو شہر کی سیر کرانے کا پروگرام بنائے بیٹھے ہیں۔ "

" زہے نصیب " میں نے فوراً سیڑھیوں سے واپس مڑتے ہوئے کہا " اس سے زیادہ خوشی کی بات میرے لئے کیا ہوگی کہ مجھے تم جیسا گائیڈ میسر ہو۔ "

" ہوسکتا ہے گائیڈ اسے اپنی خوش بختی محسوس کررہا ہو کہ ایک طویل انتظار کے بعد تم جیسا مہمان میسر آیا " وہ مخمور سے انداز میں ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ باہر جانے کے لئے ہم دوبارہ ڈائننگ روم سے ہی گزرے تو میں نے آنٹی کو وہیں بیٹھے دیکھا۔ وہ سر جھکائے نہایت ہی بے دلی سے کچھ کھانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

" ممی! میں افضل صاحب کو شہر کے کچھ مشہور مقامات کی سیر کرانے لے جارہی ہوں " راحیلہ نے ڈائننگ ٹیبل کے پاس سے گزرتے وقت گویا محض اطلاعاً کہا۔

انہوں نے سر اٹھا کر پُرخیال سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں کہا " بہتر ہوتا کہ راشد کی واپسی کا انتظار کرلیتیں۔ اسے بھی ساتھ لے جاتیں " میں نے محسوس کیا تھا کہ راحیلہ سے ہر کوئی دب کر ہی بات کرتا تھا۔ اسے واضح لہجے میں کبھی کوئی ہدایت نہیں دی جاتی تھی۔

" مجھے معلوم ہے وہ کہاں گیا ہے " راحیلہ خشک سے لہجے میں بولی " میں راستے میں اسے دیکھتی چلوں گی۔ اگر وہ مل گیا تو ہم اسے ساتھ لے لیں گے۔ "

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ راستے میں کہیں نہیں رکی۔ حسبِ عادت طوفانی انداز میں اسٹیشن ویگن چلاتی ہوئی سب سے پہلے وہ قائدِ اعظم کے مزار پر پہنچی، پھر کلفٹن، اس کے بعد کیماڑی اور واپسی میں اس نے گھر کے قریب ہی واقع ہل پارک مجھے دکھایا۔

" ویسے تو یہ سب مقامات رات ہی کو دیکھنے کے ہیں " ہل پارک کی ایک بینچ پر بیٹھتے ہوئے وہ بولی " لیکن رات کو ہر جگہ بہت ہی رش ہوجاتا ہے اور اس وقت ہم جیسے کراچی کے پرانے رہنے والوں کو ایسی جگہوں پر جاتے ہوئے کچھ عجیب سا لگتا ہے۔ کم از کم مجھے تو لگتا ہے۔ میں اپنے آپ کو ضرورت سے زیادہ ہی پینڈو محسوس کرتی ہوں۔ تھوڑا بہت پینڈو نظر آنے سے تو ہم نہیں شرماتے۔ "

" تبھی تم نے ایک پیشہ ور گائیڈ کی طرح جلدی جلدی مجھے تمام خاص خاص مقامات دکھا کر گویا فرض پورا کیا ہے " میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

" ہاں۔ اس معاملے میں تو میں جھوٹ نہیں بولوں گی " وہ بلا تأمل بولی " عام تفریحی مقامات پر جانا مجھے بہت بور کام لگتا ہے۔ مجھے صرف ایسے مقامات پر جانے میں لطف آتا ہے جہاں

نا قسم کی سنسنی خیزی، کوئی ایڈونچر ہمارا منتظر ہو۔ "

" ایڈونچر تخلیق کرنا بعض اوقات اپنے ہاتھ میں بھی ا ہے " میں نے کہا " مثلاً کیماڑی سے منوڑہ ہم کشتی میں ہ کر گئے حالانکہ ہم چاہتے تو تیرتے ہوئے بھی جاسکتے تھے۔ ٹن جاکر ہم ادھر ادھر سے سمندر کا نظارہ کرنے کے بجائے احل پر دوڑتے ہوئے کسی اونٹ یا گھوڑے سے شرط بد کر ر لگا سکتے تھے۔ یا پھر ان چار پانچ لفنگے قسم کے نوجوانوں سے ڑا شروع کرسکتے تھے جو بار بار ہمیں گھورتے ہوئے گزر ہے تھے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی ہم ایڈونچر کا لطف اٹھا سکتے ں۔ ہم خاصی بلندی پر بیٹھے ہیں۔ پارک کے اُس سرے پر بار ہم نیچے چھلانگ لگا سکتے ہیں اور پہاڑی پر سے لڑھکتے ے نیچے سڑک پر پہنچ سکتے ہیں۔ "

ہنستے ہنستے اس کی گردن پیچھے کو جھک گئی۔ اس کے اشیدہ بھورے بال ہلکی ہوا میں لہرا رہے تھے اور ڈوبتے سورج کنی کرنیں اس کے چہرے کے گرد ہالہ سا بنائے ہوئے ں۔ اس وقت سرسری سی نظر سے اسے دیکھنے پر گماں زر تا تھا کہ شاید اس کا تعلق کسی سفید فام قوم سے ہے مگر عموماً ید فاموں کے نقوش میں وہ تیکھاپن اور رنگت میں اس ت کی آمیزش نہیں ہوتی جس کی وجہ سے راحیلہ بے پناہ ش نظر آتی تھی۔

اس کی ہنسی تھمی تو وہ بولی " افضل! تم بہت دلچسپ آدمی اسی لئے آج مجھے تمہارے گائیڈ کے فرائض انجام دینے ا بھی بوریت نہیں ہوئی ورنہ اس قسم کے کاموں سے میری ا جاتی ہے۔ ویسے بھی میرے خیال میں مقامات قابلِ دید ں، انسان قابلِ دید ہوتے ہیں۔ ہمیں ان کا مشاہدہ کرنا ائے۔ عمارتوں اور ساحلوں وغیرہ کا کیا ہے، یہ تو یونہی اپنی جگہ ئم رہیں گے۔ انسانوں کا کچھ پتا نہیں۔ کون کل رہے، کون رہے۔ کون کیا سے کیا ہوجائے اور کس پر کیا بیتے۔ اس لئے زی ہے کہ انسانوں سے متعلق یادوں کو دامن میں جمع کیا ئے۔ کیا خیال ہے؟ "

" بعض اوقات تم اتنی گہری باتیں کرتی ہو کہ میں ان میں ب جاتا ہوں۔ اندیشہ ہے کہ میں اس طرح نہ ڈوب جاؤں ہ لائف گارڈ بھی مجھے نہ بچا سکیں " میں نے کہا۔

وہ ایک بار پھر ہنسی " ہماری محبت شوخی و سنجیدگی کا ایک ہ امتزاج ہے۔ "

" میرا خیال ہے کہ حقیقت میں تو ہم دونوں بے حد نجیدہ ہیں۔ یہ شوخی تو محض دل بہلاوے اور وقت گزاری کے ہے " میں نے کہا۔

" میرا بھی یہی خیال ہے " وہ جلدی سے بولی " جنہیں ہنسی ہنسی میں ایک دوسرے سے محبت ہوجاتی ہے وہ ایک دوسرے کے لئے فنا ہوجاتے ہیں۔ "

" فنا ہونے کا حوصلہ ہے تم میں؟ " میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

" تم اپنی کہو " اس نے الٹا سوال کردیا۔

" میں تو کچھ بھی نہیں کہتا۔ میں تمہاری خاطر کہاں تک جاسکتا ہوں یہ تو وقت ہی بتائے گا " میں نے خلوصِ دل سے کہا۔

" میں نے جو کچھ کہا ہے اسے بھولنا مت " وہ دھیرے سے بولی " ایسے بن کر دکھانا کہ جب تم ڈیڈی کے سامنے میرے لئے ہاتھ پھیلاؤ تو وہ انکار نہ کرسکیں۔ "

" تم مطمئن رہو۔ یہ سوئمبر میرے سوا کوئی نہیں جیت سکے گا " میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

اس کے حسین چہرے پر طمانیت پھیل گئی۔ ایک جوڑا جس کے ساتھ دو تین سال کا ایک بچہ بھی تھا ہمارے سامنے سے گزرا۔ روش پر جاتے جاتے دونوں میاں بیوی نے کئی بار مڑ کر ہماری طرف دیکھا۔

" ایک تو میں اپنی سوسائٹی کے انسانوں کی اس عادت سے بڑی تنگ ہوں " راحیلہ گردن جھٹک کر بولی " جہاں بھی کوئی لڑکا اور لڑکی اکٹھے بیٹھے ہوں تو اوباش اور نیم اوباش قسم کے چھچھورے تو کیا اچھے بھلے مدبر صورت آدمی بھی دور تک

اس طرح مُڑ مُڑ کر دیکھتے جاتے ہیں کہ اگر سامنے مین ہول کا ڈھکنا غائب ہو تو سیدھے اس میں جا گریں۔"

"اس جوڑے کو تم ان لوگوں میں شمار نہیں کر سکتیں" میں نے ان میاں بیوی کی طرف اشارہ کیا جو کافی دور پہنچ چکے تھے "یہ بے چارے تو ہمیں دیکھ کر شاید ماضی کی بھول بھلیوں میں کھو گئے تھے۔ شاید انہوں نے بھی کبھی اسی طرح کسی بینچ پر بیٹھ کر پیمانِ وفا باندھا ہو۔"

"اور اب پچھتا رہے ہوں" راحیلہ نے لقمہ دیا۔

میں نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ راحیلہ بھی ہنس دی لیکن پھر یک لخت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "لیکن ہم کبھی نہیں پچھتائیں گے۔ ہے نا؟"

"نہیں۔ کبھی نہیں" میں نے اسے یقین دلایا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے اپنے آپ کو عجیب سا محسوس کیا۔ میں نے اپنے آپ سے کہا۔ "افضل! اگر اس وقت تم اپنا تجزیہ کرو تو کیا اپنے آپ کو کسی زنانہ افسانے یا درمیانے درجے کی کسی رومانی قلم کے ہیرو نہیں محسوس کرو گے؟ نری ونزاکت کی باتیں کرنے والا... خوابوں کے جال بُننے والا۔ جبکہ تم تو کسی اور ہی دنیا کی پیداوار ہو۔ تمہاری تو لائن ہی کچھ اور ہے..."

میرے اندر سے جانے کون بول اٹھا "مگر یہی تو زندگی ہے۔ انسان کی لائن خواہ کچھ بھی ہو مگر محبت کی پیاس تو اس کے وجود سے نہیں نکل سکتی نا۔ میں غلط سلط راہوں کا مسافر ہوں تو کیا ہوا؟ کیا مجھے محبت کرنے کا حق حاصل نہیں؟ اگر حق حاصل ہے تو پھر اپنے آپ سے شرمانا کیسا؟ محبت تو سبھی تقریباً اسی طرح کرتے ہیں۔ اور پھر ہماری محبت تو نری افسانوی بھی نہیں۔ ہم تو بے اختیار ایک دوسرے پر مرمٹنے کے ساتھ ساتھ اختیاری اور شعوری طور پر بھی زندگی کی کچھ گتھیاں سلجھا رہے ہیں۔ مستقبل کے کچھ منصوبے بنا رہے ہیں۔ عملی دنیا کے تقاضے پورے کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر رہے ہیں۔ یہ سب کچھ تو سبھی کو کرنا ہوتا ہے نا؟ گھر تو سبھی کو بسانا ہوتا ہے نا؟'

اپنے اندر کی اس بحث و تمحیص سے مطمئن ہو کر میں نے مسکراتے ہوئے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ ظالم جیسے دو دن کی ملاقات میں ہی مجھے پڑھنا سیکھ گئی تھی۔ ایک ہی نظر میں گویا میری روح میں جھانکتے ہوئے بولی "تم نے ابھی ابھی دل ہی دل میں کوئی اہم فیصلہ کیا ہے۔ کیا ہے نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں... جانے کیوں اچانک ہی مجھے خیال آیا تھا کہ اس طرح پارک کی ایک بینچ پر بیٹھ کر عہد و پیماں کرتے ہوئے ہم بے وقوف اور چیپ تو نہیں لگ رہے؟"

وہ بے اختیار ہنسی "بخدا یہی خیال میرے دل میں آیا تھا۔ کالج کے زمانے میں بھی خیر ہمارے طبقے کی لڑکیاں ذہنی طور پر بڑی میچیور ہوتی تھیں اور افلاطونی قسم کے عشق میں شاذ و نادر ہی کوئی لڑکی مبتلا ہوتی تھی لیکن بد قسمتی سے اگر کوئی مبتلا ہو ہی جاتی تھی تو ہم جیسی لڑکیاں اس بے چاری کا جینا دوبھر کر دیتی تھیں۔ اس بے چاری کا یہ عالم ہوتا تھا کہ عشق میں سوکھا ہوا ہے۔ راتوں کو اختر شماری ہو رہی ہے۔ ہر الیہ گائے پر آہیں بھری جا رہی ہیں۔ ہجر و وصال کے موضوع پر شعر لکھے جا رہے ہیں۔ محبوب کو پیغام بھیجنے' ایک جھلک دیکھنے یا ملاقات کرنے کے لئے مواقع ڈھونڈے جا رہے ہیں۔ ادھر ہمارا یہ عالم ہوتا تھا کہ اس بی بی کو دیکھ دیکھ کر ہنس ہنس کر دوہرے ہوئے جا رہے ہیں اور حسب توفیق اس کو سمجھا رہے ہیں۔ اور اب یونیورسٹی میں آ کر تو اور بھی ذہنی پختگی آ چکی ہے۔ خصوصاً ہمارے طبقے کی لڑکیوں میں... لیکن..." وہ ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

لیکن کیا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"لیکن اب جیسے سب کچھ دھرا رہ گیا ہے" وہ آہ بھر کر بولی۔ "دوسروں کے وہ تمام مراحل و مسائل جن پر ہم ہنستے تھے اب یوں لگتا ہے کہ ان سب سے ہمیں بھی گزرنا پڑے گا... اور مجھے ابھی سے محسوس ہو رہا ہے کہ ان میں بھی ایک لذت ہے۔ شاید یہی زندگی ہے" اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

اچانک وہ جیسے کسی خواب سے چونک کر اور جھرجھری سی لے کر بولی "آؤ افضل گھر چلیں۔"

ہم گھر پہنچے تو راشد جانے کب کا واپس آ چکا تھا لیکن آنٹی نے راحیلہ سے نہیں پوچھا کہ ہم نے اسے ساتھ کیوں نہیں لیا تھا۔ اس کے بجائے اسی قسم کی باتیں شروع ہو گئیں کہ کہاں کہاں گئے' کیا کیا دیکھا' کیسا لگا' وغیرہ وغیرہ۔

میں جب جگہ بھی گیا تھا نہ تو مجھے اس سے کوئی خاص دلچسپی محسوس ہوئی تھی اور نہ ہی اب ان سوالوں سے کوئی دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میری دلچسپیاں تو صرف راحیلہ کی ذات تک محدود ہو کر رہ گئیں تھیں۔ مجھے خوشی تھی تو صرف اس بات کی کہ آج میں اس کے ساتھ سیر کرتا رہا تھا اور آج ہم نے ان گنت باتیں کی تھیں۔ اب ہماری منزل بے حد واضح اور روشن تھی۔ میں بے حد خوش تھا۔

رات کو اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے لاہور فون کیا۔ محبت کا خمار اپنی جگہ تھا لیکن میں نے اپنا کام' اپنی ذمے داریاں فراموش نہیں کی تھیں۔ مجھے سیٹھ واحد سے اپنی گفتگو کی رپورٹ قاسم خان کو دینی تھی۔

قاسم خان مجھے گھر پر ہی ملا۔ سیٹھ واحد سے میرے کامیاب مذاکرات کی خبر سن کر اس کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ ہم لوکہ گول مول الفاظ میں ہی بات کر رہے تھے لیکن میں چشم تصور سے قاسم خان کی کھلی ہوئی باچھیں دیکھ سکتا تھا۔ اس کی خوشی بجا تھی۔ اب تک ہم جتنے خطرات مول لے کر اور جس طرح جان جوکھوں میں ڈال کر جتنا دھندہ کرتے تھے' سیٹھ واحد کے ساتھ معاملات صحیح چلنے کی صورت میں ہم اس سے آدھی محنت کر کے دُگنا منافع کما سکتے تھے اور سیٹھ واحد جیسے آدمی سے تعلقات پروان چڑھنے کی صورت میں دیگر فوائد کے امکانات بھی اپنی جگہ موجود تھے۔ ہم سندھ کی مارکیٹ' خصوصاً کراچی کے ساحلی علاقوں سے تعلق رکھنے والے کاروبار میں قدم جما سکتے تھے۔ شمال مغربی سرحدوں سے کاروبار' کرنے والے اسمگلروں کے لئے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ ان خطوط پر 'محنت' کر کے رفتہ رفتہ وہ بین الاقوامی اسمگلروں کے کم از کم درمیانی طبقے میں تو شمار ہو ہی سکتے تھے۔ ویسے تو خیر بین الاقوامی اسمگلروں کے درمیانے طبقے میں بھی ایسی ایسی توپ چیزیں پڑی تھیں جن کے سامنے قاسم خان جیسے اسمگلروں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔

"مجھے تم پر فخر ہے افضل!" قاسم خان بولا۔ اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا" میں تو سمجھتا تھا کہ تم صرف مال لانے لے جانے کے معاملے میں ہی نڈر اور باصلاحیت آدمی ہو لیکن تم تو معاملات طے کرنے میں بھی ماہر نکلے۔ مجھے امید ہے کہ اب ہم ایک دوسرے کے لئے اور بھی زیادہ کار آمد ساتھی ثابت ہو سکیں گے..." پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "اب تم ایسا کرو کہ فوری طور پر لاہور واپس آ جاؤ۔ میں چند دن کے لئے لندن جا رہا ہوں جس کے لئے میں کراچی سے ہی فلائٹ پکڑوں گا اور واپسی پر میں سیٹھ واحد سے باقی معاملات خود طے کرتا آؤں گا جس کے بعد ہم عملی کام شروع کر دیں گے۔ اس دوران یعنی میری عدم موجودگی میں تمہیں سبزی منڈی سے مال کی بہت بڑی کھیپ لانی ہے اور پنڈی کی ایک پارٹی کو دینی ہے۔ اس مرتبہ سارا لین دین تمہیں اپنی مرضی کے مطابق کرنا ہو گا۔ کہیں سے تمہیں کوئی ہدایات نہیں ملیں گی۔"

"وہ تو ٹھیک ہے..." میں نے ڈوبتی ہوئی سی آواز میں کہا "لیکن کیا میرا فوری آنا ضروری ہے؟"

میں اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ فوری طور پر کراچی سے رخصت ہونا مجھے سزائے موت کے حکم کے مترادف محسوس ہو رہا تھا۔ میں اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ ایک مدت تک بھٹکنے کے بعد میری منزل مجھے ملی تھی۔ اس مہ وش نے آج ہی تو اقرارِ محبت کیا تھا جس کا ہیولا نہ جانے کب سے تصورات میں بسا ہوا تھا جبکہ میرا خیال تھا کہ یہ ہیولا محض میرے تصور ہی کی پیداوار ہے اور تصورات ہی کی دنیا میں آخر کار کسی دن اپنی موت آپ مر جائے گا۔ میں نے کب سوچا تھا کہ ایسی کوئی لڑکی حقیقتاً دنیا میں موجود ہو گی اور اگر موجود بھی ہو گی تو بھلا میری اس سے ملاقات ہونا ضروری تو نہیں تھی اور اگر ملاقات ہو بھی جاتی تو کیا ضروری تھا کہ وہ بھی مجھے چاہنے لگتی؟ ایسا سوچنا میرے خیال میں تو خالصتاً خوش فہمی کی بات تھی مگر آج میری یہ خوش فہمی حقیقت میں ڈھل چکی تھی۔

ظاہر ہے انسان کو زندگی میں اس کے کسی نہایت ہی حسین خواب کی تعبیر مل جائے تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا۔ رگ و پے میں ایک عجیب سا ہیجان کروٹیں لینے لگتا ہے۔ ابھی تو میں اس خوشی کو صحیح طور پر محسوس بھی نہیں کر پایا تھا کہ رسہ کشی کے میدان میں واپس پہنچنے کا حکم مل گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہ سب باتیں میں قاسم خان سے نہیں کر سکتا تھا۔ ہماری دنیا میں اس قسم کی افسانوی باتوں کی گنجائش نہیں تھی۔

قاسم خان پُر زور لہجے میں کہہ رہا تھا "ہاں بھئی... تمہارا فوری طور پر واپس آنا بہت ضروری ہے۔ مجھے تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ تمہارے بغیر اب میرا کام چلنا بہت ہی مشکل ہے"

ہماری لائن میں باس کبھی یوں کھل کر اپنے کسی کارندے کی تعریف نہیں کرتا۔ خواہ وہ اس کے لئے کتنا ہی اہم ہو۔ اور اس نے کتنا ہی بڑا کارنامہ کیوں نہ انجام دیا ہو۔ اگر قاسم خان اتنے واضح انداز میں اعتراف کر رہا تھا کہ میں اس کے لئے ناگزیر ہو چکا ہوں تو اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھ سے بہت ہی زیادہ متاثر ہو چکا تھا اور صرف یہی نہیں بلکہ وہ خدمات کے اعتراف کے سلسلے میں نہایت فراخدل بھی تھا۔ سادگی کی حد تک فراخدل۔ اس کی یہ سادگی مجھے بہت بھلی لگی۔ وہ عیار اور کینہ آدمی نہیں تھا اور مجھے حیرت تھی کہ ان دو خصوصیات سے عاری ہوتے ہوئے اس نے اتنی ترقی بھی کس طرح کر لی تھی؟

"اچھا... جیسے آپ کی مرضی" بالآخر میں نے مردہ لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ کافی دیر تک تو میں اپنی جگہ سے ہل ہی نہیں سکا... میرے جسم سے جیسے جان ہی نکل گئی تھی۔ بہت دیر تک میں بستر پر بے حس و حرکت پڑا چھت کو گھورتا رہا۔

کائنات پر گہرا سکوت طاری تھا یا پھر شاید میرے اندر ہی سکوت چھا گیا تھا۔ کمرے میں جیسے میرا دم گھٹنے لگا۔ بڑی شدت سے میرا دل چاہا کہ باہر جا کر کھلی ہوا میں لمبی لمبی سانسیں

لوں۔ بالآخر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

گیسٹ روم اوپر کی منزل پر تھا۔ یہاں دو بیڈ روم اور بھی تھے جو استعمال نہیں ہوتے تھے۔ ان سے آگے ٹیرس تھی۔ ٹیرس کے ایک کونے سے چھوٹا سا ایک زینہ لان میں جا رہا تھا۔ اس زینے کے راستے لان کی روش پر اتر کر عثمان گھر کے کسی فرد کو ڈسٹرب کئے بغیر گھر سے باہر بھی جا سکتا تھا۔

کمرے سے نکل کر اس زینے سے میں نیچے لان پر آ گیا۔ رات زیادہ نہیں بیتی تھی مگر اوس پڑنی شروع ہو گئی تھی اور دھندلی چاندنی میں کہیں کہیں اوس کے قطرے سچے موتیوں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ بے اختیار میرا ننگے پاؤں گھاس پر چلنے کو جی چاہا۔ میں نے سلیپر روش پر ہی چھوڑے اور گھاس پر ٹہلنے لگا۔

چہل قدمی کرتا ہوا میں جب اس حصے میں پہنچا جہاں لان چیئرز پڑی ہوئی تھیں تو میں ٹھٹک کر رہ گیا۔ ایک کرسی پر راحیلہ بیٹھی تھی۔ سبز پودوں کے پس منظر سے وہ کچھ فاصلے سے مجھے محض سفید دھوئیں کا ایک ہیولا معلوم ہوئی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے سفید نائٹ گاؤن میں تھی۔ پاؤں میں سفید ہی سلیپر تھے۔ اتفاق یہ تھا کہ لان چیئرز اور میز وغیرہ کا رنگ بھی سفید ہی تھا اور چاندنی میں راحیلہ کی رنگت بھی کچھ زیادہ ہی سپید نظر آ رہی تھی۔ سرخی جیسے غائب ہو چکی تھی۔ ہوا میں نمی ہونے کی وجہ سے کچھ دور سے یہ منظر سرسری نظر میں دھندلایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ کسی پُراسرار خواب کی طرح۔ ایک لمحے کے لئے تو میں مبہوت سا ہو گیا اور مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اگر میں نے قدم آگے بڑھایا تو یہ خواب ٹوٹ جائے گا۔ یہ منظر میری نظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ یہ پُرفسوں لمحہ میرے ہاتھوں سے نکل جائے گا۔

راحیلہ کو میری موجودگی کا احساس ہو چکا تھا مگر وہ بدستور ایک ٹک چاند کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس وقت اس کی روح جیسے کہیں انجانی دنیا میں محوِ پرواز تھی۔

بالآخر میں اس کی طرف بڑھا اور چند قدم چل کر اس کے برابر والی کرسی پر جا بیٹھا۔ تب دھیرے دھیرے جیسے اس کی نظریں چاند کے طلسم سے آزاد ہوئیں اور اس کی ذات کا اڑن کھٹولا ہولے ہولے حقائق کی دنیا میں اتر آیا۔

میری طرف دیکھتے ہوئے ایک ملکوتی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی اور وہ سرگوشی نما لہجے میں بولی "مجھے معلوم تھا کہ تم لان پر ضرور آؤ گے۔ یقیناً تمہارا بھی اپنے کمرے میں دم گھٹنے لگا ہوگا.... تم نے بھی ناقابلِ برداشت اضطراب محسوس کیا ہوگا۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" اس نے خوابناک سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔

"اسے ہی محبت کہتے ہیں" وہ خوابناک سے لہجے میں بولی "سچی محبت۔ جس میں ایک انسان کا دوسرے انسان سے محسوساتی رابطہ قائم ہو جائے۔ چوٹ ایک کو لگے، درد دوسرا بھی محسوس کرے۔ مصیبت ایک پر پڑے، بے چینی دوسرے کو بھی محسوس ہو۔ ایک کا دل پکارے تو دوسرا دوڑا چلا آئے۔ خواہ ان کے درمیان میلوں کا فاصلہ ہو ــــ درحقیقت محبت اسی کا نام ہے، باقی سب کچھ بکواس ہے۔ باقی سب طلب کے مختلف روپ ہیں جنہیں لوگ محبت کا نام دے دیتے ہیں"

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ میرا ذہن جیسے پیاسی زمین بن گیا تھا جس میں اس کے الفاظ ساون کی پہلی پھوار کی طرح جذب ہو رہے تھے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "مجھے معلوم ہے اس وقت تم کوئی ضروری بات مجھے بتانا چاہتے تھے۔ شاید اسی لئے میں نے بے چینی محسوس کی اور میں اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آن بیٹھی.... اور پھر شاید تمہارے لاشعور نے بھی تمہیں آگاہ کیا اور تم یہاں چلے آئے۔"

"ہاں شاید یہی بات تھی" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں بتانا یہ چاہتا تھا کہ میں کل کسی وقت واپس لاہور چلا جاؤں گا۔"

چند لمحے وہ کچھ نہ بولی۔ افسردہ سی نظروں سے ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی پھر اسی عالمِ سکوت میں اس کی جھیل سی آنکھوں سے دو آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے۔ جانے کیوں اب تک جیسے مجھے گمان نہ گزرا تھا کہ وہ رو بھی سکتی ہے۔ اس کی ذات مجھے چٹان محسوس ہوئی تھی۔ لیکن جذبے بہرحال رگِ سنگ میں بھی سرایت کر جاتے ہیں۔

میرا اپنا معاملہ کونسا مختلف تھا؟ زمانے کی بے مہری، طرح طرح کے حادثات اور تجربات، کم عمری میں ہی زندگی کے... ان گنت پہلوؤں سے آگہی اور پھر کمبخت میرا پیشہ۔ ان سب چیزوں نے مل کر مجھے بھی تو بڑا سنگدل، بے پروا اور لاابالی بنا دیا تھا مگر راحیلہ سے ملنے کے بعد دل میں کیسا گداز پیدا ہوا تھا۔ دو ہی دن کی رفاقت میں یہ عالم تھا کہ اب اس سے دور جانا ایک کڑی آزمائش بن گیا تھا اور اب اس کے آنسو تو گویا انگارے بن کر میرے دل پر آن گرے تھے۔

"روتی کیوں ہو؟" میں نے تڑپ کر کہا "میں لاہور ہی تو جا رہا ہوں۔ لاہور، کراچی سے کونسا دور ہے۔ انسان کی جیب

...قم اور دل میں لگن ہو تو روز لاہور سے کراچی کا چکر لگ سکتا ...

اس نے دونوں ہاتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں گود میں رکھ ...ئے اور سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولی "یہ تو مجھے معلوم تھا کہ ...ند دن بعد بہرحال تمہیں واپس جانا ہی ہے لیکن اتنی جلدی ...اس آزمائش کے لئے گویا میں تیار نہیں تھی۔ ابھی تو ہم نے ...جی بھر کے باتیں بھی نہیں کیں۔ لفظوں سے خواب بھی ...ہیں بُنے۔"

"ایک عمر پڑی ہے ان باتوں کے لئے" میں نے گویا ...روانگی کے اظہار کے لئے مسکرا کر اسے دلاسہ دیا "اصل چیز تو ...بت اور پھر پیمانِ وفا ہے۔ ہمیں ایک دوسرے سے محبت بھی ...ہے اور ہم ایک دوسرے کو وفا کا قول بھی دے چکے ہیں۔ باقی تو ...ثانوی باتیں ہیں۔"

"کبھی کبھی انسان کا افسانوی ہونے کو بھی تو دل چاہتا ہے نا۔" ...وہ دھیمے لہجے میں بولی "اور پھر محبت بجائے خود دنیا کی سب ...سے بڑی حقیقت ہونے کے باوجود بڑا افسانوی سا جذبہ ہے... ...ہے نا؟" اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے نہایت ...معصومیت سے پلکیں جھپکائیں پھر جواب کا انتظار کئے بغیر ...بولی "آج کی سنگلاخ، بے کیف اور بے مہر دنیا میں کہاں رہ گئی ...ہے محبت؟ سب دو اور دو چار کے اصول پر سوچتے ہیں۔ ...سب ضرورتوں کا بیوپار کرتے ہیں۔ کون کسی کے لئے جیتا ہے اور کون کسی کے لئے مرتا ہے۔ بہت ہی افسانوی سی چیز لگنے ...لگا ہے محبت" وہ افسردہ سے انداز میں مسکرائی "پھر بھی ہر ...محبت کرنے والا یہی سمجھتا ہے کہ اس کی طرح ٹوٹ کر شاید ہی ...کسی نے محبت کی ہو۔"

"ہمارے اپنے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم بالکل اچانک... نہایت حادثاتی انداز میں... خلوص کی تمام تر شدتوں کے ساتھ ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو گئے ہیں" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی "اور اس ...محبت کا ریلا اتنا شدید ہے کہ میں اس سے خوفزدہ ہو گئی ہوں۔ اتنی خوفزدہ کہ سچ پوچھو تو میں اسے ترک کر دینا چاہتی ہوں۔ اس سے آزاد ہو جانا چاہتی ہوں مگر یہ بیج جو میرے دل کی سرزمین میں پھوٹا ہے، راتوں رات گویا تناور درخت بن گیا ہے ...جسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینکنا میرے بس میں نہیں رہا۔ میں مجبور ہو گئی ہوں... چاہوں بھی تو اس سے چھٹکارا نہیں پا سکتی۔"

"کیوں چھٹکارا پانا چاہتی ہو تم؟" میں نے کہا "یہ نعمت تو کسی کسی کے حصے میں ہی آتی ہے۔"

"میں نے کہا نا کہ میں خوفزدہ ہو گئی ہوں" وہ جھرجھری سی لے کر بولی "میں بڑی بے خوف لڑکی تھی مگر جب سے اس جذبے نے دل میں جڑیں مضبوط کی ہیں گویا وسوسوں کی آماجگاہ بن کر رہ گیا ہے۔ نیند اڑ گئی ہے۔ ہر وقت دل عجیب عجیب اندیشوں سے لرزتا رہتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ویسا نہ ہو جائے... اور سب سے بڑا اندیشہ یہ ہے کہ اگر ہم ایک دوسرے کو نہ پا سکے تو زندگی کس طرح گزرے گی؟"

"کیوں نہیں پا سکیں گے ہم ایک دوسرے کو؟" میں نے قدرے تندی سے کہا "کیا رکاوٹ ہے ہمارے راستے میں؟"

"تم ڈیڈی کو نہیں جانتے" وہ خلا میں گھورتے ہوئے بولی۔ "وہ جتنے حلیم الطبع، مرنجاں مرنج اور بامروت نظر آتے ہیں درحقیقت ویسے ہیں نہیں۔ اندر سے وہ چٹان کی طرح سخت اور پوری طرح عملی دنیا کے آدمی ہیں۔ میں تمہیں یہ بتانے میں عار نہیں سمجھتی کہ انہوں نے ممی سے شادی محض ان کی دولت کی خاطر ہی کی تھی۔ وہ خود تو جوانی میں ایک معمولی ملازم تھے۔ ہماری امی کا تعلق دولت مند گھرانے سے ہے اور وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھیں... لیکن ڈیڈی کی قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ انہوں نے ممی کی دولت کو عیاشیوں میں نہیں لٹایا حالانکہ ممی ان پر اس طرح مرتی تھیں کہ انہوں نے اپنی تمام دولت و جائیداد، ہر چیز، ہر اختیار روزِ اول سے انہی کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ کسی بھی قسم کے کاغذات وہ دستخط کرانے کے لئے لاتے تھے تو ممی انہیں پڑھتی بھی نہیں تھیں۔ بس آنکھ بند کر کے سائن کر دیتی تھیں۔ اندھا اعتماد رہا ہے انہیں ہمیشہ ڈیڈی پر۔ اور ڈیڈی نے بھی کبھی ان کے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔ ہمیشہ اپنی ذمے داریوں کو محسوس کیا ہے۔ ممی سے کہیں زیادہ حسین عورتیں ان کے گرد منڈلاتی رہیں کیونکہ وہ وجیہہ بھی تھے اور دولت مند بھی لیکن ان کا کبھی کسی کے ساتھ اسکینڈل نہیں بنا۔ وہ کبھی کسی کی طرف متوجہ دکھائی نہیں دئے۔ ممی سے شادی تو انہوں نے گو کہ ان کی دولت کی خاطر کی تھی اور نہایت صاف گوئی سے اس کا اعتراف بھی کر لیا تھا لیکن شادی کے بعد شاید ممی کی قابلِ رشک عادات کی وجہ سے وہ انہی کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ انہوں نے ممی کی دولت میں بے پناہ اضافہ ہی کیا ہے اس میں کمی نہیں آنے دی اور دولت کی خاطر شادی بھی انہوں نے محض اس لئے کی کہ دولت سے دولت کمانے کا انہیں بہت شوق تھا۔ ویسے تو انہیں یقین تھا کہ وہ خالی ہاتھ بھی جدوجہد شروع کر کے ایک نہ ایک دن دولت مند ضرور بن جائیں گے لیکن ان کے خیال میں یہ لمبا راستہ تھا۔ انہوں نے شارٹ کٹ اختیار کیا۔ ان کا خیال تھا کہ

بڑھاپے میں جاکر قدرے آسودہ حال ہوجانا کوئی خاص کارنامہ نہیں - اب بھی دولت سے دولت کمانا ہی ان کا محبوب مشغلہ ہے اور اس کے لئے وہ بعض بڑی بڑی اور نہایت مخدوش بازیاں لگانے سے بھی نہیں چوکتے اور معلوم نہیں یہ ان کی ذہانت ہے یا خوش قسمتی کہ جیت ہمیشہ انہی کی ہوتی ہے - میں یہ سب کچھ تمہیں اس لئے بتارہی ہوں کہ تمہیں ڈیڈی کو سمجھنے میں آسانی رہے - مسئلہ یہ ہے کہ ان سب باتوں کو تم خواہ ڈیڈی کی زندگی کے منفی پہلو سمجھو یا مثبت لیکن مجھے وہ اسی طرح جان ودل سے عزیز ہیں - مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ وہی میرے آئیڈیل ہیں - وہ بڑے پریکٹیکل آدمی ہیں مگران کی عملیت پسندی میں بھی بڑا حسن ہے - میرے ذہن میں اپنے آئیڈیل کا جو خاکہ ہے بالکل ویسا ہی ہے - میں ان سے بغاوت نہیں کرسکتی - میں وہی کروں گی جو وہ کہیں گے خواہ اس کے لئے مجھے پوری زندگی خون تھوکتے ہوئے گزارنی پڑے - "

" عجیب بات ہے .. " میں نے آہستگی سے کہا " لیکن آخر وہ چاہیں گے کیا ؟ "

" پہلی بات تو یہ ... کہ انہوں نے خود بے شک دولت کے لئے ممی سے شادی کی تھی لیکن وہ ہرگز نہیں چاہیں گے کہ کوئی ان کی بیٹی سے دولت کے لئے شادی کرے - یہ کوئی حیرت کی بات نہیں - یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے - دوسری بات میں تمہیں پہلے ہی بتاچکی ہوں کہ وہ اپنے اسٹیٹس کا آدمی دیکھیں گے - اپنے جیسی خصوصیات اس میں دیکھنا چاہیں گے - اب تمہیں زیادہ سے زیادہ دولت کمانے اور اپنا اسٹیٹس بلند کرنے کے لئے اپنی جدوجہد تیز کرنی ہوگی - "

" اس کی تم فکر نہ کرو " میں نے مطمئن لہجے میں کہا - " میں جب تمہارے ڈیڈی سے تمہیں مانگنے آؤں گا اس وقت میں ایک ممتاز اور صاحب حیثیت آدمی ہوں گا - "

مجھے معلوم تھا کہ اپنے اس دعوے کی تکمیل کے لئے میرے پاس زیادہ مہلت نہیں تھی - چند برس کی بات اور تھی کہ انکل زاہد کو راحیلہ کی شادی کی فکر شدت سے لاحق ہوجاتی بلکہ میرا اندازہ تھا کہ اگر اس سے پہلے ہی انہیں کوئی معقول رشتہ مل گیا تو وہ اس فرض سے سبکدوش ہونے میں دیر نہیں کریں گے لیکن مجھے اطمینان تھا کہ اگر میں مارا نہ گیا یا گرفتار نہ ہوگیا تو اس عرصے میں میرے پاس دولت کی ریل پیل ہوگی کیونکہ میں نے بھی دولت کے حصول کے لئے شارٹ کٹ ہی اختیار کیا ہوا تھا -

" اگر تم یہ بات پورے وثوق سے کہہ رہے ہو تو پھر میں ڈیڈی اور ممی کو اشارہ دے دوں گی کہ میری پسند کیا ہے تاکہ وہ کہیں اور میری بات پکی کرنے کی کوشش نہ کریں " راحیلہ قدرے مربیانہ لہجے میں بولی " دو لڑکے ہیں ... جاوید اور جمیل دونوں صنعت کاروں کے لڑکے ہیں اور میرے دور پار کے کزن بھی ہیں - مجھے معلوم ہے وہ دونوں ہی مجھ میں دلچسپی رکھتے ہیں صرف وہی نہیں ان کے والدین بھی مجھے پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں بلکہ اگر میں یہ کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ محض میری وجہ سے ان دونوں خاندانوں میں ایک خاموش سی رقابت چل نکلی ہے - ادھر میرے والدین بھی ان دونوں لڑکوں کو میرے لئے موزوں سمجھتے ہیں اور ایک طرح سے مخمصے میں ہیں کہ کسے ترجیح دیں - اس سلسلے میں رائے لینے کے لئے وہ کبھی کبھار مجھے بھی کریدتے رہتے ہیں - ظاہر ہے ہم دونوں کے حق میں یہ کچھ اچھی صورتحال نہیں ہے - اب مجھے ان کے کان میں یہ بات ڈالنی پڑے گی کہ میری پسند کیا ہے - مجھے یقین ہے کہ وہ میری پسند کو یکسر نظر انداز نہیں کریں گے بشرطیکہ تم ان کی توقعات پر پورے اترنے کے قابل ہوگئے -

اس نے جو یہ کزنوں والی بات چھیڑی تھی اسے سنتے ہوئے میرا تو دل ہی ڈوبنے لگا تھا لیکن اس کے آخری الفاظ نے میری ڈھارس بندھی -

چند لمحے ہم دونوں خاموش رہے پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے قدرے یاسیت زدہ سے انداز میں مسکرائی " کتنا اچھا ہو کہ ہم نے تفصیل سے یہ سب باتیں کرلیں - اب ہمارے ذہنوں میں ایک دوسرے کی بابت کوئی ابہام نہیں رہے گا -

میں صرف اثبات میں سرہلا کر رہ گیا - میں بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جارہا تھا - دل چاہ رہا تھا کہ اس من موہنی صورت کو سینے میں کہیں نقش کرلوں - میری محویت محسوس کرتے ہوئے اس نے شرمیلے سے انداز میں سر جھکالیا اور طویل سانس لے کر بولی " تو پھر کل تم لاہور واپس جارہے ہو ... ؟ مزید رکنے کی کوئی صورت نہیں ؟ "

" تم کہو تو رک جاتا ہوں " میں نے اس لمحے کے سحر سے آزاد ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا " لیکن میرا نہ جانا میرے لئے خاصے بڑے کاروباری نقصان کا باعث ہوگا اور تمہیں معلوم ہے کہ میں کاروبار کی دنیا میں نیا ہی ہوں - ابتدا ہی میں اس قسم کے نقصانات کا متحمل نہیں ہوسکتا ... اور پھر اب تم نے حکم صادر کردیا ہے کہ مجھے اپنا اسٹیٹس بلند کرنے کی جدوجہد تیز کرنا ہوگی - "

" ہاں ... اسی لئے میں اب تمہیں رکنے کو ہرگز نہیں کہوں گی " وہ گویا اپنی افسردگی کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی " بلکہ میں تمہیں یہ بھی تلقین کروں گی کہ تم اب بلا ضرورت کبھی کراچی کا چکر بھی مت لگانا - بس یکسوئی سے اپنے کام میں لگے رہنا ... ہاں مجھے باقاعدگی سے خط ضرور لکھتے رہنا - "

" وہ تو تم نہ کہتیں تب بھی ظاہر ہے میں ضرور لکھتا " میں نے کہا " البتہ میں یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ خط میں کس پتے پر لکھا کروں گا ؟ "

" اسی گھر کے پتے پر ... اور کہاں ؟ " میرا سوال اس کے لئے گویا قدرے حیرانی کا باعث بنا تھا - پھر وہ جیسے میرا مطلب سمجھتے ہوئے مجھے تسلی دینے کی خاطر بولی " گھر میں میری ڈاک کوئی نہیں کھولتا - ہوسکے تو کبھی کبھار فون بھی کرلیا کرنا " اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش آگئی -

" میرا خیال ہے ہمیں جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں " میں نے مسکرانے کی کوشش کی -

" کون کمبخت جذباتی ہورہا ہے ؟ " وہ بھی جیسے اپنے محسوسات کو چھپاتے ہوئے دھیرے سے ہنس دی " اب تم جاکر آرام سے سوجاؤ - کل تمہیں یکدم پھر ماحول کی تبدیلی کا سامنا کرنا ہے - کونسی فلائٹ سے جاؤگے ؟ "

" میرے پاس اوپن ٹکٹ ہے - صبح ہی دیکھوں گا کہ کونسی فلائٹ میں سیٹ مل سکتی ہے " میں نے کہا -

وہ اٹھ کھڑی ہوئی " اچھا ... تو پھر میری طرف سے تو ابھی سے خدا حافظ " اس کا ڈھیلا ڈھالا گاؤن ہوا میں لہرایا اور پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی یوں میری نظر سے اوجھل ہوگئی جیسے چاندنی سے بنا ہوا کوئی ہیولا دھیرے دھیرے ہوا میں تیرتا ہوا بالآخر تاریکی میں مدغم ہوگیا ہو -

میری کچھ عجیب ہی کیفیت تھی - بچھڑنے کا دکھ تھا تو ساتھ ہی اس احساس کی لذت بھی تھی کہ کوئی انتظار کرے گا ' میرے بارے میں سوچے گا - اس احساس میں واقعی ایک عجیب کسک آمیز سی لذت پنہاں ہوتی ہے کہ کہیں آپ کا بھی کوئی چاہنے والا موجود ہے جو آپ ہی کی طرح ہجر کی راتیں گنتا اور اندر ہی اندر آنسو پیتا ہے - انہی محسوسات سے الجھتا ہوا بالآخر میں اپنے کمرے میں آکر سوگیا -

دوسری صبح جب میں نے ناشتے کی میز پر اعلان کیا کہ میں آج لاہور واپس جارہا ہوں تو سبھی حیران رہ گئے - حتی کہ راحیلہ نے بھی یوں حیرت کا اظہار کیا جیسے اسے بھی کچھ معلوم نہیں تھا - میں نے اندازہ لگایا کہ میرے جانے کا سن کر سب سے زیادہ اداسی آنٹی کے چہرے پر نظر آنے لگی تھی -

" لیکن یہ اچانک تمہارا واپسی کا پروگرام کس طرح بن گیا ؟ " وہ الجھن زدہ لہجے میں بولیں " تم تو کئی دن رہنے اور سیر وتفریح کرنے کا پروگرام بناکر آئے تھے ؟ "

" بس آنٹی ! ایک کاروباری مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا ہے " میں نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا " اور میرے بغیر وہ مسئلہ حل نہیں ہوگا - "

انکل زاہد کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے بولے " بھئی اگر کوئی مالی مشکل ہو تو مجھ سے کہتے ہوئے بالکل نہ ہچکچانا - مجھے تمہارے کام آکر خوشی ہوگی - کاروبار میں نشیب وفراز تو آتے ہی رہتے ہیں " ان کے لہجے میں حقیقی خلوص کی خوشبو تھی -

میں اس پیش کش پر خوش ہونے کے بجائے جانے کیوں کچھ شرمندہ سا ہوگیا - میں نے فوراً پرزور لہجے میں کہا " نہیں ' نہیں انکل ! مالی مسئلہ کوئی نہیں ہے - مسئلہ انتظامی ہے - بہرحال آپ کی مخلصانہ پیش کش کا بہت بہت شکریہ " میرا انداز کسی حد تک اس سفید پوش کا سا تھا جو بھوک سے قریب المرگ ہوتا ہے مگر جب اسے کوئی کھانے کے لئے پوچھتا ہے تو وہ بمشکل لبوں پر مسکراہٹ لاکر کہہ دیتا ہے " جی نہیں - شکریہ - میں تو گھر سے کھانا کھاکر چلا تھا - "

خیر مجھے حقیقتاً رقم کی ضرورت تو تھی ہی نہیں - انکل زاہد سے میں رقم لے کر کیا کرسکتا تھا ؟ کوئی شریفانہ کام تو مجھے آتا ہی نہیں تھا ... اور جو میرا دھندہ تھا وہ ویسے ہی ٹھیک چل رہا تھا - فی الحال میرا آزادانہ طور پر دھندہ شروع کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا -

" ٹھیک ہے افضل میاں ! اگر تمہارا جانا بہت ہی ضروری ہے تو چلے جاؤ " انکل دفتر جانے کے لئے اٹھتے ہوئے بولے - " لیکن ہوسکے تو جلد دوبارہ چکر لگانا - تم سے یہ ملاقات بے حد تشنہ سی رہی - کچھ ہم بھی مصروف رہے اور کچھ تم بھی اندازے سے بہت پہلے چل دیے ... اور ہاں ... تمہاری سیٹ کنفرم ہوجائے تو مجھے دفتر فون کردینا - میں آجاؤں گا - ہم سب تمہیں سی آف کرنے چلیں گے - "

مجھے شام کی فلائٹ میں سیٹ ملی اور میرے منع کرنے کے باوجود وہ سب کے سب مجھے ائرپورٹ تک چھوڑنے کے لئے چل دیے - ائرپورٹ پہنچ کر کافی دیر تک ہم ویٹنگ لاؤنج میں ہی کھڑے باتیں کرتے رہے - اسی قسم کی باتیں جیسی عموماً ایسے موقعوں پر کی جاتی ہیں - بالآخر میری فلائٹ سے متعلق اعلان ہوا تو میں سب کو خدا حافظ کہہ کر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف چل دیا - بورڈنگ کارڈ میں لے چکا تھا -

ڈیپارچر لاؤنج کے شیشے کے دروازے پر رک کر میں نے مڑ کر دیکھا - وہ لوگ سیڑھیوں کے قریب پہنچ چکے تھے - راحیلہ سب سے پیچھے تھی اور دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے سست سے انداز میں جارہی تھی - عین اسی وقت اس نے بھی

مڑ کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک ثانیئے کے لئے ایک سایہ سا لہرایا۔ خاموشی کی زبان میں اس نے ایک لمحے میں جیسے بہت کچھ کہہ دیا تھا۔

"میں نے جو کچھ کہا تھا وہ سب یاد ہے نا؟" اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھ سے پوچھا۔

"سب یاد ہے... اور مرتے دم تک یاد رہے گا۔" میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا تھا اور دوسرے ہی لمحے وہ لوگوں کی بھیڑ میں میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

روانہ ہونے سے پہلے میں نے لاہور فون کردیا تھا اور لاہور ائرپورٹ پر شرفو مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ شرفو کو میں صرف تین چار دن بعد ہی دیکھ رہا تھا مگر وہ مجھے بہت بدلا بدلا دکھائی دے رہا تھا۔ نکھرا نکھرا اور بے حد آسودہ سا معلوم ہو رہا تھا۔ لاہور کی فضا بھی مجھے بہت مختلف، بہت بہتر محسوس ہو رہی تھی۔ تبدیلی شاید انسانوں میں اور فضاؤں میں نہیں آئی تھی بلکہ تبدیلی مجھ میں ہی آئی تھی۔ ترنگ میرے ہی دل سے پھوٹ رہی تھی۔ میرا دل پہلے سنگلاخ میدان تھا، اب شاید اس میں پھول کھل اٹھے تھے۔ گرد وپیش کی ہر چیز مجھے بھلی لگ رہی تھی۔

میں اور شرفو جب ایک دوسرے سے گلے مل کر اچھی طرح ایک دوسرے کی پسلیاں کڑکڑا چکے تو باہر آکر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ شرفو نے گاڑی اسٹارٹ کرکے پارکنگ لاٹ سے نکال لی اور ہم سڑک پر پہنچ چکے تو میں نے پوچھا "کیا بات ہے، تم بہت خوش نظر آرہے ہو؟ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کسی انجانے تصور سے تمہارے گال یوں تمتما اٹھتے ہیں کہ گال کم اور ٹماٹر یا چقندر زیادہ معلوم ہونے لگتے ہیں؟"

"ہاں یار... میں بہت خوش ہوں اور اپنی خوشی کی وجہ میں صرف تمہیں بتا رہا ہوں" وہ مسرور لہجے میں بولا "بات صرف اتنی ہے کہ میری بہن کی شادی طے ہوگئی ہے۔"

"مبارک ہو" میں نے خلوص دل سے کہا۔

"شکریہ" وہ سرہلا کر بولا "پرسوں ہی گھر والوں کا خط آیا تھا تب سے میں بے چین تھا کہ تمہیں یہ خبر سناؤں۔ مجھے معلوم تھا کہ صرف تم ہی میری خوشی کو محسوس کرسکتے ہو۔ یہاں اور تو کسی کو کسی کے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں، حتی کہ قاسم خان کو بھی نہیں جس کے لئے ہم جان ہتھیلی پر رکھے پھرتے ہیں۔"

"ہاں... یہ بات تو ہے" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اسی ماہ کی اٹھارہ تاریخ طے ہوئی ہے شادی کی" وہ مسرور لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "سمجھو بس چھ ہی دن رہ گئے ہیں۔ لڑکے والوں کو بہت جلدی تھی۔ اماں نے لکھا ہے کہ گھرانہ بہت ہی شریف اور بہت ہی اچھا ہے۔ ہم تو سوچتے تھے کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہوگئی ہے۔ اب جیسا تیسا بھی رشتہ میسر آئے گا ہاں کردیں گے لیکن اللہ نے من کی مراد کے مطابق بر دے دیا ہے۔ اب زیور اور چند ایک خاص ملبوسات کا انتظام مجھے ہی کرنا ہے... اور مجھے لگتا ہے کہ یہ سب چیزیں لے کر میں عین موقع پر ہی گھر پہنچ سکوں گا کیونکہ ابھی یہاں بہت سے ضروری کام نمٹانے ہیں اور انہی کے دوران شاپنگ کرنی ہے۔ شاپنگ میں ذرا تم بھی میرا ساتھ دینا۔ مجھے تو زیور، کپڑے وغیرہ کے بارے میں خاک بھی پتا نہیں۔"

"پتا تو مجھے بھی کچھ نہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہرحال تمہارے ساتھ چلا چلوں گا۔ بشرطیکہ باس نے مجھے بھی کاموں میں بری طرح نہ الجھا دیا۔ اس نے جس طرح ہنگامی انداز میں مجھے بلایا ہے اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ مجھے بہت سے معاملات نمٹانے پڑیں گے... اور اوپر سے طرّہ یہ کہ باس خود لندن جا رہا ہے۔"

"ہاں..." شرفو مسکرایا "باس آج کل بہت اونچی ہواؤں میں ہے۔ بہت خوش ہے۔ خیر... اچھا ہی ہے۔ باس خوش ہوتا ہے تو ہمارے بھی کچھ دن پھرنے لگتے ہیں" پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولا "ہمیں تو زندگی میں بس ایک ہی فکر تھی کہ کسی طرح بہن کے فرض سے سبکدوش ہوجائیں۔ یہی ایک بوجھ تھا کندھوں پر۔ یہ کام نمٹ جائے گا تو بس ہم آزاد ہیں۔ کسی اور کی مجھے کوئی خاص فکر نہیں۔ دل ہی دل میں میں نے اپنے آپ سے صرف بہن کے فرض سے سبکدوش ہونے کا عہد کیا ہوا تھا۔ اس کے بعد ما بدولت بالکل بے فکری اور عیش وعشرت سے زندگی گزاریں گے۔"

"اب کونسا تم فکروں میں دُبلے ہوئے جارہے تھے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اندر کا حال تمہیں کیا معلوم" وہ طویل سانس لے کر گاڑی مین بلیورڈ گلبرگ کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔

ہم جب ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر پہنچے تو یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ ڈرائیو وے میں قاسم خان کی مرسڈیز موجود تھی۔ جمیل باہر ہی موجود تھا اور اس نے ہمیں بتایا کہ باس میرا ہی انتظار کر رہا ہے۔ مجھے کچھ عجیب سا ہی لگ رہا تھا کہ میں یکایک ہی قاسم خان کے لئے بہت زیادہ اہمیت کا حامل ہوگیا تھا حالانکہ میرے اپنے خیال میں ابھی میں نے کوئی ایسی بے مثال کارکردگی نہیں دکھائی تھی۔

ہم اندر پہنچے تو قاسم خان ہمیں ڈائننگ روم میں ملا۔ جولی عرف مس ٹریپ اس کے سامنے کافی کے برتن رکھ رہی تھی۔ قاسم خان بہت تپاک سے مجھ سے ملا جیسے میں اس کا کارندہ

نہیں، دوست ہوں۔ مس ٹریپ نے خاموشی سے ہمارے لئے بھی کافی تیار کی پھر اسی طرح خاموشی سے کمرے سے رخصت ہوگئی۔

بیٹھنے کے بعد رسمی باتیں ہوچکیں اور کافی تقریباً ختم ہوچکی تو قاسم خان گویا اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا "میں تو کل شام یہاں سے کراچی اور پھر وہاں سے لندن کے لئے روانہ ہوجاؤں گا۔ آنے والے دنوں میں تم دونوں کو یہاں بہت کام کرنا ہے۔ حالات نے کچھ اس طرح کروٹ لی ہے بلکہ یوں سمجھو کہ پے درپے کئی کروٹیں لی ہیں" وہ سگار نکالتے ہوئے مسکرایا "اور ان کروٹوں کی وجہ سے بہت سے معاملات الجھ کر رہ گئے ہیں۔ کچھ اچھی خبریں بھی ہیں اور کچھ بری خبریں بھی ہیں۔ کچھ عرصے کے لئے تم دونوں کو شاید کچھ ایسے کام بھی انجام دینے پڑ جائیں جو تم دونوں کے دائرہ کار میں نہیں آتے..."

میں نے مسکراتے ہوئے شرفو کی طرف دیکھا جس کا منہ لٹک گیا تھا۔ قاسم خان ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "کیا بات ہے، تم دونوں معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کی طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟"

شرفو تو کچھ نہ بولا۔ میں نے کہا "دراصل ہم پہلے ہی بات کر رہے تھے کہ مصروفیات کچھ بڑھ نہ جائیں جبکہ اٹھارہ تاریخ کو شرفو کی بہن کی شادی آرہی ہے۔"

قاسم خان نے اس خبر پر کوئی خاص ردعمل ظاہر کئے بغیر کہا۔ "ارے بھئی اٹھارہ تاریخ تک تو تم فارغ ہوچکے ہوگے۔ صرف تین چار دن کی مصروفیات ہیں۔ تمہیں تو معلوم ہے کہ میرے کام کا نظام بہت مختصر سے گروہ پر چل رہا ہے اور میری اس مختصر سی مشینری سے دو اہم پرزے کھسک گئے ہیں اس لئے تم پر اضافی کام کا بار پڑ رہا ہے۔ کچھ لین دین کے معاملات ہیں۔ کچھ لوگوں کے حصے پہنچانے ہیں۔ پندرہ تاریخ کو تم لوگوں کو ایک اہم کھیپ وصول کرنے "سبزی منڈی" کی سرحد پر جانا ہے۔ مال کو سرحد پار تو فروخت کنندہ پارٹی پہنچا دے گی۔ وہاں سے اسے پنڈی تک لانا تمہاری ذمے داری ہوگی۔ پنڈی میں خریدار پارٹی وصول کرلے گی۔ اس کے بعد وہ جانے اور اس کا کام۔ کھیپ بہت اہم ہے۔ صرف ایک ٹرک ہی ہوگا لیکن بہت ہی قیمتی ہوگا۔ اوپر کوئلہ لدا ہوا ہوگا۔ ایک بات کا خاص خیال رکھنا ہے کہ کسی بھی قیمت پر مال چھوڑ کر نہیں بھاگنا ہے۔ باقی سب میں تمہیں نقشے پر سمجھا دوں گا کہ ڈینجر زون کون سی ہے۔ کہاں کہاں سے تمہیں کوڈ ورڈز سن کر گزر جانے دیا جائے گا اور کہاں رسمی طور پر تمہیں روکا جائے گا۔ اصل خطرہ صرف ایک پوائنٹ پر ہے وہاں سے نکل گئے تو سمجھو کام ختم ہوگیا۔ خیر... یہ سب تفصیلات تو بعد میں طے ہوں گی....."

اس کا روئے سخن شرفو کی طرف ہوگیا "اس وقت میرا اصل مقصد تو تمہیں خبردار کرنا تھا تاکہ تم ذہنی طور پر تیار رہو۔ مال لانے کے لئے افضل کے ساتھ تمہیں جانا ہوگا کیونکہ جمشید میرے ساتھ لندن جارہا ہے۔"

جمشید وہ شخص تھا جو ایک طرح سے مال کے "باڈی گارڈ" کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ہم دونوں مال لینے اکٹھے جاتے تھے۔ تیسرا ڈرائیور ہوتا تھا۔ بعض اوقات ڈرائیور کے فرائض بھی ہم دونوں میں سے ہی کسی ایک کو یا باری باری دونوں کو انجام دینے پڑتے تھے۔ مال اگر ٹرک میں ہوتا تھا تو ایک وقت میں ہم میں سے ایک آدمی نیچے ڈرائیور والے حصے میں ہوتا تھا اور دوسرا اسٹین گن وغیرہ لئے ٹرک میں مال کے اوپر لیٹا ہوتا تھا اور اس کی چاروں طرف نظر ہوتی تھی۔ اگر ہمارے بری طرح پھنس جانے کا اندیشہ پیدا ہوجاتا تھا تو اوپر والے کو سگنل دے دیا جاتا تھا اور وہ زبردست طریقے سے فائرنگ شروع کردیتا تھا۔ نیچے بیٹھے ہوئے آدمی کا کام مشاقانہ حکمتِ عملی کے ساتھ ٹرک کو بچا کر نکال لے جانا ہوتا تھا۔

جمشید نہایت بے جگر آدمی تھا اور اپنے کام میں بے حد ماہر۔ اس کی حیثیت ایک طرح سے میرے اسسٹنٹ کی تھی وہ تقریباً ان پڑھ ہی سا آدمی تھا۔ معلوم نہیں قاسم خان کیوں اسے اپنے ساتھ لندن لے جارہا تھا۔

"تو مجھے مال لانے کے لئے افضل کے ساتھ جانا ہوگا؟" شرفو نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ایک مدت ہوگئی ہے مجھے اس قسم کی کسی مہم پر گئے ہوئے۔ ایک عرصہ پہلے مجھے کبھی کبھار چھوٹی موٹی کھیپ کے ساتھ بھیجا جاتا تھا۔"

"گھبرانے کی ضرورت نہیں" قاسم خان نے گویا اسے حوصلہ دیا "مجھے معلوم ہے تمہاری اس دور کی مشاقی ومہارت آج بھی برقرار ہے۔"

"گھبرانا کیسا جی؟" شرفو کی مسکراہٹ بدستور پھیکی ہی رہی "گھبرانا تو ہم نے اسی دن چھوڑ دیا تھا جس دن آپ کے حلقے میں آگئے تھے۔"

"گڈ" قاسم خان سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا "اس مہم سے گویا تمہارا بھی منہ کا ذائقہ تبدیل ہوجائے گا۔ بہت عرصہ ہوگیا تمہیں ٹھنڈے میٹھے قسم کے کام انجام دیتے ہوئے۔ اب ہم آتے ہیں دوسرے اہم کام کی طرف۔ میں نے تمہیں بتایا کہ ہماری مختصر سی مشینری کے دو پُرزے اپنی جگہ سے کھسک گئے ہیں۔ اس سے میری مراد ایک تو یہی جمشید تھا جو میرے ساتھ لندن جارہا ہے۔ دوسرا پُرزہ شاہ رخ

ہے جو صحیح معنوں میں کھسک گیا ہے۔"

شاہ رخ کو ہم سرسری طور پر جانتے تھے۔ ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ وہ گروہ میں شامل ہے لیکن صحیح طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ گروہ میں اس کی پوزیشن کیا ہے، وہ کرتا کیا ہے اور قاسم خان کے نزدیک اس کی اہمیت کتنی ہے؟ یہ بھی قاسم خان کی پالیسی ہی کا ایک حصہ تھا کہ جب تک بھی ممکن ہو گروہ کے بیشتر ارکان کو ایک دوسرے سے حتی الامکان لاتعلق رکھا جائے۔ جن لوگوں کو ایک دوسرے کے ساتھ کسی نہ کسی کام پر جانا پڑتا تھا وہی ایک دوسرے کو کسی حد تک جانتے تھے۔

شاہ رخ ایک اسمارٹ، خوش شکل اور نفیس سا نوجوان تھا۔ وہ بظاہر کسی معزز گھرانے کا فرد اور کسی صاف ستھرے ادارے کا ملازم نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ وہ کسی ایسے ویسے دھندے میں بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

"میں نے سنا ہے شاہ رخ روپوش ہو گیا ہے؟" شرفو دھیمے سے لہجے میں بولا۔

"ٹھیک سنا ہے تم نے" قاسم خان سگار کا گہرا کش لے کر بولا "مجھے فرصت ہی نہیں ملی کہ تم سے اس مسئلے پر بات کرتا۔ قصہ یہ ہے کہ پچھلے دنوں شاہ رخ سرحد پار سے ایک چھوٹی سی کھیپ لے کر آیا۔ گو کہ سب معاملات سیٹ تھے لیکن معلوم نہیں کیوں اور کس طرح اینٹی اسمگلنگ اسکواڈ والوں نے اسے گھیر لیا۔ وہ مال چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ خیر... یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ ایسا ہوتا ہی رہتا ہے۔ ویسے بھی کھیپ چھوٹی تھی اسی لئے وہ گیا بھی اکیلا تھا۔ بہرحال خطرہ ٹل جانے کے بعد اسے مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہئے تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ یہ افضل کے کراچی جانے سے بھی پہلے کی بات ہے۔ کئی دن تک مجھے اس کا کوئی سراغ ہی نہیں ملا۔ پھر خبر آئی کہ اس نے باڑہ کی ایک پارٹی سے ملاقات کی ہے جسے ہم اپنے مخالفوں میں ہی شمار کرتے ہیں... پھر معلوم نہیں کیا ہوا کہ وہ لاہور واپس آ گیا۔ میرے جاسوسوں نے مجھے خبر دی ہے کہ کل سے وہ مانی ٹوکے والے کی کٹڑی میں چھپا ہوا ہے..."

کٹڑیاں قدیم لاہور کے مختلف حصوں میں کہیں کہیں موجود وہ عمارتیں ہیں جو مغلوں کے دور سے چلی آ رہی ہیں۔ ایک ہی بڑے سے احاطے میں پچاسوں بے ترتیب سی کوٹھڑیوں وغیرہ پر مشتمل عمارت کٹڑی کہلاتی ہے۔ بعض کٹڑیاں ایسی بھی ہیں جن میں ڈھائی ڈھائی سو خاندان آباد ہیں جو درحقیقت ایک ہی لامحدود خاندان کی طرح رہتے ہیں۔ ان کے دکھ سکھ، لڑائی جھگڑے، پیار و محبت، تقریبات اور لین دین سب سانجھا ہوتا ہے اور سب کی زندگی ایک دوسرے کے سامنے کھلی کتاب ہوتی ہے۔ ہر کٹڑی کسی نہ کسی زندہ یا مردہ فرد کے نام سے موسوم ہوتی ہے۔

"اب مسئلہ کیا ہے؟" شرفو نے سرگوشی نما لہجے میں پوچھا۔

"مسئلہ یہ ہے کہ شاہ رخ غداری کر گیا ہے" قاسم خان گہری سانس لے کر بولا "کھیپ دراصل اس نے پہلے ہی پار کر لی تھی۔ تھوڑا سا مال گاڑی میں چھوڑ دیا تھا اور جان بوجھ کر اس طرح کی حرکتیں کی تھیں کہ وہ اینٹی اسمگلنگ والوں کے ہتھے چڑھ جائے۔ کھیپ بڑی نہ سہی لیکن اتنی بے وقعت بھی نہیں تھی۔ شاہ رخ جیسے لوگوں کے لئے تو بہت تھی۔ اخبار میں بہت معمولی سا مال پکڑے جانے کی خبر آئی ہے اور میں نے اپنے ذرائع سے تصدیق کر لی ہے۔ اینٹی اسمگلنگ والوں کو واقعی اتنا ہی مال ہاتھ لگا ہے۔"

"ممکن ہے شاہ رخ اس خوف سے روپوش ہو گیا ہو کہ کہیں وہ آپ کے عتاب کا نشانہ نہ بنے" شرفو نے خیال ظاہر کیا۔

"وہ کم عمر ضرور ہے مگر ایسا بچہ بھی نہیں ہے" قاسم خان پہلو بدل کر بولا "اسے معلوم ہے کہ بعض اوقات ہمیں اس سے بھی بڑی کھیپ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن کھیپ سے ہاتھ دھونے والے سیدھے ہمارے پاس آتے ہیں اور ساری صورتحال بتا دیتے ہیں۔ ہم تصدیق کر لیتے ہیں کہ کیونکر ایسا ہوا اور کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ شاہ رخ کو بھی یہ بات اچھی طرح معلوم تھی۔ پھر اس کا باڑے والی پارٹی سے ملنا... اور پھر مانی ٹوکے والے جیسے آدمی کی کٹڑی میں چھپنا۔ ان سب باتوں سے اس کی غداری کی تصدیق ہو گئی ہے۔ مجھے خطرہ یہ ہے کہ وہ کسی ذاتی وجہ کے تحت یا کسی پارٹی کے بہکاوے میں آ کر سرکاری محکموں کو ہمارے بارے میں ٹپ دینے کی کوشش نہ کرے۔ گو کہ اسے کوئی خطرناک قسم کی معلومات حاصل نہیں ہیں اور نہ ہی اس کی مدد سے ہمارے خلاف کچھ ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اس کے باوجود میں چونکہ اپنی عمارت میں کوئی مخدوش اینٹ چھوڑنا پسند نہیں کرتا اس لئے...." وہ بات ادھوری چھوڑ کر معنی خیز سے انداز میں مسکرا دیا۔

"اس کا پتا صاف کرنا ہے؟" شرفو نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں پوچھا۔

"ہاں" قاسم خان نے سرگوشی نما لہجے میں جواب دیا اور سگار کا کش لینے لگا۔

چند لمحے کمرے میں بوجھل سکوت طاری رہا۔ بالآخر قاسم خان نے ہی یہ سکوت توڑا "یہ کام آج رات ہی ہونا ضروری ہے۔ رات کے بارہ بجے کے بعد کٹڑی کا بلند و بالا چوبی دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور اس دروازے کے عقب میں ہی سب سے پہلے مانی ٹوکے والے ہی کا رہائشی حصہ ہے جس کے سامنے بنی ہوئی لمبی چوڑی اور بھاری بھرکم چارپائی پر وہ خود یا اس کے دو چار گرگے بیٹھے حقہ وغیرہ گڑگڑاتے رہتے ہیں۔ مانی ٹوکے والا پرانا آدمی ہے۔ اس کی سوچ بھی پرانی ہے لیکن بہرحال خطرناک آدمی ہے۔ اس سے الجھنے کی ضرورت نہیں۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور اسے کھول کر میز پر پھیلایا۔ اس پر آڑی ترچھی لکیروں سے ایک نقشہ سا بنا ہوا تھا۔

"میرے ایک ضعیف سراغرساں نے بڑی محنت سے یہ نقشہ تیار کیا ہے۔ اسے اتفاقاً ہی شاہ رخ کا سراغ مل گیا تھا مگر اس کے بعد اس نے اس مقصد کے لئے بڑی محنت کی ہے کہ یہ سراغ ہاتھ سے نکلنے نہ پائے" قاسم خان مسکرایا "جیسا کہ میں نے بتایا رات بارہ بجے کے بعد کٹڑی کا بھاری بھرکم اور بلند و بالا دروزاہ بند ہو جاتا ہے اور کٹڑی کی چاردیواری بھی دوسرے بلند و بالا مکانوں سے بالکل جڑی ہوئی ہے۔ عقب میں جو یہ چھوٹی سی گلی ہے...."

وہ نقشے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ نقشہ وہ درحقیقت شرفو کو سمجھا رہا تھا جو لاہور کے گلی کوچوں کا کیڑا تھا۔

قاسم خان بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس گلی سے تم درحقیقت اس مکان پر چڑھو گے اور اس طرف سے کھڑکیوں میں پاؤں رکھ کر کٹڑی میں کودو گے۔ یہ کوٹھڑیوں کے درمیان ٹیڑھے میڑھے راستے ہیں لیکن تم جہاں کودو گے وہیں سے تمہیں بائیں ہاتھ کے اس راستے پر صرف دس بارہ قدم چلنا ہے... اس کوٹھڑی میں شاہ رخ پناہ گزین ہے۔ چوّن نمبر ہے اس کوٹھڑی کا... ٹین کا ایک چوکور سا ٹکڑا ابھی دروازے کی چوکھٹ پر لگا ہوا ہے جس پر چوّن نمبر لکھا ہوا ہے۔ کام کافی ہوشیاری سے ہونا چاہئے۔ مانی ٹوکے والا تو اپنی جگہ خطرہ ہے ہی لیکن شاہ رخ خود بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہے۔ ریوالور وہ بجلی کی سی پھرتی سے نکالتا ہے اور آنکھ بند کر کے محض آواز پر بھی فائر کرے تو گولی نشانے پر لگتی ہے۔ وہ جتنا کم عمر اور معصوم نظر آتا ہے اتنا ہے نہیں۔ اپنے افضل میاں کی طرح" قاسم خان میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔

میں بھی مسکرا دیا لیکن شرفو کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ نقشے پر نظر جماتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "لاش کا کیا کرنا ہو گا؟"

"کچھ نہیں... وہیں چھوڑ آنا" قاسم خان بے پروائی سے بولا "اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ تھوڑا سا دردِ سر مانی ٹوکے والے کے لئے بھی رہنے دو۔ اگر شاہ رخ اسے یا کسی اور کو کچھ بتا بھی چکا ہے تو اول تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہو گی اور اگر ہو گی بھی تو اس کی موت کے بعد ختم ہو جائے گی۔"

ایک بار پھر چند لمحے کے لئے کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ قاسم خان میری طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "تم بھی سوچو گے کہ آ کر ستانے بھی نہیں پائے اور کام شروع ہو گیا۔"

"میں کون سا کراچی سے پیدل آیا ہوں" میں نے اپنے لہجے سے خوشدلی کا اظہار کرنے کی کوشش کی لیکن درحقیقت میں کچھ ایسا خوش نہیں تھا۔ میں اس خوشرو نوجوان کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی موت کا پروانہ جاری ہو چکا تھا۔ بہرحال کام تو کام تھا اور ہمیں اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

کچھ دیر اور گفتگو ہوتی رہی۔ کئی دیگر چھوٹے موٹے معاملات کی تفصیل طے ہوئی اور بالآخر قاسم خان جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جاتے جاتے وہ دروازے پر رک کر بولا۔۔۔ "شاہ رخ والے معاملے کی رپورٹ تم صبح جلدی مجھے دے دینا۔ کل میں سات بجے ہی اٹھ جاؤں گا۔"

وہ جا چکا تو میں اور شرفو چند لمحے خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ بالآخر میں نے پوچھا "یہ مانی ٹوکے والا کون ہے؟ میں نے پہلے بھی کہیں دو ایک بار اس کا نام سنا ہے۔"

"لاہور میں رہو گے تو اکثر سنتے رہو گے" شرفو گہری سانس لے کر بولا "خاصا مشہور آدمی ہے۔ اسے تم لاہور کا 'لوک ورثہ' کہہ سکتے ہو" وہ دھیرے سے ہنسا "ریٹائرڈ قسم کا پہلوان ہے اور نامی گرامی بدمعاشوں میں اس کا شمار ہوتا ہے مگر یہ ان روایتی قسم کے بدمعاشوں میں سے ہے جو بہت سے شریفوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ جن کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں اور جو کبھی وضعداری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ مثلاً یہ کہ مانی ٹوکے والے کی ذات سے کبھی کسی کمزور اور غریب کو کوئی نقصان نہیں پہنچا بلکہ کوئی کمزور اور غریب اگر کوئی فریاد لے کر اس کے پاس پہنچ جائے تو وہ حتی الامکان اس کی مدد کرتا ہے۔ وہ کٹڑی کے دو ڈھائی سو غریب خاندانوں کا محافظ ہے۔ اس کی کٹڑی میں کوئی بدمعاشی، کوئی جرم نہیں ہوتا۔ کسی کو ستانے والا کوئی آدمی وہاں پھٹک نہیں سکتا۔ بہت سی بڑی بڑی شخصیتوں نے اس سے بہت بڑے بڑے کام لئے ہیں۔ بہت اونچے درجے کا بدمعاش ہے مگر درویشوں کی طرح رہتا ہے۔ پڑھے لکھوں کی بڑی قدر کرتا ہے... اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہو گی کہ اس نے دو تین سپرہٹ

پنجابی فلمیں بھی بنائی ہیں جن کی کہانیاں بھی غالباً اس نے خود لکھی تھیں۔ ایک بار ایک اخبار نویس نے اس سے انٹرویو لیتے ہوئے پوچھا تھا کہ اس کی فلموں کی کامیابی کا راز کیا ہے جبکہ وہ تقریباً ان پڑھ آدمی ہے۔ تو اس نے جواب دیا تھا کہ وہ صرف اس لئے اچھی فلمیں بنانے میں کامیاب ہوا کہ اس نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا ہے اور زندگی سے قریب تر فلمیں ہی بنانے کی کوشش کی ہے اور جہاں تک حالات نے اجازت دی ہے حقائق کی عکاسی کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"یہ تو بڑا دلچسپ کردار ہے" میں نے کہا "میرا تو اس سے ملنے کو جی چاہنے لگا ہے۔"

"دعا کرو کہ کم از کم آج کی رات تو اس سے ملاقات نہ ہو" شرفو بولا "ورنہ امکان ہے کہ اس کا وہ ہاتھی کے پاؤں جیسا موٹا شیشم کا چمکتا ہوا گز بھر کا ڈنڈا ہماری کھوپڑیاں پاش پاش نہ کردے"

"ڈنڈا رکھتا ہے وہ اپنے پاس؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ویسے تو خیر ضرورت پڑنے پر وہ پل بھر میں کہیں نہ کہیں سے اسٹین گن یا رائفل بھی نکال لیتا ہے" شرفو بولا "لیکن وہ سوٹا گویا اس کا ٹریڈ مارک بن کر رہ گیا ہے۔ ہر وقت اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ معلوم نہیں اس کا نام مانی ٹوکے والا کیوں ہے۔ ٹوکہ تو اس کے ہاتھ میں کبھی نہیں دیکھا گیا۔ اس کا نام تو مانی سوٹے والا ہونا چاہئے تھا۔"

میں نے اچانک موضوع بدلتے ہوئے کہا "مجھے تو بھوک لگ رہی ہے۔"

"میں بھی یہی کہنے والا تھا" شرفو بولا "کھانا کھالیتے ہیں۔ اس کے بعد کچھ دیر آرام کرلیں گے۔ بارہ بجے کے بعد ہم گھر سے نکلیں گے اور میرے خیال میں مناسب یہ رہے گا کہ ہم اپنے حلئے بھی تھوڑے بہت تبدیل کرلیں۔ میرے بیڈ روم کی الماری میں تھوڑا سا ایسا سامان موجود ہے جس سے بظاہر تو انسان کی شخصیت میں زیادہ تبدیلی نہیں آتی مگر درحقیقت وہ ناقابل شناخت ہوجاتا ہے۔"

"ٹھیک ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "تم جو مناسب سمجھو کرلینا۔ میں تو صرف تمہارے مددگار کے طور پر ساتھ چل رہا ہوں۔"

شرفو نے آواز دی اور مس ٹریپ کمرے میں آگئی۔ اس کے چہرے پر حسب معمول گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ شرفو اسے کھانے کے بارے میں بتاچکا تو میں نے کہا "بہت ہی کٹھور عورت ہو تم۔ ہر وقت یوں منہ سجائے رکھتی ہو کہ عورت کم اور آبنوس کا مجسمہ زیادہ معلوم ہوتی ہو۔ اب مابدولت کراچی کے دورے سے واپس آئے ہیں اور تم نے حال چال پوچھنے اور خیر وعافیت جاننے کی بھی کوشش نہیں کی"

"ظاہر ہے زندہ سلامت نظر آرہے ہو تو اس کا مطلب یہی ہے کہ خیر وعافیت سے ہی لوٹ کر آئے ہو" وہ سنجیدگی سے ہی بولی "اگر کوئی ہاتھ پاؤں، ناک کان کم نظر آرہا ہوتا تو پوچھتی بھی کہ کہاں رہ گیا۔"

"ہائے ... تمہیں کیا معلوم کہ ہماری تو سب سے قیمتی متاع ہی کراچی میں رہ گئی ہے۔ ہم اپنا دل وہاں چھوڑ آئے ہیں سیاہ فام شہزادی!" میں نے غمناک لہجے میں کہا۔

"ایک تو دل تمہارے پاس معلوم نہیں تھوک کے حساب سے رکھے ہوئے ہیں۔ جہاں دیکھتے ہو اسپیئر پارٹ کی طرح ایک آدھ پھینک دیتے ہو" وہ بدستور سنجیدگی سے بولی تاہم اس کے تاثرات سے ظاہر تھا کہ اس نے میرے انداز تخاطب کا قطعاً برا نہیں منایا تھا۔ اس کی یہ خوبی بھی بڑی بے مثل تھی کہ اس کی سنجیدگی میں بھی بے پناہ زندہ دلی پنہاں ہوتی تھی۔

میں اسے یقین دلانے لگا تھا کہ میں مذاق نہیں کررہا ہوں اور نہ ہی کسی دل لگی کا تذکرہ کررہا ہوں بلکہ واقعی میں کسی کے تیر نیم کش کا گھائل ہوکر آیا ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ کیسا چغد تھا میں بھی، بھلا اس راز کا دوسروں سے ذکر کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ راحیلہ کا تصور، راحیلہ سے تعلق خاطر، ہماری باتیں، ہمارے پیماں۔ یہ تو امانتیں تھیں میرے پاس۔

"اچھا۔ جلدی سے کھانا کھلا دو۔ بہت بھوک لگ رہی ہے" میں نے فوراً موضوع بدل دیا۔ اس نے گہری گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی صبیح موٹی ظالم آنکھوں میں بدستور بنگال کا جادو رچا ہوا تھا۔ اس نے شاید کچھ پوچھنا چاہا تھا مگر پھر ارادہ بدل دیا تھا۔ وہ خاموشی سے مڑی اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

کھانا کھاکر میں اپنے کمرے میں آلیٹا اور بارہ بجے تک آرام کرنے کی غرض سے سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند جیسے آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ ذہن پر جانے کن کن متضاد خیالات کا ہجوم تھا۔ کبھی راحیلہ کا چہرہ اور کراچی میں گزارے ہوئے تین دنوں کی ان گنت یادیں یلغار کررہی تھیں اور کبھی زندگی کے مسائل ذہن کے افق پر سر ابھار رہے تھے اور کبھی ان کاموں کی فکر ستارہی تھی جو قاسم خان نے ہمارے ذمے لگائے تھے۔

بالآخر میں نے سونے کا ارادہ ہی ترک کردیا... کیونکہ میں نے محسوس کرلیا تھا کہ نیند نہیں آئے گی لیکن جب میں نے سونے کا ارادہ ترک کردیا تو آنکھ لگ گئی۔

کسی کے جھنجوڑنے سے میری آنکھ کھلی۔ وہ شرفو تھا جو میرے قریب کھڑا کہہ رہا تھا "صدقے جاؤں تمہاری بے فکری کے۔ اس طرح گھوڑے بیچ کر تو میں نے تمہیں کبھی سوتے نہیں دیکھا کہ الارم سے بھی... تمہاری آنکھ نہیں کھلی۔ اتنا اہم کام قاسم خان نے ہمارے سپرد کیا ہوا ہے اور تمہیں جیسے کوئی پروا ہی نہیں۔"

میں آنکھیں ملتا ہوا جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ باتھ روم میں جاکر ٹھنڈے پانی سے سر اور چہرہ تر کرکے میں نے سستی دور کی اور کچھ دیر بعد میں تیار ہوکر شرفو کے ساتھ کمرے سے نکلا تو وہ اپنے کمرے کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"آؤ.... تھوڑا سا حلیہ بھی بدل لیں۔"

شرفو نے اپنے کمرے میں پہنچ کر مجھے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بٹھایا۔ محض چند منٹ صرف کیے اور میرے چہرے پر ایسی نمایاں تبدیلیاں نظر آنے لگیں، ایک لمحے کے لئے تو مجھے خود بھی اپنی صورت اجنبی محسوس ہوئی۔ میرے چہرے پر لمبی اور گھنی مونچھوں کا اضافہ ہوچکا تھا جن کے نیچے میرا بالائی ہونٹ تقریباً چھپ کر رہ گیا تھا۔ بائیں رخسار پر ایک موٹا سا مسّہ نظر آرہا تھا۔ سر پر ایک خاص قسم کی اونی ٹوپی تھی اور جسم پر ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص۔ میں سرحدی علاقے کا کوئی باشندہ نظر آرہا تھا۔ شرفو کے دعوے کے مطابق واقعی چند چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں نے بڑا فرق پیدا کردیا تھا اور مجھے ناقابل شناخت بنادیا تھا۔

شرفو خود بھی اپنا حلیہ تبدیل کرچکا تھا۔ اس نے ہمہ وقت گلے میں بندھا رہنے والا رومال، پھولدار شرٹ اور اپنی ایسی ہی دیگر مخصوص چیزوں سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ وہ اس وقت خاصے عمدہ قسم کے تھری پیس سوٹ میں تھا۔ چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی اور سر پر فیلٹ ہیٹ کا اضافہ ہوچکا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے سادہ شیشوں کی عینک بھی لگا رکھی تھی جو بظاہر نظر کی عینک ہی معلوم ہورہی تھی۔ وہ تو اب اچھا بھلا خوشحال اور پڑھا لکھا تاجر یا کسی بڑی کمپنی کا کوئی ڈائریکٹر وغیرہ معلوم ہورہا تھا۔

"تم میرا حلیہ بھی اپنے ہی جیسا معززانہ بناسکتے تھے" میں نے کمرے سے نکلتے وقت شکوہ کیا۔

"اگر دونوں ہی معززانہ حلیہ بناکر بیٹھ جاتے تو پھر لڑائی بھڑائی وغیرہ ذرا مشکل ہوجاتی" شرفو بولا "واضح رہے کہ اس وقت تم میرے ڈرائیور ہو۔"

باہر آکر ہم گاڑی میں بیٹھے۔ اسٹیئرنگ وھیل میں نے سنبھالا۔ جہاں تک مجھے راستے آتے تھے وہاں تک میں ڈرائیو کرتا چلا گیا۔ اندرون شہر کی گلیوں میں پہنچ کر شرفو نے ہدایات دینا شروع کیں۔ بالآخر ہم نے ایک ایسی جگہ گاڑی چھوڑ دی جہاں اور بھی کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ویسے بھی اب ایسی گلیاں شروع ہورہی تھیں جن سے گاڑی تو کیا سائیکل گزارنا بھی آسان نہیں تھا۔

رات کے دو بجنے کو تھے لیکن اس علاقے میں ابھی تک خاصی چہل پہل تھی لیکن جب ہم نے... تنگ و تاریک گلیوں کا رخ کیا تو وہ ویران ہی نظر آئیں۔ ان گلیوں کا فرش اینٹوں کا تھا اور ہر گلی کے درمیان سے نالی گزر رہی تھی۔ دونوں طرف کی دیواروں کے ساتھ پانی کے بیسیوں جستی پائپ بچھے ہوئے تھے۔ جن میں بعض لیک بھی کررہے تھے اور رات کے سناٹے میں 'شرر شرر' کی مدھم آوازوں کے ساتھ پانی کی باریک باریک دھاریں ہوا میں بلند ہورہی تھیں۔

ایسی ہی ایک گلی سے گزرتے وقت شرفو نہایت دھیمی آواز میں مجھ سے مخاطب ہوا "اگر مانی ٹوکے والے سے سامنا ہوجائے تو اس پر گولی مت چلانا۔ مجھے وہ شخص بہت بھلا مانس لگتا ہے... اور پھر پچھلے دنوں ایک جھگڑے میں اس کا جوان بیٹا بھی مارا جاچکا ہے، گولیوں سے چھلنی ہوگیا تھا۔ تب سے مانی بہت دل شکستہ ہوچکا ہے مجھے تو اس سے ہمدردی محسوس ہوتی ہے، خواہ کسی کی نظر میں وہ اچھا ہو یا برا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے اس کے ساتھ چلتا رہا۔ بالآخر ایک جگہ پہنچ کر شرفو رک گیا۔ یہاں گلی سامنے سے بند تھی۔ بہت پیچھے نکڑ پر دیوار میں پیوست ہک پر ایک بلب لٹکا ہوا تھا۔ جو گرد و غبار سے بری طرح دھندلا چکا تھا تاہم اس کی کچھ نہ کچھ روشنی گلی کے اس سرے تک بھی پہنچ رہی تھی۔ جہاں ہم کھڑے تھے لیکن دور سے دیکھنے والے کو شاید یہاں اندھیرا نظر آتا۔ آنکھیں یہاں کے ماحول سے مانوس ہوجاتیں تو پھر چند گز دور تک کا منظر دیکھا جاسکتا تھا۔

ہمارے عین سامنے تو کسی مکان کی نہایت بلند عقبی دیوار تھی لیکن دائیں ہاتھ پر کونے میں ایک نیچا مکان تھا۔ جس کا دروازہ گلی کی سطح سے بھی کچھ نیچا تھا اور خوشی کی بات یہ تھی کہ اس دروازے پر تالا جھول رہا تھا۔ باقی مکان بھی تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے اور ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔

"ہمیں اس دیوار پر چڑھنا ہے" شرفو نے نیچے مکان کی طرف منڈیر کی اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں اکڑوں بیٹھ گیا اور شرفو میرے کندھے پر کھڑا ہوگیا میں اسے لے کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے منڈیر پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے سہارا دے کر اسے اوپر پہنچا دیا جس کے بعد اس نے منڈیر پر جھک کر ہاتھ نیچے لٹکا کر مجھے اوپر چڑھنے میں مدد دی۔

دو مکانوں کی چھتوں پر سے بلی کی طرح گزرنے کے بعد ہم کنڑی کی دیوار پر جاپہنچے۔ شرفو نے نیچے جھانک کر اطمینان کا

اظہار کیا ادھر اُدھر بے ترتیب کوٹھریوں وغیرہ کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا اور ہر طرف سکوت طاری تھا۔ چند لمحے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد ہم یکے بعد دیگرے احاطے میں اتر گئے۔

چوّن نمبر کی کوٹھری تک پہنچنے میں ہمیں دقت پیش نہیں آئی۔ چوکھٹ پر لگے ہوئے چوکور ٹین کے ٹکڑے پر سفید نمبر ملگجے اندھیرے میں بھی چمک رہا تھا۔ کوٹھری کے سالخوردہ دروازے کی درزوں سے روشنی جھانک رہی تھی۔ شاہ رخ یقیناً جاگ رہا تھا۔

ہم دونوں دروازے کے دائیں بائیں دیوار سے چپک گئے۔ ریوالور ہمارے ہاتھوں میں تھے۔ اسی پوزیشن میں شرفو نے ہاتھ بڑھا کر دروازے کی کنڈی ہلائی۔

"کون؟" اندر سے فوراً ہی تیز سرگوشی نما آواز میں پوچھا گیا۔

"مانی" شرفو نے گھٹی گھٹی اور بھاری مگر غیر واضح سی آواز میں کہا۔ اندر شاہ رخ نے اطمینان کی سانس لی۔ اس سانس کی آواز ہمیں باہر بھی سنائی دی۔ پھر دروازہ کھل گیا۔

حکمت عملی یہ طے پائی تھی کہ ہم درانہ وار اندر گھسیں گے۔ میرا سر تمکا ہوا ہوگا اور میں بھینسے کی طرح شاہ رخ کے پیٹ پر ٹکر رسید کر کے دھکیلتا ہوا پیچھے لے جاؤں گا جبکہ شرفو اسے سنبھلنے کا موقع دیئے بغیر اس کے منہ پر گھونسا رسید کر کے اسے مزید بدحواس کرے گا اور اگر اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار وغیرہ ہو تو وہ چھین لے گا۔

اس حکمتِ عملی پر عمل ضرور ہوا لیکن اس کے نتائج بہت مختلف نکلے۔ میں نے درانہ وار اندر گھستے ہوئے سر جھکا کر دروازہ کھولنے والے کو ٹکر ضرور رسید کی مگر میں اسے دھکیلتا ہوا پیچھے نہیں لے جا سکا۔ مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں کسی ہاتھی، گینڈے یا پھر قدرے نرم قسم کی کسی چٹان سے ٹکرا گیا ہوں۔

یہ چٹان اپنی جگہ سے کھسکی ضرور لیکن صرف دو تین قدم پیچھے ہٹ کر پھر ایک جگہ جم گئی اور میں بری طرح لڑکھڑا گیا۔ اگر وہ شاہ رخ ہوتا تو میرے اندازے کے مطابق اسے عقبی دیوار سے جا ٹکرانا چاہئے تھا۔

شرفو نے بھی یقیناً اپنے حصے کا کام کیا تھا لیکن کامیابی اسے بھی نہیں ہوئی تھی کیونکہ صورتحال میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے فوراً پینترا بدلتے ہوئے ریوالور سیدھا کیا لیکن اسی لمحے پیچھے کہیں کونے سے آواز آئی "خبردار فائر مت کرنا۔ افضل.....! شرفو! تم دونوں اس وقت میرے ریوالور کی زد پر ہو" یہ شاہ رخ کی آواز تھی۔

اگر وہ نہ بولا ہوتا تب بھی میں شاید فائر نہ کر پاتا کیونکہ جس چٹان پر میں گولی چلانے لگا تھا اسی لمحے میں نے اسے صحیح طور پر دیکھا تھا اور فوراً ہی پہچان لیا تھا یقیناً وہ مانی ٹوکے والا تھا۔ دروازہ اسی نے کھولا تھا اور ہم نے اسی کو رگیدنے کی کوشش کی تھی لیکن ظاہر ہے وہ اتنی آسانی سے رگیدا جانے والا آدمی نہیں تھا۔

وہ قد میں زیادہ اونچا نہیں تھا لیکن جسامت میں واقعی گینڈے کی طرح مضبوط تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی غالب تھی مگر چہرے مہرے سے قطعاً بوڑھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی رنگت تپے ہوئے تانبے سے مشابہ تھی۔ گردن کسی سانڈ کی طرح مضبوط تھی اور سینہ خوب چوڑا اور بھرا ہوا تھا۔ اس کے رخسار پر آنکھ کے نیچے زخم کا خاصا نمایاں نشان تھا۔ موٹی موٹی آنکھوں میں سرخی تھی۔

اس کے جسم پر صرف کھدر کی ایک ڈھیلی ڈھالی واسکٹ تھی اور وہ کوٹھری کے وسط میں صدیوں پرانے کسی درخت کے تنے کی طرح جما کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں شیشم کا ایک موٹا سا ڈنڈا تھا جیسا عام طور پر خانقاہوں وغیرہ میں ملنگ بھنگ گھوٹنے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اس ڈنڈے کو یقیناً خوب تیل پلایا گیا تھا کیونکہ وہ بلب کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ جس ہاتھ میں مانی ٹوکے والے نے یہ سوٹا پکڑا ہوا تھا اسی کی کلائی میں چاندی کا ایک موٹا سا کڑا بھی چمک رہا تھا۔

شرفو نے یقیناً کوٹھری میں گھستے ہی اس کے منہ پر مشینی انداز میں گھونسا رسید کر دیا تھا کیونکہ اس کے ہونٹوں کے گوشے سے خون کی ایک پتلی سی لکیر بہہ نکلی تھی مگر مانی کو جیسے اس کی قطعاً پروا نہیں تھی۔

شرفو ایک گھٹنے کے بل کھڑا تھا۔ ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ شاہ رخ نے خواہ کتنا ہی بروقت ہمیں ریوالور کی زد پر لیا تھا لیکن ہم چاہتے تو ایک ثانیے میں مانی ٹوکے والے پر فائر کر چکے ہوتے لیکن ظاہر ہے شرفو پہلے ہی کہہ چکا تھا کہ وہ اس شخص کو قتل کرنا گوارا نہیں کر سکتا اور مجھے بھی وہ منع کر چکا تھا اس لئے میں بھی عین فیصلہ کن مرحلے پر ہچکچاہٹ کا شکار ہو گیا تھا۔

"تم دونوں نے ابھی تک ریوالور نہیں پھینکے" میرے عقب سے ایک بار پھر شاہ رخ کی آواز ابھری۔ بازی غالباً ایک سیکنڈ سے بھی کم وقت میں الٹ چکی تھی اور میرے خیال میں فی الحال شاہ رخ کی بات ماننے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ ریوالور استعمال کرنے کے معاملے میں شاہ رخ کی پھرتی کی بابت قاسم خان ہمیں خبردار کر چکا تھا اس لئے کسی قسم کا خطرہ مول لینا حماقت ہی تھی۔ شاہ رخ چونکہ جسمانی طور پر کمزور آدمی تھا اس لئے ریوالور پر اس کا انحصار زیادہ تھا اور میرا تجربہ تھا کہ ہماری لائن میں اس قسم کے لوگ ریوالور استعمال کرنے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرتے۔

اگر ہم اپنے آپ کو صریح طور پر ہلاکت میں ڈالتے

ہوئے اپنے ریوالور استعمال کرنے کا فیصلہ کر بھی لیتے تب بھی ظاہر ہے ہنگامہ برپا ہوتا اور ہمارے لئے مانی ٹوکے والے کی کٹڑی سے نکلنا ایسا ہی ہوتا جیسے شیر کی کچھار سے زندہ واپس جانا۔ میں نے تن بہ تقدیر ہو کر کسی اور موقع کا انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

شرفو بھی یقیناً ایک ثانیے کے اندر اندر انہی خطوط پر سوچ چکا تھا۔ وہ جس زاویئے پر تھا وہاں سے کن انکھیوں سے غالباً شاہ رخ کو دیکھ بھی سکتا تھا۔ اس نے ریوالور پھینکنے میں پہل کی۔ اس کے بعد میں نے بھی ریوالور زمین پر ڈال دیا۔

مانی ٹوکے والا جو اس دوران دلچسپی آمیز نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا، عجیب سے انداز میں مسکرایا پھر اس کی ستون نما ٹانگ حرکت میں آئی اور اس نے ٹھوکر مار کر ایک ساتھ ہی دونوں ریوالور کوٹھری کے کونے میں پہنچا دیئے۔

اب میں نے گردن ذرا سی گھما کر دیکھا۔ کوٹھری کی ایک دیوار میں ایک دروازہ اور نظر آ رہا تھا۔ شاید وہ کوئی دوسری متصل کوٹھری تھی یا پھر باتھ روم ٹائپ کی کوئی جگہ تھی۔ اس کے ایک پٹ کے عقب سے شاہ رخ باہر آ رہا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے اور کپڑوں پر شکنیں نظر آ رہی تھیں۔ شرفو سیدھا کھڑا ہو گیا۔

شاہ رخ کی نظر ہم دونوں پر جمی رہی لیکن اس نے مخاطب مانی ٹوکے والے کو کیا "دیکھا چاچا؟ میں نے کہا تھا نا کہ یہ لوگ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔ بہت ظالم ہیں یہ ... اور بہت ہی لمبے ہاتھ ہیں ان کے۔"

مانی نہایت مشفقانہ اور مُربیانہ لہجے میں بولا "او میرا بچڑا! مجھے بتا تو سہی یہ لوگ ہیں کون؟ کس کے آدمی ہیں؟ میں ان کا بندوبست کر دیتا ہوں۔ پکا بندوبست۔ ان کی آنے والی نسلیں بھی تیری آنے والی نسلوں سے پرے پرے رہیں گی۔ مگر تو، تو زبان ہی نہیں کھولتا۔"

مجھے یہ سن کر اطمینان ہوا کہ شاہ رخ نے ابھی مانی ٹوکے والے کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ شاہ رخ باری باری ہم دونوں کو گھورتے ہوئے، دانت قدرے بھینچ کر بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا "سب کچھ بتا دوں گا چاچا! لیکن ان کا بندوبست کرنا کچھ اتنا آسان نہیں جتنا تو سمجھ رہا ہے۔ اتنے معمولی لوگ نہیں ہیں یہ۔ کیوں افضل؟" وہ میری طرف دیکھ کر قدرے نروس سے انداز میں مسکرایا۔ وہ پُر اعتماد اور دلیر نظر آنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

"عزت افزائی کا شکریہ شاہ رخ! ورنہ اس دنیا میں تو ہر کوئی اپنے سوا باقی سب کو چیڑ قناطیہ سمجھتا ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

دفعتاً شرفو پنجابی میں مانی ٹوکے والے سے مخاطب ہوا۔ "ویسے آپس کی بات ہے پہلوان جی! آپ شاہ رخ کی حفاظت کیوں کر رہے ہیں؟"

"حفاظت کیوں کر رہے ہیں؟" مانی نے ٹھیٹھ پنجابی میں سادگی آمیز لہجے میں دُہرایا "بات تو کوئی خاص نہیں ہے باؤ جی! بس ایک دفعہ جیل میں اس نوجوان کے باپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے جیل میں ہماری بڑی خدمت کی تھی۔ اب تو مر چکا ہے بیچارہ۔ بس اسی کے حوالے سے ہمارے پاس آیا تھا یہ کہنے لگا میں مصیبت میں ہوں، کچھ لوگ مجھے مارنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا، بچڑا! فکر کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تو ہماری پناہ میں ہے اور جو ہماری پناہ میں آ جائے اسے مارنا مذاق نہیں ہوتا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اب تم بتاؤ تم کیوں اس معصوم نوجوان کے پیچھے پڑے ہو؟ کیا حدودِ اربعہ ہے تمہارا؟ حیرت ہے اب گولیاں شولیاں چلانے والے ایسے جی دار بھی اس شہر میں پائے جانے لگے ہیں جنہیں مانی ٹوکے والا نہیں جانتا۔"

شرفو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مانی نے جواب کے لئے اصرار بھی نہیں کیا۔ وہ پُرخیال انداز میں اپنے موئے کو دھیرے دھیرے حرکت دے رہا تھا۔ پھر وہ الٹے ہاتھ سے ہونٹ سے بہتی ہوئی خون کی لکیریں صاف کرنے لگا۔ شاہ رخ نے ایک بار پھر اسے مخاطب کیا "میں چاہتا تھا کہ باڑہ والوں کے پاس سے میری پھنسی ہوئی رقم جلدی نکل آتی تو میں ان لوگوں سے الجھے بغیر ہی کہیں نکل جاتا۔ میں یہ ملک ہی چھوڑ جاتا۔ میں اب لائن بدلنا چاہتا ہوں۔ میں اب شطرنج کا مہرہ بن کر نہیں رہنا چاہتا۔"

"ہم تو تم سے مذاکرات کرنے آئے تھے شاہ رخ!" شرفو نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔ "تم نے بڑی غلطی کی جو روپوش ہو گئے۔ مال پکڑا گیا تھا تو کیا ہوا۔ تمہیں سیدھے باس کے پاس آ کر رپورٹ دینی چاہئے تھی....."

"میں بچہ نہیں ہوں شرفو!" شاہ رخ مغموم سے انداز میں مسکرایا "تمہیں بھی اچھی طرح سے معلوم ہے کہ اصل میں کیا ہوا ہے اور مجھے بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ تم لوگ یہاں تک کیوں آئے تھے ... جو ہونا تھا وہ تو ہو چکا۔ میرے سامنے تو اب یہ مسئلہ ہے کہ تم دونوں کا کیا کروں؟ میں تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا.... لیکن.... بہرحال یہ بقا کی جنگ ہے۔ ہم میں سے اب ایک ہی فریق زندہ رہ سکتا ہے" اس نے ریوالور کو جنبش دی لیکن مانی ٹوکے والے نے ہاتھ اس کے ریوالور کے سامنے کر دیا۔

"اس کو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں۔ شور شرابا ہوگا، میری کٹڑی والوں کے آرام میں خلل پڑے گا۔ غریب محنت مزدوری کرنے والے لوگ ہیں۔ تھک ہار کر سوئے

ہوئے ہیں" مانی نے گویا شاہ رخ کو پچکارتے ہوئے کہا "اگر کوئی گڑبڑ کریں تب تمہیں ریوالور استعمال کرنے کی اجازت ہے۔ میں ابھی اپنے آدمیوں کو بلاتا ہوں۔ وہ نہایت خاموشی اور صبر وسکون سے ان کا بندوبست کر دیں گے۔ چار چھ دن بعد کہیں دریا شریا سے ان کی ناقابل شناخت لاشیں مل جائیں گی۔"

وہ شاہ رخ کے جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے آگے بڑھا۔ کوٹھڑی ظاہر ہے کشادہ نہیں تھی۔ دروازے تک جانے کے لئے اسے میرے اور شرفو کے درمیان سے گزرنا تھا اور وہ کچھ زیادہ محتاط بھی نہیں تھا۔ اس قسم کے لوگ حکمت عملی یا احتیاط وغیرہ کو کم ہی ملحوظ رکھتے ہیں۔ طاقت کے زعم میں زیادہ رہتے ہیں۔

جیسے ہی شرفو اس کی اوٹ میں آیا اس کی ٹانگ یوں حرکت میں آئی جیسے کوئی کھنچا ہوا اسپرنگ ٹوٹ کر اچھلا ہو۔ لات ایسی جگہ پڑی کہ کچھ نہ کچھ اثر دکھا گئی۔ مانی "اوغ" کی زوردار آواز کے ساتھ قدرے جھکا اور شاہ رخ نے اسی لمحے بے دریغ فائر کر دیا لیکن اس نے عقلمندی کی کہ اس نے فائر شرفو پر نہیں کیا تھا کیونکہ شرفو حقیقتاً کافی حد تک مانی کی اوٹ میں ہی تھا۔ شاہ رخ نے اگر اضطراری طور پر اس پر گولی چلائی ہوتی تو زیادہ امکان یہی تھا کہ گولی مانی کو لگتی۔

شاہ رخ نے گولی دراصل مجھ پر چلائی تھی لیکن اس ہنگامے کا شروع ہونا میرے لئے مہلت میسر آجانے کے مترادف تھا۔ میں اس دوران نہ صرف فرش پر گر چکا تھا بلکہ شاہ رخ سے کچھ دور ہو چکا تھا۔ یہ بات شرفو کو بھی نہیں معلوم تھی کہ میرے نیفے میں ایک اور ریوالور اڑسا ہوا تھا۔

شاہ رخ کی چلائی ہوئی پہلی گولی تو اس دروازے میں لگی جس کے عقب سے وہ خود... برآمد ہوا تھا۔ فوراً ہی اس نے فرش کی طرف دوسرا فائر کیا لیکن میں مسلسل لوٹ لگا رہا تھا۔ اس گولی سے بھی بچ گیا اس دوران شرفو اور مانی ٹوکے والا الجھ چکے تھے اور اپنی پہلے والی جگہ سے کچھ آگے آگئے تھے جس کی وجہ سے شاہ رخ کو ایک بار پھر فائر کرنے میں ایک لمحے کے لئے دشواری پیش آئی۔ میرے لئے یہی ایک لمحہ کافی تھا اور اگر اس وقت شاہ رخ اپنے حواس میں ہوتا تو شاید خود بھی میرے نشانے کی داد دیتا حالانکہ میں نے بہت کٹھن زاویے سے فائر کیا تھا لیکن صفائی کا یہ عالم تھا کہ شاہ رخ کے ہاتھ سے صرف ریوالور نکل کر دور جا گرا۔ اس کی انگلی تک زخمی نہیں ہوئی۔

وہ بدحواس ہو کر دروازے کی طرف بھاگا اور اس لمحے صورتحال نے ایسا پلٹا کھایا جس کا میں نے گمان تک نہیں کیا تھا۔ ہوا یہ کہ اسی لمحے شرفو کسی طرح مانی کی گرفت سے نکل کر

ہوا میں بلند ہوا اور عین اسی لمحے بدحواس ہو کر دروازے کی طرف بھاگتا ہوا شاہ رخ اس کی زد میں آگیا۔

سوٹا ایک طرح کی جناتی قوت کے ساتھ اس کے سر پر پڑا اور اس کا سر غالباً دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے لمبے بالوں کی وجہ سے صحیح طور پر تو یہ پتا نہیں چل سکا کہ اس کے سر کا کیا حشر ہوا تھا لیکن ہم نے اتنا ضرور دیکھ لیا کہ وہ پٹ سے زمین پر گرا اور اس کے سر سے بعض جگہ سے خون اور مغز کا ملغوبہ سا بہہ نکلا۔

مانی ٹوکے والا ایک بار تو گویا سکتے میں آگیا۔ وہ کبھی بے جان شاہ رخ کو دیکھتا اور کبھی اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سوٹے کو پھر وہ پاگلوں کی طرح بڑبڑانے لگا "اوئے مانی! یہ تو نے کیا کیا.... اوئے مانی..." سوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ جنونیوں کی طرح اپنا ہاتھ دانتوں سے کاٹنے لگا۔

شرفو اس وقت تک اپنا اور میرا ریوالور اٹھا چکا تھا میرے خیال میں اس نے مانی کے حق میں اچھا ہی کیا کہ اس کی کنپٹی پر ریوالور کا دستہ رسید کر دیا۔ مانی ایک لمحے کے لئے بدمست ہاتھی کی طرح ڈگمگایا پھر کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔

"بھاگو...." شرفو نے دروازے کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔

فائروں کے دھماکوں سے رات کا سکوت درہم برہم ہو چکا تھا اور ادھر ادھر سے طرح طرح کی آوازیں بھی بلند ہونے لگی تھیں لیکن آس پاس سے ابھی کوئی کھڑکی دروازہ کھلتا نظر نہیں آیا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ ہماری راہ فرار عقبی سمت میں تھی اور راستہ بھی کچھ اس قسم کا تھا کہ شاید بہت دیر بعد ہی کسی کا اس طرف دھیان جاتا کہ کوئی ادھر سے بھی فرار ہو سکتا ہے۔ کوٹھڑی کے صدر دروازے کی طرف سے فرار ہونا تو غالباً اب ممکن نہیں رہا تھا۔

تیلی تیلی سالخوردہ اینٹوں سے بنی ہوئی دیوار کی ریخوں میں پاؤں پھنسا کر اوپر چڑھنے کے بعد ہم متصل مکان کی چھت پر کودے پھر پہلے ہی کی طرح پنجوں کے بل چلتے ہوئے منڈیر پر پہنچ کر پچھلی گلی میں کودے اور کپڑے جھاڑ کر چلنے لگے۔ اپنے ریوالور ہم چھپا چکے تھے۔

اس گلی میں کوئی نہیں تھا۔ ادھر ادھر کی گلیوں سے ہوتے ہوئے ہم کنٹری سے بہت دور نکل آئے۔ گاڑی تک پہنچنے کے لئے ہمیں پہلے کی نسبت زیادہ طویل چکر کاٹنا پڑا لیکن راستے میں شرفو بولا "اپنی فلیٹ ہیٹ تو میں اٹھا لایا ہوں لیکن میری عینک وہیں کہیں رہ گئی۔ لڑائی میں دونوں چیزیں گر گئی تھیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ عینک کے بغیر بھی تم اتنے ہی معزز ... جتنے عینک کے ساتھ لگ رہے تھے" میں نے گویا

... تسلی دی۔ دفعتاً شرفو نے میرا ہاتھ دبایا اور ہم گلی میں ذرا ایک طرف کو دبک کر کھڑے ہو گئے۔ سامنے قدرے چوڑی سڑک پر غالباً گشت پر موجود دو سپاہی ایک طرف کو دوڑے جا رہے تھے۔

ہمارے اندازے کے مطابق فائروں کی آواز یہاں تک تو نہیں پہنچی تھی کیونکہ یہاں گلیوں میں ہر طرف حسب سابق سناٹا تھا۔ کوئی ہلچل نظر نہیں آ رہی تھی۔ ممکن تھا کہ سپاہیوں کو کسی نے گڑبڑ کی اطلاع دی ہو یا ممکن ہے کہ وہ کسی اور ہی سلسلے میں دوڑے جا رہے ہوں۔ وہ نظروں سے اوجھل ہو چکے تو ہم چوڑی گلی میں آ کر اپنی گاڑی میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے۔

راستے میں میں نے شرفو سے کہا "آپس کی بات ہے مجھے شاہ رخ کی موت کا افسوس ہے۔ اچھا نوجوان تھا۔ اس نے اپنی زندگی محض ایک غلطی... یا یوں کہو کہ محض تھوڑے سے لالچ سے گنوا دی۔"

"خود ہی اس کی موت کا جواز بھی پیش کر رہے ہو اور خود ہی افسوس بھی کر رہے ہو" شرفو عقبی سیٹ سے بولا "وہ واقعی صاحبوں والے انداز میں پھیل کر بیٹھا ہوا تھا اور میں واقعی اس کا ڈرائیور معلوم ہو رہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "ہماری دنیا میں کسی کی موت پر تاسف یا صدمے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ بس جو مر گیا سو مر گیا۔"

"وہ تو مجھے بھی معلوم ہے... اور میں نے اپنے آپ کو سفاک اور سنگدل بننے کی خاصی تربیت بھی دے لی ہے لیکن پھر بھی... بس اپنے آدمیوں میں سے کسی کی موت مجھے تھوڑا بہت ضرور ہلا دیتی ہے لیکن خیر کوئی بات نہیں" میں نے بے پروائی سے سر جھٹکا "صبح تک نارمل ہو جاؤں گا۔"

اگلی صبح تک تو میں دیر تک سوتا رہا۔ شرفو نے معلوم نہیں کب باس کو رپورٹ دی اور اس کے بعد اپنے ذمے کے ایک کام بھی نمٹا آیا۔ دوپہر کے کھانے پر اس سے ملاقات ہوئی تو وہ اپنی جون واپس آ چکا تھا۔

"واقعات جس طرح پیش آئے تھے میں نے من و عن باس کو بتا دیئے تھے" اس نے مجھے بتایا "باس خوش تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شاہ رخ چونکہ مانی ٹوکے والے کے ہاتھ سے مرا ہے اور اس کی لاش دیکھ کر کوئی اندھا بھی بتا سکے گا کہ اس کی موت کسی سوٹے سے واقع ہوئی ہے۔ اس لئے مانی اس کی لاش غائب کروانا اپنی 'اخلاقی' ذمے داری سمجھے گا۔ باس کا خیال ٹھیک تھا۔ باس نے اپنے ذرائع سے پتا کرایا ہے۔ مانی نے پولیس کو یہ بیان دیا ہے کہ گزشتہ رات اس کے کسی نامعلوم دشمن

نے اس کے ڈیرے پر آ کر فائرنگ کی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ لاش کا نہ کہیں ذکر آیا اور نہ کہیں کسی کو نام ونشان ملا۔ بڑا فنکار ہے یہ اپنا مانی ٹوکے والا بھی۔ محض فائرنگ کو پولیس نے کوئی اہمیت نہیں دی کیونکہ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ مانی پر سربازار یا اس کے ڈیرے پر بارہا فائرنگ ہو چکی تھی۔ دو چار دن میں بات ٹھنڈی پڑ جائے گی۔"

میں نے کوئی تبصرہ نہ کیا کھانے کے بعد میں اپنے کاموں کے سلسلے میں نکل کھڑا ہوا۔ اسی شام قاسم خان نے ہمیں گزشتہ رات کی کارکردگی کے سلسلے میں خصوصی بونس سے بھی نوازا۔

قاسم خان مزید کچھ کاروباری معاملات طے کرنے کے بعد جا چکا تو شرفو نوٹوں کی گڈی اپنے کمرے کی چھوٹی سی دیوار گیر سیف میں رکھتا ہوا بولا "چلو اچھا ہوا کہ کچھ اور رقم حاصل ہو گئی۔ جہیز کی تیاری کے سلسلے میں شاپنگ کچھ اور اچھی ہو جائے گی" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "کب چلنے کا پروگرام ہے شاپنگ پر؟"

"اب ذرا فرصت تو میسر آئے" میں نے ملائمت سے کہا۔

ہوا یہ کہ اگلے تین دنوں میں ہمیں ذرا بھی فرصت میسر نہ آسکی وہ فارغ ہوتا تو میں مصروف ہو جاتا تھا اور میں فارغ ہوتا تو قاسم خان نے اسے دوڑایا ہوا ہوتا تھا۔ قاسم خان خود بھی ابھی تک لندن روانہ نہیں ہو سکا تھا۔ اب اس نے پروگرام کچھ بدل دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ اس اہم کھیپ کے آنے کے بعد ہی لندن جائے گا جسے لانے کے لئے مجھے اور شرفو کو جانا تھا۔ قاسم خان خود بھی بہت مصروف نظر آتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کس چکر میں تھا۔ میں نے ایک خاص بات یہ محسوس کی تھی کہ جب سے میں کراچی سے آیا تھا قاسم خان نے ایک بھی میٹنگ اپنے گھر پر نہیں رکھی تھی۔ جہاں میٹنگ کے دوران اس کی بیوی سلمیٰ ضرور ساتھ بیٹھی رہتی تھی۔ خواہ وہ بولتی کچھ نہ تھی، خاموش اور لاتعلق سے ہی بیٹھتی تھی۔ اب قاسم خان یا تو فون پر ہی ہدایات دیتا تھا یا خود ہی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر آجاتا تھا۔

انہی مصروفیات میں وہ دن بھی آگیا جب مجھے اور شرفو کو کھیپ لینے جانا تھا۔ لاہور سے ہم بذریعہ جہاز پشاور پہنچے اور وہاں سے بائی روڈ ہمیں طورخم تک کا سفر کرنا پڑا۔ یہاں ایک ویرانے میں پہاڑی پر واقع چند گھروں پر مشتمل ایک بستی میں ہمارے لئے ایک جیپ کا انتظام پہلے ہی سے کر دیا تھا جس میں بیٹھ کر ہم مطلوبہ علاقے کی طرف روانہ ہوئے۔

مطلوبہ علاقے میں ہمارا ٹرک موجود تھا لیکن سرحد پار

آیا تھا وہ جیپ لے کر واپس چلا گیا۔ ہمارے ٹرک میں صرف ڈرائیور موجود تھا جو ڈرائیورز کیبن میں آرام سے کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ اس سنگلاخ ویرانے میں جہاں اس کے ٹرک کے سوا کوئی قابلِ ذکر چیز دور دور تک نظر نہیں آ رہی تھی' وہ اس طرح اطمینان سے سویا ہوا تھا جیسے ہم اور آپ اپنی خواب گاہ میں سوتے ہیں۔

یہ ہمارا بھروسے کا آدمی تھا اور اس علاقے سے جب بھی ہمارا مال آتا تھا' ڈرائیور کے فرائض عموماً یہی انجام دیتا تھا۔ ٹرک پر دیگر عام ٹرکوں ہی کی طرح رنگ برنگے الفاظ میں ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا نام وغیرہ بھی لکھا ہوا تھا اور شیر چیتوں وغیرہ کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس ٹرانسپورٹ کمپنی کا وجود کہیں نہیں تھا۔ ٹرک پر نمبر پلیٹ وغیرہ بھی جعلی تھی اور اس کے کاغذات بھی جعلی تھے۔

اس ٹرک میں خفیہ خانے بھی موجود تھے۔ کم حجم کی اشیا یا منشیات کی نقل و حمل کے لئے یہ خانے استعمال کئے جاتے تھے۔ اس وقت ٹرک میں معمولی مقدار میں پتھر کا کوئلہ لدا ہوا تھا۔

ہم نے ڈرائیور کو اٹھایا۔ ہڑبڑا کر ایک ہاتھ سے آنکھیں ملتے ہوئے اس نے دوسرا ہاتھ سیٹ کے نیچے لے جانے کی کوشش کی مجھے معلوم تھا کہ وہاں اسٹین گن پڑی ہوگی۔ میں نے اس کا ہاتھ نیچے نہیں جانے دیا۔ اس وقت تک وہ پوری طرح بیدار ہو چکا تھا اور مجھے پہچان کر مسکرانے لگا تھا۔

رسمی باتوں کے بعد اس نے اشیائے خورد و نوش سے ہماری تواضع کی۔ اس کے پاس قہوے سے لے کر مرغ مسلم تک سبھی کچھ موجود تھا۔ جدید قسم کے اور باہر کے بنے ہوئے ناشتے دان اور تھرماسوں میں ہر چیز گویا تازہ کی تازہ تھی۔

ہمیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا' کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم گپ شپ کر ہی رہے تھے کہ مال کا ٹرک آ پہنچا۔ وہ اپنے مقررہ وقت سے تقریباً تین گھنٹے لیٹ تھے۔ ان کے ساتھ دو فاضل آدمی بھی تھے۔ ہم سب نے مل کر پہلے ٹرک سے کوئلہ اتارا۔ مال دوسرے ٹرک سے اتار کر اپنے ٹرک میں سیٹ کیا اور اوپر دوبارہ کوئلہ بھر دیا۔ ان کاموں کے لئے ضروری سامان ٹرک میں موجود تھا۔ ٹرک پر ترپال وغیرہ باندھنے کے بعد ہم نے سرحد پار سے آنے والوں کو رقم کی ادائیگی کی اور پھر ہم تینوں اپنی اپنی پوزیشن سنبھالنے کے بعد واپسی کے سفر پر روانہ ہو گئے اور وہ لوگ اپنے ملک کی طرف چلے گئے۔

.... ☆ ....

آخر شب کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا تھا اور ہمارا ٹرک گھرر گھرر کرتا ہوا خاصی تیز رفتاری سے منزل مقصود کی طرف رواں دواں تھا۔ سڑک اور اس کے دونوں طرف پھیلے ہوئے درختوں کے تنے صرف وہیں تک دکھائی دے رہے تھے جہاں تک ہیڈ لائٹس کی رسائی تھی ورنہ بس چاروں طرف گویا گہری تاریکی کا ایک سمندر تھا جس میں ہم ایک حقیر مچھلی کی طرح تیر رہے تھے۔

مجھے خوشی یہ تھی کہ قاسم خان نے نقشے میں جس علاقے کو 'ڈینجر زون' قرار دیا تھا ہم اس سے بھی بخیر و عافیت گزر آئے تھے۔ باقی مقامات پر تو معاملات سیٹ ہی تھے۔ شرفو ٹرک کے پچھلے حصے میں ترپال کے اوپر پوزیشن سنبھالے لیٹا ہوا تھا۔ راستے میں کچھ دیر ٹرک میں نے بھی ڈرائیو کیا تھا اور کچھ دیر شرفو کی جگہ بھی ڈیوٹی دی تھی۔ اور اس دوران شرفو نے آرام بھی کیا تھا۔

اب میں نیم دراز ہو کر کچھ دیر نیند لینے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ یک لخت مجھے چونک کر سیدھا ہونا پڑا۔ میری سستی اور غنودگی یوں کافور ہو گئی جیسے مجھے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ دراصل سامنے بہت دور سڑک پر اچانک دو سرچ لائٹس روشن ہوئی تھیں' ان سرچ لائٹس کی روشنی کچھ اس انداز میں پھیلی ہوئی تھی کہ ہم یہ بھی دیکھ سکتے تھے کہ یہ لائٹس ایک کھلی جیپ پر نصب تھیں۔

اس جیپ کے ساتھ ہی ایک فوکس ویگن بھی موجود تھی۔ دونوں گاڑیاں سڑک پر یوں ترچھی کھڑی تھیں کہ راستہ تقریباً مسدود ہو کر رہ گیا تھا۔

"اوئے خانہ خراب ..... یہ تو کسٹم کی گاڑیاں ہیں" ڈرائیور رئیس گل بڑبڑایا پھر اس نے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ کسی بھی خلافِ معمول صورتحال میں یہ طے کرنا میری ذمہ داری ہوتی تھی کہ کیا حکمتِ عملی اختیار کی جائے گی۔ میں نے سب سے پہلے ڈیش بورڈ پر ایک بٹن دبا کر اوپر موجود شرفو کو ہوشیار ہونے کا سگنل دیا۔

"اس علاقے میں کہاں سے آ گئے کسٹم والے؟" میں نے خود کلامی کے سے لہجے میں کہا اور اسٹین گن سیٹ کے نیچے سے کھینچ لی "یہ جو اس طرح بے موقع گھات لگا کر کھڑے ہوئے ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ ہر حال میں ہمیں پکڑنا چاہتے ہیں .... شاید مخبری ہو گئی ہے ...."

میں نے اشارے سے رئیس گل کو بتا دیا کہ اسے کیا کرنا ہے اور خود بھی الرٹ ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک گاڑی سے میگا فون کے ذریعے ہمیں رکنے کا حکم دیا جا رہا تھا۔ رئیس گل نے رفتار بالکل کم کر دی تھی جیسے رکنے لگا ہو لیکن قریب پہنچ کر اس نے

یک لخت ایکسیلریٹر دبایا اور ایک جھٹکے سے اسٹیرنگ ...ھیل گھماتے ہوئے ٹرک کو کچے میں اتار کر الٹنے کا خطرہ مول ...تے ہوئے نکال لے جانے کی کوشش کی۔

اکیلا ٹرک دیکھ کر غالباً ان لوگوں کو اتنی دیدہ دلیری کی توقع ...ہیں تھی۔ جیپ اور فوکس ویگن بہرحال اسٹارٹ ہی تھیں۔ ...یپ نے تیزی سے ٹرن لیا اور ٹرک کا راستہ روکنے کی کوشش ...ی لیکن ٹرک کسی غصیلے عفریت کی طرح گرجتا اور ہچکولے ...ھاتا اسے سائیڈ مار کر آگے بڑھتا چلا گیا۔

سائیڈ کچھ اس زاویے سے لگی اور کچھ اس وقت جیپ ...ی کچے میں اتر کر اس طرح بے توازن ہو چکی تھی کہ فوراً ...لٹ گئی۔ عین اسی لمحے ٹرک پر فائرنگ شروع ہو گئی۔ میں ...نے دوبارہ شرفو کو سگنل دیا اور فوراً ہی اوپر سے جوابی فائرنگ ...روع ہو گئی۔ میں نے خود ابھی گولی نہیں چلائی تھی۔

ٹرک سڑک پر آ چکا تھا اور دوبارہ رفتار پکڑ چکا تھا مگر خرابی کی ...ت یہ تھی کہ فوکس ویگن ہمارے تعاقب میں لگ چکی تھی ...ور اس سے فائرنگ کا سلسلہ جاری تھا۔ پہلے گولیاں بلندی کی ...طرف چلائی گئی تھیں لیکن اب وہ لوگ فائر لائن نیچی رکھ رہے تھے میں سمجھ گیا کہ وہ ٹرک برسٹ کرنا چاہتے تھے مگر رئیس ...ل اپنے کام میں ماہر تھا۔ وہ ٹرک کو بچائے لئے جا رہا تھا۔

"اس فوکسی کو بھی الٹنا ہے رئیس گل" میں نے فائرنگ ...کے شور کے درمیان میں ...ہا۔

"آپ کو پتا ہے کہ فوکسی آسانی سے کہاں الٹتی ہے ...صاحب۔" رئیس گل نے کہا۔ "اور پھر خطرہ یہ ہے کہ ہم نے اسے قریب آنے کا موقع دیا تو شاید وہ لوگ ٹائر برسٹ ...کرنے میں کامیاب ہو ہی جائیں۔"

اس وقت میں اسٹیئرنگ پر ہوتا تو یقیناً فوکسی کو الٹ دیتا ...ور شاید ٹرک کا ٹائر بھی برسٹ ہونے سے بچا لیتا۔ بشرطیکہ ...رنو میرے برابر موجود ہوتا۔

دفعتاً میں نے محسوس کیا کہ ہمارے ٹرک کے اوپر سے والی فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ تبھی فوکسی لحہ بہ لحہ قریب ...آتی جا رہی تھی۔ میں نے ڈرائیورز کیب کا دروازہ کھولا اور ایک ...زو اس کی کھڑکی سے گزار کر دروازے کے سہارے لٹکتے ...ہوئے ایک پاؤں پائیدان پر ٹکایا اور اسٹین گن بغل میں دبا کر ...تی الامکان نپے تلے انداز میں ایک برسٹ مارا۔ فوکسی کی ...دونوں ہیڈ لائٹس غائب ہو گئیں۔

فوراً ہی میں نے دوسرا برسٹ مارا۔ اس کا نتیجہ میں دیکھ تو ...نہیں سکا لیکن میں نے اندازہ ضرور کر لیا تھا کہ ونڈ اسکرین چکنا ...چور ہو گئی ہے۔ ایک لمحے کے لئے فوکسی ترچھی ہوئی اور قسمت نے گویا اس کے ٹائروں پر قسمت آزمائی کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔

ایک دھماکہ ہوا اور فوکسی بہت بری طرح لڑکھڑاتی ہوئی کچے میں اتری اور پھر ایک درخت سے جا ٹکرائی۔ معلوم نہیں ٹائر برسٹ ہونے کی وجہ سے وہ بے قابو ہوئی تھی یا ڈرائیور ہی مارا گیا تھا۔ بہرحال اس کے عقب میں سناٹا چھا گیا۔

چند ہی لمحے میں ہم کافی دور نکل آئے۔ ایک بار پھر تاریکی اور سناٹے میں صرف ہمارے ٹرک ہی کی گھرر گھرر گونج رہی تھی۔

مزید چند میل کا فاصلہ طے ہو جانے کے بعد جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ کوئی ہمارے تعاقب میں نہیں آ رہا تو میں نے رئیس گل کو ٹرک روکنے کی ہدایت کی۔ ڈرائیورز کیب کی چھت پر بدستور سکوت چھایا ہوا تھا اور یہ بڑی تشویش کی بات تھی۔

ٹرک سڑک کے ایک کنارے پر رک چکا تو میں نے کھڑکی سے سر نکال کر شرفو کو کئی آوازیں دیں مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میری دھڑکن کچھ تیز ہو گئی۔

ٹارچ لے کر میں اوپر چڑھا اور یہ دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا کہ وہ اس مستطیل ٹب نما حصے میں بے حس و حرکت اوندھا پڑا تھا۔ اسٹین گن ایک طرف کو پڑی تھی' اس کے بال اور چہرہ خون میں تر تھا اور بہت سا خون اس گدے میں جذب ہو چکا تھا جس پر وہ لیٹا ہوا تھا۔

میں نے اس کا چہرہ ذرا اوپر کر کے دیکھا۔ گولی اس کی پیشانی میں پیوست ہوئی تھی اور سر کے پچھلے حصے سے نکل گئی تھی۔ یہ جاننے کے لئے کسی ڈاکٹر کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مر چکا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی اور ہونٹ نیم وا رہ گئے تھے جن کے عقب سے اس کے ہموار دانت جھانک رہے تھے۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا واقعی شرفو مر چکا تھا؟ ایک لمحے کے لئے میری نظر دھندلا گئی اور مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید میں ٹرک سے نیچے گر جاؤں گا۔

زندگی دینے اور زندگی چھین لینے کے بھی خدا کے اپنے ہی انداز تھے۔ شرفو جو اتنی محفوظ جگہ پر لیٹا ہوا تھا اس کی عین پیشانی میں گولی گھس گئی تھی اور میں جو ٹرک کے دروازے سے لٹک کر گولیوں کی بوچھاڑ کے عین سامنے سے جوابی فائرنگ کر رہا تھا' خراش سے بھی محفوظ رہا تھا۔

بمشکل تمام میں نیچے اتر آیا اور خاموشی سے رئیس گل کے برابر آ بیٹھا۔ اس نے تشویش آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور پوچھا "کیا بات ہے؟"

"شرفو مرچکا ہے" میں نے رودینے والے لہجے میں اسے بتایا۔ شرفو سے اس کی شناسائی صرف آج کی ملاقات تک ہی محدود تھی تاہم میں نے محسوس کیا کہ اس کے دل کو بھی اس اطلاع سے دھچکا پہنچا تھا۔ چند لمحوں تک ہم دونوں ہی سوگوار انداز میں خاموش رہے۔ میں اپنے آپ کو سنبھالنے اور دل ہی دل میں خود کو سمجھانے میں لگا رہا اور وہ اسٹیئرنگ وھیل پر دونوں بازو ٹکائے، سڑک پر نظر جمائے نہ جانے کیا سوچتا رہا۔

بالآخر اسی نے سکوت توڑا "اب کیا کرنا ہے؟"

"چلو چل کر پہلے لاش کو تو چھپائیں" میں نے اپنی آواز کے ارتعاش پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

ہم نے اوپر چڑھ کر لاش کو اس خون آلود گدے میں اور پھر ایک چادر میں اچھی طرح لپیٹا اور ٹرک میں ایک جگہ سے کوئلہ ہٹا کر مال کے ڈبوں کے درمیان جگہ بنا کر لٹادیا۔ اوپر ڈبے رکھ کر ہم نے سب سے اوپر پہلے کی ہی طرح کوئلہ پھیلا دیا۔ لاش کو چھپانے کے بعد بوجھل دلوں کے ساتھ ہم ایک بار اپنے سفر پر چل پڑے۔

پشاور شہر کی حدود سے کچھ پہلے ہی ٹرکوں کا ایک اڈا تھا اور اس سے متصل ہی ایک بڑے چھپر میں ڈرائیوروں کا ایک مخصوص ریستوران تھا۔ بھٹیار خانہ نما اس ریستوران میں کچھ ڈرائیور بھاری بھرکم اور لمبی چوڑی چارپائیوں پر نیم دراز تھے کوئی خراٹے بھی لے رہا تھا۔ دو ایک ڈرائیور کھانا کھا رہے تھے۔ ایک چبوترے پر دیگچیاں وغیرہ سامنے سجائے ہوئے ایک شخص بیٹھا اونگھ رہا تھا اور بیرا سست سے انداز میں برتن اٹھائے ادھر سے اُدھر جا رہا تھا۔

اِدھر اُدھر بہت سے ٹرک کھڑے ہوئے تھے۔ ٹرکوں کے اڈے کے وسط میں چھوٹا سا ایک نیم پختہ سا کمرا موجود تھا جس میں لوہے کی ایک میز کرسی اور ایک بینچ وغیرہ پڑی ہوئی تھی۔ میرے لئے سب سے اہم بات یہ تھی کہ میز پر سیاہ رنگ کا ٹیلی فون سیٹ موجود تھا۔ میز پر ایک شخص موجود تھا جو کچھ کاغذات پنچ کرکے ایک فائل میں لگا رہا تھا۔

میں نے رئیس گل سے کہا "اس شخص سے جاکر بات کرو کہ ہمیں چند منٹ کے لئے تنہائی میں فون پر لاہور بات کرنی ہے۔"

رئیس گل نے ٹرک ایک دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑا کیا اور جاکر اس شخص سے بات کی۔ کئی منٹ کے بعد بالآخر واپس آیا اور بولا "وہ تیار ہے صاحب! لیکن وہ کہتا ہے کہ وہ جتنی دیر بھی دفتر سے باہر رہے گا ایک سو روپیہ فی منٹ کے حساب سے پیسہ لے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی بات نہیں" میں نے ٹرک سے اترتے ہوئے کہا۔

میں دفتر میں پہنچا تو وہ شخص ٹیلی فون میرے سامنے کھسکا کر خود۔۔۔ باہر چلا گیا۔ اس کی کرسی پر بیٹھ کر میں نے نمبر ڈائل کرنا شروع کیا۔ کئی بار کی کوششوں کے بعد بالآخر میرا لاہور قاسم خان سے رابطہ قائم ہوا۔ اس کا یہ فون نمبر انتہائی ہنگامی صورتحال کے لئے مخصوص تھا لیکن اس پر بھی کال سلمیٰ نے ریسیو کی۔ اس کی آواز سے قطعاً پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ سو رہی تھی جب کہ میرے استفسار پر اس نے بتایا کہ قاسم خان سو رہا تھا۔

بہرحال اس نے جلد ہی قاسم خان کو جگا کر فون تھمادیا۔ میں نے جب قاسم خان کو کوڈ ورڈز میں بتایا کہ شرفو مرچکا ہے تو اس نے فوری طور پر کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ بس ایک لمحے کے لئے چپ ہوگیا۔ حیرت، دکھ یا صدمہ۔ اس نے کسی بھی تاثر کا اظہار نہیں کیا اور نہ یہ جاننے کی کوشش کی کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا۔ جانے کیوں مجھے اس کے اس طرزِ عمل پر اندر ہی اندر دھچکا سا لگا۔

"لاش کہاں ہے؟" بالآخر اس نے اکھڑے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہم نے ٹرک میں چھپائی ہوئی ہے" میں نے جواب دیا۔

"احمق۔۔۔۔" وہ شاید اس سے آگے بھی کوئی لفظ کہنے لگا تھا مگر خود پر ضبط کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگیا پھر بولا "تمہیں سب سے پہلے لاش کو کہیں ویرانے وغیرہ میں دفن کردینا چاہئے تھا۔ کیسے عجیب آدمی ہو تم۔۔۔۔ مال تو جو ہے سو ہے تم ایک لاش کو بھی ساتھ ساتھ اٹھائے پھر رہے ہو۔"

"جناب خان صاحب!" میرے حلق میں کڑواہٹ سی گھلنے لگی "وہ ہمارے دیرینہ رفیق کی لاش ہے۔ میں اسے لاہور لانا چاہتا تھا کہ اسے کسی قدر معقول طریقے سے دفن کیا جاسکے۔"

"یہاں کیا تم اس کا مقبرہ تعمیر کراؤ گے" وہ تیزی سے بولا۔ "معلوم نہیں لاشوں سے کیوں تمہیں قلبی لگاؤ محسوس ہونے لگتا ہے۔ دیکھو میری بات سنو" اس نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی "ساتھی محض اس وقت تک ہمارے ساتھی ہوتے ہیں جب تک وہ زندہ ہوتے ہیں۔ مرجانے کے بعد ہر شخص محض ایک لاش ہوتا ہے۔ مرنے کے بعد وہ یہ دیکھنے سے قاصر ہوتا ہے کہ تم نے کتنے تزک و احتشام سے اسے دفن کیا ہے۔ البتہ کسی لاش کی وجہ سے تمہارا اپنا جنازہ ضرور اٹھ سکتا ہے۔ تم نے اپنی تربیت بڑی عمدگی سے مکمل کی ہے لیکن تربیت کا یہ اہم نکتہ شاید تم بھول جاتے ہو۔"

میں یہ کہنا چاہتا تھا: اس کا مطلب یہ ہے کہ کل کو اگر میں مارا گیا تو میرا سفرِ آخرت بھی بس اسی طرح ہوگا! لیکن یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ منہ سے خواہ وہ کچھ بھی کہتا لیکن دل میں بہرحال اس کے پاس میرے سوال کا یہی جواب ہوتا۔ مجھے اگر اس دنیا میں اس دھندے سے وابستہ رہنا تھا تو اب تک اس کے ہر سفاکانہ پہلو سے سمجھوتا کرلینا چاہئے تھا۔

جس طرح قاسم خان مجھے شرفو کی لاش ٹھکانے لگانے کی ہدایت کر رہا تھا اس سے کہیں اچھی طرح تو لاوارثوں کی تدفین ہوجاتی تھی۔ میں قاسم خان سے یہ بھی پوچھنا چاہتا تھا کہ شرفو کے گھر والوں کا کیا بنے گا جنہیں کبھی شرفو کی لاش بھی نہیں مل سکے گی۔ جو اسے اپنی آنکھوں سے دفن ہوتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکیں گے کہ سال دو سال کے بعد دل کو کسی حد تک قرار ہی آجائے لیکن مجھے خود ہی احساس ہوگیا کہ یہ سب سوالات غیر ضروری تھے۔ قاسم خان کے لئے یہ باتیں مسائل کی حیثیت نہیں رکھتی تھیں۔

"اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے" میں نے تھوک نگل کر اپنی آواز کو نارمل رکھنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے کہا "میں سب کام ختم کرکے کل واپس پہنچ جاؤں گا۔"

"بالکل ٹھیک۔ بہادر بنو۔ حوصلہ رکھو" قاسم خان نے مطمئن لہجے میں کہا اور میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ میں بہادر بھی ہوں اور حوصلہ مند بھی بلکہ اس کی طرح کافی حد تک سنگدل بھی لیکن ساتھیوں کے لئے میرا دل موم ہی رہتا ہے۔ ان کی زندگی میں بھی اور ان کی موت کے بعد بھی۔

بوجھل قدموں سے میں اس کمرے سے نکل آیا۔ وہ شخص جو غالباً آفس کلرک یا شاید آفس کا مالک ہی تھا کچھ دور چھپر کے نیچے کھڑا گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے ادائیگی کی اور واپس رئیس گل کے ساتھ ٹرک میں جا بیٹھا۔

جس طرف سے ہم آرہے تھے ادھر ایک طویل فاصلے تک پہاڑی سڑک کے دونوں طرف ویرانہ ہی ویرانہ تھا۔ وہیں کہیں تدفین کا کام انجام دیا جاسکتا تھا۔ میں نے رئیس گل کو واپس چلنے کی ہدایت کی اور اس کے استفسار پر اسے بتایا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ بس ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

اس راستے پر کئی میل کے سفر کے بعد ویرانے میں ایک مناسب مقام دیکھ کر رئیس گل نے میری ہدایت پر ٹرک کچے میں اتارا اور ایک ٹیلے کی روٹ میں پہنچ کر روک دیا۔ ہم نے نہ تو انجن بند کیا اور نہ ہی ہیڈ لائٹس آف کیں بلکہ انہی کی روشنی میں کدال اور بیلچے وغیرہ کی مدد سے زمین کھودنی شروع کردی۔

زمین کی صرف اوپری سطح کچھ نرم تھی۔ اس سے نیچے زمین تقریباً سنگلاخ تھی۔ ہمیں کھدائی کرنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ بمشکل ہم چھ فٹ لمبا ڈیڑھ فٹ گہرا گڑھا کھود پائے، اسی میں شرفو کو دفن کرکے ہم جلدی سے ٹرک میں بیٹھ کر دوبارہ پشاور کی طرف چل دیئے۔ کم از کم مجھ میں اس کے مدفن پر ٹھہرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ کل میرا وہ جگری یار میرے ساتھ ہنسی مذاق کرتا زندہ سلامت اس ویرانے سے گزرا تھا۔ آج وہ یہاں قابلِ رحم انداز میں پیوندِ خاک ہوچکا تھا اور کوئی اس کے لئے دعائے مغفرت کرنے والا نہیں تھا۔ کسی کو اس کی موت کا علم تک نہیں تھا۔ بس یہی کچھ زندگی کا مآل تھا۔ ساری کشاکشِ حیات کا یہی حاصل تھا۔ سوچتے سوچتے ایک بار تو میں نے محسوس کیا کہ شاید واپس پہنچ کر چند دنوں تک میں یہ پیشہ چھوڑ دوں گا جس کی مجھے چاٹ لگ چکی تھی۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بعض ارادے پگھلی ہوئی دھات کی طرح ہوتے ہیں۔ اگر انہیں فوری طور پر کسی شکل میں نہ ڈھالا جائے یعنی ان پر عمل نہ کیا جائے تو بعد میں انہیں کوئی شکل دینا ممکن نہیں رہتا۔ کچھ دنوں بعد مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ یہ بات بالکل درست تھی۔ وہ چند دن میرے پاؤں کی زنجیریں بن گئے تھے۔

دوسرے روز میں واپس لاہور پہنچ گیا۔ مال راستے میں پارٹی نے مجھ سے لے لیا تھا اور جب میں لاہور پہنچا تو میرے ہاتھ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس تھا جس کے اوپری حصے میں چند کپڑے اور چھوٹی موٹی چیزیں تھیں جو میری نہیں تھیں۔ ان کے نیچے آدھے سے زیادہ سوٹ کیس نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا تھا۔ رئیس گل اپنا معاوضہ لے کر پنڈی ہی میں مجھ سے جدا ہو گیا تھا۔ غالباً واپس چلا گیا تھا۔

ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پہنچ کر میں نے سب سے پہلے نہا دھو کر اپنا حلیہ درست کیا' قاسم خان کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی پھر کھانا کھانے کے لئے ڈائننگ روم میں جا پہنچا۔

مس ٹرپ میرے لئے کھانا لگاتے ہوئے بولی "شرفو تمہارے ساتھ واپس نہیں آیا" میں نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اور بظاہر بے پروا نظر آنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ شدت سے جواب کی منتظر ہے۔ اس کے سوال نے میرے دل میں پھر وہی ٹیس جگا دی تھی جسے میں بمشکل دبائے ہوئے تھا۔

"وہ مر گیا ہے" بالآخر میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ پلیٹ میز پر رکھتے ہوئے اس کے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش آ گئی پھر اس نے انگلی سے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور زیر لب کچھ کہا اس کے بعد دوبارہ پرسکون انداز میں اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اسی کمرے میں موجود کراکری کی دیوار گیر الماری سے برتن نکالنے لگی۔ اس نے بھی کچھ نہیں پوچھا۔ تفصیل جاننے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔

"تم نے کوئی تبصرہ نہیں کیا؟" میں نے سر جھکا کر چھری کانٹے سے کھیلتے ہوئے کہا۔ میں اب اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔

"کیا تبصرہ کروں؟" اس کی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دی "اس گھر میں رہتے ہوئے موت کی یہ گیارہویں اطلاع ہے جو میں نے کم و بیش اسی انداز میں سنی ہے جس طرح پہلے سنتی آئی ہوں۔"

"شاید اسی طرح کل کوئی اور شخص اسی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تمہیں میری موت کی خبر سنا رہا ہو" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"شاید....." اس نے سپاٹ اور مبہم لہجے میں جواب دیا۔ کم بخت کو اپنے تاثرات چھپانے میں کمال حاصل تھا۔

میں کھانے سے فارغ ہوا ہی تھا کہ قاسم خان آن پہنچا۔ اعظم خان اس کے ساتھ تھا مگر وہ کمرے کے باہر ہی رک گیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے نوٹوں کا ادھ بھرا سوٹ کیس قاسم خان کے حوالے کیا۔ نوٹوں کی گڈیاں دیکھ کر اور انہیں سرسری سے انداز میں الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد قاسم خان کے چہرے پر گویا زندگی کی چمک گہری ہو گئی۔

میں نے زبانی..... اسے مختصراً حساب کتاب سمجھا دیا۔ اس نے کوئی خاص توجہ دیئے بغیر طمانیت سے اثبات میں سر ہلایا پھر نوٹوں کی دو گڈیاں نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔

"یہ تمہارا کمیشن اور خصوصی بونس" وہ مسکراتے ہوئے بولا "بونس اس خوشی میں کہ تم شرفو کے مرنے کے باوجود اس کھیپ کو عمدگی سے نکال لانے میں کامیاب رہے۔ اب بتاؤ شرفو کیونکر مارا گیا؟"

میں نے بہت دھیمی آواز میں اٹک اٹک کر اسے سب کچھ بتا دیا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا "مجھے معلوم ہے اشرف خان کی موت کے بعد تمہارے لئے یہ دوسرا بڑا جھٹکا ہے لیکن اطمینان کی بات یہ ہے کہ تم اتنے دل گرفتہ اور دل شکستہ نظر نہیں آ رہے جتنے اشرف خان کی موت پر تھے۔ دو چار اور ایسے صدمے پڑیں گے اور عمر اور تجربہ بڑھتا جائے گا تو خود بخود ہی تم صدمہ پروف ہوتے جاؤ گے۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں باہر گاڑی تک اسے چھوڑنے آیا۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس نے میرا کندھا تھپک کر کہا "سب کچھ ذہن سے جھٹک دو اور کسی اچھی سی جگہ پر جا کر یہ رات عیش و نشاط میں گزارو تاکہ کل تک دل ہلکا ہو جائے۔"

میں نے اس مشورے کے جواب میں کچھ نہیں کہا۔ اعظم خان نے چھوٹا سا سوٹ کیس اپنی سیٹ کے نیچے رکھ لیا تھا۔ قاسم خان بیٹھ چکا تو ملازم جمیل نے جا کر گیٹ کھول دیا اور مرسیڈیز ڈرائیوے کی بجری کو کچلتی ہوئی باہر چلی گئی۔

میں نے قاسم خان کے مشورے پر عمل نہیں کیا کیونکہ فی الوقت میرا دل بھی ٹوٹ چکا تھا۔ اسپرین کی دو گولیاں کھا کر کچھ سکون محسوس ہوا تو سو گیا۔

دوسری صبح میں دن چڑھے اٹھ کر شیو بنانے کے ارادے سے غسل خانے کی طرف جانے ہی لگا تھا کہ میری نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے کلاک پر پڑی جو تاریخ بھی بتاتا تھا۔ تاریخ دیکھ کر میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ ٹیبل کلاک اٹھارہ تاریخ بتا رہا تھا۔

آج تو شرفو کی بہن کی شادی تھی۔

لمحے بھر کو میں اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ درحقیقت فوری طور پر تو میں یہ فیصلہ بھی نہیں کر پایا تھا کہ میری الجھن کیا ہے؟ بس یہ یاد آتے ہی ذہن میں چھناکا سا ہوا تھا کہ آج شرفو کی بہن کی شادی ہے۔ وہ بہن جسے نہ جانے کتنے عذاب ناک انتظار کے بعد ہاتھوں پر حنا کی لالی دیکھنا نصیب ہوئی تھی..... اور جس کو ڈولی میں بٹھانے کا شرفو کو بڑا ارمان تھا۔ اپنی بہن کی شادی کو ہی وہ سب سے بڑی ذمے داری سمجھتا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ اس فرض سے سبکدوش ہونے کے بعد اسے دنیا کی کسی اونچ نیچ کی کوئی فکر نہیں رہے گی۔ کسی بات کی کوئی پروا نہیں رہے گی۔

مجھے یاد آیا کہ چند دن پہلے جب میں کراچی سے واپس آیا تھا تو ایئرپورٹ پر شرفو نے کتنے مسرور لہجے میں یہ خبر سنائی تھی کہ اس کی بہن کی شادی طے ہو گئی ہے۔ مجھے اس کے الفاظ بھی یاد تھے۔ کیسی چہکار اور خوشی کے ساتھ اس نے کہا تھا
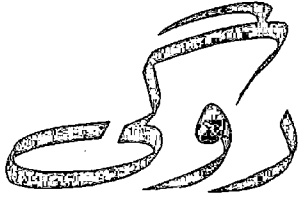
"میں بے چین تھا کہ تمہیں یہ خبر سناؤں۔ مجھے معلوم تھا کہ صرف تم ہی میری خوشی کو محسوس کرسکتے ہو۔ یہاں اور تو کسی کو کسی کے ذاتی معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں۔ حتیٰ کہ قاسم خان کو بھی نہیں، جس کے لئے ہم جان ہتھیلی پر لئے پھرتے ہیں۔"

اس نے یہ بھی کہا تھا "لڑکے والوں کو بہت جلدی ہے۔ اماں نے لکھا ہے کہ گھرانہ بہت ہی شریف اور بہت ہی اچھا ہے۔ ہم تو سوچتے تھے کہ لڑکی کی عمر زیادہ ہوگئی ہے۔ اب جیسا تیسا بھی رشتہ میسّر آئے گا ہاں کردیں گے۔ لیکن اللہ نے من کی مُراد کے مطابق بر دے دیا ہے۔ اب زیورات اور خاص خاص عروسی ملبوسات کا انتظام مجھے ہی کرنا ہے..... اور مجھے لگتا ہے کہ یہ سب چیزیں لے کر میں عین موقع پر ہی گھر پہنچ سکوں گا کیونکہ ابھی یہاں بہت سے ضروری کام نمٹانے ہیں اور اسی دوران شاپنگ کرنی ہے۔ شاپنگ میں ذرا تم بھی میرا ساتھ دینا۔ مجھے تو زیور کپڑے وغیرہ کے بارے میں خاک بھی علم نہیں۔"

میں نے اس کے ساتھ جانے کا وعدہ کیا تھا مگر آج وہ اس دنیا میں نہیں تھا۔ میں بظاہر کیسے سفاک انداز میں اس کے جسدِ خاکی کو ایک ویرانے میں، بے نشان قبر میں دفن کر آیا تھا۔ اپنی الجھن میری سمجھ میں آگئی۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ شرفو کے گھر والے کس بے تابی سے اس کا انتظار کررہے ہوں گے۔ ان بیچاروں کے پاس تو شرفو کا صحیح ایڈریس بھی نہیں تھا ..... اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ شادی کے لئے زیور کپڑا لے کر پہنچنا شرفو کی ذمے داری تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ ایسے موقعوں پر تو ذرا ذرا سی باتیں ناک کا مسئلہ بن جاتی ہیں۔ یہاں تو سب سے بڑی اور اہم چیزوں کا دارو مدار ہی شرفو پر تھا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ نو بج رہے تھے۔ اگر میں آندھی اور طوفان کی طرح حرکت میں آجاتا تو گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں شاپنگ کرکے کار میں تقریباً چار بجے تک شرفو کے گاؤں پہنچ سکتا تھا۔ گاؤں "سرگودھا خوشاب روڈ" پر تھا اور ہائی وے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ بار ہا بار سے میرا دیکھا ہوا تھا۔ لیکن اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس گاؤں کا کوئی آدمی میرا دوست بنے گا اور مختصر سی رفاقت کے بعد بچھڑ بھی جائے گا۔

اس کے گھر کا صحیح پتا تو مجھے معلوم نہیں تھا تاہم مجھے یقین تھا کہ گاؤں پہنچ کر اس کا گھر تلاش کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ دیہات میں کسی کا گھر تلاش کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

میں جس قدر جلد ممکن ہوسکتا تھا، تیار ہوا اور شرفو کے کمرے میں پہنچا۔ مجھے معلوم تھا کہ شرفو کا کوئی اکاؤنٹ نہیں تھا وہ اپنی کُل جمع پونجی اپنے کمرے میں نصب شدہ چھوٹے سے سیف میں رکھتا تھا اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس سیف کی چابی کہاں ہوتی ہے۔

ظاہر ہے اب شرفو کی رقم کا تو کوئی مصرف نہیں تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ اس کی رقم سے اپنے اندازے کے مطابق ضروری چیزیں خریدنے کے بعد اگر کچھ بچ گیا تو وہ بھی سامان کے ساتھ اس کے گھر والوں کو دے دوں گا اور اگر میری من پسند چیزیں خریدنے کے سلسلے میں رقم کم پڑی تو اپنے پاس سے ڈال دوں گا۔ اس کے علاوہ بھی میں خالصتاً اپنی طرف سے شرفو کی بہن کے لئے کچھ نہ کچھ خریدنا چاہتا تھا۔

میں نے شرفو کی بتائی ہوئی خفیہ جگہ سے سیف کی چابی نکال کر سیف کھولا تو مجھے دھچکا سا لگا۔ سیف بالکل خالی تھا۔ اس میں رقم تو کیا سادہ کاغذ کا ایک پرزہ تک نہیں تھا۔ میں اور شرفو جب شاہ رخ کو ٹھکانے لگانے کی مہم سے واپس آئے تھے تو قاسم خان نے ہمیں اس کام کا الگ سے معاوضہ دیا تھا جسے وہ بونس کہا کرتا تھا۔ اس وقت شرفو نے پانچ ہزار کی گڈی تو میرے سامنے سیف میں رکھی تھی جبکہ اس میں پہلے سے بھی رقم موجود تھی۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ کاغذات اور لفافے وغیرہ بھی نظر آئے تھے۔ مگر اب یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کبھی کچھ رکھا ہی نہیں گیا تھا۔

چند لمحے تو میں وہیں دم بخود کھڑا رہا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ اس طرح تو میں محض وقت ہی ضائع کررہا ہوں۔ سیف بند کرکے میں مڑا تو ایک بار پھر ٹھٹک کر رہ گیا۔ دروازے پر مس ٹریپ کھڑی خالی خالی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"کس چیز کی تلاش تھی تمہیں؟" اس نے اپنے ناخنوں کا جائزہ لیتے ہوئے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

میں نے اس خیال سے کہ کہیں وہ میری نیت پر شبہ نہ کرے، اسے بتادیا کہ میں کیا تلاش کررہا تھا اور کیوں تلاش کررہا تھا۔

"شاید تمہیں معلوم نہیں ...." اس نے ایک لمحے کے لئے میری آنکھوں میں جھانکا "یہاں کا اصول ہے کہ جب کوئی مرجاتا ہے تو اس کی چھوڑی ہوئی ہر چیز۔ نقد رقم، کاغذات یا کوئی بھی ایسی چیز جس سے مرنے والے کی شناخت میں کوئی مدد مل سکتی ہو، سب کچھ باس کی تحویل میں چلا جاتا ہے اور ان چیزوں کے بارے میں کوئی کسی قسم کا دعویٰ یا مطالبہ نہیں کرسکتا۔ اس لئے ہم کارندوں کو نقد رقم اور دیگر چیزیں کم سے کم اپنے پاس رکھنی چاہئیں۔ یہ بات شرفو کو بھی معلوم تھی... لیکن شاید اس کا خیال تھا کہ اس کا کام محفوظ قسم کا ہے اس لئے وہ اپنی زندگی میں ہی... اور شاید جلد ہی اپنی جمع پونجی کو استعمال کرلے گا۔ چنانچہ اس نے اپنا اثاثہ کسی محفوظ جگہ پر پہنچانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ لیکن اسے شاید اس سادہ ترین حقیقت کا احساس نہیں تھا کہ موت کا کیا بھروسا" وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی۔

میں ایک لمحہ وہیں کھڑا خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا

وہ واپس جانے کے لئے مڑنے لگی تو میں نے گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا "خیر... میں اس موضوع پر باس سے پھر بات کروں گا۔ میں شرفو کے گاؤں جارہا ہوں۔ اگر باس کا فون آئے تو خواہ تم اصل بات ہی بتادینا اور چاہو تو کہہ دینا کہ میں کسی ذاتی کام سے شہر سے باہر گیا ہوا ہوں۔ کل تک لوٹ آؤں گا۔ جو بھی تم مناسب سمجھو کہہ دینا، خدا حافظ۔"

میں تیزی سے باہر آیا۔ میری گاڑی یہاں نہیں تھی۔ وہ گلبرگ میں میری رہائش گاہ میں کھڑی تھی چنانچہ میں اسی فوکس ویگن میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا جو شرفو کے استعمال میں رہتی تھی۔ میں اپنے گھر ہی کی طرف جارہا تھا۔ میرا اکاؤنٹ گھر کے قریب ہی ایک چھوٹی سی برانچ میں تھا۔ کچھ نقد رقم گھر میں بھی رکھی ہوئی تھی۔

میرے اخراجات خاصے زیادہ تھے اور پھر مجھے "کام" کرتے ہوئے بھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ میں بمشکل تیس بتیس ہزار روپیہ بچاپایا تھا۔ اس میں سے بیشتر رقم بینک میں کرنٹ اکاؤنٹ میں موجود تھی۔ ایک نام نہاد کاروباری ادارے کے نام پر یہ اکاؤنٹ کھلوایا گیا تھا۔ اس ادارے کی تھوڑی سی اسٹیشنری بھی چھپوائی گئی تھی جو میری رہائش گاہ پر اسٹور روم کی ایک الماری میں پڑی تھی۔

گھر سے چیک بک لے کر میں بینک پہنچا تو دس بج چکے تھے۔ میں سیدھا منیجر کے پاس چلا گیا تاکہ انتظار میں مزید وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ وہ زمانہ غنیمت تھا۔ نیشنلائزیشن کی دیمک نے اداروں کو تباہ نہیں کیا تھا۔ چھوٹے اکاؤنٹ ہولڈر کو دیکھ کر بھی منیجر کرسی سے اٹھ کر استقبال کرتا تھا اور ہر متعلقہ مسئلے میں حتی الامکان مدد کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ چند ہی منٹ بعد میں اپنی تقریباً ساری رقم نکلوا کر بریف کیس میں رکھ کے گاڑی میں انار کلی کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔

انار کلی پہنچ کر میں نے جس طوفانی انداز میں شاپنگ کی اس طرح شاید ہی کسی نے کی ہو۔ زیورات اور عروسی ملبوسات وغیرہ کی دکانوں کی تاریخ میں شاید ہی کبھی ایسا کوئی گاہک آیا ہو جس نے میرے جتنی عجلت میں سامان خریدا ہو، کسی چیز کی قیمت میں ایک پیسہ بھی کم کرانے کے لئے نہ کہا ہو اور کیش میمو لینے کی بھی زحمت نہ کی ہو۔

میری عقل نے جہاں تک ساتھ دیا، میں نے ضرورت کی تقریباً سب ہی چیزیں خرید لیں۔ میرا ہاتھ اس وقت رکا جب میری جیب میں صرف ایک ہزار روپیہ رہ گیا۔ مختلف دکانوں کے درمیان گھن چکر بن کر میں پسینے میں بھیگ چکا تھا اور میری اس تمام تر جلد بازی کے باوجود مجھے بازار میں تقریباً ڈیڑھ گھنٹا لگ گیا تھا۔ وقت گویا پر لگا کر اڑ رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی تو بارہ بج چکے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ شہر سے نکلتے نکلتے مجھے ایک بج جاتا۔

چند لمحے بعد میری گاڑی سرکلر روڈ کے بے ہنگم ٹریفک میں شامل ہوگئی۔ گاڑی کا پچھلا حصہ ڈبوں، پیکٹوں اور دیگر ساز و سامان سے بھر چکا تھا۔ میں جس حد تک بھی ممکن تھا، تیز رفتاری سے ڈرائیو کررہا تھا۔ اس کے باوجود میرا وہی اندازہ درست رہا کہ مجھے ٹریفک میں الجھتے الجھتے راوی کے پل پر پہنچنے میں پون گھنٹہ لگ گیا۔ صحیح معنوں میں میں ایک بجے شہر سے روانہ ہوسکا تھا۔ اب میں انتہائی تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کرکے بھی چار بجے سے پہلے گاؤں نہیں پہنچ سکتا تھا اور شادی بیاہ میں عموماً چار بجے رخصتی وغیرہ کا مرحلہ آجاتا ہے۔ مجھے اس تصور سے گھبراہٹ ہورہی تھی کہ شرفو کے گھر والوں کی نہ جانے کیا حالت ہوگی؟ باپ تو اس کا تھا ہی نہیں۔ ماں، دو چھوٹے بھائی اور ایک یہ بہن تھی جس کی شادی ہورہی تھی۔

میں خاصی تیز رفتاری سے ڈرائیو کرتے ہوئے اپنے اندازے سے کچھ پہلے ہی گاؤں پہنچ گیا۔ گاڑی میں نے ہائی وے سے کچے میں اتاری تو کھیتوں کے قریب کھیلتے ہوئے کچھ بچے شور مچاتے ہوئے گاڑی کے پیچھے لگ گئے۔ میں نے گاڑی روک کر انہی سے شرفو کا گھر معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ نہ بتاسکے مگر جب میں نے بتایا کہ اس گھر میں آج شادی ہورہی ہوگی تب انہوں نے فوراً میری مکمل رہنمائی کردی بلکہ اسی جلوس کی معیت میں، میں شرفو کے مکان تک پہنچا۔

مکان کے سامنے ہی کھلے میدان میں درختوں کے سائے میں چارپائیوں پر باراتی بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ کچھ تو لیٹے ہی ہوئے تھے۔ ایک طرف باجے والے قدرے بیزار سے انداز میں بیٹھے تھے۔ مکان کے قریب ہی دیوار کے ساتھ کچھ دیگیں آڑی ترچھی پڑی تھیں۔ دیگیں خالی ہوچکی تھیں اور چولھے بجھ چکے تھے۔ کہیں قناتیں وغیرہ لگانے کا تکلف نہیں کیا گیا تھا بلکہ کھلے میدان میں ہی کچھ جگہ صاف کرکے دریاں بچھائی گئی تھیں جو اب الٹی سیدھی پڑی تھیں۔ ایک طرف دو تین ٹب برتنوں سے بھرے رکھے تھے۔

ہرچند کہ وہاں شادی کے لوازمات موجود تھے مگر فضا میں عجیب سی سوگواری رچی ہوئی تھی۔ ویسے تو دور ہی سے میری گاڑی کو دیکھ کر بیشتر باراتی چونک گئے تھے لیکن جب میں عین مکان کے قریب ہی جا پہنچا تو چارپائیوں پر لیٹے ہوئے آدمی بھی اٹھ بیٹھے اور متجسس نظروں سے میری طرف دیکھنے لگے پھر شاید انہیں یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ آنے والا شرفو نہیں تھا۔ کسی نے آگے بڑھ کر مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے بھی کسی سے کچھ پوچھنے یا ہچکچاہٹ میں وقت ضائع کرنے کی کوشش نہیں کی اور بے دھڑک مکان کے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ دروازہ کھلا ہی تھا اور صحن میں بہت سے مردوں اور عورتوں کا ہجوم نظر آرہا تھا۔ مکان نیم پختہ

سا ہی تھا تاہم کافی طویل و عریض معلوم ہوتا تھا۔

میں سیدھا اندر چلا گیا۔ صحن میں میں نے ایک آراستہ دیوان پر دُلھا کو بھی دیکھا۔ اس کی شکل تو میں صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس نے بھاری بھرکم سہرا تو چہرے سے ہٹایا ہوا تھا مگر اب بھی منہ پر رومال رکھا ہوا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو ایک نوجوان بیٹھے تھے جن کے سروں پر اونچے اونچے طرّوں والی کلف لگی پگڑیاں تھیں اور گلے میں گلاب کے ہار تھے جو اب مرجھانے لگے تھے!

دو تین اور صاحبان کے گلے میں بھی پھولوں کے ہار نظر آرہے تھے۔ وہ صاحبِ ریش تھے اور ایک طرف کھڑے کچھ لوگوں سے اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کررہے تھے۔ انداز بحث و تکرار کا سا تھا لیکن کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بحث کرنے والوں کے گرد مردوں اور عورتوں کا جھمگٹ تھا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے اور کس سے کہہ رہا ہے۔

اچانک کسی کی توجہ میری طرف مبذول ہوگئی اور پھر ایک ایک کرکے سبھی کی گردنیں میری طرف گھومتی چلی گئیں اور دوسرے ہی لمحے وہاں گہرا سکوت چھا گیا۔ میں نے کسی کی طرف توجہ نہیں دی اور قریب کھڑی ایک ادھیڑ عمر عورت سے پوچھا "شرفو کی ماں کہاں ہے؟"

عورت نے خاموشی سے ایک کمرے کی طرف اشارہ کردیا اور میں بلا جھجک اس کمرے میں جا گھسا۔ میں نے دیکھا، ایک ضعیف عورت آنکھیں بند کئے ایک چوڑے سے پلنگ پر چت پڑی تھی۔ ایک عورت اس کا ہاتھ سہلا رہی تھی اور دو نوجوان اس کے تلوے سہلا رہے تھے۔ نوجوانوں کے چہروں سے وحشت عیاں تھی۔

مجھے دیکھ کر ان میں سے ایک نوجوان جو نسبتاً کم عمر تھا، اٹھ کھڑا ہوا اور بے تابی سے بولا۔ "کیا شرفو بھائی آگئے؟ کیا آپ ان کے ساتھ آئے ہیں؟"

"بس سمجھ لو کہ شرفو آگیا ہے" میں نے نوجوان کا کندھا تھپتھپایا "تم بھائی ہو نہ شرفو کے؟ کیا نام ہے تمہارا؟"

"اسلم" نوجوان نے جواب دیا۔

"کیا صورتحال ہے؟ یہ باہر کیسا ہنگامہ ہورہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نکاح ہوچکا ہے.... کھانا بھی کھایا جاچکا ہے" نوجوان نے ہچکچاتے ہوئے بے بسی آمیز انداز میں بتایا "لیکن رخصتی کے وقت جھگڑا پڑگیا ہے.... ہم نے جہیز کی صرف دو چار چیزوں کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ ہم شرفو بھائی کے آسرے پر تھے۔ انہوں نے لکھا تھا، خواہ میں عین رخصتی کے وقت پہنچوں لیکن پہنچوں گا ضرور۔"

میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ ان بیچاروں کو گمان تک نہیں تھا کہ شرفو اب کبھی بھی گھر نہیں آئے گا۔

نوجوان نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بات جاری رکھی۔ "لڑکے والوں کو جب یہ پتا چلا کہ شرفو بھائی ابھی تک نہیں پہنچے ہیں تو وہ شور مچا رہے ہیں کہ ان کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ انہیں تو یہ بتایا گیا تھا کہ لڑکی کا بھائی شہر میں بڑے اچھے عہدے پر ملازم ہے اور وہ بڑا اچھا جہیز دے گا.... اماں کو ان کی باتیں سن سن کر غشی کے دورے پڑ رہے ہیں۔"

اس دوران ضعیف خاتون آنکھیں کھول چکی تھیں اور امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ میں نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا "خالہ! آپ نے تو شرفو کو لکھا تھا کہ یہ بڑے شریف اور بھلے لوگ ہیں؟"

"شریف اور بھلے تو ہیں بیٹا" شرفو کی امی نقاہت بھرے انداز میں بولیں "لیکن تھوڑا بہت لالچ تو سب میں ہی ہوتا ہے نا.... اور پھر ہم سے بھی تو وعدہ خلافی ہورہی ہے نا۔"

وہ قطعی طور پر ایک دیہاتی اور سیدھی سادی خاتون تھیں مگر غضب کی رواداری اور تحمل مزاج تھیں۔ لڑکے والوں کو برا نہیں کہہ رہی تھیں۔ کمزور سے لہجے میں بولیں "تم دوست ہو شرفو کے؟ کیا خبر لائے ہو؟"

"خالہ! شرفو کو عین وقت پر چھٹی نہیں مل سکی۔ بہرحال سامان سب بھیج دیا ہے اس نے" میں نے تھوک نگل کر کہا اور شرفو کی امی کی طرف سے منہ پھیر کر نوجوانوں کو مخاطب کیا۔

"جاؤ، جاکر گاڑی سے سامان نکال لاؤ۔"

"خدایا! تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے" شرفو کی امی نے ایک طویل سانس لی۔ ان کے سینے سے جیسے کوئی بھاری بوجھ ہٹ گیا۔ اس وقت انہیں صحیح طور پر شرفو کی خیر و عافیت دریافت کرنے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ دونوں بھائی لپک کر کمرے سے باہر چلے گئے تاہم وہ عورت جو بڑی بی کے ہاتھ سہلا رہی تھی، وہیں بیٹھی اسی طرح ہاتھ سہلاتی رہی۔ بڑی بی نے مجھے قریب ہی پڑے ہوئے موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

باہر جیسے آن کی آن میں خبر پھیل چکی تھی کہ شرفو خود تو نہیں آسکا مگر اس نے جہیز کا سامان بھیج دیا ہے۔ ماحول پر سے جیسے یکلخت یاسیت، بیزاری اور سوگواری کے سائے چھٹ گئے تھے۔ مجھے یہ سب کچھ بڑا عجیب لگ رہا تھا۔ ایک تو میں نے آج تک اس طرح عین رخصتی کے وقت کسی لڑکی کا جہیز آتے نہیں دیکھا تھا۔

دوسرے مجھے یہ بات بڑی عجیب لگ رہی تھی کہ روپیہ پیسہ انسان کی زندگی میں کیسے عجیب تماشے دکھاتا ہے۔ بچپن ہی سے میں روپے پیسے کے ہونے اور نہ ہونے کے عجیب و غریب اثرات دیکھتا چلا آرہا تھا اور مجھے یہ معاملہ بڑا دلچسپ لگتا تھا۔ بہت ہی عجیب چیز ہے یہ بے جان کرنسی بھی جو بہت سے مُردہ جذبوں میں جان ڈال دیتی ہے۔ انسان اپنے گرد و پیش کا

مشاہدہ کرے تو اسے روپے پیسے کی بہت ہی حیرت انگیز قسم کی شعبدہ بازیاں دیکھنے کو ملیں۔

ابھی اس گھر میں ہی شادی کے تمام لوازمات پورے تھے اور شادی ہو بھی چکی تھی مگر چند ہزار کا سامان نہ ہونے کی وجہ سے کس طرح چند جانیں وسوسوں کی سولی پر لٹکی ہوئی تھیں اور کس طرح ماحول پر بے یقینی اور نحوست کے سائے پھیلے ہوئے تھے اور چند ہی لمحوں میں کس طرح بازی پلٹ گئی تھی، ہر چہرے پر رونق سی آگئی تھی۔

میرے لئے پیتل کے ایک لمبے سے گلاس میں شربت آچکا تھا۔ کئی مرد اور عورتیں متجسس اور شرمیلے سے انداز میں کن انکھیوں سے مجھے دیکھتے ہوئے دروازے کے سامنے سے گزرے۔ انہیں یقیناً میرے بارے میں معلوم تو ہوچکا تھا مگر وہ آکر مجھ سے ملتے ہوئے شرما رہے تھے۔

چند ہی منٹ میں جہیز صحن میں چارپائیوں پر سجا دیا گیا۔ جو چیزیں شرفو کے گھر میں تیار کی گئی تھیں وہ بھی ساتھ رکھ دی گئی تھیں۔ اچھا زمانہ تھا، روپے پیسے کی قدر و قیمت آج کے دور سے یقیناً کافی زیادہ تھی۔ تیس پینتیس ہزار کے سامان میں جیسے پورا صحن جگمگ جگمگ کر اٹھا تھا۔ ہر طرف واہ واہ ہورہی تھی۔ دُلھا کا باپ بڑے عاجزانہ انداز میں آکر مجھ سے ملا۔ اور باتوں باتوں میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ سامان وغیرہ کی تو کوئی بات نہیں تھی، وہ تو محض شرفو کی ماں کو ان کے وعدے یاد دلا رہے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے مسکرا کر بات ٹال دی۔

میں کھانا کھا چکا اور باہر ہنگامہ سرد پڑ چکا تو رخصتی کا غلغلہ بلند ہونے لگا۔ اس وقت تک شرفو کی امی بستر سے اٹھ چکی تھیں اور ان کی طبیعت بحال ہوچکی تھی۔ وہ مجھ سے اتنی محبت اور شفقت سے باتیں کررہی تھیں کہ مجھے احساس ہی نہیں رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے تک یہ خاندان میرے لئے اجنبی تھا۔

ہوش سنبھالنے پر میں نے اپنے آپ کو ماں کی محبت سے محروم پایا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے آج تک اس محرومی کا کوئی خاص احساس نہیں ہوا تھا۔ جس چیز سے انسان آشنا ہی نہ ہو اس سے محرومی کا احساس کم ہی ہوتا ہے۔ مگر آج جب مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوا تھا کہ ماں ایسی ایک ہستی ہوتی ہے تو احساس ہونے لگا تھا کہ واقعی ماں سے محرومی بہت بڑی محرومی ہے۔

رخصتی کا مرحلہ آیا تو شرفو کی امی بولیں "آج شرفو کا نہ آنا شاید میرے سینے کا گھاؤ بن جاتا لیکن تمہاری آمد نے میرا سارا دُکھ دور کردیا ہے بیٹا! مجھے اب محسوس ہی نہیں ہورہا کہ شرفو اس اہم موقع پر موجود نہیں ہے۔ میرے لئے تم ہی شرفو بن گئے ہو۔ چلو.... چل کر بہن کو رخصت کرو۔"

میں ان کے ساتھ دوسرے کمرے میں پہنچا تو سہیلیوں کے جھرمٹ میں بیٹھی ہوئی اس اجنبی لڑکی کو دیکھ کر یکایک ہی نہ جانے کیوں میرے سینے میں جیسے محبت کے سوتے پھوٹ پڑے۔ میں ایک لمحے کے لئے ساکت کھڑا اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ تخت پر بیٹھی تھی۔ سہیلیوں نے اس کا گھونگٹ اٹھا دیا تھا۔ مجھے تو وہ قطعاً زیادہ عمر کی نہیں لگی۔ زیادہ سے زیادہ چوبیس پچیس سال کی لگ رہی تھی۔ شاید دیہات کے حساب سے وہ زیادہ عمر کی ہوگئی تھی یا پھر اس وقت دُلہن بن کر اس پر روپ آگیا تھا۔ اس کی اصل شخصیت کا تاثر اس لمحے کی خوبصورتی میں دب کر رہ گیا تھا۔ وہ تو بہت ہی معصوم سی تھی۔ میرے ذہن میں اس کا جو خاکہ تھا اس سے بہت مختلف۔ شرفو کی بہن تو وہ لگتی ہی نہیں تھی۔

اس کی امی اس کے قریب پہنچیں تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور ان کے گلے لگ کر رونے لگی۔ کچھ دیر ماں بیٹی آنسو بہاتی رہیں پھر اس کی امی آنکھیں پونچھتے ہوئے میری طرف اشارہ کرکے گلوگیر آواز میں بولیں "یہ بھی اچھو، گلو اور شرفو کی طرح تیرا بھائی ہے کلثوم! آج یہ ہماری خاطر اتنی تکلیف اٹھا کر آیا تو ہماری عزت رہ گئی۔"

"بھیا....." وہ میرے گلے سے لگ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگی۔ میرا بھی دل بھر آیا۔ اس ایک لمحے میں میری چشم تصور نے نہ جانے کتنے خواب دیکھ ڈالے جیسے وہ واقعی میری بہن تھی جو برسوں تک مجھ سے بچھڑی رہی تھی۔ جیسے ہمارا بچپن اکٹھے ہی گزرا تھا۔ میں اس کی شرارتوں پر اسے مارتا تھا اور وہ شکایت لے کر ماں کے پاس جاتی تھی۔ کبھی وہ میرے کھلونوں کو چھیڑ دیتی تھی تو میں اس کی چُٹیا کھینچ لیتا تھا۔

"روتی کیوں ہے پگلی؟" میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور اس کے سر پر ہلکی سی چپت رسید کی۔ پھر میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میں تجھ سے بس ایک ہی خاص بات کرنا چاہتا ہوں کلثوم! ویسے تو شادی کے بعد لڑکی کے معاملات میں میکے والوں کا کوئی دخل نہیں رہ جاتا۔ اس کے باوجود اگر تو کبھی بہت ہی زیادہ تنگ ہوجائے..... کوئی تجھے زیادہ ہی ستائے تو اسی پتے پر صرف دو سطر کا ایک خط لکھ دینا جس پتے پر شرفو کو لکھتی ہے۔ صرف نام شرفو کی جگہ میرا لکھ دینا۔ بس میں آکر سب ٹھیک کردوں گا۔ زندگی میں کبھی کسی بات سے گھبرانا نہیں۔ کبھی ڈرنا نہیں۔ جب تک میں زندہ ہوں تب تک کوئی تجھے دکھ دینے کی کوشش نہیں کرسکتا۔"

وہ میرے سینے سے لگ کر اور بھی زیادہ بلک بلک کر رونے لگی۔ میرا دل اس تصور سے اور بھی زیادہ ملول ہورہا تھا کہ اس کا اصل بھائی، میرا دوست ایک ویرانے میں مدفون تھا اور میں یہ بات اسے بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ کم از کم اس وقت نہیں بتا سکتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ راز کب تک راز رہے گا اور جب منکشف ہوگا تو کس طرح ہوگا؟

شرفو کے نام گھر والوں کے خط ایک دُکاندار کے پتے پر

آتے تھے جتے ہمارے ٹھکانے وغیرہ کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ میرے بھی اس دکاندار سے بہت اچھے مراسم تھے۔ میں جاکر شرفو کے نام آنے والی ڈاک بھی وصول کرسکتا تھا اور اگر کبھی میرے نام کوئی خط آتا تو وہ بھی مجھے مل سکتا تھا۔ مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ سلسلہ کب تک چل سکتا تھا۔

بالآخر رخصتی کا مرحلہ بھی تمام ہوا۔ مہمان بھی ایک ایک کرکے رخصت ہوگئے۔ صرف اہلِ خانہ اور دو چار دوسرے لوگ افسردہ سے انداز میں بیٹھے رہ گئے۔ وہ گھر جہاں چند لمحے پہلے ایک ہنگامہ برپا تھا یکدم جیسے سُونا سُونا سا ہوگیا۔ رات پڑنے لگی تھی۔

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور شرفو کی امی کو مخاطب کیا۔

" خالہ! اب مجھے بھی اجازت دیجئے۔ "

میری اس بات سے گویا انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ تقریباً اچھل ہی پڑیں اور گویا اپنی ساری افسردگی بھول کر بگڑتے ہوئے بولیں " پاگل تو نہیں ہوگئے ہو؟ بھلا اس طرح ہم تمہیں کیسے جانے دے سکتے ہیں؟ تمہیں دو چار دن تو رہنا چاہئے اور اگر اس کی گنجائش نہ ہو تو کم از کم آج کی رات تو تم کسی طرح نہیں جاسکتے۔ لاہور سے یہاں تک تم خود موٹر چلا کر آئے ہو اور یہاں آکر بھی آرام کا ایک لمحہ نصیب نہیں ہوا اور اب فوراً ہی سفر پر واپس چل دو گے؟ کیسی پاگلوں والی بات کی ہے تم نے۔ "

تھکن تو کسی حد تک میں واقعی محسوس کررہا تھا مگر رات میں وہاں ٹھہرنا خلافِ مصلحت تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رات کو جب وہ ماں بیٹے کچھ فارغ ہوکر بیٹھیں گے، ذہن کچھ ہلکا ہوگا تو محفل ضرور جمے گی اور پھر وہ مجھ سے شرفو کے بارے میں کُرید کُرید کر بہت کچھ معلوم کرنا چاہیں گے۔

مجھے معلوم تھا کہ شرفو نے کس محنت سے اپنی اصلیت گھر والوں سے اس طرح چھپا رکھی تھی کہ انہیں اس کے بارے میں ذرا سا بھی سراغ حاصل نہیں تھا اور اب میری پوزیشن اس سے بھی زیادہ نازک تھی کیونکہ میں شرفو کی موت کا راز چھپائے بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں کس بات کے جواب میں مجھ سے غلطی ہوجاتی۔ معلوم نہیں میرا کون سا لفظ انہیں شک میں مبتلا کرجاتا۔ میں رات بھر کسی قیمت پر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

شرفو کے سب سے چھوٹے بھائی اسلم نے تو نہایت معصومیت سے اپنا ارادہ بھی ظاہر کردیا "بھائی جان، ابھی تو ہمیں شرفو بھائی کے بارے میں آپ سے بہت سی باتیں پوچھنی ہیں.... وہ کونسی کمپنی میں کام کرتے ہیں؟ ہمیں وہ لاہور آنے اور خود سے ملنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ آخر ایسی بھی کیا نوکری کہ انسان اپنی بہن کی شادی پر بھی صرف ڈیڑھ سو میل دور سے بھی نہ آسکے؟ کبھی کبھی تو ہم ان کے بارے میں عجیب شکوک و شبہات کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ "

" بھائیوں کے بارے میں دل میں شک نہیں رکھا کرتے۔ "

میں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میری مسکراہٹ روح سے خالی تھی۔ پھر میں نے اس کا کندھا تھپک کر کہا " بھائی اگر چھوٹے بھائی بہنوں سے کچھ چھپا بھی رہے ہوں تو اس میں بھی شاید چھوٹوں ہی کا فائدہ ہو اور پھر تم یہ توقع کیوں کررہے ہو کہ جو باتیں تمہارا حقیقی بڑا بھائی تم سے چھپاتا ہو وہ میں تمہیں بتادوں گا؟ میں تمہیں صرف اتنا بتا سکتا ہوں کہ شاید عنقریب کمپنی شرفو کو کہیں بیرونِ ملک بھیج دے اور وہ ایک طویل عرصے تک تم لوگوں سے ملنے نہ آسکے۔ "

" وہ ملک میں رہ کر کون سا ہم سے ملنے ہر مہینے آجاتے ہیں " منجھلا بھائی غلام محمد منہ بنا کر بولا " کبھی کبھار عید بقرعید پر ہی ملاقات ہوتی ہے۔ "

" بہرحال.... تمہیں شاید یہ احساس نہ ہو کہ تم لوگ شرفو کے دل سے کتنے قریب ہو " میں نے انہیں روایتی تسلی دی۔

شرفو درحقیقت انہی لوگوں پر تو سب کچھ نثار کرگیا تھا۔

کبھی وہ بھی میری ہی طرح سیدھا سادا دیہاتی رہا ہوگا۔ اپنے والدین اور کمسن بہن بھائیوں کے لئے کمانے کی غرض سے شہر گیا ہوگا۔ میں اس سے کبھی تفصیل سے نہیں سن سکا تھا کہ وہ کب اور کس طرح ان راہوں پر چل نکلا تھا جن کی کوئی منزل نہیں تھی۔ کارگاہِ حیات کی اس سودے بازی میں اس کے ہاتھ میں کیا آیا تھا؟ جو کچھ کمایا تھا اس میں سے بیشتر کھاپی لیا، کچھ عیاشیوں میں اڑا دیا۔ جو تھوڑی بہت پونجی بچائی وہ مالک کے پاس واپس چلی گئی۔ گویا کنویں کی مٹی کنویں ہی میں لگ گئی اور شرفو جان سے بھی چلا گیا۔ یہ تو بہت گھاٹے کا سودا تھا۔ اس کا کنبہ جس کی بہتری کی خاطر وہ آنکھیں بند کرکے چل پڑا تھا۔ وہ تو وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ بلکہ اگر آج میں ہمت نہ کرتا تو اس کی بہن کی شادی بھی رنجشوں کا شکار ہوجاتی۔

ہاں اتنا ضرور تھا کہ شرفو کی گزشتہ برسوں کی تگ و دو کی بدولت اس کا گھرانہ فاقہ کشی سے بچ گیا تھا۔ ایک بار شرفو نے سرسری سے انداز میں مجھے بتایا تھا کہ جس وقت وہ کمانے کی غرض سے گاؤں سے نکلا تھا اس وقت اس کے گھر میں فاقے ڈیرا ڈال چکے تھے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اتنا ضرور ہوا تھا کہ ان کی گزر بسر آرام سے ہونے لگی تھی۔ شرفو کا سب سے چھوٹا بھائی اب کالج میں پہنچ چکا تھا اور منجھلے بھائی نے کچھ عرصہ قبل چند ایکڑ زمین خریدلی تھی جسے وہ اکیلا ہی فی الحال صحیح طرح سے آباد کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا تھا۔ اب جبکہ شرفو اس دنیا میں نہیں رہا تھا اور عین ممکن تھا کہ مستقبل میں میں بھی ان لوگوں سے کوئی رابطہ نہ رکھ پاتا اور ان کے کسی کام نہ آسکتا لیکن بہرحال اب یہ اندیشہ نہیں تھا کہ انہیں فاقوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ میرے لئے یہ احساس بڑی طمانیت کا باعث تھا

اور میں اپنے آپ کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔

کسی نہ کسی طرح ان سے اجازت لے کر میں بہرحال واپس لاہور روانہ ہوگیا۔ رات کے پچھلے پہر میں گھر پہنچا۔ نوکر کو میں نے سوتے سے اٹھایا۔ پہلے اس سے معذرت کی پھر اسے زبردست قسم کا ناشتا تیار کرنے کی ہدایت کی۔ مجھے سخت بھوک لگی ہوئی تھی اور ناشتا کرکے میرا پروگرام دن بھر سونے کا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میں جب سو کر اٹھوں تو میرا ذہن ہر بوجھ سے آزاد ہو۔ شرفو کی موت اور پھر اس کے گھر جانے کی بھاگ دوڑ سے میرا ذہن کچھ بوجھل سا ہوگیا تھا اور یہ بوجھل پن تھکن کے باعث نہیں تھا۔ میرے محسوسات میں بہت شکست و ریخت ہوئی تھی اور میں نیند کا سہارا لے کر سب کچھ ذہن سے جھٹک دینا چاہتا تھا۔ میں بہت عجیب انداز کا حساس آدمی تھا۔ جب چاہتا تھا تھوڑی سی کوشش سے اپنے صدمات کو لاشعور کے اندھیرے میں دھکیل دیتا تھا، ان کے بارے میں سوچ سوچ کر گھلتا نہیں رہتا تھا۔ اپنے آپ کو ناکارہ نہیں کرلیتا تھا۔ جذباتیت بھی مجھ پر سوار ہوتی تھی تو بہت بری طرح ہوتی تھی لیکن اگر میں چاہتا تھا تو فوراً ہی اپنے آپ پر تھوڑا سا جبر کرکے بلا کا سفاک اور سرد مہر بھی بن جاتا تھا۔

میری دن بھر سونے کی حسرت پوری نہیں ہوسکی۔ تین بجے کے قریب فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے بستر میں لیٹے لیٹے ہی ہاتھ بڑھا کر ریسیور اٹھالیا۔ دوسری طرف قاسم خان تھا۔

" آج پانچ بجے اگر دو نمبر پر آجاؤ تو گپ شپ رہے گی " وہ دھیمے لہجے میں بولا " کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس ذرا سرسری سی ایک بات کرنی ہے۔ "

احکامات دینے میں قاسم خان کا عموماً یہی انداز ہوتا تھا۔ صرف ہنگامی حالات میں اس کے لہجے سے تناؤ یا قدرے تحکم کا اظہار ہوتا تھا ورنہ یہی محسوس ہوتا تھا جیسے ایک دوست دوسرے دوست کو کہیں مدعو کررہا ہو۔ دو نمبر سے مراد ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی ہوتی تھی۔

اپنے طرزِ عمل سے قاسم خان ہمیشہ ایک مشفق و مہربان آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ وہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ جس طرح دنیا کا بیشتر کاروبار چل رہا تھا اسی طرح یہاں بھی معاملہ طلب و رسد کا تھا۔ شفقت اور مہربانیاں صرف اسی کے لئے تھیں جو کام کا آدمی تھا اور صرف اس وقت تک کے لئے تھیں جب تک وہ کارآمد رہتا تھا۔ ادھر اس کی افادیت ختم ہوئی ادھر شفقت و مہربانی کا سلسلہ یوں منقطع ہوگیا جیسے بل ادا نہ کرنے پر بجلی کے محکمے والے کنکشن [illegible] گئے ہوں۔ محبت و مہربانی کا کنکشن یہاں صرف غرض [illegible]م تھا۔ پہلے اشرف خان اور پھر شرفو کی موت [illegible] خان کا طرزِ عمل دیکھ کر مجھے دو جھٹکے لگ چکے تھے [illegible] میرے دل میں ایک گرہ سی بیٹھ گئی تھی۔ پہلے میں خود بخود ہی اپنے آپ کو قاسم خان کے جاں نثاروں میں شمار کرنے لگا تھا اور اکثر سوچا کرتا تھا کہ جب بھی موقع آیا میں قاسم خان کے لئے جان قربان کرنے سے گریز نہیں کروں گا لیکن اب میں نے اس ارادے کی پوٹلی باندھ کر لاشعور کی اندھیری کوٹھری میں پھینک دی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو بروقت سمجھا لیا تھا کہ اس دنیا میں سب سے قیمتی چیز اپنی جان ہوتی ہے۔ خصوصاً میری جان اتنی فالتو ہرگز نہیں تھی کہ میں قاسم خان جیسے باس کے لئے گنوا دیتا۔ مجھ جیسے نہ جانے کتنے احمق اس کے لئے جانیں گنوا چکے تھے اور اسے شاید ان کے نام بھی یاد نہ رہے ہوں اور نہ ہی اس نے شاید کبھی یہ جاننے کی کوشش کی ہو کہ مرنے والے کے اگر کچھ لواحقین تھے تو ان پر کیا گزری؟

" میں پہنچ جاؤں گا " میں نے مختصراً کہا اور چادر میں منہ چھپا کر لیٹ گیا۔ پانچ بجنے میں ابھی خاصی دیر تھی۔

چار بجے میں بستر سے نکلا اور تھوڑی سی ورزش کے بعد تیار ہوکر ٹھیک پانچ بجے ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پہنچ گیا۔ اس کے تقریباً دو تین منٹ بعد ہی قاسم خان بھی آن پہنچا۔ میں اس وقت ڈائننگ روم میں بیٹھا تھا اور مس ٹریپ میرے لئے کافی لاچکی تھی۔ عموماً ہماری بیشتر ضروری اور غیر ضروری گفتگو ڈائننگ ٹیبل پر ہی ہوتی تھی۔

" کیا حال ہے میرے شیر؟ " قاسم خان نے دوستانہ انداز میں میرے کندھے پر ہاتھ مار کے پوچھا " تمہاری افسردگی کچھ دور ہوئی یا نہیں؟ "

" ہوگئی " میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ میں اس کے استقبال کے لئے اٹھ چکا تھا۔ اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میرے مقابل بیٹھ گیا۔ اعظم خان دروازے ہی پر رہ گیا تھا۔

قاسم خان کے حکم پر مس ٹریپ اس کے لئے جوس کا گلاس لائی اور قاسم خان پہلی چسکی لیتے ہوئے سرسری سے انداز میں بولا " تم شرفو کے گھر گئے تھے؟ "

" ہاں " میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بلا تامل جواب دیا " اس کی بہن کی شادی تھی اور میں صرف یہ دیکھنے گیا تھا کہ انہیں کسی قسم کی مدد کی ضرورت تو نہیں ہے۔ "

" پھر کیا پتا چلا؟ " قاسم خان نے پوچھا۔

" انہیں مدد کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن شرفو کے نہ پہنچنے سے بہت پریشان تھے " میں نے جواب دیا " تاہم میں نے انہیں مطمئن کردیا۔ میں نے کچھ نہ کچھ بات تو بنا ہی دی ہے۔ "

" تم نے انہیں شرفو کی اصلیت یا ہم سے اس کے تعلق کا کوئی سراغ تو نہیں دیا؟ " قاسم خان نے بدستور سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

" کیا آپ مجھے اتنا ہی بیوقوف سمجھتے ہیں؟ " میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"نہیں۔ نہیں" وہ جلدی سے بولا۔ "میں محض تسلی کے لئے پوچھ رہا ہوں۔ ویسے تمہیں وہاں جانے کی کوئی خاص ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے تمہیں اپنی لائن کا ایک خاص نکتہ بتادیا تھا کہ لاشوں سے ہماری کوئی رشتے داری نہیں رہ جاتی۔ کسی کے مرنے پر اس کے لئے جذباتی مت ہوا کرو۔ جذباتیت اگر کسی کام آسکتی ہے تو صرف زندگی میں ہی کام آسکتی ہے۔ کسی کے مرنے کے بعد ہماری جذباتیت کا نہ تو مرنے والے کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہمیں۔ شاید تمہیں میری باتیں بری لگ رہی ہوں۔ میں چاہوں تو تمہاری نظر میں ایک اچھا، مخلص اور ایثار پسند باس بننے کے لئے جذباتیت کا لبادہ اوڑھ سکتا ہوں لیکن میں صرف تم سے اس قسم کی کوئی بات نہیں کرتا کیونکہ میں حقیقت میں صرف تم سے ہی مخلص ہوں۔ اس لئے میں تمہیں اپنی لائن کا ایک بالکل صحیح اور کامیاب آدمی بنانا چاہتا ہوں۔"

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا اور میرا دل اس سے اور بھی دور ہوتا گیا۔ وہ اپنے آپ کو میرا مخلص دوست اور رہنما ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا اور مجھے اس کی باتوں میں سب سے زیادہ کمی خلوص ہی کی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر وہ صرف یہ کہتا کہ خود غرض زمانے کے مروجہ پیمانے یہی تھے اور ان کے بغیر زمانے کی دوڑ میں آگے نکلنا ذرا مشکل تھا تب تو میں اس کی بات سے اتفاق کرلیتا مگر وہ خواہ مخواہ ہی خلوص و محبت جیسے معاملوں میں ٹانگ اڑا رہا تھا۔ اس بکواس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

قاسم خان مجھے اور بہت سی باتیں سمجھاتا رہا اور میں سعادت مندی سے سرہلاتا رہا۔ اس کے بعد "بزنس" کی باتیں شروع ہوئیں۔ قاسم خان کا خیال تھا کہ پر پرزے نکالنے کے لئے مناسب وقت آچکا تھا۔ اس کے کچھ نئے رابطے استوار ہوئے تھے اور اس کا کہنا تھا کہ اب ہمیں بہت زیادہ سرگرمی سے کام شروع کردینا چاہئے.... میں خود سرگرمی سے کام شروع کرنے کے لئے بے چین تھا کیونکہ ادھر تو میں کراچی میں راحیلہ سے وعدہ کرکے آیا تھا کہ لاہور جاتے ہی دولت مند بننے کی جدوجہد تیز کردوں گا اور ادھر آتے ہی میں نے پہلا کام یہ کیا تھا کہ جمع پونجی بھی خرچ کردی تھی۔ اس وقت میرے پاس زیادہ سے زیادہ مہینے بھر کے اخراجات کا بندوبست تھا۔ مال کی کچھ نقل و حرکت شروع ہوتی تو میرا بھی کمیشن بنتا۔ قاسم خان بتا رہا تھا کہ وہ دو دن بعد لندن روانہ ہو رہا ہے اور کراچی سے فلائٹ پکڑنے سے پہلے یا پھر واپسی پر سیٹھ واحد سے بھی ملتا ہوا آئے گا۔ وہ مجھے تفصیل بتانے لگا کہ اس کی عدم موجودگی میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔

ہماری نشست تقریباً ڈیڑھ گھنٹے جاری رہی۔ اس دوران کچھ پیپر ورک بھی ہوا۔ بعض ہدایات جنہیں لفظ بہ لفظ یاد رکھنا ضروری ہوتا تھا اور اندیشہ ہوتا تھا کہ کوئی چیز ذہن سے محو نہ ہوجائے، انہیں ہم کوڈ ورڈز میں چھوٹی موٹی پرچیوں پر لکھ کر پرس وغیرہ میں اڑس لیتے تھے۔ کوئی اور شخص ان سے کوئی مطلب اخذ نہیں کرسکتا تھا۔

قاسم خان جاچکا تو میں کوٹھی میں اِدھر اُدھر پھرنے لگا۔ شرفو کا کمرا خالی دیکھ کر ایک بار پھر مجھ پر یاسیت کا حملہ ہوا۔ شرفو جیسے اس گھر کا ایک لازمی جزو بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے بغیر یوں لگ رہا تھا جیسے کوٹھی کا کوئی ستون گر گیا ہے۔ میرے سوا کسی فرد پر شرفو کی عدم موجودگی کا کوئی اثر نظر نہیں آرہا تھا۔

بالآخر میں وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ آج مس ٹرپ سے چھیڑ چھاڑ کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ فوکس ویگن میں نے وہیں چھوڑ دی تھی۔ ٹیکسی میں میں گلبرگ آیا اور گھر سے گاڑی لے کر مین مارکیٹ آگیا۔ گاڑی ایک جگہ چھوڑ کے بے مقصد انداز میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ مارکیٹ میں بڑی چہل پہل تھی۔ ماحول کو جگمگانے کے لئے حسین چہرے عموماً اسی وقت نکلتے تھے۔ ہوا خوری بھی ہوجاتی تھی اور تھوڑی بہت شاپنگ بھی۔ کسی کسی گاڑی سے تو حسن کا کچھ زیادہ ہی ذخیرہ اُمڈ پڑتا اور خوابناک خوشبوؤں کے جھونکے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ جاتا۔ کچھ دیر تک میں مارکیٹ کے دائرے میں گھومتا رہا۔ پھر ایک دُکان سے کچھ رسالے خریدے اور ایک قریبی اسنیک بار میں جابیٹھا۔

باہر بھی رات کی تاریکی قدم جمانے لگی تھی اور اسنیک بار میں بھی ملگجی روشنی سے ماحول کو پُرسکون بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ دھیمی دھیمی انگریزی موسیقی، ارد گرد کی میزوں پر ہیولوں کی طرح نظر آنے والے مرد اور عورتیں، ایئرکنڈیشنر کی سرسراہٹ، فضا میں بہت سی خوشبوؤں کا امتزاج اور سگریٹوں کے دُھوئیں کی ہلکی سی تلخی۔ یہ سب کچھ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ میرے اعصاب کو کچھ سکون ملا۔ میں ایک کونے میں تنہا بیٹھا کولڈ کافی کی چسکیاں لیتا رہا۔ رفتہ رفتہ میری آنکھیں ملگجے اندھیرے سے مانوس ہوچکی تھیں اور مجھے مختلف میزوں پر بیٹھے ہوئے لوگوں کی صورتیں صاف دکھائی دینے لگی تھیں۔ ساتھ ہی چشمِ تصور بھی کام کرنے لگی تھی۔ میں اپنے مقابل راحیلہ کو بیٹھے دیکھ رہا تھا۔ وہ جیسے دونوں ہاتھوں کے حلقے میں چہرہ ٹکائے شوخ و شریر نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی اور سرگوشی نما لہجے میں کہہ رہی تھی "تم نے تو بڑی افلاطونی محبت کے دعوے کئے تھے اور عالم یہ ہے کہ اتنے دنوں میں تم نے خط تک نہیں لکھا۔"

"جاناں! تمہیں چونکہ میری اصلیت کا علم نہیں اس لئے تمہیں کیا معلوم کہ یہاں زندگی کس ڈھب سے گزرتی ہے" میں نے لب ہلائے بغیر جواب دیا "کبھی کبھی تو پندرہ پندرہ دن جماہیاں لیتے اور وقت گزاری کی ترکیبیں سوچتے

ہوئے گزر جاتے ہیں اور کبھی کئی کئی دن تک گویا سولی پر لٹکے رہتے ہیں۔ رات دن کچھ عجیب ہی طرح کی مصروفیت ہوتی ہے۔ بظاہر کچھ زیادہ مصروف بھی نظر نہیں آتے مگر فرصت بھی میسر نہیں ہوتی اور پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ...."

اچانک میں اس پُرسکون ماحول میں کچھ شور شرابا سا سن کر چونک اٹھا۔ میں نے دیکھا، کاؤنٹر کے قریب ایک تگڑا سا ویٹر ایک بڑے میاں کو گریبان سے پکڑے کھڑا تھا۔ بڑے میاں تاڑ کے درخت کی طرح لمبے لیکن بالکل منحنی تھے اور ان کے جسم پر ویسا ہی ایک سوٹ تھا جیسا آپ نے چارلی چپلن کے دور کی فلموں میں اکثر مزاحیہ اداکاروں کو پہنے دیکھا ہوگا۔ شیروانی کی طرح پیچھے سے لمبا کوٹ، تنگ پتلون اور جھالر دار قمیص پر بڑی سی بو۔

کاؤنٹر پر کھڑا ہوا نوجوان اسنیک بار کے مالکان میں سے ہی ایک تھا۔ وہ اشارے سے ویٹر کو کوئی ہدایت دے رہا تھا۔ ویٹر بڑے میاں کو دروازے کی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بڑے میاں وہاں سے ہلنے پر آمادہ نہیں تھے۔ اپنی جگہ جمے رہنے کے لئے انہوں نے سیڑھیوں کا چوبی جنگلا پکڑ لیا تھا اور اپنی دانست میں حتی الامکان غضبناک نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مگر اس کوشش میں صورت اور بھی مضحکہ خیز ہوگئی تھی۔ ڈاکٹر فومانچو کی طرح لٹکی ہوئی مونچھیں بری طرح پھڑپھڑا رہی تھیں اور وہ منمناتی ہوئی آواز میں کہہ رہے تھے۔ "بدبختو! چند روپوں کے لئے مرے جارہے ہو۔ ایشیا کے عظیم ترین ناول نگار کی بے عزتی کر رہے ہو۔ ناہنجارو! تم نے ہمارے عروج کا زمانہ نہیں دیکھا۔ ایسے ٹٹ پونجیا اسنیک بار میں تو ہم اپنے کتے کو بھی کچھ کھلانا پسند نہیں کرتے تھے...."

"حضورِ والا! اسی لئے تو ہم کئی بار ہاتھ باندھ کر آپ کی خدمت میں عرض کرچکے ہیں کہ اس گھٹیا اسنیک بار میں تشریف نہ لایا کریں۔ یہ آپ کے شایانِ شان نہیں ہے" کاؤنٹر پر کھڑا ہوا نوجوان دھیمے لیکن زہریلے لہجے میں بولا "ہم آپ کی بے عزتی نہیں کر رہے۔ صرف اس لئے باہر کا راستہ دکھا رہے ہیں تاکہ آپ اپنے بیٹھنے کے لئے کوئی شایانِ شان جگہ تلاش کرسکیں" نوجوان اپنی آواز حتی الامکان نیچی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ اس ہنگامے کی طرف متوجہ ہوں اور اسنیک بار کا پُرسکون ماحول متاثر ہو۔ تاہم میرے علاوہ بھی وہ چند لوگ جو کاؤنٹر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے اس طرف متوجہ ہوچکے تھے لیکن بس اس حد تک کہ اپنی اپنی جگہ بیٹھے متجسس سی نظروں سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

بڑے میاں گویا تلملا کر بولے "میاں! ہمیں لفظوں کی مار دینے کی کوشش نہ کرو۔ ہم نے ناول نگاری چھوڑ دی تو کیا ہوا، لفظوں کے بادشاہ ہم اب بھی ہیں۔ اگر ہم طنز و مزاح پر اتر آئے تو تمہارے آبا و اجداد کی روحیں بھی بلبلا اٹھیں گی۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ہمیں ویٹروں سے دھکے اس لئے دلوا رہے ہو کہ تمہیں معلوم ہے کہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ہماری جیب میں کوئی پیسہ نہیں ہے اور تم جیسے نو دولتیے ہمیں ایک برگر بھی کھلانے کے متحمل نہیں ہوسکتے، حالانکہ خدا نے تم جیسے نااہلوں کو جس طرح دولت سے نوازا ہے اس کے جواب میں کم از کم اظہارِ تشکر کے طور پر ہی تمہیں چاہئے کہ ہم جیسے اہلِ دانش کی خدمت کرتے رہا کرو جن پر فلک آج نامہربان ہوگیا ہے تو وہ تم جیسوں کے سامنے حقیر نظر آنے لگے ہیں ورنہ وہ بھی زمانہ تھا کہ تمہارا باپ نہر کے کنارے پکوڑے کی ریڑھی لگایا کرتا تھا اور تم کچی بستی کی گلیوں میں اپنے بڑے بھائی کے ساتھ میلی نیکر پہنے ننگے پاؤں پھرا کرتے تھے۔ گلبرگ اس وقت صحیح طرح سے آباد بھی نہیں ہوا تھا۔ یہاں اکا دُکا کوٹھیاں تھیں اور کئی کچی بستیاں جن میں تم جیسے کم ظرف لوگ پڑے تھے جو آج صاحبِ جائداد اور صاحبِ کاروبار ہوگئے ہیں۔"

میرا خیال تھا کہ اس ریمارک پر نوجوان کا چہرہ شرم سے سرخ ہوجائے گا اور وہ ویٹر کو فیصلہ کن انداز میں حکم دے گا کہ بڑے میاں کو بلا تامل باہر پھینک دیا جائے۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ نوجوان کے چہرے پر ترحم آمیز سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی تھی۔ اس کی تحمل مزاجی قابلِ داد تھی۔

وہ نپے تلے لہجے میں بولا "ان تغیرات پر شرم تو آپ کو بھی آنی چاہئے حضورِ والا! ہم تو بالکل تہی دست اور آپ کی نظر میں بالکل غریب و رذیل تھے مگر خدا کے کرم سے کسی نہ کسی قابل ہوگئے مگر آپ کو تو خدا نے ہر چیز سے نوازا تھا۔ آپ نے معلوم نہیں کہاں اور کس طرح سب غارت کردیا کہ آج آپ دس روپے کا برگر کھانے کے لئے دس گھنٹے بحث و مباحثہ تو کرسکتے ہیں مگر ادائیگی نہیں کرسکتے۔ میں آپ کو پچاسوں مرتبہ مفت کھانا کھلا چکا ہوں مگر اب یہ سلسلہ نہیں چلے گا۔ یہ ہمارا کاروبار ہے کوئی لنگر خانہ نہیں۔ سمجھے؟" پھر وہ قدرے دھیمے لہجے میں بولا "جس باپ کے پکوڑا فروش ہونے کا آپ ہمیں طعنہ دے رہے ہیں، ہمیں اس پکوڑا فروش باپ پر فخر ہے بڑے میاں! انہی پکوڑوں کی کمائی سے انہوں نے ہمیں پڑھنے کے لئے ولایت بھیجا تھا۔ وہ خود ان پڑھ تھے مگر انہوں نے ہمیں ایک لمحے کے لئے بھی تعلیم سے غافل نہیں ہونے دیا، کبھی نہیں چاہا کہ ہم بھی انہی کی طرح پکوڑوں کی ریڑھی لگا لیں۔ انہی کی کمائی سے ہم نے یہ پلاٹ خریدا تھا جس پر اسنیک بار تعمیر ہوا ہے۔ اس وقت اس پلاٹ کی گہرائی چھ فٹ تھی اور اس میں گندا پانی کھڑا تھا۔ لوگ ہم پر ہنستے تھے کہ ہم شاید اس جوہڑ میں مچھلیاں پالیں گے..."

یہ گفتگو بہت دھیمے لہجے میں ہو رہی تھی اور موسیقی کی

دھن نوجوان کی آواز پر غالب تھی مگر میں صرف اس لئے سن پا رہا تھا کہ میں کاؤنٹر کے عین سامنے ایک کونے میں بیٹھا تھا' راہ میں کوئی میز نہیں تھی اور میں ہمہ تن گوش تھا۔ باقی دو چار لوگ جو اس طرف متوجہ تھے وہ نسبتاً ذرا زیادہ فاصلے پر تھے اور ان کی دلچسپی صرف یہ دیکھنے کی حد تک تھی کہ کب بڑے میاں کو اٹھا کر باہر پھینکا جاتا ہے۔ اور وہ مرحلہ آہی چکا تھا۔

نوجوان نے چٹکی بجا کر ایک اور ویٹر کو قریب بلایا اور سخت لہجے میں بڑے میاں سے کہا "اس سے پہلے کہ آپ اہل زبان اور اہل ادب ہونے کے باوجود مزید بدزبانی اور بدتمیزی کا مظاہرہ کریں' بہتر ہے کہ خود ہی باہر چلے جائیں ورنہ میں آپ کو اٹھوا کر پھنکوانے لگا ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی کان کھول کر سن لیں کہ آئندہ اگر آپ کی جیب میں پیسے ہوں تب بھی یہاں تشریف لانے کی زحمت نہ کریں۔"

بڑے میاں بھی ایک ہی ڈھیٹ اور نڈر تھے۔ نتائج کی پروا کئے بغیر مزید برا بھلا کہنے لگے۔ تگڑے ویٹر نے انہیں اٹھانے کے لئے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور دوسرا ویٹر ان کی ٹانگیں پکڑنے کے لئے آگے بڑھا مگر اس وقت تک میں اٹھ کر کاؤنٹر کے قریب پہنچ چکا تھا۔

"چھوڑ دو انہیں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا تاکہ آواز دوسرے گاہکوں تک نہ پہنچے "یہ جہاں بیٹھنا چاہیں بیٹھنے دو اور جو کچھ بھی کھانا چاہیں انہیں کھانے دو۔ بل میں ادا کروں گا۔

کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے ناگواری سے میری طرف دیکھا اور بولا "میں کہہ چکا ہوں کہ اب یہ ادائیگی کرنے کے باوجود میرے اسنیک بار میں کچھ نہیں کھا پی سکتے۔ میں یہاں ان کی صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"برادر عزیز!" میں نے آگے بڑھ کے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "کچھ دیر پہلے تم اپنی گفتگو سے مجھے بے حد سلجھے ہوئے اور سمجھدار انسان معلوم ہوئے تھے لیکن اب ایک دم بچگانہ ضد پر اتر آئے۔ ایک اچھا بزنس مین کبھی اپنی بزنس کی جگہ پر جھگڑا نہیں کرتا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ کا دباؤ بڑھا دیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکرانے لگا۔ نوجوان تھا سمجھدار۔ میری آنکھوں میں یقیناً اس نے میرے عزائم پڑھ لئے تھے اور مفاہمت کی راہ اختیار کرنے میں ہی بہتری سمجھی تھی۔ ایک طویل سانس لے کر اس نے سر کے اشارے سے ویٹر کو سمجھا دیا کہ میری بات مان لی جائے۔

ویٹر نے بڑے میاں کو چھوڑ دیا اور وہ فاتحانہ انداز میں میری ہی میز پر جا بیٹھے۔ میں نے ان کے مقابل بیٹھتے ہوئے پوچھا "کیا کھانا پسند فرمائیں گے آپ؟"

بڑے میاں نے اپنی پکوڑا سی ناک سے کوئی نادیدہ مکھی اڑائی۔ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور منمناتی ہوئی سی آواز میں بولے "ادھار کی بنیاد پر تو میں یہاں صرف ایک برگر کھانے آیا تھا لیکن اب تم مہربان ہو ہی گئے ہو تو میرا خیال ہے مجھے تمہاری مہربانی سے پورا پورا استفادہ کرنا چاہئے۔"

یہ کہہ کر بڑے میاں نے مینو اٹھایا اور چٹکی بجا کر بڑے شاہانہ انداز میں ویٹر کو قریب بلایا۔ ویٹر گویا بادل ناخواستہ آیا تھا اور کھا جانے والی نظروں سے بڑے میاں کو گھور رہا تھا۔ بڑے میاں کی طمانیت دیکھ کر اندازہ کرنا قطعی ناممکن تھا کہ چند لمحے پہلے ان کی بے عزتی ہو رہی تھی۔

"ویٹر!" انہوں نے بڑی تمکنت سے کہا "ایک فنگر فش کی پلیٹ' ایک کلب سینڈوچ اور ایک پلیٹ فرائڈ رائس .... اور ہاں ... ان سب چیزوں سے پہلے چکن کریم سوپ لانا مت بھولنا ... اور کھانے کے آخر میں میں بلیک کافی پینا پسند کروں گا ... اور ہاں ... ذرا باہر والے لڑکے سے کہنا' برابر کی دکان سے گولڈ لیف کا ایک پیکٹ بھی پکڑ لے۔"

ویٹر انہیں گھورتا ہوا خاموشی سے چلا گیا۔ کسی کی نوازشات سے استفادہ کرنے کا فن واقعی بڑے میاں کو آتا تھا۔ میں نے ان کے منحنی سے وجود کا جائزہ لیتے ہوئے قدرے حیرت سے کہا "آپ نے جن چیزوں کا آرڈر دیا ہے کیا آپ واقعی وہ سب کھا لیں گے؟"

"زندگی میں دو ہی تو شوق ہیں ہمیں۔ ایک اچھا کھانے کا اور دوسرا اچھا پہننے کا" بڑے میاں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر اطمینان سے جواب دیا

"ماشاء اللہ" میں نے ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا "میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

"آتش دہلوی" بڑے میاں نے اپنی فو مانچو کٹ مونچھ کا سرا مروڑتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے واقعی حیرت کا شدید جھٹکا لگا مگر میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ میں اس وقت چھوٹا تھا جب آتش دہلوی کے سماجی ناولوں نے دھوم مچائی ہوئی تھی۔ مجھے اپنی تمام تر کم عمری کے باوجود کتابیں' رسائل اور ہر طرح کے ناول وغیرہ پڑھنے کا زبردست چسکا تھا۔ خریدنے کا تو میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لئے آنہ لائبریریوں سے کرائے پر لے کر پڑھا کرتا تھا۔

مجھے اس وقت بھی معلوم تھا کہ آتش دہلوی نے لکھے تو چند ہی ناول ہیں مگر ان میں سے ہر ایک کے کئی کئی ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ ان کے ایک ناول کو بہت بڑا ادبی انعام بھی ملا تھا۔ میں نے ان کے سبھی ناول پڑھے تھے اور اس زمانے میں ان کا زبردست مداح تھا۔ میں اکثر ان سے ملنے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ملاقات ہوگی تو اس طرح ہوگی!

وہ اچانک ہی ناول نگاری کے افق سے غائب ہو گئے تھے

اور پھر کچھ ناول کی صنف پر بھی زوال آگیا تھا۔ بہت سی ناگزیر وجوہات کی بنا پر ناولوں کی اشاعت دن بہ دن کم ہوتی جارہی تھی۔ رفتہ رفتہ لوگ بہت سے مشاہیر کی طرح آتش دہلوی کو بھی بھول گئے تھے۔ میں بھی بھول گیا تھا۔ آج ملاقات ہوئی تھی تو جیسے ذہن میں ان گنت یادوں کے دریچے کھل گئے تھے۔

اس خوف سے کہ یادوں میں کچھ زیادہ ہی نہ الجھ جاؤں' میں نے بڑے میاں سے باتیں شروع کردیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ کس طرح میں انہیں غائبانہ جانتا ہوں۔ بڑی بے پروائی سے وہ بولے "ہاں.... بہت لوگ ہمیں جانتے تھے۔ شاید اب بھی جانتے ہوں۔ یہ کم بخت نو دولتیے... اس اسنیک بار کے مالکان۔ یہ تو ہمیں ذاتی طور پر جانتے تھے مگر جب سے ہماری خوشی رخصت ہوئی ہے اور ان کے پاس دولت آئی ہے تب سے انہوں نے ہمیں پہچاننا چھوڑ دیا ہے۔"

"لیکن جناب! ناول لکھ کر آپ نے جو دولت کمائی..."

"کیا کہا؟" انہوں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا "ناول لکھ لکھ کر دولت کس کمبخت نے کمائی تھی؟ ہمارے معاشرے میں کبھی محض لکھ کر بھی کسی نے دولت کمائی ہے؟ ناول لکھ لکھ کر کوئی امیر ہوا ہے؟ کیسی بیوقوفی کی بات کی ہے تم نے۔ ارے برخوردار! میں تو ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر تھا اور بہت ہی اہم محکمے میں' بہت ہی اہم سیٹ پر تھا۔" بڑے میاں بڑی بے تکلفی سے مجھے آنکھ مار کر مسکرائے "کسی چیز کی کمی نہیں تھی۔ ناول تو میں شوقیہ لکھا کرتا تھا۔ اس زمانے میں پیشہ ور لکھنے والوں کو بھی ناول کے سو' ڈیڑھ سو روپے ملتے تھے اور مجھے سو' ڈیڑھ سو روپے لیتے ہوئے شرم آتی تھی اس لئے میں نے کبھی نہیں لئے۔"

"چلئے کسی بھی ذریعے سے سہی لیکن آپ آسودہ حال تو تھے نا؟ پھر کہاں چلا گیا وہ سب کچھ؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں" انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ اس دوران ویٹر نے سوپ ان کے سامنے لاکر رکھ دیا تھا۔ سوپ سے بھاپ اٹھ رہی تھی مگر بڑے میاں اس میں نمک وغیرہ ملا کر بے صبری اور ندیدے پن سے چمچہ بھر بھر کر حلق سے اتارنے لگے۔ ان کے جواب پر میں حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"یعنی آپ کو علم نہیں کہ آپ کس طرح مفلس ہو گئے؟" میں ایک بار پھر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"نہیں" انہوں نے منہ چلاتے ہوئے جواب دیا "مجھے صرف یہ علم ہے کہ اس دنیا میں ایک لڑکی ہوتی تھی۔ مہ پارہ اس کا نام ہوتا تھا مگر میں اسے پارو کہتا تھا۔ مجھے صرف اس بات کا ہوش ہے کہ میں اس کی محبت میں دیوانہ تھا۔ دنیا کی ہر رکاوٹ کو پھلانگتے ہوئے میں نے اس سے شادی کرلی تھی۔ میری عمر اس سے خاصی زیادہ تھی لیکن بہرحال کسی نہ کسی طرح شادی ہو ہی گئی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ شادی کے کئی برس بعد بھی اس سے میری محبت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ شادی کے گیارہ برس بعد وہ مجھے چھوڑ کر کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ چھ سال کا ہمارا ایک بچہ تھا' اسے بھی ساتھ لے گئی۔ تب مجھے پتا چلا کہ میری محبت تو یک طرفہ ہی چلی آرہی تھی۔ اسے تو مجھ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی رہی تھی۔ اس کے بعد کی باتیں مجھے کچھ صحیح طور پر یاد نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرا دماغ الٹ گیا تھا۔ لیکن میرا خیال ہے میرا دماغ نہیں الٹا تھا باقی ہر چیز الٹ گئی تھی۔ شاید دنیا یا پھر صرف میری دنیا الٹ پلٹ ہوگئی تھی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے خود اپنے آپ کو اپنے ہی ہاتھوں سے برباد کیا ہے اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ میری اس کیفیت سے میرے ہر شناسا' دوست اور عزیز نے حسب مقدور فائدہ اٹھایا اور مجھے لوٹا۔ مگر مجھے صحیح طور پر کچھ نہیں معلوم۔ اور اگر معلوم ہوتا تب بھی کیا فرق پڑتا تھا" اس نے بے پروائی سے سر جھٹکا "میرا دنیا کی ہر چیز سے اعتبار اٹھ گیا ہے اور جب دنیا سے آدمی کا اعتبار اٹھ جائے تو اسے کسی بھی چیز سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

میں دم بخود بیٹھا بڑے میاں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ تیزی سے باتیں کرنے کے بعد اس سے کہیں زیادہ تیزی سے پیالے میں بچے ہوئے سوپ کو صاف کرنے میں جت گئے تھے۔

"پھر بھی آتش صاحب..." میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ "آخر آپ اہلِ قلم ہیں.... اس طرح خالی جیب آپ یہاں آن گھستے ہیں... اپنی بے عزتی کراتے ہیں۔ آخر آپ کی انا آپ کو کس طرح اس بات کی اجازت دیتی ہے؟"

"عزیزِ من!" انہوں نے استہزائیہ سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "بے چاری میری انا کو اتنے جھٹکے لگے ہیں کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے اور میں نے اسے نہایت اطمینان سے بے غیرتی کی قبر میں لٹا دیا ہے۔ پہلے محبت کا جھٹکا ہوا .... اس کے ساتھ ہی اعتبار کا بھی جھٹکا ہوگیا اور آخر میں انا بھی حرام موت ماری گئی ــــ اب تو صرف یہ باقی رہ گیا ہے۔" انہوں نے کرسی سے قدرے اوپر کو ہو کر پیٹ پر ہاتھ پھیر کر دکھایا "اور یہ تین وقت کھانے کو مانگتا ہے۔"

"ویسے اگر آپ اس قسم کی جگہوں کے بجائے نسبتاً ذرا سستے کھانوں کے کسی اڈے پر چلے جایا کریں...." میں نے اب بھی ہچکچاتے ہوئے کہا۔ مجھے اپنا مافی الضمیر سمجھانے میں ذرا دقت ہو رہی تھی "مثلاً کوئی تندور وغیرہ.... تو وہاں عام طور پر آپ جیسے زوال زدہ شرفا کو اگر مفت کھانا کھلانا پڑ جائے تو مالک کم از کم بے عزتی کرنے پر کمربستہ نہیں ہوتا۔"

"میری عادتیں بگڑی ہوئی ہیں۔ میں زیادہ گھٹیا جگہوں پر نہیں جاسکتا" انہوں نے ویٹر کی لائی ہوئی چکن فرائیڈ رائس کی

پلیٹ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا "میری نشست و ذات اس سے زیادہ اونچی جگہوں پر رہی ہے۔ یہ تو میں اپنا پیار گرا کر یہاں آیا ہوں۔ فی الحال تو کام چل رہا ہے۔ کبھی کبھار کوئی تم جیسا فراخدل شناسا یا غیر شناسا مہربان مل جاتا ہے۔ کبھی انہی بدبختوں کا دل سخاوت کی طرف مائل ہوجاتا ہے" انہوں نے کاؤنٹر کی طرف اشارہ کیا "البتہ جب بہت ہی زیادہ مجبوری آن پڑے گی تو تندوروں کا رخ بھی کرلوں گا۔"

بڑے میاں بلاشبہ بہت ہی عجیب چیز تھے۔ میں انہیں کھاتے دیکھتا رہا اور ان کے بارے میں سوچتا رہا۔ بڑے میاں خوب سیر ہو کر کھا چکے اور کافی وغیرہ پی چکے تو میں نے بل ادا کیا اور ہم اکٹھے ہی اٹھ کر باہر آگئے۔

"واہ...واہ..... لطف آگیا" بڑے میاں پیپر نیپکن سے منہ پونچھ کر ڈکار لیتے ہوئے بولے "ایک مدت کے بعد ڈٹ کر کھانا نصیب ہوا ہے۔"

میں گاڑی کے قریب پہنچ کر رک گیا۔ وہ بھی میرے سامنے ہی رک کر دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر مستعد سے لہجے میں لے "ہاں... اب بتاؤ برخوردار! کام کیا ہے؟"

"کام؟" میں نے حیرت سے کہا "میں نے تو آپ سے کسی کام کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔"

"وہ تو درست ہے" بڑے میاں نے بُردباری سے سر ہلایا۔ "لیکن اس دنیا میں کوئی بغیر مطلب کے کسی کے کام نہیں آتا' غرض کے بغیر کوئی کسی کی مدد نہیں کرتا۔ تم بھی اپنا مقصد صاف صاف بتادو۔ میں تمہاری ہر خدمت کے لئے تیار ہوں۔"

بڑے میاں کا دنیا پر سے اعتبار بالکل ہی اٹھ چکا تھا۔ انسانی اقدار ان کی نظر میں بے معنی ہو چکی تھیں۔ مجھے ان کے اندازِ فکر سے دھچکا سا لگا لیکن ان سے فلسفیانہ تبادلۂ خیال کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"مجھے جب بھی کسی نے پیٹ بھر کر کھانا کھلایا ہے' مجھ سے کوئی نہ کوئی کام ضرور لیا ہے" بڑے میاں بات جاری رکھتے ہوئے بولے "کبھی کسی نے کہا یہ پیکٹ فلاں وقت پر فلاں جگہ کھڑی ہوئی فلاں رنگ کی گاڑی میں ڈال آنا۔ کبھی کسی نے کہا کہ' فلاں وقت پر فلاں جگہ کھڑا ہوا ایک آدمی تمہیں فلاں چیز دے گا۔ وہ لاکر ہمیں دے دینا۔ کبھی کسی نے کہا فلاں وقت پر فلاں جگہ سے ایک عورت گزرتی ہے' نظر بچا کر اسے یہ رقعہ دے دینا اور چونکہ آپ بزرگ ہیں اس لئے وہ عورت یا کوئی اور آپ کو کچھ نہیں کہے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی خدمات انجام دینے کے سلسلے میں ایک مرتبہ میں ایک عورت کے ہاتھوں پٹتے پٹتے اور ایک مرتبہ پولیس کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بچا ہوں لیکن آج کل میری خدمات سے فائدہ اٹھانے والے نہ جانے کہاں جا چھپے ہیں۔ شاید کہیں بلوں میں گھس گئے ہیں۔"

بڑے میاں کی باتوں نے میرے ذہن میں سوچوں کے کئی دروازے کھول دیئے۔ مجھے امکان نظر آنے لگا کہ مستقبل میں' میں ان سے کوئی نہ کوئی کام لے سکتا ہوں۔ صرف مستقبل ہی نہیں حال کے لئے بھی ان کا ایک مصرف میرے ذہن میں آچکا تھا۔

"پہلے تو میرے ذہن میں ایسی کوئی بات نہیں تھی" میں نے گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا "لیکن اب آپ نے ذکر چھیڑا ہے تو ایک خیال آیا ہے۔ ایک لڑکی ہے.... دوسرے شہر میں رہتی ہے۔ مجھے اس سے بے پناہ محبت ہے' گو کہ ہمیں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا..." میں نے اٹک اٹک کر بے ربط سے انداز میں اسے بتانا شروع کیا "کئی دن سے میں اسے خط لکھنے کا سوچ رہا ہوں لیکن کچھ تو مصروفیات آڑے آتی رہیں اور کچھ ویسا مضمون بھی نہیں بنا جیسا میں سوچتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اسے بہت خوبصورت قسم کا خط لکھوں۔ متاثر کرنے والا۔ میرے ذہن میں تو بڑے خوبصورت خیالات کی ریل پیل رہتی ہے۔ موزوں الفاظ کا بھی گویا ایک سیلاب سا امنڈ آتا ہے اور بات چیت میں بھی خاصی برجستگی کا مظاہرہ کرلیتا ہوں لیکن جب میں لکھنے بیٹھتا ہوں تو معلوم نہیں ذہن کو کیا ہوجاتا ہے۔ ہر لفظ پر قلم اٹکنے لگتا ہے۔ ذہن میں خیالات کچھ اتنی زیادہ ہلچل مچادیتے ہیں کہ کوئی ترتیب ہی باقی نہیں رہتی۔ کچھ سمجھ

میں نہیں آتا کہ پہلے میں کیا لکھوں اور بعد میں کیا۔ اگر آپ تیسرے چوتھے دن مجھے اس کے نام ایک خط لکھ دیا کریں تو اس کام کے عوض میں آپ کو پانچ سو روپے مہینہ دے سکتا ہوں۔ کبھی تو یونہی بس میری طرف سے خط لکھ دیا کریں اور کبھی اگر اس کا خط آیا ہو تو اس کا خوبصورت سا جواب۔ کیا آپ میرا یہ کام کرسکتے ہیں ؟ "

"کیا تم واقعی پانچ سو روپے ماہوار دیا کرو گے ؟ جھوٹ تو نہیں بول رہے ؟ " بڑے میاں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ انہیں جیسے یقین نہیں آرہا تھا۔

"میں اتنے گھٹیا قسم کے جھوٹ نہیں بولا کرتا" میں نے تحمل سے کہا " اگر آپ چاہیں تو پہلے مہینے کے پانچ سو روپے آپ کو ابھی دے دوں ؟ "

"دے دو " انہوں نے بلا تامل اور بلا تکلف ہاتھ پھیلا کر کہا۔ سڑک پر کھڑے ہو کر رقم دینا مجھے کچھ معیوب سا محسوس ہوا۔

"گاڑی میں بیٹھ جائیے " میں نے ان کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ہم دونوں گاڑی میں بیٹھ چکے تو میں نے دروازہ بند کر کے جیب سے پرس نکالا اور سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر ان کے حوالے کردیے۔ انہوں نے نوٹوں کو الٹ پلٹ کر دیکھا پھر انہیں یوں جلدی سے اپنے چارلی چپلن مارکہ کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا جیسے اندیشہ ہو کہ کہیں میں ارادہ نہ بدل دوں اور رقم واپس نہ مانگ لوں۔

" تمہاری پیش کش نے دراصل مجھے اس لئے حواس باختہ کردیا ہے ..... " بڑے میاں گہری سانس لے کر بولے " کہ میں تو اپنے محلے کے دو ایک نوجوانوں کو پانچ پانچ روپے میں پانچ پانچ صفحے کے محبت نامے لکھ کر دیتا رہا ہوں۔ آج کل تو کم بخت اس قسم کے قدر دانوں نے بھی آنا چھوڑ دیا ہے۔ "

"اب آپ کو آپ کے فن کا صحیح قدر دان مل گیا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا " اس لئے آپ کے فن کی مارکیٹ ویلیو بڑھ گئی ہے۔ اب اس ویلیو کو برقرار رکھئے گا۔ اور ہاں.... اگر آپ کفایت شعاری سے کام لیں تو اس رقم میں کم از کم پندرہ بیس روز تک کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی خواری سے بچ سکتے ہیں۔ "

" تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ میں اس رقم کو کس طرح خرچ کرتا ہوں " بڑے میاں گویا برا مناکر بولے " یہ رقم اب میری ہو چکی ہے اور اسے خرچ کرنا میرا ذاتی معاملہ ہے۔ میں تمہاری ذاتیات میں ٹانگ اڑانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ تم بھی میری ذاتیات میں ٹانگ مت اڑاؤ۔ "

میں نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیئے اور یہ کہتے کہتے رہ گیا " آپ جہنم میں جائیں۔ میری بلا سے " اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ بڑے میاں تھے بڑی ٹیڑھی چیز۔

میری خاموشی سے ان کا خوشگوار موڈ گویا یکدم بحال ہوگیا۔ پھیل کر بیٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے " لکھنے لکھانے کے معاملے میں بیشتر لوگوں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں خیالات کا تو ایک سیلاب ہوتا ہے لیکن جب وہ اسے کاغذ پر منتقل کرنے بیٹھتے ہیں تو نہیں کرپاتے اور کچھ عجیب سی تحریر سامنے آتی ہے " پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے۔ "پہلا خط غالباً تم ابھی لکھوانا چاہو گے ؟ "

"ہاں " میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا " میں آپ کے ساتھ آپ کے گھر چلتا ہوں۔ ایک خط ابھی لکھ دیجئے۔ اس کے بعد جب بھی ضرورت ہوا کرے گی میں خود ہی آپ کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں گا۔ "

"ٹھیک ہے " وہ مطمئن انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "میں یہاں سے زیادہ دور نہیں رہتا۔ "

ان کی رہنمائی میں کئی گلیوں میں مڑنے کے بعد بالآخر میں نے گاڑی ایک کوٹھی کے سامنے جاروکی۔ کوٹھی خاصی طویل و عریض تھی مگر اس کی حالت تباہ تھی۔ دیواروں سے سیمنٹ اکھڑ کر گر رہا تھا۔ کھڑکیاں اور دروازے نہ جانے کتنے برسوں سے رنگ و روغن کو ترس رہے تھے۔ لان میں گھاس جھاڑ جھنکاڑ کی طرح پھیلی ہوئی تھی اور گیٹ کے پاس بھی پختہ روش پر خشک پتوں کا انبار تھا۔ کوٹھی پر عجیب یاسیت سی برس رہی تھی۔ جیسے اس میں انسان نہیں محض ایک آدھ بدروح رہتی ہے۔ گیٹ کھلا ہی تھا مگر آتش دہلوی نے مجھے گاڑی باہر ہی روک لینے کی ہدایت کردی۔

" یہ آپ کا مکان ہے ؟ " میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ مکان خواہ نیم شکستہ ہی سہی لیکن گلبرگ میں حویلی نما اتنے لمبے چوڑے مکان کا مالک ہونا بہرحال معنی رکھتا تھا۔

" میرا ؟ " بڑے میاں استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیے " میرا ہوتا تو اب تک ضرور کوئی مجھ سے ہتھیا چکا ہوتا یا میں خود ہی بیچ کر کھا چکا ہوتا " انہوں نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور بغلی گیٹ کی طرف بڑھے جو اتنا چھوٹا تھا کہ ایک وقت میں اس سے ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔

جھاڑ جھنکاڑ سے گزرتے ہوئے ہم کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف بڑھے۔ اس دوران بڑے میاں بتانے لگے " یہ مکان ایک معمر بیوہ کا ہے جو اس زمانے سے ہماری شناسا ہے جب ہماری بھی اس شہر میں تھوڑی سی آبرو تھی۔ بیچاری جوانی ہی میں بیوہ ہوگئی تھی۔ اولاد کوئی ہے نہیں۔ تنہائی سے خوف زدہ ہو کر نچلی منزل پر کچھ کرایہ دار رکھ لئے تھے کہ آمدنی کا ذریعہ بھی رہے گا اور تنہائی کا خوف بھی نہیں ستائے گا۔ تب سے اب تک وہ تینوں کنبے یہیں براجمان ہیں گو کہ ان کی اولادیں بھی جوان ہوگئی ہیں۔ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ مہنگائی کا کیا عالم ہو چکا ہے مگر وہ تینوں کنبے ابھی تک وہی اسی روپے ماہوار فی

پورشن کرایہ دے رہے ہیں اور مکان کی یہ حالت ہو چکی ہے مگر وہ ملنے کا نام نہیں لیتے۔ نہ کرایہ بڑھاتے ہیں نہ اپنے پلے سے کچھ خرچ کر کے مکان کی حالت درست کرانے میں مدد دیتے ہیں۔ اب تو وہ گویا منتظر ہیں کہ بڑی بی اگلی دنیا کو سدھاریں تو وہ تینوں کنبے مل کر مکان کے حصے بخرے کرلیں۔ بڑی بی کو اب تنہائی سے اتنا خوف نہیں آتا جتنا ان کرایہ داروں سے آتا ہے کہ کہیں ان میں سے کوئی رات کو موقع پا کر ان کا گلا نہ دبا دے۔ کسی حد تک ترس کھا کر اور کسی حد تک مصلحت کے پیش نظر انہوں نے پچھلی طرف بنا ہوا ایک فاضل اسٹور نما کمرا بلا کرایہ برسوں سے مجھے دیا ہوا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ میں آڑے وقت میں ان کے کسی کام آسکتا ہوں " بڑے میاں نے استہزائیہ سے انداز میں قہقہہ لگایا " اب کوئی اس بے چاری سے پوچھے کہ جو شخص زندگی میں خود اپنے کسی کام نہ آسکا ہو وہ کسی دوسرے کے کیا کام آئے گا ؟ "

ہم پچھلی طرف پہنچ چکے تھے۔ اس طرف دیوار پر سیاہ کائی سی جمی ہوئی تھی۔ نکاسی وغیرہ کے زنگ آلود اور رستے ہوئے پائپوں کے قریب سے ایک تنگ اور گول زینہ بل کھاتا ہوا دوسری منزل پر جا رہا تھا۔ ہم نے جیسے ہی اس زینے پر قدم رکھا ایک قریبی بالکونی سے بکھرے ہوئے بالوں والی ایک وحشت زدہ سی بڑھیا نے جھانکا اور کرخت آواز میں پوچھا "کون ہے ؟" پھر اس کی نگاہ ہم پر پڑی اور اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔

"حیرت ہے..... آج تو بڑی جلدی گھر آگئے ہو۔" بڑھیا بولی اور جواب کا انتظار کئے بغیر بالکونی کی بتی بجھا کر واپس اندر چلی گئی۔

" محسوس تو نہیں ہوتا کہ یہاں نچلی منزل پر تین کنبے رہتے ہیں " میں نے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کمبخت سرشام سو جاتے ہیں اور منہ اندھیرے اٹھ کر شور شرابا شروع کردیتے ہیں۔ اپنے اپنے کاموں پر جانے کی تیاری کیا کرتے ہیں، معلوم ہوتا ہے پوری ایک بٹالین جنگ پر جانے کی تیاری کر رہی ہے۔ " بڑے میاں بولے۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر انہوں نے تالا کھولا اور اندر پہنچ کر لائٹ آن کی۔ کمرا کسی بڑے سے صندوق سے مشابہ تھا۔ چھت اتنی نیچی تھی کہ اگر میں صحیح طور پر تن کر کھڑا ہوتا تو میرا سر چھت سے ٹکرانے لگتا۔ یہاں بھی دیواروں اور چھت کا پلستر اکھڑ رہا تھا۔ پہلی نظر میں تو شبہ یہ ہوتا تھا کہ یہ درحقیقت کمرا نہیں کسی ریچھ کی کھوہ ہے جو انسانوں کا سا رہن سہن سیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ایک طرف لوہے کے پایوں اور تباہ حال اسپرنگوں پر مشتمل چارپائی موجود تھی مگر اس پر بستر کی جگہ پرانے اخباروں کا انبار تھا۔ بستر تقریباً گٹھڑی کی سی شکل میں فرش پر پڑا تھا۔ ایک گول تپائی پر پرانی کتابوں اور نہ جانے کس کاٹھ کباڑ کا اتنا اونچا انبار تھا کہ چھت کو چھو رہا تھا۔ ایک کرسی پر انگریزوں کے زمانے کا ایک ٹیبل فین گردن ٹیڑھی کئے کھڑا تھا۔ دھول میں اس کا اصل رنگ چھپ چکا تھا۔

ایک کونے میں ربڑ کے پائپ سے منسلک گیس کا ایک چولہا اوندھا پڑا تھا۔ اس کے گرد چند غلیظ برتن الٹے سیدھے پڑے تھے۔ چولہے کے گرد ایک دائرے میں فرش پر نہ جانے کیا چیز سیاہ کائی کی طرح جمی ہوئی تھی۔ ایک دیوار پر کھونٹیوں پر چند کپڑے ٹنگے ہوئے تھے۔ باتھ روم سے کسی برتن میں مسلسل پانی ٹپکنے کی ٹپ ٹپ سنائی دے رہی تھی۔ چھت کے گوشوں میں مکڑی کے جالے لگے ہوئے تھے۔

بڑے میاں تشویش زدہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ غالباً ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کہاں بٹھائیں۔ میں نے خود ہی یہ مسئلہ حل کردیا اور چارپائی پر سے بہت سے اخبار ایک طرف پھینک کر خود ہی اپنے لئے جگہ بنالی۔ بڑے میاں نے اطمینان کی سانس لی۔ پھر انہوں نے ٹیبل فین کو کرسی سے اتارا اور گول تپائی سے کچھ چیزیں بصد مشکل کھسکا کر بالشت بھر جگہ پیدا کی۔ کہیں سے کھینچ کھانچ کر انہوں نے ایک میلا سا کاغذ اور شکستہ سا قلم نکالا۔ یہ تیاریاں مکمل ہونے کے بعد انہوں نے اطمینان کی سانس لی اور کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولے " مجھے اس لڑکی کے بارے میں مختصراً کچھ بتادو ... وہ کیسی ہے ؟ تمہارے اس کے بارے میں محسوسات کیا ہیں ؟ اور اسی قسم کی کچھ اور چھوٹی موٹی باتیں "

میں راحیلہ کے متعلق انہیں جو کچھ بھی بتا سکتا تھا بتانے لگا۔ چند جملے سن کر ہی انہوں نے طمانیت سے سرہلایا "بس... بس... ٹھیک ہے۔ اب تم خاموشی سے بیٹھ جاؤ۔ "

وہ چند لمحے ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو گھورتے رہے پھر کاغذ پر جھک گئے اور عجیب مجنونانہ سے انداز میں قلم گھسیٹنے لگے۔ میں لکھنے کے معاملے میں بڑے میاں کی روانی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چند ہی منٹ میں انہوں نے کاغذ ٹیڑھے میڑھے لفظوں سے بھر کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا۔ بڑے میاں نے میری طرف سے لکھا تھا۔

"میری اپنی ! کشاکش حیات نے کئی دن تک خط لکھنے کی مہلت نہ دی اور جب لکھنے بیٹھا تو صورت یہ رہی کہ کئی دن تک تمہیں خط لکھ لکھ کر پھاڑتا رہا۔ کسی خط سے دل مطمئن نہ ہوا۔ الفاظ تمہارے شایان شان ہی نہ لگے۔ جذبے عظیم تھے اور الفاظ حقیر۔

تم سے ملنے سے قبل گویا یقین ہی نہیں تھا کہ اس دنیا میں تم جیسی ہستیاں بھی موجود ہوتی ہیں۔ اتنی انمول اور دل میں سما جانے والی۔ کہ جن کے تصور سے ہی رگ و پے میں سرور اور ٹھنڈک سی پھیل جاتی ہے۔

میں مرد ہوں، اظہار میری کمزوری ہے لیکن میں محض

مکالمے نہیں لکھ رہا بلکہ اپنی روح کی آواز کو لفظوں کی زندگی دے کر تم تک پہنچانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ تم میری ہستی میں اس طرح شامل ہو چکی ہو کہ اگر میں خود کو تم سے الگ کردوں تو باقی کچھ نہیں بچتا۔ میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا کہ تم میرے لئے کیا ہو۔ بس اتنا جان لو کہ میری روح تم سے محبت کے لئے تخلیق کی گئی ہے۔ مجھے اپنے آپ سے تمہاری خوشبو آتی ہے۔ ہر شام کے ڈھلتے سورج' ہر شام کی شفق' ہر رات کی ٹھنڈی چاندنی اور ہر صبح اوس میں بھیگے ہوئے پھولوں کی مہک نے مجھے تمہاری یاد دلائی۔ تم سے الگ رہ کر اپنا وجود یوں محسوس ہوتا ہے جیسے پانی کے اوپر بلبلہ۔ نہ ثبات۔ نہ سکوں۔ اگر کچھ ہے تو تمہاری مخمور نگاہوں کا تبسم اور ہم دونوں کے مستقبل کی امیدیں۔ تمہارے چہرے کی دمک' ہنسی کی کھنک اور پیار کی دھنک سے میری زندگی عبارت ہے۔ کبھی کبھی مجھے لگتا ہے کہ میں نے اپنا دل نکال کر شمع کے شعلے پر رکھ دیا ہے اور وہ قطرہ قطرہ شمع کے آنسوؤں کے ساتھ پگھل رہا ہے۔ --- تمہاری محبت نے مجھے ایک ضدی بچہ بنا دیا ہے جو چاند کو اپنے گھر کے آنگن میں اتارنے کی ضد کرتا ہے۔ تمہاری ذات کا چاند اگر میرے گھر کے آنگن میں نہ اترا تو شاید زندگی میرے لئے کوئی ایسی چیز نہ رہے کہ جس میں دلچسپی لی جائے۔ کیا تم بھی میرے بارے میں یہی سب کچھ سوچتی ہو؟

تمہارا اپنا"

خط پڑھ کر میں نے قدرے حیرت سے بڑے میاں کی طرف دیکھا پھر اس کمرے کے وحشت زدہ ماحول پر نظر ڈالی۔ بڑے میاں مشتبہ سی نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولے "کیا دیکھ رہے ہو؟"

"یقین نہیں آرہا... کہ یہ خوبصورت خط اس بے ہودہ اور اتنی بے آرامی کے ماحول میں لکھا گیا ہے" میں نے کہا۔

"تخلیق ہمیشہ تکلیف کی کوکھ سے جنم لیتی ہے" بڑے میاں مسکرائے "میں جب آسودہ حال تھا تب بھی ذہنی طور پر کئی محرومیوں کا شکار تھا۔ اسی لئے میری تحریر میں درد تھا اور میرے ناول اس قدر مقبول تھے۔ اب میری محرومیاں اور تکلیفیں بڑھ گئی ہیں۔ میں چاہوں تو پہلے سے زیادہ اچھا لکھ سکتا ہوں مگر اب لکھنے سے دل ہی اچاٹ ہو گیا ہے اور پھر مجھے خبطی سمجھ کر کوئی مجھ سے کچھ لکھوانے پر اصرار بھی نہیں کرتا۔"

"بہت بہت شکریہ" میں نے خط تہہ کر کے جیب میں رکھ کر اٹھتے ہوئے کہا "آپ کا ٹھکانہ تو میں نے دیکھ ہی لیا ہے آئندہ جب بھی مجھے خط لکھوانا ہوگا میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"رات ہی میں آیا کرنا۔ دن بھر میں اپنی اس قبر میں ضرور رہتا ہوں" بڑے میاں نے کمرے کے در و دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں باہر آگیا۔ انہوں نے میرا نام جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں نے بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا۔

میرا گھر وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ گھر پہنچ کر آرام سے اپنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھنے کے بعد میں نے اس خط کو کئی بار پڑھا۔ بڑے میاں نے واقعی کاغذ پر کلیجہ نکال کر رکھ دیا تھا۔ اپنا نہیں' میرا۔ واقعتاً یہی سب کچھ میرے جذبات تھے۔ میں نے چشم تصور سے دیکھنے کی کوشش کی کہ راحیلہ یہ سب کچھ پڑھ کر کس قدر خوش ہوگی۔ میری رگ و پے میں گدگدی سی ہونے لگی۔

میں نے خاص طور پر خریدا ہوا ایک خوبصورت رائٹنگ پیڈ نکالا اور نہایت احتیاط سے حتی الامکان خوشخطی کے ساتھ یہ مضمون رائٹنگ پیڈ پر نقل کیا' خط کو خوشبو میں بسایا اور ایک نفیس لفافے میں بند کر کے رکھ دیا۔ میں جب سونے کے لئے لیٹا تو مجھے اپنی اس ساری کارروائی پر کچھ ہنسی بھی آئی۔ عجیب بچکانہ پن سا تھا میری ان تمام حرکتوں میں لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ عشق میں یہی سب کچھ ہوتا ہے' ساری ذہنی پختگی ہوا ہو جاتی ہے۔ اپنے آپ پر اختیار ہی کب رہتا ہے۔ یہی سب کچھ بھلا لگتا ہے جو میں کر رہا تھا۔ صحیح معنوں میں محبت میں گرفتار ہی میں اب ہوا تھا۔ دوسری صبح اس خط کو پوسٹ کرنے کے بعد مجھے کچھ قرار سا آیا لیکن کچھ ہی دیر بعد جواب کے انتظار کی بے قراری شروع ہو گئی حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ ابھی تو خط منزل کی طرف روانہ بھی نہیں ہوا ہوگا۔ لیکن عشق میں منطقی جواز بھلا کب چلتے ہیں۔

دوسرے روز میں جہاز سے پشاور روانہ ہو گیا۔ وہاں سے مجھے ایک اور سرحدی علاقے کی طرف روانہ ہونا تھا اور بہت بڑی کھیپ لے کر آنا تھا۔ گروہ کے دوسرے دو ارکان بھی میرے ساتھ تھے لیکن ہم بظاہر اجنبیوں کی طرح قطعی لاتعلقی سے سفر کر رہے تھے۔

مال لانے' کھیپ کو خریداروں تک پہنچانے اور رقم کی وصولی میں کئی دن لگ گئے۔ میں واپس لاہور پہنچا تو قاسم خان حسب پروگرام لندن جا چکا تھا اور اس کی واپسی کا کوئی حتمی پروگرام نہیں تھا۔ اس کی واپسی تک رقم میری ہی تحویل میں رہنی تھی۔ رقم بہت بڑی تھی۔ میں چاہتا تو لے کر فرار بھی ہو سکتا تھا۔ اتنی رقم سے بہت کچھ کیا جا سکتا تھا اور پھر قاسم خان کے لئے میرے دل میں کچھ ایسی اپنائیت اور ہمدردی بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن میں ایک دم بڑا ہاتھ مار کر اپنی جڑیں کاٹنے کے بجائے آہستہ آہستہ اور تھوڑا تھوڑا فائدہ اٹھا کر اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا قائل تھا اور قاسم خان کے ساتھ رہتے ہوئے اپنی جڑیں مضبوط کرنے کا طریقہ میں نے سوچ لیا تھا۔

اس رقم سے مجھے معقول کمیشن ملنا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس رقم سے میں قاسم خان کے کام کے متوازی چھوٹے پیمانے پر اپنا کام بھی شروع کر دوں گا۔ میں کمیشن کی رقمیں جمع

کے اپنے دولت مند ہونے کا انتظار کرنے کے بجائے۔ ...بار" میں ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

قاسم خان کا مال تو میں لے کر آتا ہی تھا۔ اب مجھے یہ کرنا ...اس کے ساتھ ہی چھوٹ موٹی کھیپ اپنی بھی لے آیا کرتا۔ ...س کے لئے مجھے نئے گاہک تلاش کرنے تھے۔ مال سپلائی ...رنے والی پارٹیوں سے کچھ ساز باز کرنی تھی اور اپنے ساتھ ...انے والے دوسرے کارکنوں کی آنکھوں میں تھوڑی سی ...ول جھونکنی تھی۔ میری نظر میں اب یہ زیادہ مشکل کام ...تھے۔ میں اپنی لائن میں کافی منجھ چکا تھا۔

اس ٹور سے واپسی پر مجھے قوی امید تھی کہ راحیلہ کی ...ف سے خط کا جواب آچکا ہوگا مگر میری یہ امید پوری نہیں ...ئی۔ راحیلہ کا خط نہیں آیا تھا۔ مجھے کچھ دھچکا سا لگا۔ پھر ...یں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اتنا بھی بے صبر نہیں ہونا ...ہئے۔ ضروری نہیں کہ میرے احساسات میں جو شدت ...ہے وہی شدت دوسری طرف بھی ہو..... اور پھر ابھی مجھے خط ...لکھے کچھ اتنے زیادہ دن بھی نہیں گزرے تھے۔ ضروری نہیں ...تھا کہ وہ میرا خط ملتے ہی جواب لکھنے بیٹھ جاتی۔ خود میں نے بھی ...کراچی سے آنے کے کتنے دن بعد اسے خط لکھا تھا حالانکہ ...وعدہ کر کے آیا تھا کہ جاتے ہی لکھوں گا۔

ان دلائل سے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کے بعد میں ...یک بار پھر آتش دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوا۔ خوش قسمتی ...سے وہ مجھے اس صندوق نما کمرے ہی میں اپنی گدڑی میں ...مراقبہ کی سی حالت میں بیٹھے ہوئے مل گئے۔ میری فرمائش پر ...انہوں نے بڑی ہی خوشی سے فوراً ایک اور محبت نامہ لکھ دیا۔ یہ ...محبت نامہ بھی بہت ہی خوبصورت تھا۔ کچھ ہجر کی راتوں کے ...نغمے۔ کچھ تغافل کے شکوے۔ کچھ غم دوراں کی معذرتیں۔ ...کچھ غم جاناں کی ستم کاریاں۔ سبھی کچھ سمو دیا تھا ظالم نے۔ یہ ...حضرت آتش بھی بس آدمی کیا تھے' محبت ناموں کی فیکٹری ...معلوم ہوتے تھے۔ ادھر آرڈر دیا اور ادھر بالکل تازہ بہ تازہ' نو بہ ...نو حسب مرضی کے مطابق محبت نامہ برآمد۔ اس بار تو میں نے ...بے اختیار ان کے ہاتھ چوم لئے۔ گھر آکر میں نے بڑی محبت ...سے اس محبت نامے کو خوبصورت رائٹنگ پیڈ کے تین ...اوراق پر نقل کیا اور حسب سابق اگلی صبح پوسٹ کر دیا۔

چند دن بعد میرے دونوں خطوں کا مشترکہ جواب آگیا۔ ...مختصر اور سیدھا سادا تھا۔ ظاہر ہے وہ اس طرح کسی منجھے ...ہوئے ادیب سے نہیں لکھوایا گیا تھا جس طرح میں نے لکھوایا ...تھا۔ تاہم اسے پڑھ کر میں جھوم اٹھا۔ اس میں معذرتیں تھیں' ...از سر نو اقرار تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ اعتراف تھا کہ ...میرے خطوں نے اس کی روح کو گدگدا دیا تھا۔ مانا کہ وہ خط ...میرے لکھے ہوئے نہیں تھے لیکن ان میں جذبات تو میرے ...ہی تھے۔ راحیلہ کے خط میں اختصار اور سادگی کے باوجود بہرحال

خلوص کی مہک تو موجود تھی۔ میں اس رات حضرت آتش دہلوی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس خط کا جواب لکھوا کر دوسرے دن پوسٹ کردیا۔

اس دوران قاسم خان لندن سے واپس آگیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اس نے بتایا کہ سیٹھ واحد سے اس کی ملاقات ہوگئی تھی اور اس سے خاصا تعاون حاصل ہونے کی امید تھی۔ ان دنوں قاسم خان کے جائز کاروبار کا بالکل بیڑہ غرق ہوچکا تھا اس لئے دوسرے دھندے کی طرف اس کی توجہ کچھ زیادہ ہی ہوگئی تھی اور وہ بڑا سرگرم نظر آرہا تھا۔ میں نے اسے حساب دیا۔ رقم اس کے حوالے کی اور اس نے فوراً ہی کمیشن میرے حوالے کردیا۔ ساتھ ہی وہ مسکراتے ہوئے بولا "اتنی رقم اتنے دنوں تک تمہاری تحویل میں رہنا بھی ایک طرح سے تمہارا امتحان تھا افضل! مجھے خوشی ہے کہ دیگر کئی امتحانوں کی طرح تم اس امتحان میں بھی پورے اترے ہو۔ مجھے تم پر اعتماد تو اپنے پرانے ساتھیوں سے بھی زیادہ ہے لیکن میرا تجربہ ہے کہ بہت بڑی رقم دیکھ کر اچھے اچھوں کی نیت خراب ہوجاتی۔"

"میں تو اس رقم کی حفاظت کرتے کرتے پریشان ہوگیا تھا باس!" میں نے کہا۔

"دراصل اس کے لئے کسی ایسے اکاؤنٹ کا انتظام نہیں ہوسکا تھا جس میں اسے جمع کرایا جاسکتا" قاسم خان سگار کا کش لیتے ہوئے بولا "شرفو کی موت کے بعد اسے ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر بھی رکھنا مناسب نہیں تھا۔ میں نے سوچا، چلو اس بہانے تمہاری نیت کا امتحان بھی ہوجائے اور صلاحیتوں کا بھی۔ کہ تم کسی اہم امانت کی حفاظت کرسکتے ہو یا نہیں۔ لیکن تم صحیح معنوں میں اتنے مختصر عرصے میں میرے قائم مقام بن گئے ہو۔"

"ایک بار تو میں نے سوچا کہ رقم بیگم صاحبہ کے حوالے کردوں" میں نے کہا "مگر پھر یہی سوچ کر رہ گیا کہ یہ آپ کی ہدایت کی خلاف ورزی ہوگی۔"

"سلمٰی تم سے ہرگز یہ رقم نہ لیتی" قاسم خان مسکراتے ہوئے بولا "تمہیں معلوم نہیں کہ وہ ہمارے دھندے کے سلسلے میں کسی چیز کو انگلی لگانے پر بھی تیار نہیں ہوتی۔ وہ اس دھندے کو برداشت کررہی ہے یہی بڑی بات ہے۔ اس کا بس چلے تو آج مجھ سے یہ دھندہ چھڑوادے۔"

میری نظروں میں سلمٰی کا سراپا گھوم گیا۔ بلاشبہ وہ عورت نہیں، ساحرہ تھی مگر جانے کیوں اس معاملے میں اس کا سحر قاسم خان پر نہیں چل سکا۔ میرے خیال میں اگر وہ ایک طاقتور ساحرہ تھی تو دولت کا بھوت بھی کچھ کم طاقتور نہیں تھا۔ قاسم خان کے سر پر دولت کا بھوت سوار تھا۔ سلمٰی کی حسین اور ملکوتی شخصیت کا سحر بھی اس بھوت کو اتارنے میں ناکام رہا تھا۔

اس ملاقات کے تقریباً ایک ہفتے بعد میں اگلے ٹور پر روانہ ہوا۔ اس مرتبہ میں واپس آیا تو کھیپ کے ساتھ میرا اپنا بھی تھوڑا سامال تھا۔ یہ مال خاموشی سے مارکیٹ میں چلا گیا۔ قاسم خان کو تو کیا، میرے ساتھ جانے والوں کو بھی اس کی کانوں کان خبر نہیں ہوسکی۔ اس سودے کا منافع میرے کمیشن کے علاوہ تھا۔ یعنی اس پھیرے میں مجھے دُہرا فائدہ ہوا تھا۔

اس موقع پر میرے دل میں شرفو کی یاد کا خوابیدہ زخم جاگ اٹھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو شاید میں اس کے ساتھ مل کر اپنی اس پہلی کامیابی کا چھوٹا موٹا جشن مناتا لیکن اصل بات میں شاید اسے بھی نہ بتاتا کہ یہ جشن کس سلسلے میں ہے۔ یہ محسوس کرکے مجھے حیرت ہوئی کہ اس بار شرفو کی یاد میں وہ شدت نہیں تھی کہ دل لہو لہو ہوجاتا۔ ایک ٹیس سی جاگ اٹھی تھی، افسردگی کی ایک لہر آکر گزر گئی تھی۔ اور بس۔ رفتہ رفتہ مرجانے والے کی یاد کا زخم بھرہی جاتا ہے اور میرے دل کے زخم تو کچھ زیادہ ہی تیزی سے بھرتے تھے۔ یہ شاید ایک طرح سے قدرت کی عنایت ہی تھی۔ بہرحال میں نے اکیلے ہی تھوڑی بہت عیاشی کرلی۔

دوسرے دن راحیلہ کا خط آگیا۔ میری سرشاری کچھ اور بڑھ گئی۔ رات ہوتے ہی میں اس خط کا جواب لکھوانے کے لئے جناب آتش دہلوی کے دولت کدے کی طرف دوڑا۔

آج خلافِ معمول میری دستک کے جواب میں جناب آتش نے دروازہ نہیں کھولا بلکہ ان کی کانپتی ہوئی سی آواز سنائی دی "کون؟"

"آپ کا پرستار" میں نے کہا۔ ابھی تک انہیں میرا نام بھی معلوم نہیں ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ آواز سے وہ مجھے پہچان لیتے ہیں۔

"ذرا سا دھکا دو۔ دروازہ کھلا ہی ہے" ان کی آواز خلافِ معمول کچھ زیادہ ہی کانپ رہی تھی۔ میں دروازے کو تھوڑا سا دھکیل کر اندر پہنچا تو ٹھٹک کر رہ گیا۔ بڑے میاں فرش پر بچھے ہوئے گدے پر چت پڑے تھے۔ ان کی پیشانی پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ چہرے کے ڈھلکے ہوئے گوشت پر نیل نمایاں طور پر نظر آرہے تھے۔ نچلا ہونٹ بری طرح سوجا ہوا تھا اور ہاتھ پر بھی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ شاید انہوں نے چہرے پر کسی دوا کی مالش بھی کی تھی۔ چکنائی سی چمک رہی تھی۔

"یہ آپ کو کیا ہوا؟" میں نے تشویش زدہ انداز میں ان کے قریب پہنچ کر پوچھا۔ ان کی حالت دیکھ کر مجھے واقعی دھچکا لگا تھا۔

"جرمِ ضعیفی کی سزا ملی ہے" انہوں نے مغموم انداز میں مسکرانے کی کوشش کی لیکن محض کراہ کر رہ گئے۔

"صاف صاف بتائیے کہ ہوا کیا ہے؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ارے کوئی خاص بات نہیں ہے" انہوں نے میرے

بازو کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی لیکن نقاہت کے سبب کامیاب نہ ہوسکے "تم خط لکھوانے آئے ہو نا...؟ میرا دایاں ہاتھ تو ٹھیک ہے۔ میں ابھی لکھ دیتا ہوں۔ ذرا مجھے سہارا دے کر اٹھاؤ۔"

"اجی آپ گولی ماریں خط کو۔ آپ لیٹے ہی رہیں اور پہلے مجھے تفصیل سے بتائیں کہ آپ کو کیا ہوا ہے؟" میں نے جھنجلا کر کہا۔

"تم معلوم کئے بغیر نہیں رہوگے" انہوں نے گہری سانس لی اور ایک لمحے کے توقف سے بولے "معلوم نہیں میں نے تمہیں بتایا تھا یا نہیں کہ وہ جو زیب النساء ہے نا.... وہی بڑھیا جسے تم نے پہلی مرتبہ یہاں آتے وقت دیکھا تھا۔ اس مکان کی مالک۔ اس نے اپنے کرایہ داروں پر کیس کیا ہوا ہے۔ آثار پیدا ہوچکے ہیں کہ وہ کیس جیت جائے گی۔ اس پر ایک پورشن میں رہنے والے کرائے دار عبدالغفور کا جوان بیٹا منظور بہت چراغ پا ہے۔ وہ ذرا بد معاش میں بھی پاؤں دھرتا ہے۔ باقی دو کرائے دار ذرا شریف طبیعت کے ہیں۔ ان کی بد معاشی بس اتنی ہے کہ.... جم بیٹھے ہیں۔ موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے پندرہ سال میں نہ تو کرایہ بڑھایا ہے نہ خالی کرتے ہیں لیکن ان کے تیوروں سے پتا چلتا ہے کہ عدالت کا جو بھی فیصلہ ہوگا وہ اسے بے چون وچرا تسلیم کرلیں گے اور اس پر عمل کریں گے۔ انہوں نے کبھی بدتمیزی نہیں کی۔ کبھی زیب النساء سے الجھنے کی کوشش نہیں کی... لیکن یہ جو نوجوان ہے.... منظور... اسے جب سے احساس ہوا کہ ہے کہ کیس ان لوگوں کے حق میں نہیں جارہا تب سے سخت مشتعل ہے۔ کل کسی بات پر نیچے برآمدے میں زیب النساء سے الجھ پڑا۔ گندی گندی گالیاں دینے لگا۔ اس کی عمر کا بھی لحاظ نہیں کیا۔ شور سن کر میں پہنچا تو زیب النساء نے قابلِ رحم انداز میں میری طرف دیکھا، جیسے اس دنیا میں صرف میں ہی وہ شخص ہوں جو اس کی کوئی مدد کرسکتا ہے۔ میں نے منظور سے صرف اتنا ہی کہا کہ زیب النساء اس کی ماں کی عمر کی ہے، اسے کم از کم اس عورت کو گالیاں تو نہیں دینی چاہئیں۔ منظور تو گویا منتظر ہی تھا کہ کوئی آکر بیچ میں کچھ بولے۔ اس نے تابڑ توڑ مجھے کئی گھونسے رسید کردیے... میری کلائی موڑ دی... وہ تو میں چکرا کر گر پڑا ورنہ وہ معلوم نہیں میرا کیا حشر کرتا۔ یہی نہیں اس نے تو میری اور زیب النساء کی بزرگی کا ذرا بھی خیال کئے بغیر ہمارے مراسم کے بارے میں ایسی شرمناک باتیں کرڈالیں کہ ہمارا زمین میں سما جانے کو دل چاہنے لگا۔ زیب النساء ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے اٹھ کر گئی ہے.... بہت رو رہی تھی بیچاری اپنی بدنصیبی پر.... دنیا میں اس کا کوئی ہے ہی نہیں... یہ میری مرہم پٹی اسی نے کی ہے۔"

"آپ لوگوں نے پولیس کو اطلاع نہیں دی؟" میں نے پوچھا۔

"کیا فائدہ ہوتا پولیس کو اطلاع دینے کا؟" آتش دہلوی مغموم سے انداز میں مسکرائے "پولیس اس قسم کے معاملات کو اہمیت نہیں دیتی۔ خصوصاً جن لوگوں کا کیس عدالت میں چل رہا ہو۔ ان کا مؤقف یہی ہوتا ہے کہ کرایہ داروں اور مکان مالکان کے جھگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ کہیں زیادتی مالک مکان کی ہوتی ہے اور کہیں کرائے دار کی۔ ان گتھیوں کو سلجھانا عدالتوں کا کام ہے۔ البتہ اگر صورتِ حال بہت سنگین ہوجائے، قتل وغیرہ کی نوبت آجائے تو پھر پولیس توجہ دیتی ہے۔ اس قسم کا جھگڑا پہلے بھی ہوچکا ہے۔ اس وقت زیب النساء تھانے چلی گئی تھی۔ پولیس نے دونوں فریقوں کو سمجھا بجھا کر گھر بھیج دیا تھا۔ پیسہ زیب النساء کے پاس ہے نہیں کہ اس قسم کے کاموں میں خرچ کرسکے۔ کوئی ذریعۂ آمدن ہی نہیں ہے۔ میاں بس یہ مکان اور تھوڑی بہت پونجی چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ کافی عرصے سے بیچاری چاہ رہی ہے کہ اس مکان کو بیچ کر کوئی چھوٹا موٹا کمرا لے کر رہنے لگے اور باقی رقم سے گزر اوقات کرے۔ ایک کمرے سے زیادہ کی اسے ضرورت نہیں ہے... مگر متنازعہ ہونے کی وجہ سے کوئی اس کا گاہک ہی نہیں بنتا۔ بہرحال..... صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔ شاید اب عدالت زیب النساء کے حق میں فیصلہ دیدے اور اس طرح اس کے مسائل حل ہوجائیں.... اچھا خیر چھوڑو... میں نے بھی تمہیں کن دکھڑوں میں الجھالیا۔ میں تمہیں خط لکھ کر دیتا ہوں" انہوں نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے ان کے سینے پر ہاتھ رکھ کر انہیں اٹھنے سے باز رکھا۔

"یہ منظور رہتا کون سے پورشن میں ہے؟" میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"بڑے گیٹ کی طرف جو سب سے پہلے پڑتا ہے" بڑے میاں نے جواب دیا۔

"میں ابھی آیا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میری واپسی تک آپ کمرے سے نہیں نکلیں گے۔"

"ارے .... کہاں جارہے ہو تم؟" وہ یک لخت سٹپٹا گئے اور کسی نہ کسی طرح اٹھ بیٹھے "تم ..... تم منظور سے جھگڑا تو نہیں کرنے جارہے؟ بھئی .... خدارا جھگڑا مت کرنا... معاملہ اور طول کھینچ جائے گا... ہمیں بھی مصیبت پڑے گی اور کہیں تم بھی نہ نقصان اٹھابیٹھو.... رہنے دو.... پلیز۔ چھوڑو اس قصے کو۔"

"میں جھگڑا کرنے نہیں، جھگڑا ختم کرنے جارہا ہوں" میں نے دروازے پر رک کر کہا "آپ قطعاً کسی بھی قسم کی فکر نہ کریں اور آرام سے لیٹے رہیں۔"

"ارے بھئی ... تم ایک معزز اور مہذب نوجوان ہو۔ کہاں اس اجڈ کے منہ لگوگے۔ میں تو تمہیں ساری بات بتا کر ہی پچھتایا" وہ بے چارے واقعی بہت پریشان ہوگئے تھے۔ ان کی زبانی مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ میں کم از کم بظاہر تو "معزز اور مہذب" نظر آنے لگا تھا۔

میں بڑے میاں کے کمرے کی باہر کی طرف سے کنڈی لگا کر نیچے آگیا۔ سامنے کا گیٹ حسب معمول کچھ اس انداز میں کھلا تھا جیسے اس مکان کا کوئی وارث نہ ہو۔ میں جب بھی یہاں آتا تھا' بے عنوان سی مصلحت کے تحت گاڑی باہر ہی کچھ فاصلے پر کھڑی کرکے آتا تھا۔ سب سے پہلے میں نے گیٹ بند کردیا۔ مکان کی دونوں طرف کی دیواریں تسلی بخش حد تک بلند تھیں اور برآمدے میں گلوب بھی روشن تھا۔ مکان کی ساخت میں، غالباً کچھ تبدیلیاں کرکے نچلے حصے کو اس طرح تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا کہ تینوں کے دروازے پاس پاس ہی تھے۔ اوپر کی منزل پر صرف دو کمرے تھے جو بڑی بی کے استعمال میں تھے۔ اندر سے دیکھے بغیر بھی محض آتش صاحب کے بتانے پر اس مکان کا نقشہ کافی حد تک میری سمجھ میں آچکا تھا۔

میں نے مطلوبہ پورشن کے دروازے پر دستک دی تو فوراً ہی پوچھا گیا "کون؟" آواز مردانہ تھی اور انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اندر کسی دستک کا انتظار ہی کیا جارہا تھا۔

"منظور صاحب کا ٹیلی گرام ہے جی" میں نے لہجہ تھوڑا سا بدل کر کہا۔ چند سیکنڈ بعد دروازہ کھل گیا اور شلوار قمیص میں ملبوس ایک نوجوان گریبان کے بٹن بند کرتا ہوا باہر آگیا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ کچھ الجھن زدہ سا نظر آنے لگا۔ غالباً میں اسے کسی اعتبار سے ٹیلی گرام والا دکھائی نہیں دیا تھا اور نہ ہی میرے ہاتھ میں ٹیلی گرام نما کوئی چیز تھی۔ نوجوان خاصا تگڑا تھا اور قد میں بھی مجھ سے ذرا ہی کم تھا تاہم اس کے باوجود اسے دراز قد ہی شمار کیا جاسکتا تھا۔ تگڑا ہونے کی بنا پر ہی غالباً کافی حد تک گھمنڈ تھا اسے اپنے آپ پر۔ بہرحال مجھ جیسے آدمی سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے محض کسی کا تگڑا ہی ہونا کافی نہیں تھا۔

"منظور تمہارا ہی نام ہے؟" میں نے بڑی شائستگی سے پوچھا۔

"ہاں۔ کیوں؟" وہ اب کچھ چوکنا نظر آنے لگا تھا۔

"اوپر پچھلے کمرے میں رہنے والے بڑے میاں آتش صاحب کو تم نے ہی مارا تھا؟" میں نے بڑی رسانیت سے پوچھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ نوجوان کی شناخت کے سلسلے میں شک وشبہ کی کوئی گنجائش رہ جائے۔

"ہاں' میں نے ہی مارا تھا" اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا پھر اس کے لہجے میں تمسخر جھلک آیا "تم حمایتی ہو اس کے؟"

آخری لفظ اس کے ہونٹوں پر ہی تھا جب میرا گھٹنا اس کی ناف پر پڑا۔ "اوغ" کی آواز کے ساتھ وہ جھکا تو میں نے اس کی گدی پر ایک چاپ رسید کی۔ اس قسم کے معمولی درجے کے تلنگوں سے نمٹنے کے لئے تو میرے دیسی داؤ پیچ اور طاقت وسخت جانی ہی کافی تھی لیکن اب تو میں مس ٹریپ سے جوڈو اور کراٹے کے چند خاص الخاص اور نہایت ہی کارآمد داؤ بھی سیکھ چکا تھا۔ ان کی تجرباتی مشق تو میں کافی کرچکا تھا لیکن صحیح طور پر انہیں آزمانے کے لئے کئی دن سے دل مچل رہا تھا۔

منظور اوندھے منہ گرنے لگا۔ گرتے گرتے اپنی دانست میں نہایت ہی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس نے میری ٹانگ کھینچ کر مجھے بھی گرانا چاہا لیکن اس کی یہ حسرت پوری نہ ہوسکی۔ میری ٹھوکر اس کے منہ پر پڑی اور وہ اوندھے منہ گرنے کے بجائے الٹ کر گرا۔

یکایک اندر سے ایک ادھیڑ عمر اور میانہ قامت کا شخص دوڑتا ہوا باہر آیا۔ اس کے ہاتھ میں لوہے کی سلاخ تھی۔ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' سلاخ اندھا دھند گھما کر میری کھوپڑی پر رسید کرنا چاہی۔ میں جھکائی دے کر ایک طرف ہوگیا اور سلاخ کا سرا جیسے ہی فرش سے ٹکرایا میں نے پوری قوت سے اس پر پاؤں رکھ دیا اور ساتھ ہی ادھیڑ عمر شخص کی کنپٹی پر ایک بھرپور گھونسا رسید کیا۔ سلاخ میرے پاؤں کے نیچے دبی رہ گئی اور وہ شخص دور جاگرا اور وہیں بے حس وحرکت ہوگیا۔ اس کے لئے کنپٹی پر ایک گھونسا ہی کافی رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اندر سے دو تین عورتیں دروازے پر آگئیں اور وہ بین کرنے کے سے انداز میں چیخنے ہی لگی تھیں "بچاؤ.... بچاؤ...." کہ میں نے پھرتی سے ریوالور نکال کر منظور کی کنپٹی پر رکھ دیا۔

"خبردار.... اگر کسی عورت نے ذرا بھی آواز نکالی تو میں منظور کو گولی ماردوں گا" میں نے غضب ناک لہجے میں کہا۔ عورتوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا اور ان میں سے ایک نے تو منہ میں دوپٹا ٹھونس لیا۔ میں نے ایک نظر میں ہی ان کا جائزہ لے لیا۔ ان میں سے دو جوان اور ایک ادھیڑ عمر تھی۔ غالباً وہ منظور کی

ماں تھی۔ منہ میں دوپٹا اسی نے ٹھونسا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر شخص جو ایک گھونسا کھاکر "انٹاغفیل" ہوگیا تھا' غالباً منظور کا باپ تھا۔ تینوں عورتیں سخت دہشت زدہ نظر آرہی تھیں۔

میں نے گھٹے گھٹے لہجے میں کہا "میں منظور کو جان سے مارنے نہیں آیا' صرف تھوڑا سا سبق دینے آیا ہوں لیکن اگر تم لوگوں نے شور شرابا کیا تو میں اس کا پتہ صاف کرہی دوں گا۔ ویسے شور شرابا کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ اس علاقے میں شور شرابا سن کر کوئی کسی کی مدد کو نہیں آتا۔"

اس دوران منظور کے حواس شاید کسی حد تک بحال ہوگئے تھے اور اس نے غالباً یہ سمجھا تھا کہ میں پوری طرح عورتوں کی ہی طرف متوجہ ہوں۔ اس وقت تک وہ اٹھ چکا تھا اور میں نے ریوالور اس کی کنپٹی سے ہٹالیا تھا اور میں خود بھی سیدھا کھڑا ہوچکا تھا۔ منظور نے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے ریوالور پر جھپٹنے کی کوشش کی۔

میں اس کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ ریوالور تو اس کے ہاتھ نہیں آیا البتہ اس کا دستہ اس کے منہ پر پڑا۔ میرا خیال ہے اس کے دو تین دانت اس کا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بری طرح بلبلایا اور پھر اس کی انگلیوں کے درمیان سے خون ابل پڑا۔

وہ ایک بار پھر اشتعال میں آیا اور اپنے اوسان مجتمع کرکے ریوالور کی پروا کئے بغیر ارنے سانڈ کی طرح میری طرف لپکا۔ اس نے میرے چہرے پر ٹکر رسید کرنے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں اسے میرے بائیں ہاتھ سے کراٹے کا ایک اور داؤ سہنا پڑا۔ ساتھ ہی میں نے اس کی گدی پر ریوالور کا دستہ رسید کیا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن پختہ روش پر ڈھیر ضرور ہوگیا۔ اس کے حواس مختل ہوچکے تھے۔ عجیب سے انداز میں پلکیں جھپکا رہا تھا' جیسے اسے کچھ نظر نہ آرہا ہو۔ اس کے ہونٹ پھٹ چکے تھے اور منہ کی جگہ گوشت اور خون کا ملغوبہ سا نظر آرہا تھا۔ ابروؤں کے قریب بھی زخم آچکے تھے اور چہرے پر ورم بھی نمودار ہوچلا تھا۔ میرے خیال میں اب اس میں مزید مار سہنے کی سکت نہیں تھی۔ اگر میں اسے ایک آدھ ہاتھ اور رسید کردیتا تو شاید وہ بے ہوش ہوجاتا۔

میں نے ریوالور کوٹ کی جیب میں رکھ لیا اور منظور کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا "اٹھو نا میرے شیر جوان' ابھی تو میرا لہو بھی گرم نہیں ہوا اور تم لمبے ہی لیٹ گئے۔ کیا تم آتش صاحب جیسے ضعیفوں اور عمر رسیدہ لوگوں ہی سے لڑنے میں ماہر ہو؟ اٹھو... شاباش..."

اس موقع پر وہ عمر رسیدہ سی عورت جو میرے اندازے کے مطابق منظور کی ماں تھی' خاموش نہ رہ سکی۔ منہ میں ٹھونسا ہوا دوپٹا نکال کر وہ آگے بڑھی اور میرے پیروں میں گرنے لگی مگر میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا اور جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے بازو سے پکڑ کر اسے سیدھا کھڑا کردیا۔

"اسے معاف کردے بیٹا! اسے معاف کردے" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی "میں نے اسے پہلے ہی منع کیا تھا کہ بوڑھے آدمی پر ہاتھ نہ اٹھا مگر اسے اپنی طاقت دکھانے کا کچھ زیادہ ہی جوش چڑھا ہوا تھا... میں نے کہا تھا کہ جو دنیا میں اکیلے ہوتے ہیں' خدا کسی نہ کسی کو ان کا بھی حمایتی بنا کر بھیج دیتا ہے... مگر اس نے میری ایک نہ سنی۔"

"تو پھر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ آئندہ بھی تمہاری بات سنے گا؟" میں نے سرد لہجے میں کہا "میرا خیال ہے' مجھے اس کی سماعت بہتر بنانے کا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا تاکہ یہ آئندہ ماں کی بات اچھی طرح سن سکے۔"

"آئندہ یہ آتش صاحب کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔ یہ میرا وعدہ ہے... خواہ اس سے اپنی بات منوانے کے لئے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے" عورت گڑگڑائی۔

"دیکھو بڑی بی! غور سے میری بات سنو" میں نے رومال کے ذریعے اپنی ٹائی پر سے خون کا ایک چھینٹا صاف کرتے ہوئے کہا "تمہارا یا دوسرے کرائے داروں کا مکان مالکن سے جو جھگڑا چل رہا ہے اس سے مجھے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ میں چاہوں تو تم سب کو سامان سمیت اٹھوا کر راوی میں بھی پھنکوا سکتا ہوں لیکن میں ایسا نہیں کروں گا۔ ہاں اتنا ضرور چاہوں گا کہ عدالت جو بھی فیصلہ دے' اس پر تم سب بلاچون وچرا عمل کرنا۔ اس سے زیادہ مجھے تمہارے جھگڑے سے کوئی دلچسپی نہیں لیکن مجھے ان دو ضعیف اور بے سہارا افراد کی خیر وعافیت سے ضرور دلچسپی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بھی شخص' بڑی بی زیب النساء یا بڑے میاں آتش صاحب کو ذرا سی بھی ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچائے حالانکہ ان دونوں کو میں صحیح طور پر جانتا بھی نہیں اور نہ ہی وہ مجھ سے صحیح طور پر واقف ہیں لیکن اس معاملے میں تم مجھے ایک طرح کا خدائی فوجدار کہہ سکتی ہو۔ میرا مقصد صرف اتنا ہی ہے کہ تم لوگوں میں سے کوئی بھی ان دونوں کو کوئی تکلیف نہ پہنچائے اور بس۔ اگر میری اس ہدایت پر عمل ہوا تو تم میں سے بھی کسی کو آئندہ کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی... سمجھیں؟"

"تم بالکل اطمینان رکھو" بڑی بی جلدی سے سرہلا کر بولیں۔ مجھے یقین تھا کہ باقی دو پورشنوں کے دروازوں کے عقب میں بھی یقیناً مکین موجود تھے اور کئی آنکھیں درزوں سے جھانک رہی تھیں مگر انہوں نے بتیاں نہیں جلائی تھیں۔ یقیناً وہ لوگ سب کچھ دیکھ چکے تھے اور میری تقریر دل پذیر بھی اچھی طرح سن چکے تھے۔ مگر ظاہر یہی کررہے تھے کہ وہ تو اپنے گھروں میں بے خبر سوئے ہوئے ہیں۔

میں نے منظور کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ مخبوط الحواسوں کی طرح ادھر ادھر کو ڈول رہا تھا۔

"تم نے بھی میری بات اچھی طرح سن لی ہے نا؟" میں نے اس کی پسلیوں پر ہلکا سا گھونسا رسید کیا۔ وہ بلبلایا اور اس کے منہ سے خون کے کئی چھینٹے اڑ کر میرے کوٹ، ٹائی اور شرٹ پر آن گرے۔ مجھے بے حد افسوس ہوا کہ میں نے اس کمبخت کو آخری پنچ نہ ہی رسید کیا ہوتا تو اچھا تھا۔ گھونسا کھا کر اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"اگر چاہو تو جا کر اس واقعے کی رپٹ درج کرانے کی کوشش کر لینا" میں نے اس کے گریبان کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن جانے سے پہلے اپنے کفن دفن کی تیاری مکمل کر جانا کیونکہ تھانے سے واپسی پر شاید تم زندہ گھر نہ پہنچ سکو... ادھر تم تھانے کی دہلیز پر قدم رکھو گے اور ادھر مجھے علم ہو جائے گا" میں نے اسے گھر کے کھلے دروازے کی طرف دھکیل دیا۔ نزدیک کھڑی ہوئی عورتوں نے فوراً اسے سنبھال لیا اور سہارا دے کر اندر لے جانے لگیں۔

میں نے بڑی بی کی طرف مڑتے ہوئے کہا "جاؤ جا کر برخوردار کی مرہم پٹی اور ہڈیاں سینکنے کا بندوبست کرو۔ صبح تک شاید اسے اندازہ ہو سکے کہ اس بوڑھے آدمی کو اس کی مارپیٹ اور گالی گلوچ سے کتنی تکلیف پہنچی ہو گی۔"

میں تیزی سے مڑا اور بغلی لان کے جھاڑ جھنکاڑ سے گزرتا ہوا پیچھے کی طرف چل دیا۔ میں پیچھے پہنچا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ بڑی بی زیب النساء اپنی سیڑھیوں میں کھڑی تھیں۔ انہوں نے لپک کر میری بلائیں لیں اور قدرے حیرت سے بولیں۔ "تم کون ہو بیٹا؟ تم تو ہمارے لئے فرشتۂ رحمت بن کر آ گئے... تم شاید آتش صاحب کے شناسا ہو۔ میں نے ایک مرتبہ تمہیں ان کے ساتھ دیکھا تھا؟"

"جی ہاں۔ میں ان کا دوست ہوں" میں نے کسی قسم کی گرمجوشی کا اظہار کئے بغیر کہا "آپ مجھے فرشتۂ رحمت وغیرہ ہرگز قرار نہ دیں۔ میں تو بڑا گناہگار سا انسان ہوں۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔ میں تو بس اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔ کمزور پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

بڑی بی گلوگیر لہجے میں بولیں "اللہ تمہیں اس کا اجر دے گا... تم ذرا میرے گھر میں تو آؤ... کچھ دیر بیٹھو... مجھے خدمت کا موقع دو... کھانا کھاؤ، چائے پیو۔"

ان کے انداز کی سادگی پر مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ تاہم میں نے اپنے لہجے کی کرکھائی اور سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا "میرے پاس وقت بھی نہیں ہے اور چائے یا کھانے کی مجھے طلب بھی نہیں ہے۔ پھر کسی وقت سہی۔"

میں ان سے بازو چھڑا کر آگے بڑھنے لگا تو وہ جلدی سے دو قدم آگے آ کر بولیں "اگر اس بدمعاش نے دوبارہ ہم بوڑھوں اور کمزوروں کو بدمعاشی دکھائی تو کیا ہو گا؟ عین ممکن ہے کہ مار کھانے کے بعد وہ زیادہ مشتعل ہو جائے... کوئی خطرناک قدم اٹھائیے..."

"زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے بی خالہ" میں نے تیزی سے کہا "اگر خدا کو منظور ہوا تو شاید میں آئندہ بھی آپ کی مدد کے لئے آن پہنچوں... ویسے آپ کو میری مدد پر اس حد تک تکیہ بھی نہیں کرنا چاہئے۔ آخر آپ نے اتنی زندگی بھی تو میری مدد کے بغیر ہی گزاری ہے۔ کوئی آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکا۔ آئندہ بھی اگر خدا کو منظور ہوا تو کوئی آپ کو ذرا سا بھی گزند نہیں پہنچا سکے گا۔"

میں یہ کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ بڑی بی وہیں ہکا بکا کھڑی تھیں۔ شاید انہیں مجھ سے اتنی درویشانہ گفتگو کی توقع نہیں تھی۔

اوپر آ کر میں نے دیکھا، بڑے میاں اٹھ کر کرسی پر بیٹھ چکے تھے اور تشویش زدہ انداز میں دروازے ہی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے میرا سرتاپا جائزہ لیا اور غالباً یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ میرے حلیے میں کوئی زیادہ بے ترتیبی یا ٹوٹ پھوٹ کے آثار نہیں تھے جس سے انہوں نے یقیناً یہی نتیجہ اخذ کیا ہو گا کہ میں مارپیٹ اور خون خرابے سے محفوظ ہی رہا ہوں۔

"میں تو ہنگامے کی آواز پر کان لگائے بیٹھا تھا" وہ گہری سانس لے کر بولے "اور اتنی دیر میں میرا آدھا خون سوکھ گیا۔"

"کوئی ہنگامہ نہیں ہوا" میں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور آپ کو خون سکھانے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پیار سے اس کو سمجھا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اب وہ کبھی آپ لوگوں کے ساتھ بدتمیزی نہیں کرے گا۔ اب آپ کو اس سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"ڈرتا کون کمبخت ہے" آتش دہلوی کراہ کر بولے۔ "میں نے تو دنیا کی ہر چیز سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے۔ موت کا بھی مجھے تو اب کوئی خوف نہیں رہا۔ لیکن یہ جو چوٹ وغیرہ کی تکلیف ہوتی ہے نا... یہ میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ خصوصاً کوئی ایسی چوٹ جو مجھے بستر پر لیٹنے پر مجبور کر دے۔ خواہ مخواہ بستر پر لیٹے رہنا میرے بس کی بات نہیں۔ چند گھنٹے کی نیند سے قطع نظر میں صرف اس وقت بستر پر لیٹنا چاہتا ہوں جب مجھے موت آ رہی ہو۔"

اچانک انہیں جیسے کچھ یاد آ گیا۔ چونک کر شک زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "کیا تم نے واقعی پیار سے منظور کو سمجھایا تھا؟ اور کیا واقعی اس نے تمہاری بات سن لی تھی؟"

"ہاں... آپ اس کی فکر نہ کریں" میں نے کہا "اور اطمینان سے سوئیں۔ میں اب چلتا ہوں۔"

"یقین تو نہیں آ رہا کہ اس نے پیار سے تمہاری بات سن لی ہو گی" بڑے میاں خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائے "خیر صبح معلوم ہو جائے گا" پھر جیسے وہ چونک کر بولے "ارے بھئی بیٹھو۔ جا کہاں رہے ہو؟ ابھی تو میں تمہیں خط کا جواب لکھ کر دوں گا۔ میرا جسم مضروب ہے۔ میرے خیالات تو مضروب نہیں۔"

"رہنے دیں آتش صاحب! میں اتنا خود غرض بھی نہیں ہوں۔ خط دو دن بعد بھی لکھا گیا تو کوئی حرج نہیں" میں نے کہا۔

"اچھا... اگر تمہیں میری حالت پر اتنا ہی ترس آ رہا ہے تو یوں کرو کہ میں بولتا ہوں، تم لکھتے جاؤ۔ اس طرح مجھے کوئی زحمت نہیں ہو گی" بڑے میاں بولے۔ بالآخر مجھے ان کی بات ماننی پڑی۔ انہوں نے پہلے راحیلہ کا خط پڑھا اور پھر چند لمحے سوچنے کے بعد جواب لکھوانا شروع کیا۔ جواب کیا تھا، خوبصورت لفظوں کا ایک دریا تھا جو نہایت روانی سے بہتا آ رہا تھا۔ اس تکلیف کے عالم میں بھی انہوں نے مجھے جو خط لکھوایا، اسے مکمل کرنے کے بعد میں نے پڑھا تو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ خط ڈکٹیٹ کرانے میں بھی ان کے انداز کی وہ خوبصورتی برقرار تھی جو ان کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے خطوں سے جھلکتی تھی۔ گھر آ کر میں نے حسب معمول اس خط کو زیادہ خوبصورتی اور نفاست سے نقل کیا اور خوبصورت لفافے میں رکھ کر صبح پوسٹ کر دیا۔

○☆○

میری سائڈ بزنس والی اسکیم کامیاب رہی تھی۔ یعنی بزنس قاسم خان کا تھا اور سائیڈ میری۔ اس کے مال کی "درآمد برآمد" کے ساتھ ساتھ میرا مال بھی ادھر سے ادھر ہو رہا تھا اور قاسم خان کو کانوں کان خبر نہیں تھی۔ اپنے کارندوں کی خدمات سے فائدہ اٹھانے میں اس کا جواب نہیں تھا اور اس کے اعتماد سے فائدہ اٹھانے میں میرا کوئی جواب نہیں رہا تھا۔

میں نے مال کی نقل و حمل کا انتظام اس طرح اپنے ہاتھ میں لیا تھا کہ میرے ساتھ جانے والے پرانے اور قابل اعتبار کارندوں کو بھی علم نہیں ہوتا تھا کہ کتنا مال آئے گا۔ کس پارٹی کو جائے گا۔ رقم کی وصولی کب، کہاں اور کیسے ہو چکی ہے یا ہو گی... اس کے علاوہ میں نے اپنے مال کے لئے مارکیٹ ہی الگ بنائی تھی۔ میں اب بھی ان لوگوں کو ہی مال دے رہا تھا جن کا قاسم خان سے کوئی واسطہ نہیں تھا اور نہ ہی آئندہ کوئی رابطہ پیدا ہونے کی توقع تھی۔

میری جمع پونجی میں روز بہ روز اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ کمیشن کی رقم تو میرے اکاؤنٹ میں جا رہی تھی جو قاسم خان کے علم میں تھا اور جس کی ایک قانونی شکل موجود تھی لیکن "سائڈ بزنس" کی رقم میرے پاس نقد جمع ہو رہی تھی جس کا کچھ حصہ ایک بینک کے لاکر میں رکھا تھا اور کچھ رقم میرے پاس موجود رہتی تھی۔

میں اب اپنے آپ کو چھوٹے موٹے دولتمندوں میں شمار کرتا تھا۔ میری "ترقی" کی رفتار تسلی بخش بلکہ کچھ تیز ہی تھی۔ گو کہ ابھی میں کوئی بڑا سرمایہ دار تو نہیں بنا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں نے کبھی اتنی رقم کا بھی تصور تک نہیں کیا تھا جتنی میرے پاس جمع ہو چکی تھی۔ میں اب اپنے آپ کو بے حد پُراعتماد محسوس کرنے لگا تھا اور ساتھ ہی میرے دل میں مزید دولت حاصل کرنے کی خواہش جڑیں پکڑتی جا رہی تھی۔ شاید دولت چیز ہی ایسی ہے۔ ایک بار آنی شروع ہوتی ہے تو پھر اس میں اضافہ کرنے کا شوق بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔

مجھے اب کچھ کچھ امید ہو چلی تھی کہ وہ وقت شاید آ ہی جائے جب میرا شمار بھی اچھے بھلے سرمایہ داروں میں ہو سکے گا۔

میں نے کہیں انگریزی میں کسی غیر ملکی تاجر کا قول پڑھا تھا کہ آجکل کی تیز رفتار کاروباری دنیا میں صرف پہلا ملین کمانا مشکل ہوتا ہے، اس کے بعد تو رقم سے رقم بنتی چلی جاتی ہے۔ چنانچہ میں اب اس دھن میں لگ گیا تھا کہ کسی طرح میرا پہلا ملین پورا ہو جائے۔ دس لاکھ روپیہ چند سال پہلے تک میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔

میں نے کرشن چندر کے ایک افسانے میں بھی اسی قسم کی بات پڑھی تھی۔ بمبئی کے پس منظر میں انہوں نے لکھا تھا کہ یہاں روپے کی مثال برف کے گولے کی سی ہے۔ برف پوش پہاڑ کی چوٹی سے ایک بار برف کا گولا لڑھکاؤ تو نیچے پہنچنے تک وہ اتنا بڑا ہو جاتا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ راستے میں وہ نہ جانے کتنی برف اپنے ساتھ لپیٹتا ہوا لے جاتا ہے۔ یہی حال روپے کا ہے۔ ایک بار بہت سا روپیہ بمبئی کے بازار میں پھینکیے اور پھر اس کے بڑھنے کا تماشہ دیکھیے۔

مجھے معلوم تھا کہ میرے پاس اگر ایک ملین پورا ہو بھی گیا تو وہ بلیک منی ہو گی۔ اسے علی الاعلان کسی جائز کاروبار میں لگانا میرے لئے ایک مسئلہ ہو گا لیکن اس مسئلے کے سلسلے میں میں کچھ زیادہ فکرمند نہیں تھا۔ اصل مسئلہ تو میرے خیال میں دولت کا آنا تھا۔ اس کا بلیک یا وہائٹ ہونا بعد کا مسئلہ تھا۔ بلیک کو بھی وہائٹ ہوتے کیا دیر لگتی ہے؟ آخر یہ بڑے بڑے مالیاتی مشیر، بڑی بڑی ڈگریوں والے قانون داں کس لئے ہیں؟ ان میں سے کوئی نہ کوئی مشورے دینے والا، راہ سجھانے والا مجھے بھی میسر آ سکتا تھا... اور پھر میں قاسم خان سے بھی بہت کچھ سیکھتا جا رہا تھا۔ ویسے بھی میرے خیال میں دولت کا کوئی رنگ نہیں ہوتا... بلیک نہ وہائٹ... اگر کوئی رنگ ہوتا بھی ہے تو بس سنہرا ہوتا ہے جس کی چکا چوند آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔

اس دوران میرا کئی بار کراچی جانے کو جی چاہا لیکن شروع میں تو مصروفیات زیادہ رہیں اور کچھ اپنے پاؤں مضبوط کرنے کی دھن رہی۔ بعد میں کئی بار میں نے راحیلہ کو فون کیا اور اس ارادے کا اظہار کیا کہ میں چند دن کے لئے کراچی آنا چاہتا ہوں تو اس نے مجھے منع کر دیا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایم اے فائنل کے

امتحانات کی تیاری کر رہی ہے اور بڑی سنجیدگی سے دن رات پڑھائی میں مصروف ہے' اس لئے مجھے زیادہ وقت نہیں دے سکے گی۔ ظاہر ہے' اس صورت میں میرے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ کئی بار اس سلسلے میں بات ہونے کے بعد بالآخر میں نے اپنا پروگرام چند ماہ کے لئے ملتوی کر دیا۔

ان چند مہینوں میں میری دولت میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔ راحیلہ سے خط و کتابت اسی جوش و خروش سے جاری تھی۔ جوش و خروش میری طرف سے ہی زیادہ تھا' راحیلہ کے خط عام طور پر مختصر اور سیدھے سادے ہوتے تھے لیکن ظاہر ہے' اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ کوئی میری طرح کسی منجھے ہوئے ادیب سے تو خط نہیں لکھواتی تھی۔ وہ خود فون پر ایک بار کہہ چکی تھی "افضل! میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے خوبصورت خط لکھ سکتے ہو۔ تمہارا ہر خط پڑھ کر میں کیف و سرور اور حسین خوابوں کی دنیا میں کھو جاتی ہوں۔ میں ان خطوں کے شایان شان جواب نہیں لکھ سکتی۔ میرا تو دل چاہتا ہے کہ جواب لکھا ہی نہ کروں۔ بس ان خطوں کو پڑھ کر ہی لطف اندوز ہوتی رہوں۔"

اس پر میں نے بوکھلا کر کہا تھا "ایسا کبھی سوچنا بھی مت۔ خواہ تم کیسا ہی جواب لکھو لیکن لکھو ضرور... مجھے معلوم ہے کہ ان سادہ الفاظ کے عقب میں کیسے متنوع اور حسین جذبات پنہاں ہوتے ہیں۔"

اس وقت مجھے ایک لمحے کے لئے شرم سی بھی محسوس ہوئی تھی کہ میں نے راحیلہ کو ایک غیر متعلق شخص کے لکھے ہوئے الفاظ کے سحر سے متاثر کیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا کہ ان خطوط میں جذبات تو درحقیقت میرے ہی تھے اور الفاظ بھی کم و بیش میں وہی استعمال کرنا چاہتا تھا جو آتش دہلوی مجھے لکھ کر دیتے تھے۔ بات صرف اتنی تھی کہ مجھے لکھنے کا سلیقہ نہیں تھا۔

مزید چند ماہ گزر چکے تو راحیلہ کی طرف سے خطوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ کافی دن کے انتظار کے بعد میں نے قدرے وحشت کے عالم میں فون کیا تو پتا چلا کہ بات کوئی خاص نہیں تھی' بس اس کے امتحانات شروع ہو چکے تھے۔ وہ ایک ہی سانس میں مجھے اپنی تمام مصروفیات کی تفصیل بتاتی چلی گئی۔ پھر اصل موضوع پر آئی۔

"آجکل اور کسی بھی بات کا ہوش نہیں ہے افی" وہ اپنی مخصوص' کھنک دار ہنسی کے ساتھ بولی "بس زبردست لکھائی پڑھائی ہو رہی ہے۔ میں پڑھائی کے معاملے میں کبھی اتنی سیریس نہیں تھی لیکن اب ایک طرح سے ڈیڈی کے ساتھ میری ٹھن گئی ہے۔ میں ان پر ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ میں صرف سیر سپاٹوں اور دنگا فساد میں سب سے آگے نہیں ہوں' بلکہ پڑھائی میں بھی اپنی برتری ثابت کر سکتی ہوں۔"

وہ جب پیار سے مجھے افی کہتی تھی تو میں سارے گلے شکوے بھول جاتا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا "چلو ٹھیک ہے۔ تم اطمینان سے پیپرز دو۔ میں اس دوران تمہیں فون بھی نہیں کروں گا تاکہ تمہاری یکسوئی میں کوئی فرق نہ آئے..."

"لیکن خط لکھنا مت چھوڑنا" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے فوراً تلقین کی "خواہ میں جواب دوں یا نہ دوں لیکن تم خط لکھتے رہنا۔ تمہارے خطوط سے میری ذہنی یکسوئی میں کوئی خلل نہیں پڑے گا بلکہ ان خطوط سے مجھے نیا حوصلہ ملے گا۔ انہی کی بدولت میرے سینے میں ایک شعلہ سا رقصاں رہتا ہے۔"

کیسی عجیب بات تھی کہ وہ خطوط اس شخص کے لکھے ہوئے تھے جس کی اپنی زندگی میں ولولے کی چنگاری بھی باقی نہیں تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں خط حسب معمول لکھتا رہوں گا" میں نے اپنے خیال سے چونکتے ہوئے کہا "تمہارے امتحانات ختم ہو لیں پھر میں کراچی آنے کا پروگرام بناؤں گا۔"

"پھر بھی شاید تمہیں آنے کی ضرورت نہ پڑے" اس نے ایک بار پھر کھنک دار سا قہقہہ لگایا اور میرے کانوں کے قریب جیسے جلترنگ بج اٹھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میرے امتحانات ختم ہوتے ہی شاید ہمارا پورا کنبہ ہی چند دنوں کے لئے لاہور آئے۔ ڈیڈی تو شاید صرف ایک دن کو آئیں لیکن ہم لوگ زیادہ سے زیادہ دن رہنے کی کوشش کریں گے۔ اس بار تم ہمیں لاہور کی سیر کرانا۔"

"کیوں نہیں" میری دھڑکن کچھ تیز ہو گئی "تم آؤ تو سہی۔ لاہور کا گوشہ گوشہ تمہیں دکھائیں گے۔"

"بیشتر گوشے اتفاق سے ہم نے پہلے ہی دیکھے ہوئے ہیں" وہ ہنس کر بولی "لیکن جب گائیڈ کے فرائض تم انجام دو گے تو ہر چیز میں ایک نیاپن اور خوبصورتی آجائے گی۔"

مزید چند منٹ اسی قسم کی گفتگو کے بعد بالآخر ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ کافی عرصے سے میری اس قسم کی ٹیلی فون کالز کی وجہ سے بل ہزاروں روپے آرہا تھا لیکن آجکل مجھے اس کی کوئی فکر نہیں تھی۔ آجکل مال بھی اسی رفتار سے آرہا تھا' اس لئے اخراجات میں تھوڑے بہت اضافے کی کوئی فکر نہیں تھی۔ ویسے بھی جہاں محبت کا کھاتہ چل رہا ہو' وہاں تو مفلسی میں بھی اس قسم کے اخراجات کی پروا نہیں ہوتی۔ آدمی ہر حال میں انہیں پورا کرتا ہے' خواہ قرض لے کر ہی کرے اور خواہ بعد میں جوتے ہی کھائے۔ عشق میں آدمی واقعی دیوانہ ہوتا ہے۔

میرے پیشے میں انسان کو فولادی اعصاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ میرے اعصاب فولادی ہی تھے لیکن کبھی کبھی واہموں' اندیشوں اور اضطراب کا بوجھ ان پر بھی بڑھ جاتا تھا۔

ایسے میں راحیلہ سے چند منٹ کی گفتگو مجھے پُرسکون بنا دیتی تھی۔ دل کو جیسے قرار سا آجاتا تھا۔ سینے میں بھڑکتا ہوا بے اطمینانی کا آتش فشاں کچھ سرد سا پڑ جاتا تھا۔

چند دن سے البتہ راوی کچھ چین لکھ رہا تھا۔ قاسم خان کراچی گیا ہوا تھا۔ وہاں سے اسے امریکا کے لئے فلائٹ پکڑنی تھی۔ وہ چند دن پہلے ہی چلا گیا تھا۔ کراچی میں اسے کچھ کام تھے اور سیٹھ واحد سے بھی ملنا تھا۔ اپنے اس دورے کا مقصد بھی اس نے مجھے نہیں بتایا تھا۔ ملک سے باہر بلکہ بعض اوقات شہر سے باہر جاتے وقت بھی وہ مجھے اشارتاً بھی نہیں بتاتا تھا کہ وہ کس چکر میں جارہا ہے۔ مجھے بھی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس مرتبہ تو میں اس چکر میں تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں اپنے مال کی ذرا بڑی کھیپ لے آؤں۔ میں نے انتظامات بھی مکمل کر لئے تھے لیکن بس پھر میں نے تذبذب ہی کے عالم میں دن گنوا دیئے۔ اصل میں مجھے میرے ایک مخبر نے اطلاع دی تھی کہ آنے والے چند دن ہمارے روٹ کے اسمگلروں کے لئے خطرناک ہیں۔ اس لئے میں آرام سے گھوم پھر کر دن گزار رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق قاسم خان امریکا پہنچ چکا تھا۔ اس بار وہ کوئی خاص کام میرے ذمے نہیں لگا گیا تھا۔

اس دوران چند لوگوں کے توسط سے میری ملاقات کراچی کی ایک پارٹی سے ہوئی جو خاصی بھاری مقدار میں ایک پڑوسی ملک سے کوکین منگوانا چاہتی تھی (ان دنوں ہیروئن کا نام بھی شاید ہی کسی نے سنا ہو۔ حتیٰ کہ ہماری لائن کا بھی کوئی کوئی آدمی ہی اس خوفناک چیز کے بارے میں تھوڑی بہت تفصیل سے آگاہ تھا۔ جدید ترین نشہ کوکین ہی کا تھا اور ہمارے خطے میں اس کا کاروبار عروج کی طرف مائل تھا تاہم ملک میں اس کی کھپت برائے نام تھی۔ زیادہ تر باہر ہی جارہی تھی۔)

مجھے معلوم تھا' کوکین کہاں کہاں تیار ہو رہی ہے اور اس کے حصول کے ذرائع کیا ہیں۔ ہمیں مال دینے والی کون سی پارٹی یہ کام کر رہی ہے۔ حتیٰ کہ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ پڑوسی ملک کی ایک دوا ساز فیکٹری بھی اس کام میں ملوث تھی۔ کوکین تیار کرنا گویا اس فیکٹری کا "پارٹ ٹائم بزنس" تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ آجکل سب سے زیادہ فائدہ اسی میں تھا۔ پارٹی کی پیشکش بہت ہی پُرکشش تھی لیکن ڈیلیوری وہ کراچی میں چاہتے تھے۔ اس میں رسک زیادہ تھا۔ ایک تو میں نے اس لئے ہاں نہیں بھری' دوسرے نہ جانے کیوں کوکین کے کام میں ہاتھ ڈالنے کو دل ہی نہیں چاہا۔

منشیات میں سے اب تک میں نے صرف شراب اسمگل کی تھی۔ اس کے علاوہ کبھی اندرون ملک یا بیرون ملک سے کسی قسم کی منشیات ادھر سے اُدھر کرنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوئی تھی۔ یہ لائن ہی الگ تھی۔ قاسم خان نے بھی ابھی تک اس لائن میں ہاتھ نہیں ڈالا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ مستقبل قریب میں اس کا ارادہ ضرور ہے۔ میں فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ اس کے بعد اس کا اور میرا ساتھ برقرار رہے گا یا نہیں۔ میں کتنا ہی برا آدمی سہی لیکن میرے اندر شاید کسی نہ کسی کونے کھدرے میں ایک اچھے آدمی کی روح ضرور موجود تھی۔ خواہ کتنی ہی کمزور روح سہی' لیکن بہرحال وہ ابھی سانسیں لے رہی تھی۔ ناجائز دھندوں میں بھی میں اپنی ایک تھوڑی سی شان برقرار رکھنے کا خواہشمند تھا۔ میں نے بعض نشے بازوں کی ایسی بری حالت دیکھی تھی اور ان کی وجہ سے بعض ایسے خوبصورت گھرانوں کو اجڑتے دیکھا تھا کہ منشیات سے میرے دل میں نفرت سی بیٹھ گئی تھی۔ میں لوگوں کے گھروں کو اجاڑنے میں حصے دار نہیں بننا چاہتا تھا اور ادھر عالم یہ تھا کہ ایسی ایسی منشیات ایجاد ہوتی جارہی تھیں جن کے سامنے شراب کا نشہ کچھ نہیں تھا۔

میری طبیعت کے برعکس میری لائن کے زیادہ تر لوگوں کا رجحان منشیات کی طرف تھا کیونکہ یہ چیزیں حجم میں کم ہوتی تھیں جس کی وجہ سے ان کی نقل و حمل میں آسانی تھی۔ قیمت بہت زیادہ ملتی تھی' اس لئے بہت سے عناصر کے لئے زیادہ بھاری رقموں کی گنجائش نکالی جاسکتی تھی۔ اتنی بڑی رقمیں جنہیں دیکھ کر بڑے بڑے پارسا بھی ڈول جاتے تھے۔

آنے والے چند دنوں میں مجھے اندازہ ہوا کہ اس پارٹی کو انکار کر کے میں نے اچھا ہی کیا تھا۔ شاید قدرت مجھے کسی بہت بڑے نقصان سے بچانا چاہتی تھی۔ جیسا کہ میں اعتراف کر چکا ہوں کہ میں کوئی اچھا انسان نہیں لیکن شاید یہ میرے اندر چھپے ہوئے اس کمزور سے اچھے انسان کے وجود کی خوش بختی تھی کہ قدرت مجھ پر مہربان ہی رہتی تھی۔

اس پارٹی سے ملاقات اور آنے والے دنوں کے واقعات کا آپس میں کوئی تعلق تو نہیں لیکن ان میں ایک چکر مشترک تھا اور وہ تھا کوکین کا چکر... اس اتفاق پر بھی مجھے کچھ کم حیرت نہیں تھی۔

ہوا یہ کہ اس روز میں نے صبح آنکھ کھلتے ہی حسب عادت قریبی تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ملازم صبح ہی گیٹ کے قریب پڑے ہوئے دو اخبار لا کر اس تپائی پر رکھ دیتا تھا۔ میں نے ایک اخبار اٹھایا اور آنکھیں ملتے ہوئے صفحۂ اول کی موٹی موٹی سرخیوں پر نظر دوڑائی۔ ایک سرخی پڑھ کر مجھے حیرت کا اتنا شدید جھٹکا لگا کہ میں بیڈ سے گرتے گرتے بچا۔ نیند کا خمار یکلخت ہی میرے ذہن سے اتر گیا اور میں چیتے کی طرح چوکنا ہو کر بیٹھ گیا۔ ہوش و حواس پر قابو رکھتے ہوئے میں نے دوبارہ سرخی کو بغور پڑھا۔

ممتاز پاکستانی تاجر قاسم خان نیویارک کے ہوائی اڈے پر گرفتار۔ کئی پونڈ کوکین برآمد۔ نیویارک پولیس کی تفتیش کے مطابق ملزم کی یہ کوکین اسمگل کرنے کی دوسری کوشش تھی۔

ایک بار وہ کوکین نیویارک لے جانے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ مزید انکشافات کی توقع ہے۔

خبر کے متن میں خاصی تفصیل موجود تھی لیکن میرے لئے سرخیاں ہی کافی تھیں۔ خبر کے ساتھ قاسم خان کی تصویر بھی موجود تھی۔ خبر میں ڈیٹ لائن نیویارک ہی کی تھی۔ یہ خبر اس اخبار کے اپنے ہی نمائندے نے بھیجی تھی جو نیویارک میں مقیم تھا۔

خبر پڑھ کر میں کافی دیر تک سکتے کی سی کیفیت میں بیٹھا رہا۔ حیرت مجھے بہت سی باتوں پر تھی۔ ایک تو اس بات پر کہ قاسم خان پچھلے کچھ عرصے سے مجھے غیر ضروری طور پر مستعد اور مضطرب نظر آرہا تھا لیکن مجھے شبہ تک نہیں ہوا تھا کہ وہ کن چکروں میں ہے اور معلوم نہیں' اس نے کسی اور کو بھی ان چکروں میں شریک کیا تھا یا نہیں؟ اور اسے خود مال لے جانے کی کیا ضرورت تھی جبکہ گروہ میں اس مقصد کے لئے دو تین موزوں کارندے موجود تھے؟

ایک مجھے اس بات پر بھی حیرت تھی کہ یہ خبر اخبار تک پہنچ گئی تھی اور شائع بھی ہو گئی تھی مگر اس سے پہلے پولیس وغیرہ کو کچھ علم نہیں تھا۔ اگر پولیس یا کسی اور سرکاری ادارے کو کوئی اطلاع ہوتی تو کوئی نہ کوئی ضرور قاسم خان کی بیوی سلمیٰ سے رابطہ قائم کرتا اور سلمیٰ کو اطلاع ہوتی تو مجھے بھی ہو جاتی۔ سلمیٰ کو ذاتی طور پر بھی نیویارک سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی' یہ بڑی حیرت کی بات تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے سر پر بھی آج کا اخبار دیکھ کر اچانک ہی بم پھٹے گا۔

اچانک میں سکتے کی سی کیفیت سے چونکا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا "برخوردار اقی! حیران ہونے کے لئے بہت وقت پڑا ہے بلکہ عمر پڑی ہے۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ جب تم جیسا آدمی جیل کی سلاخوں کے پیچھے پہنچ جائے' تبھی آرام سے بیٹھ کر اکٹھا ہی حیران ہو لے۔ جب تک آزادی میسر ہے' تب تک تو اس آزادی کی حفاظت کے لئے ذہن کو مستعد رکھنا چاہئے اور صرف اسی ایک سمت میں زیادہ توجہ رکھنی چاہئے۔ گو کہ تم نے اپنے آپ کو گمنام' بے شناخت اور حتی الامکان لاتعلق سا رکھا ہے۔ اس کے باوجود تمہارے لئے بہت سے خطرات کے امکانات موجود ہیں... احتیاط اچھی چیز ہے..."

میں نے بیڈ سے زقند لگائی اور مشین کی طرح حرکت میں آگیا۔ سب سے پہلے میں نے اپنی رقم خفیہ ٹھکانے سے نکال کر بریف کیس میں رکھی اور وہ تمام چھوٹی موٹی چیزیں بھی جن سے میری شناخت متعین کرنے میں ذرا سی بھی مدد مل سکتی تھی۔ ایک سوٹ کیس میں میں نے چند اچھے اچھے کپڑے اور ضرورت کی کچھ دوسری چیزیں ڈال لیں۔

میری تیاریاں تقریباً مکمل ہو چکی تھیں جب فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے ایک نظر فون کی طرف دیکھا ضرور مگر اس کی طرف ہاتھ قطعاً نہیں بڑھایا۔ گھنٹی معمول سے کچھ زیادہ پُرشور انداز میں بجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی لیکن بالآخر خاموش ہو گئی۔

تیاری مکمل کر کے میں نے ملازم کو بلایا اور کنگھا کرتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا "چچا میاں! تم بہت دن سے گاؤں جانے کی چھٹی مانگ رہے تھے۔ آج سے تم چاہو تو غیر معینہ مدت کی چھٹی پر گاؤں جا سکتے ہو۔ مجھے جیسے ہی دوبارہ تمہاری ضرورت پڑے گی' تار دے کر یا خط لکھ کر تمہیں بلا لوں گا۔ میں ایک ضروری سفر پر جا رہا ہوں۔ لیکن اگر تم چھٹی کی اس پیشکش سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو دس منٹ کے اندر اندر تیار ہو کر یہاں سے روانہ ہو جاؤ۔ گھر کی فاضل چابی اپنے پاس رکھنا۔ میرے پاس اپنی چابی موجود ہے۔ بتاؤ' دس منٹ میں تیار ہونا منظور ہے؟"

چچا میاں چند لمحے تو حیرت سے میری طرف دیکھتے رہے۔ جیسے انہیں یقین ہی نہ آرہا ہو کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں یا پھر شاید میری بات ہی فوری طور پر ان کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ چند لمحے بعد انہوں نے چونک کر احمقانہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا اور قدرے شرمیلے لہجے میں بولے۔

"وہ... جی... تیاری تو میں نے پہلے ہی کی ہوئی ہے... میرا ارادہ تھا کہ اگر آج بھی آپ نے چھٹی نہ دی تو آپ کے نام ایک رقعہ چھوڑ کر ویسے ہی چپکے سے کھسک جاؤں گا۔ خواہ بعد میں آپ مجھے نوکری سے ہی نکال دیں۔"

"بہت خوب! اس عمر میں بھی ماشاءاللہ کافی تخریبی ذہن پایا ہے آپ نے" میں نے جوتوں کے تسمے باندھتے ہوئے کہا۔

"بس جی ذرہ نوازی ہے آپ کی' ورنہ بندہ کس قابل ہے" چچا میاں جھک کر آداب بجا لائے۔ چچا میاں نے بھی خاصی اچھی حس مزاح پائی تھی۔ ان سے بات کر کے اکثر لطف آتا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھی۔ چچا میاں بڑی مستعدی سے فون کی طرف بڑھے اور جب میں نے اچانک ٹانگ بڑھا کر ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی تو وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچے۔

"گستاخی معاف" وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بولے "آپ میرے معاملات میں کچھ زیادہ ہی ٹانگ اڑانے لگے ہیں۔"

"ٹیلی فون تمہارا نہیں' میرا معاملہ ہے" میں نے تصحیح کی "اور اس سلسلے میں گزارش یہ ہے کہ اب جتنی دیر تک بھی تم گھر میں موجود ہو' فون نہیں اٹھاؤ گے۔ اب جا کر فوراً سامان اٹھاؤ اور لاری اڈے کی طرف دوڑ لگا دو۔ میں تو جا رہا ہوں۔"

میں سوٹ کیس اور بریف کیس اٹھا کر کمرے سے نکل آیا۔ فون کی گھنٹی اس وقت تک خاموش ہو چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ فون کرنے والی سلمیٰ تھی۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ اب وہ فون نہیں کرے گی' خود آئے گی اور اسے میرے گھر تک پہنچنے میں چند ہی منٹ لگتے۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں گھر سے نکل آیا۔ میں زیادہ دور نہیں گیا۔ گلبرگ ہی میں درمیانے درجے کا ایک معقول ہوٹل موجود تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے فرضی نام سے ایک کمرا لیا اور آرام سے جا کر کمرے میں لیٹ گیا۔ ایک ویٹر کے ہاتھ میں نے تمام اخبارات اور کچھ رسائل منگوا لیے۔ اخبارات کو میں نے اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ خبر صرف دو ہی بڑے اخبارات میں موجود تھی۔ ایک وہی جو میں گھر پر دیکھ چکا تھا۔ دوسرا انگریزی کا ایک بڑا اخبار تھا۔ اس میں قاسم خان کی تصویر نہیں تھی اور خبر بھی مختصر تھی۔

اخبارات اور رسالوں کی ورق گردانی میں میں نے کافی وقت صرف کیا۔ پھر اطمینان سے ناشتا کیا۔ اس کے بعد میں نے قاسم خان کے گھر کا نمبر آپریٹر کو دیا۔ نمبر فوراً ہی مل گیا اور دوسری طرف سے سلمیٰ کی بے تابانہ آواز سنائی دی۔ وہ جیسے فون کی منتظر ہی تھی۔ کسی بھی فون کی۔

میں نے اپنا نام بتائے بغیر دھیمی آواز میں کہا "آپ نے اخبار دیکھ لیا نا؟"

"اف... خدا کی پناہ!" اس نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر اطمینان کی سانس لی "تم کہاں تھے بھئی؟ میں تمہیں فون کر کر کے تھک گئی۔ پھر خود گئی مگر تمہارے ہاں تالا پڑا ہوا تھا۔ تم پہلے ہی سے کہیں غائب تھے یا خبر پڑھ کر غائب ہوئے ہو؟"

"جو جی چاہے' سمجھ لیجئے" میں نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ مبہم سا جواب دیا "احتیاط تو بہرحال انسان پر لازم ہے نا۔ ہم جیسے انسانوں پر..."

"احمق ہو تم" اس نے ملامت سے کہا تاہم اس کے لہجے میں اضطراب کی بھی آمیزش تھی۔ یکایک ہی اس کے انداز میں بے تکلفی آگئی تھی۔ اس لہجے میں اس نے کبھی مجھ سے بات نہیں کی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "فوری طور پر گھر آ کر مجھ سے ملو۔ تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ہم وقت ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے"

"گھر تو میں نہیں آسکتا میڈم!" میں نے کہا "احتیاط پسندی کا تقاضا یہی ہے کہ میں آپ کے گھر کے پاس بھی نہ پھٹکوں۔"

"ارے... بھئی حیرت ہے..." اس نے مضطربانہ قہقہہ لگایا "تم تو کچھ زیادہ ہی ڈر گئے ہو۔ تم اس لائن میں اب کوئی نئے آدمی تو نہیں رہے۔ تمام نشیب و فراز کا تمہیں پتا ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ شہر میں ہمارا بھی تھوڑا بہت اثر رسوخ ہے۔ قاسم خان پکڑا گیا تو کیا ہوا۔ ہم پر کوئی ایسی قیامت تو نہیں ٹوٹ پڑی۔ تم بے فکر ہو کر آؤ۔ کم از کم فی الحال کوئی خطرہ نہیں۔ مجھے تو حیرت اس بات پر ہے کہ یہ خبر پہلے مجھے ملنے کے بجائے اخبار تک کیسے پہنچ گئی؟"

"مجھے خود اسی بات پر حیرت ہے" میں نے کہا "عام حالات میں تو قاسم خان لندن یا نیویارک میں قیام کے دوران دوسرے تیسرے دن یہاں فون کرتا رہتا تھا۔ کیا نیویارک کی پولیس نے اسے گرفتار کرنے کے بعد کسی وکیل کی خدمات حاصل کرنے یا اپنے گھر والوں سے فون پر رابطہ قائم کرنے کی اجازت نہیں دی ہوگی؟ وہ لوگ تو بہت مہذب اور دنیا میں انسانی حقوق کے بہت بڑے دعوے دار ہیں۔"

"خیر..." وہ گہری سانس لے کر بولی "تم آجاؤ' تبھی تفصیل سے بات کریں گے۔"

"میں آپ سے لان پر ملنا پسند کروں گا" میں نے کہا۔

اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا لیکن اس بار اس کی ہنسی میں بے بسی کی سی جھلک بھی تھی "بھئی حد کر دی تم نے تو" یہ کہتے ہوئے اس نے شاید پیشانی پر ہاتھ بھی مارا تھا "اب تو تم مجھے احتیاط پسند کے بجائے ڈرپوک لگنے لگے ہو۔ میں جو کہہ رہی ہوں کہ فی الحال خطرے والی کوئی بات نہیں ہے... اور یہ فون پر بھی اتنا محتاط ہونے اور دبی دبی آواز میں گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ فون ٹیپ نہیں ہوتا۔ یہ محفوظ نمبر ہے اور آئندہ بھی محفوظ ہی رہے گا۔ البتہ ہمارا جو اسی گھر کا دوسرا فون نمبر ہے' اس کے بارے میں آئندہ کے لئے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ فی الحال تو وہ بھی محفوظ ہے۔"

"لیکن باس تو کبھی کبھی شبہے کا اظہار کرتے تھے" میں نے جھجکتے ہوئے کہا۔

"باس کو کیا معلوم۔ قاسم خان تو نرا چغد..." یک لخت اسے گویا محتاط ہونے کا خیال آیا اور اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا لیکن میں اس کے لہجے کی تبدیلی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ جیسے میری توجہ ہٹانے کے لئے جلدی سے بولی "تو پھر آرہے ہو نا تم؟ اور ہاں... اگر تم غیر ضروری احتیاط پسندی پر مصر ہی ہو تو میں تمہیں لان پر ہی ملوں گی۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ گروہ کے باقی سب لوگ مجھ سے مل کر اور نئی ہدایات لے کر جا بھی چکے ہیں۔"

اس کا اندازِ گفتگو مجھے کچھ اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ بہرحال میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ چند لمحے میں صورت حال پر غور کرتا رہا اور بالآخر ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ گاڑی میں نے وہیں چھوڑ دی۔ ٹیکسی میں میں قاسم خان کے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ چند ہی منٹ کا فاصلہ تھا۔ ٹیکسی میں نے گلی کے موڑ پر ہی چھوڑ دی اور جیبوں میں ہاتھ ڈال کر یوں ٹہلتا ہوا گلی میں داخل ہوا جیسے درحقیقت مجھے اس گلی سے آگے کہیں جانا ہے۔ گلی میں کوئی مشکوک صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

جس کے بارے میں میں سوچ سکتا کہ شاید وہ قاسم خان کی کوٹھی کی نگرانی کر رہی ہے بلکہ گلی میں سرے سے کوئی تھا ہی نہیں۔ اچھی طرح مطمئن ہونے کے بعد میں اچانک گیٹ کی طرف مڑ گیا۔ چوکی دار اس وقت بھی موجود تھا اور معمول سے کچھ زیادہ مستعد نظر آ رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے گیٹ کھول دیا۔ سلمٰی واقعی لان پر موجود تھی۔ اس کے اردگرد چار پانچ لان چیئرز خالی پڑی تھیں اور سامنے تپائی پر کافی پاٹ اور چند مگ رکھے تھے۔ سلمٰی ہمیشہ کی طرح حسین' پُروقار' خوش لباس اور پُرسکون نظر آ رہی تھی۔ اس نے ہلکا سا میک اپ کیا ہوا تھا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ سگریٹ پی رہی تھی۔ غیر ملکی سگریٹوں کا بڑا سا پیکٹ بھی اس کے سامنے پڑا تھا۔ گویا تبدیلی اس کے طرزِ گفتگو میں ہی نہیں آئی تھی' انداز واطوار میں بھی آئی تھی۔ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ یہ تبدیلی اچانک آئی تھی یا مجھے علم ہی اچانک ہوا تھا۔

میں قریب پہنچا تو اس نے بڑے سرسری سے انداز میں میری طرف دیکھا اور سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"کچھ پیو گے؟" اس نے پوچھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ اس کی آواز میں خمار کا بوجھل پن تھا اور اس کی آنکھیں بھی کوئی مخمور سا فسانہ سنا رہی تھیں۔ میرے ذہن میں جو خیال آیا' اسے میں نے فوراً جھٹک دیا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ قاسم خان کی موجودگی میں یہاں جب میٹنگز ہوتی تھیں تو ڈرنکس وغیرہ سرو نہیں کی جاتی تھیں۔ قاسم خان نے مجھے بتایا تھا کہ سلمٰی گھر میں شراب وغیرہ کی موجودگی برداشت نہیں کرتی۔ اور آج خود سلمٰی کی آنکھوں سے خمار چھلک رہا تھا' لہجے میں بوجھل پن تھا۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا؟

میں نے نفی میں سر ہلا دیا' تب وہ گویا یکدم اصل موضوع پر آتے ہوئے بولی "تم بالکل گدھے ہو۔ اتنا ڈرنے اور اس طرح یکدم روپوش ہو جانے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم سے تمہارے تعلق کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ جب تک قاسم خان خود یا میں تمہارے بارے میں زبان نہ کھولوں' تب تک تمہیں کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا۔ اور ہم سے تمہیں اس قسم کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ ہمارے جسموں کا اگر کوئی ریشہ ریشہ الگ کر دے' تب بھی ہم اپنے راز نہیں اگل سکتے۔ اپنے جاں نثاروں کو کسی مصیبت میں نہیں ڈال سکتے اور یہی توقع ہم اپنے جاں نثاروں سے رکھتے ہیں۔"

اس نے جب چھوٹتے ہی مجھے گدھا کہا تھا تو اس کے لہجے میں بڑا مان اور اپنائیت تھی' اس کے باوجود جانے کیوں مجھے اس کا لہجہ اچھا نہیں لگا۔ سلمٰی جیسی حسین اور پُرکشش عورت اپنائیت سے اگر کسی کو گالیاں بھی دیتی تو شاید اسے بھلی لگتیں مگر مجھے پہلی بار اس کا لہجہ چبھ رہا تھا۔ پھر جب اس نے یہ جسموں کا ریشہ ریشہ الگ کر دینے کے باوجود بھی جاں نثاروں کے بارے میں زبان نہ کھولنے والی بڑ ہانکی تو مجھے اس کا لہجہ اور بھی برا لگا۔ جاں نثاروں کے بارے میں ان کا طرزِ عمل کیا تھا' یہ میں اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ لیکن مجھے حیرت یہ تھی کہ آج سلمٰی جمع کے صیغے میں بات کیوں کر رہی تھی۔ وہ قاسم خان کی بات کرتے وقت اپنے آپ کو بھی اس کے ساتھ شامل کر رہی تھی جبکہ آج تک صورت یہ رہی تھی کہ وہ کبھی کسی میٹنگ میں ایک لفظ بھی نہیں بولتی تھی۔ لاتعلقی سے ایک طرف بیٹھی رہتی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تمہارے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم نے اخبار میں خبر دیکھتے ہی یوں محسوس کیا جیسے ہمارے سروں پر آسمان گر پڑا ہے یا زمین پھٹ پڑی ہے۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ہمارے کام یوں نہیں ہوتے۔"

"وہ سب تو درست ہے" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "مگر میری احتیاط پسندی میں دراصل زیادہ دخل میری چھٹی حس کا ہے۔ میری چھٹی حس مجھے کسی طوفان کی آمد کا پتا دے رہی ہے۔ میں ہوا میں کسی بہت بڑے خطرے کی بو محسوس کر رہا ہوں۔ جیسے کوئی بہت بڑی عمارت قطعی غیر متوقع طور پر زمین بوس ہونے والی ہو۔"

"نان سینس" وہ سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے حقارت سے بولی "مجھے یہ افسانوی اور فلمی قسم کے ڈائیلاگ اچھے نہیں لگتے۔ تم اچھے بھلے پریکٹیکل آدمی ہو۔ یہ چھٹی حس کی باتیں چھوڑو..."

"قاسم خان نے شاید آپ کو یہ نہیں بتایا کہ ہماری لائن میں چھٹی حس بہت اہم چیز ہے" میں نے کہا۔

"قاسم خان بے چارہ خیر مجھے کیا بتائے گا" اس نے ایک طویل کش لیا اور دھواں میری سمت میں چھوڑتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکنے لگی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ گویا دل ہی دل میں کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے' ہمیں کھل کر گفتگو کرنی چاہئے۔ تم بھی کچھ الجھن زدہ نظر آ رہے ہو اور میں بھی بات کرتے ہوئے کچھ دشواری محسوس کر رہی ہوں۔ تم شاید اب بھی نہیں سمجھ سکے ہو کہ یہ سارا کاروبار درحقیقت میرے ہی دم قدم سے چل رہا ہے۔ ہمارے سارے سیٹ اپ کے پیچھے میرا ہی ذہن کام کر رہا ہے۔ میں نے ہی قاسم خان کو قاسم خان بنایا ہے' ورنہ وہ کیا تھا؟ ایک معمولی درجے کا اُچکا... جو کبھی کبھار تھوڑا بہت مال اپنے سوٹ کیسوں وغیرہ کے خفیہ خانوں میں چھپا کر کسی ملک میں لے جاتا تھا اور وہ بھی اس وقت جب دنیا کے خاص خاص ایئرپورٹس پر ممنوعہ چیزوں کی نشاندہی کرنے والی جدید ترین مشینیں نصب نہیں ہوئی تھیں۔ قسمت نے جب ہم دونوں کو ملا دیا تو میں نے اسے آگے بڑھنا سکھایا اور رفتہ رفتہ وہ اس مقام پر پہنچ گیا جہاں چند دن پہلے تک تم اسے دیکھتے رہے ہو!!"

میں دم بخود سلمٰی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ عورت جو میرے خیال میں بے راہروی کی زندگی چھوڑ کر ایک بدقماش کا سہارا قبول کر چکی تھی اور اپنے عہد پر قائم تھی اور پاکیزگی کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ میں اس سے اس کے ملکوتی حسن کے علاوہ اس کی ذات میں بلند و بالا چٹانوں جیسی مضبوطی دیکھ کر بھی متاثر ہوتا تھا مگر آج یہ تصور پاش پاش ہو گیا تھا۔ وہ یک لخت ہی ایک نئے روپ میں میرے سامنے آ گئی تھی۔ غیر معمولی عورت وہ اب بھی تھی مگر کچھ اور طرح کی۔ میں اب بھی اپنے آپ کو اس سے مرعوب محسوس کر رہا تھا مگر کسی اور انداز میں۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میرے نقطۂ نظر سے قاسم خان بالکل چغد آدمی ہے۔ جب تک وہ لفظ بہ لفظ میری ہدایات پر عمل کرتا رہا' کامیاب رہا۔ پھلتا پھولتا رہا۔ روز بروز ترقی کرتا رہا۔ پھر نہ جانے کیوں اسے شوق چرایا کہ اسے اپنے طور پر بھی فیصلے کرنے اور انتظامات چلانے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے اور اس نے اس کے لئے کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے پے در پے غلطیاں کیں لیکن میں کسی نہ کسی طرح معاملات کو سنبھالتی رہی۔ کہیں میری عقل کام آ گئی' کہیں میرے تجربات۔ کہیں میرے حسن کا جادو چل گیا اور کہیں میری معاملہ سازی کی بدولت بلا ٹل گئی۔ کہیں روپیہ کام آیا اور کہیں روپے کو استعمال کرنے کا سلیقہ۔ غرضیکہ بات بگڑی نہیں... مگر بجائے اس کے کہ قاسم خان اپنی غلطیوں سے سبق سیکھتا' اس کا احمقانہ اعتماد بڑھتا چلا گیا۔ سیٹھ واحد سے راہ و رسم پیدا کرنے سے میں نے اسے منع کیا تھا مگر معلوم نہیں کیوں وہ سیٹھ واحد کا نام سنتے ہی ریشہ خطمی ہو جاتا تھا۔ وہ اس بات کے لئے مرا جا رہا تھا کہ کبھی اس کا شمار بھی سیٹھ واحد کے دوستوں میں ہو۔ شاید سیٹھ واحد ہی اس کا آئیڈیل تھا۔ میں نے اسے بہت سمجھایا کہ بڑی مچھلی خواہ کتنی ہی ہمدرد نظر آئے لیکن بالآخر وہ چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے یا پھر ویسے ہی بڑی مچھلی کے ساتھ کسی رگڑے میں ماری جاتی ہے مگر اس نے میری ایک نہ مانی۔ پہلے تمہیں بھیجا' پھر خود اس سے ملنے جلنے لگا۔ کوکین کی پچھلی کھیپ لے کر وہ گدھوں کی طرح منہ اٹھا کر خود ہی چل دیا اور اس نے مجھے بتایا تک نہیں لیکن جب کامیاب لوٹ آیا تو میرے سامنے اس نے خوب شیخی بگھاری۔ اس کا خیال تھا کہ باہر مال لے جانا تو بالکل آسان ہے کیونکہ وہاں انسان پر تھوڑا بہت اعتماد کیا جاتا ہے۔ انسان کا انگ انگ ٹٹول کر اور اس کے سامان کی سلائیاں تک اُدھیڑ کر نہیں دیکھی جاتیں۔ ویسے بھی وہ ماضی میں چھوٹی موٹی چیزیں لے کر بہت سے ممالک کے ایئرپورٹس سے بہ خیر و عافیت گزرتا رہا تھا اس لئے اس کا حوصلہ بڑھا ہوا تھا۔ لیکن شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ منشیات کے سلسلے میں بیشتر ممالک کی پولیس اور دیگر ایجنسیاں کتنی سخت ہیں۔ اس بار بھی اس نے مجھے اپنے پروگرام کی ہوا تک نہیں لگنے دی اور بالآخر پکڑا گیا۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ "سو دن چور کے ایک دن شاہ کا" وہ ایک طویل سانس لے کر خاموش ہو گئی۔

"چلیے..... یہ سب کچھ تو اب ہو چکا۔" میں نے سنبھل کر کہا۔ "سوال یہ ہے کہ اب آپ کیا کریں گی؟"

"سب سے پہلے تو میں یہ کر رہی ہوں کہ جس قدر جلد بھی ممکن ہو سکا میں امریکا روانہ ہو جاؤں گی۔" وہ نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔ "ویزے اور ٹکٹ کے لئے میں نے آدمی دوڑا دیئے ہیں۔ آج شام تک پتا چل جائے گا۔ نیویارک پہنچ کر مجھے قاسم خان کے لئے وکیلوں وغیرہ کا بندوبست کرنا ہوگا اور اگر کوئی سفارش لڑ سکی' کوئی اثر و رسوخ کام آ سکا تو اس کے لئے بھی کوشش کروں گی گو کہ اس کی امید نہیں ہے۔ ہماری تمام تر کوششوں کے باوجود بہرحال قاسم خان لمبے عرصے کے لئے اندر ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں ہمیں کسی خوش فہمی میں گرفتار نہیں رہنا چاہئے۔ قاسم خان کے کیس کا فیصلہ ہو جانے کے بعد میں واپس آ کر کام خود سنبھال لوں گی۔ پس پردہ رہنے کے بجائے میں تم لوگوں کے سامنے آ جاؤں گی۔ کچھ عرصہ تم لوگوں کو غیر فعال رہنا ہوگا۔ جب معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا تو ہم دوبارہ اپنے دھندے سے لگ جائیں گے۔"

"میں معذرت چاہوں گا۔ شاید میں آپ کے لئے کام نہ کر پاؤں" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"کیا....؟" اس نے بری طرح چونک کر میری طرف دیکھا۔ اس کے سر پر جیسے کوئی بم پھٹ پڑا تھا۔

میں نے فیصلہ کن لہجے میں اپنے الفاظ دہرائے تو ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں سفاکی جھلک آئی۔ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں وہ بولی "تمہیں معلوم ہے کہ ہم جیسے لوگوں سے قطع تعلق کرنا کوئی آسان کام نہیں"

"مجھے معلوم ہے۔ اگر مجھے اس میں کوئی دشواری پیش آئی تو میں اسے برداشت کر لوں گا" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

کسی مصلحت کے تحت اس نے گویا یک لخت پینترا بدلنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھوں سے سفاکی کی لہر یکایک معدوم ہو گئی اور اس کی جگہ دل فریب عنایتوں کا رنگ جھلک آیا۔ بڑے شیریں لہجے میں وہ بولی "میرا خیال تھا کہ قاسم خان کے بجائے تمہیں براہِ راست میرے لئے کام کر کے زیادہ خوشی ہوگی۔ آخر کیوں تم نے اچانک ایسا فیصلہ کر لیا؟"

"بات خوشی اور دکھ کی نہیں ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "بات اعتقاد اور دل کی گواہی کی ہے۔ مانا کہ اب تک سارا کام آپ ہی کی حکمتِ عملی سے چل رہا تھا اور بلاشبہ آپ نہایت ہی ذہین اور باصلاحیت خاتون ہیں جس کا سب سے بڑا

ثبوت یہ ہے کہ اب تک کوئی آپ کے اصل روپ سے آگاہ نہیں ہوسکا تھا... اور اب بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آپ کی شخصیت کے کتنے رنگ ہیں... مانا کہ قاسم خان کی کامیابیاں آپ ہی کی ذہانت کی رہین منت رہی ہوں گی لیکن میرا خیال ہے' اس میں کچھ نہ کچھ دخل تو اس کے مقدر کا بھی رہا ہوگا۔ میں مقدر کا بہت ہی قائل ہوں میڈم ...!"

"یہ مجھے میڈم وغیرہ جیسے بھاری بھرکم القابات سے مخاطب کرنے کی کوئی ضرورت نہیں" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی "تم سیدھے سادے طریقے سے مجھے سلمٰی کہہ کر بات کرسکتے ہو۔"

"بہتر... تو میں یہ کہہ رہا تھا سلمٰی کہ میں مقدر کا بہت ہی قائل ہوں" میں نے سلسلۂ کلام جوڑا "قاسم خان آپ کی نظر میں کتنا ہی احمق سہی لیکن ممکن ہے' اب تک اس کا مقدر اس کا ساتھ دیتا رہا ہو۔ اب جبکہ وہ ہم سے بہت دور ہے اور شاید اس کی تقدیر گردش میں آچکی ہے تو جانے کیوں مجھے وہم ہو رہا ہے کہ اب بات نہیں بنے گی۔ میرا کچھ دل نہیں مان رہا اب گروہ میں شامل رہنے کو۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اتنے غیر منطقی آدمی ہو" اس کی آنکھوں میں سرد مہری سی آگئی۔ مجھے واقعی بڑی حیرت تھی کہ میں آج تک اس عورت کو دریافت نہیں کرپایا تھا۔ میں جب سے اسے قاسم خان کی بیوی کے روپ میں دیکھ رہا تھا' وہ ایک سادگی پسند' قول نبھانے والی اور بڑی وفاشعار قسم کی عورت تھی جسے دیکھ کر گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ وہ کبھی بیروت کے کسی کلب میں ڈانسر تھی۔ اس کی شخصیت پر اس کے ماضی کی معمولی سی پرچھائیں بھی تو نظر نہیں آتی تھی' سوائے اس کے کہ پختہ العمر ہونے کے باوجود اس کا جسم سڈول تھا اور خدوخال کی رعنائی و دلکشی برقرار تھی۔ اب میں اسے دیکھ رہا تھا تو یہ یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا کہ یہ وہی عورت تھی جو اپنے ماضی کو تج کر سادگی پسند' قول نبھانے والی اور وفاشعار بیوی بنی ہوئی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے دل ہی دل میں اس عورت سے ہلکا سا خوف بھی محسوس ہو رہا تھا۔ پل پل رنگ بدلنے والی وہ عورت اپنے اندر جانے کتنے زہر چھپائے بیٹھی تھی لیکن میں بھی اچانک ہی فیصلہ کرچکا تھا کہ اگر مجھے زندگی کے میدان میں کچھ اور تیزی سے آگے بڑھنا ہے تو مجھے اس عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا ہوگی۔ اپنی الگ اور خود مختار حیثیت بنانے کا یہ بڑا عمدہ موقع تھا۔ میں اب قاسم خان جیسے خود غرض آدمی اور سلمٰی جیسی ناقابلِ اعتبار عورت کی تکوی سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا اور اس سے اچھا موقع مجھے شاید پھر کبھی نہ ملتا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "مجھ سے واہموں اور اندازوں کی روشنی میں بات مت کرو۔ مجھ سے دو اور دو چار کی طرح ٹھوس بات کرو۔"

"میں جو بھی بات کر رہا ہوں' وہ دو اور دو چار کی طرح ٹھوس ہی ہے خواہ اس کے پیچھے میرے واہمے کام کر رہے ہوں یا اندازے" میں نے نپے تلے لہجے میں کہا۔

وہ پلکیں جھپکائے بغیر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہی ہے لیکن بظاہر وہ جھیل کی طرح پُرسکون تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس عورت کے ہاتھ میں ابھی بڑے وسائل اور بڑی طاقت باقی ہے۔ اسے یقیناً اس بات پر بڑا طیش آرہا ہوگا کہ مجھ جیسے نو آموز اور انہی کے پروردہ نوجوان پر اس کا کوئی وار نہیں چل رہا تھا۔ میں نہ تو اس کے لہجے میں چھپی ہوئی دھمکی سے مرعوب ہوا تھا اور نہ ہی اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی متوقع نوازشات کے وعدے نے میرا دل لبھایا تھا۔

عام حالات میں شاید میں اتنی غیر معمولی عورت کی آنکھوں میں اپنے لئے مہر و محبت کی جھلک دیکھ کر خوشی سے پھولا نہ سماتا لیکن جب سے میں راحیلہ کی محبت میں گرفتار ہوا تھا اور کراچی سے واپس آیا تھا' تب سے اس کا تصور گویا مستقل طور پر میری آوارہ سوچوں پر پہرے دار بن کر بیٹھ گیا تھا۔ کسی اور سے ناتا جوڑنے کو اب گویا دل ہی نہیں چاہتا تھا۔ کسی کی طرف التفات طلب نگاہ سے دیکھنا جرم سا محسوس ہونے لگا تھا۔

سلمٰی کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ملازم نے آکر اطلاع دی کہ اس کا فون ہے۔ سلمٰی سگریٹ پھینک کر بے تابی سے اٹھی اور تقریباً دوڑتی ہوئی اندر چلی گئی۔

اس کی واپسی خاصی دیر بعد ہوئی۔ اس دوران میں اتنا بور ہوچکا تھا کہ ملازم سے چائے منگوا کر پی چکا تھا۔ سلمٰی آکر خاموشی سے میرے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے لئے چائے کا ایک کپ تیار کیا۔ اس دوران میں نے اس کے ہاتھ میں بہت ہی خفیف سی لرزش محسوس کی۔ بظاہر وہ پہلے ہی کی طرح پُرسکون تھی لیکن میں نے اس کے انداز میں ایک تبدیلی محسوس کرلی تھی۔ اس کی آنکھوں میں چند لمحے پہلے جو چنگاری سی روشن تھی وہ گویا یکایک ہی بجھ چکی تھی۔

وہ چائے کی چند چسکیاں لے چکی تو میں نے پوچھا "فون امریکا سے تھا؟"

"نہیں" وہ دھیمے لہجے میں بولی "سیٹھ واحد کا فون تھا اور وہ یہیں لاہور سے ہی بول رہا تھا۔"

"سیٹھ واحد کا!" میں نے قدرے حیرت سے کہا "شاید اس نے اخبار میں خبر دیکھی ہوگی۔ اظہار ہمدردی کر رہا ہوگا؟"

"اظہارِ ہمدردی" وہ تلخ سے انداز میں ہنس دی "ابی! تم کون سی دنیا کے باشندے ہو؟ بعض اوقات تو تم مجھے اپنی لائن کے آدمی ہی نہیں لگتے۔ سیٹھ واحد کے پاس اتنا وقت نہیں

ہوتا کہ وہ اسے ہمدردیوں کے اظہار میں ضائع کرتا پھرے۔ اس سے بات کرکے مجھ پر ایک حیرت انگیز انکشاف ہوا ہے جس نے ایک لمحے کے لئے مجھے بھی سوچنے پر مجبور کردیا کہ کہیں تمہارے واہمے درست ہی تو نہیں ہیں!"

میں منتظر انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ چائے کی مزید چند چسکیاں لے کر کپ میز پر رکھتے ہوئے بولی "سیٹھ واحد دراصل اپنی رقم مانگ رہا تھا۔"

"رقم... کیسی رقم؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی "یہ سن کر شاید تمہیں بھی حیرت ہو کہ قاسم خان نے کوکین کی یہ کھیپ سیٹھ واحد کے توسط سے حاصل کی تھی جو نیویارک ایئرپورٹ پر پکڑی گئی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ یہ کھیپ کریڈٹ پر تھی۔"

"کریڈٹ پر...؟" میں ایک بار پھر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ "لیکن ہماری لائن میں تو کریڈٹ نہیں چلتا۔"

"ہاں... یہی اس معاملے کا مزید ستم ظریفانہ پہلو ہے" سلمٰی نے ایک گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگائی "قاسم خان نے اس سے پارٹنرشپ کی بنیاد پر یہ کھیپ لی تھی جس کی رو سے معاہدہ کچھ اس قسم کا بنتا تھا کہ وہ بین الاقوامی مارکیٹ میں اس کھیپ کی قیمتِ فروخت میں حصے دار ہوں گے اور قاسم خان ہر حال میں اس کا آدھا حصہ سیٹھ واحد کو ادا کرنے کا پابند ہوگا۔ گویا اس معاملے میں قاسم خان نے کوئی ایک حماقت نہیں بلکہ حماقت در حماقت کی ہے۔ اس حساب سے کھیپ کی قیمت دو کروڑ سے اوپر ہے۔ یعنی قاسم خان' سیٹھ واحد کو ایک کروڑ روپیہ ادا کرنے کا پابند ہے۔ اب کوئی قاسم خان سے پوچھے کہ گدھے! تمہیں اس قسم کی پارٹنرشپ میں کوکین لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم کوئی اتنے گئے گزرے تو نہیں تھے کہ ملکی مارکیٹ کے ریٹ سے کوکین خرید کر نہ لے جاسکتے۔ قاسم خان زیادہ سے زیادہ پانچ سات لاکھ روپیہ خرچ کرکے اتنا ہی مال لے جاسکتا تھا۔ پکڑا جاتا تو نقصان پانچ سات لاکھ کا ہی ہوتا اور وہ ذاتی نقصان ہوتا۔ ہم کسی کو جواب دہ تو نہ ہوتے۔ سیٹھ واحد کو بھی اس پر بہت غصہ آرہا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ اس نے قاسم خان کو مال لے جانے کا محفوظ ترین طریقہ بھی بتادیا تھا مگر قاسم خان نے معلوم نہیں اپنی تیزی و طراری ثابت کرنے کے لئے یا پھر صرف چالیس پچاس ہزار روپیہ بچانے کے لئے خود مال لے جانے کی کوشش کی اور پکڑا گیا۔ اس نے یک لخت ہی بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا' لٹیا ہی ڈبو دی۔ اب بتاؤ ایک کروڑ سیٹھ واحد کو دے کر ہماری کمر ٹوٹ جائے گی یا نہیں؟"

"کوئی ضروری نہیں ہے کہ اسے ایک کروڑ ہی دیا جائے" میں نے کہا "اسے بھی معلوم ہے کہ مال بھی پکڑا گیا ہے اور قاسم خان بھی۔ ظاہر ہے' ہمیں بہت بڑے بحران کا سامنا ہے۔ وہ ملکی مارکیٹ ریٹ سے ہم سے پانچ سات لاکھ لے لے۔"

سلمٰی کی آنکھوں میں تھکن سی جھلک آئی۔ ایک بار پھر اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے کوئی بچہ اس کے سامنے بے سروپا سی باتیں کئے جا رہا ہو۔ کچھ باتیں واقعی میری سمجھ میں نہیں آرہی تھیں اور کچھ میں جان بوجھ کر بھی بچہ بنا ہوا تھا۔

"تمہیں اچھا بھلا معلوم ہے ابی کہ اسمگلروں کے اصول کتنے سخت ہوتے ہیں" بالآخر وہ بولی "عام لوگ عدالتی کاغذوں پر اقرار نامے اور معاہدے طے کرتے ہیں' وکیلوں اور گواہوں کی موجودگی میں سب کچھ لکھا جاتا ہے۔ اس کے باوجود بعد میں جب بھی انہیں موقع ملتا ہے یا وہ ضرورت محسوس کرتے ہیں تو ان معاہدوں سے منکر ہوجاتے ہیں اور ان کے معاملات برسوں عدالتوں میں لٹکے رہتے ہیں لیکن ہم لوگوں میں ایسا نہیں ہوسکتا۔ سب کچھ زبانی ہوتا ہے لیکن بس جو طے ہوگیا سو ہوگیا۔ اس سے منکر ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جہاں کسی کی نیت میں فرق آیا وہیں دو فریقوں میں ٹھن گئی۔ کتنی ہی جانیں ضائع ہوتی ہیں اور بالآخر ایک بار کی چھڑی ہوئی دشمنی کسی ایک فریق کی تباہی اور کبھی کبھی تو دونوں فریقوں کی تباہی پر ختم ہوتی ہے... اور ہمارا معاملہ تو سیٹھ واحد سے ہے۔ سیٹھ واحد ان لوگوں میں سے نہیں کہ جن کے ساتھ کئے گئے معاہدے سے منکر ہونے کے بعد کوئی اس ملک میں رہ سکے بلکہ اس سے بدمعاملگی کرکے تو کسی اور ملک میں بھی خیر و عافیت سے رہنا ممکن نہیں۔"

"تو پھر دوسرا پینترا آزماؤ" میں نے قدرے جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا" تمہاری جنبشِ ابرو سے تو بڑے بڑے پتھریلے دلوں کے قفل کھل سکتے ہیں۔"

"خاک کھل سکتے ہیں" وہ میری بات کا برا منائے بغیر پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میری مہرباں نگاہیں تم جیسے نوجوان اور نو آموز پر تو کوئی اثر کر نہیں سکیں' سیٹھ واحد جیسے گھاگ آدمی کا دل کیا موم کریں گی۔"

"میری بات اور ہے" میں نے کہا"میں تو کسی سے وفا کا پیاں نبھا رہا ہوں' ورنہ شاید تمہارے قدموں میں لوٹ رہا ہوتا۔"

"سیٹھ واحد کی بھی بات اور ہے" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "تم اسے نہیں جانتے۔ میں جانتی ہوں۔ وہ جب ہانگ کانگ کے قریب نیلے پانیوں میں جھاگ اڑاتی موٹربوٹ میں لیتا ہوتا ہے یا فلوریڈا کے کسی ساحلی مقام پر دھوپ سینک رہا ہوتا ہے تو اس کے دائیں بائیں نہ جانے کس کس رنگ و نسل کی اور کتنی ہی لڑکیاں موجود ہوتی ہیں۔ وہ مجہول سا انسان اگر اتنی آسانی سے نظروں کے تیروں سے گھائل ہونے لگتا تو آج وہ سیٹھ واحد نہیں' کوئی چیز تناطیہ ہوتا" پھر یک لخت جیسے سلمٰی کو کچھ یاد آگیا "یہ جو تم ابھی وفا کا پیاں نبھانے کی بات کررہے تھے' یہ کیا قصہ ہے؟ کیا تم بھی ایسے کسی سنگین مرض میں مبتلا ہوچکے ہو؟"

"ان باتوں کو چھوڑو۔ اس وقت ہم زیادہ ضروری باتیں کررہے ہیں" میں نے کہا۔

"چھوڑو... اب کیا باتیں رہ گئی ہیں" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی "تم نے تو بات ہی ختم کردی۔ بہت غلط وقت پر ساتھ چھوڑ رہے ہو تم۔ اگر قاسم خان بری ہوکر آگیا تو تمہیں قتل کرادے گا۔ یہ نیک کام میں بھی کرسکتی ہوں لیکن میں اس آس پر تمہیں چھوڑ رہی ہوں کہ شاید کچھ عرصے بعد تم اپنا ارادہ بدل دو۔"

"جہاں تک جان کے خوف کا تعلق ہے تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ جب انسان یہ خوف دل سے نکال دیتا ہے تبھی اس لائن میں آتا ہے" میں نے کہا" اور جہاں تک ارادہ تبدیل کرنے کا سوال ہے تو میں ایسے ارادوں کو شاذونادر ہی دل میں جگہ دیتا ہوں جنہیں تبدیل کرنا پڑے۔"

"خیر..." وہ طویل سانس لے کر بولی "یقین رکھو' میں تمہارے بغیر بھی کاروبار چلالوں گی۔ گروہ میں تمہاری کمی میں بہت جلد پوری کرلوں گی۔"

"مجھے خوشی ہوگی" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تم ہمیں کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کروگے؟ تمہیں ہمارے بیشتر راز معلوم ہیں" وہ بولی۔

"کیا تم مجھے ایک گھٹیا آدمی سمجھتی ہو" میں نے قدرے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

"سمجھتی تو نہیں لیکن آدمی کو گھٹیا بنتے دیر تو نہیں لگتی" وہ ملائمت سے بولی۔

"میں گروہ میں ہمیشہ جواں مردوں کی طرح رہا ہوں۔ گروہ سے باہر بھی جواں مردوں ہی کی طرح رہوں گا" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

"کروگے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ابھی مجھے خود کچھ نہیں معلوم۔ میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا۔ شاید میں کراچی چلا جاؤں" میں نے کہا۔

"بہرحال ... جب تک یہاں ہو تب تک رابطے کی کیا صورت رہے گی؟" اس نے پوچھا۔

"میں خود رابطہ قائم کرتا رہوں گا" میں نے کہا۔

"ویسے تم تو خواہ مخواہ گھبرا کر گھر چھوڑ گئے ہو۔ تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ حتیٰ کہ تمہیں کوئی پکڑوانا بھی چاہے تب بھی تمہارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ہے۔ خطرہ اگر کوئی ہوسکتا ہے تو سب سے زیادہ مجھے ہوسکتا ہے۔ تم لوگ تو صرف اسی وقت خطرے میں ہوتے ہو جب مال تمہارے پاس ہوتا ہے۔ رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کی صورت میں ہی تمہیں کوئی سنگین سزا مل سکتی ہے۔"

"خیر... یہ میرے مسائل ہیں" میں اٹھتے ہوئے بولا "اب میں چلوں..."

"خدا حافظ" وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولی۔

گیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ کھوئی کھوئی سی نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ چوکی دار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ میں تیزی سے مڑا اور باہر آگیا۔ دزدیدہ سی نظروں سے میں نے ایک بار کوٹھی کے خوبصورت درودیوار کو ضرور دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے دل میں ہلکی سی کسک محسوس ہوئی۔ کچھ زیادہ مدت نہیں بیتی تھی کہ میں گاڑی کی پچھلی نشست پر اشرف خان کی لاش لئے اس گھر کے دروازے پر پہنچا تھا۔

اس گھر کے وسیلے سے مجھے بہت کچھ ملا تھا۔ پناہ' تجربہ' دولت' خود اعتمادی اور بالغ نظری ... بہت جلد ہی میں اس گھر سے ناتا توڑ کر جارہا تھا لیکن مجھے اپنے اس فیصلے پر زیادہ پچھتاوا نہیں تھا۔ میرے دل نے کہا تھا کہ مجھے جلد از جلد قاسم خان سے جان چھڑا لینی چاہئے' ورنہ میں رگڑا جاؤں گا۔ میں بہرحال دل کی آواز پر لبیک کہنا چاہتا تھا۔

یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نہایت پُرامن انداز میں گروہ سے الگ ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا' ورنہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ شاہ رخ کا انجام مجھے یاد تھا۔ اس نے تو خیر ہیرا پھیری کرکے فرار ہونے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ دیانتداری سے کام کرنے والوں کے لئے بھی قاسم خان یا

شاید سلمٰی کی مرضی کے بغیر گروہ سے علیٰحدہ ہونا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

میں ٹہلنے کے سے انداز میں گلی کے موڑ تک پہنچ گیا۔ عین اس وقت جبکہ میں موڑ مڑ رہا تھا' میں نے دوسری سمت سے پولیس کی ایک جیپ کو گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ جیپ میرے قریب سے گزر کر گلی میں داخل ہو گئی۔ ایک لمحے کے لئے میں ٹھٹکا لیکن جیپ میں موجود لوگوں میں سے کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی اور میں اسی طرح ٹہلنے کے سے انداز میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

چند قدم چلنے کے بعد جب میں نے دیکھا کہ دوسری گلی میں بھی کوئی نہیں ہے تو میں پلٹ کر آیا اور کونے کے ایک مکان کا نمبر دیکھنے کے بہانے میں نے گلی میں جھانک کر دیکھا۔ میری توقع کے عین مطابق پولیس جیپ قاسم خان کے گھر کے سامنے ہی رکی تھی اور ایک باوردی آفیسر چوکیدار سے کچھ کہہ رہا تھا۔ ایک اور باوردی آفیسر اور ایک سادہ لباس والا اس کے برابر کھڑا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں بہت ہی مناسب وقت پر گھر سے نکل آیا تھا۔ معلوم نہیں کیا سلسلہ تھا اور پولیس افسران کس نیت سے آئے تھے۔

میں تیزی سے آگے چل دیا۔ نسبتاً ایک بڑی سڑک پر پہنچ کر مجھے ٹیکسی مل گئی اور میں ہوٹل لوٹ آیا۔ کچھ دیر تک میں بستر پر لیٹا آنکھیں بند کئے' تازہ ترین حالات کا تجزیہ کرتا رہا پھر میں سب کچھ ذہن سے جھٹک کر ایک رسالے کی ورق گردانی کرنے لگا۔

شام کو میں نے قاسم خان کے گھر فون کیا۔ ریسیور سلمٰی ہی نے اٹھایا۔ اس کی آواز سن کر میں نے اطمینان کی سانس لی۔

"پولیس کس لئے آئی تھی؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"اچھا.... تم ہو...." اس نے میری آواز پہچان کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "پولیس کچھ رسمی سی پوچھ گچھ کرنے آئی تھی۔"

"انہوں نے تمہیں تفتیش میں اپنے مخصوص انداز میں تو نہیں گھسیٹا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے.....؟ مجھے بھلا وہ تفتیش میں کیوں گھسیٹیں گے؟" اس نے بڑی معصومیت سے کہا پھر وہ ایک کھنک دار قہقہہ لگا کر بولی۔ "تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں تو ایک مشرقی اور وفا شعار بیوی ہوں۔ مجھے تو اپنے شوہر کے اصل دھندوں کا ذرا بھی علم نہیں تھا۔ میں تو اسے ایک ممتاز بزنس مین اور معاشرے کا معزز فرد سمجھتی تھی۔ اس انکشاف سے مجھ پر بجلی سی گر پڑی ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑا ہے اور میں یکدم ہی بستر سے لگ گئی ہوں۔ دنیا میری نظروں میں اندھیر ہو گئی ہے۔ وغیرہ وغیرہ" اس نے ایک اور کھنک دار سا قہقہہ لگایا۔ "لو اگر تمہیں یقین نہیں آ رہا تو کل کے اخبارات دیکھ لینا۔"

"بڑی زبردست چیز ہو تم" میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"قدر شناسی ہے تمہاری.... ویسے بندی اس سے بھی زیادہ قابل ہے" وہ شوخ لہجے میں بولی۔

"قاسم خان کی کچھ خیر خبر ملی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں.... میں وہاں پہنچنے اور وکیلوں وغیرہ کا بندوبست کرنے کے لئے عجلت سے کام لے رہی تھی لیکن اب معلوم ہو گیا ہے کہ عجلت کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب میں آرام سے ہی نیویارک جاؤں گی۔" وہ بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"قاسم خان کو گرفتار ہوئے آج پانچواں دن ہے۔ پہلے دن اسے گرفتار کیا گیا۔ دوسرے دن عدالت میں پیش کیا گیا۔ تیسرے روز عدالت نے فیصلہ سنا دیا اور اسی وقت اسے جیل بھیج دیا گیا۔ آج اسے جیل میں دوسرا دن ہے۔ اسے سات سال کی سزا ہوئی ہے اب تو مجھے اس سے ملاقات ہی کرنے جانا ہے۔ اس کے لیے کچھ کرنا تو اب میرے بس کی بات نہیں رہی۔"

میں محض ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

"میں پرسوں امریکا روانہ ہو رہی ہوں" وہ بولی۔ "قاسم خان کو بتا دوں گی کہ جس ساتھی پر اسے سب سے زیادہ ناز تھا' وہ کتنے اچھے موقع پر اس کا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔"

"اس بیان میں ترمیم کی ضرورت ہے" میں نے جلدی سے کہا "قاسم خان اگر میرے سامنے موجود ہو تو میں اب بھی اسے باس ماننے اور اس کے احکامات کی تعمیل کے لئے تیار ہوں۔ میں نے قاسم خان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ گیا ہے۔"

"خیر... چھوڑو اس بحث کو" اس نے قدرے اکتاہٹ سے کہا "یہ بتاؤ کہ تم کب تک اس طرح چھپے رہو گے؟"

"جب تک میری چھٹی حس مجھے خطرے کے سگنل دینا بند نہیں کر دیتی" میں نے جواب دیا "یہ بتاؤ کہ امریکا سے کب تک واپس آنے کا ارادہ ہے؟"

"آٹھ دس دن تو لگ ہی جائیں گے" سلمٰی نے جواب دیا۔

"میں اب تمہاری واپسی پر ہی تم سے بات کروں گا اور حالات معلوم کروں گا" میں نے کہا۔

"اب اس کی کیا ضرورت رہ گئی ہے؟" وہ طنزیہ سے لہجے میں بولی "تم نے خدا حافظ کہہ دیا۔ ہم نے سن لیا۔ ایک دوسرے کی طرف ہمارا کچھ لین دین بھی نہیں نکلتا۔ پھر اب کیوں بار بار فون کر کے وقت ضائع کرتے ہو؟"

"میں نے بطور ملازم ساتھ چھوڑا ہے' بطور انسان نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد چند دن گزارنا میرے لئے خاصا صبر آزما کام ثابت ہوا۔ اتنی فرصت' ایسی بے مقصدیت تھی کہ بعض اوقات تو جھنجلا کر کسی درخت سے ٹکریں مارنے کو جی چاہتا تھا۔ اس دوران ایک مرتبہ میں نے رات کو تمام تر احتیاطی تدابیر کے ساتھ اپنے گھر کا بھی چکر لگایا اور یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ میرے مکان کی نگرانی نہیں ہو رہی تھی۔ میں گیٹ تک جا کر اپنا پوسٹ بکس بھی دیکھ آیا۔ اس میں راحیلہ کا کوئی خط موجود نہیں تھا حالانکہ میں گزشتہ دنوں میں اسے کئی خطوط ارسال کر چکا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اب تو اس کے امتحانات بھی ختم ہو چکے تھے۔ اس سے اگلے روز میں نے ہوٹل سے کال بک کرا کے کراچی فون کیا۔ راحیلہ سے بات نہیں ہو سکی۔ ملازمہ نے بتایا کہ وہ اپنی کسی دوست کے گھر گئی ہوئی ہے۔

وقت گزاری کے لئے میں نے آتش دہلوی کے ہاں جانا شروع کر دیا۔ وہ اور ان کی مہرباں زیب النساء آج کل بہت خوش تھے۔ جس دن میں نے منظور کا دماغ درست کیا تھا' اس دن کے بعد سے ان کے کسی کرائے دار نے انہیں تنگ نہیں کیا تھا۔ پھر بڑی بی کیس بھی جیت گئی تھیں اور وہ لوگ ان کی کوٹھی کا نچلا حصہ خالی کر گئے تھے البتہ جاتے وقت تھوڑی سی توڑ پھوڑ ضرور کر گئے تھے۔ اس حصے میں اب بڑی بی نے ایک سماجی کارکن کے تعاون سے لڑکیوں کے لئے دستکاری کا اسکول کھول دیا تھا اور ان کا ارادہ تھا کہ وہ کوٹھی اسکول ہی کے نام کر جائیں گی۔ اب انہیں کرایہ معقول مل رہا تھا جس سے ان کی گزر بسر عمدگی سے ہو رہی تھی۔

آتش دہلوی صاحب کا وہی حال تھا۔ وہی چال بے ڈھنگی... بہرحال ان کے ساتھ وقت اچھا گزر جاتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ان میں اب بھی کیسی زبردست تخلیقی صلاحیتیں موجود تھیں مگر اس شخص نے اپنے آپ کو مٹی میں ملا دیا تھا۔ میں نے ایک بار انہیں زندگی کی تعمیرِ نو کے موضوع پر لیکچر بھی دینے کی کوشش کی اور پوچھا کہ آخر وہ کیوں اپنے آپ کو خوار کئے ہوئے تھے۔ جواب میں انہوں نے مسکراتے ہوئے ساحر کا یہ شعر پڑھ دیا:

تونے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے

ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا "کبھی کبھی خود کو برباد کرنے میں بھی بڑی لذت محسوس ہوتی ہے۔"

اس روز ان کے ساتھ بہت دیر کی مغز کھپائی کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ وہ تباہی کی اس منزل پر پہنچ چکے ہیں جہاں سے ان کی واپسی ممکن نہیں۔ بہرحال اتنا ضرور تھا کہ جتنی دیر وہ میرے ساتھ رہتے تھے' الٹی سیدھی حرکتیں نہیں کر پاتے تھے اور لوگوں کے ہاتھوں ذلیل ہونے سے باز رہتے تھے۔

پورے دس دن بعد میں نے سلمٰی کو فون کیا۔ اس بار بھی فون اسی نے ریسیو کیا اور میری آواز پہچانتے ہی بے تابانہ لہجے میں بولی "ارے... کہاں مر گئے تھے تم؟ میں بہت بے چینی سے تمہارے فون کی منتظر تھی۔"

"لیکن تم نے تو خود ہی کہہ دیا تھا کہ اب بھلا بات چیت کی کیا ضرورت رہ گئی ہے" میں نے اسے یاد دلایا۔

"وہ تو میں جلے دل سے کہہ رہی تھی" وہ جلدی سے بولی "خیر... اس وقت ان باتوں کو رہنے دو۔ مجھے تم سے بہت ہی ضروری گفتگو کرنی ہے جو فون پر نہیں ہو سکتی۔ اب مجھے اس فون کی طرف سے بھی اطمینان نہیں رہا۔ تم سے کہاں ملاقات

ہوسکتی ہے ؟"

"تم امریکا سے کب آئیں ؟" میں نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں امریکا جا ہی نہیں سکی۔ اسی سلسلے میں تو تم سے باتیں کرنی ہیں۔ بتاؤ میں کہاں آؤں ؟" اس نے بے تابی سے کہا۔

"جگہ تمہارے شایان شان تو نہیں" میں نے سوچتے ہوئے کہا "بہرحال میری نظر میں وہی مناسب ہے" میں نے اسے اسی اسنیک بار کا نام بتایا جہاں آتش دہلوی سے پہلی بار میری ملاقات ہوئی تھی۔ اسنیک بار مین مارکیٹ سے قریب تھا اور میں اپنے ہوٹل سے ٹہلتا ہوا وہاں تک جاسکتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ اسی اسنیک بار سے متصل عمارت دفاتر پر مشتمل تھی۔ اس کی سیڑھیاں چڑھ کر میں کسی بھی فلور کی کھڑکی سے جھانک سکتا تھا اور نظر رکھ سکتا تھا کہ سلمٰی تنہا آرہی ہے یا کسی کے ساتھ۔ کوئی اس کا تعاقب کررہا ہے یا نہیں ؟

"ٹھیک ہے، میں پہنچ جاؤں گی" سلمٰی بولی "لیکن کم از کم آدھ گھنٹے بعد۔ تاکہ اندھیرا ذرا گہرا ہو جائے۔ کچھ لوگ گھر کی نگرانی کر رہے ہیں۔ مجھے ان کو غچہ دے کر آنا ہو گا۔"

"بہت بہتر" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

آدھ گھنٹے سے کچھ پہلے ہی میں ہوٹل سے نکلا اور ٹہلتا ہوا اس اسنیک بار تک پہنچا۔ میں اس اسنیک بار میں جانے کے بجائے متصل عمارت کی سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل کی راہداری کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ قریب ہی ایک سینما تھا جس میں چند ہی لمحے پہلے شو ختم ہوا تھا۔ چند لمحے بعد سڑک پر سے ہجوم ختم ہو گیا۔ اس کے تھوڑی ہی دیر بعد میں نے سلمٰی کی سرخ مرسڈیز چوراہے سے چھوٹی سڑک پر آتے دیکھی۔ وہ تنہا ہی تھی۔ گاڑی اس نے اسنیک بار سے ذرا دور ایسی جگہ کھڑی کی جہاں روشنی کم تھی۔ وہ گاڑی سے اتر کر انگلیوں میں پرس جھلاتی ہوئی لاابالی سے انداز میں اسنیک بار کے دروازے کی طرف چلی آئی۔ میں نے اس کے عقب میں نہ تو کوئی گاڑی رکتے دیکھی اور نہ ہی مجھے شبہ ہوا کہ کوئی اس کے تعاقب میں تھا۔ اس کے باوجود میں دو تین منٹ تک وہیں کھڑکی میں ہی کھڑا رہا۔ سلمٰی اندر جا چکی تھی۔

بالآخر میں سیڑھیاں اتر کر اس عمارت سے نکل آیا اور اسنیک بار میں جا پہنچا۔ وہ گیلری نما بالائی حصے میں ایک گوشے میں بیٹھی تھی اور قدرے بے نیازی سے مینو کو الٹ پلٹ رہی تھی۔ میں خاموشی سے اس کے مقابل جا بیٹھا۔

"تم تو اب ایٹی کیٹس بھی بھولتے جا رہے ہو۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر دھیمی آواز میں بولی "خواتین کو انتظار نہیں کرایا کرتے۔"

"انتظار تو میں کر رہا تھا لیکن یہاں سے ذرا ہٹ کر۔" میں نے کہا۔

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔" اس کی کھنک دار سی ہنسی ابھری لیکن اسنیک بار میں گونجتی ہوئی بھنبھناہٹ میں اس کی ہنسی صرف میں ہی سن سکتا تھا۔

اس نے اپنا گوگو چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا اور کھلے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "مجھے یقین تھا کہ تم آس پاس کہیں کھڑے جائزہ لے رہے ہو گے کہ مجھ سے ملنا مناسب بھی رہے گا یا نہیں۔ تمہاری احتیاط پسندی میں کوئی کمی نہیں آرہی ہے حالانکہ تم دیکھ رہے ہو کہ میں اب تک آزاد پھر رہی ہوں اور جن مشکلات میں میں گھری ہوئی ہوں ان کا تم تصور تک نہیں کر سکتے۔"

"تم بڑی عورت ہو۔ تمہارے مسائل بھی بڑے ہیں اور وسائل بھی۔ کسی نہ کسی طرح مسائل سے نمٹ ہی لو گی۔ میں ایک چھوٹا آدمی ہوں۔ بچ بچا کر چلنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا "تم اصل موضوع پر بات کرو۔"

اسی لمحے ویٹر ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا۔ اسے آرڈر دینے کے بعد سلمٰی بولی "شاید تمہیں یہ جان کر لاشعوری طور پر خوشی ہو کہ تمہارے واہمے تمہاری توقعات سے زیادہ درست نکلے ہیں۔ میں چاروں طرف سے اس بری گھر گئی ہوں کہ... "کاروبار" کو خیرباد کہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا۔ قاسم خان کی گرفتاری کے بعد یہاں وقتی طور پر تو حالات کی سطح بالکل پُرسکون نظر آرہی تھی اور میں بالکل مطمئن تھی کہ بات زیادہ نہیں بڑھے گی اور میں سب کچھ سنبھال لوں گی مگر اب تو یک لخت ہی سیلاب سا آگیا ہے۔ پولیس، ایف آئی اے، ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن، کسٹمز اور دیگر کئی سرکاری ایجنسیاں ہاتھ دھو کر ہی ہمارے کاروبار کے پیچھے پڑ گئی ہیں۔ جن افسروں سے ہمارے مراسم خوشگوار تھے اب تو وہ بھی آنکھ نہیں ملا رہے۔ لگتا ہے اخبارات میں متواتر کئی دن تک اس سلسلے میں خبریں آنے سے بات بہت بگڑ گئی ہے اور تمام محکمے یوں حرکت میں آگئے ہیں جیسے دنیا کا سب سے بڑا اسمگلر قاسم خان ہی ہے حالانکہ وہ بے چارہ تو کسی شمار قطار میں ہی نہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ قاسم خان اگر سزا کاٹ کر واپس آیا تو یہاں بھی اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔ ہمارے جائز اور قانونی کاروبار تک کے بارے میں چھان بین شروع ہو گئی ہے۔ ادھر سیٹھ واحد نے ناک میں دم کیا ہوا ہے۔ وہ پچھلے دنوں بھی لاہور میں ہی تھا اور میں ایک موہوم سی امید کے سہارے اس سے ملی تھی۔ بڑے اخلاق سے پیش آیا لیکن رقم کے معاملے میں وہ زیادہ فیاضی دکھانے پر آمادہ نہیں ہوا۔ صرف اتنا ہوا کہ ایک کروڑ سے وہ اسی لاکھ پر آگیا۔"

"پھر تم نے سوچا کیا ہے ؟" میں نے پوچھا۔

"سوچا تو میں نے بہت کچھ ہے اور بالآخر اسی فیصلے پر پہنچی

ہوں کہ مجھے اب ملک سے نکل لینا چاہئے" وہ گہری سانس لے کر بہت ہی دھیمی آواز میں بولی "تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ ایف آئی اے نے میرا پاسپورٹ بھی قبضے میں لے لیا ہے لیکن خیر ... یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ میرے پاس ایک اعلیٰ درجے کا جعلی پاسپورٹ اور ایک غیر ملکی پاسپورٹ بھی موجود ہے جسے ری نیو کرانے کی ضرورت ہے۔ اب مسئلہ صرف اپنے اثاثے سمیٹنے کا ہے۔ ہمارے پاس کوٹھیاں صرف یہ دو ہی ہیں۔ ایک گلبرگ والی اور ایک ماڈل ٹاؤن والی۔ چند پلاٹس ہیں۔ ان سب کی فروخت کے لئے میں نے اپنے وکیل کو پاور آف اٹارنی دے دی ہے۔ گلبرگ والی کوٹھی تو سیٹھ واحد ہی خریدنے کے لئے تیار ہے۔ پندرہ لاکھ اس نے لگائے ہیں۔ کوٹھی دینے کے بعد اس کے ہماری طرف پینسٹھ لاکھ نکلیں گے۔ وہ میں نقد دے دوں گی۔ ہمارے بڑے اکاؤنٹس پر دستخط میرے ہی چلتے ہیں۔ ادائیگیوں میں تو کوئی دقت نہیں ہوگی۔ میرے پاس نقد رقم بھی ہے۔ کوٹھی اس لئے بھی سیٹھ واحد ہی کو دینا مناسب رہے گا کہ اگر میرے نکل جانے کے بعد کوئی قانونی دشواری ہوئی تو وہ اس سے نمٹ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ساری خرید و فروخت کرنے کے بعد نقد رقم ملک سے باہر پہنچانے میں بھی وہی میری مدد کرے گا۔ روپے پیسے کے معاملے میں اس کی بدلحاظی اپنی جگہ۔ لیکن اس برے وقت میں اس کا یہ تعاون بھی کچھ کم نہیں۔"

اس دوران ویٹر مطلوبہ چیزیں لے آیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کولڈ کافی میں چمچہ ہلاتے ہوئے پوچھا "ملک سے نکل کر تم جاؤ گی کہاں ؟"

"امریکا ہی جاؤں گی اور قاسم خان کے رہا ہونے کا انتظار کروں گی۔ وہاں کی شہریت حاصل کرنا میرے لئے مشکل نہیں ہو گا حالانکہ میں ایک ایسے اسمگلر کی بیوی ہوں جو انہی کی قید میں ہے اور اسمگلر بھی منشیات کا۔ تمہیں معلوم ہو گا کہ امریکا میں منشیات کے اسمگلروں کے ساتھ سب سے زیادہ سختی برتی جاتی ہے۔"

"اس کے باوجود تم شہریت حاصل کرلو گی ؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں" وہ پُراعتماد انداز میں مسکرائی۔

اس دوران ایک خیال میرے ذہن میں دھیرے دھیرے واضح شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اچانک میں نے پوچھا "ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کی تو کسی سے بات نہیں ہوئی ؟"

"نہیں۔ لیکن تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

"وہ کوٹھی تم مجھے دے دو۔ مجھے اس سے اس لئے دلچسپی ہے کہ وہ کسی کی نظر میں نہیں ہے اور نہ ہی کوئی اس کے بارے میں یہ جانتا ہے کہ وہ قاسم خان کی ملکیت ہے" میں نے کہا۔

اس کی آنکھوں میں حیرت کا سایہ کچھ گہرا ہو گیا "تو تمہارے پاس اتنی رقم موجود ہے کہ وہ کوٹھی خرید سکو؟ کہاں ہاتھ مارلیا؟"

"میرے پاس کہاں سے آنی تھی رقم" میں استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا "جو تھوڑی بہت پونجی ہے وہ برے وقت کے لئے بچا کر رکھی ہوئی ہے۔ کوٹھی کا تو میں اپنے ایک دوست کے لئے پوچھ رہا تھا جس کے ساتھ مل کر میں کوئی شریفانہ کاروبار شروع کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ مارکیٹ ویلیو کے حساب سے جو بھی مناسب قیمت ہوگی وہ دے دے گا۔"

سلمٰی نے تفہیمی انداز میں سرہلایا۔ وہ میرے جواب سے کچھ زیادہ مطمئن تو نظر نہیں آرہی تھی لیکن اس نے غا اس خیال سے کوئی جرح نہیں کی تھی کہ اب اس کے لئے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"میں نے اپنے وکیل سے تخمینہ لیا تھا" وہ سرسری سے لہجے میں بولی "وہ کوٹھی اس وقت کم از کم چھ لاکھ کی ہے۔ تم ر وکیل کو ادا کرکے مروجہ طریق کار کے مطابق اپنے دوست کے نام ٹرانسفر کرواسکتے ہو۔ وکیل کے پاس پاور آف اٹارنی موجو ہے۔ اس وقت تک میں یہاں رہوں یا نہ رہوں، رقم بہرحال مجھے مل جائے گی۔ جولی اور اس کا شوہر اس کوٹھی سے جاچکے ہیں۔ ویسے وہ اپنا نیا ایڈریس دے گئی ہے۔ اگر تم یا تمہار دوست اسے اسی کوٹھی میں ملازم رکھنا چاہے تو وہ واپس آجائے گی۔"

"گویا یہ تم سے آخری ملاقات ہے ؟" میں نے پوچھ

"آخری ہی سمجھو" وہ بے پروائی سے بولی "میرا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب موقع مناسب دیکھ کر نکل جاؤں۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ غیر ارادی طور پر میں اس کی نیم وا آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں ہلکی سی افسردگی اتر آئی تھی۔ اچانک وہ سرگوشی نما لہجے میں بولی "افضل! ہم اچھے تھے یا برے ...... ہم نے اپنے ساتھیوں میں سے کبھی کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ بہرحال اس کے باوجود نادانستگی میں اگر کبھی ہم سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچی ہو تو معاف کر دینا۔ میں اپنی طرف سے بھی معذرت چاہ رہی ہوں اور قاسم خان کی طرف سے بھی۔"

میرے دل میں یک لخت اس کے لئے جیسے اپنائیت کا سمندر امڈ آیا۔ اس کے لہجے میں خلوص تھا۔ بعض اوقات برے لوگ بہت سے اچھے اچھے لوگوں سے زیادہ اچھے لگتے ہیں۔

"تم کوئی روایتی عورت تو نہیں ہو جو ایسی رسمی باتیں کر رہی ہو" میں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن یہ محسوس کرکے مجھے حیرت ہوئی کہ میری آواز بھرائی ہوئی تھی۔

" ہر عورت روایتی عورت ہی ہوتی ہے " وہ بدستور سرگوشی نما لہجے میں بولی " صرف حالات اس پر کوئی مختلف قسم کا خول چڑھا دیتے ہیں۔ "

تھوڑی دیر بعد وہ جانے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی اور اس کے ساتھ ہی میری کتاب زندگی کا ایک اہم باب گویا ختم ہو گیا۔

○☆○

سلمٰی جا چکی تھی اور میں ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں شفٹ ہو چکا تھا۔ سلمٰی کے جانے کے کئی دن بعد اخبار میں چھوٹی سی خبر بھی آئی تھی جس کی سرخی تھی:

اسمگلنگ کے الزام میں گرفتار ہونے والے تاجر قاسم خان کی بیوی ملک چھوڑ کر چلی گئی۔

خبر کا متن نہایت مبہم سا تھا اور اس کے بعد اس ضمن میں کوئی ذرا سی بھی خبر نہیں آئی۔ میں کئی مرتبہ قاسم خان کی گلبرگ والی کوٹھی کے سامنے سے گزرا۔ شروع شروع میں مجھے سی آئی ڈی کی ایک جیپ وہاں کھڑی نظر آئی جس میں دو سادہ لباس والے نیم دراز یا اونگھتے ہوئے نظر آئے لیکن پھر وہ جیپ غائب ہو گئی۔

سیٹھ واحد نے معلوم نہیں کس مقصد کے لئے یہ کوٹھی خریدی تھی۔ فی الحال تو اس کے گیٹ پر بڑا سا تالا لٹکا ہوا نظر آتا تھا۔ درودیوار پر عجیب ویرانی سی برسنے لگی تھی۔ گیٹ کے نیچے زرد پتوں کا انبار نظر آنے لگا تھا۔ اتنے سے عرصے میں یوں لگنے لگا تھا جیسے یہ کوٹھی کبھی آباد ہی نہیں تھی۔

ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کی قیمت ادا کرنے کے بعد بھی میرے پاس کچھ رقم باقی تھی اور اب میرا ارادہ نہایت سنجیدگی اور تندہی سے اپنے کاروبار کو منظم کرنے کا تھا۔ میں فی الحال چھوٹے پیمانے پر اپنا گروہ بنانے کے لئے کوشاں تھا۔ قاسم خان نے گروہ کا نظام کچھ اس طرح رکھا تھا کہ ایک کو دوسرے کا کچھ زیادہ پتا نہیں تھا۔ میں بھی گروہ کے سب کارکنوں کو تو تلاش نہیں کر سکا تاہم دو کو میں نے ڈھونڈ نکالا اور وہ میرے لئے کام کرنے پر آمادہ بھی ہو گئے۔ فی الحال مجھے خود بھی اس سلسلے میں دوڑ بھاگ کرنی تھی۔ ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ میں بگ باس بن کر آرام سے بیٹھ جاتا۔ تاہم اتنا مجھے یقین ہو چلا تھا کہ اب وہ وقت زیادہ دور بھی نہیں تھا۔

میں حالات کے اس نہج اور اپنی کارکردگی سے بے حد مطمئن تھا۔ مستقبل کے کئی منصوبے میرے ذہن میں تھے۔ جب ذرا فراغت اور سکون میسر آیا تو راحیلہ کا تصور میرے ذہن میں حاوی ہو گیا جسے میں عام حالات میں اور مصروفیات کے دوران ایک میٹھی کسک کی طرح دل میں دبائے رکھتا تھا۔

میں اسے کئی خط لکھ چکا تھا مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا جبکہ اپنے بتائے ہوئے پروگرام کے مطابق اسے اب تک گھر والوں کے ساتھ تعطیلات منانے کے لئے لاہور میں ہونا چاہئے تھا۔ میں اسے یہ خوشخبری سنانے کے لئے بھی بے چین تھا کہ میں نے صحیح معنوں میں ترقی کے راستوں پر قدم رکھ دیا ہے اور اپنی پہلی ذاتی کوٹھی خرید لی ہے بلکہ اگر راحیلہ لاہور میں ہوتی تو میں پہلی فرصت میں اسے کوٹھی دکھاتا اور اسے بتاتا کہ درحقیقت یہ تو محض ابتدا ہے۔ یہ کوٹھی بھی تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔ بہت جلد میں اس سے بھی اچھی کوٹھی خریدوں گا اور پھر تمہارے والدین کے سامنے دستِ سوال دراز کروں گا کہ وہ تمہارا ہاتھ میرے سوالی ہاتھ میں تھما دیں اور پھر تم آکر اس کوٹھی کو " گھر " بناؤ گی۔ اس کے درودیوار کو اپنے وجود کی دلکشی سے سجاؤ گی۔

جب مزید تاب انتظار نہ رہی تو میں نے ایک شام اسے کراچی فون کیا' دوسری طرف فون راشد نے ریسیو کیا۔ مجھے معلوم تھا کہ راحیلہ سے میری خط و کتابت راشد کے علم میں ہے اور اسے یہ بھی اندازہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کر چکے ہیں اور اس حقیقت کا اس کی طرف سے کوئی ناگوار ردِ عمل سامنے نہیں آیا تھا۔ چنانچہ میں نے رسمی باتوں کے بعد سرسری لہجے میں کہا " راشد! مجھے راحیلہ سے بات کرنی تھی۔ "

" راحیلہ....؟ وہ.... انی بھائی! راحیلہ تو اس وقت مصباح کے یہاں گئی ہوئی ہے۔ " وہ کچھ اٹک اٹک کر بولا " غالباً پارٹی ہے اس کے ہاں۔ وہ رات کو دیر سے گھر آئے گی۔ "

میں نے محسوس کیا کہ راشد نے یہ بہانہ فوری طور پر گھڑا ہے تاہم میں نے اپنے اس احساس کا اظہار نہیں کیا اور بدستور سرسری سے لہجے میں پوچھا " مصباح کے گھر فون تو ہوگا؟ "

" غالباً ہے تو سہی لیکن مجھے نمبر معلوم نہیں " راشد ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا " اور آپ کو معلوم ہے ' راحیلہ کوئی چیز صحیح طریقے سے لکھ لکھا کر تو رکھتی نہیں۔ بیشتر فون نمبر اسے زبانی یاد ہیں۔ کوئی ضروری پیغام ہو تو مجھے بتا دیجئے۔ میں اسے بتا دوں گا۔ "

" نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ بس بتا دینا کہ میں نے فون کیا تھا " میرا لہجہ غیر ارادی طور پر بجھ سا گیا تھا۔

یکایک راشد جیسے اچانک ہی کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا " انی بھائی! میں آپ کو ایک سرپرائز دوں؟ میں کل شام تک کسی بھی فلائٹ سے لاہور پہنچ رہا ہوں۔ "

" کس فلائٹ سے؟ " میں نے اپنی حیرت کو دباتے ہوئے پوچھا۔

" جس میں بھی سیٹ مل گئی " وہ بولا۔

" گویا اکیلے آرہے ہو... یہ ایک دم کیا سوجھی؟ "

" ایک ضروری کام آن پڑا ہے۔ "

" اگر فلائٹ کا علم ہوتا تو میں تمہیں لینے ایئرپورٹ آجاتا۔ "

" اس کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے اپنا ایڈریس

لکھوا دیجئے۔ میں خود ہی پہنچ جاؤں گا۔ "

میں نے اسے اپنا فون نمبر اور ایڈریس لکھوا دیا اور مزید چند سیکنڈ کی رسمی گفتگو کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔ راشد سے گفتگو کے بعد جانے کیوں میں مضطرب سا ہو گیا تھا۔ میری چھٹی حس یا شاید کوئی اور ہی حس مجھے بتا رہی تھی کہ راشد نے مجھ سے کچھ چھپایا تھا۔ شاید راحیلہ گھر میں موجود تھی مگر راشد نے اسے فون پر نہیں بلایا تھا۔ لیکن کیوں؟ پھر اسے اچانک لاہور آنے کی کیا سوجھی تھی؟ کیا وہ واقعی آرہا تھا یا اس نے محض میرا دھیان بٹانے کے لئے اور گفتگو کا رخ موڑنے کے لئے شوشا چھوڑا تھا؟ میں نے اپنی بے عنوان سی بے کلی کو دل میں دبائے رکھا اور کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے ایک دن انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

میرا معمر ملازم جسے میں پیار سے چچا میاں کہتا تھا' میرے بلاوے پر گاؤں سے واپس آچکا تھا۔ دوسرے روز شام ڈھلے میں چند لوگوں سے ملاقات کے بعد واپس آکر لباس تبدیل کرکے بیٹھا ہی تھا کہ چچا میاں نے آکر اطلاع دی کہ راشد نامی کوئی نوجوان مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں خود لپک کر باہر پہنچا۔ میں نے دیکھا' راشد ڈرائیوے میں کھڑا تنقیدی نظر سے درودیوار کا جائزہ لے رہا تھا۔

کوٹھی پر میں نے رنگ و روغن نہیں کرایا تھا اور نہ ہی سردست ایسا کوئی ارادہ تھا۔ اس لئے باہر سے وہ آسیب زدہ سی لگتی تھی۔ تاہم اندر سے درودیوار بدستور شیشے کی طرح چمکتے تھے۔

راشد کے ہاتھ میں کچھ کتابیں سی تھیں۔ وہ ایک ٹانگ پر وزن ڈالے قدرے بے نیازی کے سے عالم میں کھڑا تھا۔ اس کے خشک اور ملائم' بھورے بال ہوا سے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ اس وقت بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی کھلنڈرا سا لڑکا ابھی ابھی کالج سے واپس آیا ہو۔

ہم بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہوئے حتیٰ کہ راشد چلا اٹھا کہ اس کی پسلیاں ٹوٹنے کو ہیں تب میں نے اس سے معانقہ ختم کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا " تم تو واقعی آگئے یار! ورنہ تو میرا خیال یہی تھا کہ تم کسی مصلحت کے تحت مجھے گولی دے رہے ہو۔ "

" میری اتنی جرأت کہاں کہ میں آپ سے مذاق یا بہانے بازی کی کوشش کروں " وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

" تمہارے پاس کوئی سامان نظر نہیں آرہا؟ " میں نے کہا۔

" سامان کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں کل دوپہر واپس چلا جاؤں گا " وہ دھیمی آواز میں بولا۔ میں نے اس وقت تو اس سے تفصیل پوچھنا مناسب نہیں سمجھا لیکن اندر پہنچ کر کچھ دیر بعد جب وہ ہاتھ منہ دھو کر اور چائے وغیرہ پی کر آرام سے بیٹھ چکا تب میں نے کہا " ہاں۔ اب بتاؤ کیا قصہ ہے؟ یہ تمہاری

اچانک آمد اور کل روانگی کا پروگرام... یہ اچانک تمہیں ... آن پڑا؟ "

میں نے محسوس کیا کہ اس کی رنگت زرد پڑ گئی تھی او... کچھ متوحش سا تھا لیکن بظاہر پرسکون نظر آنے کی ... کوشش کر رہا تھا۔ بات شروع کرنے کے لئے اسے جیسے ... نہیں مل رہے تھے اور اس کے اس انداز کی وجہ سے ... اضطراب بڑھتا جا رہا تھا۔

" آخر تم بولتے کیوں نہیں؟ " میں نے تیزی سے کہ...
" تمہارے رویے نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا ہے۔ "

" میں آپ کے لئے کوئی اچھی خبر نہیں لایا انی بھائی... " بالآخر وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا پھر اس نے گویا ... جرأت کو مجتمع کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا " مجھے معلوم ... کہ آپ راحیلہ سے محبت کرتے ہیں اور اس کے بھائی ... حیثیت سے میرا یوں آپ کے سامنے بیٹھ کر اس کے ... باتیں کرنا کچھ اچھا نہیں لگتا لیکن میں کیا کروں.... راحیلہ ... مجھے بے پناہ محبت ہے اور ایک بہن کے ناتے وہ میری غیر... بھی ہے لیکن آپ کا بھی میری نظر میں جو مقام ہے وہ ... سے رشتوں پر بھاری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو نئی زندگی ... کی ہے وہ آپ ہی کے وسیلے سے ہے.... "

" ان لمبی باتوں اور وسیلوں کو چھوڑو راشد! " میں نے اس ... کی بات کاٹتے ہوئے کہا " جو کچھ کہنا ہے جلدی کہو اور ...

... کا اس کا ایک کزن ہے۔ غالباً وہ بھی صنعت کار کا بیٹا ہے؟ " مجھے ... حیرت تھی کہ اب میں خاصے پرسکون لہجے میں بات کر رہا ...

صاف کہو۔"

"بات اتنی آسان بھی نہیں ہے" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

"ممی اور ڈیڈی کو اس بات کا قطعاً علم نہیں تھا کہ آپ راحیلہ کو پسند کرتے ہیں۔ راحیلہ نے کبھی اس بات کا اشارہ ہی نہیں دیا۔ مجھے بھی شاید علم نہ ہوپاتا مگر مجھے اس نے خود ہی بتادیا تھا لیکن اس طرح نہیں جس طرح آپ سمجھ رہے ہیں بلکہ نہایت ہی مضحکہ خیز انداز میں۔ اور میں اس وقت سے تشویش زدہ تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کروں تو کیا کروں۔ یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دنوں گھر والوں نے جب مجھے شادی کارڈ دیا کہ آپ کو پوسٹ کردوں تو میں نے اسے اپنے پاس ہی رکھ لیا۔ پوسٹ نہیں کیا۔ بالآخر کل آپ کا فون آنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ میرا ذاتی طور پر آکر آپ سے بات کرنا بے حد ضروری ہے۔ کل اگر میں یہ فیصلہ نہ کرتا تو شاید سوچ سوچ کر پاگل ہوجاتا۔"

"کیسا کارڈ.... کیا باتیں....؟ تمہاری کوئی بھی بات میری سمجھ میں نہیں آرہی" میں نے قدرے جھنجلاہٹ سے کہا۔

"راحیلہ کی شادی کے کارڈ کی بات کررہا ہوں۔ کل راحیلہ کی شادی ہے۔ ہمارا گھر اس وقت شادی بیاہ کے گیتوں سے گونج رہا ہوگا" راشد بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔

میں کئی سیکنڈ تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے الفاظ کا مطلب میں خاصی دیر بعد سمجھ سکا جیسے اس نے کسی اجنبی زبان میں بات کی ہو۔

بالآخر میں نے کہا "راشد! میں، تم اور راحیلہ۔ ہم تینوں آپس میں بے تکلف ہیں لیکن بے تکلفی میں بھی اس قسم کے تکلیف دہ مذاق نہیں کئے جاتے اور آج یکم اپریل بھی نہیں ہے جو تم مجھے بیوقوف بنانے آگئے ہو۔"

"مذاق آپ سے تو کیا میں کسی سے بھی نہیں کرتا" وہ افسردہ سے لہجے میں بولا "میں محض مذاق میں اتنی زحمت کرنے کا قائل نہیں کہ اتنی گھبراہٹ میں بصد مشکل ٹکٹ حاصل کرکے فوری طور پر لاہور پہنچوں۔"

اس امر کا مجھے بھی یقین تھا۔ میں چند لمحے گم صم بیٹھا رہا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ میرے اعصاب اندر ہی اندر لرز رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں نے اگر فوری طور پر کچھ کہنے کی کوشش کی تو میرے حلق سے لرزتی ہوئی آواز برآمد ہوگی اور میں لرزتی ہوئی آواز میں بات کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔

راشد گویا مجھے قائل کرنے کے لئے لفظوں پر زور دیتے ہوئے بولا "میں سچ کہہ رہا ہوں راحیلہ کی کل شادی ہے۔"

"کس سے؟" بالآخر میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ میں اپنی روح کی سسکیاں دبانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

"جمیل سے۔ وہ ہمارا کزن ہے" راشد نظر جھکا کر بولا۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ راحیلہ نے مجھے بتایا تھا کہ اس نام

لیکن میرے اندر ہی اندر جیسے کوئی آتش فشاں پھٹ پڑنے کو بے تاب تھا۔ راشد نے میرے سوال کے جواب میں آہستگی سے اثبات میں سرہلادیا۔

"یہ غالباً آنٹی اور انکل کا فیصلہ ہوگا؟" میں نے طویل سانس لے کر صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا راحیلہ نے اس پر ذرا بھی احتجاج نہیں کیا؟ وہ ایسی لڑکی تو نہیں کہ اس سے اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات آسانی سے منوائی جاسکے۔"

"ممی، ڈیڈی یا کسی بھی دوسرے شخص کا اس میں کوئی قصور نہیں" راشد جلدی سے بولا "یہ قطعی طور پر راحیلہ کا اپنا فیصلہ تھا۔ ممی، ڈیڈی نے اس سے صرف یہ پوچھا تھا کہ کیا اس کی شادی جمیل سے کردی جائے؟ اس نے بخوشی اجازت دے دی۔"

"نہیں" میں بے اختیار چلا اٹھا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری رگوں میں لہو آتش سیال بنتا جارہا تھا۔ میرے چہرے پر شاید کوئی ایسی بات تھی کہ راشد خوف زدہ سا نظر آنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں خود پر ضبط کرتے ہوئے بیٹھ گیا۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے...؟" میں نے حتیٰ الامکان آہستگی سے کہا "راحیلہ ایسا کیونکر کرسکتی ہے۔"

راشد ایک پتلی سی ڈائری میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں راحیلہ کی لاعلمی میں راحیلہ کی یہ ڈائری میں لے آیا ہوں۔ اس میں آپ کا ذکر صرف دو تین صفحوں پر موجود ہے لیکن انہی میں آپ کو اپنے سوالوں کا جواب مل جائے گا۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھیے گا انی بھیا! آپ کو یہ سب کچھ بتانے سے میرا مقصد صرف ایک مہلک دھوکے سے آزاد کرانا اور حقائق کی دنیا میں واپس لانا ہے۔ مجھے آپ سے بہت عقیدت ہے، محبت ہے لیکن راحیلہ بھی بہرحال میری بہن ہے۔ میں نہیں چاہوں گا کہ آپ ردعمل کے طور پر اسے کوئی گزند پہنچانے کی کوشش کریں۔ آپ کو یہ سب کچھ بتا کر میں نے اپنی دانست میں آپ کے ساتھ بھلائی کی ہے۔"

اس کے الفاظ میری سماعت سے یوں ٹکرا رہے تھے جیسے کسی گنبد میں کسی بدروح کے قہقہے گونج رہے ہوں۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ پتلی سی ڈائری تھام لی۔ چرمی جلد میں لپٹی ہوئی یہ ڈائری نہیں گویا ایک پٹاری تھی جس میں زہریلے لفظوں کے سنپولئے کلبلا رہے تھے۔

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگرانی ابھی جاری ہے باقی واقعات دوسرے حصے میں پڑھیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سرکش

10

محمود احمد مودی

اُلجھے ہوئے خیالات اور اندیشوں کا ایک طوفان میرے ذہن میں برپا تھا اور میں کسی کے کچھ بتانے سے پہلے کوئی اندازہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اعلیٰ عدالت کے جج کی لاش ایک بہت بڑے اسمگلر کے دفتر میں پائی جانا کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس معاملے میں کہاں فٹ ہوتا تھا؟ میں تو جج صاحب یا مرزا اکرم بیگ.... دونوں ہی سے صحیح طور پر واقف نہیں تھا۔ آخر اس موقع پر مرزا اکرم بیگ نے اتنے پیار اور اصرار سے مجھے کیوں بُلوایا تھا؟ کہیں یہ اس کی کوئی خوف ناک چال تو نہیں تھی؟ پیر دانش کے چکروں سے تو میں بچ نکلا تھا۔ اب کہیں مرزا اکرم بیگ تو مجھے کسی چکر میں پھانسنے کی فکر میں نہیں تھا؟

اندیشوں کا ایک سیلاب میرے ذہن میں اُمنڈ آیا تھا۔ میں نے پلٹ کر ایک نظر شرافت علی کی طرف دیکھا جو مجھے یہاں لایا تھا۔ وہ بیرونی کمرے میں ہی رُک گیا تھا اور ایک طرف سر جھکائے کھڑا تھا۔

اکرم بیگ نے مجھے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو جلدی سے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "اس سے جو بھی گستاخی سرزد ہوئی ہوگی اس کے بارے میں کچھ پوچھے بغیر میں آپ سے معذرت خواہ ہوں۔ سرِدست میں اسے اس لئے معاف کر رہا ہوں کہ یہ آپ کو یہاں لے آیا ہے۔ فی الحال اس کا یہ کارنامہ کافی ہے۔"

"یہ مجھے یہاں نہیں لایا.... میں اسے یہاں لایا ہوں۔" میں نے تصحیح کی "اور اس میں تمہاری ٹیلی فون کال نے زیادہ اہم رول ادا کیا ہے۔"

اکرم بیگ مسکرایا "شکریہ.... بہرحال میرا مقصد آپ کو بُلانا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ میرا مقصد پورا ہوگیا۔ شرافت علی سے میں بعد میں نمٹتا رہوں گا۔ فی الحال تو میرا آپ سے بات کرنا ضروری ہے۔ ہم پہلے ہی آپ کے انتظار میں کافی وقت ضائع کر چکے ہیں۔"

اس نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے ان چند پُراسرار سے افراد کی طرف دیکھا جو نہایت سنجیدگی سے ہم دونوں کو گھور رہے تھے۔ میں نے ایک بار پھر پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ بے شک بیرونی کمرے میں کلاشنکوف بردار موجود تھے لیکن ایسے کوئی آثار نہیں تھے جن سے میں سمجھتا کہ میرا راستہ روکنے یا مجھے واپس جانے سے باز رکھنے کے لئے کوئی بندوبست کیا گیا تھا۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ مجھ سے شریفانہ اور پُرامن ماحول میں کوئی بات کرنا ہی مطلوب تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے اکرم بیگ بولا "ویسے بھی مجھے شرافت علی کی حالت دیکھ کر اندازہ ہو رہا ہے کہ اس نے آپ کے ساتھ بدتمیزی کی سزا بھگت لی ہوگی۔"

میں نے جیب سے شرافت علی کی سائیلنسر والی گن نکالتے ہوئے کہا "فی الحال اس کی یہ گن میرے پاس موجود ہے۔"

اکرم بیگ میری بات کاٹتے ہوئے خوشگوار لہجے میں بولا "اسی سے میں اندازہ کر سکتا ہوں کہ وہاں کیا ہوا ہوگا۔ اُمید ہے شرافت علی کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ آئندہ اگر میں اسے آپ کے پاس بھیجوں تو اسے کیا طرزِ عمل اختیار کرنا ہوگا۔"

"ہاں اُمید تو ہے۔" میں نے اس کی تائید کی "لیکن فی الحال میں اس کی یہ گن واپس نہیں کروں گا۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" اکرم بیگ بے پروائی سے بولا "اسے ایک گدھے کی حماقت کی نشانی سمجھ کر آپ ہی رکھ لیجئے گا۔"

"میں حماقتوں کی نشانیاں جمع نہیں کرتا۔ خصوصاً دوسروں کی حماقتوں کی۔" میں نے کہا "واپس جاتے وقت دے جاؤں گا۔"

"یہ آپ کی کشادہ دلی ہوگی۔" وہ بولا۔

میں نے ایک نظر جج صاحب کی لاش کی طرف دیکھا اور بے نیازی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے یہاں کیوں بُلایا گیا ہے؟"

"میں نے آپ کو فون پر بتایا تو تھا کہ مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔" وہ بدستور شائستگی سے بولا۔ عمر میں وہ مجھ سے بڑا تھا لیکن نہایت مؤدبانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔

"ایک بزنس مین، مرزا اکرم بیگ کی کیا مدد کر سکتا ہے؟" میں نے بھویں اُچکائیں۔

"میری انفارمیشن سروس بہت تیز ہے افضل صاحب!" اکرم بیگ مسکرایا۔ "آپ خود کو صرف بزنس مین نہ کہیں۔ آپ کی

ٹانگ نہ جانے کس کس معاملے میں اڑی رہتی ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ بزنس آپ کے لئے ثانوی چیز ہے۔"

"میری اپنی کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ میں کسی بھی معاملے میں ٹانگ نہ اڑاؤں۔" میں نے ملائمت سے کہا "لوگ خود ہی میری ٹانگ پکڑ کر کسی نہ کسی معاملے میں اُڑا دیتے ہیں۔"

وہ دھیرے سے ہنسا۔ اس کے انداز سے قطعاً ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ کمرے میں ایک لاش موجود تھی اور وہ بھی ایک اہم آدمی کی لاش۔ وہ تو اس طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں بھی اسی کی طرح لاش کی طرف سے بے پروا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"یوں سمجھ لیں کہ اس وقت بھی میں آپ کی ٹانگ پکڑ کر ایک معاملے میں پھنسانا چاہتا ہوں۔" مکرم بیگ بولا۔

"کس معاملے میں؟" میں نے پوچھا۔

"قتل کے معاملے میں۔" اس نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"کس حیثیت سے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "قاتل کی حیثیت سے.... یا مقتول کی حیثیت سے؟"

"اوہ نو...." وہ مسکراتے ہوئے جلدی سے بولا "مجھے ہرگز اچھا نہیں لگے گا کہ میں آپ کو ان دونوں میں سے کسی بھی حیثیت میں دیکھوں۔ میری نظر میں تو آپ کا کچھ اور ہی مقام ہے۔"

"اس مقام کی کچھ وضاحت نہیں ہو سکتی؟" میں نے پوچھا۔

"بس۔ یوں سمجھ لیں کہ اس وقت میری نظر میں آپ کی حیثیت ایک جج کی سی ہے۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

میں نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اب ہمارے ہاں جج بھی اس انجام سے دوچار ہونے لگے ہیں۔ براہِ کرم تم مجھے جج نہ ہی بناؤ تو میرے حق میں بہتر ہو گا۔ کیا تم مجھے بھی ایسے ہی انجام سے دوچار کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

"نہیں.... نہیں.... ہرگز نہیں۔" وہ جلدی سے بولا "میں تو آپ کے بارے میں.... بلکہ کسی بھی شریف اور معزز آدمی کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری نظر میں آپ کی حیثیت جج کی سی یوں ہے کہ جج کا کام حالات وواقعات اور شہادتوں کا جائزہ لے کر کسی کو قصور وار یا بے قصور قرار دینا ہوتا ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ مجھ پر کرم فرمائیں اور میرے لئے کچھ اسی قسم کا کردار ادا کریں۔ میں آپ کا بہت زیادہ شکرگزار رہوں گا۔"

ایک تو اس کے حد سے زیادہ مہذبانہ اور دوستانہ رویے نے مجھے اُلجھن میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اوپر سے اس کی باتیں بھی معمے سے کم نہیں تھیں۔ اس کی باتوں کے علاوہ بھی کئی معمے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں؟ اس کی کس بات کا کیا جواب دوں؟ یا یوں کہئے کہ اس کی کس بات کے جواب میں کیا سوال کروں؟

خیالات کا ہجوم واقعی میرے قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ سب سے پہلے تو یہی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ مکرم بیگ اس ملک میں نظر کیسے آ رہا تھا؟ میری معلومات کے مطابق بہت بڑے اسمگلروں کے خلاف بڑی زبردست مہم جاری تھی اور وہ ملک سے مفرور تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے کس لحاظ سے مفرور قرار دوں؟

وہ تو اپنی تمام تر خوش لباسی، اطمینان اور سکون کے ساتھ میرے سامنے موجود تھا۔ نہ صرف خود موجود تھا بلکہ اس کے مسلح محافظین بھی موجود تھے اور اطمینان سے بیرونی کمرے میں ٹہل رہے تھے۔

میرے لئے یہ امر بھی قدرے حیرت کا باعث تھا کہ شہر میں اس کا باقاعدہ ایک دفتر بھی موجود تھا۔ شہر کے اس پوش علاقے میں، اس مہنگی سی بلڈنگ میں یہ بڑا سا اپارٹمنٹ ایک باقاعدہ دفتر معلوم ہو رہا تھا۔ دوسرے ایک دو کمروں کے کھلے دروازوں سے مجھے اندر کی جھلک نظر آئی تھی۔ کمروں میں شاندار میزیں، کرسیاں، فائلنگ کیبنٹ، ٹیلی فون، فیکس مشینیں، اور ایک اچھے دفتر کے دیگر تمام لوازمات نظر آ رہے تھے۔

میرے لئے دوسری بڑی حیرت اس دفتر میں جج صاحب کی لاش تھی۔ ان جج صاحب کا نام عبدالسّلام تھا اور میں نے سنا تھا کہ وہ بہت ہی سخت گیر، اصول پسند اور کسی کے سامنے نہ جھکنے والے تھے۔ ان کی دیانت داری کو کسی قسم کے شک وشبے سے بالاتر سمجھا جاتا تھا۔

فطری طور پر میرے ذہن میں پہلا خیال یہی اُبھرا کہ کیا ان کی دیانت داری اور اصول پسندی ان کے لئے سزا بن گئی تھی؟ کیا مکرم بیگ کا کوئی مسئلہ ان کے پاس اٹک گیا تھا اور وہ کسی طرح اسے اپنی مرضی کے مطابق حل کرانے میں ناکام رہا تھا؟ کیا اسے آخری حل یہی نظر آیا تھا کہ جج صاحب کو راستے سے ہی ہٹا دیا جائے؟ کیا اب ہمارے ملک میں بھی اسمگلروں کے حوصلے اتنے بڑھ گئے تھے کہ وہ اعلیٰ عدالتوں کے ججوں کو قتل کرانے لگے تھے اور وہ بھی عین اپنے آفس میں؟

یہ کچھ ایسا بعید از امکان بھی نہیں تھا۔ بلکہ شاید اب تو کچھ بھی بعید از امکان نہیں رہا تھا۔ ایسے ایسے ہولناک واقعات رونما ہو رہے تھے جنہیں عقل تسلیم نہیں کرتی تھی کہ انسانوں کی بھری پُری اور گنجان آباد بستیوں میں ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ ایسے واقعات بھی سننے میں آتے تھے جن میں بظاہر کوئی ہولناکی نظر نہیں آتی تھی لیکن اگر ان کے نتائج اور دوررس اثرات پر غور کیا جاتا تو مستقبل کا نقشہ بڑا ہولناک نظر آتا تھا۔

مثلاً پچھلے دنوں میں نے سنا تھا کہ ایک بہت بڑے ڈرگ اسمگلر کے خلاف زیادہ سخت کارروائی ہوئی تو اس نے ملک کی ایک بہت ہی بڑی شخصیت کے قریبی عزیز کو اغوا کرا لیا تھا اور اسے اپنے علاقے میں اپنے محل میں ایک طرح سے یرغمال بنا کر رکھ لیا تھا۔

یہ کچھ اسی قسم کی باتیں تھیں جن کے لئے "لمحہ فکریہ" کی

اصطلاح استعمال کی جاتی ہے لیکن ہمارے ہاں ایسے نہ جانے کتنے "لمحاتِ فکریہ" روز آتے تھے اور گزر جاتے تھے۔ کسی کو فکر کرنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک سب فکر سے بے نیاز ہو چکے تھے۔

میری نظر غیر ارادی طور پر جج صاحب کی لاش پر جمی ہوئی تھی۔ وہ کچھ ایسے عمر رسیدہ نہیں تھے شاید اپنی نیک نامی اور ساکھ کی وجہ سے.... یا پھر اپنی قابلیت کی بدولت اس عمر میں منصفی کے خاصے بلند مقام پر پہنچ چکے تھے۔ انہیں تقریباً جوان ہی شمار کیا جا سکتا تھا۔ ان کے بالوں میں معمولی سی سفیدی تھی۔

میں نے جب انہیں ایک ہوٹل میں تقریب میں دیکھا تھا تو دل ہی دل میں انہیں اچھے خاصے وجیہہ آدمیوں میں شمار کیا تھا۔ ان کی رنگت سرخ وسپید، بال سیاہ چمکیلے تھے۔ اس سیاہی میں سفیدی کی جھلک بھی بھلی لگ رہی تھی۔ وہ چشمہ لگاتے تھے مگر شاید صرف لکھتے پڑھتے وقت انہیں اس کی ضرورت پیش آتی تھی۔ کاغذ سے نظر ہٹاتے تھے تو چشمہ اتار لیتے تھے۔ ان کی آنکھیں بھی خوب صورت تھیں۔ ان بھوری آنکھوں میں زندگی کی چمک نمایاں تھی۔

.... لیکن اس وقت جو چہرہ میرے سامنے تھا وہ کسی وجیہہ آدمی کا چہرہ نہیں تھا۔ موت کی بدصورتی نے اس پر بری طرح پنجے گاڑ لئے تھے۔ سرخ وسپید رنگت نیلی پڑ چکی تھی اور چہرہ کچھ متورم نظر آ رہا تھا۔ ایک آنکھ میں تو خون بھر گیا تھا اور وہ اس کے نیچے چھپ چکی تھی مگر دوسری آنکھ کھلی تھی اور گویا چھت کو تک رہی تھی۔ اس بے نور آنکھ کو بھی گویا موت کی دھندلاہٹ نے ڈھانپ لیا تھا۔

میرے حلق میں تلخی سی پھیل گئی۔ میں نے لاش سے نظر ہٹا کر ایک بار پھر مکرم بیگ کے چہرے کی طرف دیکھا جس پر زندگی اور صحت مندی کی چمک اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میرے محسوسات کے بارے میں کوئی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"کیا تم نے مجھے اپنے اس کارنامے کا تماشائی بنانے کے لئے بُلایا ہے؟" میں نے گہری سانس لے کر سرد لہجے میں پوچھا۔

"مجھے آپ سے یہ امید نہیں تھی افضل صاحب!" وہ قدرے تاسف سے بولا۔

"کیا امید نہیں تھی؟ یہی کہ میں یہ بات تمہارے منہ پر کہہ دوں گا؟" میں نے جاننا چاہا۔

اس نے گویا بڑے تحمل سے کام لیتے ہوئے نفی میں سر ہلایا "نہیں.... مجھے یہ امید نہیں تھی کہ آپ کے ذہن میں بھی وہی بات آئے گی جو کسی عام سے آدمی کے ذہن میں آ سکتی ہے۔"

"میں بھی ایک عام سا ہی آدمی ہوں مکرم بیگ!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "کبھی کسی کے سامنے خاص آدمی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ اور تم سے تو ویسے بھی میری یہ پہلی ملاقات ہے۔"

"میری نظر میں اگر آپ عام آدمی ہوتے تو میں آپ کو یہاں بُلوانے کے لئے اتنا تردد نہ کرتا۔" وہ کشیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "میری نظر میں آپ ایک خاص.... بلکہ بہت ہی خاص آدمی ہیں۔ اور موجودہ صورتِ حال میں تو آپ میرے لئے جتنے خاص ہو کر رہ گئے ہیں اس کا آپ خود بھی تصور نہیں کر سکتے۔"

"میں سوچ رہا ہوں اگر میں بھی اسی طرح تمہاری کھوپڑی میں ایک گولی اتار دوں جس طرح تم نے جج صاحب کی کھوپڑی میں اتاری ہے تو میں اور بھی زیادہ خاص الخاص آدمی ہو جاؤں گا۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"پلیز.... پلیز.... افضل صاحب!" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "میں ایک بار پھر یہی درخواست کروں گا کہ آپ صورتِ حال کو دیکھ کر وہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش نہ کریں جو کوئی بھی عام آدمی اخذ کرے گا۔ یہ آپ کی انکساری ہے کہ آپ خود کو عام آدمی تصور کرتے ہیں لیکن مجھے بھی معلوم ہے۔ اور خود آپ کو بھی معلوم ہے کہ آپ عام آدمی نہیں ہیں۔ اگر آپ تحمل سے میری بات سنیں تو شاید آپ کی وہ صلاحیتیں اُبھر کر سامنے آ جائیں جن کی اس وقت مجھے ضرورت ہے۔"

"میں ہمہ تن گوش ہوں۔" میں نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا۔

"جج صاحب کو میں نے قتل نہیں کیا۔" وہ بڑے اختصار سے بولا۔

"ظاہر ہے اس قسم کے کام تم اپنے ہاتھ سے تو انجام دیتے سے رہے۔ تمہیں تو صرف زبان ہی ہلانی پڑتی ہو گی۔ بلکہ بعض اوقات تو شاید زبان ہلانے کی بھی ضرورت پیش نہیں آتی ہو گی۔ آنکھ سے اشارہ کر دینا ہی کافی ہوتا ہو گا۔" میرے لہجے میں تلخی برقرار تھی۔

"میرا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے افضل صاحب!" وہ بڑے تحمل سے بولا۔ وہ عمر میں مجھ سے بڑا تھا لیکن اس کا اندازِ تخاطب مؤدبانہ تھا جبکہ میں نے اسے "تم" سے مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا۔

"اچھا؟ تو پھر شاید عبدالسّلام صاحب کو اچانک خودکشی کا خیال آ گیا ہو گا اور انہوں نے سوچا ہو گا کہ اس کام کے لئے مرزا مکرم بیگ کے دفتر سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہو سکتی۔ تمہیں مشکل میں پھنسانے کے لئے انہوں نے یہاں آ کر خود کو گولی مار لی ہو گی۔ کیا تم نے مجھے یہ کہانی سنانے کے لئے یہاں بلایا ہے؟"

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا "میں تو آپ کو صرف وہی کچھ بتا سکتا ہوں جو میرے علم میں ہے۔ مجھے نہیں معلوم عبدالسّلام صاحب نے خودکشی کی ہے یا کوئی اور چکر ہے۔"

"ظاہر ہے اگر تم اسے خودکشی قرار دیتے تو میں یہ بھی پوچھتا کہ وہ پستول یا ریوالور کہاں ہے جس سے انہوں نے خودکشی کی ہے۔" میں نے سر ہلایا "کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے؟"

"نہیں" اس نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا "مجھے صحیح بات

معلوم نہیں... لیکن اتنا اندازہ میں بھی لگا سکتا ہوں کہ جج صاحب نے خودکشی نہیں کی۔ میری معلومات کے مطابق ان کے حالات میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو انہیں خودکشی پر مجبور کردیتی۔ ایک جج کی زندگی عموماً خطرات میں گھری ہوتی ہے۔ خصوصاً ایک بہت دیانت دار، نہایت بے لچک اور سخت اصول پرست جج کی زندگی میں تو خطرات کچھ زیادہ ہی ہوتے ہیں لیکن عبدالسلام صاحب ان خطرات سے مانوس ہوچکے تھے اور وہ اتنے کمزور یا ڈرپوک نہیں تھے کہ ان خطرات سے گھبرا کر خودکشی کرلیتے۔ اتنا مجھے یقین ہے۔"

اس نے ایک نظر ان نامعلوم پُراسرار سے لوگوں کی طرف دیکھا جو ابھی تک گونگے بہروں کی طرح بیٹھے تھے، پھر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "جج صاحب کے لئے سب سے بڑا خطرہ تو میں خود تھا۔"

"کیوں؟" میں نے محض وضاحت کی خاطر پوچھا حالانکہ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس کی بات کا مطلب کیا تھا۔

"اس لئے کہ میرے خلاف سب سے زیادہ خطرناک مقدمات انہی کی عدالت میں زیرِ سماعت تھے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "پولیس... خفیہ ایجنسیاں... این سی بی یعنی نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کے تحت کام کرنے والے ادارے... بہت سے صحافی اور ہر وہ آدمی جسے اس قسم کے معاملات سے تھوڑی بہت بھی دلچسپی ہوتی ہے اس حقیقت سے واقف تھا۔"

"بہت خوب" میں نے کہا "صرف میں واقف نہیں تھا۔"

"آپ اس لئے واقف نہیں تھے کہ آپ ابھی میری طرف متوجہ نہیں ہوئے تھے اور آپ کو ان معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔"

"لیکن جس ڈرامائی انداز میں تم نے مجھے بلوایا ہے، اس کے بعد مجھے دلچسپی پیدا ہو چلی ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہی میں چاہتا تھا۔" اس نے قدرے طمانیت سے سرہلایا "آپ دلچسپی لیں گے تبھی میرا مسئلہ حل ہوگا۔ یہ تو آپ کی سمجھ میں آہی گیا ہوگا کہ جج صاحب کے سامنے میری پوزیشن بہت نازک تھی۔ جب تک میرے خلاف کئی سنگین مقدمات ان کی عدالت میں زیرِ سماعت تھے تب تک کیا میں ایسی حماقت کرسکتا تھا کہ انہیں مروانے کی کوشش کرتا... اور وہ بھی عین اپنے آفس میں...؟"

میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی کوئی تبصرہ کیا۔ اس نے مجھے سوچنے پر مجبور کردیا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ ذرا تیزی سے بولا "کیا میں اتنا احمق ہوسکتا تھا کہ عبدالسلام صاحب کو نہ صرف اپنے آفس میں شوٹ کرواتا بلکہ ایک خفیہ ایجنسی کی ایک بڑی شخصیت کو فون کرکے اطلاع بھی دلواتا کہ میرے آفس میں جج صاحب کی لاش موجود ہے۔ نہ صرف لاش موجود ہے بلکہ میں خود بھی موجود ہوں۔"

"کیا ایسا ہوا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں۔ ایک گمنام فون کال کے ذریعے ایک خفیہ ایجنسی کے ایک اعلیٰ عہدیدار کو اطلاع دی گئی کہ مرزا اکرم بیگ کے دفتر میں جج عبدالسلام کو قتل کردیا گیا ہے۔ خفیہ ایجنسی کے اہلکار میرے اس وقت یہاں پہنچے ہیں جب میں بھی اپنے مسلح محافظوں کے ساتھ یہاں پہنچا ہی تھا اور ہم لوگوں کو تالا کھول کر اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے چند سیکنڈ ہی ہوئے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"بہت خوب" میری دلچسپی کچھ بڑھنے لگی "غالباً ان حضرات کا تعلق خفیہ ایجنسی سے ہے؟"

میں نے ان پُراسرار سے لوگوں کی طرف دیکھا جن کے چہرے سپاٹ تھے اور جو بدستور خاموشی سے ہماری طرف دیکھے جارہے تھے۔ ان کا صبر و تحمل اور خود پر ضبط قابلِ داد تھا کہ ہماری اتنی دیر کی بک بک کے دوران انہوں نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا تھا۔ بہرحال اب ان کی پُراسراریت میری سمجھ میں آگئی تھی اور یکلخت ہی وہ میرے لئے کچھ ایسے پُراسرار نہیں رہے تھے۔

مکرم بیگ نے اثبات میں سرہلایا اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "اب غالباً اس حد تک تو بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی کہ میں اتنا احمق نہیں ہوسکتا جتنا اس صورتِ حال میں نظر آرہا ہوں۔"

میں خاموش رہا تو وہ گویا مجھے اپنے احمق نہ ہونے کا یقین دلاتے ہوئے کچھ اور زور دے کر بولا "فضل صاحب! میری جڑیں بے شک یہیں ہیں لیکن میری زندگی کا بیشتر حصہ دوسرے ملکوں میں گزرا ہے۔ روم، لاس اینجلس، لندن، پیرس اور دبئی میں میرے اس سے بہتر دفاتر ہیں جیسا آپ اس وقت یہاں دیکھ رہے ہیں۔"

"اور بظاہر تمہارا بزنس کیا ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

وہ دھیرے سے ہنسا "یہ لفظ "بظاہر" آپ نے خوب استعمال کیا ہے لیکن میں آپ کے اس طنز کا بُرا نہیں مناؤں گا۔ اس وقت میں آپ سے اسی قسم کی باتوں کی توقع کررہا ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ جب دھیرے دھیرے بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی تو آپ کی ہمدردیاں میرے ساتھ ہوجائیں گی۔"

اس نے خاموش ہوکر سرجھکالیا گویا سوچ رہا ہو کہ سلسلۂ کلام کو کیسے آگے بڑھائے۔ ہم سب اس کمرے میں اس طرح صوفوں پر بیٹھے تھے گویا کوئی دفتری میٹنگ چل رہی ہو۔ کمرے کی آرائش بھی دفتروالی ہی تھی۔ صرف وہ لاش وہاں غیر متعلق سی لگ رہی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فی الحال کسی کو اس کی فکر بھی نہیں تھی۔ شاید ابھی تک کسی نے اسے وہاں سے اُٹھوانے کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا۔

"میں نے تمہارے بزنس کے بارے میں پوچھا تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں مکرم بیگ کو یاد دلایا۔

"میں اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" وہ سر اٹھاتے ہوئے بولا "مجھے تو اب صحیح طور پر یاد بھی نہیں رہتا کہ میرے کون کون سے بزنس ہیں۔ امپورٹ ایکسپورٹ، جویلرز، مارکیٹنگ، شپنگ، رئیل اسٹیٹ کے علاوہ ایک چھوٹی سی ایئرلائن بھی میری ملکیت ہے۔ اس کے علاوہ کچھ ملکوں میں ڈیپارٹمنٹل اسٹورز ہیں اور کچھ دوسرے کاروباروں میں بھی حصے داری ہے۔"

میں سوچ رہا تھا کہ اس نے اپنے سب سے اہم "بزنس" کا نام نہیں لیا تھا۔ جو بزنس وہ گنوا رہا تھا۔ یہ سب تو دراصل اسی ایک "بزنس" کو آڑ فراہم کرنے کے انتظامات تھے تاہم میں نے اس سلسلے میں سردست کوئی سوال کرنے کے بجائے کہا "تمہارے کاروباروں میں جائیداد کا کاروبار بھی شامل ہے لیکن کیا یہ بات کچھ عجیب نہیں کہ یہ ملک... جہاں بقول تمہارے، تمہاری جڑیں ہیں... یہاں تمہاری کوئی جائیداد نہیں؟"

وہ ایک بار پھر ہولے سے ہنسا "بہت خوب! اچھا سوال کیا ہے آپ نے..." انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ٹی وی کے کسی مذاکرے میں کوئی مہمان، کمپیئر کو داد دے رہا ہو "اس کا مطلب ہے آپ بھی میرے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے ہیں۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ یہ اچھی علامت ہے۔ اس کا مطلب ہے آپ میری ذات میں دلچسپی لیتے رہے ہیں۔ میں یہی چاہتا تھا۔ جب آپ کسی کی ذات میں دلچسپی لیتے ہیں تبھی کسی کے لئے کچھ کرسکتے ہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ اب آپ میرے کام آسکیں گے۔"

"میرا سوال اب بھی تشنۂ جواب ہے۔" میں نے کہا۔

"اصل میں سوال در سوال کا سلسلہ چل نکلا ہے۔ اور یہ اچھا ہی ہے۔ میں چاہتا ہوں آپ مجھے اچھی طرح جان لیں۔ میں نے اب یہاں کوئی بھی چیز ذاتی ملکیت میں رکھنے سے توبہ کرلی ہے۔ میں صرف اس ملک سے جذباتی وابستگی کی وجہ سے یہاں سے اپنا تعلق برقرار رکھے ہوئے ہوں ورنہ میں عملی طور پر درحقیقت یہاں کوئی ایسا خاص کام نہیں کررہا..."

ایک لمحے کے توقف سے وہ دوبارہ بولا تو اس کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی در آئی تھی "میں یہاں کے ایک چھوٹے سے شہر گوجرانوالہ کے ایک غریبانہ سے محلّے میں پیدا ہوا تھا لیکن میری وابستگی بہرحال پورے ملک سے ہے۔ مجھے سبھی شہر اپنے لگتے ہیں اور مجھے سبھی سے پیار ہے۔ میں ہر شہر کے گلی کوچوں سے مانوس ہوں۔ اپنی تمام تر غربت اور نامساعد حالات کے باوجود میں نے بزنس اور صنعت کی دنیا میں بڑی تیزی سے اپنا مقام بنایا تھا۔ بچپن میں، میں نے دُکان داری کی، لڑکپن میں چند چلتی ہوئی مصنوعات کی ڈیلرشپ لی۔ نوجوانی میں ایک چھوٹا سا کارخانہ لگایا اور تیس سال کی عمر کو پہنچنے تک میں چار بڑے کارخانوں کا مالک تھا۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میری اپنی کہانی بھی اس سے ملتی جلتی تھی لیکن وہ تو میرا بھی استاد معلوم ہوتا تھا۔ اب میں سنجیدگی سے اس کی طرف توجہ دینے پر مجبور ہوچکا تھا۔ جج صاحب کی لاش نے جہاں اتنی دیر انتظار کیا تھا وہاں کچھ دیر اور انتظار کرسکتی تھی۔ ایک نادر کہانی کھل کر سامنے آرہی تھی۔ مرزا مکرم بیگ بھی یقیناً انسانی عقل کو حیران کردینے والا ایک کردار تھا اور حیران کردینے والے کردار میری کمزوری تھے۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "امریکا کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہاں ذہین اور محنت کرنے والے لوگ بڑی تیزی سے ترقی کرتے ہیں۔ یہ بات درست بھی ہے۔ ہمارے ہاں ذہین اور محنتی لوگوں کے راستے میں روڑے اٹکائے جاتے ہیں۔ بددیانت اور بے ایمان لوگوں کے لئے یہاں کا ماحول بڑا زرخیز ہے۔ اس کے باوجود بعض لوگ صرف اور صرف ذہانت و محنت کے بل بوتے پر حیرت انگیز رفتار سے ترقی کرکے دکھاتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بالکل ٹھیک کہا تھا کہ... ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی..."

مجھے ذرا سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔ ایک رسوائے زمانہ اسمگلر علامہ اقبال کی شاعری کا حوالہ دے رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے اس پر کیا تبصرہ کرنا چاہئے۔ ویسے بھی میں اسے روانی سے بولنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ وہ اس وقت بے ساختہ باتیں کررہا تھا۔

"میرے چار کارخانے بھی میری ایسی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ جس کا میں اب تصور بھی نہیں کرسکتا۔" اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "میں نے انہیں اپنی نوجوانی کے لہو سے سینچا تھا۔ میں نے جنوں کی طرح کام کیا تھا۔ مجھے بزنس اور صنعتکاری کا جنون تھا۔ مجھے لڑکپن یا نوجوانی میں بھی کوئی ایسا شوق نہیں تھا جو اس عمر میں ہونا چاہئے تھا۔ میں اس معاملے میں ابنارمل تھا۔ اور غیر معمولی کارنامے ابنارمل لوگ ہی انجام دیتے ہیں..."

کسی حد تک اس کی بات صحیح تھی لیکن میں نے دیکھا تھا، ابنارمل لوگوں کی غیر معمولی اور جناتی صلاحیتیں عموماً منفی ہوتی تھیں۔ وہ شر کے میدان میں بڑے کارنامے انجام دیتے تھے۔ خیر کے میدان میں نہیں۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ایک عمر تک مجھے کاروبار کے سوا دنیا کی کسی چیز کی طرف توجہ دینے کا خیال ہی نہیں آیا۔ وہ چار کارخانے میرا خواب تھے۔ میں یہ سوچ کر ستانے لگا تھا کہ بس یہی میری منزل تھی۔ مجھے اس سے آگے نہیں جانا تھا۔ بے شک ان کارخانوں میں سرکاری بینکوں کا قرضہ بھی شامل تھا لیکن قرضہ میں نے دیانت داری سے حاصل کیا تھا اور دیانت داری سے ادا کررہا تھا۔ زیادہ اہم چیز میری انتھک محنت اور شاندار پلاننگ تھی جسے کئی غیر ملکی ماہرین نے بھی سراہا تھا۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور قدرے افسردگی سے مسکراتے ہوئے بولا "اور پھر ہوا یہ کہ راتوں رات میرے کارخانے نیشنلائز کرلئے گئے۔ میری رہائش بھی ایک کارخانے کے اندر ہی واقع بنگلے میں تھی۔ مجھے کھڑے پیروں اس سے نکال دیا گیا۔ مجھے کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا۔ بینکوں کے قرضوں کی وجہ سے لمبے چوڑے جھگڑے کھڑے کردیئے گئے جن میں کسی اصول، کسی قاعدے کو دخل نہیں تھا۔ میں ایک طویل عرصے تک

مختلف دفتروں کے درمیان فٹ بال بنا رہا۔ کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر یہ ثابت کردیا گیا کہ میں کچھ لینے کا حق دار نہیں تھا۔ اُلٹا میری طرف سرکار کا کچھ [illegible] تھا۔ یہ صرف میری کہانی نہیں تھی۔ نہ جانے کتنوں کے ساتھ ایسا ہوا تھا۔ ان کی برسوں کی محنت پر شب خون مار لیا گیا۔

"اگر اس سارے عمل سے وہ مقصد حاصل ہوجاتے جس کے دعوے کئے جارہے تھے تب بھی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھ جیسے لوگ شاید جلد اس صدمے کو بھول جاتے کہ چلو ایک فردیا ایک خاندان کے نقصان کی کوئی بات نہیں قوم کو تو فائدہ پہنچا مگر افسوس' ایسا بھی نہیں ہوسکا۔ قوم کے نام پر قومیائی گئی صنعتوں کا جو حشر ہوا اور قوم کی جھکی ہوئی کمر پر جس طرح مزید بوجھ کا اضافہ ہوا وہ سب کے سامنے ہے۔

میں اپنی رام کہانی کو زیادہ تفصیل سے دُہرانا نہیں چاہتا گو کہ اس میں بڑے عبرت انگیز واقعات موجود ہیں مگر یہ وقت تفصیل میں جانے کا نہیں ہے۔ آپ کو مختصراً بھی اس لئے سب کچھ بتا رہا ہوں کہ آپ میری شخصیت سے کسی حد تک واقف ہوسکیں۔ مختصراً بس یہی ہے کہ اس کے بعد میں دل شکستہ ہوکر باہر چلا گیا اور ایک بار پھر نئے سرے سے جدوجہد شروع کی۔ وہاں بھی میں نے تیز رفتار ترقی کے حیرت انگیز ریکارڈ قائم کئے۔ اگر آپ اسے خود پرستی یا خود ستائشی نہ سمجھیں تو میں یہ کہنے کی اجازت چاہوں گا کہ میں ایک کاروباری جینئس ہوں افضل صاحب!"

"ہر آدمی کو اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اپنی صلاحیتوں کا کریڈٹ لینے کا حق ہے۔" میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "میں اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہوں۔"

"شکریہ۔" اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "میں جلد ہی اپنے چار کارخانوں کا صدمہ بھول گیا۔ میں نے اس ملک سے تعلق نہیں توڑا۔ میری زیادہ تر کاروباری سرگرمیوں کے مراکز دوسرے ہی ملکوں میں تھے لیکن میں ہمیشہ یہاں آتا جاتا رہا اور میرے کئی دفاتر یہاں بھی کام کرتے رہے البتہ میری ایک احتیاط جاری رہی کہ میں نے یہاں پراپرٹی نہیں بنائی۔ یہاں کچھ پتا نہیں ہے کب کون سا حکم اچانک نازل ہوجائے۔ میں دودھ کا جلا ہوں۔ چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پی رہا ہوں۔ ویسے بھی کھینچا تانی ہمارا قومی شعار ہے۔ ایک آتا ہے۔ وہ کوئی منصوبہ قوم کے سر پر لاد دیتا ہے۔ ابھی قوم اس کے بوجھ سے سنبھلنے کی کوشش کررہی ہوتی ہے کہ دوسرا آتا ہے۔ وہ اس منصوبے کو اس کے سر سے اُتار پھینکتا ہے اور اس کی جگہ اپنی سیاسی فیکٹری کا تیار کردہ منصوبہ لاد دیتا ہے۔ اسی کھینچا تانی میں بے چارے عوام اور معیشت..... دونوں کی کمر ٹوٹنے کے قریب ہے....."

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ وہ پُراسرار شخصیتیں جن کے بارے میں اب مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ ان کا تعلق خفیہ ایجنسیوں سے تھا' اب قدرے اضطراب سے پہلو بدل رہی تھیں اور بار بار لاش کی طرف دیکھ رہی تھیں لیکن مکرم بیگ کو گویا ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔

وہ اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے بولا "بہرحال..... یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد میں دراصل آپ سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں۔ ایک ایسا شخص جس نے اس عمر کو پہنچنے تک اتنے کارنامے انجام دیئے ہوں جسے بیرونِ ملک بھی کاروباری حلقوں میں جینئس کہا جاتا ہو کیا وہ اتنا احمق ہوسکتا ہے کہ اس جج کو اپنے دفتر میں قتل کردے جس کی عدالت میں اس کے خلاف کئی مقدمے چل رہے ہوں؟"

"اس سوال کا جواب دینے سے پہلے خود میرے ذہن میں کئی سوالات اُبھر آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ مجھ سے کوئی بھی سوال کرسکتے ہیں۔ خواہ وہ کتنا ہی توہین آمیز محسوس ہو۔ میں آپ کے ہر سوال کا..... اپنی بساط کے مطابق تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ آپ میری طرف سے مطمئن ہوں گے تبھی میری کوئی مدد کرسکیں گے۔ اگر آپ بدگمانیوں یا وسوسوں کا شکار رہیں گے تو پھر میرے کام نہیں آسکیں گے۔"

"سب سے پہلے تو مجھے یہی بات عجیب لگ رہی ہے کہ عبدالسلام صاحب کی عدالت میں تمہارے خلاف مقدمے چل رہے تھے۔ بقول تمہارے اپنے..... تم تو ایک شریف اور جینئس بزنس مین ہو۔ تمہارے خلاف مقدمے چلنے کی نوبت کیوں آگئی؟"

وہ استہزائیہ انداز میں ہولے سے ہنسا "سوال آپ نے بڑا ہی بھولپن سے کیا ہے لیکن مجھے معلوم ہے اس میں آپ کی ہوشیاری پنہاں ہے۔ پہلی بات تو یہ کہ ہمارے ہاں یہ کوئی طے شدہ فارمولا نہیں ہے کہ شریف اور جینئس بزنس مین کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں بن سکتا۔ اگر کوئی بنانے پر ہی تل جائے تو پھر بیسیوں مقدمے بنائے جاسکتے ہیں۔ میرے ساتھ ویسے بھی خاص طور پر ایک بدقسمتی رہی ہے۔"

"کہ تم بہت دولت مند ہوگئے؟" میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں..... یہی سمجھ لیجئے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "بے پناہ دولت مند ہونا لوگوں کے لئے خوش قسمتی کی علامت سہی لیکن مجھے دولت کے ساتھ تھوڑی سی بدقسمتی بھی شامل ہوکر ملی ہے۔ میں نے چونکہ دو مرتبہ خالی ہاتھوں سے جدوجہد شروع کرنے کے بعد ناقابل یقین تیز رفتاری سے ترقی کی اس لئے میری شخصیت میں لوگوں کے لئے کچھ پُراسراریت' کچھ افسانویت سی پیدا ہوگئی۔ ویسے بھی ہمارے ہاں کوئی تیزی سے امیر ہوجائے تو کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ اسمگلنگ کررہا ہے۔"

"بعض اوقات یہ بات درست بھی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"بعض اوقات نہیں..... بلکہ اکثر اوقات درست ہوتی ہے۔" اس نے تسلیم کیا۔

"لیکن بدقسمتی سے میرے معاملے میں یہ بات درست نہیں تھی لیکن بس افسانے اُڑتے رہے اور میرے بارے میں یہ تاثر

بہت مضبوط ہوگیا۔ اس میں کچھ اتفاقات کو بھی دخل تھا اور اس سلسلے میں میرے بعض دوستوں نے بھی بڑا اہم کردار ادا کیا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہونی چاہئے کہ میں بڑا یار باش اور دوست پرور آدمی ہوں حالانکہ ایک کٹر بزنس مین دوست پرور نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں جذبات کی گنجائش نہیں ہوتی۔ کاروبار تو اچھی خاصی سفاکی مانگتا ہے لیکن میں اس مقام پر پہنچنے کے بعد بھی جذبات کو ساتھ لئے پھر رہا ہوں۔"

یہ تو اس کمبخت نے میرے دل کی بات کردی تھی۔ کہیں اسے میرے بارے میں کچھ زیادہ ہی آگہی تو حاصل نہیں تھی؟ کہیں اس نے میرا ہی فلسفۂ حیات تو نہیں چُرا رکھا تھا؟

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ جذباتیت ہی کا کمال ہے کہ میں اس ملک میں نظر آرہا ہوں اور یہاں میرے دفاتر قائم ہیں ورنہ مجھے یہاں رہنے اور کاروباری سرگرمیاں جاری رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ میری دوست پروری سے میرے دوستوں نے بڑا ناجائز فائدہ اُٹھایا۔ میں اپنے دوستوں کی وجہ سے بڑا بدنام ہوا۔"

"تم نے ایسے دوست بنائے ہی کیوں؟ بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے انسان اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔" میں نے بڑے بوڑھوں ہی کے سے لہجے میں کہا۔

"بس..... مجھ سے یہی بڑی غلطی ہوئی۔" اس نے مسکراتے ہوئے تسلیم کیا "لوگ دراصل کاروباری تعلق استوار کرنے کے بہانے میرے قریب آتے تھے۔ کاروبار کو وسعت دینے کے لئے مجھے ہمیشہ لوگوں کی ضرورت رہی۔ چنانچہ آسودہ حال اور اثر رسوخ رکھنے والے لوگوں کے لئے میرے دروازے ہمیشہ کھلے رہے۔ اس طرح وہ لوگ میرے قریب آئے اور پھر ان سے کاروباری تعلق دوستی میں بدل گیا لیکن اپنی مصروفیت کی وجہ سے مجھے بہت دیر میں جاکر پتا چلا کہ میرے قریب آنے والے ایسے لوگوں میں سے اکثر بدعنوان' بدکردار اور جرائم پیشہ تھے۔ ان کی آسودہ حالی یا اثر رسوخ سے مجھے تو کیا فائدہ پہنچنا تھا۔ اُلٹا انہوں نے میرے نام اور اثر رسوخ سے فائدہ اٹھا کر نہ جانے کیا کچھ کرڈالا اور یہ میری حماقت تھی کہ میں اصل بات جان لینے کے بعد بھی مروت میں "مبتلا" رہا اور کوئی سخت اقدام نہ کرسکا۔"

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اس کی اس بات پر یقین کیا جائے یا نہیں؟ کیا وہ واقعی اتنا وضع دار اور بامروت ہوسکتا تھا؟ اس سوال کا جواب شاید اتنی جلدی نہیں مل سکتا تھا۔ میں نے اسے بات جاری رکھنے کا موقع دیا۔

وہ کہہ رہا تھا "میری شخصیت کے گرد افسانویت اور پُراسراریت کی جو دیوار کھڑی ہوگئی تھی وہ بھی ان لوگوں کے بہت کام آئی۔ اس دیوار کو اونچا کرنے میں درحقیقت انہی لوگوں کا ہاتھ تھا۔ اس کی آڑ میں ان لوگوں کے نہ جانے کیا کیا دھندے چلتے رہے اور ان کی لعنت ملامت میرے کھاتے میں جمع ہوتی رہی۔

اس میں شک نہیں کہ ان لوگوں کی وجہ سے مجھے کچھ مالی فائدہ بھی پہنچتا رہا لیکن یہ بڑا معمولی ہوا تھا۔ میرے [illegible] میں جو رقمیں ٹرانسفر ہوتی رہیں میں انہیں مختلف' جائز کاروباروں [illegible] منافع میں سے اپنا حصہ سمجھتا رہا۔ اگر مجھے بروقت معلوم ہوجاتا کہ وہ لوگ کس طرح یہ سب کچھ کمارہے تھے..... کتنا کمارہے تھے اور مجھے کتنے کم پر ٹرخا رہے تھے تو میں فوراً اس سلسلے میں کم از کم اتنا تو کرتا کہ ان سے کاروباری تعلق توڑ لیتا۔ دوستی اور مروت بعد کے مسئلے تھے۔"

"تمہارا مطلب ہے صرف ان لوگوں کی وجہ سے تم پر مقدمے وغیرہ قائم تھے اور انہی کی وجہ سے تمہاری شہرت خراب تھی ورنہ تم ایک نیک نام تاجر ہوتے اور تمہاری شہرت بہت اچھی ہوتی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرا یہ دعویٰ تو نہیں ہے۔" اس نے کچھ سوچ کر جواب دیا "میں نے کہا نا کہ کچھ اتفاقات' کچھ غلط فہمیوں' کچھ میری شخصیت کی پُراسراریت اور کچھ تحکموں کی بدمعاشیوں کی وجہ سے میں رسوائیوں کی زد میں تو تھا اور میرے خلاف کارروائیاں بھی چلتی رہتی تھیں لیکن اگر یہ لوگ اپنے اعمال کا بوجھ بھی مجھ پر نہ لاد دیتے تو میں زیادہ مشکل میں نہ ہوتا اور میرے گرد رسوائیوں کی دھول اتنی گہری نہ ہوتی۔ میرے لئے پاکستان میں زندگی گزارنا دشوار نہ ہوتا۔ ان لوگوں کی وجہ سے میں ایک قسم کی دلدل میں پھنس گیا ہوں اور مجھے زیادہ تر ملک سے باہر رہنا پڑتا تھا جبکہ میں ایسا چاہتا نہیں تھا۔"

"میں نے تو یہی سنا تھا کہ ان دنوں بھی تم مفرور تھے۔" میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ بڑے تحمل سے مسکرایا "میرے لئے مفرور کی اصطلاح استعمال کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں کہیں بھی پولیس کو مطلوب نہیں ہوں۔ جس عدالت یا جس خفیہ ایجنسی میں بھی میری پیشی ہوتی ہے یا مجھے بُلایا جاتا ہے اور میرا وہاں پہنچنا ضروری ہوتا ہے تو میں یا میرے وکیل پہنچتے ہیں۔ ہر دورِ حکومت میں میرے خلاف کوئی نہ کوئی کارروائی چلتی رہی ہے۔ میں اس سلسلے میں ہر ممکن تعاون کر رہا ہوں۔ تحقیقات سے ڈر کر میں کبھی نہیں بھاگا۔ ویسے میں ہر وقت حالتِ سفر میں ہی ہوتا ہوں۔ کبھی کسی کیس میں میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کیا جاسکا....."

اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی۔ وہ گویا کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا "میرے بارے میں پُراسراریت اور افسانویت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ اس کے اثرات دیگر ممالک تک بھی پہنچ چکے ہیں۔ وہاں بھی ایک طرف کاروباری حلقوں میں مجھے جینئس قرار دیا جاتا ہے تو دوسری طرف بعض حلقے میرے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے ہیں جن میں بعض ایسے سیاستداں بھی شامل ہیں جنہیں میں نے ان کی انتخابی مہم یا دیگر سیاسی سرگرمیوں کے لئے بھاری عطیات دینے سے انکار کردیا۔ میں

نے ہر جگہ ہر شخص پر یہ واضح کردیا کہ میں نہ تو اپنے ملک میں کسی سے بلیک میل ہوا ہوں اور نہ دوسرے ملکوں میں کسی سے بلیک میل ہوں گا۔ میرا دل چاہے تو میں کسی پر لاکھوں ڈالر بھی لٹا سکتا ہوں لیکن میرا دل نہ چاہے تو میں کسی کو ایک پاکستانی روپیا بھی نہیں دوں گا۔ ظاہر ہے میرے اس طرزِ عمل پر بہت بڑی بڑی شخصیات چراغ پا ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ بیرونِ ملک بھی میرے خلاف مختلف زاویوں سے تحقیقات ہوتی رہی ہیں۔ کبھی مجھے منشیات کا اسمگلر سمجھا گیا۔ کبھی اسلحے کا کمیشن ایجنٹ سمجھا گیا کبھی الیکٹرانکس اور ایٹمی مواد کا اسمگلر سمجھا گیا۔"

وہ دھیرے سے ہنسا اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "اور آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ ان کے تحقیقاتی ادارے کیسے ظالم ہیں۔ بال کی کھال نکال لیتے ہیں۔ وہ اپنے ملکوں میں تو کیا... دوسرے ملکوں میں بھی جاکر اپنے مجرم تلاش کرلیتے ہیں۔ لیکن آپ کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ وہاں بھی میرے خلاف کبھی کچھ ثابت نہیں کیا جاسکا۔ حتیٰ کہ کبھی ٹیکس چوری کا بھی کوئی الزام ثابت نہیں کیا جاسکا جس کے لئے انہوں نے سرتوڑ کوشش کی۔ اس سے آپ کیا نتیجہ اخذ کریں گے؟"

"یہی کہ یا تو تم واقعی ٹھیک آدمی ہو۔ یا پھر ان کے تحقیقاتی افسروں سے بھی زیادہ ذہین ہو۔ واقعی جینئس ہو..... لیکن ایول جینئس۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے... آپ شک کا فائدہ اٹھانے کا اپنا حق ضرور محفوظ رکھیں۔ میں آپ سے یہ نہیں کہوں گا کہ آپ پہلی ہی ملاقات میں مجھے فرشتہ سمجھنا شروع کردیں لیکن اتنی درخواست ضرور کروں گا کہ پلیز... مجھے شیطان بھی مت سمجھیں۔ مجھے ایک عام آدمی سمجھ کر میرا موقف سنیں اور میرا جو امیج بنا ہوا ہے اس سے ہرگز متاثر نہ ہوں۔ یہ اس امیج ہی کا کمال ہے کہ آپ مجھے مفرور سمجھ رہے تھے حالانکہ میں کافی عرصے سے یہیں ہوں البتہ کچھ عرصہ پہلے میں دبئی میں تھا جہاں پیر دانش مجھ سے ملنے آیا تھا۔ وہ اس سے میری آخری ملاقات تھی۔"

پیر دانش کا ذکر آیا تو میرے اعصاب نے ہلکی سی جھرجھری لی۔ میں خود اسی کا ذکر چھیڑنا چاہ رہا تھا لیکن گفتگو میں کوئی مناسب موقع تلاش کررہا تھا تاکہ اچانک اس کا نام لے کر مکرم بیگ کا ردِ عمل دیکھ سکوں لیکن اس نے خود ہی اس کا ذکر کردیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میری وجہ سے پیر دانش جس انجام کو پہنچا تھا اس پر مکرم بیگ کے دل میں میرے خلاف کینہ ہوگا۔

ابھی تک میرے ذہن میں یہ امکان موجود تھا کہ شاید اس نے مجھے کسی سازش کے جال میں پھنسانے ہی کے لئے بلایا ہو اور اس کی خوب صورت طولانی گفتگو محض مجھے بہلائے رکھنے کا ایک ذریعہ ہو۔ آخر میں یکدم دھڑام سے کوئی انکشاف میرے سر پہ آن گرے۔

حالانکہ پیر دانش جس انجام کو بھی پہنچا تھا' میرے خیال میں تو اس کا "کریڈٹ" مجھے نہیں جاتا تھا لیکن اگر مکرم بیگ اس کا "الزام" مجھے دینا چاہتا تو میں اس سے انکار نہ کرتا یا پھر اپنے احساسات ضرور بیان کردیتا کہ بھائی صاحب! پیر دانش صحیح معنوں میں تو میرے ہاتھوں انجام کو نہیں پہنچا لیکن خواہش میری یہی تھی کہ یہ نیک کام میرے ہاتھوں انجام پاتا اور اب بھی مجھے کم از کم اس بات کی ضرور خوشی تھی کہ اس سے چھیڑ چھاڑ کی ابتدا میں نے کی تھی۔

تاہم ابھی تک مرزا مکرم بیگ نے ایسی کوئی بات نہیں کی تھی کہ اس سلسلے میں اس کے دل میں کوئی غم و غصہ تھا۔ پیر دانش کا ذکر بھی اس نے بڑے ہموار لہجے میں کیا تھا۔

میں نے بھی بظاہر سرسری سے لہجے میں کہا "پیر دانش بھی تمہارا دوست تھا۔ وہ کس قسم کے دوستوں میں سے تھا؟"

"وہی..... مار آستین قسم کے دوستوں میں سے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "اس کی وجہ سے تو مجھے سب سے زیادہ نقصان پہنچا۔"

یہ جواب میرے لئے حیران کن تھا تاہم میں نے حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ اس قسم کے لوگ پیچ در پیچ شخصیتوں کے مالک ہوتے تھے۔ کچھ پتا نہیں چلتا تھا کہ کس مرحلے پر کون سی کینچلی اتار کر وہ کس روپ میں آجائیں۔ ابھی میں اس شخص پر بھروسا کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ جب تک اس کی پوری کہانی سامنے نہ آجاتی' اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا بھی مشکل تھا۔

"کس قسم کا نقصان؟" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس نے امریکیوں کے سے انداز میں کندھے اچکائے "آپ سے بہتر کون جانتا ہے کہ وہ کیا کچھ کررہا تھا۔"

"تو اب تم یہ دعویٰ کروگے کہ اس میں تمہاری مرضی شامل نہیں تھی؟" میں نے بدستور اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میرے تو فرشتوں کو بھی اس کی خبر نہیں تھی افضل صاحب!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میں کوئی بہت اعلیٰ انسان ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرسکتا۔ میں شاید اسمگلر... یا شاید منشیات کا اسمگلر بھی ہوسکتا تھا لیکن میں کم از کم اتنا گھٹیا نہیں ہوسکتا تھا جتنا پیر دانش تھا اور اس کمبخت کی وجہ سے یہ تاثر پیدا ہوگیا کہ شاید میں بھی اس کے بعض انتہائی گھٹیا دھندوں میں شریک تھا یا اسے میری سرپرستی حاصل تھی....."

پھر وہ گویا مجھے یقین دلانے کے لئے الفاظ پر زور دیتے ہوئے تقریباً التجائیہ سے لہجے میں بولا "بخدا..... ایسی کوئی بات نہیں تھی افضل صاحب! یہ میری بدقسمتی تھی کہ وہ بصد کوشش مجھ سے دوستی کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ اس کی شخصیت فراڈ تھی۔ اس کی پیری فقیری سے بھی میں متاثر نہیں تھا۔ میں نے دنیا کی خاک چھانی ہوئی ہے اور میں بڑا عملی آدمی ہوں۔ میں اس قسم کی شعبدے بازیوں سے متاثر نہیں ہوسکتا تھا لیکن ایک دوست کی حیثیت سے مجھے اس کی شخصیت میں بعض خوبیاں نظر آئیں اور میں نے محسوس کیا کہ وہ دوست بنائے جانے کے لائق تھا....."

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "مجھے بہت تاخیر سے معلوم ہوا کہ اس کی وہ خوبیاں بھی محض ڈراما بازی کی پیداوار تھیں۔ وہ انسان کو متاثر کرنے اور شیشے میں اتارنے کے فن سے واقف تھا۔"

"مجھ سے بھی اس کی بہت سی ملاقاتیں ہوئیں اور اس نے مجھے بھی متاثر کرنے کی کوششیں کیں لیکن میں تو اس سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ مجھے تو اس کی کوششیں بہت بھونڈی لگیں۔ اس نے مجھے جتنا متاثر کرنے کی کوشش کی' میں اس کی طرف سے اتنا ہی زیادہ بدگمان ہوا۔" میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے آپ اس کی طرف سے پہلے ہی بدگمان ہوں۔ کھٹکے ہوئے ہوں۔" وہ سرہلاتے ہوئے بولا "اور جب انسان کسی کی طرف سے پہلے ہی کھٹکا ہوا یا بدگمان ہوتا ہے تو اس کا زاویۂ نظر بالکل بدل جاتا ہے۔ میرا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ میری اس سے ابتدائی ملاقاتیں بیرونِ ملک ہوئی تھیں۔ آپ اس سے یہیں ملے تھے۔ آپ اسے اس کے پس منظر سمیت زیادہ قریب سے دیکھ سکتے تھے۔"

پھر وہ اپنے مخصوص مربیانہ انداز میں مسکرایا "اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ شاید آپ مجھ سے زیادہ ذہین اور مردم شناس ہوں۔"

"دیکھو... میری تعریفوں وغیرہ سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔" میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا "میں مکھن پروف واقع ہوا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے سرہلایا "اگر مجھے یہ شبہ بھی ہوتا کہ آپ جھوٹی تعریفوں سے متاثر ہوسکتے ہیں تو میں آپ کو ہرگز یہاں آنے کی زحمت نہ دیتا کیونکہ وہ کام بہت اہم ہے جس کے لئے میں نے آپ کو بڑے جتن سے بلایا ہے۔ کوئی سطحی آدمی اس سلسلے میں میری مدد نہیں کرسکتا۔"

ابھی تک وہ اس کام کی طرف نہیں آیا تھا جس کا ذکر کئے جارہا تھا۔ میں نے بھی اس سے اصل موضوع پر آنے کی فرمائش نہیں کی تھی۔ وہ اگر مرحلہ وار اس طرف آنا چاہتا تھا تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ شاید اس طرح بات زیادہ بہتر طور پر میری سمجھ میں آتی۔ البتہ اس لاش کے سلسلے میں ضرور میرے دل میں تھوڑا سا اضطراب تھا جو بے چاری ایک طرف پڑی شاید دھیرے دھیرے اکڑ رہی تھی یا اکڑ چکی تھی۔

مکرم بیگ نے بات جاری رکھی "پیر دانش بھی چند چھوٹے موٹے پراجیکٹ میں مجھے پارٹنر بنانے میں کامیاب ہوگیا جن کے بارے میں' میں کبھی پلٹ کر نہیں دیکھ سکا کہ ان کی آڑ میں درحقیقت کیا ہورہا تھا۔ ہاں..... میں یہ ضرور تسلیم کروں گا کہ اس کی طرف سے کچھ منافع میرے اکاؤنٹس میں جاتا رہا اور میں اسی خیال میں مگن رہا کہ چلو بیٹھے بٹھائے کچھ آمدنی ہورہی تھی۔ میری بہت سی چیزیں پیر دانش کے استعمال میں رہیں۔ کہیں کوئی کوٹھی... کہیں کوئی لانچ... کہیں کوئی چھوٹا موٹا بحری جہاز... حتیٰ کہ یہ دفتر بھی۔ جہاں اس وقت ہم بیٹھے ہیں... جب میں نے اسے نیا نیا سیٹ کیا تھا تو شروع میں کچھ عرصے یہ پیر دانش کے ہی پاس رہا اور بخدا مجھے آج تک معلوم نہیں کہ وہ اس میں کیا کرتا تھا۔"

"اس پر بھی تمہیں دعویٰ ہے کہ تمہاری انفارمیشن سروس بہت اچھی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اس وقت اچھی نہیں تھی جب کی یہ باتیں ہیں۔" اس نے تسلیم کیا "ویسے بھی میں اس قسم کے لوگوں میں شامل ہونا نہیں چاہتا تھا جو اپنے دوستوں اور کاروباری شراکت داروں کے بارے میں جاسوسی کراتے ہیں۔ البتہ جو واقعات میرے ساتھ پیش آئے ان کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ ایسا کرلینا ہی بہتر تھا۔ اس کے بعد ہی میں نے اپنی "انفارمیشن سروس" کو بہتر بنایا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ کچھ عرصہ پہلے مجھے پیر دانش کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل ہوئیں جو میرے لئے خاصی ہولناک تھیں۔ میں نے اسے پیغام بھیجا کہ میرے ساتھ نام نہاد پارٹنرشپ میں اس کے جو بھی دھندے چل رہے تھے وہ انہیں فوری طور پر بند کردے اور میری جو کرائے کی جگہیں اس کے استعمال میں تھیں' انہیں فوراً خالی کردے۔ یہ پیغام پاکر وہ دوڑا دوڑا میرے پاس دبئی آیا....."

مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس وقت کا ذکر کررہا تھا جب میں رات کو پیر دانش کی ایک داشتہ فرح سے متعارف ہوا تھا اور اس نے مجھے اس کے بارے میں بہت سی باتیں بتائی تھیں۔ اسی نے یہ بھی بتایا تھا کہ پیر دانش اچانک دبئی روانہ ہوا تھا۔ اسی دوران اس کوٹھی پر بھی تالا پڑگیا تھا جہاں "سینما کلب" کے شو چلتے تھے اور لڑکیاں بک ہوتی تھیں۔ اب یہ کہنا مشکل تھا کہ مرزا مکرم بیگ کی دھمکی کی وجہ سے ایسا ہوا تھا یا پیر دانش کو احساس ہوگیا تھا کہ اس کے گرد میری اور قانون کی گرفت دھیرے دھیرے مضبوط ہورہی تھی اور اس نے احتیاطی اقدامات شروع کردیے تھے۔ بہرحال اتنا ضرور تھا کہ مکرم بیگ کی باتوں سے کچھ اور کڑیاں ملتی نظر آرہی تھیں۔ جھوٹ یا سچ بعد کا مسئلہ تھا۔

مکرم بیگ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "پیر دانش سے میری آخری ملاقات خوشگوار نہیں تھی۔ میں نے اسے کھری کھری سنائیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس سے وہ میری آخری ملاقات تھی ورنہ شاید میں اتنا سخت رویّہ اختیار نہ کرتا۔ بنیادی طور پر میں ایک نرم دل انسان ہوں۔"

میں استہزائیہ انداز میں مسکرادیا لیکن مکرم بیگ میری مسکراہٹ کا کوئی اثر لئے بغیر بولا "پیر دانش میری برہمی پر حواس باختہ ہوگیا تھا۔ پتا نہیں کیوں لوگوں پر میری بڑی دہشت بیٹھی ہوئی ہے۔ حالانکہ میں کوئی فلمی قسم کا گروہ باز یا دہشت گرد نہیں ہوں کہ جس کو چاہوں مروادوں' جس کو چاہوں اٹھوالوں... جو جی چاہے کر گزروں اور اپنی انا کی جنگ میں خون کی ندیاں بہادوں۔ اس قسم کی

باتوں کے بارے میں، میں کبھی سوچتا بھی نہیں ہوں۔"

وہ میرے سامنے ایک نیا ہی مکرم بیگ بن کر آرہا تھا۔ میں اب بھی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ اس کے دعووں پر یقین کرلوں یا اس کے بارے میں جو تاثر مجھ تک پہنچا تھا اسی کو ٹھیک سمجھوں۔ بہرحال یہ کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ تھوڑی بہت کوشش اور تھوڑے بہت انتظار کے بعد عموماً ہر شخصیت کھل کر سامنے آ ہی جاتی تھی فی الحال مکرم بیگ کی باتیں سنتے رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ویسے مکرم بیگ نے مجھے حیران ضرور کردیا تھا۔ میرے ذہن میں اس کا جو تصور تھا وہ اس سے بالکل مختلف انداز میں میرے سامنے آیا تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا "تاہم اتنا ضرور ہے کہ میں کسی کو بھی اپنے ساتھ کوئی بدمعاشی نہیں کرنے دیتا۔ دوستی اور عزت میں لوگ جو فائدہ اُٹھا جائیں سو اُٹھا جائیں لیکن ایک تو دھونس دھاندلی سے کوئی بڑے سے بڑا پھنے خان بھی مجھ سے کوئی کام نہیں کرا سکتا۔ دوسرے جب کسی پر سے میرا اعتماد اٹھ جائے اور میں اس کی طرف سے بدگمان ہوجاؤں تو پھر چاہے مجھے اس سے کروڑوں کا فائدہ پہنچ رہا ہو، میں اس سے تعلق نہیں رکھتا۔"

اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر پیروانش کی طرف واپس آتے ہوئے بولا "میرا اس سے قطع تعلق کرنا اس کے لئے بہت بڑا دھچکا تھا۔ اس کے اپنے الفاظ میں وہ اس روز صحیح معنوں میں یتیم ہوا تھا۔ کمبخت مبالغہ آرائی بھی بہت کررہا تھا۔ اس کے وہ دھندے اور بدمعاشیاں جو خالصتاً اس کی اپنی تھیں، وہ بھی کچھ کم منافع بخش نہیں تھیں۔ کوئی ایسا ناجائز دھندا نہیں تھا جس میں اس کی ٹانگ نہیں پھنسی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود وہ میری حمایت سے محروم ہونے پر اپنے آپ کو کافی کمزور محسوس کررہا تھا۔"

"وہ خود ہی اپنی جگہ ایک چھوٹا سا گاڈ فادر تھا لیکن تمہیں وہ اپنا گاڈ فادر سمجھتا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں کسی کی نظر میں اس قسم کا مقام حاصل کرنا پسند نہیں کرتا۔" وہ بولا "یہ گاڈ فادر قسم کی چیزیں کبھی بھی میرا آئیڈیل نہیں رہیں۔ ویسے بھی اب یہ چیزیں آؤٹ ڈیٹیڈ ہوگئی ہیں۔"

"اصطلاحیں، نام اور القاب بدل جاتے ہیں لیکن شخصیتیں ہر دور میں کسی نہ کسی روپ میں موجود رہتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"شاید" وہ مبہم لہجے میں بولا "بہرحال..... میں نے پیروانش سے جان چھڑا کر اپنے آپ کو کافی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔"

"تمہارا ساتھ چھوٹنا اس کے لئے بڑی نحوست کا باعث ثابت ہوا۔" میں نے کہا "بے چارہ فوراً ہی قانون کے شکنجے میں آگیا۔ قانون تو شاید اب بھی اس کا کچھ نہ بگاڑ پاتا لیکن کسی اور طرح بے چارے کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔"

"مجھے ساری تفصیلات معلوم ہوچکی ہیں۔" مکرم بیگ بولا "دراصل اسی سارے چکر کی وجہ سے میں غائبانہ طور پر آپ سے متعارف ہوا اور میں نے اپنے آدمیوں کو آپ کے بارے میں معلومات جمع کرنے کی ہدایت کی۔ جب بہت سی معلومات جمع ہوگئیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں تو اتفاق سے ایک بہت شاندار آدمی کی طرف متوجہ ہوگیا ہوں جسے میرا دوست ہونا چاہئے تھا۔"

"کیا مار آستین پالنے کا شوق ابھی پورا نہیں ہوا؟" میں مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اوہ..... نو۔" وہ ایک بار پھر یکدم جذباتی ہوتے ہوئے انگریزی میں بولا "آپ کے بارے میں تو میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ مجھے معلوم ہے آپ میرا دوستی کا بڑھا ہوا ہاتھ نہیں تھامیں گے کیونکہ ابھی آپ میرے بارے میں غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کا شکار ہیں لیکن رفتہ رفتہ آپ مجھ سے واقف ہوجائیں گے تو یقیناً میرے بارے میں آپ کی رائے بدل جائے گی۔"

"کہیں رائے پہلے سے زیادہ بُری نہ ہوجائے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں ایسا ہرگز نہیں ہوگا۔" وہ اعتماد سے بولا "ہم اس شہر کے دو ایسے ممتاز افراد ہیں جو ایک دوسرے کو بہت زیادہ فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔"

"ڈیئر مرزا مکرم بیگ!" میں نے ملامت سے کہا "کیا تم ہر وقت فائدے ہی کی تلاش میں رہتے ہو؟"

"نہیں میں نقصان اُٹھانے کے لئے بھی تیار رہتا ہوں۔" وہ بلا تامل بولا "اور نقصان اُٹھا تا بھی رہا ہوں۔"

"اس سارے قصے میں یہ لاش کہاں فٹ ہوتی ہے؟" میں نے جج صاحب کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے متاسفانہ سی نظروں سے جج صاحب کی لاش کی طرف دیکھا اور ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا "یہ ایک افسوس ناک واقعہ ہے۔ کوئی انتہائی بے وقوف انسان ہی یہ سمجھ سکتا ہے کہ میں ایسی حرکت کرسکتا ہوں یا اس پر خوش ہوسکتا ہوں۔ تاہم اس لاش نے میری پوزیشن بہت ہی مشکوک بنادی ہے اور مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا ہے۔"

اس کے ساتھ ہی وہ گویا تاسف اور پریشانی کے اثرات سے نکل آیا۔ گہری سانس لے کر بولا "بہرحال..... کبھی کبھی بُری سے بُری صورتِ حال میں بھی اچھائی کا کوئی پہلو پنہاں ہوتا ہے۔ شاید یہ واقعہ میرے اور آپ کے درمیان نہایت گہرے اور کارآمد تعلقات قائم ہونے کا سبب بن جائے۔"

وہ تعلقات اور دوستی استوار کرنے کی باتیں کئے جارہا تھا جبکہ میرا خیال تھا وہ مجھے اپنے دوست پیروانش کی موت کا ذمے دار سمجھتے ہوئے میرا دشمن بن چکا ہوگا... اور وہ بہرحال ایک طاقتور آدمی تھا۔ میں اسے اپنے خطرناک دشمنوں میں شمار کرنے کا فیصلہ کئے ہوئے تھا لیکن وہ اپنے رویّے سے مجھے چکرا دینے پر تلا ہوا تھا۔

وہ ایک بار پھر پیروانش کا ذکر چھیڑتے ہوئے بولا "آپ مجھے پیروانش سے نجات دلا کر پہلے ہی مجھ پر ایک احسان کرچکے ہیں۔ یہ وہ کام تھا جو میں خود بھی نہیں کرسکتا تھا۔ انسان اچھا ہو یا بُرا... اگر کبھی اس سے تعلقات رہ چکے ہوں..... ہم نے ایک ساتھ کچھ اچھا وقت بھی گزارا ہو تو پھر میں تعلقات بگڑ جانے کے بعد بھی اس سے کوئی بُرا سلوک نہیں کرسکتا۔ پیروانش کو بھی سزا دینا یا اس سے صحیح معنوں میں قطع تعلق کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ آپ نے میرا یہ کام آسان کردیا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ اس کی موت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے سر ہلایا "اس کی موت تو خالصتاً اس کے اپنے اعمال کا نتیجہ تھی لیکن اسے اس انجام کی طرف لے جانے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا۔ میں اس کردار کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔ اسی سارے قصے سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ آپ یقیناً اچھے بھلے پیچیدہ معاملات کو سلجھانے اور ان کی تہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ میں نے سوچا موقع اچھا ہے۔ مجھے بھی آپ کی ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔"

میں ذرا چونکا۔ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "آپ کو شاید حیرت ہورہی ہے؟"

"حیرت تو مجھے اسی وقت سے ہورہی ہے جب میں نے شرافت کو اپنے کمرے میں بیٹھے دیکھا تھا۔" میں نے تسلیم کیا "لیکن ..... حیرت میرے لئے اب کوئی ایسی حیرت ناک چیز نہیں رہی۔ حیرت اب میری زندگی کی ساتھی ہے۔ قدم قدم پر کوئی حیرت میری منتظر ہوتی ہے۔"

"یعنی آپ نے حیرت انگیز باتوں پر بھی حیران ہونا چھوڑ دیا ہے؟"

"تقریباً۔" میں نے جواب دیا "یونہی..... کبھی کبھی ذرا لطف اندوز ہونے کے لئے حیران ہولیتا ہوں۔ بہرحال تم ذرا وضاحت سے بات کرو تو میں تمہارا شکر گزار ہوں گا۔ پس منظر تو میری سمجھ میں آگیا ہے۔ اب ذرا پیش منظر کے بارے میں بھی کچھ بتا دو۔"

"پیش منظر یہی ہے جو آپ کے سامنے ہے۔ پیش منظر بظاہر بڑا سادہ سا ہے لیکن درحقیقت یہ بہت اُلجھا ہوا ہے۔" وہ اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے ساتھ رگڑنے کے بعد انہیں بغور دیکھتے ہوئے بولا "ظاہر ہے ایک اعلیٰ عدالت کے جج کا قتل معمولی بات نہیں ہے اور جج بھی ایسے جو اپنی دیانت داری اور اصول پرستی کے لئے کچھ زیادہ ہی مشہور تھے اور جن کی عدالت میں میرے کئی مقدمے زیرِ سماعت تھے۔ ظاہر ہے کسی نے مجھے پھنسانے کی کوشش کی ہے۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر میرے چہرے پر گویا ردِعمل تلاش کرنے کی کوشش کی اور شاید اس میں ناکام رہنے کے بعد بولا "میرے جو مقدمے جج صاحب کی عدالت میں تھے، مجھے یقین تھا کہ مجھے ان میں سے کسی میں سزا نہیں ہوسکتی تھی۔ ایک مقدمے کا تو فیصلہ بھی ہوچکا تھا۔ میں اس میں بری ہوچکا تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ اسی طرح ایک ایک کرکے میں باقی مقدموں میں بھی بری ہوجاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے کسی نے جج صاحب کا قتل ہی میرے گلے میں ڈال دیا۔"

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ میرے خلاف آج تک قتل کا کوئی مقدمہ نہیں ہے۔"

اس کی زبانی یہ سن کر مجھے واقعی حیرت تو ہوئی لیکن کچھ زیادہ نہیں۔ میں پہلے ہی اس سلسلے میں اس کے منہ پر ہی اظہارِ خیال کرچکا تھا۔ اگر وہ واقعی اسی قسم کا آدمی تھا جیسی اس کی شہرت مجھ تک پہنچی تھی تو ظاہر ہے ایسے آدمیوں کو خود تو کسی کے خون میں ہاتھ رنگنے نہیں پڑتے تھے۔ انہیں تو صرف زبان ہی ہلانا پڑتی تھی۔ بلکہ بعض اوقات تو زبان بھی ہلانا نہیں پڑتی تھی۔ صرف آنکھ کا اشارہ ہی کافی ہوتا تھا۔

قانون بہرحال بڑی عجیب چیز ہے۔ بعض انسانوں کو تو قانون کی موشگافیوں کا بہت ہی زیادہ فائدہ پہنچتا ہے۔ بعض لوگ ہزاروں انسانوں کو قتل کرانے کا باعث بنتے ہیں لیکن چونکہ انہوں نے خود اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا ہوتا اس لئے قانون میں ان کے لئے بڑی گنجائشیں نکل آتی ہیں۔ ان پر کسی کے قتل کا مقدمہ قائم ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ نوبت آ بھی جائے تو انہیں قاتل ثابت نہیں کیا جاسکتا اور بعض اوقات تو ہزاروں انسانوں کے قاتل دیوتا کا درجہ حاصل کرلیتے ہیں۔ یہ دنیا ایک عجیب تماشا گاہ تھی اور یہ اس کے ہزاروں عجیب و غریب تماشوں میں سے ایک تماشا تھا۔

چنانچہ اگر مرزا مکرم بیگ کہہ رہا تھا کہ اس کے خلاف کبھی قتل کا کوئی مقدمہ نہیں چلا تو اس میں میرے لئے زیادہ حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ کہہ رہا تھا "لیکن اب اچانک ہی ایک ایسا قتل میرے سر ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے جو واقعی میرے لئے پھانسی کا پھندا بن سکتا ہے لیکن اگر عقل سے کام لیا جائے تو فوراً احساس ہوجائے گا کہ اس میں جلد بازی میں بڑے جھول رہ گئے ہیں۔ کیا یہ عجیب سی بات نہیں کہ میں باہر سے اپنے اپارٹمنٹ میں آتا ہوں تو مجھے یہاں جج صاحب کی لاش پڑی ملتی ہے۔ ابھی میں اور میرے گارڈز حیران ہی ہورہے ہیں اور سمجھنے کی کوشش کررہے ہیں کہ کیا ماجرا ہے تو اسی دوران خفیہ پولیس کے یہ صاحبان یہاں پہنچ جاتے ہیں۔" اس نے بے زبان قسم کی ان پراسرار شخصیتوں کی طرف اشارہ کیا جو اب میرے لئے پراسرار نہیں رہی تھیں۔

مکرم بیگ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "کسی نے عام مقامی پولیس کو اطلاع دینے کی زحمت نہیں کی تھی بلکہ براہِ راست ایک وفاقی خفیہ ایجنسی کو مطلع کیا تھا۔ معاملہ چونکہ سنگین تھا اس

لئے ایجنسی فوراً حرکت میں آئی۔ مقتول بھی ایک بڑا آدمی تھا اور جسے قاتل کے طور پر گھیرنے کی کوشش کی جارہی تھی وہ بھی کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ چنانچہ فوری طور پر یہ صاحبان یہاں آن پہنچے....."

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا پھر جسم کو ذرا ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھتے ہوئے بولا "تاہم میں اتنی آسانی سے حراست میں جانے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میں نے بھی کچھ ڈوریاں ہلائیں۔ کچھ بڑے لوگوں کو فون کئے۔ میری شہرت کیسی بھی سہی ... اور بے شک میرے خلاف بہت سے مقدمات چل رہے ہیں لیکن آپ کو یقیناً اندازہ ہوگا کہ ان سب باتوں کے باوجود مجھ جیسے لوگوں کا اپنا ایک اثر رسوخ ہوتا ہے۔ بڑے لوگ ہمیں جانتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں۔"

وہ درست کہہ رہا تھا۔ بعض اوقات تو ایسے لوگوں کے خلاف کارروائیاں محض نورا کشتی ہوتی تھیں اور بعض اوقات بڑے بڑے خاص محکموں کے کرتا دھرتا اس قسم کے لوگوں کے خلاف بیان داغتے تھے کہ ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی آپریشن کیا جائے گا۔ یہ کردیا جائے گا۔ وہ کردیا جائے گا لیکن رات کو وہی بڑے بڑے افسران اس قسم کے لوگوں کے ساتھ محفلیں سجاتے تھے اور دادِ عیش دیتے تھے۔

اس قسم کے بیانات دینا یا کبھی کبھی اپنی گیدڑ بھبکیوں کی تشہیر کرنا ان کی مجبوری تھی۔ انہیں خانہ پُری کے لئے اپنے محکموں کی کچھ نہ کچھ کارکردگی تو دکھانی ہوتی تھی۔ کبھی کبھی اس قسم کی گیدڑ بھبکیاں یا محض رسمی بھاگ دوڑ ان کی سیاسی ضرورت ہوتی تھی۔ انہیں کسی کو خوش کرنا ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس قسم کے عناصر ختم ہونا تو درکنار، دن بہ دن زیادہ سے زیادہ طاقتور ہوتے جارہے تھے۔ بعض اوقات تو ہمارے اربابِ اختیار مخلص ہوتے ہوئے اور دلی خواہش رکھتے ہوئے بھی ان کے خلاف کچھ نہیں کرپاتے تھے۔ نظام ہی کچھ ایسا تھا۔ ان کے خلاف سچ مچ کوئی کارروائی شاید ہی کبھی ہوتی تھی، اور اس سے بھی بہرحال ان کے اثر رسوخ میں کوئی کمی نہیں آتی۔ اس لئے مجھے مرزا اکرم بیگ کی کم از کم اس بات پر کوئی شبہ نہیں تھا کہ کچھ بڑے لوگ اسے جانتے بھی ہوں گے اور مانتے بھی ہوں گے۔

مرزا اکرم بیگ خفیہ ایجنسی کے تینوں آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ان صاحبان نے یہاں آکر اپنی تفتیش شروع کی۔ سب سے پہلے انہوں نے جج صاحب کی جیبوں کی تلاشی لی۔ ان کی جیبوں سے چند دوسری اہم شخصیات کے وزٹنگ کارڈز کے ساتھ ساتھ آپ کا وزٹنگ کارڈ بھی نکلا۔ تب اچانک میرے ذہن میں ایک آئیڈیا آیا۔ میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ گزشتہ دنوں میں آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا ہوں اور مجھے اندازہ ہوا تھا کہ پیرداش کے معاملے میں آپ نے حقائق کا کھوج لگانے اور معاملے کی تہ تک پہنچنے کے سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کیا تھا۔ میرے ذہن میں اسی لمحے آئیڈیا آیا اور میں نے اسی لمحے فیصلہ کرلیا کہ میں آپ کی مدد حاصل کروں گا۔"

"اوہ.....!" میں طویل سانس لے کر رہ گیا "تو..... یہ ہے اصل قصہ.....!"

"قصہ تو شاید ابھی شروع ہوا ہے۔" مکرم بیگ مسکرایا "میں نے اسی خفیہ ایجنسی کے سربراہ سے بات کی جو فوری طور پر میرے خلاف حرکت میں آئی تھی۔ بڑے افسر عام طور پر کافی معقول ہوتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے انسان کی ان تک رسائی ہو اور ان کے ساتھ دلیل اور معقولیت کے ساتھ بات کی جائے تو وہ مان لیتے ہیں۔ میری مزید خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ آپ کو بھی جانتے اور مانتے تھے....."

"آہ.....!" میں کراہ کر رہ گیا۔

"میں نے تمام صورتِ حال انہیں سمجھا کر قائل کرنے کی کوشش کی کہ جج صاحب کے قتل کے ذریعے درحقیقت کسی نے مجھے پھانسنے کی سازش کی تھی اس لئے مجھے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لئے کچھ مہلت دی جائے۔ میں نے پہلے بھی ہر الزام کا مقابلہ کیا ہے اور اب بھی کروں گا۔ میں پہلے بھی کہیں نہیں بھاگا تھا۔ اب بھی نہیں بھاگوں گا۔ اور پھر میں نے کہا کہ اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لئے میں افضل صاحب کی مدد حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے میری بات پہلے ہی تقریباً مان لی تھی۔ آپ کے نام نے گویا کام آسان کردیا۔ انہوں نے میری یہ درخواست قبول کرلی کہ مجھے فوری طور پر حراست میں لے کر بے دست و پا نہیں کیا جائے گا۔ میرے پاس اب دو تین دن کی مہلت ہے۔ اس دوران مجھے اپنی بے گناہی ثابت کرنی ہے بلکہ مجھے کیا... آپ ہی کو ثابت کرنی ہے۔"

"بہت خوب مرزا مکرم بیگ!" میں نے سر ہلایا "تم واقعی ایک عجیب و غریب آدمی ہو۔ تم نے ایک عجیب و غریب موقع پر..... ایک عجیب و غریب کام کے لئے..... ایک عجیب و غریب آدمی کا انتخاب کیا ہے۔"

"ایسے عجیب و غریب فیصلے کرنا میری پرانی عادت ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا "نہ جانے کیوں مجھے یقین ہے کہ آپ میری مدد کرنے کے لئے تیار ہوجائیں گے۔ پہلا مشکل مرحلہ طے ہوچکا ہے۔ یعنی خفیہ ایجنسی کے سربراہ نے میری بات مان لی ہے۔ اب دوسرا مشکل مرحلہ بھی طے ہوجائے۔ یعنی آپ ہاں کردیں تو میں ذرا سکون کی سانس لوں۔ جس دوران میں نے آپ کے لئے بلاوا بھیجا تھا اس دوران یہاں ابتدائی تفتیش مکمل ہوچکی ہے۔ اب صرف لاش کا یہاں سے اٹھایا جانا اور پوسٹ مارٹم ہونا باقی ہے۔ یہ کام صرف آپ کے انتظار میں رکا ہوا تھا۔ آپ کے آنے سے پہلے کچھ ماہرین یہاں سے رخصت ہوچکے ہیں۔ میں چاہتا تھا آپ لاش کو بالکل اسی حالت میں دیکھ لیں جس حالت میں وہ پائی گئی تھی۔"

اس لمحے مجھے ایک بات یاد آئی اور میں بے اختیار مسکرانے لگا۔ مکرم بیگ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ کو ایسی کیا بات یاد آئی ہے جس سے آپ محظوظ ہورہے ہیں؟"

اس کا مشاہدہ اچھا تھا۔ ہونا بھی چاہئے تھا۔ وہ کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میں محظوظ نہیں ہورہا تھا۔ قدرت کے عجیب و غریب کاموں اور اتفاقات پر حیران ہورہا تھا۔"

تاہم میں نے وضاحت نہیں کی کہ میری مسکراہٹ کا پس منظر کیا تھا۔ شاید اسے یقین نہ آتا کہ میں اس شام ہی سوچ رہا تھا اور پروگرام بنا رہا تھا کہ شغل کے طور پر کسی کا کوئی مسئلہ حل کرنے کی کوشش کیا کروں گا۔ اس سلسلے میں رحیم گل اور زرتاج سے تفصیلی تبادلۂ خیال بھی ہوا تھا۔ بیچ میں ہنسی مذاق بھی چلتا رہا تھا لیکن میں نے بہرحال بات سنجیدگی سے کی تھی لیکن مجھے یہ امید ہرگز نہیں تھی کہ "مسئلہ" اتنی جلدی میسر آجائے گا اور وہ بھی مرزا مکرم بیگ کی طرف سے.....! حالات کی یہ کروٹ واقعی حیران کن تھی!

تاہم مجھے مرزا مکرم بیگ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مجھ سے جس قسم کا کام لینے کی خواہش کا اظہار کررہا تھا اسی کی مجھے تلاش تھی اور میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مجھے اتنی جلدی میسر آجائے گا۔

میں نے اپنی مسکراہٹ کو طنزیہ سا رنگ دینے کی کوشش کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا "دراصل میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم سے ان حالات میں ملاقات ہوگی اور تم اس قسم کی فرمائش کرو گے۔ میں تو تمہارے بارے میں کچھ اور ہی طرح کے پروگرام بنائے بیٹھا تھا۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" وہ بلا تامل بولا "میں اصل میں ایک تیر سے دو نہیں..... بلکہ کئی شکار کررہا ہوں۔ ایک تو اس کام کے بہانے آپ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ کے ذہن میں میری شخصیت کا جو غلط تاثر اب تک موجود رہا ہوگا اسے دور کرنے میں مدد ملے گی، کچھ تو آپ مجھے اب تک جان گئے ہوں گے میری مدد کرنے کی کوشش کریں گے تو مزید جان لیں گے۔ اور اگر آپ واقعی مجھے بے گناہ ثابت کرنے میں میری کوئی مدد کرسکے تو یہ سب سے بڑا فائدہ ہوگا۔"

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر اس میں مجھے کیا فائدہ ہوگا؟" میں نے ذرا شاطرانہ سا لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آخر میں بھی ایک بزنس مین ہوں۔ مجھے بھی اپنا فائدہ نقصان سوچنے کی عادت ہے۔ تم تو ایک تیر سے کئی شکار کررہے ہو۔ مجھے یوں لگ رہا ہے کہ میرا تیر کہیں خلا میں جاکر غائب ہوجائے گا۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "افضل صاحب! آپ اس قسم کے بزنس مین نہیں ہیں جیسا بننے کی کوشش کررہے ہیں لیکن خیر..... مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر آپ کسی مصلحت کی وجہ سے بزنس مین بن کر بات کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ ہر شخص کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ موقع دیکھ کر سودے بازی کرے۔ آپ اگر شوقیہ بھی ایسا کرنا چاہتے ہیں تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"نہیں..... اس میں شوق یا موقع پرستی کی کوئی بات نہیں۔" میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا گو کہ دل ہی دل میں، میں اس کمبخت کی قوتِ مشاہدہ پر ایک بار پھر حیران تھا "دراصل..... میں تمہاری باتوں سے کچھ متاثر تو ہوگیا ہوں لیکن ابھی تک میرے دل میں تمہارے لئے خاطر خواہ خلوص پیدا نہیں ہوسکا۔ اس لئے بات چیت اگر مادی بنیادوں پر ہی چلے تو ٹھیک ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے اس پر بھی خوشی ہوگی۔" وہ اطمینان سے بولا "آپ بتائیں..... آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"کیا بتاؤں....." میں نے قدرے تذبذب سے کہا "ویسے... میں یہ بھی سوچ رہا ہوں کہ میں تمہاری کوئی مدد کر بھی سکوں گا یا نہیں.....؟ ظاہر ہے میں کوئی پرائیویٹ سراغرساں تو نہیں ہوں۔ مجھے اس قسم کے کاموں کا کوئی خاص تجربہ نہیں ہے اور نہ جانے کیوں تم نے مجھ سے اتنی توقعات وابستہ کرلی ہیں۔"

"پرائیویٹ سراغرساں تو خیر ہمارے ملک میں ہوتے ہی نہیں ہیں۔ لیکن اگر ہوتے، تب بھی شاید میں ان کی خدمات حاصل نہ کرتا۔ ہمارے ہاں شاید وہ سراغرساں کے بجائے بلیک میلر یا پولیس کے ٹاؤٹ بن چکے ہوتے۔" مکرم بیگ منہ بنا کر بولا "ویسے بھی مجھے نازک معاملات میں پیشہ ور لوگوں کی خدمات حاصل کرنا کچھ زیادہ پسند نہیں..... میں نے تو مغربی ممالک میں بھی ضرورت پڑنے پر کبھی پرائیویٹ سراغرساں کی خدمات حاصل نہیں کیں حالانکہ ان پر بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے تقریباً ننانوے فیصد بدعنوان نہیں ہوتے لیکن اس قسم کے سراغرساں وہاں نہیں پائے جاتے جیسے انگریزی کہانیوں، فلموں یا ٹی وی سیریز وغیرہ میں دکھائے جاتے ہیں۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور وہ مسکرا کر بولا "لیکن میں بھی کیسا بے وقوف ہوں۔ آپ کو یہ باتیں بتا رہا ہوں۔ آخر آپ نے بھی تو دنیا گھومی ہے۔"

"ہاں لیکن شاید میرا اتنا وقت ملک سے باہر نہیں گزرا جتنا تم نے گزارا ہوگا۔ مجھے دوسرے ملکوں کو زیادہ گہرائی میں جاکر دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔ اور میں نے کوشش بھی نہیں کی۔" میں نے بتایا۔

"خیر..... گولی ماریں دوسرے ملکوں کو..... اور ان کے پرائیویٹ سراغرسانوں کو....." مکرم بیگ ہاتھ ہلا کر بولا "ہم اپنی بات کرتے

ہیں۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ آپ میرے لئے کچھ کرسکیں گے یا نہیں۔ اصل بات خلوصِ نیت کی ہوتی ہے۔ خلوصِ نیت ایک کاروباری آدمی میں بھی ہونا چاہئے۔ آپ بے شک مجھ سے کاروباری بن کر بات کیجئے۔ میں بُرا نہیں مناؤں گا لیکن میرے لئے کوشش خلوصِ نیت سے کیجئے گا۔ آپ کو میرے اس موقف میں تو کچھ جان نظر آتی ہے نا... کہ میں اتنا احمق نہیں ہوسکتا تھا.....؟"

"کتنا احمق؟" میں نے گویا چونکتے ہوئے پوچھا۔

"کہ میں جج صاحب کو اپنے ہی آفس میں بُلا کر مار دیتا اور رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا؟"

"ہاں... خیر تمہاری یہ بات تو دل کو لگتی ہے کہ تم اتنے احمق نہیں ہوسکتے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"بس... اگر آپ اس حقیقت کو ذہن میں رکھ کر کچھ سوچیں گے تو یقیناً میرے لئے کچھ نہ کچھ کرسکیں گے۔ میں آپ کو غائبانہ طور پر جانتا ہوں لیکن مجھے آپ کی ذہانت پر بھروسا ہے۔"

"معلوم نہیں اب یہ تمہاری خوش قسمتی ہے یا بدقسمتی... کہ تم غائبانہ طور پر ہی میری ذہانت کے قائل ہوگئے ہو۔ ویسے تو تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ مجھے اپنی ذہانت کا پہلا قدردان میسر آیا ہے اور اس خوشی میں تم سے کوئی کاروباری بات نہیں کرنی چاہئے لیکن کیا کروں... کاروبار چھوڑ کر اِدھر اُدھر وقت ضائع کرنا افورڈ نہیں کرسکتا۔ اس لحاظ سے میں بہت مہنگا آدمی ہوں ڈیئر مکرم بیگ! میرا وقت بہت قیمتی ہے۔" میرا خیال تھا کہ رقم کی بات سُن کر وہ بدک جائے گا۔

بہرحال مجھے اپنا پروگرام یاد تھا۔ میں نے رحیم گل اور زرتاج سے باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ اگر کسی موٹی اسامی نے مجھ سے رجوع کیا تو میں اس سے اپنے وقت کی ٹھیک ٹھاک قیمت وصول کروں گا لیکن اگر کوئی مدد کا مستحق نظر آیا تو پلے سے اس کی مدد بھی کروں گا بشرطیکہ اس کا مسئلہ اس قابل ہوا کہ میں اس میں دلچسپی لے سکوں۔ اب کم از کم پہلے دن تو مجھے اپنے طے شدہ پروگرام سے نہیں ہٹنا چاہئے تھا۔ حالانکہ مکرم بیگ کے قصے میں مجھے دلچسپی محسوس ہورہی تھی لیکن میں دولت مندوں کے لئے مفت کوئی کام کرکے ان کی عادت نہیں بگاڑنا چاہتا تھا۔

"آپ اپنے وقت کی قیمت تو لگائیے افضل صاحب!" مکرم بیگ پُروقار لہجے میں بولا "مانا کہ آپ بڑے آدمی ہیں لیکن مکرم بیگ بھی اتنا چھوٹا آدمی نہیں کہ آپ کے وقت کی قیمت نہ دے سکے۔ میرے لئے آپ کی رائے یوں بھی اہمیت اختیار کرگئی ہے کہ اس اہم خفیہ ایجنسی کے سربراہ نے بھی آپ کی رائے کو قبول کرنے کا عندیہ دے دیا ہے جس کے نمائندے اس وقت یہاں موجود ہیں۔"

"ضروری نہیں ہے کہ میں کوئی حتمی رائے دے سکوں۔" میں نے حفظِ ماتقدم کے طور پر کہا "لیکن میں اپنا معاوضہ پیشگی لوں گا اور وہ ناقابلِ واپسی ہوگا۔"

"مجھے منظور ہے۔ آپ بولیے تو سہی۔" وہ بلا تامل بولا۔ کمبخت کسی طرح ہچکچاہٹ کا مظاہرہ ہی نہیں کررہا تھا۔

"میں دو ملین روپے لوں گا... بیس لاکھ۔" میں نے کہا۔

میرا خیال تھا وہ ایک لمحے کے لئے بے نیازی کا مظاہرہ کر[نا] بھول جائے گا۔ انسان خواہ ارب پتی ہو، کسی بھی چیز کی قیمت سن کر ایک بار ضرور ناک بھوں چڑھاتا ہے لیکن مکرم بیگ کی پیشانی پر ہلکی سی شکن بھی نہ ابھری۔

"نو پرابلم۔" وہ بدستور خوش دلانہ لہجے میں بولا۔

"میں چیک نہیں لوں گا۔" میں نے اپنی دانست میں ایک او[ر] رکاوٹ کھڑی کی۔

"نو پرابلم" وہ اسی بے پروائی سے بولا۔ اس نے میری کھڑ[ی] کی ہوئی اس رکاوٹ کو بھی گویا ایک انگلی کے اشارے سے ایک طرف ہٹادیا تھا۔

"ندیم!" اس نے ذرا اونچی آواز میں پکارا۔

برابر کے ایک کمرے سے فوراً ایک شخص نکل کر آیا۔ و[ہ] مضبوط کاٹھی کا ایک جوان شخص تھا جس کی آنکھیں ہر تاثر سے عاری تھیں۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں او[ر] گھنی مونچھوں نے اس کے بالائی ہونٹ کو ڈھانپا ہوا تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے مکرم بیگ کی طرف دیکھا۔

"دو ملین پاکستانی روپے۔" مکرم بیگ نے نہایت اختصار سے حکم دیا۔ اس نے جملہ پورا کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ ندیم نے بھی یہ نہیں پوچھا کہ دو ملین پاکستانی روپوں کا کیا کرنا تھا؟ پھینکنے تھے... جلانے تھے.... خیرات کرنے تھے... یا کسی کو ادائیگی کرنا تھی؟ اگر ادائیگی کرنی تھی تو کسے؟

وہ سر کو خفیف سی جنبش دے کر واپس کمرے میں چلا گیا۔ چن[د] لمحے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھوں میں ہزار ہزار کے نوٹوں وا[لی] بیس گڈیاں تھیں۔ وہ گڈیاں لئے سیدھا یوں میری طرف آیا جیسے وہ چند نوٹ تھے۔ جنہیں میں اطمینان سے کسی بھی جیب میں ر[کھ] سکتا تھا۔

میرا پہلا ہی تجربہ خود میرے لئے حیران کن تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں نے واقعی بیس لاکھ کی رقم کا مطالبہ کردیا تھا میں واقعی یہ بات اپنے منہ سے کہنے میں کامیاب ہوچکا تھا؟ اور یہ مطالبہ وہیں کھڑے کھڑے پورا بھی کردیا گیا تھا۔ سچی بات یہ کہ مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ میں اب اس سلسلے میں کیا کروں [گا] مجھے بھلا اس قسم کے کاموں کا کیا تجربہ تھا؟ لیکن میں نے خود اپنی شامت کو دعوت دی تھی۔ اتنی باتیں کرنے کے بعد اب میں پسپا[ئی] بھی اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ مکرم بیگ نے میرے لئے کوئی راہِ فر[ار] نہیں چھوڑی تھی۔

میں نے رحیم گل اور زرتاج کے سامنے بیٹھ کر پروگرام

کے ذہن میں اس کے بارے میں جو خاکہ ہوگا، اب اس کا وہ سماجی قام نہیں رہا۔" مکرم بیگ بولا۔

"کیا وہ برنس روڈ پر بن کباب کا ٹھیلا لگانے لگا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" مکرم بیگ مسکرایا "اتنے شاندار آدمی کا اب ایسا بُرا انجام بھی نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ اب اندرونِ شہر ایک گھٹیا سے پرانے ہوٹل کو ٹھیکے پر چلاتا ہے۔ اس کے لئے بہرحال اپنے ماضی کو دیکھتے ہوئے، یہ کام برنس روڈ پر بن کباب کا ٹھیلا لگانے کے برابر ہی ہے۔"

"اچھا خیر... تمہیں ہدایت وارثی کا فون آیا۔ پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں کچھ کاروباری بات چیت کرنی تھی۔ وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ مجھ سے ملنے آسکتا ہے یا نہیں۔ میں نے پہلے تو روانی میں اس سے کہہ دیا کہ وہ آجائے۔ ملاقات کا وقت پانچ بجے طے پاگیا پھر اچانک مجھے یاد آیا کہ مجھے دو تین جگہوں پر جانا تھا لیکن مجھے امید تھی کہ میں جلدی لوٹ آؤں گا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ بہرحال آجائے، اگر میں یہاں نہ ہوا تب بھی میں اس کے لئے دروازہ غیر مقفل چھوڑ جاؤں گا۔"

"بہت خوب.... کیا تم اکثر ملاقاتیوں کو یہ سہولت دیتے رہتے ہو؟" میں نے ذرا چونکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" اس نے نفی میں سرہلایا "اوّل تو یہاں ملاقاتیوں کے آنے کی نوبت ہی کم آتی ہے۔ دوسرے اس قسم کی سہولت تو خاص حالات میں کسی خاص ہی ملاقاتی کو دی جاسکتی ہے۔ ہدایت وارثی سے ملنے میں خود میرا مفاد پنہاں تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کو کوئی بہانہ ملے اور وہ ملاقات کا پروگرام ملتوی کردے۔"

"اس کے باوجود.... تمہیں اس طرح آفس کو غیر مقفل چھوڑ کر جانے میں کوئی اندیشہ محسوس نہیں ہوا؟ ہمارے ہاں ماحول ابھی کچھ ایسا قابلِ رشک بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"اس بلڈنگ میں ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ یہاں بھیڑ بھاڑ نہیں ہے۔ بلڈنگ زیادہ بڑی نہیں ہے۔ بہت ہی پُرسکون ماحول ہے۔ اگر ایک ماہ تک آپ کے اپارٹمنٹ کا دروازہ بند رہے تو پڑوسی یہ پوچھنے نہیں آئے گا کہ کیا بات ہے اور اگر اندر مکین کا انتقالِ پُرملال ہوچکا ہو تب بھی اس کی لاش کافی تاخیر سے ہی دریافت ہونے کا امکان ہے اور یہ ٹاپ فلور ہے۔ اس پر صرف یہی ایک اپارٹمنٹ ہے۔ یہاں تو ویسے ہی کوئی نہیں آتا۔"

"پھر بھی مجھے تمہاری یہ بات عجیب لگ رہی ہے۔" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"لیکن مجھے یہ قطعاً عجیب نہیں لگی تھی۔ میں پہلے بھی کئی بار کسی ملاقاتی کے لئے یا کسی اور وجہ سے دروازہ کچھ دیر کے لئے غیر مقفل چھوڑ کر جاچکا ہوں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"آخر....... دفتر میں ضروری کاغذات ہوتے ہیں۔ خفیہ دستاویزات ہوتی ہیں اور پھر تمہارے دفتر میں تو غالباً چھوٹا موٹا خزانہ بھی ہوتا ہے۔" میں نے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جس سے ندیم نے برآمد ہوکر مجھے ادائیگی کی تھی۔

"اوہ..." وہ دھیرے سے ہنسا "کاغذات... کانفیڈینشل چیزیں وغیرہ تو کمروں کے اندر بھی زبردست حفاظتی انتظامات کے ساتھ مقفل رہتی ہیں اور جہاں تک خزانے کا تعلق ہے تو اس کا نظام کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔ وہ ہمارے ساتھ ہی آتا اور جاتا رہتا ہے۔ کسی اجنبی کے یہاں کچھ ہاتھ نہیں آسکتا۔" اس نے مبہم انداز میں جواب دیا۔ لگتا یہی تھا کہ وہ اپنے انتظامات کے بارے میں مطمئن تھا۔ اس لئے دروازہ غیر مقفل چھوڑ کر جانا اس کے لئے کوئی خاص بات نہیں تھی۔

تاہم میں نے نکتہ اُٹھایا "تم اپنے دونوں گارڈز میں سے کسی ایک کو یہاں چھوڑ کر جاسکتے تھے۔"

"میں جہاں جہاں جارہا تھا وہاں میرے ساتھ گارڈز کا رہنا ضروری تھا۔" مکرم بیگ نے جواب دیا "بلکہ جب میں یہاں سے نکلا تو میں نے راستے میں ایک جگہ سے شرافت علی کو بھی اپنے ساتھ لیا۔ ہمیں کئی ضروری کام نمٹانے تھے۔"

"تم کتنے بجے یہاں سے نکلے تھے؟" میں اپنے ذہن کو پوری طرح بیدار رکھتے ہوئے جرح کررہا تھا اور کوئی کارآمد بات دریافت کرنے کی ہر ممکن کوشش کررہا تھا۔ آخر میں نے بیس لاکھ روپے لئے تھے لیکن سچی بات یہ تھی کہ ابھی تک مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ میں اپنے آپ کو اس رقم کا مستحق ثابت بھی کرسکوں گا یا نہیں؟

"میں ساڑھے چار بجے یہاں سے نکلا تھا۔" مکرم بیگ نے بتایا "اس وقت تک میری مزید کچھ لوگوں سے فون پر بات ہوچکی تھی۔ میرا پروگرام کچھ لمبا ہوچکا تھا اور میرا فوری طور پر نکلنا بھی ضروری تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ مجھے باہر کافی دیر لگ جائے گی۔ کم از کم ساڑھے سات تو ضرور بج جائیں گے۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ہدایت وارثی سے ملاقات کا پروگرام ملتوی ہی کردیا جائے تو بہتر ہے۔ چنانچہ میں نے اسے اُس کے آفس فون کیا مگر وہاں کسی نے اُٹھایا ہی نہیں۔ شاید وہ میری طرف روانہ ہونے سے پہلے کہیں اور جاچکا تھا۔ چنانچہ میں نے اس کے لئے ایک رقعہ لکھ کر چھوڑ دیا۔"

"کہاں چھوڑ دیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"میز پر۔" اس نے میز کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے میز کے قریب جاکر دیکھا۔ اس پر بڑا سا ایک سفید کاغذ پیپر ویٹ کے نیچے دبا رکھا تھا جس پر بال پوائنٹ سے بڑے بڑے الفاظ میں گھسیٹا گیا تھا۔

"میں اندازاً ساڑھے سات بجے تک واپس آجاؤں گا۔ اگر انتظار کرسکتے ہو تو کرلو۔"

رقعہ اس طرح رکھا تھا کہ اگر کوئی آکر ملاقاتیوں والی کرسیوں میں سے کسی پر بیٹھتا تو اس کی نظر ضرور پڑتی۔

مکرم بیگ بولا "میرا اندازہ ٹھیک ہی رہا۔ میں تقریباً ساڑھے سات بجے ہی یہاں واپس پہنچا۔"

"کیا ہدایت وارثی یہاں موجود تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" مکرم بیگ نے جواب دیا "یہاں جج صاحب کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اور جج صاحب اسی حالت میں تھے جس میں تم انہیں دیکھ رہے ہو۔ میری واپسی پر میرے گارڈز کے علاوہ شرافت علی بھی میرے ساتھ تھا۔ لاش ہم چاروں نے ایک ساتھ دیکھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہم چاروں بوکھلا گئے تھے۔ واضح رہے کہ ہم آسانی سے بوکھلانے والے لوگ نہیں ہیں۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" میں نے نہایت ہمدردانہ انداز میں سر ہلایا۔

"جب ہم اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا چکے تھے اس کے چند منٹ بعد خفیہ ایجنسی کے یہ صاحبان آن پہنچے۔ تب میری گھبراہٹ کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا لیکن وہ ذرا دوسری طرح کی گھبراہٹ تھی۔ وہ میں نے ان صاحبان پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ درحقیقت وہ تشویش تھی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ کسی نے مجھے پھانسنے کی زبردست کوشش کی ہے۔ ان صاحبان نے اپنی ابتدائی تفتیش مکمل کی اور اسی دوران میں نے ان کے صاحب سے بات کی۔ انہوں نے پولیس کو تو ابھی طلب نہیں کیا لیکن پولیس سرجن کو ضرور طلب کر لیا تھا۔ وہ ابھی ابتدائی معائنہ کر کے جا چکا ہے۔"

"تم نے ہدایت وارثی سے رابطہ نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس سے پہلے میں نے آپ سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے..... اور ان صاحبان نے نہایت صبر و سکون سے آپ کا انتظار کیا۔ خدا کا شکر ہے آپ مل گئے..... آ گئے... اور میں آپ کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔"

"ابھی سے اتنا خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں شرلاک ہومز نہیں ہوں۔"

"مجھے افسانوی دنیا کے کسی کردار کی ضرورت بھی نہیں ہے۔" مکرم بولا "ظاہر ہے کوئی افسانوی کردار میرے کسی کام نہیں آ سکتا۔ میں حقیقی دنیا کے کسی فرد سے ہی کوئی تھوڑی بہت امید رکھ سکتا ہوں۔"

"تمہارے خیال میں جج صاحب کا قاتل کون ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہدایت وارثی کے سوا کون ہو سکتا ہے؟" اس نے الٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"لیکن اسے جج صاحب کو قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے پوچھا۔

"دو وجوہات ہو سکتی تھیں۔" مکرم بیگ بولا "ایک تو ہدایت وارثی ایک مدت سے میرا پچاس لاکھ کا مقروض ہے اور وہ اب بھی لٹک جائے تو یہ رقم ادا نہیں کر سکتا۔ جب اس کا زوال ابھی "عروج" پر تھا تو اس نے یہ رقم مجھ سے ایک نئے منصوبے کے لئے لی تھی۔ زوال پذیر لوگوں کو کوئی قرض نہیں دیا کرتا لیکن میری اس سے بہت پرانی شناسائی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس کا مداح تھا۔ آدمی بہرحال بلا کا ذہین ہے اور اس نے جو منصوبہ پیش کیا وہ بھی مجھے بہت پسند آیا تھا لیکن مسئلہ وہی ہے کہ جب مقدر ہارا ہوا ہو تو ذہانت وغیرہ سب دھری رہ جاتی ہے۔"

اس نے گہری سانس لی اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "اس نے اپنے نئے منصوبے میں میرے پچاس لاکھ بھی ڈبو دیئے۔ یا یوں کہو کہ اس کے مقدر نے ڈبو دیئے۔ تب سے اب تک وہ قرض اسی طرح چلا آ رہا ہے اگر میں ان شرائط پر عمل درآمد کراؤں جن پر قرض لیا گیا تھا تو ہدایت وارثی اپنے آپ کو بیچ کر بھی وہ قرض ادا نہیں کر سکتا۔ ان شرائط کو تو چھوڑیں..... اگر میں اس وقت سے لے کر اب تک عام بینکوں کی مروجہ شرح سے بھی اس سے اپنی رقم پر منافع طلب کروں تو وہ زندگی بھر بھاگ دوڑ کر کے صرف منافع بھی ادا نہیں کر سکتا۔"

ذرا خاموش رہ کر وہ بولا "مسئلہ یہ ہے کہ میں اس کے ساتھ وہ سلوک بھی نہیں کر سکتا جو مجھ جیسے اصول پرست لوگ عموماً نادہندگان کے ساتھ کرتے ہیں۔ جس شخص کے لئے میری آنکھ میں لحاظ ہو اس کے ساتھ میں محض رقم کی خاطر کوئی اونچ نیچ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ یہ میری کمزوری ہے۔ کٹر بزنس مین اسی لئے کہتے ہیں کہ بزنس میں لحاظ داری نہیں چلتی....."

اس نے ایک بار پھر قدرے ٹھنڈی سانس لی "اس لئے میں نے اپنی دیگر شرائط اور منافع وغیرہ کا خیال تو ذہن سے نکال دیا۔ البتہ کبھی کبھی تاسف سے سوچا کرتا ہوں کہ اگر میری اصل رقم ہی واپس مل جائے تو بھی غنیمت ہے لیکن ظاہر ہے ہدایت وارثی اب کسی بھی طرح اصل رقم بھی دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے اور مجھے معلوم ہے اس میں اس کی بدنیتی کو دخل نہیں ہے۔ وہ بے چارہ واقعی مجبور ہے۔ اسی لئے میں نے اسے بخشا ہوا ہے گو کہ آج کل لوگ ایسے مقروض کو بھی نہیں بخشتے جو سچ مچ مجبور ہوتا ہے لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں۔"

"اچھا..... ایک وجہ تو یہ ہو گئی۔ دوسری وجہ تم کیا بتانے لگے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"دوسری وجہ یہ ہے کہ ہدایت وارثی کے دل میں بھی جج صاحب کے بارے میں کچھ اچھے جذبات نہیں ہو سکتے تھے۔ میرے مقدمے تو ابھی جج صاحب کی عدالت میں لٹک رہے ہیں لیکن ہدایت وارثی تو انہیں بہت اچھی طرح بھگت چکا تھا۔ بلکہ اس کے خیال میں تو اس کے زوال میں جج صاحب کا بہت ہاتھ تھا۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے جاننا چاہا۔

"دراصل ہدایت وارثی کی ترقی کی بنیاد تو نائٹ کلب..... شراب خانے اور اسی قسم کے دوسرے کاروبار تھے۔ اب یہ شرفا اور ایک خاص ذہن کے لوگوں کی نظر میں کوئی اچھے کاروبار تو نہیں ہیں۔ جب تک سیاسی حالات ہدایت وارثی کے حق میں تھے، کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔ حتیٰ کہ اگر واقعی کسی معاملے میں وہ قانون کی لچک سے بے جا فائدہ اٹھا رہا تھا تب بھی کسی نہ کسی طرح بچا رہا لیکن جب حالات بدلے تو ایک تو ویسے ہی رفتہ رفتہ اس کا بستر بوریا گول ہو گیا۔ دوسرے اس کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی بھی بڑی بنتی گئی۔ عبدالسلام صاحب کی عدالت میں اس کے بارے میں جو بھی مقدمہ گیا، انہوں نے ہدایت وارثی کے خلاف ہی فیصلہ دیا۔ گو کہ انہوں نے پوری طرح قانونی تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے ایسا کیا لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ ان کے ذہن کے کسی گوشے میں جذبۂ جہاد بھی کارفرما رہا ہو گا۔ وہ یہی محسوس کر رہے ہوں گے کہ وہ معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ حتیٰ کہ پچھلے دنوں تو انہوں نے ایک چھوٹے سے مسئلے میں ہدایت کو کئی مہینوں کے لئے جیل بھجوا دیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ کم از کم اب تو وہ انسان کا بچہ بن جائے۔"

"وہ چھوٹا سا مسئلہ کیا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہدایت کی بیوی کچھ سال پہلے اس سے طلاق لے کر کینیڈا چلی گئی تھی۔ دو بیٹے تھے۔ وہ بھی کہیں ادھر اُدھر چلے گئے تھے۔ زوال آتے ہی سب کو اس سے سنگین اختلافات ہو گئے تھے۔ بہرحال کئی برس سے وہ تنہا تھا مگر پھر ٹی وی پر چھوٹے موٹے کردار کرنے والی ایک ٹوٹی پھوٹی سی آرٹسٹ اس کے ساتھ رہنے لگی تھی۔"

"اب تو ہدایت وارثی خاصی عمر کا ہو گیا ہو گا۔ ابھی تک اس نے یہ دھندے نہیں چھوڑے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں کچھ ایسا زیادہ عمر رسیدہ یا گیا گزرا تو نہیں ہے۔ آدھے بال سفید ہیں مگر اب بھی ہینڈسم اور اسمارٹ لگتا ہے۔ بال رنگنے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔ اسے مالی زوال آیا ہے۔ جسمانی نہیں... جو ٹی وی آرٹسٹ اس کے ساتھ رہ رہی تھی عمر میں اس سے آدھی تھی۔ خوش شکل..... جاذبِ نظر..... اور بڑی زندہ دل عورت تھی۔ دونوں بڑی محبت سے ساتھ رہتے تھے۔"

"پھر کیا ہوا؟ کیا فلک کج رفتار کو ان کی خوشیاں ایک آنکھ نہیں بھائیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"غالباً ان کے برابر کے اپارٹمنٹ میں رہنے والے کسی جیلس قسم کے آدمی نے فلک کج رفتار کی نمائندگی کی اور ان کے بارے میں پولیس کو مطلع کیا کہ وہ بغیر شادی کے ساتھ رہتے ہیں۔ شراب پی کر غل غپاڑا کرتے ہیں، ماحول کو گندا کرتے ہیں، لوگوں کے اخلاق پر برا اثر پڑے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"کیا درحقیقت ایسا نہیں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"صرف بغیر شادی کی حد تک بات ٹھیک تھی لیکن ہدایت وارثی کا تعلق کبھی بھی شراب پی کر غل غپاڑا کرنے والی کلاس سے نہیں رہا۔ وہ جب نائٹ کلبوں اور شراب خانوں کا مالک تھا تب بھی خود شراب نہیں پیتا تھا۔ ہے نا لطف کی بات؟"

"شاید" میں نے مبہم لہجے میں کہا۔

"وہ بے چارہ تو گردن پروں میں چھپائے..... بڑی خاموشی سے بڑی گمنامی میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ مسئلہ اصل میں پڑوسی کی جیلسی کا تھا اور بے چارے ہدایت کی بدقسمتی دیکھیں کہ جس روز سادہ لباس والے اس کے گھر آئے اس روز اس کے دو تین کنگلے اور آوارہ گرد قسم کے شناسا بھی اس کے ہاں آئے ہوئے تھے۔ ہدایت نے ان کے ساتھ بیٹھ کر شغل شغل میں یونہی ایک آدھ پیگ بھی چڑھا لیا تھا۔ وہ باقاعدہ پینے والا نہیں تھا۔ بس یونہی کبھی کبھار بقول اس کے 'سوشل ڈرنکنگ' کر لیتا تھا یعنی محفل میں دو چار چسکیاں یا ایک آدھ پیگ..... بس اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس روز بھی بے چارہ کنگلے دوستوں کا ساتھ دے رہا تھا اور وہ عورت..... غالباً نیلم اس کا نام تھا..... وہ محض اس کی خوشنودی کی خاطر اس کے کنگال سے دوستوں کی خاطر مدارات کر رہی تھی۔ آپ کو اندازہ ہو گا کہ جب کسی کے خراب دن آئے ہوئے ہوں اور اس قسم کی صورت حال میں پولیس آ کر چھاپا مارے تو کیس کچھ اس طرح کا بنتا ہے کہ فلاں مقام سے اتنے مرد ایک عورت کے ساتھ "رنگ رلیاں" مناتے ہوئے یا "دادِ عیش" دیتے ہوئے پکڑے گئے۔ ہدایت وارثی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔

"زیریں عدالت نے اسے سزا سنا دی۔ اسے بڑا غصہ آیا۔ حالانکہ اب اس میں وہ پہلا سا طنطنہ باقی نہیں رہا مگر جلی ہوئی رسی میں بھی بل تو رہ ہی جاتے ہیں۔ وہ اعلیٰ عدالت میں چلا گیا۔ وہاں بدقسمتی سے اس کا پالا عبدالسلام صاحب سے پڑ گیا اور یہ بات اس کے حق میں پہلے سے زیادہ بری ثابت ہوئی۔ یہی غنیمت تھا کہ ہدایت وارثی نے پولیس سے کم از کم اس حد تک تو معاملہ کر لیا تھا کہ اس کا کیس شرعی عدالت میں نہیں گیا تھا ورنہ اس کا نہ جانے کیا بنتا لیکن عبدالسلام صاحب نے بھی اس کی خوب کھنچائی کی اور اس کی سزا مزید بڑھا دی۔ اسے بہرحال پوری سزا تو نہیں کاٹنی پڑی۔ اچھے سلوک اور دیگر وجوہات کی بنا پر وہ کچھ جلدی رہا ہو گیا لیکن یہ اس کی زندگی کا تلخ ترین تجربہ تھا۔ اس کے دل میں عبدالسلام صاحب کے بارے میں گرہ بیٹھ گئی تھی۔ ادھر خود جج صاحب بھی ہدایت وارثی جیسے لوگوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے خیال میں اس قسم کے لوگ معاشرے میں بگاڑ پیدا کرنے کے ذمے دار تھے جنہوں نے کبھی مثبت اور شریفانہ ذرائع سے روپیا کمانا نہیں سیکھا تھا۔ انہوں نے باقاعدہ اپنے عدالتی فیصلے میں اس تاثر کا اظہار کر دیا تھا۔ جج صاحب راست گو اور دبنگ آدمی تھے۔ اپنے نظریات کا اظہار کرنے میں ہچکچاتے نہیں تھے۔"

ایک لمحہ خاموش رہ کر وہ بولا "چنانچہ اس پس منظر میں ہدایت وارثی کے لئے ایسی کوئی تدبیر سوچنا بڑا فائدہ مند تھا کہ جس کے ذریعے ایک تیر سے دو شکار ہو سکیں۔ جج صاحب کو قتل کر کے ایک تو اس کے جذبۂ انتقام کی تسکین ہو سکتی تھی۔ دوسرے اگر میں جیل چلا جاتا ہوں یا ملک سے بھاگنے کی کوشش کرتا ہوں تو ہدایت وارثی کو اس کے اپنے خیال میں پچاس لاکھ کے قرض سے نجات مل جائے گی۔ حالانکہ اس نے اگر ایسا سوچا ہو گا تو یہ اس کی خام خیالی ہو گی۔"

اس نے پھر ایک لمحہ توقف کیا اور قدرے ڈرامائی سے انداز میں بولا "یہ سب میں آپ کو بتا تو رہا ہوں لیکن درحقیقت میرے خیال میں ہدایت وارثی ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے اس پر یقین نہیں ہے۔"

"کیوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"ایک ایسی یقینی وجہ موجود ہے جس کی بنا پر میں ہدایت وارثی کو بے گناہ سمجھنے پر مجبور ہوں۔ اور میں ایمانداری سے کام لینا چاہتا ہوں۔ اس وجہ کو چھپانا نہیں چاہتا۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہو گی کہ میں موقع دیکھ کر اور اپنے طور پر نتائج اخذ کر کے الزام اس پر ڈال دوں۔ یا اگر الزام اس پر آ رہا ہو تو خاموش رہوں۔ اس کی صفائی میں میرے پاس ایک نکتہ ہے جسے میں چھپانا نہیں چاہتا۔"

"وہ کیا؟" میں نے حقیقتاً تجسس سے پوچھا۔

"میں ہدایت وارثی کے لئے دروازہ غیر مقفل چھوڑ کر جانا بھول گیا تھا۔" مکرم بیگ نے جواب دیا "اور اپنی یہ "بھول" مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے جاتے وقت روانی میں اندر کی ناب کا بٹن دبا دیا تھا جس سے دروازہ لاک ہو جاتا ہے اور یہ بات مجھے اس لئے بھی اچھی طرح یاد ہے کہ باہر نکل کر دروازہ بند کرنے کے بعد میں نے باقاعدہ باہر والی ناب کو گھما کر اطمینان کیا تھا کہ دروازہ لاک ہو گیا ہے یا نہیں؟ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ دروازہ مقفل تھا۔ اس لمحے میرے ذہن سے ہی نکل گیا تھا کہ ہدایت وارثی کو مجھ سے ملنے آنا تھا اور مجھے اس کے لئے دروازہ غیر مقفل چھوڑ کر جانا تھا۔ بے خیالی میں کبھی کبھی کسی خاص موقع پر ایسی حرکتیں سرزد ہو جاتی ہے۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ جب اس نے ہدایت وارثی کے بارے میں مختصراً بتایا تھا تو میرے ذہن میں ایک لمحے کے لئے خیال ابھرا تھا کہ وہ کسی کو قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش تو نہیں کر رہا تھا؟ گو کہ غیر جانبداری سے سوچتے ہوئے میں یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ اس کی بات سچ بھی ہو سکتی تھی مگر اب اس کی بات سے ... ہو رہا تھا کہ وہ موقع دیکھ کر ہدایت وارثی کو پھانسنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی نیت درست ... تھی اور وہ حقیقتاً کسی پیچیدگی میں پھنسا ہوا تھا۔

میرے خیال میں اب وقت آ گیا تھا کہ کچھ "معائنہ" وغیرہ کیا جاتا جیسا کہ ان موقعوں پر عموماً کیا جاتا ہے۔ دروازے کا ذکر ہو رہا تھا تو پہلے دروازے کو دیکھ لینا چاہئے تھا۔ میں نے بیرونی کمرے سے گزر کر اس دروازے کا جائزہ لیا جسے کھول کر اپارٹمنٹ میں داخل ہوا جا سکتا تھا۔

میں نے دیکھا، دروازے کی اندر کی ناب سیاہی مائل تانبے کی تھی جبکہ باہر کی ناب پیپرویٹ کی طرح ٹرانسپیرنٹ تھی مگر اس کے اندر پھول بوٹے نظر آ رہے تھے، دونوں ہی عمدہ اور امپورٹڈ معلوم ہوتی تھیں اور ان کی ساخت بھی یکساں تھی مگر وہ بہرحال ایک جیسی نہیں تھیں۔

"یہ کیا چکر ہے.... یہ دونوں نابیں ایک جیسی کیوں نہیں ہیں؟" میں نے اپنی دانست میں ایک اہم نکتہ اٹھایا۔

"اصل میں آج ہی آنے کے بعد مجھے احساس ہوا تھا کہ ناب میں کوئی خرابی ہے....." مکرم بیگ دھیمے لہجے میں بتانے لگا "نیچے ایک آدمی رہتا ہے۔ مجھے اس کا نام معلوم نہیں۔ بلکہ شاید بیشتر لوگوں کو معلوم نہیں۔ سب اسے "ماموں ماموں" کہتے ہیں۔ وہ جگت ماموں ہے۔ وہ اس بلڈنگ کے نگران کے فرائض بھی انجام دیتا ہے اور اس کی ایک دوسری حیثیت بھی ہے۔ وہ ٹیکنیکل قسم کا آدمی ہے۔ بلڈنگ میں کسی کو بھی کوئی ٹیکنیکل قسم کا مسئلہ درپیش ہو، اسی کو بلایا جاتا ہے۔ اس طرح وہ کافی مصروف رہتا ہے اور شاید یہی اس کا اصل ذریعۂ معاش ہے۔ مکینوں کی ایسوسی ایشن کی طرف سے اسے تھوڑی بہت تنخواہ بھی ملتی ہے اور ان لوگوں نے اسے رہائش کے لئے ایک کمرا اور انٹرکام وغیرہ بھی دیا ہوا ہے۔ جسے ضرورت ہوتی ہے اسے بلا لیتا ہے۔ میں نے بھی آج ہی اسے بلایا تھا اور ناب تبدیل کرنے کے لئے کہا تھا۔ فوری طور پر اس علاقے میں اس پرانی تانبے کی ناب سے ملتی جلتی ناب نہیں مل سکتی تھی۔ اس نے عارضی طور پر یہ...... ناب لا کر لگا دی تھی۔ کہہ رہا تھا کہ پھر کبھی کہیں سے ایسی ہی لا کر لگا دے گا۔ میں نے اس سے کہا بھی..... کہ اگر ملتی جلتی نہیں مل رہی ہے تو دونوں ہی نابیں بدل دے لیکن وہ مجھے سمجھانے لگا کہ اس طرح زیادہ پیسے خرچ ہوں گے۔ اس فضول خرچی کی کیا ضرورت تھی؟ میں اس قسم کے لوگوں کے ساتھ دماغ سوزی کر کے اپنا وقت اور انرجی ضائع نہیں کرتا۔ اس لئے وہ جو کچھ بھی کر رہا تھا، میں نے اسے کرنے دیا۔ ممکن ہے یہ ناب اس کے اپنے پاس پڑی ہو۔ چار پیسے کمانے کے لئے بے چارے نے موقع دیکھ کر اسے کھپا دیا ہو۔ چھوٹے موٹے لوگوں کی پیسے کمانے کی یہی چھوٹی موٹی ترکیبیں ہوتی ہیں۔"

اس کے لہجے میں بے نیازی سی آ گئی تھی۔ پھر وہ مسکرایا اور بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میں نے حقیقت کی تلاش کے لئے بالکل صحیح آدمی کا انتخاب کیا ہے۔ آپ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی نظرانداز نہیں کر رہے ہیں۔"

پھر اس نے خفیہ محکمے کے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا "حیرت ہے کہ ان صاحبان نے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔"

وہ صاحبان اس وقت ہمارے قریب آکھڑے ہوئے تھے اور اس وقت ذرا شرمندہ نظر آنے لگے تھے۔ میں نے جلدی سے ان کی طرف سے توجہ ہٹاتے ہوئے مکرم بیگ سے تصدیق چاہی "بہرحال۔۔۔ یہ بات طے ہے کہ جب تم آئے تب بھی دروازہ مقفل تھا؟"

"ہاں، میں چابی سے تالا کھول کر اندر آیا تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے، تمہاری ہدایت وارثی والی تھیوری تو دھری رہ گئی؟" میں نے کہا۔

وہ محتاط لہجے میں بولا "میں اپنی طرف سے کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا۔ میں تو صرف وہ حقائق بیان کرسکتا ہوں جو میرے علم میں ہیں۔ ان کے سہارے حقیقت کی تہ تک آپ کو پہنچنا ہے۔"

یہ کہنے کے باوجود وہ گویا اظہارِ خیال کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ ہچکچاتے ہوئے بولا "بہرحال دروازہ مقفل ہونا کوئی بہت زیادہ اہم بات نہیں ہے۔ بہت سے تالوں کی چابیاں دوسرے تالوں میں لگ جاتی ہیں۔ تالے کھولنے کے دوسرے طریقے بھی ہوتے ہیں۔"

کوئی بعید نہیں تھا کہ خود مکرم بیگ نے اپنی زندگی میں بہت سے تالے کھولے ہوں۔ تاہم میں نے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "عین ممکن ہے ہدایت وارثی یہاں پہنچا ہو اور اس نے دروازہ مقفل پایا ہو تو سمجھ گیا ہو کہ میں بھولے سے تالا لگا گیا ہوں۔ اس نے سوچا ہو کہ اس کا تو چکر ہی ضائع ہو جائے گا۔ آج کے دور میں ہر شخص بڑی مشکل سے کسی کام کے لئے وقت نکال کر کہیں جاتا ہے۔"

وہ بات تشنہ سی چھوڑ کر خاموش ہو کر گویا کچھ سوچنے لگا۔

"تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟" میں نے گویا اسے اپنی تھیوری کو آگے بڑھانے کے لئے اکسایا۔

وہ بولا "شاید وہ کسی طریقے سے تالا کھول کر اندر آگیا ہو۔ اس نے میز پر رکھا ہوا میرا رقعہ پڑھا ہو اور سوچا ہو کہ میں تو کم از کم دو گھنٹے تک واپس نہیں آؤں گا۔ اس وقت کا بہتر استعمال کیا ہوسکتا ہے؟ اس کے ذہن میں اچانک اسکیم آئی ہو۔ شیطانی اسکیمیں انسان کے ذہن میں اچانک ہی آتی ہیں اور عام طور پر انسان ان پر اچانک ہی عمل کر گزرتا ہے۔"

"یعنی۔۔۔؟" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے بھی وضاحت چاہی۔

"یعنی اس نے جج صاحب کو کسی بہانے یہاں بُلالیا ہو اور انہیں گولی مار کر مجھے رنگے ہاتھوں پکڑوانے کے لئے خاموشی سے رخصت ہو گیا ہو۔ اسے معلوم تھا کہ میں اگر اس صورتِ حال میں پکڑا گیا تو میرے خلاف ایسا بہت سا مواد نکل آئے گا جو مجھے جج صاحب کا قاتل ثابت کرنے کا جواز بن جائے گا۔ اور یہ بہرحال ایک ایسا قتل ہوگا جس کی سزا سے میرا اثر رسوخ بھی مجھے نہیں بچا سکے گا۔ میری شخصیت کی مناسبت سے یہ ایک بہت عمدہ چال تھا۔"

میں نے دروازہ بند کردیا اور ہم واپس اس کمرے میں آگئے جہاں کچھ دیر پہلے موجود تھے۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا "اپارٹمنٹ میں داخل ہونے کا کوئی اور راستہ تو نہیں ہے؟"

"ویسے تو اس بلڈنگ میں پیچھے کی طرف تنگ اور بل کھاتی ہوئی سیڑھیاں بھی نصب کی گئی ہیں جو ہر اپارٹمنٹ کی کھڑکی کے قریب سے گزر رہی ہیں۔" مکرم ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا "وہ ہنگامی حالات میں استعمال کرنے کے لئے ہیں لیکن آپ کو پتا ہی ہے ہمارے ملک میں اس قسم کی چیزیں عموماً مکینوں کے نہیں، چوروں ڈاکوؤں کے کام آتی ہیں۔ اس لئے شاید مکینوں کا ان سے استفادہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور ایمرجنسی کا معاملہ انہوں نے اللہ پر چھوڑ دیا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ تقریباً سب اپارٹمنٹس کی ان کھڑکیوں پر گرل لگی ہوئی ہے جو ان سیڑھیوں کے قریب پڑتی ہیں۔ یوں گویا وہ سیڑھیاں بے کار ہی ہو کر رہ گئی ہیں۔ اپارٹمنٹ میں داخلے کا دروازہ ایک ہی ہے۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ ہدایت وارثی اسی سے اندر آیا تھا؟" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں کہا۔

اس کا ذہن ایک لمحے کے لئے بھی غیر حاضر نہیں تھا۔ وہ جلدی سے بولا "میں کوئی بھی خیال ظاہر نہیں کر رہا ہوں۔ میں تو صرف ایک امکان بیان کر رہا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ ہدایت وارثی اندر آیا تھا یا نہیں۔ اگر وہ اندر آیا تھا تو پھر زیادہ امکان یہی ہوسکتا ہے کہ وہ دروازے کے راستے ہی آیا ہوگا۔"

"لیکن وہ بھلا جج صاحب کو یہاں کیسے بُلا سکتا تھا؟ یہ بات کچھ حلق سے نہیں اُترتی۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "جج صاحب بھلا فون پر کسی ایسے شخص کے بُلاوے پر اس اپارٹمنٹ میں کیسے آسکتے تھے جس کی شہرت اور کردار ان کی نظر میں اچھا نہیں تھا۔ جسے وہ ذاتی طور پر پسند نہیں کرتے تھے۔ اور جسے وہ ماضی میں جیل بجھوا چکے تھے؟"

"میرے خیال میں یہ زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔" مکرم بیگ بھی کچھ سوچتے ہوئے بولا "اس سلسلے میں بھی میں امکانات ہی کا ذکر کروں گا۔ ایک امکان تو یہ بھی ہے کہ ہدایت وارثی نے انہیں اپنی اصل حیثیت سے فون نہ کیا ہو۔ کچھ اور بن کر فون کیا ہو۔ اس کے علاوہ میری باتوں سے آپ کو اندازہ ہوچکا ہوگا کہ جج صاحب کس قسم کی شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے دل میں معاشرے کی تطہیر کا جذبہ بڑی شدت سے کار فرما تھا۔ میں نے سنا ہے کسی اچھے مقصد کے لئے وہ خود چل کر کہیں جانے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے اور لگے بندھے اصولوں سے ہٹ کر بھی کوئی قدم اُٹھالیا کرتے تھے۔

کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے تھے جو ان کی ذمے ...یسا کام ...میں شامل نہیں ہوتا تھا۔ بشرطیکہ انہیں اس میں کوئی بڑا ...مقصد پنہاں نظر آتا۔ اپنی نجی زندگی میں ان کا رویّہ افسر شاہی ...یں تھا۔ ہوسکتا ہے ہدایت وارثی نے کوئی ایسی کہانی گھڑ کر جج ...ب کو بُلا لیا ہو کہ وہ سمجھے ہوں کہ وہ معاشرے کی کوئی بہت بڑی ...ت انجام دینے جا رہے ہیں۔"

"نیچے جج صاحب کی کوئی گاڑی یا گن مین وغیرہ بھی موجود ...ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" مکرم بیگ نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر خفیہ ادارے کے ...کی طرف اشارہ کیا "یہ صاحبان چیک کرچکے ہیں۔ نیچے کوئی گاڑی موجود نہیں ہے جسے جج صاحب کی گاڑی سمجھی جاسکے اور نہ ہی کوئی گن مین وغیرہ موجود ہے۔ ممکن ہے یہ درویش صفت ...کسی ٹیکسی وغیرہ میں آیا ہو اور تنہا ہی آیا ہو۔ شاید ہدایت ...نے اپنی کہانی کے مطابق انہیں رازداری سے آنے کی ...ت کی ہو۔ فی الحال تو اس سلسلے میں صرف قیاس ہی کیے ...لتے ہیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "اس اپارٹمنٹ ...کُل کتنے کمرے ہیں؟"

اس نے ذرا سوچا پھر جواب دیا "چھ۔۔۔۔ ان میں سے صرف ...کو میں نے بیڈ روم بنایا ہوا ہے کیونکہ کبھی کبھی مجھے یہاں آرام ضرورت بھی پیش آجاتی ہے۔ باقی سب دفتر کے طور پر استعمال ...تے ہیں۔"

"میں انہیں ایک نظر دیکھ سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" اس نے فوراً کہا اور مجھے اپنے پیچھے آنے کا ...ارہ کرتے ہوئے لاؤنج کی طرف چل دیا۔

لاؤنج میں پہنچتے ہی میری کہنی کسی چیز سے ٹکرائی۔ میں نے اپنی ...راہ ضبط کرتے ہوئے دیوار کی طرف دیکھا۔ دیوار میں سے عجیب بے ہودہ سے انداز میں چھوٹا سا ایک چھجا باہر کو نکلا ہوا تھا۔ اس ...ے نیچے دیوار میں چوکور خلا سا نظر آرہا تھا جسے ہارڈ بورڈ لگا کر بند ...رنے کی ناکام کوشش کی گئی تھی۔ ایک خوب صورت اپارٹمنٹ ...سا یہ بدنمائی مجھے حیرت انگیز لگی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

مکرم بیگ منہ بنا کر بولا "آپ کو معلوم ہی ہوگا ہمارے ہاں ہر ...معاملے میں مغرب کی نقالی کی کوشش کی جاتی ہے لیکن ہم کسی چیز ...کو وہ معیار نہیں دے پاتے۔ اس بلڈنگ کی تعمیر کے وقت اس میں "گاربیج شیوٹس" بھی بنا کردینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ اپارٹمنٹس بیچنے کے لئے اشتہاروں کی حد تک تو منصوبے میں دنیا کی نت نئی سہولیات اور آسائشیں جمع کردینے کے وعدے کئے جاتے ہیں اور نمونے کے طور پر ننھی منھی سی چیزیں دکھاوے کے لئے بنا بھی دی جاتی ہیں۔ مثلاً چار گز کا حوض بنا کر اسے سوئمنگ پول کا نام دے دیا جاتا ہے۔ دو گز ... تھوڑی سی گھاس اُگا کر اور اس میں لوہے کے دو ... بھولے نصب کرکے اسے بچوں کے تفریحی پارک کا نام دے دیا جاتا ہے۔ باتھ روم جتنے کسی کمرے پر فٹ نس سینٹر کا بورڈ لٹکا دیا جاتا ہے۔ اس طرح کی بہت سی ڈرامے بازیاں کی جاتی ہیں۔"

پھر اس نے کندھے اچکائے اور خود ہی دوسرے فریق کا دفاع کرتے ہوئے بولا "بہرحال۔۔۔ بلڈرز کے اپنے بھی بہت سے مسائل ہیں۔ مہنگائی کی مصنوعی لہر ہمیشہ ہر صنعت کو اپنے پنجوں میں جکڑے رکھتی ہے۔ دوسری رکاوٹیں بھی ہوتی ہیں۔ بلڈر اپنی اعلان کردہ قیمتوں میں صحیح معنوں میں ڈھنگ سے وہ چیزیں فراہم نہیں کرسکتا۔ میرا خود کسی زمانے میں یہاں کنسٹرکشن کا بھی بزنس تھا۔ میں نے بند کردیا۔ اب امریکا میں کر رہا ہوں، وہاں ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ بہت آسانیاں اور سہولتیں میسر ہیں۔"

"خیر تو یہ گاربیج شیوٹ ہے۔" میں نے کہنی سہلاتے ہوئے ایک مرتبہ پھر اس چھجے اور شگاف کی طرف دیکھ کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"ہاں" اس نے جواب دیا "خریدار اس وقت بہت خوش ہوئے ہوں گے کہ بڑی سہولت رہے گی۔ گھر میں کھڑے کھڑے اپنا کوڑا کچرا اس خانے میں ڈال دیا کریں گے اور وہ خود بخود کچرا خانے میں پہنچ جایا کرے گا جہاں اسے ٹھکانے لگانے کا بندوبست ہوگا لیکن یہ منصوبہ ناکام ہوگیا۔ ایک تو گاربیج شیوٹس ناکارہ تعمیر کئے گئے تھے۔ دوسرے ہمارے ہاں اچھے بھلے خوش حال طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں کو بھی ابھی ایسی چیزوں کے استعمال کا سلیقہ نہیں۔ کچھ ہی عرصے میں ان شیوٹس کا بُرا حال ہوگیا۔ کچرا خانے کا نظام بھی صحیح طور پر نہیں سنبھالا جاسکا۔ دوسرے ملکوں میں تو بجلی سے کچرا جلانے کی بھٹیاں چلتی ہیں۔ یہاں گیس سے بھی نہیں چل سکی۔ اس لئے یہ سب کچھ ناکارہ ہوگیا ہے۔ بلڈنگ والوں کو منع کردیا گیا ہے کہ ان میں کچرا نہ پھینکیں۔"

باتیں کرنے کے دوران میں ہم ایک سے دوسرے کمرے میں جاتے رہے تھے۔ اپارٹمنٹ کی سیٹنگ وہی تھی جو اس نے بتائی تھی۔ ایک کمرا بیڈ روم تھا۔ باقی کی ترتیب و آرائش دفتر والی تھی۔ کسی کمرے میں ان کے سوا کوئی فرد موجود نہیں تھا جنہیں میں دیکھ چکا تھا۔

میں نے تمام کھڑکیوں وغیرہ کا بھی جائزہ لیا تھا۔ اپارٹمنٹ میں داخلے کا واقعی کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ صرف اس کھڑکی کی گرل کاٹ کر ہی کوئی اندر آسکتا تھا جو ہنگامی سیڑھیوں کے قریب تھی لیکن اس کی گرل صحیح سلامت تھی۔ میں نے چند منٹ میں ہی معائنہ مکمل کرلیا۔

"واقعی۔۔۔ اس میں تو سامنے والے دروازے کے سوا کسی راستے سے کوئی اندر نہیں آسکتا۔" میں نے تسلیم کیا "اور تمہارا

کہنا ہے کہ تم اسے مقفل کر گئے تھے۔"
"کاش مجھے اس بات کا یقین نہ ہوتا!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اس طرح سب کا کام آسان ہو جاتا۔"
"اب تمہاری پوزیشن بدستور مشکوک ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے لیکن میں آپ سے جھوٹ بولنے کی حماقت نہیں کرنا چاہتا۔ میں ضمیر وغیرہ کی بات نہیں کروں گا کیونکہ آپ کو شاید اب بھی یقین نہ آئے کہ مجھ جیسے آدمی کے پاس ضمیر وغیرہ جیسی بھی کوئی چیز ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں محض عقل کے حوالے سے [illegible] دوں گا۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ میں جھوٹ نہ بولوں [illegible] بول کر فی الحال تو شاید میں الزام کا پھندا اپنے گلے سے نکال کر ہدایت وارثی کے گلے میں ڈالنے میں کامیاب ہو جاؤں لیکن آگے چل کر اس سے زیادہ بُری طرح پھنس جاؤں۔"
وہ بدستور ہر بات بڑی معقولیت سے کر رہا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اتنا معقول آدمی ہو سکتا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ہم واپس اسی بڑے کمرے میں آ چکے تھے جو اصل میں ڈرائنگ روم تھا مگر اب آفس کا مین کمرا وہی معلوم ہوتا تھا۔ اس میں داخلے کے دو دروازے تھے لیکن دونوں اپارٹمنٹ کے اندر ہی تھے۔ باہر کی طرف اس کا کوئی دروازہ نہیں تھا۔

"اب؟" مکرم بیگ نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔
"کیا یہ کیس پولیس کے پاس جائے گا؟" میں نے پوچھا۔
"ہاں ضابطے کی کارروائی تو وہی کرے گی۔ کیس کا اندراج بھی پولیس ہی کرے گی۔" مکرم بیگ نے جواب دیا "خفیہ ایجنسی تو صرف اس کیس کی نگرانی کرے گی کہ اس میں کوئی گھپلا نہ ہونے پائے۔ کوئی فریق پولیس سے سازباز کر کے، روپیا کھلا کے یا کوئی اور چکربازی کر کے سزا سے نہ بچنے پائے۔ اہم آدمی کے قتل کا معاملہ ہے۔"

"تم مجھے تقریباً ایک گھنٹے کی مہلت دو۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "میں ایک گھنٹے بعد دوبارہ یہاں آؤں گا اور اگر نہ آ سکا تو فون پر تم سے رابطہ کروں گا۔ اس کے بعد تم پولیس کو بُلا لینا۔"
"پولیس....؟" اس نے بھویں اچکائیں۔ اس کی آنکھوں میں پہلی مرتبہ میں نے تشویش کی ہلکی سی پرچھائیں دیکھی۔ وہ اتنے اثر رسوخ کا مالک تھا کہ ابھی تک پولیس سے زیادہ خطرناک محکمے کے لوگوں نے اسے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ معلوم نہیں کیوں پولیس کے نام پر اس کی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیں اُبھری تھی حالانکہ میرے خیال میں اس کے لئے پولیس سے محفوظ رہنا زیادہ آسان تھا۔

"ظاہر ہے پولیس کو تو بُلانا ہی پڑے گا۔ ضابطے کی کارروائی آخر اور کتنی دیر کے لئے ٹالی جا سکتی ہے؟ جتنی تاخیر ہو چکی ہے وہی کافی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں.... یہ بات تو ہے۔" اس نے کندھے اچکائے "پولیس تو بہرحال بُلانا ہی پڑے گا۔ یہ صاحبان درحقیقت اسی انتظار [illegible] بیٹھے ہیں۔" اس نے خفیہ محکمے کے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔
"کوئی بات نہیں۔ یہ لوگ کچھ دیر اور انتظار کر لیں [illegible] انہوں نے اب تک بھی نہایت صبر و تحمل اور شائستگی کا مظاہرہ [illegible] ہے۔ امید ہے، یہ میرے جانے کے بعد بھی اسی طرح تم سے تعاون جاری رکھیں گے۔ تم پولیس کو ہر بات بالکل اسی طرح سچ سچ بتانا جس طرح تم نے مجھے بتائی ہے۔ تمہارے بیان میں کوئی فرق [illegible] آنا چاہئے۔ اور پولیس تمہارا کوئی جھوٹ نہ پکڑنے پائے۔"
"جب میں جھوٹ بول ہی نہیں رہا تو وہ پکڑے گی کیسے؟" [illegible] وہ اطمینان سے بولا "وہ مجھ پر وہ فارمولا تو آزما نہیں سکتی جس [illegible] سچ، جھوٹ میں .... اور جھوٹ، سچ میں تبدیل ہو جاتا ہے۔" [illegible] مسکرایا "لیکن آپ اس دوران میں کہاں جا رہے ہیں؟"
"ہدایت وارثی سے ملنے۔" میں نے جواب دیا "یہ بتاؤ وہ اس وقت کہاں ملے گا؟"
"اگر وہ اس قتل میں ملوث نہیں ہے تو میرا خیال ہے وہ اسی ہوٹل میں ہی ملے گا جسے وہ ٹھیکے پر چلا رہا ہے۔ اس کا زیادہ وقت وہیں گزرتا ہے۔ لیکن آپ کو اس کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اسے [illegible] بُلا لیتے ہیں۔ میں فون کر دیتا ہوں۔ اگر وہ موجود ہوا تو فوراً آ جائے گا۔" [illegible]
"نہیں۔ میں اسے خبردار کئے بغیر اس کے اپنے ٹھکانے پر جا کر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اب تم نے مجھے ایک عجیب و غریب کام میں پھنسا ہی دیا ہے تو میں اپنی عقل کے مطابق چلنا چاہتا ہوں [illegible] دیکھتا ہوں مجھے کچھ کامیابی حاصل ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کے ہوٹل کا نام کیا ہے۔ اور اگر وہ کچھ زیادہ ہی گمنام ہے تو ایڈریس بھی بتا دو۔"

"آپ کے لئے وہ شاید گمنام ہو.... لیکن کچھ حلقوں میں تو بہت ہی مشہور ہے۔" مکرم بیگ معنی خیز انداز میں مسکرایا۔ پھر اس نے مجھے ہوٹل کا نام بتایا اور میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ہوٹل کا نام "لارڈز ان" تھا۔
مکرم بیگ بدستور مسکراتے ہوئے بولا "لگتا ہے اس کی شہرت آپ تک بھی پہنچ چکی ہے؟"
"میں بھی ہوٹلنگ کے بزنس میں ہوں۔ کسی خاص ہی خوبی کی بنا پر کسی کسی ہوٹل کی شہرت مجھ تک پہنچ ہی جاتی ہے۔" میں نے جواب دیا "اپنے ماضی کی روشنی میں ہدایت وارثی کوئی ایسا ہی ہوٹل ٹھیکے پر لے سکتا تھا۔"

"لارڈز ان" اس قسم کے ہوٹلوں میں سے تھا جنہیں ان کے عروج کے زمانے میں بھی کوئی اسٹار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ بہرحال کسی زمانے میں اس قسم کے ہوٹل کافی تعداد میں پائے جاتے تھے۔

درجے کے صاف ستھرے ہوٹلوں میں شمار ہوتے تھے اور [illegible] طبقے پر ہی ان کے بزنس کا دارومدار تھا۔
[illegible] وقت کے ساتھ ساتھ ان پر زوال آ گیا۔ عمارتیں پُرانی [illegible] مالکان کی زندگی کی کہانیوں میں نہ جانے کون کون سے موڑ [illegible] جن کے اثرات ان کے ہوٹلوں پر بھی پڑے۔ بعض مالکان [illegible] اس دنیا میں نہیں رہے۔ بعض ہوٹل ٹوٹ گئے۔ بعض دفاتر میں [illegible] اور بعض غیر رسمی قسم کے ہوسٹلوں میں تبدیل ہو گئے۔
[illegible] ان میں سے دو چار نے بقا کا دوسرا ہی راستہ اختیار کیا۔ "لارڈز [illegible]" انہی میں سے ایک تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس میں [illegible] فلور کے کمروں میں مختلف دفاتر قائم تھے۔ ان میں سے بعض [illegible] قسم کی کمپنیوں کے تھے جن کے نام کے ساتھ "انٹرنیشنل" [illegible] لگا ہوتا ہے مگر ان کی تمام تر بین الاقوامیت صرف ایک [illegible] کیس تک محدود ہوتی ہے۔
[illegible] ان میں سے بعض کمپنیاں چند ماہ یا سال دو سال میں غائب [illegible] آتی ہیں۔ بعض کے مالکان غائب ہو جاتے ہیں، قرض خواہوں [illegible] دیگر تقاضے داروں کا سامنا کرنے کے لئے بے چارہ اسٹاف رہ [illegible] جاتا ہے جو پہلے ہی حالات کا مارا ہوتا ہے اور اب تنخواہوں کے [illegible] انتظار میں بیٹھا ہوتا ہے مگر تنخواہوں کے بجائے انہیں دفتر کے چکر [illegible] لگانے والوں کی دھمکیاں ملتی ہیں۔
اس کے فرسٹ فلور سے اوپر کے کمرے اب بھی ہوٹل کے [illegible] کمروں کے طور پر ہی کرائے پر اٹھائے جاتے تھے۔ ہوٹل کے معیار [illegible] دیکھتے ہوئے ان کے کرائے خاصے اونچے تھے لیکن کمرے لینے [illegible] والوں کو ان پر اعتراض نہیں ہوتا تھا کیونکہ جو "سہولیات" انہیں [illegible] میسر تھیں، کہیں اور مشکل سے ہی ہو سکتی تھیں۔ انہیں یہ [illegible] اندازہ ہوتا ہو گا کہ آخر ہوٹل کی آمدنی میں سے کافی حصہ علاقہ [illegible] پولیس اور کچھ دوسرے لوگوں کو بھی جاتا ہو گا۔
وہاں بعض شادی شدہ حضرات غیر شادی شدہ خواتین کے [illegible] ساتھ اور بعض شادی شدہ خواتین غیر شادی شدہ حضرات کے [illegible] ساتھ تشریف لے جاتی تھیں۔ بعض شادی شدہ حضرات بعض [illegible] شادی شدہ خواتین کے ساتھ بھی تشریف لاتے تھے مگر وہ ان کی [illegible] بیویاں نہیں ہوتی تھیں۔ بیشتر حضرات کچھ ایسی خواتین کے ساتھ [illegible] تشریف لاتے تھے جن کی راتیں عموماً ہوٹلوں کے کمروں میں ہی.... یا [illegible] پھر ایسے گھروں میں گزرتی ہیں جن میں ہوٹلوں کی سی خصوصیات پائی [illegible] جاتی ہیں۔

ہوٹل میں گراؤنڈ فلور پر اب بھی ریستوران چل رہا تھا۔ [illegible] شام کو زیادہ تر اسٹیج اور ٹی وی وغیرہ پر ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے [illegible] فنکار اور اداکارائیں بیٹھی نظر آتی تھیں۔ انہیں وہاں کے ماحول [illegible] شاید کچھ اپنائیت اور آزادی کا احساس ہوتا تھا۔ ریستوران [illegible] فی الحال زیادہ مہنگا بھی نہیں تھا۔ وہ وہاں کم خرچ میں زیادہ سے زیادہ [illegible] وقت گزار سکتے تھے۔ کوئی انہیں بھگانے والے حربے استعمال [illegible]

نہیں کرتا تھا۔
مجھے کئی بار اس ہوٹل کے سامنے سے گزرنے کا اتفاق ہوا تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ اسے ہدایت وارثی ٹھیکے پر چلا رہا تھا۔ ممکن ہے اتنی بہت سی معلومات کے ساتھ کبھی ہدایت کا نام بھی سامنے آیا ہو لیکن میرے ذہن میں یہ خیال نہ آیا ہو کہ یہ وہی ہدایت وارثی تھا جو ماضی میں بڑی اونچی چیز رہا تھا۔
مکرم بیگ بولا "کیا آپ کا وہیں جا کر اس سے ملنا ضروری ہے؟"
"ہاں۔ میں اچانک اس کے سامنے جا کر اسے سرپرائز دینا چاہتا ہوں۔ میں ایک غیر متعلق آدمی ہوں۔ اسے یقیناً یہ جان کر کافی حیرت ہو گی کہ میں اس معاملے میں اس حد تک دلچسپی لے رہا ہوں۔ دوسرے وہاں جا کر شاید کوئی اور کام کی بات بھی معلوم ہو جائے۔ ہر جگہ کا اپنا ایک الگ ماحول ہوتا ہے۔ مشاہدہ کرنے والی آنکھ کو ماحول بھی بہت کچھ بتاتا ہے۔"
"درست کہا آپ نے۔" مکرم نے سرہلایا۔
"ہاں.... یاد آیا۔" رخصت ہونے سے پہلے میں نے کہا "تم نے اس عورت نیلم کے بارے میں تو کچھ بتایا ہی نہیں، جس کی وجہ سے ہدایت کو جیل جانا پڑا تھا۔ اس کا کیا بنا تھا؟"
"اسے بھی سزا ہوئی تھی لیکن ہدایت سے کم۔" مکرم بیگ نے جواب دیا "جج عبدالسلام صاحب نجی طور پر اس کی اصلاح پر تُلے ہوئے تھے۔ وہ اسے جیل بھیج کر بھولے نہیں تھے۔ اس کے جیل سے نکلتے ہی انہوں نے اسے بُلایا اور سمجھا بجھا کر اس کی شادی ایک ایسے شخص سے کر دی جس کی زندگی کی کہانی اسی سے کچھ کچھ ملتی جلتی تھی۔ جج صاحب کا خیال تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے لئے اچھے ساتھی ثابت ہوں گے۔ دونوں کو سہارے کی ضرورت تھی۔ دونوں درخت سے ٹوٹے ہوئے خزاں رسیدہ پتّوں کی طرح تھے۔ ہدایت ابھی جیل میں ہی تھا۔ جج صاحب کی توقعات پوری نہیں ہو سکیں۔ نیلم اور اس کے شوہر میں جلد طلاق ہو گئی۔ پھر شاید جج صاحب نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ آخر ایک مصروف شخص کب تک مصلحِ قوم کا کردار ادا کر سکتا ہے؟ جونہی ہدایت جیل سے باہر آیا، نیلم واپس اس کے پاس چلی گئی۔ اب بھی اسی کے پاس ہے۔ اس کے ہوٹل میں ہی کام کرتی ہے۔ بیک وقت ہوٹل کی ریسپشنسٹ، ہدایت کی سیکریٹری اور کبھی کبھی آپریٹر کے علاوہ نہ جانے کیا کیا فرائض انجام دیتی ہے۔ وہ ایک عجیب جوڑا ہے۔ دونوں کو ایک دوسرے میں یقیناً کوئی خاص ہی کشش محسوس ہوتی ہو گی جس نے انہیں ایک ساتھ باندھا ہوا ہے ورنہ ان کی عمروں میں تو کافی فرق ہے۔ عین ممکن ہے کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے محبت ہو۔ بعض انسانوں کو زندگی میں محبت بڑے عجیب موڑ پر.... بڑے عجیب حالات میں.... اور بڑی تاخیر کے ساتھ ملتی ہے۔"

"اور شاید وہ شادی کرکے اس محبت کو برباد کرنا نہیں چاہتے۔" میں نے خیال ظاہر کیا پھر پوچھا "وہ اب بھی بغیر شادی کے ہی ساتھ رہ رہے ہیں؟"

"غالباً" مکرم بیگ نے بے یقینی سے جواب دیا "مجھے ان کی نجی زندگی کی تازہ ترین صورتِ حال کا علم نہیں۔ بہرحال وہ دونوں ہوٹل میں ہی پائے جاتے ہیں۔"

"جج صاحب کے بارے میں تو نیلم کے دل میں بھی کچھ اچھے جذبات نہیں ہوں گے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"شاید" مکرم بیگ مبہم لہجے میں بولا "میں نے سنا ہے وہ پیٹھ پیچھے انہیں بددعائیں دیا کرتی تھی کہ ان کی وجہ سے اس کی زندگی برباد ہوئی۔" وہ دھیرے سے ہنسا "حالانکہ کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کرسکتا کہ آخر اس سے پہلے اس کی زندگی کون سی "آباد" تھی.... یا آئندہ اس کے "آباد" ہونے کے کون سے امکانات تھے؟ اس قسم کی عورتوں کی زندگی تو اسی طرح گزرتی ہے۔ بلکہ میں سمجھتا ہوں وہ اپنے اعمال کے حساب سے بہت اچھے حال میں ہے اور کافی حد تک باعزت زندگی گزار رہی ہے۔"

"خیر... میں جاکر ان سے ملتا ہوں۔" میں نے کہا اور بریف کیس اٹھا کر وہاں سے رخصت ہولیا۔

میں نیچے پہنچا تو شفیع شاہ میری گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ اس وقت اوپر سے میرے تعاقب میں کوئی نہیں آیا تھا اور وہ جگہ ایسی تھی جہاں مکرم بیگ اپنے اپارٹمنٹ کی کسی کھڑکی سے مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس لئے میں نے شفیع شاہ سے بات کرنے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

"تم یہاں کیوں آن کھڑے ہوئے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو اوپر اس اپارٹمنٹ تک بھی ہو آیا ہوں سر! لیکن وہاں مجھے ماحول پُرسکون ہی نظر آیا۔ اس لئے میں نیچے آگیا۔ اس کے باوجود اب مجھے کچھ تشویش ہوچلی تھی۔ میں فیصلہ کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ اب کیا کرنا چاہئے۔" اس نے بہت نیچی آواز میں جواب دیا۔

"مذاکرات بہت لمبے ہوگئے۔" میں نے بتایا "لیکن خیر... خوشی کی بات یہ ہے کہ وقت ضائع نہیں گیا۔ بیس لاکھ کما کر لایا ہوں۔ مزید بھی جو وقت ضائع ہوگا اس کی قیمت بھی پیشگی وصول کرلی ہے۔"

پھر میں نے بریف کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تم اپنے پاس رکھ لو۔ صبح میرے پرسنل اکاؤنٹ میں جمع کروا دینا۔ یہ خالصتاً میری نجی کمائی ہے۔ میرے گروپ آف کمپنیز سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔"

"کمپنیاں بھی آپ ہی کی ہیں سر!" شفیع شاہ بریف کیس لیتے ہوئے مسکرا کر بولا "سب پرائیویٹ لمیٹڈ ہیں۔ مالک و مختار تو آپ ہی ہیں۔ جو چند پارٹنرز ہیں وہ بھی کاغذی ہی ہیں۔ ان کمپنیوں کی آمدنی بھی آپ کی نجی ہی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے تسلیم کیا "پھر بھی یہ کچھ اور بات ہے۔"

"سر! یہ کیا کوئی نیا وینچر شروع کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں یہی سمجھ لو۔ یہ اس وینچر کے سلسلے میں "بوہنی" ہے۔ آغاز اچھا ہوا ہے۔ تفصیل تمہیں کل بتاؤں گا۔ فی الحال "لارڈز اِن" جارہا ہوں۔ اب ذرا اس کمائی کو حلال بھی کرنا ہے۔"

"اوپر کیا ہورہا ہے سر؟" اس نے بریف کیس بغل میں دباتے ہوئے پوچھا۔

"جو کچھ بھی ہوا ہے بہت بُرا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا "ایک شریف اور دیانتدار آدمی مارا گیا ہے جس کا وجود معاشرے کے لئے مفید تھا۔ قدرت کی مصلحتوں کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ بعض ایسے لوگ بے وقت مارے جاتے ہیں جن کے دم سے انسانیت کو بڑا سہارا ملتا ہے اور بعض ایسے ننگِ انسانیت جنہیں پیدا ہوتے ہی مرجانا چاہئے تھا کسی طرح مرنے میں ہی نہیں آتے۔"

میں دروازہ کھول کر گاڑی میں بیٹھ گیا اور شفیع شاہ تیزی سے کہیں اندھیرے میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف چل دیا۔ میں نے اسے گاڑی تک پہنچنے کے لئے چند سیکنڈ کی مہلت دی۔ پھر وہاں سے روانہ ہوگیا۔

جب میں لارڈز اِن پہنچا تو اس کے ریستوران میں رونق شباب پر تھی۔ اس کی ایک دیوار میں سڑک کی طرف کافی بڑا شیشہ لگا تھا۔ یہ ٹینٹڈ گلاس تھا مگر رات کو چونکہ اندر روشنیاں ہوتی تھیں اس لئے ریستوران کا منظر باہر سے بھی دیکھا جاسکتا تھا۔

میں نے گاڑی ہوٹل سے کچھ دور ہی چھوڑ دی تھی اور چند لمحے کے لئے باہر ہی رک کر اندر کے منظر کا جائزہ لیا۔ ریستوران کی تقریباً سب میزیں بھری ہوئی تھیں۔ سگریٹوں کا دھواں ہوا میں چکرا رہا تھا۔ البتہ باتوں کی بھنبھناہٹ باہر تک پہنچ رہی تھی۔

ریستوران میں براہِ راست داخل ہونے کے لئے بھی شیشے کا ایک دروازہ موجود تھا جبکہ ہوٹل کا اصل دروازہ دوسرا تھا جو ایک سی لابی میں کھلتا تھا۔ لابی کے اختتام پر استقبالیہ کاؤنٹر تھا۔ اس کی ایک طرف غالباً چھوٹا سا آفس تھا۔ اسی کے پاس ایک اور چھوٹے سے کیبن میں غالباً ٹیلی فون کا بورڈ نصب تھا۔ کونے سے سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں۔

اس لابی اور ریستوران کے درمیان بھی ایک محرابی در موجود تھا۔ ادھر سے بھی ریستوران میں داخل ہوسکتے تھے۔ ہوٹل کا اصل دروازہ شیشے کا نہیں تھا لیکن میں ریستوران کی شیشے کی دیوار سے ادھر کا منظر بھی آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔ کاؤنٹر پر

ب میں ایک عورت کھڑی تھی لیکن میں اس کا چہرہ صحیح طور پر ں دیکھ سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک موٹے سے رجسٹر پر جھکی ہوئی تھی بہت مصروف نظر آرہی تھی۔ اس کے سامنے کاؤنٹر پر کاغذات کئی پلندے بھی رکھے نظر آرہے تھے۔ وہ یقیناً نیلم تھی۔ باہر سے ر کا منظر ذرا گنجلک سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اس بالوں کی چمک نمایاں نظر آئی۔ اس نے بالوں کا جوڑا بنا رکھا ۔ اس کے بالوں کی چمک بہت انگیز تھی۔ نہایت ہی نفیس اور بھی بال تھے۔ شاید قابو میں نہیں آتے تھے۔ اسی لئے اس نے یں سمیٹ کر جوڑا بنایا ہوا تھا۔

غالباً اسی دوران میں کاؤنٹر کے نیچے چھپے ہوئے کسی ٹیلی فون کی ٹی بجی۔ اس نے ہاتھ نیچے لے جاکر ایک سرخ ریسیور برآمد کیا ر کان سے لگالیا۔ میں نے لابی والے دروازے سے ہی اندر نے کا فیصلہ کیا۔

دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا۔ میں نے جب لابی ں قدم رکھا تب بھی ریسیور اس کے کان سے لگا ہوا تھا اور وہ یمی آواز میں کسی سے بات کررہی تھی۔ لیکن بات کرتے کرتے ی اس نے نہایت گہری نظر سے ایک ہی لمحے میں میرا سرتاپا جائزہ لے ڈالا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ چونکی بھی تھی۔

ایک لمحے کے لئے مجھے شبہ ہوا کہ شاید وہ مجھے پہچانتی تھی اور البا اس نے یہی سمجھا تھا کہ میں اس کے پاس پہنچوں گا لیکن میں نے یہاں کے ماحول کو سمجھنے کے لئے پہلے کچھ دیر ریستوران میں بیٹھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس نے مجھے ریستوران کی طرف جانے والے حرابی دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا تو اس کے تاثرات پہلے ہی یسے ہوگئے۔

اسی لمحے وہ ریسیور کاؤنٹر پر رکھ کر اس کے عقب سے نکلی اور تقریباً دوڑتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ تب میں نے گردن گھما کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا.... اور یہ بڑا خطرناک تجربہ تھا۔ اسے دوڑتے ہوئے سیڑھیوں تک جاتے اور پھر اسی طرح سیڑھیاں چڑھتے دیکھنا ایک نہایت مختصر... مگر ایسا تجربہ تھا جسے دیر تک نہیں بھلایا جاسکتا تھا۔ وہ سرتاپا تھرتھراہٹ تھی۔ اور تھرتھراہٹ بھی ایسی جو دل کو اتھل پتھل کردے۔ جس کی وجہ سے سانس سینے میں اٹکنے لگے۔

وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کی عمر تیس سے پینتالیس سال کے درمیان ہوتی ہے لیکن یہ پتا نہیں چلتا کہ کہاں ہے؟ وہ دراز قد اور ذرا بھاری پن کی طرف مائل تھی لیکن بھاری پن وہ نہیں تھا جو چربی کی پیداوار ہوتا ہے۔ یہ بھاری پن بہت ہی خطرناک مقامات پر تھا۔ مجموعی طور پر وہ کسی اسمارٹ، دبلی پتلی، چلبلی اور کم عمر لڑکی سے زیادہ حشر خیز تھی۔ شکل صورت بھی بُری نہیں تھی۔ اچھی خاصی خوش شکل اور گوری چٹی تھی۔ خصوصاً آنکھیں تو بہت اچھی تھیں۔ معلوم نہیں ٹی وی اور فلم میں کیوں نہیں چلی تھی۔ اس سے کہیں کم رو عورتیں شوبزنس میں اچھے خاصے مقام پر تھیں۔ شاید اس میں ایکٹنگ کی کوئی خاص صلاحیت نہ ہو۔ وہ محض اس حد تک ہی اداکارہ ہو جس حد تک تقریباً ہر عورت ہوتی ہے۔

وہ سیڑھیوں پر غائب ہوگئی اور میں اپنی دھڑکنوں کو معمول پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے محرابی دروازے سے گزر کر ریستوران میں آگیا۔ باتوں کی وہ تیز بھنبھناہٹ جو باہر مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی، اب یکدم ہی میرے کانوں سے ٹکرائی۔ سگریٹوں کے دھوئیں اور چائے کافی وغیرہ کی مہک سے بوجھل ہوا نے میرا استقبال کیا۔ ہال میں روشنی کم ہی تھی۔

میں نے کوئی ایسی میز تلاش کرنے کی کوشش کی جس سے میں کاؤنٹر پر نظر رکھ سکوں۔ ظاہر ہے وہ بدبخت کاؤنٹر تو کوئی ایسی چیز نہیں تھا جس پر نظر رکھی جاتی۔ کاؤنٹر پر نظر رکھنے سے میرا مقصد نیلم پر نظر رکھنا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ اور لوگ بھی اپنے دل و ذہن میں یہی مقصد لے کر آئے ہوئے تھے۔ ایسے زاویوں پر رکھی تمام میزیں بھری ہوئی تھیں جن سے کاؤنٹر نظر آتا تھا۔ تاہم مجھے کافی پیچھے ایک میز خالی مل ہی گئی۔ چھوٹی سی وہ میز ایک کونے میں گھسی ہوئی تھی۔ مرکزِ نگاہ ذرا دور ہوگیا تھا لیکن میرے لئے بہرحال اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ مجھے امید تھی جب وہ کاؤنٹر پر واپس آئے گی تو میں یہاں سے بھی صاف طور پر اس کا جائزہ لے سکوں گا۔

میں نے اس کی آمد سے پہلے ریستوران کا جائزہ لیا۔ اس کا ماحول تقریباً ویسا ہی تھا جیسا کسی بھی بڑے ایشیائی ملک کے اوسط درجے کے ریستوران کا ہوسکتا تھا۔ لیکن ذرا غور سے دیکھا جاتا تو یہاں ذرا مختلف قسم کی کہانیاں کروٹیں لیتی دکھائی دے رہی تھیں۔

یہاں چائے کی پیالیوں میں طوفان اٹھائے جارہے تھے۔ ایک میز پر دبلی پتلی، سانولی اور کم رو سی لڑکی لمبے بالوں والے ایک دُبلے پتلے نوجوان کی طرف جھکی ہوئی تھی جس کی استخوانی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ حالانکہ ان کے سامنے صرف چائے کے برتن بکھرے ہوئے تھے مگر نوجوان کی آنکھیں کچھ یوں مخمور سی تھیں جیسے اس نے کچھ اور پی رکھا ہو۔

وہ نہایت مدبرانہ انداز میں لڑکی کو کچھ سمجھانے کی کوشش کررہا تھا اور وہ سعادت مندی سے سرہلا رہی تھی۔ شاید وہ اسے مستقبل کے سنہرے خواب دکھا رہا تھا کہ وہ عنقریب ٹی وی کی سپر اسٹار بننے والی تھی اور اس کے بعد فلموں میں تہلکہ مچانے والی تھی یا پھر شاید وہ اسے کامیاب اداکارہ بننے کے گُر بتا رہا تھا جبکہ اس کے اپنے کامیاب اداکار بننے کے خواب شاید کبھی کے بکھر چکے تھے۔

ایک اور میز پر تین مرد اور پھیکی سی رنگت کی ایک لڑکی سر جوڑے بیٹھے تھے۔ نیچی آوازوں میں... مگر خاصے جوش و خروش کے ساتھ گفتگو جاری تھی۔ شاید کسی فلم کا منصوبہ بن رہا تھا۔ شاید

لاکھوں کی باتیں ہو رہی تھیں مگر عین ممکن تھا کہ اٹھتے وقت انہیں یہ پریشانی لاحق ہو جاتی کہ ان میں سے چائے کا بل کون دے گا؟ نہ جانے کیوں ان کی شخصیتوں کو دیکھ کر یہی اندیشہ محسوس ہوتا تھا۔

ایک اور میز پر ذرا ہینڈسم سا لڑکا قدرے بہتر حلیے میں موجود تھا۔ اس کے گلے میں سونے کی چین چمک رہی تھی۔ اس کے ساتھ ذرا بہتر شکل کی ایک گوری چٹی لڑکی موجود تھی۔ گہرے سرخ لباس نے اس کی شخصیت کو کچھ اور اجاگر کر دیا تھا۔ میز کے عقب سے وہ پوری نظر نہیں آ رہی تھی مگر جتنی نظر آ رہی تھی' اتنی بھی خاصی دیدہ زیب تھی۔

لڑکا شاید دو چار ڈراموں میں چھوٹے موٹے رول کر چکا ہو کیونکہ وہ بار بار اِدھر اُدھر گردن گھما کر یوں متوقع سی نظروں سے لوگوں کی طرف دیکھنے لگتا تھا گویا اسے امید ہو کہ کوئی نہ کوئی ضرور اسے پہچان لے گا اور شاید آٹوگراف لینے آئے گا۔ جب اسے کوئی آثار دکھائی نہ دیتے تو وہ دوبارہ بڑے انہماک اور زور و شور سے لڑکی سے گفتگو میں مصروف ہو جاتا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بات پر اصرار کر رہا تھا جبکہ لڑکی بار بار قدرے بے بسی سے نفی میں سر ہلائے جا رہی تھی۔ شاید لڑکا اسے قائل کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر وہ اس کے کہنے پر عمل کرے تو کامیابی نہ صرف اس کے قدم چومے گی بلکہ خود لڑکے کا بھی کچھ بھلا ہو جائے گا مگر لڑکی شاید کچھ ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔ جس کی وجہ سے لڑکے کے چہرے پر کچھ مایوسی اور جھنجلاہٹ کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔

تقریباً ہر میز پر شاید کچھ اسی قسم کی کہانی بکھری ہوئی تھی۔ مکرم بیگ کی باتوں سے مجھے پہلے ہی اس ماحول کا کافی حد تک اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی دوران میں نیلم سیڑھیوں سے واپس آتی دکھائی دی۔ اس کے اُترنے کا منظر بھی کافی حد تک ویسا ہی حشر خیز تھا جیسا چڑھنے کا تھا۔

سیڑھیاں چڑھنے اور اُترنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر تموج کے آثار تھے جو میں دور سے بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس نے کاؤنٹر کے عقب میں پہنچ کر ایک بار پھر ریسیور اُٹھایا' چند سیکنڈ بات کی اور دوبارہ ریسیور کاؤنٹر کے عقب میں ہاتھ لے جا کر رکھ دیا۔

دوبارہ رجسٹر کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے اس نے ذرا سر گھما کر ہال کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس کی نظر ایک ایک میز پر ٹھہر رہی تھی۔ میرے لئے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اسے میری تلاش تھی۔ مجھے اس سلسلے میں کوئی خوش فہمی نہیں تھی۔ اس کی نظروں کو اس لئے میری تلاش نہیں تھی کہ وہ پہلی نظر میں ہی مجھ پر مر مٹی تھی بلکہ بات شاید صرف اتنی تھی کہ وہ مجھے پہچانتی تھی یا پھر اسے اس جگہ میرا وجود کچھ اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ یہاں نشست و برخاست رکھنے والوں کا شاید ایک مخصوص حلقہ تھا اور میں اسے اس حلقے سے باہر کی کوئی چیز دکھائی دیا تھا۔

آخر اس کی نظروں نے مجھے تلاش کر ہی لیا۔ ایک لمحے کے لئے ہماری نظریں ملیں۔ بیچ میں ہلکے سے رنگین شیشے کی دیوار حائل تھی لیکن میں اس کی آنکھوں سے جھانکتے ہوئے اندیشوں وسوسوں کی جھلک دیکھ سکتا تھا۔ شاید اس نے محسوس کر لیا تھا کہ میری آمد خالی از علت نہیں تھی۔ میں وہاں بیٹھ کر کسی کاغذی ڈرامے یا پرائیویٹ پروڈکشن کی تیاریاں کرنے نہیں آیا تھا' نہ ہی چائے پانی پینا' وقت گزاری کرنا یا ہاتھ پاؤں مارتی ہوئی اداکارہ کے ساتھ گپ شپ کرنا میرا مقصد تھا۔

وہ یقیناً کوڑھ مغز نہیں تھی۔ ایک ذہین عورت تھی۔ ا[illegible] اور انسان کے ارادوں کے بارے میں اندازے لگانا جانتی [illegible] ہدایت وارثی جیسا گرگ باراں دیدہ بلاوجہ ہی اس کی زلف کا [illegible] نہیں تھا اور وہ بھی یقیناً ہدایت وارثی میں کوئی خاص ہی [illegible] محسوس کرتی ہوگی جس نے اب تک انھیں ایک تعلق کی ڈو[ر] باندھ رکھا تھا ورنہ اس عورت کو اب بھی اچھے خاصے دولت [مند] اور اپنے ہم عمر... بلکہ شاید اپنے سے بھی کم عمر قدر داں میسر تھے۔ شاید ان دونوں کو واقعی ایک دوسرے کی ذات میں اپنے آئیڈیلز کی تکمیل کا امکان دکھائی دیتا ہو۔ اس قسم [کے] محسوسات رکھنے والے ہی ایک دوسرے کے بہت مضبوط [ساتھی] ثابت ہوتے ہیں خواہ بظاہر ان کے درمیان کتنی ہی بڑی خلیج نظر آتی ہو۔

دوسرے ہی لمحے اس نے نظر جھکا لی اور دوبارہ رجسٹر کی متوجہ ہو گئی۔ اسے گویا صرف یہی اطمینان کرنا تھا کہ میں ہال [میں] موجود تھا یا نہیں؟ رجسٹر کو دیکھ دیکھ کر وہ قریب رکھے کاغذات [پر] کچھ اندراجات کرنے لگی۔ شاید بل بنا رہی تھی' ریستوران [میں] ایک الگ کاؤنٹر موجود تھا۔ اس پر گنجا سا ایک ادھیڑ عمر شخص [بیٹھا] تھا۔ اس کی شکل پر کچھ بیزاری سی طاری تھی۔

کچھ ایسی ہی بیزاری چہرے پر لئے ایک ویٹر میرے قریب کھڑا ہوا۔ ماحول میں اتنی دلچسپیاں اور ہنگامہ خیزی ہونے [کے] باوجود نہ جانے کیوں ان لوگوں کے چہروں پر ایسی بیزاری طاری [تھی۔] شاید یہ لوگ روزانہ ایک ہی سا منظر دیکھ کر بور ہو گئے تھے۔ [یا] اس لئے کہ اس منظر میں ان کی کوئی خاص اہمیت یا مقام نہیں [تھا۔]

میں نے سو کا ایک کڑکڑاتا ہوا نوٹ نکال کر میز پر رکھا تو [وہ] تشویش سے سر کھجانے لگا۔ شاید پریشان ہو رہا تھا کہ میں کچھ [کھائے] پیئے بغیر کس چیز کی ادائیگی کرنا چاہ رہا تھا۔ اس قسم کے ریستو[رانوں] میں تو کھانے پینے کے بعد بھی... بلکہ بعض اوقات تو کچھ نہ [کھانے] پینے کے باوجود بھی لوگ بہت دیر تک بیٹھے رہتے ہیں۔ ادا[ئیگی کی] نوبت بڑی مشکل سے آتی ہے۔

"یہ تمہارے لئے ہے۔" میں نے وضاحت کی۔

اس نے ایک نظر نوٹ کو دیکھا اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت [ہوئی] کہ اس کے ہونٹ قدرے ناگواری سے سکڑ گئے۔ میں تو [illegible]

[illegible] خوشی سے اس کی باچھیں پھیل جائیں گی۔

"میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں سر!" وہ دھیمی آواز میں [illegible]

"کس قسم کا آدمی؟" میں نے جاننا چاہا۔

"جس قسم کا آپ مجھے سمجھ رہے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تو تمہیں شریف آدمی سمجھ رہا ہوں۔ تم یہ کہنا چاہتے ہو [کہ] تم شریف آدمی نہیں ہو۔ اور میں نے تمہارے بارے میں غلط [اندا]زہ لگایا ہے؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔

اب وہ ذرا گڑبڑا کر بولا "نہیں نہیں میرا مطلب یہی ہے کہ [میں] شریف آدمی ہوں۔"

"یہی سمجھ کر تو میں تمہاری خدمت میں یہ نوٹ پیش کر رہا [ہوں]۔ بلکہ میرا خیال ہے یہ کچھ کم ہے' اکیلا اکیلا سا نوٹ کچھ [عجی]ب نہیں لگ رہا ہے۔" میں نے ایک نوٹ اور نکال کر اس پر [رکھ] دیا "دراصل میں شریف آدمیوں کا بہت بڑا قدر دان ہوں۔"

اس نے نوٹ اٹھانے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا اور شک زدہ [سے] لہجے میں بولا "مجھے کرنا کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "صرف دو تین سوالوں [کے] جواب دینا ہوں گے اور وہ سوال ایسے ہیں کہ ان کے جواب [دی]نے سے کسی بھی انسان کی شرافت پر ہرگز آنچ نہیں آسکتی۔"

"جی پوچھئے۔" وہ اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔

"وہ سامنے کاؤنٹر پر جو عورت کھڑی ہے وہ نیلم ہی ہے نا؟"

"جی ہاں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"اور ہدایت وارثی اس وقت کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے آفس میں بیٹھے ہیں جی۔" اب اس کے لہجے میں لجاہٹ آ گئی۔

"آفس کہاں ہے؟"

"وہ جو سیڑھیوں کے نیچے چھوٹا سا دروازہ نظر آ رہا ہے وہ آفس ہے۔" اس نے شاید ذرا ڈرتے ڈرتے بتایا۔ اشارہ اس نے ہاتھ [س]ے نہیں' صرف آنکھوں سے کیا تھا۔

پھر اس نے ذرا ڈرتے ڈرتے ہی پوچھا "خیریت تو ہے سر۔ [آپ] کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ مجھے ذرا ان سے ملاقات کرنی [ہے]۔ میں نے سوچا پہلے ذرا دور سے دیکھ لوں' کس قسم کے لوگ [ہیں]۔" پھر میں نے خاصی سادگی سے پوچھا "تم اتنے پریشان کیوں [ہو گئے]؟"

"بس جی... آج کل حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ کوئی کسی کے [بار]ے میں پوچھتا ہے تو خوف محسوس ہوتا ہے۔" وہ اپنی اسٹیل کی [ٹر]ے کو سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

"بے فکر رہو۔ میں بھی ایک شریف آدمی ہوں۔" میں نے [اس]ے تسلی دی۔ میرے شریفانہ حلیے سے بھی شاید اسے کچھ اطمینان [illegible]

ہوا اور اس نے نوٹ اُٹھا لئے۔

نوٹ جیب میں رکھ چکنے کے بعد وہ بولا "ویسے یہ باتیں تو آپ بغیر ٹپ دیئے بھی پوچھ سکتے تھے۔ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے نیازی سے کہا "مجھے کم آمدنی والے لوگوں کے کام آ کر خوشی ہوتی ہے۔"

"آپ کیا کھانا پینا پسند فرمائیں گے سر؟" اب وہ ذرا پُرسکون لہجے میں بولا۔

"صرف چائے ہی پلا دو۔" میں نے کہا اور ساتھ ہی پوچھا "ویسے بائی دا وے... جب میں نے سو کا نوٹ میز پر رکھا تو تم کیا سمجھے تھے؟"

"کچھ نہیں سر۔" وہ ایک بار پھر کچھ گڑبڑا گیا "لوگ کچھ ایسی ویسی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فلاں لڑکی کہاں ہے' کب آئے گی' فلاں لڑکی سے بات ہو سکتی ہے یا نہیں' فلاں کو یہ پیغام پہنچا دو گے... وغیرہ وغیرہ۔ میں اس قسم کے چکروں میں نہیں پڑتا سر! بیوی بچوں کو روکھی سوکھی کھلا کر گزارا کر لیتا ہوں۔"

"بہت اچھا کرتے ہو۔ تمہارے بچے حلال کی کمائی پر پلیں گے تو شاید بڑے ہو کر صحیح معنوں میں بڑے آدمی بنیں۔" میں نے کہا۔

وہ نیم استہزائیہ سے انداز میں بولا "معلوم نہیں صاحب... تسلی جھوٹی ہے یا سچی... بہرحال اسی تسلی کے سہارے زندگی بسر ہو رہی ہے۔"

پھر وہ چائے لینے چلا گیا۔ میں ایک بار پھر نیلم کا جائزہ لینے لگا۔ گو کہ اس بے ہودہ کاؤنٹر نے اس کے وجود کا بیشتر حصہ اپنے عقب میں چھپا رکھا تھا۔ اس کے باوجود اس کا جائزہ لینا خاصا فرحت انگیز عمل تھا۔ وہ بدستور سر جھکائے کچھ اندراجات کرنے میں مصروف تھی۔

ویٹر چائے لے کر آ گیا۔ اس نے بڑی مستعدی دکھائی تھی۔ کچھ زیادہ ہی جلدی آ گیا تھا۔ وہ برتن میز پر رکھ رہا تھا تو میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا "میرا خیال ہے وارثی صاحب آج شام سے یہیں موجود ہوں گے؟"

"سر! آپ سچی بات سُننا چاہتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ظاہر ہے... ایک شریف آدمی سے انسان سچی بات ہی کی توقع رکھتا ہے۔" میں نے اپنی دانست میں سچ کے سلسلے میں اس کی حوصلہ افزائی کی۔

"تو پھر سچی بات یہ ہے سر... کہ مجھے اس سلسلے میں صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں ہے۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ اور یہ صاف گوئی خاصی حوصلہ شکن تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اور یہ بات آپ کو کوئی بھی ویٹر صحیح طور پر نہیں بتا سکتا کیونکہ ہم لوگ اِدھر اپنے کام میں مصروف رہتے ہیں جبکہ وارثی صاحب وہاں نہ جانے کتنی مرتبہ اپنے آفس سے نکل کر کبھی اوپر' کبھی باہر جاتے اور آتے رہتے ہیں۔ ہماری نظر تو کبھی کبھار ہی ان پر پڑتی ہے اور

ویسے بھی میری تو ڈیوٹی شروع ہوئے ہی صرف ایک گھنٹا ہوا ہے۔ بہرحال جب سے میری ڈیوٹی شروع ہوئی ہے تب سے وہ اپنے آفس میں ہی موجود ہیں۔ اتنا مجھے معلوم ہے۔"

"بھئی تم بہت ہی معقول آدی ہو۔ مجھے تمہاری صاف گوئی' دیانت داری اور شرافت پر خوشی ہے۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا "کیا نام ہے تمہارا؟"

"جی۔۔ شہنشاہ۔" اس نے قدرے شرماتے ہوئے بتایا۔

"اوہ!" میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ میری گہری سانس کا مطلب سمجھ گیا۔ میز کو کپڑے سے بلا ضرورت پونچھتے ہوئے بولا "آپ بھی سوچ رہے ہوں گے نام شہنشاہ۔۔۔ اور کام اس چھوٹے سے ہوٹل میں بیرا گیری!"

"مجھے زندگی میں اکثر نام اور شخصیت کے اس الٹ پھیر سے واسطہ پڑتا ہے۔ بہرحال۔۔۔ اس میں ایسا دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ زندگی اسی کا نام ہے۔"

میرے الفاظ سے شاید اسے کافی حوصلہ ملا اور وہ ذرا خوش دلی سے بولا "کوئی اور چیز لاؤں سر؟ میرے لائق کوئی اور خدمت ہو تو حکم فرمائیے۔"

"بس۔۔۔ تمہارا بہت شکریہ۔ مجھے بس ایک ہی بات معلوم کرنی تھی۔ تم سے وہ بھی معلوم نہیں ہو سکی۔ ... سے تمہیں زیادہ باخبر رہنا چاہئے۔ ویٹر تو چھپا چھپا... ہوتا ہے۔ ٹی وی کا خبرنامہ نہیں۔ اپنے اردگرد کے ماحول کا خبرنامہ۔" میں نے ناصحانہ لہجے میں کہا۔

"بس جی میں اپنے کام سے کام رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ بولا۔

"خبر رکھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ بس کسی کے معاملات میں ٹانگ مت اڑاؤ۔"

"بہت بہتر سر!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "شاید آپ آئندہ آئیں تو مجھے اب سے زیادہ باخبر پائیں۔"

"کوشش تو میری یہی ہوگی کہ مجھے آئندہ یہاں نہ آنا پڑے۔" میں نے چائے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "بہرحال زندگی کا کچھ پتا نہیں ہوتا انسان کو کب کہاں لے جائے۔"

وہ سر ہلاتا ہوا رخصت ہو گیا۔ میں نے بدمزہ سی چائے کے چند چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق سے اُتارے۔ ہال میں افراد کی تعداد بڑھتی جارہی تھی۔ باتوں کی بھنبھناہٹ تیز ہو چکی تھی اور فضا گویا سگریٹوں کے دھوئیں وغیرہ سے لمحہ بہ لمحہ زیادہ بوجھل ہوتی جارہی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ دیر بعد میرے سامنے کی کرسیاں بھی خالی نہیں رہیں گی۔ اپنے معیار کے حساب سے اس ہوٹل کا بزنس کچھ بُرا نہیں تھا۔

نیلم نے اب رجسٹر اور کاغذات وغیرہ کاؤنٹر کے نیچے کہیں رکھ دیئے تھے اور غالباً کسی اونچے اسٹول پر بیٹھ کر ایک بار پھر ریسیور کان سے لگا لیا تھا۔ اب شاید وہ خود کسی کو فون کر رہی تھی۔ ... کرتے وقت اس کی نظر میری میز کی طرف تھی۔

"کیا وہ کسی کو فون پر میرے بارے میں بتا رہی تھی؟" ... سوچا مگر مجھے اپنے آپ سے اس کا کوئی واضح جواب نہ ملا۔ ... بات کرتے ہوئے مسکرا رہی تھی اور اس کی مسکراہٹ ... دلکش تھی۔ میں منتظر تھا کہ شاید ہدایت وارثی بھی اپنے آ... نکل کر کاؤنٹر پر آجائے اور میں اس سے ملنے سے پہلے اسے ... دیکھ سکوں لیکن کئی منٹ کے انتظار کے بعد بھی مجھے کو... چھوٹے سے دروازے سے باہر آتا دکھائی نہیں دیا البتہ ... دوران میں یکے بعد دیگرے دو جوڑے کاؤنٹر پر آن پہنچے۔

نیلم نے ریسیور رکھ دیا اور ایک بار پھر رجسٹر نکال کر ... سامنے کاؤنٹر پر رکھ لیا۔ نہایت مستعدی سے اس نے جوڑوں کے لئے کمرے بک کئے' رقم وصول کرکے کاؤنٹر کے نیچے کہیں ... جوڑے ایک ویٹر کی رہنمائی میں آگے پیچھے سیڑھیوں سے ا... گئے۔ دونوں جوڑوں کے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا اور ان ... بتا رہا تھا کہ وہ میاں بیوی نہیں تھے۔

میں نے سوچا اس سے پہلے کہ "بزنس" مزید زور پکڑے ... نیلم اور ہدایت وارثی سے مل ہی لینا چاہئے۔ میں ماحول مشاہدہ کر چکا تھا' اتنا ہی کافی تھا۔ میں چائے آدھی چھوڑ کر ا... مزید ایک نوٹ رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس وقت نیلم کاؤنٹر ... رکھے اور ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے لابی کے بند دروازے کی ... دیکھ رہی تھی گویا کچھ اور ایسے ہی جوڑوں کی راہ تک رہی ... کے دم سے اس کے گلشن کا کاروبار چل رہا تھا۔ اس کا ... افسانوی قسم کا تھا۔

میں نے اس کے قریب پہنچ کر خاصے غیر افسانوی اند... کھنکار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا حالانکہ میرے خیال میں ... ضرورت نہیں تھی۔ وہ بہت اچھی طرح آگاہ تھی کہ میں ا... طرف آرہا تھا۔ تاہم اس نے بے خبری کی نہایت عمدہ ا... کرتے ہوئے گردن گھمائی اور اس کی لمبی لمبی پلکوں کی جھ... بڑی تیزی سے پھڑپھڑائیں۔

"ارے۔۔۔ افضل صاحب۔۔۔ آپ!" اس کی گویا ا... سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اس کا اظہارِ حیرت ... زبردست تھا۔ اگر مجھے موقع ملتا تو میں محض دو سیکنڈ ک... پرفارمنس پر ہی اس کے لئے پرائڈ آف پرفارمنس کی ... کرتا۔ معلوم نہیں ٹی وی پر وہ کیوں کامیاب اداکارہ نہیں ... تھی جبکہ وہ تو کوئی ایسی پوتر اور پارسا قسم کی چیز بھی نہیں رہی ... پروڈیوسروں نے اس سے جو توقعات رکھی ہوں ان پر پورا ... کے لئے تیار نہ ہوئی ہو۔ بعض اوقات تو شوبزنس کا حساب ... بالکل ہی سمجھ میں نہیں آتا۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میرا یہ اندازہ ... درست نکلا تھا کہ وہ مجھے پہچانتی تھی۔ یہ شاید کچھ ایسی زیادہ عجیب بات نہیں تھی لیکن مجھے پھر بھی عجیب لگتی تھی کہ اس قسم کی عورتیں عموماً شہر کے دولت مندوں اور خاص خاص شخصیتوں کو صورت سے پہچانتی تھیں۔

"اچھا تو تم مجھے پہچانتی ہو؟" میں نے کاؤنٹر کے سہارے کھڑے ہوتے ہوئے بظاہر گپ شپ کے سے انداز میں کہا۔

"جی ہاں اور جب آپ اس دروازے سے داخل ہوئے تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔ میں سمجھی تھی شاید آپ راستہ بھول کر ادھر آنکلے ہیں۔ آپ کو بھلا اس معمولی سے ہوٹل میں آنے کی کیا ضرورت پیش آسکتی تھی؟ پھر میں سمجھی شاید آپ مجھ سے بات کریں گے۔ شاید اتفاق سے آپ کو ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگوں سے کوئی کام آن پڑا ہو۔ لیکن پھر آپ ریستوران کی طرف چلے گئے۔ یہ بھی ظاہر تھا کہ آپ کو اس ہوٹل میں چائے پینے کا شوق تو نہیں ہوگا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ شاید آپ کچھ دیر وہاں بیٹھ کر ماحول کا جائزہ لینا چاہتے تھے۔" گویا اندازے صرف میں ہی نہیں لگا رہا تھا' وہ بھی لگا رہی تھی اور اس معاملے میں مجھ سے کچھ کم نہیں تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس عورت سے بہت محتاط ہو کر گفتگو کرنے کی ضرورت تھی۔

وہ بڑے دل نشیں انداز میں مسکرائی۔ اس کے موتیوں جیسے ہموار دانت جھلملا اُٹھے۔ وہ ذرا چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے میں کچھ زیادہ ہی بول رہی ہوں۔ آپ پریشان ہو گئے ہوں گے۔"

"وہ خاتون ہی کیا جو زیادہ نہ بولے۔ اور پھر تمہیں تو زیادہ بولنے کا اخلاقی حق حاصل ہونا چاہئے۔ تم بولتی ہوئی اچھی لگتی ہو۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ خاموش بیٹھی بھی تم اچھی ہی لگ رہی تھیں۔" میں نے اس کی بڑی بڑی' حیران سی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ یہ حیرانی جھوٹی تھی۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں دھوکا دینے والی آنکھیں تھیں۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ انہوں نے اب تک ہدایت وارثی کو کیوں دھوکا نہیں دیا تھا!

وہ مترنم انداز میں دھیرے سے ہنسی اور کہنی کے سہارے کاؤنٹر پر کچھ اور آگے جھک آئی۔ اس کے بالوں اور وجود سے پھوٹتی ہوئی نہایت مدھم سی خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور میرے حواس میں خفیف سی گدگدی ہوئی۔

"میں نے سُن رکھا ہے کہ آپ خواتین سے بہت لچھے دار گفتگو کرتے ہیں اور وہ بے چاری اس میں اُلجھ کر رہ جاتی ہیں۔" وہ ذرا شوخ سے لہجے میں بولی۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "یہ بڑی مشکل ہے کہ کسی خاتون کی کسی خوبی کا اعتراف کرتے ہوئے سچے دل سے اس کی تعریف کرو تو وہ سمجھتی ہے کہ لچھے دار گفتگو ہو رہی ہے۔ اس پر ڈورے ڈالے جارہے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"خیر۔۔۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے والی نہیں ہوں کہ آپ مجھ ناچیز پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کریں گے۔ میں بڑی حقیقت پسند عورت ہوں۔ بے چاری ہم جیسی عورتوں تک پہنچنے کے لئے آپ جیسے لوگوں کو ڈوروں کی ضرورت کہاں ہوتی ہے۔ ہم تو خود ہی کچے دھاگے سے بندھی چلی آتی ہیں۔" وہ کچھ بے نیازی اور کچھ تلخی سے بولی۔

"اچھا؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں "تم تو اپنے آپ کو کچھ زیادہ ہی ڈی گریڈ کر رہی ہو ورنہ مجھ پر تو تمہارا اتنا رعبِ حسن تھا کہ میں دروازے سے داخل ہونے کے بعد سیدھا تمہاری طرف آنے کی جُرأت نہیں کرسکا تھا۔ میں دراصل اسی لئے پہلے ریستوران کی طرف چلا گیا تھا کہ اپنے اندر جرأت اور ہمت پیدا ہونے کا انتظار کرسکوں۔ لیکن تم پہلی عورت ہو جو اتنی شاندار شخصیت کی مالک ہونے کے باوجود اپنے بارے میں اس قدر انکسار سے کام لے رہی ہے ورنہ میں نے تو بڑی بڑی کم رو خواتین کو بڑی بڑی خوش فہمیوں ہی میں مبتلا پایا ہے۔"

اس کی مسکراہٹ یکدم ہی غائب ہو گئی اور آنکھوں میں پھیلا ہوا خمار سا بھی معدوم ہو گیا۔ وہ یک لخت ہی بالکل سنجیدہ دکھائی دینے لگی۔ وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں سرگوشی کے سے انداز میں بولی "افضل صاحب! اِدھر اُدھر کی باتیں بہت ہو چکیں۔ اصل بات کیجئے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے حقیقتاً ذرا حیرت سے کہا۔ اس کے رویّے میں اس اچانک تغیر سے مجھے واقعی حیرت کا ہلکا سا جھٹکا لگا تھا۔

"مطلب یہ کہ آپ یہاں نہ تو چائے پینے آئے ہیں۔۔۔۔ یہاں دنیا کی کوئی نایاب چائے تو ملتی نہیں۔ نہ ہی آپ مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے آئے ہیں۔ میں بھی کوئی ایسی نایاب عورتوں میں سے نہیں ہوں۔۔۔۔ اور نہ ہی مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی ہے۔ مجھ میں کسی عام۔۔۔ چھوٹے موٹے آدمی کے لئے بہت کشش ہو سکتی ہے' آپ جیسے آدمی کے لئے نہیں۔" وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا پھر میں نے آہ بھر کر کہا "اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ میں بھی ایک عام اور چھوٹا موٹا ہی آدمی ہوں۔ میرے لئے بھی تم بہت اچھی۔۔۔ بہت اونچی۔۔۔ بہت پُرکشش خاتون ہو۔"

اس لحاظ سے وہ واقعی بڑی منفرد عورت تھی کہ میرے تعریفی الفاظ کا اس پر ذرا بھی اثر نہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں جو سرد مہری در آئی تھی وہ اسی طرح برقرار رہی۔ وہ بدستور نیچی اور سرد آواز میں بولی "ویسے۔۔۔ افضل صاحب! آپ کو ویٹر سے میرے بارے میں۔۔۔ یہاں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آپ کو جو کچھ بھی معلوم کرنا تھا آپ دروازے سے

داخل ہوتے ہی سیدھے میرے پاس آکر دریافت کرلیتے۔ میں آپ کو ہر بات کا بہت سیدھا اور سچا جواب دیتی۔ کیونکہ میں بہت سیدھی اور سچی عورت ہوں۔ کوشش کرتی ہوں کہ کبھی بھی منافقت سے کام نہ لوں۔ جیسی ہوں' ویسی ہی دنیا کے سامنے رہوں۔ بالکل کھری اور ملاوٹ سے پاک....."

میری کہنی بے اختیار کاؤنٹر سے پھسل گئی۔ شاید مجھے کسی غیر مرئی چیز نے دھکا دیا تھا۔ ممکن ہے وہ غیر مرئی چیز اس کے الفاظ ہوں۔ میں جب ویٹر سے بات کررہا تھا تو وہ رجسٹر پر سر جھکائے کچھ لکھ رہی تھی اگر وہ ہماری طرف دیکھتی تب بھی میں فرض کرلیتا کہ اس نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ میں اس کے یا ہوٹل وغیرہ کے بارے میں بات کررہا تھا لیکن اس نے تو سر اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔

اس کے باوجود وہ کچھ ایسے اعتماد سے یہ بات کررہی تھی جیسے مجھ سے یا ویٹر سے اس کا ٹیلی پیتھی کے ذریعے ذہنی رابطہ تھا اور اسے بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ ہمارے درمیان کیا گفتگو ہورہی تھی۔ بلاشبہ وہ نظر اُٹھائے بغیر چاروں طرف نظر رکھنے والی عورت تھی۔

میں نے اس جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے مسکرا کر کہا "تم تو اپنے کھری اور ملاوٹ سے پاک ہونے کا ذکر کچھ یوں کررہی ہو جیسے تم عورت نہیں' مکھن بالائی قسم کی کوئی چیز ہو۔"

"مرد تو عورت کو مکھن اور بالائی قسم کی ہی کوئی چیز سمجھتے ہیں نا... جہاں نظر آئے' ہڑپ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہڑپ کرنے میں کامیاب ہوجائیں تو مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے آگے روانہ ہوجاتے ہیں۔" وہ سرد مہری سے بولی۔

"اوہ!" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں "تم بھی یہ مرد اور عورت کی بحث میں الجھنے کی عادی ہو؟ میں تو سمجھا تھا تمہارے اس صنف کے ساتھ تعلقات زندگی بھر سے خوشگوار چلے آرہے ہوں گے۔"

"تعلقات خوشگوار ہونا الگ بات ہے۔ اور کسی کے بارے میں اپنی ایک رائے رکھنا الگ بات۔" وہ بولی "لیکن آپ ان باتوں کو چھوڑیئے۔ آپ اصل بات کے سلسلے میں ابھی تک مجھے ٹالے جارہے ہیں۔"

"تم ایسی چیز کہاں ہو کہ تمہیں کوئی ٹال سکے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "فی الحال تو میں تمہارے مشاہدے پر حیران ہورہا تھا۔ تم نے مجھے ویٹر سے بات کرتے دیکھ لیا تھا؟ میں تو سمجھا تھا تم اپنے کام میں مصروف ہو۔"

"ان دو آنکھوں کے علاوہ عورت کے پاس احساس کی آنکھیں بھی ہوتی ہیں۔" وہ اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"اگر تمہارے پاس احساس کی آنکھیں ہیں تو احساس کی زبان بھی ہونی چاہئے..... لیکن تم تو اس وقت خالصتاً کاروباری زبان میں بات کررہی ہو۔" میں نے ذرا مجروح سے لہجے میں کہا۔

"آپ کاروباری آدمی ہیں نا.... اس لئے۔" آخر اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لوٹ آئی۔

"میں ہر جگہ کاروبار کو ساتھ لئے نہیں پھرتا۔ میں یہاں کوئی کاروباری گفتگو کرنے نہیں آیا تھا۔ اور اگر آیا بھی تھا تو تمہیں دیکھ کر بھول گیا ہوں۔ کاروبار اور کاروباری گفتگو کو گولی مارو۔ یہ بتاؤ کیا تم ہر وقت اسی طرح مصروف رہتی ہو؟ کبھی اپنے اس متوقع خادم کے لئے بھی تھوڑا بہت وقت نکالو۔ کسی غیر کاروباری سی جگہ پر بیٹھ کر کوئی ڈنر.... کوئی لنچ وغیرہ ہونا چاہئے۔"

وہ کچھ اس طرح مسکرائی جیسے وہ کوئی اسکول ٹیچر تھی اور میں اس کی کلاس کا کوئی ایسا بچہ تھا جو اسے نچا دے کر فرار ہونے کی کوشش کررہا تھا۔ پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "افضل صاحب! مجھے دانہ ڈالنے کی یہ کوشش چھوڑ دیں۔ دانہ ڈالنے کے لئے بھی تھوڑی بہت سنجیدگی درکار ہوتی ہے۔ گو کہ وہ ذرا الگ قسم کی سنجیدگی ہوتی ہے۔ مجھے اس پر بھی اعتراض نہ ہوتا لیکن افسوس کی بات تو یہ ہے کہ آپ کے پاس تو وہ سنجیدگی بھی نہیں ہے۔ آپ تو بس یونہی.... جو منہ میں آرہا ہے بولے جارہے ہیں۔ اندھیرے میں تیر چلا رہے ہیں کہ شاید کوئی نشانے پر بیٹھ ہی جائے۔ آپ کی باتیں بڑی خوب صورت ہیں۔ دل نشیں ہیں... حوصلہ بڑھانے والی ہیں۔ آپ انسان کو اس کی قدر وقیمت بڑھ جانے کا احساس دلاتے ہیں... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اب عمر کی اس منزل سے نکل چکی ہوں جہاں اس قسم کی باتوں کا سحر کارگر ہوتا ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ جب میں اس عمر میں تھی تب بھی میں نے زندگی کو اتنے قریب سے دیکھ لیا تھا۔ برت لیا تھا کہ اس قسم کے الفاظ اپنی کشش کھو بیٹھے تھے۔"

"یہ تو بہت بُری بات ہے۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "ایک تو تم جیسی مشکل عورتوں سے مل کر انسان کے تمام خوب صورت جذبات اور احساسات پر جھاڑو پھر جاتی ہے۔ اچھا تمہیں کس قسم کی گفتگو متاثر کرتی ہے؟ مثلاً آج ٹمبکٹو میں ٹماٹروں اور ٹنڈوں کے ریٹ گر گئے اور بنکاک میں سونے کے ریٹ چڑھ گئے۔ واضح رہے کہ یہاں سونے سے مراد وہ والا سونا ہے جس کے لئے بستر کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس قسم کی گفتگو تمہیں پسند ہے؟"

اس نے ہونٹ بھینچ لئے اور مجھے گھورنے لگی لیکن یہ کہنا مشکل تھا کہ اس وقت وہ واقعی جھنجلاہٹ کا شکار تھی۔ اس کے ہونٹ بھرے بھرے تھے اور ان پر گہری سرخ چمکیلی لپ اسٹک تھی۔ اگر ان ہونٹوں میں کچھ بے کیفی آبھی چکی تھی تو وہ اس لپ اسٹک میں چھپ چکی تھی۔ میں نے گویا اس کے گھورنے سے سہم کر معصومانہ سے انداز میں پلکیں جھپکائیں۔

آخر وہ ذرا سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے خاصے تحمل سے بولی "افضل صاحب! پلیز سنجیدگی سے بات کیجئے۔ مجھے یقین ہے آپ

قسم کی شخصیت ہرگز نہیں ہوں گے۔ اپنے اوپر خول
ے سے کیا فائدہ؟"

اچھا چلو۔ اس انداز میں بات کرتے ہیں جسے عام طور پر
نجیدگی کا نام دیتے ہیں۔" میں نے کچھ غمناک سے لہجے میں
بتاؤ تم مجھے جانتی کیسے ہو؟"

"آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں آپ کے ہوٹل
م کرچکی ہوں۔" اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

پہلے تو صرف میری کہنی ہی کاؤنٹر سے پھسلی تھی۔ اس بار تو
تے گرتے بچا۔ میں نے گویا از سرِ نو بڑے غور سے اس کی
یکھا اور کہا "اب تم غیر سنجیدہ ہورہی ہو۔"

"اس میں غیر سنجیدگی کی کیا بات ہے؟"

"تم میرے ہوٹل میں کام کرچکی ہو اور میں تمہیں پہچانتا تک
ہے۔" میں نے گویا انتہائی افسوس سے کہا "میں اتنا بدذوق نہیں
تا۔"

"میرا دورِ ملازمت' بہت مختصر تھا اور مجھے پتا چلا تھا کہ آپ
ونادر ہی کراچی آتے ہیں۔ میرا آپ کا کبھی آمنا سامنا نہیں
ے۔" اس نے جواب دیا۔

"پھر تم مجھے کیسے پہچانتی ہو؟ میں اتنا مشہور آدمی تو نہیں
ے۔" میں نے کہا۔

"آپ کی شہرت گلی کوچوں میں نہیں ہے لیکن اونچے سماجی
نوں میں آپ کچھ ایسے گمنام بھی نہیں ہیں۔" اب اس کے لہجے
ں دوبارہ خوش گواری آچکی تھی "ویسے میں آپ کو اس لئے
پانتی ہوں کہ میں نے آپ کو صرف ایک بار ہوٹل میں دور سے
یکھا تھا۔ دوسرے روز شاید آپ لندن چلے گئے تھے۔ اس کے
لاوہ آپ کو پہچاننے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مجھے کئی بار آپ کے
رسنل نیجر کے آفس میں جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں شاید روایت
کے طور پر دیوار پر آپ کی ایک اچھی سی رنگین' فریم شدہ پورٹریٹ
نویزاں ہے۔"

"اچھا؟" میں نے واقعی حیرت سے کہا۔ میں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا تھا کہ ہوٹل میں کہیں میری تصویر بھی آویزاں تھی۔

وہ گویا اب بھی میرے لہجے میں کچھ بے یقینی محسوس کرتے ہوئے بولی "اگر آپ کو کبھی فرصت میسر ہو تو اپنے پرانے سیلری بلز کی فائل منگوا کر دیکھیے گا۔ اس میں آپ کو میرا نام بھی ملے گا۔ چند ماہ میں نے بھی وہاں تنخواہ وصول کی ہے۔"

"کیا کرتی تھیں تم وہاں؟" میں نے پوچھا۔

"میں کافی بار میں کاؤنٹر پر کھڑی ہوا کرتی تھی۔ کافی بار میں کاؤنٹر پر آکر بیٹھنے والوں کو سرو کیا کرتی تھی اور بس۔" اب وہ پھر ذرا نشیلے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"اوہ!" میں نے افسوس سے کہا "یہ ملازمت تو تمہارے شایانِ شان نہیں تھی۔ یقیناً اسی لئے تم نے چھوڑ دی ہوگی۔ میرے ہوٹل والے بھی اتنے بدذوق نہیں ہوسکتے کہ انہوں نے تمہیں ملازمت سے نکال دیا ہو۔"

"نہیں انہوں نے تو نہیں نکالا تھا۔ میری ملازمت بھی پکی تھی۔ میں کنٹریکٹ پر نہیں تھی اور میری شان بھی کچھ ایسی بلند نہیں تھی کہ میں اس ملازمت کو اپنے شایانِ شان نہ سمجھتی۔ تنخواہ اچھی خاصی تھی۔"

"تو پھر؟"

"بس مجھے ضرورت نہیں رہی تھی۔ اتنی سی بات ہے۔" وہ اطمینان سے بولی "دراصل اس وقت تک میرا دوست ہدایت وارثی جیل سے باہر آگیا تھا اور اس کے ہوتے ہوئے مجھے اپنے طور پر کوئی کام کرنے..... یا ذریعۂ معاش کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے' میں اس میں شریک ہوتی ہوں۔ وہ ایک باکمال آدمی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ اپنے انتہائی زوال کے دور میں بھی مجھے بھوکی نہیں مرنے دے گا۔"

"تم جیسی عورت کو بھلا کون بدبخت بھوکا مرنے دے گا؟ وہ پہلے خود شرم سے مرجائے گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور آفس کے چھوٹے سے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ بدستور کھلا تھا۔ اندر روشنی تھی اور کھٹ پٹ کی نہایت معمولی سی آوازیں بھی آرہی تھیں اور مجھے نیلم سے بات کرتے ہوئے بھی کافی دیر ہوگئی تھی۔ اس سے پہلے میں ریستوران میں بھی کچھ وقت گزار کر آیا تھا لیکن اس تمام عرصے میں' میں نے آفس سے کسی کو باہر آتے.... بلکہ جھانکتے ہوئے بھی نہیں دیکھا تھا۔ ہدایت وارثی یقیناً نیلم پر مکمل انحصار کرتا تھا۔ اسے شاید کبھی باہر آکر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی کہ نیلم کاؤنٹر پر کیا کررہی تھی۔ ویسے نیلم کا کاؤنٹر پر کھڑے ہونا شاید اس کے اپنے کھڑے ہونے سے زیادہ بہتر اور فائدہ مند تھا۔

"پھر وہی دل خوش کرنے والی.... مگر اوپری دل سے کی جانے والی باتیں....!" نیلم ٹھنڈی سانس لے کر بولی "افضل صاحب! میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ آپ کو یہ باتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ مجھے ان باتوں کے بغیر بھی اچھے لگ رہے ہیں۔ آپ کو بھلا مصنوعی باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"بہت شکریہ کہ میں تمہیں اچھا لگ رہا ہوں۔" میں نے نہایت شکر گزارانہ لہجے میں کہا "وقت ضائع کئے بغیر اس قسم کے خیالات کا اظہار کردینے والی خواتین مجھے اور بھی زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ تم نے اگر میرا دل رکھنے کے لئے یہ بات کی ہے تب بھی میں تمہارا شکر گزار ہوں۔"

"چلئے خیر۔ شکریے اور شکر گزاری کو چھوڑیے۔" وہ ایک بار پھر کہنی کاؤنٹر پر رکھ کر جھکتے ہوئے بولی "میں نے آپ کے سوال کا جواب دے دیا۔ اب آپ بھی میرے سوال کا جواب دے دیجئے۔"

"تمہارا سوال کیا تھا؟" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "میں تو سوال ہی بھول گیا۔ زیادہ دیر ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔"

اس نے پھر ایک لمحے کے لئے مجھے گھورا۔ آخر خود پر ضبط کرتے ہوئے بولی "میں نے پوچھا تھا' آپ یہاں کس لئے آئے ہیں؟"

"ارے ہاں..... یہ تو اچھا یاد دلایا۔" میں نے گویا یکدم ہولتے ہوئے کہا "میں تو اتنے ضروری کام سے آیا تھا مگر باتوں میں الجھ کر بھول ہی گیا۔ ایک تو یہ میرے جذبات و احساسات میرے کاموں پر غالب آجاتے ہیں۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ میں ہدایت وارثی سے ملنے آیا ہوں۔"

"کیوں؟" اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

"ارے واہ! کیا تم اس سے ملنے آنے والے ہر شخص سے پہلے اس کا مقصد وغیرہ معلوم کرتی ہو؟"

"ہاں" اس نے بلا تامل جواب دیا "بعض اوقات تو میں ان کا تفصیلی انٹرویو لیتی ہوں۔ خصوصاً ان لوگوں کا جن کے بارے میں بالکل اندازہ نہ ہو پا رہا ہو کہ ان کی آمد کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔"

میں نے یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے اور کاؤنٹر چھوڑ کر سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے کہا "بہت سنجیدہ... بلکہ سنگین معاملہ ہے۔ مجھے اس سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

وہ بہت دیر سے مجھ سے سنجیدہ ہونے کی فرمائش کر رہی تھی لیکن میں سنجیدہ ہوا تو وہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔ اس کی خوب صورت آنکھوں کی تہ میں ہلکا سا خوف جھلک آیا۔ اس کی لپ اسٹک غالباً خراب ہونے والی نہیں تھی تاہم اس نے نہایت احتیاط سے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

پھر وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی "مسٹر افضل پلیز.....! ہمیں کوئی بُری خبر نہ سنائیے گا۔ ہم نے بہت طویل عرصہ اس طرح گزارا ہے کہ ہمارے چاروں طرف بُری خبروں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اب کچھ عرصے سے زندگی میں ذرا سا سکون اور ذرا سی آسودگی آئی ہے۔ میں اب اپنی زندگی میں کوئی ہلچل پیدا ہونے سے بہت ڈرتی ہوں۔ ٹھیک ہے' مجھے اعتراف ہے ہم اب بھی کوئی زیادہ باعزت روزی نہیں کما رہے ... لیکن اس دنیا میں... اس ملک میں... اور اس شہر میں... لوگ اس سے بھی کہیں زیادہ بڑے بڑے گھناؤنے اور ہولناک کام کر رہے ہیں اور کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتا۔ پلیز ہمیں بھی سر جھکا کر اپنی اس چھوٹی سی دنیا میں... اس شہرِ بے کراں کے ایک کونے کھدرے میں پڑا رہنے دیجئے گا۔"

میک اپ کی ہلکی سی تہ میں اس کی رنگت کچھ پھیکی پڑ گئی تھی۔ اس کے شعور یا لاشعور میں نہ جانے کتنے خوف رچے ہوئے تھے جنہوں نے اسے یکدم سہما دیا تھا۔ اس لمحے وہ مجھے کچھ اور اچھی لگی۔ اس کے الفاظ میں سچائی کی خوشبو تھی اور اس کا اندازِ گفتگو بھی متاثر کن تھا۔

میں نے اس کے لئے اپنے دل میں تاسف کی ایک خفیف لہر محسوس کرتے ہوئے کہا "کوشش تو میری یہی ہوتی ہے کہ کسی کے لئے کوئی بدخبری لے کر نہ جاؤں..... لیکن واقعات بہرحال جس طرح رونما ہو چکے ہوتے ہیں اسی طرح رہتے ہیں۔ انہیں بدلا نہیں جا سکتا۔ ہم وقت کے پہیے کو اُلٹا نہیں گھما سکتے۔ بہرحال اس وقت ویسے بھی بات تمہاری نہیں... ہدایت وارثی کی ہو رہی ہے۔"

"میری زندگی بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اسے چھینک آتی ہے تو وہ میری زندگی پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔" وہ بیٹھی سی آواز میں بولی۔

اس کے لہجے میں ایک ناقابلِ بیان سا خلوص... ناقابلِ تشریح سا درد تھا جو میرے دل میں کہیں ایک پھانس بن گیا۔ ہدایت وارثی ایک خوش نصیب آدمی تھا۔ اسے ایک عورت کی رفاقت میسر تھی۔ یہ دلداری' یہ وفاداری تو بعض... میں بھی نہیں پائی جاتی۔ وہ تو اپنے آپ کو ہدایت وارثی کی دوست کہہ رہی تھی۔ جسے ایسے دوست میسر ہوں اسے دنیا... غم ہو سکتا ہے؟

"بہرحال میرا اس وقت ہدایت وارثی سے ملنا بہت ضروری ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور کونے میں بنے ہوئے آفس کے چھوٹے سے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس دروازے تک پہنچنے کے لئے کاؤنٹر کے عقب میں جانا ضروری تھا اور کاؤنٹر کے پیچھے جانے کے لئے ایک الگ دروازہ موجود تھا لیکن مجھے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

ہدایت وارثی کو گویا کسی غیبی قوت نے مطلع کر دیا تھا کہ اس کا ذکر ہو رہا تھا اور کوئی اس سے ملنے آیا تھا۔ وہ آفس کے دروازے پر اچانک ہی نمودار ہوا۔ یہ محض میرا اندازہ تھا کہ وہ ہدایت ہی ہو سکتا تھا۔ شاید میں نے کبھی کہیں اس کی تصویریں دیکھی ہوں لیکن وہ میرے ذہن میں نہیں تھیں کیونکہ اس وقت شاید میں نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ زندگی میں کبھی مجھے اس سے واسطہ پڑے گا۔ حقیقی زندگی میں آج میں پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ غیر معمولی شخصیت کا مالک ہوگا۔ آخر نیلم جیسی جہاندیدہ عورت اس سے اس طرح متاثر تھی کہ زندگی کی ڈور اس کے ساتھ باندھے ہوئے تھی۔ میرے خیال میں ایک ایسے شخص میں کوئی خاص بات ہونی چاہئے تھی لیکن کم از کم پہلی نظر میں تو مجھے ہدایت وارثی میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ پھر میں نے سوچا شاید اس میں کوئی ایسی خوبی ہو جو مجھے نہیں' صرف نیلم کو ہی نظر آ سکتی ہو۔ ویسے بھی صاحب.....! عورت کا کیا بھروسا..... کس کی کس ادا پر مرمٹے..... کون کیا کہہ سکتا ہے!

وہ چھریرے جسم کا ایک میانہ قامت شخص تھا۔ اس... سے زیادہ بال سفید تھے تاہم چہرے سے وہ اتنی عمر کا نہیں ... اور اس نے بالوں کو رنگنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ جوانی ... کسی حد تک خوش شکل رہا ہوگا لیکن بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ... شکل میں نہ جانے کیا شکست و ریخت ہوتی ہے کہ اچھا ... خوش شکل آدمی بھی عام سا دکھائی دینے لگتا ہے۔ جوانی ... جوانی ہے اور بعض لوگوں کی تو ساری خوب صورتی ہی ان ... ہوتی ہے۔

... کا سوٹ یقیناً کئی سال پرانا تھا۔ اس کے باوجود اس کی ... میں خوش لباسی کا تاثر نمایاں تھا۔ اس کی آنکھیں بھوری ... ہونٹ نہایت پتلے پتلے تھے۔ یہ ہونٹ ہلکی سی سفاکی اور ... پن کا سراغ دیتے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ چہرے مہرے ... خطرناک آدمی نہیں لگتا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبی ... شخصیت اور حرکات و سکنات سے جھلکتی ہوئی خود اعتمادی ... اس کے ماضی کو دیکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا تھا کہ یہ اس کے ... کا زمانہ تھا لیکن اس کا چہرہ اب بھی ایک فاتح بادشاہ کا سا چہرہ ... سے دیکھ کر کوئی شبہ تک نہیں کر سکتا تھا کہ وہ ایک زوال زدہ ... تھا۔

... اس نے ایک لمحے کے لئے دروازے پر ہی رک کر میرا جائزہ ... اس کی بھوری آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی لہر اُبھری اور ... ہو گئی۔ نیلم اس کی طرف دیکھ کر بڑی دلکشی سے مسکرائی اور ... عجیب شاہانہ سی تمکنت کے ساتھ کاؤنٹر کی طرف بڑھا۔ وہ ... شانہ بہ شانہ آن کھڑا ہوا۔ نیلم قد میں اس کے تقریباً برابر ...

نیلم نے مسکراتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا "یہ مسٹر افضل ... ہیں۔ کبھی ان سے ملاقات کا اتفاق ہوا ہے؟"

"نہیں مجھے یہ شرف حاصل نہیں ہوا لیکن میں انہیں پہچانتا ...۔" وہ نپے تلے سے انداز میں مسکرایا۔ ہونٹوں کے عقب سے ... کے دانتوں کی جھلک نظر آئی۔ اس عمر میں بھی اس کے دانت ... سفید اور چمکیلے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے ہونٹ ... وقت بہت ہی کم حرکت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس کا لہجہ ... نہایت نپا تلا تھا۔ اس نے مجھے پہچاننے کا اعتراف ضرور کیا تھا ... کسی خاص گرمجوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ تاہم اس نے ... ملنے کے لئے ہاتھ ضرور بڑھا دیا۔

"مجھے اس پر حیرت بھی ہے اور خوشی بھی..... کہ آپ مجھے ... جانتے ہیں۔" میں نے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا ... سرد اور نرم و نازک سا تھا۔ اگر اسے جیل میں مشقت کرنا ... ہوگی تو یقیناً بے چارے کا بُرا حال ہوا ہوگا۔

نیلم نے گویا ترجمانی کے فرائض انجام دیتے ہوئے کہا "مسٹر ... تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں ہدایت!"

"ضرور..... ضرور" ہدایت نے کسی تشویش کے بغیر کہا "لیکن پہلے میں ذرا ریستوران اور کچن کا ایک چکر لگا آؤں۔ تب تک تم افضل صاحب کو بٹھاؤ..... ان کی خاطر تواضع کرو۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ایک بڑا آدمی ہمارے اس بھٹیار خانے میں آیا ہے۔"

پھر اس نے نہایت رسمی سے معذرت خواہانہ انداز میں میری طرف دیکھا "ہم ایک نئے سرے سے بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں افضل صاحب! ہمیں چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اگر میں مقررہ اوقات میں ریسٹورنٹ اور کچن کا چکر نہ لگاؤں تو ملازم لوگ کوئی نہ کوئی گڑبڑ کر دیتے ہیں۔ ہمارا ہوٹل آپ کے ہوٹل کے معیار کا تو ہے نہیں جہاں سارا نظام خود بخود چلتا رہتا ہے۔"

"لگتا ہے آپ مجھے خاصی اچھی طرح جانتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ دعویٰ تو میں نہیں کر سکتا۔" وہ محتاط لہجے میں بولا "بہرحال..... میں ہوٹل انڈسٹری کا آدمی ہوں۔ اگر میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے مالک کو نہیں پہچانوں گا تو یہ میری نالائقی ہوگی۔"

پھر وہ کاؤنٹر کے عقب سے نکلتے ہوئے بولا "میں ابھی آیا۔ آپ نیلم کے پاس بیٹھئے اور اگر کسی چیز کی طلب ہو تو بلا تکلف اسے بتا دیجئے۔"

نیلم نے اسے مطلع کیا "افضل صاحب ادائیگی کر کے اور ویٹر کو خاصی بھاری ٹپ دے کر ہمارے ہوٹل کی غریبانہ چائے پی چکے ہیں۔"

"اوہ یہ تو انہوں نے ہمارے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے۔ خیر میں آ کر ان سے بات کرتا ہوں۔" وہ جاتے جاتے بولا۔

اب میں ایک بار پھر نیلم کے ساتھ اکیلا تھا۔ اس نے مجھے کاؤنٹر کے عقب میں ہی بُلا لیا تھا۔ اس جیسی ٹھیک ٹھاک خاتون کو چھوڑ کر ہدایت وارثی کے پیچھے پیچھے کچن میں جانا ایک بے ہودہ حرکت ہوتی۔

وہاں ایک اور اونچا اسٹول موجود تھا۔ نیلم اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "فی الحال میں آپ کو بیٹھنے کے لئے یہی پیش کر سکتی ہوں۔ میں آپ کے ساتھ آفس میں چل کر بیٹھتی لیکن اس وقت میں کاؤنٹر نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ بزنس کا وقت ہے۔"

"کیسا بُرا زمانہ آ گیا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اسٹول پر ٹکتے ہوئے کہا "خوب صورت عورتیں بھی کیسی بزنس مائنڈڈ ہو گئی ہیں۔ قربِ قیامت کی نشانیاں ہیں۔"

وہ مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر گردن موڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "افضل صاحب! لگتا ہے آپ صرف مجھے ایک خوب صورت عورت ثابت کرنے کے لئے یہاں آئے ہیں۔ لیکن میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے والی نہیں ہوں۔ نہ تو میں کوئی غیر معمولی عورت ہوں اور نہ ہی آپ یہاں مجھے یہ بتانے کے لئے آئے ہیں۔ آپ اصل بات شروع کیوں نہیں کر لیتے؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گویا بڑے افسوس سے کہا "اگر تم ایسی

ہی غیر افسانوی اور غیر رومانوی قسم کی عورت ہو تو میں دوسری قسم کی باتیں کرلیتا ہوں۔ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ آج شام پانچ بجے سے لے کر ساڑھے سات بجے کے دوران میں تم کہاں تھیں؟ مجھے خود احساس ہے کہ یہ ایک نہایت بے ہودہ سوال ہے۔ تم جیسی کسی بھی عورت سے یہ نہیں پوچھنا چاہئے کہ وہ کس وقت کہاں تھی لیکن کیا کروں... مجبوری ہے۔ تم خود مجھے موضوع تبدیل کرنے پر مجبور کررہی ہو۔"

اس نے گہری نظر سے میری طرف دیکھا "کیا آپ سنجیدگی سے پوچھ رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے۔ اس قسم کے سوال میں بھلا مذاق کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے؟"

"لیکن کیوں پوچھ رہے ہیں؟" اس کے لہجے میں حقیقتاً تھوڑا سا تعجب تھا۔

"بس... یونہی۔" میں نے کندھے اچکائے۔

"سورہی تھی۔" اس نے گویا بادلِ ناخواستہ جواب دیا۔

پوچھنا تو میں کچھ اور چاہ رہا تھا لیکن میں نے اپنے بے ساختہ سوال کو ہونٹوں کی باڑھ لگا کر روک لیا اور ایک لمحے کے توقف سے پوچھا "کتنے بجے اُٹھی تھیں؟"

"سات بجے۔" اس نے جواب دیا "میں روزانہ سہ پہر کو آرام کے لئے لیٹتی ہوں اور تقریباً سات بجے اٹھ کر تیار ہو کر یہاں کاؤنٹر پر آکر کھڑی ہوتی ہوں۔"

"اس سے پہلے یہاں کون کھڑا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہدایت۔" اس نے جواب دیا "اگر اسے کسی ضروری کام سے جانا ہو تو ہیڈ ویٹر یا اکاؤنٹنٹ وغیرہ کاؤنٹر سنبھال لیتے ہیں۔"

"آج ساڑھے چار سے ساڑھے سات بجے تک ہدایت کاؤنٹر پر موجود تھا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ آپ ہدایت سے ہی پوچھئے گا۔ میں اس کے حصے کے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔" اس نے قدرے بیزاری سے کہا "ویسے بائی داوے یہ سوالات کس سلسلے میں ہیں؟"

"سلسلہ بھی جلد تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ نے کیا پولیس یا سی آئی اے وغیرہ میں پارٹ ٹائم ملازمت کرلی ہے؟" اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ابھی مجھ پر اتنا بُرا وقت نہیں آیا۔" میں نے کہا۔

اچانک دروازہ کھلا اور پکی عمر کا ایک مرد بریف کیس اٹھائے لابی میں داخل ہوا۔ اس کے سراپا سے کچھ خوش حالی عیاں تھی۔ اس کے پیچھے اوسط شکل و صورت کی ایک لڑکی تھی لیکن ایک لحاظ سے وہ خوب صورت تھی۔ یعنی عمر کے لحاظ سے... جوانی کی اپنی جو ایک خوب صورتی ہوتی ہے وہ اس کے ہم قدم تھی۔ اس کی عمر بہ مشکل بائیس چوبیس سال ہوگی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ مرد پُراعتماد انداز میں کاؤنٹر [illegible] ہوا۔ وہ گرگ باراں دیدہ معلوم ہوتا تھا۔ نیلم کو دیکھ کر [illegible] لمحے کے لئے اپنی ساتھی کو بھول گیا اور خیالوں ہی خیالوں [illegible] کہیں دور نکل گیا۔

نیلم نے کھنکار کر اسے واپس آنے پر مجبور کیا اور [illegible] لہجے میں بولی "جی فرمایئے؟"

"کمرا چاہئے... ڈبل بیڈ۔" وہ سنبھل کر بولا۔ [illegible] سگریٹوں کا پیکٹ اور خوب صورت لائٹر اس نے گاڑی [illegible] سمیت کاؤنٹر پر رکھ دیا۔

"جی... ضرور۔" نیلم نے رجسٹر کھول لیا اور خالص [illegible] لہجے میں بولی "نام...؟"

"مسٹر اینڈ مسز صمدانی۔" مرد فراٹے سے بولا جبکہ [illegible] اس کے پیچھے چھپنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے دوپٹے کا [illegible] انگلی پر لپیٹ اور کھول رہی تھی۔

"کہاں سے تشریف لائے ہیں؟" نیلم نے رجسٹر [illegible] کرتے ہوئے پوچھا۔

"حیدر آباد سے۔" صمدانی... یا جو بھی اس کا نام تھا بولا۔

"آمد کا مقصد؟" نیلم نے سر اُٹھائے بغیر پوچھا۔

"شاپنگ۔"

"اندازاً قیام کب تک رہے گا؟"

"صبح تک۔"

"دستخط کردیجئے۔" نیلم نے رجسٹر اس کے سامنے [illegible] قلم اسے تھمادیا۔ اس نے بے پروائی سے ایک کالم [illegible] سیدھے دستخط گھسیٹ دیے۔ نیلم نے ایک ویٹر کو بلا کر [illegible] وہ دونوں اس کے پیچھے چل دیے۔ نیلم نے ایک دن [illegible] کرایہ وصول کیا تھا وہ بھی قابلِ غور تھا۔

وہ سیڑھیوں پر نظر سے اوجھل ہوچکے تو میں نے [illegible] ہوئے نیلم کی طرف دیکھا۔ اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق [illegible] نے ستائشی انداز میں سہلاتے ہوئے کہا "بہت خوب! [illegible] ہاں کرائے فائیو اسٹار ہوٹل سے کچھ ہی کم ہیں۔ کمپنی تو [illegible] میں جارہی ہوگی؟"

"خاک منافع میں جارہی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی "جو [illegible] مہیا کرتے ہیں ان کی وجہ سے نہ جانے کتنے لوگوں کو خوش [illegible] ہے۔ نہ جانے کہاں کہاں کتنا کچھ جاتا ہے۔ اس کے باوجود [illegible] کوئی نہ کوئی یہاں آکر آنکھیں نکالتا رہتا ہے۔ غراتا رہتا [illegible] دھمکیاں دیتا رہتا ہے۔"

یہ سب کچھ کرکے بھی لوگ اگر خاص فائدے میں تھے تو پھر نہ جانے کیوں کرتے تھے؟ یہ بھی شاید ایک عجیب چکر تھا جس میں پھنسنے والا کبھی نکل نہیں پاتا تھا۔ بات و[illegible]

رہتی تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے کبھی یہاں ایسے جوڑے بھی آتے ہیں جو سچ مچ میاں بیوی ہوں؟"

"کیوں نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "اب ہم اتنے بھی بدنام نہیں ہیں۔ صحیح جوڑے بھی اچھی خاصی تعداد میں آتے ہیں بلکہ میں آپ کو ایک مزے کی بات بتاؤں۔ ایک میاں بیوی تو یہاں قریب سے ہی کبھی کبھار آکر ٹھہرا کرتے تھے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"بے چاروں کو گھر میں کبھی تخلیہ ہی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ تین کمروں کا تنگ و تاریک فلیٹ تھا اور اٹھارہ افراد تھے۔ جوائنٹ فیملی تھی۔ بے چارے میاں بیوی کے پاس جب کچھ پیسے فالتو ہوتے تھے تو شفنہ اپنے رشتے داروں کے پاس جانے کا بہانہ کرکے یہاں آٹھہرتے تھے۔" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"ہائے رے انسان کی مجبوریاں!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب نہیں آتے؟"

"نہیں۔ شکر ہے بے چاروں کے حالات کچھ بہتر ہوئے اور اب انہوں نے کہیں الگ فلیٹ لے لیا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ انہوں نے مجھے اور ہدایت کو سب کچھ سچ سچ بتا رکھا تھا۔" اچانک وہ ریستوران کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "لیجئے ہدایت آگیا۔"

ہدایت محرابی دروازے سے گزر کر ہماری طرف آرہا تھا۔ وہ کاؤنٹر کے پیچھے پہنچ کر اپنے مخصوص نپے تلے لہجے میں بولا "میں معذرت چاہتا ہوں افضل صاحب! آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔" بات کرتے وقت اس کے ہونٹ تو کم ہلتے ہی تھے لیکن اس کے الفاظ میں جذبات بھی کم ہی ہوتے تھے۔ وہ جو کچھ کہتا تھا وہ تاثر سے خالی خالی سا لگتا تھا۔ جیسے اس وقت وہ معذرت کررہا تھا لیکن اس کے لہجے میں حقیقتاً کوئی معذرت نہیں تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے دنیا میں لوگوں کی بہت کم پروا تھی لیکن شاید نیلم کی بہت پروا ہو۔ تبھی تو وہ اس وارفتگی کے ساتھ اس سے وابستہ تھی۔

"آیئے... آفس میں چل کر بات کرتے ہیں۔" اس نے چھوٹے سے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

نیلم اس سے مخاطب ہوئی "میں تمہیں خبردار کردوں... افضل صاحب اس وقت اپنی باتوں سے کوئی اچھے خاصے پولیس افسر... سی آئی ڈی والے... یا کچھ سراغرساں قسم کی چیز معلوم ہورہے ہیں۔ لگتا ہے یہ کوئی خاص ہی مقصد ذہن میں لے کر یہاں آئے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ دیکھا جائے گا۔" ہدایت مصنوعی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ میں اسٹول سے اتر کر آیا لیکن ہدایت کے ساتھ اس کے دفتر میں جانے کی نوبت نہیں آئی کیونکہ اسی لمحے اوپر سے کسی عورت کی گھٹی گھٹی سی چیخیں سنائی دینے لگی تھیں۔ ہم دونوں اپنی جگہ ساکت ہوگئے اور کان لگا کر سننے لگے۔

پھر ایک ویٹر دھڑ دھڑ کرتا سیڑھیاں اُتر کر آیا اور کاؤنٹر کے قریب پہنچ کر ہانپتے ہوئے بولا "سر...! وہ... روم نمبر ٹوون تھری والا بہت ہنگامہ کررہا ہے۔ کہیں لڑکی کو مار نہ دے۔"

ہدایت کے صاف ستھرے شریفانہ چہرے پر یکدم کچھ کرختگی سی آگئی۔ آنکھوں میں سرد مہری یک بیک بہت بڑھ گئی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا تو اس کی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی "افضل صاحب! آپ بیٹھیں، میں ابھی آتا ہوں۔"

"میں بھی آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے کہا اور اس کے پیچھے لپکا۔

ہم تیزی سے دوسری منزل پر پہنچے ہی تھے کہ سامنے سے راہداری میں ایک لڑکی دوڑتی ہوئی آتی دکھائی دی۔ وہ خاصی شرمناک حالت میں تھی لیکن میرے لئے اس سے بھی زیادہ شرمناک بات یہ تھی کہ میں اسے پہچانتا تھا اور میں نے کبھی اسے اس حالت میں دیکھنے کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں شاید کبھی سوچ بھی نہ پاتا کہ میرا اس سے سامنا اس قسم کے کسی ہوٹل میں... اس حال میں ہوگا۔

وہ عذرا تھی! ایک چھوٹی موٹی سی اسکول ٹیچر... جو میرے پاس التجا لے کر آئی تھی کہ میں اس کی بہن مونا کو تلاش کردوں... اور پھر اس چکر میں مجھے پیر دانش سے واسطہ پڑا تھا۔

اس کے پیچھے لمبا تڑنگا اور گہری سانولی رنگت کا ایک بے ہودہ سا شخص' بے ہودہ ہی سے حلیے میں گرتا پڑتا دوڑا چلا آرہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی ایک ٹوٹی ہوئی بوتل تھی جس کے نوکیلے کنارے کئی خنجروں کی طرح نکلے ہوئے تھے۔ وہ محض ٹوٹی ہوئی بوتل نہیں' ایک خوف ناک ہتھیار تھا۔

اچانک عذرا شاید راہداری کے پرانے اور گھسے پٹے قالین میں الجھ کر گری۔ لمبا تڑنگا' سانولا شخص اس کے سر پہ آن پہنچا۔ وہ یقیناً نشے میں دھت تھا۔ اس نے بوتل والا ہاتھ بلند کیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس خوف ناک ہتھیار کو استعمال کر گزرے گا۔

"خبردار..." ہدایت وارثی چیخا "رک جاؤ... ورنہ شوٹ کردوں گا۔"

میں نے دیکھا' اچانک ہی اس کے ہاتھ میں ایک پستول نظر آنے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اب سرد مہری کی جگہ شدید غصہ اور سفاکی تھی۔ وہ اب ایک قطعی مختلف ہدایت وارثی نظر آرہا تھا۔ یہ میرے لئے گویا ایک دوسری حیرت تھی۔

میری نظر اس کے ہاتھ میں موجود پستول پر جم کر رہ گئی تھی اور میری آنکھوں میں مرزا اکرم بیگ کے دفتر کا منظر بھی ابھر آیا تھا۔ میں چشم تصور سے جج صاحب کی لاش دیکھ رہا تھا جس کی آنکھ سے ذرا اوپر گولی کا سوراخ تھا......!

ہدایت وارثی کا پستول پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اسے استعمال کرنے کا بھی اہل تھا۔ بلکہ شاید وہ اس میں اچھا خاصا ماہر تھا لیکن اس وقت مسئلہ یہ رہا کہ وہ گولی چلانے میں ایک لمحے کے لئے ہچکچا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ یہ ہوٹل کا معاملہ تھا۔

ویسے تو کسی بھی ہوٹل میں گولی چلنا اس کے بزنس کے معاملے میں تباہ کن ہوتا ہے لیکن ہدایت وارثی اپنے ہوٹل کی جو ریپوٹیشن بنانے کی کوشش کر رہا تھا اس کے لئے تو کوئی ہنگامہ فساد ہوتا اور بھی زیادہ خطرناک تھا۔ اس بے چارے نے اس ڈگر پر کاروبار چلا کر چار پیسے کمانے کے لئے اپنی بچی کچی انا اور غیرت وغیرہ کو بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ اس کے باوجود اگر اس بزنس کو کوئی زیادہ بڑا جھٹکا لگ جاتا تو یہ اس بے چارے کے لئے بہت ہی بڑا صدمہ ہوتا۔

بس شاید یہی سوچ اس کے لئے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کا باعث بن گئی اور اس وقت ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کی گنجائش نہیں تھی کیونکہ اس لمبے تڑنگے' مضبوط اور سانولے سے شخص نے پستول کی پروا نہیں کی تھی۔ شاید نشے نے اس کے حواس کو کچھ زیادہ ہی دھندلایا ہوا تھا اور غالباً اسے اپنے لمبے تڑنگے وجود پر بھی کچھ گھمنڈ تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس لمحے وہ محسوس کر رہا ہو کہ گولی بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔

اس معاملے کو درحقیقت بے آواز طریقے سے... یعنی خالصتاً

صرف ہاتھ پیروں سے نمٹانے کی ضرورت تھی اور یہ ہدایت وارثی کے بس کی بات نہیں تھی۔ سانولے شخص نے ٹوٹی ہوئی بوتل جس کے کنارے خنجر کی نوکوں کی طرح نظر آرہے تھے' عذرا کے جسم میں گھونپنے کے لئے بلند کرلی تھی۔ اگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاتا تو اس کا نتیجہ ہدایت وارثی کے حق میں اس کے گولی چلانے سے بھی زیادہ برا ہوتا لیکن شاید ہدایت فوری طور پر اس کے بارے میں سوچ نہیں سکا تھا۔

مجھے اس کی ہچکچاہٹ کا اندازہ ہوگیا تھا اور وہ فیصلے کا لمحہ تھا۔ میری ٹانگ تیزی سے بلندی تک گھومی اور میری ٹھوکر اس شخص کی کنپٹی پر پڑی۔ وہ دور جا گرا اور دیوار سے ٹکرایا۔ اس کے گرنے اور دیوار سے ٹکرانے کی آواز کسی موٹے سے شہتیر کے گرنے کی آواز سے کم نہیں تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ ہدایت وارثی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا تھا۔ شاید اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ میری ٹانگ ہی تھی جسے اس نے اس تیزی سے گھومتے اور لمبے تڑنگے سانولے شخص کے سر تک بلند ہوتے دیکھا تھا۔ تاہم مجھے اس کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ میری نظر سانولے شخص پر تھی۔

جس طرح میری ٹھوکر اس کی کنپٹی پر پڑی تھی اور جس طرح گرتے وقت اس کا سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس کے بعد اسے بے ہوش ہوجانا چاہئے تھا اور وہ ایک لمحے کے لئے گر کر ساکت بھی ہوگیا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ بے ہوش ہوگیا تھا لیکن وہ بدبخت جھرجھری سی لے کر اٹھ بیٹھا۔

تاہم وہ کھڑا نہیں ہوسکا۔ کم از کم دو ٹانگوں پر تو نہیں کھڑا ہوسکا۔ البتہ کروٹ لے کر چوپائے کی طرح چاروں ہاتھ پیروں پر کھڑا ہوگیا۔ اس کی نظر شاید دھندلا گئی تھی۔ اس نے سر کو ادھر ادھر جھٹکا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فرش پر کچھ تلاش کرنے لگا۔

میں سمجھ گیا' وہ چند اپنا ہتھیار یعنی وہی ٹوٹی ہوئی بوتل تلاش کر رہا تھا۔ وہ اپنی ضد کا بہت پکا معلوم ہوتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے عذرا کے جسم میں بوتل گھونپنے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ یہ خواہش اس کے ذہن کے کسی خانے میں اٹک کر رہ گئی تھی۔

اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ بوتل بھی دیوار سے ٹکرا کر اور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر مزید ٹکڑوں میں تقسیم ہوچکی تھی۔ اب وہ ہاتھ میں پکڑنے اور ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔

عذرا جلدی سے اٹھ کر مجھ سے آن چمٹی تھی۔ اس نے میری آڑ لے لی تھی۔ وہ بلی کے کسی بھیگے ہوئے بچے کی طرح تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اس صورت حال میں بھی اس کا وجود مجھے خوب صورتی' گداز اور حرارت کا احساس دلائے بغیر نہیں رہ سکا۔

وہ نہایت معمولی سی شکل صورت کی لڑکی تھی۔ چہرے سے استخوانی ساخت کی نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر صرف اس کے ہونٹ قابل ذکر [illegible] نہایت خوب صورت ہونٹ اس کے چہرے پر یوں الگ سے نظر آتے تھے جیسے کسی حسین عورت سے مستعار لے رکھے ہوں تاہم میں پہلے بھی محسوس کرچکا تھا کہ وہ کچھ ایسی ڈھانچا قسم کی چیز بھی نہیں تھی جیسی نظر آتی تھی۔ وہ نشیب و فراز سے کچھ ایسی محروم بھی نہیں تھی۔ اس کی جسمانی ساخت میں ایک الگ ہی قسم کی اسمارٹ نس اور خوب صورتی تھی۔

اس وقت اس کا حلیہ بھی ایسا تھا کہ میری اس رائے کی نہایت آسانی اور عمدگی سے تصدیق کی جاسکتی تھی لیکن میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ اس وقت اس کے وجود کی خوب صورتی' گداز' حرارت یا وہ خود مجھے بالکل اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

وہ بے شک ایک عام سی اور معمولی سی لڑکی تھی لیکن مجھ سے اس کی جو چند ملاقاتیں رہی تھیں' ان کے دوران میرے ذہن میں اس کا بہت اچھا اور پاکیزہ سا امیج بن گیا تھا۔ میری نظر میں وہ بہرحال ایک اچھی' نیک دل اور شریف لڑکی تھی۔ صرف یہی نہیں ... وہ ایک نہایت مقدس پیشے سے بھی وابستہ تھی۔ اور پھر میرے پاس سے رخصت ہوتے وقت اس نے جس جذباتیت' مگر خوب صورتی کے ساتھ مجھے خدا حافظ کہا تھا وہ لمحہ ابھی تک میرے ذہن پر نقش تھا۔

اس لڑکی کے لئے میرے ذہن میں ایک بے عنوان سی اُنسیت اور بہت سی عزت تھی۔ میں نے اسے اس قسم کے ہوٹل میں' اس قسم کے آدمی کے ساتھ' اس حال میں دیکھنے کا شاید کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے خاصا دھچکا لگا تھا۔

تاہم ابھی اپنے صدمے کے اظہار کا موقع نہیں تھا۔ میری نظر اس سانولے اور پختہ العمر شخص پر تھی جو اس کے ساتھ دادِ عیش دینے آیا تھا لیکن شاید اس دوران ظرف سے کچھ زیادہ ہی پی گیا تھا اور اس کی کند کھوپڑی الٹ گئی تھی۔ میں نے احتیاطاً اس کی پسلیوں میں بھی ایک ٹھوکر رسید کردینا بہتر سمجھا۔

اکثر کوڑھ مغز بڑی سخت کھوپڑی کے مالک ہوتے ہیں۔ شاید وہ بھی کوئی کوڑھ مغز ہی تھا یا پھر ویسے ہی اس کی کھوپڑی غیر معمولی طور پر مضبوط تھی۔ کھوپڑی پر وہ میری ٹھوکر اور دیوار سے ٹکر بھی برداشت کرگیا تھا۔ نشے میں یہ دونوں چوٹیں کھانے کے باوجود بے ہوش نہیں ہوا تھا لیکن پسلیوں پر اس کے مقابلے میں خاصی ہلکی ٹھوکر کھاتے ہی وہ خرگوش کی طرح اچھلا اور "غڑل" کی سی آواز کے ساتھ قے کرکے چت ہوگیا۔ اب وہ ساکت تھا۔ اس کی آنکھیں بند ہوچکی تھیں۔

مجھے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کراہیت محسوس ہوئی۔ میں نے منہ پھیر لیا۔ یہ سب کچھ بہت تیزی سے ہوا تھا۔ ہدایت وارثی

کو مجھ سے اس قسم کی کارروائی کی یقیناً توقع نہیں تھی مگر وہ اپنی حیرت کے جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔

ایک ویٹر وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ دوسرا ہمارے ساتھ آیا تھا۔ اس نے ان دونوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے بازوؤں سے پکڑ کر اس شخص کو اٹھایا۔ ہدایت نے پستول جیب میں رکھ کر جلدی سے آگے بڑھ کر خود اس کی ٹانگیں پکڑیں۔ ان تینوں کو بھی اسے ڈنڈا ڈولی کرکے اٹھانے میں دقت پیش آرہی تھی۔ وہ ٹھوس بدن کا لمبا تڑنگا آدمی تھا اور ویسے بھی مردہ یا بے ہوش آدمی کا وزن زیادہ محسوس ہوتا ہے۔

تاہم میں نے ان کا ہاتھ بٹانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ میں نے جتنا کردیا تھا فی الحال اتنا ہی کافی تھا۔ میں نے ہدایت وارثی کو فی الحال سنگین مسئلے سے تو بچالیا تھا۔ اب اپنا کوڑا کرکٹ انہیں خود بھی اٹھانا چاہئے تھا۔ دشواری کے باوجود انہوں نے خاصی پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس سے پہلے کہ راہداری میں دوسرے کمروں کے دروازے کھلتے' وہ تینوں اسے اٹھا کر جلدی سے اس کے کمرے میں لے گئے جس کا دروازہ کھلا تھا۔

دوسرے لوگوں نے شاید دروازے تھوڑے بہت کھول کر جھری وغیرہ سے یہ منظر دیکھ بھی لیا ہو لیکن دبکے رہنے میں ہی عافیت سمجھی ہو یا پھر شاید وہ لوگ اس پوزیشن میں ہی نہ ہوں کہ جلد دروازہ کھول کر دیکھ سکتے ہوں۔ بہرحال اس فلور پر تماشا نہیں لگنے پایا اور ہدایت وارثی ویٹروں کی مدد سے اس شخص کو اٹھا کر اس کے کمرے میں لے جاکر بیڈ پر لٹانے... بلکہ یوں کہئے کہ پھینکنے میں کامیاب ہوگیا۔

میں بھی کمرے میں جا پہنچا تھا اور میرے ساتھ تقریباً چپکی ہوئی عذرا بھی آگئی تھی۔ دروازہ میں نے اپنے عقب میں بند کردیا۔ وہ بہت چھوٹا سا کمرا تھا کہ ہم سب کے آگھسنے سے گویا وہاں تل دھرنے کو جگہ نہیں رہی تھی۔

عذرا کو شاید اب اپنے حلئے کا احساس ہوا۔ اس نے ایک بڑی سی چادر اٹھا کر اپنے گرد لپیٹ لی۔ ایک ساتھ گویا خوب صورتیوں کے کئی آفتاب غروب ہوگئے۔ وہ خوف کے غلبے سے ابھی تک نہیں نکلی تھی لیکن یہی غنیمت تھا کہ اتنی جلدی اسے اپنے حلئے کی موزونیت کا احساس ہوگیا تھا۔

اس وقت اس کی بڑے بڑے سے شیشوں والی عینک اس کے چہرے پر نہیں تھی جس کی وجہ سے اس کی شخصیت میں کچھ کمی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ بے پروا سی لگ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں خوف کے سائے لئے وہ میری طرف دیکھ کر لرزاں سی آواز میں بولی "آپ اس وقت میرے لئے گویا رحمت کا فرشتہ بن کر پہنچے افضل صاحب۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔"

میں غیر ارادی طور پر استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا "مجھے تو ابھی انسان بننے کی فرصت نہیں مل سکی۔ تم مجھے فرشتہ بنانے پر تلی ہوئی ہو۔"

"یہ تو آپ کا انکسار ہے افضل صاحب۔" وہ دھیرے دھیرے سنبھل رہی تھی۔ صورتِ حال قابو میں آجانے کے احساس سے یقیناً اسے اطمینان ہوا تھا "یہ تو مجھے ہی معلوم ہے کہ آپ کتنے اعلیٰ درجے کے انسان ہیں۔ آپ کے انکسار پر تو میں پہلے بھی بہت زیادہ حیرت زدہ ہوچکی ہوں۔"

"اور میں تمہاری "ترقی" پر حیرت زدہ ہوں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ غیر ارادی طور پر ہی میرے لہجے میں زہر گھل گیا تھا ورنہ عام طور پر میں کسی کی نجی زندگی میں دخل اندازی نہیں کرتا تھا اور نہ ہی لفظوں میں اس کے بارے میں کسی رائے کا اظہار کرتا تھا۔

وہ گویا میرا مطلب تو نہیں سمجھ سکی لیکن اسے میرے لہجے کی تلخی کا اندازہ یقیناً ہوگیا تھا۔ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی "آپ کا لہجہ بدلا بدلا لگ رہا ہے افضل صاحب! آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ مجھ سے خفا ہیں؟" اس نے تقریباً ہانپتے ہوئے ایک ساتھ کئی سوال کر دیئے۔

"جب انسان اتنا بدل جائیں تو کیا بے چارے لہجے کو تھوڑا سا بھی بدلنے کا حق حاصل نہیں؟" میں نے اسی لہجے میں کہا۔

"میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔" اس نے معصوم بننے کی بڑی کامیاب اداکاری کی لیکن مجھے یہ معصومیت بھی ڈھٹائی لگی۔

میں اپنی ناگواری پر اب بھی قابو نہ پاسکا۔ میں نے طنزیہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "قصور تمہارا بھی زیادہ نہیں۔ زندگی خاصی ہوچکی ہے۔ زندگی کی مسلسل بے کیفی تمہارے لئے ناقابلِ برداشت ہوگئی ہوگی۔ اور پھر تدریس کا پیشہ بھی تو خاصا بے رنگ ہے۔ شاید تمہیں اپنے اردگرد کوئی رنگینی نظر نہیں آتی ہوگی۔ انتظار کرتے کرتے تمہارے اعصاب جواب دے گئے ہوں۔ پھر بھی... میرا خیال ہے تمہیں اتنا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ خواہشات کی تسکین کا کوئی اور راستہ ڈھونڈنا چاہئے تھا جس میں تھوڑی سی تو رازداری ہوتی۔ شرافت کا تھوڑا بہت تو بھرم رہ جاتا۔ اب بھی کیا رسوائی کہ انسان اتنے پاکیزہ اور بلند مقام سے اتر کر گٹر میں ہی جاگرے۔"

اس کی آنکھوں کے کنارے پہلے ہی سرخ اور متورم سے تھے لیکن میں نے یہ نہیں سوچا تھا کہ شاید وہ رو رہی ہو بلکہ مجھے گمان گزرا تھا کہ شاید مرد کے شغلِ مے نوشی میں وہ بھی تھوڑی بہت شریک رہی ہو کم از کم اس حد تک... کہ جو اس پر اثر انداز نہ ہونے پائے کیونکہ وہ پوری طرح ہوش و حواس میں نظر آرہی تھی لیکن شاید ان کا کسی بات پر جھگڑا ہوگیا تھا۔ شرابی ویسے بھی اپنے ظرف سے زیادہ پی لیتے ہیں تو لڑنے مرنے کا بہانہ ڈھونڈتے خصوصاً جب ان کے سامنے کوئی کمزور مخلوق ہو تب تو کچھ زیادہ ہی آپے سے باہر ہوتے ہیں۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ گلوگیر سی آواز میں بولی "میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھی افضل صاحب۔ لیکن مجھے اتنا اندازہ ضرور ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہیں اور میں آپ کی خفگی برداشت نہیں کرسکتی۔ میں آپ سے خفگی کی وجہ نہیں پوچھوں گی البتہ اتنا ضرور کہوں گی کہ مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالیے... پلیز اپنی نفرت کی اذیت پہنچانے سے بہتر ہے کہ آپ مجھے گولی مار دیں۔"

وہ واقعی اپنی پستی سے بے خبر نظر آرہی تھی۔ شاید اس کے حواس ابھی ٹھکانے نہیں تھے یا پھر اس نے پستی کو اس حد تک ذہنی طور پر قبول کرلیا تھا کہ یہ اس کے لئے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس کے استخوانی سے چہرے پر واقعی ایک بے خبر انسان کی سی سادگی تھی۔

مجھے مزید غصہ بھی آیا۔ میں نے صحیح طور پر دل کا بخار نکال لینا ہی بہتر سمجھا۔ میں نے زہریلے مگر ملائم لہجے میں کہا "تمہیں یکدم اتنا نہیں گرنا چاہئے تھا عذرا...!" مجھے حیرت ہوئی کہ میرے لہجے میں میری دلی اذیت جھلک آئی "کہاں وہ گھریلو سی سادہ دل سی لڑکی جس کا چہرہ سفید دوپٹے کے حلقے میں گھرا ہوا تھا اور جس کے خدوخال پر شرافت کی چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور جو بچوں کو تعلیم دینے جیسے معزز پیشے سے وابستہ تھی۔" میں نے ایک گہری سانس لی "اور کہاں اس بدنام ہوٹل میں عریاں سی حالت میں بھاگتی ہوئی یہ لڑکی جس کے تعاقب میں ایک بدمست شرابی دوڑا آرہا ہو' کیسی بلندی... کیسی پستی!"

ہدایت وارثی قریب ہی کھڑا تھا اور میں نے اس کے سامنے ہی اس کے ہوٹل کو بدنام کہا تھا تاہم اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمودار نہیں ہوئے۔ وہ یقیناً ایک حقیقت پسند آدمی تھا۔

عذرا کے چہرے پر البتہ زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کے ہونٹوں کی پھڑپھڑاہٹ بتارہی تھی کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتی تھی لیکن نہ جانے کس طرح وہ خود پر قابو رکھتے ہوئے رندھی ہوئی سی آواز میں بولی "اب میں سمجھی ہوں کہ آپ میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہیں۔ لیکن بدنصیب ہر بات کچھ تاخیر سے ہی سمجھتی ہوں۔ مجھے امید نہیں تھی کہ آپ میرے بارے میں ایسا بھی سوچ سکتے ہیں۔ آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں اب بھی تدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہوں۔ یہ ہوٹل بدنام ہے یا نیک نام.... اس کا مجھے قطعاً علم نہیں کیونکہ میں اس سمندر نما شہر میں اب بھی اجنبی ہی ہوں۔ میں آپ کے اس خیال سے متفق ہوں کہ میں گٹر میں گر گئی ہوں لیکن اس گٹر میں مجھے میری ماں نے دھکا دیا ہے۔ مجھے تو میرا شوہر جہاں لایا میں چلی آئی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہم یہاں ہنی مون منانے آئے ہوئے ہیں۔ شاید میرے شوہر کے خیال میں ہنی مون اسی طرح منایا جاتا ہے۔"

اس کی آواز بالکل ہی رندھ گئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا۔ وہ اپنی سسکیوں کو روکنے کی کوشش کررہی تھی اور اس کوشش میں اس کے جسم کو جھٹکے سے لگ رہے تھے۔

"کیا؟" میرے حلق سے سرسراتی سی آواز نکلی "یہ تمہارا شوہر ہے؟" میں نے بے یقینی سے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو بیڈ پر آنکھیں بند کئے چت پڑا تھا۔ اس کا منہ تھوڑا سا کھلا تھا اور وہ دھیرے دھیرے خرخرا رہا تھا۔

"جی ہاں۔" اس نے مضمحل سے انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

"کب ہوئی تمہاری شادی!" میں نے پوچھا۔ یہ سوال یونہی غیر ارادی طور پر کیا تھا۔ درحقیقت میں سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے انکشاف پر میں صرف حیران ہی نہیں' سخت شرمندہ بھی ہوا تھا۔ میرے ذہن میں غم و غصے کے جھکڑ تھم گئے تھے اور کچھ زیادہ ہی گہرا سناٹا پھیل گیا تھا۔

"دو ماہ ہوئے۔" اس نے جواب دیا "ہم بڑی تاخیر سے ہنی مون پر روانہ ہوئے۔ کاش نہ ہی روانہ ہوئے ہوتے۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ یہ میرے لئے ہنی مون نہیں' اذیت کا ایک سفرِ مسلسل ہوگا۔"

"تم نے مجھے یا امبر کو اس شادی کی اطلاع نہیں دی۔" میں نے یونہی اس جھٹکے سے مزید سنبھلنے کے لئے کہا۔ درحقیقت میرے لہجے میں شکوہ نہیں تھا۔

اس کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی تب میں نے دیکھا اس کے صاف ستھرے سے چہرے پر ایک آدھ نیل اور خراش کے مٹتے ہوئے سے نشان موجود تھے۔

"اوّل تو مجھے اس کی مہلت ہی نہیں ملی۔" اس نے جواب دیا "اس شادی کی بات چیت تو کافی دنوں چلتی رہی لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو پارہا تھا۔ پھر جب فیصلہ ہوا تو بالکل اچانک ہی ہوگیا۔ مجھ جیسی لڑکی کی شادی کی ظاہر ہے آپ کے لئے کیا اہمیت ہوسکتی تھی؟ اس لئے سچی بات ہے میرا آپ کو تو مطلع کرنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ اچانک سارا پروگرام بن جانے کی وجہ سے امبر کو بھی مطلع نہیں کرسکی اور بعد میں اطلاع دینے کی ہمت اس لئے نہیں پڑی کہ شادی کے ساتھ ہی ایک مسلسل شرمندگی کا دور شروع ہوگیا۔ یہ شوہر نہیں' ذلت و شرمندگی کا ایک چلتا پھرتا اشتہار ہے۔ جس کے ساتھ مجھے نتھی کردیا گیا ہے۔ میں کس منہ سے کس کو بتاؤں کہ میری شادی ہوگئی ہے۔ میں آپ کی اور امبر کی نظروں سے اوجھل رہ کر ہی سسک سسک کر اپنی زندگی پوری کرکے خاموشی سے مرجاتی تو اچھا تھا مگر مجھے اس حال میں آپ کے سامنے آنا تھا۔ اس ذلت کا بھی سامنا کرنا تھا۔ آپ نے مجھے اس عفریت کے ہاتھوں مر ہی جانے دیا ہوتا تو اچھا تھا۔"

وہ ایک بار پھر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔ اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی دھیرے دھیرے چادر کھسکتی جارہی تھی۔ میں نے معذرت خواہانہ انداز میں اسے ایک بازو کے حلقے میں لے کر اپنے قریب کرلیا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کا سر تھپتھپایا اور چادر کو صحیح طور پر اس کے جسم پر لپیٹا۔

اچانک اس کے شوہر نے ہلکی سی کراہ کے ساتھ آنکھیں کھولیں اور الٹے ہاتھ سے اپنا منہ پونچھتے ہوئے کینہ بھری نظروں سے عذرا کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "یہ کیا تیرا پرانا عاشق ہے جس کے سینے سے لگ کر دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہے اور شوہر کو گالیاں دے رہی ہے؟"

مجھے ایک اور خفیف سا جھٹکا لگا۔ وہ بدبخت بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ شاید صرف تھوڑی دیر کے لئے اس کے حواس کمزور ہوئے تھے۔ شاید اس نے ہماری ساری گفتگو سن لی تھی۔

عذرا اس لمحے کمال جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میری ایسی قسمت کہاں کہ افضل صاحب جیسے لوگ میرے عاشق ہوتے۔ میری قسمت میں تو تم جیسا زمانے بھر کا گند لکھا ہوا تھا۔"

وہ اپنے کانپتے ہاتھ سے سر سہلاتے ہوئے ایک گندی سی گالی دے کر بولا "شکر کر تجھے مجھ جیسا جواں مرد مل گیا ورنہ تجھے تو کسی خارش زدہ کتے نے بھی آکر نہیں سونگھنا تھا۔ تیری جوانی کو بیٹھے بیٹھے دیمک لگ جاتی۔"

اس نے ایک بار پھر کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھا "لیکن یہ ضرور کسی وجہ سے تیرا عاشق ہے۔ تبھی اس کی صورت دیکھتے ہی تجھ میں اتنی جرأت آگئی ہے ورنہ تو میری صورت دیکھ کر تھر تھر کانپتی تھی۔"

میں نے عذرا کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تمہارا یہ ہانگڑو سا شوہر واقعی خاصا سخت جان ہے۔ میرا خیال ہے اس کے لئے ہلکا ڈوز کافی نہیں رہا اگر تم اجازت دو تو میں اسے ذرا تگڑا سا ڈوز دے دوں؟"

"رہنے دیں خواہ مخواہ مر جائے گا۔" عذرا بے اختیار میرا ہاتھ تھام کر مجھے روکتے ہوئے بولی "میں نہیں چاہتی آپ اس کے گندے خون میں اپنے ہاتھ رنگیں۔"

اس کے شوہر نے گویا ان الفاظ پر جلال میں آکر اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے ذرا گھورا تو وہ دوبارہ لیٹ گیا اور کراہتے ہوئے بولا "حرام زادی! اس وقت میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تجھے جتنا چہکنا ہے چہک لے لیکن رہنا تو تجھے میرے ساتھ ہی ہے نا۔ میں تجھ سے حساب لوں گا ان ساری باتوں کا۔ یہاں نہ سہی گھر جا کر لوں گا۔ تو سمجھ رہی ہے اپنے یہ کرتوت مجھے دکھا کر بھی بچ جائے گی۔"

"میں تمہارے ساتھ گھر جاؤں گی تب حساب لوگے نا۔" عذرا غصے سے بولی "میں اب جان دے دوں گی مگر اس گھر میں نہیں جاؤں گی جو تمہاری وجہ سے میرے لئے جہنم بنا ہوا ہے۔"

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جب کوئی انسان کی جان لینے کی کوشش کرتا ہے تو انسان جان بچانے کے لئے بھاگتا ہے۔ جس طرح چند لمحے پہلے عذرا بھاگ رہی تھی۔ لیکن اکثر جذباتی لمحوں میں وہ جان دینے کی بات کرتا ہے۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا "تمہیں شادی کے لئے یہی جانگلوس ملا تھا؟"

عذرا تلخ لہجے میں بولی "یہ سوال آپ میری والدہ سے کیجئے۔"

"اوہ۔ اس شادی میں تمہاری پسند شامل نہیں تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہر لڑکی کی طرح مجھے بھی شادی کا ارمان ضرور تھا۔ لیکن میں شادی کے لئے اس طرح مری نہیں جارہی تھی کہ اس وحشی درندے کے پلے بندھ جاتی۔" اس کے زرد چہرے پر اس وقت سرخی کی جھلک تھی پھر وہ عجیب سے لہجے میں بولی "افضل صاحب! لڑکیوں کی عمر ذرا زیادہ ہوجاتی ہے تو ماں باپ انہیں بوجھ کیوں سمجھنے لگتے ہیں؟ جیسا تیسا بھی لڑکا نظر آتا ہے اٹھا کر اس کے پلے باندھ دیتے ہیں۔"

"معلوم نہیں۔" میں نے ذرا گڑبڑا کر کہا "میں ان والدین کے محسوسات سے زیادہ واقف نہیں ہوں جن کی لڑکیوں کی عمر زیادہ ہوجاتی ہے لیکن میرا خیال ہے عمر زیادہ ہو یا کم لڑکیاں بہرحال والدین کی بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہیں اور ذمے داریاں بہرحال بوجھ ہی کی طرح ہوتی ہیں۔ یہ ایک سماجی پرابلم تو ہے لیکن مجھے یقین ہے کوئی ماں اپنی اولاد کا برا نہیں چاہتی۔ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق تو وہ اچھا ہی فیصلہ کرتی ہے۔ اب اس کی عقل ہی محدود ہو یا مقدر ہی خراب ہو تو کوئی کیا کرسکتا ہے۔ ایک بات شاید یہ بھی ہے کہ شادی کے وقت انسان کچھ اور نظر آرہا ہوتا ہے' دھیرے دھیرے کھلتا ہے تو کچھ اور ہی ہوجاتا ہے۔"

عذرا یکدم دھیمی پڑتے ہوئے' بدلے بدلے سے لہجے میں بولی "ہاں شاید یہی بات ہے۔ یہ شخص اور اس کی ایک نام نہاد عزیزہ جب رشتے کے لئے چکر لگا رہے تھے تو ہمیں شبہ تک نہیں تھا کہ یہ ایسا شرابی۔ عیاش اور اجڈ ہوگا۔ اس وقت تو یہ اتنا شریف' مہذب اور نرم خو نظر آتا تھا۔ عاجزی اور انکسار اس میں اس قدر تھا کہ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ امی کے قدموں میں لوٹنے لگے۔ شادی کے بعد تو اس کے اندر سے گویا ایک نیا ہی عبدالقدیر نکل آیا۔"

عذرا کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ گلوگیر آواز میں' رحم طلب سے انداز میں بولی "افضل صاحب! یہ مجھے بہت مارتا ہے۔ نشے میں تو اسے بالکل ہی اپنا ہوش نہیں رہتا۔ بازاری عورتوں کے چکر میں بھی رہتا ہے۔ اس کے اپنے تمام انداز و اطوار بھی بازاری ہی ہیں۔ میرا تعلق بے شک نچلے متوسط طبقے سے تھا افضل صاحب! لیکن میں بہرحال ایک نفیس اور شائستہ لڑکی تھی۔ میں نے ایسی زندگی کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ شادی کے بعد زندگی اس طرح گزرے گی تو میں کبھی شادی کے لئے ہامی نہ بھرتی۔ میں نے نباہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ اس کی ہر برائی کو برداشت کیا ہے لیکن اب میری قوتِ برداشت جواب دے گئی ہے۔ آپ میرا اس شخص سے پیچھا چھڑا دیجئے۔"

"اس کا پرابلم کیا ہے؟" میں نے اس شخص کی طرف دیکھا جس کا نام عذرا نے عبدالقدیر بتایا تھا۔

"میرا خیال ہے جس وقت یہ لوگ رشتے کے لئے امی کے پیچھے لگے' انہیں اس وقت ہی سن گن مل گئی تھی کہ چالیس پچاس لاکھ کی جائیداد امی کے نام ہونے والی ہے۔"

"غالباً یہ اسی جائیداد کا ذکر ہے جو تمہارے رشتے کے ایک چچا نے تمہاری بہن مونا کے نام کی تھی مگر وہ اس کی مالک بننے سے پہلے ہی قتل ہوگئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے آنسو پیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا "اب وہ جائیداد بڑی بھاگ دوڑ کے بعد امی کے نام ہوچکی ہے لیکن جن دنوں یہ لوگ میرا رشتہ لے کر آئے ان دنوں یہ کام ہونے کی امید نظر نہیں آرہی تھی تاہم ان لوگوں کو سن گن شاید مل گئی تھی۔"

"اور اب؟" میں نے پوچھا۔

"پتا نہیں یہ میری خوش قسمتی تھی یا بدقسمتی کہ شادی کے کچھ ہی دنوں بعد وہ جائیداد امی کے نام ہوگئی۔" وہ سسکی سی لے کر بولی "تب سے میری جان زیادہ عذاب میں ہے نہ جانے کس بے تابی سے اس بات کا انتظار ہو رہا تھا۔ اب وہی جائیداد فساد کی جڑ ہے۔ جھگڑا کسی بھی بات سے شروع ہو تان اسی بات پر ٹوٹتی ہے کہ آخر میں اپنی ماں سے وہ جائیداد اپنے نام کیوں منتقل نہیں کرالیتی جبکہ میں اب ان کی واحد اولاد ہوں اور وہ ہر وقت بیمار رہتی ہیں۔"

میں نے کمرے کی نیچی سی چھت کی طرف دیکھ کر بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لی۔ وہی جائیداد کے جھگڑے... وہی پیسے کی ہوس۔ وہی مال و زر کی کھینچا تانی۔ ہر سطح پر لوگوں نے اسی ہوس میں اپنی اور دوسروں کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ جھگڑا خواہ کوئی بھی تھا۔ اس کی نوعیت خواہ کچھ بھی تھی۔ اس کی تہ میں صرف اور صرف روپیا تھا۔

اچانک نیلم نے آہستگی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور متجسس سے انداز میں اندر جھانکا۔ سب کا جائزہ لینے کے بعد وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میرا خیال ہے اب یہاں امن و امان قائم ہوچکا ہے۔ میں اندر آسکتی ہوں؟"

"ہاں۔ امن و امان تو قائم ہوچکا ہے لیکن بڑا جذباتی سین چل رہا ہے۔" میں نے جواب دیا "ہاؤس بھی فل ہے لیکن بہرحال تم آجاؤ۔"

وہ اندر آگئی اور ہدایت وارثی کے قریب کھڑی ہوگئی جو اب بے چینی سے اپنا وزن کبھی ایک پاؤں پر اور کبھی دوسرے پاؤں پر منتقل کر رہا تھا۔ نیلم شاید صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ معلوم نہیں اس کی کچھ سمجھ میں آیا یا نہیں۔ میں کچھ اندازہ نہیں لگا سکا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے ہدایت کی طرف دیکھا لیکن وہ اس کی طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ وہ پُرتشویش اور ناپسندیدگی سے عبدالقدیر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے ہاتھ بڑھا کر عبدالقدیر کے لمبے لمبے اور چکنائی زدہ سے بال اس طرح مٹھی میں جکڑے کہ وہ چیخ اٹھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ میں نے اس کی گردن کو ایک سفاکانہ سا جھٹکا دیا اور اس پر جھکتے ہوئے دھیمے مگر فیصلہ کن سے لہجے میں کہا "کان کھول کر سن لو گدھے! اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو آئندہ اس لڑکی کو خوش رکھنا۔ اسے خوش رکھو گے تو رفتہ رفتہ جائیداد بھی مل جائے گی۔ حلوے کو ٹھنڈا کرکے کھاتے ہیں۔ جلدبازی کرو گے گرم گرم کھاؤ گے تو منہ جل جائے گا۔ بلکہ تمہارے معاملے میں تو منہ ہمیشہ کے لئے بند بھی ہوسکتا ہے۔"

عذرا جلدی سے بولی "اگر یہ ایک نارمل انسان ہوتا۔ شریفوں کی سی زندگی بسر کر رہا ہوتا ہوتا مگر آج اس سے امید ہوتی کہ اس

جائداد کو اگر یہ بڑھا نہیں سکے گا تو کم از کم برباد بھی نہیں کرے گا۔ تو میں ضرور اپنے نام کرالیتی اور پھر اس کے اختیار میں بھی دے دیتی۔ جو اس کا اصل مقصد ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے یہ تو چار دن میں اسے برابر کردے گا۔ میں پھر خالی ہاتھ کی خالی ہاتھ ہوں گی اور یہ مجھے لات مار کر گھر سے نکال باہر کرے گا۔ یا پھر اس کے برے دنوں میں جب کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی ایک ذرا سا نہیں دیکھے گا اس وقت میری حیثیت اس کے ظلم و ستم سہنے اور ہر وقت اس کی خدمت کرنے والی زر خرید لونڈی کی سی ہوگی۔ اس لئے میں ہامی نہیں بھرتی۔"

"یہ تو خیر تم اچھا کرتی ہو۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا اور عبدالقدیر کو ایک اور جھٹکا دیا۔ وہ ایک بار پھر چیخ اٹھا۔ ویسے بھی وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔

"سن رہے ہو نا تم؟" میں نے اس پر کچھ اور جھک کر کہا "یہ جو کچھ بھی کہہ رہی ہے یہ سب کچھ نہیں ہونا چاہئے۔ اس لڑکی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہئے۔ اگر آئندہ مجھے کسی بھی ذریعے سے پتا چلا کہ تم نے اسے کوئی تکلیف پہنچائی تھی تو پھر خواہ تم بھاگ کر دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جانا..... موت سے نہیں بچ سکو گے۔"

اس کی خونخواری ہوا ہو چکی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر رو دینے والے انداز میں بولا "خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ آئندہ عذرا کو مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔"

مجھے اس کے اتنی جلدی سیدھا ہونے کی امید نہیں تھی لیکن اس قسم کے لوگوں کی جان پر بنتی ہے تو وہ ہر قسم کا وعدہ کرلیتے ہیں مجھے یقین تو نہیں تھا کہ وہ اپنے وعدے پر قائم رہے گا لیکن فی الحال اسے موقع دینے کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔ فی الحال میں اسے زیادہ سخت سبق بھی نہیں دے سکتا تھا۔

میں نے اسے مزید جھٹکا دیے بغیر ذرا نرمی سے کہا "جو کچھ تم تشدد..... ظلم..... دھونس دھمکی' بلیک میلنگ..... درندگی اور خباثت سے حاصل کرنا چاہتے ہو اسے محبت' شرافت' نرمی' درگزر اور خلوص سے حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ تم فائدے میں رہو گے اور سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی انہی خصوصیات پر قائم رہنا۔ پھر اس سے بھی زیادہ فائدے میں رہو گے۔ یہ میں وعظ نہیں کررہا ہوں۔ میں ایک کاروباری آدمی ہوں۔ تمہیں کاروباری مشورے دے رہا ہوں۔ وہ بڑے احمق ہوتے ہیں جو تم جیسے طریقوں سے کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ میرے مشورے پر عمل کرکے ضرور دیکھنا۔"

میں نے اس کے بال چھوڑ دیے اور اسی لمحے پٹ سے اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔ میں نے اسے ہلایا جلایا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ چکا تھا۔

"کیا یہ مرگیا؟" عذرا نے فوراً پوچھا۔ اس کے لہجے میں امید بھی تھی اور خوف بھی۔ امید شاید اس بات کی تھی کہ جس مصیبت میں وہ پھنس گئی تھی اس سے اس کا چھٹکارا ہونے والا تھا لیکن تمام تر برے حالات کے باوجود شاید شوہر کی رفاقت سے محروم ہوجانے کا تصور ہر عورت کے لئے ایک بے عنوان خوف اور بیکراں احساس زیاں کا باعث بھی ہوتا ہے۔ عذرا کے لہجے میں بھی وہی خوف تھا۔

"اطمینان رکھو۔ یہ مرا نہیں ہے۔ صرف بے ہوش ہوا ہے۔" میں نے اسے تسلی دی "تمہارے شوہر کی کھوپڑی میں ضرور کوئی مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ جب میں نے اس کی کھوپڑی پر ٹھوکر رسید کی اور اس کا سر دیوار سے بھی ٹکرایا تب تو یہ بے ہوش نہیں ہوا۔ اب صرف بال زور سے کھینچنے اور تھوڑا سا جھٹکا دینے پر بے ہوش ہوگیا۔"

"اس کا موٹا دماغ چوٹ کا سگنل دیر میں ریسیو کرتا ہوگا۔" ہدایت وارثی نے کافی دیر بعد زبان کھولی۔

میں نے عذرا سے کہا "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم تمہارے اس بے ہودہ شوہر کے لئے ڈاکٹر کا انتظام کردیں گے۔ اس وقت میں ایک زیادہ اہم مسئلے میں پھنسا ہوا ہوں۔ اس کے ساتھ مزید مغز ماری کا متحمل نہیں ہوسکتا لیکن تم بہرحال اپنا گھر کا ایڈریس..... اور اگر کوئی فون نمبر ہو تو وہ بھی مجھے دے دو۔ میں تم سے رابطہ رکھوں گا اور اسے آئندہ سیدھا رکھنے کا بندوبست کروں گا۔ مشکل وقت میں بھی اگر اتنی مہلت میسر ہو کہ تم کسی طرح مجھ سے رابطہ کرسکو تو ضرور کرلینا۔ میں خواہ تم سے بہت دور ہوا تب بھی کسی نہ کسی طرح تمہاری مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔"

پھر میں نے ہدایت وارثی اور نیلم سے کہا "جب تک یہ دونوں یہاں ہیں تب تک آپ لوگ بھی ان کا خیال رکھنے کی کوشش کیجئے گا۔ یہ آپ کا مجھ پر احسان ہوگا۔"

ان دونوں نے ہی پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے محض دھیرے سے سر ہلانے پر اکتفا کیا۔ عذرا نے ایک کاغذ پر ایک ایڈریس اور فون نمبر کانپتے ہاتھ سے گھسیٹ کر میری طرف بڑھایا۔ ایڈریس سکھر ہی کا تھا۔

وہ مرتعش آواز میں بولی "افضل صاحب! میں شاید زندگی میں کبھی آپ کا شکریہ بھی ادا کرنے کے قابل نہ ہوسکوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم صرف حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجاؤ۔ میرے لئے یہی خوشی کافی ہوگی۔" میں نے کہا "تم اب آرام سے بیٹھ جاؤ۔ نیلم تمہارے لئے چائے وغیرہ کا اور اس کے لئے ڈاکٹر کا بندوبست کردیں گی۔" میں نے نیلم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تب تک لباس تبدیل کرلوں۔" وہ جھرجھری سی لے کر قدرے شرمندگی آمیز انداز میں وارڈروب کی طرف بڑھتے ہوئے

ہم لوگ باہر آگئے۔ ہدایت وارثی نے گویا اطمینان کی گہری ں لی۔ میں نے نیلم سے کہا "ان لوگوں کے لئے آپ کو جو بھی ل خرچ کرنا پڑے۔ کوئی بھی آؤٹ آف دی وے کام کرنا ل اس کا بل میرے ذمے ہوگا۔ مجھے بھجوا دیجئے گا۔"

نیلم دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی "افضل صاحب! آپ سامنے ہم بے شک چھوٹے لوگ ہیں لیکن اتنے چھوٹے بھی ں ہیں کہ آپ سے یہ چھوٹے چھوٹے حساب کرنے لگیں۔ آپ روست ہماری بھی دوست ہے۔"

"یہ میری کچھ ایسی دوست بھی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"تو پھر کیا ہے؟" اس کی مسکراہٹ میں شرارت سی جھلک ہے۔

"معلوم نہیں۔" میں نے حقیقتاً بے بسی سے کندھے کائے۔ وہ دھیرے سے ہنس دی۔

ہدایت وارثی سنجیدگی سے بولا "افضل صاحب! آپ نے ورتِ حال کو جتنے اچھے طریقے سے قابو میں کیا' اس کے لئے میں پ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ اگر وہ بدبخت نشے میں اس ظالمانہ ریقے سے اس لڑکی کو مار دیتا۔ یا شدید زخمی کردیتا یا لڑکی کو بچانے ں کوشش میں' میں اس گدھے پر گولی چلا دیتا تو میرے لئے بڑی بتیں کھڑی ہوجاتیں۔ بڑی مشکل سے میں نے کچھ سنبھلنا شروع یا ہے شاید میرے حالات پھر خراب ہوجاتے۔"

"یہ مسئلہ تو فی الحال ٹل گیا۔" میں نے سیڑھیاں اترتے وئے کہا "لیکن وہ مسئلہ بیچ میں ہی رہ گیا جس کے لئے میں دراصل ہاں آیا تھا۔ انسان کی زندگی کبھی کبھی الف لیلہ کی طرح داستان ر داستان ہوجاتی ہے۔"

"کبھی کبھی نہیں بلکہ انسان کی زندگی مسلسل ہی ایک داستان ر داستان ہے۔" ہدایت نے گویا تصحیح کی۔

"شاید" میں نے مبہم لہجے میں کہا۔ اس دوران ہم نیچے پہنچ چکے تھے۔

"وہ دوسری داستان کیا ہے؟" اس نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پھر جیسے اسے خود ہی خیال آیا کہ ہم لابی میں کھڑے تھے۔ جلدی سے بولا "آیئے آرام سے آفس میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔" پھر وہ نیلم سے مخاطب ہوا "ابھی کاؤنٹر تم ہی سنبھالو۔ افضل صاحب کا چہرہ بتا رہا ہے کہ معاملہ کچھ سنجیدہ ہی ہے۔"

نیلم مسکراتے ہوئے بولی "ایک بڑا آدمی کسی غیر سنجیدہ مسئلے کے سلسلے میں تو بہ نفس نفیس چل کر ہمارے ہاں نہیں آسکتا تھا۔" اس کی مسکراہٹ کے عقب سے فکرمندی جھانک رہی تھی۔

میں اور ہدایت وارثی آفس میں جا بیٹھے۔ ہدایت بولا "یہاں کی چیزیں آپ کے شایانِ شان نہیں۔ پھر بھی آپ کچھ کھانا پینا پسند کریں گے؟"

"رسمیات کی ضرورت نہیں۔" میں نے آفس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ وہ بہت چھوٹا سا آفس تھا لیکن اس میں الماریوں' شیلفوں اور کیبنٹوں میں بے شمار چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ رجسٹر' فائلیں' کتابیں' کاغذات' کارڈز اور اسی قسم کا الم غلم۔ آفس کی مناسبت سے ہدایت کی میز کافی بڑی تھی۔ وہ بھی لدی پھندی تھی۔ ہدایت منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"داستان کچھ خوشگوار نہیں ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا "آپ کے ماضی اور حال کی الجھنوں اور مسائل کو دیکھتے ہوئے مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا کہ میں آپ کو کوئی ناخوشگوار داستان سناؤں لیکن اسے خوش گوار بنانے کا بھی مجھے کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا۔"

"تو پھر اسے اس کی ناخوشگواری سمیت ہی میری طرف [illegible] کردیجئے۔" وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس مسکراہٹ سے اعصابی کشیدگی عیاں تھی۔ وہ یقیناً فکرمند تھا۔

میں نے اسے شروع سے آخر تک سب کچھ سیدھے اور سچے انداز میں بتا دیا۔ میں نے بات وہاں سے شروع کی جب شرافت علی مجھے میرے ہوٹل سے لینے آیا تھا۔ وہ خاموشی' توجہ اور انہماک سے میری بات سنتا رہا۔ بظاہر وہ بالکل پُرسکون تھا۔ وہ اپنی پریشانی کو چھپائے رکھنے پر قادر معلوم ہوتا تھا اور یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ اس نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا تھا۔ سرد و گرم چشیدہ تھا۔

"اب آپ کی باری ہے کہ آپ مجھے کچھ بتائیں مسٹر وارثی!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"پہلے مجھے حیران تو ہولینے دیں۔" وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ یہ مسکراہٹ گویا اس کے ہونٹوں پر جامد ہوکر رہ گئی تھی۔ اس میں اس کا ارادہ شامل نہیں تھا۔

"کس بات پر؟" میں نے اس کی حیرانی پر قدرے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"اس بات پر کہ آپ اس معاملے میں دلچسپی لے رہے ہیں۔" وہ بولا۔

اسے میں نے چونکہ پس منظر نہیں بتایا تھا کہ میں نے کیوں اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی تھی اور نہ ہی میں نے یہ تذکرہ کیا تھا کہ مرزا اکرم بیگ سے میں نے دو ملین روپے پیشگی فیس وصول کی تھی اس لئے اس کا حیران ہونا لازمی تھا۔ عین ممکن تھا میں یہ تفصیلات اسے بتاتا تو وہ اور بھی زیادہ حیران ہوجاتا۔

"میں کچھ دنوں سے اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لینے لگا ہوں۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "آپ اسے میرا "کاروباری شوق" یا پھر "شوقیہ کاروبار" کہہ لیں۔ میں کچھ ایسی ہی وجہ کے تحت اس میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ بہرحال یہ اہم بات نہیں ہے کہ میں اس میں دلچسپی لے رہا ہوں البتہ یہ آپ کے فائدے میں ضرور جاتی ہے۔"

"وہ کس طرح؟" اس نے بھویں اچکائیں۔

"اس وقت شاید موٹے دماغ کی کوئی سرکاری شخصیت... یا شخصیات بیٹھی آپ کے بخیے ادھیڑ رہی ہوتیں کیا یہ اس سے بہتر نہیں ہے کہ ایک مہذب اور معزز شخص دوستانہ ماحول میں بیٹھا آپ سے بات کر رہا ہے؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"ہاں... بہتر تو ہے۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے تسلیم کیا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ جج صاحب کے قتل کا سن کر چند لمحے کے لئے اس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا مگر اب وہ سنبھل چکا تھا۔

آدمی وہ یقیناً بہت گہرا تھا۔ بظاہر حسرت سے بولا "کاش ہم بھی اس قابل ہوتے کہ آپ کی خدمات حاصل کر سکتے۔" درحقیقت اس کے الفاظ میں خفیف سا طنز پوشیدہ تھا۔ میں نے کاروباری شوق یا شوقیہ کاروبار کے جو الفاظ استعمال کئے تھے اس سے وہ یقیناً سمجھ گیا تھا کہ میری دلچسپی کی تہ میں روپیا بھی کام کر رہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "ویسے آپ بتائیں تو سہی۔ اگر میں آپ کی خدمات حاصل کرنا چاہوں تو آپ کی کیا شرائط ہوں گی؟ شاید میں کسی طرح کھینچ تان کر آپ کو افورڈ کرنے کا بندوبست کر ہی لوں۔"

"کس معاملے میں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"اسی معاملے میں۔" وہ ہموار لہجے میں بولا "مجھے کچھ خطرے کی بُو محسوس ہو رہی ہے شاید مجھے بھی آپ کی خدمت کی ضرورت پڑ ہی جائے۔"

"ایک ہی معاملے میں، میں دو آدمیوں کے لئے کیسے کام کر سکتا ہوں وارثی صاحب؟" میں نے نرمی سے کہا "یہ تو کاروباری اخلاقیات کے خلاف ہے۔ ابھی تو مجھے اس شوق میں مبتلا ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ اگر میں ابھی سے بے اصولی شروع کر دوں گا تو جلد ہی کسی عبرت ناک انجام کو پہنچ جاؤں گا۔ آپ نے شاید کچھ غلط تاثر لیا ہے وارثی صاحب! اس شوقیہ کاروبار یا کاروباری شوق میں لالچ کو دخل نہیں ہے۔"

اس نے پُرخیال سے انداز میں سرہلایا۔ میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر کہا "میرا سلسلہ بہت مختلف اور بہت عجیب سا ہے۔ شاید اتنی جلدی آپ کی سمجھ میں نہ آسکے۔ بہرحال ایک بات کا یقین رکھیے۔ اگر آپ میرے ساتھ سچ بولیں گے تو فائدے میں رہیں گے۔ اگر اس معاملے میں آپ بے قصور ہوئے تو میں بغیر کسی مالی فائدے کے بھی آپ کے لئے سب کچھ کروں گا اور آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا لیکن اگر آپ نے مجھ سے جھوٹ بول کر اپنے آپ کو بے گناہ ثابت کرنے کی کوشش کی تو وہ آپ کے لئے زیادہ نقصان دہ ہوگی۔"

اس کے ہونٹوں سے وہ غیرارادی سی مسکراہٹ بھی معدوم ہوگئی۔ وہ چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ وہ بظاہر پُرسکون تھا لیکن اس کے ذہن میں یقیناً ہلچل برپا تھی۔ آخر وہ [illegible] سانس لے کر بولا "ٹھیک ہے افضل صاحب! آپ کو جو پوچھنا [illegible] پوچھیے میں ہر بات آپ کو بالکل سچ سچ بتاؤں گا۔"

"بالکل ٹھیک۔ میں آپ کے سچ کے لئے آپ کا شکر گزار [illegible] گا کیونکہ آج کے دور میں سچ کو تلاش کرنا سب سے مشکل کام [illegible] رہ گیا ہے۔" میں نے کہا اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہو[ئے] پوچھا "کیا آپ مرزا اکرم بیگ کے پچاس لاکھ کے مقروض ہیں؟"

"ہاں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا "اصولاً تو اس رقم کو بہت زیادہ ہو جانا چاہئے تھا لیکن یہ مرزا اکرم بیگ کی شرافت [ہے] کہ وہ اب تک صرف اصل زر ہی شمار کر رہا ہے۔ اس میں [illegible] سود شامل نہیں کر رہا۔"

"کیا وہ اس قرض کی واپسی کے لئے آپ پر دباؤ ڈال [رہا] ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مرزا اکرم بیگ جیسے لوگوں کو کسی پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کا صرف کہہ دینا ہی کافی ہوتا ہے اور گزشتہ [illegible] سال کے دوران وہ مجھ سے تین چار مرتبہ کہہ چکا ہے۔ کسی آدمی کو اس کا صرف ایک مرتبہ ہی کہہ دینا کافی ہوتا۔ اس کے [بعد] یا تو وہ شخص رقم کا بندوبست کرتا یا پھر جان بچانے کے لئے روپوش ہو کر کسی محفوظ کونے کھدرے کی تلاش میں کسی سمت میں [بھاگنا] شروع کر دیتا۔ امید نہیں ہے کہ اسے زیادہ دور تک بھاگنا نصیب ہوتا۔ اسی ملک میں... یا پھر دنیا کے کسی اور ملک کے کسی گلی کوچے میں اس کی زندگی کی شام ہو جاتی۔"

"لیکن آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"یہ اس کی مہربانی ہے۔ اس کا حُسنِ سلوک ہے۔ مجھ سے اس کے تعلقات خاصے دوستانہ رہے ہیں۔"

"آپ ابھی یہ قرضہ ادا کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔ ورنہ میں بھلا اکرم بیگ کو تقاضا کرنے کا موقع کیوں دیتا؟ میں دراصل ابھی تک بڑی گہری دلدل میں پھنسا تھا۔ اب دھیرے دھیرے باہر آ رہا ہوں۔ ابھی تو میں اور نیلم [رو]پوشی سے زندگی گزارنے اور ذرا سکون کی سانس لینے کے قابل ہوئے ہیں۔ پہلے میں نے چھوٹے چھوٹے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے قرضے اتارے ہیں۔ اس قسم کے قرض خواہ ذرا تھڑدلے سے ہوتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے پیسوں کے لئے سرِراہ بے عزتی کرنے پر تُل جاتے ہیں۔ اور سرِراہ بے عزتی کرانے کی نسبت گلی کوچے میں گولی کھا کر مر جانا میرے لئے قابلِ ترجیح ہے۔"

"میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ قرض آپ نے کس مقصد کے لیا تھا؟"

"کیوں نہیں۔ اس میں چھپانے والی تو کوئی بات نہیں۔" وہ بے نیازی سے بولا "مجھے اعتراف ہے کہ ہمارے ملک اور معاشرے کی قدروں کے لحاظ سے میری کمائی کے ذرائع کبھی کچھ زیادہ باعزت

نہیں رہے۔ میں ذرا مغربی سے ذہن کا آدمی تھا۔ شاید میری تربیت کچھ مختلف رہی تھی یا آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ میری تربیت میں کچھ خامیاں رہ گئی ہوں گی۔ بہرحال میں نائٹ کلب اور شراب خانے وغیرہ چلانے کو کچھ ایسا معیوب نہیں سمجھتا تھا۔ بلکہ میں کیا ان دنوں بہت سے لوگ نہیں سمجھتے تھے۔ اور اگر اب آسانی سے اجازت ملنے لگے تو اب بھی بہت سے لوگ ان کاروباروں کی طرف لپکیں گے۔ بہرحال گزشتہ برسوں کے دوران جب حالات اس قسم کے کاموں کے لئے بالکل ناموزوں ہو گئے تھے تو میں نے لائن بدلنے اور کچھ دوسری طرح روپیا کمانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ ذہن ہمیشہ بڑے کاروباروں کی طرف بھاگتا تھا۔ چھوٹے موٹے کاروبار کرنا یا محض گزارا کرنا مجھے کبھی اچھا نہیں لگا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر کچھ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ شاید ماضی کے کچھ خوب صورت لمحوں کا عکس اس کی نظروں کے سامنے رقصاں تھا "یہ تو میں اب آپ کو ذرا قناعت پسند، پُرسکون اور ذرا منکسر المزاج نظر آ رہا ہوں ورنہ میں تو ہر چیز کی بے حساب طلب رکھنے والا.... پارے کی طرح متحرک اور گردن ذرا اونچی رکھ کر بات کرنے والا آدمی تھا۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" میں نے کہا۔

"خیر۔ تو بات ہو رہی تھی ذرا مختلف قسم کے منصوبے کی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تاہم اس کا تعلق بھی تفریحات کے شعبے سے تھا۔ میں نے کراچی کے ایک اور ساحلی مقام پر ایک اور بڑے ملے لینڈ کا منصوبہ بنایا تھا جس میں دوسروں کو شریک کرنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ میں چھوٹی چھوٹی پارٹیوں کو جمع کر کے بھان متی کا کنبہ بنانے کے بجائے اکیلا ہی اپنی مرضی سے سب کچھ کرتا اور بلا شرکتِ غیرے مالک رہنا چاہتا تھا۔ شاید اوپر والے کو میری یہ سوچ پسند نہیں آئی یا پھر شاید کسی اور طرح دولت کمانا میرے مقدر میں ہی نہیں تھا۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے گویا بات مکمل کی "منصوبہ فلاپ ہو گیا!"

اس نے اثبات میں سرہلایا "حالانکہ بہت سوچ سمجھ کر منصوبہ بنایا گیا تھا۔ میں خود اپنے آپ کو تفریحات کے میدان کا بہت بڑا ماہر سمجھتا ہوں لیکن اس میں دوسرے کئی ماہرین کے مشورے بھی شامل تھے مگر کسی کی کوئی تدبیر نہیں چلی۔ زمین کی لیز پر خرچ کی گئی رقم ضائع ہو گئی۔ پبلسٹی پر لاکھوں روپیا ضائع ہو گیا۔ تنخواہوں پر لاکھوں روپیا ضائع ہو گیا۔ قیمتی مشینوں کو پڑے پڑے زنگ لگ گیا [او]ر وہ کاٹھ کباڑ کے برابر ہو گئیں۔ صرف اکرم بیگ سے لی ہوئی رقم [ہ]ی نہیں، بہت سے دوسرے چھوٹے موٹے قرضے اور میری اپنی جمع پونجی بھی ڈوب گئی۔ میں نے بہت بڑا جوا کھیلا تھا۔ اس میں [ک]وئی محفوظ پہلو نہیں رکھا تھا۔ یہی میری سب سے بڑی حماقت [تھ]ی۔ ایسے پراجیکٹ بہت خطرناک ہوتے ہیں جو اگر فلاپ ہو جائیں تو انسان بالکل ہی اوندھے منہ گرتا ہے۔"

میں نے سرہلایا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "آپ نے آج اسے فون کیا تھا سہ پہر کے قریب؟"

"ہاں۔" اس نے بلا جھجک کہا۔

"آپ اس سے ملنا چاہتے تھے؟"

"ہاں۔ وہ ان دنوں باہر سے آیا ہوا تھا۔ ورنہ اس سے ملنا بھی ایک مسئلہ ہوتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا اس نے کوئی ایسی بات کی تھی کہ وہ دروازہ کھلا چھوڑ جائے گا؟"

میں نے ایک لمحے کے لئے بھی اس کے چہرے سے نظر نہیں ہٹائی تھی۔ وہ اب بھی بلا ہچکچاہٹ بولا "ہاں اس نے کہا تھا کہ وہ آفس کا بیرونی دروازہ غیر مقفل چھوڑ جائے گا کیونکہ اسے اچانک کہیں جانا پڑ رہا تھا۔ وہ اس قسم کے کام کرتا رہتا ہے۔ اسے ان باتوں کی کوئی خاص فکر نہیں ہوتی۔ وہ اس شہر میں بھی... ان حالات میں بھی کبھی کبھی بیس تیس لاکھ گاڑی کا دروازہ لاک کئے بغیر... چابی اگنیشن میں چھوڑ کر کسی دفتر وغیرہ میں کام سے چلا جائے گا اور اسے یقین ہوتا ہے کہ کوئی اس کی گاڑی کو نہیں چھوئے گا۔ حالانکہ ظاہر ہے گاڑی پر تو نہیں لکھا ہوتا کہ یہ مرزا اکرم بیگ کی گاڑی ہے۔"

"بہت خوب۔" میں نے کہا "ملاقات کا وقت کیا طے پایا تھا؟"

"پانچ بجے۔" اس نے جواب دیا۔

"آپ اس سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں اس سے قرض کی ادائیگی کے سلسلے میں مزید مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا اور خاصی لمبی مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا کیونکہ مستقبل قریب میں تو میرے پاس اتنی بڑی رقم کا کوئی انتظام ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں اس موضوع پر اس سے ذرا تفصیلی بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے اپنے تمام حالات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔"

وہ خاموش ہو گیا اور کئی سیکنڈ تک کچھ نہ بولا تو میں نے کہا "پھر آپ اس سے ملنے گئے؟"

"ہاں میرے پاس ان دنوں ایک پرانی سی گاڑی ہے۔ وہ خراب تھی۔ میکینک کے پاس تھی۔ اس لئے میں ٹیکسی میں گیا اور ٹھیک پانچ بجے اس کے دفتر پہنچ گیا لیکن اس اپارٹمنٹ کا دروازہ مقفل تھا جسے وہ دفتر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ مجھے دھچکا سا لگا کہ اس نے وعدہ خلافی کیوں کی تھی۔ میں نے کئی بار کال بیل بجائی کہ شاید ابھی وہ اندر ہی ہو مگر کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے سوچا شاید اس نے دروازہ غیر مقفل چھوڑ کر جانے کے بجائے چابی کہیں چھپا کر جانا بہتر سمجھا ہو۔ میں نے اپارٹمنٹ کے سامنے ٹیرس نما حصے پر رکھے ہوئے تمام گملوں کو بھی اٹھا کر دیکھا کہ شاید چابی ان میں سے

کسی کے نیچے ہو مگر نہیں تھی۔ میں نے نیچے آکر چوکیدار سے بھی پوچھا کہ شاید وہ اسے دے گیا ہو مگر اس کے پاس بھی نہیں تھی۔"

"پھر آپ نے کیا کیا؟"

"فوری طور پر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے تھا۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ مجھ سے ملنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ کہیں اس کا موڈ خراب ہونے کی نشانی تو نہیں تھی؟ میرے ذہن پر پہلے ہی کافی بوجھ تھا۔ اچانک بوجھ کچھ بڑھ گیا۔ پچھلے دنوں میرے سینے میں بھی کچھ تکلیف رہی تھی۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا تو اس نے میرا مکمل چیک اپ کرنے کے بعد یہ "قیمتی" مشورہ عنایت فرمایا تھا کہ میں تفکرات سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کروں۔"

وہ دھیمے لیکن استہزائیہ سے انداز میں ہنسا "ڈاکٹر کتنی آسانی سے یہ بات کہہ دیتے ہیں۔ گویا تفکرات سے پیچھا چھڑا لینا انسان کے اپنے بس کی بات ہے اور بہت آسان سا کام ہے۔ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ انسان کے کپڑوں پر دھول مٹی لگ جائے تو وہ بھی آسانی سے نہیں جھڑتی۔ تفکرات کو ذہن سے جھٹکنا تو بہت مشکل ہے۔ وہ تو زہر کی طرح انسان کے خون میں سرایت کر جاتے ہیں۔ لیکن خیر بے چارے ڈاکٹروں کا بھی کوئی قصور نہیں۔ مریض کی تسلی کے لئے انہیں کچھ تو کہنا ہوتا ہے۔ ان کے پاس یہی چند رٹے رٹائے سے جملے ہوتے ہیں۔"

میں نے اس کی تائید میں سرہلایا۔ اس کی سوچ سطحی نہیں تھی۔ وہ گہری سوچ کا مالک تھا۔ تاہم میں نے اسے اصل موضوع پر لانے کی کوشش کی "جب مکرم بیگ کا آفس آپ کو مقفل ملا اور چابی بھی نہیں مل سکی تو آپ نے کیا کیا؟"

"یہی بتانے کے لئے میں پہلے آپ کو اپنی اس وقت کی ذہنی کیفیت سے آگاہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔" وہ ملائمت سے بولا "میرے ذہن پر بوجھ تھا۔ میں نے سوچا ذرا ڈاکٹر صاحب کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ موسم بڑا خوشگوار تھا۔ ساحل وہاں سے دور نہیں تھا اور قدرے خنک ہوا ڈیزل کے بھیانک دھوئیں سے پاک محسوس ہو رہی تھی۔ میں نوجوانوں کی طرح سیٹی بجاتا' ٹہلتا ہوا ساحل کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر سمندر کا نظارہ کرتا رہا۔ مجھے اپنی ٹینشن کچھ کم ہوتی محسوس ہوئی۔ پھر میں پلے لینڈ چلا گیا۔"

"پلے لینڈ؟" میں نے ذرا حیرت سے دہرایا۔

"جی ہاں" وہ مسکرایا "پلے لینڈ کے دونوں حصوں میں خوب رونق تھی۔ بچوں بڑوں' عورتوں مردوں کا ہجوم تھا۔ میں انہیں دیکھتا رہا اور اپنے پلے لینڈ کے خلاف منصوبے کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہاں سے میں نے دو تین مرتبہ مکرم بیگ کے دفتر فون کیا لیکن وہاں کسی نے فون نہیں اٹھایا۔ میں نے ملاقات اور مذاکرات کے لئے جو وقت نکالا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔ میرا یہاں ہوٹل پہنچنا ضروری تھا۔ چنانچہ میں ٹیکسی میں بیٹھا اور یہاں آگیا۔"

میں ایک لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مزید کچھ نہ بولا تو میں نے کہا "ظاہر ہے اس قسم کی مصروفیت کا کوئی ثبوت تو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس دوران آپ کو اپنا کوئی جاننے والا دوست یا شناسا تو نہیں ملا ہو گا جس نے آپ کو ساحل پر یا پلے لینڈ وغیرہ میں دیکھا ہو؟ جو اس بات کی شہادت دے سکتا ہو؟"

میں نے جرم و سزا کی بہت سی کہانیوں میں پڑھا تھا کہ اس قسم کی شہادت کی بڑی اہمیت ہوتی تھی۔ ظاہر تھا کسی جائے وقوعہ سے کسی مشتبہ شخص کی غیر حاضری کا ثبوت حاصل کرنے کے جو بھی ذرائع ممکن تھے' یہ ان میں سے ایک تھا مگر ہدایت وارثی کچھ اس انداز میں مسکرایا جیسے اسے میری یہ بات کچھ بچکانہ سی لگی ہو۔

"ظاہر ہے انسان چہل قدمی... سمندر کے نظارے یا پلے لینڈ میں بغیر کسی پروگرام کے کچھ وقت گزارنے جاتا ہے تو کہیں اس کا تحریری ریکارڈ محفوظ کروا کے نہیں آتا اور نہ ہی لوگوں کو پکڑ پکڑ کر اپنی صورت دکھاتا ہے کہ خواتین و حضرات! ذرا غور سے دیکھ لیجئے۔ میں یہاں موجود ہوں اور وقت بھی نوٹ کیجئے۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولا۔

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "یہ مغربی تفتیش کے طور طریقے اپنے ہاں چلانا بہت مشکل ہیں افضل صاحب! میں تو نہایت صاف گوئی سے اعتراف کر رہا ہوں کہ میری اتنی دیر کی مصروفیت کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ مجھے تو اس وقت اگر کلفٹن کی ان جگہوں پر کوئی شناسا یا جاننے والا نظر بھی آ جاتا تو شاید میں خود ہی اس سے نظر چرا لیتا' چھپا لیتا۔ میں اس وقت کسی کا سامنا کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔ میں اس وقت ایک عجیب سی کیفیت میں گھوم رہا تھا جسے شاید آپ سمجھ سکیں۔"

"میں خوب سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اسے اطمینان دلایا "انسان پر مختلف حالات میں جو کیفیتیں گزرتی ہیں میں ان سب لذتوں اور اذیتوں سے واقف ہوں۔"

"یہ بھی غنیمت ہے۔" اس نے سرہلایا "بہرحال آپ کو یہ بھی اندازہ ہونا چاہئے کہ اگر انسان کی کوئی واردات کر گزرنے کی نیت ہو تو پھر جائے واردات سے اپنی غیر موجودگی کے ثبوت تیار کرنا کون سا مشکل کام ہے؟ اگر میرے دل میں چور ہوتا تو میں آپ سے یہ نہ کہتا کہ میری اتنی دیر کی مصروفیت کا کوئی ثبوت یا کوئی گواہ موجود نہیں۔ اس کے برعکس میں ثبوت اور گواہ کا پہلے ذکر کرتا۔"

پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا "بلکہ اگر زیادہ مجبوری آن پڑے تو میں اب بھی اپنے بیان میں ترمیم کر سکتا ہوں۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ میں تو اس دوران فلاں شخص کے ساتھ تھا اور ایسا کوئی "فلاں شخص" پیش کرنا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں۔"

"ان سب باتوں کا مجھے بھی احساس ہے۔" میں نے تحمل سے کہا "اس کے باوجود بات کرنے سے ہی کوئی نتیجہ نکلتا ہے۔ بات تو کرنا ہی پڑتی ہے۔"

"ہاں یہ بات درست ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے تسلیم کیا پھر پوچھا "اب آپ کا پروگرام کیا ہے؟ کیا مجھے آپ کے ساتھ چلنا پڑے گا؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "آپ کے حق میں بہتر تو یہی ہے لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو پولیس یا کسی خفیہ ادارے کے لوگ آکر اپنے ساتھ لے جائیں تو وہ آپ کی مرضی ہے۔"

"نہیں میں آپ کے ساتھ چلنا پسند کروں گا۔" اس نے ایک پوشیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ میں فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے میری تقلید کی۔

کاؤنٹر پر آکر وہ نیلم سے مخاطب ہوا "میں شاید "غیر معینہ" مدت کے لئے افضل صاحب کے ساتھ جا رہا ہوں۔ فی الحال ہوٹل کا انتظام تمہیں تنہا ہی سنبھالنا پڑے گا۔"

"یہ کیا چکر ہے؟ کچھ مجھے بھی تو بتاؤ۔" نیلم نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا لیکن درحقیقت وہ فکر مند نظر آنے لگی تھی۔

"چکر کوئی خاص نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ہدایت شاید اس وقت مصلحت اندیشی کو بہتر نہیں سمجھ رہا تھا یا پھر شاید مصلحت اندیشی اس کی عادت ہی نہیں تھی۔

وہ میری بات کاٹتے ہوئے نیلم سے مخاطب ہوا "چکر بہت خاص ہے۔ جج عبدالسلام صاحب کو قتل کر دیا گیا ہے' کچھ لوگوں کو شبہ ہے کہ یہ میرا کام ہے۔ تمہیں جج عبدالسلام صاحب یاد ہیں نا؟"

"میں بھلا انہیں کیسے بھول سکتی ہوں۔" نیلم تلخ لہجے میں بولی "پھر بھی مجھے کچھ تو بتاؤ۔ تم پر قتل کا شبہ کیسے اور کس طرح ہونے لگا؟"

ہدایت نے کافی اختصار سے اسے ساری صورتِ حال بتائی۔ اس کے دوران نیلم بال پوائنٹ ہونٹوں میں دبائے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی اور غیر ارادی طور پر ایک ہاتھ سے رجسٹر کے اوراق پھڑپھڑاتی رہی۔ میں نے گھڑی دیکھی' اب مجھے کچھ اضطراب سا محسوس ہونے لگا تھا۔ میں نے مکرم بیگ کے دفتر میں بھی کافی وقت صرف کر دیا تھا۔ اس سے پہلے جب شرافت علی مجھے میرے ہوٹل سے لے جانے کے لئے آیا تھا تب بھی کافی وقت ضائع ہو چکا تھا۔ اور اب یہاں بھی مجھے کافی دیر لگ گئی تھی جبکہ یہ ایک ہنگامی معاملہ تھا۔

گویا میری کارکردگی کچھ زیادہ تسلی بخش نہیں تھی لیکن اگر اس اعتبار سے دیکھا جاتا کہ میں نہ تو کوئی بہت پرانا اور تجربہ کار پولیس آفیسر تھا اور نہ ہی کسی مغربی ملک کا کوئی پرائیویٹ سراغرساں... تو میری یہ کارکردگی کچھ ایسی بری بھی نہیں تھی جبکہ میرے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ہر جھگڑے میں ایک نیا جھگڑا بھی نکلتا رہتا تھا۔

ابھی میں ایک مسئلہ حل نہیں کر پاتا تھا کہ دوسرے میں الجھ جاتا تھا۔ اس لحاظ سے تو کارکردگی بری نہیں تھی ویسے بھی ابھی تو محض آغاز ہی تھا تجربات بہرحال انسان کو بہت کچھ سکھاتے ہیں۔

ہدایت نے بات جلد ہی ختم کر لی اور میرے ساتھ چل دیا۔ دروازے پر پہنچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ نیلم کچھ اس طرح ہماری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں اس کے محبوب کو کسی قربان گاہ کی طرف لے جا رہا تھا۔

ہم جب مکرم بیگ کے دفتری اپارٹمنٹ پر پہنچے تو انسپکٹر رحیم گل نے ہمارا استقبال کیا۔ میں نے اسے دیکھتے ہی ماتھے پر ہاتھ مار کر کہا "اوہ! تم یہاں پہنچ گئے! اب تو تفتیش کا اللہ ہی حافظ ہے۔"

اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی طاری رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مذاق کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس وقت وہ وردی میں تھا اور گرد اس کے ماتحت سرگرم نظر آ رہے تھے اور وہ ایک اہم آدمی کے قتل کے سلسلے میں جائے واردات پر تھا۔ ان حالات میں شاید اس کا مذاق کرنے یا مذاق سہنے کا موڈ نہیں ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میری بات کے جواب میں جب اس نے محض گہری نظروں سے میری طرف دیکھنے پر اکتفا کیا تو میں نے اس کی مزید خبر نہیں لی اور اس کا مزید مذاق نہیں اڑایا۔

خفیہ ایجنسیوں کے آدمی وہاں سے غائب ہو چکے تھے۔ صرف ایک پُراسرار چہرہ اِدھر اُدھر منڈلاتا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ شاید پولیس کی کارروائی کی نگرانی کر رہا تھا۔ اب وہاں بہت سے پولیس والے دکھائی دے رہے تھے۔ جج صاحب کی لاش اٹھا کر لے جائی جا چکی تھی۔ اس کے باوجود پولیس والے نہ جانے کیوں بڑی مستعدی سے اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ معلوم نہیں وہ اپنے آپ کو کن کاموں میں مصروف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس سے پہلے کہ میں ہدایت وارثی کا تعارف کراتا' رحیم گل بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے خود ہی اندازہ لگاتے ہوئے بولا "آپ یقیناً ہدایت وارثی ہیں؟"

"جی ہاں۔" ہدایت وارثی نے شاید غیر ارادی طور پر ہونٹوں پر زبان پھیرنے کے بعد جواب دیا۔

رحیم گل مجھ سے مخاطب ہوا "مکرم بیگ نے مجھے بتا دیا تھا کہ تم ان کی طرف گئے ہو۔ مجھے امید تھی کہ تم انہیں لے آؤ گے۔ اسی لئے میں نے پولیس کو وہاں نہیں بھیجا تھا۔"

"بہت شکریہ۔" میرے بجائے ہدایت وارثی نے جواب دیا۔ اگر پولیس عین اس وقت وہاں پہنچتی جب عذرا کا جانگلوس شوہر ٹوٹی ہوئی بوتل سے اس کا قیمہ بنانے کی فکر میں تھا تو ایک نیا ہی چکر شروع ہو جاتا۔

رحیم گل نے اپنی چھڑی دھیرے دھیرے دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے نہایت پُرخیال نظروں سے ہدایت وارثی کی طرف

دیکھتے ہوئے کہا "میں بہت بے چینی سے آپ کے بیان کا منتظر تھا ہدایت وارثی صاحب!"

میں نے محسوس کیا کہ ہدایت کی رنگت ذرا پھیکی پڑ گئی۔ رحیم گل کا یہ انداز نہ جانے کیوں بڑے بڑوں کا پتا پانی کر دیتا تھا حالانکہ اس کے چہرے پر خشونت' سفاکی یا کرختگی وغیرہ نہیں تھی۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ بظاہر اس کی شخصیت میں کسی کو مرعوب یا خوف زدہ کرنے والی کوئی بات نہیں تھی مگر شاید یہ اس کی دیانت داری اور بے خوفی کا رعب تھا جس سے سامنے والے کی سٹی گم ہو جاتی تھی۔

ہدایت نے اپنی وہی رام کہانی شروع کر دی جو وہ مجھے سنا چکا تھا۔ میں اس دوران مکرم بیگ کی طرف چلا گیا۔ وہ کچھ دور ایک صوفے پر بیٹھا اس طرح سگار کے کش لے رہا تھا جیسے اس صورتِ حال سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ گویا کسی بور سی تقریب میں آیا ہوا کوئی مہمان تھا۔ جو ایک طرف بیٹھا دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ جلد از جلد تقریب ختم ہو تو وہ اپنے گھر جائے۔

"شرافت علی نظر نہیں آ رہا۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"پولیس کے آنے سے پہلے میں نے خود ہی اسے غائب ہونے کی ہدایت کر دی تھی۔" مکرم بیگ نے اطمینان سے جواب دیا "اس بے چارے کی شخصیت ہی کچھ ایسی ہے کہ ہر جرم کا شبہ فوراً اس پر جاتا ہے۔ اور پھر اس کا ماضی بھی کچھ ایسا بے داغ نہیں ہے۔ میں نے سوچا محض اس کی موجودگی کی وجہ سے پولیس اس کیس کو کچھ کا کچھ نہ بنا دے۔ اس لئے میں نے اسے غائب کر دینا ہی بہتر سمجھا۔ ویسے میں نے خفیہ ادارے والوں سے اجازت لے لی تھی اور ضرورت کے وقت اسے واپس بھی بلایا جا سکتا ہے۔"

"تم نے انسپکٹر کو سب کچھ سچ سچ بتا دیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں جس طرح آپ نے مشورہ دیا تھا میں نے اسی طرح ساری بات سچ سچ بتا دی ہے۔" اس نے جواب دیا پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد پوچھا "یہ انسپکٹر آپ کا دوست ہے؟"

میں نے احتیاطاً اس کا اعتراف نہ کرنا ہی بہتر سمجھا اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا "پولیس والے بھلا کب کسی کے دوست ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے بہرحال شناسائی ہے۔ تمہیں کیسے اندازہ ہوا؟"

"جس طرح آپ اس سے آ کر ملے تھے اس سے میں نے محسوس کیا تھا کہ آپ اسے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔" وہ بولا۔

"لیکن آپ نے دیکھا۔ اس نے جواباً کیسی سرد مہری کا مظاہرہ کیا؟" میں نے گویا شکوہ کیا۔

وہ ترحم آمیز انداز میں دھیرے سے ہنسا اور بولا "یہ بے چارے بھی کیا کریں۔ مجبور ہوتے ہیں۔ جو بھی ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے یہ یہی سمجھتے ہیں کہ وہ کبھی نہ کبھی ان سے کوئی ناجائز کام کرانے کی کوشش کرے گا۔ ان کی دوستی سے [illegible] اٹھانے کی کوشش کرے گا۔"

"اور وہ بھی مفت میں۔" میں نے لقمہ دیا۔

وہ ذرا خوش دلی سے ہنسا "جی ہاں شاید یہ خیال بھی آتا [illegible] شاید کیا بلکہ یقیناً آتا ہو گا۔"

رحیم گل نے اس دوران ہدایت وارثی سے بات چیت کر لی تھی۔ وہ ٹہلنے کے سے انداز میں ہماری طرف آ گیا۔ [illegible] شاید سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ وہ گمشدہ گائے [illegible] اِدھر اُدھر دیکھتا اس کے پیچھے آ رہا تھا۔

"تمہارے آنے سے پہلے ہم نے کچھ تفتیش بھی کر لی۔" رحیم گل نے مجھے مطلع کیا۔

"بہت مستعد ہو گئی ہے ہماری پولیس۔" میں نے [illegible] سانس لے کر کہا "جج صاحب کے قتل کا معاملہ تھا نا۔ کاش عام آدمی کے قتل کے سلسلے میں بھی تم لوگ اتنے ہی [مستعد] ہو جاؤ۔"

"تم قتل تو ہو کر دیکھو۔ ہم تمہارے قتل کی تفتیش بھی مستعدی سے کریں گے۔" وہ جواب دیئے بغیر نہ رہ سکا۔

"میرا مسئلہ اور ہے محترم انسپکٹر! تمہیں معلوم ہے کہ میں عام آدمی نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ اگر تم نے میرے کیفرِ کردار تک نہ پہنچایا تو میری روح.... بلکہ بدروح تمہیں چین سے نہیں رہنے دے گی۔ ویسے.... بائی دا وے۔ تم نے چلایا۔ میرا مطلب ہے تم نے کیا کچھ معلوم کیا ہے!؟"

رحیم گل ایک لمحے خاموشی سے مجھے گھورنے کے بعد [بولا] "تو شاید تمہیں معلوم ہی ہو کہ جج صاحب نے شادی نہیں کی [تھی]۔"

"اوہ نہیں' مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ اتنے عقل [مند] تھے۔ ذہین اور لائق تو وہ یقیناً ہوں گے کیونکہ اتنے اہم [منصب پر] فائز تھے لیکن شادی نہ کرنا یہ ذرا ایک الگ ہی قسم کی [بات] ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہاری یہ بے موقع چلنے والی زبان ذرا دیر کے [لئے رک] جائے تو میں مزید کچھ بات کروں۔" اب رحیم گل ذرا دانت [پیس کر] غرایا۔

"ایک تو تم جہاں جاتے ہو انسان کی اظہارِ خیال کی [آزادی] چھیننے کی کوشش کرتے ہو۔" میں نے افسوس سے کہا "[اچھا] کہو کیا کہنا چاہتے ہو۔"

رحیم گل گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا "جج صاحب [عرصے] سے اوسط درجے کے ایک ہوٹل میں رہتے آ رہے تھے۔ ا[نہوں نے] زندگی میں کبھی گھر وغیرہ کا چکر پالا ہی نہیں تھا۔ بہت محدود [سی] زندگی تھی اور بس۔ ہوٹل ہی ان کا گھر تھا۔ بہت سادگی [سے رہتے] تھے۔ ان کی تنخواہ اور دیگر مراعات وغیرہ میں سے اگر کچھ [بچتا] تو رفاہی کاموں میں خرچ کر دیتے تھے یا بے گناہ پکڑے جا[نے والے] کسی شخص کی مدد کرتے رہتے تھے۔ بہت ہی عجیب لائف [اسٹائل ...]ی نہ [...] ئل تھا ان کا۔ ان کا رہن سہن اور معمولات دیکھ کر کسی کے [لئے] یقین کرنا مشکل ہوتا تھا کہ وہ اعلیٰ عدالت کے ایک نہایت سینئر [جج] تھے۔"

"ہاں اس قسم کے کردار تو اب قصے کہانیوں کی زینت ہوتے [جا] رہے ہیں۔" میں نے اب سنجیدگی سے کہا۔ اس قسم کے کرداروں [کے] اس انجام پر واقعی دل میں تاسف کی لہر ابھرتی تھی۔

رحیم گل سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "اوسط درجے کے [اس] ہوٹل میں دو کمروں پر مشتمل ایک سوئٹ ان کے لئے مخصوص [تھا] جس کا وہ پرانی اور رعایتی شرح سے ماہانہ کرایہ ادا کرتے تھے اور [ص]رف فون کرنے پر انہیں ضرورت کی ہر چیز وہیں مل جاتی تھی۔ ان کے ایک آدھ جاننے والے نے بتایا ہے کہ انہیں اسی طرح رہنا [پس]ند تھا اور انہوں نے کبھی گھر کا بکھیڑا پالنے کے بارے میں سوچا بھی [ن]ہیں تھا۔"

رحیم گل صوفے پر بیٹھ گیا اور اس نے ہدایت کو بھی بیٹھنے کا [ا]شارہ کیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ہدایت کی طرف بغور [د]یکھتے ہوئے بولا "آج شام جج صاحب کو ایک ٹیلی فون کال موصول [ہ]وئی تھی۔ یہ کال ریسیو کرنے کے بعد انہوں نے دوبارہ ہوٹل کی آپریٹر لڑکی سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ وہ باہر جا رہے تھے' اگر ان کے لئے کوئی فون آئے تو اس نمبر پر ملا دیا جائے۔"

اس نے نمبر بتایا اور کچھ اس طرح خاموش ہو گیا جیسے سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ مرزا مکرم بیگ اور ہدایت بھی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر اسے خود ہی کہنا پڑا "اور یہ یہاں کا نمبر ہے۔ یعنی جج صاحب کسی کا فون آنے پر یہاں کے لئے روانہ ہوئے تھے۔ آپریٹر لڑکی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ فون کس کا تھا اور کیا بات ہوئی تھی۔"

"فون کس وقت آیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"آپریٹر کو صحیح طور پر یاد نہیں۔ ظاہر ہے وہ ٹیلی فون بورڈ پر کافی مصروف رہتی ہے۔" رحیم گل نے جواب دیا "بہرحال اسے اتنا اندازہ ہے کہ وہ کال چار سے چھ بجے کے درمیان آئی تھی۔"

وہ مکرم بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "فون آپ نے کیا تھا بیگ صاحب؟"

"نہیں۔ میں نے نہیں کیا تھا انسپکٹر صاحب!" مکرم بیگ نے انگریزی میں جواب دیا۔

"مسٹر وارثی! آپ نے....؟" رحیم گل نے ہدایت وارثی کی طرف دیکھا۔

"نہیں جناب! میں نے بھی نہیں کیا تھا۔" ہدایت نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔

رحیم گل نے انگلی کے اشارے سے ایک کانسٹیبل کو قریب بلایا اور اسے حکم دیا "چوکیدار کو بلاؤ۔"

کانسٹیبل دوسرے کمرے سے ایک باریش پٹھان کو لے کر آیا۔ اس کے کندھے پر اس وقت بھی ایک پرانی تھری ناٹ تھری رائفل لٹکی ہوئی تھی۔ وہ اپنے اردگرد اتنے پولیس والوں اور دیگر لوگوں کو دیکھ کر پریشان تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ پھیلی پھیلی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں جب شرافت علی کے ساتھ آیا تھا تو میں نے اسے بلڈنگ کے گیٹ پر نہیں دیکھا تھا تاہم یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ روایتی قسم کے چوکیدار اپنی ڈیوٹی کے دوران اِدھر اُدھر ہوتے رہتے ہیں اور آج کے دور میں مجرم جتنے طاقتور اور منظم ہو گئے ہیں اس کو دیکھتے ہوئے تو چوکیدار کے ہونے یا نہ ہونے سے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ چوکیداروں کے ہوتے ہوئے بھی وارداتیں ہو جاتی تھیں اور منظم گروہوں سے تعلق رکھنے والے مجرم تو بعض اوقات چوکیدار کو بھی ٹھکانے لگا جاتے تھے۔ سب سے زیادہ تیز رفتار ترقی جرائم کے میدان میں ہو رہی تھی۔

رحیم گل نے ہدایت وارثی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چوکیدار سے پوچھا "تم نے اس سے پہلے کبھی اس آدمی کو دیکھا ہے؟"

"جی صاب.... ام نے اس کو آج ای دیکھا تھا۔" چوکیدار نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جواب دیا "یہ بلڈنگ میں آئی تھی۔"

"آج کس وقت؟ صحیح صحیح ٹائم بتاؤ۔" رحیم گل بولا۔

"ٹیم تو ام کو ٹھیک یاد نئیں اے صاب۔ لیکن یہ بلڈنگ میں آئی تھی۔ امارا خیال ہے اس وقت پانچ بجا تھا کیونکہ اس وقت ام عصر کا نماز پڑھنے کے لئے وضو کرتی تھی۔" چوکیدار نے بتایا اور پریشانی کے عالم میں سر کھجانے کے لئے ہاتھ بلند کیا۔ پھر شاید اسے یاد آیا کہ اس کے سر پہ پگڑی تھی۔ ایک لمحے کے لئے اس کا ہاتھ رکا لیکن پھر اس نے پگڑی پر ہی کھجالیا۔

"ٹھیک ہے' جج صاحب کی لاش تو تم دیکھ ہی چکے ہو اور بتا چکے ہو کہ تم نے انہیں بھی اندر آتے دیکھا تھا۔ کیا تم بتا سکتے ہو کہ دونوں میں سے کون پہلے آیا تھا؟" رحیم گل نے ملائمت سے پوچھا "ذرا دماغ پر زور دو۔"

چوکیدار نے آنکھیں بند کر لیں۔ ایک بار پھر سر کو.... یا یوں کہئے کہ پگڑی کو کھجایا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں' ہاتھ ملے' لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھا پھر یوں اِدھر اُدھر دیکھا جیسے بھاگنے کے لئے راہِ فرار تلاش کر رہا ہو۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ بیٹھے بٹھائے کس مصیبت میں پھنس گیا۔ چند لمحے کے لئے اس نے پھر آنکھیں بند کیں۔ شاید ذہن پر زور دے رہا تھا جو یقیناً اس کے لئے ایک مشکل کام تھا۔

آخر کار اس نے آنکھیں کھولیں اور نہایت سادگی و دیانت داری سے بولا "ام کو ٹھیک سے یاد نئیں اے۔ ام کو کیا مالوم تھا کہ یہ باتیں یاد رکھنے کا ضرورت پڑے گا۔ ادھر بڑا بڑا صاب لوگ آتا

ہے۔ ام تو بس گیٹ کا خیال رکھتی ہے۔ ام کو آرڈر اے کہ بس یہ دیکھے کہ کوئی شرارتی اور بدمعاش قسم کا لڑکا مڑکا لوگ اندر نئیں آئے، کوئی اسلحہ بندوق لے کر اندر نہیں آئے۔ جو آدمی شکل شکل سے شریف اور بڑا صاب لوگ نظر آتی ہے ام اس کو نئیں رد کتی۔ کچھ نئیں پوچھتی۔ یہ صاب بھی اندر آئی اور وہ جو صاب گولی کھا کر مر گیا اے وہ بھی اندر آئی۔ لیکن ام کو یاد نئیں کہ کون پہلے آئی۔ ام ایسی چیزوں کو یاد نئیں رکھتی۔ ابھی آپ بولے گی تو آئندہ یاد رکھے گی۔"

رحیم گل نے کسی قسم کی برہمی کا اظہار کرنے یا اس پر رعب جھاڑنے کی کوشش نہیں کی اور تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے ملائمت سے بولا "ٹھیک ہے۔ کسی چوکیدار سے اس قسم کی کوئی بات معلوم ہونے کی امید مشکل سے ہی پوری ہو سکتی ہے چلو خیر یہ بتاؤ کیا تم نے ان صاحب کو واپس جاتے دیکھا تھا؟" اس نے ہدایت وارثی کی طرف اشارہ کیا۔

"نئیں صاحب! ام اس کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔" چوکیدار نے اب ذرا سکون کی سانس لیتے ہوئے جواب دیا "ایک بات تو یہ۔۔۔ کہ ادھر گیٹ کے پاس ایک جگہ ام نماز پڑھتی اے۔۔۔ ام ادھر نماز پڑھتی تھی تو کافی لوگ اندر بھی آئی۔ باہر بھی گئی۔ شاید یہ اس وقت نکل ہو۔ ام اس کو جاتے نئیں دیکھا۔"

"بلڈنگ سے باہر جانے کا کوئی دوسرا راستہ بھی ہے؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"جی صاب! پیچھے دوسرا گیٹ بھی اے۔ چھوٹا گیٹ۔" چوکیدار نے جواب دیا۔

"لیکن تم نے بہرحال ان صاحب کو جاتے نہیں دیکھا؟" رحیم گل نے تصدیق چاہی۔

"نئیں صاب! ام جھوٹ نہیں بولے گا۔ بے شک نوکری جائے۔ ام اس کو جاتے نئیں دیکھا۔ مگر یہ امارا غلطی نئیں اے صاب۔ مگر پھر بھی۔۔۔ اگر امارا غلطی اے تو ام مانی مانگتی اے۔" اس کے چہرے پر زبردست الجھن کے آثار تھے۔

اس کے انداز پر رحیم گل کے ہونٹوں پر بھی خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ تاہم وہ اسے دباتے ہوئے جلدی سے کانسٹیبل سے مخاطب ہوا "اس کا بیان لے لیا گیا ہے نا؟"

"جی سر!" کانسٹیبل نے مستعدی سے جواب دیا "اکرم صاحب نے بیان لے لیا ہے اور اس سے انگوٹھا بھی لگوالیا ہے۔"

رحیم گل چوکیدار سے مخاطب ہوا "ٹھیک ہے تم جاؤ اور اب ذرا زیادہ دھیان سے اپنی ڈیوٹی دو۔"

"ام جائے؟" چوکیدار نے حیرت سے پوچھا۔ شاید اس بے چارے کو یقین نہیں آرہا تھا کہ اسے اتنی آسانی سے جانے دیا جا رہا تھا۔ اس نے تو شاید یہی سوچا ہو کہ ایک بڑے آدمی کا اس بلڈنگ میں قتل ہو گیا تھا اور چوکیدار ایک چھوٹا آدمی تھا اب سب سے زیادہ شامت اسی کی آئے گی۔ اسی کی چمڑی ادھڑے گی۔ شاید اس نے تو قربانی کا بکرا بننے کے لئے دل ہی دل میں اپنے آپ کو تیار بھی شروع کر دیا تھا۔ اتنی آسانی سے گلو خلاصی ہونا اسے یقیناً خواب لگ رہا تھا۔

اس کے جانے کے بعد رحیم گل نے اس طرح دونوں چہرے پر رگڑے جیسے سستی دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر گہری سانس لے کر اس نے خواب ناک سی نظروں سے ہدایت وارثی کی طرف دیکھا اور نرمی سے بولا "حالات آپ کے حق میں کچھ اچھے نہیں ہیں وارثی صاحب!"

"میرے حق میں تو حالات ایک مدت سے اچھے نہیں انسپکٹر صاحب!" ہدایت وارثی ذرا تلخی سے مسکرایا "کچھ دنوں میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے ہی لگا تھا کہ شاید میرا ستارہ گردش سے نکل آیا ہے لیکن اب میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے یہ خوش فہمی دل سے نکال دینی چاہئے۔"

"شاید" رحیم گل اس کے لہجے کی جذباتیت سے متاثر ہوئے بغیر مبہم سے لہجے میں بولا "آپ کا اعتراف ہے کہ آپ مرزا بیگ کے پچاس لاکھ کے مقروض تھے۔ اور یہ قرض کافی پرانا تھا؟"

"جب مکرم بیگ صاحب اس بات کا تذکرہ کر ہی چکے ہیں تو میں بھلا اس کو کیسے جھٹلا سکتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"اس قرضے کا کوئی تحریری ثبوت موجود ہے؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"نہیں سر! بیگ صاحب جیسے لوگوں کو تحریری ثبوت کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ جب چاہیں کسی سے اپنا قرضہ وصول کر سکتے ہیں۔ اور اگر انہیں ایک فیصد بھی امکان نظر آرہا ہو کہ وہ کسی سے اپنا قرضہ وصول نہیں کر سکیں گے تو اسے وہ قرضہ دیں گے ہی نہیں۔" ہدایت وارثی نے مکرم بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" رحیم گل نے سرہلایا پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کچھ محتاط سے لہجے میں بولا "مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ جج عبدالسلام صاحب کے بارے میں آپ کے دل میں کچھ اچھے جذبات نہیں تھے۔ مجھے ان کی وجہ بھی معلوم ہو چکی ہے۔ پھر بھی میں آپ کے منہ سے سننا چاہوں گا کہ آپ کی ان کے بارے میں کیا رائے تھی؟"

"اب جبکہ وہ اس دنیا میں نہیں ہیں کیا میرا ان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرنا ضروری ہے؟" ہدایت گویا جرأت سے کام لیتے ہوئے بولا۔

"جی ہاں۔" رحیم گل نے خشک لہجے میں جواب دیا "آپ پوری امید رکھئے کہ میں آپ کو کسی غیر ضروری کام کی زحمت نہیں دوں گا۔"

"لگتا ہے آپ اس معاملے میں میری پوزیشن اور بھی زیادہ خراب کریں گے جبکہ مجھے پہلے ہی اپنی پوزیشن کچھ اچھی نظر نہیں آرہی۔" ہدایت وارثی اب کافی اعتماد سے بات کر رہا تھا۔ اب شاید اس کے اندر کا خوف کچھ کم ہو گیا تھا۔ مکرم بیگ قدرے لاتعلق سا بیٹھا یہ گفتگو سن رہا تھا۔

"میں تو خود کو آپ کی پوزیشن اچھی یا خراب کرنے کے قابل نہیں سمجھتا۔ میرے خیال میں تو اس کا زیادہ انحصار خود آپ پر ہی ہے۔ آپ سچ بولنے کی کوشش کیجئے۔ آپ کو کم نقصان پہنچے گا۔" رحیم گل نے خشک لہجے میں مشورہ دیا۔

"یہ آپ کا خیال ہے انسپکٹر صاحب!" ہدایت وارثی کراہنے کے سے انداز میں بولا "جج صاحب کے بارے میں اگر میں سچائی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کروں گا تو مجھے زیادہ نقصان پہنچے گا۔"

"اس کے باوجود میں آپ کو سچ ہی بولنے کا مشورہ دوں گا۔" رحیم گل نے اصرار کیا۔ ہدایت وارثی نے چھت کی طرف دیکھ کر گہری سانس لی اور بے بسی آمیز انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے! اگر آپ مجھے سچ بلوا کر پھانسی چڑھوانے پر تلے ہی ہوئے ہیں تو مجھے شاید اسی کو اپنا نصیب سمجھنا پڑے گا۔ یہی غنیمت ہے کہ مجھے تھانے میں کھال ادھڑواتے ہوئے سچ نہیں بولنا پڑا بلکہ اس عمدہ اپارٹمنٹ میں۔۔۔ معزز لوگوں کی طرح صوفے پر بیٹھ کر ایک مہذب اور شائستہ پولیس آفیسر کے سامنے بولنا پڑ رہا ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا اور کچھ سوچ کر بولا "ویسے بات کچھ ایسی خاص بھی نہیں ہے اور اب تو میں جج صاحب کو تقریباً بھولنے ہی لگا تھا۔ میں تو ان کے خلاف صرف اس وقت بھڑکا تھا جب انہوں نے مجھے سزا سنائی تھی۔ میں نے کچھ بکواس کی تھی جس کے نتیجے میں انہوں نے توہینِ عدالت کے جرم میں میری سزا میں دو ماہ کا اضافہ کر دیا تھا۔"

"میں اصل میں یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ آپ نے کیا کہا تھا؟" رحیم گل تحمل سے بولا۔

"میں نے کچھ اسی قسم کی باتیں کی تھیں۔ جج صاحب! اس معاشرے میں ہزاروں انتہائی خطرناک دہشت گرد، قاتل اور بے شمار سنگین جرائم کے عادی لوگ دندناتے پھر رہے ہیں مگر ان پر آپ کا کوئی بس نہیں چلتا۔ اگر ان میں سے ایک آدھ کبھی کبھار کسی طرح گرفتار ہو کر آپ کے سامنے پہنچ بھی جاتا ہے تو آپ پولیس کو گواہ پیش کرنے کا حکم دیتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کے لوگوں کے خلاف کون گواہی دے کر اذیت کی موت مرنا چاہے گا یا اپنے بچوں کو تشدد سے مروانا چاہے گا چنانچہ گواہ میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ پیشہ ور اور انتہائی خطرناک مجرم ہوتے ہوئے بھی سینہ تانے اور مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے آپ کی عدالتوں سے رخصت ہو جاتے ہیں اور مجھ جیسے بے ضرر لوگ جن کے جرائم کی نوعیت درحقیقت اخلاقی ہوتی ہے وہ آپ کے قابو میں آجاتے ہیں۔ ان پر آپ خوب اپنا غصہ نکالتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر آپ کو اپنے سارے اخلاقی اصول یاد آجاتے ہیں، کچھ اس قسم کی جذباتی تقریر کی تھی میں نے۔۔۔۔ اس سے پہلے کہ پولیس والے مجھے گھسیٹ کر دور لے جاتے، میں نے خوب دل کا غبار نکالا تھا۔ جج صاحب نے مجھے واپس بلا لیا تھا۔ میں سمجھا وہ میری جذباتی تقریر سے متاثر ہو گئے ہیں۔ فلموں میں ایسا ہی ہوتا ہے مگر انہوں نے توہینِ عدالت کے جرم میں میری سزا میں دو ماہ کا اضافہ کر دیا۔"

"میں نے سنا ہے اس کے علاوہ بھی آپ نے کچھ کہا تھا۔" رحیم گل اس کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر بولا۔

ہدایت نے ایک لمحے کے لئے سر جھکا لیا۔ یکدم ہی وہ خاصا افسردہ دکھائی دینے لگا۔ ذرا ہچکچاہٹ کے ساتھ وہ بولا "نیلم بھی جیل چلی گئی تھی۔ اگر آپ سب کچھ جانتے ہیں تو پھر نیلم کو بھی جانتے ہوں گے۔ وہ میری دوست ہے۔ ہم دونوں کی رفاقت کی وجہ سے ہی سارا فساد کھڑا ہوا تھا۔ بہرحال وہ مجھ سے بہت پہلے جیل سے باہر آگئی اور جج صاحب نے کھینچ تان کر ایک لفنگے سے اس کی شادی بھی کرادی۔ اپنی دانست میں انہوں نے بڑی سماجی خدمت انجام دی تھی۔ اس وقت مجھے پہلے سے زیادہ غصہ آیا تھا اور میں نے جیل میں کافی بکواس کی تھی۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"مثلاً؟" رحیم گل اس سے سب کچھ کہلوانے پر تلا ہوا تھا۔

"میں نے یہی کہا تھا کہ میں بڑا شریف اور مہذب آدمی ہوں لیکن زندگی میں اگر کبھی موقع ملا تو میں جج صاحب کا پتا ضرور صاف کروں گا۔" ہدایت ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا پھر گویا اس نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی "انسان جب جذباتی ہوتا ہے تو اس قسم کی بکواس کرتا ہے اسے معلوم نہیں ہوتا کہ کبھی کبھی اس قسم کی بکواس گلے بھی پڑ جاتی ہے۔ لاشعوری طور پر مجھے احساس تھا کہ جیل کی چار دیواری تو بہت اونچی ہوتی ہے اور جیل کے باسی تو گویا دنیا سے کٹے ہوتے ہیں۔ میری بات بھلا قیدیوں کے سوا کس نے سنی ہوگی لیکن مجھے بعد میں پتا چلا کہ باہر کی دنیا میں بھی یہ بات بہت سے لوگوں تک پہنچ چکی تھی۔ یہ دنیا واقعی ایک حیرت کدہ ہے۔"

"ہاں یہ دنیا واقعی ایک حیرت کدہ ہے۔" رحیم گل نے اس کی تائید میں سرہلایا "لیکن اگر اب میں اپنی رائے کا اظہار کروں تو آپ کو زیادہ حیرت زدہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ یہ ایک منطقی رائے ہوگی۔"

ہدایت نے سوالیہ نظروں سے رحیم گل کی طرف دیکھا تو وہ بولا "یہ ایک تیر سے دو شکار کرنے والی بات ہے۔ آپ یہاں آئے۔ آپ نے دیکھا مکرم بیگ موجود نہیں ہے اور ساڑھے سات تک اس کے واپس آنے کا امکان بھی نہیں ہے۔ آپ کے ذہن میں اچانک ایک منصوبہ آیا۔ آپ نے جج صاحب کو فون کیا اور کوئی

چکر دے کر انہیں یہاں بلالیا۔ انہیں گولی مار کر آپ یہاں سے غائب ہوگئے۔"

"کاش میں اتنا ذہین اور اتنا جُرات مند ہوتا کہ اس قسم کے منصوبے اتنی تیزی سے میرے ذہن میں آیا کرتے اور اتنی ہی تیزی سے میں ان پر عمل بھی کر گزرتا۔" ہدایت ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"آپ جیسے انسانوں سے اگر اس قسم کے کام سرزد ہوتے ہیں تو اچانک ہی سرزد ہوتے ہیں۔ سوچ سمجھ کر اور باقاعدہ منصوبہ بندی سے تو پیشہ ور مجرم کام کرتے ہیں۔" رحیم گل بولا "بہرحال آپ کا چند منٹ یا چند سیکنڈ میں بنایا ہوا منصوبہ بھی برا نہیں تھا۔ اس طرح ایک تو آپ کو جج صاحب پر اپنے غصے کی آگ ٹھنڈی کرنے کا موقع مل گیا۔ دوسرے آپ نے مرزا مکرم بیگ کو ایسی پوزیشن میں پھنسا دیا کہ اس کے لئے آپ سے اپنا قرضہ وصول کرنا تقریباً ناممکن ہوجائے۔"

ہدایت کراہنے کے سے انداز میں ہنسا "انسپکٹر صاحب! آپ اس طرح نتائج اخذ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جس طرح کہانیوں میں کئے جاتے ہیں مگر یہ کہانیوں کی نہیں' حقائق کی دنیا ہے۔ میری غصے کی آگ تقریباً ٹھنڈی ہی ہوچکی تھی۔ میں نے عرض کیا نا کہ میں تو جج صاحب کو تقریباً بھول ہی چکا تھا۔ انسان کی زندگی میں کبھی کبھار ایسے جذباتی لمحے آجاتے ہیں جب وہ اس قسم کے دعوے کر گزرتا ہے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں میری عمر اب زیادہ عرصے تک اپنے جذباتی دعووں اور ارادوں میں پھنسے رہنے کی نہیں ہے۔ دوسرے میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ مکرم بیگ کو جیل بھجوا کر میں اس کا قرضہ ادا کرنے سے بچ سکتا ہوں۔ مکرم سامنے بیٹھا ہے' میں اس کی پیٹھ پیچھے بات نہیں کروں گا۔ مکرم ان لوگوں میں سے ہے جن کا نیٹ ورک ان کے جیل جانے۔ یا کہیں بھی جانے کے بعد بھی کام کرتا رہتا ہے۔ اس کا قرضہ دینے سے تو میں ایک ہی صورت میں بچ سکتا ہوں کہ میں خود جیل چلا جاؤں۔"

"ہوسکتا ہے آپ نے یہی سوچا ہو۔" رحیم گل اب واضح مسکراہٹ کے ساتھ بولا "شاید آپ نے مکرم بیگ کے قرضے کی ادائگی سے بچنے کے لئے ہی اپنے جیل جانے کا بندوبست کیا ہو۔"

"ابھی میں اپنی زندگی سے اتنا بیزار نہیں ہوا تھا۔" ہدایت نے جواب دیا۔

رحیم گل نے گردن گھما کر مکرم بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "کیوں بیگ صاحب! کیا وارثی صاحب سچ کہہ رہے ہیں کہ آپ جیسے لوگوں کا نیٹ ورک ان کے جیل چلے جانے کے بعد بھی کام کرتا رہتا ہے؟"

"خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" مکرم بیگ انکسار سے مسکراتے ہوئے بولا "وارثی صاحب تو خواہ مخواہ ہی مجھے گاڈ فادر یا ڈون قسم کی کوئی چیز بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ میں تو ایک عام بزنس مین ہوں۔" اس کے اس انکسار پر میں بھی دل ہی دل میں اسے داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔

رحیم گل ایک بار پھر ہدایت وارثی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "آپ کے پاس اپنی اس وقت کی مصروفیات کا بھی کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ہے جس دوران جج صاحب کو قتل کیا گیا۔ آپ نے خود ہی کہا ہے کہ آپ ٹہلتے رہے۔ پھر پلے لینڈ چلے گئے۔ ایسی مصروفیت نہیں ہے جس کا کوئی ثبوت نہ پیش کیا جاسکے۔ اس معاملے میں آپ کے سوا کسی اور کی طرف ذہن جانا بہت مشکل ہے۔"

"دراصل اس وقت میری گردن پتلی ہے۔ پھندا میری گردن میں فٹ آرہا ہے۔" ہدایت قدرے تلخ لہجے میں بولا۔

"ہدایت صاحب کو قاتل ثابت کرنے میں ایک رکاوٹ ہے۔" میں نے گفتگو میں مداخلت کی "جب یہ یہاں آئے اپارٹمنٹ کا دروازہ مقفل تھا اور اس کا اعتراف خود مکرم بیگ صاحب کرچکے ہیں۔ اپارٹمنٹ میں داخلے کا کوئی اور راستہ بھی نہیں ہے۔ آخر ہدایت صاحب اندر کیسے پہنچے؟"

"سوال تو معقول ہے افضل صاحب!" رحیم گل نے میری طرف دیکھ کر سرہلاتے ہوئے ذرا تیکھے لہجے میں کہا "لگتا ہے آپ نے واقعی ان معاملات میں بڑی گہری دلچسپی لینا شروع کردی ہے۔"

"آپ کا اندازہ بالکل درست ہے جناب انسپکٹر صاحب!" میں نے طنزیہ طور پر مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

رحیم گل اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے ہدایت سے مخاطب ہوا "آپ ذرا کھڑے ہونے کی زحمت کریں گے ہدایت صاحب؟"

ہدایت اٹھ کھڑا ہوا۔ رحیم گل اس کے سامنے جا پہنچا اور ملائمت سے بولا "میں نہایت شریفانہ سے انداز میں آپ کی تلاشی لینا چاہتا ہوں۔ امید ہے آپ برا نہیں منائیں گے۔"

"میں برا منانے کی پوزیشن میں کہاں ہوں انسپکٹر صاحب!" ہدایت خود استہزائی کے سے انداز میں بولا۔

رحیم گل نے اس کی جیبوں سے چیزیں نکال کر تپائی پر رکھنا شروع کیں۔ ان میں ایک بٹوا تھا۔ چابیوں کا ایک گچھا تھا۔ ایک قلم تھا۔ سیلوفین میں پیک شدہ دو سگار' ایک کنگھا اور ایک رومال تھا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن جب ہدایت کی اندرونی جیب سے پستول برآمد ہوا تو ہدایت کی رنگت پھیکی پڑگئی۔ رحیم گل بغور اس کا معائنہ کرنے لگا۔

ہدایت گویا اپنی جرات مجتمع کرتے ہوئے بولا "میں اس پستول کو اپنے ہوٹل میں ہی چھپا کر بھی آسکتا تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اتفاق سے افضل صاحب اسے دیکھ چکے تھے۔ میں اسے چھپا کر آتا تو زیادہ مشکوک معلوم ہوتا۔ ویسے برسبیلِ تذکرہ بتا چلوں کہ اس کا لائسنس موجود ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ لائسنس موجود ہوگا۔ میں لائسنس دیکھنے کی فرمائش بھی نہیں کروں گا۔ جس گن سے کسی کو قتل کیا جاتا ہے اس کا لائسنس ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لائسنس صرف اس ہتھیار کا ریکارڈ رکھنے کا ایک ذریعہ ہوتا ہے۔ وہ کسی کو قتل کرنے کا لائسنس نہیں ہوتا۔" رحیم گل بولا۔

"میرا بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ میں نے یہ پستول جائز اور قانونی طریقے سے رکھا ہوا ہے۔" ہدایت خفیف سی چڑچڑاہٹ کے ساتھ بولا۔

اس دوران رحیم گل پستول کا میگزین کھول کر دیکھ چکا تھا اور اسے سونگھ بھی چکا تھا۔ وہ سرہلاتے ہوئے بولا "آپ خواہ مخواہ اس پستول کے بارے میں وضاحتیں پیش کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے حال ہی میں استعمال نہیں کیا گیا۔ اس کا میگزین پورا بھرا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بڑے کیلیبر کا پستول ہے۔ میں جج صاحب کی پیشانی پر موجود سوراخ کا بڑی باریکی سے معائنہ کرچکا ہوں۔ انہیں نہایت کم کیلیبر کے پستول سے گولی ماری گئی تھی جس کی آواز بھی شاید اس اپارٹمنٹ کے بند دروازوں سے باہر نہ گئی ہو۔"

ہدایت کے چہرے پر قدرے طمانیت کے آثار نمودار ہوئے لیکن رحیم گل دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ڈرامائی سے انداز میں بولا "اہم بات یہ نہیں ہے کہ آپ کی جیب سے وہ پستول برآمد نہیں ہوا جس سے جج صاحب کو قتل کیا گیا۔ اہم بات یہ ہے کہ آپ کے پاس پستول موجود رہتا ہے یعنی آپ پستول استعمال کرنے کے اہل ہیں۔ پستول کا کیا ہے' ایک انسان کی جیب میں ہوسکتا ہے دوسرا کہیں اور بھی ہوسکتا ہے۔ بلکہ ممکن ہے کام ہوچکنے کے بعد اب وہ دوسرا پستول سمندر کی تہ میں کہیں موجود ہو۔ سمندر یہاں سے زیادہ دور بھی تو نہیں ہے اور آپ خود ہی کہہ چکے ہیں کہ آپ پلے لینڈ بھی گئے تھے۔ سمندر اور پلے لینڈ کے درمیان چند قدم ہی کا تو فاصلہ ہے۔"

"آپ جو چاہیں فرض کرسکتے ہیں جناب!" ہدایت بے بسی سے بولا "کوئی کسی کو کچھ فرض کرنے سے کیسے روک سکتا ہے!"

"کوئی ٹھوس ثبوت پیش کرکے روک سکتا ہے۔" رحیم گل نے جواب دیا اور ہدایت کی باقی چیزوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے فون نمبرز کی چھوٹی سی نوٹ بک کے اوراق سرسری انداز میں الٹ پلٹ کر دیکھے۔ پھر اس کے بٹوے میں جھانکا۔ دونوں چیزیں اس نے واپس تپائی پر رکھ دیں اور چابیوں کا گچھا اٹھا لیا جو چمڑے کے ایک چھوٹے سے کیس میں لپٹا ہوا تھا۔

اس نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر چابیوں کا گچھا لئے بیرونی دروازے کی طرف چل دیا۔ ہدایت گویا غیر ارادی طور پر کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور میں نے مکرم بیگ کو بھی ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ وہ گویا بادلِ نخواستہ اٹھا اور میرے ساتھ چل دیا۔

دروازے پر پہنچ کر رحیم گل نے اسے کھلا ہی رکھتے ہوئے اس کی اندرونی ناب کا بٹن دبا کر اسے لاک کردیا اور ایک چابی باہر والی ناب میں داخل کرنے کی کوشش کی لیکن وہ چابی سوراخ میں داخل ہی نہیں ہوئی۔ تب اس نے دوسری چابی آزمائی۔ وہ چابی سوراخ میں داخل تو ہوگئی لیکن گھوم نہیں سکی۔ تیسری بھی سوراخ میں داخل ہوگئی لیکن گھوم نہیں سکی۔

رحیم گل نے چوتھی چابی کو آزما کر دیکھا اور اس بار کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ناب کا دبا ہوا بٹن واپس ابھر آیا اور تالے کی زبان اندر چلی گئی۔ رحیم گل نے تیزی سے چابی کو کئی بار گھمایا اور کئی بار تالا یوں کھلا اور بند ہوا جیسے کوئی سانپ بار بار اپنی زبان منہ سے نکال رہا ہو۔

آخرکار رحیم گل نے چابی تالے سے نکال لی۔ دروازہ زور سے بند کردیا اور میری طرف گھومتے ہوئے بولا "اب غالباً تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ مسٹر ہدایت وارثی کس طرح اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔ یا اب بھی تمہیں کسی وضاحت کی ضرورت ہے؟ مزید کوئی ثبوت درکار ہے؟"

ہدایت وارثی کا چہرہ یکدم سفید پڑگیا تھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑے کھڑے کچھ لہرا سا گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے شبہ ہوا کہ وہ مجھ پر گر پڑے گا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا تو رحیم گل اس سے مخاطب ہوا "آپ اس پر کوئی تبصرہ کریں گے وارثی صاحب؟" اس کا لہجہ بظاہر بڑی ملائمت لئے ہوئے تھا لیکن ہدایت وارثی اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا تھا کہ اس میں چھپے زہر کا اندازہ نہ کرسکتا۔

"مم۔۔۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ میری واقعی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" وہ ہکلایا "یہ چابی میری نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم یہ میری چابیوں میں کیسے آئی۔"

رحیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "چابیوں میں بھی اب بڑی بے راہ روی پیدا ہوگئی ہے' خود بخود گھر سے نکلتی ہیں اور جس کی رِنگ میں چار اچھی چابیاں دیکھتی ہیں اس میں جا گھستی ہیں۔"

ہدایت کی کیفیت اس وقت یقیناً ایسی نہیں تھی کہ اس کے طنز و مزاح سے محظوظ ہوسکتا۔ مکرم بیگ کی سنجیدگی میں بھی کوئی فرق نہ آیا۔

رحیم گل نے غالباً مزید طنز و مزاح کے مظاہرے کا ارادہ ترک کردیا اور ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے مدبّرانہ لہجے میں بولا "یہ کام آپ دونوں میں سے کسی ایک کا ہے یا تو مکرم بیگ اتنے احمق تھے کہ انہوں نے ایک ایسے جج کو اپنے ہی دفتر میں قتل کرڈالا جن کی عدالت میں ان کے مقدمات ابھی زیرِ سماعت ہیں یا پھر ہدایت صاحب نے انہیں پھنسانے کی ترکیب سوچی اور اس پر عمل کر گزرے' ان دونوں میں سے کوئی ایک بات صحیح ہے۔"

ہدایت وارثی اب بھی کچھ جھولتا ہوا سا دکھائی دے رہا تھا۔ رحیم گل نے بظاہر اسے سہارا دینے کے لئے اس کا بازو تھاما لیکن

درحقیقت وہ اسے اور زیادہ مرعوب کرنے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "آپ نے آخری بار کسی پستول سے فائر کب کیا تھا وارثی صاحب؟ آج شام۔۔۔۔؟"

"نہیں نہیں ہرگز نہیں۔" ہدایت ہڑبڑا کر جلدی سے بولا۔

"ایک آدھ دن پہلے؟" رحیم گل بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

"نہیں نہیں۔" ہدایت ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "آپ شاید میری بات کا یقین نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ پستول ہمیشہ میرے پاس رہا ہے مگر میں نے آج تک گولی نہیں چلائی کبھی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ زندگی میں صرف چند ایک مرتبہ پستول جیب سے نکالنے کی نوبت آئی اور سامنے والے کو محض مرعوب کرنے سے ہی کام چل گیا۔ میں چاہتا بھی یہی تھا۔ میں نے صرف اپنے دفاع کے خیال سے پستول اپنے پاس رکھا ہے لیکن دل ہی دل میں ہمیشہ یہی دعا کی ہے کہ مجھے گولی چلانے کی ضرورت نہ پڑے۔ مجھے معلوم ہے انسپکٹر صاحب! ایک بار گولی چلتی ہے تو پھر سلسلہ بہت دور تک جاتا ہے۔ مجھے کبھی گولی چلانے کی خواہش محسوس نہیں ہوئی۔ پستول بھی محض اپنے پیشے اور اس دور کی کچھ مجبوریوں کی وجہ سے رکھا ہے ورنہ میں یہ بھی رکھنا نہیں چاہتا۔ مجھے اس قسم کی چیزیں رکھنے یا اپنی طاقت کا اظہار کرنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے۔ میں بہت ہی مہذب اور امن پسند آدمی ہوں انسپکٹر صاحب!"

وہ بہت بے ساختگی اور روانی سے یہ سب کچھ کہتا چلا گیا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رحیم گل پر اس کی تقریر کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور ہدایت گویا سہارے کے لئے میرے کندھے سے آن ٹکا۔ رحیم گل اب مکرم بیگ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "آپ کیا کہتے ہیں بیگ صاحب؟ آپ نے آخری مرتبہ فائر کب کیا تھا؟"

"مجھے اپنے ہاتھ سے فائر کرنے کی ضرورت شاذونادر ہی پیش آتی ہے۔" مکرم بیگ نہایت بے خوفی اور خود اعتمادی سے مسکراتے ہوئے بولا "تاہم دو ماہ پہلے میں نے اپنے ہاتھوں سے بہت سے فائر کئے تھے۔"

"کس بدنصیب پر؟ یا مجھے یوں پوچھنا چاہئے کہ کن بدنصیبوں پر؟" رحیم گل نے دریافت کیا۔

"کچھ خرگوش تھے۔ کچھ مرغابیاں تھیں۔ کچھ تیتر تھے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "میں دراصل اپنے ایک زمیندار دوست کے ساتھ ٹھٹھہ کے قریب اس کے علاقے میں شکار کے لئے گیا ہوا تھا۔ میں نے سوچا ذرا نشانہ ہی آزما لیا جائے کہیں بالکل ہی آوٹ آف پریکٹس نہ ہو جاؤں۔"

"مقصد یہ کہ۔۔۔ آپ دونوں کا دعویٰ ہے کہ آپ میں سے کسی نے بھی حال ہی میں کسی گن سے گولی نہیں چلائی؟" رحیم گل نے ایک بار پھر تصدیق کے لئے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ مکرم بیگ نے محض کندھے اچکانے پر اکتفا کیا جبکہ ہدایت نے نفی میں سر ہلایا۔

"اس کا مطلب ہے اگر آپ دونوں کے ہاتھوں کا پیرافین ٹیسٹ کرایا جائے تو آپ دونوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا؟" رحیم گل بولا۔

"پیرافین ٹیسٹ؟" ہدایت نے قدرے حیرت سے دہرایا۔ مکرم بیگ خاموش رہا۔

"ہاں یہ ہاتھوں کا ایک ٹیسٹ ہوتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ کسی نے حال ہی میں گن سے فائر کیا ہے یا نہیں۔ پہلے یہ ٹیسٹ صرف ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا تھا۔ حالانکہ بہت آسان اور سادہ سا ٹیسٹ ہے۔ اب اپنے ہاں بھی ہونے لگا ہے۔" رحیم گل نے بتایا۔ پھر وہ مکرم بیگ سے مخاطب ہوا "آپ کو یہ ٹیسٹ کرانے پر کوئی اعتراض تو نہیں؟"

مکرم بیگ کندھے اچکا کر بے پروائی سے بولا "مجھے تو کسی بات پر کوئی اعتراض نہیں۔ میں چاہتا ہوں پولیس اچھی طرح اطمینان کر لے۔ میری پوزیشن پہلے ہی بڑی نازک ہے۔ میں انگشت نمائی نہیں چاہتا۔"

"آپ کو اگر اعتراض ہوتا تب بھی آپ کو ٹیسٹ کے لئے چلنا ہی پڑتا بیگ صاحب!" رحیم گل نے گویا اس کی خوش فہمی دور کی۔ "میں تو رسماً پوچھ رہا تھا۔ مجھے ہر زاویے سے ضابطے کی کارروائی پوری کرنی ہے۔ آپ دونوں کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"دونوں کو نہیں۔ تینوں کو۔" میں نے لقمہ دیا "میں یہاں بیٹھ کر مکھیاں تھوڑا ہی ماروں گا۔"

"مجھے معلوم تھا کہ تمہیں کہنے یا نہ کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم تو ہر حال میں ساتھ ہی جاؤ گے۔ تم تو اس معاملے میں اب یقیناً پولیس کے دُم چھلے بن چکے ہو۔" رحیم گل منہ بنا کر بولا۔

"چلو خیر تم نے اعتراف تو کیا کہ پولیس کی کوئی دُم بھی ہوتی ہے جس میں کوئی چھلا بھی ہو سکتا ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

رحیم گل کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھور کر رہ گیا۔ اس نے جواباً کچھ کہہ کر بات بڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے اے ایس آئی اکرم کو بھی ساتھ لے لیا۔ ہم پولیس کی جیپ میں روانہ ہوئے۔ میں نے محسوس کیا کہ مکرم بیگ اور ہدایت وارثی' دونوں ہی اس وقت غیر رسمی سی حراست میں تھے اور اے ایس آئی اکرم ان پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ ایسا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا کہ مکرم یا ہدایت میں سے کوئی بھاگنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے باوجود اے ایس آئی اکرم کا ہاتھ مستقل طور پر اس کے ہولسٹر پر تھا۔ رحیم گل نے جیپ ڈرائیو کرنے کے لئے کسی کو ساتھ نہیں لیا تھا' وہ خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہدایت کو اب گویا چپ لگ گئی تھی۔

کچھ دیر کے سفر کے بعد مکرم بیگ نے پوچھا "ہم کہاں جا رہے ہیں؟"

"اصولاً تو ہمیں پولیس لیبارٹری جانا چاہئے تھا لیکن ہم وہاں نہیں جا رہے۔" رحیم گل نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

"تو پھر؟" مکرم بیگ گویا ذرا چونک کر بولا۔

"پولیس لیبارٹری کو جدید بنانے کی تھوڑی بہت کوششیں کی گئی ہیں لیکن زمانے کے لحاظ سے وہ اب بھی خاصی فرسودہ ہے اور اس کا ساز و سامان ناقابلِ اعتبار ہے۔ پولیس کے پاس اس قسم کے کاموں کے لئے فنڈز ہی نہیں ہوتے۔" رحیم گل نے بتایا۔

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اگر پولیس والے اپنی تنخواہ محکمے ہی کو عطیے کے طور پر دے دیا کریں اور خود صرف اوپر کی کمائی پر گزارا کریں تو محکمہ بہت سے کاموں میں خود کفیل ہو سکتا ہے اور پولیس والوں کی صحت پر بھی کوئی خاص فرق نہ پڑے' بے چارے خواہ مخواہ ہی تکلفاً اپنی حقیری تنخواہیں وصول کرنے جاتے ہیں۔ تنخواہوں سے ان کے بچوں کا جیب خرچ بھی پورا نہیں ہوتا ہوگا۔"

رحیم گل نے گردن گھما کر اس طرح مجھے دیکھا کہ اگر نظروں سے قتل ہونا ممکن ہوتا تو اس وقت میں تین چار مرتبہ قتل ہو چکا ہوتا۔ میں نے جلدی سے مصنوعی گھبراہٹ کے ساتھ کہا "سامنے دیکھو میری جان! اس رفتار سے ڈرائیونگ کرتے وقت قاتل نظروں سے اِدھر اُدھر نہیں دیکھا کرتے۔ آدمی منزل پر پہنچنے کے بجائے سیدھا اوپر پہنچ جاتا ہے۔ کم از کم میں پولیس کی گاڑی میں مرنا پسند نہیں کروں گا۔"

"اگر تم نے پولیس کے بارے میں اس قسم کی مزید کوئی بکواس کی تو میں لات مار کر تمہیں گاڑی سے باہر پھینک دوں گا۔" وہ غرایا۔

"نازک ٹانگ میں موچ آ جائے گی۔ مجھے لات مار کر پھینکنا اتنا آسان نہیں ہے۔" میں نے اسے مزید چڑایا "ویسے جب تم اپنی بات کرو تو یہ مت کہا کرو کہ لات مار کر پھینک دوں گا بلکہ اس طرح کہا کرو کہ دولتی مار کر پھینک دوں گا۔"

مکرم بیگ دھیرے سے ہنس دیا۔ رحیم گل اس کی طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "آپ اس کی باتوں کا برا مت منایئے گا کچھ سال پہلے تک یہ سرکس میں مسخرہ ہوا کرتا تھا۔ اللہ نے چھپّر پھاڑ کر دولت دے دی سیٹھ بن بیٹھا۔"

"چغد کہیں کے! وہ برا نہیں منا رہے۔ ہنس رہے ہیں۔ برا منانے والے ہنسا نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔

ہدایت بدستور خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت مدھم سی مسکراہٹ تھی اور وہ بھی روح سے خالی تھی۔ مکرم بیگ نے نہایت مہذبانہ انداز میں رحیم گل کو واپس اصل موضوع پر لانے کی کوشش کی "آپ لیبارٹری کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے۔"

"جی ہاں۔ ابھی بتاتا ہوں۔ لیکن اس سے پہلے میں اس مسخرے سیٹھ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔" رحیم گل بولا پھر وہ میری طرف دیکھے بغیر مجھ سے مخاطب ہوا "تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تم جیسے لوگوں نے جو یہ تاثر بنا رکھا ہے تاکہ پولیس کے محکمے میں شاید کوئی ایسا آدمی ہوتا ہی نہیں جو رشوت نہ کھاتا ہو۔ یہ تاثر درست نہیں ہے۔ میں اپنی صفائی تو خیر پیش کرنا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔ لیکن تمہیں کبھی چند منٹ کی فرصت ملے تو میرے تھانے میں آنا۔ میں تمہیں ایک کانسٹیبل سے ملواؤں گا جو پانچ وقت کا نمازی ہے' شرعی داڑھی رکھے ہوئے ہے اس نے زندگی میں کبھی رشوت نہیں کھائی اور اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ وہ ایک کچی بستی کی جھونپڑی میں رہتا ہے اور اس کے بچے اکثر اوقات چٹنی سے روٹی کھاتے ہیں مگر اس دور میں اور ان حالات میں بھی اس کا ایمان کبھی متزلزل نہیں ہو سکا۔"

"میرے خدا۔" میں نے بے اختیار ٹھنڈی سانس لی "نیک لوگوں کے یہی حالات سن کر تو باقی لوگوں کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ لالچ کے عفریت کے سامنے بے بس ہو جاتے ہیں لیکن خیر۔۔۔۔ ایسے بے مثال لوگوں کو اوپر والا نہ جانے کیسے عظیم الشان صلے سے نوازے۔ شاید ایسے اِکّا دُکّا لوگوں کی وجہ سے ہی تمہارا محکمہ ابھی تک قائم ہے ورنہ شاید اب تک تو ڈاکو' بدمعاش اور دہشت گرد تم لوگوں کا آملیٹ بنا کر کھا چکے ہوتے۔"

مکرم بیگ کو شاید میرے ارشاداتِ عالیہ اور پولیس کے حالات وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ قدرے بے چینی سے پہلو بدل کر ملائمت سے بولا "اگر آپ پولیس لیبارٹری کے حال سے ایسے ہی غیر مطمئن ہیں تو پھر اس کے رزلٹ پر کیسے بھروسا کیا جا سکتا ہے؟"

"یہی تو میں بتانے لگا تھا۔" رحیم گل بولا "اس وقت ہم پولیس لیبارٹری نہیں جا رہے ہیں۔ ایک بہت اعلیٰ' جدید اور مہنگی قسم کا کمیونٹی اسپتال اس شہر میں موجود ہے۔ اس کی لیبارٹریز بڑی عمدہ اور جدید قسم کی ہیں۔ بعض نازک اور خاص معاملات میں ہم ان کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور اس کے لئے معاوضہ ادا کرتے ہیں۔ اپنی لیبارٹری اور سرکاری اسپتالوں کے علاوہ ان کی رپورٹ بھی ہمارے محکمے میں مستند مانی جاتی ہے۔ اس وقت ہم وہیں جا رہے ہیں۔"

"اوہ" مکرم بیگ نے صرف اتنا کہا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد رحیم گل بولا "میں جس ٹیسٹ کی بات کر رہا ہوں' بیرونی ممالک میں تو یہ آتشیں ہتھیار استعمال ہونے کے ہر متنازعہ کیس میں بیسیوں سال سے ہوتا آ رہا ہے ہمارے ہاں چند سال سے ہی شروع ہوا ہے لیکن بہت کم آفیسر اس سے استفادہ کرتے ہیں۔"

"ہمارے ہاں زیادہ تر پولیس والے ہر کیس میں سب سے زیادہ ڈرائنگ روم لیبارٹری اور چھتر ٹیسٹ یا ڈنڈا ٹیسٹ سے

استفادہ کرتے ہیں۔" میں نے ایک بار پھر لقمہ دیا۔

اس بار رحیم گل نے مجھ سے الجھنے کی کوشش نہیں کی اور سنی ان سنی کردی۔ یہ شاید اس کی نئی حکمتِ عملی تھی۔ مکرم بیگ نے نہایت سنجیدگی سے اس سے پوچھا "کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ کس قسم کا ٹیسٹ ہوتا ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم تو ہے لیکن میں آپ کو بتاؤں گا تو سائنس کے موضوع پر چھوٹا سا لیکچر ہو جائے گا۔ کیا آپ اس قسم کا لیکچر پسند کریں گے؟" رحیم گل بولا۔

"معلومات میں تھوڑا سا اضافہ ہی سہی۔" مکرم بیگ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "آپ ذرا آسان زبان میں سمجھایئے گا۔"

"بات ہی بڑی آسان اور سیدھی سی ہے۔" رحیم گل بولا "جب بھی کسی آتشیں ہتھیار سے فائر کیا جاتا ہے تو نائٹریٹ کے کچھ ذرّات فائر کرنے والے کی ہتھیلی پر جم جاتے ہیں جو آنکھ سے نظر نہیں آتے اور بہت جلد یا آسانی سے صاف بھی نہیں ہوتے۔ پیرافین ٹیسٹ کے ذریعے اصل میں انہی ذرّات کی موجودگی کا پتا چلایا جاتا ہے۔ ہاتھ پر شفاف' فلٹر شدہ اور نیم گرم پیرافین کا اسپرے کیا جاتا ہے حتیٰ کہ اس کی ایک تہ جم جاتی ہے۔ نائٹریٹ کے ذرّات اگر مساموں میں بھی گھس گئے ہوں تو پیرافین کے گرم ہونے کی وجہ سے نکل آتے ہیں اور پیرافین پر چپک جاتے ہیں لیکن اب بھی وہ آنکھ سے نظر نہیں آتے۔ اس پیرافین کی تہ اتار کر ایک اور کیمیکل میں ڈالی جاتی ہے' اس کا نام ذرا مشکل سا ہے اگر آپ کہیں تو وہ بھی بتادوں؟"

"چلیں بتا ہی دیں۔ کیا حرج ہے۔" مکرم بیگ نے جواب دیا۔

میں نے مکرم بیگ سے کہا "آپ اس بے چارے کو اپنی قابلیت جھاڑنے کا پورا پورا موقع فراہم کررہے ہیں' یہ اصل میں صرف یہ ثابت کرنے کی کوشش کررہا ہے کہ پولیس والے اتنے بھی جاہل نہیں ہوتے جتنا انہیں سمجھا جاتا ہے۔"

رحیم گل نے اس بار بھی میری طرف توجہ نہیں دی اور مکرم بیگ کو بتانے لگا "اس کیمیکل کا نام "ڈائی فینی لا مائن" ہے جس میں پیرافین کی جمی ہوئی پپڑیوں کو ڈبویا جاتا ہے۔ ان پپڑیوں پر اگر نائٹریٹ کے ذرّات موجود ہوں تو وہ نیلے ہو جاتے ہیں اور صاف نظر آنے لگتے ہیں اس کا مطلب ہوتا ہے کہ پچھلے چند گھنٹوں کے دوران اس شخص نے فائر کیا تھا۔ بس اتنی سی بات ہے۔ میرا لیکچر ختم۔"

"خیر۔ اتنا ثقیل لیکچر نہیں تھا۔" مکرم بیگ مسکراتے ہوئے بولا "صرف اس کیمیکل کا نام ذرا بھاری بھرکم تھا۔"

چند منٹ بعد ہم لوگ اسپتال پہنچ گئے۔ گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کرکے رحیم گل ہمیں اپنے ساتھ اندر لے گیا۔ اے ایس آئی اکرم پیچھے پیچھے تھا اور اس کا ہاتھ بدستور ہولسٹر پر تھا۔ مجھے ایک آدھ مرتبہ پہلے بھی کسی کی عیادت وغیرہ کے سلسلے میں اس اسپتال میں آنے کا اتفاق ہوا تھا۔ وہ واقعی ترقی یافتہ ممالک کے معیار کا اسپتال تھا۔

گراؤنڈ فلور پر ہی ایک بہت بڑے رقبے میں لیبارٹری پھیلی ہوئی تھی۔ جس میں کاؤنٹروں پر قطار در قطار کمپیوٹرائزڈ مشینیں پھیلی ہوئی تھیں۔ سائنسی آلات بھی جگہ جگہ سر اٹھائے کھڑے تھے اور ان کے درمیان سفید اوورآلز میں اسمارٹ اور چاق و چوبند مرد اور خواتین لیبارٹری ٹیکنیشنز یا پیتھالوجسٹ وغیرہ اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ لیبارٹری کے چاروں طرف شیشے کی دیواریں تھیں۔ اس سے نہ صرف خوب صورتی پیدا ہوگئی تھی بلکہ اسپتال میں آتے جاتے ہوئے تمام لوگ اس جدید لیبارٹری کے نظارے سے مرعوب بھی ہوسکتے تھے۔

رحیم گل نے استقبالیہ پر اپنا مدعا بتایا۔ استقبالیہ کلرک نے فوراً فون پر کسی سے بات کی۔ چند لمحے بعد ہی ایک سوٹڈ بوٹڈ شخص ایک طرف سے لپکا چلا آیا۔ اس کی جیب پر اعجاز احمد کا بیج آویزاں تھا اور عہدہ ڈائریکٹر لیبارٹریز درج تھا۔ رحیم گل نے انگریزی میں اسے اپنی آمد کے مقصد سے آگاہ کیا۔ وہ ہمیں فوراً "اسپیشل روم" میں لے گیا۔ اس سے ملحق ایک ویٹنگ لاؤنج بھی موجود تھا۔

اعجاز احمد نے انٹرکام پر کسی سے رابطہ کیا۔ چند لمحے بعد لیبارٹری ٹیکنیشن آگیا۔ پہلے مکرم بیگ کو ٹیسٹ کے لئے پیش کیا گیا۔ اس کے تمام کوائف درج کئے گئے انہیں کمپیوٹر میں فیڈ کیا گیا۔ پھر ایک مشین سے رحیم گل کی موجودگی میں اس کے ہاتھ پر پیرافین کا اسپرے کیا گیا اور اس نمونے کو ایک جار میں ڈال کر اس پر نام وغیرہ کا جو لیبل چسپاں کیا گیا اس پر رحیم گل کے علاوہ میرے دستخط بھی گواہ کے طور پر حاصل کئے گئے۔ بڑی احتیاط سے سب کام ہو رہا تھا۔

نمونہ لیبارٹری میں چلا گیا اور چند منٹ بعد ہی کمپیوٹر سے چھپی ہوئی رپورٹ کے ساتھ واپس آگیا۔ جس میں ایک مختصر سے جملے میں لفظ "نیگیٹو" نمایاں تھا۔ یعنی مکرم بیگ کے ہاتھ پر بارود یا نائٹریٹ کے ذرّات نہیں پائے گئے تھے۔ مکرم بیگ پہلے بھی کچھ ایسا پریشان نہیں تھا لیکن اس رپورٹ کے بعد تو اس کے چہرے پر باقاعدہ بشاشت آگئی۔

اب ہدایت وارثی کی باری تھی۔ اسی طریقۂ کار کے مطابق اس کا بھی ٹیسٹ لیا گیا۔ چند منٹ بعد رپورٹ آئی تو اس میں لفظ "پازیٹو" نمایاں تھا۔ یعنی اس کے ہاتھ پر نائٹریٹ کے ذرّات پائے گئے تھے۔

"تمہیں یقین ہے کہ رپورٹ بالکل درست ہے؟" رحیم گل نے لیبارٹری ٹیکنیشن سے پوچھا۔

جواب اس کے بجائے ڈائریکٹر نے دیا "آپ کو معلوم ہی ہے آپ کے محکمے کے لئے ہمارے ہاں رپورٹ کتنی احتیاط سے تیار کی

جاتی ہے اس میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تجزیہ خود چیف پیتھالوجسٹ نے کیا ہے۔"

ہدایت وارثی اس وقت میرے قریب بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا اور وہ چکرا کر مجھ پر لڑھک گیا۔ اسپتال میں ایک نئی بھاگ دوڑ شروع ہوگئی۔ ہدایت کو اسٹریچر پر ڈال کر ایمرجنسی وارڈ میں لے جایا گیا۔ دو تین ڈاکٹر آگئے لیکن ہدایت کو چار پانچ منٹ بعد ہی ہوش آگیا اور وہ ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود خود ہی اٹھ بیٹھا۔

اب اس کی حالت بہتر نظر آرہی تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کسی صدمے یا اندیشے کی انتہا سے گزر جانے کے بعد پُرسکون ہو جاتا ہے۔ شاید اس کے لاشعور میں یہ خیال ہوتا ہے کہ جو مصیبت سر پر پڑنا تھی وہ تو پڑ ہی گئی ہے اسے تو اب بھگتنا ہی پڑے گا خواہ مخواہ غم و تشویش سے ہلکان ہونے کا کیا فائدہ۔ شاید ہدایت کی کیفیت کچھ اسی قسم کی تھی۔

رحیم گل نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ ساتھ چلنے کے لئے تیار تھا؟ اس نے اثبات میں جواب دیا۔ ڈاکٹروں نے بھی اجازت دے دی تاہم وہ اسے ایک آدھ انجکشن لگانے سے باز نہیں رہے۔ کچھ دیر بعد ہم گاڑی میں بیٹھے واپس جا رہے تھے' واپسی کا سفر خاصی سوگواری خاموشی کے ساتھ طے ہوا۔

مکرم بیگ کے اپارٹمنٹ میں واپس پہنچ کر رحیم گل نے وہاں موجود اکلوتی پُراسراری شخصیت کو ایک طرف لے جاکر رازدارانہ سے انداز میں کچھ مشورہ کیا۔ پھر واپس آکر ہدایت سے مخاطب ہوا "مجھے افسوس ہے مسٹر وارثی! لیکن مجھے بہرحال آپ کو جج صاحب کے قتل کے الزام میں گرفتار کرنا پڑے گا۔"

"ان رسمی الفاظ کی کیا ضرورت ہے انسپکٹر صاحب!" ہدایت قدرے تلخی سے بولا "میں تو کافی دیر سے خود کو گرفتار ہی سمجھ رہا ہوں۔"

رحیم گل نے دو پولیس والوں کو بلایا اور ہدایت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "انہیں ہتھکڑی لگا کر نیچے لے جاکر گاڑی میں بٹھاؤ۔ لیکن دیکھو کوئی بدتمیزی یا سختی نہ کرنا۔"

پولیس والے اسے ہتھکڑی لگا کر لے گئے۔ جاتے وقت اس نے جن نظروں سے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا وہ بلاشبہ دل میں خلش پیدا کردینے والی تھیں۔ میں جواباً معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔

مکرم بیگ بولا "میں تو اب خود کو آپ لوگوں کے شبے سے آزاد سمجھوں نا؟"

"جی ہاں لیکن جب بھی پولیس یا عدالت کو آپ کی گواہی کی ضرورت پڑی تو آپ کو آنا پڑے گا۔" رحیم گل نے جواب دیا۔

"میں نے اب تک ہر طرح سے تعاون کیا ہے اور آئندہ بھی میں ہر طرح سے تعاون کے لئے تیار رہوں۔" مکرم بیگ خوش خلقی سے بولا "اب مجھے یہ کرنا پڑے گا کہ دو تین ماہ تک ملک سے باہر نہیں جاؤں گا تاکہ آپ کے یا عدالت کے کسی بھی اچانک بلاوے پر حاضر ہوسکوں۔"

"ہاں بہتر یہی ہے۔" رحیم گل بولا "بجائے اس کے کہ ہمیں آپ کا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل کرانا پڑے' یہ زیادہ اچھا ہوگا کہ آپ اپنی خوشی سے ہی ملک میں رہیں۔"

"جو حکم سرکار کا۔" مکرم بیگ سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے بولا "میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔"

رحیم گل نے اپنے ماتحتوں کو چلنے کا حکم دیا پھر مجھ سے مخاطب ہوا "اگر تمہارے پاس گاڑی نہیں ہے تو میں تمہیں ہوٹل تک چھوڑ دوں گا۔" اس کا لہجہ کسی حد تک دوستانہ ہی تھا۔

"شکر ہے میرے پاس اس وقت گاڑی موجود ہے اور میں تمہارا احسان لینے سے بچ گیا ہوں۔" میں نے گویا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"کس کس احسان سے بچو گے؟" وہ شاید اپنی مسکراہٹ کو شاطرانہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "جس قسم کے کاموں میں تم ٹانگ اڑانے لگے ہو ان میں تو تمہیں قدم قدم پر ہمارا احسان لینا پڑے گا۔"

"خدا مجھے ایسے وقت سے بچائے۔" میں نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر دعا کی۔

وہ مسکراتا ہوا اپنے آدمیوں اور اس پُراسراری شخصیت کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد یکدم ہی فلیٹ میں سناٹا چھا گیا حالانکہ ابھی ہم پانچ افراد وہیں موجود تھے یعنی میں' مکرم بیگ' اس کے دو گن مین اور وہ شخص جو غالباً اس کا کیشئر' اکاؤنٹنٹ یا منیجر قسم کی چیز تھا۔

میں اور مکرم بیگ چند لمحے خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر مکرم بیگ مسکراتے ہوئے بولا "خدا کا شکر ہے اس چکر سے خاصی آسانی سے میری جان چھوٹ گئی۔ ورنہ میں تو پریشان ہی ہوگیا تھا کہ بیٹھے بٹھائے یہ کیا مصیبت گلے پڑ گئی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ میرا کام ختم ہوگیا یا نہیں؟" میں نے یہ سوال گویا اپنے آپ سے کیا تھا۔

"ظاہر ہے ختم ہوگیا۔" مکرم بیگ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا "میں نے آپ کی مدد صرف اس لئے حاصل کی تھی کہ جج صاحب کے قتل کا الزام مجھ پر نہ آنے پائے۔ متعلقہ پولیس آفیسر نے مجھے شک وشبے سے بالاتر قرار دے دیا ہے۔ میرا مقصد پورا ہوگیا ہے۔ اب اگر محض ایک گواہ کے طور پر مجھے کبھی تھانے کچہری میں پیش ہونا پڑا تو ہو لوں گا۔ ایسے معاملات میں مدد کے لئے میرے پاس بہت سے وکیل موجود ہیں۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ میں نے چند گھنٹے میں بیس لاکھ روپیا کما لیا ہے۔" میں نے اس سادہ لوح دیہاتی کی سی حیرت سے کہا

جس کی کوئی بڑی لاٹری نکل آئی ہو۔

"افضل صاحب! آپ ایک بڑے بزنس مین ہیں آپ کو تو اس پر حیران نہیں ہونا چاہئے۔" مکرم بیگ گویا میری حیرانی پر حیران ہوتے ہوئے بولا "بڑے بزنس میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ بعض اوقات راہ چلتے لاکھوں کا فائدہ یا لاکھوں کا نقصان ہو جاتا ہے۔ میں ایک بار جہاز میں سنگاپور سے لندن جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک بڑا پاکستانی صنعت کار سفر کر رہا تھا۔ یوں سمجھ لیں وہ اس وقت کا ٹیکسٹائل میگنٹ تھا اور ان دنوں ہماری ٹیکسٹائل انڈسٹری کے حالات بھی بہت اچھے تھے۔ اسے ایک کارخانہ لگانے کے لئے خاص قسم کی مشینری کی ضرورت تھی۔ وہ چاہ رہا تھا کہ نئی جیسی لیکن تھوڑی بہت چلی ہوئی مشینری مل جائے۔ اس میں اسے بہت فائدہ تھا۔ اتفاق سے میری چند دن پہلے ہی جاپان کے ایک صنعت کار سے سنگاپور میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس کی کمپنی کے پاس بالکل وہی مطلوبہ مشینری معمولی استعمال شدہ حالت میں پڑی تھی اور یوں سمجھئے کہ وہ اس سے جان چھڑانا چاہتا تھا لیکن ابھی اس نے اس کے لئے کوششیں شروع نہیں کی تھیں۔ اتفاق سے اس کا وزیٹنگ کارڈ میرے پاس موجود تھا۔ میں نے پاکستانی صنعت کار کو شیشے میں اتارا۔ لندن سے بھاگا بھاگا دوسرے روز پاکستان پہنچا۔ اسی آفس میں بیٹھ کر میں نے صرف چند فون اور چند فیکس کئے۔ اپنا کمیشن پکا کرتے ہوئے اور دونوں کے فائدے کا خیال رکھتے ہوئے میں نے سودا کرایا اور صرف تین دن کی گفت و شنید میں مجھے تین ملین ڈالر مل گئے۔ روپے نہیں امریکی ڈالر۔"

وہ مربیانہ سے انداز میں مسکرایا "تو جناب! بزنس تو اسی کو کہتے ہیں۔ بلکہ میں تو اسے کارڈ جنریٹیڈ بزنس کہتا ہوں۔ یعنی محض کسی کا وزیٹنگ کارڈ آپ کے پاس موجود ہونے کی وجہ سے کوئی بڑی بزنس ڈیل ممکن ہو جاتی ہے۔ آپ کے ساتھ بھی میرا معاملہ شاید صرف اس لئے ہی ممکن ہو سکا کہ جج صاحب کی جیب سے آپ کا کارڈ نکل آیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ پیر دانش کے معاملے میں آپ نے کیا کیا تھا۔ اتفاق سے مجھے اس کے کیس کے بارے میں ساری معلومات حاصل تھیں، مجھے اندازہ تھا کہ اس میں آپ نے کتنا اہم کردار ادا کیا تھا۔ اسی لئے مجھے آپ کی مدد حاصل کرنے کا خیال آیا اور میرا فیصلہ واقعی بڑا کارآمد ثابت ہوا۔"

"لیکن یہ درحقیقت بزنس تو نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"میں تو ایسی ہر ڈیل کو بزنس ہی سمجھتا ہوں جس میں کم از کم کسی ایک پارٹی کو ہی کچھ فائدہ پہنچ جائے۔" مکرم بیگ بولا "اگر یہ بزنس نہیں تھا تب بھی مجھے اس پر خوشی ہے آپ کی آمد میرے لئے بھاگوان ثابت ہوئی۔ دونوں ہی کو کچھ فائدہ پہنچ گیا۔ آپ کو آپ کے وقت کی قیمت مل گئی اور میں ایک بڑے چکر میں ملوث ہونے سے بال بال بچ گیا۔"

"چلیں۔ آپ خوش ہیں تو میں بھی خوش ہو جاتا ہوں۔"

میں نے اجازت چاہی تو وہ لفٹ تک مجھے چھوڑنے [آیا] اور مضبوطی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولا "رابطہ رہنا چاہئے افضل صاحب!"

"رابطہ یقیناً رہے گا۔ کام نمٹ جانے کے بعد بھی انسان [کے] مراسم تو ختم نہیں ہو جانے چاہئیں۔" میں نے اس کی تائید کی [اور] لفٹ آنے پر نیچے آگیا۔

شفیع شاہ بے چارہ اپنی ڈیوٹی پر موجود تھا۔ ہوٹل پہنچ کر میں [نے] صبح تک کے لئے اسے گھر جانے کی ہدایت کی اور اوپر آکر اپنے کمرے میں پہنچ کر سو گیا۔

○☆○

صبح اپنے کان کے قریب ٹھک ٹھک کی آواز سن کر میری آنکھ کھلی لیکن بیدار ہونے کے بعد اندازہ ہوا کہ آواز کان کے قریب سے نہیں آرہی تھی بلکہ کوئی دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ نیند سے بوجھل حواس کے ساتھ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو حواس سے دھند یکدم چھٹ گئی۔ سامنے نیلم کھڑی تھی۔

وہ کل شام جیسی تروتازہ اور سراپا قیامت تو نہیں لگ رہی تھی لیکن اب بھی کچھ کم پرکشش نہیں تھی۔ اس وقت وہ کچھ پریشان نظر آرہی تھی۔ میک اپ معمولی سا تھا اور خاص اہتمام سے نہیں کیا گیا تھا۔ آنکھوں میں شاید شب بیداری کی سرخی تھی اور وہ غالباً عجلت میں تیار ہو کر آئی تھی تاہم اس کے وجود سے کسی اچھے کلون کی مدھم سی مہک ضرور پھوٹ رہی تھی۔

میں نے کچھ پوچھے بغیر اسے اندر آنے کے لئے راستہ دیا۔ وہ معمولی حد تک فربہی کی طرف مائل ایک دراز قد عورت تھی لیکن ہوا کے ایک نہایت سبک خرام جھونکے کی طرح اندر آگئی۔ میں نے دروازہ آہستگی سے مقفل کر دیا۔ پھر گھوم کر اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا لیکن وہ کمرے کی تنگ راہداری میں ہی تن کر کھڑی تھی اور اپنے بھرپور وجود سے گویا میرا بھی راستہ روکے ہوئے تھی۔

"ہدایت کو گرفتار کروا کے آپ کو کیا مل گیا؟" سوال نہایت نرم لہجے میں کیا گیا تھا، اس کی آنکھوں یا الفاظ میں میرے لئے نفرت نہیں تھی لیکن یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ مجھ سے خفا تھی۔

"تم آگے تو چلو۔ بیٹھو تو سہی۔" میں نے صوفوں کی طرف اشارہ کیا۔

"دل تو نہیں چاہ رہا۔ لیکن میں مجبور ہوں، بیٹھ جاتی ہوں۔" وہ پلٹ کر اپنی مخصوص حشر خیز سی چال کے ساتھ ایک صوفے کی طرف بڑھی۔

"اتنے دردناک انداز میں اپنی مجبوری کا اعلان کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "تمہیں یہ خیال کیونکر آیا کہ ہدایت کو میں نے گرفتار کرایا ہے؟"

"ظاہر ہے وہ آپ کے ساتھ ہی ہوٹل سے گیا تھا۔ اس کے

[بعد] اس کا تھانے سے فون آیا کہ وہ گرفتار ہو گیا ہے۔ میں اس سے [کیا] نتیجہ اخذ کرتی؟"

"اس نے تمہیں نہیں بتایا کہ وہ کن حالات میں اور کن [وار]داتوں کی بنا پر گرفتار ہوا؟" میں نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے [پو]چھا۔

"تھانے والوں نے اسے لمبی بات کرنے کی اجازت نہیں [دی تھی]۔" نیلم نے بتایا۔

"اس کے باوجود تم نے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ اسے میں نے [گ]رفتار کرایا ہوگا؟" میں نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جھانکا [جن] میں اس وقت گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔

"میری سمجھ میں تو یہی بات آئی ہے۔" وہ اب کچھ گڑبڑا کر [بو]لی۔

"میری معلومات کے مطابق تم نے خاصے دھکے کھائے ہیں۔ [ز]ندگی کو قریب سے دیکھا ہے لیکن میرا خیال ہے تمہیں اب بھی کچھ زیادہ عقل نہیں آئی۔ تمہیں پہلے جا کر اس سے ملنا چاہئے تھا۔ [ا]صل بات معلوم کرنی چاہئے تھی۔ پھر مجھ پر کوئی الزام عائد کرنا [چا]ہئے تھا۔" میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔

اب وہ نرم پڑ گئی اور حقیقتاً مجبور سے لہجے میں بولی "میں [تھا]نے ہی سے آرہی ہوں۔ انہوں نے مجھے اس سے ملنے نہیں دیا۔ [م]عاملہ بھی تو بہت سنگین ہے۔ اس پر جج عبدالسلام صاحب کے قتل کا الزام ہے۔ مجھے پہلے کسی بڑے فوجداری وکیل سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا میں کس سے رابطہ کروں۔" اس کی آواز بھرا سی گئی۔

"تم واقعی ہدایت کے لئے بہت پریشان ہو؟" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"تمہیں کچھ شک ہے؟" اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا "اگر میں بال بکھرائے چیختی چلاتی اور دہائی دیتی یہاں نہیں پہنچی تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں پریشان نہیں ہوں۔ مجھے اپنے آپ کو بیچ کر بھی اسے چھڑانا پڑے تو میں اس کے لئے تیار ہوں۔"

وہ اچانک اٹھ کر میرے قدموں میں آبیٹھی۔ دونوں ہاتھ اس نے میرے گھٹنوں پر رکھ دیئے اور التجائیہ لہجے میں بولی "پلیز مجھے بتاؤ یہ سب کیسے ہوا؟"

میں ایک لمحہ اس کے صبیح چہرے اور تھرتھراتے ہونٹوں کو دیکھتا رہا پھر میں نے نہایت دھیمے لہجے میں اسے سب کچھ بتا دیا۔ اس کے صبیح چہرے پر تمتماہٹ آگئی۔ وہ تند لہجے میں بولی "یہ کوئی سازش ہے، ہدایت جج صاحب کو قتل نہیں کر سکتا۔ اگر اس نے قتل کیا ہوتا تو یہ بات مجھے ضرور معلوم ہوتی حتیٰ کہ اس نے اگر ایسا ارادہ بھی کیا ہوتا تب بھی مجھے معلوم ہوتا۔ اس کی کوئی بات مجھ سے چھپی رہ ہی نہیں سکتی۔"

"خواہ وہ اس کی زندگی اور موت کا معاملہ ہو؟" میں نے جاننا چاہا۔

"ہاں۔ خواہ وہ اس کی زندگی اور موت کا معاملہ ہو۔" وہ اعتماد سے بولی۔

پھر اس نے کچھ اور قریب کھسکتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ اپنے گداز ہاتھوں میں تھام لئے اور مجھے اپنے اوپر جھکانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "پلیز تم اسے بچانے کی کوشش کرو۔ اس کے عوض میں تمہارے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ میں خود سراپا رضامندی بن کر تمہاری خدمت میں حاضر ہوں۔ اگر تمہیں میری ذات سے کوئی دلچسپی ہے تو میں ہر طرح سے تیار ہوں۔"

میری دھڑکنیں بے قابو ہونے لگی تھیں۔ میں نے بہ مشکل انہیں قابو میں رکھا اور آہستگی سے اپنے ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر انہیں سلیپنگ گاؤن کی جیبوں میں ٹھونستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس سے دو قدم دور چلا گیا۔ وہ ایک سیل رواں تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ نہ بہا لے جائے۔ اپنی لپیٹ میں نہ لے لے۔

"بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم نے مجھے اتنا گھٹیا آدمی سمجھا۔" میں نے مجروح لہجے میں کہا۔

"گھٹیا آدمی؟" اس نے حیرت سے دہرایا "اس میں گھٹیا پن کی کیا بات ہے؟" میرے لئے یہ ایک اور حیرت تھی کہ اس کے لئے اس میں گھٹیا پن کی کوئی بات نہیں تھی۔

"تمہارے نزدیک اس میں گھٹیا پن کی کوئی بات نہیں کہ میں ایک عورت کو ایک طرح سے بلیک میل کروں؟ اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور اسے ایک سنہری موقع سمجھتے ہوئے اپنے اندر کے شیطان کو بہلانے کی کوشش کروں؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"اگر یہ گھٹیا پن ہے تو معاشرے میں بہت عام ہو چکا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا ہے کہ یہ گھٹیا پن ہے یا بڑھیا پن۔" وہ اپنے لہجے کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے بولی "اس سوسائٹی میں کوئی بھی کام کروانے کے لئے قدم قدم پر رشوت دینا پڑتی ہے۔ بڑے کاموں کے لئے رشوت بھی بڑی ہوتی ہے۔ میں بڑی رشوت دینے کے قابل نہیں ہوں۔ میرے پاس سب سے قیمتی اثاثہ میں خود ہوں۔ اگر میں محسوس کرتی ہوں کہ کہیں میری وجہ سے کوئی اشد ضروری کام نکل سکتا ہے تو میں اپنے آپ کو پیش کر دیتی ہوں۔"

میں نے اس کی طرف پلٹ کر نہیں دیکھا اور سچ مچ تعجب سے کہا "عجیب عورت ہو تم بھی.....!"

"مجھے خود سے زیادہ تم عجیب لگ رہے ہو۔" وہ بولی "میری پیشکش کا کوئی جواب ہی نہیں دے رہے۔ کیا تمہیں میری ذات سے دلچسپی نہیں؟ اس معاملے میں میرے اندازے غلط نہیں ہوتے۔ میں نے تمہاری آنکھوں میں اپنے لئے دلچسپی کی جھلک

دیکھی تھی۔ اب یہ مت کہنا کہ مجھے غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

"نہیں تمہیں غلط فہمی نہیں ہوئی تھی۔ تم جیسی سرد و گرم چشیدہ عورت کو بھلا غلط فہمی کیسے ہو سکتی تھی؟ مرد کی آنکھوں میں دلچسپی کی لہر کو محسوس کرنے کے معاملے میں تو کوئی نوخیز لڑکی بھی کبھی دھوکا نہیں کھاتی۔ ان سگنلز کو ریسیو کرنے کے معاملے میں صنفِ نازک کا نظام بڑا حساس ہوتا ہے۔" میں نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا۔

"تو پھر اب تمہیں کیا ہوا؟" اس نے جاننا چاہا۔

"حیرت ہے اتنی سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی۔" میں نے کھڑکی کے تاریک شیشے سے باہر دیکھتے ہوئے کہا "اگر تمہیں میری ذات میں دلچسپی محسوس ہوئی ہوتی، تم سے دوستی استوار ہوئی ہوتی تو بات کچھ اور ہوتی۔ تمہاری کسی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمہیں رشوت میں وصول کرنا میرے نزدیک بڑا گھٹیا پن ہوگا۔ یہ میرے مزاج کے خلاف ہے۔ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ تم نے مجھے سمجھنے میں غلطی کی ہے۔"

وہ چند سیکنڈ بالکل خاموش رہی۔ میں نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ مجھے دور سے بھی اس کی آنکھوں میں نمی کی جھلملاہٹ نظر آگئی۔ وہ سر جھکا کر گلوگیر سی آواز میں بولی "میں نے اپنے آپ کو تمہاری دوستی اور قربت کے قابل نہیں سمجھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے لئے تمہارے قریب آنے کا کوئی باعزت راستہ بھی کھلا ہے۔"

"اگر تم اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتی تھیں تو پھر اپنے آپ کو میرے سامنے رشوت میں پیش کئے جانے کے قابل بھی مت سمجھو۔ میرے لئے ایسی عورتوں کی بھی کمی نہیں ہے جنہیں اس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے لیکن میرے لئے اس میں کوئی کشش نہیں ہے۔ دوستی اور کسی طرح کا ذہنی تعلق استوار ہونے کے بعد جب دھیرے دھیرے تمام مرحلے طے ہوتے ہیں تو ان میں کسی اور ہی طرح کی سنسنی ہوتی ہے، میرے لئے اس سنسنی میں زیادہ کشش ہے۔"

وہ اٹھ کر میرے قریب آگئی۔ عقب سے اس نے دونوں بازو میرے گلے میں ڈال دیے اور بدلے ہوئے لہجے میں بولی "میں نے واقعی تمہیں سمجھنے میں غلطی کی۔ میں تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا اس میں دراصل میرا بھی قصور نہیں۔ مجھے کبھی زندگی کے نفیس پہلوؤں کی طرف دھیان دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

میں نے اس کی قربت کے خطرناک اثرات سے دھیان ہٹانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "بہرحال تمہاری اور ہدایت کی جوڑی واقعی بڑی عجیب ہے۔ ایک طرف تم اس سے اتنی محبت کرتی ہو، اس سے وابستہ ہو، اپنے آپ کو اس کے لئے وقف کر رکھا ہے دوسری طرف اتنی آسانی سے کسی اور کی خوابگاہ کی زینت بننے کی پیشکش بھی کر دیتی ہو۔ کچھ عجیب سی بات ہے۔"

"ہاں وہ تو ہے۔" اس نے تسلیم کیا "ہمارا تعلق اپنی جگہ گہرا ہے لیکن اس میں ایک دوسرے کی شخصی آزادی اور پسند ناپسند جوں کی توں محفوظ ہے۔ تعلق اپنی جگہ برقرار رہتا ہے رہتا ہے۔ اس میں کوئی فرق نہیں آنے پاتا لیکن بیچ میں اگر میرا کسی پر دل آجائے، کوئی مجھے اچھا لگ جائے تو میں بہک جاتی ہوں۔ ہدایت اس کا برا نہیں مناتا اور اگر ہدایت اس عرصے میں کبھی کسی سے رسم و راہ بڑھانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو روایتی عورتوں کی طرح ہنگامہ برپا کرنا تو درکنار آنکھ اٹھا کر دیکھتی تک نہیں۔"

"بہت خوب۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"بعض اوقات تو ہدایت کا کہیں کوئی کام اٹک جاتا ہے اسے اندازہ ہوتا ہے کہ مجھ جیسی عورت کے جانے سے اس کا کام نکل جائے گا تو وہ خود مجھے متعلقہ آدمی کے پاس بھیج دیتا ہے۔ بہرحال کام نکلوا کر آتی ہوں۔ ہدایت کو اس سے غرض نہیں کہ کس طرح نکلوا کر لائی ہوں۔"

"معلوم تو ہوتا ہی ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"اس کے باوجود تمہیں اس سے محبت ہے؟" میرے لہجے میں حیرت برقرار تھی۔

"محبت؟" وہ ایک لمحے کے لئے جیسے سوچ میں پڑ گئی "شاید محبت نہیں ہے، مجھے کبھی اس پہلو پر بھی غور کرنے کی فرصت نہیں ملی۔" اس نے اعتراف کیا "شاید یہ ضرورت ہے، شاید ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے ہیں۔ شاید ہم ایک دوسرے کے اتنے زیادہ اچھی طرح مزاج آشنا ہو گئے ہیں کہ اب ہماری کسی اور کے ساتھ بن ہی نہیں سکتی۔ ہم ایک دوسرے کی پناہ گاہ، ایک دوسرے کی ڈھال ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر ہمیں زندگی زیادہ مشکل لگتی ہے۔"

میں نے محض ہنکارا بھرنے پر اکتفا کیا۔ اس نے مجھے بازوؤں کے حلقے سے آزاد کر دیا تھا۔ میرے لئے سانسوں کی آمدورفت آسان ہو گئی تھی۔ میں واپس صوفے پر جا بیٹھا۔ وہ بھی میرے مقابل آبیٹھی۔ اب وہ بالکل پُرسکون نظر آرہی تھی۔

"ہدایت رہا ہو جائے گا نا؟" اس نے کچھ اس طرح پوچھا جیسے اب تک میں اسے یہی اطمینان دلا رہا تھا۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، میں نے ابھی تک ایسی کوئی بات نہیں کی۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا تم اس سلسلے میں میری کوئی مدد نہیں کرو گے؟" اس کے لہجے میں مایوسی در آئی۔

"اگر اس نے یہ جرم کیا ہے تو پھر میں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔" میں نے کہا "میرا نظریہ ہے کہ جس نے جرم کیا ہے اسے سزا ضرور ملنی چاہئے۔ چاہے وہ میرا یا میری محبوبہ کا بھائی ہی کیوں نہ ہو۔ بلکہ سچ پوچھو تو اس سلسلے میں میرا ایک اور نظریہ درحقیقت یہ ہے۔"

"وہ بھی بیان کر دو۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"وہ یہ کہ اگر ہماری عدالتیں اور ہمارا نظام انصاف اپنی خامیوں، مجبوریوں اور ناکارہ پن کی وجہ سے کسی مجرم کو اس کے جرم کی سزا نہ دے سکے تب بھی اسے کسی اور ذریعے سے سزا ملنی چاہئے۔ مجرم کو سزا نہ ملنے کا عمل بڑی قیامت برپا کرتا ہے رفتہ رفتہ معاشرے پر مجرموں کی حکمرانی قائم ہو جاتی ہے۔ یہ دنیا پہلے ہی بڑی حد تک بدصورت ہو چکی ہے۔ مجرم اسے اور بھی زیادہ بھیانک بنا دیتے ہیں۔"

"آئی ایم سوری۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بڑے مصلحِ قوم ہو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "طنز فرمانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے مصلحِ قوم ہونے کا دعویٰ ہرگز نہیں ہے۔ مصلحِ قوم بن کر بھلا میں کر بھی کیا سکتا ہوں؟ یہاں کوئی تنہا شخص کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میں تو صرف اپنی تسکین اور اپنے اطمینان کی خاطر کچھ اپنے اصولوں کے تحت زندہ رہنا چاہتا ہوں اور جس معمولی سی حد تک بھی میرا بس چلتا ہے وہاں تک کچھ نہ کچھ کرتے رہنا چاہتا ہوں۔ تاکہ مرتے وقت مجھے یہ احساس نہ ہو کہ دوسرے ان گنت لوگوں کی طرح میں بھی بھیڑ بکریوں کی سی زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہوں۔"

"کیا پولیس کی طرح تم نے بھی فرض کر لیا ہے کہ ہدایت مجرم ہے؟" اس نے میرے فلسفۂ حیات میں کوئی دلچسپی محسوس کئے بغیر کہا۔

"اطمینان رکھو۔ پولیس آج ہی ہدایت کو پھانسی تو نہیں چڑھوا دے گی۔ ابھی تو مزید تفتیش ہوگی۔ کیس چلے گا۔ نہ جانے کیا کیا نئی باتیں سامنے آئیں۔ تبھی کوئی حتمی رائے قائم کرنا ممکن ہوگا۔" میں نے کہا۔

"فی الحال تمہاری رائے حتمی نہیں ہے؟" اس نے جاننا چاہا۔

"میں اتنی جلدی حتمی رائے قائم نہیں کرتا۔" میں نے جواب دیا۔ تب اسے گویا کچھ اطمینان ہوا مگر چند لمحے بعد ہی اسے ایک اور طرح کی تشویش نے آن گھیرا۔

"اگر پولیس نے اسے مار پیٹ کر۔۔۔ اور اپنے دوسرے بدنام زمانہ ہتھکنڈے استعمال کر کے اس سے اعترافِ جرم کرا لیا تو کیا ہوگا؟" اس نے گویا ہولتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی خوش قسمتی ہے کہ اس وقت وہ ایک ایسے پولیس آفیسر کی تحویل میں ہے جو کم از کم ہدایت جیسے لوگوں کے ساتھ اس قسم کے طریقے استعمال نہیں کرے گا۔ وہ صرف پیشہ ور، سفاک بدمعاشوں اور اپنے آپ کو ہیرو سمجھنے والے قاتلوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرتا ہے ورنہ بڑے سائنٹفک طور، طریقوں پر چلنے والا آدمی ہے۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔

"میری تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس قسم کے کیس کے سلسلے میں مجھے کس وکیل سے ملنا چاہئے۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "ایک فوجداری وکیل ہمارے جاننے والے ہیں۔ میں ان کی طرف سے ہوتی آئی ہوں لیکن اس وقت وہ بھی اپنے آفس میں نہیں تھے۔ ان کے آفس کے دروازے پر پہنچ کر مجھے یاد آیا کہ یہ وقت تو ان کے عدالت میں رہنے کا ہوتا ہے۔ پریشانی میں مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔"

"کیا نام ہے ان کا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اتنے بڑے یا معروف وکیل نہیں ہیں۔ لیکن ہمارے جاننے والے وکیلوں میں بس وہی ہیں جو فوجداری مقدمات لڑتے ہیں۔" اس نے مجھے نام بتایا۔ وہ اگر بڑے یا معروف وکیل بھی ہوتے تب بھی میرے لئے ان کا نام شناسا نہ ہوتا۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "تم اپنا فون نمبر وغیرہ میرے پاس چھوڑ جانا۔ میں اپنے ایک آدمی سے کہوں گا وہ تمہارے لئے بندوبست کر دے گا اور تمہیں فون کر کے بتا دے گا کہ فلاں وکیل سے جا کر مل لو۔" میرا ارادہ تھا کہ اس سلسلے میں شفیع شاہ کو ہدایت کروں گا، وہ ہر شعبۂ زندگی کے لوگوں کو مجھ سے بہتر جانتا تھا۔

"میں اور ہدایت زیادہ لمبی چوڑی فیس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔" وہ بولی۔ لہجے میں بدستور پریشانی تھی۔

"تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔

تب وہ مطمئن ہو گئی۔ اتنی دیر میں پہلی بار اس کے چہرے پر زندگی کی اصل چمک نمودار ہوئی جس نے اس کی دلکشی کو بڑھا دیا۔ وہ بہت مختلف مسکراہٹ کے ساتھ بولی "تم میری اور ہدایت کی جوڑی کو عجیب کہہ رہے تھے۔ جبکہ میرا خیال ہے تم خود بہت عجیب انسان ہو۔"

"یہ بات اتنے بہت سے لوگوں نے مجھ سے کہی ہے کہ اب مجھے تھوڑا تھوڑا یقین آنے لگا ہے کہ شاید میں واقعی ایک عجیب انسان ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ ایک بار پھر اٹھ کر میرے قریب قالین پر آبیٹھی اور اس کے بازو میرے گھٹنوں پر آن ٹکے۔ اس کی غزالی آنکھیں جو کچھ دیر پہلے تک وحشت زدہ دکھائی دے رہی تھیں اب کچھ مخمور سی دکھائی دینے لگی تھیں۔

میں نے اس کی پیش قدمی کو روکتے ہوئے کہا "اب پھر شکر گزاری کا اظہار نہ شروع کر دینا۔ تمہیں شاید شکر گزاری کے اظہار کا ایک ہی طریقہ آتا ہے۔"

"اس سے زیادہ حسین اور دلچسپ کوئی طریقہ ہے تو مجھے بتا دو۔ میں اس پر عمل کر لوں گی۔" وہ بوجھل لہجے میں بولی۔

میں نے خود کو لاجواب محسوس کیا تاہم میں نے ایک بار پھر

اسے اپنا فلسفہ یاد دلانے کی کوشش کی "لیکن مجھے نوازشات وہ اچھی لگتی ہیں جن کے پیچھے کوئی غرض، کوئی مجبوری، کوئی سودے بازی کام نہ کررہی ہو۔ میں خود کو بلیک میلر محسوس کرنا نہیں چاہتا۔ ہر قدم دل کے کہنے پر اٹھے تو بات کچھ اور ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھتے ہوئے بولی "آئندہ میں اس وقت تمہارے قریب آؤں گی جب یہ ضرورت اور مجبوری کا بحران درمیان سے ہٹ چکا ہوگا۔ اس وقت میں ایک سیلاب کی طرح ہوں گی اور تمہیں بہا کرلے جاؤں گی، اس وقت مجھے روکنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گی۔"

"میں تو پہلے ہی تمہارے بارے میں محسوس کرچکا ہوں کہ تم ہر حال میں ہی ایک سیلاب کی طرح ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ایک عورت جس کی جوانی ڈھلنے کا دور شروع ہوچکا ہو۔ اس میں اتنی بلاخیزی میں نے کم ہی دیکھی ہے۔"

"عمر کا یہی دور تو سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے مری جان! نوجوانی سے بھی زیادہ۔" وہ میرا رخسار تھپتھپاتے ہوئے کچھ بھاری آواز میں بولی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ میرا بیٹھے رہنا ہی بہتر تھا، دروازے پر رک کر وہ پلٹتے ہوئے بولی "مجھے اور میرے ہدایت کو بھول مت جانا۔" پھر وہ رخصت ہوگئی۔

مجھے جو کچھ کرنا تھا وہ میں مکرم بیگ کے لئے کرچکا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ہدایت کے لئے میں کیا کرسکتا تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ اسے کم از کم ایک اچھا وکیل فراہم کردینے میں تو کوئی حرج نہیں تھا۔ آگے اس کی قسمت۔ یا اس کے اعمال!

تاہم اتنا ضرور تھا کہ اس سلسلے میں میرے ذہن میں کوئی خلش موجود تھی۔ میں پوری طرح مطمئن نہیں تھا۔ کوئی غیبی قوت مجھے بتا رہی تھی کہ ابھی اس سلسلے میں مجھے اور بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

یہی خلش ذہن میں لئے میں تیار ہوا اور ناشتا کرنے لگا۔ ناشتے کے بعد میں نیچے آفس میں جانے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف رحیم گل تھا۔ اس کی آواز پہچان کر میں نے چہکنے کے سے انداز میں کہا "کیا حال ہے پیارے دشمن جاں! میں تمہیں فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ تمہارا فون آگیا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا ایسے موقعوں پر کیا محاورہ بولا جاتا ہے؟"

"محاورے کو گولی مارو۔ تمہیں یقیناً کوئی نئی تکلیف شروع ہوگئی ہوگی جو تم مجھے فون کرنے کا سوچ رہے تھے؟"

"تکلیف میں تمہیں فون کرنے کا کون سوچ سکتا ہے پیارے! تم تو خود ایک تکلیف ہو۔" میں نے جواب دیا "میں تو بے چارے ہدایت وارثی کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا کہ اس کا کیا حال چال ہے۔ تمہارے زیرِ سایہ اس کی شب غم کیسی گزری؟"

"وہ بالکل ٹھیک ٹھاک اور خیریت سے ہے اور تمہاری خداوند کریم سے نیک چاہتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"پولیس کی تحویل میں آدمی بھلا خیریت سے کیسے ہوسکتا کوئی اس سے چھوٹا جھوٹ بولو یار؟"

"پولیس کے بارے میں زہر اگلنے کے سوا ابھی کبھی کام کرلیا کرو۔" وہ نرمی سے بولا۔

"ایک پولیس والے سے پولیس کے سوا بھلا کس موضوع بات کی جاسکتی ہے؟ تم بتاؤ تم نے کیسے فون کرلیا؟ کل تو سیدھا بات نہیں کررہے تھے۔ خود کو واقعی کوئی بہت بڑا افسر سمجھ تھے۔" میں نے شکوہ کیا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "لوگوں کے سامنے اسی طرح ہے یار! ورنہ لوگ سمجھیں گے کہ اس بدمعاش قسم کے سیٹھ ایک شریف قسم کے پولیس آفیسر کو اپنی دوستی کے جال میں پھنسا رکھا ہے، معلوم نہیں اس سے کیا کیا ناجائز کام لیتا ہوگا۔ لوگوں کے سامنے خود کو تمہارا دوست ظاہر کرکے اپنا امیج خراب کرنا نہیں چاہتا۔"

"اتنی زیادہ مزاحیہ باتیں مت کیا کرو یار! ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑنے لگتے ہیں۔" میں نے کراہ کر کہا "اس سے زیادہ مزاح برداشت نہیں کرسکوں گا۔ اب سنجیدگی سے بتاؤ ہدایت وارثی سے مزید کوئی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟"

"یہی پوچھنے کے لئے تو میں نے تمہیں فون کیا ہے کہ تمہیں اس کیس کے سلسلے میں کوئی نئی بات معلوم نہیں ہوئی؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"عجیب آدمی ہو یار!" میں نے ذرا ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا "پولیس والے تم ہو یا میں؟ اب اپنے حصے کے کام بھی مجھ سے لوگے؟ کیس حل کرنا تمہارا کام ہے۔ میرا نہیں۔"

"لیکن اس معاملے میں تو تم پولیس سے زیادہ مستعدی دکھا رہے ہو، بڑا شوق چڑھا تھا نا تمہیں اس قسم کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا۔ اب خوش قسمتی سے تمہیں موقع بھی مل گیا ہے تو کچھ کارکردگی دکھاؤ نا۔" وہ بولا۔

"دکھا تو دی ہے کارکردگی۔" میں نے کہا "میری کارکردگی کے نتیجے میں ہی تو تم مجرم تک پہنچے ہو۔ اگر میری ٹانگ بیچ میں نہ ہوتی تم سیدھے مکرم بیگ سے جا ٹکراتے اور وہ تمہیں ناکوں چنے چبوا دیتا۔"

"یہ تو خیر بعد کی بات تھی کہ کون کسے ناکوں چنے چبواتا۔" وہ بے پروائی سے بولا "فی الحال تم یہ بتاؤ تم نے اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کے لئے مکرم بیگ سے کتنا مال کھینچا۔"

"آہا... آخر کار اصل تکلیف زبان پر آہی گئی۔ خواہ مخواہ دیر سے اِدھر اُدھر کی باتیں کئے جارہے تھے۔ آخر پولیس والے مال کے خیال سے۔ یقیناً ساری رات نیند نہیں آئی ہوگی لیکن

یہ خیال کیوں کر آیا کہ میں نے مکرم بیگ سے مال کھینچا ہوگا؟"

"ظاہر ہے تم رات کو وہاں خدمتِ خلق کے شوق میں تو بھاگے بھاگے نہیں پھر رہے تھے۔" وہ جل کر بولا "ابھی تمہارے دل میں اس قسم کے جذبات اس حد تک موجزن نہیں ہوئے۔ اس کے علاوہ جب تم اس قسم کے چکروں میں دلچسپی لینے کا پروگرام بنا رہے تھے تو تم نے کہا تھا کہ موٹی اسامیوں سے تم باقاعدہ ٹھیک ٹھاک قسم کا معاوضہ وصول کروگے۔ اور مکرم بیگ بہرحال موٹی اسامی ہے۔"

"یہ سب دلیلیں چھوڑو۔ یہ کہو کہ پولیس والے مال کی خوشبو بہت دور سے سونگھ لیتے ہیں۔" میں نے کہا "بہرحال یہ میرا ٹریڈ سیکرٹ ہے۔ میں تمہیں کیوں بتانے لگا؟ تم ٹوہ لینے کی کوشش چھوڑو۔"

"تمہارا انداز تو واقعی بالکل سنجیدہ اور پیشہ ور لوگوں والا ہوگیا ہے جب تم نے بات کی تھی تو میں سمجھا تھا یونہی کوئی نیا شغل تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہو لیکن تمہیں اپنے اس شوق کی تسکین کا راستہ نہیں مل سکے گا مگر تمہیں تو فوراً ہی کلائنٹ میسر آنے لگے۔"

"کلائنٹ بھی ایسے جو گھر سے اٹھوانے پر تلے ہوئے تھے۔ زبردستی اپنا کیس میرے سر پر لاد رہے تھے انکار سننا ہی نہیں چاہتے تھے۔" میں نے کہا۔

"ویسے یہ ماننا پڑے گا یار۔" وہ گہری سانس لے کر بولا "کہ آدمی تم لکی ہو۔ جو بھی دھندا شروع کرتے ہو آغاز ہی سے چمک جاتا ہے۔ لگتا ہے تمہاری یہ بے نام کمپنی بھی اچھا بزنس کرے گی۔"

"بس یہ اوپر والے کا کرم ہے۔ تم بھی اسی سے مانگا کرو۔" میں نے نہایت صوفیانہ لہجے میں مشورہ دیا۔

"تمہارے خیال میں اور کس سے مانگتا ہوں۔" وہ ذرا بگڑ کر بولا۔

"اس کے علاوہ اپنے اعمال بھی ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔ سب سے پہلے تو پولیس کی نوکری چھوڑو۔" میں نے مزید مشورہ دیا۔

"اچھا اب میں فون بند کررہا ہوں مجھ میں مزید بکواس سننے کی تاب نہیں رہی۔ میں تمہیں صرف یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ آج میں ہدایت وارثی کے خلاف چالان تیار کررہا ہوں۔ کل عدالت میں پیش کردوں گا۔" وہ بولا۔

"میں کیا اس کا وکیلِ صفائی ہوں جو مجھے بتا رہے ہو؟" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا۔

"تم بھلا کسی کے وکیلِ صفائی کہاں ہوسکتے ہو۔ تم تو صرف وکیلِ گندگی ہوسکتے ہو گندے آدمی!" وہ جل کر بولا۔

اس کے لہجے پر مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا "معلوم مت جل کرو! جلنا بری بات ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کیا تم نے مزید تفتیش کا ارادہ ترک کردیا ہے؟ کسی اور زاویے سے اس کیس کو نہیں دیکھوگے؟"

"تفتیش تو جاری رہے گی۔" اس کے لہجے میں فوراً پیشہ ورانہ دلچسپی جھلک آئی "محض ایک چابی اور پیرافین ٹیسٹ کی بنیاد پر تو ہدایت کو قاتل ثابت کرنا بہت مشکل ہوگا۔ ابھی تو آلۂ قتل بھی برآمد نہیں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ کیس کا ایک اور زاویہ بھی سامنے آیا ہے بات بہت مبہم سی ہے لیکن اس پر بھی تفتیش کرنی پڑے گی۔"

"کیسی بات؟" میں نے ذرا چونکتے ہوئے پوچھا۔ مجھے معلوم تھا اس کا غصہ، اس کی چڑچڑاہٹ سب کچھ مصنوعی تھا اور بظاہر وہ مجھ سے بات چھپانے کی بھی کوشش کرے گا لیکن درحقیقت وہ مجھے کچھ بتانا ہی چاہتا تھا اسی کے لئے اس نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ مجھے کوئی اشارہ دینا چاہتا تھا اور اس طرح اپنے کام کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا بظاہر وہ ایسا ہی انداز اختیار کرے گا جیسے وہ مجھے کچھ بتانا نہیں چاہتا، کوئی خاص بات مجھ سے چھپائے رکھنا چاہتا ہے لیکن میرے زور دینے اور مجبور کرنے پر بادلِ نخواستہ بتادے گا۔ یہ ساری کھینچا تانی میرے لئے بھی دلچسپ ہوتی تھی اور اسے بھی یقیناً اس میں لطف آتا تھا۔

میری توقع کے عین مطابق وہ بولا "وہ بات میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔"

"کیوں؟ کیا اس کا تعلق تمہاری زندگی کے کسی شرمناک پہلو سے نکل آیا ہے؟" میں نے بڑی سادگی سے پوچھا۔

"شرمناک پہلو تمہاری زندگی میں ہوں گے۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔" وہ بولا۔

"تم... اور شریف آدمی؟" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "سمجھ میں نہیں آرہا اسے اس سال کا سب سے بڑا جھوٹ شمار کروں یا سب سے بڑا لطیفہ!"

"تم جو چاہے شمار کرو لیکن میں وہ بات تمہیں نہیں بتاؤں گا۔" وہ بضد رہا۔

"آخر کیوں؟" میں نے مصنوعی جھنجلاہٹ سے پوچھا۔

"کیونکہ اس کا تعلق ایک لڑکی سے ہے اور لڑکی کا ذکر سنتے ہی تم پھدکتے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاؤ گے۔" وہ بولا۔

"اگر تم کہو گے تو میں پھدکتا ہوا نہیں جاؤں گا۔ آرام سے چلتا ہوا جاؤں گا تم بتاؤ تو سہی۔" میں نے پیار سے کہا۔

"دیکھا؟" وہ جلدی سے بولا "لڑکی کا تو ذکر سنتے ہی ریشہ خطمی ہونے لگے۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔"

"بھئی ایک مرد کو اگر ریشہ خطمی ہونا ہی ہے تو بہتر یہی ہے کہ لڑکی کے ذکر پر ہو۔ اب کوئی صحیح الدماغ مرد تمہاری طرح گتے، بلیاں اود بلاؤ اور لکڑ بھگے وغیرہ کے ذکر پر تو ریشہ خطمی ہونے سے رہا۔ ہاں تو یہ لڑکی کا کیا قصہ ہے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

وہ گویا اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے خفگی آمیز سے لہجے میں بولا "مجھے آج صبح ہی پتا چلا ہے کہ جج صاحب نے کچھ عرصہ پہلے ہی خاصی بڑی رقم کی ایک بیمہ پالیسی لی تھی اور ایک خانہ بدوش قسم کی لڑکی کو اپنا وارث بنایا تھا۔"

"خانہ بدوش قسم کی لڑکی" میں نے ذرا مایوسی سے کہا۔

"دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں۔" اس نے مجھے تسلی دی "خانہ بدوش سے میری مراد واقعی کسی خیمے میں رہنے والی پھٹے پرانے کپڑوں والی میلی کچیلی لڑکی نہیں ہے۔ حالانکہ تم سے کچھ بعید نہیں ہے کہ ایسی کسی لڑکی کے پاس بھی دُم ہلاتے ہوئے پہنچ جاؤ۔"

"بھئی لڑکی تو لڑکی ہے جس حال میں بھی ہو اس کی قدر کرنی چاہئے۔ سین ہلانے کے لئے دُم مجھے تم سے مستعار لینی پڑتی کیونکہ کچھ سائنسی کتابیں پڑھ کر مجھے پتا چلا ہے کہ امتدادِ زمانہ سے میری دُم تو صدیوں پہلے گھس گھس کر غائب ہو چکی ہے لیکن تمہارا تعلق جس نسل سے ہے اس کی دُم ابھی تک صحیح سلامت چلی آرہی ہے۔"

"اچھا بچو! اگر اتنی بکواس کرو گے تو میں تمہیں اس لڑکی کے بارے میں نہیں بتاؤں گا تم خود ہی اسے ڈھونڈ لو۔ بقولِ شاعر اب اسے ڈھونڈ چراغِ دُمِ زیبا لے کر۔ میں فون بند کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"ایک تو یہ تم ہر وقت روٹھی ہوئی حسینہ کی طرح فون بند کرنے کی دھمکی مت دیا کرو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ دُم تمہاری زندگی کا ایک حساس موضوع ہے۔ چلو میں اب دُم کا بالکل ذکر نہیں کروں گا اور مستعار بھی نہیں مانگوں گا۔ اچھا تو اس لڑکی کے خانہ بدوش ہونے سے تمہاری مراد کیا ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"وہ کچھ زیادہ ہی امیر اور ماڈرن گھرانے کی لڑکی ہے۔" رحیم گل ذرا توقف کے بعد بولا "اسی قسم کے لوگ جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ شاید وہ غلطی سے پاکستان میں پیدا ہو گئے ہیں ورنہ درحقیقت انہیں امریکا' انگلینڈ یا یورپ وغیرہ میں پیدا ہونا تھا۔ ذہنی طور پر وہیں رہتے ہیں۔ یہاں کی ہر چیز کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور وہیں کے تصورات میں کھو کر ٹھنڈی آہیں بھرتے رہتے ہیں مگر مستقل طور پر وہاں جا کر آباد بھی نہیں ہوتے۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"اس قسم کے بعض گھرانوں کی نئی نسل کے لئے شاید وہ آزادیاں بھی کافی نہیں ہوتیں جو انہیں میسر ہوتی ہیں۔ ہر سہولت' ہر عیش و آرام اور ہر آزادی میسر ہونے کے باوجود یہ نئی نسل اپنے والدین سے ناراض رہتی ہے۔ پہلے اس میں زیادہ تر لڑکے ہی ہوا کرتے تھے مگر اب لڑکیاں بھی اچھی خاصی تعداد میں نظر آنے لگی ہیں۔ ان کو گھربار' ماں باپ' معاشرے.... سب سے بے شمار شکایات ہوتی ہیں ان میں سے بعض کی شکایات اتنی بڑھتی ہیں کہ وہ گھربار ہی چھوڑ دیتی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"اصل میں یہ وہی مغرب کی بے راہ روی ہے جس سے وہ خود پریشان ہیں۔ ہمارے خوش حال طبقے کے توسط سے دھیرے دھیرے یہ ہمارے ہاں بھی سرایت کر رہی ہے آگے چل کر وہاں جیسی صورت ہی اختیار نہ کر لے۔" وہ اب بالکل سنجیدہ تھا۔

"خدا نہ کرے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں جس لڑکی کا ذکر کر رہا ہوں وہ اسی قسم کی لڑکیوں میں سے ایک ہے۔" وہ بولا۔

"لیکن اس قسم کی لڑکی جج صاحب کی زندگی میں کہاں سے آگئی؟" میں نے پوچھا۔

"وہی ان کا اصلاحِ معاشرہ کا شوق!" رحیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اس لڑکی کے والدین سے شاید ان کی واقفیت رہی تھی۔ گھر سے باغی ہونے کے بعد لڑکی شاید کسی چکر میں ملوث ہو کر ان کی عدالت میں بھی پیش ہوئی تھی ابھی مجھے تفصیلات معلوم نہیں ہیں لیکن میں جلد معلوم کر لوں گا۔"

میں اس کا مطلب سمجھ رہا تھا۔ اشارہ دینے کا مقصد یہ تھا کہ اگر میں اس سے پہلے کچھ مفید معلومات حاصل کر سکتا تھا تو کر لوں اور یوں ہم ایک دوسرے کو اپنی اپنی کوششوں اور اپنے اپنے وسائل سے مستفید کرتے ہوئے کسی پیچیدہ معاملے کو جلد از جلد سلجھانے اور انجام تک پہنچانے کی کوشش کریں۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "جج صاحب نے غالباً لڑکی کی اصلاح کی اپنی سی کوششیں کی تھیں اسے گھر واپس بھیجنے کی بھی کوشش کی تھی۔ وہ اسے واپس گھر تو نہیں بھجوا سکے البتہ اس کی بے راہ روی اور آوارہ گردی کچھ کم ہو گئی تھی۔ جج صاحب کو امید تھی کہ مستقبل میں وہ کافی سدھر جائے گی۔ وہ اس کی مالی مدد بھی کرنا چاہتے تھے۔ وہ خود تو زیادہ آسودہ حال آدمی نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے اسے کچھ مالی فائدے پہنچائے تھے پھر اس کے مستقبل کی بہتری کے خیال سے خود اپنی انشورنس پالیسی میں بھی اسے وارث مقرر کر دیا تھا۔ ان کی اپنی بیوی یا بچے تو تھے نہیں۔"

یہ سب کچھ بتا کر اس نے گہری سانس لی اور گویا بات ختم کرتے ہوئے بولا "یہ ہے کُل قصہ!"

"اپنی دانست میں تم نے سارا قصہ سنا دیا لیکن لڑکی کا نام اب تک نہیں بتایا۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم تھا تم نام جاننے کے لئے تڑپ رہے ہو گے۔ میں نام بتا دوں گا تو پھر تم ایڈریس پوچھو گے اور میرے فون بند کرتے ہی تمہاری گاڑی جہاز کی رفتار سے اس کے گھر کی طرف اڑی جا رہی ہو گی۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن مقصد وہ نہیں ہو گا جو تم جیسے کسی لنگور کے ذہن میں ہو گا۔ چغد کہیں کے! انسان کو اپنے کاموں کے سلسلے

میں نہ جانے کہاں کہاں جانا پڑتا ہے۔ اب تم جیسے جہلا اس سے کچھ اور مطلب اخذ کرتے رہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔ میں تو اگر گیا تو شاید کوئی کام کی بات معلوم کر کے جلد ہی واپس آجاؤں لیکن تمہارے بارے میں تو اندیشہ پایا جاتا ہے کہ اگر تم اس قبیل کی کسی لڑکی کے ہاں گئے تو تمہیں تو واپس لانا ہی مشکل ہو جائے گا۔ اب بکواس چھوڑو اور نام بتاؤ۔"

"نام تو اس کا ماریا ہے لیکن اپنے حلقۂ احباب میں وہ پنکی کے نام سے مشہور ہے۔" رحیم گل نے جواب دیا "ایڈریس نوٹ کر لو۔ یہ ڈیفنس کا ایک اپارٹمنٹ ہے۔" اس نے ایڈریس بھی بتا دیا۔

"تم ان خطوط پر سوچ رہے ہو کہ انشورنس کی رقم حاصل کرنے کے چکر میں شاید لڑکی ہی یہ کام کر گزری ہو؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ممکن ہے۔ اس قسم کی آوارہ گرد۔ زیادہ آزاد خیال اور بے خوف قسم کی لڑکیوں سے کچھ بعید نہیں۔" رحیم گل بولا "ان کے مراسم اور رابطے بھی ہر طرح کے لوگوں سے ہوتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس نے خود اپنے ہاتھ سے یہ کام کیا ہو لیکن وہ ایسی کسی سازش میں شریک یا سازش کی خالق ہو سکتی ہے۔"

"کیا انشورنس کی رقم بہت بڑی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کسی رقم کو چھوٹی یا بڑی سمجھنے کا ہر انسان کا ایک الگ معیار ہوتا ہے اور مختلف قسم کے حالات میں یہ معیار بدلتا بھی رہتا ہے۔ کسی وقت انسان کے لئے پانچ دس ہزار کی رقم بھی اتنی بڑی ہوتی ہے کہ اس کے لئے وہ قتل کر گزرتا ہے۔"

یہ کمبخت رحیم گل بھی کبھی بڑے پتے کی بات کہہ جاتا تھا تاہم میں نے اسے داد دینے کے بجائے ڈانٹ کر کہا "زیادہ فلسفہ بولنے کی کوشش مت کرو۔ جاہلوں کی زبان پر فلسفہ زیب نہیں دیتا۔ یہ بتاؤ انشورنس کی رقم کتنی بنتی ہے؟"

"دس لاکھ۔" اس نے جواب دیا۔

"معقول رقم ہے۔" میں نے کہا "اب دیکھنا یہ پڑے گا کہ لڑکی کے حالات ان دنوں کیسے ہیں اور کیا وہ اتنی خطرناک ہو سکتی ہے کہ رقم کے لئے اپنے محسن کو قتل کر سکے۔"

"اس کے بارے میں جو معلومات مجھ تک پہنچی ہیں اور ان کی روشنی میں لڑکی کی شخصیت کا جو خاکہ میرے ذہن میں ابھرا ہے اس کے اعتبار سے تو میرا تجربہ یہی بتاتا ہے کہ اس قسم کی لڑکیوں سے ایسی حرکت یا کم از کم ایسی کسی سازش میں شریک ہونے کی توقع کی جا سکتی ہے۔ ان لڑکیوں.... یا اس قبیل کے لڑکوں کے نزدیک جذباتی رشتوں کی اہمیت ہی کہاں ہوتی ہے؟ جو لوگ اپنے سگے والدین کے فرمانبردار یا ان کے بڑھاپے کا سہارا نہیں بن سکتے ان کے نزدیک کسی اور خیر خواہ کا کیا مقام ہو سکتا ہے؟" اس کے لہجے میں ناپسندیدگی تھی۔

"خیر۔ اس کو دیکھنے اور بات کرنے کے بعد زیادہ صحیح رائے قائم کی جا سکے گی۔" میں نے کہا۔

"اس کو دیکھنے کے لئے اتنے قریب مت چلے جانا کہ بعد میں ہم تمہیں ڈھونڈتے ہی رہ جائیں۔" وہ ایک بار پھر غیر سنجیدگی کی طرف لوٹ آیا۔

"ایک تو میرے بارے میں تمہاری رائے بہت ہی غلط تصورات پر مبنی ہے جہالت کے پلندے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"تو پھر تم اس کی طرف کب روانہ ہو رہے ہو علم و دانش کے پیکر؟" اس نے دریافت کیا۔

"تم خود ہی تو پیش گوئی کر چکے ہو کہ تمہارے فون بند کرتے ہی میری گاڑی جہاز کی رفتار سے اس کے گھر کی طرف اڑی جا رہی ہو گی۔" میں نے جواب دیا "میں سوچ رہا ہوں اب تمہارا دل کیا توڑنا۔ مجھے تمہاری توقعات پر پورا اترنا چاہئے میں ایسا ہی کروں گا جیسا تم نے کہا ہے۔ ویسے بھی بہت دنوں سے کسی معزز قسم کی آوارہ خاتون سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"اتنا جھوٹ مت بولا کرو۔ مجھے پتا چلا ہے کہ رات ہدایت وارثی کی دوست نیلم سے تمہاری طویل ملاقات رہی ہے۔ میں نے سنا ہے اس خاتون کی جوانی بھی خاصی رنگین اور سنگین گزری ہے؟" وہ ذرا دلچسپی سے بولا۔

"تمہاری آواز سن کر کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تمہاری رال ٹپکنے ہی والی ہے۔" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے۔ تم سے دوستی کا یہی انجام ہونا تھا۔ آخر صحبت کا کچھ نہ کچھ اثر تو ہوتا ہی ہے۔" اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"لیکن تم نے ہم جیسے قدر دانوں سے حُسن اور جوانی کی قدر دانی نہیں سیکھی۔" میں نے کہا "تم تو اس طرح اس کی جوانی گزر چکنے کا ذکر کر رہے ہو جیسے بڑھاپے کی انتہائی حدوں کو پہنچنے کے بعد آخرکار اس کا انتقالِ پُرملال ہو چکا ہے اور تم اس کے چہلم میں بھی شرکت کر چکے ہو۔ بھائی ابھی تو اس کی جوانی گزر رہی ہے پوری طرح گزر تو نہیں چکی۔"

"خیر۔ یہ تو تمہیں زیادہ صحیح طور پر معلوم ہو گا تم تو جوانیاں ناپنے کا سب سے زیادہ قابلِ اعتبار پیمانہ ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"خیر تمہیں نظر کی کمزوری کی وجہ سے اس کی عمر اور سراپا کے بارے میں صحیح اندازہ نہیں ہوا ہو گا۔ اس میں تمہارا قصور بھی نہیں۔ بڑھاپے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے تم نے اسے ہدایت وارثی سے بھی ملنے نہیں دیا۔" میں نے کہا۔

"ہدایت وارثی سے میں نے اسے احتیاطاً ملنے نہیں دیا۔" وہ سنجیدگی سے بولا "ایسی تیز و طرار اور جہاندیدہ عورتوں سے میں محتاط ہی رہتا ہوں۔ یہ کسی بھی وقت کوئی نیا فساد کھڑا کر کے پولیس کے لئے مسئلہ پیدا کر سکتی ہیں۔ کیس کو بگاڑ سکتی ہیں یا اس پر اثر انداز ہو سکتی ہیں۔"

نیلم اس کے اندازوں سے مختلف عورت تھی۔ بہرحال اس کی احتیاط اور اندیشے اپنی جگہ درست تھے۔ ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے وہ اپنی ذمے داریوں اور اپنے کام کے تقاضوں کو بہت اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی کارکردگی بھی حیرت انگیز تھی۔ خاموشی سے وہ اندر ہی اندر نہ جانے کیا کچھ کر گزرتا تھا اور کہاں کہاں پاؤں پھیلائے رکھتا تھا۔ کم سے کم وقت میں وہ بہت زیادہ باتیں معلوم کرلیتا تھا اور اپنے ماتحتوں کو بھی اسی طرح مصروف رکھتا تھا۔ خود سوتا تھا نہ انہیں سونے دیتا تھا۔ کچھ صحیح پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ کس وقت آرام کرتا تھا۔ میں سوچتا تھا اگر ہمارے ایک چوتھائی پولیس آفیسر بھی ایسے ہوتے تو ہمارے حالات نہ جانے کتنے مختلف ہوتے۔

"تم عورتوں سے اسی طرح ڈرا کرو اور اسی طرح محتاط رہا کرو۔" میں نے مشورہ دیا "تمہارے حق میں بہتر یہی ہے۔"

"بہت بہتر استاد محترم! کوئی اور حکم۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"حکم یہ ہے کہ اگر اس لڑکی کا فون نمبر معلوم ہے تو وہ بھی بتادو۔ میرا خیال ہے میں اسے فون کرکے اس کے ہاں جاؤں تو بہتر ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اپنے انتہائی قیمتی وقت میں سے گنجائش نکال کر اس کے ہاں پہنچوں اور وہ کہیں آوارہ گردی پر نکلی ہوئی ہو۔" میں نے کہا۔

"کیا کہنے تمہارے قیمتی وقت کے۔" وہ طنزیہ انداز میں ہنکارا بھر کر بولا "بہرحال ابھی مجھے اس کا فون نمبر معلوم نہیں ہوسکا۔ شکر کرو۔ میں نے اتنے کم وقت میں اتنی معلومات حاصل کرلی ہیں۔ فون نمبر اگر میرے پاس ہوتا تب بھی میں تمہیں یہ مشورہ نہ دیتا کہ فون کرکے جاؤ۔ اس قسم کے لوگوں سے کوئی کام کی بات معلوم ہونے کی امید اسی صورت میں کی جاسکتی ہے کہ اچانک ان کے سر پر پہنچ جاؤ۔ فون کرکے جاؤ تو وہ اپنی تمام تر عیاریوں' مکاریوں اور چالاکیوں کے ساتھ آپ کے استقبال کے لئے تیار ہو کر بیٹھے ہوتے ہیں۔"

یہ اس نے کام کا نکتہ بتایا تھا لیکن میں نے اسے داد دینے کے بجائے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا "بس بس اپنی اوقات پر رہو۔ زیادہ عظیم' تجربہ کار اور جہاندیدہ پولیس آفیسر بننے کی کوشش مت کرو۔ اور ہاں ہر وقت فون پر لوگوں کے کان کھانے کے بجائے کبھی کچھ کام بھی کرلیا کرو۔ خدا حافظ۔" اس سے پہلے کہ وہ جواباً مجھے کچھ سناتا میں نے فون بند کردیا۔

کچھ دیر بعد میں گاڑی میں ڈیفنس کی طرف جارہا تھا لیکن رحیم تل کی جلی کٹی پیش گوئی کے مطابق ہوائی جہاز کی رفتار سے اڑا نہیں جارہا تھا بلکہ نہایت سست رفتاری سے جارہا تھا کیونکہ اس وقت میں واقعات پر از سر نو غور کررہا تھا۔

میں محسوس کررہا تھا کہ ہدایت وارثی کی گرفتاری پر مجھے اس طرح خوشی یا طمانیت حاصل نہیں ہوئی تھی جس طرح ایک مجرم کی گرفتاری پر ہونی چاہئے تھی۔ لاشعور کے کسی گوشے میں کوئی خلش موجود تھی۔ جیسے کہیں کوئی کمی' کوئی کسر رہ گئی تھی۔ کام مکمل نہیں ہوا تھا یا شاید صحیح طریقے سے نہیں ہوا تھا۔ ابھی کوئی گمشدہ کڑی تلاش کرنے کی ضرورت باقی تھی۔

مطلوبہ بلڈنگ تلاش کرنا خاصا آسان ثابت ہوا۔ وہ ڈیفنس کے ایک کمرشل علاقے کے قریب ہی واقع صاف ستھری تقریباً دس منزلہ عمارت تھی۔ اس علاقے اور اس عمارت کو دیکھ کر اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس میں اپارٹمنٹ کی قیمت یا کرایہ افورڈ کرنا ہرایرے غیرے کے بس کی بات نہیں تھی۔ ماریا عرف پنکی اگر اس عمارت میں رہ رہی تھی تو اس کے مالی حالات یقیناً خراب نہیں کہے جاسکتے تھے۔

میں نے گاڑی ایک مناسب جگہ پر کھڑی کی اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلنے کے سے انداز میں عمارت میں جا پہنچا۔ گیٹ پر چوکیدار موجود تھا لیکن اس نے سرسری نظر سے میری طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ معزز آدمی نظر آنے کا یہ بڑا فائدہ تھا کہ چوکیدار وغیرہ روکنے یا زیادہ پوچھ گچھ کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

اپارٹمنٹ کا نمبر آٹھ سو آٹھ تھا۔ جس سے مجھے اندازہ تھا کہ اسے آٹھویں فلور پر ہونا چاہئے تھا لیکن جب میں لفٹ کے ذریعے آٹھویں فلور پر پہنچا تو آٹھ سو آٹھ نمبر مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ اسی دوران ایک اپارٹمنٹ سے ایک جوڑا نکلتا دکھائی دیا۔ مرد اور عورت دونوں نوجوان' خوب صورت اور خوش لباس تھے۔ میں نے زیادہ باریک بینی سے تلاش کرنے کے بجائے آسان راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی اور انگریزی میں مرد کو مخاطب کیا "معاف کیجئے گا۔ کیا آپ بتاسکیں گے کہ اپارٹمنٹ نمبر آٹھ سو آٹھ کس طرف پڑے گا؟"

دونوں میاں بیوی خاصی سنجیدہ طبیعت کے مالک معلوم ہوتے تھے۔ اس سوال پر دونوں ہی نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ بلکہ یوں کہئے کہ میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ دونوں رک گئے تھے اور یوں خاموش تھے گویا فیصلہ نہ کرپارہے ہوں کہ مجھے کیا جواب دیں۔

"پنکی کے ہاں جانا ہے؟" آخر مرد نے سوال کیا اور میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ موصوفہ اپنے پاس پڑوس میں خاصی مشہور معلوم ہوتی تھیں ورنہ اس قسم کے علاقوں میں لوگ خواہ فلیٹوں میں رہتے تھے تب بھی اپنے اڑوس پڑوس کے لوگوں کے بارے میں بے خبر ہوتے تھے۔

"جی ہاں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

وہ ذرا اٹکتے ہوئے لیکن انگریزی میں ہی بولا "وہ جو سامنے دیوار نظر آرہی ہے اس کے پاس سے بائیں ہاتھ پر مڑجایئے۔ آپ سامنے ہی پنکی کے اپارٹمنٹ کا دروازہ نظر آجائے گا یہاں ...اری سے اس کا دروازہ نظر نہیں آتا۔ اور یہ شاید پنکی کے حق ... بہتر ہی ہے شاید اس نے دیکھ بھال کر خود ہی ایسا اپارٹمنٹ ... کیا ہو۔"

میں نے یوں تیزی سے پلکیں جھپکائیں گویا میری کچھ سمجھ میں ...یا ہو۔ وہ اپنی بیوی کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے لفٹ کی طرف بڑھ ...۔ اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں تھیں۔ لفٹ کا دروازہ بند ...کا تو میں نے طویل سانس لی اور اس کی بتائی ہوئی سمت میں بڑھ ...۔

در حقیقت میں دیکھ نہیں سکا تھا کہ اس طرف کی دیوار پر ...داری کا اختتام نہیں ہورہا تھا بلکہ ایک تنگ سا راستہ بائیں ...ف کو بھی جارہا تھا۔ کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ اپارٹمنٹس ...نے کے چکر میں بڑے عجیب عجیب انداز میں عمارتوں کی ڈیزائننگ ... جاتی ہے۔ اس راستے کے اختتام پر واقعی ایک اپارٹمنٹ کا ...وازہ نظر آرہا تھا جس پر آٹھ سو آٹھ نمبر بھی موجود تھا۔

دروازے پر کارڈ بورڈ پر واٹر کلرز سے تیار کی گئی ایک تجریدی ...ٹنگ بھی چسپاں تھی جسے دیکھ کر یقیناً پکاسو کی روح تڑپی ہوگی۔ ...ں میں ایک جانور نظر آرہا تھا جو خچر بھی ہوسکتا تھا اور گدھا یا ...گھوڑا بھی۔ حتیٰ کہ اس پر ہاتھی ہونے کا شبہ بھی کیا جاسکتا تھا۔

اس کی کمر پر گول سی کوئی چیز رکھی تھی۔ وہ تربوز بھی ہوسکتا تھا ...ر شلغم بھی۔ لیکن زیادہ امکان یہ تھا کہ مصورہ نے وہ دنیا یا کرہ ...رض کا سمبل بنایا تھا۔ یعنی اس خچر' گدھے یا ہاتھی نے دنیا کا بوجھ ...ٹھایا ہوا تھا لیکن یہ عجیب دنیا تھی جس کی ایک باریک سی دُم بھی ...کلی ہوئی تھی۔ مجھے اس لئے فوری طور پر معلوم ہوگیا تھا' یہ کسی ...مصورہ کے فن کا نمونہ تھا کہ اس کے ایک کونے پر خاصے جلی ...حروف میں ماریا لکھا ہوا تھا۔ مصوروں کا یہ طبقہ بھی مجھے عجیب ہی لگتا تھا جو اپنی فنکارانہ صلاحیتوں کو دروازے پر ٹانگ دیتا تھا۔

ابھی میں نے کال بیل کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ پکے رنگ کی ایک فربہ تیم ضخیم عورت میرے سامنے کھڑی تھی جس کے چہرے پر شکنیں نمایاں تھیں۔ اس کے ذرا اوپر کو اٹھے ہوئے دانت ہونٹوں سے جھانک رہے تھے۔ بلکہ یوں کہئے کہ ہونٹوں سے باہر پھدکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے کیونکہ وہ ان تیزی سے پان چبارہی تھی جیسے پان سے کوئی پرانا خاندانی انتقام لے رہی ہو۔

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ اس اپارٹمنٹ میں کیا کوئی ریموٹ کنٹرول قسم کا نظام کام کررہا تھا کہ ادھر بیل کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ادھر دروازہ کھل گیا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ عین اس وقت وہ عورت باہر آرہی تھی جب میں نے کال بیل بجانا چاہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں نے سوچا کہ اگر وہ ماریا تھی تو مجھے الٹے قدموں واپس جانے کے بارے میں غور کرنا چاہئے تھا لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سمجھایا "برخوردار افضل! فرض کو حسن پرستی پر غالب رہنا چاہئے۔" حالانکہ میں جس سلسلے میں وہاں آیا تھا وہ میرا فرض نہیں تھا لیکن میں خود کو ثابت قدم رکھنے کے لئے کسی بھاری بھرکم فلسفے کا سہارا لینا چاہتا تھا۔

اسی لمحے مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ بہرحال ماریا نہیں ہوسکتی تھی۔ میں نے اس کی شخصیت اور حلئے پر از سر نو غور کرلیا تھا۔ وہ بے شک خاصے صاف ستھرے حلئے میں تھی لیکن بہرحال ملازمہ قسم کی شخصیت تھی۔ دروازہ کھولتے ہی مجھے سامنے پاکر وہ یکدم گڑبڑا گئی تھی۔ پہلے تو شاید اس نے پیچھے ہٹ کر دروازہ بند کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر سنبھل کر بولی "کس سے ملنا ہے آپ کو؟" لہجہ کرخت اور اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اردو یقیناً اس کی زبان نہیں تھی لیکن روانی سے بول رہی تھی۔

"پنکی سے۔" میں نے ذرا بارعب لہجے میں کہا۔

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولی "میں تو اس وقت کام ختم کرکے جارہی تھی لیکن آپ ٹھہریں۔ میں بی بی جی کو بتاتی ہوں۔ ویسے بی بی اس وقت شاید کسی سے بھی ملنا پسند نہیں کریں گی پھر بھی میں بول دیتی ہوں۔"

وہ شاید دروازہ بند کرکے اندر اطلاع دینے کے لئے جانا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں آگے بڑھ کر دروازے میں حائل ہوچکا تھا۔ وہ اب شاید اندر جانے کے سلسلے میں الجھن میں پڑچکی تھی۔

میں نے جلدی سے کہا "تمہیں اندر جاکر اطلاع وغیرہ دینے کی ضرورت نہیں۔ تم اگر کام ختم کرکے جارہی ہو تو جاؤ۔ میں خود ہی مل لوں گا۔ تم ملازمہ ہو نا؟"

"ہاں جی۔ میں اس گھر کی ماسی ہوں۔ دو گھنٹے کے لئے آتی ہوں۔ پھر بھی میں بی بی جی کو خبر کردیتی ہوں۔ آپ کا نام کیا ہے؟"

وہ بدستور میرا راستہ روکے کھڑی تھی۔

"نام کو چھوڑو۔ میرا تعلق سی آئی ڈی سے ہے۔" میں نے نیچی آواز میں کہا۔

"سی آئی ڈی؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں "ٹھیک ہے صاحب! آپ خود ہی بی بی جی سے مل لیں۔ میرا تو جانے کا ٹائم ہورہا ہے۔ میرا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہے صاحب! میں تو ادھر صرف پارٹ ٹائم کام کرتی ہوں۔ ماسی ہوں نو سے گیارہ بجے تک۔ آج تو مجھ کو بارہ بج گئے ہیں۔ دیر ہوگئی ہے۔ میں تو چلتی ہوں۔"

اس نے مجھ سے کترا کر باہر جانے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ جلدی سے باہر کی طرف تقریباً چھلانگ لگاتے ہوئے بولی "بہت بہت مہربانی صاحب! اللہ آپ کا بھلا کرے۔" وہ تیزی سے تنگ راستے کے موڑ پر غائب ہوگئی۔ میں نے دروازہ نہایت آہستگی سے بند کرکے کھٹکا دبا کر مقفل کردیا۔

پھر میں دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے یوں ٹہلتا ہوا آگے بڑھا گویا وہ میرے کسی یارِ غار کا گھر تھا۔ وہ ایک کشادہ اپارٹمنٹ تھا۔ شاید تبھی دروازے پر ہونے والے مکالمے کی آواز اندر تک نہیں پہنچی تھی یا پھر شاید اس گھر کے مکین تجسس میں مبتلا ہونے کے قطعاً عادی نہیں تھے۔ انہوں نے دروازے کی طرف آنے یا آواز دے کر کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی' اندر بدستور سناٹا تھا۔

میں جونہی راہداری سے گزر کر لاؤنج میں پہنچا مجھے کچھ ایسا جھٹکا لگا جیسے کسی نے میرے پیٹ میں گھونسا رسید کردیا ہو۔ مگر نہیں شاید یہ مثال میں نے غلط دی ہے کیونکہ اس جھٹکے سے مجھے تکلیف نہیں ہوئی تھی۔ اس قسم کے جھٹکے کھانے کی تو لوگ آرزو کرتے ہیں۔

لاؤنج کے سرے پر بڑے سے ایک کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ وہ کمرا کسی آرٹسٹ کا اسٹوڈیو معلوم ہوتا تھا اور آرٹسٹ سامنے ہی بیٹھی تھی اور جس حالت میں وہ بیٹھی تھی اسی کی وجہ سے میرے پیٹ پر گھونسا سا پڑا تھا۔

میں نے یہ تو سنا تھا کہ بعض آرٹسٹ ایک خاص طرز کی تصویریں بنانے کے لئے جیتی جاگتی ماڈل کو اس حالت میں سامنے بٹھاتے تھے لیکن یہ نہیں سنا تھا اور نہ ہی کبھی دیکھنے کی توقع کی تھی کہ خود آرٹسٹ صاحبہ اس حالت میں پینٹنگ فرماتی ہوں گی۔

میں شاید اسے ماڈل ہی سمجھتا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس کے ایک ہاتھ میں رنگوں کی پلیٹ اور دوسرے میں برش موجود تھا۔ اسی کے سامنے ایزل پر کینوس سجا ہوا تھا۔ وہ ایک چوکور اسٹول پر موٹا سا رنگین کشن رکھے بیٹھی تھی' اسے آرٹسٹ سمجھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

وہ اپنے کام میں کچھ اس طرح منہمک تھی کہ میری آہٹ شاید اس نے سنی ہی نہیں۔ اور اگر سنی تو پلٹ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ میں دروازے کے قریب پہنچا تو مجھے مصورہ کا ماڈل بھی نظر آگیا۔

وہ ایک وجیہہ اور باڈی بلڈر نوجوان تھا۔ اس کا جسم تانبے کی طرح چمک رہا تھا اور وہ ایک دیوار کے قریب اسٹول پر باڈی بلڈروں والا ایک مخصوص پوز بنائے بیٹھا تھا جس میں اس کے پٹھے اور جسم کی خوب صورتیاں خوب نمایاں نظر آرہی تھیں۔ مصورہ اور ماڈل دونوں یکساں ہی لباس میں تھے۔ یعنی نہ ہونے کے برابر گو کہ مصورہ تو باڈی بلڈر نہیں تھی۔ اسے تو قدرت نے جیسا بنادیا تھا وہ اسی طرح غضب کی چیز تھی۔ وہ اگر اس میں کچھ کمی بیشی کی کوشش کرتی تو شاید اس کی خوب صورتیوں کا ناس لگ جاتا۔ گو کہ وہ ذرا چھوٹے قد کی تھی اور کچھ بھاری پن کی طرف مائل تھی مگر اسی طرح ٹھیک تھی۔ وہ قدرے گول مٹول سی قیامت تھی' اس کی رنگت تازہ کھلے گلابوں کی سی تھی۔

میں دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔

ماڈل نے مجھے دیکھ لیا تھا لیکن اس کے حوصلے کی داد دینا [illegible] کہ اس بے چارے نے اپنے پوز میں فرق نہیں آنے دیا [illegible] چارہ اچھی بھلی آزمائش میں پڑا ہوا تھا۔ وہ گویا ایک پر[illegible] کی سُولی پر مصلوب تھا۔

ایک تو باڈی بلڈروں کی پوزنگ ویسے ہی آسان نہیں [illegible] چند سیکنڈ کے لئے جو پوز بناتے ہیں اس میں سخت قسم کی [illegible] کی طرح زور لگتا ہے اور توانائی صرف ہوتی ہے جبکہ وہ [illegible] جانے کب سے اسی قسم کے ایک پوز میں بیٹھا تھا۔ اوپر [illegible] مصورہ کی صورت میں اس کی مزید آزمائش کا سامان سامنے موجود تھا۔ اس آزمائش سے گزرنا ہر ایک کے بس [illegible] نہیں تھی۔

ماڈل کے پوز میں تو فرق نہیں آیا لیکن اس کی آنکھیں [illegible] بے چینی سے حرکت کرنے لگیں تب شاید مصورہ کو احساس [illegible] دروازے پر کوئی موجود تھا۔ حالانکہ اس کی بھی دروازے [illegible] پشت نہیں تھی۔ وہ ذرا ترچھی بیٹھی تھی۔ چاہتی تو گردن [illegible] بھی دروازے کی طرف دیکھ سکتی تھی لیکن شاید بے چا[illegible] سے سچی محبت تھی۔ فن کی گہرائیوں میں ڈوب جانا اسی [illegible] اسے گرد و پیش کا کوئی ہوش نہیں تھا۔

وہ کس حد تک فن کی گہرائیوں میں اتری ہوئی [illegible] اندازہ اس کے سامنے موجود اس کے زیرِ تکمیل شاہکار [illegible] جاسکتا تھا۔ اگر اس باڈی بلڈر نے اپنی وہ پورٹریٹ دیکھی [illegible] اس کے صبر اور حوصلے کی مزید داد دینی چاہیے تھی کیونکہ [illegible] انسان کے بجائے کوئی ایسا ریچھ معلوم ہو رہا تھا جس کے با[illegible] غم سے جھڑ گئے تھے یا پھر کسی قسم کی خارش نے اسے سر [illegible] تک گنجا کردیا تھا۔ اس کے جسم کے وہ نشیب و فراز جو [illegible] میں کافی دلکش معلوم ہوتے ہوں گے اس پینٹنگ میں [illegible] معلوم ہورہے تھے جیسے سیلاب گزر جانے کے بعد کچے [illegible] میں گڑھے پڑگئے ہوں۔ یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ [illegible] تجریدی تھی یا حقیقت پسندانہ؟ ممکن ہے وہ ان دونوں کے [illegible] کی کوئی چیز رہی ہو۔

مصورہ نے ذرا گردن گھما کر میری طرف دیکھا [illegible] اٹھی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔ تین چار سال پہلے بھی زیادہ خوب صورت رہی ہوگی۔ وہ ان لڑکیوں میں [illegible] ہوتی تھی جو اپنی خوب صورتی اور جوانی کا سرمایہ بڑی بے [illegible] دریا دلی سے لٹاتی ہیں اور جلد ہی خالی خالی سی دکھائی دینے [illegible] اس کی آنکھیں شربتی' بال تراشیدہ اور بھورے تھے۔ رنگت [illegible] سپید تھی اچٹتی نظر میں تو گماں گزرتا تھا کہ اس کا تعلق [illegible] سفید فام نسل سے تھا۔ وہ اپنی عمر سے کچھ بڑی بڑی سی [illegible] تھی۔

اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں

"مسٹر! کون ہو تم اور اندر کس طرح آگئے؟" اس نے انگریزی میں سوال کیا۔

"بس یونہی ٹہلتا ہوا آگیا۔" میں نے انگریزی میں ہی جواب دیا۔

"پنکی! اگر تم کہو تو میں اس گدھے کو اٹھا کر باہر پھینک دوں؟" اچانک ایک منمناتی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ایسی منمناتی ہوئی سی آواز اس نوجوان باڈی بلڈر کے شاندار وجود سے برآمد ہوئی تھی۔ ایک تو شاید اس کی آواز ہی ایسی تھی دوسرے شاید کافی دیر سے اسی صبر آزما پوز میں بیٹھے بیٹھے اس کی آواز پر مزید کچھ منفی اثرات مرتب ہوئے تھے۔

مجھے لفظ "گدھے" پر غصہ تو بہت آیا' جی چاہا کہ آگے بڑھ کر اس میں اور اس کی پورٹریٹ میں کچھ مشابہت پیدا کردوں لیکن ایک تو میں اس ملاقات کا آغاز ہی دنگے فساد سے نہیں کرنا چاہتا تھا دوسرے مسئلہ یہ بھی تھا کہ راستے میں وہ مصورۂ مسرت اور اس کا سازوسامان حائل تھا۔

مجھے دل ہی دل میں ایک بار پھر اس عظیم مصورہ کے اس عظیم ماڈل کے صبر و استقامت کی داد دینا پڑی کہ اس نے بات کرتے ہوئے بھی اپنے پوز میں فرق نہیں آنے دیا تھا۔ اس کے باوجود پنکی نے اسے ڈانٹا "ٹمی تم آرام سے بیٹھے رہو اور اپنے تاثرات خراب مت کرو۔ مجھے تمہارے جو تاثرات درکار ہیں وہ آج بڑی مشکل سے تمہارے چہرے پر پیدا ہوئے ہیں۔"

میں نے ایک بار پھر اس کی پورٹریٹ پر نظر ڈالی کہ ان تاثرات کا نظارہ کرسکوں جنہیں وہ عظیم مصورہ کینوس پر منتقل کررہی تھی مگر وہاں تاثرات تو درکنار چہرے کا ہی صحیح پتا نہیں چل رہا تھا کہ کہاں تھا؟ تاہم مصورہ میرے بارے میں اپنی تشویش کو فوراً ہی بھول کر دوبارہ نہایت پُرسکون انداز میں اپنے کام کی طرف متوجہ ہوچکی تھی۔ اس نے کینوس پر اس جگہ برش سے چند اسٹروکس لگائے جہاں غالباً اس نوجوان کی ٹھوڑی تھی۔ تاہم میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ پیشانی بھی ہوسکتی تھی۔

میری نظر پنکی پر جمی ہوئی تھی۔ اگر اس عالم میں بھی کسی کی نظر اس پر نہ جمتی تو یہ بڑی ناقدری والی بات ہوتی۔ مجھے احساس تھا کہ اس کا باڈی بلڈر ماڈل بڑے غصے سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میری وجہ سے اس بے چارے کے لئے صحیح طور پر اپنے پوز میں بیٹھے رہنا مشکل ہوگیا تھا۔

وہ ایک بار پھر منمنایا "پنکی! تم اس آدمی سے پوچھو تو سہی۔ یہ یہاں کیوں آیا ہے؟" وہ بھی انگریزی میں ہی بات کررہا تھا۔ وہ دونوں اسی طبقے کے افراد معلوم ہوتے تھے جو گدھا گاڑی والے سے بھی انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کرتے ہیں خواہ اس بے چارے کی کچھ سمجھ میں آئے یا نہیں۔

گو کہ میری نظر لڑکی کے چہرے سے نیچی تھی لیکن میں اس کے چہرے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یہ چہرہ مجھے شناسا محسوس ہوا تھا لیکن یاد نہیں آرہا تھا کہ اس سے پہلے میں نے اسے کہاں دیکھا تھا؟ اگر میں اس سے ملا ہوتا تو مجھے ضرور یاد ہوتا۔ کم از کم لڑکیوں کے بارے میں میری یادداشت ابھی اتنی خراب نہیں ہوئی تھی۔

اپنے ماڈل کی فرمائش پر مصورہ نے میری طرف دیکھے بغیر دریافت کیا "ہاں تم یہاں کس لئے آئے ہو؟"

"میرا نام افضل چوہدری ہے۔"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی "میں نے تمہارا نام نہیں کام پوچھا ہے۔ میرا مطلب ہے یہاں کس کام سے آئے ہو؟ نام اتنے شوق سے کیوں بتا رہے ہو؟ یہ تو کوئی ایسا نام نہیں ہے جسے سن کر میں خوشی یا حیرت سے اچھل پڑوں یا میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ جائے۔"

"تم جیسے لوگوں کے جسم میں سنسنی دوڑنا ایک ایسا واقعہ ہوتا ہے جو بڑی مشکل سے رونما ہوتا ہے' مجھ غریب کے نام میں اتنی طاقت کہاں کہ محض اسے سن کر تمہارے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑ سکے۔ سنسنی کی تلاش میں تو تم لوگ نہ جانے کیا کیا جتن کرتے ہو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ ایک بار پھر میری بات کاٹتے ہوئے بولی "تم کیا یہاں کوئی وعظ وغیرہ کرنے آئے ہو؟ حلیے سے تو کوئی ریفارمر یا مولوی معلوم نہیں ہوتے۔"

"میں نے کہا نا کہ میں افضل چوہدری ہوں۔"

"ہائے واوے۔ تم کس گاؤں کے چوہدری ہو؟ تمہاری اونچے شملے والی پگڑی۔ تمہاری کلف لگی دھوتی اور تمہارا زری والا کھسا کہاں ہے؟ تم تو بڑے مہنگے قسم کے سوٹ بوٹ میں دکھائی دے رہے ہو۔ تم کس قسم کے چوہدری ہو؟" اس نے بدستور برش چلاتے ہوئے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"وہ گاؤں اُجڑ چکا ہے جس کا میں چوہدری تھا۔ میں شہر آکر ماڈرن ہوگیا ہوں۔ سوٹ بوٹ پہننے لگا ہوں۔ اگر تمہیں کوئی اعتراض ہے تو معافی چاہتا ہوں' کچھ دن بعد واپس گاؤں چلا جاؤں گا۔" میں نے ملائمت سے جواب دیا۔

ٹمی ایک بار پھر منمنایا "پنکی! خدا کے لئے اس آدمی سے سنجیدگی سے معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ یہ کیا چاہتا ہے؟"

پنکی نے اسے بری طرح ڈانٹتے ہوئے کہا "خدا کے لئے تم مجھے یہ بتانا بند کرو کہ مجھے کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں۔ مجھے جو کچھ بھی پوچھنا ہوگا میں خود ہی پوچھ لوں گی۔ تم اپنا یہ ننھا سا منہ بند رکھو اور اسی طرح بھوکی نظروں سے صرف میری طرف دیکھو جس طرح کچھ دیر پہلے دیکھ رہے تھے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میری اس پینٹنگ کا تھیم طاقت اور ہوس ہے۔ میں طاقت اور ہوس کی عکاسی کرنا چاہتی ہوں۔ تمہارے چہرے پر طاقت تو نظر آرہی ہے' ہوس کا کہیں پتا ہی نہیں چل رہا۔ وہ پہلے ہی بہت کم تھی۔ اس اجنبی چوہدری کو

دیکھ کر تو بالکل ہی غائب ہو گئی ہے اب صرف غصہ ہی غصہ نظر آ رہا ہے۔ غصہ مجھے نہیں چاہئے مجھے غصہ پینٹ نہیں کرتا ہے۔"

نوجوان نے میری طرف سے نظر ہٹالی اور اپنے چہرے پر ہونقی پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں اس کا چہرہ کچھ ایسا دکھائی دینے لگا جیسے وہ پیٹ کے درد میں مبتلا ہو۔ پنکی دوبارہ انہماک سے اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ اس نے گویا بھلا دیا تھا کہ میں وہاں موجود تھا۔ یا پھر شاید اس کے لئے یہ قطعاً کوئی اہم بات نہیں رہی تھی۔

میں چند لمحے اسے الٹے سیدھے برش مارتے دیکھتا رہا پھر میں نے یکدم بدلے بدلے اور سخت لہجے میں کہا "مس ماریا عرف پنکی! پینٹنگ کی یہ پیروڈی بند کرو اور چند منٹ کے لئے میری طرف توجہ دو۔ مجھے تم سے کچھ ضروری اور سنجیدہ گفتگو کرنی ہے۔"

اس نے گویا جھنجلا کر رنگوں کی پلیٹ ایک طرف اور برش دوسری طرف پھینک دیا اور تنک کر بولی "اس شہر میں انسان کہیں بھی بیٹھ کر تخلیقی کام نہیں کر سکتا۔ لگتا ہے سکون کی تلاش میں اب مجھے قبرستان ہی جانا پڑے گا۔"

وہ میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ وہ قد میں مجھ سے بہت چھوٹی تھی۔ سر اٹھا کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے باوجود گویا میں اسے بہت چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا "اگر قبرستان جانے کا پروگرام بن بھی جائے تو اس حالت میں مت جانا۔ مُردے قبروں سے اٹھ بیٹھیں گے اور سخت برا منائیں گے۔ وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کرتے کہ کوئی ان کے جذبات سے کھیلنے کی کوشش کرے۔ سکون میسر آنے کے بجائے وہاں تمہارا رہا سہا سکون بھی برباد ہونے کا اندیشہ ہے۔ مُردے تمہارا جینا دوبھر کر دیں گے۔"

وہ گویا اب تک اپنی حالت سے قطعی بے خبر تھی۔ اب اسے اندازہ ہوا کہ میری نظر کہاں سے کہاں تک بھٹک رہی تھی، اس نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی اور ذرا چونک کر بولی "اوہ!"

اس بے خبری اور بے پروائی پر قربان جانا چاہئے تھا لیکن میں اس وقت قربان جانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے قریب ہی ایک کرسی کے ہتھے پر پڑا ہوا ریشمی گاؤن اٹھا کر پہن لیا اور ایک بار پھر گویا میرے لئے وضاحت کی "میں ٹمی کے چہرے پر ایک خاص تاثر پینٹ کرنا چاہتی تھی۔ اس کے لئے میں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا۔"

"تم جیسے سچے فنکار صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا "یہ ٹمی کہاں سے تمہارے ہاتھ لگا ہے؟"

"ہاتھ لگا ہے؟ کیا مطلب؟" وہ ناک سکیڑ کر بولی "تم تو کچھ اس طرح بات کر رہے ہو جیسے بے چارہ ٹمی گلیوں میں آوارہ پھرتا ہوا کوئی پلا یا بلی کا بچہ تھا جو اتفاق سے میرے ہاتھ لگ گیا۔ یہ ایک معزز اور دولت مند گھرانے کا لڑکا ہے۔ اس کے والد یورپ میں سفیر رہ چکے ہیں۔ آج کل ان کا بہت بڑا بزنس ہے۔"

"کیا وہ کسی عمر رسیدہ مصور خاتون کے لئے ماڈلنگ کرتے ہیں؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"اوہ پلیز طنز مت کرو۔ ٹمی برا منا جائے گا۔ اس کا غصہ بہت خراب ہے۔" وہ گویا ہنستے ہنستے رہ گئی۔ پھر اس نے گردن گھما کر ٹمی کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک پوز بنائے اکڑا بیٹھا تھا۔

"اوہ ٹمی پلیز۔ اب تم اسٹول سے اتر آؤ۔ فی الحال کام رک گیا ہے۔" پنکی نے اسے مطلع کیا۔ گویا وہ بے چارہ خود دیکھنے سے قاصر تھا۔ وہ نہایت سعادت مندی سے اسٹول سے اتر آیا۔ چند گہری گہری سانسیں لے کر اور جسم کو جھٹکے دے کر اس نے شاید اکڑاؤ دور کیا اور آگے آ گیا۔

وہ کینہ توز نظروں سے مجھے گھور رہا تھا مگر ہاتھ پھیلا کر بولا "سگریٹ ہو گی تمہارے پاس؟"

"پنکی ابھی بتا رہی تھی کہ تمہارے باپ کا بہت بڑا بزنس ہے۔ لیکن سگریٹ مانگ کر پیتے ہو۔ کیا یہ بھی تمہارے خاندانی بزنس کا ایک حصہ ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

اس کا تمتمایا ہوا سا چہرہ کچھ اور سرخ ہو گیا۔ بازوؤں کی مچھلیاں پھڑپھڑانے لگیں "میرا سگریٹ کا پیکٹ نیچے میری جیپ میں رہ گیا ہے بدتمیز آدمی! مرے کیوں جا رہے ہو۔ اگر ایک سگریٹ نہیں دے سکتے تو سیدھی طرح انکار کر دو۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ مجھے سیدھی طرح انکار کرنا آتا نہیں ہے کیونکہ میں سگریٹ پیتا نہیں ہوں۔" میں نے اب ذرا نرم لہجے میں کہا "اور تم جیسا باڈی بلڈر میں نے پہلی بار دیکھا ہے جو سگریٹ پیتا ہے۔"

پنکی نے اس کی طرف دیکھ کر گویا اسے تسلی دی "سگریٹ میرے پاس اندر پڑی ہے۔ میں ابھی تمہیں لا دیتی ہوں لیکن پہلے ہمیں اس عجیب و غریب اجنبی سے بات کرنی چاہئے۔ آخر یہ چاہتا کیا ہے۔"

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی "دیکھو مسٹر! تم جو کوئی بھی ہو۔ لیکن تمہیں میرے بوائے فرینڈ کی توہین کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ ایک تو تم پہلے ہی نہ جانے کس طرح منہ اٹھائے میرے گھر میں گھس آئے ہو۔"

زمانہ واقعی کچھ زیادہ ہی تیزی سے ترقی کر رہا تھا۔ کچھ عرصے پہلے تک اس طبقے کی لڑکیاں بھی بوائے فرینڈ کی اصطلاح استعمال نہیں کرتی تھیں کم از کم اجنبیوں کے سامنے تو اس قسم کے لڑکوں کو "کزن" وغیرہ کے مشہورِ زمانہ رشتے سے ہی متعارف کراتی تھیں لیکن پنکی نے بڑے اطمینان سے اسے اپنا بوائے فرینڈ قرار دیا تھا۔

"یہ تمہارا بوائے فرینڈ ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے کیا؟" پنکی سرکش لہجے میں

"مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ جب تم نے اپنے والدین کے بھی نہیں سنے ہوں گے اعتراضات تو تم نے اپنے والدین کے بھی نہیں سنے ہوں گے، میرے اعتراض کرنے سے کیا فرق پڑ سکتا ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا اور از سرِ نو گہری نظر سے اس نوجوان کا جائزہ لیا۔ کسی کے اشارے پر کسی کو قتل کرنے کا پوری طرح اہل معلوم ہوتا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس کے پاس اعشاریہ تین دو کا پستول بھی موجود رہا ہو۔ رحیم گل نے مجھے بتایا تھا کہ جج صاحب کو اعشاریہ تین دو کے پستول سے گولی ماری گئی تھی۔

پنکی بولی "ایک آرٹسٹ کو پرائیویسی کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"بے شک۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "خصوصاً ایک آرٹسٹ کو تو بہت ہی پرائیویسی میسر ہونی چاہئے۔"

وہ میری بات پر دھیان دیئے بغیر تیزی سے بولی "تم میری پرائیویسی میں مخل ہوئے ہو۔ زبردستی میرے گھر میں داخل ہوئے ہو۔ میں تمہیں پولیس کے حوالے کر دوں گی۔"

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔" میں نے پری کی انگریزی گفتگو میں پہلی بار اردو کا مصرع ٹانکا۔

"وہاٹ؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"اسے چھوڑو۔ یہ تمہاری سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔" میں نے کہا "پہلے تم مجھے ایک بات سمجھاؤ جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ مجھے تمہاری صورت کچھ شناسا سی لگ رہی ہے۔ کیوں ہے؟ کیا ہم پہلے کبھی مل چکے ہیں؟"

"اگر ہم پہلے ملے ہوتے تو تم اتنی آسانی سے مجھے نہیں بھول سکتے تھے۔" وہ آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی "اور تم بھی اس قابل نظر لگتے ہو کہ تمہیں یاد رکھا جاتا۔ میرا خیال ہے تمہیں میری صورت اس لئے جانی پہچانی لگ رہی ہے کہ میں ماڈلنگ کرتی ہوں ٹی وی پر۔ اور پریس میں کئی اشتہاروں میں آ چکی ہوں۔"

"اوہ ہاں بالکل یہی بات ہے۔" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے اس کی تائید کی۔

"آج کل میں ذرا اوور ویٹ ہو رہی ہوں اس لئے میں نے ماڈلنگ چھوڑی ہوئی ہے۔ اب میں خوب زبردست ڈائٹنگ شروع کروں گی دوبارہ سلم اور اسمارٹ ہو کر زیادہ زور و شور سے ماڈلنگ کے میدان میں آؤں گی۔" اب اس کا لہجہ تھوڑا سا دوستانہ ہو چکا تھا۔

"ضرور آنا۔ ضرور آنا۔" میں نے سر ہلایا "یہ بتاؤ تم جج عبدالسلام صاحب کو جانتی ہو؟"

"کیوں نہیں۔" وہ بلا تامل بولی "وہ میرے ڈیڈی کے دوست ہیں بلکہ یوں کہو کہ انہوں نے میرے دوسرے ڈیڈی بننے کی کوشش کی تھی۔ میری ایک ہی ڈیڈی سے بڑی مشکل سے جان چھوٹی تھی اس لئے میں کوشش کرتی تھی کہ وہ میرے دوسرے ڈیڈی نہ بننے پائیں۔"

اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "بہرحال اچھے آدمی ہیں۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی کہاں ہیں آج کل وہ؟ کیا تم ان کا کوئی پیغام لائے ہو؟"

"وہ اب وہاں ہیں جہاں سے کوئی پیغام بھیجنا ناممکن ہی ہوتا ہے۔"

"کیا مطلب؟" اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

"انہیں کل شام کسی نے قتل کر دیا ہے۔" میں نے کہا اور اس کے چہرے پر نظر جمائے رکھی۔

"اوہ نو۔" وہ کھڑے کھڑے ذرا لڑکھڑا سی گئی۔ ٹمی نے فوراً لپک کر اپنے مضبوط بازوؤں میں اسے سہارا دیا اور گدیلی کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کی رنگت کچھ متغیر سی ہو گئی تھی۔

"پوئر اولڈ ڈیڈی!" چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ترحم آمیز سے انداز میں بڑبڑائی۔

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ پوئر اولڈ ڈیڈی نے ایک انشورنس پالیسی لی ہوئی تھی اب اس کی رقم دس لاکھ بنتی ہے، اس پالیسی میں انہوں نے تمہیں وارث مقرر کیا ہوا تھا؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی "وہ بے چارے میری مدد کرنا چاہتے تھے۔ ان دنوں میرے حالات کافی

خراب تھے۔ ماں باپ سے میری نئی نئی علیحدگی ہوئی تھی۔ اب میں اپنے حالات بہتر کرنے کے لئے بے چارے جج صاحب کی موت کا انتظار تو نہیں کر سکتی تھی۔ اس لئے میں نے خود ہی ہاتھ پاؤں مار کر اپنے حالات بہتر کر لئے تھے۔ لیکن اب تم یہ خبر لائے ہو۔ کیا تمہارا تعلق انشورنس کمپنی سے ہے؟"

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ابھی ہمارے ہاں انشورنس کمپنیاں اتنی مستعد نہیں ہوئیں کہ آدمی کے قتل کے دوسرے دن ہی وارث کے گھر پہنچ جائیں۔ بے چاری انشورنس کمپنی کو تو ابھی اس واقعے کی اطلاع بھی نہیں ہے۔"

"تو پھر تم کون ہو؟ تم پولیس والے تو نہیں ہو سکتے۔ اور پرائیویٹ سراغرساں ہمارے ملک میں ہوتے نہیں ہیں۔" اس نے مجھے گھورا۔

"درست ہے۔" میں نے سر ہلایا "میں نہ پولیس والا ہوں اور نہ ہی پرائیویٹ سراغرساں۔ میں بتا چکا ہوں میرا نام افضل چوہدری ہے اور میں ایک نہایت ہی نامعقول آدمی ہوں لیکن مجھے ایک معقول قسم کے سوال کا جواب چاہئے۔ کل شام پانچ سے سات بجے کے دوران تم اور تمہارا یہ ذرا نچلے درجے کا ٹارزن بوائے فرینڈ کہاں تھے؟"

اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور ان سے غیظ و غضب کا اظہار ہونے لگا۔ ٹمی کے نتھنے بھی پھولنے پچکنے لگے۔ وہ نیچی لیکن غصیلی آواز میں بولی "اب میں سمجھی کہ تم کیا کہنے کی کوشش کر رہے ہو۔ شاید تم نے کچھ انگریزی کہانیاں پڑھ لی ہیں جنہوں نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ پاکستان میں انشورنس کے لئے قتل نہیں ہوتے۔"

"پاکستان میں کیا نہیں ہوتا مائی ڈیئر پنکی!" میں نے طویل سانس لے کر کہا "جو کچھ بھی مغرب میں ہوتا ہے۔ بیس تیس پچاس سال بعد اور بعض اوقات اس سے پہلے مشرق میں بھی ہونے لگتا ہے۔ تھوڑا یا زیادہ لیکن ہوتا ضرور ہے جب یہاں بوائے فرینڈز ہو سکتے ہیں تو انشورنس کے لئے قتل بھی ہو سکتے ہیں۔ مجھے ایک بار ایک انشورنس کمپنی کے بہت اعلیٰ افسر نے بتایا تھا کہ یہاں بھی انشورنس کے لئے کیا کچھ ہوتا ہے اصل مسئلہ تو پیسے کا ہے نا اور پیسے کے لئے یہاں کیا نہیں ہوتا؟"

وہ مجھے گھورتی رہی۔ میں نے اپنا سوال دُہرایا تو وہ آہستگی سے بولی "کل شام میں اور ٹمی ایک آرٹ گیلری میں تصویروں کی نمائش دیکھ رہے تھے۔"

"اس کا کوئی ثبوت؟"

"ثبوت کے بچے۔" ٹمی برہمی سے پہلے اردو میں بولا پھر فوراً انگریزی کی طرف منتقل ہوتے ہوئے چلایا "میں دیتا ہوں تمہیں ثبوت۔ تم ہوتے کون ہو ہم سے ثبوت مانگنے والے۔ بہت ہو چکی۔"

وہ بازوؤں کے مسل پھُلائے میری طرف بڑھا
بھی پھول پچک رہے تھے۔ پنکی نے ہاتھ کے اشار
روکنے کی کوشش کی۔ میں نے پُرسکون لہجے میں کہا
جواب حاصل کرنے کے بعد مجھے اس گھر کی تلاشی بھی

"اب حد ہو گئی ہے پنکی!" ٹمی غضبناک لہجے
میں اس منحوس کو اٹھا کر کھڑکی کے راستے نیچے پھینکو
اس نے دوسری مرتبہ مجھے اٹھا کر پھینکنے کا ارا
شاید ویٹ اٹھاتے اٹھاتے اسے ہر چیز کو اٹھانا بہت
تھا۔ میرے ہاتھ ابھی تک پتلون کی جیبوں میں تھے۔
وہ کچھ زیادہ ہی اعتماد سے خوف ناک انداز میں مجھ پر
اندازہ نہیں کر سکا ہو کہ کب میرا ہاتھ جیب سے باہ
میرا گھونسا اس کی پیشانی پر پڑا۔ یہ وہ گھونسا تھا جس
شفیع شاہ کے کئی ہارس پاور کا انجن کام کر رہا ہوتا تھا۔

وہ جتنی تیزی سے جھپٹا تھا اس سے کہیں زیادہ
سے پیچھے گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھ
تھیں۔ پنکی کو شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس کا ٹارزا
گھونسے میں اس طرح چت ہو گیا تھا۔

میں نے گویا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا
اطمینان سے لی جا سکے گی۔ یہ خواہ مخواہ بیچ میں جھک
میرا خیال ہے میں اس کے کپڑوں سے ہی تلاشی شروع
پھر اپارٹمنٹ کو دیکھوں گا۔"

میں نے دوسری کرسی کے ہتھے پر اس کا سوٹ او
دیکھ لی تھی۔ پنکی ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہی تم
اس بے چارے کو ہلا جلا کر دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی
میں نے آگے بڑھ کر کرسی کے ہتھے سے سب
کوٹ اٹھایا۔ مجھے اس کی ایک جیب میں کچھ وزن محس
وزن بٹوے کے وزن سے کچھ زیادہ محسوس ہو رہا تھا۔
سے پہلے اسی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے
میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے پستول نکال کر دیکھا۔ وہ
کا ہی پستول تھا۔

میں نے اس کا میگزین نکال کر دیکھا۔ اس میں ا
تھی کم تھیں میں نے پنکی کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور پھٹی
سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

نے ایک بار پھر میگزین کا جائزہ لیا اور سر ہلاتے ہوئے
اعشاریہ تین دو کا پستول ہے۔ اور جج صاحب کو
ن دو کے پستول سے ہی قتل کیا گیا ہے۔ اس کے میگزین
لی بھی کم ہے۔"
لیا صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کرتے ہوئے زرا
کھا جانے والے انداز میں بولی۔ "یہ تو کسی کو قاتل ثابت
ت آسان طریقہ ہے۔"
نے تو اتنی بھی زحمت کر لی ہے۔ پولیس کے پاس تو کسی کو
کرنے کے اس سے بھی کہیں زیادہ آسان طریقے موجود
نے کہا۔
تم کون خدائی فوج دار ہو۔ اور کیوں اس طرح اچانک
گلے پڑ گئے ہو؟" وہ برہمی سے چیخی۔
بات ذرا دیر سے تمہاری سمجھ میں آئے گی" میں نے

نے اچانک بپھری ہوئی جنگلی بلی کی طرح مجھ پر حملہ کر دیا۔
لے مخصوص روایتی انداز میں اس نے میرا منہ نوچنے کی۔
لیکن میں نے اس کے ناخن اپنے چہرے تک نہیں پہنچنے
سے کلائیوں سے پکڑ کر قابو کرنے کی کوشش کی۔
ے ٹھوکریں مارنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے اس کو اور
طرح قابو میں کرنے کی کوشش کرنا پڑی اور اس کوشش
پارا صفت وجود میرے ہاتھوں میں بکھرنے لگا۔ وہ جس
انداز میں مچل رہی تھی اس عالم میں اسے قابو میں کرنا
تھا۔
سے وہ مجھے دانتوں سے کاٹنے کی بھی کوشش کر رہی تھی۔
ں کے دانتوں سے بچتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش
ہو' یہ اچھی بات نہیں ہے۔ اس طرح دانتوں سے کاٹنے
کو کچھ اور کہتے ہیں۔ میں تمہیں وہ نام دینا نہیں چاہتا'
بھی ہوتی ہے۔"
جیسے کچھ بھی نہیں سن رہی تھی۔ اس کے انگ انگ میں
نائی بھری ہوئی تھی۔ شاید یہ توانائی کی زیادتی ہی ہوتی ہے
سے اس قسم کی روحیں کچھ زیادہ ہی باغی ہو جاتی ہیں۔
باغی' ماں باپ سے باغی' معاشرے سے باغی' اصولوں سے
ایسے کہ ہر چیز سے باغی۔
خود بھی ریشم سے کم نہیں تھی۔ اوپر سے اس کا گاؤن ریشمی
میرے ہاتھوں سے پھسل پھسل جا رہی تھی۔ اسے قابو میں
ں بہت مشکل تھا۔ ایک بار تو اس نے میری ناک پر ٹکر بھی
نے کی کوشش کی۔ غنیمت تھا کہ اس کا قد چھوٹا تھا۔ چلنے
راس کا سر صرف میری ٹھوڑی سے ہی ٹکرا سکا۔
ٹکر سے ٹھوڑی کا کچھ نہیں بگڑا۔ البتہ اگر ٹکر ناک پر پڑ
تو یقیناً نکسیر پھوٹ جاتی اور مجھ پر چودہ طبق روشن

ہو جاتے۔ اس کی کوششیں اس کے باڈی بلڈر ماڈل سے زیادہ مؤثر تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اس دبیز اور گداز کمبل سے جان چھڑا لینا ہی بہتر تھا۔

میں نے اسے دور اچھال دیا۔ وہ اپنی رنگ کی ٹیوبیں' آئل کے ڈبے اور نہ جانے کس کس کاٹھ کباڑ کو بکھیرتی ہوئی اپنے بوائے فرینڈ پر جا گری۔ جس حسین انداز میں وہ اس پر جا گری تھی اس سے اس بدبخت کو ہوش آ جانا چاہیے تھا مگر شاید وہ بے ہوشی کے جنگل میں کچھ زیادہ ہی دور نکل گیا تھا۔ اتنا کرنٹ لگنے بلکہ پاور پلانٹ کے نیچے دب جانے پر بھی ہوش میں نہ آیا۔

پنکی نہایت پھرتی سے اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس بار وہ جس طرح مجھ پر حملہ آور ہوئی اس سے یہ حیرت انگیز انکشاف بھی ہوا کہ وہ جوڈو کراٹے بھی جانتی تھی۔ زیادہ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس نے پہلی مرتبہ ہی حملہ کرتے وقت اپنا یہ ہنر کیوں نہیں آزمایا تھا؟ اس وقت وہ کیوں خالص زنانہ انداز میں حملہ آور ہوئی تھی اور میرا منہ نوچنے کی کوشش کرنے لگی تھی؟

اسی کوشش میں وہ کسی حد تک میرے قابو میں آ گئی تھی۔ شاید جبلت اس کے ہنر پر غالب آ گئی تھی۔ عورت عموماً غصے اور غیظ و غضب کے عالم میں یہی کہتی ہے۔ "منہ نوچ لوں گی۔"

بہرحال حیرت ہی حیرت میں مجھے اپنے کندھے پر اس کی ایک فلائنگ کک برداشت کرنی پڑ گئی۔ شیر کی بچی میں اچھی بھلی طاقت اور پھرتی تھی۔ میں نے اس کے باقی دو تین داؤ خالی دیئے اور آخر فیصلہ کیا کہ اسے تھوڑا بہت ڈوز دینا ضروری تھا۔

پھر میں نے سونار کی ایک لوہار کی' والے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے بتایا کہ اساتذہ کس طرح وار کرتے ہیں۔ کھوپڑی پر ایک ہی چاپ پڑی تو وہ ایک فولڈنگ کرسی پر اس طرح جا کر گری کہ کرسی سمیت الٹ گئی۔ وہ وہیں ساکت رہی تو مجھے ذرا تشویش ہوئی کہ کہیں وہ بھی اپنے بوائے فرینڈ کی طرح بے ہوشی کے جنگل کی طرف تو نہیں نکل گئی تھی؟

چیزوں کو پھلانگتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر فولڈنگ چیئر ایک طرف ہٹا کر دیکھا۔ مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ وہ اچانک ہی ایک بھیانک چیخ کے ساتھ نہ اٹھ کھڑی ہو اور ننجا ماسٹر والے اسٹائل میں اچھل کر میری کھوپڑی نہ چٹخا دے لیکن وہ چت پڑی آنکھیں پٹ پٹا رہی تھی۔

وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں اتر آنے والی خفیف سی دھندلاہٹ بتا رہی تھی کہ اس کا ذہن سست پڑ گیا تھا۔ میں نے خطرہ مول لیتے ہوئے فولڈنگ چیئر سیدھی کی اور پنکی کو گردن سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے اس پر بٹھا دیا۔

اس نے اب مجھ پر حملہ نہیں کیا اور ڈھیلے ڈھالے انداز میں کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ ذرا وقت سے ہی سہی لیکن بات بہرحال اس کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ میں اس کے بس کی چیز نہیں تھا۔ تاخیر سے ہی

سہی. لیکن اس نے بہرحال اس حقیقت کو تسلیم کرلیا تھا۔

میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "معذرت خواہ ہوں کہ میرے بارے میں تمہارے اندازے غلط نکلے۔"

اس کے بوائے فرینڈ کا پستول اور اس کا میگزین میں نے ایک طرف پھینک دیا تھا۔ وہ دونوں چیزیں اٹھاتے ہوئے میں نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "میں پولیس کو فون کرنے لگا ہوں۔ کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ تمہارے بوائے فرینڈ نے جج صاحب کو خود اپنی مرضی سے قتل کیا تھا یا یہ تمہاری ہدایت تھی؟"

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتے ہوئے کاہلی آمیز سے انداز میں پلکیں جھپکاتی رہی۔ ایک کونے میں مجھے فون رکھا نظر آگیا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ تاہم میری نظر چکی پر ہی تھی۔

میں نے ریسیور پر ہاتھ رکھا تو وہ تھکی تھکی سی آواز میں بول اٹھی۔ "مجھے تمہارا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے۔"

"تمہیں کیا مجھے خود بھی کبھی کبھی اپنا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے" میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔

"محض مطلوبہ کیلیبر کے پستول اور اس میں ایک گولی کم ہونے کی وجہ سے تم نے ٹمی کو اور مجھے ایک ساتھ قاتل فرض کر لیا۔" اس کی آواز اب کچھ غنودگی زدہ سی محسوس ہو رہی تھی۔ "یہ پستول آج کے دور میں بہت حقیر اور آؤٹ ڈیٹیڈ سا ہتھیار ہو کر رہ گیا ہے۔ اب تو لوگ نہ جانے کیا کچھ لیے پھرتے ہیں۔ اس کے باوجود اب بھی شہر میں سیکڑوں لوگوں کے پاس یہ پستول موجود ہوگا اور ان کے میگزین میں ایک یا ایک سے زیادہ گولیاں کم ہوں گی۔ تمہیں ان سب کو بھی جج صاحب کے قتل کے الزام میں پکڑ لینا چاہیے" وہ اب بھی بات انگریزی میں ہی کر رہی تھی۔

"پستول یقیناً بہت سے لوگوں کے پاس ہوں گے۔ ان کا کیلیبر بھی یہی ہوگا اور وہ ان سے فائر بھی کر چکے ہوں گے لیکن ان کے پاس جج صاحب کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہوگا۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

وہ مضمحل مگر استہزائیہ سے انداز میں ہنسی۔ "تمہارے خیال میں اس شہر میں جتنے بھی قتل ہو رہے ہیں وہ جواز کے ساتھ ہو رہے ہیں؟ ان کے لیے اگر کچھ جواز گھڑ بھی لیے گئے ہیں تو وہ سب جھوٹے اور بکواس ہیں۔ اصل جواز صرف یہ ہے کہ بہت سے انسانوں میں بے پناہ خباثت اور خون کی پیاس پیدا کردی گئی ہے۔"

"درست ہے مگر جج صاحب کا معاملہ ان سے مختلف ہے۔ وہ ایک الگ سلسلہ ہے۔ جج صاحب کا قتل ایک الگ مسئلہ ہے۔" میں نے ریسیور اٹھایا۔

"ٹھہرو۔" وہ اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر بولی۔

میں نے ریسیور واپس رکھ کر اس امید کے ساتھ اس کی طرف دیکھا کہ وہ حقیقت کا اعتراف کرنے لگی تھی۔ وہ بوجھل لہجے میں بولی۔ "میں تمہیں بتاتی ہوں' ٹمی کے پستول میں ایک گولی کیوں کم

ہے۔ کل جب میں اور ٹمی تصویروں کی نمائش سے
تھے تو ہمیں راستے میں ایک ریستوران میں کھانا وغی
کافی دیر ہو گئی تھی۔ پھر ایک جگہ راستے میں گاڑی
میڈیکل اسٹور میں کوئی دوا لینے چلا گیا۔ گاڑی ٹمی کی
ماڈل کی پجیرو ہے۔ میں گاڑی میں ہی بیٹھی تھی۔ ا
موٹر سائیکل پر تین لڑکے لدے ہوئے آئے۔ ان ک
پستول تھے۔ انہوں نے مجھے' نیچے اتر کر پجیرو چھوڑ
بلکہ ایک نے تو کھڑکی میں سے ہاتھ ڈال کر اگنیشن
نکال لی۔"

وہ جیسے بولتے بولتے تھک گئی۔ سانس لینے
انہماک سے سن رہا تھا۔ اس نے سلسلۂ کلام جوڑا
سب کچھ دیکھ لیا تھا اور وہ سمجھ گیا تھا کہ لڑکے کا
کوشش کر رہے تھے۔ ٹمی ایک بے خوف نوجوان
بھی بہت تیز ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی ہے ک
زندہ کیسے ہے۔"

"صرف اس لیے کہ اوپر والے نے ابھی اس ک
ہوئی ہے" میں نے سادگی سے جواب دیا۔ "بہرحال کہ

"یہ اِدھر اُدھر بھاگنے کے بجائے تیر کی طرح
طرف آیا۔ اس نے پستول فوراً ہی نکال لیا تھا اور
بھی رہا تھا۔ اس نے اس بات کی بھی پروا نہیں کی
تھے اور ان کے پاس ٹی ٹی تھے۔ ٹمی اکیلا تھا اور اس
یہ ننھا سا پستول تھا جو آج کے دور میں کھلونا لگتا ہے۔

"تم بھی تو تھیں۔ تم بھی کسی کمانڈو سے کم نہیں
کہا۔

"نہتا انسان مارشل آرٹس سے بھی واقف ہ
افراد کے سامنے اس قسم کے حالات میں تقریباً
ہے" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "مجھے اعتراف ہے کہ
خوف زدہ ہو گئی تھی۔"

"مجھے معلوم ہوتا تم اس طرح خوف زدہ ہو
تمہیں اسی طرح خوف زدہ کرنے کی کوشش کرتا۔"
سانس لے کر کہا۔

"بکواس مت کرو" اس کے لہجے میں پھر زرا
"مجھے اندازہ ہو گیا ہے تم سڑکوں پر لوٹ مار کرنے
کے لٹیروں اور بدمعاشوں سے زیادہ خطرناک چیز ہ

"شکریہ۔ ذرہ نوازی ہے تمہاری۔" میں نے
کر گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے کہا۔

وہ اسی طرح نیم دراز' ایک لمحے مجھے گھورتی
آنکھوں میں اضمحلال دھیرے دھیرے کم ہو رہا تھا
طور پر حواس میں آرہی تھی۔

"زندگی میں کبھی موقع ملا تو میں تمہیں سمجھنے

کروں گی۔" وہ بولی۔

"ایسے فضول کام میں وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارا وقت بہت قیمتی ہے۔" میں نے کہا پھر اسے یاد دلایا۔ "تم اس واقعے کے بارے میں بتا رہی تھیں۔"

"بس ٹمی نے سوچے سمجھے بغیر ایک فائر بھی کر دیا تھا" وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے بولی۔ "ایک لڑکے کے ہاتھ پر گولی لگی۔ اس کا ٹی ٹی گر گیا مگر وہ فوراً ہی دوسرے لڑکے نے اٹھا لیا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اسی لمحے وہاں سائرن کی آواز سنائی دینے لگی حالانکہ وہ شاید کسی ایمبولنس کے سائرن کی آواز تھی لیکن لڑکوں پر کچھ گھبراہٹ سی طاری ہو گئی شاید انہوں نے سمجھا ہو کہ پولیس کی کوئی گاڑی اس طرف آرہی تھی۔ وہ فوراً موٹر سائیکل... پر بیٹھے اور بھاگ نکلے۔ ہماری دوسری خوش قسمتی یہ تھی کہ انہوں نے ہم پر فائرنگ نہیں کی حالاں کہ بھاگتے بھاگتے انہوں نے چند ہوائی فائر ضرور کیے۔ شاید اس لیے کہ کوئی ان کا راستہ روکنے کی کوشش نہ کرے۔ ان کی گنوں کا رخ ہماری طرف بھی ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔" اس نے خاموش ہو کر ایک گہری سانس لی اور ذرا سیدھی ہو کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اس واقعے کا کوئی گواہ؟" میں نے پوچھا۔

وہ ایک آہ بھر کر سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ "میں ابھی یہی سوچ رہی تھی کہ کیا تم یہ احمقانہ سوال بھی کرو گے؟ تم نے میری توقع پوری کردی۔"

"میں لوگوں کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کرتا ہوں" میں نے خلوص سے کہا۔ "خواہ کوئی مجھے احمق ہی سمجھ لے۔ اس سے میری ذہانت پر کوئی خاص اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ کیا مجھے اپنا سوال دہرانا پڑے گا؟"

"نہیں" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولی "سب سے بڑے گواہ تو وہ لوگ ہیں جن کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا' وہ چھوٹی سی مارکیٹ تھی اور تین چار دکانیں اس وقت بھی کھلی ہوئی تھیں۔ گو کہ اس واقعے کے بعد وہ بھی تیزی سے بند ہو گئیں لیکن دکانداروں نے بہرحال سب کچھ دیکھا تھا۔"

اس نے مجھے اس جگہ کا اور مارکیٹ کا نام بتایا پھر بولی "اس کے علاوہ ٹمی نے ایک عقلمندی یہ کی تھی کہ گھبراہٹ کے عالم میں سیدھا گھر آنے کے بجائے پہلے تھانے جا کر اس واقعے کی رپورٹ درج کرادی تھی۔ انہوں نے پکی ایف آئی آر تو درج نہیں کی تھی لیکن ان کا کہنا تھا کہ اگر وہ لوگ پکڑے گئے تو پھر وہ پکی ایف آئی آر درج کرلیں گے۔ بہرحال پولیس اپنے ریکارڈ کے لیے اس قسم کے واقعات ایک الگ رجسٹر میں لکھ لیتی ہے جسے کچی ایف آئی آر کہا جاتا ہے۔ آج کل بہت سے جرائم کے سلسلے میں یہی طریقہ چل رہا ہے یہ مجھے اس روز تھانے جا کر پتا چلا۔"

اس نے دوبارہ کرسی کے پشتے سے ٹیک لگالی۔ "یہ ہے کل کہانی! اس لیے ٹمی کے پستول میں ایک گولی کم ہے۔ ٹمی نے پستول پولیس والوں کو بھی دکھا دیا تھا۔ اس کے پاس لائسنس موجود ہے۔ اسے کوئی خوف نہیں تھا۔ جہاں تک جج صاحب کو قتل کرنے کا تعلق ہے تو بے چارہ ٹمی تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کیوں کہ یہ تو جج صاحب کو جانتا ہی نہیں اور نہ ہی اسے یہ پتا ہے کہ میرے اور جج صاحب کے درمیان کیا رشتہ تھا۔ اس سے میری دوستی زیادہ پرانی نہیں ہے۔ اس سے آج تک جج صاحب کے بارے میں میری کوئی بات نہیں ہوئی۔"

میں نے ایک لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد کہا۔ "مجھے اس واقعے کی تصدیق کرنا ہوگی۔"

میں نے ایک بار پھر فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور رحیم گل کا نمبر ڈائل کیا۔ میری نظر بدستور چکی پر تھی۔ ٹمی کے بارے میں مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔ وہ ابھی تک اسی طرح چت پڑا تھا۔

میں جب لائن ملنے کا انتظار کر رہا تھا اس دوران میں چکی نہ جانے کیوں عجیب سے لہجے میں بولی۔ "میں اور ٹمی اتنے برے نہیں ہیں جتنے تم سمجھ رہے ہو۔"

"شاید تم درست کہہ رہی ہو لیکن یہ سب کچھ تم اتنی اچھل کود' دھینگا مشتی اور چیخ و پکار کے بغیر بھی کہہ سکتی تھیں" میں نے نرمی سے کہا۔

"تم نے ہم سے صحیح طریقے سے بات کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔" وہ اب خاصی ملائمت سے بولی۔ "اس کے علاوہ مجھے اس بات پر بھی بہت غصہ آیا تھا' ٹمی کو بھی آیا ہوگا کہ تم نے آکر ہماری پرائیویسی میں دخل دیا تھا۔ ہمارے ہاں لوگ ویسے بھی دوسرے کی پرائیویسی کا کوئی احترام نہیں کرتے اور تم نے تو حد ہی کردی تھی۔"

"میں اس معاملے میں دوسروں سے کافی مختلف ہوں اور لوگوں کی پرائیویسی کا بہت احترام کرتا ہوں" میں نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "میں اپنی دانست میں دوستانہ انداز میں آیا تھا اور میرے ذہن میں کچھ شکوک و شبہات تھے جو ابھی دور نہیں ہوئے ہیں بہرحال مزاجوں کے فرق کی وجہ سے کچھ غلط فہمیاں سی پیدا ہوتی چلی گئیں۔ مجھے متکبر' اکڑ دکھانے والے اور خود کو بہت بڑا سورما سمجھنے والے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑنے پر میں اپنی حدود سے کچھ تجاوز کر جاتا ہوں۔ تاہم اگر تم دونوں جج صاحب کے قتل سے اسی طرح لاتعلق ثابت ہوئے جس طرح تم بتا رہی ہو تو میں ہاتھ جوڑ کر تم سے معافی مانگ لوں گا۔"

"صرف معافی؟" اس کے ہونٹوں پر اب خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"ہاں تمہیں صرف معافی پر ہی گزارا کرنا پڑے گا اور یہ بھی میرے انتہائی شائستہ و انصاف پسند ہونے کی دلیل ہوگی کیوں کہ

میں نے تم دونوں پر حملہ کرنے میں پہل نہیں کی تھی۔ میں نے تو صرف اپنا دفاع کیا تھا" میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ "تمہارا باڈی بلڈر بیرا معلوم نہیں میرے ساتھ کیا سلوک کرنے کے لیے دانت پیس کر مجھ پر چڑھا آرہا تھا۔ اس قسم کے ڈیزل انجن کو روکنے کے لیے مجھے کچھ تو کرنا تھا ورنہ وہ مجھے کچلتا ہوا گزر جاتا۔ میں نے تمہیں بھی شرافت سے روکنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن تمہیں مجھ پر طبع آزمائی کا بہت شوق چڑھا ہوا تھا۔ اگر میری جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو اس بے چارے کا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔ اب اگر تم میری معذرت کا مطلب یہ سمجھ رہی ہو کہ میں تمہارے بوائے فرینڈ کو اپنی پیشانی پر گھونسا رسید کرنے اور تمہیں اپنی کھوپڑی پر کراٹے کی چاپ مارنے کا موقع دوں گا تو میں اپنی معذرت واپس لے لیتا ہوں۔"

وہ خاموش رہی۔ اس دوران میں رحیم گل فون پر آچکا تھا۔ میں نے پنکی کی طرف سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ "کہاں مر گئے تھے؟"

"تمہارے سوئم میں شرکت کے لیے گیا ہوا تھا" وہ جلے کٹے انداز میں بولا۔

"اتنی اہم تقریب میں مجھے ساتھ لیے بغیر ہی چلے گئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"کہاں سے بول رہے ہو؟" اس نے مزید الجھنے کے بجائے فوراً سوال کیا۔

"وہیں سے جہاں تم نے مجھے بھیجا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہو، تم ابھی تک وہیں گھسے بیٹھے ہو۔" اس کے لہجے میں بیزاری کچھ کم ہوگئی "کیا لڑکی نے غلطی سے چائے پانی کو پوچھ لیا ہے؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "پہلے لڑکی کے باڈی بلڈر دوست نے مجھے غالباً دو چار گھونسوں اور ایک آدھ دھولی پٹرے کی چپتیاں کھلانے کی کوشش کی تھی پھر خاتون نے کراٹے کا کوکا کولا پلانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے معذرت کے ساتھ انکار کر دیا۔"

"رپورٹ کیا ہے؟" اب اس کے لہجے میں واضح دلچسپی جھلک آئی۔

"میں کیا تمہارا ملازم یا ماتحت ہوں جو مجھ سے رپورٹ مانگ رہے ہو؟" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا۔

"تو پھر کس لیے فون کیا ہے؟ کیوں کان کھا رہے ہو؟ بند کرو فون۔" اس نے ڈانٹ پلائی۔

"میں نے تو صرف یہ دیکھنے کے لیے فون کیا تھا کہ اپنی ڈیوٹی پر موجود بھی ہو یا اِدھر اُدھر کہیں آوارہ پھر رہے ہو۔ حرام خور افسروں کی ذرا نگرانی رکھنی پڑتی ہے نا۔" میں نے کہا۔ پنکی اب قدرے حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"اچھا، تم بکواس چھوڑو اور سنجیدگی سے بتاؤ کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟" رحیم گل کے لہجے میں دبی دبی سی التجا تھی۔

"ہاں۔ ایک کام کی بات معلوم ہوئی ہے لیکن وہ اس وقت فرش پر بے ہوش پڑی ہے" میں نے جواب دیا۔

"بات فرش پر بے ہوش پڑی ہے؟" رحیم گل نے دہرایا۔

"ہاں۔ خاصی وزنی سی بات تھی۔ باڈی بلڈر قسم کی" میں نے جواب دیا۔ "اور دوسری شعلۂ جوالہ قسم کی بات سامنے بیٹھی مہرباں نظروں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔ خیر، میں تمہیں بتانے کی کوشش کرتا ہوں کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ شاید بات تمہاری سمجھ میں آجائے" پھر میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔

میں خاموش ہوا تو وہ بولا۔ "یہ تو میرے ہی تھانے کا معاملہ ہے۔ میں ابھی معلوم کرلیتا ہوں کہ ایسے کسی واقعے کی رپورٹ درج ہوئی تھی یا نہیں۔ تم ہولڈ رکھنا" وہ مجھے ہولڈ کرا کے کسی سے بات کرنے لگا۔

میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پنکی سے کہا۔ "ابھی تمہاری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔"

وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ "تم کس کے لیے کام کرتے ہو؟"

"میں صرف اپنے لیے کام کرتا ہوں" میں نے فلسفیانہ لہجے میں جواب دیا۔ "ایک صرف میرا ہی ذکر کیا..... میرے خیال میں دنیا کا ہر شخص صرف اپنے لیے ہی کام کرتا ہے۔"

اس فلسفے کی مار مارنا مناسب رہا۔ اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ میرے لیے اس کو یہ سمجھانا مشکل تھا کہ میں کس کے لیے کام کرتا تھا۔ اسے اتنا اندازہ ضرور ہوگیا تھا کہ فی الحال میں کسی پولیس آفیسر سے بات کر رہا تھا۔

فون پر دھیمی آوازوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ رحیم گل کسی کو ڈانٹ رہا تھا۔ "ایک ذرا سی بات پوچھ لو تو پورے تھانے پر مصیبت پڑ جاتی ہے۔ بھگدڑ اور افراتفری مچ جاتی ہے۔ میں لوگوں کو آرگنائزڈ اور سارے کام کو سسٹمیٹک بنانے کی اتنی کوشش کر رہا ہوں لیکن تم لوگ سدھر کر ہی نہیں دیتے۔" رحیم گل نے غالباً ریسیور میز پر رکھ دیا تھا اور اسے خیال نہیں رہا تھا کہ آواز مجھ تک پہنچ رہی ہوگی۔

چند سیکنڈ بعد دوبارہ فون پر رحیم گل کی "ہیلو" ابھری تو میں نے کہا۔ "تم ان بے چاروں کو آرگنائزڈ اور سسٹمیٹک ہونے کے بارے میں ڈانٹ پلاتے ہو۔ ان بے چاروں کو تو ان الفاظ کے معانی بھی معلوم نہیں ہوں گے۔"

پھر میں نے حسبِ معمول اسے چھیڑنا ضروری سمجھا۔ "بھئی جن کے افسر تم جیسے نالائق اور نکمے ہوں وہ بھلا کب سدھر سکتے ہیں۔"

"بکواس بند کرو" وہ غرایا۔ "پنکی کا بیان بہرحال صحیح ہے۔ واقعہ میرے علم میں نہیں تھا۔"

"تمہارے علم میں ہوتا ہی کیا ہے" میں نے فوراً اس کی بات اچک لی۔ "تمہیں بھلا کیا پتا کہ تمہارے تھانے کی حدود میں کیا ہوتا ہے۔ تم کسی بے ہودہ قسم کے بادشاہ سلامت سے کم تھوڑا ہی ہو جسے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کی رعایا کے ساتھ کہاں کیا ہو رہا ہے۔ تم جیسے نالائق اور نکمے افسروں کی وجہ سے ہی تو شہر اس حال کو پہنچا ہے......"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے غرایا۔ "احمق آدمی! اس دلکش لڑکی کے سامنے بیٹھ کر شیخیاں مت جھاڑو اور اس پر رعب مت ڈالو کہ تم کس طرح پولیس افسروں کو ڈانٹتے ہو ورنہ وہیں پہنچ کر آٹھویں فلور سے نیچے پھینک دوں گا۔ فٹ پاتھ پر تمہارا ملیدہ پڑا ہوگا۔"

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "یہ تو دنیا ہی دیکھے گی کہ فٹ پاتھ پر ملیدہ کس کا پڑا ہوگا"

وہ ذرا نرمی سے بولا۔ "دیکھو، میرے تھانے کی حدود میں ہونے والا ہر واقعہ میرے علم میں نہیں ہوتا۔ رپورٹ میں نہیں، محرر درج کرتا ہے۔ میں بھی کہیں ہوتا ہوں، کبھی کہیں لیکن جلد یا بدیر بہرحال ہر بات میرے علم میں آتی رہتی ہے اور پروسیجر کے تحت ہر مسئلے پر ترتیب وار کارروائی ہوتی رہتی ہے۔ اب تم جیسے جاہل آدمی کو میں کیا سمجھاؤں کہ ہر بڑے ادارے کا ایک سسٹم ہوتا ہے جو کام کرتا رہتا ہے۔ یہ واقعہ بہرحال ریکارڈ پر موجود ہے لیکن زیادہ اہم نہیں تھا اس لیے اس کے بارے میں مزید کارروائی نہیں ہوئی۔"

"زیادہ اہم تو تب ہوتا جب وہ تینوں لٹیرے ان دونوں کو گولیوں سے چھلنی کرکے سڑک پر لٹا جاتے اور پجیرو لے کر فرار ہو جاتے" میں نے اس سے چھیڑ چھاڑ جاری رکھی۔

"یار، تم پولیس والوں کو برا بھلا کہنے کا شوق اس وقت پورا کر لینا جب مجھ سے ملاقات ہوگی۔ فی الحال کام کی بات کرلو" اس نے منت کی "پنکی کی کہانی تو ٹھیک ہے پھر بھی تمہاری بات سن کر نہ جانے کیوں مجھے یہ نوجوان کچھ مشکوک لگ رہا ہے۔ میں اس سے مزید بات چیت کرنا چاہتا ہوں۔ تم اسے میرے پاس تھانے میں نہیں لاسکتے؟"

"اوقات میں رہو میرے چاند!" میں نے شفقت سے کہا۔ "میں تمہارا مال بردار مزدور تو نہیں لگا ہوا ہوں جو اس وزنی بوری کو کندھے پر لاد کر تمہارے پاس لاؤں۔ وہ ابھی تک بے ہوش ہے۔"

"آخر رہے نا جاہل کے جاہل" وہ بولا۔ "اور پولیس والوں کو جاہل کہنے کا شوق ہے۔ چغد کہیں کے! اسے ہوش میں لاؤ اور گاڑی میں بٹھا کر لاؤ۔"

"یہ لانے لے جانے کا کام خود کرو پیارے! انہی کاموں کے لیے سرکار نے تمہیں اتنا عملہ دے رکھا ہے۔ میں تو اب گھر جا رہا ہوں۔ میرے کرنے کا جو کام تھا وہ میں نے کرلیا" میں نے ٹکا سا جواب دیا۔

"عملے کی کیا پوچھتے ہو جاہل اور کاہل دوست!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "کام کے مقابلے میں عملہ ایسے ہی ہے جیسے اونٹ کے منہ میں زیرہ۔"

"اور اس عملے کے ساتھ تمہارا ہونا ایسے ہی ہے جیسے بہرے کے منہ میں زیرہ۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔ "اس سے پہلے کہ تم مزید کچھ بکواس کرو، میں جا رہا ہوں۔"

"مجھے یہاں کا فون نمبر بتا دو" وہ جلدی سے بولا۔

میں نے ٹیلی فون سیٹ پر دیکھ کر نمبر اسے بتا دیا اور خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں اب چلتا ہوں" میں نے پنکی سے کہا۔

وہ اب کافی حد تک ہوش و حواس میں دکھائی دے رہی تھی اور سر سہلا رہی تھی۔ جل کر بولی۔ "تم تو اس طرح کہہ رہے ہو جیسے بڑے مہذبانہ انداز میں یہاں سوشل کال پر آئے ہوئے تھے۔"

"اگر تم اچھے اخلاق کا مظاہرہ کرتیں تو یہ سوشل کال بھی ہوسکتی تھی" میں نے گویا اظہارِ افسوس کیا۔

"تم جس طرح آئے اور جس طرح تم نے باتیں کیں، اس کے نتیجے میں تمہارا انتقال بھی ہوسکتا تھا۔" وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

"چلو خیر دونوں ہی کی تھوڑی تھوڑی غلطی تھی۔ حساب برابر ہوگیا۔ دعا کرنا آئندہ اگر ملاقات ہو تو خوشگوار حالات میں ہو" میں نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور کمرے سے نکل آیا۔ وہ اپنی جگہ بیٹھی مجھے حیرت سے دیکھتی رہی۔ یقیناً اس کی سمجھ میں اب تک نہیں آیا تھا کہ میں کون تھا اور یہ سب کچھ کیوں کرتا پھر رہا تھا۔

اس نے اب تک اپنے بوائے فرینڈ کی طرف قطعاً توجہ نہیں دی تھی۔ میں نے دروازے پر رک کر مڑتے ہوئے کہا۔ "ذرا اپنے اس بن بالوں کے ریچھ کی بھی کچھ فکر کرو۔ اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ اس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارو۔"

"میں ابھی فون کرکے ڈاکٹر کو بلاتی ہوں اور تمہارے خلاف رپورٹ بھی درج کراؤں گی۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"تمہاری سہولت کے لیے تھانہ انچارج خود ہی یہاں آرہا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ نہ آیا تو اس کا کوئی ماتحت ضرور آئے گا۔ تم میرے خلاف جو بھی رپورٹ درج کرانا چاہو، بڑے شوق سے کرالینا۔ ویسے اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جب بھی حکم دوگی، میں خود ہی ـــ بغیر کسی جرم کے ـــ اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگا کر تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

تب وہ نہ جانے کیوں مسکرا دی۔ اب تک اس کا جو موڈ نظر آتا رہا تھا، یہ مسکراہٹ اس سے قطعی مختلف تھی۔ اس کے اندر

یک لخت ہی جیسے کوئی دوسرا سوئچ آن ہو گیا تھا۔ بہت متلون مزاج لڑکی معلوم ہوتی تھی جس کے بارے میں یہ کہنا شاید بہت مشکل تھا کہ اگلے لمحے وہ کیا کر گزرے گی۔

وہ بالکل صاف ستھری اردو میں بولی۔ "تم جو کوئی بھی ہو لیکن ہو بڑی خبیث چیز!"

اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ بہت اچھی طرح اردو بولنے پر قادر تھی لیکن جان بوجھ کر اپنے اوپر انگریزی کا خول چڑھائے ہوئے تھی۔ ہماری سوسائٹی میں یہ بھی ایک خاص طبقہ موجود تھا جس کا خیال تھا کہ انگریزی بولنے سے انسان زیادہ باعزت نظر آتا تھا اور اردو بولنے سے شاید اس کا سماجی مقام گھٹ جاتا تھا۔ اس لیے وہ بہت اچھی اردو آتے ہوئے بھی اردو نہیں بولتے تھے۔

بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ ظاہر کرنا فیشن میں داخل ہو چکا تھا کہ انہیں اردو نہیں آتی۔ مائیں فخر سے پڑوسیوں کو بتاتی تھیں۔ "میرا بیٹا اردو میں بڑا کمزور ہے اردو میں اکثر فیل ہو جاتا ہے۔"

میں خود کوئی دقیانوسی آدمی نہیں تھا۔ میں اس بات کو اچھا سمجھتا تھا کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ انگریزی آتی ہو بلکہ میرے خیال میں تو انسان کو زندگی جتنی بھی مہلت دے اور وہ جتنی بھی زیادہ سے زیادہ زبانیں سیکھ سکے، اتنا ہی اچھا ہے لیکن یہ ایک اضافی قابلیت ہے۔ تاہم اگر انسان کو انگریزی نہ آتی ہو تو یہ کوئی ایسی شرم کی بات نہیں البتہ اگر انسان کو اپنی مادری زبان نہ آتی ہو تو یہ ضرور شرم کا مقام ہے مگر مجھے یہ بات بڑی عجیب لگتی تھی کہ لوگ اردو نہ آنے کا ذکر فخر سے کرتے تھے بلکہ بچوں کے اردو میں فیل ہونے پر خاصے خوش نظر آتے تھے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ لوگوں کا اندازِ فکر اگر یہی رہا تو کہیں اردو کے پیپر میں فیل ہونے پر مٹھائی بانٹنے کا رواج نہ شروع ہو جائے۔

میں نے سرہلاتے ہوئے تحسین آمیز نظروں سے پنکی کی طرف دیکھا اور کہا۔ "واہ! پہلے آگ اگل رہی تھیں۔ اب منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ اب تم سے نئے سرے سے ملاقات کرنے کو جی چاہ رہا ہے لیکن مجھے دیر ہو چکی ہے۔ پھر کسی وقت سہی" میں نے ایک بار پھر ہاتھ ہلایا اور اسے اسی طرح مسکراتے چھوڑ کر اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف واپس جاتے وقت میں سوچ رہا تھا کہ رحیم گل کا یہ خیال شاید ٹھیک ہی تھا کہ ممی کچھ مشکوک معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے یہ دردِ سر رحیم گل کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ رحیم گل میرے تعاون سے ہدایت وارثی کو مجرم قرار دے کر اس کے خلاف چالان پیش کرنے کی تیاری تو کر رہا تھا لیکن اپنی اس تفتیش سے شاید وہ خود بھی مطمئن نہیں تھا۔ ادھر میرے ذہن میں بھی ایک خلش سی تھی۔ لگتا تھا کہ اس معاملے کی کوئی کڑی غائب تھی لیکن وہ کڑی کیا تھی اور کہاں غائب تھی یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ہدایت وارثی کا خیال آیا تو مجھے نیلم بھی یاد آگئی۔ نہ جانے کیوں مجھے ابھی تک ایک موہوم سی آس تھی کہ اس عورت سے مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی تھی۔ میں نے اپنے ہوٹل کی طرف جاتے جاتے غیر ارادی سے انداز میں اس کے ہوٹل کی طرف گاڑی موڑ لی۔

میں سہ پہر کے قریب وہاں پہنچا۔ میں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ میرے پیٹ میں چوہے کوئی بڑا میچ کھیلنے کی تیاری کر رہے تھے بلکہ وارم اپ میچ تو انہوں نے شروع بھی کر دیا تھا۔

میں نے دیکھا، نیلم کاؤنٹر پر موجود نہیں تھی۔ اس کی جگہ دبلا پتلا اور سانولا سا ایک نوجوان کھڑا تھا جس کی مونچھیں اس کے بازوؤں سے زیادہ موٹی تھیں۔ میں نے اس سے نیلم کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ ابھی اوپر اپنے کمرے میں ہی تھی اور شام تک اس کا نیچے آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ چناں چہ میں اوپر ہی چلا گیا گو کہ اس مونچھ پرور نوجوان نے دبے دبے لفظوں میں بتا کر مجھے منع کرنے کی کوشش کی تھی کہ میڈم اس وقت آرام کر رہی ہوں گی۔ مگر میں نے اس کی اس زیرِ مونچھ بڑبڑاہٹ پر توجہ نہیں دی اور اس نے بھی مجھے روکنے کے لیے اصرار نہیں کیا۔

میری کئی بار کی ہلکی ہلکی دستک کے بعد نیلم نے دروازہ کھولا۔ میں اس وقت یہ سوچ کر واپس جانے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ شاید وہ گہری نیند سو رہی تھی، اسے بے آرام نہیں کرنا چاہیے تھا۔ وہ شب خوابی کے لبادے میں تھی اور اس کی آنکھوں میں نیند کے ڈورے تیر رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ویسے بھی کم خطرناک نہیں تھیں، اس وقت زیادہ خطرناک لگ رہی تھیں۔ اوپر سے شب خوابی کا لبادہ ناقابلِ تشریح تھا۔ وہ اچھے بھلے پارساؤں کے لیے چلتی پھرتی آزمائش بنی ہوئی تھی۔

"حالاں کہ میں بہت ڈھیٹ آدمی ہوں" میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس وقت کافی شرمندہ ہوں۔"

"کیوں؟ تم نے ایسا کیا کام کر ڈالا ہے جس پر تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت پیش آگئی؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے تمہیں سوتے سے جگایا۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ تو تم نے بہت اچھا کیا ہے۔ کسی کو خوابِ غفلت سے جگانا نیکی ہے" اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اندر پہنچا تو اس نے دروازہ مقفل کر دیا۔

"میں تو اب واپس جانے کا سوچ رہا تھا۔ تین چار بار دستک دینے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ شاید تم گہری نیند سو رہی ہو۔ تب میں کچھ شرمندہ سا ہو گیا اور واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا مگر عین وقت پر تم نے دروازہ کھول دیا۔"

"اگر تم واپس چلے جاتے تو یہ میری بدقسمتی ہوتی" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیوں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"میرے ایک خواب کی تعبیر واپس چلی جاتی" اس نے مجھے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ ایک معقول اور کشادہ کمرا تھا۔ اسی کے ایک حصے کو نشست گاہ بنایا گیا تھا۔ میں ایک کاؤچ پر جا بیٹھا اور وہ میرے عین مقابل بیڈ کی پائنتی کی طرف ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گئی۔ بیڈ کافی اونچا تھا۔ کچھ شوخ اور کچھ معنی خیز سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر منجمد تھی اور وہ گویا آنکھیں بھی نہیں جھپک رہی تھی۔

"خواب کی تعبیر واپس چلی جاتی؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔

"ہاں۔ اگر میں تمہیں ایک بات بتاؤں تو تم یقین کر لو گے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ویسے عورتوں کی بات کا یقین تو نہیں کرنا چاہیے لیکن تم کہتی ہو تو کر لوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں کتنی عورتوں نے دھوکا دیا ہے جو تم نے عورتوں کی بات پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے؟" وہ ذرا تیکھے لہجے میں بولی۔

"ایک نے بھی نہیں" میں نے اپنی شکل پر مسکینی طاری کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "انہوں نے مجھے اس اعزاز کے قابل ہی نہیں سمجھا کہ مجھے دھوکا دیا جائے۔ خواتین سے دھوکا کھانا بھی ہر ایک کے نصیب میں کہاں ہوتا ہے۔"

"زیادہ مسکین بننے کی ضرورت نہیں" اس نے مجھے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔ "کم از کم تمہارے معاملے میں تو مجھے یقین ہے کہ تمہیں کوئی عورت دھوکا نہیں دے سکتی۔ البتہ تم نے نہ جانے کس کس کو دھوکا دیا ہو گا۔"

"یہ تو تمہاری ذرہ نوازی ہے جو تم اس حقیر پُر تقصیر کو اس قابل سمجھ رہی ہو ورنہ مجھ میں اتنی اہلیت کہاں" میں نے احساسِ محرومی سے بھرپور ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"سادہ اور معصوم بننا تمہیں خوب آتا ہے" وہ مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"اچھا۔ ٹھنڈی سانسیں لینے کا مقابلہ مت کرو اور وہ بات بتاؤ جس پر تمہارے خیال میں مجھے یقین آنا مشکل ہو گا؟" میں نے کہا۔

"میں اس وقت تمہیں خواب میں دیکھ رہی تھی" اس نے زیادہ روشن مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔ "اور جب دستک سن کر میری آنکھ کھلی تو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تعبیر دروازے پر کھڑی ہو گی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہنستے ہنستے دہرا ہو جاؤں، کاؤچ سے گر پڑوں یا کھڑکی کے راستے باہر سڑک پر چھلانگ لگا دوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"کیوں۔ کیا میرے خواب میں آنا تمہارے لیے اتنا ہی المیہ ہے؟" اس نے مجروح سے لہجے میں پوچھا۔ "کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہیں خواب میں ہی دیکھ سکوں؟"

"بات کو الٹا رخ دینے کی کوشش مت کرو" میں نے کہا۔ "جہاں تک قابل ہونے کا تعلق ہے تو میں صرف اپنے آپ کو ہی کسی قابل نہیں سمجھتا۔ تمہیں کیا معلوم کہ تمہارے خواب میں آنا میرے لیے کتنی بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"تو پھر تمہیں کیا تکلیف ہے جو ہنستے ہنستے دہرے ہونے یا کھڑکی سے چھلانگیں لگانے کی باتیں کر رہے ہو؟" اس نے مجھے گھورا۔

"تکلیف یہ ہے کہ مجھے اس بات پر یقین نہیں" میں نے کراہ کر کہا۔ "میں نے سنا ہے کہ اس قسم کی باتیں مرد کرتے ہیں اور اس طرح عورتوں کا دل لبھاتے ہیں۔ انہیں خوش فہمی میں مبتلا کرتے ہیں لیکن یہاں تو الٹا ہی معاملہ ہو رہا ہے۔"

"میں عورت اور مرد کی تفریق میں نہیں پڑتی کہ عورتیں یہ کرتی ہیں اور مرد یہ کرتے ہیں یا عورتوں کو یہ کرنا چاہیے اور مردوں کو وہ کرنا چاہیے" وہ منہ بنا کر بولی۔ "میں تو بس ایک سیدھی اور سچی بات کرتی ہوں۔ جو میں سوچتی ہوں، جو محسوس کرتی ہوں یا جو مجھ پر گزرتی ہے صاف بتا دیتی ہوں۔ فضول قسم کی مصلحت کوشی میں نہیں پڑتی کہ میں نے فلاں بات کی تو بطورِ عورت میرا مرتبہ گھٹ جائے گا یا فلاں بات مجھے دوسرے کے منہ سے سننے کا منتظر رہنا چاہیے۔ یہ فضول اور رسمی باتیں ہیں۔"

"کتنے روشن خیالات ہیں تمہارے!" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ "بہرحال خواب پھر بھی میرے حلق سے نیچے نہیں اتر رہا۔ میں اتنا خوش قسمت نہیں ہو سکتا۔ میں تو آج تک ایک چھیچھڑے کے طور پر کسی بلی کے خواب میں بھی نہیں آیا۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟" مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر طلوع ہونے لگی "ہو سکتا ہے کہ بلی نے تمہیں بتایا ہی نہ ہو!"

"بہرحال میں نے اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہیں کی" میں نے کہا۔

"یہ تمہارا انکسار ہے جو یقیناً عورتوں کے حق میں بڑی ہی خطرناک بات ثابت ہوتی ہو گی" اس نے ایک طویل انگڑائی لی۔

میں نے کراہ کر کہا۔ "کیا اب تمہارا انگڑائی لینا بھی ضروری ہے؟"

"میری انگڑائی سے تمہیں تکلیف ہو رہی ہے کیا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے واقعی تکلیف زدہ لہجے میں جواب دیا۔

"کیا تکلیف ہے؟" اس نے جاننا چاہا۔

"بعض تکلیفیں ناقابلِ بیان ہوتی ہیں" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟" وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

"آخر تکلف بھی کوئی چیز ہے" میں نے کہا۔

"تم سے کس گدھے نے کہا ہے کہ تکلف کرو؟" وہ اپنی مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کہا ہے ایک گدھے نے۔ وہ گدھا میں خود ہوں" میں نے سر جھکاتے ہوئے گویا اعترافِ جرم کیا۔

"تمہارے گدھا ہونے میں تو واقعی کلام نہیں۔ جہاں تکلف کو بہت برا سمجھا جا رہا ہو وہاں بھی تکلف کرنے والے کو گدھا ہی کہا جا سکتا ہے بلکہ اس تشبیہ پر تو شاید گدھا بھی برا منائے۔ وہ بھی شاید کہے گا کہ ٹھیک ہے' میں گدھا ہوں مگر اتنا بھی گدھا نہیں ہوں۔" یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کر میرے برابر آن بیٹھی۔

پھر اچانک ہی جیسے اس پر کوئی دورہ پڑا۔ اس نے دانت کچکچا کر میرے بال مٹھیوں میں جکڑ لیے اور گھٹی گھٹی آواز میں بولی "خبیث! تمہیں معلوم ہے میں کب سے تمہارے لیے مری جا رہی ہوں؟"

"نہیں' مجھے نہیں معلوم" میں نے چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی سی آواز نکالی۔

"اس وقت سے جب میں نے تمہارے ہوٹل میں مختصر عرصے کے لیے ملازمت کی تھی" اس نے بتایا۔ "میں نے اپنی ملازمت کے مختصر سے عرصے میں تمہاری صرف ایک جھلک ہی دیکھی تھی اور وہ بھی دور سے۔ اس وقت ہی میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا تھا۔ واہ' کیا چیز ہے۔ کاش......! لیکن اس کاش سے آگے میں نہیں سوچ سکتی تھی کیوں کہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی ایک نہیں بلکہ بڑے ہمہ جہت قسم کے فرق حائل تھے۔ ایک نہیں' کئی خلیجیں تھیں۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ تمہاری جھلک بھی دیکھنا نصیب نہیں ہوئی۔"

اس نے ایک طویل سانس لی۔ یہ سانس شاید شعلوں کو چھو کر آئی تھی۔ یکدم ہی اس کے لہجے میں کچھ دھیماپن آگیا۔ "ایک طویل عرصے بعد میں نے تمہیں جج صاحب والے چکر میں دوبارہ دیکھا اور آج خواب میں دیکھ رہی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا اس وقت تم میرے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوگے۔ قسمت بھی انسان سے کیسی اٹکھیلیاں کرتی ہے۔"

"خواہ مخواہ ہی مجھے خبیث کہہ رہی تھیں" میں نے شکوہ کیا۔

"تمہاری باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ تم خود غالباً سال ہا سال سے کافی خبیث قسم کی چیز چلی آ رہی ہو۔"

"ہاں۔" اس نے مجھے ایک کونے میں دھکیل دیا۔ "مجھ میں یہی تو ایک خرابی ہے جس نے مجھے کہیں کا نہیں رکھا یا پھر شاید یہی ایک خوبی ہے مگر میں ہر ایک پر تو اپنی اس خوبی کا اظہار نہیں کر سکتی نا۔ میں صرف دل کی غلام ہوں' دل جس پر آجائے۔"

"بہرحال میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ مجھے یہ بات کسی نے نہیں بتائی تھی" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"اب تو بتا دی ہے نا۔ اب تو گدھے سے انسان بن جاؤ۔" اس نے مجھے ایک گھونسا رسید کیا۔

"میں تو پہلے ہی سے انسان ہوں اور بہت خطاوار قسم کا انسان ہوں۔ میرے صبر کا امتحان مت لو" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔

"صبر کا امتحان میں لے رہی ہوں یا تم؟" وہ غرائی۔

میں یہ فیصلہ تو نہیں کر سکا کہ کون کس کا امتحان لے رہا لیکن امتحانی سلسلہ بہرحال موقوف ہوگیا۔ میں نے جھوٹ نہیں تھا۔ میں بہرحال انسان تھا اور اس قسم کے امتحانوں میں زیادہ ثابت قدم نہیں رہ سکتا تھا۔

وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ پھر وہ سائڈ ٹیبل پر رکھے ہو ایک تھرموس سے اپنے اور میرے لیے کافی انڈیلتے ہوئے بو "میں اس وقت روم سروس کے کسی ویٹر کو یہاں بلانا نہیں چاہتی اس لیے تھرموس کی کافی پر ہی گزارا کرو۔"

وہ اب بہت خوش اور بہت مطمئن نظر آ رہی تھی۔ اس ذہن پر پہلے گویا کوئی بہت بڑا بوجھ تھا جو اب اتر گیا تھا۔ اس اعصاب گویا کسی شکنجے کی گرفت میں تھے جو اب آزاد ہوگئے تھے ہم بیڈ پر ہی پاس پاس بیٹھ کر کافی پینے لگے۔ کافی خوب گرم تھی اس میں تھرموس والی بدمزگی ابھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میں کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے..... کن انکھیوں سے اس طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بشاشت تھی۔ وہ بڑی کما کی عورت تھی۔ بڑھتی ہوئی عمر نے شاید اس کا کچھ نہیں بگاڑا بلکہ اس میں اور بھی توانائیاں بھر دی تھیں۔ ایک اور بات پر مجھ بڑی حیرت تھی۔ کل تک وہ ہدایت وارثی کے بارے میں سخت پریشان' متوحش اور فکرمند تھی۔ آج اس کے چہرے پر فکرمندی شائبہ تک نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج تو ہدایت اسے یاد نہیں تھا۔ میں اسے یاد دلانا چاہتا تھا۔

خاموشی سے کافی کے دو تین گھونٹ بھرنے کے بعد میں نے کہا۔ "اگر اس وقت کسی اتفاق کے تحت اچانک ہدایت وارثی آجائے تو کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں" وہ کافی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے نہایت اطمینان سے بولی۔

"کیا وہ خفا بھی نہیں ہوگا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں" اس نے اس بار بھی اطمینان سے جواب دیا۔

"حیرت ہے!" میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں" وہ بولی۔ "میں نے تمہیں پہلے بھی بتایا تھا لیکن بات شاید تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرا اور ہدایت کا رشتہ شاید اسی لیے بہت زیادہ مضبوط ہے کہ ہم نے ایک دوسرے کو کسی بندھن میں نہیں باندھ رکھا۔ ہم ایک دوسرے کے نہایت مخلص ساتھی بھی ہیں لیکن اپنی اپنی زندگی گزارنے کے لیے آزاد بھی ہیں۔ ہدایت نے کبھی مجھے اپنی مقبوضہ چیز بنا کر نہیں رکھا۔ میرا مسئلہ یہی ہے کہ میرا اب کسی ایسے مرد کے ساتھ گزارا بھی نہیں ہو سکتا جو مجھے پابند یا اپنی مقبوضہ چیز بنا کر رکھے۔"

"اوہ! تم ایک گمشدہ گائے ہو۔ جنگل جنگل چرتی پھرتی ہو۔" میں نے سرہلایا۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے" اس نے مصنوعی غصے سے مجھے گھورا۔ "مجھے سمجھنے میں غلطی مت کرو۔ میں ایک ناقابلِ رسائی عورت ہوں۔ شاذ و نادر ہی کوئی میرے ذہن' میرے دل اور میرے وجود تک رسائی حاصل کرتا ہے بلکہ میرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ میرے آئیڈیلز بہت اونچے ہیں۔ جو لوگ عموماً میرے قریب آنے کی کوشش کرتے ہیں وہ مجھے اچھے نہیں لگتے۔ ان کے لیے میں ناقابلِ رسائی ہوتی ہوں اور جو مجھے اچھے لگتے ہیں' ان کی نظریں کہیں اور ہوتی ہیں۔ وہ میری اوقات سے بہت اونچے ہوتے ہیں۔ میرے لیے ناقابلِ رسائی ہوتے ہیں۔"

"یہ رسائی نارسائی کا چکر بھی عجیب ہوتا ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بے شک۔" اس نے تسلیم کیا۔ "یہی چکر انسان کو سب سے زیادہ تشنہ رکھتا ہے۔"

"لیکن میں غریب تمہاری رسائی میں آگیا۔" میں نے مظلومانہ انداز میں کہا۔

"تم اتنے مسکین ہو نہیں جتنے بعض اوقات بننے کی کوشش کرتے ہو۔ اوّل درجے کے بدمعاش ہو تم!" وہ کپ رکھتے ہوئے مسکرائی۔

"یہ خراجِ تحسین تم مجھے پہلے بھی پیش کر چکی ہو" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیا تم آج نیچے کاؤنٹر پر اپنی ڈیوٹی دینے نہیں جاؤ گی؟ اب تو تمہارا کام بٹانے کے لیے ہدایت بھی موجود نہیں ہے۔"

"دوسرے لوگ ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام سنبھالے رکھتا ہے" وہ بے پروائی سے بولی۔ "آج مجھے کام مت یاد دلاؤ اور ہدایت کے بارے میں بھی میرے تفکرات کو جگانے کی کوشش مت کرو۔ آج مدت بعد میں اپنے آپ کو بہت خوش محسوس کر رہی ہوں۔ میری خوشی کو غارت مت کرو۔ مجھے جشن منانے دو۔"

"بہت عجیب موقع ڈھونڈا ہے تم نے جشن منانے کا۔" میں نے کہا۔

"میرا خیال ہے انسان تو شاذ و نادر ہی موقع ڈھونڈتا ہے۔ اکثر اوقات تو موقع انسان کو ڈھونڈتا ہے۔ میں بڑی خوش قسمت ہوں۔ آج مجھے ہی موقع نے ڈھونڈا ہے۔" اس نے ایک بار پھر میرے سینے میں منہ چھپا لیا۔

بہت دیر بعد بہت اونچی فضاؤں سے واپس زمین پر قدم رکھتے ہی میری نظر ایک بار پھر گھڑی کی طرف چلی گئی۔ اس نے مجھے گھڑی پر نظر ڈالتے دیکھ لیا۔ خمار زدہ سے لہجے میں بولی۔ "تم بہت ہی بے ہودہ آدمی ہو۔ بار بار گھڑی دیکھ کر اپنے بارے میں کوئی اطمینان کرنے کی کوشش کر رہے ہو یا اس عالم میں بھی تمہیں کوئی کام یاد آ رہا ہے؟"

"میں واقعی بہت بے ہودہ انسان ہوں" میں نے غمزدہ انداز میں تسلیم کیا۔ "میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا کہ میں یہاں کس لیے آیا تھا اور تم نے مجھے کس چکر میں ڈال دیا۔"

"تم جس چکر میں آئے تھے کیا وہ اس سے زیادہ حسین تھا؟" وہ تکیے کے سہارے بیٹھ کر ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔

"اب مجھے اس قسم کے غیر شاعرانہ بلکہ غیر انسانی موازنے کرنے پر مجبور مت کرو۔ میں تو تم سے کچھ پوچھنے آیا تھا جو ظاہر ہے ایک نہایت نامعقول قسم کا کام ہے۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے لیے ایک بار پھر کافی انڈیلتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں نے تمہارے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی اپنے آپ کو کھلی کتاب کی طرح تمہارے سامنے پیش کر دیا۔ تم اگر سوالات کرنے میں لگے رہتے تو میرے بارے میں ایک صدی میں بھی اتنا کچھ نہیں جان سکتے تھے جتنا ان دو تین گھنٹوں میں جان گئے ہوگے" اس نے مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "تمہارے لیے بھی اور کافی ڈالوں؟"

"نہیں" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کافی کی شکل بتا رہی ہے کہ اب یہ بے کار ہو چلی ہے اور ہاں' میں تمہارے بارے میں پوچھنے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ میں ہدایت وارثی کے بارے میں پوچھنے آیا تھا۔"

"کیا پوچھنے آئے تھے؟" اس نے دھواں میرے منہ پر چھوڑا۔

"یہی کہ اب بھی وقت ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں کوئی خاص بات یاد آ رہی ہے تو مجھے بتا دو" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے اس وقت اس کے بارے میں جو باتیں یاد آ رہی ہیں وہ نہایت نجی قسم کی ہیں۔ وہ میں تمہیں نہیں بتا سکتی" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔

میں ایک لمحے کے لیے اسے گھورتا رہ گیا۔ "آج تم پر بہت ہی خباثت طاری ہے۔ میں تمہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہا ہوں۔ کل تم ہدایت وارثی کی فکر میں رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں۔ سخت وحشت زدہ تھیں۔ آج ایسا لگ رہا ہے جیسے تمہیں اس کی ذرّہ برابر پروا نہیں۔"

"پروا تو آج بھی اتنی ہی ہے جتنی کل تھی اور آنے والی کل کو بھی اتنی ہی رہے گی لیکن بات دراصل یہ ہے کہ مجھ پر غم' خوشی' فکر اور دیگر سب ہی خاص جذبے آندھی طوفان کی طرح حملہ آور ہوتے ہیں اور اسی طرح معدوم ہو جاتے ہیں۔ میرے اندر بگولا سا اٹھتا ہے۔ اس کے بعد میں اس معاملے کے بارے میں جو کچھ بھی کرتی ہوں بڑے ٹھنڈے دل سے کرتی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے یہ جو میرے بارے میں تمہارے وجود میں بگولا سا اٹھا ہے یہ بھی کل تک معدوم ہو جائے گا' گزر جائے گا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "لیکن یہ بگولا دو چار

دن بعد پھر اسی شدت سے دوبارہ سر اٹھا سکتا ہے۔ بگولا گزر جانے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دوبارہ نہیں آئے گا۔ عین ممکن ہے کل یا پرسوں ہدایت کے بارے میں سوچتے وقت میں پھر اتنی ہی جذباتی ہو جاؤں۔"

"میرا خیال ہے کہ میں یہاں سے نکل ہی بھاگوں تو بہتر ہے" میں نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا۔ "مجھے تم جیسی عورتوں سے خوف آتا ہے جو پل بھر میں شعلہ ہوتی ہیں' پل بھر میں آندھی اور پل بھر میں برف کی پھوار"

"خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے" وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "البتہ اگر تم بہانہ کر کے بھاگنا چاہتے ہو تو بات دوسری ہے۔ تم میری بات کی غلط تشریح کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

"تم مجھے ہدایت کے بارے میں کوئی کار آمد بات نہیں بتا رہیں؟" میں نے ایک بار پھر سنجیدگی سے پوچھا۔ میں باتھ روم کی طرف جاتے جاتے رک گیا تھا۔

"مجھے ایسی کوئی بات یاد نہیں آ رہی جو تمہارے یا ہدایت کے لیے کار آمد ثابت ہو سکے۔" اس نے جواب دیا۔

"ذہن پر زور دو" میں نے اصرار کیا۔

"کافی عرصے بعد ذہن اتنا ہلکا ہلکا ہوا ہے۔ تم چاہتے ہو میں پھر اس پر زور دے کر اسے بوجھل بنا لوں۔ واقعی یہ دنیا کبھی کسی کو خوش نہیں دیکھ سکتی۔"

"ٹھیک ہے" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "اگر تم خوش رہنا چاہتی ہو تو رہو۔ مجھے کیا پڑی ہے ہدایت کی فکر میں دبلا ہونے کی؟ میں تو تمہاری ہی وجہ سے اس کے بارے میں فکر مند ہو رہا تھا۔"

"پہلے تم نے اسے حوالات پہنچوا دیا۔ اب اس کے بارے میں فکر مند ہو رہے ہو؟"

"میں نے پہلے بھی تمہاری یہ غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی تھی" میں نے نرمی سے کہا۔ "ہدایت کو میں نے نہیں' حالات نے حوالات میں پہنچایا ہے یا پھر یوں کہو کہ اس کے خلاف میسر آنے والی شہادتیں اس کے لیے مصیبت بنی ہیں۔ میں بھلا کیا کر سکتا تھا؟ میری اس سے کوئی دشمنی تو نہیں تھی۔ میں نے تو پرسوں سے پہلے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔"

"صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں" اس کی مسکراہٹ اب بھی برقرار تھی۔ "میں درحقیقت شکوہ نہیں کر رہی تھی۔ میں صرف جاننا چاہ رہی تھی کہ تمہارے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ ہے یا نہیں؟"

"پھر تمہیں کیا اندازہ ہوا؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرا خیال ہے اسے حوالات بھجوا کر تم بھی خوش نہیں ہو" اس نے جواب دیا۔

"ہاں" میں نے اعتراف کیا۔ "وہ پکڑا ضرور گیا ہے لیکن جانے کیوں میرا دل مطمئن نہیں ہے۔ دل میں ایک خلش سی ہوتی ہے۔"

"یہ شک کی خلش ہے" وہ وثوق سے بولی۔ "اس کا مطلب ہے تم اس کے بارے میں پُر یقین نہیں ہو کہ وہ مجرم ہے اور اگر تمہارے دل میں اس کے بارے میں شک کی خلش موجود ہے تو تم یقیناً اس کے لیے بہت کچھ کر سکتے ہو۔"

"میں تو کوشش شروع بھی کر چکا ہوں" میں نے کہا۔ "آج سے میں اس سلسلے میں حرکت میں ہوں۔ ایک امکان نظر بھی آیا لیکن وہ بھی ختم ہو گیا" میں نے اسے پنکی اور اس کے دوست کے بارے میں بتایا پھر کہا۔ "بہرحال پولیس ابھی باریک بینی سے اس مسئلے کو ذرا اور کھنگالے گی لیکن مجھے کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔"

وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "میں جو تمہیں اتنی مطمئن اور بے پروا نظر آ رہی ہوں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ میرے دل کو قرار سا آ گیا ہے۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ہدایت بے گناہ ہے اور وہ اس چکر سے بخیر و عافیت نکل آئے گا۔ یہ ایک عارضی پریشانی ہے۔ ایسی پریشانیاں ہم پر آتی رہی ہیں۔"

"اچھا' تو تم بھی دل کے کہنے پر چلتی ہو!" میں نے سر ہلایا۔

"دل کے کہنے پر ہی تو سب سے زیادہ چلتی ہوں" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "اس کے علاوہ ایک دوسری وجہ بھی ہے۔"

"وہ بھی بتا دو"

"تم نے میرے لیے جس وکیل کا بندوبست کروایا تھا' میں جا کر اس سے ملی تھی۔ اس نے سارا قصہ سننے کے بعد مجھے تسلی دی ہے کہ اس کیس میں بالکل جان نہیں ہے۔ وہ بہت بڑا وکیل ہے۔ اس نے تو اس سے کہیں زیادہ سنگین کیسوں میں لوگوں کو رہا کرایا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ پہلی پیشی پر ہی ہدایت کو ضمانت پر رہا کرا لے گا۔ اس کے بعد کوئی عدالت بھی اسے سزا نہیں سنا سکے گی۔ جس قسم کی شہادتیں اس کے خلاف موجود ہیں ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔"

"خیر' اچھی بات ہے کہ وکیل نے تمہیں حالات کا روشن پہلو دکھایا ہے اور اسی وجہ سے تم اتنی خوش ہو۔ وہ میرے ہی گروپ آف کمپنیز کے لیے کام کرنے والے بہت بڑے وکیلوں میں سے ایک ہے لیکن میں تمہیں کم از کم اتنا ضرور بتانا چاہوں گا کہ وکیلوں کا کام تختۂ دار تک ملزم کو تسلیاں دینا ہے۔ جس طرح ڈاکٹر اس وقت تک مریض کے لیے کوئی نہ کوئی دوا لکھ رہا ہوتا ہے جب اسے آخری غسل دیا جا رہا ہوتا ہے۔"

"تم بہت ظالم ہو۔" اس نے ہونٹ سکیڑ کر مجھے گھورا۔ "تم نہیں چاہتے کہ میں خوش رہوں؟"

"یہ بات کہہ کر میرے دل پر گھونسا مت مارو" میں نے سینے پر

ہاتھ رکھ کر کراہ کر کہا۔ "میں تو اس دنیا میں ہر شخص کو خوش دیکھنا چاہتا ہوں اور ہر شخص کی آنکھوں میں امیدوں کے ستارے جھلملاتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا مقصد تمہیں مایوسی اور یاسیت میں مبتلا کرنا نہیں تھا۔ میں صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تم محض وکیل کی بات پر مطمئن ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کر مت بیٹھ جانا۔ اپنی سی کوشش جاری رکھنا۔"

"میں کیا کر سکتی ہوں؟" وہ بے بسی سے بولی۔ "اب میں ریمبو کی طرح کوئی توپ جتنی وزنی گن اٹھا کر تھانے اور حوالات کو گولوں سے اڑا کر تو ہدایت کو نہیں چھڑا سکتی۔"

"میں تمہیں ایسا کرنے کا مشورہ بھی نہیں دوں گا۔ یہ طریقے صرف فلموں میں ہی کامیاب رہتے ہیں۔ عملی زندگی میں ایسا کرنے والے کسی اور کو اس طرح باہر لاتے لاتے خود اندر چلے جاتے ہیں۔ میرا مقصد صرف یہ ہے کہ حالات سے باخبر اور مستعد رہو۔ شریفانہ طریقوں سے ہدایت کے لیے جو بھی ممکن ہو' کرتی رہو۔ کوئی ذرا سی بھی کار آمد بات معلوم ہو تو اس سے مجھے مطلع کرو۔"

"او کے باس!" اس نے بیڈ پر بیٹھے بیٹھے ہی مجھے سلیوٹ کیا پھر سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ "تم ایک بار ہدایت سے میری ملاقات کروا دو۔ مجھے تو اس معاملے پر اس سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملا۔ وکیل نے ملاقات کا معاملہ کل پرسوں پر ڈال دیا ہے۔"

"پرسوں تک تو شاید اس کا چالان ہی عدالت میں پیش ہو جائے۔ اس وقت تو تم عدالت میں بھی مل سکو گی" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو میں کہہ رہی ہوں کہ اس کے عدالت میں پیش ہونے سے پہلے کم از کم ایک بار تو اس سے میری ملاقات کرا دو۔ ہمیں بھی تمہارے اثر رسوخ کا کچھ فائدہ پہنچ جائے۔"

"اچھا۔ چلو' تمہاری ملاقات کرا ہی دیتے ہیں" میں نے شاہانہ انداز میں کہا۔ "تم بھی کیا یاد کرو گی کہ حاتم طائی کے کسی قریبی عزیز سے پالا پڑا تھا۔"

تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم دونوں تیار ہو کر دو صاف ستھرے معزز اور نہایت سنجیدہ شہریوں کی طرح ہوٹل سے برآمد ہوئے۔ وہ ہوٹل چوں کہ شہر کے نہایت گنجان اور مرکزی علاقے میں واقع تھا جہاں پارکنگ کا بڑا مسئلہ رہتا تھا اس لیے میں نے اپنی گاڑی کچھ دور ایک عقبی گلی میں کھڑی کی تھی۔ میں نیلم کو ساتھ لیے اس طرف چل پڑا۔

شاور لینے کے بعد نیلم کے وجود سے پہلے سے زیادہ دلفریب مہک پھوٹ رہی تھی اور وہ پہلے سے زیادہ تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ میں بھی خود کو فریش محسوس کر رہا تھا اور رات کے سائے گہرے ہوتے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اس وقت تو انسان کو تھانے حوالات جیسی بے ہودہ جگہوں کے بجائے کسی خوب صورت اور رومان پرور جگہ پر جانا چاہیے تھا لیکن اب یہ بات میں نیلم سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں اس سے وعدہ کر چکا تھا اور وعدہ بہرحال ذاتی محسوسات سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

عقبی گلیوں میں تاریکی تھی۔ اس طرف دکانیں ہی دکانیں تھیں جو بہت پہلے بند ہو چکی تھیں۔ گلیاں ویران تھیں اور ٹریفک کی بھیڑ بھاڑ ختم ہونے پر اب کچھ کشادہ دکھائی دے رہی تھیں۔ میں نے گاڑی ایک آہنی جنگلے کے قریب کھڑی کی تھی۔ اب وہاں ملگجا اندھیرا تھا۔ تاہم دور سے بھی گاڑی کے کچھ حصے جھلملاتے نظر آ رہے تھے جس سے پتا چل رہا تھا کہ گاڑی کہاں کھڑی تھی۔

نیلم نے اندھیرے میں گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ کون سی حس یا کون سا جذبہ تھا جس نے مجھے اچانک پلٹ کر دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ شاید وہ کوئی غیبی طاقت تھی جس نے ایک لمحے کے لیے میری گردن پیچھے کی طرف گھما دی تھی۔

اسی لمحے مجھے عقب میں عمارتوں کے درمیان ایک نہایت تنگ سی گلی سے ایک انسانی ہیولا برآمد ہوتا دکھائی دیا۔ اگر وہ صرف انسانی ہیولا ہی ہوتا تب بھی کوئی بات نہیں تھی لیکن اس کے ہاتھوں میں ہیولے ہی کے انداز میں مجھے ایک اور چیز کی جھلک بھی دکھائی دی تھی۔ مجھے یکدم گویا بہت ہائی وولٹیج کا کرنٹ لگا۔

میں نے نیلم کا بازو پکڑ کر ایک خاص انداز میں جھٹکا دیا اور اسے اپنے ساتھ لیتے ہوئے سڑک پر گر پڑا۔ سنسان گلی گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ گولیاں یقیناً ہمارے سر پر سے گزری تھیں۔ میری گاڑی سے بہت پہلے ایک اور کار فٹ پاتھ سے لگی کھڑی تھی۔ میں نیلم کو ساتھ لیے لڑھکتا ہوا اس کی اوٹ میں چلا گیا تھا۔

اس وقت تک دوسرا برسٹ بھی مارا جا چکا تھا لیکن میں اور نیلم نہ صرف گولیاں چلانے والے کی نظر سے اوجھل ہو چکے تھے بلکہ ہمیں گاڑی کی آڑ بھی میسر آ چکی تھی۔ نیلم یقیناً اس اچانک افتاد سے بوکھلا چکی تھی۔ اچانک گرنے سے شاید اسے چوٹ بھی لگی ہو لیکن اس وقت چوٹ کا کسے ہوش تھا؟

اب مجھے نیلم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بدحواس ہو کر خود ہی کسی چھوٹے بچے کی طرح میری کمر سے چمٹ چکی تھی اور میں اس عالم میں بھی محسوس کر سکتا تھا کہ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جیب سے مشین پسٹل نکالا اور گاڑی کے وہیل کے عقب سے سر نکالا۔ اس وقت تک ایک برسٹ اور مارا جا چکا تھا اور وہ بھی ضائع ہو چکا تھا۔ گولیوں نے نہ جانے کتنی دکانوں کے شٹروں اور دوسری چیزوں کو چھلنی کیا تھا۔

میں نے جب گاڑی کے پہیے کی اوٹ سے جھانکا اس وقت وہ ہیولا دوبارہ اسی تنگ سی گلی میں غائب ہو رہا تھا۔ میں صرف ایک فائر کرنے میں کامیاب ہو سکا۔ میں نے اس ہیولے کو ایک جھٹکا سا

لگتے دیکھا لیکن ہیولا رُکا نہیں۔ تاہم مجھے یقین ہو گیا کہ گولی ضائع نہیں گئی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ گولی اس کے کندھے پر لگی تھی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے بعد یکدم گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ دور سے آتے ہوئے ٹریفک وغیرہ کی مدھم سی آوازیں بھی جیسے کسی طرح رک گئی تھیں اور جہاں تک گولیوں کی آوازیں گئی تھیں وہاں تک لوگ گویا اپنی اپنی جگہ دبک گئے تھے۔ اس عمل میں بہ مشکل تین یا چار سیکنڈ لگے تھے۔

میں نے بہ مشکل اپنے آپ کو نیلم سے چھڑایا۔ وہ گھگیا رہی تھی۔ "پلیز...... مجھے چھوڑ کر مت جاؤ......" ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دانت بج رہے تھے۔

"میں کہیں نہیں جا رہا ہوں۔ تم ایک منٹ یہیں رکو۔" میں نے بڑی مشکل سے اس سے ہاتھ چھڑایا اور اس تنگ گلی کی طرف دوڑا۔ گلی کے سرے پر پہنچ کر میں نے احتیاط سے دیوار کی اوٹ سے سر نکالتے ہوئے گلی میں جھانکا۔ میرے اندیشے کے مطابق ہیولا غائب ہو چکا تھا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی دبی دبی آوازیں سن کر میں نے تیزی سے رخ بدلا۔ میں دیوار سے چپک گیا تھا اور میرے ہاتھ میں موجود مشین پسٹل آگ اگلنے کے لیے تیار تھا۔ تین اور ہیولے گلی میں داخل ہوئے لیکن میں ایک طویل سانس لے کر ذرا آگے آ گیا۔ وہ ہیولے دراصل شفیع شاہ اور میرے دوسرے دو آدمیوں کے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔

جس طرح میں نے شفیع شاہ کا ہیولا دیکھ کر اسے پہچان لیا تھا اسی طرح اس نے بھی مجھے کالے اندھیرے میں پہچان لیا۔ مجھے گلی کے سرے پر کھڑے دیکھ کر ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ حملہ آور کہاں گیا ہوگا۔ اس نے مجھ سے کچھ پوچھنے میں وقت ضائع نہیں کیا اور گلی میں گھس گیا۔

اس کا اس طرح اندھادھند گلی میں گھسنا بھی غلط تھا۔ اگر حملہ آور گلی میں ہی کہیں چھپا ہوتا تو آسانی سے شفیع شاہ کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ منجھے ہوئے آدمی بھی جلد بازی اور جذباتیت میں ایسی غلطی کر جاتے ہیں۔ میں بھی اسے نہیں روک سکا تاہم مجھے کچھ اطمینان بھی تھا کہ شفیع شاہ بھی کبھی کبھار آنکھیں بند کر کے اچانک ایسے خطرات کے منہ میں چھلانگ لگا دیتا تھا تو وہ عین آخری لمحے میں اس سے اپنا بچاؤ کرنا بھی جانتا تھا۔

اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو دوسری اطراف سے گھوم کر گلی کے دوسرے سرے پر پہنچنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ان میں سے ایک الٹے قدموں دوڑتا چلا گیا۔ دوسرا مخالف سمت میں دوڑا۔ دونوں مختلف سمتوں سے گلی کے سرے پر پہنچنا چاہتے تھے۔ میں گلی میں جھانک کر شفیع شاہ کو اندھیرے میں آگے جاتے دیکھ سکتا تھا۔ گلی کے وسط میں پہنچ کر وہ رک گیا اور دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہاں ویسی ہی ایک اور گلی اس گلی کو کراس کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ حملہ آور کے غائب ہونے کے امکانات بڑھ گئے تھے۔

مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ ان گلیوں میں اتنا اندھیرا تھا حالاں کہ یہ کوئی عقبی گلیاں نہیں تھیں جن میں کوڑا کباڑ پھیلا ہے۔ یہ شہر کا مرکزی علاقہ تھا اور تنگ تنگ سی یہ پیچ در پیچ گلیاں بھی اچھے خاصے کاروباری مراکز تھے۔ ان میں دکانوں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ عین ممکن تھا کہ جس گلی سے ہیولا برآمد ہوا اس کے بلب تو اسی نے غائب کیے ہوئے ہوں۔ اب ان اطراف میں کہیں کہیں جو تھوڑی بہت روشنی آ رہی تھی وہ دکانوں کے اوپر بنے ہوئے نہایت پرانے اور بوسیدہ فلیٹس میں سے آ رہی تھی اور وہ نہ ہونے کے برابر تھی۔

میں قدرے مایوسی کے عالم میں نیلم کے پاس آ گیا۔ حملہ آور یقیناً دیکھ بھال کر، گردوپیش کا اچھی طرح جائزہ لے کر، فرار کی راہ متعین کر کے اور ہر امکان کو ذہن میں رکھ کر اپنا کام کرنے آیا تھا۔ البتہ یہ امکان شاید اس کے ذہن میں نہ رہا ہو کہ میں اتنے غیر متوقع حملے سے بچ بھی سکتا تھا ورنہ شاید وہ اکیلا نہ آتا۔ دو چار آتے اور مختلف سمتوں سے آتے۔

میں نے دیکھا نیلم گاڑی کے نیچے گھسنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مجھے واپس آتے دیکھ کر اسے حوصلہ ہوا اور اس نے یہ کوشش ترک کر دی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا۔ وہ اٹھتے ہوئے ڈر رہی تھی کیوں کہ اس طرح وہ گاڑی کی اوٹ سے باہر ہو جاتی۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مرتعش سرگوشی میں بولی۔ "ابھی اور آدمی بھی تو گلی میں آئے تھے۔ وہ کہاں گئے؟"

"ڈرو مت۔ وہ اپنے ہی آدمی تھے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

تب اس نے ایک طویل سانس لی۔ شاید اس کے اعصاب پر سے بوجھ کچھ کم ہوا تھا۔

شفیع چند سیکنڈ بعد ہی لوٹ آیا اور نیچی آواز میں بولا۔ "آئی ایم سوری سر! ہمیں یہاں پہنچنے میں چند سیکنڈ کی تاخیر ہو گئی۔"

"نہیں اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم تو میرے اندازے سے زیادہ جلدی پہنچے ہو۔"

وہ دور رہ کر میری نگرانی کرتا تھا۔ وہ اس گلی سے کافی دور تھا جس میں میں نے گاڑی کھڑی کی تھی جب کہ حملہ آور تو اس کی بھی ایک بغلی گلی میں چھپا ہوا تھا۔ شفیع شاہ یقیناً فائرنگ کی آواز سن کر حرکت میں آیا ہوگا۔ اس اعتبار سے اس نے گاڑی سے اتر کر یہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ وہ اور دوسرے دونوں آدمی چھلاوے کی سی پھرتی سے محض چند سیکنڈ میں یہاں پہنچ گئے تھے۔ اب اس سے زیادہ پھرتی کی تو کسی سے توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

دوسرے دونوں آدمی واپس نہیں آئے تھے۔ شفیع شاہ یقین سے بولا۔ "وہ آدمی بھاگا نہیں ہے سر! وہ اسی چوکور سے حصے میں

کہیں غائب ہوا ہے۔ کیا ہم علاقے کو گھیرنے اور تلاشی لینے کی کوشش کریں؟"

وہ جس چوکور حصے کی بات کر رہا تھا اس میں تنگ و تاریک راستوں اور نہ جانے کیسے کیسے چور دروازوں والی بیسیوں ایسی عمارتیں پھیلی ہوئی تھیں جن کے نیچے دکانیں، ان سے اوپر دفتر، ورکشاپیں اور نہ جانے کیا کچھ تھا پھر ان سے اوپر دڑبا نما فلیٹ پھیلے ہوئے تھے۔ بیچ میں اِدھر اُدھر آنے جانے کے درجنوں راستے تھے۔ محض ہم چار آدمیوں کا اتنے بڑے اور پُرپیچ حصے کو گھیرنا اور تلاشی لینے کی کوشش کرنا بے کار تھا۔ یہ کام تو پولیس بھی اچھی خاصی نفری کے ساتھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بھی محض بے فائدہ قسم کی پکڑ دھکڑ کر سکتی تھی۔ نکلنے والا آسانی سے نکل سکتا تھا۔

"اس کا کوئی فائدہ نہیں" میں نے کہا۔ "میں نے اس شخص کو صرف ایک پرچھائیں کی طرح دیکھا ہے لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ وہ پرچھائیں کس کی تھی اور اسے کہاں تلاش کرنا چاہیے۔ اس لیے یہاں وقت ضائع کرنے اور اپنے لیے الجھنیں کھڑی کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنے آدمیوں کو واپس بلا لو۔ ہم یہاں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ مزید ہدایات میں تمہیں راستے میں موبائل فون پر دوں گا۔"

"او کے سر!" وہ لپک کر اسی تنگ سی گلی میں غائب ہو گیا۔ پھر میں نے کسی پرندے کی سی آواز سنی۔ وہ اپنے ساتھیوں کو واپس آنے کے لیے سگنل دے رہا تھا۔

میں نیلم کا ہاتھ پکڑ کر اپنی گاڑی کی طرف لپکا۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں نے روف لائٹ آن کی۔ میرے اور نیلم کے کپڑے مٹی میں لتھڑ چکے تھے تاہم زیادہ برا حال نہیں ہوا تھا۔ ہم نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی اپنے آپ کو جھاڑ پونچھ کر اپنا حلیہ درست کیا پھر میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے اور ریورس کرنے میں بھی جان بوجھ کر چند سیکنڈ کی تاخیر کی۔ میں شفیع شاہ کو یہ دیکھنے کا موقع دینا چاہتا تھا کہ میں کدھر کا رخ کر رہا تھا۔

جب میں نے اس کی گاڑی گلی کے ایک سرے پر نمودار ہوتے دیکھ لی تو اپنی گاڑی گلی کے دوسرے سرے کی طرف بھگائی۔ گنجان علاقہ اس وقت گنجان محسوس نہیں ہو رہا تھا اس لیے میں نہایت آسانی اور تیز رفتاری سے وہاں سے نکل آیا۔ اس وقت تک کسی بھی طرف سے پولیس وغیرہ کی آمد کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔

گارڈن روڈ پر پہنچ کر میں نے گاڑی کی رفتار بالکل کم کر دی اور فون پر شفیع شاہ سے رابطہ کیا۔ سڑک کے کنارے کنارے نہایت سست رفتاری سے گاڑی چلاتے ہوئے میں نے شفیع شاہ کو کچھ ہدایات دیں۔ پھر میں نے رحیم گل سے رابطہ کیا۔ وہ میری آواز پہچانتے ہی بولا۔ "ابھی میں نے تمہیں ہوٹل فون کیا تھا۔ تم وہاں نہیں ملے تو اب میں تمہارے موبائل نمبروں پر رابطہ کرنے کی سوچ رہا تھا۔"

"کیوں؟ کیا تکلیف تھی، نہیں؟" میں نے گاڑی ایک جگہ روکتے ہوئے پوچھا۔ میں چاہ رہا تھا اس سے اطمینان سے بات کر لی جائے۔

"وہ تم نے پنکی اور ثمی نام کی جو دو عجیب و غریب مخلوقات مجھ سے ٹکرائی تھیں، ان کے بارے میں تمہیں بتانا تھا" اس نے خوش گوار لہجے میں جواب دیا۔

میں نے اسے چڑانے کے لیے کہا۔ "اتنے شکایتی لہجے میں کیوں بول رہے ہو؟ شکر کرو کہ اس بہانے تمہیں ایک ماڈرن اور آزاد خیال لڑکی سے تعارف حاصل کرنے کا موقع مل گیا ورنہ تمہارے مقدر میں اس قسم کی بلکہ کسی بھی قسم کی لڑکیوں سے ملنا کہاں!"

"تم اس ماڈرن اور آزاد خیال لڑکی کو اپنے پاس ہی رکھو......" وہ بولا۔

"چلو ٹھیک ہے، رکھ لوں گا" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "یہ تمہارے بس کی باتیں نہیں ہیں۔ یہ بتاؤ اس کے بوائے فرینڈ سے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی یا نہیں؟"

"ہاں معلوم ہوئی ہے۔"

"کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہی کہ پنکی جیسی لڑکیاں کس قسم کے مردوں کو پسند کرتی ہیں" اس نے جواب دیا۔

"خیر ان میں تمہارا کوئی ذکر نہیں ہوگا۔ تم نہ تین میں ہو نہ تیرہ میں۔ تمہیں اس قسم کی باتوں میں دلچسپی لینے کی ضرورت نہیں" میں نے نہایت شفقت سے کہا۔ "تم صرف اپنے پولیسیانہ کاموں میں دلچسپیاں لیا کرو۔"

"ہاں۔ لڑکیوں میں دلچسپی کے لیے تو صرف تم ہی ایک گلفام کے بچے رہ گئے ہو۔" وہ بولا۔

"اتنا مت جلو۔ دھواں یہاں تک پہنچ رہا ہے۔ ٹیلی فون سیٹ سے برآمد ہو رہا ہے" میں نے گویا پیار سے اسے سمجھایا۔ "تم نے ثمی کے بیان کی ابتدائی تصدیق تو کر لی تھی۔ یہ بتاؤ کہ کیا ذرا گہرائی سے جائزہ لینے پر بھی وہ بے قصور ہی معلوم ہوتا ہے؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے جج صاحب کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ میں نے اسے چھوڑ دیا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"شاید تم نے ٹھیک ہی کیا۔ یہ بات میں صبح تک زیادہ یقین سے کہہ سکوں گا" اب میں نے بھی سنجیدگی سے بات کی۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ فضول باتوں میں وقت برباد کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ "فی الحال تم کچھ ہدایات سن لو اور انہیں اپنے ناکارہ دماغ میں بٹھانے کی کوشش کرو......"

"تم اس وقت بول کہاں سے رہے ہو؟" وہ میری بات کاٹتے

ہوئے بولا۔

"فضول سوال کرنے کی تمہاری عادت کبھی نہیں جائے گی" میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔ "اس بات سے بھلا کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کہاں سے بول رہا ہوں؟"

"فرق کیوں نہیں پڑتا' بہت فرق پڑتا ہے۔" وہ بحث کے لیے تیار معلوم ہوتا تھا۔

"میں عالم بالا سے ذرا دو چار فٹ اِدھر سے بول رہا ہوں" میں نے کہا "اگر سر گھما کر پیچھے دیکھنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی تو اس وقت عالم بالا ہی سے بول رہا ہوتا لیکن پھر کسی نیک روح سے میری بات ہو رہی ہوتی۔ تم جیسی بد روح سے نہیں۔"

"اچھا تم اس وقت سسپنس پیدا کرنے کی اپنی بھونڈی کوشش ترک کرو اور جو اصل واقعہ بتانا چاہ رہے ہو وہ بتاؤ" رحیم گل بولا۔

میں نے اس کی فرمائش پوری کر دی اور اصل واقعہ اسے بتا دیا۔ میں خاموش ہوا تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "آہ! کیا عظیم الشان گدھا تھا وہ نامعلوم شخص جو اتنا اہم کام صحیح طریقے سے انجام نہیں دے سکا۔ اگر وہ ذرا سی مستعدی دکھا دیتا تو اس وقت دنیا کو کتنی بڑی مصیبت سے نجات مل چکی ہوتی۔ ماحول کتنا صاف ستھرا ہو چکا ہوتا۔"

"مستعد تو وہ بہت تھا میرے لال بجھکڑ! اگر تمہیں اس سے واسطہ پڑ گیا تو تمہیں پتا چل جائے گا کہ عظیم الشان گدھا وہ ہے یا تم" میں نے کہا۔ "لیکن فی الحال تم اپنی چونچ بند کرو اور اپنے اس کاہل وجود کو تھوڑی سی حرکت دینے کے لیے تیار ہو جاؤ"

میں نے تفصیل سے کچھ ہدایات دیں اور کہا۔ "ان ہدایات پر عمل کرنے میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔ فوری طور پر حرکت میں آجاؤ۔ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت بلکہ تمہارے ساتھ تو مسئلہ یہ ہے کہ تمہارے پاس صرف وقت ہی نہیں' بلکہ عقل بھی کم ہے۔"

وہ میری ہدایات سن کر طنز و مزاح بھول گیا تھا۔ نہایت سنجیدہ بلکہ کسی حد تک متفکرانہ لہجے میں بولا۔ "تم بالکل سنجیدہ ہو؟"

"میں تو اس وقت رنجیدہ بھی ہوں کہ مجھے تم جیسے نکمے آدمی کا تعاون بھی حاصل کرنا پڑ رہا ہے۔ محض اس لیے کہ تم قانون کے نمائندے ہو۔ ورنہ میں تو خود ہی اس مسئلے سے نمٹ لیتا۔ ویسے بھی اب تم جیسے کوڑھ مغز سے تھوڑی بہت دوستی ہے تو میں چاہتا ہوں تمہیں میری ذات سے کچھ فائدہ پہنچ جائے۔ خود اپنے بل بوتے پر تو تم زندگی میں مشکل سے ہی کچھ کر سکو گے۔"

خلاف توقع اس نے میری ان سلگانے والی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "میں اب روانہ ہو رہا ہوں۔ تم بھی تیزی سے حرکت میں آجاؤ ورنہ کوئی الجھن کھڑی ہو سکتی ہے۔ تمہیں تو سانپ سونگھ گیا ہے۔ مجھے ابھی بتاؤ تم بروقت پہنچ سکو گے یا نہیں؟"

"پہنچ جاؤں گا' پہنچ جاؤں گا۔ مرے کیوں جا رہے ہو؟" تیزی سے بولا۔

میں نے اسے شب بخیر کہا اور فون بند کر کے نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ اب اس دھچکے سے سنبھل چکی تھی جو اسے اچانک لگا تھا تاہم اب وہ میری گفتگو سے پریشان نظر آرہی تھی۔

"یہ تم کس قسم کی باتیں کر رہے تھے اور ہم کہاں جا رہے ہیں؟" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

"تم نے ایک ساتھ دو سوال کر دیے" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ میں اکثر اسی قسم کی باتیں کرتا ہوں۔ خصوصاً اس شخص سے جس سے میں اس وقت بات کر رہا تھا۔"

"تم انسپکٹر رحیم گل سے بات کر رہے تھے نا" اس نے تصدیق چاہی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولی۔ "بہت سخت گیر افسر ہے۔ میں نے صرف ہدایت سے ملاقات کے سلسلے میں اس کی بہت منت کی۔ ہمارا جو تھوڑا بہت اثر رسوخ ہے' اس کے حوالے دیے۔ بڑی رجھانے والی مسکراہٹیں بھی اس پر نچھاور کیں مگر بد بخت ٹس سے مس نہیں ہوا بلکہ محض اشارتاً میں نے کچھ دَمکا کا ذکر کیا تو اتنا برا منا گیا کہ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا' کوئی الزام لگا کر مجھے ہی اندر نہ کر دے۔"

"ہاں۔ اس سے یہ بعید تو نہیں تھا" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ پھر غیر ارادی طور پر میں سنجیدہ بلکہ ایک لمحے کے لیے افسردہ سا ہو گیا۔ "لیکن ہمارے ملک کو اس قسم کے "مردود" "بد بخت" پولیس افسروں کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ تم شکر کرو ہدایت اس کی تحویل میں گیا ہے۔ اگر وہ بے گناہ ثابت ہو گیا تو زحمت اور کسی جسمانی نقصان کے بغیر عزت و آرام سے گھر آجائے گا ورنہ بے گناہ ہونے کے باوجود اس کا تیل نکل جاتا۔ تمہاری اس سے حوالات میں ملاقات اتنی ضروری نہیں تھی۔ اس کے بغیر گزارا ہو سکتا ہے۔ زیرِ حراست ملزم خیر و عافیت سے ہو' اس کے ساتھ کوئی زیادتی' تشدد وغیرہ نہ ہو رہا ہو تو پھر ملاقات اتنی ضروری نہیں۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے" ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے تسلیم کیا۔ "بہرحال اب تم مجھے ہدایت سے ملوانے تو یقیناً نہیں لے جا رہے۔ تمہارا پروگرام بدل چکا ہے نا؟"

"ہاں۔ تمہیں تمہارے دوسرے سوال کا جواب تو مل گیا ہے۔ میرا خیال ہے تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ رحیم گل سے میری جو گفتگو ہو رہی تھی اس سے تمہیں معلوم ہو چکا ہو گا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔"

"ہاں" اس نے تسلیم کیا۔ "وہ میں غیر ارادی طور پر پوچھ رہی ہوں۔ دراصل مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"تم چاہو تو میں تمہیں راستے میں اپنے ہوٹل چھوڑ دوں۔ تم میرے کمرے میں اطمینان سے میری واپسی کا انتظار کرنا اور اگر مجھے واپسی میں دیر ہو جائے تو وہیں سو جانا۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"نہیں۔ خیر' اب اتنا بھی ڈر نہیں لگ رہا" وہ گویا اپنا حوصلہ مجتمع کرتے ہوئے مسکرائی۔ "تم جس آدمی کے ٹھکانے کی طرف جا رہے ہو وہ بلاشبہ بہت خطرناک آدمی ہے لیکن میرا خیال ہے تم خود بھی کچھ کم خطرناک آدمی نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ جاتے ہوئے مجھے خوف زدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"کیوں ایک معصوم اور بے ضرر انسان پر بہتان تراشی کر رہی ہو۔ مجھ جیسا سیدھا آدمی تمہیں کہاں ملے گا جو ہر ایک سے تھوڑی تھوڑی محبت کرنے لگتا ہے۔ جو ہر ایک میں کوئی نہ کوئی خوب صورتی تلاش کر لیتا ہے۔ جو ہر ایک کی صرف خوبیوں پر نظر رکھتا ہے' خامیوں کو نظر انداز کر دیتا ہے" میں نے اپنا دفاع کیا۔

"تم پکے بدمعاش ہو!" وہ سیٹ سے سر ٹکا کر گہری سانس لے کر فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "ہر ایک کو اس کی نظر میں اہم بنا دیتے ہو' ہر ایک کا دل رکھتے ہو۔ اپنے دل کا بھید کسی کو نہیں بتاتے۔ تم ہر اعتبار سے خطرناک ہو۔ مجھے تم سے دور رہنا چاہیے ورنہ اندیشہ ہے کہ میں اس ڈھلتی عمر میں تم سے عشق نہ کرنے لگوں۔"

"تو پھر کرو نا۔ کس نے منع کیا ہے؟" میں نے گویا یکدم خوش ہوتے ہوئے کہا۔ "میں تو عشق کا بہت بڑا قدر دان ہوں۔ میں تو کسی کے عشق کو اپنے لیے بہت بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔"

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم پکے بدمعاش ہو۔ ہر ایک کو محض باتوں سے خوش کرتے رہتے ہو۔ پارسا بننے کی کوشش نہیں کرتے۔ منہ زور جذبوں اور خواہشوں کے بارے میں ایک عام انسان نظر آتے ہو لیکن دل کا فولادی دروازہ مضبوطی سے بند رکھتے ہو۔ اس بات کا پورا پورا خیال رکھتے ہو کہ کوئی تمہارے گلے کا ہار نہ بننے پائے۔"

"اوہ میرے خدا!" میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سر تھام لیا۔ "تم تو میرا پوسٹ مارٹم کرنے پر تُل گئی ہو۔ تم سے دوستی تو خود میرے لیے بہت ہی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ تم کیا کوئی ماہرِ نفسیات قسم کی چیز ہو؟" میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ "بے چارے ماہرینِ نفسیات کو نفسیات کا کیا پتا؟ آدھے ماہرینِ نفسیات تو خود نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ تمہیں اگر نفسیات کے بارے میں کچھ معلوم کرنا ہو' خصوصاً مردوں کی نفسیات کے بارے میں تو مجھ جیسی کسی عورت سے معلوم کیا کرو جس نے زندگی کو اس کی تمام تر سفاکی کے ساتھ قریب سے دیکھا ہو۔"

"بس۔ اب اتنی کھردری باتیں مت کرو" میں نے جھرجھری لے کر کہا۔ "مجھے کھردری باتیں کرنے والی عورتوں سے خوف آتا ہے۔ عورت قدرت کی ایک خوب صورت تخلیق ہے۔ اس کے منہ سے ریشم جیسی نرم اور پھولوں جیسی مہکی مہکی باتیں اچھی لگتی ہیں۔ کھردری باتیں مردوں کے لیے چھوڑ دو۔"

"لیکن مجبوری ہے مائی ڈیئر افضل!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ہر عورت ریشم جیسی ملائم اور پھولوں جیسی مہکی مہکی باتیں نہیں کر سکتی کیوں کہ ہر عورت کی زندگی ریشم جیسی ملائم اور پھولوں جیسی مہکی مہکی نہیں ہوتی۔ میرے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ میں خوش فہم نہیں ہوں۔ تم اگر میرا دل بڑھانے والی باتیں کر رہے ہو یا ہم کچھ اچھا وقت ساتھ گزار چکے ہیں تو اس سے میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ تم مجھ پر عاشق ہو چکے ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ میں ایک خاصا ناقابلِ رشک ماضی رکھنے والی ڈھلتی عمر کی عورت ہوں جس کے دامن میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں ہے' جس پر تم فخر کر سکو۔"

"عشق فخر کرنے کے لیے نہیں ہوتا اُلّو کی دُم!" میں نے اسے ڈانٹا۔ "عشق تو صرف اپنی روح کو سرشار کرنے کے لیے اور اپنے اندر موجود خلا کو پُر کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ میں تو اب یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر تم ڈھلتی عمر میں ایسی ہو تو نوجوانی میں کیا چیز رہی ہو گی؟"

"نوجوانی میں بالکل بے کار سی چیز تھی۔ بہت ہی بے وقوف' بہت ہی بے کشش سی لڑکی تھی۔ واقعی اُلّو کی دُم تھی" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"میرا خیال ہے کہ تم عمر کے ہر دور میں ہی اپنے لیے بہت زیادہ کسرِ نفسی سے کام لیتی رہی ہو۔ میں نے تم جیسی کسرِ نفسی کسی اور عورت میں نہیں دیکھی۔ میں نے تو بڑی بڑی عجیب الخلقت خواتین کو اپنے بارے میں سخت خوش فہمی میں مبتلا دیکھا ہے۔"

"مجھے شاید بچپن سے ہی خود آگہی کی بیماری لگ گئی تھی" وہ بولی۔

"اور کچھ زیادہ ہی لگ گئی تھی" میں نے تاسف سے کہا۔ "ایسی ظالمانہ حد تک خود آگہی اچھی نہیں ہوتی۔ یہ خود کشی کی طرف لے جاتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ میری روح تو کافی عرصہ پہلے خود کشی کر چکی ہے۔ یہ صرف میرا جسم ہے جس میں زندگی گزارنے کی امنگ بڑے زور شور سے زندہ ہے" وہ بولی۔

"اچھا اب فضول اور ڈپریس کرنے والی باتیں مت کرو ورنہ میں تمہیں گاڑی سے نیچے دھکا دے دوں گا اور اندھیرے میں ادھر اُدھر دوڑتا ہوا کوئی بدذوق اور جاہل چوہا تمہاری یہ خوب صورت سی ناک کتر لے گا" میں نے گویا اسے ڈرایا۔

"اندھیرے میں دندناتے ہوئے دو ٹانگوں والے بھیڑیے بھی میری مرضی کے خلاف میری ناک نہیں کتر سکتے' چوہا کیا چیز ہے" اس کے ہونٹوں پر اس کی پُرکشش سی مسکراہٹ واپس آتی دکھائی دی۔

"بڑی دلیر نظر آنے کی کوشش کر رہی ہو!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کچھ دیر پہلے تو بڑی خوف زدہ ہو گئی تھیں۔"

"گولیوں کی بوچھار ایسی ہی چیز ہوتی ہے" وہ بولی۔ "اور پھر اتنا اچانک حملہ!" اس نے جھرجھری سی لی۔ "کتنی طمانیت' خوشی اور سرور کے سے عالم میں میں تمہارے ساتھ چل رہی تھی۔ مدت بعد میں نے اپنے آپ کو اتنا خوش محسوس کیا تھا۔ اس مردود' کتے کے پلّے نے میری چند لمحوں کی وہ عارضی سی خوشی بھی برباد کردی۔"

"شکر کرو کہ بات صرف خوشی پر ٹل گئی" میں نے کہا۔ "خوشیاں تو زندگی میں آتی جاتی رہتی ہیں لیکن زندگی چلی جائے تو لوٹ کر نہیں آتی۔"

"ہاں' یہ تو ہے" اس نے تھکے تھکے انداز میں تسلیم کیا پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا' میری طرف رخ کرتے ہوئے بولی۔ "مجھے کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے اس حملے نے اچانک تمہارے ذہن کو پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ تم یک لخت ہی جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئے ہو۔ اس سے پہلے گویا تم اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ تمہیں اچانک ہی روشنی نظر آگئی ہے۔"

میں دل ہی دل میں اس کے مشاہدے کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بعض اوقات تخریب کی کوکھ سے تعمیر جنم لیتی ہے۔ میں بڑی الجھن میں تھا لیکن اس حملے کے بعد ذہن میں جیسے کوئی بند کھڑکی کھل گئی۔ معمے کے ٹکڑے بہت ہی تیزی سے جڑتے چلے گئے۔ ابھی کچھ باتوں کی تصدیق ہونا باقی ہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ جس طرح میں سوچ رہا ہوں' بات اسی طرح ہوگی۔ اس لحاظ سے یہ حملہ زحمت نہیں رحمت ثابت ہوا ہے۔"

"تم کچھ الجھی الجھی سی گفتگو نہیں کر رہے؟" وہ گردن ترچھی کرتے ہوئے بولی۔

"یہ صرف تمہارے لیے الجھی ہے اور فی الحال الجھی ہے۔ تھوڑی دیر بعد الجھی نہیں رہے گی" میں نے کہا۔

اس وقت تک ہم ایک نیم تاریک اور سنسان سی گلی میں پہنچ چکے تھے۔ یہ کلفٹن کا علاقہ تھا۔ میں نے ایک مناسب جگہ دیکھ کر گاڑی کھڑی کی۔ میری کوشش تھی کہ گاڑی کسی کی نظر میں نہ آئے۔ میں اسے اپنی اصل منزل سے کچھ دور ہی چھوڑ رہا تھا۔ نیلم اب خوف زدہ دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گاڑی سے اتر کر وہ پُر اعتماد انداز میں قدم اٹھاتی میرے ساتھ چل رہی تھی۔

ایک ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ پیدل طے کرنے کے بعد ہم اس خوب صورت عمارت کے سامنے جا پہنچے جس کے ٹاپ فلور پر مرزا مکرم بیگ کا وہ اپارٹمنٹ تھا جسے وہ ہیڈ کوارٹر کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس وقت بلڈنگ کا گیٹ بند تھا لیکن اس کے عقب میں ایک کرسی پر چوکیدار موجود تھا۔

شاید جج صاحب کے قتل والے واقعے کے بعد اسے سبق حاصل ہو گیا تھا اور وہ مستعدی سے اپنی ڈیوٹی دینے لگا تھا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اس کا واسطہ رحیم گل جیسے پولیس آفیسر سے پڑا تھا ورنہ شاید وہ ابھی حوالات میں ہوتا اور تفتیش کے نام پر اس کا نہ جانے کیا حشر ہو چکا ہوتا۔ تفتیش میں بھی غریب ہی کی سب سے زیادہ شامت آتی ہے۔ گھریلو ملازموں' چوکیداروں اور اسی قسم کے دوسرے معمولی کام کرنے والوں سے سب سے زیادہ زور و شور سے تفتیش ہوتی ہے۔

چوکیدار نے گیٹ تھوڑا سا کھول کر مجھے دیکھا اور پیچھے ہٹتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ ورنہ مجھے کوئی اور طریقہ استعمال کرنا پڑتا۔ اس نے مجھے رحیم گل کے ساتھ دیکھا تھا جب اسے بلوا کر اس سے پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ شاید وہ مجھے بھی سادہ لباس والا کوئی پولیس آفیسر یا اسی طرح کی کوئی اور اہم سرکاری شخصیت سمجھ رہا تھا۔ میں نے اس کی یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس نے جب باچھیں کھلا کر بڑے ادب سے مجھے سلام کیا تو میں نے اعلا سرکاری افسروں والے انداز میں ذرا نخوت سے گردن ہلا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور بارعب لہجے میں پوچھا۔ "ماموں کا کمرا کدھر ہے؟"

"ماموں؟" چوکیدار ایک لمحے کے لیے حیران پریشان ہو گیا۔

"یہاں بلڈنگ میں ایک آدمی رہتا ہے نا۔ وہ چھوٹے موٹے مرمت کے کام کرتا ہے۔ پانی کی موٹر چلاتا ہے۔ اس کا نام مجھے معلوم نہیں۔ سب اسے ماموں ماموں کہتے ہیں" میں نے وضاحت کی۔

"او اچھا...... اچھا" چوکیدار نے اطمینان کی سانس لی۔ "آپ طاہر ماموں کو پوچھتی ہے اس کا کمرا بلڈنگ کے پیچھے کی طرف ہے۔ آپ امارے ساتھ آؤ" اس نے ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

میں اپنی کہنی سہلاتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا۔ نیلم سرگوشی میں بولی۔ "یہ تم کس ماموں کے چکر میں پڑ گئے؟ میں تو سمجھی تھی کہ تم یہاں مرزا مکرم بیگ سے ملنے آرہے تھے۔"

"ہاں' ملنا تو مکرم بیگ سے ہی ہے لیکن اس سے پہلے میں قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری بات یاد آگئی اور اس کے ساتھ ہی الہامی سے انداز میں ایک اور بات کا احساس ہوا۔ میں نے سوچا ہے قسمت آزمائی کر کے دیکھ لی جائے" میں نے جواب دیا۔

نیلم نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے وضاحت کے سے انداز میں کہا۔ "انسانی ذہن واقعی قدرت کا کارخانۂ عجائب ہے۔ میں کبھی کبھی اس کی طلسماتی قلابازیوں پر حیران ہوتا ہوں۔ جج صاحب کے قتل والی رات جب میں بلڈنگ میں مرزا مکرم بیگ کے اپارٹمنٹ میں تھا تو میری بائیں کہنی دیوار میں ابھرے ہوئے ایک چھجّے سے ٹکرائی تھی اور خاصی

چوٹ لگ گئی تھی۔ مکرم بیگ نے بتایا تھا کہ وہ ایک گاربیج شوٹ کا دہانہ تھا۔ یہ بڑی جدید بلڈنگ ہے۔ اس میں ہر اپارٹمنٹ کے اندر بیٹھے ہی بیٹھے کوڑا پھینکنے کے لیے گاربیج شیوٹس بھی بنائے گئے تھے لیکن بہت سے دوسرے ترقی پسند منصوبوں کی طرح یہ منصوبہ بھی فلاپ ہو گیا کیونکہ ترقی کو ہضم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قوم کا معدہ اس قابل بنایا جائے۔ کچھ تو مکینوں کو ایسی چیزیں استعمال کرنے کا شعور نہیں کیوں کہ روپیا پیسا تو بہت سے لوگوں کے پاس ہے لیکن تعلیم کم لوگوں کے پاس ہے۔ دوسرے ہر چیز غیر معیاری بنائی جاتی ہے اس لیے یہاں یہ سسٹم بھی بے کار پڑا ہے۔"

"بات ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئی" نیلم بولی۔

"ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی۔ اس لیے تمہاری سمجھ میں نہیں آئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج جب ہم پر حملہ ہوا اور میں تمہیں ساتھ لیتے ہوئے سڑک پر گرا تو ایک بار پھر میری اسی کہنی پر چوٹ لگی۔ یہ تجربہ شاید تمہیں بھی ہوا ہو۔ انسان کے جسم کے اس حصے پر اکثر دوبارہ چوٹ لگ جاتی ہے جو پہلے ہی کسی چوٹ سے دکھ رہا ہوتا ہے لیکن اس دوسری چوٹ نے میرے لیے گویا سوچ کی راہیں کھول دیں"

"ہاں۔ ہر نئی چوٹ انسان کے لیے سوچ کی راہیں کھولتی ہے" نیلم ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"درست ہے لیکن میں زیادہ گہری نہیں' ایک عام اور سطحی سی بات کر رہا ہوں۔ اس چوٹ سے مجھے گاربیج شیوٹ یاد آیا اور پھر ایک اور چیز یاد آگئی جو میں نے مکرم بیگ کے اپارٹمنٹ میں دیکھی تھی۔ میرے ذہن میں ایک شبہے نے سر ابھارا ہے اور میں سوچ رہا ہوں کہ مکرم بیگ کے سامنے جانے سے پہلے ذرا قسمت آزمائی کرتا چلوں۔ تم تماشا دیکھتی رہو۔ بات دھیرے دھیرے تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔"

"اگر نہ بھی سمجھ میں آئی تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا" وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "میں ہر بات سمجھنے کے لیے زیادہ دماغ نہیں کھپاتی۔ میری دلچسپی سب سے زیادہ اس بات میں ہے کہ ہدایت حوالات سے باہر آجائے۔"

"بہت زیادہ امید ہے کہ آئندہ ایک دو گھنٹے میں اس کا فیصلہ ہو جائے گا" میں نے کہا۔

ہم عمارت کے گرد گھوم کر عقب میں پہنچ چکے تھے۔ چوکیدار ایک چھوٹے سے دروازے پر رک چکا تھا۔ یہ سیڑھیوں کے نیچے بنا ہوا ایک کمرا تھا جو باہر سے ہی چھوٹا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دیوار پر بجلی اور گیس کے میٹروں کا جال سا پھیلا ہوا تھا۔ اس سے ذرا آگے چوڑا سا ایک ڈھلوان راستہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ یقیناً تہ خانے کا راستہ تھا جس کے اختتام پر لوہے کا گرل والا گیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ اس پر بڑا سا تالا جھول رہا تھا۔

چوکیدار نے لکڑی کے چھوٹے سے دروازے پر دستک دی۔ دروازہ محض دستک سے ہی لرز کر رہ گیا مگر اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ چوکیدار نے دو تین مرتبہ زور سے دستک دی پھر میری طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ماموں خانہ خراب بڑا ظالم نیند سوتی ہے۔ بڑی مشکل سے اٹھتی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر دستک دی اور مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ دروازہ نیچے ہی نہ آرہے۔ تاہم اس دستک پر چندھی چندھی سی آنکھوں والے ایک ادھیڑ عمر شخص نے دروازہ کھول دیا۔ اس کی میلی اور شکن آلود سی شلوار قمیص پر گریس کے دھبے لگے ہوئے تھے۔ شاید وہی اس کے کام کرنے کے کپڑے تھے جنہیں وہ شب خوابی کے لباس کے طور پر استعمال کرتے ہوئے سو گیا تھا۔

میں نے چوکیدار کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ۔ مجھے اس سے کچھ ضروری بات چیت کرنی ہے۔ تم چاہو تو اب آرام کرنے بھی جا سکتے ہو۔ اب کافی دیر تک یہاں پولیس والوں کا آنا جانا لگا رہے گا۔"

وہ چہرے پر الجھن کے آثار لیے لیکن اثبات میں سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔ اس سے زیادہ الجھن طاہر ماموں کے چہرے پر نظر آرہی تھی۔ اس کی چندھی چندھی آنکھیں جتنا بھی پھیل سکتی تھیں' پھیل چکی تھیں۔ میں اور نیلم اس سے اجازت لیے بغیر اندر پہنچ گئے اور دروازہ میں نے اپنے عقب میں بند کر دیا۔

وہ ایک چھوٹا سا کمرا بلکہ کمرا بھی کیا' ایک کوٹھری سی تھی جس میں ایک، چارپائی' ایک ٹرنک اور دوسرا چھوٹا موٹا سامان موجود تھا جو کسی بھی مزدور ٹائپ آدمی کے ٹھکانے پر نظر آسکتا ہے۔ طاہر ماموں ایک سیدھا سادہ شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر عیاری مکاری کی کوئی علامت نہیں تھی۔

"سر! آپ لوگ کون ہیں؟ میں نے آپ کو پہچانا نہیں" اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر گویا جرأت سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"جان پہچان کو چھوڑو طاہر ماموں" میں نے اس کی چندھی چندھی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے تم سے صرف چند ضروری باتیں پوچھنی ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہیں پولیس سے واسطہ نہ پڑے اور تم کسی بڑی مصیبت میں نہ پھنسو تو مجھے میرے سوالوں کے ٹھیک ٹھیک جواب دینا۔ تمہاری جان یہیں چھوٹ جائے گی۔ ذرا سا بھی جھوٹ بولو گے تو میں نہیں کہہ سکتا کہ تمہاری گردن کتنی سختی سے پولیس کے شکنجے میں پھنسے گی اور تم کہاں تک گھسٹتے پھرو گے۔"

"میں کچھ سمجھا نہیں صاحب!" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔ کمرے میں صرف ایک ہی کمزور سا زرد بلب روشن تھا۔ اس کی ناکافی سی روشنی میں بھی اس کی رنگت کچھ متغیر نظر آنے لگی تھی۔

"میرا سوال ضرور تمہاری سمجھ میں آجائے گا" میں نے اس

کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "کیا پرسوں شام کسی وقت ٹاپ فلور کے کرائے دار مرزا اکرم بیگ نے تمہیں ایک دروازے کی ناب تبدیل کرنے کے لیے بلایا تھا؟"

وہ ایک لمحے خاموش رہا تو میں نے کہا۔ "تمہیں میرے اس سوال پر چالاک بننے کی ضرورت نہیں کیوں کہ یہ بات مکرم بیگ خود مجھے بتا چکا ہے۔ میں صرف تصدیق کرنا چاہتا ہوں کہ یہ کام تمہارے ہی ہاتھوں ہوا تھا اور مکرم بیگ نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا تھا۔"

اس نے اثبات میں سرہلایا تو میں نے پوچھا۔ "تم نے صرف باہر کی طرف کی ناب تبدیل کی تھی؟"

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"اس نے تمہیں ناب تبدیل کرانے کی کوئی وجہ بتائی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ان کا کہنا تھا کہ کبھی کبھی ناب گھومتی نہیں' اٹک جاتی ہے" اس نے جواب دیا۔

"لیکن جس وقت تم نے چیک کیا اس وقت ناب ٹھیک تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔ مجھے تو وہ ٹھیک ہی معلوم ہو رہی تھی لیکن مکرم صاحب کا حکم تھا کہ میں اسے تبدیل کردوں" اس نے بتایا۔

"کیا وہ یہ کام کرانے کے لیے بہت جلدی میں دکھائی دے رہے تھے؟"

"جی ہاں۔ معلوم تو کچھ ایسا ہی ہوتا تھا کہ انہیں اس کام کی بہت جلدی تھی" طاہر ماموں اٹکتے ہوئے بولا۔ "جلد بازی کی وجہ سے ہی تو صرف ایک ناب بدلی جاسکی اور دروازے کے دونوں طرف الگ الگ ڈیزائن کی ناب لگ گئی۔ وہ تو دونوں طرف کی ناب بدلوانا چاہ رہے تھے لیکن یہاں آس پاس ہارڈویئر کی کوئی دکان نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے صرف ایک ناب مل سکی۔"

"یہ شاید قدرت کی طرف سے ہوا تھا" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "قدرت کو اس طرف میری توجہ مبذول کرانا مقصود تھا۔ اگر دونوں طرف ایک جیسی ناب لگ جاتی تو شاید میری توجہ اس طرف نہ جاتی اور میں مکرم سے اس سلسلے میں سوال نہ کرتا اور غیرارادی طور پر وہ یہ اعتراف نہ کرتا کہ اس نے ناب تبدیل کرائی ہے۔ یہ سب قدرت کے کام ہوتے ہیں مائی ڈیئر طاہر ماموں!" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "تم یہ بتاؤ کہ تم نے کس وقت یہ کام انجام دیا تھا؟"

"صحیح وقت تو مجھے یاد نہیں۔ میں نے گھڑی نہیں دیکھی تھی۔ بہر حال شام کا اندھیرا گہرا ہوچکا تھا" اس نے جواب دیا۔

"اس نے تمہیں اس کام کے لیے پیسے بھی اچھے خاصے دیے ہوں گے؟"

طاہر ماموں کی ہچکچاہٹ اور بڑھ گئی۔ وہ بہت اٹک اٹک کر بولا۔ "جی۔ انہوں نے ایک ہزار روپیا دیا تھا۔ میں نے تو صرف پچاس روپے مانگے تھے۔ میں اتنے زیادہ پیسے لے نہیں رہا تھا۔ انہوں نے زبردستی دیے تھے۔ مجھے اس وقت ہی شبہ ہو رہا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میرا دل نہیں مان رہا تھا پیسے لینے کو لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ گڑبڑ کیا تھی؟"

"خیر۔ یہ بہت زیادہ ہوشیار لوگوں کے سمجھنے کی باتیں ہیں" میں نے کہا۔ "تمہارے سمجھنے کی نہیں ہیں۔ ویسے اگر تم ایک کمرا آگے بڑھ کر دیکھ لیتے تو گڑبڑ شاید تمہیں قالین پر چت پڑی نظر آجاتی لیکن اس نے تمہیں دروازے سے آگے بڑھنے نہیں دیا ہوگا اور باقی کمروں کے دروازے بند ہوں گے؟"

"جی ہاں" اس نے اثبات میں سرہلا کر تصدیق کی۔

"جو ناب تم نے دروازے سے اتاری' کیا وہ مکرم بیگ نے تمہیں دے دی تھی اور ہدایت کی تھی کہ اسے کہیں پھینک دینا' ضائع کردینا؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ وہ انہوں نے مجھ سے واپس لے لی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ خود اسے کہیں پھینک دیں گے" طاہر ماموں نے جواب دیا۔

"تمہارے خیال میں اس نے وہ کہاں پھینکی ہوگی؟" میں نے گویا اس سے رائے طلب کی۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جی۔ میں تو وہاں سے واپس آگیا تھا" اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

"میرا ایک اندازہ ہے جو غلط بھی ہوسکتا ہے لیکن چلو قسمت آزمائی کرکے دیکھ لیتے ہیں" میں نے کہا۔ "اس عمارت میں جو گاربیج شیوٹس بنائے گئے تھے ان کا کوڑا جمع ہونے کے لیے بھٹی نہ خانے میں بنائی گئی ہوگی؟"

"جی ہاں۔ لیکن وہ تو بلڈنگ بننے کے کچھ عرصہ بعد سے ہی ناکارہ پڑی ہے" طاہر عرف ماموں نے جلدی سے بتایا۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسی لیے تو میں اس پر قسمت آزمائی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا اس پر کوئی تالا لگا ہوا ہے؟"

"جی ہاں۔ اس کی چابی میرے پاس ہے" اس نے چابی کے بارے میں میرے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بتا دیا۔ "بلڈنگ والوں کی ایسوسی ایشن جلد ہی اس جگہ کو صاف کرواکے اسے کسی اور مقصد کے لیے استعمال کرنے کے بارے میں سوچ رہی ہے۔"

"یہ بھی اچھا ہوا کہ ابھی اس پروگرام پر عمل درآمد نہیں ہوا ہے۔ آؤ چل کر اسے ذرا ایک نظر دیکھ ہی لیں" میں نے کہا۔

میں نے محسوس کیا کہ جگت ماموں اب کچھ پُرسکون ہوچکا تھا تاہم چابی تلاش کرنے سے پہلے اس نے شک زدہ سے لہجے میں یہ ضرور پوچھا۔ "سر! میں کسی مصیبت میں تو نہیں پھنسوں گا؟ سر! میں بالکل سیدھا سادہ اور غریب سا آدمی ہوں۔ میں نے زندگی میں کبھی کوئی غلط کام نہیں کیا اور نہ ہی کبھی لالچ میں مبتلا ہوا ہوں۔"

"آئندہ بھی کوئی غلط کام نہ کرنا اور نہ لالچ میں مبتلا ہونا۔ بہت سکھ میں رہو گے۔ اپنی غربت سے پریشان مت ہونا۔ زندگی غربت کے ساتھ گزر جاتی ہے۔ جرم کے ساتھ نہیں گزرتی" میں نے نرمی سے کہا۔

"اپنے خیال میں تو میں نے کوئی جرم نہیں کیا سر!" وہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا۔

"تمہارے اس خیال سے میں بھی متفق ہوں" میں نے کہا۔ "تم مجھ سے تعاون کر رہے ہو اور مجھے امید ہے کہ تم نے مجھ سے کوئی جھوٹ نہیں بولا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ تم کسی پریشانی میں نہ پھنسنے پاؤ۔"

"لیکن سر، مجھے مکرم بیگ صاحب سے نہ جانے کیوں بہت خوف آتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی بات ہو جس سے وہ مجھ سے ناراض ہو جائیں" اس کے لہجے میں واقعی خوف تھا۔

"مطمئن رہو۔ بات ان تک نہیں پہنچے گی۔ اس لیے تو میں پہلے تمہارے پاس آگیا ہوں۔ میں نے تمہیں مکرم بیگ کے سامنے نہیں بلوایا۔ آئندہ شاید کبھی مکرم بیگ سے سامنا نہ ہو" میں نے تسلی دی۔

اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے اپنی چارپائی کے نیچے سے لوہے کا ایک ٹرنک نکال کر اس میں سے چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور ہمیں ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے نکلا۔

تہ خانے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ بولا۔ "میں نے سنا ہے مکرم بیگ صاحب کے اپارٹمنٹ میں کسی جج صاحب کا قتل ہو گیا ہے؟"

"تم نے ٹھیک سنا ہے" میں نے اختصار سے جواب دیا۔

"پھر تو معاملہ بہت سنگین ہوگا؟" وہ آنکھیں کچھ پھیلاتے ہوئے بولا۔

"ہر انسان کے قتل کا معاملہ بہت سنگین ہوتا ہے لیکن ہم نے اپنی آنکھوں پر طرح طرح کی عینکیں چڑھالی ہیں۔ کوئی قتل ہمیں سنگین نظر آتا ہے۔ کوئی ذرا بھی اہم نہیں لگتا اور کسی پر ہم خوش ہوتے ہیں" میں نے ملائمت سے جواب دیا۔

میرا فلسفہ شاید اس لیے گاڑھا تھا۔ معلوم نہیں اس کے حلق سے اترا یا نہیں بہرحال وہ خاموش رہا۔ اس نے تہ خانے کا تالا کھولا اور ہم اندر پہنچے۔ نیلم ہمارے ساتھ تھی۔ اس کے چہرے پر الجھن ضرور تھی لیکن بیزاری نہیں تھی۔

تہ خانہ اس طرح بنایا گیا تھا کہ پارکنگ کے لیے بھی استعمال ہو سکے لیکن یہاں غالباً صرف وہ دو چار گاڑیاں پارک کی گئی تھیں جنہیں زیادہ دنوں کے لیے کھڑی کرنا مقصود تھا۔ ان میں سے کسی پر کپڑا چڑھا ہوا تھا اور کسی پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ آخر ہم ایک طرف بنے ہوئے ایک بڑے سے کمرا نما حصے تک پہنچے جو چاروں طرف سے مکمل طور پر بند تھا البتہ اس میں سے کچھ موٹے موٹے پائپ نکل کر اِدھر اُدھر جا رہے تھے۔ اس میں لوہے کا چوکور دروازہ لگا ہوا تھا جو کسی بہت بڑی تجوری کے دروازے سے مشابہ نظر آ رہا تھا۔

"کیا میں اسے واقعی کھول دوں سر؟" طاہر عرف ماموں نے اجازت چاہی۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ کوئی ایسے بے ہودہ کام کی فرمائش کر سکتا ہوں۔

"ظاہر ہے۔ ہم اسی لیے یہاں آئے ہیں" میں نے جواب دیا۔

"سر! اس میں بڑا گند اور کاٹھ کباڑ ہے۔ اسے کھولتے ہی بدبو کا بھبکا آئے گا" طاہر نے گویا مجھے ڈرایا۔

"کوئی بات نہیں" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "صاف ستھری زندگی گزارتے ہوئے ہمیں کبھی کبھار گندگی اور کاٹھ کباڑ میں بھی جھانکتے رہنا چاہیے۔"

پھر میں نے نیلم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ بلڈنگ ہمارے معاشرے کی طرح ہے۔ باہر سے خوب صورت اور دمکتے آراستہ و پیراستہ اپارٹمنٹ، تہ خانے میں بدبودار کاٹھ کباڑ کا ڈھیر جسے ائرٹائٹ دروازہ بند کر کے چھپایا گیا ہے۔ بلکہ ہمارا معاشرہ تو اوپر سے بھی اتنا خوب صورت اور آراستہ و پیراستہ نہیں۔ محض لیپا پوتی سے ہی کام چلایا جا رہا ہے اور تہ میں بہت ہی سڑاند ہے۔"

نیلم مسکرا دی اور طاہر شاید اس فلسفے کو بھی اپنے لیے سمجھتے ہوئے دروازے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے ایک بڑی چابی تالے کے سوراخ میں ڈال کر گھمائی اور مضبوط آہنی ہینڈل پکڑ کر شاید پوری طاقت سے کھینچا۔ اس بے چارے کی پوری طاقت بھی بس یونہی سی تھی۔ بہرحال دروازہ کھل گیا۔ مضبوط دروازے زیادہ عرصہ بند رہیں تو خاصی دشواری سے اور اپنی مخصوص چرچراہٹ کے ساتھ کھلتے ہیں۔

طاہر نے ٹھیک کہا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی بدبو کا ایک زوردار بھبکا ہمارے نتھنوں میں آن گھسا۔ نیلم تو کافی پیچھے ہٹ کر دیوار سے جا لگی۔ طاہر نے پلٹ کر گویا میرے تاثرات کا جائزہ لیا۔ میں نے اس کی تسلی کے لیے مسکرا دیا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں ایسی کی بدبوؤں سے گھبرانے والا نہیں تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ وہ بھٹی یا کباڑ خانہ کسی خبیث کے دل کی طرح تاریک تھا۔ تہ خانے کی روشنی اس میں دو فٹ سے آگے تک نہیں جا رہی تھی۔ میں نے طاہر سے پوچھا۔ "تمہارے پاس ٹارچ ہوگی؟"

وہ وہیں موجود ایک آہنی الماری سے بڑی سی ٹارچ نکال لایا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے ٹارچ لے لی اور اسے روشن کر کے اندر میں داخل ہونے لگا۔

طاہر گویا بوکھلا کر غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔ "یہ آپ کیا کر رہے ہیں سر؟ آپ اندر جائیں گے۔

میرا مطلب ہے آپ خود؟" اس کی چندھی چندھی آنکھیں بھی جتنی پھیل سکتی تھیں، پھیل ہی گئیں۔

"ہاں۔ اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے سر!"

"کوئی بات نہیں۔ یہ تو کچھ دیر پہلے بھی خاصے خراب ہو چکے ہیں۔ میں اس سوٹ کو ڈرائی کلین کروا تا یا اسے پھینک کر دوسرا خریدنا افورڈ کر سکتا ہوں۔ کپڑوں کے خیال سے میں اپنے ضروری کام تو ملتوی نہیں کر سکتا" میں نے کہا۔

"پھر بھی سر! اندر بہت بدبو، کاٹھ کباڑ اور کالک ہے سر! آپ کس طرح برداشت کریں گے؟" وہ بے چارہ مجھ سے ہمدردی کر رہا تھا۔

"تم خود ہی دیکھنا میں کس طرح برداشت کروں گا" میں نے جواب دیا۔

"آپ مجھے حکم کریں سر! آپ کیا تلاش کرنا چاہتے ہیں؟ مجھے سمجھا دیں، میں اندر چلا جاتا ہوں" اس نے پیشکش کی۔

"تم شاید وہ چیز تلاش نہ کر سکو جس کی مجھے تلاش ہے۔ یہ کام مجھے ہی کر لینے دو۔ مجھے اطمینان ہو جائے گا" میں نے کہا اور اسے مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر اندر گھس گیا۔

وہ ایک چھوٹا سا جہانِ حیرت تھا مگر گندا اور بدبودار تھا۔ ابتدا میں وہاں کوڑا کباڑ جلایا بھی گیا ہوگا مگر اس کی بھی صفائی نہیں کی گئی تھی۔ تہ میں راکھ، ادھ جلی چیزیں اور دیواروں وغیرہ پر کالک تھی۔ بغیر جلے کوڑے کرکٹ کی تہیں بھی کافی اونچی تھیں۔

مجھے اپنی متوقع چیزیں واقعی وہاں مل گئیں اور اس میں نہ تو زیادہ دیر لگی اور نہ ہی زیادہ وقت پیش آئی لیکن میرا حلیہ بہت ہی بری طرح خراب ہو گیا۔ میں اپنی شکل تو خود نہیں دیکھ سکتا تھا مگر مجھے اندازہ تھا کہ وہ بھی داغ دار ہو چکی تھی۔ مجھے اس کی ذرہ برابر پروا نہیں تھی۔ اپنا اندازہ درست ثابت ہونے اور اپنی توقع پوری ہونے کی مجھے اتنی خوشی تھی کہ پاؤں زمین پر نہیں پڑ رہے تھے یا یوں کہیے کہ پاؤں کچرے پر نہیں پڑ رہے تھے۔

میں جب بھٹی سے برآمد ہوا تو میرے ہاتھوں میں دروازے کی ایک ناب، نہایت شاندار اور نفیس قسم کے دستانوں کی ایک جوڑی، ایک پستول اور ایک اعلا قسم کا رومال تھا۔ گو کہ ساتویں منزل سے لڑھک کر اس کچرا خانے میں پہنچتے پہنچتے ان چیزوں کی حالت کچھ خراب ہو چکی تھی۔ پھر بھی ان کے معیار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

نیلم نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پہلے ان چیزوں کو اور پھر مجھے دیکھا۔ طاہر بھی پہلے سے زیادہ حیران پریشان تھا۔ نیلم منہ پر ہاتھ رکھ کر بے آواز طریقے سے ہنسنے لگی۔ وہ شاید اب اپنی پریشانی وغیرہ بھول چکی تھی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے برا منانے کی اداکاری کی۔

"کاش تم اس وقت آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ سکتے" وہ ہنسی روکتے ہوئے بولی۔ "ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کوئلے کی کان میں کئی دن رہ کر آئے ہو۔"

"ہاں" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ معاملہ کسی حد تک کوئلے کی دلالی جیسا ہی تھا اور اب مجھے پتا چلا ہے کہ کوئلے کی دلالی میں صرف ہاتھ ہی نہیں بلکہ کبھی کبھی منہ بھی کالا ہو جاتا ہے۔"

پھر میں نے ناب طاہر کو دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "یہی ناب تبدیل کی تھی نا تم نے؟"

اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک بار پھر ناب کو دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن آپ کو کیسے پتا چلا کہ یہ یہاں پائی جائے گی؟"

"بس...... آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں" میں نے ٹارچ اسے واپس دیتے ہوئے کہا۔ "تمہارے پاس کوئی شاپنگ بیگ ہوگا؟"

اس نے الماری سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر مجھے ایک مڑا تڑا اور میلا شاپنگ بیگ بھی لا دیا۔ میں نے ناب، دستانے، پستول اور رومال اس میں ڈالتے ہوئے کہا۔ "طاہر! تم بہت ہی کام کے آدمی ہو۔ اب تو میرا بھی دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں ماموں کہنے لگوں۔"

میں نے اپنے ہاتھوں کو اپنے کوٹ پر ہی کسی حد تک صاف کر کے جیب میں سے پرس نکالا اور ہزار کا ایک نوٹ نکال کر طاہر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تم نے بغیر کسی حیل حجت کے مجھ سے تعاون کیا۔ یہ تمہارا انعام ہے لیکن یہ مکرم بیگ کے انعام کی طرح ایک غلط کام میں تعاون کرنے کا صلہ نہیں ہے بلکہ یہ قانون سے تعاون کرنے کا انعام ہے۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے سر! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا" وہ اپنے ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے بولا۔

میں نے نیلم کی طرف دیکھ کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "سادہ دل لوگوں کی یہی بات مجھے سب سے زیادہ اچھی لگتی ہے۔ وہ کسی کی کوئی اہم خدمت انجام دے کر بھی یہی کہتے ہیں کہ انہوں نے کچھ نہیں کیا جب کہ گھٹیا اور کم ظرف لوگ کچھ نہ کر کے بھی ڈھنڈورا پیٹتے مر جاتے ہیں کہ انہوں نے فلاں کے لیے نہ جانے کون کون سے پہاڑ توڑ دیے۔"

پھر میں نے نوٹ طاہر کی جیب میں ڈال دیا اور کہا۔ "اس ساری کارروائی کا کسی سے ذکر نہ کرنا اور بالکل لاعلم بنے رہنا۔ یہ میں اپنے بھلے کے لیے نہیں، تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ اب تم جا کر آرام سے سو جاؤ اور دنیا سے بالکل بے تعلق ہو جاؤ۔ کم از کم صبح تک کے لیے۔"

"بہت بہتر سر!" وہ سعادت مندی سے بولا۔

میں نے شاپنگ بیگ ہاتھ میں لٹکایا اور نیلم کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے تہ خانے کے دروازے کی طرف چل دیا۔ نیلم میرے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے ناک سکیڑ کر بولی۔ "تم میں سے بُو آرہی ہے۔"

"وقت وقت کی بات ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کبھی کبھی خوشبو دار دوست بھی بدبودار ہو جاتے ہیں۔ جب ہم ہوٹل سے چلے تھے تو غسل کرکے' تر و تازہ ہو کر' کلون وغیرہ لگا کر کیسی شان سے نکلے تھے۔ یہاں پہنچنے تک تمہارا خوب صورت اور صاف ستھرا لباس کئی جگہ سے میلا ہو گیا اور میں تو باقاعدہ میونسپل کارپوریشن کا کنڈی مین نظر آنے لگا۔ شاید فلکِ کج رفتار کو ہماری صفائی ستھرائی پسند نہیں آئی۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ صبر کرو' برداشت کرو۔"

میں نے دیکھا' اب چوکیدار گیٹ پر نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے جن لوگوں کا انتظار تھا وہ پہنچ چکے تھے۔ گو کہ وہ کہیں نظر نہیں آ رہے تھے لیکن مجھے اطمینان ہو گیا۔ ہم لفٹ تک جا پہنچے۔

نیلم بولی "اس حلیے میں مرزا مکرم بیگ کے سامنے جاؤ گے؟"

"جب میں اس حلیے میں تم جیسی خوب صورت خاتون کے ساتھ چل سکتا ہوں تو مکرم بیگ کے سامنے جانے میں مجھے کون سی قباحت محسوس ہو سکتی ہے؟ وہ تو ایک لومڑی صفت مرد ہے اور وہ بھی بارلیش" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

ہم لفٹ کے ذریعے ٹاپ فلور پر پہنچے تو وہاں غضب کا سناٹا تھا۔ نیلم میرا بازو تھامتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ "مجھے تو خوف محسوس ہو رہا ہے۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا تھا' تمہیں راستے ہی میں ہوٹل میں چھوڑ دیتا ہوں مگر تم نہیں مانیں۔ اب بھگتو" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے نیچی آواز میں جواب دیا۔

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "بہرحال' اسی طرح کچھ عرصہ میرے ساتھ دوستی رہے گی تو خوف تمہارے دل سے نکل جائے گا۔"

"اور اگر خوف دل سے نہ نکل سکا تو کم از کم روح تو جسم سے نکل ہی جائے گی" وہ گویا جل کر بولی۔

میں نے بے آواز طریقے سے ہنستے ہوئے مکرم بیگ کے اپارٹمنٹ کی طرف قدم بڑھایا تو وہ بولی۔ "مکرم بیگ یہاں موجود ہوگا یا نہیں؟ لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے جیسے اس اپارٹمنٹ میں کوئی موجود نہیں۔"

"یہاں تو ہمیشہ ہی ایسا لگتا ہے" میں نے جواب دیا۔ "لیکن مجھے سگنل مل چکا ہے کہ وہ موجود ہے۔"

"میں نے تو دیکھا نہیں' تمہیں کب سگنل مل گیا؟" اس نے مجھے گھورا۔

"ضروری نہیں کہ تم ہر چیز دیکھ سکو" میں نے جواب دیا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر سرگوشی میں ہی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں تو تمہیں محض ایک بڑا بزنس مین سمجھی تھی مگر تم کافی پُراسرار قسم کی چیز ہو۔"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر مدھم اور مترنم سی آواز ابھری پھر پہلے جیسا ہی سناٹا چھا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اندر موجود افراد کو دروازہ کھولنے میں کچھ تامل تھا اور شاید کوئی صلاح مشورہ جاری تھا۔ میں نے دوبارہ بیل دی۔ میجک آئی سے یقیناً ہمیں دیکھا جا رہا تھا۔ اسی لیے دروازہ کھلنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔

میں تیسری بار بیل دینے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا خود مکرم بیگ ہی تھا۔ باہر سے اپارٹمنٹ واقعی اس طرح تاریک اور پُرسکوت معلوم ہوتا تھا جیسے اندر کوئی موجود نہ ہو اور اگر ہو بھی تو وہ بتیاں وغیرہ بجھا کر گہری نیند سویا ہوا ہو لیکن دروازہ کھلتے ہی تیز روشنی میں نہائی ہوئی چھوٹی سی ایک دنیا سامنے آجاتی تھی۔

بازارِ حسن کی طرح اس دنیا میں بھی شاید راتیں جاگتی تھیں اور دن سوتے تھے۔ مکرم بیگ اسی طرح خوش لباس اور تازہ دم نظر آ رہا تھا جیسے ابھی ابھی اس کے آفس کے اوقات شروع ہوئے ہوں اور اس نے آ کر اپنی کرسی سنبھالی ہو۔ اس کے بال سلیقے سے سنورے ہوئے تھے۔ نفیس سوٹ مہک رہا تھا۔ اور جوتے چمک رہے تھے۔ بیرونی کمرے میں صرف اس کے دو گن مین نظر آ رہے تھے۔ وہ دونوں بھی تازہ دم اور چاق و چوبند معلوم ہوتے تھے مگر ان کے چہرے پتھرائے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ کندھوں پر لٹکی ہوئی گنوں پر تھے۔

"ارے افضل صاحب! یہ آپ نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟" مکرم بیگ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "اور اس وقت اس حلیے میں آپ کو یہاں آنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

میں نے یہ انتظار نہیں کیا کہ وہ مجھے اندر آنے کی دعوت دے بلکہ میں خود ہی اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے اندر جا پہنچا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے دیکھ کر درحقیقت اتنا حیرت زدہ نہیں تھا جتنا پریشان ہو گیا تھا لیکن اس جیسے مضبوط اعصاب کے آدمی کے چہرے سے اس کی پریشانی کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔

میں نے اپنا کالک میں لتھڑا ہوا کوٹ ایک انگلی سے جھاڑتے ہوئے اور غیر محسوس طور پر اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "قدرت کے کام بھی عجیب ہوتے ہیں مکرم بیگ! حالات کی مناسبت سے تو اس وقت مجھے عالمِ بالا پر ہونا چاہیے تھا لیکن میں یہاں پایا جا رہا ہوں۔ کسی ان دیکھی قوت نے مجھے یہاں بھیج دیا۔"

"بہت خوب' بہت خوب" وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔ اس

کے ایک گن مین نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اُس نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔

میں اس کمرے میں جا پہنچا جسے وہ اپنے آفس کے طور پر استعمال کر رہا تھا۔ اس نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو میں نے کہا۔ "میں نہ ہی بیٹھوں تو بہتر ہے۔ تمہارا قیمتی صوفہ خراب ہو جائے گا۔"

"صوفہ آپ سے زیادہ قیمتی نہیں ہے افضل صاحب! ایسے ہزاروں صوفے آپ پر قربان کیے جا سکتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کی مسکراہٹ میں اب تصنع نمایاں ہونے لگا تھا۔

"تم نے یہ کہہ کر میرا دل بڑھا دیا مکرم بیگ! میری نظر میں میری ویلیو بڑھا دی ورنہ میں تو خود کو ہی قربانی کا بکرا محسوس کر رہا تھا۔" میں نے دھم سے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا اور نیلم کو بھی اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

مکرم بیگ میز کے سہارے ٹکتے ہوئے نیلم کی طرف بغور دیکھ کر بولا۔ "یہ خاتون غالباً نیلم ہیں؟"

وہ ذرا تجاہلِ عارفانہ کا مظاہرہ کر رہا تھا ورنہ مجھے یقین تھا کہ وہ نیلم کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ نیلم نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا۔ تیکھے لہجے میں بولی۔ "ملاقاتیں تو آپ سے کئی ہو چکی ہیں لیکن یہ بھی غنیمت ہے کہ آپ کو شک بھرے انداز میں ہی میرا نام یاد ہے۔ آپ جیسے بڑے لوگ کسی کو اس حد تک بھی یاد رکھ لیں تو بڑی بات ہے۔"

"بھئی یہ رسمی گفتگو نہیں ہونی چاہیے" وہ مصنوعی ہنسی کے ساتھ انگریزی میں بولا۔ "مجھے یاد آگیا ہے' میری ہدایت سے چند ایک ملاقاتوں کے دوران میں آپ اس کے ساتھ موجود تھیں۔ معذرت خواہ ہوں کہ مجھے ذرا صحیح طور پر یاد نہیں رہا تھا۔"

کون کہہ سکتا تھا کہ اتنا مہذب و شائستہ نظر آنے والا اور اتنی ملائمت سے گفتگو کرنے والا انسان اندر سے کیا تھا۔

وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "بہرحال' خاتون سے میں بعد میں بات کروں گا۔ پہلے آپ سے بات ہو جائے۔ آپ بڑی پُراسراری گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ عالمِ بالا پر پائے جانے کی باتیں' یہ عجیب و غریب حلیہ۔ آخر یہ کیا چکر ہے؟ کچھ بتائیے تو سہی افضل صاحب!"

"کافی روپیا کمانے کے باوجود میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ روپیا کمانا آسان نہیں ہے" میں نے اپنے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"روپیا کمانا واقعی بہت مشکل کام ہے افضل صاحب! اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ جائز تو جائز' ناجائز ذرائع سے روپیا کمانا بھی کوئی آسان کام نہیں ہے جیسا کہ لوگ عموماً سمجھتے ہیں۔" اس نے سر ہلایا۔

"ہاں۔ یہ بات تم سے بہتر کون جان سکتا ہے" میں نے فوراً کہا۔

اس نے اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اب مجھے ہی لے لو۔ میں نے تم سے بیس لاکھ روپے فیس تو لے لی لیکن اب اسے حلال کرنا ایک مسئلہ بنا ہوا ہے۔ اس سلسلے میں دیکھو' میرا کیا سے کیا حال ہو گیا ہے!" میں نے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔ "روپیا لے لینا تو آسان ہوتا ہے لیکن اس کا حق ادا کرنا کافی مشکل ہوتا ہے۔"

"میرا خیال تھا کہ آپ حق ادا کر چکے تھے افضل صاحب!" اس کی کشادہ پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ "معاملہ ختم ہو چکا تھا۔ قاتل پولیس کی تحویل میں جا چکا تھا۔"

"میں بھی یہی سمجھا تھا کہ معاملہ ختم ہو چکا ہے اور قاتل پولیس کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے لیکن قدرت کو ہماری غلطی کی اصلاح منظور تھی۔ قدرت کے کام واقعی بہت عجیب ہوتے ہیں۔ میں اکثر ان باتوں پر حیران ہوتا ہوں اور اکثر ان کا تذکرہ کرتا ہوں۔ اب یہی دیکھ لو کہ قاتل نہایت ہوشیاری سے کسی اور کو جال میں پھنسا کر محفوظ ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ عقل کا تقاضا یہی تھا کہ وہ اسی طرح آرام سے بیٹھا رہتا۔ اس میں اس کا فائدہ تھا لیکن اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ اس نے مجھے بھی راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا اور اپنا ہرکارہ مجھے قتل کرنے کے لیے بھیج دیا۔"

"اوہ!" مکرم بیگ کے ہونٹ سکڑ گئے۔ "تو آپ کا یہ حلیہ اسی چکر میں ہوا ہے؟"

"نہیں۔ اس چکر میں تو حلیہ اتنا خراب نہیں ہوا تھا۔ یہ تو بات کی تہ تک پہنچنے کے چکر میں زیادہ خراب ہوا ہے" میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر جواب دیا۔

"اوہ...... اچھا تو آپ بات کی تہ تک پہنچ گئے؟" اس نے پلک جھپکائے بغیر ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ اب وہ اپنی مصنوعی مسکراہٹ بھی ہونٹوں پر سجائے رکھنا بھول گیا تھا۔

"ہاں۔ لیکن یہ صرف اس لیے ممکن ہوا کہ میں حملے میں بچ گیا ورنہ بات کی تہ تک پہنچنے کے بجائے میں قبر کی تہ تک پہنچتا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ میں نہ صرف حملے میں بچ گیا بلکہ میں نے حملہ آور کو ایک ہیولے کی سی صورت میں دیکھ بھی لیا" میں نے بڑے مسرور انداز میں اسے بتایا۔

"یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے" اس کا لہجہ اس کے الفاظ کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ "لیکن کیا صرف ہیولا دیکھ کر آپ کسی نتیجے پر پہنچ گئے؟"

"اس شخص کی جسمانی ساخت اتنی غیر معمولی اور منفرد ہے کہ میں تو کیا کوئی بھی شخص جس نے اسے ایک مرتبہ بھی دیکھا ہوتا' دوبارہ محض اس کا ہیولا دیکھ کر بھی اسے پہچان ہی لیتا" پھر میں نے ایک نظر نیلم کی طرف دیکھا۔ "اگر وہ ہرکارہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا تو یہ بے چاری خاتون خواہ مخواہ ہی میرے ساتھ ماری جاتی جس کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ہم دونوں کی

لاشیں اکٹھی سڑک پر ملتیں تو نہ جانے کیا کیا افسانے بنتے۔ افواہوں کی اتنی دھول اڑتی کہ اصل بات اس میں کہیں چھپ کر رہ جاتی۔"

مکرم بیگ کے دونوں گن مین اس دوران میں کمرے کے دروازے پر آن کھڑے ہوئے تھے اور بڑی بدتمیزی سے اندر جھانک رہے تھے۔ گن مین عموماً مالک کے حکم کے بغیر اس قسم کی حرکت نہیں کرتے اور ان کے یہ انداز و اطوار نہیں ہوتے لیکن ظاہر تھا کہ مکرم بیگ کے گن مین کوئی عام گن مین یا روایتی باڈی گارڈ نہیں تھے۔ وہ یقیناً پیشہ ور قاتل اور ماہر گن مین فائٹر یا کمانڈو قسم کی چیز تھے۔

دروازہ انہوں نے روک رکھا تھا اور ہمارے سامنے مکرم بیگ بیٹھا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کے بھی دونوں بازوؤں تلے گنیں موجود ہوتی تھیں۔ دوسرے کمروں کے دروازے بند تھے لیکن میرا خیال یہی تھا کہ ان میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس وقت اس کمرے میں ہماری حیثیت چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہوں کی سی تھی۔ وہ نام نہاد گن مین یقیناً اسی احساس سے کافی مطمئن تھے۔ انہیں یقیناً صورتِ حال کا سارا پس منظر معلوم تھا اور وہ یہی محسوس کر رہے تھے کہ شکار خود جال میں آن پھنسا تھا لیکن مکرم بیگ اتنا بے وقوف نہیں تھا۔

اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر تشویش میں مبتلا تھا لیکن شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کے پُراعتماد انداز میں کوئی فرق آئے۔ اسے یقیناً اندازہ تھا کہ اگر میں صورتِ حال کو سمجھ چکا تھا تو پھر میں اتنا احمق نہیں ہو سکتا تھا کہ منہ اٹھا کر اس کی کچھار میں چلا آتا اور ایک خاتون کو بھی ساتھ لے آتا جو تنہا آنے سے بھی زیادہ بری بات تھی۔ لڑائی جھگڑوں اور فائرنگ کے دوران میں کسی ایسی خاتون کی موجودگی الجھنیں ہی پیدا کرتی ہے جو اس لڑائی میں حصہ لینے کی اہل نہ ہو۔

مکرم بیگ یقیناً اس الجھن میں تھا کہ باہر سے کون آکر مداخلت کر سکتا تھا؟ پولیس، کسی خفیہ ادارے کے لوگ یا پھر میرے آدمی؟ یا پھر تینوں ہی بیک وقت اپارٹمنٹ کو گھیرے میں لے چکے تھے؟ وہ مجھ سے باتیں بھی کر رہا تھا اور ساتھ ہی یقیناً اس متوقع صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے کوئی حکمتِ عملی بھی سوچ رہا تھا۔

میں نے اب گھما پھرا کر بات کرنے کے بجائے سیدھی طرح پوچھا۔ "مکرم بیگ! کیا آج کل تمہارے پاس آدمیوں کی کمی ہے؟"

"آپ کو یہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" اس کا لہجہ اب بھی مؤدبانہ اور شائستہ ہی تھا۔

"تم شرافت علی کو پہلے مجھے بلانے کے لیے بھیج چکے تھے۔ تمہیں معلوم تھا کہ میں اسے اچھی طرح پہچاننے لگا ہوں۔ اس کے باوجود آج تم نے اسی کو میرا کام تمام کرنے کے لیے بھیج دیا......

لیکن شاید اس میں تمہارا قصور نہیں۔ ایک تو وہ ان کا بہت ماہر ہوگا۔ دوسرے تمہیں توقع نہیں ہوگی کہ میں یہ بتا لیے زندہ رہوں گا کہ مجھ پر حملہ کس نے کیا تھا۔ یہی بات تم

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور نہ ہی اس کے تاثرات میں تبدیلی آئی۔ میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "تم پاس یقیناً آج کل آدمیوں کی کمی ہے ورنہ اس قسم کے کام کے لیے تو تمہارے پاس ٹولیاں کی ٹولیاں موجود رہتی ہوں گی کل یقیناً تم پر سخت وقت آیا ہوا ہے اور تم بہت محتاط نہ کروا رہے ہو۔ تم نے اپنے بیشتر آدمیوں کو اِدھر اُدھر کیا ہوا نہیں چاہتے کہ تمہارا کوئی آدمی کہیں کسی چکر میں خواہ مخواہ کے ہتھے چڑھے اور تمہاری الجھنوں میں اضافہ ہو۔ اس صرف چند منتخب آدمیوں سے کام چلا رہے ہو اور آج کل وہی تمہارے ساتھ نظر آ رہے ہیں۔"

"میں کبھی بھی اپنے ساتھ بھیڑ بھاڑ رکھنے والا آدمی نہ افضل صاحب!" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔ "میں صرف ضر کے وقت ہی آدمیوں کا انتظام کرتا ہوں لیکن آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ آپ کس حملے کی بات کر رہے ہیں! آپ پر حملہ کرانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں نے تو تمہیں جج صا کے قتل کے الزام سے بچانے اور ایک بے گناہ کو اس چکر میں بھجوانے میں تمہاری مدد کی تھی۔ اس کے باوجود تم نے صاف کرانے کی کوشش کی۔"

وہ اس بزرگ کی طرح مشفقانہ انداز میں مسکرانے لگا جو بچے کی بے سروپا باتوں سے محظوظ ہو رہا ہو۔ میں نے بات جاری رکھی۔ "کیا تم سے اس بیس لاکھ روپے کی رقم کا صدمہ برداشت نہیں ہوا تھا جو تم نے فیس کے طور پر مجھے ادا کی تھی؟ یا پھر تم اندیشہ تھا کہ میں جلد یا بدیر بات کی تہ تک پہنچ جاؤں گا اور تمہارے لیے مشکلات پیدا کروں گا؟"

"آپ کی باتیں واقعی بہت عجیب ہیں افضل صاحب!" ایک ٹھنڈی سانس لے کر میز چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "آپ نشے کی علامات بھی موجود نہیں ہیں ورنہ میں یہی سمجھتا کہ آپ کے عالم میں بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں۔"

"وہ بڑا خطرناک وقت ہوتا ہے جب کسی کی ہوش مندا باتیں کسی کو بہکی بہکی باتیں محسوس ہونے لگیں۔" میں نے متانت انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "بہرحال مختصراً بات صرف اتنی کہ تم نے مجھے اسی کام کے لیے فیس ادا کی تھی کہ میں جج صاحب کے اصل قاتل کا پتا چلاؤں اور میں نے تھوڑی سی غلطی کرنے کے بعد آخر کار صحیح نتیجہ اخذ کر ہی لیا ہے اور قاتل کو تلاش کر لیا ہے یعنی میں نے فیس حلال کر لی ہے لیکن تمہارے لیے ظاہر ہے یہ نیا انکشاف نہیں ہوگا۔"

"کیوں؟" وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"اس لیے کہ قاتل تم خود ہی ہو" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب" اس کی مسکراہٹ میں تناؤ آگیا۔ "اور میں اتنا بے وقوف قاتل تھا کہ قتل کرنے کے بعد کسی ایسے آدمی کو ڈھونڈتا رہا تھا جو بیس لاکھ روپے لے کر مجھے قاتل ثابت کر سکے۔ وہی لاکھ میں پولیس کو دے کر تفتیش کا رخ موڑ سکتا تھا اور اپنے بچاؤ کا پکا بندوست کر سکتا تھا۔"

"نہیں کر سکتے تھے" میں نے زور دے کر کہا۔ "ایک تو تمہیں معلوم تھا کہ تمہارے علاقے کا پولیس آفیسر رشوت خور نہیں تھا۔ سخت اصول پرست تھا۔ اِدھر تم رشوت دینے کی کوشش کرتے اور اُدھر تم مشکوک ہو جاتے۔ سب سے پہلے تم ہی گرفت میں آتے۔ ویسے بھی یہ جس جج کے قتل کا معاملہ تھا اسے آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کوئی کرپٹ پولیس آفیسر بھی شاید تمہاری زیادہ مدد نہ کر پاتا۔ اسی لیے تم نے اپنے علاقے کے پولیس آفیسر کے چکروں میں پڑنے کے بجائے اس کے قریبی دوست کو گھیرا جس کا وہ دل ہی دل میں درحقیقت بڑا احترام کرتا ہے۔"

"آپ کا الزام بے سروپا ہے افضل صاحب! میں اس الزام تراشی کے خلاف کسی بھی قسم کی ضروری کارروائی کا حق محفوظ رکھتا ہوں" اس کے لہجے میں ہلکی سی غراہٹ آگئی۔ اس کے اندر اصل مکرم بیگ بیدار ہو رہا تھا جسے اس نے اب تک بڑی عمدگی سے سُلایا ہوا تھا۔

"یقیناً...... یقیناً" میں نے سرہلایا۔ "ہر مجرم اپنے دفاع کے حق کے بارے میں بے گناہوں سے بھی زیادہ شور مچاتا ہے اور ہاں، تم بے وقوف ہرگز نہیں تھے مکرم بیگ! تم تو بہت ہی زیادہ چالاک تھے۔ اتنی چالاکی سے ایسے کسی قتل کا منصوبہ بنانے کے بارے میں ہمارے ملک میں تو شاید ہی کوئی سوچ سکتا ہو۔ تم یقیناً جینیئس ہو...... جینیئس۔"

"اگر آپ کا خیال ہے کہ میں اس قسم کی تعریف پر خوش ہو جاؤں گا تو میں آپ کو بتا دوں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے" وہ خشک لہجے میں بولا۔

"میں اس وقت کوئی بھی بات تمہیں خوش کرنے کے لیے نہیں کر رہا ہوں" میں نے اس کی خوش فہمی دور کی۔ "میں خود بھی اس وقت خوش نہیں ہوں۔ مجھے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ کیسے کیسے ذہین لوگ اپنی ذہانت کا استعمال کیسے کیسے منفی کاموں میں کرتے ہیں۔ تم نے دُہرا نفسیاتی داؤ کھیلا۔ تم نے خود اپنے آپ کو مشکوک بنایا جس سے واقعی دوسرا یہ سوچنے پر مجبور ہو کہ تم اتنے احمق تو نہیں ہو سکتے کہ اس طرح اپنے پھنسنے کا بندوبست کرو۔ تم نے درحقیقت جسے پھانسنے کا بندوبست کیا تھا، خود ہی نہایت معصومیت سے اس کی بے گناہی کی گواہی بھی دینے کی کوشش کرتے رہے۔ میں واقعی تمہاری ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گو کہ اس قسم کی ذہانت کو میرے خیال میں ذہانت نہیں، خباثت کہنا چاہیے۔"

اس کے ظاہری سکون میں کوئی فرق نہ آیا۔ تاہم میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی کشادہ پیشانی پر پسینے کی نہایت ننھی ننھی سی بوندیں نمودار ہو چکی تھیں جو کمرے کی تیز روشنی میں ننھے ننھے موتیوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

"میں آپ کی باتوں کو پاگل پن کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتا افضل صاحب!" اس نے شاید اپنے اعصابی تناؤ کو کم کرنے کے لیے کمرے میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اس کے دونوں باڈی گارڈز گنوں کے دستوں پر ہاتھ رکھے شاید اس کے حکم کے منتظر تھے۔ میری غیر محسوس طور پر ہر طرف نظر تھی اور میں پوری طرح مستعد تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ مکرم بیگ ٹہلتے ٹہلتے اچانک مڑتا تو اس کے ہاتھ میں گن ہوتی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید وہ آخری لمحے تک شرافت کا ڈراما جاری رکھنا چاہتا تھا۔

"کھوکھلے الفاظ اب تمہاری کیا مدد کر سکتے ہیں مکرم بیگ؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"الفاظ تو آپ کے بھی ایسے ہی ہیں جو آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے" وہ میری طرف گھومتے ہوئے بولا۔ "لیکن چوں کہ میں کسی کا بولنے کا حق سلب نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے آپ کو بھی آزادی ہے۔ جو چاہیں بولیں۔"

"اجازت کا شکریہ جہاں پناہ!" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

وہ ایک ٹک مجھے گھورتا رہا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم اس معاملے کو شروع سے لیتے ہیں۔ تمہیں عدالتی کارروائیوں یا جج صاحب کے رویے یا پھر ان کی کسی بات سے یقین ہو گیا تھا کہ وہ تمہیں بہت سخت سزا سنانے والے ہیں۔ ملک سے تمہارے فرار کے راستے بھی مسدود کر دیے گئے تھے۔ میں نے گزشتہ روز معلومات کی ہیں۔ تمہارے اصل پاسپورٹ کے ساتھ تمہارا ایک جعلی پاسپورٹ بھی عدالت کے قبضے میں ہے اور تمہارا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں بھی شامل ہے ورنہ شاید تم ان دنوں یہاں نظر ہی نہ آ رہے ہوتے۔ ان دنوں تم یقیناً اپنے آپ کو چوہے دان میں پھنسا محسوس کر رہے ہو گے۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"آپ اپنی بات کرتے رہیں افضل صاحب! مجھ سے میری رائے طلب نہ کریں۔" اس نے ملائمت سے مشورہ دیا۔

"تم نے فیصلہ کیا کہ جج صاحب کو ٹھکانے لگانا ضروری تھا۔ یہ قتل تمہارے لئے بہت اہم تھا۔ اس لئے تم نے اپنے لوگوں پر بھی بھروسا نہیں کیا۔ یہ کام تم نے اپنے ہاتھوں سے انجام دیا حالانکہ مدت سے تم نے اس قسم کے کام اپنے ہاتھوں سے انجام دینے چھوڑ دیے ہوں گے۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس کام کے لئے تمہیں قربانی کے ایک بکرے کی بھی ضرورت تھی جو بہت ہی بروقت تمہیں میسر

آگیا۔"

"وہ کون تھا؟" اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے ہدایت وارثی۔" میں نے جواب دیا "وہ تمہارے اس دہری چال والے تانے بانے میں فٹ بیٹھتا تھا۔ وہ تمہارا پچاس لاکھ کا مقروض تھا اور کوئی رسید یا کاغذات وغیرہ نہ ہونے کے باوجود اس قرض کو تسلیم کرتا تھا۔ چنانچہ یہ عین ممکن نظر آتا تھا کہ اس نے تمہیں جج صاحب کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی سازش تیار کی ہو۔ اگر تم جج صاحب کے قتل کے جرم میں صحیح طور پر گرفت میں آجاتے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ تمہیں یقینی طور پر پھانسی کی سزا ہوتی۔ یوں ہدایت اس قرض سے بچ جاتا جس کی ادائیگی کی اس میں جان ہی نہیں تھی۔ اس لئے اس امکان کو تسلیم کرنے کو فوراً دل مانتا تھا کہ اس نے تمہیں پھانسنے کی سازش تیار کی تھی۔ صرف یہی نہیں، تمہاری خوش قسمتی سے اس جال میں پہلے ہی سے ضروری کئی پھندنے بھی ٹنکے ہوئے تھے یعنی ہدایت کی مزید بد قسمتی یہ تھی کہ ماضی میں وہ بھی جج صاحب کے شکنجے میں آچکا تھا اور انہیں قتل کرنے کی دھمکی بھی دے چکا تھا۔ کسی شدید جذباتی لمحے میں اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے تھے جو اس کے گلے کا پھندا بن گئے۔ گویا بالکل تمہارا من پسند قربانی کا بکرا موجود تھا۔ میرے اندازے ٹھیک جارہے ہیں نا؟"

"میں فی الحال کوئی تبصرہ نہیں کروں گا۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"یہ سنہری موقع گو کہ اچانک تمہارے سامنے آیا تھا لیکن میں تمہاری خباثت نما ذہانت کی ایک بار پھر داد دوں گا کہ وقت کی کمی کے باوجود تم نے باریک ترین جُزئیات کا خیال رکھا۔ تمہارا منصوبہ نہایت جدّت پسندانہ تھا۔ بد قسمت ہدایت وارثی نے اس روز تمہیں فون کیا اور تم سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ گویا قربانی کا بکرا خود چھُری تلے آنے کی اجازت طلب کررہا تھا۔ تمہارے شیطانی ذہن نے فوراً منصوبے کی کڑیاں جوڑلیں۔ تم نے اسے پانچ بجے آنے کا وقت دیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر تم موجود نہ ہو تو وہ بیٹھ کر انتظار کرلے، اسے دروازہ غیر مقفل ملے گا۔"

"میرے یہ کہنے سے بھلا کس طرح میرے شیطانی منصوبے کی نشاندہی ہوتی ہے افضل صاحب؟" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

"تم چاہتے تھے کہ وہ یقینی طور پر دروازے کی ناب کو گھما کر دیکھے۔" میں نے اس کے چہرے پر نظر جما کر کہا۔

آخر کار اس کے مضبوط اعصاب ذرا ہل ہی گئے۔ اس کے چہرے پر مجھے خفیف سا تغیر نظر آیا۔ شاید اسے بہت زیادہ یقین تھا کہ اس کی چال کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اس کی یہ خوش فہمی دور ہوگئی تو اس کے چہرے سے مسکراہٹ بھی غائب ہوگئی۔ گو کہ اس کے دانت بدستور ہونٹوں کے عقب سے جھانک رہے تھے مگر اب وہ اپنی تمام تر وجاہت کے باوجود مسکراتے ہوئے انسان کے بجائے دانت نکوستا ہوا درندہ نظر آرہا تھا۔

"آپ میرے اندازوں سے زیادہ چالاک ہیں افـ[illegible] صاحب!" اس کے ہونٹوں نے کوئی خاص حرکت نہیں کی لیکن [illegible] کے دانتوں کے عقب سے سرسراتی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی۔

"مجھے چالاک کیوں کہہ رہے ہو خبیث آدمی!" میں نے [illegible] سے کہا "ذہین کہتے ہوئے کیا تمہیں موت آرہی تھی؟ یا تم ا[illegible] سوا کسی کو ذہین نہیں سمجھتے۔"

"چلو... میں اپنے علاوہ تمہیں بھی ذہین تسلیم کرلیتا ہوں[illegible] بہت دھیمی آواز میں بولا۔ آخر کار وہ "آپ" سے "تم" پر آ[illegible] تھا۔

"کیا اپنے ڈرامے کی مزید تفصیلات بھی سننا چاہتے ہو؟" [illegible] نے پوچھا۔

"میں ہر وہ بات سننا چاہتا ہوں جو تمہیں معلوم ہے یا جو [illegible] سمجھنے میں کامیاب ہوئے ہو۔ اس کے بعد شاید ہم کوئی کاروبا[ری] بات کرسکیں۔" وہ بولا۔

"اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو اس قسم کی حماقت نہ کرتا۔ [illegible] مطلب ہے کاروباری بات کرنے کی حماقت۔" میں نے کہا [illegible] جرم اور کاروبار کو بالکل الگ الگ رکھنا چاہتا ہوں۔ انہیں ا[یک] دوسرے میں گڈمڈ کرنا نہیں چاہتا۔"

"چلو خیر۔ یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال تم اصل با[ت] کرو۔" وہ بولا۔

"ہدایت وارثی کو پانچ بجے آنے کا وقت دے کر تم نے [illegible] صاحب کو ان کے ہوٹل فون کیا۔ میرا اندازہ ہے کہ تم نے ان [illegible] بہت جذباتی اور ڈرامائی گفتگو کی ہوگی۔ جج صاحب معاشرے [کی] اصلاح کے سلسلے میں بڑے شدید جذبات رکھتے تھے اور اس سلسلے میں قانون اور عدالت سے ہٹ کر بھی بہت سے غیر رسمی کام کر[تے] رہتے تھے۔ کسی مثبت کام کے لئے وہ ہر ممکن زحمت اٹھانے کو تیا[ر] رہتے تھے۔ تم ان کی اس کمزوری سے واقف تھے۔ تم نے شا[ید] انہیں چکر دیا ہو کہ تم اپنے جرائم کا اعتراف کرنا چاہتے تھے لیکن اس کے لئے تمہیں کوئی تھوڑا سا باعزت راستہ چاہئے تھا۔ [illegible] عدالت سے باہر اس معاملے پر تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے اور ا[س] کے لئے فوری ملاقات ضروری تھی۔

جج صاحب نے اس موقع کو غنیمت جانا ہوگا۔ وہ دلیر آدمی تھے۔ تم جیسے بڑے، دولت مند، بارسوخ اور خطرناک مجرموں کے بلاوے پر بھی چلے جانا ان کے لئے ایک معمولی کام تھا۔ اس کے علاوہ یہ تو انہیں گمان بھی نہیں ہوگا کہ تم انہیں باقاعدہ اپنے ٹھکانے پر بلاوا دے کر قتل کرنے کی جرأت کرسکتے ہو۔ انہوں نے غالباً یہی سوچا ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ تم ان سے کچھ نرمی کی اپیل کروگے۔ کوئی سودے بازی کرنا چاہو گے یا ہتھیار ڈالنے کے عوض کوئی رعایت حاصل کرنا چاہو گے۔

بے چارے جج صاحب کچھ زیادہ ہی غیر روایتی اور کچھ زیادہ ہی [خو]ش فہم ہونے کی وجہ سے مارے گئے۔ تم نے وہ کام کرڈالا جو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یعنی تم نے عین اپنے دفتر میں انہیں اپنے مقابل بٹھا کر گولی مار دی۔ تمہارے دونوں بغلی ہولسٹروں میں جو ریوالور موجود ہیں یہ یقیناً لائسنس یافتہ ہوں گے تم نے ان دونوں میں سے کوئی استعمال نہیں کیا۔ اس کام کے لئے تم نے ایک الگ ہی پستول نکال کر رکھا ہوگا جس کا کہیں کوئی ریکارڈ نہیں ہوگا۔ اتفاق سے وہ پستول.... دوسرے لوازمات کے ساتھ اس وقت اس گندے سے شاپنگ بیگ میں موجود ہے۔" میں نے شاپنگ بیگ ذرا اونچا کرکے اسے دکھایا۔

اس کی پیشانی پر جھلملاتی ہوئی پسینے کی بوندیں اب کچھ نمایاں ہوتی جارہی تھیں۔ تاہم وہ بولا تو اس کا لہجہ اب بھی متزلزل نہیں تھا بلکہ اس میں طنز کی جھلک تھی "شاید تم بھول گئے کہ میرے ہاتھوں کا پیرافین ٹیسٹ ہوا تھا اور وہ صاف پائے گئے تھے۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ میں نے کوئی فائر نہیں کیا تھا۔ جبکہ ہدایت وارثی کے ہاتھوں پر بارود کے ذرات پائے گئے تھے۔"

"میں اسی طرف آرہا ہوں۔ یہ کون سا مشکل کام تھا۔ تمہیں معلوم تھا اس قسم کے معاملات میں کہیں کہیں ہماری پولیس نے بھی پیرافین ٹیسٹ کا سلسلہ شروع کردیا ہے۔ بلکہ اگر رحیم گل ایسا نہ کرتا تو شاید تم خود اس طرف اشارہ دیتے کیونکہ تم نے اس کا بندوبست پہلے ہی کیا ہوا تھا۔ تم نے فائر کرتے وقت سوئڈ کے نہایت خوب صورت اور نفیس دستانے پہن رکھے تھے جنہیں تم نے بعد میں غالباً رومال سے پکڑ کر اتارا تھا یا پھر شاید پستول کو رومال میں لپیٹا تھا۔ بہرحال وہ رومال اور دستانے بھی اس شاپنگ بیگ میں موجود ہیں۔ اب یقیناً یہ بھی تمہاری سمجھ میں آگیا ہوگا کہ میرا حلیہ ایسا کیوں نظر آرہا ہے۔ اس متروک گاربیج شیوٹ کے ذریعے پھینکی ہوئی تمہاری یہ چیزیں تلاش کرنے کے لئے مجھے کالک اور کچرے سے بھری ہوئی ایک بدبودار کان میں اترنا پڑا لیکن میں نے سوچا چلو کوئی بات نہیں۔ بیس لاکھ میں دوسری ذہنی و جسمانی کھینچ تان کے ساتھ یہ زحمت بھی اٹھالیتے ہیں۔ سودا پھر بھی مہنگا نہیں۔ خصوصاً جبکہ تم جیسی بڑی مچھلی ہاتھ آرہی ہو۔"

وہ خاموش تھا۔ اس کے باڈی گارڈز اس کے حکم کے انتظار میں ساکت تھے لیکن وہ انہیں کوئی حکم نہیں دے رہا تھا۔

میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "جج صاحب کو ٹھکانے لگا کر تم یہاں سے رخصت ہوگئے لیکن تم نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ جاتے وقت تم دروازہ مقفل کرجاؤ تاکہ ہدایت وارثی آئے تو اسے کھول نہ سکے کیونکہ اندر جج صاحب کی لاش پڑی ہوئی تھی لیکن تم چاہتے تھے کہ ہدایت وارثی ناب کو اچھی طرح زور لگا کر گھمانے کی کوشش ضرور کرے کیونکہ یہ دہری چال کا ایک اہم حصہ تھا۔"

"وہ کس طرح؟" اب اس کی آواز حلق میں کچھ پھنسنے لگی تھی۔

"کیونکہ تم نے اس ناب پر بارود کے ذرات یا پھر شاید سوڈیم ہائپو کلورائٹ کے ذرات بہت اچھی طرح چھڑک رکھے تھے۔ یہ بہت عام سی چیز ہے۔ عام زبان میں اسے بلیچنگ پاؤڈر کا ایک حصہ کہہ سکتے ہیں۔ سائنسی نام ذرا مشکل لگتا ہے لیکن اسے دھوبی تک استعمال کرتے ہیں۔ دونوں ہی چیزیں حاصل کرنا تمہارے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں نے کل ہی اس مشہور اسپتال کی لیبارٹری والوں سے فون پر بات کی ہے جہاں تمہارے اور ہدایت کے ہاتھوں کا ٹیسٹ ہوا تھا۔ ان سے بات کرکے میری معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ بارود کے ذرّات کے علاوہ سوڈیم ہائپو کلورائٹ کے ذرات کا بھی پیرافین ٹیسٹ میں ویسا ہی رزلٹ آتا ہے۔ اب یہ تو ناب کے تجزیے سے معلوم ہوجائے گا کہ تم نے دونوں میں سے کون سی چیز استعمال کی تھی۔ اتفاق سے اس وقت وہ ناب بھی اس شاپنگ بیگ میں موجود ہے جو تم نے تبدیل کرادی تھی۔"

میں نے ایک بار پھر شاپنگ بیگ اونچا کرکے اسے دکھایا۔ اس بار اس کی نظر شاپنگ بیگ پر جم کر رہ گئی۔ شاید وہ کوئی ایسا طریقہ سوچ رہا تھا جس سے میں اور نیلم شاپنگ بیگ سمیت ہوا میں تحلیل ہوجائیں۔

میں نے طویل سانس لے کر کہا "یوں بے چارے ہدایت وارثی کے ہاتھوں کے ٹیسٹ نے اسے مروادیا اور تمہارے ہاتھ صاف نکلے۔ تم ہمیشہ سے ہی ہر کام میں ہاتھ ڈالنے کے باوجود اپنے ہاتھ صاف رکھنے میں بڑے ماہر ہو۔" میں نے شاپنگ بیگ صوفے کے نیچے گھسیڑ دیا۔ میں اس میں موجود سب چیزوں کے بارے میں اسے بتا چکا تھا۔

"اچھا.... تو پھر؟" اس نے کہا۔ اس کا ذہن یقیناً کہیں دور تھا۔

"پھر تم شرافت علی کے ساتھ یہاں واپس آئے۔ تم نے ظاہر عرف ماموں سے عجلت میں ناب تبدیل کرائی جسے تم نے شاید رومال سے پکڑ کر گھمایا تھا۔ پھر تم نے مجھے لانے کے لئے شرافت علی کو بھیجا۔ اب اس معاملے کو تمہاری مرضی کے مطابق لپیٹنے کا مرحلہ درپیش تھا۔ تمہیں اندازہ تھا کہ ایک معزز اور بارسوخ آدمی ہونے کے ساتھ ساتھ میں رحیم گل کا دوست بھی ہوں۔ میری مدد تمہارے لئے بہت اہم تھی۔ خصوصاً مجھے بیس لاکھ دینے کے بعد تو شاید تمہارا خیال یہ رہا ہو کہ میری زبان تمہارے خلاف کھلے گی ہی نہیں۔ لیکن اب تمہیں پتا چلا ہوگا کہ میں اور رحیم گل دوسرے امکانات پر بھی غور کررہے ہیں اور عملی طور پر بھی اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کرتے پھر رہے ہیں۔ اس کا مطلب تھا کہ ہدایت وارثی کو گرفت میں لے لینے کے باوجود ہم مطمئن نہیں تھے۔ یہ تمہارے لئے خطرے کی گھنٹی تھی۔"

"اچھا تو پھر؟" اس نے وہی الفاظ دہرائے لیکن اب اس کی نظر میرے چہرے پر تھی۔

"پھر یہ کہ تم نے ہنگامی طور پر میرا پتّا صاف کرنے کا بھی پروگرام بنالیا۔" میں نے اطمینان سے کہا "جرم ایک ایسی ہی دلدل ہے۔ ایک جرم سے دوسرے جرم کی کڑی جڑتی چلی جاتی ہے۔ کڑی سے کڑی مل کر زنجیر بن جاتی ہے اور کبھی نہ کبھی یہ زنجیر مجرم کے پیروں میں پڑجاتی ہے۔ ایک وقت آتا ہے جب اس کی دوڑ ختم ہوجاتی ہے۔ جرم کی دلدل اسے نگل جاتی ہے۔"

"لیکچر نہیں۔ کام کی بات کرو۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا "شاید ہم ایک بار پھر ایک دوسرے سے مزید کاروباری معاملات پر بات کرسکیں۔ بیس لاکھ روپیا میرے لئے کوئی آخری حد نہیں ہے۔"

"ہاں یہ تو مجھے معلوم ہے۔" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "لیکن ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے۔"

"چلو تم اپنی بات بھی مکمل کرلو۔" وہ حیرت انگیز حد تک پُرسکون لہجے میں بولا۔ دولت والے کو اپنی دولت کی طاقت پر آخر وقت تک اعتماد رہتا ہے۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ شرافت علی کا کیا بنا؟ وہ مجھے قتل کرنے گیا تھا ابھی تک واپس نہیں آیا۔ کیا تمہیں اس کے بارے میں کوئی تشویش نہیں؟"

"کیا وہ تمہارے ہاتھوں مارا گیا؟" اس نے جس صبروسکون سے یہ سوال کیا اس طرح کوئی کسی کتے بلی کے مرنے کے بارے میں بھی نہیں کرسکتا تھا۔

"افسوس کہ یہ نیک کام میرے ہاتھوں پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا۔ میرا خیال ہے میں اس دیو زاد کا صرف کندھا زخمی کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میرا خیال ہے وہ کہیں مرہم پٹی کرا رہا ہوگا۔ اسی لئے اسے واپسی میں دیر ہوگئی ہے۔ مرہم پٹی کرواکر وہ سیدھا یہیں دوڑا آئے گا۔ اس کا زخمی حالت میں یہاں آنا اس کے اور تمہارے... دونوں ہی کے حق میں برا ثابت ہوگا۔ اگر اس کے پاس موبائل فون موجود ہے تو اسے فون کرکے یہاں آنے سے منع کردو۔"

میں نے یہ مشورہ نہایت ہمدردانہ لہجے میں دیا تھا۔ اس نے میز کی طرف دیکھا۔ میز پر تین عام فون اور ایک موبائل فون موجود تھا مگر اس نے کسی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اس میں کوئی چال پوشیدہ تھی۔

اگر وہ میرے سامنے فون پر شرافت علی کو یہاں نہ آنے کا حکم دیتا تو گویا وہ تسلیم کرلیتا کہ اس نے شرافت کو مجھے قتل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ شاید اسے یہ بھی اندیشہ ہو کہ اس کا فون ٹیپ نہ ہورہا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شرافت علی کے پاس موبائل فون موجود ہی نہ ہو اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ مکرم بیگ کو شرافت علی کی اتنی بھی پروا نہ ہو جتنی شطرنج کے کھلاڑی کو پٹ جانے والے مہرے

آسیب زدہ

انوار صدیقی (زیرِ طبع)

کی ہوسکتی ہے۔

وہ ایک بار پھر کمرے میں ٹہلنے لگا لیکن اس کی نظر مجھ پر جمی [illegible] چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ بولا "پولیس کو اس میں سے کتنا [illegible] معلوم ہے؟"

"فی الحال کچھ بھی نہیں۔" میں نے معمولی سا جھوٹ بولا۔

"بہت خوب... بہت خوب۔" اس کی آنکھوں میں [illegible] طمانیت جھلک آئی... "تو ابھی کاروباری بات چیت ہونے [illegible] گنجائش باقی ہے۔"

وہ ابھی تک روپے پیسے سے میرا منہ بند کرنے کے بارے میں پُرامید تھا اور میں اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ امید ٹوٹ جانے کے بعد اس کا ردعمل کیا ہوگا؟

"کیا پولیس نے اپارٹمنٹ کو گھیرے میں لے رکھا ہے؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"مجھے کیا معلوم" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا "اپنے ایک گارڈ کو باہر بھیج کر پتا کرالو۔"

وہ استہزائیہ انداز میں ہنس دیا جیسے کہہ رہا ہو' میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔

"تم اتنے بے وقوف نہیں ہوسکتے کہ سب کچھ جان لینے کے بعد اس طرح منہ اٹھا کر تنہا یہاں چلے آتے۔" وہ بولا۔

"میں تنہا تو نہیں ہوں۔ کیا تمہیں میرے ساتھ اتنی سروقد اور دل نشیں خاتون نظر نہیں آرہی؟" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا۔

"خاتون تو تمہارے لئے اور بھی مسئلہ بن سکتی تھی۔ اس سے تو تمہارا تنہا آنا ہی بہتر تھا۔" وہ بولا۔

"میں تنہا بھی آسکتا تھا اور کسی جم غفیر کو ساتھ لے کر بھی آسکتا تھا۔ میری کھوپڑی گھوم جائے تو میں کچھ بھی کرسکتا ہوں ڈیئر مکرم بیگ! تم ابھی مجھے سمجھ ہی نہیں سکے۔" میں نے کہا۔

وہ ایک بار پھر درندے کے دانت نکوسنے کے سے انداز میں مسکرادیا اور پھنکارتی سی آواز میں بولا "مکرم بیگ انسانوں کو پہچاننے میں کبھی غلطی نہیں کرتا۔ یہی تو اس کی کامیابی کا راز ہے۔"

میں بے اختیار ہنسنے لگا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" اس نے مجھے گھورا۔

"اس سے زیادہ مزاحیہ بیان تو میں نے اس ہفتے میں کسی سیاستداں کا بھی نہیں پڑھا۔" پھر میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

مردم شناسی تو تمہاری کامیابی کا راز تھی۔ اب پلو خیر مان لیا۔ تمہارے زوال کا راز کیا ہوگا؟"

اس نے کندھے اچکائے اور اس سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا "تمہیں کب اصل بات کا اندازہ ہونا شروع ہوا؟"

"اس میں "شروع" ہونے والا کوئی سلسلہ نہیں رہا۔" میں نے جواب دیا "کچھ ہی دیر پہلے جب میں اور نیلم شرافت علی کے شریفانہ حملے سے بچے اور میں نے اندھیرے میں اس کے ہیولے کو پہچانا تو یکدم ہی میرے ذہن میں ساری کڑیاں مل گئیں۔ ظاہر ہے اگر تمہارے دل میں چور نہ ہوتا تو تمہیں مجھ پر حملہ کرانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اور جب یہ بات طے ہوگئی کہ تمہارے دل میں چور تھا تو پھر باقی باتوں کو سمجھنا اور ان کے جواز تلاش کرنا قطعاً مشکل نہیں تھا۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تم نے بے چارے ہدایت وارثی کے چابیوں کے گچھے میں اپنے اپارٹمنٹ کی چابی بھی ڈلوادی۔ یہ بھی کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وہ چابیوں کے بارے میں زیادہ محتاط آدمی نہیں ہے۔ اس کے ہوٹل میں بہت سے ملازم ہیں۔ شاید تم نے کسی ملازم کو رشوت دلوا کر یہ کام کرایا ہو۔ تم جیسے لوگ اپنے کاموں میں رشوت کی طاقت کو بہت استعمال کرتے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر کسی سوچ میں الجھا نظر آرہا تھا۔ لیکن بدستور کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ میری نظر ایک لمحے کے لئے بھی اس پر سے نہیں ہٹی تھی۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں پہنچا تو اس کی پشت ایک لمحے کے لئے میری طرف ہوگئی۔ یہ وہی جگہ تھی جہاں جج صاحب کی لاش پڑی پائی گئی تھی۔

اس لمحے اس نے غالباً آخری جُوا کھیلنے کا فیصلہ کیا۔ اس صورت حال میں وہ جگہ یقیناً بہت اچھی تھی۔ وہاں گھُس کر وہ بڑی سی میز کی آڑ بھی لے سکتا تھا جو یقیناً چھوٹی گنوں کی بہت سی گولیوں کے لئے تو عمدہ ڈھال ثابت ہوسکتی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ بُلٹ پروف ہی رہی ہو۔

جونہی اس کی پشت میری طرف ہوئی' اس نے کسی ویسٹرن فلم کے ہیرو کی سی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بغل سے ریوالور نکال کر ایڑیوں کے بل گھومتے ہوئے اندھا دھند گولی چلانا چاہی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔

میں اس کا ہاتھ بغل تک جانے سے پہلے ہی صوفے سے پھسل چکا تھا اور نیلم کو بھی میں نے نیچے کھینچ لیا تھا۔ میرا مشین پسٹل جیب سے باہر آچکا تھا۔ مکرم بیگ کو گولی چلانے کا موقع نہیں ملا۔ نہ صرف اس کے ہاتھ سے ریوالور غائب ہوگیا بلکہ دروازے پر ایک گارڈ بھی ہلکی سی ڈکراہٹ کے ساتھ ڈھیر ہوگیا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ وہ گن کندھے سے اتار چکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ مکرم بیگ کے ساتھ ہی وہ بھی ہم پر برسٹ مارتا۔

اس بار نیلم نے بھی کمال کردیا۔ شاید اس لئے کہ وہ اب خوف زدہ نہیں تھی اور اس قسم کی صورتِ حال اس کے لئے غیر متوقع نہیں تھی۔ وہ نہ صرف صوفے کی سیدھ میں لیٹ کر آدھی صوفے کے نیچے ہوگئی تھی بلکہ اس کے ہاتھ میں چھوٹا سا ایک پستول بھی نظر آنے لگا تھا جو اُب تک اس نے اپنے لباس میں نہ جانے کہاں چھپا رکھا تھا۔ گو کہ اس کے ہاتھ میں ہلکی سی لرزش تھی لیکن اس نے انتہائی جُرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسرے گارڈ کو محض خبردار کرنے کے لئے اس پر ایک فائر کردیا تھا۔

گولی گارڈ کو نہیں لگی تھی۔ شاید نیلم نے جان بوجھ کر نہیں ماری تھی۔ اس کا مقصد غالباً اسے ہلاک یا زخمی کرنا نہیں بلکہ محض اسے اپنی جدید ساخت کی کلاشنکوف استعمال کرنے سے باز رکھنا تھا۔ وہ اس مقصد میں کامیاب رہی تھی۔ گارڈ اپنی جگہ ساکت ہوکر رہ گیا تھا۔ میں دل ہی دل میں نیلم کو داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں اس سے اس حوصلے کی توقع نہیں کررہا تھا اور ڈر رہا تھا کہ واقعی اگر گولیاں چلیں تو وہ میرے لئے مسئلہ نہ بن جائے۔ لیکن اس کا انداز بتارہا تھا کہ شرافت علی کے اچانک حملے نے اسے ضرور حواس باختہ کردیا تھا لیکن ذرا سا بھی پیشگی اندازہ ہونے کی صورت میں وہ اس قسم کے حالات میں گھبرانے والی عورت نہیں تھی۔

مکرم بیگ کا ہاتھ ناکارہ ہوگیا تھا اور اس کے وجیہہ چہرے پر کسی زخمی درندے کی سی خوفناکی آگئی تھی۔ معلوم نہیں' یہ تبدیلی تکلیف کی وجہ سے آئی تھی یا اس کا اصل روپ سامنے آرہا تھا۔

میں نے فرش پر لیٹے ہی لیٹے پُرسکون لہجے میں کہا "گن نکالنے اور فائر کرنے میں تم مجھ سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ نہیں کرسکتے میری جان! افسوس کہ آج کل امریکا میں ویسٹرن فلمیں بنانے کا رواج ختم ہوگیا ہے ورنہ میں تو ہالی ووڈ جاکر اس لائن میں بھی اچھا خاصا کیریئر بنا سکتا تھا۔ اپنے گن فائٹ کے سین کسی ڈپلی کیٹ یا اسٹنٹ مین کے بغیر پکچرائز کرایا کرتا۔ بڑی قدر ہوتی میری...."

میرا خیال تھا کہ مکرم بیگ اپنے دل میں اس بات کا اعتراف کرلے گا کہ وہ بازی ہار چکا تھا اور اپنے لئے مزید دشواریاں پیدا نہیں کرے گا لیکن ایسا لگتا تھا کہ شکست تسلیم کرنا اس کی سرشت میں نہیں تھا۔

اس لمحے اس نے ایک ایسی حرکت کی جس کی میں قطعاً توقع نہیں کرسکتا تھا۔ وہ ہاتھ زخمی ہونے کے باوجود ایک بھیانک چیخ کے ساتھ ننجا ماسٹر کے سے اسٹائل میں اچانک ہوا میں اچھلا اور سیدھا میری طرف آیا۔ مجھے کم از کم دوسرے گارڈ کی طرف سے خطرہ نہیں تھا۔ اسے نیلم نے کور کررکھا تھا۔

میرے لئے مکرم بیگ سے نمٹنا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن میں اسے مزید زخمی نہیں کرنا چاہتا تھا اور جس طرح وہ فضا میں اچھلا تھا' اگر میں اس عالم میں اس پر مشین پسٹل سے فائر کرتا تو عین ممکن تھا کہ وہ مر ہی جاتا۔ گولی نہ جانے کہاں لگتی۔ بس اسی جھجک میں' میں فائر کرنے میں ایک لمحے کے لئے چُوک گیا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ میں ایک طرف کو لڑھک گیا ورنہ وہ کسی چھوٹی سی چٹان کی

طرح دھم سے مجھ پر آن گرتا۔

تاہم اتنا ضرور ہوا کہ اس کے جوتے کی ایڑی بہت زور سے میری کلائی پر پڑی۔ میرا بازو جھنجنا گیا اور مجھے پتا بھی نہ چلا کہ کب مشین پسٹل میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ دایاں ہاتھ زخمی ہونے کے باوجود وہ کسی جنونی ریچھ کی طرح مجھ سے لپٹ گیا۔ میں اس کے نیچے دب گیا تھا۔ وہ اپنا بایاں ہاتھ مشین پسٹل کی طرف بڑھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں نے اس کا وہ بازو پکڑ لیا تھا۔

میرا ایک بازو میرے اپنے ہی نیچے دب گیا اور میں اسے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ مکرم بیگ اپنے وزن سے اور اپنی طاقت کی خاص ٹیکنیک سے مجھے فرش سے ہی چپکائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ زندگی اور موت کی کشمکش کے لمحے تھے۔ کوئی بھی لمحہ فیصلہ کن ثابت ہو سکتا تھا۔ توازن' موت یا زندگی.... دونوں میں سے کسی بھی طرف بگڑ سکتا تھا۔

مجھے سب سے زیادہ خطرہ دوسرے گارڈ کی طرف سے تھا۔ مجھے معلوم تھا اس صورتِ حال میں وہ زیادہ دیر تک اس بات کی پروا نہیں کرے گا کہ اسے نیلم نے کور کر رکھا تھا اور وہ اپنی جان پر کھیل کر اپنے مالک کے لئے کچھ کرنے کی کوشش کرے گا۔

مکرم بیگ کے ساتھ زیادہ دیر زور آزمائی میں الجھنا بہت بڑا خط... بنے والی بات تھی۔ رحیم گل نہ جانے کہاں مر گیا تھا۔ کم از کم گولی چلنے کی آواز سن کر اسے اپنے آدمیوں کے ساتھ اپارٹمنٹ میں گھس آنا چاہئے تھا۔

آخر میں نے مکرم بیگ کو ہوا میں اچھال دینا ہی بہتر سمجھا۔ میں اسے زیادہ اونچا تو نہیں اچھال سکا لیکن اس کے نیچے سے نکل گیا۔ ساتھ ہی میں نے مشین پسٹل کو ہاتھ مار کر دور کھسکا دیا۔ اس کے زخمی ہاتھ سے کچھ خون میری آنکھوں میں گر چکا تھا۔ اور مجھے دیکھنے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔ آنکھیں پونچھنے کی مہلت نہیں تھی۔

مکرم بیگ کے بائیں ہاتھ نے میری گردن گرفت میں لے لی تھی اور یہ گرفت کسی آہنی شکنجے سے کم نہیں تھی۔ میرا خیال ہے وہ اپنی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ جلد یا بدیر اب موت تو کسی نہ کسی صورت میں اس کا مقدر ہو چکی تھی۔ اس کی ساری جدوجہد اب صرف اس بات کے لئے تھی کہ مرتے مرتے مجھے بھی ساتھ لے مرے۔ یہ سوچ کر تو جب کوئی کمزور انسان بھی لڑتا ہے تو بڑی مصیبت بن جاتا ہے۔ مکرم بیگ تو پھر بھی ایک طاقتور آدمی تھا۔ لیکن اِدھر ایک اُبال مجھ میں بھی آیا۔

اس نے جب میری گردن ہاتھ کے شکنجے میں دبوچی تو میری کھوپڑی گھوم گئی۔ میں نے تمام احتیاطوں اور رعایتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے چہرے پر وہ گھونسا رسید کیا جس کے پیچھے میرے غیظ و غضب کی طاقت ہوتی تھی۔ اس کا چہرہ پہلے تو صرف غصے کی شدت سے بگڑا ہوا تھا لیکن اب سچ مچ بگڑ گیا۔

میری گردن پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں نے گھٹنا موڑ کر اس کی کمر میں رسید کیا۔ وہ درندے کی طرح غرایا اور ... کی ایک ضرب سے گویا فیصلہ کن وار کرتے ہوئے اسے دور ... دیا۔

اس کے اور میرے درمیان خاصا فیصلہ پیدا ہو گیا تھا اور موقعے کو غنیمت سمجھتے ہوئے غالباً اس کے گارڈ نے اس قصے ... کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنی دانست میں مجھ پر برسٹ ... لیکن ہوا یہ کہ میں اس لمحے اپنا مشین پسٹل اٹھانے کے لئے ... عقب میں لڑھک چکا تھا جبکہ مکرم بیگ دوبارہ مجھ پر جھپٹنے کے ... لڑاکا بھینسے کی طرح میرے تعاقب میں لپکا تھا۔ وہ اس برسٹ کی ... میں آ گیا اور گولیوں کے دھچکے نے اچھل کر دیوار سے جا ٹکرایا۔

نیلم نے گارڈ کو دوسرا برسٹ مارنے کی مہلت نہیں دی۔ ... نے پستول کے فائر کی آواز سنی اور گارڈ اوندھے منہ چوکھٹ ... اندر آن گرا۔ اس لمحے مزید چند گولیاں چلیں لیکن یہ اندر نہیں ... تھیں۔ کسی نے باہر سے برسٹ مار کر بیرونی دروازے کا تالا اڑا ... تھا۔

دروازہ کھلا اور رحیم گل کی قیادت میں بہت سے پولیس ... والے "خبردار... خبردار" کرتے ہوئے گنیں تانے دھڑ دھڑ کر ... اندر گھس آئے اور اِدھر اُدھر کونے کھدروں میں پوزیشنیں لینے ... کی کوشش کرنے لگے۔

"بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔" میں نے کراہ کر میز کا سہارا ... لے کر اٹھتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا پھر میں نے ان پولیس والوں ... دیکھا جو اِدھر اُدھر سینے کے بل لیٹ کر گنیں سیدھی کر رہے تھے۔

میں نے انہیں مخاطب کیا "آپ لوگ کیا اب کرسیوں ... میزوں اور صوفوں وغیرہ سے مقابلہ کریں گے؟"

ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا اور وہ منتظر رہے کہ گارڈز یا مکرم ... بیگ میں سے کوئی حرکت کرے تو وہ اس پر گولی چلائیں۔ رحیم گل ... میرے قریب آتے ہوئے بولا "دراصل ہم نے پیچھے ہنگامی زینوں ... ایک شخص کو تعینات کیا ہوا تھا۔ وہاں سے وہ اس کمرے کی ا... کھڑکی سے چوری چھپے جھانک کر اندر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔"

اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا لیکن میں اس کے اشارے ... سے پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ اس کی مراد کون سی کھڑکی سے تھی کیونکہ ... میں دو دن پہلے اس کھڑکی کا معائنہ کر چکا تھا۔

رحیم گل بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس آدمی کے اور ... ہمارے درمیان طے پایا تھا کہ وہ صورتِ حال کا جائزہ لیتے ہوئے ... ہمیں سگنل دے گا کہ کس وقت ہمیں اندر گھسنا چاہئے۔ یہ احتیاط ... میں نے اس لئے کی تھی کہ کہیں ہمارا اچانک اندر گھس پڑنا ہم ... لوگوں کے لئے فائدے کے بجائے نقصان کا باعث نہ بن جائے ... کسی غلط موقع پر کسی غلط آدمی کے ہاتھوں کوئی غلط سی گولی نہ چل ... جائے۔"

بات اس کی مناسب تھی۔ میں نے پوچھا "لیکن پھر کیا ہوا؟"

وہ آہ بھر کر بولا "پھر ہوا یہ کہ ہم سگنل کا انتظار ہی کرتے ... رہے مگر سگنل نہیں ملا۔"

"پولیس والوں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"پولیس والا بے چارہ کیا کرتا۔ وہ اس تنگ سے ہنگامی زینے کی دوسری منزل سے گر پڑا تھا۔" رحیم گل نے بتایا "اس طرف اندھیرا تھا اور اس شاندار بلڈنگ کا ہنگامی زینہ نہایت گھٹیا اور بے کار بنا ہوا ہے۔"

"یہ چیزیں تو محض دکھاوے کی ہوتی ہیں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اس کا جنگلا ٹوٹنے کی وجہ سے ہمارا آدمی نیچے گر گیا۔ شکر ہے ابھی وہ دوسری منزل پر ہی تھا اور نیچے زمین کچی تھی۔ اگر وہ ٹاپ فلور سے گرا ہوتا یا زمین کچی ہوتی تو اس کی تو چھٹی ہو جاتی۔"

"پولیس والوں کے کام ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے ایک بار پھر کہا "وہ سیدھا ٹاپ فلور پر آنے کے بجائے راستے میں کسی اور فلیٹ میں تاکا جھانکی کرنے لگا ہو گا۔"

رحیم گل نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا اور اکڑوں بیٹھ کر بیک وقت دونوں گارڈز کی نبض دیکھنے لگا۔ جلد ہی وہ خاصی مسرت سے بولا "یہ دونوں تو زندہ ہیں۔"

"یقیناً ہوں گے۔ خبیث آدمی بڑی مشکل سے مرتے ہیں۔ وہ نیک لوگ ہوتے ہیں جو بے چارے کبھی کبھی صرف ٹھوکر لگنے سے... اور بعض اوقات تو محض شرم سے مر جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں ایمبولینس کے لئے پہلے ہی فون کر چکا ہوں۔ ہمارا بھی جو آدمی سیڑھیوں سے گرا ہے' سخت زخمی ہے۔" رحیم گل بولا۔

"احمق آدمی! ایمبولینس تو تمہیں ساتھ ہی لے کر آنا چاہئے تھا۔" میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔

اس نے غصے سے مجھے گھورا لیکن غصے کے پیچھے درحقیقت اس کی آنکھوں میں ایک التجا چھپی ہوئی تھی کہ ماتحتوں کے سامنے مجھے احمق آدمی وغیرہ جیسے القابات سے مت پکارو۔

میں نے اس پر رحم کھاتے ہوئے ذرا نرمی سے کہا "کیا تمہیں اندازہ نہیں تھا کہ یہاں کیا کچھ ہو سکتا ہے؟ ہم یہاں کسی محفلِ مشاعرہ میں تو مدعو نہیں تھے۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور محض مجھے گھورنے پر ہی اکتفا کیا۔ گھورنے سے فارغ ہو کر وہ مکرم بیگ کی طرف بڑھا۔ مکرم بیگ پہلے سے چند لمحے پہلے جتنا خوفناک دکھائی دے رہا تھا' اب نہ جانے کیوں اتنا ہی مسکین معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے شیطانی تاثرات نہ جانے کیوں موت کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر منجمد نہیں ہوئے تھے۔ اس کا بارعب اور خون میں لتھڑا ہوا چہرہ دیکھ کر نہ جانے کیوں کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بے چارہ کوئی شریف آدمی خواہ مخواہ ہی مارا گیا تھا۔

یہ جاننے کے لئے اس کی نبض دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ مر چکا تھا۔ اس کے باوجود رحیم گل نے جھک کر اس کی بھی نبض دیکھی۔ شاید اس وقت اس پر کسی خبطی ڈاکٹر کی روح سایہ فگن تھی۔

"یہ مر چکا ہے۔" اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھتے ہوئے اعلان کیا۔

"اچھا؟" میں نے حیرت سے کہا "کمال ہے! اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا کہ یہ مذاق کر رہا ہے۔"

رحیم گل کی آنکھوں سے ایک بار پھر قہر و غضب جھانکنے لگا۔ میں نے مسکین سی شکل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں کیا کروں یار...! بعض اوقات تم بات ہی اتنی احمقانہ کرتے ہو کہ یقین نہیں آتا تم انسپکٹر رحیم گل ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تم لکڑہارے رحیم گل ہو۔"

"گدھے کہیں کے! پولیس کی کارروائی میں ہر بات ضابطے کے مطابق کی جاتی ہے۔ تم اسے خانہ پُری کرنا بھی کہہ سکتے ہو۔ یہ الفاظ ریکارڈ پر آتے ہیں۔ مجھے بھی معلوم ہے کہ یہ مر چکا ہے۔ میں مرے ہوئے آدمی کو ایک میل دور سے دیکھ کر بتا سکتا ہوں کہ وہ مر چکا ہے لیکن ضابطے کی کارروائی کے طور پر مجھے اس کا اعلان کرنا پڑتا ہے۔ پولیس کے ضابطوں اور قاعدوں کے سلسلے میں' میں لکیر کا فقیر ہوں۔"

"اوہ... معاف کرنا پیارے بھائی! یہ باتیں مجھ گھسیارے کو معلوم نہیں تھیں۔" میں نے معذرت کی۔

نیلم صوفے پر دم بخود سی بیٹھی تھی۔ پستول اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم گل سے کہا "ذرا اس کی بھی نبض دیکھ کر ضابطے کی کارروائی کے مطابق اعلان کر دو کہ اسے زندہ سمجھا جائے یا مُردہ؟"

رحیم گل کی آنکھیں کچھ زیادہ ہی قہر آلود ہو گئیں۔ ویسے بھی اپارٹمنٹ کی فضا کچھ سوگوار سی تھی۔ میں نے سوچا زیادہ بکواس کرنا ٹھیک نہیں۔ میں رحیم گل کے قریب چلا گیا۔ وہ ایک بار پھر مکرم بیگ کی طرف متوجہ ہو گیا اور بڑے انہماک سے اس کا معائنہ کرنے لگا۔

"کلاشنکوف کا برسٹ لگا ہے۔" اس نے بڑبڑانے کے سے انداز میں تبصرہ کیا۔

"اس میں عبرت کا پہلو یہ ہے کہ جس شخص کو اس نے تنخواہ پر اپنی جان کی حفاظت کے لئے رکھا ہوا تھا اس کے ہاتھ سے یہ مر گیا۔" میں نے دھیمے لہجے میں سنجیدگی سے کہا۔

"ایمبولینس کے آنے سے پہلے تم مجھے وقوعے کی تفصیلات بتا دو۔" رحیم گل نے فرمائش کی "یہاں کیا کیا باتیں ہوئیں۔ کس کی گولی سے کون مرا۔"

میں نے اسے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔ وہ طمانیت سے سر

ہلاتے ہوئے بولا "چلو خیر۔ ایک بہت بڑا کیس بہت کم وقت میں انجام کو پہنچا۔"

"اب اس کا سہرا تم اطمینان سے اپنے سر باندھ لینا۔ میری طرف سے اجازت ہے۔ تمہارا سر خالی خالی کچھ اچھا نہیں لگ رہا۔" میں نے فیاضی سے کہا۔

"تمہاری نظر کافی کمزور ہو گئی ہے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا "میرا سر خالی نہیں ہے۔ اس پر پولیس کی ٹوپی موجود ہے اور میرے لئے یہی کافی ہے۔ تم اپنا سہرا اپنے پاس ہی رکھو۔"

"میں بیرونی طور پر سر کے خالی ہونے کی بات نہیں کر رہا تھا۔ میں تو اندر سے خالی ہونے کی بات کر رہا تھا۔ سہرے کی آڑ میں اس قسم کا خالی پن ذرا زیادہ اچھی طرح چھپ جاتا ہے۔ پولیس کی ٹوپی سے تو اور بھی زیادہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ کھوپڑی اندر سے خالی ہو گی۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

"اگر تم نے مزید بکواس کی تو میں تمہیں مکرم بیگ کے قتل کے شبے میں گرفتار کر لوں گا۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"تم سے یہی امید کی جا سکتی ہے۔ آخر ازلی احسان فراموش ہو۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "تمہیں اتنے بڑے عفریت سے اتنی آسانی سے نجات دلا دی لیکن احسان مند ہونے کے بجائے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کرتے ہوئے مجھے گرفتار کرنے کی دھمکی دے رہے ہو۔ میرا خیال ہے تمہارے لئے مناسب یہی تھا کہ زندگی بھر مکرم بیگ کے سامنے دُم ہلاتے پھرتے رہتے۔"

"تم نے مجھے کب کسی کے سامنے دُم ہلاتے دیکھ لیا؟" وہ تاؤ کھا کر بولا۔

"ہزاروں مرتبہ دیکھا ہے۔ تمہیں خود پتا نہیں چلا ہو گا۔ اگر کہو تو آئندہ تمہاری دُم ہلتے دیکھ کر تمہیں خبردار کر دیا کروں؟" میں نے نیچی آواز میں کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ زیادہ جل بھن کر مزید کچھ کہتا' ایک دیو قامت شخص اپارٹمنٹ کے بیرونی دروازے پر نمودار ہوا۔ وہ ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا اور چہرے سے کافی حواس باختہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ شرافت علی تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بڑی شرافت سے گرفتاری پیش کرنے آیا تھا۔

اچانک وہ یوں اوندھے منہ کمرے کے وسط میں آگرا جیسے کسی گینڈے نے اس کی کمر پر ٹکر رسید کی ہو۔ گینڈے سے کمتر کسی جانور کی ٹکر اسے اتنا آگے لا کر اوندھے منہ نہیں گرا سکتی کیونکہ وہ خود کسی ہاتھی سے کم نہیں تھا لیکن جب وہ سامنے سے ہٹا تو پتا چلا کہ اس کے عقب میں کوئی گینڈا نہیں بلکہ شفیع شاہ موجود تھا۔

شفیع شاہ جیسا چھریرے جسم کا اسمارٹ آدمی شرافت علی کے جناتی وجود کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گن تھی جس کی نال پر وہ شرافت علی کو یہاں تک لایا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ شفیع شاہ جیسے سبک آدمی نے شرافت علی کی کمر پہ لات رسید کی تھی تو وہ اوندھے منہ ہال کے وسط میں آگرا تھا۔

شفیع شاہ اندر آگیا۔ اس کی گن کا رخ شرافت علی کی طرف تھا۔ ہم دوسرے کمرے میں تھے۔ شفیع شاہ دور سے ہی مجھ سے مخاطب ہوا "آپ کا اندازہ ٹھیک تھا سر! اس نے آپ پر حملے میں ناکام ہونے کے بعد اپنے کندھے کی مرہم پٹی کروا کر ادھر کا رخ کیا تھا۔ یہاں اس کے استقبال کے لئے ہم اندھیرے میں چھپے ہوئے تھے۔ یہ نہایت آسانی سے ہی ہمارے ہتھے چڑھ گیا۔"

اس نے منہ پھیر کر اپنے ایک ساتھی کو آواز دی "مراد خان! شرافت علی کی گن لے آؤ۔"

فوراً ہی ایک اور شخص اندر آگیا۔ وہ ایک کلاشنکوف اٹھائے ہوئے تھا۔ شفیع شاہ نے اس سے کلاشنکوف لے کر دور سے ہی مجھے دکھاتے ہوئے کہا "سر! اس گن سے آپ پر حملہ کیا گیا تھا۔"

رحیم گل نے ایک سپاہی کو اشارہ کیا۔ اس نے آگے بڑھ کر شفیع شاہ سے کلاشنکوف لے لی۔ شرافت علی اس وقت تک اٹھ کر بیٹھ چکا تھا اور اپنے دائیں ہاتھ سے بائیں کندھے کو پکڑے ہوئے تھا۔ میں کندھے پر اس کے کوٹ میں ایک سوراخ دیکھ چکا تھا۔

شفیع شاہ نے مجھے بتایا "آپ کے فائر سے اس کا کندھا زخمی ہوا تھا سر! لیکن زخم خطرناک نہیں ہے اور نہ ہی گولی کندھے میں پیوست ہے۔ یہ ایک پرائیویٹ اسپتال سے بینڈیج کروا کے آیا ہے۔"

میں نے رحیم گل سے کہا "اس دیو زاد کو بھی سنبھال لو۔ یہ جج صاحب کے قتل کے کیس کی اہم کڑی ہو گا۔ بلکہ اس کے تن و توش کو دیکھتے ہوئے اسے تو کڑی کے بجائے کڑا کہنا چاہئے۔"

"کون ہے یہ؟" رحیم گل نے ہال میں پہنچ کر پوچھا۔

"ہر گینگسٹر اور مافیائی قسم کی شخصیت کے پاس یوں تو بہت سے بندوق بردار ہوتے ہیں جو مختلف خدمات انجام دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ خاص ہوتے ہیں اور ایک آدھ تو خاص الخاص ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے یہ مکرم بیگ کا خاص الخاص آدمی ہے۔ چیف گارڈ ہے۔ اس کے ذریعے تمہیں مکرم بیگ کی ہسٹری کھنگالنے میں بڑی مدد ملے گی اور یقیناً بہت سے انکشافات سامنے آئیں گے۔ شکر کرو کہ یہ ہاتھی زندہ سلامت تمہارے ہاتھ آ رہا ہے۔"

شرافت علی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور جھکے ہوئے کندھوں کے باوجود وہ ہم سب میں نمایاں نظر آ رہا تھا لیکن اب وہ اس شاندار عمارت کی طرح تھا جو کہنگی یا ناقص تعمیر کے باعث کسی بھی لمحے ڈھیر ہونے کو تھی۔ دراصل اس کی نظر دوسرے کمرے میں پڑی ہوئی مکرم بیگ کی لاش پر پڑ چکی تھی۔ اس کے چہرے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ یکدم ہی اندر سے ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا۔ گاڈ فادر قسم کی شخصیت کا اپنا ایک الگ ہی امیج ہوتا ہے۔ وہ بذاتِ خود کوئی ایسی غیر معمولی شخصیت نہیں ہوتے اور نہ ہی ان کے جسم میں کوئی جناتی طاقت مقید ہوتی ہے۔ ان کا سارا رعب و دبدبہ' دہشت و طاقت' شرافت علی جیسے لوگوں ہی کی مرہونِ منت ہوتی ہے۔ وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح فانی ہوتے ہیں۔

اس کے باوجود جب کسی دن اچانک وہ ٹوٹے ہوئے کھلونے کی طرح سامنے پڑے نظر آتے ہیں تو وہ ستون بھی ریت کے میناروں کی طرح بیٹھنے لگتے ہیں جو اس بارعب عمارت کو اپنے سر پہ اٹھائے کھڑے ہوتے ہیں۔ شرافت علی بھی مکرم بیگ کی لاش دیکھ کر یکدم ہی ڈھے گیا تھا۔

اسی اثنا میں ایمبولینس بھی آن پہنچی۔ رحیم گل نے شرافت علی کو ہتھکڑی لگوائی اور زخمی گارڈز کو اسپتال بھجوانے کے لئے ضروری ہدایات دینے لگا۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا "ہم اب چلتے ہیں۔ ہمارا اب یہاں کوئی کام نہیں رہا۔ معاشرے کا کچھ کچرا اب تم لوگ سمیٹو۔"

"مجھے تمہارے تفصیلی بیان کی ضرورت ہو گی۔" رحیم گل بولا۔

"ٹھیک ہے۔ کل کسی وقت مجھ سے اپائنٹ منٹ لے کر آجانا۔ میں بیان ریکارڈ کرا دوں گا۔ میں بہت نیک دل آدمی ہوں۔ چھوٹے چھوٹے آدمیوں سے بھی بہت تعاون کرتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں۔ میں کوشش کروں گا کہ اس کیس میں تمہیں کچھ ترقی بھی مل جائے۔" میں نے شفقت آمیز انداز میں اس کا کندھا تھپتھپایا۔

اس نے پہلے اپنے ماتحتوں وغیرہ کی طرف دیکھا کہ کوئی یہ باتیں سن تو نہیں رہا تھا لیکن کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ بعض مصروف نہ ہوتے ہوئے بھی بہت مصروف نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تب رحیم گل دانت پیس کر بولا "تم کم از کم ایسے غمناک موقعوں پر تو سنجیدہ رہا کرو۔"

"یہ موقع تمہارے لئے غمناک ہو گا۔ اگر کوئی نیک اور شریف آدمی مرا ہوتا تو یہ موقع میرے لئے غم ناک ہوتا۔ غم اور خوشی کے بارے میں بھی ہر ایک کا اپنا اپنا ایک زاویۂ نظر ہوتا ہے نا۔" میں نے کہا۔

"موت کسی کی بھی ہو' اس پر افسوس کرنا چاہئے۔" وہ نیچی آواز میں بولا۔

"اوہو... اس وقت تو تم بڑے نیک اور حساس لوگوں جیسی باتیں کر رہے ہو۔ خیریت تو ہے؟ کیا تمہارے جسم میں کسی اور کی روح حلول کر گئی ہے؟" میں نے شک بھری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔

وہ کچھ نہ بولا تو میں نے کہا "ویسے صورتِ حال کافی مختلف بھی ہو سکتی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ جہاں مکرم بیگ کی لاش پڑی ہے وہاں میری لاش پڑی ہوتی۔ بلکہ عین ممکن ہے ہدایت وارثی کے ہوٹل کے قریب میری اور نیلم کی لاش پڑی ہوتی۔ پھر تم کیا کرتے؟"

"میں سکون کی سانس لیتا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"لیکن افسوس۔ تمہارے مقدر میں سکون کی سانس نہیں ہے۔ البتہ میں اب سکون کی سانس لینے جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔" میں نے شفیع شاہ وغیرہ کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور رحیم گل کو وہیں تذبذب کے سے عالم میں چھوڑ کر باہر آگیا۔

لفٹ کی طرف جاتے وقت میں نے حقیقتاً اپنے اعصاب میں ایک عجیب سا سکون محسوس کیا۔ میں نے شفیع شاہ سے کہا "پیر دانش والے بہت اہم اور بہت بڑے معاملے کے بعد یہ دوسرا بڑا اور اہم معاملہ ہے جو ہم نے نمٹایا ہے۔ پیر دانش والا معاملہ تو خود بخود ہی ہمارے سر پہ آن پڑا تھا اور ہم غیر ارادی سے انداز میں اس سے نمٹتے چلے گئے تھے لیکن اس معاملے کی تو ہم نے باقاعدہ ذمے داری لے کر اسے نمٹایا ہے۔"

"بے چارے مکرم بیگ نے دو ملین روپے میں اپنے لئے موت خریدی۔" شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"یہ بھی پیر دانش سے کچھ کم خبیث چیز نہیں تھی۔" میں نے لفٹ میں داخل ہوتے ہوئے کہا "یہ وہ لوگ ہیں جن کی خباثتیں گلی کوچوں میں نظر نہیں آتیں لیکن معاشرے کی شکست و ریخت میں یہ لوگ بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ہماری سماجی قدروں کو الٹ پلٹ کرنے والے اصل میں یہی لوگ ہوتے ہیں۔ بظاہر بڑے اُجلے اُجلے دکھائی دیتے ہیں۔ بہترین علاقوں میں شرفا اور معززین کے شانہ بہ شانہ رہتے ہیں۔ عمدہ گاڑیوں میں گھومتے ہیں۔ پڑھے لکھے' صاف ستھرے اور بڑے خوش اطوار نظر آتے ہیں لیکن روپے پیسے' طاقت اور ٹھاٹ باٹ کے لئے یہ تمام انسانی قدروں کو خدا حافظ کہہ چکے ہوتے ہیں۔ پیر دانش میں پھر بھی کچھ دیسی پن تھا لیکن مکرم بیگ کافی حد تک ویسٹرنائزڈ ہو چکا تھا۔ شاید اس لئے کہ اس کا زیادہ وقت باہر گزرتا تھا تاہم پیر دانش کی خباثتیں اس سے زیادہ سنگین تھیں۔"

ہم نیچے پہنچ چکے تھے اور اپنی گاڑیوں کی طرف روانہ ہو رہے تھے۔ اس وقت تک بلڈنگ کے کئی اپارٹمنٹس میں روشنیاں نظر آنے لگی تھیں اور کچھ لوگ قدرے سہمے سہمے سے انداز میں کھڑکیوں اور بالکونیوں سے جھانکتے بھی دکھائی دیے تھے۔ پولیس اور میرے ساتھیوں کی تمام تر خاموشی اور راز داری کے باوجود بلڈنگ کے مکینوں کو احساس ہو چکا تھا کہ بلڈنگ میں کوئی بڑی کارروائی جاری تھی۔

ہم سڑک پر آئے تو نیلم نے مجھ سے پوچھا "اب تو ہدایت جلد رہا ہو جائے گا نا؟"

"یقیناً۔" میں نے جواب دیا "میرے خیال میں اسے کل چھٹکارا مل جانا چاہئے۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ابھی رحیم گل نے اس کے خلاف چالان عدالت میں پیش نہیں کیا تھا ورنہ بڑی گڑبڑ ہوتی۔ سب کے لئے الجھنیں کھڑی ہو جاتیں۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ تمہیں یہاں ساتھ لا کر مجھے پچھتانا نہیں پڑا۔ تم کافی باہمت عورت ثابت ہوئیں۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ مت پوچھو کہ اس باہمت عورت کا اندر سے کیا حال ہے۔ میری ٹانگیں ابھی تک کانپ رہی ہیں اور دل پتے کی طرح لرز رہا ہے۔"

"کچھ عرصے ہمارے ساتھ رہو گی تو یہ بیماریاں بھی ٹھیک ہو جائیں گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔

شفیع شاہ نے اپنی گاڑی میری گاڑی سے کچھ ہی دور کھڑی کی تھی۔ چند منٹ بعد ہم اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔

○☆○

ایک ہفتے بعد۔۔۔ جبکہ یہ قصہ کافی پرانا پرانا سا محسوس ہونے لگا تھا، میں اپنے آفس میں بیٹھا زرتاج کو بڑی ترنگ میں اس کی تفصیلات بتا رہا تھا۔ زرتاج سے ملاقات کئی دن بعد ہو رہی تھی اور وہ اس قصے کی تفصیلات سے واقف نہیں تھی۔

سب کچھ سننے کے بعد وہ حیرت سے بولی "تم تو واقعی اس دھندے میں چل نکلے ہو۔ ابتدا میں ہی تمہارا یہ حال ہے تو اس کا مطلب ہے آگے چل کر کافی ترقی کرو گے۔" پھر وہ کچھ فکرمند سی ہوتے ہوئے بولی "لیکن اس قسم کے چکروں میں تمہارے ساتھ خدانخواستہ کوئی اونچ نیچ بھی ہو سکتی ہے۔"

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" میں نے ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "اونچ نیچ کا کیا ہے۔ وہ تو انسان کے ساتھ کسی بھی کام میں ہو سکتی ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو کوئی کام کئے بغیر ہی کوئی اونچ نیچ ہو جاتی ہے۔ انسان کو جب کوئی اچھا اور تعمیری کام کرنے کے مواقع میسر ہوں تو اسے ضرور کرنا چاہئے۔"

زرتاج مسکراتے ہوئے بولی "اور میرا خیال یہ ہے کہ انسان کو جب کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو وہ اس کے لئے سو جواز گھڑ لیتا ہے۔ خواہ کام اچھا ہو یا برا۔"

پھر وہ جلدی سے بولی "یہ مت سمجھنا کہ میں اس کام کو برا کہہ رہی ہوں۔ یہ تو کسی بھی لحاظ سے برا نہیں ہے۔ اس سے تو تمہیں بھی فائدہ پہنچا۔ کچھ دوسرے لوگوں کو بھی اور معاشرے کو بھی۔" ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "نیلم اور ہدایت وارثی تو تمہارے بہت شکرگزار ہوں گے؟"

"ارے۔۔۔ کچھ مت پوچھو۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا "ان کی شکرگزاری نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ حد سے زیادہ شکرگزاری سے بھی میں شرمندہ ہو جاتا ہوں۔ ان کا بس نہیں چل رہا کہ میرے ہوٹل میں آ کر ویٹر اور ویٹرس کے فرائض انجام دینے لگیں۔ اور وہ بھی بغیر تنخواہ کے۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا ہے کہ یہ خدمت میں نے خالصتاً ان کے لئے انجام نہیں دی۔ اس میں میری اپنی بھی کچھ دلچسپی، کچھ مفادات (یا) کچھ نظریات کارفرما تھے۔ بڑی مشکل سے بات ان کی سمجھ میں (آئی) ہے اور وہ کچھ پرسکون ہوئے ہیں۔"

"اس قسم کے کاموں میں اگر کبھی میری خدمات کی ضرورت پڑے تو میں بھی حاضر ہوں۔ میری بلا معاوضہ خدمات اگر کسی (کام) آسکیں تو مجھے خوشی ہو گی۔" زرتاج بولی۔

"یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا "تمہاری پیشکش سے پہلے ہی میں نے تمہیں اپنے ساتھیوں میں شامل کر (لیا) ہے۔ کسی بھی وقت، کسی بھی کام کے سلسلے میں تمہیں بلاوا آ(سکتا) ہے۔"

"مجھے تمہارے کسی کام آ کر خوشی ہو گی۔ میں آج کل خود کچھ ناکارہ سی محسوس کر رہی ہوں۔" وہ بولی۔

"بہت تاخیر سے تمہیں اپنے ناکارہ ہونے کا احساس ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہی غنیمت ہے کہ ہو تو گیا۔" وہ ترکی بہ ترکی بولی "بعض لوگوں کو تو زندگی بھر پتا ہی نہیں چلتا کہ وہ اس دنیا میں بالکل بےمصرف ہیں۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، میرے ڈائریکٹ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف راحیلہ تھی۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یوں تو راحیلہ کا فون دیگر اوقات میں بھی آتا ہی رہتا تھا۔ وہ لاہور میں ہیڈ آفس چلا رہی تھی اور ساتھ ہی میرے منہدم شدہ بنگلے کو بھی دوبارہ تعمیر کرا رہی تھی۔ اسے اکثر ہی مجھ سے رابطہ کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی لیکن یہ بات تو گویا طے ہو چکی تھی کہ جب زرتاج میرے پاس بیٹھی ہوتی تھی، تب اس کا فون ضرور آتا تھا۔ اب تو واقعی میرا دل بھی اسے محض اتفاق سمجھنے پر تیار نہیں ہوتا تھا۔

میں نے مسکرا کر زرتاج کی طرف دیکھا اور وہ فوراً سمجھ گئی کہ (فون) کس کا تھا۔ اس اتفاق پر اسے بھی حیرت ہوتی تھی۔ راحیلہ بولی "(لگتا) ہے کراچی میں تمہارا بہت ہی دل لگ گیا ہے؟"

"یہ اندازہ تم نے کیسے لگایا؟" میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"اتنے دن ہو گئے تمہیں وہاں بیٹھے ہوئے۔ اس دوران میں (ایک) بار بھی تم نے لاہور کا چکر نہیں لگایا۔ کبھی فون تک نہیں (کیا)۔ جب بھی کرتی ہوں، میں ہی کرتی ہوں۔ لگتا ہے یہاں کے (بزن)س کی تو تمہیں کوئی فکر ہی نہیں ہے۔"

"وہاں کے بزنس کی فکر کرنے کے لئے تمہیں وہاں چھوڑا ہوا ہے۔ آخر تم کس مرض کی دوا ہو؟" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"لیکن شاید تم بھول گئے ہو کہ تمہارا ہیڈ آفس یہاں ہے اور اس کی اہمیت کراچی آفس سے کہیں زیادہ ہے۔ سال میں کم از کم ایک بار تو تمہارا یہاں ہونا ناگزیر ہے۔" وہ بولی۔

"بھئی تم بیویوں کی طرح کڑ کڑ مت کرو اور ایک باصلاحیت پریذیڈنٹ ڈائریکٹر کی طرح سیدھے، سلیس اور ڈائریکٹرانہ انداز میں بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے۔" میں ایک بار پھر زرتاج کی طرف دیکھ کر مسکرایا لیکن اب وہ کچھ سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ اس کا ذہن گویا کہیں اور تھا۔

"بیویوں کی طرح کڑ کڑ کرتی ہے میری جوتی۔" راحیلہ جل کر بولی۔

"یہ تو تم نے اور بھی زیادہ بیویانہ مکالمہ بولا ہے۔" میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"تم بہت ہی خبیث ہو۔" اس کے لہجے میں جلد ہی شکست خوردگی جھلک آئی "کبھی کبھی میں سوچتی ہوں کہ تمہیں فون ہی نہیں کیا کروں گی۔ یہ تمہارا بزنس ہے۔ جب تمہیں ہی اس کی فکر نہیں ہے تو مجھے فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ بھاڑ میں جائے سب کچھ۔"

"یہ تو اور بھی زیادہ بیویانہ انداز ہے۔ آخر تمہیں کیا ہو گیا ہے راحیلہ ڈیئر؟" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "آخر تم کیوں بھول جاتی ہو کہ تمہارا مقام اور مرتبہ کچھ اور ہے۔"

"جہنم میں گیا میرا مقام اور مرتبہ۔" وہ جھلا کر بولی۔

"کس چیز کو تم بھاڑ میں بھیج رہی ہو کسی کو جہنم میں۔۔۔ اور تمہارے الفاظ سے بھی کچھ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے تم نے انگارے چبا رکھے ہیں۔ آخر قصہ کیا ہے؟ کیا لاہور میں بہت زیادہ گرمی پڑ رہی ہے۔۔۔ یا تم نے غلطی سے نیم چڑھا کریلا پکا کر کھا لیا ہے؟"

"میں نے تو آرام سے بات شروع کی تھی۔ تم ہی انسان کو غصہ دلا دیتے ہو۔" وہ گویا حکمت عملی تبدیل کرتے ہوئے ذرا نرم لہجے میں بولی۔

"ہاں اب طبیعت کچھ بہتر معلوم ہو رہی ہے۔ اب بولو کیا بات ہے؟" میں نے طمانیت سے کہا "ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ مجھے تمہاری بیویانہ کڑ کڑ زیادہ اچھی لگتی ہے۔"

"بیویانہ کڑ کڑ سننے کی تو تمہیں حسرت ہی رہے گی۔ ویسے تمہاری مرضی ہے کہ گفتگو کو جو بھی نام دیتے رہو۔" وہ اب نہایت ملائمت سے بولی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ غصہ دکھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا "میں تو تمہیں صرف یہ اطلاع دینا چاہ رہی تھی کہ کل یہاں تمہارے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی سالانہ میٹنگ ہے اور اس میں تمہاری شرکت نہایت ضروری ہے۔ کئی اہم فیصلے ہونے ہیں جو تمہاری موجودگی کے بغیر نہیں کئے جا سکتے۔"

"بس۔۔۔ اتنی سی بات تھی؟" میں نے بےپروائی سے کہا۔

"تمہارا آنا بہت ضروری ہے۔" اس نے ایک بار پھر گویا مجھے معاملے کی اہمیت کا احساس دلایا۔

"تو آ جاؤں گا حضور! ایسی کیا پریشانی ہے؟" میں نے اطمینان سے کہا۔

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔" راحیلہ بولی۔

"تمہارے کان ہمیشہ سے کچھ بےاعتبارے سے ہی چلے آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے اب تم کان تبدیل ہی کرا لو۔ یہ کان کٹوا کر خرگوش کے لگوا لو۔ وہ دیکھنے میں بھی زیادہ خوب صورت لگیں گے۔"

"تم نے جو اپنی جینوئن دُم کٹوا کر گدھے کی لگوائی تھی اس کا کیا حال ہے؟" وہ جل کر بولی۔

"بالکل ٹھیک چل رہی ہے، لوگ اب اسے ہی جینوئن سمجھتے ہیں۔" میں نے بلا تامل جواب دیا۔

"بس ٹھیک ہے۔ تو پھر کل اپنی دُم سمیت لاہور پہنچ جاؤ۔ میٹنگ دوپہر کے کھانے کے بعد شروع ہو گی اور اس کا اختتام حسب معمول ڈنر پر ہو گا۔ اور ہاں۔۔۔ سیدھے لاہور ہی آنا۔ راستے میں کوئی لڑکی نظر آ جائے تو دُم ہلاتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے کہیں اور نہ پہنچ جانا۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو۔ دُم ہلانے والا جانور دوسرا ہوتا ہے۔ میری دُم تو ویسے بھی تمہارے سوا کسی کو دیکھ کر ہلتی ہی نہیں ہے۔ میں بھلا کسی اور کے پیچھے کہاں جا سکتا ہوں۔" میں نے دردناک لہجے میں کہا۔

"جھوٹ بولنے میں بھلا تمہیں کون شکست دے سکتا ہے۔ سب جاننے والوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تمہارے لنڈورے ہونے کی وجہ یہی تھی کہ تمہاری جینوئن دُم ہر لڑکی کے پیچھے ہل ہل کر بوسیدہ ہو کر ٹوٹ کر گر گئی تھی۔ بہرحال میں اس سلسلے میں اب مزید بکواس سننا نہیں چاہتی۔ کل زیادہ سے زیادہ دو بجے تک تمہیں لاہور میں ہونا چاہئے۔" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے ریسیور رکھ کر زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں اب اس بات کو محض اتفاق سمجھنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔"

"کس بات کو؟" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔

"یہی کہ جب تم یہاں ہوتی ہو تو راحیلہ کا فون آجاتا ہے۔ اسے ضرور ٹیلی پیتھی کے ذریعے پتا چل جاتا ہے۔" میں نے کچھ یقین اور کچھ بے یقینی سے کہا۔

"لیکن اس بار اس نے میرا کوئی ذکر تو نہیں کیا۔" زرتاج بولی۔ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ گفتگو میں اس کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔

"ذکر تو نہیں کیا۔ لیکن مجھے یقین ہے اس کا ذہن تمہارے خیال سے خالی نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

وہ کندھے اچکا کر رہ گئی۔ وہ شاید اس موضوع پر کوئی اظہارِ خیال کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ یکدم اس کے چہرے اور لہجے کی شگفتگی کم ہوگئی تھی۔ اس قمقمے کی طرح جو چند لمحے پہلے تک زیادہ وولٹیج سے جگمگا رہا تھا لیکن اب وولٹیج کم ہونے کی وجہ سے یکدم مدھم پڑ گیا تھا۔

"میں صبح لاہور جارہا ہوں۔" میں نے اسے مطلع کیا۔

"خیریت؟ کوئی ایمرجنسی آن پڑی کیا؟" اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ اسے ایمرجنسی تو نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن راحیلہ نے مجھے اطلاع عین وقت پر دی ہے۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی سالانہ میٹنگ ہے جس میں میری شرکت ضروری ہوتی ہے۔" میں نے بتایا۔

"کب تک واپس آجاؤ گے؟" اس نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"اگر کوئی اور ضروری کام نہ نکل آیا تو پرسوں لوٹ آؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے فون کردینا۔ میں تمہیں لینے ائرپورٹ آجاؤں گی۔ اپنے آدمیوں کو زحمت مت دینا۔ مجھے ائرپورٹ پر کسی کو ریسیو کرنا بہت اچھا لگتا ہے۔" اس کے لہجے میں ایک لمحے کے لئے نوخیز لڑکیوں کی سی معصومیت جھلک آئی۔

"کسی کو بھی ریسیو کرنا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں کسی کو بھی ریسیو کرنا۔" اس نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"پھر تو یہ میرے لئے کوئی اعزاز کی بات نہ ہوئی۔" میں نے ذرا مایوسی سے کہا۔

"تم سے کس نے کہا ہے کہ ہر بات میں اپنے لئے اعزاز تلاش کیا کرو؟" اس کی مسکراہٹ میں ہلکی سی شرارت جھلک آئی۔

"دراصل زندگی میں بہت کچھ غیر متوقع سے انداز میں مل گیا ہے۔ شاید اس لئے کچھ خوش فہم سا ہوتا جارہا ہوں۔"
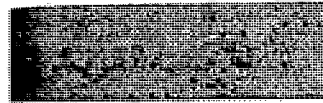
"یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ ابھی سے اپنا علاج کرا[illegible] بہتر ہے۔"

"مریض خود تو اپنا علاج نہیں کرسکتا نا۔ اور جو معالج مجھے آرہے ہیں وہ سب کے سب نکمے ہیں۔" میں نے افسردگی [illegible] سہلاتے ہوئے کہا "میری دائیں ٹانگ میں تکلیف ہوتی ہے [illegible] بائیں پر پلستر باندھ دیتے ہیں۔ اوپر کی داڑھ میں درد ہوتا ہے [illegible] کی داڑھ نکال دیتے ہیں۔ میں دردِ دل کی بات کرتا ہوں [illegible] پھیپڑوں کا علاج کرنے لگتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کر[illegible] کہاں جاؤں۔"

"تم کہیں بھی مت جاؤ۔ فی الحال میں جاتی ہوں۔" [illegible] کھڑی ہوئی۔

"کیا تمہیں کسی کو ائرپورٹ پر صرف ریسیو کرکے خوشی [illegible] ہے۔ سی آف کرنا اچھا نہیں لگتا؟" میں نے پوچھا۔

"سی آف کرنا تو اُداس کردینے والا کام ہے۔ اس میں [illegible] ہونے یا اچھا لگنے والی کون سی بات ہے؟ میں تمہیں چھوڑنے جاسکتی۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"میں تو صرف ایک دن کے لئے لاہور جارہا ہوں۔ کوئی [illegible] وغیرہ کرنے سمندر پار تو نہیں جارہا۔" میں نے دلیل دی۔

"کچھ بھی ہو۔ میں سی آف کرنے نہیں جاؤں گی۔" [illegible] فیصلہ سنایا۔

"اچھا بابا۔ تمہاری مرضی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "تم سی آف کرنے مت جانا لیکن میں دروازے تک تمہیں [illegible] کرنے چلتا ہوں۔"

اس کے ساتھ باہر جاتے وقت میں نے راستے میں امبر کے [illegible] میں رک کر اسے ہدایت کی کہ وہ میرے لئے صبح کی کسی [illegible] میں لاہور کے لئے بکنگ کرادے۔

امبر نے حیرت انگیز پھرتی دکھائی.... یا پھر شاید یہ ہمارے ٹریول [illegible] کی مستعدی تھی کہ میری واپسی تک میری سیٹ بک ہوچکی [illegible] میں زرتاج کو پارکنگ لاٹ تک چھوڑنے چلا گیا تھا۔ وہ اپنی [illegible] میں بیٹھنے لگی تو جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ وہ بولی "تم لاہور سے واپس آؤگے تو میں تمہیں ایک عورت سے ملادوں گی۔"

"بہت بہت شکریہ۔ کتنی اچھی ہوگئی ہو تم۔" میں نے انتہائی شکرگزارانہ لہجے میں کہا "کیا عمر ہے اس عورت کی اور کیا وہ تمہاری ہی طرح خوب صورت ہے؟"

اس نے غصے سے مجھے گھور کر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "وہ ایک ادھیڑ عمر بیوہ ہے اور عام سی شکل صورت کی مالک ہے۔"

"اوہ" میں نے کراہنے کے سے انداز میں کہا "اب میری یہ وقات رہ گئی ہے کہ میں ادھیڑ عمر بیواؤں سے ملا کروں؟"

"تمہاری تو یہ اوقات بھی نہیں ہے۔" زرتاج بولی "یہ تو میری مہربانی ہے کہ میں تمہیں اس سے ملوادوں گی۔ میری اس سے ملاقات ڈیفنس ہی کے ایک گھر میں خاصی گھریلو سی تقریب میں ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے وہ بھی ایک کیس ہے جو تمہارے لئے خاصا دلچسپ ثابت ہوسکتا ہے۔ اب تم نے باقاعدہ طور پر ایسے کاموں میں ٹانگ اڑانا شروع کردی ہے تو ایک کام یہ بھی سہی۔ تم لاہور سے واپس آجاؤ تو میں اس کی مزید تفصیلات معلوم کرکے تمہیں بتاؤں گی۔"

"بہت بہتر۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور وہ بجیرو میں بیٹھ کر رخصت ہوگئی۔

میں واپس آیا تو امبر نے بتایا کہ صبح ساڑھے نو بجے والی فلائٹ پر میری سیٹ بک ہوچکی تھی۔ میں نے اس کی اور ٹریول ایجنٹ کی مستعدی کی داد دی اور اسے ہدایت کی کہ وہ لاہور آفس کو میری آمد کی اطلاع دے دے تاکہ ائرپورٹ پر کوئی مجھے لینے آجائے۔

دوسرے روز میں گیارہ بجے لاہور پہنچ گیا۔ میرا خیال تھا کہ راحیلہ مجھے لینے آئی ہوگی لیکن ائرپورٹ پر ٹونی موجود تھا۔ وہ گرمجوشی سے مجھ سے گلے ملتے ہوئے بولا "سر! کچھ ایسا محسوس ہورہا ہے جیسے برسوں بعد آپ سے ملاقات ہورہی ہے۔"

"حالانکہ میں کراچی میں چند ماہ کا ہی عرصہ گزار کر آیا ہوں اور اس دوران میں بھی میرا ایک آدھ چکر لگا ہے۔" میں نے اس کے بازوؤں کے آہنی شکنجے سے آزاد ہوتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی سر! یہاں آپ کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔" وہ میرا بریف کیس لے کر پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"جلد ہی میں لمبے عرصے کے لئے یہاں ڈیرا ڈالنے آؤں گا۔" میں نے گویا اسے تسلی دی۔

ہم باتیں کرتے پارکنگ لاٹ تک جاپہنچے اور گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ کینٹ کے علاقے میں راحت بیکری والے چوک پر سگنل بند تھا۔ ٹونی نے گاڑی روک لی۔ ائرپورٹ کی طرف سے آنے والا کافی ٹریفک ہمارے دائیں بائیں موجود تھا۔ میں ٹونی کے برابر ہی پسنجر سیٹ پر موجود تھا اور اس سے دفتری معاملات کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے گاڑی کے رنگین شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔

اچانک میری نظر اپنے برابر رکی ہوئی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پر پڑی۔ اس گاڑی میں صرف ڈرائیور ہی موجود تھا لیکن وہ ڈرائیور کے بجائے خانساماں کی وردی میں نظر آرہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے سر پر خانساماؤں والی اونچی سی سفید ٹوپی بھی موجود تھی جبکہ اس کا اپنا قد بھی یقیناً خاصا لمبا تھا جس کی وجہ سے ٹوپی گاڑی کی چھت کو چھو رہی تھی۔

اسی لمحے اس نے بھی گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ ہماری گاڑی کے شیشے تو ٹینٹڈ تھے اس لئے وہ مجھے صاف طور پر نہیں دیکھ

سکتا تھا لیکن میں اسے صاف طور پر دیکھ رہا تھا۔ وہ طوطے کی چونچ جیسی ناک والا ایک سیاہ فام شخص تھا۔ سفید لمبی ٹوپی اور سفید بش کوٹ کے درمیان اس کا استخوانی سیاہ چہرہ ایک عجیب سا تضاد پیش کر رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے منہ پھیر کر گاڑی آگے بڑھا دی کیونکہ سگنل کھل چکا تھا لیکن اس چہرے کو دیکھ کر میرے ذہن میں کوئی سرخ بتی جلنے بجھنے لگی تھی۔ ٹونی بڑے اطمینان سے دھیمی رفتار سے گاڑی چلا رہا تھا جبکہ وہ خانساماں نما ڈرائیور یا ڈرائیور نما خانساماں اپنی بڑی سی پرانی ہنڈا سوک میں کافی آگے نکل چکا تھا۔

میرا ذہن اس کی صورت میں اٹک چکا تھا اور میں ٹونی سے بات کرنا بھول گیا تھا۔ عین اس وقت جب وہ گاڑی کافی آگے ایک موڑ پر بائیں طرف مڑتے وقت میری نظر سے اوجھل ہو رہی تھی تو میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔

مجھے یاد آگیا تھا کہ وہ شخص کون تھا۔ یاد آنے میں تاخیر اس لئے ہوئی تھی کہ میں اس وقت..... اس شہر میں..... اس جگہ..... اس حلئے میں اس شخص کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

وہ ڈاکٹر برنارڈ تھا!

میں نے بے اختیار ٹونی کا کندھا پکڑ کر اس طرح ہلایا کہ اس کے ہاتھوں میں اسٹیئرنگ وہیل بھی ہل گیا اور گاڑی ایک لمحے کے لیے بری طرح لہرا گئی۔ غنیمت تھا کہ کسی کو سائڈ نہیں لگی تھی۔

ٹونی نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے دبے دبے جوش کے ساتھ کہا۔ "ٹونی! تم نے وہ گاڑی دیکھی" میں نے موڑ کی طرف اشارہ کیا جہاں اب اس گاڑی کا نام و نشان بھی نہیں تھا البتہ دوسری کئی گاڑیاں جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

"کون سی گاڑی سر؟" اس نے وضاحت چاہی اور رفتار کچھ اور کم کر دی۔

"سفید رنگ کی وہ پرانی ہنڈا سوک جو اس موڑ پر غائب ہوئی ہے۔" میں نے اشارہ کیا "رفتار بڑھاؤ اور تیزی سے اس کا تعاقب کرو۔"

اس نے شاید اس گاڑی پر توجہ نہیں دی تھی تاہم اس نے رفتار بڑھا دی اور پچھلی گاڑیوں کی پروا کیے بغیر چند لمحے بعد موڑ کاٹا۔ مجھے یہ اطمینان تھا کہ برنارڈ ہماری گاڑی کے تاریک شیشوں کی وجہ سے مجھے نہیں دیکھ سکا ہوگا اس لیے وہ بروقت خطرے سے آگاہ نہیں ہو سکے گا اور اسے تاخیر سے تعاقب کا احساس ہوگا۔

ٹونی نے فوری طور پر میری ہدایت پر عمل شروع کر دیا تھا لیکن اس کا ذہن اصل کام کی طرف سے ابھی نہیں ہٹا تھا۔ اسے احساس

لیا تھا کہ کوئی نیا چکر شروع ہونے لگا تھا۔ اس لیے اس نے مجھے دلانے کی کوشش کی۔

"سر! وہ سالانہ میٹنگ......"

"ارے یار! بھاڑ میں گئی میٹنگ۔" میں نے بے تابی سے کہا۔ اس وقت جو آدمی مجھے نظر آیا ہے اسے پکڑنے کے لیے میں ہزاروں سالانہ میٹنگیں منسوخ کر سکتا ہوں" پھر میں نے اضافہ کیا۔ لیکن افسوس کہ میں ہزاروں سال تک زندہ نہیں رہوں گا۔"

گاڑی موڑ کاٹ کر والٹن کی طرف جانے والی سڑک پر آگئی تھی۔ یہ دیکھ کر میرا دل ڈوب گیا کہ اس سڑک پر دور دور تک اس سفید گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ کیا ڈاکٹر برنارڈ نے تاریک شیشوں کے باوجود مجھے دیکھ لیا تھا؟ اس صورت میں تو اس نے آندھی طوفان کی طرح گاڑی بھگائی ہوگی اور اس کا ہاتھ آنا بہت مشکل تھا۔

ٹونی نے بھی دیکھ لیا تھا کہ اس سڑک پر کوئی سفید گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے قدرے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔ "سر! اس گاڑی میں تھا کون؟ کیا کوئی بہت اہم آدمی ہے جسے پکڑنا ضروری ہے؟"

"میرا خیال ہے تمہیں بتا ہی دوں تاکہ تمہارے جسم میں بھی کرنٹ دوڑ جائے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "اس گاڑی میں ڈاکٹر برنارڈ تھا جسے ملک کے تمام بڑے بڑے شہروں میں نہ جانے کتنی آنکھیں تلاش کر رہی ہیں مگر ابھی تک اس کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ آج خوش قسمتی سے وہ نظر آہی گیا ہے تو اسے غائب نہیں ہونا چاہیے۔"

میرا اندازہ صحیح تھا۔ ٹونی کے جسم میں واقعی کرنٹ سا دوڑ گیا ہوگا کیوں کہ میں نے محسوس کیا، اسے جھٹکا سا لگا تھا اور اس نے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھا دی تھی۔ ٹونی کو بھی بہت اچھی طرح معلوم تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کون تھا اور ہمیں اس کی کیوں تلاش تھی۔ ہماری بے قاعدہ سی تنظیم "دی سرکل" جن جن لوگوں پر مشتمل تھی وہ بھی اپنی اپنی جگہ برنارڈ کی تلاش کے سلسلے میں اپنے گرد و پیش پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

میری جہاں تک بھی رسائی تھی اور میرے اپنے جتنے بھی وسائل تھے ان سب کو میں ایک عرصے سے ڈاکٹر برنارڈ کی تلاش کے سلسلے میں استعمال کر رہا تھا لیکن قسمت یاوری نہیں کر رہی تھی۔ آج جب کہ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا تو مجھے اس کی جھلک نظر آگئی تھی مگر وہ ایک واہمے کی طرح غائب ہو گیا تھا۔

ٹونی بولا۔ "اب مجھے یاد آرہا ہے ہمارے بائیں طرف جو گاڑی کھڑی تھی میں نے اس کے رنگ وغیرہ کی طرف تو توجہ نہیں دی تھی لیکن اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر مجھے کوئی بٹلر قسم کی شخصیت دکھائی دی تھی۔"

"بٹلر نہیں شیف۔" میں نے تصحیح کی۔ "وہ خانساماؤں والے حلئے میں تھا۔ سر پر اونچی سفید ٹوپی تھی۔"

"ہاں..... ہاں مجھے یاد آگیا۔" ٹونی جلدی سے بولا۔ "لیکن سر! وہ تو سیاہ فام تھا۔"

میں نے کراہ کر کہا۔ "تم بھول رہے ہو دوسرے تمام ساتھیوں کی طرح تمہیں بھی اطلاع دی گئی تھی کہ ڈاکٹر برنارڈ کی تلاش کے سلسلے میں نظر رکھتے وقت رنگت کو اہمیت نہ دی جائے۔ رنگت تبدیل کرنا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے تاہم میرے خیال میں وہ اپنی رنگت اس طرح پکے انداز میں تبدیل نہیں کرتا جس طرح اس نے راحیلہ کا آدھا چہرہ سیاہ کیا ہے۔ اپنی رنگت وہ غالباً عارضی بنیادوں پر تبدیل کرتا ہے۔ تاہم پچھلی مرتبہ جب وہ مجھے کراچی کے ایک جزیرے پر مقامی دیہاتی کے روپ میں دھوتی واسکٹ میں نظر آیا تھا تو اس وقت بھی وہ تقریباً سیاہ فام ہی بنا ہوا تھا۔ وہ کوئی بہت پرانا جدی پشتی قسم کا مکرانی نظر آرہا تھا۔ اب بھی اس کی رنگت تقریباً ویسی ہی تھی۔ کوئی بھی اسے دیکھ کر شبہ نہیں کر سکتا کہ وہ سفید فام ہوگا۔"

اب ہم دوراہے پر پہنچ چکے تھے۔ بائیں طرف سڑک والٹن ہی کی طرف جا رہی تھی لیکن دائیں طرف ذرا آگے مزید خم کھانے کے بعد کیولری گراؤنڈ کی طرف جا رہی تھی۔ ہمیں اب فیصلہ کرنا تھا کہ کس طرف جانا چاہیے۔

بائیں طرف کی سڑک تو دور تک صاف نظر آرہی تھی۔ اس پر کسی سفید گاڑی کا نام و نشان تک نظر نہیں آرہا تھا۔ دائیں طرف کی سڑک کا منظر ہم دور تک نہیں دیکھ پا رہے تھے۔ میں نے اسی پر قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ تاہم یہ محض اندھیرے میں تیر چلانے ہی کے مترادف تھا۔

اس سڑک پر بھی اگلا موڑ مڑنے کے بعد ہم کیولری گراؤنڈ کی طرف نکل آئے مگر سفید گاڑی کہیں نظر نہ آئی۔ سڑک دور تک صاف نظر آرہی تھی۔ میں نے ٹونی سے کہا۔ "اگر ڈاکٹر برنارڈ واقعی اس طرح جھلک دکھا کر نکل گیا تو میرے دل میں زندگی بھر کے لیے خلش رہ جائے گی۔ شاید میرے لیے راتوں کو سونا مشکل ہو جائے۔"

وہ ایک خم دار سی سڑک تھی۔ دائیں طرف میدان میں کچھ لوگ ورزش اور پریڈ کر رہے تھے۔ ٹونی اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پُرخیال لہجے میں بولا۔ "سر! ہم غلطی کر رہے ہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے اس کا مطلب سمجھتے ہوئے اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔ "گاڑی واپس موڑو۔ مجھے بھی ابھی خیال آیا ہے کہ اتنی جلدی وہ اتنی دور نہیں نکل سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ وہ چوکنا بھی نہیں ہوا تھا۔ وہ یقیناً راستے میں کسی گھر میں داخل ہوا ہے۔ ہم خواہ مخواہ اتنی دور نکل آئے۔"

ٹونی نے گاڑی واپس موڑی اور ہم اسی سڑک پر آگئے جس پر

ہمارے اندازے کے مطابق ڈاکٹر برنارڈ کسی گھر میں داخل ہوا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس سڑک پر بہت سے مکان تھے۔ سب ہی سڑک سے کافی ہٹ کر درختوں کی قطاروں کے عقب میں تھے اور تقریباً سب ہی کے گیٹ بند تھے۔

بہرحال ہم نے گاڑی کچے میں اتار کر اسے درختوں سے بچاتے ہوئے اِدھر اُدھر ہر گیٹ کی جھری وغیرہ سے جھانکنا شروع کیا کہ شاید کسی کوٹھی کے پورچ میں سفید گاڑی کی جھلک نظر آجائے۔ ایک گیٹ کا کچھ حصہ جنگلا نما تھا۔ اس کے عقب میں ہمیں ایک سفید گاڑی کی جھلک نظر آئی۔

ٹونی نے فوراً گاڑی روکی اور میں نے اس گیٹ پر جا کر باقاعدہ رکوع کی سی حالت میں جاتے ہوئے اندر جھانکا۔ وہ گاڑی سفید ضرور تھی مگر پرانی سوک نہیں تھی۔ اس وقت اگر کوئی ہماری طرف توجہ دیتا تو شاید یہی سمجھتا کہ ہم معززانہ حلیے اور معززانہ گاڑی میں ضرور تھے لیکن یقیناً کسی واردات پر نکلے ہوئے تھے۔ ہماری حرکات و سکنات سخت مشکوک تھیں مگر اچھی بات یہ تھی کہ اس سڑک پر تقریباً سناٹا ہی تھا۔ اِکا دُکا گاڑیاں گزرتی نظر آرہی تھیں۔

ہم نے گاڑی چھوڑ کر پیدل ہی قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ میں سڑک کی ایک طرف اور ٹونی دوسری طرف ہر گیٹ سے اندر جھانکنے کی کوشش کرنے لگا۔ یوں ہم کافی دور تک چلے آئے۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ کسی کوٹھی کے چوکیدار کی نظر ہم پر نہیں پڑی اور اس نے ہماری گردن ناپنے کی کوشش نہیں کی۔

اچانک ایک گیٹ کی ایک سائڈ سے جھانکتے ہوئے میری دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اس گھر کے پورچ میں وہ سفید گاڑی کھڑی تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس میں کوئی نہیں تھا بلکہ پورے گھر پر ہی ویرانی سی چھائی ہوئی تھی۔ کہیں بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس گھر میں چوکیدار بھی نہیں تھا۔

میں نے جلدی سے اشارہ کر کے ٹونی کو اپنے قریب بلایا اور نیچی آواز میں اسے بتایا کہ مطلوبہ گاڑی نظر آگئی تھی۔ پھر میں نے اسے ہدایت کی کہ وہ اپنی گاڑی وہیں لے آئے۔ وہ چیتے کی طرح بے آواز قدموں سے دوڑتا ہوا گیا اور چند سیکنڈ میں گاڑی لے کر آگیا۔ گاڑی اس نے گیٹ کے سامنے اس طرح کھڑی کر دی کہ اندر سے نکلنے والی کوئی گاڑی نہ گزر سکے۔

وہ گاڑی سے اتر آیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ گیٹ خاصا اونچا تھا اور صرف گیٹ پر ہی نہیں بلکہ چار دیواری پر بھی تیر نما نوکیلی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ ویسے تو ان سب باتوں کے باوجود میرے اور ٹونی کے لیے گیٹ یا دیوار پھلانگ جانا کوئی مسئلہ نہیں تھا لیکن میں نے یہی سوچا کہ شاید قسمت مزید ساتھ دے اور ہمارا مقصد سیدھے طریقے سے ہی پورا ہو جائے۔

بیل بجانے کے بعد میں نے اور ٹونی نے گیٹ کی سائڈوں سے

تاک جھانک بند کر دی۔ کوئی ہماری یہ حرکت دیکھ سکتا تھا۔ ہم دھڑکتے دلوں سے کسی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ ہمارے ہاتھ جیبوں میں اپنی اپنی گن کے دستے پر تھے۔ عین ممکن تھا کہ گیٹ کھولنے والا ڈاکٹر برنارڈ ہی ہوتا۔

چند لمحے بعد بغلی گیٹ کھلا اور اس کے عقب سے میرے لیے ایک اور حیرت برآمد ہوئی۔ وہ موٹے موٹے عدسوں کی عینک والا ایک ہونق سا نوجوان تھا جو دراز قد اور صحت مند ہونے کے باوجود مجہول نظر آتا تھا۔ اس کے لمبے گھنگریالے بال بکھرے ہوئے تھے۔ عینک ناک کی نوک پر پہنچی ہوئی تھی۔ منہ کھلا ہوا تھا اور چہرے پر حماقتوں کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ وہ سلیپنگ سوٹ میں تھا۔ پیروں میں ہوائی چپل تھی۔

میں نے پہلی نظر میں ہی اسے پہچان لیا۔ وہ وسیم احمد تھا! نہایت احمق نظر آنے والا وہ نوجوان میرا پرانا شناسا تھا۔ میں آج تک فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ سچ مچ احمق تھا یا اس نے اپنی ذہانت اور چالاکی کو حماقت کے پردے میں چھپا رکھا تھا۔ طویل عرصے سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور میں اسے تقریباً بھول چکا تھا۔

جہاں تک مجھے یاد تھا وہ اندرونِ شہر کسی پرانے اور گنجان علاقے میں رہتا تھا۔ اس کا مرحوم باپ چھوٹا موٹا صنعت کار تھا۔ اپنی وراثت وغیرہ حاصل کرنے کے ضمن میں وہ میرا شکر گزار

...آگاہ تھا لیکن اس وقت میرے کافی حد تک اس کے حالات سے... ذہن میں دور دور تک اس کا خیال نہیں تھا اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کوٹھی سے وہ برآمد ہو جائے گا۔ یہ خاصا مہنگا علاقہ تھا اور جس کوٹھی سے وہ نکلا تھا وہ بھی خاصی مہنگی دکھائی دے رہی تھی۔ میرے خیال میں یہ سب کچھ اس کی اوقات سے زیادہ تھا۔ اسے دیکھ کر میں اتنا حیران ہوا کہ وقتی طور پر ڈاکٹر برنارڈ کو بھول گیا۔ اس کے بعد خود وسیم احمد نے مجھے کافی کچھ بھلا دیا۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ موٹے عدسوں کے عقب میں اس کی آنکھیں اور بھی زیادہ پھٹی پھٹی دکھائی دے رہی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ مجھے پہچان کر بیک وقت بازو اور باچھیں پھیلاتے ہوئے یوں میری طرف لپکا جیسے مجھے گود میں اٹھا کر جذبات کی شدت میں زمین پر دے مارے گا لیکن میرا چونکہ اپنی جگہ سے ہلنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے وہ مجھ سے لپٹ تو گیا لیکن زور لگا کر رہ گیا۔ میں نے جنبش نہیں کی۔

وہ ہانپتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ میں اگر حیرت زدہ نہ ہوتا تو اسے اس حد تک بھی بے تکلفی کی اجازت نہ دیتا کہ وہ یوں احمقوں کی طرح مجھ سے لپٹ جاتا۔

"سر..... سر.....!" اس نے یوں دونوں ہاتھ پھیلائے گویا میری شان میں کوئی قصیدہ پڑھنے کے لیے اسٹارٹ لے رہا ہو..... "آپ تو چاند کی عید..... میرا مطلب ہے عید کا چاند ہوگئے ہیں۔ میں تو کئی بار آپ سے ملنے کے لیے آپ کے آفس بھی گیا لیکن آپ کے آفس والے مجھے لفٹ ہی نہیں کراتے۔ آپ کے بارے میں سیدھی طرح کچھ بتاتے ہی نہیں ہیں کہ آپ سے کب، کہاں اور کس طرح ملاقات ہو سکتی ہے۔ آپ انہیں بتاتے کیوں نہیں ہیں کہ میرے اور آپ کے تعلقات کتنے گہرے ہیں اور ہم کس زمانے سے ایک دوسرے کے دوست چلے آرہے ہیں۔"

وہ کچھ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے زمانۂ غار سے میرا دوست چلا آرہا تھا۔ اوّل تو اس سے میری شناسائی اتنی پرانی نہیں تھی۔ بھلا وہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا دوسرے یہ ابھی تک محض شناسائی ہی تھی۔ میں آج تک فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ اسے اپنے دوستوں میں شمار کروں یا نہیں؟ کبھی اتنی گہرائی سے غور کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ تاہم وہ ایک دلچسپ کردار تھا۔ میں اس کی ذات میں دلچسپی محسوس کرتا تھا اور اس کے بارے میں کسی حد تک تجسس میں بھی مبتلا تھا۔

"دراصل آفس والوں کو میں نے خود ہی منع کیا ہوا ہے کہ میرے بارے میں کسی کو بھی صحیح معلومات نہ دیا کریں۔" میں نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا۔

"وہ کیوں سر؟" اس نے گول گول آنکھیں گھمائیں۔

"بس..... حالات ہی کچھ ایسے ہیں" میں نے گول مول جواب دے کر اسے ٹالنے کی کوشش کی۔

"سر! آپ کے حالات ہمیشہ کچھ خطرناک سے ہی رہتے ہیں۔ آپ آدمی کچھ پُراسرار سے ہیں۔" اس نے یوں قہقہہ لگایا جیسے کوئی زوردار لطیفہ سنایا ہو۔ صرف یہی نہیں، اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مارنے کے لیے ہاتھ بھی اونچا کر لیا۔ مجبوراً مجھے ہاتھ آگے کرنا پڑا۔ میں اس وقت اس کی دل شکنی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میری آنکھ بنگلے کے پورچ پر لگی ہوئی تھی تاہم مجھے اطمینان تھا کہ سفید گاڑی پورچ میں موجود تھی تو وہ خبیث ڈاکٹر برنارڈ بھی اندر ہی موجود تھا۔ میں وسیم سے اطمینان سے اس کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا، ان دونوں کے درمیان کیا تعلق تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا، میرے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جسے سن کر وسیم بدک جائے۔

"ہنہہ..... میری پُراسراریت کو چھوڑو۔ تم خود مجھ سے کہیں زیادہ پُراسرار آدمی ہو" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ یہ گویا اس کے لیے تعریفی الفاظ تھے۔ اس نے خوش دلی سے ایک قہقہہ لگایا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اب یہی دیکھ لو نا کہ آخری مرتبہ میری تم سے ملاقات ہوئی تھی تو تم کرشن نگر میں کہیں رہتے تھے۔ تمہارے پاس پرانی سی ایک فوکسی تھی۔ آج ڈیفنس میں نظر آرہے ہو۔ پورچ میں دو معقول گاڑیاں بھی کھڑی ہیں۔ کیا چکر ہے؟ کہیں باہر کے پھیرے تو نہیں لگانے شروع کر دیے؟ کوئی پاؤڈر وغیرہ کی کمائی.....؟"

اس نے گویا ہنستے ہوئے دہرے ہونے کا ارادہ کیا لیکن پھر ملتوی کر دیا تاہم اس کی آنکھوں میں آنسو ضرور آگئے۔ اس نے اپنی موٹے موٹے شیشوں والی عینک اتار کر آنکھیں پونچھیں پھر عینک دوبارہ ناک پر جماتے ہوئے بولا۔ "آپ بھی بڑا شدید مذاق کرتے ہیں افضل بھائی! میں تو گاڑی میں ٹالکم پاؤڈر کا ڈبا لاتے ہوئے ڈرتا ہوں کہ کہیں کوئی اسے بھی دوسرا پاؤڈر سمجھ کر نہ دھر لے۔ ماچس اس خوف سے جیب میں نہیں رکھتا کہ کہیں آتش گیر مادہ اپنے قبضے میں رکھنے کے الزام میں اندر نہ ہو جاؤں۔ وہ دوسرے والا پاؤڈر ملک سے باہر لے جانے کی مجھ میں ہمت کہاں!"

"تو پھر یہ ترقی..... یہ ٹھاٹ باٹ.....؟" میں نے بنگلے کی طرف اشارہ کیا۔ ٹونی ایک ٹک وسیم احمد کو دیکھے جا رہا تھا۔

"یہ سب آپ کی مہربانیاں ہیں" وسیم احمد تشکر سے مغلوب لہجے میں بولا۔

"میری مہربانیاں.....؟" میں نے واقعی حیرت سے کہا۔ "بھئی یہ مہربانیاں میں نے کب کر ڈالیں کہ مجھے پتا ہی نہیں چلا؟"

"بس آپ کی مہربانیوں کی وجہ سے میرے گھریلو جھگڑے ختم ہوئے، کاروبار میرے ہاتھ میں آیا اور میں نے اسے پھیلانا شروع کیا تو بس یہ پھیلتا ہی جا رہا ہے۔ ابھی تو میرے ذہن میں ترقی کے بڑے بڑے منصوبے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک لہرا کر معدوم ہوگئی۔

جب وہ اس قسم کی بات کرتا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے گویا ایک غیر ارادی سی تبدیلی آتی تھی تب ہی مجھے شبہ ہوتا تھا کہ وہ درحقیقت وہ وسیم احمد نہیں تھا جو نظر آتا تھا۔ اس کے اندر ایک اور وسیم بھی رہتا تھا۔

وہ گویا اپنی اس لمحاتی تبدیلی سے بے خبر اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ابا کا جو چپل بنانے کا کارخانہ تھا وہ اس میں برسوں سے صرف دو تین ڈیزائن کی چپلیں بنائے جا رہے تھے۔ وہ چپلیں انہیں سب سے زیادہ مجھ پر ہی آزمانے کا شوق تھا۔ ان سے وہ اکثر میری پٹائی کیا کرتے تھے۔ جب سے ان کا انتقال ہوا ہے اور کاروبار میرے ہاتھ میں آیا ہے' میں نے اس میں بڑی جدّتیں کیں' دل کھول کر خرچ کیا۔ اسی حساب سے اس میں ترقی ہوئی۔ بینکوں سے قرضہ وغیرہ بھی ملنے لگا۔ اب تو کاروبار یوں جا رہا ہے......" اس نے ہاتھ سے یوں اشارہ کیا جیسے جہاز آسمان کی طرف جا رہا ہو۔

"مبارک ہو...... مبارک ہو۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "چلو تمہارے حالات میں تبدیلی کا پس منظر تو سمجھ میں آگیا۔ اب یہ بتاؤ کہ تم نے کالا سا...... لمبا سا وہ خانساماں کب سے رکھا ہے جس کی ناک طوطے کی طرح مڑی ہوئی ہے؟"

اس نے پلٹ کر ایک نظر اندر کی طرف دیکھا اور گویا خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولا۔ "عبدل کی بات کر رہے ہیں؟ بھئی بڑا ہی کمال کا نوکر ہے۔ آج کل اچھی بیوی اور اچھا نوکر قسمت سے ہی ملتے ہیں۔ بیوی تو مجھے بس یونہی گزارے لائق ہی ملی ہے لیکن نوکر بہت اچھا مل گیا ہے۔ ملٹی پرپز قسم کی چیز ہے۔ خانساماں بھی ہے' ڈرائیور بھی ہے' مالی بھی ہے...... فریج' ٹی وی' اے سی وغیرہ بھی ٹھیک کر لیتا ہے۔ گاڑی خراب ہو جائے تو اس کے نیچے بھی گھس کر لیٹ جاتا ہے۔ حیرت انگیز آدمی ہے۔ ایسا ہر فن مولا تو میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ جب سے وہ آیا ہے ہماری زندگی بڑی آسان سی ہو گئی ہے۔"

"ہوں' سمجھو تم نے ایک تنخواہ میں پورا اسٹاف رکھ لیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بے شک" اس نے جوش و خروش سے تائید میں سر ہلایا۔ "اور تنخواہ کا بھی کیا پوچھتے ہیں۔ بغیر تنخواہ طے کیے آزمائشی طور پر آیا تھا اور تنخواہ آج تک طے نہیں ہو سکی۔ اپنے منہ سے کچھ مانگتا ہی نہیں۔ جو دے دو' رکھ لیتا ہے اور نہ دو تو تقاضا ہی نہیں کرتا۔ ہم نے اسے ڈرتے ڈرتے رکھا تھا کہ نہ جانے کس قسم کا انسان ہو۔ اب ہمیں یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ ہمیں چھوڑ کر نہ چلا جائے۔ ہمیں اس جیسا دوسرا آدمی نہیں مل سکے گا۔"

میں نے دل میں سوچا۔ "اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ مزید کس کس ہنر سے واقف ہے تو شاید تم حیرت سے بے ہوش ہی ہو جاؤ اور پھر شاید تم اسے اپنے پاس رکھنے کے اتنے زیادہ خواہش مند نہ رہو۔"

"لیکن یہ تمہیں مل کہاں سے گیا؟" میں نے پوچھا۔

"بس...... یونہی سرِ راہ مل گیا تھا۔" وسیم نے جواب دیا۔ "کبھی کبھی کوئی بہت اچھی چیز راستے میں پڑی مل جاتی ہے۔ خصوصاً جب انسان کا ستارہ زوروں پر ہو...... اور آج کل شاید میری قسمت کا ستارہ زوروں پر ہے۔ ورنہ انسان کو کوئی معمولی سی چیز ڈھونڈے سے نہیں ملتی لیکن اپنا یہ عالم ہے کہ جس چیز کی تلاش ہوتی ہے وہ گویا خود ہی مجھے تلاش کرتی ہوئی چلی آتی ہے۔"

اس کا اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہونا شاید بجا تھا لیکن میں اس اتفاق پر حیران تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ نے کراچی سے فرار ہو کر لاہور پہنچ کر پناہ بھی لی تھی تو میرے ہی ایک پرانے شناسا کے گھر میں!

میرے خیال میں یہ محض اتفاق ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے پیچھے ریڈ ڈاٹ یا ڈاکٹر برنارڈ کا کوئی خاص مقصد پنہاں نہیں ہو سکتا تھا کیوں کہ انہیں یقیناً یہ معلوم نہیں تھا کہ وسیم احمد سے میری کوئی شناسائی تھی۔ جن دنوں میں ریڈ ڈاٹ سے الجھا ہوا تھا ان دنوں وسیم احمد سے کبھی میرا سامنا بھی نہیں ہوا تھا۔

وسیم کو گویا کوئی خیال آیا۔ چونکتے ہوئے بولا۔ "کیا ساری باتیں گیٹ پر کھڑے کھڑے ہی ہوتی رہیں گی؟ آیئے' اندر آیئے نا۔ ایک نو دولتیے کا دولت کدہ ملاحظہ فرمایئے اور ہو سکے تو کچھ مشوروں سے نوازیئے۔ آج دوپہر کا کھانا آپ کو میرے ساتھ کھانا پڑے گا۔ آج تو جو بھی دال دلیا تیار ہو گا وہی حاضر کیا جائے گا لیکن پھر کسی دن باقاعدہ پروگرام طے کر کے آپ کے اعزاز میں ایک پُر تکلف لنچ یا ڈنر کا اہتمام کیا جائے گا۔ امید ہے آپ اپنے اس خادم کی یہ دعوت قبول فرمائیں گے۔"

"پیارے خادم یہ بتاؤ کہ اس وقت تمہارا وہ ہر فن مولا قسم کا خانساماں کہاں ہو گا؟" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر پوچھا۔ وہ مجھے اندر چلنے کا اشارہ کر چکا تھا لیکن میں اندر قدم رکھنے سے پہلے اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ گھر کے کس حصے میں ہو گا۔

وسیم احمد نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "کچھ دیر پہلے وہ سودا سلف لے کر آیا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت وہ کچن میں ہو گا لیکن آپ اس کے بارے میں اس طرح کرید کرید کر کیوں پوچھ رہے ہیں؟ مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے جیسے آپ اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ مجھے آپ سے اس بدذوقی کی امید نہیں تھی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ ہے کہ تقریباً اسی سال کی عمر تک انسان اگر کسی خوب صورت خاتون کا پیچھا کرتے ہوئے کسی مکان تک پہنچے تب تو ٹھیک ہے لیکن ایک کالے بھجنگ' بانس نما خانساماں کا تعاقب کرتے ہوئے آنا اور پھر اس کی ٹوہ لینا تو بدذوقی ہی کہلائے گا۔ آخر آپ کو اس پکی عمر کے بنگالی میں کیوں اتنی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے؟"

"بنگالی......؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "تمہارے خیال میں وہ بنگالی ہے؟"

"اس نے مجھے یہی بتایا ہے۔" وسیم سادگی سے بولا۔

"شکر ہے اس نے تمہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ گزشتہ سال کے کسی مقابلۂ حسن میں اوّل آیا ہے۔ تم تو شاید اس پر بھی یقین کر لیتے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"جی ہاں' مجھے اس پر یقین کرنا ہی پڑتا۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "ججوں کا کیا بھروسا کہ وہ کب کس کو کس مقام پر فائز کر دیں لیکن اس صورت میں محض احتیاطاً میں اس سے مقابلۂ حسن میں شرکت کا سرٹیفکیٹ ضرور طلب کر لیتا۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "بہرحال آپ کو اس کے بنگالی ہونے پر شک کیوں ہے؟"

"تم نے اس سے پہلے زندگی میں کبھی اتنا لمبا بنگالی دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "یہ تو کوئی ایسی شک میں ڈالنے والی بات نہیں ہے۔ خصوصی کیس تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ کیا امریکیوں میں کوئی حد سے زیادہ پستہ قد نہیں ہو سکتا؟"

اس کی دلیل معقول تھی اور انہی باتوں کی بنا پر مجھے شبہ ہوتا تھا کہ وہ درحقیقت بے وقوف نہیں تھا۔ تاہم ڈاکٹر برنارڈ کے بارے میں اس کی دلیل بے کار تھی کیوں کہ اسے حقیقتِ حال کا اندازہ نہیں تھا اور مجھے یقین تھا کہ میں نے ڈاکٹر برنارڈ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔

اچانک ٹونی نے گھڑی دیکھی اور دبی دبی زبان میں بولا۔ "سر! وہ میٹنگ......!"

"بھاڑ میں ڈالو یار میٹنگ کو" میں نے بھی نیچی سی آواز میں جواب دیا۔ "کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ اس وقت میٹنگ سے کتنا زیادہ اہم معاملہ درپیش ہے؟"

"سر! میرا مطلب تھا کہ اس سے میں نمٹ لیتا ہوں۔ آپ میٹنگ میں پہنچ جائیں۔ میرے بغیر تو میٹنگ چل سکتی ہے لیکن اگر ہم دونوں ہی غائب ہوں گے تو......" وہ زیرِ لب بولا۔

"ذرا ٹھہر جاؤ...... یہیں سے فون کر دیں گے کہ آج میٹنگ ملتوی کر دی جائے۔ میٹنگ کل یا پرسوں یا ایک ہفتے بعد بھی ہو سکتی ہے لیکن ڈاکٹر برنارڈ اس دنیا کی بھیڑ میں نہ جانے کبھی برسوں بعد بھی ہاتھ آئے یا نہیں؟ اس کام کے لیے میں تمہیں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے دل کو اطمینان نہیں ہو گا۔ تمہیں شاید معلوم ہی ہو گا کہ کراچی میں یہ ایک جزیرے پر کتنے ہی لوگوں کے نرغے میں سے نکل گیا تھا۔ اب میں کوئی رسک لینا نہیں چاہتا۔ راحیلہ کو جب معلوم ہو گا کہ میٹنگ ملتوی کرنے کی وجہ کیا تھی تو وہ قطعاً احتجاج نہیں کرے گی اور دل ہی دل میں یقیناً خوش ہو گی۔"

وسیم احمد پھٹی پھٹی آنکھوں سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "آپ نے کچھ پُراسراری گفتگو شروع کر دی۔ میں کسی خطرے کی بو سونگھ رہا ہوں۔"

"شکر کرو کہ ہم نے بروقت آ کر تمہیں خطرے کی بو سنگھا دی ہے ڈیئر وسیم احمد!" میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "ورنہ تم کسی بڑی مصیبت میں پڑ سکتے تھے۔ تم نے اس ملٹی پرپز نوکر سے جتنے سکھ اٹھائے ہیں اس سے نہ جانے کتنے گنا زیادہ دکھ تمہیں جیل کی چار دیواری میں اٹھانے پڑ جاتے۔"

"کیا واقعی؟" موٹے موٹے شیشوں کے عقب میں اس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ "مجھے یہ تو پتا چلا تھا کہ غیر قانونی تارکینِ وطن کو وطن میں ملازم رکھنے کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی ہونے لگی ہے لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ معاملہ اتنا زیادہ سنگین ہو چکا ہے کہ جیل وغیرہ جانے کی نوبت بھی آ سکتی ہے۔"

"یہ غیر قانونی تارکینِ وطن والا معاملہ نہیں ہے پیارے! تمہارا وہ نام نہاد خانساماں عبدل سرے سے بنگالی ہی نہیں ہے۔ معلوم نہیں تم کیوں اسے بنگالی سمجھنے پر تلے ہوئے ہو۔ وہ تم سے کس زبان میں بات کرتا ہے؟"

"ٹوٹی پھوٹی اردو میں' بالکل بنگالیوں کی طرح۔" وسیم نے جواب دیا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ بنگالی ہرگز نہیں ہے وہ سفید فام ہے۔ کئی خفیہ ایجنسیاں اس کی تلاش میں ہیں۔ اسے ملک سے فرار ہونے سے روکنے کے لیے تمام ہوائی اڈوں اور جائز و ناجائز سمندری راستوں کی نگرانی ہو رہی ہے۔ وہ شاید فرار ہونے کے لیے صرف کسی مناسب موقع کا انتظار کر رہا ہے یا پھر اس کا کوئی کام یہاں اٹکا ہوا ہے ورنہ شاید وہ تمام حفاظتی تدابیر کے باوجود اب تک نکل چکا ہوتا۔ غالباً صرف اسی چکر میں وہ تم جیسے بے وقوفوں کے ہاں وقت گزارتا پھر رہا ہے۔ اگر وہ کسی ایجنسی کے ہتھے چڑھ جاتا تو اسے پناہ دینے کے چکر میں تم بھی لپیٹ میں آ سکتے تھے اور تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ خطرناک بین الاقوامی مجرموں کے چکر میں جو لوگ لپیٹ میں آتے ہیں ان کا حال بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں رہتا۔"

وسیم احمد کی آنکھیں بدستور پھیلی رہیں اور وہ تھوک نگل کر بولا۔ "سر! کیا واقعی آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں؟ آپ کو یقین ہے کہ آپ کو غلط فہمی نہیں ہوئی؟"

"احمقانہ باتیں مت کرو اور شکر کرو کہ یہ معاملہ میرے علم میں آنے کی وجہ سے تم کسی بڑی مصیبت سے بچ گئے ہو۔ ہم اسے پہچان کر اتنی دور سے اس کے پیچھے بھاگے چلے آ رہے ہیں۔ اب ہم بالا بالا ہی اسے پکڑ کر لے جائیں گے اور تمہارا ذکر بیچ میں نہیں آنے دیں گے۔ کسی کو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ اسے تمہارے ہاں سے پکڑا گیا تھا۔"

"بہت شکریہ سر!" اس نے گویا اطمینان کی سانس لی اور سر

کھجاتے ہوئے کہا "گستاخی معاف' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ اس معاملے سے آپ کا کیا تعلق ہے؟"

اسے یقیناً خیال آیا ہوگا کہ میں کوئی سرکاری آدمی تو نہیں تھا۔ میں کیوں اتنے زور شور سے خود ہی کارروائی کرنے پر تُلا ہوا تھا؟

میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "ابھی تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ میں کچھ پُراسرار سا آدمی ہوں۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں کہ کس کس معاملے سے میرا کیا تعلق ہے۔ ہر بات تو بتانے کی نہیں ہوتی اور اگر بتائی بھی جائے تو اس کا کوئی مناسب وقت ہوتا ہے۔"

"ہاں' یہ بھی ٹھیک ہے۔" اس نے سرہلاتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں کہا پھر گیٹ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "کیا میں اندر جا کر اس سے کہوں کہ آپ لوگ اسے لینے آئے ہیں؟"

"وسیم پیارے! اچھی بھلی عقل کی باتیں کرتے کرتے یکدم اتنی سادگی پر مت اتر آیا کرو۔" میں نے کراہ کر کہا۔ "تمہارا خیال ہے کہ تمہاری بات سن کر وہ سعادت مندی سے سرجھکائے تمہارے پیچھے پیچھے چلا آئے گا؟"

"ابھی تک تو وہ ایسا ہی سعادت مند رہا ہے۔" وسیم نے جواب دیا۔

"تمہاری بات سنتے ہی اسے خطرے کا احساس ہوجائے گا اور جونہی اسے خطرے کا احساس ہوگا' تم اس کی سعادت مندی کو یاد کرتے رہ جاؤ گے۔"

"تو پھر......؟"

"ہم تمہارے ساتھ اندر چل رہے ہیں۔ ہم خود ہی اس سے نمٹ لیں گے۔ تم صرف ہماری رہنمائی کرو کہ وہ کہاں موجود ہوگا۔ اس کے بعد تم خود ذرا الگ تھلگ ہی رہنا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس چکر میں تمہیں کوئی نقصان پہنچے۔" میں نے کہا۔

"سر! آپ تو واقعی مجھے ڈرا رہے ہیں" وہ کچھ سہم کر بولا۔ "مجھے کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے اب تک میں نے گھر میں کسی خوفناک ڈاکو کو پناہ دے رکھی تھی جس نے سو پچاس قتل کیے ہوئے ہیں۔ مجھے تو وہ بہت بے ضرر سا لگتا ہے۔"

"یہی بات تو اس قسم کے لوگوں کو زیادہ خطرناک بناتی ہے کہ یہ بظاہر بے ضرر نظر آتے ہیں۔ ایک خوف ناک ڈاکو جس نے سو پچاس قتل کیے ہوں وہ تو شکل سے ہی کسی نہ کسی حد تک خطرناک اور خونی نظر آنے لگتا ہے۔ انسان اسے دیکھ کر ہی ہوشیار ہوسکتا ہے۔ اس سے بچاؤ کی کوئی تدبیر کرسکتا ہے لیکن اس قسم کے لوگ جو پوری پوری قوموں کے قتل کی سازش میں شریک ہوتے ہیں اور بقول تم جیسے بے وقوفوں کے' بالکل بے ضرر نظر آتے ہیں وہ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں اور یہ بدبخت تو بانس جیسے جسم کا مالک اور ایک ڈاکٹر و سرجن ہونے کے باوجود انفرادی طور پر بھی بڑا خطرناک ہے۔

یہ پرانے تربیت یافتہ کمانڈوز کے گھیرے سے بھی نکل سکتا ہے' راہ میں آنے والے کسی بھی شخص کو قتل کرسکتا ہے۔"

"یقین نہیں آرہا سر!" وسیم سر جھٹک کر بولا۔

"جن لوگوں نے اس قسم کے لوگوں کا اصل روپ نہیں دیکھا ہوتا' انہیں واقعی یقین نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "چلو' اب چلو۔"

"سر! عبدل مجھے بہت یاد آئے گا۔" وسیم غم زدہ سے لہجے میں بولا۔ "کیا وہ واقعی سفید فام ہے؟ کوئی سفید فام ایسا سیاہ فام نظر آسکتا ہے؟"

"یہ شاید اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ اس قسم کے شاید تھوک کے حساب سے اس کی جیب میں پڑے رہتے ہیں۔ اسی لیے تو وہ اتنی آسانی سے ہمارے نہ جانے کس کس شہر میں' کس کی آنکھوں میں کب سے دھول جھونکتا پھر رہا ہے۔"

میں اور ٹونی اس کے پیچھے پیچھے چل دیے۔ میں رومال سے منہ صاف کرنے کے بہانے اپنا چہرہ تقریباً چھپائے ہوئے تھا۔ ویسے بھی اس وقت فیلٹ ہیٹ سر پر رکھے ہوئے تھا اور اس سنہرے فریم کی تاریک شیشوں والی عینک بھی لگا رکھی تھی۔ اسے فوری طور پر پہچاننا مشکل تھا۔ ویسے بھی ہم وسیم کے پیچھے ایک چھوٹی سی قطار کی صورت میں چل رہے تھے تاکہ سامنے سے فوری طور پر کوئی ہمیں اچھی طرح نہ دیکھ سکے۔

اس طرح ہم ڈرائنگ روم میں جا پہنچے۔ وسیم بولا۔ "آپ اطمینان سے بیٹھیے...... میں ابھی معلوم کرکے آپ کو بتاتا ہوں عبدل اس وقت کہاں ہے۔"

"ہم یہاں اطمینان سے بیٹھنے نہیں آئے وسیم ڈیئر!" میں اِدھر اُدھر دیکھ کر مکان کی ساخت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔ مکان بہرحال زیادہ عالی شان اور زیادہ بڑا نہیں تھا۔ "تم ذرا جلدی دیکھ کر بتاؤ وہ کہاں ہے اور وہاں تک ہماری رہنمائی کرکے اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ اپنے اہلِ خانہ کو بھی اپنے کمرے تک محدود رکھنا اور کسی بھی حال میں وہاں سے نہ نکلنا۔"

"کیا خون خرابے کا خطرہ ہے؟" وہ ایک بار پھر سہم کر بولا۔

"کوشش تو ہماری یہی ہوگی کہ خون خرابا نہ ہو۔ ہم اسے زندہ سلامت قابو میں کرنا چاہتے ہیں۔ فی الحال ہمیں بھی اس کی خیر عافیت بہت عزیز ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اسے کمرے سے جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی دوران میں ایک ادھیڑ عمر عورت نے کمرے میں جھانکا۔ وہ ملازمہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک نظر ہمیں دیکھ کر وسیم سے مخاطب ہوئی۔ "مہمان آئے ہیں صاحب جی؟ کچھ کھانے پینے کو لاؤں؟"

وسیم نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر اس کے قریب جا کر نیچی آواز میں بولا۔ "عبدل اس وقت کہاں ہے؟"

"کچن میں ہے صاحب جی! کھانا پکا رہا ہے۔ کیوں؟" وہ شاید اس کے رازدارانہ انداز پر قدرے حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"ہیں...... ٹھیک ہے۔ تم بیگم صاحب کے پاس کمرے میں جاؤ اور دروازہ بند کرلو۔ میں بھی ایک منٹ میں آرہا ہوں۔" وسیم بولا۔

ملازمہ اس کی ہدایت کے مطابق رخصت تو ہوگئی لیکن اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سخت تشویش میں مبتلا ہوچکی تھی۔ وسیم خود بھی کچھ کم دہشت زدہ نہیں تھا۔ شاید بے چارہ اس گھڑی کو کوس رہا تھا جب اس نے کال بیل سن کر گیٹ کھولا تھا۔ تاہم اس نے ہمیں اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

ہم دبے پاؤں اس کے پیچھے چلنے لگے۔ ڈرائنگ روم سے ہم لاؤنج میں آئے۔ یہاں قالین نہیں تھا۔ اس لیے ہمیں اپنی آہٹ کو دبانے میں اور بھی احتیاط کرنا پڑی۔ کچن اسی کشادہ لاؤنج کے ایک سرے پر تھا۔ وہاں سے برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ اور کسی کی دھیمی سی سیٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ آوازوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ کوئی بڑے انہماک سے کچن میں کام میں مصروف تھا۔

پھر ایک مشین کے چلنے کی بھی آواز آئی۔ غالباً گرائنڈر میں مسالا پیسا جارہا تھا۔ وسیم سرگوشی میں بولا۔ "وہ مصروف ہے۔"

"میرا خیال ہے عقبی لان کی طرف کچن کا دوسرا دروازہ بھی ہے؟" میں نے سرگوشی میں ہی تصدیق چاہی۔

وسیم نے اثبات میں سرہلایا۔ ہم ایک طرف لاؤنج کی دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ کچن کا دروازہ کھلا تھا اور کسی بھی لمحے ڈاکٹر برنارڈ عرف عبدل اچانک باہر آسکتا تھا۔ اس صورت میں بھی اسے یقیناً حیرت کا شدید جھٹکا لگتا۔ میں اسے سرپرائز ہی دینا چاہتا تھا لیکن بہتر یہی تھا کہ میں کچن میں جا کر ہی اسے سرپرائز دیتا۔ کچن اس کے لیے زیادہ بہتر چوہے دان ثابت ہوسکتا تھا۔

میں نے ٹونی کو اشارہ کیا۔ وہ بلی کی طرح دبے قدموں واپس ڈرائنگ روم کی طرف چلا گیا تاکہ اس کے دروازے سے نکل کر تھوڑا سا چکر کاٹ کر کچن کے عقبی دروازے پر پہنچ جائے اور ڈاکٹر برنارڈ کے اِدھر سے فرار ہونے کا امکان نہ رہے۔ گن اب اس کے ہاتھ میں تھی۔

میں چاہتا تھا کہ لاؤنج کے اس دروازے کا بھی بولٹ چڑھا دوں جو ڈرائیو وے کی طرف کھلتا تھا اور ساتھ ہی میں نے ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی بند کرلینے کے بارے میں سوچا کیوں کہ میں ڈاکٹر برنارڈ کے لیے کوئی راہِ فرار چھوڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کردیا کیوں کہ کھٹر پٹر کی ذرا سی بھی آواز ہوتی تو ڈاکٹر برنارڈ جھانک کر باہر دیکھ سکتا تھا۔

میرے ہاتھ میں اب میرا مخصوص مشین پسٹل موجود تھا۔ میں نے وسیم کو اشارہ کیا کہ وہ اپنے کمرے میں چلا جائے۔ وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا بلی کی طرح بے آواز قدموں سے رخصت ہوگیا۔

گرائنڈر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد دوبارہ گھوں گھوں کرنے لگا تھا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر برنارڈ کو سرپرائز دینے کے لیے یہ لمحات موزوں تھے جب وہ گرائنڈر پر مصروف تھا۔

میں ذرا سی بھی آہٹ پیدا کیے بغیر کچن کے کھلے دروازے کے قریب جا پہنچا لیکن میں دروازے کے سامنے نہیں تھا' کچن کی دیوار سے چپکا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جونہی گرائنڈر خاموش ہوگا' میں کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہوں گا۔

"ہیلو ڈاکٹر برنارڈ! میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ تم سے ملاقات ایک کچن میں ہوگی جہاں تم دنیائے طب کا کوئی حیرت انگیز آپریشن کرنے کے بجائے ہنڈیا پکا رہے ہوگے......"

مجھے یقین تھا کہ پہلے وہ انجان بننے کی کوشش کرے گا جیسے میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ پھر وہ تردید کرنے کی پوری پوری کوشش کرے گا کہ وہ ڈاکٹر برنارڈ ہرگز نہیں ہے اور وہ تو اس نام کے کسی آدمی کو جانتا تک نہیں' وہ تو صرف اور صرف عبدل ہے۔

گرائنڈر کے خاموش ہوتے ہی میں نے کچن میں قدم رکھا اور میری خیال آرائی دھری کی دھری رہ گئی۔ میری "ہیلو" میرے ہونٹوں پر نہ آسکی۔ اپنی باقی مختصر تقریر تو میں ویسے ہی بھول گیا کیوں کہ کچن خالی تھا!

گرائنڈر کا شاید ٹائمر سیٹ کیا گیا تھا جس کی وجہ سے وقفے وقفے سے وہ خود ہی چل رہا تھا اور بند ہورہا تھا۔ میں نے ایک لمحے میں پورے کچن کا جائزہ لے ڈالا۔ عقبی دروازہ بند تھا۔ کیا وہ ٹونی کے اِدھر پہنچنے سے پہلے ہی نکل چکا تھا؟ یا پھر ملازمہ کی اطلاع غلط تھی؟ یہ سوالات بھی اسی ایک لمحے میں میرے ذہن میں ابھرے تھے۔ میرا مشین پسٹل والا ہاتھ اٹھا کا اٹھا ہی رہ گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میری سمجھ میں آگیا کہ وہ کہاں ہوسکتا تھا مگر عین اسی لمحے میری آنکھوں کے سامنے برق سی کوندی۔ میرے بائیں ہاتھ پر بڑا سا فریج تھا اور وہ اس کے پہلو میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹیل کا ایک بڑا سا جھلملاتا ہوا چاپر تھا جس سے گوشت کے ٹکڑے کاٹے جاتے ہیں۔

اگر میں نے اپنا مشین پسٹل والا ہاتھ پیچھے کرنے میں ایک ثانیے کی بھی تاخیر کی ہوتی تو میرا ہاتھ مشین پسٹل سمیت کٹ کر دور جا گرا ہوتا اور اگر اس کے بعد بھی مجھے زندہ رہنا نصیب ہوتا تو کم از کم پیٹھ پیچھے لوگ مجھے افضل ٹُنڈا کے نام سے یاد کیا کرتے۔

بجائے اس کے کہ میں ڈاکٹر برنارڈ کو سرپرائز دیتا' اس نے مجھے سرپرائز دے دیا تھا۔ اپنا اتنا زوردار وار خالی جانے پر بھی وہ اپنی جھونک میں آگے نہیں آیا بلکہ جس رفتار سے اس کا ہاتھ آگے کی طرف گھوما تھا' اسی تیزی سے واپس آیا اور اس دوران میں چاپر کا رخ تبدیل ہوچکا تھا۔

میں نے بھی اسی جیسی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشینی انداز

میں اپنا چہرہ پیچھے کر لیا ورنہ شاید چاپر میرے چہرے پر پڑا ہوتا اور میرا چہرہ ترچھے رخ سے دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا۔ میں بس اضطراری طور پر ہی اس وار سے بھی بچ گیا تھا ورنہ میں تو درحقیقت اس کے پہلے وار کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ مجھے تو کچن میں قدم رکھتے وقت کسی حملے کی توقع ہی نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ نے اگر کچھ کیا بھی تو اس وقت کرسکے گا جب وہ میرے دیے ہوئے سرپرائز کے اثر سے سنبھل جائے گا۔

سچی بات یہ تھی کہ اب میرے لیے اس کے دیے ہوئے سرپرائز سے سنبھلنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کا ہاتھ جب الٹا گھومتا ہوا واپس آیا اور میں نے اپنے چہرے کو چاپر سے بچالیا تو چاپر "کھچ" کی زوردار آواز کے ساتھ فریج کے دروازے میں پیوست ہو گیا۔

اسی لمحے میں نے مشین پسٹل کا دستہ اس کی پیشانی پر رسید کیا۔ حقیقت یہ تھی کہ مشین پسٹل صرف اسے دھمکانے اور اس سے اپنا حکم منوانے کے لیے تھا ورنہ میں اس پر گولی چلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو اسے زخمی بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میری تو خواہش یہی تھی کہ وہ بالکل صحیح حالت میں بہ قائمی ہوش و حواس ہمارے ہاتھ میں آجائے کیوں کہ مجھے راحیلہ کے چہرے کی رنگت ٹھیک کرانے کے لیے اس کی ضرورت تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اس حالت میں ہمارے ہاتھ میں آئے کہ اس کے ہاتھ پاؤں اور دماغ بالکل ٹھیک کام کر رہا ہو۔

میں نے اس کی پیشانی پر پسٹل کا دستہ بھی مجبوراً رسید کیا تھا کیوں کہ اس وقت جو کچھ بھی کرنا تھا فوری طور پر کرنا تھا ورنہ چاپر تیسری مرتبہ بھی قوس کی صورت میں گھومتا ہوا واپس آسکتا تھا اور اس بار شاید میری پسلیاں اس کی زد میں ہوتیں۔

میں نے چاپر کی واپسی سے بچتے ہوئے اس کی پیشانی پر پسٹل کا دستہ رسید کیا تھا اور میرا خیال تھا کہ اس ضرب سے وہ وہیں ڈھیر ہو جائے گا لیکن یہ آرزو پوری نہیں ہو سکی۔ اس کا سر شاید لوہے کا بنا ہوا تھا۔ چاپر تو وہیں فریج کے دروازے میں پیوست رہ گیا۔ برنارڈ کا سر پیچھے دیوار سے ٹکرایا۔ گویا اسے دو طرف سے چوٹ لگی تھی سامنے سے میں نے پسٹل کا دستہ رسید کیا تھا اور پیچھے سے سر دیوار سے ٹکرایا تھا۔ اس کے باوجود اس کے حواس پر ایک لمحے کے لیے کوئی اثر نہ پڑا۔ بجلی کی سی تیزی سے سر جھکاتے ہوئے اس نے بکرے کی طرح میرے پیٹ پر ٹکر رسید کی۔

مجھے کچھ ایسا ہی لگا جیسے کسی نے بھاری شہتیر کا سرا پوری قوت سے میرے پیٹ میں دے مارا تھا۔ آنتیں گویا اچھل کر حلق میں آگئیں۔ میری کمر پیچھے ماربل کے کاؤنٹر سے ٹکرائی۔ مجھے یوں لگا جیسے میری ریڑھ کی ہڈی کو کسی نے کلہاڑی سے دو ٹکڑے کر دیا تھا۔ میرے جسم کے نچلے حصے میں یکدم گویا بجلی کا کوئی سوئچ آف ہو گیا اور نچلا دھڑ جیسے یک لخت بے جان ہو گیا۔ ٹانگیں شل ہو گئیں۔ میں فرش پر گر پڑا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ میں ٹکر لگنے کی وجہ سے نہیں گرا تھا بلکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ یکہ میری ٹانگوں نے میرے جسم کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا تھا۔ وحشت سے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ ریڑھ کی ہڈی پر بعض اوقات کسی خاص زا... سے چوٹ لگ جائے تو دماغ کا ایک خاص حصہ متاثر ہو جاتا۔ انسان عمر بھر کے لیے مفلوج بھی ہو سکتا ہے۔ اس کی باقی زندگی یا وہیل چیئر پر ہی گزر سکتی ہے۔ اس احساس نے مجھے دہشت زدہ کر دیا تھا کہ کہیں میرے ساتھ ناگہانی طور پر ایسا ہی تو نہیں ہوا تھا؟

اس وقت تک ڈاکٹر برنارڈ ایک چھلاوے کی طرح پھلانگ کر کچن سے نکل چکا تھا۔ مجھ میں گویا اس کی فکر کرنے کے بارے میں سوچنے کی سکت ہی نہیں رہی تھی لیکن جونہی دھپ سے فرش پر گرا تو گویا ایک معجزہ سا ہوا۔ میرے نچلے دھڑ میں سوئچ آف ہوا تھا وہ گویا آن ہو گیا۔ برقی رو منقطع رہنے کا وقفہ گویا صرف ایک لمحے تک ہی محدود رہا لیکن اس ایک لمحے میں ہی مجھ پر قیامت سی گزر گئی۔ صرف ایک لمحے میں میرا جسم پسینے سے تر ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے جب میں نے محسوس کیا کہ میں اٹھ سکتا ہوں تو میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے پیچھے بھاگا لیکن اس ایک لمحے کے تجربے نے میرے اعصاب مرتعش کر دیے تھے۔ میرا مشین پسٹل وہیں کہیں گر گیا تھا۔ میں نے اسے اٹھانے کے چکر میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور خالی ہاتھ ہی ڈاکٹر برنارڈ کے تعاقب میں بھاگا۔ برنارڈ کا چاپر بھی فریج کے بالائی حصے میں پیوست ہی رہ گیا تھا اور ابھی تک ہولے ہولے لرز رہا تھا۔

لاؤنج میں آکر مجھے یہ سمجھنے میں ایک لمحہ لگ گیا کہ وہ لاؤنج کے دروازے سے ہی پورچ کی طرف نکل گیا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں نہیں گیا تھا۔ میں تیزی سے نیم وا دروازے سے نکلا تو وہ پورچ کا چھت والا حصہ عبور کر کے ڈرائیو وے میں پہنچ چکا تھا۔

اس کی ٹوپی جو مجھے ٹکر رسید کرتے وقت پچک چکی تھی راستے میں گری پڑی تھی اور وہ اولمپک ریس میں حصہ لینے والے کھلاڑی کی طرح گیٹ کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔ اس کی لمبی لمبی ٹانگیں بانسوں کی طرح لیکن مشینی انداز میں حرکت کر رہی تھیں۔ گیٹ مقفل تھا لیکن مجھے معلوم تھا، وہ تالا کھولنے کی زحمت نہیں کرے گا۔ اس سے کم وقت میں وہ نہایت آسانی سے گیٹ پھلانگ جائے گا۔ ایک بار وہ گلیوں میں نکل جاتا تو پھر اسے پکڑنا محال تھا۔ میرے پاس مشین پسٹل بھی نہیں رہا تھا۔ اسے روکنے کے لیے میں اس کی ٹانگ پر فائر بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک لمحے کے لیے مایوسی کی لہر نے مجھ پر غلبہ پایا لیکن میں نے فوراً ہی اس سے نجات پاتے ہوئے اونچے برآمدے سے پورچ تک ایک لمبی زقند لگائی۔ عین اسی وقت میں نے دیکھا، مکان کے پہلے

کونے کی آڑ سے اچانک ایک گٹھری سی لڑھکتی ہوئی نکلی اور ڈاکٹر برنارڈ کے راستے میں آگئی۔

برنارڈ نہ تو سنبھل سکا اور نہ ہی بروقت اسے پھلانگ سکا۔ وہ اس میں الجھ کر اس کے اوپر سے ہوتا ہوا ڈرائیو وے میں قلابازی کھا گیا۔ اس وقت تک میں دیکھ چکا تھا کہ وہ "گٹھری" دراصل وسیم احمد تھا۔ وہ مکان کے کونے والے دروازے سے نکل کر تقریباً اکڑوں سی حالت میں اچانک ہی پھدک کر برنارڈ کے راستے میں آگیا تھا۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ اسی طرح اکڑوں سی حالت میں ڈرائیو وے کو کراس کرنے کے لیے نکلا ہو اور غلطی سے برنارڈ کے راستے میں آگیا ہو۔ غلطی بھی ایسی جو اس سے نادانستگی میں سرزد ہوئی ہو کیونکہ اس دروازے سے اچانک نکلنے والے کو واقعی علم نہیں ہو سکتا تھا کہ دوسری طرف سے کوئی آرہا تھا۔

میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اس طرح اچانک مجھے کوئی مدد میسر آجائے گی۔ اس سے پہلے کہ برنارڈ اٹھ پاتا، میں نے وسیم کو پھلانگتے ہوئے اس پر چھلانگ لگادی اور اسے دبوچ لیا مگر اسے دبوچنا گویا کسی آکٹوپس کو دبوچنے کے برابر تھا۔

اس کے ہاتھ پاؤں یوں تو عام انسانوں کی طرح دو دو ہی تھے لیکن وہ جس بری طرح مچلا، تڑپا اور جس طرح اس نے میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی، اس سے کچھ یوں لگا جیسے وہ کئی بازوؤں اور کئی ٹانگوں کا مالک تھا۔ اس کے بازو اور ٹانگیں آکٹوپس ہی کی طرح لجلجی بھی تھیں اور ان میں ویسی ہی لچک بھی تھی لیکن وہ فولاد کی طرح مضبوط بھی تھیں۔

ایک بار تو مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ میری تمام تر طاقت، مہارت اور مضبوطی کے باوجود وہ میری گرفت سے نکل جائے گا لیکن عین اس وقت ٹونی وہاں آن پہنچا۔ اسے غالباً اندازہ ہو چکا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہو گئی تھی اور وہ عقبی لان سے دوڑا دوڑا آیا تھا۔

سچی بات یہ تھی کہ اس وقت تک مجھے اپنے طریقۂ کار پر پچھتاوا ہونے لگا تھا۔ ہم نے خواہ مخواہ ہی خوش فہمی میں رہتے ہوئے اپنی دانست میں اسے بے خبری میں جا دبوچنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے یقیناً کہیں سے ہمیں دیکھ لیا تھا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ وہ تاخیر سے ہماری آمد کے بارے میں باخبر ہوا تھا۔ اگر ذرا پہلے باخبر ہوا ہوتا تو وہ یقیناً عقبی دروازے سے نکل چکا ہوتا اور ہم ایک بار پھر اس سانپ کے نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔

اب جب کہ یہ سانپ میرے ہاتھوں میں پھسل جانے کو تھا تو میرا دل چاہ رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پختہ فرش سے ٹکرا دوں اور اس وقت تک ٹکراتا رہوں جب تک وہ ملغوبے میں تبدیل نہ ہو جائے۔ اگر اسے صحیح سلامت پکڑنے کا مسئلہ درپیش نہ ہوتا تو شاید میں ایسا کر گزرتا۔

ٹونی نے سوچ بچار یا الجھن میں وقت ضائع نہیں کیا اور نہ ہی اس نے اپنے ہاتھوں کو زحمت دی۔ ویسے بھی اس کے ہاتھ میں گن تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ برنارڈ میری گرفت میں پوری طور پر نہیں آسکا تھا اور پھسل کر نکل جانے کو تھا تو اس نے اس کی کنپٹی پر پاؤں سے ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔

اس ٹھوکر کے پیچھے اس کی جھنجلاہٹ بھی کام کر رہی تھی کہ میں نے اپنی جھنجلاہٹ پر قابو رکھا تھا۔ وہ کاؤبوائز جیسے اور نوکیلے جوتے پہنے ہوئے تھا جن کی نوکوں پر تانبے کے کلپ سے بھی لگے ہوئے تھے۔ برنارڈ کی کھوپڑی کی تمام تر [illegible] کے باوجود بہرحال اس کی کھوپڑی پر میرے پسٹل کی ضرب کے کچھ نہ کچھ اثرات تو موجود رہے ہی ہوں گے۔ ٹونی کی ٹھوکر نے کسر پوری کر دی۔ ویسے بھی یہ ٹھوکر ذرا حساس حصے پر پڑی تھی۔

برنارڈ کی ساری جدوجہد یک لخت دم توڑ گئی اور اس کا [illegible] طرح تڑپتا مچلتا وجود میری گرفت میں ساکت ہو گیا۔ اس کے باوجود میں نے اسے فوری طور پر نہیں چھوڑا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں اسے چھوڑ کر کھڑا ہوا اور ادھر وہ اچانک ٹوٹنے والے اسپرنگ کی طرح اچھل کر بھاگ لے گا۔

کچھ دیر بعد میں نے اسے چھوڑا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹونی گن کا رخ اس کی طرف کیے تیار کھڑا تھا لیکن وہ اٹھ کر نہیں بھاگا۔ وہ واقعی بے ہوش ہو گیا تھا۔ اس دوران میں وسیم ہمارے قریب آکھڑا ہوا تھا۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حسب معمول حماقت برس رہی تھی

"تم اچانک گھر سے کیسے نکل آئے؟ تمہیں تو بہت ڈر لگ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"ڈر تو مجھے اب بھی لگ رہا ہے۔" وہ جھرجھری سی لے کر بولا۔ "ڈر کی وجہ سے ہی میں اپنے کمرے سے نکلا تھا۔ زیادہ ڈر لگنے سے میں اپنے کمرے سے نکل کر اپنی دانست میں چھپنے کے لیے کوارٹر کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میں عبدل کے راستے میں آجاؤں گا۔"

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر الجھ گیا۔ ہمیشہ کی طرح اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ سچ بول رہا تھا یا محض ڈراما کر رہا تھا۔ شاید اس نے بہت بروقت ہماری مدد کی تھی اور شاید اس کا ظرف اتنا تھا کہ وہ یہ بات جتانا نہیں چاہ رہا تھا۔

اسے گویا اندازہ تھا کہ میں کیا سوچ رہا تھا۔ وہ جیسے موضوع کا رخ بدلنے کے لیے ڈاکٹر برنارڈ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں بولا "فضل بھائی کیا آپ کو یقین ہے کہ یہی ہمارا مطلوبہ آدمی ہے؟"

"اگر یہ ہمارا مطلوبہ آدمی نہ ہوتا تو چاپڑ سے میرے چہرے کا نقشہ بنانے کی کوشش نہ کرتا اور ہم سے بچنے کے لیے یوں پاگلوں کی طرح نہ دوڑتا۔" میں نے کہا۔ "اگر تم اسے چاپڑ سے مجھ پر وار کرتے دیکھ لیتے تو تمہیں اندازہ ہو جاتا کہ یہ کتنا غیر معمولی آدمی ہے۔ یہ محض خانساماں نہیں ہو سکتا تھا۔"

"مجھے تو اس کو دوڑتے اور آپ کی گرفت میں جدوجہد کرتے دیکھ کر بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ کوئی عام آدمی نہیں ہو سکتا۔" وسیم بولا۔ "لیکن مجھے یہ یقین کرنا بھی مشکل معلوم ہو رہا ہے کہ یہ کوئی سیاہ فام ہو سکتا ہے۔"

اس نے اپنی انگلی پر ذرا سا تھوک لگایا اور برنارڈ کے پاس بیٹھ کر اس طرح وہ انگلی اس کی کلائی پر رگڑنے لگا جیسے اسے امید ہو کہ شاید کالی سے رنگ اتر کر اس کی انگلی کو لگ جائے گا۔ میں نے بچپن میں دیکھا تھا کہ عورتیں کپڑا خریدتے وقت اس طرح اس کا رنگ چیک کیا کرتی تھیں کہ کچا ہے یا پکا۔ وسیم کی انگلی پر ذرا سی بھی سیاہی منتقل نہیں ہوئی۔

اس نے شک زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "اس کا رنگ تو پکا ہے۔"

"ظاہر ہے جس گھر میں اسے غیر معینہ مدت تک رہنا تھا وہاں کچا رنگ لے کر تو نہیں گھس سکتا تھا۔" میں نے کہا۔ بہرحال تم اس چکر میں مت پڑو۔ اپنے ننھے سے ذہن کو پریشان مت کرو۔ یہ تمہارے سمجھنے کی باتیں نہیں ہیں۔ اگر ہو سکا تو ہم سفید فام حالت میں بھی تمہیں اس کا دیدار کرا دیں گے" پھر میں نے ٹونی سے کہا۔ "گاڑی اندر ہی لے آؤ۔ اسے لے کر چلنے کا بندوبست کرتے ہیں۔"

وسیم اٹھ کھڑا ہوا اور آہ بھر کر بولا۔ "میرا عبدل...... اس کے بغیر زندگی کیسے گزرے گی؟"

"تم اب بھی اسے عبدل ہی سمجھنے پر مُصر ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے تو یہ ہمیشہ عبدل ہی رہے گا۔" وہ مغموم لہجے میں بولا۔

"اتنا غم زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "عبدل ہمیشہ سے تمہارے ساتھ نہیں تھا۔ اس کے بغیر جب تم اتنے بڑے حتیٰ کہ شادی شدہ بھی ہو گئے تھے تو باقی زندگی بھی گزر ہی جائے گی۔ تمہیں تو شکر کرنا چاہیے کہ کوئی نقصان اٹھائے بغیر تمہاری جان چھوٹ رہی ہے۔"

پھر میں نے اسے ہدایت کی۔ "تمہارے کچن میں میری گن گر گئی ہے۔ ذرا وہ اٹھا لاؤ۔"

"گن......؟" اس نے تھوک نگلا۔ "آتشیں ہتھیاروں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی میری جان جاتی ہے لیکن خیر...... آپ کا حکم ہے تو لے آتا ہوں۔"

وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ ٹونی اس دوران میں گاڑی اندر لے آیا تھا۔ میں نے جلدی سے آگے بڑھ کر گیٹ دوبارہ بند کر دیا۔ ہماری گاڑیوں میں ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں پڑی رہتی تھیں۔ ٹونی نے نائیلون کی ڈوری نکال کر ڈاکٹر برنارڈ کے ہاتھ پشت پر باندھے۔ پیروں میں بھی ڈوری باندھی اور منہ پر ٹیپ چپکا دیا۔

"پارسل تیار ہے سر!" وہ ہاتھ جھاڑ کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔

اس دوران میں وسیم اس طرح گن اٹھائے اندر سے آتا دکھائی دیا جیسے وہ کوئی زندہ مخلوق ہو اور اسے اندیشہ ہو کہ وہ کسی بھی لمحے اسے کاٹ کھائے گی۔ وہ کچھ روہانسا بھی ہو رہا تھا۔ قریب آکر بولا "سر! آپ تو کہہ رہے تھے کہ کسی نقصان کے بغیر جان چھوٹ گئی۔ آپ نے اندر کچن میں فریج کا حشر دیکھا؟ اس کے فریزر کے دروازے میں کس طرح چاپڑ پیوست ہے؟ پورے بتیس ہزار کا فریج تھا۔ ابھی چند ہفتے پہلے ہی تو خریدا تھا۔" اس کی آواز بھرانے لگی۔

"بس...... بس اب کہیں باقاعدہ رونا نہ شروع کر دینا۔" میں نے گن جیب میں رکھنے کے بعد اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "اس جیسے فریج تو بازار میں ہزاروں مل جائیں گے لیکن اگر وہ چاپڑ میرے چہرے پر پیوست ہو گیا ہوتا تو مجھ جیسا دوسرا پیس ملنا بہت مشکل تھا۔"

"آپ کا مطلب ہے...... کہ اس نے آپ پر وار کیا تھا؟" وسیم کی آنکھیں ایک بار پر پھیل گئیں اور بالکل گول گول دکھائی دینے لگیں۔

"ظاہر ہے۔ اس نے فریج کی مضبوطی چیک کرنے کے لیے تو اس میں چاپڑ نہیں گھسیڑا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "اور یہ اس کا دوسرا وار تھا۔ اس سے پہلے ایک وار خالی گیا تھا۔"

وسیم احمد نے کچھ اس طرح جھرجھری لی جیسے کلاسیکل ڈانس کے لیے اسٹارٹ لینے لگا ہو۔ میں نے ٹونی سے کہا۔ "کل کسی سے کہہ دینا کہ وسیم کے لیے بازار سے کوئی بڑا سا، عمدہ سا فریج خرید کر یہاں پہنچا دے۔"

وسیم گویا ہڑبڑا کر جلدی سے بولا۔ "نہیں سر! میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا آپ تو مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔ نفع نقصان تو زندگی میں چلتے رہتے ہیں۔ میں اپنے ابا مرحوم کی طرح چھوٹے دل کا نہیں ہوں۔"

"وہ تو مجھے اندازہ ہے" میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔ "لیکن تم بھی میرا مطلب غلط سمجھ رہے ہو۔ میں فریج تمہیں اپنی خوشی سے تحفتاً بھجوانا چاہتا ہوں۔ تم تصور نہیں کر سکتے کہ میں اس وقت کتنا خوش ہوں۔ یہ شخص کیا ہاتھ آیا ہے بس یوں سمجھو کہ ہماری زندگی کا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ مسئلہ یوں راہ چلتے اچانک حل ہو جائے گا جس کے سلسلے میں نہ جانے کتنے افراد کہاں کہاں سر پھوڑ رہے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر! مجھے بھی خوشی ہے کہ آپ کا کوئی مسئلہ

حل ہوگیا لیکن پلیز آپ فریج مت بھجوائیے گا۔ مجھے شرمندگی ہوگی۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟ کیا تم کسی کا بھیجا ہوا تحفہ قبول نہیں کرتے؟" میں نے اسے گھورا۔

"یہ بات نہیں ہے سر!" پریشانی کے عالم میں اسے پھر سر کھجانے کا خیال آگیا تھا۔

"بس...... اگر یہ بات نہیں ہے تو اپنی چونچ بند رکھو اور اس بدبخت کو گاڑی میں ڈالنے میں ہمارا ہاتھ بٹاؤ۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور برنارڈ کی طرف اشارہ کیا۔ وسیم گویا سہم کر خاموش ہوگیا۔

ہم نے مل کر اسے گاڑی میں پچھلی اور اگلی سیٹوں کے درمیان فرش پر ڈال دیا۔ اس طرح اس کا گاڑی میں آنا مشکل تھا۔ میں نے اور ٹونی نے اس کی لمبی لمبی ٹانگیں موڑ کر اس کے پیٹ سے لگا دیں۔

وسیم غم ناک سے لہجے میں بولا۔ "آپ تو اسے بالکل قربانی کے بکرے کی طرح لے جارہے ہیں۔"

"وقت وقت کی بات ہے پیارے!" میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "اس کا تعلق جن لوگوں سے ہے، کبھی ہم سب ان کے سامنے قربانی کے بکرے تھے، اچھا اب اجازت دو۔" میں نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"سر! کیا آپ واقعی جارہے ہیں؟" وہ بھونچکا سا رہ گیا۔ "یہ تو کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ آپ نے میرے گھر میں بیٹھ کر پانی تک نہیں پیا۔ میں تو کھانے وانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ یہ بیچ میں عجیب ہی سلسلہ شروع ہوگیا۔"

"بس اسی سلسلے نے ہمیں کھانا بھلا دیا ہے۔ یہ جو تحفہ تم نے ہمیں دے دیا ہے یہ جانے کتنی عظیم الشان دعوتوں سے بڑھ کر ہے۔" میں نے گاڑی میں گھستے ہوئے ڈاکٹر برنارڈ کی طرف اشارہ کیا پھر گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی ہمارا ناشتا...... کھانا وغیرہ کچھ اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ کبھی ناشتے میں دو چار گھونسے، چار چھ لاتیں کھالیں، کبھی دوپہر کے کھانے میں دو چار فلائنگ ککس اور کراٹے کی دو چار چاپس کھالیں۔ رات کے کھانے میں ایک آدھ ٹکر اور ایک آدھ پنچنی پر گزارا کرلیا۔ اکثر و بیشتر ہمارا مینیو یہی رہتا ہے۔"

ٹونی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی تھی۔ میں پیسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ وسیم دروازے پر جھکتے ہوئے قدرے مایوسی سے بولا۔ "اچھا، جیسے آپ کی مرضی! ہوسکے تو مجھے بعد کے حالات سے بھی مطلع کیجیے گا کہ عبدل کا کیا بنا۔"

"یہ عبدل نہیں، ڈاکٹر برنارڈ ہے۔" میں نے ایک بار پھر اسے یاد دلایا۔

ٹونی نے گاڑی ریورس کی۔ وسیم نے آگے بڑھ کر گیٹ کھولا۔

ہم سڑک پر کافی دور نکل آئے تب تک وسیم گیٹ پر کھڑا رہا۔ ہم نے موڑ کاٹا تو وہ ہماری نظر سے اوجھل ہوا۔

"دلچسپ کردار ہے۔" ٹونی نے تبصرہ کیا۔

"بے شک۔" میں نے تائید کی۔ "اور ایک عجیب ہے کہ یہ میری زندگی میں ہمیشہ کسی اہم موڑ پر ہی نمودار اور اس کی وجہ سے کسی ایسی شخصیت سے ملاقات ہوئی میں تلاش کررہا ہوتا ہوں۔ اس وقت تیسری مرتبہ ایسا ہوا"

"عجیب بات ہے!" ٹونی نے حیرت کا اظہار کیا۔

اچانک اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ایک اسٹیئرنگ وہیل سنبھالتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ سے لگایا۔ میں قریب ہی تھا۔ مدھم سی آواز سے مجھے اندا کہ دوسری طرف راحیلہ تھی۔

وہ ٹونی سے مخاطب تھی۔ "کہاں مرگئے ہو؟ کیا ائیر پورٹ پر ریسیو کرنے کے بجائے سیدھے کراچی چلے گئے وہاں سے اسے ساتھ لے کر پیدل واپس آرہے ہو؟"

"نہیں پیدل تو نہیں آرہے۔ گاڑی میں ہی ہیں۔" طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"پھر بھی احتیاطاً ذرا غور سے دیکھ لو کہیں کسی گدھا مرسڈیز سمجھ کر تو نہیں بیٹھ گئے ہو؟" وہ تشویش سے بولی۔

"کیا گدھا گاڑی میں ایکسیلیریٹر، اسٹیئرنگ وہیل، کلچ، لیور وغیرہ بھی ہوتے ہیں؟" ٹونی نے سادگی سے پوچھا۔

"ہو بھی سکتے ہیں۔ یہ ماڈرن زمانہ ہے۔ کچھ بھی ہوسکتا" راحیلہ نے جواب دیا۔

"لیکن اس میں مجھے آگے گدھا جتا ہوا دکھائی نہیں رہا۔" ٹونی بولا۔

"ہوسکتا ہے کہ گدھا اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھا ہو۔" راحیلہ نے خیال ظاہر کیا۔ ترکی بہ ترکی جواب دینے کے معاملے میں کب چوکنے والی تھی۔

ٹونی نے شاید لاجواب ہو کر قدرے کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا اور کمزور سے لہجے میں پوچھا۔ "تمہیں کر شبہ ہوا؟"

"تم اب تک آفس جو نہیں پہنچے اس لیے شبہ ہوا۔" راحیلہ نے جواب دیا "میں نے ائرپورٹ فون کرکے معلوم فلائٹ تو کب کی آچکی ہے۔"

"بس جب باس ساتھ ہوں تو راستے کچھ زیادہ ہی لمبے ہو ہیں۔ تم باس سے خود بات کرلو۔ وہی بہتر بتا سکتے ہیں کہ ہم ابھی آفس کیوں نہیں پہنچ سکے۔" ٹونی نے یہ کہہ کر گویا جان چھڑا فون میرے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں نے فون کان سے لگاتے ہوئے "ہیلو" کہا تو راحیلہ ایک طویل سانس لی۔

"اچھا...... تو تم پہنچ چکے ہو! کیا راستہ گوجرانوالہ آرہے ہو؟ نہیں تو بہت پہلے پہنچ چکے ہونا چاہیے تھا۔"

"کیا بات ہے، بے چینی سے میرا انتظار کررہی ہو؟" میں نے لچپی سے پوچھا۔

"مجھے کیا پڑی ہے بے چینی سے انتظار کرنے کی۔" وہ یکدم بگڑ گئی۔ "مجھے تو ان سولہ افراد کا خیال آرہا ہے جو ہوٹل میں بیٹھے کھانا شروع ہونے کا انتظار کررہے ہوں گے۔ ان کے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہوں گے۔ اگر وہ کھانے سے پہلے ہی اتنے نڈھال ہوگئے تو میٹنگ میں کیا خاک حصہ لیں گے۔"

"ان کے پیٹ میں ابھی کچھ دیر اور چوہوں کو دوڑنے دو۔ دوڑنا بھاگنا چوہوں کا بنیادی حق ہے۔ ڈائریکٹرز اگر نڈھال ہو بھی گئے تو کھانا کھانے کے بعد دوبارہ چاق و چوبند ہوجائیں گے۔ ہمیں ابھی تھوڑی سی دیر اور لگے گی۔"

"آخر تم کرتے کیا پھر رہے ہو؟" وہ ذرا جھنجلا کر بولی۔

"تمہارے لیے ہی کچھ کررہا ہوں" میں نے جواب دیا "دراصل مجھے خیال آگیا تھا کہ کافی دنوں بعد تم سے ملاقات ہونے والی ہے۔ خالی ہاتھ آتے کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے سوچا کوئی تحفہ ہی لیتا چلوں لیکن سمجھ میں ہی نہیں آرہا تھا کہ کیا لے کر چلوں۔ کوئی اچھا سا تحفہ ہی نہیں مل رہا تھا۔ اب ایک تحفہ ملا تو ہے لیکن ابھی اس کی پیکنگ وغیرہ کا مرحلہ درپیش ہے اس لیے تھوڑی دیر اور لگے گی۔"

"کیا بکواس ہے؟" اس کے گویا کان کھڑے ہوئے۔ "تم اور تحفہ؟ ناممکن۔ تمہاری زندگی میں ایسے تکلفات کی گنجائش کہاں ہے۔ سچ سچ بتاؤ کس چکر میں ہو؟"

"تم تو واقعی بہت ہی بے ہودہ اور بہت ہی بے حس قسم کی لڑکی ہو۔" میں نے غم زدہ لہجے میں کہا۔ "تمہیں زندگی میں کبھی نہ تو کسی کے جذبات کا اعتبار آئے گا اور نہ ان کی قدر ہوگی۔"

"اچھا خیر...... تمہیں جو جھٹکے کھانے ہیں، کھالو۔ مجھے صرف یہ بتاؤ کہ کتنی دیر تک پہنچ رہے ہو تاکہ میں ڈائریکٹرز کو فون پر تسلی دے سکوں جو ہوٹل میں جمع ہیں اور تمہارا انتظار کررہے ہیں۔" راحیلہ گویا اس موضوع سے جان چھڑاتے ہوئے بولی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ احساس بھی تھا کہ ٹونی میرے ساتھ سفر کررہا تھا۔

"بس تھوڑی ہی دیر اور لگے گی۔ اس بہانے ڈائریکٹرز کو بھی تھوڑا بہت پتا چل جائے کہ بھوک کسے کہتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے تو پھر میں بھی اب ہوٹل ہی پہنچ رہی ہوں۔ تم دونوں وہیں آجانا۔" راحیلہ نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔ وہ فائیو اسٹار ہوٹل جس میں لنچ کا انتظام کیا گیا تھا، ہمارے آفس سے زیادہ دور نہیں تھا بلکہ اسی سڑک پر تھا۔

میں نے سوچا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کو ٹونی کے گھر چھوڑتے چلیں گے۔ اس کا گھر گلبرگ میں تھا جو یہاں سے دور نہیں تھا اور میرے اشارے پر ٹونی ادھر گاڑی موڑ بھی چکا تھا۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ ٹونی کے گھر میں چھوٹا سا ایک تہ خانہ بھی موجود تھا۔ ڈاکٹر برنارڈ کو ذرا خفیہ اور محفوظ جگہ پر رکھنا ضروری تھا۔

چند منٹ بعد ہی ہم ٹونی کے گھر جا پہنچے۔ مسلح گارڈ نے گیٹ کھولا اور اس نے گاڑی اندرونی دروازے کے بالکل قریب ہی لے جا روکی۔ اس نے اور گارڈ نے مل کر ڈاکٹر برنارڈ کو تہ خانے میں پہنچایا۔ وہ بدستور بے ہوش تھا۔ تہ خانے کا فرش صاف ستھرا تھا۔ انہوں نے اسے فرش پر لٹا دیا۔

"فی الحال اسے اسی طرح پڑا رہنے دو۔ ہاتھ پاؤں اسی طرح بندھے رہنے دو۔ ہونٹوں پر ٹیپ بھی رہنے دو۔ میٹنگ سے فارغ ہو کر ہی آکر اس سے نمٹیں گے۔" میں نے کہا۔

تہ خانے کا دروازہ ٹونی نے مقفل کردیا۔ برنارڈ کے ہاتھ پاؤں پہلے ہی بندھے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود ٹونی نے اپنے گارڈ کو خبردار کیا۔ "اگر یہ آدمی غائب ہوگیا تو تم اپنی زندگی کی خیر مت سمجھنا۔"

"سر! اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں اور تہ خانے کا دروازہ بھی آپ لاک کرکے جارہے ہیں۔ اس کے بعد تو یہ صرف اسی صورت میں غائب ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی بدروح ہو" گارڈ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بظاہر تو یہ انسان ہے لیکن تم اسے بدروح ہی سمجھنا" میں نے گارڈ کو ہدایت کی۔

وہاں سے ہم ہوٹل پہنچے۔ ٹونی کو معلوم تھا کہ لنچ کے لیے کس ہال میں ریزرویشن تھی۔ وہ مجھے سیدھا وہیں لے گیا۔ راحیلہ ہال کے دروازے پر موجود تھی۔ وہ اپنے اسی نقاب پوش حسینہ والے حلیے میں تھی۔ ہم کافی دنوں بعد ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ میں سراپا اشتیاق تھا لیکن میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں تو اس کی آنکھوں میں بھی نہیں جھانک سکتا تھا۔ وہ بھی بڑے بڑے تاریک شیشوں کے چشمے کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں۔

میں جب بھی اسے اس حلیے میں دیکھتا تھا، مجھے افسوس ہوتا تھا۔ میں خود کو مجرم سا محسوس کرتا تھا کہ شاید میری ہی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تھا۔ اگر یہ سب کچھ پردے کے نقطۂ نظر سے ہوتا تب بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ جن جگہوں پر بہت اونچے طبقے کی نشست و برخاست اور آمدورفت رہتی تھی وہاں بھی کبھی کبھی پردے کی بہت زیادہ پابندی کرنے والی کوئی خاتون اس سے ملتے جلتے حلیے میں نظر آجاتی تھی۔ سیمیناروں اور میٹنگوں میں بھی کبھی کبھار اس قسم کی کوئی شخصیت دکھائی دے جاتی تھی لیکن راحیلہ کا معاملہ پردے کی حدود سے بھی کچھ آگے کا لگتا تھا۔

وہ ان جگہوں پر کچھ عجوبہ ہی دکھائی دیتی تھی۔ یقیناً اسے خود بھی اس بات کا احساس ہوتا ہوگا لیکن اس نے آج تک بڑے

حوصلے سے صورت حال کا مقابلہ کیا تھا۔ اپنی کسی بات سے اس نے کبھی کسی تاسف، شکوے یا احساسِ کمتری کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے پہلے ہی کی طرح بالکل نارمل انداز میں وقت گزارا تھا جیسے اس کی ذات کے ساتھ کوئی مسئلہ وابستہ نہ ہو۔ اس کی جگہ کوئی عام سی لڑکی ہوتی تو شاید منہ چھپا کر گھر میں بیٹھ جاتی اور اس وقت کو روتی جب اس نے میرے شانہ بہ شانہ ریڈ ڈاٹ سے جھگڑا مول لیا تھا۔ ایک ایسا جھگڑا جس سے اس کا اپنا کوئی تعلق نہیں تھا۔

تاہم اب اس کے قریب جاتے ہوئے میرے دل میں ایک عجیب سی خوشی کی لہر ابھری۔ اب یہ زیادہ دیر کا مسئلہ نہیں تھا۔ اب اسے اس کا اصل رنگ روپ واپس ملنے والا تھا۔ اس کا چہرہ درست ہونے والا تھا جس کے بعد وہ اپنی نارمل زندگی کی طرف واپس آسکتی تھی۔ میری روح پر۔ جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔

"تم تو میرے لیے کوئی تحفہ لا رہے تھے...؟" وہ سیاہ نقاب کی اوٹ سے بولی۔ "تمہارے ہاتھ تو بھکاریوں کی طرح خالی ہیں۔"

"بھکاریوں کے ہاتھ خالی کہاں ہوتے ہیں بے وقوف!" میں نے کہا "ان کے ہاتھوں میں تو بھیک میں ملی ہوئی چیزیں ہوتی ہیں۔"

"تمہارے ہاتھ میں تو ایسی بھی کوئی چیز نظر نہیں آرہی۔ میں اسے ہی تحفہ سمجھ لیتی" وہ یقیناً تحفے والی بات سے تجسس میں مبتلا ہو چکی تھی اور اس کی تہ کو پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہی ہو۔ میں نے واقعی تمہارے لیے ایک شاندار تحفہ تلاش کیا ہے لیکن وہ تھا بہت بڑا" میں نے سنجیدگی سے کہا "اسے یہاں لانا بہت مشکل تھا۔ ہمیں خود چل کر تحفے کے پاس جانا پڑے گا۔"

شاید وہ تاریک شیشوں کے عقب سے مجھے گھور رہی تھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی "اچھا... چلو۔ اندر چلو۔ سب لوگ تمہارے انتظار میں بھوکے مر رہے ہیں۔"

میں ہال میں پہنچا جہاں ہمارے گروپ آف کمپنیز کے تمام سرکردہ افراد موجود تھے۔ وہ کچھ اس طرح مجھ سے ملے جیسے میں برسوں سے ان سے بچھڑا ہوا تھا۔ میں نے انہیں زیادہ دیر باتوں میں نہیں الجھایا اور بزنس لنچ شروع کرا دیا۔ اِدھر اُدھر کی باتیں بہت کم وقت کے لیے جاری رہیں۔ جلد ہی گھوم پھر کر سب کاروبار پر آگئے حالانکہ ابھی باضابطہ میٹنگ شروع نہیں ہوئی تھی مگر وہ سب بنیادی طور پر کاروباری لوگ تھے۔ کاروبار ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ وہ بے شک کمپنی میں ملازم تھے لیکن ہر شخص اپنے شعبے کو اپنے ذاتی کاروبار کی طرح چلا رہا تھا۔

نہایت پُرتکلف لنچ کے بعد ہم لوگ ہیڈ آفس آگئے اور کانفرنس روم میں باضابطہ طور پر سالانہ میٹنگ کا آغاز ہوا۔ یہ ایک نہایت خشک قسم کی کاروباری کارروائی تھی جس میں طویل طویل رپورٹیں پیش کی گئیں۔ آڈیٹرز کی رپورٹ پڑھ کر سنائی گ… منصوبوں کی منظوری لی گئی۔ کچھ چیزوں سے میں نے اختلاف… ان کی جگہ نئی تجاویز پیش کیں جنہیں کچھ بحث اور ترامیم… منظور کر لیا گیا۔

میٹنگ رات کے آٹھ بجے تک جاری رہی۔ بہرحال… تسلی بخش میٹنگ تھی۔ بہت سے اہم معاملات طے پا گئے… ہوا کہ میں کسی نہ کسی طرح شرکت کے لیے پہنچ ہی گیا ت… میٹنگ ملتوی نہیں ہوئی تھی۔ میٹنگ کے دوران میں ڈاکٹ… میں تقریباً بھول ہی گیا حتیٰ کہ اس دوران میں راحیلہ پر کئی بار… پڑنے کے باوجود مجھے اس کا خیال نہیں آیا۔ راحیلہ میرے… ہاتھ پر ہی بیٹھی تھی۔ وہ اور ٹونی بھی کمپنی کے ملازم ڈائریکٹر… شامل تھے۔ میری غیر موجودگی میں سب سے زیادہ اختیارات… کے پاس ہوتے تھے۔

میٹنگ کے اختتام پر کافی کا ایک اور دور چلا۔ تمام امور… اسلوبی سے طے پا جانے کے بعد ڈائریکٹرز کے چہروں پر بشاشت آنے لگی تھی ورنہ اس سے پہلے ان کے چہرے کچھ ایسے… دے رہے تھے جیسے پوری دنیا کے معاشی مسائل کا بوجھ ا… چاروں نے اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔

کافی کا دور بھی ختم ہو چکا تو مجھے اچانک ڈاکٹر برنارڈ کا… آیا۔ ہمیں اس بدبخت کو تہ خانے میں پھینکے ہوئے کچھ زیادہ… ہو گئی تھی۔ میں نے تمام حضرات سے اجازت طلب کی اور ک… روم سے باہر آگیا۔ صرف ٹونی اور راحیلہ میرے ساتھ تھے۔

"تم ہمارے ساتھ چلو" میں نے راحیلہ سے کہا۔

"کہاں؟" اس نے جاننا چاہا۔

"یہ مت پوچھو۔ کیا تم اپنا تحفہ دیکھنا نہیں چاہتیں؟" م… کہا۔

"تحفہ وغیرہ تو خیر کیا ہوگا..." وہ بے یقینی سے بولی "بہرحال تمہاری یہ نئی شعبدے بازی دیکھنا چاہتی ہوں۔ ذرا پتا تو چلے تم پٹاری سے کیا نکال کر دکھانا چاہتے ہو جس کے لیے بچوں کی ا… تجسس پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔"

ہم تینوں نیچے آکر ٹونی کی مرسڈیز میں بیٹھے۔ ٹونی ڈرائی… تھا۔ گاڑی کے شیشے رنگین تھے۔ اس لیے راحیلہ نے چہرے… نقاب ہٹا دیا اور سیاہ چشمہ بھی اتار لیا۔ اب میں اس کے تاث… دیکھ سکتا تھا۔ وہ کچھ استہزائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ… تھی جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کی شرارت کو سمجھتے ہوئے نظر… ہو۔ اس کے آدھے سیاہ اور آدھے سفید چہرے پر پھیلی… مسکراہٹ بھی کچھ ایسی محسوس ہوتی تھی گویا اسے بھی دو… میں تقسیم کر دیا گیا ہو۔ یہ احساس میرے لیے بڑا جاں فزا تھا کہ یہ مضحکہ خیزی زیادہ دیر کی بات نہیں تھی مگر راحیلہ اس بات سے بے خبر تھی کہ اسے کتنی بڑی خوش خبری ملنے والی تھی۔

…س طرح بڑی بی بن کر ایسی بزرگانہ نظروں سے میری طرف…

…ت دیکھو" میں نے منہ بنا کر کہا "میں نے واقعی تمہارے لیے ایک عظیم الشان تحفے کا بندوبست کیا ہے۔ دیکھو گی تو اچھل پڑو گی۔"

"اچھلنے کودنے کا کام تو میری طرف سے تم ہی کر لینا" وہ اسی شفقانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میرے تاثرات کا اندازہ تو تمہیں میرے اچھلے کودے بغیر بھی ہو جائے گا۔"

پھر وہ ٹونی سے مخاطب ہوئی "ٹونی! تم ہی بتا دو کیا چکر ہے۔ تمہارے باس کو تو اسی طرح تجسس پیدا کرنے اور پھر پہاڑ کھود کر چوہا نکالنے کا شوق ہے۔"

"تمہیں معلوم ہے باس کے معاملات میں، میں ٹانگ نہیں اڑا سکتا۔ مجھے اپنی ٹانگ عزیز ہے" ٹونی نے عقب نما آئینے میں ہماری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اوہ... آئی ایم سوری... میں تو بھول ہی گئی تھی۔ تم تو اسی گرو کے چیلے ہو... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اسی مداری کے بچہ جمہورا ہو۔ تم بھلا اس کے سامنے اس کی مرضی کے خلاف کچھ کرنے کی جرأت کہاں کر سکتے ہو" راحیلہ نے اپنا لہجہ پُرتحقیر بنانے کی کوشش کی۔

"بالکل بجا ارشاد فرمایا آپ نے" ٹونی سعادت مندی سے بولا۔ "آپ بالکل ٹھیک سمجھیں۔ میں وہی ہوں جو آپ کہہ رہی ہیں۔"

"اچھا... ٹھیک ہے... تو پھر اپنی چونچ بند رکھو" راحیلہ نے خفگی سے کہا لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ خفگی مصنوعی تھی۔ درحقیقت وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ وہ منہ پھیر کر کھڑکی کے رنگین شیشے سے باہر دیکھنے لگی۔

چند منٹ بعد ہم ٹونی کے گھر جا پہنچے۔ گارڈ گیٹ پر ہی موجود تھا۔ ٹونی نے اس سے پوچھا "تم نے اس کی خیر خبر لی تھی؟"

"میں خیر خبر کیسے لے سکتا تھا صاحب!" گارڈ نے مؤدبانہ لہجے میں کہا "میرے پاس تو تہ خانے کی چابی ہی نہیں ہے۔"

"اوہ... یہ تو میں بھول ہی گیا تھا" ٹونی نے کہا اور تیزی سے تہ خانے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اور راحیلہ اس کے پیچھے تھے۔

ٹونی نے سیڑھیاں اتر کر جیب سے چابی نکال کر تہ خانے کا آہنی دروازہ کھولا۔ میری نظر سامنے گئی تو میرے دل میں تشویش کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ ہم ڈاکٹر برنارڈ کو جس حالت میں چھوڑ گئے تھے، وہ فرش پر اسی حالت میں پڑا تھا۔

یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ ہمیں گئے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ کیا وہ اس دوران میں کسمسایا بھی نہیں تھا؟ کیا اس نے کروٹ لینے کی بھی کوشش نہیں کی تھی؟ وہ بالکل ساکت نظر آرہا تھا۔ میرے لاشعور کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ ابھرا تھا کہ کہیں وہ کسی وجہ سے مر تو نہیں گیا تھا؟ میرے لیے یہ ایک ناقابلِ بیان صدمہ ہوتا۔ یہ کچھ ایسی ہی بات ہوتی جیسے کسی لبِ گور مریض کو نئی زندگی دے کر فوراً ہی واپس لے لی جائے۔ ڈاکٹر برنارڈ کی صورت میں مجھے امید کی جو کرن نظر آئی تھی وہ میرے لیے گویا اتنی ہی اہم تھی جتنی کسی لبِ گور مریض کے لئے نئی زندگی۔

ٹونی کے ذہن میں بھی یقیناً اسی اندیشے نے سر ابھارا تھا جس سے میں دوچار تھا۔ وہ لپک کر برنارڈ کے قریب پہنچا اور اس نے فرش پر بیٹھ کر بڑی توجہ سے اس کی نبض دیکھی پھر میری طرف دیکھ کر بڑے مسرور لہجے میں بولا "سر! یہ زندہ ہے۔"

مجھے اس کی اطلاع پر حیرت نہیں ہوئی کیونکہ اس وقت تک میں برنارڈ کے سینے میں خفیف سی حرکت محسوس کر چکا تھا۔ یعنی سانس کی آمدورفت جاری تھی۔ پھر بھی اس کا اتنی دیر تک بے ہوش رہنا بہرحال باعثِ تشویش تھا۔

"یہ کون ہے؟" راحیلہ نے ذرا دور ہی کھڑے کھڑے پوچھا۔ وہ اسے پہچان نہیں سکی تھی۔

"یہی تو ہے وہ تحفہ جو تمہاری خدمت میں پیش کرنا تھا" میں نے جواب دیا "افسوس کہ ہمیں اس کی اچھی سی گفٹ پیکنگ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔"

تب راحیلہ قریب آگئی۔ اس نے جھک کر برنارڈ کا چہرہ سیدھا کر کے ذرا غور سے دیکھا اور گہری سانس لے کر سیدھی ہو گئی "اچھا...! تو اس کے لیے تم اتنی ڈرامے بازی کر رہے تھے؟"

"کیا مطلب...؟ تم نے پہچان لیا یہ کون ہے؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔

"اسے پہچاننا کون سا مشکل کام ہے۔ کم از کم میرے لیے تو نہیں ہے" وہ بے پروائی سے بولی "میں بھلا اسے کیسے بھول سکتی ہوں؟ یہ ڈاکٹر برنارڈ ہے۔ میں سوچ تو رہی تھی کہ کہیں یہ خبیث تو تمہارے ہتھے نہیں چڑھ گیا... لیکن مجھے یہ کچھ بعید از امکان سا نظر آرہا تھا۔"

"اس دنیا میں کوئی بھی بات بعید از امکان نہیں راحیلہ ڈیئر!" میں نے فلسفیانہ لہجے میں کہا پھر آنکھیں سکیڑتے ہوئے اس کا جائزہ لیا "لیکن تمہارے لہجے میں خوشی کی کوئی جھلک نہیں ہے۔ کیا تمہیں ذرا بھی خوشی نہیں ہے کہ جب ہم اس مردود کی طرف سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے تو یہ قطعی غیر متوقع طور پر نہ صرف ہمیں نظر آگیا بلکہ ہمارے قابو میں بھی آگیا؟"

"تمہارے خیال میں مجھے اس پر کیوں خوش ہونا چاہیے؟" اس نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"احمق لڑکی! ظاہر ہے اب تمہارا یہ دورنگا چہرہ ٹھیک ہو جائے گا" میں نے تیزی سے کہا۔

"میرے لیے اب یہ کوئی اتنی بڑی خوش خبری نہیں ہے" وہ بے پروائی سے بولی "میں نے کئی بار تمہیں بتایا تو ہے کہ اب میں اس نقص کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادی ہو چکی ہوں۔ جو خوشخبری تم مجھے سنانا چاہ رہے تھے اس کا اب مجھے کوئی خاص انتظار

نہیں رہا۔"

"تم کچھ بے حس اور غیر انسانی سی مخلوق نہیں ہوتی جا رہیں؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"تم جو چاہو کہہ سکتے ہو؟" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی "بات صرف اتنی سی ہے کہ میں نے غیر ضروری امیدیں اور غیر ضروری توقعات رکھنا چھوڑ دی ہیں۔ میں نے بہت بڑی بڑی باتوں کی پروا کرنی چھوڑ دی ہے۔ اس طرح زندگی میرے لیے بہت آسان ہو گئی ہے۔"

"خیر... اب زندگی کو اپنے لیے اتنی آسان بھی مت بناؤ کہ وہ زندگی کے بجائے' اردو کا آسان قاعدہ لگنے لگے۔ اس میں غم' خوشی' حیرت اور دیگر انسانی جذبات کی تھوڑی بہت گنجائش تو رہنے دو بڑی بی!" میں نے دبے دبے غصے سے کہا "تمہارا ردعمل دیکھ کر تو میں اپنے آپ کو سخت چغد محسوس کر رہا ہوں..."

"وہ تو خیر تم ہو ہی... اس میں محسوس کرنے کی کیا بات ہے؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی "ظاہر ہے انسان اپنے آپ کو وہی محسوس کرتا ہے جو وہ ہوتا ہے۔"

"میں سوچ رہا ہوں کہ ڈاکٹر برنارڈ کے ہوش میں آنے پر ہم اس کے پیروں میں گر کر اس سے معافی مانگتے ہیں اور یہ جس ملک جانے کی فرمائش کرے اسے وہاں کے جہاز پر سوار کرا کے آتے ہیں۔"

"خیر... اب اتنا بھی بددل ہونے کی ضرورت نہیں" وہ بولی "میرے چہرے کا مسئلہ اگر چھوڑ دیا جائے تب بھی تم اس خبیث سے اور بہت سی باتوں کا حساب کتاب لے سکتے ہو۔ ریڈ ڈاٹ کے فتنے کی کچھ باقیات اگر یہاں رہ گئی ہیں تو تم اس کے ذریعے ان کا پتا چلانے کی کوشش کر سکتے ہو..."

پھر وہ ایک گہری سانس لے کر گویا میرا دل رکھنے کو بولی "فرض کرو' میں اس خوش خبری کی قدروقیمت کا احساس کرنے کے لیے تیار بھی ہو جاتی ہوں۔ جو تم مجھے سنا رہے ہو تب بھی اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ تمہاری توقع واقعی پوری ہو جائے گی... یعنی ڈاکٹر برنارڈ واقعی میرا چہرہ ٹھیک کرنے پر آمادہ ہو جائے گا؟"

"اسے آمادہ ہونا پڑے گا" میں نے غیر ارادی طور پر تیزی سے کہا۔ "اس کا تو باپ بھی آمادہ ہوگا۔ میں اس کی ہڈیوں کا سرمہ بنا دوں گا۔ اس کے جسم کا ریشہ ریشہ الگ کر دوں گا۔ میں اس سے یہ بات منوا کر چھوڑوں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے کوئی بھی حربہ استعمال کرنا پڑے۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر دھیمے لہجے میں بولی "تم واقعی ہر قدم اٹھانے پر تلے ہوئے ہو؟"

"یقیناً" میں نے بلا تامل جواب دیا۔

تب راحیلہ کچھ بدلے بدلے سے لہجے میں بولی "میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ مجھے اپنا چہرہ ٹھیک ہونے کی قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ میں بھی نارمل زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ میں عام لوگوں کی طرح کسی کی نظر میں عجوبہ بنے بغیر آزادی اور بے فکری کے احساس کے ساتھ اِدھر اُدھر آنا جانا چاہتی ہوں لیکن نہ جانے کیوں مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے میرا چہرہ اب کبھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ اسی لیے میں اس سلسلے میں زیادہ پُرجوش نہیں رہی۔ میں نے گویا صبر کر لیا ہے۔ مجھے قرار سا آ گیا ہے۔ میں نے اس بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔"

"لیکن اب تو صورتِ حال بدل چکی ہے۔ اب تو ڈاکٹر برنارڈ مل گیا ہے" میں نے زور دے کر کہا۔

"اس کے باوجود مجھے کوئی امید نظر نہیں آ رہی۔ معلوم نہیں کیوں مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ یہ نہیں مانے گا" راحیلہ بولی۔

"لگتا ہے تمہارا چہرہ تو آدھا ہی کالا ہوا تھا' زبان پوری کالی ہو گئی ہے" میں نے جل کر کہا "کم از کم اپنے لیے تو کوئی نیک فال منہ سے نکالو۔ میں برنارڈ سے تمہارا چہرہ ٹھیک کرا کے چھوڑوں گا۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔"

وہ بڑے تحمل سے مسکراتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے... تم کوشش کر دیکھو۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے تمہیں اپنے محسوسات کے بارے میں سچ سچ بتایا ہے۔ کاٹنے کو کیوں دوڑ رہے ہو؟"

میں نے ٹونی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "یار! اس خبیث کو ہوش میں لانے کی کوشش کرو۔ میں اس سے بات کرنے کے لیے بے تاب ہوں۔ یہ منحوس تو کچھ زیادہ ہی لمبا بے ہوش ہو گیا۔ تمہارے جوتے کی نوک تو پستول کے دستے سے زیادہ خطرناک ثابت ہوئی ہے۔"

ٹونی مسکرایا اور تہ خانے میں موجود کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آپ دونوں اطمینان سے تشریف رکھیں۔ میں اس مردود کو نخلخہ سنگھاتا ہوں۔"

"وہ کیا ہوتا ہے؟" میں نے اپنے اور راحیلہ کے لیے کرسیاں کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں" ٹونی نے معصومیت سے جواب دیا "میں نے بھی بچپن میں صرف پرانی کہانیوں میں ہی اس کا ذکر پڑھا تھا۔ میں نے تو فرض کر رکھا ہے کہ ہر وہ چیز جس کے سونگھنے سے کوئی بے ہوش انسان ہوش میں آ جائے' نخلخہ ہے۔"

میں نے راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیکھا تم نے! ہمارے ملک میں کیسے کیسے قابل لوگ پڑے ہوئے ہیں۔"

"بے شک... لیکن تمہاری قابلیت کو پھر بھی کوئی نہیں پہنچ سکتا" راحیلہ گہری سانس لے کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

ہم دونوں دلچسپی آمیز نظروں سے ڈاکٹر برنارڈ کی طرف دیکھنے لگے جسے ٹونی نے سیدھا کر دیا تھا جس کی وجہ سے اس کے ہاتھ اس

کے نیچے دب گئے تھے۔ ٹونی نے اس کے ہاتھ کھولے نہیں تھے۔ البتہ اس کے ہونٹوں سے ٹیپ اس نے اتار دیا۔

اس نے دوبارہ اس کی نبض دیکھی۔ سینے سے کان لگا کر دھڑکن سنی۔ آنکھیں کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے پتلیوں کا معائنہ کیا۔ پھر اسے ہلایا جلایا' رخسار تھپتھپائے مگر وہ بے جان سے انداز میں ہی پڑا رہا۔

تہ خانے کے ایک گوشے میں چھوٹا سا ایک فریج بھی موجود تھا۔ ٹونی اس میں سے ٹھنڈے پانی کی ایک بوتل نکال لایا اور دوبارہ اس کے پاس بیٹھتے ہوئے بولا "سنگھانے والا نخلخہ تو موجود نہیں ہے۔ چھڑکنے والا نخلخہ استعمال کر کے دیکھتا ہوں ورنہ پھر اپنے خاص ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا۔"

ہمیں ایک ڈاکٹر دوست کی خدمات بھی حاصل تھیں۔ جو ہمارے خفیہ معاملات میں کسی لالچ کے بغیر ہماری مدد کرتا رہتا تھا اور بوقتِ ضرورت بُلانے پر آ جاتا تھا۔ اسے یہ یقین اور اعتماد تھا کہ ہم مجرمانہ نیت سے کوئی کارروائی نہیں کرتے تھے۔ کسی بے گناہ کو گزند نہیں پہنچاتے تھے اور ہماری کسی بھی خلافِ معمول کارروائی کا مقصد تعمیری ہوتا تھا۔

ٹونی نے برنارڈ کے چہرے پر خاصی مقدار میں ٹھنڈا پانی چھڑکا۔ پھر ایک بریکٹ فین کا رخ اس کے چہرے کی طرف کیا۔ آخرِ کار اس نے جھرجھری سی لے کر آنکھیں کھول ہی دیں لیکن ان آنکھوں کو دیکھ کر مجھے کچھ کھٹکا سا ہوا۔ ان آنکھوں میں اضمحلال کے ساتھ ساتھ دیوانگی کی جھلک تھی۔

اس نے سر کو یوں ہلایا جیسے آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھندلاہٹ دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو لیکن غالباً سر کی تکلیف سے دانت بھینچ کر رہ گیا۔ ٹونی نے رومال سے اس کا چہرہ پونچھ دیا اور اسے اٹھا کر دیوار کے سہارے بٹھا دیا۔ اس دوران میں ڈاکٹر برنارڈ نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے رکھا۔

"ہیلو ڈاکٹر برنارڈ!" ٹونی نے مسکراتے ہوئے نہایت خوش خلقی سے اسے مخاطب کیا لیکن وہ وحشت زدہ سی نظروں سے باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ پھر وہ یوں کسمسایا گویا اپنے ہاتھ پیروں کو حرکت دینا چاہتا ہو لیکن شاید اسے پہلی بار احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔

اچانک اس کے حلق سے کھرکھراتی ہوئی غصیلی سی آواز برآمد ہوئی۔ "میں کون ہوں...؟ میں کہاں ہوں...؟ تم لوگ کون ہو؟ تم نے مجھے کیوں باندھ رکھا ہے؟" سوالات اس نے انگریزی میں کیے تھے۔

"آہستہ... آہستہ... ڈیئر!" ٹونی نے ہاتھ ہلاتے ہوئے انگریزی میں ہی کہا "تم نے تو ایک سانس میں چار سوال کر دیے... اور سوال بھی نہایت غیر ضروری اور فضول..."

ڈاکٹر برنارڈ نے گویا اس کی آواز سنی ہی نہیں تھی۔ ایک گہری سانس لے کر سنبھلتے ہوئے اس نے تقریباً مجنونانہ سے انداز میں وہی سوال دہرائے پھر وہ اپنے ہاتھ پاؤں' بندشوں سے آزاد کرانے کے لیے زور آزمائی کرنے لگا۔ مجھے یہ دیکھ کر ذرا اطمینان ہوا کہ اس میں توانائی عود کر آئی تھی۔ وہ نڈھال یا نیم جاں نہیں تھا لیکن اس کی زور آزمائی کے انداز میں واقعی دیوانگی کی جھلک تھی۔

اپنی کوشش میں ناکام رہنے کے بعد اس نے پھر اپنے سوالوں کی تکرار شروع کر دی۔ چند لمحے کے لیے تو یہ محسوس ہوا گویا کسی ٹیپ ریکارڈر سے یہ آواز ابھر رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس آواز میں لحہ بہ لحہ غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ہم تینوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ تینوں ہی ایک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔ بالآخر اس نے ہمیں گالیاں دینی شروع کر دیں۔ غنیمت تھا کہ انگریزی میں گالیاں اتنی سنگین محسوس نہیں ہو رہی تھیں۔ وہی گالیاں اگر وہ ہمیں اردو میں دے رہا ہوتا تو ہم اپنے آپ کو زیادہ شرمندہ محسوس کرتے اور راحیلہ کی موجودگی کی وجہ سے یہ شرمندگی بڑھ جاتی۔

ٹونی میری طرف دیکھ کر گہری سانس لے کر بولا "یہ تو فلمی سین شروع ہو گیا۔ یہ شیطان کا چیلا یادداشت کھو جانے کا ڈراما کر رہا ہے" وہ انگریزی میں ہی بات کر رہا تھا۔ شاید ڈاکٹر برنارڈ کو سنانے کے لیے۔

میں نے مسکراتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا "بھئی... کیا بعید ہے' تمہارے جوتے کی نوک خطرناک ثابت ہوئی ہو۔ تمہاری ٹھوکر سے شاید اس بدروح کا کوئی غلط چینل دب گیا ہو۔ اب تم ایسا کرو کہ اس کی دوسری کنپٹی پر دوسری ٹھوکر رسید کرو۔ شاید اس سے چینل ٹھیک ہو جائے۔ صحیح نشریات آنے لگیں۔ فلموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ایک چوٹ سے یادداشت جاتی ہے' دوسری چوٹ سے واپس آ جاتی ہے۔"

"بکواس مت کرو..." برنارڈ اب ذرا خوف زدہ سے انداز میں سر دیوار کے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔ وہ گویا متوقع ضرب سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "مجھے مت مارو... تم لوگ مجھے بتاتے کیوں نہیں... میں کون ہوں؟ تم لوگوں نے مجھے تاوان کے لیے اغوا کیا ہے؟ جب مجھے معلوم ہی نہیں ہوگا کہ میں کون ہوں تو میں تمہیں تاوان کیسے دلاؤں گا؟ کس سے دلاؤں گا؟ اور دیکھو... میرے اپنے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے... میری جیبیں دیکھ لو... میری جیبیں خالی ہیں..." اس کی باتیں بے ربط تھیں۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ تمہاری جیبیں خالی ہیں؟" میں نے اسے گھورا "تمہاری تو یادداشت کھو گئی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے... مجھے معلوم ہے..." وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں چیخا "میری جیبیں خالی ہیں... مجھے معلوم ہے' میں غریب آدمی ہوں... مگر تم مجھے بتاؤ' میں کون ہوں؟ میرا قصور کیا ہے؟"

"کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا...؟" ٹونی نے یہ کہتے ہوئے

میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے راحیلہ کی طرف اشارہ کرکے ڈاکٹر برنارڈ کو گھورتے ہوئے کہا "اس لڑکی کو غور سے دیکھو اور مجھے بتاؤ اس کا کیا قصور تھا؟"

ڈاکٹر برنارڈ نے وحشت زدہ سی نظروں سے راحیلہ کو دیکھا اور پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا "کون ہے یہ؟ اس کا چہرا ایسا کیوں ہے؟"

ہم خاموش رہے۔ ہم تینوں ایک ٹک اسے گھور رہے تھے۔

اس نے بدستور راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا اضافے کے ساتھ ایک بار پھر اپنے سوالوں کی گردان شروع کردی "یہ کون ہے؟ تم کون ہو؟ میں کون ہوں....؟"

اس کا دماغ تو نہ جانے خراب ہوا تھا یا نہیں.... لیکن مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ اس کی یہ تکرار سن کر میرا دماغ ضرور خراب ہوجائے گا۔ ہم تینوں اسی طرح خاموشی سے اس کی طرف دیکھے جارہے تھے۔ آخر کار وہ خود بھی گویا اپنی تکرار سے تھک گیا۔ اس میں دیوانگی کا جو اُبال سا آیا تھا وہ ختم ہوگیا۔

اچانک ہی وہ دیوار کی طرف منہ کرکے بلک بلک کر رونے لگا۔ ہچکیاں لیتے ہوئے وہ مدھم سی آواز میں کہے جارہا تھا "مجھے کوئی نہیں بتاتا' میں کون ہوں... مجھے کوئی نہیں بتاتا' میں کون ہوں....؟"

"کیا وہ واقعی یادداشت کھوچکا تھا؟" یہ سوچ کرہی میرا دل ڈوبا جارہا تھا۔ جیسی مایوسی اور دل شکستگی اس وقت مجھ پر غلبہ پارہی تھی اس سے مجھے زندگی میں پہلے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا اور ڈاکٹر برنارڈ جب ہمارے قابو میں آیا تھا' اس وقت میں نے جو خوشی اور سرشاری محسوس کی تھی وہ بھی اس سے پہلے میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔ میں واقعی یہی محسوس کررہا تھا کہ میں راحیلہ کے لیے ایک بے بہا اور بے بدل تحفہ لے جارہا تھا۔ اس کے لیے ایک نئی زندگی کا پیغام لے کر جارہا تھا۔

اب گویا کسی نے میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ میرا دل مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا اور ہر خوشی کا احساس اس میں سے نچوڑ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے آپ کو راحیلہ کی نظر میں بہت خجل بھی محسوس کررہا تھا حالانکہ اگر ڈاکٹر برنارڈ واقعی یادداشت کھو بیٹھا تھا تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا لیکن میں پھر بھی خود کو بہت شرمندہ محسوس کررہا تھا۔ میں نے گویا اسے کوئی بہت بڑی امید دلانے کے بعد اپنے آپ کو اس کی نظر میں جھوٹا ثابت کردیا تھا۔

میں نے دُزدیدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ گویا میرے محسوسات سے بالکل بے خبر تھی اور اسے شاید اس صورتِ حال کا کوئی خاص دکھ بھی نہیں تھا.... یا پھر شاید بات یہ تھی کہ وہ بہت گہری عورت بننے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ مجھے ندامت و شرمندگی میں مبتلا دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کے لیے اس نے بے فکری و بے پروائی کا اپنا ایک فلسفہ تراش لیا تھا۔

وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی "اسے بخشوانے گئے نماز بخشوانے جانا اور روزے گلے پڑجانا۔ بجائے اس کے کہ میرا چہرہ ٹھیک کرتا.... پہلے تمہیں اس کا دماغ ٹھیک کرانے کا بندوبست کرنا پڑے گا۔ اب کیا کروگے؟ کیا اسے کسی مینٹل ہسپتال میں داخل کراؤگے؟" وہ اردو میں بات کررہی تھی۔

"میں اتنا فارغ البال نہیں ہوں کہ اس قسم کے چکروں میں خوار ہوتا پھروں" میں نے افسردگی کے دھندلکے سے باہر آتے ہوئے کہا۔ "ویسے بھی مجھے یقین ہے کہ اس بدبخت کی یادداشت وغیرہ ہرگز نہیں کھوئی ہے۔ مجھے یہ ہر اعتبار سے بہت اونچا فنکار لگتا ہے۔ زبردست ڈراما کررہا ہے۔ اس قسم کے دماغی امراض کا علاج کرنے کے لیے یہی اسپتال بہت اچھا ہے۔ دوچار چھوٹے چھوٹے نسخوں سے ہی اس کی گمشدہ یادداشت واپس آجائے گی۔"

میری کنپٹیوں میں دھمک سی ہورہی تھی۔ خون کی گردش تیز ہوچکی تھی۔ میں نے ٹونی سے کہا "اس پر فارمولا نمبر آزماؤ۔ اسے چپلی کبابوں کا مزہ چکھاؤ۔"

ہم یہ گفتگو اردو میں کررہے تھے۔ اس دوران میں ڈاکٹر گویا اپنے گردوپیش سے بے خبر دیوار پر رخسار ٹکائے آنکھیں بند کیے بدستور روئے جارہا تھا۔ آنسو اس کے رُخساروں پر بہہ رہے تھے۔

ٹونی تہ خانے کی ایک الماری سے خاص ساخت کا ایک ساہیٹر نکال لایا۔ اس نے ہیٹر کا پلگ لگایا۔ وہ چند سیکنڈ میں دہک اٹھا۔ میں ڈاکٹر برنارڈ کے سر پر جا کھڑا ہوا۔ میرے دل میں اب واقعی بے بسی آمیز غصہ ابل رہا تھا۔

میں نے دانت پیس کر کہا "ڈاکٹر برنارڈ! اب بھی وقت ہے تم یہ ڈرامے بازی چھوڑدو.... ورنہ ایک دردناک انجام تمہارا منتظر ہے۔"

"میں کون سی ڈرامے بازی کررہا ہوں؟" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں چیخا "تم مجھے بتاتے کیوں نہیں ہو.... میں کون ہوں۔ اگر ڈاکٹر برنارڈ ہوں.... تو کس چیز کا ڈاکٹر ہوں؟ کہاں پریکٹس کرتا ہوں؟ میرا گھربار کہاں ہے؟ مجھے کچھ یاد نہیں آرہا.... اگر تم مجھے نہیں رہے ہو تو کم ازکم میرے بارے میں کچھ بتا تو دو۔"

تب گویا میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں تو بندھے ہوئے ہی تھے۔ میں نے اسے بری طرح جکڑلیا اور ذرا بھی حرکت کرنے کے قابل نہ چھوڑا۔ ایک ہاتھ میں نے اس کی گردن کے پیچھے سے لے جا کر اس کے منہ پر جمادیا تھا۔

ٹونی نے اس کی ٹانگوں پر گھٹنا جمالیا اور ہیٹر اس کے پاؤں کے ایک تلوے سے لگادیا۔ وہ بری طرح مچلا لیکن ہل نہ سکا۔ چرچراہٹ کے ساتھ گوشت جلنے کی بو تہ خانے میں پھیلی۔

میرے ہاتھ کے نیچے سے اس کی "روع' روع" کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

چند لمحے بعد میں نے ٹونی کا اشارہ کیا۔ اس نے اس کے پاؤں سے ہیٹر ہٹالیا اور دھیرے دھیرے میں نے بھی ڈاکٹر برنارڈ کے منہ سے ہاتھ ہٹالیا۔ میں نے اس کی چیخوں کا گلا تو گھونٹ دیا تھا لیکن اب اس کے منہ سے مغلظات کا سیلاب امنڈ پڑا۔ تکلیف سے اس کا چہرہ مسخ سا ہوکر رہ گیا تھا۔

پھر اس کے پاس گویا گالیاں ختم ہوگئیں اور وہ ایک عجیب بے بسی آمیز نفرت کے ساتھ ہمیں بددعائیں دینے لگا۔ میں ڈاکٹر برنارڈ کو بہت قریب سے تو نہیں جانتا تھا لیکن میں محسوس کررہا تھا کہ یہ اس کا اسٹائل نہیں تھا۔

....تو کیا وہ واقعی یادداشت کھوچکا تھا؟ کہیں میں ایک بے خبر شخص پر تشدد کرکے ظلم کا مرتکب تو نہیں ہورہا تھا؟ میرے دل میں ایک خلش سی ابھر آئی۔ راحیلہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔

میرے ذہن میں تذبذب کا بیج پھوٹ چکا تھا تاہم میں نے اپنی سخت گیری برقرار رکھتے ہوئے غضب ناک لہجے میں کہا "معلوم ہوتا ہے ہلکے ڈوز سے تمہاری یادداشت واپس نہیں آئے گی۔ اس طریقے کو تو ہماری زبان میں "چپلی کباب" والا طریقہ کہا جاتا ہے۔ لگتا ہے تمہارے پورے جسم کو چپلی کباب بنانا پڑے گا۔ اب تمہارے دوسرے پاؤں کی باری ہے۔ اس کے بعد ایک ایک کرکے جسم کے ہر حصے کی باری آئے گی۔"

وہ بدستور روتے ہوئے بولا "تم کیوں مجھ پر ظلم کیے جارہے ہو....؟ تمہیں کیوں میری بات کا یقین نہیں آرہا؟ میں تو ماننے کو تیار ہوں کہ میں ڈاکٹر برنارڈ ہوں.... لیکن اس کے بعد اگر تم مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہو تو وہ میں کیسے بتاؤں گا؟ جو باتیں مجھے معلوم ہی نہیں ہیں وہ میں کیسے بتاسکتا ہوں؟ مجھے تو یہ بھی تم سے ہی معلوم ہورہا ہے کہ میں ڈاکٹر برنارڈ ہوں۔ میں تو خود اپنے بارے میں پریشان ہوں.... اوپر سے تم نے مجھے جلانا شروع کردیا ہے.... خدا کرے تم بھی اسی طرح جہنم کی آگ میں جلو...." وہ ایک بار پھر کراہنے اور بری طرح رونے لگا۔

راحیلہ بولی "فی الحال یہ سلسلہ بند کرو۔ ہم لوگ ذرا اوپر چل کر بات چیت کرتے ہیں" وہ مجھ سے مخاطب تھی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر ڈاکٹر برنارڈ سے کہا "تم کچھ اور توانائی جمع کرلو۔ ہم تھوڑی دیر میں آکر تم سے نمٹتے ہیں۔ یہ بات بہرحال طے ہے کہ تمہاری یادداشت واپس آجائے گی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت تم میں صرف چند سانسیں باقی ہوں۔"

ٹونی نے ہیٹر الماری میں واپس رکھ دیا اور گارڈ کو بلا کر اسے برنارڈ کی نگرانی پر کھڑا کرکے ہمارے ساتھ اوپر آگیا۔ ہم ڈائننگ روم میں آبیٹھے۔

راحیلہ ایک کرسی پر بیٹھ کر کنپٹیاں مسلتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے وہ ڈراما نہیں کررہا۔ تم دونوں نے جب اسے پکڑا تھا تو کیا ہوا تھا؟"

میں نے اسے بتایا کہ برنارڈ کس طرح قابو میں آیا تھا۔ ساری تفصیل سننے کے بعد وہ بولی "تم نے اس کی پیشانی پر مشین پسٹل کا دستہ مارا.... بعد میں ٹونی نے اس کی کنپٹی پر ٹھوکر ماری.... اور تم دونوں اونچے درجے کے خبیث ہو۔ تم دونوں کی لگائی ہوئی ضرب معمولی نہیں ہوتی۔ کیا بعید ہے کہ وہ یادداشت کھو بیٹھا ہو۔ انسانی کھوپڑی بے شک بہت مضبوط ہوتی ہے.... اور ڈاکٹر برنارڈ کی کھوپڑی شاید تمہارے اندازے کے مطابق اور بھی زیادہ غیر معمولی طور پر مضبوط ہو لیکن انسانی ذہن بہرحال ایک پُرپیچ مشین ہے۔ اس کے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا۔"

میں اور ٹونی خاموش تھے۔ میں نے ٹونی سے پوچھا "تمہاری کیا رائے ہے؟"

"میری رائے بھی راحیلہ کی رائے سے تقریباً ملتی جُلتی ہی ہے" وہ بلا تامل بولا۔

"اگر تم دونوں کی رائے درست ہوئی پھر تو ہم برنارڈ کے ساتھ جو کچھ بھی کریں گے ظلم ہی ہوگا اور ہمیں ہمیشہ دعویٰ رہا ہے کہ ہم ظلم کے خلاف ہیں" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"تمہاری اپنی رائے کیا ہے؟" راحیلہ میز پر کہنیاں ٹکاتے ہوئے بولی۔

"میرے ذہن میں صرف خفیف سا شک ہے" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ یہ ہم ساتھیوں کی روایت تھی۔ ہر ایک بلا جھجک اپنی دیانت دارانہ رائے کا اظہار کرتا تھا۔ "لیکن میں تم دونوں کی رائے کے احترام میں برنارڈ پر مزید سختی کا ارادہ ملتوی کردیتا ہوں۔"

پھر میں نے راحیلہ کو مخاطب کیا "اس کے ساتھ ہی تمہارا چہرہ ٹھیک ہونے کی آخری امید بھی ختم ہوجائے گی۔ یہ تصور میری روح کے لیے ایک گھاؤ سے کم نہیں کہ تمہیں باقی زندگی اپنے چہرے کے اسی نقص کے ساتھ گزارنی پڑے گی۔"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "کاش مجھے کوئی ایسا طریقہ معلوم ہوتا جس سے میں تمہیں سمجھا سکتی کہ یہ میرا مسئلہ ہے۔ جب مجھے فکر نہیں ہے تو تمہیں اس فکر میں دُبلے ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک محاورہ بھی ہے نا.... کہ جب تک سانس تب تک آس.... میں بھی آس نہیں چھوڑوں گی۔ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ میرے چہرے کو ڈاکٹر برنارڈ نے خراب کیا تھا اور وہی اسے ٹھیک کرسکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کسی کے بس کی بات نہیں.... لیکن اگر اب ڈاکٹر برنارڈ اس قابل نہیں رہا تو میں کوئی اور آس دل میں بسالوں گی۔ فرض کرلوں گی کہ دنیا میں کوئی نہ کوئی اور ایسا فرد ضرور موجود ہوگا جس کے پاس میرا چہرہ درست کرنے کا فارمولا موجود ہوگا اور وہ مجھے مل ہی جائے گا.... یا کوئی اور طریقہ کبھی نہ

کبھی نکل آئے گا۔"

میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے اس کی طرف بغور دیکھا۔ وہ بڑے مطمئن انداز میں مسکرا رہی تھی۔ میں نے چند لمحے اس کی بات پر غور کیا پھر ڈاکٹر برنارڈ کے بارے میں سوچا اور سر جھٹک کر کہا "کافی رات بیت گئی ہے.... بھوک لگ رہی ہے۔ پہلے کھانا کھاتے ہیں پھر میں اپنی تجویز پیش کروں گا کہ ڈاکٹر برنارڈ کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔"

"بالکل ٹھیک" ٹونی فوراً بولا اور اس نے خانساماں کو کھانا لگانے کی ہدایت کی۔

کھانے کے دوران میں راحیلہ کے ذہن پر یقیناً بوجھ تھا جس سے دھیان ہٹانے کے لیے وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ کراچی آفس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ حتیٰ کہ اس نے زرتاج کی خیر و عافیت بھی دریافت کی۔

"میرے خیال میں تو وہ ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔" میں نے جواب دیا "مزید معلومات کے لیے تم خود بھی اسے فون کر لینا۔ اس کے گھر پر دو تین فون ہیں۔ موبائل فون بھی ہے... اور اب تو اس نے آفس بھی کھول لیا ہے۔ تین چار فون آفس میں بھی ہیں۔"

"آفس...؟" راحیلہ نے خفیف سے تجسس سے دہرایا "کیا کام شروع کیا ہے اس نے؟"

"رئیل اسٹیٹ کا۔" میں نے بتایا "وہ بہت مہنگی قسم کی پراپرٹی کی خرید و فروخت کراتی ہے۔ وہ خود تو زیادہ تر پس منظر میں ہی رہتی ہے۔ خاص خاص موقعوں پر، صرف خاص خاص پارٹیوں کے سامنے ہی آجاتی ہے۔ بیشتر کام اس کا ایک جہاندیدہ قسم کا منیجر کرتا ہے۔ اس نے بہت ٹھاٹ باٹ سے کام شروع کیا ہے... اور وہ چل بھی پڑا ہے۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے ٹھیک ٹھاک روپیا کما لیا ہے۔"

"روپیا واقعی روپے کو کھینچتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ شاید ہم تینوں ہی کافی کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ اس دوران میں کچھ دیر خاموشی رہی۔ میرے ساتھ ساتھ یقیناً وہ دونوں بھی اپنی اپنی جگہ کسی نہ کسی سوچ میں الجھے ہوئے تھے۔

آخر راحیلہ نے پوچھا "تم ڈاکٹر برنارڈ کے بارے میں کوئی تجویز پیش کرنے کی بات کر رہے تھے۔"

"ہاں..." میں نے کافی کا آخری گھونٹ بھر کر مگ میز پر رکھا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد اپنی تجویز بیان کی۔ ان کی آنکھوں میں دلچسپی کی نہایت معمولی لہر ابھری۔ شاید انہیں اس کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آرہا تھا۔ بہرحال وہ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔

ہم دوبارہ تہ خانے میں پہنچے۔ ڈاکٹر برنارڈ زمین پر پڑا کراہ رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ بری طرح خوفزدہ ہو گیا۔ ٹونی نے الماری سے ٹیپ نکالا اور اس کا ایک ٹکڑا کاٹ کر اس کے ہونٹوں پر چپکا لگا۔ میں اس دوران میں اس کے قریب کھڑا تھا۔

میں نے بڑبڑاتے ہوئے انگریزی میں خود کلامی کے سے انداز میں کہا "جب یہ ہمارے کسی کام ہی نہیں آسکتا تو پھر اس معیبت کو یہاں لٹائے رکھنے کا کیا فائدہ؟ اس سے جان ہی چھڑا لیتے ہیں۔"

گارڈ اور ٹونی نے اسے اٹھایا اور ایک بار پھر اسے اوپر لا کر پہلے ہی کی طرح گاڑی میں ٹھونس دیا گیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب وہ ہوش میں تھا۔ راحیلہ اب مکمل نقاب پوشی والی حالت میں ہمارے ساتھ تھی۔ ٹونی ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاڑی سست رفتاری سے گلبرگ کی سڑکوں پر سفر طے کرنے لگی۔

ہم اب نیچی آوازوں میں آپس میں باتیں کر رہے تھے تاہم آوازیں برنارڈ بھی سن سکتا تھا۔ راحیلہ بولی "میں تو کہتی ہوں دریائے راوی کا خیال چھوڑ دو۔ خواہ مخواہ اتنی دور تک سفر کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہیں گلبرگ میں بھی نہر موجود ہے اس سے کام کیوں نہیں اٹھاتے؟ وہ بھی اچھی خاصی گہری ہے۔ آج کل تو اس میں خوب پانی آرہا ہے۔"

"اس میں یہ اچھی طرح ڈوب بھی جائے گا؟ لمبا تو ہے... کہیں کوئی تدبیر تو نہیں کر لے گا؟" ٹونی نے ذرا تشویش سے پوچھا۔

"اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں۔ منہ پر ٹیپ ہے۔ کیا خاک کرے گا؟" راحیلہ ناگواری سے بولی "مزید احتیاط کے لیے ہم اس کی کمر کے ساتھ تھوڑا بہت وزن بھی باندھ دیں گے۔"

"میرا خیال ہے تمہاری تجویز مناسب ہی ہے۔" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "ہمیں راوی تک جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا مقصد تو اسی علاقے میں پورا ہو جائے گا۔ میرا خیال ہے مسلم ٹاؤن والے پل پر چلتے ہیں۔ وہاں اس وقت بالکل سناٹا ہوگا۔ ہم ذرا اطمینان سے اپنا کام کر سکیں گے۔"

"تو پھر میں گاڑی مسلم ٹاؤن کی طرف موڑ لوں؟" ٹونی نے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "گاڑی کی ڈکی میں کوئی فالتو وزنی چیز موجود ہے؟"

ٹونی نے ایک لمحے سوچا پھر بولا "گاڑی کا ایک فالتو ریمپ موجود ہے۔ میرا مطلب ہے صرف لوہے کا ریمپ ہے۔ اس پر ٹائر نہیں ہے۔ وہ کافی وزنی ہے۔"

"بس... وہی ٹھیک رہے گا۔ وہی باندھ دیں گے۔ اب رات کے اندھیرے میں وہاں نہر کے کنارے پتھر وغیرہ کون تلاش کرتا پھرے گا۔" میں نے طمانیت سے کہا۔

ڈاکٹر برنارڈ اس دوران میں مڑی تڑی حالت میں فرش پر ساکت پڑا تھا۔ میں پچھلی سیٹ پر تھا اور میرے پاؤں اس کی بندھی ہوئی ٹانگوں پر ٹکے ہوئے تھے۔ ہم جان بوجھ کر اردو میں ہی باتیں کر رہے تھے تاکہ برنارڈ یہ سمجھے کہ ہم اسے اپنی گفتگو کے مقصد سے بے خبر رکھنا چاہ رہے تھے جبکہ مجھے یقین تھا برنارڈ کافی حد تک اردو سمجھتا تھا۔ وہ جس طرح آنکھیں بند کیے ساکت پڑا تھا اس سے مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کان لگا کر ہماری گفتگو سن رہا تھا۔

جلد ہی ہم نہر کے مسلم ٹاؤن والے پل پر پہنچ گئے جہاں سے نہر کے نشیب میں ایک راستہ ایف سی کالج کی طرف جا رہا تھا۔ ہم پل کی دوسری طرف آگئے۔ یہاں دونوں طرف کی سڑکوں پر اتفاق سے لائٹس بھی اس وقت بند تھیں جس سے ہمارا کام اور بھی آسان ہو گیا۔ ویسے بھی یہاں دونوں طرف خاصا اونچا اونچا سبزہ اور درختوں کی قطاریں تھیں جن کی وجہ سے پُراسرار اور ملگجا سا اندھیرا پھیلا رہتا تھا۔ ٹونی نے گاڑی ذرا نشیب میں درختوں کے درمیان لے جا روکی۔

نہر کے دونوں طرف ون وے سڑکیں تھیں جو وحدت روڈ اور ...ز مال کو ملاتی تھیں۔ ان پر حسب توقع اس وقت گاڑیوں کی آمدورفت ختم ہو چکی تھی۔ ہم تینوں پُراسرار سایوں کی طرح گاڑی سے اتر آئے اور ہم نے برنارڈ کو تقریباً کھینچ کر گاڑی سے نکالا۔ اس کا منہ بند تھا لیکن گھٹی گھٹی کچھ آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ کراہ رہا تھا۔

ٹونی نے نہایت پھرتی سے ڈکی سے وہیل کا آہنی ریمپ نکالا اور ہم نے اسی پھرتی سے اسے نائیلون کی ڈوری کے ذریعے برنارڈ کی کمر سے باندھ دیا۔ ریمپ سمیت وہ کافی وزنی ہو گیا لیکن ہم تینوں کے لیے مل کر اسے اٹھانا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

ہم نے اسے اٹھایا اور احتیاطاً اِدھر اُدھر دیکھا۔ دونوں طرف سڑکوں پر دور دور تک کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ ہم تیزی سے اسے چھوٹے سے پل پر لے آئے۔ پل کی دیوار بہت چھوٹی تھی۔ نیچے نہر کے پانی کی سطح تاروں کی ملگجی روشنی میں کہیں کہیں سے جھلملا اٹھتی تھی۔ چاروں طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ صرف پانی کی مدھم سی سرسراہٹ یا پھر کبھی کبھار جھینگر کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

ہم تینوں نے پل کی نیچی سی دیوار پر ڈاکٹر برنارڈ کو جھولا دیا اور اسے نہر میں اچھالنے ہی لگے تھے کہ اس کی "اوغ اوغ" کچھ تیز ہو گئی۔ میں نے گویا یکدم ہنگامی انداز میں خود رکتے ہوئے اور اپنے دونوں ساتھیوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہوئے گھبراہٹ آمیز انداز میں کہا "ٹھہرو... ٹھہرو... شاید یہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔"

ہم نے اسے پل کی دیوار پر لٹا دیا اور میں نے اس کے منہ پر سے ٹیپ آہستگی سے ہٹاتے ہوئے کہا "اگر تم نے چیخ مارنے کی کوشش کی تو تم دوسرے ہی لمحے نہر میں ہو گے۔"

اس نے چیخ نہیں ماری۔ ٹیپ ہٹتے ہی وہ بری طرح ہانپنے لگا جیسے بہت دور سے دوڑتا آرہا ہو۔ اس وقت یقیناً اس کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس کی گہری سانولی رنگت تو ملگجے اندھیرے سے میل کھا رہی تھی لیکن آنکھوں کا سفید سفید حصہ گویا الگ ہی چمک رہا تھا۔

وہ چند لمحے گہری گہری سانسیں لیتا رہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے... میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔ خدا کے لیے مجھے جلدی واپس لے چلو ورنہ میں نہر میں گرے بغیر ہی مر جاؤں گا۔"

"یعنی تمہاری یادداشت واپس آگئی ہے؟" میں نے مصنوعی بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں... ہاں... اب طنز وغیرہ مت کرو۔ میری یادداشت بالکل ٹھیک ہے اور تم مجھ سے بھی بڑے سؤر کے بچے ہو۔" وہ نقاہت زدہ لہجے میں بولا۔

"کتنی خوشی کی بات ہے کہ عین آخری لمحے پر تمہاری یادداشت واپس آگئی۔" میں نے گویا خوشی سے نہال ہوتے ہوئے کہا "خدا کا شکر ہے ابھی ہم نے تمہیں ہاتھوں سے چھوڑا نہیں تھا۔"

میں نے جلدی سے اس کی کمر سے ریمپ ہٹایا اور ہم نہایت پھرتی سے اسے گاڑی میں واپس لے آئے اور پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا۔

"اب تم کسی حد تک باعزت لوگوں کی طرح سفر کر سکتے ہو۔" میں نے کہا "بہرحال احتیاط ضروری ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ٹیپ اس کے ہونٹوں پر دوبارہ چپکا دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں بھی بدستور بندھے ہوئے تھے۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ ٹونی نے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم تیزی سے واپس روانہ ہو گئے۔

میرے ذہن سے جیسے کوئی بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ میں اپنے آپ کو بہت خوش محسوس کر رہا تھا۔ ساری تھکن دور ہو گئی تھی۔ ٹونی اور راحیلہ بالکل خاموش تھے۔

"دیکھا تم لوگوں نے... کیسی بابرکت نہر ہے۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا "اس کے اوپر جھولا جھلانے سے بے چارے ڈاکٹر برنارڈ کی یادداشت واپس آگئی ورنہ بے چارہ اس دنیا سے یادداشت کے بغیر ہی رخصت ہو جاتا۔"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ برنارڈ منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ سڑکوں پر ٹریفک برائے نام تھا۔ جلد ہی ہم ٹونی کے گھر واپس جا پہنچے۔ ایک بار پھر ہم نے تہ خانے کا رخ کیا۔ ڈاکٹر برنارڈ کو اب بھی اٹھا کر نیچے پہنچایا گیا۔ تہ خانے میں ایک گوشہ حوالات کی کوٹھری سے مشابہ تھا۔ اس کا دروازہ بھی آہنی سلاخوں والا تھا۔

اس بار ہم نے برنارڈ کو اس میں پہنچا دیا اور فرش پر بچھے گدے پر لٹا دیا۔ میں نے اس کے منہ سے ٹیپ ہٹا کر کہا "اگر تم اچھے انسانوں کا سا رویہ اختیار کرو گے اور موقع ملتے ہی فرار کی کوئی اسکیم بنانے کی کوشش نہیں کرو گے تو ذرا بہتر اور باعزت انداز میں رہ سکو گے۔ تمہارے ساتھ مہمانوں کا سا سلوک کرنے کی کوشش

کی جائے گی۔ رہو گے تو تم اسی تہ خانے میں۔ لیکن تمہیں حوالات نما اس کوٹھری سے نجات مل جائے گی۔"

"تم چاہتے کیا ہو؟" اچانک اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں اضمحلال اور تھکن تھی۔

"کیا ابھی تک تمہاری سمجھ میں نہیں آیا کہ ہم کیا چاہتے ہیں؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"میری کیا سمجھ میں آیا ہے اسے تم چھوڑو۔ میں تمہاری زبانی سننا چاہتا ہوں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ اب وہ ایک معقول انسان معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے راحیلہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ لڑکی، جس کا چہرہ تم نے بگاڑا تھا۔ ہم چاہتے ہیں اس کا چہرہ ٹھیک کر دو۔"

"بس۔۔۔؟" اس نے تصدیق چاہی گویا میرا مطالبہ اس کی توقعات سے بہت کم رہا ہو۔

"تم اور کیا سمجھ رہے تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں سوچ رہا تھا شاید تم ریڈ ڈاٹ کے بارے میں مجھ سے وہ باتیں پوچھنے کی کوشش کرو گے جو مجھے خود بھی معلوم نہیں ہیں۔" وہ بولا۔

"فی الحال میں نے تمہاری ریڈ ڈاٹ پر لعنت بھیجی ہوئی ہے۔ چونکہ فی الحال ہمیں ایسی کوئی اطلاع نہیں مل رہی ہے جس سے پتا چلتا ہو کہ وہ دوبارہ ہمارے ملک میں سرگرم ہونے کی کوشش کر رہی ہے یا اس کی باقیات نئے سرے سے منظم ہو رہی ہیں۔ اس لیے ہم نے بھی اس کا پیچھا چھوڑ دیا ہے۔ ہو سکتا ہے ابھی تمہارے علاوہ بھی تمہاری تنظیم کے کچھ بچے کھچے لوگ یہاں موجود ہوں لیکن جب تک وہ کوئی شرارت نہیں کریں گے ہم ان کے چکر میں نہیں پڑیں گے۔"

وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے آنکھیں یوں پھیلائے ہوئے تھا جیسے کچھ اور بھی سننے کی توقع رکھتا ہو لیکن صرف اتنا سن کر اس نے گویا سکون کی سانس لی۔

میں نے اب قدرے دوستانہ لہجے میں کہا "اگر تم راحیلہ کا چہرہ ٹھیک کر دیتے ہو تو میں باقی ہر بات بھول جاؤں گا۔ خفیہ اداروں کو اگرچہ اس وقت بھی تمہاری تلاش ہے لیکن میں دل پر جبر کرتے ہوئے تمہیں ان سے بھی بچا لوں گا۔ اگر تم ملک سے فرار ہونا چاہتے ہو اور تمہیں اس میں کوئی مسئلہ درپیش ہے تو میں وہ بھی حل کرا دوں گا۔ تمہیں یہاں سے نکلوا دوں گا۔"

وہ مربیانہ انداز میں مسکرا دیا "اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ میں جب تمہارے ملک سے نکلنا چاہوں گا، نکل جاؤں گا خواہ تمہارے تمام خفیہ ادارے تمام راستوں کی نگرانی کر رہے ہوں۔ میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہو گا کہ مجھے تمہاری قید سے رہائی مل چکی ہو۔"

اس نے اتنی خود اعتمادی سے یہ بات کی تھی کہ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ شاید میری آنکھوں میں حیرت کی لہر محسوس کرتے ہوئے بولا "تمہارے ملک میں گھسنا اور یہاں سے نکلنا۔۔۔ دونوں ہی بڑے آسان کام ہیں۔ معمولی درجے کے بدمعاش، دہشت گرد، تخریب کار، اسمگلر اور غیر قانونی تارکین وطن یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ میں تو پھر بھی ریڈ ڈاٹ کا آدمی ہوں۔"

بات افسوسناک تھی لیکن سچ تھی۔ میں دل ہی دل میں کچھ شرمندہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ تاہم میں نے اپنی شرمندگی کا اظہار نہیں کیا۔ بعض اوقات ڈھیٹ بنے رہنا انسان کی مجبوری ہوتی ہے۔

"تو پھر تم اب تک نکلے کیوں نہیں تھے؟ پاکستان میں ہی کیوں ٹکے ہوئے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"شاید اس لیے کہ میری قسمت میں تمہارے ہاتھوں ذلت لکھی ہوئی تھی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ویسے اس کا دنیاوی جواب یہی ہے کہ ابھی مجھے ہائی کمان کی طرف سے یہ ملک چھوڑنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔"

"خیریت تو ہے؟" میرے کان کھڑے ہوئے "کیا ابھی یہاں کچھ اور فساد پھیلانے کا پروگرام ہے؟"

وہ ہنس دیا لیکن دوسرے ہی لمحے تکلیف سے کراہ اٹھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اپنی تکلیف پر ضبط کرتے ہوئے اس نے گویا مجھے تسلی دی "مجھے یہاں روکے رکھنے کی وجہ کچھ اور ہے۔ اب یہاں میرے اور ریڈ ڈاٹ کی ایک دوسری شخصیت کے سوا تنظیم کا کوئی آدمی موجود نہیں ہے۔ مزید کسی کے آنے کا پروگرام بھی نہیں ہے۔ ایک آدھ مہینے تک شاید باہر سے ہائی کمان کی طرف سے ہمارے لیے بھی کچھ احکامات آجائیں۔"

"دوسری شخصیت کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم نے کہا تھا کہ تم ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کرو گے۔" اس نے فوراً مجھے یاد دلایا۔

"یہ وعدہ صرف اس صورت میں ہے کہ تم راحیلہ کا چہرہ ٹھیک کرو گے۔" میں نے کہا۔

"میں اس کے لیے تیار ہوں لیکن پہلے تم میری حالت کا تو خیال کرو۔ میرے پاؤں میں شدید تکلیف ہے۔ میرا جوڑ جوڑ پھوڑے کی طرح دکھ رہا ہے۔ اس وقت یہی غنیمت ہے کہ میں ذہنی طور پر اس قابل ہوں جو تمہاری باتوں کا جواب دے رہا ہوں۔" اب وہ قطعی مضمحل نظر آ رہا تھا۔

"تم خود ڈاکٹر ہو۔ فی الحال اپنا علاج تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ جن دواؤں کی ضرورت ہو وہ ٹونی کو لکھوا دو۔ ابھی منگوا لی جائیں گی۔ ایک آدھ دن میں تمہاری حالت بہتر ہو جائے تو تمہیں راحیلہ کا چہرہ ٹھیک کرنے کے لیے کام شروع کرنا ہو گا۔"

"تم میرے لیے جلدی سے دوائیں منگوا دو پلیز۔۔۔! یہ تو تم نے دل کی بات کر دی۔ اور خدا کے لیے میرے ہاتھ بھی کھول دو۔ اب تو مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے بازو جسم سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔" اس کا لہجہ اب بالکل بدل چکا تھا۔ بلکہ ملتجیانہ ہو چکا تھا۔

"کوئی بدمعاشی تو نہیں دکھاؤ گے؟" میں نے گویا اطمینان کرنا چاہا۔

"مجھ میں اب بدمعاشی کی ہمت ہی کہاں ہے۔" وہ کراہ کر بولا "میری تو جان پر بنی ہوئی ہے۔"

"بہرحال۔۔۔ اگر تم نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو یہ سمجھنا کہ تم اپنے ساتھ دشمنی کرو گے۔" میں نے کہا اور ٹونی کو اشارہ کیا۔ اس نے اس کے ہاتھ کھول دیے۔

میں نے ایک کاغذ اور قلم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اب تم اپنے لیے دوائیں خود ہی لکھ ڈالو۔"

"میرے ہاتھ ابھی لکھنے کے قابل کہاں ہیں۔۔۔" وہ بازوؤں کو اس طرح حرکت دیتے ہوئے بولا جیسے وہ عرصے تک فالج کا شکار رہنے کے بعد ٹھیک ہونا شروع ہوئے ہوں "یہ تو مجھے مفلوج سے محسوس ہو رہے ہیں۔۔۔" اس نے ہاتھوں کی انگلیاں ہلانے کی کوشش کی۔

"کوئی بات نہیں۔ اکثر ڈاکٹروں کے نسخے دیکھ کر یہی گمان گزرتا ہے جیسے وہ فالج زدہ ہاتھوں سے لکھے گئے ہیں۔" میں نے کہا اور قلم اس کی طرف بڑھایا، لیکن وہ قلم صحیح طور پر تھام بھی نہ سکا چنانچہ اس نے دواؤں کے نام بتائے اور ٹونی نے لکھے۔ پھر ٹونی وہ پرچہ اوپر اپنے نوکر کو دے کر واپس آ گیا۔

میں نے برنارڈ سے کہا "تم نے دیکھا۔۔۔؟ اگر کوئی ہمارے ساتھ شرافت سے چلے تو اس کے لیے ہم کتنے اچھے لوگ ہیں؟ اب ہم تمہاری تیمارداری بھی کریں گے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ راحیلہ کا چہرہ ٹھیک کرنے کے لیے تم کب کام شروع کر سکو گے اور اس میں کتنا وقت لگ جائے گا؟"

"اب یہ میرے لیے بھی آسان نہیں رہا۔۔۔" وہ بغور راحیلہ کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ذرا تشویش سے بولا۔

"اب تم مجھے کوئی نئی کہانی سنانا اور بہانے بازیاں کرنا مت شروع کر دینا۔" میں نے تیزی سے کہا "ورنہ میری کھوپڑی گھوم جائے گی اور یہ تمہارے حق میں بہت برا ہو گا۔"

"اپنا دماغ ٹھنڈا رکھو۔۔۔" وہ جلدی سے بولا "میں تمہیں کوئی نئی کہانی نہیں سنا رہا اور نہ ہی بہانے بازی کر رہا ہوں۔ تمہیں ٹھنڈے دل سے میری بات سننی چاہیے۔ جب تک ہمارا ہیڈ کوارٹر اور دوسرے ٹھکانے موجود تھے، ہمارے پاس اپنے مقاصد کے لیے مکمل لیبارٹریاں اور تمام ضروری سازوسامان، کیمیکلز وغیرہ موجود تھے۔ تمہیں معلوم ہے وہ سب اب تباہ ہو چکا ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کچھ وقت تو ہو گی۔ اس پر تمہیں اپنی کھوپڑی سلگانے کی ضرورت نہیں۔۔۔ بلکہ تمہیں صبروتحمل سے میری ہدایات کے مطابق کام کرنا ہو گا۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو صبروتحمل پر آمادہ کرنے کی کوشش کی اور ذرا نرمی سے پوچھا "کیا دشواریاں پیش آنے کی توقع ہے؟"

"دشواریاں کچھ خاص نہیں ہیں۔۔۔" وہ کراہ کر بولا "مجھے تھوڑا سا سامان درکار ہو گا جو عام اسکولوں کالجوں کی لیبارٹریوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ٹیسٹ ٹیوبس۔۔۔ بیکر۔۔۔ جار۔۔۔ وغیرہ۔۔۔ کچھ کیمیکلز وغیرہ جو تمہیں کسی بھی بڑی دواساز کمپنی سے مل سکتے ہیں تاہم وہ بھی عام آدمیوں کو نہیں دیے جاتے۔۔۔"

"ہم عام آدمی نہیں ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم ان چیزوں کی فکر چھوڑو۔ جو کچھ تم کہو گے، تمہیں فراہم کر دیا جائے گا۔"

"لیکن ایک کیمیکل شاید تمہیں بھی آسانی سے نہ ملے۔ اسے رکھنے کا لائسنس صرف ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے پاس ہے جس کا ہیڈ آفس امریکا میں ہے لیکن اس کی ایک فیکٹری یہاں بھی کام کر رہی ہے۔ اس کی چند نہایت مہنگی پروڈکٹس یہاں بھی مارکیٹ ہوتی ہیں۔"

"تم ان چکروں میں مت پڑو کہ کون سی چیز ہمیں کیسے ملے گی۔" میں نے قدرے بے تابی سے کہا "بس وہ چیز دنیا میں کہیں موجود ہونی چاہیے۔ ہم تمہیں لا دیں گے۔۔۔ خواہ وہ ہمیں کچرا کریا ڈاکا ڈال کر لانی پڑے۔"

"میں تو تمہیں صرف امکانات سے خبردار کر رہا ہوں۔" ڈاکٹر برنارڈ بولا "ویسے تو مجھے معلوم ہے کہ تم سب کتنے اونچے درجے کے فنکار ہو۔ تم ہی لوگوں کی وجہ سے تو یہاں ریڈ ڈاٹ جیسی تنظیم کا حشر خراب ہو گیا اور آج میں بھی یہاں اس حال میں پڑا ہوں۔ تمہارے سرکاری اداروں سے تو ہم نے کبھی کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔"

میری سمجھ میں نہ آیا، اس کی اس بات پر مجھے خوش ہونا چاہیے تھا یا شرمندہ۔ چنانچہ میں نے اس موضوع پر کوئی بات کرنے کے بجائے اپنے اصلی مسئلے کے بارے میں ہی بات جاری رکھتے ہوئے کہا "کل ہی تم مجھے ان تمام چیزوں کی فہرست بنا دو جو تمہیں اس کام کے سلسلے میں درکار ہوں تاکہ جب تک تمہاری حالت بہتر ہو تو تب تک ہم ان کا بندوبست کر لیں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔" وہ کراہ کر بولا "اب یہ کام ہو جائے گا۔ میری طرف سے کوئی انکار نہیں ہے۔ بس تم اس خاص کیمیکل کا بندوبست کرنے کی فکر کرو۔ اس کے بغیر یہ کام ممکن نہیں ہو گا۔"

"وہ کیمیکل اگر روئے زمین پر پایا جاتا ہے تو تمہیں ضرور مل جائے گا لیکن اگر تم کسی فرضی کیمیکل کے نام سے خواہ مخواہ مجھے چکر

...ی کوشش کرو گے تو پھر اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار
...میں نے کہا۔
...کوئی بات نہیں ہے۔" وہ بولا "میں تو اب خود جلد از
...کام کر کے تم سے جان چھڑانا چاہوں گا۔"
"ٹھیک ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اس دوران
ٹونی کا ملازم دوائیں وغیرہ لے آیا تھا۔ ٹونی نے گارڈ کو برنارڈ کی
...انی پر اور ملازم کو اس کی ضروریات کا خیال رکھنے پر مامور کیا
میرے ساتھ اوپر آ گیا۔ راحیلہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔
"آپ کہاں ٹھہریں گے؟" ٹونی نے پوچھا۔
"سوچ رہا ہوں ہوٹل میں ہی ٹھہر جاؤں۔" میں نے جواب
...جس فائیو اسٹار ہوٹل میں بوقتِ ضرورت میرا قیام رہتا تھا وہ
...کے قریب ہی تھا۔ وہاں سے میں ٹہلتا ہوا بھی اپنے ہیڈ آفس
...سکتا تھا۔
"آپ یہیں کیوں نہیں ٹھہر جاتے؟" ٹونی بولا "یہاں تمام
...وں سے رابطے میں بھی آسانی رہے گی۔۔۔ ڈاکٹر برنارڈ بھی یہیں
...۔ میرا خیال ہے ہم دونوں میں سے ایک کو ہر وقت اس گھر میں
...ود رہنا چاہیے۔"
"بات تمہاری ٹھیک ہے۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا
...ں یہیں ٹھہر جاتا ہوں۔"
ٹونی کے گھر میں ایک عمدہ گیسٹ سوئٹ موجود تھا۔ اس نے وہ
...ھلوا دیا اور ملازم کو از سرِ نو اس کی جھاڑ پونچھ کی ہدایت کی۔ اس
...ت تک ہم لوگ ڈرائنگ روم میں ہی موجود تھے۔ راحیلہ خاموش
...ی۔
"تم خوش نہیں ہو کیا؟" میں نے پوچھا۔
"میں اب اتنی بھی ناشکری نہیں ہوں کہ اتنی بڑی خوشخبری
...ن کر بھی خوش نہ ہوں۔۔۔ لیکن تم مجھ سے بھی زیادہ خوش ہو۔" وہ
مسکراتے ہوئے بولی۔
"ہاں۔۔۔ اس میں کوئی شک نہیں۔" میں نے تسلیم کیا۔
"لیکن برنارڈ نے اب خاص کیمیکل کی رٹ لگا دی ہے۔"
راحیلہ کے لہجے میں کوئی اندیشہ تھا۔
"کوئی بات نہیں۔ ہم اس کی ہر فرمائش پوری کریں گے۔ اس
کے لیے کوئی عذر نہیں چھوڑیں گے۔ ویسے میرا خیال ہے ایسے کسی
کیمیکل کی اسے واقعی ضرورت ہو گی۔ وہ خواہ مخواہ رٹ نہیں لگا رہا
ہے۔ لو اس کا یقیناً کوئی خاص ہی فارمولا ہو گا جس کی مدد سے اس
نے اس طرح آدھا چہرہ سیاہ کیا تھا کہ دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ملکوں
کے ماہرین جلد نے بھی اسے درست کرنے سے معذوری ظاہر کر دی
تھی۔ اس فارمولے کا توڑ بھی ایسا آسان تو نہیں ہو گا۔"
"چلو۔۔۔ خیر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔ میں اب چلتی ہوں۔ صبح
میں تمہیں یہاں سے ساتھ لیتی چلوں گی۔ ذرا ایک نظر اپنے گھر
کی تعمیر کے کام کو بھی دیکھ لینا۔ کافی تیزی سے کام ہو رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں ٹھیک نو بجے تمہیں تیار ملوں گا۔" میں نے
کہا اور وہ رخصت ہو گئی۔
دوسری صبح میں نے اور ٹونی نے ناشتے کے بعد تہ خانے میں جا
کر ڈاکٹر برنارڈ کی حالت کا جائزہ لیا اور اس کی خیر و عافیت دریافت
کی۔ اسے حوالات نما کوٹھری میں ہی رکھا گیا تھا لیکن اب اس کے
پاؤں بھی کھول دیے گئے تھے۔ ضرورت کی ہر چیز اسے مہیا کی
جا رہی تھی۔ گارڈ گن لیے پہرا دے رہا تھا۔ اب اس کی حالت
بہت بہتر تھی۔ جلے ہوئے پاؤں کی بینڈیج بھی اس نے خود ہی کر لی
تھی البتہ وہ اس پاؤں پر وزن دے کر کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔
میری فرمائش پر اس نے مطلوبہ چیزوں کی فہرست بنا دی۔
خاص کیمیکل کا فارمولا ہی درحقیقت اُس کا نام تھا اور وہ برنارڈ نے
ایک علیحدہ کاغذ پر لکھ دیا تھا۔ اس نے اس ملٹی نیشنل امریکی کمپنی کا
نام بھی لکھ دیا تھا جس سے اس کے ملنے کی امید تھی۔ اتفاق سے
اس کی فیکٹری لاہور ہی میں تھی۔ میں نے وہ فہرست ٹونی کے سپرد
کر دی اور ان چیزوں کی فراہمی کا کام اس کے ذمے لگا دیا۔
"اس سلسلے میں اگر کوئی دشواری پیش آئے یا زیادہ ہی اثر
رسوخ کی ضرورت پڑے تو مجھے بتانا۔" میں نے کہا۔
کچھ دیر بعد راحیلہ مجھے لینے آ گئی۔ میں اس کے ساتھ روانہ
ہو گیا اور ٹونی اپنے کاموں کے سلسلے میں نکل کھڑا ہوا۔ راحیلہ اپنی
گاڑی میں مجھے اس جگہ لے گئی جہاں میرا منہدم شدہ مکان نئے
سرے سے تعمیر ہو رہا تھا۔ کام بہت تیزی سے ہو رہا تھا۔ ستون تعمیر
ہو چکے تھے۔ دیواریں کھڑی کی جا چکی تھیں اور چھتوں کے لیے
شٹرنگ لگائی جا رہی تھی۔
میں چند لمحے گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ راحیلہ ڈرائیونگ سیٹ پر
تھی۔ اس کی انگلیاں اسٹیرنگ وہیل پر دھیرے دھیرے حرکت
کر رہی تھیں۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی "کیسا لگ رہا
ہے؟" شاید وہ مسکرائی تھی مگر اس وقت وہ نقاب پوش حسینہ والے
حلیے میں تھی۔ میں اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھ سکتا تھا۔
"یہ میرے مکان کا دوسرا جنم ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے
کہا "ریڈ ڈاٹ نے اسے تباہ کیا تھا۔ یہ دوبارہ بن گیا۔ ریڈ ڈاٹ کے
ڈاکٹر برنارڈ نے اپنی دانست میں تمہارے چہرے کو نمونۂ عبرت بنایا
تھا۔ اسے وہ اپنے ہاتھوں سے ٹھیک کرے گا۔ ریڈ ڈاٹ ہم سے
بہت زیادہ طاقت ور تھی۔ اس نے ہمیں چیونٹیاں سمجھ کر فنا کر دینا
چاہا تھا لیکن ہم آج بھی زندہ گھوم رہے ہیں جبکہ ان کے بیسیوں
نہایت ہی نادرِ روزگار قسم کے لوگ مارے جا چکے ہیں اور باقی ادھر
اُدھر بھاگنے پر مجبور ہو گئے۔ بس۔۔۔ یہی فرق ہوتا ہے جرم میں اور
بے گناہی میں۔۔۔! جرم اکثر اوقات خوب پھلتا پھولتا ہے۔ چاروں
طرف اس کی دہشت پھیل جاتی ہے۔۔۔ بے گناہی سہم جاتی ہے۔
پناہ ڈھونڈتی پھرتی ہے۔۔۔ لیکن آخرِ کار بے گناہی اپنی بقا کا راستہ
ڈھونڈ لیتی ہے۔ سروائیو کر جاتی ہے لیکن جرم فنا ہو جاتا ہے۔ ظلم

کتنا ہی طاقتور ہو جائے لیکن ' اسے شکست ہو جاتی ہے۔"

"ہیئر... ہیئر... ہیئر..." راحیلہ نے بے آواز تالی بجائی "کبھی کبھی میں سوچتی ہوں... اور حیران ہوتی ہوں... کہ تم لیڈر ہوتے تو کیا ہوتا؟؟"

"بہت برا ہوتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "دنیا میں فساد کچھ اور بڑھ جاتا۔"

"اور فی الحال تم کیا کر رہے ہو؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"فی الحال تو میں اپنی بساط کے مطابق فساد کو کم کرنے میں زندگی گزار رہا ہوں۔ دنیا میں قدم قدم پر فساد کے بڑے بڑے پہاڑ کھڑے ہیں۔ اگر میں ان میں سے دو چار ذرّے ہی کم کرنے میں کامیاب ہو گیا تو میرے لیے یہی بڑی کامیابی ہو گی۔ بظاہر تو کوئی فرق پڑتا نظر نہیں آئے گا لیکن میں خود کافی طمانیت کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوں گا۔"

"ہوں...!" اس نے ہنکارا بھرا اور اس کی انگلیاں دھیرے دھیرے دوبارہ اسٹیئرنگ وہیل کو کھٹکھٹانے لگیں۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "مکان کی تعمیر کا کام قریب جا کر نہیں دیکھو گے؟"

"تم دیکھتی رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا "بس... تو پھر میں دیکھ کر کیا کروں گا۔"

"اچھا... تو پھر آفس چلتے ہیں۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے بولی "تمہارا کمرا کافی دنوں سے خالی پڑا ہے۔ تمہاری یاد میں آہیں بھرتا رہتا ہے۔ کہیں تم سے بڑا کوئی آسیب اس میں بسیرا نہ کر لے۔"

"جب تم جیسی بد روح اس کی حفاظت کے لیے بیٹھی ہے تو پھر آسیب اس میں گھسنے کی جُرات کیسے کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گاڑی گھما کر سڑک پر لے آئی۔

کچھ دیر بعد ہم آفس جا پہنچے۔ اوپر پہنچ کر میں سب لوگوں سے ملاقات کے بعد اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوا تو راحیلہ میرے ساتھ ہی تھی۔ کیتھرین نے اپنی میز سے اٹھ کر میرا استقبال کرتے ہوئے "ہیلو... ہائے" وغیرہ کے تبادلے کے بعد بتایا "کچھ دیر پہلے ہی کراچی سے آپ کے لیے زرتاج کا فون تھا۔"

میں نے غیر ارادی طور پر راحیلہ کی طرف دیکھا لیکن اس کا چہرہ ابھی تک نقاب اور تاریک چشمے کی پناہ میں تھا۔ میں اس کے تاثرات نہ دیکھ سکا۔ استہزائیہ ہی ہوں گے!

میں نے کیتھرین سے پوچھا "کوئی خاص بات...؟ اس نے کوئی پیغام تو نہیں چھوڑا؟"

"نہیں سر!" اس نے جواب دیا "وہ بس آپ کی خیریت معلوم کرنا چاہ رہی تھیں اور یہ پوچھ رہی تھیں کہ آپ کا قیام کہاں ہے... کب تک واپسی ہو گی۔ یہ باتیں مجھے خود بھی معلوم نہیں تھیں اس لیے میں انہیں کچھ نہیں بتا سکی۔ وہ کہہ رہی تھیں ممکن ہو تو آپ انہیں فون کر لیجیے گا۔"

میں نے سر ہلایا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میرے ساتھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ذرا استہزائیہ لہجے میں بولی "بے چاری کے لیے انتظار کی گھڑیاں گزارنا مشکل ہے۔ ایک دن میں ہی بے تاب ہو گئی۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔" میں نے اپنی ریوالونگ چیئر پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا "کاش ایسا ہی ہو...! لیکن ایسا نہیں... جب میں وہاں ہوتا ہوں تب تو وہ چار چار دن فون نہیں کرتی۔ اب رسماً کر لیا ہو گا۔ دوسرے شہر آیا ہوا ہوں نا۔"

"صفائیاں کیوں پیش کر رہے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ وہ میرے مقابل بیٹھ چکی تھی۔ نقاب اس نے ہٹا دیا تھا اور چشمہ اتار کر میز پر رکھ دیا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میری توقع کے مطابق استہزائیہ تھی۔

"مجھے صفائیاں پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا "البتہ یہ حسرت ضرور ہے کہ کبھی وہ وقت بھی آئے جب صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت پیش آئے...!" میں نے بات ختم کر کے ایک حسرت بھری آہ بھر کر بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کے آدھے چہرے کا گلابی پن کچھ گہرا ہو گیا۔

"بکواس مت کرو..." وہ فوراً موضوع بدلتے ہوئے بولی "یہ بتاؤ... اتنے دنوں بعد اپنے اس آفس میں بیٹھنا کیسا لگ رہا ہے؟"

"ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے میں کہیں گیا ہی نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"بالکل ٹھیک..." وہ طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولی "اب آرام سے یہاں بیٹھ کر کام کرو۔"

"کام...؟" میں نے کراہ کر کہا "کیسا کام؟ ابھی کل ہی تو میں نے کراچی سے یہاں تک سفر کر کے... راستے میں ڈاکٹر برنارڈ سے لپا ڈگی کر کے... اتنی طویل اور دماغ سوز قسم کی میٹنگ بھگتائی ہے۔ کیا اب بھی میرے لیے کچھ کام باقی ہے؟؟"

"تمہارے یہاں نہ ہونے سے بہت کام جمع ہو چکا ہے۔ واپس جانے سے پہلے کچھ تو نمٹا جاؤ۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"تم لوگ آخر کس مرض کی دوا ہو؟" میں نے کچھ ایسے انداز میں کہا جیسے کوئی پرائی مصیبت میرے سر پڑ رہی ہو۔

"ہم سے تو جو ہو سکتا ہے کرتے ہی رہتے ہیں... فون اور فیکس پر بھی تم سے رابطہ رہتا ہے... روزانہ ضروری کاغذات دستخط کے لیے تمہیں وہاں بھی بھیجتے رہتے ہیں... اس کے باوجود کچھ نہ کچھ کام رہ جاتے ہیں۔"

"اُف خدایا...!" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ میں اپنے آپ کو کام چور ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔

[...]نے اتنی دولت اس لیے تو نہیں کمائی تھی کہ مجھے پھر بھی کام [...]ڑے۔"

"دولت تو جتنی زیادہ کماؤ گے... کام اتنا ہی بڑھتا چلا جائے [...]"

"کسی دن میری کھوپڑی گھوم گئی تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر کھدر [...] ایک چولا پہن کر جنگل میں جا بیٹھوں گا... بن باس لے لوں [...] جب بال سفید ہو جائیں گے تو سنیاسی بابا کہلانے لگوں گا؟؟"

"بہت مشکل ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی "پاؤں میں دولت کی [...]ی زنجیر ہو... گلے میں دنیا داری کا طوق ہو تو اتنی آسانی سے جان [...]ں چھوٹتی۔ لہٰذا بہتر ہے کہ یہ فضول "مَیں مَیں" کرنے کے [...]ے کچھ ضروری کاغذات دیکھ لو۔"

اس نے انٹرکام پر جنرل منیجر اور منیجر ایکسپورٹس کو کچھ فائلیں [...]ے کمرے میں بھجوانے کی ہدایت کی۔ فائلیں آگئیں تو وہ مجھے [...]م کاغذات کے بارے میں الگ الگ ہر ضروری بات بتانے لگی۔ [...]اس نے مجھے کام میں الجھا دیا لیکن اٹھنے سے پہلے بولی "ویسے [...]رے کام میں زیادہ مصروف ہونے سے پہلے اس بے چاری [...]تاج کو فون کر لو۔ شاید وہ بے تابی سے تمہارے فون کا انتظار [...]رہی ہو۔"

"تمہارے سامنے تھوڑا ہی کروں گا فون۔" میں نے فوراً کہا "تخلیے میں کروں گا۔ آخر پرائیویسی بھی کوئی چیز ہے۔ زرتاج سے بات کرنی ہے کسی نتھو خیرے سے نہیں۔"

"کیوں نہیں... کیوں نہیں..." وہ مسکرا کر اٹھتے ہوئے بولی "میں تو جا ہی رہی ہوں۔ تم بے شک اطمینان سے چھت سے الٹے لٹک کر بات کرو۔"

اس کے جانے کے بعد میں نے واقعی زرتاج کو فون کر لیا۔ بات کوئی خاص نہیں تھی۔ اس نے صرف میری خیر و عافیت پوچھنے اور واپسی کا پروگرام جاننے کے لیے ہی فون کیا تھا۔

"میں آیا تو صرف ایک دن کے لیے ہی تھا لیکن اب پتا نہیں کتنے دن لگ جائیں۔ میں یہاں ایک اور ہی چکر میں پھنس گیا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"تم جہاں جاتے ہو' چکر تمہارے منتظر ہوتے ہیں۔" وہ ہلکی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"کیا کروں... قسمت ہی کچھ ایسی پائی ہے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"کیا یہ خاصا خوبصورت "چکر" ہے؟ کیا عمر ہے اس کی... اور کہاں رہتی ہے؟" اس نے معصومانہ سے لہجے میں پوچھا۔

"آہ... ہر طرف سے طنز کے تیر...!" میں نے کراہ کر کہا "کیا تم لڑکیوں کو اس قسم کی باتیں کرنے کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا؟"

"اچھا... تو کوئی اور بھی اس قسم کی باتیں کرتا رہا ہے؟" وہ چونکی۔

"جو دو ڈھائی لڑکیاں اتفاق سے میری جاننے والی ہیں وہ آج کل اسی قسم کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی ایسا برا زمانہ بھی آئے گا جب خوبصورت اور جوان لڑکیوں کے پاس بات کرنے کے لیے اس قسم کے موضوعات کے سوا کوئی موضوع ہی نہیں ہوگا۔"

"زمانہ تو خیر اس سے بھی برا آئے گا جب لڑکیوں کے پاس تم سے بات کرنے کے لیے وقت ہی نہیں ہوگا... اور اگر ہوگا بھی تو وہ زیادہ سے زیادہ یہی دریافت کریں گی' باباجی! کھانسی اب کیسی ہے؟ ہاتھوں کا رعشہ کچھ کم ہوا یا نہیں؟ جوڑوں کے درد کو کچھ آرام ہے یا نہیں؟ کبھی نہ کبھی تمہیں وہ دن بھی دیکھنا ہی ہے۔" وہ ہنسنے لگی گویا اس وقت کے تصور سے محظوظ ہو رہی ہو۔

"اتنا بھیانک نقشہ کھینچ کر مجھے مجبور مت کرو کہ میں بھی حضرت جوش کی طرح دعا کرنے لگوں کہ خدا وہ وقت آنے سے پہلے ہی مجھے اٹھالے" میں نے خوفزدہ لہجے میں کہا "اور یہ مت بھولو کہ جب مجھ پر ایسا وقت آئے گا تو تمہاری حالت اس سے بھی زیادہ عبرتناک ہوگی۔"

"دیکھا جائے گا..." وہ بے پروائی سے بولی "بہرحال یہ فرق ضرور ہوگا کہ مجھے اس پر کوئی خاص افسوس نہیں ہوگا۔ میں تو صبر شکر سے دن گزار لوں گی لیکن تمہیں بہت افسوس ہوگا۔ دن رات بیٹھے آہیں بھرو گے۔"

"تم نے اس وقت کے تصور سے ڈرانے کے لیے ہی صبح فون کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں... بس میں نے تمہیں یاد دلانے کے لیے فون کیا تھا کہ ہو سکے تو ذرا جلدی آنے کی کوشش کرنا۔ یہاں بھی ایک چکر تمہارا منتظر ہے جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا لیکن یہ ذرا عمر رسیدہ اور بیوہ قسم کا چکر ہے۔ تمہیں اس قسم کے چکر سے کوئی دلچسپی تو نہیں ہو سکتی لیکن میں چاہتی ہوں کہ میری خاطر تم دلچسپی لے لو۔ میں بھرپور سفارش کر رہی ہوں۔"

"تمہاری خاطر تو دلچسپی لینی پڑے گی۔" میں نے کہا۔

"بہت شکریہ۔ میں انتظار کر رہی ہوں۔ خدا حافظ۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ریسیور رکھنے کے بعد بھی کچھ دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ کیا واقعی اس نے صرف اتنی سی بات یاد دلانے کے لیے فون کیا تھا؟ میں نے اس موضوع پر زیادہ غور کرنے کے بجائے اپنے آپ کو کام میں الجھانے کی کوشش کی۔

کام میں وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا حتیٰ کہ لنچ بریک ہو گیا۔ راحیلہ نے اپنے اور میرے لیے کھانا قریبی ریستوران سے منگوایا ہوا تھا جو ہم نے کانفرنس روم میں بیٹھ کر کھایا۔

کھانے کے دوران میں میں نے بغور اس کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "اب تمہارے چہرے کا اصل حالت [illegible] عجیب لگے گا؟"

"مجھے تو شاید یقین ہی نہ آئے۔" وہ مسکراتے ہوئے [illegible] حال اب اس نے اس امید کی مسرت کو محسوس کرنا شروع [illegible] کہ اس کا چہرہ ٹھیک ہو سکتا تھا ورنہ پہلے تو وہ مایوسی کے خول [illegible] نکلنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"ٹونی آج اسی سلسلے میں انتظامات کرتا پھر رہا ہے [illegible] ہاں... تم نے جتنا کام میرے سپرد کیا تھا' میں نمٹا چکا ہوں [illegible] ہے۔ شام تک باقی بھی نمٹ جائے گا۔ میں تمام کاغذات [illegible] گا۔"

"جب تم سنجیدگی سے کام کرنے بیٹھتے ہو تو مہینوں کا کام [illegible] میں نمٹا لیتے ہو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"کیا کریں... جب تم جیسا سخت باس سر پر ہو تو کام کرنا [illegible] ہے۔" میں نے مظلومانہ لہجے میں کہا۔

"حرامخوری کی ایکٹنگ خوب کرتے ہو۔ اگر تم حرامخور ہو [illegible] بزنس کو اتنا پھیلا نہیں سکتے تھے۔" راحیلہ بولی۔

"بزنس کو پھیلانے میں میرا کوئی کمال نہیں۔ اس کا تو [illegible] بھی صحیح طور پر پتا نہیں کہ یہ کیسے پھیلتا چلا گیا۔ میں نے یہ [illegible] خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔" میں نے کہا۔

میں جب یہ بات کرتا تھا تو عام طور پر لوگوں کو یقین نہیں [illegible] تھا کہ میرے لیے یہ سب کامیابیاں غیر متوقع تھیں لیکن [illegible] اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "اکثر کامیاب لوگوں کے محسوسات [illegible] یہی ہوتے ہیں۔ وہ جب بلندی پر پہنچ جاتے ہیں تو پھر انہیں اپنا سفر ایک خواب لگتا ہے۔ یہ سب اوپر والے کے معجزے ہیں [illegible] بعض اوقات انسان کے لیے اپنی عنایات اور نوازشیں [illegible] پھیلا دیتا ہے کہ وہ سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ ہو گیا؟ یہ دونوں ہی عمل خواب جیسے ہیں۔"

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر [illegible] "آج کے دور میں ایک تو یہ بڑی مصیبت ہے کہ ذرا سی کوئی [illegible] بات کرو تو لوگ عجیب سی نظروں سے آپ کی طرف دیکھنے لگتے [illegible] گویا انہیں شبہ ہو رہا ہو کہ آپ کی کھوپڑی کا کوئی پرزہ گرا [illegible] ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میرے [illegible] پریشانی کی بات یہ ہے کہ میرے اور تمہارے خیالات [illegible] ملتے جلتے کیوں ہیں۔"

"تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں ہر اچھی بات پر پریشانی [illegible] ہے" وہ ترحم آمیز لہجے میں بولی۔

کھانے اور کافی کے بعد میں اپنے کمرے میں آگیا اور [illegible] کام میں جُت گیا۔ چار بجے کے قریب ٹونی کا فون آیا "سر [illegible] باقی سب سامان جمع کر دیا ہے۔ تمام انتظامات مکمل ہیں۔ [illegible]

[illegible] کیمیکل کا رہ گیا ہے۔ وہ تو واقعی ٹیڑھی کھیر بن گیا ہے۔"

"کیا مطلب...؟" میرا ماتھا ٹھنکا۔

"ڈاکٹر برنارڈ نے ہمیں جس ملٹی نیشنل امریکی کمپنی گبسن فارما [illegible] بارے میں لکھ کر دیا تھا... یہ کیمیکل صرف ان کے پاس ہوتا تھا [illegible] ان کی بھی صرف ایک پروڈکٹ میں استعمال ہوتا تھا۔ وہ کچھ [illegible] قسم کے زخموں کی دوا تھی۔ اس کیمیکل کو دوا ساز کمپنیوں کے [illegible] عام فہم زبان میں "فارمولا اے" کہتے ہیں...."

"ہاں... یہ سب باتیں تو ڈاکٹر برنارڈ نے ہمیں بتائی تھیں" [illegible] نے کہا۔

"لیکن تازہ ترین صورتحال اس خبیث کو بھی معلوم نہیں [illegible] قصہ یہ ہے کہ زخموں کی وہ دوا ترقی یافتہ ممالک میں تو تقریباً [illegible] سال پہلے بین ہو چکی ہے۔ ہمارے ہاں اسے تقریباً چھ ماہ پہلے [illegible] ممنوع قرار دیا گیا ہے۔"

"اس کے بارے میں شبہ پایا گیا ہوگا کہ وہ اگر زخموں کو کچھ [illegible] دیتی ہے تو کوئی دوسری مہلک بیماری بھی پیدا کرتی ہے؟" میں [illegible] خیال ظاہر کیا۔

"جی ہاں" ٹونی نے جواب دیا۔

"یہ کوئی نئی کہانی نہیں" میں نے تاسف سے کہا "ہم جیسے [illegible] تو ان مغربی سائنس دانوں کے لیے ان چوہوں اور بندروں [illegible] اہمیت بھی نہیں رکھتے جن پر یہ لوگ طرح طرح کے تجربات [illegible] کرتے رہتے ہیں۔ ان چوہوں اور بندروں کے تحفظ کے سلسلے میں [illegible] انجمنیں بنی ہوئی ہیں اور ان کی حمایت میں جلسے جلوس ہوتے [illegible] رہتے ہیں لیکن ہمارے بارے میں کبھی کسی نے سوچا بھی نہیں ہوگا [illegible] بس یہ لوگ اپنی ایجادات کے سلسلے میں تختۂ مشق بنائے رکھتے [illegible]"

"جی سر!" ٹونی بولا "پہلے یہ ایک دوا ایجاد کر کے ہمارے ہاں [illegible] بھیجتے ہیں۔ اپنے ہاں تو یہ جلد ہی اس کے خطرناک نتائج سے [illegible] ہو کر اسے بند کر دیتے ہیں۔ اس سے جان چھڑا لیتے ہیں لیکن [illegible] ہمارے ہاں اگر ان کی اپنی کمپنی بھی اس دوا کو مارکیٹ کر رہی ہو تو یہ [illegible] اس کو بند کرانے کے سلسلے میں سخت اور واضح ہدایات نہیں بھیجتے۔ [illegible] ہمارے سرکاری محکمے اور افسر شاہی تو ویسے ہی سونے پہ [illegible] ہیں۔ آٹھ دس سال تو ویسے ہی ان کے کان پر جوں نہیں [illegible] بعض اوقات تو اس سے بھی زیادہ عرصے کے بعد جا کر [illegible] پتا چلتا ہے کہ فلاں دوا کے اثرات خراب ہیں اور وہ فلاں [illegible] ملک میں اتنے سال پہلے بین ہو چکی ہے۔ اس وقت تک نہ [illegible] کتنے بدنصیب ان دواؤں کی وجہ سے پیچیدہ اور مہلک امراض [illegible] میں مبتلا ہو چکے ہوتے ہیں۔"

"الغرض یہ سلسلہ تو ہمارے ہاں بہت عرصے سے چل رہا ہے" [illegible] نے تاسف سے کہا "زخموں کی وہ دوا بین ہو چکی ہے اس لیے [illegible] فارمولا اے دستیاب نہیں [illegible]"

"جی ہاں" ٹونی نے میرے بدترین خدشے کی تصدیق کی "دوا ساز کمپنی کے پاس جتنا اسٹاک تھا... کمپنی کے نہایت ذمے دار افراد کے بیان کے مطابق وہ کچھ عرصہ قبل ہی ضائع کر دیا گیا ہے۔"

"تم نے کوئی اور ذریعہ... کوئی اور راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی؟ کسی کیمسٹ وغیرہ کو... فارمیسی کے کسی ماہر کو روپے پیسے وغیرہ کا لالچ دے کر...؟" میں نے بے تابی سے کہا۔

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "اسی چکر میں تو اتنی دیر لگ گئی سر! باقی کام تو لنچ سے پہلے ہی نمٹ گئے تھے۔ میں نے کوئی سرا تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فارمولا اے بہت جلد ہی قصۂ پارینہ بن گیا۔ کسی کو اس کے بارے میں کچھ یاد نہیں... کسی کو صحیح معلومات نہیں ہیں۔ ویسے بھی وہ اپنی جگہ ایک مکمل فارمولا تھا اور تیار شدہ حالت میں امریکا سے ہی امپورٹ ہوتا تھا۔ یہاں کسی نے اسے تیار کرنے یا اس کا فارمولا محفوظ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ زخموں کی اس دوا کے بارے میں شبہ پایا گیا تھا کہ وہ کینسر کا سبب بن رہی ہے اور اس سلسلے میں سب سے زیادہ شبہ "فارمولا اے" پر ہی جا رہا تھا اس لیے اب گویا کوئی بھی اس کے بارے میں کسی بھی قسم کی واقفیت ظاہر کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ میں نے جلدی سے کہا "کہیں یہ ڈاکٹر برنارڈ کا بچہ ہمارے ساتھ کوئی اور ہی کرتب تو نہیں کرنا چاہتا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ بظاہر راحیلہ کا چہرہ ٹھیک ہو جائے... ہم برنارڈ کو رہا کر دیں اور بعد میں راحیلہ کسی نئی مصیبت میں پھنس جائے؟"

"میں نے اس امکان پر غور کیا تھا۔ میری ایک بہت بڑے کیمسٹ سے بات ہوئی ہے۔ میں اصل قصہ تو اسے نہیں سنا سکتا تھا لیکن میں نے اس سے فارمولا اے کے استعمال کے بارے میں رائے لی تھی" ٹونی نے بتایا "اس کا کہنا یہ تھا کہ فارمولا اے' اپنی جگہ مکمل دوا نہیں ہے۔ وہ محض ایک کیمیکل ہے۔ اصل دارومدار اس کے استعمال پر ہے۔ جس طرح زہر کھا کر انسان مر جاتا ہے لیکن ایک ماہر کیمیا داں اسی زہر سے طرح طرح کی دوائیں تیار کرتا ہے اسی طرح فارمولا اے کو بھی کوئی جینئس اس طرح استعمال کر سکتا ہے کہ اس سے کوئی معجزاتی دوا تیار ہو جائے۔ وہی چھری والی بات ہے... کہ کوئی اس سے گلا بھی کاٹ سکتا ہے اور کوئی دوسرے ہزاروں تعمیری کام لے سکتا ہے۔ ڈاکٹر برنارڈ بہرحال ایک جینئس ہے۔ نہ جانے اس نے کس کس چیز کے کیا کیا استعمال دریافت کر رکھے ہوں گے۔ مجھے توقع ہے کہ اب وہ ہمارے ساتھ بدمعاشی نہیں کرے گا۔"

"پھر... کچھ امید کی کرن بھی نظر آئی یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ابھی ایک امید باقی ہے" ٹونی خوشگوار لہجے میں بولا

پر قسمت آزمائی کرنا پسند کریں اور کوئی اچھی خبر لے کر آئیں۔ ورنہ مجھے ہی حکم دیجیے گا۔ میں اس ذریعے کو بھی کھنگال کر دیکھ لوں گا۔"

"کیا ہے وہ ذریعہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہاں کے لیے کمپنی کا پریذیڈنٹ امریکی ہی ہے اور وہ آج کل چھٹی پر ہے" ٹونی بتانے لگا "شاید وہ کچھ زیادہ ہی بیزار ہو کر چھٹی پر گیا ہوا ہے۔ اس نے سختی سے ہدایت کی ہے کہ دو ہفتے تک کسی بھی کاروباری یا دفتری معاملے میں اس سے رابطہ کرنے کی ہرگز کوشش نہ کی جائے۔ کمپنی کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے امید ظاہر کی ہے کہ شاید اب بھی فارمولا اے کا چھوٹا موٹا اسٹاک کہیں موجود ہو لیکن وہ صرف پریذیڈنٹ گیری ہیرس کے علم میں ہوگا یا وہ کم از کم رہنمائی کر سکے گا کہ ہم اس کی تھوڑی بہت مطلوبہ مقدار کہاں سے حاصل کر سکتے ہیں.... لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے وہ ہمارے بارے میں مطمئن ہو کہ ہم ٹھیک ٹھاک.... قابلِ اعتماد اور معزز لوگ ہیں۔ اس قابل ہیں کہ فارمولا اے ہمارے ہاتھ میں دیا جا سکے.... اور یہ کہ ہم اس کا کوئی غلط استعمال نہیں کریں گے۔"

میں نے اس کے الفاظ پر غور کرتے ہوئے کہا "مسئلہ یہ ہے کہ ہم اسے اصل کہانی تو نہیں سنا سکتے۔ ہم اسے یہ تو نہیں بتا سکتے کہ فارمولا اے ہمیں اصل میں ایک جینئس کے لیے چاہیے۔ اور وہ جینئس اتفاق سے اس وقت ہمارے تہ خانے میں قید ہے اور ہم نے اس مردود کا ایک پاؤں بھی جلا رکھا ہے۔ عین ممکن ہے کہ ڈاکٹر برنارڈ امریکی ہی ہو اور اس انکشاف پر براہِ راست وہائٹ ہاؤس میں کھلبلی مچ جائے۔ ریڈ ذات کو خفیہ طور پر تو تمام ترقی یافتہ سفید فام قوموں کی حمایت حاصل تھی۔ کوئی بعید نہیں کہ برنارڈ کوئی بہت اہم امریکی ہو۔ اس لیے اس کا تو ہم ذکر تک نہیں کر سکتے۔ امریکیوں کی یہ بات مجھے سب سے زیادہ پسند ہے کہ وہ اپنے ایک معمولی سے شہری کی حفاظت کے لیے بھی سردھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں اور اپنے تمام وسائل استعمال کرتے ہیں۔ برنارڈ کے لیے تو وہائٹ ہاؤس تک میں کھلبلی مچ سکتی ہے۔"

"ہم کوئی اور دردناک کہانی گھڑ کر سنا سکتے ہیں جو گیری ہیرس کے جذبۂ انسانیت کو اپیل کر سکتے ہیں" ٹونی بولا "یہ لوگ بعض اوقات بڑے انسان دوست بھی ثابت ہوتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں کسی اعلیٰ اور نیک مقصد کے لیے فارمولا اے کی ضرورت ہے۔"

"اس صورت میں بھی شاید وہ ثبوت دیکھے بغیر اور اپنا اطمینان کیے بغیر ہماری مدد نہ کرے...." میں نے تمام امکانات پر غور کرتے ہوئے کہا "بہر حال تم یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔ میں اپنی سی کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔ تم نے اس کا فون نمبر اور ایڈریس وغیرہ تو حاصل کر لیا ہوگا؟"

"جی ہاں...." ٹونی نے مجھے دو فون نمبر اور ایڈریس لکھوایا۔

"ٹھیک ہے.... تم اب کچھ وقت ڈاکٹر برنارڈ کے سر پر سوار رہو اور دیکھو کہ وہ اس صورتِ حال کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر برنارڈ کے ذہن کو ٹٹولنے کی کوشش کرو کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی کھیل تو نہیں کھیل رہا" میں نے ہدایت کی "اگر کوئی بات تمہارے علم میں آئے جو تمہیں ذرا سی بھی اہم لگے تو مجھے موبائل فون پر فوراً مجھے مطلع کرنا۔ شاید کچھ دیر بعد میں تمہیں وہاں نہ ملوں۔"

"میرا آپ کے ساتھ آنا تو ضروری نہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ اگر میں نے ضرورت محسوس کی تو بلا لوں گا" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ یوں تو امریکی ہم جیسے لوگوں میں ایک حاکمانہ شان کے ساتھ رہتے ہیں لیکن میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں اپنا مکمل تعارف کرانے کے بعد ہیرس سے بات کروں تو شاید وہ مجھے کچھ اہمیت دینے اور میری بات توجہ سے سننے پر آمادہ ہو جائے۔

پھر میں نے سوچا کہ اس سے بہتر طریقہ یہ ہوگا کہ کسی اور ذریعے سے ہیرس تک پہنچنے کی کوشش کروں۔ وہ بے شک امریکی تھا اور ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا پریذیڈنٹ تھا لیکن بہر حال اس کی حیثیت ایک کاروباری شخص کی تھی اور اس کا کاروبار دوا سازی کا تھا۔ بہر حال ہماری وزارتِ صحت کی ہدایات کی کچھ نہ کچھ پابندی تو کرنی ہی پڑتی ہوگی اور ہماری اس وزارت کے سیکریٹری کی، افسروں یا وزیروں کی اس کی نظر میں کچھ نہ کچھ تو اہمیت ہوگی۔ میرا خیال یہ تھا کہ پہلے میں اس سطح کے کسی شخص سے اس کو فون کرواؤں اور اس کے بعد خود بات کروں۔

میں نے ان لوگوں کو یاد کیا جن سے کسی نہ کسی حوالے سے میری رسم و راہ تھی۔ پھر میں نے اسلام آباد چند لوگوں کو فون کیے۔ آخرِ کار ایک بہت ہی کار آمد شخصیت ہاتھ آ گئی۔ یہ شخصیت وفاقی وزیر کے برابر اہم تھی۔ میں نے اس سے مدعا بیان کیا۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ فوری طور پر ہیرس کو فون کر دے گا۔

اس کے بعد میں فون بند کر کے کافی منگوا کے آرام سے چسکیاں لینے لگا۔ مجھے تقریباً پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑا۔ مجھے مایوسی ہونے لگی۔ میں نے سوچا شاید وہ شخصیت اتنی بھی اہم نہیں تھی جتنی میں سمجھ رہا تھا۔ یا پھر شاید اس نے میری بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔

عین اس وقت جب کہ میں ہیرس سے براہِ راست بات کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا، کیتھرین نے مجھے انٹر کام پر بتایا کہ مسٹر گیری ہیرس مجھ سے بات کرنا چاہتے تھے۔ مجھ پر طاری مایوسی یک لخت دور ہو گئی اور میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ زیادہ بہتر رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ میں گیری ہیرس کو فون کر کے اپنا تعارف کراتا اور اپنی رام کہانی سناتا، وہ مجھے فون کر کے یقیناً جاننا چاہتا تھا کہ مجھے اس سے کیا کام تھا؟

میری ہدایت پر کیتھرین نے اس سے لائن ملائی۔ دوسری طرف سے ایک بھاری، کچھ بوجھل مگر چہکتی ہوئی سی آواز سنائی دی "ہیلو مسٹر افضل چوہدری! کیسے ہیں آپ؟ مجھے بڑی خوشی ہے کہ اس وقت میں آپ سے بات کر رہا ہوں۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ آپ کو مجھ سے کچھ کام ہے۔ گو کہ میں ان دنوں چھٹی پر ہوں۔ پھر بھی مجھے آپ کے کام آ کر خوشی ہوگی۔"

وہ نہایت دوستانہ لہجے میں، نہایت روانی سے بات کیے چلا جا رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ طبعاً گرم جوش تھا یا میرے کرائے ہوئے ٹیلی فون نے اس کے لہجے میں گرمجوشی بھر دی تھی۔

"بہت شکریہ مسٹر ہیرس!" میں نے پُر وقار لہجے میں کہا "میں آپ کو زحمت نہ دیتا لیکن مجھے واقعی آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے...." اور پھر میں نے اچانک ہی اپنے مطلب کی بات کر دینے کی تکنیک آزمائی۔ بعض اوقات اس تکنیک کے بہت ہی اچھے نتائج سامنے آتے تھے۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "مسٹر ہیرس! مجھے تھوڑی سی مقدار میں وہ کیمیکل چاہیے جسے فارماسیوٹیکل کمپنیوں والے آسان زبان میں فارمولا اے کہتے ہیں۔"

"فارمولا اے....؟" اس نے دہرایا اور چند سیکنڈ کے لیے گویا اسے سانپ سونگھ گیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید اچانک بات کر دینے کی میری تکنیک کچھ اچھی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ بعض اوقات انسان اس کے جواب میں ہڑبڑا کر انکار بھی کر دیتا تھا۔

"آپ کو اس کی کیا ضرورت پڑ گئی؟" آخر اس نے گویا سنبھل کر پوچھا۔

"ایک انتہائی نجی ضرورت سمجھ لیجیے.... میں آپ کو اطمینان دلاتا ہوں کہ اس کا کوئی غلط استعمال نہیں کیا جائے گا۔ ایک انتہائی لائق ڈاکٹر اپنے ایک فارمولے کے تحت اسے ایک انتہائی نیک مقصد کے لیے استعمال کرے گا۔ یہ استعمال صرف ایک فرد تک محدود ہوگا.... اور یوں سمجھ لیجیے یہ اس فرد کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔"

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ وہ سارا جوش و خروش جو مجھ سے بات کرتے وقت اس کے لہجے میں محسوس ہوا تھا، یکدم ہی گویا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اپنی خوش خلقی کے اس مظاہرے پر پچھتا رہا ہو۔ میں نے اچانک ہی فیصلہ کیا تھا کہ اسے اصل افراد کے بارے میں تو کچھ نہیں بتاؤں گا لیکن بات حقیقت سے قریب تر کروں گا۔ سچ بولنے پر میرا روحانی اعتقاد تھا۔ اس معاملے میں بھی حقیقت بیانی کے اثرات دیکھنا چاہتا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ہیرس کھنکار کر بولا "مسٹر چوہدری! آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ وہ ایک ممنوعہ کیمیکل ہے۔ کوئی بھی شخص جو اس کے استعمال کا پوری طرح اہل نہ ہو وہ اس کی وجہ سے کسی کو کینسر میں مبتلا کر سکتا ہے۔ اس کیمیکل کے بارے میں یہ شبہ پایا جاتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے مسٹر ہیرس!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آپ اطمینان رکھیں.... وہ کیمیکل ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں استعمال ہوگا جو میڈیکل اور فارمیسی کی دنیا کا ایک بہت بڑا جینئس ہے...."

"میں اس کا نام پوچھ سکتا ہوں؟" اس نے فوراً سوال کیا۔

مجھے اسی سوال کا اندیشہ تھا۔

"اس نے اپنا نام پوشیدہ رکھنے کی درخواست کی ہے کیونکہ کام نجی نوعیت کا ہے" میں نے جواب دیا "ویسے آپ کو اس ضمن میں تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے مسٹر ہیرس! اگر اس کیمیکل کے بارے میں یہ شبہ درست ہے تو پھر اس ملک کے بدنصیب ضرورت مندوں پر وہ وقت بھی گزرا ہے جب اس سے بنی ہوئی دوا عام میڈیکل اسٹورز پر بک رہی تھی۔ یعنی لوگ اپنی جیب سے قیمت ادا کر کے کینسر خرید کر گھروں کو لے جا رہے تھے۔"

"وہ لاعلمی کی بات تھی مسٹر چوہدری! لاعلمی میں تو آپ کے مذہب میں بھی بڑی بڑی غلطیاں معاف ہیں" وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

"غلطی....!" میں نے چبھتے ہوئے سے لہجے میں دہرایا "یہ بڑا ہی مددگار قسم کا لفظ ہے۔ اپنے اعمال کا جواز پیش کرنے کے سلسلے میں بہت کام آتا ہے۔ یہ کچھ اسی قسم کی غلطی ہے جیسے کسی بڑے مقام پر فائز شخص ایک اشارے سے ہزاروں افراد کو اذیت کی موت مروا دے اور پھر کہے اوہ.... معاف کیجیے.... مجھ سے ذرا غلطی ہو گئی.... اگر ایسی غلطیوں کو غلطی تسلیم کرنے کا رواج شروع ہو جائے تو اس دنیا کا انجام مزید بھیانک ہو سکتا ہے مسٹر ہیرس! جب کہ یہ پہلے ہی خاصے بھیانک انجام کی طرف بڑھ رہی ہے۔"

پھر میں نے ذرا معنی خیز سے لہجے میں کہا "میرا خیال ہے اس دوا کے بارے میں کبھی کوئی اسٹوری پریس میں نہیں آئی؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے ایسا کوئی قصہ کبھی اخبارات میں نہیں پڑھا" میں اسے اشارہ دینا چاہتا تھا کہ پہلے اگر اس سلسلے میں اخبارات میں کچھ نہیں آیا تھا تو اب آ سکتا تھا۔ پہلے اگر کسی کے اثر رسوخ یا دولت کی طاقت نے اس اسکینڈل کو دبا دیا تھا تو اب کسی کا اثر رسوخ اور دولت کی طاقت اس گڑے مُردے کو اکھاڑ بھی سکتی تھی۔

وہ میرا اشارہ سمجھ گیا۔ اس کے لہجے میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی۔ وہ پہلے خاصے دوستانہ اور خوشگوار لہجے میں بات کر رہا تھا۔ اب بولا تو اس کے لہجے میں خفیف سا تناؤ آ گیا۔ اس کی مصنوعی خوش مزاجی رخصت ہو گئی۔ بہر حال مجھے اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ مجھے اس کی مصنوعی خوش مزاجی کی نہیں، فارمولا اے کی ضرورت تھی۔

"آپ کافی تلخ آدمی ہیں مسٹر چوہدری!" وہ بولا۔

"میں تلخ ہرگز نہیں ہوں مسٹر ہیرس!" میں نے فوراً اپنے لہجے میں خوشگواری لاتے ہوئے کہا "لیکن اگر کسی کا کوئی اشد ضروری اور نہایت معمولی سا جائزہ کام بھی نہ ہو رہا ہو تو وہ تلخ بھی ہو سکتا ہے۔"

"آپ ایسا کریں..." وہ غالباً کچھ سوچ کر بولا "کہ آج شام چھ بجے مجھ سے ملاقات کریں۔ اس وقت تک میں ذرا اور غور و خوض کرلوں گا۔ ہم دوستانہ ماحول میں بیٹھیں گے... دو چار ڈرنکس لیں گے اور کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں گے۔"

"مسٹر ہیرس' مسئلہ اتنا نازک ہے کہ میں محض ملاقات برائے ملاقات کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" میں نے ملائمت سے کہا "مجھے کوئی واضح وعدہ... کوئی قوی امید چاہیے۔ اگر آپ یہ کام نہیں کر سکتے... یا کرنا نہیں چاہتے تو صاف انکار کر دیجیے۔ میں برا نہیں مناؤں گا اور کوئی دوسرا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کروں گا۔"

میرے لہجے میں بے شک ملائمت تھی لیکن میں نے بات دو ٹوک کی تھی۔ میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو چکی تھیں۔ درحقیقت میرے سامنے فی الحال تو کوئی دوسرا راستہ تھا ہی نہیں۔ میں تو خواہ مخواہ ہی حد سے زیادہ پُراعتماد بن کر اس پر چڑھائی کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور کچھ دھمکی آمیز سے اشارے دے رہا تھا۔ وہ جواباً انکار بھی کر سکتا تھا اور اپنے انکار پر اڑ بھی سکتا تھا۔ اس صورت میں کسی جائز اور قانونی راستے پر چلتے ہوئے تو میں اس سے اپنی بات منوانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ اب جب کہ مطلوبہ آدمی میرے سامنے آگیا تھا' میں ٹیڑھی انگلیوں سے بھی گھی نکالنے سے دریغ نہیں کروں گا۔ خواہ اس کے لیے مجھے ناگوار اور تکلیف دہ نتائج ہی کیوں نہ بھگتنے پڑیں۔

چند لمحے کی صبر آزما خاموشی کے بعد وہ خلافِ توقع خوشگوار لہجے میں بولا "آپ بہت ضدی آدمی بھی ہیں مسٹر چوہدری!"

"معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میں نہ تو ضدی ہوں اور نہ ہی تلخ..." میں نے بھی خوشگوار لہجے میں کہا "صرف ضرورت نے مجھے ایسا بنا دیا ہے... اور ضرورت بہت سنگین نوعیت کی ہے۔ اگر عام حالات میں آپ سے ملاقات ہوئی ہوتی تو شاید آپ مجھے بہت مختلف آدمی محسوس کرتے اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ آپ مجھے اپنے نہایت پسندیدہ دوستوں میں شمار کرنے لگتے۔"

"اوہ... کیا واقعی؟" وہ دھیرے سے ہنسا۔ اس کی ہنسی بھی کو بجلی سی تھی "یقین نہیں آرہا..." پھر وہ سنجیدہ لہجے میں بولا "کاش آپ مجھے ضرورت کی نوعیت بتا سکتے۔ کھل کر بات کر سکتے۔"

"کام ہو جانے کے بعد شاید میں آپ کو سب کچھ بتا دوں... بلکہ شاید اس شخصیت کو بھی آپ کے سامنے لا کھڑا کروں جس کے لیے یہ تقریباً زندگی موت کا سا مسئلہ ہے۔ پھر آپ یقیناً خوش ہوں گے کہ آپ کے ہاتھوں سے تقریباً لاعلمی میں ایک بہت نیک کام ہو گیا۔"

"اچھا... ٹھیک ہے... گو کہ آج کل کے زمانے میں کم بات پر اعتبار کرنے کو تو دل نہیں چاہتا... لیکن میں آپ کی بات پر بھروسا کر لیتا ہوں۔ آپ میری طرف سے تقریباً وعدہ ہی سمجھیں لیکن میں پہلے کچھ دیر آپ کے ساتھ بیٹھ کر... آپ سے بات کر کے ذرا اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کس قسم کے آدمی ہیں۔ میں اپنے طور پر ذرا مطمئن ہونا چاہتا ہوں کہ میں کسی غلط آدمی کو ایک اہم چیز نہیں دے رہا۔ اس دوران میں میں ذرا آپ کے بارے میں مزید معلومات بھی کرلوں گا۔ امید ہے آپ برا نہیں منائیں گے۔"

"ہرگز نہیں" میں نے جواب دیا "اگر آپ میرے بارے علاقے کے تھانے سے بھی معلومات حاصل کریں گے تو میں نہیں مناؤں گا۔"

وہ اب ذرا کھل کر ہنسا اور بولا "نہیں... نہیں... خیر! مجھے امید ہے کہ آپ اتنے غیر معزز آدمی نہیں ہیں جو آپ کے بارے میں علاقے کے تھانے سے معلومات حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئے۔"

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا "میں ایک اور بات واضح کرنا چاہتا ہوں۔ میں صرف چند گرام فارمولا اے کی منہ مانگی قیمت بھی ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے شروع میں یہ پیشکش کرنا اچھا معلوم نہیں ہوا کہ کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں آپ کو لالچ دینے کی کوشش کر رہا ہوں لیکن اب جب کہ آپ تقریباً آمادہ ہو چکے ہیں میں یہ بات کہہ دینے میں کوئی حرج نہیں سمجھتا۔ آپ چاہیں تو لاکھوں میں بھی اس کی قیمت طلب کر سکتے ہیں۔"

"اوہ... میں اب بھی یہ سمجھ سکتا ہوں کہ آپ مجھے لالچ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر اس چیز کی اب بھی آپ کی نظر میں کوئی قیمت ہے تو وہ آپ بلا تکلف مجھ سے وصول کر سکتے ہیں۔ میں کسی کی شرافت سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا" میں نے کہا۔

"بعض لوگوں کے نزدیک قیمت چیز کی نہیں... ضرورت کی ہوتی ہے" وہ سنجیدگی سے بولا "لیکن وہ تقریباً بلیک میلر ہوتے ہیں اور میں تھوڑا سا بھی بلیک میلر نہیں ہوں مسٹر چوہدری! وہ کیمیکل جب استعمال ہوتا تھا تب بھی اتنا مہنگا نہیں تھا اور اب تو اس کی قیمت مٹی کوڑے کے برابر بھی نہیں... بلکہ اب تو اس کا کسی کے پاس موجود ہونا ہی جرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ میں اتنا برا آدمی نہیں ہوں کہ آپ کی ضرورت کا سن کر پھیل جاؤں۔ میں آپ سے اس کی کوئی قیمت نہیں لوں گا۔"

"بہت بہت شکریہ مسٹر ہیرس! پیشگی شکریہ..." میں نے حقیقتاً شکر گزاری سے کہا "کیا وہ آپ کی رسائی میں ہے؟ میرا مطلب ہے... جب آپ وہ مجھے دینے کا حتمی فیصلہ کر لیں گے تو فوری طور پر دے سکیں گے یا نہیں؟ کہیں کسی فیکٹری یا گودام وغیرہ میں تلاش تو نہیں کرانا پڑے گا؟"

"نہیں... نہیں... فیکٹری یا گودام وغیرہ میں تو اب اس کا نشان بھی نہیں ملے گا" اس نے جواب دیا "جن دنوں اس کا اسٹاک ضائع کیا جا رہا تھا... میں نہ جانے کیوں اس کے دو تین چھوٹے ڈبے اٹھا کر گھر لے آیا تھا۔ میں تو انہیں تقریباً بھول ہی چکا تھا۔ اب تم نے اتنی شد و مد سے ذکر چھیڑا تو مجھے یاد آئے تھے... نہ جانے کس اسٹور میں پڑے ہوں گے۔ تلاش کرانے پڑیں گے۔ میرے گھر میں کئی بڑے بڑے اسٹور روم ہیں اور سب میں نہ جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ بھرا ہوا ہے۔ بہرحال وہ مل جائیں گے۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے" اس کے لہجے میں اطمینان تھا۔

میری روح میں ایک عجیب سی سرشاری اتر آئی۔ اگر وہ شخص میرے سامنے ہوتا تو شاید میں اس کے ہاتھ چوم لیتا۔ میں نے اس کا اتنا شکریہ ادا کیا کہ وہ شرمندہ ہو گیا اور بولا "مت بھولیں کہ ابھی میں نے آپ کا کام کیا نہیں ہے مسٹر چوہدری!"

"میرے نقطۂ نظر سے تو کر ہی دیا ہے" میں نے کہا۔ وہ ہنس دیا اور میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "ٹھیک چھ بجے آپ سے ملاقات ہوگی۔"

"ٹھیک ہے... میں انتظار کروں گا" اس نے کہا۔ میں نے اسے خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔

اس وقت ساڑھے چار بجے تھے۔ مجھے ڈیڑھ گھنٹا مزید گزارنا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنے آپ کو کام میں الجھا لیا۔ بے تابی اپنی جگہ تھی لیکن اب مجھے طمانیت بھی اتنی حاصل ہو چکی تھی کہ ڈیڑھ گھنٹا گزارنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ میں وقت کی ستم ظریفی پر حیران تھا۔ بعض اوقات کوئی ایسی چیز... حاصل کرنا بھی جوئے شیر لانے سے کم نہیں رہتا جس کی قدر و قیمت بقول ہیرس' کوڑے کرکٹ کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ آپ اس کی منہ مانگی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں مگر وہ آپ کی رسائی سے دور ہوتی ہے۔ بہرحال... قسمت مجھ پر مہربان تھی اور یہ مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ میں نے فون کر کے ٹونی کو بھی اطلاع دے دی اور اسے بتا دیا کہ چھ بجے میری ہیرس سے ملاقات طے پا گئی تھی۔

راحیلہ کو بھی میں نے یہ خبر سنا دی۔ وہ فوراً بولی "میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"کیوں؟" میں نے اسے گھورا۔ وہ اس وقت میرے کمرے میں آئی ہوئی تھی۔

"تم اپنے پیچ کو مکمل ہی کر دینا" وہ مسکراتے ہوئے بولی "اسے میری صورت دکھا دینا اور دردناک لہجے میں اپیل کرنا۔ حضورِ والا! یہ ہے وہ ستم رسیدہ لڑکی جس کے لیے دراصل مجھے فارمولا اے کی ضرورت ہے۔ اس کے حال پر رحم کھائیں۔ اگر کوئی تھوڑی بہت رکاوٹ باقی ہوگی تو وہ بھی دور ہو جائے گی۔"

"تمہاری خاطر میں یہ بھی کر گزرتا... مجھے کچھ بھی کرنے میں عار نہیں تھا لیکن میں مصلحتاً تمہیں وہاں نہیں لے جانا چاہتا" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"کیا ہے وہ مصلحت؟" وہ بدستور شریر سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"وہ تمہارے چوکھٹے پر یہ عجیب و غریب کارروائی دیکھ کر ضرور تجسس میں مبتلا ہو جائے گا کہ آخر یہ انوکھا قسم کا کارنامہ کس کا ہے اور کون اسے درست کرنے کا فارمولا تیار کر رہا ہے... وہ فارمولا کیا ہے...؟ وغیرہ وغیرہ۔ کیمیکل دینے سے پہلے وہ زیادہ تفصیلی پوچھ گچھ نہ شروع کر دے۔ دوا سازی کے بزنس سے اس کا تعلق ہے۔ ایسے کسی انوکھے معاملے میں تو اس کی دلچسپی بہت شدید ہو سکتی ہے۔"

راحیلہ خاموش رہی۔ تاہم اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ برقرار تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس سے بھی زیادہ خدشہ مجھے اس بات کا ہے کہ کہیں گیری ہیرس کا تعلق بھی ریڈ ڈاٹ ہی سے نہ ہو... یا ماضی میں نہ رہ چکا ہو۔ عین ممکن ہے وہ تمہارا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ جائے کہ یہ ڈاکٹر برنارڈ کی کارروائی ہے۔ اسے معلوم ہو کہ اس نقص کو ٹھیک بھی برنارڈ ہی کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے اس کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا مشکل نہیں ہوگا کہ اس وقت برنارڈ کسی نہ کسی انداز میں ہمارے قابو میں ہے... اور میں فی الحال کسی کو اس بات کی ہوا بھی نہیں لگنے دینا چاہتا کہ ہمیں برنارڈ کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔"

"بہت عقلمند اور دور اندیش ہوتے جا رہے ہو۔ لگتا ہے تمہاری عقل داڑھ نکل آئی ہے" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔

"میری تو ہر داڑھ عقل داڑھ ہے۔ تم سناؤ... تمہارے بھی دودھ کے دانت ٹوٹے یا نہیں؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

"یہ ابھی سے کیوں پوچھ رہے ہو۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے۔ ساٹھ ستر سال کی عمر میں پوچھنا" وہ اٹھتے ہوئے بولی "اب کام کرو۔ ابھی تو چھ بجنے میں کافی دیر ہے۔ جانے سے پہلے کچھ کام تو نمٹا جاؤ۔"

"خدا کی پناہ...!" میں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا "ہم تمہارے اتنے بڑے مسئلے کے پیچھے مرتے پھر رہے ہیں اور تمہیں کام کی پڑی ہوئی ہے۔"

"یہ مت سمجھ لینا کہ میں کام کے بارے میں فکر مند ہونے کی ایکٹنگ کرتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی "کمپنی سے اب جو کچھ مجھے مل رہا ہے... جتنی سہولیات اور جتنی آسائشیں مجھے حاصل ہیں... جتنے اختیارات تم نے مجھے دے رکھے ہیں اور جس طرح سب کچھ مجھ پر چھوڑ رکھا ہے اس کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ یہ سب کچھ میری توقعات اور ضروریات سے بہت زیادہ ہے۔ میں محسوس

کرتی ہوں کہ اس کے عوض میں جو کچھ کرتی ہوں وہ کم ہے۔ مجھے اس سے بھی زیادہ کچھ کرنا چاہیے۔ اسی لیے میں ہر وقت کام کو سر پر سوار رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ اپنی تنخواہ اور مراعات وغیرہ حلال کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"تم اب تک میرے لیے جو کچھ کر چکی ہو اور جو قربانیاں دے چکی ہو وہی اتنی کافی ہیں کہ اب تم ساری عمر بیٹھ کر بھی کمپنی سے یہ سب کچھ وصول کرتی رہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"نوکری سے ہٹ کر اگر میں نے کچھ کیا ہے تو وہ دوستی میں تھا۔ اسے نوکری میں شمار مت کرو" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اچھا بابا... یہ حساب کتاب کا موقع نہیں ہے" میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "اگر مجھ سے تھوڑا بہت کام کرانا ہے تو میری جان چھوڑ دو۔"

"مجھے کوئی شوق نہیں ہے تم جیسے بور آدمی کے پاس بیٹھنے کا... تم نے خود ہی مجھے بلایا تھا" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"بس... غلطی ہوگئی تھی مجھ سے... کبھی کبھی انسان کا دماغ الٹ بھی تو جاتا ہے" میں نے اس طرح بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا کہ وہ آسانی سے سن لے تاہم اس نے سیز فائر کردیا اور کوئی جواب دیے بغیر رخصت ہوگئی۔

پونے چھ بجے میں آفس سے نکل کھڑا ہوا۔ ہیرس کا ایڈریس ماڈل ٹاؤن کا تھا۔ فاصلہ خاصا تھا لیکن ٹھیک چھ بجے میں اس کے مکان کے سامنے موجود تھا۔ وہ ایک عظیم الشان حویلی نما مکان تھا۔ ذرا پرانی طرز کا تھا لیکن اس پرانے پن میں ایک الگ ہی قسم کی شان تھی اور وہ نہایت پرشکوہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے لان کی خوبصورتی بھی قابلِ دید تھی۔ اس کی ترتیب و آرائش کی ذمے داری یقیناً بہت ہی ماہر ہاتھوں میں تھی۔ گھاس میں چھپے ہوئے آٹو میٹک اسپرنکلرز یا چھوٹے چھوٹے فوارے خود بخود وقفے وقفے سے رنگا رنگ خوبصورت پھولوں اور پودوں کو بھگو رہے تھے۔ گاڑی ڈرائیو وے میں لے جاتے ہی مجھے کھڑکیوں کے شیشے اتارنے سے پہلے ہی فرحت کا احساس ہوا۔

دو لمبے تڑنگے مسلح محافظوں نے میری گاڑی کا ہارن سن کر گیٹ تو فوراً ہی کھول دیا تھا لیکن جونہی میں نے ذرا آگے پہنچ کر گاڑی روکی تو وہ دونوں طرف کی کھڑکیوں پر آن جھکے۔ وہ مقامی ہی تھے۔ میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے انہیں بتایا "مسٹر گیری ہیرس کے ساتھ چھ بجے میری ملاقات طے ہے۔"

"آپ کا نام افضل چوہدری ہے؟" ان میں سے ایک نے خاصے مہذب اور شائستہ لہجے میں پوچھا حالانکہ شکل و صورت اور وضع قطع سے وہ نہایت اکھڑ اور کرخت مزاج دکھائی دیتا تھا۔

"ہاں" میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے تھما دیا۔ اس نے اپنی گن کندھے پر لٹکاتے ہوئے جیب سے واکی ٹاکی نکالا اور اندر کسی کو اطلاع دی۔

"افضل چوہدری صاحب آگئے ہیں" یہ جملہ اس نے ا[...] ہی کہا تھا۔

چند لمحے بعد سامنے کا چوبی دروازہ کلک کی ہلکی آواز کے [ساتھ] کھلا اور ایک باوردی بٹلر باہر آگیا۔ وہ بری معلوم ہوتا تھا۔ ا[س نے] مجھے محض ایک نپی تلی مسکراہٹ سے نوازنے پر اکتفا کیا۔ کچھ نہ بولا تنقیدی سی نظروں سے اس نے نہ صرف میرا جائزہ لیا بلکہ میری گاڑی کو بھی گہری نظر سے دیکھا۔ شاید اندا[زہ] کررہا تھا کہ میری "اوقات" ہیرس سے ملنے کی ہے بھی یا [نہیں]۔ ڈرائیو وے میں پہلے ہی تین چار شاندار اور بیش قیمت گاڑ[یاں] کھڑی تھیں۔

میں نے بٹلر کو ذرا سرد نگاہوں سے گھورا۔ وہ کچھ سٹپٹا [سا گیا] اور اس نے فوراً مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ بھاری بھ[رکم] منقش چوبی دروازہ ایک بار پھر کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ [...] اور میں بٹلر کے پیچھے اندر پہنچا۔ دروازے کے عقب میں [...] دبیز اور نفیس قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔

ہلکی روشنی نے میرا استقبال کیا۔ ایک طویل و عریض ہال [سے] گزر کر ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ سامنے لاؤنج، ڈائننگ [ہال] وغیرہ دکھائی دے رہا تھا لیکن کہیں کوئی ذی روح نظر نہیں آیا [تھا] اور نہ ہی کسی طرف سے کسی قسم کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

باہر سے وہ مکان خوبصورت، عالی شان اور پرشکوہ تھا [...] دیکھ کر روح میں ایک نئی امنگ اور دل میں زندگی کی ترنگ محسو[س] ہوتی تھی لیکن اندر پہنچ کر نہ جانے کیوں مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی مقبرے میں داخل ہوگیا تھا۔ اس مکان میں یقیناً زند[گی] کی تمام اعلیٰ ترین آسائشیں موجود تھیں۔ اس کا ہر گوشہ یقیناً جد[ید] دور کی تمام تعیشات سے آراستہ تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں کچھ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے بقول ناصر کاظمی مرحوم "اس گھر کے در و دیوار پر اداسی بال کھولے سو رہی تھی۔ اس ہلکی ہلکی [...]

[...] طرف جیسے یاسیت سایہ فگن تھی۔

[س]یڑھیوں پر بھی دبیز قالین موجود تھا اور خفیف سی آہٹ بھی [ن]ہیں ہورہی تھی۔ بالائی منزل پر بھی ہم ویسے ہی ایک ہال سے [گزر]ے اور راہداری میں آگئے۔ اس نے ایک کمرے کی طرف [اشارہ] کیا اور ٹوٹی پھوٹی سی اردو میں بولا "صاب... ادر اسٹڈی میں [ہے]۔"

[اس] نے ناب گھما کر میرے لیے دروازہ ذرا سا کھول دیا اور [پیچھے] ہٹ گیا۔ میں کمرے میں داخل ہوگیا۔ دروازہ کلک کی ہلکی [آ]واز کے ساتھ میرے عقب میں بند ہوگیا۔ کمرے میں بھینی [بھینی] خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ کوئی عمدہ قسم کا ائیر ریفریشنر چھڑکا گیا تھا۔

[و]ہ ایک شاندار اسٹڈی اور لائبریری تھی۔ چاروں طرف [دیوا]ر گیر الماریوں میں کتابوں کی قطاریں دور تک چلی گئی تھیں اور [الم]اریاں چھت تک بلند تھیں۔ اس کمرے میں بھی روشنی زیادہ تیز [نہی]ں تھی تاہم ایک عظیم الشان میز پر روشنی اسپاٹ لائٹ کی طرح [پڑ] رہی تھی۔ اس دودھیا روشنی میں میز کے عقب میں چمڑے کی [پ]شت والی اونچے پشتے کی ایک کرسی میں ہیرس دھنسا ہوا تھا۔

اس کا چہرہ دروازے کی طرف ہی تھا۔ اس کے عقب میں [ای]ک ویسا ہی ایک دروازہ بڑی سی ٹیرس پر کھلا ہوا تھا اور اس طرف سے [ہلکی] ہلکی خوشگوار ہوا کمرے میں آرہی تھی تاہم اس طرف کا جالی [دار] دروازہ بند تھا۔

گیری ہیرس میرے تصور سے بہت مختلف تھا۔ وہ بہت بھاری [بھر]کم اور لمبا چوڑا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ جبڑوں کا گوشت لٹکا ہوا [تھا]۔ چلتے وقت وہ یقیناً تھل تھل کرتا ہوگا۔ اس کے بال برف کی [طر]ح سفید تھے اور دودھیا روشنی میں چمک رہے تھے۔ انہیں دیکھ [ک]ر نہ جانے کیوں یہ احساس ہوتا تھا کہ انہیں لازماً سلیقے سے جمے [ہو]ا ہونا چاہیے تھا لیکن وہ اس وقت کچھ بے ترتیب سے تھے۔

"ہیلو ہیرس!" میں نے خوش دلی سے کہا۔

میری آواز گویا کسی مقبرے کے گنبد میں گونج کر واپس آگئی۔ میرا تو خیال تھا کہ وہ گرمجوشی سے میرا استقبال کرے گا۔ خود مجھے "ہیلو" اور "گڈ ایوننگ" وغیرہ کہے گا مگر اس نے تو میری "ہیلو" کا بھی جواب نہیں دیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے معمولی سی خفت کا احساس ہوا۔

اچانک میں چونکا۔ مجھے خود پر حیرت ہوئی کہ میں نے کمرے [م]یں داخل ہوتے ہی اس چیز کو کیوں محسوس نہیں کیا تھا؟ شاید اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں کمرے میں داخل ہوتے ہی حسبِ [ع]ادت ایک ہی نظر میں اس کا مکمل جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا [تھا]۔ دوسرے میرے ذہن میں دور دور تک ایسا امکان نہیں تھا [ک]ہ...

[م]یں نے غیر ارادی سے انداز میں سانس روک کر آنکھیں [پھا]ڑ پھاڑ کر ہیرس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں۔ میں ان آنکھوں کا رنگ بھی صاف دیکھ سکتا تھا۔ وہ شفاف نیلی آنکھیں تھیں۔ ان میں جو تھوڑی بہت دھندلاہٹ تھی وہ شاید بڑھاپے کی وجہ سے تھی لیکن جس چیز کو میں نے ایک لمحے کی تاخیر سے محسوس کیا تھا وہ یہ تھی کہ وہ آنکھیں بے نور تھیں۔

ایک قدم آگے بڑھ کر میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ہیرس کے دونوں بازو درحقیقت کرسی کے ہتھوں پر ٹکے ہوئے نہیں تھے بلکہ پہلوؤں میں جھول رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ کیا اس پر دل کا دورہ پڑا تھا؟ کیا وہ واقعی مرچکا تھا؟

میں سنبھل کر تیزی سے اس کی طرف لپکا اور میز کے عقب میں پہنچا تب میں نے دیکھا اس کی پسلیوں میں عین دل کے مقام پر ایک خنجر پیوست تھا جس کا صرف دستہ باہر تھا۔ اس کے خیمہ نما کوٹ کے بٹن کھلے تھے اور اس کی ہلکی نیلی دھاریوں والی قمیص کا بہت تھوڑا سا حصہ خون میں تر تھا اور کچھ خون رستا ہوا اس کی پتلون کی بیلٹ تک چلا گیا تھا۔ وہاں تشدد، مزاحمت یا کشمکش کی کوئی نشانی موجود نہیں تھی۔ وہ نہایت ہی پرسکون انداز میں بیٹھے بیٹھے ہی مرگیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے رضاکارانہ طور پر اپنی پسلیاں کسی دشمنِ جاں کے سامنے پیش کردی تھیں اور فراخدلی سے کہہ دیا تھا کہ جو ستم آزمانا ہے" آزمالو۔

یہ طنزیہ خیال نہ جانے کیوں میرے دل میں آیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت تو میرا رونے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں بے اختیار دونوں ہاتھ چھت کی طرف اٹھا کر کراہ اٹھا "خدایا...! اس وقت میں تقدیر کا یہ مذاق برداشت نہیں کرسکتا۔ میری زندگی میں ہر قدم پر بڑی سنسنی ہے۔ بڑا ہنگامہ ہے۔ ہر موڑ پر کوئی نہ کوئی ڈراما میرا منتظر ہوتا ہے لیکن کم از کم اس وقت مجھے سنسنی سے محفوظ فرمادے۔ اس وقت مجھے کوئی ڈراما نہیں چاہیے... اس وقت کسی مایوسی کا سامنا کرنے کی مجھ میں سکت نہیں۔"

میری اس آہ و بکا سے صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہیرس اسی طرح ساکت رہا۔ اس کی آنکھیں اسی طرح بے نور رہیں اور خنجر کا دستہ اسی طرح اس کے پہلو سے جھانکتا رہا۔ میں اس وقت اس شخص سے زیادہ تکلیف میں تھا جس کی کمند لبِ بام پہنچ کر ٹوٹ گئی ہو۔ میں چونکہ قسمت، تقدیر، رضائے الٰہی وغیرہ کا بہت زیادہ قائل تھا اس لیے بڑے تاسف اور دکھ سے سوچ رہا تھا کہ کیا راحیلہ کا چھوٹنا اس کے مقدر میں نہیں تھا؟ کیا میں اس کے لیے اتنی بھاگ دوڑ کرکے درحقیقت تقدیر سے لڑ رہا تھا؟

مجھے احساس ہی نہ رہا کہ میں کتنی دیر تک ساکت کھڑا ہیرس کے چہرے کو تکتا رہا جو زندگی سے محروم تھا۔ اس کی جلد موم سی دکھائی دینے لگی تھی اور دودھیا روشنی میں اس کے چہرے پر ایک مریضانہ سی چمک دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی پسلیوں میں خنجر پیوست ہوئے یقیناً زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ اگر میں چند منٹ

پہلے اس کے پاس پہنچ جاتا تو شاید وہ کیمیکل مجھے مل جاتا... لیکن میں بھلا چند منٹ پہلے کیسے آسکتا تھا؟ اگر آ بھی جاتا تو شاید وہ مجھ سے نہ ملتا۔ اس نے مجھے چھ بجے کا وقت دیا تھا اور اس طبقے کے لوگ... خصوصاً غیر ملکی تو وقت کے پابند ہوتے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ قدرت ان سے بھی زیادہ' وقت کی پابند ہوتی ہے۔ آسمان پر اس کی موت کا جو وقت لکھ دیا گیا تھا اس سے تو ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تو میرا یہ سوچنا ہی فضول تھا کہ یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا۔

یہ سوال ناگ کی طرح پھن پھیلائے میرے سامنے کھڑا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے تھا؟ ایک بوجھل سی سانس لے کر میں اس ارادے سے مڑنے ہی لگا تھا کہ گھر کے کسی فرد سے رابطہ کیا جائے... مگر اس کی نوبت نہیں آسکی۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا بدمعاش!" میرے عقب میں ایک کھردری اور تحکمانہ سی آواز گونجی۔ جملہ انگریزی میں کہا گیا تھا اور لہجہ خالصتاً امریکی تھا۔ "ہاتھ اوپر اٹھا دو۔" مجھے دوسرا حکم ملا۔

میں نے ہاتھ نہایت آہستگی سے اٹھالیے اور اس سے بھی زیادہ آہستگی سے تھوڑا سا گھوما۔ میرے گھومنے پر اعتراض نہیں کیا گیا۔ میں نے دیکھا دروازہ نیم وا تھا اور مجھے حکم دینے والا اس دوران میں اندر آچکا تھا جب میں اذیت ناک سوچوں میں الجھا ہوا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں نہایت جدید ساخت کی نیلگوں گن چمک رہی تھی۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان ہوگی۔ اس کی شخصیت کسی باڈی بلڈر قسم کے فلمی ہیرو کے تصور پر پوری اترتی تھی۔ اونچا قد' چوڑی چھاتی' کسرتی جسم اور کھردرا مگر پُرکشش چہرہ۔ وہ آدھی آستین کی سرخ قمیص اور گہری نیلی جینز میں تھا۔ قمیص کے دو بٹن کھلے تھے اور بالوں بھرے سینے پر سونے کی موٹی سی چین چمک رہی تھی۔ اس کے مضبوط ہاتھ میں گن بالکل ساکت تھی اور اس کا رخ میرے سینے کی طرف تھا۔ اس کی سبزی مائل آنکھوں میں ایک وحشیانہ سی چمک تھی۔ اس نے خاصی حقارت سے مجھے "بدمعاش" کا خطاب دیا تھا اور یہ حقارت اس کے چہرے پر بھی بکھری ہوئی تھی۔ وہ لہجے سے ہی نہیں' صورت سے بھی خالص امریکی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے لہجے اور چہرے کی حقارت نے میری کنپٹیوں میں چنگاریاں سی بھر دیں۔

"تم نے مجھے بدمعاش کہا؟" میں نے دھیمے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں تصدیق چاہی۔

"ظاہر ہے... میں پیپر ویٹ یا ٹیلیفون سیٹ کو تو بدمعاش نہیں کہہ سکتا تھا۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا "تمہارا خیال تھا کہ تم مسٹر ہیرس کو قتل کر کے صاف بچ کر نکل جاؤ گے؟"

"اوہ... یہ قصہ ہے!" یہ کہتے ہوئے میں نے ہاتھ نیچے کر لیے۔

"ہاتھ اوپر اٹھاؤ بدمعاش!" اس نے چیخ کر ایک بار پھر مجھے اسی لقب سے نوازا۔

"میں جوڑوں کے درد کا مریض ہوں۔ زیادہ دیر ہاتھ اوپر نہیں رکھ سکتا۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ میری نظر ٹریگر پر جمی ہوئی اس کی انگلی پر تھی۔ اس انگلی کی حرکت پر میری حرکات و سکنات کا دارومدار تھا۔ میں نے دوستانہ سے لہجے میں پوچھا۔ "تمہاری تعریف؟"

"وِل برینڈن... فرام ایف بی آئی۔" اس نے بارعب لہجے میں جواب دیا۔

"ایف۔ بی آئی...؟" میں نے واقعی حیرت سے دہرایا "بہت خوب... بہت خوب...! میں نے ایف بی آئی کی قابلیت اور مستعدی کے بے شمار قصے سنے اور پڑھے ہیں لیکن آج تو میں اس کی مستعدی کا ایسا نمونہ دیکھ رہا ہوں کہ حیرت سے بے ہوش ہو سکتا ہوں... اب ایف بی آئی والے سات سمندر پار ہونے والے کسی قتل پر بھی چند لمحوں میں جائے واردات پر پہنچنے لگے ہیں۔ یقیناً ان کے پاس الہ دین کے ایک نہیں' کئی چراغ ہوں گے۔"

"بکواس مت کرو۔" اس نے مجھے ڈانٹ دیا "میں یہاں کسی اور سلسلے میں آیا ہوا ہوں اور مسٹر ہیرس کے ذاتی مہمان کی حیثیت سے ان کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ مسٹر ہیرس میرے ذاتی دوست ہیں... یا یوں کہو... تھے۔"

"اگر وہ تھوڑی دیر اور زندہ رہتے تو یقیناً میرے بھی ذاتی نہ سہی... "غیر ذاتی" قسم کے دوست تو بن ہی جاتے۔" میں نے ملائمت سے کہا "بہرحال... تم ان کے مہمان ہی سہی... پھر بھی تمہاری کارکردگی قابلِ داد ہے۔ تم نے قاتل کو رنگے ہاتھوں گرفتار کرلیا۔"

میں نے اپنے ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے ان کا جائزہ لیا گویا مجھے توقع رہی ہو کہ ان پر مجھے کہیں رنگ لگا ہوا نظر آجائے گا۔

"اس میں کیا شک ہے؟" وہ غرایا۔

"میں تو سمجھتا تھا کہ صرف پاکستانی فلموں میں پاکستانی پولیس کے ہاتھوں ہی اس طرح عین موقع پر... یا رنگے ہاتھوں قاتل پکڑے جاتے ہیں... اور اکثر اوقات تو وہ بے چارے آلۂ قتل کو بھی ہاتھ میں اٹھا لیتے ہیں... لیکن اب تو بات ایف بی آئی تک جا پہنچی ہے۔ خدا ایف بی آئی کے حال پر رحم کرے..."

پھر میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "میں تمہارا کارڈ دیکھ سکتا ہوں مسٹر برینڈن؟"

اس نے بائیں ہاتھ سے جیب سے چمڑے کے کور میں لپٹا ہوا ایک کارڈ نکال کر لہرایا۔ اتنے فاصلے سے میں اس پر اس کی رنگین تصویر کی جھلک کے سوا کچھ نہ دیکھ سکا۔ وہ کسی مزدور یونین کا کارڈ بھی ہو سکتا تھا۔ اس وقت تک ویسے بھی میری کھوپڑی اتنی گھوم چکی تھی کہ اگر وہ واقعی ایف بی آئی کا کارڈ تھا تو مجھے اس کی بھی پروا نہیں رہی تھی۔

نیم وا دروازے سے اچانک ایک حسین نسوانی چہرے نے اندر جھانکا اور سہمی سہمی سی نظروں سے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ وِل برینڈن کو گویا اس کی طرف دیکھے بغیر اس کی موجودگی کا احساس ہو گیا۔

وہ مجھ پر سے نظر ہٹائے بغیر بولا "اندر آجاؤ مسز ہیرس! اس پاکستانی لفنگے نے تمہارے شوہر کو قتل کر دیا ہے لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا ہے۔ تم پہلے امریکی قونصل جنرل کو... اور پھر پولیس کو فون کرو۔"

میرا خیال تھا کہ وہ عورت ہسٹریائی انداز میں چیختی ہوئی اندر آئے گی اور ہیرس کی لاش سے لپٹ جائے گی لیکن منظر نامہ میری توقع کے مطابق نہیں رہا۔ وہ ہچکچاتے ہوئے اندر آگئی اور دروازہ اس نے اپنے عقب میں بند کر دیا۔ ہیرس کی لاش کی طرف دیکھ کر اس نے صرف ہونٹوں پر زبان پھیرنے پر اکتفا کیا۔

وہ تقریباً چالیس کی عمر کی ایک انتہائی حسین اور پُرکشش عورت تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ نوجوانی میں وہ کیسی رہی ہوگی لیکن میرے خیال میں وہ انہی عورتوں میں سے تھی جن کا حسن چالیس کی عمر کے قریب پہنچ کر اور بھی نکھر جاتا ہے' وہ اور بھی زیادہ دمکنے لگتی ہیں' اور بھی زیادہ قیامت ڈھانے لگتی ہیں۔ شاید کبھی وہ ماڈل یا ایکٹریس رہی ہو۔ اگر اس عمر میں وہ ہیرس جیسے عمر رسیدہ آدمی کی بیوی تھی تو پھر میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ ان دونوں میں سے کس پر رشک کروں اور کس پر افسوس؟

وہ آگے بڑھ کر ایک کرسی پر تقریباً ڈھیر ہو گئی اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی "اوہ... ہیرس...! یہ سب کیا ہوا... کیسے ہوا... کیوں...؟"

آنجہانی ہیرس اس کے سوالوں کے جواب دینے سے قاصر تھا تاہم میں نے اس موقع کو غنیمت جانا جب برینڈن کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ مجھے ایک ہی فرد سے نمٹنا تھا۔

میرا ہاتھ میز کے قریب تھا اور اس کے کنارے پر ایک خوبصورت پیپر ویٹ رکھا تھا جو کسی ہیرے سے مشابہ تھا۔ میں نے پیپر ویٹ کو اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا ہاتھ یک لخت ٹوٹنے والے اسپرنگ کی طرح حرکت میں آیا اور پیپر ویٹ وہیں سے اڑتے ہوئے گولی کی طرح برینڈن کی پیشانی سے ٹکرایا اور اس سے پہلے ہی میں قالین پر گر کر لڑھک چکا تھا۔

برینڈن کی گن سے گولی نکلی لیکن وہ مجھے نہیں لگ سکی۔ کوئی شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا سنائی دیا۔ اس وقت تک میں قالین پر لڑھک کر اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میں نے اسے دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہیں دی۔

پیپر ویٹ پیشانی سے ٹکرانے کے باعث وہ چکرا کر لڑکھڑا چکا تھا۔ اس کی سمجھ میں یقیناً نہیں آیا تھا کہ ہوا کیا تھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں میں ٹانگیں الجھاتے ہوئے اسے اوندھے منہ گرا دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کی کمر پر سوار تھا۔ میں نے اس کے بازو پر کراٹے کا وار کیا۔ گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ وہ حسینہ مسز ہیرس اسے اٹھا سکتی تھی۔

پیپر ویٹ لگنے کے بعد جو کسر رہ گئی تھی وہ میرے دو چار گھونسوں نے پوری کر دی۔ وِل برینڈن کو شاید اپنے کسرتی بدن پر بہت ناز رہا ہو لیکن چند سیکنڈ بعد وہ میری گرفت میں ڈھیلا ہو چکا تھا اور کسی مریض کی طرح کراہ رہا تھا۔ پھر بھی احتیاطاً میں نے اس کی کنپٹی پر ایک گھونسا اور رسید کر دیا۔ پھر میں نے اس کے اوپر سے اترتے ہوئے اسے اٹھا کر لکڑی کے ایک معمولی گٹھے کی طرح دیوار کی طرف اچھال دیا۔ وہ وہاں سے نہیں اٹھا۔

مسز ہیرس نے شوہر کی لاش دیکھ کر تو چیخ نہیں ماری تھی لیکن اب اس کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بھاگی۔ اس کا بھاگنا بھی بڑا دلکش تھا لیکن یہ حُسن کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا وقت نہیں تھا۔

میں نے خاصی بدذوقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے لپک کر پیچھے سے اس کے خوبصورت ریشمی سنہرے بالوں کی پونی ٹیل کو بے دردی سے مٹھی میں جکڑا اور اسے واپس کھینچ کر قالین پر پٹخ دیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی اور وہیں پڑی ایک شکستہ گڑیا کی طرح سسکیاں لینے لگی۔

میں نے اس پر جھکتے ہوئے نہایت شیریں لہجے میں کہا "سویٹ ہارٹ! اب بتاؤ... اصل قصہ کیا ہے؟"

مسز ہیرس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں ابھی تک آنسو تھے مگر مظلومیت یا احساسِ زیاں کی جھلک نہیں تھی۔ میں نے اس کے بال چھوڑ دیے تو گویا اس کی جان میں جان آئی۔

"قصّہ......؟ کیسا قصّہ؟" اس نے حیرت اور وحشت سے پوچھا مگر میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ حیرت بھی مصنوعی تھی اور وحشت بھی۔ وہ سنبھلنے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اسے صرف تھوڑی سی مہلت کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد وہ میرے کان کترنے کی کوشش کرے گی۔ میں کالا نہ ہوتے ہوئے بھی آخر اس کی نظر میں محض "کالا پاکستانی" ہی تھا۔ مجھے بے وقوف بنانا شاید اس کا قومی فریضہ یا پھر پیدائشی حق تھا۔

"یہاں یقیناً کوئی کھچڑی پکی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کھچڑی کا فارمولا پہلے سے تیار کیا گیا تھا یا جلدی میں کوئی فارمولا آزمایا گیا ہے جس کی وجہ سے نتائج اچھے برآمد نہیں ہو سکے لیکن کھچڑی پکی ضرور ہے کیونکہ مجھے اس کی خوشبو آ رہی ہے...... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اب تو بدبو آ رہی ہے کیونکہ کھچڑی جل چکی ہے۔"

میں ایک کرسی کھینچ کر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا لیکن اپنا پاؤں میں نے اس پوزیشن میں رکھا تھا کہ وہ ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش کرتی تو میری ٹھوکر کا نشانہ بن سکتی تھی۔ اتنی خوبصورت اور بظاہر نرم و نازک نظر آنے والی عورت کو ٹھوکر رسید کرتے ہوئے مجھے یقیناً روحانی تکلیف ہوتی لیکن مجبوری میں انسان کو اس قسم کے غیر شاعرانہ کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔

مجھے معلوم تھا امریکی عورتیں...... بلکہ بیشتر سفید فام عورتیں بظاہر نرم نازک اور نہایت شائستہ و نفاست پسند نظر آنے کے باوجود بہت سی ایشیائی اور افریقی عورتوں سے زیادہ سخت جان' مضبوط اور توانا ہوتی ہیں۔ ان پر وحشت سوار ہو جائے تو نہ جانے کیا کچھ کر سکتی ہیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ غمزدہ خاتون بھی میری ٹانگ کھینچ کر' مجھے نیچے گرا کر مجھے کچا چبانے کی کوشش کرتی۔ اشاخ میں میری صلاحیتوں کا عظیم الشان مظاہرہ دیکھ لینے کے باوجود وہ قسمت آزمائی کا فیصلہ کر سکتی تھی۔

"بکواس مت کرو۔" وہ غصّے سے چیخی۔ اس کا اعتماد بڑی تیزی سے لوٹ آیا تھا۔

"یہی تو ایک کام ہے جو مجھے سب سے زیادہ کرنے کی عادت ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یعنی بکواس...... بکواس...... اور بکواس۔"

وہ گویا بصد کوشش اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے ذرا دھیمے مگر نہایت زہریلے لہجے میں بولی "تم بہت شوخ بننے کی کوشش کر رہے ہو لیکن یہ شوخی تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا "کون سی چیز مہنگی پڑتی ہے اور کون سی سستی...... میں اس قسم کی باتوں میں دماغ نہیں کھپاتا۔ میں نے تم سے جو بات پوچھی ہے اس کا جواب دو۔"

اس نے ایک بار پھر سنی ان سنی کر دی اور اُلٹا مجھ سے سوال کر دیا "کیا تم نے اسے ہلاک کر دیا ہے؟" اس کا اشارہ ول برینڈن کی طرف تھا۔

"کوشش تو میری یہی تھی کہ نہ مرے۔" میں نے مسز ہیرس کی طرف سے نظر ہٹائے بغیر کہا "ویسے بھی بے غیرت لوگ آسانی سے نہیں مرتے اور یہ تو اچھا خاصا باڈی بلڈر معلوم ہوتا ہے۔ بہر حال......" میں نے امریکیوں ہی کے انداز میں بے پروائی سے کندھے اچکائے "اگر مر بھی گیا ہو تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔"

"تمہاری یہ بے پروائی دھری رہ جائے گی...... جب تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ کون ہے۔" اس کے لہجے میں ایک بار پھر خونخواری عود کر آئی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا غصہ' خونخواری...... یا پھر خود پر قابو پا کر زہریلے لہجے میں بات کرنے کی کوششیں...... یہ سب کچھ مصنوعی تھا۔ درحقیقت وہ اندر سے خوفزدہ تھی۔ اسی لیے میں زیادہ مطمئن اور پُر اعتماد تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "یہ ہمارے سفیر کا سالا ہے۔" اس نے "برادر اِن لا" کی اصطلاح استعمال کی تھی اور کوئی وضاحت نہیں کی تھی۔ عین ممکن تھا اس کی مراد بہنوئی رہی ہو لیکن میں نے سالا ہی فرض کیا تھا۔

میں چند لمحے استہزائیہ انداز میں ہنستا رہا جس کے دوران میں وہ مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتی رہی۔ میں نے ہنسی روکتے ہوئے کہا "معلوم نہیں تم نے کیوں اس کے تعارف میں توسیع کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر پہلے اس نے مجھے خود اپنے منہ سے بتایا تھا کہ یہ ایف بی آئی ایجنٹ ہے۔ اس وقت تم کمرے میں نہیں تھیں۔ شاید اس لیے یہ تم سے مشورہ نہیں کر سکا کہ اسے کیا بننا چاہیے...... پھر اب تم نے اسکیم کچھ بدل دی ہے؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ ان آنکھوں میں غیظ و غضب اور نفرت کی آگ روشن رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی لیکن اس کوشش میں اسے کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ اس آگ کی تہ سے خوف کے برف زار جھانک رہے تھے۔

"وہ سفیر کا سالا بھی ہے اور ایف بی آئی ایجنٹ بھی۔" وہ شرمندہ یا نروس ہوئے بغیر بولی۔

"مجھے اندیشہ ہے کہ کچھ دیر بعد تم اسے صدرِ امریکا کا قریبی عزیز نہ بنا دو یا کسی اور خفیہ ایجنسی کے ڈائریکٹر وغیرہ کے عہدے پر فائز نہ کر دو۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ تم مجھے حقیقت سے آگاہ کرنے کی کوشش کرتیں۔ اس طرح تم اپنے آپ کو بہت سی غیر ضروری تکلیفوں اور مصیبتوں سے بچا لیتیں۔"

"تکلیفوں اور مصیبتوں میں تو تم نے اپنے آپ کو پھنسا لیا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ ہیرس کو قتل کر کے اور برینڈن کو تقریباً جان سے مار کر تم بچ جاؤ گے؟ تم پاکستانی واقعی بڑے خوش فہم ہوتے ہو۔"

"بے شک۔" میں نے پہلی مرتبہ نہایت خوش دلی سے اس کی تائید کی "خوش فہمی ہمارا بہت بڑا قومی اثاثہ ہے۔ یہاں پچانوے فیصد لوگوں کی زندگی کسی نہ کسی خوش فہمی کے سہارے ہی بسر ہو رہی ہے۔ تم مجھے اس پر ٹوکنے والی کون ہوتی ہو؟"

وہ خاموش رہی تو میں نے ملائمت سے کہا "لیکن اس وقت تم مجھے اپنے سے زیادہ خوش فہم لگ رہی ہو۔ آخر تم نے کیا سوچ کر اتنی بودی اسکیم بنائی تھی؟"

"کیسی اسکیم؟" وہ گویا بُری طرح چونکی۔

"مجھے یہ وہی پُرانا پلاٹ لگ رہا ہے جس پر تمہارے امریکا میں ہر بار ایک نئی عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ افسوس کہ تم لوگوں نے یہاں آ کر بھی اس پلاٹ پر طبع آزمائی کرنے کی کوشش کر ڈالی مگر میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ ایک بھونڈی کوشش تھی۔" میں نے متاسفانہ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"معلوم نہیں تم کیا بکواس کیے جا رہے ہو۔ میں ابھی اپنے قونصل جنرل کو اور اسلام آباد اپنے سفیر کو فون کرتی ہوں۔"

اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں نے جوتے سمیت سختی سے اس پر پاؤں رکھ دیا۔ قسائی بعض اوقات کسی بکرے کو ذبح کرتے وقت اسی طرح پاؤں یا گھٹنے تلے دبانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ایک حسین اور سفید فام عورت کے معاملے میں کسی قسائی سے بھی اس قسم کی بد ذوقی کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں نے ایک نظر میرے جوتے کو اور ایک نظر مجھے دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہی ہو کہ کاش یہ جوتا میرے ہاتھ میں ہوتا اور میں پوری طاقت سے اس شخص کے منہ پر رسید کر سکتی!

کوئی بعید نہیں تھا کہ اس کے دل میں اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین اور خطرناک خواہشیں کروٹیں لے رہی ہوں۔ بہرحال مجھے ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ میرے پاؤں تلے مچل کر رہ گئی لیکن بہت زور لگانے کے باوجود اُٹھ نہیں سکی۔ اس نے میری ٹانگ کو نوچنے کھسوٹنے کی کوشش نہیں کی اور اپنی جدوجہد ترک کرنے میں ہی عافیت سمجھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم کس قسم کے آدمی ہو۔" وہ ہانپتے ہوئے بولی "کیا تمہیں ذرا بھی پروا نہیں ہے کہ تم کن لوگوں کے ساتھ کیا کر رہے ہو۔ اور تمہارا انجام کیا ہو سکتا ہے؟ تم لمحہ بہ لمحہ زیادہ سے زیادہ بڑی مصیبت کو دعوت دے رہے ہو۔"

"یہی تو تم دونوں سے سب سے بڑی غلطی سرزد ہوئی کہ تم نے یہ جانے بغیر مجھ پر ہاتھ ڈال دیا کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔ ایک عرصے سے بڑی بڑی مصیبتیں مول لینا میرا مشغلہ بن گیا ہے۔ تمہارے اسٹاک میں اور بھی جو اونچے درجے کی مصیبتیں ہیں وہ میرے سر ڈال دو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"تمہاری باتیں واقعی سمجھ میں نہ آنے والی ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اور نہ ہی یہ میری سمجھ میں آ رہا ہے کہ آخر تمہیں کسی بھی بات کی پروا کیوں نہیں ہے۔ اپنے انجام سے تم جیسا بے پروا آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ تم مجھے صرف قونصل جنرل یا سفیر کو فون کرنے دو۔ پھر تم خود ہی دیکھ لینا کہ تمہارا کیا حشر ہوتا ہے۔ تمہاری ساری خوش فہمیاں دور ہو جائیں گی۔"

"قونصل جنرل اور سفیر کو فون تم نہیں...... بلکہ میں کروں گا۔ میں خود انہیں یہاں بُلاؤں گا۔ تمہیں اتنی زحمت کرنے کی کیا ضرورت ہے سویٹ ہارٹ؟ ان کو بلانے کے سلسلے میں تم اتنی پریشان کیوں ہو؟ تمہیں تو کچھ دوسری باتوں کے سلسلے میں پریشان ہونا چاہیے۔"

"مثلاً......؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ اب دوسرا قربانی کا بکرا کہاں سے تمہارے ہاتھ آئے گا؟ یہ قربانی کا بکرا تو رسی تڑا کر بھاگ رہا ہے......" میں نے اپنی طرف اشارہ کیا "کیونکہ یہ ذرا سرکش قسم کا بکرا واقع ہوا ہے۔ پہلے بھی اسے بارہا قربانی کا بکرا بنانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن یہ ہر بار بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اب تو یہ اس معاملے میں بہت تجربہ کار ہو چکا ہے۔"

"تم فضول بکواس میں وقت ضائع کیے جا رہے ہو اور میرے شوہر کے قتل کو زیادہ سے زیادہ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ اس طرح کوئی اہم شہادت ضائع ہونے کا بھی خطرہ ہے۔" وہ شاید آخری لمحے تک اپنا بھرم' دکھاوا اور ڈرامے بازی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"کتنا صدمہ ہے تمہیں اپنے شوہر کے قتل کا...... اور کتنی فکر ہے تمہیں قتل کی کوئی شہادت ضائع ہونے کی......" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "قتل کی سب سے اہم شہادت تو کچھ دیر پہلے ہی میرے ہاتھوں ضائع ہوتے ہوتے بچی ہے۔"

"کون سی؟" اس نے شاید غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"وہ......" میں نے ول برینڈن کی طرف اشارہ کیا "وہ میرے ہاتھوں مر بھی سکتا تھا لیکن میں نے اسی لیے ہاتھ ہلکا رکھا کہ اگر وہ مر گیا تو میرے قربانی کا بکرا بننے کے امکانات کچھ روشن ہو جائیں گے اور یہ بات مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ قربانی کا بکرا بننے سے مجھے سخت نفرت ہے اور میں اکثر عین موقع پر رسّی تڑا کر بھاگتا رہا ہوں۔"

"اگر تم کچھ وضاحت سے بات کرتے تو بہتر تھا۔ شاید مجھ کم عقل کی بھی کچھ سمجھ میں آ سکتا۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی تاہم اب اس کے تاثرات میں کچھ دھیما پن آ گیا تھا۔ شاید اسے یقین ہو گیا

تھا کہ غصہ اور رعب دکھانے یا دھمکیاں دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"اگر تم اب بھی معصوم بننے پر تُلی ہوئی ہو تو وضاحت کر دیتا ہوں ورنہ میرے خیال میں کم از کم تمہیں تو وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔ وضاحت کی ضرورت تو مجھ غریب کو ہے لیکن مجھ سے ہی وضاحت مانگی جا رہی ہے۔ کیا الٹا زمانہ آگیا ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر بات جاری رکھی "بہرحال میں چونکہ محض اپنی کھوپڑی پر ذرا زور دینے اور اپنی حسیات کو ہر وقت بیدار رکھنے کی وجہ سے وضاحت کرنے کی پوزیشن میں ہوں اس لیے میں یہ خدمت انجام دے دیتا ہوں۔"

وہ کسمسائی تو میں نے اس کے جسم پر پاؤں کا دباؤ کم کرتے ہوئے کہا "اگر تم بالکل پرسکون رہنے کا وعدہ کرو اور زیادہ اچھل کود نہ دکھاؤ تو میں تمہیں معزز لوگوں کی طرح کرسی پر بیٹھنے کی دعوت بھی دے سکتا ہوں۔"

وہ کوئی وعدہ کرنے کے بجائے، کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتی رہی لیکن مجھے اندازہ ہوگیا کہ اب اس نے زیادہ تیزی طراری دکھانے کا ارادہ ترک کردیا تھا۔ میں نے پاؤں اس کے اوپر سے ہٹالیا اور وہ اٹھ کر بدستور مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس دوران میں اس نے ایک بار بھی اپنے آنجہانی شوہر کی طرف نہیں دیکھا تھا جو ریوالونگ چیئر پر اسی پوزیشن میں موجود تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ بے چارہ اسی حالت میں نہ اکڑ جائے۔

"مسز ہیرس! کیا تم بتانا پسند کرو گی کہ مسٹر ہیرس سے شادی سے پہلے تم کیا کرتی تھیں؟" میں نے اب سنجیدگی اور ملائمت سے پوچھا۔

"تم نے پولیس افسروں کی طرح مجھ سے سوالات کرنے کا نہیں...... بلکہ مجھے کچھ بتانے کا وعدہ کیا ہے۔" اس نے گویا مجھے یاد دلایا۔ اس کا لہجہ اب پہلے کی طرح جارحانہ نہیں تھا لیکن اس میں تیکھا پن بہرحال برقرار تھا۔

"خیر...... میں اپنے سوال پر اصرار نہیں کروں گا۔ یہ اتنا اہم سوال نہیں ہے۔ بہرحال اس سے مجھے تم کو بہتر طور پر جاننے میں مدد ملتی...... لیکن میں اپنے اندازوں کی مدد سے تمہیں جتنا جان سکا ہوں، میرا خیال ہے فی الحال وہی کافی ہے۔" پھر میں نے اچانک ول برینڈن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "اس سے تمہارا معاشقہ کب سے چل رہا ہے؟"

"کیا بکواس ہے؟" وہ پھر یکدم ہتھے سے اکھڑ گئی۔ اس نے برہمی کا اظہار کرنے کی ایک بار پھر بھرپور کوشش کی تھی لیکن مجھے اس برہمی کی تہ میں چھپے ہوئے خوف کا سراغ مل گیا تھا۔ بہرحال وہ بڑی باہمت عورت تھی۔ ابھی تک اس ڈرامے میں اپنے کردار پر ڈٹی ہوئی تھی۔

میں نے گویا اس کی برہمی پر توجہ دیے بغیر بات جاری رکھی "میں اپنے اس خیال پر اب بھی قائم ہوں کہ تم نے بہت گھسے پٹے پلاٹ کا سہارا لے کر ڈراما رچانے کی کوشش کی ہے۔ اگر تمہیں مسٹر ہیرس سے نجات حاصل کرنی ہی تھی تو اس کے لیے کوئی اور راستہ اختیار کرلیتیں۔ اس بے چارے کو قتل کرنا ہی کیا ضروری تھا؟"

وہ اس طرح میری طرف دیکھتی رہی جیسے بہ زبان خموشی مجھے بتانے کی کوشش کر رہی ہو کہ تمہارا تو دماغ چل گیا ہے، میں بھلا کیا کرسکتی ہوں۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "لیکن مسئلہ وہی لالچ کا آجاتا ہے۔ لالچ انسان کو اس دنیا میں سب سے زیادہ ذلیل کراتا ہے۔ ظاہر ہے ہیرس کی دولت کی خاطر ہی تو تم نے اس سے شادی کی ہوگی ورنہ اس عمر، اس سراپا اور اس حسین چہرے کے ساتھ تمہیں ایک موٹے، بے ہنگم اور عمر رسیدہ شخص کے پلے بندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ اس سے طلاق حاصل کرنے کی صورت میں امریکی قوانین کے مطابق تمہیں لمبا چوڑا نقصان ہورہا ہوگا...... اور میرا خیال ہے تم انہی عورتوں میں سے ہو جو زندگی میں کبھی گھاٹے کا سودا کرنا پسند نہیں کرتیں۔"

میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تو وہ کاٹ دار لہجے میں بولی "تمہیں بکواس کرنی ہے، کرتے رہو۔"

"وہ تو میں بہرحال کروں گا۔ اس کے لیے مجھے تم سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اطمینان سے کہا "ویسے بائے دا وے...... تم ہیرس کی دوسری بیوی ہو یا تیسری؟ میرا خیال ہے تیسری سے آگے جانے کا تو امریکیوں میں حوصلہ نہیں ہوتا...... اور انہیں اس کی ضرورت بھی نہیں پڑتی۔"

"تیسری۔" اس نے گویا کسی غیر مرئی زہر کا گھونٹ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

"آہ......!" میں نے یوں ٹھنڈی سانس لی جیسے اس انکشاف سے مجھے شدید روحانی صدمہ پہنچا ہو "گویا آنجہانی مسٹر ہیرس بھی لالچی ہی تھے۔ اسے بھی لالچ ہی کی ایک قسم کہا جاسکتا ہے کہ انسان آخر عمر تک جوان اور حسین عورتوں کی صحبت سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ ہو اور محض دولت کے زور پر خواہشوں کا سلسلہ دراز کرتا چلا جائے۔ کبھی کبھی اس لالچ کی سزا بھی بھگتنی پڑ جاتی ہے۔ تم نے ہیرس کو ٹھکانے لگوانے کے لیے ول برینڈن کو امریکا سے بلوایا تھا یا یہ یہیں رہتا ہے؟"

"کیا اس نے تمہیں بتایا کہ وہ ایف بی آئی ایجنٹ ہے اور ایک خاص مشن پر چند دن پہلے ہی پاکستان آیا ہے؟" مسز ہیرس تیزی سے بولی۔

"بتایا تو ہے...... بتایا تو تم نے بھی بہت کچھ ہے...... لیکن میں

اس خرافات پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ تمہاری نظر میں شاید ہر پاکستانی بے وقوف ہوتا ہوگا مسز ہیرس! لیکن میں کم از کم اتنا بے وقوف نہیں ہوں جتنا تم نے فرض کرلیا تھا۔ میں نے دنیا دیکھی ہے اور میرے پاس گو کہ بڑی بڑی ڈگریاں نہیں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میں بہت سے پڑھے لکھوں سے زیادہ پڑھا لکھا ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ کوئی بھی سفید فام دس پندرہ فٹ دور سے مجھے کوئی کارڈ لہرا کر دکھائے اور میں یقین کرلوں کہ وہ ایف بی آئی ایجنٹ ہے؟"

"تو اور کیا اس کے لیے خود ایف بی آئی کے ڈائریکٹر کو آکر تمہارے سامنے دست بستہ گزارش کرنا پڑے گی اور حلفیہ بیان دینا پڑے گا کہ فلاں شخص واقعی ان کا ایجنٹ ہے اور تم بھی مہربانی فرما کر اسے ایجنٹ تسلیم کرلو؟" وہ گویا جل کر بولی۔

"نہیں...... خیر...... اتنے بھی تردّد کی ضرورت نہیں۔ میرا دل ہی مجھے بتا دیتا ہے کہ کس کا دعویٰ کس حد تک صحیح ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور اسے تنبیہہ کی "تم اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش نہ کرنا۔ تم دیکھ ہی چکی ہو کہ میں خوبصورت عورتوں تک کے معاملے میں کس قدر بدلحاظ واقع ہوا ہوں۔ خصوصاً بد صورت عزائم رکھنے والی خوبصورت عورتوں کے معاملے میں......!"

میں ول برینڈن کے پاس پہنچا جو اسی جگہ بے ہوش پڑا تھا جہاں میں نے اسے پھینکا تھا۔ میری نظر مسز ہیرس پر بھی رہی اور اس کے ساتھ ساتھ میں نے خاصی تیزی سے ول برینڈن کی تلاشی لے ڈالی۔ میں نے سب سے پہلے اس کے کارڈ کا جائزہ لیا جو اس نے مجھے دور سے دکھایا تھا۔ مسز ہیرس نے اس دوران میں خاصی شرافت کا ثبوت دیا اور اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ اس نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے اس کی تلاشی بھی نہیں لی تھی۔ اس کے لباس میں کہیں اتنی گنجائش تو نظر نہیں آرہی تھی کہ اس میں سے کوئی چھوٹا موٹا زنانہ قسم کا پستول برآمد کرسکتی۔ میں بہرحال اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا۔

ول برینڈن کا کارڈ واقعی ایف بی آئی کا تھا۔ اس پر ایک سنہرا بیج بلاسٹک تھا اور ابھری ہوئی مہر وغیرہ بھی بنی ہوئی تھی۔ وہ ایک کمپیوٹرائزڈ کلرڈ تھا اور ہر اعتبار سے متاثر کن تھا۔ ہمارے ہاں اگر وہ کسی اچھے بھلے پڑھے لکھے پولیس آفیسر کو بھی دکھایا جاتا تو وہ ضرور مرعوب ہوجاتا اور شاید اسے نقلی سمجھنے کا خیال بھی دل میں نہ لاتا لیکن میں نہ جانے کیوں اس معاملے میں اپنے دل کی بات ماننے پر تلا ہوا تھا...... اور میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ وہ شخص ایف بی آئی ایجنٹ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس سے پہلے بھی جب کبھی اتنے وثوق سے میرے دل میں کوئی بات آئی تھی تو اسے مان کر میں نقصان میں نہیں رہا تھا۔

"امریکا بہرحال امریکا ہے۔" میں نے کارڈ کو ہوا میں لہراتے ہوئے ستائشی انداز میں کہا "حالانکہ یہ کارڈ وہاں کی کسی عقبی گلی کے معمولی اور سیلن زدہ تہ خانے میں بیٹھے ہوئے کسی جعلساز نے تیار کیا ہوگا مگر نقل بہرحال اصل کے عین مطابق ہے۔ ہمارے ہاں بھی اسی قسم کے عظیم ماہرین کی کچھ کمی نہیں۔ ان معاملات میں ہم بھی خود کفیل ہیں لیکن اس کارڈ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس مقام اور ان سہولیات تک رسائی رکھنے والے ماہرین ہمارے ہاں ذرا مشکل سے ہی ملتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ ماہر تمہارے ہاں کسی شمار قطار میں نہیں ہوگا۔ چند ڈالر میں یہ کام کرکے دیتا ہوگا۔ غربت کی زندگی بسر کرتا ہوگا اور اپنے سائے سے بھی ڈرتا ہوگا۔ ہمارے ہاں ہوتا تو خاصی خوش حالی کی زندگی بسر کررہا ہوتا اور شاید سینہ تان کر چلتا۔"

"کیا تم نے اس سے پہلے کبھی ایف بی آئی کا اصل کارڈ دیکھا ہے؟" اس نے گویا میری طویل تقریر ان سنی کرتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ اب غالباً اس نے جارحانہ طرزِ عمل اختیار کیے رکھنے کا ارادہ ترک کردیا تھا اور اپنی حکمتِ عملی بدل رہی تھی۔ اس حسین چہرے کے پیچھے یقیناً ایک شیطانی ذہن کام کررہا تھا۔ اور اس ذہن نے اسے پینترا بدلنے کا مشورہ دیا تھا۔

"تمہارے اندازوں کی انہی غلطیوں نے تو تمہیں مروا دیا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "معلوم نہیں کیوں تم نے مجھے بالکل ہی گھسیارا فرض کرلیا تھا۔ شاید تمہارے اس عاشق نے تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کیا ہو۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے نہ صرف ایف بی آئی کا کارڈ دیکھ رکھا ہے بلکہ کاروبار کے سلسلے میں امریکا میں قیام کے دوران میں ایف بی آئی کے ایک خاص شعبے کے ڈائریکٹر سے میری خاصی ملاقاتیں بھی رہی ہیں۔ اس سے تقریباً دوستی ہی ہوگئی تھی۔"

اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ابھرا۔ بہت گہری عورت تھی۔ اس کے بارے میں یقین سے کہا جاسکتا تھا کہ وہ آسانی سے کسی بات سے متاثر ہونے والی نہیں تھی۔ میرے انکشاف پر اس کا مرعوب ہونے کا یقیناً کوئی ارادہ نہیں تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تمہارے ہاں کے سراغرسی، جرم و سزا اور اسپائی ایجنٹوں کی کہانیاں لکھنے والے مصنفوں نے خواہ مخواہ ایف بی آئی والوں کو ایک ماورائی سی مخلوق بنا رکھا ہے۔ ان میں سے بیشتر ہماری تمہاری طرح عام سے آدمی ہی ہوتے ہیں۔ بس وہ ذرا ایک مخصوص تربیت سے گزر کر آئے ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض ذرا زیادہ ذہین ہوتے ہیں لیکن یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں۔ عام لوگوں میں بھی کچھ لوگ ذرا زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ سب لوگوں کی طرح ایف بی آئی والوں میں بھی عام سی بشری کمزوریاں ہوتی ہیں اور شاید تم حب الوطنی کے جوش میں میری اس بات سے اتفاق نہ کرو کہ ان میں سے بعض تو اچھے خاصے موٹے دماغ کے بھی ہوتے ہیں۔ بالکل تمہارے اس آشنا کی طرح......!"

میں نے ایک بار پھر ول برینڈن کی طرف اشارہ کیا۔ مسز ہیرس نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس میں شک نہیں کہ یہ بھی کوشش کرتا تو ایف بی آئی ایجنٹ بن سکتا تھا۔۔۔۔ اور شاید اسے شوق بھی رہا ہو جس کی تکمیل وقتاً فوقتاً نقلی کارڈ کے ذریعے کرتا رہا ہو لیکن شاید اسے عمر رسیدہ دولت مندوں کی جوان اور حسین بیویوں سے شناسائی بڑھانے سے فرصت نہ ملی ہو جس کی وجہ سے یہ ایف بی آئی میں جانے کا صحیح راستہ اختیار نہ کرسکا ہو۔"

میں نے ایک لمحے توقف کیا۔ میں اس کے کچھ بولنے کا منتظر تھا لیکن وہ خاموش رہی۔ ول برینڈن کی گن پہلے ہی میرے قبضے میں آچکی تھی۔ اب اس کی تلاشی کے دوران میں اس کی ٹانگ سے بندھی ہوئی ایک خصوصی نیام سے خاصی خوفناک شکل کا ایک جھلملاتا ہوا خنجر بھی برآمد ہوا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے تک میں بھی اسی طرح ایک خنجر اپنی پنڈلی سے بندھی نیام میں رکھتا تھا لیکن اب میں نے چھوڑ دیا تھا۔ میرے خیال میں اب میرے لیے حالات اتنے خطرناک نہیں رہے تھے کہ میں ایک فاضل ہتھیار کے طور پر خنجر بھی ساتھ رکھنے کی ضرورت محسوس کرتا۔

میں نے ول برینڈن کا خنجر دور ہی سے پنڈولم کی طرح جھلاتے ہوئے مسز ہیرس کو دکھا کر کہا "اب شاید تم یہ بھی کہو گی کہ ایک ایف بی آئی ایجنٹ کے لیے ٹانگ سے خنجر باندھ کر رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے ورنہ اس کا افسر اس سے جواب طلبی کرسکتا ہے؟"

وہ بدستور خاموش رہی تو میں نے ملائمت سے پوچھا "آخر تم دونوں نے کیا سوچ کر مجھے ہیرس کے قتل کے چکر میں پھنسانے کا فیصلہ کیا تھا؟ کیا تمہارے خیال میں یہ کام اتنا ہی آسان تھا؟"

اس نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا تو میں نے کہا "شاید تم سے یا تمہارے اس عاشق سے یہ قتل اچانک سرزد ہوگیا۔ تمہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ ایک پاکستانی تمہارے شوہر سے ملنے آنے والا تھا۔ تم نے اور تمہارے عاشق نے مل کر اس بے چارے پاکستانی پر ملبا ڈالنے کا ہنگامی پروگرام بنالیا ہو۔۔۔۔ لیکن میرے خیال میں یہ ایک احمقانہ سی کوشش تھی۔ تمہیں اس پاکستانی کے بارے میں کچھ معلومات تو حاصل کرلنی چاہیے تھیں۔ کچھ تو معلوم کرلینا چاہیے تھا کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے۔ اس کی حیثیت کیا ہے۔ کچھ ہوم ورک تو کرلینا چاہیے تھا۔۔۔۔"

پھر میں نے خود ہی جواز پیش کردیا "لیکن مسئلہ پھر وہی آجاتا ہے۔ شاید تمہارے پاس وقت نہیں تھا۔ تم نے ایک اندھی چال چلی تھی جو اُلٹی تمہارے منہ پر آن پڑی۔ وہ پاکستانی اتنا چغد نہیں نکلا جتنی تمہیں توقع تھی۔ وہ تمہارے باڈی بلڈر عاشق کے ہاتھ میں گن ہونے کے باوجود اس کے قابو میں نہیں آیا۔۔۔۔"

پھر میرے لہجے میں حقیقی اُلجھن در آئی "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آرہی۔۔۔۔ اگر تمہارا عاشق اپنے کسرتی جسم کو زیادہ زحمت دیے بغیر محض گن کے بل بوتے پر مجھے قابو میں کرلیتا اور اپنی فرضی کہانی کے ساتھ مجھے پولیس کے حوالے کرتا۔۔۔۔ اور بے شک میں ایک عام اور غیر اہم سا آدمی ہوتا۔۔۔۔ تب بھی کیا تمہارے عاشق کے لیے اپنی کہانی کو ثابت کرنا کافی مشکل نہ ہوتا؟"

اس نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ لگتا تھا کہ اس نے کچھ زیادہ سختی سے اپنی زبان بند رکھنے کا ارادہ کرلیا تھا۔ نہ جانے اس میں کیا مصلحت تھی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "کیا وہ مجھے پولیس کے حوالے کرتے وقت بھی اپنے آپ کو ایف بی آئی ایجنٹ ہی ظاہر کرتا؟" گو کہ وہ کوئی جواب نہیں دے رہی تھی لیکن میں گویا اعیار بن کر کچھ نہ کچھ پوچھے جارہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ٹھیک ہے۔۔۔۔ ہماری پولیس کی کم علمی اور نااہلی کی شہرت عالمگیر ہے لیکن پھر بھی۔۔۔۔ اس سے اتنی زیادہ بے وقوفی کی توقع تو نہیں رکھنی چاہیے تھی کہ ول برینڈن اپنے آپ کو ایف بی آئی ایجنٹ کہہ کر متعارف کراتا اور سب پولیس والے آنکھیں بند کرکے یقین کرلیتے۔ کم پولیس آفیسر کے ذہن میں تو سوال پیدا ہوتا کہ یہ کیسا ایف بی آئی ایجنٹ ہے جس کی آمد کی اسے بھی اطلاع نہیں۔ ہمارے ہاں کسی ایف بی آئی ایجنٹ کی آمد بڑا اہم واقعہ ہوتی ہے۔ اخباروں میں خبریں چھپتی ہیں۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ تمہارا عاشق پولیس کے سامنے بھی آخری وقت تک اپنا فراڈ نبھانے میں کامیاب رہتا، کسی بھی مرحلے پر اس کا پول نہ کھلتا؟"

اس نے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہ دیا تو میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اے خوبصورت بیوہ! آخر تم کب تک خاموش رہو گی؟"

"جب تک میرے وکیل یہاں نہیں پہنچ جاتے۔ مجھے اب جو کچھ بھی کہنا ہوگا اپنے وکیلوں کی موجودگی میں کہوں گی۔" اس نے جواب دیا۔

"چلو۔۔۔۔ خدا کا شکر ہے تم نے کسی سوال کا جواب دیا۔۔۔۔" میں نے گہری سانس لے کر ول برینڈن کا خنجر مقتول ہیرس کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ میں نے اسے رومال کی مدد سے پکڑا تھا اور اس پر اپنی انگلیوں کے نشانات نہیں آنے دیے تھے۔

میں نے دوبارہ مسز ہیرس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "اب تم قونصل جنرل اور سفیر سے بات کرنے کے بجائے اپنے وکیلوں سے بات کرنے پر تیار ہو۔ چلو۔۔۔۔ تمہارا مطالبہ کچھ تو نیچے آیا۔ ویسے یہ بھی امریکیوں کا خاص اسٹائل ہے۔ جب ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اب مزید جھوٹ کیسے بولا جائے تو وہ اپنے وکیلوں کا انتظار شروع کردیتے ہیں۔"

اچانک میں بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک ہی میرے دل میں اداسی کی ایک لہر سی ابھری تھی۔ میں نے آنجہانی ہیرس کی طرف دیکھا۔ اس کی جلد میں ہلکی سی نیلاہٹ اور موم کی سی جھلاہٹ نمودار ہونے لگی تھی۔ میں نے ایک بار پھر مسز ہیرس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "میں اب سمجھ گیا ہوں۔۔۔۔ ول برینڈن کا ایف بی آئی والا ڈراما صرف میرے لیے تھا۔ اسے بھی یقیناً معلوم ہوگا کہ وہ اس فراڈ کو زیادہ آگے تک نہیں چلا سکتا تھا۔ اس کا مطلب ہے یہ ایف بی آئی والا ڈراما صرف مجھے بدحواس کرنے کے لیے تھا۔ ول برینڈن اور بھی نہ جانے کہاں کہاں یہ ڈراما کرچکا ہوگا اور اس کے سہارے نہ جانے کیا کچھ کرچکا ہوگا۔ اس کا سارا پول تو اب کھلے گا۔۔۔۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بہرحال مجھے یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ میرے بارے میں اس کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے مجھے یہیں ہلاک کردینا تھا۔ یہ مجھے پولیس کے حوالے کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ بعد میں غالباً یہ پولیس کو کچھ اس قسم کی کہانی سناتا کہ میں نے ہیرس کو قتل کیا تھا اور فائر کی آواز سن کر جب وہ یہاں پہنچا تو میں نے اسے بھی قتل کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنے دفاع میں گولی چلا کر مجھے ہلاک کردیا۔ یہ سیدھا سادہ خود حفاظتی کا کیس بن جاتا اور برینڈن کا کچھ بھی نہ بگڑتا۔ پولیس مغز ماری کرتی رہتی اور اپنا سر پھوڑتی رہتی کہ آخر میں ہیرس کو کیوں قتل کرنا چاہتا تھا؟ عین ممکن ہے وہ جلد ہی کوئی جواز تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاتی یا پھر کوئی مفروضہ قائم کرکے کیس کو داخلِ دفتر کردیتی۔ تم لوگ غیر ملکی ہو۔ دولت اور اثر رسوخ والے ہو۔ وہ تمہیں زیادہ تنگ نہ کرتی اور تم سب کچھ بیچ باچ کر اطمینان سے رخصت ہوجاتے۔ امریکا جاکر کہیں خوبصورت ساحلوں پر ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈال کر دھوپ سینکتے پائے جاتے۔"

وہ بدستور خاموش تھی۔ ویسے اب اس کی آنکھوں میں ایک تغیر رونما ہوا تھا۔ ان کی گہرائی میں کچھ مایوسی نظر آرہی تھی۔ اس شخص کی طرح جس کے تمام قیمتی رازوں تک کسی کی رسائی ہوچکی ہو لیکن وہ پھر بھی انہیں بچانے کی کوئی تدبیر سوچ رہا ہو۔

میں اپنے دل میں اُبھرتی ہوئی اداسی کی لہر کو دبانے کی کوشش کررہا تھا لیکن شاید مجھے اس میں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ میں جب بولا تو میرے لہجے میں سچ مچ افسردگی تھی۔ مجھے خود بھی حیرت ہوئی۔

"تم نے۔۔۔۔ یا برینڈن نے بہت ہی غلط وقت پر ہیرس کو قتل کیا۔۔۔۔ بہت ہی غلط وقت پر۔۔۔۔!" میں نے کہا "کیا تم اس شخص کے محسوسات کا اندازہ کرسکتی ہو جو ایک مدت سے ماؤنٹ ایورسٹ سر کرنے کی کوشش کررہا ہو اور عین اس وقت جب چوٹی اس سے دو چار ہاتھ کے فاصلے پر ہو، چٹان میں گڑی ہوئی وہ میخ اکھڑ جائے جس پر اس کا پاؤں ٹکا ہو۔۔۔۔ اس کی کمر سے بندھی ہوئی نائلون کی ڈوری ٹوٹ جائے اور وہ برفانی دھند لکوں میں لپٹی سرمئی فضا میں گویا آسمان سے پاتال کی طرف سفر شروع کردے؟ کیا تم اس کی کیفیت کا اندازہ کرسکتی ہو؟"

میں اسے گھور رہا تھا۔ اس نے نظر چرالی۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ اٹھ کر پہلے سے زیادہ بے دردی سے اس کے بال مٹھی میں جکڑلوں اور اس کے منہ پر ایسا گھونسا رسید کروں کہ زندگی بھر کے لیے اس کا چہرہ مسخ ہوکر رہ جائے یا پھر اسے اٹھا کر اس طرح دیوار سے دے ماروں کہ وہ دوبارہ نہ اٹھے۔ نہ جانے کس طرح میں نے خود پر قابو رکھا۔

اس نے کچھ یوں میری طرف دیکھا جیسے میری بات کا اصل مفہوم سمجھنے کی کوشش کررہی ہو۔ میں نے ایک لمحے کے لیے دانت بھینچے رکھے پھر کہا "تم جیسی عورتوں کی منہ زور خواہشات بیک وقت نہ جانے کتنی زندگیاں برباد کردیتی ہیں۔۔۔۔ اور افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات خود ان کے اپنے ہاتھ بھی کچھ نہیں آتا۔۔۔۔"

میرے دل پر بوجھ بڑھ رہا تھا۔ میں نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بات جاری رکھی "محض چند منٹ سے بڑا فرق پڑگیا۔۔۔۔ تمہارا اور ول برینڈن کا معاشقہ یا ہیرس کو راستے سے ہٹانے اور اس کی دولت پر قبضہ کرنے کی ہوس۔۔۔۔ یہ سب تمہارا، ول برینڈن کا۔۔۔۔ یا پھر تمہارے شوہر کا دردِ سر تھا۔ مجھے اس سے ذرا بھی غرض نہ ہوتی۔ مجھے شاید کسی بات کا علم بھی نہ ہونے پاتا۔ میں آتا۔۔۔۔ ہیرس سے ایک معمولی سی چیز لیتا اور خاموشی سے رخصت ہوجاتا۔ تمہارا منصوبہ چند منٹ یا چند گھنٹے بعد بھی عملی شکل اختیار کرسکتا تھا اور اس میں اُلجھنے والا میرے بجائے کوئی اور بھی ہوسکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں قسمت کو یوں منظور تھا۔۔۔۔!"

میں نے ایک طویل سانس لی جس نے میرے دل پر خراش سی ڈال دی "شاید اس میں ایک اچھا پہلو تو یہ تھا کہ تمہیں اور تمہارے عاشق کو انجام کو پہنچنا تھا لیکن بُرا پہلو یہ ہے کہ ایک بے قصور لڑکی کی زندگی کو بربادی سے بچانے کی جو تدبیر ہونے والی تھی دھری کی دھری رہ گئی اور اس کے لیے میرے سامنے کوئی متبادل راستہ بھی نہیں۔۔۔۔ ایک عرصے کی تگ و دو کے بعد امید کی کرن نظر آئی تھی، وہ بھی تمہاری وجہ سے دم توڑ گئی منحوس عورت!"

میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیسے۔ پہلی بار اس کی رنگت زرد پڑگئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ میری آنکھوں میں یقیناً کوئی بات تھی جس نے اسے خوفزدہ کردیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میں نے اپنے اندر مچلتے ہوئے ایک درندے کو بڑی مشکل سے قابو میں رکھا ہوا تھا۔

میں اس کی طرف بڑھا تو وہ دہشت زدہ سے انداز میں اُلٹے قدموں دیوار کی طرف بڑھنے لگی۔ حتیٰ کہ دیوار سے جا لگی۔ میں اس کے قریب جا رکا۔ وہ سر اٹھائے میری طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی سانس گویا سینے میں اٹک گئی تھی۔ اس کا چہرہ مجھ سے صرف چند

انچ کے فاصلے پر تھا۔ اس کی رنگت زرد تھی اور پیشانی پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

چند سیکنڈ کی اعصاب شکن سی خاموشی کے بعد جب میں بولا تو مجھے خود اپنی آواز کسی درندے کی غراہٹ سے مشابہ محسوس ہوئی "تم کتنی خوش قسمت ہو مسز ہیرس...... کہ تم قانون کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچو گی...... میرے ہاتھوں نہیں......"

اس کی خوبصورت مرمریں اور صراحی دار گردن کو گرفت میں لینے کے لیے میرے ہاتھ کے عضلات اکڑے جا رہے تھے لیکن میں نے بڑی مشکل سے اپنے ہاتھ کو قابو میں رکھتے ہوئے انہیں گردن کے بجائے اس کے بازو کی طرف بڑھایا۔ دہشت کے مارے اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی لیکن جب اس نے دیکھا کہ میں نے صرف اس کا بازو تھاما تھا تو اس نے شاید بہ مشکل اپنے آپ کو مزید چیخنے سے باز رکھا۔

"تم اپنی جگہ سے حرکت مت کرو مسز ہیرس!" میں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا "جس کرسی پر میں نے تمہیں بٹھایا تھا، اسی پر بیٹھی رہو۔ میرے محسوسات میں اس وقت ایک بارودی سرنگ پھیلی ہوئی ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا پاؤں اس بارودی سرنگ پر پڑ جائے اور سب کچھ دھماکے سے اُڑ جائے......"

میں نے اسے بازو سے پکڑے پکڑے لا کر واپس کرسی پر بٹھا دیا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ اس کی آنکھیں بدستور پھیلی ہوئی تھیں اور وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اب یقیناً اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا واسطہ ایک بالکل مختلف قسم کے آدمی سے پڑا تھا۔

میں نے دل برینڈن کو ایک ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا "اس گدھے کے بچے کی بے ہوشی تو کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی۔ اب تک تو اسے ہوش میں آ جانا چاہیے تھا۔ مجھے اس سے بھی دو دو باتیں کرنا تھیں...... لیکن...... خیر میں اب اس کے ہوش میں آنے کا انتظار نہیں کر سکتا......"

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کا انداز مؤدبانہ اور محتاط سا تھا۔ میں ایک لمبا سا ڈگ بھر کر دوبارہ مسز ہیرس کے قریب جا کھڑا ہوا۔

"پوچھو کون ہے۔" میں نے سرگوشی میں اسے حکم دیا "کوئی غیر ضروری بکواس کرنے یا کسی کو مدد کے لیے بُلانے کی ضرورت نہیں...... کہیں ایسا نہ ہو کہ تم ہر قسم کی مدد سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز ہو جاؤ۔"

میرے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا مگر وہ اس سے زیادہ دہشت زدہ تھی جتنی شاید کسی ہتھیار بردار کو اپنے سر پہ کھڑے دیکھ کر ہو سکتی تھی۔ اس نے تھوک نگلا اور بہ آواز بلند پوچھا "کون ہے؟"

"بٹلر...... میڈم! آپ کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟" شاید بھاری بھرکم اور ساؤنڈ پروف چوبی دروازے کی وجہ سے باہر [illegible] آواز بہت ہلکی آ رہی تھی۔ میں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ [illegible] لہجہ شک زدہ تو نہیں تھا؟ لیکن مجھے اس میں شک کا سراغ نہیں ملا [illegible]

مسز ہیرس اس بار میری ہدایت کے بغیر ہی بولی "نہیں [illegible] لوگ اس وقت ضروری میٹنگ کر رہے ہیں۔ کوئی ہمیں ڈسٹرب نہ کرے......" اس کے لہجے میں خفیف سا ارتعاش تھا لیکن مجھے امید تھی کہ بھاری بھرکم دروازے کے پار بٹلر اس ارتعاش کو محسوس نہیں کر سکے گا۔ اگر وہ شک میں مبتلا بھی ہو جاتا تب بھی مجھے کوئی خاص پروانہ ہوتی۔ دروازہ مقفل تھا۔ اگر اس کے پاس ڈپلیکیٹ چابی تھی تب بھی اس کے دروازہ کھولنے تک کی مہلت میرے لیے بہت کچھ کر گزرنے کو کافی ہوتی۔

"بہت بہتر میڈم!" بٹلر کی آواز آئی اور پھر سکوت چھا گیا۔

میں اسٹڈی کی بڑی سی میز کے قریب جا بیٹھا۔ ٹیلیفون میں نے اپنے قریب کھسکا لیا۔ تب مسز ہیرس نے تھوک نگل کر پوچھا "کسے فون کرنے لگے ہو؟"

"تمہارے قونصل جنرل اور سفیر کو۔" میں نے جواب [illegible] "تمہیں ان دونوں سے بات کرنے کا بہت شوق تھا نا......؟ اب ان سے جتنی دیر چاہو بات کر سکو گی۔ فرق صرف یہ ہو گا کہ پہلے [illegible] ان سے بات کروں گا اور تمہاری معلومات میں یہ اضافہ ہو گا کہ میری بھی کچھ کام کے لوگوں سے شناسائی ہے۔ ان دونوں سے [illegible] کرنے کے بعد میں آئی جی صاحب سے بھی بات کروں گا۔ وہ خود یا آئیں گے یا کسی معقول آدمی کو بھیجیں گے۔ کچھ دیر میں میرے اندازوں کی تصدیق ہو جائے گی اور اگر کوئی بات میرے اندازوں کی رسائی میں آنے سے رہ گئی ہو گی تو وہ بھی معلوم ہو جائے گی۔"

"ٹھہرو...... ایک منٹ ٹھہرو...... میری بات سنو۔" [illegible] متذبذب سے انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس کا چہرہ [illegible] تھا کہ اس نے جس مصنوعی خود اعتمادی اور جارحانہ پن کا سہارا [illegible] تھا وہ اب اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ دل ہی دل میں اس نے [illegible] تسلیم کر لی تھی اور اب اسے کسی راہِ فرار کی تلاش تھی۔

میں اپنے مطلوبہ نمبر معلوم کرنے کے لیے اپنے آفس [illegible] کرنے لگا تھا۔ میں نے ہاتھ روک لیا اور سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم نے کسی چیز کا ذکر کیا تھا...... جو تم ہیرس سے لینے آئے تھے۔ کیا چیز تھی وہ؟" اس نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

میرے دل میں ایک موہوم سی امید نے سر ابھارا۔ میرا [illegible] وغضب کچھ کم ہو گیا۔ میں نے قدرے نرمی سے کہا "ہاں...... مجھے خیال ہی نہیں آیا تھا...... میں تمہیں اس چیز کا نام [illegible] ہوں۔ شاید تم میری کچھ مدد کر سکو۔ مجھے فاربمولا اے چاہیے [illegible]"

میں نے اسے اس کا کیمیائی نام بھی بتا دیا "مجھے بہت [illegible] مقدار [illegible] سی مقدار میں یہ کیمیکل چاہیے...... بہت نیک

لیے...... یوں سمجھ لو کہ یہ کیمیکل میسر آ جائے تو کسی کی زندگی سنور جائے گی۔ ہیرس نے مجھے یہ کیمیکل دینے کا وعدہ کیا تھا۔ اگر وہ زندہ ہوتا تو اب تک شاید میں اپنی مطلوبہ چیز لے کر جا بھی چکا ہوتا......"

میں اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک سی نمودار ہوتے اور معدوم ہوتے دیکھ چکا تھا۔ میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں۔ میں نے جلدی سے پوچھا "کیا تم یہ کیمیکل مجھے دے سکتی ہو؟ ہیرس کے پاس اس کی کچھ مقدار موجود تھی۔ کیا تمہیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے؟"

اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سنبھل چکی تھی اور اس کے تیز و طرار ذہن میں شاید کچھ چرخیاں سی تیزی سے گھومنے لگی تھیں۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولی "میں یہ کیمیکل تلاش کرنے کی کوشش کر سکتی ہوں لیکن کیا اس کے بدلے ہمارے درمیان کچھ سودے بازی ہو سکتی ہے؟"

"کیسی سودے بازی؟" میں نے اپنے لہجے میں سختی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔

"تم کہہ چکے ہو کہ اگر تمہیں اس معاملے میں اُلجھانے کی کوشش نہ کی جاتی تو تمہیں اس سے کوئی غرض نہ ہوتی......" وہ یقیناً بہت سوچ سمجھ کر بول رہی تھی "تم چاہو تو اب بھی فرض کر سکتے ہو کہ تمہیں اس معاملے میں الجھانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ تمہیں کچھ معلوم ہی نہیں ہے۔ تم نے کچھ دیکھا ہی نہیں ہے۔ تمہیں جو زحمت ہوئی اس کے لیے میں تہِ دل سے تم سے معذرت کر لوں گی۔ ویسے تم نے برینڈن کی درگت بنا کر کافی حد تک اس زحمت کا حساب برابر بھی کر لیا ہے۔"

اس کی بات سُن کر میں خود ساری زحمت بھول گیا تھا لیکن میں نے خود کو حد سے زیادہ خوشی کا اظہار کرنے سے بھی باز رکھا اور ذرا سخت لہجے میں کہا "وضاحت سے بات کرو۔"

"فرض کرو میں کیمیکل اے تلاش کر کے تمہیں دے دیتی ہوں...... تو کیا تم ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟ یہ لاش اسی طرح یہاں رہے گی۔ برینڈن بھی اگر اس وقت تک ہوش میں نہ آیا تو یہ بھی اسی طرح پڑا رہے گا۔ جب یہ ہوش میں آئے گا تو ہم دونوں آپس میں مشورہ کر کے اس صورتِ حال سے نمٹنے کی کوئی بھی تدبیر سوچ لیں گے۔ بہر حال تمہارا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔" وہ بولی۔

"میری عدم موجودگی میں تو تم مجھے زیادہ آسانی سے...... اور زیادہ بہتر طور پر پھانس سکتی ہو۔ تمہارا خیال ہے کہ میں اپنے آپ کو اتنا ہوشیار ثابت کرنے کے بعد اب یکایک احمق ہو جاؤں گا کہ آنکھیں بند کر کے تمہاری پیشکش قبول کر لوں گا؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"مجھے اعتراف ہے کہ احمق تم نہیں...... میں اور برینڈن تھے۔ ہم نے تمہیں آسان شکار سمجھا اور بہت جلد بازی میں تمہیں گھیرنے کی کوشش کی۔ مجھے اب احساس ہو رہا ہے کہ ہماری یہ کوشش کتنی بھونڈی تھی...... لیکن اب میں تمہارے ساتھ دیانتداری سے معاملہ کرنا چاہتی ہوں اور جان بچانے کی کوئی دوسری تدبیر کرنا چاہتی ہوں۔"

"گویا تمہیں یہ بھی اعتراف ہے کہ میں نے جو اندازے ظاہر کیے وہ درست ہی تھے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"تقریباً۔" اس نے جواب دیا "کچھ چھوٹی موٹی جزئیات ہیں لیکن ان سے تمہارے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ تمہاری بات تقریباً ٹھیک ہے لیکن میں اب تم سے تصادم نہیں چاہتی۔ تم باہمی بقا کا کوئی راستہ نکالو۔ تمہارا جو کام اٹکا ہوا ہے اسے پورا کرنے کی تدبیر کرو اور ہمیں ہمارے حال پہ چھوڑ دو۔ میرا تم سے شریفانہ وعدہ ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے خلاف کوئی سازش نہیں ہو گی۔ کسی کے سامنے تمہارا ذکر تک نہیں آئے گا۔"

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا "مجھے تمہاری یہ تجویز منظور تو ہے...... میں خود بھی اس معاملے میں ٹانگ اڑانا نہیں چاہتا۔ سرِدست میرے پاس وقت نہیں ہے۔ یہ تو تم دونوں نے زبردستی میری ٹانگ پکڑ کر اس معاملے میں گھسیٹ لی تھی اس لیے مجھے جوابی کارروائی کرنی پڑی۔ اگر تم مجھے کیمیکل اے دے دیتی ہو تو میں سب کچھ بھولنے پر تیار ہوں لیکن میں تمہارے زبانی وعدے پر یقین کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ میں زیادہ چالاک لوگوں پر بھروسا کرنے کا عادی نہیں ہوں۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا ہو گا؟" اتنی دیر میں پہلی بار اس نے مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا اور دزدیدہ نظروں سے برینڈن کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک ہوش میں نہیں آیا تھا۔

"تمہیں ایک مختصر سی تحریر مجھ کو دینا ہو گی جس میں اعتراف کیا گیا ہو کہ تم نے یا برینڈن نے سازش کے تحت ہیرس کو قتل کیا تھا اور اس الزام میں مجھے پھنسانے کی کوشش کی تھی۔ تمہاری یہ تحریر ضمانت کے طور پر میرے پاس محفوظ رہے گی۔ اگر تم نے دوبارہ مجھے پھنسانے کی کوشش نہ کی تو سال دو سال حفاظت سے اپنے پاس رکھنے کے بعد میں وہ تحریر ضائع کر دوں گا ورنہ بوقتِ ضرورت وہ سامنے آ جائے گی۔" میں نے یہ تجویز فوری طور پر ہی "گھڑ" کر پیش کر ڈالی۔

اس کا ذہن یقیناً بہت تیزی سے کام کرتا تھا۔ اس نے صرف ایک لمحے اس تجویز کے بارے میں سوچا اور بولی "یہ تو اپنے ہاتھ کٹوانے والی بات ہے۔ میں گویا خود اپنی موت کا پروانہ تمہارے ہاتھ میں دے دوں گی۔"

"اس کے باوجود تم نقصان میں نہیں رہو گی کیونکہ تمہاری موت کا پروانہ تو اب بھی جاری ہو چکا ہے۔ اگر اپنے آپ کو بچانے کے لیے جُوا کھیلنا چاہتی ہو تو تمہیں میری تجویز پر عمل کرنا پڑے گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اس بات کی کیا ضمانت ہوگی کہ تم مستقبل میں مجھے بلیک میل نہیں کروگے؟" اس نے ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے ابھی لفظ "شریفانہ" استعمال کیا تھا۔ یہی ایک طریقہ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے ساتھ شریفانہ انداز میں چلنے پر مجبور کیے رکھے گا۔ ورنہ ظاہر ہے نہ تو تمہیں میری زبان پر اعتماد ہے اور نہ ہی مجھے تمہاری زبان پر۔ ایک دوسرے کی طرف سے کسی خطرے کی تلوار سر پہ لٹکتی رہے گی تو دونوں ہی ٹھیک رہیں گے۔ میرا تو خیر ویسے بھی ٹھیک ہی رہنے کا ارادہ ہے لیکن تمہیں اس بات کا یقین دلانے کا میرے پاس کوئی طریقہ نہیں۔ تم بہرحال مجرم ہو۔ تمہیں زیادہ رسک لینا پڑے گا۔"

چند سیکنڈ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر میں نے قدرے بیزاری سے پوچھا "تم تیار ہو یا نہیں؟"

اس نے ایک طویل سانس لی اور اس کے کندھے کچھ شکست خوردگی کے سے انداز میں جھک گئے۔ میں نے میز سے رائٹنگ پیڈ اور قلم اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا اور کہا "لکھو......"

میں نے دو جملوں میں اپنے مطلوبہ انداز میں اس سے ایک طرح سے تحریری اقبالِ جرم کرایا۔ اس نے نیچے اپنے دستخط گھسیٹ دیے۔ میں اس کے سر پر کھڑا تھا۔ میں نے کہا "جانے سے پہلے میں کسی دوسری اہم چیز پر موجود تمہارے دستخط دیکھ کر اطمینان کروں گا کہ یہ واقعی تمہارے دستخط ہیں یا نہیں۔ اس لیے صحیح دستخط کرنا۔ مجھے چکر دینے کی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں بولی "یہ واقعی میرے دستخط ہیں۔"

"شکریہ۔" میں نے اب نہایت مہذبانہ لہجے میں کہا اور میز پر رکھے ہوئے ایک قلمدان پر سے ایک فاؤنٹین پین اٹھالیا۔ پھر اچانک میں نے اس کا ہاتھ پکڑا اور فاؤنٹین پین سے اس کے ایک انگوٹھے پر روشنائی لگانے لگا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" وہ ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی لیکن مجھ سے ہاتھ چھڑانا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر وہ میرا مقصد سمجھ گئی اور اس کا بازو ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے اس کاغذ پر اس کے انگوٹھے کا نشان بھی ثبت کرلیا۔

"اب کام ذرا پکا ہوگیا۔" میں نے کاغذ رائٹنگ پیڈ سے علیحدہ کرتے ہوئے طمانیت سے کہا۔

"میں نے واقعی اپنی موت کے پروانے پر دستخط کردیے ہیں۔" وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی۔ اس کے لہجے میں فکر مندی لیکن ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ یہ ایک عجیب تضاد تھا۔

"موت کے پروانے پر تو تم نے اسی وقت دستخط کردیے تھے۔ جب تم نے بے گناہ ہیرس کو گولی کا نشانہ بنانے یا بنوانے کا فیصلہ کیا ہوگا۔ جو شخص بھی کسی بے گناہ کو ہلاک کرتا ہے، میرے خیال میں تو اسے پورا یقین ہونا چاہیے کہ جلد یا بدیر گولی پلٹ کر اس کی طرف بھی آئے گی۔" میں نے کہا۔

"بے گناہ!" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی "آخر تم ہونا...... مرد کی حمایت میں بولو گے۔ تمہارے خیال میں اس کے معاملات میں وہ تمام بوڑھے مگر دولت منداور ہوس پرست کے مرد بالکل بے قصور اور بے گناہ ہوتے ہیں جو دولت کے بوتے پر جوان اور خوبصورت عورتوں کو خرید لیتے ہیں؟"

"مجھے تمہارے طبقے کی ایک سفید فام عورت کے منہ سے ٹٹ پونجیا بات سننے کی توقع نہیں تھی۔" میں نے ناگواری سے "کسی پسماندہ معاشرے کی عورت کے منہ پر تو شاید یہ بات جاتی لیکن تم ایک انتہائی ترقی یافتہ ملک کے انتہائی آزاد معاشرے کی عورت ہو۔ تم اس جواز کا سہارا لے کر اپنے آپ کو ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔"

"اگر تم اصل کہانی سے واقف ہوتے تو یہ بات کرتے......" اس کے لہجے میں تلخی جھلک آئی "لیکن کہانی ہے...... اور یہ لمبی کہانیاں چھیڑنے کا وقت نہیں۔"

"بات پہلے ہی بہت لمبی ہوچکی ہے۔ میں بھی لمبی لمبی کہانیوں میں الجھنا نہیں چاہتا۔" میں نے وہ کاغذ تہ کرکے جیب میں جس پر اس نے دو تین جملے لکھے تھے "اب تم مجھے کیمیکل تلاش کردو۔ میں تمہاری تمام تر خباثت کے باوجود تمہارا شکر گزار رہوں گا۔"

اس نے شاید لفظ "خباثت" کے استعمال پر مجھے گھورا لیکن پھر ٹھنڈی سانس لے کر کندھے اچکا کر اٹھ کھڑی ہوئی اور جویانہ لہجے میں بولی "تلاش کہاں کرنا ہے...... وہ اوپر کباڑ خانے میں پڑا ہے۔ یہ محض اتفاق ہے کہ مجھے اس کے بارے میں ورنہ مجھے اس کے بارے میں کیا خاک پتا ہوتا تھا۔ اور یہ بھی نہیں تمہاری خوش قسمتی ہے یا میری...... کہ یہ بات مجھے گئی۔ بہت پہلے کی بات ہے جب وہ ڈبے فیکٹری سے گھر آئے تھے اور ہیرس نے باتوں باتوں میں مجھے ان کے بارے میں بتایا تھا۔ تمہیں وہ کیمیکل کتنی مقدار میں چاہیے؟"

"صرف آدھا پاؤنڈ۔" میں نے جواب دیا۔

"صرف آدھا پاؤنڈ......؟" اس نے حیرت سے دہرایا "کباڑ خانے میں تو اس کے کئی کارٹن پڑے ہیں۔ میں تو سمجھی تھی تم سارے اٹھا کر لے جانا چاہو گے۔ ہیرس تو پچھلے دنوں انہیں ٹھکانے لگوانے لگا تھا پھر نہ جانے کس لیے بات بیچ میں رہ گئی۔"

میں حالات کی اس قسم کی ستم ظریفیوں پر اکثر حیران ہی رہتا تھا اور اس سے محظوظ بھی ہوتا تھا۔ میں جس چیز کی معمولی مقدار کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا تھا اور جس کے لیے بھاگ دوڑ کر رہا تھا وہ یہاں کباڑ خانے میں نہ جانے کتنی مقدار میں پڑی تھی۔ یہ پہلو بھی کچھ کم قابلِ غور نہیں تھا کہ ہیرس نے اسے ضائع کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر یہ کام بیچ میں رہ گیا تھا اور ہیرس خود ضائع ہوگیا تھا۔ یوں قدرت کو مجھے نہ جانے کس کس پیچ و خم سے گزارنے کے بعد میرا مسئلہ حل کرنا منظور تھا۔

مسز ہیرس نے ایک نظر اپنے آنجہانی شوہر کی طرف اور پھر برینڈن کی طرف دیکھا۔ نہ جانے کیوں اس نے دونوں ہی کی طرف سے فوراً نظر ہٹالی اور دروازے کی طرف چل دی۔

"ایک منٹ ٹھہرو......" میں نے برینڈن کے قریب پہنچ کر مسز ہیرس کو پکارا "میں نہیں چاہتا کہ ہم اوپر جائیں اور پیچھے تمہارا یہ بے ہودہ عاشق کوئی ہتھیار اٹھائے یا گھر کے دوسرے ملازمین کو ساتھ لیے آجائے اور میری کھوپڑی توڑنے کی کوشش کرے......"

کمرے میں مجھے ایسی کوئی چیز دکھائی نہ دی جس سے میں اس کے ہاتھ پاؤں باندھ سکتا۔ میری جیب میں ہنگامی ضروریات کے لیے نائیلون کا ایک تار موجود رہتا تھا لیکن وہ صرف اس کے ہاتھ باندھنے کے لیے کافی رہا۔ اس کے پاؤں باندھنے کے لیے میں نے اپنی ٹائی استعمال کی اور پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ کبھی کبھی کوئی بے کار چیز بھی کتنا کام دے جاتی تھی۔ میں مسز ہیرس سے کوئی چیز منگوانے کے لیے اسے تنہا باہر بھیجنا نہیں چاہتا تھا اور نہ ہی برینڈن کو تنہا کمرے میں اس طرح چھوڑ کر جانا چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں کھلے ہوتے۔ اس کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ وہ کس لمحے ہوش میں آجاتا اور اسے چونکہ علم نہیں تھا کہ مسز ہیرس سے میرے کیا مذاکرات ہوچکے تھے اس لیے وہ کوئی بھی حرکت کرکے سلجھے ہوئے مسئلے کو دوبارہ الجھا سکتا تھا۔

میں ٹائی کو خاص ترکیب سے برینڈن کی ٹانگوں پر لپیٹ کر گرہ لگا رہا تھا تو مسز ہیرس بولی "تم واقعی بہت احتیاط پسند آدمی ہو۔"

"تم جیسے لوگوں سے نمٹنے کے لیے احتیاط پسندی تو سب سے زیادہ ضروری چیز ہے۔ ادھر انسان نے ذرا سی بے احتیاطی کی اور ادھر وہ چت ہوا۔" میں نے اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس سے معاہدہ ہوجانے کے باوجود ابھی تک میں اس کی طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اب بھی وہ موقع ملتے ہی کوئی چیز اٹھا کر میری کھوپڑی پر دے مارتی۔

وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ ہیرس سے ملنے کے لیے آنے والا پاکستانی اس قسم کی چیز ہوگا۔"

"قسمت اسی طرح کبھی کبھی انسان کو خوش فہمی میں مبتلا کرکے مرواتی ہے۔" میں نے اس کے پیچھے چلتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا "ویسے تمہارے اس باڈی بلڈر کو اب تک ہوش میں آجانا چاہیے تھا۔ شاید یہ اتنا مضبوط نہیں ہے جتنا میں سمجھ رہا تھا۔"

"وہ جتنا مضبوط ہے میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" وہ پلٹ کر ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولی "آخر وہ بے چارہ انسان ہی ہے۔

اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا واسطہ تم جیسی غیر انسانی مخلوق سے پڑجائے گا۔"

ہم اس وقت بیضوی ٹیرس سے گزر رہے تھے۔ یہاں سے مکان کا سامنے کا لان اور گیٹ وغیرہ بھی دکھائی دے رہا تھا۔ گیٹ پر بدستور مسلح گارڈ تعینات تھے۔ انہیں معلوم ہی نہیں تھا کہ اوپر کیا ڈراما چل چکا تھا۔ اسی دوران میں، میں نے بٹلر کو بھی گھر کے ایک کونے سے نکل کر دوسرے کونے کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی چال میں اچھی خاصی شاہانہ سی تمکنت تھی۔ وہ بٹلر خود اپنی جگہ کسی نوابزادے سے کم نہیں تھا۔

اس نے سر اٹھا کر ہم دونوں کو آگے پیچھے ٹیرس سے گزرتے دیکھا اور رُک گیا۔ شاید اسے توقع تھی کہ اس کی مالکن اسے بُلانے گی۔ مسز ہیرس نے رک کر پلٹتے ہوئے مجھ سے پوچھا "ڈبا تلاش کرانے کے لیے کسی ملازم کو بُلوا لوں؟ کباڑ خانہ واقعی کباڑ خانہ ہے۔ اس میں بے پناہ کاٹھ کباڑ ہے اور دھول بھی جمی ہوگی۔ میں نے تو عرصے سے اس کی صورت نہیں دیکھی۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "میں خود ہی ڈھونڈ لوں گا۔ تم مجھے ہی اپنا خادم سمجھو۔"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر آگے بڑھ گئی۔ نیچے لان پر بٹلر نے بھی شاید ٹھنڈی سانس لے کر کندھے اچکائے اور آگے بڑھ گیا۔

وہ مکان واقعی کسی محل سے کم نہیں تھا۔ قالین سے ڈھکی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر ہم اوپر پہنچے۔ چھت کا فرش بھی ماربل کا تھا لیکن اس کے ایک حصے میں روف گارڈن بھی موجود تھا اور اس پر تقریبات وغیرہ کے لیے باربی کیو کا انتظام بھی تھا۔

مسز ہیرس نے جس کمرے کو کباڑ خانے کے نام سے یاد کیا تھا وہ بجائے خود کسی چھوٹے موٹے مکان سے کم نہیں تھا۔ اس کا دروازہ غیر مقفل ہی تھا۔ میں اس کی رہنمائی میں کمرے میں داخل ہوا تو ایک جہانِ حیرت میرا منتظر تھا۔

کمرا کیا تھا، ایک عجائب خانہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز وہاں لاکر رکھ دی گئی تھی۔ کوئی بھی ایسی دنیاوی ضرورت کی چیز، جس کا تصور کیا جاسکتا تھا وہاں موجود تھی۔ کمرا نہایت طویل و عریض تھا اور پھر اس میں شیلف وغیرہ بھی بنے ہوئے تھے۔ ہر کونا کھدرا چیزوں سے بھرا ہوا تھا اور سب پر واقعی مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میرا سر گھوم گیا۔ اس کباڑ خانے میں تو واقعی اپنی مطلوبہ چیز تلاش کرنا بہت دشوار تھا۔ شاید ایک لمحے کے لیے میں اپنے تاثرات چھپانا بھول گیا تھا۔ مسز ہیرس بغور میری طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ سے انداز میں مسکرا کر بولی "چلو پیارے خادم! اب اپنا یہ عمدہ سوٹ اتار دو اور صرف انڈر ویئر میں اس بحرِ ذخار میں چھلانگ لگادو۔"

میں نے سنبھلتے ہوئے کہا "میں ذرا شرمیلا قسم کا آدمی

ہوں...... معزز خواتین کے سامنے انڈرویئر میں اس قسم کے بے ہودہ کام کرنا پسند نہیں کرتا۔ میں سوٹ سمیت ہی تلاش کرلوں گا۔"

وہ اب ذرا واضح انداز میں مسکرائی اور اسے گویا مجھ پر ترس آگیا۔ کافی حد تک دوستانہ لہجے میں بولی "میں تمہاری کچھ رہنمائی کردیتی ہوں۔ تمہارا کام کافی آسان ہوجائے گا۔"

کمرے میں کارٹنوں اور گتے کے چھوٹے ڈبوں کی بھی کوئی کمی نہیں تھی اور وہ کئی جگہ بکھرے ہوئے تھے۔ کچھ شیلفوں میں بھی موجود تھے۔ سب سے زیادہ گرد انہی پر جمی ہوئی تھی۔ وہ ایک کونے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس حصّے میں ایسے مسترد شدہ کیمیکلز اور بیش قیمت دوائیں رکھی جاتی ہیں جنہیں فیکٹری کے گوداموں یا اسٹورز وغیرہ میں چھوڑنا مناسب نہیں ہوتا۔ انہیں ضائع کرنے کے لیے بھی خصوصی حفاظتی اقدامات کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی فرصت میسر آئے تو یہ کام کیا جاتا ہے۔ تم صرف اسی حصّے میں وہ کارٹن تلاش کرو۔"

"اس کی کوئی نشانی......؟" میں نے گویا کمرہمت کستے ہوئے پوچھا۔

"کارٹن سادہ ہیں...... اندر ٹین کے چوکور ڈبے ہیں۔ ڈبوں پر جلی حروف میں "کیمیکل اے" اور نیچے اس کا کیمیائی فارمولا چھپا ہوگا۔" اس نے بتایا "میں نے اتفاق سے ہیرس کے سامنے ایک ملازم کو ایک کارٹن کھولتے دیکھا تھا اور ان کی باتیں مجھے یاد رہ گئی تھیں۔"

فرش پر صحیح معنوں میں تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی لیکن میں کسی نہ کسی طرح پاؤں دھرتا مختلف چیزوں کے انباروں کے درمیان سے گزرتا وہاں تک پہنچا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اب بھی مسز ہیرس پر نظر رکھنا چاہتا تھا۔

وہ غالباً اس بات کو سمجھتے ہوئے ذرا چڑ کر بولی "خدا کے لیے تم میری فکر چھوڑدو اور اطمینان و یکسوئی سے اپنی مطلوبہ چیز تلاش کرو۔ اب میں کوئی گڑبڑ نہیں کروں گی۔ گڑبڑ کرنے کا وقت اب گزر چکا ہے۔"

"عورت تم سمجھدار ہو...... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ زیادہ سمجھدار لوگوں سے ہی اکثر بڑے احمقانہ جرائم سرزد ہوتے ہیں۔" میں نے سرہلایا اور کارٹنوں وغیرہ کا جائزہ لینے لگا۔

"اب تو میں چاہتی ہوں کہ تم اپنی مطلوبہ چیز لے کر جلد از جلد یہاں سے دفع ہوجاؤ۔" وہ قدرے بیزاری سے بولی۔

"بہت ہی قدر ناشناس قسم کی خاتون معلوم ہوتی ہو۔" میں درد ناک لہجے میں کہا "میری زندگی میں شاذ و نادر ہی کسی خاتون نے میرے بارے میں اس قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہوگا......"

پھر میں نے گویا خود ہی اس کی وجہ سمجھتے ہوئے کہا "اوہ...... دراصل ابھی وہ بدبخت وِل برینڈن زندہ سلامت ہے

نا...... کیا تم ایک آدھ عاشق اسپیئر میں رکھنا پسند نہیں کرتیں؟ اسٹپنی کے طور پر......؟"

اس نے دور سے ہی خونخوار نظروں سے مجھے گھورا۔ میں جلدی جلدی ایک گرد آلود کارٹن کو اٹھا اٹھا کر کھول کر دیکھنے کے بعد دوسری طرف رکھنے لگا۔ چند لمحے کے توقف کے بعد وہ قدرے خوشگوار لہجے میں بولی "اگر تم سے کچھ اچھے حالات میں ملاقات ہوئی ہوتی تو شاید میں اس امکان پر غور کرتی لیکن اس وقت تو میں تمہارا خون پی جانے کی خواہش پر بڑی مشکل سے قابو پائے ہوئے ہوں۔"

یہ بھی میری بدقسمتی ہے کہ جب بھی کسی ڈھنگ کی خاتون سے ملاقات ہوتی ہے' حالات اچھے نہیں ہوتے۔" میں نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"تم اوّل درجے کے جھوٹے معلوم ہوتے ہو...... کم از کم اس معاملے میں۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے...... کسی سے میل ملاپ رکھے اور کسی کو آزمائے بغیر تو اس قسم کی رائے کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

وہ خاموش رہی۔ میں جلد ہی کارٹنوں کی پچھلی قطار تک پہنچ گیا۔ اس دوران میں تمام تر احتیاط کے باوجود میرے ہاتھ مٹی میں لتھڑ چکے تھے اور کپڑوں پر بھی کئی جگہ مٹی لگ گئی تھی مگر مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔

جس چیز کی تلاش یا طلب جتنی شدید ہوتی ہے' کبھی کبھی وہ اتنی ہی تاخیر اور کتنے ہی صبر آزما مراحل کے بعد ہاتھ آتی ہے۔ "کیمیکل اے" کے کارٹن سب سے نیچے دبے ہوئے تھے۔ جب میرے ہاتھ میں چمکیلے ٹین کا وہ ڈبا آیا جس پر "کیمیکل اے" کے جلی حروف جھلملا رہے تھے تو فرطِ جذبات سے میری حالت عجیب سی ہوگئی۔

چند لمحے کے لیے میں اس ڈبے کو تکتا رہ گیا اور مجھے اپنی نظر کچھ دھندلاتی سی محسوس ہوئی۔ اس معمولی سی چیز کے لیے مجھے اتنی خواری اٹھانا پڑی تھی۔ ڈبے پر اس کا وزن ایک پاؤنڈ لکھا تھا۔ وہ میری ضرورت سے دُگنا تھا۔ احتیاطاً میں نے ایک ڈبا اور اٹھالیا۔ وہاں ان ڈبوں سے بھرے ہوئے تین چار کارٹن موجود تھے۔

میں گویا ساری تکلیف اور دشواریوں کو بھول گیا اور شاید ہوا کے دوش پر اُڑتے ہوئے مسز ہیرس کے پاس پہنچا۔ میں نے اب گویا ایک نئے ہی زاویۂ نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے ابھی تک تمہارا نام معلوم نہیں۔" غیر ارادی طور پر میرا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔

"میرا نام مونیکا ہے۔" وہ نہایت دھیمے لہجے میں بولی۔ اس کی آنکھوں میں بھی اب جیسے برف سی پگھل رہی تھی۔

میرے ایک ہاتھ پر دونوں ڈبے ٹکے ہوئے تھے۔ گرد میں لتھڑے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کا صاف ستھرا نرم و نازک ہاتھ تھامتے ہوئے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں کہا "مونیکا! جو کچھ بھی ہوا اس پر مجھے افسوس ہے...... لیکن ہوسکے تو یقین کرلینا...... میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں...... بہت زیادہ۔"

اس نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی سانسیں بھی کچھ مرتعش سی ہوگئی تھیں۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے۔ شاید اس نے کچھ اور کہنا چاہا تھا لیکن ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بولی "تم چاہو تو سارے کارٹن لے جاسکتے ہو۔ یہ اب ایک ممنوعہ کیمیکل ہے۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن مجھے سارے کارٹنوں کی ضرورت نہیں۔ میں تو اب بھی اپنی ضرورت سے زیادہ لے جارہا ہوں۔" میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ چھوڑدیا اور دونوں ہاتھوں سے یوں ڈبوں کو تھام کر دروازے کی طرف بڑھا جیسے وہ کسی بہت بڑے عالمی مقابلے کی ٹرافی تھی اور میں اسے جیتنے کے بعد دنیا بھر کے رپورٹروں کے سامنے اسٹیج پر جارہا تھا۔

اب میں آگے آگے تھا اور مونیکا میرے پیچھے آرہی تھی۔ میں نے گویا تمام احتیاطوں کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ مونیکا چاہتی تو عقب سے میری پشت میں خنجر گھونپ سکتی تھی۔ اس کی مہربانی تھی کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔

سیڑھیوں کے قریب پہنچ کر میں رُک گیا۔ میں نے پلٹ کر مونیکا کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی دھندلاہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ وہیں سے مجھے خدا حافظ کہہ دے گی اور اسٹڈی میں واپس چلی جائے گی لیکن وہ دھیمے لہجے میں بولی "میں تمہیں گیٹ تک چھوڑنے چلتی ہوں۔ گارڈ یا دوسرے ملازمین تمہاری یہ حالت دیکھ کر تمہیں مشکوک نہ سمجھیں۔"

وہ میرے ساتھ سیڑھیاں اُترنے لگی۔ ہال' راہداریوں اور مرمریں فرش سے آراستہ گزرگاہوں سے ہوتے ہوئے ہم گیٹ تک پہنچے۔ مونیکا میرے ساتھ تھی اس لیے کسی گارڈ نے آنکھ اُٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا اور خودکار گیٹ میرے لیے کھل گیا۔

وہ میری گاڑی کے قریب رُک کر نیچی آواز میں بولی "تم نے مجھ سے جو اعتراف نامہ لکھوایا ہے...... اسے حفاظت سے رکھنا...... کسی اور کے ہاتھ نہ لگنے پائے...... اور ہوسکے تو جلد ہی اسے ضائع کردینا۔"

"وہ میرے پاس ایک امانت کی طرح ہے۔ جیسے ہی محسوس کروں گا کہ مجھے تمہاری طرف سے کسی سازش کا خطرہ لاحق نہیں...... میں اسے ضائع کردوں گا...... یا اگر تم چاہوگی تو تمہارے اطمینان کے لیے تمہیں واپس بھی دے دوں گا۔ اگر تم یہ ملک چھوڑ کر جارہی ہوگی تو مجھ سے رابطہ کرکے اس سلسلے میں بات کرلینا۔ شاید تب تک میرے حساب سے مناسب وقت آچکا ہو۔"

"ٹھیک ہے......" اس نے گاڑی کی کھڑکی سے ہٹ کر سیدھی ہوتے ہوئے ایک طویل سانس لی۔ اب اس کے چہرے پر طمانیت ہی نہیں' ایک روشن مسکراہٹ بھی تھی۔ میں نے گاڑی ڈرائیو وے میں موڑی اور وہ ہاتھ ہلا کر واپس چل دی۔

میں جب ٹونی کے گھر پہنچا تو وہ تہ خانے ہی میں تھا اور تہ خانہ ایک قسم کے چھوٹے موٹے بیوٹی پارلر کا منظر پیش کر رہا تھا۔ وہاں ایک بڑی سی میز اور ریوالونگ چیئر کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میز پر ایک بڑا سا آئینہ، بیوٹی پارلرز میں استعمال ہونے والا ایک ماسک، مختلف ڈبے، شیشیاں، برش اور نہ جانے کیا کچھ موجود تھا۔

ڈاکٹر برنارڈ اب بندشوں سے آزاد تھا۔ اس کے پاؤں پر بینڈیج لپٹی ہوئی تھی اور وہ لنگڑاتا ہوا، شیشے کے کچھ باؤل وغیرہ ہاتھ میں اٹھائے اِدھر سے اُدھر نہ جانے کیا کرتا پھر رہا تھا۔ ٹونی شاید اس کی نگرانی کے لیے ایک اسٹول پر موجود تھا۔ ویسے تہ خانے کے دروازے پر ایک مسلح گارڈ بھی مستقل تعینات تھا۔ دروازہ وہی کھولتا اور بند کرتا تھا۔

ٹونی مجھے دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور مسکرا دیا۔ وہ میرے ہاتھ میں ڈبے دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ میں اپنے مشن سے کامیاب لوٹا تھا لیکن ڈاکٹر برنارڈ نے بے توجہی سے ایک نظر میری طرف دیکھ کر پوچھا "کیمیکل لے آئے؟"

دل تو چاہ رہا تھا پہلے اسے ایک ایسا گھونسا رسید کروں کہ وہ اچھل کر چھت سے جا ٹکرائے پھر جواب دوں "ہاں..... لے آیا ہوں ابلیس کے چیلے! اگر تم نے اتنی ۔ خباثت نہ دکھائی ہوتی تو ہمیں اتنی مصیبت نہ اُٹھانی پڑتی اور راحیلہ کو بھی اتنا عرصہ اتنے مضحکہ خیز انداز میں نہ گزارنا پڑتا۔"

تاہم میں نے اپنے جذبات پر قابو رکھا اور یہ نہیں کیا۔ ابھی ہمارا کام اس کے ہاتھ میں اٹکا ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے اب بات بنتی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے بڑے تحمل سے جواب دیا "ہاں..... لے آیا ہوں۔"

اس نے ڈبوں کی طرف ایک نظر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی اور شیشے کی ایک پیالی میں کچھ گھولتے ہوئے بے اعتنائی سے بولا "ادھر میز پر رکھ دو۔"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اس نے گھر کے کسی نوکر بچے کو دو چار روپے کی بھنڈی لانے بازار بھیجا تھا اور اب وہ لے آیا تھا تو بے پروائی سے انہیں ایک طرف رکھنے کا حکم دے رہا تھا۔ شاید اسے اندازہ تک نہیں تھا کہ اس چیز کے لیے ہمیں کتنے پاپڑ بیلنے پڑے تھے۔

میں نے خون کے گھونٹ پیتے ہوئے ڈبے دیگر ساز و سامان کے پاس میز پر رکھ دیے اور بدستور ملائمت سے کہا "انہیں دیکھ تو لو..... کیا یہ واقعی وہی کیمیکل ہے جو تمہیں درکار تھا؟"

میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خوف موجود تھا کہ میں جان جوکھوں میں ڈال کر جو چیز اٹھا کر لایا تھا کہیں ڈاکٹر برنارڈ ایک نظر اسے دیکھنے کے بعد پیشانی پر بل ڈال کر ناگواری سے نہ کہہ دے "یہ تو وہ کیمیکل نہیں ہے جو میں نے منگوایا تھا۔ اس میں اور میرے مطلوبہ کیمیکل میں یہ فرق ہے....." اور میں اپنے غیر کیمیا پسند ذہن کے ساتھ اس فرق کو سمجھ بھی نہ سکوں۔

برنارڈ نے خاصی بے اعتنائی سے ایک ڈبا اٹھا کر دیکھا [illegible] اور فارمولا وغیرہ پڑھا پھر بولا "ہاں..... بس یہ ڈبا سربمہر [illegible] ٹھیک ہی ہوگا..... ڈبا کھلا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ کھلا ہوتا تو کسی [illegible] کا امکان ہو سکتا تھا..... اور یہ تم دو ڈبے کیوں اٹھا لائے؟ یہ ایک بھی بہت زیادہ ہے۔ مجھے تو یہ بہت تھوڑی سی مقدار [illegible] چاہیے۔"

دل تو چاہا کہ اسے جواب دوں "دوسرا ڈبا میں تمہاری کھوپڑی پر مار کر کھوپڑی کے دو ٹکڑے کرنے کے لیے لایا ہوں۔"

لیکن مجھے اس جواب کا بھی اپنے دل میں ہی گلا گھونٹنا پڑا [illegible] بظاہر میں نے نہایت ملائمت اور سنجیدگی سے جواب دیا [illegible] فاضل ڈبا میں احتیاطاً لے آیا ہوں۔"

"کافی رقم خرچ ہوئی ہوگی۔ آج کل تو اس کا ملنا ہی مشکل [illegible] تھا۔" اچانک اسے نہ جانے کیوں مالی پہلو کا خیال آگیا۔

"رقم تو خرچ نہیں ہوئی..... البتہ میں خود خرچ ہوتے ہوتے رہ گیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ..... اچھا؟ خطرناک معاملہ تھا؟" اس نے بھویں اچکا کر میری طرف دیکھا۔

"نہیں..... کوئی خاص خطرناک معاملہ نہیں تھا۔" میں نے بے نیازی سے جواب دیا "بس ایک دولت مند غیر ملکی شخص قتل ہو گیا اور دو قتل ہوتے ہوتے بچ گئے۔"

"اچھا.....؟ بہت خوب۔" اس نے یوں دلچسپی سے کہا جیسے میں نے اسے کوئی خوشخبری سنائی تھی "کیا قصہ ہے؟ کچھ بتاؤ تو سہی" وہ باتیں کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا کام کرتا جا رہا تھا۔

"تم قصے کہانیوں کو چھوڑو اور اپنا کام کرو۔" میں اب اپنی چڑچڑاہٹ کو نہ چھپا سکا تاہم میں نے پھر بھی خود پر کافی حد تک قابو رکھا تھا۔ میرے لہجے سے نہایت معمولی سی چڑچڑاہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

ڈاکٹر برنارڈ کسی بد روح کی طرح ہنسا اور بولا "لگتا ہے واقعی کافی مشکل پیش آئی ہے کیمیکل اسے حاصل کرنے میں۔ بہر حال..... میں نے اپنا کام تقریباً ختم ہی کر لیا ہے۔ تمام تیاریاں مکمل ہیں۔ مجھے صرف اسی کیمیکل کا انتظار تھا۔ اب مجھے آدھا گھنٹا مزید درکار ہوگا۔ تم چاہو تو اس دوران میں لڑکی کو بلا سکتے ہو۔"

"راحیلہ کہاں ہے؟" میں نے پلٹ کر ٹونی سے پوچھا۔

"وہ آفس سے اپنے گھر چلی گئی تھی سر!" ٹونی نے بتایا "اس نے مجھ سے کہا تھا کہ جب اس کی ضرورت ہو، اسے بلا لیا جائے۔ تقریباً آدھا گھنٹا پہلے اس کا فون آیا تھا۔ میں اسے فون کر کے بلا لیتا ہوں۔ تب تک آپ شاور لے کر لباس تبدیل کر لیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے واپسی کے لیے پلٹتے ہوئے کہا۔ ٹونی میرے ساتھ ساتھ تہ خانے سے باہر آیا اور کھٹ سے دروازہ مقفل ہو گیا۔

مجھے باتھ روم میں گئے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"خدا کی پناہ.....!" میں نے شاور بند کرتے ہوئے بہ آواز بلند کہا "انسان کی زندگی ایسی بے ہودہ بھی نہیں ہونی چاہیے کہ وہ چین سے نہا بھی نہ سکے۔"

"آئی ایم ایکسٹریملی سوری سر!" باہر سے ٹونی کی آواز سنائی دی۔ اس کے لہجے سے حقیقتاً بے پناہ شرمندگی کا اظہار ہو رہا تھا "میں آپ کو اس وقت ہرگز زحمت نہ دیتا لیکن مجھے کچھ گڑبڑ کا احساس ہو رہا ہے۔ راحیلہ کے گھر کوئی فون نہیں اُٹھا رہا۔ اگر راحیلہ گھر پر نہ ہو تب بھی ملازمہ یعنی خالہ بی ضرور فون ریسیو کرتی ہیں۔"

میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی اور یہ لہر ٹھنڈے پانی کی وجہ سے نہیں تھی۔ میں نے چہرے سے پانی پونچھتے ہوئے کہا "راحیلہ کے پاس موبائل فون بھی تو ہے۔ اس پر فون کر کے دیکھا؟"

"جی سر! اس پر بھی کوئی جواب نہیں مل رہا۔" ٹونی نے جواب دیا "میں فوری طور پر اس کے گھر جا رہا ہوں۔ میں نے شبیر شیخ اور سردار علی کو بھی فون کر دیا ہے کہ اس کے گھر پہنچیں۔ آپ آرام سے وہاں پہنچ جائیے گا۔ جلد بازی نہ کیجیے گا اور پریشان نہ ہوئیے گا..... ہم دیکھ لیں گے کیا معاملہ ہے۔" اس نے اطلاع کے ساتھ ساتھ گویا مجھے تسلی بھی دی۔

وہ تو یہ کہہ کر رخصت ہو گیا لیکن میں اس کے مشورے پر عمل نہ کر سکا۔ یعنی جلد بازی سے نہ بچ سکا۔ میں نے جتنی تیزی سے غسل کیا اور کپڑے پہنے اس سے یقیناً کوئی عالمی ریکارڈ قائم ہوا ہوگا لیکن افسوس کہ ایسی باتوں کا عالمی ریکارڈ رکھا نہیں جاتا۔

اس کے بعد میں بھی تیزی سے گھر سے نکلنے ہی لگا تھا لیکن مجھے کچھ خیال آگیا۔ میں خود پر جبر کرتے ہوئے تہ خانے میں چلا گیا۔ وہاں سب کچھ جوں کا توں تھا۔ آہنی دروازہ مقفل تھا۔ گن مین مستعد کھڑا تھا۔ میرے اشارے پر اس نے دروازہ کھولا اور میں نے اندر جھانکا۔ ڈاکٹر برنارڈ بدستور کام میں مصروف تھا۔ شاید اس کا کام آخری مرحلے میں تھا۔ وہ کسی سائنس داں کی طرح ٹیسٹ ٹیوب ہاتھ میں لیے روشنی کے سامنے اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس میں نیلے رنگ کا کوئی چمکیلا سا سیال نظر آ رہا تھا۔ اس نے میری طرف نہیں دیکھا اور انہماک سے اس سیال کے معائنے میں مصروف رہا۔

میں نے دروازہ دوبارہ مقفل کر دیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اپنی بھگدڑ اور افراتفری میں ہمیں ڈاکٹر برنارڈ کو نہیں بھولنا چاہیے تھا اور حفاظتی انتظامات کی طرف سے غافل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ شاید کوئی اسی تاک میں ہو۔ میں تیزی سے اوپر آیا۔

ٹونی کے گھر میں دوسرا کوئی گارڈ بھی موجود تھا۔ اس وقت گیٹ پر تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی "تم صرف گیٹ پر مت رہو۔ چاردیواری کے اندر ہی رہتے ہوئے مکان کے چاروں طرف گشت بھی کرتے رہو اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد جا کر تہ خانے کی سیڑھیوں میں بھی جھانکتے رہنا۔"

"ٹھیک ہے سر!" اس نے مستعدی سے کہا اور اپنی گن سنبھالے حرکت میں آگیا۔ وہ دونوں عام اور روایتی سے گارڈ نہیں تھے۔ تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ کسی جگہ یا فرد کی حفاظت کے معاملے میں ان کا ریکارڈ بہت اچھا تھا۔ میں نے اسے مطلع کیا "میں دو آدمیوں کو اور بُلوا رہا ہوں۔ وہ بھی تمہارے ساتھ گھر کی نگرانی کریں گے۔"

"بہت بہتر۔" اس نے سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔

میں نے اپنے ساتھیوں میں سے صفدر اور سلیمان کو فون کیا۔ وہ صورتِ حال سے آگاہ تھے۔ میں نے انہیں ٹونی کے گھر پہنچنے کی ہدایت کی اور کہا "مقصد صرف ڈاکٹر برنارڈ کی کڑی نگرانی کرنا ہے۔ کہیں اسے ہمارے قبضے سے چھڑانے کی کوشش نہ کی جائے۔"

"سر! اسے دو نمبر پر کیوں نہ شفٹ کر دیا جائے؟" صفدر نے تجویز پیش کی۔

"دو نمبر" ہمارا بہت بڑا خفیہ ٹھکانا تھا۔ وہاں اکثر کئی افراد موجود رہتے تھے۔ مس ٹرپ اس طویل و عریض مکان اور اس کے نیچے موجود اتنے ہی بڑے تہ خانے کی انچارج تھی۔ وہاں حفاظتی انتظامات بھی بہت بہتر تھے۔ شاید ہم ڈاکٹر برنارڈ کو شروع میں ہی وہیں لے جاتے لیکن اس وقت ہم نے کوئی خاص خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔

"اب اسے گھر سے نکالنا اور کہیں منتقل کرنا ٹھیک نہیں ہے....." میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "فی الحال وہ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دو اور اسی جگہ کو زیادہ سے زیادہ محفوظ بنانے کی کوشش کرو۔ بعد میں دیکھیں گے کہ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے راحیلہ کے سلسلے میں ہم خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہوں اور کوئی خاص بات نہ ہو۔"

"ٹھیک ہے سر!" صفدر نے کہا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد میں جس رفتار سے راحیلہ کے ہاں پہنچا وہ بھی لاہور کی ٹیڑھی میڑھی سڑکوں پر ایک ریکارڈ ہی تھا۔ گلبرگ تو پھر بھی لاہور کا پوش علاقہ تھا اور میرا سفر اسی علاقے میں تھا۔ یہاں کی سڑکیں اور ان کی پلاننگ تو پھر بھی کچھ غنیمت تھی۔ پرانے شہر میں تو انسان کسی بھی گاڑی میں گدھا گاڑی کی رفتار سے زیادہ تیزی سے سفر کر ہی نہیں سکتا تھا۔

میں جب راحیلہ کے ہاں پہنچا تو میرے بالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کے گھر کا گیٹ چوپٹ کھلا دیکھ کر میرے دل کو جیسے کچھ

ہونے لگا۔ راحیلہ کا مکان زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ ذرا پرانی ساخت کی ایک چھوٹی سی کوٹھی تھی۔ ٹونی کی گاڑی مجھے سامنے ہی پورچ میں کھڑی نظر آگئی۔ اس سے آگے راحیلہ کی اپنی گاڑی کھڑی تھی۔

پورچ میں تیسری گاڑی کی گنجائش نہیں تھی اس لیے میں نے اپنی گاڑی باہر ہی چھوڑی اور تیزی سے اندر پہنچا۔ راحیلہ کے ہاں کوئی گارڈ وغیرہ تو کیا' عام سا کوئی چوکیدار بھی نہیں تھا اور نہ وہ بڑے گھر میں رہنا پسند کرتی تھی۔ اس مکان کے بارے میں بھی اس کا کہنا تھا کہ یہ اس کی ضرورت سے بڑا تھا۔

ہمارے پاس وسائل کی کمی نہیں تھی۔ وہ چاہتی تو اپنے لیے کوئی بڑی کوٹھی یا بنگلا پسند کر سکتی تھی۔ گارڈز وغیرہ بھی رکھ سکتی تھی۔ آج کل وہ ہمارے گروپ آف کمپنیز میں جس حیثیت سے کام کر رہی تھی' اس کی مناسبت سے اس کا حق بھی بنتا تھا۔ وہ خاصے ٹھاٹ باٹ سے رہ سکتی تھی لیکن اس سرپھری لڑکی کی کھوپڑی میں کچھ انقلابی سے کیڑے گھس گئے تھے۔

وہ کہتی تھی کہ اس نے زندگی میں بہت ٹھاٹ باٹ دیکھ لیا تھا اور یہ سب بے معنی چیزیں تھیں' انسان کی ہوس عجیب و غریب سرابوں کے پیچھے دوڑا دوڑا کر' تھکا کر مار دیتی تھی اور ان سب باتوں کے باوجود اس کی ذات میں کوئی سرخاب کا پر نہیں لگ جاتا تھا۔ آخر کار وہ کسی بھی عام اور غریب سے آدمی کی طرح خالی ہاتھ اس دنیا سے رخصت ہو جاتا تھا۔

ویسے بھی جس ملک میں بیس بیس افراد پر مشتمل بعض کنبوں کو رہنے کے لیے ایک کمرا بھی میسر نہیں تھا اور سفر کرنے کے لیے بس میں لٹکنے کی جگہ بھی میسر نہیں تھی وہاں اس کا زیادہ اچھے گھر میں رہنے' مہنگی گاڑی میں سفر کرنے اور دیگر غیر ضروری تعیشات کے ساتھ زندگی گزارنے کو دل نہیں مانتا تھا۔

میں جب ان معاملات میں اس کا ساتھ دینے سے انکار کرتا تھا تو وہ مجھے سرمایہ دارانہ ذہنیت کا مالک اور نہ جانے کیا کچھ قرار دیتی تھی۔ میں اسے سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ میں بہت سے لوگوں کی عملی مدد کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا ہوں لیکن یہ مسئلہ نظام کا ہے' جب تک پورا نظام تبدیل نہ ہو تا تب تک کوئی خاص تبدیلی نہیں آسکتی تھی۔ اکیلا چنا بھاڑ نہیں پھوڑ سکتا۔

اس پر وہ خفگی سے کہتی کہ سب یہی تقریر کرتے رہتے ہیں۔ عملی طور پر کوئی کچھ نہیں کرتا۔ سب کو بہترین بہانہ ملا ہوا ہے کہ جب تک نظام تبدیل نہیں ہو تا تب تک ہمیں تو عیش سے رہنے دو اور نظام تبدیل ہونے کے چونکہ صدیوں تک کوئی آثار نہیں' اس لیے عیش پرستوں کے لیے فکر کی کوئی بات نہیں۔

پھر وہ انگریزی کا وہ مقولہ دُہراتی جس کا مطلب تھا کہ خیرات اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے۔ میں اسے بتاتا کہ یہ سب کچھ کرنے کو میرا اس سے زیادہ شدت کے ساتھ دل چاہتا تھا لیکن ابھی میں خود پیاسا تھا۔ یہ عروج' دولت مندی اور ٹھاٹ باٹ خود میرے خواب تھے جن کی جڑیں میرے ذہن میں بہت گہرائی میں تھیں۔ ابھی تو میں ان چیزوں سے سیر نہیں ہوا تھا۔ محرومیوں نے میری روح پر جو گھاؤ چھوڑے تھے انہیں ... عرصہ نہیں گزرا تھا۔

ابھی میں نہ جانے کتنے عرصے تک ان تعیشات ... باٹ سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا جو کبھی کبھی مجھے خواب ... چیزیں لگتی تھیں۔ اس کے بعد میرا بھی کچھ پتا نہیں تھا کہ ... سب کچھ تیاگ کر درویشی کی زندگی بسر کرنے لگوں یا اپنا ... کاموں کے لیے وقف کر دوں۔

اس پر وہ استہزائیہ انداز میں ہنستی اور کہتی کہ جتنا ... گزرتا جائے گا اتنا ہی اس ارادے پر عملدرآمد زیادہ ... جائے گا' تم ان تعیشات کے اتنے عادی ہو جاؤ گے کہ ... محرومی کا تصور بھی محال ہو گا اور یہ سب ارادے خواب ... جائیں گے۔

پھر وہ گویا اپنے مؤقف کی وضاحت کرنے کی کوشش ... "میں یہ بھی نہیں کہتی کہ بالکل ہی درویشی کی زندگی اختیار کر ... جائے...... پاؤں میں کھڑاویں ہوں اور سر میں خاک ... ہو...... میں تو حد سے زیادہ غیر ضروری تعیشات ترک کرنے ... کرتی ہوں لیکن مصیبت یہ ہے کہ تمہارے طبقے کے لوگ ... زیادہ غیر ضروری تعیشات کو بھی اپنی اہم ضروریات شمار کرتے ... ہیں۔ میری طرح اوسط درجے کی زندگی گزاری جاسکتی ہے۔ اگر اس ملک کے نوّے فیصد لوگوں کی زندگی سے اس ... کی زندگی کا بھی موازنہ کیا جائے تو یہ بھی نہایت پُر تعیش ... لگے گی۔"

اس قسم کی بے نتیجہ بحث ہمارے درمیان چلتی رہتی ... ہم دونوں ایک دوسرے کی باتیں ایک کان سے سُن کر دوسرے ... نکالتے رہتے تھے لیکن اس وقت راحیلہ کے گھر میں داخل ... وقت نہ جانے کیوں ایک لمحے کے اندر اندر یہ سب باتیں ... آگئیں۔

میں انہیں ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے ... دروازہ کھول کر تیزی سے اندر پہنچا۔ گن میرے ہاتھ میں ... میرے حواس شاید شکار پر نکلے ہوئے درندے کی طرح بیدار ... لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

ٹونی سامنے ہی موجود تھا اور فرش پر چت پڑی خالہ ... میں لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ خالہ بی کچھ ایک ... خالہ بی نہیں تھیں۔ وہ تقریباً پینتالیس کی عمر کی ایک ... مضبوط جسم کی عورت تھی۔

اچھی خاصی خوش شکل تھی۔ نوجوانی میں اس ... خوبصورت لڑکیوں میں رہا ہو گا۔ ہر وقت پان چباتی رہتی ... سفید دوپٹے کے حلقے میں گھرا رہتا تھا۔ یہ عورت الگ ...

رول مِل گئی تھی۔ اس کی اپنی ایک الگ کہانی تھی۔ کافی عرصے سے وہ راحیلہ کے ہاں ملازم تھی اور خاصی کثیر المقاصد قسم کی چیز تھی۔ گھر کے سب کام وہی کرتی تھی۔ گھر ایک طرح سے اس کے ہی سپرد تھا۔ راحیلہ اکثر خدا کا شکر ادا کرتی تھی کہ آج کے دَور میں اسے اتنی کام کی عورت مل گئی تھی۔

اور سب باتیں تو اپنی جگہ تھیں لیکن مجھے اس اعتبار سے وہ دنیا کی انوکھی عورت لگتی تھی کہ اسے بزرگ بننے کا شوق تھا۔ میں نے زندگی میں وہ پہلی عورت دیکھی تھی جو اپنی عمر سے بڑی ہونے کا تاثر دیتی تھی اور ہر معاملے میں اس کا رویّہ کچھ زیادہ ہی بزرگانہ ہوتا تھا۔

وہ کبھی میک اپ کرنا تو درکنار' لپ اسٹک تک نہیں لگاتی تھی۔ اس کے سر میں جو تھوڑے سے سفید بال موجود تھے انہیں چھپانے کے لیے اس نے کبھی ہیر کلر وغیرہ کا سہارا لینے کی کوشش نہیں کی تھی حالانکہ عملاً وہ کوئی ایسی مذہبی قسم کی عورت بھی نہیں تھی۔ مجھے راحیلہ یا ٹونی وغیرہ کو وہ اتنی شفقت سے بیٹا یا بٹیا وغیرہ کہہ کر مخاطب کرتی تھی کہ گماں گزرتا تھا وہ ہم سے دس پندرہ سال بڑی نہیں بلکہ ہماری دادی یا نانی کی عمر کی تھی ورنہ میں نے تو یہی دیکھا تھا کہ لوگ اپنے سے پانچ سات سال چھوٹوں کو بھی انکل یا آنٹی وغیرہ کہہ کر مخاطب کرنے کی کوشش کرتے تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ اپنے بارے میں یہ ثابت کر دیں کہ ابھی تو ان کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے۔

اس عورت کا نام غالباً زبیدہ تھا لیکن وہ نام سے پکارے جانے یا باجی' آپا وغیرہ کہلوانے کی نسبت خالہ بی کہلوانا زیادہ پسند کرتی تھی۔ میں راحیلہ سے کہا کرتا تھا "ایک تو تم خود ہی کچھ کم عجیب نہیں تھیں اوپر سے تمہیں گھر سنبھالنے والی خود سے بھی زیادہ عجیب مل گئی۔ اللہ نے ملائی جوڑی......" اس پر وہ مجھے گھور کر رہ جاتی۔

اس وقت خالہ بی اس طرح چت پڑی تھی کہ ان کی ٹانگیں لاؤنج میں تھیں اور بالائی دھڑ ڈائننگ روم میں۔ وہ محرابی دروازے کے بیچ میں پڑی تھیں۔ ٹونی ان کے منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔ وہ غالباً مجھ سے چند منٹ پہلے ہی یہاں پہنچا تھا۔ موسم ٹھنڈا تھا مگر کھڑکیاں دروازے کھلے تھے اور پنکھے پوری رفتار سے گھوم رہے تھے۔ کھڑکیاں دروازے غالباً ٹونی نے ہی آکر کھولے تھے' پنکھے بھی اسی نے آن کیے تھے۔ کمرے میں خفیف سی ایک بو محسوس ہو رہی تھی جو کچھ دیر پہلے تک یقیناً کافی تیز رہی ہو گی۔ ڈائننگ روم میں ایک کرسی الٹی پڑی تھی اور اس کے عقبی دروازے کے قریب خوبصورت سی ایک سرخ چپل پڑی تھی جو یقیناً راحیلہ کی تھی۔ اس کا موبائل فون لاؤنج میں سائڈ بورڈ پر رکھا ہوا تھا۔ الٹی ہوئی کرسی اور دروازے کے قریب پڑی چپل کے سوا ڈائننگ روم یا لاؤنج میں کہیں کسی قسم کی کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آرہی تھی۔

"راحیلہ کو اغوا کر لیا گیا ہے سر!" ٹونی نے مجھے دیکھتے ہی مطلع کیا۔

میری نامعلوم حس مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ اس طرح کی کوئی بات ہو چکی ہے لیکن میں ایک موہوم سی امید کے سہارے خود کو تمام راستے تسلی دیتا آیا تھا کہ شاید ایسا نہ ہوا ہو۔ اب وہ اُمید ٹوٹ گئی اور میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ راحیلہ کا چہرہ ٹھیک کرنے کے لیے ہم نے کس جتن سے مطلوبہ چیزیں جمع کی تھیں۔ اس سے پہلے جب ڈاکٹر برنارڈ ہمارے ہاتھ آیا تھا تو اسے میں نے اپنی کتنی بڑی خوش قسمتی سمجھا تھا۔

اسے اس کام پر آمادہ کرنا ایک الگ مرحلہ ثابت ہوا تھا۔ ان تمام کٹھن اور جاں گسل مراحل کے بعد اب جبکہ وہی ڈاکٹر برنارڈ تمام تیاریوں کے ساتھ اس تہ خانے میں راحیلہ کا منتظر بیٹھا تھا تو راحیلہ غائب ہو گئی تھی۔ بدقسمتی واقعی اس لڑکی کے تعاقب میں تھی لیکن مجھے بھی گویا ضد سی ہو گئی تھی کہ میں اسے اس بدقسمتی کے چنگل سے نکال کر رہوں گا۔ یہ ستم ظریفی آخر کب تک جاری رہ سکتی تھی؟

میں نے ڈائننگ روم کا عقبی دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ یہ چھوٹے سے عقبی لان کی طرف کھلتا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ راحیلہ کو اسی طرف سے لے جایا گیا تھا۔ دو چار نرم و نازک سے پھولدار پودے کچلے ہوئے نظر آرہے تھے اور چھوٹا سا عقبی گیٹ بھی کھلا تھا۔

میں پلٹ کر دوبارہ ٹونی کی طرف متوجہ ہوا تو وہ بولا "میں نے شبیر شیخ اور سردار علی کو دوبارہ فون کر دیا ہے کہ وہ یہاں آنے کے بجائے آس پاس کے علاقے اور خاص خاص سڑکوں کا گشت کریں۔ کوئی مشکوک گاڑی نظر آئے تو کسی بہانے اسے روک کر اندر جھانکنے کی کوشش کریں......"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہم اپنا اثر رسوخ استعمال کرتے ہوئے پولیس کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ ان کے پاس بہرحال مین پاور اور رابطے کے ذرائع زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ کم وقت میں کافی بڑے علاقے کی ناکا بندی کر سکتے ہیں۔"

میں نے ایک لمحے سوچا۔ میرے دل میں یکدم پھیل جانے والے اندھیرے میں امید کی کوئی کرن نہ جھلملائی۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "اس معاملے میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہے...... پہلے ہی کچھ نہ کچھ تاخیر ہو چکی ہے۔ جب تک میں اوپر والوں سے بات کروں گا...... وہ احکامات جاری کریں گے اور پولیس ناکا بندی کی حکمتِ عملی طے کر کے حرکت میں آئے گی اور اہم پوائنٹس پر پہنچے گی تب تک بہت تاخیر ہو چکی ہو گی۔ اس طرح کی کارروائی کرنے والوں نے بھی ان تمام امکانات کے بارے میں سوچ رکھا ہوتا ہے اور اپنا بندوبست کر رکھا ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں

کوئی بڑی سے بڑی واردات کرکے بھی نکل جانا بہت آسان ہے۔ اسی لیے تو اتنے بڑے بڑے جرائم ہو جاتے ہیں اور پولیس لکیر پیٹتی رہ جاتی ہے۔ کوئی شخص کسی قسم کا مشکوک معاملہ دیکھ کر پولیس کو اطلاع نہیں دیتا اور ایسے کسی مسئلے میں اُلجھنا پسند نہیں کرتا جس کا پولیس سے تعلق بنتا ہو۔ ان حالات میں تو جو تھوڑے بہت مجرم پکڑے بھی جاتے ہیں وہ زیادہ تر تو اتفاقات اور قدرت کے اپنے نظامِ انصاف کے تحت ہی پکڑے جاتے ہیں۔"

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر ایک ڈائننگ چیئر گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے غیرارادی طور پر کچھ ایسے پُرامید سے انداز میں اُلٹی ہوئی کرسی کی طرف دیکھا جیسے وہ مجھے کوئی سراغ دے گی...... وہاں کیا ہوا تھا اس کے بارے میں کچھ بتائے گی لیکن کرسی بہرحال کرسی تھی۔ وہ خاموش رہی اور میں اپنی بچگانہ امید پر ٹھنڈی سانس لینے کے سوا کچھ نہ کرسکا۔

ٹونی اب بھی خالہ بی کو ہوش میں لانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے پوچھا "اس خاتون کے سر وغیرہ پر کہیں کوئی چوٹ کا نشان تو نہیں ہے؟"

"نہیں۔" ٹونی نے جواب دیا "بہرحال...... چونکہ یہ خاتون ہیں...... اور بہت مختلف قسم کی خاتون ہیں...... شاید اس لیے میں جھجک کا شکار رہا...... میں نے زیادہ ٹٹول کر نہیں دیکھا کہ ان کی جسمانی کیفیت کیا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ یہ گیس کے اثر سے بے ہوش ہوئی ہیں۔ احتیاطاً میں نے اپنے ڈاکٹر کو فون کردیا ہے لیکن شاید اسے آنے میں کچھ دیر لگ جائے۔ فاصلہ زیادہ ہے۔"

"تم انہیں اُٹھا کر ڈرائنگ روم میں صوفے پر...... یا راحیلہ کے بیڈ روم میں بیڈ پر لٹا دو۔" میں نے ہدایت کی۔

وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا لیکن اس نے بہرحال میری ہدایت پر عمل کیا۔ ڈرائنگ روم سامنے ہی تھا اور اس کا دروازہ کھلا ہی تھا۔ خالہ بی ذرا دُہرے بدن کی عورت تھی اور اس وقت بے ہوش تھی۔ بے ہوشی میں نہ جانے کیوں انسان کا وزن کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتا ہے لیکن چھریرے جسم کے ٹونی نے اسے کسی چھوٹی بچی کی طرح اٹھا لیا اور صوفے پر لٹا دیا۔

ہم ڈرائنگ روم میں ہی آگئے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "سوچنے کی بات یہ ہے کہ راحیلہ کو کون اغوا کرسکتا ہے؟"

"میرا ذہن خود اسی سوال میں الجھا ہوا ہے۔" ٹونی بولا "آج کل تو ہم کسی خاص سلسلے میں کچھ ایسے سرگرم بھی نہیں ہیں۔ سیدھے سادے طریقے سے بزنس میں لگے ہوئے ہیں۔ کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں چل رہی۔ پھر یہ اچانک کیا چکر نکل آیا؟ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔"

"تم نے یہ غور نہیں کیا کہ پچھلے ایک دو دن کے دوران میں کیا خاص بات ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹر برنارڈ ہمارے ہاتھ آیا ہے۔" ٹونی نے بلا تامل جواب دیا۔

"بس یہ اسی کا ردِعمل ہے۔" نہ جانے کیوں غیرارادی طور پر میرا لہجہ پُریقین سا ہوگیا۔

"آپ کا مطلب ہے...... ریڈ ڈاٹ......؟" ٹونی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا "لیکن...... ہمارے خیال میں تو ہم نے ریڈ ڈاٹ کا صفایا کردیا تھا۔ تمام ایجنسیاں بھی اس سلسلے میں مطمئن ہو چکی تھیں۔ ہم نے اپنی دانست میں خاصی باریک بینی سے کام لیا تھا۔ شواہد تو یہی بتاتے تھے کہ ریڈ ڈاٹ کی باقیات میں صرف ڈاکٹر برنارڈ ہی رہ گیا تھا۔"

وہ بات بھی کرتا جارہا تھا اور ساتھ ساتھ خالہ بی کو ہوش میں لانے کی اس کی کوششیں بھی جاری تھیں۔ وہ ان کے چہرے پر فریج کے ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارتا اور اخبار سے چہرے کو ہوا دیتا۔ گو کہ پنکھا بھی چل رہا تھا۔ چہرہ زیادہ گیلا ہو جاتا تو ٹونی تولیے سے پونچھ دیتا۔ خالہ بی اس دوران میں ذرا کسمسائی تھیں اور ان کے حلق سے خفیف سی آواز بھی نکلی تھی لیکن ان کی آنکھیں بدستور بند رہیں۔ تاہم امید نظر آنے لگی تھی کہ اب وہ جلد ہی ہوش میں آجائیں گی۔ ٹونی وقفے وقفے سے انہیں ہلا جلا بھی رہا تھا اور دھیرے دھیرے آوازیں بھی دے رہا تھا۔

میرے اندر ایک عجیب سا اضطراب کروٹیں لے رہا تھا۔ میں نے اُٹھ کر کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا "ٹونی! تمہیں معلوم ہے سرجن جب ٹانسلز کا آپریشن کردیتا ہے تب بھی کچھ عرصے بعد وہی تکالیف کسی نہ کسی حد تک لوٹ آتی ہیں جو ٹانسلز کی وجہ سے ہوتی تھیں یا جسم میں کوئی اور گلٹی یا کسی قسم کا ابھار پیدا ہوتا ہے اور اسے آپریشن سے نکال دیا جاتا ہے تو کچھ عرصے بعد وہ پھر وہیں یا کسی اور حصے پر سر ابھارنے لگتی ہے۔ سرجنوں کے خیال میں اس کی بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اس چیز کا کوئی نہ کوئی ٹشو بہرحال باقی رہ جاتا ہے اور وہ پھر نمو پکڑ لیتا ہے۔ کچھ دوسرے قسم کے طبی ماہرین کا خیال کچھ اور ہے...... لیکن بہرحال ایسا ہوتا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے ریڈ ڈاٹ کا بھی کوئی ٹشو باقی رہ گیا ہے...... اور وہ اب بھی تنگ کررہا ہے؟" ٹونی نے گردن گھما کر بغور میری طرف دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

"یقیناً۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "اگر یہ ٹشو نمو پکڑے گا تو شاید اور بھی زیادہ تنگ کرے۔"

ٹونی نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا لیکن پھر ذرا الجھن سے بولا "اگر یہ واقعی ریڈ ڈاٹ کے کسی آدمی کا کام ہے اور ڈاکٹر برنارڈ کے اغوا کا جواب ہے تو وہ میرے گھر سے براہِ راست ڈاکٹر برنارڈ کو چھڑا کر لے جانے کی کوشش بھی تو کرسکتا تھا؟"

"صحیح بات تو مجھے بھی معلوم نہیں ہے۔ ابھی تو ہم صرف

اندازوں کے سہارے امکانات پر بات کررہے ہیں۔ تم نے کچھ عرصے پہلے ہی مکان بدلا ہے۔ عین ممکن ہے کہ تمہارا مکان ابھی اس شخص کی نظر میں نہ آیا ہو۔ دوسری وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ وہاں ...... اور اگر اس کے کچھ ساتھی ہیں...... تو انہیں بھی خاصی مزاحمت کا اندیشہ ہوگا۔ ممکن ہے فی الحال وہ تصادم مول لینے کی پوزیشن میں نہ ہوں یا تصادم سے گریز کرنے میں ان کی کچھ مصلحت ہو۔ راحیلہ کے ہاں کوئی حفاظتی انتظامات نہیں ہیں۔ اسے بے خبری میں...... اور گیس وغیرہ کے ذریعے بے ہوش کرکے اغوا کرنا بالکل آسان کام تھا۔ وہ آج کل گویا ہمارا "ویک پوائنٹ" تھی۔ اس لیے اس پر ہاتھ ڈالنا ہی انہیں آسان دکھائی دیا ہوگا۔"

وہ خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "یہ بھی ممکن ہے کہ خطرات وغیرہ اب بھی ان کے لیے کوئی معنی نہ رکھتے ہوں۔ راحیلہ کو انہوں نے صرف ہمیں سبق سکھانے کے لیے اغوا کیا ہو اور ان کا اصل ٹارگٹ ڈاکٹر برنارڈ ہی کو رہا کرانا ہو۔ اس طرح انہیں دُہرا فائدہ حاصل ہونے کی امید ہو کہ ہم سب بوکھلا کر یہاں دوڑے آئیں گے اور راحیلہ کو تلاش کرنے کے سلسلے میں وحشت زدہ اور پریشان ہو کر اِدھر اُدھر بھاگے پھریں گے۔ وہ اس دوران میں آسانی سے تمہارے گھر میں گھس کر ڈاکٹر برنارڈ کو نکال لے جائیں گے۔"

یہ امکان ٹونی کو حقیقت سے اتنا قریب محسوس ہوا کہ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تاہم جب وہ بولا تو اس کا لہجہ پُرسکون تھا "میرا خیال ہے مجھے اپنے گھر فون کرکے دیکھ لینا چاہیے۔ اگر وہاں کوئی گڑبڑ محسوس ہوئی تو ہمارا وہاں پہنچنا زیادہ ضروری ہوگا۔"

وہ اپنے موبائل فون پر اپنے گھر کا نمبر پنچ کرنے لگا۔ احتیاطاً بات کرلینا ہی بہتر تھا۔ تاہم میں نے اسے تسلی بھی دے دی "میں آنے سے پہلے صفدر اور سلیمان کو وہاں پہنچنے کی ہدایت دے آیا تھا۔ اس کے علاوہ دونوں گارڈز کو بھی زیادہ چوکنا کر آیا تھا۔"

فون اس کے خانساماں نے ریسیو کیا اور اطلاع دی کہ وہاں "سب خیریت" تھی۔ صفدر اور سلیمان بھی پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے وہاں پہنچنے میں کافی پُھرتی دکھائی تھی۔ ڈاکٹر برنارڈ بھی تہ خانے میں موجود تھا۔ گویا کمی تھی تو صرف اس کی...... جس کی خاطر ساری مصیبت اُٹھائی گئی تھی۔

اس نے قدرے مطمئن ہو کر فون بند ہی کیا تھا کہ کال بیل بج اٹھی۔ آنے والا ہمارا اپنا خاص ڈاکٹر تھا۔ ٹونی اسے اندر لایا۔ اس نے مختصراً احوال جاننے کے بعد خالہ بی کو ایک انجکشن لگایا۔ ان کے ہوش میں آنے کے آثار تو پہلے ہی پیدا ہو رہے تھے۔ انجکشن لگنے کے بعد انہوں نے ایک آدھ منٹ میں ہی آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے تیزی سے آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے چاروں طرف دیکھا لیکن وہ سوال نہیں کیا جو عام طور پر لوگ ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے کرتے ہیں۔ یعنی "میں کہاں ہوں؟"

ان کے حواس جلد ہی بحال ہوگئے تھے اور ان کی سمجھ میں آگیا تھا کہ وہ کہاں تھیں۔ صرف یہی نہیں، انہوں نے مجھے اور ٹونی کو بھی جلد ہی پہچان لیا اور اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بین کرنے کے سے انداز میں بولیں "ہائے...... میرے بچے...... تم نے پہنچنے میں دیر کردی...... وہ خبیث مردود میری بچی کو اٹھا کر لے گئے......"

"کون خبیث مردود...... خالہ بی؟" میں نے جھک کر ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملائمت سے پوچھا۔

انہوں نے جواب دینے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر اچانک اٹھ کر لاؤنج میں لگے ہوئے واش بیسن کی طرف لڑکھڑاتی ہوئی بھاگیں۔ ٹونی نے جلدی سے آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا۔ دراصل انہیں بڑے زور کی قے آئی تھی۔

ڈاکٹر اس دوران میں بولا "یہ بہت اچھا ہوا کہ انہیں قے آگئی۔ اب ان کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

آخر ٹونی خالہ بی کو واپس لے آیا۔ وہ صوفے پر ڈھیر ہو کر چند لمحے ہانپتی رہیں پھر اسی طرح بین کرنے کے سے انداز میں بولیں "میری بچی اس طرح آسانی سے کسی کے قابو میں آنے والی تھوڑی تھی...... وہ تو شیرنی ہے...... شیرنی...... وہ ضرور کوئی خطرناک گیس ہوگی جس سے انہوں نے اسے بے ہوش کیا...... ورنہ اسے تو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا تھا...... وہ تو ایک مرتبہ میرے ساتھ مارکیٹ چلی گئی تھی...... وہاں اس کا حد سے زیادہ چھپا ہوا چہرہ دیکھ کر دو تین لفنگے سے نوجوان چھیڑنے لگے...... آوازے کسنے لگے...... میری بچی نے صرف ایک بار ہاتھ اور ایک بار پاؤں ہلایا تھا...... وہ بھی اس طرح کہ صحیح طور پر پتا ہی نہیں چلا تھا کہ ہوا کیا تھا...... اور دوسرے ہی لمحے ان میں سے ایک اُچھل کر عین سڑک کے بیچ میں جا گرا تھا...... اسے تو شاید ایک گاڑی کچلتی ہوئی گزر جاتی...... پتا نہیں مردود کیسے بچ گیا...... شیطان جلدی نہیں مرتے...... دوسرا اچھل کر ایک...... ستون سے ٹکرایا تھا اور چھپکلی کی طرح پٹ سے وہیں گر گیا تھا۔ میری بچی نے...... میرا مطلب ہے راحیلہ بی بی نے پلٹ کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی اور مجھے ساتھ لے کر گاڑی میں بیٹھ کر گھر آگئی تھی...... اب تم ہی بتاؤ ایسی لڑکی کو کوئی اتنی آسانی سے اغوا کرسکتا تھا؟"

جواب کا انتظار کیے بغیر ایک گہری سانس لے کر انہوں نے بات جاری رکھی "اور تمہیں معلوم ہے...... ایک بار تو اس گھر میں رات کو ڈاکو گھس آئے تھے...... ان کے پاس تو کلاشنکوف اور پستول وغیرہ بھی تھے۔ انہیں کہیں سے خبر مل گئی ہوگی کہ اس گھر میں صرف ایک بڑھیا اور ایک برقع پوش لڑکی رہتی ہے......"

خالہ بی کے حوصلے کا واقعی جواب نہیں تھا۔ وہ خود اپنے منہ سے خود کو بڑھیا کہہ رہی تھیں۔ میں نے کسی ایسی عورت کو بھی اپنے منہ سے خود کو بڑھیا کہتے نہیں سُنا تھا جس کے منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت نہیں تھی جبکہ خالہ بی کو تو ابھی میک اپ کے بغیر

بھی کسی نہ کسی حد تک جوانوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ وہ یقیناً کسی نہ کسی قسم کے ایوارڈ کی مستحق تھیں۔

وہ کوئی اور قصہ شروع کرنے کی فکر میں تھیں۔ راحیلہ کی نظر میں یہ قصے اتنے غیر اہم تھے کہ اس نے کبھی باتوں باتوں میں بھی ان کا کوئی تذکرہ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میں نے خالہ بی کی بات کاٹتے ہوئے کہا "وہ تو سب ٹھیک ہے خالہ بی...! یہ بتایئے کہ یہاں کیا ہوا تھا؟ کون لوگ تھے وہ...... ان کا کچھ حلیہ وغیرہ......؟"

"ارے بیٹا! میں بھلا کیا بتا سکتی ہوں؟ انہوں نے آکر کوئی اپنا تعارف تھوڑا ہی کرایا تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں انہیں ٹھیک طرح سے دیکھ بھی نہیں سکی......"

پھر انہوں نے گویا ہمارے حال پہ کرم کیا اور گہری سانس لے کر شروع سے واقعہ بتانے کا فیصلہ کر ہی لیا "ہوا یہ تھا بیٹا...... کہ راحیلہ بٹیا دفتر سے آکر شاور لے کر لباس تبدیل کر کے دروازے بند کر کے ڈائننگ روم میں بیٹھ گئی تھی۔ میں نے اسے کافی تیار کر کے دے دی تھی۔ یہ اس کا ریلیکس کرنے کا انداز ہوتا ہے۔ دفتر سے اُس کا آنے کا کوئی ایک وقت نہیں ہے۔ کبھی وہ رات کو بہت دیر سے بھی آتی ہے لیکن آکر اس کا طریقہ بس یہی ہوتا ہے۔ فریش ہو کر...... ایزی ہو کر...... کافی کا مگ لے کر کمرا بند کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ کبھی کبھار صبح کے بچے کھچے انگریزی اخبار دیکھتی ہے۔ اس وقت وہ چاہتی ہے کہ کوئی اس کے پاس نہ رہے۔ میں اس بات کو سمجھتی ہوں اس لیے میں بھی اس کے کان نہیں کھاتی......"

گویا خالہ بی کو یہ بھی احساس تھا کہ وہ دوسروں کے کان کھاتی ہیں...... یا کان کھانے کی کم از کم صلاحیت تو رکھتی ہی ہیں۔ ورنہ کان کھانے والوں کو یہ احساس کہاں ہوتا ہے کہ وہ کسی کے کان کھا رہے ہیں۔ وہ تو یہی سمجھتے ہیں کہ وہ نہایت کم گو ہیں اور دوسرے ان کے کان کھا رہے ہیں۔

خالہ بی بات جاری رکھتے ہوئے بولیں "میں اس دوران میں اِدھر اُدھر کے کاموں میں لگ جاتی ہوں۔ آج میں سامنے والے لان پر جا کر کچھ زیادہ ہی لمبے کام میں الجھ گئی۔ میں گلاب کے پودے ٹھیک کرنے لگی جو دراصل میرے بس کا کام ہی نہیں تھا۔ ہفتے میں تین دن ایک پارٹ ٹائم مالی آتا ہے۔ وہ یہ سب کر کے جاتا ہے۔ میں نے اس کی آمد کا انتظار کرنے کے بجائے خود اپنی قابلیت دکھانے کا فیصلہ کیا اور کافی دیر کے لیے اُلجھ کر رہ گئی۔

میں جب لان پر ہی پائپ سے ہاتھ پاؤں دھو کر واپس آئی تو گھر کچھ زیادہ ہی سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ خاموشی تو اس وقت روزانہ ہی تقریباً اسی طرح ہوتی تھی لیکن آج سکوت میں کوئی خاص بات تھی۔۔۔ وہ کچھ ایسا سکوت تھا جس سے دل ہولنے لگتا ہے۔ روزانہ کچھ ایسا سکوت ہوتا تھا جس سے دل ودماغ کو آرام ملتا ہے......"

مجھے خوشی ہوئی کہ یہ ادھیڑ عمر بڑی بی، ایسی باریک باتوں کو محسوس کرنے کی بھی اہلیت رکھتی تھیں۔ وہ بات جاری رکھ[illegible] بولیں "پھر بھی...... جو کچھ میں نے دیکھا وہ میرے وہم [illegible] بھی نہیں تھا۔ میں تو زیادہ سے زیادہ یہی سوچ رہی تھی کہ [illegible] کی طبیعت ناساز نہ ہو۔ جونہی میں نے ڈرائنگ روم کا [illegible] بدبو کا ایک زبردست جھونکا میری ناک میں گھس گیا۔ [illegible] طرف ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا جو نہ جانے کیوں [illegible] زیادہ گہرا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر [illegible] طرف دیکھا۔ پہلے تو مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اس بدبو نے [illegible] میں ہی میرے حواس شل کر دیے تھے......"

خالہ بی منظر کشی بھی ٹھیک ٹھاک کر لیتی تھیں اور [illegible] و محسوسات کو بھی خاصے اچھے طریقے سے بیان کر لیتی [illegible] مشکل سے وہ سانس لینے کے لیے رکیں پھر جھرجھری سی [illegible] سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولیں "پھر اچانک مجھے نظر آ[illegible] لحیم شحیم سے آدمی راحیلہ بٹیا کو ڈنڈا ڈولی کیے اٹھائے لے [illegible] تھے۔ ظاہر ہے وہ بے ہوش تھی ورنہ وہ مردود اسے اس طر[illegible] تو درکنار، ہاتھ لگا کر بھی پچھتاتے۔ وہ لاؤنج سے گزر کر اس روم کے دروازے کی طرف لے جا رہے تھے......"

"آپ کو یہ اندازہ ہوا کہ وہ مقامی ہی تھے یا سفید [illegible] مطلب ہے انگریز وغیرہ......؟" میں نے اپنی دانست میں [illegible] سہولت کے لیے وضاحت کی۔

"سفید فام تو خیر نہیں تھے......" خالہ بی کچھ جھنجھلا[illegible] میں ہاتھ ہلا کر بولیں "موئے ہیں کے لگ رہے تھے...... زیادہ ہی کالے تھے...... یا شاید ملگجے اندھیرے کی وجہ [illegible] دکھائی دے رہے تھے۔ ایک تو چھوٹی مگر گھنی داڑھی والا [illegible] کے چہرے پر خونخواری تھی۔ اس نے جب پلٹ کر دیکھا [illegible] اندھیرے کے باوجود میں ڈر گئی تھی اور میرے منہ سے شاید [illegible] نکل گئی تھی۔ دوسرا نوجوان تھا اور کچھ ایسا فیشن ایبل سا [illegible] دیتا تھا جو باپوں کی یا اپنی حرام کی کمائیوں سے مہنگی مہنگی [illegible] لے کر اچھے علاقوں کی سڑکوں اور بازاروں میں لفنگا بن[illegible] پھرتے ہیں......"

"بس دو ہی آدمی تھے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"پہلے تو مجھے دو ہی نظر آئے تھے اور پہلا خیال میر[illegible] میں یہی آیا کہ وہ ڈاکو تھے مگر پھر فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ ڈاکو [illegible] والوں کو بے بس کر کے قیمتی سامان تلاش کرتے۔ وہ لڑکی کو [illegible] لے جا رہے تھے۔ یقیناً کوئی اور بات تھی...... پھر مجھے تیسرا [illegible] بھی نظر آیا۔ اس کی میری طرف پشت تھی اور وہ گویا ان کا [illegible] تھا...... آگے آگے جا رہا تھا...... مطلب یہ کہ میں پہلی نظر میں [illegible] مرد ہی سمجھی تھی کیونکہ وہ پینٹ اور جیکٹ میں تھا...... پھر اس [illegible] نے گھوم کر دیکھا اور مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تو عورت تھی [illegible] فام تھی......"

"کیسی تھی وہ؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"بہت خوبصورت تھی" خالہ بی نے سادگی سے جواب دیا۔

"نہیں... میرا مطلب ہے... خوبصورتی کے علاوہ کوئی خاص ...؟ اس کی کوئی خاص پہچان وغیرہ......؟" میں نے جلدی سے وضاحت کی۔

"بس... وہ لمبی... دُبلی پتلی... اسمارٹ تھی..." خالہ بی گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولیں "اس کے بال پٹے کٹے ہوئے تھے... معلوم نہیں کس رنگ کے تھے لیکن اندھیرے میں بھی گویا چمکتے سے دکھائی دے رہے تھے... اور اس کی شکل کے بارے میں، میں تمہیں کیا بتاؤں..." وہ جیسے الجھن میں پڑ گئیں۔ چند لمحے ذہن پر زور دینے کے بعد وہ بولیں "بس... یہ احساس تو ہے کہ وہ بہت خوبصورت تھی... لیکن یہ خوبصورتی کچھ عجیب سی تھی... وہ جیسے گلابی برف سے تراشی گئی عورت تھی... گوشت وپوست کی صورت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ سب سے زیادہ عجیب اس کی آنکھیں تھیں۔ ان آنکھوں کا جیسے کوئی رنگ ہی نہیں تھا... وہ شفاف نیلی بھی ہو سکتی تھیں... سبزی مائل بھی... اور شفاف سرمئی بھی... میں کچھ یقین سے نہیں کہہ سکتی..." انہیں گویا اپنا مفہوم بیان کرنے میں دقت پیش آنے لگی تھی۔

میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ میں نے ان سے وضاحت نہیں چاہی۔ وہ جس عورت کا ذکر کر رہی تھیں اس کے بارے میں انہوں نے جتنا کچھ بتا دیا تھا وہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ خصوصاً جب کہ اس کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا اور خود ان کے اپنے حواس پر دھندلاہٹ غلبہ پا رہی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود ان کا مشاہدہ بہرحال قابلِ داد تھا۔

میرے رگ وپے میں نہ جانے کیوں ایک سرد سی لہر دوڑ رہی تھی۔ اس عورت کو میں نے دو تین بار مختلف مقامات پر دیکھا تھا لیکن آج تک میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان سکا تھا۔ میں تو کیا، اس کے بارے میں خفیہ ادارے بھی کچھ نہیں جان سکے تھے۔ یہ تو بہرحال طے تھا کہ اس کا تعلق ریڈ ڈاٹ سے تھا لیکن اس تعلق کی نوعیت کیا تھی، یہ ہم میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں تھا۔ ریڈ ڈاٹ میں اس کی کیا حیثیت تھی، یہ ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا۔

تشویش کی بات یہ تھی کہ وہ اب تک زندہ سلامت اور آزاد پھر رہی تھی۔ مجھے پہلے ہی اس کے بارے میں اندیشہ تھا کہ وہ ہمارے ملک میں ہی کہیں موجود تھی...... اور اگر موجود نہیں بھی تھی تب بھی جس وقت چاہتی کہیں بھی آ جا سکتی تھی۔ اس اندیشے سے نہ جانے کیوں اکثر میری دھڑکنیں تیز ہونے لگتی تھیں۔ آج اس اندیشے نے حقیقت کا روپ دھار لیا تھا۔ ٹونی سے میں نے ریڈ ڈاٹ کے جس باقی رہ جانے والے "ٹشو" کا ذکر کیا تھا، عین ممکن تھا کہ وہ ٹشو یہی ہو...... بلکہ میرا دل کہتا تھا کہ وہ "ٹشو" سے بڑھ کر کوئی چیز تھی۔

خالہ بی نے سلسلۂ کلام جوڑا "میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا پھیل رہا تھا۔ مجھے چاہیے تھا کہ میں پلٹ کر باہر نکل بھاگتی۔ وہ لوگ پچھلے دروازے کی طرف جا رہے تھے۔ شاید میں اگلے گیٹ پر پہنچ کر کسی سے مدد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتی......"

میں دل ہی دل میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ امید کم اور خوش فہمی زیادہ تھی۔ بھلا اس قسم کے معاملات میں کون ٹانگ اڑاتا تھا؟ اور پھر ریڈ ڈاٹ کے معاملات میں اڑائی جانے والی ٹانگ کی حیثیت تو ایک تنکے سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی جسے توڑا بھی جا سکتا تھا اور حقارت سے ایک طرف پھینکا بھی جا سکتا تھا۔

خالہ بی کہہ رہی تھیں "مگر میں یہ دیکھ کر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی کہ وہ لوگ میری راحیلہ بٹیا کو یوں اٹھا کر لے جا رہے تھے۔ میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا لیکن میں بڑی مشکل سے اپنی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کی طرف لپکی۔ میری حالت چاہے کچھ بھی تھی لیکن میرا غیظ وغضب کچھ کم نہیں تھا۔ اگر اس وقت میرے ہاتھ میں کوئی بھی ہتھیار...... بندوق...... پستول...... خنجر...... کچھ بھی ہوتا...... میں وہ لے کر پاگلوں کی طرح ان پر حملہ آور ہو جاتی چاہے وہ ہتھیار استعمال کرنا میرے بس کی بات نہ ہوتی......"

انہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اتنا مجھے بھی اندازہ تھا۔

وہ ایک بار پھر جھرجھری سی لے کر بولیں "وہ اس وقت تک کھانے کی میز کے پاس سے گزرتے...... ایک کرسی گراتے عقبی دروازے تک پہنچ چکے تھے لیکن میں درمیانی دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ میں بُری طرح لہرائی۔ میں نے سنبھلنے کی بہت کوشش کی لیکن نہ سنبھل سکی بلکہ اس کوشش میں شاید میں دیوار سے ٹکرا کر گھوم گئی۔ مجھے یہ احساس ہے کہ میں دھم سے گری تھی۔ کوشش کے باوجود میں اٹھ نہ سکی۔ آخری بات مجھے بس یہ یاد ہے کہ دروازے پر رک کر انہوں نے حقارت سے میری طرف دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ جاتے جاتے مجھے ہلاک کر جائیں گے لیکن انہوں نے میرے قریب آنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ میں جہاں گری تھی، انہوں نے مجھے وہیں پڑے رہنے دیا اور میرے سامنے دروازہ کھول کر نکل گئے۔ میں کچھ بھی نہ کر سکی۔ دوسرے ہی لمحے میری آنکھیں بند ہو گئیں......"

انہوں نے خاموش ہو کر ہمارے چہروں کی طرف دیکھا اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سسکی سی لے کر وہ بولیں "آخر کون لوگ تھے وہ؟ کیا دشمنی تھی انہیں میری بچی سے......؟ نہ جانے میری بچی کس حال میں ہو گی......!"

میں نے ان کے کسی سوال کا جواب دینے کے بجائے چاروں طرف کا جائزہ لینے کے بعد ٹونی سے کہا "انہوں نے پہلے کسی پائپ وغیرہ کے ذریعے...... یا کوئی چیز اندر پھینک کر کمرے میں گیس پھیلائی ہو گی...... اور وہ بہت سریع الاثر گیس ہو گی۔ اپنے خیالوں میں گم بیٹھی راحیلہ کو سنبھلنے کا موقع نہیں ملا ہو گا۔ خالہ بی کو

کیفیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس گیس کو اثر کرنے کے لئے چند سیکنڈ ہی کافی تھے۔ وہ لوگ نہایت خاموشی سے اپنا کام کرنا چاہتے تھے۔"

خالہ بی کو جیسے کچھ یاد آیا اور وہ آنسو پونچھتے ہوئے ذرا حیرت سے بولیں۔ "لیکن خود ان لوگوں پر گیس کا اثر کیوں نہیں ہو رہا تھا؟ انہوں نے تو اپنے منہ پر کوئی ماسک وغیرہ نہیں لگایا ہوا تھا اور نہ ہی ناک پر کپڑا لپیٹا ہوا تھا۔ وہ تو بڑے اطمینان سے جا رہے تھے۔"

"ویسے تو ان لوگوں کے لئے یہ کوئی خاص بات نہیں..... اس قسم کے شعبدے ان کی جیبوں میں پڑے رہتے ہیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ وہ اندازاً بالکل صحیح وقت پر اندر آئے ہوں جب راحیلہ بے ہوش ہو چکی ہو اور وہ فوراً ہی اسے اٹھا کر چل دیئے ہوں۔ یہ چند سیکنڈ کا کام تھا۔ اتنی دیر کے لئے..... بلکہ اس سے کہیں زیادہ دیر کے لئے تو سانس بھی روکی جا سکتی ہے" میں نے انہیں سمجھایا۔

انہوں نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا پھر ان کے آنسوؤں سے بھیگی آنکھوں میں ذرا چمک ابھری اور وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پُر امید سے لہجے میں بولیں۔

"تمہاری باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ تم ان لوگوں کو جانتے ہو..... تو پھر جلدی کچھ کرو نا بیٹے!"

"جی ہاں آنٹی! کچھ نہ کچھ تو کریں گے..... اسی لئے تو آپ سے یہ سب کچھ پوچھ رہے تھے تاکہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کیا کرنا چاہئے" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ اپنی سوچوں میں الجھا ہونے کی وجہ سے بے خیالی میں میں نے انہیں خالہ بی کے بجائے آنٹی کہہ کر مخاطب کر لیا تھا۔

میرے خیال میں تو بات ایک ہی تھی لیکن خالہ بی رنج اور فکر کے ان لمحات میں بھی تنک کر بولیں "بھئی مجھے آنٹی وانٹی مت کہا کرو..... سیدھا سادہ خالہ بی جو کہتے ہو وہی ٹھیک ہے۔ کتنی دلکشی اور اپنائیت ہے اس رشتے میں..... مجھے یہ انگریزی میں رشتے ناتے یا القابات جوڑنا بالکل پسند نہیں ہے..... اب آنٹی بھی بھلا کوئی لفظ ہے؟ کچھ پتا نہیں چلتا اس سے مراد پھوپی ہے..... خالہ ہے..... ممانی ہے..... یا چچی ہے۔ انگریزوں کی نظر میں شاید یہ سارے رشتے برابر ہوں گے۔ اس لئے اٹھا کر ایک ہی نام رکھ دیا۔ لیکن ہماری تہذیب میں ان سب رشتوں کی اپنی باریکیاں، اپنی خوبصورتیاں ہیں، انہیں گڈمڈ نہ کرو۔ انگریزوں کا کیا ہے۔ وہ تو اٹھا کر سالے اور بہنوئی دونوں ہی کو برادر اِن لا قرار دے دیتے ہیں۔ اب ہمارے ہاں تو ایسے مختلف رشتوں کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکا جا سکتا۔"

"جی ہاں..... بالکل ٹھیک کہا آپ نے..... معافی چاہتا ہوں خالہ بی!" میں نے شرمندہ ہوتے ہوئے ذرا جلدی سے کہا۔

پھر میں نے انگریزی میں ٹونی سے کہا "اگر یہ ریڈ ڈاٹ کا کام ہے تو اس کا کوئی نہایت ہی واضح مقصد ہو گا جو جلد سمجھ میں آ جائے گا۔ ریڈ ڈاٹ کی یہ بچی کھچی سی طاقت اگر اتنے دنوں کی خاموشی کے بعد حرکت میں آئی ہے تو اس کا مقصد ضرور کچھ حاصل کرنا ہو گا۔ آسیبی آنکھوں والی عورت شاید خود اس سلسلے میں رابطہ کرے۔ میرا خیال ہے اس وقت کارروائی کرنے والی اصل شخصیت ہو گی۔ وہ مقامی لوگ شاید کرائے کے بدمعاش ہوں۔"

جونہی میں خاموش ہوا تو خالہ بی بول اُٹھیں "تم لوگوں نے اچانک انگریزی میں کیوں بات چیت شروع کر دی؟ اگر رازداری مقصود ہے تو میں دوسرے کمرے میں چلی جاتی ہوں" ان کا لہجہ بتا رہا تھا کہ شاید وہ تھوڑا سا بُرا مان گئی تھیں۔ لطف کی بات یہ تھی کہ انہوں نے یہ دونوں جملے نہایت روانی سے انگریزی میں بولے تھے۔ وہ یقیناً انگریزی بھی روانی سے بولتی اور سمجھتی تھیں۔

مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ حیرت شاید ٹونی کو بھی ہوئی تھی۔ ان کی یہ اہلیت آج تک ہم سے بھی پوشیدہ تھی۔ راحیلہ نے بھی ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔ شاید اتفاق تھا کہ ایسا کوئی تذکرہ نہیں آیا تھا۔ بہرحال..... یہ دنیا تھی اور ہر طرح کے کرداروں سے بھری ہوئی تھی۔

خالہ بی شاید آج مجھے کچھ زیادہ ہی شرمندہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ میں نے سنبھلتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "کوئی بات نہیں ہے آنٹی..... میرا مطلب ہے خالہ بی! آپ تو ہم سے ہی ایک ہیں۔ کنبے کے ایک فرد کی طرح ہیں۔ آپ سے رازداری؟؟"

یہ بات راحیلہ کہا کرتی تھی "میں اور خالہ بی..... دو افراد پر مشتمل ایک کنبہ ہیں۔"

ایک بار میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا "کاش میں بھی اس کنبے میں شامل ہوتا۔ مجھے ایک طرح کی ریڈی میڈ ساس جہیز میں مل جاتی۔"

اس پر راحیلہ مجھے گھونسا رسید کرتے کرتے رہ گئی تھی۔

میں نے شرمندگی کے مزید اظہار کے لئے خالہ بی سے کہا "کبھی کبھی فوقتاً انگریزی میں منہ مارنا ہماری عادت ہے۔ آپ اس کے لئے ہمیں معاف کر دیں اور یہ مت سمجھیں کہ ہم رازداری کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں..... اور اب جب کہ یہ واضح ہو گیا کہ آپ انگریزی بولتی اور سمجھتی ہیں تو ویسے بھی کہاں کی رازداری رہ گئی؟"

"تو پھر مجھے بھی بتاؤ یہ ریڈ ڈاٹ کیا ہے؟" وہ فوراً بولیں۔

اس مرحلے پر ڈاکٹر نے اجازت طلب کی اور رخصت ہو گیا۔

اچانک ٹونی کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف شبیر تھا۔ سردار علی بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ ایک ہی گاڑی میں تھے۔ شبیر نے بتایا کہ انہوں نے پہلے طوفانی سے انداز میں اور پھر رفتاری سے آس پاس کی سڑکوں پر چکر لگایا تھا لیکن انہیں کوئی ایسی کار دکھائی نہیں دی تھی جسے وہ مشکوک محسوس کرتے۔

"کسی گاڑی میں کوئی سفید فام مرد یا عورت دکھائی دی

نے پوچھا۔

"نہیں" شبیر شیخ نے جواب دیا۔

"اچھا..... اب ان لوگوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی ہیں" ٹونی کچھ سوچتے ہوئے بولا "ان کی روشنی میں ذرا زیادہ دور تک کے علاقے کا جائزہ لینے کی کوشش کرو....." وہ اس سفید فام عورت اور دو مقامی آدمیوں کا حلیہ بتانے لگا۔ اس نے خالہ بی سے پوچھ کر مزید کچھ تفصیل شامل کی پھر بولا "اب تاخیر ہو چکی ہے۔ ان لوگوں کے نظر آنے کی کوئی خاص امید نہیں لیکن قسمت آزمائی میں کوئی حرج نہیں..... بعض اوقات بڑے عجیب اتفاقات بھی رونما ہو جاتے ہیں۔"

اس نے فون بند کیا تو خالہ بی ہاتھ اُٹھاتے ہوئے بولیں "میری دعا ہے کہ وہ پکڑے جائیں اور میری بچی ابھی گھر واپس آ جائے۔"

ان کی دعا شاید اس حد تک تو قبول نہیں ہوئی مگر اتنا ضرور ہوا کہ اسی لمحے میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے بات کرنے کے لئے بٹن دبایا تو میٹھی میٹھی مگر جذبات خیز سی ایک نسوانی آواز نے تصدیق چاہی "افضل..... تم افضل ہو نا؟" وہ انگریزی میں بات کر رہی تھی۔

"ہاں..... میں افضل بول رہا ہوں" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جواب دیا۔

"بہت پریشان ہو؟" بولنے والی نے یوں پوچھا جیسے وہ میرے سامنے بیٹھی بات کر رہی تھی۔ میں اس آواز میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ وہ بہت ہی عجیب آواز تھی۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اسے میٹھی میٹھی سی آواز کہا جا سکتا تھا یا کھنکھناتی ہوئی؟ اس میں دونوں ہی خصوصیات کی جھلک موجود تھی۔ لہجہ پُرانے اور شائستہ انگریزوں والا تھا جو صاف ستھری اور واضح انگریزی بولتے تھے۔ جدید زمانے کے امریکیوں کی طرح انگریزی کا ملیدہ بنانے والا انداز نہیں تھا۔

"ہاں..... میں پریشان ہوں" میں نے اعتراف کر لینے میں عار نہیں محسوس کی "تم نے کیا میری پریشانی دور کرنے کے لئے فون کیا ہے؟"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ میرے جسم میں پھریری سی دوڑ گئی لیکن ابھی اس کیفیت کے بارے میں بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی اصل وجہ کیا تھی؟ کیا یہ قہقہہ جذبات خیز تھا؟ اس کی وجہ سے میرے اعصاب میں گدگدی سی ہوئی تھی یا درحقیقت میرے جسم میں خوف کی پھریری دوڑی تھی؟

"جو پریشانیاں خود مول لی جاتی ہیں انہیں دور کرنے کی تدبیر بھی خود کرنا پڑتی ہے ہنی!" وہ بڑی محبت سے بولی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو اس کا یہ لہجہ مجھے ان گنت خوش کن تصورات کی دنیا میں لے جا سکتا تھا۔

"مثلاً.....؟ میں نے خود کون سی پریشانی مول لی ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ میرے ذہن میں ایک آندھی سی چل رہی تھی۔ میں بات اس سے کر رہا تھا لیکن سوچ کچھ اور بھی رہا تھا۔

"وہی جس کے بارے میں اس وقت بیٹھے سوچ رہے ہو" اس نے جواب دیا۔

میں نے یہ آواز اس سے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی البتہ اس عورت کی صورت مجھے دو تین مرتبہ ضرور نظر آئی تھی لیکن اس وقت فون پر اس کے بولتے ہی مجھے یقین ہو گیا تھا کہ یہ انہی آسیبی آنکھوں والی لڑکی کی آواز تھی اور اب تو گفتگو جس نہج پر جا رہی تھی اس کے بعد اس سلسلے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہ گیا تھا۔

میں نے ٹونی کو اشارہ کیا کہ وہ نمبر ٹریس کرانے کی کوشش کرے جس سے کال کی جا رہی تھی۔ ٹونی اپنا موبائل فون اٹھا کر برابر کے کمرے میں چلا گیا۔

میں نے بات کو طول دیتے ہوئے کہا "مجھے تو اس وقت کئی طرح کی پریشانیاں لاحق ہیں۔ تم نہ جانے کس پریشانی کا ذکر کر رہی ہو۔ میں تو یہ سوچ کر بھی پریشان ہوں کہ اگر انسان کی تین ٹانگیں ہوتیں تو خاصا مسئلہ ہوا کرتا۔ پتلون بھی تین ٹانگوں والی سلوانی پڑتی۔"

"اس قسم کی بکواس کر کے تم نہ اپنے آپ کو دھوکا دے سکتے ہو اور نہ مجھے" اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی "مجھے معلوم ہے تم اس لڑکی کو کتنا چاہتے ہو۔ اس کے لئے شاید تم اپنا سب کچھ داؤ پر لگا سکتے ہو۔"

"اس طرح کی تو کم و بیش ایک درجن لڑکیاں ہیں۔ تم کس کی بات کر رہی ہو؟ نام لے کر بات کرو تو آسانی رہے گی" میں نے کہا۔

"اس قسم کی بکواس کر کے دوسرے کے خیالات کو الجھانے کی کوشش کرنا شاید تمہاری عادت ہے" وہ پُرسکون لہجے میں بولی "لیکن میں اپنے ٹریک سے ہٹنے والی عورت نہیں ہوں۔"

پھر اس نے نہایت دو ٹوک لہجے میں پوچھا "تم کام کی بات کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

"کام سے پہلے نام کی بات ہونی چاہئے" میں نے کہا "میں کسی ایسی عورت سے کام کی بات کیسے کر سکتا ہوں جس کا مجھے نام تک معلوم نہیں"

"نام میں کیا رکھا ہے" اس کے لہجے میں ملائمت آ گئی "ویسے تم مجھے "دی لیڈی" کہہ سکتے ہو۔ جتنے لوگ مجھے جانتے ہیں ان میں سے بیشتر اسی نام سے جانتے ہیں۔"

"یہ اندازہ تو خیر مجھے آواز سُن کر بھی ہو گیا تھا کہ تم کوئی لیڈی ہی ہو سکتی ہو۔ لیکن تم دی لیڈی ہو..... محض لیڈی نہیں ہو..... یہ سن کر زیادہ خوشی ہوئی..... تو پھر کام کی بات کہاں سے شروع کی جائے؟ مقامی مارکیٹ کے اُتار چڑھاؤ سے یا بین الاقوامی منڈیوں کے بحران سے؟"

"تمہاری محبوبۂ دلنواز سے..... جس کا چہرہ آدھا سیاہ ہو جانے کے بعد بھی تم نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا" وہ بدستور پُرسکون لہجے

میں بولی۔

"ہم مشرقی لوگ ہیں۔ اتنی آسانی سے کسی کا پیچھا نہیں چھوڑتے" میں نے خوش دلی سے جواب دیا "چہرے کا کیا ہے۔ چہرہ تو پورا بھی کالا ہو جائے تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ انسان کا دل کالا نہیں ہونا چاہئے۔ اب ایسے سفید فام ہونے کا کیا فائدہ کہ انسان کے سینے میں شب تاریک سے بھی زیادہ کالا دل دھڑک رہا ہو۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر گہری سانس لے کر بولی "اگر تم دل کے اتنے بڑے قدر دان ہو تو دل کے بارے میں ایک اہم بات سُن لو۔ آج رات کے ٹھیک بارہ بجے تمہاری محبوبہ کا دل دھڑکنا بند کردے گا۔ کل صبح تم کوشش کرو گے تو شہر کے کسی کوڑے دان سے تمہیں اس کی لاش مل جائے گی۔"

"غیر فانی تو تم بھی نہیں ہو آسیبی آنکھوں والی ڈارلنگ! ہو سکتا ہے کبھی تمہاری لاش بھی کسی گندے نالے میں پڑی پائی جائے" میں نے جواب دیا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے الفاظ سے میرے دل پر گھونسا سا لگا تھا لیکن میں نے اپنے لہجے سے یہ اظہار نہیں ہونے دیا تھا کہ اس کی بات کا میں نے ذرا سا بھی اثر لیا تھا۔

"بہت مشکل ہے" وہ خوشگوار لہجے میں بولی "کم از کم تمہارے لئے بہت مشکل ہے۔"

"میرے لئے مشکل سہی.... اوپر والے کے لئے تو مشکل نہیں ہے" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"اوپر والا....؟" اس نے دُہرایا "اوہ.... اچھا' خدا کی بات کر رہے ہو...." وہ دھیرے سے ہنسی "تو کبھی کبھی خدا کو بھی یاد کر لیتے ہو؟"

"کبھی کبھی نہیں.... اکثر ہی کر لیتے ہیں.... مشکل اور کٹھن وقت میں کچھ زیادہ ہی یاد کر لیتے ہیں۔ شاید اسی لئے تو بہت سے ایسے کام کر گزرتے ہیں جو بظاہر ناممکن نظر آتے ہیں" میں نے جواب دیا "اب یہی دیکھ لو کہ کیا ریڈ ڈاٹ جیسی طاقت کا بیڑا غرق کرنا ہم جیسے لوگوں کے بس کی بات تھی؟"

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر بولی "تم نے ایک ایسی جنگ کو دوبارہ شروع کیا ہے جو ختم ہو چکی تھی۔ ہم نے شکست تسلیم کر لی تھی۔ ہمارے بچے کھچے لوگ بھی رخصت ہو چکے تھے۔ ہم نے تمہارے ملک کا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ دنیا بہت بڑی ہے اور یہاں اکثریت پس ماندہ ملکوں کی ہے۔ ہمارے سامنے کام کرنے کے لئے بہت بڑا میدان پڑا ہے۔ تمہارے ملک کو ہم پھر کبھی اپنا اڈا بنالیں گے اور وہ وقت شاید ایسا ہو کہ تم جیسے سو افضل چوہدری اور ہزار نفیس خان بھی مل کر کچھ نہ کر سکیں" اس کا لہجہ رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کو برف بنا دینے والا تھا "اس وقت تمہارے اپنے گلی کوچوں میں کئی کئی ریڈ ڈاٹس موجود ہوں گی۔ تمہارے اپنے لوگ ہمارا کام بہت آسان کردیں گے۔"

کام تو اس وقت بھی ہمارے اپنے بہت سے لوگوں نے آسان کیا ہوا تھا۔ مستقبل کا نقشہ تو اور بھی خوفناک تھا لیکن میں نے اپنے رگ و پے میں پھیلتے ہوئے خوف کو اپنے لہجے تک نہ آنے دیا اور بظاہر بے فکری سے کہا "تم مستقبل کی باتیں چھوڑو۔ حال کی بات کرو۔ میں نے اس جنگ کو دوبارہ کیسے شروع کیا ہے؟"

"ڈاکٹر برنارڈ کو اغوا کر کے" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ ڈاکٹر برنارڈ کو میں نے اغوا کیا ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"افضل ڈیئر! تم ریڈ ڈاٹ کو تقریباً اتنا ہی جانتے ہو جتنا ہم خود.... تمہیں اس قسم کے بچگانہ سوالات نہیں کرنے چاہئیں۔ ہمارا نیٹ ورک بے شک ختم ہو چکا ہے لیکن اس قسم کی چھوٹی موٹی باتیں معلوم کرنا ہمارے لئے اب بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ اس لئے تم اس کی تردیدوں میں اُلجھ کر وقت مت ضائع کرو۔"

میں اسے جھٹلانے کے لئے مزید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تم نے بہت ہی غلط وقت پر یہ کام کیا۔ چند دن بعد ہم ڈاکٹر برنارڈ کو ساتھ لے کر یہاں سے جانے والے تھے۔ صرف چند دن کی بات اور تھی۔ ریڈ ڈاٹ تمہارے لئے ایک قصہ پارینہ.... ایک بھولی بسری کہانی بن جاتی لیکن تم نے ہمارا سارا پروگرام درہم برہم کردیا.... اور اس کے ساتھ ساتھ خود اپنے لئے بھی کچھ نئی مصیبتوں کو دعوت دے دی۔"

"اگر تم چند دن بعد جانے والے تھے تب تو یہ کام شاید بالکل بروقت سا ہو گیا تھا۔ ڈاکٹر برنارڈ تو چلا جاتا لیکن میں شاید زندگی بھر اسے یہاں تلاش کرتا رہتا۔"

پھر میں نے نہایت نرم اور صلح جویانہ لہجے میں کہا "دیکھو۔ پہلے بات کچھ اور تھی اب کچھ اور ہے۔ اب ہمارے درمیان کوئی جنگ نہیں چل رہی.... اور اگر تم بچے کھچے لوگ بھی جا رہے ہو تب تو سمجھو کہ ہمارے رہے سہے اختلافات بھی ختم ہو گئے۔ ڈاکٹر برنارڈ کو میں نے ہلاک کرنے یا خفیہ اداروں کی تحویل میں دینے کے لئے نہیں پکڑا۔ یہ بات میں نے خود اس پر بھی واضح کردی ہے۔"

"پھر تم نے اسے کس لئے پکڑا ہے؟" دی لیڈی نے پوچھا۔

"اس کا جواب راحیلہ کی صورت میں تمہارے پاس موجود ہے۔ تم تو ڈاکٹر برنارڈ کو لے کر چلی جاؤ گی لیکن کیا راحیلہ اپنی باقی زندگی اسی طرح آدھے کالے اور آدھے سفید چہرے کے ساتھ گزارے گی؟"

"تم نے جو کچھ ہمارے ساتھ کیا.... یہ اس کی نہایت معمولی سزاؤں میں سے ایک ہے۔ تمہیں تو اس پر ہی شکر کرنا چاہئے تھا کہ وہ کم از کم زندہ سلامت تو ہے۔"

"تم لوگ یہاں جو کچھ کر رہے تھے.... اور جو کچھ مزید کرنا چاہتے تھے وہ تم کسی بھی ملک میں جا کر کرو گے تو وہاں تمہارے ساتھ یہی ہو گا۔ بشرطیکہ وہاں مٹھی بھر بھی محبّ وطن لوگ موجود ہوئے...." میں نے کہا۔

"تم مجھے حب الوطنی پر لیکچر دینے مت بیٹھ جانا" وہ ...ب بولی "میں تمہارے ہاں حبّ الوطنی کے ڈھنڈورے ...ں کو خوب جانتی ہیں۔"

"کاش تم مجھے بھی جان سکتیں!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر

"تمہیں بھی جان گئی ہوں.... مجھے اعتراف ہے کہ تم ذرا ...ی کھیر ہو.... دوسروں سے کچھ مختلف ہو۔ اصل میں ریڈ ڈاٹ ...غلطی یہ ہوئی کہ اس نے تمہیں اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ ہم نے ...اس غلطی کی بہت بڑی سزا بھگتی ہے۔ ہم بالا ہی بالا اپنا کام کرتے ...جب تمہارے فرشتوں کو بھی علم نہ ہوتا۔ تمہیں صرف اس ...ہا چلتا جب یہ ڈھانچا زمیں بوس ہو جاتا۔ خیر.... جو ہوا.... سو ...جو ہو چکا اسے اب نہ ہو چکنے کی شکل نہیں دی جا سکتی۔"

"لیکن راحیلہ کے ساتھ جو ہو چکا ہے اسے تو پہلے والی ...رت پر لایا جا سکتا ہے" میں نے ملائمت سے کہا "یہ محض اتفاق ...کہ ڈاکٹر برنارڈ میرے ہاتھ آگیا۔ میں نے صرف راحیلہ کا چہرہ ...ٹھیک کرانے کے لئے اسے قابو میں کیا ہے۔ میرا اور کوئی مقصد ...ہیں ہے۔ بڑی مشکل سے اس کے انتظامات مکمل ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر برنارڈ کے لئے یہ ایک معمولی سا کام ہے۔ تم اسے یہ کام ...کر لینے دو۔ اس کے بعد تم جہاں کہو گی' میں خود اسے بہت عزت و ...احترام سے پہنچا دوں گا۔ میرے لئے اس سے بڑی خوشخبری کیا ...ہو سکتی ہے کہ تم لوگ خود ہی یہاں سے جا رہے ہو۔ اس سلسلے میں ...اگر کوئی دشواری ہو تو میں خود تمہاری مدد کے لئے تیار رہوں۔"

اس کے نزدیک گویا یہ بڑی بچگانہ سی بات تھی۔ اس نے استہزائیہ سا قہقہہ لگایا اور مربیانہ سے لہجے میں بولی "نہیں.... بہت شکریہ۔ ہمیں تمہاری مدد کی ضرورت نہیں۔ ہم ابھی اتنے محتاج نہیں ہوئے۔"

"تو پھر راحیلہ کو رہا کرو۔ اتنی معمولی سی بات کو تصادم کی بنیاد ...مت بناؤ۔ حقیقت پسند بن کر سوچو۔ سلجھی ہوئی صورتِ حال کو اُلجھانا کوئی دانشمندی نہیں۔ مجھے اب ریڈ ڈاٹ سے یا ڈاکٹر برنارڈ سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" میں نے ملائمت سے اسے سمجھانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اگر مجھے یقین ہوتا کہ وہ منت سے بات مان جائے گی تو شاید اس وقت میں اس کی منت بھی کر لیتا۔ میں اس وقت امید اور ناامیدی کے درمیان ایک عجیب سے خلا میں معلق تھا۔ میری ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر اچانک ہی اس نے پوچھا "تم نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"اب اتنی آسانی سے اپنی معلومات میں اتنا اضافہ مت کرو" میں نے جواب دیا۔ وہ دھیرے سے ہنسی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ کم از کم ابھی انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کو کہاں رکھا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا ٹونی کا گھر فی الحال کچھ محفوظ ٹھکانا تھا۔

"یہ معلوم کرنا ہمارے لئے کچھ زیادہ مشکل نہیں ہو گا" وہ بولی۔

"لیکن اسے چھڑانا ضرور مشکل ہو گا" میں نے کہا "اب لاشوں کے تبادلے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ جب ایک کام سیدھے طریقے سے ہو سکتا ہے تو اسے مشکل بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہارا ڈاکٹر برنارڈ میرے پاس ایک امانت ہے۔ میرا وعدہ ہے میں یہ امانت تمہیں لوٹا دوں گا۔"

پھر جیسے مجھے کچھ یاد آیا۔ میں نے گویا اسے ایک خفیف سے دھچکے کے لئے تیار کرتے ہوئے کہا "لیکن ایک بات میں واضح کروں.... کہیں تم بعد میں یہ نہ کہو کہ میں وعدے اور معاہدے کی خلاف ورزی کر رہا ہوں۔ میں راحیلہ کا چہرہ ٹھیک ہونے کے بعد بھی کچھ دن اسے اپنے پاس رکھوں گا۔ محض یہ اطمینان کرنے کے لئے کہ اس نے اپنا کام ٹھیک کیا ہے اور راحیلہ کے چہرے پر کوئی ردِ عمل یا خراب اثر ظاہر نہیں ہو رہا۔"

"کتنے دن روکو گے اسے؟" اس کے لہجے میں ایک بار پھر ہلکی سی سختی آگئی۔

"کم از کم ایک ماہ" میں نے دیانتداری سے جواب دیا۔

"ایک ماہ....؟" وہ تقریباً چلّا اٹھی "نہیں.... افضل ڈیئر! ہمارے درمیان معاہدہ نہیں ہو سکتا۔ بات صرف میری شرائط پر ہو گی۔ آج رات دس بجے سے پہلے پہلے ڈاکٹر برنارڈ کو رہا کردو۔ ورنہ کل صبح تمہیں راحیلہ کی لاش ملے گی۔"

"جلد بازی والی بات مت کرو" میں نے تحمل سے اسے سمجھانے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے کہا "میں اسے رکھنے کی مدت کچھ کم کروا دیتا ہوں۔ میں اسے ایک ماہ کے بجائے صرف ایک ہفتے بعد چھوڑ دوں گا۔ اسے اپنی پیدا کی ہوئی خرابی کو تسلی بخش طور پر ٹھیک کرنا ہوگا۔ یہ کوئی بے جا مطالبہ نہیں ہے۔ وہ لڑکی جتنی سزا بھگت چکی ہے وہی کافی ہے۔ یہ اسی کا حوصلہ تھا کہ اس نے اس نقص کے ساتھ بھی زندگی گزارنے کا ڈھنگ سیکھ لیا اور اپنے معمولات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا۔ اس کی جگہ اگر کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید پریشانی اور احساسِ کمتری کے باعث نفسیاتی مریض بن جاتی اور اگر اپنے حسن کے بارے میں کچھ زیادہ ہی حساس ہوتی تو شاید خودکشی کر لیتی۔ اگر ڈاکٹر برنارڈ جاتے جاتے اپنی اس حرکت کی تلافی کر جائے گا تو اس کا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

"خیر... اگر ڈاکٹر برنارڈ نے یہ کام کرنے کی ہامی بھرلی ہے تو وہ ضرور کردے گا اور ٹھیک طرح ہی کرے گا ورنہ وہ ہامی ہی نہ بھرتا... وہ ایک عجیب قسم کا سنکی ہے... تم نے اس پر تشدد کیا ہوگا؟"

"تھوڑی سی سختی تو کرنا پڑی تھی" میں نے قدرے شرمندگی سے اعتراف کیا۔ "وہ بات مان جو نہیں رہا تھا۔"

"ٹھیک ہے... ہم بھی لڑکی پر تھوڑی سی سختی کریں گے" وہ بولی۔

"پلیز... ایسا مت کرنا" میں نے جلدی سے کہا "اس سے کون سا تمہیں کوئی بات منوانی ہے۔" میری دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں۔

"یہ تو معلوم ہو ہی جائے گا کہ ڈاکٹر برنارڈ کو کہاں رکھا گیا ہے" وہ گویا میری کیفیت کا تصور کرکے محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"اسے یہ بات ابھی معلوم نہیں ہے۔ اسے ٹارچر کرنا فضول ہوگا" میں نے جھوٹ بولا۔

وہ ابلیس کی خالہ اس قسم کے جھوٹ سے بہلنے والی نہیں تھی۔ طنزیہ لہجے میں بولی "ایک طرف تم اتنے اصول پرست اور راست گو بننے کی کوشش کرتے ہو۔ دوسری طرف جھوٹ بولنے سے بھی باز نہیں آتے..."

اب میں اسے کیسے یقین دلاتا کہ جھوٹ مجھے کسی کی جان بچانے یا کسی کو گزند پہنچانے کے لیے بولنا پڑ رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی "جب ڈاکٹر برنارڈ تمہارے ہتھے چڑھا ہوگا تو سب سے پہلے تم راحیلہ کو ہی یہ خوشخبری سنانے دوڑے ہوگے اور وہاں یہ ذکر بھی ضرور آیا ہوگا کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے؟" وہ بولی۔

"خیر... تم اس قسم کی بحث وغیرہ میں الجھنے کے بجائے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرو" میں نے درخواست کی۔

"حل یہی ہے کہ آج رات دس بجے تک برنارڈ کو رہا کردو۔ صبح تک راحیلہ کو بھی رہا کردیا جائے گا۔ اس کا چہرہ جیسا ہے ویسا ہی رہنے دو۔ اس نے غالباً اب اس چہرے کے ساتھ زندگی گزارنا سیکھ لیا ہے۔ اگر تمہیں اس سے اتنی ہی محبت ہے تو تم بھی ایسے چہرے والی بیوی کے ساتھ زندگی گزارنا اور لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا سیکھ لو" وہ فیصلہ کن سے لہجے میں بولی۔

اب میں اسے کیا بتاتا کہ راحیلہ اس چہرے کے ساتھ مجھ سے شادی کے لیے تیار نہیں تھی ورنہ شاید میں اس طرح زندگی گزارنے کی تجویز قبول کر لیتا اور اس کا عادی بھی ہو جاتا۔

"مجھے تم پر اعتبار نہیں ہے کہ میں ڈاکٹر برنارڈ کو رہا کردوں تو تم لوگ بھی واقعی راحیلہ کو رہا کردو گے" میں نے صاف گوئی سے کہا۔

"ہمیں بھی تم پر اعتبار نہیں ہے کہ ڈاکٹر برنارڈ سے راحیلہ کا چہرہ ٹھیک کرانے کے بعد تم اسے زندہ جانے دو گے" وہ بلا تامل بولی "تم اتنے دیانت دار آدمی نہیں ہو سکتے... کم از کم ہمارے معاملے میں...!"

"میں تمہیں اپنی دیانت داری کا قائل کرنے کی کوشش نہیں کروں گا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میں لاحاصل کام نہیں کرتا۔ راحیلہ کا چہرہ ٹھیک ہونے کے بعد مجھے برنارڈ کو مار کر کیا حاصل ہوگا؟ خصوصاً جبکہ مجھے یہ یقین ہے کہ تم لوگ واقعی اس ملک کا پیچھا چھوڑ کر جا رہے ہو۔"

"مسئلہ وہی بے اعتباری کا آجاتا ہے" وہ بولی "تمہیں ہم پر اعتبار نہیں اور ہمیں تم پر بھروسا نہیں۔ یہ گتھی کیسے سلجھے گی؟"

"گتھی کو سلجھانا تمہارے ہاتھ میں ہے" میں نے کہا۔

اس نے ایک لمحے سوچا پھر بولی "میں ایک گھنٹے بعد پھر تم سے بات کروں گی۔ مجھے مزید سوچ بچار کی ضرورت ہے۔ اس معاملے میں تھوڑا سا خلوصِ نیت ڈال دیا جائے تو شاید بات بن جائے۔ میں دوبارہ فون کروں گی تو برنارڈ سے بھی بات کرنا چاہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ برنارڈ سے تمہاری بات ہو جائے گی اور جہاں تک خلوصِ نیت کا تعلق ہے تو میری طرف سے تو خلوصِ نیت شامل ہے۔ تمہیں اپنے ہاں یہ عنصر تلاش کرنا پڑے گا۔ تم لوگوں کے ہاں یہ چیز خاصی نایاب ہے" میں نے کہا۔

"بکواس مت کرو۔ زیادہ طنز کرنے کی ضرورت نہیں" اس نے ڈانٹا اور میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا "ایک گھنٹے بعد میرے فون کا انتظار کرنا... اور ہاں... جتنا کم چالاک بننے کی کوشش کرو گے اتنا زیادہ فائدے میں رہو گے۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "یہ چالاکی کا وقت نہیں ہے۔"

اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ اس دوران میں ٹونی دوسرے کمرے سے واپس آچکا تھا۔ اس کے چہرے پر مایوسی تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا "نمبر ٹریس نہیں ہو سکا۔ موبائل فون کمپنی میں اپنے جاننے والے جو افسر موجود ہیں انہوں نے خود بھی کوشش کی تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ جس ٹیلی فون سے کال کی جا رہی تھی اس پر کوئی آلہ لگا ہوا ہے جو نمبر ٹریس نہیں ہونے دیتا۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ حضرت انسان بھی واقعی عجیب مخلوق تھا۔ ایک طرف خنجر اور تلوار ایجاد کرتا تھا۔ دوسری طرف اس سے بچنے کے لیے زرہ بکتر ایجاد کرتا تھا۔ ایک طرف نئی اسلحے کو ناکام بنانے کے لیے بمبار طیارے ایجاد کرتا تھا تو دوسری طرف طیارہ شکن توپیں۔

ایک طرف اگر ایسے آلات موجود تھے جو کال کرنے والے کا نمبر ٹریس کر سکتے تھے تو دوسری طرف انہیں ناکام بنانے والے آلات بھی موجود تھے۔ گویا ایک طرف ترقی تھی تو دوسری طرف مزید ترقی کے ساتھ اس کا توڑ موجود تھا۔ جب ہر چیز کا توڑ موجود تھا تو پھر اس چیز کو ایجاد کرنے کا فائدہ کیا تھا؟ میں اکثر سوچتا تھا اور حیران ہوتا تھا کہ درحقیقت کہیں انسان وہیں کا وہیں تو نہیں کھڑا تھا جہاں وہ لاکھوں سال پہلے تھا؟ اس کا سفر محض ایک دائرے میں تو نہیں تھا؟

خالہ بی نے مجھے میرے خیالوں سے چونکایا "ارے کچھ مجھے بھی بتاؤ یہ کون نگوڑ ماری تھی جو راحیلہ کو اٹھوا کر لے گئی اور اب اسے چھوڑنے پر تیار نہیں ہو رہی؟"

گویا خالہ بی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ میں کسی عورت سے بات کر رہا تھا۔ میں نے پُرخیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ایک آدھ دن ٹھہر جائیں خالہ بی! آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔"

"معلوم تو مجھے بہت کچھ ہو گیا ہے بیٹا! میں اتنی کوڑھ مغز اور جاہل نہیں ہوں جتنی تم سمجھ رہے ہو" وہ اب بالکل چاق و چوبند نظر آرہی تھیں۔

"توبہ کیجیے خالہ بی! میں بھلا آپ کو جاہل اور کوڑھ مغز سمجھنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہوں۔ آپ چاہیں تو ہم جیسوں کے کان کتر سکتی ہیں" میں نے کہا۔

"خیر! مجھے کان کترنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ مجھے پان کترنے کا شوق ہے، وہ میں کترتی رہتی ہوں۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی تھی کہ تمہاری باتیں تو میں نے سن ہی لی ہیں لیکن کافی حد تک مجھے اس حرافہ کی آواز بھی سنائی دیتی رہی جو تم سے بات کر رہی تھی۔ میں نے کان ادھر ہی لگائے ہوئے تھے۔ جو باتیں میری سمجھ میں نہیں آسکیں ان کے بارے میں بھی میں نے کافی حد تک اندازہ لگا لیا ہے۔"

خالہ بی خود بھی یقیناً کافی تیز تھیں اور ان کی سماعت بھی تیز تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولیں "میں ایک تجویز پیش کرنا چاہتی ہوں۔ شاید اس سے یہ گتھی سلجھ جائے جو ایک دوسرے پر بداعتمادی کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں اپنی تجویز بیان کروں؟" وہ اپنی تمام تر بے باکی اور تیزی و طراری کے باوجود کچھ ہچکچا رہی تھیں۔

"کیوں نہیں... کیوں نہیں..." میں نے جلدی سے کہا "اس وقت تو کوئی بھی تجویز سننا بھلا معلوم ہوگا۔"

"راحیلہ بٹیا کا چہرہ ٹھیک کرانے کے لیے اسے اس حرافہ کے چنگل سے چھڑوانا ضروری ہے اور وہ بداعتمادی کی وجہ سے اسے چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔ تم اس سے کہو راحیلہ بٹیا کو چھوڑ دیں اور ضمانت کے طور پر ہماری خالہ بی کو رکھ لیں۔ میں راحیلہ بٹیا کی جگہ ضمانت کے طور پر جتنے دن بھی ضرورت ہو، رہنے کے لیے تیار ہوں۔ اگر انہوں نے بدعہدی کرتے ہوئے یا کسی اور وجہ سے مجھے مار بھی ڈالا تب بھی کوئی بات نہیں۔ میں بٹیا کی رہائی اور اس کا چہرہ ٹھیک کرانے کے لیے اپنی جان کا داؤ کھیلنے کے لیے تیار ہوں۔"

میں نے بغور خالہ بی کی طرف دیکھا۔ آج درحقیقت ان کی ذات کی تہیں کھل رہی تھیں۔ وہ کافی حد تک ایک حیران کن عورت تھیں۔ وہ ایک عام سی عورت بہرحال نہیں تھیں۔ میں ان کے اخلاص اور جاں نثاری سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے ان کی تجویز پر صرف ایک لمحے کے لیے غور کیا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ تجویز دی لیڈی کے لیے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ راحیلہ کے عوض وہ بھلا خالہ بی کو ضمانت کے طور پر کیسے قبول کر سکتی تھی۔ وہ یقیناً یہی سوچتی کہ خالہ بی جیسی کسی عورت کی بھلا ہماری نظر میں کیا اہمیت ہو سکتی تھی؟ اور جو شخصیت ہمارے لیے اہم نہ ہوتی، اسے وہ ضمانت کے طور پر کیسے قبول کر سکتی تھی؟

تاہم خالہ بی کی تجویز نے مجھے ایک راہ ضرور سجھائی تھی۔ میں نے ٹونی کی طرف دیکھا۔ وہ بھی بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے خالہ بی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "آپ کا جذبہ قابلِ قدر ہے خالہ بی! ہم تو آپ کا شکریہ ادا کرنے کے قابل بھی نہیں ہیں لیکن ہمیں اندازہ ہے کہ ان خبیثوں کے لیے یہ تجویز قابلِ قبول نہیں ہوگی۔ بہرحال ہم اس تجویز کو قابلِ قبول بنانے کی کوئی اور صورت نکالیں گے۔ فی الحال ہمیں اجازت دیجیے۔ ابھی ہمیں اس سلسلے میں نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑے۔ ایک گھنٹے بعد اس خوب صورت بدروح کا پھر فون آئے گا۔ ہم آپ سے رابطہ رکھیں گے۔ اگر کوئی نئی بات آپ کے علم میں آئے تو آپ بھی فوری طور پر ہمیں اطلاع دیجیے گا۔ ہمارے نمبر وغیرہ آپ کے پاس ہیں نا؟"

"ہاں بیٹا! راحیلہ بٹیا نے مجھے سب کچھ بتا رکھا ہے" انہوں نے گویا مجھے تسلی دی۔

میں اور ٹونی انہیں خدا حافظ کہہ کر باہر آئے۔ گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے ٹونی بولا "راحیلہ کی جگہ ضمانت کے طور پر میں ان کے پاس چلا جاتا ہوں۔"

مجھے معلوم تھا کہ خالہ کی بات سنتے ہی اس کے ذہن میں سب سے پہلا خیال یہی آیا تھا۔ میں نے فوراً کہا "تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود چلا جاؤں گا۔ میرے پیچھے راحیلہ کا چہرہ

ٹھیک کرانے کے کام کی نگرانی تو تم بھی کر سکتے ہو۔"

"لیکن آپ کو جانے کی کیا ضرورت ہے" ٹونی بولا "ہم اتنے ساتھی جو موجود ہیں۔ خصوصاً میرا اپنے بارے میں تو یہی خیال ہے کہ وہ مجھے ضمانت کے طور پر ضرور قبول کرلیں گے کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ میں آپ کے نہایت قریبی ساتھیوں میں شامل ہوں۔ میں' راحیلہ اور شفیع شاہ جتنے اہم آپ کے لیے ہیں' یرغمال کے طور پر اتنے ہی اہم ان کے لیے ہوں گے۔"

"میں اپنے نجی معاملات میں اپنے کسی ساتھی کی جان داؤ پر لگانا نہیں چاہتا۔" میں نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کا نجی معاملہ نہیں ہے سر!" وہ زور دے کر بولا "راحیلہ ہم سب کی ساتھی ہے۔ وہ ہر مرحلے پر ہمارے ساتھ رہی ہے۔ وہ ساری اجتماعی جدوجہد میں ہمارے ساتھ شریک رہی ہے۔ ہم سب لوگ ایک خاندان کی طرح ہیں اور وہ جب سے کراچی سے آئی ہے اس خاندان کے ایک فرد کی حیثیت سے ہی رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ ہم میں سے کسی کے لیے بھی اپنی جان کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کرے گی.... تو پھر اس مرحلے پر ہم کیسے پیچھے ہٹ سکتے ہیں۔ خصوصاً مجھ پر زیادہ ذمے داری عائد ہوتی ہے کیونکہ لاہور میں موجود ساتھیوں میں شاید مجھے ہی ریڈ ڈاٹ والے سب سے زیادہ آسانی سے یرغمال کے طور پر قبول کریں گے۔ آپ کی ضرورت چونکہ ہم سب کی عدم موجودگی میں بھی سب سے زیادہ رہتی ہے اس لیے آپ خود کو یرغمال کے طور پر ہرگز پیش نہ کریں۔ کوئی بھی ساتھی اس پر رضامند نہیں ہوگا اور نہ ہی اس بات کو پسند کرے گا۔ حتیٰ کہ خود راحیلہ بھی آپ کے عوض رہا ہونے اور اپنا چہرہ ٹھیک کرانے کو ترجیح نہیں دے گی۔"

میں چند سیکنڈ اسے تکتا رہا اور سوچتا رہا کہ آج کے دور میں جسے ایسے ساتھی میسر ہوں اس سے زیادہ خوش نصیب کون ہو سکتا تھا؟ آزمائش کے مرحلوں میں یہ خیال مجھے ہمیشہ ہی آتا تھا اور میرے دل میں ایک عجیب سا گداز پیدا ہوجاتا تھا۔ میں بے پناہ تشکر کے ساتھ سوچتا تھا کہ بچپن اور لڑکپن میں اگر میری زندگی میں کسی بھی قسم کے احساسِ محرومی کو دخل رہا تھا تو اب تک ہزار طریقوں سے اس کی تلافی ہوچکی تھی۔

ٹونی منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس مخصوص کیفیت کے حصار سے باہر آتے ہوئے کہا "ٹونی! میں تمہیں اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔ مجھے ان لوگوں کی زبان پر اعتبار نہیں ہے۔ مجھے وہ ایسے وعدہ نبھانے والے نہیں لگتے کہ ہمارے یرغمالی کو زندہ چھوڑدیں۔"

"کوئی بات نہیں سر!" وہ مسکراتے ہوئے بولا "جان جانے کے مرحلے تو اس سے پہلے بھی بارہا آئے ہیں۔ ہم محفوظ طریقے سے ان کے ساتھ بازی کھیلنے کی کوشش کریں گے۔ جب تک ڈاکٹر برنارڈ ہمارے قبضے میں ہے وہ ہماری نرم شرائط تو مان ہی لیں گے۔

آپ ان سے کہہ دیجیے کہ راحیلہ کے بدلے آپ ایک ہفتے کے لیے مجھے یرغمالی کے طور پر ان کے حوالے کرنے کو تیار ہیں لیکن تبادلہ ایک ساتھ عمل میں آئے گا۔ یعنی ادھر سے وہ راحیلہ کو لے کر آئیں اور ادھر سے مجھے لے جائیں۔ چھوٹی موٹی تفصیلات اسی طرح طے کرلیں گے جس طرح عموماً تاوان لینے والے کرتے ہیں۔ ایک ہفتے بعد اپنے ایک یرغمالی کو واپس لینے اور ڈاکٹر برنارڈ کو ان کے حوالے کرنے کا مرحلہ بھی اسی طرح طے کیا جائے! گویا "اس ہاتھ دے.... اس ہاتھ لے" والا معاملہ ہوگا۔ اور یہ شرط ماننے سے صاف انکار کردیجیے گا کہ پہلے ہم ڈاکٹر برنارڈ کو رہا کریں' بعد میں وہ ہمارے یرغمالی کو رہا کریں گے۔ ان کو سمجھانا بہرحال ان کی بھی مجبوری ہے۔ اس لیے امید ہے کہ وہ یہ شرط مان لیں گے۔"

"کسی بھی قسم کے تبادلے کا طریقہ تو میں نے بھی یہی سوچا تھا" میں نے کہا "البتہ ان کی طرف سے میں یہ بات ماننے کے سلسلے میں زیادہ پرامید نہیں ہوں اور یہی ان کی بدنیتی کی دلیل ہوگی۔ وہ واقعی شرافت سے اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہوں گے تو ہماری تجویز منظور کرلیں گے۔ "دی لیڈی" کے نام سے یہ جو آنکھوں والی عورت سامنے آئی ہے' اس کے بارے میں ابھی ہم کچھ نہیں جانتے۔ معلوم نہیں ریڈ ڈاٹ میں اس کی حیثیت کیا ہو اور یہ معاملت میں کیسی ہو۔ فی الحال معاملہ شاید اسی کے ہاتھ میں ہے۔ میرا خیال ہے یہ بات کو بنا بھی سکتی ہے اور بگاڑ بھی سکتی ہے۔"

"بہرحال آپ بات انہی خطوط پر کریں اور یرغمالی کے طور پر صرف میرا نام پیش کریں۔ اپنا نام ہرگز نہ لیں۔ کہیں وہ واقعی پھیل نہ جائیں۔"

"تمہارا اصرار ہے تو ایسا کرکے دیکھ لیتے ہیں۔ تبادلے کے بارے میں تو میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ اس ہاتھ دے اور اس ہاتھ لے کے سوا کوئی طریقہ اختیار کرنا خطرے سے خالی نہیں.... لیکن یرغمال کے طور پر میں صرف اپنے آپ کو پیش کرنا چاہتا تھا۔"

"کوئی بھی ساتھی اس پر تیار نہیں ہوگا۔ خواہ آپ سب کو فون کرکے بات کرلیں" ٹونی بولا۔

"چلو.... خیر.... فی الحال ڈاکٹر برنارڈ کے پاس چلتے ہیں۔ اس کی بہت زیادہ حفاظت کرنی چاہیے۔ تم تمام ساتھیوں کو بلا کر اپنے مکان پر تعینات کردو.... لیکن اس طرح کہ باہر سے کوئی انہیں دیکھنے نہ پائے۔ اس کے علاوہ انہیں خاص طور پر یہ ہدایت بھی کردینا کہ تمہارے گھر پہنچتے وقت ہر ایک خصوصی احتیاط کرے۔ ادھر اُدھر گھومتے پھرتے پہنچے اور اچھی طرح اطمینان کرلے کہ اس کا تعاقب نہیں کیا جارہا۔ یہ محض اتفاق ہے کہ تمہارا نیا گھر ریڈ ڈاٹ کی باقیات کی نظر سے بچا ہوا ہے۔ اب اسے ان کی نظر سے بچا کر ہی رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ پھر بھی شاید زیادہ دیر تک نہ رہ سکے۔"

"دیکھا جائے گا" ٹونی بے پروائی سے کندھے اچکا کر بولا "بہرحال ہم لوگوں کی وہاں موجودگی کے دوران میں تو وہ ڈاکٹر برنارڈ کو وہاں سے نکال کر نہیں لے جاسکتے۔ خواہ وہ اپنی ساری سائنسی ایجادات بھی لے کر آجائیں۔ وہ جو کچھ بھی کرسکیں گے' ہماری لاشوں پر سے ہی گزر کر کرسکیں گے۔"

"میرا خیال ہے' اب سائنسی ایجادات ان کے پاس کوئی ایسی خاص نہیں رہیں۔ سب کچھ تباہ ہوچکا ہے۔" میں نے کہا "ورنہ دی لیڈی کا بات کرنے کا انداز کچھ اور ہوتا۔"

"اگر انہیں سائنسی ایجادات کی مدد حاصل نہیں ہے تب تو انہیں ہمارے قبضے سے کسی کو چھڑانے کے لیے چھوٹی موٹی فوج کی ضرورت ہوگی" ٹونی بولا۔

"میرا خیال ہے اب ان کے پاس زیادہ آدمی بھی نہیں ہیں" میں نے کہا "بہرحال بڑے بڑے خطرناک مقامی بدمعاشوں اور ہر شعبۂ زندگی کے دوسرے لوگوں کی خدمات انہیں پہلے بھی بڑے منظم انداز میں حاصل رہی ہیں۔ اب بھی کسی نہ کسی طرح کام تو چلا رہے ہوں گے۔"

ٹونی نے تفہیمی انداز میں سرہلایا اور موبائل فون پر ساتھیوں کو ہدایات دینے لگا۔ پھر ہم اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر الگ الگ راستوں سے ٹونی کے گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ طے یہی پایا تھا کہ ہم بھی ذرا اِدھر اُدھر گھومتے گھامتے ہی وہاں پہنچیں گے۔

مجھے راستے میں یقین ہوگیا کہ میرا تعاقب نہیں کیا جارہا تھا۔ تب میں نے ٹونی کے گھر کا رخ کیا۔ دی لیڈی کو غالباً اندازہ تھا کہ تعاقب وغیرہ فرسودہ طریقے تھے اور ہمارے معاملے میں اس سے کچھ حاصل ہونے کی امید نہیں تھی۔ تعاقب کے سلسلے میں ہم اکثر ہی ہوشیار رہتے تھے۔ اس میں تو الٹا کسی کو لینے کے دینے بھی پڑسکتے تھے یعنی تعاقب کرنے والا ہمارے ہتھے بھی چڑھ سکتا تھا۔ اس صورت میں اسے ہمارے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہونے کے بجائے شاید اپنے بارے میں بہت کچھ اگلنا پڑجاتا۔

میں اور ٹونی تقریباً ایک ساتھ ہی اس کے گھر پہنچے۔ ٹونی نے بھی یہی رپورٹ دی کہ اس کا تعاقب نہیں کیا گیا تھا۔ صفدر اور سلیمان وہاں پہلے سے موجود تھے اور چار دیواری کے اندر ہی رہتے ہوئے مستعدی سے گھر کی نگرانی کررہے تھے۔ کچھ دیر بعد شبیر شیخ اور سردار علی بھی آپہنچے۔ دو گارڈ پہلے ہی موجود تھے۔ سب نے حکمتِ عملی طے کرتے ہوئے مختلف جگہیں سنبھال لیں۔ ہمارے تین اور ساتھی منیر' مسعود اور احمد بھی پہنچنے والے تھے۔ اب یہ مکان گویا ایک مضبوط اور محفوظ قلعہ تھا۔

ہم جب تہ خانے میں پہنچے تو ڈاکٹر برنارڈ ایک ریوالونگ چیئر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ ہماری آمد پر چونکا اور ایک طویل جماہی لیتے ہوئے بولا "بھئی کہاں ہے وہ لڑکی؟ میں اس کے انتظار میں بوڑھا

ہورہا ہوں۔ حالانکہ میرا زندگی بھر بوڑھا ہونے کا پروگرام نہیں ہے۔"

"کیوں۔ کیا تم نے سدا بہار جوانی کا کوئی نسخہ بھی دریافت کرلیا ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"ہاں" اس نے اثبات میں سرہلایا "۔۔۔ اور اسے مذاق مت سمجھنا۔ سدا بہار جوانی کا نسخہ بھی میرے دریافت کردہ عجیب و غریب چٹکلوں میں سے ایک ہے۔ اگر میں صرف اسی کو دنیا بھر میں مارکیٹ کرنے کا بندوبست کرلوں تو ارب پتی ہوسکتا ہوں۔ ایسے کسی نسخے کی تلاش میں دنیا بھر کے مرد مارے مارے پھرتے ہیں۔"

پھر وہ پُرامید سے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا "تمہیں چاہیے؟ اب تم سے تعلقات کچھ دوستانہ سی شکل اختیار کررہے ہیں تو میں سوچ رہا ہوں کہ جاتے جاتے تمہیں کوئی تحفہ دے جاؤں۔"

"تم اپنا تحفہ اپنے پاس ہی رکھو" میں نے سخت لہجے میں کہا "ہم ابھی اصل کام بیچ میں لٹکا ہوا ہے اور تمہیں دائمی جوانی کے نسخے کی پڑی ہوئی ہے۔"

اس خبیث کا کوئی بھروسا نہیں تھا کہ جاتے جاتے دائمی جوانی کے نام پر کوئی ایسا تحفہ دے جاتا کہ انسان اپنی موجودہ جوانی کو بھی چراغ لے کر ڈھونڈتا پھرتا۔ ویسے بھی مجھے سدا بہار جوانی کی کوئی ایسی ہوس نہیں تھی۔ جب انسان کے ظاہری سراپا پر بالکل ہی زوال آجائے تو پھر جوانی کچھ بے میل سی چیز ہوجاتی ہے۔ بُری پیکنگ میں اچھا سامان کچھ ایسا اچھا بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ قدرت کا اپنا نظام بس جس طرح چل رہا تھا' اسی طرح ٹھیک تھا۔ اس میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے تھی۔

"کام بیچ میں تو تم نے لٹکایا ہوا ہے" ڈاکٹر برنارڈ بولا۔ "میری تو سب تیاریاں مکمل ہیں۔ تمام کیمیکل اور فلٹرز تیار ہیں۔ میں تو انتظار میں بیٹھا ہوا ہوں۔ لڑکی کہاں ہے؟ اب تو واقعی خود مجھے بھی اس پر ترس سا آنے لگا ہے۔ وہ بہت خوب صورت لڑکی ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر اپنا فارمولا آزما کر زیادتی کی تھی۔۔۔۔ چلو یہ بھی اچھا ہے کہ مجھے اپنی زیادتی کی تلافی کا موقع مل رہا ہے۔"

وہ واقعی ایک بدلا ہوا انسان لگ رہا تھا لیکن افسوس جب وہ بدلا تھا تو صورت حال بھی بدل گئی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ دی لیڈی نے ایک گھنٹے بعد فون کرنے کے لیے کہا تھا۔ ایک گھنٹا پورا ہونے میں ابھی چند منٹ باقی تھے۔

ڈاکٹر برنارڈ بولا "تم جیسا قدرناشناس آدمی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ میں کسی اور کو اپنا نسخہ دینے کی بات کرتا تو وہ خوشی سے اُچھل کر چھت سے جا ٹکراتا اور پھر میرے پیروں میں گر پڑتا۔۔۔۔ لیکن۔۔۔ خیر۔۔۔ دنیا ہر قسم کے بے ہودہ لوگوں سے بھری پڑی ہے۔ فی الحال اس معاملے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ لڑکی کہاں ہے؟ بلاؤ نا اسے۔"

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "افسوس کہ اب جب سب کچھ الٹ گیا ہے تو لڑکی نہیں آسکتی۔ البتہ تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ تمہیں کمک میسر آگئی ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ ذرا چونکا۔

"یہ کام ہوجانے کے بعد ویسے بھی ہمارا ارادہ تمہیں رہا کردینے کا ہی تھا۔ ہم نے تم سے جو وعدہ کیا تھا اسے صدق دل سے نبھانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن عین وقت پر تمہاری "دی لیڈی" نے ضروری مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے تمہاری مدد کو پہنچ گئی ہے۔ اس نے راحیلہ کو اغوا کرلیا ہے اور اسے چھوڑنے کے لیے اس نے شرط رکھی ہے کہ پہلے تمہیں رہا کیا جائے۔"

"دی لیڈی۔۔۔؟" ڈاکٹر برنارڈ نے بے یقینی سے دُہرایا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی "کیا اس نے واقعی راحیلہ کو اغوا کرلیا ہے؟ کیا دی لیڈی نے خود تم سے بات کی تھی؟" اس نے کچھ اس طرح یہ سوال کیا تھا جیسے دی لیڈی کا کسی سے بات کرنا اس شخص کے لیے ایک اعزاز ہو۔

"ہاں۔۔۔ اس نے خود مجھے شرفِ ہمکلامی بخشا تھا۔ کسی ترجمان کے توسط سے بات نہیں کی تھی" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

وہ میرے لہجے میں پنہاں طنز کو محسوس کرتے ہوئے بولا "اس میں طنز کی کوئی بات نہیں ہے۔ تم اسے اپنے لیے واقعی اعزاز سمجھو کہ دی لیڈی نے تم سے بات کی ہے۔ یہ وقت وقت کی بات ہے۔ ورنہ شاید تم کبھی اس کی آواز نہ سُن پاتے۔ ریڈ ڈاٹ کے خلاف اتنا بڑا آپریشن ہوا۔ ریڈ ڈاٹ تمہارے ملک میں عملاً ختم ہوگئی لیکن اس دوران میں "دی لیڈی" نے تم سے بات کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی" اس کے لہجے میں دی لیڈی کے لیے بے پناہ احترام اور عقیدت تھی۔

"تم تو کچھ اس طرح اس کا ذکر کررہے ہو جیسے وہ کسی ایسے ملک کی سربراہ ہے جو سپر پاورز میں شمار ہوتا ہے" میں نے جان بوجھ کر اب بھی اپنا لہجہ استہزائیہ ہی رکھا۔

"وہ تو خود اپنی جگہ ایک سپر پاور ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "تم اس سارے قضیے کے دوران میں اسے نہیں جان سکے شاید یہ تمہارے حق میں اچھا ہی ہوا۔ اگر کوئی مرد اس کے سحر میں گرفتار ہوجائے تو پھر وہ دیوانہ ہوکر ہی مرتا ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں دو تین مرتبہ دور سے اسے دیکھ چکا ہوں۔ تم خواہ مخواہ کسی ماہر داستان گو کی طرح میرے تجسس کو بھڑکانے کی کوشش مت کرو۔ میرا اس کے سحر میں گرفتار ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"جس دن تم نے اسے قریب سے۔۔۔۔ میرا مطلب ہے صحیح معنوں میں قریب سے دیکھ لیا اس دن یہ جملہ تمہاری زبان پر نہیں آسکے گا۔ وہ تمہیں مکھی بنا کر دیوار سے چپکا دے گی اور تم بجوں کی طرح پک جاؤ گے۔"

"او میرے خدا۔۔۔۔!" میں نے چھت کی طرف دیکھ کر ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرلیں "تم تو واقعی اس کی شان میں کوئی لمبا سا قصیدہ تخلیق کرنے کی فکر میں ہو۔ یہ سب بکواس تم ذاتی تجربے کی بنا پر کررہے ہو یا سنی سنائی باتیں ہیں؟"

"ہم جیسوں کی یہ مجال کہاں کہ اس سے ذرا بے تکلفی سے بات بھی کرسکیں۔ ہمارے لیے تو اس کی حیثیت تقریباً وہی ہے جو غلاموں کے لیے ملکہ کی۔۔۔۔ لیکن اس کے سحر میں الجھ کر میں نے تم سے کہیں زیادہ نادرِ روزگار قسم کی شخصیتوں کو یوں تباہ ہوتے دیکھا ہے جیسے پروانہ شمع کی طرف لپکتا ہے اور ایک لمحے میں خاک ہوجاتا ہے۔"

"بس۔۔۔ بس۔۔۔ ایسی شاعرانہ مثالیں مت دو۔ تم تو واقعی پوری طرح اس کا حق نمک ادا کرنے پر تلے ہوئے ہو" میں نے قدرے بیزاری سے کہا۔ "اسے شمع سے تشبیہ بھی مت دو۔ شمع تو شعلہ بردوش ہوتی ہے۔ دی لیڈی کو دیکھ کر تو گلیشیرز کا خیال آتا ہے۔ تاحدِ نظر پھیلا ہوا ایک برف زار۔۔۔۔؟"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔۔۔ نظر کا دھوکا ہے" وہ ہاتھ ہلا کر گویا میری کسی نادیدہ تحریر پر خط تنسیخ پھیرتے ہوئے بولا "بعض آتش فشاں بھی گلیشیرز کا لبادہ اوڑھے کھڑے ہوتے ہیں۔"

"تم اس کی شان میں شاعری ہی کیے جاؤ گے یا یہ بھی بتاؤ گے کہ وہ درحقیقت ہے کون؟" میں نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"وہ ریڈ ڈاٹ کی پاکستان میں ریزیڈنٹ ڈائریکٹر تھی۔۔۔۔ میرا مطلب ہے وہ تو اب بھی ریزیڈنٹ ڈائریکٹر ہے۔۔۔۔ لیکن ریڈ ڈاٹ کی مقامی شاخ ختم ہوچکی ہے۔ شاید اب اسے کہیں اور تعینات کردیا جائے گا۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔ خدایا۔۔۔!" میں نے طویل سانس لی "تم نے تو اس طرح طومار باندھ رکھا تھا جیسے دنیا کی کسی اہم ترین شخصیت کا ذکر کررہے ہو۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔ ریڈ ڈاٹ ایک بہت ترقی یافتہ اور بہت ہی جدید خطوط پر استوار "تنظیم" ہے۔ اسے تمام ترقی یافتہ سفید فام قوموں کی غیر رسمی پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ پھر بھی بنیادی طور پر تو اس کا کام پسماندہ اور ترقی پزیر ملکوں کی جڑیں مزید کھوکھلی کرنا۔ انہیں ہر وقت فتنہ و فساد اور عدم استحکام سے دوچار رکھنا۔ ان کے وسائل پر قبضہ کرنا اور رفتہ رفتہ انہیں غلام بنانا ہی ہے۔ اس لحاظ سے اسے ایک مکروہ تنظیم ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس کی کسی مقامی شاخ کی ریزیڈنٹ ڈائریکٹر ہونا کوئی ایسے فخر کی بات تو نہیں ہے۔"

"تمہاری نظر میں نہیں ہوگی۔ ہماری نظر میں تو ہے" وہ ڈھٹائی سے بولا۔

"اچھا خیر۔۔۔ اختلافی پہلو کو تو چھوڑ دو۔۔۔۔ ویسے بھی یہ کوئی بہت بڑا عہدہ تو نہیں ہے" میں نے اپنے لہجے سے قدرے حقارت کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"تمہیں اس کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے" وہ مبہم لہجے میں بولا۔

"میرے لیے یہ خوشی کا مقام ہے" میں نے کہا "میں اس کی اہمیت کا اندازہ کرنا بھی نہیں چاہتا۔ بہرحال یہ حیرت کی بات ہے کہ ریڈ ڈاٹ سے اتنے طویل تصادم یا دوستانہ ملاقاتوں کے دوران میں کبھی اس سے باقاعدہ سامنا نہیں ہوا۔ کبھی کوئی واسطہ نہیں پڑا۔"

"اس کا سامنے آنا ضروری نہیں تھا۔ اس وقت اس کی حیثیت واقعی ایک ملکہ کی تھی۔ بہرحال تمام کارروائیوں کو وہی کنٹرول کررہی تھی۔"

"تبھی ریڈ ڈاٹ کا بیڑا غرق ہوگیا" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"وہ ایک الگ کہانی ہے جس پر طویل بحث کی جاسکتی ہے" وہ بولا۔

"جس کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے" میں نے کہا "خیر۔۔۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ ریڈ ڈاٹ کا مرکزی سربراہ کون ہے؟ سب سے بڑا آدمی۔۔۔ بگ باس۔۔۔؟ یا وہ بھی کوئی عورت ہے؟"

"یہ کسی کو بھی معلوم نہیں۔ جتنے لوگ یہاں کی شاخ سے متعلق تھے' کم از کم انہیں تو معلوم نہیں تھا" اس نے جواب دیا۔

"بکواس مت کرو۔ تم جھوٹ بول رہے ہو" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"میں اب جھوٹ بولنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ تم ان باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ دی لیڈی نے تم سے کیا کہا؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔

"وہ چاہتی ہے کہ ہم تمہیں رہا کردیں۔ بعد میں وہ راحیلہ کو رہا کرے گی۔ اگر اس نے واقعی راحیلہ کو رہا کردیا تب بھی اس کا چہرہ ٹھیک کرانے کا معاملہ بیچ میں ہی رہ جائے گا۔ ساری جدوجہد بے کار چلی جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔

اسے گویا ہماری پریشانیوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ باچھیں کھلاتے ہوئے بولا۔ "میرے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ میرے سلسلے میں اس نے خود تم سے بات کی اور اس معاملے میں خود آگے آئی ہے۔ وہ بہت ہی اہم معاملات میں خود آگے آتی ہے۔ موجودہ حالات میں 'میں تنظیم کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہوں" وہ گویا فخر سے پھولا نہیں سما رہا تھا۔

"کیا کہنے اس اثاثے کے...!" میں نے اس کے سراپا کی طرف اشارہ کیا "ایسے ہوتے ہیں اثاثے؟ اس اثاثے نے کبھی آئینے میں شکل دیکھی ہے اپنی؟"

"خیر... میں برا نہیں مناؤں گا" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولا "یہ تو دراصل کھسیانی بلی کھمبا نوچ رہی ہے۔ یہ بتاؤ طے کیا پایا ہے؟"

"تمہاری ملکۂ عالیہ نے ایک گھنٹے بعد دوبارہ فون کرنے کے لیے کہا تھا۔ اب کسی بھی لمحے اس کا فون آنے والا ہوگا" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

ٹونی نے موبائل فون کو ایک اسٹینو سیٹ سے منسلک کردیا تھا تاکہ ہم تینوں دوسری طرف سے آنے والی آواز بیک وقت اسپیکر پر سن سکیں "تمہاری ملکۂ عالیہ تم سے بھی بات کرنا چاہتی ہیں" میں نے ڈاکٹر برنارڈ کو مطلع کیا۔ "مجھے اس سے تمہاری بات کرانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن ایک بات ذہن نشین کرلو کہ زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش مت کرنا۔ اگر تم نے کوئی بھی غیر ضروری بات کی یا کسی بھی بات سے ہمارے مفادات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو یہ بات یقینی ہوگی کہ آئندہ تم بات کرنے کے قابل نہیں رہوگے۔ میرا مطلب ہے' اس جہانِ فانی سے کوچ کرجاؤ گے۔ ویسے بائی دا وے.... تمہیں میری یہ "بات" کی تکرار کیسی لگی؟"

"بہت بری۔" اس نے بلا تامل جواب دیا "مجھے دھمکیاں دینے کی کوشش مت کرو۔ میں ایسی باتوں کا بہت برا مناتا ہوں۔ ویسے.... آپس کی بات ہے.... تم نے گو کہ میرا پاؤں جلا کر بہت برا کیا.... اس کے باوجود اب میں واقعی دل میں سوچ رہا تھا کہ مجھے اس لڑکی کا چہرہ ٹھیک کرہی دینا چاہیے۔ میں یہ کام اپنی خوشی سے کررہا تھا اور میرا اس میں گڑبڑ کرنے کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا.... لیکن بہرحال.... اب میں جو کچھ بھی کروں گا' دی لیڈی کی ہدایت کے مطابق کروں گا۔"

"چاہے تمہارا دوسرا پاؤں بھی جل جائے؟" میں نے پوچھا۔

"چاہے میں سارا ہی جل جاؤں" اس نے بے خوفی سے جواب دیا۔

میں نے چھت کی طرف دیکھ کر دوستانہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "واہ پیارے اللہ میاں! اس دنیا میں بعض بندے دوسرے بندوں کے حکم کے کتنے تابع ہیں.... لیکن آپ جو سب سے بڑے ہیں.... خالقِ کائنات ہیں.... آپ کا وہ ایک حکم بھی نہیں مانتے۔"

میں نے ہاتھ نیچے کرلیے اور ٹھنڈی سانس لے کر برنارڈ کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا "یہ تم نے کیا وعظ شروع کردیا تھا؟"

"گدھے کہیں کے! یہ وعظ نہیں تھا.... یہ تو بندوں کی بندہ پرستی پر ذرا حیرت کا اظہار تھا" میں نے ملامت سے کہا "خیر... یہ باتیں تو یونہی بیچ میں آجاتی ہیں۔ اصل اور اہم بات یہ ہے کہ ہم اور تمہاری وہ ملکۂ عالیہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ تم ہو تو کافی منحوس آدمی.... ریڈ ڈاٹ سے تعلق رکھنے والا ظاہر ہے کوئی اچھا آدمی تو نہیں ہوسکتا.... پھر بھی اگر ہوسکے تو اس معاملے میں کوئی اچھا کردار ادا کرنے کی کوشش کرنا کیونکہ اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔ ہم یہی چاہتے ہیں کہ تمہاری ہم سے اور ہماری تم سے جلد از جلد جان چھوٹ جائے لیکن مسئلہ یہی ہے کہ راحیلہ کا چہرہ تسلی بخش طور پر ٹھیک ہوئے بغیر ہم تمہیں نہیں چھوڑ سکتے۔ یہ کام نہایت پرسکون طریقے سے ہوجاتا' اگر تمہاری یہ ملکۂ عالیہ بیچ میں نہ کود پڑتیں۔"

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں" وہ دھیمے لہجے میں بولا "میں تمہاری نظر میں کتنا ہی منحوس آدمی سہی لیکن اس کام کے سلسلے میں میرا نحوست پھیلانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بہرحال صاف گوئی اور دیانت داری کی بات یہ ہے کہ اب میں وہی کروں گا جو دی لیڈی کا حکم ہوگا۔"

میں اسے گھور کر رہ گیا۔ میرے گھورنے کا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا اور پراشتیاق نظروں سے فون کو تکنے لگا۔ چند لمحے بعد گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اگر یہ دی لیڈی ہی کا فون تھا تو اس نے واقعی پابندیِ وقت کا مظاہرہ کیا تھا۔ ٹھیک ایک گھنٹے بعد فون کیا تھا۔

میں نے بٹن آن کیا۔ دوسری طرف دی لیڈی ہی تھی۔ نام وغیرہ کی تصدیق کے بعد اس نے پہلا سوال ڈاکٹر برنارڈ ہی کے بارے میں کیا "برنارڈ یہاں موجود ہے یا نہیں؟"

میرے جواب دینے کے بجائے برنارڈ خود ہی بول اٹھا "یس میڈم! میں یہاں موجود ہوں" اس کے لہجے سے عجیب بچگانہ سا اشتیاق عیاں تھا۔ عین ممکن ہے وہ مجنونانہ سا اشتیاق رہا ہو لیکن مجھے بچگانہ محسوس ہوا ہو۔ بعض لوگوں کی محبوبیت یا عاشقی میں بھی تو بچگانہ پن کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اگر میں اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ

رہا ہوتا اور کانوں سے نہ سن رہا ہوتا تو شاید مجھے یقین نہ آتا کہ طب اور سائنس کا ایک ایسا جینیئس کچھ لوگوں کے ہاتھوں کھلونا بنا رہتا ہوگا اور اس میں اس کی خوشی بھی شامل ہوتی ہوگی۔ بہرحال دنیا ایک عجائب خانہ تھی۔ لاکھوں سال سے مفکرین اور دانشور اسے سمجھنے کی کوشش کررہے تھے۔ ایک میں بے چارہ بھی اس شمار و قطار میں تھا۔

اسٹینو سیٹ کی وجہ سے ہم تینوں بیک وقت دی لیڈی کی آواز سن رہے تھے اور سیٹ ہاتھ میں لینے کی زحمت کیے بغیر اس سے بات بھی کرسکتے تھے۔ یہ گویا چار افراد کے درمیان کانفرنس شروع ہورہی تھی جن میں سے ایک نہ جانے کہاں تھی۔

"برنارڈ! انہوں نے تم پر تشدد تو نہیں کیا؟" دی لیڈی نے سخت لہجے میں پوچھا۔

برنارڈ نے باری باری میری اور ٹونی کی طرف دیکھا پھر یکدم غیر ارادی سے انداز میں بول اٹھا "میڈم! انہوں نے میرا پاؤں ہیٹر سے جلایا تھا۔"

"کوئی بات نہیں.... ہم راحیلہ کے دونوں پاؤں ہیٹر سے جلادیں گے" دی لیڈی سفاک لہجے میں بولی "میں دیکھ چکی ہوں' اس کے پاؤں بڑے خوب صورت ہیں۔ جل کر جب وہ مڑی تڑی شکل اختیار کریں گے تو تمہارا حساب برابر ہوجائے گا۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔ افضل! تم سن رہے ہونا؟"

میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ مجھے معلوم تھا وہ صرف مجھے سنانے کے لیے یہ بات نہیں کررہی تھی۔ میں نے اپنے لہجے کو پرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "معاملات کو مزید پیچیدہ مت بناؤ دی لیڈی! ہم قطعاً تشدد پسند لوگ نہیں ہیں۔ ہم نے محض لطف اندوز ہونے کے لیے برنارڈ کا پاؤں نہیں جلایا تھا اور نہ ہی اس سے کوئی ناجائز مطالبہ یا ایسی فرمائش کررہے تھے جسے پورا کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ راحیلہ کا چہرہ اسی نے خراب کیا تھا اور یہ اسے ٹھیک بھی کرسکتا تھا۔ ہم اس سے صرف یہی مطالبہ کررہے تھے۔ اس میں کون سی ایسی ناجائز بات تھی؟ مگر یہ کسی طرح مان کر ہی نہیں دے رہا تھا اور یادداشت کھوجانے کی اداکاری کرنے پر تلا ہوا تھا۔ ہم نے جو کچھ کیا' بادلِ ناخواستہ اور بڑی مجبوری کے عالم میں کیا۔ ہمیں اس پر قطعاً خوشی نہیں ہے۔ اگر اس نے جلدی وہ کام کردیا ہوتا تو شاید مسئلہ یہ رخ ہی اختیار نہ کرتا اور اس وقت اس کی رہائی قریب ہوتی۔ اس سے پوچھ لو کہ جب سے اس نے اپنی ہی کی ہوئی اس حرکت کی تلافی کا وعدہ کیا ہے' کیا اس کے بعد سے اسے کوئی تکلیف پہنچی ہے؟ اسے اس کے سوختہ پاؤں کے علاج کے لیے ہر سہولت فراہم کی جارہی ہے۔ یہ خود اپنا علاج کررہا ہے۔ اس سیاق و سباق کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اسے ظلم نہیں کہا جاسکتا۔"

دی لیڈی غالباً سمجھ چکی تھی کہ ہم بیک وقت اس کی آواز سن رہے تھے۔ وہ برنارڈ سے مخاطب ہوئی "کیا افضل ٹھیک کہہ رہا ہے برنارڈ؟"

"ٹھیک تو کہہ رہا ہے.... لیکن پھر بھی انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا..." برنارڈ نے جواب دیا۔ یہ عجیب منطق تھی۔ اس کا لہجہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے گلی کوچے میں کوئی بچہ اپنے ہم عصروں سے لڑ بھڑ کر مار کھاچکا ہو اور اوپر سے اس کی ماں آگئی ہو۔ وہ اس کے سامنے رو رو کر اپنے اوپر ہونے والے مظالم بیان کررہا ہو اور جب اس کی ماں نے تصدیق کرنے کی کوشش کی ہو کہ اس کا بھی کوئی قصور تو نہیں تھا.... تو وہ شکوہ آمیز انداز میں کہہ رہا ہو۔ "اگر میرا قصور تھا تب بھی تمہیں تو میری حمایت کرنی چاہیے۔ تم تو میری ماں ہو۔"

فرق صرف یہ تھا کہ دی لیڈی اس کی ماں نہیں تھی۔

میں نے دی لیڈی کو مخاطب کیا "میری تم سے درخواست ہے کہ نئے جھگڑوں میں الجھنے اور نئی بحث چھیڑنے کے بجائے اصل مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرو۔ یہ یاد رکھنا کہ اگر راحیلہ کو کچھ ہوا تو ہم اس کی بازیابی یا اس کا چہرہ ٹھیک کرانے کے معاملے میں صبر کرلیں گے۔ ہم اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں گے لیکن ڈاکٹر

برنارڈ کی لاش کے ٹکڑے تمہیں کسی ویران سڑک پر مل جائیں گے۔"

"مجھے دھمکیاں مت دو ہنی!" دی لیڈی نے گویا مجھے پچکارا لیکن اس مشفقانہ لہجے میں درحقیقت خنجر کی سی کاٹ پنہاں تھی۔

"تم بھی راحیلہ کو کوئی اذیت دینے کا خیال دل سے نکال دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے" میں نے مضبوط لہجے میں کہا "وہ بغیر کسی قصور کے پہلے ہی کافی سزا بھگت چکی ہے۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہی تو میں نے تیزی سے کہا "ان فضول باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے کام کی بات کرو۔ میں ایک تجویز پیش کررہا ہوں۔ تمہیں منظور ہو تو اس میں دونوں کا بھلا ہے۔ میں راحیلہ کے بدلے اپنا عزیز ترین ساتھی ضمانت کے طور پر تمہاری تحویل میں دے دیتا ہوں۔ تم راحیلہ کو چھوڑ دو۔ راحیلہ کا چہرہ ٹھیک ہونے اور ایک ہفتہ گزرنے کے بعد میں برنارڈ کو چھوڑ دوں گا۔ اس کے بدلے تم میرے ساتھی کو چھوڑ دینا۔ دونوں مرتبہ تبادلے آمنے سامنے اور بیک وقت عمل میں آئیں گے۔ اگر ہم میں سے کوئی بھی زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہ کرے اور شرافت سے اس تجویز پر عمل کرے تو ایک دوسرے پر تمام تر بے اعتباری کے باوجود یہ مسئلہ خوش اسلوبی سے حل ہوسکتا ہے۔"

وہ چند سیکنڈ خاموش رہی پھر اسپیکر پر اس کا ہنکارا اُبھرا "اس تجویز پر عمل درآمد کس طرح ہوگا؟"

"بالکل سیدھے سادے اور دیانت دارانہ طریقے سے" میں نے جواب دیا "جگہ تم تجویز کردینا۔ کوئی کھلا میدان یا ویران سڑک ہونی چاہیے جہاں ہم دور سے ایک دوسرے کو آتے دیکھ سکیں اور یہ بھی دیکھ سکیں کہ ایک دوسرے کے پیچھے مزید کچھ لوگ تو نہیں آرہے؟ تم بھی صرف ایک گاڑی لے کر آنا۔ ہم بھی صرف ایک گاڑی میں آئیں گے۔ میرے ساتھ ٹونی کے علاوہ دو آدمی اور ہوں گے۔ تم بھی اپنے ساتھ راحیلہ کے علاوہ دو آدمی لاسکتی ہو۔ ہمارے پاس ہتھیار ہوں گے۔ تم لوگ بھی ہتھیار لاسکتے ہو لیکن یہ محض ایک احتیاط ہوگی۔ تم اپنے آدمیوں کو یہ ہدایت کرکے ساتھ لانا کہ تمہارے حکم کے بغیر کوئی گولی نہیں چلائے گا اور میرے آدمی بھی میرے اس حکم کے پابند ہوں گے۔ ہم دونوں کو اپنے آپ سے یہ عہد کرکے چلنا ہوگا کہ کوئی گولی نہیں چلے گی ورنہ پھر یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ ہم میں سے کون زندہ بچے گا اور کون نہیں..... بلکہ یہ کہنا بھی مشکل ہوگا کہ کوئی بچے گا بھی یا نہیں۔ میرا خیال ہے ہم میں اتنی عقل تو موجود ہی ہے کہ ہم ایک بے فائدہ تصادم سے بچنے کی کوشش کریں۔ تم راحیلہ کو ہمارے حوالے کردینا۔ میں ٹونی کو ضمانت کے طور پر تمہارے سپرد کردوں گا۔ ٹھیک ایک ہفتے بعد اسی طرح پرامن اور پرسکون انداز میں ٹونی اور ڈاکٹر برنارڈ کا تبادلہ عمل میں آجائے گا۔"

وہ دھیرے سے ہنسی "بہت خوب..... بہت خوب۔ گویا گھٹیا قسم کے گروہ بازوں کی طرح "جنگی قیدیوں" کا تبادلہ عمل میں آئے گا! خیر..... منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے ہم بھی اسے ایک چھوٹا ایڈونچر سمجھ کر قبول تو کرسکتے ہیں لیکن مجھے ایک بار پھر سوچنے کے لیے تم سے کچھ مہلت لینا پڑے گی۔ میں پندرہ منٹ بعد ایک بار فون کروں گی۔ اگر ہمیں یہ تجویز منظور ہوئی تب بھی اس پر درآمد کل کسی وقت ہی ہوسکے گا۔ ہم دن کی روشنی میں ہی اس پر عمل درآمد کرنا پسند کریں گے۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں..... کیونکہ میری نیت صاف ہے۔ صرف تمہاری بے اعتباری کی وجہ سے یہ سارا تردد کرنا پڑرہا ہے" میں نے جلدی سے کہا۔

"بے اعتباری کا مسئلہ تو اس تجویز میں بھی حائل ہورہا ہے لیکن بہرحال..... کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا" وہ بولی۔

"تبھی برف پگھلے گی۔ تبھی گرہ کھلے گی" میں نے کہا۔

"میں پندرہ منٹ بعد تمہیں دوبارہ فون کروں گی..... اور ڈاکٹر برنارڈ! تمہارا کیا موڈ ہے؟ تم اس لڑکی کا چہرہ ٹھیک کرنا چاہتے ہو یا نہیں؟"

"جیسے آپ کا حکم ہو میڈم!" برنارڈ کچھ اس طرح مؤدب ہوکر بولا جیسے وہ اپنی ملکۂ عالیہ کی آواز محض فون پر نہ سن رہا ہو بلکہ باقاعدہ اس کے دربار میں حاضر ہو۔ حتیٰ کہ اس کا سر بھی جھکا ہوا تھا گویا نظر اٹھا کر دیکھنے پر اسے گستاخی کا مرتکب ہوجانے کا اندیشہ ہو۔

"اس معاملے میں تمہاری اپنی رائے کو بھی اہمیت دی جائے گی۔ ان لوگوں کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ انہوں نے تم سے تمہاری مرضی کے خلاف بھی کام لے لیا تھا" دی لیڈی اپنے لہجے سے اپنے آپ کو واقعی کوئی ملکہ ہی ثابت کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

"اب تو آپ سے رابطہ ہوگیا ہے..... اب کوئی مجھ سے میری مرضی..... یا آپ کی مرضی کے خلاف کام نہیں لے سکتا" برنارڈ کے لہجے میں ایک لمحے کے لیے فخر جھلک آیا لیکن پھر وہ گویا ہچکچاتے..... بلکہ ڈرتے ہوئے بولا "ویسے میرا خیال تو یہی تھا کہ کام کرہی دیا جائے۔ تمام تیاریاں مکمل ہیں..... اور پھر ہم لوگوں کو جانا بھی ہے..... اب کوئی رخنہ نہ پڑے تو اچھا ہے۔ بہرحال۔ آخری حکم تو آپ کا ہی چلے گا..... ہمیں وہی کرنا چاہیے جو آپ مناسب سمجھتی ہوں۔"

وہ تقریباً گھگھیا رہا تھا اور مجھے اتنے تیز و طرار اور شاطر انسان کو گھگھیاتے دیکھ کر واقعی حیرت ہورہی تھی۔

"ٹھیک ہے..... میں پندرہ منٹ بعد پھر فون کروں گی" دی لیڈی نے کہا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس معاملے میں کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے کسی سے مشورہ کررہی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ

ہدایات بیرون ملک سے آرہی ہوں۔ ڈاکٹر برنارڈ سے اس سلسلے میں کچھ پوچھنا فضول تھا۔

دی لیڈی سے بات کرنے کے بعد برنارڈ کے چہرے پر بشاشت آگئی تھی۔ اس کا گویا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔ اس کی رنگت گوکہ اب بھی کالی ہی تھی۔ اس کے باوجود اس کی شگفتگی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس نے اپنے اوپر جو سیاہ رنگ چڑھایا ہوا تھا وہ اس کے حساب سے "کچا" تھا۔ گوکہ ویسے تو وہ بھی کسی چیز سے اُتر نہیں سکتا تھا لیکن جب وہ چاہتا تو پانی میں محض ایک کیمیکل گھول کر نہانے سے اسے اُتار سکتا تھا۔ یعنی وہ باتھ روم میں جاتا تو سیاہ فام ہوتا۔ باہر آتا تو سفید فام ہوتا۔ کمبخت نے عجیب فارمولے تیار کر رکھے تھے۔ انسانوں کو کچا یا پکا رنگنا کپڑوں کو رنگنے کے برابر بنالیا تھا۔

"اب ہمیں تمہاری ملکۂ عالیہ کے فون کے لیے مزید پندرہ منٹ انتظار کرنا پڑے گا" میں نے ناگواری سے کہا۔

ڈاکٹر برنارڈ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اب وہ گویا میری حالت سے محظوظ ہونے کی پوزیشن میں آگیا تھا "پھنسے تم خوب ہو.....!" وہ چہکا "دی لیڈی نے تمہاری دُکھتی رگ پکڑی ہے۔ اب کیسے شریفانہ معاہدوں کی پیشکش کرنے پر اتر آئے ہو ورنہ تم ایسی شریفانہ تجویزیں پیش کرنے والے کہاں تھے!"

"میں نے تو پہلے بھی بہت سی شریفانہ تجاویز پیش کی تھیں جن کا تمہیں علم نہیں ہے دو ٹانگوں والے کیکڑے!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مگر ریڈ ڈاٹ کو وہ تجاویز سننے کی فرصت کہاں تھی۔ سب سے شریفانہ تجویز تو یہی تھی کہ وہ اپنے تمام "خبیثانہ" پروگرام سمیت کرہ ارض سے دفعان ہوجاتی تو اس کا اور ہمارا کوئی جھگڑا نہیں تھا لیکن وہ مجھے اور میری تجاویز کو خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ پہلے انہوں نے مجھے اپنا آلۂ کار بنانے کے لیے سر پر بٹھالیا اور میرے مسلسل انکار کے بعد مجھے اپنا سب سے بڑا معتوب قرار دے دیا۔"

"یہ سب کچھ مجھے معلوم ہے۔ میں اس کھیل کا ایک حصہ تھا" برنارڈ بولا۔

"تمہارے اس منحوس کھیل نے کتنی تباہی پھیلائی" میں نے نفرت سے کہا۔

وہ ایک بار پھر ہنسا۔ اب تو وہ اپنے پاؤں کی تکلیف بھی بھول چکا تھا "ابھی تو تم سستے چھوٹ گئے ہو۔ جو کچھ آگے چل کر ہونا تھا اس کے مقابلے میں تو یہ تباہی کچھ بھی نہیں تھی۔"

میں نے اسے گھورا۔ وہ اپنی ٹیڑھی میڑھی استخوانی سی انگلیوں سے میز کھٹکھٹاتے ہوئے کچھ گنگنانے لگا۔ میں نے ٹونی کی طرف دیکھا۔ وہ نہایت پرسکون انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

پندرہ منٹ بھی آخر کار کسی نہ کسی طرح گزر ہی گئے۔ ٹھیک پندرہ منٹ بعد ایک بار پھر فون کی گھنٹی بجی۔ دی لیڈی کی آواز ایک بار پھر میرے اعصاب میں ارتعاش سا پیدا کرنے لگی۔

"..... ٹھیک ہے۔ ہمیں تمہاری تجویز منظور ہے" وہ کہہ رہی تھی۔ "تفصیلات ہم صبح طے کریں گے۔ ہم اسے ایک چھوٹا سا ایڈونچر سمجھ کر قبول کررہے ہیں لیکن تم اس میں کوئی جُوا کھیلنے کی کوشش نہ کرنا۔"

"ہرگز نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں" میں نے ایک بار پھر اسے یقین دلانے کی کوشش کی۔

اس نے خدا حافظ کے بغیر سلسلہ منقطع کردیا۔ اس کا اندازِ گفتگو نہایت کاروباری تھا۔ وہ فضول باتوں میں ذرا بھی وقت ضائع نہیں کرتی تھی۔ اس نے کل فون کرنے کا کوئی وقت نہیں بتایا تھا۔ وہ یقیناً احتیاط برت رہی تھی اور پروگرام اچانک بتانا چاہتی تھی۔

میں نے ٹونی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب ہمیں صرف انتظار کرنا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں کھانا کھا کر سوجانا چاہیے اور علی الصباح اٹھ کر تیار رہنا چاہیے۔ کل کسی وقت بھی دی لیڈی کی طرف سے بُلاوا آسکتا ہے۔ یہ تجویز تمہاری ہے۔ ایک بار پھر اس کے بارے میں سوچ لو۔"

"اب کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں سر!" ٹونی مسکراتے ہوئے بولا "خوشی کی بات یہ ہے کہ ہماری منشا کے مطابق معاملہ طے پاگیا۔ اس میں زیادہ خطرات پوشیدہ نہیں ہیں ورنہ میں تو اس کی بتائی ہوئی جگہ پر تنہا اور نہتا جانے کے لیے بھی تیار تھا۔"

"ٹونی! تم مجھے اتنا زیر بار نہ کرو کہ میں بالکل ہی سر نہ اٹھا سکوں۔" مجھے خود اپنا لہجہ عجیب سا محسوس ہوا۔

"سر! آپ کیسی باتیں کررہے ہیں۔ ہم تو جان دے کر بھی آپ کو زیر بار نہیں کرسکتے کیونکہ آپ سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی تو شاید یہ جان بھی کسی پولیس مقابلے میں جاچکی ہوتی۔ یہ سارا ٹھاٹ باٹ..... معاشرے میں یہ عزت آپ ہی کی وجہ سے ہے ورنہ اگر ہم زندہ بچ بھی گئے ہوتے تو شاید آج بھی گولیوں سے بچتے بچاتے، جنگلوں ہی میں بھٹک رہے ہوتے۔" وہ دھیمی آواز میں کہتا چلا گیا۔

"گڑے مُردے مت اکھاڑا کرو" میں نے اسے ڈانٹا۔

پھر ہمیں کل کی مہم پر ساتھ لے جانے کے لیے دو ساتھیوں کے انتخاب کا مرحلہ درپیش ہوا۔ ڈاکٹر برنارڈ بڑے غور سے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کی معلومات میں اضافہ ہورہا تھا۔ اس لیے ہم تہ خانے سے نکل آئے۔ اوپر آکر ہم نے فیصلہ کیا کہ کل شبیر شیخ اور سردار علی کو ساتھ لے جایا جائے گا۔ ہمارے ساتھیوں میں ٹونی اور شفیع شاہ کے بعد وہی سب سے زیادہ باصلاحیت تھے۔ عمر میں گوکہ وہ ٹونی اور شفیع شاہ سے کچھ بڑے تھے لیکن صلاحیتوں، تجربے اور مشاقی و مہارت میں ان سے ذرا پیچھے تھے۔ ٹونی اور شفیع شاہ تو بڑے ہی باکمال اور بے مثال نوجوان تھے۔

یہ فیصلہ ہوجانے اور ان دونوں کو صورتِ حال سمجھانے کے

بعد میں کھانا کھا کر کافی اطمینان کے عالم میں سو گیا۔ صبح الارم نے مجھے جگایا اور میں خاصی پھرتی سے تیار ہو کر ناشتے کی میز پر پہنچ گیا۔ وہاں ٹونی، شبیر شیخ اور سردار علی پہلے سے موجود تھے اور میرے ہی منتظر تھے۔ ٹونی اور سردار علی بے فکری سے کچھ ہنسی مذاق کر رہے تھے جبکہ شبیر شیخ خاموشی سے اپنی گھنی اور بارعب مونچھوں کو پرخیال انداز میں بل دے رہا تھا۔ ٹونی کو دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ نوجوان اپنے آپ کو ایک ایسی تنظیم کی سربراہ کے پاس بطور یرغمال جانے کے لیے پیش کر چکا تھا جس کے ساتھ ہم نے ایک طویل عرصے تک زندگی اور موت کی جنگ لڑی تھی۔

میرے پہنچتے ہی ناشتا میز پر لگا دیا گیا۔ ہ ے بعد باقی ساتھیوں کو ناشتا کرنا تھا۔ فی الحال وہ چاروں طرف سے مکان کی نگرانی کر رہے تھے۔ ناشتے کے بعد ہم نے اپنی گنیں وغیرہ چیک کیں۔ ہم کسی بھی لمحے چلنے کے لیے تیار تھے۔

ہمارا انتظار طویل ثابت نہیں ہوا۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ ٹونی نے اسے بدستور اسٹینو سیٹ سے منسلک کیا ہوا تھا۔ دوسری طرف دی لیڈی ہی تھی۔ مجھے پہلے ہی توقع تھی کہ وہ صبح جلدی فون کرے گی۔

میری آواز سن کر وہ بولی ”افق پر سورج نمودار ہو چکا ہے اور اس کی کندنی کرنیں میدانوں، کھیتوں اور سبزہ زاروں کو جگمگا رہی ہیں۔ پھولوں کے رخساروں پر ابھی شبنم تھرتھرا رہی ہے لیکن پرندے کب سے رزق کی تلاش میں گھونسلوں سے نکل چکے ہیں.....“

”یہ تم شاعری کر رہی ہو یا پھر موسم کی کوئی ذرا بہتر قسم کی کمنٹری تمہارے ہاتھ لگ گئی ہے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”میں نہ تو کبھی شاعری میں الجھتی ہوں اور نہ ہی شاعروں میں“ اس نے جواب دیا ”موسم کی کمنٹری سے بھی مجھے کبھی دلچسپی نہیں رہی۔ ہم تو ان لوگوں میں سے ہیں جنھوں نے موسموں کو بھی اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کا عزم کیا ہوا ہے۔“

”تو پھر اس لفاظی کا مطلب؟“ میں نے پوچھا حالانکہ میں مطلب خوب سمجھ رہا تھا۔

”مطلب یہ کہ تم بھی اپنے گھونسلے سے نکلنے کے لیے فوراً تیار ہو جاؤ“ وہ بولی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ ہم تو پہلے ہی تیار بیٹھے ہوئے تھے۔

”تیار ہونے کے بعد کیا کریں؟“ میں نے پوچھا۔

”شالامار لنک روڈ پر پہنچ جاؤ اور باٹا پور سے ایک میل آگے نکلنے کے بعد رک جاؤ۔ ہماری گاڑی وہاں پہلے سے موجود ہوگی یا چند [illegible] پہنچ جائے گی۔ تمہیں ٹھیک آٹھ بجے وہاں ہونا چاہیے اور [illegible] طرف رکنا چاہیے۔ ہم سرخ رنگ کی بڑی لینڈ روور [illegible] کے شیشے رنگین ہوں گے۔ تمہاری گاڑی کون سی ہوگی؟“

”ہم سیاہ مرسیڈیز میں ہوں گے۔ اس کے شیشے بھی رنگین ہوں گے“ میں نے جواب دیا۔

”بہت خوب“ وہ ہنسی ”گویا دونوں ہی کے لیے اندازہ کرنا مشکل ہوگا کہ گاڑی میں درحقیقت کتنے لوگ آ رہے ہیں۔ خیر کوئی بات نہیں..... کبھی کبھی بلائنڈ بھی کھیلنا چاہیے۔ ہماری گاڑی مذکورہ مقام پر تمہارے سامنے کی سمت میں پہلے سے کھڑی ہوگی یا اسی طرف سے آ رہی ہوگی۔ تمہارے آگے پیچھے دور دور تک کوئی گاڑی نہیں ہونی چاہیے ورنہ لینڈ روور واپسی کے لیے مڑ جائے گی۔“

”یہ کیسے ممکن ہے.....“ میں نے فوراً قدرے تشویش سے کہا ”اپنی دانست میں تم نے ایک سنسان سڑک کا انتخاب کیا ہے اور وقت بھی ایسا ہے..... اس کے باوجود ہو سکتا ہے اتفاقاً کوئی گاڑی ہماری گاڑی کے آگے یا پیچھے آ رہی ہو۔“

”اس صورت میں تم اپنی گاڑی سڑک کے ایک طرف روک لو گے اور اسے گزر جانے کا موقع دو گے۔ جب وہ کافی دور نکل جائے تب تم دوبارہ آگے بڑھو گے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ وہ گاڑی تمہارے ساتھ نہیں ہے۔ اس ہدایت پر تمہیں ہر صورت میں عمل کرنا ہے۔ خواہ ہماری گاڑی نظر آ رہی ہو یا نہیں۔“

”بہت بہتر۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا۔

”تمہاری گاڑی سے سب سے پہلے ٹونی اترے گا اور وہ چند قدم آگے آ جائے گا۔ ہماری گاڑی سے سب سے پہلے راحیلہ کو اتارا جائے گا اور وہ بھی چند قدم آگے آ جائے گی۔ پھر تم اپنی گاڑی سے اترو گے اور ذرا پیچھے ہی رہو گے۔ اس کے بعد میں اتروں گی......“

”اس تبادلے کے لیے تم خود آ رہی ہو؟“ میں نے تصدیق چاہی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس کی امید ذرا کم ہی تھی۔

”ہاں..... مجھے خود ہی آنا پڑے گا۔“ اس نے ٹھنڈی سانس لی اور ایک لمحے کے توقف سے بولی ”ہم دونوں کے مسلح ساتھی اپنی اپنی گاڑی میں ہی رہیں گے۔ یہ خیال رکھنا کہ اس وقت کئی انگلیاں ٹریگرز پر ہوں گی۔ کوئی ذرا سی غلطی..... یا ہوشیاری دکھانے کی کوئی معمولی سی کوشش کم از کم چار افراد کی ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔“

”یعنی میں..... تم..... ٹونی اور راحیلہ؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”ہاں..... اور عین ممکن ہے دونوں گروپوں کے تمام افراد ہی بیک وقت ایک دوسرے کو ہلاک کر بیٹھیں۔ اس لیے معاہدے پر عمل کرنے میں ہی دونوں کا فائدہ ہے۔“ اس نے گویا تنبیہ کی۔

”ہم اتنے احمق نہیں ہیں کہ اپنے ہی تجویز کردہ معاہدے کو سبوتاژ کریں۔“ میں نے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

”ٹھیک ہے..... تو پھر تم روانہ ہونے کی تیاری کرو۔ کوئی بات.....؟“

”کیا راحیلہ اس وقت بھی تمہارے آس پاس ہی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔ وہ کسی اور جگہ ہے۔ میں کسی اور جگہ سے بول رہی ہوں۔“ اس نے ملائمت سے جواب دیا۔

”اچھا..... آٹھ بجے ملاقات ہوگی۔“ میں نے کہا۔

اس بار اس نے خدا حافظ کہنے کا تکلف کر لیا۔ اس کا لہجہ بھی نا زیادہ سپاٹ اور خالص کاروباری نہیں رہا تھا۔ سلسلہ منقطع ہوا تو میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے اپنی اپنی گھڑی دیکھی۔ ٹونی بولا ”ہم تو کچھ دیر بعد بھی روانہ ہوں تو آرام سے صحیح وقت پر پہنچ سکتے ہیں۔“

ہم پندرہ منٹ بعد روانہ ہوئے۔ اس دوران سردار علی نے یہ تجویز بھی پیش کی کہ موقع کو غنیمت جانتے ہوئے ہم انہیں ہلاک کرنے یا قابو میں کرنے کی حکمتِ عملی تیار کرنے کے بارے میں غور کریں لیکن میں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ میرا اندازہ تھا کہ ریڈ ڈاٹ سے اصل تعلق رکھنے والے شاید دو چار افراد ہی باقی بچے ہوں گے اور ان کی بھی روانہ ہونے کی تیاریاں مکمل تھیں۔ ہمارا مقصد پُرامن طریقے سے پورا ہو رہا تھا تو ہمیں کوئی خطرناک قدم اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟

میں اپنے کسی بھی ساتھی کی جان داؤ پر لگانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ہمارا مقصد صرف یہی تھا کہ راحیلہ بہ خیریت واپس آ جائے، اس کا چہرہ ٹھیک ہو جائے اور ریڈ ڈاٹ کے بچے کھچے لوگ اس ملک کی جان چھوڑ دیں۔ دوبارہ پاؤں جمانے کی کوشش نہ کریں۔ طے شدہ معاہدے پر عمل کرنے سے یہ تینوں مقاصد پورے ہو رہے تھے۔ دیگر تمام صورتوں میں خطرات ہی خطرات تھے۔ میں نے سردار علی کو نرمی سے سمجھا بجھا دیا۔

ہم باٹا پور پہنچے تو آٹھ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ ٹھیک آٹھ بجے مطلوبہ مقام پر پہنچنے کے لیے ضروری تھا کہ ہماری گاڑی رینگنے کی سی رفتار سے سفر کرتی۔ اس وقت باٹا پور سے آگے ٹریفک بالکل نہیں تھا۔ کسی زمانے میں تو باٹا پور تک پہنچنا بھی جوئے شیر لانے کے مترادف سمجھا جاتا تھا۔ راستے میں دونوں طرف ویرانی کا راج تھا لیکن اب لاہور کی آبادی بھی کراچی کی طرح پھیلتی ہوئی بہت دور تک آ گئی تھی۔ شہر ہر سمت میں بہت پھیل چکا تھا۔

ڈرائیونگ میں کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں صرف ایک بس باٹا پور سے آگے جاتی دکھائی دی۔ میرے خیال میں دی لیڈی اتنی احمق تو نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ سمجھ لیتی ہم بس ساتھ لے کر آ رہے ہوں گے۔ اس کے باوجود احتیاطاً میں نے گاڑی ایک طرف تقریباً روک لی اور بس کو بہت آگے نکل جانے کا موقع دیا۔ وہ دھوئیں کے مرغولے چھوڑتی جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

مطلوبہ مقام پر پہنچ کر میں نے دیکھا، سڑک کے دونوں طرف دور دور تک چٹیل میدان تھا۔ کہیں کہیں خاردار جنگلی جھاڑیاں سی دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں دور دور تک کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ انسان بھاگ کر جس کی آڑ میں چھپ سکتا۔ کہیں مورچہ بند نہیں ہوا جا سکتا تھا۔ کہیں کسی کو قبل از وقت نہیں چھپایا جا سکتا تھا۔ شاید اسی لیے اس جگہ کا انتخاب کیا گیا تھا۔

کسی سرخ لینڈ روور کا کہیں دور دور تک پتا نہیں تھا۔ میں نے گاڑی سڑک کے کنارے دی لیڈی کی بتائی ہوئی ایک نشانی کے قریب کھڑی کر دی تاہم انجن اسٹارٹ ہی رکھا۔ انجن کی ہلکی سی گھرگھراہٹ، ایئر کنڈیشنر کی سرسراہٹ میں مدغم تھی۔ اس خفیف آواز کے باوجود بوجھل سکوت کا احساس ہو رہا تھا۔

ایک منٹ بعد ہی بہت دور سڑک پر ایک سرخ کھلونا سا نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ وہ ایک سرخ لینڈ روور تھی جو تیزی سے قریب آتی چلی گئی۔ گاڑی کیا تھی گویا ایک خوبصورت عفریت تھا۔ اس کے شیشے تاریک تھے۔ اس کے عقب میں مجھے دور تک کوئی گاڑی نظر نہیں آئی اس لیے میں نے اپنا ہاتھ گیئر لیور سے ہٹا لیا تاہم انجن اسٹارٹ ہی رہنے دیا۔ شبیر شیخ اور سردار علی کی انگلیاں ہلکی مشین گنوں کے ٹریگرز پر تھیں۔ پچھلی دونوں کھڑکیوں کے شیشے تھوڑے تھوڑے نیچے کر لیے گئے تھے اور ان کے اوپر گنوں کی نالیں ٹکی ہوئی تھیں۔ لینڈ روور کے شیشوں پر دھوپ جھلملا رہی اور ان کے کناروں سے بھی مجھے ایک ایک گن کی نال جھانکتی دکھائی دی۔ لینڈ روور پر کوئی نمبر پلیٹ نہیں تھی اور وہ نہ جانے کہاں سے آ رہی تھی۔ شاید راستے میں اسے کہیں بھی کسی نے نہیں روکا تھا۔

قریب پہنچ کر لینڈ روور ہماری سائڈ پر ہی آ گئی اور چند گز دور ہماری گاڑی کے مقابل ایک دھچکے سے رک گئی۔ اس کا انجن بھی اسٹارٹ ہی رہا۔ فضا میں ایک عجیب سی کشیدگی تھی۔ شاید یہ بے اعتباری کی کشیدگی تھی۔

میں نے گویا اس کشیدگی کا حصار توڑنے میں پہل کرنے کی کوشش کی۔ میں نے ٹونی کو اشارہ کیا اور وہ دروازہ کھول کر دونوں

ہاتھ اُٹھائے گاڑی سے اُتر پڑا۔ وہ گویا گن گن کر آہستگی سے قدم اُٹھاتا آگے بڑھا۔

چار قدم آگے بڑھ کر وہ رک گیا۔ ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ لینڈ روور کا دروازہ کھلا اور اس نے راحیلہ کو اگل دیا۔ راحیلہ اپنا چھو چھپائے رکھنے کے لیے جو جتن کرتی تھی اس وقت ان کے لوازمات سے محروم تھی۔ اس کا برقع اور تاریک چشمہ اس کے پاس نہیں تھا اور آدھے سفید آدھے سیاہ چہرے کے ساتھ وہ کوئی پُراسرار مخلوق دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی آنکھوں پر البتہ تاریک چشمے کی جگہ سفید پٹی موجود تھی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے گھریلو سے سفید شلوار قمیص میں تھی جو کچھ میلا ہو چکا تھا۔ اسے اس کے گھر سے اغوا کیا گیا تھا۔ اس وقت وہ یقیناً چشمے اور برقعے کے بغیر تھی۔

اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور جب اس نے آگے بڑھنے کی کوشش کی تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس کے پیروں میں بھی ڈوری کی بندشیں تھیں لیکن ان میں اتنی ڈھیل چھوڑی گئی تھی کہ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھا سکتی تھی۔ دو تین چھوٹے چھوٹے قدم بڑھا کر وہ رک گئی۔ ٹونی کے اور اس کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔

تب میں گاڑی سے اُترا۔ میں نے بھی ہاتھ اوپر اٹھائے ہوئے تھے حالانکہ مجھے اس کی ہدایت نہیں کی گئی تھی لیکن میں اپنا رویہ زیادہ سے زیادہ صلح جویانہ ظاہر کرنا چاہتا تھا۔

میں راحیلہ کے قریب پہنچ کر رک گیا اور تب دی لیڈی گاڑی سے اُتری۔ اس کے انداز میں واقعی ایک ملکہ کی سی شان اور تمکنت تھی۔ اس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ ایک چپکیلی سی ڈھیلی ڈھالی اسپورٹس شرٹ اور نیوی بلیو جینز میں تھی۔ گلے میں نہ جانے کیوں اسکاؤٹس کی طرح ایک خوبصورت رومال جھول رہا تھا۔ اس کے خوبصورت، ریشمی اور سنہری تراشیدہ بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

آج میں پہلی بار اسے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک دراز قد عورت تھی لیکن لمبے قد نے اس کی نسوانی دلکشی کو متاثر نہیں کیا تھا۔ اس کی جسمانی ساخت غضب کی تھی۔ اس کی آنکھوں کا تاثر واقعی آہنی سا تھا۔ ان کے رنگ کا تعین کرنا مشکل تھا۔ ان آنکھوں سے وہ بھی بغور میرا جائزہ لے رہی تھی اور میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی نظریں میرے وجود کے پار ہوتی جا رہی تھیں۔

"اگر اجازت ہو تو میں راحیلہ کی بندشیں کھول دوں؟" میں نے بدستور پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھول دو۔" اس نے نہایت اختصار سے جواب دیا لیکن اس کی آواز وہی اعصاب سے چھیڑ چھاڑ کرنے والی تھی۔

میں نے سب سے پہلے راحیلہ کی آنکھوں سے پٹی کھولی۔ اس نے نہایت آہستگی سے چاروں طرف سر گھما کر گرد و پیش کا جائزہ لینے اور شاید صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھ میں برف زار سے پھیلے ہوئے تھے لیکن جب اس کی نظر ایک لمحے کے لیے دی لیڈی پر رُکی تو میں نے محسوس کیا کہ ان برف زاروں میں نفرت کی برق کوندی تھی۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہ دی لیڈی سے ہونے والے معاہدے سے بھی لاعلم تھی۔ شاید دی لیڈی نے اسے کچھ بتانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھوں کی بندشیں کھول کر زمین پر بیٹھ کر اس کے پاؤں بھی کھولے۔

دونوں گاڑیوں کے انجنوں کی خفیف سی گھرگھراہٹ کے باوجود فضا میں سکوت کا احساس اس قدر شدید تھا کہ پتا بھی گرتا تو شاید اس کی آواز الگ سے سنائی دیتی۔

بندشیں کھلنے کے بعد راحیلہ چند لمحے اپنی کلائیاں مسلتی رہی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ اچانک راحیلہ کسی ننجا کی طرح فضا میں اچھلی اور دوسرے ہی لمحے اس کی لات دی لیڈی کے منہ پر پڑی۔

دی لیڈی اپنی لینڈ روور کے دروازے سے ٹکرائی مگر صرف ایک لمحے کے لیے لڑکھڑائی تھی۔ اس نے راحیلہ کو دوسرا وار کرنے کی مہلت نہیں دی۔ اس کا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا لیکن راحیلہ کو اس کے وار سے بچانے کے لیے میں بیچ میں آگیا۔

دی لیڈی کی پوری کلائی کی ضرب میری گردن پر شانے کے قریب پڑی۔ میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ کسی عورت کی کلائی کی ضرب تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا تھا جیسے لوہے کی ایک ٹھوس سلاخ کسی طاقتور شخص نے پوری طاقت سے گھما کر رسید کی تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو اوندھے منہ زمین پر پایا۔ میں نے زندگی میں کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ کسی عورت کا وار یوں مجھے زمین چٹا سکتا تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے ناچ گئے تھے۔

دوسرے ہی لمحے فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ اس اندیشے سے گویا میری دھڑکنیں تھم گئیں کہ اب سب کچھ ختم ہونے کو تھا.....!

میری حالت اس قابل نہیں تھی کہ میں اُٹھنے کی کوشش کرتا لیکن میں کسی نہ کسی طرح اُٹھ کھڑا ہوا۔ صدمے اور اندیشے کبھی انسان کو ڈھا بھی دیتے ہیں۔ اس طرح گرا دیتے ہیں کہ وہ کبھی اٹھنے کے قابل نہیں رہتا لیکن یہی صدمے اور اندیشے کبھی انسان کو اُٹھا کر کھڑا بھی کر دیتے ہیں۔

میرے ساتھ اس وقت یہی ہوا تھا۔ اس وقت مجھے ہلاک کرنے کے لیے گولیوں کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے ہلاک کرنے کے لیے یہ احساس ہی کافی تھا کہ میں جس مسئلے کو حل کرنے کے لیے اتنی تگ و دو، اتنا جوڑ توڑ کر رہا تھا، محض راحیلہ کی ذرا سی بات کی وجہ سے اس کا حل ہونا تو ایک طرف رہ گیا تھا، الٹا اب جان کے لالے پڑ گئے تھے۔ نہ جانے کون کون ہلاک ہو چکا تھا اور مزید کون کون موت کے منہ میں جانے والا تھا۔

اس موقع پر میرا اُٹھ کھڑے ہونا بھی ایک حماقت ہی تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ گولیاں کہاں سے اور کس سمت میں چل رہی تھیں۔ وہ میرا لہو چاٹتی ہوئی بھی گزر سکتی تھیں اور میرے لیے ایک لمحے میں یہ قصہ ختم ہو سکتا تھا...... لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ ایسا نہیں ہوا۔

میرا اُٹھ کھڑے ہونا قطعی اضطراری تھا۔ اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔ میری آنکھوں کے سامنے اب بھی نیلے پیلے تارے ناچ رہے تھے اور مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میری یہ حالت ایک عورت کے بازو کی ضرب سے ہوئی تھی۔...... جبکہ وہ بازو دیکھنے میں کچھ ایسا غیر معمولی یا آہنی نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ محض ایک خوبصورت اور اسمارٹ عورت کا بظاہر نرم و نازک اور سڈول بازو تھا۔ وہ سرتاپا خوبصورت تھی اور یہ بازو بھی اس کی خوبصورتی کا ایک حصہ تھا لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اس خوبصورتی کے عقب میں ایسی طاقت، ایسی تباہ کاری کی صلاحیت پنہاں تھی۔

اس مختصر لمحے میں، میں یہ سوچے بغیر بھی نہیں رہ سکا کہ اگر یہ ضرب راحیلہ کو لگی ہوتی تو اس کا کیا حال ہوتا؟ بے شک وہ بھی مارشل آرٹس وغیرہ کی زبردست ماہر تھی اور اس کی قوتِ برداشت کا بھی جواب نہیں تھا جس کے مظاہرے میں بہت سے موقعوں پر دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود یہ تصوّر مجھے بے حد ہولناک محسوس ہوا۔

میں جب سیدھا کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا اور مجھے احساس ہوا کہ اس وقت تک کوئی گولی میرا لہو چاٹتی ہوئی نہیں گزری تھی تو یک لخت ہی جیسے میرے حواس ٹھکانے آ گئے۔ دی لیڈی کی ضرب نے گویا میرے وجود میں چھپی ہوئی تمام جانی انجانی طاقتوں کے سرچشمے کا مین سوئچ آف کر دیا تھا۔ میرے رگ و پے میں اندھیرا چھا گیا تھا اور تمام اعضا گویا حرکت بھی کرنے کے قابل نہیں رہے تھے لیکن اب جیسے وہ مین سوئچ دوبارہ آن ہو گیا تھا۔

تاریک وجود میں روشنی پھیل گئی تھی۔ آنکھوں کے سامنے منظر دوبارہ واضح ہو گیا تھا۔ اعصاب میں جھنجھناہٹ گو کہ باقی تھی لیکن اب میں دیکھنے، سوچنے سمجھنے اور کچھ کرنے کے قابل تھا۔ میرے حواس پر یہ قیامت گزرنے اور میرے سنبھلنے کے درمیان شاید مشکل سے تین چار سیکنڈ کا وقفہ حائل رہا ہو گا لیکن مجھے محسوس یہی ہوا تھا جیسے اس میں گھنٹوں لگ گئے تھے۔

سب سے پہلا احساس مجھے یہی ہوا تھا کہ فائرنگ نہیں ہو رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ محض ایک دو برسٹ ہی مارے گئے تھے اور دوسرے لمحے خاموشی چھا گئی تھی۔ یہ احساس خوش کُن بھی تھا اور ہولناک بھی۔ کیا دونوں فریق بیک وقت سنبھل گئے تھے اور انہوں نے فائرنگ کو غیر ضروری سمجھ کر ہاتھ روک لیا تھا...... یا پھر فائرنگ کرنے والوں کی دونوں طرف بیک وقت لاشیں گر چکی تھیں؟ اس سوال کا جواب خوش کن بھی ہو سکتا تھا اور ہولناک بھی۔

میں نے شاید سیکنڈ کے دسویں یا بیسویں حصے میں صورت حال کا جائزہ لے لیا۔ دونوں طرف گاڑیوں کی کھڑکیوں سے گنوں کی نالیں جھانک رہی تھیں اور کسی گاڑی کے شیشے ٹوٹے ہوئے دکھائی نہیں دیے تھے۔ گاڑیوں کے کسی اور حصے پر بھی گولی کا کوئی نشان نظر نہیں آیا تھا۔

اس کا مطلب تھا دونوں طرف کے آدمیوں نے عقلمندی کا

مظاہرہ کیا تھا اور صرف ہوائی فائرنگ کرکے صورتِ حال کو خراب ہونے سے بچانے کی کوشش کی تھی۔ انہیں اندازہ تھا کہ دونوں طرف کے "باس" شرافت اور امن وسکون سے معاملے کو نمٹانا چاہتے تھے۔ صرف راحیلہ کی غیر ضروری مستعدی نے صورت حال خراب کردی تھی۔

اس غیر ضروری مستعدی کا نتیجہ وہ خود بھی بھگت رہی تھی۔ میں نے دیکھا' وہ دونوں گاڑیوں کے درمیان کھلی جگہ میں زمین پر چت پڑی تھی اور دی لیڈی اس کے سینے پر سوار تھی۔ دی لیڈی نے اسے کچھ اسی طرح دبوچا ہوا تھا جیسے بلی نے چوہے کو۔ چوہا بے شک جسامت میں بلی کے تقریباً برابر ہی ہو لیکن وہ بہرحال چوہا ہوتا ہے۔ راحیلہ یقیناً چوہا تو نہیں تھی لیکن اس وقت دی لیڈی نے جس طرح اسے دبوچ رکھا تھا اس عالم میں وہ ایک بے بس چوہا ہی نظر آرہی تھی۔

دی لیڈی دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا دبا رہی تھی اور اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل آئی تھیں۔ دی لیڈی نہ جانے کس طرح اس پر سوار تھی اور دونوں ہاتھ مصروف ہونے کے باوجود اس نے نہ جانے کس طرح راحیلہ کو قابو میں کر رکھا تھا کہ اس کے سارے مارشل آرٹس وغیرہ دھرے رہ گئے تھے اور وہ اپنے آپ کو اس کی گرفت سے نکالنے کے لیے کچھ بھی کرتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ٹونی لینڈ روور کے خاصا قریب پہنچ چکا تھا اور دونوں ہاتھ اٹھائے ساکت کھڑا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے تھا۔ اگر وہ حرکت میں آتا تو شاید دونوں طرف سے گنیں شعلے اگلنے لگتیں...... اور اس بار شاید فائرنگ ہوائی نہ ہوتی۔ راحیلہ نے حماقت کرڈالی تھی لیکن وہ شاید کوئی حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا یا صورتِ حال زیادہ بگڑنے کی ذمے داری اپنے سر لینا نہیں چاہتا تھا۔

میرے ذہن میں کوندا سا لپکا۔ جس تیزی سے میں نے صورتِ حال کا جائزہ لیا تھا' اسی تیزی سے میں فیصلے پر بھی پہنچ گیا۔ جہاں طاقت کا استعمال فائدے کے بجائے نقصان پہنچائے وہاں طاقت استعمال کرنا حماقت ہوتا ہے۔ مجھے معلوم تھا اگر میں نے اندھا دھند حرکت کی تو دی لیڈی کے آدمی فوراً گولی چلادیں گے۔ اس کے ساتھ ہی دوسری طرف سے بھی گولیاں چلیں گی اور جو تباہی چند سیکنڈ پہلے ٹل گئی تھی' وہ اب آجائے گی۔

میں نے بلا تامل دونوں گاڑیوں کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے چلا کر انگریزی میں کہا "کوئی گولی نہ چلائے...... پلیز...... یہ مسئلہ دوستانہ ماحول میں طے ہوجائے گا۔"

اس وقت میں نے اس التجا میں کوئی عار محسوس نہیں کی تھی گو کہ مجھے یقین نہیں تھا' کوئی اس التجا پر کان دھرے گا تاہم میں نے آخری لفظ منہ سے نکلتے ہی تن بہ تقدیر ہو کر دی لیڈی کی طرف چھلانگ لگادی۔ اس دوران میں اس اندیشے سے گویا میری روح رکی ہوئی تھی کہ کسی بھی لمحے گولیاں میرے جسم کو چھلنی کرتی گزریں گی اور کم از کم میرے لیے یہ قصہ یہیں ختم ہوجائے گا...... مگر ایسا نہیں ہوا۔

میں بخیر وعافیت چھلانگ لگانے اور دی لیڈی کے قریب پہنچ جانے میں کامیاب ہوگیا۔ شاید دی لیڈی کے آدمیوں نے میری انتہائی عجلت میں کی گئی التجا کو بھی سمجھ لیا تھا' اس پر یقین کرلیا اور اسے شرفِ قبولیت بخش دیا تھا۔

میرا خیال ہے اس وقت راحیلہ کے لیے زندگی اور موت کے درمیان صرف چند سیکنڈ کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اس کی آنکھیں گویا حلقوں سے بالکل ہی باہر آگئی تھیں۔ آدھے سیاہ اور آدھے سفید چہرے پر نسیں بری طرح پھول کر نمایاں نظر آنے لگی تھیں اور سفید حصہ بھی تقریباً جامنی سا ہی ہوگیا تھا۔ زبان منہ سے باہر آگئی تھی اور منہ کھل کر رہ گیا تھا۔ اس وقت کوئی اسے دیکھ کر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی اس کا شمار نہایت حسین لڑکیوں میں ہوتا تھا۔

میں نے دی لیڈی کے دونوں بازو پکڑ کر پوری طاقت صرف کرتے ہوئے راحیلہ کی گردن اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس لمحے یہی محسوس ہوا جیسے میں عورت کے بازوؤں کو نہیں' فولاد کے دو مضبوط اور موٹے پائپوں کو ان کی جگہ سے ہلانے کی کوشش کررہا تھا جنہیں نٹ بولٹوں وغیرہ کی مدد سے راحیلہ کی گردن پر کس دیا گیا تھا۔

عجیب بات تھی کہ راحیلہ کو اس کے قابو میں آنے کے بعد کبھی موقع نہیں ملا تھا کہ وہ اسے اپنے اوپر سے اچھال کر پھینک سکتی حالانکہ وہ اتنی آسانی سے کسی شہ زور اور دنیا بھر کے داؤ پیچ کے ماہر کے بھی قابو میں آنے والی چیز نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں وہ چوہے کی طرح دبوچ لی گئی تھی۔ میں وہ منظر نہیں دیکھ سکا تھا مگر اب تو خیر اس میں جنبش کرنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ ممکن تھا کہ اس کے ہوش وحواس ہی جواب دے چکے ہوں۔

دی لیڈی نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بجلیاں کوندرہی تھیں اور اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت صحیح معنوں میں موت کی پیامبر لگ رہی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ راحیلہ کا گلا گھونٹتے گھونٹتے کہیں جھٹکا دے کر اس کی گردن ہی نہ توڑدے۔ اتنا مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ ان ہاتھوں کی گرفت میں آئی ہوئی کسی بھی چیز کا ٹوٹ جانا بعید از امکان نہیں تھا۔

مسئلہ یہ تھا کہ میں دی لیڈی پر حملہ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ زیادہ زور شور سے کوئی داؤ بھی نہیں آزما سکتا تھا۔ اس کے آدمی فوراً فائر کردیتے۔ میرے آدمی اس کا جواب دیتے اور دو طرفہ تصادم ہمارا مقدر ہوتا جس کے نتیجے میں نہ جانے کس کس کی لاشیں وہاں پڑی ہوتیں۔

بھی بات یہ تھی کہ اس عورت سے واسطہ پڑتا...... اور وہ بھی اس قسم کی صورت حال میں واسطہ پڑنا میری زندگی کا ایک کٹھن تجربہ تھا۔ مجھے دانتوں پسینے آگئے تھے...... اور عجیب بات یہ تھی کہ کہنے کو وہ محض ایک عورت تھی!

میں اس کے دونوں بازو پکڑ کر چوڑے کرنے کی کوشش کررہا تھا تاکہ راحیلہ کی گردن اس کی گرفت سے چھوٹ جائے لیکن چھوٹنا یا بازوؤں کا چوڑے ہونا تو درکنار' ان میں معمولی سا خم بھی نہیں آیا تھا۔ بس شاید اتنا سا ہی فرق پڑا تھا کہ راحیلہ کی گردن پر اس کے ہاتھوں کے آہنی شکنجے کا بڑھتا ہوا دباؤ رک گیا تھا۔

معلوم نہیں وہ بھی میری کوشش سے رکا تھا یا اس میں بھی دی لیڈی کی مرضی کو دخل تھا۔ اس کا چہرہ میرے چہرے سے دو چار انچ کے فاصلے پر ہی تھا۔ میں اس کی آتشیں سانسوں کی تپش اپنے چہرے پر محسوس کرسکتا تھا۔ کچھ دیر پہلے اس عورت کی آنکھوں میں برف زار پھیلے ہوئے تھے۔ بلکہ اس کی پوری شخصیت کا تاثر ہی برف زاروں جیسا تھا لیکن اب احساس ہورہا تھا کہ اس کے اندر تو آتش نشاں مقید تھے جو پھٹ پڑے تھے۔ وہ آگ اگل رہی تھی۔ شاید اس کے ہر مسام جاں سے تپش پھوٹ رہی تھی۔ اس وقت اس کی رسائی میں آنے والی کوئی بھی چیز' کوئی بھی شخص راکھ ہوسکتا تھا۔ میں نے اس سے پہلے شاید زندگی میں کبھی کسی عورت کو ایسی غضبناک' ایسی شعلۂ جوالہ نہیں دیکھا تھا۔

مگر جس لمحے میں نے اس کے بازو گرفت میں لیے تھے اور ان پر زور آزمائی شروع کی تھی' اس کی آنکھوں میں کوندتی ہوئی بجلیاں جیسے مدھم پڑگئی تھیں۔ ہم ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھے۔ پلک جھپکنا تو وہ گویا جانتی ہی نہیں تھی۔ مجھے یاد نہیں تھا کہ جب سے اس کا اور میرا سامنا ہوا تھا' میں نے اسے پلک جھپکتے دیکھا تھا۔ شاید اس وجہ سے اس کی آنکھیں اور بھی زیادہ آسیبی سی لگتی تھیں۔

ان آنکھوں میں غیظ وغضب کے ساتھ اب جو تاثر شامل ہوا تھا وہ تمسخر اور تضحیک کا تھا...... یا پھر شاید اسے ایک طرح کا چیلنج بھی کہا جاسکتا تھا۔ وہ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی تھی "اچھا...... !تو تمہارا خیال ہے کہ تم میرے بازوؤں پر زور آزمائی کرکے اپنی دوست کو میری گرفت سے چھڑالوگے؟ کیا اس سے پہلے تم نے کبھی شیرنی کے جبڑے سے اس کا شکار چھڑایا ہے؟ نہیں...... ؟ تو پھر اب کیوں اپنا وقت ضائع کرنے اور اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے آگئے ہو؟ شاید تمہیں اپنی طاقت پر بہت گھمنڈ ہے...... چلو کوئی بات نہیں...... زور آزمائی کرکے دیکھ لو...... اپنے دل کا ارمان نکال لو......"

میں اپنے بارے میں کبھی بھی خوش فہمی میں تو مبتلا نہیں رہا تھا لیکن زندگی میں بہت سے کٹھن مرحلے ضرور آئے تھے جب مسئلہ تمام تر طاقت کی آزمائش کا آن پڑا تھا اور گولی یا بندوق کہیں پیچھے رہ گئی تھی۔ ایسے موقعوں پر قدرت نے ہمیشہ مجھے سرخرو کیا تھا جس کی وجہ سے شاید بجا طور پر کبھی کبھی مجھے یہ احساس بھی ہوا تھا کہ میرے وجود میں ایک شہ زور چھپا ہوا تھا۔

کئی بار مجھ سے طاقت کے ناقابلِ یقین مظاہرے "سرزد" ہوئے تھے۔ اس کے باوجود میں نے اس نظریے کو بہرحال اپنی زندگی سے خارج نہیں کیا تھا کہ ہر سیر کے لیے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی سوا سیر موجود ہوتا ہے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے حصے میں وہ "سوا سیر" ایک سرو قد' خوبصورت اور اسمارٹ سفید فام عورت کے روپ میں آئے گا جو بظاہر بالکل نازک اندام نظر آتی ہوگی۔

میں نے پوری قوت صرف کرڈالی تھی۔ میرا خیال ہے اس وقت میرے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ رہا تھا کیونکہ میں اپنے آپ کو سر سے پاؤں تک بھیگا ہوا محسوس کررہا تھا مگر میں اس کے بازوؤں کو چوڑا کرنے میں ناکام رہا تھا۔ میں اس کے وار سے سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن شاید میری اصل طاقت سلب ہوچکی تھی۔ شاید میری وہ قوت عود کر نہیں آسکی تھی جس پر میں کچھ زیادہ ہی بھروسا کرنے لگا تھا۔

اس کی آنکھوں میں استہزائیہ رنگ گہرا ہوگیا۔ چیلنج گویا اور مضبوط ہوگیا۔ بے بسی سے میں نے اپنے آپ کو زمین میں گڑتے ہوئے محسوس کیا۔ اس لمحے میں نے صدقِ دل سے دعا کی۔ اسی سے مدد مانگی جو آڑے وقت میں ہم سب کو یاد آتا ہے۔ اس کے سوا شاید کوئی چارہ ہی نظر نہیں آیا تھا۔ مجھ جیسے لوگ جو ایک تو ویسے ہی بڑے گناہ گار ہوتے ہیں...... پھر انہیں اکثر آڑے وقت میں ہی اوپر والا یاد آتا ہے۔ مگر مالک کا کمال یہی ہے کہ سچے دل سے پکارو تو جیسے سب کچھ بھول بھال کر پھر نظرِ کرم کردیتا ہے۔ شاید شرط صرف خلوصِ دل کی ہے۔

میں نے کوئی لمبی چوڑی دعا نہیں کی تھی...... بلکہ سچ پوچھیے تو دعا ہی نہیں کی تھی۔ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ میں صرف دی لیڈی کی اس گرفت کو لمحہ بہ لمحہ سخت تر ہونے سے روکنے میں کامیاب ہوا تھا لیکن آثار بتا رہے تھے کہ میں اسے زیادہ دیر نہیں روک سکوں گا اور راحیلہ مزید بڑھتے ہوئے دباؤ کو چند لمحے بھی برداشت نہیں کرسکے گی۔

نازک لمحوں کی اس کشمکش میں بھلا میں دعا کیوں کر مانگ سکتا تھا؟ میں نے بس شاید ایک لمحے کے لیے اوپر والے کو یاد کیا تھا...... اور بس...... !لیکن اس ایک لمحے میں ہی ساری التجائیں سمٹی ہوئی تھیں۔ اس ایک لمحے میں ہی بے بسی کا سارا قصہ سمویا گیا تھا۔

اسی ایک لمحے میں دل کو نہ جانے کہاں سے بے پناہ تقویت مل گئی۔ ایک لمحہ پہلے جسم گرتی ہوئی عمارت کی طرح ہونے کو تھا مگر دوسرے ہی لمحے یوں سنبھل گیا جیسے اس عمارت کو ہزاروں نادیدہ ستونوں کا سہارا مل گیا ہو۔ میں نے دانت پر دانت جمائے۔ میرے گھٹنے زمین پر ٹکے ہوئے تھے۔ میں نے اتنی قوت صرف کی کہ مجھے

محسوس ہونے لگا' میرے گھٹنے زمین میں دھنسے جا رہے تھے۔

میں نہ صرف اس کے دونوں بازوؤں کو ایک دوسرے سے دور کرنے کے لیے زور لگا رہا تھا بلکہ میرے ہاتھ بھی اس کی کلائیوں پر لحہ بہ لحہ آہنی شکنجے کی طرح گرفت سخت کررہے تھے۔ یہ وہ گرفت تھی جس میں گوشت کچلا جاتا تھا اور بازو ایک عرصے کے لیے ناکارہ ہوجاتے تھے لیکن اس آسیبی مخلوق نے نہ جانے کیا کھایا ہوا تھا اور اس کا جسم نہ جانے کس چیز کا بنا ہوا تھا کہ اس پر کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ حتی کہ اس کے چہرے پر بھی اذیت کی کوئی رمق تک نہیں اُبھری تھی...... لیکن آخر کار وہ معجزہ سا رونما ہونے ہی لگا' جس کا مجھے انتظار تھا!

اس کے ہاتھوں نے نہ صرف راحیلہ کی گردن چھوڑ دی بلکہ اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے سے دور ہونے لگے گو کہ وہ انہیں اپنی جگہ رکھنے کے لیے اب بھی قوت صرف کررہی تھی۔ اس احساس سے مجھے کچھ اطمینان ہوا کہ راحیلہ نے ایک زوردار آواز کے ساتھ سانس اندر کھینچی تھی۔ یہ نہ صرف زندگی کی علامت تھی بلکہ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔

میں اس وقت طمانیت کو بھی محسوس کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ اطمینان انسان کے اعصاب کو کچھ نہ کچھ ڈھیلا کردیتا ہے۔ میں اس وقت ذرا سا اطمینان بھی "افورڈ" نہیں کرسکتا تھا۔ راحیلہ بدستور اس کے نیچے دبی ہوئی تھی اور وہاں سے نکلنے کے لیے کسمسائی تک نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا ابھی اس میں سکت نہیں تھی۔

میں بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اس کے باوجود میں نے بولنے کی کوشش کی۔ میرے حلق سے ایک عجیب غیر انسانی سی سرگوشی برآمد ہوئی۔ دی لیڈی کے سوا شاید کوئی اسے سُن بھی نہ سکا ہو "دی لیڈی...... پلیز...... اسے چھوڑ دو......"

خواہ مخواہ گلے پڑ جانے والے اس جھنجٹ سے جان چُھڑانے کے لیے میں گویا ان سب کی منت کرنے کے لیے تیار تھا لیکن اس کا بھی شاید کوئی فائدہ نہیں ہورہا تھا۔ دی لیڈی کی آنکھوں میں اب بھی استہزائیہ رنگ برقرار تھا۔ شاید وہ اپنی جدوجہد ترک کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ دوبارہ راحیلہ کو اسی طرح دبوچنے کی فکر میں تھی۔ فی الحال شاید وہ اس صدمے سے نہیں سنبھل پارہی تھی کہ کسی نے اس کی گرفت سے کسی کو چُھڑا لیا تھا۔ شاید اس کی نظر میں یہ انہونی تھی۔ شاید اس سے پہلے واقعی ایسا نہ ہوا ہو۔

ہمارے بازو اب ایک جگہ ساکت سے ہو کر رہ گئے تھے۔ لیکن میں اس کے بازوؤں کے ذریعے اس کے جسم کے ارتعاش کو محسوس کررہا تھا۔ ہمارے گرد فضا میں گویا ہر چیز ساکت تھی۔ ہم گویا کسی عظیم الشان اکھاڑے میں اترے ہوئے دو بہت بڑے پہلوانوں کی طرح ہوگئے تھے جن کا کوئی داؤ پھنس کر رہ گیا تھا۔

اب میں اس کی پوزیشن میں تھا کہ اپنا کوئی داؤ دکھا سکتا تھا لیکن محض گولیاں چل جانے کے خوف سے میں رکا ہوا تھا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنا داؤ آزمانے پر تلی ہوئی تھی۔ کسی غیبی سی قوت نے مجھے خبردار کیا کہ وہ اچانک سر جُھکا کر میرے سینے پر ٹکر رسید کرے گی اور یہ حملہ نہ صرف میرے لیے بے پناہ تکلیف دہ ہوگا بلکہ اس کے بازو بھی میری گرفت سے نکل جائیں گے اور وہ دوبارہ راحیلہ کو دبوچ لے گی۔ یوں یہ ساری کشمکش بے فائدہ ہو کر رہ جائے گی۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے ارادے پر عمل کر گزرتی' میں نے تن بہ تقدیر ہو کر اس کے بازوؤں کو ایک خاص انداز میں جھٹکا دیتے ہوئے ذرا سا سر جُھکایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ میرے سر پر سے ہوتی ہوئی پیچھے جا گری۔ میں نے دھپ سے اپنے عقب میں اس کے گرنے کی آواز سنی اور منتظر رہا کہ شاید میری اس "گستاخی" پر گولیوں کی باڑھ میرے جسم کو چھیلتی ہوئی گزرے لیکن میں اب بھی محفوظ ہی رہا۔ شاید دونوں طرف کے بندوق برداروں نے یہ عقلمندانہ فیصلہ کیا تھا کہ جب تک دست بہ دست معرکہ جاری تھا اور دونوں میں سے کسی کی زندگی یا موت کا مسئلہ پیدا ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا' تب تک اس میں گولیوں سے مداخلت نہیں کی جائے گی۔

لڑائی بھڑائی کے بڑے پرانے ماہرین کو بھی اکثر میرے اس داؤ کی اس وقت سمجھ نہیں آتی تھی جب وہ ان پر آزمایا جاتا تھا۔ انہیں پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ یک لخت ہی اُڑتے ہوئے میرے اوپر سے دوسری طرف کیسے جا گرے؟ اس کے علاوہ وہ جلدی سے سنبھل بھی نہیں پاتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ دی لیڈی کی سمجھ میں تو آگیا ہو کیونکہ وہ بھی ان معاملات میں بہت پہنچی ہوئی چیز معلوم ہوتی تھی لیکن وہ بھی بہرحال اس سے بروقت اپنا بچاؤ نہیں کرسکی تھی۔

میں دوسرے ہی لمحے تیزی سے گھوما اور ایک "حیرت" نے میرا استقبال کیا۔ دی لیڈی میرے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے سنبھلنے اور اُٹھنے میں ناقابلِ یقین پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے عقب سے مجھ پر حملہ نہیں کیا تھا اور مسکرا رہی تھی۔

بے اختیار میرے سینے سے ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ اس کے مسکرانے کا مطلب یہ تھا کہ مصیبت کی گھڑیاں گزر گئی تھیں۔ اس نے راحیلہ کی "گستاخی" کو معاف کردیا تھا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا کہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی اور وہ میرے عقب میں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک بار پھر برق سی لہرائی تھی اور میں نے محسوس کیا کہ اس کا جسم یک لخت ایک خاص انداز میں اکڑ گیا تھا۔

وہ عورت جس قدر مضبوطی و طاقت کی مالک تھی اور جو کچھ کر گزرنے کی اہلیت رکھتی تھی اس کا مجھے اچھی طرح اندازہ ہوچکا تھا۔ میں نے چند لمحوں میں ہی اسے خاصا بھگت لیا تھا۔ اس کے جسم میں اس طرح اکڑاؤ آنے کا مطلب یہی تھا کہ وہ اپنے جسم کو کسی حملے کے لیے ڈھال بنا رہی تھی۔

میں تیزی سے گھوما۔ عقب میں دوسری حیرت میری منتظر تھی۔ میں نے چند لمحے پہلے راحیلہ کی جو حالت دیکھی تھی اس کے پیش نظر میرا خیال تھا کہ اسے صحیح طور پر چاق و چوبند ہونے کے لیے دو تین دن درکار ہوں گے اور اس کے گلے میں تکلیف تو شاید مزید دو تین دن برقرار رہے لیکن آج شاید دونوں خواتین میرے اندازے غلط ثابت کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔ شدتِ انتقام کے باعث اُن کی نہ جانے کون کون سی خفیہ صلاحیتیں بیدار ہوگئی تھیں اور وہ گویا اپنے آپ کو کوئی مافوق الفطرت قوت ثابت کرنے کی کوشش کررہی تھیں۔

میں نے دیکھا' راحیلہ نہ صرف اُٹھ چکی تھی اور میرے عقب میں موجود تھی بلکہ دی لیڈی پر حملہ آور ہونے کے لیے ایک بار پھر تجا ماسٹر کی طرح ہوا میں بلند بھی ہوچکی تھی۔ اس طرح یہ جھگڑا کبھی ختم نہیں ہوسکتا تھا اور جس برے انجام سے بچنے کی میں سرتوڑ کوشش کررہا تھا اس سے دوچار ہوئے بغیر ہم نہیں رہ سکتے تھے۔

میں ان کے بیچ میں تو تھا ہی...... لیکن راحیلہ مجھے بچاتے ہوئے کسی عقاب کی طرح دی لیڈی پر جھپٹ رہی تھی۔ میں نے اس کی ٹانگ ایک قوس کی سی صورت میں دی لیڈی کی طرف جاتے دیکھی اور میں فوراً ہی ایک چیخ مار کر اس کے سامنے آگیا۔ یہ چیخ دراصل اسے اس وار سے روکنے کی ناکام کوشش تھی کیونکہ وار تو اب ہوچکا تھا اور جس طرح کمان سے نکلے ہوئے تیر کو واپس نہیں لایا جاسکتا اس طرح اس وار کو بھی روکا نہیں جاسکتا تھا۔ فرق صرف یہ پڑا کہ وار دی لیڈی کے بجائے میں نے سہہ لیا۔

آج شاید میرا خواتین سے مار کھانے کا دن تھا۔ ایک ایسی لات میری کمر پہ پڑی جو کمر توڑ کیا...... کسی ہٹے موٹے گھرے کو بھی گرا دینے کے لیے کافی تھی۔ ایک بار پھر میں اوندھے منہ زمین پر جاتے جاتے بچا اور ایک لمحے کے لیے مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میری کمر کے دو ٹکڑے ہوگئے تھے۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری ناقابلِ یقین سی قوتِ برداشت تھی...... یا پھر جدوجہد سے زیادہ تشویش' جس نے مجھے ڈھیر ہونے سے باز رکھا۔ تشویش اب بھی مجھے اسی بات کی تھی کہ صورتِ حال بگڑ نہ جائے' معاملہ میرے ہاتھ سے نکل نہ جائے...... لیکن لگتا تھا کہ راحیلہ کو میری اس تشویش کی ذرا بھی فکر نہیں تھی۔ اگر وہ میری تشویش سے لاعلم تھی تب بھی ایک لمحے کے لیے میری حالت زار کے بارے میں ہی سوچ لیتی۔

میں نے پہلے دی لیڈی کا ایک بھیانک وار برداشت کیا تھا۔ پھر اس سے زور آزمائی میں مجھے دانتوں پسینے آگئے تھے اور اب راحیلہ کی لات جس ٹیکنیک سے میری کمر پر پڑی تھی۔ اس سے میری ریڑھ کی ہڈی ٹوٹتے ٹوٹتے بچی تھی مگر اس کے باوجود راحیلہ نے ایک لمحے بھی توقف نہیں کیا۔

اس کا بازو دی لیڈی کے سر پر چاپ رسید کرنے کے لیے ہوا میں بلند ہوچکا تھا۔ غنیمت تھا کہ میں اپنی تمام تر بدحالی کے باوجود اس مرتبہ اس کا بازو ہوا ہی میں روکنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس کا بازو میرے ہاتھ کے شکنجے میں پھنس کر رہ گیا۔ اس کے باوجود وہ باز نہیں آئی اور اس نے "بازو میرے ہاتھ میں ہونے کے باوجود ہوا میں اُچھلنے کی کوشش کی لیکن یہ کوشش میں نے ناکام بنادی۔

دی لیڈی شاید اس وقت ہی اس پر وار کرچکی ہوتی جب وہ زمین سے اٹھی تھی مگر اس نے تحمل کا ثبوت دیا تھا اور اس کے بعد تو اُس نے دیکھ ہی لیا تھا کہ میں صدقِ دل سے راحیلہ کو روکنے کی کوشش کررہا تھا۔ شاید اسی لیے اس نے اپنے آپ کو اپنی جناتی سی صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے سے باز رکھا تھا اور ذرا پیچھے ہٹ کر محفوظ فاصلے پر جا کھڑی ہوئی تھی۔

راحیلہ شاید دی لیڈی پر کچھ زیادہ ہی خار کھائے ہوئے تھی۔ ادھر میں بھی ابھی کچھ صحیح طور پر اپنی قوت مجتمع نہیں کرپایا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے مجھ سے بازو چُھڑا لیا اور ایک بار پھر دی لیڈی کی طرف لپکی۔ وہ اس وقت کسی زخمی شیرنی سے کم غضبناک نہیں تھی۔

وہ میری گرفت سے نکل گئی تھی تاہم اس وقت ٹونی نے ایک اچھا اور عقلمندی کا کام کیا۔ وہ سکوت اور تذبذب کی کیفیت سے باہر آیا اور بجلی کی سی تیزی سے اس نے ٹانگ اڑا کر راحیلہ کو گرادیا۔ راحیلہ اس وقت اس کے قریب سے گزرنے لگی تھی۔ اسے شاید یہ پتا بھی نہ چلا ہو کہ ٹونی نے کچھ کیا تھا۔

بہرحال مجھے موقع مل گیا اور میں نے چھلانگ لگا کر اسے زمین پر ہی دبوچ لیا۔ اب میں نے اسے ہلنے نہیں دیا اور ہانپتے ہوئے سمجھانے کی کوشش کی "راحیلہ...... پلیز...... تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں...... ہمارا ان سے معاہدہ ہوچکا ہے...... سب ٹھیک ہے......"

"بھاڑ میں گیا تمہارا معاہدہ۔۔۔۔۔" اس کے حلق سے عجیب پھٹی پھٹی سی آواز نکلی۔ جس حد تک اس کا گلا دبایا گیا تھا اس کے بعد اس کی آواز کی نالیاں کام کر رہی تھیں' یہی بڑی بات تھی "میں۔۔۔۔۔ میں اس عورت کو نہیں چھوڑوں گی۔۔۔۔۔ یہ اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہے۔۔۔۔۔ اس سے کہو کہ اپنے آدمیوں کو ایک طرف ہٹا دے اور کھلے میدان میں مجھ سے مقابلہ کرے۔"

مجھے اس کے الفاظ پر حیرت ہوئی۔ اگر اسے صورتِ حال کا علم نہیں تھا تب بھی میرے کہنے سے بات اس کی سمجھ میں آجانی چاہیے تھی۔ لگتا تھا کہ اسے دی لیڈی کی کسی بات سے کچھ زیادہ ہی زک پہنچی تھی۔ پہلی بار میں نے اسے کسی بات کو اس طرح اپنی اَنا کا مسئلہ بناتے دیکھا تھا۔ وہ بھی ایسے نازک موقع پر۔

راحیلہ میری گرفت میں بری طرح مچل رہی تھی۔ میں نے بہ مشکل ایک نظر دی لیڈی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دیے چند قدم دور نہایت پُرسکون انداز میں کھڑی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ وہ گویا اس صورتِ حال سے خاصی محظوظ ہو رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اپنے آپ کو کھسیانا سا محسوس کیا۔

"تم اس سے بات بنا رہے ہو؟" وہ ایک بار پھر پھٹی پھٹی اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ شاید اُس نے چیخنے کی کوشش کی تھی تب اتنی آواز نکلی تھی۔ اُس کا اشارہ دی لیڈی کی طرف تھا۔ اسے کھانسی سی آگئی۔ اس کا چہرہ مٹی میں لتھڑ گیا تھا لیکن اس کی وحشت اور جنون میں کمی نہیں آئی تھی۔

محض ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ اسی مجنونانہ لہجے میں بولی "یہ عورت۔۔۔۔۔ صرف یہ عورت ہمارے تمام مصائب کی ذمے دار تھی۔۔۔۔۔ اور اس سے کبھی صحیح طور پر ہمارا سامنا نہیں ہوا۔۔۔۔۔ صرف اس کی وجہ سے ہم نے اتنی تکلیفیں اُٹھائیں۔۔۔۔۔ اس کے حکم پر سب کچھ ہوتا تھا اور یہ خود بڑے مزے سے پس منظر میں رہی۔۔۔۔۔ یہ اب بھی بڑے مزے میں ہے۔۔۔۔۔ اس کے ٹھاٹ باٹ اور عیش و عشرت میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ ریڈ ڈاٹ کی پاکستان برانچ کی سربراہ تھی۔۔۔۔۔ برانچ ہمارے ہاتھوں تباہ ہوگئی۔۔۔۔۔ مگر یہ ہم سے بھی بچی رہی اور تنظیم کی ہائی کمان کی طرف سے بھی اس پر کوئی عتاب نہیں آیا۔۔۔۔۔"

چند سیکنڈ کے لیے ساکت رہ کر اس نے پھر اپنے آپ کو چھڑانے کی جدوجہد شروع کر دی۔ تاہم اب میں اس پر گرفت مضبوط کر چکا تھا۔ میں نے نسبتاً کم مرتعش لہجے میں کہا "مجھے معلوم ہے۔۔۔۔۔ سب کچھ معلوم ہے۔۔۔۔۔ لیکن اس وقت صورتِ حال کا تقاضا کچھ اور ہے۔"

"تم صورتِ حال کی پروا مت کرو" راحیلہ نے نہایت "دانشورانہ" مشورہ دیا "یہ عورت محض اتفاق سے سامنے آگئی ہے۔ اسے جانے مت دو۔ یہ بہت بڑے فساد کی جڑ ہے۔"

"یہ بھی مجھے معلوم ہے۔۔۔۔۔" میں نے اب بھی تحمل سے کہا

"لیکن تم دیکھ نہیں رہی ہو۔۔۔۔۔؟ اس وقت ہم سب ایک دوسرے کی گنوں کی زد پر ہیں۔ ایک اشارے پر بیک وقت سب ایک دوسرے کو خون میں نہلا دیں گے اور جانوں کے اس زیاں کا کسی کو بھی قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"اوہ۔۔۔۔۔ تو اب تم بھی فائدے نقصان کے بارے میں سوچنے لگے ہو۔۔۔۔۔!" وہ کراہ کر بولی مگر کراہنے کا انداز بھی طنزیہ تھا۔

"میں ہمیشہ ہی سے سوچتا آیا ہوں مگر تمہیں شاید اب تک اندازہ نہیں ہوا ہوگا۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"لیکن میں سوچنا نہیں چاہتی" اس پر واقعی ضد سوار تھی۔ آج شاید اس پر اندر کی عورت غالب آگئی تھی۔۔۔۔۔ اور عورت کی ضد تو مشہور ہے!

وہ اردو میں گفتگو کر رہی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ دی لیڈی پوری طرح اردو سمجھتی ہو یا اسے کم از کم مفہوم کا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا۔ وہ گویا راحیلہ کی حالت سے کچھ اور محظوظ ہوتے ہوئے انگریزی میں بولی "تم اسے چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ میرے آدمی گولی نہیں چلائیں گے۔ تم بھی اپنے آدمیوں کو گنیں رکھ دینے کا حکم دے دو۔ کھلا میدان یہاں موجود ہے۔ میں خالی ہاتھ اس سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اسے دل کا ارمان نکال لینے دو۔ مجھے اس کی آرزو پوری کر کے خوشی ہوگی۔"

"نہیں۔" میں نے سختی سے کہا "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم یہاں کسی فلم کی شوٹنگ پر نہیں آئے ہوئے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔ شوٹنگ نہ سہی۔۔۔۔۔ حقیقی زندگی کا تھوڑا سا ایڈونچر سہی۔" وہ مسکراتے ہوئے بڑی خوش مزاجی سے بولی۔

میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا دی لیڈی راحیلہ کو زندہ نہیں چھوڑے گی۔ وہ راحیلہ کے بس کی چیز نہیں

تھی۔ خالی ہاتھوں اس کو موت کے گھاٹ اتارنے میں تو شاید مجھے بھی دانتوں پسینے آجاتے اور اگر قسمت ساتھ نہ دیتی تو اس کے ہاتھوں میرا مارے جانا بھی کچھ ایسا بعید از امکان نہیں تھا۔ میں اچھی طرح اندازہ کر چکا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی عورت تھی اور اس سے نمٹنے کے لیے غیر معمولی صلاحیتوں ہی کی نہیں' ایک نہایت پُرسکون اور کمپیوٹر سے زیادہ برق رفتاری سے کام کرنے والے ذہن کی ضرورت تھی۔ میں جانتے بوجھتے راحیلہ کو موت کے منہ میں نہیں دھکیل سکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ اس پر ہوش کے بجائے جوش غالب تھا۔ وہ خود بھی ایک غیر معمولی عورت تھی لیکن میں فی الحال اسے دی لیڈی کی ہم پلہ یا اس سے برتر سمجھنے کا رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

راحیلہ ایک بار پھر کسمسائی اور اس نے مجھے اوپر سے اُچھال پھینکنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ وہ ایک بار پھر اسی غیر انسانی سی آواز میں غرائی "اب تو چھوڑ دو مجھے۔۔۔۔۔ وہ چیلنج دے رہی ہے۔۔۔۔۔ گولیاں نہ چلنے کی ضمانت بھی دے رہی ہے۔۔۔۔۔"

"شٹ اپ۔" اب میں نے سختی سے اسے ڈانٹا "تم شاید بھول گئی ہو کہ ہمارا بھی ایک ڈسپلن ہے۔۔۔۔۔ تم اس کی خلاف ورزی کر رہی ہو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ یہ فضول مار دھاڑ بند کرو اور جس طرح کہا جائے اس طرح کرو۔"

ان الفاظ اور میرے لہجے نے جادو کا سا اثر دکھایا۔ اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اس میں وہ نرمی لوٹ آئی جو نسوانیت کی علامت ہوتی ہے۔ اس کا سارا جوش خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ جدوجہد دم توڑ گئی۔ یہ بھی غنیمت ہی تھا ورنہ مجھے تو اندیشہ تھا کہ وہ میرے حکم سے بھی بغاوت کر دے گی۔

اب بھی میں اسے چھوڑتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ مجھے غچا دینے کی کوشش نہ کر رہی ہو۔ ادھر میں اسے چھوڑوں اور ادھر وہ پھر اسپرنگ والے گڈے کی طرح اچھل کر اٹھ کھڑی ہو۔ مارشل آرٹس میں اسے غیر معمولی مہارت تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ پھر کوئی کرتب دکھانے کی کوشش نہ کرے۔

بہرحال مجھے رسک تو لینا ہی تھا۔ میں اسے یونہی دبوچے تو نہیں رہ سکتا تھا۔ صورتِ حال خاصی مضحکہ خیز۔۔۔۔۔ بلکہ شرمناک تھی تاہم میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر راحیلہ نے اب بھی میری ہدایت کی خلاف ورزی کی تو میں خود اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کر کے اسے دو چار گھنٹے کے لیے بے ہوش کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔

اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ کچھ شکست خوردہ سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے کپڑے جھاڑنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اب تک اس کے وجود میں گویا کوئی خوفناک زلزلہ آیا ہوا تھا جو یک دم ہی ختم ہو گیا تھا۔ تاہم نظروں ہی نظروں میں اگر کسی کو قتل کرنا ممکن ہوتا تو اب بھی دی لیڈی اس کی نظروں سے کم از کم دس مرتبہ قتل ہو چکی ہوتی۔ وہ کچھ ایسی ہی نظروں سے دی لیڈی کو گھور رہی تھی۔ دی لیڈی اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اسے گویا اس کی ذرّہ برابر بھی پروا نہیں تھی۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے گہری سانس لے کر مسکراتے ہوئے بولی "خدا کا شکر ہے کہ تمہاری ساتھی۔۔۔۔۔ بلکہ تمہاری نائب انسانیت کے جامے میں آگئی۔" گویا اس خبیث عورت کو یہ بھی معلوم تھا کہ راحیلہ کی حیثیت میری نائب کی سی تھی۔

میں نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا "آخر عورت ہے نا! کبھی کبھی آپے سے باہر ہو جانا عورت کی سرشت میں شامل ہے۔"

"فضول بات مت کرو۔" وہ سر کو جھٹکا دے کر بولی تاہم لہجہ خوشگوار ہی تھا "تم مشرقی لوگ عورت اور مرد کی تخصیص کیے بغیر بات ہی نہیں کر سکتے۔"

"بے شک۔" میں نے بلا تامل تسلیم کیا "عورت اور مرد کی تخصیص کے بغیر بات کرنے سے دراصل بات بنتی نہیں ہے۔ قدرت نے بلاوجہ ہی تو دونوں میں اتنا فرق نہیں رکھا۔ اس فرق کو مٹانے کی کوشش کرو تو کچھ عجیب سا نقشہ بن جاتا ہے۔ انسان نہ اِدھر کا رہتا ہے' نہ اُدھر کا۔"

"خیر۔۔۔۔۔ یہ اس بحث میں پڑنے کا موقع نہیں ہے۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ اس کی آسیبی سی آنکھیں اب کسی شفاف جھیل کی طرح پُرسکون تھیں "میں تو یہ کہتی ہوں کہ عورت میں مرد سے کہیں زیادہ صلاحیتیں ہیں۔ لیکن سائنس اور طب کی تمام تر ترقی کے باوجود ابھی تک ان تمام صلاحیتوں کو ترقی دینا تو درکنار' ابھی انہیں پوری طرح دریافت بھی نہیں کیا جا سکا۔ اس کے علاوہ کچھ عورتیں پیدائشی طور پر ہی غیر معمولی بھی ہوتی ہیں۔۔۔۔۔"

"وہ تو بعض مرد بھی ہوتے ہیں۔" میں نے لقمہ دیا۔

"لیکن غیر معمولی عورت اگر غیر معمولی محنت کرے تو وہ غیر معمولی مرد کو بھی بہت پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔۔۔۔۔ بہت پیچھے" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اس کی یہ مسکراہٹ نہ جانے کیوں ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑاتی تھی۔ اس کا ذہن جیسے یہاں سے بہت دور' کہیں اور مصروفِ عمل تھا۔

پھر وہ گویا ذرا چونکتے ہوئے اور اس نامعلوم جگہ سے واپس آتے ہوئے بولی "بہرحال۔۔۔۔۔ تم مبارکباد کے مستحق ہو۔ تم ایک غیر معمولی مرد ہو۔ میرا جو وار سہہ کر تم اٹھ کھڑے ہوئے ہو اسے برداشت کرنا ہی کسی مرد کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس وار کے بعد کوئی نہایت مضبوط تنومند اور ورلڈ کلاس باڈی بلڈر یا پیشہ ور فائٹر بھی شاید اس دنیا سے رخصت ہو چکا ہوتا یا کم از کم کچھ دن کے لیے اسپتال پہنچ چکا ہوتا۔ تمہیں اپنے آپ پر فخر ہونا چاہیے۔"

"فخر۔۔۔۔۔؟" میں نے کراہ کر کہا "میں شرم سے ڈوب مرنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تم مجھے فخر کرنے کا مشورہ دے رہی

ہو۔ میری زندگی میں تم پہلی عورت ہو جس کے ایک وار نے مجھے زمین چاٹنے پر مجبور کردیا۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ میری زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آئے گا۔"

اس نے ایک کھنک دار سا قہقہہ لگایا اور بولی "اسی لیے تو میں کہہ رہی تھی کہ عورت اور مرد کی تخصیص کے بغیر سوچا کرو۔ اس طرح تمہیں کم صدمہ پہنچے گا۔"

راحیلہ اب بھی خوفناک نظروں سے اس کی طرف دیکھے جارہی تھی مگر دی لیڈی گویا اب بھی اس کی طرف سے قطعی بے نیاز تھی۔ میں نے سرہلاتے ہوئے کہا "مشورے کا شکریہ..... اب کچھ کام کی بات ہوجائے۔"

"بات کیا ہونی ہے....." وہ بے پروائی سے بولی "باتیں تو بہت ہوچکیں..... بلکہ اب تو خاصا ایکشن بھی ہوگیا....." اب اس نے ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھا "ویسے اس لڑکی میں بڑا غیظ وغضب بھرا ہوا ہے۔ لگتا ہے تم اسے اچھی طرح لگام ڈال کر نہیں رکھتے۔ اسے قابو میں رکھو ورنہ یہ تمہیں کہیں مروا دے گی۔"

راحیلہ اپنی جگہ تلملا کر رہ گئی۔ شاید اس نے خود کو دی لیڈی پر چھلانگ لگانے سے بہ مشکل باز رکھا تھا۔ میں نے مسکین سی شکل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم سے پہلے بھی کئی سیانے یہی مشورہ دے چکے ہیں لیکن کیا کروں..... یہ لگام ڈالنے کے لیے مجھے قریب پھٹکنے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ بہرحال..... تم کہتی ہو تو ایک بار پھر اپنی سی کوشش کر دیکھوں گا۔"

راحیلہ نے کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا گویا فیصلہ کررہی ہو کہ دی لیڈی پر حملہ نہیں کیا جاسکتا تو نہ سہی..... لیکن کم ازکم مجھے تو ایک "منہ توڑ" قسم کی لات رسید کرہی دی جائے۔ میرا خیال ہے یہ میرا وہم نہیں تھا کہ اس کے ایک پاؤں نے اپنی جگہ سے تھوڑی سی حرکت بھی کی تھی۔

میں نے جلدی سے دوبارہ دی لیڈی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "اس سے پہلے کہ یہاں میرے باضابطہ حکم کے باوجود دوبارہ دنگا فساد شروع ہوجائے، ہمیں تبادلے کی کارروائی مکمل کرلینی چاہیے۔"

"ہاں..... ضرور۔" دی لیڈی نے سرہلایا۔

میں نے ٹونی کو اشارہ کیا۔ اس نے دھیرے دھیرے چلتے ہوئے لینڈ روور کی طرف باقی فاصلہ طے کیا اور اس میں جا بیٹھا۔ گو کہ گاڑی کا ایک دروازہ کھلا تھا لیکن میں اب اسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ گاڑی کے شیشے تاریک تھے۔ اسے یوں ان لوگوں کے نرغے میں جاتے ہوئے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے میرے دل کو کچھ ہوا لیکن میں نے اپنے آپ کو تسلی دی اور دل کو مضبوط کرلیا۔

پھر میں نے اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے راحیلہ سے کہا "چلو..... تم اس میں بیٹھو۔"

وہ جیسے چونکی "یہ کیا ہورہا ہے؟" اس کے لہجے میں اب ایک نئی قسم کی برہمی تھی "شاید ٹونی کے بدلے میرا تبادلہ ہوا ہے......"

اسے واقعی اس سودے بازی کا علم نہیں تھا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا تو وہ نفی میں سرہلاتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "اگر یہ سچ ہے تو مجھے یہ سودا منظور نہیں ہے۔ مجھے ٹونی کے بدلے اپنی رہائی منظور نہیں ہے۔ میں اپنی جان بچانے کے لیے اپنے کسی بھی ساتھی کی جان نذرانے کے طور پر پیش کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔"

"بکواس مت کرو۔" میں نے ایک بار پھر اسے ڈانٹا "یہ جان وان جانے کا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ ٹونی خیروعافیت سے واپس آجائے گا۔ ابھی ایک تبادلہ اور ہونا ہے۔"

"تمہیں ان لوگوں کی زبان پر اعتبار ہے؟" راحیلہ زہریلے لہجے میں بولی۔

"نہیں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا "اعتبار نہ ہونے کی وجہ سے ہی تو یہ سارا کھٹ راگ پھیلانا پڑا ہے ورنہ اس کی کیا ضرورت تھی؟ محض زبان سے کہنے سے سارا کام ہوجاتا۔ میں جس طرح ان سے کہتا، یہ کرلیتے۔ یہ جس طرح مجھ سے کہتے میں کرلیتا۔ کام بہت آسان ہوجاتا۔ اتنا فساد کیوں کھڑا ہوتا؟ لیکن مسئلہ وہی ہے ہم دونوں کو ایک دوسرے کی زبان پر اعتبار نہیں ہے۔ اسی لیے تو ایک دوسرے کے پاس ضمانت رکھوائی جارہی ہے۔ اتنی سادہ سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی؟"

"اب تو آگئی ہے......" وہ بدستور برہمی سے بولی "اس کے باوجود مجھے ان لوگوں پر اعتبار نہیں ہے۔"

دی لیڈی ایک ٹک راحیلہ کو گھور رہی تھی۔ اس کی آہنی سی آنکھیں اس وقت بلا کی سفاک نظر آرہی تھیں تاہم وہ کچھ نہیں بولی۔

"اب حالات بہت مختلف ہیں۔ انہیں ہم کو یا ہمیں ان کو دھوکا دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس طرح کی کوئی حرکت کرکے دونوں نقصان میں رہیں گے۔ ڈاکٹر برنارڈ ابھی ہمارے پاس ہے۔ ابھی ہمارے درمیان ایک تبادلہ اور ہوگا۔ اب تم زیادہ بحث مت کرو اور چل کر گاڑی میں بیٹھو۔" میں نے اپنے لہجے میں سختی برقرار رکھی۔

وہ گویا بادل ناخواستہ گاڑی کی طرف چل دی۔ وہ بہت آہستگی سے قدم اٹھا رہی تھی۔ دی لیڈی کھنک دار سی آواز میں بولی "ڈیئر افضل! ٹھیک دو دن بعد..... اسی وقت..... اسی جگہ دوسرا تبادلہ عمل میں آئے گا۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ چالاک بننے کی کوشش مت کرنا۔ پولیس یا کسی خفیہ ایجنسی کو بیچ میں ڈالنے یا ہمارے پیچھے لگانے کی حماقت مت کرنا۔ یہ ٹونی کی زندگی کا سوال ہے..... اور میرا خیال ہے وہ تمہارے اہم ترین ساتھیوں میں سے ایک ہونے کے ساتھ ساتھ تمہارا دوست بھی ہے۔"

"ان بچکانہ ہدایات کی ضرورت نہیں۔" میں نے قدرے ...ی سے کہا "جب ایک تبادلہ اس طرح ہوگیا ہے تو دوسرا بھی ...ائے گا۔"

"لیکن دوسرے تبادلے میں یہ کچھ بھی نہیں ہونا چاہیے جو ...ہوا ہے......" اس نے راحیلہ کی طرف اشارہ کیا "دوسرے ...لے میں تو خیر ویسے بھی اس لڑکی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن تم ...محبت میں اسے ساتھ نہ اٹھا لانا۔ اس کے ذہن کو بدلنا بہت ...ل ہے۔ معلوم ہوتا ہے..... اور اگر یہ اسی ذہن سمیت ...ارے ساتھ آئی تو عین ممکن ہے زندہ واپس نہ جاسکے۔"

راحیلہ اس وقت تک گاڑی کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس کا ...دروازے کے ہینڈل پر تھا۔ وہ آہستگی سے گھومی اور اسی ...خوار لہجے میں بولی "اگر میرے باس پر اس قدر مہذب، امن پسند ...رہنے بازبننے کا دورہ نہ پڑا ہوتا تو ہم بھی دیکھ ہی لیتے کہ کون ...ندہ واپس جاتا اور کون ٹھہرہ۔"

دی لیڈی نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا پھر میری طرف دیکھ ...رمربیانہ انداز میں مسکرائی "لڑکی واقعی شعلۂ جوالہ ہے۔ تم اسے ...رت نکال لینے کا موقع کیوں نہیں دیتے؟"

"میں فضول اور غیر ضروری کاموں میں اس قسم کے شعلوں کی ...رارت ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا "اور ...ہاں..... مجھے ایک ضروری بات یاد آئی۔ تم دو دن بعد دوسرا تبادلہ ...کرنے کے لیے کہہ رہی ہو لیکن اس کے لیے میں کم ازکم ایک ہفتے ...کی مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔"

"کیوں؟" اس کی کشادہ وروشن سی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں "ڈاکٹر برنارڈ تو آج ہی..... یا زیادہ سے زیادہ کل تک اپنا کام ختم کر لے گا۔ اس کے بعد تمہیں اس کا کیا کرنا ہے؟"

"میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر برنارڈ اپنا کام کرجائے لیکن بعد میں کوئی گڑبڑ ہوجائے۔" میں نے صاف گوئی سے اپنا اندیشے کا اظہار کردیا۔

اس نے ٹھنڈی سانس لی اور ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھا جو اب گاڑی میں بیٹھ چکی تھی "ڈیئر افضل! گڑبڑ اگر ہونی ہوگی تو وہ سال دو سال بعد بھی ہوجائے گی۔" وہ بڑے تحمل سے بولی "ڈاکٹر برنارڈ بہت ہی بڑا بدمعاش ہے۔ اس کی پوٹلی میں نہ جانے کیا کیا شعبدے پڑے ہوئے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہم لوگ زبان دے کر پھرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ تمہاری نظر میں ہم بہت برے لوگ..... بے شک ہمارے عزائم تمہارے ملک کے بارے میں اچھے نہیں تھے اور ہم نے اپنے حساب سے کچھ پلاننگ کی تھی جس کی ہم نے کافی سزا بھگت لی..... اس کے باوجود ہم اتنے گھٹیا نہیں ہیں جتنا تم ہمیں سمجھتے ہو۔ ہم میں شاید تم سے اور تمہارے ہم وطنوں سے بہت سے بہتر اوصاف موجود ہیں۔ ہماری طرف سے جب کسی کام کی زبان ہوگئی سو ہوگئی۔ ڈاکٹر برنارڈ نے جب ایک کام کی ہامی بھرلی ہے اور ہماری طرف سے اسے اجازت بھی مل چکی ہے تو اب وہ اپنا کام دیانتداری سے کرے گا، اتنا تمہیں یقین رکھنا چاہیے۔ اب اگر قدرت کی طرف سے ہی کوئی گڑبڑ ہونی ہو تو ہوسکتی ہے، اس کی طرف سے نہیں ہوسکتی۔ تمہارے اطمینان کے لیے میں اسے مزید تاکید کردوں گی۔ میں دو گھنٹے بعد تمہیں فون کروں گی۔ تم اس سے میری بات کرادینا۔"

"گویا تم ایک ہفتے کی مہلت دینے کے لیے تیار نہیں ہو؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"اس سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔" وہ بدستور تحمل سے بولی "میں نے کہا نا کہ گڑبڑ ایک ہفتے میں ہی نظر آنی ضروری نہیں۔ گڑبڑ تو ایک سال بعد بھی ہوسکتی ہے لیکن ہمیں مزید ایک ہفتہ رکنے کے لیے اپنے منصوبوں میں بڑی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی جو ہمارے لیے بہت مشکل کام ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ ہم اس وقت کافی دشواریوں میں گھرے ہوئے ہیں جن میں سے بیشتر تمہاری پیدا کردہ ہیں۔"

"خواہ مخواہ کی الزام تراشی مت کرو" میں نے ملائمت سے کہا "دشواریاں تمہارے اپنے اعمال کی پیدا کردہ ہیں۔ اس دنیا میں ہر کوئی جو بوتا ہے وہی اُسے کاٹنا پڑتا ہے۔"

"چلو..... تمہیں اس طرح سوچنے سے خوشی حاصل ہوتی ہے تو تم اسی طرح سوچتے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں" وہ خوش دلی سے بولی "بہرحال ہمارے نظریے کے مطابق تو ہمارے زوال کی سب سے بڑی وجہ تم ہو اور اس وقت بھی ہمیں جن دشواریوں کا سامنا ہے ان میں سے بیشتر تمہاری پیدا کردہ ہیں۔ سب سے بڑی دشواری تو خفیہ ادارے ہیں جن سے ابھی تک ہماری آنکھ مچولی چل رہی ہے۔ ہمارے فرار کی تمام تیاریاں مکمل ہیں۔ ایک ہفتے کی تاخیر کرنے سے ہمارا فرار خطرے میں پڑسکتا ہے۔ ہم اب کوئی غیر ضروری رسک نہیں لینا چاہتے۔"

"کیا ستم ظریفی ہے کہ جس نے خفیہ اداروں کو تمہارے پیچھے لگایا ہے وہ خود اس وقت یہاں کھڑا تم سے سودے بازی میں مصروف ہے اور فی الحال تمہارے بارے میں خفیہ اداروں کو کچھ نہیں بتا سکتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ہاں..... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔" وہ مسکرائی "بہرحال..... تمہیں تو اس پر خوش ہونا چاہیے کہ ہم بچے کھچے لوگ جلد تمہاری جان چھوڑ کر جارہے ہیں۔ تمہیں تو ایک ہفتے کی مہلت مانگنے کے بجائے کل ہی دوسرا تبادلہ کرنے کی بات کرنی چاہیے۔ یہ تو تمہاری دلی خواہش تھی تا کہ تمہاری سرزمین پر ہم لوگ تمہیں دکھائی نہ دیں۔ یہ کام اب خود بخود ہی ہورہا ہے تو اس میں تاخیر کیوں کرارہے ہو؟"

"ہاں..... بات تو تمہاری ٹھیک ہے۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "معقول بات دشمن بھی کہے تو مان لینی چاہیے۔ پرسوں

کا پروگرام ٹھیک ہے۔"

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "مجھے خوشی ہے کہ تھوڑی سی گڑبڑ کے باوجود تم سے ملاقات خوشگوار رہی۔"

عجیب بات تھی کہ اس کے ہاتھ میں نسوانیت کا گداز بھی تھا اور فولاد کی سی سختی بھی۔ بات صرف اسی تضاد پر ختم نہیں ہوتی تھی' اس ہاتھ میں زندگی کی بھرپور حرارت بھی دوڑ رہی تھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آہنی سی آنکھیں میری آنکھوں میں جیسے کچھ تلاش کر رہی تھیں۔

پھر وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی "مجھے حسرت رہے گی..... کاش تم نے ریڈ ڈاٹ کی پیشکش قبول کرلی ہوتی اور تم آج ہمارے ساتھی ہوتے!"

"خدا کا شکر ہے کہ میں ذلت میں پڑنے سے بچ گیا اور لالچ میں نہیں آیا..... گو کہ لالچ بہت بڑا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس کا منہ بن گیا۔ بدمزگی کے تاثرات سے اس کی خوبصورتی میں یوں فرق پڑ گیا جیسے کسی روشن بلب کی وولٹیج کم ہو گئی ہو۔ میں نے طول پکڑ جانے والے مصافحے کو اختتام تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہوئے جلدی سے کہا "اچھا..... تو پرسوں تم سے آخری ملاقات ہوگی۔"

اس نے گویا بدمزگی کو ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کی خوبصورتی کی وولٹیج بحال ہوگئی اور وہ کھنکتے سے لہجے میں بولی "اتنے وثوق سے پرسوں کی ملاقات کو آخری ملاقات مت کہو۔ دنیا اتنی بڑی نہیں ہے..... اور ہم اتنے چھوٹے لوگ نہیں ہیں کہ اس کی بھیڑ میں کھو جائیں۔ ہمارے لیے تو یہ دنیا ایک مکان کی طرح ہے۔ بے شک مکان بہت بڑا ہے اور اس میں بہت سے کمرے ہیں لیکن بہرحال مکان ہے۔ ہم تو ایک سے دوسرے کمرے میں آتے جاتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی بھی وقت..... کسی بھی کمرے میں..... یعنی کسی بھی ملک میں تم سے دوبارہ ملاقات ہو سکتی ہے۔ تم بھی بزنس مین ہو۔ ادھر اُدھر آتے جاتے ہی رہتے ہو..... اور کچھ بعید نہیں ہے کہ اسی ملک میں پھر سے ملاقات ہو جائے۔"

"ایسا تو مت کہو۔" میں نے کراہ کر کہا۔

وہ ہنسی "ضروری تو نہیں کہ اس وقت بھی میں کسی عالمی سازش کے تحت یہاں پائی جاؤں۔ میری اپنی نجی زندگی بھی ہے۔ میں گھومنے پھرنے..... کسی سے ملاقات کرنے بھی آسکتی ہوں۔ کوئی مجھے روک نہیں سکتا۔"

"بے شک۔ بے شک۔" میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا اور وہ میرا ہاتھ چھوڑ کر یک دم ہی مشینی سے انداز میں اپنی گاڑی کی طرف مڑ گئی۔

گاڑی میں بیٹھ کر وہ اس کا دروازہ بند کرنے سے پہلے گردن نکال کر بولی "تم ابھی دو منٹ یہیں رُکو گے۔ ہمارے دور نکل جانے

...ں تمہاری گاڑی یہاں سے حرکت نہیں کرے گی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ بڑی سی سرخ لینڈ روور تیزی سے گھوم کر سڑک کی طرف روانہ ہوگئی۔ میں آہستگی سے اپنی گاڑی کی طرف مڑا جس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا۔ آتے وقت گاڑی میں ہی چلا رہا تھا۔ اب میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تو میرے برابر ٹونی کے بجائے راحیلہ بیٹھی تھی۔ ٹونی ان لوگوں کے ساتھ جا چکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے پھر گویا میرے دل کو کچھ ہوا لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی' پرسوں ٹونی پھر ہمارے ساتھ ہوگا۔

راحیلہ کچھ روٹھے سے انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ اجنبیت سی تھی۔ میں نے نرمی سے کہا "آج تم نے خاصی بدمزگی کی۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے درمیان معاہدہ ہو چکا ہے۔ اس کُتیا نے بھی مجھے نہیں بتایا تھا۔" وہ غرانے کے سے انداز میں بولی۔ اس کا لہجہ معذرت خواہانہ ہرگز نہیں تھا۔

"معلوم ہو جانے کے بعد بھی تمہارے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی" میں نے شکوہ کیا "آج تو تم گویا کام بگاڑنے پر تلی ہوئی تھیں۔"

میرے اس شکوے میں اپنائیت تھی لیکن وہ گویا کاٹ کھانے والے لہجے میں بولی "افضل! ٹھیک ہے..... ہم لوگوں نے تمہارا حکم ماننے کا حلف اٹھایا ہوا ہے..... اور میں اس حلف پر قائم ہوں..... آئندہ بھی قائم رہوں گی لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو ایسا کوئی معاہدہ ہرگز نہ کرتی۔"

میں نے پہلی بار راحیلہ کے لیے اپنے دل میں ناگواری کی ایک خفیف سی لہر محسوس کی تاہم میں نے اپنے لہجے میں ملائمت برقرار رکھتے ہوئے کہا "میں نے اس میں کوئی حرج نہیں سمجھا اس لیے میں نے یہ معاہدہ کرلیا۔ مجھے اس میں فائدہ نظر آیا تھا..... اور یہ سب کچھ ہم تمہارے لیے کر رہے تھے۔ ٹونی نے خود ہنسی خوشی یہ تجویز پیش کی تھی۔ اس نے خود اپنے آپ کو ضمانت کے طور پر پیش کیا تھا۔"

"اس کا خلوص اور ایثار اپنی جگہ..... مگر تمہیں اس تجویز کو مسترد کر دینا چاہیے تھا۔" وہ اسی طرح پُرزور لہجے میں بولی "میں نے کب کہا تھا یا میں نے کب چاہا تھا کہ تم لوگ میرے لیے اتنا تردد کرو..... اتنی پریشانی اٹھاؤ..... کسی کو قربانی کا بکرا بناؤ..... میں تو کب سے تمہیں یہ یقین دلانے کی کوشش کرتی آئی ہوں کہ میرا مسئلہ اتنا زیادہ اہم نہیں ہے۔"

وہ بے شک ایسا کہتی تھی لیکن ہم تو ایسا نہیں سمجھ سکتے تھے۔ ویسے بھی زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ تکلف میں ایسا کہتی تھی۔ کون لڑکی ایسے چہرے کے ساتھ ایک مطمئن زندگی گزار سکتی تھی؟ میں نے خاموشی اور قدرے افسردگی سے سڑک کی طرف دیکھا۔ سرخ لینڈ روور نظر سے اوجھل ہو چکی تھی۔ شبیر شیخ اور سردار علی نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا کر ہلکی مشین گنیں سیٹوں کے نیچے رکھ لی تھیں۔ مجھے گاڑی میں گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ میں نے ائرکنڈیشنر آن کر کے گیئر لگایا اور گاڑی کو آہستگی سے سڑک کی جانب موڑا۔

راحیلہ بولی "میری آنکھوں سے پٹی ہٹی تو میں نے سمجھا تم نے کسی طرح مجھے ان کے قبضے سے رہا کرانے کا بندوبست کرلیا ہے اور یہ موقع اچھا ہے..... ہمیں فوراً ایکشن میں آکر اس حرافہ کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جو اس سارے فساد کی جڑ تھی....."

"جڑ وہ نہیں تھی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ملائمت سے تصحیح کی "جڑ اب بھی کہیں اور محفوظ ہے۔"

"بہرحال ہمارا معاملہ تو اسی پر جا کر ختم ہوتا تھا۔ اس لیے میں چاہتی تھی وہ ہمارے ہاتھ آجائے۔ اگر میں صورتِ حال کو غلط سمجھی تھی تب بھی میرے ایکشن میں آجانے کے بعد تمہیں میرا ساتھ دینا چاہیے تھا۔ تمہیں اتنا معافی تلافی والا رویّہ اختیار کرنے کے بجائے اس موقع کو غنیمت سمجھتے ہوئے ان لوگوں کو قابو میں کرنے یا ہلاک کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔"

میں نے بدستور ملائمت سے کہا "تمہارے حواس شاید ابھی تک صحیح طور پر کام نہیں کر رہے ہیں۔ تمہیں ابھی تک صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو سکا کہ صورتِ حال کیا تھی۔ دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے کی سب مشین گنوں کی زد پر تھے۔ مورچا بندی کے لیے آس پاس کہیں کوئی آڑ میسر نہیں تھی۔ میں تمہیں اور ٹونی سمیت کسی بھی ساتھی کو بے مقصد خاک و خون میں نہلانا نہیں چاہتا تھا۔"

"ہم نے ان سے پہلے بارہا اس سے بھی زیادہ خطرناک صورت حال میں محض اپنی پھرتی' طاقت' قوتِ فیصلہ اور بے خوفی سے پانسا اپنے حق میں پلٹا ہے۔ تمہیں کئی قسم کی حکمتِ عملی اپنے ذہن میں لے کر چلنا چاہیے تھا۔ میں نے تم لوگوں کو ایک اسٹارٹ دیا لیکن کسی نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ مجھے پہلی بار یوں لگا جیسے تم موت سے خوفزدہ تھے۔ اس سے پہلے میں نے تمہیں کبھی موت سے خوفزدہ نہیں پایا..... اور شاید اب تک تمہارے جیتے چلے آنے کی وجہ بھی یہی ہے۔"

"ہاں..... میں موت سے خوفزدہ تھا۔" میں نے اعتراف کیا "لیکن اپنی موت سے نہیں..... اپنے ساتھیوں کو موت سے..... خصوصاً بے مقصد موت سے۔"

وہ میرے لہجے کے اخلاص سے متاثر ہوئے بغیر یک دم ہی تلخ لہجے میں بولی "موت اور زندگی کے معرکے تو اس سے پہلے بھی بارہا برپا ہوئے ہیں۔ پہلے تو کبھی تم اتنے احتیاط پسند اور مصلحت کوش نظر نہیں آئے۔ یوں کہو کہ ایک حسین اور غیر معمولی عورت کو دیکھ کر تم ریشہ خطمی ہو گئے تھے۔ تمہارے اعصاب فولاد کے بجائے

ریشم کے ہو گئے تھے۔ غیر معمولی...... بلکہ شاید کسی بھی قسم کی عورت تمہاری کمزوری ہے۔"

میں نے حیرت اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ناک کی سیدھ میں دیکھنے لگی۔ اس نے گویا کسی عجیب سی قوت کے زیرِ اثر اپنے دل کا غبار نکال لیا تھا لیکن اس میں مجھ سے نظر ملانے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ شبیر شیخ اور سردار علی اپنی اپنی طرف کی کھڑکی کے شیشے پر ناک ٹکائے بیٹھے تھے۔ بظاہر ان کا مقصد چاروں طرف نظر رکھنا تھا لیکن مجھے معلوم تھا اس طرح وہ گاڑی کے اندر ہونے والی بحث سے لاتعلق نظر آنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

میں نے دبی دبی آواز میں کہا "میں تو تمہیں بھی غیر معمولی عورت سمجھتا ہوں راحیلہ! لیکن آج تم مجھے ایک نہایت دقیانوسی اور نہایت روایتی سی بیوی لگ رہی ہو جس کی ازدواجی زندگی کے دس بیس سال اسی طرح بک بک جھک جھک کرتے اور شوہر کے کان کھاتے گزر چکے ہیں۔ ابھی تو ہماری شادی بھی نہیں ہوئی ہے۔ ابھی سے تمہارا یہ حال ہے۔ مجھے تمہاری باتیں سن کر افسوس ہو رہا ہے!"

"اسی لیے تو میں تم سے شادی کے لیے ہاں نہیں بھرتی۔ مجھے معلوم ہے میں تمہیں اس سے بھی زیادہ بُری لگنے لگ جاؤں گی جتنی اب لگی ہوں۔" وہ بدستور ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے بولی۔

"تم مجھے بُری لگتی نہیں ہو...... لیکن تم شاید آج کل سرتوڑ کوشش کر رہی ہو کہ مجھے بُری لگنے لگو" میں نے حقیقتاً تاسف سے کہا "میرا خیال ہے تمہارے اعصاب پر دباؤ کافی بڑھ گیا ہے۔ میں نے تم پر کچھ زیادہ ہی بوجھ لاد دیا ہے اور کچھ عرصہ پہلے تک ہمیں بہت ہی اعصاب شکن حالات سے واسطہ رہا ہے۔ میرا خیال ہے اب ان سب باتوں کے اثرات تمہارے اعصاب پر ظاہر ہونے لگے ہیں۔ تم کچھ دنوں کی تعطیلات گزارنے مری، سوات، کوئٹہ یا کسی اور ٹھنڈی جگہ چلی جاؤ۔ اپنی کھوپڑی کو ٹھنڈا کرنے کی کوئی تدبیر کرو۔ تمہارے دماغ کو کچھ گرمی چڑھ گئی ہے...... بلکہ ان علاقوں کو بھی چھوڑو...... اگر تم بہتر سمجھو تو کچھ عرصے کے لیے سوئزر لینڈ وغیرہ چلی جاؤ۔"

"تم واقعی مجھے کہیں بھیجنے کے معاملے میں سیریس ہو؟" اس نے اب بھی میری طرف دیکھے بغیر سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ میں بالکل سیریس ہوں۔ میرے خیال میں ایسا کرنا بہت ضروری ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے...... اگر تم مجھ سے جان چھڑانا ہی چاہتے ہو تو پھر مجھے واپس کراچی بھیج دو۔ کچھ عرصے کے لیے نہیں...... ہمیشہ کے لیے۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر گویا دل میں کلبلاتا ہوا کوئی راز اُگل دیا۔

میرے ہاتھ اسٹیئرنگ وہیل پر مرتعش سے ہو کر رہ گئے۔ ایک لمحے کے لیے گاڑی لہرا گئی مگر پھر میں نے گاڑی کو بھی سنبھال لیا اور خود کو بھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "کچھ عرصے سے تم میں ہر بات کا غلط مطلب اخذ کرنے کی عادت بھی پیدا ہو گئی ہے......"

"مجھ میں ہر قسم کی بُری عادت پیدا ہو چکی ہے۔ میں سراپا ایک بُری عورت ہوں۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں تم مجھ سے جان چھڑا لو۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میں نے واقعی چھٹیاں گزارنے اور اعصاب پر سے بوجھ کم کرنے کے لیے کچھ دن کسی پُرفضا مقام پر گزارنے کی بات کی تھی......"

"میرے اعصاب اتنے کمزور نہیں ہیں کہ اتنی جلدی چٹخ جائیں۔ تم میرے اعصاب کی فکر چھوڑ دو اور اپنے دل کی بات کرو۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

"اکثر لوگوں کو اپنے بارے میں خوش فہمی ہوتی ہے کہ ان کے اعصاب بہت مضبوط ہیں اور وہ حالات سے متاثر نہیں ہوتے لیکن کچھ نہ کچھ حالات ایسے ضرور ہوتے ہیں اور کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب مضبوط سے مضبوط آدمی کے اعصاب بھی کچھ نہ کچھ متاثر ضرور ہو جاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اسے خود پتا نہ چلے......" میں نے نہایت تحمل سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بہرحال...... اگر تم میری تجویز کو جان چھڑانے کی تدبیر سمجھنے پر مُصر ہو تو میں اس کی تردید نہیں کروں گا۔ بہت سی باتوں کی تردیدیں کرتے کرتے میں اب تھک چکا ہوں۔ لیکن مجھے اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ میں نے صحیح سنا ہے۔ کیا تم واقعی کراچی واپس جانا چاہتی ہو؟ ہمیشہ کے لیے......؟ مجھے چھوڑ کر...... ہم سب کو چھوڑ کر......؟" مجھے اپنی آواز گلے میں اٹکتی محسوس ہوئی۔

"ہاں......" وہ منہ ذرا دوسری طرف کرتے ہوئے بولی "میں محسوس کر رہی ہوں کہ میں تم لوگوں کے لیے صرف پریشانی کا باعث بن رہی ہوں اور میری یہاں کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ میرے بغیر بھی ہر کام چل سکتا ہے...... بلکہ شاید زیادہ بہتر طور پر چل سکتا ہے۔"

"یہ صرف تمہارا اپنا فیصلہ ہے...... ہمارا نہیں۔" میں نے کہا "ہم میں سے تو کسی سے تم نے اس سلسلے میں رائے لینے کی بھی زحمت نہیں کی۔ بہرحال...... تم اس پر ابھی مزید سوچ لو۔ اگر تمہارا فیصلہ برقرار رہا تو ظاہر ہے تمہیں اس پر عمل درآمد کی آزادی ہو گی۔ تم ہماری غلام نہیں، ساتھی ہو۔ حلف اور دوسری سب باتیں اپنی جگہ ہیں لیکن تمہاری شخصی آزادی بہرحال اپنی جگہ برقرار ہے کیونکہ "دی سرکل" بہت قریبی اور جاں نثار دوستوں کا ایک حلقہ ہے، کوئی مافیا نہیں۔ ہم صرف تعمیری کاموں کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں لیکن اگر کوئی دوست اس سے بیزار ہو کر جانا چاہتا ہے تو اس کے لیے واپسی کے دروازے کھلے ہیں۔ اگر تم کراچی میں بھی کوئی ذمے داری قبول نہیں کرنا چاہو گی اور بالکل ہی لاتعلق ہو کر رہنا چاہو گی تو مجھے بتا دینا...... لیکن ابھی نہیں...... دو چار دن بعد...... ابھی تمہاری کھوپڑی گھومی ہوئی ہے۔"

وہ خاموش رہی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے گہری سانس لے کر کہا "اگر تمہارا جانے کا فیصلہ برقرار رہتا ہے تب بھی بہرحال ڈاکٹر برنارڈ سے تمہارا چہرہ ٹھیک کرانے کے پروگرام پر تو عملدرآمد ہونا ہی ہے۔ یہ تمہارا مجھ پر ایک بہت بڑا قرض ہے۔ اب تو اس کی ادائیگی اور بھی زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے...... اب تو اس کام کے لیے اتنا تردد کیا جا چکا ہے...... اتنی پریشانی اُٹھائی جا چکی ہے...... سب تیاریاں مکمل ہیں۔ اب یہ کام ہو ہی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں...... لیکن اس کے بعد جلد ہی میں تم سے اجازت چاہوں گی۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی میں جیسے بوجھل سا سکوت چھا گیا تھا۔ اس سے زیادہ سکوت میرے دل میں چھا گیا تھا۔ میں نے یک دم ہی اپنے آپ کو بے حد تنہا تنہا سا محسوس کیا۔ محبتیں، رفاقتیں، انسان اور انسان کے خواب سب کچھ کتنا بے ثبات اور کیا ناقابلِ اعتبار تھا۔ خوابوں کی سرزمین پر سفر کرتے کرتے بس یونہی کبھی انسان کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے۔

میرے حلق میں کڑواہٹ سی گھل گئی تھی اور میری پلکیں گویا جلنے لگی تھیں۔ پلکوں تلے گویا کسی نے انگارے بھر دیے تھے۔ شاید یہ انگارے نہیں، وہ آنسو تھے جو بہنا چاہتے تھے۔ مگر بہہ نہیں پا رہے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ میں ایک مضبوط آدمی تھا۔ میرے اعصاب فولادی تھے۔ اور مضبوط لوگ رویا نہیں کرتے۔ گو کہ کچھ دیر پہلے میں خود ہی کہہ چکا تھا کہ کبھی کبھی مضبوط اور فولادی اعصاب بھی جواب دے جاتے ہیں لیکن میں خود اس کی عملی تفسیر بننا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ میں بالکل پُرسکون اور خاموش رہا جیسے کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔

تاہم کچھ دیر بعد میں صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں کہے بغیر نہ رہ سکا "وہ غیر معمولی، سفید فام عورت...... دی لیڈی...... جس پر تمہارے خیال میں میں پھسل گیا ہوں، جلد از جلد اس ملک سے رخصت ہونا چاہتی ہے۔ اس لیے بھی میں نے خون خرابے سے پرہیز کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ہمارا مقصد تو اس سے چھٹکارا حاصل کرنا ہی تھا، یہ کام اگر خون خرابے کے بغیر ہو رہا تھا تو لاشیں گرانے کی کیا ضرورت تھی۔"

"وہ جا رہی ہے تو کیا تمہارے خیال میں کبھی واپس نہیں آئے گی؟" راحیلہ نے اب بھی میری طرف دیکھے بغیر تند سے لہجے میں پوچھا "تم میری یہ بات لکھ لو...... وہ جلد یا بدیر واپس آئے گی اور ہمارے لیے...... اس ملک کے لیے پہلے سے بڑا فتنہ بن کر آئے گی۔"

اس نے ایک لمحے توقف کیا۔ پھر اس کا لہجہ استہزائیہ سا ہو گیا "لیکن تمہیں تو اس کی واپسی کے تصور سے خوشی ہو رہی ہو گی۔ فتنوں کا کیا ہے۔ فتنوں سے نمٹتے رہنا تو تمہاری ہابی ہے۔"

"شکر ہے تم نے یہ نہیں کہہ دیا کہ اس کے عشق میں گھن چکر ہو کر میں اس کی فتنہ انگیزیوں کو بھی نظرانداز کر دوں گا...... بلکہ شاید اس مرتبہ خود ہی سر کے بل جا کر ریڈ ڈاٹ میں شامل ہو جاؤں گا۔ ان کا آلۂ کار بن جاؤں گا۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

وہ خاموش رہی۔ شاید وہ ابھی اس سطح تک جانے کے لیے تیار نہیں تھی۔ یہ بھی اس کی مہربانی تھی ورنہ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے اب کچھ بھی اس کی سوچ سے بعید نہیں تھا۔

تاہم چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "پھسلے صرف تم ہی نہیں ہو۔ وہ بھی تھوڑا سا پھسلی ہے...... وہ ضرور واپس آئے گی۔ اب تک وہ پس منظر میں رہی تھی۔ آئندہ وہ خود تمہیں ہینڈل کرے گی۔"

میں نے صرف دھیرے سے ہنسنے پر اکتفا کیا۔ اپنی دانست میں میں نے طنزیہ انداز میں ہنسنے کی کوشش کی تھی لیکن اپنی ہنسی خود مجھے ایک کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی۔ راحیلہ میں واقعی شادی سے پہلے ہی چڑچڑی، جھگڑالو اور شکی بیویوں والی خصوصیات پیدا ہو چکی تھیں۔

"اس میں ہنسنے کی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ گویا کچھ اور چڑ کر بولی۔ اُس کی عجیب سی آواز کچھ اور عجیب تر ہو گئی تھی۔ وہ بھی مضبوط عورت تھی۔ شاید وہ بھی اپنے کچھ آنسوؤں کو بہنے سے روکے ہوئے تھی جو اس کی خراب آواز کو خراب تر بنا رہے تھے۔ اس کی گردن پر دی لیڈی کی انگلیوں کے نیلے نیلے نشان اُبھر آئے تھے۔ گلا کچھ سُوجا سُوجا سا لگ رہا تھا۔

میں خاموش رہا اور بالآخر ہم ٹونی کے گھر جا پہنچے۔ بنگلے کے پورچ میں وہ گاڑی سے اُترتے ہوئے بولی "شکر ہے ٹونی کی فیملی نہیں ہے۔ اگر اس کے گھر والے ہم سے پوچھتے کہ ہم ٹونی کو کہاں چھوڑ آئے...... تو ہم کیا جواب دیتے؟"

"اگر اس قسم کے سوالوں کا امکان ہوتا تو میرے پاس جواب بھی موجود ہوتا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "فی الحال تم ان سوالوں میں نہ اُلجھو جو ہم سے پوچھے نہیں جا رہے۔ میرا خیال ہے تم اب گھر جا کر آرام کرو اور رات کو دوبارہ آ جاؤ۔ ڈاکٹر برنارڈ کا کام چند گھنٹے کا ہے اور تمہاری حالت فی الحال شاید اس قابل نہیں ہے کہ چند گھنٹے کے لیے کرسی پر ساکت بیٹھ سکو۔"

"اگر مجبوری ہوتی تو بیٹھ بھی جاتی لیکن اس وقت میں تمہارے مشورے پر عمل کروں گی۔ ایسی کون سی آفت آ رہی ہے۔ برنارڈ پرسوں تک ہمارے پاس ہے۔" وہ بولی۔

"شبیر شیخ اور سردار علی تمہیں اسی گاڑی میں گھر لے جائیں

گے اور یہ دونوں تمہارے گھر پر ہی تعینات رہیں گے۔" میں نے کہا اور گاڑی سے اُتر گیا۔ وہ محض کندھے اُچکا کر رہ گئی۔ شبیر شیخ نے آگے آکر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور گاڑی اسے لے کر روانہ ہوگئی۔

میں چند لمحے ڈرائیو وے میں ہی کھڑا رہا حتیٰ کہ گیٹ دوبارہ بند ہوگیا۔ میں نے ڈاکٹر برنارڈ سے بھی ملنے کی زحمت نہیں کی اور اس گیسٹ روم میں آکر لیٹ گیا جو ٹونی نے میرے لیے مخصوص کیا تھا۔ میرے ذہن میں ابھی تک آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر راحیلہ نے اچانک اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرلیا تھا؟

گھوم پھر کر میرا ذہن اسی نکتے پر آٹھہرا کہ بے شک راحیلہ کو زندگی کی ہر آسائش میسر تھی مگر پھر بھی یہ ایک بے کیف زندگی تھی۔ اس میں مسلسل آزمائشیں تھیں، کشمکش تھی، مار دھاڑ اور ناقابلِ یقین حالات کی یلغار تھی۔ ایک لڑکی کے اعصاب آخر کب تک اس کا ساتھ دے سکتے تھے؟ مگر وہ اسے ماننے پر بھی تو تیار نہیں تھی۔ وہ اس کے کچھ اور جواز تراش رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ میری سوچوں کا ناقابلِ بیان سا بوجھ میرے ذہن کو شل کر رہا تھا۔ دھیرے دھیرے میرا ذہن غنودگی میں ڈوبتا چلا گیا۔ شاید میں ان سوچوں سے فرار چاہتا تھا اس لیے کسی غیبی سی طاقت نے مجھے سُلا دیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے زندگی میں شاید کبھی اتنا ڈپریشن محسوس نہیں کیا تھا۔ میری نیند کسی مدہوش شرابی کی سی نیند تھی۔ میں بن پیے نشے میں تھا۔ کبھی کبھی افسردگی میں بھی ایک نشہ ہوتا ہے جو دھیرے دھیرے حواس کو کند کر دیتا ہے۔

انٹرکام کے بزر نے مجھے جگا دیا۔ میں نے آنکھیں کھول کر پہلے گرد و پیش کا جائزہ لیا۔ ایک لمحے کے لیے گویا مجھے یاد ہی نہ آیا کہ میں کہاں موجود تھا۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا کیونکہ کھڑکیوں پر پردے پھیلے ہوئے تھے اور شاید شام ہو چکی تھی۔ میرے دل کے آنگن میں بھی کچھ ایسا ہی اندھیرا تھا۔ شاید وہاں بھی شام اُتر آئی تھی۔

میں نے انٹرکام کا ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف شبیر شیخ تھا۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا "سر! میڈم راحیلہ آگئی ہیں۔ ہم نے ڈاکٹر برنارڈ سے پوچھ لیا ہے۔ وہ اپنا کام شروع کرنے کے لیے تیار ہے۔ آپ آجائیں تو کام شروع کرایا جائے۔"

"ٹھیک ہے..... میں دس منٹ میں آرہا ہوں۔" میں نے جواب دیا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے فیصلہ کیا کہ افسردگی کو ذہن سے جھٹکنے کے لیے تیزی سے حرکت میں آجانا بھی ایک کارگر تدبیر تھی اور مجھے یہ تدبیر آزمانی چاہیے ورنہ افسردگی مجھے گھُن کی طرح کھا جائے گی۔ میں نے نہایت پھرتی سے شاور لیا، لباس تبدیل کیا اور کمرے سے نکلا۔

ذہن پر چھائی دُھند کچھ چھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔

وہ تینوں لاؤنج میں موجود تھے اور چائے پی رہے تھے۔ راحیلہ اب تازہ دم نظر آرہی تھی۔ اس کے گلے پر پٹی لپٹی ہوئی تھی۔ شبیر شیخ نے ملازم سے میرے لیے بھی چائے منگوائی۔ کچھ بوجھل اور افسردہ سے ماحول میں چائے پی گئی حالانکہ یہ ہمارے لیے خوشی کا موقع ہونا چاہیے تھا۔ ایک ایسا کام ہونے جا رہا تھا۔ جس کے لیے ہم سب ایک عرصے سے اپنی اپنی جگہ کوشش کر رہے تھے اور دو چار دن پہلے تک اس کی کوئی اُمید نظر نہیں آرہی تھی۔ ہم سب اپنی اپنی جگہ اس ضمن میں کسی حد تک مایوس ہو چکے تھے مگر اب غیر متوقع سے انداز میں وہ کام ہونے کی نوبت آئی تھی تو ہم جیسے اس پر خوش ہونے کے قابل نہیں رہے تھے۔

چائے پی کر ہم تہ خانے میں آئے۔ مسلح گارڈز نے ہمارے لیے آہنی دروازہ کھولا جو مقفل تھا۔ اندر ڈاکٹر برنارڈ نے باچھیں پھیلا کر ہمارا استقبال کیا۔ وہ خاصا خوش نظر آرہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کی رہائی قریب آگئی تھی۔ اس کے پاؤں پر پٹی تو بدستور بندھی ہوئی تھی لیکن وہ چلتے پھرتے ہوئے اب بہت کم لنگڑا رہا تھا۔

صفدر اور سلیمان جو گھر کی نگرانی پر مامور تھے، مجھے بتانے لگے کہ دی لیڈی کا فون آیا تھا لیکن میں اس وقت سو رہا تھا اس لیے مجھے ڈسٹرب نہیں کیا گیا۔ وہ ڈاکٹر برنارڈ سے بات کرنا چاہتی تھی۔ صفدر اور سلیمان نے اپنی نگرانی میں برنارڈ سے اس کی بات کرا دی تھی اور اسپیکر سیٹ پر خود بھی سنتے رہے تھے۔ دی لیڈی نے اسے تاکید کی تھی کہ وہ جلد از جلد اور دیانتدارانہ طریقے سے اپنا کام کردے۔ اس کا مطلب تھا کہ دی لیڈی نے اپنے وعدے کے مطابق فون کیا تھا جبکہ مجھے یہ بات یاد بھی نہیں رہی تھی اور میں نے اس کے فون کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ اس کے طرزِ عمل سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اب اس کام کو نمٹانے کے معاملے میں مخلص تھی۔

ڈاکٹر برنارڈ راحیلہ کو دیکھ کر بڑی گرمجوشی سے انگریزی میں بولا "آؤ..... آؤ پیاری لڑکی! اس کرسی پر بیٹھ جاؤ....." اس نے ایک بڑے سے دیوار گیر آئینے اور لمبی چوڑی میز کے پاس رکھی ہوئی ریوالونگ چیئر کی طرف اشارہ کیا۔ میز مختلف ساز و سامان سے بھری ہوئی تھی۔

راحیلہ بیٹھ چکی تو ڈاکٹر برنارڈ نے خاصے مشفقانہ لہجے میں پوچھا "کیسی رہی دی لیڈی سے تمہاری ملاقات؟" اس کی مخاطب راحیلہ تھی۔

راحیلہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ ڈاکٹر برنارڈ نے سر ہلاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بُرا منائے بغیر بولا "او..... او..... لڑکی ابھی تک مجھ سے ناراض معلوم ہوتی ہے۔"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ وہ کس کس سے ناراض تھی۔ دی

زی کا نام آتے ہی اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو چکی تھیں ہم میں نے دھیمے لہجے میں ڈاکٹر برنارڈ کی بات کا جواب دینے کی کوشش کی "جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا تھا..... کیا اس کے بدلے تم سے خوش ہونا چاہیے تھا؟"

"او..... ہاں..... ہاں....." وہ ہوا میں انگلی لہراتے ہوئے بولا "بالکل ٹھیک کہا تم نے..... لیکن اس وقت میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں، اس کی مجھے کبھی اتنے عجیب سے حالات میں تلافی بھی کرنی پڑے گی۔"

"یہی تو انسان کی سب سے بڑی خرابی ہے ڈیئر برنارڈ!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "وہ کسی پر بڑی سے بڑی زیادتی کرتے وقت بھی یہ نہیں سوچتا کہ شاید کبھی اسے اس کی تلافی کرنی پڑ جائے۔"

"ہاں..... یہ تو ٹھیک ہے..... یہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے اپنی سارس جیسی گردن ہلائی اور چڑیلوں جیسا قہقہہ لگایا۔ اس وقت وہ نہ جانے کیوں مجھے کسی انگریزی فلم کا کوئی مزاحیہ کردار لگ رہا تھا۔ اس نے گویا ازسرِ نو میز پر رکھے سامان کو چیک کرنا شروع کر دیا تھا۔

سامان کی طرف سے مطمئن ہو کر اس نے راحیلہ سے پوچھا "تم تقریباً چار گھنٹے اس کرسی پر ساکت بیٹھ کر گزار لوگی؟ اگر تم چاہو تو میں تمہیں خواب آور دوا کا انجکشن دے سکتا ہوں۔ اس طرح تمہیں زیادہ زحمت نہیں ہوگی۔ آرام سے اس کرسی پر نیم دراز سوتی رہو گی۔ آنکھ کھلے گی تو چہرہ ٹھیک ہو چکا ہوگا۔"

"کیا اس کام میں مجھے کچھ تکلیف محسوس ہوگی؟" راحیلہ نے کڑی نظروں سے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں..... تکلیف تو کچھ نہیں ہوگی۔" ڈاکٹر برنارڈ نے نفی میں سر ہلایا "اصلی کام بھی صرف آدھے گھنٹے کا ہے۔ اس کے بعد تو صرف اور صرف انتظار کرنا ہے۔ انتظار کرنا بجائے خود ایک مشکل کام ہے۔ خصوصاً ساکت بیٹھ کر انتظار کرنا۔"

"میں انتظار کرلوں گی۔ مجھ میں صبر و تحمل سے انتظار کرنے کی بڑی اہلیت ہے۔ تم مجھے کوئی انجکشن وغیرہ مت لگاؤ۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔

ڈاکٹر برنارڈ نے اس کے گلے سے پٹی ہٹا دی۔ اُس نے گلے پر کوئی دوا لگا رکھی تھی جو بے رنگ تھی مگر چکنائی کی ایک تہ سی چمکتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس چکنائی میں انگلیوں کے نیلے نشانات اب بھی نمایاں تھے۔

"یہ کیا.....؟" ڈاکٹر برنارڈ حیرت سے بولا۔

"یہ تمہاری دی لیڈی کی محبت کی نشانی ہے۔ اس سے ملاقات بڑے خوشگوار ماحول میں ہوئی تھی۔" راحیلہ زہریلے لہجے میں بولی۔

"تم بہت بے صبری لڑکی ہو..... ضرور تم نے ہی کوئی گڑبڑ کی ہوگی....." ڈاکٹر برنارڈ ایک بار پھر فلمی چڑیلوں کے اسٹائل میں قہقہہ لگا کر بولا "ورنہ دی لیڈی سے جس طرح پروگرام طے پایا تھا اس میں کسی گڑبڑ کی اُمید نہیں تھی۔"

"ہاں..... گڑبڑ اکثر میری ہی وجہ سے ہوتی ہے۔" راحیلہ نے بظاہر پُرسکون لہجے میں کہا لیکن مجھے اندازہ ہوگیا کہ اندر ہی اندر وہ ایک بار پھر بھڑکنے لگی تھی۔

میں نے جلدی سے برنارڈ سے کہا "تم اپنا کام شروع کرو۔"

"ضرور..... ضرور۔" برنارڈ نے سعادت مندی سے کہا اور ایک بڑے سے سفید کپڑے کو جھاڑتے ہوئے پھر راحیلہ سے مخاطب ہوگیا "دی لیڈی نے مجھ سے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا کہ وہاں کوئی بدمزگی ہوئی تھی۔"

"یہ اس کے لیے غیر اہم بات ہوگی۔" راحیلہ کا لہجہ اب بھی پُرسکون مگر زہریلا تھا "اگر میں اس کے ہاتھوں ماری جاتی تو پھر شاید وہ تم سے ذکر کردیتی..... اور اگر وہ میرے ہاتھوں ماری جاتی تو میں اس خوشی میں پہلے تمہیں مٹھائی کھلاتی۔ پھر یہ خبر سناتی۔"

ڈاکٹر برنارڈ کے چہرے سے خوش مزاجی کے تاثرات یک دم غائب ہوگئے اور کچھ ایسی تکلیف کے آثار اُبھر آئے جیسے کسی نے اچانک اس کے پہلو میں گھونسا رسید کر دیا ہو۔

وہ نہایت سنجیدگی سے بولا "دی لیڈی کو مارنا تمہارے بس کی بات نہیں بے بی! وہ ایک ناقابلِ شکست عورت ہے اور ابھی کئی سو سال تک جیئے گی....."

اپنی تمام تر برہمی کے باوجود راحیلہ منہ پر ہاتھ رکھ کر یوں بے اختیار ہنس دی جیسے اس نے کوئی لطیفہ سُن لیا ہو۔ پھر وہ ناصحانہ سے انداز میں بولی "بالکل ہی پٹڑی سے اُترے ہوئے لوگوں کی طرح باتیں مت کیا کرو۔ آج کے دور میں ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ خصوصاً تم جیسے جینیٹک سرجن، سائنس داں اور ڈاکٹر کے منہ سے....."

"میں ایک جینیٹک سرجن، سائنس داں اور ڈاکٹر ہوں..... اسی لیے تو یہ بات کہہ رہا ہوں۔ وہ عورت بہت طویل عمر پائے گی اور اس کے پیچھے ایک راز ہے جو عام لوگوں کی سمجھ میں نہیں آسکتا۔" ڈاکٹر برنارڈ بدستور گہری سنجیدگی سے بولا۔

"اس کے ہاتھ ذرا کم تر درجے کا آبِ حیات لگ گیا ہوگا۔" راحیلہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

"یہی سمجھ لو۔" ڈاکٹر برنارڈ کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا "کچھ اسی سے ملتی جلتی بات ہے۔" اس نے حجاموں کی طرح کپڑا پھیلا کر راحیلہ کی گردن میں لپیٹ دیا اور بڑے انہماک سے ایک جار میں جھانکنے لگا۔

میں نے ملائمت سے کہا "تم حجاموں کی طرح کام ضرور کرو مگر حجاموں کی طرح اِدھر اُدھر کے قصے مت سناؤ۔ ویسے بھی میری ایک دوست کے بقول عورت میری کمزوری تو ہے لیکن اب ایسا بھی نہیں ہے کہ میں کئی سو سال کی عورت میں دلچسپی لینے لگوں۔"

"فی الحال تو وہ کئی سو سال کی نہیں ہے..... اور جب وہ کئی

دمال کی ہوگی تو تمہاری ہڈیاں بھی اس دنیا میں نہیں ہوں گی۔"
اکٹر برنارڈ بولا پھر اس نے متاسفانہ...... بلکہ ترحم آمیز انداز
ں سرہلایا اور بولا "تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ تم لوگ آسانی سے کسی
ی بات پر یقین نہیں کرتے حالانکہ ہمارے معاملے میں تم بہت سی
اقابل یقین چیزیں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہو۔ دوسرا مسئلہ یہ
ہے کہ تم لوگوں کے ذہن بہت چھوٹے ہیں۔ سائنسی ترقی کی رفتار
کے مقابلے میں بہت پیچھے ہیں۔ کسی بھی نئی بات کو تمہارا پسماندہ
ذہن قبول ہی نہیں کرتا۔"

"اچھا بھائی! تم اپنی ترقی پسندی کو اپنے پاس رکھو اور کام کی
طرف دھیان دو۔" میں نے قدرے بیزاری سے کہا "تمہاری
سائنسی ترقی نے ہمیں جتنے دکھ دیئے ہیں ان کے بعد تو ویسے بھی
اس قسم کی سائنسی ترقی سے نفرت ہوگئی ہے۔"

اس نے کندھے اُچکائے اور ریوالونگ چیئر کو ذرا گھما کر
راحیلہ کا چہرہ اپنی طرف کرلیا۔ ایک محدب عدسے سے اس نے
چہرے کا بغور جائزہ لیا پھر عدسہ ایک طرف رکھ کے ایک نہایت
نفیس قسم کا باریک برش اٹھالیا۔ یہ برش اس نے شیشے کے ایک جار
میں ڈبویا جس میں سفید پینٹ سا موجود تھا لیکن یہ سیال پینٹ سے
کچھ پتلا اور دودھ سے کچھ گاڑھا معلوم ہوتا تھا۔ اس میں ہلکی نقرئی
کی جھلک بھی موجود تھی۔

جار اور برش ہاتھ میں تھام کر ڈاکٹر برنارڈ راحیلہ کے چہرے پر
جھک گیا اور مستعد سے لہجے میں بولا "آنکھیں بند کرلو...... اور ہلنا
مت۔" ریوالونگ چیئر کا ایک لیور دبا کر اس نے اسے اس کی جگہ
ساکت کردیا تھا۔

اس نے کسی ماہر مصوّر کی سی مشّاقی سے وہ سفید محلول راحیلہ
کے چہرے کے سیاہ حصے پر پینٹ کرنا شروع کیا۔ درمیانی حصے کو پینٹ
کرنا بڑی مہارت کا کام تھا کیونکہ اس پینٹ نما سیال کو غالباً سفید
حصے کی طرف نہیں جانا چاہیے تھا۔ برنارڈ یہ کام نہایت مہارت
سے ہی کررہا تھا۔ جس نفاست سے وہ برش استعمال کررہا تھا' اسے
دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر وہ پینٹر بھی ہوتا تو شاید بڑا
صاحب کمال ہوتا۔

آخر اس نے سیاہ حصے کو مکمل سفید کردیا لیکن یہ سفیدی
بہرحال انسانی رنگت کی طرح فطری نہیں تھی۔ کچھ ایسا ہی معلوم
ہورہا تھا جیسے راحیلہ کے آدھے چہرے پر نقرئی پینٹ کردیا گیا تھا۔
البتہ اس کے نیچے اس کے چہرے کی سیاہی مکمل طور پر چھُپ کر رہ گئی
تھی۔ برنارڈ اس کے چہرے پر پھونکیں بھی مارتا جارہا تھا جس سے وہ
پینٹ نما سیال غالباً تیزی سے خشک ہوتا جارہا تھا۔

برنارڈ نے یہ کام مکمل کرکے گویا سکون کی سانس لی اور راحیلہ
کو ہدایت کی "اب تم کچھ دیر کے لیے آنکھیں کھول سکتی ہو تاکہ
تمہیں زیادہ الجھن نہ ہو۔ اُلجھن ہوگی تو چہرے کے عضلات معمولی
نا ہموار کیں گے اور اس کام کے دوران میں عضلات ذرا بھی پھڑکنے
نہیں چاہئیں۔ مجھے تمہارا چہرہ اس طرح چاہیے جیسے کسی مُردے کا
چہرہ ہوتا ہے۔"

راحیلہ آنکھیں کھول کر اسے گھورتے ہوئے بولی "تم اسے
مردے کا...... بلکہ زمانۂ غار کے کسی مُردے ہی کا چہرہ سمجھو۔ اس
میں اگر زندگی کی کوئی رمق تھی تو وہ بھی تم جیسے منحوس لوگوں نے
چھین لی ہے۔"

پھر وہ آئینے میں اپنے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ ڈاکٹر برنارڈ...
فی الحال شاید اس کی برہمی کو مذاق سمجھ کر ٹالے جارہا تھا۔ شاید اس
کی وجہ بھی صرف یہ تھی کہ اس کا اپنا موڈ اس وقت بڑا خوشگوار تھا
تاہم میں نہیں چاہتا تھا کہ راحیلہ کی زہریلی جملے بازی جاری رہے
اور کسی مرحلے پر برنارڈ کے جذبات مجروح ہوجائیں۔ وہ اس وقت
ایک نازک کام میں مصروف تھا۔ اس کا موڈ خوشگوار رہنا ہی بہتر
تھا۔

"ڈاکٹر! کافی پینا پسند کروگے؟" میں نے پوچھا۔

"خدا کا واسطہ...... ایسی باتیں مت کرو۔" وہ فوراً بولا "اس
کام کے دوران میں میں کچھ کھانے پینے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔
ویسے بھی یہ وقفہ صرف دو منٹ کا ہے۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

میں نے اس وقت خدا کا شکر ادا کیا جب باقی وقفہ خیریت اور
خاموشی سے گزر گیا۔ اس دوران میں راحیلہ نے مزید کسی زہریلے
جملے سے برنارڈ پر حملہ نہیں کیا اور پُرخیال انداز میں آئینے میں
اپنے چہرے کا جائزہ لیتی رہی۔

ٹھیک دو منٹ بعد برنارڈ نے دوسرا جار اٹھایا۔ اس میں سیاہ
پینٹ نما سیال موجود تھا۔ اس نے یہ سیال ایک دوسرے نفیس برش
کی مدد سے راحیلہ کے باقی آدھے چہرے پر پینٹ کرنا شروع کیا جس
کی فطری رنگت برقرار تھی۔ کچھ دیر بعد وہ حصہ سیاہ ہوچکا تھا۔ یعنی
اب معاملہ الٹ ہوگیا تھا۔ چہرے کا جو حصہ پہلے سیاہ تھا وہ اب
سفید نظر آرہا تھا اور جو حصہ سفید تھا وہ اب سیاہ ہوچکا تھا۔

ڈاکٹر برنارڈ اس بار بھی چہرے کو پینٹ کرنے کے ساتھ ساتھ
پھونکیں مارتا رہا۔ کوئی دیسی آدمی اس طرح کررہا ہوتا تو اُسے کسی
خاص روحانی عمل کا نام بھی دیا جاسکتا تھا لیکن وہ درحقیقت صرف
اس کیمیکل کو سکھانے کے لیے ایسا کررہا تھا۔ پینٹ مکمل کرنے کے
بعد اس نے اسے زیادہ صحیح طور پر سوکھنے کے لیے مزید دو منٹ
دیئے۔

پھر اس نے راحیلہ سے پوچھا "اب تم تین گھنٹے تک آنکھیں
بند کرکے بیٹھنے کے لیے تیار ہو؟ یہ خاصا مشکل کام ہے۔"

"میں چھ گھنٹے بھی آنکھیں بند کرکے بیٹھ سکتی ہوں کیونکہ اس
طرح مجھے تمہاری منحوس شکل نظر آنا بند ہوجاتی ہے۔" وہ بلا تامل
بولی۔

ڈاکٹر برنارڈ نے اب بھی خوش دلی سے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا
"اس وقت میں تمہارے لیے جو خدمت انجام دے رہا ہوں اس

کی وجہ سے تو تمہیں میری شکل نہایت حسین نظر آنی چاہیے۔"

"ڈاکٹر برنارڈ!" راحیلہ سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم خواہ سات مرتبہ بھی جنم لے لو اور اپنا سارا سائنسی علم بھی اپنے چہرے پر آزمالو تب بھی مجھے تمہاری شکل حسین نظر نہیں آسکتی۔ مجھے ریڈ ذات سے تعلق رکھنے والا ہر چہرہ منحوس ہی نظر آئے گا کیونکہ ان کے لیے میرے خون میں نفرت گھلی ہوئی ہے۔"

"اوہ میرے خدا......!" برنارڈ چھت کی طرف دیکھ کر بولا "تمہیں کیا ہوگیا ہے راحیلہ ڈیئر؟ مانا کہ تم بہت پُرجوش لڑکی ہو لیکن ایسی مغلوب الغضب تو نہیں ہوا کرتی تھیں۔"

"مجھے پاگل کُتّے نے کاٹ کھایا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"اور تب سے بے چارے کتے کی حالت خراب ہے۔" میں بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ایسے موقعوں پر اگر راحیلہ کو کوئی جواب نہیں دینا ہوتا تھا تب بھی وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتی ضرور تھی لیکن اس وقت اس نے یہ زحمت بھی نہیں کی۔

ڈاکٹر برنارڈ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا "میرا خیال ہے مجھے اپنا کام مکمل کر ہی دینا چاہیے۔"

اس نے ہیلمٹ نما ایک ماسک اٹھایا اور راحیلہ کے سر پر چڑھا دیا۔ اس میں آگے کی طرف ایک خاص ساخت کا موٹا نیلگوں شیشہ لگا ہوا تھا جس سے راحیلہ کا پورا چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ اب اس نے چھوٹے سے ایک اسٹینڈ پر سات مستطیل شیشے فٹ کیے۔ ہر شیشہ مختلف رنگ کا تھا اور یہ اسٹینڈ ڈاکٹر برنارڈ نے خود تیار کیا تھا۔

یہ اسٹینڈ راحیلہ کے چہرے کے عین سامنے فٹ کر کے برنارڈ نے ایک لیمپ ان شیشوں کے پیچھے رکھا جس میں طاقتور مرکری بلب لگا ہوا تھا۔ پھر وہ راحیلہ سے مخاطب ہوا "اب تم تین گھنٹے تک اپنے آپ کو جتنا ساکت رکھو گی اتنا ہی بہتر ہوگا۔"

میں نے شبیر شیخ اور سردار علی سے کہا "تم لوگ چاہو تو چلے جاؤ۔ تین گھنٹے اس طرح یہاں بیٹھے تم لوگ کیا کرو گے؟ میں تو بہرحال یہیں بیٹھوں گا۔"

وہ ذرا متجسس سے انداز میں...... لیکن خاصے صبر و سکون سے بیٹھے ہوئے تھے۔ شبیر بولا "آپ بیٹھے ہیں تو ہم بھی بیٹھے رہتے ہیں۔"

راحیلہ ماسک کے عقب سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "بیٹھا رہنے دو نا بے چاروں کو...... ان کے سامنے سرکس کی بندریا تیار ہو رہی ہے۔ یہ تماشا انہوں نے زندگی میں پہلے کہاں دیکھا ہوگا۔"

شبیر شیخ اور سردار علی نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا اور خاموشی سے اٹھ کر چلے گئے۔ میں نے راحیلہ سے کہا "جوں جوں مسئلہ حل ہونے کے قریب آرہا ہے، تمہاری تلخی کم ہونے کے بجائے بڑھتی جارہی ہے۔ تم ان مخلص ساتھیوں کی دل آزاری سے بھی باز نہیں رہیں جو تمہارے ایک اشارے پر جان قربان کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔" ضبط کی کوشش کے باوجود میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی آگئی۔

تب وہ میری طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ چہرے پر دو طرح کے پینٹ کی وجہ سے اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ عجیب لگ رہا تھا۔ ان دونوں رنگوں میں نقرئی سی چمک تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک قسم کی طمانیت سی ابھری۔ گویا اس کے لیے یہ اطمینان کی بات تھی۔ وہ کسی کی دل آزاری کرنے میں کامیاب رہی تھی۔

پھر وہ دھیمی آواز میں بولی "آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوا ہے۔"

"لعنت ہے ایسے دل پر...... اور ایسے درد پر۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

ڈاکٹر برنارڈ راحیلہ سے مخاطب ہوا "میں نے تین گھنٹے ساکت رہنے کی جو بات کی تھی اس میں تمہاری زبان کا ساکت رہنا بھی شامل تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں کچھ نہیں بولوں گی۔ بالکل اچھی بچی بن کر بیٹھوں گی۔" راحیلہ نے وعدہ کیا اور ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے ساکت بیٹھ گئی۔

"آنکھیں بند رکھنی ہیں۔" برنارڈ نے یاد دلایا۔ راحیلہ نے آنکھیں بند کرلیں۔

تب برنارڈ نے مرکری لائٹ آن کردی۔ تیز چمکیلی روشنی مختلف شیشوں سے گزرتی ہوئی راحیلہ کے چہرے تک پہنچنے لگی۔ شیشے غالباً فلٹرز کا کام دے رہے تھے۔ اس وقت مجموعی طور پر منظر کچھ اس قسم کا تھا جیسے کسی بیوٹی پارلر میں راحیلہ کا کوئی خاص میک اپ ہو رہا ہو اور اسی مقصد کے لیے اس کے چہرے پر ماسک چڑھایا گیا ہو۔ میں ایک ٹک اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ مرکری بلب کی بہت تیز روشنی ہلکی ہو کر اس کے چہرے تک پہنچ رہی تھی اور مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ پل پل رنگ بدل رہی ہو۔ معلوم نہیں یہ میرا فریبِ نظر تھا یا حقیقت...... کہ مجھے اس کے چہرے پر رنگا رنگ کرنیں رقص کرتی محسوس ہو رہی تھیں۔

میں بھی راحیلہ ہی کی طرح ساکت بیٹھا تھا اور ایک ٹک منظر دیکھے جارہا تھا۔ منظر بھی اپنی جگہ ساکت تھا۔ بس کرنوں کا رقص جاری تھی۔ ڈاکٹر برنارڈ نے ایک کتاب سنبھالی اور بڑے اطمینان سے ایک چھوٹے سے بیڈ پر جالیٹا۔

"میرے کرنے کا اب کوئی کام نہیں ہے۔ اس لیے میں اب مطالعے سے دل بہلاؤں گا۔ میری مانو تو تم بھی جاکر آرام کرو۔" اس نے مشورہ دیا "تم اس کے پاس بیٹھے بیٹھے

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا "لیکن ضروری تو نہیں کہ انسان ہر وقت کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہے۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کتاب کھول کر اس کے مطالعے میں منہمک ہوگیا۔ شاید اس لمحے اس نے دل ہی دل میں سوچا ہو "یہ ایشیائی واقعی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔" شاید اس کا خیال درست ہی رہا ہو۔ مجھے خود اس وقت اپنا آپ عجیب لگ رہا تھا اور اس سے بھی عجیب تر وہ منظر تھا جس پر اس وقت میں نظر جمائے بیٹھا تھا۔ وہ کردار بھی کچھ کم عجیب نہیں تھا جو اس وقت میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ شاید یہ خیال بھی میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں موجود تھا کہ یہ منظر الوداعی مناظر میں سے ایک ہے۔ شاید میں ان الوداعی مناظر کو آنکھوں میں سمو لینا چاہتا تھا۔

راحیلہ کو تو تین گھنٹے ساکت بیٹھنا ہی تھا۔ یہ اس کی مجبوری تھی مگر میں کسی مجبوری کے بغیر تین گھنٹے ساکت بیٹھا رہا جبکہ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میرے لیے گویا وہ مصر کے اہراموں میں بچی ہوئی کسی عزیز از جاں ہستی کی ممی تھی اور میں کسی معجزے کے تحت اسے دوسری زندگی ملنے کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

آخر کار ڈاکٹر برنارڈ انگڑائی لے کر بستر سے اٹھا اور اس نے گھڑی دیکھی۔ شاید اس دوران میں اسے غنودگی آگئی تھی کیونکہ کافی دیر کے لیے میں نے کتاب اس کے منہ پر رکھی دیکھی تھی۔ میں اپنی جگہ کچھ اکڑ کر رہ گیا تھا۔ ڈاکٹر برنارڈ حرکت میں آیا تو میں نے بھی اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی۔

برنارڈ نے مرکری لائٹ آف کی اور ہیلمٹ نما ماسک کا شیشہ کا اُٹھا کر محدب عدسے سے راحیلہ کا نہایت باریک بینی سے معائنہ کیا۔ گو کہ مرکری لائٹ آف ہوچکی تھی لیکن میری آنکھوں کے سامنے گویا اب بھی نیلی پیلی شعاعیں رقص کر رہی تھیں۔ برنارڈ کا معائنہ خاصی دیر جاری رہا۔ اس دوران میں میری آنکھوں کے سامنے شعاعوں کا رقص ختم ہوگیا لیکن آنکھیں گویا بخار کی سی کیفیت میں جل رہی تھیں۔ میں نے اپنے آپ کو تھوڑی سی لعنت ملامت بھی کی کہ آخر مجھے اُلّوؤں کی طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر اس عمل کا مسلسل جائزہ لینے کی کیا ضرورت تھی؟

آخر برنارڈ نے طمانیت آمیز سی گہری سانس لی اور راحیلہ سے مخاطب ہوا "اب تم آنکھیں کھول سکتی ہو۔"

"افسوس کہ اتنی دیر کے مراقبے کے بعد بھی آنکھیں کھولنے پر مجھے تمہاری نیولے جیسی شکل ہی نظر آئے گی۔" وہ ایک طویل سانس لے کر آہستگی سے آنکھیں کھولتے ہوئے بولی۔

"اگر تم مجھ پر مہربان ہونے کا وعدہ کرو تو میں کسی فلمی ہیرو کی شکل بھی اُدھار مانگ سکتا ہوں۔" اس مرتبہ برنارڈ بھی جواب دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"اوہ...... " راحیلہ نے اسے گھورا "اب تو تمہیں بھی چہکنا آگیا ہے۔"

"تم جیسے زندہ دل لوگوں کی صحبت میں رہ کر کچھ سیکھ رہا ہوں۔" برنارڈ نے اس کے چہرے کا معائنہ جاری رکھتے ہوئے جواب دیا۔ راحیلہ نے خود بھی کن انکھیوں سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ عجیب بات تھی کہ اس کے چہرے پر لگے ہوئے کیمیکلز کا رنگ اب الٹ چکا تھا یعنی جدھر سفید کیمیکل لگایا گیا تھا وہ سیاہ ہوچکا تھا اور سیاہ کیمیکل سفید ہوچکا تھا۔ یوں وہ دو رنگی ترتیب چہرے کے رنگوں کے مطابق ہی ہوگئی تھی۔ یعنی راحیلہ کا چہرہ ویسا ہی نظر آنے لگا تھا جیسا اس کرسی پر بیٹھنے سے پہلے تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب دونوں طرف ہلکی سی نقرئی چمک نظر آرہی تھی جو ان کیمیکلز یا پینٹ کی تھی۔

"یہ تم نے کیا کیا ہے خبیث؟" راحیلہ گویا یک دم بھڑک اٹھی "میرا چہرہ تو وہی پہلے جیسا ہے۔"

"ہاں...... اب تمہیں اس پر خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے لڑکی"..برنارڈ طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولا "یہ میری کوشش کے کامیاب ہونے کی نشانی ہے۔ تمہیں اتنی جلدی آپے سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک اور جار اٹھایا۔ اس میں ناریل کے تیل جیسا کوئی بے رنگ سا محلول موجود تھا۔ اس نے ذرا چوڑے برش سے اب وہ محلول راحیلہ کے چہرے پر پھیرنا شروع کردیا۔

"تم نے تو میرے چہرے کو سنیما کی دیوار بنالیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد برش اٹھاتے ہو اور کوئی نیا پینٹ کرنا شروع کردیتے ہو۔" راحیلہ ناگواری سے بولی۔

"منہ بند رکھو۔" برنارڈ نے ہدایت کی "ورنہ برش منہ میں چلا جائے گا اور کیمیکل زبان پر لگ جائے گا جس کے بعد تم پورے خانے میں ناچتی پھرو گی۔"

"ہوسکتا ہے اس کیمیکل کی برکت سے زبان چلنے کی رفتار کچھ کم ہو جائے۔" میں نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا۔

برنارڈ نے مغموم انداز میں نفی میں سر ہلایا "اس کے برعکس اندیشہ ہے کہ رفتار بڑھ نہ جائے۔ میں اپنی تمام تر سائنسی اور طبی قابلیت کے باوجود ابھی تک کوئی ایسی دوا ایجاد نہیں کرسکا جو عورت کی زبان کی رفتار کم کرسکے۔"

"شکر کرو کہ بات صرف زبان چلنے پر ٹل رہی ہے۔" راحیلہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے دانت پیس کر بولی "ورنہ میرے تو ہاتھ بھی چلنے کے لیے مچل رہے ہیں۔"

"اچھا...... خدا کے لیے اب ذرا سا منہ بند کرو اور آنکھیں بھی......" برنارڈ نے سنجیدگی سے کہا۔

راحیلہ نے گویا بادلِ ناخواستہ اس کی ہدایت پر عمل کیا اور برنارڈ نے بے رنگ سیال کا پینٹ مکمل کرلیا۔ دو منٹ بعد اس نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو دونوں طرف کے پینٹ میں نقرئی چمک ختم

ہو چکی تھی۔ برنارڈ نے پانی سے بھرے ہوئے ایک جگ میں بے رنگ سی کوئی دوا ملائی اور وہ جگ راحیلہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اب تم واش بیسن پر رکھے ہوئے صابن اور اس پانی سے منہ دھولو۔"

راحیلہ کرسی سے اٹھی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اس کا جسم بھی بیٹھے بیٹھے اکڑ چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو ذرا موڑا توڑا پھر آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے بولی "ڈاکٹر برنارڈ! خدا تمہیں غارت کرے...... سرکس کے کسی مسخرے...... کسی کلاؤن کی زندگی بھی اتنی مضحکہ خیز نہیں ہوتی ہوگی جتنا تم نے میری زندگی کو مضحکہ خیز بنا دیا۔"

"اب جب دعائیں دینے کا وقت آیا ہے تو تم بددعائیں دینے لگی ہو۔" برنارڈ کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"پہلے بد دعائیں دینے کی فرصت نہیں مل سکی تھی تا...... مصروفیت بہت زیادہ تھی۔"

راحیلہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ پھر وہ جا کر واش بیسن پر اس جگ سے پانی لے کر اور اچھی طرح صابن مل مل کر نہایت آہستگی سے ہاتھ منہ دھونے لگی۔ میری دھڑکنیں اس وقت متزلزل تھیں۔ شاید راحیلہ کے دل کا بھی یہی حال ہو۔

منہ دھونے کے بعد اس نے تولیے سے خشک کیا پھر دھیرے دھیرے ہماری طرف گھومی۔ میں نے دیکھا' اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ وہ اسی طرح اندازے سے چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھاتی آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی اور مرتعش لہجے میں بولی "برنارڈ! تم اپنی اس ساری ڈرامے بازی سے مجھے بھی تجسس میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہوگئے ہو۔ اب میرا آنکھیں کھولنے کا حوصلہ نہیں پڑ رہا۔ تم دیانت داری سے مجھے بتادو کہ چہرہ ٹھیک ہوگیا ہے یا نہیں؟"

اس نے سوال مجھ سے نہیں' برنارڈ سے کیا تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ ویسے بھی شاید مجھ میں فوری طور پر بولنے کی سکت نہیں تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس کا چہرہ واقعی اپنی اصلی حالت پر آچکا تھا۔ اس کے چہرے پر سیاہی گویا کہ کبھی تھی ہی نہیں۔ اب اس کے پورے چہرے کی رنگت شگفتہ گلاب کی سی تھی۔ مجھے یہ سب کچھ ایک خواب لگ رہا تھا اور دل نہیں مان رہا تھا کہ یہ انہونی ہو چکی تھی۔

اس لمحے تک میرا دل امید اور ناامیدی کے درمیان کہیں معلق تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آخر میں راحیلہ کا چہرہ جوں کا توں نہ رہ جائے اور برنارڈ معذرت خواہانہ لہجے میں یہ نہ کہہ دے کہ فلاں گڑ بڑ ہوگئی یا فلاں مسئلہ ہوگیا اس لیے اس کی کوشش سے صحیح نتائج حاصل نہیں ہوسکے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ وہ کام جو بہت سے دشوار گزار مرحلوں سے گزرنے کے بعد بھی مجھے مشکل ہی نظر آرہا تھا' آخر کار ہوگیا تھا۔ میرا دل تشکر کے جذبات سے نہ جانے کیوں لرز سا رہا تھا۔ شاید تشکر کے ساتھ ساتھ میرے دل کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں یہ کوئی خواب ہی نہ ہو۔ خواب ٹوٹ جائے اور آنکھ کھل جائے تو سب کچھ پہلے ہی کی طرح دکھائی دے۔

ڈاکٹر برنارڈ بولا "میں تمہارے سوال کا جواب نہیں دوں گا بلکہ تم ایک بہادر لڑکی ہو۔ تم نے ایک عرصے تک حالات اور حقائق کا مردوں سے زیادہ دلیری سے مقابلہ کیا ہے۔ تم خود آنکھیں کھول کر اب بھی حقیقت کا سامنا کرو۔"

"مجھے مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔" راحیلہ خبردار کرنے والے انداز میں بولی "اس سے تمہارے بارے میں میرے جذبات تبدیل نہیں ہوں گے۔ اگر اتنی مصیبتیں جھیلنے کے بعد اب بھی میرا چہرہ ٹھیک نہ ہوا تو میں تمہیں قتل کرکے تمہاری لاش اسی تہ خانے میں دفن کردوں گی۔"

"آہ...... ! تمہارے اس خوبصورت سراپا میں مجھ سے بھی زیادہ خبیث روح مقید ہے۔" برنارڈ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "بہرحال...... تمہیں آنکھیں تو کھولنا ہی پڑیں گی۔ اس کے بعد جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔"

"اچھا...... تم کہتے ہو تو یونہی سہی۔" راحیلہ نے گہری سانس لی اور یک دم آنکھیں کھول دیں۔ کئی لمحے تک وہ پلک جھپکے بغیر آئینے میں خود کو دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر صرف ایک لمحے کے لیے تغیر سا نمودار ہوا لیکن وہ نہایت صفائی سے اسے دبا گئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ تاثرات سے عاری دکھائی دینے لگا جیسے اس کا چہرہ ٹھیک ہوگیا تھا تو یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں تھی۔

تاہم چند لمحے بعد آہستگی سے ڈاکٹر برنارڈ کی طرف مڑی اور نہایت ملائمت سے بولی "تمہارا بہت شکریہ ڈاکٹر برنارڈ! مجھے زندگی میں کبھی تم سے کسی اچھائی کی امید نہیں تھی لیکن اب تم مجھے ایک بالکل مختلف انسان نظر آرہے ہو۔"

اس کا لہجہ اب بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ تیزی تُندی' نفرت' تلخی اور حد سے زیادہ برہمی اس لہجے سے مفقود ہو چکی تھی۔ پھر وہ ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں میری طرف گھومی اور اسی ملائمت سے بولی "تمہارا بھی بہت شکریہ انی! تم نے میری خاطر بہت زحمت اُٹھائی۔"

میں نے اپنی عجیب و غریب کیفیات کے مدّوجزر سے نکلتے ہوئے اور سنبھلتے ہوئے ذرا مسکرا کر کہا "بہت تکلف سے بات کررہی ہو۔ لگتا ہے یکایک ہی تمہارے اندر کسی وضع دار' باتکلف اور نرم خو انسان کی روح حلول کرگئی ہو۔"

"انسان خود اپنی جگہ ایک بہت بڑی بد روح ہے۔ اس کے اندر سو طرح کے انقلاب آتے رہتے ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"تو پھر تمہارے اندر کوئی نیا انقلاب آیا یا نہیں؟" میں نے فوراً پُرامید لہجے میں پوچھا "تم نے جانے کا ارادہ ملتوی کیا یا نہیں؟"

"وہ تو جو فیصلہ ہوگیا سو ہوگیا۔ اس میں اب ترمیم کی کوئی

فائش نہیں۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولی "تاہم اب اتنا ضرور گا کہ میں تم سے کسی ناخوشگوار اور تلخ ماحول میں اجازت نہیں ہوں گی۔ میں دوستانہ ماحول میں رخصت ہوں گی اور شاید آئندہ ی ملاقات ہوتی رہے۔"

"اب جبکہ تمہاری کھوپڑی ٹھنڈی ہوگئی ہے تو مجھے ذرا تحمل ے...... صحیح طرح کوئی وجہ سمجھاؤ تو سہی۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"وجہ شاید کوئی ایک نہیں...... کئی وجوہات ہیں۔" وہ دوبارہ ریوالونگ چیئر پر بیٹھتے ہوئے بولی "شاید تم نے ٹھیک ہی کہا تا...... میں تھک گئی ہوں...... اور مجھے عارضی نہیں' مستقل آرام چاہیے۔ میں اپنا لائف اسٹائل بدلنا چاہتی ہوں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ جو کچھ میں کرتی ہوں' یہ ایک لڑکی کے کام نہیں ہیں۔"

"لائف اسٹائل تو تم یہاں رہ کر زیادہ آسانی سے بدل سکتی ہو۔ تمہیں ہر طرح کی سپورٹ حاصل ہوگی۔ تم جیسا لائف اسٹائل چاہو اختیار کرسکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"یہی تو مسئلہ ہے......" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اب میں بغیر کسی سپورٹ کے' بغیر کسی کی مداخلت کے زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

"وہ بھی تم یہیں رہتے ہوئے کرسکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"نہیں کرسکتی۔ میں تمہارے قریب رہوں گی تو وہ خود مختاری کا احساس پیدا نہیں ہوگا جو میں چاہتی ہوں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "ویسے تمہارا یہ کہنا بھی غلط ہے کہ جو کچھ تم کرتی پھر رہی ہو وہ ایک لڑکی کے کام نہیں ہیں۔ یہ تو بیچ میں ان خبیث ریڈ ڈاٹ والوں کی وجہ سے کچھ عرصہ ایسا گزرا جس میں سبھی کا لائف اسٹائل بے ہودہ ہوگیا۔ اب تو ان سے مکمل طور پر جان چھوٹ رہی ہے...... اور ان دنوں جو کچھ تم کررہی ہو وہ تو اب غیر ممالک میں کیا' پاکستان میں بھی کئی بہت بڑی کمپنیوں میں ملازمت کرنے والی لڑکیاں اور کئی بہت بڑی کاروباری فیملیوں کی لڑکیاں کررہی ہیں۔ یہ ایک بہت ذمے دارانہ قسم کی اور بہت بڑی آفس جاب ہے۔ تم نمبر دو کی حیثیت سے ایک بڑے گروپ آف کمپنیز کو چلا رہی ہو۔ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ یہ ایک لڑکی کا کام نہیں ہے؟"

شاید اب اس سے کوئی دلیل بن نہیں پڑ رہی تھی۔ وہ سر جھکاتے ہوئے ضدی سے لہجے میں بولی "بس اب میں لاہور میں رہنا نہیں چاہتی...... دی سرکل سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی...... تم سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی...... تمہارے قریب' تمہاری نظر میں رہنا نہیں چاہتی۔"

میرے دل کو جیسے کسی نے مُٹھی میں لے کر مسل دیا لیکن میں نے اپنے لہجے سے اپنی اذیت ظاہر نہ ہونے دی اور طویل سانس لے کر کہا "ہاں...... یہ ہے اصل بات...... اور اس کے سامنے کوئی دلیل نہیں چل سکتی۔ جانے والوں کو بھلا کون روک سکتا ہے۔" میں نے گویا بحث ختم کردی۔

ڈاکٹر برنارڈ اس دوران میں میز کے قریب ہی کھڑا بغور باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور گویا ہماری گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ ہم اردو میں بات کررہے تھے۔

ہماری باتوں کا کچھ مفہوم گویا ڈاکٹر برنارڈ کی سمجھ میں آگیا اور وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے راحیلہ سے مخاطب ہوا "تم افضل اینڈ کمپنی کو چھوڑ کر جارہی ہو؟ بہت خوب...... بہت خوب...... تاخیر سے ہی سہی...... لیکن تم نے اچھا فیصلہ کیا۔ اب تم ہمارے ساتھ چلو...... ہم تمہیں ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ کوارٹرز میں کسی بہت اچھے عہدے پر فائز کردیں گے۔ ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ کوارٹرز میں کوئی اچھا عہدہ بعض ملکوں کے سربراہوں سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔"

"میں لعنت بھیجتی ہوں تم پر...... ریڈ ڈاٹ پر...... اور تمہارے اہم عہدے پر۔" راحیلہ یک دم پھر گویا جلال میں آگئی "اس سے تو کہیں بہتر ہے کہ میں جنگلی سؤروں کے ریوڑ میں شامل ہوجاؤں۔"

ڈاکٹر برنارڈ کا منہ بن گیا اور وہ ناگواری سے بولا "واقعی تم لوگ اس قابل ہی نہیں ہو کہ تمہیں کبھی کوئی اچھی پیشکش کی جائے۔"

"اور تم لوگ اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں اچھائی اور بُرائی کا فرق معلوم ہوسکے۔" راحیلہ ترکی بہ ترکی بولی "خدا نے تم لوگوں کی آنکھوں' کانوں اور دل پر مہر لگادی ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے ملائمت سے ڈاکٹر برنارڈ کو مخاطب کیا "معاف کرنا پیارے برنارڈ! میں اور راحیلہ محاورے کے مطابق اپنے گندے کپڑے تمہارے سامنے دھونے بیٹھ گئے تو تم نے اس سے غلط مطلب اخذ کرلیا اور تمہیں بے نقط سننا پڑیں۔ میرا مشورہ ہے کہ تم ان چکروں میں پڑنے کے بجائے اپنے کام سے کام رکھو۔ یہ بتاؤ کہ اب راحیلہ کو کسی احتیاط کی ضرورت تو نہیں؟"

اس نے کندھے اُچکا کر گویا ناگواری کو ذہن سے جھٹکا اور ایک بار پھر میز کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "ہاں...... دو چار دن تو احتیاط کرنی ہوگی لیکن وہ محض اتنی ہوگی کہ دھوپ میں جاتے وقت یہ لوشن اپنے چہرے پر لگالیا کرے......"

اس نے میز سے ایک شیشی اٹھا کر راحیلہ کی طرف بڑھائی جس میں پانی جیسا ایک بے رنگ محلول تھا۔ راحیلہ شیشی لے کر اسے بغور دیکھنے لگی۔ برنارڈ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "دن نکلنے کے بعد کسی وقت بھی انسان کا دھوپ میں چلے جانے کا امکان ہوتا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ صبح تیار ہونے کے بعد ہی احتیاطاً یہ لوشن چہرے پر لگالیا کرو۔ یہ پانی کی طرح پتلا اور بے بو ہے۔ چہرے پر اس کی موجودگی کا قطعاً کوئی احساس نہیں ہوگا۔"

ڈاکٹر برنارڈ نے گویا اپنا کام ختم کرلیا تھا۔ وہ ہاتھ ملتے ہوئے پُراشتیاق انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا "میرے لیے اب کیا حکم ہے؟"

"تمہیں معلوم تو ہے......" میں نے قدرے تعجب سے کہا "پرسوں صبح دوسرا تبادلہ عمل میں آئے گا۔ پروگرام طے ہوچکا ہے۔"

"اوہ......! پرسوں صبح تک کا وقت میں اس قید خانے میں کیسے گزاروں گا؟" وہ کراہ کر بولا "میں نے اپنا کام دیانتداری سے مکمل کردیا ہے۔ تم مجھے ابھی کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟"

"واہ میرے دوست!" میں نے سرہلایا "تم تو کچھ زیادہ ہی پھیلنے لگے۔ میں تمہیں چھوڑ دوں اور ٹونی کی طرف سے صبر کرلوں جو دی لیڈی کی تحویل میں ہے؟ مجھے تو نہیں معلوم کہ دی لیڈی کہاں روپوش ہے اور کس طرح اس سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔"

"میں چلا جاؤں گا تب بھی ٹونی واپس آجائے گا۔" اس نے گویا مجھے تسلی دی۔

"میں نے تم لوگوں پر جتنا اعتبار کیا ہے اتنا ہی کافی ہے۔ اب یہ توقع مت رکھو کہ میں بالکل ہی آنکھیں بند کرکے تمہاری ہر بات مان لوں گا۔ تم لوگ اتنے بھی نیک اور دیانتدار نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

وہ مایوسی کے سے عالم میں خاموش ہوگیا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "اس کا مطلب ہے تمہیں معلوم ہے دی لیڈی کہاں موجود ہے۔ یہاں سے نکل کر تم اس کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے تھے؟"

"نہیں...... میرا تو خود کافی عرصے سے اس سے رابطہ ٹوٹا ہوا تھا۔ مجھے اب بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے اور کس طرح اس سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ چند گھنٹے پہلے گو کہ تمہاری غیر موجودگی میں اس نے مجھ سے بات کی۔ پھر بھی اس نے اس سلسلے میں کوئی اشارہ تک نہیں دیا کہ کہیں تم لوگ تشدد کرکے مجھ سے معلوم نہ کرلو۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر تم یہاں سے نکل کر کہاں جانا چاہتے تھے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو صرف آزادی کے احساس سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ پرسوں صبح تبادلے کے وقت تک تو شاید میں یہیں لوٹ آتا اور تمہارے ہی توسط سے دی لیڈی کے پاس پہنچتا۔" اس نے بڑی معصومیت سے جواب دیا۔

میں چند لمحے اسے گھورتا رہا۔ اس کی گویا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں اسے کیوں گھور رہا تھا۔ آخر میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ان غچّا بازیوں کو چھوڑو پیارے...... اور آرام سے پرسوں صبح تک کا وقت یہاں گزار دو۔ اب یہ تمہارے لیے قید خانہ نہیں ہے۔ اب تو تمہیں ایک مہمان کی طرح زندگی کی ہر آسائش یہاں میسر ہے۔ اب شاید پرسوں ہی تم سے ملاقات ہو۔ خدا حافظ۔"

میں نے اس کے جواب کا انتظار نہیں کیا اور راحیلہ کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہاں سے نکل آیا۔ اوپر آکر میں ڈرائنگ روم میں جا بیٹھا اور راحیلہ کو اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اب جبکہ تم کسی قیمت پر اپنا فیصلہ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہو تو پھر کل اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ سے باضابطہ طور پر اپنا حساب کتاب کرلو۔ اپنے واجبات وغیرہ وصول کرلو۔ ایک نئی زندگی کا آغاز کرنے کے لیے اگر تم میری طرف سے کوئی چیز قبول کرنا پسند کرو تو بلاتکلف مجھے بتاسکتی ہو۔ رقم...... کراچی میں مکان...... کوئی گاڑی...... میری کمپنیز میں نہ سہی، کسی اور کمپنی میں کوئی بڑی نوکری...... غرضیکہ تم اپنی کوئی بھی ضرورت بتاسکتی ہو اور اسے دوستی کی حقیر نشانی سمجھ کر قبول کرسکتی ہو۔"

"مجھے کچھ بھی نہیں چاہیے۔ میں اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ سے حساب کتاب بھی کرنا نہیں چاہتی۔ میرے سیونگ اکاؤنٹ میں کافی عرصے کے گزارے کے لیے رقم موجود ہے۔ وہ میں کراچی ٹرانسفر کرالوں گی۔ میں نئے سرے سے اپنی جدوجہد کا آغاز کرکے ہر چیز حاصل کرلوں گی۔ مجھے زندگی گزارنا آتی ہے۔ مجھے کسی خاص چیز طلب یا ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال تمہاری پیشکش کا شکریہ۔" وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ کمبخت کی آنکھوں میں ذرا بھی تاسف، پچھتاوا یا تغیر نہیں تھا۔ چہرے پر کسی تلاطم کے آثار نہیں تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایسی کٹھور دل بھی ہوسکتی تھی۔

"پھر بھی...... ہر کام کا ایک باضابطہ طریقہ ہونا چاہیے۔" میں نے نرمی سے کہا "اگر تم اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ سے اپنے واجبات لے لو تو اچھا ہوگا۔ اس کے علاوہ پرسوں ٹونی واپس آجائے تو میں چاہتا ہوں کہ تم باضابطہ طور پر چارج اسے دو۔ اور ٹونی نے جو اضافی کام تمہارے سپرد کر رکھے تھے جن میں میرے زیر استعمال مکان کی دیکھ بھال بھی شامل ہے۔ ان کے بارے میں تازہ ترین صورت حال اسے سمجھا دو۔ اس کے بعد......"

میں نے خاموش ہوکر طویل سانس لی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد سلسلۂ کلام جوڑا "اس کے بعد میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ کراچی چلو۔ ہمارے سب قریبی ساتھی بھی ہمارے ساتھ چلیں گے۔ وہاں میں تمہارا چہرہ ٹھیک ہونے کی خوشی میں اپنے فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک بہت شاندار پارٹی دینا چاہتا ہوں۔ میرا یہ پروگرام بہت پہلے سے تھا۔ میں نے سوچا ہوا تھا کہ جب بھی تمہارا چہرہ ٹھیک ہوگا، ہم سب ساتھی کراچی میں اپنے ہوٹل میں جمع ہوکر ایک طرح کا چھوٹا موٹا جشن منائیں گے۔ اب تم اسے ایک الوداعی پارٹی کہہ سکتی ہو۔ یہ فیئرویل پارٹی تمہارے اعزاز میں ہوگی۔"

اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار نظر آئے۔ پھر اس نے جلدی سے کہا "انکار نہ کرنا۔ پھانسی چڑھائے جانے والے مجرم کی بھی آخری خواہش پوری کی جاتی ہے بشرطیکہ وہ معقولیت کی حدود میں ہو۔ تم نے مجھے بھی پھانسی چڑھانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ میری آخری خواہش پر خواہ مخواہ کوئی اعتراض اٹھانے کی کوشش مت کرنا۔ یہ نہایت معقولیت کی حدود میں ہے۔ میں چاہتا ہوں ہم ایک دوسرے کو ذرا باعزت انداز میں خدا حافظ کہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی "مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں...... لیکن پارٹی کے کسی مرحلے پر تم فلمی انداز میں اٹھ کر یہ اعلان کرنا نہ شروع کردینا کہ یہ ایک فیئرویل پارٹی ہے اور راحیلہ کے اعزاز میں ہے کیونکہ وہ ہمیں چھوڑ کر جارہی ہے۔ میں چاہتی ہوں ہمارے ساتھیوں میں بھی جتنے کم سے کم لوگوں کو علم ہوسکے تو اتنا ہی بہتر ہے...... اور غیر متعلقہ لوگوں کے سامنے تو یہ ذکر آنا ہی نہیں چاہیے۔ میں چاہتی ہوں کہ اس پارٹی کے بعد نہایت خاموشی سے ہمارے راستے جدا ہوجائیں۔"

"ٹھیک ہے...... ایسا ہی ہوگا...... اور کوئی شرط......؟" میں نے کہا۔

"نہیں...... اور کوئی شرط نہیں۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

ایک لمحے کے لیے کمرے میں بوجھل سکوت طاری رہا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی ایسے سکوت میں اپنے آپ کو اتنا مضطرب محسوس نہیں کیا تھا جتنا اس وقت محسوس کررہا تھا۔ اچانک اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پہلی بار مجھے اس کی آنکھوں میں تاسف اور پچھتاوے کی پرچھائیاں نظر آئیں۔

"ایں! مجھے افسوس ہے۔" وہ جملہ مکمل نہ کرسکی۔

"کس بات کا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا "کیا اس بات کا کہ تمہارا چہرہ ٹھیک ہوگیا؟"

"نہیں...... نہیں...... میرا مطلب ہے...... مجھے افسوس ہے کہ سب کچھ اس طرح نہیں ہوسکا جس طرح تم چاہتے تھے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"شکر ہے تمہیں اس پر افسوس تو ہے ورنہ مجھے تو اسی بات کا افسوس تھا کہ تمہیں افسوس تک نہیں ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "ویسے تم نے کبھی یہ جاننے کی کوشش کی کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟"

"میرے ذہن کا کوئی ٹیڑھا پن۔" اس نے اطمینان سے اعتراف کیا۔

"اور تم اس ٹیڑھے پن کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرسکتیں؟"

"کرتی ہوں...... مگر کامیاب نہیں ہوتی۔" اس نے جواب دیا۔

"ہونہہ ٹھیک ہے...... جب انسان کسی معاملے میں مجبور ہو تو پھر کچھ نہیں کیا جاسکتا۔" میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر شکست خوردگی در آئی "مجھے تم سے کوئی شکوہ نہیں ہے۔"

"مجھے تم سے یہی امید تھی۔" اس کے لہجے میں ایک قسم کی شکرگزاری تھی۔ اس کے ذہن سے گویا کوئی بوجھ ہٹ گیا تھا۔

اچانک شبیر شیخ اور سردار علی کمرے میں داخل ہوئے۔ راحیلہ کا چہرہ ٹھیک ٹھاک دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹک گئے۔ شاید تمام تر تیاریوں اور ڈاکٹر برنارڈ کی موجودگی کے باوجود انہیں اُمید نہیں تھی کہ یہ کام ہوجائے گا اور وہ اس انقلاب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔ تاہم دوسرے ہی لمحے ان کے چہرے سپاٹ نظر آنے لگے۔ راحیلہ نے مسکرا کر ان کی طرف دیکھا اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اب اس کا موڈ خراب نہیں تھا۔ لیکن شبیر اور سردار کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

راحیلہ کا چہرہ دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ کام ختم ہوچکا تھا۔ شاید اسی لیے شبیر شیخ نے پوچھا "سر! اب کیا پروگرام ہے؟"

"کوئی پروگرام نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "پرسوں صبح تک اب ہم انتظار کے سوا کچھ نہیں کرسکتے لیکن اس دوران میں بہرحال پہلے ہی کی طرح الرٹ رہنا ہے۔ تم دونوں راحیلہ ہی کی نگرانی پر رہو۔ جب تک ٹونی واپس نہیں آجاتا، ڈاکٹر برنارڈ کی نگرانی بھی سخت رہنی چاہیے۔ کوئی اسے زندہ سلامت یہاں سے نہ لے جاسکے۔ کل میں اور راحیلہ آفس آئیں گے۔ پرسوں تبادلے کے لیے چلیں گے۔"

"ٹھیک ہے سر!" انہوں نے سرہلایا۔

"میں اب چلتی ہوں۔ صبح آفس میں ملاقات ہوگی۔" راحیلہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"تم دونوں پہلے ہی کی طرح راحیلہ کے ساتھ جاؤ گے اور اس کے گھر پر تعینات رہو گے۔" میں نے شبیر اور سردار علی کو حکم دیا۔ انہوں نے اثبات میں سرہلایا اور راحیلہ کے پیچھے پیچھے رخصت ہوگئے۔

میں اب یک دم کوئی بےکار سا ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ میرے سامنے کوئی مصروفیت نہیں تھی اور میرے لیے بےکار بیٹھنا بہت مشکل کام تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسی اثنا میں صفدر میرا موبائل فون لے کر کمرے میں آیا۔ میں فون ڈرائنگ روم میں چھوڑ کر آیا تھا۔

"سر! دی لیڈی آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔" اس نے فون میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

فون مجھے تھما کر وہ رخصت ہوگیا۔ میں نے فون کان سے لگا کر ہیلو کہا تو دی لیڈی بلاتمہید بولی "اب تو خوش ہو؟"

"کس بات پر؟" میں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"میرا اندازہ ہے کہ اب تک تمہاری محبوبہ کا چہرہ ٹھیک ہوچکا ہوگا۔ اصولاً اس وقت تمہیں بہت خوش ہونا چاہیے۔" وہ ذرا شوخ لہجے میں بولی۔

"محبوب......!" میں نے دل ہی دل میں استہزائیہ سے انداز میں دُہرایا اور دل کے کسی گوشے میں خفیف سی ایک کسک محسوس ہوئی۔ انگریزی میں اس مفہوم کے لیے دی لیڈی نے جو لفظ استعمال کیا تھا اس میں ایک عجیب سی دلربائی تھی مگر میں اس سے محظوظ نہیں ہو سکتا تھا اور اسے یہ بھی نہیں بتا سکتا تھا کہ خوشی کہیں پس منظر میں چلی گئی تھی۔ درحقیقت تو میرے دل میں ایک بے عنوان سناٹا پھیلا ہوا تھا۔

"ہاں...... میں بہت خوش ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اور وہ آگ میں لپٹی ہوئی لڑکی بھی خوش ہے یا نہیں؟" اس کی آواز میں وہی ایک مخصوص کھنک موجود تھی جو دلوں کو گُدگُدا سکتی تھی مگر اس وقت میرا دل بجھا ہوا تھا۔ میں مصنوعی خوش مزاجی کا سہارا لیے ہوئے تھا۔

"ہاں۔ وہ بھی بہت خوش ہے...... لیکن یہ خوشی پائیدار ہونی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"پائیدار ہی ہوگی۔" اس کے لہجے میں کھنک کچھ اور بڑھ گئی "تمہیں اس بات پر تو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے کہ کم از کم جاتے وقت تو ہم تمہیں ایک عظیم خوشی دے کر جا رہے ہیں۔"

"اگر میرے شکریے سے تمہیں خوشی حاصل ہو سکتی ہے تو میں شکریہ ادا کر دیتا ہوں۔" میں نے شگفتہ لہجے میں کہا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کو یقیناً معلوم ہو چکا تھا کہ راحیلہ صرف مجھے ہی نہیں، تمام ساتھیوں کو چھوڑ کر جا رہی تھی اور جب وہ دی لیڈی کے پاس جائے گا تو یہ بات اسے بھی بتا دے گا۔ اس لیے فی الحال میرا ایسی باتیں کرنا محض بھرم رکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں تھا اور میں محض بھرم رکھنے کی خاطر کوئی بات کرنے کا قائل نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس وقت نہ جانے کیوں میں اسے اصل بات نہ بتا سکا۔

دی لیڈی بولی "اب جبکہ کام بھی ہو چکا ہے...... تم بھی خوش ہو...... وہ غضبناک لڑکی بھی بہت خوش ہے تو پھر اب وقت کیوں ضائع کیا جائے؟ پرسوں کے بجائے کل صبح دوسرا تبادلہ کیوں نہ کر لیا جائے؟ ہم جیسے اور تم جیسے لوگوں کے لیے تو ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ یہ تو پورے چوبیس گھنٹے کی بچت ہے۔"

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا "جو پروگرام طے ہو چکا ہے اسے اسی طرح رہنے دیا جائے تو کیا بہتر نہ ہوگا؟ مزید ایک دن میں راحیلہ کی طرف سے تھوڑا بہت اور اطمینان ہو جائے گا۔"

"اس کی طرف سے اب تم مطمئن ہی رہو۔ مجھے معلوم ہے برنارڈ نے اپنا کام دیانت داری سے کیا ہوگا۔ محض ایک دن میں اس سلسلے میں تمہیں کوئی گارنٹی نہیں مل جائے گی۔ فی الحال تو تمہیں ہماری زبان کو ہی گارنٹی سمجھنا پڑے گا۔ محض انتظار میں ایک دن ضائع کرنے کا خیال چھوڑ دو۔ حقیقت پسند بن کر سوچو۔" وہ بولی۔

"حقیقت پسند تو میں ہوں...... لیکن ذرا دوسری طرح کا حقیقت پسند ہوں۔ آج کی دنیا میں خود غرض اور بے حس انسان کے لیے حقیقت پسند کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ میں اس طرح کا حقیقت پسند نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم کس طرح کے حقیقت پسند ہو۔ تم اپنے حساب سے سوچو تب بھی تمہیں میری بات مان لینی چاہیے۔" وہ ملائمت سے بولی۔

"ٹونی ٹھیک ہے نا؟" میں نے اچانک پوچھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہے۔ حالانکہ ہمیں آج کل بہت سی دُشواریاں پیش آ رہی ہیں اس کے باوجود ہم نے اس کے ساتھ وہی رویّہ رکھا ہے جو انتہائی اہم شخصیات کے ساتھ رکھا جاتا ہے۔ ہم بھی چاہتے تو اس کا پاؤں جلا سکتے تھے۔" اس نے جتایا۔

"اس صورت میں ڈاکٹر برنارڈ تمہیں پورا ہی جلا ہوا ملتا...... کوئلے کے ایک بدشکل مجسمے کی صورت میں...... ویسے اس وقت بھی تقریباً ایسا ہی ہے۔" میں نے کہا۔

"تم بہت بدمعاش ہو......" وہ دھیرے سے ہنسی "اور وہ بھی بڑا ستم ظریف ہے۔ اپنے اوپر بھی کچھ نہ کچھ تجربات کرتا رہتا ہے۔ خیر...... اب تم تلخ باتوں کو چھوڑو اور میری اصل بات کا جواب دو۔"

میں نے ایک لمحے بعد جواب دیا "اچھا...... ٹھیک ہے...... کل ہی سہی۔"

"بہت شکریہ۔" اس کے لہجے کی شیرینی بڑھ گئی۔

"وقت اور جگہ وہی رہے گی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بارے میں تمہیں کچھ دیر پہلے ہی بتاؤں گی۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہو...... ابھی احتیاط جاری ہے۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"تمہاری طرف سے تو ہر وقت ہی محتاط رہنا چاہیے خواہ عاشق و دلدار بن کر پہلو میں ہی کیوں نہ بیٹھے ہو۔" وہ بولی۔

"اب مجھے اتنا بھی گھٹیا ثابت کرنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا۔

"بات گھٹیا پن کی نہیں ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ تم اپنے نظریات...... اپنے کمٹ منٹ کے بہت پکے ہو۔ ذہن میں جو کچھ طے کر چکے ہوتے ہو اس پر بڑی سختی سے قائم رہتے ہو۔ حالات کے مدوجزر، کسی تبدیلی یا تغیّر سے متاثر نہیں ہوتے۔" وہ عالمانہ سے لہجے میں بولی "مجھے تو اسی پر حیرت ہے کہ صبح کی طے شدہ ملاقات میں تم نے کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہیں کی...... کسی ایجنسی کو ہمارے بارے میں خبردار نہیں کیا...... بلکہ اپنی محبوبہ کو بھی ہنگامہ برپا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ ہمیں تم سے اس امن پسندی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔"

"میں صرف اس آسرے پر اتنا امن پسند ہو گیا ہوں کہ تم لوگ ملک چھوڑ کر جا رہے ہو۔" میں نے کہا "ویسے...... کیا واقعی تمہاری اس بات پر اعتبار کر لینا چاہیے؟"

"بالکل کر لینا چاہیے...... لیکن یہ بھی یقین رکھنا چاہیے کہ دیر یا بدیر تم سے پھر ملاقات ہوگی۔"

میرے ذہن میں راحیلہ کے الفاظ گونج اٹھے۔ اس نے کہا تھا یہ عورت پھر آئے گی اور پہلے سے بڑا فتنہ بن کر آئے گی۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ وہ اپنے غصے اور برہمی کے باوجود صحیح بات کر رہی ہو لیکن میں اپنی خفگی میں اس کا بُرا منا رہا تھا۔ بعض لوگوں کے خیال میں تو عورتوں میں ایک خاص الہامی سی کیفیت ہوتی ہے جسے FEMININE INTUTION کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کے خیال میں بعض عورتیں، بعض اوقات اپنی اس کیفیت کے تحت کسی واقعے کے بارے میں پہلے ہی آگاہ ہو جاتی ہیں۔ شاید راحیلہ میں بھی کچھ ایسی ہی بات ہو لیکن سردست میں اسے کوئی خاص اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔

"ویسے اندازاً کب تمہارے دوبارہ نازل ہونے کا امکان ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی "میں تو آسیب ہوں۔ کسی بھی وقت کسی بھی جگہ پہنچ سکتی ہوں۔"

"پہلی بار ایسا آسیب دیکھا ہے جو اپنے آپ کو آسیب ہی کہہ رہا ہے۔" میں نے حیرت سے کہا۔

"جس دن تم اس آسیب کے زیرِ اثر آجاؤ گے اس دن تمہاری طاقت کئی گنا بڑھ جائے گی مسٹر چودھری! تم مجھ سے بھی بڑے آسیب بن جاؤ گے۔"

"خدا مجھے اس دن سے محفوظ رکھے۔" میں نے کہا۔

"مجھ سے آئندہ ملاقات کے بعد تم یہ دعا کبھی نہیں مانگو گے...... اور آئندہ ملاقات سے مُراد وہ ملاقات نہیں ہے جو کل ہوئی ہے۔ بلکہ اس کے بعد کی کوئی ملاقات۔" وہ ہلکا سا قہقہہ لگانے کے بعد بولی۔

"کیا تم پھر کوئی فتنہ لے کر اس ملک میں نازل ہوگی؟" میں نے پوچھا گو کہ مجھے اس سوال کے دیانت دارانہ جواب کی توقع نہیں تھی۔

"اوہ...... نہیں...... ہرگز نہیں۔" وہ زور دے کر بولی "تمہیں اس اندیشے میں مبتلا ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اس قسم کا کوئی پروگرام نہیں ہے...... اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ تم سے ملاقات اسی ملک میں ہو۔ اچھا...... فی الحال خدا حافظ۔" اس نے اچانک ہی بات ختم کرتے ہوئے کہا "صبح میرے فون کا انتظار کرنا...... اور اس تبادلے کے وقت اپنی اس احمق محبوبہ کو ساتھ لے کر مت آنا۔"

"نہیں...... اس موقع پر تو ظاہر ہے اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ بھلا کیوں ساتھ آنے لگی؟" میں نے کہا۔

"آخر وہ تمہاری محبوبہ...... نائب...... ایگزیکٹیو ڈائریکٹر سبھی کچھ ہے۔ تم جہاں چاہو اسے ساتھ لے جا سکتے ہو۔ کل اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن تمہارا کیا بھروسا کہ محبت میں آ کر ساتھ اٹھا لاؤ۔" وہ شریر سے لہجے میں بولی۔

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے کمزور سے لہجے میں کہا۔ میں اسے نہیں بتا سکا کہ وہ جتنے رشتے گنوا رہی تھی، راحیلہ وہ سب توڑ دینا چاہتی تھی۔

اس نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے فون پر شبیر شیخ اور سروار علی سے رابطہ کر کے انہیں پروگرام میں تبدیلی کی اطلاع دی اور بتایا کہ راحیلہ کی نگرانی پر مامور رہنے کے لیے میں صبح ہی صفدر اور سلیمان کو بھیج دوں گا جبکہ ان دونوں کو میرے پاس آ جانا چاہیے۔ تبادلے کے موقع پر آج ہی کی طرح میں ان دونوں کو لے جانا چاہتا تھا۔

انہیں مطلع کرنے کے بعد میں نے رات کا کھانا کھایا اور اپنے کمرے میں جا کر سو گیا۔ دوسری صبح فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ گھنٹی موبائل فون کی بج رہی تھی۔ میں نے فون اٹھانے سے پہلے ٹیبل کلاک کی طرف دیکھا۔ ساڑھے پانچ بج رہے تھے۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ذرا ہٹا کر دیکھا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

"خدایا...... صبح ہی صبح کس کا فون آ گیا!" میں نے بڑبڑاتے ہوئے میز سے فون اُٹھایا اور غنودگی کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔

دوسری طرف سے دی لیڈی کی کھنکتی ہوئی آواز سن کر غنودگی خود بخود ہی کافور ہو گئی۔ وہ نہایت مطمئن اور شگفتہ لہجے میں بولی "اٹھو...... اور تیار ہو جاؤ۔"

"کس کام کے لیے؟" میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔

"اپنا ساتھی واپس لینے اور ہمارے ساتھی کو ہمارے سُپرد کرنے کے لیے۔" اس نے جواب دیا۔

"تم تو بہت سحر خیز عورت معلوم ہوتی ہو۔ کیا تم روزانہ ہی اس وقت اٹھ جاتی ہو؟" میں نے جماہی لیتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو اس سے بھی پہلے اُٹھ جاتی ہوں۔ میرے بس میں ہو تو میں سویا ہی نہ کروں۔ ہم جیسے لوگوں کو جتنے کام کرنے ہوتے ہیں ان کے لیے چوبیس گھنٹے کا دن بھی چھوٹا ہے۔ دن کچھ اور بڑا ہونا چاہیے تھا۔" وہ بولی۔

"تمہاری حد تک تو یہ ٹھیک ہوگا لیکن اس بے ہودگی میں مجھے کیوں شریک کر لیا؟ یہ کوئی وقت ہے کسی شریف آدمی کو نیند سے جگانے کا؟" میں نے خفگی سے کہا۔

"شکر کرو میں نے تمہیں رات کے سوا بارہ بجے نہیں جگایا۔ اصولاً تو بارہ بجے کے بعد دوسرا دن شروع ہو جاتا ہے۔ گویا سوا بارہ بجے وہ دن شروع ہو چکا تھا جب ہمیں معاہدے پر عمل درآمد کرنا

تھا۔" وہ بولی۔

"وہ وقت کچھ اور طرح کے معاہدوں پر عمل درآمد کا ہوتا ہے...بے وقوف عورت!" میں نے سمجھانے کے انداز میں کہا "تم خواہ مخواہ میری نیند خراب کرتیں۔"

"آج تو نیند سے اٹھتے ہی جھکنے لگے۔ رات تو انداز گفتگو سے کچھ بجھے بجھے لگ رہے تھے۔" وہ گویا کچھ سنبھل کر بولی۔

"انسان اور قمقمے میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔" میں نے کہا "دونوں ہی کبھی جلتے کبھی بجھتے رہتے ہیں۔ ہو سکتا ہے رات وولٹیج کم مل رہی ہو۔ اس لیے تمہیں بجھے بجھے ہونے کا گمان ہوا ہو۔"

"اب کہیں سے کچھ اور وولٹیج حاصل کرنے کی کوشش کرو تاکہ جلدی سے حرکت میں آسکو۔ بستر سے نکلو، تیار ہوجاؤ، ناشتا وغیرہ کرلو۔ اس کے لیے میں تمہیں آدھا گھنٹا دے سکتی ہوں۔"

"تم نے فوراً ہی حکم چلانا شروع کردیا۔ آدھے گھنٹے میں تو صرف ناشتا بھی نہیں ہو سکتا......وغیرہ وغیرہ تو دور کی بات ہے۔"

"بنو مت۔" وہ ملائمت سے بولی "مجھے معلوم ہے تم اتنے سست یا آرام طلب آدمی نہیں ہو جتنا خود کو ظاہر کرنے کی کوشش کررہے ہو۔ میں آدھے گھنٹے بعد تمہیں دوبارہ فون کروں گی۔ اس وقت تمہیں گھر سے نکلنے کے لیے تیار ہونا چاہیے۔"

اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ صرف احتیاطاً اچانک فون کرتی تھی کہ میں اسے ٹریپ کرنے کا کوئی پروگرام نہ بنانے پاؤں۔ جگہ کے بارے میں بھی وہ آخری وقت تک مجھے اندھیرے میں رکھنے کی کوشش کررہی تھی۔ گو کہ ہمارے درمیان معاملات نہایت خوش اسلوبی سے طے ہورہے تھے۔ اس کے باوجود اس کی احتیاط بہرحال برقرار تھی۔ اسی طرح میں بھی اپنی جگہ محتاط ہی تھا۔

میں اس کے دیے ہوئے وقت سے پہلے ہی تیار ہوگیا۔ ناشتے کا ارادہ میں نے ملتوی کردیا اور تہ خانے میں پہنچا۔ مسلح گارڈز مستعدی سے باہر پہرا دے رہے تھے لیکن ڈاکٹر برنارڈ اندر گہری نیند سورہا تھا۔ ایک آدھ آواز دینے پر وہ نہ اٹھا۔

تب میں نے زور سے اس کا کندھا ہلاتے ہوئے کہا "اب اٹھ بھی جاؤ کالے کیکڑے!"

وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور مجھ پر نظر پڑی تو تشویش سے بولا "خیریت تو ہے؟ تم پر صبح ہی صبح کیا آفت آن پڑی؟"

"مجھ پر تم جو ایک آفت پڑی ہوئی ہو وہی کیا کم ہے جو تم کسی اور آفت کا پوچھ رہے ہو۔ اوپر سے تمہاری اس دی لیڈی نے زندگی خراب کر رکھی ہے۔ وہ تمہاری جدائی میں مری جارہی ہے۔ جلد از جلد تمہیں واپس حاصل کرنا چاہتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس سے تمہاری بات ہوئی ہے؟ کیا کہا ہے اس نے؟" اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی دلچسپی کی چمک نمودار ہوئی۔ وہ اپنی تمام گھبراہٹ اور ناگواری بھول گیا۔

دی لیڈی کے ذکر پر اس کی آنکھوں میں یا اس کے تاثرات میں جو دلچسپی، عقیدت اور ایک عجیب سا اشتیاق نظر آتا تھا وہ مجھے کچھ پُراسرار لگتا تھا۔ اس کا انداز اپنے اندر ایک خاص بھید سا چھپائے ہوتا تھا۔ مجھے یقین ہوچلا تھا کہ وہ دی لیڈی کا زبردست عاشق تھا لیکن شاید دی لیڈی کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں تھی اور برنارڈ میں خود شاید اس سلسلے میں کوئی اشارہ تک دینے کی جرأت نہیں تھی۔ دوسروں کے سامنے شاید وہ غیر ارادی طور پر کچھ غیر محتاط ہوجاتا تھا۔

"اس نے کہا ہے، میں اب اپنے پیارے برنارڈ کی جدائی میں مزید ایک لمحہ بھی نہیں گزار سکتی، اسے فوراً میرے پاس لے آؤ۔"

"مذاق مت کرو۔ سچ سچ بتاؤ۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"تمہاری دعا قبول ہوگئی ہے۔ جس پروگرام پر کل عمل درآمد ہونا تھا اس پر آج ہی عمل ہورہا ہے۔ اب فوراً اٹھ کر کھڑے ہوجاؤ اور اپنے اس بے ہودہ منہ پر پانی کے دو چار چھپکے مارلو۔ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ آج تم ناشتا اپنے خوابوں کی شہزادی کے ساتھ کروگے۔" میں نے کہا۔

وہ اٹھ کر تیزی سے حرکت میں تو آگیا لیکن تنبیہہ کے سے انداز میں بولا "تم دی لیڈی کے لیے اس قسم کے الفاظ مت استعمال کیا کرو۔"

"وہ تمہارے لیے ملکہ عالیہ ہوگی۔ میرے لیے تو نہیں ہے۔ میں تو اس سے تمہارے بارے میں بھی پوچھوں گا کہ آخر تم اس بے چارے پر نظرِ کرم کیوں نہیں کرتیں جو تمہارے عشق میں بے حال ہورہا ہے۔" میں نے کہا۔

"بکواس مت کرو۔" وہ تیزی سے گھوما اور میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں تھیں اور چہرے کے کھنچے ہوئے سے عضلات کچھ اور کھنچ کر رہ گئے تھے "اس قسم کی کوئی بکواس نہ کرنا۔ میرے بارے میں تمہیں دی لیڈی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ واقعی اس بچے کی طرح خوفزدہ نظر آنے لگا تھا جسے اندیشہ محسوس ہورہا ہو کہ محلے کا کوئی بچہ اس کے سخت گیر باپ سے اس کی کوئی سنگین شکایت کردے گا۔

"تم تو بہت ہی بزدل قسم کے عاشق ہو ڈیئر ڈاکٹر!" میں نے حیرت سے کہا "تم نے تو عشق میں پرانے مشرقی لوگوں کو بھی مات کردیا جن کے کانوں کی لویں محبوب کے ذکر پر سرخ ہوجاتی تھیں اور جن کی عمریں یہی تردید کرتے گزر جاتی تھیں کہ فلاں کے ساتھ ان کا کوئی چکر نہیں ہے جبکہ تم لوگ تو اپنے آپ کو آنے والے زمانوں کے لوگ کہتے ہو۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے۔" وہ بدستور گڑبڑاتے ہوئے انداز میں بولا "لیکن میرا دی لیڈی کے ساتھ عشق وغیرہ کا کوئی چکر نہیں ہے۔

اس قسم کی کوئی بکواس نہ کرنا۔ ہمارے ہاں ڈسپلن بڑا سخت ہے۔ اس قسم کی غیر ضروری باتوں اور فضولیات کو بالکل پسند نہیں کیا جاتا۔"

اس لمحے مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ تنظیم میں اس کا اتنا اہم مقام تھا اور دی لیڈی نے خاص طور پر اس کی بازیابی کے لیے بڑی زحمت اٹھائی تھی لیکن میرے چھیڑنے پر بے چارے کا عالم کچھ ایسا ہی تھا جیسے کسی بہت بڑی کمپنی کا چپراسی، کمپنی کے مالک کی بیوی کے بارے میں عشقیہ جذبات کا اظہار کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو۔

"اچھا خیر...... تمہیں زیادہ خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی "میں اپنی زبان بند ہی رکھوں گا لیکن تم جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ اگلی ہدایات کے لیے کسی بھی لمحے تمہاری ملکہ عالیہ کا فون آنے والا ہوگا۔"

"کیا ناشتا کرنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی؟" اس نے دوبارہ واش بیسن پر جھکتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا انحصار تمہاری ملکۂ عالیہ کی آئندہ ہدایات پر ہے۔ شاید سب کو ہی بغیر ناشتے کے روانہ ہونا پڑے۔ یہ سب تمہاری دی لیڈی کی ڈرامے بازی ہے ورنہ یہ کام آرام سے بھی ہو سکتا تھا۔ ایسے کوئی ہنگامی حالات تو نہیں تھے۔" میں نے کہا "بہرحال تمہارے حق میں تو اچھا ہی ہے۔ دی لیڈی تمہیں خود اپنے ہاتھوں سے پیار سے ناشتا کرائے گی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔"

"تم نے پھر بکواس شروع کردی۔" وہ چلایا حالانکہ اس کے منہ پر صابن لگا ہوا تھا جس کے جھاگ نے اس کے تاثرات کو چھپالیا تھا۔

"بکواس تو میں اپنا اخلاقی فرض سمجھ کر کرتا ہوں۔ تمہیں اس سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "بہرحال مجھے تمہاری کمزوری کا پتا چل گیا ہے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس سے معقول میں فائدہ اٹھاتا۔ اب تم لوگ ہماری جان چھوڑ کر جارہے ہو۔ اس لیے معاف کررہا ہوں۔"

اس کی گویا جان میں جان آئی اور وہ ذرا مستعدی سے ہاتھ منہ دھونے لگا۔ میری توقع کے عین مطابق چند لمحے بعد فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف دی لیڈی ہی تھی۔ وہ بلا تمہید بولی "میں تمہیں صرف ایک گھنٹے کی مہلت دے سکتی ہوں۔ اس دوران میں تمہیں اس جگہ پہنچنا بھی ہے جس کے بارے میں ابھی تمہیں سمجھاؤں گی۔ اس کے علاوہ اگر گنجائش نظر آتی ہے تو ناشتا وغیرہ بھی کرلو......"

اس بار اس نے فیروز پور روڈ پر شہر سے کافی دور صنعتی علاقے سے آگے کے ایک مقام کے بارے میں سمجھایا اور بولی "ٹھیک ساڑھے سات بجے تمہیں وہاں ہونا چاہیے۔ طریقہ اور ہدایات وغیرہ سب وہی رہیں گی۔ امید ہے تم اس بار بھی کوئی گڑبڑ نہیں کرسکے۔ میں ذاتی طور پر تمہاری شکر گزار ہوں گی۔"

"بس تمہاری شکر گزاری اور شرافت دیکھ کر ہی تو میں نے کسی بھی قسم کی گڑبڑ سے پرہیز رکھا ہے۔" میں نے کہا "کاش تم نے شروع سے ہی اس شکر گزاری اور شرافت کا مظاہرہ کیا ہوتا تو اتنی تباہی اور اتنے خون خرابے کی نوبت نہ آتی اور نہ ہی اتنے بہت سے لوگ اتنی بہت سی تکلیفیں اٹھاتے۔"

"اگر سب لوگ شروع ہی سے ہر معاملے میں اتنے شریف اور شکر گزار ہوجائیں تو پھر دنیا سے بیشتر جھگڑے ہی ختم ہوجائیں۔ جنگوں اور خانہ جنگیوں کی تباہ کاریاں رک جائیں اور یہ دنیا جنت نظیر دکھائی دینے لگے لیکن......" اس نے ایک طویل سانس لی اور اسی رسان سے بولی "خدا نے دنیا میں ہر طرح کے انسان پیدا کیے ہیں۔ شریف، بدمعاش، غنڈے، دہشت گرد، سچے، جھوٹے، فرشتہ صفت، ابلیس صفت، سائنس داں، مزدور، کچھ بنانے والے، کچھ توڑنے والے...... غرضیکہ اس دنیا میں ہر قبیل کا انسان موجود ہے۔ ہر صفت رکھنے والا آدمی یہاں پایا جاتا ہے......اور ہر ایک اپنا اپنا کام کررہا ہے۔ یہی دنیا کی رنگا رنگی ہے۔ کوئی اس دنیا کو مکمل طور پر کسی بھی قسم کے لوگوں سے خالی نہیں کرسکتا۔ ہم بھی اس دنیا کے باشندے ہیں۔ ہمارے ذمے بھی کچھ کام ہیں جو ہماری نظر میں بہت اچھے ہیں۔ تمہاری نظر میں بہت خراب ہیں۔ ہم اپنا کام کیے جارہے ہیں، تم اپنا کام کرتے رہو۔"

"واہ......واہ......! تم اچھی خاصی دانشور ہو۔ میں تمہارا بہت بڑا قدردان بن سکتا تھا لیکن افسوس ہے کہ تم جیسے بھٹکے ہوئے دانشوروں نے ہی دنیا کو سب سے زیادہ عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ٹھیک ہے......تم دنیا کو عذاب سے بچانے کی اپنی سی کوشش کرتے رہو۔ میں نے کہا نا کہ ہم سب کو دنیا میں اپنا اپنا کام کرتے رہنا ہے۔" وہ بولی "اور فی الحال تم اس کام کی طرف توجہ دو جو ہمیں فوری طور پر درپیش ہے۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے تمہیں اس جگہ پہنچنا ہے جو میں نے تمہیں بتائی ہے۔"

"بہت بہتر۔ کوئی اور حکم؟" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

"فی الحال یہی کافی ہے۔" اس نے شگفتہ لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ناشتا کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہم لیٹ ہوسکتے تھے۔ ڈاکٹر برنارڈ اس دوران میں اسی ریوالونگ چیئر پر جا بیٹھا جس پر اس نے راحیلہ کو بٹھا کر اس کے چہرے کی اصل رنگت بحال کی تھی۔ وہ بڑے انہماک سے اپنے چھدرے بالوں میں کنگھی کررہا تھا۔

"اس ہارسنگار کو چھوڑو۔" میں نے عقب سے اس کا کالر پکڑ کر اسے اٹھاتے ہوئے کہا "اس سے تمہاری شکل پر برستی ہوئی پھٹکار میں کمی نہیں ہوگی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ تم اپنے وجود کی یہ سیاہی دور کرلیتے۔ انسان سفید فام ہو تو کافی بدشکل ہونے کے باوجود کم بدشکل لگتا ہے۔ اپنے دل کی سیاہی دور کرنا تو تمہارے بس کی

بات نہیں۔ کم از کم جلد کی سیاہی تو دور کر ہی لیتے۔"

وہ اب میرے زہریلے الفاظ پر بھی بدمزہ نہیں ہوتا تھا۔ بُرا منانے کے بجائے وہ اب لطف اندوز ہوتا تھا۔ اپنے مخصوص چہلوں والے انداز میں ہنس کر بولا "ابھی اس گیٹ اَپ کی ضرورت ہے۔ اب تو تمہارے ملک سے نکل جانے کے بعد ہی اس سے چھٹکارا ملے گا۔"

میں نے اسے اشارہ کیا اور وہ لنگڑاتا ہوا میرے آگے آگے چل دیا۔ تہ خانے کے بڑے دروازے پر متعیّن مسلح گارڈز نے اسے میرے ساتھ جاتے دیکھا تو ان میں سے ایک نے پوچھا "سر! اب ہمیں یہاں ڈیوٹی دینے کی ضرورت نہیں؟"

"نہیں۔ یہ مصیبت تمہارے سر سے ٹل رہی ہے۔" میں نے برنارڈ کی طرف اشارہ کیا "اب تمہیں پرانے روٹین کے مطابق پورے گھر کی نگرانی کرنی ہے۔"

اوپر آکر میں نے صفدر اور سلیمان کو ساتھ لیا اور میری گاڑی میں ہم چاروں راحیلہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ برنارڈ پچھلی سیٹ پر ان دونوں کے درمیان بیٹھا تھا اور دونوں طرف سے ایک ایک گن کی نال اس کی پسلیوں پر ٹکی ہوئی تھی۔

راحیلہ کے گھر پہنچ کر میں نے اندر جانے کی زحمت نہیں کی۔ راحیلہ شاید اس وقت تک سو کر بھی نہیں اٹھی تھی۔ اسے پروگرام کی تبدیلی کی اطلاع نہیں تھی لیکن شبیر شیخ اور سردار علی کو بھی جو اس کے گھر پر تعینات تھے۔ وہ خود ہی باہر آگئے اور انہوں نے صفدر اور سلیمان کی جگہ لے لی۔ صفدر اور سلیمان اندر چلے گئے۔

یہ تبدیلی میں نے ایک معمولی سی وجہ کی بنا پر...... اور محض احتیاطاً کی تھی۔ یوں تو میرے یہ چاروں ہی ساتھی بے مثل فائٹر تھے۔ ہر قسم کے ہتھیاروں کے استعمال میں ماہر اور ہر قسم کی صورتِ حال سے نمٹنے میں یکتا تھے لیکن صفدر اور سلیمان کے بارے میں خاص طور پر میں نے محسوس کیا کہ انہیں کسی جگہ کی نگرانی کرنے اور وہاں موجود کسی فرد کی حفاظت کرنے میں خصوصی مہارت حاصل تھی۔ صرف وہ آدمی جہاں موجود ہوتے وہاں سے کسی شخص کو نکال کر لے جانے کے لیے جنگجوؤں کے کم از کم ایک مضبوط دستے کی ضرورت پڑتی۔

شبیر شیخ اور سردار علی کسی ایسی صورتِ حال کے لیے زیادہ موزوں آدمی تھے جہاں پلک جھپکتے میں خود ہی کوئی فیصلہ کر کے خود ہی عمل کرنا ضروری ہوجاتا۔ وہ پختہ عمر تھے اور ان میں بلا کی تحمل مزاجی بھی تھی۔ وہ دیکھنے میں بالکل عام اور سیدھے سادے سے آدمی نظر آتے تھے۔ انہیں دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ انہوں نے زندگی میں کبھی گولی چلانا تو درکنار' کسی ہتھیار کو ہاتھ بھی لگایا ہوگا۔ ان کی شخصیت سے ظاہر ہونے والی معصومیت اور سادگی...... بلکہ کسی حد تک دیہاتی پن کو دیکھ کر ان کا حریف بھی ان کے بارے میں بہت غلط اندازے قائم کرتا تھا اور شاید اسی لیے زیادہ بری طرح مار کھاتا تھا۔

راحیلہ کے گھر سے ہم فیروز پور روڈ کی طرف روانہ ہوگئے۔ گزشتہ شام جب میں نے شبیر شیخ اور سردار علی کو پروگرام کی تبدیلی سے آگاہ کیا تھا تو شبیر نے ہچکچاتے ہوئے یہ تجویز بھی پیش کی تھی کہ جب ٹونی بہ حفاظت ہماری تحویل میں آجائے تو رخصت ہوتے وقت دی لیڈی اور اس کے ساتھیوں پر اچانک اور قطعی غیر متوقع طور پر حملہ کر کے ان کا صفایا کرنے کی کوشش کی جائے تاکہ اس بچے کھچے فتنے کا بھی خاتمہ ہوجائے۔

میں نے صرف ایک لمحے اس تجویز پر غور کیا تھا اور اسے مسترد کردیا حالانکہ ہم تینوں مل کر ایسی مثلث بن جاتے تھے جو اس قسم کا رسک لے سکتے تھے اور تقدیر کا فیصلہ اپنے حق میں ہونے کی امید کرسکتے تھے۔ خصوصاً جبکہ ٹونی بھی ہماری طرف آچکا ہوتا۔ وہ خالی ہاتھ بھی بڑے کام کا آدمی تھا۔ اس کے باوجود میں نے یہ داؤ کھیلنے کا مشورہ قبول نہیں کیا تھا۔

عین ممکن ہے شبیر شیخ اور سردار علی کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا ہو کہ شاید راحیلہ کا شُبہ درست ہی تھا اور میرے دل میں دی لیڈی کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوچکا تھا مگر میں نے اس امکان کی پروا نہیں کی۔ مجھے ان سے اُمید تو نہیں تھی کہ وہ ایسا سوچیں گے مگر ایسے کسی خیال کا کیڑا اُن کے دماغ میں رینگ بھی جاتا تو یہ میرے خیال میں اتنی خطرناک بات نہیں تھی جتنا خطرناک دی لیڈی سے تصادم ہوسکتا تھا۔

دی لیڈی بے وقوف نہیں تھی۔ وہ ویران مقام پر بالکل کھلے میدان میں اسی لیے ملاقات رکھ رہی تھی کہ ٹکراؤ کی صورت میں دونوں کے لیے رسک یکساں رہے۔ دونوں طرف جب برابر کی چوٹ والا معاملہ ہو' دونوں فریق یکساں طور پر الرٹ ہوں' دونوں کو ایک دوسرے کے بارے میں ذرا بھی خوش فہمی نہ ہو' دونوں کو ایک دوسرے پر ذرا بھی اعتبار نہ ہو تو ان کا آپس میں ٹکرا جانا کچھ ایسا بھی ثابت ہوسکتا تھا جیسے کبھی دو پتھر اچانک آپس میں ٹکرا جاتے ہیں تو دونوں ہی پاش پاش ہوجاتے ہیں۔

میرے دل میں خواہ دی لیڈی کے لیے نرم گوشہ واقعی پیدا ہوجاتا تب بھی اگر میں اسے ہلاک کرنا اپنے ساتھیوں کے علاوہ ملک کے مفاد میں بھی ضروری سمجھتا تو ہر حال میں یہ کام کر گزرنے کی کوشش کرتا۔ خواہ اس میں کتنا ہی رسک ہوتا اور خواہ اس میں جان ہی چلی جاتی مگر فی الحال میری نظر میں یہ کام ضروری نہیں تھا لیکن شاید یہ بات میں صحیح طور پر اپنے ساتھیوں کو سمجھانے میں ناکام ہوگیا تھا۔ مگر میں نے فی الحال ایسے کسی خیال کی تردید کرنا بھی یا کوئی وضاحت پیش کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ سب میرے واہمے تھے۔

وقت کے بارے میں میرا اندازہ ٹھیک ہی رہا۔ ہم ٹھیک

ساڑھے سات بجے فیروز پور روڈ پر دواؤں کی ایک فیکٹری سے آگے ایک کچے میں اتر کر اس ویران مقام پر پہنچ گئے جس کی نشانیاں دی لیڈی نے مجھے سمجھائی تھیں۔ کسی زمانے میں اس سے میلوں تک ویرانہ ہی تھا لیکن اب فیکٹریاں اور ہاؤسنگ اسکیمیں یہاں تک آگئی تھیں۔ جس ویرانے میں ہم آکر رُکے تھے' مجھے یاد ہے چند سال پہلے تک یہاں کھیت ہوا کرتے تھے۔ اب کھیت اُجڑ چکے تھے۔ فی الحال یہ ویرانہ تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ ان زمینوں کے مالکان بھی یہاں کوئی ہاؤسنگ اسکیم بنانے کی منصوبہ بندی کررہے ہوں۔

دی لیڈی نے بتایا تھا کہ آج وہ لوگ گہرے نیلے رنگ کی ایک پجیرو میں آئیں گے جس کے بونٹ پر اونچا سا ایک انٹینا لہرا رہا ہوگا اور اس کے شیشے تاریک ہوں گے۔ مجھے جھاڑیوں کے قریب گاڑی روکے پانچ منٹ گزر گئے لیکن کسی طرف سے ایسی کوئی گاڑی آتی دکھائی نہ دی۔ ہم سب کی نظریں چاروں طرف بھٹک رہی تھیں اور میں بار بار گھڑی بھی دیکھ رہا تھا۔

مقررہ وقت سے سات منٹ زائد ہوچکے تو میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون کان سے لگایا تو مجھے توقع تھی کہ دوسری طرف دی لیڈی ہوگی۔ اندازہ درست ثابت ہونے پر میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"امید ہے تم میری بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ چکے ہوگے۔" وہ بولی۔

"اور اب غالباً تم کسی دوسری جگہ پر پہنچنے کے لیے کہوگی؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

وہ اپنے مخصوص کھنک دار انداز میں ہنسی اور معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی "سمجھ ہی گئے ہو تو اب تھوڑی سی تکلیف کرلو۔ ملاقات وہیں ہوگی جہاں پہلے ہوئی تھی۔"

"اوہ...... میرے خدا......!" میں کراہ اُٹھا۔ وہ جگہ یہاں سے میلوں دور تھی "یہ تم نے کیا پیشہ ور اغوا کنندگان کی سی قلابازیاں شروع کردیں!" میں نے شکوہ کیا۔

"احتیاط تو بہرحال ضروری ہے نا ائی ڈیئر!" آج اس کا لہجہ کچھ بدلا ہوا تھا۔ اس میں ملائمت' شیرینی اور دوستانہ رنگ کچھ اور گہرا ہوچکا تھا۔

"جب ہم وہاں پہنچ جائیں تو تم فون کر کے یہ نہ کہہ دینا کہ اب گوجرانوالہ کے چنگی ناکے پر آجاؤ۔ میرے خیال میں تو اب تمہیں چوہے بلی کے اس کھیل کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہیے تھی۔" میں نے کہا۔

"ضرورت تو یقیناً نہیں تھی۔ پھر بھی......" اس نے جملہ اُدھورا چھوڑ دیا پھر ایک لمحے کے توقف سے گویا بڑے مان سے بولی "چلو اب آ بھی جاؤ۔ تمہیں کون سا پیدل یا گدھا گاڑی پر آنا ہے۔ شاندار ائرکنڈیشنڈ گاڑی میں آنا ہے جس میں سفر کا پتا بھی نہیں چلتا...... اور پھر یہ سفر ہے بھی کیا؟ محض چند میل ہی کی تو بات ہے۔ مجھے معلوم ہے تم اتنے کاہل تو نہیں ہو۔ ضرورت پڑنے پر تم تو پیدل بھی اتنی دور آسکتے ہو۔"

"میں تو پیدل گوجرانوالہ یا پنڈی بھی آسکتا ہوں لیکن یہ تم بے اصولی اور وعدہ خلافی کررہی ہو۔ مجھے تم سے ایسی بے اعتباری کی توقع نہیں تھی۔"

"میں یہ توقع رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ تم ہمارے حق میں فرشتے ثابت ہوسکتے ہو...... اور میں تم سے بھی یہ فرمائش نہیں کرتی کہ ہمارے بارے میں ایسا سمجھو۔ ہم اپنی جگہ احتیاط کررہے ہیں۔ تم بھی اپنی جگہ محتاط رہو۔ بس اب خفگی چھوڑو اور روانہ ہوجاؤ۔" اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

پروگرام میں اس تبدیلی کے بارے میں سُن کر شبیر شیخ اور سردار نے تو کوئی ردِعمل ظاہر نہ کیا لیکن ڈاکٹر برنارڈ تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے دھیرے سے ہنس دیا "دی لیڈی سے ہمیشہ ایسی باتوں کی توقع رکھنی چاہیے۔"

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "اپنی ساری احتیاط پسندی کے باوجود وہ یہاں ریڈ ڈاٹ کو نہیں بچا سکتی۔" پھر میں نے گاڑی سڑک کی طرف موڑلی۔

"یہاں ریڈ ڈاٹ نے سب سے بڑی غلطی تمہاری ذات میں دلچسپی لے کر اور پھر تم سے اُلجھ کر کی۔ اگر ریڈ ڈاٹ نے ایسا نہ کیا ہوتا تو اسے آج بھی یہاں کوئی خطرہ لاحق نہ ہوتا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"وہ تمام بدبخت جو عبرت ناک انجام کو پہنچتے ہیں ان سب کی زندگی میں ایسا کوئی نہ کوئی "اگر" ضرور آتا ہے۔ ان کی تباہی کا ذکر آتا ہے تو عموماً بات اسی طرح ہوتی ہے کہ اگر انہوں نے یہ نہ کیا ہوتا...... اگر انہوں نے وہ نہ کیا ہوتا...... لیکن یہ "اگر مگر" سب قدرت کے نظام کا ایک حصہ ہیں۔ ہر بُرائی کو ایک نہ ایک روز اپنے انجام کو پہنچنا ہوتا ہے۔" میں نے پُرسکون انداز میں ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا۔

ڈاکٹر برنارڈ نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ سفر خاموشی سے طے ہوا۔ ہم جب گزشتہ روز والی جگہ پر پہنچے تو مجھے دور سے ہی ویرانے میں سرخ لینڈ روور کھڑی نظر آگئی جس میں دی لیڈی اور اس کے ساتھی کل آئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ نیلی پجیرو میں آنے والی بات غلط تھی۔ میں دور ہی سے اس جانی پہچانی گاڑی کو دیکھ کر گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں اس تصور سے محظوظ ہوئے بغیر بھی نہ رہ سکا کہ دی لیڈی کے دل میں بہرحال ہماری طرف سے خوف موجود تھا جس کی وجہ سے وہ اتنی قلابازیاں کھا رہی تھی' اتنی احتیاط برت رہی تھی۔ انہوں نے بھی یقیناً دور ہی سے ہماری گاڑی دیکھ لی ہوگی۔ وہ جگہ ہی

ایسی تھی۔ وہاں دور سے ہی کسی گاڑی کو آتے دیکھا جا سکتا تھا اور صورتِ حال خطرناک ہوتے دیکھ کر عین آخری لمحوں میں بھی راہِ فرار اختیار کی جا سکتی تھی۔ ان کی گاڑی کے شیشے فوراً تھوڑے تھوڑے نیچے ہو گئے اور ان سے گنوں کی نالیں جھانکنے لگیں۔ شبیر اور سردار نے بھی اپنی گنوں کا رخ باہر کی طرف کر لیا۔

میں نے گاڑی عین کل والی جگہ پر ہی جا روکی اور انجن اسٹارٹ ہی رہنے دیا۔ لینڈ روور کا انجن بھی یقیناً اسٹارٹ ہی تھا۔ اچانک اس کا دروازہ کھلا اور ٹونی گاڑی سے اُتر آیا۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ اپنے کل والے کپڑوں میں ہی تھا اور صاف ستھرا تازہ دم نظر آ رہا تھا۔

ڈاکٹر برنارڈ کو گاڑی سے اتارنے کے لیے شبیر کو گاڑی سے اترنا پڑا۔ اس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔ لینڈ روور سے فوراً گویا کسی اسپیکر پر دی لیڈی کی آواز اُبھری جس میں ہلکی سی تشویش بھی شامل تھی "یہ کیا ہو رہا ہے افضل؟" اس کی گاڑی کی کھڑکیوں سے فوراً پچھ اور گنوں کی نالیں جھانکنے لگیں۔

"اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں......" میں نے کھڑکی سے سر نکال کر چیخ کر کہا۔ اس وقت تک ڈاکٹر برنارڈ کو بھی گاڑی سے اتار دیا گیا تھا۔ اسے دیکھ کر گویا ان لوگوں کو کچھ اطمینان ہوا۔

برنارڈ ہاتھ اٹھائے ان کی گاڑی کی طرف بڑھ گیا اور ٹونی ہاتھ اٹھائے ہماری گاڑی تک آ گیا۔ دونوں گاڑیوں میں بیٹھ چکے تو دی لیڈی گاڑی سے اُتری۔ وہ آج اورنج کلر کی ڈھیلی ڈھالی اسپورٹس شرٹ و سیاہ ٹراؤزر میں تھی۔ سر پر آسمانی رنگ کا خوبصورت پھولدار اسکارف باندھے ہوئے تھی۔ جدید فیشن کا سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا جس کی وجہ سے اس کی آسیبی آنکھیں چھُپ کر رہ گئی تھیں۔

میں نے بھی اخلاقاً گاڑی سے اتر جانا بہتر سمجھا۔ وہ اپنی گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے انداز میں ایک چیلنج سا پنہاں تھا گویا وہ سمجھ رہی ہو کہ میں اس کے قریب جانے کی ہمت نہیں کروں گا لیکن میں بے خوفی سے اس کے قریب چلا گیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی گاڑی میں پروگرام کے مطابق صرف دو نہیں بلکہ کم از کم چھ مسلح افراد موجود تھے۔ اب ڈاکٹر برنارڈ بھی پہنچ گیا تھا۔ گاڑی بڑی اور کافی گنجائش والی تھی۔ اس کے باوجود خوب بھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ خالی تھی۔ دی لیڈی غالباً خود ہی ڈرائیو کرتی ہوئی یہاں تک آئی تھی۔

وہ مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی "بہت شکریہ...... کہ تم نے پر امن انداز میں معاہدہ مکمل کیا۔"

"ہم حقیقتاً بہت امن پسند لوگ ہیں۔ اگر تم ہمارے ملک کی جڑیں نہ کاٹ رہی ہوتیں اور مستقبل کے بارے میں تمہارے اتنے خطرناک عزائم نہ ہوتے تو تم ہمیں بہت اچھا دوست پاتیں۔" میں نے دھیمے سے لہجے میں کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پُراسرار سے انداز میں مسکراتی رہی۔ میرا ہاتھ اس کے گداز ہاتھ کی گرفت میں تھا جس کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے یقین نہیں آتا تھا کہ یہی ہاتھ کھوپڑی توڑ ضربات لگا سکتا تھا۔

"ہو سکتا ہے ہماری آئندہ ملاقات مختلف حالات میں ہو۔" نہایت آہستگی سے بولی۔ نہ جانے کیوں وہ آئندہ ملاقات کے امکان کو دہرائے جا رہی تھی۔

"اگر اس وقت ہمارے بارے میں تمہارے عزائم بھی نیک ہوئے تو مجھے اس ملاقات سے خوشی ہو گی۔" میں نے کہا۔

"خدا حافظ۔" وہ میری بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر بولی اور میرا ہاتھ چھوڑ کر یک دم اُچھل کر گاڑی میں سوار ہو گئی۔ دروازہ بند ہوا، دوسرے ہی لمحے گاڑی کا انجن غصیلے سے انداز میں غرایا اور وہ تیزی سے گھوم کر سڑک کی طرف چل دی۔ میں ہونقوں کی طرح وہیں کھڑا رہ گیا۔

چند لمحے بعد میں نے سر جھٹکا۔ اس وقت تک میں گاڑی کی اُڑائی ہوئی خاصی دھول پھانک چکا تھا۔ میں اپنی گاڑی میں واپس آ گیا۔ ٹونی پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا اور مبہم سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"ان کا رویّہ تمہارے ساتھ کیسا رہا ٹونی؟" میں نے پوچھا۔

"بہت اچھا۔ میں اپنے آپ کو ان کا خاص الخاص مہمان محسوس کر رہا تھا۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ یہ تمہیں کہاں لے گئے تھے...... کہاں ٹھہرایا تھا؟"

"جاتے وقت انہوں نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی تھی اور آتے وقت بھی پٹی باندھ کر لائے ہیں۔" ٹونی نے میری توقع کے مطابق جواب دیا "اگر اسے بدسلوکی کہا جا سکے تو یہ واحد بدسلوکی تھی جو انہوں نے میرے ساتھ کی۔ اس کے لیے بھی بڑی معذرت کر رہے تھے۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "جہاں انہوں نے مجھے لے جا کر ٹھہرایا تھا وہ کوئی شاندار بنگلا معلوم ہوتا تھا جہاں زیادہ تر میں انہی مسلح لوگوں کو دیکھتا رہا جو اس کے ساتھ آئے تھے۔ یہ چھ آدمی تھے۔ وہ مختلف زبانیں بولنے والے، مگر یہیں کے باشندے معلوم ہوتے تھے۔ میرا اپنا اندازہ ہے کہ وہ بنگلا بھی کسی مقامی شخصیت کی ملکیت تھا جو خود وہاں نہیں رہتا تھا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ انہیں ابھی تک ہمارے لوگوں کا تعاون حاصل ہے۔"

"یقیناً۔" میں نے جواب دیا "اس ملک کے خلاف آج تک جتنی بھی سازشیں ہوئی ہیں ان میں اپنوں کا تعاون شاملِ حال نہ ہوتا تو وہ کیونکر پروان چڑھ سکتی تھیں اور کیونکر کامیاب ہو سکتی تھیں۔"

ٹونی بولا "میں چاہتا تو تھوڑی بہت مار دھاڑ کر کے یا ان میں سے کسی کو قابو میں کر کے وہاں سے فرار ہونے یا یہ معلوم کرنے کی کوشش کر سکتا تھا کہ وہ بنگلا کس کا تھا۔ اس سے آگے مزید کچھ

پتا چل سکتا تھا، کچھ سراغ مل سکتے تھے لیکن اس سے پھر وہی کشیدگی کی فضا پیدا ہو جاتی جس سے آپ گریز کر رہے تھے۔"

"تم نے اچھا کیا جو ایسا نہیں کیا۔ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ ریڈ ڈاٹ کے بچے کھچے لوگ واقعی ملک چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ میں یہی چاہتا تھا کہ انہیں نکل جانے کا موقع دیا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اُلجھنے کی صورت میں یہاں ان کا قیام لمبا ہو جائے یا کہیں باہر سے ان کے لیے کمک آ جائے اور ختم ہوتا ہوا معاملہ پھر طول پکڑ جائے۔ ہمارا مقصد بلاؤں سے پیچھا چھڑانا ہی ہے۔ اب اگر بلائیں رخصت ہو ہی رہی ہیں تو ان کی دُم پکڑ کر کھینچنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے گاڑی سڑک پر لا کر اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے کہا۔

"میں یہی سوچ کر میں بھی وہاں خاصے سعادت مند قسم کے مہمانوں کی طرح ٹکا رہا۔" ٹونی بولا۔

"تم نے اچھا کیا۔ راحیلہ نے تو یہاں غلط موقع پر جارحانہ رویّے کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا...... پھر اس کے مزاج کی یہ طبیعت کسی اور ہی سمت میں نکل گئی۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ ذرا چونک کر بولا۔

"راحیلہ نے ہم سب کو چھوڑ کر جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" میں نے بتایا۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، میں نے کبھی ٹونی کو حیرت سے اُچھلتے نہیں دیکھا تھا لیکن اس وقت ٹونی حیرت سے اُچھل پڑا۔ میں نے اپنی توجہ دوبارہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر لی لیکن مجھے احساس تھا کہ وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے سر!" بالآخر وہ سرسراتی آواز میں بولا۔

"دنیا میں کیا نہیں ہو سکتا میرے دوست!" میں نے خود استہزائیہ سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا "اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"سر! حیران ہونے کی بات تو ہے......" وہ انگریزی میں بولا "کم از کم یہ اطلاع تو اس قابل ہے کہ اس پر میں اپنے آپ کو حیران ہونے کا موقع دوں۔"

"تم واقعی حیران ہو گئے۔ بلکہ حیرت کی شدت سے انگریزی بولنے لگے......" میں نے ایک بار پھر ہنستے ہوئے کہا۔ میں گویا ہنسی میں بات ٹالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ٹونی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تک نہ ابھری۔

پھر وہ گویا صفائی پیش کرتے ہوئے بولا "سر! ہم نے تو آپ کی عدم موجودگی میں بھی آپ کی ہدایات سے بڑھ کر انہیں عزت و احترام دینے اور خوش رکھنے کی کوشش کی تھی...... اور میرا خیال تھا کہ وہ ہم سب سے بہت خوش ہیں۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں۔ اسے تم سے یا کسی اور سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" میں نے اس کا وہم دور کرنے کی کوشش کی۔

"تو پھر آپ سے......؟" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بظاہر تو اسے مجھ سے بھی کوئی شکایت نہیں ہے۔ وہ کسی شکایت کی وجہ سے نہیں جا رہی ہے...... بس جا رہی ہے۔" میں نے قدرے بے بسی سے کہا۔ میں اسے کیا سمجھاتا؟

"پھر بھی...... کچھ تفصیل تو بتایئے۔" اس نے فرمائش کی۔

گزشتہ روز راحیلہ سے میری جو بات چیت ہوئی تھی وہ میں نے اُسے سنا دی۔ وہ چند لمحے خاموش رہا پھر بولا "بس کچھ ایسا ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے جیسے کسی انسان کا یک دم ہی کسی جگہ سے...... کچھ لوگوں سے دل اُچاٹ ہو گیا ہو...... بیزار ہو گیا ہو......"

"ہاں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں؟" ٹونی نے پوچھا۔

"نہیں...... اس کی ضرورت نہیں...... اچھا معلوم نہیں ہو گا...... میں اپنی سی کوشش کر چکا ہوں۔" میں نے اٹک اٹک کر کہا "وہ ان جانے والوں میں سے معلوم ہوتی ہے جنہیں روکنا بے کار ہوتا ہے۔"

ٹونی خاموش رہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ چند لمحے کی بوجھل سی خاموشی کے بعد وہ بدستور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولا "یہ اچھا نہیں ہوا سر!"

"زندگی میں سب باتیں اچھی نہیں ہوتیں ٹونی! ہم میں سے کوئی بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

وہ خاموش رہا اور اس کے بعد راحیلہ کے گھر پہنچنے تک خاموش ہی رہا۔ میں شبیر اور سردار کو وہاں اُتار کر چاروں ساتھیوں کو کچھ ضروری ہدایات دینا چاہتا تھا۔ میں نے گاڑی جونہی گیٹ کے سامنے روکی گیٹ کھل گیا۔ کھولنے والا صفدر تھا۔ سلیمان بھی قریب ہی لان پر موجود تھا۔ راحیلہ برآمدے میں کھڑی تھی۔ وہ لوگ جیسے ہمارے ہی منتظر تھے۔ راحیلہ کو غالباً صفدر اور سلیمان سے معلوم ہو چکا تھا کہ ہم ٹونی کو واپس لانے کے لیے گئے تھے۔ میں گاڑی پورچ میں لے گیا۔

ہم گاڑی سے اُترے تو میں نے ٹونی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حتی الامکان شگفتہ لہجے میں راحیلہ سے کہا "لو بھئی...... جسے ہم موت کے منہ میں چھوڑ آئے تھے وہ ہنسی خوشی اور بہ خیر و عافیت واپس آ گیا ہے۔ اس کے جسم پر خراش تک نہیں ہے۔ کم از کم اس سلسلے میں تو تمہارا غیظ و غضب کم ہو جانا چاہیے، باقی سلسلے اپنی جگہ۔"

"میں کسی بھی سلسلے میں غیظ و غضب کا شکار نہیں ہوں۔ تم فضول باتیں مت کرو۔" راحیلہ مبہم سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

ٹونی ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر بولا "یقین نہیں آ رہا آپ وہی کل والی راحیلہ ہیں۔"

"تم کل انہیں دیکھتے تو تمہیں یہ یقین نہ آتا کہ یہ پرسوں والی

راحیلہ ہیں۔" میں نے لقمہ دیا۔

"یہیں کھڑے بکواس مت کرتے رہو۔ اندر چلو تم سب لوگ۔" راحیلہ کے الفاظ تو پہلے جیسے ہی تھے لیکن لہجہ پہلے جیسا نہیں تھا۔ اس لہجے میں وہ اپنائیت نہیں تھی جو اس کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔

ہم اندر پہنچے تو خالہ بی نے فردا فردا ہم سب کی بلائیں لیں اور راستے میں کھڑے کھڑے ہی ایک خاصی طویل تقریر کر ڈالی جس کا خلاصہ صرف یہ تھا کہ راحیلہ کا چہرہ ٹھیک ہونے اور تمام معاملات خیریت سے طے پا جانے کی انہیں بہت خوشی تھی۔ ان کی تقریر شاید مزید طول پکڑ جاتی لیکن راحیلہ نے تقریباً زبردستی انہیں کافی تیار کرنے کے لیے بھیج دیا اور ہم ڈرائنگ روم میں آبیٹھے۔

"سنا ہے آپ کراچی واپس جارہی ہیں؟" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ٹونی نے راحیلہ کو مخاطب کیا۔ اس کے لہجے میں تناؤ تھا۔

"ہاں..... لیکن پلیز..... اس موضوع پر مزید کوئی بات نہیں ہوگی۔" راحیلہ ہاتھ اٹھا کر بولی اور یوں اس نے گویا بات ہی ختم کردی۔

"لیکن ایک بات ضرور ہوگی۔" میں نے بہ آواز بلند کہا "ہم سب ساتھی چند دن کے لیے کراچی جارہے ہیں جہاں ہمارے اپنے ہوٹل میں راحیلہ کے اعزاز میں ایک شاندار پارٹی ہوگی۔ اصل میں تو یہ پارٹی راحیلہ کا چہرہ ٹھیک ہونے کی خوشی میں ہوگی لیکن تم لوگ اسے ایک طرح کی الوداعی پارٹی بھی سمجھ سکتے ہو۔"

"یہ تکلیف کیا ضروری ہے؟" راحیلہ ملائمت سے بولی۔

"ہر معاملے میں تم اپنی مرضی چلاتی ہو۔ یہ چھوٹا سا کام تو ہمیں اپنی مرضی سے کرنے دو۔" میں نے کہا "ویسے بھی ایک اہم ساتھی کی رخصتی اس کے شایانِ شان تو ہونی چاہیے۔" پھر میں نے ٹونی سے کہا "سب ساتھیوں کے کراچی چلنے کے انتظامات تمہارے ذمے ہیں۔ قیام ہوٹل ہی میں رہے گا۔"

ٹونی نے اثبات میں سرہلایا۔ پھر اس دن کا پروگرام طے ہونے لگا۔ راحیلہ آفس جانے اور الوداعی کام نمٹانے کے لیے تیار بیٹھی تھی۔ میں نے باقی ساتھیوں سے کہا کہ وہ چاہیں تو آج آرام کرلیں۔ دو دن سے وہ سب خاصے تناؤ میں تھے لیکن انہوں نے بھی آفس ہی جانے کا فیصلہ کیا۔

چند منٹ بعد کافی پی کر ہم سب آفس روانہ ہوگئے اور وہاں سب مصروف ہوگئے۔ میں نے محسوس کیا کہ راحیلہ کے جانے کی خبر نے ہم سب کے اعصاب پر جو تناؤ سا مسلط کیا تھا کم از کم میرے ساتھی اب اس کے اثر سے باہر آرہے تھے۔ انہوں نے اس حقیقت کو قبول کرلیا تھا اور محسوس کرلیا تھا کہ اس سلسلے میں اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا اس لیے اس سے سمجھوتا کرلینا ہی بہتر تھا۔

مجھے اپنے کمرے میں بیٹھے کچھ ہی دیر ہوئی تھی اور میں چند [illegible] کیا تھا جب [illegible] نے بتایا کہ آفاق علی مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ آفاق علی اس فلم کمپنی کا ڈائریکٹر تھا جو میرے سرمائے [illegible] قائم ہوئی تھی۔ اب یہ کمپنی بھی اپنے پیروں پر کھڑی ہو رہی تھی اور نامساعد حالات کے باوجود کچھ نہ کچھ منافع دے رہی تھی۔ [illegible] مختلف ٹی وی چینل اور حکومتی پالیسیوں وغیرہ کی وجہ سے فلمسازی کے حق میں حالات اچھے نہیں تھے تاہم گزشتہ دنوں ہماری کمپنی کی دو تین فلمیں سپرہٹ ہوجانے کی وجہ سے کمپنی کو کافی سنبھالا مل گیا تھا اور اب اس میں میرا سرمایہ جاتے رہنے کے بجائے واپس بھی آنا شروع ہوگیا تھا۔ اس کامیابی پر مجھ سے زیادہ آفاق خوش تھا۔

"سر! مجھے پتا چلا تھا کہ آپ ان دنوں یہیں ہیں تو میں نے سوچا سلام دعا تو کرلی جائے۔" آفاق بولا "اب تو بہت بہت دن آپ سے بات ہی نہیں ہوتی۔" وہ بولا۔

"بس..... حالات ہی کچھ ایسے رہے۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "شاید کچھ عرصے بعد میں مستقل طور پر لاہور واپس آجاؤں۔ اس وقت تک شاید مکان بھی مکمل ہوجائے۔ فی الحال تو کل پرسوں میں دوبارہ کراچی جارہا ہوں۔"

"اچھا.....؟" آفاق قدرے دلچسپی سے بولا پھر اس نے گویا برسبیلِ تذکرہ کہا "پرسوں ہماری نئی فلم کا یونٹ بھی شوٹنگ کے لیے کراچی روانہ ہورہا ہے۔ وہاں ہاکس بے وغیرہ پر چند سین شوٹ کرنے ہیں۔ سمندر میں اسمگلروں اور کوسٹ گارڈ کے درمیان مقابلے کے بھی کچھ مشکل سین ہیں۔ شاید ہمارا ابھی بیس پچیس دن قیام رہے۔ اگر آپ زیادہ مصروف نہ ہوئے تو وہاں ملاقات رہے گی۔"

"ضرور۔" میں نے کہا۔ اچانک مجھے ایک خیال آیا اور میں نے پوچھا "یونٹ میں تمہارے ساتھ کون کون جارہا ہے؟ میرا مطلب ہے اداکاروں میں سے کون کون شامل ہے؟"

"اہم اداکار تو سبھی ہیں۔ ہیروئن سمیرا ہے..... ہیرو مسعود ہے..... ولن الفت خان ہے۔ سائڈ ہیرو اکمل اور سائڈ ہیروئن چندا بھی ہے۔ چند دوسرے اداکار ہیں۔" آفاق نے بتایا۔

سمیرا اور مسعود دونوں ہی نوجوان اور فلمی دنیا میں نووارد تھے۔ ابھی تک ان کی غالباً تین چار فلمیں ہی ریلیز ہوئی تھیں اور ان کی خوش قسمتی تھی کہ سبھی سپرہٹ ہوگئی تھیں جن میں ایک ہماری کمپنی کی فلم بھی شامل تھی۔ فلم انڈسٹری کی روایت کے مطابق اب غالباً ان کے دروازے پر ڈائریکٹروں اور پروڈیوسروں کی لائن لگ چکی تھی۔ آفاق فلمی دنیا کے طور طریقوں سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ بھی نہ صرف ان کی ایک فلم ریلیز کرچکا تھا بلکہ اب اس کی زیرِ تکمیل فلم میں بھی یہی دونوں ہیرو اور ہیروئن تھے۔ میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ میں نے ان کی کوئی فلم بھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ بھی نہیں دیکھی تھی جو اپنی کمپنی کی پروڈکشن تھی۔ ان کے بارے میں میری معلومات صرف اخبارات میں اچٹتی سی نظروں سے پڑھی ہوئی اور فون پر آفاق کی بتائی ہوئی باتوں تک محدود تھیں۔

"بات یہ ہے کہ آفاق ڈیئر.....!" میں نے فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا "دو چار دن بعد میں کراچی میں اپنے ہوٹل میں اپنی ایک ساتھی کے اعزاز میں بہت اچھی پارٹی دے رہا ہوں۔ پروگرام میرے کراچی پہنچنے کے بعد ہی فائنل ہوگا۔ یہ بڑا اچھا ہوا کہ اتفاق سے تم بھی انہی دنوں میں کراچی جارہے ہو۔ وہاں پہنچ کر مجھے فون کر کے پروگرام معلوم کرلینا۔ میں چاہتا ہوں تم فلم کے چار پانچ خاص خاص اداکاروں کو بھی اس پارٹی میں میری طرف سے مدعو کرلو۔ باقی ہر شعبۂ زندگی کے نہایت چیدہ چیدہ لوگ موجود ہوں گے۔ میں چاہتا ہوں فلمی دنیا کی بھی نمائندگی ہوجائے۔ ویسے بھی اداکاروں کو تمام طبقوں کے لوگ دلچسپی سے دیکھتے ہیں اور اشتیاق سے ملنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ کسی پارٹی میں موجود ہوں تو پارٹی میں ذرا جان پڑ جاتی ہے۔"

"ضرور..... ضرور۔" آفاق قدرے پرجوش لہجے میں بولا "یہ ان لوگوں کے لیے ایک اعزاز ہوگا۔ یہ سب لوگ غائبانہ طور پر آپ کو جانتے ہیں اور آپ سے ملنے کے مشتاق بھی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں اس دعوت پر بہت خوشی ہوگی۔"

"بس تو پھر یہ طے ہوگیا کہ تم فلمی ستاروں کو پارٹی میں لاؤ گے۔" میں نے طمانیت سے کہا پھر پوچھا "تم لوگ وہاں کس ہوٹل میں ٹھہرو گے؟"

"کافی لوگ ہیں..... دو تین ہوٹلوں میں بکھریں گے۔ ہیرو ہیروئن کو تو فائیو اسٹار ہوٹل میں ہی ٹھہرانا پڑے گا جو آپ والا ہی ہوگا کیونکہ وہاں ہماری فلم کمپنی کو رعایت ملتی ہے جو کہ درحقیقت آپ ہی کی فلم کمپنی ہے۔ آپ ہی کا روپیا گھوم پھر کر ہمارے ہاتھوں سے بذریعۂ ہوٹل واپس آپ ہی کو جارہا ہوتا ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"حساب تو بہرحال حساب ہے آفاق ڈیئر! کاروباری دنیا میں اسی طرح کام چلتے ہیں۔" میں نے بھی ہنستے ہوئے کہا "دوسرے لوگ کہاں ٹھہریں گے؟"

"وہ حسبِ مراتب ذرا سستے ہوٹلوں میں ٹھہریں گے۔ فلم میکنگ کے ہر مرحلے پر اخراجات کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ میں خود رضاکارانہ طور پر سستے ہوٹل میں ٹھہرتا ہوں۔" آفاق نے بتایا۔

آفاق مالِ مفت دلِ بے رحم کا نظریہ رکھنے والا آدمی نہیں تھا اسی لیے اس نے مجھ جیسے لاتعلق اور بے نیاز فائنانسر کی کمپنی کو نفع میں چلا کر دکھا دیا تھا۔ اس کی جگہ کوئی عام اور لالچی سا آدمی ہوتا جو صرف وقتی فائدے کے بارے میں سوچتا تو وہ کچھ عرصہ عیش و عشرت کرکے، میری برہمی کا مرحلہ شروع ہوتے دیکھ کر رخصت ہوجاتا اور یوں ایک بڑے ادارے کی سربراہی کھودیتا۔ ایسے لوگوں کو ہر تھوڑے عرصے بعد ایک نیا شکار تلاش کرنا پڑتا ہے۔ آفاق نے اپنے آپ کو اس چکر سے بچایا ہوا تھا اور نہایت عزت و آبرو..... بلکہ یوں کہیے کہ ٹھیک ٹھاک رعب کے ساتھ فلمی دنیا میں ایک قد آور شخصیت بنا کھڑا تھا۔

"بھئی تم اپنے معاملات میں خود مختار ہو۔ جہاں چاہو ٹھہر سکتے ہو۔ کمپنی کے نفع نقصان کا فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے۔ اس پارٹی میں بہرحال تمہیں اپنے فلمی ساتھیوں کے ہمراہ شریک ہونا ہے تاکہ اسے چار چاند لگ جائیں۔" میں نے کہا۔

"کراچی میں تو میرے ساتھ صرف دو چاند ہوں گے سر! وہ میں آکر آپ کی پارٹی میں لگادوں گا۔ ان میں سے ایک ذرا گہنایا ہوا سا ہے۔" آفاق ذرا شریر سے لہجے میں بولا "درحقیقت تو یہ چاند بھی نہیں..... صرف ستارے ہیں....."

"کوئی بات نہیں..... انہی سے کام چل جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ویسے اگر آپ زیادہ ستارے جمع کرنا چاہتے ہیں تو میں بہت سے اپنے ساتھ لاسکتا ہوں لیکن وہ عین اسی رات آئیں گے جس رات تقریب ہوگی تاکہ ان کا زیادہ وقت ضائع نہ ہو۔ انہیں صرف ہوائی جہاز کا فرسٹ کلاس کا آنے جانے کا ٹکٹ دینا پڑے گا۔ کسی اور کا معاملہ ہو تو وہ خاصے نخرے دکھائیں گے۔ شوٹنگوں کا حرج ہونے کا عذر کریں گے۔ اپنے نقصان کی تلافی کی باتیں کریں گے لیکن آپ کے معاملے میں ایسا نہیں ہوگا۔ آپ کا نام سن کر ہی بہت سے لوگ آجائیں گے۔ انڈسٹری میں غائبانہ طور پر ایک افسانوی سی شخصیت کے طور پر آپ کا نام جانا پہچانا ہے۔"

"اس کی وجہ تم ہوگے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"کچھ میں ہوں..... اور کچھ پرانے واقعات ہیں جو اب بھی فلمی لوگوں کی محفلوں میں زیرِ بحث آجاتے ہیں۔" آفاق نے جواب دیا۔

"خیر..... زیادہ ستاروں کو بلانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "ہمارا کام تو دو چار ستاروں سے ہی چل جائے گا۔ میں بہت زیادہ بھیڑ بھاڑ بھی کرنا نہیں چاہتا۔ ہر شعبۂ زندگی سے تھوڑے تھوڑے لوگ بھی آئے تب بھی کافی ہوجائیں گے۔ کراچی اور لاہور سے اپنے بھی تمام خاص خاص ساتھی ہوں گے۔ دوست احباب ہوں گے۔ خاصا بڑا اجتماع ہوجائے گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" آفاق بولا "اب آپ سے کراچی میں ملاقات ہوگی۔"

میں نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کیا ہی تھا کہ کیتھرین نے بتایا کراچی سے زرتاج کی کال تھی۔ کیتھرین نے لائن ملائی تو زرتاج بلاتمہید بولی "معلوم ہوتا ہے لاہور میں بہت دل لگ گیا ہے تمہارا۔"

"بھئی دل لگے یا نہ لگے...... میرا اصل ہیڈ کوارٹر تو یہی ہے۔ کراچی میں تو میری حیثیت مسافر کی سی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"فی الحال تو آپ کا قیام کراچی میں ہی ہے نا مسافر صاحب! ہم نے تو آپ کو صرف میٹنگ میں شرکت کی غرض سے ایک آدھ دن کے لیے لاہور والوں کو مستعار دیا تھا۔ یہ بتائیں کہ فی الحال قیام لمبا کیوں ہو گیا؟"

"تمہیں معلوم ہے جہاں میں جاتا ہوں وہاں کچھ نہ کچھ پریشانیاں، افراتفری، بھگدڑ اور اُلجھنیں میری منتظر ہوتی ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اُف خدایا......!" وہ شاید پیشانی پر ہاتھ مارتے مارتے رہ گئی تھی "اب کیا نئی اُفتاد آن پڑی؟"

"کوئی خاص نہیں......" میں نے اس تذکرے سے بچنے کی کوشش کی "بہرحال اب تو میں کل یا پرسوں تک پہنچنے والا ہوں۔ آج ٹکٹ اوکے ہو جائے تو میں تمہیں اطلاع دے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ائرپورٹ آؤں گی۔" اس نے مطلع کیا۔ وہ پہلے بھی اس ارادے کا اظہار کر چکی تھی۔

"تم مجھے اس خوش فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش کر رہی ہو کہ کراچی میں بڑی بے تابی سے میرا انتظار ہو رہا ہے؟" میں نے کہا۔

"تم اسے خوش فہمی سمجھنے پر کیوں مُصر ہو؟ یہ حقیقت بھی تو ہو سکتی ہے۔" وہ مترنم سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"اپنے ایسے نصیب کہاں!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تم وہ بے ہودہ اور ناشکرے انسان ہو جس نے خود اپنا نصیب پھوڑا ہوا ہے اور مسکینی اور انکسار کے اظہار کے لیے جو ہر بات پر ٹھنڈی سانس لے کر کہہ دیتا ہے کہ اپنے ایسے نصیب کہاں! تم یہ دوغلی پالیسی ترک کر دو ورنہ کسی روز میں تمہاری کھوپڑی توڑ دوں گی۔" وہ خطرناک سے لہجے میں بولی۔

"اپنے اپنے اندازِ فکر کی بات ہے۔ ایک ہی مسئلے کے بارے میں کتنے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ ایک اور خاتون نے اس بات کو یوں بیان کیا تھا کہ میں اس طرح دوسرے کی قدر و منزلت خود اس کی اپنی نظر میں بڑھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اسے احساس دلاتا ہوں کہ وہ کتنا اہم اور اعلا و ارفع انسان ہے، میری رسائی اور دسترس سے کتنا دور ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس کی بات کو درست سمجھوں۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"سب کچھ جانتے ہوئے انجان بنے رہنا...... یہ بھی تمہاری ایک ادا ہے۔ تمہیں سب کچھ معلوم ہے اور سب کچھ بہت اچھی طرح تمہاری سمجھ میں آتا ہے۔ میں اب تمہیں اچھی طرح سمجھنے لگی ہوں۔"

"یہ وہ کام ہے جو میں خود بھی نہیں کر سکا۔ میں بھی خود کو سمجھنے کی بہت کوشش کرتا رہتا ہوں لیکن ابھی تک کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ اب تمہاری زبانی مجھے خود اپنے بارے میں معلومات حاصل ہوتی رہیں گی۔"

"اچھا...... اب جھوٹ بولنا بند کرو اور سچ سچ بتاؤ کیا تم کل پرسوں آرہے ہو؟"

"ہاں۔ کم از کم اس بات کو تو جھوٹ مت سمجھو۔" میں نے کہا۔

"میں حتمی اطلاع کے لیے تمہارے فون کا انتظار کروں گی" اس نے کہا اور پھر خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

○☆○

ہم دوسرے ہی روز کراچی روانہ ہو گئے۔ فرسٹ کلاس اکٹھی سیٹیں ہمیں شام کی فلائٹ میں میسر آئیں۔ راحیلہ اور فرزانہ کے علاوہ چھ دوسرے ساتھی میرے ہم راہ تھے۔ شفیع شاہ اور زرتاج ہمیں لینے کے لیے ائرپورٹ پر موجود تھے لیکن یہ اطلاع صرف شفیع شاہ کو تھی کہ میرے ساتھ کون کون آرہا تھا اور ہمارا یوں ایک ساتھ آمد کا مقصد کیا تھا لیکن زرتاج اس سارے معاملے سے بے خبر تھی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں تنہا ہی آرہا تھا۔

ارائیول لاؤنج میں بھی میں ہی سب سے پہلے پہنچا۔ باقی لوگ ایک قطار کی سی صورت میں کچھ پیچھے تھے۔ میں لاؤنج میں پہنچا تو زرتاج نے بڑے اشتیاق اور زور و شور سے دونوں بازو لہرائے اور جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے شفیع شاہ سے بھی پہلے اور اس سے بھی زیادہ جوش و خروش سے مجھ سے مصافحہ کیا۔ جوش و خروش کی لہر شاید اس کے پورے وجود میں ہی دوڑ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ تپ رہے تھے۔ شفیع شاہ اپنے مخصوص مبہم سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

"خدا کا شکر ہے تم آگئے۔" زرتاج بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ بولی "مجھے تو اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ تمہیں بلوانے کے لیے غنڈے، بدمعاش یا پھر پولیس بھیجنی پڑے گی۔"

"مجھے جب بھی کہیں سے بلوانا ہو، غلطی سے بھی کبھی غنڈے بدمعاش یا پولیس والے نہ بھیج دینا کیونکہ ان کا اپنا واپس جانا مشکوک ہو جائے گا۔ البتہ کسی حد سے زیادہ شریف آدمی کو بھیج دینا۔ میں فوراً تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ ویسے اطلاعاً عرض ہے کہ مجھے گئے ہوئے صرف چند ہی دن ہوئے تھے۔ کوئی ایسا زیادہ لمبا عرصہ نہیں گزرا تھا۔"

"لیکن ہمیں لگ رہا تھا جیسے تمہیں گئے ہوئے برسوں گزر گئے ہیں۔" زرتاج بلا جھجک بولی۔

اچانک اس کی نظر میرے عقب میں کہیں جا ٹھہری اور یک دم اس کے تاثرات ہی بدل گئے۔ اس کا سارا جوش و خروش گویا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا اور آنکھوں میں مچلتا اشتیاق دم توڑ گیا۔ وہ یک دم جیسے سب کچھ بھول بھال گئی۔ اس کا ذہن جیسے کہیں اور ہی جا اٹکا۔ اس کا چہرہ گویا پتھرا سا گیا تھا۔

میں نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں گردن گھما کر دیکھا۔ پیچھے باقی ساتھی چلے آرہے تھے جن میں سب سے آگے راحیلہ تھی۔ وہ میرے قریب پہنچ چکی تھی اور زرتاج کی نظر اسی پر گڑی تھی۔

راحیلہ کچھ اور آگے آچکی تو میں نے مسکراتے ہوئے زرتاج سے کہا "تم نے شاید اسے پہچان لیا ہے۔ یہ وہی راحیلہ ہے جو پچھلی بار تمہیں نقاب پوش حسینہ کے روپ میں ملی تھی۔"

زرتاج گویا سنبھل کر کھوکھلی سی ہنسی کے ساتھ بولی "اور اب یہ اس قابل ہو گئی ہیں کہ بے نقاب گھوم سکیں۔ واقعی یقین نہیں آتا ہے کہ یہ وہی خاتون ہیں۔ یہ معجزہ کیونکر رونما ہوا؟"

"دراصل اسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ اس نے پچھلے کئی ماہ سے منہ ہی نہیں دھویا۔" میں نے ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھ کر کہا "ایک روز اس نے غلطی سے صابن سے منہ دھو لیا۔ فوراً ہی صاف ہو گیا۔ بس اتنی سی بات تھی۔"

راحیلہ نے گھور کر مجھے دیکھا پھر مصافحے کے لیے زرتاج کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "اب تک آپ کو یقیناً اچھی طرح معلوم ہو چکا ہو گا کہ یہ بڑا بکواسی شخص ہے اور آپ نے اس کی بکواس پر دھیان دینا بھی چھوڑ دیا ہو گا۔"

"ہاں...... لیکن کبھی کبھی یہ بکواس بکواس میں بڑے کام کی بات کر جاتے ہیں۔" زرتاج کچھ اور سنبھل کر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ وہ ایک ٹک راحیلہ کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس نے راحیلہ سے مصافحہ بڑی مضبوطی سے کیا تھا۔ دونوں کے ہاتھ ابھی ایک دوسرے میں ہی پھنسے ہوئے تھے اور دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں۔ دونوں بظاہر مسکرا رہی تھیں لیکن دونوں کی آنکھوں میں ایک عجیب سی سرد مہری تھی۔

میں آج پہلی بار انہیں اس طرح آمنے سامنے دیکھ رہا تھا اور میرے ارادے کے بغیر ہی میرے لاشعور میں گویا کوئی غیبی طاقت دونوں کا موازنہ کر رہی تھیں۔ دونوں کی شخصیت مختلف تھی۔ ان کی اٹھان، نین نقش، رنگت، شکل صورت، سب کچھ مختلف تھا لیکن دونوں کو ہی بے پناہ خوبصورت لڑکیوں میں شمار کیا جا سکتا تھا اور اپنی اپنی جگہ دونوں اپنے اوصاف کے اعتبار سے بے مثل تھیں۔

اگر میرے دل پر بہت پہلے سے راحیلہ کی تصویر کندہ نہ ہوتی اور ان دونوں کو بیک وقت جاننے کے بعد میرے سامنے ان دونوں میں سے کسی ایک کے انتخاب کا مسئلہ ہوتا تو شاید وہ میری زندگی کا مشکل ترین فیصلہ ہوتا۔ اب بھی اس مختصر سے وقفے میں کئی لمحے ایسے گزرے جب میں نے محسوس کیا کہ وہ دونوں لڑکیاں نہیں تھیں، ترازو کے دو پلڑے تھے اور میرا وجود برابر وزن کے دو باٹوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ایک باٹ ایک پلڑے میں رکھا تھا، دوسرا باٹ دوسرے پلڑے میں...... مگر پھر جیسے جھرجھری سی لے کر میں نے خود ڈنڈی ماردی اور راحیلہ والا پلڑا جھک گیا۔

راحیلہ چبھتے ہوئے جملوں کا جواب دینے میں کسی سے پیچھے نہیں تھی۔ وہ تو اینٹ کا جواب پتھر سے دینے...... بلکہ بعض اوقات تو اینٹ مارنے میں پہل کرنے کی قائل تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ گزشتہ روز سے اس کے رویّے میں ایک نمایاں تبدیلی آچکی تھی۔ اس کے انداز و اطوار اور گفتگو میں ایک عجیب سا ٹھہراؤ اور ٹھنڈا پن آگیا تھا۔ اب اگر کوئی دوسرا تیکھی بات کر بھی رہا تھا تو وہ جیسے ایک بزرگانہ وقار اور متانت سے اَن سنی کر رہی تھی اور اگر کسی کے رویّے میں تلخی کی کوئی جھلک بھی تھی تو وہ اسے نظر انداز کر رہی تھی۔ شاید اس نے سوچ لیا تھا...... اپنے آپ کو سمجھا لیا تھا کہ جب ان لوگوں سے تعلق واسطہ ختم ہی ہو رہا تھا تو پھر آخری وقت میں کسی سے اُلجھنے کی کیا ضرورت تھی۔

آخر انہوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ چھوڑ دیا اور زرتاج کشیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "بہرحال...... آپ کی صورت کو صحیح دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ مبارک ہو۔"

"بہت شکریہ۔" راحیلہ نے متانت سے کہا۔

اس دوران میں ہمارے ساتھی بھی قریب آن کھڑے ہوئے تھے۔ کنوئیر بیلٹ پر ہمارا سامان بھی آچکا تھا اور سب اپنا اپنا سامان اٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے زرتاج سے ان سب کا تعارف کرایا تو وہ بولی "تم تو پوری کرکٹ ٹیم لے کر آئے ہو۔ کیا کسی خاص مشن پر آئے ہو؟"

"ہاں...... ایک بہت ہی خاص مشن پر۔" میں نے اپنا لہجہ پُراسرار بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اس مشن میں تم بھی ہمارے ساتھ شریک ہو گی۔"

اس نے گہری اور وضاحت طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میں نے سب کو باہر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "ساری باتیں یہیں کھڑے ہو کر کرنا ضروری نہیں۔ اللہ نے ہمیں بہت سی جگہیں عطا فرمائی ہیں جہاں بیٹھ کر ہم شرفا کی طرح بات چیت کر سکتے ہیں۔"

ہم باہر آگئے اور پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیے۔ زرتاج اب بالکل خاموش تھی اور مجھے اس کا افسوس تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے توقع نہیں تھی کہ اسے راحیلہ کی صورت شکل صحیح دیکھ کر ایسا دھچکا لگے گا۔

شفیع شاہ سب کو لینے کے لیے ہوٹل کی کوسٹر لے کر آیا تھا جس میں ڈرائیور بھی موجود تھا۔ وہ خود زرتاج کے ساتھ اس کی پجیرو میں آیا تھا۔ ائرپورٹ سے روانہ ہوتے وقت سب ساتھی کوسٹر میں جا بیٹھے۔ صرف میں اور راحیلہ، زرتاج کے ساتھ اس کی پجیرو کی طرف چل دیے۔ راحیلہ بھی کوسٹر ہی میں جانے لگی تھی لیکن میں نے خود قدرے اصرار سے اسے زرتاج کی گاڑی میں چلنے کے لیے

کہا تھا۔

زرتاج کی گاڑی میں اگلی سیٹ پر ایک عورت بیٹھی تھی۔ وہ عمر رسیدہ تھی مگر بظاہر عمر رسیدہ نظر نہیں آتی تھی۔ اس نے بال بھورے ڈائی کیے ہوئے تھے۔ چہرے پر ہلکا سا میک اَپ بھی تھا۔ آنکھیں نیلی تھیں۔ پہلی نظر میں اس پر غیر ملکی ہونے کا گمان گزرتا تھا کیونکہ رنگت بھی بے حد گوری تھی مگر یہ گورا پن کپڑے کی سفیدی جیسا تھا۔ ہلکی سی سرخی کی جھلک صرف اس کے ہونٹوں میں نظر آرہی تھی اور وہ بھی شاید لپ اسٹک کی مرہونِ منت تھی۔ اس کے پتلے پتلے سے ہونٹوں میں خفیف سا کھنچاؤ تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت سے ایک عجیب سی سرد مہری اور ہلکی سی سفاکی جھلکتی تھی لیکن جب زرتاج نے اس سے میرا تعارف کرایا تو یہ سرد مہری اور خفیف سی سفاکی گویا یک لخت غائب ہوگئی۔

اس کی آنکھوں میں یکدم شفقت اور نرماہٹ آگئی۔ جب وہ بولی تو اس کے غیر ملکی ہونے کا تاثر بھی زائل ہوگیا۔ وہ بڑی صاف اور شستہ اردو میں بولی "کیسے ہو بیٹا!" اس کے لہجے کی شفقت سے ایک ٹھنڈک سی رگ وپے میں اُتر گئی۔ اس شفقت میں ایک خاص قسم کی اپنائیت بھی شامل تھی۔

اس نے بال ضرور رنگے ہوئے تھے اور ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا جس سے یہ بھی سمجھا جاسکتا تھا کہ شاید بیشتر لوگوں کی طرح اسے بھی عمر کا کمپلیکس تھا اور اس نے اپنی عمر چھپانے کی کوشش کی تھی لیکن جس طرح اس نے تعارف ہوتے ہی مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کرلیا تھا اس سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ اسے عمر کا کمپلیکس نہیں تھا۔ اس کے پہناوے اور شخصیت وغیرہ سے سستا پن بھی عیاں نہیں تھا۔ بزرگی کا تاثر بہرحال ملتا تھا۔ ہمیں گاڑی کی طرف آتا دیکھ کر وہ سیٹ سے اُتر آئی تھی۔ تب میں نے دیکھا تھا کہ وہ ایک دراز قد عورت تھی۔ ہاتھ پاؤں اور جسمانی ساخت بتاتی تھی کہ جوانی میں وہ ایک مضبوط عورت رہی ہوگی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اس شاندار عمارت پر زوال آچکا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں.... بالکل ٹھیک ہوں...." میں نے اپنی سوچوں کے اُلجھاوے سے باہر آتے ہوئے کہا اور سوالیہ نظروں سے زرتاج کی طرف دیکھا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے سوال کیا تھا "تم نے ان خاتون کا تعارف تو کرایا نہیں...."

میرا خاموش سوال اس تک پہنچ گیا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ مسز دُرّانی ہیں۔ وہی خاتون.... جن کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا.... جنہیں ایک مسئلہ درپیش ہے۔"

میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ وہی خاتون ہوسکتی تھیں۔ پھر بھی کچھ شک سا تھا جو زرتاج نے دور کردیا۔ وہ معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی "میں نے مسز دُرّانی سے ذکر کردیا تھا کہ تم آج اس فلائٹ سے آرہے ہو۔ یہ ضد کرنے لگیں کہ یہ بھی میرے ساتھ ائرپورٹ چلیں گی۔ میں یہی سمجھ رہی تھی کہ تم اکیلے آؤ گے۔ اس لیے انہیں ساتھ لے آئی اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تمہارے ساتھ دوسرے لوگ بھی آرہے ہیں تو میں انہیں نہ لاتی۔"

"خیر.... اب اتنے تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ساتھ آنے والے میرے دوست ہی ہیں۔ اگر تم ان خاتون کو ساتھ لے آئی ہو تو اس سے پروٹوکول کی خلاف ورزی نہیں ہوگی کیونکہ ہم درویشوں سے ملنے کا کوئی پروٹوکول ہے ہی نہیں۔"

پھر میں نے مسز دُرّانی سے کہا "آپ زرتاج کی باتوں کا خیال نہ کیجیے گا۔ یہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو بڑی مہذب، شائستہ اور باتکلف ظاہر کرنے کی کوشش کررہی ہے۔ آپ یہاں آگئیں۔ یہ آپ کی محبت اور عنایت ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔"

"جیتے رہو بیٹا!" خاتون کے لہجے میں شاید ممنونیت کے باعث ہلکی سی لرزش آگئی۔ ان کے ہونٹ تھرتھرائے۔ شاید انہوں نے کچھ اور بھی کہنا چاہا تھا لیکن آواز نے ساتھ نہیں دیا۔

زرتاج بولی "تم ان کی آنکھوں کے گرد حلقے دیکھ رہے ہو؟"

میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا، خاتون کی آنکھوں کے گرد واقعی سیاہ حلقے دکھائی دے رہے تھے جو ہلکے سے میک اَپ کی وجہ سے بہت نمایاں تو نہیں رہے تھے لیکن بہرحال موجود تھے۔ میں نے دوبارہ خاتون کے چہرے کا بغور جائزہ لیا اور زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر تم ان حلقوں کے علاج کے سلسلے میں میرا انتظار کررہی تھیں تو تمہیں یہ جان کر مایوسی ہوگی کہ آنکھوں کے حلقوں کا کوئی معقول علاج مجھے معلوم نہیں ہے۔"

"شروع کردی اِدھر اُدھر کی ہانکنی...." زرتاج نے مجھے گھورا پھر مسز دُرّانی کی طرف دیکھ کر گویا معذرت کی "آپ ان کی باتوں کا خیال نہیں کیجیے گا۔ انہیں بچپن سے ہی مسخرہ بننے کا شوق تھا مگر اللہ نے انہیں معاشرے کا معزز فرد بنا دیا۔"

"اس میں مسخرے پن کی کیا بات ہے؟" میں نے زرتاج کو گھورا "تم نے حلقوں کی طرف میری توجہ دلائی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنی کم علمی کا اعتراف کرلیا۔"

"میرا کہنے کا مطلب یہ تھا کہ اگر تم اپنے پروگرام کے مطابق جلدی واپس آجاتے تو شاید مسز دُرّانی کی آنکھوں کے گرد یہ حلقے نمودار نہیں ہوتے" زرتاج وضاحت کرتے ہوئے بولی "گزشتہ چند دنوں میں ان کا مسئلہ زیادہ سنگین ہوگیا اور ان کی راتوں کی نیند اُڑ گئی جس کی وجہ سے ان کی آنکھوں کے گرد حلقے پیدا ہوگئے۔"

"اوہ.... اتنا پیچیدہ فلسفہ بھلا مجھ جیسا کوڑھ مغز کہاں سمجھ سکتا تھا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "خیر.... چلو.... گاڑی میں بیٹھو راستے میں باتیں ہوتی رہیں گی۔ دوسرے لوگ بے چارے کو سڑکی کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔"

میں اور راحیلہ پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ وہ خاتون آگے بیٹھ گئیں۔ ڈرائیونگ سیٹ زرتاج نے سنبھالی اور گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکالتے ہوئے بولی "مسز دُرّانی سے میری ملاقات ایک گھریلو سی تقریب میں ہوئی تھی اور پھر باتوں باتوں میں انکشاف ہوا کہ یہ تو دور پار کے رشتے سے میری خالہ ہیں۔ بات سے بات.... اور رشتے سے رشتہ نکلتا چلا آیا.... لیکن اتفاق تھا کہ اس رشتے داری کے باوجود ہماری کبھی ایک دوسرے سے ملاقات نہیں ہوئی تھی...."

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا، کوسٹر ہم سے کافی پیچھے رہ گئی تھی۔ کچھ گاڑیوں کی وجہ سے اسے راستہ نہیں ملا تھا۔ زرتاج بات جاری رکھتے ہوئے بولی "رشتے داری نکل آنے کی وجہ سے آنٹی نے اپنے مسئلے کا ذکر مجھ سے کردیا تھا ورنہ یہ بڑی خوددار اور اپنا ہر معاملہ اپنی ذات تک محدود رکھنے کی عادی ہیں۔ ان کی ساری زندگی مسلسل جدوجہد سے عبارت ہے...."

"زرتاج! تمہیں شہر آئے تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے لیکن اتنے سے دنوں میں ہی تمہاری اردو تو بہت گاڑھی ہوگئی؟" میں نے کچھ حیرت اور کچھ رشک سے کہا۔

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ شہر آکر ایسا ہوا ہے" زرتاج بولی "میں جب زمینوں پر تھی تب بھی گاڑھی اردو، گاڑھی انگریزی، گاڑھی فرانسیسی، گاڑھی پنجابی، گاڑھی سندھی، گاڑھی سرائیکی بول سکتی تھی۔"

"خدا کی پناہ....!" میں نے خوف زدہ ہوکر کہا "عورت کا تو ایک ہی زبان بولنا کافی ہوتا ہے۔ تم نے اتنی ساری زبانیں کیوں سیکھ لیں؟"

"سیکھی تو میں نے صرف فرانسیسی تھی.... باقی سب تو خود بخود آتی چلی گئیں" اس نے جواب دیا "بہرحال.... تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم کہو گے تو میں کسی ایک زبان میں بھی تمہارے کان نہیں کھاؤں گی۔"

"تو پھر زندہ رہنے کی کیا ضرورت رہ جائے گی؟ مرد کے لیے وہ زندگی بھی بھلا کوئی زندگی ہے جس میں کوئی خاتون اس کے کان نہ کھائے؟ ایسی زندگی سے تو بہتر ہے کہ انسان صحیح وقت پر آنے والی کسی ٹرین کے سامنے لیٹ کر خودکشی کرلے۔"

"اگر وہ صحیح وقت پر آنے والی ٹرین کے انتظار میں رہا پھر تو خودکشی نہیں کرسکے گا۔" زرتاج بولی۔

"آپس کی بات ہے...... میں نے اپنی بات میں یہی تو تحفظ کا پہلو رکھا ہے۔" میں نے رازدارانہ سے لہجے میں کہا "خیر...... تم آنٹی کے مسئلے کے بارے میں بات جاری رکھو۔"

"ہاں..... میں یہ بتانے لگی تھی کہ رشتے داری نکل آنے کی وجہ سے میں نے بھی ان کے مسئلے میں دلچسپی لی اور جس حد تک مدد کرسکتی تھی وہ بھی کی۔ میں نے گاؤں سے ایک دو آدمی بُلا کر ان کی حفاظت کے لیے ان کے گھر پہ تعینات کردیے لیکن میں ابھی یہاں کے ماحول...... یہاں کے لوگوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھتی ہوں اس لیے فیصلہ نہیں کرپا رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے آنٹی کو تسلی دے رکھی تھی کہ ہمارے ماہر "پھڈا جات" مسٹر افضل چودھری تشریف لائیں گے تو ان کا مسئلہ ان کے دربار میں پیش کیا جائے گا۔ یہ بے چاری بہت خوفزدہ ہیں۔ اسی لیے زیادہ تر میرے ساتھ رہتی ہیں۔ حالانکہ یہ آسانی سے خوفزدہ ہونے والی عورت نہیں ہیں۔"

"کیا ان کی جان کو خطرہ لاحق ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں...... یہی سمجھ لو۔"

مسز دُرّانی بہت کم گو عورت معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے بارے میں گفتگو ہورہی تھی لیکن انہوں نے خود ابھی تک اس میں مداخلت نہیں کی تھی۔

"اصل مسئلہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایک شخص ان کو ایک کروڑ روپیا دینا چاہتا ہے۔" زرتاج بولی۔ میں نے عقب نما آئینے میں اسے گھورا وہ مسکرا رہی تھی۔

"یہ تو واقعی بڑا سنگین مسئلہ ہے......!" میں نے سرہلایا "آج کے دور میں تو کوئی کسی کو دس روپے دینا نہیں چاہتا...... بلکہ اپنے دیے ہوئے پیسے کسی سے مانگ لو تو وہ آنکھیں دکھاتا ہے۔ ایسے میں کوئی شخص انہیں ایک کروڑ روپیا دینا چاہتا ہے جبکہ یہ عمر کی اُس منزل سے بھی گزر چکی ہیں جب اس قسم کی پیشکشیں آنے کی اُمید رکھی جاسکتی ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تو اس شخص کا دماغی معائنہ ہونا چاہیے۔ اگر اس کا دماغ صحیح ہو لیکن پیشکش غلط ہو تو پھر اسے کوڑے لگنے چاہئیں۔ کون ہے وہ؟ مجھے بتاؤ...... میں ابھی جاکر اس کی خبر لیتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ زرتاج کوئی جواب دیتی، فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ گاڑی بُری طرح لہرائی اور میں نے زرتاج کو سیٹ پر پہلو کے بل گرتے دیکھا تب مجھے اندازہ ہوا کہ گولیوں کا نشانہ ہماری ہی گاڑی تھی۔ دائیں طرف کی کھڑکی کے شیشے کی کرچیاں گاڑی میں اُچھلتی دکھائی دی تھیں۔

میرے لیے یہ تجربہ نیا نہیں تھا۔ میری نامعلوم حس نے شاید مجھے چھناکے سے ایک لمحہ پہلے ہی جھکنے پر مجبور کردیا تھا۔ اپنے ساتھ میں نے راحیلہ کو بھی جھکا دیا تھا لیکن زرتاج کے بارے میں مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ بروقت جھک سکی تھی یا نہیں؟ مسز درانی کی طرف تو مجھے دیکھنے کی مہلت ہی نہیں ملی۔

گاڑی بُری طرح لہرائی اور دوسرے ہی لمحے رک گئی۔ میں نے بریکوں کی چرچراہٹ سنی تھی اور گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرائی بھی نہیں تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ گاڑی زرتاج نے خود روکی تھی۔ یہ ایک خوش کن خیال تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ گولیاں زرتاج کو بھی نہیں لگی تھیں...... لیکن یہ میری خوش فہمی بھی ہوسکتی تھی۔ گاڑی چلاتے ہوئے انسان کو گولیاں لگیں تو یہ بھی عین ممکن ہوتا ہے کہ اس کی ٹانگوں کی اضطراری حرکت سے بریک لگ جائے۔ یہ اس کے زندہ ہونے کی یقینی علامت نہیں تھی۔

میرے کانوں میں صرف ایک لمحے کے لیے سنسناہٹ سی گونجی پھر موت کا سا سکوت چھاگیا۔ کائنات کی گردش جیسے تھم گئی۔ ایک ثانئے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں میں تکلیف کے احساس کے بغیر ہی مر تو نہیں گیا تھا؟ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاگیا تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کی وجہ شاید صرف یہ تھی کہ میرے جسم کا تمام خون گویا یک دم سمٹ کر سر کی طرف آگیا تھا۔ اس کے سوا میرے جسم میں کوئی تغیر نہیں آیا تھا۔ کہیں کوئی گولی پیوست نہیں ہوئی تھی۔ شیشے کی صرف چند کرچیاں اچٹ کر مجھ پر گری تھیں۔

پھر مجھے بریکوں کی چرچراہٹ' کئی طرح کے ہارن بجنے کی تیز تیز آوازیں سنائی دیں۔ کچھ بھگدڑ کا سا احساس ہوا۔ تب مجھے یقین ہوگیا کہ میں زندہ سلامت تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے سر اٹھایا اور اسی لمحے میں نے راحیلہ کو بھی سر اٹھاتے دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی اذیت کے آثار نہیں تھے۔ اس کا مطلب تھا اسے بھی گولی نہیں لگی تھی۔ ویسے بھی مجھے گولی لگنے کا امکان زیادہ تھا کیوں کہ جس طرف میں بیٹھا تھا' فائرنگ اُدھر سے ہوئی تھی۔

زیادہ گولیاں اگلی کھڑکی پر ڈرائیونگ سیٹ والی سائڈ پر لگی تھیں۔ ادھر زرتاج تھی۔ اس کے بارے میں سوچ کر میری دھڑکن رکی جارہی تھی۔ وہ اور مسز درانی' دونوں ترچھی پڑی تھیں۔ میں ان دونوں کی طرف متوجہ تھا کہ میں نے اپنے بازو میں کسی کی انگلیاں گڑتی محسوس کیں۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ وہ راحیلہ تھی۔ وہ بدحواس نہیں تھی لیکن اس کے چہرے کے عضلات گویا کھنچے ہوئے اور آنکھیں کچھ پھیلی ہوئی سی تھیں۔

"تم ٹھیک ہونا؟" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔

"ہاں......" میرے حلق سے بھی بیٹھی بیٹھی سی آواز نکلی "اور تم......؟"

اس نے محض اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے کھڑکی سے باہر نہیں جھانکا اور نہ ہی یہ دیکھنے کی کوشش کی کہ ہمارے اردگرد کیا ہورہا تھا۔ یہ اندیشہ بھی میرے ذہن میں نہیں آیا کہ شاید وہ گاڑی اب بھی آس پاس کہیں موجود ہو جس سے فائرنگ کی گئی تھی اور شاید دوبارہ فائرنگ ہوجائے۔

میں فوراً زرتاج کی طرف متوجہ ہوا۔ اس سے پہلے کہ میں ہاتھ بڑھا کر اسے ہلاتا جُلاتا' میں نے اسے بھی سیدھی ہوتے دیکھا اور اسی کی تقلید میں مسز درانی بھی اٹھ بیٹھیں۔ میرے سینے سے بے اختیار طمانیت کی گہری سانس خارج ہوئی۔

"تم ٹھیک ہو؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔ وہ ہماری ہی طرف گھومنے لگی تھی۔

اس نے کوئی جواب دینے کے بجائے گھوم کر ہماری طرف دیکھا اور مسکرائی۔ یہ مسکراہٹ ہی گویا میرے سوال کا جواب تھی۔ بلاشبہ وہ بڑے مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی تمتماہٹ تھی اور بال ذرا اُلجھ گئے تھے۔ اس کے سوا اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"ہاں...... میں ٹھیک ہوں...... اور یہ شاید قدرت کا ایک معجزہ ہے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی "وہ گاڑی ہماری گاڑی کے مقابلے میں بہت چھوٹی اور نیچی تھی اس لیے گولیاں ترچھی ہوکر چھت کی طرف چلی گئیں اگر وہ گاڑی ہماری جیپ جتنی اونچی ہوتی تو شاید میرا اور مسز درانی کا قصہ تو پاک ہوجاتا۔"

میں نے چھت کی طرف دیکھا۔ اس کا اندازہ صحیح تھا۔ گولیاں آگے کی طرف چھت کے وسطی حصے میں سوراخ کرتی ہوئی نکلی

ہیں۔ اس سے ان کے رخ کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ عین ممکن تھا ایک آدھ گولی زرتاج کے بالوں کو بھی چھوتی ہوئی گزری ہو۔

زرتاج ایک نظر چھت کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں نے اس گاڑی کی کھڑکی سے ایک گن کی نال برآمد ہوتے دیکھ لی تھی لیکن مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ میں اپنے اور مسز درانی کے بچاؤ کے چکر میں پڑ گئی حالاں کہ میں چاہتی تو سائڈ مار کر اس گاڑی کو روک سکتی تھی کیوں کہ اس کی دوسری طرف گرین بیلٹ کی چھوٹی سی دیوار تھی۔"

"چلو خیر...... جو ہوا ٹھیک ہی ہوا...... جان بچی سو لاکھوں پائے۔" میں نے کہا اور مسز درانی کی طرف دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک عام سی عورت کو اس اچانک افتاد پر تقریباً بے ہوش ہوجانا چاہیے تھا لیکن مسز درانی حیرت انگیز طور پر پُرسکون تھیں۔ ان کی آنکھیں کچھ پھیلی ہوئی ضرور تھیں لیکن وہ زیادہ بدحواس معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ مجھے ان کی طرف سے بھی اطمینان ہوگیا۔

میں اس دوران میں یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ ہمارے ساتھیوں کی کوسٹر بہت تیزی سے آگے گئی تھی۔ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ اس گاڑی کے تعاقب میں گئے ہیں جس سے فائرنگ کی گئی تھی۔ انہوں نے یقیناً اسے دیکھ لیا تھا لیکن سڑک پر خاصا ٹریفک تھا اور کوسٹر جیسی بڑی گاڑی کسی چھوٹی گاڑی کا تعاقب کرنے کے لیے موزوں نہیں تھی۔

مجھے ان کی کامیابی کی کوئی خاص امید نہیں تھی۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں اور میرے جو ساتھی جہاز سے آئے تھے' ان کے پاس اسلحہ نہیں تھا۔ ہم جہاز میں اپنے ساتھ آتشیں ہتھیار نہیں لائے تھے۔ چاہتے تو لا بھی سکتے تھے۔ اس کے لیے اثر رسوخ بھی استعمال کرسکتے تھے لیکن ہم نے کبھی اس کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت کوسٹر میں جو لوگ موجود تھے ان میں زیادہ سے زیادہ صرف شفیع شاہ کے پاس کوئی گن موجود ہوسکتی تھی۔

اچانک سائرن کی آواز سنائی دی جو تیزی سے قریب آتی گئی اور پھر پولیس کی ایک موبائل ہمارے قریب آن رکی۔ اس کی چھت پر ایک مشین گن فٹ تھی اور شگاف سے سر نکالے ایک پولیس والا کچھ مستعدی اور کچھ بدحواسی سے اسے اِدھر اُدھر گھما رہا تھا۔ اس کا سر بھی گن کے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا لیکن اس کی متلاشی نظروں کو کوئی ٹارگٹ نہیں مل رہا تھا۔

موبائل کے کیب والے حصے میں ڈرائیور کے پاس غالباً انسپکٹر کے عہدے کا کوئی پولیس آفیسر موجود تھا۔ وہ ایک مستعد پولیس آفیسر معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ اس کے دل میں کچھ کرگزرنے کا جذبہ موجود ہے۔ موبائل کے پچھلے حصے میں آہنی جالیوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے گول سوراخ موجود تھے۔ ان سے بھی گنوں کی نالیں جھانک رہی تھیں۔

انسپکٹر نے گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے جھانکنے کے سے انداز میں ہماری گاڑی کا تیزی سے جائزہ لیا پھر چیخ کر پوچھا "آپ کی گاڑی پر کس نے فائرنگ کی ہے؟" اس نے زرتاج کو مخاطب کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ ڈرائیونگ سیٹ پر وہی تھی۔ اس سائڈ کی دونوں کھڑکیوں کے شیشے چکنا چُور ہوچکے تھے۔

زرتاج ٹھنڈی سانس لے کر بولی "کاش! ہمیں معلوم ہوتا!"

"فائرنگ کرنے والے کدھر گئے ہیں؟" انسپکٹر نے تیزی سے تفتیشی انداز میں ہی دوسرا سوال کیا۔

"کاش ہمیں معلوم ہوتا!" زرتاج نے ایک بار پھر وہی جواب دیا۔

انسپکٹر نے خون خوار نظروں سے اسے گھورا اور تیسرا سوال داغا "وہ موٹر سائیکل پر تھے یا گاڑی میں؟"

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ زرتاج ایک بار پھر وہی جواب نہ دے دے "کاش ہمیں معلوم ہوتا......!"

اس کا ردِعمل انسپکٹر کی نظر میں شاید اس سے بھی بُرا تھا یعنی وہ ایک لمحے خاموش رہی۔ انسپکٹر گویا آگ بگولا ہوتے ہوئے چلایا "اسی لیے تو مجرم پکڑے نہیں جاتے...... کہ جس سے بھی کچھ پوچھو وہ کہتا ہے مجھے کچھ معلوم نہیں۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے......" زرتاج بڑی نرمی اور ملائمت سے بولی "مجھے یہ تو معلوم ہے کہ وہ گاڑی میں تھے۔ چھوٹی سی سفید گاڑی تھی...... غالباً سوزوکی...... نمبر میں نہیں دیکھ سکی۔"

"وہ کس طرف گئی ہے؟" انسپکٹر نے تیزی سے پوچھا۔

"یہ میں نہیں دیکھ سکی کیوں کہ ہمیں جان بچانے کی پڑگئی تھی...... لیکن ظاہر ہے جدھر ٹریفک کا رخ ہے اُدھر ہی گئی ہوگی۔ کم از کم اگلے سگنل تک تو وہ اِدھر اُدھر کہیں نہیں مڑسکتی تھی۔" زرتاج نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا "ہم تو فی الحال اسی بات پر حیران ہورہے ہیں کہ ہم زندہ کیسے بچ گئے۔ یہ واقعہ کسی معجزے سے کم نہیں۔"

"ٹھیک ہے...... آپ لوگ پولیس کی مزید نفری آنے سے پہلے یہاں سے بالکل نہ ہلیں۔" انسپکٹر کا لہجہ تحکمانہ ہوگیا۔ اس کا ایک ہاتھ گن پر ہی جما رہا لیکن دوسرے ہاتھ سے اس نے وائرلیس کا مائیک سنبھال لیا اور موبائل سائرن بجاتی تیزی سے آگے روانہ ہوگئی۔

میں نے دیکھا ٹریفک پہلے سے کم ہوچکا تھا اور گاڑیاں ہماری گاڑی سے کترا کر گزر رہی تھیں۔ شاید پیچھے سے آنے والی گاڑیوں کے ڈرائیوروں کو اطلاع مل گئی تھی کہ آگے کہیں فائرنگ ہوئی ہے اور وہ غالباً پچھلے چوراہے سے ہی اِدھر اُدھر مڑنے لگے تھے۔

میں نے زرتاج سے کہا "پولیس کی مزید نفری آنے سے پہلے

ہم یہاں سے چلے چلیں تو بہتر ہے۔"

"تم نے شاید انسپکٹر کی بات صحیح طرح نہیں سنی۔ اس نے کہا تھا کہ مزید نفری آنے تک ہم یہاں سے نہ ہلیں۔" زرتاج بولی "لیکن پولیس کے احکامات کی خلاف ورزی کو تو شاید ہمارے ہاں سب لوگوں نے اپنا اخلاقی فرض سمجھ لیا ہے۔"

"بے شک......" میں نے اس کی تائید میں سرہلایا "لیکن تمہیں اس سلسلے میں جو بھی ڈانٹ ڈپٹ کرنی ہے، دفتر پہنچ کر کرلینا۔ اس کے علاوہ پولیس کے احمقانہ سوالوں کے جواب بھی ہم وہیں بیٹھ کر دے لیں گے۔ میں انہیں وہیں بلوالوں گا۔"

"اور اگر وہ خفا ہوئے کہ ہم "جائے وقوعہ" سے "فرار" کیوں ہوئے تھے؟" زرتاج نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا جواب بھی میں خود ہی دے لوں گا۔" میں نے کہا۔

"اور وہ جو ہماری کوسٹر اس گاڑی کے تعاقب میں گئی ہے...... کیا ہم اس کی مدد کے لیے بس جانے کی کوشش نہ کریں؟" عقب میں میرے برابر بیٹھی راحیلہ نے پوچھا۔

"اب تاخیر ہو چکی ہے۔" میں نے جواب دیا "ہمیں معلوم نہیں وہ لوگ کس طرف گئے ہیں۔ میرا خیال ہے پولیس والے بھی ٹامک ٹوئیاں مار کر واپس آجائیں گے۔ اس قسم کے واقعات کے بعد عموماً یہی ہوتا ہے۔ فی الحال تو میں اسی بات پر خدا کا شکر ادا کررہا ہوں کہ اتنی جلدی پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ ہماری پہلی خوش قسمتی تو یہ تھی کہ پولیس اتنی جلدی پہنچ گئی۔ ایسے واقعات خوش قسمت لوگوں کے ساتھ ہی پیش آتے ہیں۔"

پھر میں نے زرتاج سے کہا "چلو...... ہوٹل کی طرف اپنا سفر جاری رکھو۔"

زرتاج نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ گاڑی کسی دشواری کے بغیر ہی اسٹارٹ ہوگئی اور ہم آگے روانہ ہوگئے۔ میں اس دوران غیر ارادی طور پر مسز درانی کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ وہ ناک کی سیدھ میں دیکھ رہی تھیں اور بُت کی طرح ساکت نظر آرہی تھیں۔

انہوں نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نگل کر بولیں "یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے...... یہ فائرنگ دراصل مجھ پر ہوئی تھی...... میری وجہ سے آپ لوگوں کو اتنے بڑے خطرے سے دوچار ہونا پڑا......" ان کے لہجے میں شرمندگی، معذرت اور بے پناہ تاسف تھا۔

راحیلہ نیم استہزائیہ سے لہجے میں بولی "آپ کو اتنا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اپنی شامت کو آواز دینے کے معاملے میں ہم لوگ بھی کچھ کم نہیں...... گولیاں تو اکثر و بیشتر ہم پر بھی برستی ہی رہتی ہیں۔ موت اکثر ہمارے بھی تعاقب میں رہتی ہے...... بلکہ اگر دو چار دن خیریت سے گزر جائیں...... گولیاں نہ چلیں، ہنگامہ و فساد نہ ہو...... اٹھا پٹخ نہ ہو تو طبیعت خراب سی ہونے لگتی ہے۔ عجیب وحشت سی محسوس ہوتی ہے۔ ہاضمہ خراب ہو جاتا ہے۔"

میں نے اسے گھورا۔ وہ محض کندھے اچکا کر رہ گئی۔ میں نے مسز درانی کی طرف دیکھا۔ ان کی وحشت آمیز سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ غالباً اس وقت راحیلہ کی حسِ مزاح سے لطف اندوز ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھیں۔

وہ اصرار سے بولی "نہیں...... نہیں...... اس وقت یہ حملہ صرف اور صرف مجھے ہلاک کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ آپ لوگ خواہ مخواہ لپیٹ میں آجاتے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہم سب کو اپنی امان میں رکھا۔"

"کیا آپ نے فائرنگ کرنے والوں کو دیکھا تھا؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"نہیں۔" انہوں نے ذرا ترچھی ہو کر پیچھے دیکھتے ہوئے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا آپ نے وہ کار دیکھی جس سے فائرنگ کی گئی تھی؟"

"نہیں۔" مسز درانی نے تسلیم کیا۔

"تو پھر آپ اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتی ہیں کہ یہ حملہ آپ کو ہلاک کرنے کے لیے کیا گیا تھا؟" راحیلہ کا انداز جرح کرنے کا سا تھا۔

"میرے پاس اس کا کوئی ثبوت تو نہیں ہے......" مسز درانی بے بسی سے بولیں "لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ گولیوں کی یہ بارش صرف میرے لیے تھی...... اور اس حملے کا تعلق اسی مسئلے سے ہے جس کے سلسلے میں، میں نے زرتاج سے...... اور زرتاج نے افضل صاحب سے مدد طلب کی......"

"اور افضل صاحب کو ابھی تک یہ معلوم نہیں کہ مسئلہ کیا ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"میں تو آپ کو ائرپورٹ پر ہی بتانا چاہ رہی تھی لیکن آپ نے کہا کہ راستے میں اطمینان سے بات کریں گے۔ پھر زرتاج نے راستے میں بات شروع ہی کی تھی کہ فائرنگ ہوگئی۔ یوں بات ایک بار پھر بیچ میں ہی رہ گئی۔" مسز درانی نے کہا۔

"خیر...... کوئی بات نہیں۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ ہوٹل پہنچ کر آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ اب تو مجھے اس معاملے میں خاصی دلچسپی محسوس ہونے لگی ہے کیوں کہ اس میں مجھے تھمن گرج سنائی دے گئی ہے...... بشرطیکہ آپ کا اندازہ صحیح ہو کہ یہ گولیاں آپ کے لیے چلائی گئی تھیں۔" میں نے کہا۔

"میں وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ اس وقت مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ صرف اس لیے میں یہ بات وثوق سے نہیں کہہ رہی ہوں کہ میرا دل گواہی دے رہا ہے...... بلکہ کل شام مجھے فون پر باقاعدہ دھمکی دی گئی تھی کہ چوبیس گھنٹے کے اندر اندر مجھے ہلاک کردیا جائے گا۔ اسی لیے میں کل شام سے زرتاج کے ساتھ چپکی ہوئی تھی اور اس وقت دل ہی دل میں یہ حساب لگا کر خود

کو اطمینان دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ چوبیس گھنٹے تو گزر چکے ہیں اور میں ابھی تک زندہ ہوں۔ اس لیے شاید دھمکی کھوکھلی ہی ثابت ہو...... لیکن عین اسی وقت فضا میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونج اٹھی۔" مسز درانی نے جھرجھری سی لی۔

"دھمکی کس نے دی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ پہلی دھمکی نہیں تھی۔ دھمکیاں اس سے پہلے بھی ملتی رہی ہیں۔" مسز درانی نے جواب دیا "لیکن اس سے پہلے دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ ان کا مقصد شاید صرف مجھے خوف زدہ کرنا اور میرا خون خشک کرنا تھا۔ اب دھمکیوں پر عمل شروع ہوگیا ہے۔ دھمکیاں مختلف آوازوں میں عموماً صرف فون پر ہی ملتی رہی ہیں لیکن مجھے معلوم ہے ان کے پیچھے اصل میں صرف ایک ہی شخصیت ہے۔ وہ شخص خود فون نہیں کرتا۔ اپنے کارندوں سے کراتا ہے۔"

"اور وہ کون ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہی جو مجھے ایک کروڑ روپیہ دینا چاہتا ہے۔" مسز درانی نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔" میں نے سرہلایا "ایک طرف وہ آپ کو ایک کروڑ روپیہ دینا چاہتا ہے۔ دوسری طرف وہی آپ کو ہلاک بھی کرنا چاہتا ہے۔ یہ کچھ عجیب سی بات ہے۔"

"قطعاً عجیب نہیں ہے۔" مسز درانی بولیں "وہ مجھے اس لیے ہلاک کرنا چاہتا ہے کہ میں اس کی بات نہیں مان رہی۔ میں اس کا ایک کروڑ روپیہ قبول نہیں کررہی۔"

"اس معاملے میں تو واقعی خاصا سسپنس پوشیدہ معلوم ہوتا ہے۔ اب آپ سسپنس کو اسی موڑ تک رہنے دیجیے۔ ہم آپ کی باقی کہانی ہوٹل پہنچ کر سنیں گے۔ تجسس میں مبتلا رہنے کا بھی اپنا ہی ایک لطف ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

مسز درانی سرہلا کر رہ گئیں۔ چند لمحے بعد ہی ہم ہوٹل جا پہنچے۔ ابھی میرے ساتھیوں کا سامان کمروں میں پہنچایا جارہا تھا کہ میرے موبائل فون پر شفیع شاہ نے رابطہ کیا اور میری آواز سنتے ہی بولا "آپ کہاں ہیں سر؟"

"ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی......" میں نے مصرع ادھورا چھوڑ دیا اور پوچھا "ہم تو جہاں ہیں سو ہیں...... تم بتاؤ کہاں ہو؟"

"ہم ہوٹل کی طرف واپس آرہے ہیں سر!" اس نے جواب دیا۔

"بہت اچھا کر رہے ہو کیوں کہ ہم پہلے ہی ہوٹل پہنچ چکے ہیں۔" میں نے بتایا۔

"آپ خیریت سے تو ہیں نا سر؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ظاہر ہے...... خیریت سے ہوں تبھی تو اس طرح چہک رہا ہوں ورنہ تمہیں فون پر شاید کچھ اور ہی طرح کی آوازیں سنائی دیتیں۔" میں نے جواب دیا۔ پھر پوچھا "تم سناؤ...... تمہاری کار چیزنگ کیسی رہی...... کوئی شکار ہاتھ بھی آیا یا نہیں؟"

"نہیں سر!" اس نے شرمندگی آمیز سے لہجے میں جواب دیا "ہماری گاڑی بڑی ہونے کی وجہ سے پہلے ٹریفک میں...... اور پھر ایک تنگ گلی میں پھنس گئی۔ وہ گاڑی بہت چھوٹی ہونے کی وجہ سے نکل گئی۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر میں یا ٹونی نہیں تھا۔ یہ ایک عام سا ڈرائیور ہے جو اس وقت بھی گاڑی چلا رہا ہے۔ یہ ہوٹل کی ہی کوسٹر چلاتا ہے۔ اسے اس قسم کے معاملات کا تجربہ نہیں۔"

"چلو خیر...... کوئی بات نہیں...... اسے معاف کردو۔" میں نے کہا۔

شفیع شاہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ان سب باتوں کے باوجود ہم نے آخرِ کار انہیں جالیا تھا۔ میں نے چند فائر کرکے اس گاڑی کے پچھلے ٹائر برسٹ کردیے تھے لیکن اس دوران ہماری گاڑی ایک دیوار سے ٹکرا گئی اور اس کا اکلوتا دروازہ جام ہوگیا۔ ہم ڈرائیور والے دروازے سے نکلے لیکن اس میں کچھ دیر لگ گئی۔ وہ لوگ گاڑی چھوڑ کر نکل گئے۔"

"شاید ان سے پھر کبھی ملاقات ہو جائے۔" میں نے امید ظاہر کی "گاڑی کا نمبر وغیرہ نوٹ کر لیا؟"

"گاڑی کچھ دیر پہلے ائرپورٹ کے علاقے سے ہی چھینی گئی تھی۔ اس سے کوئی سراغ ملنے کی امید نہیں ہے۔ وہ کسی شریف آدمی کی ہو گی۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"تمہیں اتنی جلدی یہ بات کیسے معلوم ہو گئی؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارے پیچھے پیچھے پولیس بھی وہاں آن پہنچی تھی۔ ان لوگوں سے پتا چلا۔ انہیں وائرلیس پر کچھ ہی دیر پہلے اس گاڑی کا نمبر وغیرہ دیا گیا تھا اور نظر رکھنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ موبائل میں جو انسپکٹر موجود تھا وہ میرا جاننے والا تھا۔ اس نے یہ بات مجھے بتائی ہے۔" شفیع شاہ بولا۔

"جاننے والا تھا...... شاید اسی لیے اس نے اتنی جلدی تمہاری جان چھوڑ دی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"جان کہاں چھوڑی ہے۔ موبائل میں پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ وہ اب رسمی طور پر آپ سے بھی بات کرے گا۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"اوہ میرے خدا......!" میں کراہ اٹھا "اب وہ یہاں بھی میرے کان کھائے گا۔ میں تو سمجھا تھا میں اس سے جان چھڑا کر بھاگ آیا ہوں۔"

"میں نے اسے آپ کے بارے میں بتا دیا ہے۔" شفیع شاہ معنی خیز انداز میں ہنس کر بولا "وہ آپ کے کان نہیں کھائے گا۔ محض رسمی خانہ پُری کے لیے آپ سے ملے گا۔"

"اچھا...... آنے دو...... اسے بھی آنے دو بھائی!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "غریب خانہ ہے حاضر ہر اِک بلا کے لیے۔"

شفیع شاہ نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے مسز درانی، زرتاج اور راحیلہ کو بتایا کہ شفیع شاہ کیا کہہ رہا تھا۔ ہم لوگ اس وقت آفس میں موجود تھے۔ مسز درانی کچھ تشویش آمیز سے انداز میں بولیں "کیا آپ پولیس والوں کو بتائیں گے کہ یہ حملہ دراصل مجھ پر ہوا تھا؟"

"آپ کیا چاہتی ہیں...... ہم بتائیں یا نہ بتائیں؟" میں نے اُلٹا انہی سے سوال کیا۔

"میں چاہتی ہوں...... کہ آپ ابھی پولیس وغیرہ سے اس سلسلے میں بات نہ کریں۔" مسز درانی ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں بولیں۔

"ٹھیک ہے...... اگر آپ چاہتی ہیں تو ایسا ہی ہو جائے گا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"تو پھر آپ ان سے کیا کہیں گے؟" وہ بے چاری بدستور پریشان تھیں۔

"یہ آپ مجھ پر چھوڑ دیجیے۔ ان مسائل سے نمٹنا ہمارے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا "اس شہرِ بے اماں میں آئے دن نہ جانے کتنے لوگوں پر فائرنگ ہوتی ہے جنہیں کچھ پتا نہیں ہوتا کہ آخر ان پر فائرنگ کیوں ہوئی ہے جنہیں پتا ہوتا ہے وہ بھی کسی مصلحت یا خوف کی وجہ سے بعض اوقات اصل بات پولیس کو نہیں بتاتے۔ یہ کون سی نئی بات ہے۔"

"شکریہ۔" مسز درانی کو گویا کچھ اطمینان ہوا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "اس کا مطلب ہے آپ نے اپنے مسئلے کے سلسلے میں اس سے پہلے بھی پولیس سے مدد حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"نہیں......" مسز درانی نے نفی میں سر ہلایا "مجھے دھمکی دی گئی تھی کہ پولیس کے پاس جانے کی صورت میں نتائج زیادہ خطرناک ہوں گے اور جو کچھ ہونا ہو گا وہ جلد ہو جائے گا۔ ابھی تک تو گویا مجھے مہلت دی جا رہی تھی۔ پولیس کے پاس جانے کی صورت میں یہ مہلت بھی نہ ملتی۔"

میں نے ان سے مزید کوئی سوال نہ کیا۔ تھوڑی دیر بعد میرے باقی ساتھی آن پہنچے۔ ان کے پیچھے پیچھے پولیس بھی چلی آئی۔ انسپکٹر کا رویّہ نہایت مؤدبانہ اور ہمدردانہ تھا۔ ہم نے ان سب کی خاطر تواضع فائیو اسٹار ہوٹل کے معیار کے مطابق کی جس سے وہ خوش ہو گئے۔ انسپکٹر کی آمد کا مقصد درحقیقت صرف یہ تھا کہ وہ اس بات کو ریکارڈ پر لے آئے کہ جس گاڑی پر فائرنگ ہوئی تھی وہ اس کے مسافروں سے ملا تھا اور اس نے تفتیش کے تقاضے پورے کیے تھے۔ مجھے اس کی اس مستعدی پر خوشی بھی ہوئی۔

وہ لوگ رخصت ہو چکے تو مسز درانی نے گویا سکون کی سانس لی۔ تمام گفتگو کے دوران ان سے کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اب میں ان سے کچھ سوالات کرنا چاہتا تھا لیکن عین اس وقت آفس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف آفاق تھا۔

"سر! مجھے پتا چلا ہے کہ آپ کراچی پہنچ چکے ہیں۔" وہ بولا۔

"بھئی ماننا پڑے گا کہ تمہاری سی آئی ڈی بہت تیز ہے۔" میں نے کہا۔

"کبھی کبھی کوئی جاننے والا بھی سی آئی ڈی کا کام دے جاتا ہے۔" آفاق ہنس کر بولا "میرا ایک جاننے والا آپ کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے۔ وہ کچھ دیر پہلے لابی میں کھڑا مجھے فون کر رہا تھا۔ وہ آپ کو بھی پہچانتا ہے۔ اس نے آپ کو آتے دیکھا تھا اور باتوں باتوں میں مجھ سے ذکر کر دیا تھا...... لیکن وہ بتا رہا تھا کہ آپ کے پیچھے پیچھے پولیس بھی چلی آئی تھی۔ خیریت تو تھی؟"

"تمہیں معلوم ہی ہے ہمارے پیچھے تو ہر طرح کی بلائیں لگی رہتی ہیں۔ پولیس بہرحال اب جا چکی ہے۔ وہ ایک الگ چکر تھا۔ بہرحال تم اسے چھوڑ دو اور یہ بتاؤ اس وقت کہاں سے بول رہے ہو؟ لاہور ہی میں ہو یا کراچی آ چکے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے آپ کو یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ میں کراچی پہنچ چکا ہوں اور آپ ہی کے ہوٹل میں مقیم ہوں۔ ہماری ہیروئن ...اور ہیرو مسعود بھی وہیں ٹھہرے ہوئے ہیں لیکن اس وقت میں ...اور ہوٹل سے بول رہا ہوں۔ اتفاق سے یہاں بھی ایک فلمی ...ٹھہرا ہوا ہے۔ اس میں ہیروئن نگار اور ہیرو علی جان بھی ...شامل ہیں۔ میں نے ان سے بات کی تھی۔ یہ لوگ بھی بہ خوشی آپ کی پارٹی میں آنے کے لیے تیار ہیں۔ سمیرا اور مسعود تو موجود ہی ہوں گے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے نمایاں چہرے موجود ہوں گے۔ میں نے سوچا، آپ سے معلوم کر لوں کہ پارٹی کے بارے میں کیا پروگرام ہے۔ اگر تاریخ اور وقت فائنل ہو گیا ہو تو مجھے بتا دیں تاکہ میں ان لوگوں کو زبانی دعوت دے سکوں۔ اس کے مطابق یہ لوگ اپنے شوٹنگ کے شیڈول کو ایڈجسٹ کر لیں گے۔"

"ایک منٹ ہولڈ کرو۔" میں نے کہا اور شفیع شاہ سے پارٹی کے بارے میں پوچھا۔

"کل شام چھ بجے کا پروگرام بن چکا ہے۔ کارڈ تقسیم ہو چکے ہیں۔" شفیع شاہ نے بتایا "اہم شخصیات کو ہماری گیسٹ ریلیشنز منیجر نے ذاتی طور پر فون بھی کر دیے ہیں۔ بس آپ لوگوں کا اور ان چند فلمی مہمانوں کا انتظار تھا۔"

میں نے آفاق کو یہ پروگرام بتایا تو وہ بولا "ٹھیک ہے سر! جتنے بھی فلمی ستارے میسر ہیں وہ میں آپ کی محفل میں جمع کر دوں گا۔ اب یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان سے آپ کی محفل سجتی ہے یا نہیں۔"

"ضرور سجے گی آفاق ڈیئر!" میں نے کہا "دنیا ان کی دیوانی ہوتی ہے۔ ہر طبقہ ان کی پزیرائی کرتا ہے۔"

"ٹھیک ہے...... تو پھر کل شام پارٹی میں تو آپ سے ملاقات رہے گی لیکن اس سے پہلے بھی اگر آپ کے پاس وقت ہو اور آپ مجھ سے ملنا چاہیں تو مجھے کمرے سے بلوا لیجیے گا۔" اس نے مجھے اپنا کمرا نمبر بتایا۔

میں نے اسے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھا تو محسوس کیا کہ مسز درانی عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

"آپ کی نظروں سے مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں۔" میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

مسز درانی کے ہونٹوں پر پھیکی مگر قدرے کھسیانی سی مسکراہٹ ابھری اور وہ کچھ معذرت خواہانہ سے انداز میں بولیں "میں دراصل حیران ہو رہی تھی۔ کچھ ہی دیر پہلے ہماری گاڑی پر فائرنگ ہوئی ہے اور ہم معجزاتی سے انداز میں بچے ہیں لیکن تم اس وقت یوں پارٹی کا پروگرام طے کرنے میں مصروف ہو جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔"

"ہم زندہ بچ گئے ہیں نا...... ہمیں خراش تک بھی نہیں آئی ہے نا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

مسز درانی نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا "بس...... تو پھر اس کا مطلب ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا......" میں نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ہم سب کے سب بس کچھ ایسے ہی لوگ ہیں۔ ہمارے روز و شب پل پل رنگ بدلتے ہیں۔ کبھی زندگی کا رنگ...... کبھی موت کا رنگ۔ آپ کچھ دیر ہمارے ساتھ رہیں گی تو آپ کو حیران ہونے کے بہت سے مواقع ملیں گے۔ اس لیے آپ فی الحال حیرانی کا ذکر چھوڑیے اور مجھے کچھ اپنے بارے میں...... اپنے مسئلے کے بارے میں بتائیے۔"

مسز درانی نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور چند سیکنڈ خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کریں۔ اچانک انہوں نے سر اٹھایا اور عجیب سے لہجے میں بولیں "میں بہت ضدی عورت ہوں۔"

"یہ کوئی انکشاف نہیں ہے مسز درانی! ہر عورت ہی ضدی ہوتی ہے۔" یہ کہتے ہوئے میں نے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

"شاید......" مسز درانی مبہم لہجے میں بولیں "لیکن مجھ جتنی ضد بہت کم عورتوں میں پائی جاتی ہو گی۔ میں ضد کے معاملے میں موت کی حد تک جا سکتی ہوں۔"

"یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ تقریباً ہر عورت ضد کے معاملے میں موت کی حد تک جا سکتی ہے۔ آخر "تریا ہٹ" خواہ مخواہ تو مشہور نہیں ہے۔" میں نے کہا اور ایک بار پھر راحیلہ کی طرف دیکھا لیکن وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔

مسز درانی کے چہرے پر قدرے مایوسی ابھر آئی۔ وہ بے چاری یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی تھیں کہ وہ دوسری عورتوں سے بہت مختلف، منفرد اور غیر معمولی عورت تھیں لیکن میں نے یوں ہی ذرا انہیں معمولی سی جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے اور اس بہانے راحیلہ کو یہ بات سنانے کے لیے ان کا دعویٰ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یوں وہ بات شروع کرتے ہی کچھ اُلجھن میں پڑ گئی تھیں۔ اس طرح بعض اوقات انسان زیادہ کھل کر بات کرتا ہے۔ ویسے بھی انسان اپنے آپ کو دوسروں سے مختلف، منفرد اور غیر معمولی ثابت کرنے کی تگ و دو میں ہمیشہ ہی لگا رہتا ہے۔

مسز درانی نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ بہت سے افراد کی موجودگی میں بات کرتے ہوئے وہ اُلجھن محسوس کر رہی تھیں۔ میں نے ٹونی اور شفیع شاہ وغیرہ کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی اس بات کو محسوس کر چکے تھے۔ وہ اپنے اپنے کمروں میں جانے کا کہہ کر اٹھ گئے۔ زرتاج اور راحیلہ وہیں رہیں۔ راحیلہ بھی جانے لگی تھی لیکن میں نے اسے روک لیا۔

زرتاج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے مسز درانی سے کہا "یہ تو ویسے ہی ساری بات سے...... اور آپ کے حالات سے

واقف ہے۔ آپ کی رشتے دار بھی ہے......" پھر میں نے راحیلہ کی طرف اشارہ کیا "اور اس کی موجودگی میں آپ مجھے تنہا ہی سمجھیں۔ اب آپ کھل کر بات کر سکتی ہیں۔"

"میں نے اپنے بارے میں کبھی کسی سے کھل کر بات نہیں کی۔" مسز درانی نے مجھے مطلع کیا۔

"شاید آپ نے اچھا ہی کیا...... لیکن مجھ سے ضرور کھل کر بات کیجیے۔" میں نے مشورہ دیا "کیوں کہ میں جن لوگوں کو زیادہ قریب سے نہیں جانتا' ان کے مسائل میں دلچسپی نہیں لیتا۔ جب تک ظاہر کے ساتھ ساتھ کسی کا باطن بھی میرے سامنے نہ ہو' میں کیسے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میری مدد کا مستحق ہے؟"

وہ ایک لمحے خاموش رہیں۔ ان کے پتلے پتلے ہونٹ بھنچے رہے پھر وہ گویا دل ہی دل میں کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولیں "میں کراچی ہی میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی ہوں۔ میں نے کراچی کو اتنی ترقی کرتے اور بتدریج سمندر کی طرح پھیلتے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میرے والد کی دو تین لانچیں چلتی تھیں۔ ہم اگر بہت زیادہ خوش حال نہیں تھے تو کچھ ایسے بد حال بھی نہیں تھے۔ ہمارا شمار متوسط طبقے میں کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی اس وقت تعیشات کی ہوس اور ایک دوسرے کو کچل کر آگے نکلنے کی دوڑ آج جیسے عذاب ناک مرحلوں میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے متوسط طبقہ بھی اپنے آپ کو بہت آسودہ حال محسوس کرتا تھا۔

"تقسیم ہند کے بعد میرے بچپن ہی کے زمانے سے کلفٹن دولت مند طبقے کی رہائش کے لیے مخصوص ہو چکا تھا اور اس علاقے میں بڑی بڑی کوٹھیاں سر اٹھائے کھڑی تھیں جن میں سے کچھ ابھی تک اپنی اصل حالت میں موجود ہیں لیکن اب وہ بہت پرانی طرز کی معلوم ہوتی ہیں۔

"اس وقت کوٹھیوں کی تعداد بہرحال کم تھی اور کلفٹن ایک مختصر علاقہ تھا۔ میرے والد نے اس وقت کلفٹن سے بہت دور سمندر کے کنارے ایک خاصا بڑا لیکن سیدھا سادہ مکان بنوایا تھا۔ ان کی لانچیں بھی وہاں سے قریب ہی سمندر میں کھڑی رہتی تھیں۔ بعض لوگ انہیں باربرداری کے لیے اور بعض مچھیرے مچھلیاں پکڑنے کے لیے کرائے پر لے جاتے تھے۔

"اس وقت وہ علاقہ بہت دور افتادہ محسوس ہوتا تھا جہاں وہ مکان واقع تھا۔ چاروں طرف ویرانہ نظر آتا تھا۔ گو کہ اب آبادی اور تعمیرات پھیلتی ہوئی اس کے قریب جا پہنچی ہیں اور فلیٹوں کے کچھ پروجیکٹ اس کے آس پاس ہی آباد ہو رہے ہیں اور بہرحال وہ علاقہ کلفٹن میں ہی شمار ہوتا ہے اس لیے زمین اور جائداد کی قیمت خاصی زیادہ ہے تاہم اب بھی اسے شہر کے قریبی علاقوں میں شمار نہیں کیا جا سکتا......"

مسز درانی نے ایک گہری سانس لی اور کرسی کے پشتے سے سر ٹکا کر چند سیکنڈ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ اب وہ بے حد پُرسکون نظر آ رہی تھیں۔ دوبارہ آنکھیں کھول کر انہوں نے جب سلسلۂ کلام جوڑا تو ان کے لہجے میں بھی بے پناہ ٹھہراؤ تھا۔

"وہ مکان بڑی عجیب جگہ پر واقع ہے......" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولیں "گو کہ اونچی اونچی عمارتوں کے عفریت تیزی سے اس کی طرف بڑھتے آ رہے ہیں۔ اس کے باوجود ابھی تک یہی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ کسی الگ تھلگ چھوٹے سے جزیرے پر واقع ہے۔ وہاں غضب کا سکون ہے۔ صرف سمندر آپ سے باتیں کرتا ہے۔ عام لوگوں کو رات کے وقت سمندر شور مچاتا محسوس ہوتا ہے لیکن برسوں سے اس کے کنارے رہنے والوں کے لیے اس کا شور بھی سکوت ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔

"میری ساری زندگی اس پُرسکون مکان میں گزری ہے۔ شور' وحشت' تشدد' دھوئیں اور ہر قسم کی آلودگی کے سمندر میں دھیرے دھیرے ڈوبتے ہوئے اس شہر میں وہ مکان میرے لیے ایک الگ تھلگ سا جزیرہ...... ایک پناہ گاہ ہے۔ سترہ سال کی عمر میں میری شادی ہو گئی تھی اور شادی کے بعد بھی میں اسی مکان میں رہی ہوں۔ میں جب عمر کے سترھویں سال میں تھی تو ایک بزنس مین کا نوجوان بیٹا اپنے باپ کے ساتھ ہمارے ہاں آنے لگا تھا۔ میرے اور اس کے باپ کے درمیان کچھ کاروباری تعلق تھا۔

"میرے اور اس نوجوان کے درمیان ویسا ہی طوفانی سا عشق چلا جیسا کسی نوخیز جوڑے کے درمیان چل سکتا ہے۔ ہمیں آزادی بھی میسر تھی اور آسودہ حالی بھی...... تاہم ہمارے عشق میں آوارگی کی آمیزش نہیں ہوئی۔ کچھ عرصے بعد اس کا باپ رشتہ لے کر آیا اور شریفانہ انداز میں ہماری شادی ہو گئی۔ یہ کم عمری کی شادی تھی۔ پانچ سال گویا ایک خوب صورت خواب کی طرح بیت گئے۔ شادی کے کچھ عرصے بعد ہی ایک سمندری حادثے میں اس کا باپ مر چکا تھا۔ ماں پہلے ہی نہیں تھی۔ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ باپ کے انتقال کے بعد سے ہی وہ گھر داماد کے سے انداز میں ہمارے ہاں رہنے لگا تھا۔

"کچھ عرصے بعد مچھیروں کے ایک جھگڑے میں بیچ بچاؤ کراتے ہوئے میرے والد کا بھی حادثاتی سے انداز میں اچانک انتقال ہو گیا۔ صدمہ بہت بڑا تھا لیکن ظفر کی رفاقت میسر تھی اس لیے میں جلد ہی اس صدمے سے سنبھل گئی۔ ظفر میرے شوہر کا نام تھا اور اس کی رفاقت میرے لیے دنیا کی سب سے قیمتی چیز تھی۔ ظفر ساتھ تھا تو کوئی غم ناقابلِ برداشت نہیں تھا۔

"میرے والد کی زندگی میں ہی ہمارا کاروبار ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ ہر گزرتے برس کے ساتھ کاروبار کے نئے نئے طور طریقے سامنے آ رہے تھے۔ پرانے طور طریقے متروک ہوتے جا رہے تھے۔ آئے دن نئی نئی سرکاری پالیسیاں بھی سامنے آتی رہتی تھیں۔ نئے نئے ٹیکس اور پابندیاں لاگو ہوتی جا رہی تھیں۔ پرانی وضع کے لوگ وقت کے ساتھ چلنے میں ناکام رہتے تھے۔ ظفر بھی کوئی خاص کام نہیں کرتا تھا لیکن بہرحال سفید پوشی سے گزر بسر ہو رہی تھی۔ ہمیں کوئی تنگی نہیں تھی مگر پھر یک دم میرے پیروں تلے سے زمین کھینچ لی گئی۔ ایک ایسی بات ہو گئی جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی۔" اس نے یوں سر جھکا لیا جیسے وہ اپنے آپ سے کوئی جرم سرزد ہو جانے کا ذکر کر رہی ہو۔

میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اسے سوچوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے کا موقع دیا۔ آخر وہ سر اٹھاتے ہوئے بولی "ظفر مجھے چھوڑ کر بھاگ گیا......" آواز گویا اس کے حلق کو چھیلتی ہوئی نکلی تھی اور یہ بتاتے وقت وہ گویا خود اپنے آپ سے شرمندہ تھی۔

"اوہ......!" میں نے تأسف سے کہا تاہم مجھے اس کا بیان تشنہ لگا۔ شوہر کے بھاگ جانے کا یقیناً کوئی پس منظر ضرور رہا ہو گا۔

مجھے اب بھی کوئی سوال نہیں کرنا پڑا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی تفصیل بیان کرنے لگی "ہمارے گھر میں ایک نوجوان ملازمہ کام کرتی تھی۔ مشکل سے سترہ اٹھارہ سال کی ہو گی۔ ایک مچھیرے کی بیٹی تھی۔ غربت میں پلی بڑھی تھی لیکن جوانی اس پر ٹوٹ کر آئی تھی۔ سانولی سلونی تھی مگر شاید ہر قدم پر مردوں کے دلوں پر ایک نئی قیامت ڈھاتی تھی۔ وہ سراپا پُرکشش تھی...... مگر ان ساری باتوں پر میں نے اس وقت غور کیا جب ظفر اسے ساتھ لے کر بھاگ چکا تھا۔ اس سے پہلے میں نے کبھی اس کی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ کبھی اسے اپنے لیے خطرہ محسوس نہیں کیا تھا کیوں کہ میں نے کبھی ظفر کی آنکھوں میں اس کے لیے التفات کی پرچھائیں بھی نہیں دیکھی تھی......"

اس نے شکست خوردہ سے انداز میں گہری سانس لی پھر سلسلۂ کلام جوڑا "لیکن درحقیقت وہ دونوں بڑی کامیابی سے مجھے دھوکا دے رہے تھے۔ میرا گھر خاصا بڑا ہے اور کچھ عجیب سی ساخت کا ہے۔ اس میں کئی محفوظ گوشے ہیں...... پناہ گاہیں سی ہیں...... نہ جانے کہاں کہاں ان کے رنگین لمحوں کی ہیجان خیز داستانیں بکھری ہوں گی...... وہ رنگین لمحے جو انہوں نے میری آنکھوں میں دھول جھونک کر چرائے ہوں گے۔ دراصل وہ مجھے دھوکا نہیں دے رہے تھے' میرا اندھا اعتماد مجھے دھوکا دے رہا تھا۔ وہ اعتماد جو مجھے ظفر پر تھا...... اپنے آپ پر تھا...... اپنی محبت پر تھا۔ میں بھول گئی تھی کہ میں تین بچوں کی ماں بن چکی تھی اور تقریباً چھ برس سے ظفر کی شب و روز کی ساتھی تھی۔

"بہرحال...... وہ چمپا کو لے کر بھاگ گیا...... چمپا اس سانولی سلونی قیامت کا نام تھا۔ حیرت کی بات ہے کہ ظفر نے کوئی اور راستہ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر وہ کونے کھدروں میں لذتوں کے خزانوں میں نقب لگاتے لگاتے تنگ آ گیا تھا اور ان خزانوں کو مستقل طور پر بے فکری سے اپنے تصرف میں لانا چاہتا تھا۔ تب بھی اس نے کوئی اور راستہ اختیار نہیں کیا۔ اس نے نہ تو اپنے اس تعلق کو ظاہر ہونے دیا اور نہ ہی دوسری شادی کے لیے فساد کھڑا کیا۔ بس...... خاموشی سے چمپا کو لے کر غائب ہو گیا۔ مستقبل کی فکر...... بچوں کی محبت...... میرے ساتھ ایک بھولے بسرے سے تعلق کا خیال...... غرض یہ کہ کوئی بھی چیز اس کے پیروں کی زنجیر نہیں بنی......"

پھر مسز درانی نے خود ہی جواز پیش کیا "شاید اس نے اس لیے بھی کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کی کوشش نہیں کی کہ اسے معلوم تھا کہ میں اسے کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے ہی نہیں دوں گی۔ میں نے تمہیں بتایا نا کہ میں بہت ضدی عورت ہوں۔ اس معاملے میں ظاہر ہے میرے منہ سے انکار ہی نکلتا...... اور ایک بار میرے منہ سے انکار نکل جائے تو اسے اقرار میں بدلنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے...... یا اگر میں ایک بار کسی کام کا تہیہ کر لوں تو پھر شاید ہی کوئی طاقت مجھے اس کام سے باز رہنے پر مجبور کر سکے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولیں "ظفر نے میرے پندار پر بہت ہی گہرا گھاؤ لگایا تھا۔ مجھے چھوڑ کر بھاگ جانا...... اور وہ بھی ایک نوکرانی کے ساتھ......! میں نے اسے بھی انا کا مسئلہ بنا لیا۔ اس غم میں اندر ہی اندر تو گھلتی رہی لیکن بہ ظاہر میں وہی ایک مضبوط عورت رہی۔ مالی حالات بہت اچھے نہیں تھے لیکن میں نے کسی معاملے میں کم ہمتی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کسی سے مدد نہیں مانگی۔ اپنے بچوں کی پرورش بہت اچھے طریقے سے کی۔ انہیں اچھے تعلیمی اداروں میں تعلیم دلائی۔ میرے دو لڑکے اور ایک لڑکی ہے......"

"وہ آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں...... وہ تینوں کینیڈا میں مقیم ہیں۔ تینوں کی شادی ہو چکی ہے۔ انہیں چوں کہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے دنیا کی ہر ضروری چیز بغیر کسی جدوجہد اور بغیر کسی الجھن یا انتظار کے ملتی رہی ہے اس لیے زندگی گزارنا ان کے نزدیک ایک آسان سا کام رہا اور زمانے کی روایات کے مطابق وہ یہی محسوس کرتے ہیں کہ وہ سیلف میڈ انسان ہیں' سب کچھ انہوں نے خود ہی کیا ہے' ماں کا اس میں کوئی خاص حصہ نہیں ہے' کوئی خاص کردار نہیں ہے......"
وہ مسکرائیں۔ اس مسکراہٹ میں خفیف سی افسردگی کی آمیزش تھی "یہ بات وہ منہ سے تو نہیں کہتے لیکن مجھے معلوم ہے وہ محسوس اسی طرح کرتے ہیں۔ بچے جب بڑے ہو جاتے ہیں تو ان کی سوچ ایسی ہی ہو جاتی ہے۔ بہرحال...... اتنا ہی غنیمت ہے کہ وہ مجھے مکمل طور پر نہیں بھولے۔ مجھ سے اب بھی ان کی کچھ نہ کچھ وابستگی باقی ہے۔ مائیں بڑی صابر و شاکر قسم کی مخلوق ہوتی ہیں۔ وہ اس برائے نام وابستگی میں بھی خوش رہتی ہیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ وہ مجھے وہاں بلاتے ہیں......"
"لیکن آپ نہیں جاتیں۔" میں نے گویا ان کی بات مکمل کی۔

"ہاں۔" وہ دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔ اس احساس سے شاید انہیں کچھ اطمینان ہوا تھا کہ میں ان کی بات سمجھ رہا تھا "میں گھومنے پھرنے کے لیے دو تین مرتبہ وہاں جا چکی ہوں لیکن ان کے پاس رہنے کے لیے نہیں جاتی۔ میں وہاں رہنا نہیں چاہتی۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان سے تعلقات کی کمزور سی ڈور ٹوٹی نہیں ہے...... ورنہ مغرب کی زندگی بڑی ظالم ہے۔ میں چاہتی ہوں میری زندگی کی شام اسی مکان میں ہو جہاں میرا بچپن اور جوانی گزر چکی ہے...... اور اب بڑھاپا گزر رہا ہے۔ بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں پیدائش سے موت تک ایک ہی مکان میں رہنا نصیب ہو۔ اکثر لوگ کسی نہ کسی وجہ سے نقل مکانی کر جاتے ہیں۔ کبھی اپنی خوشی سے...... اور کبھی کسی مجبوری کی وجہ سے...... لیکن میں چاہتی ہوں۔ مجھے موت اسی گھر میں آئے۔ اس کے عقب میں بڑا سا صحن ہے۔ میں چاہتی ہوں مجھے وہیں دفن کیا جائے۔ وہاں بہت سے پھول بوٹے بھی لگے ہوئے ہیں۔ مرنے کے بعد کوئی پھول دار سا پودا میری قبر پر سایہ کیے رہے تو کیا ہی اچھا ہو۔ یہ بھی شاید میری ایک ضد ہے۔"
پھر گویا انہیں کچھ یاد آیا۔ ان کے ہونٹوں پر ایک عجوب سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس یاد میں شاید بیک وقت تلخی بھی تھی اور شیرینی بھی...... ایک لمحے کے لیے شاید وہ الجھن میں بھی رہیں کہ اس بات کو زبان پر لائیں یا نہیں؟ پھر شاید انہوں نے اسے بیان کر دینا ہی بہتر سمجھا۔
"میں اپنی ضد کی ایک مثال بیان کرتی چلوں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولیں "ظفر کو فرار ہوئے جب تین سال ہو چکے تھے اور میرے بچے سمجھ دار ہونے لگے تھے تو ایک نوجوان میرے پیچھے لگ گیا......"
انہوں نے اس طرح باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا جیسے ہم ان کی اس بات کو مبالغہ آرائی سمجھیں گے اور شاید استہزائیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھیں گے لیکن ہم تینوں کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔
تب وہ گویا کچھ ہمت کر کے بولیں "میں تو ظفر کے جانے کے بعد سے خود کو ایک کھنڈر ہی محسوس کرنے لگی تھی لیکن شاید اس کھنڈر میں اصلی عمارت کی کچھ خوب صورتی باقی تھی جو اس نوجوان کو بھا گئی تھی اور وہ کچھ زیادہ ہی شدومد سے میرے پیچھے لگ گیا تھا۔ اس کا مقصد محض آوارہ جذبوں کی تسکین نہیں تھا۔ وہ نہایت سنجیدگی سے مجھ سے شادی کرنا چاہتا تھا اور میری ہر شرط پوری کرنے کے لیے تیار تھا۔ میرے بچوں کو بھی ہر طرح کا تحفظ' سرپرستی اور باپ کا سا پیار دینے کا دعویٰ کر رہا تھا۔
"ایک ناقابلِ یقین سی بات یہ تھی کہ اس نوجوان کو ہر اعتبار سے مجھ سے کہیں بہتر رشتے میسر آ سکتے تھے۔ وہ وجیہہ تھا' تعلیم یافتہ تھا۔ اس کا گھرانا دولت مند اور کاروباری تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ عمر میں بھی مجھ سے چھوٹا تھا۔ تمام قانونی کارروائیاں بھی وہ خود ہی پوری کرنے کے لیے کمربستہ تھا۔ ظفر کو غائب ہوئے تین سال سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں عدالت میں تنسیخِ نکاح کی درخواست دے دوں۔ ضروری کارروائیاں پوری ہونے کے بعد مجھے دوسری شادی کی اجازت مل جائے گی۔
"یہ ایک آئیڈیل سی صورتِ حال تھی۔ میری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید پھولی نہ سماتی۔ خصوصاً ظفر نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا اس کے بعد تو مجھے اس پیشکش کو ہنس کر قبول کر لینا چاہیے تھا...... اور سچی بات یہ ہے کہ ایک دو بار میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا بھی ہوا...... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دل میں گدگدی سی ہوئی۔ تین سال سے زیادہ عرصے سے میں بیواؤں کی سی زندگی بسر کر رہی تھی۔ میں خود کو ایک بیوہ ہی محسوس کرتی تھی۔
"یہ سب باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن میں نے ابتدا ہی میں اس نوجوان کو سمجھا دیا تھا کہ میں اس سے شادی نہیں کر سکتی...... میں شادی کرنا ہی نہیں چاہتی۔ اس کے باوجود اس کی ضد بڑھتی ہی گئی۔ معلوم نہیں اسے مجھ میں کیا نظر آ گیا تھا۔ انسان کا دل بھی عجیب ہے۔ کبھی کبھی بے وجہ ہی کسی پر آ جاتا ہے۔ بہت سے عشق بالکل ہی بے جواز ہوتے ہیں۔ وہ بس عشق ہوتے ہیں۔ کسی منطق سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ شاید اسے مجھ سے کچھ ایسا ہی عشق تھا......"
ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر انہوں نے افسردہ سی سانس

ر سر جھکا لیا پھر سلسلۂ کلام جوڑا "لیکن میرا مسئلہ وہی تھا کہ ...منہ سے انکار نکل چکا تھا۔ اس کے بعد شادی نہ کرنا بھی گویا ضد بن چکا تھا۔ شاید ایک بات یہ تھی کہ مجھ میں عشق...... اور کسی کا گھر بسانے کی آرزو مر چکی تھی۔ شاید میری ...ابی حسیات مر چکی تھیں...... یا پھر شاید میں خود ہی اندر سے ...تھی۔ میں اس نوجوان کی زندگی خراب کرنا نہیں چاہتی تھی ...سب باتیں میں نے ابتدا میں ہی اسے سمجھا دی تھیں مگر وہ مجھ ...بھی بڑا بقراط بن کر مجھے سمجھانے لگتا کہ وہ خود ہی میرے اندر ...رابیدہ عورت کو جگا لے گا...... بلکہ اگر وہ واقعی مر چکی ہو گی۔ ...بھی وہ اسے زندہ کر لے گا۔
"آخر کار میں نے اسے گھر آنے سے نہایت سختی سے منع ...ا۔ اس کا فون سننا چھوڑ دیا مگر وہ بھی شاید میرے ہی مقابلے کا ...تھا۔ شاید میں اس کی ضد بن گئی تھی۔ وہ گاڑی لا کر گھر کے ...نے کھڑی کر دیتا اور گھنٹوں اس میں بیٹھا رہتا۔ پرانی فلموں کے ...کی طرح المیہ فلمی نغمے اپنی گاڑی کے ٹیپ ریکارڈر پر اونچی ...ز سے چلاتا رہتا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں ایک روایت پسند شوہر پرست عورت کی طرح ابھی سرد مہری کی دلدل میں پھنسی ...ہوں لیکن کبھی نہ کبھی تو اس دلدل سے باہر آ جاؤں گی...... ...انہ کبھی تو میرا دل پگھلنے لگے گا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میرا ...ر پتھر پر لکیر ہوتا ہے اور اسے اقرار میں بدلنا ناممکن ہی ہوتا ہے۔
"غنیمت تھا کہ میرے آس پاس خالی ریتلی زمین تھی۔ آس ...ا لا سرے مکانات...... محلّے...... پڑوس کچھ نہیں تھا ورنہ اس ...کے روز کے معمول کی وجہ سے اچھا خاصا تماشا لگ جاتا۔ مکانات ...سلسلہ خاصی دور ہونے کی وجہ سے میں رسوائی سے تو بچی ہوئی ...ی لیکن مجھے خود ہی اس کا یہ معمول برا لگنے لگا تھا۔ میں خود اپنی ...نظروں میں اپنے آپ کو رسوا سا ہوتا محسوس کرتی۔ اس کے ٹیپ ...ریکارڈر پر بلند آواز سے گونجتے المیہ نغمے مجھے زہر لگنے لگے۔" وہ ...اموش ہو گئیں۔ ان کا سر بدستور جھکا رہا۔
وہ چند لمحے خاموش ہی رہیں۔ شاید وہ چاہتی تھیں کہ ہم میں ...سے کوئی ان سے سوال کرے چناں چہ میں نے ہی پوچھ لیا "پھر کیا ..."

"پھر یہ ہوا کہ ایک روز میں نے گھر میں سے لوہے کا ایک موٹا ...پ اٹھایا اور باہر جا کر اس کی گاڑی کے تمام شیشے توڑ ڈالے۔ ...ا کو جگہ جگہ سے پچکا دیا اور اس کا بھی سر پھاڑ ڈالا۔ وہ بے ...ہوش ہو گیا۔ مرتے مرتے بچا۔ اس کے سر میں اٹھارہ ٹانکے آئے ...ٹی ہوئی ہڈی کو جڑنے میں تین ماہ کا عرصہ لگا۔" مسز درانی نے ...ایا۔
"او مائی گاڈ......!" راحیلہ اتنی دیر میں پہلی بار بولی "اتنے ...عاشق کے ساتھ یہ سلوک!"
"زیادہ اچھے اور سچے عاشقوں کے ساتھ تو عورتیں یہی سلوک کرتی ہیں۔" میں نے اس کی طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا "اونچے درجے کے گپ باز...... جھوٹے خواب دکھانے والے اور نت نئے طریقوں سے چکر دینے والے عاشقوں کے ساتھ عورتیں بالکل ٹھیک رہتی ہیں۔ اپنا سب کچھ ان پر نچھاور کر دیتی ہیں اور جیسا وہ چاہتے ہیں ویسا ہی کرتی ہیں۔"
راحیلہ مجھے گھور کر بولی "میرے تو زبان کھولتے ہی تمہیں دل کے پھپھولے پھوڑنے کا موقع مل جاتا ہے۔"
میں نے دوبارہ مسز درانی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "اگر ہماری بک بک شروع ہو گئی تو پھر آپ کی داستان بیچ میں ہی رہ جائے گی۔ اس لیے بہتر ہے کہ آپ اپنی بات جاری رکھیں۔ اب بات شروع ہو ہی گئی ہے تو بہتر ہے پوری ہو جائے۔"
"وہ میرے خلاف کچھ نہیں بولا۔ اس لیے میں جیل جانے سے بال بال بچ گئی ورنہ مجھ پر شاید اقدامِ قتل کا الزام آ جاتا۔" مسز درانی بولیں۔
"مرد ایسے ہی باوفا اور ایثار پیشہ ہوتے ہیں" میں نے غمزدہ انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔
"کیسے؟ ظفر جیسے؟" زرتاج نے معصومیت سے پوچھا۔
"میں ظفر کی نہیں' اس نوجوان کی بات کر رہا ہوں جس کا نام ابھی مسز درانی نے ہمیں نہیں بتایا؟" میں نے مصنوعی غصے سے

زرتاج کو گھورتے ہوئے جواب دیا۔
"اس کا نام عارف تھا" مسز درانی جلدی سے بولیں۔
"حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا..." میں نے بے اختیار کہا پھر جلدی سے معذرت طلب کی "معاف کیجئے گا... میں نے یہ مصرع تو پڑھ ڈالا لیکن یہ پوچھا ہی نہیں کہ وہ زندہ ہے یا..."
"مجھے برسوں سے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ بھی ملک سے باہر چلا گیا تھا" مسز درانی نے جواب دیا۔
"اچھا ہی کیا اس نے... اسے چلے ہی جانا چاہیے تھا" میں نے سرہلایا۔
مسز درانی چند سیکنڈ تک مجھے ایک ٹک دیکھتی رہیں پھر گویا میری غیر سنجیدگی کو نظر انداز کرتے ہوئے بولیں "تمہیں حیرت نہیں ہوئی کہ میری اس ساری داستان میں میرے مسئلے کا تو کہیں کوئی ذکر ہی نہیں ہے؟"
"حیرانی صحت کے لیے کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ اس لیے عرصہ ہوا میں نے زیادہ تر باتوں پر حیران ہونا چھوڑ دیا ہے۔" میں نے جواب دیا "ویسے بھی... مجھے یقین ہے کہ اس ساری تمہید کا اصل موضوع سے کوئی تعلق ضرور ہے۔"
"براہِ راست تو شاید کوئی تعلق نہیں ہے..." وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں "لیکن میں نے تمہیں اس لیے مختصراً سب کچھ بتادیا ہے کہ تم میرے حالات، میری فطرت اور اس پورے پس منظر کو اچھی طرح سمجھ سکو جو میرے اکثر معاملات میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ سب کچھ بتانے کے بعد جب میں اپنا مسئلہ بیان کروں گی تو دوسرے لوگوں کی طرح تم مجھے سمجھانے نہیں بیٹھ جاؤ گے بلکہ خود کچھ سمجھنے کی کوشش کرو گے۔"
"یقیناً... یقیناً۔" میں نے سرہلایا۔
ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولیں "یہ سب کچھ جو میں نے تمہیں اپنی ذات اور اپنے حالات کے بارے میں بتایا ہے... اس کے بعد اگر اچانک کوئی شخص نمودار ہو اور وہ مجھ سے میرا مکان چھیننے کی کوشش کرے تو تم اندازہ کرسکتے ہو کہ میری کیا کیفیت ہوگی۔"
"اوہ... تو یہ قصہ ہے!" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔
زرتاج نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ مسز درانی کو مخاطب کیا "غلط بیانی نہ کریں آنٹی! وہ آپ سے مکان چھین تو نہیں رہا۔ وہ تو آپ سے سیدھی طرح خریدنا چاہتا ہے۔ وہ آپ کو ایک کروڑ روپے قیمت دینے کو تیار ہے... بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ دے دے... بشرطیکہ آپ سودے بازی کی طرف آئیں... جب کہ آپ کے مکان کی مارکیٹ ویلیو پچاس لاکھ بھی نہیں ہے۔"
"میں پھر بھی اسے چھیننا ہی کہوں گی کیونکہ میں اپنا مکان کسی قیمت پر بیچنا نہیں چاہتی اور وہ اسے لینے پر تلا ہوا ہے" مسز درانی قدرے برہمی سے بولیں "قیمت کا سوال تو بعد میں آتا ہے۔ پہلے تو یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ کوئی اپنی چیز بیچنا بھی چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی کسی بھی حال میں بیچنا ہی نہیں چاہتا تو پھر قیمت کوئی معنی نہیں رکھتی۔"
زرتاج میری طرف دیکھ کر ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "شاید اب تمہاری سمجھ میں آگیا ہو کہ آنٹی بار بار زور دے کر اپنے ضدی ہونے کا ذکر کیوں کررہی تھیں۔ اس شخص نے بات پچیس لاکھ سے شروع کی تھی اور بڑھتے بڑھتے ایک کروڑ تک آن پہنچا ہے۔"
"اس ملک میں جن لوگوں کے پاس بے حساب حرام کی دولت جمع ہوچکی ہے وہ اسی طرح تو اپنی ہر مطلوبہ چیز کی بولی بڑھاتے چلے جاتے ہیں" مسز درانی غصیلے لہجے میں بولیں "ان کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ جس چیز کی طرف انہوں نے اشارہ کردیا وہ انہیں مل جانی چاہیے۔ قیمت خواہ کچھ بھی ہو۔"
پھر وہ گویا اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں "یہی بات تو اسے اور بھی مشکوک بناتی ہے۔ جس چیز کی مارکیٹ ویلیو پچاس لاکھ بھی نہیں ہے وہ اس کے ایک کروڑ دینے پر کیوں تلا ہوا ہے؟ مانا کہ اس کے پاس حرام کی دولت ہے... لیکن لوگ اپنی حرام کی دولت بھی اتنی آسانی سے نہیں پھینکتے۔ اسے سینے سے چمٹا کر رکھتے ہیں۔ وہ اگر مارکیٹ ویلیو سے اتنا زیادہ دینے کی بات کررہا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ کوئی چکر ضرور ہے... اور وہ چکر کیا ہے؟ یہ ہمیں معلوم نہیں ہو پارہا۔"
"آپ کو چکر سے کیا مطلب آنٹی!" زرتاج بدستور مسکراتے ہوئے بولی "آپ اپنا ایک کروڑ روپیہ کھرا کریں اور باقی زندگی عیش و آرام سے بسر کریں۔"
"مشورے کا شکریہ" مسز درانی تلخ لہجے میں بولیں "یہ کوئی نئی تجویز نہیں ہے۔ جن دو چار لوگوں کو بھی اس مسئلے کا علم ہوا ہے انہوں نے یہی مشورہ دیا ہے۔"
"سوائے میرے" میں نے لقمہ دیا۔
"عین ممکن ہے دو منٹ بعد تم بھی مجھے یہی سمجھانے بیٹھ جاتے" وہ بولیں۔
"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا" میں نے دیانتداری سے کہا۔
تب مسز درانی دوبارہ زرتاج کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں "تمہارا خیال ہے کہ ایک کروڑ لے کر ہی میری زندگی عیش و آرام سے گزر سکتی ہے؟ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایک کروڑ کے بغیر بھی میری زندگی عیش و آرام سے ہی گزر رہی ہے مجھے کوئی تنگی یا تکلیف نہیں ہے... اور کوئی بعید نہیں ہے کہ وہ بدمعاش ایک کروڑ دینے کا کوئی ارادہ ہی نہ رکھتا ہو۔ وہ یونہی مجھے لالچ دے کر... تھوڑی بہت رقم دے کر کسی طرح مکان خالی کرالے اور باقی رقم ہضم کر جائے۔ اتنی آسانی سے ایک کروڑ روپیہ کون دیتا ہے۔"

"اس کی ایسی کی تیسی۔" زرتاج مصنوعی غصے سے بولی "اس کی مجال کہ وہ آپ سے فراڈ کرے؟ ہم اتنے نامی گرامی بدمعاش یہاں کس لیے بیٹھے ہوئے ہیں؟ ویسے تو میں شریف لڑکی ہوں لیکن آپ کی خاطر غنڈی بن جاؤں گی۔" پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا "یہ اپنے افضل صاحب بھی بہت بڑے دادا گیر ہیں۔ ویسے بھی یہ چودھری ہیں۔ آپ نے اگر فلمیں دیکھ رکھی ہوں تو شاید آپ کو پتا ہو کہ ان میں وہ جو "پنڈ دا چوہدری" ہوتا ہے... اسے بدمعاشی کے سوا کوئی کام ہی نہیں ہوتا۔"
"عزت افزائی کا شکریہ" میں نے آداب بجالاتے ہوئے کہا۔
تب زرتاج نے ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں راحیلہ کی طرف اشارہ کیا۔ "اور یہ راحیلہ خانم ہیں۔ میں انہیں زیادہ نہیں جانتی لیکن افضل صاحب کی ساتھی ہیں تو یقیناً کوئی پہنچی ہوئی چیز ہی ہوں گی۔ ہم سب مل کر اس بدمعاش کا بھرکس نکال دیں گے۔ وہ ہماری آنٹی کو چکر نہیں دے سکتا۔ ان کا ایک کروڑ روپیہ ہضم نہیں کرسکتا۔ ہم اس کا پیٹ پھاڑ کر بھی رقم نکلوالیں گے۔"
"میں فلمی ڈائیلاگ سننے کے لیے یہاں تم لوگوں کے درمیان نہیں بیٹھی ہوں۔" مسز درانی خفگی آمیز لہجے میں بولیں "تمہیں معلوم ہے میں جس شخص کی بات کررہی ہوں اس کا پیٹ تو کیا' قمیص پھاڑنا بھی آسان کام نہیں ہے۔ کیا میں یہ سمجھوں کہ تم میرا مذاق اڑانے کی کوشش کررہی ہو؟"
"نہیں پیاری آنٹی! میں بھلا آپ کا مذاق اڑانے کی جُرات کیسے کرسکتی ہوں؟" زرتاج خوشامدانہ سے انداز میں ان کا کندھا دباتے ہوئے بولی "اگر مجھے آپ کا مذاق اڑانا ہوتا تو میں اتنی سنجیدگی سے آپ کو ساتھ ساتھ لیے' اپنی زندگی کو خطرے میں ڈالے کیوں پھرتی؟"
"تو پھر تمہیں ایسی بات نہیں کرنی چاہیے" مسز درانی ملائمت سے بولیں "تمہیں تو اچھی طرح معلوم ہے وہ کتنا بڑا بدمعاش ہے۔ اس کی بدمعاشی کا ایک نمونہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی ہم لوگ راستے میں دیکھ چکے ہیں۔ کس طرح بھری پُری سڑک پر ہم پر فائرنگ کی گئی۔"
"یہ تو خیر اب اس شہر میں آئے دن کا معمول ہوچکا ہے" زرتاج بولی "بہرحال اب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ کتنا ہی بڑا بدمعاش سہی... آپ اب اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں۔"
"میں کیسے چھوڑ دوں؟" مسز درانی بے بسی سے بولیں "وہ مجھ سے میرا مکان چھیننا چاہتا ہے۔"
"اگر وہ قیمت... بلکہ بہت اچھی قیمت کی پیشکش کررہا ہے تو پھر یہ چھیننا تو نہ ہوا۔ اسے تو 'خریدنا' کہا جائے گا" میں نے اظہارِ خیال کیا۔
"لیکن میں اسے بیچنا نہیں چاہتی... اور وہ ہر طریقے سے اسے حاصل کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اسے تو چھیننا ہی کہیں گے" مسز درانی نے اصرار کیا پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولیں "میں تمہیں بتاچکی ہوں نا... کہ میں بہت ضدی عورت ہوں۔ میں اسی لیے اس بات پر بہت زور دے رہی تھی۔ میرے منہ سے ایک بار انکار نکل چکا ہے۔ اب وہ اقرار میں نہیں بدل سکتا۔ ویسے بھی اس مکان کے معاملے میں مسئلہ صرف ضد کا بھی نہیں ہے۔ میری اپنی کچھ جذباتی وجوہات ہیں جن کی بنا پر میں مکان بیچنا نہیں چاہتی۔ کسی کو کیا معلوم کہ وہ مکان میرے لیے کیا معنی رکھتا ہے..."
ان کی آواز کچھ بھرا سی گئی تاہم انہوں نے بات جاری رکھی "ٹھیک ہے... ہمارے ہاں لوگوں کے دلوں میں قانون کا کوئی احترام نہیں رہا... خصوصاً جن لوگوں کو کسی بھی قسم کی طاقت حاصل ہوجاتی ہے وہ تو قانون کو بالکل ہی پیروں تلے روندنے لگتے ہیں۔ بنیادی طور پر ہم لوگ بہت کم ظرف ہیں۔ ہمیں ذرا سی طاقت مل جائے تو بالکل وہی معاملہ ہوجاتا ہے جیسے گنجے کو ناخن مل گئے ہوں۔ اس کے باوجود میں کسی کے سامنے یہ فریاد ضرور کرنا چاہوں گی کہ ہر انسان کو یہ حق تو حاصل ہونا چاہیے کہ اگر وہ اپنی چیز بیچنا نہیں چاہتا تو نہ بیچے۔ کوئی اس سے زبردستی تو وہ چیز نہ چھینے..."
پھر جیسے انہیں کچھ خیال آیا۔ وہ افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "شاید یہ بھی اس شخص کی مہربانی ہے کہ وہ اتنی اچھی قیمت آفر کررہا ہے ورنہ وہ اتنی طاقت رکھتا ہے کہ زبردستی بھی میرے مکان پر قبضہ کرلے تو میں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔ غریبانہ علاقوں میں تو آئے دن ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کبھی کبھی متوسط اور خوشحال لوگوں کے علاقوں میں بھی ہوجاتے ہیں۔ میرا خیال ہے میری طرف سے مایوس ہوکر اب وہ دوسرے طریقوں پر اُتر آیا ہے۔ اب وہ میرا قصہ ہی پاک کرنے پر تُل گیا ہے۔"
میں نے گہری سانس لے کر کہا "آپ اور زرتاج اس کے بارے میں میرے تجسس کو عروج پر لے جانے میں کامیاب رہی ہیں۔ آپ نے اس کے بارے میں اتنی باتیں کی ہیں لیکن ابھی تک مجھے اس کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ آخر وہ کون ہے... کیا چیز ہے؟"
مسز درانی اور زرتاج نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر مسز درانی بولیں "اس کا نام جبار جیلانی ہے..."
وہ کچھ ایسی متوقع سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں جیسے میں یہ نام سن کر اچھل پڑوں گا یا کم از کم چونک ضرور پڑوں گا۔ میں نے ذہن پر زور دیا لیکن میرے ذہن میں اس نام کی وجہ سے کوئی گھنٹی نہ بجی۔
"کیا مجھے یہ نام سن کر خوفزدہ ہوجانا چاہیے؟" میں نے بڑی سادگی سے پوچھا۔
"ہاں... میرے خیال میں تھوڑا بہت تو ہونا چاہیے" مسز درانی نے بھی سادگی سے ہی جواب دیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کی سادگی حقیقی تھی۔

"دراصل اس شہر میں اب خطرناک لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ان سب کے ناموں سے واقف ہونا بڑا مشکل ہوگیا ہے" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

زرتاج بولی "جبار جیلانی اصل میں اس قبیل کے لوگوں میں سے ہے جن کا اپنا نام زیادہ جانا پہچانا نہیں ہوتا۔ اس کی کمپنی البتہ بہت مشہور ہے۔ تم نے کبھی اسکائی بلڈرز کا نام سنا ہے؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا "یہ تو کافی مشہور اور بڑی کمپنی ہے۔ اس نے شہر میں بہت سے تعمیراتی منصوبے متعارف کرائے ہیں۔ کچھ مکمل بھی ہوچکے ہیں۔ کچھ آباد ہوچکے ہیں اور کچھ شاید زیر تکمیل بھی ہیں۔"

میری ایک ذیلی کمپنی چونکہ کنسٹرکشن کا کام بھی کررہی تھی اس لیے مجھے اس شعبے کے بارے میں کچھ معلومات حاصل تھیں تاہم میں یا میری کمپنی اس شعبے میں زیادہ سرگرم نہیں تھی۔ مجھے اس کاروبار کو صحیح خطوط پر استوار کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی ورنہ اس کام میں بھی بہت دولت تھی۔ میں نے کئی بار اس کام کی طرف بھرپور توجہ دینے کا ارادہ کیا تھا لیکن ابھی تک اس ارادے پر عملدرآمد کی نوبت نہیں آسکی تھی۔

اسکائی بلڈرز کے بارے میں میری معلومات کا بڑا ذریعہ صرف اخبارات اور اشتہارات تھے۔ مجھے اس کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا اور نہ ہی یہ معلوم تھا کہ اس کا مالک کون تھا۔ زرتاج بولی "جبار جیلانی اسکائی بلڈرز کا مالک ہے.... ویسے مجھے پتا چلا ہے کہ ہر تھوڑے دن بعد اس کی کوئی نہ کوئی نئی کمپنی بھی سامنے آجاتی ہے۔"

"یہ تو خیر کوئی حیرت کی بات نہیں" میں نے کہا "ٹیکس بچانے کے چکر میں اکثر بڑے بلڈر اپنا ہر نیا منصوبہ کسی نئی کمپنی کے نام سے سامنے لاتے ہیں لیکن گاہکوں کو کمپنی کی ساکھ سے متاثر کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اس لیے کسی نہ کسی طریقے سے اصل اور پرانی بڑی کمپنی کا نام بھی پیچھے پیچھے چلاتے رہتے ہیں۔"

"خیر.... ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں" مسز درانی بولیں "مجھے اس شخص کے بارے میں جو اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق یہ شخص دُہری شخصیت کا مالک ہے۔ بظاہر یہ ایک بڑا اور معزز بلڈر ہے۔ اس کی وہ آمدنی جو بظاہر قانونی اور جائز نظر آتی ہے وہی کچھ کم نہیں ہے لیکن اس کے ناجائز اور ظالمانہ قسم کے ذرائع آمدنی بھی ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ سنا ہے یہ شخص لینڈ مافیا کا بھی ایک نہایت اہم اور سرگرم رُکن ہے۔ سرکاری اور نجی خالی زمینوں پر قبضے کرنا.... فراڈ کے ذریعے انہیں اپنی یا اپنے آدمیوں کی ملکیت بنوانا.... راتوں رات ناجائز کچی بستیاں وجود میں لانا اور اس قسم کے دوسرے بہت سے دھندے بھی اس کی سرپرستی میں جاری ہیں۔"

"اس قسم کے چھوٹے موٹے لوگ بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتے۔ جبار جیلانی تو لینڈ مافیا کے بادشاہوں میں سے ایک ہے بنیادی طور پر شاید یہ لینڈ مافیا ہی کا آدمی تھا۔ پہلے اس نے اس حیثیت سے ترقی کی۔ بعد میں معزز بلڈر بھی بن گیا۔ اب اس کے پاس بے اندازہ دولت ہے۔ دولت بجائے خود ایک بڑی طاقت ہے لیکن جبار جیلانی نے تو ہر اعتبار سے ہی اپنی طاقت میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ علاقے کا ایم این اے اس کی جیب میں ہے وزیروں سے اس کی دوستیاں ہیں۔ پولیس کے محکمے میں نہ جانے کتنے لوگ اس کے وظیفہ خوار ہیں۔ دوچار آدمیوں کو مروا ڈالنا تو اس کے لیے ایسا ہی ہے.... جیسے.... جیسے مہمانوں کی آمد پر دوچار مرغیاں ذبح کروا دینا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "پھر تو واقعی غنیمت ہے کہ اس نے آپ کو آپ کے مکان کی اتنی اچھی قیمت کی پیشکش کی تھی اور آپ کے مسلسل انکار کے بعد دوسرے ہتھکنڈوں کی طرف آیا ہے۔ ورنہ یہ ہتھکنڈے تو وہ شروع سے ہی اختیار کرسکتا تھا۔ آپ کو تو اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔"

"وہ تو میں نے کیا تھا اور شکریے کے ساتھ اس کی پیشکش مسترد کردی تھی۔" مسز درانی نے جواب دیا "لیکن میرے انکار کی وجہ سے اسے میرا شکریہ بھی پسند نہیں آیا۔ انکار سننے کا تو وہ عادی ہی معلوم نہیں ہوتا۔"

"کیا وہ خود آپ سے بات کرتا رہا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس نے صرف پہلی مرتبہ خود بات کی تھی" مسز درانی نے جواب دیا "اس کے بعد سے اس کے مختلف آدمی فون پر بات کرتے رہے ہیں۔ کبھی سیکریٹری.... کبھی اسسٹنٹ منیجر.... کبھی جنرل منیجر.... معلوم نہیں کتنا لمبا چوڑا اسٹاف ہے اس کا.... انہی لوگوں نے بات چیت جاری رکھی اور رقم بڑھاتے رہے۔ ظاہر ہے وہ جبار جیلانی کی ہدایت پر ہی ایسا کررہے ہوں گے۔ دو تین مرتبہ اس کی طرف سے کچھ لوگ مجھ سے ملنے بھی آئے۔ انہوں نے بھی وہی پیشکش دُہرائیں جو میں فون پر بھی سنتی رہی تھی۔ ان کے انداز گفتگو میں بھی دھمکی پوشیدہ ہوتی تھی۔ آخری مرتبہ جو شخص ایک کروڑ کی پیشکش لے کر آیا اسے تو میں نے خوب بے عزت کرکے گھر سے نکالا۔ اس روز میرا دماغ گھوم گیا تھا۔ اس کے بعد سے پیشکش کا سلسلہ بند ہوگیا اور رقم میں اضافے کی کوئی بات نہیں کی گئی۔ شاید انہیں یقین ہوگیا تھا کہ یہ خبطی بڑھیا نہیں مانے گی۔"

"آپ کتنی انکسار پسند ہیں آنٹی!" زرتاج ان کا کندھا سہلاتے ہوئے بولی "خود کو خبطی بھی کہہ رہی ہیں اور بڑھیا بھی۔ آپ کی عمر اور آپ جیسی اچھی شکل صورت کی کسی عورت کو خبطی بڑھیا کہا جائے تو وہ کہنے والے کا سر پھاڑ دے گی بلکہ وہ تو میری عمر کی کسی لڑکی کو یہ اجازت بھی نہیں دے گی کہ وہ اسے آنٹی کہے آپ مبالغہ نہ سمجھیں تو میں یہ بھی کہوں گی کہ ابھی تو آپ کسی پاکستانی فلم میں ہیروئن بھی آسکتی ہیں۔ بس ذرا زیادہ میک اپ کا سہارا لینا پڑے گا۔"

"کیا یہ اس قسم کی بکواس کا موقع ہے؟" مسز درانی نے اُسے گھورا۔

"بکواس کا یوں تو کوئی بھی موقع نہیں ہوتا لیکن یہ تو انسان پر منحصر ہے۔ وہ جس موقع پر چاہے بکواس کرسکتا ہے" زرتاج اطمینان سے بولی "ویسے میں بکواس نہیں کررہی۔ سچ بول رہی ہوں۔"

"شاید تم مجھے مکھن لگانے کی کوشش کررہی ہو" مسز درانی آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولیں "لیکن اس وقت مجھے مکھن کی نہیں، مدد کی ضرورت ہے۔"

"ہم سب آپ کی مدد کے لیے ہی تو جمع ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں تو اب آپ کو کوئی فکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں" زرتاج بولی۔ وہ شاید اپنی دانست میں مسز درانی کے ذہن سے بوجھ کم کرنے کی کوشش کررہی تھی لیکن وہ اپنے مسئلے کو ایک لمحے کے لیے بھی فراموش کرنے کو تیار نہیں تھیں۔

وہ میری طرف دیکھ کر اسی تشویش زدہ سے انداز میں بولیں "میری تو سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر میرے مکان میں اسے کون سا سرخاب کا پر لگا دکھائی دے گیا ہے اور وہ کیوں اس کے پیچھے پڑگیا ہے؟"

"بلڈرز کی اس قسم کی دلچسپی کی وجہ تو عموماً ایک ہی ہوتی ہے.... " میں نے ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "وہ پانچ دس سال آگے کی بات سوچتا ہے۔ اسے اندازہ ہوجاتا ہے کہ کسی وجہ سے فلاں جگہ کی اہمیت بڑھنے والی ہے۔ وہ پہلے ہی سے اس اراضی یا پلاٹ پر نظر رکھ لیتا ہے اور اس کے حصول کی کوششیں شروع کردیتا ہے۔ اہمیت ہی کے حساب سے وہ اس کی قیمت بھی لگاتا ہے۔"

"اس پہلو پر تو میں نے بھی سوچا تھا۔ مجھے بھی جائداد کے لین دین وغیرہ کے بارے میں سب باتوں کا اندازہ ہے۔ اسی لیے تو میں زیادہ حیران ہورہی ہوں کیونکہ میرے دائیں بائیں اور سامنے.... یعنی سڑک کی دوسری طرف ابھی تک پلاٹ خالی ہیں۔ لوگوں میں ابھی تک وہاں گھر بنا کر رہنے کا حوصلہ نہیں ہے جہاں میں برسوں سے رہ رہی ہوں۔ وہ پلاٹ دستیاب بھی ہیں۔ میرے بالکل آس پاس اس سے آدھی قیمت میں پلاٹ حاصل کیا جاسکتا ہے.... بلکہ شاید اس سے بھی کم میں مل جائے.... تو پھر میرا ہی مکان کیوں؟"

"شاید اسے کسی پیر صاحب نے بتایا ہو کہ اس مکان میں کوئی خزانہ دفن ہے" زرتاج نے ایک بار پھر مسز درانی کو چھیڑا۔

"خزانہ....!" مسز درانی استہزائیہ سے انداز میں ہنسیں۔ یہ ہنسی ایک کراہ سے مشابہ تھی "مکانوں میں مدفون خزانے اب صرف قصے کہانیوں میں پائے جاتے ہیں۔ ویسے اپنی ضد کا جواز پیدا کرنے اور مجھے مطمئن کرنے کے لیے اس نے ایک کہانی بھی گھڑ کر سنائی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ محض ایک افسانہ تھا.... اور کچھ نہیں...."

"کیا تھی وہ کہانی؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس نے بتایا کہ میرے مکان کے عقب میں ساحل کا جو حصہ لگتا ہے وہاں کسی زمانے میں چھوٹی سی کھاڑی ہوتی تھی۔ یہاں تک تو اس کی بات درست ہے لیکن اس سے آگے وہ کہتا ہے کہ اس کا باپ بھی ایک لانچ چلانے والا تھا۔ باربرداری وغیرہ کرتا تھا اور اپنی لانچ اسی کھاڑی میں کھڑی کرتا تھا۔ جبار کا کہنا ہے کہ اس کے ماں باپ لانچ میں ہی رہتے تھے اور وہ لانچ میں ہی پیدا ہوا تھا۔ اس کا بچپن بڑی غربت میں گزرا۔ اب جب اس کے پاس افسانوی سے انداز میں بہت دولت آچکی ہے تو وہ اس مقام کے قریب ہی اپنا ایک خاص مکان تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اس جگہ سے اس کی جذباتی وابستگی ہے۔ وہ اب خود وہیں رہائش اختیار کرے گا۔ یہ سب بکواس ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"مجھے اس ساحل پر کام کرنے والے وہ لوگ بھی اچھی طرح یاد ہیں جن کے خاندان اس وقت معدوم ہورہے تھے جب میں چھوٹی تھی۔ جبار جیلانی اپنے باپ دادا کے جو نام اور نشانیاں بتاتا ہے ان ناموں اور نشانیوں کے لوگ میری معلومات کے مطابق وہاں کبھی نہیں تھے۔ دوسری بات پھر وہی آجاتی ہے کہ آخر میرا مکان ہی کیوں....؟ میرے مکان کے عقب میں ساحل کم از کم آدھ میل دور ہے اور اس ساری لمبائی میں زمین برائے فروخت موجود ہے۔ دستیاب ہے۔ یادگار کے طور پر کیا وہ کہیں اور مکان نہیں بناسکتا؟ میں نے جب اس سے یہ بات کی تو کہنے لگا کہ میرے مکان کی لوکیشن اسے بہت پسند ہے۔ وہ مجھے کوئی بے وقوف اور خبط الحواس عورت سمجھتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ایک کروڑ کی پیشکش سُن کر میری رال ٹپک پڑے گی۔"

"لیکن آپ کی رال نہیں ٹپکی.... اور نہ ہی ٹپکنے کا کوئی امکان ہے؟" میں نے تصدیق چاہی "میرا مطلب ہے کہ ایک بار پھر سوچ لیجیے.... آپ واقعی کسی بھی قیمت پر مکان فروخت کرنا نہیں چاہتیں؟"

"نہیں" مسز درانی نے غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا "جبار جیلانی نے مجھے یہ پیشکش بھی کی تھی کہ وہ کراچی کے کسی بھی اچھے علاقے میں کوئی بنگلا یا شاندار قسم کا اپارٹمنٹ مجھے لے دے گا اور باقی رقم میرے نام سے کسی بھی اسکیم میں انویسٹ کردے گا۔ مجھے مرتے دم تک کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ عیش سے زندگی بسر ہوگی۔ اگر مجھے اس کی تجویز منظور ہوتی تو یہ کام میں خود بھی کرسکتی تھی۔ مجھے اس قسم کے کاموں کے لیے اس کی خدمات کی ضرورت نہیں تھی۔ میں ہمیشہ سے اپنے ہر قسم کے کام خود ہی کرتی آئی ہوں۔ میں کسی بھی معاملے میں اوپر والے کے سوا کسی کی

محتاج نہیں ہوں۔"

"آپ کے بچوں کو اس معاملے کی خبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" مسز درانی نے نفی میں سرہلایا۔ وہ گویا اس تصور سے ہی سہم گئی تھیں "مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا ہے کہ کہیں انہیں پتا نہ چل جائے۔"

"کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ دوڑے دوڑے آئیں گے اور میری زندگی عذاب کردیں گے کہ میں فوراً اس پیشکش کو قبول کرلوں" مسز درانی بولیں "تمہیں تو اندازہ ہوگا کہ نئی نسل ویسے بھی کچھ کم مادیت پرست نہیں ہے لیکن یہ مغربی ملکوں میں رہنے والوں کی تو ذہنیت بالکل ہی تبدیل ہوجاتی ہے۔ ان پر بھی گوروں کا بڑا اثر آجاتا ہے۔ ان کی زندگی میں بھی جذباتیت کی گنجائش نہیں رہتی۔ انہیں گویا یاد ہی نہیں رہتا کہ جذباتی وابستگی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ خصوصاً بے جان چیزوں سے تو جذباتی وابستگی کا وہ تصور ہی نہیں کرسکتے۔ وہ میری جان عذاب میں کردیں گے کہ اس کھنڈر کے اگر ایک کروڑ مل رہے ہیں تو میں فوراً ہاں کردوں' اس سے پہلے کہ خریدار ارادہ بدل لے۔ بلکہ مجھے تو یہی خوف لگا رہتا ہے کہ کہیں جبار جیلانی کو میرے بچوں کے بارے میں پتا نہ چل جائے اور وہ ان سے رابطہ نہ کرلے۔ میں چاہتی ہوں بس میری زندگی اس گھر میں پوری ہوجائے۔ میرے بعد اس مکان کا کیا ہوتا ہے' مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔"

"بہت خوب!" میں نے تحسین آمیز انداز میں سرہلایا "مجھے خوشی ہے کہ آپ نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر بالکل صاف صاف اپنا مقصد بیان کردیا۔ آپ نے اپنے محسوسات چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ دوسرے لوگ شاید اسے ضد یا ہٹ دھرمی کہیں.... آپ نے خود بھی اپنے آپ کو ضدی عورت قرار دیا ہے لیکن میرے خیال میں یہ ارادے کی مضبوطی ہے۔ خصوصاً جب آپ کو کوئی بڑا لالچ دیا جارہا ہو تو اپنے ارادے پر قائم رہنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اب آپ یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دیں۔"

"وہ تو میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہی زرتاج کے کہنے پر دل ہی دل میں اپنی دانست میں معاملہ تم پر ہی چھوڑ دیا تھا" مسز درانی بولیں "لیکن مجھے آسان لفظوں میں سمجھاؤ کہ اب مجھے کرنا کیا ہوگا؟"

"آپ اس کے منیجر یا سیکریٹری کو فون کرکے بتادیں کہ آپ نے مکان میرے ہاتھ فروخت کردیا ہے۔ بیعانہ ہوگیا ہے اور ایک دو ماہ میں ڈیل مکمل ہوجائے گی اس لیے اب وہ آپ کا پیچھا چھوڑ دے۔ اب اس سلسلے میں کوئی بھی بات کرنی ہو' وہ مجھ سے کرے۔ آپ کہہ سکتی ہیں کہ مجھ سے آپ کا سودا ایک کروڑ سے بھی زیادہ میں ہوا ہے۔"

"اور وہ اس پر یقین کرلے گا؟" مسز درانی استہزائیہ سے لہجے میں بولیں۔

"ہمیں اس سے غرض نہیں ہے کہ وہ اس پر یقین کرتا ہے یا نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اس کی توجہ میری طرف مبذول ہوجائے۔ اسے معلوم ہوجائے کہ کوئی اور آدمی بھی اس معاملے میں کود پڑا ہے۔ وہ آپ کی جان چھوڑ دے اور اگر اسے الجھنا ہی ہے تو مجھ سے اُلجھے۔"

"جب وہ اس بات پر یقین ہی نہیں کرے گا تو اس کی توجہ تمہاری طرف مبذول ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" مسز درانی وثوق سے بولیں۔

"چلیں خیر.... کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں کسی اور طریقے سے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالوں گا لیکن فی الحال میری اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول ہے۔ آپ مجھے دو تین دن کی مہلت دیجیے۔ میں ذرا یکسو ہوجاؤں۔ پھر میں صحیح طور پر آپ کے مسئلے کی طرف توجہ دوں گا۔ ویسے میری نظر میں یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے جبار جیلانی جیسے لوگوں کو کس قسم کے ڈوز کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں وہ ڈوز دینا جانتا ہوں...."

"یا یوں کہو کہ ڈوز دینے کی طاقت رکھتے ہو" مسز درانی نے لقمہ دیا۔ وہ سمجھدار خاتون معلوم ہوتی تھیں لیکن دنیا کے بیشتر انسانوں کی طرح بہرحال ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں کوئی سنک' کوئی ٹیڑھ موجود تھی۔

"ہاں.... یوں بھی کہا جاسکتا ہے" میں نے ان سے اتفاق کیا "امید ہے ڈوز مل جانے کے بعد وہ ٹھیک ہوجائے گا۔ اگر اس دوران زیادہ خطرہ محسوس کریں تو یہیں میرے ہوٹل میں ٹھہر سکتی ہیں۔ جب تک جبار جیلانی کا کوئی بندوبست نہیں ہوجاتا تب تک آپ یہیں قیام کریں۔ آپ سے کوئی کرایہ وغیرہ چارج نہیں کیا جائے گا۔"

"اتنا حاتم طائی بننے کی ضرورت نہیں۔" زرتاج نے مداخلت کی "ان کے طعام و قیام کا بل مجھے دے دینا۔"

"بہت بہتر جاگیردارنی صاحبہ! ہمیں معلوم ہے آپ کے پاس بڑی دولت ہے۔ اگر آپ حکم کریں تو میں اور میرے تمام ساتھی بھی یہاں اپنے قیام و طعام کا بل آپ کی خدمت میں پیش کردیں؟" میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"میں نے شہر کے تمام غربا اور مساکین کا ٹھیکا تھوڑا ہی لے رکھا ہے۔ مسز درانی کی ذمے داری تو میں اس لیے لے رہی ہوں کہ یہ میری دور پار کے رشتے کی خالہ ہیں اور میرے گھر میں رہنے کو تیار نہیں ہیں کیونکہ یہ کسی کو زیادہ تکلیف دینا پسند نہیں کرتیں۔"

"میں کسی کو یہ تکلیف دینا بھی پسند نہیں کرتی کہ وہ میرا بل ادا کرے اور نہ ہی میں کسی کی شرافت کا اتنا ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتی ہوں کہ اسے ایک بھیانک خطرے کی طرف بھی دھکیلوں اور اس کے ہوٹل میں بھی مفت قیام کروں" مسز درانی خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "بیٹا! تم میرے لیے جو خطرہ مول لے رہے ہو وہی

[...]ہے۔ تم میرے قیام وغیرہ کی فکر مت کرو۔ میں آخر دم تک [...]گھر میں ہی رہوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ اس مردود کو یہ [...]ں ہو کہ میں خوفزدہ ہو کر گھر چھوڑ کر بھاگ گئی۔ یہ گویا اس کی [...]ی۔ میں اسے فتح کا احساس دلانا نہیں چاہتی...."

[...]پھر وہ جھرجھری سی لے کر بولیں "آج کے واقعے کے بعد تو [...]ایمان اور پختہ ہوگیا ہے کہ اگر آپ کی زندگی باقی ہے تو پھر [...]سے چلائی گئی گولیاں بھی آپ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔ میں تو [...]خود اس شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس سے بات [...]چاہتی ہوں۔"

زرتاج دھیرے سے ہنسی اور بولی "بہت خوب! آپ پر تو حملے [...]نا ہی اثر ہوا ہے۔ جبار جیلانی نے سوچا ہوگا کہ اوّل تو آج مجیلی [...]یا کا پتا ہی صاف ہوجائے گا اور اگر کسی معجزے کے تحت وہ بچ [...]گئیں تو اتنی خوفزدہ ہوجائے گی کہ گھگیاتے ہوئے اس کی ہر بات [...]لے گی لیکن یہاں تو اُلٹے بانس بریلی کو جارہے ہیں۔ پہلے تو آنٹی [...]سے خوفزدہ تھیں۔ اب اسے آنکھیں دکھانے پر تُلی ہوئی [...]"

"میں نے ساری زندگی بے خوفی سے گزاری ہے۔ اب میں عمر [...]آخری دور میں خوفزدہ نظر آنا نہیں چاہتی.... خصوصاً ایک [...]رے' بدمعاش اور حرام کی دولت اکٹھا کرنے والے سے تو میں [...]ل ہی ڈرنا نہیں چاہتی۔ کوئی زمانہ تھا کہ ایسے لوگ شریفوں سے [...]تے تھے۔ جب سے شریفوں نے ان سے ڈرنا شروع کیا ہے تب [...]سے یہ لوگ زیادہ طاقتور ہونا شروع ہوئے ہیں۔ حتیٰ کہ اب تو [...]لگتا ہے جیسے سارا نظام ہی ان کی مٹھی میں آگیا ہے...."

پھر مسز درانی نے ٹھنڈی سانس لی اور متاسفانہ سے لہجے میں [...]لیں "میری اب زندگی ہی کتنی رہ گئی ہوگی.... اگر جبار جیلانی یہ [...]تھوڑے سے برس بھی مجھے چین سے گزار لینے دیتا تو اس کا کیا بگڑ [...]جاتا!؟ بہرحال.... میں تہیہ کیے ہوئے ہوں کہ میں اس کے سامنے [...]ذرا بھی لچک کا مظاہرہ نہیں کروں گی۔ اگر اپنی اس ضد میں' میں [...]جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں تو تمہیں ایک مضبوط بنیاد میسر آجائے گی۔ [...]میری موت کو جواز بنا کر تم جبار جیلانی کا فتنہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے [...]کی کوشش کرنا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ خوامخواہ اپنی جان کا نذرانہ [...]پیش کرنے کی کوشش نہ کریں۔ جبار جیلانی سے نمٹنے کے لیے مجھے [...]کسی لاش کی ضرورت نہیں۔"

مسز درانی قدرے مایوسی سے بولیں "شاید تم اندازہ نہیں [...]لگا سکے ہو کہ وہ کتنا خطرناک' بارسوخ اور دولت مند آدمی ہے۔"

"مجھے بہت اچھی طرح اندازہ ہوگیا ہے" میں نے انہیں [...]یقین دلایا "ایسے ہی آدمی سے تو پنگا لینے میں مزہ آتا ہے۔ پنگے کا [...]مطلب سمجھتی ہیں نا آپ؟"

"کیوں نہیں" مسز درانی پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "ہمارے ہاں تو اس کا سب سے زیادہ رواج ہے۔ یہاں ہر ایک نے کسی نہ کسی کے ساتھ پنگا لے رکھا ہے۔ لوگوں کی زندگی کا بیشتر حصہ ہی پنگے بازی میں گزرتا ہے۔"

"بالکل ٹھیک" میں نے طمانیت سے کہا "لیکن المیہ یہ ہے کہ جن لوگوں سے پنگا لینا چاہیے' ان سے کوئی نہیں لیتا۔ میں ایسے ہی لوگوں سے پنگا لینا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہوں۔ میں آپ کے ٹیلی فون پر آبزرویشن وغیرہ کا بھی انتظام کرادیتا ہوں۔ اگر کسی نے آپ کو دھمکی دی تو وہ کال بھی ریکارڈ ہوجائے گی۔ جبار جیلانی نے خود کبھی آپ کو براہِ راست دھمکی دی ہے؟"

"قطعاً نہیں" مسز درانی نے نفی میں سرہلایا "میں نے بتایا ناکہ اس نے تو مجھ سے بات ہی صرف ایک مرتبہ کی اور اتنے اچھے طریقے سے کی تھی کہ کوئی سنتا تو یہی سمجھتا کہ اس سے زیادہ خوش خلق آدمی شاید ہی اس شہر میں کوئی ہو۔ اس کے بعد اس کے آدمی بھی صرف سودے بازی کو آگے بڑھاتے رہے۔ دھمکی ان میں سے کسی نے نہیں دی۔ دھمکیاں تو گمنام فون کالز کے ذریعے ملتی رہیں۔ وہ اب بہت اونچے درجے کا بدمعاش ہے اس لیے ہر کام احتیاط سے کرتا ہے۔ کوئی ایسی حرکت نہیں کرتا جس سے اس کے خلاف کوئی ثبوت مل سکے۔ اس مقام پر پہنچنے کے بعد بدمعاشوں کو ایک فائدہ یہ بھی ہوجاتا ہے تاکہ وہ اپنے ہاتھ گندے کیے بغیر ہر گندے سے گندا کام کرسکتے ہیں۔ اس لیے فون پر آبزرویشن لگوانے' فون ٹیپ کرانے یا اس قسم کے دوسرے "شریفانہ" اقدامات کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"اچھا.... تو پھر ٹھیک ہے.... دو چار دن بعد اس سے براہِ راست ہی بات ہوگی" میں نے سوچتے ہوئے کہا "آپ چاہیں تو میں اس دوران میں آپ کی حفاظت کے لیے اپنا کوئی آدمی آپ کے گھر پر تعینات کردوں؟"

"یہ پیشکش تو زرتاج نے بھی کی تھی.... لیکن میرا خیال ہے ابھی اس کی ضرورت نہیں" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولیں "اس طرح وہ ہوشیار ہوجائے گا اور جلد از جلد کچھ کر گزرنے کی کوشش کرے گا۔ فی الحال شاید وہ مجھے لاوارث سمجھ کر کوئی ایسی غلطی کرجائے جس کی وجہ سے اسے گرفت میں لینا آسان ہوجائے۔"

میں نے اصرار نہیں کیا اور کہا "جیسا آپ مناسب سمجھیں ویسا کرلیتے ہیں۔ بہرحال میں ہر طرح سے مدد کے لیے تیار ہوں۔ آپ زرتاج کی عزیزہ ہیں تو میرے لیے بھی محترم ہیں۔ آئندہ دو چار دنوں کے دوران بھی آپ جب چاہیں.... جب ضرورت محسوس کریں' مجھ سے رابطہ کرسکتی ہیں۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ خطرہ محسوس کرتے ہی مجھ سے یا زرتاج سے رابطہ ضرور کرلیجیے گا۔ زیادہ ضد میں مت رہیے گا.... کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کی ضد کی محض یاد باقی رہ جائے.... یا پھر یہ پچھتاوا کہ ہم بروقت آپ کے لیے کچھ نہیں کرسکے۔ اس طرح کے پچھتاوے بڑے اذیت ناک ہوتے ہیں۔"

"میں ماری بھی گئی تو تم ایسے کسی پچھتاوے کو دل میں جگہ نہ دینا" مسز درانی ایک کشیدہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "یہی سوچ کر اپنے آپ کو سمجھا لینا کہ ایک احمق عورت تھی' اپنی حماقت کی سزا پا گئی۔"

پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں "اب میں چلتی ہوں۔"

زرتاج بھی اُٹھتے ہوئے بولی "میں آپ کو گھر چھوڑنے چلوں گی۔"

میں نے زرتاج کو یاد دلایا "تمہیں کل پارٹی میں ضرور آنا ہے اور مسز درانی کو بھی ساتھ لانا ہے۔"

"یہ تمہیں بیٹھے بٹھائے پارٹی کی کیا سوجھی؟" زرتاج جاتے جاتے رک کر بولی۔

"زندگی میں بڑی یکسانیت سی آ گئی تھی۔ میں نے سوچا کچھ ہلا گلا ہونا چاہیے" میں نے جواب دیا۔

"تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں" زرتاج بولی "ورنہ میرے خیال میں تو تمہاری زندگی میں یکسانیت نام کی کسی چیز کا کوئی گزر نہیں۔"

پھر وہ رخصت ہو گئی۔ میں نے شفیع شاہ کو بُلایا اور دوسرے روز کی پارٹی کے انتظامات کے بارے میں اس سے تبادلۂ خیال کرنے لگا۔

○☆○

شفیع شاہ اور میرے دوسرے ساتھیوں کو پارٹی کی تیاری کے لیے زیادہ وقت نہیں ملا تھا اس کے باوجود اسے شہر کی نہایت عظیم الشان اور یادگار پارٹیوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ ہوٹل کے چاروں ہال اسی کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے اور اس روز باہر کے کسی پروگرام کے بکنگ نہیں رکھی گئی تھی۔

ہر شعبۂ زندگی سے شہر کے تمام چیدہ چیدہ لوگ جمع تھے۔ شو بزنس' تجارت' صحافت' سیاست' شعر و ادب اور صنعت و حرفت..... غرضیکہ ہر شعبے کے لوگ نظر آ رہے تھے اور وہاں سبھی کی دلچسپی کا سامان موجود تھا۔ پینے پلانے والوں کو بھی اپنی اپنی پسند کا برانڈ بے حساب طریقے سے دستیاب تھا۔ آج میں نے تمام پابندیوں کو بالائے طاق رکھنے کی ہدایت کر دی تھی۔ بال روم بھی ایک عرصے بعد کھول دیا گیا تھا اور رقص کا شوق رکھنے والے جوڑوں کو وہاں رقص کی اجازت تھی۔

ہر طرف موسیقی اور رنگ و نور کا ایک سیلاب تھا۔ ماحول کی خوبصورتی اپنی جگہ تھی لیکن یہ بھی حقیقت تھی کہ وہاں بہت سے چہرے ایسے موجود تھے جن کے دم سے فضا کچھ اور جگمگا اُٹھی تھی' در و دیوار کچھ اور سج گئے تھے۔ میرا اتنے لوگوں سے تعارف کرایا گیا کہ میرے لیے ان میں سے ایک چوتھائی کا بھی نام اور حیثیت یاد رکھنا مشکل تھا۔ میں ایک سے دوسرے ہال میں آ جا رہا تھا۔ تین ہال ایسے تھے جن کے درمیان عارضی چوبی دیواریں حائل رہتی تھیں۔ بوقتِ ضرورت انہیں ہٹایا جا سکتا تھا۔ اس وقت انہیں ہٹا دیا گیا تھا اور ہوٹل کے اس فلور پر ایک طویل و عریض حصے میں مہمان بکھرے ہوئے تھے۔ ورائٹی پروگرام کے لیے ایک طرف اسٹیج بھی لگایا گیا تھا۔ بال روم بھی اسی طویل و عریض حصے سے منسلک تھا مگر بیچ میں دیوار حائل تھی۔ زرتاج اور راحیلہ میرے ساتھ تھیں۔ میرے ساتھ گویا ان کی حیثیت بھی میزبانوں ہی کی سی تھی۔ وہ بھی اپنے آپ کو مہمان نہیں سمجھ رہی تھیں۔ مسز درانی بھی آئی ہوئی تھیں۔ اپنی تمام تر سادگی اور بڑی عمر کے باوجود وہ ایک پیاری خاتون لگ رہی تھیں لیکن ان کی شخصیت میں دلکشی کے ساتھ ساتھ ایک خفیف سی سفاکی کی جھلک تھی۔ ان کے پتلے پتلے ہونٹ کچھ بھنچے بھنچے سے لگتے تھے جن کی وجہ سے ان کا چہرہ ایک سخت گیر عورت کا چہرہ دکھائی دیتا تھا۔ اس کے باوجود مجموعی طور پر ان کی شخصیت ایسی تھی کہ میں نے کئی افراد کو متجسس انداز میں کنکھیوں سے ان کی طرف دیکھتے پایا گویا وہ جاننا چاہتے ہوں کہ وہ خاتون کون تھیں..... لیکن مسز درانی سب سے الگ تھلگ ایک کونے میں بیٹھی تھیں اور کچھ کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی تھیں۔ شاید جوانی کی یادیں ان کی نظروں کے سامنے رقصاں ہوں۔

بہت سے مہمانوں کے ساتھ ان گنت باتیں کرنے کے بعد بالآخر میں کچھ لوگوں سے جان چھڑا کر راحیلہ اور زرتاج کے ساتھ ایک الگ تھلگ سے گوشے میں جا کھڑا ہوا جہاں بھیڑ بھاڑ کم تھی۔ ایک ویٹر ٹرے اٹھائے قریب سے گزرا تو میں نے کولڈ ڈرنک کا گلاس ٹرے سے اٹھایا' پہلے اس کا معائنہ کیا کہ وہ کولڈ ڈرنک ہی تھی' پھر اس میں سے ایک گھونٹ بھرا۔ تقریب کے آغاز سے اب تک یہ پہلی چیز تھی جو میں نے چکھی تھی۔

ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا "مجھے امید نہیں تھی کہ اتنے شارٹ نوٹس پر اتنے لوگ جمع ہو جائیں گے..... حتیٰ کہ ایک اچھے قسم کے ورائٹی پروگرام کا بھی بندوبست ہو جائے گا جب کہ لوگوں کو تقریب کا سرپیر بھی معلوم نہیں ہے۔"

"تمہارے آدمی بڑے کام کے ہیں..... جنات ہیں جنات!" زرتاج بھی ایک کولڈ ڈرنک کی چسکی لے کر بولی۔

راحیلہ خاموش تھی۔ وہ تقریب کے آغاز سے ہی خاموش تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ وہ جب سے کراچی آئی تھی' چپ چپ ہی تھی۔ وہ ایسی کم گو لڑکی نہیں تھی۔ اپنی خاموشی کی وجہ وہ خود تو جانتی ہی ہو گی مگر میں بھی اسے سمجھ سکتا تھا۔ یہ احساس تو یقیناً اس کے لیے بھی خوشی کا باعث نہیں ہو گا کہ آج ہمارے ساتھ اس کی وابستگی کا یہ آخری دن تھا۔ یہ بات زرتاج کو بھی معلوم نہیں تھی کہ آج کی پارٹی درحقیقت راحیلہ ہی کے اعزاز میں تھی اور یہ ایک طرح کی الوداعی پارٹی تھی۔

اچانک میں نے آفاق احمد کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ خوبصورت' چمکیلے' میکسی نما لبادے میں ایک خوبصورت و خوش ادا لڑکی بھی اس کے ساتھ تھی جو بڑے ناز سے قدم اُٹھاتی چلی آ رہی تھی گویا اسے احساس ہو کہ وہ سب کی مرکزِ نگاہ تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ سب تو نہیں' البتہ کچھ لوگ گردنیں گھما گھما کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ متناسب الاعضا اور سرو قد تھی۔ اس کی آنکھیں سفید قاموں کی طرح قدرے نیلی' رنگت کافی سفید' بال بھورے' ریشمی اور تراشیدہ تھے۔ مجموعی طور پر اسے ایک اسمارٹ' خوبصورت اور پرکشش لڑکی کہا جا سکتا تھا۔ شخصیت اور ظاہری رکھ رکھاؤ سے وہ اچھے طبقے کی فرد بھی نظر آتی تھی۔

اس کی صورت مجھے دور سے ہی مانوس محسوس ہوئی لیکن قریب آنے تک میں اسے نہیں پہچان سکا۔ آفاق مسکراتا ہوا اس کے ساتھ چلا آ رہا تھا پھر اچانک میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا اور مجھے یاد آ گیا' وہ سمیرا تھی۔ نئے دور کی مقبول ترین فلمی ہیروئن' اس کی ابھی چند ہی فلمیں ریلیز ہوئی تھیں لیکن سب کی سب کامیاب ہوئی تھیں۔ فلمی دنیا میں آئے اسے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن اس وقت وہ سُپر اسٹار تھی۔

ہر طرف اس کے نام کی گونج سنائی دے رہی تھی۔ میں نے سنا تھا ہر پروڈیوسر' ڈائریکٹر اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ان گنت پرستاروں کے علاوہ چھوٹے موٹے کئی وزیر سفیر اس کے عشاق کی طویل قطار میں شامل تھے۔ وہ ہماری کمپنی کی ایک ریلیز شدہ فلم کی بھی ہیروئن تھی اور آنے والی دو ایک فلموں میں بھی کام کر رہی تھی۔ میں نے اس کی کوئی فلم نہیں دیکھی تھی لیکن اس لیے اسے پہچان لیا تھا کہ اخبارات وغیرہ میں اور رسائل کے سرورق پر اس کی بے شمار رنگین تصویریں چھپ چکی تھیں۔ اس کے علاوہ میں نے یونہی اِدھر اُدھر آتے جاتے ایک آدھ ٹی وی پروگرام میں اور غالباً کسی ٹاک شو میں اس کی جھلکیاں دیکھی تھیں۔

آفاق نے قریب آ کر ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرایا تو نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں اور وہ ذرا جھٹکے وار سے لہجے میں بولی "واقعی..... کیا واقعی آپ ہی افضل چوہدری ہیں؟"

"یہ تو آپ آفاق سے ہی پوچھیے۔ ہو سکتا ہے یہ آپ سے مذاق کر رہا ہو۔ اسے کبھی کبھی مذاق کرنے کی عادت ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

سمیرا نے شک زدہ سی نظروں سے آفاق کی طرف دیکھا اور اُلجھن کے سے عالم میں بولی۔

"سچ سچ بتائیں نا آفاک صاحب! آپ مذاخ تو نہیں کر رہے ہیں ناں؟ مجھے یہ تو پتا ہے کہ آپ کی طبیعت بڑی مزاحیہ ہے مگر دیکھیں..... تعارف وغیرہ کے بارے میں مذاخ اچھا نہیں ہوتا۔"

اس لڑکی کی شخصیت میں جتنی خوبصورتی اور دلکشی تھی' اس کا منہ کھلتے ہی گویا اس کا بیڑا غرق ہو گیا تھا۔ اس کے لہجے اور اندازِ گفتگو نے سارے تاثر پر پانی پھیر دیا تھا۔ آفاق زیرِ لب مسکرا رہا

تھا۔ وہ فلمی دنیا کا کیڑا تھا۔ ایک عرصے سے اچھے بُرے' شائستہ ناشائستہ' پڑھے لکھے' نیم پڑھے لکھے' اجڈ گنوار' سلجھے ہوئے' اُلجھے ہوئے' غرضیکہ ہر طرح کے اداکاروں اور اداکاراؤں کو بھگت رہا تھا۔ اس نے اب ایسی باتوں پر شرمندہ ہونا چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ اس وقت میرے محسوسات کا اندازہ کرتے ہوئے محظوظ ہو رہا تھا۔

سمیرا کے استفسار پر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "ہاں بھئی یہی افضل چوہدری صاحب ہیں۔ تمہیں اتنی حیرت کیوں ہو رہی ہے؟"

"میں جب ان کے کاروباروں وغیرہ کے بارے میں سنتی تھی تو میں نے اپنے حساب سے اندازہ لگایا تھا کہ کافی بڑی عمر کے ہوں گے اور کچھ نہ کچھ جٹ قسم کے آدمی ہوں گے لیکن یہ تو جوان بھی ہیں..... کافی پڑھے لکھے بھی لگ رہے ہیں..... ان میں تو چوہدریوں والی کوئی بات ہی نظر نہیں آ رہی....." وہ نہایت بے جھجک انداز میں میرا سراپا جائزہ لے رہی تھی لیکن مخاطب آفاق سے تھی۔

آفاق مشفقانہ سے انداز میں اس کا کندھا تھپتھپا کر بولا "سمیرا بی بی! تمہارے ذہن میں اصل میں صرف وہی چوہدری اٹکا ہوا ہے جو تم نے فلموں میں دیکھا ہے جسے ہمیشہ ہیرو گنڈاسا' کلہاڑی یا لاٹھی لے کر للکارتا رہتا ہے۔ چوہدری صرف ویسا ہی نہیں ہوتا۔ حقیقت کی دنیا میں چوہدری سب طرح کے ہوتے ہیں۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے..... میرے دماغ میں وہ فلم والا چوہدری نہیں تھا..... مجھے پتا ہے وہ تو یونہی رائٹر لوگوں کا بنایا ہوا چوہدری ہے..... لیکن میرے ذہن میں ایسا چوہدری بھی بہرحال نہیں تھا....." پھر وہ اپنا مرمریں ہاتھ مصافحے کے لئے میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "آپ سے مل کر بچی مچی بڑی خوشی ہوئی چوہدری صاحب!"

میں نے آہستگی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس ہاتھ میں نرمی' گرمی' گداز' سبھی کچھ تھا۔ بس خلوص کی حرارت نہیں تھی۔

میرے سراپا جائزے سے فارغ ہو کر وہ زرتاج اور راحیلہ کی طرف متوجہ ہوئی اور باری باری ان کا جائزہ لینے کے بعد بولی "یہ دونوں غالباً آپ کی بیگمات ہیں؟"

میں بے اختیار کراہ کر رہ گیا اور میرا دونوں ہاتھوں سے سر تھام لینے کو جی چاہا۔ آفاق نے اسے کہنی ماری اور نیچی آواز میں بولا "میں نے تمہیں بتایا تو تھا کہ چوہدری صاحب غیر شادی شدہ ہیں۔"

"اوہ..... میں مافی چاہتی ہوں..... ایسی خاص بات میں نے سنی ہوتی تو بالکل نہ بولتی۔ میرا خیال ہے میں نے دھیان سے سنی ہی نہیں ہو گی" وہ جلدی سے معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

میں نے غم ناک سے لہجے میں کہا "میں تو ان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی شوہر ہونے کی جُرات نہیں کر پا رہا۔ آپ مجھے دونوں کا شوہر بنانے پر تُلی ہوئی ہیں۔"

"میں ایک بار پھر مافی چاہتی ہوں..... وہ دراصل ایویں..... ذرا جلدی میں میری زبان سے نکل گیا..... دراصل میں نے اکثر دیکھا ہے

کہ زیادہ امیر آدمیوں کی دو دو بیویاں ہوتی ہیں۔۔۔" پھر گویا بے اختیار اس کی زبان سے نکلا "ویسے یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں۔"

زرتاج اور راحیلہ دونوں کھا جانے والی نظروں سے اسے گھور رہی تھیں۔ انہیں اگر آداب محفل اور موقع محل کا خیال نہ ہوتا تو شاید وہ سمیرا کو ایک ایک ہاتھ تو رسید کر ہی دیتیں اور ان کا ایک ایک ہاتھ سمیرا جیسی لڑکی کو کم از کم دو چار ہفتے کے لیے اسپتال پہنچا سکتا تھا۔

سمیرا اب بھی اندازے ظاہر کرنے سے باز نہ آئی اور بظاہر بڑی سمجھداری سے سر ہلاتے ہوئے بولی "یہ دونوں شاید آپ کی دوست ہیں۔"

"یہی سمجھ لیں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ماشاً اللہ دونوں بڑی خوبصورت ہیں" اس نے ایک بار پھر دونوں کا سرتاپا جائزہ لیا۔ زرتاج اور راحیلہ' دونوں کے چہروں پر ناگواری برقرار رہی حالانکہ میرے خیال میں کم از کم اس ریمارک پر تو انہیں خوش ہونا چاہیے تھا اور سمیرا کا شکریہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ یہ کچھ کم حیرت انگیز واقعہ نہیں تھا کہ ایک لڑکی نے خود خوبصورت ہوتے ہوئے اور فلموں کی سپر اسٹار ہوتے ہوئے دوسری لڑکیوں کی خوبصورتی کی تعریف کی تھی ورنہ عام طور پر کوئی کالی کلوٹی اور انتہائی کم رو لڑکی بھی اپنے سامنے کسی کو خاطر میں نہیں لاتی تھی۔

زرتاج اس روز مغربی لباس میں تھی۔ سمیرا غالبًا اس لباس کی وجہ سے اس کے بارے میں ایک اور اندازہ ظاہر کیے بغیر نہ رہ سکی "آپ شاید ماڈلنگ کرتی ہیں۔۔۔ آپ کی صورت کچھ جانی پہچانی سی لگ رہی ہے۔"

"یہ میری بدقسمتی ہے کہ آپ کو میری صورت جانی پہچانی سی لگ رہی ہے" زرتاج انگریزی میں بولی "ماڈلنگ کے بارے میں' میں نے آج تک کبھی سوچا بھی نہیں۔"

"جی۔۔۔؟" سمیرا ایک دم ذرا گڑبڑا کر بولی۔

میں نے بات کو سنبھالتے ہوئے کہا "یہ ماڈلنگ وغیرہ نہیں کرتیں۔۔۔ یہ زمیندارنی ہیں۔۔۔ اور کچھ پراپرٹی وغیرہ کا بھی بزنس ہے۔"

"ماشاً اللہ۔۔۔ ماشاً اللہ۔۔۔" سمیرا نے بڑی متانت سے سر ہلایا "یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ اب خواتین بھی زمینداری کر رہی ہیں۔ میری ایک پھوپی کی بھی نارنگ منڈی کے قریب چار مربع زمین ہے۔ علاقے میں ان کا بڑا رعب رباب ہے۔۔۔ ان کے علاقے کا چاول بڑا مشہور ہے" پھر یک دم ہی اس نے بڑے تجسس سے پوچھا "آپ کی کتنی زمین ہے؟"

"بس۔۔۔ تھوڑی سی ہے۔۔۔ دال روٹی چل جاتی ہے" زرتاج نے انکساری سے جواب دیا۔

"خیر۔۔۔ میری پھوپی کے تو پورے چار مربع ہیں۔۔۔" اس کے لہجے میں فخر جھلک آیا۔ شاید وہ بے چاری سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ زرتاج کتنی بڑی زمیندارنی تھی۔ سیکڑوں مربعوں یا ہزاروں ایکڑ زمین کے ساتھ ساتھ کئی فارم بھی تھے۔ اس کا پراپرٹی کا بزنس بھی زبردست انداز میں چل نکلا تھا جسے دیکھ کر یقین آتا تھا کہ پیسہ پیسے کو کھینچتا ہے۔

سمیرا کی بات جاری تھی "ابھی تو میں گلبرگ میں کوٹھی خرید کر فارغ ہوئی ہوں۔۔۔ اس سے پہلے ہنڈا اکارڈلی تھی۔۔۔ میری ذرا دو چار فلمیں اور ریلیز ہو جائیں۔۔۔ میں بھی سوچ رہی ہوں کہ لاہور کے آس پاس کسی اچھے سے زرعی علاقے میں دو چار فارم خریدوں گی۔ زمینداری کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اس کے بڑے فائدے ہیں۔۔۔" وہ کچھ شاطرانہ اور معنی خیز سے انداز میں مسکرائی۔

زرتاج دم بخود کھڑی ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ گویا سنبھل کر انگریزی میں ہی بولی "آپ تو جس کام میں بھی ہاتھ ڈالیں گی اس میں آپ کو فائدہ ہی فائدہ ہوگا۔ نقصان کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

سمیرا ذرا گڑبڑا کر راحیلہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ راحیلہ پاکستانی لباس میں تھی۔ شاید سمیرا نے سوچا ہو کہ وہ اسے انگریزی کی مار نہیں مارے گی۔ اس کے علاوہ میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اپنی دانست میں وہ بے چاری آداب محفل نبھانے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ شاید یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ ہر ایک کی طرف بھرپور توجہ دے رہی ہے' کسی سے بے رخی نہیں برت رہی۔۔۔ بلکہ کھل مل کر باتیں کر رہی ہے۔ اب یہ الگ مسئلہ تھا کہ بے ساختگی میں اس کے منہ سے کیا نکلتا تھا۔

میرے خیال میں تو یہ بھی غنیمت تھا کہ ابھی اس کے انداز گفتگو میں کسی حد تک بے ساختگی برقرار تھی۔ ابھی اسے فلم انڈسٹری میں زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا اسے کچھ عرصے تک اونچے طبقے کی خواتین میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملے گا تو پھر وہ اس طبقے کی خواتین اور لڑکیوں کے بھی کان کترے گی۔

اپنے پہناوے' رکھ رکھاؤ اور شخصیت کے اعتبار سے راحیلہ بھی بہت اونچے طبقے کی فرد نظر آتی تھی۔ سمیرا خاصی متجسس نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "آپ کیا کرتی ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں" راحیلہ نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ میں سمجھ گئی۔۔۔ آپ کا تعلق یقیناً کسی کھاتے پیتے گھرانے سے ہوگا" سمیرا نے ایک بار پھر اپنی دانست میں بڑی سمجھداری سے سر ہلایا "اس لیے آپ کچھ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی ہوں گی۔"

پھر اس نے خود ہی اپنے خیال کی تردید کر دی "ویسے آج کل تو کھاتے پیتے گھرانوں کی لڑکیاں زیادہ کام کر رہی ہیں۔۔۔ بڑے بڑے کام کر رہی ہیں۔۔۔ ان کے پاس پیسہ ہوتا ہے ناں۔۔۔ وہ ہر کام زیادہ

اچھے اسٹینڈرڈ سے کر سکتی ہیں۔ آج کل تو وہ ہر کام میں چھائی ہوئی ہیں جی! اب مجھی کو دیکھ لیں۔۔۔ میرے والد بھی اچھے بھلے زمیندار ہیں۔ انہوں نے مجھے بڑا منع کیا کہ فلم میں کام مت کرو' یہ لین بڑی بدنام ہے لیکن میں نے کہا' نہیں۔۔۔ میں اپنی زندگی خود بنانا چاہتی ہوں۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہتی ہوں۔۔۔ اور ماحول کا کیا ہے۔۔۔ ماحول تو انسان خود بناتا ہے۔ انسان خود اچھا ہو تو ماحول بھی اچھا ہو جاتا ہے۔ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ انسان خود بُرا ہو تو جا کر اچھے ماحول کو بھی خراب کر دیتا ہے۔ بس میری باتیں سُن کر ڈیڈی نے مجھے اجازت دے دی۔"

میں نے یہ تقریر دل پذیر سن کر زور شور سے اس کی تائید میں سر ہلایا لیکن زرتاج اور راحیلہ کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی قدرے خونخوار سی نظروں سے سمیرا کو گھورے جا رہی تھیں۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ صرف گھورنے پر ہی اکتفا کیے ہوئے تھیں۔ سمیرا کی گویا ان کے تاثرات کی طرف توجہ ہی نہیں تھی۔ وہ اپنی دُھن میں تھی۔

وہ خاموش ہوئی تو راحیلہ گویا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے بولی "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کھاتے پیتے گھرانے کی نہیں ہوں۔ میرا تو کوئی گھرانا ہی نہیں ہے۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ آپ کے والدین فوت ہو چکے ہیں۔۔۔ بڑا افسوس ہوا سُن کر۔۔۔" سمیرا نے اپنے لہجے میں ہمدردی سمونے کی کوشش کی لیکن راحیلہ کی بات نے اس کی پوزیشن اور بھی معیوب سی بنا دی تھی جس کا شاید اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔ وہ جل جل کر جو جواب دیے جا رہی تھی ان سے سمیرا اپنی پروازِ تخیل کے مطابق مفہوم اخذ کیے جا رہی تھی۔ وہ اس کے مقام یا پس منظر کو بھلا کہاں سمجھ سکتی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ سر ہلاتے ہوئے بولی "خیر۔۔۔ کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ افضل صاحب کی دوست ہیں۔۔۔"

وہ مزید کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔۔۔ اور یہ اس کے حق میں اچھا ہی ورنہ شاید وہ راحیلہ کے ہاتھوں ایک آدھ بہت اہم قسم کی ہڈی تڑوا ہی بیٹھتی اور خود تکلیف اٹھانے کے ساتھ ساتھ فلمسازوں کے کروڑوں کے نقصان کا باعث بنتی۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔ میں خوب سمجھ رہی ہوں آپ افضل صاحب کی کس قسم کی دوست ہیں۔ آپ کے سارے ٹھاٹ باٹ تو افضل صاحب کے دم سے ہی ہوں گے۔

راحیلہ زہر میں بجھے لہجے میں بولی "دو دن پہلے تک میں افضل صاحب کے گروپ آف کمپنیز میں ایگزیکٹو ڈائریکٹر تھی۔"

"اوہ۔۔۔! یہ تو بہت اچھی بات تھی" سمیرا آنکھیں قدرے پھیلاتے ہوئے بولی۔ "اس کا مطلب ہے آپ کچھ نہ کچھ تو کرتی ہی تھیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ آپ کچھ نہیں کرتیں۔۔۔" وہ کرخت سے انداز میں ہنسی پھر بولی "ویسے آپ ماشاء اللہ ہیں بہت خبصورت۔۔۔ آپ کو تو فلموں میں کام کرنا چاہیے۔"

"خدا نہ کرے جو میں فلموں میں کام کروں" راحیلہ گویا بے ساختہ بولی۔

سمیرا جواب تک بڑے جوش و خروش سے اپنی ہی دُھن میں باتیں کیے جا رہی تھی اور دوسروں کی باتوں کے اصل مفہوم اور تاثر کی طرف کم ہی دھیان دے رہی تھی' اس جواب میں چھپی ہوئی کاٹ اور تحقیر کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی۔ ذرا ٹھٹک کر بولی "کیوں جی۔۔۔ فلم میں کام کرنے میں کیا برائی ہے؟ مجھے کئی مرتبہ تجربہ ہوا ہے۔۔۔ کھاتے پیتے گھرانوں کے۔۔۔ اور زیادہ پڑھے لکھے لوگ اکثر فلموں کے ذکر پر۔۔۔ اور فلموں میں کام کرنے کی بات پر ناک منہ چڑھاتے ہیں مگر جب کسی اسٹار کو دیکھ لیتے ہیں تو اس کے اردگرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اسے اپنے گھر آنے کی دعوتیں دیتے ہیں۔ درخواستیں کرتے ہیں کہ ہم ان کے یا ان کے بچّوں کے ساتھ تصویریں بنوا لیں۔۔۔"

وہ جوش جذبات میں بولتے بولتے ایک لمحے کے لیے سانس لینے کو رکی پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "اب اس محفل کو ہی دیکھ لیجیے۔ کیسی زبردست پارٹی ہے۔۔۔ کتنے بڑے بڑے لوگ آئے ہوئے ہیں۔ کیسے کیسے مگرمچھ یہاں موجود ہیں لیکن جب سے مجھ جیسی ایک چھوٹی سی مچھلی یہاں آئی ہے' سب گردنیں موڑ موڑ کر دیکھ رہے ہیں۔۔۔ اور خدا جھوٹ نہ بُلوائے۔۔۔ آٹوگراف دیتے دیتے انگلیاں تھک گئی ہیں۔"

راحیلہ کو اپنے لفظوں سے جو تاثر دینا تھا' دے چکی تھی۔ اب غالبًا اس نے سمیرا کو بخش دینے کا فیصلہ کیا اور قدرے نرم لہجے میں بولی "شاید میں اپنی بات صحیح طریقے سے نہیں کہہ سکی۔ آپ نے تو خواہ مخواہ بات دل پر لے لی۔ میرا مطلب یہ تھا کہ فلموں میں کام کرنا تو بہت مشکل ہے۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ خدا مجھے اس مشکل میں نہ ڈالے۔ میں تو اپنے دفتری کام میں ہی ٹھیک ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔" سمیرا نے سر ہلایا۔ شاید اس کی کچھ تالیفِ قلب ہو گئی تھی۔

وہ شاید کچھ اور بھی کہنے لگی تھی مگر اسی دوران ایک بھاری بھرکم شخص ہمارے قریب سے گزرا۔ سمیرا پر نظر پڑی تو ٹھٹکا اور جاتے جاتے پلٹ آیا۔ وہ شاہ نور شمسی تھا۔ وہ بہت بڑا فلمساز' ڈسٹری بیوٹر' بلڈر اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ اس کا باپ' وہ خود' اس کے کئی بھائی اور بھانجے بھتیجے بزنس میں تھے۔ ان کے نہ جانے کیا کیا بزنس تھے۔ بہت بڑی فیملی تھی۔

مجھ سے تو کچھ دیر پہلے اس کی گپ شپ ہو چکی تھی اس لیے میری طرف تو اس نے صرف معذرت خواہانہ مسکراہٹ کے ساتھ دیکھنے پر اکتفا کیا البتہ سمیرا سے رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد بولا "اچھا ہوا آپ سے یہاں ملاقات ہو گئی۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنا تھی۔"

پھر اس نے اجازت طلب نظروں سے میری طرف دیکھا "فضل بھائی! اگر آپ بُرا نہ منائیں تو میں ذرا سیمرا کو ایک طرف لے جا کر بات کرلوں؟"

"مجھے بُرا منانے کی کیا ضرورت ہے شاہ نور ڈیئر!" میں نے ملائمت سے کہا "البتہ خود سیمرا سے پوچھ لو۔۔۔ یہ تو بُرا نہیں منائے گی۔"

سیمرا جلدی سے بول اٹھی "توبہ کریں چوہدری صاحب! میں بھلا کیوں بُرا منانے لگی۔ شمسی صاحب تو ہمارے بہت بڑے کرم فرما ہیں۔ پچھلے ہفتے ہی تو میں نے ان کی دو فلمیں سائن کی ہیں۔ بڑے دل والے آدمی ہیں۔"

شمسی کے دل کے بارے میں تو مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ کتنا بڑا تھا البتہ جسمانی طور پر وہ خاصا بھاری بھرکم آدمی تھا۔ ہمیشہ بہت مہنگے لیکن ڈھیلے ڈھالے اور شکن آلود سوٹ میں ہوتا تھا۔ سوٹ ڈھیلا ڈھالا ہونے کی وجہ سے اور بھی زیادہ بھاری بھرکم نظر آتا تھا۔ موٹے فریم کی عینک لگاتا تھا۔ داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اپنی اصل عمر سے بڑا لگتا تھا۔ اس کے بال قدرتی طور پر سُرخی مائل تھے۔

وہ سیمرا کو لے کر ایک کونے میں چلا گیا اور دونوں زور شور سے کوئی بات کرنے لگے۔ شمسی دیوزاد لگ رہا تھا اور سیمرا اس کے سامنے ایک نازک اندام پری۔ آفاق کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "آپ لوگ سیمرا کی باتوں کا بُرا مت منایئے گا۔ انڈسٹری میں نئی نئی آئی ہے۔ ابھی صرف انڈسٹری میں اور عام سی ذہنیت کے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کے قابل ہوئی ہے لیکن اس قسم کی لڑکیاں سیکھتی بہت جلدی ہیں۔ آپ لوگ دیکھیں گے کہ تھوڑے عرصے میں ہی یہ آپ کے طبقے میں بھی اُٹھنے بیٹھنے کے قابل ہوجائے گی۔ اگر اسے گھر پر کچھ ٹیوشن وغیرہ لینے کا وقت مل گیا تو عین ممکن ہے گزارے لائق انگریزی بھی بولنے لگے لیکن مسئلہ یہی ہے کہ یہ لڑکیاں جب اسٹار بن جاتی ہیں تو ان کے پاس کچھ بھی سیکھنے کا وقت نہیں رہتا۔ یہ صرف روپیہ کمانے میں جُتی رہتی ہیں۔۔۔ اور یہ کام انہیں کسی سے سیکھنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

پھر وہ ایک نظر سیمرا کی طرف دیکھ کر بولا "صرف ایک ہیروئن کو چھوڑ کر۔۔۔ یہ اب تک انڈسٹری میں آنے والی تمام ہیروئنوں سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اسے صرف تھوڑی سی گرومنگ کی ضرورت ہے۔ بڑی ٹھیک ٹھاک چیز بن جائے گی۔"

"تمہارے کہنے سے پہلے میں خود یہی سوچ رہا تھا" میں نے گہری سانس لے کر کہا "اُمید ہے تم۔۔۔ اور وہ تمام دوسرے ہدایت کار، جن کی فلموں میں یہ کام کررہی ہے۔۔۔ اس کی گرومنگ کے لیے بھرپور جدوجہد کررہے ہوں گے؟"

آفاق مسکرایا "اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ہر شخص اسے کچھ نہ کچھ سکھانے کی کوشش کررہا ہے لیکن جن حرکتوں کی طرف آپ کا اشارہ ہے۔۔۔ کم از کم میری اب وہ عمر نہیں رہی کہ اس قسم کی حرکتوں میں دلچسپی لے سکوں۔"

"کیوں۔۔۔ کیا ہوا تمہاری عمر کو؟" میں نے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا "ابھی تو تم پچاس کے بھی نہیں ہوئے۔ تم سے بڑی عمر کے لوگ گاتے پھرتے ہیں۔۔۔ ابھی تو میں جوان ہوں۔۔۔"

"یہ تو اپنے اپنے حوصلے۔۔۔ یا یوں کہئے کہ اپنی اپنی ڈھٹائی کی بات ہے۔" وہ اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا جن میں سفیدی نمایاں تھی "اپنا تو یہ عالم ہے کہ سیمرا کی عمر کی لڑکیوں نے ہمیں انکل کہنا شروع کردیا ہے۔"

زرتاج بولی "یہ تو خیر کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں۔ آپ کو اس سے دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ انکل کہنے کا تو آج کل فیشن ہے۔ آپ تو سیمرا کی عمر کی لڑکیوں کی بات کررہے ہیں۔۔۔ انکل تو آپ کو وہ لوگ بھی کہہ سکتے ہیں جو عمر میں آپ کے برابر یا آپ سے بڑے ہوں۔"

آفاق خوش دلی سے ہنسا اور بولا "یہ تجربہ بھی بارہا مجھے ہوچکا ہے۔"

میں نے کہا "بس۔۔۔ تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے۔ تم سیمرا کی عمر کی لڑکیوں کو کچھ نہ کچھ سکھانے یا ان کی گرومنگ کرنے کی کوششیں جاری رکھو۔"

"سر! کیوں شرمندہ کررہے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ نوجوانی میں۔۔۔ خصوصاً شادی سے پہلے مزاج میں تھوڑی سی رنگین مزاجی تھی۔ وہ کب کی رخصت ہوچکی۔ اب تو کام کے وقت نہایت سنجیدگی کے ساتھ صرف کام سے ہی غرض رکھتے ہیں۔ اسی لیے تو بہت سے نقصانات سے بچے ہوئے ہیں۔"

"اچھا بھئی۔۔۔ تمہاری مرضی!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہم تو تمہارے ہی بھلے کی بات کررہے تھے۔"

آفاق ایک نظر سیمرا کی طرف دیکھ کر بولا "ویسے یہ عمر کا کمپلیکس بھی عجیب چیز ہے۔ ہر عمر اور ہر طبقے کے لوگوں میں موجود ہوتا ہے۔ اب ان موصوفہ کو ہی لے لیجیے۔۔۔ عمر چوبیس پچیس سال سے کم نہیں ہے لیکن پچھلے دنوں انہوں نے اپنی سترھویں سالگرہ منائی ہے جس میں نہایت دیدہ دلیری سے انڈسٹری کے تمام سرکردہ لوگوں کو بُلایا ہوا تھا۔ ان میں سے بعض تو موصوفہ کی پیدائش کے پس منظر اور ولدیت وغیرہ سے بھی اچھی طرح واقف تھے مگر ان کے سامنے بھی موصوفہ کی والدہ نہایت حوصلے سے "بچی" کی عمر سترہ سال بتائے جارہی تھیں اور اس "بچی" کو اگر آپ روپے پیسے، لین دین وغیرہ کے معاملات طے کرتے دیکھ لیں تو اتنے بڑے کاروباری آدمی ہونے کے باوجود چوکڑی بھول جائیں۔ اس کے باوجود والدہ محترمہ کو "بچی" پر بھروسا نہیں ہے۔ وہ اسے بے وقوف کہتی ہیں اس لیے سارے کاروباری معاملات خود طے کرتی ہیں۔ اس سے آپ اندازہ کرلیں کہ والدہ محترمہ کیا چیز ہوں گی۔"

"مجھے زیادہ تجربہ تو نہیں۔۔۔ لیکن میرا خیال ہے فلم لائن میں آنے والی بیشتر چیزیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔" میں نے کہا۔

زرتاج نے کسی ہچکچاہٹ کے بغیر سرسری سے لہجے میں پوچھا "یہ ہے کہاں کی؟ کیا اُس بازار کی ہے؟"

"نہیں۔۔۔ اُس بازار کی تو نہیں ہے لیکن گھر کا ماحول بازار جیسا ہی ہے۔" آفاق نے جواب دیا۔

اس دوران دور کونے میں شاہ نور اور سیمرا بدستور سر جوڑے کھڑے تھے۔ اب شاہ نور شمسی نے ایک ڈائری نکال لی تھی اور اس کا کوئی صفحہ کھول کر سیمرا کو دکھا رہا تھا اور ان پر ہاتھ مار رہا تھا۔ سیمرا کی توجہ اندراجات کی طرف دلا رہا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کسی مسئلے پر ان کے درمیان خاصی بحث وتمحیص جاری تھی۔

"ان کی بحث تو خاصا طول پکڑ گئی ہے۔ شمسی ڈائری کھول کر نہ جانے کیا دکھا رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"تحفوں وغیرہ کا حساب دکھا رہا ہوگا۔ شمسی بڑا حسابی کتابی آدمی ہے۔" آفاق ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "سیمرا گلبرگ لاہور میں جو کوٹھی خریدنے کی بات کررہی تھی اس کے لیے بھی آدھی رقم شمسی نے ہی دی تھی۔ دراصل ابھی سیمرا بہت زیادہ اوپر نہیں گئی ہے۔ شمسی ابھی سے اسے پوری طرح قابو میں کرلینے کی فکر میں ہے۔ وہ لاہور میں اسے ہر طرح سے اپنا پابند بنا کر رکھنے کے چکر میں ہے لیکن سیمرا پردوں پر پانی نہیں پڑنے دے رہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ان فوائد سے بھی ہاتھ دھونا نہیں چاہتی جو اسے شمسی سے حاصل ہورہے ہیں۔ وہ چاہ رہی ہے کہ اس کی چار چھ فلمیں اور ریلیز ہوجائیں اور فلمی دنیا کی اصطلاح میں اس کا بھاؤ اور بڑھ جائے پھر وہ شمسی سے بات کرے کہ پہلے تو جو کچھ لیا دیا گیا اس حساب کھاتے کو بند سمجھو۔ اب نئے سرے سے بات کرو اور بتاؤ تمہاری پیشکشیں کیا ہیں۔ مگر شمسی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہے۔ اس کی عمر زیادہ نہ سہی مگر وہ اس میدان کا پُرانا کھلاڑی ہے۔ وہ ابھی وقت ہی اس چڑیا کے پر باندھنے کی فکر میں ہے جب وہ زیادہ اونچی اڑان کے قابل نہیں ہے۔ دونوں کے درمیان ایک شطرنج سی چل رہی ہے۔ دونوں کے لیے مشغلہ اچھا ہے۔"

اچانک راحیلہ جھرجھری سی لے کر بولی "کتنی بُری بات ہے۔۔۔ ہم لوگ یہاں کھڑے اس بے چاری کے بارے میں غیبت کیے جارہے ہیں۔ ہر ایک کی اپنی ایک دنیا۔۔۔ اپنا ایک لائف اسٹائل ہوتا ہے۔ ہمیں کیا حق پہنچتا ہے کہ کسی کا مذاق اُڑائیں" اتنی دیر کی خاموشی میں اس کے دل کی کایا پلٹ چکی تھی۔ خیالات بدل چکے تھے۔

"ہم مذاق تو نہیں اُڑا رہے۔" آفاق نے جلدی سے سب کا دفاع کیا "ہم تو ذرا اس رنگ برنگی دنیا کے رنگ برنگے کرداروں کی

باتیں کرکے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔"

"میں تو ذرا کچھ اور مہمانوں سے ملنے ملانے جا رہی ہوں۔ مجھے یہاں خاصے پُرانے وقتوں کے کچھ شناسا چہرے بھی نظر آ رہے ہیں۔" راحیلہ بولی۔ اس نے شاید وہاں سے کھسکنے کا بہانہ ڈھونڈا تھا۔

"میں بھی ذرا آنٹی کی خبر لے آؤں۔" زرتاج بولی۔ وہ دونوں کچھ تبدیلی چاہ رہی تھیں۔ دونوں وہاں سے کھسک گئیں۔

ان کے جانے کے بعد آفاق بولا "سیمرا واپس آئے تو میں بھی یہاں سے کھسک جاؤں گا۔ آپ کچھ وقت فلم انڈسٹری کی ایک ٹاپ اسٹار کے ساتھ گزاریں اور دیکھیں کہ ہماری نو وارد فلمی ہیروئنیں کیسی ہوتی ہیں۔"

"سبھی تو ایک جیسی نہیں ہوتیں۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں...... یہ تو درست ہے۔ سب ایک جیسی نہیں ہوتیں۔" آفاق نے تسلیم کیا "ہر ایک کی ایک الگ شخصیت' ایک الگ خاندانی پس منظر' الگ سوچ' الگ مجبوریاں اور الگ حالات ہوتے ہیں لیکن چند باتیں ان میں مشترک ہوتی ہیں۔ وہ آپ محسوس کرلیں گے۔"

اس دوران ایسا دکھائی دیا کہ شاہ نور شمسی اور سیمرا کے درمیان بحث شاید کسی نتیجے پر پہنچے بغیر ختم ہو گئی تھی۔ شاید انہوں نے متنازعہ نکات کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ آفاق نے سیمرا کو پلٹتے دیکھا تو حسبِ ارادہ جلدی سے وہاں سے کھسک لیا۔

سیمرا مہمانوں کی دو تین ٹولیوں کے قریب سے گزر کر مجھ تک پہنچی تو مجھے تنہا کھڑے دیکھ کر اپنی خوب صورت بلوری آنکھوں کو مصنوعی حیرت سے پھیلاتے ہوئے بولی "ارے..... آپ تنہا کھڑے ہیں! وہ تینوں کہاں چلے گئے؟"

"اس محفل میں بہت بڑے بڑے مقناطیس موجود ہیں۔ کوئی کسی کو کھینچ کر لے جاتا ہے..... کوئی کسی کو۔" میں نے جواب دیا "آپ کو بھی تو آخر کوئی مقناطیس کھینچ کر لے ہی گیا تھا۔"

"ارے چھوڑیں چوہدری صاحب! آپ بڑے مزاحیہ ہیں....." وہ اپنی مخصوص مصنوعی ہنسی کے ساتھ بولی جس میں ہلکی سی کرختگی محسوس ہوتی تھی "آپ تو خود بہت بڑے مقناطیس ہیں مگر آپ کو اپنی طاقت کا اندازہ نہیں ہے شاید..... یا پھر شاید آپ وہ دکھا رہے ہیں... کیا کہتے ہیں اسے....." اس نے بڑی ادا سے اپنی مخروطی انگلی اپنی روشن پیشانی پر ماری جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔

"کسر نفسی۔" میں نے کہا۔

"ہاں..... ہاں....." وہ جلدی سے بولی "اور وہ جو مجھے کھینچ کر لے گیا تھا نا..... وہ موٹا شمسی..... وہ مقناطیس نہیں..... وہ تو کمبل ہے کمبل..... میں اس سے جتنا جان چھڑانے کی کوشش کرتی ہوں وہ اتنا ہی چمٹا جا رہا ہے۔ میں تو اس کی فلمیں سائن کرکے پھنس گئی۔"

"لیکن کاروبار کی دنیا میں بہرحال اسے میگنیٹ کہا جاتا ہے..... اور میگنیٹ تو شاید آپ سمجھتی ہی ہوں گی..... مقناطیس کو کہتے ہیں....."

"کیوں نہیں..... میں کوئی ان پڑھ تو نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے میگنیٹ مقناطیس کو کہتے ہیں۔" وہ میری بات کاٹ کر بولی۔

میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ بیسیوں اداکارائیں خود اس سے دوستی کی خواہش مند رہتی ہیں۔"

"رہتی ہوں گی۔" وہ ناک چڑھا کر بولی "میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں کوئی ایسی گری پڑی یا دولت کی لالچی لڑکی نہیں ہوں۔ دولت ہی تو سب کچھ نہیں ہوتی چوہدری صاحب! بندے کی کوئی پرسنالٹی بھی ہونی چاہیے۔" وہ بڑی ادا سے مسکرائی اور اٹھلا کر کچھ اور قریب آگئی "جیسے آپ کی۔"

میں پلک جھپکائے بغیر اس کی شفاف آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ اس کم عمری میں ہی ان آنکھوں میں لومڑی کی سی چمک تھی۔ وہ آنکھیں میرے چہرے پر اپنے الفاظ کا ردِعمل تلاش کر رہی تھیں۔ دیکھ رہی تھیں کہ میں کچھ ریشہ خطمی ہونا شروع ہوا تھا یا نہیں؟

میں نے کوشش کی کہ زیادہ نہیں تو کسی حد تک اس کی خواہش کے مطابق تاثرات دے سکوں گو کہ میرے لیے ایک مشکل کام تھا۔ میرے لیے یہ ایک آزمائش سے کم نہیں تھا کہ کوئی مجھے اچھا نہ لگ رہا ہو اور میں ظاہر کرنے کی کوشش کروں کہ میں اس پر قربان جانے کی تیاری کر رہا ہوں۔ ان لوگوں کے سامنے تو ایسا کرنا میرے لیے اور بھی زیادہ مشکل تھا جن کے تاثرات مصنوعی ہوتے تھے..... الفاظ روح سے خالی..... اور جذبے محض لالچ اور ہوس کی جھوٹی تفسیریں! مزید ستم ظریفی یہ ہوتی ہے کہ ایسا کوئی انسان مجھے عقل سے پیدل اور گھڑے کی مچھلی سمجھ لیتا تھا۔

"کیا واقعی آپ کو میری پرسنالٹی اچھی لگی؟" میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"اب آپ اتنے بھولے نہ بنیں چوہدری صاحب!" وہ اس طرح اٹھلائی کہ اس کا گداز کندھا میرے بازو سے مس ہونے لگا "اب ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ بات ابھی تک آپ کو کسی نے بتائی نہیں ہوگی۔ آپ تو اچھے بھلے بنے بنائے فلمی ہیرو ہیں بلکہ ہماری انڈسٹری میں تو کئی بہت ماٹھے قسم کے لوگ بھی ہیرو بن کر جا چکے ہیں۔ آپ تو ان سے لاکھ درجے بہتر ہیں۔ مجھے تو حیرت ہے کہ آپ نے اپنی فلم کمپنی ہوتے ہوئے اس سلسلے میں نہیں سوچا۔ آپ کو تو بہت پہلے ایسا سوچنا چاہیے تھا۔ آپ نے اپنی نوجوانی کے کئی قیمتی سال ضائع کردیے لیکن خیر..... اب بھی دیر نہیں ہوئی۔"

"میرا تو خیال ہے کہ میں اگر کسی فلم میں ہیرو آیا تو وہ فلاپ

ہو جائے گی کیوں کہ مجھے اداکاری نہیں آتی۔ پرسنالٹی تو بہت سے لوگوں کی اچھی ہوتی ہے لیکن اداکاری کرنا..... خصوصاً کیمرے کے سامنے اداکاری کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"چھوڑیں جی....." وہ ہاتھ لہرا کر بولی اور اس کی سڈول کلائی میں سونے کی دمکتی چوڑیاں کھنکنا اٹھیں "ہماری فلموں میں ہیرو آنے کے لیے کون سا اداکاری کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"نہیں خیر..... ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ میرے خیال میں تو سب اچھے اداکار ہیں۔ حتیٰ کہ آپ بھی۔" میں نے کہا۔

"میری تو خیر اور بات ہے۔" وہ جلدی سے بولی "میں تو فن کی بلندیوں پر پہنچنے کے لیے بہت محنت کر رہی ہوں لیکن میں سچ کہہ رہی ہوں..... جس پوزیشن پر آپ ہیں اس پوزیشن کے آدمی کے لیے فلم میں ہیرو آنا بالکل مشکل نہیں۔ تھوڑا بہت اداکار تو ہر آدمی ہوتا ہے۔ باقی کام ڈائریکٹر آپ سے خود ہی لے لیتا۔ آفاق جیسا ڈائریکٹر آپ کا ملازم ہے۔"

"ملازم نہیں..... وہ میرا کچھ فیصد کا حصے دار ہے۔" میں نے تصحیح کی۔

"تقریباً ملازم ہی سمجھیں جی..... ہے تو آپ کا تابعدار..... آپ کی بڑی تعریفیں کرتا ہے۔ وہ تو اپنے آپ کو آپ کے حکم کا غلام سمجھتا ہے۔"

"یہ اس کی مہربانی ہے۔" میں نے کہا۔

"بہرحال آپ میری تجویز پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اسے مذاق نہ سمجھیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے لمبی لمبی پلکوں کی جھالریں اوپر اٹھاتے ہوئے بولی۔

"آپ نے توجہ دلائی ہے تو میں اب ضرور اس پر غور کروں گا۔" میں نے کہا۔

وہ پھر اٹھلائی "اور آپ کے ساتھ آپ کی پہلی فلم میں ہیروئن میں ہوں گی۔"

"اس وقت تک شاید آپ اتنی مصروف ہو جائیں کہ آپ سے ڈیٹس لینے کے لیے ہمیں آپ کے پیچھے پیچھے پھرنا پڑے۔" میں نے کہا۔

"مصروف تو میں اس وقت بھی کچھ کم نہیں ہوں لیکن آپ کے لیے اب بھی دل و جان سے حاضر ہوں اور آئندہ بھی آپ مجھے اپنے اشارے کی منتظر پائیں گے۔" وہ بڑی روشن مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ اس مسکراہٹ میں اَن گنت دعوتیں پنہاں تھیں۔

پھر اچانک اس نے پوچھا "یہ ہوٹل واقعی آپ کا ہے چوہدری صاحب؟"

"آپ کو کچھ شک ہے؟" میں اس کے سوال پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"نہیں..... نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں....." وہ جلدی سے تشفی آمیز انداز میں میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنے مخصوص کرخت انداز میں ہنس کر بولی "مجھے پتا تو ہے..... آفاق نے مجھے آپ کے بارے میں سب کچھ بتا رکھا ہے..... آپ کے اتنے لمبے چوڑے کاروبار ہیں..... کراچی میں بھی' لاہور میں بھی..... فلم انڈسٹری میں بھی آپ کا پیسہ لگا ہوا ہے..... یہ ہوٹل بھی ہے۔ آپ تو بڑے دولت مند آدمی ہوں گے چوہدری صاحب؟" اس بار اس کی آنکھیں شاید غیر ارادی طور پر پھیل رہی تھیں حالانکہ اس سوال پر وہ یقیناً پہلے بھی کئی بار غور کر چکی ہوگی۔

"کچھ اتنا زیادہ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "اس ملک میں مجھ سے بھی نہ جانے کتنے بڑے بڑے دولت مند پڑے ہیں..... اور وہ بھی نہ جانے کتنی تعداد میں۔" میرے اس جواب میں انکساری بھی تھی اور دیانت داری بھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے....." وہ پُرخیال سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی "لیکن فی الحال ہم صرف آپ کی بات کر رہے ہیں۔ میں بتا نہیں سکتی کہ مجھے آپ سے مل کر کتنی خوشی ہوئی ہے۔ آفاق مجھے اکثر آپ کے بارے میں بتاتے تھے تو میں حیرت سے سوچا کرتی تھی..... کیسا بے نیاز اور بے پروا آدمی ہے..... اس کی فلم کمپنی ہے مگر اسٹوڈیو میں کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی' یقین کریں..... میں اکثر آپ کے بارے میں سوچا کرتی تھی لیکن میں جھوٹ نہیں بولوں گی..... میرے دماغ میں یہ خیال بالکل نہیں تھا کہ آپ ایسے ہوں گے۔ میرے دماغ میں آپ کی بالکل دوسری طرح کی تصویر تھی۔"

وہ اب بہت قریب ہو کر بہت دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ اس کے وجود سے کسی اچھے کلون کی مہک پھوٹ رہی تھی۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے آپ کی بات پر کوئی حیرت نہیں۔ اکثر لوگوں کے ذہن میں میرا امیج حقیقت سے بہت مختلف ہوتا ہے۔"

وہ پلکیں جھپکائے بغیر بولی "آپ کا ہیڈ آفس تو لاہور میں ہے۔ وہاں آنا جانا تو اکثر ہی ہوتا ہوگا؟"

"میں تو زیادہ تر رہتا وہیں ہوں۔ یہ تو اتفاق سے کچھ عرصے سے کراچی میں قیام ذرا طویل ہو گیا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"اب آپ آئندہ جب بھی لاہور آئیں گے' ساری مصروفیتیں چھوڑ کر سب سے پہلے مجھ سے ملیں گے۔" اس نے اپنی دانست میں بڑے پیار بھرے انداز میں حکم سنایا پھر اپنے پتلے سے پرس سے ایک خوب صورت وزیٹنگ کارڈ نکال کر قدرے راز دارانہ سے انداز میں میری طرف بڑھایا "آپ جب بھی آئیں مجھے بس ایک فون کر دیجیے گا۔ آفاق سے بھی میرے بارے میں معلومات کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ ڈائریکٹ مجھے فون کریں۔"

"بہت بہتر۔" میں نے سعادت مندی سے کہا اور کارڈ

میں رکھ لیا۔

اس نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ اپنی دانست میں اس نے پھندا میرے گرد پوری طرح کس لیا تھا اور اب میں اس کے حسن، شہرت کی کشش اور گلیمر کے جال سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اس نے گویا ایک "پراجیکٹ" پر کام مکمل کرلیا تھا اور اب اس کی مضطرب نظریں اِدھر اُدھر پھسلنے لگی تھیں۔ اب شاید اسے مجھ جیسی یا شاہ نور شمسی جیسی کسی اور اسامی کی تلاش تھی لیکن یہاں بیشتر شکلیں اس کے لیے اجنبی تھیں۔ ایک لڑکی...... اور خصوصاً فلم کی صفِ اوّل کی ہیروئن کی حیثیت سے اس کے لیے یہ تو بہت مشکل تھا کہ وہ خود آگے بڑھ کر لوگوں سے ملتی۔

وہ تعارف کی محتاج تو نہیں تھی پھر بھی اس وقت اسے یقیناً ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو رسماً اور باعزت طریقے سے اس کا تعارف بڑی بڑی "اسامیوں" اور "کام" کے لوگوں سے کراتا۔ پہلے شاید بے خیالی کے سے انداز میں یہ فریضہ آفاق انجام دے رہا تھا لیکن آفاق خود یہاں کے لوگوں کو زیادہ نہیں پہچانتا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کے اضطراب سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا "آپ کی والدہ آپ کے ساتھ نظر نہیں آرہیں؟" مجھے اس پر بجا طور پر حیرت تھی۔

اس قسم کی نوجوان اور اُبھرتی ہوئی اداکارائیں...... بلکہ وہ اداکارائیں بھی جو اچھا خاصا "اُبھر" چکی ہوتی تھیں...... اماں، دادی، نانی، باجی یا اس قسم کی کسی اور سرپرست شخصیت کے بغیر تو ہرگز کہیں نہیں نکلتی تھیں۔ نکل ہی نہیں سکتی تھیں۔ کچھ غیر مرئی سے شکنجے انہیں جکڑے ہوتے تھے لیکن سمیرا کی ماں شاید اپنی سونے کی چڑیا کی کارکردگی سے مطمئن تھی اور اسے یہ بھی اطمینان تھا کہ کوئی "باز" اسے اچک کر نہیں لے جاسکتا۔

وہ جلدی سے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے اور ایک مشینی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے بولی "آتے وقت یہاں کے ائرپورٹ پر لاؤنج کی سیڑھیاں اُترتے وقت جوتی کی ایڑی ٹیڑھی ہوجانے کی وجہ سے امی کے پاؤں میں موچ آگئی تھی۔ پھر ہلکی سی حرارت بھی ہوگئی۔ وہ اوپر کمرے میں لیٹی آرام کررہی ہیں۔ شاید ڈاکٹر کی دوا کا اثر ہے کہ کچھ غنودگی میں ہیں۔"

"اوہ...... بڑا افسوس ہوا یہ جان کر کہ یہاں آتے ہی انہیں یہ زحمت اُٹھانا پڑی۔" میں نے رسماً کہا۔

"تکلیف تو جو مقدر میں ہو وہ اُٹھانی ہی پڑتی ہے جی......" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی لیکن پھر اس کی مسکراہٹ کچھ اور واضح ہوگئی۔ وہ دھیمی آواز میں بولی "بہرحال اس سے آپ کے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ جس وقت چاہیں، کمرے میں تشریف لاسکتے ہیں۔"

پھر وہ شوخ سے انداز میں ذرا آنکھ دبا کر بولی "بلکہ جس وقت امی غنودگی میں ہوں اس وقت تشریف لائیں تو زیادہ اچھا ہو۔" وہ

ایک بار پھر اپنے مخصوص انداز میں ہنسی۔ اخلاقاً مجھے بھی اس ہنسی میں کسی حد تک اس کا ساتھ دینا پڑا۔

زندگی میں شاید یہ پہلا موقع تھا کہ میرا ایک جوان اور حسین لڑکی کے پاس کھڑے ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کا تصنع، اس کے لہجے کا کھوکھلا پن اور اس کے ہر لفظ کے پیچھے سے جھانکتا ہوا لالچ تھا۔ میرے خیال میں ایک اداکار کو بھی اتنا اداکار نہیں ہونا چاہیے تھا کہ اس کی زندگی سے حقیقی جذبے بالکل ہی رخصت ہوجائیں، ان کا کہیں ذرا سا سُراغ بھی نظر نہ آئے۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کہیں اِدھر اُدھر ہوجاؤں، کوئی آکر اسے ساتھ لے جائے یا وہ خود ہی کسی طرف کو چل دے اور مجھے ساتھ آنے کی دعوت نہ دے تاہم تہذیب کی منافقت مجھ پر بھی حاوی تھی۔ میں ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائے کھڑا تھا۔ گویا میں بھی ایک اداکارہ کے مقابلے پر اداکاری کررہا تھا۔ میں فیصلہ نہ کرسکا کہ ہم میں سے کون زیادہ ملامت کا مستحق تھا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ میری اداکاری محض اس کا دل رکھنے اور اسے خود آگہی کے رنج سے بچانے کے لیے تھی۔ شاید یہ کم تر درجے کی بُرائی تھی۔

بہرحال میں اُلجھن میں تھا۔ قدرت نے میری مدد کی۔ آفاق نے آکر مجھے اس اُلجھن سے نکالا۔ وہ چار پانچ خواتین و حضرات کی ایک ٹولی کو لے کر آگیا اور بولا "بھئی سمیرا......! یہ لوگ تم سے ملنے کے بڑے شدید خواہش مند ہیں......" وہ سب ہی دولت مند گھرانوں کے جانے پہچانے لوگ تھے ورنہ شاید آفاق انہیں یہاں تک نہ لاتا، راستے ہی میں کہیں جان چھڑا کر آجاتا۔

وہ فرداً فرداً سمیرا سے ان کا تعارف کرانے لگا۔ میں موقع پاکر وہاں سے کھسک لیا۔ ہجوم جتنا بڑھ گیا تھا اور لوگ وہاں جتنے خوش دکھائی دے رہے تھے، اتنی ہی مجھے وہاں گھٹن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ شاید اس لیے کہ مجھے تقریب کا سبب یاد آگیا تھا۔ یہ تقریب بہر ملاقات نہیں تھی۔ یہ تو تقریب بہر جدائی تھی۔ کوئی مجھے الوداع کہہ کر جارہا تھا اور میں نے رنگ، نور، موسیقی اور خوشبوؤں کا یہ میلہ لگا رکھا تھا۔ میں کس کو دھوکا دے رہا تھا؟ دنیا کو یا اپنے آپ کو؟

افسردگی کی ایک لہر میرے سینے سے اُٹھی تھی اور رگ و پے میں پھیل گئی تھی۔ سب چہرے اور روشنیاں میری آنکھوں کے سامنے دھندلا گئی تھیں۔ موسیقی کی دُھن گویا کہیں بہت دور سے سنائی دے رہی تھی۔ میں ہال سے نکل آیا۔

اچانک مجھے سامنے ہی لفٹ نظر آئی۔ اس کا دروازہ نہ جانے کیوں آغوشِ مادر کی طرح وا تھا۔ شاید کوئی اس کا بٹن دبا کر اسی لمحے اِدھر اُدھر ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے کہ دروازہ بند ہوتا، میں قطعی غیر ارادی طور پر لفٹ میں داخل ہوگیا۔ میں نے دسویں منزل کا بٹن

دبا دیا۔ یہ ٹاپ فلور تھا۔ ہوٹل میں اگر مزید فلور ہوتے تب بھی شاید میں سب سے اوپر والا بٹن ہی دباتا۔ میرے لاشعور میں شاید اس وقت زیادہ سے زیادہ بلندی کی طرف جانے کی خواہش رچی ہوئی تھی۔ یہ درحقیقت فرار کی خواہش تھی۔

دسویں منزل پر پہنچ کر میں سیڑھیوں کے راستے چھت پر پہنچ گیا۔ چھت کے ایک حصے پر روف گارڈن پھیلا ہوا تھا۔ اس میں برائے نام حالات میں بھی مدھم روشنی والی بتیاں جلتی تھیں۔ آج وہ بھی بجھی ہوئی تھیں۔ تاہم اندھیرا گہرا نہیں تھا۔ صبح دم کا سا سماں تھا۔ یہاں گویا پو پھٹنے کو تھی۔

میں ایک بالکونی نما حصے میں جا کھڑا ہوا اور نیچے دیکھنے لگا۔ میرے بائیں ہاتھ پر جہازی سائز کے گملوں کی قطار تھی جن میں چھتری نما پودے سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ نیچے سڑک پر ٹریفک بہت کم ہوچکا تھا اور اس بلندی سے گاڑیاں کچھ چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ خاموشی سے بڑے بڑے کھلونوں کی طرح گویا اِدھر اُدھر لڑھکتی جارہی تھیں۔ ان کے انجنوں کی آواز اوپر تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں چند منٹ ساکت کھڑا رہا۔

"آخر تم بھی یہیں پہنچ گئے......!" اچانک میرے قریب سے سرگوشی اُبھری۔

میرے اعصاب کو خفیف سا جھٹکا لگا لیکن میں نے فوری طور پر گردن گھما کر نہیں دیکھا۔ مجھے یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ سرگوشی کرنے والا کون تھا۔ اس آواز کو میں سرگوشی کی صورت میں بھی پہچان سکتا تھا۔ بہت آہستگی سے میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ وہ بڑے سے گملے اور چھتری نما پودے کی اوٹ سے برآمد ہورہی تھی۔ اس طرف گارڈن چیئرز بھی پڑی تھیں۔ ممکن تھا کہ وہ ان میں سے کسی پر بیٹھی رہی ہو۔ وہ راحیلہ تھی!

کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر وہ گویا ہلکورا سا لے کر میرے قریب آگئی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ میرا تخیل مجھے دھوکا تو نہیں دے رہا تھا؟ مگر وہ میرے سامنے واقعی موجود تھی اور ملگجے اندھیرے میں اس کی آنکھیں ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔

"تو تم یہاں پہلے سے موجود تھیں......!" میری آواز شاید سرگوشی سے بھی نیچی تھی۔

"ہاں" اس نے مختصر سا جواب دیا۔ نہ کوئی وضاحت، نہ کوئی جواز۔

میں خاموش رہا اور اپنے دل سے پوچھتا رہا کہ آخر وہ کون سی چیز تھی جو مجھے یہاں لائی تھی؟ لیکن میرے دل نے شاید مجھے کوئی جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرتا رہا۔

"اگر کسی نے ہمیں آگے پیچھے یہاں آتے دیکھا ہو تو وہ یقیناً یہی سمجھے گا کہ ہم طے شدہ پروگرام کے تحت یہاں آئے ہیں۔" راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"حالانکہ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جنہیں چھپ چھپ کر ملنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ہمیں بھلا کسی کا کیا ڈر؟" میں نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا "لیکن مسئلہ صرف اتنا سا ہے کہ اب ہماری تقدیر میں ملنا ہی نہیں رہا۔"

"کیوں نہیں رہا......" وہ آہستگی سے بولی "میں نے تمہیں ملنے سے تو منع نہیں کیا۔"

"کیا فائدہ اب ان ملاقاتوں کا......؟ مجھے ملاقاتوں کی بھیک نہیں چاہیے" میں نے کہا اور ایک بار پھر جھک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔

کئی لمحے خاموشی رہی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ چلی تو

نہیں گئی تھی؟ لیکن اس کے وجود کی دلفریب خوشبو میرے پاس موجود تھی۔ میں نے گردن ذرا ترچھی کر کے دیکھا۔ وہ اپنی جگہ کھڑی تھی اور ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے اپنے حلق میں پھیلی کڑواہٹ کو نگلتے ہوئے کہا "اب میں خود حیران ہوں.... بلکہ شاید پشیمان بھی.... کہ یہ جو نیچے ہنگامہ رنگ و بو برپا ہے.... یہ تماشا میں نے کیوں سجایا ہے...."

میں بہت چاہ رہا تھا کہ اس طرح اٹک اٹک کر نہ بولوں لیکن الفاظ تسلسل کے ساتھ حلق سے برآمد ہی نہیں ہو رہے تھے "راحیلہ! تم نے دیکھا.... نیچے جو مہمان آئے ہوئے ہیں.... سب کے سب کیسے خوش ہیں؟ سب پی پلا رہے ہیں.... کھا رہے ہیں.... ایک دوسرے کو لطیفے سنا رہے ہیں.... قہقہے لگا رہے ہیں.... اور جس نے یہ محفل سجائی ہے اس کا دل کھنڈر کی طرح ویران ہے۔"

وہ اب بھی خاموش تھی۔ شاید اس کا مجھے اپنی صلیبِ سکوت پر مصلوب کرنے کا ارادہ تھا۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی پھر ایک بار اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "تمہیں معلوم ہے اس وقت میرا دل کیا چاہ رہا ہے؟"

"نہیں۔ مجھے نہیں معلوم" اس نے نہایت پرسکون لہجے میں جواب دیا۔ میرے دل پر جیسے اک تازہ خراش پڑ گئی۔ کم بخت کے لہجے میں ذرا سا بھی تو ارتعاش نہیں تھا۔ تاسف، پچھتاوے.... یا خون چوسنے والے ایسے کسی بھی اور جذبے کی رمق تک نہیں تھی۔ شاید میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ اس کے سینے میں تو دل ہی نہیں تھا۔

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ.... اس وقت نیچے جتنے لوگ.... جتنی بھی پی رہے ہیں، میں ان سب سے زیادہ پیوں.... یہیں کھڑے ہو کر پیوں.... صبح کا اجالا نمودار ہونے تک پیتا رہوں.... پھر یہیں سے جام نیچے پھینک دوں جو سڑک پر گرے اور کرچی کرچی ہو جائے.... میں یہیں لیٹ جاؤں اور اسی عالم میں.... اسی خاموشی سے میری روح اس جسم کے قفس سے نکل جائے جتنی خاموشی سے تم میری زندگی سے جا رہی ہو۔"

"تم کوئی فلمی ہیرو ہو جو میری جدائی کے غم میں بہت سی شراب پینا چاہتے ہو؟" اس کے لہجے میں ہلکی سی شوخی تھی۔ شاید اس کا پرسکون رہنا مجھ پر ستم ڈھانے کے لیے کافی نہیں تھا جو اب اس نے اپنے لہجے میں شوخی بھی سمو لی تھی۔ شاید وہ اپنی فتح پر نازاں تھی۔ شاید یہ احساس [illegible] ں کے لیے تسکین کا باعث تھا کہ وہ ایک بہت مضبوط دل مرد کو خون کے آنسو رلا سکتی تھی۔

اس لیے میں نے سوچا یہ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔ عجیب عجیب باتوں میں ان کے لیے فخر کا احساس پنہاں ہوتا ہے.... اور یہ محبت کرنا بھلا کیا جانیں! وفا سے ان کا کیا واسطہ؟ کسی کی چاہ میں خود کو فنا کر لینا ان کے بس کی بات کہاں؟ لوک داستانوں کا کیا ہے.... وہ تو فرضی ہوتی ہیں۔ وہ بھی عورتوں کے چاہنے والوں نے گھڑی ہیں اور انہیں وفاداری کے کتنے اونچے سنگھاسن پر بٹھا دیا ہے۔ مگر حقیقت تو کچھ اور ہے۔ زندگی تو کچھ اور کہتی ہے۔

ایک لمحے کے لیے میرے دانت سختی سے بھنچ گئے۔ زندگی میں پہلی بار خود پر ضبط کرنا مجھے دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ میں جب بولا تو خود اپنی آواز مجھے اجنبی محسوس ہوئی۔

"تم بہت باحوصلہ لڑکی ہو.... جو اس وقت بھی مذاق کر سکتی ہو" میں نے کہا "میرا دل چاہ رہا ہے گھونسا مار کر تمہارا منہ توڑ دوں۔"

"تو پھر توڑ دو.... کس نے منع کیا ہے؟" اس نے اپنا چہرہ آگے کر دیا۔

"مجھ سے قطع تعلق کر کے تمہیں بہت خوشی ہو رہی ہے جو یوں شوخ بننے کی کوشش کر رہی ہو؟" میں نے بھنچے بھنچے سے دانتوں کے درمیان کہا۔

"کس نے کہا ہے کہ میں تم سے ترکِ تعلق کر رہی ہوں؟" وہ اطمینان سے بولی۔

"کیا....؟" میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ بڑی مشکل سے میرے حلق سے آواز نکلی "اور وہ جو تم نے کہا تھا.... تمہارا مطلب ہے کہ تم مجھے.... اور سب ساتھیوں کو چھوڑ کر نہیں جا رہیں؟"

"تم نے یہ یقین کر لیا کہ میں تمہارے بغیر.... ان سب ساتھیوں کے بغیر اب رہ سکتی ہوں؟" الٹا اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"تم نے مجھے یقین کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ میں تو یقین کرنا نہیں چاہتا تھا۔" میں نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں کہا۔

وہ خاموش رہی۔ مسکراتی رہی۔

"تم نے ایسا کیوں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ابتدا میں تو میں نے غصے میں کہا تھا.... اس وقت واقعی میرا ارادہ ترکِ تعلق کا تھا...." وہ دھیمے لہجے میں بتانے لگی "لیکن پہلی ہی رات یہ بات کرنے کے بعد میرے لیے چین سے بیٹھنا، کھانا پینا، سونا سب کچھ حرام ہو گیا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ میں نے سب بکواس کی ہے۔ میں شاید نیا جنم لے کر بھی اس پر عمل نہیں کر سکتی۔ میری زندگی کا جو سیٹ اپ بن گیا ہے.... جس میں تم شامل ہو.... سب ساتھی شامل ہیں.... میرا کام شامل ہے۔ وقتاً فوقتاً سر پر پڑنے والے مسائل شامل ہیں.... ان سب کے بغیر تو اب میں زندگی گزار ہی نہیں سکتی۔"

"پھر تم نے یہ بات مجھے کیوں نہیں بتائی؟ کیوں اتنی دیر تک مجھے اذیت دیتی رہیں؟" میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔

"پھر مجھے مذاق سوجھا۔ میں نے سوچا جس طرح بات چل رہی ہے، چلنے دو۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ تم اتنا اثر لو گے۔ پتا نہیں کیوں

[illegible] اب بھی تمہارے جذبوں پر کچھ بے اعتباری سی ہونے لگتی [illegible].... تم بظاہر کچھ ہرجائی سے آدمی لگتے ہو نا.... ہر عورت.... ہر [illegible].... جس میں ایک خاص قسم کی کشش ہوتی ہے.... اگر تم پر [illegible]ن ہو جائے تو تم اس کی خلوتوں کا ساتھی بننے میں ایک منٹ کی [illegible] تاخیر نہیں کرتے...." وہ اب اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔

"وہ کچھ اور بات ہے.... تمہاری کچھ اور بات ہے۔"

"میری کچھ سمجھ میں نہیں آتا.... تم نے سب باتوں کو گڈمڈ [illegible]ریا ہے نا.... تمہارے فلسفے عجیب ہیں...." وہ بے چارگی سے [illegible]

"جب تک تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی، میرے فلسفے یونہی [illegible] رہیں گے۔ آخر میں انسان ہوں۔ اس دنیا کا جیتا جاگتا [illegible]ان.... کسی قصے کہانی کا کردار نہیں ہوں۔ میرے وجود میں [illegible] فشاں مقید ہیں۔ میں اپنی ہی آگ میں جل کر.... یا پاگل ہو کر [illegible] نہیں چاہتا.... اور میں منافق بھی نہیں ہوں کہ اپنے اوپر [illegible]سائی کا خول چڑھا لوں۔ درپردہ جو چاہے کرتا پھروں۔ کسی کو [illegible] کان خبر نہ ہونے دوں۔ وہ لوگ زیادہ خطرناک اور زیادہ [illegible]لِ اعتبار ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں بھی تو ہوں.... اور عورتیں بھی تو ہیں.... وہ بھی تو زندگی [illegible]ارتی ہیں" وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں [illegible]ساتے ہوئے بولی۔

"عورت کو شاید قدرت نے ضبط کی طاقت زیادہ دی ہے۔ [illegible]یہی وجہ ہے کہ جب کبھی عورت سے یہ طاقت چھن جاتی ہے تو [illegible] وہ کچھ اور ہی چیز بن جاتی ہے.... مرد کو بہت پیچھے چھوڑ جاتی ہے۔ [illegible] تو پھر اس کی گرد کو بھی نہیں پا سکتا۔"

"خیر.... میں اس بحث میں نہیں پڑتی" وہ کندھے اچکا کر بولی [illegible]یں نے تو بہرحال صرف مذاق میں زبان بند رکھی تھی۔ میں تمہارا [illegible]ل دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، یہ سب کچھ عارضی ہے۔ [illegible]یں واقعی چلی بھی جاؤں تو شاید تھوڑے ہی عرصے میں مجھے بھول [illegible]ے۔ بس.... میں ایسی ہی باتیں سوچتی رہتی تھی اور تم سے کچھ نہیں [illegible] تھی۔"

"تو یہ تمہارا مذاق تھا؟" میں نے اپنے سینے میں رکی ہوئی سی [illegible]س کو دھیرے دھیرے آزاد کرتے ہوئے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا اور عجیب سے انداز میں [illegible]رائی۔

تب اچانک میرے اندر جیسے بے پناہ کھنچا ہوا کوئی اسپرنگ [illegible]ٹ گیا۔ میرا ہاتھ مشینی انداز میں حرکت میں آیا اور میں نے اس [illegible] ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا۔ وہ دور جا گری۔ چند سیکنڈ وہ وہیں پڑی [illegible]۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ بے ہوش نہ ہو گئی ہو گو کہ مجھے یہ [illegible] احساس تھا کہ وہ اتنی آسانی سے بے ہوش ہونے والی نہیں تھی۔

نہایت کاہلی آمیز سے انداز میں وہ آہستگی سے اٹھی اور دوبارہ میرے قریب آ گئی۔ اس کا ایک ہونٹ پھٹ گیا تھا اور خون کی پتلی سی لکیر پھسل کر اس کی ٹھوڑی کی طرف جا رہی تھی مگر وہ مسکرا رہی تھی۔ اچانک اس کی زبان کسی درندے کی زبان کی طرح باہر آئی اور اس نے اپنا لہو خود ہی چاٹ لیا۔ اس کی آنکھیں اب بھی نم آلود سی تھیں اور ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں لیکن نہ جانے کیوں اب وہ راحیلہ کی آنکھیں نہیں لگ رہی تھیں۔

بھاری سی آواز میں وہ بولی "مجھے اور مارو.... اس وقت تک اسی طرح مارتے رہو جب تک میرے جسم کی ہڈی ہڈی نہ ٹوٹ جائے۔"

میرے اندر جیسے کوئی اور روح حلول کر گئی تھی۔ میں نے اچانک اور قطعی غیر ارادی طور پر اسے سینے سے چمٹا لیا اور بن بہے آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا "میں یہ بھی تو نہیں کر سکتا۔"

تب وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی انگلیوں کے ناخن میری کمر میں پیوست ہوئے جا رہے تھے اور اس کے جسم کو تشنجی سے انداز میں جھٹکے لگ رہے تھے۔ وہ کچھ اس طرح رو رہی تھی کہ لگتا تھا اب کبھی چپ نہیں ہو گی۔

اسی عالم میں وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی "میں کبھی تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی.... اور نہ ہی کبھی تم مجھے چھوڑ کر جانا.... ورنہ.... ورنہ میں تمہیں قتل کر دوں گی۔"

میں بے اختیار ہنس دیا اور چند لمحے ہنستا ہی رہا۔ اس نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ میرے سینے سے ہٹایا اور رونا بھول کر حیرت سے بولی "ہنس کیوں رہے ہو؟"

"یونہی...." میں نے کہا اور اس کے آنسو پونچھنے لگا پھر میں نے فرمائش کی "اب تم بھی ہنسو۔"

"زبردستی ہے کیا؟" وہ غصے سے بولی۔

"ہاں۔ زبردستی ہے" میں نے جواب دیا۔

وہ ابھی میرے ایک بازو کے حلقے میں ہی تھی۔ اچانک سیڑھیوں کی طرف سے آہٹ سنائی دی پھر ایک ہیولا سا ملگجے اندھیرے میں ہماری طرف بڑھتا دکھائی دیا۔

میں راحیلہ سے ہنسنے کی فرمائش کررہا تھا اور وہ اس بات پر مجھ سے اُلجھ رہی تھی لیکن اندھیرے میں اس ہیولے کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر ہم دونوں اپنی اپنی بات بھول گئے اور ایک دوسرے سے الگ ہو کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے دیکھا وہ ہیولا نسوانی تھا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ وہ کون تھی؟

وہ فلم اسٹار سیمرا تھی!

چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی وہ ہمارے قریب آگئی۔ اس نے بھی یقیناً چند قدم کے فاصلے سے ہی ہمیں پہچان لیا تھا۔ قریب آکر اس نے گہری نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لیا۔ راحیلہ اس وقت تک اپنے آنسو پونچھ چکی تھی اور بالکل نارمل نظر آرہی تھی۔

سیمرا مسکرائی اور اپنے مخصوص جہالت آمیز سے لہجے میں شوخی سے بولی "اوہو... یہاں تو لَو سین ہورہا ہے۔"

راحیلہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا اور گہری سنجیدگی سے بولی "ہم جیسے لوگ تو صرف لَو کرسکتے ہیں بی بی! سین کرنا تو آپ لوگوں کا کام ہے۔"

سیمرا اس کے لفظوں کے اُلٹ پھیر سے ذرا بھی محظوظ ہوئے بغیر قدرے کاٹ دار سے لہجے میں بولی "بس جی... کرنے کو تو سبھی لوگ بہت کچھ کرتے ہیں لیکن بدنام ہم فلمی دنیا والے زیادہ ہیں۔ وہ جو سیانے کہتے ہیں نا... بد اچھا بدنام بُرا... تو وہ شاید ہم فلم لین کے لوگوں کے بارے میں ہی کہا گیا ہے۔"

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ دونوں اُلجھ نہ پڑیں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ سیمرا اپنی جہالت کی وجہ سے اور راحیلہ اپنے تیز دماغ کی وجہ سے کہاں تک جاسکتی تھی اس لیے میں نے جلدی سے مداخلت کی اور سیمرا کو مخاطب کیا "چھوڑیں سیمرا بی بی! دل جلانے والی باتیں چھوڑیں۔ یہ بتائیں، آپ اس طرف کیسے نکل آئیں؟"

بہت کم لوگوں کو ہوٹل کی چھت پر آنے کا خیال آتا تھا اور اس سے بھی کم لوگوں کو یہ معلوم تھا کہ ہوٹل میں روف گارڈن موجود تھا۔ زیادہ تر ان لوگوں کو علم تھا جن کی ہوٹل میں بہت زیادہ آمدورفت رہتی تھی۔

میرا سوال سُن کر سیمرا کے لہجے میں ہلکی سی شوخی لوٹ آئی اور وہ گویا راحیلہ کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے بولی "بس جی... دل کو دل سے راہ ہوتی ہے افضل صاحب! مجھے پتا تھا، آپ یہاں موجود ہیں۔ اس لیے آپ کے پیچھے پیچھے ہم بھی چلے آئے۔"

"لیکن بدقسمتی سے آگے میں بھی موجود تھی" راحیلہ نے لقمہ دیا۔

سیمرا بے پروائی سے بولی "ہوا کریں جی... ہمارے لیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے آپ بے فکر رہیں... ہم آپ کے افضل صاحب کو آپ سے چُرا کر نہیں لے جائیں گے۔"

کہنے کو اس نے یہ کہا تھا لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی ... شاید وہ کہنا چاہ رہی تھی ... آپ تو کیا چیز ہیں جی... ہمارے شکار کے اردگرد تو آپ جیسی دو چار اور لڑکیاں موجود ہوں تب بھی ہم اسے اُچک کر لے جاسکتے ہیں۔ ہم جس شکار پر نظر جمالیں وہ زیادہ دیر تک دوسروں میں اُلجھا نہیں رہ سکتا۔"

تاہم یہ اس کی مہربانی تھی کہ اس نے ترکی بہ ترکی ایسا کوئی جواب دینے سے گریز کیا تھا تاہم اس نے جو جواب دیا تھا وہ بھی راحیلہ کو جلانے کے لیے کافی تھا۔ وہ زہریلے لہجے میں بولی "میں تو کبھی بھی افضل صاحب کے بارے میں فکرمند نہیں رہی بی بی! آپ چاہیں تو بڑے شوق سے انہیں چُرا کر لے جاسکتی ہیں۔ یہ تو ویسے بھی چُرائے جانے کے بڑے شوقین ہیں۔ سرِراہ پڑے رہتے ہیں کہ کوئی انہیں چُرا کر لے جائے... بلکہ چُرانے کی بھی کیا ضرورت ہے... یہ تو صرف اٹھائے جانے کے منتظر رہتے ہیں۔"

پہلی بار سیمرا نے بڑے غور سے راحیلہ کی طرف دیکھا اور پہلی ہی بار مجھے اس کی آنکھوں میں لالچ سے ہٹ کر کسی جذبے کی جھلک نظر آئی۔ شاید وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا اوپر کا خانہ بالکل ہی خالی نہیں تھا۔ وہ کچھ دماغ بھی رکھتی تھی۔ شاید وہ بے چاری کچھ حیران پریشان بھی تھی۔ غالباً اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر میرے اور راحیلہ کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا تھی۔

تاہم اس بار وہ بڑے تحمل سے مسکراتے ہوئے بولی "آپ غصے کی بہت تیز معلوم ہوتی ہیں راحیلہ صاحبہ!"

"اس میں کیا شک ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہ ناشتے میں ڈیڑھ دو کلو انگارے چباتی ہیں اور پانی کی جگہ پیٹرول پیتی ہیں۔"

سیمرا منہ پر ہاتھ رکھ کر زور سے ہنسی "افضل صاحب! آپ واقعی بڑے مزاحیہ ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر بندہ ہنسے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔"

"ابھی تو آپ باتوں پر ہی ہنس رہی ہیں... حرکتیں دیکھیں گی تو اس سے زیادہ ہنسیں گی۔ پچھلے جنم میں یہ سرکس میں جوکر ہوا کرتے تھے" راحیلہ بولی۔

میں نے ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھ کر قدرے بے چارگی سے سیمرا کو مخاطب کیا "اب میں آپ کو یہ نہیں بتاسکتا کہ پچھلے جنم میں یہ میرے ساتھ سرکس میں کیا ہوا کرتی تھیں۔"

راحیلہ نے خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا تو میں نے سہم جانے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "ویسے تو میرے خیال میں ہم لوگ اس جنم میں بھی سرکس میں ہی ہیں کیونکہ میرے خیال میں یہ دنیا محض ایک سرکس ہی ہے اور ہم سب اس میں کام کرنے والے جاندار ہیں۔ شیکسپیئر نے کہا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم اس کے اداکار ہیں۔ میں نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کرلی ہے۔"

"اچھی ترمیم ہے" سیمرا بدستور ہنستے ہوئے بولی۔ اچانک اسے ... شاید راحیلہ کی نظروں کی خونناکی کا احساس ہوا۔ اس لیے شاید اس نے مصلحت کوشی کو بہتر سمجھا اور سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "راحیلہ صاحبہ! اگر آپ کو میری کوئی بات بُری لگی ہو تو میں معافی چاہتی ہوں۔ یہ سب ہنسی مزاح کی باتیں ہیں۔ آپ میری کسی بات کو دل پر نہ لیں۔ انسان کو کبھی کبھی ہنسی مذاق ضرور کرتے رہنا چاہیے۔ چار دن کی زندگی ہے... بلکہ پتا نہیں چار دن کی بھی ہے یا نہیں... جتنی بھی ہے، ہنستے بولتے گزر جائے تو اچھا ہے۔ آپ خوش رہنے کی کوشش کیا کریں۔"

"اس قیمتی مشورے کا بہت شکریہ" راحیلہ زہرخند کے ساتھ بولی "ویسے آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بہت خوش رہتی ہوں... میں جن حالات میں خوش رہتی ہوں ان حالات میں خوش رہنے کا شاید کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔ یہ جو خونخواری ہے، یہ تو یونہی ذرا فضول قسم کے لوگوں کو ڈرانے کے لیے ہے جو موقع محل دیکھے بغیر فضول قسم کی باتیں شروع کردیتے ہیں۔"

سیمرا کی شاید سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس موقع پر کیا کہے۔ وہ یونہی بے مقصد سے انداز میں سرہلا کر رہ گئی۔ تاہم وہ چند لمحے پُرخیال نظروں سے راحیلہ کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے غالباً اس بے نتیجہ سی بحث میں مزید نہ اُلجھنے کا فیصلہ کیا اور مجھ سے مخاطب ہوئی "میں تو یونہی پورا ہوٹل دیکھنے کے شوق میں چھت تک آگئی تھی" اب اس کا انداز صفائی پیش کرنے کا سا تھا۔

"ہمیں آپ کے آنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے بی بی!" میں نے مربیانہ لہجے میں کہا "آپ بڑے شوق سے پورا ہوٹل دیکھیں۔ آپ چھت تو کیا، چھت سے مزید اوپر تک بھی جاسکتی ہیں..."

وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی مگر اس بار انداز کچھ بے جان سا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ویسے آپ کو صحیح طور پر پورا ہوٹل دیکھنے کے لیے دو تین گھنٹے درکار ہوں گے... اور اس کے لیے رات کا وقت مناسب نہیں ہے۔"

"جی ہاں... وہ تو مجھے اندازہ ہوگیا ہے" وہ ملائمت سے بولی "نہ جانے کس کونے کھدرے میں کون کس مصروفیت میں اُلجھا ہوا ہو۔"

کم بخت اتنی کوڑھ مغز نہیں تھی جتنی ہم سمجھ رہے تھے۔ موقع پاتے ہی اس نے اچھا خاصا تیکھا جملہ ٹکا دیا تھا۔ راحیلہ بھلا کہاں چوکنے والی تھی فوراً بولی "ہاں... یہاں تو پھر بھی بعض مصروفیات کے لیے لوگ رات کا انتظار کرلیتے ہوں گے۔ بعض جگہیں تو ایسی ہوتی ہیں جہاں لوگ نہ دن دیکھتے ہیں نہ رات... انہیں جو کرنا ہوتا ہے، کر گزرتے ہیں۔"

سیمرا کو گویا سانپ سونگھ گیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد راحیلہ ملائمت سے بولی "ویسے کبھی کبھی انسان کی آنکھ اسے بڑا دھوکا دیتی ہے۔ بعض چیزوں کا وہ مطلب نہیں ہوتا جو اس کی آنکھ اسے بتاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ بعض انسانوں کا ذہن بڑا محدود ہوتا ہے۔ وہ صرف مخصوص سمتوں میں ... سوچ سکتا ہے۔ اس میں ذہن کا بھی قصور نہیں ہوتا، بے چارے کو تربیت ہی ایسی ملی ہوتی ہے۔ بہرحال... آپ کے لیے میرا مخلصانہ، دوستانہ... مگر حقیر سا مشورہ یہی ہے کہ اپنے ذہن کو وسیع اور کشادہ کرنے کی کوششیں کیجیے۔ بعض باتوں کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو ظاہری طور پر آنکھ سے دیکھنے پر محسوس ہوتا ہے۔ اللہ نے آپ کو اچھی شکل... خاص قسم کی عقل... زندگی کی دوسری تمام نعمتیں اور ہر طرح کے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کے مواقع عطا کیے ہیں۔ دولت کی بارش بھی شروع ہوچکی ہے۔ ابھی مزید بارش ہوگی اور نہ جانے کب تک جاری رہے گی۔ ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ اگر آپ ابھی سے اپنے ذہن کو بھی کشادہ کرنے کی کوششیں شروع کردیں تو بہت ہی اچھا ہو۔ آپ زیادہ فائدے میں رہیں گی۔"

سیمرا دم بخود اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے راحیلہ کو ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا "بھئی، یہ کیا بکواس شروع کردی تم نے۔ انسان کے ذہن اور مکان کے صحن میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ذہن تو ذہن ہوتا ہے۔ کوئی صحن تو نہیں ہوتا کہ جب دل چاہا، کوئی دیوار وغیرہ گرا کر اسے کشادہ کرلیا۔ ذہن تو عمر کے ساتھ ساتھ ہی کشادہ ہوتا ہے۔ ابھی سیمرا بی بی کی عمر ہی کیا ہے۔ میں نے سنا ہے چند دن پہلے ہی تو انہوں نے اپنی سترہویں سالگرہ منائی ہے۔ ابھی سے تم ان کے ساتھ اتنی بڑی بڑی باتیں کیوں کررہی ہو؟ ابھی تو ان کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔"

"مجھے ان کے کھانے اور کھیلنے پر کوئی اعتراض نہیں" راحیلہ کے لہجے میں اب بھی بلا کی نرمی تھی "یہ جتنا چاہیں کھیلیں... اور جو کھیل چاہیں کھیلیں۔ جتنا چاہیں کھائیں۔ اور جو چاہیں کھائیں۔ بہرحال میرے خیال میں تو ذہن کو کسی بھی عمر میں کشادہ کرنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ ذہن اور صحن کو کشادہ کرنے میں میرے خیال میں بہت زیادہ فرق نہیں۔ صحن کو کشادہ کرنے کے لیے اینٹوں کی کوئی دیوار گرانی پڑتی ہے یا فالتو کاٹھ کباڑ ہٹانا پڑتا ہے، ذہن کو کشادہ کرنے کی لیے بُغض، حسد، تنگ دلی اور خودپسندی کی دیواریں گرانی پڑتی ہیں۔ محدود سوچوں کا کاٹھ کباڑ ہٹانا پڑتا ہے۔"

"یہ ہر ایک کے اپنے بس کی بات نہیں ہوتی" میں نے کہا۔

"کوشش تو کرنی چاہیے" راحیلہ نے اصرار کیا۔

سیمرا شاید گھبرا گئی کہ وہ کن فلسفیوں کے درمیان پھنس گئی تھی۔ وہ جلدی سے بولی "میں اب نیچے چلتی ہوں۔ ورائٹی شو شروع ہورہا ہے۔ آفاق نے کہا تھا کہ افضل صاحب کی خاطر میں بھی دو چار منٹ کے لیے اسٹیج پر آجاؤں۔"

"آپ کی بڑی نوازش" میں نے شکرگزارانہ لہجے میں کہا "اس میں شک نہیں کہ آپ فلم والوں کے دم سے ہماری آج کی محفل زیادہ سج گئی۔"

"پھر بھی ... احسان ... " سیمرا کو دوبارہ تیکھے

لہجے میں بات کرنے کا موقع مل گیا "ہمیں تو لوگ طرح طرح کی باتیں سنانے میں ہی لگے رہتے ہیں۔"

"آپ کو سب لوگوں کی باتوں پر دھیان نہیں دینا چاہیے۔ صرف مجھ جیسے قدر دانوں کی بات سننی چاہیے" میں نے اپنے لہجے میں خلوص سموتے ہوئے کہا۔

"بہت شکریہ افضل صاحب! میں اب چلتی ہوں" وہ بولی۔

"بس ہم بھی دو چار منٹ تک نیچے آرہے ہیں۔ ورائٹی شو تو ہمیں بھی دیکھنا ہے۔ خصوصاً آپ کو اسٹیج پر آتے دیکھ کر ہمیں اپنے دل کی دھڑکنوں کو تیز ہونے کا موقع دینا ہے" میں نے جلدی سے کہا۔

اس نے اب گویا از سرِ نو گہری نظر سے میرا جائزہ لیا۔ میری اس بات سے کم از کم اتنا ضرور ہوا کہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر واپس آگئی۔ گو کہ اس کی مسکراہٹ اب بھی تصنع سے بھرپور اور روح سے خالی تھی لیکن اس کے خوب صورت چہرے پر جچتی تھی۔

وہ دھیمے لہجے میں بولی "آپ بڑے شریر ہیں افضل صاحب!" پھر وہ جانے کے لیے مڑ گئی۔

وہ نظر سے اوجھل ہو چکی تو راحیلہ بولی "میں یہاں نہ ہوتی تو وہ کم از کم آخری مکالمہ..... بلکہ شاید سارے ہی مکالمے تمہارے گلے میں باہیں ڈال کر بولتی۔"

"گویا تمہاری موجودگی نے مجھے ایک شاندار موقع سے محروم کر دیا" میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب تمہیں اس کی تلافی کرنی چاہیے۔"

"بکواس مت کرو۔ میں ابھرتی ہوئی فلمی ہیروئن نہیں ہوں جسے بڑی بڑی آسامیوں کی تلاش ہو" وہ کچھ اور پیچھے ہٹ کر کھڑی ہو گئی۔

"اس کا مطلب ہے جذباتیت کی لہر گزر چکی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" اس نے نیچے سڑک پر جھانکتے ہوئے جواب دیا۔

"لعنت ہے ایسی جذباتیت پر" میں نے کہا "اتنا مختصر دورہ..... کم از کم اسے ہارٹ اٹیک جتنا طویل تو ہونا چاہیے تھا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بدستور نیچے دیکھتی رہی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "شاید یہ دورہ ہارٹ اٹیک جتنا طویل تو ہو ہی جاتا بشرطیکہ سمیرا ظالم سماج کی طرح نہ آن پہنچتی" میں نے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی لیکن اس نے خاصی طاقت صرف کر کے ہاتھ چھڑا لیا گو کہ اس میں کشمکش کا احساس نہیں ہوا۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بہت کم تھا لیکن ایک بار پھر یہ اتنا سا فاصلہ مجھے بہت بڑی خلیج کے برابر محسوس ہونے لگا تھا۔ تاہم میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کا وجود ابھی تک کسی انجانی آگ میں جل رہا تھا۔ میں اتنا دور نہیں تھا کہ اس کے وجود کی تپش کو محسوس نہ کر سکتا۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "تمہیں معلوم ہے..... تم نے یہ جو رخصت ہونے اور علیحدگی اختیار کرنے کا ڈراما شروع کیا تھا' یہ میری جان بھی لے سکتا تھا؟ مجھے ہارٹ اٹیک بھی ہو سکتا تھا؟"

"تمہیں ہارٹ اٹیک نہیں ہو سکتا" وہ وثوق سے بولی "تمہارا دل ایک گینڈے کی طرح مضبوط ہے..... اور گینڈے کو کبھی ہارٹ اٹیک نہیں ہوتا۔"

اچانک مجھے پھر سمیرا کا خیال آگیا۔ میں نے شکوہ آمیز لہجے میں کہا "تم نے سمیرا کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ مجھے اس طرح کسی کی دل شکنی اچھی نہیں لگتی خواہ وہ ایک خود غرض اداکارہ ہی کیوں نہ ہو۔"

"یوں کہو کہ تمہیں تو کسی بھی خوش شکل لڑکی کی دل شکنی اچھی نہیں لگتی۔" راحیلہ ناک چڑھا کر بولی "تمہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ لڑکی پہلی فرصت میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر تمہیں اپنے بیڈ روم میں کھینچ لے گی۔ اس لیے تم پھدک پھدک کر اس کی طرف جا رہے ہو۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر" میں نے جلدی سے کہا۔

اس کا منہ بن گیا۔ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سنجیدگی سے کہا "یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ میں پھدک پھدک کر اس کی طرف جا رہا ہوں۔ تمہیں معلوم ہے کہ لڑکی میں اگر تصنع اور خود غرضی' دونوں ہی چیزیں بیک وقت موجود ہوں تو پھر وہ مجھے ہرگز اچھی نہیں لگتی خواہ وہ خوب صورت ہی کیوں نہ ہو۔ میں کم رو لڑکی کی طرف بھی متوجہ ہو جاتا ہوں بشرطیکہ وہ جس جذبے کا بھی اظہار کرے' اس میں سچائی ہو۔ بیڈ روم میں بھی بلائے تو کم از کم سچے دل سے تو بلائے۔ صحیح معنوں میں اس کا مقصد نشاط کی چند گھڑیاں گزارنا ہو۔ کسی کو بے وقوف سمجھ کر بلانا' اس پر جال پھینکنا یا اسے اپنی کسی دوسری غرض کے لیے پھانسنا تو مقصود نہ ہو۔ محبت' نفرت یا طلب..... میں ہر جذبے کو خالص دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"تمہیں تو وہ کسی نہ کسی خالص جذبے کے تحت بلا لے گی کیونکہ تم محض دولت مند ہی نہیں ہو' دیکھنے میں بھی ٹھیک ٹھاک چیز ہو" وہ بولی۔

"یہ تم کہہ رہی ہو؟" میں نے گویا خوشی سے بے حال ہوتے ہوئے کہا "ذرا میری طرف دیکھ کر کہو کہ میں دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک چیز ہوں۔"

"مجھے یہ بات کہنے کے لیے تمہاری طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے" وہ بدستور سڑک کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میں نے تمہیں بہت اچھی طرح دیکھا بھالا ہوا ہے۔ تم میری بات چھوڑ دو اور مجھے خواہ مخواہ ادھر ادھر کی باتوں سے بہلانے کی کوشش بھی مت کرو۔ تمہارا دل چاہ رہا ہے کہ دُم ہلاتے ہوئے اس لڑکی کے پیچھے جاؤ۔ میں تمہیں مشورہ دے رہی ہوں کہ اپنی اس خواہش پر فوراً عمل کر ڈالو۔ میں ہرگز برا نہیں مناؤں گی۔ ویسے بھی تم نے اس

سے وعدہ کیا ہے کہ تم ورائٹی شو دیکھنے نیچے آؤ گے۔ اس بے چاری کی نظریں تمہیں تلاش کر رہی ہوں گی۔"

"میرے لیے تو تم بھی ایک ورائٹی شو ہی ہو" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ورائٹی شو میں بھی کامیڈین کے بیسیوں مرتبہ سنائے ہوئے لطیفے اور سنگرز کے بیسیوں مرتبہ گائے ہوئے نغمے سننے کو ملتے ہیں۔ اگر وہ کوئی نیا لطیفہ سناتے بھی ہیں یا سنگر کوئی نیا نغمہ گاتا بھی ہے تو وہ پرانے سے ہزار درجے بدتر ہوتا ہے۔ تمہارا بھی وہی معاملہ ہے۔ تمہارے پاس بھی وہی جلی کٹی باتیں ہوتی ہیں جو میں ہزاروں مرتبہ سن چکا ہوں۔ اگر تم کوئی نئی بات کرتی بھی ہو تو وہ پہلے سے زیادہ جلی کٹی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ میری تمہارے ساتھ شادی ہو چکی ہے۔"

"اسی لیے تو میں تم سے شادی نہیں کرتی کہ جب شادی سے پہلے تمہارے محسوسات کا یہ عالم ہے تو شادی کے بعد کیا ہوگا" راحیلہ ترکی بہ ترکی بولی "شادی کے تو ایک آدھ سال بعد ہی تمہیں یوں لگے گا جیسے شادی کو صدیاں بیت چکی ہیں۔"

"وہ تو خیر ہوتا ہی ہے۔ شادی خواہ کسی کے ساتھ بھی ہو' یہ تو ہوتا ہی ہے۔ لیکن اب اس کی وجہ سے شادی کا ارادہ تو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کام بہرحال ضروری ہے۔ کرنا ہی پڑے گا۔ آباؤ اجداد کی روایت ہے۔ نبھانی ہی پڑے گی" میں نے مغموم سے انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

"ضرور نبھاؤ' میں نے کب منع کیا ہے" راحیلہ فوراً بولی "بہت سی لڑکیاں تم سے شادی کی خواہش مند ہوں گی اور اگر تم "آسامی خالی ہے" کا اعلان کر دو گے تو اور بہت سی مل جائیں گی۔ ان میں سے جو تمہیں موزوں لگے اس سے شادی کر کے یہ جھگڑا بھی نمٹا ہی دو۔ تم نے خواہ مخواہ اتنا فساد برپا کر رکھا ہے..... بلکہ اگر تم ساری کی ساری لڑکیوں سے شادی کر لو تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بس اس موضوع پر تم میرے کان کھانا چھوڑ دو۔"

"تم نے مجھے پرانے زمانے کا کوئی بادشاہ سلامت سمجھ رکھا ہے جو میں اتنی لڑکیوں سے شادی کر کے حرم آباد کروں گا؟" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا۔

"مزاج تو تقریباً ویسا ہی پایا ہے۔ حالات بھی غریبی دعوے کے کسی بادشاہ سلامت سے ملتے جلتے ہی ہیں۔ تم ایسا کر ہی گزرو۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟ کچھ تو دل کے ارمان نکلیں گے" وہ بولی۔

"میں سمجھتا تھا' میں ہی بکواس کرنے کا ماہر ہوں لیکن کبھی کبھی تم مجھے پیچھے چھوڑ جاتی ہو" میں نے آسمان کی طرف دیکھ کر آہ بھر کر کہا "آؤ اب نیچے چلیں۔ کچھ دیر پہلے تم نے مجھے جو خوش خبری سنائی ہے اس کے بعد مجھ میں اتنا حوصلہ پیدا ہو گیا ہے کہ میں کسی کامیڈین کے سو سال پرانے لطیفے اور کسی سنگر کے ننانوے سال پرانے گیت بھی سن سکتا ہوں۔ اب میں کسی اداس الو کی طرح اس چھت پر ٹنگے رہنے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا۔"

میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور سیڑھیوں کی طرف کھینچا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچائی گویا فیصلہ نہ کر پا رہی ہو کہ اسے میرے ساتھ نیچے جانا چاہیے یا نہیں..... لیکن پھر اس کی خفیف سی مزاحمت معدوم ہو گئی اور وہ میرے ساتھ چل دی۔

نیچے اسی طرح خوشبوئیں اور روشنیاں بکھری ہوئی تھیں۔ مہمان اس ہال میں نشستیں سنبھال چکے تھے جہاں ورائٹی پروگرام کے لیے اسٹیج لگایا گیا تھا۔ پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ خوش شکل سی ایک نو عمر گلوکارہ نور جہاں کے ایک پرانے اور لافانی گانے کو اپنی آواز سے ایک نیا قالب دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ نور جہاں کو کاپی کرنا..... خصوصاً اس کی نوجوانی کے زمانے کی آواز کو کاپی کرنا اس کے بس کی بات تو نہیں تھی تاہم وہ اپنی سی کوشش کر رہی تھی اور حاضرین کو شاید اس کی کوشش پسند آرہی تھی اس لیے وہ ہمہ تن گوش تھے۔

زرتاج' راحیلہ' میرے دوسرے ساتھیوں اور میرے لیے آگے نشستیں مخصوص تھیں لیکن میں نے دیکھا' ان میں سے کوئی بھی آگے نہیں بیٹھا تھا اور ان نشستوں پر کچھ دوسرے ہی لوگ براجمان تھے جنہوں نے غالباً انہیں خالی پا کر موقع غنیمت جانا تھا۔ مجھے معلوم تھا' میں اور میرے ساتھی ایسے موقعوں پر آگے بیٹھنے سے گریزاں رہتے تھے۔

زرتاج مجھے ایک کونے میں سب سے پچھلی قطار میں بیٹھی نظر آئی۔ وہ مسز درانی کے ساتھ بیٹھی تھی۔ اس نے دور ہی سے ہمیں بغلی دروازے سے داخل ہوتے دیکھ لیا تھا اور گہری نظر سے ہمارا جائزہ لیا تھا لیکن جونہی مجھ سے اس کی نظر ملی' اس نے نظر چرالی۔ ان کے پاس دو تین نشستیں خالی تھیں۔ ہم وہیں جا بیٹھے۔

تب زرتاج ہماری طرف دیکھ کر خوش دلی سے مسکرائی اور سر ذرا نیچا کر کے ہماری طرف جھکتے ہوئے سرگوشی میں مجھ سے مخاطب ہوئی "آفاق تمہیں ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔"

"احمق ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "مجھے ڈھونڈ کر اسے کیا ملے گا۔ اسے چاہیے کہ اپنی ہیروئن کو ڈھونڈے جو منہ اٹھائے ادھر ادھر بھٹکتی پھر رہی تھی۔"

"وہ تو اسے مل گئی ہے" زرتاج بدستور مسکراتے ہوئے بولی "اس وقت وہ اس کے پاس ہے۔"

"کہاں؟" میں نے پوچھا۔

"اسٹیج کے پیچھے" زرتاج نے جواب دیا۔

"چلو کوئی بات نہیں..... کچھ دیر اسے دل خوش کرنے دو" میں نے کہا۔

"وہ وہاں دل خوش کرنے نہیں..... ورائٹی پروگرام کے منتظمین کی مدد کرنے گیا ہے۔" زرتاج نے گویا اس کے بارے میں صفائی پیش کی "وہ اپنے ساتھ فلم کے جن آرٹسٹوں کو لے کر آیا ہے' کمپیئر ان سب کو تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے اسٹیج پر بلانا چاہتا

ہے۔ آفاق اس سلسلے میں اس کی مدد کرنے گیا ہے کہ انہیں کس کس بہانے اور کس کس طریقے سے اسٹیج پر بلایا جائے گا۔"

"اچھا.... اچھا...." میں نے طمانیت سے سرہلایا "اگر وہ اسٹیج کے پیچھے چلا گیا ہے تو شاید پروگرام کچھ بہتر ہو جائے۔"

زرتاج سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ تب راحیلہ مجھے گھورتے ہوئے بولی "تمہیں کیا تشویش ہو چلی تھی کہ وہ سمیرا کو لے کر اسٹیج کے پیچھے چلا گیا ہے اور وہاں تخلیے سے فائدہ اُٹھائے گا؟"

"جاہل لڑکی! اسٹیج کے پیچھے تخلیہ کہاں ہوتا ہے؟ اور پھر مجھے سمیرا کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ فی الحال تو وہ میرے بارے میں تشویش میں مبتلا ہے۔ اس کے علاوہ آفاق کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہونے بھی بھلا کیا ضرورت ہے؟ تم نے سنا نہیں تھا کہ وہ بے چارہ کیسی مسکینوں والی گفتگو کر رہا تھا؟ خود ہی کہہ رہا تھا کہ سمیرا کی عمر کی لڑکیاں تو اسے انکل کہنے لگی ہیں۔"

"اس چکر میں نہ رہنا۔ وہ بڑا میسنا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح مسکین بن کر سب کو اپنی طرف سے مطمئن رکھتا ہوگا۔ اندر ہی اندر اپنا اُلو سیدھا رکھتا ہوگا۔ میں نے اخبار میں پڑھا تھا' روس کے فلمی میلے میں بھی وہ سمیرا کے ساتھ گیا تھا اور وہاں ہوٹل میں وہ دونوں ایک ہی کمرے میں ٹھہرے تھے۔ سمیرا کو فلمی میلے میں بھی دراصل اسی کی کوششوں سے لے جایا گیا تھا ورنہ ابھی اس کی یہ حیثیت تو نہیں تھی۔ اس کے علاوہ سمیرا کو فلمی دنیا میں درحقیقت اسی نے متعارف کرایا ہے اور اتنی تیزی سے آگے بڑھنے میں مدد دی ہے۔ اخبار والوں کو مختلف بہانوں سے اس کے گھر پر اکٹھا کرتا رہا ہے۔ اسے کم سے کم وقت میں اتنی زیادہ شہرت دلانے میں آفاق کا بڑا ہاتھ ہے اور ہر وقت' ہر جگہ وہ اس کے ساتھ ساتھ چپکا رہتا ہے؟" راحیلہ نے بڑے ہمدردانہ انداز میں یہ تفصیل میرے گوش گزار کی۔ وہ میرے دائیں طرف بیٹھی تھی جبکہ زرتاج میرے بائیں طرف تھی۔

میں نے ایک نظر زرتاج کی طرف دیکھا اور پھر راحیلہ کو گھورتے ہوئے پوچھا "کیا تم یہ جتانے کی کوشش کر رہی ہو کہ سمیرا میرے دل کی ملکہ ہے اور آفاق کے بارے میں یہ سب کچھ سنتے ہی میں جا کر کوئی چھری تلاش کروں گا اور لے جا کر آفاق کی چھوٹی سی.... معصوم سی توند میں گھونپ دوں گا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" راحیلہ معصوم سی شکل بناتے ہوئے بولی "مجھے تو یہ معلوم ہے کہ اگر تمہارا کسی لڑکی سے [illegible]رف کرایا جائے اور وہ اندھی کانی' لولی لنگڑی نہ ہو تو چند سیکنڈ بعد وہ تمہارے دل کی ملکہ ہوتی ہے۔"

زرتاج خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ پُرتجسس نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر خونخوار نظروں سے راحیلہ کی طرف دیکھا اور کہا "چھت پر تو تم کچھ اور کہہ رہی تھیں۔ اس سے بالکل متضاد قسم کی باتیں کر رہی تھیں۔"

"بلندی پر جا کر میرا دماغ اُلٹ جاتا ہے" وہ اطمینان سے بولی "نیچے آ کر میرا دماغ اصل حالت پر آ جاتا ہے۔"

"دماغ....؟" میں نے حیرت سے دُہرایا "تمہیں بھلا کیا معلوم کہ دماغ کیا ہوتا ہے؟ جس چیز سے انسان پیدائشی طور پر محروم چلا آرہا ہو اس کے بارے میں اتنے وثوق سے بات کرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔"

گو کہ ہم ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنے کے لیے یہ باتیں تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں ہی کر رہے تھے لیکن اتنی نیچی آوازوں سے بھی شاید ہم سے اگلی قطار میں بیٹھی ہوئی دو تین فیشن ایبل قسم کی لڑکیاں ڈسٹرب ہونے لگیں۔ اس وقت تک وہ نوخیز گلوکارہ بُرا سا نغمہ سنا کر اور اس کے بعد ایک انٹرٹینر صرف دو مختصر سے لطیفے سنا کر جا چکا تھا۔ اب نئی نسل کا ایک پاپ سنگر اچھل اچھل کر تقریباً قلا بازیاں کھاتے ہوئے ایک ایسا نغمہ سنا رہا تھا جسے سمجھنا بہت مشکل تھا۔ وہ مریخ کی زبان معلوم ہوتی تھی۔

اس گلوکار کے گانے اور اس کے آرکسٹرا کا شور اتنا تھا کہ اس میں ہم سرگوشیوں میں تو کیا' اگر چیخ چیخ کر بھی بات کرتے تب بھی شاید ہماری آوازیں نقار خانے میں طوطی کی صدا کے مترادف ہوتیں لیکن شاید وہ نوعمر اور فیشن ایبل لڑکیاں یہ ظاہر کرنا چاہتی تھیں کہ وہ اس قسم کی موسیقی کی کتنی بڑی قدردان تھیں اس لیے انہوں نے گردنیں گھما کر بڑی ناگواری سے ہماری طرف دیکھا۔

ایک عمر رسیدہ جوڑا بھی ان کے ساتھ تھا۔ وہ غالباً ان کے والدین تھے۔ بڑے میاں کا شاندار سوٹ' اکڑی ہوئی گردن اور شکن آلود چہرے پر پھیلی ہوئی نخوت بتا رہی تھی کہ وہ دولت مندوں کے ایک خاص طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ریٹائرڈ یا حاضر نوکری کے کوئی بہت بڑے سرکاری افسر ہوں۔

ان میں سے ایک لڑکی جس کے بوائے کٹ بال اسٹیج پر گاتے ہوئے گلوکار سے کہیں چھوٹے تھے' خاصی بلند آواز میں اپنے برابر والی لڑکی سے بولی "اب تو فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی معلوم نہیں کیسے کیسے لوگ گھس آتے ہیں۔"

اس نے یہ بات انگریزی میں کی تھی اور آواز یقیناً جان بوجھ کر اتنی بلند رکھی تھی کہ ہم آسانی سے سن سکیں۔ اس نے صحیح طور پر ہماری طرف دیکھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ انہی لوگوں میں سے معلوم ہوتی تھی جنہیں اپنی ناک سے آگے نظر نہیں آتا لیکن انہیں دوسروں کے بارے میں ریمارکس پاس کرنے کی بہت جلدی ہوتی ہے۔

تاہم میں اس کے تبصرے پر بُرا ماننے کے بجائے اس سے محظوظ ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت میں بہت خوش تھا۔ کچھ دیر پہلے تک جو یخ بستہ اداسی دل و جان پر محیط تھی' وہ اب دور ہو چکی تھی اس لیے اب سب کچھ اچھا لگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ اسٹیج پر بن مانس کی طرح اُچھل کود کرتا ہوا گلوکار بھی اچھا لگ رہا تھا۔ دل کی ترنگ بھی کیا چیز ہے! منظر اور پس منظر سبھی کچھ بدل دیتی ہے۔

راحیلہ اور زرتاج نے بھی یہ تبصرہ سنا تھا لیکن انہیں بھی غصہ آنے کے بجائے ہنسی آرہی تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ان کے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ راحیلہ مجھے کہنی مار کر سرگوشی میں بولی "یہ بات اس نے تمہارے لیے کہی ہے۔"

میں نے زرتاج کی طرف دیکھا اور کہا "میرے خیال میں تو تمہارے لیے کہی ہے۔"

زرتاج سرگوشی میں بولی "ٹھیک ہے.... میرا تعلق دیہات سے ہے.... لیکن میرا خیال ہے تم زیادہ بڑے "پینڈو" ہو۔ تمہارے لیے کہی ہوگی۔"

میں نے راحیلہ کو گھورتے ہوئے کہا "میرے خیال میں تو اس کے لیے کہی ہوگی۔ یہ سلم ہونے کے شوق میں کسی فاقہ زدہ اور چڑچڑ تاتیہ فیملی کی "چشم و چراغ" معلوم ہوتی ہے۔"

"کبھی اپنی شکل دیکھی ہے آئینے میں؟" راحیلہ گھٹی گھٹی آواز میں بولی "لگتا ہے کوئی بیل اپنا ہل چھوڑ کر کھیت سے فرار ہو کر سوٹ زیب تن کر کے ہوٹل میں آ بیٹھا ہے۔ تمہیں تو شاید کوئی اس ہوٹل میں ویٹر بھی نہ رکھے۔"

"اپنے بارے میں بھی خوش فہمی میں مت رہو۔ تمہیں تو شاید کوئی کچن میں برتن دھونے پر بھی ملازم نہ رکھے" میں نے حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔

"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ کچن میں تو میں جب چاہوں کوئی نہ کوئی ملازمت حاصل کر سکتی ہوں" وہ فخر سے بولی۔

"وہ کیسے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"میں آج شام ڈائننگ ہال میں بیٹھی کافی پی رہی تھی تو ہیڈ ویٹر بھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا" راحیلہ نے فخر سے بتایا "وہ خوشی خوشی میری سفارش کرے گا۔"

"اس خوش فہمی میں مت رہنا۔ ہیڈ ویٹر کی نظر کمزور ہے۔ وہ تو بعض اوقات ہال کے کسی ستون کو بھی دیر تک میٹھی نظروں سے دیکھتا رہتا ہے۔" میں نے خبردار کیا۔

زرتاج منہ پر ہاتھ رکھے بے آواز طریقے سے ہنس رہی تھی۔ مسز درانی ہماری طرف جھک کر سرگوشی ہی کے انداز میں بولیں "تم تینوں بہت بدمعاش ہو۔ اگر تم لوگوں کو دراصل پروگرام نہیں دیکھنا ہے اور نہ ہی کچھ سننا ہے تو اٹھ کر باہر ہی چلے جاؤ۔ جن بے چارے دوسرے لوگوں کو دلچسپی ہے' کم از کم انہیں تو سننے دو۔"

"ہاں.... یہ بات ٹھیک ہے" راحیلہ فوراً بولی "آؤ باہر چلتے ہیں۔"

"باہر بھی کیا رکھا ہے" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر جواب دیا "ویسے بھی گانے کے دوران اٹھ کر جانا بُرا لگتا ہے۔ گلوکار کی

حوصلہ شکنی ہوگی۔ نئی نسل کا اتنا مقبول گلوکار ہے۔ لوگ بھی کیا کہیں گے کہ شاید ہم میں اس عظیم موسیقی اور بے مثال گلوکاری سے محظوظ ہونے کی اہلیت ہی نہیں ہے۔"

"اس کا صرف ایک گانا ہٹ ہوا تھا" راحیلہ اسٹیج کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اس کے بعد سے آج تک لوگوں کو تو کیا' شاید اسے خود بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کیا گا رہا ہے مگر بس.... وہ گا رہا ہے.... اور لوگ سن رہے ہیں۔"

"شاید سُن کم رہے ہیں.... دیکھ زیادہ رہے ہیں" زرتاج بولی پھر اس کا لہجہ ترحم آمیز سا ہو گیا "شاید انہیں یقین نہیں آیا کہ موسیقی کسی کو اتنی اذیت میں بھی مبتلا کر سکتی ہے۔ ذرا دیکھو تو بے چارہ کیسا تڑپ رہا ہے۔"

مسز درانی نیچی آواز میں بولیں "میرے پرس میں ایک بہت نوکیلی ہیئر پن موجود ہے۔ اگر تم لوگوں نے اب بھی اپنی بکواس بند نہ کی تو میں وہ ہیئر پن باری باری تم تینوں کی پسلیوں میں گھونپ دوں گی۔"

"پھر تو ہم بھی اسی طرح تڑپنے لگیں گے" راحیلہ نے اسٹیج کی طرف اشارہ کیا۔

"اور لوگ سمجھیں گے کہ ہم گانے والے کا ساتھ دے رہے ہیں" زرتاج نے لقمہ دیا۔

"اچھا بس.... اب بکواس بند...." میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "اب ہم سنجیدگی سے تھوڑا بہت پروگرام دیکھنے کی کوشش کریں گے۔"

"تم اور سنجیدگی....؟" راحیلہ نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا "یہ تو کچھ ایسا ہی ہے جیسے کوئی سرکاری ملازم وعدہ کرے کہ آئندہ وہ دفتر میں تندہی سے کام کیا کرے گا۔"

میں نے بدستور ہونٹوں پر انگلی رکھی اور کوئی جواب نہ دیا۔ ہم سیدھے ہو کر کرسیوں کے پشتوں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور واقعی سنجیدگی سے پروگرام دیکھنے اور سُننے لگے۔ چند لمحے بعد پاپ سنگر رخصت ہو گیا اور کمپیئر نے سمیرا کو بُلا لیا۔ اس کے اسٹیج پر آنے کے انداز میں خاصی متانت اور دلکشی تھی۔ اتنے فاصلے سے اور اتنی روشنیوں کے جھرمٹ میں وہ اپنے سجے سنورے سراپا کے ساتھ ایک پُرکشش شخصیت معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے قریب کھڑے ہو کر باتیں کرنے پر اس کے بارے میں جو تاثر لیا تھا' اب تاثر اس سے خاصا مختلف تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اصل وہی تھا جو میں دیکھ چکا تھا' محسوس کر چکا تھا۔ باقی سب رنگوں' روشنیوں اور ریہرسلوں کے دھوکے تھے۔ بہرحال لوگوں نے بھرپور تالیوں کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔

کمپیئر خود بھی ایک مزاحیہ اداکار اور اسٹیج کا انٹرٹینر تھا۔ اس نے سمیرا سے ذرا چھیڑ چھاڑ کی۔ اس پر دو چار جملے کسے۔ سمیرا نے ترکی بہ ترکی جواب دینے یا تیز و طرار بننے کی کوشش نہیں کی.... اور

یہ اس کے حق میں بہتر ہی تھا۔ وہ دلکشی اور متانت سے مسکراتی رہی اور یوں زیادہ اچھی لگی۔ اس کے موتیوں جیسے دانت تیز روشنیوں میں جھلملاتے رہے۔ شاید آفاق نے بڑی سمجھ داری سے اسے ریہرسل کرائی تھی۔

کمپیئر نے اس سے اس کی فلموں اور پسند ناپسند وغیرہ کے بارے میں دو چار سوالات کیے۔ اس نے بہت سنبھل سنبھل کر نپے تلے انداز میں جوابات دیے۔ اس کی گفتگو سے بھونڈا پن ظاہر نہیں ہوا۔ حاضرین نے اس کے ہر جواب پر تالیاں بجائیں۔

راحیلہ بھی میری طرف دیکھ دیکھ کر استہزائیہ سے انداز میں تالیاں بجارہی تھی۔ پھر وہ مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے بولی "دل میں تولڈو پھُوٹ رہے ہوں گے کہ اتنی گلیمرس.... اتنی مقبول.... اتنی خوب صورت اور اتنے بڑے نام والی شخصیت تمہیں اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کررہی ہے؟"

مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ زرتاج کو سُنانے کے لیے یہ بات کررہی تھی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کیوں مجھ غریب کو خوش فہمیوں میں مبتلا کرنے کی کوشش کررہی ہو۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ مقناطیس کس چیز کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ جو کچھ میرے پاس ہے وہ اگر کسی اور کے پاس ہوگا تو یہ مقناطیس اسے بھی اپنی طرف کھینچنے لگے گا... اور اس سے پہلے بھی کھینچ ہی رہا ہے۔ البتہ تیس پینتیس سال کی عمر میں جاکر جب احساس تنہائی روح میں پنجے گاڑے گا تو پھر شاید اس مقناطیس کی سوچ بدل جائے۔ پھر شاید یہ دولت کے علاوہ بھی کسی چیز کی طرف متوجہ ہونے لگے مثلاً وفا... محبت.... کردار... سچائی اور سوزِدل وغیرہ۔"

"اصل بات کو فلسفے اور نثری شاعری میں گم کرنا یا پھر مذاق میں اُڑانا تمہیں خوب آتا ہے" راحیلہ تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے بولی۔ زرتاج گہری نظر سے ہم دونوں کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہی تھی یا اس وقت اس کے محسوسات کیا تھے۔

اس وقت تک میرا تالیوں کی گونج میں اسٹیج سے رخصت ہوچکی تھی اور وہی نوعمر گلوکارہ لوٹ آئی تھی جسے میں نے پہلے بھی دیکھا تھا۔ وہ ایک بار پھر ایک پرانا اور لازوال نغمہ سنارہی تھی۔ ماحول میں یکدم ٹھہراؤ اور حقیقی نغمگی سی آگئی تھی۔ شاید منتظمین پاپ گانوں اور کامیڈی وغیرہ کی ہنگامہ خیزی کے ساتھ ساتھ اس قسم کے نغمے سُنواکر پروگرام میں ایک قسم کا توازن رکھنا چاہتے تھے۔ یہ توازن بھلا محسوس ہورہا تھا۔ لوگ بھی اس سے محظوظ ہورہے تھے۔ ان کا رجحان کسی ایک طرف نہیں تھا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ حاضرین میں ہر عمر کے لوگ موجود تھے۔

مسز درانی نے ایک بار پھر ہمیں تنبیہہ کی کہ ہمیں اپنی بکواس بند کرلینی چاہیے۔ ہم ایک بار پھر سنجیدہ ہوکر کرسیوں کے پشتوں سے ٹیک لگاکر سیدھے ہوکر بیٹھ گئے۔ اس بار ہم نے خاصی دیر تک کھسر پھسر نہیں کی لیکن میرے لیے ایک اور الجھن شروع ہوگئی۔ میری نامعلوم حِس نے مجھے تنگ کرنا شروع کردیا۔ میری یہ حِس مجھے چھٹی حِس سے بھی پہلے خطرے سے خبردار کرتی تھی۔

میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہاں کیا خطرہ ہوسکتا تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے پورے ہال کا جائزہ لیا۔ سب لوگ نہایت انہماک اور اشتیاق سے پروگرام دیکھ رہے تھے۔ دیواروں کے ساتھ کچھ ویٹر کھڑے تھے۔ وہ بھی پروگرام میں محو تھے۔ وہ بغیر کسی ادائیگی کے، مہمانوں کی کوئی بھی کھانے پینے کی فرمائش پوری کرنے کے لیے وہاں کھڑے تھے لیکن کوئی بھی ان سے کچھ نہیں منگوارہا تھا۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کہیں سے کوئی آنکھ ہماری جانب نگراں تھی لیکن چاروں طرف دیکھنے پر بھی کوئی ایسا شخص نظر نہ آیا جو ہماری طرف دیکھ رہا ہو۔ حتیٰ کہ ہمارے سامنے والی قطار میں بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے بھی گردن گھماکر خشمگیں نظروں سے ہماری طرف دیکھنا بند کردیا تھا۔ شاید انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ہم ڈھیٹ لوگ تھے اور کھسر پھسر سے باز آنے والے نہیں تھے۔

ویسے مجھے یقین تھا کہ ہماری کھسر پھسر ان کے پروگرام سننے اور دیکھنے میں مخل ہرگز نہیں ہورہی تھی ورنہ میں ضرور باز آجاتا۔ مجھے خود کسی کی تفریح یا سکون میں مخل ہونا قطعاً پسند نہیں تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ درحقیقت ڈسٹرب نہیں ہورہی تھیں، انہیں صرف نخرا جھاڑنے کا شوق تھا۔

میری نامعلوم حِس بدستور مجھے بے چین کیے ہوئے تھی اور میں فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ وہ صحیح سگنل ریسیو کررہی تھی یا اس کے نظام میں کوئی خلل واقع ہوگیا تھا۔ میں نے ازسرنو اسٹیج سے لے کر عقبی دیوار تک ہال کا جائزہ لیا مگر مجھے کہیں کسی آنکھ کی موجودگی کا احساس نہ ہوا... اور وہ آنکھ بھی گویا کوئی عام آنکھ نہیں تھی۔ وہ کوئی خباثت بھری، شیطانی سی آنکھ تھی۔ تباہی کا پیغام لانے والی... خباثت پھیلانے والی...!

اچانک میری توجہ بائیں طرف کی دیوار پر گئی۔ وہ درحقیقت ایک چوبی پارٹیشن تھا جو بال روم اور اس ہال کو الگ کرنے کا کام دے رہا تھا۔ اس کا بالائی حصہ کچھ جالی دار سا تھا کیونکہ اس میں پھولوں کے ڈیزائن سے بنے ہوئے تھے۔ دوسری طرف بال روم میں اندھیرا تھا کیونکہ وہاں کوئی نہیں تھا۔ تمام مہمان اس ہال میں موجود تھے اور ورائٹی شو دیکھ رہے تھے۔

عین ممکن تھا کہ پارٹیشن کے جالی دار حصے میں کسی سوراخ سے آنکھ لگائے بال روم سے کوئی ہمیں دیکھ رہا ہو۔ جالی کچھ اس قسم کی تھی کہ اس کے دوسری طرف کسی کی موجودگی کا پتا نہیں چل سکتا تھا۔ خصوصاً جبکہ دوسری طرف تاریکی تھی۔ اس صورت میں تو خواہ دوچار نہیں، بہت سی آنکھیں بھی اس جالی دار حصے پر لگی ہوتیں تو ہم انہیں نہیں دیکھ سکتے تھے۔

میں فوری طور پر فیصلہ نہ کرسکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ میں ہال کے ایک کونے میں پھنسا ہوا تھا۔ بال روم تک جانے کے لیے مجھے خاصا فاصلہ طے کرنا پڑتا اور اگر وہاں واقعی کوئی موجود تھا تو میرے اٹھتے ہی وہ ہوشیار ہوسکتا تھا۔ غائب ہونے کے لیے اسے خاصا وقت میسر آسکتا تھا۔

ٹونی، شفیع شاہ وغیرہ میں سے کوئی بھی ہال میں موجود نہیں تھا۔ شاید انہیں پروگرام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی یا پھر وجہ یہ تھی کہ ان کی ایک دوسرے سے ملاقات کافی دنوں بعد ہوئی تھی اور انہوں نے پروگرام دیکھنے کے بجائے کہیں اور بیٹھ کر گپ شپ کرنے کو ترجیح دی تھی۔

موبائل فون میرے پاس تھا۔ میں نے ان میں سے کسی سے موبائل فون کے ذریعے رابطہ کرنے کے بارے میں سوچا لیکن اس میں بھی مجھے یہی اندیشہ محسوس ہوا کہ میرا موبائل فون کو استعمال کرنا بھی اس نادیدہ ہستی کو خبردار کرسکتا تھا... اور معلوم نہیں درحقیقت کوئی ہستی وہاں موجود بھی تھی یا نہیں؟ میری اس نامعلوم حِس نے مجھے کبھی دھوکا تو نہیں دیا تھا پھر بھی اس قسم کی باتوں کے بارے میں ہمیشہ یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

میں نے زرتاج اور راحیلہ سے اس سلسلے میں بات کرنے کے بارے میں سوچا۔ ہم کھسر پھسر تو بہت دیر سے کرہی رہے تھے۔ مزید کھسر پھسر کسی کو شک میں مبتلا نہیں کرسکتی تھی۔ اس دوران نوعمر گلوکارہ اسٹیج سے رخصت ہوچکی تھی اور ایک انٹرٹینر آچکا تھا جو پرانے لطیفوں کو نئے آہنگ، نئی ترامیم اور اپنے صوتی اثرات کے ساتھ سنارہا تھا۔

میری سوچ بچار کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گئی۔ یہ تجربہ مجھے پہلے بھی دوتین مرتبہ ہوچکا تھا کہ بعض معاملات میں زیادہ دیر تک سوچ بچار میں الجھے رہنا اور کوئی عملی قدم نہ اٹھانا نقصان دہ ہوتا ہے۔ میں کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کرتا رہا اور اچانک ہال میں اندھیرا چھاگیا۔

ایک ساتھ کئی اضطراری سی چیخیں بلند ہوئیں جن میں سے بیشتر نسوانی تھیں لیکن ان میں خوف کی آمیزش نہیں تھی۔ سب لوگ ایک خوب صورت ماحول میں بیٹھے تھے۔ سب کو لاشعوری طور پر ایک بے عنوان سے تحفظ کا احساس تھا۔ آس پاس کہیں کوئی ہنگامہ بھی برپا نہیں تھا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ عین اس وقت اسٹیج پر موجود کامیڈین بجلی کے محکمے کے بارے میں ہی ایک لطیفہ سنارہا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس نے ایک عمدہ لطیفے کو کھینچ تان کر بجلی کے محکمے پر فٹ کردیا تھا اور اس میں باربار بجلی جانے کا ہی ذکر تھا۔ شاید اس لیے چیخوں کے ساتھ بے اختیار کچھ قہقہے بھی بلند ہوئے تھے۔

کوئی بعید نہیں تھا، بعض لوگوں نے سمجھا ہو کہ اس طرح لائٹ جانا پروگرام کا ایک حصہ تھا اور اس لطیفے پر بڑی عمدہ ٹائمنگ کے ساتھ جان بوجھ کر بتی بند کی گئی تھی، شاید کامیڈین اس مرحلے پر زیادہ دلچسپ انداز میں کوئی شگوفہ چھوڑنے والا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ کامیڈین شاید خود چوکڑی بھول گیا تھا۔

اس کے منہ سے صرف "ارے.... باپ رے...." نکلا تھا اور اس کے بعد اسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ شاید اسے فوری طور پر یہ صدمہ بھی ہوا ہو کہ اس کے آئٹم کا تو بیڑا غرق ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

ان سب باتوں سے قطع نظر میں نے اندھیرا ہوتے ہی لوگوں کی قدرے لطف آمیز سی چیخیں معدوم ہونے سے بھی پہلے یہ کام کیا تھا کہ راحیلہ اور زرتاج کو اپنے ساتھ لیتے ہوئے کرسیوں سے نیچے پھسل گیا تھا۔ یہ کسی حد تک ایک اضطراری سی حرکت تھی۔ مجھے صحیح طور پر خود بھی معلوم نہیں تھا کہ میں نے ایسا کیوں کیا تھا۔ جس وقت اندھیرا ہوا اس وقت مجھے اپنے آس پاس تو کیا، دور دور تک بھی کوئی مشکوک شخص دکھائی نہیں دیا تھا۔

راحیلہ اور زرتاج تو میرے دائیں بائیں تھیں اس لیے میں نے دونوں بازوؤں سے انہیں اپنے ساتھ ہی نیچے دھکیل لیا تھا لیکن مسز درانی، زرتاج کے برابر تھیں اور میرا ہاتھ ان تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کرُسی سے نیچے پھسل آئی تھیں یا نہیں۔ مجھے ان کے بارے میں تشویش تھی لیکن میں فوری طور پر ان کے بارے میں جاننے کے لیے کچھ نہیں کرسکا۔

کرسیوں کی قطاروں کے درمیان جگہ زیادہ نہیں تھی۔ میں زرتاج سے سرگوشی میں کہنا چاہتا تھا کہ وہ مسز درانی کو بھی کرسی سے نیچے کھینچ لے۔ میں نے اندھیرے میں جلدی سے زرتاج کا بازو تھامنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن میرا ہاتھ کہیں اور پڑگیا۔ وہ بدک کر دور ہٹی اور میں شرمندگی کے مارے اس سے اصل بات کہنا تو درکنار، معذرت بھی نہ کرسکا۔

ویسے ہوٹل میں لائٹ کا متبادل نظام بھی موجود تھا لیکن جنریٹرز کے آن ہونے اور لائٹ بحال ہونے میں تقریباً دو منٹ لگ جاتے تھے۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ لائٹ پورے ہوٹل کی گئی تھی یا صرف اسی ہال کا کوئی کٹ آؤٹ وغیرہ نکالا گیا تھا۔ لوگوں کی تھوڑی بہت چیخ پکار اور آوازے وغیرہ کسنے کا شور اتنا تھا کہ اس میں الگ سے کسی آواز کو پہچاننا مشکل تھا۔

مجھے تشویش یہ بھی تھی کہ اگر مین لائٹ میں کوئی گڑبڑ کی گئی تھی یا صرف اس ہال کا کوئی کٹ آؤٹ وغیرہ نکالا گیا تھا تب تو شاید جنریٹرز کے ذریعے بھی لائٹ بحال ہونا... بعید از امکان تھا۔ جنریٹرز کا خودکار نظام بھی صرف اس صورت میں آن ہوتا تھا جب باہر سے بجلی کی سپلائی منقطع ہوتی تھی۔ اگر لائنوں میں کوئی گڑبڑ ہوتی یا بیچ میں سے کٹ آؤٹ وغیرہ نکل جاتے تو پھر خواہ جنریٹرز آن ہوجاتے تب بھی بجلی بحال نہیں ہوسکتی تھی۔

لائٹ جانے کے چند سیکنڈ بعد ہی میری آنکھیں اندھیرے سے

مانوس ہوگئیں۔ تیز روشنیاں یکدم آنکھوں کے سامنے سے معدوم ہوجائیں تو خاصی دیر تک تاریکی اصل سے بھی زیادہ گہری محسوس ہوتی ہے۔ دوسرے لوگوں کی کیفیت سے یہی ظاہر ہورہا تھا کہ ابھی انہیں اپنے برابر والوں کا ہیولا تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس وقت مجھے اپنی' راحیلہ کی یا زرتاج کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی مسزدرانی کی تھی۔ میں نے اُچک کر ان کی کرسی کی طرف دیکھا۔ ان کی کرسی خالی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا۔ شاید زرتاج نے یہ عقل مندی کی تھی کہ اپنے ساتھ انہیں بھی نیچے کھینچ لیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میری دھڑکنیں کچھ تیز ہوگئیں۔

مسزدرانی کی کرسی کے مخملیں پشتے میں چار پانچ انچ لمبی کوئی چیز اُبھری ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کیا چیز ہوسکتی تھی اور درحقیقت اسی لیے میری دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔ میں کھڑا بھی نہیں ہونا چاہتا تھا۔ تقریباً بیٹھے بیٹھے ہی مجھے اس چیز تک ہاتھ پہنچانے کے لیے کسی حد تک زرتاج کو رگیدنا پڑا جس کا اس نے خاصا بُرا منایا۔

وہ گھٹی گھٹی سی سرگوشی کے انداز میں غصّے سے کچھ بولی اور اس نے مجھے اپنے اوپر سے دھکیلنے کی بھی کوشش کی لیکن میں نے اس کی کوشش ناکام بنادی اور اس کی خفگی کی پروا کیے بغیر اس چیز تک ہاتھ پہنچا کر ہی رہا۔ اتفاق سے میرے ہاتھ میں اس وقت ٹشو پیپر موجود تھا۔ میں نے اسی سے اس چیز کو تھاما۔ میں براہِ راست اسے ہاتھ میں پکڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ وہ ایک خنجر کا دستہ تھا۔ خنجر کا پورا پھل مخملیں کشن میں سے ہوتا ہوا چوبی تختے میں پیوست ہوگیا تھا۔ کرسی کے پشتے کا پچھلا حصہ چوبی تختے پر مشتمل تھا جبکہ ٹیک لگانے کی جگہ فوم کا اُبھرا ہوا مخملیں کشن بنا ہوا تھا۔

خنجر کی پوزیشن بتارہی تھی کہ جس وقت اسے یہاں پیوست کیا گیا اس لمحے اگر مسزدرانی کرسی پر ہی موجود ہوتیں تو وہ پشتے کے بجائے عین ان کے سینے میں پیوست ہوا ہوتا۔ شاید مسزدرانی کے کرسی سے پھسلنے اور اس خنجر کے پیوست ہونے میں صرف ایک لمحے کا ہی فرق رہا ہو اور شاید مسزدرانی کو اس بات کا علم بھی نہ ہو کہ موت ان کے کتنے قریب سے گزری تھی ورنہ وہ خوف زدگی کے عالم میں ضرور کوئی حرکت کرتیں۔ عین ممکن تھا کہ انہوں نے چیخ ماری ہوتی یا زرتاج سے لپٹی ہوتیں۔

میں نے خنجر کو پشتے سے نکالنے کی کوشش کی تو اندازہ ہوا کہ وہ لکڑی میں اتنا گہرا پیوست تھا کہ اتنی آسانی سے نہیں نکل سکتا تھا۔ اس کے ساتھ کرسی بھی کچھ آگے جھک آئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ روشنی ہو تو مسزدرانی اپنی کرسی کے پشتے میں خنجر پیوست دیکھ کر خوف زدہ ہوجائیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دوسرے لوگوں کی بھی اس پر نظر پڑجاتی اور وہ ان سے بھی زیادہ خوفزدہ ہوجاتے۔

ایسے موقعوں پر ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بات بہت تیزی سے پہنچتی ہے بلکہ دوسرے سرے تک پہنچتے پہنچتے بات کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہال میں خوف وہراس پھیل سکتا تھا۔ تقریب میں بدمزگی تو ہو ہی چکی تھی لیکن اگر اس قسم کی کوئی بات ہوجاتی تو پھر تقریب کا بالکل ہی بیڑا غرق ہوسکتا تھا۔

چنانچہ میں نے کرسی کو تھامنے کے لیے دوسرا ہاتھ بھی بڑھایا۔ زرتاج میرے نیچے مزید دبنے سے بچنے کے لیے دوسری طرف کھسک گئی۔ شاید اس نے جھنجلاہٹ میں میرا بازو بھی نوچا تھا مگر اس وقت مجھے کوئی خاص احساس نہیں ہوا۔ وہ بڑبڑا رہی تھی۔ یقیناً اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کرنا کیا چاہ رہا تھا اور کہاں پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں دل ہی دل میں یہی دعا کررہا تھا کہ وہ اور مسزدرانی اندھیرے میں کچھ نہ دیکھنے پائیں۔

ایک ہاتھ سے کرسی تھام کر دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کے پشتے میں سے خنجر کھینچ لیا۔ میں نے ٹشو پیپر اس کے دستے پر ہی لپٹا رہنے دیا اور خاموشی سے اسے اپنے موزے میں اڑس لیا۔ پھر میں پیچھے ہٹ گیا اور زرتاج کی گویا جان میں جان آئی۔ یہ سب کچھ بھی محض چند سیکنڈ میں ہوگیا۔ لائٹ گئے شاید پورا ایک منٹ بھی نہیں ہوا تھا۔

میری نامعلوم حِس نے خطرے کا سگنل ٹھیک ہی ریسیو کیا تھا۔ وہ محض واہمہ نہیں تھا۔ خطرے کا احساس بھی صرف مسزدرانی کے بارے میں ہوا تھا۔ یہ بھی واہمہ نہیں تھا۔ کسی نے اندھیرے میں بھی بالکل صحیح طرح تاک کر اپنی دانست میں عین ان کے سینے پر وار کیا تھا۔ اس نے شاید سوچا بھی نہ ہو کہ عین اس لمحے وہ کرسی سے نیچے پھسل جائیں گی۔

اب میرا ذہن اصل مسئلے کی طرف گیا۔ یہ بڑا حیران کُن سا سوال تھا کہ خنجر گھونپنے والا کون تھا؟ ہم آخری قطار میں تھے اور ہماری نشستیں ایک کونے میں تھیں۔ ہمارے بائیں طرف اور اگلی قطاروں میں موجود تمام خواتین و حضرات ہمارے ہی مدعو کیے ہوئے معزز مہمان معلوم ہوتے تھے۔ لائٹ جانے سے پہلے جہاں تک بھی میری نظر گئی تھی اور جس حد تک بھی میں مشاہدہ کرسکا تھا اس کے مطابق ان میں سے کوئی بھی اندھیرا ہوتے ہی اتنی پھرتی سے یہاں تک پہنچ کر خنجر کا وار کرنے کا اہل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر تو بڑی عمر کے' دولت مند اور آرام طلب سے لوگ ہی معلوم ہوتے تھے۔

جس پارٹیشن کے بارے میں مجھے شبہ تھا کہ اس کے عقب سے جالی دار حصے سے کوئی آنکھ ہمیں تک رہی تھی اور بال روم میں شاید کوئی موجود تھا' اب اس کے بارے میں بھی سوچنا فضول تھا کیونکہ اگر میرا شبہ درست بھی تھا اور وہاں کوئی موجود بھی رہا تھا تب بھی لائٹ جاتے ہی پلک جھپکنے میں اس کا مسزدرانی کی کرسی کے

قریب پہنچنا اور خنجر گھونپنا ایک ناممکن سا کام تھا کیونکہ اس پارٹیشن کے صرف ایک سرے پر ایک دروازہ تھا اور وہ ہم سے کافی فاصلے پر تھا۔

تو پھر آخر وہ شخص کہاں سے آیا تھا اور کہاں غائب ہوگیا تھا؟

اس نے یہ کام لائٹ جانے کے بعد یقیناً صرف دو تین سیکنڈ کے اندر اندر کیا تھا کیونکہ اس دوران ہی مسزدرانی اپنی کرسی سے پھسل چکی تھیں اور اس وقت تک میری آنکھیں بھی اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئی تھیں۔ اگر میں آس پاس کے لوگوں کو زیادہ صاف طور پر نہیں دیکھ رہا تھا تب بھی ان کی نقل وحرکت تو آسانی سے دیکھ رہا تھا اور مجھے کوئی ایسا شخص نظر نہیں آیا تھا جس کے بارے میں' میں کہہ سکتا کہ وہ مسزدرانی کو خنجر سے ہلاک کرنے کی کوشش کے بعد فرار ہورہا تھا۔

مزید چند سیکنڈ اس اُلجھن میں گزر گئے۔ اچانک مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے اندھیرے میں ایک برق سی لہرائی ہو لیکن یہ برق میری آنکھوں کے سامنے نہیں بلکہ میرے ذہن میں لہرائی تھی۔ مجھے اچانک خیال آیا تھا کہ ہمارے دائیں طرف کی دیوار ہمارے زیادہ قریب تھی اور اس پر چھت سے لے کر فرش تک بھاری اور دبیز پردے آویزاں تھے۔

پردوں نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اس دیوار کو ڈھانپا ہوا تھا کیونکہ اس میں بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکیاں موجود تھیں۔ یہ کھڑکیاں سڑک کی طرف کھلتی تھیں اور ائرکنڈیشننگ کی وجہ سے ہر وقت بند رہتی تھیں لیکن اندر کی طرف سے انہیں کھولنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ محض ایک بٹن دباکر گہرے رنگ کے کسی بھی بھاری اور سلائڈنگ شیشے کو ایک طرف کھسکایا جاسکتا تھا۔

کیا بعید تھا کہ اس دیوار پر پھیلے ہوئے پردوں کے عقب میں کوئی ہمارے عین قریب چھپا رہا ہو اور اب تک کھڑکی کھول کر باہر کود کر فرار بھی ہوچکا ہو؟ یہ خیال مجھے ذرا تاخیر سے آیا تھا۔ قصور دراصل میرا بھی نہیں تھا۔ میں اس ہوٹل کا مالک ضرور تھا لیکن اس کی ساخت سے اتنی اچھی طرح واقف نہیں تھا کہ تمام تفصیلات ہر وقت مجھے ازبر رہتیں۔

میں جلدی سے اُٹھا اور عقب میں کرسیوں کے درمیان سے جگہ بنا کر انہیں پھلانگ کر پیچھے خالی جگہ میں پہنچا۔ وہاں سے ایک سرے سے پردہ اٹھا کر میں اس کے عقب میں گھس گیا۔ اب میں پردے اور دیوار کے درمیان تھا۔ ائرکنڈیشنڈ ہال میں فضا کچھ اور تھی۔ ہوا کے ذرا مختلف قسم کے ایک جھونکے نے مجھے بتایا کہ آگے ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔

تاریک اور یک طرفہ منظر دکھانے والے شیشوں سے باہر مجھے روشنیاں جھلملاتی دکھائی دیں۔ حتیٰ کہ ہوٹل کے دوسرے حصوں میں بھی لائٹ موجود تھی۔ کسی طرح صرف اس بڑے ہال کی لائٹ غائب کی گئی تھی۔ ہال فرسٹ فلور پر تھا۔ میں نے جلدی سے دیوار کے ساتھ ساتھ چند قدم آگے بڑھ کر اس کھڑکی سے جھانکا جس کا شیشہ ایک طرف کو کھسکا ہوا تھا۔

کھڑکی کے نیچے ایک چھجا تھا جو خاصی دور تک چلا گیا تھا۔ یہ چھجا زمین سے تو خاصی بلندی پر تھا لیکن اس سے دو تین فٹ کے فاصلے پر باؤنڈری وال تھی جو خاصی چوڑی تھی۔ تھوڑی بہت مجرمانہ مہارت رکھنے والا شخص بھی چھجے پر اتر کر اس دیوار پر کود سکتا تھا۔ بس ذرا توازن برقرار رکھنے کی ضرورت تھی۔ دیوار پر کودنے کے بعد باہر سڑک پر کودنا آسان ہی تھا۔

میرے خیال میں کوئی اس موقع سے فائدہ اٹھاچکا تھا۔ ذرا آگے ایک چوراہا تھا۔ وہاں سے گاڑیاں کافی تعداد میں گزر رہی تھیں۔ جانے والا ان میں سے کسی بھی گاڑی میں ہوسکتا تھا۔ کچھ گاڑیوں کو میں نے بائیں طرف مڑتے دیکھا۔ ان میں سے ایک گاڑی نے خاصی تیز رفتاری سے موڑ کاٹا تھا۔ شاید اس کے ٹائر چرچرائے بھی تھے۔ ممکن تھا کہ گاڑی چلانے والا کوئی چھچھورا نوجوان رہا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہال میں کام دکھانے والا اس گاڑی میں فرار ہوا ہو۔

اب کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کھڑکی کا شیشہ بند کیا اور اپنی جگہ پر واپس آگیا۔ پھر میں نے سوچا' ایک نظر چوبی پارٹیشن کے دوسری طرف بھی دیکھ لینا چاہیے۔ میں پیچھے سے گھوم کر کرسیوں کی قطاروں کے پاس سے گزرتا ہوا اس کے درمیانی دروازے تک پہنچا مگر وہ دوسری طرف سے بند تھا۔

مجھے ہال کے مین دروازے کی طرف سے گھوم کر دوسرے ہال میں جانا پڑا۔ وہ بال روم تھا مگر اس وقت وہاں بھی تاریکی تھی۔ میں دروازے میں کھڑا نہیں ہوا۔ ہال کے کسی تاریک گوشے سے کوئی سنسناتا ہوا خنجر یا گولی میری طرف بھی آسکتی تھی۔ میں احتیاطاً دیوار سے چپک کر کھڑا ہوا اور چند سیکنڈ وہیں کھڑا رہا۔ اب میری آنکھیں ہال کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دیکھ سکتی تھیں لیکن وہاں کوئی ذی روح موجود نہیں تھا۔

لائٹ بحال کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع ہوچکی تھی۔ بہت سے لوگ تیزی سے اِدھراُدھر لپکتے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر ایمرجنسی لائٹس اِدھراُدھر چکرانے لگیں۔ ہوٹل کے عملے کے لوگ انہیں ہاتھوں میں لٹکائے اِدھراُدھر آجارہے تھے۔ ان سے اچھی خاصی روشنی ہوگئی۔ میرے اندازے کی تصدیق اب ہلکی سی روشنی میں بھی ہوگئی۔ بال روم میں کوئی موجود نہیں تھا۔

میں ست قدموں سے آڈیٹوریم کی طرف واپس چل دیا۔ جو کچھ ہوا تھا اس میں یقیناً دو آدمیوں کا ہاتھ تھا۔ ایک نے لائٹ میں گڑبڑ کی تھی۔ دوسرے نے خنجر استعمال کیا تھا۔ لائٹ میں گڑبڑ کرنے والا شاید کسی اور راستے سے نکلا تھا اور دوسرے کے فرار کا شاید کوئی اور طریقہ طے تھا۔

میں ہوٹل کے حفاظتی انتظامات سے مطمئن نہیں تھا لیکن

سیکیورٹی والوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ وہ روایتی انداز میں تو اپنے فرائض تندہی سے ہی انجام دیتے تھے۔ کوئی مشکوک اور مسلح شخص تو اندر نہیں آسکتا تھا لیکن ہوٹل بہرحال ایک عوامی جگہ تھی۔ لوگوں کی آمدورفت جاری رہتی تھی۔ راستے بھی بہت سے تھے۔ خصوصاً تقریبات وغیرہ کے دوران معزز افراد کے روپ میں دو ایک ماہر قسم کے آدمیوں کا اندر کہیں پہنچ جانا اور چند سیکنڈ میں کوئی کارروائی کرکے فرار ہو جانا بہت زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

ویسے یہ کام بہت آسان بھی نہیں تھا۔ اس میں رسک تو موجود تھا لیکن جرائم پیشہ افراد رسک تو بہرحال لیتے ہیں۔ ہم سیکیورٹی بہت زیادہ ٹائٹ کرکے معزز مہمانوں کی ناراضگی بھی مول نہیں لے سکتے تھے۔ ہمارے ہاں ایک رجحان یہ بھی ہے کہ لوگوں کو خود ان کی اپنی حفاظت کے سلسلے میں کوئی زحمت دی جائے تو وہ بُرا مناتے ہیں۔

واپس ہال کے دروازے کی طرف جاتے وقت مجھے سیکیورٹی انچارج داؤد نظر آیا۔ وہ سیڑھیوں کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ میں نے آواز دے کر اسے روکا اور اس کے قریب جاکر اس کی ٹارچ بجھادی۔ اب ہم ملگجے سے اندھیرے میں تھے۔ میرے موزے میں اڑسا ہوا برہنہ خنجر ذرا سی بھی تیز نقل و حرکت میں مجھے نقصان پہنچا سکتا تھا یا نکل کر گر سکتا تھا۔

میں نے وہ خنجر نکال کر داؤد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اسے کہیں حفاظت سے رکھ دینا۔ امید تو نہیں ہے کہ اس پر انگلیوں کے نشانات ہوں گے لیکن بعد میں بہرحال چیک کروا کر دیکھ لیں گے۔" خنجر کا دستہ ٹشو پیپر میں ہی لپٹا ہوا تھا۔

اس نے حفاظت سے اسے اپنی یونیفارم کی بڑی سی جیب میں رکھ لیا تاہم میں نے کم روشنی کے باوجود محسوس کیا کہ اس کا منہ لٹک گیا تھا "سر! کیا کچھ ہو گیا ہے؟" اس نے نیچی آواز میں پوچھا۔ لہجے میں تشویش بھی تھی اور شرمندگی بھی۔

"یوں سمجھو کہ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ قسمت اچھی تھی" میں نے جواب دیا اور ہال کی طرف بڑھ گیا۔

آڈیٹوریم کے طور پر استعمال ہونے والے ہال میں دیواروں پر چند ایمرجنسی لائٹس آویزاں کردی گئی تھیں جن کی وجہ سے خاصی روشنی ہو گئی تھی۔ میں اپنی نشست پر واپس پہنچا تو زرتاج عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟ تمہاری حرکات وسکنات کچھ مشکوک سی ہیں۔"

"یہ کون سی کوئی نئی بات ہے" میں نے بے پروائی سے جواب دیا "میری حرکات وسکنات میری پیدائش کے کچھ عرصے بعد سے ہی مشکوک چلی آرہی ہیں۔"

"بے شک.... بے شک..." زرتاج نے متانت سے سرہلایا "اور زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ تمہیں اس پر کوئی شرمندگی بھی نہیں ہے۔"

راحیلہ خاموش تھی۔ اسے گویا کچھ پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ گویا صورت حال کو سمجھ رہی تھی۔ مسز درانی بھی اب اپنی نشست پر موجود تھیں اور دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھیں لیکن ان کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ شاید بے چاری ان خاتون کو گمان تک بھی نہیں تھا کہ چند لمحے پہلے انہیں موت چھو کر گزری تھی۔

میری یہ خوش فہمی جلد ہی دور ہو گئی۔ اچانک ہی انہوں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا "کیا وہ ہاتھ نہیں آیا؟"

"کون؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی.... جس نے کسی چیز سے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی؟" وہ نیچی آواز میں بولیں۔

"میرا خیال ہے آپ کو غلط فہمی ہوئی تھی" میں نے انہیں بہلانے کی کوشش کی۔

"اب تم بھی مجھے گولیاں دینی شروع کردیں" انہوں نے بے اختیار ایک آہ بھری۔ ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آئے۔

پھر وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے ذرا ایک طرف کو ہٹ کر گردن گھماتے ہوئے...... پشتے کے گدیلے حصے پر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے بولیں "یہ کیا ہے؟"

وہ خنجر پیوست ہونے کا معمولی سا شگاف تھا۔ خنجر نکل جانے کے بعد کشن میں اس کا شگاف نمایاں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے افسوس زدہ سے لہجے میں کہا "ہوٹل کا معیار کچھ متاثر ہوتا جارہا ہے۔ میرے آدمیوں کا اب باریکیوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں رہا۔ معلوم نہیں یہ کپڑا کب اور کس طرح پھٹا ہوگا۔ بہرحال اسے ٹھیک کیا جانا چاہیے تھا یا کرسی تبدیل کی جانی چاہیے تھی۔"

مسز درانی سیدھی ہو کر بیٹھ گئیں۔ انہوں نے سخت نگاہوں سے مجھے گھورا اور سپاٹ مگر نیچی آواز میں بولیں "اب تم نے بھی مجھے بچوں کی طرح بہلانا شروع کردیا۔ اس کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں جتنی شکل سے نظر آتی ہوں۔"

یہ شاید ان کی انکساری تھی کہ وہ شکل سے بے وقوف نظر آنے کا اعتراف کررہی تھیں ورنہ میری ان کے بارے میں یہ رائے ہرگز نہیں تھی کہ وہ شکل سے بے وقوف نظر آتی تھیں۔ مجھے تو اب یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ بہت گہری عورت تھیں۔ ان کی شخصیت کی تہ تک پہنچنا خاصا مشکل کام تھا۔

مجھے خاموش پاکر وہ گویا تسلی دیتے ہوئے بولیں "اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد میں خوف زدہ ہو کر ہسٹیریائی انداز میں چیخیں مارنے لگوں گی.... تو ایسی کوئی بات

نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ میں اتنی بزدل عورت نہیں ہوں۔ میں نے تم سے اور زرتاج سے مدد ضرور طلب کی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں خوف سے مری جارہی ہوں۔ ظفر کے چلے جانے کے بعد سے زندگی میری نظر میں اتنی زیادہ اہم نہیں رہی۔"

ان کی یہ مختصری تقریر دل پذیر سن کر بھی میں فیصلہ نہ کرپایا کہ حقیقت حال کا اعتراف کرلوں یا نہیں؟ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولیں "اندھیرا ہوتے ہی تم لوگوں کے ساتھ میں بھی غیر ارادی طور پر کرسی سے نیچے پھسل گئی تھی لیکن مجھے بہرحال اپنے قریب کسی کی نقل وحرکت کا احساس ہوا تھا۔ پھر ہلکی سی 'ٹھک' کی آواز آئی تھی۔ بھاری کرسی کے پائے میری کمر سے ٹکرائے تھے گویا کرسی اُلٹتے اُلٹتے بچی تھی۔ اس کے بعد جب ذرا روشنی ہوئی تو ہم نے تمہیں غائب پایا اور میں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے وقت یہ نشان دیکھا۔ کیا تمہارے خیال میں، میں اتنی بے وقوف ہوں کہ ان سب باتوں کا مقصد نہ سمجھ سکوں؟"

"نہیں.... " میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں بھلا آپ کو بے وقوف کیسے سمجھ سکتا ہوں؟ برسوں پہلے میں اس نتیجے پر پہنچ چکا ہوں کہ اس ملک کا سب سے بے وقوف انسان میں ہوں۔"

اس موقع پر راحیلہ نے زبان کھولی۔ وہ دھیمے لہجے میں نہایت سنجیدگی سے بولی "ٹھیک ہے.... انسان کو حقیقت پسند ہونا چاہیے لیکن اب اتنی بھی کیا انکساری کہ انسان ملکی سطح پر اپنے احمق ہونے کا اعتراف کرنے لگے۔ تم اپنے آپ کو صرف شہر کا احمق ترین انسان کہہ کر بھی کام چلا سکتے ہو۔ یہ بھی کافی بڑا اعزاز ہے۔"

"تم اپنی لپ اسٹک زدہ چونچ بند رکھو" میں نے سرگوشی میں اسے ڈانٹ پلانے کی کوشش کی "اس وقت سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔"

"اچھا.... واقعی....؟" اس نے استہزائیہ انداز میں آنکھیں پٹپٹاتے ہوئے تصدیق چاہی۔

میں نے دوبارہ مسز درانی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "آپ خوش قسمت عورت ہیں۔ کل اور آج.... صرف دو دنوں میں دو مرتبہ موت آپ کو چھوتی ہوئی گزر گئی ہے اور آپ کو خراش تک نہیں آئی۔"

ان کے ہونٹوں پر دلیرانہ سی مسکراہٹ ابھری "جب تک میرا وقت نہیں آئے گا تب تک مجھے کون مار سکتا ہے۔"

زرتاج نے گویا انہیں چھیڑا "اگر آپ کا ایمان اتنا ہی مضبوط ہے تو آپ نے میرے توسط سے افضل صاحب سے مدد کیوں طلب کی؟"

"اتمام حجت کے لیے" مسز درانی نے اطمینان سے جواب دیا۔

"آسان اردو میں گفتگو کیجیے" زرتاج نے ترچھی نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"میرا مطلب ہے کہ تقدیر اپنی جگہ ہے" مسز درانی بولیں "عقیدہ میرا وہی ہے لیکن جان کی حفاظت کے لیے ہر ممکن تدبیر کرنا بھی بہرحال میرا فرض ہے۔ میں بے خوفی کے ساتھ زندہ رہنا چاہتی ہوں لیکن ایسا طرزعمل بھی اختیار کرنا نہیں چاہتی کہ میری موت صریحاً خودکشی نظر آئے۔"

"ٹھیک ہے.... تو پھر ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر یہ ہے کہ آج رات سے آپ اسی ہوٹل میں قیام کریں گی" میں نے کہا "میں نے آپ کا گھر دیکھا نہیں.... لیکن مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا ہے کہ اس کا محل وقوع کیا ہے اور وہ کس قسم کا مکان ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ اپنے دشمنوں کے لیے آسان شکار بن جائیں۔"

"یہ نہیں ہو سکتا" وہ بلا تامل فیصلہ کن لہجے میں بولیں۔

"کیوں نہیں ہو سکتا؟" زرتاج نے آنکھیں نکالیں۔

"میں ایک رات کے لیے بھی اپنا گھر چھوڑ کر نہیں بھاگوں گی۔ یہ بات میں پہلے ہی بتا چکی ہوں اور یہ بھی بتا چکی ہوں کہ میں بڑی ضدی عورت ہوں۔ درانی ہوں۔ میری رگوں میں شاہی خون دوڑ رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ جب میں مروں تو کچھ ایسا نظر آئے جیسے میں موت سے ڈر کر بھاگتے بھاگتے ماری گئی ہوں۔"

میں نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "میں نے مان لیا مسز درانی!"

"کیا مان لیا؟" وہ یکدم حیران ہو کر بولیں۔

"یہی کہ آپ مجھ سے بھی زیادہ عجیب انسان ہیں" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ مسکرادیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ ان کی مسکراہٹ روح سے خالی تھی۔ اچانک لائٹ آگئی۔ اسٹیج اور ہال تیز روشنیوں سے جگمگا اٹھا۔ لائٹ بہ مشکل تین چار منٹ غائب رہی تھی لیکن کم از کم مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت وقت گزر گیا تھا اور اس دوران بہت کچھ ہو گیا تھا۔ لائٹ آنے پر ایک بار پھر شور سا برپا ہوا۔ اس وقت تک اسٹیج تقریباً اندھیرا رہا تھا اور بہت سے فنکار وہیں آکر کھڑے ہوگئے تھے۔ جمگھٹا سا لگ گیا تھا۔ لائٹ آتے ہی وہ سب اسٹیج کے ونگس کی طرف بھاگے۔ صرف وہی فنکار اسٹیج پر رہ گیا جو لائٹ جانے سے پہلے لطیفہ سنا رہا تھا۔

"....ہاں تو میں کہہ رہا تھا...." اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "لائٹ جانے پر ایک صاحب نے بجلی کے محکمے کو فون کیا...."

"یہ لطیفہ مت سناؤ.... لائٹ پھر چلی جائے گی" کسی نے آواز کسا۔

"نہیں.... اب لائٹ نہیں جائے گی" کامیڈین نے وثوق سے جواب دیا "اب لائٹ گئی تو میں خود بھی گھر چلا جاؤں گا۔"

"وہاں بھی لائٹ گئی ہوئی ہوگی" ایک اور آواز آئی۔ شاید کچھ لوگ کامیڈین کے مقابلے میں خود بھی کامیڈین بننے پر تلے ہوئے

تھے۔

"یہ تو خیر اچھا ہوگا۔ میں بھی یہی چاہتا ہوں" کامیڈین نے مائیک پر جواب دیا۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔ بڑی مشکل سے کامیڈین اپنے لطیفے کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑنے میں کامیاب ہوا۔

کچھ دیر بعد سیکیورٹی انچارج داؤد ہال میں آیا۔ اس کی متلاشی نظریں مجھ تک آن پہنچیں۔ پھر وہ میرے عقب میں آکر مجھے اطلاع دینے کے انداز میں سرگوشی میں بولا "سر! کسی نے دیوار میں چھپا ہوا شیشے کا باکس توڑ کر اس فلور کا الیکٹرانک مین سوئچ خراب کردیا تھا۔ مینٹیننس والوں نے فی الحال لائن ڈائریکٹ کردی ہے۔"

"کوئی مشکوک آدمی بھی ہاتھ آیا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر!" اس نے قدرے خجالت سے جواب دیا۔

"بس... تو پھر بجلی کے بارے میں میری معلومات میں اضافہ مت کرو" میں نے دوبارہ اسٹیج کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے نرمی سے کہا۔ وہ کھسیانے سے انداز میں واپس چلا گیا۔

اس کے بعد ورائٹی پروگرام خیروعافیت سے جاری رہا۔ رات کے بارہ بجے تو زرتاج اٹھ کھڑی ہوئی اور نیچی آواز میں بولی "مجھے اب اجازت دو۔"

پروگرام ابھی جاری تھا اور لوگ محظوظ ہو رہے تھے۔ مسز درّانی بھی زرتاج کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا "پروگرام تو پورا دیکھ لیتیں؟"

"جتنا دیکھ لیا' اتنا ہی کافی ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولیں "ایک مدت بعد کسی پروگرام میں اتنی دیر تک بیٹھی ہوں۔"

راحیلہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور ہم ہال کے عقبی دروازے کی طرف چل دیے۔ میں نے مسز درانی سے پوچھا "آپ بھی زرتاج کے ساتھ ہی جائیں گی؟"

"ہاں۔ میں آئی بھی تو اسی کے ساتھ تھی" انہوں نے جواب دیا۔

"اگر آپ ہوٹل میں نہیں ٹھہر سکتیں تو کم از کم زرتاج کے گھر ہی ٹھہر جائیں۔ وہاں آپ کچھ لوگوں کے درمیان تو رہیں گی" میں نے ایک بار پھر انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ مہربانہ انداز میں مسکرائیں پھر گویا کسی بچّے کو سمجھاتے ہوئے بولیں "تمہیں میرے گھر پر میرے تنہا رہنے کے بارے میں زیادہ فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ میرا گھر کافی محفوظ ہے۔ میری مرضی کے بغیر اس میں کوئی داخل نہیں ہوسکتا۔ میں نے کافی حفاظتی انتظامات کیے ہوئے ہیں۔"

وہ واقعی ایک ضدی عورت تھیں۔ میں نے اصرار نہیں کیا البتہ اتنا ضرور کہا "کل فون کرکے اپنی خیروعافیت کی اطلاع دے دیجیے گا۔"

"ہاں... زندہ رہی تو ضرور اطلاع دے دوں گی" وہ مسکرائیں۔ ضدی ہونے کے ساتھ ساتھ وہ عجیب بھی تھیں۔ ان کی بات سے کچھ ایسا لگا تھا جیسے وہ اپنے زندہ رہنے کے بارے میں زیادہ پُریقین نہیں تھیں لیکن دوسری طرف زندگی اور موت کے بارے میں ان کا عقیدہ بھی بڑا مضبوط تھا اور وہ اپنی ضد بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔

میں کہے بغیر نہ رہ سکا "ایک طرف آپ کے ذہن میں شک بھی ہے کہ معلوم نہیں کل تک زندہ رہوں یا نہ رہوں... دوسری طرف آپ کسی کی بات ماننے کے لیے بھی تیار نہیں۔"

"میں یہ بات اس لیے تھوڑا ہی کہہ رہی ہوں کہ مجھے جبّار جیلانی کی طرف سے خطرہ ہے" وہ گویا وضاحت کرتے ہوئے بولیں "جبار جیلانی یا اس جیسا کوئی اور شخص کسی کا دشمن ہو یا نہ ہو... وہ بھلا یقین سے کیسے کہہ سکتا ہے کہ کل تک وہ زندہ ہوگا یا نہیں؟ اور اگر کوئی ایسا دعویٰ کرتا ہے تو وہ سخت احمق ہے۔ بھروسا تو اگلی سانس کا بھی نہیں ہوتا نا؟"

میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ زرتاج نے استہزائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کندھے اُچکا کر بولی "تم آنٹی سے باتوں میں نہیں جیت سکتے۔ بھلا کسی خبطی سے کوئی کیسے جیت سکتا ہے!"

"کیا...؟" مسز درانی نے آنکھیں نکالیں اور مصنوعی خفگی سے بولیں "تم مجھے میرے منہ پر خبطی کہہ رہی ہو؟" پھر انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا "توبہ... توبہ! کیا زمانہ آگیا ہے۔ اب تو نئی نسل موقع کا بھی انتظار نہیں کرتی کہ بڑے بوڑھوں کو پیٹھ پیچھے ہی خبطی کہہ لیں۔ اب تو صاف منہ پر ہی کہہ دیتے ہیں۔ کیا تم نے بھی وہ کتابیں پڑھ لی ہیں جن کے بارے میں اکبر الہٰ آبادی نے شعر کہا تھا؟"

"کون سا شعر؟" زرتاج نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"ارے وہی مشہورِ زمانہ شعر۔

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں"

"نہیں۔ میں نے وہ کتابیں تو نہیں پڑھیں لیکن آج کل میں تھوڑے بہت ٹی وی پروگرام دیکھ رہی ہوں۔ شاید ان کا اثر ہو؟" زرتاج معصومیت سے بولی۔

مسز درانی نے خفگی آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو زرتاج جلدی سے ایک بازو ان کے گرد حمائل کرکے انہیں اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولی "ارے آپ میری بزرگ کہاں ہیں۔ آپ تو صرف آنٹی ہیں۔ آنٹی کا کیا ہے... آنٹی تو عمر میں بھانجے بھتیجے سے چھوٹی بھی ہوسکتی ہے۔ آپ سے تو ویسے بھی ابھی بزرگی بہت دور ہے۔ ابھی تو آپ کے چہرے سے بچپن کی معصومیت بھی رخصت نہیں ہوئی۔"

پھر اس نے مجھ سے تصدیق چاہی "کیوں افضل... میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟ آنٹی کے چہرے پر بچّوں جیسی معصومیت ہے نا؟"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔ میری تائید غلط نہیں تھی۔ مسز درّانی کے چہرے پر گو کہ بڑی عمر کے اثرات موجود تھے اور مختلف

ات میں مختلف جذبوں کا پرتو بھی نظر آتا تھا مگر ان سب کی تہ میں جال ایک بچکانہ سی معصومیت جاگزیں نظر آتی تھی۔ شاید اسی ہاس عمر میں بھی ان کا چہرہ خاصا دلکش نظر آتا تھا۔

"اب تم مجھے اتنا مکھن نہ لگاؤ جو میری صحت کے لیے نقصان ہو" مسز درانی مسکراتے ہوئے بولیں۔ اب وہ ذرا بھی متفکر نظر بں آرہی تھیں۔ وہ خاصے مضبوط اعصاب کی عورت معلوم ہوتی بں اور واقعات کے اثرات کو جلد از جلد ذہن سے جھٹکنے میں میاب ہوجاتی تھیں۔

میں نے انہیں مزید کچھ سمجھانے بجھانے کی ضرورت نہیں بی۔ میرے خیال میں سردست انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا بہتر تھا۔ میں اور راحیلہ انہیں چھوڑنے ہوٹل کے بیرونی وازے سے نکل کر پارکنگ لاٹ تک گئے۔ زرتاج کی جس سیرو گزشتہ شام فائرنگ ہوئی تھی وہ غالباً ریپئرنگ کے لیے جاچکی ی۔ وہ آج سیاہ رنگ کی ہنڈا اکارڈ میں آئی تھی۔

وہ مسز درانی کو ساتھ بٹھاکر رخصت ہوچکی تو میں نے راحیلہ ے ساتھ ہوٹل کی طرف واپس آتے ہوئے پوچھا "تمہارا کیا وگرام ہے؟"

"ہم غریبوں کا کیا پروگرام ہونا ہے..." وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہائی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "بس... کمرے میں جاکر وجاؤں گی۔"

"اور امیروں کا کیا پروگرام ہوگا؟" میں نے اسے گھورا۔

"مجھے کیا معلوم... یہ تو امیروں کو ہی پتا ہوگا" وہ کندھے چکا کر بولی۔

"امیروں کا پروگرام اس سے بھی بدتر ہوگا۔ وہ بستر پر لیٹ کر کروٹیں بدلیں گے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کمرے کی کھڑکی سے اگر تھوڑا بہت آسمان نظر آگیا اور اس پر تارے بھی وجود ہوئے تو شاید وہ تارے گن گن کر رات گزار دیں۔"

"اب یہ تو ان کی نالائقی ہے۔ وہ چاہیں تو تارے گننے کے بجائے فلمی ستاروں کے ساتھ بھی رات گزار سکتے ہیں۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

"دل چاہتا ہے ایسے بے ہودہ مشورے دینے والے کی گردن اڑادی جائے" میں نے کہا۔

"نیکی کا تو آج کل زمانہ ہی نہیں ہے" وہ طویل سانس لے کر بولی۔

ہم ہوٹل میں داخل ہوئے تو سامنے سے ٹونی اور شفیع شاہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے آتے دکھائی دیے۔ ہم ایک دوسرے کے قریب پہنچ کر رکے تو شفیع شاہ بولا "سنا ہے آڈیٹوریم میں کچھ گڑبڑ ہوئی تھی؟"

"ہاں... کوئی خاص بات نہیں تھی۔ خیریت ہی رہی" میں نے کہا پھر پوچھا "تم دونوں کہاں غائب تھے؟ پورے ہوٹل میں کہیں نظر نہیں آئے۔ میں اب موبائل فون پر تم سے رابطہ کرنے کی سوچ رہا تھا۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ٹونی نے سر کی جنبش سے شفیع شاہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ مجھے سمندر کی سیر کرانے لے گیا تھا۔"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اسکول لیٹ پہنچنے پر کوئی بچّہ صفائی پیش کرنے کے لیے ٹیچر کے سامنے اپنے ساتھی بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ رہا ہو "سر! یہ مجھے بہکا کر ایک جگہ لے گیا تھا ورنہ میں تو بہت شریف بچّہ ہوں۔"

"رات کو اس وقت سمندر کی سیر...؟" میں نے حیرت سے کہا "تم دونوں ہوٹل کا ورائٹی پروگرام چھوڑ کر رات کے اندھیرے میں سمندر کی سیر کے لیے گئے ہوئے تھے؟"

"سر!" ٹونی اپنے مخصوص انداز میں دھیمے لہجے میں بولا "شفیع نے بتایا تھا کہ ہماری فشنگ کمپنی میں ایک نئی لانچ آئی ہے۔ ابھی وہ ماہی گیری میں استعمال نہیں ہوئی... یعنی اس میں مچھلیوں کی بُو نہیں رچی... اس میں سمندر کی سیر کرنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ خاص طور پر رات کے وقت سمندر کی سیر کرنے کا ایک الگ ہی لطف ہے۔ رات کے وقت سمندر ایک پراسرار جذباتیت میں مبتلا ہوتا ہے... کچھ اس قسم کی تقریر کی تھی اس نے۔"

"اور تم اس کی تقریر سے متاثر ہوکر سمندر کی جذباتیت کا نظارہ کرنے چل دیے؟ یعنی تم نے بھی تقریروں سے متاثر ہونا شروع کردیا؟ تمہیں معلوم نہیں' تقریروں سے متاثر ہونے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ انسان' جانور' سمندر یا ندی نالا... کوئی بھی چیز ہو... جب اس میں جذباتی اُبال آیا ہوا ہو تو اس کے قریب نہیں جانا چاہیے" میں نے مصنوعی خفگی سے اسے ڈانٹ پلائی۔

"لیکن سر! شفیع شاہ تو کہتا ہے جب کسی چیز میں جذباتی اُبال آیا ہوا ہو تبھی اس کے قریب جانا چاہیے" ٹونی معصومیت سے بولا۔

"یہ تمہیں مروادے گا۔ تم اس کی باتوں میں مت آیا کرو" میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا پھر مشفقانہ لہجے میں پوچھا "اچھا یہ بتاؤ تمہارے ساتھ لانچ میں کوئی مچھلی بھی تھی یا تم دونوں اس اُمید پر گئے تھے کہ کوئی مچھلی سطح سمندر پر آوارہ گردی کرتی ہوئی مل جائے گی؟"

"سر! آپ کو معلوم ہے ہم شریف بچّے ہیں۔ ہم مچھلیاں نہیں پکڑتے" اس بار شفیع شاہ نے صفائی پیش کی۔

"اچھا خیر... مچھلیوں کا ذکر چھوڑو اور ایک مگرمچھ کا نام نوٹ کرو" میں نے فضولیات کا باب بند کرتے ہوئے کہا۔

"جی سر!" وہ دونوں یکدم مستعد اور ہمہ تن گوش ہوگئے۔

"مگرمچھ کا نام جبار جیلانی ہے" میں نے نیچی آواز میں کہا "بہت بڑا بلڈر اور درپردہ لینڈ مافیا کا کنگ ہے۔ سُنا ہے بہت بارسوخ ہے۔ اس کے بارے میں جتنی زیادہ معلومات حاصل ہوسکیں اتنا ہی

اچھا ہے۔ کمزور پہلو کیا ہیں' کہاں کہاں رابطے ہیں' اس سے "پنگا" لینے سے پہلے جتنا ہوم ورک ضروری ہو' وہ کرلو۔ اسے تھوڑا سا سبق دینا ہے۔"

"مسزدرانی کے سلسلے میں؟" ٹونی نے تصدیق چاہی۔

"ہاں... زرتاج کی سفارش ہے۔ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا" میں نے کہا۔

"میں اسے تھوڑا بہت جانتا ہوں سر!" شفیع شاہ بولا "ایک آدھ مرتبہ ملاقات بھی ہوچکی ہے لیکن شاید اسے یاد نہ ہو۔ اس کے بارے میں ہوم ورک کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔"

"دوچار روز میں مجھے اس کے بارے میں تفصیلی رپورٹ دو۔ پھر دیکھیں گے کہ اس پر کس زاویے سے ہاتھ ڈالنا مناسب رہے گا اور کہاں کہاں اس کے اثر رسوخ کا توڑ کرنا ہوگا" میں نے کچھ اور نیچی آواز میں کہا "مجھے ذاتی طور پر بھی اس شخص پر کچھ خار آگئی ہے۔ اس کے آدمیوں نے ہماری موجودگی میں مسزدرانی پر بھری پُری سڑک پر فائرنگ کرکے انہیں ہلاک کرنے کی کوشش کی۔ انہیں یقیناً معلوم ہوگا کہ اس وقت مسزدرانی کن کے ساتھ جارہی تھیں لیکن انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ کچھ دیر پہلے اسی ہوٹل میں مسزدرانی کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی۔"

"اوہ!" ٹونی نے ہلکی سی سیٹی بجائی اور شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ شفیع شاہ نے پُرخیال انداز میں ٹھوڑی مسلتے ہوئے سر کو خفیف سی حرکت دی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر جبار جیلانی ایسی ہی توپ چیز ہے جیسا کہ اس کے بارے میں سننے میں آرہا ہے تو اس کا بدمعاشی کا نیٹ ورک بھی خاصا وسیع اور مضبوط ہوگا۔ اس صورت میں اسے اب تک پتا چل چکا ہوگا کہ مسزدرانی ہم سے مدد طلب کرچکی ہیں۔ ظاہری طور پر بھی کل سے وہ ہماری پناہ میں نظر آرہی ہیں۔ اس کے باوجود جبار جیلانی کے آدمیوں نے آج ہمارے ہی ہوٹل میں مسزدرانی کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ اسے ہماری کوئی پروا نہیں... اور وہ ہمیں قطعاً خاطر میں نہیں لارہا۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر میں نے گہری سانس لی پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "ڈیئر فرینڈز! مجھے ایسے لوگ بالکل پسند نہیں ہیں جو ہمیں خاطر میں نہیں لاتے اور ہماری آنکھوں کے سامنے... بلکہ یوں کہو کہ ہماری ناک کے نیچے بڑی سے بڑی مجرمانہ کارروائی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ انہیں یہ تو پتا چلنا چاہیے کہ اس شہر میں کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں جنہیں اس طرح کی کارروائیاں پسند نہیں... اور جو اس طرح فرعونیت زدہ انداز میں بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو روک سکتے ہیں۔"

"بلکہ بوقتِ ضرورت توڑ بھی سکتے ہیں" شفیع شاہ نے اضافہ کیا۔

ٹونی مسکرایا اور بولا "ٹھیک ہے سر! اگر وہ ایسی ہی توپ چیز ہے تو اس توپ کا گولا نکال دیتے ہیں۔ گولے کے بغیر توپ بے کار ہوگی۔ محض لوہے کا ڈھیر ہوگی۔"

"ہاں... شاید یہی کرنا پڑے گا" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "اب مسئلہ محض ایک بے سہارا عورت کے ساتھ جبر اور زیادتی کا نہیں رہا بلکہ اس میں ہماری انا کا مسئلہ بھی شامل ہوگیا ہے۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہورہا ہے جیسے جبار جیلانی نے ہماری غیر مرئی دُم پر پاؤں رکھ دیا ہے..... اور تمہیں معلوم ہے کسی کی غیر مرئی دُم پر پاؤں رکھنا کوئی اچھی بات نہیں۔ ہم جیسے لوگوں کے معاملے میں تو یہ جرم زیادہ سنگین ہوجاتا ہے۔"

"بے شک" ٹونی نے متانت سے سرہلایا "ہم تو اپنی دُم کی فریاد اوّلین فرصت میں سنتے ہیں۔"

"دُم کے احترام کا تقاضا ہے کہ اس پر جو بھی پاؤں رکھا گیا ہے اس کی فوراً ذرا اچھی طرح خبر لی جائے" شفیع شاہ نے بھی سنجیدگی سے تائید کی پھر کہا "میں جلد از جلد جبار جیلانی کے بارے میں ضروری معلومات جمع کرکے آپ کو مطلع کرتا ہوں۔"

یہ کام اس کے سپرد کرکے میں مطمئن ہوگیا۔ اس کے بعد راحیلہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں اوپر آگیا۔ میں پروگرام ختم ہونے تک آڈیٹوریم میں رہا پھر شفیع شاہ کے ساتھ دروازے پر کھڑے ہوکر مہمانوں کو رخصت کرتا رہا۔ ان کا رسمی شکریہ ادا کرتا رہا۔ میں صبح کا اُجالا پھیلنے سے کچھ ہی پہلے اپنے کمرے میں پہنچا۔

دوسرے روز میں دن چڑھے تک سوتا رہا۔ پھر اُٹھا تو ناشتے وغیرہ کے بعد مصروفیت سی شروع ہوگئی۔ لاہور والے دوست واپس جارہے تھے۔ صرف ٹونی کو میں نے روک لیا تھا۔ راحیلہ بھی واپس جارہی تھی۔ سب ساتھیوں کو معلوم ہوچکا تھا کہ وہ ہم سے علیحدگی اختیار نہیں کررہی تھی۔ اندر ہی اندر سب خوش ہوئے تھے لیکن اسے زِچ کرنے کے لیے سب نے اس کا خوب مذاق اُڑایا تھا اور اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے آئندہ اس قسم کی "ڈرامے بازی" کی تو اسے اٹھا کر کسی برساتی جوہڑ میں پھینک دیا جائے گا۔

ان لوگوں کے رخصت ہونے تک میں کچھ ایسا مصروف رہا کہ مجھے مسزدرانی کا خیال ہی نہیں آیا۔ شام کو جب ذرا فرصت میسر آئی تو مجھے خیال آیا کہ انہوں نے فون کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ان کا فون نہیں آیا تھا۔ زرتاج بھی نہ تو خود آئی تھی اور نہ ہی اس کا فون آیا تھا ورنہ شاید اس سے ان کے بارے میں کوئی اطلاع مل جاتی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زرتاج کی طرح شاید مجھے بھی اس خاتون سے خاصی انسیت ہوگئی تھی اور اس انسیت کے نتیجے میں اس وقت ہمارا ٹیلی پیتھک رابطہ قائم ہوگیا تھا کیونکہ جونہی میں نے انہیں فون کرنے کا ارادہ کیا' میری سیکریٹری امبر نے بتایا کہ ان کا

فون ہے۔

میں نے فون اٹھایا تو وہ میری آواز سنتے ہی بولیں "افضل! بھئی معاف کرنا... میں حسبِ وعدہ صبح تمہیں فون کرکے اپنی خیریت کی اطلاع نہیں دے سکی۔ ویسے کچھ زیادہ خیریت تھی بھی نہیں... صبح سے میری کھوپڑی گھومی ہوئی ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"بھئی وہ جبار جیلانی تو قاتلانہ حملوں کے بعد بالکل ہی جمعدارانہ حربوں پر اُتر آیا ہے" وہ بولیں۔

"کیا مطلب؟"

"آج میں دن چڑھے سوکر اٹھی تو میرا ڈرائیو وے' صحن اور مکان کے اردگرد کی نشیبی زمین گندے پانی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ رات بارش بھی ہوئی تھی۔ اس سے گویا سونے پر سہاگا ہوگیا۔"

"اصل وجہ کیا تھی؟"

"اصل وجہ بڑی "تفتیش" اور "تحقیقات" کے بعد معلوم ہوئی۔ میرے کئی گھنٹے اس چکر میں دوڑتے بھاگتے اور جمعداروں سے اُلجھتے گزر گئے۔ وہ سیوریج کا پانی تھا اور رفتہ رفتہ اس کی سطح اونچی ہوتی جارہی تھی۔ میرا مکان بہت پرانا ہے لیکن شکر ہے اس کی اصل عمارت کا فرش اب بھی کافی اونچا ہے ورنہ شاید گندا پانی مکان میں داخل ہوجاتا اور میرا جو بھی غریبانہ سازوسامان ہے' سب برباد ہوجاتا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ میرے مکان کی سیوریج لائن میں ایسے مقام پر سیمنٹ کی بوری پھنسادی گئی تھی کہ اس سڑک پر میرے مکان سے کافی پہلے جو نئے فلیٹوں کی بلڈنگیں وغیرہ ہیں' ان کے گندے پانی کا بہاؤ بھی رک گیا تھا اور وہ پانی میرے مکان کے گٹروں اور باتھ روم وغیرہ سے اُبل پڑا تھا۔" انہوں نے کہا۔

"حیرت ہے....!" میں نے واقعی حیرت سے کہا "اس قسم کی تدبیر تو کوئی نہایت بدبودار ذہنیت کا مالک ہی سوچ سکتا ہے۔ میں تو جبار جیلانی کو خاصا اونچے درجے کا بدمعاش سمجھا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ اتنا نیچے چلا جائے گا کہ گٹرلائنوں تک جاپہنچے گا۔"

"بنیادی طور پر تو اس قسم کے لوگ گٹر کے چوہے ہی ہوتے ہیں نا..." مسزدرانی نفرت سے بولیں "معاشرے کی گندی نالیوں کے ذریعے لوگوں کے گھروں میں نقب لگانے والے چوہے...! مجھے تو اس سے کسی بھی قسم کی حرکت کی توقع رہی ہے۔ بہرحال اس مصیبت سے نمٹ کر بیٹھی تو ایک سرکاری گاڑی میں دو آدمی آگئے۔ انہوں نے ایک محکمے کا نام بتایا اور کہنے لگے کہ وہ اس کے سروے ڈپارٹمنٹ سے آئے ہیں۔"

"آپ نے انہیں اندر تو نہیں گھسنے دیا؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"تم کیا مجھے بالکل ہی بے وقوف سمجھتے ہو؟" انہوں نے گویا بُرا مناتے ہوئے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے دیانت داری سے جواب دیا۔

"بس... تو پھر میں بھلا انہیں اندر گھسنے کا موقع کیسے دے سکتی تھی؟ میں نے تو ان کے لیے گیٹ بھی نہیں کھولا۔ میرے گیٹ میں چھوٹا سا ایک چوکور شگاف ہے۔ اس کے پیچھے بھی مضبوط آہنی شٹر لگا ہوا ہے۔ کسی بھی اجنبی سے میں اسی شگاف کے راستے بات کرتی ہوں۔ اگر میں اس کی کوئی ذرا بھی مشکوک حرکت دیکھوں تو فوراً ایک طرف ہوکر شٹر بند کرسکتی ہوں۔ گیٹ بہت مضبوط ہے۔ چار دیواری خاصی اونچی ہے اور اس پر خاردار باڑھ لگی ہوئی ہے۔ اندر سے مکان بے شک کھنڈر ہورہا ہے لیکن اس میں بلا اجازت گھسنا بہرحال بہت مشکل ہے۔ تم میری ہمت کی داد دو کہ میں تو سیوریج والے مسئلے سے بھی اس طرح نمٹتی رہی کہ گیٹ چند سیکنڈ کے لیے بھی کُھلا نہ رہنے پائے۔ اس سلسلے میں جب مجھے تنہا باہر نکلنا بھی پڑا تو میں اپنے ابّا کے زمانے کی رائفل ساتھ لے کر نکلی تھی" ان کے لہجے میں فخر جھلک آیا۔

"ابّا کے زمانے کی رائفل....؟" میں نے کراہ کر پوچھا "وہ فائر بھی کرتی ہے یا نہیں؟ کہیں اس کی گولی ریورس میں تو نہیں جاتی؟"

"مذاق اُڑانے کی ضرورت نہیں" ان کے لہجے میں ہلکی سی خفگی آگئی "وہ "ہیمرگن" رائفل ہے۔ آج بھی بہترین حالت میں ہے اور اس کی کارکردگی آج کل کی جدید رائفلوں سے اچھی ہے۔"

"اوہ... معاف کیجئے گا... میں بھول گیا تھا کہ بعض چیزوں کا "اولڈ از گولڈ" والا معاملہ ہوتا ہے۔" میں نے ان کی تالیفِ قلب کے لیے کہا "بہرحال... ان دو آدمیوں کے بارے میں بتائیے... انہوں نے مزید کیا کہا؟"

"کہہ رہے تھے کہ انہیں اطلاع ملی ہے یہ مکان بہت مخدوش حالت میں ہے اور اس میں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے یا تو اس کی مرمت کرائی جائے اور پھر سروے ڈپارٹمنٹ سے معائنہ کرایا جائے ورنہ اسے خالی کردیا جائے" مسزدرانی نے بتایا۔

"بہت خوب!" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "جبار جیلانی ہر طرف سے دباؤ بڑھارہا ہے۔ ہر حربہ آزمارہا ہے۔ آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں ایک جلالی خاتون ہوں لیکن جلال میں آنے سے پہلے میں نے گیٹ کے شگاف سے ہی خونخوار نظروں سے انہیں گھورتے ہوئے تھوڑی سی جرح کی کہ آخر انہیں اطلاع کس نے دی کہ میرا مکان مخدوش حالت میں ہے؟ اس کا تو کبھی سروے ہی نہیں ہوا۔ میرے پاس پڑوس میں کوئی نہیں رہتا جو جاکر کسی محکمے کو اس قسم کی اطلاع دیتا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ انہیں الہام ہوا تھا... فرشتوں نے اطلاع دی تھی یا مکان خود چل کر ان کے پاس گیا تھا کہ جناب میری حالتِ زار ملاحظہ فرمائیے؟"

ان کے انداز پر مجھے ایک بار پھر ہنسی آگئی "پھر وہ کیا بولے؟"

میں نے پوچھا۔

"وہ میرے طنز و مزاح سے قطعاً محظوظ نہیں ہوئے اور انہوں نے مجھے مرعوب کرنے کی کوششیں جاری رکھیں۔ معلوم نہیں کون کون سے سرکاری کاغذات لہرا لہرا کر مجھے دکھاتے رہے کہ مجھے فلاں فلاں دفعہ، فلاں فلاں قانون کے تحت نوٹس جاری کیے جاتے رہے ہیں لیکن میں نے کسی کا کوئی جواب نہیں دیا اس لیے میرے خلاف فلاں فلاں کارروائی ہو سکتی ہے... اور یہ کہ عمارت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے ان کے اپنے ذرائع ہوتے ہیں... اور اس مکان کو تو بنے ہوئے ویسے ہی اتنی مدت گزر چکی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"پھر آپ نے کیا کہا؟"

"پھر میں جلال میں آ گئی۔ میں نے ان سے کہا کہ وہ فوراً اپنی منحوس شکلیں لے کر دفع ہو جائیں ورنہ میں کسی نامعلوم دفعہ کے تحت ان شکلوں کو مزید بگاڑ دوں گی۔ وہ میرے رعب اور برہمی کو خاطر میں نہیں لائے۔ کہنے لگے کہ میرا رویّہ بہت خراب تھا اور میں سرکاری کام میں مداخلت، مزاحمت اور نہ جانے کیا کچھ کر رہی تھی، اس لیے میرا چالان ہو گا۔ وہ ایک فائل گاڑی کے بونٹ پر رکھ کر معلوم نہیں کاغذ پر کیا کچھ گھسیٹنے لگے۔ تب میں نے اپنی اس پرانی وفادار رائفل کی نال گیٹ کے سوراخ سے نکالی اور انہیں بتایا کہ میں صرف تین تک گنوں گی۔ اگر اس دوران وہ وہاں سے رخصت نہ ہوئے تو ان کی کھوپڑیوں کے ٹکڑے ہوا میں اُڑ رہے ہوں گے اور کچھ دیر بعد ان کی لاشوں پر چیلیں، کوّے اور گِدھ جشن منا رہے ہوں گے۔"

وہ غالباً سانس لینے کے لیے رکیں تو میں نے پوچھا "ان پر آپ کی دھمکی کا اثر ہوا؟"

"بہت اچھا اثر ہوا" مسز درانی نے مسرور لہجے میں بتایا "وہ دُم دبا کر بھاگے اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر فوراً ہی یہاں سے دفع ہو گئے۔"

"حیرت ہے!" میں نے کہا "انہوں نے آپ کی رائفل کے جواب میں آپ کو کوئی کلاشنکوف وغیرہ نہیں دکھائی؟"

"نہیں" مسز درانی بولیں "وہ سچ مچ سرکاری ملازم ہی معلوم ہوتے تھے۔ انہیں بھجوانے کا انتظام تو جبار جیلانی نے ہی کیا ہو گا لیکن وہ بہرحال اصلی سرکاری ملازم معلوم ہوتے تھے۔ اس کے گُرگے یا بدمعاش نہیں تھے۔ بے ضرر معلوم ہوتے تھے۔ رائفل دیکھ کر اُن کے ہوش اُڑ گئے تھے۔ انہیں اس قسم کے استقبال کی توقع یقیناً نہیں تھی۔"

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد انہوں نے پوچھا "میں نے ٹھیک کیا نا؟"

"بالکل ٹھیک کیا" میں نے بلا تامل کہا "اب آپ کو اپنا رویّہ ایسا ہی رکھنا ہے کیونکہ اب میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

"جب تم میرے ساتھ نہیں تھے تب بھی اکثر معاملات میں میرا رویّہ تقریباً ایسا ہی ہوتا تھا" مسز درانی شگفتہ لہجے میں بولیں "اب تمہاری پشت پناہی میسر آ گئی ہے تو میں ذرا اور شیر... یا شاید شیرنی ہو گئی ہوں... لیکن مجھے شیرنی بنوا کر مروا نہ دینا۔" وہ دھیرے سے ہنسیں۔

مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ اتنے دباؤ، دھمکیوں اور جسمانی بھاگ دوڑ کے بعد اس عمر کی کوئی خاتون اس زندہ دلی اور شگفتگی سے بات کر سکتی تھی۔ نہ جانے کیوں اس پر مجھے ایک انجانی سی خوشی ہوئی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "زندگی اور موت کے بارے میں تو آپ اپنا فلسفہ بیان کر ہی چکی ہیں۔ آپ کا اور میرا فلسفہ تقریباً یکساں ہے۔"

"میں تو مذاق کر رہی تھی" وہ جلدی سے بولیں "میں مرنے سے نہیں ڈرتی۔ میں تو یہ گھر چھوڑنے سے ڈرتی ہوں۔ یہ گھر چھوڑنے کے مقابلے میں مجھے مر جانا زیادہ آسان لگتا ہے۔"

"حیرت ہے...!" میں نے بے اختیار کہا۔ وہ واقعی ایک عجیب عورت تھیں۔ میں نے گھر کے بارے میں بہت سے لوگوں کو جذباتی وابستگی میں گرفتار دیکھا تھا مگر یہ شدت اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

"میرے محسوسات کو کوئی بھی نہیں سمجھ سکتا" وہ بولیں۔

"میں سمجھ رہا ہوں" میں نے انہیں اطمینان دلایا "کافی حد تک آپ نے سمجھا دیا ہے۔ مزید سمجھنے کی کوششیں میں جاری رکھوں گا۔ اچھا یہ بتائیے... ان دو سرکاری ملازموں کے جانے کے بعد سے تو سکون ہے نا؟ راوی چین لکھ رہا ہے نا؟"

"چین کہاں ہے مرے نصیب میں!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولیں "یہ تمہارے راوی اور چناب بھی مجھ سے ناراض معلوم ہوتے ہیں۔"

"کیا اور کوئی بھی آ گیا تھا؟" میں نے ذرا تشویش سے پوچھا۔

"ہاں۔ مہمانِ خصوصی تو بعد میں ہی آیا تھا" یہ کہہ کر انہوں نے توقف کیا۔ شاید وہ تجسس پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب تھیں۔

"کون تھا وہ؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"جبار جیلانی کا چھوٹا بھائی غفار جیلانی" انہوں نے جواب دیا۔

"اوہ خدایا...!" میں بے اختیار کراہ اٹھا "یک نہ شد دو شد۔"

"مجھے بھی معلوم نہیں تھا کہ جبار کا کوئی چھوٹا بھائی بھی ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ معاشرے میں گند پھیلانے کے لیے وہ اکیلا ہی کافی ہے مگر یہ تو دوسرا بھی نکل آیا" وہ بولیں۔

"بُرا آدمی اب اکیلا دکیلا کہاں ہوتا ہے مسز درانی! ان کی تو ٹولیاں ہوتی ہیں... گروہ ہوتے ہیں... بلکہ یوں سمجھیں کہ پوری فوج

فوج ہوتی ہے۔ زمانے کی ترقی نے ان کا کام بھی آسان کر دیا ہے۔ ان کا اپنا ایک نیٹ ورک ہوتا ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایک مدت سے بدمعاشی بھی جدید خطوط پر استوار ہو چکی ہے۔ اب وہ پُرانے زمانے والی باتیں کہاں!"

"ہاں... یہی تو مصیبت ہے" انہوں نے تسلیم کیا "بدمعاشوں میں اتحاد ہے۔ شرفا میں انتشار ہے۔"

"جی ہاں... یہی بات میں اپنے جاننے والوں کو ایک عرصے سے بتاتا آ رہا ہوں مگر شرفا کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ خیر... چھوڑیے ان باتوں کو... یہ بتائیے غفار جیلانی نے کیا تقریر کی؟ کیا وہ اپنے ساتھ کچھ بدمعاش وغیرہ بھی لے کر آیا تھا؟"

"ارے... اسے بدمعاشوں کی کیا ضرورت تھی" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولیں "وہ تو خود سو بدمعاشوں کا ایک بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ اس کا تو چہرہ ہی اس کا تعارف تھا۔ وہ جو مصرع ہے نا... کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے... تو اس طرح موصوف کو دور سے ہی دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کیا چیز چلی آ رہی ہے۔ حالانکہ سوٹ بوٹ میں تھا اور قیمتی گاڑی میں آیا تھا۔"

"ماڈرن بدمعاش ایسے ہی ہوتے ہیں۔ وہ دھوتیاں باندھ کر گنڈاسا، کلہاڑی یا لاٹھی کندھے پر رکھ کر نہیں آتے" میں نے کہا۔

"لیکن کچھ چیزیں ایسی تھیں جو اس کے ماڈرن حلیے کے ساتھ میل نہیں کھا رہی تھیں۔ مثلاً اس کا چہرہ ایسا تھا جیسے اس پر بہت سے باکسر مشق کرتے رہے ہوں۔ ناک پچکی ہوئی اور کئی زخموں کے مدھم نشان... ایک ابرو کا کچھ حصہ غائب... نچلا ہونٹ بیچ میں سے کٹا ہوا..."

"غربت کے زمانے کی نشانیاں ہوں گی" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"شاید" مسز درانی بولیں "بہرحال اب تو دولت کی چمک دمک نے چہرے کی خوفناکی کے تاثر کو بڑی حد تک چھپا لیا تھا۔ چھ فٹ سے اوپر اس کا قد تھا اور اچھا خاصا باڈی بلڈر معلوم ہو رہا تھا۔ سوٹ میں بھی اس کے مسل پھڑکتے دکھائی دے رہے تھے۔ حالانکہ عمر اچھی خاصی تھی۔ وہ کوئی نوجوان نہیں تھا مگر خدوخال پر زوال کے آثار نہیں تھے۔ اس نے کچھ ایسی آواز میں بات چیت شروع کی جیسے زنگ آلود آری سے کسی گیلی لکڑی کو کاٹنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔"

"کیا اسے آپ نے اندر آنے دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی... ایسے احمقانہ سوالات مت کرو۔ میں تو آج کل بلّی کے کسی معذور بچے کو بھی گھر میں داخل نہیں ہونے دے رہی۔ ایسے آدمی کے لیے بھلا کیسے گیٹ کھول سکتی تھی جو شکل سے ہی ماڈرن چنگیز خان معلوم ہو رہا تھا۔"

"گویا تمام مذاکرات گیٹ پر کھڑے کھڑے ہی ہو رہے تھے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں!" انہوں نے جواب دیا "میں بند گیٹ کے اندر کی طرف تھی اور وہ باہر کھڑا تھا۔ بیچ میں صرف وہی چھوٹا سا چوکور سوراخ تھا۔ میرا خیال ہے اس نے اپنی دانست میں کافی نرم لہجے میں بات شروع کی تھی لیکن اس کا نرم لہجے میں بات کرنا بھی ایسا ہی تھا جیسے بھیڑیا کسی بھیڑ پر غرا رہا ہو۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد اس نے بتایا کہ وہ اپنے بھائی کی طرف سے مجھ سے بات کرنے آیا تھا۔ میں اس کے بھائی سے ایک مرتبہ اتفاقاً مل چکی ہوں۔ جب یہ مکان کا چکر نہیں چلا تھا۔ اس کے مقابلے میں اس کا بڑا بھائی کم از کم ظاہری طور پر تو ہزار درجے بہتر ہے۔ وہ پھر بھی تھوڑا بہت خاندانی اور مہذب آدمی نظر آتا ہے..." وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئیں۔ میں نے محسوس کیا کہ انہوں نے غفار جیلانی کا تصور کرتے ہوئے ہلکی سی جھرجھری لی تھی۔

پھر انہوں نے سلسلۂ کلام جوڑا "اس نے مجھے یاد دلایا کہ اس کے بھائی نے مکان کے سلسلے میں مجھے بہت معقول پیش کش کی تھی لیکن میں مسلسل انکار کر کے اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہی تھی۔ میں نہ صرف ایک بڑی رقم سے محروم ہونے کا سامان کر رہی تھی بلکہ اپنے لیے نہ جانے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہی تھی۔ میں نے اپنی دانست میں نہایت غضب ناک ہو کر اس سے پوچھا "تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟" وہ بڑے اطمینان سے بولا "ہاں... دھمکی دے رہا ہوں اور صرف بھائی جان کی تحمل مزاجی کی وجہ سے اب تک اس دھمکی کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ اب بھی وقت ہے... کہہ دو کہ تمہیں ہماری پیشکش منظور ہے" میں نے اسے یہی جواب دیا کہ میں اب بھی اس پیشکش پر لعنت بھیجتی ہوں۔"

"پھر کیا ہوا؟" میں نے دریافت کیا۔ وہ غالباً سانس لینے کے لیے خاموش ہوئی تھیں۔

"وہ کہنے لگا کہ وہ لوگ کسی بات کے جواب میں انکار سننے کے عادی نہیں ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھ سے واسطہ پڑنے کے بعد وہ انکار سننے کے عادی ہو جائیں گے۔ اس پر اس کا کٹا پھٹا ہونٹ غصے سے تھرتھرانے لگا۔ اس نے مجھے پاگل، خرِدماغ بڑھیا اور اس قسم کے کچھ دوسرے القابات سے نوازا" وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئیں۔

"تو پھر آپ نے کیا کہا؟"

"میں نے اسے اس سے بھی کچھ زیادہ بُرے القابات سے نوازا، مجھے خود بھی آج پہلی بار اندازہ ہوا ہے کہ میں ضرورت پڑنے پر کتنی بدزبان ثابت ہو سکتی ہوں۔ اس کا ناہموار چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ اس نے بالکل اسی طرح زمین پر دو تین مرتبہ پاؤں بھی مارا جس طرح بل فائٹنگ کے میدان میں بھینسا دوڑنا شروع کرنے سے پہلے مارتا ہے۔"

میں اس صورتِ حال کے تصور سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ جبار اور غفار کو واقعی ایک تنہا، لاوارث اور عمر رسیدہ عورت سے اس قسم کے ردِعمل کی قطعاً توقع نہیں رہی ہو گی۔ میری اور

زرتاج کی حمایت میسر آجانے کے بعد واقعی مسز درانی میں بڑا حوصلہ آگیا تھا اور وہ بڑی بے خوفی سے ان لوگوں کا سامنا کرنے کے قابل ہوگئی تھیں۔ ضدی تو وہ پہلے ہی تھیں۔ جبار اور غفار جیسے لوگوں کے دماغ کسی نہ کسی حد تک ہلانے کے لیے اس قسم کے تجربے مؤثر ثابت ہوسکتے تھے۔

"پھر اس نے دوڑ کر گیٹ کو ٹکر تو نہیں ماری؟" میں نے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

"اب وہ اتنا بھی پاگل نہیں تھا" مسز درانی بولیں "اس نے یہ حرکت تو نہیں کی البتہ میری موت کی تاریخ مقرر کردی۔ اس نے کہہ دیا کہ اگر چھ دن کے اندر اندر میں نے اپنا فیصلہ نہ بدلا تو ساتویں دن میں اس دنیا میں نہیں رہوں گی۔ میں نے کہا کہ یہ کوشش تو وہ لوگ پہلے بھی کرچکے ہیں لیکن میں دنیا میں موجود ہوں۔ اس پر وہ بولا کہ اب تک درحقیقت سنجیدگی سے کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ ابھی تو مجھے صرف یہ بتانے کی کوشش کی جاتی رہی ہے کہ ایسا بھی ہوسکتا ہے۔"

وہ دھیرے سے ہنسیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ ایک مضطربانہ ہنسی تھی۔ پھر وہ بولیں "کتنا جھوٹ بول رہا تھا خبیث کہیں کا!"

"آپ نے اس کے جواب میں کیا کہا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"میں نے اس سے کہا کہ وہ تو ساتویں دن کی بات کررہا تھا لیکن اگر وہ اپنی جہنمی شکل لے کر فوراً وہاں سے دفع نہ ہوا تو وہ آج..... بلکہ اسی وقت دنیا سے رخصت ہوجائے گا۔ یہ کہہ کر میں نے اسے اپنی کہنہ سال اور وفادار رائفل کی جھلک دکھانے کے لیے اس کی نال گیٹ کے سوراخ سے نکالی مگر وہ منحوس ذرا بھی مرعوب نہ ہوا۔ سرکاری ملازم تو رائفل دیکھتے ہی دُم دبا کر بھاگ گئے تھے لیکن وہ اُلٹا گیٹ کے کچھ اور قریب آگیا اور حقارت سے بولا "پاگل بڑھیا! اسے اندر ہی رکھ..... اس قسم کے کھلونوں سے ہمارے نوکروں کے بچّے کھیلتے ہیں" کمبخت مجھے بڑھیا کہہ رہا تھا۔ مجھے تو فوری طور پر گولی چلادینی چاہیے تھی لیکن میں نے چند سیکنڈ کی تاخیر کردی۔"

"اس کا مطلب ہے آپ نے گولی بہرحال چلائی تھی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں" وہ اطمینان سے بولیں "اس نے مجھے مزید کچھ بُرا بھلا کہا تو میں نے رائفل کا رخ اس کی طرف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بے دھڑک گولی چلادی لیکن اس بدبخت نے بروقت رائفل کی نال پکڑ کر اس کا رخ کافی اوپر کی طرف کردیا۔"

"چلیں خیر..... یہ اچھا ہی ہوا کہ فی الحال اسے گولی نہیں لگی۔ آپ کے لیے خواہ مخواہ مصیبت کھڑی ہوجاتی" میں نے اطمینان کی سانس لے کر کہا "اگر اسے گولی مارنا بہت ہی ضروری ہوجائے گا تب بھی کسی طریقے سلیقے سے مارنی پڑے گی۔ عین اپنے گھر کے دروازے پر تو کسی کو گولی مارنا کوئی معقول حرکت نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے..... لیکن اگر گولی اسے ہی لگ جاتی تو اچھا تھا۔ مجھے قطعاً کوئی افسوس نہ ہوتا" وہ غم زدہ سے لہجے میں بولیں۔

"تو کیا گولی کسی اور کو لگ گئی؟" میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہاں..... ذرا کم بلندی پر اُڑتی ہوئی ایک چیل کو لگ گئی۔ ہے نا ایک عجیب اتفاق؟ بلکہ یوں کہو کہ ناقابلِ یقین سی بات ہے۔ اگر میں نشانہ باندھ کر اسے گولی مارنے کی کوشش کرتی تو ہرگز نہ لگتی۔ یوں اچانک لگ گئی۔ وہ بے چاری پٹ سے گری اور ایک درخت میں اٹک گئی..... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ لٹک گئی۔ مجھے بڑا افسوس ہوا۔ اس بے چاری نے میرا کیا بگاڑا تھا؟" وہ بے گناہ چیل کی اس ناگہانی موت کے غم میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئیں۔

"غفار کا کیا ردِعمل رہا؟" میں نے پوچھا۔

"گولی چلنے کے بعد گن کی نال بہت تپ جاتی ہے لیکن اس نے اُف تک نہیں کی اور اسی طرح رائفل کی نال پکڑے رہا اور دانت پیس کر کسی حد تک فلمی انداز میں بولا "اور گولیاں چلالے بڑھیا! تجھے ہوا میں گولیاں چلانے کا شوق ہے تو پورا میگزین خالی کرلے" میں نے رائفل کو واپس اندر کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس کی نال گویا کسی شکنجے میں پھنسی ہوئی تھی اور اپنی جگہ ساکت تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ گیٹ کا وہ چوکور سوراخ چھوٹا تھا۔ غفار نے گویا جواباً رائفل باہر کھینچنے کی کوشش کی لیکن اس کا ٹریگر اور دستے والا حصہ سوراخ سے نہیں نکل سکا۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد شاید وہ باہر ہی سے نال کو توڑ مروڑ کر اکھاڑ کر رکھ دیتا..... اور یہ زیادہ مشکل کام نہیں تھا..... پوری نال باہر تھی۔ لیور کے اُصول کے مطابق اسے موڑا جاتا تو زیادہ طاقت نہ لگانی پڑتی اور وہ الگ ہوجاتی مگر میری خوش قسمتی تھی کہ کھینچ تان میں اس کا ہاتھ نال پر سے پھسل گیا اور میں نے فوراً رائفل اندر کھینچ کر کھٹ سے شٹر بند کرلیا۔ میں اس رائفل کو اپنے ابّا کی نشانی سمجھتی ہوں۔ میں اسے کوئی نقصان پہنچتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔"

"یعنی آپ نے ایک ہی گولی چلانے پر اکتفا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں..... بس وہ بھی جلال میں آکر چلادی۔ بعد میں کافی دیر تک میں اس فائر اور کھینچا تانی کے اثرات سے بدحواس رہی۔ میرے ہاتھ پاؤں کانپتے رہے" انہوں نے جواب دیا۔

"اب تو ٹھیک ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں..... اب تو بالکل ٹھیک ہوں۔ کیا تمہیں میری باتوں سے اندازہ نہیں ہورہا؟"

"ہاں..... اندازہ تو ہورہا ہے" میں نے تسلیم کیا "آپ خوف زدہ معلوم ہونے کے بجائے خوش معلوم ہورہی ہیں۔"

"اندر سے تو میں کچھ دیر پہلے تک سخت خوف زدہ تھی لیکن پھر مجھے اس احساس سے بڑی خوشی ہوئی کہ جو لوگ مجھے اکیلی اور بے

آسرا سمجھ کر خوف زدہ کرنے آئے تھے، میں نے انہیں کیسا منہ توڑ جواب دیا۔ میں ان کے سامنے گڑگڑائی نہیں..... میں نے ان سے رحم طلب نہیں کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ بہادر نظر آنے میں بڑی لذت ہے لیکن مسئلہ یہی ہے کہ ہر انسان بہادری دکھانا یا بہادر نظر آنا افورڈ نہیں کرسکتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان فطری طور پر بہادر ہوتا ہے لیکن حالات اسے اپنی بہادری دکھانے کا موقع نہیں دیتے۔ وہ مصلحت کوشی یا مجبوریوں کے پہاڑوں تلے دفن ہوجاتا ہے۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی کسی پر ایک کم معروف شاعر ریاض مجید کا یہ مصرع بھی صادق آتا ہے کہ..... میں بہادر ہوں مگر ہارے ہوئے لشکر میں ہوں..... لہٰذا اگر انسان اپنے آپ کو بہادر ثابت کرنے کی پوزیشن میں ہو تو اسے اس موقع کو بھی ایک نعمت سمجھنا چاہیے۔ اس [illegible] شکر ادا کرنا چاہیے۔"

"آج تو آپ بڑے کام کی باتیں کررہی ہیں" میں نے کہا۔

"اب مجھ پر سے خوف کی برف پگھلی ہے تو میری اصلی شخصیت سامنے آرہی ہے" وہ بولیں "میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہ جو بڑے بڑے بدمعاش اور پھنے خاں نظر آتے ہیں، درحقیقت یہ اندر سے بہت بزدل ہوتے ہیں کیونکہ انہیں خود بھی پتا ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کررہے ہیں، ناجائز کررہے ہیں، ظلم کررہے ہیں۔ ان کے لاشعور میں ایک احساسِ جرم ضرور جاگزیں ہوتا ہے جو ان کی بزدلی کی جڑ ہوتا ہے۔ مگر بعض اوقات حالات ان کے حق میں ہوتے ہیں اور انہیں ایک مصنوعی سی طاقت حاصل ہوتی چلی جاتی ہے اس لیے وہ بہادر نظر آنے لگتے ہیں جبکہ بہادر اصل میں صرف شریف اور دیانت دار آدمی ہوتا ہے مگر معاشرے میں اس کی تنہائی، اس کے حالات اور مجبوریاں اس پر ایسا خول چڑھادیتی ہیں کہ وہ بزدل نظر آنے لگتا ہے۔ یہ ایک عجیب ستم ظریفی ہے۔ معاشرے کا یہ الٹ پھیر بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آتا ہے۔"

میں ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ درحقیقت اس وقت فون پر محض گفتگو سے گویا مسز درانی کا ایک نیا روپ میرے سامنے آرہا تھا۔ درحقیقت میں گم صم تھا۔ انہوں نے جو بات کی تھی وہ میرے لیے نئی نہیں تھی۔ درحقیقت یہ میرا ہی فلسفہ تھا لیکن مجھے امید نہیں تھی کہ میں اپنا یہ فلسفہ مسز درانی کے منہ سے سُنوں گا۔ ابھی تک وہ مجھے قدرے سطحی عورت ہی نظر آئی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ ذہین اور حسّاس ضرور ہیں لیکن میں انہیں ایک گہری عورت ہرگز نہیں سمجھتا تھا۔ اب میں اپنے ذہن میں ان کا امیج ایک نئے سرے سے مرتب کررہا تھا۔

"خاموش کیوں ہوگئے؟ کیا میری باتوں سے بور ہورہے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا "بور تو پہلے ہورہا تھا۔ آپ کی باتوں سے بوریت دور ہوگئی ہے۔"

وہ ذرا مسرور انداز میں دھیرے سے ہنسیں اور بولیں "دل رکھنا کوئی تم سے سیکھے۔"

"آپ اسے محض دل رکھنا مت سمجھیں" میں نے سنجیدگی سے کہا "اچھا یہ بتایئے..... جب آپ نے رائفل اندر کھینچ لی اور گیٹ کا وہ سوراخ بھی بند کرلیا تو غفار نے کیا کہا؟"

"اس نے مجھے مزید بُرا بھلا کہا۔ بُرے نتائج کی دھمکیاں دیں لیکن آخرکار رخصت ہوگیا" مسز درانی نے بتایا۔

میں محض ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ میں خیالوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ میں اس عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا جس میں اس عمر میں بھی اپنے سے کہیں زیادہ بڑی قوت سے مقابلہ کرنے اور اس کے جبر کو تسلیم نہ کرنے کا جذبہ موجود تھا۔ اس کی "فائٹنگ اسپرٹ" ان لوگوں کے لیے ایک نمونہ تھی جو گلی محلے کے چھوٹے موٹے بدمعاشوں کے سامنے بھی سر نہیں اُٹھاتے اور یوں انہیں بلامزاحمت زیادہ بڑے بدمعاش بننے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد مسز درانی بولیں "اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"حکم.....؟" میں بے اختیار ہنس دیا "میری کیا مجال کہ میں آپ جیسی جلالی خاتون کو کوئی حکم دوں۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں کل دوپہر کے قریب آپ کے ہاں آؤں گا۔ میں اس دوران میں اپنے وکیل سے آپ کے مکان کے لیے اپنے نام ایک پاور آف اٹارنی تیار کرالیتا ہوں جس کی رو سے آپ کے مکان کے بارے میں تمام اختیارات مجھے حاصل ہوجائیں گے۔ اگر آپ مجھ پر اعتماد کرسکتی ہیں تو اس پاور آف اٹارنی پر دستخط کردیجیے گا....."

"اعتماد کی خوب بات کی تم نے....." وہ میری بات کاٹ کر ڈانٹنے کے سے انداز میں بولیں "تم میرے لیے اتنے خبیث اور اتنے خطرناک آدمی سے اپنی کسی ذاتی غرض کے بغیر دشمنی مول لے رہے ہو اور میں تم پر اعتماد بھی نہ کروں تو پھر مجھے اپنے لیے کسی اچھے انجام کی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔ تم اگر کہو تو میں مکان تمہارے ہی نام کردوں یا وصیت کردوں کہ میرے انتقال کے بعد یہ تمہیں ملے۔ اسے تم میری طرف سے حقیر سا تحفہ سمجھنا۔ اس مکان میں میری دلچسپی تو صرف اتنی ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں تب تک کوئی مجھے اس میں سے نہ نکالے۔ میری موت کے بعد یہ کس کے پاس جاتا ہے اس کی مجھے ذرہ برابر بھی پروا نہیں۔ اگر تم جیسے کسی محسن کے پاس چلا جائے تو مجھے..... یا یوں کہو کہ میری روح کو خوشی ہوگی۔"

"جی نہیں..... مجھے آپ کے مکان سے کوئی دلچسپی نہیں..... اور نہ ہی میں اسے آپ کی زندگی میں یا آپ کی موت کے بعد حاصل کرنے کی کوئی خواہش رکھتا ہوں" میں نے پُرزور لہجے میں کہا "مجھے تو پاور آف اٹارنی کے کاغذات صرف اس منحوس جبار جیلانی کی آنکھوں کے سامنے لہرانے کے لیے چاہئیں۔ میں کاغذات اسے دکھا کر بتاؤں گا کہ مکان کے سلسلے میں مسز درانی نے ہر چیز کا مالک

ومختار مجھے بنادیا ہے پھراس سے پوچھوں گا اب بتاؤ بیٹا! کیا چاہتے ہو؟ مکان کے سلسلے میں جو بھی بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔ میں اسے دس کروڑ میں بھی بیچنا نہیں چاہتا۔ تم میں طاقت ہے تو مجھ سے چھین لو یا مجھے راستے سے ہٹاکر اس پر قبضہ کرلو اسے یہ چیلنج دینے کے بعد میں دیکھوں گا کہ اس کا ردِّعمل کیا ہوتا ہے۔"

"اسے یہ چیلنج تو میں بھی دے چکی ہوں لیکن اس نے میرا پیچھا تو نہیں چھوڑا" مسز درانی بولیں۔

"آپ کے اور ہمارے چیلنج دینے کے انداز میں فرق ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ کو تو ہم درمیان سے ہٹادیں گے نا..... پھر ہم جانیں اور جبار جیلانی جانے" میں نے کہا۔ "بس... اب آپ کل یہ کام کیجئے کہ اس پاور آف اٹارنی پر سائن کردیجئے۔"

"بھئی تم مجھ سے دس پاور آف اٹارنی سائن کرالو لیکن اس مصیبت سے میرا پیچھا چھڑادو" مسز درانی بولیں۔

"سمجھ لیں کہ آپ کا پیچھا چھوٹ گیا۔ اب تو شاید جبار جیلانی کو ہمارے سلسلے میں کسی کے پاس فریاد لے کر جانا پڑے کہ ان سے میرا پیچھا چھڑادو" میں نے کہا "اب آپ مجھے اپنے مکان کے بارے میں ضروری تفصیلات بتادیجئے۔ میں کل پاور آف اٹارنی کے کاغذات تیار کرواکے آپ کے ہاں پہنچوں گا اور دوپہر کا کھانا آپ کے ساتھ کھاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے..." وہ غالباً خوش ہوتے ہوئے بولیں "میں تمہارے لیے خاص طور پر بڑے اہتمام سے مچھلی کی ایک ڈش تیار کروں گی جو شاید تم نے اس سے پہلے نہیں کھائی ہوگی اور اسے کھاکر تم اپنے فائیو اسٹار ہوٹل کے کھانوں کو بھول جاؤ گے۔"

"انہیں تو میں پہلے ہی کسی شمار قطار میں نہیں سمجھتا" میں نے کہا۔

"بہرحال تم آ ضرور جانا کیونکہ میرا کسی کے لیے یہ ڈش تیار کرنا کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ برسوں بعد میں کسی کے لیے یہ اہتمام کروں گی۔ اگر تم نہ آئے تو میں وہ سارے برتن ہوٹل ہی میں لاکر تمہارے سر پر اُلٹ دوں گی" ان کے لہجے میں مان تھا۔

"مچھلی کا سالن..... اور وہ بھی کسی کے سر پر اُلٹ دیا جائے... کیا عبرت انگیز منظر ہوگا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ میں ضرور آؤں گا۔ جب یہ کام ذمّے لے لیا ہے تو جھوٹے وعدے کرنے کا کیا سوال؟ اب مکان کے بارے میں تفصیل بتادیجئے..."

میں نے ان سے کچھ سوالات کیے جن کے انہوں نے جواب دے دیے۔ وہ میں نے نوٹ کرلیے اور خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔ پھر میں نے اپنے وکیلوں میں سے ان وکیل صاحب کو فون کیا جو ہمارے جائداد کے معاملات ڈیل کرتے تھے۔ انہیں میں نے پاور آف اٹارنی تیار کرنے کے بارے میں ہدایات دیں۔ رات سے پہلے پہلے کاغذات تیار ہوکر میرے پاس پہنچ گئے۔

دوسرے روز میں ان کاغذات کی فائل لے کر مسز درانی کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے کسی کو اس سلسلے میں مطلع نہیں کیا اور نہ ہی کسی کو ساتھ لیا۔ میں آج اکیلا ہی ذرا اس مکان کا جائزہ لینا اور اس کے بارے میں کچھ "تفتیش" کرنا چاہتا تھا۔ مسز درانی نے جو جذباتی پس منظر بیان کیا تھا اس کی روشنی میں اس مکان سے ان کی وابستگی اور زندگی کے آخری سانس تک یہاں رہنے کا عزم میرے لیے عجیب یا حیران کن نہیں تھا۔ میں نے بہت سے لوگوں کو اس طرح کے پس منظر کی وجہ سے کسی چیز کے بارے میں ایسی ہی جذباتی وابستگی میں گرفتار دیکھا تھا۔

نمبر وغیرہ میرے پاس تھا۔ راستہ اور نشانیاں مسز درانی نے سمجھادی تھیں۔ اس لیے مجھے کسی سے پوچھے بغیر اس مکان تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تاہم اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ محض مختصر سے ایڈریس کے سہارے کسی عام آدمی کا وہاں تک پہنچنا واقعی مشکل تھا۔

میں نے گاڑی مکان سے کچھ دور ہی روک لی اور گاڑی میں ہی بیٹھے بیٹھے اس کا جائزہ لیا۔ یوں تو مکان خاصے بڑے پلاٹ پر بنا ہوا تھا لیکن اسے تقریباً کھنڈر ہی کہا جاسکتا تھا۔ مسز درانی کی اپنی شخصیت کی عمارت اس سے کہیں زیادہ بہتر حالت میں تھی۔ مکان کی چاردیواری کچھ اچھی اور مضبوط حالت میں دکھائی دیتی تھی۔ صاف نظر آتا تھا کہ صرف چاردیواری کا خیال رکھا جاتا تھا یا پھر وہ مکان سے بہت بعد میں تعمیر ہوئی تھی۔ اس سے پہلے مکان کے گرد لان یا باغ باغیچہ وغیرہ یونہی بغیر چاردیواری کے چھوڑ دیا گیا تھا۔

وہ ایک چوکور اور سیدھا سادہ سا مکان تھا۔ گیٹ البتہ خاصا اونچا اور مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ مکان سڑک سے کافی ہٹ کر تھا اور اس کے پہلوؤں سے دو پگڈنڈی نما راستے اس کے پیچھے کی طرف جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ اسے دیکھ کر گمان نہیں گزرتا تھا کہ وہ آباد ہوگا۔ بُری حالت میں تو میں نے بے شمار مکان دیکھے تھے لیکن اگر ان میں ایک بھی فرد رہتا تھا تب بھی احساس ہوتا تھا کہ وہ آباد ہیں مگر اس مکان کو دیکھ کر کسی اُجاڑ بیابان کا سا تاثر ملتا تھا۔

مسز درانی کا تصور کرکے میرے ذہن میں ترحّم کی ایک لہر اُبھری۔ بعض شاندار عورتوں کی زندگی ایک بے عنوان سی تشنگی کی نذر ہوجاتی ہے۔ برباد ہوجاتی ہے اور وہ اپنے اُجڑے خوابوں کو سینے سے لگائے ماضی کے کھنڈر میں روز و شب گزارتی رہتی ہیں۔

میں نے گاڑی وہیں چھوڑی اور ایک بغلی پگڈنڈی کے راستے مکان کے عقب میں جا پہنچا۔ مکان کے عقب میں جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا حالانکہ یہاں کی زمین ریتلی تھی اور ریتلی زمین میں مشکل سے ہی کچھ اُگتا ہے لیکن یہاں دور تک صحرائی سی جھاڑیاں اور قدِ آدم گھاس پھیلی دکھائی دے رہی تھی۔ بہت دور سرمئی سی دھندلاہٹ میں لپٹے سمندر کی لہریں بھی ساحل سے چھیڑ چھاڑ کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔ تاہم ساحل نشیب میں تھا۔ اس سے کافی دور تو پتھر کی حفاظتی دیوار اور اس کے متوازی پتلی سی ایک سڑک دکھائی دے رہی تھی۔

ساحلی علاقے کی مارکیٹ ویلیو بہت زیادہ بڑھ جانے کے باوجود یہ کوئی ایسا حصہ نہیں تھا جس کی قیمت جلد اوپر جانے کی کوئی امید ہوتی۔ اگر جبار جیلانی صحیح معنوں میں ایک بلڈر اور بزنس مین تھا تو پھر میرے لیے یہ سمجھنا مشکل تھا کہ وہ کس خوبی کی وجہ سے اس مکان کے ایک کروڑ دے رہا تھا جسے کوئی بھی نیا منصوبہ شروع کرنے کے لیے مسمار کرنا ضروری تھا۔ یعنی توڑنے پر الگ خرچ آتا اور ایک کروڑ صرف زمین کی قیمت ہوتی بلکہ اگر مسز درانی سودے بازی کے موڈ میں نظر آتیں تو شاید وہ اس سے زیادہ بھی دے سکتا تھا۔

میں بھی ایک بزنس مین تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہاں کوئی ملٹی اسٹوری یا ہائی رائز بلڈنگ بناکر اس کے اپارٹمنٹ مہنگے داموں بیچنا بہت مشکل تھا۔ اس کے لیے نہ جانے کتنا طویل انتظار کرنا پڑتا۔ اس دوران اگر بلڈنگ نہ بنائی جاتی تو یہ ایک ڈیڑھ کروڑ روپیا بلاک کرنے والی بات تھی اور اگر بلڈنگ بنائی جاتی تو اس کا حشر خراب ہوجاتا کیونکہ بکنے کی نوبت نہ جانے کب آتی اور اس علاقے کی آب و ہوا اور زمین بہت جلد تعمیرات کا بیڑا غرق کردیتی تھی۔ جبکہ جبار جیلانی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس مکان کو حاصل کرنے کے لیے نہ صرف زیادہ سے زیادہ رقم دینے کے لیے تیار تھا بلکہ مسز درانی کے انکار پر ان کی جان لینے پر تلا ہوا تھا۔

میں دیر تک اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور اس مسئلے پر غور کرتا رہا۔ کیا واقعی اس مکان میں کوئی خزانہ دفن تھا جس کی جبار جیلانی کو خبر مل گئی تھی مگر خود مسز درانی اس سے بے خبر تھیں؟ میں نے غیر ارادی طور پر یوں عقبی دیوار کو سونگھ کر دیکھا جیسے مکان میں اگر کوئی خزانہ دفن ہوا تو مجھے یہیں سے اس کی خوشبو آجائے گی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے خود اپنی اس حرکت پر ہنسی آگئی۔

پچھلی دیوار میں بھی چھوٹا سا ایک زنگ آلود آہنی دروازہ موجود تھا جو نہ جانے کب سے بند تھا مگر اس وقت اچانک ہی وہ کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ کھل گیا۔ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے میری ہنسی نے کچھ طلسماتی سا اثر کیا تھا یا پھر وہ "کھل جا سم سم" قسم کی چیز ثابت ہوئی تھی۔

مسز درانی مجھے اس آہنی دروازے کے عقب سے جھانکتی نظر آئیں۔ ان کے چہرے پر حیرت تھی۔ وہ کافی بنی سنوری نظر آرہی تھیں مگر ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

"یہ تم یہاں کیا کرتے پھر رہے ہو؟" وہ حیرانی سے بولیں "گھر کا مین گیٹ دوسری طرف ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں ابھی اس طرف آنے ہی والا تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہیں اِدھر آنے کی کیا ضرورت پڑ گئی؟" وہ نہ جانے کیوں کچھ زیادہ ہی پریشان نظر آرہی تھیں۔

"یونہی.... ذرا سراغ رساں بننے کی کوشش کررہا تھا" میں نے جواب دیا۔

"سراغ رساں..؟" ان کی پریشانی گویا کچھ اور بڑھ گئی لیکن پھر وہ کچھ سنبھل کر بولیں "لیکن مجھے تو تم کچھ اور لگ رہے تھے۔ میں تمہیں اس جانور سے تشبیہ دینا نہیں چاہتی۔ تم تو دیوار سونگھتے پھر رہے تھے۔"

تب میں نے ذرا توجہ سے چھوٹے سے آہنی دروازے کی طرف دیکھا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اس میں ایک میجک آئی لگی ہوئی تھی جو سرسری انداز میں دیکھنے پر نظر نہیں آتی تھی۔ اس کا مطلب تھا، مسز درانی نے پچھلا دروازہ کھولے بغیر بھی پچھلی طرف کا جائزہ لینے کا انتظام کیا ہوا تھا اور انہوں نے دروازہ کھولنے کے بعد مجھے نہیں دیکھا تھا بلکہ پہلے سے دیکھ رہی تھیں۔

"جس جانور سے آپ مجھے تشبیہ دینا نہیں چاہ رہیں وہ بھی ایک طرح سے چھوٹا موٹا سراغ رساں ہی ہوتا ہے۔ بے زبان سراغ رساں" میں نے کہا پھر یونہی انہیں ذرا چھیڑا۔ "دراصل میں اس لیے آپ کی دیوار سونگھ رہا تھا کہ مجھے آپ کے مکان سے خزانے کی خوشبو آرہی تھی۔ آپ کے مکان میں ضرور کہیں کوئی خزانہ دفن ہے۔"

"خزانہ.....دفن....؟" ان کے منہ سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی اور ان کی رنگت ہلکے سے میک اپ کے باوجود زرد نظر آنے لگی جیسے اپنے مکان میں کسی مدفون خزانے کی بات سُننا ان کے لیے خوش خبری نہیں، بہت بڑی بدخبری تھی۔

"ارے... آپ تو ڈر گئیں" میں نے خوش دلی سے کہا "اگر آپ کو خزانوں سے اتنا ہی خوف آتا ہے تو آپ اسے تلاش مت کیجئے گا۔ میں اسے تلاش کرکے نکال کے لے جاؤں گا۔ دولت کی کشش تو اپنی جگہ ہے اور ویسے بھی کسی مکان میں دفن خزانہ ملنے کا تصور بڑا رومان انگیز سا لگتا ہے۔"

میں اپنی ہانکے جارہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مسز درانی میری باتوں سے ذرا بھی محظوظ نہیں ہورہی تھیں۔ وہ تو بالکل ہی وحشت زدہ اور پریشان نظر آنے لگی تھیں۔ یہ بات مجھے کچھ عجیب سی لگی۔

"یہاں کوئی خزانہ وزانہ نہیں ہے" وہ تیزی سے بولیں "میں تمہیں کہیں کھدائی کی اجازت نہیں دوں گی۔ تم ایسا کوئی خیال بھی دل میں مت لانا۔ میں نے تم سے اپنے تحفظ کے لیے مدد طلب کی ہے اس لیے نہیں کہ تم میرے ہی مکان کی کھُدائی کرتے پھرو۔"

مجھے ان کے تیور کچھ بدلے ہوئے سے لگے۔ جب سے میری ان سے ملاقات ہوئی تھی تب سے ان کا رویّہ میرے ساتھ بے حد مشفقانہ بھی رہا تھا اور اس میں میرے لیے لمحہ بہ لمحہ بڑھتی ہوئی

پسندیدگی کی آمیزش بھی تھی۔ انہوں نے جب مجھے بڑے چاؤ سے کھانے پر مدعو کیا تب بھی ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ میرے لیے دل وجان سے کچھ کرنا چاہتی تھیں۔ انہیں احساس تھا کہ میں بغیر کسی غرض یا مفاد کے.... ان کی ایک بہت بڑی مصیبت اپنے سر لے رہا تھا۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اس کے جواب میں کیا کریں۔ غالباً وہ مجھے کھانے پر مدعو کرکے اور بے پناہ لطف وعنایت کا مظاہرہ کرکے شکر گزاری کے اظہار کی ایک ادنیٰ سی کوشش کرنا چاہتی تھیں۔

مگر اس لمحے گویا ان کے یہ محسوسات کہیں پس منظر میں چلے گئے تھے۔ وہ سب کچھ بھول گئی تھیں۔ میں نے گویا انہیں کسی پریشانی میں مبتلا کردیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا "میں تو آپ سے مذاق کررہا تھا۔ میرا کہنے کا مقصد تو یہی تھا کہ جبار جیلانی اگر اس شدت سے اس مکان کے پیچھے پڑا ہوا ہے تو پھر اس کی وجہ تو یہی ہوسکتی ہے کہ اس میں کوئی خزانہ پوشیدہ ہے کیونکہ میں نے اس کے چاروں طرف گھوم پھر کر باقی تو ہر اعتبار سے جائزہ لے لیا ہے۔ میرے حساب سے تو اس کی قیمت پچیس تیس لاکھ سے زیادہ نہیں ہوسکتی.... اور یہ صرف زمین کی قیمت ہے۔ مکان کو تو اندر سے دیکھے بغیر مجھے اندازہ ہورہا ہے کہ وہ ایک باعزت قسم کا کھنڈر ہوگا۔"

مسز درانی نے ایک گہری سانس لی۔ میری بات سُن کر گویا ان کی بے عنوان گھبراہٹ اور وحشت یکدم کافی کم ہوگئی۔ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی۔ گوکہ یہ مسکراہٹ پھیکی سی تھی لیکن غنیمت تھی۔

"تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا...." وہ بولیں "جب میں نے میجک آئی سے تمہیں دیکھا' اس وقت تمہاری پیٹھ دروازے کی طرف تھی اور تم ذرا جُھک کر جھاڑیوں میں گویا کچھ تلاش کررہے تھے۔ میں تو تمہیں غفار جیلانی سمجھی تھی اور اپنے اندر ہمت پیدا کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ آج تو اس کی پیٹھ میں گولی اُتار ہی دی جائے۔ اچھا ہوا تم جلدی گھوم گئے ورنہ آج تو شاید میں اس ارادے پر عمل کر ہی گزرتی۔" انہوں نے دروازہ کچھ اور کھول دیا۔ تب میں نے دیکھا' ان کے ہاتھ میں ایک رائفل تھی۔ رائفل پرانی ساخت کی تھی مگر اس کی حالت بہت عمدہ تھی۔ یقیناً یہ وہی رائفل تھی جسے وہ اپنے ابا کی نشانی کہتی تھیں۔

"اوہ...." میں نے سیٹی بجا کر کہا "اس کا مطلب ہے آج تو مابدولت بال بال بچ گئے ورنہ نیکی کرنے کے شوق میں اپنا تو پتّا صاف ہوجاتا۔"

"تم نے حرکت بھی تو عجیب کی نا...." مسز درانی بولیں "تم پہلے اندر آتے.... مجھ سے ملتے اور مجھے بتانے کے بعد جہاں کا چاہتے' معائنہ کرتے پھرتے۔"

"اگر میں اتنا سلیقے کا آدمی ہوتا تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ویسے آپ سے میری مؤدبانہ گزارش ہے کہ بات بے بات اپنی یہ خاندانی رائفل اٹھا کر اِدھر اُدھر نہ بھاگتی پھرا کریں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اسے استعمال کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھی ہیں۔"

"ہر انسان کو اپنی حفاظت کا حق حاصل ہے۔ لوگ مجھ سے میرا گھر چھیننے پر تُلے ہوئے ہیں۔ میرے ہی گھر کے دروازے پر کھڑے ہوکر مجھے دھمکیاں دیتے ہیں۔ مجھے ہلاک کرنے کی کوششیں کرتے ہیں.... تو کیا مجھے اتنا بھی حق حاصل نہیں کہ میں دو چار گولیاں ان کے گندے وجود میں اُتار سکوں؟ میرا دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ "مارو یا مرجاؤ" والی پالیسی اختیار کرلوں" وہ خاصے جوش سے بولیں۔ شاید یہ بھی ان کے جوش کا اثر تھا کہ اس وقت انہوں نے رائفل نال کی طرف سے پکڑ رکھی تھی۔

"اب.... جبکہ آپ نے معاملہ میرے سپرد کردیا ہے تو پھر آپ کو اس قسم کی پالیسیاں اختیار کرنے کی ضرورت نہیں" میں نے نرمی سے کہا "اگر آپ خود ہی "مارو یا مرجاؤ" پر تُل جائیں گی تو پھر میری کیا ضرورت رہ جائے گی؟"

"ضرورت یا عدم ضرورت کا فیصلہ ہم آرام سے بیٹھ کر کرلیں گے۔ تم اندر تو آؤ" وہ اب پہلے سے کافی بہتر انداز میں مسکرائیں اور دروازے کو مزید وا کرکے خود ایک طرف کو ہوگئیں۔ مجھے جُھک کر اس دروازے سے گزرنا پڑا۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا' مکان کی حالت میرے اندازے سے زیادہ خستہ تھی۔ ہم اس وقت عقبی لان میں کھڑے تھے لیکن اب اسے لان کہنا' لان کے تصور کے ساتھ زیادتی محسوس ہوتا تھا۔ وہاں جھاڑ جھنکاڑ قسم کی گھاس اور کچھ ناقابلِ شناخت قسم کے پودوں کے سوا کچھ نہیں تھا جو بُری طرح ایک دوسرے میں اُلجھے ہوئے تھے۔ دروازے کے قریب سے ایک پختہ روش مکان کی طرف جارہی تھی۔

اس روش کے قریب لان کے ایک کونے پر تھوڑا سا حصہ صاف ستھرا اور پھول دار پودوں سے آراستہ نظر آرہا تھا۔ وہ حصہ اس اُجڑے ہوئے لان میں ایک خوب صورت پیوند کی طرح تھا۔ لگتا تھا کہ اسے بڑے پیار سے سجایا سنوارا گیا تھا۔

پختہ روش پر چلتے ہوئے میں نے اس کیاری نما حصے کی طرف دیکھ کر کہا "یہ آپ نے ٹاٹ میں مخمل کا پیوند کیوں لگا رکھا ہے؟ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں اکیلی عورت ہوں۔ لان کا اتنا حصہ میں نے سنوار رکھا ہے جتنا میں سنوار سکتی تھی۔ اس سے زیادہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ ملازم یا ملازمہ میں رکھنا نہیں چاہتی۔ اگر بے بس اور معذور ہوگئی.... بستر پر گرگئی تب شاید کوئی ملازمہ رکھ لوں۔ بشرطیکہ اس وقت بھی اختیار رکھ سکی [illegible] ورنہ یونہی اپنے اس گوشۂ تنہائی میں مرکھپ جاؤں گی" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

بظاہر وہ مسکرا رہی تھیں لیکن مجھے یقین تھا کہ یہ بات کرتے وقت ان کے دل پر خراش سی پڑ رہی ہوگی۔ یہ واقعی ایک عجیب اور خوف زدہ کردینے والی تنہائی تھی جس کی آغوش میں وہ زندگی گزار رہی تھیں اور یہ صرف انہی کا مسئلہ نہیں تھا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے نہ جانے کتنے کردار تھے جنہیں مفلوک الحال افراد میں بھی شمار نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن وہ عجیب تنہائی اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہے تھے۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولیں "مجھے کیا پتا تھا کہ تم اُدھر سے نازل ہوگے اور یہ سب کچھ دیکھ لوگے۔ جو ملاقاتی شریف اور مہذب لوگوں کی طرح سامنے کے گیٹ سے آتا ہے وہ یہ سب کچھ دیکھ ہی نہیں پاتا اور میں شرم کے مارے خود کسی کو اس طرف لاتی ہی نہیں۔ دل میرا بھی چاہتا ہے کہ سارا لان ہی خوب صورت تراشیدہ گھاس اور رنگ برنگے پھولوں والے پودوں سے سجا ہو اور ہر طرف ترتیب وسلیقہ نظر آئے لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں۔ اللہ نے مجھے زمین دی ہے' توفیق نہیں دی۔ اس لیے میں ایک چھوٹے سے ٹکڑے کو ہی سجا سنوار کر شوق پورا کرلیتی ہوں۔ جب دل گھبراتا ہے تو یہاں کرسی ڈال کر بیٹھ جاتی ہوں اور صرف اسی ٹکڑے پر نظر جما کر فرض کرلیتی ہوں کہ یہی میرا لان ہے اور اس کے آس پاس کچھ بھی نہیں ہے۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی "آپ واقعی عجیب عورت ہیں مسز درانی!" میں نے کہا۔

اس وقت تک ہم مکان کے ایک بغلی گلی نما راستے سے گزر کر سامنے کی طرف آپہنچے تھے۔ اس طرف ایک کشادہ ڈرائیو وے تھا جس کا فرش بُری طرح ٹوٹ پھوٹ چکا تھا۔ کسی زمانے میں شاید اس طرف بھی لان موجود رہا ہو لیکن بعد میں شاید اس کی دردِ سری سے بچنے کے لیے یا کسی اور وجہ سے اسے ختم کرکے وہاں سیمنٹ کا فرش بنایا گیا ہوگا مگر وہ ویسے ہی بڑا ناقص تھا۔ جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ چکا تھا اور اس میں کہیں کہیں سے گھاس دوبارہ سر اُبھار چکی تھی۔

مسز درانی رائفل جھلاتی ہوئی میرے آگے آگے مارچ کرنے کے انداز میں چل رہی تھیں۔ میں ان کی رہنمائی میں نشست گاہ میں پہنچا۔ کسی زمانے میں وہ ایک معیاری ڈرائنگ روم رہا ہوگا لیکن صحیح طور پر دیکھ بھال نہ ہونے اور بوسیدگی وکہنگی کی وجہ سے اس کی بھی حالت خراب تھی۔

وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولیں "سمجھ میں نہیں آرہا تمہیں کہاں بٹھاؤں۔ کوئی چیز اس قابل نہیں ہے جس پر تمہیں بیٹھنے کی دعوت دی جائے۔"

"آپ میرا مقام ومرتبہ اتنا بلند کرنے کی کوشش نہ کریں" میں نے سنجیدگی سے کہا "یہ تو بہت باعزت جگہ ہے۔ میں تو اس سے کہیں بدتر جگہوں پر اُٹھتا بیٹھتا رہا ہوں۔"

میں ایک صوفے پر ڈھیر ہوگیا جو کافی میلا میلا نظر آرہا تھا۔

مسز درانی گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولیں "ان تمام چیزوں کو گندی یا گرد آلود نہ سمجھنا۔ آج میں نے بڑی جان ماری کرکے نہایت "تفصیلی" صفائی کی ہے لیکن اب اس گھر کی اور تمام سازوسامان کی حالت ہی ایسی ہے کہ جتنی چاہے صفائی کرلوں' سب کچھ میلا میلا ہی دکھائی دیتا ہے۔"

"انسان کا دل میلا نہیں ہونا چاہیے۔ باقی خواہ کچھ بھی میلا ہو' فکر کی کوئی بات نہیں" میں نے بھی انہیں تسلی دینے کی کوشش کی۔

وہ ابھی کھڑی ہی تھیں اور رائفل کو دونوں ہاتھوں میں لیے گویا اس سے کھیل رہی تھیں۔ میں نے یونہی ذرا انہیں چھیڑنے کے لیے پوچھا "کیا یہ واقعی لوڈڈ ہے؟"

انہوں نے ذرا پیچھے ہوکر میری پیشانی کا نشانہ لیتے ہوئے کہا "فائر کرکے دکھاؤں؟" وہ بالکل سنجیدہ نظر آرہی تھیں۔

میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر ایک ٹک ان کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا "اتنا مہنگا ثبوت نہیں چاہیے مجھے.... جس کی تصدیق کے لیے میں دنیا میں موجود ہی نہ رہوں۔"

"تو پھر ایسی احمقانہ باتیں مت کرو" انہوں نے رائفل کو میری طرف سے ہٹا کر یوں بازوؤں میں لے لیا جیسے کسی بچے کو گود میں اُٹھایا ہو۔ پھر وہ اسے واقعی اس طرح سینے سے لگا کر پیار کرنے لگیں جیسے وہ رائفل نہیں' کوئی ننھا سا بچہ ہو۔

پھر وہ خوابناک سے لہجے میں بولیں "ابا میرے لیے یہی تو سب سے کارآمد چیز چھوڑ گئے تھے۔"

"ایسا مت سوچیں مسز درانی!" میں نے سنجیدگی سے کہا "ہتھیار کو سب سے کارآمد چیز سمجھنے والے نقصان میں رہتے ہیں۔ سب سے کارآمد چیز انسانی قدریں ہیں۔ ایک پُرگداز دل.... دوسرے کے لیے کوئی قربانی دینے کا جذبہ.... احساس کی دولت.... درگزر کرنے کا جذبہ.... ذہنی کشادگی.... بلند سوچ.... یہ کارآمد چیزیں ہیں۔"

"میرے پاس وہ بھی ہیں" مسز درانی.... گویا اپنی خوابناک کیفیت سے باہر آتے ہوئے بولیں۔

"بعض اوقات انسان کو محض خوش فہمی ہوتی ہے کہ اس کے پاس یہ چیزیں موجود ہیں.... بلکہ میرا خیال ہے انسانوں کی اکثریت اسی خوش فہمی میں مبتلا ہوتی ہے لیکن درحقیقت ہم میں سے بیشتر انسانوں کا انسانی قدروں پر سے ایمان ختم ہوچکا ہے لیکن ہر کوئی اپنے آپ کو بہت اعلیٰ درجے کا انسان سمجھنے پر بضد ہے" میں نے کہا۔

"تم کیا یہاں وعظ کرنے آئے ہو؟" انہوں نے مجھے گھورا۔

"نہیں۔ میں تو یہاں اچھا سا کھانا کھانے آیا ہوں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تو پھر تم نے یہ کیا تقریر شروع کردی؟" انہوں نے بدستور

سخت نگاہوں سے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے سوچا اچھا سا کھانا کھانے سے پہلے کچھ اچھی اچھی باتیں کر لی جائیں" میں نے جواب دیا پھر ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ اچھی اچھی باتیں آپ کو ہرگز اچھی نہیں لگ رہی ہیں۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ صرف نئی نسل کے لوگوں کو.... نوعمروں اور نوجوانوں کو اچھی اچھی' ناصحانہ اور فلسفیانہ باتوں سے دلچسپی نہیں ہوتی کیونکہ انہیں عقل اور تجربہ حاصل نہیں ہوتا' وہ ابھی زندگی کی حقیقتوں سے صحیح طرح آشنا نہیں ہوتے.... لیکن آج معلوم ہوا کہ آپ جیسے پختہ عمر اور سرد گرم چشیدہ لوگوں کو بھی عاقلانہ اور سنجیدہ گفتگو اچھی نہیں لگتی۔"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے ایسی گفتگو اچھی نہیں لگتی" وہ ناگواری سے ہاتھ ہلا کر بولیں "میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں تو پہلے ہی اکثر ڈپریشن میں مبتلا رہتی ہوں۔ مجھے زندگی کی منفی حقیقتیں یاد دلا کر مزید ڈپریشن میں مبتلا نہ کرو۔ مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے لیکن صرف معلوم ہونے سے کیا ہوتا ہے؟ میں بھلا کیا کر سکتی ہوں؟"

"میں نے اکثر لوگوں کو یہی کہتے سنا ہے کہ میں بھلا کیا کر سکتا ہوں۔ مجھے آج تک کسی ایسے انسان سے ملنے کی حسرت ہی رہی جس نے کہا ہو کہ ہاں میں اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہوں۔ آخر کون اس سلسلے میں کچھ کر سکتا ہے؟"

"ہم سب کو مل کر اس شخص کو ڈھونڈنا چاہیے" وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"میں نے تو ڈھونڈ لیا ہے؟" میں نے کہا۔

"کون ہے وہ؟" انہوں نے تجسس سے پوچھا۔

"میں خود۔" میں نے جواب دیا۔

وہ بے اختیار ہنس دیں۔ میں نے سنجیدگی سے کہا "اگر ہر شخص اپنے دل میں یہ یقین بٹھا لے کر وہ اس بے ہودہ سوسائٹی کی بہتری کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے.... خواہ وہ کوشش ذرہ برابر ہی کیوں نہ ہو.... تو شاید حالات کچھ بہتر ہو جائیں۔"

"اچھا.... تم یہ بوجھل باتیں چھوڑو۔ معاشرہ تو ایک منہ زور اور پُراسرار دریا ہے۔ یہ خود اپنا راستہ بناتا چلا جاتا ہے۔ ہم تم جیسے لوگ اس کا رُخ تبدیل نہیں کر سکتے..."

"لیکن اس کا گدلا پن تو کچھ کم کر سکتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں سے.... چھوٹی چھوٹی کوششوں سے...." میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"شاید..." انہوں نے مبہم لہجے میں کہا اور رائفل میرے سامنے تپائی پر رکھ دی۔ میں نے اسے اٹھا کر دیکھا۔ وہ واقعی لوڈ ڈ تھی اور سیفٹی کیچ بھی ہٹا ہوا تھا۔

وہ میرے برابر آ بیٹھیں۔ ان کے وجود سے ایک دلفریب مہک اٹھ رہی تھی۔ آج وہ واقعی خاصے اہتمام سے تیار ہوئی تھیں۔ شاید کسی کو کھانے پر مدعو کرنا بھی ان کے لیے ایک چھوٹی سی تقریب' ایک چھوٹی سی خوشی تھی اور یہ خوشی بھی شاید ان کی تنہا زندگی میں بہت دن بعد آئی تھی۔

دفعتاً وہ بڑے شیریں لہجے میں بولیں "اب تم مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم مکان کے پیچھے کیا تلاش کرتے پھر رہے تھے؟" انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی بچے کو بہلا پھسلا کر کوئی اہم بات معلوم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ واقعی اس سلسلے میں بہت ہی متجسس معلوم ہوتی تھیں۔

"کیا آپ کے خیال میں واقعی وہاں کوئی ایسی چیز تھی جسے تلاش کیا جا سکتا ہے؟" میں نے اُلٹا انہی سے سوال کر دیا۔

"یہی تو میں جاننا چاہتی ہوں؟" وہ بولیں۔

"ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے ایک ایسی بات معلوم کرنا چاہتے ہیں جو ہم دونوں میں سے کسی کو بھی معلوم نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہرحال آپ کے اطمینان کے لیے بتا دوں کہ میں وہاں کچھ تلاش نہیں کر رہا تھا۔ معلوم نہیں کیوں آپ کو یہ وہم ہو گیا ہے۔ میں تو ذرا گرد و پیش کا جائزہ لے کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس جگہ کی کیا مارکیٹ ویلیو ہو سکتی ہے۔ مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو اس مکان کی مارکیٹ ویلیو بہت زیادہ بڑھانے کا سبب بن سکتی ہو۔ اس لیے وہی پرانا خیال میرے دل میں اُبھرا کہ آخر جبار جیلانی اس کے لیے اتنا دیوانہ کیوں ہو رہا ہے؟ کیا اس میں کوئی خزانہ دفن ہے؟ غیر ارادی طور پر میں دیوار کو سونگھنے لگا۔ میں اس قسم کی.... بلکہ اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب حرکتیں اکثر کرتا رہتا ہوں۔ جب آپ سے میری شناسائی کچھ پرانی ہو جائے گی تو آپ میری عادتوں سے زیادہ واقف ہو جائیں گی.... اور شاید ان کی عادی بھی ہو جائیں۔"

"اوہ...!" اب شاید انہوں نے حقیقی طمانیت کی گہری سانس لی۔ ان کی آنکھوں سے شکوک و شبہات کی پرچھائیاں مٹ گئیں اور ان کی خوب صورت آنکھیں اطمینان کی چمک کی بدولت دوبارہ روشن روشن دکھائی دینے لگی تھیں۔

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولیں "اِدھر اُدھر کی باتوں میں اتنا وقت گزر گیا اور میں نے تمہیں ٹھنڈے گرم کے لیے بھی نہیں پوچھا۔ کھانا لگانے میں مجھے کچھ وقت لگ جائے گا تب تک تم کچھ پی لو۔"

"اگر آپ پلانا ہی چاہتی ہیں تو ٹھنڈا پانی پلا دیجیے۔ کھانے سے پہلے گرم پلا کر میری بھوک مارنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ نے جو کچھ پکایا ہو گا میں اس کا اچھی طرح صفایا کر کے جاؤں گا" میں نے کہا۔

"ضروری نہیں ہے کہ وہ تمہیں اتنا پسند آئے۔" وہ اٹھتے ہوئے مسکرا کر بولیں۔

"اگر پکانے والا مجھے پسند ہو تو پھر اس کا پکایا ہوا بھی عموماً پسند آ ہی جاتا ہے۔"

"شکریہ.... شکریہ" وہ آداب بجا لاتے ہوئے بولیں "اس عمر میں بھی انسان کو ایسے خیالات سے آگاہی حاصل کر کے بہرحال خوشی ہوتی ہے" وہ لاؤنج سے گزر کر غالباً کچن میں چلی گئیں اور میری نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

میرے پاس ایک فائل تھی جس میں پاور آف اٹارنی کے کاغذات لگے ہوئے تھے۔ ان پر مجھے مسز درانی سے دستخط کرانے تھے۔ اسے میں اب تک بغل میں دبائے ہوئے تھا۔ اب میں نے اسے سامنے تپائی پر رکھ دیا اور اطمینان سے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا لیا۔ پھر میں نے جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور شفیع شاہ کا نمبر پنچ کیا۔

سلسلہ ملنے پر میں نے پوچھا "جبار جیلانی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟ ویسے میں کچھ زیادہ ہی جلدی پوچھ رہا ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں سر!" شفیع شاہ بولا "اس کے بارے میں بنیادی باتیں تو بہت کم وقت میں معلوم ہو گئی ہیں اور میرے خیال میں وہی کافی ہیں لیکن مزید مہلت ملتی رہی تو مزید ہوم ورک کرتے رہیں گے۔"

"بنیادی باتیں کیا ہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ واقعی لینڈ مافیا کے بانیوں میں سے ہے پھر اپنے آپ کو باعزت بنانے کے لیے کنسٹرکشن کے بزنس میں گھس گیا۔ دولت اس کے پاس بے حساب ہے لیکن مزید دولت حاصل کرنے کی ہوس بھی بے حساب ہے خواہ اس کے لیے کسی کا بھی گلا کاٹنا پڑے۔ اب اس میں خود تو اتنا دم خم نہیں رہا۔ اس کا چھوٹا بھائی غفار اس کے "شعبۂ بدمعاشی" کا سربراہ ہے۔ حقیقت میں جبار جیلانی کا اثر رسوخ کچھ اتنا زیادہ نہیں ہے لیکن جہاں ضرورت ہوتی ہے وہاں وہ پیسا پانی کی طرح بہاتا ہے۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ اس کا اصل اثر رسوخ روپیا پیسا ہی ہے" شفیع شاہ نے بتایا۔

"یہ اثر رسوخ بھی کچھ کم نہیں ہے" میں نے کہا۔

"بے شک" شفیع شاہ نے تائید کی "ویسے اس کا سیاسی اثر رسوخ بھی ہے لیکن میرا خیال ہے اس کی بنیاد بھی روپیا ہی ہے۔"

"وہ کس طرح؟" میں نے دریافت کیا۔

"ایک نہایت کرپٹ سیاست داں ہے.... کے ایم کمال.... ہر دورِ حکومت میں کوئی نہ کوئی منصب اس کے پاس رہتا ہے۔ کافی عمر ہو چکی ہے اور بیشتر سیاست دانوں کی طرح اب تک بہت دولت مند ہو چکا ہے لیکن جبار جیلانی کی طرح دولت کی ہوس اب بھی بے پناہ ہے۔ جبار جیلانی کو اس کی مکمل پشت پناہی حاصل ہے بلکہ میرا خیال ہے ان دونوں کے درمیان ایک غیر رسمی سی پارٹنرشپ ہے۔ کے ایم کمال کو خاموشی سے اس کا حصہ پہنچتا رہتا ہے۔ اب چونکہ جبار جیلانی کے پاس بہت دولت ہے اس لیے وہ اپنا سیاسی اثر رسوخ مزید بڑھانے کے لیے بھی ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔"

"اس سے پہلے ہی اس کے پر کتر دینے چاہئیں۔ ایسے لوگوں کا سیاسی اثر رسوخ پہلے ہی کیا کم ہے" میں نے کہا۔

"اگر آپ خود سامنے آ کر براہِ راست اس کی خبر لینا چاہتے ہیں تو آپ کو کافی اوپر سے بندوبست کر کے کوئی قدم اٹھانا ہو گا کیونکہ جبار جیلانی کی تو کوئی بات نہیں لیکن وہ کے ایم کمال بہت بڑا فتنہ ہے۔ پھر پریس ان لوگوں کا بہت بڑا ہتھیار ہے۔ یہ پرانے مگرمچھ اسے استعمال کرنے کا گُر جانتے ہیں۔ یہ جب چاہتے ہیں اپنی ناجائز سے ناجائز بات کو بھی سچ ثابت کرنے کے لیے پریس میں خوب واویلا مچا لیتے ہیں۔ پریس والے ان کی چھینک مارنے کی خبر بھی لپک کر شائع کرتے ہیں۔"

"لیکن تم نے بتایا ہے کہ کے ایم کمال ایک کرپٹ سیاست داں ہے؟" میں نے کہا۔

"آج کل اس بات سے تو کسی کے مقام و مرتبے میں کوئی خاص فرق ہی نہیں پڑتا۔"

"لیکن کہیں کہیں یہ دُکھتی رگ گرفت میں آ جاتی ہے۔ نفیس صاحب زندہ باد!" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "ان سے ان سب کا دم نکلتا ہے۔ ان کے پاس ان سب کی فائلیں بہت حفاظت سے رکھی رہتی ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کی ضخامت میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔"

"کیا وہ فائلیں یونہی خفیہ خانوں میں سجی رہیں گی اور انہیں دیمک کھاتی رہے گی؟ وہ کبھی منظرِ عام پر نہیں آئیں گی؟" شفیع شاہ کے لہجے میں تلخی تھی۔

"وہ اس پیچ در پیچ اور تاریک نظام کی ایک الگ بُرائی.... ایک الگ کہانی ہے۔ بہت اُلجھی ہوئی ہے۔ بہرحال یہ دُکھتی رگیں کبھی نہ کبھی کام آ جاتی ہیں۔ میں نفیس صاحب کو صرف ایک فون کروں گا۔ کے ایم کمال چوں بھی نہیں کرے گا۔ جبار جیلانی کی حمایت میں کوئی پریس کانفرنس کرنے کا اسے خیال بھی نہیں آئے گا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "جبار جیلانی کا بدمعاشی کا نظام کیسا ہے؟"

"اس کی بدمعاشی کی عمارت صرف چند ستونوں پر کھڑی ہے۔ آٹھ دس بدمعاش ہیں اور تین چار پولیس افسر ہیں جو صرف پیسے کی ڈوری سے اس کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں۔ بدمعاش بھی سارے ہر وقت اس کے ساتھ نہیں رہتے۔ بوقتِ ضرورت بیپر یا موبائل فون وغیرہ پر پیغام ملنے پر فوراً اس کے پاس.... یا پھر اس جگہ پہنچ جاتے ہیں جہاں کے بارے میں وہ حکم دے۔ اپنا مشن مکمل کر کے یہ لوگ غائب ہو جاتے ہیں۔"

"اور اس کا بھائی؟"

"وہی اس کا سب سے بڑا باڈی گارڈ ہے۔ سائے کی طرح ساتھ رہتا ہے۔ وہی صحیح معنوں میں جاں نثار ہے۔ شاید اس لیے کہ مالی مفادات کے علاوہ اس کا خون کا رشتہ بھی ہے۔ شہر کے نہایت

مہنگے کاروباری علاقے میں سب سے اہم شاہراہ پر جبار جیلانی نے حال ہی میں ایک چھوٹے مگر نہایت مہنگے پلاٹ پر ایک [illegible] عمارت تعمیر کرائی ہے جس میں صرف اس کے اپنے دفاتر پھیلے ہوئے ہیں۔ کافی اونچی بلڈنگ ہے۔ اس میں ٹاپ فلور پر وہ خود بیٹھتا ہے۔ صرف دو بدمعاش باہر اس فلور پر اس کے گارڈز کے فرائض انجام دیتے ہیں اور اندر کمرے میں اس کا بھائی اس کے ساتھ ہوتا ہے۔"

"بس...؟ کُل یہی لوگ ہوتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ باقی سب تو دفتری لوگ ہوتے ہیں جن سے بلڈنگ بھری ہوتی ہے۔ وہ سب بے چارے تو شریف شرفا ہوتے ہیں۔ گولی کی آواز سن کر میزوں کے نیچے دبک جانے والے" شفیع شاہ نے بتایا۔

میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "اتنے کم وقت میں تم نے ساری ہی معلومات تو جمع کرلیں۔ اب کون سی بات رہ گئی؟"

"کارروائی شروع کرنے کے لیے تو یہی معلومات کافی ہیں لیکن اگر جلد کارروائی شروع کرنا ضروری نہیں ہے تو میرے "جاسوس" بدستور اپنی کوششوں میں لگے رہیں گے۔ چھوٹی چھوٹی باتیں، معمولی جزئیات بھی سامنے آجائیں گی۔ اس طرح کے کاموں میں بعض اوقات معمولی جزئیات بھی اہم ثابت ہوتی ہیں۔" شفیع شاہ بولا پھر اس نے پوچھا "آپ اس پر کب ہاتھ ڈالنا چاہتے ہیں؟"

"ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا لیکن تم اور ٹولی تیار رہنا۔ کسی وقت بھی میرا فون آسکتا ہے۔ اس دوران اپنے "جاسوسوں" کو کام کرتے رہنے دو اور ان سے تھوڑی تھوڑی دیر بعد رپورٹ لیتے رہو۔ کوئی ذرا سی بھی اہم بات معلوم ہو تو مجھے ضرور بتا دینا۔ میں فی الحال مسز درانی کے ہاں بیٹھا ہوں۔ احتیاطاً میں ابھی اسلام آباد فون کرکے کچھ ڈوریاں ہلا دیتا ہوں تاکہ اگر ہمیں اچانک ہی جبار جیلانی کے خلاف کوئی کارروائی کرنی پڑے تو وہ جواباً کوئی کارروائی نہ کرسکے۔"

"اوکے سر!" شفیع شاہ بولا اور میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

مسز درانی اس دوران ایک ٹرے میں کولڈ ڈرنک کے گلاس سجائے میرے سامنے آکھڑی ہوئی تھیں اور بدستور کھڑی ہی تھیں۔ انہوں نے ٹرے تپائی پر نہیں رکھی تھی۔ شاید وہ میری گفتگو میں الجھ گئی تھیں اور بھول ہی گئی تھیں کہ ان کے ہاتھ میں ٹرے بھی۔ شفاف گلاسوں میں بے رنگ سیال سنسنا رہا تھا اور اس میں برف کے کیوبس تیر رہے تھے۔

میں نے فون بند کیا تو مسز درانی گویا کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولیں "تم نے اپنا کام شروع کردیا ہے؟"

"کام تو کافی پہلے سے ہی شروع ہے" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"میں اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھ کر تمہیں ایک اہم بات بتانا بھول ہی گئی۔ آج صبح جبار جیلانی کے اسٹیٹ منیجر کا پھر فون آیا تھا۔ وہ اپنی پیشکش ایک کروڑ سے ایک دم بڑھا کر ڈیڑھ کروڑ پر لے گیا ہے۔"

"اوہ...!" میں نے بے اختیار سیٹی بجائی "میں تو ایک کروڑ پر ہی حیران ہو رہا تھا۔ یہاں معاملہ یکدم ہی ڈیڑھ کروڑ پر پہنچ گیا۔ حالانکہ کاروبار کی دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ پیشکشیں بہت آہستہ آہستہ بڑھائی جاتی ہیں۔ آپ نے کیا جواب دیا؟"

"میں اپنے جواب پر قائم ہوں" وہ مسکراتے ہوئے اطمینان سے بولیں۔

"اور وہ جواب کیا ہے؟"

"یہی... کہ جہنم میں جاؤ" انہوں نے سادگی سے کہا۔

"حیرت ہے! آپ کو لالچ کیوں نہیں آتا مسز درانی! اب تو میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ آپ اس پیش کش کو قبول کرہی لیجئے اور اس کھنڈر سے جان چھڑا لیجئے۔ میرا خیال ہے کہ قیمت کے بارے میں اب وہ اس سے آگے نہیں جائے گا۔"

"تو تمہارا خیال ہے کہ میں قیمت زیادہ سے زیادہ بڑھوانے کے چکر میں انکار کررہی ہوں؟" انہوں نے غضب ناک نظروں سے مجھے گھورا۔

"نہیں۔ میں تو ویسے ہی مشورہ دے رہا ہوں کہ خدارا اب لالچ میں آہی جائیے" میں نے التجائیہ سے لہجے میں کہا "اس نے یقیناً یہ بھی کہا ہوگا کہ یہ اس کی آخری پیشکش ہے۔"

"ہاں... اور اس نے یہ بھی کہا تھا کہ اسے قبول کرنے کا آج پہلا اور آخری دن ہے۔ مجھے آج فیصلہ کرلینا چاہیے" انہوں نے روٹھے روٹھے سے لہجے میں بتایا۔

"پھر آپ نے کیا سوچا؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تمہیں بھی مجھ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت ہے؟" وہ گویا بُرا مناتے ہوئے بولیں۔ "اس گھر سے تو اب میرا جنازہ ہی نکلے گا۔"

عین اسی لمحے ایک زوردار چھناکا ہوا جو دراصل دو تین چھناکوں کا تسلسل تھا۔ مسز درانی اس وقت تک چھوٹی سی ٹرے ہاتھ میں ہی پکڑے کھڑی تھیں۔ اس میں موجود دونوں گلاسوں کو میں نے بیک وقت ٹکڑے ہوتے دیکھا۔ کچھ مشروب اور کرچیاں اُچھل کر مجھ پر گریں اور اس کے ساتھ ہی مسز درانی اچھل کر پیچھے جاگریں۔

انہوں نے منہ سے یہ الفاظ نکالے ہی تھے کہ اس گھر سے میرا جنازہ ہی نکلے گا... اور عین اسی لمحے فائر ہوا تھا۔ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ اس اندیشے سے میری دھڑکن تھمنے لگی کہ شاید اس گھر سے مسز درانی کا جنازہ اُٹھنے کا انتظام ہوگیا تھا۔

میں خود چھناکے کی آواز کے ساتھ ہی صوفے سے پھسل کر

نیچے بوسیدہ قالین پر گرچکا تھا اور سمجھنے کی کوشش کررہا تھا کہ گولی کس طرف سے آئی تھی۔ میرا مشین پسٹل میرے ہاتھ میں آچکا تھا اور میں اس درندے کی طرح چوکنا ہوچکا تھا جس کی پسلیوں میں کچھ چبھو دیا گیا ہو۔

مجھے مزید فائر ہونے کی توقع تھی مگر ایسا نہیں ہوا البتہ مکان کے عقب میں کہیں دور سے کوئی موٹر سائیکل اسٹارٹ ہونے کی آواز ابھری اور تیزی سے معدوم ہونے لگی۔ مجھے اس وقت تیزی سے مکان کے پچھلی طرف بھاگنا چاہیے تھا لیکن مجھے مسز درانی کی طرف سے بھی تشویش تھی۔ کہیں انہیں فوری طبّی امداد کی ضرورت تو نہیں تھی؟

میں اس وقت اس چوپائے کی سی پوزیشن میں تھا جو ایک ٹانگ زخمی ہونے کی وجہ سے تین ٹانگوں پر کھڑا ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے ایک ہاتھ میں مشین پسٹل تھا۔ میں نے تپائی کے نیچے سے جھانک کر دوسری طرف دیکھا تو مجھے مسز درانی بھی اسی حالت میں نظر آئیں۔ وہ ایک ہاتھ بڑھا کر تپائی پر سے اپنی رائفل اٹھانے کی کوشش کررہی تھیں۔

بے اختیار میرے سینے سے طمانیت کی ایک گہری سانس خارج ہوئی۔ وہ نہ صرف زندہ تھیں بلکہ صحیح سلامت بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید انہیں خراش بھی نہیں آئی تھی۔ اس وقت تک مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ گولی کدھر سے آئی تھی۔ کچن مکان کے عقبی احاطے کی طرف تھا۔ اس کی دونوں کھڑکیاں آمنے سامنے تھیں۔ دونوں کا شیشہ ٹوٹ چکا تھا۔

فائر رائفل سے کیا گیا تھا۔ کسی نے غالباً عقبی دیوار پر چڑھ کر کچن کی کھڑکی پر فائر کیا تھا۔ گولی دونوں کھڑکیوں اور لاؤنج سے گزرتی ہوئی ڈرائنگ روم کے اندرونی دروازے سے آئی تھی اور ہم دونوں کے درمیان سے گزر گئی تھی۔ درمیان میں صرف گلاس تھے۔ گولی انہیں بھی اُڑاتی ہوئی گزر گئی تھی۔ محض ایک ثانئے کے فرق نے مسز درانی کی زندگی بچالی تھی۔ عین اس وقت وہ ٹرے تپائی پر رکھنے کے لیے جھکنے لگی تھیں۔ اگر وہ ذرا زیادہ جھک چکی ہوتیں تو گولی گلاسوں کو توڑ کر گزرنے کے بجائے ان کی کنپٹیوں سے آرپار نکل جاتی۔

موٹر سائیکل کی آواز دور جاتے سن کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ مزید فائرنگ کا خطرہ ٹل چکا تھا اس لیے میں تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا تاہم اب بھی میں نے اتنی احتیاط ضرور کی کہ رکوع کی سی حالت میں رہا اور اسی حالت میں کچن کی طرف دوڑا۔ مجھے اپنے پیچھے قدموں کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ مسز درانی بھی میری تقلید کرتے ہوئے میرے ہی انداز میں سر جھکائے ایک ساتھی کمانڈو کی طرح رائفل اٹھائے میرے پیچھے بھاگی چلی آرہی تھیں۔

"خدا کے لیے... آپ تو کسی محفوظ جگہ پر آڑ وغیرہ میں رہیں" [illegible] سے کہا۔ مجھے اندیشہ [illegible] اب بھی کوئی [illegible] ہوسکتا تھا۔ مسز درانی جوش اور ضد میں بہادر تو بنی ہوئی تھیں لیکن اچانک کسی خطرے کا سامنا ہونے پر وہ اپنا دفاع نہیں کرسکتی تھیں، اتنا مجھے اندازہ تھا۔

وہ خاموشی سے ایک طرف کو ہوگئیں اور میں جلدی سے کچن میں داخل ہوکر اس کھڑکی پر پہنچا جس سے عقبی دیوار نظر آتی تھی۔ اب وہاں کوئی نہیں تھا اور موٹر سائیکل کی آواز معدوم ہوتی جارہی تھی۔ میں کچن سے نکل کر دوڑتا ہوا اس آہنی دروازے تک پہنچا جس سے میں اندر آیا تھا لیکن وہاں پہنچ کر میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

دروازے پر اندر کی طرف بڑا سا تالا جھول رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ مسز درانی نے مجھے اندر بلانے کے بعد میرے سامنے ہی یہ تالا لگایا تھا۔ میں سخت بدمزگی کے عالم میں پلٹا تو میں نے مسز درانی کو اپنے پیچھے کھڑے پایا۔

فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے انہوں نے ایک چابی میری طرف بڑھائی اور بولیں "مجھے معلوم تھا تمہیں میری ضرورت پڑے گی۔ اسی لیے تو میں تمہارے پیچھے آرہی تھی۔"

میں نے دیکھا اب ان کے پیروں میں چپلیں نہیں تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ محض مجھے دکھانے کے لیے راستے میں ایک لمحے کو رُک گئی تھیں لیکن میرے پلٹتے ہی چپلیں اتار کر دوبارہ میرے پیچھے دوڑ پڑی تھیں۔ میں نے چابی ان کے ہاتھ سے جھپٹ کر تالا کھول کر آہنی دروازے کی آڑ میں رہتے ہوئے باہر جھانکا۔

باہر پھیلے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ کی وجہ سے مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ احتیاطاً میں نے جھاڑ جھنکاڑ میں تین چار فائر کیے۔ تھوڑی سی سرسراہٹ کے سوا کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔ شاید کچھ چوہے اس جھاڑ جھنکاڑ میں اِدھر اُدھر بھاگے تھے۔ تب میں نے دروازے کی اوٹ سے نکل کر باہر جاکر مکان کی دیوار کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے سمندر کے کنارے والی سڑک کی طرف دیکھا جو یہاں سے محض ایک پتلی سی پٹی کی طرح نظر آرہی تھی۔

اس پر مجھے ایک اسپورٹس موٹر سائیکل کی صرف ایک جھلک دکھائی دی جس پر دو آدمی موجود تھے۔ ہمیں باہر پہنچنے میں بہت تاخیر ہوچکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے وہ موٹر سائیکل بل کھاتی سڑک پر سمندر کی حفاظتی دیوار کی اوٹ میں نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اس کے تعاقب کے بارے میں سوچنا بھی فضول تھا۔ میری گاڑی مکان کے دوسری طرف کافی فاصلے پر کھڑی تھی۔ میں پہلے اس تک پہنچتا اور اسے اسٹارٹ کرکے کافی آگے لاتا تو دوسری طرف پہنچنے کے لیے مجھے بہت چوڑی ریتلی پٹی کو عبور کرنا پڑتا۔ وزنی ہونے کی وجہ سے گاڑی کے ریت میں کہیں دھنسنے کا بھی خطرہ موجود تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تب بھی اس پتلی سی سڑک پر پہنچنے تک موٹر سائیکل سوار نہ جانے کہاں پہنچ چکے ہوتے۔

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپس ہولیا۔ مسز درانی سائے کی طرح میرے ساتھ تھیں۔ ان کا چہرہ بتا رہا تھا کہ انہیں اپنی رائفل استعمال کرنے کی حسرت ہی رہ گئی تھی۔

"بزدل.... بھگوڑے کہیں کے...!" وہ پچھلے دروازے سے مکان میں داخل ہوتے ہوئے بڑبڑائیں۔

"یہ بزدلی کا معاملہ نہیں ہے" میں نے کہا "فی الحال ان کا مقصد آپ کو صرف دھمکانا اور دہشت زدہ کرنا ہے۔ ایک طرف وہ پیش کش بھیجتا ہے۔ جب آپ اسے ٹھکرا دیتی ہیں اور سخت جواب دیتی ہیں تو اس قسم کی کوئی کارروائی ہوتی ہے۔ جب ان کی امید بالکل ختم ہوجائے گی اور وہ اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اب آپ سے بات کرنے کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں.... تو پھر فیصلہ کن قدم اٹھایا جائے گا.... اور وہ واقعی ہلاکت خیز ہوسکتا ہے۔"

ان کے چہرے پر ذرا خوف کے تاثرات ابھرے اور انہوں نے خفیف سی جھرجھری لی تاہم اس دوران میں بھی وہ دروازے کو اندر کی طرف سے تالا لگانا نہیں بھولیں۔

تالا لگا کر وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولیں "اور تم مجھے بچانے کے لیے کیا کروگے؟"

"بچانے والا تو وہ ہے...." میں نے درویشانہ انداز میں آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"اسی نے تو تمہیں میری مدد کے لیے بھیجا ہے" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولیں "اسی لیے تو تم سے پوچھ رہی ہوں تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

"یہ میں ابھی اندر جا کر کھانا وغیرہ کھانے کے بعد اطمینان سے قیلولہ کرنے کے انداز میں بیٹھ کر سوچوں گا" میں نے مشین پسٹل کو دوبارہ بغلی ہولسٹر میں پہنچاتے ہوئے کہا "میں خالی پیٹ زیادہ صحیح طرح سوچ بچار نہیں کرسکتا۔ پیٹ خالی ہوتا ہے تو مجھے ذہن بھی کچھ خالی خالی محسوس ہونے لگتا ہے۔"

"کہیں ایسا تو نہیں یہ محض تمہاری خوش فہمی ہو کہ تمہارے پاس ذہن موجود ہے؟ ممکن ہے سوچ بچار کا فریضہ تمہارا معدہ ہی انجام دیتا ہو" وہ معصومیت سے بولیں۔ میں نے بغور ان کی طرف دیکھا۔ ان کے اندر بھی یقیناً کوئی چنچل روح مقید تھی مگر حالات نے اسے دبا کر رکھ دیا تھا۔

"مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہورہی ہے کہ آپ نے اس قسم کے حملوں سے نروس ہونا چھوڑ دیا ہے۔" میں نے گویا انہیں خراجِ تحسین پیش کیا۔

"میرا یہ اطمینان.... شوخی.... تیزی و طراری سب مصنوعی ہے" وہ اندر پہنچ کر ایک آرام کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولیں "اندر سے میں سخت خوف زدہ ہوں۔ جب سے میں نے وہ خوفناک چھناکا سنا ہے تب سے ابھی تک میرا دل خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہا ہے۔ شاید تمہاری موجودگی کی وجہ سے میرا حوصلہ برقرار ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے آنکھیں بند کرلیں۔ اب وہ یکدم ہی بہت تھکی تھکی دکھائی دینے لگی تھیں۔ میں بھی صوفے پر جا بیٹھا۔ کچھ دیر کمرے میں گہرا سکوت طاری رہا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی سوچوں میں الجھے ہوئے تھے۔ میں اپنے ذہن میں کچھ پروگرام ترتیب دے رہا تھا۔ اب بہت ہوچکی تھی۔ میرے خیال میں اب کچھ کرہی گزرنا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ جبار جیلانی کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاتا، مجھے اس معاملے میں پہل کردینی چاہیے تھی۔

چند لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "کیا اب میں آپ کو کھانا کھلانے اپنے ہوٹل لے چلوں؟"

انہوں نے آہستگی سے آنکھیں کھول کر خوابناک سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر شگفتگی لوٹ آئی اور وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولیں "اوہ.... معاف کرنا.... میں تو اس وقت بھول ہی گئی تھی کہ میں نے تمہیں کھانے پر مدعو کر رکھا ہے۔"

"لیکن میں نہیں بھولا تھا۔ میں ایسی اہم باتیں نہیں بھولتا" میں نے کہا۔

وہ ایک طویل سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ انہوں نے لاؤنج اور کمرے میں بکھری ہوئی کرچیوں کو دیکھا۔ تپائی اور قالین پر کولڈ ڈرنک کی نمی کے دھبے بھی نظر آرہے تھے۔ وہ کاہلی آمیز انداز میں مسکرائیں اور بولیں "میں تمہارے لیے کولڈ ڈرنک لائی تھی.... اور اپنے لیے بھی.... مگر پینی نصیب نہیں ہوئی۔ اس پر ہماری مُہر نہیں تھی۔ تم نے دیکھا.... جو چیز نصیب میں نہ ہو، کس طرح ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔"

"کولڈ ڈرنک پر ہماری مُہر نہیں تھی، یہ تو کوئی اہم بات نہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "البتہ اس بات پر خدا کا شکر ادا کریں کہ اندر آنے والی اس گولی پر ہم دونوں میں سے کسی کے نام کی مُہر نہیں تھی" میں نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ گولی اس کے پشتے میں پیوست ہوئی تھی۔

"ہاں.... یہ تو واقعی شکر کا مقام ہے" مسز درانی نے تسلیم کیا اور اثبات میں سرہلایا پھر وہ کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولیں "میں کھانا گرم کرکے لاتی ہوں۔"

ان کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر فون اٹھایا اور اسلام آباد کا ایک نمبر ملایا۔ اس نمبر پر کامیابی نہیں ہوئی۔ نفیس صاحب کو میں تیسرے نمبر پر تلاش کرنے میں کامیاب ہوسکا۔ میں نیچی آواز میں چند منٹ ان سے بات کرتا رہا۔ اس دوران مسز درانی نے کھانا گرم کرکے ڈرائنگ روم میں ہی موجود ایک پرانی سی ڈرائنگ ٹیبل پر لگادیا تھا اور ایک کرسی پر بیٹھ کر منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

آخر میں نے گفتگو ختم کی اور ان کے قریب جا بیٹھا۔ انہوں نے میری گفتگو سیاق و سباق کے بغیر سُنی تھی اس لیے شاید ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ انہوں نے الجھن آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا تاہم اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا اور فوراً ہی کھانے کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ میں اب بہت مطمئن تھا اس لیے نہایت دل جمعی کے ساتھ کھانے میں جُت گیا۔ مسز درانی نے صرف مچھلی کی ایک خاص ڈش ہی نہیں، دو تین ڈشیں اور بھی بنائی تھیں۔ سبھی کچھ بہت عمدہ تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں توقع نہیں تھی کہ مسز درانی کو اتنے عمدہ کھانے پکانے آتے ہوں گے۔ ویسے بھی ایک عرصے تک ہوٹلوں کے کھانے کھاتے رہنے کے بعد گھر کے کھانوں میں کچھ زیادہ ہی لطف آتا ہے۔ کھانے کے بعد میں نے سوئٹ ڈش پر ہاتھ صاف کیا۔

مسز درانی کافی بنا کر لے آئیں تو میں نے کرسی پر ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا "اخلاقیات کا تقاضا ہے کہ آپ مہینے میں کم از کم چار چھ مرتبہ میری دعوت کیا کریں۔"

"میری طرف سے تو تمہیں مستقل دعوت ہے۔ تم اگر اس کھنڈر میں رہنے کا حوصلہ کرسکتے ہو تو ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاؤ لیکن اس سے پہلے تمہیں جبار جیلانی کا بندوبست تو بہرحال کرنا پڑے گا ورنہ کبھی کھڑکی سے گولی آتی رہے گی اور کبھی روشندان سے" مسز درانی مسکراتے ہوئے بولیں۔

"جبار کا بندوبست تو خیر ہوجائے گا لیکن میں یہاں مستقل رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اگر آپ ایسے ہی کھانے پکا پکا کر مجھے کھلاتی رہیں گی تو میرا وزن تو کسی جاپانی پہلوان سے بھی زیادہ ہوجائے گا۔ آپ نے میری خوراک نہیں دیکھی؟"

"میں نے تمہیں اپنے ہوٹل میں تو اتنا کھاتے نہیں دیکھا" وہ بولیں۔

"میرا اصول ہے کہ کھانا بہت اچھا لگے تو بے حساب کھاؤ۔ زیادہ اچھا نہ لگے تو گزارے لائق کھاؤ اور اگر دو چار دن میسر نہ آئے تو صحرا کے اونٹ کی طرح اس کے بغیر بھی ہنسی خوشی کام چلاتے رہو، ماتھے پر شکن تک نہ آنے دو، اپنے تمام معمولات سکون سے انجام دیتے رہو۔"

"اس اصول کو اپنانا ہر ایک کے بس کی بات نہیں" مسز درانی کافی کی چسکی لے کر بولیں پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے پوچھا "تم نے جبار جیلانی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"اب سوچنے کا نہیں، کوئی عملی قدم اٹھانے کا وقت ہے خاتون!" میں نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ "مجھے اس کافی سے لطف اندوز ہولینے دیں۔ اس کے بعد ایک مشین کے پرزے حرکت میں آنے والے ہیں۔ اس مشین کو اسٹارٹ ہونے سے پہلے کافی مل جائے تو نتائج عموماً بہتر ہوتے ہیں۔"

انہوں نے کندھے اچکائے اور خاموشی سے کافی کی چسکیاں لینے لگیں۔ کافی ختم کرکے میں نے ایک بار پھر فون پر شفیع شاہ سے رابطہ کیا۔ وہ میری آواز پہچان چکا تو میں نے کہا "شاہ جی! ایسا معلوم ہوتا ہے ہمارے پاس انتظار کی گنجائش نہیں رہی۔ جبار جیلانی کے آدمی تین مرتبہ تو میری موجودگی میں مسز درانی کو ہراساں کرنے کے لیے خاصی خطرناک کارروائیاں کرچکے ہیں جن میں سچ مچ بھی ان کی جان جاسکتی تھی۔ میں پہلے بھی تم سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے یہ بات بالکل اچھی نہیں لگی کہ وہ ہمیں خاطر میں نہیں لایا۔ اب تو یہ بات بالکل ہی برداشت سے باہر ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے، اب وقت آگیا ہے کہ اس سے اپنا تعارف کرا ہی دیا جائے اور دو دو باتیں کرلی جائیں۔"

"جیسے آپ مناسب سمجھیں سر!" شفیع شاہ بے پروائی سے بولا۔

"ذرا معلوم کرو وہ اس وقت اپنے دفتر میں موجود ہے یا نہیں؟" میں نے کہا۔

"معلوم کرنے کی ضرورت نہیں سر! مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔ ابھی چند سیکنڈ پہلے ہی اپنے ایک آدمی سے میری فون پر بات ہورہی تھی۔ میں اس سے تازہ ترین رپورٹ لے رہا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ اس وقت اپنے آفس میں موجود ہے" شفیع شاہ نے بتایا۔

"بس.... تو پھر ٹھیک ہے۔ میں ہوٹل پہنچ رہا ہوں۔ ٹونی کو بھی وہیں بُلا لو۔ ہم تینوں اکٹھے چلیں گے اور جناب جبار جیلانی سے "شرفِ ملاقات" حاصل کریں گے" میں نے کہا۔

"کیا ہم ان سے ڈپلومیٹک مذاکرات کریں گے سر!" شفیع شاہ نے پوچھا۔

"نہیں۔ ڈپلومیٹک مذاکرات کا وقت نہیں ہے۔ اب ہم ان سے پریکٹیکل مذاکرات کریں گے" میں نے جواب دیا۔ میرے ساتھی ان اصطلاحوں کا مطلب بخوبی سمجھتے تھے۔ ان کے لیے صرف اشارہ کافی ہوتا تھا۔ اس کے بعد صورتِ حال کے مطابق وہ خود ہی طے کرلیتے تھے کہ انہیں کیا کرنا ہوگا۔

میں کافی ختم کرچکا تھا۔ فون پر شفیع شاہ کو خدا حافظ کہتے ہی میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اور کافی نہیں پیوگے؟" مسز درانی نے پوچھا۔

"عقلمند را تھوڑی کافی، کافی است" میں نے صوفے پر سے فائل اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"واہ.... کیا عمدگی سے تم نے فارسی کی ٹانگ توڑی ہے.... اور ساتھ ہی کافی کی بھی ٹانگ توڑ دی" مسز درانی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

میں نے فائل کھول کر ان کے سامنے رکھ دی اور ایک کاغذ پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "یہاں دستخط کر دیجیے۔"

"یہ کیا ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"پاور آف اٹارنی" میں نے جواب دیا "آپ کے دستخط کرتے ہی میں آپ کے اس بیش قیمت کھنڈر کا مختارِ کل ہوجاؤں گا۔ جس کے ہاتھ چاہوں بیچ دوں اور ساری رقم ہضم کرجاؤں۔"

"ٹھیک ہے.... ٹھیک ہے.... ابھی جو کھانا کھایا ہے اس کے ساتھ ہی ہضم کرلینا" انہوں نے بلا تامل کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔

میں نے فائل بند کی اور رخصت ہونے لگا تو وہ میرے ساتھ باہر کی طرف چلتے ہوئے بولیں۔ "تو آج تم اس سے بات کروگے؟" میں نے اثبات میں سرہلایا تو وہ بولیں "مجھے اب کیا کرنا چاہیے؟" میں نے محسوس کیا کہ ان کے چہرے پر فکرمندی کی پرچھائیاں اُبھررہی ہیں۔

"بس گھر سے مت نکلئے گا...." میں نے کہا "گھر میں جو آپ کا دل چاہے کیجیے۔"

وہاں سے رخصت ہوکر میں ہوٹل پہنچا تو آفس میں ٹونی اور شفیع شاہ دونوں میرے منتظر تھے۔ وہ بھی میری طرح عمدہ سوٹ میں تھے اور اونچے درجے کے نوجوان بزنس مین دکھائی دے رہے تھے۔ شفیع شاہ کے پاس تو بریف کیس بھی تھا۔

میں نے سائڈ ٹیبل سے اپنا بریف کیس اُٹھاتے ہوئے کہا "میں بھی بریف کیس ساتھ لے لیتا ہوں۔ آخر میں بھی ایک معزز بزنس مین ہوں۔"

وہ دونوں مسکرادیے۔ میں نے پاور آف اٹارنی والی فائل اپنے بریف کیس میں رکھ لی۔ چند منٹ ہم نے نیچی آوازوں میں باتیں کیں۔ اس دوران چائے کا دور بھی چلا پھر ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم تینوں میری مرسیڈیز میں روانہ ہوئے لیکن ڈرائیونگ سیٹ پر شفیع شاہ تھا۔

جبار جیلانی کے دفاتر جس بلڈنگ میں تھے وہ ہمارے ہوٹل سے زیادہ دور نہیں تھی۔ جلد ہی ہم وہاں جا پہنچے۔ وہ چھوٹے سے پلاٹ پر بنی ہوئی ایک اونچی اور ٹاور نما بلڈنگ تھی۔ باہر کی طرف امپورٹڈ شیشے لگاکر بہت چمک دمک پیدا کی گئی تھی .... اس کی پارکنگ لاٹ اتنی چھوٹی تھی کہ ہمیں گاڑی کھڑی کرنے کی جگہ میسر نہیں آسکی۔ شفیع شاہ نے گاڑی عقبی گلی میں کھڑی کی۔ یہ بھی ایک لحاظ سے اچھا ہی تھا لیکن ہم عقبی دروازے سے اندر نہیں جاسکتے تھے۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔

عمارت کے گرد گھوم کر ہم دوبارہ صدر دروازے پر آئے۔ میں نے دیکھا پارکنگ لاٹ میں ایک کونے میں زرد رنگ کی ایک اسپورٹس موٹر سائیکل بھی موجود تھی۔ مسز درانی کے ہاں میں نے رائفل کے فائر کے بعد جن دو آدمیوں کو موٹر سائیکل پر فرار ہوتے ہوئے بہت دور سے دیکھا تھا وہ بھی زرد رنگ کی تھی۔ اگر یہ وہی موٹر سائیکل تھی تو مجھے جبار جیلانی کی بے خوفی کی داد دینی چاہیے تھی۔ اس نے اتنی احتیاط کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ جس موٹر سائیکل پر کوئی واردات کرائی تھی کم ازکم اسے تو اپنی بلڈنگ سے دور رکھنے کی ہدایت کرتا۔

عمارت میں گراؤنڈ فلور پر ایسی جگہ پر ریسپشن بنا ہوا تھا کہ باہر سے آنے والا کوئی بھی شخص اس کے سامنے سے گزرے بغیر اندر یا اوپر نہیں جاسکتا تھا۔ ویسے بھی اس پر ایک ایسی سراپا ناز قسم کی ریسپشنسٹ بیٹھی تھی کہ شاید کسی کا اس سے رجوع کیے بغیر اندر جانے کو دل ہی نہ چاہتا۔

کچھ لوگ یونہی کاؤنٹر کے سامنے سے گزرتے ہوئے بھی اندر یا پھر سیڑھیوں اور لفٹ کی طرف جارہے تھے لیکن وہ یقیناً انہی دفاتر میں ملازم تھے۔ شفیع شاہ مجھے بتاچکا تھا کہ کوئی اجنبی اگر اس طرح جانے کی کوشش کرتا تو اسے روک لیا جاتا تھا۔ سیڑھیاں اور لفٹ پاس پاس ہی تھی۔ دو باوردی گارڈ وہاں کھڑے تھے اور آنے جانے والوں کا عقابی نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔

ہم خود ہی ریسپشن کے سامنے جارکے اور شفیع شاہ نے بڑی معصوم سی شکل بناکر پوچھا "جبار جیلانی صاحب سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟" سوال اس نے انگریزی میں کیا تھا۔

اس حشر ساماں قسم کی ریسپشنسٹ نے میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ باری باری ہم تینوں کی طرف دیکھا اور میٹھی میٹھی سی آواز میں بڑی شائستگی سے انگریزی میں ہی پوچھا "کیا ان سے آپ کی ملاقات طے ہے؟"

"جی نہیں.... مگر میرا خیال ہے' وہ ہم سے مل لیں گے۔ ہم ان سے ایک اہم بات کرنے آئے ہیں" شفیع شاہ نے جواب دیا "بہت بڑا کاروباری معاملہ ہے۔"

ہمارے حلیے اور شخصیتیں اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے کافی تھیں۔ نفیس اور مہذب سی شخصیتوں کے مالک' تین سوٹڈبوٹڈ اور نہایت شائستہ بزنس مین یا ایگزیکٹو نظر آنے والے آدمی اس کے سامنے کھڑے تھے جن میں سے دو نہایت نفیس قسم کے بریف کیس بھی اُٹھائے ہوئے تھے۔

اپنی میٹھی مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے اس نے ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھایا "میں انہیں کیا بتاؤں؟"

"ان سے کہئے کہ مسز درانی والی پراپرٹی کے سلسلے میں تین صاحبان بات کرنے آئے ہیں" شفیع شاہ نے جواب دیا اور میری طرف اشارہ کیا "یہ مسز درانی کے وکیل ہیں مسٹر افضل بار ایٹ لا ...." پھر اس نے اپنی اور ٹونی کی طرف اشارہ کیا "ہم رئیل اسٹیٹ کا کاروبار کرنے والی ایک ... ہم میں پارٹنر ہیں ... "اسٹیٹ مین" کے نام سے ڈیفنس میں ہمارا دفتر ہے۔"

لڑکی نے طمانیت سے سرہلایا اور نہایت نیچی آواز میں فون پر غالباً جبار جیلانی کو ہی ہمارے بارے میں بتانے لگی۔ چند لمحے بعد اس نے ریسیور رکھا اور ہمارے لیے باقاعدہ ایک گیٹ پاس تیار کرکے ہمیں دیا پھر پہلے سے زیادہ میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "ٹاپ فلور پر باس کی سیکریٹری آپ کی منتظر ہیں۔"

ہم تینوں نے بیک زبان اس کا شکریہ ادا کیا اور لفٹ کی طرف بڑھ گئے۔ ہمیں اتنا شریفانہ رویّہ اختیار کرنے کا کھڑاگ اس لیے

بلانا پڑا کہ ہم گراؤنڈ فلور پر ایسی کوئی حرکت نہیں کرنا چاہتے تھے ں کی اطلاع ٹاپ فلور پر بیٹھے جبار جیلانی کو ملتی اور وہ قبل از ت ہوشیار ہوجاتا۔ ریسپشنسٹ نے ہمیں اس لفٹ کی طرف نے کا اشارہ کیا جو صرف باس اور اس کے ملاقاتیوں کے لیے صوص تھی اور سیدھی ٹاپ فلور پر جاتی تھی۔ راستے میں کہیں یں رکتی تھی۔

لفٹ کا دروازہ کھلا تو ہم نے خود کو ایک راہداری میں پایا جس ں دونوں طرف کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔ سامنے ناک کی دھ میں لکڑی کا ایک شاندار دروازہ بند نظر آرہا تھا۔ راہداری ں دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور روشنی مدھم تھی۔ اس قسم کی ہداریاں اور ایسی آرائش عام طور پر اچھے ہوٹلوں میں دیکھنے میں ی تھی۔ شفیع شاہ عمارت کی ساخت اور قرب وجوار کی عمارتوں ، بارے میں بھی تمام ضروری معلومات حاصل کرچکا تھا۔ وہ مجھے ر ٹونی کو بھی ان معلومات سے آگاہ کرچکا تھا۔

اس بند دروازے کے قریب سے ہی سیڑھیاں اوپر جارہی یں جن کے راستے چھت پر جایا جاسکتا تھا لیکن دروازے کے نوں طرف باوردی گارڈ ہلکی مشین گن لیے کھڑے تھے جن کا رخ ری طرف تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میں ٹھٹک گیا کہ کیا نیچے سے پر آنے کے دوران ہی ہماری حقیقت کھل چکی تھی؟ کیا جبار جیلانی کو م ہوچکا تھا کہ میں حقیقتاً کون تھا؟

مگر شفیع شاہ تصدیق کرچکا تھا کہ اس بلڈنگ کے راستوں یا لفٹ وغیرہ میں کہیں خفیہ کیمرے نصب نہیں تھے جن سے جبار جیلانی اپنے آفس میں بیٹھے بیٹھے ٹی وی اسکرین پر ہماری صورتیں دیکھ سکتا۔ ہم بھی غیر محسوس طور پر اِدھراُدھر کا جائزہ لے کر تصدیق کرچکے تھے کہ کہیں سے کسی کیمرے کی خفیہ آنکھ ہمیں نہیں دیکھ رہی تھی۔ شاید جبار جیلانی ابھی اتنی احتیاط کی ضرورت محسوس نہیں کرتا تھا اس لیے اس نے یہ کھڑاگ نہیں پالا تھا۔ اس کے خیال میں اس کے موجودہ انتظامات اور اس کی دہشت ہی اس کے مخالفوں کو اپنی حدود میں رکھنے کے لیے کافی تھی۔

ہم نے اپنے آپ کو گن پوائنٹ پر دیکھ کر کوئی کام دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ ہم ایسی کوئی کوشش کر بھی نہیں سکتے تھے۔ ہمارے اور ان کے درمیان فاصلہ کافی تھا۔ کوئی کام دکھانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ہمارے کچھ قریب ہوتے۔ چنانچہ ہم نے تین شریف کاروباری شخصیات کی طرح' اتنی خوفناک گنیں دیکھ کر تھوڑا سا نروس ہوجانے کی اداکاری کی.... بلکہ ٹونی نے تو ہاتھ بھی اٹھادیے کیونکہ اس کے پاس بریف کیس نہیں تھا۔ میں نے اور شفیع شاہ نے کچھ ایسی اداکاری کی جیسے ہمارے ہاتھوں سے بریف کیس گرتے گرتے بچے تھے۔

گارڈز کی گنیں ہی نہیں' ان کی صورتیں بھی خاصی خوفناک سی تھیں۔ ان میں سے ایک نے گن سے اور دوسرے نے ایک

ہاتھ سے ہمیں اشارہ کیا کہ ہم لفٹ سے ذرا آگے ہی رُک جائیں جہاں ہم پہنچ چکے تھے۔ پھر وہ دونوں خود ہی ہمارے قریب آگئے۔ میرا دل باغ باغ ہوگیا۔ کتنا اچھا معلوم ہوتا ہے جب شکار خود ٹہلتا ہوا شکاری کے پاس آجائے۔

"خ... خ... خیریت تو ہے؟" میں نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... خیریت ہی ہے" ایک گارڈ گویا ہماری گھبراہٹ سے لطف اندوز ہوتے ہوئے زیرِ مونچھ مسکرایا "اندر جانے سے پہلے آپ کو تلاشی دینی ہوگی اور یہ بریف کیس کھول کر دکھانے ہوں گے۔ یہ یہاں کا اصول ہے۔ سب مہمان اس سلسلے میں ہمارے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔"

"اوہ...!" میں نے گویا اطمینان کی طویل سانس لی اور بازو نیچے کرتے ہوئے کہا "تم نے تو ہماری جان ہی نکال دی تھی۔"

اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ آفس کے دروازے سے آگے آگئے تھے۔ ویسے تو مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ آفس کا دروازہ ساؤنڈ پروف تھا اور چھوٹی موٹی کھٹر پٹر کی آوازیں اندر نہیں جائیں گی لیکن یہ اور بھی اچھی بات تھی کہ اب ہم سب دروازے سے خاصے فاصلے پر تھے۔

میں نے اور شفیع شاہ نے بریف کیس دونوں طرف کی دیواروں کے ساتھ لگا کر رکھ دیے اور ہاتھ اٹھا کر گویا تلاشی دینے کے لیے تیار ہوگئے۔ ایک گارڈ نے گن سے ہمیں کور رکھا۔ دوسرے نے گن کندھے پر لٹکالی اور غالباً ہمارے لباس کو تھپتھپانے کے ارادے سے دونوں ہاتھ پھیلا کر آگے بڑھا۔ ہم انسے تلاشی دینے کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے کیونکہ ہم تینوں کے پاس نہ صرف گنیں بلکہ ضرورت کی اور دو چار چھوٹی موٹی چیزیں موجود تھیں جنہیں عام لوگ خطرناک اشیا میں شمار کرتے تھے۔

چنانچہ اِدھر اس گارڈ کے ہاتھوں نے میرے لباس کو چھُوا‘ اُدھر ان کے سروں پر قیامتیں ٹوٹ پڑیں۔ دوسرے گارڈ کو شاید پتا بھی نہیں چلا ہوگا کہ کب اور کس طرح اس کے ہاتھوں سے گن نکل گئی۔ شفیع شاہ اور ٹونی کے ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت میں آئے تھے کہ میں خود بھی انہیں صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا۔ ان دونوں نے گارڈز کے سروں پر کراٹے کے وار کیے تھے۔

وہ دونوں لڑکھڑائے لیکن میں نے انہیں گرنے نہیں دیا اور تیزی سے حرکت میں آتے ہوئے دونوں کی گردنیں بازوؤں میں جکڑلیں۔ اسی اثنا میں ان کی گنیں شفیع شاہ اور ٹونی کے ہاتھوں میں جاچکی تھیں۔ میں نے محض احتیاطاً ان کی گردنیں بازوؤں کے شکنجے میں جکڑی تھیں کہ وہ کوئی آواز نہ نکالنے پائیں لیکن اسی لمحے مجھے اندازہ ہوگیا کہ شفیع شاہ اور ٹونی کا ایک ایک وار ہی ان کے لیے کافی ثابت ہوا تھا اور وہ بے ہوش ہوچکے تھے تاہم میں نے انہیں گرفت میں ہی رکھا۔

نکال کر اتنی پھرتی سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھے کہ کوئی دیکھتا تو یقین نہ کرپاتا کہ یہ انسانی ہاتھوں کا کام تھا۔ انہوں نے ان کے ہونٹوں پر ٹیپ بھی چپکادی۔ ایک گارڈ کی خوفناک مونچھوں کی وجہ سے ہونٹوں پر ٹیپ چپکانے میں چند سیکنڈ زیادہ لگ گئے۔

اس دوران میں نے آفس کے دروازے پر بھی نظر رکھی تھی کہ کہیں وہ اچانک نہ کھل جائے اور ان نازک لمحوں میں کوئی باہر نہ آجائے مگر کام خیریت سے مکمل ہوگیا۔ اس میں بہ مشکل ایک منٹ لگا ہوگا۔ میں نے ان کی گردنوں کو بازوؤں کے شکنجوں سے آزاد کردیا اور اسی لمحے شفیع شاہ اور ٹونی نے جھک کر انہیں کندھوں پر لادلیا۔ فوراً ہی وہ بے آواز قدموں سے سیڑھیوں کی طرف دوڑتے چلے گئے۔

میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہوگیا۔ میرا ہاتھ بغلی ہولسٹر پر اور نظر آفس کے دروازے پر تھی لیکن مزید چند سیکنڈ بھی خیریت ہی رہی اور اسی دوران شفیع اور ٹونی ان دونوں گارڈز کو چھت پر لٹا کر واپس آگئے۔ وہ اپنا کوٹ اور ٹائی وغیرہ ٹھیک کرتے آرہے تھے جن پر صرف چند شکنیں آگئی تھیں لیکن مجموعی طور پر حلیے میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا۔

"اب وہ آرام سے کچھ دیر دھوپ سینکیں گے" شفیع شاہ نیچی آواز میں بولا۔

"اور ان کی گنیں؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"وہ ہم نے پانی کی ٹنکی کی آڑ میں کھڑی کردی ہیں۔ ہمیں ان کی ضرورت نہیں" اس نے جواب دیا۔

ہم نے ہاتھ جھاڑے اور ایک بار پھر ہونٹوں پر نہایت خلیق اور امن پسندانہ سی مسکراہٹ سجا کر نفیس کاروباری لوگوں کی طرح چلتے ہوئے دروازہ کھول کر اندر جا پہنچے۔ خنک فضا‘ دودھیا روشنی اور دلفریب خوشبو نے ہمارا استقبال کیا۔ دروازے نے ایک نہایت خفیف اور مترنم سی گھنٹی سے گویا ہماری آمد کا اعلان کیا۔

کمرے کے دوسرے سرے پر دیوار کے ساتھ ایک خوب صورت میز اور اس کے لوازمات سجے ہوئے تھے۔ سائڈ ٹیبل پر تین چار رنگوں کے فون‘ انٹرکام اور کمپیوٹر وغیرہ بھی موجود تھا۔ ایک نہایت خوب صورت اور خوش لباس لڑکی کمپیوٹر کے کنسول سے کھیل رہی تھی اور نیلی اسکرین پر کچھ اعداد و شمار رقصاں تھے۔ نہایت مدھم اور مترنم گھنٹی کی آواز سن کر وہ ہماری طرف متوجہ ہوئی لیکن عین اسی وقت اس کے پہلو میں ایک فون گنگنا اُٹھا اور اس نے اس کا ریسیور اُٹھالیا۔

میں نے دروازے پر ہی رک کر سرگوشی میں ٹونی سے کہا "یار ٹونی! یہ اکثر بُرے دھندے کرنے والے بدمعاش اپنے دفتروں کے لیے اتنی خوب صورت اور سلیقے کی لڑکیاں کہاں سے ڈھونڈ لاتے ہیں؟"

مسکراتے

ہوئے سرگوشی میں بولا "اور پھر خوب صورت لڑکیاں بھی ان کا اہم سرمایہ ہوتی ہیں۔"

ہم آگے بڑھ کر میز کے قریب جا پہنچے تو لڑکی ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر ہماری طرف دوبارہ متوجہ ہوتے ہوئے بولی "آپ لوگ مسز درانی والی پراپرٹی کے سلسلے میں آئے ہیں نا؟"

"جی۔" شفیع نے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔

"آپ اندر چلے جائیے۔ باس آپ کا انتظار کررہے ہیں" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ہم اس طرف پہنچے تو اندازہ ہوا کہ جبار جیلانی کے کمرے کا دروازہ ایک خوب صورت آرائشی پارٹیشن کی آڑ میں چھُپا ہوا تھا۔ اس پر تانبے کی نہایت خوب صورت نیم پلیٹ جڑی ہوئی تھی۔

ہم نے یہ دروازہ کھولا تو اس نے کوئی چوں چاں نہیں کی۔ جبار جیلانی سامنے ہی ایک شاندار میز کے عقب میں بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ میں نے اس کے بارے میں کوئی بہت اونچا تصور تو نہیں باندھا تھا پھر بھی اس کے بارے میں افسانے سن کر توقع تھی کہ تھوڑی بہت بارعب‘ بھاری بھرکم یا متاثر کن شخصیت کا مالک تو ہوگا لیکن اسے دیکھنا ایک طرح سے "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" والا معاملہ ہی تھا۔

وہ بہت ہی مختصر الوجود تھا۔ سر سے چپکے ہوئے بالوں میں سفیدی نمایاں تھی۔ آنکھیں مختصر چہرے پر مینڈک کی طرح اُبھری ہوئی تھیں۔ اوپر سے اس نے مونچھیں جو کروں والی رکھی ہوئی تھیں جو اس کے چہرے پر قطعاً نہیں جچ رہی تھیں مگر شاید یہ باتیں اہم نہیں تھیں۔ اہم باتیں یہ تھیں کہ وہ کروڑپتی تھا۔ اس کے جسم پر نہایت بیش قیمت سوٹ تھا۔ اس کی "انی شیلڈ" (INITIALED) ٹائی ہی شاید ہزاروں روپے یا سیکڑوں ڈالر کی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں تھیں اور وہ کمرے کی خنک فضا میں ہوانا کے سگار کا دُھواں بکھیر رہا تھا۔

بزنس کی حد تک تو بات ٹھیک تھی لیکن مجھے یہ امید نہیں تھی کہ اس قسم کی شخصیت کا مالک لینڈ مافیا کا روحِ رواں بھی ہوسکتا تھا۔ لینڈ مافیا کو چلانا خطرناک لوگوں کا کام تھا۔ میرا مطلب ہے جو دیکھنے میں ہی خطرناک نظر آتے تھے۔ بہرحال... اس شاندار ریوالونگ چیئر میں دھنسے ہوئے جبار جیلانی کی شخصیت اگر "خطرناکی" سے خالی تھی تو اس نے توازن برقرار رکھنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔

اس کی کرسی کے عقب میں گویا ایک دیو زاد استادہ تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ غفار جیلانی تھا۔ مسز درانی نے اس کا جو حُلیہ اور نشانیاں بیان کی تھیں وہ میرے ذہن میں تازہ تھیں۔ وہ ایک ایسی شخصیت کا مالک تھا جسے دیکھ کر ہی ایک کمزور دل آدمی کو جھرجھری آسکتی تھی۔ وہ گویا اپنے کمزور اور مختصر الوجود بھائی کو اپنی پناہ‘ اپنی چھاؤں میں لیے کھڑا تھا اور کینہ توز نظروں سے ہمیں گھور رہا تھا۔ اتنے بے جوڑ بھائی میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھے تھے۔ شاید ان میں سے ایک کی حیثیت ذہن کی اور دوسرے کی جسم کی تھی۔ اس لیے آج کے دور میں بھی دونوں کا ساتھ اتنی عمدگی سے نبھ رہا تھا۔

جبار جیلانی کو دیکھ کر مجھے جو خفیف سا جھٹکا لگا تھا‘ میں نے تو اس کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا لیکن وہ مجھے دیکھ کر اپنی حیرت نہیں چھُپا سکا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ یکدم میز پر کچھ آگے جھک آیا اور سگار سمیت دو انگلیوں سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تم... تم تو فائیو اسٹار ہوٹل کے مالک افضل چوہدری ہو... کیا تم نے اپنے آپ کو نیچے ریسیپشن پر مسز درانی کا وکیل ظاہر کیا تھا؟"

"ہاں" میں نے اطمینان سے سر ہلایا "وکیل ظاہر نہیں کیا تھا... بلکہ میں سچ مچ وکیل ہوں۔ فائیو اسٹار ہوٹل بے شک میرا ہے لیکن بنیادی طور پر میں بیرسٹر ہوں۔ شوقیہ طور پر کبھی کبھار اپنے کچھ جاننے والوں کے قانونی معاملات کی ذمّے داری لے لیتا ہوں۔"

اسے شاید کچھ اطمینان ہوا کیونکہ اس کی کمر دوبارہ ریوالونگ چیئر کے پشتے سے جا لگی تھی اور یہ گویا اس کے عقب میں کھڑے ہوئے غفار جیلانی کے لیے اشارہ تھا کہ زیادہ گڑبڑ کی کوئی بات نہیں ہے کیونکہ اس کا اپنی جیب کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ واپس آگیا تھا اور چہرے پر خشونت کے آثار کم ہوگئے تھے ورنہ میرے جھوٹ کا اندازہ ہوتے ہی گویا انہیں خطرے کا احساس ہوا تھا لیکن میں نے فوراً بات بنا کر انہیں مطمئن کردیا تھا۔ کم از کم عارضی طور پر تو کر ہی دیا تھا۔

تاہم جبار کا رویّہ پھر بھی زیادہ دوستانہ نہیں ہوا۔ اپنے سامنے پڑی کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا "بیٹھو... بیٹھو" شخصیت کے برعکس اس کی آواز نہایت بھاری اور متاثر کُن تھی۔

ہم نے جان بوجھ کر کرسیاں میز سے کچھ دور کرلیں تاکہ آسانی سے حرکت کرنے کے لیے کھلی جگہ میسر رہے۔ مجھے پہچان لینے کے باوجود اس بدبخت جبار جیلانی نے بداخلاقی کی حد کردی کہ ٹھنڈے گرم کے لیے بھی نہیں پوچھا اور سگار ایش ٹرے میں مسل کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بلا تمہید پوچھا "ہاں... بولو... کیا بات کرنے آئے ہو؟"

خبیث کا بچہ اپنی شامت کو آواز نہیں بلکہ آوازیں دیے جارہا تھا۔ وہ کچھ اس طرح بات کررہا تھا جیسے اس کے سامنے ایک فائیو اسٹار ہوٹل اور ملک کے ایک بڑے گروپ آف کمپنیز کا مالک نہیں بلکہ اس کا کوئی معمولی ملازم بیٹھا ہوا تھا اور اپنی تنخواہ میں اضافے کا مطالبہ لے کر آیا تھا۔ میری کھوپڑی جو اس کی حرکتوں کی وجہ سے پہلے ذرا کم گھوم رہی تھی اب تیزی سے گھومنے لگی تھی۔ کنپٹیاں تپ رہی تھیں۔

میں نے جواب دینے میں توقف کیا تو وہ قدرے مضطربانہ لہجے

میں بولا "مجھے پتا چلا ہے' وہ عورت آج کل تمہارے ساتھ' تمہارے ہوٹل میں بہت دیکھی جارہی ہے۔ تمہاری اس عورت میں یا اس کی پراپرٹی میں کیا دلچسپی ہے؟" وہ گویا میرا انٹرویو لے رہا تھا۔

"اس عورت کی وہ عمر گزر چکی ہے جب اس میں دلچسپی لی جاسکتی تھی" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

اس کے سیاہی مائل ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ اُبھری گویا میں نے اس کا پسندیدہ موضوع چھیڑ دیا ہو اور وہ میرے بارے میں ذرا کم ناپسندیدگی سے سوچنے پر مجبور ہوگیا ہو۔

"وہ اب بھی خاصی ٹھیک ٹھاک چیز ہے" وہ کہنیاں میز پر ٹکاتے ہوئے بولا "سنا ہے جوانی میں بڑی شعلہ جوالا تھی۔ بہت سی چنگاریاں اب بھی باقی ہوں گی۔"

میں کچھ دیر اور مہذبانہ ماحول برقرار رکھنا چاہتا تھا لیکن اس کی یہ بات سُن کر میں نے ارادہ ملتوی کرتے ہوئے کہا "بکواس مت کرو... مجھ سے اس کا رویہ بزرگانہ اور مشفقانہ ہے۔"

حیرت انگیز طور پر اس نے میری بات کا بُرا نہیں منایا اور ہلکا سا قہقہہ لگایا لیکن غفار جیلانی دانت پیس کر آگے آتے ہوئے بولا "تم بھائی جان سے اس لہجے میں بات کررہے ہو! تمہاری یہ جرأت...!"

مگر جبار جیلانی نے صرف ہاتھ اٹھایا اور وہ یوں رک گیا جیسے گاڑی کو پوری قوت سے بریک لگادی گئی ہو۔ وہ بھائی کی طرف دیکھے بغیر بولا "ابھی انہیں بات کرنے دو۔ شاید اس سے زیادہ غصے کا مرحلہ آگے آئے۔"

پھر اس نے میری بات کا جواب دیا "اس کے بزرگانہ اور مشفقانہ رویے پر نہ جانا۔ رنگین مزاج عورت ہے۔ جب اس پر جذبات غالب آتے ہیں تو سب کچھ بھول جاتی ہے۔"

مسز درانی کی شخصیت بلاشبہ ابھی مکمل کھنڈر نہیں ہوئی تھی اور ان میں کشش بھی موجود تھی لیکن مجھے ان کی حرکات وسکنات یا آنکھوں میں کہیں بھی رنگین مزاجی کی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ بہرحال اکثر لوگ عورتوں کے معاملے میں دور کے تماشائی ہوتے ہوئے بھی بڑے وثوق سے اپنے "گراں قدر" خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

جبار جیلانی نے مجھے بولنے کا موقع دیے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بہرحال مجھے صرف اس کے مکان سے دلچسپی ہے۔ کیا تم لوگ اس پر کچھ کیس کھڑا کرنے کے ارادے سے آئے ہو؟"

"میں تمہیں یہ بتانے آیا ہوں کہ مکان کو ہتھیانے کے لیے تم نے بندر کی طرح جو اُچھل کود مچا رکھی ہے وہ اب بند کردو" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرد لہجے میں کہا پھر اس کی طرف سے نظر ہٹائے بغیر بریف کیس سے فائل نکال کر اس کے سامنے لہرائی "اس میں اس مکان کے بارے میں میرے نام پاور آف اٹارنی موجود ہے۔ اب تمہیں اس کے بارے میں جو بھی بات کرنی ہو' مجھ سے کرنا اور اس ضمن میں تمہارے لیے سب سے زیادہ فائدے کی بات یہ ہے کہ مجھ سے کوئی بات نہ کرو اور اب اس بات کو بھول جاؤ۔"

وہ چند سیکنڈ کے لیے بالکل خاموش رہا اور ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ کمرے میں اتنا گہرا سکوت تھا کہ میں اس کے بھائی کی سانسوں کی خرخراہٹ بھی سُن رہا تھا جو کسی غصہ ور سانڈ کی سانسوں کی شوں شوں سے مشابہ تھی۔

آخر جبار جیلانی نے ایک بار پھر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگالیا اور گہری سانس لے کر کہا "اس خرافہ کو بھی آخر کار اپنا گیم کھیلنے کے لیے ایک چُغد مل ہی گیا۔" پھر وہ نہایت نرم لہجے میں' سمجھانے کے سے انداز میں بولا "دیکھو برخوردار! یہ جو تم نے "پاور آف اٹارنی" کی بات کی ہے نا.... اس میں "آف اٹارنی" کے الفاظ بالکل فالتو ہیں۔ اصل چیز صرف پاور ہوتی ہے.... اور پاور ہمارے پاس ہے۔ اس لیے ہم کسی اٹارنی وغیرہ کو نہیں مانتے۔ میں اس ٹیڑھی عورت کے ساتھ جتنی شرافت کا مظاہرہ کرسکتا تھا' کرچکا۔ میں نے اسے وہ آفر دی جو اس صدی میں حاتم طائی کا کوئی جانشین بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اب بہت ہوچکی.... اوپر سے تم کاغذ کے یہ پُرزے لے کر میرا دل جلانے آگئے ہو۔"

اس نے کرسی ذرا سی گھُما کر اپنے گینڈے نما بھائی کی طرف دیکھا اور بڑے پیار سے کہا "غفار! ان شریف شرفا قسم کے لوگوں کو بتاؤ کہ پاور اور پاور آف اٹارنی میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہ فائل ان صاحب کے ہاتھ سے لے کر پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دو۔"

غفار کے کٹے پھٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ اُبھری گویا اسے اس کے پسندیدہ کام کا موقع میسر آرہا تھا۔ وہ ہماری طرف بڑھا۔ حیرت انگیز پھرتی سے وہ جیب سے پستول نکال چکا تھا اور چیتے کی طرح چوکنا نظر آرہا تھا۔

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگزشت ابھی جاری ہے باقی واقعات گیارھویں حصے میں پڑھیں۔

11

ہمارے اپنے گلی کوچوں میں ہونے والا تماشائے آہن و سنگ
ہمارے آپ کے گرد بکھرے ہوئے کرداروں کی داستانِ ہزار رنگ

سرگزشت

محمود احمد مودی

جاسوسی
ڈائجسٹ
کے
مقبول ترین
سرگزشت

مکتبہ القریش ۰ سرکلر روڈ ۰ اردو بازار لاہور
فون
۷۲۲۴۶۶۵

جبار جیلانی کا اس حد تک متکبرانہ رویّہ میرے لیے حیرت کا باعث تھا۔ کبھی کبھی مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اثر رسوخ' روپیا پیسا' سیاسی پشت پناہی اور غنڈوں کی فوج ظفر موج کیا واقعی انسان کو فرعون بنا دیتی ہے مگر کوئی نہ کوئی ایسا نمونہ سامنے آجاتا تھا کہ مجھے یقین کرنا ہی پڑتا تھا۔

ایسا ہی ایک نمونہ جبار جیلانی کے روپ میں اس وقت میرے سامنے تھا۔ اس کا دیو زاد بھائی غفار جیلانی اس کے حکم پر پستول سنبھالے کچھ یوں ہماری طرف بڑھ رہا تھا جیسے اس سے ہماری بوٹیاں۔۔۔ بلکہ شاید قیمہ بنا کر کتے بلیوں کے سامنے پھینک دے گا۔ ہمارے نفیس سوٹ' مسکین سی مسکراہٹ اور بے وقوفوں کی طرح پھیلی پھیلی سی آنکھیں اسے غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھیں۔

دوسرے ہی لمحے مجھے اس بے چارے پر ترس بھی آیا۔ اسے شاید پتا بھی نہیں چلا ہو گا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا اور کس طرح ہوا۔ ٹونی اور شفیع شاہ اچانک ٹوٹ جانے والے اسپرنگ کی طرح اپنی جگہ سے اُچھلے تھے۔ اس کے بعد غفار کا پستول ہوا میں اُڑتا ہوا نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور وہ خود اوندھے منہ فرش پر پڑا تھا۔

ٹونی اس کی کمر پر سوار تھا۔ اس نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کی پیشانی زور سے فرش پر ماری گو کہ فرش پر دبیز قالین موجود تھا۔ اس کے باوجود دھمک سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ غفار کی تربوز نما کھوپڑی پر کیا اثرات مرتب ہوئے ہوں گے۔ غفار گو کہ ٹونی اور شفیع شاہ کے مقابلے میں نہایت گرانڈیل اور خطرناک نظر آتا تھا لیکن اس وقت پلک جھپکتے میں ٹونی نے اسے یوں دبوچ لیا تھا جیسے بلی چوہے کو دبوچتی ہے۔ یہ دوسری بات تھی کہ یہ بلی جسامت میں چوہے سے چھوٹی تھی البتہ قد میں اسی کے برابر تھی۔

ٹونی نے جس طرح اس کا سر فرش سے ٹکرایا تھا' مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید اس کی دھمک گراؤنڈ فلور تک گئی ہو۔ اس کی جسمانی ساخت بتاتی تھی کہ اس کا سر لوہے کے گولے کی طرح مضبوط ہو گا لیکن پیشانی کے ساتھ شاید اس کی ناک بھی فرش سے ٹکرائی تھی اور پچک گئی تھی۔

رہی سہی کسر شفیع شاہ نے پوری کر دی۔ وہ غفار کو اوندھے منہ فرش پر گرانے کے سلسلے میں تو اپنا کام دکھا ہی چکا تھا۔ اب اس نے جھک کر اس کی دونوں کنپٹیوں پر بیک وقت یوں گھونسے رسید کیے جیسے کسی بڑے سے تربوز کو پچکانے کی کوشش کر رہا ہو۔ میرے خیال میں دو یا تین سیکنڈ کی یہ کارروائی ہی غفار کے لیے کافی ثابت ہوئی تھی۔

اس کا سر غالباً فرش پر ٹکا ہی رہ گیا تھا۔ اسی لمحے میں نے ٹونی کو اس کے ہاتھ پشت پر لاتے دیکھا۔ شفیع شاہ اس سے بھی زیادہ پھرتی سے بریف کیس سے ڈوری نکال کر اسے دے رہا تھا جس کا ایک مخصوص پھندا پہلے ہی تیار رہتا تھا۔ بس اسے کلائیوں پر چڑھانے کی دیر تھی' غفار کے ہاتھ بندش میں جکڑ جاتے۔

میں صرف یہیں تک دیکھ سکا کیونکہ میں جبار کی طرف سے بھی غافل نہیں رہ سکتا تھا۔ پہلے سے طے شدہ حکمتِ عملی کے مطابق اسے سنبھالنا میری ہی ذمّے داری تھی۔ میں اس کے بارے میں کسی خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں تھا۔ وہ بے شک طاقتور اور خطرناک دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن سانپ خواہ مختصر الوجود اور بظاہر بے ضرر نظر آنے والا ہو تب بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ضرر پہنچانے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے۔

میرا اس کی طرف سے خبردار رہنا مفید ہی ثابت ہوا۔ اسے حرکت میں آنے میں دو تین سیکنڈ کی تاخیر بھی شاید اس لیے ہو گئی کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا ہو گا۔ اس نے پلک جھپکتے میں اپنے قابلِ فخر بھائی کا یہ حشر ہوتے شاید کبھی نہیں دیکھا ہو گا۔۔۔ اور وہ بھی چھریرے جسم کے دو ایسے نوجوانوں کے ہاتھوں۔۔۔ جو حلیے اور صورت سے نہایت شریف بلکہ مسکین قسم کے بزنس مین نظر آتے تھے۔ اس کی آنکھیں مینڈک کی آنکھوں کی طرح پہلے ہی اُبھری ہوئی تھیں لیکن اس دوران شدید حیرت کے باعث کچھ اور اُبھر آئی تھیں۔

اس کی میز میں اس کے ہاتھ کے قریب ہی غالباً کوئی ایسا خانہ تھا جس میں ریوالور رکھا رہتا ہو گا کیونکہ اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا تھا اور اس نے کوئی دراز وغیرہ نہیں کھولی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں جدید ساخت کا ایک ڈبل بیرل ریوالور دکھائی دیا تھا جو چودہ گولیاں فائر کرتا تھا۔

میں نے اسے ریوالور سیدھا کرنے کا موقع نہیں دیا اور میز کے دوسری طرف سے ہی جھکتے ہوئے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈال دیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی کھوپڑی پر کراٹے کا وار کیا۔ اس کا ریوالور والا ہاتھ میز کی سطح سے اوپر نہیں آسکا۔ ریوالور بہرحال لوڈڈ تھا۔ اس سے فائر ہو گیا۔ دو گولیوں کا دھماکا بھی زیادہ زوردار نہیں تھا کیونکہ ریوالور پر سائیلنسر بھی موجود تھا۔ البتہ میز کے کسی حصے کے پرخچے اُڑنے کی آواز سنائی دی۔

میں نے اس کی کھوپڑی پر کراٹے کا ہاتھ ہلکا ہی رسید کیا تھا لیکن اس کے لیے وہی کافی رہا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی تھی کیونکہ اس کا جسم یک لخت بالکل ڈھیلا پڑ گیا تھا۔ ریوالور ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا اور اُبھری ہوئی آنکھیں یک دم کچھ نیچے کو چلی گئیں۔ ان آنکھوں میں شاید مینڈک کی آنکھوں کی طرح پھیلنے اور سکڑنے کی صلاحیت تھی لیکن مختلف کیفیات میں وہ دبتی اور اُبھرتی بھی تھیں۔ غنیمت یہ تھا کہ ابھی اس کی آنکھیں بند نہیں ہوئی تھیں۔

میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر میز کے اوپر ہی سے اپنی طرف کھینچ لیا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب اس کا چہرہ میرے چہرے کے قریب تھا۔ اس کے گلے پر ٹائی اور کالر کا شکنجہ سخت ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر نسیں اُبھر آئی تھیں اور سانسیں خرخراہٹ میں تبدیل ہو گئی تھیں تاہم اس سے مجھے یہ

اطمینان ہوا کہ وہ مرا نہیں تھا۔ اگر وہ کرانے کے اتنے ہلکے ہاتھ سے ہی مر جاتا تو یہ میرے لیے بڑے افسوس کا مقام ہوتا۔

درحقیقت وہ بے ہوش بھی نہیں ہوا تھا۔ صرف اس کے حواس مختل سے ہو گئے تھے۔ میں نے سرگوشی کے سے انداز میں اس کے کان میں کہا "بُری بات ہے میرے چاند! دنیا میں زیادہ فساد نہیں مچایا کرتے۔ کبھی کبھی سیر کو سوا سیر بھی مل جاتا ہے۔"

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے میری بات سُنی تھی یا نہیں۔ وہ میز پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ اس کی ٹانگیں اس کی کرسی پر پہنچ چکی تھیں۔ میں نے اسے گھسیٹا تھا تو بہت سی چیزیں میز پر سے پھسل کر نیچے آگری تھیں۔ میں اس دوران ٹونی اور شفیع شاہ کی کارروائی سے بھی بے خبر نہیں تھا۔ وہ غفار کے ہاتھ پشت پر باندھنے کے علاوہ اس کے پاؤں بھی باندھ چکے تھے اور اسے کسی پارسل کی طرح دیوار کے ساتھ لٹا چکے تھے۔ وہ واقعی بے ہوش تھا۔ ناک پچک چکی تھی۔ چہرہ خون میں تر ہو چکا تھا۔

میں نے دوبارہ جبار کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "تم تو بالکل ہی خاموش ہو گئے۔ کچھ تو بولو نا۔۔۔ مجھ سے مکان کا سودا نہیں کرو گے؟ مسز درّانی سے تو تم مکان چھیننے پر تلے ہوئے تھے۔ میں خود تمہیں وہ مکان دینے کے لیے تیار ہوں۔ آخر تم مجھ سے لے کیوں نہیں لیتے۔ یہ لو مکان۔۔۔۔!" میں نے فائل زور سے اس کے منہ پر ماری۔

اس کے جسم کا سارا خون گویا اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ فائل ایک تھپڑ کی طرح اس کے منہ پر پڑی تو چہرہ کچھ اور سُرخ ہو گیا۔ میں نے اسے واپس اس کی کرسی پر دھکیل دیا۔ پہیوں والی کرسی اس کے وزن کے باعث پچھلی دیوار سے ٹکرائی۔ وہ اس طرح کرسی میں فٹ ہو گیا تھا جیسے کسی نے اسے بڑی احتیاط سے بٹھایا ہو اور پھر اوپر سے بُری طرح دبا دیا ہو۔

اتنی دیر میں پہلی بار میں نے اسے پلکیں جھپکاتے دیکھا پھر کئی سیکنڈ تک وہ تیزی سے پلکیں جھپکاتا ہی چلا گیا جیسے غلطی سے اس کا کوئی بٹن دب گیا ہو اور اس کے وجود میں کوئی مشین اسٹارٹ ہو گئی ہو۔ اس کا موٹا سا نچلا ہونٹ کچھ اور نیچے کو لٹک گیا تھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا لیکن شاید اب بھی وہ حرکت کرنے کے قابل نہیں تھا تاہم یہی غنیمت تھا کہ وہ ہوش میں تھا۔

میں نے ٹونی اور شفیع شاہ کو اشارہ کیا "اس کی بھی پیکنگ کر دو۔"

انہوں نے حسبِ سابق پُھرتی کے ریکارڈ قائم کرتے ہوئے چند سیکنڈ میں اس کا بھی تسلی بخش بندوبست کر ڈالا۔ یعنی اب صورت یہ تھی کہ وہ کرسی پر ہی بیٹھا ہوا تھا لیکن اس کے ہاتھ کرسی کے عقب میں نائیلون کی ڈوری سے بندھے ہوئے تھے۔ دونوں پیروں میں بھی ڈوری کی بندشیں تھیں اور ہونٹوں پر ٹیپ چپکائی جا چکی تھی۔ اس دوران وہ پلکیں جھپکانا ایک بار پھر گویا بھول چکا تھا۔

کمرا گو کہ مکمل طور پر ساؤنڈ پروف تھا اور جس گن سے کمرے میں فائر ہوا تھا اس پر بھی سائیلنسر لگا ہوا تھا لیکن جبار کی سیکریٹری بہر حال ملحقہ کمرے میں ہی بیٹھتی تھی۔ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں کمرے میں جو دھما چوکڑی مچ چکی تھی۔ وہ اسے تشویش میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھی۔ ہماری مشاقی، مہارت اور احتیاط کے باعث اس ساؤنڈ پروف کمرے سے شاید بہت ہی مدھم سی آوازیں سیکریٹری تک پہنچی ہوں گی لیکن بہر حال وہ تجسس سے مجبور ہو کر یا پھر اپنے اطمینان کے لیے کمرے میں جھانکنے چلی آئی۔

ہم نے جان بوجھ کر دروازہ اندر سے غیر مقفل کر دیا تھا۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ وہ اندر جھانکنے کی کوشش کرے گی اور اگر اسے دروازہ مقفل ملا تو وہ باہر سے باہر کوئی کارروائی کر سکتی تھی یا اور کسی ممکنہ گڑبڑ کی اطلاع نچلے فلور پر دوسروں تک پہنچا سکتی تھی۔ اس سے بہتر تھا کہ اسے اندر آنے دیا جائے۔

دروازے کی ناب گھومنے کی خفیف سی کلک کی آواز سُنتے ہی شفیع دروازے کے قریب دیوار سے جا چپکا تھا۔ جونہی سیکریٹری کا خوبصورت سر دروازے سے اندر آیا، شفیع شاہ کا ہاتھ ایک مشینی کلہاڑی کی طرح نیچے آیا اور دوسرے ہی لمحے سیکریٹری اوندھے منہ کمرے کے وسط میں پڑی تھی۔ اس کے منہ سے خفیف سی آواز بھی نہیں نکلی اور نہ ہی اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی۔ شفیع شاہ نے دروازہ آہستگی سے بند کیا اور بٹن دبا کر مقفل کر دیا۔ سیکریٹری کو شاید یہ بھی دیکھنے کی مہلت نہیں ملی تھی کہ اندر کیا ہو رہا تھا۔

"تمہیں صنفِ نازک کا تو کچھ لحاظ کرنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"سر! اس نازک صورتِ حال میں صنفِ نازک کا لحاظ کیسے کیا جا سکتا ہے۔" شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا "ابھی یہ گلا پھاڑ کر چیخنے لگتی تو نزاکت کا سارا تصور پاش پاش ہو جاتا۔ تب بھی شاید ہمیں اس کے ساتھ یہی سلوک کرنا پڑتا۔"

جبار جیلانی اپنی کرسی پر بیٹھا گویا جاگتی آنکھوں سے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا اور نہ جانے کیوں اس وقت بے حد مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ چند منٹ پہلے تک شاید وہ یہ تصور کرنے کے لیے بھی تیار نہ ہو تا کہ اس کے اپنے آفس میں اس کے ساتھ یہ کچھ ہو سکتا تھا۔

میں نے میز پر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا "تم نے دیکھا جبار جیلانی۔۔۔؟ کبھی حالات اچانک کس طرح پلٹا کھا جاتے ہیں۔ پلک جھپکتے میں کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ بہر حال۔۔۔ تمہیں اب بھی حالات سے دل برداشتہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھو تمہارے دل کی مراد پوری ہو گئی ہے۔ مسز درّانی تو تمہیں مکان دینے کے لیے تیار نہیں تھیں لیکن میں وہی مکان تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔ تم کچھ سودے بازی تو کرو۔ یہ دیکھو نا۔۔۔ پاور آف اٹارنی بھی میرے پاس ہے اور پاور بھی۔۔۔! یہ محض تمہاری خوش فہمی تھی کہ پاور صرف تمہارے پاس ہے۔"

وہ بیل کے خرخرانے کے سے انداز میں سانس لے رہا تھا۔ میں نے فائل اس کے سامنے لہرائی تو وہ اپنی جگہ پر کچھ سکڑ سا گیا۔ شاید اسے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ میں فائل پھر اس کے منہ پر رسید کروں گا۔ زور سے ماری جائے تو محض ایک فائل بھی تھپڑ سے زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ میں ہنس دیا اور فائل اس کے چہرے کے قریب لے گیا۔ وہ اپنا چہرہ اِدھر اُدھر ہٹانے کی کوشش کرنے لگا۔ بندشوں کی وجہ سے وہ کرسی کے ساتھ تو تقریباً جڑا ہوا تھا۔ اِدھر اُدھر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا چہرہ پسینے میں تر تھا۔ اس نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی اسے ایسی بے بسی کا سامنا بھی کرنا پڑے گا۔ کوئی یوں اس کے ساتھ چوہے بلی کا سا کھیل کھیلے گا۔

"اوہو۔۔۔ تمہیں تو پسینہ آ رہا ہے" میں نے ترحم آمیز انداز میں کہا اور فائل سے اسے پنکھا جھلنے لگا "تمہیں تو اس فائل سے بہت ٹھنڈی ٹھنڈی اور معطر ہوا آنی چاہیے کیونکہ اس کی وجہ سے تمہیں وہ مکان مل سکتا ہے جسے حاصل کرنے کے لیے تم مرے جا رہے تھے۔۔۔ مگر تم اب اس کی کوئی قیمت ہی نہیں لگا رہے۔۔۔"

پھر میں نے گویا چونکتے ہوئے کہا "اوہ۔۔۔ معاف کرنا۔۔۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم تو بول ہی نہیں سکتے۔ تمہارے تو منہ پر ٹیپ چپکی ہوئی ہے۔ خیر۔۔۔ چھوڑو ان فضول باتوں کو۔۔۔ فی الحال کام کی بات سُنو۔ ہم اس گینڈے کو اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں جو اتفاق سے تمہارا بھائی واقع ہوا ہے۔ تم اس کی بازیابی کے لیے اپنی غنڈا فورس۔۔۔ اپنا اثر رسوخ یا کوئی بھی اور ذریعہ جو تم استعمال کرنا چاہو، کر لینا۔ تمہارے دل میں کوئی حسرت نہیں رہنی چاہیے۔ اس کے بعد شاید تمہیں اپنی زندگی کی سب سے بڑی حیرت کا سامنا کرنا پڑے۔ تم دیکھو گے کہ تمہاری غنڈا فورس، تمہارا اثر رسوخ، یا کوئی بھی اور ذریعہ تمہیں تمہارا بھائی واپس نہیں دلا سکے گا۔۔۔"

میں گہری سانس لے کر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ مجھے یقین تھا کہ اب اس کے حواس اس حد تک ضرور کام کر رہے تھے کہ میرے الفاظ اس کے ذہن پر نقش ہوتے جا رہے تھے کیونکہ اس کی آنکھیں کچھ اور اُبھر آئی تھیں۔

ان اُبھری ہوئی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر میں نے سرد اور سفاک لہجے میں کہا "تمہارا بھائی تمہیں صرف اس صورت میں واپس ملے گا جب تم کوئی معتبر سی ضمانت دو گے کہ تم نے مسز درّانی کے مکان کا خیال دل سے نکال دیا ہے اور اب تم اس سلسلے میں انہیں ہرگز تنگ نہیں کرو گے، تمہارے آدمی کبھی آنکھ اٹھا کر بھی ان کی طرف نہیں دیکھیں گے۔ سمجھ گئے؟"

اس نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ اسی طرح اُبھری ہوئی وحشت زدہ سی آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "اگر نہیں سمجھے ہو تو ہمارے پاس سمجھانے کے اس سے بھی زیادہ مؤثر اور کارگر بہت سے طریقے موجود ہیں لیکن ہم درجہ بدرجہ آگے بڑھتے ہیں۔ یہ پہلا درجہ ہے۔ عقلمند لوگ پہلے ہی درجے پر سمجھ جاتے ہیں۔ احمق لوگ ہمیں آخری درجے تک جانے پر مجبور کر دیتے ہیں جہاں سے ان کی واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ تم سمجھ ہی گئے ہو گے۔ وہ دوسری دنیا کی طرف سُدھار جاتے ہیں۔ بس۔۔۔ مجھے اتنا ہی کہنا تھا۔"

میں اس کی میز سے اٹھ کھڑا ہوا پھر میں نے فائل سے اس کے چہرے کو تھپتھپایا اور اس کی طرف جھکتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "تمہارے جانے کے بعد جب کوئی آ کر تمہیں اس مصیبت سے نجات دلا دے تو آرام و سکون سے بیٹھ کر میری باتوں پر غور ضرور کرنا اور کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے بہت اچھی طرح سوچ سمجھ لینا۔ تمہاری کسی غلطی کے نتیجے میں اس گینڈے کی لاش کسی گندے نالے میں بھی ڈالی جا سکتی ہے۔"

اس کی آنکھوں میں امید کی موہوم سی کرن لہرائی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ ہم اس کے بے ہوش بھائی کو لے کر عمارت سے باہر نہیں جا سکیں گے۔ عمارت میں آنے اور باہر جانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ لفٹ یا سیڑھیاں، کسی بھی ذریعے سے نیچے جانے کی صورت میں ہمیں بہر حال ریسپشن کے سامنے سے گزرنا پڑتا جہاں اکثر بہت سے لوگ موجود رہتے تھے اور شیشے کی دیوار سے گراؤنڈ فلور کے دفاتر کا منظر بھی دکھائی دیتا تھا۔

اگر وہاں سے تین آدمی بے ہوش غفار جیلانی کو اٹھائے گزرتے تو یقیناً ایک ہنگامہ برپا ہو جاتا۔ جبار کو نہیں معلوم تھا کہ ہم بے شک عجلت میں یہاں آئے تھے لیکن ان پہلوؤں کے بارے میں سوچنا نہیں بھولے تھے۔

میں نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ اکیلے شفیع شاہ نے غفار کو کندھے پر اٹھا لیا۔ میں غفار کو محض استہزائیہ طور پر گینڈا نہیں کہہ رہا تھا۔ وہ واقعی مضبوطی اور وزن میں کسی گینڈے سے کم نہیں تھا۔ بے ہوشی کی حالت میں انسان کا وزن اور بھی زیادہ محسوس ہوتا ہے لیکن شفیع شاہ کے انداز سے قطعاً ظاہر نہیں ہوا تھا کہ اسے غفار کو اٹھانے میں کوئی دشواری پیش آئی تھی۔

جبار جیلانی کے لیے شاید یہ ایک اور ناقابلِ یقین نظارہ تھا۔ اس کی نظر شفیع شاہ پر جم کر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے الوداعی انداز میں کہا "جب تمہارا تعفن زدہ ذہن حقائق کو قبول کر لے اور تم پُرسکون و پُرامن انداز میں اپنے بھائی کو واپس حاصل کرنے کا فیصلہ کر لو تو مجھے فون کر دینا۔ میرے فون نمبر ڈائریکٹری میں موجود ہیں۔ میں نہ تو شہر چھوڑ کر بھاگوں گا اور نہ ہی کہیں چھپا ہوں گا۔ میں باقاعدگی سے اپنے آفس میں پایا جاؤں گا اور تم آسانی سے مجھ سے رابطہ کر سکو گے۔۔۔ لیکن صرف اس وقت مجھ سے بات کرنا جب تم میں رتی دو رتی انسانیت واپس آ چکی ہو۔ خدا حافظ۔"

•

میں نے فائل سے اس کا گال تھپتھپایا اور کمرے سے نکل آیا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے شفیع اور ٹونی کو اشارہ کیا۔ وہ بھی میرے پیچھے باہر آ گئے۔ دروازہ بند کر کے ہم لفٹ کی طرف جانے کے بجائے سیڑھیوں کے راستے چھت پر آ گئے۔ اس چھت اور برابر کی عمارت کی چھت کے درمیان صرف تین چار فٹ اونچی ایک دیوار حائل تھی۔ ٹونی پُھرتی سے دوسری طرف کود گیا اور اس نے یوں غفار کو اس کے کندھے سے اپنے کندھے پر کھینچ لیا جیسے ایک شخص نے دوسرے کی گود سے بچّہ لے لیا ہو۔ مجھے تو ذرا سی بھی زحمت نہیں کرنا پڑ رہی تھی۔ کام میری توقعات سے کہیں

زیادہ آسان اور کم مشقت طلب ثابت ہوا تھا۔ کوئی خاص مار دھاڑ بھی نہیں ہوئی تھی۔

تین چار فٹ کی اس دیوار کو پھلانگتے وقت میں خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کہ میرا سیٹی بجانے کو جی چاہ رہا تھا۔ میں نے بہ مشکل اپنے آپ کو باز رکھا۔ اس چھت پر ایک اسٹریچر موجود تھا۔ شفیع شاہ کے جاسوس نے اپنا کام بڑی ذمے داری سے انجام دیا تھا۔

اسٹریچر پر ایک تہ شدہ چادر بھی موجود تھی۔ ٹونی نے غفار کو اسٹریچر پر تقریباً پٹخ دیا۔ وہ دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھایا جانے والا اسٹریچر تھا اور غفار جیسے ڈیل ڈول کے آدمی کے لیے چھوٹا تھا لیکن کام چلانے کے لیے کافی تھا۔ غفار کی ناک سے خون بہنا بند ہو چکا تھا۔ میں نے ایک فاضل کپڑے سے اس کا چہرہ احتیاطاً پونچھ دیا اور اس پر چادر پھیلا دی۔ میں اسے اچھی طرح سر سے پاؤں تک چادر سے ڈھانپ چکا تو شفیع شاہ اور ٹونی نے ایک جھٹکے سے اسٹریچر اٹھا لیا اور ہم سیڑھیاں اُتر کر نیچے کی منزل پر آ گئے جہاں تک لفٹ چلتی تھی۔

اتفاق سے اس وقت اس فلور پر لفٹ آ کر رُکی ہی تھی۔ اِدھر لفٹ نے اپنے شکم سے چند لوگوں کو اگلا' اُدھر ہم گھبرائے ہوئے انداز میں اس کی طرف بڑھے' چند افراد بڑی تمیز اور سلیقے سے لفٹ میں سوار ہونے کے لیے قطار بنائے کھڑے تھے۔ اپنے ملک میں کہیں کہیں یہ سلیقہ اور مہذبانہ انداز و اطوار نظر آتے تھے تو ایک خوشگوار سی حیرت ہوتی تھی۔

"ایمر جنسی۔۔۔ ایمر جنسی۔۔۔" میں نے اسٹریچر کے آگے آگے گھبراہٹ آمیز انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے کہا "قادر صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے۔ ذرا ایک طرف ہٹ جائیے۔" لوگ ہڑبڑا کر ایک طرف کو ہٹ گئے۔ یقیناً کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ قادر صاحب کون تھے؟ خود ہمیں بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ بے چارے جو شاید کئی منٹ سے صبر و تحمل سے لفٹ کا انتظار کر رہے تھے' ان میں سے کوئی بھی لفٹ میں سوار نہیں ہوا اور ہم تینوں لفٹ میں گھس گئے۔

لفٹ چھوٹی تھی۔ اس میں اسٹریچر لے کر گھسنے کی گنجائش نہیں تھی۔ خصوصاً جب کہ ہم تینوں بھی کچھ ایسے مختصر الوجود نہیں تھے اور لفٹ میں آپریٹر بھی اپنے اسٹول پر موجود تھا لیکن ہم نے خود آڑے ترچھے ہو کر اور اسٹریچر کو بھی آڑا ترچھا کر کے لفٹ میں سمو ہی لیا اور آپریٹر نے نہایت عقلمندی اور مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے براہِ راست گراؤنڈ فلور کا بٹن دبا دیا۔

شاید کسی نے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ تین سوٹڈ بوٹڈ آدمی' جن میں سے دو کے ہاتھوں میں بریف کیس بھی جھول رہے تھے' ان کے پاس اسٹریچر کہاں سے آ گیا تھا۔ ہم میں سے کوئی بھی ایمبولینس کے لیے کا آدمی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

اس عمارت میں گراؤنڈ فلور پر اس کی چار دیواری کے اندر ہی ایک بغلی گلی سی موجود تھی جس کے راستے ہم لفٹ سے نکلتے ہی عقبی گلی میں جا سکتے تھے۔ شفیع شاہ کو یہ سب معلومات حاصل تھیں۔ اس کی رہنمائی میں ہم چند سیکنڈ میں عقبی گلی میں جا پہنچے اور ہم نے پھرتی سے غفار کو اسٹریچر سے اُتارتے ہوئے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ٹھونس ٹھانس دیا۔

جس بے دردی سے ہم نے اسے ٹھونسا تھا' اگر وہ واقعی کوئی ایسا شخص ہوتا جسے دل کا دورہ پڑ چکا ہوتا تو یقیناً وہ اس وقت ہی اللہ کو پیارا ہو چکا ہوتا۔ ذرا دیر بعد ہی گاڑی سڑکوں پر فراٹے بھر رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ شفیع شاہ نے سنبھالی تھی۔ غفار کو لے کر نکلنے کا مرحلہ بھی قطعاً دشوار ثابت نہیں ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ابھی جبار جیلانی کے کمرے کا منظر جوں کا توں ہو گا۔ وہ کرسی پر بندھا بیٹھا ہو گا اور منتظر ہو گا کہ کوئی کسی کام سے اس کے کمرے میں آئے۔ اس کی سیکریٹری کمرے کے وسط میں' گرد و پیش سے بے خبر اوندھی پڑی ہو گی۔ اس کی میز پر ٹیلی فونوں کی گھنٹیاں بج رہی ہوں گی اور فون کرنے والے سوچ رہے ہوں گے کہ وہ کم بخت کہاں مر گئی۔

گاڑی جب کلفٹن والی سڑک پر پہنچ چکی تو میں نے ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا "تم دونوں کے خیال میں جبار جیلانی کا ردِ عمل کیا ہو گا؟"

ٹونی پچھلی سیٹ پر جبار کے بھائی سمیت پھنسا بیٹھا تھا۔ غفار کا سر اس کی گود میں تھا اور وہ راستے میں اس خیال کا اظہار کر چکا تھا کہ اس سے تو بہتر تھا وہ کسی گدھے کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ جاتا۔ جواب دینے میں پہل اس نے کی تاہم اس کے لہجے میں ہچکچاہٹ تھی۔

"میرا خیال ہے وہ سب سے پہلے قانونی کارروائی کرے گا" وہ بولا۔

"اسے ہر دروازہ بند ملے گا۔ کوئی اس کی نہیں سُنے گا۔ بہت ہوا تو اسے رسمی سی تسلی دے دی جائے گی" میں نے کہا۔

"بدمعاشی اس کی فطرت معلوم ہوتی ہے۔ شاید قانونی محاذ پر رسماً کارروائی پوری کرنے کے بعد وہ اپنے آدمیوں کی مدد سے بدمعاشی دکھانے کی کوشش کرے۔" شفیع شاہ نے خیال ظاہر کیا۔

"ہم اور ہمارے آدمی جہاں جہاں بھی موجود ہوں گے' پوری طرح الرٹ رہیں گے۔ تم ایک بار پھر سب کو ہدایت کر دینا کہ کسی بھی مشکوک شخص کو پاس پھٹکتے دیکھ کر اچھی طرح اس کی خبر لیں نتائج کی پروا نہ کریں" میں نے کہا۔

"وہ سب اس کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔" شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بس۔۔۔ تو پھر پریشانی کی کوئی بات نہیں" میں نے کہا "میرا اپنا خیال یہ ہے کہ بہت جلد اس کی عقل ٹھکانے آ جائے گی اور وہ انسانیت کے جامے میں آ کر نہایت شریفانہ انداز میں مجھ سے مذاکرات کرے گا۔ ہم نے آج اسے اچانک جو شاک دیا ہے وہ نفسیاتی اعتبار سے کافی مفید ثابت ہو گا۔ اس کا دماغ درست ہونے میں اس سے کافی مدد ملے گی۔ یہ "ڈوز" بعض اوقات ایسے لوگوں کو زیادہ اشتعال میں لانے کے بجائے خوفزدہ کر دیتا ہے۔ بدمعاش خواہ کتنا ہی بڑا ہو' اندر سے وہ بہرحال کھوکھلا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے اس نظریے سے اکثر استفادہ کیا ہے۔"

باتیں کرتے ہوئے ہم جلد ہی مسز درانی کے گھر پہنچ گئے۔ میں نے شفیع شاہ کو پہلے ہی بتا رکھا تھا کہ غفار کو لے کر ہمیں کہاں جانا تھا۔ میری کال بیل کے جواب میں مسز درانی نے حسبِ معمول پہلے اپنے گیٹ کے چھوٹے سے چوکور سوراخ سے باہر کا جائزہ لیا۔ مجھے سامنے کھڑا دیکھ کر وہ مطمئن ہو گئیں اور انہوں نے گیٹ فوراً کھول دیا۔ میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا۔ وہ گاڑی پورچ میں لے گیا۔

گیٹ بند کرنے کے بعد مسز درانی نے دیکھا کہ گاڑی کی پچھلی سیٹ پر کوئی چادر میں لپٹا پڑا تھا۔ وہ بُری طرح چونک اٹھیں۔ ہم تینوں مل کر غفار کو گاڑی سے نکالنے لگے۔ اس وقت بھی ہم نے اس پر سے چادر اُترنے نہیں دی۔

تب مسز درانی گھبرائے ہوئے انداز میں بولیں "یہ تم کیا اُٹھا لائے ہو؟ کہیں یہ کوئی لاش تو نہیں؟"

"آپ کے منہ میں گھی شکر۔۔۔ کاش یہ لاش ہی ہوتی!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن مسئلہ یہی ہے کہ ایسے لوگ زندہ گھومتے رہتے ہیں اور ان کے ہاتھوں بہت سے بے گناہ' لاشوں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ زندہ ہے؟" انہوں نے ہمارے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔ ان کے لہجے میں تشویش کچھ کم ہو گئی۔

"بالکل زندہ ہے۔۔۔ اور بغیر کسی شرمندگی کے زندہ ہے" میں نے انہیں تسلی دی۔ انہوں نے اطمینان کی سانس لی۔

اس وقت تک ہم ڈرائنگ روم میں پہنچ چکے تھے۔ ہم نے غفار کو بوسیدہ اور گھسے ہوئے قالین پر ہی لٹا دیا۔ اس کا چہرہ ابھی تک چادر میں چھپا ہوا تھا۔

"آخر یہ ہے کون؟" مسز درانی شاید بے چین تھیں کہ آگے بڑھ کر اس کے چہرے سے چادر ہٹا دیں۔ اس کے چہرے پر چادر کا جتنا حصہ تھا اس میں کہیں کہیں سرخی دکھائی دینے لگی تھی۔ بے ہوشی کی حالت میں غفار کے ساتھ جو اٹھا پٹخ ہو رہی تھی شاید اس کی وجہ سے اس کی ناک سے دوبارہ خون رسنے لگا تھا۔ میں نے مسز درانی کو زیادہ دیر تجسس میں جلا نہیں رکھا اور غفار کے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ عام حالات میں بھی غفار کا چہرہ دیکھنا کوئی خوش کن عمل نہیں تھا۔ اس وقت تو اس کی صورت کچھ اور بھی بگڑی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اوپر سے چہرے پر خون بھی نظر آ رہا تھا۔ مسز درانی گویا سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئیں حالانکہ وہ آسانی سے سہمنے والی عورت نہیں تھیں۔

"یہ تو غفار ہے!" وہ تھوک نگل کر بولیں۔

"بے شک" میں نے نہایت سعادت مندانہ انداز میں سر ہلایا پھر ٹھنڈی سانس لے کر حقیقتاً بڑے افسوس سے کہا "کبھی کبھی مجھے یہ دیکھ کر عجیب سا دکھ ہوتا ہے کہ کیسے کیسے شیطان صفت لوگوں کے نام کتنے پُر تقدس ہوتے ہیں۔ ان کی فطرت میں اتنی خباثت ہوتی ہے کہ مقدس ناموں کے اثرات سے بھی کم نہیں ہوتی۔"

مسز درانی نے گویا میری بات نہیں سنی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک ٹک غفار کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں "تم نے اس کا یہ حشر کر دیا؟"

"کوئی خاص بُرا حشر تو نہیں کیا" میں نے گویا ان کی غلط فہمی دور کی "یہ تو صرف دو تین سیکنڈ کی کارروائی ہے۔۔۔ اور وہ بھی میری نہیں۔۔۔ میرے ان ہونہار شاگردوں کی ہے۔" میں نے شفیع شاہ اور ٹونی کی طرف اشارہ کیا "استاد نے تو اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ استاد کی توجہ تو سرپرستِ اعلیٰ یعنی جبار جیلانی کی طرف تھی۔"

"یعنی۔۔۔ یعنی۔۔۔ تم اسے جبار جیلانی کے سامنے اٹھا کر لائے ہو؟" مسز درانی نے ہکلاتے ہوئے پوچھا۔ انہیں گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟" میں نے سچ مچ ذرا حیرت سے پوچھا۔

انہوں نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر شاید ارادہ ملتوی کر دیا اور کندھے اچکا کر رہ گئیں' شاید وہ کہنا چاہتی ہوں۔ تم ان سے بھی بڑے بدمعاش معلوم ہوتے ہو۔

اس کے بجائے وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولیں "تم اسے یہاں کیوں لائے ہو؟"

"اب یہ ایک آدھ دن یہیں رہے گا۔ یہ بھی ممکن ہے اس کا قیام دو چار دن یا ایک آدھ ہفتہ رہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا۔۔۔؟" وہ تقریباً اچھل پڑیں۔

"ہم اسے ضمانت کے طور پر ساتھ لائے ہیں۔ جب جبار جیلانی ہمیں کسی طرح اطمینان دلا دے گا کہ آئندہ وہ مکان کے سلسلے میں۔۔۔ بلکہ کسی بھی سلسلے میں آپ کو تنگ نہیں کرے گا' تو ہم اس کا یہ پیارا بھائی اسے واپس دے دیں گے" میں نے بتایا "اس وقت تک یہ ہمارے پاس رہے گا۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن۔۔۔ کیا اس کا یہاں رہنا ضروری ہے؟" وہ ایک بار پھر ہکلانے لگیں اور پہلے سے زیادہ وحشت زدہ دکھائی دینے لگیں۔

"ہاں" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا "میرے خیال میں اسے رکھنے کے لیے یہ مکان موزوں ترین جگہ ہے۔ جبار جیلانی کے وہم و گمان میں بھی شاید یہ بات نہ آئے کہ ہم نے اسے یہاں رکھا ہوا ہو گا۔ میں چاہتا ہوں ہمیں اس کی نگرانی اور حفاظت کے لیے زیادہ تردد نہ کرنا پڑے۔ ایک آدھ دن شاید میں خود یہاں رہوں۔ میں خود اس کی نگرانی کروں گا۔ میں چاہتا ہوں اس دوران آپ یہاں موجود نہ رہیں۔"

"کیا۔۔۔؟" وہ ایک بار پھر اُچھل پڑیں۔ میری باتوں سے آج بے چاری مسز درانی کو دھچکے پر دھچکا لگ رہا تھا "میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ میں ایک رات کے لیے بھی اس گھر سے دور رہنا نہیں چاہتی۔"

"لیکن اب بہت سخت مجبوری آن پڑی ہے" میں نے کہا "ہم غفار کو یہاں رکھنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق

اسے چھپانے کے لیے یہ ایک محفوظ جگہ ہے لیکن یقین سے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اندازے غلط بھی ہوسکتے ہیں۔ ممکن ہے جبار کے آدمی یہاں دھاوا بول دیں۔ ضروری نہیں کہ وہ غفار کی تلاش میں ہی یہاں آئیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ صرف اپنے ردِّعمل کا اظہار کرنے اور آپ کو ہلاک کرنے کے ارادے سے ہی اس مکان پر چڑھ دوڑیں۔ اس صورت میں یہاں خونریزی ہوسکتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس دوران آپ یہاں موجود نہ ہوں۔ تصادم کی صورت میں آپ کا یہاں موجود ہونا ہمارے لیے زیادہ پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔"

تصادم اور خونریزی کا ذکر سُن کر ان کے چہرے کی رنگت کچھ اور پھیکی پڑ گئی تاہم وہ آسانی سے ہار ماننے والی عورت نہیں تھیں۔ سنبھل کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں "تم مجھے ان خطروں سے ڈرا کر بھگانے کی کوشش نہ کرو۔ مجھے تم لوگوں کی جانیں بھی اپنی ہی جان کی طرح عزیز ہیں۔ جب تم لوگ یہاں ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود رہو گے تو میں بھی رہ لوں گی۔ بلکہ ہوسکتا ہے میں تمہارا کچھ ہاتھ ہی بٹا دوں۔ تم مجھے اتنی گئی گزری مت سمجھو۔"

"آپ کی جُراَت و ہمت کے مظاہرے تو ہم دیکھ چکے ہیں" میں نے تحمل سے کہا "ہمیں معلوم ہے آپ اتنی گئی گزری نہیں ہیں لیکن ہم نہیں چاہتے کہ اس چکر میں آپ جان سے ہی گزر جائیں۔ آپ کی جان بچانے اور یہ ثابت کرنے کے لیے ہی تو ہم ساری مصیبت اٹھا رہے ہیں کہ آخری فتح اعلیٰ انسانی اصولوں کی ہوتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں ہمارے یہ دونوں ہی مقصد پورے ہوں۔ اگر آپ کو کوئی نقصان پہنچ گیا تو ہم اپنے آپ کو فتح یاب نہیں، شکست خوردہ سا محسوس کریں گے۔"

اس بار وہ خاموش تو رہیں لیکن ان کے چہرے پر آمادگی کے آثار نہیں تھے۔ تب میں نے ذرا زور دے کر کہا "مانا کہ آپ ایک ضدی عورت ہیں لیکن کم از کم اس معاملے میں آپ ضد چھوڑ دیں۔ میں آپ کے فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ ہم آپ کے لیے بغیر کسی لالچ یا غرض کے اتنی مصیبت اُٹھا رہے ہیں تو آپ کم از کم ہماری ایک بات تو مان لیں۔ ایک دو رات کی تو بات ہے۔ آخر اس سے کیا فرق پڑ جائے گا۔"

انہوں نے غالباً محسوس کرلیا کہ میرے لہجے میں خفگی کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد مُردہ سے لہجے میں بولیں "اچھا... ٹھیک ہے... میں چلی جاتی ہوں۔ تم مجھے کہاں بھیجنا چاہتے ہو؟"

"آپ زرتاج کے ہاں چلی جائیں۔ شفیع شاہ آپ کو چھوڑ آئے گا" میں نے ذرا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے۔ میں اکیلی اپنی ہی گاڑی میں چلی جاؤں گی" اب شاید ان کے لہجے میں خفیف سی خفگی جھلک آئی تھی لیکن میں نے اس کی پروا نہیں کی۔

"مگر آپ اپنی گاڑی میں جائیں گی تب بھی شفیع شاہ حفاظت کے نقطۂ نظر سے اپنی گاڑی میں آپ کے پیچھے پیچھے جائے گا اور آپ کو وہاں پہنچا کر واپس آجائے گا۔ ابھی معاملہ تازہ تازہ ہے۔ ابھی آپ کو بے احتیاطی نہیں کرنی چاہیے بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ جب تک جبار سے کوئی بات طے نہ ہوجائے تب تک آپ احتیاط ہی برتیں" میں نے کہا۔

ان کی پُرانی کھٹارا اسی فیٹ پورچ میں ہی کھڑی تھی۔ انہوں نے جلدی جلدی ایک چھوٹے سے بیگ میں ضرورت کی چند چیزیں ڈالیں پھر الماری سے اپنی پُرانی رائفل بھی نکال لائیں۔

"آپ یہ بھی ساتھ لے کر جائیں گی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں... کیا حرج ہے" وہ اطمینان سے بولیں۔

"خدا کا واسطہ مسز دُرّانی...!" میں نے ان کے آگے ہاتھ جوڑ دیے "اس کیے از آثارِ قدیمہ کو تو یہیں چھوڑ دیجئے۔ یہ صرف میدانِ جنگ میں دشمن سے مقابلہ کرنے یا پھر جنگلوں میں بڑے جانوروں کا شکار کرنے کے سلسلے میں کام آنے والی چیز ہے۔ گھر کے اندر یا راہ چلتے دشمن کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں یہ زیادہ کارآمد چیز نہیں ہے۔ خصوصاً آپ کے لیے۔"

"تمہیں اتنے یقین سے نہیں کہنا چاہیے کہ کون سی چیز میرے لیے کارآمد ہے اور کون سی نہیں" وہ بیگ اور رائفل اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدرے بے اعتنائی سے بولیں۔ وہ ایک بار پھر ایک سنکی سی عورت دکھائی دینے لگی تھیں۔ دنیا سے روٹھی روٹھی اور ناراض سی۔

"زرتاج کے گھر میں کئی جدید ہتھیار بھی موجود ہیں اور انہیں استعمال کرنے والے آدمی بھی" میں نے انہیں یاد دلایا۔

"وہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں... لیکن انسان کے پاس اپنے استعمال کے لیے اپنی ذاتی چیزیں بھی ہونی چاہئیں" انہوں نے جواب دیا۔

میں اور شفیع شاہ ان کے ساتھ کمرے سے نکل کر گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ جبکہ ٹونی، غفار کے پاس ہی موجود رہا۔ مسز دُرّانی نے رائفل اپنی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے رکھ لی۔

شفیع شاہ نے گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے اس کی ڈکی سے کینوس کا ایک تھیلا نکال کر مجھے دے دیا۔ ہمارا چونکہ غفار کو یہاں لانے کا پروگرام پہلے ہی سے طے تھا اس لیے ہم نے کچھ ایسی چیزیں ساتھ رکھی تھیں جن کی ہمیں ضرورت پیش آسکتی تھی۔ دونوں گاڑیاں آگے پیچھے روانہ ہوچکیں تو میں گیٹ مقفل کرکے اندر آگیا۔ غفار کو اس وقت تک ہوش نہیں آیا تھا۔

"یہ گینڈے کا بچہ تو کچھ لمبا ہی بے ہوش ہوگیا" میں نے اس کا معائنہ کرتے ہوئے کہا "حالانکہ جب تم نے اس کا سر فرش سے ٹکرایا تو فرش پر قالین موجود تھا۔"

"یہ اتنا مضبوط اور طاقتور ثابت نہیں ہوا جتنا میں سمجھا تھا۔" ٹونی بولا۔

"چلو... اب اس کے قیام کا بندوبست کردیں" میں نے کہا۔

پورے مکان کا جائزہ لینے کے بعد ہم نے ایک کمرا منتخب کیا جو

کچن کے قریب تھا۔ وہ بیڈ روم تھا مگر ایک عرصے سے شاید کسی بھی استعمال میں نہیں آرہا تھا۔ اس میں فرنیچر یا کوئی اور کاٹھ کباڑ بھی نہیں تھا۔ جو تھوڑا بہت سامان موجود تھا وہ بھی ہم نے نکال دیا۔ فرش پر کھڑکی کے قریب صرف ایک چادر بچھا دی۔

پھر ہم نے غفار کو اٹھا کر اس کمرے میں لا کر چادر پر لٹا دیا۔ اس کے ہاتھ ہم نے پشت پر ہی بندھے رہنے دیے تاہم پیروں کی بندشیں کھول دیں لیکن پھر ہم نے اس کے ایک پاؤں میں آہنی کڑے والی زنجیر ڈال کر زنجیر کو کھڑکی کی موٹی سی سلاخ سے باندھ دیا اور اس میں تالا لگا دیا۔ اب غفار ہوش میں آنے کے بعد اس کمرے میں صرف چند فٹ کے دائرے میں حرکت کرسکتا تھا۔

اپنے اس انتظام سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے ٹونی سے کہا "اب اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنی چاہیے... بلکہ اگر اسے تھوڑی سی طبی امداد بھی دے دی جائے تو کوئی حرج نہیں۔ اب یہ محض چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی طرح ہے۔"

ٹوٹی ہوئی ناک کی وجہ سے اسے سانس ہلکی سی خرخراہٹ کے ساتھ آرہی تھی اور معمولی سا خون اب بھی رِس رہا تھا۔ ٹونی نے کندھے اچکائے اور کینوس کے تھیلے سے آہنی زنجیر کے بعد ضرورت کا دوسرا آئٹم یعنی فرسٹ ایڈ کٹ نکالی۔ خاصی مہارت سے اس نے غفار کا چہرہ صاف کرکے دوا وغیرہ لگا کر اس کی ناک کی بینڈیج کردی جس کے دوران غفار کسمسانے لگا اور بالآخر اسے ہوش آگیا۔

اس کے بازو چونکہ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لیے ہم نے اسے چت لٹانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ دائیں پہلو پر لیٹا ہوا تھا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو میں اس کے سامنے کھڑا تھا لیکن اس کے چہرے پر شناسائی کا کوئی تاثر نہ ابھرا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ بھی ڈاکٹر برنارڈ کی طرح یادداشت کھو جانے کا ڈراما نہ شروع کردے۔ اس کی آنکھیں دھندلائی ہوئی سی تھیں۔ اس نے سر جھٹکنے کی کوشش کی اور بُری طرح کراہ کر رہ گیا۔

"میں کہاں ہوں؟" اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

"ہونا تو تمہیں چڑیا گھر میں چاہیے تھا لیکن وہاں کے جانور تمہیں کوئی پنجرہ دینے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس لیے مجبوراً ہم تمہیں ایک شریف شہری کے مکان میں لے آئے ہیں" میں نے جواب دیا۔

اس کی یادداشت اگر متاثر بھی ہوئی تھی تو شاید صرف چند لمحوں کے لیے ہوئی تھی۔ فوراً ہی اس کی آنکھوں سے ظاہر ہونے لگا کہ اسے سب کچھ یاد آگیا تھا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھ نہ سکا اور ایک بار پھر کراہ کر رہ گیا۔ اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کس طرح بندھا ہوا تھا۔ ٹونی نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور گھسیٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ اس کا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا ہوا تھا۔

ٹونی بھی میرے برابر آن کھڑا ہوا۔ ہم کچھ اس طرح اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ جیسے کوئی نئی اور انوکھی قسم کا جانور دو سائنس دانوں کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ میں منتظر تھا کہ وہی کچھ بولے۔ وہ جب بولا تو اس نے وہی اکڑ دکھانے کی کوشش کی جو اپنے زعم میں جلا بدمعاش اکثر دکھاتے ہیں۔

"لگتا ہے تم لوگوں کو اپنی زندگی سے بالکل پیار نہیں" وہ غرایا۔

"بہت پیار ہے" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا "کیونکہ زندگی اوپر والے کی دی ہوئی ایک خوبصورت نعمت ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی سے بھی پیار ہے... خصوصاً ان لوگوں کی زندگی سے... جو کسی کو کوئی دکھ نہیں پہنچاتے... کسی کا کچھ نہیں بگاڑتے... اس کے باوجود کچھ لوگ ان کا جینا دوبھر کردیتے ہیں۔"

"آخر تمہیں اس عورت سے کیا دلچسپی ہے جو تم اس کی خاطر یوں اپنی جان داؤ پر لگا رہے ہو؟" اس کے لہجے میں واقعی الجھن در آئی۔

"یہ باتیں تمہارے موٹے دماغ میں آنے والی نہیں ہیں۔" میں نے کہا "ہم سرپھرے سے لوگ ہیں۔ اکثر ایسے بے سروپا کام کرتے رہتے ہیں جو دنیا کے بیشتر لوگوں نے کرنے چھوڑ دیے ہیں لیکن تم بھلا کیسے سمجھ سکتے ہو کہ دنیا میں کچھ کام بغیر کسی غرض، بغیر کسی لالچ اور بغیر کسی معاوضے کے بھی کیے جاتے ہیں۔ تمہاری اس تربوز نما کھوپڑی میں تو ایسی باتوں کو سمجھنے والا کوئی خانہ ہی نہیں ہوگا۔"

وہ اپنی ناک اور کھوپڑی کی تکلیف کے سلسلے میں خاصی قوتِ برداشت کا مظاہرہ کر رہا تھا اور اس عالم میں بھی اپنے تاثرات خوفناک بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ناک پر بینڈیج وغیرہ کی وجہ سے وہ خاصا مزاحیہ لگ رہا تھا۔

"تم جتنی چاہے بکواس کرلو..." وہ غرانے کے سے انداز میں بولا "لیکن ایک بات ذہن نشین کرلو کہ میرا بھائی تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔"

"کبھی کبھی وقت کیسا پلٹا کھا جاتا ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تمہارا بھائی کسی کو دھمکی دینے کے لیے آج تک تمہارا نام استعمال کرتا ہوگا۔ آج تمہیں اس کا نام استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ تم دونوں بھائی کسی کو بھی دھمکی اپنے اپنے بل بوتے پر دیا کرتے۔"

"تم میرے ہاتھ پاؤں کھول دو... میں تمہیں ابھی بتا دیتا ہوں کہ میں اپنے بل بوتے پر کیا کرسکتا ہوں" وہ پھنکارا۔

"ہم نے تمہیں اسی حالت میں رکھا ہے جس میں درحقیقت تمہیں ہونا چاہیے۔ تم جیسے لوگوں کا کھُلا پھرنا بنی نوع انسان کے لیے بڑی تکلیف کا باعث ہوتا ہے" میں نے بردبارانہ سے انداز میں کہا "ویسے مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس وقت تمہارے ہاتھ پاؤں کھلے ہی تھے جب تم ہمیں سبق سکھانے کے ارادے سے ہماری طرف بڑھ رہے تھے... نہ صرف ہاتھ پاؤں کھلے تھے بلکہ تمہارے ایک

ہاتھ میں پستول بھی تھا۔"

شاید خجالت کے احساس سے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "اس قسم کی فضول باتیں کرنے اور گیدڑ بھبکیاں دینے سے بہتر ہے کہ تم ہمیں کوئی ڈھنگ کی بات بتادو۔"

"مثلاً۔۔۔؟" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔

"مثلاً یہ کہ تم دونوں بھائی مسز درانی کے۔۔۔ یا یوں کہو کہ اس مکان کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو؟ آخر صرف تمہارے ہی نزدیک اس کی اہمیت کیوں بڑھ گئی ہے؟ کیا واقعی تمہارا مسز درانی کو ڈیڑھ کروڑ روپے کی ادائیگی کرنے کا ارادہ تھا یا محض مکان ہتھیانے کے لیے لالچ دے رہے تھے؟"

اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ گویا کچھ سوچ کر بولا "میں تمہارے صرف آخری سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔ ہمارا ارادہ واقعی اسے ڈیڑھ کروڑ روپے دینے کا تھا۔ ہم لوگ لین دین کے بہت کھرے اور زبان کے بہت پکے ہیں۔"

"بے شک۔۔۔ بے شک" میں نے سرہلایا "تم دونوں بھائیوں کی نیکی اور پارسائی کے تو دور دور تک چرچے ہیں۔"

"نیکی اور پارسائی کا تو ہمیں دعویٰ نہیں۔۔۔ لیکن بھلائی کے کام شاید میرا بھائی تم سے زیادہ کرتا رہتا ہے" وہ سنجیدگی سے بولا "وہ باقاعدگی سے بیواؤں اور ناداروں کی مدد کرتا ہے۔ فلاحی اداروں کو چندے دیتا ہے۔ بہت سے طالب علموں کے لیے اس نے وظیفے مقرر کر رکھے ہیں اور کئی اسپتالوں میں غریب مریضوں کے لیے اس کی طرف سے کھانا جاتا ہے۔"

عین ممکن تھا وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہو۔ میں نے ناجائز دھندوں اور معاشی مار دھاڑ کے ذریعے بے تحاشا دولت کمانے والوں کے معاملے میں اکثر دیکھا تھا کہ وہ لین دین کے بڑے کھرے ہوتے تھے۔ جائز یا ناجائز، کسی بھی سلسلے میں کسی کو کوئی رقم دینے کا وعدہ کرتے تھے تو اکثر وعدہ نبھاتے تھے جب کہ جائز اور شریفانہ کاروبار کرنے والے ادائیگیوں کے معاملے میں اکثر تقاضے داروں کو نچا دینے کی فکر میں رہتے تھے۔ اس کے علاوہ ناجائز دھندے کرنے والے اکثر عطیات خیرات کے معاملے میں بھی خاصے فراخ دل ہوتے تھے۔

میں نے اثبات میں سرہلایا تو غفار اسے طنزیہ اشارہ سمجھ کر قدرے جوش سے بولا۔

"جب تم ہمارے آفس میں آئے اس وقت بھی میرا بھائی انٹر کام پر کیشیئر کو ہدایات دے رہا تھا کہ گراؤنڈ فلور والے آفس میں بیٹھی ہوئی اور ایک بہت دور دراز غریبانہ علاقے سے آئی ہوئی بیوہ عورتوں کو زکوٰۃ کی رقم میں سے کچھ ادائیگی کردی جائے۔"

"خیر۔۔۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ ہم یہ نیک کام ہوچکنے کے بعد پہنچے اور ہماری وجہ سے اس میں خلل نہیں پڑا" میں نے کہا "میرا خیال ہے اس قسم کے کام کرنے کے بعد تمہارے بھائی کو اطمینان ہوجاتا ہوگا کہ اس کی دولت پاک صاف ہوگئی اور اس کے گناہ دُھل گئے۔"

وہ کچھ نہ بولا۔ کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"خیر۔۔۔ چھوڑو ان متنازعہ مسائل کو۔۔۔ میں خود بھی اس قسم کے بہت سے کام کرتا رہتا ہوں لیکن مجھے بھی اپنے بارے میں معلوم نہیں کہ میرے ان کاموں کو اوپر والے کے دربار میں قبولیت حاصل ہوگی یا نہیں۔ ہوسکتا ہے تمہارے خبیث بھائی کی کوئی نیکی وہاں قبول ہوجائے اور میری کوششیں دھری رہ جائیں۔ یہ اوپر والے کے کام ہیں۔ ہم ان میں دخل نہیں دے سکتے۔"

اب وہ کچھ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید حیران ہو رہا تھا کہ میں نے یہ کس قسم کی باتیں شروع کردی تھیں۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر یکدم پٹڑی بدلتے ہوئے کہا "اصل مسئلہ یہ ہے کہ مجھے اپنے پہلے دونوں سوالوں کے جواب بھی چاہئیں۔"

وہ خاموش رہا۔ چند لمحے کے انتظار کے بعد میں نے پوچھا "تم زبان نہیں کھولو گے؟"

اس نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔

"زبان کھلوانے کے معاملے میں ہم پولیس سے زیادہ سخت گیر ہیں" میں نے گویا اسے خبردار کیا۔

وہ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد بولا "یہ باتیں بھائی صاحب کو معلوم ہیں۔ مجھے ان معاملات کا پتا نہیں۔ مجھے تو جو حکم ملتا ہے میں صرف وہ کرتا ہوں۔"

میں نے تاسف زدہ سے انداز میں گہری سانس لیتے ہوئے کہا "مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ سیدھی انگلیوں سے گھی نہیں نکلے گا۔ تم اپنے بھائی کے معاملات سے اتنے لاعلم نہیں ہو جتنے بننے کی کوشش کررہے ہو لیکن خیر۔ کوئی بات نہیں۔ آج رات ہم ایک جادوئی عمل شروع کریں گے۔ جس سے تمہاری زبان کھل جائے گی۔ تم فرفر بولنے لگو گے۔"

"مجھے ٹارچر کرنے کا خیال دل سے نکال دو۔ اس سے پہلے ہی موت تمہیں آن دبوچے گی" وہ بے خوفی سے بولا۔

"ایسی باتیں اتنے وثوق سے نہیں کیا کرتے میرے بدصورت چاند!" میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا "یہ ایک طرح سے چھوٹا منہ بڑی بات والا معاملہ ہوجاتا ہے۔"

وہ گویا میرے الفاظ پر توجہ دیے بغیر بولا "ہماری پیشکش بہرحال اب بھی برقرار ہے۔ اگر تم مجھے اب بھی چھوڑ دو تو ہم اب بھی مکان کا سودا کرنے اور عورت کو ڈیڑھ کروڑ روپے دینے کو تیار ہیں۔ میں بھائی صاحب سے سفارش کروں گا کہ آج جو کچھ ہوا اسے بھی بھول جائیں۔ اگر کوئی جوابی کارروائی ہو رہی ہوگی تو میں اسے رُکوا دوں گا۔"

"کون کم بخت جوابی کارروائی رکوانا چاہتا ہے؟ میں تو بے چینی سے جوابی کارروائی کا منتظر ہوں۔ میں نے یہ "سوالی" کارروائی اس لیے تو نہیں کی کہ جوابی کارروائی رُکوانے کے لیے سفارش ڈھونڈتا پھروں" میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر قدرے مایوسی جھلک آئی۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے بہت بڑی پیشکش کردی تھی جسے ٹھکرانا ہم لوگوں کے لیے بہت مشکل تھا۔ میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "اب تم کچھ دیر آرام کرلو کیونکہ تمہارے ساتھ جو کچھ ہونے والا ہے۔ اس سے پہلے تم سکون کی کچھ گھڑیاں گزار لو تو اچھا ہے۔"

اس نے اپنے چہرے سے خوف کا اظہار نہیں ہونے دیا اور نفرت سے مجھے گھورتا رہا۔ میں اور ٹونی ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اس دوران شفیع شاہ بھی لوٹ آیا۔

"تم نے جب مسز درانی کو زرتاج کے حوالے کیا تو وہ کچھ بولی تو نہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"حیران ہو رہی تھی کہ آپ نے مسز درانی کو گھر چھوڑنے پر کیسے آمادہ کرلیا۔" پھر شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا "وہ خود اس سے پہلے بارہا یہ کوشش کرچکی تھی مگر کامیاب نہیں ہوئی تھی۔ مسز درانی ایک رات کے لیے بھی اس کے ہاں رہنے پر آمادہ نہیں ہوئی تھیں۔"

"اسے ہدایت کردی تھی ناکہ مسز درانی کی حفاظت کے سلسلے میں ذرا ہوشیار رہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں" اس نے جواب دیا "ویسے بھی زرتاج کے مکان اور رہن سہن کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے ہاں حفاظتی انتظامات خاصے معقول ہیں۔"

"آخر جاگیردارنی ہے۔ شہر میں بھی اپنے جاگیردارانہ اسٹائل سے ہی رہتی ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن۔۔۔ بہرحال۔۔۔ بہت اچھی جاگیردارنی ہے۔ اگر ہمارے پچاس فیصد جاگیردار بھی ایسے ہوجائیں تو شاید معاشرے میں ایک انقلاب آجائے۔"

شفیع شاہ سرہلا کر رہ گیا۔ اس وقت تک شام کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ ہم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ میں نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا "شفیع شاہ! بھوک ستا رہی ہے۔ یہاں کا قریب ترین ریستوران بھی خاصا دور ہوگا۔ کہیں سے کچھ کھانے کی چیزیں پیک کرالاؤ۔ ہم یہاں ایک طرح سے ایڈونچر پر آئے ہوئے ہیں اور اس دوران خود پکا کر کھانا مزید ایڈونچر ہوسکتا تھا لیکن میرا خیال ہے یہ ہم میں سے کسی کے بس کی بات نہیں۔"

شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا "مجھے پہلے ہی اس بات کا اندازہ تھا کہ ہمیں یہ مسئلہ درپیش ہوگا۔ اس لیے میں آتے وقت اپنے ہی ہوٹل سے کچھ ریڈی میڈ چیزیں پیک کرالایا تھا کیونکہ زرتاج کے گھر سے اپنا ہوٹل قریب ہی تھا۔"

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنے عقلمند ہوچکے ہو شفیع شاہ!" میں نے گہری سانس لے کر کہا پھر بے تابی سے پوچھا "کہاں ہیں وہ چیزیں؟"

"گاڑی میں" شفیع شاہ ڈرائنگ روم سے باہر جاتے ہوئے بولا۔

وہ گاڑی سے چند ڈبے نکال لایا اور ہم ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھے بیٹھے ان پر ٹوٹ پڑے۔ کھانے کے دوران ٹونی کو جیسے کچھ خیال آیا اور وہ چونکتے ہوئے بولا۔

"کیا خیال ہے۔۔۔ غفار کو بھی کچھ کھانے کے لیے دے دیا جائے؟"

میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "ہمیں اس کے ساتھ سلوک خواہ کچھ بھی کرنا پڑے لیکن اسے کھانے سے محروم نہیں رکھنا چاہیے۔ تم نے اس طرف توجہ دلائی ہے۔ تو یہ نیک کام تم ہی کو انجام دینا پڑے گا۔ میں چاہتا ہوں اس کے ہاتھ نہ کھولے جائیں۔ فلمی قسم کا بدمعاش ہے۔ ہاتھ کھل جائیں تو کہیں ہیرو بننے کی کوشش نہ کرے اور ہمیں مزید کوئی زحمت اٹھانی پڑے۔ اس سے بہتر ہے اس خبیث کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا دیا جائے۔"

"آپ کہتے ہیں تو کھلا دوں گا" ٹونی مُردہ سے لہجے میں بولا اور ایک ڈبا نے کر اٹھنے لگا۔

"اب اتنی رحم دلی بھی ضروری نہیں" میں نے کہا "پہلے خود کھا پی لو۔ پھر اسے کھلا دینا۔۔۔ اور خیال رکھنا کہیں ہاتھ پر کاٹ نہ لے۔"

"اگر کاٹ لیا تو تمہیں چودہ ٹیکے لگوانے پڑیں گے" شفیع شاہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ ٹونی اسے گھور کر رہ گیا۔

کھانے کے بعد ٹونی دوسرے کمرے میں غفار کو کھلانے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو میں نے پوچھا "کچھ کھا بھی لیا اس نے۔۔۔ یا نخرے دکھا رہا ہے؟"

"خوب ڈٹ کر کھالیا۔۔۔ میرے اندازے کے مطابق تو اب وہ ایک آدھ ہفتہ بھی نہ کھائے تب بھی نہیں مرے گا" ٹونی نے جواب دیا پھر ذرا دھیمے لہجے میں بولا "کھانے کے بعد اس نے سوئٹ ڈش کے طور پر مجھ سے دو تین تھپڑ بھی کھالیے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"ایک تو میں اس بدبخت کو کسی ہمدرد۔۔۔ اور شفیق ماں کی طرح کھانا کھلا رہا تھا اوپر سے اس مردود نے مجھے گالی دی" ٹونی روٹھے ہوئے بچے کی طرح بولا پھر اس نے ٹھنڈی سانس لی "واقعی آج کل نیکی کا زمانہ نہیں۔ مجھ سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ میں نے جواب نہیں دیا تو اُلو کے پٹھے نے مجھے موٹی سی گالی دی۔"

مجھے اس کے انداز پر ہنسی آگئی "اب وہ کس حال میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"لیٹا ہوا ہے خبیث" ٹونی جل کر بولا "اب دو چار گھنٹے تو لیٹا ہی رہے گا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ اسے لیٹا رہنے دو اور تم دونوں میرے ساتھ آؤ" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں انہیں اپنے ساتھ عقبی باغیچے میں لایا جہاں اب باغیچہ نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی تھی۔ ہر طرف جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا

لیکن بیچ میں ایک جگہ پختہ روش کے پاس ایک بڑی سی کیاری تر و تازہ پودوں اور رنگا رنگ پھولوں سے آراستہ دکھائی دے رہی تھی۔ مسز درّانی کا کہنا تھا کہ وہ صرف اتنے ہی ٹکڑے کا دھیان رکھ سکتی تھیں، پورے باغیچے کی دیکھ بھال ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے انہوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

میں نے کیاری کے قریب رُک کر ٹونی اور شفیع شاہ کو یہ بات بتائی پھر کہا۔

"ویسے تو ان کی بات میں وزن محسوس ہوتا ہے۔ لیکن میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں شک کا کوئی سنپولیا سرسرا رہا ہے۔ مسز درّانی کی زندگی کی تفصیلی کہانی تم دونوں بھی سُن چکے ہو۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

"کیاری کو کھود ڈالتے ہیں" شفیع شاہ بلا تامل بولا۔

"اور اگر اس کے نیچے سے کچھ نہ نکلا تو مسز درّانی اپنی اتنی خوبصورت کیاری کو تباہ کرنے پر ہم تینوں کو اپنی اس زمانۂ غار کی رائفل سے گولی ماردیں گی" ٹونی بولا۔

شفیع شاہ بولا "تم نے وہ کہاوت نہیں سُنی کہ کسی بھی جگہ سے خزانہ نکل سکتا ہے بشرطیکہ تم سو فیصد یقین کے ساتھ کھدائی کرو کہ وہاں خزانہ دفن ہے۔"

"وہ سو فیصد یقین کہاں سے لائیں؟" ٹونی ٹھنڈی سانس لے کر بولا "سو فیصد یقین تو باس کو بھی نہیں ہے۔"

"محض ایک کیاری کھودنے کے لیے تو باس کا محض شک بھی کافی ہے" شفیع شاہ بے پروائی سے بولا "اگر کچھ نہ نکلا تو ہم کوئی مالی بھیج کر مسز درّانی کو دوبارہ ایسی کیاری تیار کرادیں گے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار مہینے لگ جائیں گے۔"

"کھدائی کے لیے بھی ہم فون کرکے کسی کو بُلوا سکتے ہیں" میں نے کہا۔

"اس کی کیا ضرورت ہے سر!" شفیع شاہ جلدی سے بولا "میں اور ٹونی ذرا سی دیر میں اسے کھود ڈالیں گے۔ یہ کون سا مشکل کام ہے۔ اب ہمارے مسلسل کئی کئی دن کاہل دولت مندوں کی طرح ٹھاٹ باٹ اور آرام طلبی میں گزرتے رہتے ہیں حالانکہ ہماری تربیت کا تقاضا ہے کہ ہمیں ہمیشہ پُر مشقت زندگی گزارنی چاہیے اور کسی نہ کسی بہانے ایکشن میں رہنا چاہیے۔ ہمیں تو آج کافی دنوں بعد کوئی ڈھنگ کا کام نصیب ہو رہا ہے ورنہ زندگی عجیب بے ہودہ انداز میں گزر رہی ہے۔ ائرکنڈیشنڈ دفتروں میں بیٹھنا، ائرکنڈیشنڈ گاڑیوں میں گھومنا، ملازموں پر حکم چلانا، فائیو اسٹار ہوٹلوں میں کھانے کھانا، پارٹیاں اٹینڈ کرنا..... یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے!" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

ٹونی ہنستے ہوئے بولا "ان بے چاروں سے پوچھو جو اس زندگی کے خواب دیکھتے ہیں۔"

شفیع شاہ نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی "خواب تو خیر لڑکپن میں ہم نے بھی بہت دیکھے تھے..... اور یہ زندگی اچھی بھی لگتی ہے..... لیکن پھر بھی..... میں چاہتا ہوں ہم بُرائی اور اس زندگی میں توازن رکھیں۔"

"اچھا اب زیادہ بقراط مت بنو۔ یہ باس کا سکھایا ہوا سبق ہے۔ باس کے سامنے ہی دُہرا رہے ہو" ٹونی نے اسے کہنی ماری۔

"ظاہر ہے..... اُستاد کا سکھایا ہوا سبق اُستاد کے سامنے ہی دُہرانا چاہیے" شفیع شاہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"مجھے خوشی ہے کہ میرے بھی دوستوں نے میرے سکھائے ہوئے سبق نہ صرف اچھی طرح یاد رکھے ہیں بلکہ ان پر عملدرآمد بھی جاری رکھتے ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن فی الحال موضوع سے ہٹنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت یہ بڑی سنجیدہ میٹنگ ہو رہی ہے۔ تم دونوں کسی قسم کی نوک جھونک میں اُلجھنے اور راحیلہ کی کمی پوری کرنے کی کوشش مت کرو اور اپنے چہروں پر پوری سنجیدگی طاری کرلو۔"

"یس باس!" دونوں نے مستعدی سے بیک آواز میں کہا پھر شفیع شاہ معصومیت سے بولا "کیا گاڑی سے بریف کیس نکال لاؤں؟ جب سنجیدگی سے میٹنگ ہو رہی ہو تو بریف کیس ساتھ رکھنا اور کبھی کبھار اسے کھول کر اس میں سے کچھ کاغذات نکالنا اور کوئی فائل واپس رکھنا بھی اچھا معلوم ہوتا ہے۔"

"لیکن ہمارے بریف کیسوں میں کاغذات اور فائلیں وغیرہ کہاں ہیں احمق آدمی!" ٹونی نے اسے ڈانٹا۔

"ویسے بھی یہ میٹنگ کسی اچھے ہوٹل یا آفس کے ائرکنڈیشنڈ کانفرنس روم میں بیٹھ کر نہیں ہو رہی" میں نے یاد دلایا "اس جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان اس نیم شکستہ گزرگاہ پر کھڑے ہو کر میٹنگ کرنے کے لیے صرف تھوڑی سی سنجیدگی ہی کافی ہے۔ میں اصل میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ مسز درانی کی مدد اپنی جگہ ہے..... ہم اس سلسلے میں کافی آگے بھی چلے گئے ہیں لیکن میں اس معاملے میں مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوں۔ کل سے ایک خلش میرے ذہن میں ہے۔ کہیں کوئی پھانس سی چبھی ہوئی ہے۔ درحقیقت میں اسی لیے غفار کو یہاں لایا تھا کہ مسز درانی کے سر پر یکدم مصیبت... ڈال کر انہیں ہڑبڑا کر یہاں سے نکالا جائے تاکہ ہم اطمینان سے اپنا کام کرسکیں ورنہ وہ کسی صورت میں یہاں سے جانے والی نہیں تھیں۔ اب موقع میسر ہے تو میں دیکھ ہی لوں کہ میرے شبے کی تصدیق ہوتی ہے یا تردید۔"

شفیع شاہ ایک کونے میں بنے ہوئے جھونپڑی نما کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے ہمیں اس کمرے میں باغبانی وغیرہ میں کام آنے والے اوزار مل جائیں گے۔ آپ نے جب فیصلہ کرلیا ہے تو دیر کیسی۔"

ٹونی اسے گھورتے ہوئے بولا "لگتا ہے تم تو اس خوبصورت کیاری کو اُجاڑنے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب ہو۔"

"یہی سمجھ لو" شفیع شاہ بولا "اس کی دوبارہ آباد کاری کے فرائض تم انجام دے دینا۔"

ہم تینوں اس جھونپڑی نما کمرے میں پہنچے۔ اس کے دروازے پر کوئی تالا وغیرہ نہیں تھا۔ اندر دنیا جہاں کا کاٹھ کباڑ جمع تھا جسے ذرا

اُلٹنے پلٹنے پر ہمیں کدال، بیلچا وغیرہ سب کچھ مل گیا۔ چیزیں بہت پُرانی اور زنگ آلود تھیں لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں نے بھی اپنے لیے ایک گینتی اٹھائی تو شفیع شاہ میرا ہاتھ روکتے ہوئے بولا۔

"آپ کو کھدائی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اتنی سی کیاری کو تو دس بیس فٹ گہرائی تک کھودنے کے لیے ہم دونوں ہی کافی ہیں۔"

ٹونی نے بھی میرا ہاتھ تھام لیا اور پھر آہستگی سے گینتی میرے ہاتھ سے لے لی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لگتا ہے تم لوگ مجھے مزدوری کی عیاشی نہیں کرنے دو گے؟"

وہ دونوں کدال وغیرہ اٹھائے واپس کیاری تک آئے۔ کوٹ وہ پہلے ہی اُتار کر ڈرائنگ روم میں رکھ چکے تھے۔ اب انہوں نے ٹائیاں اور قمیصیں بھی اتار پھینکیں۔ پتلونوں کے پائنچے کافی اوپر تک چڑھا لیے اور کیاری پر ٹوٹ پڑے۔ دیکھتے ہی دیکھتے رنگا رنگ پھولوں سے لدے پودے دور جا پڑے۔ مجھے افسوس بھی ہوا۔

ان کے بازو تیزی سے حرکت کرنے لگے تھے۔ چند ہی لمحوں میں ان کے جسم کے کھلے حصوں پر پسینہ چمکنے لگا۔ ان کے جسم پر کہیں موٹاپے یا چربی کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ البتہ ہر حرکت کے ساتھ ان کے مسلز اتنی تیزی سے پھڑکتے تھے کہ ان پر نگاہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ واقعی بہت جلد وہ اس کیاری کو بہت گہرائی تک کھود ڈالیں گے۔

میں انہیں اس کام میں مصروف چھوڑ کر اس کمرے میں آگیا جس میں ہم نے غفار کو باندھ رکھا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گو کہ خون کی سُرخی تھی لیکن وہ بے حد بُجھا بُجھا دکھائی دے رہا تھا۔ شاید اس بات سے اسے مایوسی ہوئی تھی کہ ابھی تک اس کے لیے کوئی امداد نہیں پہنچی تھی۔ مجھے اس پر کسی حد تک حیرت تھی کہ جبار کی طرف سے کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ میرے کسی بھی ٹھکانے پر کوئی گڑبڑ ہوتی تو اب تک مجھے اطلاع مل چکی ہوتی۔ میرے آدمی ہر جگہ الرٹ تھے۔ حیرت کی بات تو یہ تھی کہ ہوٹل سے بھی کسی گڑبڑ کی اطلاع نہیں ملی تھی جو کہ میرا بہت ہی معروف اور نمایاں ٹھکانا تھا۔

"کیا حال ہیں پیارے بدمعاش؟" میں نے غفار کے قریب پہنچ کر خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس خشمگیں نظروں سے مجھے گھورتا رہا لیکن اب اس کی نظروں میں وہ پہلی سی بات نہیں رہی تھی۔ اب وہ کچھ تھکا تھکا دکھائی دینے لگا تھا۔

"اب بھی تم میرے سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔

"کون سے سوال کا؟" وہ غرایا۔

"بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم میرا سوال ہی بھول گئے۔ یادداشت بہت کمزور معلوم ہوتی ہے تمہاری" میں نے کہا "خیر..... کوئی بات نہیں۔ میں کمزور دشمن پر زیادہ سختی کرنے کا قائل نہیں۔ اس لیے سوال دُہرا دیتا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تمہارا بھائی مسز درّانی کے اس مکان کے پیچھے کیوں پڑ گیا تھا؟ کیوں اس کی اصل مارکیٹ ویلیو سے کہیں زیادہ رقم دینے کو تیار ہے؟ اس کے پیچھے کیا راز ہے؟ بس اتنی سی بات جاننا چاہتا ہوں میں۔ یہ کوئی بہت بڑا مطالبہ تو نہیں۔ اب بھی میرے سوال کا جواب دو گے یا نہیں؟"

"نہیں" اس نے مضبوط لہجے میں جواب دیا "میں تمہارے اس سوال کا..... یا کسی بھی... سوال کا کوئی جواب نہیں دوں گا۔"

"بہت ہی ہٹ دھرم ہو تم..... بہت ڈھیٹ ہڈی ہو!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھے پہلے ہی معلوم تھا تم کسی سوال کا جواب نہیں دو گے۔ اس لیے میں نے پہلے ہی تمہارا بندوبست شروع کرادیا تھا۔ تم اگر پسند کرو تو ذرا کھڑے ہو کر ایک نظر اس کھڑکی سے باہر ضرور دیکھ لو" میں نے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس میں اس کے پاؤں کی زنجیر کا ایک سرا موٹی سی سلاخ میں بندھا ہوا تھا۔

تجسس سے مجبور ہو کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کھڑکی سے عقبی احاطے کے جھاڑ جھنکاڑ کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ اور میرے دونوں ساتھیوں کو کیاری کی کھدائی کرتے بھی دیکھا جاسکتا تھا حتیٰ کہ احاطے کے بلب کی زرد روشنی میں ان کے بازوؤں کی پھڑکتی ہوئی مچھلیاں بھی دیکھی جاسکتی تھیں۔ زرد روشنی، بے ہنگم سائے، جھاڑ جھنکاڑ، پسینے سے چمکتے ہوئے دو ورزشی جسم اور آسیب زدہ سا ماحول۔ یہ سب چیزیں مل کر اس منظر کو خاصا پُراسرار اور خوفناک بنا رہی تھیں۔

"یہ..... یہ تو مسز درّانی ہی کا مکان معلوم ہوتا ہے!" وہ بے تابانہ انداز میں بول اٹھا۔ اس نے شاید اس سے پہلے بھی اس کھڑکی سے جھانک کر دیکھا ہو لیکن یہ بات اب اس کی سمجھ میں آئی تھی۔

"چلو..... دیر سے ہی سہی..... لیکن کوئی بات تمہاری سمجھ میں آئی تو سہی" میں نے طمانیت سے کہا "تم ہماری سمجھ داری کی داد دو۔ تمہیں لانے کے لیے اس سے بہتر جگہ اور کون سی ہوسکتی تھی؟ اس مکان کو حاصل کرنے کی تمہیں اور تمہارے بھائی کو شدید خواہش تھی۔ ہم نے سوچا تمہیں اس میں کچھ وقت گزارنے کا موقع دے ہی دیا جائے..... لیکن تمہیں جس چیز پر زیادہ توجہ دینی چاہیے تھی، اس طرف تم نے دھیان ہی نہیں دیا۔ تم نے یہ نہیں پوچھا کہ میرے وہ دونوں ساتھی اس قدر جانفشانی سے زمین کی کھدائی کیوں کررہے ہیں۔"

"کیوں کررہے ہیں؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تمہاری قبر تیار ہو رہی ہے" میں نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے جواب دیا "طے یہ پایا ہے کہ تمہیں زندہ ہی دفن کردیا جائے کیونکہ تمہارا بھائی ہماری بات ماننے اور اس مکان کا پیچھا چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس لیے ہم نے سوچا ہے اسے تھوڑا سا سبق سکھایا جائے کہ مکان اور دیگر جائداد وغیرہ کے لالچ میں مبتلا

ہونے کا نتیجہ کبھی کبھی یہ بھی نکل سکتا ہے۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے رک کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور مسکراتے ہوئے کہا "تمہیں بھی اس مکان سے بہت محبت ہے نا؟ اس لیے تمہیں خوش ہونا چاہیے کہ اسی میں تمہاری قبر بن رہی ہے۔ تم زندگی میں نہ سہی مر کر تو اس مکان کو پالو گے۔ یعنی مرنے کے بعد یہ تمہاری دسترس اور رسائی میں ہو گا۔"

میں ایک بار پھر کسلنے لگا "میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ کمزور دشمن کے ساتھ ہم زیادہ سختی نہیں کرتے۔ میں نے سوچا اب کون تم سے اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے مختلف ہتھکنڈے اختیار کرے' ٹارچر کے نئے نئے حربے آزمائے۔ اس تردد میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ سیدھا سادہ کام کرنا چاہیے اور یہ قصہ ہی ختم کر دینا چاہیے۔ ذرا گہرا سا گڑھا تیار ہو جائے۔ تمہیں اسی طرح بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ اس میں پھینکیں گے اور گڑھے کو بھر دیں گے۔ مسئلے پر مٹی ڈالنا اسے کہتے ہیں۔"

میں نے گہری سانس لے کر سلسلۂ کلام جوڑا "اگر اس سے بھی مسئلہ حل نہ ہوا تو پھر مجبوراً ہمیں تمہارے پیارے بھائی جان کی قبر بھی تمہارے پہلو میں بنانی پڑے گی۔ مسئلہ صرف یہ ہو گا کہ ان قبروں کا کسی کو علم نہیں ہو گا اور نہ ہی یہ کسی کو نظر آئیں گی کیونکہ اوپر سے یہ بالکل سپاٹ ہوں گی۔ یہ فیصلہ بھی بعد میں کیا جائے گا کہ ان پر جھاڑ جھنکاڑ اُگنے دیے جائیں یا خوبصورت پھولوں والے پودے اُگائے جائیں۔"

میں نے رک کر اور پلٹ کر اس کا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس کے اندر خوف پنجے گاڑ چکا تھا لیکن وہ بظاہر دلیر نظر آنے کی کوشش ترک کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"یہ اتنا آسان کام نہیں ہے میری جان!" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "ہم اتنے چھوٹے لوگ نہیں ہیں کہ تم ہمیں یوں اطمینان سے دفن کر دو اور تمہارا کچھ نہ بگڑے۔"

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تمہارا کیا بگڑتا ہے اور کیا سنورتا ہے' اس کی ہم نے کبھی پروا ہی نہیں کی پیارے! ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جب کوئی اس قسم کے کام کرتا ہے تو کچھ بندوبست کر کے ہی کرتا ہے۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ ہم بھی کچھ چھوٹے آدمی نہیں ہیں؟ یا اب بھی تمہیں دنیا میں اپنے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا؟ تم نے ابھی تک کیا اس پر بھی غور نہیں کیا کہ ہم تمہیں تمہارے پیارے بھائی جان کے سامنے تمہارے بھرے پُرے آفس سے اس حال میں اُٹھا لائے اور ایک چوپائے کی طرح تمہیں یہاں باندھا ہوا ہے اور ابھی تک ہمارا کچھ نہیں بگڑا۔ کیا اس سے بھی تمہیں اپنی اوقات کا پتا نہیں چلا؟"

وہ خاموش رہا اور کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے کندھے اُچکائے اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ "خیر۔۔۔ بعض لوگوں کو مرتے دم تک عقل نہیں آتی۔ تم انہی ان گنت احمقوں میں سے ایک معلوم ہوتے ہو۔ میں ذرا دیکھ آؤں تمہاری قبر تیار ہو گئی ہے یا نہیں۔"

میں تیزی سے کمرے سے نکل آیا اور تباہ شدہ کیاری کے قریب جا پہنچا۔ مجھے یقین تھا کہ غفار اب کھڑکی سے مجھے دیکھ رہا ہو گا لیکن میں اس کی طرف سے بے پروا بنا رہا۔ قریب جا کر میں نے کیاری کا جائزہ لیا۔ شفیع اور ٹونی نے اسے تقریباً ڈیڑھ فٹ گہرا کھود ڈالا تھا لیکن ابھی تک اس میں سے سوائے مٹی کے کچھ برآمد نہیں ہو رہا تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں غفار کو کیا چکر دے رہا تھا۔ وہ گڑھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگے گویا مجھے بتا رہے ہوں کہ قبر تیار ہو چکی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ غفار کھڑکی سے یہ تمام حرکات و سکنات دیکھ رہا ہو گا۔ شفیع شاہ اور ٹونی اپنی کدال اور بیلچے کا سہارا لے کر یوں اطمینان سے کھڑے ہو گئے جیسے انہوں نے اپنا کام ختم کر لیا ہو۔ گڑھے کے کنارے مٹی کا خاصا اونچا ڈھیر نظر آ رہا تھا جس میں پچاسوں پودے جڑوں سمیت اُلجھے اور دبے پڑے تھے۔

میں واپس کمرے میں آ گیا۔ غفار کھڑکی کے قریب ہی کھڑا تھا لیکن اب اس کا رخ میری طرف ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی زنجیر میں کھڑکی کی سلاخ کے قریب لگے ہوئے تالے کی چابی جیب سے نکالی اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "چلو پیارے! تمہاری آخری آرام گاہ تیار ہو گئی ہے۔ تم اس قابل تو نہیں تھے لیکن پھر بھی بڑی عزت سے دفن ہو رہے ہو۔ بس تھوڑی سی خرابی یہ ہوئی کہ ہم تمہارے مرنے کا انتظار نہیں کر سکے۔"

میرے لہجے میں تمام تر شگفتگی کے باوجود میرے انداز میں ایک سفاکانہ اشتیاق تھا جو اسے یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ اس کے ساتھ قطعاً کوئی مذاق نہیں ہو رہا تھا بلکہ ہم اس معاملے میں بالکل سنجیدہ تھے۔ اس کی ایک ٹانگ میں آہنی کڑا تھا جس کے ساتھ زنجیر بندھی ہوئی تھی۔ اس کی دوسری ٹانگ ہم نے آزاد کر دی تھی۔

میں اس کے قریب پہنچا تو اس نے اچانک ایڑی کے بل گھوم کر اسی آزاد ٹانگ سے مجھ پر جوڈو کا ایک داؤ آزمانے کی کوشش کی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ وہ میری کنپٹی پر پاؤں کی ایک خاص ضرب لگا کر مجھے بے ہوش کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

مجھے پہلے ہی اس کی طرف سے اس قسم کی کسی حرکت کی توقع تھی اور میں اس کے لئے تیار تھا۔ میں نے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے اس کی ٹانگ پکڑ لی۔ وہ ایک ٹانگ پر ناچنے لگا۔ اس کی ایک ٹانگ میں زنجیر تھی۔ ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً گر جاتا لیکن میں نے اسی ٹانگ کو اس طرح پکڑے رکھا تھا کہ وہ گرنے سے باز رہا پھر میں نے اسے ایک خاص انداز سے موڑا۔ وہ تکلیف سے بے اختیار چلا اٹھا۔

"اسی طرح ایک سیکنڈ میں تمہارے گھٹنے کا جوڑ بھی الگ ہو سکتا ہے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اور اگر تمہاری اس احمقانہ اچھل کود کے نتیجے میں' میں کچھ اور کر بیٹھتا تو ممکن تھا کہ تمہاری ٹوٹی ہوئی ناک سے دوبارہ خون جاری ہو جاتا اور خون کا یہ بہاؤ جاری رہنے کے نتیجے میں تمہاری موت بھی واقع ہو سکتی

تھی۔ معلوم ہے اس کا مطلب کیا ہوا؟" میں نے اس کی ٹانگ کو ایک اور تکلیف دہ جھٹکا دیا پھر اچانک ٹانگ چھوڑ دی۔ وہ تکلیف دہ انداز میں چیخ کر دھپ سے گر پڑا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم بھی تمہیں آخری سفر پر روانہ کرنے کی تیاری کر رہے ہیں اور تم خود بھی اپنے آپ کو ہلاک ہی کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ گویا تمہیں موت کے منہ میں پہنچانے میں ہمارا کچھ زیادہ قصور نہیں۔ تم خود بھی مرنا ہی چاہتے ہو۔ اپنے دشمن آپ ہو۔ تم خود کو بچانے کی کوئی کوشش نہیں کر رہے۔ بہرحال ہم چاہتے ہیں کہ تم اگر مرنے پر تلے ہی ہوئے ہو تو پھر زندہ دفن ہو کر ہی مرو۔ خوامخواہ دوسری الٹی سیدھی حرکتیں کرنے کی ضرورت نہیں۔"

میں اس پر نظر رکھتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے اس کی زنجیر کا تالا کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ساتھ ہی میں نے اسے خبردار کیا۔ "اگر تم نے اب زیادہ پھرتی دکھانے کی کوشش کی تو میں اسی زنجیر سے تمہیں گوشت اور خون کے ملغوبے میں تبدیل کر دوں گا۔ گو کہ مجھے بندھے ہوئے دشمن کو مارنا بالکل اچھا نہیں لگتا لیکن تم جیسے آدمی کو اس طرح مارنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔"

میں نے تالا کھول کر یکدم زنجیر سے ہی اسے دروازے کی طرف کھینچا۔ وہ کئی فٹ تک چادر سمیت گھسٹتا چلا آیا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی۔ لگتا تھا اس میں اب دم خم نہیں رہا تھا یا پھر اسے اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا کہ وہ کوئی نتیجہ خیز مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

جب میں اسے دروازے سے باہر گھسیٹنے لگا تب اس نے اچانک دروازے میں ٹانگ پھنسا لی اور شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ "اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔ میں تمہارے سوال کا جواب دے دیتا ہوں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ اس کے بعد تم مجھے زندہ دفن کرنے کا ارادہ ملتوی کر دو گے؟"

"فی الحال صرف میری زبان ہی گارنٹی ہے۔" میں نے اسے گھسیٹنے کی کوشش ترک کرتے ہوئے کہا۔ "اور میری زبان پر بہرحال تم دونوں بھائیوں کی زبان سے زیادہ اعتبار کیا جاتا ہے۔"

وہ یکدم ہی مضمحل نظر آنے لگا تھا۔ اس لمحے وہ مجھے اس پُرشکوہ عمارت کی طرح نظر آیا جو یکدم ہی کسی فنی خرابی کی وجہ سے زمیں بوس ہو گئی ہو۔ آخر اس کی اکڑ فوں رخصت ہو ہی گئی تھی۔

وہ پہلو کے بل فرش پر پڑا چند لمحے ہانپتا رہا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس کا بازو پکڑ کر ایک جھٹکے سے اسے کھڑا کر دیا اور ملائمت سے کہا۔ "تم چاہو تو آرام سے چل کر اسی دیوار کے قریب چادر پر بیٹھ سکتے ہو اور سکون سے بات کر سکتے ہو۔"

اس نے میری پیشکش قبول کر لی اور واپس اسی دیوار کے قریب چلا گیا جس میں سلاخوں والی کھڑکی تھی۔ بیٹھنے سے پہلے اس نے ایک نظر شفیع شاہ اور ٹونی کی طرف بھی دیکھا۔ وہ کچھ اسی طرح منتظر انداز میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے جیسے انہوں نے اپنا کام تقریباً ختم کر لیا ہو اور اب اس "زندہ مُردے" کو جلد از جلد قبر میں لٹا کر اس ذمے داری سے جان چھڑانا چاہتے ہوں۔

غفار آلتی پالتی مار کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور اس نے تکلیف دہ سے انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ میں صبر و سکون سے اس کے سامنے کھڑا رہا اور اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ میں اس کی کسی خلافِ توقع حرکت کے لئے بھی پوری طرح تیار تھا۔

آخر اس نے آنکھیں کھولیں اور بوجھل سی آواز میں بولا۔ "یہ بات بہرحال راز تو نہیں رہنی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو مہینے تک اسے تمام اخبارات میں چھپ ہی جانا ہے لیکن اسے اس وقت تک راز میں رکھنے کی بڑی اہمیت تھی۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ اور لمبی تمہیدیں بھی مت باندھو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"یہ نہ تو کوئی پہیلی ہے اور نہ ہی تمہید۔" وہ تیزی سے بولا۔ "یہ اصل بات کا ایک اہم حصہ ہے۔"

"اوہ۔۔۔ معاف کرنا تمہاری تو دُم پر پاؤں آ گیا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔ تم اپنا بیان جاری رکھو۔"

"مکان کے پیچھے لگنے میں جو راز پنہاں ہے وہ درحقیقت کوئی ایسا خاص راز بھی نہیں ہے۔ ہم کاروباری لوگ جب اس طرح کسی چیز کے پیچھے لگتے ہیں اور اس طرح قیمت آفر کرتے ہیں تو اس کے پیچھے درحقیقت اس سے کئی گنا زیادہ رقم کی کشش کام کر رہی ہوتی ہے۔" وہ اب خاصی معقولیت سے بولا۔

"یہی امکان مجھے بھی نظر آ رہا تھا لیکن مجھے مستقبل قریب تو کیا' مستقبل بعید میں بھی اس مکان کی مارکیٹ ویلیو بڑھنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"بس یہی کل راز تھا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "سیاسی اثر رسوخ اور سرکاری درباری حلقوں میں رسائی کا فائدہ بعض ایسے ہی موقعوں پر پہنچتا ہے۔ اس مکان کے عقب میں جو ایک طویل ساحلی پٹی پھیلی ہوئی ہے وہ ایک ٹرسٹ کی ملکیت تھی لیکن وہ ٹرسٹ اب تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ بہت پُرانا ٹرسٹ تھا۔ حالات کچھ ایسے رہے کہ رفتہ رفتہ وہ ٹوٹ پھوٹ گیا اور قانونی طور پر کالعدم ہو گیا۔ وہ زمین مفت میں حکومت کے ہاتھ آ گئی۔ اس سے پہلے کہ اس کی بندربانٹ شروع ہوتی ایک شریف اور دیانت دار مشیر نے اس کے بارے میں ایک منصوبہ پیش کر دیا۔۔۔"

مجھے مسکراتے دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور وہ تیکھے لہجے میں بولا۔ "شاید تمہیں یقین نہیں آ رہا کہ سیاسی اور سرکاری حلقوں میں بھی کوئی شریف اور دیانت دار مشیر ہو سکتا ہے؟ کبھی کبھی ایسا ہو جاتا ہے۔ ہر شعبے میں سیکڑوں یا ہزاروں لوگوں میں ایک آدھ ایسی مثال تو پائی ہی جاتی ہے۔ شاید انہی مثالوں کے دم قدم سے یہ نظام چل رہا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ یہ بات تو تم نے صحیح کہی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ورنہ تم جیسے لوگوں کی وجہ سے تو یہ نظام کب کا بیٹھ چکا ہوتا۔"

اس نے ناگواری سے مجھے گھورا تاہم اس پر کوئی تبصرہ کئے بغیر بات جاری رکھی "بہرحال میرے بھائی کو باوثوق ذرائع سے اطلاع مل گئی کہ متعلقہ حکام کے آئندہ اجلاس میں یہ منصوبہ منظور کرلیا جائے گا۔ وہ ایک بہت بڑا تفریحی منصوبہ ہے جس میں پرائیویٹ سیکٹر سے بھی لوگوں کو شریک کیا جائے گا۔ اس میں بہت بڑا پارک ہوگا۔ بچوں اور بڑوں کے لئے تفریح گاہیں ہوں گی۔ ایک چھوٹا سا اسٹیڈیم ہوگا۔ حتیٰ کہ خاص طور پر صرف اس منصوبے تک آمدورفت کے لئے ایک رعایتی بس سروس بھی چلانے کا پروگرام ہے۔ ترقی یافتہ ملکوں کی تفریح گاہوں کی طرز پر یہ منصوبہ بنایا گیا ہے ــــ بلکہ عین ممکن ہے وہاں کے کسی منصوبے کی جوں کی توں نقل کرلی گئی ہو۔

"بھائی صاحب نے اپنے ذرائع سے اس منصوبے کے لئے آؤٹ پلان کی ایک کاپی بھی حاصل کرلی ہے۔ اس نقشے کے مطابق' اس منصوبے کے شروع ہوتے ہی جو پلاٹ سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوگا اس پر مسزدرانی کا کھنڈر سر اٹھائے کھڑا ہے جسے وہ مکان کہتی ہیں۔ آج جو بھی پارٹی یہ پلاٹ حاصل کرلے گی وہ سال دو سال میں اس پر ہائی رائز بلڈنگ کھڑی کرکے کروڑوں کمائے گی۔ بس اتنی سی بات تھی ــــ"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا پھر بولا "ابھی کسی کو اس منصوبے کی ہوا تک نہیں لگی لیکن جب باقاعدہ اجلاس ہوجائیں گے' منظوریاں مل جائیں گی اور ساری بات پریس میں آجائے گی تو سب کو نہ صرف مسزدرانی کے مکان کی اہمیت کا اندازہ ہوجائے گا بلکہ آس پاس جو چند کچی پلاٹ موجود ہیں۔ ان کی قیمت بھی بہت بڑھ جائے گی پھر تو شاید ان سب لوگوں کو بہت اچھی قیمت دینے کے لئے بہت سی پارٹیاں سامنے آجائیں۔ اس لئے بھائی صاحب جلد از جلد اس ڈیل کو مکمل کرلینا چاہتے تھے۔ سیدھی یا ٹیڑھی انگلیوں سے گھی نکال لینا چاہتے تھے لیکن ــــ اگر اب مسئلہ جان کا ہی آپڑا ہے تو ظاہر ہے ہم مالی فائدے سے دستبردار ہوجائیں گے۔ اس پروجیکٹ کو چھوڑ دیں گے۔ زندگی رہے تو دولت کمانے والے بہت سے پراجیکٹ سامنے آتے رہتے ہیں۔"

"اگر بات صرف دوسرے کی زندگی سے کھیلنے کی ہوتی تب تو تم اس پراجیکٹ کے سلسلے میں اپنی ضد پر قائم رہتے" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا "لیکن اب چونکہ بات اپنی زندگی کی آن پڑی ہے اس لئے تم دست بردار ہونے پر تیار ہوگئے ہو۔ بس ــــ یہ فرق ہوتا ہے اپنی اور دوسرے کی جان میں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایسے لوگوں کے پاس ایسی باتوں کا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ ہاں اگر کج بحثی کرنا چاہیں تو بات دوسری ہے۔ غفار نے کم از کم یہ اچھا کیا کہ کج بحثی نہیں کی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "بہرحال ــــ تمہارا شکریہ کہ تم نے یہ معمولی سا معما حل کردیا جو بظاہر بہت اُلجھا ہوا نظر آرہا تھا۔"

میں نے اس کی زنجیر کا سرا دوبارہ کھڑکی کی سلاخ سے باندھ کر تالا لگادیا۔ اس دوران اس نے موقع سے فائدہ اٹھانے کی کوئی کوشش نہیں کی اور کافی شریفانہ لہجے میں بولا "تم مجھے آزاد نہیں کررہے ہو؟"

"ابھی تو صرف تمہیں زندہ دفن کرنے کا پروگرام ملتوی ہوا ہے" میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا "تمہاری آزادی کا دارومدار تمہارے بھائی صاحب کے رویئے پر ہے۔ جس طرح تم نے اس پراجیکٹ سے دست برداری کا ارادہ ظاہر کردیا ہے اسی طرح اگر وہ بھی راضی ہوگیا اور اس نے کوئی معقول ضمانت دے دی تو تمہیں رہا کردیا جائے گا۔"

"تمہارے پاس موبائل فون موجود ہے۔ تم میری ان سے بات کراؤ۔ وہ مان جائیں گے۔ وہ میری بات نہیں ٹالتے" وہ جلدی سے بولا۔ اب وہ پوری طرح تعاون پر آمادہ نظر آرہا تھا۔ اس نے غالباً محسوس کرلیا تھا کہ اب جان چھڑانے ہی میں عافیت تھی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا "ابھی نہیں ــــ ذرا ٹھہر جاؤ۔ میں تمہارے بھائی صاحب کے ردِعمل کا منتظر ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو میں تم سے کہوں گا کہ اس سے رابطہ کرو۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ تم آرام سے ایک آدھ رات ہمارے مہمان رہو۔"

"مہمان کے ساتھ یہ سلوک ہوتا ہے؟" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"جیسا مہمان ویسا سلوک" میں نے جواب دیا اور باہر آگیا۔

شفیع شاہ اور ٹونی کے قریب جاکر میں نے انہیں بتایا کہ ترکیب کارگر رہی تھی اور غفار نے وہ راز اُگل دیا تھا جس نے ہم سب کو الجھن میں مبتلا کررکھا تھا۔ میں نے انہیں وہ سب کچھ بتایا جو غفار نے مجھے بتایا تھا۔

شفیع شاہ منہ بنا کر بولا "راز تقریباً وہی ہے جس کا ہمیں کچھ کچھ اندازہ تھا۔"

"لیکن ہمارے اندازے کی کسی طرح تصدیق نہیں ہورہی تھی" ٹونی بولا۔

شفیع شاہ ٹھنڈی سانس لے کر دوبارہ کدال سنبھالتے ہوئے بولا "یہ راز تو بے نقاب ہوگیا لیکن فی الحال اس کیاری سے کوئی راز برآمد نہیں ہورہا۔"

ٹونی دوسری کدال سنبھالتے ہوئے بولا "ابھی کھدائی بھی تو ذرا سی ہوئی ہے۔ بعض راز خاصی گہرائی میں دفن ہوتے ہیں۔"

"بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ــــ کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ وہ بھی مرا ہوا" میں نے کہا "اگر ایسا ہوگیا تو دل چھوٹا نہ کرنا۔"

"سر! آپ کو معلوم ہے ہم دل چھوٹا کرنے والے لوگ نہیں ہیں کیونکہ ــــ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں ــــ" ٹونی بولا "جب تک آپ نہیں روکیں گے ہم یہاں کھدائی کرتے چلے جائیں گے۔ اور کچھ نہیں تو کنوئیں جتنی کھدائی ہونے پر پانی تو نکل ہی آئے گا۔"

وہ دونوں دوبارہ مستعدی سے کھدائی میں جت گئے۔ میں نے اس کمرے کی کھڑکی کی طرف دیکھا جس میں غفار موجود تھا۔ وہ

کھڑکی میں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اگر اس نے کھڑکی سے جھانکا اور شفیع اور ٹونی کو دوبارہ کھدائی میں مصروف دیکھا تو وہ یہی سمجھے گا کہ میں نے اسے بچھاڑ کر اصل بات تو معلوم کرلی لیکن اسے دفن کرنے کا ارادہ ترک نہیں کیا تھا۔

میں اسے تسلی دینے کے لئے دوبارہ اس کے کمرے میں جانے کا ارادہ کرہی رہا تھا کہ میری جیب میں موجود موبائل فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں نے جیب سے فون نکالا۔ دوسری طرف میری سیکریٹری امبر تھی جو میری خصوصی ہدایات کی وجہ سے ابھی تک ہوٹل میں اپنے آفس میں ہی موجود تھی۔

اس نے اطلاع دی۔ "سر! یہاں نہ تو کسی نے حملہ کیا اور نہ ہی مسلح افراد نے ہوٹل میں گھسنے کی کوشش کی۔ سیکیورٹی کا عملہ بھی الرٹ رہا اور شفیع شاہ صاحب کے تعینات کئے ہوئے دوسرے آدمی بھی ہوٹل کی نگرانی کرتے رہے مگر کوئی گڑبڑ' کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔"

"یہ خبر میرے لئے حیرت انگیز ہے ــــ بہرحال اچھی خبر ہے" میں نے کہا۔

"دوسری اہم خبر یہ ہے کہ چند منٹ پہلے جبار جیلانی کا فون آیا تھا۔ وہ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے" امبر نے بتایا۔

"کس انداز میں بات کررہا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہایت شرافت سے" امبر نے بتایا۔

"کمال ہے!" میں نے بے یقینی سے کہا "آج تو میرے لئے حیرتوں کا دن ہے۔"

"اس نے چند فون نمبر چھوڑے ہیں اور درخواست کی ہے کہ آپ ان میں سے کسی پر بھی اس سے رابطہ کریں" امبر بولی۔

"تم نے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا کہ ان میں سے کس کس نمبر پر اس نے کال ریکارڈ کرنے کا انتظام کیا ہے" میں نے کہا۔

"پوچھ لیا تھا سر!" وہ بولی "وہ خاصے مُردہ سے لہجے میں صفائی پیش کرنے لگا کہ اس نے ایسا کوئی انتظام نہیں کیا ہے کیونکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی کوئی فائدہ تھا۔ اس نے جو کچھ کیا وہ بھی ڈنکے کی چوٹ پر کیا اور افضل صاحب نے جو جوابی کارروائی کی وہ بھی علی الاعلان کی۔ دونوں میں سے کسی کی شخصیت بھی پردے کے پیچھے نہیں ہے۔ اس لئے گھات لگانے اور ایک دوسرے کے خلاف ثبوت حاصل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ تو ایک دوسرے کے لئے کھلا چیلنج ہے۔ طاقت کا کھیل ہے' پہلا فریق دوسرے کا جو کچھ بگاڑ سکتا ہے' بگاڑ لے۔ یہ میں جبار جیلانی کے الفاظ دُہرا رہی ہوں۔"

"بہت سمجھداری کی باتیں کررہا تھا گدھا کہیں کا!" میں نے کہا "تم نمبر مجھے لکھوادو۔ میں اس سے بات کرکے دیکھتا ہوں کہ ابھی اس کی سمجھداری قائم ہے یا نہیں۔"

امبر نے مجھے تین فون نمبر نوٹ کرائے اور سلسلہ منقطع کردیا۔ میں نے شفیع اور ٹونی کو بتایا "مبارک ہو۔ جبار جیلانی کا پیغام آگیا ہے کہ اس سے رابطہ کیا جائے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ

یہ معلوم [illegible] رہا ہے یا نئی دھمکیاں دیتا ہے۔"

[illegible] شاہ کھدائی جاری رکھتے ہوئے قدرے مرتعش سانسوں کے درمیان بولا "اگر اس نے نئی دھمکیاں دیں تو ہم اسے بھی اٹھالائیں گے۔"

"میرا خیال ہے اب تک وہ اپنی حفاظت کے لئے اپنے آدمیوں کو اکٹھا کرنے کے علاوہ سرکاری محافظوں کی خدمات بھی حاصل کرچکا ہوگا" میں نے جبار جیلانی کا پہلا نمبر پنچ کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔ اس کے باوجود اُٹھا لائیں گے" شفیع شاہ بے پروائی سے بولا۔ "اسے بھی پتا چل جائے گا کہ محافظوں کا ہجوم اسے کتنا تحفظ فراہم کرسکتا ہے۔"

میں نے نمبر پنچ کرکے فون کان سے لگایا۔ دوسری طرف دوسری بیل کے آغاز پر ہی فون اُٹھالیا گیا اور بے تابانہ سی "ہیلو" سن کر ہی میں نے پہچان لیا' وہ جبار جیلانی ہی کی آواز تھی۔

"کیا حال ہیں سیٹھ صاحب؟" میں نے شیریں لہجے میں پوچھا۔

"افضل ــــ تم افضل ہونا؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ میں آپ کا حقیر سا خادم افضل ہی ہوں" میں نے اپنے لہجے کی مٹھاس برقرار رکھتے ہوئے کہا "سنا ہے آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا؟"

"ہاں ــــ دیکھو افضل ــــ بات یہ ہے ــــ" اس کے لہجے کا ارتعاش کچھ کم ہوا۔ اسے گویا میری آواز سن کر کچھ اطمینان ہوا تھا لیکن شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کس طرح کرے حالانکہ میرے خیال میں اس نے انتظار کے لمحات کے دوران میں بیسیوں مرتبہ ان الفاظ اور ان کی ترتیب کو دُہرایا ہوگا جو وہ مجھ سے بات چیت میں استعمال کرنا چاہتا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میری آواز سن کر وہ ساری ترتیب الٹ پلٹ ہوگئی تھی۔

وہ خطرناک ترین صورتِ حال کا سامنا ہونے پر بھی نروس ہونے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا جب کہ اس وقت تو میں اس کے سامنے بھی نہیں تھا اور وہ غالباً نہایت محفوظ ماحول میں اپنے گھر میں بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود وہ نروس معلوم ہوتا تھا۔ پھر شاید وہ کچھ سنبھلتے ہوئے بولا "میں تم سے سیدھی' صاف اور سچی بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"یہ سُن کر بہت خوشی ہوئی۔" میں نے کہا۔ "سیدھی' سچی اور صاف بات سے اچھی تو کوئی بات ہی نہیں ہوتی۔ ایسی کوئی بات سننے کے لئے تو میں بے تاب رہتا ہوں۔"

"جو ہوا سو ہوا ــــ لیکن میں تم سے تصادم نہیں چاہتا۔" وہ ملائمت سے بولا۔ وہ اب جبار جیلانی تو ہرگز معلوم نہیں ہو رہا تھا جس سے آج سہ پہر میری ملاقات ہوئی تھی۔ میں زمانے کے ان تغیرات پر ٹھنڈی سانس لئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ واقعی سیدھی اور سچی بات کرنے کے موڈ میں معلوم ہوتا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے اس تغیر کی وضاحت کردی۔ "میں نے تمہارے بارے میں چاروں طرف سے اپنے ذرائع سے

معلومات حاصل کی ہیں اور فوری طور پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ہمارے درمیان تصادم ہم دونوں کے لئے بہت خطرناک ہو گا۔“

”تم میری فکر نہ کرو۔ صرف اپنی بات کرو۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”ظاہر ہے انسان فیصلہ تو اصل میں اپنے ہی نفع نقصان کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ یہی سمجھ لو کہ میں نے صرف اپنے نقصان کے بارے میں سوچا ہے۔“ اس نے تسلیم کیا۔

”آدمی عقلمند ہو۔“ میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

”میں جوانی میں بھی کبھی جذباتی نہیں رہا۔۔۔ اور اب تو میری جذباتیت کی عمر ہی نہیں اگر میں جذباتی ہوتا تو شاید بہت پہلے کسی گینگ وار میں مارا جا چکا ہوتا۔ میں صرف وہاں وار کرتا ہوں جہاں مجھے مکمل فتح کا یقین ہوتا ہے۔“ وہ بولا۔

”دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ کمزور پر وار کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”خیر۔۔۔ ایسی بھی بات نہیں ہے۔ میں نے اس شہر میں ایسے بھی بہت سے لوگوں کو سبق سکھایا ہے جو اپنے آپ کو بڑا پھنے خاں سمجھتے تھے۔“ وہ اب کافی سنبھل چکا تھا اور خاصی خود اعتمادی سے بات کر رہا تھا۔

”میرے خیال میں تو تم خود بھی انہی میں سے ایک ہو۔“ میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

وہ گویا میری بات ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”بہرحال میں تم سے گینگ وار نہیں چاہتا۔“

”گینگ صرف تمہارے پاس ہو گا۔ میرا کوئی گینگ نہیں ہے۔“ میں نے تصحیح کی۔ ”اور نہ ہی مجھے کسی سے ”وار“ کا کوئی شوق ہے۔ میں نے صرف ایک اصولی مؤقف کے تحت ایک کمزور عورت کی حمایت اور عملی مدد کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔“ وہ بے تابی سے بولا۔ ”تم اپنی جگہ ٹھیک ہو۔ میں تم سے بحث میں نہیں الجھنا چاہتا۔ میرے خیال میں، میں بھی اس عورت کے ساتھ کوئی ایسی ناانصافی نہیں کر رہا تھا۔ میں تو اسے مارکیٹ ویلیو سے بھی زیادہ قیمت دینا چاہ رہا تھا۔ ناانصافی تو تب ہوتی جب میں عورت کو کمزور اور بے سہارا دیکھ کر کوئی قیمت دیئے بغیر ہی اسے مکان سے بے دخل کر کے یا راستے سے ہٹا کر مکان پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتا۔ مجھ سے بھی کمتر پوزیشن کے لوگ ایسے کام کر گزرتے ہیں۔“

”لیکن جب اس عورت نے انکار کر دیا تو بات ختم ہو جانی چاہئے تھی۔ اس کے انکار کے بعد تو تم بھی اسی غنڈا گردی پر اتر آئے تھے جسے تم ناانصافی کہہ رہے ہو۔“ میں نے یاد دلایا۔

”میں نے کہا نا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اس پر مٹی ڈالو۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”ٹھیک ہے۔ ڈال دی مٹی۔“ میں نے سعادت مندی سے کہا اور سوچنے لگا کہ اس وقت اس کا کیا عالم ہو گا جب اس کا بھائی اسے بتائے گا کہ ہم تو اس پر مٹی ڈالنے لگے تھے۔

”یہ صرف مالی فائدے کا چکر تھا اور مال بہرحال جانوں سے زیادہ قیمتی نہیں ہے۔“ وہ بولا۔

”تمہارے پیارے بھائی نے اس مالی فائدے کی تفصیل ہمیں بتا دی ہے۔“ میں نے اسے مطلع کیا۔

”بتا دی ہے۔۔۔؟“ اسے گویا دھچکا لگا۔ ”کیا تم نے اس پر۔۔۔“ اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نہیں۔۔۔ نہیں۔ ہم نے اس پر کوئی تشدد نہیں کیا۔“ میں نے گویا اس کی غلط فہمی دور کی۔ ”اس نے شرافت سے ہی ہمیں ٹرسٹ کی زمین اور متوقع سرکاری منصوبے وغیرہ کے بارے میں بتا دیا تھا۔“

”واقعی؟“ اسے گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں۔۔۔ واقعی۔“ میں نے اس کی حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

”خیر۔۔۔“ وہ گویا اس دھچکے سے سنبھلتے ہوئے بولا۔ ”اب اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا اب تو میں اس پراجیکٹ سے دستبردار ہونے کا فیصلہ کر ہی چکا ہوں۔ اب تم یہ بتاؤ کہ غفار کی واپسی کی کیا صورت ہو گی؟ تمہیں کس قسم کی ضمانت چاہئے؟“

”کسی بھی شریف، معزز اور غیر جانبدار آدمی کی ضمانت کہ آئندہ تم مسز درانی کو تنگ نہیں کرو گے۔“ میں نے کہا۔ ”اور یہ بھی یاد رکھنا کہ اس ضمانت کے باوجود اگر تم نے اپنے وعدے کا پاس نہیں کیا تو تمہاری تمام تر اضافی احتیاطی تدابیر کے باوجود آئندہ تمہیں اس سے بڑا سبق دیں گے جسے شاید تم زندگی بھر بھول پاؤ گے۔ یہ تو محض ٹریلر تھا۔ اگلی مرتبہ تمہیں اصل فلم دیکھنی پڑ جائے گی۔“

”اب میں اس قصے کو ہی بھول جانا چاہتا ہوں تو آئندہ ایسی کسی کوشش کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔“ وہ بولا۔

”یہ میں احتیاطاً اس لئے کہہ رہا ہوں کہ شاید غفار کی بخیر و عافیت واپسی کے بعد اچانک تمہاری انا بیدار ہو جائے۔ تمہیں خیال آئے کہ یہ تو تمہاری بے عزتی ہوئی ہے اور اب انتقام تمہارا اخلاقی فرض ہے۔ اس طرح انتقام در انتقام کا سلسلہ چل نکلے۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ انتقام در انتقام کا سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔“

”میں اتنا احمق نہیں ہوں اگر مجھے اس قسم کے فضول چکر میں اپنی توانائیاں ضائع کرنا ہوتیں تو اب بھی کر سکتا تھا۔“ وہ بولا۔

”اس وقت تو تمہارا بھائی پھنسا ہوا ہے نا۔۔۔ شاید بھائی کی واپسی کے بعد تمہارے خیالات بدل جائیں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں۔ ایسا نہیں ہو گا۔“ وہ الفاظ پر زور دے کر بولا۔ ”میری بدمعاشی اپنی جگہ ہے لیکن ساتھ ہی میں ایک بزنس مین بھی ہوں۔ میں کوئی بھی قدم اٹھاتے وقت نفع نقصان کا حساب لگاتا ہوں۔“

”یوں کہو کہ تم ایک بدمعاش بزنس مین ہو۔“ میں نے ہلکی

ہنسی کے ساتھ کہا۔

"چلو۔۔۔ تم یہی سمجھ لو۔" وہ اب خوش دلی سے بولا۔ "لیکن میں تمہیں شہر کے بہت بڑے بڑے شرفا کی ضمانت دے سکتا ہوں۔ شہر کے بلڈرز کی اپنی ایک مضبوط تنظیم ہے۔ اس کے صدر کی ضمانت دلوا سکتا ہوں۔ کمشنر' ڈپٹی کمشنر سے کہلوا سکتا ہوں۔ تم خود کسی اور شخصیت کا نام تجویز کردو۔ میں کوشش کروں گا کہ اس سے ضمانت دلوا سکوں۔"

"نہیں۔ اتنی زحمت کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "تم جن شخصیتوں کے نام لے رہے ہو' ان میں سے کسی کے کہنے سے بھی کام چل جائے گا۔ یہ تو محض ایک رسمی سی کارروائی ہے۔ تمہارے الفاظ پر عملدر آمد تو ہم خود ہی کرائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر اس کا کیا طریقہ ہو گا؟" اس کے لہجے میں بے تابی جھلک آئی۔

"بہت آسان سا طریقہ ہے۔ میں ہر کام تمہاری سہولت کے مطابق کرنا چاہتا ہوں۔ تمہیں زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔" میں نے کہا۔ "تم ان میں سے کسی بھی شخصیت سے میرے آفس میں فون کرا دو۔ میری سیکریٹری فون سُن کر مجھے اطلاع دے گی پھر وہ خود اس شخصیت کے مصدقہ فون نمبر پر فون کر کے تصدیق کرے گی کہ کیا واقعی اس نے اس سلسلے میں فون کر کے ضمانت دی ہے؟ اگر اس شخصیت نے تسلیم کرلیا کہ ہاں فون اسی نے کیا تھا تو بس سمجھ لو کہ کارروائی پوری ہو جائے گی۔"

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میرے دفتر کے ٹیلیفون سے یہ سب گفتگو ریکارڈ ہو رہی ہو گی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ ٹیپ شدہ بات چیت کبھی میرے کسی کام آسکتی تھی یا نہیں۔۔۔ لیکن میں نے محض احتیاطاً یہ بندوبست کر رکھا تھا۔ یقیناً اس امکان کی طرف اس کا ذہن بھی گیا ہو گا لیکن یہ کوئی ایسا بھیانک پہلو نہیں تھا کہ وہ بدک جاتا بلکہ یہ سب کچھ تو شاید اس کی توقعات سے بھی زیادہ آسان ثابت ہو رہا تھا۔

وہ جلدی سے بولا۔ "بالکل ٹھیک ہے۔ مجھے منظور ہے۔ اس کے بعد غفار کی رہائی کی کیا صورت ہو گی؟"

"وہ تو اب صبح ہی گھر واپس آسکے گا۔ کم از کم آج رات تو اسے ہمارا ہی مہمان رہنے دو۔ کبھی کبھار اسے شرفا کے ساتھ رہنے کا بھی موقع دیا کرو۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"تم نے اسے کہاں رکھا ہوا ہے؟" اس نے غیر ارادی انداز میں اچانک ہی پوچھا۔

"اتنے نازک رازوں کے بارے میں اتنے سرسری سے انداز میں نہیں پوچھا کرتے۔" میں نے ناصحانہ انداز میں کہا۔

"وہ ٹھیک تو ہے نا؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"اس کا جو بگڑنا تھا تمہارے آفس میں بگڑ چکا تھا اس کے بعد اس میں کوئی مزید ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی۔" میں نے جواب دیا۔ "اب تم نے اتنا شریفانہ انداز اختیار کرتے ہوئے مسئلہ حل کر دیا ہے اور صلح کا معاہدہ طے پا گیا ہے تو ہم اسے کچھ اور سہولیات فراہم کر دیں گے۔ اس کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں ہو گا۔ وہ آرام سے رات گزارے گا اور صبح خیریت سے واپس پہنچ جائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک۔۔۔" اس نے طمانیت سے کہا پھر ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "بہت شکریہ۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے خلوص سے کہا۔ "معقولیت اختیار کرنے والوں کے ہم خادم ہیں۔"

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے فون بند کرتے ہوئے شفیع اور ٹونی کو مخاطب کیا۔ "ایک بار اور مبارک ہو۔ جبار جیلانی نے کچھ زیادہ ہی آسانی سے گھٹنے ٹیک دیئے ہیں اور صلح کا علم کچھ زیادہ ہی اونچا کر دیا ہے۔۔۔" جبار نے جو کچھ کہا تھا وہ میں نے انہیں بتایا۔

"کہیں اس میں اس کی کوئی چال تو نہیں؟" ٹونی شکی لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ آدمی عقلمند معلوم ہوتا ہے۔۔۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ اس کی عقل بروقت ٹھکانے آگئی ہے۔۔۔ اور اگر اس میں کوئی چال ہوئی تب بھی اس سے نمٹ لیں گے۔ وہ بھی یہیں ہے اور ہم بھی یہیں ہیں۔"

وہ دوبارہ کھدائی میں مصروف ہو گئے۔ میں نے آفس فون کر کے امبر کو کچھ ہدایات دیں۔ یوں تو اسے معلوم ہی تھا کہ کس صورتِ حال میں اسے کیا کرنا تھا لیکن میں نے اسے یاددہانی کرانا بہتر سمجھا۔

پھر میں دوبارہ اسی کمرے میں پہنچا جہاں غفار مقید تھا۔ میں نے اسے بھی مبارکباد دی اور بتایا کہ اس کے بھائی سے فون پر کیا گفتگو ہوئی تھی۔ اسے شاید اپنے بھائی کے اس قدر شریفانہ رویئے پر کچھ مایوسی ہوئی۔ شاید اس کی انا بھی مجروح ہوئی تھی کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لئے اس کے بھائی نے کچھ جنگ و جدل والی فضا پیدا نہیں کی تھی تاہم اپنی جان کا۔۔۔۔۔۔۔ بچ جانا بہرحال ہر انسان کے لئے شعوری طور پر نہ سہی تو لاشعوری طور پر ضرور راحت کا باعث ہوتا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر ایک لمحے کی مایوسی کے بعد ایک عجیب سی طمانیت کی جھلک دیکھی لیکن وہ اپنے خوفناک تاثرات برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ بھائی صاحب نے صرف اس لئے صلح کا راستہ اختیار کیا ہے کہ کہیں مجھ پر تشدّد تو نہیں کیا جا رہا ہے۔ وہ برداشت نہیں کر سکتے کہ مجھے کوئی تکلیف پہنچے۔ جس طرح میں برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔"

"چلو۔۔۔ خیر کسی وجہ سے بھی سہی۔۔۔ لیکن صلح کا راستہ اختیار تو کیا۔ صلح میں عافیت ہے۔" میں نے کھڑکی کی سلاخ سے اس کی زنجیر کھولتے ہوئے کہا۔ "اب تم یہ رات کسی حد تک آرام سے بسر کر سکو گے۔"

پھر میں نے اس کی زنجیر کا سرا تھام کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "دوسرے کمرے میں چلو۔"

"یہ تم کیا مجھے کتے کی طرح اِدھر سے اُدھر گھسیٹتے پھر رہے ہو۔ اس ذلت سے تو بہتر ہے کہ تم مجھے گولی مار دو۔" وہ غرایا۔

"ضرورت پڑی تو گولی بھی مار دیں گے۔ اتنی بے تابی کس بات کی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے اللہ تعالیٰ تو انسان کو بڑی عزت دینا چاہتا ہے لیکن اپنے اعمال سے وہ کتا بن جاتا ہے۔ اب زیادہ نخرے مت دکھاؤ اور آرام سے دوسرے کمرے میں آجاؤ ورنہ میں پہلے ہی کی طرح گھسیٹتا ہوا لے جاؤں گا۔ میں تو تمہارے بھلے کی سوچ کر تمہیں دوسرے کمرے میں لے جا رہا ہوں۔ تمہیں کچھ عزت سے رات گزارنے کا موقع دینا چاہتا ہوں لیکن معلوم یہی ہوتا ہے کہ عزت تمہیں راس ہی نہیں ہے۔"

وہ آگے بڑھ آیا۔ میں اس پر نظر رکھتے ہوئے تقریباً الٹے قدموں چل رہا تھا۔ دوسرے کمرے میں پہنچ کر میں نے کہا۔ "یہاں بیڈ موجود ہے۔ اب تم کم از کم رات تو بیڈ پر گزار سکو گے۔ کیا یاد کرو گے کہ کسی رحمدل آدمی سے پالا پڑا تھا۔"

وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھور کر رہ گیا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کی یہ خونخواری مصنوعی تھی۔ اندر سے درحقیقت اب وہ خوش تھا۔ اپنے چھٹکارے کا تصور بہرحال اس کے لئے خوش کن تھا۔

اس کمرے کی کھڑکی میں بھی موٹی سلاخیں موجود تھیں۔ مسز درانی نے حفاظت کے خیال سے سبھی کمروں میں بدنمائی کا خیال کیے بغیر موٹی سلاخیں لگوا رکھی تھیں۔ مکان ویسے ہی بہت پُرانی ساخت کا تھا۔ سلاخوں والی کھڑکیوں سے اس میں کچھ ایسی بدنمائی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ وہ اس سے میل کھاتی تھیں۔

میں نے غفار کے پاؤں کی زنجیر بیڈ کے قریب کھڑکی کی سلاخ میں باندھ دی اور اس میں تالا لگانے کے بعد ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "لو۔۔۔ اب تمہیں رات فرش پر نہیں گزارنی پڑے گی۔"

"لیکن میرا یہ پاؤں اور دونوں ہاتھ اسی طرح بندھے رہیں گے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ اب ہم تم پر اتنا تو اعتبار نہیں کر سکتے کہ تمہیں بالکل ہی کھلا چھوڑ دیں۔ جتنی آسائش تمہیں مل رہی ہے' اسی پر خدا کا شکر ادا کرو۔ اس کے علاوہ تمہیں کھانا مل جائے گا۔ ناک کی تکلیف اور دوسری چوٹوں کے لئے کوئی پین کلر وغیرہ مل جائے گا۔ یہ کیا کم عیاشی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ میں اسے اسی طرح پیچ و تاب کھاتے چھوڑ کر باہر آگیا اور ایک بار پھر شفیع اور ٹونی کے پاس پہنچا۔ وہ دونوں کھدائی روکے کھڑے تھے اور اپنے پیروں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں یہی سمجھا کہ وہ تھک گئے تھے اور سستا رہے تھے لیکن میں قریب پہنچا تو شفیع شاہ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے گہری سانس لے کر بولا۔ "سر! آپ کا شبہ ٹھیک ہی نکلا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تجسس سے گڑھے میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ وہ خاصا لمبا چوڑا گڑھا تھا اور اب تقریباً تین فٹ گہرا ہو چکا تھا۔ برآمدے کی روشنی اس میں ذرا کم ہی پہنچ رہی تھی۔ اس کے باوجود ناہموار مٹی میں ایک چیز کی جھلک دیکھ کر نہ جانے کیوں میری رگ و پے میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

شفیع شاہ نے جھک کر مٹی میں سے کوئی چیز اُٹھائی اور اس پر سے مٹی جھاڑ کر اسے میری طرف بڑھایا۔ میں نے اسے نہیں تھاما اور بغور صرف اس کا جائزہ لینے پر اکتفا کیا۔ وہ انسانی ٹانگ کی ہڈی تھی۔ اسکول اور کالج میں پڑھا ہوا اناٹومی کا علم جس حد تک میرے ذہن میں باقی تھا اور اِدھر اُدھر دیکھے ہوئے جو چارٹ وغیرہ یادداشت میں محفوظ رہ گئے تھے۔ ان کے مطابق وہ پنڈلی کی ہڈی معلوم ہوتی تھی۔

ٹونی نے بھی جھک کر اسی طرح ایک چیز اُٹھائی اور مٹی جھاڑ کر مجھے دکھائی۔ وہ ایک انسانی کھوپڑی تھی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ٹونی معذرت خواہانہ سے انداز میں بولا۔ "ہم اب چونکہ کچھ زیادہ پُرامید نہیں تھے۔ اس لئے اندھا دھند کھدائی کر رہے تھے۔ ہماری بے احتیاطی کی وجہ سے کچھ ہڈیوں پر ضرب لگ گئی ہے اور وہ اتنی بھربھری ہو رہی تھیں کہ ٹوٹ گئی ہیں لیکن اب ہم احتیاط سے مزید کھدائی کریں گے۔ میرا خیال ہے یہاں صرف ایک ڈھانچا نہیں ہے۔"

"اوہ میرے خدا۔۔۔!" میرے منہ سے نکلا اور میں گڑھے کے کنارے اکڑوں بیٹھ کر اندر جھانکنے لگا۔ ناہموار مٹی میں کہیں کہیں ہڈیوں کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ شفیع شاہ نے کھدائی شروع کرتے وقت گاڑی سے ایمرجنسی لائٹ بھی نکال کر دہیں لاکر رکھی ہوئی تھی لیکن ابھی تک اسے روشن نہیں کیا تھا۔ میرے خیال میں اب اسے روشن کرنے کی ضرورت آن پڑی تھی۔

میں نے لائٹ اٹھائی اور اس کا رخ گڑھے کی طرف کر کے اس کا سوئچ آن کیا۔ گڑھے کا منظر واضح ہو گیا کئی انسانی ہڈیاں مٹی سے جھانک رہی تھیں۔ شفیع شاہ اور ٹونی گڑھے کے دونوں سروں پر کھڑے تھے۔ ان کے پاؤں مٹی میں دھنسے ہوئے تھے اور وہ اس وقت گورکن معلوم ہو رہے تھے۔ گڑھے سے ایک کراہیت انگیز سی بُو خارج ہو رہی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ گڑھے میں کسی قسم کے کیڑے مکوڑے رینگتے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ شاید اس لئے کہ اس انسانی جسم کو زمین میں دفن ہوئے بہت ہی طویل عرصہ گزر چکا تھا اب شاید کیڑے مکوڑے خود بھی ختم ہو چکے تھے یا پھر یہاں ان کی دلچسپی کی کوئی چیز نہیں رہی تھی۔

چند لمحے ماحول پر گہرا سکوت طاری رہا۔ صرف احاطے میں پھیلے ہوئے جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان ہوا سرسرا رہی تھی۔ آخر کار ٹونی نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی انسانی کھوپڑی گڑھے کے کنارے جمع شدہ مٹی کے ڈھیر پر آہستگی سے رکھ دی۔ اس کی آنکھوں کے خالی گڑھے گویا مجھے تک رہے تھے۔ میں نے چشم تصور سے دو آنکھیں دیکھیں جنھوں نے دھیرے دھیرے ان گڑھوں کو بھر دیا۔ ان آنکھوں میں اَن گنت سوال تھے۔ میں نے ان سے نظر چُرالی۔ شفیع شاہ نے بھی لمبی سی ہڈی مٹی پر رکھ دی۔

اب انہوں نے پھاوڑے سنبھال لئے اور کسی حد تک ماہر

آثارِ قدیمہ کے انداز میں ذرا احتیاط اور آہستگی سے کھدائی کرنے لگے کچھ ان کی کدالیں لگنے کی وجہ سے اور کچھ ویسے ہی اس ڈھانچے کی کافی ہڈیاں ایک دوسرے سے الگ ہو چکی تھیں۔ وہ انہیں احتیاط سے گڑھے سے باہر رکھنے لگے اور کوشش کرنے لگے کہ ڈھانچے کا باقی حصہ جس حالت میں تھا اسے اسی حالت میں نکال لیں' مناسب اوزار میسر نہ ہونے کی وجہ سے یہ ایک دشوار کام تھا۔ بہرحال خاصی دیر کی محنت کے بعد ہو ہی گیا۔ میں نے بھی ان کا ہاتھ بٹایا۔

اس دوران میں ان کی توجہ گڑھے کے آدھے حصے کی طرف ہی رہی تھی جس کی گہرائی زیادہ ہو گئی تھی۔ اب انہوں نے باقی آدھے گڑھے کی بھی احتیاط سے مٹی ہٹانی شروع کی' جلد ہی اُدھر بھی کچھ ہڈیوں کی جھلک دکھائی دینے لگی۔ میں مضطربانہ انداز میں غیر ارادی طور پر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا یہ تو میرے اندیشوں سے بھی بڑھ کر تھا۔

دھیرے دھیرے شفیع شاہ اور ٹونی دوسرے ڈھانچے سے اس حد تک مٹی ہٹانے میں کامیاب ہو گئے کہ اسے مکمل حالت میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے سائز وغیرہ کو دیکھتے ہوئے میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ان میں سے ایک ڈھانچا مرد کا تھا اور دوسرا عورت کا۔ شفیع شاہ اور ٹونی بھی یقیناً یہ نتیجہ اخذ کر چکے تھے۔ وہ بھی اب اوزار چھوڑ کر گڑھے کی دیوار سے ٹیک لگائے متاسفانہ سے انداز میں خاموش کھڑے تھے۔

آخر میں نے ہی گہری سانس لے کر اس بوجھل سکوت کو توڑتے ہوئے کہا۔ "۔۔۔ تو یہ تھا وہ راز جسے چھپانے میں مسز درانی کی زندگی گزر گئی۔ اسی راز کے کھل جانے کا خوف ان کے ذہن پر اس بُری طرح طاری تھا کہ وہ ایک رات بھی اس گھر سے باہر گزارنے پر آمادہ نہیں ہوتی تھیں اور کسی قیمت پر بھی اس مکان کو فروخت کرنے کے لئے تیار نہیں تھیں۔"

ان دونوں نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا۔ "غالباً تم سمجھ ہی گئے ہو گے کہ یہ دونوں ڈھانچے کن کے ہیں؟"

شفیع شاہ نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور بوجھل سی سانس لے کر بولا۔ "جی ہاں! مرد تو یقیناً درانی صاحب ہوں گے ۔۔۔ مسز درانی کے شوہر۔۔۔ اور نسوانی ڈھانچا یقیناً اس ملازمہ کا ہو گا جس کے ساتھ ان کا معاشقہ چل رہا تھا۔"

"ہاں ۔۔۔" میں نے اکڑوں بیٹھ کر گڑھے میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "عین ممکن ہے کہ انہوں نے واقعی ملازمہ کے ساتھ فرار ہونے کا پروگرام بھی بنا لیا ہو لیکن مسز درانی نے انہیں اس پروگرام پر عملدر آمد کرنے کی مہلت نہ دی ہو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ دونوں ڈھانچوں کے آمنے سامنے کی ایک پسلی کچھ عجیب سے انداز میں ٹوٹی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ مسز درانی نے ان دونوں کو پشت کی طرف سے گولی ماری ہو گی۔"

"اور اکیلی عورت نے اتنا بڑا اور اچھا خاصا گہرا گڑھا کھود کر ان دونوں لاشوں کو اس میں دفن کیا۔۔۔!" شفیع شاہ قدرے حیرت سے بولا۔

"تم نے دیکھا نہیں کہ وہ اب بھی کیسی جلالی' کیسی ضدی اور دُھن کی کیسی پکی عورت ہیں۔ تم تصور کر سکتے ہو کہ جوانی میں وہ کیسی رہی ہوں گی۔ ایسی عورت اس قسم کے جذباتی مسئلے پر کچھ بھی کر سکتی تھی۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"تمہارا خیال ٹھیک ہے افضل ڈیئر! تمہارے سب اندازے درست ہیں۔" ہوا کے دوش پر یہ آواز یوں ہماری سماعتوں سے ٹکرائی جیسے کسی کھنڈر میں ذرا تیز سی آواز میں کسی بدروح نے سرگوشی کی ہو۔

ہمیں اپنے اعصاب پر قابو رکھنے میں مہارت تھی ورنہ شاید اس آواز پر ہم تینوں بُری طرح اچھل پڑے ہوتے۔ آواز جانی پہچانی تھی مگر پھر بھی اس میں ایک سفاکانہ سی اجنبیت تھی۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ آواز کس سمت سے آئی تھی۔ ہم تینوں کے سر نہایت آہستگی سے اس سمت میں گھومے۔

مسز درانی چھت کی منڈیر کے عقب میں موجود تھیں ان کا آدھے سے زیادہ بالائی دھڑ ہمیں دکھائی دے رہا تھا۔ باقی جسم منڈیر کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ وہ دراصل گھٹنوں کے بل منڈیر کے عقب میں بیٹھی تھیں مگر ان کی وہ پرانی رفیق رائفل منڈیر کے اوپر سے جھانک رہی تھی۔ ہم تینوں اس کی زد پر تھے۔ ہم کھلی جگہ میں تھے۔ درمیانی فاصلہ خاصا تھا اور وہ بلندی پر تھیں۔ ہم تینوں نہ تو انہیں قابو میں کرنے کے لئے کوئی مؤثر کوشش کر سکتے تھے اور نہ ہی اپنا دفاع کرنے کی پوزیشن میں تھے۔

میں اپنی جگہ سے اٹھنے ہی لگا تھا کہ وہ بدلی بدلی اور کڑک دار سی آواز میں بولیں۔

"خبردار افضل! جہاں بیٹھے ہو وہیں بیٹھے رہو ورنہ میں گولی چلا دوں گی۔ تم بہت خطرناک آدمی ہو۔ میں تمہارے سلسلے میں ذرا بھی رسک نہیں لوں گی۔"

"یعنی۔۔۔ یعنی آپ مجھ پر بھی گولی چلا دیں گی؟" میں نے واقعی بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اگر تم نے میری طرف بڑھنے یا مجھے قابو میں کرنے کے لئے ذرا بھی حرکت میں آنے کی کوشش کی تو میں گولی چلانے میں قطعاً نہیں ہچکچاؤں گی۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولیں۔ "میرے سینے میں ایک محبت کرنے والی عورت کا دل ہے لیکن جب میرے پندار کو ٹھیس پہنچتی ہے یا میرے اعتماد کو دھوکا دیا جاتا ہے تو میں ایک سفاک قاتلہ بھی ثابت ہو سکتی ہوں۔"

"وہ تو میں دیکھ چکا ہوں۔" میں نے حیرت اور صدمے سے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "لیکن میرا قصور کیا ہے؟"

"یہ قصور کیا کم ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ کھوجی طبیعت کے مالک ہو۔ تم نے میرے اس راز کو کھود نکالا جسے چھپانے کے لئے میں نے اپنی جوانی گنوا دی۔ اب میں عمر کے اس آخری دور میں یہ رسوائی کیسے برداشت کر سکتی ہوں؟" ان کے لہجے میں غم و غصے کے طوفان مچل رہے تھے۔

"میں نے اپنی دانست میں بغیر کسی غرض کے آپ کے کام آنے کی کوشش کی تھی مسز درانی!" میں نے گویا اسے اپنا احسان یاد دلا کر متاثر کرنے کی کوشش کی۔ "میں نے اور میرے ساتھیوں نے آپ کی خاطر جان اور اپنا بزنس خطرے میں ڈالا تھا۔ ہم نے ایک ایسے شخص سے کسی ذاتی پرخاش کے بغیر محض آپ کے لیے دشمنی مول لی ہے۔ جو اس شہر کے بہت سے فرعونوں میں سے ایک ہے۔"

"یہ میری سنگین غلطی ہے۔ میں نے تم سے مدد طلب کی' میں تو درحقیقت تمہیں جانتی بھی نہ تھی۔ مجھے تو زرتاج نے تم سے ٹکرایا۔ لیکن خیر۔۔۔ اس میں اس کا بھی کوئی قصور نہیں۔ شاید قسمت کی خرابی تھی' اس وقت میں واقعی کسی مضبوط اور بے خوف آدمی کی مدد کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔" ان کا انداز خود کلامی کا سا ہو گیا۔

"لیکن اب کام نکل گیا تو آپ ہمیں گولی مارنے کے لئے تیار ہیں" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

"کام نکلا کہاں ہے۔۔۔ کام تو اور زیادہ خراب ہو گیا۔" وہ شاید اپنے لہجے کے ارتعاش پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ "تم سے مدد طلب کرنے کا ان ڈائریکٹ اور حقیقی مقصد تو یہی تھا کہ یہ راز اسی طرح دفن رہ جائے۔ مجھے کم از کم ایک باعزت موت نصیب ہو جائے۔ اس کے بعد اگر اس راز کو بے نقاب ہونا ہو تو بے شک ہوتا رہے۔۔۔ لیکن تم نے تو میری مدد کرنے کے ساتھ ساتھ میرے ماضی کی قبر بھی کھود ڈالی۔ اب وہ مدد بے معنی ہو کر رہ گئی ہے۔ اب تو تم تینوں میرے سر پر لٹکتی ہوئی تین تلواروں کی طرح ہو ذلت' رُسوائی اور سزا کی تلوار۔"

میں نے گہری سانس لے کر ڈھانچوں کی طرف اشارہ کر کے محض تصدیق کی خاطر پوچھا۔ "بہرحال آپ کو اعتراف ہے کہ یہ آپ کے شوہر اور ملازمہ کے ڈھانچے ہیں؟"

"ہاں۔" وہ بلا تامل بولیں۔

"آپ نے انہیں قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر قتل کیا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ قابلِ اعتراض حالت میں تو انہیں بیسیوں مرتبہ دیکھا تھا۔" پھر وہ استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔ "تہذیب کے تقاضے بھی عجیب ہیں۔ گفتگو کو شرافت کی حدود میں رکھنے کے لئے جن اصطلاحوں کا سہارا لینا پڑتا ہے وہ خاصی مضحکہ خیز لگنی چاہئیں۔ مثلاً مجرمانہ حملہ۔۔۔! حملہ تو۔۔۔ کسی بھی طرح کا ہو وہ مجرمانہ ہی ہوتا ہے مگر نہ جانے کیوں ایک مخصوص عمل کو مجرمانہ حملہ کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ اصطلاح "قابلِ اعتراض" حالت ہے۔ حالتیں تو ہزاروں قابلِ اعتراض ہوتی ہیں لیکن صرف ایک مخصوص حالت کے لئے ہی یہ اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔"

"مسز درانی!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "مجھے خوشی ہے کہ آپ اس صورتِ حال میں بھی اصطلاحوں کے بارے میں اظہارِ خیال کرنے کے قابل ہیں۔"

"تو تم کیا سمجھ رہے ہو کہ میں اس وقت گھبرائی ہوئی یا نروس ہوں؟" وہ خوشگوار لہجے میں بولیں۔ خاصے فاصلے اور کم روشنی کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ وہ مسکرائی تھیں پھر انہوں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ "نہیں۔۔۔ میں نروس یا بدحواس ہرگز نہیں ہوں۔ میں اس وقت بالکل پُرسکون ہوں کیونکہ میرا ذہن فیصلے پر پہنچ چکا ہے اور میرے پاس وقت بھی بہت ہے۔ پوری رات ہی پڑی ہے۔ مجھے کوئی خاص کام تو ہے نہیں۔ مجھے بس تم تینوں کو گولی ہی تو مارنی ہے۔ اپنی قبر تو تم لوگ خود اپنے ہاتھوں سے کھود ہی چکے ہو۔"

وہ ہمیں گولی مارنے کی بات اتنے سرسری سے انداز میں کر رہی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں۔ "مجھے تم لوگوں کو صرف سردرد کی گولیاں ہی تو دینی ہیں۔۔۔ چائے تو پہلے ہی تیار ہے۔"

یہ اس عورت کا ایک نیا روپ تھا۔۔۔ یا پھر شاید پُرانا تھا مگر ہم اسے پہلی بار دیکھ رہے تھے اور مجھے وہ اپنے ارادے پر عمل کر گزرنے کی پوری طرح اہل معلوم ہوتی تھی۔ اس لئے میں بظاہر اس سے باتوں میں مصروف تھا لیکن میرا ذہن دوسرے ٹریک پر بھی کام کر رہا تھا۔

میں اب بھی یہی سوچ رہا تھا کہ کیا کسی طرح اس کے گولی چلانے سے پہلے اس تک پہنچنا ممکن تھا؟ اس کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ گویا ایک قلعے کی بلند فصیل پر مورچہ بند تھی اور ہم کھلے میدان میں تھے۔ جو لوگ گن لئے ہمارے سامنے آ جاتے تھے ان پر قابو پانا یا ان کے حملے سے بچنا ہمارے لئے زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا اور جو شخص گن لئے ہمارے قریب چلا آتا تھا وہ گویا اپنی شامت کو دعوت دیتا تھا لیکن مسز درانی نے عقلمندی کی تھی۔ وہ چھت پر چڑھی ہوئی تھیں اور ان کے پاس لانگ رینج رائفل تھی۔ پوزیشن کچھ ایسی تھی کہ ہم گڑھے میں بیٹھ کر بھی اپنے آپ کو گولیوں کی زد سے نہیں بچا سکتے تھے۔ خصوصاً ایک طاقتور اور دور مار رائفل کی گولیوں سے۔

سرِدست مجھے امید کی صرف ایک کرن نظر آ رہی تھی۔ قتل کے ارادے سے نکلا ہوا فرد خواہ بظاہر کتنا بھی پرسکون اور پُراعتماد دکھائی دے رہا ہو لیکن اس کے اعصاب درحقیقت وائلن کے تاروں کی طرح کشیدہ ہوتے ہیں۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ بات کرتی رہیں۔ غیر ارادی طور پر ان کے اعصاب ڈھیلے پڑتے جائیں۔

پھر شاید معقولیت اور دلیل کے سہارے ان کے ذہن تک پہنچنے کا کوئی راستہ پیدا ہو جائے۔ شاید کوئی بات ان کے ذہن کے کسی نازک گوشے پر اثر انداز ہو جائے اور وہ ہمیں گولی مارنے کے ارادے سے باز آ جائیں۔ ہوتا عموماً یہی ہے کہ جب کسی کے ہاتھ میں بندوق ہو اور اس کے کندھوں پر کسی سنگین جرم کا بوجھ بھی لدا ہو تو وہ کسی کی دلیل نہیں سنتا۔ جرم ایک ایسی دلدل ہے جس میں انسان لحہ بہ لحہ زیادہ گہرائی کی طرف جاتا ہے۔ خصوصاً قتل۔۔۔! ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا قتل آسان تر ہوتا ہے۔ اگر کوئی اور طاقت قاتل کو نہ روک پائے تو پھر یہ سلسلہ اسی

وقت رُکتا ہے جب مکافاتِ کا عمل شروع ہوتا ہے اور قاتل خود اپنے ہی بہائے ہوئے لہو میں ڈوب جاتا ہے۔

مسز درانی بات جاری رکھتے ہوئے بولیں "انہیں قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ کر صبر کرنا تو میں نے سیکھ لیا تھا... بلکہ سچ پوچھو تو مجھے ان پر ترس آتا تھا۔ کس طرح ہر وقت وہ موقع کی تاک میں رہتے تھے... کس طرح چُھپ چُھپ کر ملتے تھے... عیش و نشاط کے چند لمحے چُرانے کے لئے کیسے کیسے جتن کرتے تھے۔ میں تو سمجھتی ہوں انہیں ہلاک کرکے میں نے انہیں ایک لذت آمیز عذاب سے نجات دلائی تھی۔"

"کیا انہیں ہلاک کرنے کے لئے صرف یہی وجہ کافی تھی؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ تو میں ایک ضمنی بات کررہی ہوں۔ اصل میں تو میں نے انہیں اس وقت قتل کیا تھا جب وہ فرار ہورہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس وقت میں گھر سے باہر گئی ہوئی تھی جیسے کہ اس وقت تم سمجھ رہے تھے لیکن میں اس روز بھی بالکل اسی طرح چپکے سے واپس آگئی تھی جس طرح آج آگئی ہوں..."

"آپ اندر کیسے آگئیں مسز درّانی؟" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے شاید غور نہیں کیا کہ بغلی گیٹ صرف دو تالوں کے ذریعے بند ہوتا ہے۔ اس میں اندر یا باہر کی طرف کوئی کنڈی نہیں ہے۔ یہ انتظام میں نے ہی کیا ہوا ہے۔ اندر کی طرف سے تو تالے محض لیور ذرا سا ہٹانے سے 'بغیر چابی کے کھل جاتے ہیں البتہ باہر کی طرف سے انہیں کھولنے کے لئے چابی کی ضرورت پڑتی ہے... اور ظاہر ہے میرے پاس دونوں کی چابیاں موجود ہیں۔ بس اتنی سی بات ہے!"

انہوں نے ایک طویل سانس کھینچی جس کی آواز مجھے نیچے تک سنائی دی۔ پھر وہ بولیں۔ "میں چپکے سے بغلی گیٹ کھول کر اندر آگئی۔ مکان کی سیڑھیاں پورچ کی طرف ہی ہیں۔ ادھر سے میں چھت پر پہنچ گئی۔ میں نے پوری کوشش کی تھی کہ اس دوران میں ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہو۔ ویسے بھی مکان کے سامنے والے اور پچھلے حصے کے درمیان خاصا فاصلہ ہے۔ اس کے علاوہ تم تینوں اپنی اس سنسنی خیز دریافت میں اتنے اُلجھے ہوئے تھے کہ تھوڑی بہت آواز پیدا ہوتی تب بھی تمہیں سنائی نہ دیتی۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھیں۔ ہم زندگی میں بڑے عجیب اور ناقابلِ یقین حالات سے گزرے تھے لیکن وہ ڈھانچے برآمد ہوتے دیکھ کر کم از کم میں تو واقعی گردوپیش سے بے خبر ہوگیا تھا۔ میں نے مسز درانی کی جوانی نہیں دیکھی تھی' ان کے شوہر اور ان کی ملازمہ کو نہیں دیکھا لیکن میرا تصور مجھے ماضی کے تاریک صنم خانوں میں لے گیا تھا۔ جس کے ہر اجنبی گوشے میں ایک چشم کشا تماشا جاری تھا۔ میں واقعی کھو گیا تھا' مبہوت ہوگیا تھا۔

مسز درّانی کہہ رہی تھیں "برسوں پہلے کا وہ دن بھی ایک لحاظ سے آج کے دن سے ملتا جلتا ہی تھا۔ وہ دونوں گھر کی تمام قیمتی چیزیں اور نقدی سمیٹے' ایک ایک سوٹ کیس اُٹھائے عقبی گیٹ سے نکلنے کے ارادے سے اسی روش پر چلے جارہے تھے۔ میں اس روز بھی اسی طرح خاموشی سے اوپر چڑھ آئی تھی۔ میرے ہاتھ میں یہی رائفل تھی۔ اس روز بھی میرا ایک بہت قیمتی راز فاش ہونے جارہا تھا۔ اس روز بھی سرِبازار میری رسوائی کا سامان ہونے لگا تھا۔"

"کیسا راز؟" میں چونکا۔

"یہی کہ میری بیکراں محبت بھی میرے شوہر کو میرا اسیر بنا کر نہیں رکھ سکی۔ جسے میں نے ٹوٹ کر چاہا... جس کے لئے میں نے زندگی تج دی وہ بھی میرا ہوکر نہیں رہ سکا۔ وہ اپنے معمولی سے حیوانی جذبوں کو بھی لگام ڈال کر نہیں رکھ سکا... اور وہ کوئی ایسا شہ زور مرد بھی نہیں تھا۔ میرے وجود میں اس سے زیادہ منہ زور حیوانی جذبے مقید تھے لیکن میں تو کبھی ان کے بہاؤ میں بھٹکتی ہوئی کہیں نہیں پہنچی۔ میں نے اپنے روئیں روئیں کو اس کی امانت جانا' اپنی ہر سانس میں اسے یاد رکھا۔ دنیا میں اس کے سوا مجھے کوئی نظر ہی نہیں آتا تھا۔ میری محبت بہت شدید' بہت طوفانی اور کسی کی شراکت برداشت نہ کرنے والی تھی۔ اس کے باوجود میں نے نوکرانی کے ساتھ اس کا افیئر برداشت کرلیا۔ یہ بات گھر کی چار دیواری میں ہی رہ جاتی تب بھی میں اپنے سینے کے اس ناسور کے ساتھ زندگی گزار لیتی... لیکن تماشا تو اب سرِبازار جارہا تھا..."

انہوں نے ایک اور گہری سانس لی "بس... وہاں پہنچ کر میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میرے اندر کوئی چیز بڑے زوردار کڑاکے کے ساتھ ٹوٹ گئی اور میری انگلی کے نیچے ٹریگر خود بخود دب گیا۔ مجھے اس میں ذرا بھی ہچکچاہٹ یا خوف محسوس نہیں ہوا... اور فوری طور پر مجھے کسی خاص دکھ کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ شاید میرے دل سے لہو رس رس کر دل میں ہی جذب ہورہا تھا۔ میں فوری طور پر کچھ بھی محسوس کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ بس میں نے ان کے دلوں میں بھی ایک ایک سوراخ کردیا۔ میں نے بڑی عمدگی سے نشانہ باندھ کر دونوں فائر کئے تھے اور میرے ہاتھوں میں ذرا سی بھی لرزش نہیں تھی۔"

"لیکن رسوائی تو پھر بھی آپ کے حصے میں آئی مسز درانی!" میں نے اپنے لہجے میں دوستی اور ہمدردی کا تاثر برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ویسے مجھے تو آپ کے اس رُسوائی والے فلسفے سے بھی اتفاق نہیں ہے۔ آپ دنیا سے تقریباً کٹے ہوئے اس دور افتادہ گھر میں رہتی تھیں۔ اس وقت تو آپ کے اردگرد اور بھی زیادہ دور تک ویرانہ ہوگا۔ آپ کوئی پبلک فگر نہیں تھیں۔ عوامی شخصیت نہیں تھیں... اور میرا خیال ہے کچھ ایسی زیادہ سوشی ایبل (SOCIABLE) بھی نہیں تھیں۔ بہت زیادہ لوگوں سے آپ کا میل جول نہیں تھا۔ میرا خیال ہے یہ تو ہرگز نہیں کہا جاسکتا ہوگا کہ ایک زمانہ' ایک خلقت آپ کو جانتی ہوگی۔ گنتی کے چند لوگ آپ کو جانتے ہوں گے۔ پھر بھلا ایسا کیا رُسوائی کا واویلا...!"

"رُسوائی انسان کے اپنے اندر بھی تو ہوتی ہے... انسان خود اپنی نظر میں بھی تو ذلیل و رُسوا ہوتا ہے۔ اس کے اپنے دل کی دنیا میں بھی اس کا تماشا بنتا ہے" وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولیں "صرف بہت زیادہ مشہور یا بہت زیادہ سماجی میل جول رکھنے والے لوگ ہی تو رُسوا نہیں ہوتے۔"

"وہ... اس فلسفے کی طرف میرا دھیان نہیں گیا تھا" میں نے قدرے استہزائیہ لہجے میں کہا "بہرحال وہ بھاگ تو رہے تھے۔ آپ نے آخری اقدام... یعنی گولی کے ذریعے انہیں روکا۔ دل کی دنیا میں رُسوائی تو پھر بھی ہوئی ہوگی۔"

"ہاں" انہوں نے تسلیم کیا "لیکن دل کو کم از کم یہ اطمینان ضرور تھا کہ جب میں اس ویرانے میں... اس بڑے سے مکان میں تنہا راتوں کا عذاب جھیل رہی ہوں گی' اپنی سوچوں کے جہنم میں جل رہی ہوں گی اس وقت وہ دونوں بھی یہاں سے کہیں دور گھپ نہیں اُڑا رہے ہوں گے۔ ایک دوسرے کی قربتوں کے مزے کہیں لوٹ رہے ہوں گے۔ اس وقت وہ مجھ سے زیادہ قابلِ رحم حالت میں زیرِ خاک ابدی نیند سو رہے ہوں گے۔ یہ بھی ایک بڑی عجیب طرح کی طمانیت تھی۔"

"یقیناً ہوگی" میں نے تسلیم کیا۔

"وہ دونوں اچھل کر عین اسی جگہ لان پر گرے تھے جہاں تم نے انہیں مدفون پایا ہے اور جہاں تم لوگ اس وقت کھڑے ہو" وہ بولیں "میں نے اسی لئے فیصلہ کیا ان کی آخری آرام گاہ کے لئے یہی جگہ مناسب ہے جہاں ان کا لہو جذب ہورہا تھا۔ پوری رات کی محنت کے بعد میں نے انہیں دفن کیا۔ اس وقت یہ لان کافی حد تک اچھا اور صحیح حالت میں تھا۔ چند دن بعد میں نے محسوس کیا کہ ہرے بھرے لان میں خاک کا یہ پیوند اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کم از کم ان کی آخری آرام گاہ پر تو ہمیشہ پھول کھلے رہنے چاہئیں۔ رنگا رنگ پھولوں سے لدے سرسبز پودے لہلہانے چاہئیں۔ چنانچہ میں نے اسی ٹکڑے پر کئی خوبصورت پھولوں کے پودے اگائے اور رفتہ رفتہ جب میں نے باقی لان کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور اسے سنبھالنا میرے بس کی بات نہ رہی تب بھی اس ٹکڑے کی میں خوب دیکھ بھال کرتی رہی۔ ان پھولوں پر جوبن بھی خوب آیا تھا۔ شاید اس لئے کہ ان کی جڑوں میں ان دونوں کی جوانی کا خون تھا..."

وہ ایک ہچکی سی لے کر اچانک ہی خاموش ہوگئیں پھر جیسے گلے میں پھنسی ہوئی کوئی چیز نگل کر گہری سانس لے کر بولیں "لیکن راز پھر بھی راز نہ رہا۔ شاید ہر راز کے کھلنے کا ایک وقت ہوتا ہے لیکن میں اب بھی اس راز کے کھلنے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ میں چاہتی ہوں یہ راز میری موت تک راز ہی رہے۔ میں تمہارے بارے میں جو کچھ جان پائی ہوں اور جو کچھ مجھے زرتاج نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔ اسے ذہن میں رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ تم اس راز کو راز نہیں رہنے دو گے۔ تم یقیناً مجھے مجرم ٹھہراؤ گے اور جرم و سزا کے بارے میں تمہارا اپنا کوئی نظریۂ انصاف بھی ہے۔ تم چاہتے ہو کہ مجرم کو پہلے قانون سے سزا دلوانے کی کوشش کی جائے اور اس سلسلے میں اگر قانون کی کوئی مجبوری یا کمزوری آڑے آجائے تو خود اسے صحیح سزا دی جائے... بلکہ اگر پہلے ہی یہ اندیشہ ہو کہ مجرم قانون کے پھندے میں پھنسنے ہی نہیں پائے گا اور آسانی سے نکل جائے گا تو تم اس کی نوبت آنے ہی نہیں دیتے اور خود ہی حساب برابر کرنے کی کوشش کرتے ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟"

"ہاں" میں نے ایک ٹک ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں جھوٹ بول کر آپ کو کسی خوش فہمی میں رکھنے یا دھوکا دینے کی کوشش نہیں کروں گا۔ میں اپنے ذاتی نظریۂ انصاف کے بارے میں بڑا سخت ہوں اور کسی سے بھی کوئی رعایت نہیں کرتا۔ یوں سمجھ لیں کہ یہ میری زندگی کا مشن ہے۔"

"یعنی تم مجھے بھی قانون کے حوالے کردو گے؟" انہوں نے استہزائیہ سے لہجے میں تصدیق چاہی۔

"ہاں" میں نے بلا تامل کہا۔ اس موقع پر بھی میرا جھوٹ اور مصلحت کوشی سے کام لینے کو جی نہیں چاہا حالانکہ ہم تینوں کی جان داؤ پر لگی ہوئی تھی لیکن جھوٹ بول کر انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کرنا اور پھر قانون کے حوالے کرنا مجھے بہت بڑا اور کمینگی آمیز دھوکا محسوس ہوتا۔ میرے ضمیر نے یہ گوارا نہیں کیا کہ میں انہیں اس دھوکے میں رکھوں۔ موت اس کے مقابلے میں باعزت چیز تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "آپ کے شوہر اور ملازمہ کا جرم میرے خیال میں اتنا سنگین نہیں تھا کہ انہیں ہلاک کردیا جاتا۔ آپ نے انہیں محض جذباتی سزا دی۔ میں جذباتی سزا کا قائل نہیں ہوں۔ جذباتی سزائیں معاشرے میں بڑا انتشار پیدا کرتی ہیں۔ آپ کے اس جرم کے بعد آپ کے لئے یہی رعایت کافی ہے کہ آپ نے اتنے برس آزادی سے گزار لئے..."

"آزادی سے کہاں گزارے۔" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولیں "تمہیں کیا معلوم کہ میں کس قید میں رہی۔ میں نے کتنی بڑی سزا کاٹی۔ اس مکان میں اس دُہری قبر کے ساتھ میں کس عذاب میں رہی۔"

"وہ ایک جذباتی جرم کی جذباتی سزا تھی" میں نے کہا "لیکن اب کم از کم عمر کے آخری دور میں آپ کو اپنے جرم کی حقیقی سزا بھی کاٹ لینی چاہئے۔"

"تم مجھے اپنی ذاتی عدالتِ انصاف سے سزا نہیں دو گے؟" ان کا لہجہ اب بھی قدرے استہزائیہ تھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا "کیونکہ مجھے یقین ہے آپ کو قانون کی عدالت سے ہی اپنے جرم کی صحیح سزا مل جائے گی بلکہ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو کم سزا ملے اور جیل میں قطعاً کوئی تکلیف نہ ہو۔ آپ جیل میں بھی تقریباً گھر کی طرح ہی رہ سکیں گی۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ کے ساتھ زیادہ سختی ہو کیونکہ آپ کا جرم محض جذباتیت کی پیداوار تھا۔ فطری خباثت کا نتیجہ نہیں تھا۔ میں ان جرائم کی زیادہ سخت سزاؤں کا قائل ہوں جو محض اپنی خباثت کی تسکین کے لئے کئے جاتے ہیں۔"

"تمہارا بہت شکریہ۔۔۔ کہ تم نے اپنے دل میں میرے لیے اب بھی نرم گوشہ رکھا" وہ بدستور استہزائیہ لہجے میں بولیں "اور اس بات پر بھی تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے اپنے ارادے صاف ظاہر کر دیے۔ مجھے کوئی چکر دینے یا اندھیرے میں رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ تم واقعی ایک نایاب آدمی ہو۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آج کے دور میں بھی ایسے آدمی پائے جاتے ہیں۔ زرتاج نے جب مجھے تمہارے بارے میں تفصیل سے بتایا تھا تو مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ کوئی آدمی اپنے اصولوں اور نظریات وغیرہ کے بارے میں اتنا سخت بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ان باتوں کو اپنائے رکھنا۔۔۔ ان اخلاقی قدروں کو سینے سے لگائے رکھنا' جو ایک زمانہ ہوا متروک ہو چکی ہیں' بڑے حوصلے کی بات ہے۔ تم واقعی ایک باکمال آدمی ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ ایسا باکمال آدمی میرے ہاتھوں ضائع ہو جائے گا۔۔۔ وہ بھی اکیلا نہیں۔۔۔ اپنے دو قیمتی ساتھیوں سمیت۔۔۔! واقعی یہ بڑے افسوس کا مقام ہے لیکن میں مجبور ہوں کیونکہ میں کسی بھی حال میں جیل جانا نہیں چاہتی۔"

"عزت افزائی کا شکریہ۔۔۔ لیکن جب آپ مجھے گولی مارنے پر تُلی ہی ہوئی ہیں تو پھر اس عزت افزائی کا کوئی فائدہ نہیں" میں نے کہا "ویسے۔۔۔ بائے داوے۔۔۔ زرتاج نے آپ کو یہاں آنے کیسے دیا؟ میں نے شفیع شاہ کی زبانی کہلوایا تھا کہ وہ آپ کی حفاظت کا خیال رکھے۔"

"اس نے تو اپنی دانست میں بہت خیال رکھا تھا" وہ خوشگوار لہجے میں بولیں "اس نے مجھے ایک کمرے میں تقریباً بند کر دیا تھا لیکن آج اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ وہ خواب آور گولی کھا کر اپنے بیڈ روم میں بند ہو کر سو گئی۔ اس کے بعد باقی لوگوں کو چکر دے کر وہاں سے نکل آنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ میں بہرحال اس کی قیدی نہیں' آنٹی تھی۔"

"مسز درانی!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "یہ مت سمجھئے گا کہ میں یا میرے ساتھی موت سے خوفزدہ ہیں۔ لڑکپن سے اب تک موت سے ہماری آنکھ مچولی جاری ہے اور ہم نے اس حقیقت کو صحیح معنوں میں ذہنی طور پر قبول کر رکھا ہے کہ موت انسان کو کسی بھی لمحے آ سکتی ہے۔ اس لئے میں موت کے خوف سے نہیں۔ بلکہ آپ کی بھلائی کی خاطر آپ کو مشورہ دینا چاہتا ہوں کہ ایک بار پھر ٹھنڈے دل سے اپنے فیصلے پر غور کر لیں۔ آپ کا کیا خیال ہے کہ اکٹھے ہم تین آدمیوں کو قتل کر کے آپ کسی بُرے انجام سے بچ سکیں گی؟"

"کسی پر یہ تھوڑا ہی ظاہر ہو گا کہ تم قتل ہو گئے ہو۔ تم تو غائب ہو جاؤ گے" وہ اطمینان سے بولیں۔

"اور آپ اس کا کیا جواز پیش کریں گی؟" میں نے پوچھا۔

"ایک بیوہ اور کمزور عورت کے لئے کوئی بھی کہانی گھڑنا اور لوگوں کو اس پر یقین دلا دینا زیادہ مشکل نہیں ہوتا" انہوں نے جواب دیا "خصوصاً جب کہ شہر میں تمہارے بیسیوں خطرناک دشمن موجود ہوں گے۔ جو طرزِ زندگی۔۔۔ جو اصول اور طریقے تم نے اپنا رکھے ہیں' ان کے حساب سے تو تمہارے بہت سے دشمن ہونے چاہئیں۔"

"شاید آپ بھول رہی ہیں کہ غفار جیلانی بھی اس مکان کے ایک کمرے میں موجود ہے۔ اس وقت بھی وہ ایک کھڑکی میں کھڑا ہے۔ وہ آپ کو نہیں دیکھ رہا لیکن ہمیں دیکھ رہا ہے اور یہ سب کچھ سُن رہا ہے۔ وہ آپ کے اس جرم کا چشم دید گواہ ہو گا" میں نے کہا۔

مسز درانی نے قدرے وحشت زدہ سے انداز میں قہقہہ لگایا "بہت اچھا گواہ ڈھونڈا ہے تم نے۔۔۔! کیا تمہیں اتنا بھی اندازہ نہیں کہ جبار اور غفار تو تمہاری موت پر خوشی سے پھولے نہیں سمائیں گے اور شاید کچھ شرمندہ بھی ہوں گے کہ جو کام وہ اتنے بڑے بدمعاش ہوتے ہوئے' اتنی دولت' طاقت اور اثر رسوخ رکھتے ہوئے نہیں کر سکے۔ وہ ایک کمزور' حقیر اور بے سہارا عورت نے کر دیا۔ اس کے علاوہ بھی ان کی زبان بند رہنے کی ایک وجہ پیدا ہو جائے گی۔۔۔ اور وہ بہت بڑی وجہ ہو گی۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ وہ جواب دیں گی لیکن شاید وہ فتح کے احساس سے سرشار تھیں۔ خوشگوار لہجے میں بولیں "میں یہ مکان جبار جیلانی کو تحفے میں پیش کر دوں گی جس کے لئے وہ مرا جا رہا ہے کیونکہ جس قبر کی کھدائی سے اور لاشوں کو دریافت سے بچانے کے لیے میں اس مکان سے چمٹی ہوئی تھی وہ تو بہرحال دریافت کر لی [illegible] ہیں۔ اب مجھے اس مکان سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں جبار [illegible] کے سامنے صرف دو چھوٹی چھوٹی شرطیں رکھوں گی۔ ایک تو یہ کہ وہ مجھے رہائش کے لیے چھوٹا موٹا فلیٹ دلا دے۔ دوسرے ان ڈھانچوں اور تم تینوں کی لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا کوئی متبادل انتظام کر دے۔ اس کے بعد یہ مکان بلاقیمت اس کا ہو جائے گا۔ وہ چاہے اس پر پلازہ بنائے' ٹاور بنائے یا اپنی قبر بنائے' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ جبار جیلانی دوڑ کر میری یہ پیشکش قبول کر لے گا۔"

ایک عجیب و غریب شیطانی راستے پر مسز درانی کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اس طرح کی باتیں کرنے اور ان پر عمل کرنے کی اہل بھی ہو سکتی ہیں۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھیں وہ واقعی کچھ ایسا بعید از امکان نہیں تھا۔

میرا دل ایک عجیب سی افسردگی سے بوجھل ہو گیا۔ ہمیں آج تک طاقتور سے طاقتور دشمن بھی اس طرح ایک نادیدہ چوہے دان میں نہیں پھنسا سکا تھا۔ صورتِ حال خواہ کتنی ہی مایوس کن ہوتی تھی لیکن کوئی نہ کوئی ایسا طریقہ نکل آتا تھا جو ہمارے بچاؤ کا سبب بن جاتا تھا یا معاملے کو مکمل طور پر ہی ہمارے حق میں پلٹ دیتا تھا لیکن آج ایسا ہونے کی کوئی صورت دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں اب بھی گویا کچھ چرخیاں سی تیزی سے گھوم رہی تھیں لیکن کوئی بات بنتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔

"اچھا۔۔۔ افضل! خدا حافظ۔" مسز درانی نے کہا اور اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کا نشانہ میں تھا۔ پہلے وہ یقیناً مجھے ہی شوٹ کرنا چاہتی تھیں۔

موت سے بچاؤ کی کوئی صورت تو نظر نہیں آ رہی تھی پھر بھی میں نے نہ جانے کس موہوم سی امید کے سہارے چند لمحوں کی مزید مہلت حاصل کرنے کی غرض سے پوچھا "ہمیں گولی مارتے وقت آپ کو افسوس نہیں ہو گا مسز درانی؟"

"افسوس تو ہو گا۔۔۔ لیکن مجبوری ہے۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولیں۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بھی بات انہیں اپنا ارادہ تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے تاسف سے کہا "کیا ستم ظریفی ہے! ہم بڑے بڑے پھنے خاں قسم کے مجرموں کے قابو میں نہیں آئے لیکن ایک کمزور سی تنہا عورت نے دھوکے سے ہمیں موت کے پھندے میں لا پھنسایا۔۔۔ اور عورت بھی وہ' جس پر ترس کھا کر ہم نے اپنی جانیں اور بزنس خطرے میں ڈال کر بلاغرض اس کی مدد کرنے کی کوشش کی۔"

"زندگی میں انسان کو کسی بھی قسم کا اتفاق پیش آ سکتا ہے۔ اب اس بات پر افسوس کرنا چھوڑو اور تم تینوں افراد آنکھیں بند کر کے کلمہ پڑھ لو۔ افسوس کرتے کرتے اس دنیا سے کوچ کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان کلمہ پڑھتا ہوا دنیا سے رخصت ہو۔"

"آپ کے اعمال اور افعال میں شیطانیت کی جھلک ہے لیکن آپ کا مشورہ نیک انسانوں والا ہے۔ آپ یہ مشورہ نہ دیتیں تب بھی ہم ایسا ہی کرتے۔" میں نے کہا اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ انہوں نے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے چہروں پر پچھتاوا' خوف یا گھبراہٹ نہیں' ایک عجیب سی طمانیت تھی۔ ان کی اس طمانیت سے مجھے بھی حوصلہ ملا۔ میں نے بھی اپنے دل میں ایسی ہی طمانیت اور بے خوفی محسوس کرتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے کلمہ ختم ہی کیا تھا کہ ایک زوردار دھماکا سُنائی دیا۔ مجھے ایک جھٹکا لگا لیکن پھر احساس ہوا کہ مجھے گولی تو کہیں نہیں لگی تھی۔ کیا مسز درانی نے مجھ سے پہلے میرے کسی ساتھی کو نشانہ بنایا تھا؟

میں نے فوراً آنکھیں کھولیں۔ اسی لمحے شفیع شاہ اور ٹونی بھی آنکھیں کھول چکے تھے۔ ہم تینوں نے بیک وقت مسز درانی کو منڈیر پر سے اُلٹ کر گرتے دیکھا۔ ان کی رائفل پہلے ہی نیچے گر چکی تھی۔

وہ جہاں گری تھیں' جھاڑ جھنکاڑ وہاں تک پھیلا ہوا تھا اور زمین کچی ہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے ہم تینوں ہی ساکت رہے۔ فوری طور پر ہم کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کر سکے۔ ہماری سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ درحقیقت ہوا کیا تھا۔ تاہم دوسرے ہی لمحے شفیع شاہ اور ٹونی اچھل کر گڑھے سے باہر آ گئے۔ میں بھی اٹھ کھڑا ہوا اور ہم دو ہی زقندوں میں دیوار کے قریب جا پہنچے۔

مسز درانی بے ترتیب گھاس کے درمیان آڑی ترچھی پڑی تھیں۔ ان کے چہرے اور کھوپڑی کا تقریباً آدھا بالائی حصہ غائب تھا اور تب ہماری سمجھ میں آیا کہ ہمیں اچانک کوئی غیبی امداد میسر نہیں آئی تھی یعنی گولی کسی اور سمت سے نہیں آئی تھی بلکہ مسز درانی نے غالباً رائفل کی نال خود اپنے ہی منہ میں گھسیڑ کر ٹریگر دبا دیا تھا۔ وہ باتیں خواہ کچھ بھی کر رہی تھیں لیکن درحقیقت انہیں شاید کوئی بھی راہِ فرار نظر نہیں آئی تھی یا پھر وہ خود ہی اپنے آپ کو سزا دینا چاہتی تھیں۔

چند لمحے ہم تینوں ان کے قریب ساکت کھڑے رہے۔ سچی بات یہ تھی کہ اس دھچکے نے اس وقت تو مجھے بھی کچھ ناکارہ سا کر دیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے تھا۔ میں نے دیکھا کچھ فاصلے پر غفار بھی بیڈ روم کی کھڑکی میں دم بہ خود کھڑا تھا اور یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ ساری گفتگو بھی وہ یقیناً سن چکا تھا۔ مسز درانی کی بچی کھچی کھوپڑی سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا اور بچا کھچا مغز بھی اس میں شامل ہو کر ملغوبے کی طرح گھاس پر پھیل گیا تھا۔ میں نے ان کی طرف سے نظر پھیر لی۔

"یہ واقعی ایک عجیب عورت تھیں!" شفیع شاہ بڑبڑایا۔

"شاید ہر عورت ہی عجیب ہوتی ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "ہر ایک کے ہی دل و ذہن میں ایک کارخانۂ عجائب موجود ہوتا ہے مگر ہم ہر ایک کے دل و ذہن کے قفل نہیں کھول پاتے۔ اس لیے اس حقیقت سے لاعلم رہتے ہیں۔"

ہم اب مسز درانی کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ہم نے لاش کو بالکل نہیں چھیڑا اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اندر آ گئے۔ ہمیں پولیس کو یہ عجیب اور پُر پیچ کہانی سنانی تھی اور یہ ایک صبر آزما کام تھا۔

اس سے پہلے میں غفار کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ اس وقت تک کھڑکی میں ہی کھڑا تھا۔ میرے کھنکارنے پر وہ سحر زدہ سی حالت میں میری طرف مڑا۔ میں نے جیب سے زنجیر کے تالے کی چابی نکالتے ہوئے کہا "میں تمہیں کھول رہا ہوں۔ اب خواہ مخواہ ہاتھا پائی کرنے' اپنی طاقت دکھانے یا فساد مچانے کی کوشش مت کرنا ورنہ میرے ہاتھ سے مارے جاؤ گے۔ میں تمہاری گردن مروڑنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ اگر تم میں ذرا سی بھی عقل ہوئی تو اب تم بالکل پُرسکون رہو گے۔ اب ہمارے درمیان جھگڑے کی کوئی وجہ نہیں رہی۔ سب کچھ تم نے سن بھی لیا ہے اور دیکھ بھی لیا ہے۔ مسز درانی کی اولادیں کینیڈا میں ہیں۔ مسز درانی کے جنازے پر وہ لوگ یقیناً پہنچیں گے۔ تھوڑا سا انتظار کر کے' مناسب موقع دیکھ کر تم لوگ ان سے بات کر لینا۔ مجھے یقین ہے وہ تمہاری موجودہ پیشکش سے بھی کم رقم میں یہ مکان تمہیں دے دیں گے۔ ہم اب کسی بھی معاملے میں بیچ میں نہیں آئیں گے اس لیے تمہیں ہماری طرف سے تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ٹھیک ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

دھچکے سے وہ بھی یقیناً ابھی تک نہیں سنبھلا تھا لیکن بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ تب میں نے اس کی زنجیر کا تالا کھول دیا اور زنجیر اس کے پاؤں سے نکال دی۔ پھر میں

نے اس کے ہاتھوں کی بندشیں بھی کھول دیں۔ اس نے طمانیت کی چند گہری گہری سانسیں لیں' ہاتھ پیروں کو جھٹکے دیے پھر ناک کی بینڈیج پر احتیاط سے انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا "میری ناک میں سخت تکلیف ہے جو سر تک جاری ہے۔ شاید میری ناک کو آپریشن کی ضرورت ہے۔"

"آپریشن کی ضرورت تو تمہارے دماغ کو ہے۔ بہرحال ناک کا بھی کروالینا۔" میں نے بہ ظاہر بے پروائی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن درحقیقت میں اس کی طرف سے اب بھی ہوشیار تھا۔ وہ شیطانی ذہن کا مالک تھا اور میرے اندازے کے مطابق اپنے بارے میں بڑے زعم میں مبتلا معلوم ہوتا تھا۔ ایسے آدمیوں کی طرف سے ہروقت ہی ہوشیار رہنے کی ضرورت رہتی ہے۔

"میں اب تمہاری کسی بھی بات کا بُرا نہیں مناؤں گا کیوں کہ اب واقعی ہمارے درمیان کوئی جھگڑا نہیں رہا۔" وہ خوش گوار لہجے میں بولا۔

"ہمارے درمیان تو پہلے بھی کوئی جھگڑا نہیں تھا۔ میں تو صرف مسز دُرّانی کے حصے کی لڑائی لڑ رہا تھا کیوں کہ وہ کمزور تھیں۔ وہ اپنی لڑائی خود نہیں لڑسکتی تھیں۔" میں نے ایک بار پھر اصل بات اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ پُرخیال انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "خیر...... وہ اتنی کمزور بھی نہیں تھیں۔ وہ صرف تنہا تھیں پھر بھی بہرحال بڑی خطرناک عورت تھیں...... اور شاید بہت عجیب بھی۔" پھر اس نے بغور میری طرف دیکھا اور ذرا بلند آواز میں بولا "اور تم ان سے بھی زیادہ عجیب آدمی ہو۔"

"ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اب اس بات کی تردید کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ اس دوران میں تھکے تھکے سے انداز میں بیڈ پر جا بیٹھا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "اب تم اپنی تمام تکلیفوں کا علاج کرانے کے لیے آزاد ہو لیکن تمہیں تھوڑی دیر اور یہاں رُکنا پڑے گا۔ پولیس کو میں یہ سارا قصہ دیانت داری سے سُنانا چاہتا ہوں۔ اس دوران میں تمہاری یہاں موجودگی ضروری ہے۔ اس کے بعد اگر پولیس کو کوئی اعتراض نہ ہوا تو تم جہاں چاہو... جاسکتے ہو۔"

"پولیس......؟" اس کی آنکھوں میں ذرا تشویش نمودار ہوئی لیکن پھر وہ گویا تشویش کو ذہن سے جھٹک کر مسکرایا "ہاں...... ہاں...... کیوں نہیں۔ میں اب تم سے اور پولیس سے ہر طرح کا تعاون کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ویسے اگر تم پولیس کے ساتھ ساتھ بھائی صاحب کو بھی بُلوالو تو میں تمہارا شکر گزار رہوں گا۔"

"ہاں۔ اس میں کوئی حرج نہیں...... بلکہ ایک لحاظ سے تو یہ ضروری ہے۔" میں نے کہا اور اسے اشارہ کیا "آؤ' ہمارے ساتھ لاؤنج میں آجاؤ۔"

وہ سعادت مندی سے اُٹھ کر ہمارے ساتھ چل دیا۔ لگتا یہی تھا کہ اب اس کا کوئی بدمعاشی دکھانے کا ارادہ نہیں تھا۔ فون لاؤنج میں موجود تھا تاہم میں اپنا موبائل فون ہی استعمال کرنا چاہتا تھا۔ لاؤنج میں آنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ ہم چاروں یہاں بیک وقت بیٹھ بھی سکتے تھے اور کچن کے قریب موجود ایک عقبی دروازے سے کسی حد تک مکان کے پچھلے حصے پر نظر بھی رکھ سکتے تھے۔

غفار بڑی شرافت سے ڈائننگ ٹیبل کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب مجھے اس کی طرف سے اطمینان ہوگیا تھا تاہم شفیع شاہ اور ٹونی اس کی طرف سے غافل نہیں تھے۔ وہ اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے۔ وہ دونوں اب بھی ذرا ماڈرن مگر جفاکش قسم کے مزدوروں کی طرح پتلونوں کے پائنچے چڑھائے' مٹی میں لتھڑے بیٹھے تھے۔ قمیص انہوں نے اب بھی نہیں پہنی تھیں۔

میں نے ڈائننگ ٹیبل کے ایک سرے پر بیٹھ کر رحیم گل کا نمبر ملایا۔ ہم چاروں کچھ ایسے انداز میں بیٹھے تھے جیسے کوئی اہم میٹنگ شروع ہونے والی ہو اور ہم بڑے اہتمام سے اس میں شریک ہونے کے لیے آئے ہوں۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ یہ علاقہ رحیم گل کے تھانے کی حدود میں ہی آتا تھا اور میں براہِ راست یہ معاملہ اسی کو سونپ سکتا تھا۔

وہ مجھے آفس میں ہی مل گیا اور میری آواز پہچانتے ہی بولا "میں ابھی تمہارے بارے میں ہی سوچ رہا تھا...... اور وہ جو انگریزی کا محاورہ ہے نا...... تھنک آف دا ڈیول۔"

"اگر تم ڈیول کی بات کررہے ہو تو پھر تم یقیناً اپنے ہی بارے میں سوچ رہے ہوگے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"نہیں...... میں بہ قائمی ہوش وحواس تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔" اس نے اصرار کیا "میں اس وقت سنجیدگی سے بات کررہا ہوں۔ میں دراصل تم سے معذرت کرنا چاہ رہا تھا کہ تم نے اتنے اصرار سے مجھے اپنی پارٹی میں بُلایا تھا لیکن میں نہیں آسکا۔ دراصل اسی روز مجھے کچھ خطرناک مجرموں کے تعاقب میں پولیس پارٹی لے کر اندرونِ سندھ جانا پڑا۔ کام بہت ضروری اور اہم تھا۔ اس کے لیے خاص طور پر میری ڈیوٹی لگی تھی۔ خود ڈی آئی جی صاحب نے آرڈر دیا تھا۔"

"کامیابی بھی ہوئی یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کامیابی تو تمہارے اس خادم کو کسی نہ کسی طرح ہوہی جاتی ہے کیوں کہ مابدولت صحیح نیت کے ساتھ نکلتے ہیں اور جان ہتھیلی پر رکھ کر نکلتے ہیں۔" وہ خوش دلی سے بولا "اس مشن میں بھی وہی مشکلات پیش آئیں جو کسی نہ کسی شکل میں کسی نہ کسی حد تک ہر جگہ ہی پیش آتی ہیں۔ گولیوں کی بارش میں اپنا راستہ بنانا پڑا۔ کچھ وڈیروں کی دھمکیوں اور اثر رسوخ کا مقابلہ کرنا پڑا۔ کچھ رشوت کے لیے ڈھیر کی گئی نوٹوں کی گڈیوں کو ٹھکرانے کے لیے بہرے سے بہت سا صبر اور حوصلہ پیدا کرنا پڑا...... اور آخر کار ہم سرخرو لوٹ آئے۔"

"مبارک ہو۔" میں نے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اصل بات شروع کروں۔

وہ اسی خوش گوار لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن اس ساری بے ہودہ کارروائی کے دوران تمہاری محفل کا خیال آتا رہا۔ میں تصور ہی تصور میں دیکھتا رہا کہ تم نے خاصا ٹھیک ٹھاک بدتمیز لگالیا ہوگا اور ساتھ ہی اپنی قسمت کو کوستا رہا کہ جس وقت تم یہاں حسینوں کے جھرمٹ میں چہچہا رہے ہوگے اس وقت میں بدنصیب......"

"جنگلوں میں گھاس چر رہا تھا۔" میں نے جملہ مکمل کیا۔

"گھاس چرنا تو پھر بھی کچھ معقول فعل ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میں تو اس سے کہیں زیادہ نامعقول مصروفیات میں اُلجھا ہوا تھا۔ سُنا ہے تم نے اچھی خاصی رنگینی جمع کرلی تھی؟"

"میں نے اس وقت بھی تمہارے لیے کچھ رنگینی جمع کی ہے لیکن یہ خون کی رنگینی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

دوسری طرف ایک لمحے کے لیے خاموشی چھاگئی پھر رحیم گُل ذرا بدلے ہوئے سے لہجے میں بولا "اب تم ضرور مجھے کوئی بُری خبر سناؤگے۔ تم نے ضرور کہیں نہ کہیں' کوئی نہ کوئی نحوست پھیلا رکھی ہوگی۔"

"نحوست تو خیر یہاں صحیح معنوں میں تمہارے آنے کے بعد پھیلے گی۔ میں تو برسوں سے جمع شدہ نحوست کو سمیٹنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس دوران میں یہاں کچھ گڑبڑ ہوگئی۔ میں نے کہا۔

"تمہاری موجودگی میں اگر کوئی گڑبڑ ہو اور تم اس کے سلسلے میں مجھے فون بھی کرنے کی زحمت کرلو تو وہ گڑبڑ قتل سے کم تو نہیں ہوسکتی۔" رحیم گل نے گویا کوئی پہیلی بوجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کون قتل ہوگیا ہے؟"

"فی الحال تو کوئی قتل نہیں ہوا...... البتہ پچیس تیس سال پُرانے دو قتل دریافت ہوئے ہیں۔ ان کے علاوہ ایک خودکشی بھی ہے۔ غرض یہ کہ تمہارے لیے مصروفیات کا کافی سامان ہے۔ ایک عبرت انگیز سی کہانی تمہاری منتظر ہے۔ جلدی آجاؤ۔" میں نے اسے ایڈریس سمجھایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں بیس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" اس نے بے تلے انداز میں مستعدی سے کہا۔

میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ غفار بولا "اب تم بھائی صاحب کو بھی بُلالو۔"

"میں اسے بُلاؤں گا تو وہ سمجھے گا کہ شاید اسے پھنسانے کے لیے کوئی جال پھیلایا جارہا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ تم خود ہی اس سے بات کرو۔" میں نے موبائل فون اس کی طرف بڑھا دیا۔ وہ ایک دم کافی خوش نظر آنے لگا۔ اس نے نمبر ملایا۔

ناک ٹوٹی ہونے کی وجہ سے گو کہ اس کی آواز عجیب سی ہوگئی تھی پھر بھی اس کے لہجے سے اس کی خوشی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ "بھائی صاحب! صورتِ حال نے اچانک ہی پلٹا کھایا ہے۔ سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔"

مسز دُرانی کی موت گویا ان کے لیے خوشی کا سامان تھی۔ ان کے مرنے سے ان دونوں بھائیوں کے لیے "سب کچھ ٹھیک" ہوگیا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کو پورا واقعہ بتایا پھر اسے بُلانے کی غرض سے اس نے جو باتیں شروع کیں ان سے اندازہ ہونے لگا کہ جبار جیلانی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہاں واقعی یہ سب کچھ ہوچکا تھا۔ وہ اب بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ اسے پھنسانے کے لیے کوئی جال پھیلایا جارہا تھا کیوں کہ اس کے ساتھ تو دوسرا پروگرام طے ہوچکا تھا۔ اب شاید ہم نے اسے گھیرنے کے لیے دوسری کہانی گھڑی تھی اور غفار جو باتیں کررہا تھا وہ شاید اس سے گن پوائنٹ پر کہلوائی جارہی تھیں۔ بڑی مشکل سے غفار اسے یہ یقین دلانے میں کامیاب ہوا کہ ایسا کوئی چکر نہیں تھا پھر میں نے اس سے بات کی اور وہ اپنے وکیل وغیرہ کو ساتھ لے کر آنے پر آمادہ ہوگیا۔

میں نے فون بند کردیا تو کمرے میں بوجھل سکوت چھاگیا۔ اب ہمارے پاس پولیس اور جبار جیلانی اینڈ پارٹی کا انتظار کرنے کے سوا کوئی مصروفیت نہیں تھی۔

○☆○

اس واقعے کے ڈیڑھ ماہ بعد ہم اسے تقریباً بھولنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ زرتاج بھی افسردگی کے اثر سے نکل آئی تھی۔ مسز درانی کے بیٹا بیٹی ان کی تدفین میں تو شریک نہیں ہو سکے تھے لیکن بعد میں کینیڈا سے آگئے تھے اور چہلم تک کراچی میں ہی رہے تھے۔ جبار جیلانی سے ان کا معاملہ طے پا گیا تھا اور چہلم کے بعد وہ کم سے کم وقت میں ڈیل فائنل کر کے چلے گئے تھے۔ میں نے ان معاملات میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں لی تھی۔ مجھے اس سلسلے میں تھوڑی بہت خبریں زرتاج سے ملتی رہی تھیں یا پھر کبھی کبھار رحیم گل کچھ بتا دیتا تھا جس نے اس کیس کی تفتیش کر کے اسے داخلِ دفتر کیا تھا۔ جبار جیلانی نے اس کے بعد ہم سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہیں کی تھی ورنہ مجھے تو اندیشہ تھا کہ وہ روایتی بدمعاشوں کی طرح دل میں دشمنی نہ پال لے لیکن میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا تھا۔

ہمارے معمولاتِ زندگی ہموار انداز میں چل رہے تھے۔ میں نے اس دوران میں لاہور کے بھی دو چکر لگائے تھے۔ وہاں میرے مکان کی تعمیر جاری تھی۔ راحیلہ پہلے ہی کی طرح اپنے معمولات انجام دینے لگی تھی۔ سیاہ پوش حسینہ والے حلیے سے نجات پا کر وہ اندر ہی اندر تو یقیناً خوش تھی لیکن ظاہر یہی کرتی تھی جیسے یہ اس کے لیے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ فون یا فیکس پر اس سے رابطہ رہتا تھا اور دفتری و کاروباری معاملات کے درمیان بھی اس سے نوک جھونک جاری رہتی تھی۔

اسی روز دوپہر کو میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ سیٹھ رمضان کا فون آگیا۔ کئی دن بعد اس کا فون آیا تھا۔ ملاقات کو اس سے بھی زیادہ دن گزر چکے تھے۔ سلام دعا کے بعد میں نے کہا "کہاں مرے ہوئے ہو؟ کافی دنوں سے تم نے اپنی منحوس شکل نہیں دکھائی۔ فون پر تمہاری منحوس آواز بھی خاصے دنوں۔ کے وقفے کے بعد سنائی دے رہی ہے۔"

"وقفہ بہت ضروری ہے افضل پیارے! تمہیں اس عظیم فلسفے کی اہمیت کا اندازہ ابھی نہیں ہو سکتا۔ بیس تیس سال بعد جا کر ہوگا۔" وہ غمگین سے لہجے میں بولا "لیکن اس وقت تم مجھے موضوع سے بھٹکانے کی کوشش مت کرو۔ میں نے تمہیں ایک ضروری کام سے فون کیا ہے۔ کہیں میں وہ بھول نہ جاؤں۔"

"کاروباری لوگوں کی یہ بھی ایک پہچان ہے کہ وہ جب بھی کسی کو فون کرتے ہیں کسی کام سے ہی کرتے ہیں۔" میں نے اپنا لہجہ طنزیہ بنانے کی کوشش کی۔

"دل توڑنے والی باتیں مت کرو پیارے!" وہ گویا بُرا مناتے

ہوئے بولا "میں نے تو تمہیں بغیر کسی مطلب کے بیرونِ ملک سے بھی کالیں کی ہیں۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ ساتھ ہی یہ بھی مت بھولو کہ تم بھی ایک کاروباری آدمی ہو۔"

"میں تو یوں ہی شغل شغل میں کاروباری آدمی بن گیا ہوں۔ کاروبار میرے خون میں شامل نہیں ہے۔ تم جیسے لوگ صحیح معنوں میں کاروباری آدمی کہلاتے ہیں۔"

"اچھا یار۔۔۔ اگر خون میں کاروبار شامل ہونے سے خون گندا ہو جاتا ہے تو میں خون بدلوالوں گا۔ اگلی مرتبہ لندن، نیویارک یا ٹورانٹو جانے لگوں گا تو یاد دلا دینا۔ فی الحال یہ خرافات چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ مصروفیات کا کیا حال ہے؟"

"تم کام بتاؤ۔ مصروفیات کا کیا ہے۔۔۔ تمہارے کام کی خاطر ہم اپنے کام چھوڑ دیں گے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ اب اتنا اہم کام بھی نہیں ہے کہ اس کی خاطر تم اپنے ضروری اور طے شدہ کام چھوڑو۔" سیٹھ رمضان بولا "وہ جو تم نے کاروبار میں نیا شغل یا یوں کہو کہ شغل میں نیا کاروبار شروع کیا ہوا ہے، یہ اس خانے میں فٹ ہونے والی چیز ہے۔ کام نہایت معمولی سا ہے اور تمہارے مطلب کا بھی ہے۔ یعنی کام کا کام اور تفریح کی تفریح۔۔۔ ایسے موقعوں کے لیے شاید کوئی محاورہ بھی بولا جاتا ہے۔۔۔ آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔۔۔ یہ یہاں فٹ بیٹھ رہا ہے یا نہیں؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" میں نے جواب دیا "اگر فٹ نہیں بیٹھ رہا تب بھی مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ تم کام بتاؤ۔"

"تمہیں کسی خوب صورت لڑکی سے ملے ہوئے کتنے دن ہو گئے؟" اس نے پوچھا۔

"اس معاملے میں بھی اپنی قسمت اچھی ہی ہے۔ کسی دن بھی ناغہ نہیں ہوتا۔ اگر کسی نئی لڑکی سے ملاقات نہ ہو تو پرانی دوستوں سے تو ہوتی ہی رہتی ہے۔" میں نے جواب دیا "مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟"

"میں سوچ رہا تھا کہ میں بھی تمہیں ایک خوب صورت لڑکی سے ملوا دوں۔" وہ بولا۔

"تم نے یہ کام کب سے شروع کر دیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بکواس مت کرو۔" اس کے لہجے میں قطعاً شرمندگی ظاہر نہیں ہوئی۔ "اگر یہ کام کیا ہوتا تو بزنس کیے بغیر ہی سیٹھ کہلا سکتا تھا۔ میں نے تو تمہارے لیے ایک دلچسپ کام تلاش کیا ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ کام کے بہانے ایک خوب صورت لڑکی سے تمہاری ملاقات ہو جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ ایک غریب آدمی کی مدد بھی ہو جائے گی۔"

"غریب آدمی۔۔۔؟ کتنا غریب ہے وہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"بس لکھ پتی ہے۔۔۔ چھوٹا موٹا سا بزنس مین ہے۔" سیٹھ رمضان نے جواب دیا۔

"چ۔۔۔ چ۔۔۔ چ۔۔۔ پھر تو واقعی بڑا غریب ہے۔" میں نے ترحم بھرے لہجے میں کہا "اسے روٹی وغیرہ بھی کھانے کو مل جاتی ہے یا نہیں؟"

"بس۔۔۔ کھینچ تان کر دال روٹی چل رہی ہے۔"

"بے چارہ۔۔۔!" میں نے پہلے سے زیادہ ترحم بھرے لہجے میں کہا۔

"یار۔۔۔ تم یہ طنز و مزاح وغیرہ چھوڑو۔ وہ شریف آدمی ہے۔ اپنا بڑا نیاز مند ہے۔ اس کی ذرا سی مدد کرنی ہے۔" سیٹھ رمضان ملائمت سے بولا۔

"کیا مسئلہ درپیش ہے اسے؟" میں نے قدرے بے پروائی سے دریافت کیا۔

"اسے ایک خوب صورت، دولت مند اور مشہور لڑکی نے تنگ کیا ہوا ہے۔۔۔"

"واہ۔۔۔ کیا خوب صورت مسئلہ ہے! کیا وہ اتنا بڑا گدھا ہے کہ اس مسئلے سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے؟ اسے تو چاہیے کہ زندگی بھر اس مسئلے میں گرفتار رہے۔۔۔"

"تم نے یہ جانے بغیر فیصلہ سنانا شروع کر دیا کہ مسئلہ کیا ہے۔" سیٹھ رمضان قدرے خفگی سے بولا۔

"مسئلے کی نوعیت میں اُلجھنے کی کیا ضرورت ہے۔ اُلجھنا ہی ہوا تو لڑکی کی "نوعیت" میں اُلجھنا چاہیے۔ تم بتا رہے ہو کہ لڑکی خوب صورت، دولت مند اور مشہور ہے۔ اس قسم کی لڑکی کی طرف سے کوئی مسئلہ ہو تو اسے گلے سے لگا لینا چاہیے۔"

"کسے۔۔۔؟ مسئلے کو یا لڑکی کو؟" سیٹھ رمضان نے دریافت کیا۔

"دونوں میں سے جس کا بھی موقع ملے۔" میں نے جواب دیا۔

"خواہ مسئلہ یہ ہو کہ وہ لڑکی اس شخص کو زہر دینے کی کوشش کر رہی ہو؟" سیٹھ رمضان نے جاننا چاہا۔

"ہاں۔۔۔ ایسی لڑکی کے ہاتھ سے تو زہر بھی کھایا جا سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اللہ تمہیں جلد از جلد ایسی کسی لڑکی کے ہاتھوں پاؤ ڈیڑھ پاؤ انتہائی سریع الاثر زہر کھانا نصیب کرے کیوں کہ اس سے کم میں تم مرو گے نہیں۔" وہ جل کر بولا "لیکن میرے نیاز مند کا مسئلہ نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟ کیا وہ لڑکی اس سے شادی کرنا چاہتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مسئلہ ہوتا تب بھی میرے اس شناسا کو اعتراض نہ ہوتا۔ مسئلہ تو یہ ہے کہ اس بے چارے نے تو آج تک اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ اس سے بات بھی نہیں کی۔ وہ اس کا فون تک

سنتی۔"

"تم یہ چاہتے ہو کہ میری وجہ سے وہ اس کی شکل دیکھنے لگے۔۔۔ اس سے بات کرنے لگے اور اس کا فون سننے لگے؟ معاف کرنا۔۔۔ میں نے یہ کام شروع نہیں کیا۔ تم غلط سمجھے ہو۔" میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "کاش۔۔۔ اللہ تمہیں توفیق دے کہ تم کبھی کسی کی پوری بات سُن لیا کرو۔ میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس لڑکی کی وجہ سے میرے اس جاننے والے کا لاکھوں کا نقصان ہو رہا ہے۔"

"ابھی تو وہ بات نہیں کرتی۔۔۔ فون تک نہیں سنتی اور شکل دیکھنے کی روادار نہیں۔" میں نے حیرت سے کہا "اس پر بھی لاکھوں کا نقصان ہو رہا ہے۔ اگر کہیں میل ملاقات ہو گئی تو نقصان کروڑوں تک جا پہنچے گا۔"

"یار۔۔۔ خدا کے لیے تم اسے لڑکی اور مرد کا دوسرا چکر بنانے کی کوشش مت کرو۔ یہ خالص کاروباری معاملہ ہے۔" سیٹھ رمضان کراہا "میں نے تو پہلے اپنے دوست کو کسی اچھے سے وکیل کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا۔۔۔ بلکہ مشورہ کیا دیا تھا، اپنے ایک جاننے والے وکیل کے پاس تقریباً بھیج ہی دیا تھا۔ پھر اچانک مجھے تمہارا خیال آیا۔ میں نے سوچا تم کون سا کسی وکیل سے کم ہو۔ ضرورت پڑنے پر تم خود وکیل بن سکتے ہو اور کسی وکیل سے زیادہ فساد مچا سکتے ہو۔"

"تمہارے اس بیان سے وکیلوں کی توہین کا پہلو نکلتا ہے۔ اگر کسی وکیل نے سُن لیا تو وہ تمہیں عدالت میں گھسیٹ لے گا اور اچھی طرح اپنا زورِ وکالت دکھا دے گا۔ بعض وکیلوں کے پاس بڑا وقت ہوتا ہے۔ وہ راہ چلتے اِدھر اُدھر دیکھتے رہتے ہیں کہ کوئی شکل انہیں اچھی نہ لگے تو اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کریں۔"

"میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی جس سے وکیلوں کی توہین کا پہلو نکلتا ہے؟" سیٹھ رمضان کچھ اس طرح بُرا مناتے ہوئے بولا جیسے اس میں خود اس کی اپنی توہین کا کوئی پہلو نکل آیا ہو۔

"تم مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میں کسی وکیل سے زیادہ فساد مچا سکتا ہوں۔ تمہارا مطلب ہے وکیل فساد مچاتے ہیں؟" میں نے ایک وکیل ہی کی طرح پوچھا۔

"یار۔۔۔! میرا مطلب یہ تھا کہ تم بھی اچھی بھلی قانونی کارروائی کر سکتے ہو۔ تم خود بھی قانونی داؤ پیچ سے اچھی طرح واقف ہو۔ اس کے علاوہ مجھے کاروباری چکروں میں جن وکیلوں کی خدمات حاصل رہتی ہیں۔۔۔ تمہیں ان سے بھی زیادہ بڑے اور نامی گرامی وکیلوں کی خدمات حاصل ہیں۔ تم کسی کے خلاف قانونی کارروائی کیا۔۔۔ بلکہ ہر قسم کی کارروائی ہی مجھ سے کہیں زیادہ اچھی طرح کر سکتے ہو اس لیے میں نے اس آدمی کو تمہاری طرف بھیجنے کا ارادہ کیا ہے۔"

"یوں کہو کہ تم نے اسے میرے حوالے کر کے اپنا وقت بچانے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"ایسا مت کہو یار! میں تمہارے پاس کلائنٹ بھیج رہا ہوں۔ وہ تمہارے وقت کی قیمت ادا کرے گا۔ تمہیں مناسب فیس دے گا۔" سیٹھ رمضان نے گویا مجھے لالچ دیا۔

"میری مناسب فیس بھی خاصی نامناسب ہے۔" میں نے کہا "تم خود ہی کہہ رہے تھے کہ وہ بے چارہ غریب سا آدمی ہے۔ محض لکھ پتی ہے۔ وہ میری فیس افورڈ کر لے گا؟"

"تم کیا کروڑوں میں فیس لینے لگے ہو؟" سیٹھ رمضان خفگی سے بولا۔

"مجھ سے کوئی بعید نہیں ہے کہ میں کیس کی نوعیت اور کلائنٹ کی فطرت دیکھنے کے بعد کروڑوں میں فیس کا مطالبہ کر دوں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"اگر ایسا ہوا تو وہ بے چارہ سر کے بل میرے پاس واپس دوڑا آئے گا۔"

"نام کیا ہے اس کا؟" میں نے کوئی خاص دلچسپی ظاہر کیے بغیر پوچھا۔

"کوڑل جان کڑیالی۔" سیٹھ رمضان نے جواب دیا۔

"یہ کس قسم کا نام ہے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"مجھے معلوم تھا تم یہی سوال کرو گے۔ اس بدنصیب کا نام سنتے ہی ہر شخص سب سے پہلا سوال یہی کرتا ہے۔" سیٹھ رمضان ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"تم یقیناً نام کے ذریعے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہ تمہارا اپنا گھڑا ہوا نام ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"میں اس قسم کے کاموں میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔۔۔ اور مجھے گھڑنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ دنیا میں اس سے بھی زیادہ عجیب و غریب گھڑی گھڑائی چیزیں پہلے سے موجود ہیں۔" سیٹھ رمضان سنجیدہ معلوم ہوتا تھا۔

"حیرت ہے۔۔۔!" میں نے کہا "خاصا مضحکہ خیز سا نام ہے۔ میں نے دنیا میں بڑے عجیب عجیب نام سنے ہیں لیکن یہ کچھ زیادہ ہی عجیب لگ رہا ہے۔"

"میں خود کوڑل کو کئی بار مشورہ دے چکا ہوں کہ بھائی اخبار میں اشتہار وغیرہ دے کر اور ضابطے کی تمام کارروائیاں پوری کر کے اپنا نام بدل ہی لو۔ اس نام کو سُن کر کوئی عجیب سی نظروں سے تمہاری طرف دیکھتا ہے۔۔۔ لیکن اس کے کان پر جوں ہی نہیں رینگتی۔ وہ اس مشورے کو ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیتا ہے اور اسی نام کے ساتھ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔ اونچے طبقے میں نشست و برخاست رکھتا ہے اور ذرا نہیں شرماتا۔ دراصل وہ قبائلی ہے۔" اس نے بتایا۔

"اوہ۔۔۔ یہ بات ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔

سیٹھ رمضان نے جلدی سے وضاحت کی "لیکن یہ اسی قسم کا قبائلی ہے جو برس ہا برس سے شہروں میں رہ رہے ہیں' بزنس کر رہے ہیں اور اونچے طبقے میں رچے بسے ہوئے ہیں۔ وہ صرف اپنی روایات میں قبائلی ہیں ورنہ بظاہر ان کے طور طریقے یا رہن سہن وغیرہ ہم تم سے قطعاً مختلف نہیں۔ صرف بعض خاص معاملات میں ان کی قبائلی روایات یا ان کی ذرا مختلف سوچ آڑے آجاتی ہے۔ مثلاً کوژل جان کڑیالی اس لیے اپنا نام نہیں بدلتا کہ قبیلے والے کیا کہیں گے "کوژل نے شہر جا کر ماں باپ کا دیا ہوا نام بھی چھوڑ دیا۔"

"میں سمجھ گیا۔۔۔۔" میں نے کہا "عجیب اتفاق ہے گزشتہ رات بھی اسی قسم کا ایک قبائلی میرا مہمان رہا ہے۔ آج صبح ہی اسے رخصت کر کے بیٹھا ہوں۔ لگتا ہے میرے لیے آج کل قبائلیوں سے ملاقات کا سیزن چل پڑا ہے۔ خیر۔۔۔۔ یہ بتاؤ۔۔۔۔ یہ جو تمہارا کوژل خان کڑیالی ہے۔۔۔۔"

"کوژل خان کڑیالی نہیں۔۔۔۔ کوژل جان کڑیالی۔" سیٹھ رمضان نے میری بات کاٹتے ہوئے تصحیح کی۔

"وہی۔۔۔۔ وہی۔" میں نے جلدی سے کہا "اس کا تو ایک سے زیادہ مرتبہ نام لیتے ہوئے بھی زبان میں "کڑل" سے پڑنے لگتے ہیں "کڑل" کا مطلب سمجھتے ہو نا؟ موچ آنا۔۔۔۔ تشنجی قسم کے جھٹکے لگنا۔"

"میں سب سمجھتا ہوں پیارے! تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ میں کیا کچھ سمجھتا ہوں۔ میں پاکستان میں بولی جانے والی تقریباً تمام زبانیں سمجھتا ہوں۔" سیٹھ رمضان۔۔۔ گہری سانس لے کر بولا۔

"حیرت ہے! میں تو تمہیں بالکل ہی گھامڑ سمجھتا تھا۔" میں نے کہا "بہر حال میں یہ کہنے لگا تھا کہ تمہارا یہ کوژل جان کڑیالی قبائلی ہونے کے باوجود محض ایک لڑکی سے تنگ آگیا ہے؟ اس نے اپنے انداز میں اس کا کوئی علاج کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"خواتین کے معاملے میں اکثر قبائلی بڑی شرم لحاظ والے ہوتے ہیں۔ جب تک کوئی اشد مجبوری نہ آن پڑے تب تک کوئی سخت قدم نہیں اٹھاتے۔۔۔۔ اور یہ جو میرا دوست کوژل جان کڑیالی ہے۔۔۔۔ یہ تو بہت شریف اور سیدھا آدمی ہے۔ نرم دل بھی بہت ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ بزنس کیسے کر رہا ہے۔ پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر وہ ٹیڑھا آدمی ہوتا تب بھی اس لڑکی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا کیوں کہ وہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے۔ اس کا شمار وی آئی پی لوگوں میں ہوتا ہے۔ کوژل بے چارہ تو اس کے سامنے نرا کوژل ہی ہے۔ وہ تو اس سے ملنے جانے کی بھی جرأت نہیں کر پا رہا تھا۔ اسی لیے تو وہ مجھ سے مدد طلب کرنے آیا تھا۔ مجھے فوراً خیال آیا کہ یہ تو تمہارے مطلب کا کیس ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔ مجھے اس میں سے اپنے مطلب کے کیس کی خوشبو تو آ رہی ہے لیکن پہلے تم مجھے یہ تو سمجھاؤ کہ آخر مسئلہ کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"مسئلہ کوئی خاص نہیں ہے لیکن لڑکی بہت خاص ہے۔ اس لیے میں تمہیں اس کے پاس بھیج رہا ہوں۔" سیٹھ رمضان بولا۔

"یار۔۔۔۔! تمہاری یہ لڑکی لڑکی کی گردان سنتے سنتے کان پک گئے ہیں۔ کیوں خواہ مخواہ سسپنس پیدا کیے جا رہے ہو۔ بہتر ہے مزید بتانے سے پہلے لڑکی کا ہی تعارف کرا دو۔ آخر وہ کون حسینۂ دل نواز ہے؟" میں نے اپنے لہجے میں تجسس کے بجائے قدرے بے زاری کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"دل نواز تو وہ معلوم نہیں' ہے یا نہیں۔۔۔۔ لیکن حسینہ ضرور ہے۔ گو کہ میں اس سے کبھی ملا نہیں ہوں لیکن گزشتہ چند برس کے دوران میں میں نے کئی بار اس کی تصویریں دیکھی ہیں اور ہر بار دل پر ہاتھ رکھ کر بھول گیا ہوں۔" اس نے شاید اس وقت بھی دل پہ ہاتھ رکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"تم نے محض دل پہ ہاتھ رکھنے پر کیوں اکتفا کیا؟" میں نے پوچھا "کسی بہانے اس سے ملنے کیوں نہیں جا پہنچے؟ تم تو ایسے معاملے میں اس عمر میں بھی بڑے فنکار ہو۔"

"جن دنوں اس کا نام اکثر سامنے آتا تھا ان دنوں میرے حالات کچھ ایسے تھے کہ اس سے تعارف حاصل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔۔۔۔ اور اس کے حالات کچھ اس قسم کے تھے کہ شاید وہ میرے کسی بھی بہانے کے باوجود مجھ سے نہ مل پاتی۔ کبھی اس کی شادی ہو رہی تھی۔ کبھی طلاق ہو رہی تھی۔ کبھی وہ ملک سے باہر تھی۔ خاصی ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے اس نے۔۔۔۔ ان دنوں ہمارے ہاں انگریزی پریس میں اکثر اس کا تذکرہ ہوتا رہتا تھا۔ اونچے درجے کے فیشن میگزینز میں رنگا رنگ تصویریں بھی چھپتی رہتی تھیں۔ کافی عرصے کی خاموشی کے بعد پھر اس کا نام سننے میں آیا ہے۔ پریس میں تو اب اس کا تذکرہ نہیں آتا۔ لگتا ہے پریس والے اور اونچے طبقے کے لوگ اسے بھول بھال گئے ہیں۔" سیٹھ رمضان نے خاصی ترنگ میں بتایا۔

"اوہو۔۔۔۔ اس کا مطلب ہے موصوفہ شادیوں اور طلاقوں کے مرحلوں سے بھی گزر چکی ہیں۔" میں نے اپنے لہجے سے قدرے مایوسی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"تو اس میں اتنی مایوسی کی کیا بات ہے۔ صرف دو ہی شادیاں اور طلاقیں تو ہوئی ہیں بے چاری کی۔۔۔۔" سیٹھ رمضان گویا حوصلہ بڑھاتے ہوئے بولا "تمہارے لیے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بے چاری کی دونوں شادیاں بہت تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے برقرار رہی ہیں۔ نوجوانی میں ہی دو مرتبہ کی طلاق ہو چکی ہے۔"

"اچھا۔۔۔۔ صرف دو ہی شادیاں ہوئی ہیں بے چاری کی۔" میں نے گویا سکون کی سانس لیتے ہوئے کہا "یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ بے چاری کو کم از کم آٹھ دس شادیوں کا موقع تو ملنا چاہیے تھا۔ خیر۔۔۔۔ تم بتا رہے ہو کہ ابھی تو وہ نوجوان ہی ہے۔ ابھی تو بہت پڑا ہے۔ اس کے عزائم یقیناً بلند ہوں گے۔ کیا الزبتھ سے اس کی کچھ رشتے داری ہے؟"

"ارے نہیں یار۔۔۔۔! وہ خالص پاکستانی لڑکی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ میں تو مزاجی رشتے دار کی بات کر رہا ہوں۔ کوئی خاتون شادی کے معاملے میں مزاجاً بھی الزبتھ ٹیلر کی رشتے دار ہو سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا معاملہ ایسا معلوم نہیں ہوتا۔" سیٹھ رمضان بولا۔

"بات کس کی کر رہے ہو؟ اب کلائمیکس بھی بیان کر ہی دو۔ یعنی اس خاتون کا نام بتا ہی دو۔ اتنی دیر سے تمہید باندھے جا رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"اس کا نام پرنسس سیرا ہے۔ کہو۔۔۔۔ کچھ یاد آیا۔۔۔۔ یا انگریزی محاورے کے مطابق ذہن میں کوئی گھنٹی بجی؟" سیٹھ رمضان بولا۔

"ہاں۔۔۔۔" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا "ذہن میں گھنٹی بج تو رہی ہے لیکن بہت دور کہیں بج رہی ہے۔ کان لگا کر سننی پڑ رہی ہے۔"

مجھے یاد آ رہا تھا کہ میں نے اونچے طبقے میں پڑھے جانے والے بعض ملکی ہی نہیں بلکہ ایک آدھ غیر ملکی رسالے میں بھی پرنسس سیرا کے بارے میں پڑھا تھا اور بہت سی رنگین یا بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں بھی دیکھی تھیں۔ کسی زمانے میں شاید اس نے مختصر عرصے کے لیے ماڈلنگ بھی کی تھی اور اپنے وقت کی سب سے مہنگی ماڈل رہی تھی۔ ریکارڈ معاوضہ لینے کے باوجود اس کا انداز شوقیہ ماڈل کا سا تھا۔ موڈ آیا تو کسی اشتہار یا کمرشل فلم میں کام کر لیا ورنہ نہیں۔ پھر شاید اس مشغلے سے بھی دل بھر گیا تھا اور اس نے یہ چھوڑ دیا تھا۔

"یہ وہی پرنسس سیرا تو نہیں جس کی شادی کسی خلیجی ریاست کے شہزادے کے ساتھ ہوئی تھی اور یہ مڈل ایسٹ چلی گئی تھی مگر شادی زیادہ عرصے نہیں چل سکی تھی اور یہ طلاق لے کر واپس آگئی تھی؟ شاید اس وقت سے ہی اس کے نام کے ساتھ "پرنسس" کا اضافہ ہوا تھا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"تمہیں ٹھیک یاد آیا۔" سیٹھ رمضان گویا کچھ خوش ہوتے ہوئے بولا "لیکن پرنسس یہ شادی سے پہلے ہی ہوا کرتی تھی کیوں کہ اس کا تعلق ہمارے ہاں کی کسی سابق ریاست کے والیان کے خاندان سے تھا۔ آکسفورڈ میں یہ خلیجی ریاست کے شہزادے کے ساتھ پڑھتی تھی۔ وہیں سے شادی کے عہد و پیماں ہوئے تھے لیکن ان پر عمل درآمد بہت بعد میں جا کر ہوا۔ یہ بندھن توڑنے میں البتہ دونوں نے بڑی عجلت دکھائی۔ اتنا عرصہ بھی شادی نہیں چل سکی جتنا عرصہ شاید افیئر چلا تھا۔"

"اس طبقے کے بعض لوگوں کی شادیاں یا افیئرز اسی طرح ہوتے ہیں۔ پھلجھڑی کی طرح ذرا دیر کے لیے آنکھیں خیرہ کر کے ختم ہو جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔ ایسا ہوتا ہے لیکن تم اس موضوع پر دانش وری مت بگھارو۔" اس نے مجھے ڈانٹا۔

"تم میں یہی تو سب سے بڑی بیماری ہے۔ تم مجھے کچھ بھی بنتے نہیں دیکھ سکتے۔ حتیٰ کہ دانش ور بنتے بھی نہیں دیکھ سکتے۔" میں نے دکھ سے کہا "بہر حال۔۔۔۔ تم اپنا بے ہودہ بیان جاری رکھو۔ پھر اس خاتون نے دوسری شادی کر لی؟"

"ہاں۔۔۔۔ اور وہ شاید میرے بیان سے بھی زیادہ بے ہودہ تھی۔ وہ پہلی شادی سے بھی کم عرصے چلی۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا اس کا دوسرا شوہر بھی کوئی موٹی اسامی تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ وہ محض ایک خوب رو مگر ناکام اداکار تھا۔ شاید محترمہ اس کی خوب روئی کی وجہ سے اس پر فریفتہ ہو گئی ہوں۔" اس نے خیال ظاہر کیا۔

"مگر یہ فریفتگی بھی جلد ہی کافور ہو گئی۔ گویا آج کل وہاں ویکنسی موجود ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اسی لیے تو تمہیں بھیج رہا ہوں۔" سیٹھ رمضان بولا۔

"لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے اس قسم کی خواتین کے درجۂ شوہریت پر فائز ہونے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن "شغل میلے" کے لیے تو میری تجویز بُری نہیں ہے۔۔۔۔ اور پھر تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ یہ ایک کیس ہے یار! ایک مسئلہ ہے جسے حل کرنا ہے۔ ایک کاروباری مصروفیت ہے جس سے تمہیں آمدنی ہوگی۔"

"ہاں۔۔۔۔ واقعی۔۔۔۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔۔۔۔ لیکن میں ایک بار پھر پوچھنا چاہوں گا کہ وہ میری فیس افورڈ کر لے گا؟"

"ہاں یار۔۔۔۔! وہ اتنا "غریب لکھ پتی" بھی نہیں ہے۔ جتنا اس کا نقصان ہو رہا ہے' اس کا پچیس فیصد تو وہ فیس کے طور پر ہنسی خوشی دے دے گا اور وہ بھی کچھ کم نہیں ہوگا۔" سیٹھ رمضان بولا۔

"چلو ٹھیک ہے۔۔۔۔" میں نے آمادگی سے کہا "لیکن اب تم مجھے صحیح طرح یہ بتاؤ کہ کوژل جان۔۔۔۔ کڑیالی اس معاملے میں کس پریشانی میں مبتلا ہے؟"

"پرنسس سیرا کے والد بہت دولت مند صنعت کار تھے۔ سیرا ان کی دوسری اولاد ہے۔ اس سے بڑی ایک بہن اور ہے۔ پچھلے دنوں والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ ان کی انڈسٹری اور دو تین کمپنیاں ان کی وصیت کے مطابق سیرا کو منتقل ہو چکی ہیں۔ پرنسس سیرا اپنے ایک الگ ہی اسٹائل سے آزاد اور خود مختار سی زندگی گزارنے کی عادی تھی۔ وہ پہلے بھی لاکھوں بلکہ کروڑوں میں کھیلتی تھی اور بہت عیش و آرام سے زندگی گزارتی تھی۔ وراثت منتقل

ہونے کے بعد تو شاید اسے خود بھی اپنی دولت کا اندازہ نہیں رہا۔ کچھ انڈسٹری اور اثاثے بڑی بہن کو بھی منتقل ہوئے ہیں۔ پھر بھی اسے بہرحال کم حصہ ملا ہے۔ معلوم نہیں کیوں باپ نے اسے برابر کے حصے کا مستحق نہیں سمجھا۔۔۔۔"

"یہ باتیں تمہیں کیسے معلوم ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک کاروباری شناسا کے ذریعے۔" سیٹھ رمضان نے جواب دیا "یہ مشہور لوگوں کی فیملی ہے۔ ان کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات حاصل کرنا کچھ زیادہ مشکل کام نہیں۔ اصل بات میں تمہیں یہ بتا رہا تھا کہ پرنس سیرا کو وراثت میں جو کاروبار مل گیا ہے اسے اس کے سر پیر کا کچھ پتا نہیں۔۔۔۔ اور نہ ہی وہ اس کی طرف کوئی توجہ دے رہی ہے۔ اسے ورثے میں ملنے والی کمپنیوں میں ایک سپلائی کمپنی بھی شامل ہے جو صنعتی ضروریات میں استعمال ہونے والا مال سپلائی کرتی ہے۔ کوڑل جان کریالی نے کافی عرصہ پہلے ایسے مال کی بہت بڑی کھیپ کا آرڈر اس کمپنی کو دے رکھا تھا۔ کمپنی کا نام امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن ہے۔ پرنس سیرا کے والد پرنس سعید کے زمانے میں ہی اس کمپنی کے کام میں بے قاعدگی آگئی تھی۔ کوڑل کا آرڈر انہی کے زمانے کا ہے اور ابھی تک اس کی تکمیل نہیں ہو سکی۔ پہلے اسے بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑ رہا تھا اس لیے اس نے بھی زیادہ پروا نہیں کی لیکن اسے جہاں مال سپلائی کرنا تھا اب اسے وہاں سے نوٹس ملے اور کچھ جرمانہ بھی بھرنا پڑ گیا تب وہ ذرا حرکت میں آیا تو اسے پتا چلا کہ کمپنی کا دفتر ہی بند ہو چکا ہے۔ ابھی کچھ پتا نہیں کہ اس کا کیا بن رہا ہے اور اس کا مستقبل کیا ہوگا۔ کوڑل نے لاکھوں روپے کی رقم بھی کمپنی میں پیشگی جمع کرائی ہوئی ہے۔"

"وہ کوئی قانونی کارروائی کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے پیارے بقراط!" سیٹھ رمضان ٹھنڈی سانس لے کر بولا "صرف مجھے ہی نہیں بلکہ خود کوڑل کو بھی معلوم ہے اور وہ یہی سوچ رہا تھا۔ یہ بات تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں۔۔۔۔ لیکن تمہیں معلوم ہے اس قسم کے معاملات میں عدالتوں میں فیصلہ ہوتے برسوں لگ جاتے ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں۔۔۔۔ جب کہ سامنے کوئی موجود ہو۔ یہاں تو سامنے کوئی موجود ہی نہیں ہے۔ کمپنی کا دفتر بند پڑا ہے۔ اصل مالکن تک کسی کی رسائی نہیں ہو پاتی۔۔۔۔ بلکہ وہ تو اس قسم کے کاروباری مسائل پر فون پر بھی بات نہیں کرتی۔۔۔۔ اور مجھے یقین ہے کہ وہ بات بھی کرے گی تو اسے کچھ پتا نہیں ہوگا۔"

"تو تم چاہتے ہو کہ اب میں جا کر اس سے بات کروں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"شکر ہے یہ بات تمہاری سمجھ میں آگئی۔" سیٹھ رمضان نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی "لیکن مجھے یقین ہے کہ تم اب بھی شکریہ ادا نہیں کرو گے کہ میں نے تمہارے لیے کیا دلچسپ کام تلاش کیا ہے۔۔۔۔ یعنی کسی خوب صورت، دولت مند اور مشہور لڑکی کے گھر جا کر اس سے بات کرنا۔"

"لیکن اس کا گھر ہے کہاں؟" میں نے دریافت کیا "مجھے تو اس کا گھر معلوم نہیں ہے۔"

"تو معلوم کرو نا بھائی! اگر تم کسی وی وی آئی پی قسم کی شخصیت کا گھر بھی تلاش نہیں کر سکتے تو تم اپنے کلائنٹس کو کس قسم کی خدمات مہیا کرو گے؟" سیٹھ رمضان نے مجھے ہلکی سی ڈانٹ پلائی "یہ تو ویسے بھی بامعاوضہ کیس ہے۔"

"تم اپنا کلائنٹ اپنے پاس رکھو۔ میں کوئی پرائیوٹ سراغ رساں تھوڑا ہی ہوں کہ فیس لے کر ہر کام کرتا پھروں۔" میں نے مصنوعی خفگی سے کہا۔

"پھر تم کیا ہو؟" اس نے پوچھا۔

"میں اس سے آگے کی کوئی چیز ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"یعنی تمہیں یہ معلوم نہیں کہ تم کیا چیز ہو؟"

"مجھے یہ معلوم ہو یا نہ ہو لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ میں اپنی مرضی کا مالک ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔۔۔۔ جب انسان کا پیٹ بھرا ہو تو وہ اس قسم کی باتیں کر سکتا ہے۔ تم پیسے والے ہو۔ نخرے دکھا سکتے ہو۔"

"نخروں کا کیا ہے۔۔۔۔ نخرے تو انسان بغیر پیسوں کے بھی دکھا سکتا ہے۔ نخروں پر کوئی خرچہ تھوڑا ہی آتا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے پیارے! غربت میں نخرے خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔"

"اچھا چلو تمہاری خاطر میں دولت مندی میں نخرے کم کر لیتا ہوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے۔" میں نے فراخ دلی سے کہا "میں گھر خود ہی معلوم کر لوں گا۔"

"خیر۔۔۔۔ میری معلومات اتنی کم بھی نہیں ہیں۔ میں تو یوں ہی تمہیں ذرا زیادہ ایکٹو ہونے کا موقع فراہم کر رہا تھا۔ ایک ایڈریس نوٹ کرو۔۔۔۔" اس نے مجھے کلفٹن کا ایک ایڈریس نوٹ کرایا۔ میں ایڈریس نوٹ کر چکا تو وہ بولا "یہ ایک بنگلا ہے لیکن اس میں پرنس سیرا کی رہائش نہیں ہے۔ اسے وہ اپنا اسٹوڈیو کہتی ہے اور اس کا زیادہ وقت یہیں گزرتا ہے۔ یہاں موصوفہ مصوری، مجسمہ سازی وغیرہ فرماتی ہیں۔"

"اوہ۔۔۔۔ یہ شوق بھی ہیں موصوفہ کو؟" میں نے گہری سانس لی۔

"ہاں۔۔۔۔ لیکن یہ شوق زیادہ پرانا نہیں ہے۔ آج کل موصوفہ چوں کہ ایک غیر شادی شدہ خاتون کی حیثیت سے زندگی گزار رہی ہیں اس لیے شاید زندگی میں کوئی کمی نہ ہونے کے باوجود کوئی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اسی لیے شاید یہ مشاغل اختیار کر لیے ہوں۔ یہ بنگلا موصوفہ نے انہی خرافات کے لیے مخصوص کیا ہوا ہے۔"

"رمضان ڈیئر! ٹھیک ہے، تم ایک بدذوق سیٹھ ہو لیکن بول

اس کا اعلان تو مت کرو۔ تم مصوری اور مجسمہ سازی وغیرہ کو خرافات کہہ رہے ہو۔" میں نے افسوس سے کہا۔

"میں مصوری اور مجسمہ سازی کو خرافات نہیں کہہ رہا ہوں۔" سیٹھ رمضان بولا "لیکن مجھے یقین ہے کہ مصوری' اور مجسمہ سازی کے نام پر جو کچھ پرنس سیمرا کرتی ہوگی وہ خرافات ہی ہوگی کیوں کہ میں نے آج تک کسی نمائش میں اس کے فن پارے نہیں دیکھے۔ آرٹ کے دلدادہ حلقوں میں کہیں اس کا ذکر نہیں سنا۔"

"شاید ابھی اسے اس طرف توجہ دینے کی فرصت نہ ملی ہو۔" میں نے کہا "لیکن اگر وہ دولت مند ہے تو پھر رفتہ رفتہ سب کچھ ہونے لگے گا۔ نمائشیں بھی ہو جائیں گی۔ ذکر بھی سنائی دینے لگے گا چاہے مصوری اور مجسمہ سازی میں اس کا عمل دخل ہو یا نہیں۔"

"ہاں..... یہ بھی عین ممکن ہے۔" سیٹھ رمضان بولا "لیکن ہمیں اس سے غرض نہیں۔ وہ بے شک پکاسو کی جانشین بن جائے' ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ تم اس سے مل کر میرے دوست کا مسئلہ حل کرادو۔ ہماری غرض تو صرف اتنی ہے۔ اس سے آگے اگر تمہاری کوئی غرض نکل آئے تو اس سے بھی ہمیں کوئی غرض نہیں۔"

"اب اتنے بے غرض بننے کی کوشش مت کرو۔ میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں بوڑھے شیطان!"

اس نے ایک کونجیلا سا قہقہہ لگایا اور خوش گوار لہجے میں بولا "مجھے شیطان بے شک کہہ لو لیکن بوڑھا مت کہو یار!"

"بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اکثر بوڑھوں کی یہی فرمائش ہوتی ہے۔"

"اچھا فضول باتیں چھوڑو۔ ہم دونوں بڑے بزنس مین ہیں۔ ہمارا وقت قیمتی ہے۔ ہمیں اس کو فضول باتوں میں ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" اس کے لہجے میں سنجیدگی آگئی۔

"اب تک ہم کیا کر رہے تھے؟" میں نے کہا "زیادہ تر تو ہم نے بکواس ہی کی ہے۔ کام کی بات تو اس میں بہت کم کم تھی۔"

"یہ تو خیر ہمارا اسٹائل ہوا....." سیٹھ رمضان بولا "اگر ہم فون کا ریسیور کان سے لگاتے ہی کام کی بات کرنا شروع کردیں اور ریسیور رکھنے تک صرف کام کی بات ہی کرتے رہیں تو ہماری صحت پر اس کے نہایت مضر اثرات پڑ سکتے ہیں۔ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہے اور تم اسی کے قائل ہو مگر خواہ مخواہ مدبر بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ کام کی خشک باتوں کو اِدھر اُدھر کی تر باتوں میں ملا کر جو معجونِ گفت وشنید تیار ہوتا ہے وہ صحت کے لیے نہایت مفید ہوتا ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ میں نتائج جاننے کے لیے تمہیں کب فون کروں؟"

"میں خود ہی فون کرلوں گا۔" میں نے ایک لمحہ سوچ کر کہا۔

"لیکن یار..... یہ کام ذرا جلدی کرنا ہے۔"

"یار.....! تم اصرار کر رہے ہو تو میں آج ہی اس لڑکی سے ملنے چلا جاتا ہوں ورنہ تمہیں معلوم ہی ہے کہ مجھے تو لڑکیوں سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔" میں نے گویا بادلِ ناخواستہ کہا۔

"ہاں..... واقعی۔" سیٹھ رمضان نے سنجیدگی سے کہا "میں نے خود برسوں تمہیں ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ جس جس طرف خواتین بیٹھی تھیں تم ادھر سے منہ پھیر پھیر کر گزر رہے تھے اور اگر اچانک کوئی خاتون تمہارے سامنے آ بھی جاتی تھی تو تم آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتے تھے۔ تمہاری اس بے نیازی کا تذکرہ تو اخباروں میں بھی آتا رہتا ہے۔ شرفا اور معززین کی محفلوں میں اس کی مثالیں دی جاتی ہیں۔"

"لیکن تم جیسے دوستوں کی وجہ سے مجھے کتنا ایثار کرنا پڑتا ہے۔ کتنی قربانی دینا پڑتی ہے کہ خود جا جا کر خوب صورت خواتین سے ملنا پڑتا ہے۔" میں نے کراہ کر کہا "بہرحال..... اسی کا نام زندگی ہے۔ انسان دوسروں کے لیے ایثار نہ کرے تو جینے کا فائدہ ہی کیا..... اچھا..... خدا حافظ..... میں جلد ہی فون کر کے بتاؤں گا کہ ملاقات کا نتیجہ کیا رہا۔ ٹھیک ہے؟"

"ٹھیک ہے۔" اس نے طمانیت سے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

○☆○

اس شام جب میں اس بنگلے پر پہنچا تو مجھے خاصی حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ میرے ذہن میں کچھ ایسا تصور تھا جیسے اس بنگلے کے گیٹ پر کئی مسلح گارڈ تعینات ہوں گے اور پرنس سیمرا سے ملنا واقعی کارے دارد ہوگا۔ معلوم نہیں کس کس کی پوچھ گچھ کا سامنا کرنا پڑے گا اور کن کن مراحل سے گزرنا پڑے گا لیکن اس بنگلے کے گیٹ پر مجھے کوئی باوردی مسلح گارڈ تو کیا' کوئی عام روایتی ڈنڈا بردار قسم کا چوکی دار بھی نظر نہ آیا۔

بنگلے کی ساخت البتہ اس اعتبار سے بہت اچھی تھی کہ اس میں حفاظتی اقدامات کا بہت خیال رکھا گیا تھا۔ چار دیواری کچھ اس قسم کی تھی اور اس پر ایسے انتظامات موجود تھے کہ اسے پھلانگ کر یا کسی اور طریقے سے کسی کا اندر پہنچنا تقریباً ناممکن ہی نظر آتا تھا۔ اس کے باوجود در و دیوار سے شاعرانہ حسن بھی نمایاں تھا۔ صاف نظر آتا تھا کہ بنگلے کی تعمیر میں کسی صاحبِ ذوق کا بھی ہاتھ تھا۔

بنگلا زیادہ طویل و عریض نہیں تھا لیکن اس کی مارکیٹ ویلیو یقیناً بہت زیادہ تھی۔ گو کہ وہ کسی بارونق جگہ پر واقع نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کی لوکیشن بہت اہم تھی اور اسے باہر ہی سے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اندر سے وہ نہایت پُر آسائش ہوگا۔ اس کے اردگرد اس سے کہیں زیادہ طویل و عریض بنگلے پھیلے ہوئے تھے لیکن بہت سے پلاٹ خالی بھی تھے۔ علاقے میں ویرانی کا راج نظر آتا تھا۔

بنگلے کی دیوار پر ایک خوب صورت تختی پر جلی انداز میں صرف بنگلے کا نمبر درج تھا جو مجھے دور سے ہی نظر آگیا تھا اور میں نے

اپنی گاڑی وہیں ایک طرف روک کر کھڑی کردی تھی۔ چند قدم پیدل چل کر میں گیٹ تک پہنچا۔ نمبر والی تختی پر اور کچھ بھی درج نہیں تھا اور نہ ہی کہیں کوئی دوسری تختی نظر آرہی تھی۔

گیٹ کے پلر میں انٹرکام نصب تھا۔ میں نے کال بیل بجائی اور انٹرکام کے قریب ہو کر کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ انٹرکام پر کوئی آواز سنائی دے گی جو میرے بارے میں استفسار کرے گی۔ میں نے متوقع سوالوں کے جواب کافی حد تک سوچ رکھے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں پرنس سیمرا سے کوڑل جان کڑیالی کا وکیل بن کر ملنے کی کوشش کروں گا۔ آگے چل کر جو بھی صورتِ حال ہوگی اس کی مناسبت سے کوئی قدم اٹھاؤں گا۔

اس وقت مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا جب انٹرکام پر کوئی آواز سنائی دینے کے بجائے چھوٹا گیٹ اچانک کھل گیا اور میں نے ایک خوب صورت لڑکی کو سامنے کھڑے پایا۔ وہ غیر معمولی طور پر خوب صورت تھی اور اس قسم کی شخصیتوں میں سے تھی جو اچانک سامنے آجائیں تو ویسے بھی حیرت کا ایک خوش گوار سا جھٹکا لگتا ہے۔ اس وقت اور اس جگہ اس کا اچانک گیٹ کھول کر سامنے آجانا میرے لیے یوں بھی حیرت کا باعث تھا کہ میں ایک پرنس سے تو کیا' کسی عام آدمی سے بھی اس بے احتیاطی کی توقع نہیں کرسکتا تھا کہ وہ محض کال بیل سن کر گیٹ کھول دے گا۔

شاید اس نے میجک آئی یا کسی خفیہ روزن سے میرا جائزہ لیا ہو لیکن گیٹ کھولنے سے پہلے کوئی پوچھ گچھ نہیں کی تھی۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ وہ میرا معززانہ حلیہ دیکھ کر مطمئن ہوگئی ہو۔ وہ کچھ ایسی نوخیز نوجوان تو نہیں تھی لیکن نہ جانے کتنی نوخیز نوجوان لڑکیوں سے زیادہ حشر خیز شخصیت کی مالک تھی..... اور پھر دولت مندی کی اپنی ایک عجیب چمک دمک ہوتی ہے جو انسان کی شخصیت کے گرد ایک غیر مرئی سا ہالہ بنادیتی ہے۔ یہ ہالہ کسی خوب صورت شخصیت کو مزید خوب صورت بنادیتا ہے۔ وہ ویلوٹ کے سیاہ چست ٹراؤزر اور ہلکی پھلکی سی سفید شرٹ میں تھی۔ تراشیدہ بال کندھوں سے ذرا اوپر جھول رہے تھے۔ اس کی شربتی سی آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ اس کے باوجود اس کا چہرہ ایک لاابالی لڑکی کا چہرہ تھا۔

مجھے حیرت کا دوسرا جھٹکا اس وقت لگا جب وہ گہری نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے یوں مسکرائی جیسے مجھے جانتی ہو۔ ایک لمحے کے لیے تو میں اپنے پروگرام پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہوگیا اور سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس کے سامنے وکیل بننے کی کوشش کروں یا نہ کروں؟ کہیں وہ مسکراتے ہوئے کہہ ہی نہ دے "فضل صاحب! مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ آپ ہوٹل کے مالک اور بزنس مین ہونے کے علاوہ وکیل بھی ہیں۔"

پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو تسلی دی کہ یہ اس کے لیے کوئی ایسی تشویش کی بات نہیں ہوسکتی تھی کیوں کہ بہت سے لوگ تعلیم کے اعتبار سے کچھ اور ہوتے تھے لیکن وہ کسی اور پیشے یا بزنس میں بہت کامیاب ہو جاتے تھے۔ اس نے مجھے میرے نام سے تو مخاطب نہیں کیا لیکن وہ مجھے حیرت کا ایک اور جھٹکا دینے پر بہرحال تلی ہوئی تھی۔ نہایت شیریں لہجے میں وہ انگریزی میں بولی "کیسے ہو.....؟ اندر آجاؤ نا....."

اس کے اس مہرباں لہجے پر میرے دل میں تھوڑی سی کھد بد ہوئی۔ میں نے اپنے ذہن کے گرد آلود گوشوں کو کھنگالا۔ ایسا تو ہرگز نہیں ہوسکتا تھا کہ میں ایسی کسی لڑکی سے ملا ہوتا' اس سے میری تھوڑی بہت شناسائی رہی ہوتی اور میں اسے بھول گیا ہوتا۔ میں نے اس امکان کو یکسر مسترد کردیا۔ بات کچھ اور تھی۔ اس بات کو جاننے کے لیے اس کی دعوت قبول کرنا ضروری تھا۔ ویسے بھی مجھے اپنا کام تو کرنا ہی تھا۔

اس کے خوب صورت ہونٹوں پر روشن مسکراہٹ برقرار تھی اور اس کے عقب میں کہیں کوئی مسلح یا غیر مسلح آدمی نظر نہیں آرہا تھا اس لیے میں نے چھوٹے گیٹ سے اندر قدم رکھ دیا تاہم میرا ہاتھ اب بھی اس جیب میں تھا جس میں ایک چھوٹا اور ہلکا پھلکا سا لیکن نہایت خطرناک پستول موجود تھا۔ پرنس سیمرا کی مہرباں مسکراہٹ بے شک دل کو گرمانے والی تھی لیکن اس نے مجھے شک میں بھی مبتلا کردیا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اندر پہنچنے پر مجھے اچانک کسی گڑبڑ کا سامنا کرنا پڑتا۔ میں اس کے لیے تیار تھا۔

اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دیا پھر گیٹ بند کرتے ہوئے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کے وجود کی دل فریب مہک میرے حواس میں ارتعاش سا پیدا کر رہی تھی۔ میں نے "پہلے آپ" والے انداز میں اسے آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اور روشن ہوگئی۔ اس کا قیامتیں جگانے والا سراپا اپنی سحرانگیز خوش بُو کے حلقے میں ہلکورے لیتا میرے آگے چل دیا۔

میں اپنے حواس کو ہلچل سے بچانے کے لیے اِدھر اُدھر توجہ دینے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے گرد و پیش کا جائزہ بھی لینا تھا۔ ہم جس مرمریں راستے پر چل رہے تھے وہ طویل نہیں تھا اور اس کے دونوں طرف پھیلا ہوا لان بھی طویل و عریض نہیں تھا لیکن اس کی خوب صورتی مثالی تھی۔ لان ڈھلوان تھا اور اس پر جا بجا موجود رنگا رنگ پھولوں کی ترتیب و آرائش کسی ماہر باغبان کے ہاتھوں کی رہینِ منت معلوم ہوتی تھی۔ اس قسم کے لان زیادہ تر تصویروں میں ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔

وکٹورین طرز کا ایک بڑا سا چوبی دروازہ کھول کر ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔ اس میں قدم رکھتے ہی احساس ہوا کہ ہم ایک بڑے آرٹ اسٹوڈیو میں داخل ہوگئے ہیں۔ ہال میں ایک نہیں بلکہ کئی ایزل استادہ تھے جن پر کئی مکمل اور نامکمل پینٹنگ نظر آرہی تھیں۔ دیواروں پر بھی پینٹنگز آویزاں تھیں۔ کچھ پینٹنگز فرش پر بھی دیواروں کے سہارے کھڑی تھیں۔

سیٹھ رمضان کی باتوں سے تو یہی اندازہ ہوا تھا کہ پرنسس سیمرا کو آرٹ کی دنیا میں قدم رکھے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا۔ یہ اس کا نیا نیا شوق تھا لیکن پینٹنگز کی تعداد اس اعتبار سے حیران کن تھی مگر جب میں نے ان پر اچٹتی ہوئی سی نظر ڈالی تو احساس ہوا کہ اس میں حیرانی کی کچھ ایسی بات نہیں تھی۔ کوئی بھی آرٹسٹ کوشش کرتا تو دن میں اس قسم کی آٹھ دس پینٹنگز تو تیار کر ہی سکتا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ان کے فریم تیار ہونے میں اس سے زیادہ وقت لگا ہوگا جتنا پینٹنگز تیار ہونے میں لگا ہوگا۔ ایک طرف ایک بڑی سی میز پر بہت سے برش، رنگ، کوئلے اور نہ جانے کیا کیا کاٹھ کباڑ رکھا تھا۔

میں تجریدی آرٹ کا کچھ ایسا قدر داں نہیں تھا لیکن اس کا مخالف بھی نہیں تھا مگر پرنسس سیمرا کی پینٹنگ تو تجریدی آرٹ سے بھی کچھ آگے کی چیزیں معلوم ہوتی تھیں۔ لگتا تھا بہت سے بچوں نے رنگوں میں برش لتھیڑ کر کینوس پر جنگ وجدل کا مظاہرہ کیا تھا۔ صرف ایک ایزل پر لگی ہوئی ایک نامکمل پینٹنگ کا کچھ سر پیر سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ کسی لڑکی کی پورٹریٹ تھی۔ غالباً کسی ترک لڑکی کی تصویر بنانے کی کوشش کی گئی تھی تاہم وہ کوئی پاکستانی قبائلی لڑکی بھی ہوسکتی تھی۔

اس گھر کی ساخت بھی گویا پرنسس سیمرا کی ضروریات کے مطابق تھی اور اس میں شاید ایک باقاعدہ قسم کے بڑے آرٹ اسٹوڈیو کے تمام لوازمات موجود تھے۔ اس ہال سے آگے ایک اور طویل وعریض ہال تھا۔ اس میں بہت سے اسٹینڈز پر طرح طرح کے مجسمے موجود تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر بھیانک مجسمہ موجود تھا۔ پرنسس سیمرا نے غالباً اپنی دانست میں تو انسانوں کے ہی مجسمے بنائے تھے لیکن معلوم یہی ہوتا تھا کہ وہ انجانے سیاروں سے حملہ آور ہونے والی نہ جانے کس کس مخلوق کی یادگاریں تھیں۔ ان میں سے کچھ مجسمے مٹی کے تھے۔ کچھ پتھر سے تراشے گئے تھے اور کچھ شاید کوئلے سے۔ پرنسس غالباً ہر میدان میں طبع آزمائی کررہی تھی۔

تاہم ان تمام چیزوں کی مضحکہ خیزی کے باوجود میں یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا کہ اس میں مصوری اور مجسمہ سازی کی صلاحیتیں موجود تھیں اور اس میدان میں قدم رکھ کے اس نے غلطی نہیں کی تھی لیکن اسے بہت محنت اور ماہرین فن سے رہنمائی حاصل کرنے کی ضرورت تھی جس کی اس سے امید نہیں رکھی جاسکتی تھی۔

دوسرے ہال سے گزر کر ہم ایک نشست گاہ میں پہنچے۔ اس کی آرائش سے بھی پوری طرح اظہار ہوتا تھا کہ وہ کسی آرٹسٹ کی نشست گاہ تھی۔ فرنیچر عجیب ساخت کا تھا۔ پردے مختلف رنگوں کے تھے۔ ایک طرف میز پر ایک کائی زدہ نیم شکستہ گھڑا اور مختلف سائز کے کئی سال خوردہ پتھر رکھے ہوئے تھے۔ ممکن ہے وہ نوادرات میں سے رہے ہوں لیکن انہیں دیکھتے ہی بے اختیار میرا دل چاہا تھا کہ اٹھا کے باہر پھینک دوں۔ ایک صوفے کے پیچھے سے ایک اچھا بھلا چھوٹا سا درخت بھی سر نکالے کھڑا تھا۔ اس پر ایک کبوتر بیٹھا اڑنے کے لیے پر تول رہا تھا۔ اسے دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ اب اڑا کہ تب اڑا لیکن چند سیکنڈ انتظار کے بعد بھی جب وہ نہیں اڑتا ہوگا تب دیکھنے والے کی سمجھ میں آتا ہوگا کہ وہ حنوط شدہ تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے مجھے اسی کبوتر کے زیر سایہ ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ لہجے میں ہلکا سا تحکم تھا۔ شاید یہ تحکم اس کے لہجے میں اکثر ہی شامل رہتا ہو۔

میں نہایت سعادت مندی سے بیٹھ گیا۔ وہ میرے قریب آکر گردن کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف جھکائے ہوئے یوں غور سے میرا معائنہ کرنے لگی گویا وہ کوئی مرد فلم ڈائریکٹر تھی اور میں ہیروئن بننے کی شوقین کوئی لڑکی۔ ڈائریکٹر صاحب گویا تنقیدی نظروں سے ہر زاویے سے امیدوار لڑکی کا معائنہ فرما رہے تھے۔ اگر وہ اونچے درجے کی چیز نہ ہوتی تو میں یہ مثال بھی دے سکتا تھا کہ وہ اپنے کام میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لینے والے اس حجام کی طرح میرا جائزہ لے رہی تھی جس کی دکان میں کوئی گاہک پہلی بار داخل ہوا تھا اور وہ جائزہ لے رہا تھا کہ اس کے بال کس کس زاویے اور کس کس انداز سے کاٹنا مناسب رہے گا۔

میں گو کہ گیٹ پر ہی چند سیکنڈ میں اس کا خاصا تفصیلی جائزہ لے چکا تھا لیکن اب موقع غنیمت جانتے ہوئے میں نے مزید گہری نظر سے گویا جواباً اس کا جائزہ لے ڈالا۔ وہ اسی قسم کی شخصیات میں سے تھی جن کا زیادہ قریب سے تفصیلی جائزہ لینا حواس کے لیے صبر آزما کام تھا۔ اس کی عمر اٹھائیس تیس کے قریب ہوگی۔ اس عمر میں وہ دو مرتبہ کی طلاق یافتہ تھی۔ گزرے ہوئے ماہ وسال نے گویا اس کا کچھ بگاڑا نہیں بلکہ سنوارا ہی تھا۔ میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں مجھے کچھ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے وہ پہلے سے زیادہ دلکش، پہلے سے زیادہ ہوشربا تھی۔ اس نے ابھی تک اپنا تعارف کرانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ شاید وہ محسوس کرتی ہو کہ اس کی شخصیت تعارف کی محتاج نہیں تھی۔ کم از کم میری حد تک یہ بات درست تھی۔ میں نے کچھ عرصہ پہلے تک بعض رسالوں میں اس کی جو تصویریں دیکھی ہوئی تھیں ان کی یاد کے سہارے اسے پہچان لیا تھا۔

اب تو میں دوبارہ اس الجھن میں تھا کہ کیا وہ بھی مجھے پہچانتی تھی؟ مگر اس نے اچانک بلاتمہید ایک سوال کرکے میری یہ الجھن دور کردی۔ سوال یہ تھا "تمہارا نام کیا ہے؟" بظاہر اس سوال کا مطلب یہی تھا کہ وہ مجھے نہیں جانتی تھی۔

"فضل چوہدری۔" میں نے گویا سکون کی سانس لیتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی مسکراہٹ جو چند لمحے کے لیے غائب ہوگئی تھی، لوٹ آئی اور وہ خاصے شیریں لہجے میں بولی "میں "آپ جناب" کے تکلفات کے ساتھ بات نہیں کروں گی۔ امید ہے تم برا نہیں مناؤ گے۔ تم بھی چاہو تو مجھے "تم" کہہ کر مخاطب کرسکتے ہو۔ میں ہرگز برا نہیں مناؤں گی۔"

"بہت بہتر۔" میں نے اپنے چہرے سے خوشی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"تمہاری عمر کیا ہے؟" اس نے دوسرا سوال کیا۔

"بالکل صحیح تو مجھے معلوم نہیں۔ اندازاً بتیس سال ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا بھی یہی اندازہ تھا۔" اس نے طمانیت سے سر ہلایا پھر پوچھا "غیر شادی شدہ ہو؟"

میں نے اقراراً گردن ہلادی۔

"یعنی تمہاری کبھی شادی، طلاق، منگنی وغیرہ نہیں ہوئی؟" اس نے گویا مزید وضاحت چاہی۔

"نہیں۔۔۔ میں ابھی تک ان خرافات کے قریب نہیں پھٹکا۔" میں نے جواب دیا۔

"حیرت ہے تم ابھی تک شادی سے کیسے بچے ہوئے ہو۔۔۔!" اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے شادی کوئی چھوت کی بیماری تھی اور اس علاقے میں عرصہ دراز سے پھیلی ہوئی تھی۔

"بس۔۔۔ کچھ اتفاقات ایسے رہے کہ شادی نہیں ہوسکی۔۔۔ اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے اپنی خوش قسمتی کہوں یا بدقسمتی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"فی الحال تو اسے خوش قسمتی ہی سمجھو۔" وہ مبہم سے لہجے میں بولی پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا "تمہیں معلوم ہے کہ تم ایک اچھے خاصے ہیرو ٹائپ آدمی ہو؟"

"نہیں میڈم! مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ کسی نے مجھے بتائی ہی نہیں تھی۔" میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا "ویسے آپ خود ارے ہاں کی کئی ہیروئنوں سے بہتر ہیں۔"

اپنی تعریف سن کر بھی اس کے چہرے پر خوشی کا کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ اس نے یقیناً زندگی میں بے تحاشا اپنی تعریفیں سنی ہوں گی۔ وگرنہ تعریف ایسی چیز ہے کہ جسے سننے سے بیشتر انسانوں کا کبھی دل نہیں بھرتا لیکن شاید اس کا بھر چکا تھا یا وہ ظاہر یہی کرنا چاہتی تھی۔

"ویسے۔۔۔ تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو نا؟" اس نے پرخیال سے لہجے میں پوچھا۔

"ٹھیک ٹھاک۔۔۔؟" میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں "یا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ دیکھنے میں تو تم بالکل صحت مند اور مضبوط لگ رہے ہو۔ حقیقت میں بھی ایسے ہی ہو نا؟ میرا مطلب ہے تمہیں کوئی بیماری وغیرہ تو لاحق نہیں ہے؟"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مجھے زندگی میں دو چار مرتبہ سردرد ہوا ہے۔ ایک مرتبہ چوٹ کی انفیکشن کی وجہ سے بخار کے سوا کبھی کچھ نہیں ہوا۔" میں نے قدرے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہاں آتے ہی میرا کس قسم کا انٹرویو شروع ہوگیا تھا۔ مجھے اس کے ذہنی توازن کے بارے میں کچھ شبہ سا ہونے لگا تھا حالاں کہ اس کی آنکھوں میں اس قسم کی کوئی مبہم سی علامت بھی موجود نہیں تھی۔

پھر میں نے اٹھنے کے لیے پر تولتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کس قسم کے سوالات۔۔۔"

اس نے بے تابی سے مجھے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور خود سامنے ہی ایک کاؤچ پر نیم دراز ہوگئی۔ اب اس کے خدوخال کچھ اور بھی قیامت ڈھانے لگے لیکن اس کی پیشانی پر ناگواری کی ہلکی سی شکنیں ابھر آئی تھیں۔ وہ تیکھے لہجے میں بولی "سوالات جو بھی ہیں اور جیسے بھی ہیں، تمہیں ان کے جوابات دینے ہوں گے۔ اگر تمہیں یہ سوالات ناگوار گزریں تو تم جاسکتے ہو۔ تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کیا جو کھلا ہی تھا۔

تجسس نے مجھے مجبور کیا کہ وہ جو بھی کھیل کھیل رہی تھی میں اس میں اس کا ساتھ دوں تبھی میری سمجھ میں آسکتا تھا کہ یہ کیا چکر تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ سیدھے سادے طریقے سے وہ میرے سوالوں کا جواب دے گی۔ سوال کرنے کا اختیار وہ یقیناً صرف اپنے ہی پاس رکھنا چاہتی تھی۔

میں نے اپنے لہجے کو خوش گوار بناتے ہوئے کہا "اگر آپ کو میری صحت کے بارے میں کسی قسم کا کوئی شک وشبہ ہے تو مجھے موقع دیجیے۔۔۔ میں کل اپنا ہیلتھ سرٹیفکیٹ لاکر پیش کردوں گا۔"

"سرٹیفکیٹوں کا کیا ہے۔ وہ تو جعلی بھی بن جاتے ہیں۔ ٹی بی کے مریض بہترین صحت کا سرٹیفکیٹ لے کر ملک سے باہر چلے جاتے ہیں اور وہاں ملازمت کرنے لگتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی "میں سرٹیفکیٹوں پر یقین نہیں رکھتی۔"

"تو پھر کسی قسم کے عملی مظاہرے کا حکم دیجیے۔" میں نے پراشتیاق لہجے میں کہا اور سامنے پڑی بے ہودہ سی چوبی تپائی کی طرف اشارہ کیا "اسے ایک گھونسے میں توڑ کر دکھاؤں؟"

"اپنی طاقت کا ایسا مہنگا مظاہرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تپائی چالیس پچاس ہزار روپے کی ہے۔ یہ اسے امپورٹ کی گئی ہے۔" وہ ملائمت سے بولی۔

مجھے معلوم تھا کہ وہاں موجود بہت سی چیزیں جو دیکھنے میں ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی تھیں، اس سے بھی زیادہ مہنگی ہوں گی۔ بعض دولت مندوں کو ایسی چیزوں پر بھی پیسے خرچ کرنے کا شوق ہوتا ہے جن کے مہنگے ہونے کی وجوہات یوں ہی فضول سی ہوتی ہیں۔

میں نے ادھر ادھر دیکھا تو ایک ٹیلی فون ٹرالی پر مجھے تین عدد موٹی موٹی ڈائریکٹریاں رکھی نظر آئیں۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہاں شاید سب سے سستی چیز یہی ہے۔ میں ان میں سے کسی بھی ڈائریکٹری کو دونوں ہاتھوں

ٹکڑے کر کے دکھاؤں؟"

"نہیں..... نہیں..... اس کی ضرورت نہیں۔" وہ جلدی سے ہاتھ اٹھا کر بولی "تم سے تمہاری صحت کے بارے میں سوال کرنے کا مقصد یہ نہیں تھا کہ تم پہلوانی کے مظاہرے شروع کردو۔ یہ بتاؤ تمہارا ذریعۂ معاش کیا ہے؟ گزر اوقات کے لیے کیا کرتے ہو؟"

اس انٹرویو سے اب میں کچھ محظوظ ہونے لگا تھا۔ الٹے سیدھے جواب دینے میں کچھ لطف آنے لگا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر میں نے اسے اپنی اصل حیثیت کے بارے میں بتادیا تو یہ سلسلہ یہیں ختم ہوجائے گا اور میں شاید اس کا اصل مقصد نہیں جان سکوں گا۔ اس لیے میں نے کچھ دیر اور اِدھر اُدھر کی ہانکنے کا فیصلہ کیا۔

"میں فلموں میں اسٹنٹ مین ہوں۔" میں نے جواب دیا "کبھی کبھی فلموں میں ہیرو کے ڈپلی کیٹ کے طور پر بھی کام کرتا ہوں اور اس کے حصے کے خطرناک کام انجام دیتا ہوں۔ اس کے علاوہ فلموں میں جو مشکل مشکل سین نظر آتے ہیں اور انوکھی حرکتیں دکھائی جاتی ہیں ان کے پیچھے اکثر مجھ جیسے لوگوں کا ہاتھ ہی ہوتا ہے لیکن آپ کو معلوم ہے کراچی میں فلمیں بہت کم بنتی ہیں اور میرے حالات مجھے لاہور جانے کی اجازت نہیں دیتے اس لیے سال میں ایک آدھ مرتبہ ہی کام ملتا ہے۔"

وہ سرہلاتے ہوئے مربیانہ انداز میں مسکرائی "میں سمجھ گئی۔ تم دراصل یہ کہنا چاہتے ہو کہ زیادہ تر تم بے روزگار رہتے ہو....." اس کی آنکھوں میں خفیف سی ہمدردی بھی جھلک آئی "اور تم رہتے کہاں ہو افضل؟"

"زیادہ تر کسی پبلک پارک میں ہی ڈیرا لگاتا ہوں۔ جہاں کوئی بنچ خالی مل جائے اور پولیس والے تنگ نہ کریں وہاں رات گزر جاتی ہے۔" میں نے جواب دیا "ان دنوں زیادہ ٹھنڈ نہیں ہے اس لیے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔"

اس نے تفہیمی انداز میں سرہلایا اور چند سیکنڈ کے لیے کچھ نہ بولی۔ وہ کچھ سوچ رہی تھی حالاں کہ وہ ذہن پر زور دینے کی عادی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ تبھی تو اس نے میرے جھوٹ کو آسانی سے ہضم کرلیا تھا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ کئی ہزار کا تو میں نے سوٹ پہن رکھا تھا اور میری شخصیت میں کہیں بھی وہ ایک خاص قسم کا لاابالی پن نظر نہیں آرہا تھا جو پارک کی بنچوں پر سونے والوں کی نشانی بن جاتا ہے' کیا میں کسی ایسے پارک کی بنچ پر سوتا تھا جہاں گھر کی سی تمام سہولیات میسر تھیں؟ پھر میں نے سوچا کہ شاید اس نے فرض کرلیا ہو کہ آج کے اس موقع کے لیے میں خاص طور پر بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آیا تھا۔

"مجھے تمہاری یہ راست گوئی پسند آئی افضل! تم بے شک بے ہو' پارکوں میں بنچوں پر سوتے ہو لیکن تمہاری شخصیت میں اذ ہے۔ تم اس موقع پر کسی امیر کبیر آدمی کی طرح اہتمام سے تیار ہو کر آئے ہو....."

میں اندر ہی اندر کراہ کر رہ گیا۔ اس نے اپنے آپ کو اسی احمقانہ جواز سے مطمئن کرلیا تھا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تم نے گھگھیانے' گڑگڑانے یا میری ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ بہرحال..... یہ تو تمہیں اندازہ ہی ہوگا کہ اگر اس عمر تک تمہارا یہ حال ہے تو پھر تمہارا مستقبل روشن ہونے کا امکان بھی ذرا کم ہی ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"مستقبل تو سبھی انسانوں کا ایک جیسا ہوتا ہے۔" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

"یہ بات تو میں نے آج پہلی مرتبہ سنی ہے۔" وہ قدرے حیرت سے بولی "سب انسانوں کا مستقبل بھلا ایک جیسا کیسے ہوسکتا ہے؟"

"دیکھیں نا..... ہر انسان پیدا ہوتا ہے..... زندگی میں نہ جانے کیا کچھ کرتا ہے لیکن انجام کار وہ مر جاتا ہے نا..... اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اپنی مختصر سی زندگی میں وہ کیا کرتا رہا۔ انجام تو سب کا ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے فلسفیانہ لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے تم اپنی اس زندگی سے مطمئن ہو؟ تم کچھ بھی کرنا نہیں چاہتے؟ مستقبل کے بارے میں تمہارے کچھ عزائم نہیں ہیں؟"

"کیوں نہیں ہیں....." میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں بھی زمین پر اپنی بہت سی جائداد اور بینک میں بہت سی دولت چھوڑ کر مرنا چاہتا ہوں۔ یہ آج کے دور کے ہر انسان کا خواب ہے۔"

"تم کچھ قنوطی انسان معلوم ہوتے ہو۔" وہ آنکھیں سکیڑ کر گویا ایک نئے زاویۂ نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولی "تمہیں دنیا میں جو تکالیف اور دشواریاں اٹھانی پڑی ہوں گی شاید ان کی وجہ سے دنیا کے بارے میں تمہارا رویہ تلخ ہے اور تمہیں دنیا والوں سے بہت سی شکایات ہیں۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے پُرزور لہجے میں کہا "میں تو بڑا خوش مزاج آدمی ہوں۔ مجھے دنیا سے کوئی شکایت نہیں..... بلکہ عین ممکن ہے دنیا والوں کو مجھ سے بہت سی شکایات ہوں۔ اس دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جن کا میں نے ناک میں دم کیا ہے۔"

"اوہ....." اس نے گویا طمانیت کی سانس لی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر تشویش کی ایک نئی لہر ابھری "کہیں تم سیاسی قسم کے آدمی تو نہیں ہو؟ کسی سیاسی پارٹی کے ورکر تو نہیں ہو؟"

"میں..... اور سیاسی ورکر؟" میں نے تکلیف کے عالم میں ہلکا سا قہقہہ لگایا "یہ دل دکھانے والی باتیں کرتی ہیں؟ ہمارے ہاں آج تک جس قسم کی سیاست کی گئی ہے اور اس نے اس ملک کا جو حشر کیا ہے اس کے بعد مجھے سیاست سے نفرت ہوگئی

ہے۔ میرے بس میں ہو تو کم از کم سو سال کے لیے سیاست پر پابندی لگوا دوں اور اس دوران میں صرف تعلیم' معاشی ترقی اور جذبۂ انسانیت کو فروغ دینے کے لیے کچھ ہنگامی اور انقلابی اقدامات کروں۔ اگر سو سال بعد کچھ ماہرین یہ محسوس کریں کہ لوگ سیاست جیسے خطرناک کھلونے سے کھیلنے کے قابل ہو گئے ہیں تو پھر یہ کھلونا ان کے ہاتھ میں دے دیا جائے۔"

"ہیئر۔۔۔ ہیئر۔۔۔!" اس نے تالی بجاتے ہوئے کچھ استہزائیہ سے انداز میں کہا "ویسے تو تم کہہ رہے ہو کہ تمہیں سیاست سے نفرت ہے لیکن تم نے چھوٹی سی جو یہ تقریر کی ہے یہ خود اپنی جگہ خاصی سیاسی ہے۔"

"فرق صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں تقریریں صرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لیے کی جاتی ہیں لیکن میں جو کچھ کہہ رہا ہوں سچے دل سے کہہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں نے جو بکواس کی تھی اس نے اس پر اچھا اثر ڈالا تھا یا بُرا۔ ویسے میری کوشش یہی تھی کہ اس وقت میرے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکلے جسے سن کر وہ ہتھے سے اکھڑ جائے مگر اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے سوالوں کے جواب میں کیا سننا چاہتی تھی اور کیا نہیں؟ بہرحال اس کے چہرے پر بے اطمینانی نہیں تھی۔

"تم کبھی گرفتار تو نہیں ہوئے؟" اچانک اس نے اگلا سوال کیا "کبھی کسی چکر میں تمہیں حوالات یا جیل کی ہوا تو نہیں کھانی پڑی؟"

میں نے ایک بار پھر اپنے چہرے پر دلی تکلیف کے آثار پیدا کیے اور مجروح سے لہجے میں کہا "خاتون! میں بے گھر اور غریب آدمی ضرور ہوں لیکن اتنا بھی غیر معزز نہیں ہوں کہ پولیس مجھے پکڑتی پھرے اور مجھے جیل یا حوالات کی سیر کرنی پڑے۔"

"اچھا۔۔۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔" اس نے طمانیت سے سر ہلایا "تمہارا حلیہ اور شخصیت بتاتی ہے کہ جب تم بُرے حال میں بھی ہوتے ہو گے تب بھی غیر معزز نہیں لگتے ہو گے۔ یہ بتاؤ۔۔۔ تم مستقل طور پر یہیں رہتے ہو نا؟" وہ گویا سوچ سوچ کر اس حساب سے سوال کر رہی تھی کہ میری شخصیت کے بارے میں کوئی بات جاننے سے رہ نہ جائے۔

"جی ہاں۔۔۔ میں یہیں رہتا ہوں۔۔۔ لیکن حالات بہتر ہونے کی امید ہو تو کہیں بھی رہ سکتا ہوں۔" میں نے اپنی دانست میں تسلی بخش جواب دینے کی کوشش کی۔

"ہوں۔۔۔!" اس نے ہنکارا بھرا اور کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے قریبی تپائی پر سے غیر ملکی سگریٹ کا ایک پتلا اور لمبا سا پیکٹ اُٹھایا۔ غیر ممالک میں' میں نے لڑکیوں کو اکثر ہی سگریٹ پیتے دیکھا تھا۔

"میں اگر سگریٹ پیوں تو تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہو گا؟" اس نے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبانے سے پہلے شائستگی سے پوچھا۔

"میں کون ہوتا ہوں جی اعتراض کرنے والا۔۔۔!" میں نے انکساری سے کہا "سگریٹ بھی آپ کی اپنی ہے۔ ہونٹ بھی آپ کے اپنے ہیں اور پھیپھڑے بھی بلا شرکت غیرے آپ کی اپنی ملکیت ہیں۔ آپ جس طرح بھی انہیں نقصان پہنچانا پسند کریں' پہنچا سکتی ہیں۔"

"ہوں۔۔۔" وہ مسکرائی "تمہارا یہ اندازِ گفتگو بتاتا ہے کہ تم سگریٹ نہیں پیتے۔"

"غریب آدمی ہوں خاتون! جتنی کم سے کم چیزیں پیوں' میرے حق میں اتنا ہی اچھا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب۔۔۔ تم دلچسپ آدمی ہو۔ معلوم نہیں کیوں تمہیں غریب تسلیم کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ بہرحال۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور ایک بار پھر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ دھوئیں کے مرغولوں کے پیچھے اس کا سوچ میں ڈوبا چہرہ کچھ اور دلکش دکھائی دینے لگا۔ وہ گویا کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہی تھی۔

پھر وہ شاید "بات برائے بات" کے خیال سے بولی "بعض لوگوں کو لڑکیوں کا سگریٹ پینا اچھا نہیں لگتا۔"

"مجھے تو مردوں کا بھی سگریٹ پینا اچھا نہیں لگتا لیکن یہ بات میں ان کے منہ پر نہیں کہتا۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ کوئی بھی ایسی بات نہ کہوں جس سے کسی کی دل آزاری کا معمولی سا امکان بھی ہو۔ ویسے میں کبھی کبھار شغل میں خود بھی سگریٹ وغیرہ پی لیتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ "وغیرہ" سے تمہاری کیا مراد ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"بس۔۔۔ جانے دیجئے۔۔۔" میں نے گویا قدرے شرما کر سر جھکا لیا۔

"خیر۔۔۔!" اس نے مبہم سے لہجے میں صرف اتنا کہا اور ایک بار پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ اس بار وہ کچھ زیادہ ہی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس کی نظر گو کہ اب بھی مجھ پر تھی لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اس کا ذہن کہیں دور پہنچا ہوا تھا۔ گو کہ میرے دل میں سخت کھد بد ہو رہی تھی۔ تجسس سے میرا بُرا حال تھا اور میں فوری طور پر جاننا چاہتا تھا کہ آخر وہ کس چکر میں تھی لیکن میں اپنے تجسس کو دبائے نہایت صبر و استقامت سے بیٹھا رہا۔ اپنے چہرے پر میں نے حتی الامکان سادگی اور معصومیت طاری کیے رکھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت مجھے اسی کی ضرورت تھی۔ میں اس کے چہرے پر گہری فکرمندی کی پرچھائیاں دیکھ رہا تھا۔ معلوم نہیں وہ کن تفکرات میں گھری ہوئی تھی۔ وہ بے پناہ دولت کی مالک تھی لیکن شاید دولت بھی اس کے مسائل حل نہیں کر سکی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ دولت ہی اپنے ساتھ مسائل لے کر آئی ہو۔ اس کے دونوں شوہروں نے اسے صرف طلاق ہی نہیں دی تھی بلکہ اس کے ساتھ بہت سی دولت و جائداد بھی دی تھی۔ پھر دو ماہ قبل اس کا باپ اپنی دو بیٹیوں کے نام کارخانے' کمپنیاں' بنگلے اور بینک بیلنس وغیرہ چھوڑ کر مر گیا تھا۔ اس کے بارے میں جس کسی کو بھی یہ باتیں معلوم ہوتیں وہ اس پر رشک ہی کر سکتا تھا لیکن میرے خیال میں یہ بات زیادہ قابلِ غور تھی کہ یہ سب کچھ میسر ہونے کے باوجود اس کے چہرے پر تفکرات کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ اندر ہی اندر کسی زبردست کشمکش میں مبتلا تھی۔

پھر اچانک ہی وہ گویا کسی فیصلے پر پہنچ گئی۔ اس کا ذہن سوچ کے جن صحراؤں میں بھٹک رہا تھا وہاں سے لوٹ آیا۔ وہ کاؤچ پر اٹھ بیٹھی۔ اس کا اُٹھنا اس کے نیم دراز ہونے سے بھی زیادہ صبر آزما تھا۔ سگریٹ اس نے ایش ٹرے میں مسل دی اور اعلان کیا "افضل! میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں تم پر بھروسا کر سکتی ہوں۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم ایک قابلِ اعتماد آدمی ہو۔"

"بے شک۔" میں نے خلوص سے کہا "بہت سے لوگوں کا میرے بارے میں یہی خیال ہے اور میں ان کے خیال سے متفق ہوں۔"

"اچھا۔۔۔ یہ بتاؤ کہ خاصی بڑی رقم کمانے کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" اس نے جاننا چاہا۔ اس کے دلکش ہونٹوں پر مسکراہٹ لوٹ آئی تھی۔

"آپ کتنی بڑی رقم کی بات کر رہی ہیں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"دس لاکھ روپے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"میں کئی مرتبہ اتنی رقم کا خواب دیکھ چکا ہوں۔" میں نے کچھ اس طرح کہا گویا میرے خیال میں وہ مجھ سے مذاق کر رہی تھی اور مجھے اس کا یہ مذاق اچھا نہیں لگا تھا۔

"تمہارا یہ خواب اب حقیقت میں ڈھل سکتا ہے۔" اس کی مسکراہٹ کی دلکشی بڑھ گئی۔

"اس کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟ کسی کی پٹائی کرنی ہو گی یا کسی کو اٹھا کر لانا ہو گا؟ میں آپ کی اس طرح کی کسی فرمائش سے پہلے بتا دوں کہ میں اپنی تمام تر مفلوک الحالی' آوارہ گردی اور خانہ بدوشی کے باوجود ایک شریف آدمی ہوں۔ میں نے کبھی اس قسم کے کام نہیں کیے۔" میں نے واضح کیا۔

"اس قسم کے بے ہودہ کام کرنے کے لیے تمہیں کون کہہ رہا ہے؟" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی "اس قسم کے کاموں کے لیے تو بہت آسانی سے مل جاتے ہیں لیکن مجھے جس کام کے لیے تمہاری ضرورت ہے اس کے لیے موزوں اور قابلِ اعتماد آدمی تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔ حالاں کہ کام بہت آسان اور دلکش ہے۔"

"آخر وہ کون سا کام ہے؟" میں نے سادگی سے دریافت کیا۔

اسے شاید میری سادگی پسند نہیں آئی۔ اس کی خوب صورت پیشانی پر ایک بار پھر شکنیں ابھر آئیں "کیا تمہیں واقعی معلوم نہیں۔۔۔ یا محض صورتِ حال سے لطف اندوز ہونے کے لیے انجان بننے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"مجھے واقعی معلوم نہیں۔" میں نے اپنی سادگی برقرار رکھی۔

"تو پھر تم چل کر یہاں تک کیوں آئے ہو؟" اس نے آنکھیں سکیڑیں۔

"بس۔۔۔ میں آ گیا ہوں۔" میں ابھی مصلحتاً اپنی آمد کا اصل مقصد واضح کرنا نہیں چاہتا تھا "آپ یوں سمجھ لیجئے کہ میں آپ کے منہ سے سُننا چاہتا ہوں۔ اب بتا ہی دیجئے تاکہ دس لاکھ روپے حاصل کرنے کے لیے مجھے کیا کرنا ہو گا؟"

"تمہیں صرف مجھ سے شادی کرنا ہو گی۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔

میرے رگ و پے میں سنسنی کی لہر دوڑی لیکن میں نے دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو سمجھایا "برخوردار افضل! زیادہ ریشہ خطمی ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔ پہلے اس چکر کو سمجھنے کی کوشش کرو۔"

وہ بے پناہ دولت مند' بے حد حسین اور جوان تھی۔ دو مرتبہ کی طلاق یافتہ ہونے کے باوجود اگر وہ محض سرسری طور پر اس خواہش کا کہیں اظہار کر دیتی کہ وہ شادی کرنا چاہتی تھی تو شاید اچھے سے اچھے امیدوار قطار در قطار چلے آتے۔ اسے ایک ایسے شخص کو شادی کے لیے دس لاکھ روپوں کی پیشکش کرنے کی کیا ضرورت تھی جسے وہ مفلس اور قلاش سمجھ رہی تھی؟ میں اپنے بارے میں اتنی زیادہ خوش فہمی میں تو مبتلا نہیں ہو سکتا تھا کہ مجھ میں کوئی سرخاب کا پر لگا ہوا تھا۔ اُدھر اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ مذاق ہرگز نہیں کر رہی تھی۔ اس نے یہ بات پوری سنجیدگی سے کی تھی۔

میں نے تھوک نگل کر ذرا بدحواس نظر آنے کی اداکاری کی اور اٹک اٹک کر کہا "دیکھیے۔۔۔ میڈم۔۔۔ میں۔۔۔"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی "میرا تو خیال تھا کہ تم سوچ سمجھ کر ہی یہاں آئے ہو گے۔ اس کے باوجود اگر تم الجھن میں پڑ گئے ہو تو فوری جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم مزید سوچ بچار کے لیے وقت لے سکتے ہو۔ میں تمہیں کچھ مہلت دے سکتی ہوں۔"

"کتنی مہلت؟" میں نے دریافت کیا۔

"گھنٹا دو گھنٹا سوچ لو۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"گھنٹا۔۔۔ دو گھنٹا۔۔۔!" میں دل ہی دل میں استہزائیہ انداز

میں سوچے بغیر نہ رہ سکا۔ اپنی شادی خود میرے لیے ایسا مسئلہ بنی ہوئی تھی جسے میں کئی برس سے حل نہیں کر پایا تھا اور وہ مجھے گھنٹے دو گھنٹے میں فیصلے پر پہنچنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ صرف یہی نہیں، اس نے کچھ اس طرح متوقع سی نظروں سے میری طرف دیکھنا شروع کر دیا تھا جیسے میں فیصلے پر پہنچنے میں گھنٹا دو گھنٹا بھی نہیں لگاؤں گا بلکہ ایک آدھ منٹ میں ہی اسے جواب سے مطلع کر دوں گا۔

"یہ تو بتائیں آپ مجھ پر یہ مہربانی کیوں فرما رہی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ میرا دل کہہ رہا ہے تم بھروسے کے قابل ہو۔ کسی نازک معاملے میں تم پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ عورتوں میں اس قسم کی باتوں کا اندازہ کرنے کی ایک خاص حس موجود ہوتی ہے۔"

میں نے کئی عورتوں کو کسی نہ کسی موقع پر یہی کہتے سنا تھا اور میرے خیال میں یہ محض ان کی خوش فہمی ہوتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا میں نے سال ڈیڑھ سال پہلے جس انگریزی رسالے میں اس کی رنگین تصویریں دیکھی تھیں ان کے ساتھ انٹرویو میں لکھا تھا کہ وہ سخت موڈی، ضدی اور کسی حد تک سنکی لڑکی تھی۔ انٹرویو بھی غالباً کسی خاتون نے ہی لیا تھا اور وہ شاید انگریزی کی کوئی کہنہ مشق صحافی تھی۔ اس نے انٹرویو میں سوال و جواب کے ساتھ ساتھ جا بجا نہایت دیانت دارانہ انداز میں اس کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار بھی کیا تھا۔ اس کے بارے میں، میں نے دوسرے جو دو تین انٹرویو اور فیچر پڑھے تھے ان میں زیادہ تر خوشامدانہ رنگ ہی جھلکتا محسوس ہوا تھا لیکن اس تفصیلی انٹرویو کو میں نے خاصا تیکھا اور دیانت دارانہ محسوس کیا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی کئی باتیں مجھے یاد رہ گئی تھیں۔

میں انہی باتوں کی روشنی میں یہ سوچنے پر مجبور تھا کہ وہ واقعی کسی نہ کسی حد تک سنکی ضرور تھی۔ اس کے دماغ کا کوئی پرزہ اپنی جگہ سے کھسکا ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر بڑے غور سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ آنکھیں اس کی خوب صورتی کا سب سے اہم جزو تھیں۔ اگر اس کے عشاق میں شاعر بھی شامل رہے ہوتے تو شاید وہ سب سے زیادہ غزلیں اور نظمیں اس کی آنکھوں ہی کی شان میں کہتے۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا اس کی پیشکش قبول کرنے کو جی چاہا پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ میں وہاں اس کام کے لیے نہیں آیا تھا۔

میرے خیال میں اب بہت ہو چکی تھی۔ وہ کسی سنک یا خبط میں مبتلا تھی یا پھر مذاق کر رہی تھی۔ اصل بات خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن میں کافی حد تک اس کا ساتھ دے چکا تھا۔ اب مجھے اس سلسلے کو ختم کر دینا چاہیے تھا اور اس کا ردِعمل دیکھنا چاہیے تھا۔

"دیکھیے پرنس سیرا..." میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بات شروع کی "قصہ اصل میں کچھ یوں ہے..."

اس نے میرے لہجے کی تبدیلی پر ذرا بھی توجہ نہیں دی اور شاید اسے میرا قصہ سننے سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ بات کاٹتے ہوئے بولی "تم اگر یہاں آئے ہو تو ظاہر ہے کچھ سوچ کر ہی آئے ہو گے۔ اب کیا تم کچھ نخرے دکھانے کا ارادہ کر رہے ہو؟"

جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے بات جاری رکھی "تمہیں زیادہ الجھن، فکر یا پریشانی میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ یہ شادی زیادہ عرصے کے لیے نہیں ہو گی۔ صرف ایک یا دو مہینے کی بات ہے یعنی شادی صرف مہینے دو مہینے کے لیے ہو گی۔ اس کے بعد تم طلاق دے دینا۔ اگر تم نے نہ دی تو میں خود ہی لے لوں گی لیکن اس صورت میں تمہیں دھکوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ ہو سکتا ہے تمہاری تھوڑی بہت پٹائی بھی ہو جائے... لیکن اگر تم میرے کہنے پر خاموشی اور شرافت سے مجھے طلاق دے دو گے تو تمہیں دس لاکھ روپے ملیں گے۔ عین ممکن ہے کہ میں خوش ہو کر بونس کے طور پر تمہیں کچھ اور رقم بھی دے دوں۔ تم اپنے چھڑے پن کی زندگی کی طرف لوٹ جانا اور مزے کرنا۔ اگر دس لاکھ کی رقم کو تم نے تھوڑے بھی سلیقے سے استعمال کیا تو تمہاری زندگی سنور سکتی ہے۔ تم اسے عیش و عشرت میں بھی اُڑا سکتے ہو۔ یہ تمہاری مرضی ہے۔ وہ بہرحال تمہاری رقم ہو گی۔"

"آپ کی اس فیاضانہ پیشکش کا بہت شکریہ..." آخر میں نے فیصلہ کن انداز میں اٹھتے ہوئے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ اس پیشکش پر میرا دل بے ایمان ہو رہا ہے لیکن مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی نظر نہیں آ رہی۔ آگے چل کر ضرور کوئی بد مزگی ہو گی۔ میرے خیال میں آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ میں جب یہاں آیا تو میرے ذہن میں کہیں دور دور تک شادی کا ارادہ نہیں تھا۔ میں یہاں کسی اور کام سے آیا تھا۔"

"کسی اور کام سے...؟" اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں۔ "کیا تمہیں ماریہ نے میرے پاس نہیں بھیجا؟"

"کون ماریہ؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا، میں اس نام کی کسی خاتون کو نہیں جانتا تھا۔

"'ماریہ میرج کونسل' والی ماریہ۔" اس نے جواب دیا۔

"افسوس کہ میں اس نام کے کسی ادارے سے واقف نہیں۔ ماریہ میرج کونسل... غالباً یہ کوئی میرج بیورو ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ بول نہیں سکی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ملائمت سے کہا "شادی کے سلسلے میں ابھی مجھے شاید ایسے اداروں کے چکر لگانے کی ضرورت نہیں پڑی اور آپ کو تو خواب و خیال میں بھی ایسے کسی ادارے کی خدمات حاصل کرنے کی ضرورت پیش نہیں آ سکتی۔ آپ

اشارے پر اُمیدواروں کی لائن لگ سکتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن مسئلہ کچھ اور تھا۔۔۔" وہ اُلجھن آمیز سے لہجے میں بولی۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کرپارہی تھی کہ اس موضوع پر مجھ سے بات کرے یا نہیں۔ پھر گویا وہ غیر ارادی سے انداز میں بولی "ماریہ میرج کونسل کی مالکن ماریہ میری تھوڑی بہت جاننے والی ہے۔ پہلے تو اس نے میری ہدایت پر اخبار میں اشتہار بھی دیا تھا کہ ایک خوب صورت کروڑپتی عورت کے لیے مناسب رشتے کی ضرورت ہے۔ کوئی شرط نہیں۔۔۔ مناسب مالی امداد کی جائے گی' وغیرہ وغیرہ۔۔۔ لیکن حیرت انگیز طور پر اس کے جواب میں بہت کم لوگوں نے رابطہ کیا۔۔۔ اور جنھوں نے کیا وہ بھی نہایت ہی بے ہودہ قسم کی شخصیات کے مالک تھے۔ اس سے بھی زیادہ بے ہودہ ان کے پس منظر تھے۔ بارہ بارہ بچّوں والے بھی چلے آرہے تھے۔ ماریہ نے مجھے پہلے ہی بتادیا تھا کہ اس اشتہار کے جواب میں زیادہ لوگ رابطہ نہیں کریں گے کیوں کہ اب لوگوں نے اس قسم کے اشتہاروں پر اعتبار کرنا چھوڑدیا ہے۔"

"کسی کو کیا معلوم تھا کہ اس بار اشتہار سچ مچ ایک حسین' کروڑپتی خاتون نے دلوایا ہوگا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے سرہلاتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا "ماریہ نے تو اشتہار بھی اردو اخبار میں دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اردو اخبار سے تو پھر بھی کچھ رسپانس مل جائے گا' انگریزی اخبار سے بالکل نہیں ملے گا۔ بہت سے اداروں نے اس قسم کے اشتہاروں کے ذریعے روپیا بٹورنے کو کاروبار بنا رکھا ہے۔ بہرحال جب اس طرح مسئلہ حل نہیں ہوا تو ماریہ نے اخبار میں الگ سے ایک اشتہار چھپوایا۔ یہ اشتہار نہ تو میرج بیورو کی طرف سے تھا اور نہ ہی اس میں ضرورتِ رشتہ کا حوالہ دیا گیا تھا۔ امیدواروں کو صرف فون پر رابطہ کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ ماریہ نے کہا تھا کہ وہ کوئی موزوں امیدوار خود ہی منتخب کرکے میرے پاس بھیج دے گی۔ چناں چہ کچھ دیر پہلے اس کا فون آیا تھا کہ وہ ایک شخص کو میرے پاس بھیج رہی ہے جس سے اس کی بات ہوئی ہے اور وہ اسے موزوں امیدوار معلوم ہوا ہے۔ میں سمجھی تم وہی شخص ہو۔"

"لیکن آپ کو یہ سب کچھ کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟" میری اُلجھن ایک بار پھر لفظوں کی صورت میں میرے ہونٹوں پر آگئی۔

"یہ میرا ایک ذاتی مسئلہ ہے۔ میں فی الحال اس پر تم سے بات نہیں کرسکتی۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی رُکھائی آگئی۔

"اس سے تو اچھا تھا میں امیدوار ہی بنا رہتا اور دیکھتا کہ بات کہاں تک پہنچتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی لیکن وہ فوراً سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "خیر۔ اب اس بات کو تو چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ تم کس سلسلے میں میرے پاس آئے تھے؟"

"میں آپ سے کوڑل جان کڑیالی کے بارے میں بات کرنے آیا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ چونکتے ہوئے ذرا حیرت سے بولی۔ میں نے نام دُہرایا تو وہ بولی "یہ کیا چیز ہے؟"

"یہ چیز نہیں۔۔۔ ایک شخص کا نام ہے۔ اسے آپ کلائنٹ سمجھ لیجیے۔" میں نے جواب دیا۔

"کلائنٹ۔۔۔؟" اس کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔

"ہاں۔ مجھے آپ ایک وکیل سمجھ لیجیے۔ بوقتِ ضرورت خدائی فوج دار بھی بن جاتا ہوں۔ اگر کوئی مجھ سے مدد کی درخواست کرے تو میں اس کے کام آنے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہوں بشرطیکہ میرے نقطۂ نظر سے وہ واقعی مدد کا مستحق ہو۔"

"مگر تم نے تو کہا تھا۔۔۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑدیا۔

"میرے کہنے پر مت جائیے۔ ضرورت اور حالات کے تحت میں بہت کچھ کہتا رہتا ہوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "ابھی جب آپ نے بلا روک ٹوک مجھے اندر بُلالیا اور عجیب قسم کی باتیں شروع کردیں تو میں نے سوچا مجھے آپ کا دل رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ شاید یہ کسی قسم کا کھیل ہے اور مجھے اس کھیل میں آپ کا ساتھ دینا چاہیے۔ بس۔۔۔ کچھ اس قسم کی سوچوں کے تحت میں تھوڑی بہت بکواس کرتا رہا۔"

وہ ایک بار پھر مبسم سے انداز میں مسکرائی۔ ایک لمحے توقف سے میں نے کہا "ویسے مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ میں آسانی سے آپ سے ملنے میں کامیاب ہوگیا۔ میرا خیال تھا اس کام کے لیے کافی تگ و دو کرنی پڑے گی۔"

"ہاں۔۔۔" وہ پُرخیال سے لہجے میں بولی "مجھ سے ملاقات آسان کام نہیں ہے لیکن آج اسی اہم کام کی وجہ سے میں نے راستے کی تمام رکاوٹوں کو دور کر رکھا تھا۔ تم یہ بتاؤ کہ اپنے کلائنٹ کے کام کے سلسلے میں تم میرے پاس کیوں آئے ہو؟"

"کیوں کہ آپ کی وجہ سے اس کا لاکھوں کا نقصان ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میری وجہ سے۔۔۔؟" وہ ایک بار پھر سراپا حیرت بن گئی۔

"آپ کی کمپنی اس سے کیے گئے کنٹریکٹ کے تحت مال سپلائی نہیں کررہی۔ اس بے چارے کا لاکھوں کا نقصان ہورہا ہے۔ آپ کی کمپنی میں اس کا لاکھوں کا ایڈوانس بھی جمع ہے۔ وہ آپ کے خلاف قانونی کارروائی کرکے ہرجانہ وصول کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہے۔" میں نے وکیلوں کا سا لہجہ اپنانے کی کوشش کرتے ہوئے روانی سے کہا۔

"تم کس کمپنی کی بات کررہے ہو؟" اس کی پیشانی پر سلوٹیں اُبھر آئیں۔

"امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ کارپوریشن۔" میں نے جواب دیا۔

اس کی پیشانی پر شکنیں گہری ہوگئیں۔ وہ گویا سوچ میں پڑ گئی۔

پھر قدرے بے یقینی کے سے عالم میں سرہلاتے ہوئے بولی "ہاں۔۔۔ اس نام کی کمپنی بھی مجھے پاپا کے دیگر اثاثوں کے ساتھ ورثے میں ملی تو ہے لیکن میں ابھی تک اس کا دفتر یا اس کے کاغذات بھی نہیں دیکھ سکی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی پاپا کے پورے بزنس کے ہی سرے کا کچھ پتا نہیں ہے۔ صحیح معنوں میں ابھی میں نے بزنس ٹیک اوور بھی نہیں کیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ یہ کمپنی پاپا نے اپنی زندگی میں کچھ اور لوگوں سے خریدی تھی۔ اس میں شاید کچھ اندرونی' کچھ بیرونی اور کچھ قانونی گڑبڑ چل رہی تھی جس پر پاپا نے قابو پالیا تھا۔ شاید اب کوئی اور قصہ کھڑا ہوگیا ہو۔ وہ جو تمہارا کلائنٹ ہے۔۔۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا؟"

"کوڑل جان کڑیالی!"

"ہاں۔۔۔ وہی۔۔۔ وہ کمپنی کے کسی ذمّے دار آدمی سے رجوع کیوں نہیں کرتا؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"پرنسس میرا۔۔۔!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کوڑل جان کڑیالی کا نام سن کر آپ کے ذہن میں شاید یہ تصور ابھرا ہو کہ وہ کوئی نہایت اجڈ' گنوار اور عقل سے پیدل دیہاتی ہوگا مگر ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ ایک سلجھا ہوا' سمجھ دار اور شائستہ بزنس مین ہے۔ میں آج ہی اس سے ملا ہوں۔ اس کی شخصیت اس کے نام سے کوئی مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ اتنا احمق نہیں ہے کہ ایسا کوئی مسئلہ کھڑا ہونے پر کمپنی کے ذمّے داروں سے رجوع نہ کرتا۔ اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا لیکن ابتدا میں اسے ٹرخایا جاتا رہا اور پھر کمپنی کا آفس ہی بند ہوگیا۔"

"آفس بند ہوگیا۔۔۔؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

اس موقع پر میرا دل وہ مصرع پڑھنے کو جی چاہا "اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا۔" لیکن میں نے اپنے آپ کو باز رکھا اور نہایت تحمل سے دُہرایا "جی ہاں۔ کمپنی کا آفس بند ہے۔"

"وہاں پھر کوئی گڑبڑ ہوگئی ہوگی۔" اس نے خود کلامی کے سے انداز میں خیال ظاہر کیا "لیکن حیرت ہے کہ میرے وکیلوں نے مجھ سے اس بات کا کوئی ذکر نہیں کیا۔۔۔" پھر اسے گویا خود ہی تصحیح کا خیال آیا اور وہ نہایت خفیف سی شرمندگی کے ساتھ بولی "یا پھر شاید ذکر کیا ہو لیکن میں نے ہی کوئی توجہ نہ دی ہو۔ میں نے اس معاملے کو اہم نہ سمجھا ہو۔"

"بہرحال۔۔۔ بے چارے کوڑل کے لیے یہ معاملہ بہت اہم ہے۔ وہ ایک چھوٹا سا بزنس مین ہے۔ اس کے لیے لاکھوں کا نقصان بہت بڑا نقصان ہے۔ اب تو محض رقم یا ہرجانے سے بھی اس کے نقصان کی تلافی نہیں ہوسکتی کیوں کہ اس کے پاس اتنا وقت نہیں رہا کہ وہ کہیں اور سے مال کا بندوبست کرسکے۔ اس کے نقصان کی تلافی کا صحیح طریقہ تو یہی ہے کہ اسے مال سپلائی کیا جائے۔" میں نے اپنے لہجے میں معمولی سی سختی لانے کی کوشش کی۔

"میں دیکھوں گی کہ میں اس سلسلے میں کیا کرسکتی ہوں۔" وہ ملائمت سے بولی "ویسے میں تمہیں سچ بتارہی ہوں۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ پتا نہیں ہے۔"

"مجھے آپ کی بات کا یقین ہے۔ آپ کو تو شاید یہ بھی پتا نہ ہو کہ اس کمپنی میں آپ کا ایک پارٹنر بھی ہے جس کا نام جمشید کریم ہے۔" میں نے اسے مطلع کیا۔

"جمشید کریم۔۔۔؟" اس نے پُرخیال انداز میں دہرایا "میرا خیال ہے میں تو آج تک اس نام کے کسی آدمی سے نہیں ملی۔"

"تو پھر اب وقت آگیا ہے کہ مل لیں۔ انسان کی کم از کم اپنے کاروباری حصے داروں سے تو واقفیت ہونی چاہیے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"مجھے دولت سے دلچسپی ضرور ہے مسٹر افضل!" وہ گہری سانس لے کر بولی "لیکن کاروباری مسائل' اُلجھنوں اور پریشانیوں سے میں دور رہنا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں بزنس ایک خود کار مشین کی طرح میرے لیے دولت پیدا کرتا رہے۔"

اس کی صاف گوئی قابلِ تعریف تھی۔ میں نے نرمی سے کہا "ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ آج کے جدید دور میں گو کہ بیش تر کاروبار خود کار ہوگئے ہیں۔ آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں تو بھی منافع کما سکتے ہیں لیکن رفتہ رفتہ ہر وہ بزنس کھوکھلا ہوکر آخر کار بالکل بیٹھ جاتا ہے جس کی طرف مالک بالکل بھی توجہ نہ دے۔"

"یعنی تم مشورہ دے رہے ہو کہ مجھے اپنے کاروبار کی طرف توجہ دینی چاہیے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "وکیل ہوتے ہوئے بھی مفت مشورہ دینے کا شکریہ۔ فی الحال مجھے کچھ اُلجھنیں درپیش ہیں' ان سے نمٹ لوں۔ پھر کاروبار کی طرف بھی ضرور توجہ دوں گی اور ایسے لوگوں کے مسائل بھی حل کرنے کی کوشش کروں گی جن کا میں نے کبھی نام تک نہیں سنا۔ مثلاً تمہارا یہ کلائنٹ۔۔۔ کیا نام بتایا تھا تم نے اس کا۔۔۔؟"

ٹھنڈی سانس لے کر مجھے ایک بار پھر اس کا نام دُہرانا پڑا۔ ساتھ ہی میں نے کہا "وہ اب آپ کی کمپنی کے خلاف قانونی کارروائی کرنے پر تُلا بیٹھا ہے جس میں کمپنی کی منیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے ساری ذمّے داری آپ پر آئے گی۔ آپ کا پارٹنر جمشید کریم اس کمپنی میں کم تر درجے کا پارٹنر ہے۔ وہ تو اطمینان سے یہ عذر کرکے بری الذمہ ہوجائے گا کہ اس کے پاس فیصلے کے اختیارات نہیں تھے۔"

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے مسٹر افضل؟" اس نے کچھ اس طرح پوچھا جیسے میں اس کے خلاف شکایت کرنے والے کا نہیں' بلکہ اس کا اپنا وکیل تھا۔

"سیدھی سی بات ہے۔۔۔ آپ یہ معلوم کرنے کی کوشش کریں کہ کمپنی میں گڑبڑ کیا ہے۔۔۔ کون اس کا ذمّے دار ہے۔ سپلائی کے آرڈر کس کی وجہ سے پورے نہیں ہوئے۔ صرف ایک ہی آرڈر تو پورا ہونے سے نہیں رہا ہوگا۔ یقیناً اور بھی کچھ کمپنیاں

ہوں گی جنہیں آپ کی کمپنی سے اسی قسم کی شکایت ہوگی اور شاید وہ بھی قانونی کارروائی کی تیاریاں کر رہی ہوں گی۔ میں تو اس لیے سب اندرونِ خانہ قسم کی معلومات حاصل کرنے کے بعد سیدھا آپ کے پاس چلا آیا کہ پہلے عدالت سے باہر رہتے ہوئے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کر لی جائے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اگر آپ کی کمپنی مطلوبہ سامان فراہم نہیں کر سکتی تو کوٹل کی ایڈوانس کی رقم ہرجانے سمیت واپس کر دی جائے۔ میں کوشش کروں گا کہ مسئلے کا کوئی اور حل نکل آئے یعنی اسے ہنگامی طور پر مال کہیں اور سے مل جائے۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بلا تامل بولی "میں کوشش کروں گی کہ ایک آدھ دن میں تمہارے کلائنٹ کی شکایت دور ہو جائے۔"

"بہت شکریہ۔" میں نے کہا اور اپنا ایک ایسا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا جس پر میرے گروپ آف کمپنیز وغیرہ کا نام نہیں تھا اور نہ ہی اس سے میری اصل حیثیت کا پتا چلتا تھا۔ اس پر صرف میرا نام اور فون نمبر وغیرہ موجود تھے۔

وہ اس پر نظر دوڑاتے ہوئے بولی "اس پر تمہاری ڈگریاں وغیرہ درج نہیں ہیں۔"

"اس سے میری قانونی قابلیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا "ہر چیز پر اپنی ڈگریوں کی قطار سجائے پھرنا اچھا نہیں لگتا۔ ویسے وکیلوں کی ایک پوری سینڈیکیٹ موجود ہے جو میری ہدایات کے مطابق کام کرتی ہے۔ میں آپ کو اس کا بھی کارڈ دے دیتا ہوں۔"

میں نے اسے وکیلوں کی اس فرم کا کارڈ نکال کر دیا جو مستقل طور پر میرے گروپ آف کمپنیز کے قانونی مشیر تھے۔ ان سے ذاتی سطح پر میری دوستی بھی تھی اور میرا یہ بیان مبالغے پر بھی مبنی نہیں تھا کہ وہ میری ہدایات کے مطابق کام کرتے تھے۔ وہ وکیلوں کی ایک بہت بڑی اور اپنے میدان میں بڑی معروف فرم تھی۔ اس کا کارڈ ہی خاصا لمبا چوڑا اور متاثر کن تھا۔ ہر وکیل کے نام کے ساتھ لمبی چوڑی ڈگریاں درج تھیں۔ یہ سب دیکھتے ہوئے جب اس نے یہ سنا کہ وہ سب میری ہدایات کے مطابق کام کرتے تھے تو اس کے چہرے پر واضح طور پر کچھ مرعوبیت جھلک آئی۔

"آپ تو کافی اونچی چیز معلوم ہوتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اگر آپ سے میل ملاقات رہی تو کچھ عرصے میں جا کر آپ کو صحیح طور پر معلوم ہو سکے گا کہ میں دراصل کیا چیز ہوں۔" میں نے ذرا شوشہ چھوڑ دیا تاکہ کل کلاں کو جب اسے میری اصل حیثیت کے بارے میں معلوم ہو تو وہ اس کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے کچھ تیار ہو۔

"اوہو..... گویا ابھی اور بہت کچھ معلوم ہونا باقی ہے؟" اس کی مسکراہٹ کچھ اور واضح ہوگئی۔

"یقیناً۔" میں نے جواب دیا "پہلی ملاقات میں کسی کے بارے میں سب کچھ کہاں معلوم ہو پاتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے ابھی تم سے کچھ اور ملاقاتیں ہو[illegible] پڑیں گی۔" اس کی مسکراہٹ میں نہایت مدھم سی شوخی و[illegible] جھلک آئی۔ اس کا ذہن اس وقت یقیناً کچھ اور خیالوں میں الجھ[illegible] تھا۔

"اگر آپ سے آئندہ بھی ملاقات ہوگی تو میں اسے اپنی [illegible] قسمتی سمجھوں گا اور بے حد خوشی محسوس کروں گا۔" میں نے خوش خلقی سے کہا۔

"اچھا..... خدا حافظ۔" اس نے کہا اور غالباً اپنے [illegible] جدت پسندانہ روایات کے مطابق مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا[illegible] میں نے بلا تامل وہ مرمریں ہاتھ تھام لیا۔ وہ بلاشبہ نزا[illegible] کا ایک حسین مجموعہ تھا۔ اسے ہونا بھی چاہیے تھا۔ ا[illegible] ہاتھوں سے وہ کون سی مشقت کرتی ہوگی۔ اس کی زندگی [illegible] سے بڑی مشقت غالباً آدھی چھٹانک کا برش اٹھا کر کینوس پر [illegible] پھر مجھے خیال آیا کہ وہ مجسمے بھی تو بناتی تھی اور بعض مجسمے [illegible] پتھر سے تراشے ہوئے دیکھے تھے۔ ممکن تھا کہ اس کے لیے قدیم دقیانوسی ہتھوڑی اور چھینی کے بجائے کچھ ایسے جدید [illegible] استعمال کرتی ہو جس سے اس کے ہاتھوں پر مشقت کے اثر[illegible] نہ رہتے ہوں یہ بھی ممکن تھا کہ اس کے ہاتھوں میں آ کر پتھر [illegible] ہو جاتے ہوں..... لیکن اسی لمحے یہ بھی احساس ہوا کہ ا[illegible] انگلیاں سرد تھیں۔ اس کے ہاتھ میں زندگی کی حرارت کی ک[illegible]

اس سے پہلے کہ میں اس ہاتھ کے بارے میں مزید بار[illegible] غور کرتا' اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور اسی لمحے فون کی گھنٹی بج [illegible] معذرت خواہانہ لہجے میں بولی "میں تمہیں چھوڑنے گیٹ [illegible] جا سکوں گی۔ اندر سے گیٹ آسانی سے کھل جائے گا۔ جا[illegible] اسے بند کر دینا۔ الیکٹرک لاک خود ہی بند ہو جائے گا۔" [illegible] نے ایک بار پھر مجھے خدا حافظ کہا اور فون کی طرف متوجہ [illegible] میں جب ہال میں پہنچا تو عقب سے مجھے فون پر اس کے با[illegible] کی مدھم آواز سنائی دینے لگی تھی۔

میں جس راستے سے آیا تھا اسی سے واپس گیٹ تک [illegible] ایک بٹن دبا کر میں نے تالا کھولا اور سر جھکا کر چھوٹے [illegible] نکلا۔ باہر قدم رکھتے ہی میں ایک شخص سے ٹکراتے ٹکرا[illegible] وہ اس وقت کال بیل کا بٹن دبانے ہی لگا تھا جب اچانک [illegible] آ گیا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا پھر اس [illegible] دبائے بغیر ہی قدرے شرمیلے سے انداز میں ہاتھ نیچے کر لیا [illegible] قدم پیچھے ہٹ گیا۔

میں نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک خوش[illegible] مضبوط کاٹھی کا نوجوان تھا۔ نچلے یا متوسط طبقے کے انہی [illegible] میں سے ایک معلوم ہوتا تھا جو اتنے خوش حال نہیں ہو[illegible]

آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کی شرٹ کچھ معقول لیکن جینز لنڈے کی معلوم ہوتی تھی۔ پرانے جوتوں پر کچھ گرد جمی ہوئی تھی ۔ر ایسا لگتا تھا کہ وہ کسی کے جوتوں تلے کچلے بھی گئے ہوں گے۔ ایدوہ کسی بس وغیرہ سے اتر کر پیدل وہاں تک پہنچا تھا۔ اس کی رٹ کے دو بالائی بٹن کھلے تھے۔ اس کے سینے پر تھوڑے سے بال ور گلے میں نقلی سونے کی چین نظر آ رہی تھی۔ شاید وہ ان دونوں ی نمائش کرنا چاہ رہا تھا گو کہ دونوں ہی چیزیں کچھ ایسی بھلی معلوم نہیں ہو رہی تھیں تاہم مجموعی طور پر نوجوان کی شخصیت کا تاثر خوش گوار تھا۔ وہ کوئی بدمعاش یا زیادہ تیز و طرار قسم کا نوجوان معلوم نہیں ہوتا تھا۔

"میرا نام کامران دانش ہے۔۔۔" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "مجھے زیادہ دیر تو نہیں ہوئی؟"

"کس کام میں؟" میں نے پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"یہاں پہنچنے میں۔۔۔" وہ کچھ گڑبڑا کر بولا "مجھے ماریہ میرج کونسل والوں نے بھیجا ہے۔۔۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ شادی کے امیدوار ہو؟" میں نے ایک بار پھر گہری نظر سے بلا ضرورت ہی اس کا سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ کچھ اور گڑبڑا گیا۔ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملنے لگا۔

"جی۔۔۔ جی ہاں۔۔۔" وہ تھوک نگل کر بولا "مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ خاتون میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔"

"ہاں۔۔۔ تمہیں ٹھیک ہی بتایا گیا ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "تم خوش قسمت ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی فراڈ نہیں ہو رہا۔۔۔ اور تم اس اعتبار سے بھی خوش نصیب ہو کہ اس دروازے پر امیدواروں کی لائن نہیں لگی ہوئی ہے۔ میدان صاف ہے اور تم آدمی بھی کچھ معقول ہی معلوم ہوتے ہو۔ اگر تمہاری قسمت اچھی ہوئی تو منتخب ہو جاؤ گے۔ جاؤ۔۔۔ جا کر قسمت آزمائی کرو۔۔۔" میں نے کھلے ہوئے چھوٹے گیٹ کی طرف اشارہ کیا جسے ابھی میں نے بند نہیں کیا تھا پھر مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے اپنا ایک وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اگر آنے والے چند دنوں کے دوران کوئی مسئلہ درپیش ہو تو مجھ سے رابطہ کرنا۔ شاید میں تمہاری کوئی مدد کر سکوں۔"

اس نے میرے بارے میں کچھ پوچھے بغیر نہایت زور شور سے میرا شکریہ ادا کیا اور کارڈ احتیاط سے جیب میں رکھ لیا۔ درحقیقت میری دلی خواہش تھی کہ وہ مجھ سے رابطہ کرے۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ میرے آنے کے بعد اس پر کیا گزری۔ اس سے اس پورے معاملے کو سمجھنے میں مدد بھی مل سکتی تھی۔ میں نے اسے اندر جانے کا اشارہ کیا اور اس نے یوں ڈرتے ڈرتے اندر قدم رکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ فوراً ہی کسی طرف سے کوئی کتا لپک کر اس کی ٹانگ پکڑ لے گا۔ میں نے آہستگی سے گیٹ بند کر دیا اور اس طرف چل

کھڑا ہو جاتا۔ تمہاری طرح۔۔۔" سیٹھ رمضان بولا۔

لوں پر "وہ ٹانگوں پر کھڑے ہونے کی کوشش میں تمہاری کمر میں چک

دیا جدھر میں اپنی گاڑی کھڑی کر کے آیا تھا۔ بائے کی "چک" سمجھتے ہو نا؟"

کچھ دیر بعد میں ہوٹل واپس پہنچ گیا۔ آفس سے میں بر "کیوں نہیں۔" وہ فخر سے بولا "پنجابی فلموں میں ولن اکثر

رمضان کو فون کر کے اطلاع دی "میں تمہاری پرنس سیرا ن کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے "۔ منوں چک

آیا ہوں۔" لے چلو۔۔۔" "لیکن وہ ان سے "چکی" نہیں جاتی۔"

"کتنے خوش نصیب ہو تم!" وہ ٹھنڈی سانس لے ک "بے او بغیر دُم کے گدھے! میں اس 'چک' کی نہیں' دوسری

دوسرے ہی لمحے اس نے پُر اشتیاق لہجے میں پوچھا "کیسی ت کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

ہیں ٹھیک تھی۔۔۔" میں نے قدرے مایوسی سے ک "اچھا۔۔ اچھا۔۔ ہاں۔۔۔ مجھے یاد آگیا۔ کمر میں بھی چک پڑ

ٹانگیں تھیں اس کی۔۔۔ ایک دُم تھی۔۔۔ لمبے لمبے کان تھے ہے۔۔۔ لیکن افضل ڈیئر! تم کچھ زیادہ بدتمیز نہیں ہوتے

"دیکھو۔۔۔ مجھے یہ چکر دینے کی کوشش نہ کرنا کہ ز ہے ہو؟ بے تُکے سے بات کرنے لگے ہو۔"

سیرا کے دھوکے میں کسی بکری سے مل کر آ گئے۔ میں اتنا "اس سے اگلا مرحلہ لپاڈگی کا ہوتا ہے۔ میں تو اس کے

نہیں ہوں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔" بے میں سوچ رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم اس سے زیادہ بے وقوف ہو گے" "نہیں یار۔۔۔!" وہ جلدی سے بولا "تمہیں اتنا آگے بڑھنے

اعلان کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا پھر میں کم ضرورت نہیں۔۔۔ میں سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے امید ہے کوئل

بدلتے ہوئے ڈانٹنے کے سے انداز میں بولا "بڑی خبیث کام ہو گیا ہو گا؟"

تمہیں اپنے دوست کے کام کی فکر نہیں۔ اس کے بار متعلق اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔ اس قسم کا کام چٹکی بجاتے

نے کچھ نہیں پوچھا۔ فوراً ہی پرنس کے بارے میں پتا نہیں ہو سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ مالکن کو خود اپنے کاروبار کے

کردیا۔" بے میں کچھ پتا نہ ہو۔۔۔ لیکن بہرحال۔۔۔ کام جلد ہو جائے گا۔

"کام کا کیا ہے۔۔۔ کام تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ پہلے خود بھی کوئل سے بات کروں گا۔ تم بھی اسے تسلی دے دینا۔"

معلومات حاصل کر لینا بہت ضروری ہے۔" وہ بے نیاز "تم کس حیثیت سے پرنس سے ملے تھے؟" سیٹھ رمضان

"مجھے یقین ہے تم پرنس سے دوستی تو گانٹھ آئے ہو نے دریافت کیا۔

ملاقات کہاں طے پائی ہے؟" "کوئل کے وکیل کی حیثیت سے۔" میں نے جواب دیا۔

"جہنم میں۔" میں نے جل کر جواب دیا۔ "تم۔۔۔ اور وکیل۔۔۔؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا "اس

"خیر۔۔۔ تم جیسے اور پرنس سیرا جیسے لوگوں کا آخ تمہارا مذاق نہیں اُڑایا؟"

جہنم ہی ہے لیکن ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ ابھی سے کیوں "نہیں۔ وہ تمہاری طرح جاہل تھوڑا ہی تھی۔ اسے معلوم تھا

کی فکر میں ہو۔ اوپر والے نے جتنی مہلت دے رکھی ہے وکیل بھی ہماری تمہاری طرح انسان ہی ہوتے ہیں۔۔۔ بلکہ

فائدہ اٹھالو۔" وہ ترحم آمیز سے لہجے میں بولا۔ ن بے چارے تو ہم تم سے بھی گئے گزرے ہوتے ہیں۔ اس کے

"اگر تم میرے سامنے ہوتے تو تمہیں اس علاوہ ہمیں جتنے وکیلوں اور جتنی قانونی کارروائیوں سے واسطہ پڑتا

فائدہ اٹھانے کا موقع نہ ملتا۔" میں نے کہا "جاہل اتنا ہے اس کے بعد تو ہم خود آدھے وکیل ہو ہی جاتے ہیں۔"

تمہیں اس کام کے بارے میں بتانے کی کوشش کر رہا "لیکن یہ وہی نیم حکیم خطرۂ جان والی بات ہوتی ہے۔ خیر۔۔۔

میرے سپرد کیا تھا۔۔۔" اسے چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ تم اس سے کس طرح جا کر ملے۔۔۔ کیا

"مجھے معلوم ہے تم مجھے کیا بتانے کی کوشش کرتے ہو گی؟"

میری بات کاٹتے ہوئے بولا "تم نے پرنس کو مدعو میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ پرنس سیرا سے ملاقات میں

اپنے ہوٹل میں ڈنر پر مدعو کیا ہو گا؟" مجھے کس طرح حیرت کا سامنا کرنا پڑا تھا اور کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔

"نہیں۔ میں نے اسے چڑیا گھر میں ایک نا میں نے اسے صرف وہ باتیں بتائیں جو کوئل کے معاملے سے تعلق

کے لیے مدعو کیا ہے۔ اپنا یہ وعدہ پورا کرنے کے رکھتی تھیں۔ وہ جب بولا تو اس کے لہجے سے امید جھلک رہی تھی

تمہارے گھر لے آؤں گا جہاں تم اپنے لان پر گھاس "میرا خیال ہے اب کوئل کا نقصان پورا ہو جائے گا۔۔۔"

اور امید ہے کہ پرنس کو دیکھ کر خوشی کے مارے دوسرے ہی لمحے وہ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا "تتی سی

بھی چلانے لگو گے۔" میں نے کہا۔ ے تھی۔۔۔ میں نے خوامخواہ ہی تمہیں بھیجا۔ اس سے تو اچھا تھا

"آپ میں اتنا بھی گدھا نہیں ہوں۔ اگر میں

تب بھی پرنس کے استقبال کے لیے تو سوٹ پہن

میں خود ہی چلا جاتا۔"

"تو اب چلے جاؤ۔ روکا کس نے ہے؟ اگر تم چاہتے ہو کہ کوئل کا نقصان کبھی پورا نہ ہو اور وہ عدالتوں کے چکر لگاتا رہے تو چلے جاؤ۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ تم تو یہی کہو گے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تم سے کب برداشت ہوتا ہے کہ میں کسی حسین لڑکی سے ملوں۔"

"یہ تمہاری غلط فہمی ہے۔ میں تو دعا کرتا ہوں کہ تم کسی حسین لڑکی سے ملو اور میں تمہیں دیکھوں۔ کافی عرصے سے میں نے پہلوئے حور میں لنگور نہیں دیکھا۔" میں نے کہا۔

"تم تو بڑے خبیث ہو۔" وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا۔

"یہ تم عرصے سے کہہ رہے ہو۔ اپنی باتوں کو اتنی مرتبہ مت دُہرایا کرو۔ اچھا۔۔۔ اب اجازت دو۔ مجھے کچھ کام کرنا ہے۔ میں ایک مصروف آدمی ہوں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے مصروف آدمی! تم سے پھر بات ہو گی۔۔۔ بلکہ شاید ملاقات ہی ہو جائے۔"

اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد چند لمحے تک میں پرنس سیرا کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ایک دلچسپ کردار تھی اور مجھے اس کردار میں پُراسراریت کی جھلک نظر آئی تھی۔ کچھ دیر بعد میں نے اپنی سیکرٹری امبر کو بلایا اور اسے تین چار روز پہلے تک کے تمام اردو اخبارات لانے کے لیے کہا۔ ہوٹل میں تمام اخبارات آتے تھے اور ان کی فائلنگ بھی کی جاتی تھی۔ امبر نے کچھ دیر بعد ہی مطلوبہ اخبارات میرے سامنے لا رکھے۔

میں نے انہیں کھنگالنا شروع کیا اور جلد ہی مجھے وہ اشتہار نظر آ گیا جو میرے اندازے کے مطابق میرا مطلوبہ اشتہار ہو سکتا تھا۔ اشتہار زیادہ بڑا نہیں تھا اور ایک اخبار کے پچھلے صفحے پر چھپا ہوا تھا لیکن اس قسم کا اشتہار اگر اس سے بھی کم نمایاں طور پر چھپا ہوتا تب بھی اس کا بہت زیادہ رسپانس مل سکتا تھا۔ اس کا عنوان تھا "سنہری موقع" اشتہار کا مضمون کچھ یوں تھا:

"ایک آسان، دلچسپ اور دلکش کام کے لیے ایک غیر شادی شدہ، خوش شکل اور شائستہ نوجوان کی ضرورت ہے۔ کام عارضی ہے لیکن معاوضہ اتنا معقول ملے گا جس سے زندگی سنواری جا سکتی ہے۔ مکمل رازداری کے ساتھ رجوع کیجیے۔"

نیچے صرف ایک فون نمبر دیا گیا تھا۔ چند لمحے کی سوچ بچار کے بعد میں نے وہ نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف دیر تک گھنٹی بجتی رہی۔ میرے اندازے کے مطابق یہ "ماریہ میرج کونسل" کا نمبر ہونا چاہیے تھا اور وہ چوں کہ عام دفتروں کے کھلے رہنے کا وقت نہیں تھا اس لیے دوسری طرف کوئی نہیں اٹھا رہا تھا۔

عین اس وقت جب کہ میں سلسلہ منقطع کرنے والا تھا، دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا اور ایک مردانہ آواز نے "ہیلو" کہا۔

"ماریہ میرج کونسل......؟" میں نے تصدیق چاہی۔

ادھر ایک لمحے کے لیے سکوت چھا گیا پھر وہ شخص کچھ محتاط سے لہجے میں بولا "جی نہیں...... آپ سے کس نے کہا کہ یہ ماریہ میرج کونسل کا دفتر ہے؟"

"ایک خاتون نے۔" میں نے جواب دیا۔

"کس خاتون نے؟" اس نے ملائمت سے پوچھا۔

"کیا یہ بتانا ضروری ہے؟" میں نے دھیمے لہجے میں دریافت کیا۔

"جی ہاں...... کیوں کہ آپ کو صحیح اطلاع فراہم نہیں کی گئی۔" وہ شائستگی سے بولا "ہم کبھی کبھار ماریہ میرج کونسل کے لیے چھوٹی موٹی خدمات انجام دیتے ہیں لیکن ماریہ میرج کونسل بہرحال ایک الگ ادارہ ہے۔ آپ کو کس سلسلے میں بات کرنا تھی؟"

"پرسوں کے اخبار میں آپ کا جو اشتہار شائع ہوا ہے...... میں اس کے سلسلے میں اپنی خدمات پیش کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا "میں ایک غیر شادی شدہ، خوش شکل، شائستہ اور نہایت معقول نوجوان ہوں۔"

"اوہ...... اچھا......" اس نے گویا اطمینان کی سانس لی "جناب! آپ یقیناً ویسے ہی ہوں گے جیسا کہ آپ بیان کر رہے ہیں لیکن معذرت کے ساتھ آپ کو مطلع کر رہا ہوں کہ ہم نے اس کام کے لیے امیدوار کا انتخاب کر لیا ہے کیوں کہ مسئلہ ذرا ہنگامی نوعیت کا تھا۔ بہرحال آپ رابطے کے لیے اپنا کوئی فون نمبر دے دیجیے۔ امید تو نہیں ہے کہ ضرورت پڑے گی...... لیکن اگر پڑ گئی تو ہم آپ کو زحمت دیں گے۔"

میں نے اپنا نمبر بتا دیا لیکن اس شخص کے لہجے میں چھپی عدم دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے مجھے شبہ تھا کہ اس نے نوٹ بھی کیا ہوگا۔ میں نے ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں کہا "پھر بھی آپ کچھ تو بتا ہی دیجیے کہ یہ کس قسم کا ادارہ ہے...... کیا یہ بھی کسی شادی کا دفتر ہے؟"

"نہیں بھائی!" اس شخص نے ٹھنڈی سانس لی "یہ ایک قسم کی لیگل ایڈوائزری سروس ہے۔ گھر میں ہی ایک چھوٹا موٹا سا دفتر سمجھ لیں۔ یہ ایک خاتون وکیل کا گھر ہے جو زیادہ تر فیملی کورٹس کے لیے کام کرتی ہیں۔ شادی، بیاہ، طلاق وغیرہ کے سلسلے میں مقدمات لیتی ہیں۔ ماریہ میرج کونسل والوں سے ان کی دوستی بھی ہے اور تھوڑا بہت کاروباری تعلق بھی ہے۔ کبھی کبھار ان کے لیے ہم چھوٹی موٹی خدمات انجام دے دیتے ہیں۔ یہ اشتہار بھی انہی کی کسی کلائنٹ کے لیے دیا گیا ہے۔ فون نمبر ہمارا استعمال کیا گیا ہے۔ منتخب امیدواروں کے انٹرویو بھی یہیں ہوئے تھے...... لیکن اب اس معاملے کو ختم ہی سمجھیے۔"

وہ شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میری پوچھ گچھ اسے زیادہ خوش گوار محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن میری تسلی کے لیے اس نے غالباً صحیح صورتِ حال بتا دی تھی۔ پرنسس سیمرا نے بھی مجھے یہی بتایا تھا کہ ماریہ میرج کونسل والی ماریہ نے دوسری مرتبہ اپنے دفتر اور "ضرورتِ رشتہ" کے چکر سے ہٹ کر اس کے لیے عارضی شوہر تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔

میں نے اس شخص کی شرافت سے تھوڑا سا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ذرا متجسسانہ سے لہجے میں پوچھا "اور آپ ان خاتون وکیل کے ہاں ملازم ہیں کیا؟"

"ملازم سے بھی بدتر ہی سمجھیے...... میں ان کا شوہر ہوں۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اس شریف آدمی میں حسِ مزاح بھی موجود تھی۔

"اوہ...... اچھا...... اچھا......" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا "آپ ان کے شوہرِ نامدار ہیں۔"

"نامدار تو نہیں ہوں۔ صرف شوہر ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے تصحیح کی۔

"آپ کا بہت شکریہ...... میں نے آپ کا خاصا وقت ضائع کیا......" میں نے خاصے عاجزانہ انداز میں کہا "ویسے...... یہ کس قسم کا کام تھا جس کے لیے اشتہار دیا گیا تھا؟"

"بھائی! اگر آپ کو اس کام کے لیے منتخب کیا گیا ہوتا تو ضرور اس کی نوعیت بھی بتا دی جاتی۔ اب آپ کا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں، تو نوعیت پوچھ کر کیا کریں گے؟ وہ ایک محاورہ ہے نا، جس گاؤں جانا نہیں، اس کا راستہ کیا پوچھنا۔" وہ بدستور ملائمت

سے بولا۔ میں نے اس کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔

اس وقت تک میرے معدے نے احتجاج شروع کردیا تھا۔ تب مجھے یاد آیا کہ میں نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا چناں چہ میں اٹھ کرڈائننگ ہال میں چلا گیا۔ وہ منگل کا دن تھا جو اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ بدھ کا دن میری اپنی کاروباری مصروفیات میں گزرا۔ اس روز کوڑل بھی مجھ سے ملنے آیا اور میں نے اسے بھی اطمینان دلایا کہ صورتِ حال امید افزا تھی۔

اس رات میں نے ساڑھے دس بجے سونے کا ارادہ کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ شب خوابی کا لباس پہن کر میں سونے کے لیے لیٹا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس روز واقعی کچھ جلدی سونے کا موڈ بن گیا تھا اس لیے فون کی گھنٹی سخت ناگوار گزری۔ میں نے فون کرنے والے کو دل ہی دل میں کچھ نامناسب الفاظ سے بھی نوازا۔ میں چاہتا تو بٹن گھما کر گھنٹی بند بھی کرسکتا تھا۔ ریسیور کریڈل سے اتار کر بھی رکھ سکتا تھا لیکن ہمیشہ کی طرح تجسس سے مجبور ہو کر چوتھی گھنٹی پر میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا ہی لیا اور "ہیلو" کہا۔

دوسری طرف سے ایک نہایت مترنم سی نسوانی آواز سُنائی دی۔ آواز کیا تھی گویا کان کے قریب جلترنگ بج اُٹھا۔ میں نے فون کرنے والے کو دل ہی دل میں جن نامناسب الفاظ سے نوازا تھا' دل ہی دل میں وہ الفاظ فوراً واپس بھی لے لیے۔

"مسٹر افضل چوہدری؟" بولنے والی نے تصدیق چاہی۔ آواز دلکش ہی نہیں' شناسا بھی محسوس ہورہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ پرنس سیمرا کی آواز تھی لیکن میں اتنی جلدی اس کے فون کی توقع نہیں کررہا تھا۔۔۔ اور وہ بھی رات کو اس وقت۔۔۔! آج شام ہی میں نے اس کے بارے میں سوچا تھا اور ارادہ کیا تھا کہ صبح اسے فون کروں گا۔

"جی ہاں۔۔۔ میں افضل ہی بول رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے تکیے کے سہارے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میری سستی اور غنودگی یک لخت کافور ہوگئی۔

"میں سیمرا بول رہی ہوں۔۔۔ پرنس سیمرا۔" اس نے نہایت شیریں لہجے میں میرے اندازے کی تصدیق کردی۔

"بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ نے فون کیا۔" میں نے بھی بڑی خوش خلقی سے کہا "کیسے یاد فرمایا؟"

"سچ سچ بتایئے۔۔۔ کیا واقعی آپ کو اس وقت میرے فون سے خوشی ہوئی ہے؟" اس کے لہجے میں مسرت آمیز تجسس جھلک آیا۔

"ہاں۔۔۔ واقعی۔" میں نے کافی حد تک دیانت داری سے جواب دیا "آپ جیسی خاتون سے گفتگو کا شرف روز روز تو حاصل نہیں ہوتا۔"

"بس۔۔۔ اب ایسی باتیں مت کیجئے جیسی اکثر لوگ کرتے ہیں۔" اس نے گویا اپنے لہجے میں سنجیدگی لانے کی کوشش کی "میں نے آپ کو ایک کام کے سلسلے میں فون کیا ہے۔"

"آپ کو مجھ سے کام پڑگیا؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ کیوں۔۔۔ کیا مجھے آپ سے کام نہیں پڑسکتا؟"

"پڑتو سکتا ہے۔۔۔" میں نے تسلیم کیا "بہرحال میں اسے اپنی خوش قسمتی سمجھوں گا۔"

"بھئی وکیل اور ڈاکٹر کی ضرورت تو کسی کو کسی بھی وقت پیش آسکتی ہے۔"

"اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ یہ تو صحیح ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اس وقت بھول ہی گیا تھا کہ کل میں اس سے ایک وکیل کی حیثیت سے ملا تھا "لیکن وکیل کو رات ساڑھے دس بجے لوگ کم ہی یاد کرتے ہیں۔"

"یوں سمجھیں کہ مسئلہ ذرا ہنگامی نوعیت کا ہے۔" وہ بولی۔

"کیا واقعی؟" میں نے حقیقتاً ذرا حیرت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں آپ سے فوراً بات کرنا چاہتی ہوں لیکن ساری بات چیت فون پر نہیں ہوسکتی۔ کیا آپ اس وقت آسکتے ہیں؟"

"کہاں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے اسٹوڈیو۔" اس نے جواب دیا "میں یہیں ہوں اور آج رات میرا یہیں رُکنے کا ارادہ ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں گدگدی سی ہوئی۔ شاید وہ بیسیوں وکیلوں کو جانتی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کچھ وکیل کاروباری مسائل کے سلسلے میں مستقل طور پر اس کے لیے قانونی خدمات انجام دیتے ہوں لیکن اس وقت وہ مشورے کے لیے مجھے بُلا رہی تھی جس کے وکیل ہونے کا نہ جانے اس نے کیسے یقین کرلیا تھا۔ معلوم نہیں یقین کیا بھی تھا یا نہیں؟ اگر یقین نہیں کیا تھا اور اس کے باوجود مجھے وکیل کہہ کر مشورے کے لیے بُلا رہی تھی تو مجھے اس کا کیا مطلب سمجھنا چاہیے تھا؟

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ سنجیدگی سے صرف کوئی بات ہی کرنا چاہتی ہو۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ٹھیک ہے۔۔۔ مجھے آدھے گھنٹے کی مہلت دیجئے۔ میں پہنچ رہا ہوں۔"

"بہت شکریہ۔ میں انتظار کررہی ہوں۔" اس کا لہجہ کچھ اور ریشمی ہوگیا۔

میں نے ریسیور رکھا اور چھلانگ لگا کر بیڈ سے اُترا۔ نائٹ گاؤن کو غیر معینہ وقت کے لیے خدا حافظ کہتے ہوئے میں نے ایک تھری پیس سوٹ منتخب کیا اور کم سے کم وقت میں تیار ہونے کا ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کی۔ ٹھیک آدھے گھنٹے بعد میں ایک بار پھر اس بنگلے کے گیٹ پر موجود تھا اور کسی معقول وکیل کی طرح سنجیدہ و مدبر نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

میں نے کال بیل بجائی لیکن نہ تو انٹر کام پر کوئی آواز اُبھری اور نہ ہی کوئی گیٹ کھولنے آیا۔ در و دیوار پر گہرے سکوت کی چادر پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے دوبارہ بیل دی تب بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں تشویش کی گھنٹی بجی۔ اسی لیے مجھے احساس ہوا کہ چھوٹا گیٹ صحیح طور پر بند نہیں تھا۔ میں نے اسے دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اس کے مقفل ہونے میں ذرا سی کسر رہ گئی تھی۔

میں جلدی سے اندر جا پہنچا' تاہم اندرونی دروازے پر میں نے ایک لمحے کے لیے رک کر احتیاطاً پرنس سیمرا کو بہ آوازِ بلند پکارا لیکن اس کے جواب میں بھی خاموشی رہی۔ آخر میں نے اس کے اسٹوڈیو میں قدم رکھ دیا۔ اندر تمام بتیاں روشن تھیں۔ پہلے ہال میں اس کی پینٹنگز نے میرا استقبال کیا۔ ایک ایزل پر ترکی سی لڑکی کی نامکمل پورٹریٹ اداس آنکھوں سے میری طرف تک رہی تھی۔

میں جب دوسرے ہال میں پہنچا تو مجھے معلوم ہوگیا کہ پرنس سیمرا کی طرف سے کوئی جواب کیوں نہیں مل رہا تھا۔ وہ جواب دینے کی پوزیشن میں نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ فرش پر چاروں خانے چت اور ساکت پڑی تھی۔ یہ وہی ہال تھا جس میں مجسمے وغیرہ سجے ہوئے تھے۔ اس کے ایک حصے میں تین چار نفیس کرسیاں اور تپائی موجود تھی۔ یہ غالباً اس لیے تھیں کہ کام کے دوران بھی اگر بات چیت کے لیے کسی مہمان وغیرہ کو بٹھانے کی ضرورت پیش آئے تو وہیں بٹھالیا جائے۔ پینٹنگز والے ہال میں بھی ایک گوشے میں نشست کا ایسا ہی انتظام موجود تھا لیکن مجسموں والے اس ہال میں دو کرسیاں اُلٹی ہوئی تھیں۔ تپائی بھی اصل جگہ سے کھسکی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

میں نے پرنس سیمرا کے قریب بیٹھ کر ایک لمحے کے لیے اس کا جائزہ لیا اور میرا دل ڈوب سا گیا۔ چھت کو تکتی ہوئی اس کی آنکھیں بے نور سی تھیں اور خوب صورت تراشیدہ بالوں کا کچھ حصہ خون میں لتھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ کچھ خون بالوں کے قریب فرش پر بھی پھیلا ہوا تھا اور ابھی پوری طرح خشک بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو میں فون پر اس لڑکی کی' زندگی سے بھرپور آواز سُن رہا تھا۔ اس آواز میں کچھ سحر انگیز سے جذبوں کا اتار چڑھاؤ بھی موجود تھا۔

میں کچھ دیر اس کے قریب گم صم ہی بیٹھا رہا پھر گویا کسی خواب سے چونکا۔ میں نے بے اختیار اس کی مرمریں کلائی پر انگلیاں رکھ دیں۔ میں اس کی نبض محسوس کرنا چاہتا تھا۔ اس کی جِلد کے لمس سے مجھے احساس ہوا کہ زندگی کی حرارت کی خفیف سی رمق ابھی اس کے جسم میں موجود تھی لیکن اس کی نبض ساکت ہوچکی تھی۔ جس چیز کو ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہوئے اسے زندگی سے محروم کیا گیا تھا' وہ اس کے قریب ہی پڑی تھی۔ وہ سیاہ پتھر کا تقریباً ڈیڑھ فٹ لمبا ایک مجسمہ تھا جو گندھارا تہذیب کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ پرنس سیمرا نے غالباً کسی تاریخی مجسمے کو کاپی کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی مجسمے سے اس کے سر پہ ضرب یا پھر شاید ضربیں لگائی گئی تھیں۔

میں ایک موہوم سی امید کے سہارے اس کی کلائی تھامے بیٹھا تھا کہ شاید میں صحیح طور پر اس کی نبض نہیں دیکھ پایا تھا۔ شاید اب کسی بھی لمحے مجھے نبض کی حرکت محسوس ہونے لگے۔ اس کا دل واقعی ساکت ہوچکا تھا تب بھی شاید کسی معجزے کے تحت دوبارہ دھڑکنے لگے۔

میری یہ توقع تو پوری نہیں ہوسکی لیکن ایک تیز اور دہشت زدہ سی چیخ نے میرے رونگٹے ضرور کھڑے کردیے۔ میرے حواس' جن پر کچھ دیر کے لیے گویا برف سی گرچکی تھی' یک دم پوری طرح بیدار ہوگئے۔ میں نے تیزی سے گھوم کر دیکھا۔ میرے عقب میں ہال کے وسط میں لمبی تڑنگی سی ایک عورت کھڑی تھی جس کی نظر پرنس سیمرا پر جمی ہوئی تھی اور آنکھیں خوف و دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے شاید منہ پر ہاتھ رکھ کر اپنی چیخ کو روکنے کی بھی کوشش کی تھی لیکن اس میں کامیاب نہیں ہوسکی تھی۔ اس کا ہاتھ اب بھی اس کے منہ پر تھا۔

پھر اس کی نظر سیمرا کے چہرے سے ہٹ کر میرے چہرے پر آن ٹھہری۔ اس کے ہونٹ تھرتھرائے اور اس کے حلق سے عجیب کھرکھراتی سی آواز نکلی "تم۔۔۔ تم نے۔۔۔ اسے مار دیا۔۔۔؟"

میں نے پرنس سیمرا کی کلائی چھوڑ دی اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں ایک قدم اس عورت کی طرف بڑھا تو وہ خوف زدہ سے انداز میں دو قدم پیچھے ہٹ گئی لیکن اس نے کمرے سے بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ یوں تو وہ ایک خوب صورت عورت تھی مگر لمبی تڑنگی اور مضبوط کاٹھی کی ہونے کی وجہ سے اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر ایک مردمار قسم کی عورت کا تھا اور اس قسم کی عورتیں خوب صورت ہونے کے باوجود عموماً بے کشش اور بے کیف سی نظر آتی ہیں۔ کم از کم میرا خیال یہی تھا۔

میک اَپ کے باوجود اس کی رنگت خاصی زرد نظر آرہی تھی۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ اس کی رنگت کمرے کا منظر دیکھ کر زرد ہوئی تھی یا قدرتی اور مستقل طور پر ہی زرد تھی۔ لباس اور وضع قطع سے وہ ایک دولت مند عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس نے لرزتی سی آواز میں اپنا سوال دُہرایا "تم...... تم نے اسے مار دیا......؟"

پھر جواب کا انتظار کے بغیر شاید اس نے دوسری چیخ مارنے کا ارادہ کیا۔ اس کی پہلی چیخ نے ہی میرے اعصاب پر خراشیں سی ڈال دی تھیں۔ وہ مجھے عورت کی نہیں، کسی چڑیل کی چیخ محسوس ہوئی اور میں ویسی دوسری چیخ سُننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

میں نے خبردار کرنے والے انداز میں جلدی سے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دھمکی دی "تمہارے حلق سے اب کوئی آواز نہ نکلے۔"

میں خود اپنے تاثرات تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن میرا خیال ہے وہ خاصے تسلی بخش تھے اور لہجہ بھی یقیناً پُرتاثیر ثابت ہوا تھا کیوں کہ اس کی چیخ اس کے گلے میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ وہ علاقہ گنجان آباد نہیں تھا، مکان بہت بڑے بڑے تھے اس لیے مجھے یہ اندیشہ تو نہیں تھا کہ اس کی چیخ جو اس مکان کے ایک ہال میں گونجی تھی، کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی لیکن خود مجھے وہ بہت ناگوار گزری تھی۔ میں کچھ سوچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس غیر متوقع صورت حال میں کچھ سوچنا ویسے بھی کچھ آسان کام نہیں تھا لیکن اس کی چیخ نے تو میرے خیالات بالکل ہی منتشر کر کے رکھ دیے تھے۔

اس نے چیخنے کا ارادہ تو ملتوی کر دیا لیکن زیرِ لب کہے بغیر نہ رہ سکی "سیمرا...... سیمرا......!"

شاید وہ چیخ کر ہی اسے پکارنا چاہتی تھی لیکن میرے دھمکی آمیز انداز کے باعث والیوم یک دم کم ہو گیا تھا۔ جب اسے سیمرا کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے سرگوشی کے سے انداز میں اپنا الزام دُہرایا "تم نے...... تم نے اسے مار دیا......!" اس بار اس نے یہ بات گویا پورے یقین سے کہی تھی۔

میں نے گہری سانس لے کر اپنے اعصاب کو سکون پہنچانے کی کوشش کرتے ہوئے ہموار لہجے میں کہا "عام طور پر فلموں اور بعض کہانیوں افسانوں میں ایسا ہوتا ہے کہ کہیں ایک لاش پڑی ہوتی ہے۔ کوئی بے گناہ شخص جس کا اس قتل سے دور دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا، آ کر اس لاش کو دیکھنے لگتا ہے۔ بعض اوقات وہ اس میں زندگی کے آثار محسوس کرنے کے لیے اسے ہاتھ بھی لگا لیتا ہے اور فلموں میں تو وہ آلۂ قتل کو بھی ضرور اپنے ہاتھ میں اٹھا لیتا ہے۔ اوپر سے پولیس آجاتی ہے اور وہ بے گناہ قتل کے الزام میں پکڑا جاتا ہے۔ اب یہ مصنف اور ڈائریکٹر پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کتنے گھماؤ پھراؤ کے بعد اس بے چارے کو جرمِ بے گناہی کے پھندے سے نکالتے ہیں......"

اس کی سمجھ میں شاید میری بات نہیں آئی تھی۔ وہ بدستور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اس کے حواس ہی صحیح طور پر کام نہیں کر رہے تھے تاہم میں نے ڈرامائی انداز میں انگلی اُٹھاتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا "لیکن میں حقیقی زندگی میں اس قسم کے چکر میں پڑنے کے لیے بالکل تیار نہیں ہوں۔ مجھے قربانی کا بکرا بننے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے۔ میں نے پرنس سیمرا کو ہرگز قتل نہیں کیا...... میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا تھا...... لیکن اگر تم نے خواہ مخواہ گلا پھاڑ کر لوگوں کو اس طرف متوجہ کرنے اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ میں نے ہی پرنس کو قتل کیا ہے...... تو میں تمہارا گلا ضرور دبا دوں گا یا گردن توڑ دوں گا۔"

یہ سیدھی اور صاف سی بات تھی۔ شاید آسانی سے اس کی سمجھ میں آگئی کیوں کہ اس نے اپنے لرزتے ہوئے ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ گویا اب وہ واقعی کوشش کر رہی تھی کہ اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلنے پائے۔

"گڈ۔" میں نے طمانیت سے سر ہلایا اور اپنے تاثرات کو

دوستانہ بنانے کی کوشش کی "میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم بالکل ہی گونگی ہو کر کھڑی ہو جاؤ۔ میرا مطلب یہ تھا کہ ہمیں خواہ مخواہ چیخ پکار کر کے دوسروں کو غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے بجائے آرام وسکون سے دو سمجھ دار انسانوں کی طرح بات چیت کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ صحیح معاملہ سمجھ میں آسکے۔"

"کیا..... کیا سمیرا واقعی مرچکی ہے؟" اس نے گویا ہمت کر کے پوچھا۔ آواز اب سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"ہاں۔" میں نے دیانت داری سے جواب دیا "لیکن اسے میں نے نہیں مارا۔ مجھے تو اس نے فون کر کے بُلایا تھا لیکن جب میں یہاں پہنچا تو میں نے اسے اسی حالت میں پایا..... اور میں تم سے صرف ایک دو منٹ پہلے یہاں پہنچا ہوں۔ میں اس کی نبض دیکھ رہا تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ زندہ ہو..... شاید اسے طبّی امداد کی ضرورت ہو لیکن......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

دیانت داری اور اخلاص سے سیدھے سچے لہجے میں بات کرنے کا اپنا ہی ایک اثر ہوتا ہے۔ بعض اوقات بظاہر یہی محسوس ہوتا ہے کہ سامنے والے نے سیدھی سچی بات کا بھی اثر قبول نہیں کیا ہوگا لیکن درحقیقت اثر ہوتا ضرور ہے۔ کبھی کبھی اس کی تصدیق دیر میں ہوتی ہے۔ تاہم میری بات کا فوری اثر ضرور ہوا۔ عورت کی آنکھوں سے خوف کے سائے معدوم ہوگئے۔ اس کی جگہ غم واندوہ کا سیلاب سا اُمنڈ آیا۔

اس نے ایک نظر سمیرا کی لاش کی طرف دیکھا اور سختی سے آنکھیں بند کرلیں گویا کوئی اندرونی اذیت اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئی ہو۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے جا لگی تھی اور غنیمت تھا کہ راستے میں کسی چیز سے ٹکرائی نہیں تھی ورنہ شاید گرچکی ہوتی۔ اس کی بند آنکھوں سے آنسو نہ جانے کس طرح راستہ تلاش کر کے نکلے اور رخساروں پر پھسل آئے۔

میں خاموش رہا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ اب میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہوچکا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھی، اس کا یقیناً سمیرا سے کوئی خاص تعلق تھا۔ خاص تعلق کے بغیر اس طرح بے اختیار آنکھوں سے آنسو نہیں چھلک سکتے تھے۔ اس کے آنسو حقیقی غم کی پیداوار معلوم ہوتے تھے۔ مکّاری یا دکھاوے میں یہ بے ساختگی نہیں ہوسکتی تھی۔

تاہم اس نے جلد ہی آنکھیں کھول لیں۔ کچھ اور آنسو اس کے رخساروں پر پھیلے لیکن اس نے فوراً ہی ٹشو پیپر سے انھیں خشک کرلیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ شاید آنسوؤں کی دُھندلاہٹ کی وجہ سے اسے میری صورت صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی اور وہ گویا مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

غالباً اپنی اس کوشش میں ناکام ہو کر وہ قدرے حیرت سے بولی "تم ہو کون؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا "میرا نام افضل چوہدری ہے۔" پھر میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا کہ اسے اپنی اصلی حیثیت کے بارے میں بتایا جائے یا نہیں؟ اسی ایک لمحے میں، میں نے فیصلہ کیا کہ اس کے سامنے مجھے وہی حیثیت برقرار رکھنی چاہیے جو میں نے سمیرا کے سامنے ظاہر کی تھی۔ فی الحال..... بلکہ شاید آئندہ بھی کچھ دنوں کے لیے اپنے بیان پر قائم رہنا ہی بہتر تھا تاکہ کہیں تضاد بیانی ظاہر ہونے کی نوبت نہ آتی۔

صرف ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "میں ایک وکیل ہوں۔ تقریباً آدھا گھنٹا پہلے پرنسس سمیرا نے فون کر کے مجھے ملاقات کے لیے بُلایا تھا۔ اس نے صرف یہ اشارہ دیا تھا کہ وہ کسی اہم مسئلے پر بات کرنا چاہتی ہے۔ میں فوراً آگیا۔ میں بتا ہی چکا ہوں کہ میں آپ سے صرف دو منٹ پہلے یہاں پہنچا تھا۔ باہر کا گیٹ صحیح طور پر مقفل نہیں تھا اور میری کال بیل کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا اس لیے میں اندر چلا آیا اور میں نے پرنسس کو اسی حالت میں پایا۔"

"لیکن....." وہ اُلجھن آمیز سے لہجے میں بولی "سمیرا کے وکیل تو دوسرے ہیں۔ میں ان سب کو جانتی ہوں۔ وہ اپنے معاملات میں ان سے مشورہ کرتی ہے۔ آپ کو میں پہلی مرتبہ دیکھ رہی ہوں۔"

میں اب اس سے ذرا تکلف اور احترام سے بات کر رہا تھا تو اس کا لہجہ بھی ویسا ہی ہوگیا تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا "پرنسس سے میری ملاقات پرسوں ہی ہوئی تھی اور شاید انھوں نے مجھے قابلِ اعتماد سمجھ لیا تھا اس لیے آج یاد کیا تھا لیکن میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ......" میں نے متاسفانہ سے انداز میں ٹھنڈی سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا "میں اندر آتے وقت چھوٹا گیٹ مقفل کر کے آیا تھا پھر آپ اندر کیسے آگئیں؟"

"میرے پاس اس بنگلے کی ایک چابی موجود رہتی ہے۔" اس نے جواب دیا اور اس سے آگے کچھ نہ بولی۔

جواب تشنہ تھا۔ میں منتظر رہا کہ شاید وہ کچھ وضاحت کرے، اس کے پاس اس بنگلے کی چابی کیوں موجود رہتی تھی لیکن اس نے شاید جواب کی ضرورت محسوس نہیں کی یا پھر اس کا ذہن اُلجھا ہوا تھا۔ آخر مجھے کہنا ہی پڑا "میں نے تو بتا دیا کہ میں کون ہوں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کون ہیں؟"

"میں سمیرا کی بڑی بہن ہوں۔" اس نے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"اوہ.....!" میں نے صرف اتنا ہی کہا اور پوری کوشش کی کہ میرے چہرے سے حیرت کا اظہار نہ ہونے پائے۔ دراصل مجھے توقع نہیں تھی کہ پرنسس سمیرا جیسی نازک اندام اور پری پیکر لڑکی کی بڑی بہن اس سے اتنی مختلف شخصیت کی مالک ہوگی تاہم یہ تضاد میرے لیے کچھ ایسا نیا بھی نہیں تھا۔ بہت سی بہنوں یا بہن بھائیوں میں یہ تضاد دیکھنے میں آتا ہے۔ بعض اوقات اس کی بڑی وجہ شاید ان کے والدین کی شخصیتوں کا تضاد ہوتا تھا۔ کوئی ایک بچہ یا بچی ماں پر چلی جاتی تھی اور دوسرا بچہ یا بچی باپ پر..... اور اس طرح دونوں میں زمین آسمان کا فرق نظر آتا تھا۔

"میرا خیال ہے مجھے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع دینی چاہیے۔" میں نے کہا۔

"پولیس.....؟" اس کے چہرے پر یک دم تفکّرات کے سائے نمودار ہوگئے۔ مسئلہ خواہ کتنا ہی سنگین ہو اور لوگ خواہ اونچے اور بارسوخ طبقے سے تعلق رکھتے ہوں تب بھی پولیس سے واسطہ پڑنے کا تصور انھیں پریشان کردیتا ہے "کیا..... کیا پولیس کو بُلانا ضروری ہے؟"

"ظاہر ہے جی....." میں نے قدرے حیرت سے کہا "آپ کا تعلق ملک کے اہم اور دولت مند طبقے سے ہے۔ آپ کے طبقے کی ایک نمایاں لڑکی پُراسرار حالات میں قتل ہوگئی ہے۔ ہم پولیس کو اس معاملے سے بے خبر تو نہیں رکھ سکتے۔ اب یہ تو ممکن نہیں ہے کہ میں اور آپ یا خاندان کے دو چار اور لوگ مل کر خاموشی سے پرنسس سمیرا کی تکفین کریں اور خاموشی سے ہی جا کر اسے دفنا آئیں۔"

"اُف خدایا.....!" وہ ہوا میں گویا کسی غیر مرئی خوف ناک سی چیز کو دیکھ کر جھرجھری لیتے ہوئے بولی "پولیس نہ جانے کن کن زاویوں سے تفتیش کرے گی..... اخبارات میں خبروں کا ایک سلسلہ چل پڑے گا..... جس کا جو دل چاہے گا، لکھنا شروع کردے گا..... نہ جانے کیسے کیسے لوگ منہ اُٹھائے ہمارے گھروں کی طرف آنے لگیں گے۔" اس کے لیے یہ سب تصورات گویا ناقابلِ برداشت تھے۔

"آپ جیسے لوگوں کے لیے ان مسائل سے نمٹنا مشکل نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے ہمدردی سے کہا "بہرحال..... اگر تھوڑی بہت مشکل پیش بھی آئی تو میں اپنی خدمات پیش کرسکتا ہوں۔ پولیس اور پریس میں میرے تھوڑے بہت تعلقات ہیں جو آپ کو بہت سی غیر ضروری پریشانیوں سے بچا سکتے ہیں۔ میں ہر ممکن تعاون کے لیے تیار ہوں..... لیکن کیا اس کے جواب میں آپ بھی مجھ سے کچھ تعاون کرسکتی ہیں؟"

"کیسا تعاون؟" وہ کچھ چونکی۔ میں اس کی آنکھوں میں صاف پڑھ سکتا تھا کہ اس کے ذہن میں پہلا خیال کیا آیا ہوگا۔ اس نے یقیناً یہی سوچا تھا کہ میں اپنے تعاون کے جواب میں اس سے کچھ رقم حاصل کرنا چاہوں گا۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس دور میں ہر صاحبِ حیثیت شخص کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ اس کے سامنے آنے والا ہر شخص اس سے کچھ نہ کچھ اینٹھنے کی فکر میں ہوگا۔

"پریشان نہ ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ اس دوران میں اس نے کنکھیوں سے اپنے پرس کی طرف بھی دیکھا تھا "میں صرف یہ چاہوں گا کہ پولیس کی آمد اور ان کی پوچھ گچھ سے پہلے آپ میرے کچھ سوالوں کے جواب دے دیں۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔"

اس نے کچھ اُلجھن آمیز سی نظروں سے میری طرف دیکھا تاہم اثبات میں سرہلا دیا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ اس وقت اس کی آنکھیں ویران اور چہرہ زندگی کی تب وتاب سے محروم نظر آرہا تھا۔

میں نے ملائمت سے پوچھا "کیا آپ پہلے بھی اکثر وبیش تر رات کو اس وقت، اس جگہ پرنسس سمیرا سے ملنے آتی رہی ہیں؟"

"نہیں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا "مجھے سمیرا کے منگیتر نے فون کیا تھا۔ اس نے کچھ وضاحت تو نہیں کی لیکن لہجے سے وہ پریشان معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے تاکید کی کہ میں سمیرا کے پاس پہنچ جاؤں اور ہوسکے تو آج رات یہیں اس کے پاس ٹھہر جاؤں۔ اس کے خیال میں آج سمیرا کو یہاں تنہا چھوڑنا ٹھیک نہیں تھا۔ خصوصاً جب کہ آج کل اس کے پاس یہاں گیٹ پر تعینات کرنے کے لیے کوئی گارڈ وغیرہ بھی نہیں تھا۔ یہاں جو گارڈ ہوا کرتا تھا اسے سمیرا نے چند دن پہلے کسی بات پر ناراض ہو کر بھگا دیا تھا اور اس کے بعد دوسرے گارڈ کا بندوبست کرنے کا تردّد بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے سمیرا کے منگیتر سے بہت پوچھا کہ کیا کوئی خطرے والی بات ہے؟ تو اس نے بس اتنا کہا کہ ایسے خطرے والی بات نہیں ہے کہ جس کے لیے مسلح گارڈز وغیرہ کی ضرورت ہو بلکہ اصل خطرہ اس کی ذہنی وجذباتی کیفیت سے تھا....."

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ گویا وضاحت کے طور پر بولی "سمیرا بڑی من موجی..... بڑی سرکش اور متلوّن مزاج لڑکی ہے..... میرا مطلب ہے..... تھی....." اس نے گویا ایک سسکی سی لے کر تصحیح کی۔ اس کے ذہن نے ابھی صحیح طور پر اس حقیقت کو قبول نہیں کیا تھا کہ سمیرا اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔

میرا ذہن اس کے پہلے ہی جملے میں اٹک کر رہ گیا تھا۔ میں اس کی باقی باتیں زیادہ توجہ سے نہیں سُن سکا تھا۔ پرنسس سمیرا کی وجہ سے میرے ذہن کو پے در پے جو جھٹکے لگ رہے تھے اس نے ان میں ایک اور جھٹکے کا اضافہ کردیا تھا۔ اگر سمیرا کا کوئی منگیتر بھی موجود تھا تو پھر اسے اخبار میں "ضرورتِ رشتہ" کا اشتہار دینے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر میں نے سوچا شاید منگیتر سے مراد وہی نوجوان ہو جسے غالباً اس اشتہار کے نتیجے میں منتخب کیا تھا اور جسے منتخب ہونے سے پہلے میں نے دو روز قبل اس وقت اسی بنگلے کے گیٹ پر پہنچتے دیکھا تھا جب میں یہاں سے رخصت ہو رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس نے اپنا نام کامران دانش بتایا تھا۔

میں نے زیادہ حیرت کا اظہار کیے بغیر پوچھا "سمیرا کا منگیتر.....؟ کیا نام ہے اس کا؟"

"صفدر منیر۔" اس نے جواب دیا "اس سے سمیرا کی اس

طرح باقاعدہ رسوم کے ساتھ تو منگنی نہیں ہوئی تھی جس طرح کنواری لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے دو مرتبہ کی طلاق یافتہ لڑکی کے معاملے میں اس طرح کے تکلفات تو نہیں کیے جاسکتے تھے لیکن سمیرا کی تیسری شادی کی بات اسی سے پکی تھی۔"

"کب سے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سات آٹھ مہینوں سے۔" اس نے جواب دیا۔

سمیرا کی شادی کی بات صفدر منیر نامی کسی شخص سے طے تھی اور وہ شوہر کی تلاش کے لیے اشتہار دے رہی تھی اور وہ شوہر اسے عارضی طور پر...... غالباً مہینے دو مہینے کے لیے درکار تھا۔ اگر اس معاملے کا علم صفدر منیر کو تھا تب تو اسے پریشان ہی ہونا چاہیے تھا۔

"صفدر منیر نے تو آپ کو یہاں بھیجنے کی وجہ نہیں بتائی...... لیکن آپ کو خود کچھ اندازہ نہیں ہوسکا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے آہستگی سے نفی میں سر ہلایا "البتہ میں وجہ معلوم کرنے ہی یہاں آئی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہورہا تھا کہ فیملی میں پھر کوئی اسکینڈل تو کھڑا نہیں ہورہا؟ ہم لوگ نہیں چاہتے کہ اب ہماری فیملی کا پریس میں کوئی ذکر آئے۔ اخباروں رسالوں میں ہمارے بارے میں چٹخارے دار انداز میں باتیں چھپیں۔ شاید ہم اب کسی اسکینڈل کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ میرے شوہر کا خیال ہے کہ......"

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ کمرے میں ایک لمحے کے لیے گہرا سکوت چھا گیا جس میں موت کی سوگواری بھی شامل تھی۔ میں نے اسے بات مکمل کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی "آپ کچھ کہہ رہی تھیں......"

اس نے گویا میری بات سُنی ہی نہیں۔ وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں ایک بار پھر ہوا میں نہ جانے کس غیر مرئی چیز کو تک رہی تھیں۔ اس کا ذہن نہ جانے کن اندیشہ ہائے دور دراز میں اُلجھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک اندیشہ الفاظ کی صورت میں آخر کار اس کی زبان پر آہی گیا "میں چاہ رہی تھی کہ میرے شوہر یہاں آکر فیصلہ کرتے کہ ہمیں سمیرا کے قتل کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے...... کیا یہ ممکن نہیں کہ تم یہاں سے چلے جاؤ تاکہ ہم اپنے مسئلے پر خود نمٹ سکیں؟ میرے شوہر خود ہی پولیس کو اطلاع دے دیں گے۔"

"یہ آپ نے اچھی کہی۔" میں نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا "میں یہاں سے چلا جاؤں تاکہ بعد میں پولیس مجھے ہی اس قتل کے الزام میں گرفتار کرنے پہنچ جائے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری عدم موجودگی میں یہاں میرے لیے کوئی پھندا تیار ہوجائے۔"

"نہیں...... نہیں......" وہ بے تابی سے بولی "ایسا بھلا کیوں ہونے لگا؟ ہمیں تم سے کوئی دشمنی تو نہیں ہے۔ مجھے یقین آگیا ہے کہ تمہارا اس قتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم ایک شریف اور

مہذب آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

"میں اپنی شرافت اور شائستگی کے بارے میں زبانی کلامی تصدیق پر زیادہ یقین نہیں رکھتا۔ انسان کی زبان بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ خصوصاً اجنبیوں کے بارے میں......" میں نے بے پروائی سے کہا "ویسے بائے دا وے...... آپ کا نام کیا ہے؟ میں نے ابھی تک آپ کا یا آپ کے شوہر کا نام نہیں پوچھا۔"

"میں واجدہ پرویز ہوں...... احمد پرویز کی بیوی۔" اس نے گویا بادلِ نخواستہ جواب دیا۔

اب میرے ذہن میں کچھ گھنٹیاں سی بجیں۔ بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آنے لگیں جو شاید اس لیے ذہن سے محو ہوگئی تھیں کہ آج سے پہلے وہ میرے لیے اہم نہیں تھیں۔ احمد پرویز کا نام میرے لیے نیا نہیں تھا۔ وہ شہر کا ممتاز صنعت کار تھا۔ دو ڈھائی سال پہلے تک وہ چیمبرز آف کامرس کا صدر بھی رہا تھا۔ دو چار مرتبہ اس سے بہت سرسری سی ملاقاتیں ہوئی تھیں، رسماً کسی نے اس کا اور میرا تعارف بھی کرایا تھا مگر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کہ اس نے مجھے ذرا سی بھی اہمیت دینا تو درکنار، میری طرف معمولی سی توجہ بھی نہیں دی تھی۔

اسی ہال میں ایک دیوار گیر فون موجود تھا۔

میں نے رحیم گل کے تھانے کا نمبر ملایا لیکن پتا چلا کہ اس وقت وہ ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ گھر فون کیا تو اس کے ملازم نے بتایا کہ وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اب تو اس نے اپنے خرچ پہ موبائل فون بھی لے لیا تھا اور اسے چوں کہ چوبیس گھنٹے اپنے آپ کو ڈیوٹی پر ہی سمجھنے کا شوق تھا اس لیے اس سے موبائل فون پر بھی رابطہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے اپنی ننھی سی الیکٹرانک نوٹ بک میں اس کے موبائل کا نمبر دیکھ کر ملایا تو اس نے فوراً ہی فون ریسیو کرلیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ منہ چلا رہا تھا۔ نہایت خفیف سی آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا۔

"کہاں ہو اس وقت؟" میں نے پوچھا۔ اس نے ایک ریستوران کا نام بتایا جو اس کے تھانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔

"یقیناً اس وقت کھانا کھا رہے ہو۔" میں نے کہا "جگالی کرنے کی سی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔"

"قدرت نے تمہیں غیر معمولی حسیات دے کر اچھا نہیں کیا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تم جیسے اوچھے انسانوں کے پاس ایسی صفات نہیں ہونی چاہئیں۔"

"میری صلاحیت پر تنقید مت کرو اور اسے اپنے تھانے کی عمل داری میں آنے والی کوئی شے مت سمجھو۔ قدرت جو کرتی ہے، بہتر کرتی ہے اور تم جیسے گدھوں سے پوچھ کر نہیں کرتی۔" میں نے کہا "فی الحال تم جتنا بھی کھا چکے ہو اسی پر اکتفا کرو اور صبر شکر کے ساتھ یہاں آجاؤ......"

میں اسے ایڈریس بتانے ہی لگا تھا کہ وہ میری بات کاٹ کر بولا "خیریت تو ہے؟"

"خیریت کے عالم میں پولیس والوں کو فون کوئی گدھا ہی کر سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ..... میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم جیسے منحوس آدمی سے کوئی خیر کی خبر بھلا کیسے مل سکتی ہے۔" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا "خیر..... جب بُری خبر کی تمہید سُننے کو مل جائے تو پھر بُری خبر کو بھی جتنی جلد سُن لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ کہو..... کیا خبر ہے؟ کیا تم نے کوئی گل کھلا دیا ہے؟"

"نہیں۔ یہ فریضہ کسی اور نے انجام دیا ہے۔ تم نے کبھی پرنسس سیمرا کا نام سُنا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ ایک خاص طبقے میں تو وہ بڑی مشہور شخصیت ہے۔ مجھے تو خود اس سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس سے ملنے کا کوئی بہانہ بن جائے تو اچھا ہے۔ کیا اس نے کوئی گل کھلا دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس بہانے اس سے ملاقات ہو جائے گی۔" وہ قدرے پُرجوش انداز میں تیز، تیز کہتا چلا گیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں جیسے کوئی کانٹا سا چُبھا۔ صورتِ حال کی افسردگی اور بوجھل پن سے بچنے کے لیے اس پر بھی رحیم گل کے ساتھ نوک جھونک کے سہارے خود کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ موت ایک بدصورت حقیقت تھی۔ خصوصاً حُسن اور جوانی کی موت.....! میرے نظریں چُرانے سے یہ حقیقت مٹ تو نہیں سکتی تھی پھر بھی میں گویا اس سے نظر چُرانا چاہتا تھا۔ بظاہر مجھے معلوم تھا کہ پرنسس سیمرا کو قتل کر دیا گیا تھا اور میں رحیم گل کو اسی واقعے کی اطلاع دے رہا تھا لیکن اپنے دل کو میں خود فریبی میں مبتلا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ یہ محض ایک ناخوش گوار خواب تھا لیکن اس طفل تسلیوں سے نہ تو خواب حقیقت بن جاتے ہیں اور نہ حقیقتیں خوابوں میں ڈھلتی ہیں۔ میرے حلق میں گویا کوئی چیز اٹک رہی تھی۔ میں نے اسے نگلتے ہوئے حتی الامکان شگفتگی سے کہا "نہیں..... پرنسس سیمرا نے کوئی گل نہیں کھلایا۔ وہ جتنے گل کھلا سکتی تھی، کھلا چکی۔ اب وہ گل کھلانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔"

"اوہ نو......" اس کی سرسراتی سی آواز فون پر اُبھری اور وہ یک دم خاموش ہو گیا۔

"تمہیں اس سے ملاقات کا موقع تو مل گیا لیکن افسوس کوئی اچھا موقع نہیں ہوگا۔" میں نے اس اطلاع کے بوجھل پن کو کم کرنے کی کوشش کی۔

وہ شاید چند سیکنڈ کے اس وقفے میں سنبھل چکا تھا اور اسے یاد آگیا تھا کہ اس کا اصل کردار ایک ذمّے دار پولیس آفیسر کا تھا۔ غیر جذباتی اور قدرے پیشہ ورانہ سے لہجے میں بولا "قتل کہاں ہوا ہے؟"

"کلفٹن کے ایک بنگلے میں اس نے اپنا آرٹ اسٹوڈیو بنا رکھا تھا۔ وہ یہاں اکیلی تھی۔ کسی نے اس کے سر پر پتھر کا ایک مجسمہ مار کر اسے ہلاک کیا ہے۔" میں نے بتایا۔

"اور تم وہیں موجود ہو؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"ظاہر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کسی چیز کو چھیڑنا مت......" اس نے تاکید کی۔

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہر احمق اپنے بارے میں یہی کہتا ہے۔" وہ غرّایا "تم احمق ہی نہیں بلکہ اوّل درجے کے منحوس بھی ہو۔ جس خوب صورت لڑکی سے ملتے ہو وہ قتل ہو جاتی ہے۔ شاید یہ کسی حسینہ کی بددعا ہے یا تم پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ خدا کے لیے کسی کامل یا پیر فقیر سے مل کر اپنی نحوست دور کراؤ ورنہ وہ دن دور نہیں جب بعض جرائم پیشہ کسی خوب صورت لڑکی کو قتل کرنے کے لیے خود ہاتھ پاؤں ہلانے کے بجائے تمہاری خدمات حاصل کریں گے۔ تم جس لڑکی سے جا کر ملو گے وہ خود ہی قتل ہو جایا کرے گی۔

اسی ہال میں ایک دیوار گیر فون موجود تھا۔

میں نے رحیم گل کے تھانے کا نمبر ملایا لیکن پتا چلا کہ اس وقت وہ ڈیوٹی پر نہیں تھا۔ گھر فون کیا تو اس کے ملازم نے بتایا کہ وہ گھر نہیں پہنچا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ اب تو اس نے اپنے خرچ پہ موبائل فون بھی لے لیا تھا اور اسے چوں کہ چوبیس گھنٹے اپنے آپ کو ڈیوٹی پر ہی سمجھنے کا شوق تھا اس لیے اس سے موبائل فون پر بھی رابطہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے اپنی ننھی سی الیکٹرانک نوٹ بک میں اس کے موبائل کا نمبر دیکھ کر ملایا تو اس نے فوراً ہی فون ریسیو کرلیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ منہ چلا رہا تھا۔ نہایت خفیف سی آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا تھا۔

"کہاں ہو اس وقت؟" میں نے پوچھا۔ اس نے ایک ریستوران کا نام بتایا جو اس کے تھانے سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس نے میری آواز پہچان لی تھی۔

"یقیناً اس وقت کھانا کھارہے ہو۔" میں نے کہا "جگالی کرنے کی سی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔"

"قدرت نے تمہیں غیر معمولی حسیات دے کر اچھا نہیں کیا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تم جیسے اوچھے انسانوں کے پاس ایسی صفات نہیں ہونی چاہئیں۔"

"میری صلاحیت پر تنقید مت کرو اور اسے اپنے تھانے کی عمل داری میں آنے والی کوئی شے مت سمجھو۔ قدرت جو کرتی ہے' بہتر کرتی ہے اور تم جیسے گدھوں سے پوچھ کر نہیں کرتی۔" میں نے کہا "فی الحال تم جتنا بھی کھا چکے ہو اسی پر اکتفا کرو اور صبر شکر کے ساتھ یہاں آجاؤ......"

میں اسے ایڈریس بتانے ہی لگا تھا کہ وہ میری بات کاٹ کر بولا "خیریت تو ہے؟"

"خیریت کے عالم میں پولیس والوں کو فون کوئی گدھا ہی کرسکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہ..... میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم جیسے منحوس آدمی سے کوئی خیر کی خبر بھلا کیسے مل سکتی ہے۔" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا "خیر..... جب بُری خبر کی تمہید سُننے کو مل جائے تو پھر بُری خبر کو بھی جتنی جلد سُن لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ کہو..... کیا خبر ہے؟ کیا تم نے کوئی گل کھلا دیا ہے؟"

"نہیں۔ یہ فریضہ کسی اور نے انجام دیا ہے۔ تم نے کبھی پرنسس سمیرا کا نام سُنا ہے؟"

"کیوں نہیں۔ ایک خاص طبقے میں تو وہ بڑی مشہور شخصیت ہے۔ مجھے تو خود اس سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ اس سے ملنے کا کوئی بہانہ بن جائے تو اچھا ہے۔ کیا اس نے کوئی گل کھلا دیا ہے؟ اگر ایسا ہے تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس بہانے اس سے ملاقات ہوجائے گی۔" وہ قدرے پُرجوش انداز میں تیز تیز سے کہتا چلا گیا۔

ایک لمحے کے لیے میرے دل میں جیسے کوئی کانٹا سا چُبھا۔ صورتِ حال کی افسردگی اور بوجھل پن سے بچنے کے لیے اس پر بھی رحیم گل کے ساتھ نوک جھونک کے سہارے خود کو بہ... کی کوشش کررہا تھا۔ موت ایک بدصورت حقیقت تھی خ... حُسن اور جوانی کی موت......! میرے نظریں چُرانے سے یہ حق... مٹ تو نہیں سکتی تھی پھر بھی میں گویا اس سے نظریں چُرانا چاہتا... بظاہر مجھے معلوم تھا کہ پرنسس سمیرا کو قتل کردیا گیا تھا اور میں... گل کو اسی واقعے کی اطلاع دے رہا تھا لیکن اپنے دل کو میں خود فریبی میں مبتلا کرنے کی ناکام کوشش کررہا تھا کہ ایسی کوئی... نہیں تھی۔ یہ محض ایک ناخوش گوار خواب تھا لیکن اس... طفل تسلیوں سے نہ تو خواب حقیقت بن جاتے ہیں اور حقیقتیں خوابوں میں ڈھلتی ہیں۔ میرے حلق میں گویا کوئی چیز... رہی تھی۔ میں نے اسے نگلتے ہوئے حتی الامکان شگفتگی...

"نہیں..... پرنسس سمیرا نے کوئی گل نہیں کھلایا۔ وہ جتنے گُل... سکتی تھی' کھلا چکی۔ اب وہ گُل کھلانے کی پوزیشن میں نہیں... اسے کسی نے قتل کردیا ہے۔"

"اوہ نو......" اس کی سرسراتی سی آواز فون پر ابھری... یک دم خاموش ہوگیا۔

"تمہیں اس سے ملاقات کا موقع تو مل گیا لیکن افسو... کوئی اچھا موقع نہیں ہوگا۔" میں نے اس اطلاع کے بوجھل... کم کرنے کی کوشش کی۔

وہ شاید چند سیکنڈ کے اس وقفے میں سنبھل چکا تھا اور ا... آگیا تھا کہ اس کا اصل کردار ایک ذمے دار پولیس افسر کا... غیر جذباتی اور قدرے پیشہ ورانہ سے لہجے میں بولا "قتل کہاں... ہے؟"

"کلفٹن کے ایک بنگلے میں اس نے اپنا آرٹ اسٹوڈیو... تھا۔ وہ یہاں اکیلی تھی۔ کسی نے اس کے سر پر پتھر کا ایک مج... کر اسے ہلاک کیا ہے۔" میں نے بتایا۔

"اور تم وہیں موجود ہو؟" وہ تیز لہجے میں بولا۔

"ظاہر ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"کسی چیز کو چھیڑنا مت......" اس نے تاکید کی۔

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہر احمق اپنے بارے میں یہی کہتا ہے۔" وہ غرایا "تم احمق ہی نہیں بلکہ اوّل درجے کے منحوس بھی ہو۔ جو... صورت لڑکی سے ملتے ہو وہ قتل ہوجاتی ہے۔ شاید یہ تمہیں... کی بددعا ہے یا تم پر کسی آسیب کا سایہ ہے۔ خدا کے لیے کسی... کامل پیر فقیر سے مل کر اپنی نحوست دور کراؤ ورنہ وہ دن... جب بعض جرائم پیشہ کسی خوب صورت لڑکی کو قتل کرنے... خود ہاتھ پاؤں ہلانے کے بجائے تمہاری خدمات حاصل کریں... گے۔ تم جس لڑکی سے جاکر ملو گے وہ خود ہی قتل ہوجایا کرے گی...

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا "کر چکے بکواس...... یا ابھی اور ٹرٹر کرو گے؟"

"یہ بکواس نہیں' ایک فکر انگیز حقیقت ہے۔ آج نہیں تو کل تمہیں اس مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنا ہوگا۔ بہتر ہے آج ہی سوچ لو ورنہ کبھی نہ کبھی تم کسی لڑکی کے قتل کے الزام میں خود اندر ہو جاؤ گے۔ آخر میرا دوست ہونا تمہارے کب تک کام آئے گا؟" وہ اب وہی رحیم گل بننے کی کوشش کر رہا تھا جس سے میری نوک جھونک چلتی رہتی تھی۔

"میں پہلے بھی اس حقیقت کی طرف تمہاری توجہ دلا چکا ہوں کہ کئی حسین لڑکیوں سے میری مہینوں بلکہ برسوں سے میل ملاقات ہے اور وہ آج بھی ہٹی کٹی ہیں۔ یہی نہیں' ان میں سے بعض تو میری ہی وجہ سے موت کے منہ میں جاتے جاتے بچی ہیں...... اور جہاں تک اس بات کا سوال ہے کہ تمہارا دوست ہونا میرے کب تک کام آئے گا...... تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم اس قسم کی خوش فہمیوں میں کیوں مبتلا ہو جاتے ہو۔ محض ایک انسپکٹر ہو کر تمہیں مجھ سے اس قسم کی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارا تبادلہ واپس اندرونِ سندھ کروا دوں؟"

"تم میرا تبادلہ بعد میں کرواتے رہنا...... میرا خیال ہے فی الحال تو میں آکر پہلے تمہیں پرنس سیرا کے قتل کے الزام میں اندر کرتا ہوں' خواہ قاتل بھی جائے واردات پر موجود ہی کیوں نہ ہو۔

واضح رہے کہ یہ بات میں دانت پیس کر کہہ رہا ہوں۔" وہ بدستور غرانے کے سے انداز میں بولا "ذرا جلدی سے ایڈریس لکھواؤ۔"

میں نے ایڈریس لکھوایا اور اس نے فوراً فون بند کر دیا۔ میں نے بھی ریسیور ہک پر لٹکا دیا اور واجدہ کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بدستور آنکھیں بند کیے پڑی تھی اور گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ غنیمت یہ تھا کہ اس کے ہونٹ نیم وا تھے۔ اس کے دانت تشنج کی سی کیفیت میں سختی سے بھنچے ہوئے نہیں تھے۔

میں نے کچن تلاش کیا جہاں فریج موجود تھا۔ میں ایک گلاس میں تھوڑا سا ٹھنڈا پانی لے کر واجدہ کے پاس واپس پہنچا۔ میں نے ابھی اس کے چہرے پر ایک بار ہی چھینٹے مارے تھے کہ اس نے جھرجھری سی لے کر آنکھیں کھول دیں تاہم آنکھیں دھندلائی ہوئی سی تھیں۔

"آپ کیسا محسوس کر رہی ہیں مسز پرویز!" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "اگر آپ کہیں تو میں آپ کے لیے ڈاکٹر کو بلاؤں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا تاہم خود ہی ذرا کوشش سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اب تک گویا اسے یاد نہیں آیا تھا کہ وہ کیوں بے ہوش ہوئی تھی لیکن اب یاد آیا تو اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہوئے۔ اس نے صرف ایک نظر اپنی بہن کی لاش کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ اس کے جسم پر کپکپی سی طاری تھی۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے وجود

درحقیقت آنسوؤں کا ایک سیلاب مقید تھا جسے وہ روکنے کی کوشش کر رہی تھی اس لیے زیادہ اذیت میں مبتلا تھی۔

میں نے ملائمت سے کہا "آپ اپنے آنسوؤں کو نہ روکیں۔ اگر آپ کا رونے کو جی چاہ رہا ہے تو ضرور رولیں۔"

اسے گویا کسی طرف سے اسی مشورے کا انتظار تھا۔ بعض اوقات کسی کے چند معمولی الفاظ سے کسی کے ضبط کا بندھن ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس کے جسم کو تشنجی جھٹکے لگنے لگے۔ میں خاموشی سے ایک طرف منتظر سے انداز میں کھڑا رہا۔ آنسوؤں کا سیلاب جتنا شدید تھا اتنی ہی تیزی سے گزر بھی گیا۔ جلد ہی اس کے جسم کو جھٹکے لگنا بند ہو گئے۔ آنسو بھی تھم گئے اور وہ کافی دیر تک پُرسکون ہو گئی۔ میں نے جلدی سے اس کا ٹشو بکس اسے تھما دیا۔ اس نے اس میں سے کئی ٹشو پیپر نکالے اور اپنا چہرہ خود ہی پونچھ لیا۔

"بعض اوقات اپنے دکھ کے بارے میں کسی سے بات کرنے سے بھی دل ہلکا ہوتا ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا "میں آپ کے لیے اجنبی سہی...... بہرحال انسان ہوں۔"

اس نے متورم سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اس دنیا میں اکثر انسانوں کو صرف انسانیت کے رشتے پر ہی بھروسا کرنا پڑتا ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فوری ضرورت کے وقت وہ لوگ میسر نہیں ہوتے جن سے آپ کے خون کے رشتے ہوتے ہیں یا کوئی گہرا جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ ایسے میں صرف انسانیت کا رشتہ کام آتا ہے۔

اس وقت شاید اسے بھی یہ رشتہ غنیمت محسوس ہوا اور وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی "کیا تم سیرا کو بہت اچھی طرح جانتے تھے؟"

"نہیں۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا۔" میں نے جواب دیا "میری اس سے پرسوں ہی پہلی ملاقات ہوئی تھی اور وہ کسی حد تک سرسری سی ملاقات تھی۔"

وہ منہ پھیر کر ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو تکنے لگی۔ اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی "سیرا کو کوئی بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکا۔ لوگوں نے اس کے بارے میں طرح طرح کے افسانے مشہور کر رکھے تھے لیکن درحقیقت وہ سب کے اندازوں سے بہت مختلف لڑکی تھی۔ کوئی اسے عیاش' کوئی آوارہ' کوئی غیر ذمے دار' کوئی ضدی و سرکش اور کوئی بگڑی ہوئی مغرب زدہ نواب زادی سمجھتا تھا لیکن درحقیقت وہ ان سب تصورات سے بہت مختلف تھی۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے سسکی سی لی پھر بولی "دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کا امیج کچھ اور ہوتا ہے لیکن اگر آپ کو ان کے قریب ہونے کا موقع ملے تو پتا چلتا ہے کہ حقیقت میں وہ کچھ اور طرح کے ہیں۔ کسی کا امیج فرشتے کا ہوتا ہے لیکن قریب جانے پر وہ شیطان نکلتا ہے۔ کسی کا امیج شیطان کا ہوتا ہے مگر اندر سے وہ فرشتہ ہوتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہتی کہ سیرا بہت نیک' پارسا اور دین دار لڑکی تھی لیکن وہ ویسی بھی بہرحال نہیں تھی جیسی اسے سمجھا جاتا تھا۔ وہ عیاش ہرگز نہیں تھی۔ اس نے ہمیشہ اپنی حدود میں رہ کر زندگی گزاری اور اپنے شوہروں کے ساتھ مخلص رہی۔ اس کی بدقسمتی تھی کہ شوہروں کے ساتھ اس کی نہیں بن سکی۔ میں اس کی نجی زندگی سے کافی اچھی طرح واقف ہونے کا دعویٰ کر سکتی ہوں۔ اپنے دونوں شوہروں کے سوا اس کے کبھی کسی سے مراسم نہیں رہے۔ اس جتنی دولت اور آزادی و خود مختاری کسی اور لڑکی کو حاصل ہوتی تو اس کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔"

وہ ایک بار پھر ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی اور یوں میری طرف دیکھنے لگی جیسے اطمینان کر رہی ہو کہ میں اس کی بات کا یقین بھی کر رہا ہوں یا نہیں۔ میں نے اپنے چہرے پر حتی الامکان ہمدردانہ تاثرات رکھنے کی کوشش کی۔ اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "وہ غیر ذمے دار' ضدی یا سرکش بھی نہیں تھی۔ بات بس اتنی تھی کہ اس کی ترجیحات دوسروں سے ذرا مختلف تھیں اور اس نے اپنا ایک الگ لائف اسٹائل بنایا ہوا تھا۔ جن کو اس کے لائف اسٹائل سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ اسے طرح طرح کے نام دیتے تھے لیکن یہ اپنے آپ میں مگن رہتی تھی۔ کسی کی پروا نہیں کرتی تھی۔ تمہیں یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ وہ چپکے چپکے نہ جانے کتنے غریبوں کی مدد کرتی تھی۔ کتنی بیواؤں کے اس نے وظیفے باندھ رکھے تھے۔ کتنی ہی غریب لڑکیوں کی اس نے خود پس منظر میں رہتے ہوئے شادیاں کرائی تھیں۔ ہمارے طبقے میں فلاحی کام زیادہ تر دکھاوے کے لیے کیے جاتے ہیں۔ کوئی بیگم صاحبہ تنظیم بنا کر اس کے چندے سے بیواؤں کو چند سلائی مشینیں بھی دیتی ہیں تو پورے پریس کو جمع کر کے تصویریں کھنچواتی ہیں اور وہ تصویریں جب تک اخباروں میں نہیں چھپتیں' انہیں چین نہیں آتا لیکن سیرا کسی فلاحی تنظیم کی عہدے دار تو کیا' رکن بھی نہیں تھی۔ اس کے ان کاموں کا اس کے قریبی لوگوں کو بھی علم نہیں ہوتا تھا' اخبارات میں ان کا تذکرہ آنا تو دور کی بات تھی......"

سسکی کے سے انداز میں ایک گہری سانس لے کر وہ پھر بولی "قدرت کے کاموں کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ معلوم نہیں قدرت کو اس کی کون سی ادا پسند تھی۔ وہ چپکے چپکے لوگوں کی امداد کے لیے جتنی رقم خرچ کرتی تھی اس کی دولت میں کسی نہ کسی بہانے اتنا ہی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ دولت کے بارے میں جتنی بے پروا تھی' دولت اتنا ہی اس کی طرف کھنچی چلی آتی تھی۔"

وہ جو کچھ بتا رہی تھی' وہ میرے لیے بھی کسی حد تک سیرا کی شخصیت کا ناقابلِ یقین پہلو ہی تھا مگر زیادہ ناقابلِ یقین نہیں۔ میں کسی کے بھی ظاہری امیج پر زیادہ یقین نہیں رکھتا تھا۔ وہ گویا مجھے

زیادہ یقین دلانے کے لیے زور دے کر بولی "یہ مت سمجھنا کہ میں اپنی بہن کی محبت میں آ کر ایسی باتیں کر رہی ہوں اور اس کی چھوٹی چھوٹی خوبیوں کو بڑا بنا کر پیش کر رہی ہوں یا اسے افسانوی شخصیت بنانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی زندگی میں تو خود میری بھی اس سے کبھی نہیں بنی۔ میں بھی اسے لعن طعن کرنے والوں میں ہی شامل رہی اور اس میں میری ہی زیادہ غلطی تھی۔ میں نے کبھی اسے بڑی بہن جیسی شفقت اور محبت نہیں دی۔ اب یہ پچھتاوا زندگی بھر میرے ساتھ رہے گا۔ میرے تمام تر خراب رویے کے باوجود اس کے رویے میں کبھی فرق نہیں آیا۔ وہ میرے لیے ویسی ہی ہنس مکھ، مؤدب اور ہر بات پر سر جھکا دینے کی عادی رہی جیسے کسی چھوٹی بہن کو ہونا چاہیے......"

اس نے ایک بار پھر سسکی سی لی اور ٹشو پیپر سے ناک پونچھی۔ وہ اب سیمرا کی لاش کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس سے نظر چرا رہی تھی۔ شاید اب اس میں اس طرف دیکھنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔

اچانک اسے جیسے کچھ یاد آیا اور وہ ذرا چونک کر بولی "میرا خیال ہے تم نے پولیس کو اطلاع دے دی ہے جبھی تم اتنے مطمئن نظر آ رہے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "آپ کو اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جو پولیس آفیسر یہاں آ رہا ہے وہ بہت سلجھا ہوا اور دیانت دار انسان ہے۔ وہ اس معاملے کو بے ڈھنگے طریقے سے ہینڈل نہیں کرے گا۔ آپ کی فیملی کے بارے میں کوئی اسکینڈل نہیں بنے گا۔"

اس کے چہرے پر یک دم خوف کے جو سائے اُبھر آئے تھے، میرے تشفی آمیز الفاظ سے وہ کچھ کم ہوئے۔ وہ تھوک نگل کر بولی "میرے شوہر کو بھی بُلا دو۔ پولیس کی آمد کے موقع پر ان کا بھی موجود ہونا ضروری ہے۔ ان کے موبائل فون کا نمبر......"

وہ نمبر بتانے لگی تو میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "پہلے پولیس کو آ جانے دیجئے۔ وہ خود جس کو مناسب سمجھیں گے، بُلا لیں گے۔ آپ بہرحال اطمینان رکھیں۔ آپ کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ پولیس کے آنے تک وقت گزاری کے لیے مجھے سیمرا کے بارے میں کچھ اور بتائیں اس طرح آپ کے دل کا بوجھ کچھ اور ہلکا ہوگا۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے اس کی دو ناکام شادیوں کے بارے میں بتائیں۔"

اس نے ایک لمحے سوچا پھر شاید اسے میرا مشورہ معقول محسوس ہوا۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد وہ کمزور سی آواز میں بولی "دو شادیوں کی ناکامی ہی نے تو سیمرا کا امیج سب سے زیادہ خراب کیا۔ سیمرا جیسا لائف اسٹائل اور سیمرا جیسی شہرت رکھنے والی کسی بھی لڑکی کی شادی اگر ناکام ہوتی ہے تو اس کے بارے میں فوراً فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس کی وجہ صرف لڑکی ہی ہوگی۔ شوہر کے بارے میں تو اکثر لوگوں کو کچھ معلوم ہی نہیں ہوتا اور نہ [illegible] شخصیت زیرِ بحث آتی ہے۔"

"پرنس سیمرا کا پہلا شوہر کسی خلیجی ریاست کا شہز[ادہ تھا؟"] میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" اس کے لہجے میں یک دم تلخی آ گئی "اور ب[ہت] کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ایک اجنبی ماحول میں اس [طرح] شہزادوں کے ساتھ زندگی گزارنا کسی لڑکی کے لیے نہایت [ہمت] اور دل گردے کا کام ہے۔ وہ سیمرا کے ساتھ آکسفورڈ میں [پڑھتا تھا] تو گویا اس کی کوئی اور ہی شخصیت سامنے تھی۔ سیمرا اس [سے] بیاہ کر اس کی ریاست میں، اس کے پیلس میں چلی گئی تو گو[یا کوئی اور] ہی پرنس اس کے سامنے آ گیا۔ اس کے سارے خواب [اور] رومانس دھرا رہ گیا۔ اس کے باوجود سیمرا نے گزارا [کرنے کی] کوشش کی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ ایک عورت سے شاید [شہزادوں] کا دل بہت جلد بھر جاتا ہے..... ہو سکتا ہے مجموعی طور پر [ایسا نہ] ہو لیکن کم از کم سیمرا کے شوہر کا معاملہ تو یہی تھا۔ جس [نے] اتنے چاؤ سے بیاہ کر لے گیا تھا، ایک سال بعد ہی گویا اس [کے لیے] سیمرا میں کوئی کشش نہیں رہی۔ اس کی یہ بھی فرمائش تھی [کہ وہ] ماں نہ بنے..... اور اس سب کے باوجود اس نے صرف ا[یک سال] بعد دوسری اور ڈیڑھ سال بعد تیسری شادی کر لی۔ سیمرا [نے] چوں چاں کی تو اقرار نامے وغیرہ کے مطابق کچھ دولت دے [کر] کاغذات اسے تھما کر طلاق دے کر چلتا کر دیا۔ مہر کے طور پر دولت و جائیداد وہ پہلے ہی دے چکا تھا۔ ان لوگوں کے ہاں طل[اق اور] شادی کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے۔ کاروباری مسائل کی [طرح] انہیں بھی نہایت غیر جذباتی انداز میں نمٹاتے ہیں۔ سیمرا [کا] آئیڈیل ازم دھرا رہ گیا۔"

"اس کی دوسری شادی غالباً کسی اداکار سے ہوئی تھی؟" [میں] نے ذرا انجان بنتے ہوئے پوچھا۔ ویسے یہ حقیقت بھی تھی [کہ مجھے] اس کے بارے میں بہت زیادہ معلومات تو نہیں تھیں۔

"ہاں..... ایک تھرڈ کلاس اور ناکام اداکار......!" [اس] کے لہجے میں بے پناہ ناگواری سمٹ آئی "مگر شکل صورت اچھی تھی اور اس پر بلا کی معصومیت طاری رہتی تھی۔ [ایسا لگتا تھا جیسے بھولا] سا گا یہ کہ زبان بڑے غضب کی پائی تھی۔ میٹھی میٹھی باتوں [سے] کسی کو بھی شیشے میں اُتار سکتا تھا مگر حیرت کی بات یہ ہے [کہ ان] "زبردست" خوبیوں کے باوجود وہ زندگی کے ہر شعبے میں نا[کام رہا۔] اداکاری، کاروبار، ذاتی پروڈکشن، غرض یہ کہ کسی بھی مید[ان میں] کامیاب نہیں ہو سکا۔ اس کی زندگی کی سب سے بڑی کامیا[بی] یہی تھی کہ وہ سیمرا جیسی لڑکی تک پہنچنے اور شادی کے لیے [اسے] شیشے میں اُتارنے میں کامیاب ہو گیا۔ شاید اس کی بڑی وجہ [یہ تھی] کہ سیمرا اس وقت دل شکستہ اور احساسِ تنہائی کا شکار تھی۔ طلاق کے بعد سے اس کے اندر ایک ٹوٹ پھوٹ جاری تھی

عمران نے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔"

"اس کا نام عمران تھا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں..... کیا تم اسے جانتے ہو؟" واجدہ نے دریافت کیا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا "میں نے شاید صرف ایک آدھ مرتبہ ٹی وی پر دیکھا ہے۔"

"زبردست سفارش کے باوجود وہ اپنی بد اعمالیوں کے سبب وہاں بھی نہیں چل سکا۔ سیرا کو بہت جلد اندازہ ہوگیا کہ اس کا یہ انتخاب پہلے سے بھی زیادہ خراب تھا۔ عمران کی سب سے بڑی خرابی اس کی لالچی فطرت اور دھوکے بازی کی عادت تھی۔ وہ ہر شخص سے فراڈ کرتا تھا' ہر ایک کو شکار سمجھ کر ذبح کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ بیوی کے نام پر نہ جانے کس کس سے لاکھوں کے فراڈ کرتا تھا اور ستم ظریفی یہ تھی کہ یہ بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ لاکھوں روپے جاتے کہاں تھے؟ وہ ہمیشہ قلاش کا قلاش ہی رہتا تھا۔ شادی سے پہلے اس کے جو ٹھاٹ باٹ نظر آتے تھے وہ جعل سازی اور دھوکے بازی کے رہین منت ہوتے تھے اور شادی کے بعد جو ٹھاٹ باٹ رہے وہ سیرا کی بدولت رہے۔ اس قسم کے لوگوں کو برداشت کرنا سیرا کی فطرت میں نہیں تھا اس لیے یہ شادی بھی زیادہ عرصے نہیں چل سکی۔ سیرا نے اسے کچھ دے دلا کر اس سے خود جان چھڑائی تھی....."

واجدہ نہایت افسردگی سے مسکرائی اور ایک لمحے کے توقف سے بولی "بہت سے انسانوں کو خدا بہت نوازتا ہے۔ ان کی زندگی دوسروں کے لیے قابلِ رشک ہوتی ہے لیکن خدا ان کی ذات میں کوئی ایسی تشنگی رکھ دیتا ہے جو زندگی بھر ان کے ساتھ ہی چلتی ہے۔ سیرا کی بھی یہ بدقسمتی رہی کہ اسے سب کچھ میسر رہا اور اس نے زندگی بھی اپنی مرضی سے بسر کی..... اپنا ہر فیصلہ خود کیا لیکن اسے اپنے آئیڈیل کے مطابق کوئی مخلص اور بے غرض رفیقِ حیات نہیں مل سکا۔ بعد میں اسے احساس ہوا کہ شاید اس کی غلطی یہ تھی کہ اس نے اس معاملے میں کبھی باپ سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی یا یہ معاملہ ان پر نہیں چھوڑا۔ اس نے اپنی آزادی و خودمختاری سے کچھ زیادہ ہی فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی اور اس معاملے میں باپ کو خاطر میں نہیں لائی۔ شاید قدرت نے اسے اس بات کی سزا دی۔ اس نے اپنی زندگی کی ان دو بڑی ٹھوکروں سے سبق حاصل کیا تھا اور اب وہ بہت بدل چکی تھی۔ ہماری والدہ تو ہماری کم سنی میں ہی مرچکی تھیں۔ سیرا نے عہد کیا کہ اب وہ زندگی کے ہر معاملے میں والد کی رائے کو مقدم رکھے گی لیکن اس کے بعد والد ہی اس دنیا میں نہ رہے۔"

وہ ایک بار پھر ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ میں چاہتا تھا کہ رحیم گل کے آنے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہے اور میں جتنی بھی معلومات حاصل کرسکوں' کرلوں۔ چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تاہم والد کے انتقال کے بعد سیرا نے ایک بار پھر کوئی جیون ساتھی تلاش کرلیا..... ابھی صرف منگنی ہوئی ہے اور ا[س] کے منگیتر کا نام صفدر منیر ہے؟"

واجدہ نے اثبات میں سر ہلایا "ہاں..... سیرا کے دل میں [صحیح] معنوں میں اپنا گھر بسانے کی خواہش بہرحال اب بھی موجود [تھی]۔ اس بار بھی مستقبل کے ساتھی کے انتخاب میں والد صاحب [کا] مشورہ تو شامل نہیں ہوسکا کیوں کہ وہ اس دنیا میں موجود ہی [نہیں] تھے لیکن سیرا کا خیال یہی تھا کہ اس بار اس نے قطعی غیر جذبا[تی ہو] کر اور نہایت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا تھا۔"

"صفدر منیر کیا کرتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"امپورٹ ایکسپورٹ کی کسی چھوٹی سی فرم کا مالک ہے۔ [مجھے] اس کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں کیوں کہ میں [سیرا] کے معاملات میں زیادہ دلچسپی ظاہر نہیں کرتی تھی۔ بظاہر ہم [بہنوں] میں زیادہ قربت نہیں تھی۔ میں بتا ہی چکی ہوں۔ ویسے جہاں [تک] میری ذاتی رائے کا تعلق ہے..... مجھے یہ صفدر منیر نامی نوجوان شریف اور دیانت دار معلوم ہوتا ہے۔ سیرا کی بھی اس کے [بارے] میں یہی رائے تھی۔ تاہم مجھے اس کی رائے پر زیادہ اعتماد [نہیں] تھا۔"

وہ چند لمحے سوگوار انداز میں خاموش رہی۔ میں نے دھیمے [لہجے] میں کہا "آپ سے بات کرکے پرنس سیرا کی شخصیت کے [بہت] سے مخفی پہلو اُجاگر ہوئے ہیں۔"

"میں تمہیں کیا کیا بتاؤں....." اس نے ایک بار پھر سسکی لی "اس کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن پر کوئی [یقین] نہیں کرے گا۔ وہ بظاہر بڑی لاابالی' بے پروا..... بلکہ بعض لوگ[وں کو] تو کسی حد تک سفاک بھی نظر آتی تھی لیکن درحقیقت وہ نہایت [نرم] دل اور حساس تھی۔ اس کی ذات سے دانستہ طور پر شاید کبھی [کسی] چیونٹی کو بھی گزند نہ پہنچی ہو۔ اسے آج کے دور کی سیاست [اور ہر] قسم کے جھگڑوں سے بے پناہ نفرت تھی۔ اسے دنیا کے کسی [بھی] گوشے میں کسی بھی بے گناہ کی موت کا دلی صدمہ ہوتا تھا۔ [اسی لیے] وہ ہتھیاروں کی صنعت سے بھی نفرت کرتی تھی۔ کہا کرتی تھی کہ [اگر] اس کا بس چلے تو وہ ساری دنیا کے ہتھیاروں کے کارخانے [بند] کرادے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ ہمارے اپنے والد کی انڈسٹریز [میں] سے ایک انڈسٹری ایسی ہے جس میں ہتھیاروں کی تیاری [میں] استعمال ہونے والا سامان بنتا ہے۔ سیرا اکثر ان سے لڑتی [تھی کہ] انہوں نے وہ انڈسٹری کیوں لگائی۔ وہ ان سے ضد کیا کرتی تھی کہ [وہ] اس انڈسٹری کو بند کردیں۔ وہ ہر بار ہنس کر اس کی بات ٹال [دیتے] تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہ انڈسٹری سب سے زیادہ منافع [بخش] ہے۔"

"ہاں۔ افسوس کی بات تو یہی ہے کہ ہتھیاروں کی تجارت [اور] صنعت دونوں' دنیا کی سب سے زیادہ منافع بخش صنعت اور [تجارت] ہے۔ امریکا جیسے ملک کی معیشت انہی کے سہارے کھڑی

ہے۔" میں نے تاسف سے کہا "اجتماعی خودکشی کا یہ کاروبار کوئی بھی بند نہیں کرسکتا۔"

اچانک آس پاس ہی کہیں مترنم سی کال بیل گنگنا اُٹھی۔ واجدہ گویا کسی خطرے کے سے احساس سے چونکتے ہوئے بولی "کون آیا ہوگا؟"

"میرا خیال ہے پولیس آن پہنچی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر ایک بار پھر وحشت بڑھ گئی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ دوبارہ نہ چکرا جائے لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا تاہم اس کے ہاتھوں میں صاف طور پر ارتعاش محسوس ہورہا تھا۔ میں نے انٹرکام وغیرہ تلاش کرنے کے بجائے خود گیٹ پر جانے کا فیصلہ کیا۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ آنے والا رحیم گل ہی تھا اور وہ وردی میں تھا۔ پولیس کی ایک موبائل اس کے ساتھ تھی۔ چوں کہ معاملہ لڑکی کے قتل کا تھا اس لیے شاید احتیاطاً وہ دو پولیس والیوں کو بھی ساتھ لے آیا تھا جو خاصی موٹی موٹی اور بارعب شخصیت کی مالک تھیں۔ ان کے علاوہ دیگر ضروری عملہ بھی اس کے ساتھ تھا۔ وہ بالکل سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

اس نے اندر آکر بالکل اسی طرح ضابطے کی کارروائی شروع کرادی جس طرح ڈھنگ کے پولیس والوں کو کرنی چاہیے۔ پیمائشیں ہونے لگیں۔ جائے واردات کا نقشہ بننے لگا' فنگر پرنٹس اور دیگر شہادتیں تلاش کی جانے لگیں۔ رحیم گل نے نہایت سنجیدگی سے میرا اور واجدہ کا بیان بھی لیا جو ایک اے ایس آئی نے قلم بند کیا۔ واجدہ کی حالت اس دوران دوبارہ کچھ بگڑنے لگی تھی اس لئے رحیم گل نے اس کے فیملی ڈاکٹر کو بھی فون کردیا۔ اس کے شوہر کو بھی اس واقعے کی اطلاع دے دی گئی جس نے غالباً یہ بتایا کہ وہ شہر سے ذرا دور کسی صنعتی علاقے میں تھا اس لیے اسے پہنچنے میں کچھ دیر لگ جائے گی۔ اس کے علاوہ رحیم گل نے لاش اُٹھوانے کی غرض سے ایمبولینس بُلوانے کے لیے بھی فون کردیا۔

ڈاکٹر کہیں قریب ہی رہتا تھا۔ وہ بہت جلد پہنچ گیا اور اس نے واجدہ کو ایک انجکشن لگادیا۔ اسے ایک بیڈ روم میں لٹایا جاچکا تھا۔ پولیس کی آمد کے ساتھ ہی اسٹوڈیو میں ایک افراتفری سی برپا ہوگئی تھی لیکن اب کچھ سکون ہوگیا تھا۔ ایمبولینس آکر لاش لے جاچکی تھی لیکن پولیس والے اب بھی پورے بنگلے میں کھٹر پٹر کرتے پھررہے تھے اور ہر چیز کی تفصیل نوٹ کررہے تھے۔ شاید وہ کوئی سراغ تلاش کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ میرے خیال میں ان کی ان کوششوں سے خانہ پُری کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

آخر کار رحیم گل مجھے ساتھ لے کر ہال کے اس گوشے میں جا بیٹھا جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس نے نوٹ بک بند کرکے ایک طرف رکھ دی اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "ہاں برخوردار.....! اب مجھے اصل کہانی سُناؤ۔ تمہاری بھلائی کے لیے میں فی الحال اسے نوٹ نہیں کروں گا لیکن پوری' سچی اور صحیح بات میرے علم میں آنی چاہیے۔"

"بزرگوار! اصل کہانی تو یہی ہے جو میں اپنے بیان کی صورت میں لکھوا چکا ہوں البتہ اس کا ایک پس منظر بھی ہے۔ وہ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔" میں نے بھی گہری سنجیدگی سے جواب دیا "کچھ تفصیلات اور جزئیات ہیں جو میں نے اپنے رسمی بیان میں بتانا ضرور نہیں سمجھیں۔ وہ باتیں آف دی ریکارڈ سمجھ کر اب سُن لو۔"

"ہاں..... ہاں..... جلدی بتاؤ یہاں تم نے کیا نیا ڈراما رچایا تھا۔" وہ صوفے پر کچھ آگے کھسکتے ہوئے بولا۔

"میں نے نہ تو پہلے کبھی کوئی ڈراما رچایا تھا اور نہ اب رچایا ہے..... بلکہ اس مرتبہ تو صحیح معنوں میں میرے ساتھ ڈراما ہوا ہے۔" میں نے گویا بُرا مناتے ہوئے کہا "لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ ڈرامے میں اتنی جلدی ایسا المیہ موڑ آجائے گا۔ سیرا کے اس طرح قتل ہونے کا مجھے حقیقتاً دلی افسوس ہے۔"

رحیم گل کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ قتل کی اس واردات نے اسے بھی متاثر کیا تھا گو کہ لاشیں دیکھنا ان لوگوں کے معمولات میں شامل تھا۔ میں نے تفصیل سے اسے سب کچھ بتادیا کہ کس طرح میری پرنس سیرا سے ملاقات ہوئی تھی' کیا باتیں ہوئی تھیں' کیا کچھ مجھے معلوم ہوا تھا۔ کس طرح رخصت ہوتے وقت میرا کامران دانش نامی نوجوان سے سامنا ہوا تھا۔

"اس کا حلیہ وغیرہ تفصیل سے بتاؤ۔" رحیم گل نے میری بات کاٹتے ہوئے فرمائش کی۔ میں نے وہ بھی بتادیا تو وہ بولا "پھر کیا ہوا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" میں نے دیانت داری سے جواب دیا "اس کے بعد تو بس آج رات سیرا کا فون آیا اور اس نے فرمائش کی کہ وہ کسی کام کے سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کے انداز گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا کہ معاملہ اہم تھا۔"

"تم کہہ رہے ہو کہ تم نے کوئی ڈراما نہیں رچایا۔ ڈراما تو تم نے کسی نہ کسی حد تک شروع کرہی رکھا تھا۔ تم وکیل بنے ہوئے تھے۔ تمہارا یہ اقدام جعل سازی کے زمرے میں آتا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے مجھے گھورا۔

"اتنے غم ناک موقع پر اتنی مزاحیہ باتیں مت کرو یار! اس وقت ہنسنے کو دل نہیں چاہ رہا۔" میں نے کراہ کر کہا "مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں اب تم یہ نہ کہہ دو کہ یہ ملک اسی لیے اس حال کو پہنچ گیا ہے کہ پرسوں میں نے وکیل نہ ہوتے ہوئے اپنے آپ کو وکیل کہہ دیا تھا' اتنا بڑا فراڈ شاید ملک کی تاریخ میں آج تک نہیں ہوا اور یہاں جتنے بھی اخلاقی اور معاشرتی بحران آئے ہوئے ہیں اسی غلط بیانی کی وجہ سے آئے ہیں۔ غلط بیانی بعد میں ہوئی ہے بحران پہلے ہی آگئے تھے....."

"بس..... بس..... اب تقریر مت شروع کر دینا۔" وہ ہاتھ اُٹھاتے ہوئے بولا۔

"تمہارے لیے میری تقریر سے بچنے کا ایک طریقہ ہے..... اور وہ یہ کہ تم ابھی میرے اس ڈرامے کو جاری رہنے دینا۔ فی الحال کسی کے سامنے تردید مت کرنے بیٹھ جانا کہ میں وکیل نہیں ہوں۔ میں خود ہی جہاں ضروری سمجھوں گا' اپنے اس ڈرامے کو جاری رکھوں گا اور جہاں اس سلسلے میں زبان بند رکھنا ضروری سمجھوں گا' بند رکھوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"اچھا خیر..... اس بکواس کو چھوڑو۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "یہ بتاؤ کہ پرنس سمیرا نے آج رات جب تمہیں فون کرکے بُلایا تو کام کی نوعیت کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں دیا تھا؟"

"نہیں۔ اگر اس نے کچھ بتایا ہوتا تو اب تک میں تمہیں بتا چکا ہوتا۔ اس وقت میں تمہارے ساتھ بہت دیانت داری سے چل رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا مسٹر دیانت دار.....!" رحیم گل کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک کانسٹیبل اندر آگیا۔ رحیم گل نے اسے ہدایت کر رکھی تھی کہ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو اس ہال میں آنے نہ دیا جائے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی آکر ہماری گفتگو سُنے یا اس میں مداخلت کرے۔ اس نے سوالیہ نظروں سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

"سر! ایک صاحب آئے ہیں..... اپنا نام احمد پرویز بتا رہے ہیں..... ہم نے انہیں اندر آنے سے روک دیا تو سخت ناراض ہو رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں یہاں ان کا انتظار ہو رہا ہے۔" کانسٹیبل نے بتایا۔

"ٹھیک ہے..... انہیں اندر آنے دو۔" رحیم گُل نے بے پروائی سے کہا۔

کانسٹیبل چلا گیا اور دوسرے ہی لمحے احمد پرویز اندر آگیا۔ غصّے سے اس کے نتھنے پھول پچک رہے تھے۔ شاید اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اسے اس کی سالی کے گھر میں کسی کمرے میں داخل ہونے سے محض ایک کانسٹیبل روک دے گا۔ احمد پرویز ان لوگوں میں سے تھا جن کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگ ان پر ایک نظر ڈالیں اور انہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کتنے طاقت ور' کتنے بارسوخ اور کتنے دولت مند ہیں۔ وہ اپنی ان خصوصیات کا چلتا پھرتا اشتہار ہوتے ہیں۔

ایسے لوگوں کو برداشت کرنا تو دور کی بات تھی' ان کی طرف دیکھنا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کے جسم پر غالباً فرانس کی ایک فیشن کمپنی کا تیار کردہ سوٹ اور پیروں میں شاید امریکی ایلی گیٹر شوز تھے۔ مگرمچھ کی کھال کے بنے ہوئے جوتے..... یہ دوسری بات تھی کہ وہ خود بھی کسی مگرمچھ سے کم نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے کروڑ تو وہ بینکوں کے قرضے ہضم کیے بیٹھا تھا۔

اپنے تمام تر بیش قیمت پہناوے اور رکھ رکھاؤ کے باوجود کوئی دولت مند صنعت کار کم اور گوریلا زیادہ لگتا تھا۔ وہ پستہ قد چوڑے اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ گردن نہ ہونے کے برابر تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چوڑے کندھوں پر خاصا بڑا سا سر رکھ دیا گیا تھا۔ دولت مندوں کی شخصیت میں عام طور پر ایک خاص نفاست' نزاکت اور نرمی جھلکنے لگتی ہے مگر اس کی شخصیت میں ایسی کوئی خصوصیت ذرا بھی نہیں جھلکتی تھی۔ اس کا تاثر ایک کرخت اور کھردری شخصیت کا تھا۔ اس کی رنگت بھی سانولی تھی۔ واجدہ کی اور اس کی جوڑی یقیناً خاصی عجیب لگتی ہوگی۔ بیوی قد میں شوہر سے خاصی اونچی تھی لیکن نزاکت بہرحال دونوں میں سے کسی کو چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ واجدہ کی شخصیت میں البتہ کچھ نفاست اور اُجلا پن موجود تھا۔

وہ مختلف مجسموں وغیرہ سے بچتا ہوا ہال کے وسط میں پہنچا۔ ایک کانسٹیبل نے اسے اس جگہ پاؤں رکھنے سے باز رکھا جہاں دیر پہلے تک پرنس سمیرا کی لاش پڑی تھی۔ وہاں چاک سے خاکہ بنا دیا گیا تھا۔ احمد پرویز نے خوں خوار نظروں سے اس کانسٹیبل کو گھورا جس نے ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے گزر جانے سے روکا اور ذرا ہٹ کر چلنے کا اشارہ کیا تھا۔

وہ ہمارے مقابل پہنچ کر ذرا دور ہی رُک گیا۔ قریب نہیں آیا۔ شاید اسے توقع تھی کہ ہم دونوں اُٹھ کر اور آگے بڑھ کر اس کا استقبال کریں گے۔ رحیم گل کی جگہ کوئی اور ایس ایچ او ہوتا تو شاید یہی کرتا لیکن وہ اللہ کا بندہ بھی ایک ہی شاہکار چیز تھا۔ اس نے تو در کنار' اپنی پھیلی ہوئی ٹانگیں بھی سکیڑنے کی کوشش نہیں کی۔ بے نیازی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بھی کچھ ایسا تاثر دینے کی کوشش کی جیسے میں نے توجہ سے اس کی طرف دیکھنا ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اس کے تاثرات سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اندر ہی اندر اس پر کیا گزری تھی۔ وہ اس وقت ایک ایسا سوٹڈ بوٹڈ سانڈ دکھائی دے رہا تھا جو ہم دونوں کو بیک وقت رسید کرنے کے لیے مناسب زاویہ تلاش کر رہا تھا۔

"مجھے فون تم نے کیا تھا؟" اس نے کڑکتے لہجے میں رحیم گل کو مخاطب کیا۔

"جی ہاں۔ یہ گستاخی میں نے ہی کی تھی۔" رحیم گل چبھتے ہوئے لہجے میں بولا "مجھے انسپکٹر رحیم گل کہتے ہیں۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ تمہارا نام اور عہدہ کیا ہے۔" وہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی رعونت اور حقارت سے بولا۔ اونچا کاروباری طبقہ بھی اپنی تمام تر دولت مندی اور اثر رسوخ کے باوجود صلح جو طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ اس طبقے کے لوگ بلا ضرورت پولیس آفیسر یا دوسرے سرکاری ملازموں سے اس طرح کا رویّہ اختیار نہیں کرتے۔ احمد پرویز کے دماغ میں نہ جانے کیا خناس گھسا ہوا تھا۔

وہ اسی لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "پرنس میرا کی لاش کہاں ہے؟"

"پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کی جاچکی ہے۔" رحیم گل نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔

"میرے پہنچنے کا انتظار بھی نہیں کیا گیا؟" احمد پرویز پھنکارا۔

"کیوں..... کیا پوسٹ مارٹم آپ کو کرنا تھا؟" رحیم گل نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے!" وہ غرایا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اندر ہی اندر اسے خاصا زوردار جھٹکا لگا تھا۔ وہ لوگ جو بزعم خود اپنے آپ کو بڑی توپ چیز سمجھ کر رحیم گل پر رعب جھاڑنے کی کوشش کرتے تھے اور جب رحیم گل جواباً ان سے بھی زیادہ توہین آمیز رویّہ اختیار کرتا تھا تو وہ کم از کم ایک لمحے کے لیے ضرور سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ وہ یقیناً کوئی مضبوط جڑوں والا درخت تھا' ذرا سی تیز ہوا سے اِدھر اُدھر ڈول جانے والا نرم و نازک پودا نہیں تھا اور نہ ہی وہ کوئی ایسا درخت تھا جسے کرپشن نے کھوکھلا کر رکھا ہو اور وہ تیز و تند ہوا کا ایک جھکڑ بھی برداشت نہ کرسکتا ہو۔

رحیم گل اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے الفاظ کو گویا چباتے ہوئے بولا "احمد پرویز صاحب! ایک محاورہ ہے..... "جیسی روح ویسے فرشتے"..... آپ نے کبھی سُنا ہے؟"

احمد پرویز نے اب غالباً اپنے اندر امنڈتے ہوئے غصّے کے طوفان کو قابو میں کیا۔ اس نے گرجنے برسنے کی کوشش نہیں کی تاہم جب وہ بولا تو اس کا لہجہ گھُٹی گھُٹی سی پھنکار سے ہی مشابہ تھا "میں آئی جی صاحب سے تمہارے بارے میں بات کروں گا۔"

"ضرور کیجئے گا..... بلکہ بہتر تو یہی ہے کہ اسی وقت کیجئے۔ دن میں وہ بہت مصروف ہوتے ہیں۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "میں آپ کو بتاؤں اس وقت وہ کس نمبر پر ملیں گے؟"

"مجھے معلوم ہے۔ میں بعد میں ان سے بات کروں گا....." یہ کہہ کر اس نے ایک لمحے کے لیے ہونٹ بھینچ لیے۔ وہ ایک ٹک رحیم گل کو گھور رہا تھا۔ رحیم گل نے بھی پلک نہیں جھپکی تھی۔ میں تو اس وقت گویا کسی شمار قطار میں ہی نہیں تھا۔ میری طرف احمد پرویز نے ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی۔

"ضرور..... ضرور....." رحیم گل نے سرہلایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی چھڑی اس کے ہاتھوں میں تھی۔ اسے تھوڑا سا موڑتے ہوئے وہ خاصے فلمی اور ڈرامائی انداز میں احمد پرویز کے سامنے تن کر جا کھڑا ہوا۔ وہ احمد پرویز سے خاصا لمبا تھا۔ احمد پرویز کو سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھنا پڑ رہا تھا اور یہ اس جیسے آدمی کے لیے یقیناً مزید تکلیف دہ بات تھی۔ اگر رحیم گل کے جسم پر پولیس کی وردی نہ ہوتی تو شاید احمد پرویز اپنے کسی ملازم یا گارڈ وغیرہ کو بُلا کر کوئی حکم دینے کے بجائے خود ہی رحیم گل کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کردیتا اور مجھے یقین تھا کہ وہ گھونسا خاصا طاقت ور ہوتا۔ ایک بار تو رحیم گل کا بھیجا ہل جاتا۔

احمد پرویز مٹھیاں بھینچے کھڑا تھا تاہم رحیم گل گویا اس کی کیفیت کو ذرا بھی خاطر میں لائے بغیر بولا "مسٹر احمد پرویز! آپ کی سالی پُراسرار حالات میں قتل ہوچکی ہے۔ ہم اس قتل کی تحقیش کررہے ہیں اور ہم اپنے کام کو بہتر سمجھتے ہیں۔ میں نے جس وقت آپ سے رابطہ کیا' آپ اس وقت نوری آباد میں تھے۔ آپ نے واضح طور پر کوئی اندازہ بھی ظاہر نہیں کیا تھا کہ آپ کو یہاں پہنچنے میں کتنی دیر لگ جائے گی۔ یہ فیصلہ کرنا میرا کام تھا کہ کس کا انتظار کیا جاسکتا ہے اور کس کا نہیں۔"

اس نے چھڑی کو دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے نہایت ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بات جاری رکھی "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لاش کو جتنی جلدی پوسٹ مارٹم کے لیے لے جایا جائے' بعض حقائق معلوم کرنے میں اتنی ہی آسانی رہتی ہے۔ اگر آپ کو واقعی اپنی مقتولہ سالی سے کوئی ہمدردی ہے اور آپ واقعی اس کے قاتل کو گرفتار کرانے میں کوئی دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ کو پولیس پر رعب جھاڑنے کے بجائے تفتیش میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر آپ کو یہ کرنے کی توفیق نہیں ہے تو پھر آپ کے حق میں بہتر ہے کہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ جائیے۔ میں کچھ دیر بعد آپ کا رسمی بیان لوں گا۔"

احمد پرویز کے لیے یہ تقریر یقیناً دل پزیر نہیں تھی لیکن اس کے نتھنے پھولنے پچکنے کی رفتار کچھ کم ہوگئی۔ چہرے پر نظر آنے والا خوں خواری بھی مدھم پڑگئی۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس پولیس آفیسر کو مرعوب کرنے کی کوششیں فضول تھیں۔ تاہم وہ یک دم بھی اپنا رویّہ تبدیل کرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ جب بولا تو اس کے لہجے میں پہلے جیسی خوں خواری تو نہیں' البتہ تلخی ضرور تھی۔

"میری بیوی کہاں ہے؟" اس نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔

"اس بیڈ روم میں۔" رحیم گل نے اشارے سے بتایا "ڈاکٹر نے انہیں انجکشن لگایا ہے۔ اس سے نیند تو نہیں آئے گی لیکن ان کی طبیعت پُرسکون ہوجائے گی۔"

"میں اسے گھر لے جارہا ہوں۔" احمد پرویز نے اعلان کیا۔

"آپ فیصلے کرنے میں کچھ زیادہ ہی جلد باز معلوم ہوتے ہیں مسٹر احمد پرویز!" رحیم گل ایک بار پھر چھڑی ہاتھ پر مارتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا "ابھی آپ اپنی بیگم کو نہیں لے جاسکتے۔ ابھی تو میں نے ان سے کچھ بھی نہیں پوچھا۔"

"تمہیں جو کچھ پوچھنا ہو' گھر آکر پوچھتے رہنا۔" وہ رعونت سے بولا۔

"گھر آکر بھی پوچھتے رہیں گے..... ممکن ہے آپ لوگوں کو پولیس اسٹیشن بھی آنا پڑے..... لیکن یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ فی الحال تو میرا یہیں ان سے چند سوالات کے جوابات حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں انتظار کررہا ہوں کہ ان کی طبیعت کچھ اور بہتر ہوجائے۔" رحیم گل بدستور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"تو تم ہمیں پولیس اسٹیشن بُلانے کے خواب بھی دیکھ رہے ہو؟" احمد پرویز نے گویا دانت پیس کر پوچھا۔

"ہم آپ کے خادم ہیں جناب! ضرورت پڑے تو پولیس اسٹیشن خود آپ کے گھر بھی آسکتا ہے اور ضرورت پڑنے پر کسی معزز شہری کو پولیس اسٹیشن آنے کی زحمت بھی دی جاسکتی ہے۔ کوئی بھی نظام باہمی تعاون سے ہی چل سکتا ہے۔ فرعونیت سے تو کوئی بھی مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ فرعونیت بجائے خود ایک مسئلہ ہے اور بے شمار مسائل کی جڑ ہے۔" رحیم گل نے ملائمت سے کہا۔

"تم مجھے فرعون کہہ رہے ہو؟" احمد پرویز کی خون خواری ایک بار پھر عود کر آئی۔

"ہرگز نہیں۔" رحیم گل نے فوراً نفی میں سرہلایا "میں بھلا ایسی گستاخی کیسے کرسکتا ہوں۔ میں تو ایک عمومی بات کررہا ہوں۔"

احمد پرویز نے شاید اس سے مزید اُلجھنا فضول سمجھا اور پاؤں پٹختا ہوا بیڈ روم کی طرف چلا گیا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ رحیم گل دوبارہ میرے قریب آبیٹھا اور طویل سانس لے کر بولا "میں کئی ایسے لوگوں سے بھی ملا ہوں جن کی جڑیں اس شخص سے کہیں زیادہ گہری تھیں لیکن ایسی فرعونیت میں نے ان میں بھی نہیں دیکھی اور اس طرح آتے ہی بلا سبب تو میں نے کسی کو ایسے پولیس آفیسر پر چڑھ دوڑنے کی کوشش کرتے نہیں دیکھا جو جائے واردات پر تفتیش کرنے آیا ہو۔"

"اوچھا آدمی ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا "اس کی فرعونیت اکثر مواقع پر کارگر رہتی ہوگی۔ اس نے اسے زندگی کا ایک حصّہ بنالیا ہوگا۔ اسے ابھی تجربہ نہیں ہوا ہوگا کہ کبھی کبھی فرعونیت گلے بھی پڑجاتی ہے۔ ویسے..... کوئی بنیاد تو ہوگی جس پر یہ اُچھل رہا تھا۔"

رحیم گل مسکراتے ہوئے بولا "ایک محاورہ ہے کہ بچھیا کھونٹے پر ہی اُچھلتی ہے..... کھونٹا جتنا مضبوط ہو' منہ زور مویشی اتنا ہی زیادہ اُچھلتا ہے۔ احمد پرویز کا بھی کہیں نہ کہیں کوئی کھونٹا تو ضرور ہوگا۔ اس نے چھوٹتے ہی آئی جی صاحب کا حوالہ دیا تھا۔ ممکن ہے اس کی آئی جی صاحب سے رشتے داری یا دوستی ہو۔"

"پھر تو تمہیں کھینچا تانی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا "تمہیں تو معلوم ہے پیارے..... کہ تمہارے اس خادم نے نوکری بعد میں شروع کی تھی اور کھینچا تانی کے لیے پہلے تیار ہوگیا تھا ورنہ اپنا جو نوکری کرنے کا اسٹائل اور اپنے جو نظریات ہیں ان کے ساتھ تو آدمی پولیس لائن میں چل ہی نہیں سکتا۔ میری طرح پولیس میں نوکری کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔"

"اصل میں تمہارا ابھی کھونٹا مضبوط ہے نا..... تم بھی اس لیے اُچھلتے ہو۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"لیکن یہ بڑے افسوس کی بات ہے نا کہ اگر انسان کا کھونٹا مضبوط نہ ہو تو وہ دیانت داری اور فرض شناسی کا مظاہرہ بھی نہ کرسکے۔ ان کاموں کے لیے تو کھونٹے کی ضرورت نہیں پڑنی چاہیے۔ آج کے دور میں تو اگر کوئی سرکاری ملازم دیانت داری اور غیر معمولی تندہی سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے تو یوں سمجھو کہ وہ جہاد کررہا ہے۔ اس کا اگر اسے کوئی صلہ نہیں مل سکتا تو کم از کم شاباش تو ملنی چاہیے لیکن المیہ تو یہ ہے کہ اس بے چارے کو اپنی نوکری بچانے کے لیے کھونٹے کی ضرورت پڑتی رہتی ہے....."

اس کے لہجے میں وہی پُرانا کرب جھلک آیا اور ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "ابھی پرسوں ہی کی بات ہے..... ایک علاقے کے ایس ایچ او نے ایک بڑے منشیات فروش کے کارندے پر ہاتھ ڈال دیا اور بھاری رشوت کی پیشکش کے باوجود اسے نہیں چھوڑا۔ آج اس بے چارے کو لائن حاضر کردیا گیا ہے۔ یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے نا..... ان حالات میں آپ کیسے توقع کرسکتے ہیں کہ پولیس کا محکمہ سُدھرے گا یا اس میں کوئی بہتری آئے گی۔ اگر اچھا کام کرنے پر جوتے پڑیں گے تو پھر کوئی پاگل ہی ہوگا جو اچھا کام کرے گا۔ رفتہ رفتہ سب لوگ اس معاشرے کو اس کے حال پہ چھوڑ دیں گے..... اور پھر جو غدر برپا ہوگا اس میں سب کا اللہ ہی حافظ ہوگا.....!" وہ جھرجھری سی لے کر خاموش ہوگیا۔

میں دل ہی دل میں اس سے سو فیصد متفق تھا لیکن بظاہر نوک جھونک جاری رکھنا' ہم گویا اپنا اخلاقی فرض سمجھتے تھے۔ ویسے بھی اس وقت ماحول پہلے ہی کافی بوجھل اور تناؤ زدہ تھا۔ کم از کم اس وقت ہم اس قسم کے موضوعات کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ میں نے منہ بنا کر کہا "موقع ہو یا نہ ہو..... تم اپنے دُکھڑے لے کر بیٹھ جایا کرو۔"

"میں اپنی فطرت سے مجبور ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"واقعی..... اس دنیا میں ہر کوئی اپنی فطرت کی وجہ سے مجبور ہے۔" میں نے سرہلایا۔

اس نے ایک نظر اس بیڈ روم کے بند دروازے کی طرف دیکھا جس میں احمد پرویز کی بیوی پہلے سے موجود تھی اور اب احمد پرویز بھی پہنچ چکا تھا پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا "اس دنیا میں احمد پرویز جیسے لوگ کیوں پائے جاتے ہیں؟"

"اس دنیا میں احمد پرویز سے کہیں بدتر لوگ بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ اللہ کی رنگا رنگ دنیا ہے۔ وہی اس کی مصلحتوں کو بہتر سمجھتا ہے۔ میں اور تم کیا کرسکتے ہیں؟ یہاں ہماری مرضی نہیں چل

سکتی پیارے! اس لیے بہتر یہی ہے کہ فی الحال تم وہ کام کرو جو تمہارے اختیار میں ہے۔" میں نے درویشانہ لہجے میں کہا۔

"کبھی کبھی تم اتنے زیادہ حقیقت پسند ہو جاتے ہو کہ دل چاہتا ہے چھڑی مار کر تمہاری کھوپڑی توڑ دوں۔ محض دل رکھنے کے لیے بھی کسی کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتے۔"

"یہ حقیقت پسندی نہیں' درویشی ہے۔ میں اللہ میاں کے کاموں پر بھلا کیا کہہ۔۔۔ سکتا ہوں؟ اللہ میاں کی دنیا ہے.... اس نے جیسی بھی بنادی..... اس کی مرضی!" میں نے پہلے سے زیادہ درویشانہ انداز میں چھت کی طرف انگلی اٹھادی۔

"اللہ میاں نے تو دنیا بڑی خوب صورت بنائی تھی..... اور اسے مزید خوب صورت بنانے کے طریقے بھی بہت پہلے بتادیے تھے۔ اسے تمہارے جیسے خبیث انسانوں نے خراب کررکھا ہے۔ اس کا ستیاناس ماردیا ہے۔" رحیم گل تاسف سے بولا۔

"تم یہاں تفتیش کے لیے آئے ہو یا تبلیغ کے لیے؟" میں نے اسے گھورا۔

"میری کیا مجال کہ میں تبلیغ کروں۔ میں تو بہت ہی گناہ گار سا انسان ہوں۔ اوپر سے میرے جسم پر یہ بدنام وردی ہے۔ میں تو بھی خود کو بہت زیادہ اصلاح کے قابل سمجھتا ہوں۔"

"بس..... تو پھر زیادہ ٹرٹر مت کرو اور اپنی ڈیوٹی انجام دو۔"

"کہیں پرنسس سیمرا کے قتل کا تعلق تمہارے اس کوڑل جان کڑیالی والے معاملے سے تو نہیں؟" اس نے اچانک یوں سرسری انداز میں پوچھا جیسے دیر سے وہ اسی موضوع پر گفتگو کررہا تھا اور اس نے کوئی دوسرا موضوع چھیڑا ہی نہیں تھا۔

"نہیں..... ایسا نہیں ہوسکتا....." میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "کوڑل تو بے چارہ اس قسم کا آدمی ہے جو پرنسس سیمرا جیسی عورت سے صرف بات کرنے کے لیے سہارے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ وہ اس طرح کی عورت کے قتل کی حد تک جانے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا اور نہ ہی اس میں کسی سازش کی اہلیت نظر آتی ہے۔"

"ضروری نہیں کہ یہ سب کچھ کسی طے شدہ منصوبے یا سازش کے تحت ہوا ہو۔ یہ فوری اشتعال کے تحت کیا گیا قتل معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کوڑل یہاں آیا ہو..... بات بڑھ گئی ہو اور....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہ محض ایک مفروضہ ہی ہوسکتا ہے۔" میں نے نفی میں سر ہلایا "کوڑل اپنے وکیل کے یا میرے بغیر یہاں آنے کی جرأت ہی نہیں کرسکتا تھا۔ اگر پرنسس سیمرا نے اسے بلایا ہوتا تو وہ مجھ سے کم از کم ذکر ضرور کردیتا اور سیمرا نے بھی جب مجھے فون کیا تو وہ کم از کم اس طرف کوئی اشارہ ضرور دے دیتی۔ وہ اس قسم کی شخصیت نہیں تھی کہ کوئی کاروباری مسئلہ طے کرنے کے لیے کوڑل جیسے شخص کو رات کو اس وقت اپنے اسٹوڈیو میں بلاتی۔ جب اس نے مجھ سے فون پر بات کی تو میں نے محسوس کیا تھا کہ مسئلہ ذاتی نوعیت کا تھا۔"

"ایک ہی ملاقات میں وہ تم سے اتنی بے تکلف ہوگئی اور تم پر اتنا بھروسا کرنے لگی کہ اس نے کسی نجی مسئلے پر بات کرنے کے لیے تمہیں بلانے کا فیصلہ کرلیا؟" اس نے مجھے گھورا۔

"انسان انسان میں فرق ہوتا ہے۔" میں نے بے نیازی سے جواب دیا "جو تجربہ تمہیں زندگی میں کبھی نہ ہوا ہو' ضروری تو نہیں کہ وہ کسی اور کو بھی نہ ہو۔"

"میں تمہاری خوش فہمیوں کے بارے میں پہلے بھی اظہار خیال کرتا رہا ہوں۔ اب میں اپنے الفاظ ضائع نہیں کروں گا۔" وہ منہ بنا کر بولا "بہرحال میں کوڑل سے ملاقات ضرور کروں گا۔ مجھے جو بھی رائے قائم کرنی ہوگی' خود کروں گا۔"

"ٹھیک ہے...... اگر اس سے تمہاری تکلیفات میں اضافہ ہوسکتا ہے تو ضرور ملاقات کرلینا۔ بہرحال میری رائے یہی ہے کہ وہ شریف آدمی ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہاری رائے کا کیا ہے......" وہ منہ بنا کر بولا "تم خود اپنے بارے میں بھی یہی رائے رکھتے ہو کہ تم ایک شریف آدمی ہو۔ اگر میں تمہاری رائے پر بھروسا کرنے لگا پھر تو تفتیش کرچکا......"

اس سے پہلے کہ میں اسے ترکی بہ ترکی کوئی جواب دیتا کہ وہ جلدی سے بولا "میرے سامنے دوسرا...... بلکہ یوں کہو کہ سب سے زیادہ مشتبہ نام کامران دانش کا ہے جو بامعاوضہ شوہر بننے کے لیے امیدوار کے طور پر آیا تھا۔ سب سے پہلے مجھے اس کو تلاش کرنا ہے۔"

"یہ تو کوئی مشکل کام نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "وہ ماریہ میرج کونسل والوں کے توسط سے ان کی جاننے والی ایک خاتون وکیل تک پہنچا تھا۔ اشتہار میں تو درحقیقت صرف اسی خاتون وکیل کا فون نمبر دیا گیا تھا اور اسی نے امیدواروں کے انٹرویو کرکے ایک موزوں امیدوار کو منتخب کیا تھا لیکن اس سارے چکر کے پیچھے درحقیقت ماریہ میرج کونسل والوں ہی کا ہاتھ تھا۔ انہی کے تعاون سے سب کچھ ہو رہا تھا۔ چناں چہ انہوں نے یا پھر اس خاتون وکیل نے امیدوار کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات تو اپنے ریکارڈ میں رکھی ہوں گی۔ ان سے کامران دانش کا سُراغ مل سکتا ہے۔"

اس نے بڑی توجہ سے میری بات سُنی تھی لیکن جب میں خاموش ہوا تو وہ منہ بنا کر بولا "اتنی سی بات کے لیے اتنی لمبی تقریر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو میں تمہارے بتانے سے پہلے ہی سوچ چکا تھا۔"

"ہر ناشکرا اور غبی انسان مشورہ مل چکنے کے بعد یہی کہتا ہے۔" میں نے متاسفانہ سے لہجے میں کہا۔

"اب میں کچھ کہوں گا تو تم پھر بات سے بات نکالتے چلے جاؤ گے اور میں فالتو باتوں میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا۔" وہ خاصی سنجیدگی سے بولا "یہ بتاؤ مسز احمد پرویز کو ضرورت رشتہ اور اشتہار والے چکر کے بارے میں معلوم ہے؟"

"مجھے اس موضوع پر اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ رات کو اس وقت یہاں کیسے آن پہنچی؟" اس نے پوچھا۔

میں اس کے سوال کا جواب دینے ہی لگا تھا کہ ہال کا دروازہ زوردار آواز کے ساتھ کھلا اور ایک دراز قد نوجوان اس عالم میں تیزی سے اندر داخل ہوا کہ اس کا کالر پیچھے سے کانسٹیبل نے پکڑ رکھا تھا جسے رحیم گل نے ہال کے باہر کی طرف کھلنے والے دروازے پر تعینات کر رکھا تھا۔ نوجوان کچھ باڈی بلڈر ٹائپ تھا۔ اس کا گریبان کھلا تھا۔ شاید کانسٹیبل کی کھینچا تانی کی وجہ سے کھل گیا تھا۔ گلے میں سونے کی چین جھول رہی تھی۔ کانسٹیبل بے چارہ چھوٹے قد کا اور مختصرالوجود تھا۔ وہ اسے روکنے میں ناکام رہا تھا اور بے بسی سے نوجوان کے پیچھے گھسٹتا چلا آیا تھا۔ نوجوان خاصا پریشان اور وحشت زدہ نظر آرہا تھا۔

"سر.....! میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی..... لیکن یہ نہیں رُکا۔" کانسٹیبل نے رحیم گل کے سامنے گویا صفائی پیش کی۔

"اب یہ اندر آہی گیا ہے تو اسے چھوڑ دو۔ کیوں اس کے ساتھ لٹکے ہوئے ہو۔" رحیم گل نے ناگواری سے کہا اور گہری نظروں سے نوجوان کا جائزہ لیا۔ وہ ایک وجیہہ اور جاذب نظر نوجوان تھا۔ خاصا فیشن ایبل بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی جسمانی ساخت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ باقاعدگی سے خاصی سخت ورزش کرنے کا بھی عادی ہے۔ کانسٹیبل نے اس کا کالر چھوڑ دیا اور رحیم گل کا اشارہ پاکر واپس باہر چلا گیا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے.....؟ سیمرا کہاں ہے؟" نوجوان نے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا اور متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

"آپ کی تعریف؟" رحیم گل نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ وہ اس کا سرتاپا جائزہ لے چکا تھا۔ بوکھلاہٹ اور وحشت زدگی کی وجہ سے اس کی وجاہت کچھ متاثر نظر آرہی تھی۔

"میں سیمرا کا منگیتر ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ اس بوکھلاہٹ اور وحشت کے عالم میں بھی اس کے لہجے سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ سیمرا کا منگیتر ہونا اس کے لیے ایک اعزاز تھا۔ رحیم گل کئی سیکنڈ کے لیے بالکل خاموش رہا۔ شاید اب وہ ایک نئے زاویۂ نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔

"تمہارا نام؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"صفدر منیر۔" نوجوان نے جواب دیا پھر اپنا سوال دُہرایا "سیمرا کہاں ہے؟"

"سرکاری اسپتال کے مُردہ خانے میں۔" رحیم گل نے جواب دیا۔

"کیا.....؟" صفدر نے کچھ اس طرح رحیم گل کی طرف دیکھا جیسے اسے یہ بے ہودہ مذاق بالکل پسند نہ آیا ہو۔

"میرے اندازے کے مطابق وہ اس وقت سرکاری اسپتال کے مُردہ خانے میں ہوگی اور سرجن اس کے پوسٹ مارٹم کی تیاری کر رہے ہوں گے یا پھر پوسٹ مارٹم شروع کرچکے ہوں گے۔ اسے قتل کردیا گیا ہے..... اور یہ کسی چور، ڈاکو یا لٹیرے کا کام نہیں ہوتا۔" رحیم گل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

اتنی افسوس ناک خبریوں بلا تمہید کسی کو سُنا دینا اچھا نہیں ہوتا لیکن بعض اوقات اس میں بھی پولیس والوں کی مصلحت ہوتی ہے۔ وہ اچانک ایسی خبر سنا کر کسی کا ردِ عمل دیکھنا چاہتے ہیں۔ صفدر منیر پر اس کا خاصا شدید ردعمل ظاہر ہوا۔ اس کے جسم کو زوردار جھٹکا لگا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور رنگت متغیر ہوگئی۔ وہ شاید کچھ بولنا چاہ رہا تھا لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

آخر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی دونوں آنکھوں سے ایک ایک آنسو راہ پاکر اس کے رخساروں پر پھسل آیا۔ اس نے دیوار کی طرف منہ پھیرلیا اور بازو کے حلقے میں پیشانی دیوار پر ٹکا دی۔ میں نے اسے بڑبڑاتے سُنا "سؤر کا بچہ..... وہ سؤر کا بچہ.....!"

پھر اس نے دو مرتبہ زور زور سے دیوار پر گھونسا مارا۔ گھونسے اس نے اس طرح مارے تھے جیسے اس کا مقصد محض غصے کا اظہار کرنا نہیں بلکہ سچ مچ کسی کا منہ توڑنا ہو۔ دوسرے گھونسے پر اس کے ہاتھ کی ہڈیوں پر سے کھال اچھی خاصی چھل گئی لیکن اس طرح سے گویا اس کے اندر ابلتا ہوا غصہ کچھ کم ہوا۔ اس کا منہ دیوار کی طرف ہی تھا۔ اس کے سانس لینے سے خرخراہٹ کی سی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔

رحیم گل اپنی جگہ ساکت و جامد بیٹھا ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر میں ہی اُٹھ کر اس کے قریب پہنچا۔ میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا "حوصلہ رکھو..... جو ہونا تھا وہ ہوچکا..... فی الحال اسے ایک حادثہ سمجھ کر برداشت کرنے کی کوشش کرو۔"

اس نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا لیکن نہیں پوچھا کہ میں کون ہوں۔ شاید اس نے میرے سادہ لباس کے باوجود فرض کرلیا ہو کہ میرا بھی پولیس کے محکمے سے ہی کوئی تعلق ہے۔ میں نے اپنا رومال نکال کر اس کے زخمی سے ہاتھ پر لپیٹ دیا۔ وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے رحیم گل کی طرف گھوم گیا۔

تب رحیم گل بولا "مجھے معلوم ہے..... یہ موقع ایسا ہے کہ آپ کو دل کا غبار نکالنے کے لیے کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے تو بہتر تھا لیکن کچھ ناگوار فریضے ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں جتنی جلدی انجام دے لیا جائے اتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ مجھے بہرحال آپ سے کچھ سوالات کرنے ہی ہیں۔ اگر آپ ابھی اور اسی وقت ان کے جوابات دے سکیں تو زیادہ اچھا ہے لیکن اگر آپ کی طبیعت....."

"نہیں..... میں ٹھیک ہوں....." وہ بات کاٹتے ہوئے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا "آپ کو جو پوچھنا ہے پوچھ لیجیے۔"

"بیٹھ جائیں۔" رحیم گل نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی عقابی نظر صفدر منیر پر سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ہٹی تھی۔

صفدر بیٹھ چکا تو رحیم گل سر ہلاتے ہوئے بولا "اچھا..... تو آپ پرنس سیمرا کے منگیتر تھے؟"

"مجھے باقاعدہ منگیتر تو نہیں کہا جاسکتا....." وہ پہلے ہی کی طرح دھیمی اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا "ہماری باقاعدہ منگنی یا رسم وغیرہ نہیں ہوئی تھی ..... لیکن یہ بات طے تھی..... فیصلہ ہوچکا تھا کہ سیمرا تیسری شادی مجھ سے کرے گی..... آپ کہہ سکتے ہیں..... کہ ہمارے درمیان ایک خاص تعلقِ خاطر تھا..... ہم..... ہم ایک دوسرے کو بہت پسند کرتے تھے۔"

"مجھے پتا چلا ہے کہ پرنس سیمرا نے اپنے لیے شوہر کی تلاش کے سلسلے میں اخبار میں اشتہار دیا تھا۔ کیا یہ سچ ہے؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"ہاں..... یہ سچ ہے۔" اس کی آواز کچھ اور مدھم پڑگئی۔

اس کے بعد چند سیکنڈ سکوت رہا۔ آخر رحیم گل بولا "کیا اب مجھے یہ بھی کہنا پڑے گا کہ یہ معاملہ کچھ وضاحت چاہتا ہے؟"

صفدر مزید چند لمحے سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر بولا "بات شاید مشکل سے آپ کی سمجھ میں آئے..... لیکن..... بہرحال میں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں سیمرا کا دور پار کا عزیز ہوں اور پہلے میں پرنس انڈسٹریز میں ہی ملازم تھا لیکن میری سیمرا کے والد پرنس سعید سے کوئی خاص ملاقاتیں نہیں رہیں اور شاید وہ مجھے کچھ زیادہ پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ بہرحال یہ ان کی مہربانی تھی کہ بہت پہلے انہوں نے مجھے کمپنی میں ایک اچھی ملازمت دے دی تھی۔ درحقیقت سیمرا اور واجدہ ہی ان کی کُل کائنات تھیں لیکن سچی بات یہ ہے کہ انہیں اپنی ان اولادوں سے بھی بڑھ کر اپنی انڈسٹری سے محبت تھی۔ انہوں نے اسے پھیلانے کے لیے محنت بھی بہت کی تھی۔

"ان سے ان کا ریاستی نظام اور نوابی وغیرہ تو عملی طور پر چھن چکی تھی لیکن انہوں نے گویا اس کے متبادل کے طور پر اپنی صنعتی ایمپائر کھڑی کرلی تھی۔ یہ گویا ان کی ایک چھوٹی سی بادشاہت تھی اور آپ کو یہ جان کر شاید حیرت ہو کہ وہ ایک نہایت رجعت پسند اور روایت پرست آدمی تھے۔ سیمرا کو دیکھ کر کوئی یقین نہیں کرسکتا تھا کہ وہ ان کی بیٹی تھی۔ سیمرا بھی درحقیقت آوارہ، بدچلن یا مغرب زدہ نہیں تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس نے کبھی باپ کی مرضی اپنی زندگی پر مسلط نہیں ہونے دی۔ اپنے فیصلے خود کیے اور اس کا تعلق چوں کہ اونچے..... بلکہ بہت اونچے طبقے سے تھا اس لیے اس نے اسی طبقے کے انداز میں زندگی بسر کی۔ بہرحال، صرف اس فرق کی وجہ سے بھی اس کے اور پرنس سعید کے درمیان بڑا فاصلہ نظر آتا تھا۔

"پرنس سعید کی فراخ دلی یہ تھی کہ انہوں نے زبردستی سیمرا سے کوئی بات منوانے کی کوشش نہیں کی اور اس سے بدستور اتنی ہی محبت کرتے رہے، جتنی ایک باپ کو اپنی بیٹی سے کرنی چاہیے۔ لیکن عمر کے آخری حصے میں وہ کام کی زیادتی، مختلف قسم کے دباؤ اور کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر سنکی سے ہوگئے تھے۔ جوں جوں ان کی عمر بڑھ رہی تھی اور انہیں مختلف بیماریاں چمٹتی جارہی تھیں، ان کے لیے یہ احساس بھی سوہانِ روح بنتا جارہا تھا کہ ایک روز بہرحال ان کی صنعتی ایمپائر..... ان کی بادشاہت ان سے چھن جائے گی۔ میرا خیال ہے جب وہ موت کے بارے میں بھی سوچتے ہوں گے تو انہیں دنیا سے جانے یا خدا کے سامنے اپنے اعمال کا جواب دینے کی اتنی فکر نہیں ہوتی ہوگی جتنا اپنی دوسری بادشاہت چھن جانے اور اس سے جدا ہونے کا غم ہوتا ہوگا۔ میرا خیال ہے اب آپ کو انڈسٹری کے بارے میں پرنس سعید کے محسوسات کا کچھ اندازہ ہوگیا ہوگا؟"

رحیم گل نے سر کو نہایت خفیف سی جنبش دی۔ میں نے اس کی بھی زحمت نہیں کی۔ صفدر منیر نے ہونٹوں پر زبان پھیری، تھوک نگلا اور شاید قدرے دشواری سے سلسلۂ کلام جوڑا "زندگی کے آخری دنوں میں وہ سیمرا کے بارے میں بڑی تشویش کا شکار رہنے لگے تھے جو دوسری طلاق کے بعد بظاہر تنہائی اور مایوسی و نامرادی کی زندگی گزار رہی تھی لیکن اسی دوران میں میری اس سے راہ و رسم بڑھنے لگی۔ میں بدقسمتی سے شادی شدہ تھا ورنہ شاید حالات میں اتنی پیچیدگی پیدا ہی نہ ہوتی۔ میں جلد از جلد سیمرا سے شادی کرلیتا اور سارے مسائل سیدھے سادے انداز میں طے ہوجاتے۔ میری گھریلو زندگی سخت ناخوش گوار تھی۔ سیمرا بھی کچھ اسی قسم کے حالات سے گزر چکی تھی۔ شاید یہ قدرِ مشترک بھی ہم دونوں کو قریب لانے کا باعث بنی تھی۔ میں اپنی بیوی کو طلاق دینے کا فیصلہ کرچکا تھا لیکن میرے سسرال والوں نے مجھ پر کچھ مقدمے کیے ہوئے تھے جن کی وجہ سے میری طلاق کی کارروائی کو قانونی طور پر مکمل ہونے میں بہت دیر لگ گئی۔ اسی دوران میں پرنس سعید کا انتقال ہوگیا۔

"انہیں اپنی زندگی کے آخری ایّام میں معلوم ہوگیا تھا کہ میں اور سیمرا ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے ہیں اور آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ وہ اس بات پر خوش تھے۔ اس کی وجہ جان کر شاید آپ کو مزید حیرت ہو۔ وجہ صرف یہ تھی کہ میں پرنس انڈسٹریز کا ملازم تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ سیمرا اگر اب شادی کرے تو پرنس انڈسٹریز کے کسی ملازم سے کرے خواہ وہ وہاں کا ایک معمولی سا مزدور ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ اپنی انڈسٹری کے بارے میں ان کے جذبات کیا تھے۔ اپنی دوسری بیٹی

واجدہ کا تعلق بھی اپنی انڈسٹری سے مضبوط تر بنانے کے لیے انہوں نے احمد پرویز کو اپنے ہاں ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن کا عہدہ دے رکھا تھا حالاں کہ اسے اس عہدے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود اپنی جگہ ایک بڑا صنعت کار ہے لیکن محض اس دکھاوے کے عہدے کے تحت وہ تنخواہ اور دیگر مراعات کی صورت میں پرنس انڈسٹریز سے لاکھوں روپے سالانہ وصول کرتا آرہا ہے۔"

اس نے گہری سانس لے کر ایک بار پھر ہونٹوں پر زبان پھیری "خیر.... اس ذکر کو تو چھوڑیے۔ اصل قابلِ ذکر بات میں آپ کو یہ بتانے لگا تھا کہ ہمیں علم بھی نہیں تھا کہ پرنس سعید نے اپنی زندگی کے آخری دنوں میں..... یا یوں کہیے کہ اپنے زیادہ سنکی پن کے زمانے میں ایک بہت ٹھوس اور ناقابلِ تنسیخ وصیت نامہ تیار کروا کے رکھ دیا تھا۔ اس وصیت نامے میں انہوں نے لکھوایا تھا کہ ان کے انتقال کے بعد اگر سیمرا ایک سال کے اندر اندر پرنس انڈسٹریز کے کسی ملازم سے شادی کر لیتی ہے تب تو وہ اپنے والد کی آدھی دولت وجائداد وغیرہ کی وارث ہوگی لیکن اگر وہ یہ شرط پوری کرنے میں ناکام رہتی ہے تو اس کا حصہ بھی واجدہ کو منتقل ہو جائے گا اور وہ پوری وراثت کی مالک ہوگی۔ شادی کے وقت پرنس سیمرا کے شوہر کو لازماً پرنس انڈسٹریز کا ملازم ہونا چاہیے تھا۔ سابق ملازم بھی اس شرط پر پورا نہیں اترتا تھا۔"

"یہ تو واقعی عجیب شرط تھی۔" رحیم گل نے تبصرہ کیا۔

"بڑے میاں سے آخری دنوں میں کچھ بھی توقع کی جا سکتی تھی۔" صفدر آہ سی بھر کر بولا "ویسے اپنی دانست میں انہوں نے کوئی ایسی مشکل شرط عائد نہیں کی تھی۔ انہیں اندازہ ہو چکا تھا کہ سیمرا نے اگر شادی کی تو مجھ سے ہی کرے گی اور میں بہرحال پرنس انڈسٹریز کا ملازم تھا۔"

وہ چند لمحے خاموش رہا تو رحیم گل بولا "پھر تو اس شرط کی تکمیل میں کوئی دشواری پیش نہیں آنی چاہیے تھی لیکن تم تو ابھی تک پرنس سیمرا کے منگیتر ہی بنے ہوئے ہو، آخر یہ کیا چکر ہے؟"

"اس معاملے میں ایک نہیں، کئی چکر ہیں۔" صفدر تاسف سے بولا "تقدیر جب انسان کو الجھاتی ہے تو پھر چکر در چکر پیدا ہوتے چلے جاتے ہیں اور اگر ان چکروں کے ساتھ کسی انسان کے شاطر ذہن کے پیدا کردہ الجھاوے بھی شامل ہوتے چلے جائیں پھر تو انہیں سلجھانا بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے۔ کافی عرصے تک تو مجھے اور سیمرا کو اس وصیت کے مندرجات کا پتا ہی نہیں چل سکا۔ میں تو خیر اس وقت تک ایک غیر متعلق فرد تھا۔ سیمرا کو بھی وصیت کے بارے میں کوئی عجلت یا زیادہ تجسس نہیں تھا۔ اسے تو شبہ تک نہیں تھا کہ وصیت نامے میں ایسی کوئی بات ہو گی لیکن ایسا لگتا ہے کہ کسی "غیبی" قوت کو اس وصیت نامے کے مضمون کا بروقت پتا چل چکا تھا۔"

"غیبی قوت" کے الفاظ پر رحیم گل کی پیشانی پر شکنیں ابھریں تاہم اس نے وضاحت نہیں چاہی اور صفدر کو بات جاری رکھنے کا موقع دیا۔ وہ کہہ رہا تھا "شاید اس غیبی قوت نے ہی اس وصیت نامے کو دیر تک غائب رکھنے کا بندوبست کیا۔ پرنس سعید کا انتقال لندن میں ہوا تھا۔ پہلے تو یہی سننے میں آتا رہا کہ وصیت نامہ لندن ہی میں ہے۔ سیمرا نے اس کے لیے کوئی خاص تردد نہیں کیا اور اسی طرح کئی ماہ گزر گئے۔

"ادھر پرنس سعید کے انتقال کے چند روز بعد ہی مجھے ملازمت سے نکال دیا گیا۔ ڈائریکٹر ایڈمنسٹریشن جناب احمد پرویز نے اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے مجھ پر غبن کا ایک جھوٹا کیس بنا کر مجھے برطرف کیا لیکن میں اس وقت تک اس برطرفی کی اصل وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے یہی سمجھا کہ احمد پرویز چونکہ مجھے ناپسند کرتا تھا اس لیے اس نے پرنس سعید کے انتقال کے فوراً بعد موقع مناسب دیکھتے ہوئے میرا پتا صاف کر دیا ہے۔ میں نے اس معاملے کو کسی اور تناظر میں نہیں دیکھا اور نہ ہی اسے زندگی موت کا مسئلہ بنایا۔ میں نے امپورٹ ایکسپورٹ کی ایک چھوٹی فرم قائم کر لی۔ میرا کام جلد ہی اس حد تک چل نکلا کہ میرے حالات نوکری سے بہتر ہو گئے۔

"اسی دوران میں "غیبی طاقت" نے شاید میرے سسرال والوں کے کان میں کچھ پھونک دیا۔ پہلے میری بیوی طلاق لینے پر آمادہ نظر آتی تھی لیکن پھر اس نے اور اس کے والدین نے معاملے کو طول دینا شروع کر دیا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اصل وجہ کچھ اور ہو سکتی تھی۔ اس لیے میں زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہوا۔ مجھے بھی پرنس سیمرا سے ہنگامی انداز میں تو شادی کرنی نہیں تھی اور نہ ہی ابھی وہ پوری طرح اس کے لیے تیار تھی۔ اسی طرح غیر محسوس انداز میں پرنس سعید کے انتقال کو کئی ماہ گزر چکے تھے۔

"آخر کار دور پار کے کچھ عزیزوں نے جب مرحوم پرنس کی دولت وجائداد پر دانت تیز کرنے شروع کیے تو ان کی وصیت ڈھنڈیا پڑی۔ ان کے وکیل نے بتایا کہ اس نے وصیت نامہ لندن سے تلاش کروا کے منگوانے کا انتظام کر لیا ہے لیکن اسے اس کے مندرجات کا علم نہیں..... کیوں کہ وصیت نامہ کسی اور وکیل نے تیار کیا تھا۔ یہ واضح رہے کہ اس سارے عرصے کے دوران وکیل کا رویہ خاصا پُراسرار رہا تھا حالاں کہ وہ پرنس سعید کا خاندانی وکیل رہا تھا لیکن مجھے بعد میں شبہ ہوا کہ شاید اس پر بھی "غیبی طاقت" کا اثر ہو چکا تھا۔ پیسے میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔"

"وکیل..... اور خاص طور پر خاندانی وکیل اس قسم کے کام میں بدمعاملگی کرتے نہیں ہیں۔" میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

رحیم گل میری طرف اشارہ کر کے دکھاوے کے لیے ذرا منہ بنا کر بولا "یہ اس لیے وکیلوں کے وکیل صفائی بننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ یہ خود بھی وکیل ہیں۔ ویسے تو ان کا بڑا نام

لیکن یہ شوقیہ وکالت بھی کرتے ہیں۔ اپنے قانونی معاملات سے یہ خود ہی نمٹتے ہیں۔"

"اچھا......؟" صفدر منیر نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا "لیکن یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟ کیا یہاں کسی کو وکیل کی ضرورت پیش آگئی تھی؟"

"پرنس سیمرا نے فون کر کے انہیں بلایا تھا کہ وہ کسی اہم مسئلے پر مشورہ کرنا چاہتی ہیں۔" رحیم گل نے جواب دیا۔

"کیسا مسئلہ؟" صفدر منیر گویا کچھ چونکا۔

"یہ جاننے کا تو موقع نہیں ملا۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "میں جب یہاں پہنچا تو مجھے پرنس سیمرا کی لاش ملی۔"

صفدر منیر نے سر جھکا لیا۔ ایک لمحے کے لیے بوجھل سی خاموشی طاری رہی پھر رحیم گل بولا "آپ اپنا بیان جاری رکھیں۔ اس میں خاصے پیچیدہ حالات کا تذکرہ ہے۔ اس میں وقفہ نہیں آنا چاہیے۔ وقفہ آیا تو بات کچھ اور اُلجھی ہوئی محسوس ہو گی۔"

صفدر سر اُٹھاتے ہوئے بولا "میں یہ بتا رہا تھا کہ پرنس سیمرا کے وکیل نے یہ تو کہہ دیا کہ وصیت نامہ لندن کے ایک بینک میں محفوظ ہے اور اس نے اسے وہاں سے منگوانے کا بندوبست کر لیا ہے لیکن اس کے بعد وہ خود علاج اور آرام وغیرہ کی غرض سے ملک سے باہر چلا گیا اور کئی ماہ غائب رہا۔ میں تو خیر ویسے بھی ایک غیر متعلق فرد تھا لیکن سیمرا کو بھی وصیت نامے کے بارے میں کچھ ایسی خاص تشویش نہیں تھی۔ ایک تو وہ روپے پیسے کے معاملے میں حیرت انگیز حد تک بے پروا لڑکی تھی، دوسرے اسے اطمینان تھا کہ وہ دونوں بہنیں ہی بہرحال تمام دولت و جائداد کی وارث ہوں گی۔ ہمیں شبہ تک نہیں تھا کہ وصیت نامے کے سلسلے میں درحقیقت حیلے بہانوں سے وقت ضائع کیا جا رہا تھا۔

"آخر کار جب وصیت نامہ وکیل صاحب کے ہاتھ میں آیا اور وکیل صاحب وارثوں کے ہاتھ آئے اور اس سلسلے میں سب کے یک جا ہونے کی نوبت آئی اور وصیت نامہ پڑھا گیا تو سیمرا کے اور میرے سر پر گویا بم پھٹ پڑا۔ سیمرا کے پاس شادی کرنے کے لیے صرف ایک ماہ کی مہلت باقی تھی اور اس ایک ماہ میں بھی اسے کسی ایسے شخص سے شادی کرنی تھی جو پرنس انڈسٹریز کا ملازم ہوتا۔ میں تو ویسے ہی اس شرط پر پورا نہیں اتر سکتا تھا کیوں کہ مجھے تو پرنس سعید کے انتقال کے فوراً بعد ہی نوکری سے، نہ صرف نکال دیا گیا تھا بلکہ غبن کے الزام میں مجھے کچھ دن حوالات میں بھی رہنا پڑا تھا۔ اگر سیمرا نے مجھے چھڑانے کے لیے کوشش نہ کی ہوتی تو شاید میں لمبے ہی عرصے کے لیے جیل چلا جاتا اور اس کے پیچھے بھی درحقیقت یہی مقصد کار فرما ہوتا کہ کسی طرح میرے پرنس انڈسٹریز میں واپس آنے اور سیمرا سے شادی کرنے کا امکان نہ پیدا ہونے پائے۔ اب تو آپ کو یقین آگیا ہو گا کہ اس سارے چکر کے پیچھے کوئی "غیبی طاقت" کام کر رہی تھی جسے وصیت نامے کے مندرجات کا علم ہو چکا تھا اور جسے اس صورت میں فائدہ پہنچ سکتا تھا کہ شادی والی شرط پوری نہ کر پاتی۔"

"آپ کھل کر اس غیبی طاقت کا نام کیوں نہیں لیتے؟" گل بولا۔

"میں اس کا نام لینے سے ڈرتا نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا آپ بھی اپنی کچھ رائے ظاہر کریں۔" صفدر بولا۔

"بعض معاملات میں پولیس اپنی رائے اشد ضرورت وقت ہی ظاہر کرتی ہے۔" رحیم گل محتاط لہجے میں بولا "بہرحال آپ کی رائے کو الفاظ کا جامہ پہنانے میں کوئی حرج محسوس کرتا۔ آپ غالباً یہ کہنا چاہتے ہیں کہ واجدہ وہ غیبی طاقت تھی"

میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ رحیم گل بوجھ کر تھوڑا سا انجان بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ صفدر سہلاتے ہوئے بولا "واجدہ نہیں...... اس کا شوہر احمد پرویز واجدہ ایک 'شریف' نیک طینت اور بے ضرر عورت ہے درست ہے کہ سیمرا اگر وصیت نامے کی شرط پر عمل نہیں کر اس کا بھاری فائدہ واجدہ ہی کو پہنچے گا لیکن وہ اس کے لیے سازش نہیں کر سکتی۔ کم از کم اپنی بہن سیمرا کے خلاف تو ہرگز کر سکتی لیکن اس کو فائدہ پہنچنا، اس کے شوہر کو فائدہ پہنچنے کے مترادف ہے اور وہ اتنے بڑے فائدے کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔ وہ بڑی سے بڑی سازش کرنے کی ذہنیت بھی رکھتا ہے اہلیت بھی۔"

رحیم گل نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ایک نظر اس روم کے دروازے کی طرف دیکھا جو خاصی دور واقع تھا۔ دروازہ بند تھا اور احمد پرویز ابھی تک اندر اپنی بیوی کے پاس ہی تھا۔

صفدر اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے بولا "یہ سمجھئے گا کہ مجھے احمد پرویز کی یہاں موجودگی کا علم نہیں ہے۔ معلوم ہے وہ یہاں موجود ہے اور اس کی بیوی بھی...... وہ شاید الگ الگ یہاں پہنچے ہیں۔ میں دونوں کی گاڑیاں باہر دیکھ چکا ہوں۔ میں جو سچ سمجھتا ہوں وہ ان کے منہ پر بھی کہنے سے ڈرتا نہیں ہوں۔"

وہ یقیناً ایک پرجوش اور تندخو نوجوان تھا۔ ایسے لوگ اور دیانت دار بھی ہو سکتے ہیں لیکن جذباتیت میں کبھی اچانک غیر متوقع قدم بھی اٹھا سکتے ہیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ پرنس سیمرا سے تیسری شادی بھی ایک غلطی ہی ہوتی۔

"آپ کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔" رحیم گل بولا "اشتہار کے ذریعے شوہر کی تلاش والا معاملہ ابھی رہتا ہے۔"

"ہاں......" صفدر نے سر ہلاتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا "میں یہ بتا رہا تھا کہ وصیت نامے کا ظاہر ہونا سیمرا کے اور میرے سر پر بم پھٹنے کے مترادف تھا...... بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ بم در حقیقت میرے سر پر پھٹا تھا۔ سیمرا اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ اگر میں چاہوں تو کہہ سکتا ہوں کہ وصیت نامہ اس کے لیے زیادہ تشویش کا باعث تھا۔ وہ اب اس کی تردید کرنے نہیں آسکتی لیکن میں سچ بولوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ روپے پیسے کے معاملے میں زیادہ بے پروا اور من موجی لڑکی تھی۔ اسے وصیت نامے کے مندرجات کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر باپ کی دولت و جائداد اس کے ہاتھ سے جا رہی تھی تو بے شک جائے۔ اس کے باوجود اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں تھی اور وہ مجھ سے شادی کرنے کے لیے تیار تھی۔ میں اپنی بیوی کو زبانی طلاق دے چکا تھا۔ مجھے صرف کاغذی کارروائی مکمل ہونے کا انتظار تھا جس میں شاید ایک دو ماہ اور لگ جاتے اور اس دوران میں وہ مہلت بھی ختم ہو جاتی جو وصیت نامے کی رو سے باقی تھی۔

"مہلت اگر زیادہ بھی ہوتی تب بھی میں تو اس سے استفادہ نہیں کر سکتا تھا کیوں کہ وصیت نامے کی شرط کے مطابق میں تو پرنس انڈسٹریز کا ملازم ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ اپنی ہونے والی بیوی کے ہاتھ سے اتنی زیادہ دولت و جائداد کے نکل جانے کا تصور میرے لیے زیادہ تکلیف دہ تھا۔ میں ہی ہاتھ دھو کر سیمرا کے پیچھے پڑ گیا تھا کہ وہ کوئی ایسی ترکیب سوچے کہ یہ دولت اور جائداد خواہ مخواہ ہاتھ سے جانے نہ پائے۔

"آخر کار اسی نے ابتدا میں مذاق کے سے انداز میں ایک تجویز پیش کی لیکن بعد میں ہم نے جوں جوں اس پر تبادلۂ خیال کیا ہم اس کے بارے میں سنجیدہ ہوتے گئے۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ فی الحال عارضی طور پر پرنس انڈسٹریز کے کسی ملازم سے شادی کر لے اور جب دولت و جائداد وغیرہ اس کے نام منتقل ہو جائے، تمام کارروائیاں مکمل ہو جائیں تو وہ اس سے طلاق حاصل کر کے مجھ سے شادی کر لے۔ ان کارروائیوں میں دو تین ماہ لگنے تھے۔"

"آپ نے اس تجویز کو قبول کر لیا؟" رحیم گل نے قدرے حیرت سے پوچھا "آپ کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ آپ کے خوابوں کی عورت آپ کی بیوی بننے سے پہلے دو تین ماہ کسی اور کی بیوی بن کر رہ لے...... اور آپ کے خوابوں کی عورت کے لیے بھی یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں تھا؟"

صفدر کے دہشت زدہ چہرے پر ایک لمحے کے لیے ہلکی سی سرخی آئی لیکن وہ تحمل سے بولا "آپ پہلے میری پوری بات سن لیں۔ نتائج اخذ کرنے میں اتنی جلدی نہ کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ مادیت پرستی کا دور ہے اور میں بھی اپنی ہونے والی بیوی کی دولت و جائداد کے بارے میں کافی مادیت پرستی کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرے پاس جذبات بالکل نہیں تھے یا جذبات اور غیرت و حمیت وغیرہ جیسے تصورات کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں تھی۔ حقیقت میں تو میری جذباتیت ہی سیمرا کی نظر میں میری سب سے بڑی خوبی تھی......"

"بہت خوب!" رحیم گل نے بھویں اچکائیں۔

صفدر گہری سانس لے کر بولا "سیمرا کی تجویز کا ایک اہم حصہ اصل میں یہ تھا کہ یہ محض دکھاوے کی شادی ہو گی جس کے دوران میں وہ اپنے نام نہاد شوہر کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دے گی۔ وہ محض کاغذات میں اس کا شوہر ہو گا لیکن درحقیقت وہ اسے چھونے کی بھی کوشش نہیں کرے گا۔"

"اوہ......!" رحیم گل نے دھیرے دھیرے چھڑی اپنے ہاتھ پر مارتے ہوئے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا "آپ کو امید تھی کہ آپ کوئی ایسا مسکین اور بے ضرر شوہر تلاش کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟"

"اس تجویز پر عمل درآمد کے سلسلے میں یہی تو مشکل مرحلہ تھا۔ پہلے ایک مسئلہ یہی تھا کہ اس شخص کو پرنس انڈسٹریز کا ملازم ہونا چاہیے تھا۔ پرنس انڈسٹریز کی صورتِ حال یہ ہے کہ مختلف مقامات پر اس کے کئی پلانٹ ہیں لیکن ان پر کام کرنے والے ننانوے فیصد لوگ ٹیکنیکل اور مزدور ٹائپ ہیں۔ جو تھوڑے بہت بھی پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ ہیں وہ تقریباً سبھی شادی شدہ تھے۔ یہ باتیں بھی میں صرف اس پلانٹ کے لوگوں کے بارے میں جانتا تھا جہاں میں خود تعینات رہا تھا۔ باقی پلانٹس پر کام کرنے والوں کے بارے میں مجھے کوئی معلومات نہیں تھیں۔

"اگر معلومات ہوتیں تب بھی یہ بڑا مشکل کام تھا کہ میں جا کر ان میں سے کوئی نہایت مناسب، شریف اور قابلِ اعتماد نظر آنے والا شخص تلاش کر کے اس سے درخواست کروں کہ تم اپنی انڈسٹری کی ہونے والی مالکن اور میری مستقبل کی بیوی سے فی الحال چند ماہ کے لیے شادی کر لو اور ان چند ماہ کے دوران میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھنا اور جب بھی تم سے مطالبہ کیا جائے تم بے چوں چرا اس حسین اور جوان خاتون کو طلاق دے کر خاموشی سے گھر چلے جانا۔ اس کام کا تمہیں معقول معاوضہ مل جائے گا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ہمارے منصوبے کے مطابق ہر شرط پر ہامی بھرنے والا کوئی آدمی مل بھی گیا تو وہ شادی کے بعد واقعی اپنی زبان پر قائم رہے گا؟ وعدہ خلافی کرنے والے کے ساتھ یوں تو ہم بہت کچھ کر سکتے تھے لیکن اس صورت میں ہمارے لیے کوئی بڑی الجھن کھڑی ہو سکتی تھی۔ خصوصاً جب کہ "غیبی قوت" مسلسل ہمارے خلاف کام کر رہی تھی اور ہم پر مستقل نظر رکھے ہوئے تھی۔

"اسی مستقل مسئلے پر غور و خوض میں مزید کئی قیمتی دن ضائع ہو گئے۔ وقت ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ آخر سیمرا نے اپنی ایک جاننے والی کی خدمات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا جو ماریہ میرج کونسل کی مالک تھی۔ باہمی مشوروں سے ہم نے اندازہ لگایا کہ پرنس انڈسٹریز کے تمام پلانٹس اور دفاتر وغیرہ میں کام کرنے والوں

کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ ان میں سے کسی سے بھی براہِ راست رابطہ کرنے کے بجائے اگر ضرورتِ رشتہ کا اشتہار دے دیا جاتا تب بھی امید تھی کہ جتنے لوگ رابطہ کریں گے' ان میں کچھ نہ کچھ تو ایسے بھی ہوں گے جو پرنس انڈسٹریز میں کام کرتے ہوں۔ اصل انٹرویو کے لیے صرف انہی کو بلایا جائے اور باقی سب کو بالا بالا ہی ٹرخا دیا جائے۔ جنہیں بُلایا جائے ان میں سے بھی موزوں ترین امیدوار کو ماریہ میرج کونسل والے ہی منتخب کر کے سیمرا تک بھیجیں اور اسے پہلے ہی اعتماد میں لے لیا جائے لیکن ضرورتِ رشتہ کے عنوان کے تحت ہماری کوشش ناکام ہو گئی۔

"اس اشتہار کے جواب میں جن لوگوں نے رابطہ کیا ان میں سے صرف دو پرنس انڈسٹریز کے ملازم تھے اور وہ بھی کچھ بے ہودہ سے ہی آدمی معلوم ہوتے تھے۔ چناں چہ مضمون بدل کر کسی اور عنوان کے تحت اشتہار دیا گیا اور اس میں فیملی کیسز لڑنے والی ایک خاتون وکیل کو بھی ڈالا گیا جو بہت سمجھ دار' تجربہ کار اور مردم شناس تھیں۔ بڑی چھان پھٹک کے بعد آخر کار انہوں نے ایک امیدوار کو منتخب کیا۔ اس کا نام کامران دانش تھا......" یہ کہہ کر نہ جانے کیوں اس نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی۔

اس موقع پر میں نے گفتگو میں مداخلت کی "مسٹر صفدر منیر! اتفاق سے مجھے کامران دانش سے چند لمحے کے لیے ملنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ آج سے پہلے جب میں پرنس سیمرا سے مل کر باہر جا رہا تھا تو وہ مجھے گیٹ پر ملا تھا۔ جب میں پرنس سے ملنے پہنچا تو درحقیقت وہ کامران دانش ہی کی منتظر تھیں اور وہ مجھے ہی کامران دانش سمجھی تھیں۔ انہوں نے اسی غلط فہمی میں میرا انٹرویو لینا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اسے ان کا مذاق سمجھ کر الٹے سیدھے جواب دینے شروع کر دیے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو بے روزگار بتایا تھا لیکن انہوں نے اس پر حیرت کا اظہار نہیں کیا۔ ان کی معلومات کے مطابق تو مجھے پرنس انڈسٹریز کا ملازم ہونا چاہیے تھا۔"

صفدر منیر نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا "وہ اسے آپ کا مذاق سمجھی ہوں گی۔ اسے معلوم تھا کہ ایسے کسی امیدوار کو اس کے پاس نہیں بھیجا جا سکتا تھا جو پرنس انڈسٹریز کا ملازم نہ ہوتا۔"

مجھے خاموش ہونا پڑا۔

رحیم گل بولا "کیا پرنس سیمرا نے کامران دانش کو منتخب کر لیا تھا؟"

"جی ہاں....." صفدر کے لہجے میں ایک بار پھر کچھ خوں خواری سی عود آئی "سیمرا نے نہ صرف اسے منتخب کر لیا تھا بلکہ پرسوں رات ہی خاموشی اور رازداری سے ان کا نکاح بھی ہو گیا تھا۔ تمام انتظامات پہلے ہی مکمل تھے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ آج شام بھی یہیں سیمرا کے پاس موجود تھا۔ وہ..... وہ خبیث....." غصے کی شدت سے اس کی آواز گویا گلے میں پھنس کر رہ گئی

اب مجھے اندازہ ہوا کہ جب اس نے سیمرا کے قتل کی ... کر غیظ و غضب کے عالم میں دیوار پر دو گھونسے رسید کیے ... بھی اس کے ذہن میں درحقیقت کامران دانش ہی کا تصور ... اس کی گفتگو کے دوران میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ شاید ... سارا غیظ و غضب احمد پرویز کے خلاف تھا اور اسے یہی شبہ ... سیمرا کا قتل ایک سازش تھی اور اس کے پیچھے احمد پرویز کا ... لیکن اب بات کچھ بدلتی نظر آ رہی تھی۔

"نکاح ہو چکا تھا......؟" اس خبر پر رحیم گل بھی حیران ... بغیر نہ رہ سکا۔ حیرت کا جھٹکا مجھے بھی لگا تھا۔ یہ لوگ واقعی ... فنکار اور بہت تیزی سے بہت کچھ کر گزرنے کے عادی معلوم ... تھے۔

صفدر نے اثبات میں سر ہلایا تو رحیم گل تیکھے لہجے میں ... "بڑی پھرتی دکھائی آپ لوگوں نے اس کام میں۔"

"وقت تیزی سے ہمارے ہاتھ سے نکلا جا رہا تھا۔ ہم ... اور پریشان تھے۔" صفدر نے گویا عذر پیش کیا۔

"کامران دانش ہر اعتبار سے آپ کے اور سیمرا کے ... پورا اترا تھا؟" رحیم گل نے دریافت کیا۔

"اس کا تفصیلی انٹرویو تو سیمرا ہی نے کیا تھا اور اسی نے ... او کے کیا تھا۔ بہرحال مجھے بھی وہ آدمی معقول ہی لگا تھا... آج کل کسی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ... شریف اور بھروسے کے قابل معلوم ہوتا تھا۔" صفدر نے ...

"اپنی باتوں سے لالچی بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چند مجبوریوں کی ... سے وہ اس پیشکش کی طرف متوجہ اور پھر آمادہ ہوا تھا۔ ... سلجھا ہوا اور تعلیم یافتہ نوجوان تھا لیکن نہایت ناسازگار حالات ... شکار تھا۔ حالات کے بھنور سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ... ملک میں پھیلی ہوئی بے روزگاری اور اپنی معاشی مجبوریوں کی ... سے وہ' اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود پرنس انڈسٹریز کے ... پلانٹ پر تقریباً مزدور کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ ایک جوان ... کی شادی کی ذمے داری اس پر تھی۔ والدین مر چکے تھے اور ... نے ورثے میں قرضوں کے سوا کچھ نہیں چھوڑا۔ خود کامران ... باہر جانے کے چکر میں چالیس ہزار قرض لے کر ایک ... ایجنٹ کے ہاتھوں گنوا چکا تھا۔ قرض خواہ اسے پریشان کر... دونوں بہن بھائی رشتے کے ایک ماموں کے گھر میں رہتے ... کسی طرح سفید پوشی کا بھرم رکھتے ہوئے زندگی کی گاڑی ... تھے۔ بہتر دنوں کی آس لیے تگ و دو میں لگے ہوئے تھے۔ ... کہانی وہی تھی جو آج کل نچلے گر ذرا سفید پوش طبقے کے ... گھر کی کہانی ہے۔"

"وہ شادی کے اس ڈرامے کا ایک اہم کردار بننے کو تیار ہو گیا؟" رحیم گل نے تصدیق چاہی۔

صفدر نے اثبات میں سرہلایا "اس کے خیال میں یہ ایک طرح سے اس کی لاٹری نکلنے کے آثار پیدا ہورہے تھے۔ اس مصنوعی شادی کے ذریعے اس کے حالات بدل سکتے تھے۔ دس لاکھ اس کے لیے بہت بڑی رقم تھی۔ وہ چند ضروری قرضے اتار کر کفایت شعاری سے اپنی اور بہن کی شادی بھی کر سکتا تھا۔ اس کے بعد بھی کوئی چھوٹا موٹا کاروبار شروع کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ رقم بچ رہتی۔ اس طبقے میں سب کام کم خرچ طریقے سے ہی کیے جاتے ہیں۔ اس کے سب مسائل حل ہوسکتے تھے ورنہ بظاہر تو آثار یہی بتا رہے تھے کہ اگر وہ زندگی بھر بھی ہاتھ پاؤں مارتا رہا تو شاید کبھی یک مشت دس لاکھ روپے حاصل نہ کرسکے...... اور پھر اس کے لیے اسے کچھ بھی نہیں کرنا تھا بلکہ ایک طرح سے یہ خاصا دلچسپ سا کام تھا۔"

"آپ دونوں کو یہ بھی امید تھی کہ قانونی طور پر سمیرا کا شوہر بن جانے کے بعد وہ کوئی ناجائز فائدہ اٹھانے یا کسی مسئلے پر اڑنے کی کوشش نہیں کرے گا؟" رحیم گل نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ اس پر یہی بھروسا کرنے کو تو فوراً دل مان رہا تھا۔ ایک رکاوٹ البتہ آن پڑی تھی۔ وہ منگنی شدہ تھا اور اس کی منگیتر شاید اس کی کوئی کزن ہی تھی جسے وہ بہت پسند بھی کرتا تھا۔ کوئی بچپن کی محبت وغیرہ کا قصہ تھا۔ وہ خود تو اس کاغذی شادی کی تجویز کے سلسلے میں فوراً رضا مند ہوگیا تھا لیکن بس ذرا اپنی منگیتر سے اجازت لینا چاہتا تھا۔ سمیرا نے اشارتاً اسے مشورہ بھی دیا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بالا ہی بالا اس کام سے فارغ ہوجائے گا اور اس کی منگیتر کو پتا بھی نہیں چلے گا لیکن وہ مصر رہا کہ یہ ایک مشہور اور دولت مند لڑکی سے شادی کا معاملہ تھا' اس کا راز رہنا مشکل تھا اور وہ اپنی منگیتر کے اعتماد کو دھوکا دینا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی یہ شادی راز رکھنے کے لیے تو نہیں کی جارہی تھی۔

"بہرحال...... تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد سمیرا نے اسے اجازت دے دی اور وہ اپنی منگیتر سے بات کرنے چلا گیا۔ سمیرا کو اندیشہ تھا کہ شاید وہ اس چکر کو کچھ پُراسرار محسوس کرتے ہوئے خوف زدہ ہوجائے اور واپس نہ آئے مگر وہ دو گھنٹے بعد واپس آگیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی منگیتر پہلے تو رونے پیٹنے لگی۔ پھر اس نے بہت سے اندیشوں کا اظہار کیا لیکن جب کامران نے بہت سمجھایا بجھایا تو آخر وہ مان گئی۔ بڑی مشکل سے آخر کار بات اس کی سمجھ میں آگئی۔"

"آپ کو اس کی منگیتر کا نام و پتا وغیرہ معلوم ہے؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"نہیں...... مجھے معلوم نہیں۔" صفدر نے نفی میں سرہلایا "شاید سمیرا نے اس کے بارے میں پوچھا ہو۔ مجھے البتہ کامران کا ایڈریس معلوم ہے۔ اس کا ایڈریس تو خیر پرنس انڈسٹریز کے ریکارڈ میں اور ماریہ میرج کونسل والوں کے پاس بھی ہوگا۔ ماریہ میرج کونسل والوں نے بھی اس سے تفصیلی انٹرویو کیا تھا تبھی اسے سفارش کے ساتھ آگے بھیجا تھا۔ پھر خاتون وکیل نے باتوں میں اسے اچھی طرح پرکھا تھا۔ اس کے بعد وہ سمیرا کے سامنے ہوا تھا پھر جب سمیرا نے اسے اوکے کردیا تو سمیرا کے ساتھ اس نکاح کے انتظامات میں نے ہی کیے تھے۔ اس سے پہلے میں نے اس کا انٹرویو لیا تھا۔"

کافی دیر کی خاموشی کے بعد اس مرحلے پر ایک بار پھر میں گفتگو میں دخل دیا اور صفدر کو مخاطب کیا "آپ نے کس بنا پر فیصلہ کیا تھا کہ کامران دانش اس نازک' عجیب اور پیچیدہ معاملے میں ایک قابلِ اعتبار آدمی ثابت ہوگا؟"

"کس بنا پر......؟" صفدر کچھ گڑبڑا گیا پھر سنبھل کر بولا "کئی افراد کی پوچھ گچھ کی چھلنی سے گزر چکا تھا...... اور پھر ہر انسان سے ملنے' اس سے بات چیت کرنے کے بعد آپ کا دل بھی تو کچھ کچھ گواہی دیتا ہے۔ میں ایک بزنس مین ہوں۔ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ مجھ میں بھی کچھ نہ کچھ مردم شناسی اور قوتِ فیصلہ تو ہے۔ مجھے وہ آدمی ٹھیک ہی لگا تھا۔"

"پھر بھی......" میں نے ملائمت سے کہا "آپ اپنی مجبوری اسے بتا کر...... اپنا راز اس کے ہاتھ میں دے کر گویا ایک بھرا ہوا پستول اس کے ہاتھ میں دے رہے تھے جسے وہ کسی بھی وقت آپ کی کنپٹی پر رکھ سکتا تھا۔"

"اس طرح کے کاموں میں کچھ نہ کچھ رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔ ویسے ہم نے اپنی دانست میں ہر ممکن احتیاطی تدبیر اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ ہم نے اس سے ایک اقرار نامہ بھی سائن کروایا تھا۔"

"کیسا اقرار نامہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہی کہ سمیرا جب بھی کہے گی وہ اس سے دس لاکھ روپے لے کر اسے طلاق دے دے گا۔" صفدر نے جواب دیا۔

"عدالتوں میں اس قسم کے اقرار ناموں کی حیثیت ردی کاغذ سے زیادہ نہیں ہوتی۔" میں نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا "آپ بزنس مین ہیں...... مردم شناس ہیں...... آپ نے دنیا دیکھی ہے...... لیکن شاید آپ کو علم نہیں ہے کہ ہر قسم کے معاملات کے لیے ایسے اقرار نامے تیار کرنے کے الگ الگ قانونی طریقے ہیں جن کی عدالت میں واقعی کوئی اہمیت ہوتی ہے اور ان کی بنیاد پر فیصلے دیے جاتے ہیں۔"

وہ ذرا شکست خوردگی اختیار کرتے ہوئے بولا "میں بہرحال وکیل نہیں ہوں۔ ہم بس اپنے سے انتظامات کررہے تھے۔"

"لیکن اب آپ یہ تسلیم کرنے کے لیے تیار ہیں کہ آپ کے انتظامات ناکافی اور آپ کے اندازے غلط ثابت ہوئے؟" رحیم گل نے دریافت کیا۔

"ظاہر ہے جناب......!" وہ ایک لمحے کے لیے سر جھکا کر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اگر ہر انسان ہمیشہ صحیح فیصلے کرنے اور صحیح اندازے لگانے پر قادر ہوتا تو دنیا کی یہ حالت ہرگز نہ ہوتی جو آج ہے اور تاریخ کے صفحات تباہیوں کے تذکروں سے اتنے داغ دار نہ ہوتے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد رحیم گل بولا "دوسرے لفظوں میں آپ کہنا چاہتے ہیں کہ کامران دانش' سمیرا کو قتل کرکے فرار ہوگیا؟"

"میں یہ نہیں کہہ رہا......" صفدر نے فوراً ایک سمجھ دار انسان کی طرح باقاعدہ کوئی الزام عائد کرنے کی ذمّے داری سے بچتے ہوئے کہا "میں تو ایک امکان کی بات کررہا ہوں۔ آخر اور کون سمیرا کو قتل کرسکتا تھا؟ آپ خود ہی نتیجہ اخذ کرچکے ہیں کہ یہ چوری ڈاکے کی واردات نہیں ہے اور آج شام سے سمیرا کے پاس کامران دانش کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ سمیرا نے مجھے فون کرکے بتایا تھا کہ کامران اس کے پاس آیا ہوا تھا۔"

"اس نے کوئی وجہ نہیں بتائی کہ وہ کیوں آیا ہوا تھا؟" رحیم گل نے فوراً سوال کیا "اس کے آنے کی کوئی خاص وجہ تو نظر نہیں آتی۔ نکاح ہوچکا تھا اور اسے سمیرا کے ساتھ نہیں رہنا تھا۔ یہ محض دکھاوے کی شادی تھی۔"

"سمیرا نے مجھے کوئی وجہ نہیں بتائی تھی۔ ہوسکتا ہے اس وقت تک کامران نے اس کے سامنے کوئی وجہ بیان ہی نہ کی ہو۔ یہ بھی عین ممکن ہے کہ کامران بغیر کسی وجہ کے ہی چلا آیا ہو۔ سمیرا بہرحال جوان' حسین اور زندگی سے بھرپور لڑکی تھی۔ کسی بھی نوجوان کا اس سے ملنے کو جی چاہ سکتا تھا۔ خصوصاً جب کہ وہ قانونی طور پر اس کا شوہر بھی بن چکا ہو۔"

ایک لمحے خاموشی رہی پھر رحیم گل ہمت افزائی کے سے انداز میں بولا "صفدر صاحب! آپ کھل کر بات کیجیے۔ اپنی احتیاط پسندی کو تھوڑا کم کیجیے۔ آپ نے یہاں آتے ہی اپنے جذبات کے اظہار کے سلسلے میں کچھ بے ساختگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر وہ بے ساختگی برقرار رہ سکے تو ہمیں تفتیش میں کافی مدد مل سکتی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو اپنی کہی ہوئی کسی بھی بات کو آف دی ریکارڈ قرار دے سکتے ہیں۔ ہم آپ سے اس حد تک تعاون کرنے کو تیار ہیں کہ ہم بھی اسے آف دی ریکارڈ ہی سمجھیں گے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ بھی ہم سے کچھ تعاون کریں۔ ہمیں آپ کا اصل نکتۂ نظر معلوم ہونا چاہیے۔"

"میرے نکتۂ نظر سے کیا ہوتا ہے جی......" وہ دھیمے لہجے میں بولا "بہرحال آپ کے اس مہذبانہ اور ہمدردانہ رویے کا بہت شکریہ۔ میں اپنے ہاں کی پولیس سے اس قسم کے رویے کی توقع نہیں کرسکتا تھا۔"

"میں اپنی زندگی میں جس مشن کے لیے کام کررہا ہوں اس کا ایک چھوٹا سا حصہ یہ بھی ہے کہ میں پولیس کا امیج بہتر بنانے کی حتی المقدور کوشش کروں گا۔ یہ امیج بہت بگڑ چکا۔ اب کوئی تو ایسا ہونا چاہیے جو اسے بہتر بنانے کی بھی کوشش کرے۔" رحیم گل بولا۔

صفدر گویا اس کی باتوں سے حوصلہ پا کر بولا "ممکن ہے کامران دانش کوئی خاص مقصد لے کر سمیرا کے پاس آیا ہو۔ وہ مقصد پورا نہ ہوا ہو...... جھگڑے اور تلخ کلامی کی نوبت آگئی ہو...... کامران سے فوری اشتعال کے تحت یہ قتل ہوگیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کامران پہلے سے ذہن میں کوئی مقصد لے کر نہ آیا ہو لیکن یہاں آکر اسے کاغذی شوہر کے بجائے سچ مچ کا شوہر بننے کی سوجھی ہو...... وہ بہرحال ایک غیر شدہ نوجوان تھا...... یہاں کا خوب صورت اور رومان پرور ماحول...... سمیرا جیسی لڑکی کی موجودگی...... خلوت کا احساس......! یہ سب چیزیں کوئی گل کھلا سکتی تھیں...... اور سمیرا کا امیج خواہ کچھ بھی رہا ہو لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ وہ کتنے مضبوط کردار کی مالک تھی۔ وہ بہک نہیں سکتی تھی۔ وہ مزاحمت پر اتر آئی ہوگی۔ کامران پر شاید شیطان سوار ہو۔"

"اس قسم کی کسی مزاحمت کے آثار نظر نہیں آئے ہیں۔" رحیم گل بولا "مزید باریکیاں پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے واضح ہوجائیں گی۔ اگر یہ قتل فوری اشتعال کے تحت نہیں ہوا تو پھر ہمیں یہ فرض کرنا پڑتا ہے کہ کامران نے کچھ سوچ کر سمیرا کو قتل کیا ہوگا...... لیکن یہ تو اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ وہ ایک ضرورت مند نوجوان ہے۔ دس لاکھ کی جس رقم کی امید پر وہ اس ڈرامے میں حصہ لے رہا تھا' اس طرح تو وہ بھی ڈوب گئی۔ یہ امریکا تو ہے نہیں...... کہ جہاں بیوی کی موت کی صورت میں شوہر اور شوہر کی موت کی صورت میں بیوی تمام دولت و جائداد کی مالک بن جائے۔ امریکا میں بھی شوہر اسی صورت میں دولت مند بیوی کو قتل کرکے سب کچھ حاصل کرنے کی توقع رکھ سکتا تھا جب کہ قتل کا الزام اس پر نہ آتا۔ یہاں تو قتل کا الزام کامران پر آسکتا ہے اور اسے کسی بھی طرح سمیرا کے مرنے کا کوئی فائدہ پہنچتا نظر نہیں آتا۔"

"اگر وہ قتل کے الزام سے بچ جاتا ہے تب تو وہ مقدمے بازی وغیرہ کرکے دس لاکھ سے کہیں زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔" صفدر نے امکان ظاہر کیا "اور اس سے کہیں زیادہ فائدہ واجدہ پرویز کو پہنچ سکتا ہے اور اسے فائدہ پہنچنے کا اصل مطلب احمد پرویز کو فائدہ پہنچنا ہے۔ وہ عورت تو خیر اس قسم کی گھناؤنی حرکت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"لیکن آپ کے خیال میں احمد پرویز ایسا سوچ سکتا ہے؟" رحیم گل فوراً بولا۔

"وہ تو نہ صرف سوچ سکتا ہے بلکہ خود محفوظ رہتے ہوئے ایسی کسی بھی سازش کو عملی جامہ پہنانے کے وسائل اور ہمت بھی رکھتا ہے۔" صفدر نے بلا تامل جواب دیا۔

"گویا آپ کے حساب سے ایک نہیں' دو مشکوک آدمی

ہال میں میرے اور رحیم گل کے سوا کوئی تیسرا فرد موجود ہی نہیں تھا۔ میں نے صفدر کی طرف دیکھا۔ وہ نفرت بھری نظروں سے اسے جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ یہ بات کسی حد تک اس کے حق میں جاتی تھی کہ اس نے اپنے طرزِ عمل یا اپنی باتوں میں احمد پرویز کے خلاف اپنی نفرت کو چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی اور منافقت سے کام نہیں لیا تھا۔

چند لمحے بعد احمد پرویز اپنی بیوی کو ساتھ لیے بیڈ روم سے نکلتا دکھائی دیا۔ واجدہ نے اس کے بازو کا سہارا لیا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں تقریباً بند تھیں۔ وہ اس کے ساتھ گویا گھسٹ رہی تھی۔ دونوں میاں بیوی ہال میں سے نہیں گزرے بلکہ بیڈ روم کے سامنے والی راہ داری سے ہی گزر کے دوسرے راستے سے نکل گئے۔ صفدر کھڑکی کے راستے بھی انہیں باہر تک جاتے دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ احمد پرویز نے گو کہ ایک بار بھی اس کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن میں محسوس کر سکتا تھا کہ اس کے دل میں صفدر کے لیے شاید اس سے بھی زیادہ نفرت تھی۔ وہ دونوں بجلی کی ان تاروں کی طرح تھے جن میں نہ جانے کتنے وولٹ بجلی گزر رہی تھی۔ ان دونوں کا ایک دوسرے سے چھونا بھی نہ جانے کتنی تباہی کا سبب بن سکتا تھا۔ تاہم احمد پرویز کے رخصت ہو جانے کے بعد جیسے فضا میں ایک خطرناک تناؤ ختم ہو گیا۔ صرف سوگواری رہ گئی۔ یہ جواں مرگی کی سوگواری تھی۔

چند لمحے بعد رحیم گل نے سکوت توڑا اور صفدر کو مخاطب کیا "تو آپ کے خیال میں احمد پرویز کروڑوں کی دولت و جائداد کے لیے اپنی سالی کو قتل کروا سکتا ہے؟"

صفدر اس سوال کا کوئی براہِ راست جواب دینے کے بجائے بولا "اس دنیا میں...... بلکہ صرف ہمارے ہی ملک میں نہ جانے کتنے لوگ اس سے بھی کم دولت و جائداد کے لیے اپنی سگی بہنوں...... اور بھائیوں تک کو قتل کروا چکے ہیں۔ سالی تو پھر بھی خون کا رشتہ نہیں ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" رحیم گل نے میری طرف دیکھا۔

"آدمی خطرناک ہے...... !" میں نے بھی غیر واضح جواب دینے کی کوشش کی "لیکن سیمرا کے قتل کے سلسلے میں اس کا کیا کردار ہو سکتا ہے' یہ میں ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔"

رحیم گل ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا "مجھے ابھی تک کامران پر ہی سب سے زیادہ شک ہے۔ ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ وہ ہاتھ آجائے۔"

میرے خیال میں یہ اس کا بلف تھا۔ کوئی بھی اچھا پولیس آفیسر اس طرح کی صورتِ حال میں کسی پر حتمی انداز میں شک کا اظہار نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی رائے محفوظ ہی رکھتا اور عملی طور پر جو کرنا ضروری ہوتا وہ کرتا رہتا۔

صفدر کو گویا کچھ خیال آیا اور وہ رحیم گل سے مخاطب ہوا۔ "آپ نے چوری یا ڈکیتی کے نکتہ نظر سے اسٹوڈیو کا اچھی طرح جائزہ لیا ہے؟"

"بہت زیادہ باریک بینی سے تو جائزہ نہیں لیا۔ اگر سیمرا چوری یا ڈکیتی کے چکر میں قتل کیا گیا ہوتا تو اس کے آثار سامنے نظر آجاتے۔ کئی اچھی بھلی قیمتی چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں انہیں اٹھا کر لے جانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ خود سیمرا کے جسم پر ڈائمنڈ کی دو تین چیزیں موجود تھیں' انہیں بھی نہیں چھیڑا گیا۔"

"ایک آدھ جگہ ایسی بھی ہے جو زیادہ خفیہ تو نہیں ہے لیکن تھوڑی بہت خفیہ ضرور ہے۔ احتیاطاً اس کا بھی جائزہ لے لینا چاہیے۔ اگر وہاں سے چیزیں بھی غائب ہوئیں تو پھر یہ چوری یا ڈکیتی کا کیس بھی ہو سکتا ہے...... اور چور کامران بھی ہو سکتا ہے۔" صفدر اٹھتے ہوئے بولا۔ میں اور رحیم گل بھی اس کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوئے۔

اس کی رہنمائی میں ہم ایک بیڈ روم میں پہنچے۔ یہ وہ بیڈ روم نہیں تھا جس میں واجدہ پرویز کو لٹایا گیا تھا۔ یہ بھی اعلیٰ درجے کے تمام ضروری اور غیر ضروری سامان سے آراستہ تھا۔ کہنے کو یہ بطور آرٹ اسٹوڈیو کے طور پر استعمال ہوتا تھا لیکن یہاں اعلیٰ درجے کی رہائش کے بھی تمام لوازمات موجود تھے۔

صفدر نے بیڈ کے نیچے موجود ایک خفیہ دراز کو باہر کھینچا۔ واقعی کچھ ایسی زیادہ خفیہ بھی نہیں تھی۔ آج کے دور میں چور ڈاکوؤں کو اس قسم کے تمام ٹھکانوں کا علم ہوتا ہے اور وہ سب سے پہلے انہی کی تلاشی لیتے ہیں۔ اس دراز میں تو تالا بھی موجود نہیں تھا۔ دراز باہر آتے ہی ہمیں اس میں زیورات کے کئی مخملیں ڈبے رکھے دکھائی دیے۔ صفدر نے سب ڈبوں کو باری باری کھولا اور ہماری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ سب میں ڈائمنڈز کے زیورات موجود تھے۔ چند لمحے کے لیے، تو میں بھی دم بخود رہ گیا۔

میرے لیے ایک نظر میں ان کی مالیت کا اندازہ لگانا تو مشکل تھا لیکن عین ممکن تھا کہ ان کی مالیت لاکھوں کے بجائے کروڑوں کی حدود میں ہوتی۔ یہ بلاشبہ ناقابلِ یقین سی بات تھی کہ اتنی مالیت کے زیورات بغیر تالے کی ایک دراز میں ایک ایسے بنگلے میں پڑے ہوئے تھے جس کے دروازے پر چوکی دار تک موجود نہیں تھا اور جہاں زیادہ تر صرف ایک تنہا لڑکی موجود رہتی تھی۔

ان زیورات تک میری اور رحیم گل کی رہنمائی کر کے صفدر نے گویا اپنی نیک نیتی کا ایک واضح ثبوت پیش کر دیا تھا۔ ایسے قیمتی زیورات کے لیے کسی کی بھی نیت خراب ہو سکتی تھی اور شاید صفدر کے سوا کسی کو ان کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ اگر اس کی نیت میں ذرا بھی خرابی آجاتی تو وہ ان کے بارے میں زبان بند رکھ سکتا تھا اور بعد میں نہایت آسانی سے ان پر ہاتھ صاف کر سکتا تھا۔ رحیم گل اور اس کے آدمیوں نے سرسری انداز میں ہی جائے وقوعہ کا جائزہ لینے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ یہاں چوری یا ڈکیتی کی کوشش نہیں ہوئی تھی اس لیے انہوں نے اِدھر اُدھر زیادہ ہاتھ پاؤں نہیں مارے تھے۔ ویسے ان کا اندازہ تو ٹھیک ہی تھا کہ چوری یا ڈکیتی کی کوشش واقعی نہیں ہوئی تھی لیکن ان کی اس بے توجہی سے کوئی سُراغ بھی نظر سے اوجھل رہ سکتا تھا۔

رحیم گل کو اپنے آپ کو بے نیاز ظاہر کرنے کی خاصی عادت تھی لیکن ان زیورات کو دیکھ کر وہ بھی سٹپٹا کر رہ گیا۔ وہ صفدر کو دراز بند کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے تفہیمی سے انداز میں سرہلا کر بولا "پرنس سیمرا کی رہائش تو اصل میں کسی اور بنگلے میں تھی نا؟"

"جی ہاں۔ ڈیفنس کا ایک بنگلہ اس کی اصل رہائش تھا۔ وہاں ملازم وغیرہ بھی موجود ہیں۔" صفدر نے جواب دیا "لیکن اس کا زیادہ وقت یہیں گزرتا تھا۔ بعض اوقات وہ یہیں سے تیار ہو کر پارٹی وغیرہ میں چلی جاتی تھی۔ اسی لیے زیادہ تر زیورات بھی یہیں رکھے ہوئے تھے لیکن یہاں وہ سکون اور تنہائی چاہتی تھی اس لیے یہاں وہ میرے علاوہ کسی کو بھی بلاتی تھی تو اشد ضرورت کے تحت یا پھر رازداری کے خیال سے بلاتی تھی۔"

رحیم گل ایک لمحے کے لیے پُرخیال انداز میں خاموش رہا۔ شاید وہ ملک بھر میں پھیلے ہوئے غربت و امارت کے اس بھیانک فرق کے بارے میں سوچ رہا تھا جس کی طرف احساس کی نظر سے دیکھنے والوں کا دل واقعی خون ہو جاتا تھا۔ ہمارے ہاں ایک طرف دولت کی بھی کوئی حد نہیں تھی اور ایک طرف غربت کی بھی کوئی حد نہیں تھی۔ ایک طرف تو یہ عالم تھا کہ صرف ایک فرد کے رہنے اور فضول قسم کے شوق کی تکمیل کے لیے مہنگے ترین علاقوں میں کروڑوں کے بنگلے موجود تھے جن کے ساتھ اعلیٰ درجے کی تمام تعیشات بھی تھیں۔ لاکھوں کے...... بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ کے زیورات تھے۔ بینکوں اور دیگر مالیاتی اداروں میں نہ جانے کیا کچھ پڑا تھا۔ اس پر بھی طرہ یہ کہ مزید بے اندازہ دولت و جائداد اس کے حصے میں آنے والی تھی جس کے لیے کھینچا تانی شروع ہو چکی تھی۔

دوسری طرف ایسے بھی بے شمار لوگ تھے جو گندے نالوں کے کنارے ہارڈ بورڈ' گھاس پھونس اور لکڑی کے تختوں سے بنے ہوئے ایسے مکانوں میں رہتے تھے جو تیز بارشوں اور آندھیوں میں بکھر جاتے تھے اور ان میں بھی جگہ کی تنگی کا یہ عالم تھا کہ دس دس افراد ایک ایک کمرے میں سوتے تھے۔ ان گنت لوگ ان جگہوں پر زندگی گزار رہے تھے جہاں زندگی کا تصور محال تھا۔ ان حالات میں جی رہے تھے جن کا کوئی تصور نہیں کر سکتا تھا۔ مہذب دنیا کے بہت سے لوگ تو اگر قریب جا کر دیکھتے تو حیران ہوتے کہ وہ اب تک زندہ کیسے تھے۔ یہ ایک بھیانک تضاد تھا جس کے بارے میں' میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ کہیں یہ سوسائٹی میں کوئی بھیانک انقلاب تو نہیں لائے گا۔

میں خود بھی اس تضاد کا ایک حصہ تھا لیکن اسے مکمل طور پر ختم کرنے یا اس میں نمایاں کمی لانے کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں انفرادی سطح پر اپنی سی کوششیں کرتا رہتا تھا۔ کسی کمزور کو سہارا دے کر آگے لانے کے سلسلے میں جو کچھ ہو سکتا تھا' کرتا رہتا تھا لیکن اس سے مجموعی طور پر معاشرے میں ظاہر ہے کوئی فرق نہیں پڑ سکتا تھا لیکن دوسرے بہت سے لوگ تو اتنا بھی نہیں کرتے تھے۔ میں کم از کم اس تضاد کے بارے میں سوچتا تو تھا۔ بے شمار لوگ تو سوچتے بھی نہیں تھے بلکہ شاید وہ اس تضاد سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ وہ اپنی دولت کی زیادہ سے زیادہ نمائش کرتے تھے۔ میں اپنی سی کوششیں کرنے کے باوجود معاشرے کے پسے ہوئے طبقوں کے سامنے اپنے آپ کو مجرم مجرم سا محسوس کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو دل چاہتا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر یا کسی فلاحی ادارے کے نام کر کے کہیں باہر نکل جاؤں لیکن ابھی تک اس ارادے پر عمل درآمد کی نوبت نہیں آسکی تھی۔

صفدر کہہ رہا تھا "میں سیمرا سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ وہ ان زیورات کو کہیں لاکرز وغیرہ میں رکھ دے لیکن وہ اس تردد میں بھی نہیں پڑتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ مجھے تو کسی وقت بھی ان کی ضرورت پڑ سکتی ہے...... میرا کسی وقت بھی انہیں پہننے کا موڈ ہو سکتا ہے' اگر اس وقت لاکر کھلا نہ ہوا تو میں کیا کروں گی۔ بس...... وہ سخت موڈی لڑکی تھی۔ اس سے کوئی بات منوانا بہت مشکل تھا۔"

"اس کے باوجود آپ اس سے شادی کرنے کے لیے بے تاب تھے!" میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"محبت اسی کا نام ہے۔" صفدر افسردہ لہجے میں بولا "ویسے اس کی شخصیت کا یہ پہلو کبھی کبھی ہی نمایاں ہوتا تھا۔ اب ایسا بھی نہیں تھا کہ وہ کوئی بات مانتی ہی نہیں تھی۔ اکثر مان بھی لیتی تھی بلکہ کبھی کبھی تو اس کی سعادت مندی ناقابلِ یقین لگتی تھی۔ اس کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ کسی ملکہ کی طرح زندگی گزارنے کی عادی ہونے کے باوجود اسی گھر میں اپنے ہاتھ سے کبھی کبھی میرے لیے کھانا بھی پکاتی تھی۔ کبھی کبھی آڑے وقت میں...... اور عجلت کے عالم میں میرے جوتے بھی پالش کر دیتی تھی۔ آپ اس بات پر یقین کریں گے؟"

"بات تو واقعی ناقابلِ یقین سی ہے۔" رحیم گل بولا۔

میرے لیے اس میں بے یقینی والی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "عورت سے کسی بھی بات کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔"

"غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود تمہیں عورتوں کے بارے میں بہت تجربہ ہے۔" رحیم گل نے مجھے گھورا۔

"میں اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"واقعی...... !" رحیم گل نے سرہلایا "ہم لوگوں نے تو آنکھوں پر پٹی باندھی ہوئی ہے اور کانوں میں روئی ٹھونسی ہوئی ہے۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ہاں...... کم از کم پولیس کے بارے میں تو یہی کہا جا سکتا ہے۔ ورنہ بھلا ہمارے معاشرے کا یہ حال ہوتا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔ رحیم گل نے بھی کڑی نظروں سے مجھے گھورا۔ وہ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہا تھا کہ پُرانی بحث شروع کرنے کا یہ کوئی موقع

نہیں ہے۔

میں نے اسے بخش دیا اور زیورات کے ڈبوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جلدی سے کہا "بہرحال ان زیورات کی موجودگی سے اس نظریے کی تصدیق ہوجاتی ہے کہ یہاں کامران یا کسی اور نامعلوم فرد نے چوری کرنے یا ڈاکا ڈالنے کی کوشش نہیں کی تھی اور سیمرا ایسی کسی کوشش کے دوران میں مزاحمت کی وجہ سے نہیں ماری گئی۔"

صفدر نے پُرخیال انداز میں اثبات میں سرہلایا اور بیڈ کی خفیہ دراز کو بند کرنے لگا۔ اسی لمحے میری نظر اس کی کلائی پر بندھی ہوئی جھلملاتی گھڑی پر پڑی۔ وہ ایک عمدہ اور بیش قیمت گھڑی تھی لیکن اس کے شیشے پر بڑی گہری خراش پڑی ہوئی تھی اور وہ بند تھی۔ غالباً اس نے جب دو مرتبہ زور سے دیوار پر گھونسا مارا تو اس کی گھڑی بھی دیوار سے رگڑ کھا گئی تھی لیکن میں نے اس وقت اس نقصان کی نشان دہی نہیں کی۔

اس کے بجائے میں نے اپنی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "کافی رات بیت چکی ہے۔ مجھے تو اب اجازت دو انسپکٹر! کل ملاقات ہوگی۔" میں نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھادیا۔ "جب کامران دانش تمہارے سامنے پہنچ جائے تو مجھے بتانا کہ وہ اس سلسلے میں کیا کہتا ہے۔"

رحیم گل نے سخت نگاہوں سے مجھے گھورا۔ وہ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے ڈانٹ رہا تھا کہ آخر مجھے ابھی سے بھاگنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ فی الحال مجھے بات کچھ آگے بڑھتی نظر نہیں آرہی تھی اس لیے میرا وہاں ٹھہرنا فضول تھا۔ اس کی تو خیر ڈیوٹی تھی۔ وہ بال کی کھال نکالنے کے لیے تمام رات بھی وہاں ٹھہرا رہتا تو کوئی حرج نہیں تھا لیکن میں محسوس کررہا تھا کہ فی الحال ہمارے سامنے ایک دیوار آگئی تھی۔ اس دیوار سے سر ٹکرانے کے بجائے اپنے ہوٹل جاکر آرام کرنا بہتر تھا۔

رحیم گل نے گویا بادلِ ناخواستہ مجھے جانے کی اجازت دے دی اور میں ہوٹل واپس پہنچ کر دل میں ایک بے عنوان سی خلش اور بے نام سی افسردگی لیے پرنس سیمرا کے بارے میں سوچتے اور اس پُراسرار مسئلے پر غور کرتے کرتے سوگیا۔

دوسری صبح میں بہت دیر سے اٹھا۔ تیار ہونے کے بعد ناشتا اور دوپہر کا کھانا میں نے اپنے کمرے میں مشترکہ ہی کھایا۔ بریک فاسٹ اور لنچ کا یہ مرکب یعنی "برنچ" BRUNCH مجھے اکثر ہی کرنا پڑتا تھا۔

آغازِ سہ پہر کے قریب میں اپنے دفتر میں پہنچا۔ کچھ دیر بعد امبر میرے سامنے کچھ فائلیں رکھنے آئی تو مسکراتے ہوئے بولی۔ "سر! آپ راتوں رات کافی مشہور ہوگئے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے ذرا چونکتے ہوئے پوچھا۔

"شام کے کئی اخباروں میں آپ کی بڑی اچھی سی تصویر چھپی ہے۔ جس خبر کے حوالے سے چھپی ہے وہ تو افسوس ناک سی ہے لیکن آپ کی اور مقتولہ کی تصویریں بہت پیاری ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے ایک لمحے کے لیے غور سے اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "کیا خبر کے مطابق میں بھی مقتول ہوگیا ہوں؟"

"خدا نہ کرے.....!" وہ گویا دہل کر بے ساختہ بولی "خبر میں صرف ایک مقتولہ کا ذکر ہے۔ پرنس سیمرا کا.....! آپ نے تو اس کی لاش سب سے پہلے دیکھی تھی۔ اخبار والوں نے صرف اس حوالے سے بھی آپ کا ذکر بڑے اہتمام سے کیا ہے۔"

"ان کے پاس میری تصویر کہاں سے آگئی؟ جائے وقوعہ پر پریس کا کوئی رپورٹر یا فوٹوگرافر نہیں پہنچا تھا۔" میں نے حیرت سے کہا۔ ظاہر ہے امبر کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا تھا اس لیے میں نے ساتھ ہی اس سے کہا "ذرا وہ اخبارات لاکر مجھے بھی تو دکھاؤ۔"

امبر جلدی سے اخبارات لے آئی اور میری میز پر رکھ کر چلی گئی۔ ان میں تین اردو کے اور ایک اخبار انگریزی کا تھا۔ میں ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگا کر ذرا اطمینان اور باریک بینی سے جائزہ لینے لگا۔ درحقیقت وہ صرف پرنس سیمرا کے قتل کی خبر تھی لیکن شام کے اخباروں نے اپنی روایت کے مطابق مختصر متن اور تصویروں کو ذرا سنسنی خیز سی سرخیوں کے ساتھ کافی پھیلا کر شائع کیا تھا۔

پرنس سیمرا کی ایک تصویر زندہ حالت کی تھی جسے پہلے صفحے پر اوپر کی طرف خوب نمایاں انداز میں تین کالمی سائز میں چھاپا گیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ فوری طور پر اپنی توجہ مبذول کرانے والی تصویر تھی۔ اس میں پرنس سیمرا کا حسن اور تمکنت اچھی خاصی نمایاں تھی۔ دوسری اور کافی چھوٹی تصویر اس کی لاش کی تھی۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ زندگی اور موت کا فرق تصویروں میں بھی اجاگر ہوجاتا ہے۔

تیسری تصویر اس خاکسار کی تھی جو تصویر میں کچھ ایسا خاص نظر نہیں آرہا تھا۔ میری تصویر سنگل کالمی ہونے کے باوجود خاصی نمایاں نظر آرہی تھی۔ مجھے فوراً یاد آگیا کہ درحقیقت وہ کسی تقریب کی تصویر تھی جس میں شاید میں دوسری دو تین اہم شخصیات کے ساتھ موجود تھا لیکن اس خبر کے ساتھ لگانے کے لیے میری تصویر کو علیحدہ کرکے غالباً بڑا بھی کیا گیا تھا۔

خبر گو کہ صرف پرنس سیمرا کے پُراسرار قتل کی تھی اور اس میں ذکر صرف اس حد تک آیا تھا کہ شہر کے ممتاز بزنس مین اور فائیو اسٹار ہوٹل کے مالک افضل چوہدری جب آدھی رات سے کچھ پہلے پرنس سیمرا کے بلاوے پر اس کے بنگلے پر پہنچے تو وہ مردہ پڑی تھی۔ پولیس کی تفتیش جاری تھی اور تفصیلات کے لیے ابھی اخبارات نے اپنی آئندہ اشاعتوں کا انتظار کرنے کی درخواست کی تھی۔ ان اخباروں کی یہ مستعدی بھی کچھ کم نہیں تھی کہ انہوں نے آدھی رات کے بعد کی خبر نمایاں تصویروں کے ساتھ

تک پیش کردی تھی۔ گویا اب وہ بھی کافی حد تک مغربی اخباروں کا مقابلہ کرنے لگے تھے۔

جب تک میں پرنس سیمرا کے اسٹوڈیو سے واپس آیا تھا تب تک چوں کہ میں نے کسی اخباری نمائندے کو وہاں نہیں دیکھا تھا اس لیے اس "مستعدانہ" کوریج کے پیچھے مجھے کسی مہرباں کا تعاون "شاملِ حال لگتا تھا۔ کرائم کی رپورٹوں کے سلسلے میں کرائم رپورٹروں کا خبریں حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ پولیس ہی تھی۔ جس خبر کو پولیس ذرا لیٹ کرنا چاہتی تھی اس کے سلسلے میں تاخیری ہتھکنڈے استعمال کرکے اسے کچھ لیٹ کروادیتی تھی لیکن جسے وہ جلد از جلد منظرِ عام پر لانا چاہتی تھی اس کے سلسلے میں غیر معمولی تعاون بھی کرلیتی تھی اور کوئی تصویر اگر اس کی رسائی میں ہوتی تو وہ بھی فراہم کردیتی تھی لیکن اگر رپورٹرز اور فوٹوگرافرز خود بروقت جائے وقوع پر پہنچ جاتے تھے تو پھر عام طور پر انہیں کسی کے تعاون اور رہنمائی کی ضرورت ذرا کم ہی رہ جاتی تھی۔ وہ اپنی مرضی اور اپنے اپنے حساب سے رپورٹنگ کرتے تھے۔

سیمرا کے قتل کی خبر جتنی "پھرتی" اور جس انداز سے چھپی تھی اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کے پیچھے رحیم گل کا دستِ تعاون کام کررہا تھا اور میری تصویر بھی اسی نے اخبارات کو فراہم کی تھی۔ ایسا اس نے کسی بُری نیت سے یا زیادہ چالاکی دکھانے کے ارادے سے نہیں کیا تھا۔ وہ میرا دوست تھا۔ زبانی خواہ ہم ایک دوسرے کے کتنے ہی بخیے ادھیڑتے لیکن نہ تو وہ میرے معاملے میں بدخواہ ہوسکتا تھا اور نہ ہی میں اس کے معاملے میں۔

اس خبر میں کوئی ایسی بات نہیں تھی جو میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوتی تھی۔ وہ کرائم کی ایک سیدھی سادی اور مختصر سی خبر تھی۔ بس لکھنے والوں نے اپنے اپنے انداز میں خفیف سا یہ تاثر دینے کی کوشش ضرور کی تھی کہ اس واقعے کے پیچھے کوئی اسکینڈل جھانک رہا تھا۔ ظاہر ہے یہ ان کی عادت بھی تھی اور مجبوری بھی۔ انہیں اپنے قارئین کو دانہ تو ڈالنا تھا..... اور پھر پرنس سیمرا کے قتل کا اب سچ مچ اسکینڈل تو بننا ہی تھا۔ رحیم گل نے تو صرف اتنا ہی کیا تھا کہ اس رپورٹ کے لیے مواد اور تصویریں فراہم کرنے میں تعاون کیا تھا جس کی وجہ سے اخبارات کے لیے مستعدی دکھانا ممکن ہوا تھا۔ رحیم گل پہلے بھی ایسا کرتا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں جب بھی کوئی اہم کیس آتا تھا وہ کوشش کرتا تھا کہ اسے اخباروں میں اچھالا جائے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ وہ خود پس منظر میں ہی رہنا پسند کرتا تھا۔ اس کی کبھی تصویر تو کیا' نام بھی اخبارات میں نہیں آتا تھا۔ اس کا تذکرہ صرف "متعلقہ پولیس آفیسر" کے طور پر آتا تھا۔

ان تمام اخبارات میں وہ خبر پڑھنے کے بعد میں دیر تک ساکت بیٹھا رہا اور اپنی کاروباری فائلوں کی طرف متوجہ نہ ہوسکا۔ میری نظر میں اب بھی گزشتہ رات کے تمام مناظر گھوم رہے تھے اور میں ان کی تمام جزئیات پر غور کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

میرے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی خلش تھی لیکن میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ خیالوں کی جھیل میں جیسے کوئی مچھلی تھی جو اِدھر اُدھر مچلتی پھر رہی تھی مگر ہاتھ نہیں آتی تھی اور کوئی غیبی قوت کہہ رہی تھی کہ اسے پکڑنا بہت ضروری تھا۔

ابھی میں اسی کوشش میں الجھا ہوا تھا کہ انٹرکام کے بزر نے خیال کی نازک ڈور توڑ دی۔ امبر نے بتایا کہ کوڑل جان کڑیالی کا فون تھا۔ میں اس کے فون کی توقع کررہا تھا۔ میری ہدایت پر امبر نے لائن ملائی تو کوڑل رو دینے والی آواز میں بولا "سائیں! یہ کیا ہوگیا..... ہماری تو نیّا ہی ڈوب گئی حالاں کہ ہم نے آپ جیسے آدمی کو ناخدا بنایا تھا۔"

"کیا ہوگیا برادر کوڑل؟" میں نے ذرا انجان بنتے ہوئے کہا "یہ فلمی قسم کے مکالمے کیوں بول رہے ہو؟"

"سائیں! یہ فلمی مکالمے نہیں' میرے دل کی آواز ہے۔" وہ کچھ اور رقت زدہ سی آواز میں بولا "میں تو سمجھ رہا تھا کہ آپ کے تعاون سے میں نقصان سے بچ جاؤں گا مگر وہ تو بے چاری لڑکی ہی مرگئی..... اور ہاں..... یہ آپ اتنے انجان کیوں بن رہے ہیں جیسے آپ کو کچھ پتا ہی نہیں ہے۔ آپ کی تو اس حسینہ کے پہلو میں تصویر چھپی ہے۔ سائیں! مجھے تو لگتا ہے اب میری رقم بالکل ہی ڈوب جائے گی..... بلکہ مجھ پر جرمانہ اور ہرجانہ بھی پڑے گا۔"

"کوڑل یار! بڑے افسوس کی بات ہے..... تمہیں ایک خوب صورت' جوان اور بے قصور لڑکی کے قتل کا کوئی دکھ نہیں ہے۔ صرف اپنے مالی نقصان کی فکر پڑی ہوئی ہے۔" میں نے کسی حد تک ملامت کے سے انداز میں کہا۔

کوڑل کے اندازِ گفتگو سے ایک عجیب سادگی جھلکتی تھی۔ وہ سامنے نہ ہوتا اور اس کی گفتگو سنی جاتی تب بھی احساس ہوتا کہ کوئی سادہ دل شخص بول رہا ہے اور وہی بول رہا ہے جو اس کے دل میں ہے۔ منافقت یا زمانہ سازی اسے بالکل نہیں آتی تھی۔

اس وقت بھی اپنی اسی مخصوص سادگی سے بولا "دکھ تو ہوا ہے سائیں! مگر شاید زیادہ دکھ اس لیے نہیں ہوا کہ میں اسے جانتا نہیں تھا۔ کبھی ملا تک نہیں تھا۔"

میں نے یوں ہی اپنے موڈ کا کچھ بوجھل پن اس کی طرف منتقل کرنے کے لیے فلسفیانہ لہجے میں کہا "کوڑل! کتنی عجیب بات ہے کہ کسی کے مرنے کا دکھ محسوس کرنے کے لیے بھی ہم نے کچھ شرائط رکھ دی ہیں۔ ان مخصوص شرائط کے تحت ہمیں کسی کے مرنے کا دکھ ہوتا ہے۔ مثلاً کیا مرنے والا ہمارا ہم زبان تھا؟ کیا سیاسی طور پر ہمارا ہم نظریہ تھا؟ کیا اس سے ہمارا کوئی تعلق' واسطہ' واقفیت یا غرض تھی؟ اس طرح اپنے دکھ اور افسوس کو ہم نے مخصوص خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ صرف انسانیت کے ناتے ہمیں کسی کے مرنے کا افسوس نہیں ہوتا..... بلکہ بعض کے معاملے میں تو شاید خوشی ہوتی ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے افضل سائیں!" وہ ذرا شرمندگی سے

بولا "اپنا تو یہ عالم ہے کہ کہیں ایک کتا بھی بے قصور مرتا ہے تو ہمیں اس کا بھی دکھ ہوتا ہے...... لیکن زیادہ تر لوگ کس طرح سوچتے ہیں، کس طرح محسوس کرتے ہیں، اس کی ذمّے داری تو میں نہیں لے سکتا۔ یہ اللہ سائیں کی رنگا رنگ دنیا ہے۔ اس میں ہر طرح کے لوگ موجود ہیں..... اور جہاں تک پرنسس سیمرا کے قتل کا تعلق ہے تو آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بے قصور ماری گئی ہے؟ ہو سکتا ہے اس کے پیچھے کوئی چکر ہو۔ آپ اس کی زندگی کے ہر بھید سے تو واقف نہیں ہو گئے نا۔"

اس سادہ سے انسان نے بات بڑی لاجواب کرنے والی کی تھی لیکن میں نے کمزور سے لہجے میں کہا "چلو یار..... ! کوئی چکر، کوئی بھید ہو تب بھی انسان کو قتل تو نہیں کیا جانا چاہیے۔ جان تو صرف جان ہی کے بدلے میں لی جا سکتی ہے۔"

"اچھا سائیں! چلیں آپ کی بات ٹھیک ہے۔ میں تو کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ آپ کے ساتھ بحث کہاں کر سکتا ہوں۔" وہ گویا بات ختم کرنے کی غرض سے بولا "مجھے تو صرف یہ بتائیں کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"بھئی تمہیں پہلے بھی کچھ انتظار کرنا تھا..... اب بھی کچھ انتظار کرو۔ وہ لڑکی تو شاید اپنی زندگی میں بھی تمہارے مسئلے کے سلسلے میں کچھ نہ کر پاتی۔ وہ تو اپنے ہی چکروں میں پھنسی ہوئی تھی۔ فی الحال تم اپنا کام کسی اور کمپنی کے ذریعے چلا لو۔ تمہارا مالی نقصان بہرحال پورا ہو جائے گا کیوں کہ پرنسس سیمرا بے شک اس دنیا میں نہیں رہی اور اس کمپنی کا دفتر بھی بند ہے جس نے تم سے وعدہ خلافی کی ہے لیکن کمپنی ختم نہیں ہوئی ہے اور نہ ہی دیوالیہ قرار پائی ہے۔ یہ معلومات میں نے کر لی ہیں۔ چناں چہ تمہارا روپیا اور ہرجانہ ڈوبا نہیں ہے۔ البتہ اس کام کے پیچھے اب میں اپنے ایک بچ بچ کے وکیل کو لگاؤں گا جو اس قسم کے ہرجانے اور بقایا جات وصول کرنے میں بڑا ماہر ہے۔ بلکہ اگر قانونی طریقوں سے کچھ دیر لگی لیکن کمپنی کی کوئی ذمّے دار شخصیت سامنے آ گئی تو اسے اس کے ضروری ساز و سامان کے ساتھ یہیں بلوا لیں گے۔ جب تک وہ تمہاری واجب الادا رقم کا چیک سائن کر کے نہیں دے دے گا اور وہ چیک کیش نہیں ہو جائے گا تب تک وہ یہاں سے واپس نہیں جائے گا۔"

"نہیں..... نہیں افضل سائیں..... ! میں کسی قسم کی دادا گیری..... غنڈا گردی نہیں چاہتا۔" وہ ذرا نروس سی ہنسی کے ساتھ بولا "اس قسم کے کام کرنے ہوتے تو اپنے بڑے زبردست قبائلی یار موجود ہیں۔ وہ ایسے کام بڑی خوشی سے کر سکتے ہیں لیکن میں نے ان سے کبھی ایسا کوئی کام نہیں لیا۔"

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو کوژل یار!" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "کسی سے اپنی رقم وصول کرنا غنڈا گردی یا دادا گیری نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ آسانی سے دینے کی توفیق رکھتا ہو۔ اگر کوئی غریب ہو، دیوالیہ ہو گیا ہو، اسے کوئی مجبوری آن پڑی ہو تو اس کے ساتھ ضرور مہربانی اور ہمدردی کا سلوک کرنا چا[ہیے] لیکن جب اس طرح کا کوئی مسئلہ نہ ہو تو پھر جس طرح بھی ممکن ہو رقم لے لینی چاہیے۔ غنڈا گردی، دادا گیری یا دہشت گردی تو [تب] کہلا سکتی ہے جب ہم کسی سے بھتا، تاوان یا جبری چندہ لینے کی کوشش کریں۔ کیا خیال ہے؟"

"میں کیا خیال ظاہر کروں سائیں! آپ بڑے آدمی [ہیں۔] دانش ور ہیں۔"

"اوہ..... خدایا..... !" میں نے کراہ کر اس کی بات کا[ٹتے] ہوئے کہا "کم از کم مجھ پر دانش ور ہونے کا الزام تو مت لگ[اؤ۔] لڑکپن میں ہم جنہیں دانش ور سمجھ کر دل ہی دل میں ان کی [پوجا] کرتے تھے، بعد میں جب ان کے قریب ہونے کا موقع ملا تو پتا چ[لا] وہ تو ذہنی طور پر بونے..... بلکہ بالشتیے تھے۔ اس کے بعد سے تو دا[نش] وروں کی دانش وری سے فیض حاصل کرنے کی تمنا بھی دل سے [نکل] گئی۔ اب تم مجھے دانش ور قرار دینے پر تلے ہوئے ہو۔ یہ ب[ہت] اونچا منصب ہے پیارے بھائی! تم مجھے اس خوش فہمی میں [مبتلا] کرنے کی کوشش نہ کرو۔"

"سائیں! ہم جیسے جاہلوں کے لیے تو آپ بھی دانش ور ہیں[۔"] وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا "میں نے تو اپنا کام آپ کے سپرد کیا ت[ھا] اب آپ اسے کسی وکیل کے سپرد کر رہے ہیں۔ بہرحال آپ جو [کچھ] کر رہے ہیں سوچ سمجھ کر ہی کر رہے ہوں گے۔ میرے لیے [ہر] طرح بھی ٹھیک ہے۔ بس میرا کام ہو جانا چاہیے۔"

"تمہارا کام ہو جائے گا۔ میں خود اب ذرا دوسرے کام [میں] لگ گیا ہوں۔ مجھے پرنسس سیمرا کے قاتل کو تلاش کرنا ہے۔" [میں] نے کہا۔

"اس کام کی فیس آپ کو کون دے گا؟" وہ قدرے حیرت [سے] بولا۔

"کوئی بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "تم سے کس نے [کہا کہ] میں ہر کام فیس کے لیے کرتا ہوں؟"

"ارے ہاں..... میں تو بھول ہی گیا تھا کہ آپ تو مر[بعوں کے] مالک ہیں سائیں! ہاں..... سائیں! بڑے لوگوں کی بڑی باتیں[۔"] ٹھنڈی سانس لے کر بولا "قاتل کو آپ تلاش کریں گے تو پو[لیس کیا] کرے گی؟"

"پولیس کا فرض ہے مدد آپ کی۔ وہ میری مدد کرے گی[۔" میں] نے جواب دیا۔

"اچھا..... واقعی.....؟" وہ بے یقینی سے بولا "اگر پ[ولیس] آپ کی مدد کرے گی تو پھر اللہ آپ پر رحم کرے۔"

"اللہ تو خیر ہر حال میں ہی سب پر رحم کرے۔ ویسے [شاید] انسپکٹر اس سلسلے میں تم سے بھی ملنے آئے گا جو اس کیس کی [تفتیش] کر رہا ہے۔" میں نے گویا اسے خبردار کیا۔

"مجھ سے ملنے.....؟" وہ گویا کچھ پریشان ہو گیا۔ "مگر [میں نے] کیا کیا ہے؟"

"بھئی پولیس صرف انہی لوگوں سے تو ملنے نہیں جاتی [جنہوں] نے کچھ کیا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی وہ ایسے لوگوں سے ملنے بھی پہنچ جاتی ہے جنہوں نے کچھ نہیں کیا ہوتا۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"بھی کبھی نہیں..... اکثر وہ ایسے ہی لوگوں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ شاید یہ پوچھنے کے لیے..... کہ آخر انہوں نے کیوں کچھ نہیں کیا؟" وہ جیسے کچھ جل کر بولا "سوال یہ ہے کہ انہیں اس سلسلے میں مجھ سے ملنے کا خیال کیوں آ گیا؟"

"مجھے اپنے بیان میں ان کو بتانا پڑا تھا کہ پہلی بار مجھے کس سلسلے میں پرنسس سیمرا سے ملنے جانا پڑا تھا۔ ظاہر ہے وہ تمہارا کام تھا۔ تمہارا نام بیچ میں آ گیا۔" میں نے جواب دیا۔

"مروا دیا..... !" وہ کراہ کر بولا "سائیں! اس کو کہتے ہیں نماز بخشوانے جانا اور روزے گلے پڑ جانا۔ آپ کو کیا ضرورت پڑی تھی میرا نام لینے کی؟ آپ کو شاید پتا نہیں ہے کہ پولیس کو تو ناموں کی تلاش رہتی ہے۔ ناموں کی فہرست جتنی لمبی ہوگی اتنے ہی ان کے حالات بہتر ہوں گے۔"

"تمہیں اتنا زیادہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں..... اور نہ ہی اِدھر اُدھر کھسکنے کی کوشش کرنا۔ خواہ مخواہ تمہاری پوزیشن مشکوک ہوگی۔" میں نے اسے سمجھایا "تمہارے پاس جو پولیس آفیسر آئے گا وہ تمہارے تصورات سے بہت مختلف ہے..... اور پھر میں نے بھی اسے تمہارے بارے میں سمجھا دیا ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہ محض ایک رسمی کارروائی ہے۔ بس ایک احتیاط کرنا..... اور وہ یہ کہ اس کے ساتھ کوئی جھوٹ ہرگز نہ بولنا۔"

"اچھا سائیں! آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی کریں گے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا اور میں نے اسے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

ابھی میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ رحیم گُل کا فون آ گیا۔ میں نے اس کی آواز سنتے ہی کہا "میں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ پولیس والوں کی عمر شیطان کی طرح لمبی ہوتی ہے۔ ابھی چند لمحے پہلے ہی ان پر تمہارا ذکر ہو رہا تھا۔"

"کہاں لمبی ہوتی ہے عمر..... !" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "آج صبح ہی منہ اندھیرے سائٹ کے علاقے میں ڈاکوؤں سے مقابلہ کرتے ہوئے چار پولیس والے مر گئے ہیں۔ ان میں سے کسی کی عمر تیس سال سے زیادہ نہیں تھی۔"

ایک لمحے کی متاسفانہ خاموشی کے بعد میں نے کہا "خیر..... ایسا تو کبھی کبھار ہوتا ہے۔"

"میرا ذکر کس سلسلے میں ہو رہا تھا؟" اس نے پوچھا۔

میں نے اسے بتایا تو وہ بولا "میں نے کوژل سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا۔ مجھے اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہونے کی توقع نہیں۔"

"کمال ہے..... !" میں نے بے یقینی سے کہا "کبھی کبھی تو تم بالکل اس طرح عقل کی بات کرنے لگتے ہو جیسے تم نے پولیس کی نوکری چھوڑ دی ہے۔ بے چارے کوژل کا خواہ مخواہ خون خشک ہوتا رہے گا۔ میں ابھی ابھی اسے تسلی دے کر فارغ ہوا ہوں۔ اب فون کر کے اسے یہ خوش خبری سنانی پڑے گی کہ تم نے اس کا ذہنی سکون درہم برہم کرنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔"

"میں نے تمہیں ایک اہم بات بتانے کے لیے فون کیا ہے۔ تم کوژل کو لے کر بیٹھ گئے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ اس کے لہجے سے تھکن بھی عیاں تھی۔ شاید اسے گزشتہ رات سے اب تک آرام کا کوئی خاص موقع نہیں ملا تھا۔

"تو بتا بھی چکو۔ اتنی تمہید کیوں باندھ رہے ہو۔" میں نے ڈانٹ پلانے کے سے انداز میں کہا۔

"کامران دانش پولیس کے ہاتھ نہیں آ سکا....."

"کتنا خوش قسمت ہے!" میں نے فوراً لقمہ دیا۔

وہ گویا دانت پیس کر بولا "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں کہ تم سے فون پر بات کرنے کے بجائے ہمیشہ روبرو بات کیا کروں اور ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا رکھا کروں۔ جب بھی تم بے موقع کسی بات میں دخل دو، فوراً وہ ڈنڈا تمہاری کھوپڑی پر رسید کروں۔"

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

وہ گویا اَن سُنی کرتے ہوئے بولا "لیکن پھر میں سوچتا ہوں کہ اگر تمہاری کھوپڑی پر ڈنڈا مارنے سے بھوسا نکل کر باہر بکھر گیا تو خواہ مخواہ کام بڑھ جائے گا۔"

"یہ میری کھوپڑی ہے۔ کسی پولیس والے کی نہیں۔" میں نے کہا "بہرحال تم اپنا بیان جاری رکھو۔"

"بیان بس یہی ہے کہ کامران دانش رات کو کچھ گھبرایا ہوا گھر پہنچا تھا۔ گھر سے مراد اس کے ماموں کا گھر ہے۔ اپنے والدین کے انتقال کے بعد سے وہ اپنی بہن سمیت اپنے ایک بے اولاد ماموں کے گھر رہتا ہے کیوں کہ وہ دونوں بہن بھائی الگ گھر میں رہنا افورڈ نہیں کر سکتے۔ رات وہ گھبرایا ہوا گھر پہنچا اور اپنی بہن کو ساتھ لے کر ماموں کو کچھ بتائے بغیر کہیں چلا گیا۔ لگتا ہے وہ روپوش ہو گیا ہے۔" رحیم گل نے بتایا۔

"تم نے اس کی جگہ اس کے ماموں کو تو نہیں اٹھوا لیا؟ تم لوگ یہی کرتے ہو..... بیٹا نہ ملے، باپ کو اٹھا لو۔ سالا نہ ملے، بہنوئی کو اٹھا لو۔ انڈا نہ ملے تو مرغی کو اٹھا لو۔"

"گدھا نہ ملے تو افضل چوہدری کو اٹھا لو۔" اس نے لقمہ دیا "حالاں کہ اس پر گدھا بُرا منا سکتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں جوابی حملہ کرتا وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "یار! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں کہ ہر وقت، ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔ سو میں کوئی ایک آدھ کیس ایسا ہو جاتا ہے اور وہ نہ جانے کتنے عرصے کے لیے اور کس کس موقع کے لیے ضرب المثل بن جاتا ہے۔ کبھی کبھی صرف اس لیے بھی ہم ایسا کرتے ہیں کہ ہمیں یقین ہوتا ہے کہ ہمیں چکر دیا جا رہا ہے اور اس طرح کا کوئی ہتھکنڈا استعمال کرنے سے اصل بندہ پیش ہو جاتا ہے۔"

"اچھا یار...... چلو مان لیا تم بہت شریف اور معصوم انسان ہو۔ یہ بتاؤ تمہارے آدمیوں نے کامران کے ماموں کے ساتھ اپنی مخصوص "شرافت" کا مظاہرہ کرتے ہوئے معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ کامران کہاں گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خیر..... میں کچھ ایسی شرافت کے دعوے بھی نہیں کر رہا۔ متعلقہ تھانے کے لوگ وہاں گئے تھے۔ ان کی باتوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے بلا وارنٹ مکان کی تلاشی بھی لی تھی اور ماموں میاں کے ساتھ ذرا سختی سے ڈانٹ ڈپٹ بھی کی تھی..... " وہ بولا۔

"خیر..... یہ تو معمولی کیس ہے۔" میں نے کہا۔

"اکثر جگہوں پر ایسا کرنا پڑتا ہے بھائی!" وہ بڑے نرم لہجے میں بولا "ہماری پبلک میں بھی سب کے سب فرشتے نہیں ہوتے کہ ہر بات بالکل سچ کہتے ہوں اور پولیس کو دیکھتے ہی ملزم کو لا کر سامنے پیش کر دیں۔"

"قصہ مختصر یہ کہ کامران دانش غائب ہو گیا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"اس کیس کے سلسلے میں یہ پہلی کامیابی مبارک ہو۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"بکواس مت کرو۔ تمہاری تو زبان ہی کالی ہے۔ تم تو پہلے ہی ہماری ناکامی کی پیش گوئیاں کرتے رہتے ہو۔" وہ جل کر بولا۔

"میری زبان کا ذکر چھوڑو۔ وہ نہ کالی ہے نہ پیلی۔ وہ ٹیکنی کلر ہے۔ ہر قسم کے اثرات رکھتی ہے۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ تم نے اب کیا نظریہ قائم کیا ہے؟"

"صرف صفدر منیر کے کہنے سے تو ظاہر ہے میں کامران دانش کو قاتل تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا لیکن اب اس کے اس طرح غائب ہونے سے مجھے اس پر کافی شک ہو گیا ہے۔" رحیم گل بولا "ماریہ میج کونسل والوں نے ایک عقل مندی کی تھی کہ اس سے انٹرویو کرتے وقت اپنے روٹین کے مطابق اس کی ایک تصویر لے کر رکھ لی تھی۔ وہ اس کی تازہ ترین تصویر ہے۔ اس کے پرنٹ نکلوا کر میں نے شہر کے تقریباً تمام تھانوں کو جاری کر دیے ہیں۔ خاصی سرگرمی سے اس کی تلاش شروع ہو چکی ہے۔"

"آج کل تصویریں ریلیز کرنے میں تم بڑے مستعد ہو گئے ہو۔ تم نے میری تصویر بھی بڑی پھرتی سے شام کے اخبارات کو جاری کر دی۔ شکر ہے میں اشتہاری مجرم نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"اچھا..... تو تم سمجھ گئے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"اب میں اتنا بھی گھامڑ نہیں ہوں۔ اتنا گھامڑ ہوتا تو پولیس میں بھرتی ہو چکا ہوتا۔"

"اس پرانے موضوع پر بک بک کرنے کے بجائے کوئی کام کی بات کرو۔" وہ بیزاری سے بولا "تم اس سلسلے میں کیا کر رہے ہو؟"

"میں جب کچھ کروں گا، تمہیں پتا چل جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ایسا کچھ مت کرنا کہ میں تمہیں پکڑ کر حوالات میں ڈالنے پر مجبور ہو جاؤں۔" اس نے گویا خبردار کیا۔

"تم یہ حسرت ہی لیے دنیا سے چلے جاؤ گے۔"

"خیر..... یہ تو وقت بتائے گا۔ فی الحال میں تمہیں یہ بات بتا رہا ہوں کہ مجھے بتائے بغیر اس کیس کے سلسلے میں کوئی سیدھی حرکت مت کرنا۔" اس نے گویا خبردار کیا۔

"میں تو کوئی سیدھی حرکت ہی کروں گا۔ الٹی حرکتیں کرنے کے لیے تو میں نے تمہیں چھوڑ رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہاری باقی بکواس پھر کبھی سنوں گا۔" اس نے کہا... سلسلہ منقطع کر دیا۔

ابھی میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ امبر کمرے میں داخل... اور قریب آ کر بولی "سر! ایک لڑکی آپ سے ملنے آئی ہے۔"

"کتنا مبارک دن ہے۔" میں نے فوراً کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی "سر! وہ بے چاری مجھ سے بھی گزرے طبقے کی معلوم ہوتی ہے اور پریشان بھی نظر آ رہی ہے۔"

"دیکھو بھئی..... لڑکی، لڑکی ہوتی ہے اور اس کا کوئی طبقہ نہیں ہوتا۔ میں ویسے بھی طبقاتی امتیاز کا قائل نہیں ہوں۔ تم... جاننے کی کوشش کی کہ وہ مجھ سے ملنے سے پہلے ہی پریشان کیوں ہے؟"

"میرے خیال میں اسے سب سے زیادہ پریشانی تو اس بات کی تھی کہ آپ اس سے ملیں گے بھی یا نہیں۔" امبر بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔

"ابھی میں اتنا بے ہودہ، بد ذوق یا مردہ دل تو نہیں ہوا کہ لڑکیوں سے ملنا چھوڑ دوں۔" میں نے کہا "نام کیا ہے اس کا؟"

"رباب!" امبر نے بتایا "اور اس کے پاس آپ کا وزٹنگ کارڈ بھی ہے۔"

"نام کچھ پرانا سا..... مگر خوب صورت ہے۔" میں نے... زور دیتے ہوئے کہا "لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی... نام کی کسی لڑکی کو اپنا وزٹنگ کارڈ دیا ہو۔ وہ کس سلسلے میں مجھ سے ملنا چاہتی ہے؟"

"سلسلہ وہ نہیں بتا رہی۔" امبر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی... لیے تو میں انٹرکام پر اطلاع دینے کے بجائے خود آپ کو بتانے آئی ہوں۔ وہ کہتی ہے کہ معاملہ بہت اہم ہے۔ کسی کی زندگی اور موت کا مسئلہ ہے لیکن وہ اس کے بارے میں صرف آپ سے بات کرے گی۔"

"اوہ..... یہ تو کوئی سنجیدہ روح معلوم ہوتی ہے۔" میں... سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا "اسے جلدی سے اندر بھیجو۔ دیکھیں واقعی کوئی سنجیدہ معاملہ ہے یا محض ڈراما ہی ہے۔"

امبر سرہلا کر واپس چلی گئی۔ چند لمحے بعد جو لڑکی جھجکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی۔ اسے حسنِ سادہ کی ایک دلکش تصویر کہا جا سکتا تھا۔ وہ معمولی لیکن صاف ستھرے لباس میں تھی۔ اس کی اپنی شخصیت بھی نکھری نکھری تھی۔ پریشانی اور دہشت نے اس کی آنکھوں میں ڈیرے ڈال رکھے تھے لیکن اس سے اس کے

نکھی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اس کا جسم گویا ایک خوب صورت سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ لباس گو کہ معمولی اور سیدھا سادہ تھا مگر اس میں بھی اس کے خدوخال کی قیامتیں نمایاں تھیں۔ اس کی شخصیت کو بس ذرا غربت کے غبار...... نے ماند کیا ہوا تھا۔ اگر اسے ذرا دولت مندی کا نکھار میسر ہوتا تو اس کی شخصیت چاند کی طرح تاباں نظر آ سکتی تھی۔

اس کا چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا اور گلابی ہونٹ دھیرے دھیرے تھرتھرا رہے تھے۔ ان کی تھرتھراہٹ کو روکنے کا فوری طور پر ایک ہی طریقہ سمجھ میں آتا تھا لیکن میں نے جلدی سے دل ہی دل میں اپنے آپ کو سرزنش کرتے ہوئے یہ خیال اپنے ذہن سے جھٹکا۔ وہ میز کے قریب آن رکی اور پھیلی پھیلی حیران سی آنکھوں سے ایک ٹک میری طرف دیکھنے لگی۔

"کیا..... واقعی..... مسٹر افضل چوہدری آپ ہی ہیں؟" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔ اسے گویا یقین نہیں آ رہا تھا۔

"جی ہاں۔ آپ کو اس میں کوئی شک ہے کیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں..... شک تو نہیں ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں سرہلا کر رہ گئی۔

"اس میں اتنی حیرت اور بے یقینی کی کیا بات ہے؟" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں..... وہ دراصل..... آپ میرے تصور سے بہت مختلف ہیں۔" وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولی۔

"اگر آپ کو مایوسی ہوئی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔" میں نے خوش دلی سے کہا۔

"نہیں..... نہیں یہ بات نہیں....." اس نے گویا میری غلط فہمی دور کرنے کے لیے جلدی سے اپنا مرمریں ہاتھ ہلایا "مایوس کن تو میرا تصور تھا..... حالاں کہ میں اخباروں میں آپ کی تصویر بھی دیکھ چکی تھی مگر مجھے یقین نہیں تھا کہ....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور اس کے ہونٹ ایک بار پھر کانپ کر رہ گئے۔

پھر یک دم ہی جیسے اس کی زبان سے بے ربط لفظوں کا سیل رواں پھوٹ پڑا "وہ..... دراصل میں کامران کے سلسلے میں آئی تھی۔ وہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ پولیس اس کی تلاش میں ہے اور اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ کیا کرے..... میں نے تو اس سے کہا تھا کہ وہ بھی میرے ساتھ یہاں آئے لیکن وہ نہیں مانا۔ وہ تو مجھے بھی منع کر رہا تھا لیکن میں نے اس کی بات نہیں مانی اور......"

میں نے ٹریفک کے سپاہی کی طرح ہاتھ اٹھا کر اس کے الفاظ کی گاڑی کو روکا اور اپنے قریب پڑی ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "پہلے آپ آرام سے بیٹھ جائیے۔"

وہ بیٹھ گئی لیکن انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ذرا سے کھٹکے پر بھاگ نکلے گی۔ پہلے اس کے حسنِ سادہ نے میرے دل کی دھڑکنوں کو بے ترتیب کیا تھا لیکن اب کسی اور سبب سے میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ رحیم گل نے شہر کے تقریباً سب تھانوں کو کامران دانش کی تلاش میں مستعد رہنے کے لیے کہا تھا۔ اس کے باوجود مجھے اس کی کامیابی کی کوئی امید نہیں تھی۔ یہ شہر ایک سمندر تھا۔ اس میں سیکڑوں جانے پہچانے قاتل اور بدمعاش ایک بار لاپتا ہو جاتے تھے تو انہیں تلاش کرنا..... تقریباً ناممکن ہو جاتا تھا۔ کامران تو پھر بھی ایک عام سا نوجوان تھا اور پولیس کے پاس اس کا کوئی خاص ریکارڈ نہیں تھا۔ تھوڑا بہت حلیہ بدل کر بعض جگہوں پر تو وہ پولیس کے سامنے سے بھی گزر جاتا تب بھی شاید کسی کو پتا نہیں چلتا لیکن یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کے بارے میں ایک حسین سراغ خود چل کر میرے پاس آیا تھا۔

"میرا خیال ہے پہلے کچھ تعارف ہو جائے۔" میں نے مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔ میں چاہ رہا تھا اس کا اضطراب کچھ کم ہو جائے۔ اس کے ذہن میں یقیناً خیالات کا ہجوم تھا۔ میرے لہجے اور رویے سے اسے کچھ حوصلہ ہوا اور وہ کرسی پر ذرا پیچھے کو ہو کر بیٹھ گئی۔

"سب سے پہلے تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ میرا نام رباب نہیں، صفیہ ہے۔ آپ کی سیکرٹری کو میں نے اپنا نام ڈر کے مارے غلط بتایا تھا۔" اب اس کا لہجہ قدرے پرسکون تھا "میں کامران کی منگیتر ہوں اور آپ کے پاس مدد کی امید لے کر آئی ہوں۔ آپ کا یہ کارڈ مجھے کامران نے ہی دیا ہے....."

اس نے میرا وزٹنگ کارڈ اونچا کر کے مجھے دکھایا اور تب مجھے یاد آیا کہ میں نے کارڈ کامران کو اس وقت دیا تھا جب میں پرنس میرا کے اسٹوڈیو سے نکل رہا تھا اور وہ امیدوار کی حیثیت سے وہاں پہنچا تھا۔ میں نے اسی امید پر کارڈ اسے دیا تھا کہ شاید کبھی کچھ حقائق معلوم کرنے کے سلسلے میں اس سے کچھ مدد ملے لیکن مجھے یہ امید نہیں تھی کہ وہ کارڈ ان حالات میں اور اس طرح اس سے رابطے کا ذریعہ بنے گا۔

صفیہ بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہی تھی "کامران کا آپ سے صرف ایک مرتبہ اور وہ بھی چند لمحے کے لیے سامنا ہوا ہے۔ اس کے بعد ہم نے آج دوپہر کے اخباروں میں آپ کی تصویر دیکھی ہے اور تذکرہ پڑھا ہے لیکن محض اتنی سی "شناسائی" کی بنیاد پر نہ جانے کیوں اسے امید تھی کہ آپ اس کی مدد کریں گے اور میرے دل نے بھی یہی گواہی دی۔ ہمارے خیال میں آپ ایک مہربان، کھرے اور جرات مند آدمی ہیں۔ آپ کا چہرہ یہی کہتا ہے..... لیکن آپ کے بارے میں یہ رائے قائم کرنے کے باوجود کامران میرے ساتھ آپ کے پاس آنے کی جرات نہیں کر سکا۔ آخر بڑی بحث تمحیص کے بعد مجھے اکیلے ہی آنا پڑا....."

اس کے گلابی ہونٹ خشک ہوئے جا رہے تھے اور وہ بار بار ان

پر زبان پھیر رہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ باہر سے کسی کو بلا دیں اور گفتگو میں خلل پڑے۔ میں نے خود اٹھ کر اپنے کمرے کے چھوٹے سے فریج سے کولڈ ڈرنک کی ایک بوتل نکال کر اس کے سامنے رکھی۔ اس نے بے جا تکلف کا مظاہرہ نہیں کیا اور اسٹرا ہونٹوں میں دبا کر چند گھونٹ بھرنے کے بعد گہری گہری سانسیں لیں۔ اب وہ بالکل پُرسکون نظر آنے لگی اور یکایک ہی اس کی شخصیت کچھ بدلی بدلی سی دکھائی دینے لگی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس میں تو بلا کی خود اعتمادی تھی۔

میں نے بظاہر نہایت سرسری سے انداز میں پوچھا "کامران ہے کہاں؟"

وہ اتنی بے وقوف نہیں تھی کہ روانی میں اس سوال کا جواب دے جاتی۔ وہ اطمینان سے بولی "یہ بات اب میں اس طرح یک دم تو نہیں بتا سکتی پہلے مجھے آپ سے یہ یقین دہانی حاصل کرنا ہوگی کہ آپ پولیس کو نہیں بتائیں گے۔"

"لیکن تم ایسی بے وقوفانہ یقین دہانی کیوں حاصل کرنا چاہتی ہو؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"کیوں کہ پرنسس سمیرا کو اس نے قتل نہیں کیا۔" وہ زور دے کر بولی۔

"پھر تو اسے ضرور پولیس کے سامنے پیش ہو جانا چاہیے۔ اس طرح غائب ہو کر تو وہ اپنا کیس مزید خراب کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ آپ نے اچھی کہی کہ اسے ضرور پولیس کے سامنے پیش ہو جانا چاہیے۔۔۔ " وہ تلخ سے لہجے میں بولی "تاکہ وہ مار مار کر اس کی چمڑی ادھیڑ دیں۔۔۔ ہڈیاں توڑ دیں اور اعترافِ جرم کرا لیں کہ پرنسس سمیرا کو اسی نے قتل کیا ہے۔ وہ ایک مشہور اور دولت مند عورت تھی۔ اس کے قاتل کو گرفتار کرنے کے سلسلے میں پولیس پر کافی دباؤ ہوگا۔ اس وقت ان کی پوری پوری کوشش یہ ہوگی کہ اگر قاتل ہاتھ نہیں آتا تو جلدی سے قربانی کا کوئی بکرا ہی مل جائے جس کی گردن میں پھانسی کا پھندا فٹ آسکتا ہو۔"

میں نے حتی الامکان دوستانہ اور کسی حد تک مربیانہ انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔

"پولیس کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے۔۔۔ جو کچھ فلموں اور ڈراموں میں دکھایا جاتا ہے۔۔۔ کچھ دیر کے لیے اسے بھول جاؤ۔"

"ان باتوں کو کوئی کیسے بھول سکتا ہے افضل چوہدری صاحب! یہ کہانیاں تو گلی گلی بکھری ہوئی ہیں۔" اس کے لہجے میں تلخی برقرار رہی "ہمارے پاس تو کامران کو بچانے کے لیے بھاگ دوڑ کے سلسلے میں خرچ کرنے کے لیے ایک ہزار روپیہ بھی نہیں ہے۔۔۔ اور یہ پرنسس سمیرا جیسی عورت کا معاملہ ہے۔ پولیس نہ جانے کامران کا کیا حشر کرے۔ اس کا رویّہ اور اس کے مطالبات نہ جانے کیا ہوں۔

اس موضوع پر واقعی کسی کو قائل کرنا بہت مشکل [illegible] صحیح صورتِ حال بتانا ضروری تھا۔ میں نے گہری سانس [illegible] "متعلقہ پولیس آفیسر جو اس کیس کی تفتیش کر رہا ہے وہ [illegible] ہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تب بھی کچھ زیادہ فرق نہ [illegible] اتنا گیا گزرا آدمی نہیں ہوں کہ اپنی آنکھوں سے پولیس [illegible] دانستہ یا نادانستہ بہت بڑی ناانصافی کرتے دیکھوں اور اسے [illegible] سکوں۔"

"وہ تو ہمیں اندازہ ہو چکا ہے۔ ظاہر ہے آپ کا [illegible] اثر رسوخ ہے تبھی تو آپ پرنسس سمیرا کی لاش دریافت کر[illegible] بعد بھی آرام سے پولیس اور مقتولہ کے رشتے داروں [illegible] بیٹھے رہے ورنہ بعض اوقات تو لاش دریافت کرنے وا[illegible] شامت آجاتی ہے۔ سب سے پہلے اسے ہی مشتبہ قرار دے[illegible] جاتا ہے۔" صفیہ بولی "میں اسی لیے تو آپ کے پاس آئی [illegible] آپ ایک دولت مند اور بارسوخ آدمی ہیں۔"

"کچھ دیر پہلے تم نے کچھ اور خصوصیات بھی بتائی تھیں [illegible] نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔ وہ بھی اپنی جگہ ہیں۔" وہ بھی جواباً مسکرائی۔

"کیا تمہیں یقین ہے کامران بے گناہ ہے؟ دل پر ہاتھ [illegible] بالکل سچ سچ کہنا۔ یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیا[illegible] گی۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔ مجھے یقین ہے۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولی [illegible] نے پلکیں بھی نہیں جھپکائیں۔ اس کی خوب صورت آنکھ[illegible] دھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ وہاں کچھ متضاد سے جذبات کے عکس دکھائی دے رہے تھے۔

"تو پھر تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں آپ کامران کو بچانے میں میری مدد کر[illegible] اس کے عوض آپ کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں [illegible] اچانک فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"ہر بات۔۔۔؟" میں نے اپنی حیرت کو چھپاتے [illegible] تصدیق چاہی۔

"ہاں۔۔۔ ہر بات۔" وہ کچھ عجیب سحر زدہ انداز میں [illegible] اس کے اندر جیسے کوئی اور روح حلول کر گئی اور اب وہ اسی [illegible] اثر بول رہی تھی۔

میں ابھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھ ہی رہا تھا کہ وہ [illegible] میری کرسی کے عقب میں آگئی۔ دوسرے ہی لمحے اس کی [illegible] عقب سے میرے گلے میں حمائل تھیں اور میں اپنے رخسا[illegible] کی مرتعش سانسوں کی تپش محسوس کر رہا تھا۔

مجھے زندگی میں قدم قدم پر نت نئی حیرتوں کا سامنا کرنا [illegible] لیکن کم از کم اس وقت میں اس طرح کی کسی حیرت کی توقع [illegible]

[illegible] تھا۔ صفیہ نے بلاشبہ مجھے ایک انوکھی حیرت سے دوچار کیا [illegible] مجھے اس طرح کی لڑکی ہرگز دکھائی نہیں دی تھی۔ اس کے [illegible] اطوار دیکھ کر چند لمحے پہلے تک مجھے شبہ بھی نہیں گزرا تھا کہ [illegible] ایسا پینترا بدلے گی۔ میرا تجربہ تو یہی تھا کہ اس طبقے اور [illegible] اطوار کی لڑکیاں کسی کے رجھانے پر بھی ان راستوں کی [illegible] مائل نہیں ہوتی تھیں۔ خصوصاً جب کہ وہ کسی مرد کے ساتھ [illegible] شادی کے بندھن میں بھی بندھی ہوتی تھیں۔

[illegible] حیرت کے اس دھچکے نے کچھ دیر تک مجھے کسی بھی ردِ عمل کے [illegible] سے باز رکھا پھر میں نے نہایت آہستگی سے اس کے بازو اپنی [illegible] سے ہٹائے اور ریوالونگ چیئر گھما کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ [illegible] ہونٹ دانتوں میں دبائے، سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کے [illegible] رجو کچھ دیر پہلے تک سفید تھے اب دہکتے سے دکھائی دے [illegible] تھے لیکن میں انہیں چھو کر ان کی تپش کا اندازہ کرنا نہیں [illegible] تھا۔

"تم نے واقعی مجھے حیران کر دیا ہے" میں نے دھیمے لہجے میں [illegible]

"کس طرح؟" اس نے نظر اٹھائے بغیر پوچھا۔

"اپنے آپ کو رشوت کے طور پر پیش کر کے" میں نے جواب [illegible]

"سنا ہے، مردوں میں یہ مقبول ترین رشوت ہے" وہ دونوں [illegible] کی مرمریں انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے بولی۔

"صرف سنا ہے۔۔۔ عملی تجربہ نہیں ہے؟" میں نے اپنی نظر [illegible] کے چہرے پر مرکوز رکھی۔

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا "یہ میری پہلی کوشش [illegible]"

میں ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ اس کی جھکی جھکی آنکھیں [illegible] رخساروں پر کچھ زیادہ ہی شدت سے نمودار ہونے والی سرخی [illegible] تھی کہ وہ سچ ہی کہہ رہی تھی جس سے میری حیرت اور بھی [illegible] ہے۔ آخر یہ اسے سوجھی کیا تھی؟

"تم نے پہلی بار ہی تجربے کے لیے کسی صحیح آدمی کا انتخاب [illegible] کیا" بالآخر میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"کیوں۔۔۔ کیا آپ بہت شریف، نیک اور پارسا آدمی ہیں؟" [illegible] نے اب گویا اپنی جرات کو مجتمع کرتے ہوئے نظر اٹھائی۔ اس [illegible] آنکھوں میں بھی گلابی ڈورے تیرنے لگے تھے۔ اس کے وجود [illegible] ہیجان خیز طغیانی آئی ہوئی تھی۔ باتوں سے تو یہی لگتا تھا کہ یہ پہلا [illegible] مجبوراً اور بادل ناخواستہ کرنے جا رہی تھی لیکن کسی چور [illegible] سے شاید اس کا دل، اس کے جذبے اس کا ساتھ دے [illegible] تھے۔

"میں نیک، شریف اور پارسا آدمی ہرگز نہیں" میں نے کہا

"میں تو اس قسم کا کوئی دعویٰ کرنے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ وہ جرات مند نظر آنے اور جرات مند بننے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔ اب اس کے لہجے میں ارتعاش نہیں تھا۔

"مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے" میں نے بے پروائی سے جواب دیا "اسی کرسی پر جا کر بیٹھ جاؤ جس سے تم اٹھ کر آئی ہو۔"

اس نے مجروح سی نظر سے میری طرف دیکھا تاہم میری ہدایت پر عمل کیا۔ اسے گویا کچھ مایوسی ہوئی تھی۔ اس کے رخساروں سے شفق کا رنگ اترنے لگا تاہم وہ الجھن میں پڑ گئی تھی۔

میں نے ملائمت سے کہا "مسئلہ صرف یہ ہے کہ زندگی کے بارے میں میرے اپنے کچھ فلسفے ہیں۔ میں ان کے خلاف نہیں چل سکتا۔ میں نے اس طرح کبھی کسی مجبور لڑکی کا رشوت کا نذرانہ قبول نہیں کیا، خواہ وہ کوئی چلتی پھرتی سی چیز کیوں نہ رہی ہو۔ چلتی پھرتی

سی لڑکیاں بھی کبھی کبھی کسی مجبوری کے پھندے میں پھنس جاتی ہیں۔ ان کے لیے تو اپنے آپ کو رشوت کے طور پر پیش کردینا کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوتا اور وہاں تو کوئی بہت بلند و بالا اخلاقی قدریں بھی آڑے نہیں آتیں۔ اس کے باوجود میں ایسی کسی پیشکش سے کبھی استفادہ نہیں کرسکا۔ تم تو پھر بھی ایک شریف لڑکی ہو۔"

"لیکن کیوں۔۔۔ آپ ایسا کیوں نہیں کرسکتے؟" اس کی الجھن گویا بڑھ گئی۔

"اس لیے کہ یہ مجھے ایک گھٹیا قسم کی بلیک میلنگ محسوس ہوتی ہے اور میں نہ تو گھٹیا ہوں اور نہ ہی بلیک میلر" میں نے جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔!" اس نے صرف اتنا کہا اور گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے سر ٹکالیا۔ بات گویا کسی حد تک اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔

"رفاقتیں وہی اچھی لگتی ہیں جو کسی کے دل میں طلب بن کر ابھریں اور دوستی یا پسندیدگی کے راستے سے ہوتی ہوئی کسی منزل تک پہنچیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ مجبوری آپ کو کسی اجنبی تک لے آئی اور پہلی ہی ملاقات میں آپ نے خود کو مالِ غنیمت کی طرح کسی کے سامنے رکھ دیا۔ میں تعلق، واسطے اور رفاقت کا آدمی ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ بھی ہو وہ اچھا لگتا ہے۔ تم نے جس شارٹ کٹ کے ذریعے سارے فاصلے مٹائے ہیں اس میں میرے لیے کوئی کشش نہیں۔ یہ بہت ہی بے ہودہ اور بے حس سے لوگوں کے پسندیدہ راستے ہیں" میں نے بہت ہی ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں یہ سب کچھ کہا۔

"میں سمجھ گئی۔۔۔" اس نے سرہلایا اور اس کا چہرہ بتارہا تھا کہ وہ واقعی بات سمجھ گئی تھی۔ اس نے بہت ہی عجیب نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ دل کو لہو کردینے والی نظریں تھیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی سی چھلک آئی۔ وہ دوبارہ بولی تو اس کی آواز مرتعش تھی "آپ خوابوں، خیالوں کے آدمی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپ جیسے آدمی صرف افسانوں اور کہانیوں میں پائے جاتے ہوں گے۔"

"یہ بات مجھ سے پہلے بھی کسی نے کہی تھی لیکن میں بہرحال اسی دنیا میں موجود ہوں اور بہت گناہ گار سا آدمی ہوں۔ میں اسی دنیا کی ایک جیتی جاگتی حقیر سی حقیقت ہوں۔"

"یہ بات پہلے بھی آپ سے مجھ جیسی ہی کسی بدنصیب نے کہی ہوگی جس نے اپنی دانست میں بہت ہی کامیاب فارمولا آزمانا چاہا ہوگا" وہ افسردہ سے لہجے میں بولی۔

"اس بات کو جانے دو کہ وہ کون تھی" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" اس نے سر جھٹکا اور دونوں ہاتھ چہرے پر پھیر کر گویا کسی قسم کی غنودگی یا خمار کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی پھر کچھ بدلے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

"چلیے۔۔۔ یہ بات تو یہاں تک تھی لیکن اس سے آگے بھی ایک بات ہے۔۔۔"

گویا ایک جہانِ حیرت سے آگے دوسرا جہانِ حیرت ہا[...] میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"شاید آپ کے لیے ایسا ہو لیکن جو کچھ میں کہنا چاہتی ہو[ں] میرے اپنے خیال میں اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے" [و]ہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"چلو۔۔۔ یہ فیصلہ تو بعد میں ہوتا رہے گا۔ تم کہو تو سہی [کیا] چاہتی ہو؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"میں آپ کو کیسی لگی ہوں؟" وہ کرسی پر ذرا اونچی ہو کر [گویا] آپ کو گویا نمائش کے لیے پیش کرتے ہوئے بولی۔

"بہت اچھی" میں نے دیانتداری سے جواب دیا۔

"میں جب آپ کے قریب آئی تو آپ کے دل کی دھڑکنیں [تیز] ہوئی تھیں؟"

"بہت زیادہ" میں نے اس بار بھی دیانتداری سے جواب [دیا] "بلکہ مجھے تو کچھ یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میرا دل کنپٹیوں [میں] دھڑک رہا تھا اور کسی کان کے راستے باہر آنے والا تھا۔"

حقیقت یہ تھی کہ اس کے سوالوں پر میری دھڑکنیں اب تیز ہورہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ درحقیقت [وہ] کہنا چاہ رہی تھی۔ وہ دھیرے سے ہنسی مگر اس کی روح اس ہنسی [میں] شامل نہیں تھی۔ وہ گویا اپنی تمام توانائیاں اور تمام تر جرات ایک نقطے پر مرکوز کرتے ہوئے اہم بات کہنا چاہتی تھی، گویا [کوئی] اہم مرحلہ طے کر گزرنا چاہتی تھی۔

میرا یہ خیال درست ثابت ہوا۔ وہ تھوک نگل کر جلدی [سے] بولی "تو۔۔۔ تو پھر آپ مجھے اپنی داشتہ بنا لیجیے۔۔۔"

مجھے واقعی حیرت کا دوسرا زوردار جھٹکا لگا۔ پھر اسے گویا یاد آیا اور وہ قدرے مضطربانہ سے انداز میں بولی "آپ نے ابھی جو کچھ کہا تھا، میں اس کا بھی خیال رکھوں گی۔ میں کا[...] کاروباری انداز میں آپ کے سر پر مسلط نہیں ہوں گی۔ میں آپ کے پاس آنا جانا شروع کروں گی۔ ہمارے درمیان [تعلقات] استوار ہوں گے۔ میں آپ کو اچھی تو لگی ہوں۔۔۔ دو چار ملاقاتوں [میں] آپ مجھے اس سے زیادہ۔۔۔ بہت زیادہ پسند کرنے لگیں گے۔ [مجھے] یقین ہے، آپ کو اس تعلق میں کاروباری سفاکی محسوس [نہیں] ہوگی۔ اس میں دوستی اور محبت کی کچھ نہ کچھ خوشبو ضرور شا[مل] رہے گی۔۔۔"

"بہت خوب!" میں نے مسکراتے ہوئے بہت غور سے اس [کی] طرف دیکھا "گویا یہ بھی کوئی ڈش تیار ہورہی ہے جس میں اپنی پسند کے اجزا شامل کیے جاسکتے ہیں۔"

"جی ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔" وہ گویا مجھے قائل کرنے کے [لیے] زور دے کر بولی "مجھے یقین ہے کہ سب کچھ آپ کی مرضی [اور آپ] کی پسند۔۔۔ اور آپ کے فلسفوں کے مطابق ہوجائے گا۔ یہ

[آ]پ کے لیے بہت خوبصورت۔۔۔ بہت خوش کن رہے گا۔"

[میں] اب ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ حیرت [انگ]یز سا ای کردار معلوم ہوتی تھی۔ وہ شاید میری خاموشی کو حوصلہ [اف]زا محسوس کرتے ہوئے تیزی سے بولی "میں آپ سے ابتدا میں [کچھ] بھی نہیں مانگوں گی تاکہ آپ یہ نہ محسوس کریں کہ یہ تعلق [خ]الصتاً کاروباری ہے۔ اس میں جذبات، محبت، دوستی یا خلوص کا ذرا [س]ا بھی رنگ شامل نہیں ہے۔ جب آپ محسوس کریں کہ میں اس [قاب]ل ہوں کہ مجھ سے کوئی تعلق رکھا جاسکے تو پھر آپ اپنی خوشی سے [مج]ھے کوئی اچھا سا بنگلا۔۔۔ ایک بہت اچھی سی گاڑی اور ان کے تمام [لو]ازمات لے دیجیے گا۔ بینک میں میرے نام کچھ رقم ڈال دیجیے گا [او]ر ہر مہینے بھی مجھے معقول رقم دیتے رہیے گا۔ ٹھیک ہے؟"

میں اب بھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ سچی بات یہ [ت]ھی کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا، اسے کیا جواب دوں۔ وہ منتظر [ن]ظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آخر میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ کس قسم کی گفتگو ہے۔ تم [تو] میرے پاس اپنے منگیتر کامران کو بچانے کے سلسلے میں مدد کی [د]رخواست لے کر آئی تھیں۔"

"وہ مسئلہ بھی اپنی جگہ بہت اہم ہے۔ اسے بھی حل کرنا ہے [ل]یکن یہ مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ میں نے سوچا، لگے ہاتھوں اس پر [ب]ھی بات کرلی جائے۔ معلوم نہیں پھر کبھی اس طرح تنہائی میں آپ [ج]یسے کسی دولت مند سے ملاقات اور بات چیت کرنے کا موقع ملے یا نہ ملے" وہ اب ذرا ہموار لہجے میں بولی۔

"تم جیسی خوش شکل اور جرات مند لڑکی کے لیے تنہائی میں کسی دولت مند سے ملاقات اور بات چیت کرنا تو خیر کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہیں مجھ جیسے بہت سے مل جائیں گے جو بہت خوش ہوں گے۔ بلکہ ریشہ خطمی ہو کر تنہائی میں تم سے ملاقات کرنا چاہیں گے اور اس قسم کی بات چیت تو وہ بہت ہی ذوق و شوق سے کریں گے جیسی تم کررہی ہو" میں نے کہا۔

"شاید آپ کا خیال درست ہو لیکن میرے سامنے کئی پہلو [قاب]لِ غور ہیں۔ ایک مسئلہ تو یہ ہے کہ میرے خیال میں کاروباری [آدمی] ہر معاملے میں کاروباری ہوتا ہے۔ وہ ہر چیز سستے داموں [خر]یدنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس معاملے میں بھی کاروبار سے [با]ز نہیں آئے گا اور میں نے تہیہ کررکھا ہے کہ اب جب کہ میں نے [بک]نے کا فیصلہ کرہی لیا ہے تو بہت مہنگے داموں بکوں گی۔۔۔"

"بہت خوب!" میں نے سرہلایا۔ وہ خود ہی فیصلے کیے جارہی [تھی]، یہ خود ہی اپنے معیار مقرر کیے جارہی تھی۔ اب تو مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ اس کی کھوپڑی کا کوئی پرزہ اپنی جگہ سے کھسکا ہوا ہے۔

[و]ہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح آپ کو خالص اور کھردرے قسم کے کاروباری تعلق میں، کچھ لو اور کچھ دو، کے اصولوں میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی اسی طرح میرے ساتھ جمالیاتی حس کا معاملہ ہے۔ میں سوچتی ہوں، مجھے خریدنے والا بھی ایسا ہو جو کم از کم نظروں کو تو بھلا لگے۔ جس کے قریب جاتے ہوئے دل کی دھڑکنیں تیز ہوں۔ کراہیت نہ آئے۔ اگر کوئی سیٹھ میری منہ مانگی ہر چیز دینے کو تیار بھی ہوجائے گا لیکن وہ کوئی عمر رسیدہ، موٹا، بھدا، بدشکل اور بدذوق آدمی ہوگا تو میں اس کی پیشکش قبول نہیں کروں گی۔"

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ وہ واقعی ایک دلچسپ کردار تھی "گویا ابتدا ہی سے تم بہت چوزی ہو کر چلو گی۔ کسی کے انتخاب کے سلسلے میں تمہارا اپنا ایک معیار ہوگا؟"

"بالکل" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"اور میں تمہارے انتخابی معیار پر پورا اترتا ہوں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آپ اس معیار سے بھی بڑھ کر ہیں" اس کی آنکھیں کچھ خواب ناک سی ہوگئیں۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ اس کی حقیقی کیفیت تھی یا وہ آنکھوں میں زبردستی ایک نشیلا پن سا پیدا کرنے کی کوشش کررہی تھی "لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ اس قدر ردّ و قدح میں کیوں پھنسے ہوئے ہیں۔ کیا آپ شادی شدہ ہیں؟"

"نہیں" میں نے جواب دیا "شادی شدہ ہونے سے ان معاملات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ بہت سے امیر لوگ دو دو بیویاں ہونے کے باوجود داشتائیں رکھتے ہیں۔"

"یہی تو میں نے بھی سنا ہے" وہ قدرے گرمجوشی سے بولی "لیکن آپ کیسے دولت مند ہیں جو غیر شادی شدہ ہونے کے باوجود اس معاملے میں اس قدر ہچکچاہٹ کا شکار ہیں۔ جب کہ میں آپ کے اندازِ فکر کو سمجھنے اور آپ کی سوچ کے مطابق چلنے کی بھی اہلیت رکھتی ہوں؟"

"میں اس سلسلے کی کوئی انوکھی مثال نہیں ہوں۔ ہزاروں ایسے دولت مند ہوں گے جو غیر شادی شدہ ہوں گے مگر انہوں نے کوئی داشتہ بھی نہیں رکھی ہوگی" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔۔۔ انہیں مفت میں عیاشیوں کے مواقع میسر ہوں گے۔ انہیں دولت خرچ کرنے کی کیا ضرورت ہے" اس کے لہجے میں تلخی آگئی۔

ایک لمحے کے لیے کمرے میں بوجھل سی خاموشی چھاگئی۔ پھر میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا "دیکھو اچھی لڑکی! میرا خیال ہے، تم خواہ مخواہ ہی اس موضوع میں الجھ گئی ہو۔ یہ تمہاری منزل نہیں ہے۔ تم یقیناً یہاں کچھ اور بات کرنے آئی تھیں لیکن ہر انسان کے ذہن پر کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی سنک کا حملہ ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے، تم پر بھی کوئی سنک سوار ہوگئی ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کرو اور اصل موضوع پر بات کرو۔ مجھے یقین ہے، تم ایسی لڑکی نہیں ہو۔ تم ایک غریب مگر شریف اور باعزت نوجوان کی منگیتر

ہو۔ تم جس دنیا کی باتیں کررہی ہو وہ یقیناً تمہارے خوابوں کی دنیا نہیں ہوگی لیکن بعض اوقات کسی سنک میں اٹھایا گیا ایک قدم انسان کو اس کے خوابوں کی دنیا سے بہت دور لے جاتا ہے اور واپسی کا بھی کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ میں تمہاری اس لمحاتی کمزوری سے فائدہ اٹھانا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔ میرے خیال میں یہ ایک قسم کا گھٹیا پن ہوگا اور مجھے کسی بھی قسم کا گھٹیا پن پسند نہیں۔ تم نے اب تک ایک صاف ستھری زندگی گزاری ہوگی۔ میں چاہتا ہوں تم اس پر قائم رہو...."

"میں لعنت بھیجتی ہوں اس صاف ستھری زندگی پر...." وہ یک لخت ہی گویا بھڑک اٹھی۔ اس کے لہجے میں جذبات کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے مجھے دھچکا سا لگا۔ ایک بار پھر اس کا چہرہ لال بھبوکا سا ہوگیا "آپ میرے بزرگ بننے کی کوشش نہ کریں اور مجھے نصیحتوں سے نہ نوازیں۔ میں نے زندگی میں ان گنت نصیحتیں سنی ہیں.... بلکہ میرا خیال ہے غریب آدمی کو تو زندگی میں نصیحتوں کے سوا سننے کو کچھ ملتا ہی نہیں ہے.... اور آپ بھلا اتنے یقین سے کیسے کہہ سکتے ہیں کہ کسی لڑکی کے خواب کیا ہوں گے؟"

مجھے بے یقینی سے اپنی طرف دیکھتے پاکر وہ گویا کچھ دھیمی پڑی اور اپنے لہجے میں معقولیت لانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "اب تک شاید میرے خوابوں کی دنیا وہی رہی ہو جس کا آپ ذکر کررہے ہیں۔ اس میں ہر قدم پر شرافت و پاکیزگی کے بلند مینار کھڑے ہوں۔ آج اچانک ہی میں نے اس دنیا پر بھی لعنت بھیج دی ہے۔ میں اپنی ساری یادوں، سارے نظریات، سارے فلسفوں اور اپنے پورے ماضی کو کسی سمندر میں غرق کردینا چاہتی ہوں۔ میں ایک نئی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ اپنا سفر نئے سرے سے شروع کرنا چاہتی ہوں۔ ماضی کی ہر نشانی کو حرفِ غلط کی طرح مٹا دینا چاہتی ہوں۔ ہر پرانے تعلق واسطے کو خیرباد کہہ دینا چاہتی ہوں۔ آپ مجھے اس کا طریقہ بتایئے۔ نصیحت مت کیجئے۔"

میں اس کی باتوں سے ذرا بھی دل برداشتہ نہ ہوا اور نہ ہی مجھے غصہ آیا بلکہ اب بات کسی حد تک میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔ میں نے ایک نئے زاویۂ نظر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان کی آنکھوں میں اب بھی سرخی تھی مگر اس سرخی کے عقب میں شاید ان گنت سلگتی خواہشوں کا دھواں تھا۔

میں نے ملائمت سے کہا "میرا ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ انسان کو نصیحت کی سب سے زیادہ ضرورت اسی وقت ہوتی ہے جب وہ کہتا ہے کہ اسے نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اپنا سب سے زیادہ نقصان اسی وقت کررہا ہوتا ہے جب وہ نصیحت سننا نہیں چاہتا۔ میں محسوس کررہا ہوں کہ تمہارے اندر برسوں سے سوچوں کا لاوا ایک رہا تھا اور آج اس آتش فشاں کو اچانک کوئی ایسا دھچکا لگا ہے کہ یہ پھٹ پڑا ہے۔ مجھے اپنا دوست سمجھو اور اپنے محسوسات کے بارے میں ذرا تحمل سے بتاؤ۔"
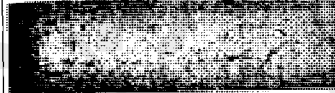
وہ ایک لمحے خاموش رہی۔ اس کا نچلا ہونٹ دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ اس نے اسے دانتوں میں دبالیا۔ کچھ دیر اس کا سر جھکا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور افسردہ سے لہجے میں بولی "فضل صاحب! غربت واقعی بڑی ذلیل چیز ہے۔ میں نے اور کامران نے بچپن ہی سے غربت اور مسائل کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ اب ہم ان سے چھٹکارا پانا چاہتی ہوں۔ نجات حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ہم نے بہت جدوجہد کی ہے، بہت ہاتھ پاؤں مارے ہیں لیکن ہم کامیاب نہیں ہوسکے حالانکہ ہم میں صلاحیتوں کی کمی نہیں ہے۔ ہم نے اپنی تمام تر غربت اور اردو میڈیم سرکاری اسکولوں، کالجوں میں پڑھنے کے باوجود بہت شاندار نتائج کے ساتھ تمام امتحانات پاس کیے۔ جو بھی چھوٹی موٹی نوکریاں ہمیں ملیں ہم نے ان میں نہایت دیانتداری اور محنت سے اپنے فرائض ادا کرنے کی کوشش کی لیکن ہم غریب کے غریب ہی رہے۔ غربت سے ہمارا پیچھا نہیں چھوٹ سکا۔ ہمارے خواب بھی بہت اونچے نہیں تھے۔ ہم انہونی باتیں نہیں سوچتے تھے لیکن ہمارے معمولی خوابوں کو بھی تعبیر نہیں مل سکی۔ ہم جوانی میں ہی تھک چکے ہیں۔ خصوصاً میں زیادہ تھک چکی ہوں۔ شاید میں اندر سے زیادہ کمزور ہوں...." اس نے گہرا سانس لی اور کرسی کے پشتے سے سر ٹکا کر واقعی تھکے تھکے انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔

میں نے ملائمت سے کہا "اس کے باوجود ایک بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئی کہ غربت اور امارت صرف تقدیر کے چکر ہیں لیکن انسان کے ہاتھ پاؤں مارنے سے تھوڑا سا فرق پڑتا ہے

معجزے رونما نہیں ہوتے۔ معجزے صرف ان کے لیے رونما ہوتے ہیں جن کی قسمت بہت اچھی ہوتی ہے۔ آپ محنت کرتے ہیں کہ آپ کو محنت کا مناسب صلہ مل جاتا ہے۔ خدا کسی کی محنت ضائع نہیں جانے دیتا لیکن بعض اوقات ہم خدا سے اپنی محنت کے بہت زیادہ صلے کی توقع رکھنے لگتے ہیں۔ ہم محنت کرنے کے بعد اپنے آپ کو مستحق سمجھنے لگتے ہیں کہ اب ہمارے لیے محل کھڑے ہوجانے چاہئیں لیکن ہمارے مقدر کے حساب سے ہماری محنت کا صلہ صرف اتنا ہی ہوتا ہے کہ ہم پیٹ بھر کر روٹی کھا سکیں، معمولی کپڑا پہن سکیں اور کسی چھت کے نیچے سر چھپا سکیں۔ ہمارا مقدر اتنا زوردار نہیں ہوتا کہ ہمارے لیے مٹی سونا بننے لگے۔"

وہ قدرے تحقیر آمیز سے انداز میں مسکرائی گویا میں کوئی دھوکے باز تھا اور اسے چکر دینے کی کوشش کررہا تھا۔ اپنی اس ہوسائٹی میں یہ المیہ بھی مجھے قدم قدم پر دیکھنے کو ملتا تھا کہ جب آپ خلوصِ دل سے کسی کو سمجھانے اور صحیح راستہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ کچھ ایسی نظروں سے آپ کی طرف دیکھتا ہے جیسے آپ اس کے دشمن ہیں لیکن جو ان کے سامنے جی بھر کے جھوٹ بولتے ہیں، بکواس کرتے ہیں اور انہیں کسی اندھے کنویں کی طرف لے جارہے ہوتے ہیں، ان کے پیچھے وہ بڑی عقیدت سے آنکھیں بند کرکے چلتا رہتا ہے۔ بعض اوقات تو اندھے کنویں میں گر چکنے کے بعد بھی تسلیم نہیں کرتا کہ اس کی بربادی کا سبب وہی تھا جسے اس نے اپنی رہنمائی کے لیے منتخب کیا تھا۔ وہ پھر بھی دوسرے لوگوں یا دوسرے عوامل کو ہی برا بھلا کہتا رہتا ہے۔

منیزہ جب بولی تو اس کا لہجہ مدھم تھا لیکن اس میں بلا کی تلخی گھلی ہوئی تھی "ایک مدت سے ہم جیسے تہی دست لوگوں کو مقدر کے فلسفے کا جھانسا دیا جارہا ہے۔ تقدیر کے ڈھکوسلے سے بہلایا جارہا ہے۔"

"اگر فاقوں کی نوبت نہ ہو تو غربت اتنی زیادہ تکلیف دہ چیز نہیں۔ پرانے وقتوں میں لوگ غربت میں بھی ہنسی خوشی گزر بسر کرلیا کرتے تھے۔ اب غربت کو زیادہ تکلیف دہ اس حقیقت نے بنادیا ہے کہ ایک آدمی تو چھوٹی چھوٹی ضروریات کے لیے ترس رہا ہوتا ہے لیکن وہ اپنے اردگرد نظر ڈالتا ہے تو اسے دولت مندی کے ہوشربا نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ وہ بہت سے لوگوں کو دیکھتا ہے کہ لافضولیات اور خرافات پر بھی پیسا پانی کی طرح بہارہے ہیں۔ اس کے خوفناک نتائج سامنے آرہے ہیں۔ اس وقت لوٹ مار کا جو سیلاب آیا ہوا ہے، جو افراتفری مچی ہوئی ہے اس کی بڑی وجہ یہی خوفناک تضاد ہے۔ میں اس خوفناک تضاد کے خلاف ہوں لیکن میں اسے صحیح طریقے سے دور کرنے کے حق میں ہوں۔ میں اس بھیانک تضاد کو دور کرنے کے لیے اس کے حق میں نہیں ہوں کہ محروم طبقے ڈاکے مارنے لگیں، دوسروں کو لوٹنے لگیں اور اونچے خواب دیکھنے والی لڑکیاں قحبہ خانے آباد کرنے لگیں یا دولت مند لوگوں کی داشتائیں بننے کی سعی کریں۔ یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ اس طرح تو معاشرے کا خلفشار اور بڑھے گا۔"

"مجھے اس سے غرض نہیں ہے" وہ ضدی لہجے میں بولی "میں نے معاشرے کا ٹھیکا نہیں لے رکھا۔ میں نے اپنی زندگی بدلنے کا تہیہ کرلیا ہے۔ اس کے لیے میرے سامنے یہی ایک شارٹ کٹ ہے۔ میں اس سسکتی ترستی زندگی سے تنگ آچکی ہوں۔ میں زندگی کی تمام بڑی بڑی آسائشوں سے لطف اندوز ہونا چاہتی ہوں۔"

محرومیوں سے جھنجلائے ہوئے اور تنگ آئے ہوئے ہر شخص کا یہی جواب ہوتا ہے۔ یہ جواب بعض اوقات زبان پر نہیں آتا، صرف ذہن میں ہی رہتا ہے۔ انہیں سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے تاہم انسان کے بارے میں ہمیشہ ایک موہوم سی امید میرے ذہن میں رہتی تھی۔ میں نے نرم لہجے میں کہا "اور وہ جو بے چارہ شریف آدمی تمہارا منگیتر ہے، اس کا کیا بنے گا؟ وہ تو تم سے شادی کے انتظار میں بیٹھا ہوگا؟"

"اس کا مسئلہ تو بیچ میں آن پھنسا ہے" وہ بیزاری سے بولی "وہ اس نئے چکر میں پھنس گیا ہے۔ وہ اکثر ہی کسی نہ کسی چکر میں پھنستا رہتا ہے۔ اس بار زیادہ ہی بڑے چکر میں پھنس گیا ہے۔ میں چاہتی ہوں وہ اس چکر سے نکل جائے۔ اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ بھی ہوسکا وہ میں کروں گی۔ میرا اس سے جو بھی تعلقِ خاطر ہے، جو بھی رشتہ ناتا ہے، اس کے حوالے سے اس کے لیے یہ میرا آخری تحفہ ہوگا کہ میں اسے اس چکر سے نکلوادوں لیکن اس کے بعد میں اس سے کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتی۔ میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ وہ بہت ہی بے وقوف آدمی ہے۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ تم بہت عقلمند لڑکی ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کم از کم اس سے تو زیادہ عقلمند ہوں۔ میں نے ابھی تک اپنی عقل کو استعمال نہیں کیا تھا۔ آنکھیں بند کرکے اس کے ساتھ گھسٹتی آرہی تھی یا یوں کہنا چاہیے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ میں جب غربت کی اس کینچلی کو اتار پھینکنے کے لیے میدانِ عمل میں قدم رکھوں گی تو ایک حشر برپا کردوں گی۔"

"واہ.... واہ....!" میں نے ہلکی سی تالی بجائی "تمہارے عزائم واقعی بڑے بلند ہیں لیکن میرے خیال میں تمہارے منگیتر کے ساتھ یہ بڑی زیادتی ہوگی۔"

"آپ اس کی بے وقوفی دیکھیں نا...." وہ شکوہ بھرے انداز میں بولی "اس نے اپنے حالات کو بدلنے کے لیے ایک انقلابی قدم اٹھانے کا فیصلہ بھی کیا تو وہ بھی کیسا بے وقوفانہ تھا۔ اس نے اپنے آپ کو غربت سے بھی زیادہ بڑی مصیبت میں پھنسالیا۔"

"بات پھر وہی مقدر کی آجاتی ہے" میں نے تحمل سے کہا "مقدر خراب ہو تو ہر ہاتھ الٹا پڑتا ہے۔ مقدر اچھا ہو تو بے وقوفانہ

فیصلے بھی منافع بخش بن جاتے ہیں۔"

"آپ اپنے اس فلسفے پر خواہ کتنا ہی زور دیتے رہیں لیکن میں جو فیصلہ کرچکی ہوں' جو پروگرام بنا چکی ہوں اس پر ضرور عمل کر کے رہوں گی" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولی۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" میں نے خوش دلی سے کہا "اگر تمہیں داشتہ بننے کا اتنا ہی شوق چڑھا ہوا ہے اور تمہارے خیال میں یہ بہت ہی باعزت مقام ہے تو ضرور اس تک پہنچو۔"

"عزت کو گولی ماریں۔۔۔" وہ بیزاری سے بولی "مفلس کی اس سوسائٹی میں کیا عزت ہے؟ عزت روپے پیسے' ٹھاٹ باٹ سے ہے۔ یہ چیزیں آپ کو حاصل ہوں تو سب آنکھیں بند کر کے عزت کرتے ہیں۔ کوئی بھی آپ سے نہیں پوچھتا کہ یہ سب چیزیں کہاں سے آئیں اور آپ چاہیں تو کسی کے پوچھنے سے پہلے ہی کوئی خوبصورت سی کہانی گھڑ کر اپنے جاننے والوں یا متوقع جاننے والوں میں پھیلا سکتے ہیں۔"

"جب انسان بہت جلا بھنا اور جھنجلایا ہوا ہوتا ہے تو اس قسم کے باغیانہ فلسفے بہت اچھے لگتے ہیں کہ مفلس کی اس سوسائٹی میں کیا عزت ہے' عزت روپے پیسے سے ہے وغیرہ وغیرہ۔۔۔ لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ سچ نہیں ہے۔ یہ بھی محض ایک دل کا بہلاوا ہے۔ جلد ہی یہ دل کا بہلاوا بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے اور پھر وہی ایک بے اطمینانی' ایک خلش ساتھ رہ جاتی ہے۔ پرانی قدروں میں پھر بھی زیادہ جان ہے۔ انسان ان کے سہارے زیادہ مطمئن رہتا ہے۔ زیادہ پرسکون زندگی گزارتا ہے۔"

"آپ مجھے بہلانے کی کوششوں میں اپنا وقت [illegible] الفاظ ضائع نہ کریں" اس کے لہجے میں ضد کم نہ ہوئی "آپ کو داشتہ کی ضرورت نہیں ہے۔۔۔ تو کوئی بات نہیں۔۔۔ آپ مت رکھیے۔ اس میں زبردستی والی تو کوئی بات نہیں۔ یہاں اور بہت سے دولت مند ہیں۔ کوئی تو قدرداں مل جائے گا۔"

"یقیناً مل جائے گا۔۔۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ تم اس میدان میں ہاتھوں ہاتھ لی جاؤ گی" میں نے کہا "لیکن میں تمہیں بربادی و بے ہودگی کے راستے پر خوش آمدید کہنے کا کریڈٹ لینا نہیں چاہتا۔ میں نہیں چاہتا کہ اس راستے پر پہلا قدم تم میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھاؤ۔ میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ یہ اعزاز' کسی اور کو ہی حاصل ہو۔ میں ایک غریب اور شریف لڑکی کو یہ راستہ اختیار کرتے دیکھ کر منہ پھیر لینا ہی بہتر سمجھوں گا۔۔۔ ہاں۔۔۔ اس سودے بازی کے بغیر ہی میں تمہارے حالات بہتر بنانے کے لیے تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"کیا واقعی؟" وہ طنزیہ سے انداز میں مسکرائی۔

"ہاں۔۔۔ کیوں نہیں" میں نے بلا تامل کہا "حالات بہتر بنانے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے کے اور بھی بہت سے راستے ہیں۔ میں ایک بزنس مین ہوں۔ بہت سے طریقے بتا سکتا ہوں اور جتنی مدد کر سکتا ہوں اس کے لیے بھی حاضر ہوں۔"

"بغیر کسی مطلب کے۔۔۔؟" اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ بغیر کسی مطلب کے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر میں اتنا ہی مطلبی ہوتا تو تمہاری پہلی پیشکش میرے لیے زیادہ قابلِ توجہ ہوتی۔"

"یقین نہیں آتا کہ اس دنیا میں ایسا بھی ہوتا ہے" وہ [illegible] جھٹک کر بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی "میرے تجربات تو اس سے بہت مختلف رہے ہیں۔"

"کسی بھی قسم کے تجربات حرفِ آخر نہیں ہوتے۔ زندگی میں ہر قدم پر ایک نیا تجربہ انسان کا منتظر رہتا ہے" میں نے مربیانہ انداز میں کہا "لیکن انسان جب مایوسی' جھنجلاہٹ اور بد دلی کی انتہا [illegible] ہوتا ہے تو اس کی سوچیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں۔ اسے اپنے متضاد فیصلے بھی درست معلوم ہوتے ہیں۔ وہ بیک وقت مختلف راستوں پر چلنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے سبھی صحیح دکھائی دیتے ہیں۔ تم جیسے باغیانہ روش اختیار کرنے والوں کو بھی اکثر میں نے فائدے میں نہیں دیکھا۔ مثلاً میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ محرومیوں اور جھنجلاہٹ کی شدت میں یا کسی کے بہکاوے میں آکر کوئی نوجوان ڈکیت یا دہشت گرد بن گیا تب بھی اس کے اصل مسائل تو حل نہیں ہوئے بلکہ مسائل کچھ اور بڑھ گئے۔ کچھ دن کی وحشیانہ [illegible] عیش و عشرت کے بعد آخر کار جب وہ کسی پولیس مقابلے میں یا قدرت کے دستِ انصاف کی زد میں آکر کسی اور طریقے سے مرا تو اس کے ڈیرے یا ٹھکانے سے منشیات اور چند ہتھیاروں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ اگر کچھ موجود بھی ہو تو وہ پولیس وغیرہ کی جیبوں میں چلا جاتا ہے۔ اگر انجام یہی ہونا ہے تو پھر اتنے تھوڑے سے عرصے کے لیے خود کو اور خلقِ خدا کو عذاب میں ڈالنے کا کیا فائدہ؟"

"ڈاکو اور داشتہ میں بڑا فرق ہوتا ہے" وہ مسکرائی "عام طور پر داشتہ کا انجام بخیر ہی ہوتا ہے اور وہ اپنے پیچھے بہت کچھ چھوڑ کر مرتی ہے۔ اس کے دم سے بہت سے لوگ اس کی زندگی میں بھی عیش کرتے ہیں اور اس کے مرنے کے بعد بھی۔"

"ضروری نہیں ہے" میں نے نرمی سے کہا "اگر کسی لڑکی کا مقدر ہی خراب ہو تو وہ اس لائن میں آکر بھی خوار اور بدحال ہو سکتی ہے۔ میں نے داشتائیں اور طوائفیں بھی غریب اور بدحال دیکھی ہیں۔ ان میں بھی طبقے اور درجہ بندیاں ہوتی ہیں۔ ضروری نہیں ہوتا کہ اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے بعد بھی عورت اپنی [illegible] پسند زندگی گزارنے کے قابل ہو سکے۔"

"لگتا ہے' دلیل میں آپ سے جیتنا ممکن نہیں ہے" وہ اب [illegible] مختلف انداز میں مسکرائی۔ شاید اس کے اندر کا تناؤ اور جھنجلاہٹ کچھ کم ہو چکی تھی۔

"میری دلیلیں محض کتابی نہیں ہیں" میں نے ملائمت سے کہا "میں نے دنیا دیکھی ہے۔ ہر طرح کے حالات دیکھے ہیں۔ زندگی کے ہر گوشے' ہر روپ کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔"

"آپ کے اس بیان پر تو مجھے قطعاً کوئی شک نہیں" اس کی مسکراہٹ برقرار رہی "آپ جیسے لوگوں کے مقابلے میں ہم جیسے لوگوں کا زندگی گزارنا تو محض جھک مارنا ہی ہوتا ہے۔"

"تو پھر تمہیں میری بات مان لینی چاہیے" میں نے کہا۔

"خیر۔۔۔ اس مسئلے کو فی الحال اٹھا رکھتے ہیں۔ ویسے آپ کی وہ دوسرے طریقوں سے مدد والی پیشکش تو ابھی برقرار ہے نا؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔۔۔ اور وہ اس وقت تک برقرار رہے گی جب تک تم اپنے ان ارادوں پر عملدرآمد کی کوشش نہیں کرتیں جو نہ جانے کس طرح تمہارے دماغ میں گھس گئے ہیں۔"

وہ مسکرائی تو ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ویسے اگر تم منگنی شدہ نہ ہوتیں اور تمہارا منگیتر لڑکپن سے تمہارے عشق میں گرفتار نہ ہوتا تو میں تم سے دوستی اور تعلق رکھنے میں خوشی محسوس کرتا۔"

اس کی مسکراہٹ کچھ اور روشن و دھیاں ہو گئی "ابھی تک تو میں اس زبانی کلامی منگنی کو توڑنے اور اس کا ساتھ چھوڑنے کے ارادے پر قائم ہوں۔ معلوم نہیں کیوں میرے دل میں یکایک اس کے لیے محبت نہیں رہی۔"

"تم اسے نہیں چھوڑو گی" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "اگر تم اسے چھوڑو گی تو پھر میری ہمدردیاں تمہارے ساتھ نہیں رہیں گی۔ اتنی ہرجائی مت بنو۔ لڑکیاں عموماً اتنی ہرجائی ہوتی نہیں ہیں۔ اس وقت تم صرف غصے اور جھنجلاہٹ کی وجہ سے اس طرح سوچ رہی ہو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔۔۔" وہ کچھ الجھن کے سے عالم میں بولی "بس۔۔۔ وہ کھا مڑ یکایک ہی نہ جانے کیوں میرے دل سے اتر گیا ہے۔ شاید مجھے کبھی بھی اس سے محبت نہ رہی ہو۔ یہ محض بچپن کی رفاقت اور وضع داری ہو جو میں اب تک اس کا ساتھ دیتی آرہی ہوں۔"

"وضع داری یہی ہے کہ یہ ساتھ اسی طرح نبھاتی رہو" میں نے مشورہ دیا "ویسے اگر تمہیں اس سے محبت نہ ہوتی تو تم اسے اس نئی مصیبت سے چھڑانے کے لیے اتنی فکرمند کیوں ہوتیں؟"

"بچپن کی رفاقت کے بہرحال اپنے اثرات تو ہوتے ہیں۔ میں اسے کسی بہت برے انجام سے دوچار ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔"

"شاید اسی کا نام محبت ہو" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"اگر یہ محبت ہوتی تو شاید میں اس سے اس طرح قطع تعلق کا فیصلہ نہ کر پاتی جس طرح اب کیے بیٹھی ہوں۔۔۔" پھر اس نے ایک طویل سانس لے کر ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرتے ہوئے سر جھٹکا اور ذرا تھکے تھکے سے لہجے میں بولی "خیر۔۔۔ یہ سب باتیں بہت تفصیل طلب ہیں۔ ہم نے ان میں اب بھی بہت سا وقت ضائع کر دیا ہے۔ اس کے باوجود جو گتھیاں کھلنے سے رہ گئی ہیں انہیں پھر فرصت میں بیٹھ کر کھولیں گے۔ فی الحال تو صرف یہ بتائیے کہ آپ اسے بچانے کے سلسلے میں میری کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

"خود کامران بھی میری مدد حاصل کرنے کا خواہش مند ہے یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔۔۔" وہ تیزی سے بولی "اس بے چارے کی حالت تو اس وقت ڈوبتے ہوئے شخص کی سی ہے۔ اس کے لیے تو تنکے کا سہارا بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے اور آپ تو تنکا نہیں' شہتیر ہیں۔"

"اس عجیب و غریب تعریف کا شکریہ۔۔۔ اور اس بات پر مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں کسی کی آنکھ کا شہتیر نہیں ہوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں اس کی ہر ممکن مدد کرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ پہلے میں اس کا مؤقف سنوں۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ قتل کی رات اس گھر میں کیا ہوا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس رات کامران پرنس سیرا کے پاس موجود تھا۔"

"موجود تو تھا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی کہ وہ پرنس سیرا کو قتل کر دیتا۔ وہ تو۔۔۔" صفیہ خاصے پرجوش سے لہجے میں بولی۔

میں نے ہاتھ اٹھایا اور اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے جو کچھ بھی سننا ہو گا میں اسی کی زبانی سننا پسند کروں گا۔ اگر مجھے خود ایک طرح سے اس کا وکیلِ صفائی بننا ہے تو پھر مجھے کسی اور وکیلِ صفائی کی ضرورت نہیں۔ اگر اس کی باتوں سے یا کسی اور طریقے سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ قاتل ہے تو پھر میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکوں گا۔"

"قاتل تو وہ نہیں ہے۔۔۔ وہ چاہے بھی تو کسی کو قتل نہیں کر سکتا۔۔۔" وہ افسردہ سے انداز میں مسکرائی "لیکن بہرحال میری بات کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ اصل اہمیت تو صرف اس بات کی ہے کہ قانون اور عدالت اسے بے گناہ تسلیم کرتے ہیں یا نہیں۔ آپ خود اگر اس کے لیے کچھ نہ کریں تب بھی اتنا تو کر ہی سکتے ہیں کہ اس کے لیے کسی اچھے سے وکیل کا بندوبست کر دیں۔ ہم تو کسی معمولی وکیل کی خدمات بھی حاصل نہیں کر سکتے۔ وکیل کی خدمات حاصل کرنے کا حق تو ایک مجرم کو بھی ہوتا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ہوتا تو ہے۔۔۔ لیکن میرے ہاں نہیں ہوتا" میں نے جواب دیا "میرا بس چلے تو میں ان تمام وکیلوں کا بھی کوئی بہت ہی مناسب بندوبست کر ڈالوں جو یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کا مؤکل مجرم ہے' اس کی وکالت کرتے ہیں۔ اسے سزا سے بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں۔ یہ بے ضمیری بھی بڑے مسائل پیدا

کر رہی ہے۔"

"کسی ایک جگہ بے ضمیری ہو تو اس کا رونا بھی رویا جائے۔ یہاں تو ہر طرف بے ضمیری ہی بے ضمیری نظر آتی ہے" صفیہ تلخی سے بولی "بہر حال.... میں یہ کہنے لگی تھی کہ آپ اطمینان سے کامران کی مدد کے سلسلے میں کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ اس نے اس امیرزادی کو قتل نہیں کیا۔"

"تاہم اس نے اس سے شادی ضرور کی تھی" میں نے کہا۔

"پرنس نے اسے خود شادی کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ محض دکھاوے کی.... اور کاروباری قسم کی شادی تھی۔ اس کا اپنا کوئی لمبی چوڑی جائداد کا چکر تھا۔ کامران کو صرف اس بات سے غرض تھی کہ اسے دس لاکھ روپے مل جائیں گے تو اس کی زندگی کے شاید سارے ہی مسائل حل ہو جائیں گے۔ وہ جب یہ تجویز لے کر دوڑا دوڑا میرے پاس آیا تھا تو میں نے اسی وقت اس کی مخالفت کی تھی۔ اس قسم کے منصوبے بظاہر خواہ کتنے ہی اچھے معلوم ہوں لیکن نہ جانے کیوں دل کو نہیں لگتے۔ کم از کم میرے دل کو نہیں لگتے۔ میں نے اس وقت ہی اس کی مخالفت کی تھی لیکن کامران مجھے سمجھانے لگا' منتیں کرنے لگا۔ اس نے بہت سے وعدے بھی کئے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اگر پرنس اس پر مہربان بھی ہوئی تو وہ اسے چھوئے گا بھی نہیں...."

"اور تم نے اس کے وعدے پر یقین کر لیا تھا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"یقین کرنے کے سوا میرے لیے کوئی چارہ نہیں تھا" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اس کے علاوہ اس نے بتا دیا تھا کہ پرنس نے تو خود پہلے اس پر یہی واضح کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو محض دکھاوے کا شوہر سمجھے اور سچ مچ شوہر بننے کی کوشش نہ کرے۔ گو یہی تھا کہ وہ بڑی سختی سے یہ ہدایت دے رہی تھی۔ کم از کم مجھے کامران نے یہی بتایا تھا۔"

"بہر حال تم نے اجازت دے دی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں.... بادل ناخواستہ میں نے اجازت دے دی" وہ گہری سانس لے کر بولی "میں نے دل میں یہی سوچا تھا کہ یہ بھی کامران کی شرافت ہی تھی کہ وہ اس سلسلے میں مجھ سے اجازت لینے آ گیا تھا۔ وہ نہ بھی پوچھتا تو میں کیا کر لیتی۔ میں محض اس کی منگیتر ہی تو تھی' بیوی تو نہیں تھی۔ اکثر اوقات تو بیویاں بھی اس قسم کے معاملات میں کچھ بھی نہیں کر پاتی ہیں جب کہ شوہر بیچ باہر جا کر دوسری شادی کر لیتے ہیں۔ خاص طور پر جو بے چاری اپنا گھر آباد رکھنا چاہتی ہیں اور دنیا کو اپنی ازدواجی زندگی کا تماشا نہیں دکھانا چاہتیں وہ تو بہت ہی خاموشی سے حالات سے سمجھوتا کر لیتی ہیں۔ بہر حال میرا دل نہ جانے کیوں پہلے ہی اندیشوں سے لرز رہا تھا.... اور آخر کار میرے اندیشے درست ہی ثابت ہوئے۔ اسے لینے کے دینے پڑ گئے۔"

"بہر حال.... وقوعے کی رات وہ اس کے اسٹوڈیو میں تھا۔ اس نے تمہیں بتایا ہے کہ اس رات وہاں کیا ہوا تھا؟ وہ وہاں گیا کیوں تھا؟"

"ہاں.... اس نے مجھے سب کچھ بتایا ہے" وہ سرہلاتے ہوئے بولی "وہ اس رات اس کے پاس کچھ ایڈوانس لینے کے چکر میں گیا تھا۔ آپ اس کے حالات کی مضحکہ خیزی پر شاید دل ہی دل میں ہنس رہے ہوں...."

"نہیں.... میں ہرگز نہیں ہنس رہا" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اسے اطمینان دلایا "میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"

"حالات واقعی بہت خراب اور مضحکہ خیز تھے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "دکھاوے کی شادی کو ابھی دو دن بھی نہیں ہوئے تھے کہ کرائے کا شوہر خاصی موٹی رقم ایڈوانس مانگنے کے ارادے سے اس حسین اور دولت مند بیوی کے پاس جا پہنچا جسے وہ صرف دیکھ سکتا تھا' چھو نہیں سکتا تھا۔ جس کی دولت مندی کے مظاہرے وہ صرف دیکھ سکتا تھا' ان سے استفادہ نہیں کر سکتا تھا۔"

"کیا اسے پیسوں کی ضرورت تھی؟" میں نے پوچھا۔

"کیں ایسی...." وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی "میرے اور اس کے حالات کے بارے میں جان لینے کے بعد تو آپ کو اس قسم کا سوال نہیں کرنا چاہیے۔ پیسوں کی تو اتنی اشد ضرورت تھی کہ ان کے انتظار میں وہ مرا جا رہا تھا۔ کافی عرصے پہلے اس نے باہر جانے کے چکر میں ایک پٹھان سے منافع پر رقم لے کر گنوا دی تھی۔ اس کی اس قسم کی حماقتوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ بہر حال اس پٹھان نے اس کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ دوسری بھی بہت سی فوری ضروریات تھیں۔ شادی کا معاہدہ تو دو ڈھائی ماہ چلنا تھا۔ عین ممکن تھا اس سے بھی زیادہ طول کھینچ جاتا جب کہ کامران رقم کے انتظار میں ایک ایک دن نہیں' بلکہ ایک ایک گھنٹا گن گن کر گزار رہا تھا۔ وہ پرنس کیرا سے لاکھ دو لاکھ بطور ایڈوانس مانگنے کے ارادے سے گیا تھا تاکہ فوری نوعیت کے مسائل حل کئے جا سکیں اور اسے کچھ ذہنی یکسوئی حاصل ہو سکے" وہ خاموش ہو گئی۔

مجھے اپنے دل کے کسی گوشے میں کامران کے لیے ہمدردی کی محسوس ہوئی۔ وہ اور صفیہ ہمارے ہاں کے لاکھوں نوجوان لڑکے لڑکیوں کی نمائندگی کرتے تھے جو نہ جانے کن کن گلی کوچوں میں بکھرے ہوئے تھے اور ایک بے مقصد' تھکا دینے والی اور گوناگوں مشکل سے بھری زندگی گزار رہے تھے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "کامران وہاں جا کر دیر تک پرنس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا لیکن اصل بات زبان پر لانے کی جرات نہ کر سکا کیونکہ پرنس نے اس سے معاہدہ کرتے وقت ہی واضح کر دیا تھا کہ وہ اصل مسئلہ حل ہونے تک اسے کوئی رقم نہیں دے گی۔ اسی لیے شرم کے مارے کامران حرفِ مدعا زبان پر نہیں لا سکا حالانکہ دو ایک مرتبہ پرنس نے سرسری انداز میں پوچھا بھی کہ وہ کس لیے آیا تھا لیکن وہ پھر بھی دستِ سوال دراز نہ کر سکا۔"

"کامران نے یہ بتایا کہ پرنس اس وقت کیا کر رہی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے خاص طور پر تو نہیں بتایا لیکن اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس وقت اپنے انہی امیرانہ چونچلوں میں مصروف تھی جنہیں یہ لوگ آرٹ وغیرہ کا نام دیتے ہیں...." صفیہ کے لہجے میں زہریلا پن آ گیا "میرا مطلب ہے کہ وہ اپنے انہی مشاغل یعنی پینٹنگ وغیرہ میں مصروف تھی۔ اس دوران میں دو تین ٹیلی فون کالز آئیں جن کے بعد پرنس نے کامران سے کہا کہ ایک دو مہمانوں کے آنے کا امکان ہے یہ بھی امکان تھا کہ ان کے ساتھ زیادہ دیر تک بات چیت چلے۔ کھانے کا وقت ہو چکا تھا۔ وہاں ملازم تو ہوتے نہیں ہیں۔ پرنس خود کھانے پکانے کے چکر میں بھی پڑنا نہیں چاہتی تھی اور اس کا باہر جانے کا موڈ بھی نہیں تھا۔ وہاں سے خاصے فاصلے پر بوٹ بیسن کے قریب بہت بارونق مارکیٹ سی ہے جہاں اچھے قسم کے ریستوران بھی ہیں۔ وہاں کئی طرح کی کھانے پینے کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ پرنس نے کامران کو کچھ رقم دے کر بھیجا کہ وہاں سے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کرلائے۔ اس نے اپنی بیش قیمت گاڑی کی چابی بھی اسے دے دی۔"

"کامران کو ڈرائیونگ آتی ہے؟" میں نے تصدیق کر لینا بہتر سمجھا۔

"بہت اچھی" صفیہ نے جواب دیا "وہ کچھ عرصے پہلے ٹھیکے پر کسی کی ٹیکسی بھی چلاتا رہا ہے۔ بے چارے کی قسمت کچھ زیادہ ہی خراب ہے۔ ایک بار ڈاکو وہ ٹیکسی اس سے چھین کر لے گئے تھے۔ سر پر ٹی ٹی کے دستے سے ضرب بھی لگا گئے۔ ٹیکسی تو بعد میں مل گئی لیکن گولیوں سے چھلنی تھی اور اسے دو تین وارداتوں میں استعمال کیا جا چکا تھا۔ مالک نے ہاتھ باندھ کر کامران سے معذرت کر لی کہ اب وہ اسے اپنی ٹیکسی چلانے کے لیے نہیں دے گا.... بلکہ اسے کیا' کسی کو بھی نہیں دے گا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کامران کے ساتھ اس قسم کے واقعات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ بہر حال.... میں بتا رہی تھی کہ کامران گاڑی لے کر کھانا لینے چلا گیا۔ مارکیٹ میں رش تھا۔ پرنس کی مطلوبہ کھانے کی چیزیں لینے میں کامران کو کافی دیر لگ گئی۔ وہ واپس آیا تو اس نے پرنس کو مردہ پایا۔ کالے پتھر کا ایک مجسمہ اس کے پاس پڑا تھا...."

"ایک منٹ...." میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "کامران اندر کیسے پہنچا؟ پرنس کے اس بنگلے کے گیٹ میں الیکٹرک لاک لگا ہوا ہے۔"

"پرنس نے اسے گاڑی کی چابیاں دی تھیں۔ اس کے رنگ میں گیٹ کی چابی بھی تھی اور یہ بات پرنس نے خود بھی کامران کو بتا دی تھی تاکہ اگر اس کی واپسی پر پرنس کہیں ادھر

ادھر ہو یا کام میں منہمک ہو تو اسے یا پرنس کو کوئی زحمت نہ ہو" صفیہ نے نہایت تحمل سے بتایا "چنانچہ کامران گیٹ کھول کر گاڑی اندر لے گیا تھا۔ اس نے پہلے کھانے پینے کی چیزیں کچن میں رکھی تھیں۔ پھر اس ہال میں گیا تھا جہاں اس نے پرنس کو کام کرتے چھوڑا تھا۔ آپ تو تصور نہیں کرسکتے کہ پرنس کی لاش دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی لیکن میں تصور کرسکتی ہوں۔ اس قسم کی صورتِ حال میں ہمارے ہاں کی پولیس کا تصور کرکے تو اکثر باہمت شرفا کا بھی پتا پانی ہو جاتا ہے۔ کامران تو پھر بھی خاصا ڈرپوک اور کم ہمت سا آدمی ہے۔ وہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ اس کی عقل بالکل خبط ہو گئی تھی۔ اس کا یہ فعل بالکل غیر ارادی اور اضطراری تھا۔ بہت دیر تک وہ بدحواسی کے سے عالم میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ غنیمت ہے کہ اس دوران میں اسے ادھر ادھر گشت کرنے والے پولیس والوں نے نہیں دھرلیا ورنہ انہیں سو فیصد یقین ہو جاتا کہ وہ کوئی واردات کرنے آیا تھا۔ حالانکہ معاملہ بالکل الٹ ہے۔ واردات کرنے والے بالکل نروس نہیں ہوتے۔ وہ اس طرح دندناتے پھرتے ہیں کہ شاید پولیس بھی ان کی طرف سے نظر پھیر کر گزر جاتی ہے....."

میں اس تصور سے مسکرا دیا کہ اگر اس وقت رحیم گل یہاں ہوتا تو یہ تبصرہ سن کر اس پر کیا گزرتی۔ صفیہ نے بات جاری رکھی "پھر کامران ایک ریستوران میں جا بیٹھا۔ اس نے کچھ ٹھنڈا وغیرہ پیا تو اس کے حواس کسی حد تک ٹھکانے آئے۔ اس نے بہت دیر سوچ بچار کی۔ اس کی سوچ بچار بھی بس ایسی ہی ہوتی ہے۔ گھنٹوں کی سوچ بچار کے بعد بھی وہ اسی نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچا۔ بہرحال اس رات اس نے کم از کم یہ فیصلہ ضرور کرلیا کہ اسے ایک بار پھر بنگلے پر جاکر دیکھنا چاہیے اور صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے....." وہ سانس لینے کو رکی۔

"اس نے اس فیصلے پر عمل بھی کیا یا نہیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں۔ عمل تو کرلیا لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا" صفیہ منہ بنا کر بولی۔ "بہت دیر بعد جب وہ دوبارہ بنگلے پر پہنچا تو باہر ہی پولیس کی اور کئی دوسری گاڑیاں کھڑی تھیں جنہیں اس نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ انہیں دیکھ کر وہ پہلے سے بھی زیادہ گھبرا گیا اور پہلے سے زیادہ پھرتی سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ بس..... یہ اس کی کل کہانی ہے۔ اگر آپ اس پر یقین کرنے کے لیے تیار ہیں تو پھر آپ کو اس بات کا بھی یقین آجانا چاہیے کہ وہ بے گناہ ہے۔ ویسے بھی..... آپ خود ہی سوچیں..... اسے پرنس سمیرا کو قتل کرکے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسانے کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے پاس تو پہلے ہی مسائل اور مصیبتوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔"

"پولیس اس طرح نہیں سوچتی" میں نے نرمی سے کہا "اگر ہم پولیس کے نکتۂ نظر سے سوچنے کی کوشش کریں تو دو امکانات نظر آتے ہیں جن کے تحت کامران، پرنس کو قتل کرسکتا تھا۔ ایک یہ کہ اب وہ قانونی طور پر پرنس کا شوہر بن چکا ہے۔ شاید اس کے دل میں لالچ آیا ہو کہ وہ پرنس کو قتل کرکے..... لیکن خود کو بے گناہ ثابت کرکے دس لاکھ سے کہیں زیادہ دولت و جائیداد حاصل کر سکتا تھا کیونکہ پرنس کے قریبی رشتے داروں میں ایک بڑی بہن کے سوا کوئی نہیں تھا جسے پہلے ہی والد کی جائیداد میں سے برابر کا حصہ مل چکا تھا۔"

صفیہ استہزائیہ انداز میں ہنس دی "اس تھیوری میں کئی جھول ہیں۔ غور کیجیے ہیں لیکن ہم صرف ایک دو موٹے موٹے نکتوں پر ہی بات کریں گے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس نے اگر ایسا کوئی منصوبہ بنایا تھا تو اس کے مطابق اسے خود کو بے گناہ ثابت کرنے کے لیے کچھ بندوبست رکھنا چاہیے تھا۔ جائے واردات پر موجود رہنا چاہیے تھا یا پھر وہاں سے اپنی عدم موجودگی کا کوئی ٹھوس ثبوت رکھنا چاہیے تھا۔ وہ تو اس کے بجائے وہاں اپنی موجودگی کے نشان چھوڑ آیا۔ اس دوران میں پرنس سمیرا اپنے منگیتر کو بھی فون پر بتا چکی تھی کہ کامران وہاں موجود ہے اور لاش دیکھنے کے بعد وہاں سے فرار ہو کر کامران نے اپنے آپ کو زیادہ مشکوک بنا لیا۔"

اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ گہری ہو گئی اور وہ ایک لمحے کے توقف کے بعد ذرا نرم لہجے میں بولی "سر! اگر وہ اتنا ہی ذہین و طرار اور ایسی خطرناک سازشیں تیار کرنے کا اہل ہوتا تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا۔ پھر وہ اتنا بدحال تھوڑا ہی ہوتا۔ وہ بھی کوئی بہت بڑا بزنس پھیلائے..... کوئی ایمپائر کھڑی کیے خود آرام سے بیٹھا ہوتا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ جو لوگ بڑے بڑے بزنس پھیلائے اور ایمپائر کھڑی کیے ہوئے ہیں وہ سب کے سب ذہین، تیز و طرار اور خطرناک سازشیں تیار کرنے کے اہل ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور ساتھ ہی واضح کیا "تمہارا یہ بیان ہتکِ عزت کے زمرے میں آتا ہے۔"

"ہرگز نہیں سر!" وہ بھی مسکراتے ہوئے بولی "میں سب کے بارے میں ایسا نہیں کہہ رہی لیکن کم از کم نوّے فیصد کے بارے میں میرا یہ دعویٰ درست ہے اور ضرورت پڑنے پر میں اسے کسی بھی عدالت میں ثابت کرسکتی ہوں۔"

"بہت خوب۔ تم ایک جرات مند لڑکی ہو" میں نے کہا۔

"لیکن اس جرات مندی نے بھی مجھے کچھ نہیں دیا" وہ قدرے بیزاری سے سر جھٹک کر بولی "خیر..... فی الحال ہم کامران کے بارے میں بات کریں گے۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ وہ اتنا ہوشیار اور نڈر ہوتا تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا اور اگر وہ چالاک اور بے خوف ہوتا تو پھر جائے واردات سے فرار ہو کر روپوش ہو کر، اپنے آپ کو اس قدر مشکوک بنا کر اتنی بڑی حماقت کا ثبوت نہ دیتا۔ آپ ذرا سوچیں افضل صاحب! کوئی شخص ایک ہی وقت بہت چالاک، بہت دلیر، بہت احمق اور بہت بزدل نہیں ہو سکتا۔"

"ہو بھی سکتا ہے" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "قدرت کے اس کارخانۂ عجائب میں بڑی بڑی عجیب چیزیں بھری پڑی ہیں۔ بہرحال میں تم سے بحث میں مزید وقت ضائع نہیں کروں گا۔ ہم پہلے ہی بہت سا وقت ضائع کرچکے ہیں۔ میں پولیس کی تھیوری کا دوسرا نکتہ تمہیں بتاتا چلوں۔ وہ یہ رائے بھی قائم کرسکتے ہیں کہ کامران نے کسی باقاعدہ سازش یا ارادے کے تحت پرنس کو قتل نہیں کیا ہوگا..... اور اگر وہ ایسا سوچے تو یہ اس کی مہربانی ہوگی کیونکہ اس طرح یہ قتلِ عمد اور سازشِ مجرمانہ کا کیس نہیں رہے گا بلکہ فوری اشتعال یا جذبات کے غلبے کے تحت کیا گیا قتل قرار پائے گا جس کی سزا کم ہوگی۔ نکتہ یہ ہوگا کہ تنہائی میں کامران کی نیت خراب ہو گئی ہوگی۔ وہ قانونی طور پر پرنس کا شوہر تھا۔ اس نے اپنے حقوق سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہوگی۔ پرنس نے مزاحمت کی ہوگی اور کامران نے غصے، اشتعال اور جذبات سے مغلوب ہو کر مجسمہ اٹھا کر اس کی کھوپڑی پر دے مارا ہوگا۔ یہ نکتہ عدالت کو بھی قرینِ قیاس محسوس ہوگا۔"

اس بار وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر یوں ہنسنے لگی جیسے میں نے کوئی بہت ہی بے وقوفانہ بات کہہ دی تھی۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے خفگی آمیز لہجے میں کہا "ایک بے گناہ لڑکی قتل ہو چکی ہے اور تم اس کے ذکر پر کھی کھی کررہی ہو۔"

"میں اس کے ذکر پر کھی کھی نہیں کررہی....." وہ منہ بنا کر بولی "ویسے آپ اس کے بے گناہ ہونے کا اتنے وثوق سے دعویٰ نہ کریں..... اور اگر وہ بے گناہ بھی رہی ہو تب بھی مجھے اس سے کوئی خاص ہمدردی نہیں ہے۔ وہ ایک دولت مند لڑکی تھی اور دنیا میں اس نے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ یہاں تو آئے دن ایسے کمسن، معصوم اور بے وسیلہ سے لوگ جرمِ بے گناہی میں مارے جاتے ہیں جنہوں نے زندگی میں کچھ نہیں دیکھا ہوتا، چھوٹی سے چھوٹی آسائش بھی جن کے لیے زندگی بھر ایک خواب رہی ہوتی ہے۔ ہم ان کا ماتم کریں، ان پر افسوس کریں یا ان بڑے بڑے عیش پرست مگرمچھوں کا غم دل پر لیں" اس کی سفاکانہ صاف گوئی کچھ تکلیف دہ سی تھی۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی" میں نے کہا "اگر کوئی دولت مند، آزاد اور خود مختار ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ اسے بغیر کسی قصور کے مار دیا جائے اور پھر اس پر اظہارِ افسوس بھی نہ کیا جائے۔"

"میں اس کے مارے جانے کی حمایت نہیں کررہی" وہ جلدی سے بولی "میں تو کسی کے بھی مارے جانے کے حق میں نہیں ہوں۔ بس..... مجھے اس کی موت کا کوئی خاص افسوس نہیں ہوا اس لیے میں افسوس کا اظہار نہیں کررہی ہوں۔ میں منافق نہیں ہوں۔ ہنسی مجھے آپ کے بیان کردہ مفروضے پر آئی تھی کہ کامران پر شیطان سوار ہو گیا ہوگا۔"

"اس میں بھی ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے بدستور اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں اور کامران ساتھ کھیل کود کر جوان ہوئے ہیں۔ جوانی کے بعد بھی ہم پہ کوئی خاص پابندیاں نہیں رہیں۔ ہمیں تنہائی میں میل ملاقات کے مواقع بھی حاصل رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے، کامران کے وجود میں کوئی بہت بڑا شیطان مقید نہیں ہے۔ وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے والا دھیما آدمی ہے۔ اس کے اندر کا شیطان بھی کچھ ایسا زیادہ شیطان نہیں ہے۔ ذرا ڈانٹنے اور بعض اوقات تو محض سخت نظروں سے گھورنے سے ہی قابو میں آجاتا ہے۔ اگر اس میں ایسی وحشت اور درندگی پائی جاتی تو اتنے عرصے کی رفاقت میں مجھے بھی ضرور اندازہ ہو جاتا۔"

"بہت خوب! تم نے تو اسے بہت اچھی طرح پرکھا ہوا ہے" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اس میں کیا شک ہے" وہ نظر چرائے بغیر بلا تامل بولی۔

چند لمحے کمرے میں خاموشی رہی۔ آخر میں نے گہری سانس لے کر کہا "خیر..... میں تو یہ پولیس کے متوقع خیالات بیان کررہا تھا۔ کامران کے بارے میں میری اپنی رائے بری نہیں ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں ابھی اس کے بارے میں کوئی رائے دے ہی نہیں سکتا کیونکہ میری اس سے صرف چند سیکنڈ کی ملاقات ہوئی ہے اور ظاہر ہے چند سیکنڈ میں کسی کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی جاسکتی۔"

"اس سے ملنے کے بعد یقیناً آپ کی رائے بہت اچھی ہو جائے گی۔ اس میں آپ کو کوئی خوبی نظر آئے یا نہ آئے لیکن آپ کم از کم اس بات کے ضرور قائل ہو جائیں گے کہ وہ کسی کو قتل کرنے کا اہل نہیں ہے" صفیہ وثوق سے بولی۔

"وہ ہے کہاں؟" میں نے اپنی دانست میں ایک بار پھر بے خبری میں داؤ لگایا مگر صفیہ بہت ہوشیار تھی۔

وہ مربیانہ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے مسکرائی "آپ بار بار مجھے چکر دے کر پوچھنے کی کوشش نہ کریں۔ میں ویسے ہی آپ کو بتا دوں گی۔ ظاہر ہے میں اسی لیے آپ کے پاس آئی ہوں کہ آپ کو اس کی بے گناہی کا یقین دلا سکوں۔ اس کے لیے اس سے ملنا بھی ضروری ہوگا..... لیکن اس سے پہلے میں آپ سے وعدہ لینا چاہتی ہوں کہ آپ ہر طرح سے اس کی مدد کریں گے۔ مردوں والا وعدہ۔"

"میں مردوں والا وعدہ کرنے کے لئے بالکل تیار ہوں" میں بے بلا تامل کہا "لیکن میں صرف اس شرط پر کامران کی مدد کروں گا کہ وہ بھی ایک مردوں والا کام کرے۔"

"وہ کیا؟" وہ چونکی۔

"وہ اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کردے" میں نے کہا۔

"اوہ۔" اس کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی "آپ ویسے ہی کہہ دیں کہ وہ اپنے گلے میں پھندا ڈال کر لٹک جائے۔ یعنی میں جو اتنی دیر سے آپ کے ساتھ مغز ماری کررہی ہوں۔۔۔ بلکہ اس موضوع کے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا بکواس کرگئی اس کا ذرہ برابر بھی فائدہ نہیں ہوا۔ پرنالہ وہیں بہہ رہا ہے۔ اگر اسے اس طرح اپنے آپ کو پولیس کے حوالے ہی کرنا ہوتا تو پھر مجھے آپ کے پاس آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

میں نے بڑے تحمل سے اس کی بات سنی اور نہایت نرمی سے کہا "تمہیں اس کی بے گناہی کا یقین ہے نا؟"

"ہاں" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بس۔۔۔ تو پھر جس طرح میں کہہ رہا ہوں اس طرح کرو۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کرتا یا اتفاقاً ان کے ہتھے چڑھتا تو کچھ اور بات ہوتی لیکن اب میں اسے پولیس کے حوالے کروں گا، یہ کچھ اور بات ہوگی۔ جب تک وہ روپوش ہے یا پولیس سے بھاگ رہا ہے اس وقت تک میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکتا کیونکہ اس طرح اس کی حیثیت ایک مفرور ملزم ہی کی رہے گی۔ اگر اس کا مستقل طور پر ہی بھاگتے رہنے کا ارادہ ہے تو پھر اسے میری مدد کی نہیں بلکہ جوتوں کی ایک نہایت مضبوط قسم کی جوڑی اور ایک آدھ ٹی ٹی یا ماؤزر وغیرہ کی ضرورت ہے تاکہ وہ ذرا دل جمعی سے اپنی دوڑ جاری رکھ سکے۔ اپنے تعاقب میں آنے والوں پر گاہے بہ گاہے دو چار فائر کرسکے۔ اسی طرح جواب میں چلنے والی کوئی گولی کسی دن اس کا کام تمام کردے گی اور قصہ ختم ہوجائے گا۔ ایک اور احمق بے گناہ کی کہانی انجام کو پہنچ جائے گی۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ میری ان باتوں کے جواب میں کچھ نہ بولی تو میں نے کہا "زمانہ خواہ کیسا ہی آن لگا ہے اور اچھی قدریں خواہ کتنی ہی پامال ہوچکی ہیں اس کے باوجود میں ہر کام کو صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میرا کسی کے بھی اندازوں سے زیادہ اثر رسوخ ہے اور روپے پیسے کے بل پر بھی میں بڑی آفت ڈھا سکتا ہوں، بڑی دھاندلی مچا سکتا ہوں، بڑے بڑے ناجائز کام کرسکتا ہوں لیکن میں ایسا کرتا نہیں ہوں۔ شاید اسی لیے بعض بہت اونچی جگہوں پر میرا بہت اعتبار قائم ہے۔ میں کچھ بھی کر گزروں، مجھ سے کچھ نہیں پوچھا جاتا۔ اس کے باوجود میری پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ میں اپنی حیثیت کو غلط طور پر استعمال نہ کروں۔ اس سے کوئی ناجائز فائدہ نہ اٹھاؤں۔ یہ بڑا حوصلے کا کام ہے۔ اس کے لیے بڑے صبر و ضبط، بڑی قوت برداشت اور بڑا ظرف درکار ہوتا ہے۔ ورنہ یہاں تو چوہے کو بھی ذرا سی طاقت مل جائے تو وہ دُم پر کھڑا ہوجاتا ہے۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" وہ ذرا الجھن سے بولی۔

"یہی کہ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ آؤٹ آف دی وے جاکر کوئی کام نہ کروں۔" میں نے جواب دیا "اگر میں نے کبھی آؤٹ آف دی وے جاکر کوئی کام کیا بھی ہے تو وہ بھی کسی ا[illegible] متکبر اور فرعون صفت شخصیت کو سبق سکھانے کے لیے یا پھر ایسے مجبور اور کمزور کی مدد کرنے کے لیے، جسے سیدھے طریقے سے اس کا حق دلانے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا تھا۔"

"یہ بھی تو ایسا ہی معاملہ ہے" وہ جلدی سے بولی۔

"نہیں۔ اس میں کوئی ایسی پیچیدگی یا مشکل نہیں ہے" [illegible] نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تمہیں یقین ہے کہ قتل کامران نے نہیں کیا۔ مجھے بھی پوری طرح یہ یقین آجانے دو۔ اور پوری طرح یہ یقین اس سے ملنے کے بعد ہی آسکتا ہے۔ اس کے بعد کوئی ایسا پیچیدہ اور مشکل مسئلہ نہیں رہ جاتا۔ وہ پولیس کے سامنے پیش ہونے سے ڈر رہا ہے۔۔۔ جب وہ میرے توسط سے پولیس کے پاس جائے گا تو اسے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔ کوئی اسے انگلی بھی نہیں لگائے گا۔ سب کے لیے آسانی ہوجائے گی۔ اس کے اپنے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر جائے گا۔ گویا ایک مصیبت سے نکل آئے گا۔ پولیس بھی اس کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد یکسوئی سے اصل قاتل کی تلاش میں لگ جائے گی جب کہ ذاتی دلچسپی کے تحت میں خود بھی اسی کوشش میں ہوں۔ عین ممکن ہے میں پولیس سے پہلے یہ کام کر گزروں۔"

وہ خاموش رہی تو ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "اب بھی قائل نہیں ہوئیں؟ لعنت ہے میری دلیل بازی پر۔۔۔!"

"یہ بات نہیں ہے۔۔۔" وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے مسکرائی "قائل تو میں ہوچکی ہوں۔۔۔"

"تو پھر الجھن کس بات کی ہے؟ چلو۔۔۔ مجھے کامران کے پاس لے چلو" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ پھر بھی ہچکچاہٹ کا شکار رہی تو میں نے کہا "تم بہت ذہین اور بہت تیز و طرار لڑکی ہو۔ اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آرہی؟ انسان کو جب کوئی جسمانی تکلیف ہوتی ہے تو وہ ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا۔ اسے سب کچھ بتا دیتا ہے۔ اس کے ہر سوال کا جواب دیتا ہے۔ اسی طرح جب انسان کسی وکیل کے پاس اپنا کیس لے کر جاتا ہے تو اس کیس کے سلسلے میں وہ اس سے کوئی بات نہیں چھپاتا، خواہ وہ مجرم ہی کیوں نہ ہو۔ وکیل تبھی اس کا کیس بہتر طور پر لڑ سکتا ہے جب اسے چھوٹی سے چھوٹی تفصیل معلوم ہو۔ میں بھی اس وقت کامران کے وکیلِ صفائی کا کردار ادا کرنے کی کوشش کررہا ہوں بلکہ ایک لحاظ سے میں وکیلِ صفائی سے کہیں زیادہ ذمے داریاں قبول کررہا ہوں لیکن اگر مجھ پر تمہاری بداعتمادی کا یہی عالم رہے گا تو پھر میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکوں گا۔ تم جاسکتی ہو اور کوئی دوسرا ہمدرد تلاش کرسکتی ہو۔"

جو فارمولا اپنی دانست میں صحیح اور کارگر سمجھتے ہوئے اس نے مجھ پر استعمال کرنے کی کوشش کی تھی، اس کے ذریعے تو وہ آسانی سے ایک نہیں، کئی ہمدرد تلاش کرسکتی تھی لیکن میری بات سن کر وہ بدکنے کے بجائے راہِ راست پر آگئی۔ اس کی ہچکچاہٹ دور ہوگئی۔ اور وہ گویا یکدم ہی واضح فیصلے پر پہنچ گئی۔

"ٹھیک ہے۔ آیئے میرے ساتھ۔۔۔" وہ گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اسے گاڑی میں بٹھا کر اس کی رہنمائی میں روانہ ہوا۔ خاصا طویل سفر کرنے بعد گاڑی جب سائٹ کی طرف جانے والی سڑک پر پہنچی تو میں نے کہا "کامران کہاں چھپا ہوا ہے؟"

"تھوڑی دیر میں آپ خود ہی دیکھ لیں گے" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ میں گہری نظر سے اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ چار دیواری سے باہر کی فضا میں وہ زیادہ خوبصورت اور دلکش دکھائی دے رہی تھی۔ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ لڑکی تھوڑی سی خوشحال ہوتی، اپنے آپ کو ذرا بہتر انداز میں سجانے سنوارنے اور اچھے پہناوے کی متحمل ہوسکتی تو اس کی شخصیت نہ جانے کتنی نکھر آتی۔ اس صورت میں وہ اور غضب ڈھاتی۔

حالانکہ میں نے صرف ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا تھا لیکن وہ اسی دوران میں شریر سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "دھیان سے ڈرائیو کریں، میری طرف کیا دیکھ رہے ہیں۔ اب دیکھنے کا کیا فائدہ؟"

"کیوں۔۔۔ اب کیا ہوگیا؟" میں نے پوچھا۔

"اب چڑیا اڑ چکی ہے۔"

"بہت جلد باز چڑیا تھی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"چڑیاں تو ایسی ہی ہوتی ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے تم نے اپنی پیشکش واپس لے لی ہے؟" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اسی وقت واپس لے لی تھی جب آپ کی اصول پسندی اور ذرا الگ قسم کے اندازِ فکر کے بارے میں آپ کا طویل لیکچر میری سمجھ میں آگیا تھا۔ میں اپنی ذات کے خول میں واپس لوٹ گئی ہوں۔ میں اب وہی پرانی صفیہ ہوں۔ وہ بس ایک رو تھی جس میں بہہ گئی تھی۔ اب میں اس رو سے نکل آئی ہوں۔"

میں اس کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا لیکن اس کے لہجے کی سنجیدگی کو محسوس کرسکتا تھا۔ مجھے گاڑی ایک جگہ روکنی پڑی تھی۔ [illegible] کا وقت تھا۔ موقع غنیمت جانتے ہوئے میں نے ایک بار پھر اس کے دمکتے چہرے کی طرف ایک نظر دیکھا اور پوچھا "گویا اب تم کسی اور کے پاس بھی وہ پیشکش لے کر نہیں جاؤ گی؟"

"نہیں۔۔۔ بس۔۔۔ اب تو دیکھا جائے گا۔ زندگی جس طرح گزرتی ہے گزار ہی لیں گے" وہ بے پروائی سے بولی۔

"پروگرام کی اس تبدیلی میں کامران کی طرف لوٹ جانا بھی شامل ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے۔ اس کے بارے میں از سرِ نو سوچوں گی۔ میں اس شخص سے بہت بیزار ہوچکی ہوں۔"

"وہ بچپن کی محبتوں کے قصے اور اس موضوع پر گائے گئے دردناک قسم کے گانے بھی تمہارے دل میں کوئی گداز پیدا نہیں کررہے؟"

"اس گداز سے مجبور ہوکر تو آپ کو ہر قیمت پر اس کی مدد پر آمادہ کرکے ساتھ لیے جارہی ہوں لیکن گداز آخر کب تک ساتھ دے گا؟ بچپن کو رخصت ہوئے بھی برسوں گزر چکے ہیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ میں بڑھاپے تک اس شخص کے ساتھ نہیں گھسٹ سکوں گی۔ مل جل کر منافقت کی زندگی گزارنے سے بہتر ہے کہ راستے بدل لیے جائیں۔ میں ابھی سے تھک چکی ہوں" اس نے واقعی تھکے تھکے سے انداز میں سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کرلیں۔

"تم تھکنے والی چیز تو نہیں لگتیں" میں نے ایک بار پھر کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں جسمانی تھکن کی نہیں، روح کی تھکن کی بات کررہی ہوں" وہ آنکھیں کھولے بغیر بولی۔

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی تو اس نے جلدی سے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ قدرے شوخی اور شرارت کی چمک اس کے چہرے پر عود کر آئی۔ آہستگی سے میری کہنی ذرا دباتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے میری طرف کو جھک کر بولی "آپ کو چڑیا کے اڑ جانے کا دکھ ہے کیا؟ کوئی پچھتاوا ہے؟"

"چڑیوں کے اڑنے کا کیا دکھ؟ چڑیاں تو ہوتی ہی اڑنے کے لیے ہیں۔ اب نہ سہی تو منٹ دو منٹ بعد انہیں اڑ ہی جانا ہوتا ہے۔۔۔ اور جہاں تک پچھتاووں کا تعلق ہے تو اپنی زندگی میں تو بہت سے پچھتاووں کا بہت بڑا انبار لگا ہوا ہے" میں نے فلسفیانہ انداز میں غیر واضح جواب دیا۔

"آپ پچھتاوے پالنے والے آدمی لگتے تو نہیں ہیں" اس نے میرے ہی انداز میں کہا۔

"صرف ایک بار مجھ سے مل کر میرے بارے میں رائے قائم کرنے کی کوشش نہ کرو" میں نے دردناک لہجے میں کہا اور ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی۔

"یہی بات میں بھی آپ سے کہہ سکتی تھی" اس کی شریر مسکراہٹ برقرار تھی۔ "ویسے دردناک زنانہ افسانوں کی ہیروئن اس موقع پر دوپٹے کا پلو انگلی پر لپیٹتے ہوئے کہتی ہے۔ شرجیل! اپنے دکھ مجھے دے دو۔۔۔ لیکن میں آپ سے یہ نہیں کہہ سکتی کیونکہ میرے اپنے دکھ ہی کچھ کم نہیں ہیں۔ مجھ سے انہی کا بار نہیں اٹھایا جاتا۔"

"میں تمہیں اس طرح کی کوئی بے ہودہ تکلیف دینا پسند بھی نہیں کرتا۔ ویسے بھی دکھ درد کوئی جامن یا بیر تو نہیں ہیں کہ اپنی جھولی سے نکال کر کسی اور کی جھولی میں ڈال دو۔ انسان کے کپڑوں

پر مٹی بھی لگ جائے تو آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔ دکھ درد تو بڑی ظالم چیز ہیں۔ یہ تو زہر کی طرح انسان کے خون میں سرایت کرجاتے ہیں" میں نے کہا۔

اس وقت تک سگنل کھل چکا تھا اور ٹریفک ذرا رینگنے لگا تھا۔ میں اس طرف متوجہ ہوگیا تاہم مجھے احساس تھا کہ وہ گردن موڑے بغور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے کندھے اچکائے اور ایک بار پھر پشتے سے ٹیک لگا کر ڈھیلے ڈھالے انداز میں بیٹھ گئی۔

"صفیہ! میرا دل کہتا ہے کہ تم کوئی بہت غضب کی چیز بنو گی" میں نے اچانک کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسی "ابھی تک تو بنی نہیں..... اور نہ ہی بننے کے کوئی آثار ہیں کیا بڑھاپے میں جاکر بنوں گی؟ یہ تو کچھ اسی قسم کی بات ہے جیسے فلموں میں بڈھے بڈھے کامیڈین ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں 'تم بڑے ہوکر کیا بنو گے۔'"

"بڑھاپے تک کا سفر تو تم بہت دیر میں طے کرو گی۔ تمہارے پاس ابھی بہت وقت ہے..... اور پھر کسی کی ذات اور حالات میں انقلاب آتے کیا دیر لگتی ہے؟ پلک جھپک کر کوئی دیکھتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے اس کے سامنے کوئی انسان نیا جنم لے کر کھڑا ہے۔ سر سے پاؤں تک..... روح سے جسم تک سب کچھ بدل چکا ہوتا ہے۔ میں حیرانی سے سوچ رہا ہوں۔ تم غربت میں اتنے غضب کی چیز ہو..... جب تمہارے حالات بدلیں گے تو کیا چیز بن جاؤ گی!"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے....." وہ ہنستے ہوئے بولی "حالات بدلنے تو دیں۔ ویسے مجھ میں مزید انقلابات کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن وقت کے بارے میں بھلا کوئی کیا کہہ سکتا ہے" پھر اس کے لہجے میں یک دم سنجیدگی سی آگئی "آپ کا وہ میری مدد والا وعدہ برقرار ہے نا؟"

"ہاں..... بھئی..... برقرار ہے۔ ابھی سے پوچھنے کی ضرورت پیش آگئی؟ ابھی تو ایک گھنٹا بھی نہیں گزرا۔ اتنی بے اعتباری ہے تو اسٹامپ پیپر پر لکھ دوں؟" میں نے کہا۔

"اسٹامپ پیپر سے زیادہ میرے لیے آپ کی زبان قابلِ اعتبار ہے" وہ کچھ مسرور سے انداز میں بولی۔

باتوں کے دوران بھی وہ مجھے راستہ بتانا نہیں بھولی تھی۔ ہاتھ کے اشارے سے وہ رہنمائی کرتی جارہی تھی اور ہم بس چلے ہی جارہے تھے۔ آخر کار میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "تم نے کہا تھا تھوڑی دیر میں ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ تمہاری لغت میں تھوڑی دیر کا مطلب کیا ہوتا ہے؟"

"بھئی غریبوں کی لغت میں وقت کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ وہ بے چارے بس میں لٹک کر ڈیڑھ دو گھنٹے میں بھی گھر پہنچتے ہیں تو یہی فرض کرلیتے ہیں کہ بہت جلدی پہنچ گئے" وہ اطمینان سے بولی "ویسے..... بس تھوڑا سا سفر اور رہ گیا ہے۔ جگہ جگہ ٹریفک جام اور رش کی وجہ سے سفر اور بھی لمبا لگ رہا ہے۔"

"اتنی دیر میں تو ہم حیدر آباد سے ہو کر آجاتے" میں نے کہا۔

"آپ یہی فرض کرلیں کہ آپ حیدر آباد جاکر واپس آرہے ہیں" اس نے گویا مجھے دلاسا دیا۔

"اور وہ بھی گدھا گاڑی پر.....!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

کافی دیر بعد ہم ایک نہایت دور افتادہ اور غریبانہ علاقے کے آخری سرے پر جاپہنچے۔ راستے میں ہم کئی ایسے مقامات سے گزرے جہاں گاڑی چلانا سرکس میں کمال دکھانے کے مترادف تھا۔ کئی جگہوں سے تو بڑی گاڑی کا گزرنا ہی محال تھا۔ راستے میں ایک جگہ بچوں کے غول بھی گاڑی کے پیچھے لگ گئے۔ وہ گویا اسے پیچھے سے پکڑ کر روکنے یا پھر اس کی چھت پر چڑھنے کے لیے کوشاں تھے۔ انہیں گویا ایک عرصے بعد کوئی دلچسپ مشغلہ ہاتھ آیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بڑے شہروں کے انتہائی پس ماندہ علاقوں میں اب اس قسم کے نظارے دیکھنے کو نہیں ملتے ہوں گے لیکن اب بھی کبھی نہ کبھی ان سے پالا پڑ ہی جاتا تھا۔ بہت سے عسرت زدہ مکانوں کے ٹوٹے پھوٹے دروازوں یا ٹاٹ کے پردوں وغیرہ کے عقب سے سہمے سہمے یا متجسس سے چہروں نے بھی جھانکا۔

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر مشین پسٹل کی موجودگی کا اطمینان کرتے ہوئے کہا "آج کل تو ایسے علاقوں کا رخ نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ ایک عجیب خلفشار برپا رہتا ہے۔"

"ڈر رہے ہیں آپ؟" وہ قدرے شریر سے لہجے میں بولی۔

"مجھے ڈر اپنا نہیں، تمہارا ہے" میں نے کہا۔

"میری آپ فکر نہ کریں" اس نے مجھے تسلی دی "جب خود اپنی کوئی فکر نہیں ہے تو آپ کو فکر میں دبلے ہونے کی ضرورت ہے۔"

"تم اتنے سفاکانہ انداز میں کوئی کھردری اور کرخت حقیقت منہ پر دے مارتی ہو کہ اسے قبول کرنا مشکل ہوجاتا ہے" میں نے کہا۔

"میرے ساتھ رہنے کا موقع ملا تو آپ عادی ہوجائیں گے" وہ اطمینان سے بولی "ویسے بر سبیلِ تذکرہ میں آپ کو بتادوں کہ علاقے کے جس حصے سے میں، میں آپ کو لارہی ہوں یہ خلفشار سے بچا ہوا ہے اور در حقیقت میں بھی اسی لیے اطمینان سے بیٹھی ہوں ورنہ میں اتنی بہادر نہیں ہوں جتنی نظر آنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ یہ ایک اور کھردری اور کرخت حقیقت ہے لیکن یہ میں آپ کے منہ پر نہیں مار رہی ہوں۔"

"اس نوازش کا بہت شکریہ" پھر میں نے گاڑی کو گڑھوں سے بچاتے ہوئے اردگرد کا جائزہ لینے کی کوشش کی "اس علاقے میں واقعی حالات ہمیشہ بہت خراب رہتے ہیں لیکن اس وقت سکون محسوس ہو رہا ہے۔ گلی کوچوں میں سوائے بچوں کے شور شرابے کے اور کوئی ہلچل محسوس نہیں ہو رہی۔ عجیب بات ہے۔"

"یہ شہر تو ایک بیکراں سمندر ہے لیکن یہ علاقہ بھی بجائے خود کسی سمندر سے کم نہیں۔ اس سمندر میں اس ٹکڑے کی حیثیت ایک جزیرے کی سی ہے۔ میں تمہیں لائی بھی محفوظ راستوں سے ہوں۔ ورنہ اب تک ہمیں راستے میں روکا جاچکا ہوتا اور گاڑی سمیت جو کچھ بھی تمہارے پاس ہے وہ چھیننے کی کوشش کی جاچکی ہوتی۔ مسلح لڑکوں کی ٹولیاں غولِ بیابانی کی طرح ہر طرف پھرتی رہتی ہیں" صفیہ نے بتایا۔

"لگتا ہے تمہیں تو یہاں کے بارے میں بہت معلومات ہیں" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"میرا یہاں اچھے اور برے حالات میں آنا جانا رہا ہے۔ اس علاقے کے کئی حصوں میں میرے کچھ عزیز و اقارب رہتے ہیں" اس نے جواب دیا "اور میں جہاں جاتی ہوں، بہت جلد وہاں کے بھید بھی لیتی ہوں۔"

"مجھے پہلے ہی اندازہ ہوچکا ہے تم بہت خطرناک چیز ہو۔ تم سے ہوشیار رہنا چاہیے۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"بہت زیادہ" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ پھر اس نے ایک درخت کے نیچے گاڑی روکنے کا اشارہ کیا اور بولی "اس سے آگے گاڑی نہیں جاسکے گی۔ ہمیں پیدل جانا پڑے گا۔"

"اوہ..... خدایا.....!" میں نے ٹھنڈی سانس لی "بالکل ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کامران علاقۂ غیر میں جاکر پناہ گزیں ہوگیا ہے۔"

"علاقۂ غیر جانے کی اب کیا ضرورت رہ گئی ہے۔ بہت سے بڑے علاقے اب اپنوں کے لیے علاقۂ غیر ہوگئے ہیں بلکہ تم علاقۂ غیر جاؤ تو وہاں شاید زیادہ اپنائیت کا احساس ہو۔" وہ تلخ لہجے میں بولی۔

میں نے گاڑی لاک کی اور اس کی رہنمائی میں ایک ایسی گلی میں داخل ہوا جو بظاہر گلی ہی معلوم نہیں ہو رہی تھی۔ اس کے بعد گلی در گلی کا ایک اور پر پیچ سلسلہ چل پڑا۔ کہیں گٹر کا پانی کھڑا تھا تو کہیں متعفن کوڑے کے انبار تھے۔ ان گلیوں میں بھی بہت سی متجسس اور شک زدہ نظروں نے ہمارا تعاقب کیا۔

کچھ دیر خاموشی سے چلنے کے بعد میں نے کہا "ان راستوں کو یاد رکھنا بھی تمہارا ایک کمال ہے۔"

اسے ان راستوں پر چلتے ہوئے گویا ذرا بھی الجھن نہیں ہو رہی تھی۔ وہ پلٹ کر مسکراتے ہوئے بولی "جب انسان کا کسی سے دلی تعلق ہوتا ہے تو اس میں ایسے کمالات پیدا ہوجاتے ہیں..... حالانکہ کسے کہ اسے ایسے کمالات اپنے اندر پیدا کرنے پڑتے ہیں۔"

"اس کے باوجود تم کہتی ہو کہ تمہیں کامران سے محبت نہیں

"ابھی تک تو محبت ہے....." وہ مسکرائی "لیکن میں اس محبت کو دل سے نکال دوں گی۔ اس محبت نے بچپن سے آج تک مجھے دکھ، پریشانیوں اور تکلیفوں کے سوا کچھ نہیں دیا۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ جب ہم چھوٹے تھے اس وقت کامران کو دوسرے لڑکوں کے ہاتھوں پٹنے سے میں بچایا کرتی تھی۔ جب کوئی کامران کو مارتا تھا تو میں جوتی اتار کر اس کی پٹائی لگاتی تھی۔ اس میں اپنا دفاع کرنے کی بھی صلاحیت نہیں تھی۔"

میں بے اختیار ہنس دیا۔ اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں..... بس مجھے ذرا اپنا بچپن یاد آگیا تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا آپ کے بچپن میں بھی ایسی کوئی محبت کرنے والی آپ کے ساتھ تھی؟"

"نہیں..... میں اتنا خوش نصیب نہیں تھا۔"

"اگر ایسا ہوتا تو آپ خوش نصیب نہیں، بدنصیب ہوتے۔" وہ منہ بنا کر بولی "اور اگر وہ لڑکی اب تک آپ کی محبت میں گرفتار چلی آرہی ہوتی تو شاید وہ بدنصیب ہوتی۔ بہرحال میں نے کم از کم اس ایک بدنصیبی سے تو پیچھا چھڑانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ ...... میں ایک کمزور اور بے وسیلہ سی لڑکی ہوں۔ میں کب تک ایک مرد کا سہارا تلاش کرنے کے بجائے اس کا سہارا بنی دنیا میں دھکے کھاتی پھر سکتی ہوں۔"

"گویا یہ محبت نہیں، بجلی رو ہوگئی۔ جب دل چاہا سوئچ آن کردیا۔ جب دل چاہا آف کردیا..... یا جب مناسب سمجھا، تاریں کہیں اور جوڑ دیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کیسی ہرجائی لڑکی ہو تم..... اور اپنے ہرجائی پن کے لیے بہانے تلاش کرتی ہو۔ شعروں کی آڑ لینے کی کوشش کرتی ہو۔ محبت میں ایسے بہانے نہیں چلتے۔"

"مجبوریاں سب کرادیتی ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "کوئی یقین سے نہیں کہہ سکتا، کہاں محبت کی حد ختم ہوتی ہے اور کہاں سے مجبوری کی سرحد شروع ہوتی ہے۔"

اس دوران میں ہم ایک ایسی گلی سے گزر رہے تھے جو گلی کے بجائے دو پہاڑیوں کے درمیان پیدا ہوجانے والی کسی دراڑ سے مشابہ تھی۔ اس گلی میں کوڑے کا ایک ڈھیر بھی راہ میں حائل تھا اور اس ڈھیر پر دو کتے بیک وقت ایک مردہ مرغی کو بھنبھوڑتے ہوئے اپنے اپنے حقِ ملکیت کا جھگڑا طے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اس نازک مقام کو عبور کرتے ہوئے ہمیں ان سے تقریباً مس ہو کر گزرنا پڑا۔ یہ ایک کراہیت انگیز تجربہ تھا۔ وہ نہایت ہی غیر معزز قسم کے کتے تھے اور بہت گندی حالت میں تھے۔ صفیہ ان میں سے ایک سے تقریباً مس ہوتے ہوئے گزرنے لگی تو اس نے کچھ زیادہ ہی کتے پن کا مظاہرہ کرتے ہوئے مرغی کی ٹانگ چھوڑ کر اس کی

ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی۔ شاید اسے یکایک مردہ مرغی کے بجائے زندہ مرغی کی ٹانگ سے دلچسپی پیدا ہوگئی تھی اور فی الحال اس نے صفیہ کی ٹانگ کو اس کا متبادل سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

صفیہ نہ تو خوف زدہ ہوئی اور نہ ہی اس نے عام لڑکیوں کی طرح دل دوز چیخ مار کر ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کی۔ وہ زنانہ جوتوں یا سینڈلوں وغیرہ کے بجائے نہایت پرانے سے جوگر پہنے ہوئے تھی۔ اس نے بڑی صفائی سے اپنی ٹانگ بچاتے ہوئے کتے کی ابھری ہوئی پسلیوں میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کی۔ وہ بے شک ایک فاقہ زدہ سا کتا تھا اور اس کی پسلیاں ابھری ہوئی تھیں لیکن بہرحال خاصا جسیم تھا۔ اس کے باوجود صفیہ کی ٹھوکر پڑنے پر وہ تقریباً ایک فٹ اونچا اچھل پڑا اور مردہ مرغی کو بھی بھول کر بلبلاتا ہوا بھاگ اٹھا۔

مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ میں نے مشین پسٹل نکال کر ہاتھ میں رکھتے ہوئے اس نازک مقام کو عبور کرنا بہتر سمجھا تھا لیکن میں جس کتے کے قریب سے گزرا تھا وہ دم دبا کر ایک طرف کو ہوگیا تھا۔ شاید یہ اس کی امن پسندی کا نتیجہ تھا کہ مردہ مرغی پوری اس کے حصے میں آگئی تھی۔ وہ جلدی سے دوسری طرف کو بھاگ گیا۔

صفیہ کنکھیوں سے میرے مشین پسٹل کو دیکھتے ہوئے بولی "اوہ..... تو آپ اس قسم کی چیزیں بھی رکھتے ہیں۔ گویا آپ خاصے مختلف قسم کے بزنس مین ہیں۔"

"بے شک۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ان مریل کتوں سے نمٹنے کے لیے یہ نکالنے کی کیا ضرورت تھی۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی "کہیں آپ ان لوگوں میں سے تو نہیں جو مچھر کو بھی توپ سے مارنے کی کوشش کرتے ہیں؟"

"نہیں..... ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میرے سلسلے میں اس قسم کی مبالغہ آرائی نہیں کی جاسکتی۔" میں نے مشین پسٹل واپس جیب میں رکھتے ہوئے کہا "لیکن میں کتوں کے معاملے میں اس قسم کی احتیاط کا ضرور قائل ہوں تاکہ معاملہ دور دور سے ہی طے ہوسکے۔ میں کتوں سے ہاتھا پائی کا قائل نہیں ہوں..... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ میں کتوں سے دست وگریباں ہونا پسند نہیں کرتا۔ میں خنجروں، تلواروں اور آٹو میٹک گنوں کا سامنا تو کرسکتا ہوں لیکن چالیس یا چودہ ٹیکوں کا تصور میرے لیے ہول ناک ہے..... بلکہ چالیس اور چودہ تو کیا..... میرے لیے ایک ٹیکے کا تصور بھی خوف ناک ہے۔"

"حیرت ہے!" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"ویسے تمہاری لات ماشاء اللہ کافی زوردار تھی۔ کتا ہوا میں اچھل گیا تھا۔" میں نے اسے داد دی۔

"اس میں میری نفرت کی قوت بھی شامل تھی۔" وہ بے نیازی سے بولی "مجھے ایسی ہر مخلوق سے نفرت ہے جو بلاوجہ ہر آتے جاتے انسان کی ٹانگ پکڑنے کی کوشش کرتی ہے۔"

دائیں بائیں عجیب وغریب مکانات کے سلسلے کو دیکھتے ہوئے "ابھی اور کتنی دور جانا ہے؟"

"بس اب تھوڑی دور رہ گیا ہے۔" وہ مسکرائی۔

"تمہاری یہ "تھوڑی دور" اور "تھوڑی دیر" بھی کسی سیاستدان کے وعدے سے کم نہیں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ویسے کامران نے پناہ کے لیے جگہ خوب ڈھونڈی۔ پولیس سال تک بھی اسے ڈھونڈتی رہے تو نہیں پاسکتی۔"

"ظاہر ہے اس بے چارے کو کسی ایسی ہی جگہ پناہ ملنی تھی۔ کسی فرضی نام پتے کے ساتھ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کرنے کی تو اس کی اوقات نہیں تھی۔" صفیہ بولی "ویسے ہم جیسے لوگوں کو پناہ دینے والے زیادہ تر ایسے ہی علاقوں میں رہتے ہیں۔ جب پولیس یا کوئی دشمن پیچھے لگا ہو تو ایسے ہی علاقوں میں رہنے والے دوست، ہمدرد اور شناسا آپ کے لیے اپنے گھروں کے دروازے کھول دیتے ہیں۔ دولت مندوں کے علاقوں میں رہنے والے تو آپ کے عزیز رشتے دار بھی ہوں اور آپ عام حالات میں بھی ان کے پاس جائیں تو ان کے دروازے مشکل سے ہی کھلتے ہیں۔ ہاں اگر آپ خود بھی دولت مند ہوں تو پھر بات دوسری ہے۔ کہتے ہیں نا..... مایا سے ملے مایا کر کر لمبے ہاتھ۔"

"کامران سے ملنے کی مہم خاصی بے ہودہ محسوس ہو رہی تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن تمہاری دلچسپ باتوں کی وجہ سے اس کی ناگواریوں کا احساس نہیں ہوا۔"

"آپ کے لیے یہ دلچسپ باتیں ہوں گی حالاں کہ حقیقت یہ ہے، میں دل کے پھپھولے پھوڑ رہی ہوں....." پھر وہ ایک گلی میں مڑتے ہوئے بولی "مبارک ہو، ہماری منزل آگئی۔"

وہاں کی گلیاں بغیر کھدائی کے بھی کچھ ایسی لگ رہی تھیں جیسے انہیں جگہ جگہ سے کھود ڈالا گیا ہے لیکن اب ہم جس گلی میں داخل ہوئے اس میں واقعی کھدائی کی گئی تھی۔ وہ بھی دوسری گلیوں کی طرح اتنی چھوٹی گلی تھی کہ کھدائی کے بعد وہاں صرف کھدائی ہی رہ گئی تھی، گلی غائب ہوگئی تھی۔ گلی کی کھدائی کر کے وہاں شاید پائپ ڈالا گیا تھا لیکن بعد میں شاید اس کام کا کوئی فائدہ نظر نہیں آیا تھا یا پھر کسی اور وجہ سے اسے ادھورا چھوڑ دیا گیا تھا۔ علاقے میں ویسے بھی سیوریج کا انتظام موجود نہیں تھا۔ شاید یہاں اسی حصے میں اس کے لیے کوئی ترکیب کرنے کی کوشش کی گئی تھی

تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس منصوبے کو اسی حالت میں چھوڑے عرصہ گزر چکا ہے اور اب دونوں طرف کے اونچے نیچے کچے پکے مکانوں میں رہنے والے مٹی کے انہی ڈھیروں پر سے خندق نما گڑھے کو پھلانگ کر ایک طرف سے دوسری طرف آجا رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی اس کام میں ماہر ہوچکے تھے اور بڑی عمر کے لوگ بھی خندق پھلانگ رہے تھے۔ یہاں بھی آس پاس سے گزرتے دو چار آدمیوں نے خاصی شک زدہ سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

یہ گلی شیطان کی آنت کی طرح لمبی تھی۔ اس میں بھی خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد صفیہ خندق پھلانگ کر دوسری طرف چلی گئی۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ ایک دروازے پر جا رکی تھی جس پر ٹاٹ کا پردہ جھول رہا تھا۔ اس دروازے کے قریب ایک بکری بھی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بڑی تمیزدار بکری معلوم ہوتی تھی۔ آنے جانے والوں کو راستہ دینے کے لیے سکڑ سمٹ کر ایک طرف کو ہو جاتی تھی۔

صفیہ نے پردہ ہٹا کر لوہے کے دروازے پر دستک دی تو اندر سے ایک کرخت نسوانی آواز نے پوچھا "کون ہے؟"

صفیہ نے اپنا نام بتایا تو چند لمحے بعد کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والی مضبوط کاٹھی کی ایک ادھیڑ عمر عورت تھی جس کی رنگت شاید کبھی سرخ وسفید رہی ہو مگر اب تانبے جیسی ہوچکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس نے جلدی سے آدھا چہرہ چادر میں چھپالیا اور سرگوشی میں صفیہ سے کچھ بات کرنے کے بعد واپس اندر چلی گئی۔ صفیہ نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا پھر اس نے اندر سے دروازے کا بولٹ چڑھا دیا۔

مکان گلی کی نسبت نشیب میں تھا اور اس کی چھت ٹین کی تھی۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ بارشوں میں اس علاقے کا اور ان مکانوں کا کیا حال ہوتا ہوگا لیکن اندر پہنچ کر جب میں نے غیر محسوس انداز میں ادھر ادھر دیکھا تو مجھے ایک خوش گوار حیرت ہوئی۔ گرد وپیش کی حالت دیکھ کر میں تصور نہیں کرسکتا تھا کہ اندر اتنی صفائی ہوگی۔ میرے خیال میں اس علاقے کی حالت اور اس مکان کی عسرت زدگی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے اس سے زیادہ صفائی کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سیمنٹ کا عام سا سیاہی مائل فرش بھی جھلملا رہا تھا اور ناہموار دیواروں پر چونا پھرا ہوا تھا۔

وہ لیبوٹری سی ساخت کا مکان معلوم ہوتا تھا اور پہلے کمرے کو حسبِ مقدور ڈرائنگ روم بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس میں مرمت شدہ کرسیاں اور ایک بوسیدہ تپائی رکھی تھی۔ فرش پر پلاسٹک کی دری بچھی ہوئی تھی۔ تپائی پر المونیم کا ایک پیالہ رکھا تھا جس سے ایش ٹرے کا کام لیتے ہوئے کسی نے اسے سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھر دیا تھا۔ شاید یہ کسی کے اضطراب مسلسل کی نشانی تھی۔

صفیہ نے اس کمرے سے آگے جائے بغیر ہی پکارا "کامران!

میں آئی ہوں۔"

دوسرے ہی لمحے بغیر پٹ کے درمیانی دروازے سے جو شخص برآمد ہوا اسے پہلی نظر میں تو میں پہچان ہی نہیں سکا کہ وہ کامران تھا۔ اس کی شیو کافی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گرد حلقے تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ سرخ سرخ آنکھوں اور میلے کچیلے کپڑوں کے ساتھ وہ کسی ایسے بن مانس سے مشابہ نظر آرہا تھا جو بم باری سے خوف زدہ ہو کر کسی غار میں جا چھپا تھا اور کئی دن بعد ڈرتے ڈرتے باہر آیا تھا۔ اس کی بائیں آنکھ وقفے وقفے سے پھڑک رہی تھی۔

"آخر تم انہیں ساتھ لے ہی آئیں.....!" وہ وحشت زدہ اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں صفیہ سے مخاطب ہوا۔ اس کے لہجے میں تشکر اور اطمینان کے بجائے شکوے اور بیزاری کا عنصر شامل تھا جیسے صفیہ نے مجھے ساتھ لا کر اس کے حق میں بہت برا کیا ہو۔ صفیہ نے ٹھنڈی سانس لے کر میری طرف دیکھا جیسے بہ زبان خموشی کہہ رہی ہو "دیکھا آپ نے.....؟ کیا یہ شخص اس قابل ہے کہ اس کے ساتھ کوئی نیکی کی جائے؟"

وہ شاید اس سے نمٹنا بھی جانتی تھی۔ تیکھے لہجے میں بولی "اگر تمہیں ان کے آنے سے اتنی تکلیف ہوئی ہے تو یہ واپس چلے جائیں گے۔ انہیں کوئی شوق نہیں تھا اس حسین مقام پر آنے کا..... میں منت سماجت سے انہیں لائی ہوں۔"

"یہ مجھے پولیس کے پاس لے جائیں گے۔" وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔ اس کے ذہن میں پولیس کا غیر معمولی خوف بیٹھا ہوا تھا۔ شاید کوئی نفسیاتی گرہ تھی۔ پولیس کے نام سے خوف زدہ تو اکثر ہی لوگ ہوتے تھے لیکن اس کی خوف زدگی میں کوئی خاص بات تھی۔ عام لوگوں کے سلسلے میں بھی یہ تضاد بڑا ستم ظریفانہ محسوس ہوتا تھا کہ مجرموں کے بجائے شرفا پولیس سے لرزہ براندام رہتے تھے۔

"یہ اگر تمہیں پھانسی دینے والے کسی جلاد کے پاس بھی لے جائیں تو چپ چاپ چلے جانا۔" صفیہ نے گویا بڑے خلوص سے اسے مشورہ دیا۔

کامران نے شاید اس کا مشورہ ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیا اور مجھ سے مخاطب ہوا "پولیس کو آپ نے میرے بارے میں بتایا تھا؟"

"مجھے یہ زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہاں صفدر منیر جو موجود تھا سب کچھ بتانے کے لیے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

"اوہ..... اسے تو میں بھول ہی گیا تھا۔" وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا "اگر وہ اس وقت وہاں آن پہنچا جب میں کھانے پینے کی چیزیں لے کر واپس آیا تھا اور پرنس سمیرا کی لاش کو دیکھ رہا تھا، تو وہ یقیناً مجھے پولیس کے حوالے کرنے کے لیے سر

دھوکے کی بازی لگا دیتا۔"

"میرا خیال ہے کسی کو بھی تمہارے سلسلے میں یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے پرسکون لہجے میں کہا "مجھے امید ہے تم خود اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا اچھی طرح فٹ کرنے کے بعد اپنی کسی حماقت کی بدولت پولیس کے سامنے پہنچو گے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے کچھ اور زیادہ الجھن اور وحشت سے میری طرف دیکھا۔ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

میں نے ملائمت سے کہا "اگر تمہاری ذہنی حالت یہ ہے کہ تم صفدر منیر کو بھولے ہوئے تھے تو پھر تمہارا اللہ ہی حافظ ہے۔ تم نے یہ غلطی تو کر ہی لی ہے کہ گھبراہٹ میں روپوش ہو گئے اور یوں اپنے آپ کو زیادہ مشکوک بنا لیا..... لیکن اب تم سے اس سے بھی بڑی کسی حماقت کی توقع کی جا سکتی ہے۔"

اس موقع پر صفیہ نے مداخلت کی "آپ دونوں کا کھڑے ہو کر ہی ساری بات چیت کرنا ضروری نہیں ہے۔ آپ بیٹھ بھی سکتے ہیں۔ کامران کی عقل تو ویسے بھی گھٹنوں میں ہے۔ زیادہ دیر کھڑے رہنے سے وہ بالکل ہی ٹخنوں میں چلی جائے گی۔"

کامران نے غصے سے صفیہ کی طرف دیکھا۔ شاید غصہ اور جھنجلاہٹ ہی اس کی آخری پونجی رہ گئی تھی لیکن صفیہ نے پلک نہیں جھپکائی۔ وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھتی رہی، گویا چیلنج کر رہی ہو کہ مجھے ڈانٹ کر دیکھو، میں تمہارے منہ پر گھونسا رسید کر دوں گی۔ کامران کچھ نہیں بولا۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں چشم تصور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اگر ان کی شادی ہو گئی اور کسی نہ کسی طرح اسے آٹھ دس سال گزر گئے تو پھر کیا عالم ہو گا۔

میں ایک غیر آرام دہ سی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کامران نے بھی میری تقلید کی لیکن اس کے بیٹھنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ذرا سے کھٹکے پر بدک کر بھاگ کھڑا ہو گا۔ میں نے اس کی حالت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "بہتر تو تھا کہ تم میرے ساتھ چلتے۔ تمہارے پاس اگر کوئی سامان ہے تو وہ لے لو۔"

"آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟" اس کے لہجے میں وحشت فوراً بڑھ گئی۔

"تم میرے ساتھ میرے ہوٹل چل سکتے ہو۔ وہاں ہم آرام سے بیٹھ کر پرسکون ماحول میں دو معزز انسانوں کی طرح بات چیت کر سکتے ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"اس جگہ میں کیا خرابی ہے؟" وہ اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں بولا۔

"خرابی تو کوئی نہیں..... بس مجھے تمہاری حالت دیکھ کر ترس آ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں یہاں اپنے آپ کو بہتر محسوس کر رہا ہوں۔" وہ بولا "یہاں مجھے تحفظ کا احساس ہو رہا ہے۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔"

اگر اس احمق کو اس علاقے اور اس ماحول میں تحفظ کا احساس ہو رہا تھا..... اور تحفظ کا احساس ہونے کے باوجود اس کا یہ عالم تھا تو پھر اسے اس کے حال پر ہی چھوڑ دینا ٹھیک تھا۔

اسی اثنا میں اندر سے ٹین کی ایک پرانی سی ٹرے میں چائے آ گئی۔ چائے کے ساتھ ایک پلیٹ میں کچھ بسکٹ بھی تھے۔ کچھ لمحے کے لیے بالکل خاموش رہا۔ دس بارہ سال کی ایک بچی جو ٹرے تپائی پر رکھ کر خاموشی سے واپس چلی گئی۔ ایک شخص قتل کے الزام سے بچنے کے لیے یہاں پناہ گزیں تھا اور اس کے مہمانوں کی حسب استطاعت خاطر مدارات ہو رہی تھی تو پھر یہ جگہ واقعی میرے فائیو اسٹار ہوٹل سے بہتر تھی۔

صفیہ مجھے چائے پیش کرتے ہوئے دھیمی اور معذرت خواہانہ سی آواز میں بولی "یہ سب کچھ آپ کے شایان شان نہیں لیکن....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"میری شان کی تم قطعاً فکر نہ کرو۔" میں نے کپ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا "میری کوئی شان نہیں ہے۔ شان ہوتی تو شاید میں تمہارا ساتھ میسر ہونے کے باوجود یہاں تک نہ پہنچ پاتا۔" میں نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔ کامران نے بھی چائے کی چسکیاں لینے لگا۔ اسی دوران میں اس نے سگریٹ سلگائی۔

"آپ میری مدد کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں؟" اس نے شکی سے لہجے میں پوچھا۔

"ظاہر ہے..... اور کیا تمہارے خیال میں میں تم سے کسی فلاحی تنظیم کے لیے چندہ مانگنے آیا ہوں؟"

"میں آپ کو پہلے ہی بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں جواباً آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکوں گا۔ میں شاید کسی بھی شکل میں آپ کے احسان کا صلہ نہ دے سکوں۔ میں بہت غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے۔"

"اچھا..... ؟ حیرت ہے!" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "میں تو یہی سمجھ کر یہاں آیا تھا کہ ایک ارب پتی شخص یہاں چھپا ہے اور میں جا کر اس کی مدد کروں گا تو وہ خوش ہو کر کروڑوں کا نذرانہ میری خدمت میں پیش کرے گا۔"

صفیہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی "آپ نے موصوف کو ویسا ہی پایا ہو گا جیسا سنا تھا؟"

"اس سے بھی کچھ بڑھ کر۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ کامران ایک ہینڈسم نوجوان تھا لیکن عقل کی طرف سے واقعی بے چارے کا ہاتھ خالی معلوم ہوتا تھا۔

"آپ دونوں کو میرا مذاق اڑانے کی ضرورت نہیں۔" وہ تیزی سے بولا "کیا یہ بہتر نہیں کہ انسان ہر معاملے میں اپنی پوزیشن پہلے ہی واضح کر دے؟ ہو سکتا ہے افضل صاحب بغیر کسی غرض کے میری مدد کے لیے آئے ہوں لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تو اس میں بے وقوفی والی کیا بات ہے؟ آج کل کون کسی کے لیے اتنی بڑی بڑی پریشانیاں مول لیتا ہے؟ کم از کم میں نے تو کسی کو کسی کے لیے اس قسم کی زحمت اٹھاتے نہیں دیکھا اس لیے میرا پریشانی میں مبتلا ہونا بجا ہے۔ میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ افضل صاحب جیسے امیر آدمیوں کے پاس تو کسی سے فالتو بات کرنے کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا۔ یہ بھلا مجھے اتنے سنگین مسئلے سے نکالنے کے لیے اتنی خواری کیوں اٹھاتے پھر رہے ہیں؟"

"دراصل میں تھوڑا سا پاگل ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے....." وہ کندھے اچکا کر بولا "آپ بات کو مذاق میں ٹالنا چاہتے ہیں تو ٹال دیجیے، لیکن آپ بعد میں مجھ سے شکوہ نہیں کر سکتے کہ میں نے اپنی مفلسی کے بارے میں آپ کو نہیں بتایا تھا۔ اسی مفلسی کو دور کرنے کے لیے میں اس احمقانہ چکر میں پڑا تھا۔ اس میں بھی لینے کے دینے پڑ گئے۔ اب آپ بتائیے آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

"صرف سچائی۔" میں نے اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"سچائی یہ ہے کہ میں نے پرنس سیمرا کو قتل نہیں کیا۔" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔

"کون کہہ رہا ہے کہ تم نے اسے قتل کیا ہے؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"پولیس تو یہی سمجھ رہی ہے اور اخبارات میں بھی آ گیا ہے۔" وہ بولا۔

"ظاہر ہے، انہیں تو نتیجہ اخذ کرنا تھا۔ وہ لوگ ظاہری حالات سے نتیجہ اخذ کرتے ہیں۔" میں نے کہا "اس میں ان کا قصور نہیں ہے۔ بہرحال یہ نہ تو حرفِ آخر ہے اور نہ ہی عدالت کا فیصلہ ہے۔ ابھی تو اسے ثابت کرنے کا مرحلہ باقی ہے۔"

"پولیس کے لیے کچھ بھی ثابت کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ خصوصاً ہم جیسے بے یار و مددگار لوگوں کے معاملے میں۔" وہ زہریلے انداز میں مسکرایا۔

"میرے ہوتے ہوئے یہ ان لوگوں کے لیے کچھ ایسا آسان کام نہیں ہو گا..... اور میرے ہوتے ہوئے تم اپنے آپ کو بے یار و مددگار بھی مت سمجھو۔" میں نے اسے تسلی دی "تم شروع سے آخر تک سب کچھ مجھے بتا دو۔ شرط صرف یہی ہے کہ اس میں جھوٹ کی ذرا سی بھی آمیزش نہ کرنا۔"

"مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے....." وہ قدرے ناگواری سے بولا "میرے تو سچ پر بھی کوئی یقین نہیں کرے گا، جھوٹ تو بعد کی بات ہے....."

پھر اس نے دھیرے دھیرے جو کچھ مجھے بتایا وہ کم و بیش وہی تھا جو میں صفیہ کی زبانی سن چکا تھا۔ صفیہ نے بڑے اچھے طریقے سے تمام جزئیات کے ساتھ ساری بات مجھے بتائی تھی۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے پوچھا "سارا پس منظر معلوم ہونے کے باوجود کیا تمہیں پرنس سیمرا کی پیشکش عجیب نہیں لگی تھی؟"

"عجیب..... ؟ ارے صاحب! مجھے تو اس پر یقین ہی نہیں تھا لیکن انسان کی ضرورتیں اسے عجیب عجیب باتوں پر یقین کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں۔ وہ طرح طرح کے خواب دیکھنے لگتا ہے..... یا پھر اسے ایک طرح کا لالچ سمجھ لیجیے۔ انسان بنیادی طور پر لالچی ہے۔ بچپن سے ہمیں لالچ سے بچنے کی تلقین کی جاتی ہے۔ طرح طرح کی سبق آموز کہانیاں سنائی جاتی ہیں لیکن لالچ ہے کہ ہماری فطرت سے نکل کر ہی نہیں دیتا۔ آپ نے دیکھا نہیں..... کہ لوگ سب سے زیادہ انہی اسکیموں سے بے وقوف بنتے ہیں جن میں انہیں ان کی توقعات سے زیادہ کچھ دینے کا لالچ دیا جاتا ہے۔ ایسی اسکیموں سے لوگ ایک بار نہیں، بار بار بے وقوف بنتے ہیں۔ حالاں کہ ذہن کے کسی تاریک گوشے میں یہ وہم موجود ہوتا ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا..... یہ جو پیشکش کی جا رہی ہے، یہ ممکن نہیں ہے۔ اس کے باوجود انسان اس پر عمل کرتا چلا جاتا ہے۔ لالچ انسان کے خمیر میں ہے....." جذبات سے اس کے چہرے پر سرخی آ گئی تھی۔

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "یہ جو ہمارے ملک میں لوگ لیڈروں کی پوجا کرتے ہیں، ان کے پیچھے جانیں دینے کو تیار رہتے ہیں، اس کے پیچھے بھی بنیادی طور پر دو ہی جذبے کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک تو ہر انسان کو ہیرو ورشپ کے لیے بہرحال کوئی نہ کوئی شخصیت چاہیے ہوتی ہے۔ وہ پسندیدگی کے بہت سے جواز گھڑ لیتا ہے، اس کے بے ہودہ فلسفوں کو سینے سے لگا کر پرستش شروع کر دیتا ہے لیکن اس کے متوازی دوسرا جذبہ لالچ ہی کا چل رہا ہوتا ہے۔ لاشعور میں کہیں یہ امید موجود ہوتی ہے کہ اگر اس شخص کو سارے اختیارات مل گئے تو ہمارے گھر میں بھی دودھ، شہد کی نہریں بہنے لگیں گی۔ حالاں کہ ایسا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ پرنالہ وہیں بہتا ہوتا ہے لیکن یہ بات کسی کے سمجھانے سے سمجھ میں نہیں آتی۔ یہ بھی لالچ کی ایک قسم ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا مگر صفیہ نے اسے ڈانٹا "تم تقریر مت جھاڑو۔ یہ تقریر کا وقت نہیں ہے۔ صرف کام کی بات کرو۔"

اس نے مجروح سی نظر سے صفیہ کی طرف دیکھا پھر گہری سانس لے کر بولا "پرنس سیمرا کی پیشکش تو خیر کچھ ایسی بے بنیاد اور کھوکھلی بھی نہیں تھی۔ میں تو صرف اپنی بات کر رہا ہوں کہ میں لالچ کے تحت اس پر آمادہ ہوا تھا ورنہ اس کا مقصد تو مجھے دھوکا دینا یا وعدہ خلافی کرنا نہیں تھا۔ وہ تو اپنی پیشکش کے بارے میں بالکل سنجیدہ تھی اور مجھے یقین ہے کہ اگر وہ بے چاری قتل نہ ہوتی تو کام پورا ہوتے ہی وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر دس لاکھ میرے ہاتھ پر

رکھ دیتی۔ وہ بھی ضرورت مند تھی، میں بھی ضرورت مند تھا۔ ہماری ضرورتوں کی نوعیت مختلف تھی لیکن بہرحال دونوں ضرورت مند تھے اور دونوں خلوص سے اپنی اپنی جگہ معاہدہ نبھانا چاہتے تھے۔"

"یہ شادی کرانے میں خود سیمرا کا منگیتر پیش پیش تھا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ سارے انتظامات اسی نے کئے تھے۔" کامران نے جواب دیا "نکاح کو رجسٹر ہونے اور نکاح نامہ ملنے میں چند دن لگتے ہیں لیکن اس نے یہ کام بھی چوبیس گھنٹے کے اندر اندر کرالیا تھا۔"

"لیکن اسے یہ بات بہرحال پسند نہیں تھی کہ تم پرنسس سیمرا کے قریب رہو؟"

"پسند۔۔۔؟" وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسا "مجھے یقین ہے اگر میں اس کے سامنے پرنسس کا ہاتھ پکڑ لیتا تو وہ فوراً میرے ہاتھ قلم کرنے کی کوشش کرتا۔ حالاں کہ خود پرنسس کا رویہ میرے ساتھ خاصا دوستانہ تھا۔۔۔"

اس نے ایک نظر صفیہ کی طرف دیکھا اور جلدی سے صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا "لیکن ظاہر ہے میں صفیہ سے بے وفائی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

"شکریہ۔۔۔ شکریہ۔" صفیہ پھنستے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

"مطلب یہ کہ تم ایمان داری سے بتا رہے ہو کہ پرنسس پر تمہارا دل خراب نہیں ہوا تھا؟" میں نے صاف طور پر وضاحت چاہی۔

اس نے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ سے ایسے سوال کی توقع نہ رہی ہو۔ پھر وہ تھوک نگل کر بولا "ایسا بھلا کیسے ہو سکتا تھا؟ میں اس سے بہت زیادہ مرعوب تھا اور جس سے انسان بے پناہ مرعوب ہو اس کے بارے میں کوئی ایسا ویسا خیال دل میں کیوں کر آسکتا ہے؟"

"خیال آنے پر تو کوئی بھی پابندی نہیں لگا سکتا۔" میں نے کہا "ہاں۔۔۔ البتہ تم یہ کہہ سکتے ہو کہ اس خیال کے تحت کچھ کرنے کی جرات نہیں ہو سکتی۔"

"چلئے آپ ایسا ہی سمجھ لیجئے۔" وہ قدرے تیکھے لہجے میں بولا۔

"میرے سوالوں پر ناگواری محسوس مت کرو۔" میں نے مشورہ دیا "اگر تمہارے خیال میں میرے سوالات مناسب نہیں ہیں تو اس وقت کا انتظار کرو جب تمہیں پولیس کے سوالوں کے جواب دینے ہوں گے۔ ان کا سوالات کرنے کا انداز تو پھر کچھ اور ہی ہوتا ہے نا۔۔۔ یوں سمجھو میں اس معمولی ٹیسٹ کے ذریعے تمہیں ایک بڑے امتحان کے لیے تیار کر رہا ہوں۔"

میری یہ بات اس کے لیے کچھ ایسی خوش کن نہیں تھی۔ اس کی رنگت ایک لمحے کے لیے پھیکی پڑ گئی۔ میں نے جلدی سے اسے اگلے سوال میں الجھانے کی غرض سے کہا "تم نے بتایا کہ دو تین فون کالز آنے کے بعد پرنسس نے تمہیں کھانے پینے کا سامان لینے کے لیے بھیجا تھا۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ وہ کن لوگوں کے فون تھے؟"

"ایک تو صفدر منیر ہی کا تھا۔ وہ غالباً کسی کام کے سلسلے میں کہیں پھنسا ہوا تھا لیکن جب اس نے سنا کہ میں پرنسس کے پاس موجود ہوں تو وہاں آنے پر تل گیا لیکن وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ کس وقت پہنچے گا۔۔۔"

"اس بے چارے نے اپنی منگیتر سے تمہاری دکھاوے کی شادی تو کرادی تھی لیکن اسے تمہاری طرف سے اطمینان نہیں تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کی بے اطمینانی کا مطلب تو یہ ہوا کہ اسے اپنی منگیتر کی طرف سے بھی اطمینان نہیں تھا۔ چلو اسے مجھ پر تو اعتماد نہیں تھا لیکن کیا اپنی منگیتر پر بھی اعتماد نہیں تھا؟" کامران بولا پھر اس نے جواب کا انتظار کئے بغیر صفیہ کی طرف دیکھا "مجھے تو صفیہ پر اندھا اعتماد ہے۔ یہ خواہ کہیں بھی ہو، کسی کے بھی ساتھ ہو، میں تو کوئی ایسا ویسا خیال دل میں نہیں لاؤں گا۔"

میں نے صفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں اپنی کرسی پر کسمسا کر رہ گئی۔ میں کامران کو نہیں بتا سکا کہ جس صفیہ کے بارے میں وہ اس قسم کے جذبات کا اظہار کر رہا تھا وہ کچھ دیر پہلے تک داشتہ بننے کے لیے کسی بہت موٹی اسامی کی تلاش میں تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اب تک اس کے گراں قدر خیالات میں کوئی اور انقلاب آچکا تھا یا نہیں۔۔۔ لیکن اگر اس کے یہ خیالات برقرار بھی ہوتے تب بھی میں اسے قابلِ ملامت نہیں سمجھ سکتا تھا جس کی کئی وجوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ مجھے خود اپنے بارے میں پارسائی کے دعوے نہیں تھے۔ دوسرے یہ کہ میں کسی کی نجی زندگی میں دخل اندازی تو کیا، اس کے بارے میں رائے زنی کو بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ تیسرے صفیہ کا اپنا فلسفہ بھی قابلِ غور تھا۔ وہ نہ جانے کن کن صبر آزما مرحلوں سے گزری تھی۔ آخر کبھی تو انسان کی قوتِ برداشت جواب دے ہی جاتی ہے۔

میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "تم اپنا اور ان کا موازنہ مت کرو۔ یہ بتاؤ کہ تمہیں مزید کچھ اندازہ ہوا کہ پرنسس اور صفدر کے درمیان کیا گفتگو ہوئی؟"

"میرا خیال ہے، ان کے درمیان جلد ہی کسی بات پر تیزی و تندی سے بحث و تمحیص شروع ہو گئی تھی۔ پرنسس کا انداز صفدر کو ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا سا تھا۔" کامران نے بتایا "لیکن میں کچھ زیادہ نہیں سن سکا اور نہ ہی گفتگو کے بارے میں کچھ اندازہ لگا سکا کیوں کہ میں اعلیٰ اخلاقیات کا مظاہرہ کرتے ہوئے باہر چلا گیا تھا تاکہ پرنسس اطمینان سے بات کر سکے۔"

"اوہ۔۔۔!" میں نے بے اختیار اظہارِ افسوس کیا "اور کس کس کا فون آیا؟"

"ایک شاید کوئی جمشید کریم تھا۔ پرنسس نے اس کا نام دہرایا تھا۔ اس سے پرنسس امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں کوئی بات کر رہی تھی۔ پرنسس اس پر بھی خوب ناراض ہو رہی تھی۔"

"اور تم ایک بار پھر باہر چلے گئے ہو گے؟" صفیہ نے لقمہ دیا۔

"ظاہر ہے۔۔۔" کامران نے جواب دیا "یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ فون پر کسی کی کسی سے نجی گفتگو چل رہی ہو یا بات کرنے والے ایک دوسرے پر برہم ہو رہے ہوں اور آپ اس کے سر پر بیٹھے رہیں۔"

مجھے یاد آگیا تھا، جمشید کریم امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن میں پرنسس کا پارٹنر تھا جسے پرنسس اس وقت تک جانتی بھی نہیں تھی جب میں اس سے ملا تھا۔ اسی فرم نے کوڑل جان کڑیالی کو پریشانی میں مبتلا کیا تھا اور اسی کی وجہ سے میں پرنسس سے متعارف ہوا تھا۔ اس پر پرنسس کا برہم ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔

کامران میرے اگلے سوال کا انتظار کئے بغیر بولا "ایک اور فون کسی جمال سعیدی نامی شخص کا آیا تھا۔ اس وقت میں پرنسس کے بیڈ روم میں تھا۔۔۔"

صفیہ نے بری طرح چونک کر کامران کی طرف دیکھا "بیڈ روم میں۔۔۔؟" وہ یہ الفاظ دہرائے بغیر نہ رہ سکی۔

کامران نے اس کی طرف دیکھا۔ پہلی بار میں نے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی ایسی مسکراہٹ ابھرتے دیکھی جو اعصابی تناؤ کی پیداوار نہیں تھی۔ وہ متاسفانہ سے انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "خدا کی پناہ۔۔۔! تم لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہونے کے بہانے ڈھونڈتے پھر رہے ہو۔ بھئی پرنسس خود اس وقت ہال میں ہی تھی۔ اس نے ایک نوٹ بک اٹھا کر لانے کے لیے مجھے بیڈ روم میں بھیجا تھا۔ تم لوگ اپنا ذہن ادھر ادھر لے جانے کی کوشش مت کرو۔ میں تو اپنے آپ کو اس کا نوکر سا محسوس کر رہا تھا۔ تمہیں معلوم ہے ایک نیا نیا نوکر اپنی مالکن کے سامنے کیسا مرعوب رہتا ہے اور جہاں مرعوبیت کا رشتہ ہو وہاں کوئی ایسی ویسی بات بھلا دل میں کیسے آسکتی ہے؟" وہ گویا صفیہ کے سامنے صفائی پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تمہیں۔۔۔ یہ ضروری نہیں ہے۔" صفیہ کندھے اچکا کر بولی "اگر نوکر کسی دار ہو یا مالکن مہربان طبیعت کی مالک ہو تو ابتدائی دنوں میں بھی بہت کچھ ہو سکتا ہے۔"

"لیکن تمہیں معلوم ہے کہ یہاں دونوں ہی باتیں نہیں تھیں۔" کامران جلدی سے بولا۔

میں نے اس وقت مداخلت بہتر سمجھی اور پوچھا "کچھ اندازہ ہے، جمال سعیدی کون تھا اور اس سے کس طرح کی گفتگو ہو رہی تھی؟"

"اس سے بھی پرنسس کا کوئی کاروباری تعلق ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس پر بھی پرنسس سخت برہم ہو رہی تھی لیکن بات زیادہ اونچی آواز میں نہیں کر رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ پر قابو رکھنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن بہرحال وہ اس سے بھی برہم تھی۔ شاید وہ اس کا برہمی کا ہی دن تھا۔"

"تم اپنی سناؤ۔۔۔ تم پر بھی برہم ہوئی یا نہیں؟" صفیہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مجھ پر برہم ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی تاہم وہ مجھ پر کچھ ایسی مہرباں بھی نہیں تھی۔ بس رسمی سا رویہ تھا اس کا۔۔۔" پھر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پُرخیال سے لہجے میں بولا "ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بہت سے تفکرات میں گھری ہوئی تھی لیکن ذہن بٹانے کے لیے اپنے آپ کو کام میں الجھائے ہوئے تھی۔ وہ کچھ زیادہ ہی شدومد۔۔۔ شاید میں غلط کہہ رہا ہوں۔۔۔ وہ کچھ زیادہ ہی جوش و خروش سے کام میں جتی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے اسے کوئی ڈیڈ لائن ملی ہوئی تھی۔ اسے کسی مقررہ وقت سے پہلے پہلے بہت سا کام مکمل کر کے دینا تھا۔ میں نے تو اس سے پوچھ بھی لیا کہ کیا ایسی کوئی بات تھی۔ اس کا جواب نفی میں تھا۔ اس نے بتایا کہ جب اس پر کام کا جنون سوار ہوتا تھا تو وہ اسی طرح کام کرتی تھی۔ اس نے اس کے لیے انگریزی کی اصطلاح CREATIVE FRENZY بھی استعمال کی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس تخلیقی جنون کے دوران میں خاصی تکلیف میں رہتی تھی۔ اسی لیے اس پر اس وقت چڑچڑا پن غالب تھا۔۔۔"

وہ کچھ الجھن آمیز سے انداز میں خاموش ہو گیا۔ میں منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "مجھے تخلیقی کام کرنے والوں کو قریب سے دیکھنے کا زیادہ تجربہ تو نہیں۔۔۔ ایسے لوگوں کو کام کرتے دیکھنے کا بھی کوئی خاص اتفاق نہیں ہوا۔۔۔ لیکن میرا خیال پھر بھی یہی ہے کہ پرنسس اس وقت تخلیق کے جنون یا تخلیق کی اذیت میں مبتلا نہیں تھی۔ اسے کچھ اور طرح کی پریشانیاں لاحق تھیں۔ وہ فکر مند تھی۔"

"بہرحال۔۔۔ تمہاری موجودگی میں کوئی اس سے ملنے نہیں آیا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں۔" اس نے نفی میں سرہلایا "پھر جب میں کھانے پینے کی چیزیں لے کر واپس آیا اور میں نے اسے مردہ دیکھا تو میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ سب سے پہلا خیال مجھے یہی آیا کہ یہ کوئی بہت بڑی اور پُرپیچ سازش تھی جس کے لیے مجھے پھنسایا گیا تھا۔ میں قربانی کا بکرا تھا۔ اکثر بڑے لوگوں کے قتل کی سازش میں قربانی کے بکرے ہی پھنستے ہیں۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مناسب امیدوار کی تلاش کا اشتہار، جائداد کی وراثت کا قصہ اور دوسری سب باتیں محض کسی ڈرامے کا حصہ تھیں۔ کسی کا اصل مقصد شاید پرنسس کو قتل کرنا ہی تھا اور پھانسی کا پھندا فٹ کروانے کے لیے ایک عدد گردن کی ضرورت تھی۔ میری گردن اسی کام آنی

تھی۔ بس یہی سوچ کر میں سر پہ پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگا۔۔۔۔ اور اب کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے میرا خیال صحیح ہی تھا۔ پولیس کو سرگرمی سے اب صرف میری ہی تلاش ہے۔"

"نہیں اصل میں قاتل کی تلاش ہے اور تم اس سلسلے کی پہلی سیڑھی ہو۔" میں نے کہا۔

"ارے صاحب! مجھے ان طفل تسلیوں سے بہلانے کی کوشش مت کیجئے۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولا "میں کہیں باہر سے نہیں آیا ہوں۔ میں اسی ملک کا ایک شہری ہوں اور اس طبقے سے تعلق رکھتا ہوں جو پولیس کو زیادہ بہتر طور پر جانتا ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے انہیں کس لیے میری تلاش ہے۔"

"نہیں، تمہیں معلوم نہیں ہے۔" میں نے نرمی سے کہا "تمہیں اس وقت معلوم ہو گا جب تم میرے ساتھ پولیس کے پاس چلو گے۔ ان کا رویہ تمہاری توقعات کے بالکل برعکس ہو گا۔"

وہ مبہم سے انداز میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "اپنی بہن کو تم نے کہاں چھوڑا ہے؟"

اس نے صفیہ کی طرف دیکھا مگر کوئی جواب نہ دیا۔ میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس نے اپنی بہن کو صفیہ کے ہاں چھوڑا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ٹین کی چھت والے اس کمرے کا جائزہ لیا اور پوچھا "تم اس وقت سے یہیں ہو؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا "یہ کس کا گھر ہے؟"

"کیا یہ جاننا ضروری ہے؟" اس نے جواب دینے کے بجائے الٹا سوال کر دیا۔

"کیا یہ چھپانا ضروری ہے؟" میں نے اسی کے سے انداز میں پوچھا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد گویا بادلِ ناخواستہ بولا "میرے ایک مزدور ٹائپ دوست کا ہے۔ وہ قریبی سیمنٹ فیکٹری میں کام کرتا ہے۔ اس وقت وہیں گیا ہوا ہے۔ بال بچے دار آدمی ہے۔ میرے ساتھ خواہ کچھ بھی ہو جائے لیکن میں چاہوں گا کہ کسی بھی سلسلے میں اس کا نام تک نہ آئے۔"

"مطمئن رہو۔ کم از کم میرے ذریعے نہیں آئے گا۔" میں نے اسے تسلی دی پھر کہا "کوئی اور خاص بات جو تم مجھے بتانا چاہو؟"

اس نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا "ہاں۔۔۔۔ ایک بات میں آپ کو بتانا چاہوں گا۔ یہ مجھے پہلے اہم محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اب یہ مجھے کھٹک رہی ہے۔ بار بار خیال آ رہا ہے کہ شاید اس کی کوئی اہمیت ہو۔۔۔۔"

وہ الجھن آمیز سے انداز میں خاموش ہو گیا۔ یقیناً اس کا مقصد سسپنس پیدا کرنا نہیں تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح بتائے۔ آخر وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا "میں پرنس انڈسٹریز کے نوری آباد والے پلانٹ پر کام کرتا ہوں۔ ملک کے دوسرے حصوں میں بھی پرنس انڈسٹریز کے پلانٹ ہیں۔ چند روز پہلے ایک شخص آ کر ہمارے پلانٹ پر مزدور کی حیثیت سے بھرتی ہوا۔ اس سے پہلے تو وہاں کا مزدور طبقہ مجھے ہی دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا تھا اور زیادہ تر لوگ بہت دن تک مجھ سے اظہارِ ہمدردی کرتے رہے تھے کہ ملک میں بے روزگاری نے کیا حال کر رکھا ہے کہ مجھ جیسے پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے نوجوان کو بھی مزدوری کرنی پڑ رہی ہے۔۔۔۔ لیکن اس شخص کے آنے کے بعد وہ گویا میرے "صدمے" کو بھول گئے۔"

"وہ کون تھا؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"اس کا نام تو عمران تھا لیکن جلد ہی وہ "ہیرو" کی عرفیت سے پکارا جانے لگا۔ وہ تھا تو تقریباً چالیس کی عمر کا۔۔۔۔ لیکن اچھا ہینڈسم اور ذہین تھا۔ بلا کا چرب زبان اور ہر قسم کے لوگوں میں فوراً گھل مل جانے والا۔۔۔۔"

میرے ذہن میں گھنٹی سی بجی لیکن میں اپنے تجسس کو دبائے بیٹھا رہا۔ کامران نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "پتا چلا کہ موصوف ٹی وی پر دو چار ڈراموں میں کام کر چکے تھے۔ کچھ لوگوں کو وہ ڈرامے یاد بھی تھے۔ مجھے تو یاد نہیں تھا کہ میں نے اس کا کوئی ڈراما دیکھا تھا لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ مجھے تو فکرِ معاش نے کبھی باقاعدگی سے ٹی وی دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی۔ بہرحال اس کے باوجود مجھے اس کی صورت کچھ مانوس سی لگی۔ شاید خوش شکل اور وجیہہ لوگ ویسے ہی کچھ مانوس مانوس سے لگتے ہیں۔"

"خوش شکل اور وجیہہ تو تم بھی ہو لیکن تم مجھے پہلی بار دیکھنے پر قطعاً مانوس نہیں لگے تھے۔ یہ کچھ صورتوں کی اضافی خصوصیت ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اجی ہم کیا اور ہماری وجاہت کیا۔۔۔۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر انکساری سے بولا "ہمیں تو غربت نے اجاڑ کر رکھ دیا۔ ہماری ہر خوبی پر دھول مٹی جم گئی۔"

"تم نے غربت کے احساس کو کچھ زیادہ ہی ذہن پر بٹھا رکھا ہے۔ تم انگریزی کے اس مقولے کو ذہن میں رکھا کرو کہ حالات اس سے بدتر بھی ہو سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔۔ دل کے بہلانے کو اس قسم کی باتیں تو کرنی ہی پڑتی ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "حالات کے بدتر ہونے کی تو واقعی کوئی انتہا نہیں۔۔۔۔ لیکن حالات بہتر ہونے میں آخر کیا مضائقہ تھا؟"

"بہتر بھی ہو جائیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی "یہ سب زندگی کے مختلف موسم ہیں، آتے جاتے رہتے ہیں۔ تم مجھے عمران کے بارے میں بتا رہے تھے۔"

"ہاں۔۔۔۔ عمران خود بھی ذکر کرتا رہتا تھا اور اس کے انداز واطوار سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے بہت اچھا وقت دیکھا تھا۔۔۔۔ شاہانہ انداز میں زندگی گزاری تھی لیکن تقدیر اسے گھیر گھار کر کہاں لے آئی تھی۔ ویسے۔۔۔۔ پرنس انڈسٹریز کے ان پلانٹس پر کام کی نوعیت کچھ ایسی ہے کہ وہاں چٹے ان پڑھ مزدور جنہیں صرف وزن ڈھونا اور پُرمشقت کام کرنا آتا ہے لیکن کسی ٹیکنیکل بات کو سمجھنے میں جن کے ذہن زیادہ ہی سست ہوتے ہیں، وہ نہیں چل سکتے۔ اس لیے وہاں جو طبقہ مزدوروں میں شمار ہوتا ہے وہ بھی تھوڑا بہت پڑھا لکھا، سلجھا ہوا اور کچھ ٹیکنیکل مائنڈڈ ہوتا ہے۔ مزدوروں کو وہاں تنخواہ بھی اچھی ملتی ہے۔ دوسری سہولیات بھی ہیں۔ وہاں کے مزدور عام دفتروں کے کلرک سے بہتر حال میں ہوتے ہیں۔ ایک طرح سے وہ مزدوروں کی خاصی بہتر کلاس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود بہرحال عمران جیسے آدمی کا وہاں نظر آنا قسمت کی ستم ظریفی ہی لگتا تھا۔ دو چار دن اسے قریب سے دیکھنے کے بعد احساس ہوتا تھا کہ وہ شخص کوشش کرتا تو اسے کہیں نہ کہیں اس سے بہتر کوئی نوکری، کوئی کام مل ہی سکتا تھا لیکن پھر میں نے یہی سوچا کہ شاید قسمت نے اس کے لیے ہر دروازہ بند کر دیا ہو۔ زندگی کبھی کبھی عجیب تماشے دکھاتی ہے۔"

"بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ قسمت تو دروازے کھولتی ہے لیکن وہ انسان کی بری عادتوں اور بدنیتی یا بدمعاملگی وغیرہ کی وجہ سے بند ہوتے چلے جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ممکن ہے۔۔۔۔" کامران نے سر ہلایا "بہرحال وہ وہاں فرصت کے اوقات میں اپنی زندگی کے شاہانہ ادوار کے قصے سناتا رہتا تھا۔ یہ اس کا بھی محبوب موضوع تھا اور اس کے سامعین کا بھی۔ شاید اس لیے بھی کہ اس میں دنیا بھر کی عیاشیوں کے قصے بھی آتے تھے جنہیں بیان کرتے ہوئے وہ کبھی کبھی تہذیب کی سطح سے کچھ زیادہ ہی نیچے بھی گر جاتا تھا۔۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔ یہ سب ضمنی باتیں ہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بولا "اصل حیرانی مجھے اس بات کی ہے کہ اتنے دنوں میں اس نے وہاں دنیا بھر کی باتیں کیں، نہ جانے کون کون سے قصے سنائے لیکن کبھی یہ ذکر نہیں کیا کہ وہ پرنسس سمیرا کا شوہر بھی رہا تھا جو پرنس انڈسٹریز اور ان جیسے دوسرے نہ جانے کتنے اثاثوں کے مالک کی بیٹی تھی جسے اب باپ کے انتقال کے بعد ان سب اثاثوں میں سے نصف ملنے والا تھا اور جو پہلے ہی سے خود بھی کچھ کم دولت مند نہیں تھی۔ اس بات کا اس نے کبھی اشارتاً بھی تذکرہ نہیں کیا۔"

"پھر تمہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟" میں نے دریافت کیا۔

"جب پرنسس سمیرا کے قتل کی خبریں اخباروں میں چھپیں تو اس کی زندگی کے خاص خاص واقعات کا تذکرہ بھی آیا تھا۔ شام کے اخباروں نے تو خاصی تفصیل چھاپی تھی۔ پرنسس کی دو ناکام شادیوں کے ضمن میں عمران کا تعارف بھی چھپا تھا۔ ایک اخبار میں تو چھوٹی سی تصویر بھی تھی۔ اس سے میں نے پہچانا کہ یہ تو وہی عمران تھا جسے میں نے حال ہی میں نوری آباد والے پلانٹ پر کام کرتے دیکھا تھا۔ مجھے یہ بات بہت عجیب لگی کہ عمران نے اس بات کا قطعاً ذکر نہیں کیا تھا کہ وہ پرنسس سمیرا کا شوہر رہ چکا تھا۔ خصوصاً جب کہ وہ شیخی بگھارنے کا بھی عادی معلوم ہوتا تھا اور اس قسم کے حوالے دینے میں فخر محسوس کرتا تھا۔ کیا یہ بات عجیب نہیں؟"

"ممکن ہے یہ حوالہ اس جیسے ڈھیٹ آدمی کے لیے بھی باعث شرم ہو۔ شاید اس معاملے میں اس نے سوچا ہو کہ لوگ کیا کہیں گے، جن انڈسٹریز وغیرہ کی وارث اس کی بیوی رہی تھی آج وہ اس کے ایک پلانٹ پر مزدور کے طور پر کام کر رہا تھا۔ یہ واقعی فلک کج

رفتار کی کچھ زیادہ ہی عبرت انگیز کارروائی تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں نے بھی اسی جواز سے اپنے آپ کو مطمئن کیا ہے۔" کامران بولا "لیکن عین ممکن ہے کہ اس کی تہ میں عمران کی کوئی مصلحت ہو۔"

"میں تم سے اختلاف نہیں کرتا۔ وقت آنے پر میں تمہارے اس دوسرے نظریے کی بھی تصدیق کرلوں گا۔ یہ میں خود ذاتی طور پر معلوم کرلوں گا۔" میں نے کہا پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "حوری آباد والے پلانٹ پر مزدوروں کی بھرتی کا کیا طریقہ ہے؟ کیا ٹھیکا سسٹم ہے؟"

"نہیں..... ٹھیکا سسٹم سے تو وہاں کی انتظامیہ پرہیز ہی کرتی ہے۔ ٹھیکے پر مزدور فراہم کرنے والوں کو تو وہ لوگ اپنے ہاں گھسنے بھی نہیں دیتے حالاں کہ اس طریقے میں کارخانے داروں کو چار پیسے کی بچت ہوتی ہے اور یونین وغیرہ کے پھڈوں میں اضافہ ہونے کا امکان بھی گھٹ جاتا ہے۔ اس کے باوجود پرنس انڈسٹریز والے اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال نہیں کرتے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان کی مالی حالت بھی بہت اچھی ہے۔ صنعتی ابتری کے اس دور میں بھی ان کی تمام ترانڈسٹریز بہت مستحکم جاری ہیں۔ ان کے بعض پلانٹس پر دفاعی ضروریات کا سامان تیار رہوتا ہے اور گورنمنٹ سے ان کے کنٹریکٹ چلتے رہتے ہیں....."

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ میں منتظر تھا کہ وہ میرے سوال کا جواب دے۔ وہ جلد ہی اس طرف آگیا "وہاں مزدور کے طور پر بھرتی ہونا مشکل نہیں ہے لیکن مزدور کے معیار پر پورا اترنا ضرور مشکل ہے۔ طریقہ بہت سادہ سا ہے۔ کارخانے میں گیٹ کے قریب ہی ایک ایڈمنسٹریشن آفس ہے جسے مختصراً ایڈمن آفس کہا جاتا ہے۔ اس میں دیگر اسٹاف کے علاوہ ایک لیبر کلرک بیٹھتا ہے۔ پہلے تو امیدوار گیٹ پر ہی گارڈز وغیرہ کو بتاتا ہے کہ وہ بھرتی ہونے آیا ہے۔ گارڈز اس کی اچھی طرح تلاشی وغیرہ لے کر اندر جانے دے گا۔ کافی عرصے وہاں ڈاکوں اور بھتوں کا بہت زور رہا ہے جس کی وجہ سے بہت سی انڈسٹریز اجڑ بھی گئی ہیں۔ جو انڈسٹریز کامیاب ہیں اور ابھی تک جمی ہوئی ہیں ان میں حفاظتی انتظامات بہت سخت ہیں۔ گارڈز وغیرہ کی چیکنگ سے گزرنے کے بعد امیدوار دفتر میں لیبر کلرک کے پاس چلا جاتا ہے۔ وہ اسے ایک فارم دے دیتا ہے جو انگریزی میں ہوتا ہے۔ وہ امیدوار کو وہیں کلرک کے سامنے بیٹھ کر بھرنا ہوتا ہے۔ جو امیدوار فارم ہی بھرنے کا اہل نہ ہو اسے وہیں سے جواب دے دیا جاتا ہے۔ فارم بھرنے اور اس پر تین تصویریں لگانے کے بعد امیدوار کو پرسنل منیجر کے پاس بھیج دیا جاتا ہے جو اسی دفتر میں بیٹھتا ہے۔

"فارم کو پڑھنے اور امیدوار کو ایک نظر دیکھنے کے بعد اگر وہ اسے موزوں محسوس کرتا ہے اور پلانٹ پر آدمی کی ضرورت بھی

ہوتی ہے تو وہ اسی وقت اس کا تفصیلی انٹرویو لے لیتا ہے اور اسناد وغیرہ دیکھ کر ایک آدھ دن بعد ڈیوٹی پر بلا لیتا ہے۔ اگر امیدوار موزوں ہوتا ہے لیکن اس وقت پلانٹ پر آدمی کی ضرورت نہیں ہوتی تو وہ اس کا فارم منتظر امیدوار کے طور پر رکھ لیتا ہے اور ویٹنگ لسٹ کی ترتیب کے لحاظ سے کچھ دن بعد اسے بلایا جاسکتا ہے۔ اگر پرسنل منیجر کو وہ امیدوار موزوں نہ لگے تو وہیں اس کا فارم پھاڑ کر پھینک دیتا ہے۔ کوئی لمبا چوڑا چکر نہیں ہے۔ کافی حد تک منظم انداز میں کام ہوتا ہے۔ سہولیات بھی کسی حد تک مغرب والی ہیں اور اس طرح منتخب ہونے والے افراد تو لیبر ہی کہلاتے ہیں لیکن آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ وہ لیبر سے کافی بہتر لوگ ہوتے ہیں۔ اس لیے مجھ جیسے اور عمران جیسے لوگ بھی ادھر ادھر دھکے کھانے اور بہت سی ناکامیوں سے دوچار ہونے کے بعد کہیں سے معلومات حاصل ہونے کی بنا پر وہاں جا پہنچتے ہیں اور منتخب ہوجاتے ہیں۔ عام مزدور وہاں منتخب نہیں ہوسکتا۔"

"اس کا مطلب ہے، وہاں امیدوار کے منتخب ہونے کا زیادہ دارومدار پرسنل منیجر پر ہے؟" میں نے بیک وقت بہت سے نکات پر غور کرتے ہوئے کہا۔

"سب سے زیادہ دارومدار تو اس بات پر ہے کہ وہاں ضرورت اور گنجائش موجود ہو۔" کامران نے جواب دیا "ویسے گا ہے گا ہے جگہ نکلتی رہتی ہے۔ وہاں کام کرتے ہوئے بھی لوگ اس سے بہتر نوکری کی تلاش میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کسی کی قسمت یاوری کرجاتی ہے۔ کبھی کسی کا باہر سے بلاوا آجاتا ہے۔ یوں جگہ خالی ہوتی رہتی ہے۔ اگر آدمی کی ضرورت ہو تو پھر کسی کو منتخب کرنے کا دارومدار صرف پرسنل منیجر پر ہوتا ہے۔"

"تم نے وہاں رہنے کے دوران کچھ پرسنل منیجر اور عمران کے درمیان باس اور معمولی ملازم سے بڑھ کر کوئی شناسائی، واسطہ یا تعلق محسوس کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

وہ کچھ چونکا اور جلدی سے بولا "شناسائی.....؟ ارے صاحب! ان میں تو دوستی معلوم ہوتی تھی۔ فارغ اوقات میں، میں نے کئی

پرسنل منیجر صاحب کو پلانٹ پر آتے جاتے اور ادھر ادھر کھڑے ہو کر عمران سے گپ شپ کرتے اور ہاتھ پہ ہاتھ مار کر ہنستے دیکھا ہے حالاں کہ وہاں حفظِ مراتب کا بہت خیال رکھا جاتا ہے۔ ماحول بڑا سنجیدہ ہے۔ پرسنل منیجر اور لیبر کے درمیان ویسے بھی کافی فاصلہ ہے۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ان میں یہ دوستی اور بے تکلفی پہلے سے تھی یا عمران نے وہیں پہنچنے کے بعد اس سے راہ و رسم بڑھائی تھی۔ دوستی گانٹھنے میں بہرحال اس کا جواب نہیں تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ جلد ہی وہ اپنی حرکتوں کی وجہ سے معقول لوگوں کے دل سے اتر جاتا تھا۔"

"وہ ابھی تو وہیں ملازم ہے نا؟" میں نے دریافت کیا۔

"ایک ہفتہ پہلے میں وہاں سے دو دن کی چھٹی لے کر آیا تھا اور اب تک واپس نہیں جاسکا ہوں..... اور معلوم نہیں کب تک نہ جاسکوں۔ میرا خیال ہے میری نوکری تو چلی ہی جائے گی۔ بہرحال جس روز میں نے چھٹی لی اس وقت تک تو وہ وہاں کام کرنے آرہا تھا اور اس کے کہیں جانے کے آثار نہیں تھے۔ وہ باقی سب لوگوں کے ساتھ کمپنی کی بس میں ہی شہر آیا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے وہ کہاں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میری تو خیر اس سے زیادہ بے تکلفی نہیں ہو سکی لیکن میرا خیال ہے اس نے کسی اور کو بھی نہیں بتایا تھا۔ ممکن ہے اس کی بھی رہائش ہم جیسے لوگوں کی طرح یوں ہی سی ہو اور وہ احتیاط کرتا ہو کہ کوئی اس سے ملنے وہاں نہ آپہنچے..... یا پھر شاید کوئی اور بات ہو۔"

ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا "عین ممکن ہے، اس کی بتائی ہوئی یہ بات خاصی اہم ثابت ہو۔ معلوم نہیں کیوں میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں ایک مدھم سی گھنٹی بج رہی ہے جو مجھے خبردار کررہی ہے کہ یہ محض ایک دولت مند، مشہور اور خوب صورت لڑکی کے قتل کا قصہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے کوئی اور اس سے بھی زیادہ سنگین اور طولانی کہانی پھیلی ہوئی ہے۔ ہمارا سرا ہمارے ہاتھ نہیں آرہا۔ خیر..... کوئی بات نہیں..... دیکھا جائے گا۔"

کامران نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور جیب سے موبائل فون نکال کر رحیم گل سے رابطہ کیا۔ وہ میری آواز پہچانتے ہی بولا "بھائی! تم شیطان کی طرح نہیں ہے..... لیکن خیر..... تم سے تو یہ شکایت کرنی ہی نہیں چاہیے کیونکہ تم تو خود شیطان ہو۔ میں تمہیں فون کرنے کی سوچ ہی رہا تھا۔"

"مجھے فون کرنے کے علاوہ بھی کوئی کام کرلیا کرو شیطان کے بڑے بھائی!" میں نے کہا۔

"کام ہی تو کرنے گیا تھا۔ اسی کے بارے میں تمہیں بتانا تھا۔" وہ اگلے لمحے بولا۔

"کبھی کام کرکے اس کی رپورٹ اپنے افسرانِ بالا کو دیا کرو۔ میں کوئی تمہارا افسر ہوں؟"

"خدا نہ کرے جو تم جیسے لوگ میرے افسر ہوں۔" وہ فوراً بولا۔

"ہاں..... اگر مجھ جیسے لوگ تمہارے افسر ہوگئے تو تمہارے محکمے میں سدھار پیدا ہوجائے گا اور یہ تمہیں کب گوارا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہرحال..... بتاؤ..... کیا تیر مار آئے؟"

"تیر ہی تو نہیں مار سکا، یہی تو افسوس ہے۔" وہ مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میں واجدہ پرویز کو فون کیے بغیر اس سے ملنے اور اس کا بیان لینے چلا گیا تھا۔ دراصل میں ادھر سے گزر ہی رہا تھا۔ میں نے سوچا چلو یہ رسمی کارروائی بھی کرتے چلیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا وہ منحوس گینڈا نما شوہر بھی گھر پر ہوگا....."

"ایسا مت کہو رحیم گل پیارے!" میں نے پیار سے کہا "کسی کے شوہر کے بارے میں ایسے الفاظ استعمال نہیں کرتے۔ کل کو تمہیں بھی کسی نصیبوں جلی کا شوہر بننا ہے۔ تم جیسے سانڈ نما پولیس آفیسر نے اس گینڈا نما شوہر کے سینگ میں اپنا سینگ پھنسا دیا ہوگا؟"

"ایک اسمارٹ پولیس آفیسر کو سانڈ کہہ کر تم اپنی خرکارانہ بدذوقی کا اعلان مت کرو۔" رحیم گل بولا "سینگ میں نے نہیں پھنسایا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہے وہ کیسے پھنکارتا پھرتا ہے۔ مجھ سے کہنے لگا، تم میری بیگم سے اپائنٹمنٹ لیے بغیر اس کا بیان لینے کیسے آگئے؟ پہلے تو میں نے سوچا کہ اسے ایک جھانپڑ رسید کردوں تاکہ ابتدا میں ہی دماغ کے کیڑے جھڑ جائیں لیکن پھر میں نے کچھ صبر سے کام لیا اور اسے بتایا کہ وہ اور اس کی بیگم مشتبہ افراد کی فہرست میں شامل ہیں، اسے شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں نے انہیں تھانے نہیں بلوایا اور خود چل کر ان کے گھر آگیا۔"

"پھر اس کا دماغ کچھ ٹھیک ہوا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھئی..... جن کے دماغوں میں اتنے برسوں سے فرعونیت بھری ہو وہ کچھ آسانی سے تو راہِ راست پر نہیں آتے۔ وہ میری پیٹی اتروانے اور لائن حاضر کروانے کی دھمکیاں دینے لگا جس طرح عموماً وہ بڑے لوگ دیا کرتے ہیں جو دراصل اندر سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔"

"پھر تم نے اس سے وہیں لپاڈگی تو شروع نہیں کردی؟" میں نے پوچھا۔

"میں تمہاری طرح جاہل تو نہیں ہوں۔ مجھے اس کی کیا ضرورت تھی؟ میں نے اپنی ناک اس کی بے ہودہ ناک سے ایک انچ کے فاصلے پر رکھتے ہوئے اور حسبِ توفیق پھنکارتے ہوئے اسے بتایا کہ پہلی ملاقات پر تو میں نے اس کا لحاظ کرلیا تھا اور اس کی پھنے خانی برداشت کرلی تھی لیکن اگر اب بھی وہ اسی طرح پھنے خانی دکھاتا رہا تو میں دونوں میاں بیوی کو ہتھکڑی لگا کر تھانے لے جاؤں گا۔"

"اس بڑھے اور صدمے سے اس کے دماغ کی کوئی نس تو نہیں پھٹ گئی؟"
"ایسے ڈھیٹ قسم کے گینڈوں کی نس وغیرہ کہاں پھٹتی ہے۔" رحیم گل افسوس زدہ سے انداز میں بولا "اس نے فوراً ڈی آئی جی صاحب کو فون کھڑکایا لیکن ڈی آئی جی صاحب سے بات کر کے اس پر کچھ اوس سی پڑ گئی۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ ڈی آئی جی صاحب نے بہت تحمل سے اس کی بات سنی تھی' معذرت بھی کی تھی لیکن اسے مشورہ یہی دیا تھا کہ وہ اس پولیس آفیسر سے نہ الجھے' مذکورہ پولیس آفیسر بہت سرپھرا ہے' بہتر ہے کہ اسے اس کا کام کرنے دیا جائے۔" وہ گویا اس جواب سے محظوظ ہوتے ہوئے دھیرے سے ہنسا۔
"اگر تمہیں سرپھرا بننے کا اور ہر طرح کے لوگوں سے پنگے لینے کا یوں ہی شوق رہا تو ایک روز سرپھرے کے بجائے سرکٹے ہو جاؤ گے۔" میں نے کہا۔
"میں اسے نقصان کا سودا نہیں سمجھتا۔ کچھ تاریخی کرداروں کی طرح میں بھی کہہ سکوں گا کہ یہ سر کٹ تو گیا لیکن جھکا نہیں۔" وہ اطمینان سے بولا۔
"کیا سر کٹ چکنے کے بعد یہ بات کہو گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا "ابے گھامڑ! اس قسم کے مکالمے سر کٹنے سے پہلے بولے جاتے ہیں کہ یہ سر کٹ تو سکتا ہے' جھک نہیں سکتا۔ تم نے آج تک فلموں کے علاوہ کبھی کسی کٹے ہوئے سر کو مکالمہ بولتے دیکھا ہے؟"
"ہاں...... یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے تسلیم کیا "چلو...... اگر میرا سر عجلت میں کٹ گیا اور مجھے مکالمہ بولنے کی مہلت نہ ملی تو میری طرف سے تم بول دینا۔ بات تو سچ ہوئی نا۔ سچ سامنے آنا چاہیے خواہ وہ کسی کی زبانی ہو۔"
"اچھا یہ بتاؤ تم واجدہ پرویز کا بیان لینے میں کامیاب بھی ہوئے یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔
"بیان تو لے لیا لیکن خواہ مخواہ ہی اس دو لفظی بات کے لیے اتنا وقت خراب کیا اور اس گینڈے کے ساتھ بک بک جھک جھک کی۔" رحیم گل بدمزگی سے بولا "اس کے بیان سے بس یہ معلوم ہوا کہ اسے کچھ معلوم نہیں ہے۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ اسی قسم کا بیان دے گی لیکن رسمی کارروائی تو بہرحال کرنا تھی۔ اس کا بیان مقدمے کی فائل میں تو منسلک ہو گا۔"
"فائلیں موٹی کرنے اور بندے دُبلے کرنے کے سوا تم پولیس والے کر ہی کیا سکتے ہو۔" میں نے اپنا لہجہ افسوس زدہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
"لگتا ہے تم نے کچھ کر لیا ہے۔ اندھے کے ہاتھ کوئی بٹیر آگیا ہے۔ اسی لیے بے چین ہو کر فون کیا ہو گا۔ کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟"
"کامران دانش مجھے مل گیا ہے......" میں نے سامنے بیٹھے

آکر گزر گیا۔ میں نے اس سے اتنی دیر باتیں کی تھیں اور محسوس تھا کہ اس دوران میں اس کا اعصابی تناؤ کافی کم ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر پہلے جیسی وحشت نہیں رہی تھی لیکن میں نے جوں ہی اس کے بارے میں رحیم گل کو بتایا' مجھے اس کے چہرے پر وہی پہلی سی وحشت واپس آتی دکھائی دی۔
"کہاں سے ملا؟" رحیم گل نے فوراً بے تابی سے سوال کیا "اور اس وقت وہ کہاں ہے؟"
"میرے سامنے۔" میں نے جواب دیا۔
"اور تم کہاں ہو؟" اس نے اب ذرا تحمل سے پوچھا۔
"اس کے سامنے۔" میں نے جواب دیا۔
"اور اگر اب میں یہ پوچھوں گا کہ تم دونوں کہاں ہو تو کہو گے کہ ایک دوسرے کے آمنے سامنے......" رحیم گل لمبی سانس لے کر بولا "بہتر ہے کہ اس قسم کے پرانے لطیفوں کی پھیری کے بجائے تم شرافت سے مجھے بتا دو کہ اس وقت تم کہاں ہو۔ میں ابھی اپنے آدمی لے کر پہنچتا ہوں۔"
"خدا کا خوف کرو یار......!" میں نے کہا "وہ کوئی قاتل...... تربیت یافتہ دہشت گرد یا مفرور گوریلا تو ہے نہیں جو تم اس طرح آدمیوں کو ساتھ لے کر پہنچنے کی بات کر رہے ہو۔ وہ ایک امن پسند اور عام سا نوجوان ہے۔"
"ہو سکتا ہے تمہارا خیال ٹھیک ہو۔" رحیم گل اب ذرا ملائمت سے اور ٹھہراؤ سے بولا "میں بھی اسے جنونی قاتل یا دہشت گرد یا گوریلا سمجھ کر بات نہیں کر رہا تھا۔ دراصل اس قسم کی خبر سننے کے بعد ہم پولیس والے اسی انداز میں بات کرتے ہیں۔"

میرے سامنے کامران نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ میں نے جلدی سے رحیم گل سے کہا "بہرحال تمہیں یہ تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی اسے لے کر تمہارے پاس آرہا ہوں۔ تمہیں فون کرنے کا مقصد یہ تھا کہ تم نے جگہ جگہ کھڑی ہونے والی اور گشت کرنے والی پولیس پارٹیوں کو اس کی تصویر پہنچوا رکھی ہے۔ میں چاہتا ہوں تم ان سب کے لیے اطلاع نشر کروا دو کہ فی الحال اسے تلاش نہ کریں۔ راستے میں خواہ مخواہ تمہارے روایتی قسم کے پولیس والوں کی نظر پڑ گئی تو کام خراب ہو جائے گا۔ انہیں تو بات سمجھانی بھی مشکل ہوتی ہے۔"
وہ ایک لمحے خاموش رہا تو میں نے کہا "یہ میں ویسے ہی احتیاطاً کہہ رہا ہوں ورنہ اسے تم تک لانا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس شہر میں تو سیکڑوں اشتہاری مجرم ادھر سے ادھر پھرتے رہتے ہیں اور ہزاروں فرار ہو چکے ہیں۔ وہ کسی کو نظر نہیں آتے تو اس شریف نوجوان کو لانا کون سا مسئلہ ہے...... اور ویسے بھی اسے تو میں پولیس کے پاس ہی لا رہا ہوں۔ فرار کرانے تو نہیں لے جا رہا۔ پھر بھی میں نے سوچا' تمہیں بتا دینا ہی بہتر ہے۔"
"ہاں...... یہ تو تم نے اچھا کیا۔ کبھی کبھی جاہل بھی کوئی عقل کی بات کر لیتے ہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا "ویسے بہتر یہی تھا کہ تم مجھے جگہ کے بارے میں سمجھا دیتے۔ میں خود آکر اسے اپنی تحویل میں لے لیتا لیکن مجھے معلوم ہے کہ تمہاری ناکارہ کھوپڑی میں جو خیال گھس جائے' تم اس سے چمٹے رہتے ہو۔ اس لیے میں زیادہ اصرار نہیں کروں گا۔ میں تھانے سے اٹھ رہا تھا لیکن اب میں تمہارے انتظار میں بیٹھوں گا۔ اندازاً کب تک پہنچو گے؟"
"ایک ڈیڑھ گھنٹا لگ جائے گا۔ میں ذرا دور ہوں۔" میں نے جواب دیا۔
"ٹھیک ہے...... میں انتظار کروں گا۔ اگر اس دوران میں تمہارا ناکارہ اور نکما دماغ تمہیں کوئی اور بے ہودہ پروگرام بنانے کا مشورہ دے تو مجھے اطلاع دینا مت بھولنا۔"
"بہت بہتر جناب بقراط صاحب!" میں نے سعادت مندی سے کہا اور فون بند کر دیا۔
کامران اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ میں نے تسلی دینے کے سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "تمہیں اس پولیس افسر کے پاس چلنا ہے...... اور تمہیں اس سے کوئی ناجائز تکلیف نہیں پہنچے گی' یہ میرا وعدہ ہے۔ تم اسے پوری دیانت داری سے اسی طرح اپنی کہانی سناؤ گے جس طرح تم نے مجھے سنائی ہے۔ صرف میری درخواست پر دو چھوٹی چھوٹی باتیں بھول جانا۔ تم یہ مت بتانا کہ تم نے پرنس کیسرا کو فون پر جمشید کریم اور جمال سعیدی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ تم صرف اتنا کہہ سکتے ہو کہ کسی کا فون آیا تھا۔

کچھ دن بعد چاہو تو ذہن پر زور دے کر تم نام بھی یاد کر سکتے ہو لیکن اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔"
"کیوں...... آپ مجھے یہ ہدایت کیوں کر رہے ہیں؟" اس نے اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں پوچھا۔
"اس لیے کہ میں خود بھی معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا "پولیس اس کام میں مہینوں لگا دے گی اور ممکن ہے مسئلہ پھر بھی حل نہ ہو۔ اصل قاتل پھر بھی ہاتھ نہ آئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ زیادہ نام سامنے ہونے پر پولیس معاملے کو بگاڑ دے۔ اس لیے پہلے میں اپنے طور پر کچھ ہاتھ پاؤں ماروں گا۔ اگر کافی کوشش کے باوجود مجھے کامیابی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو پھر میں اس معاملے سے ہاتھ کھینچ لوں گا اور پولیس جو بھی کرے گی اسے کرنے دوں گا۔"
میں نے دیانت داری سے اسے اپنا پروگرام بتا دیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا "آؤ چلیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا لیکن وہ گویا کرسی سے ہی چپک کر رہ گیا تھا۔ اس کا چہرہ بھی کچھ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ صفیہ اس سے پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ اس جگہ سے نکلنے اور اس معاملے کو کسی انجام تک پہنچانے کے لیے بے قرار معلوم ہوتی تھی۔
"لگتا ہے میری اتنی دیر کی مغز ماری کے باوجود خوف تمہارے ذہن سے نہیں نکلا۔" میں نے اب اپنے دل میں ابھرنے والی بیزاری کی لہر کو ذرا مشکل سے دباتے ہوئے کہا۔
"نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ کمزور سے لہجے میں بولا۔ اس کا چہرہ اسی طرح پتھرایا ہوا سا ہی رہا۔ آخر صفیہ نے ہی اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کیا اور دروازے کی طرف لے چلی۔
"میری کہانی پر یقین تو کر لیا جائے گا؟" اس نے یوں دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا جیسے اسے پھانسی کے تختے کی طرف لے جایا جا رہا ہو۔
"ہاں...... تمہاری خوش قسمتی ہے کہ میری وجہ سے تمہیں ان کو یقین دلانے کا موقع میسر آرہا ہے۔" میں نے دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔ صفیہ اندر اطلاع دینے چلی گئی تھی کہ ہم لوگ جا رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تم اسی طرح چھپے رہتے یا بھاگتے رہتے تو زندگی بھر تمہاری پوزیشن صاف نہیں ہو سکتی تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ شاید ایک آدھ کیس تم پر اور بھی پڑ جاتا۔ پولیس کو تو ایسے آدمی بہت اچھے لگتے ہیں جن پر ایسے مقدمات کا ملبہ ڈالا جا سکے جو ان سے کسی کنارے نہیں لگتے۔"
"وہ لوگ مجھے حوالات میں رکھیں گے؟" اس نے تھوک نگل کر پوچھا۔
"تمہارے حق میں بہتر تو یہی ہے کہ وہ تمہیں حوالات میں رکھیں۔" میں نے جواب دیا "وہاں تم حفاظت سے رہو گے۔ اگر اس معاملے کے پیچھے کوئی بڑی سازش کام کر رہی ہے تو تمہارا آزاد

پڑنا تمہارے حق میں خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ بہرحال..... اگر تمہیں حوالات میں رہنا اتنا ہی تکلیف دہ اور خوف ناک لگ رہا ہے تو تمہارا کوئی اور بندوبست کردیں گے۔"

صفیہ اندر سے آگئی اور ہم تینوں اس مکان سے رخصت ہولیے۔ ابھی ہم اسی گلی میں تھے جس میں خندق سی کھدی ہوئی تھی اور میں صفیہ کی طرف متوجہ ہو کر اس کی کوئی بات سننے لگا تھا کہ اس بدبخت کامران نے مجھے زور سے دھکا دیا۔ میں اس لمحے اس کی طرف سے قطعی غافل تھا اور مجھے اس سے اس حرکت کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میں اس کا برین واش کرنے میں کامیاب ہوچکا تھا لیکن یہ "مردِ ناداں پر کلامِ نرم ونازک بے اثر" والا معاملہ معلوم ہوتا تھا۔

مردِ ناداں کم از کم اس حد تک نہایت ذہین ثابت ہوا تھا کہ اس نے مجھے دھکا دینے کے لیے بہت ہی موزوں جگہ کا انتخاب کیا تھا۔ اس گلی میں چلنا ویسے بھی بازی گر کے رسے پر چلنے سے کم نہیں تھا۔ اوپر سے اس وقت میں صفیہ کی طرف جھک کر اس کی بات سننے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ سرگوشی کے سے انداز میں مجھے کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔ کامران نے دھکا پوری طاقت سے دیا تھا جس میں اس کی وحشت کی طاقت بھی شامل تھی۔

میں صفیہ کو ساتھ لیتا ہوا خندق میں جاگرا۔ صفیہ نیچے تھی۔

میں اس کے اوپر گرا تھا اور وہ سیوریج کی ناکارہ لائن پر گری تھی۔ گری بھی بڑے آڑے ترچھے زاویے سے تھی۔ یقیناً اس کی ہڈیاں کڑکڑائی ہوں گی بلکہ ایک لمحے کے لیے تو مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کی کوئی ہڈی، کوئی جوڑ جواب ہی نہ دے گیا ہو مگر قسمت شاید مہربان ہی رہی تھی اور وہ بڑی باہمت لڑکی تھی۔ میرے اٹھتے ہی وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی لیکن ہمارا اٹھنا بھی کسی بے ترتیب قسم کے رقص سے مشابہ تھا کیونکہ اس خندق میں کہیں صحیح طور پر پاؤں جمانے کی جگہ نہیں تھی۔

پائپ لائن کے نیچے کچھ کیچڑ اور گدلا پانی بھی جمع تھا۔ پائپ لائن کے اوپر بھی پھسلن تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ چند لمحے کے لیے کامران کا خیال ہی میرے ذہن سے محو ہوگیا۔ مجھے صفیہ کی فکر پڑگئی تھی۔ میں نے اسے سنبھالا، سہارا دیا اور بڑی تشویش سے پوچھا "تم ٹھیک تو ہونا؟"

"ہاں..... میں تو ٹھیک ہوں۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "آپ اس گدھے کی فکر کریں۔"

لیکن جب تک میں اس خندق سے نکلا اور صفیہ کو بھی سہارا دے کر نکالنے میں کامیاب ہوا تب تک وہ "گدھا" اس گلی سے غائب ہوچکا تھا۔ میرا اور صفیہ کا حلیہ کافی خراب ہوچکا تھا۔ کپڑے کہیں کہیں سے کیچڑ میں لتھڑ چکے تھے لیکن یہ ان باتوں کی فکر کرنے کا وقت نہیں تھا۔ میں اس کے تعاقب میں دوڑا۔ میں نے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن مجھے احساس تھا کہ صفیہ میرے پیچھے آرہی ہے۔

میرے اندازے کے مطابق کامران جس گلی میں گیا تھا میں حتی الامکان تیزی سے اس گلی میں مڑا لیکن وہ وہاں بھی کہیں نہیں آیا۔ بہرحال میں تیزی سے دوڑتا رہا۔ وہ گلیاں کیا بھول بھلیاں تھیں۔ غیر ارادی طور پر ہی میں نہ جانے کتنا فاصلہ طے کرگیا۔ ان گلیوں میں گویا کسی غیر مرئی چیز کا بہاؤ تھا جو انسان کو اپنے ساتھ لیے جاتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ کامران کو بھی یہ بہاؤ اسی طرح لے گیا ہوگا۔ اس لیے میں اپنی دانست میں راستوں سے ناواقفیت کے باوجود اس کے پیچھے تھا۔ شاید جبلت کے سہارے جس طرح شکاری کتے اپنے شکار کو دیکھے بغیر بھی اس کا پیچھا کرتے رہتے ہیں۔

کافی دور نکل آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ شاید یہ میری خوش فہمی تھی۔ کامران کی تو مجھے کہیں جھلک بھی نظر نہیں آئی تھی۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرسکتا تھا کہ میں صحیح سمت میں اس کا تعاقب کررہا تھا۔ یہ تنگ وتاریک، پُرپیچ اور کوڑے کرکٹ سے بھری ہوئی گلیاں تو جال کی ڈوریوں کی طرح چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔

آخر کار میں رک گیا۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ یوں بھاگتے رہنا فضول تھا۔ بے ہنگم، بے ترتیب، کچے پکے مکانوں کے دروازے بند تھے اور گلی میں سکوت تھا جو مجھے بہت عجیب لگا۔

بہت ایک ایسی چیز تھی جو اس قسم کی گلیوں میں نہیں پائی جاسکتی تھی۔ ہر قدم پر اچھلتے کودتے، شور مچاتے مفلوک الحال سے بچوں کی ٹولیاں تو ہونی چاہیے تھیں۔ ان ٹولیوں کا یہاں نظر نہ آنا کچھ غیر فطری سی بات تھی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ پچھلی چند گلیاں جن سے میں گزرا تھا وہ بھی کچھ ایسے ہی سکوت کی لپیٹ میں تھیں۔ اس سکوت نے شاید خاصے بڑے حصے کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا۔ جو تھوڑی بہت آوازیں آرہی تھیں وہ بھی شاید بہت دور سے آرہی تھیں۔

یہ سکوت پُراسرار تھا۔ کیا ان مکانوں کے مکین کہیں چلے گئے تھے؟ ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ مکانوں پر تالے نہیں تھے۔ اِکّا دُکّا مکانوں پر ہی تالے نظر آئے تھے جو نارمل سی بات تھی۔ کئی گھروں سے کھانے پکانے کی خوشبوئیں بھی آرہی تھیں جو زندگی کا پتا دیتی تھیں۔ میں بہت دور نکل آیا تھا۔ کیا پتا کب اور کس سمت میں ایسے ہی کسی گھر نے کامران کو نگل لیا ہو..... لیکن اس طرح اچانک ایک اجنبی کو اتنی خاموشی سے کون پناہ دے سکتا تھا؟

میرے سب سوال بے جواب تھے۔ میں نے انہیں ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ اسی لمحے مجھے صفیہ کا خیال آیا۔ وہ بدبخت کامران تو نکل ہی گیا تھا، کہیں میں نے صفیہ کو بھی تو نہیں کھو دیا تھا؟ لیکن جوں ہی میں نے پلٹ کر دیکھا، بے اختیار اطمینان کی ایک گہری سانس میرے سینے سے خارج ہوئی۔ وہ گرتی پڑتی چلی آرہی تھی۔ جوگنگ کرنے کے سے انداز میں وہ مجھ تک آپہنچی۔ اگر اس نے میرا سراغ نہیں کھویا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ تمام راستے بہت تیز بھاگی تھی۔ ہانپتی ہوئی وہ میرے قریب آن رکی۔

"بھئی..... تمہارا یہ منگیتر نما محبوب یا محبوب نما منگیتر تو واقعی بڑی بے ہودہ چیز ہے۔" میں نے کہا "یقین نہیں آتا کہ آج کے دور میں کوئی عقل سے اتنا پیدل بھی ہوسکتا ہے۔"

"اب وہ نہ تو میرا محبوب ہے اور نہ ہی منگیتر۔" وہ مرتعش سانسوں کے درمیان بولی "میں نے آپ کو کیا بتایا تھا؟ انسان یوں ہی تو اپنی بچپن کی محبت سے بیزار نہیں ہوجاتا۔"

"اب تو میں بھی تم سے متفق ہوگیا ہوں..... بلکہ میرے خیال میں تم بہت ہی صابر اور باہمت لڑکی ہو جو تم نے اب تک اس کا ساتھ نبھایا ہے۔" میں نے سرہلایا۔ وہ مسکرادی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا اس بات کا کوئی امکان موجود ہے کہ ہم اب بھی کوشش کریں تو وہ ہمیں مل جائے؟"

"وہ تو اب ہمیں قسمت سے ہی مل سکتا ہے..... مطلب یہ کہ اگر اس کی قسمت اچھی ہوئی..... جس میں مجھے کافی شبہ ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "ہم بہت دور نکل آئے ہیں۔ یوں سمجھئے، شہر کے ایک بالکل مختلف حصے میں آگئے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کس طرف نکل گیا ہو یا کہاں چھپ گیا ہو۔ مجھے اندیشہ ہے، ہم اسے جہاں اور جس طرح بھی تلاش کرنے کی کوشش کریں گے، ذلت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔"

اس کی رائے معقول تھی، مطلب بھی واضح تھا۔ اس کے باوجود میں نے گویا محض اتمامِ حجت کے لیے پوچھا "تمہارا مطلب ہے، اسے اس کے حال پہ چھوڑ دیا جائے؟"

"اگر ہم اسے اس کے حال پر نہیں چھوڑیں گے تو پھر ہمارا اپنا حال بہت خراب ہوسکتا ہے۔" صفیہ بولی۔

مجھے کامران کو اس کے حال پر چھوڑنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مجھے فکر رحیم گل کی ستا رہی تھی جو اس انتظار میں بیٹھا ہوا تھا کہ میں کامران کو لے کر اس کے پاس پہنچ رہا ہوں۔ مجھ سے حماقت سرزد ہوچکی تھی کہ میں نے اسے اطلاع دینے میں کچھ زیادہ ہی مستعدی دکھا دی تھی۔ اب اسے اس بات پر قائل کرنا بہت مشکل ہوتا کہ اگر کامران میرے ساتھ نہیں آسکا تھا تو اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا کیوں کہ وہ بہرحال اس کا مطلوبہ آدمی نہیں تھا۔ وہ پرنسس سیمرا کا قاتل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ رحیم گل یقیناً یہی کہتا کہ میں یہ فیصلہ کرنے والا کون ہوتا تھا، کسی کے مجرم ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں رائے تو صرف پولیس ہی دے سکتی تھی اور فیصلہ صرف عدالت ہی کرسکتی تھی۔ جب کسی سے کوئی حماقت سرزد ہوجاتی تھی تب تو اسے شہریوں کے فرائض، پولیس کے دائرۂ کار اور عدالت کی اہمیت وغیرہ زیادہ ہی یاد آنے لگتی تھی۔

اب مجھے اس مصیبت کو بھگتنا ہی تھا۔ یہ تصور خاصا تکلیف دہ تھا لیکن فی الحال صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چناں چہ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر واپسی کے لیے مڑتے ہوئے کہا "چلو اے خاتونِ رہنما! اس خدائی فوجدار..... بلکہ خدائی خوار کو ان بھول بھلیوں سے نکالو۔"

اس نے یوں آسمان کی طرف دیکھا جیسے ستاروں کی مدد سے راستے کا تعین کرنے کی کوشش کررہی ہو حالاں کہ آسمان پر اس وقت ستارے موجود ہی نہیں تھے۔ پھر اس نے مسکراتے ہوئے مجھے ایک طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ چند قدم کے بعد وہ ایک طرف مڑی جہاں دو دیواروں کے درمیان معمولی سا فاصلہ نظر آرہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس طرف بھی ایک گلی موجود تھی۔ چند قدم آگے وہ راستہ کشادہ ہوگیا لیکن ہمارے سامنے گلی کے عین بیچوں بیچ ایک تاریک سے چھپّر تلے کنواں بنا ہوا تھا جس پر باقاعدہ لکڑی کی چرخی بھی لگی ہوئی تھی۔ ہم دونوں اس کنویں کے چبوترے پر سے گزرتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

صفیہ ایک اور تنگ گلی میں مڑی اور دوسرے ہی لمحے ہمارے پیروں تلے سے زمین کھسک گئی۔ ہم گھاس پھوس اور کوڑے کرکٹ کی جس تہ سے گزرنے لگے تھے وہ یک دم ہی دھنس گئی اور ہم دونوں غڑاپ سے نیچے جاگرے۔ پہلے تو اس اندیشے سے میرا دل کچھ اور ڈوب گیا کہ کہیں یہاں بھی کوئی متروک کنواں تو موجود نہیں تھا لیکن جلد ہی ایک زوردار دھچکے سے ہم زمین سے جالگے۔ گڑھا زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن اچانک جھٹکے کی وجہ سے دماغ ہل گیا۔

اس بار میں صفیہ پر نہیں بلکہ صفیہ مجھ پر گری تھی۔ یوں گویا حساب برابر ہوگیا تھا۔ اوپر سے کوڑا کرکٹ بھی ہم پر گرا تھا جس کی وجہ سے فوری طور پر تو آنکھیں بند اور حواس مختل سے ہوگئے۔ ظاہر تھا کہ اس گڑھے کو چھپایا گیا تھا۔ اس پر گھاس پھونس اور کوڑا کرکٹ بچھایا گیا تھا تو اس کا کوئی مقصد بھی تھا لیکن اس نکتے کی طرف میرا ذہن ایک لمحے کی تاخیر سے گیا ورنہ شاید میں بروقت کچھ ہوشیار ہو جاتا۔

اس کے علاوہ مجھے صفیہ کی بھی فکر پڑ گئی تھی۔ میں اسے سنبھالنے میں لگ گیا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں ہم دوسری مرتبہ خندق میں گرے تھے اور یہ خندق گو کہ خشک اور چھوٹی تھی اس کے باوجود یہ تجربہ نہ جانے کیوں پہلے تجربے سے زیادہ خطرناک تھا۔ پہلی بار سیوریج والی خندق میں گرنے پر میں بدحواس نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس بار میں ایک لمحے کے لئے بدحواس ہوگیا تھا کیونکہ مجھے اپنے قریب سے صفیہ کی چیخ سنائی دی تھی۔

میں نے اس کی خبر لینے کی کوشش کی لیکن اس کے بعد میرے لئے خود اپنی خبر رکھنا دُشوار ہوگیا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے اوپر سے آسمان مجھ پر آن گرا تھا۔ میں کسی چیز میں بُری طرح لپٹ کر رہ گیا تھا۔ شاید وہ کوئی بھاری خیمہ یا بوری تھی۔ میں نے اس سے نکلنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کی لیکن اسی اثنا میں میرے سر پر کسی بھاری اور سخت چیز کی ضرب لگی۔

ضرب یقیناً زوردار تھی لیکن میں جس چیز میں لپٹ کر رہ گیا تھا اسی کی وجہ سے میری کھوپڑی کو تھوڑا سا تحفظ مل گیا اور پھر معاملہ بھی کسی عام کھوپڑی کا نہیں تھا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ فوری طور پر میرے اعضا بے جان سے ہوگئے' آنکھیں تو پہلے ہی دیکھنے سے قاصر ہو چکی تھیں' اس ضرب کی وجہ سے اندھیرا گویا ذہن اور حواس تک بھی آپہنچا۔ میں مکمل طور پر بے ہوش تو نہیں ہوا لیکن ہوش اور بے ہوشی کے درمیان کہیں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی گویا مجھے آکٹوپس نے گرفت میں لے لیا۔ بہت سے بازو یا پھر شاید رسیاں میرے چاروں طرف لپٹ گئی تھیں۔ میں صحیح طور پر نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کیا چیزیں تھیں لیکن اگر مجھ میں حرکت کرنے کی تھوڑی بہت سکت باقی تھی تو انہوں نے مجھے اس کے قابل بھی نہیں چھوڑا۔ تاہم میرا ذہن پوری طرح تاریکی کی دلدل میں نہیں اترا تھا۔ میرے حواس شاید نہایت معمولی حد تک کام کر رہے تھے۔

مجھے صفیہ کی چیخ سنائی دی لیکن وہ آواز جیسے کہیں بہت دور سے اور کسی کنویں کی تہ سے آئی تھی۔ اس عالم میں مجھے اس کنویں کی بھی نہایت دھندلی سی یاد آئی جو ہم نے راستے میں دیکھا تھا اور شاید مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کیا صفیہ دوبارہ اس کنویں تک جا پہنچی تھی اور اس نے کسی وجہ سے اپنے آپ کو اس میں گرا لیا تھا؟

مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ شاید مجھے اوپر کی طرف اٹھایا جا رہا تھا یا پھر میں خود ہی بہت ہلکا ہوگیا تھا اور گیس والے [illegible] طرح دھیرے دھیرے اوپر آسمان کی طرف جا رہا تھا۔ [illegible] خاصی دیر تک رہی۔ شاید میں فضا میں چاروں طرف بکھر [illegible] رہا تھا۔ کبھی اوپر نیچے ہونے لگتا تھا اور کبھی نہایت سُست [illegible] دائیں بائیں پرواز کرنے لگتا تھا۔

پھر جیسے میرا ہلکا پن ختم ہوگیا اور میں دھم سے نیچے [illegible] شاید میری ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی۔ میرے ذہن میں [illegible] ہوا لیکن یہ جھٹکا گویا صحت افزا تھا۔ میری کیفیت اس [illegible] بلب کی سی تھی جو زیادہ واٹ کا تھا لیکن کسی گڑبڑ کی وجہ سے بہت کم برقی توانائی مل رہی تھی اس لئے وہ صحیح معنوں میں [illegible] نہیں تھا بلکہ محض ٹمٹما رہا تھا۔

اس تازہ دھچکے نے گویا برقی توانائی کسی حد تک بحال کر [illegible] لیکن میں اب بھی اپنی اصلی حالت پر نہیں آیا تھا تاہم اتنا [illegible] کہ مجھے اپنے اردگرد کی آوازیں کافی صاف سنائی دینے لگی [illegible] اور میرے محسوسات پر سے بھی اندھیرا کسی حد تک چھٹ [illegible] اب کم از کم اتنا ضرور تھا کہ میں اپنے حواس بحال کرنے [illegible] یوگا کی سانسوں کی مشقوں کا سہارا لے سکتا تھا ورنہ اس سے [illegible] میرے ذہن کے کسی گوشے میں یوگا کا نہایت ہی مدھم سا [illegible] تھا لیکن میں نے کوشش کے باوجود اپنے آپ کو اس قابل [illegible] نہیں کیا تھا کہ میں یوگا کی کسی مشق کا سہارا لے سکتا۔

اب میں نے یکدم سانس روک لی اور اپنے ذہن کو ایک [illegible] پر مرکوز کرنے کی کوشش کی۔ اردگرد کی آوازیں میری یکسوئی میں خلل ڈالنے کی کوشش کر رہی تھیں لیکن میں انہیں سنتے اور [illegible] ہوئے بھی ان کی طرف سے بے نیاز تھا۔ مجھے یہ بھی احساس [illegible] تھا کہ میرے گرد کوئی بڑا سا پرانا کمبل لپٹا ہوا تھا لیکن میں نے [illegible] ہٹانے یا اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ پھر [illegible] مٹی کی چبھن کے باوجود میں نے آنکھیں دوبارہ بند کرلیں۔ [illegible] اردگرد جو بھی لوگ موجود تھے ان کی نظر میں' میں بے ہوش [illegible] تو بہتر تھا۔

میں اپنے اردگرد مختلف آوازیں سن رہا تھا۔ پھر قریب [illegible] گالی دے کر بولا "..... کا بچہ بہت ہی بھاری ہے" موٹی سی گالی [illegible] ساتھ یہ عزت افزائی میری ہی کی گئی تھی۔

کسی نے تصحیح کی "اے..... کا بچہ نہیں ہاتھی کا بچہ کہو۔" [illegible] کوئی غرانے کے سے انداز میں دھیرے سے ہنسا اور بولا "[illegible] میں تو نہیں لگتا؟"

"[illegible] ٹھانے میں لگ رہا تھا....." پہلی آواز نے ہانپتے [illegible] جواب دیا "اور پھر ہم نے اسے پکڑا بھی تو اسی ٹیکنیک سے [illegible] ہاتھی پکڑے جاتے ہیں۔"

پھر مجھے قریب ہی کہیں سے صفیہ کے کراہنے کی تو آواز آئی [illegible] کسی نے یقیناً اسی سے پوچھا۔

"تمہیں کہاں چوٹ لگ گئی ہے مری جان.....!" اس سے آگے اس نے بہت ہی غلیظ سی بات کی جو کسی کے بھی لہو میں ابال لانے کے لئے کافی تھی لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اپنی یکسوئی کو برقرار رکھا۔

اس کے بعد صفیہ بالکل خاموش ہوگئی۔ وہ جو کوئی بھی تھے انتہائی گھٹیا اور غلیظ انداز میں بات کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ آپس میں بھی وہ گالی گلوچ کے بغیر بات نہیں کر رہے تھے۔ میرے گرد لپٹا ہوا وہ کمبل اچانک کھینچ لیا گیا۔ میں نے تب بھی آنکھیں نہ کھولیں۔ کمبل کھینچے جانے سے میں بری طرح ہل گیا تھا اور میری سانس کی مشق متاثر ہوئی تھی لیکن میں نے اسے جاری رکھا۔ اب اس کا مقصد پورا ہونے کے قریب تھا۔ میرے سر میں اٹھتی ہوئی دھمک معدوم ہو رہی تھی اور میرے جسم میں طاقت واپس آرہی تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ کوئی قریب سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر میرے قریب سے ہی آواز ابھری "آدمی تو امیر معلوم ہوتا ہے۔"

"ابے سالے کی جیبوں کی تلاشی لے..... بٹوا دیکھ..... امیر آدمیوں کے پاس زیادہ کیش نہیں ہوتا۔ وہ کیش لے کر نہیں گھومتے۔ ہمارے لئے تو وہ امیر ہے جس کی جیبوں میں نوٹ بھرے ہوں۔ ہمیں کسی کے سوٹ ٹائی سے کیا لینا" کسی نے نہایت روانی سے کہا۔ لہجہ اس کا بھی گھٹیا قسم کے بدمعاشوں والا ہی تھا لیکن اس سے تحکم جھلک رہا تھا۔

ایک ہاتھ بڑی تیزی سے میری جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس مقصد کے لئے ایک بار مجھے آدھی کروٹ بھی دلائی گئی۔ میرا بٹوا اور کار کی چابیاں وغیرہ نکال لی گئیں۔ اتفاق سے میرے بٹوے میں خاصی نقد رقم کے علاوہ ایک جیب میں بھی خاصی تعداد میں بڑے نوٹ موجود تھے۔ ایک مسرت بھری آواز ابھری جو یقیناً تلاشی لینے والے کی تھی "استاد! اس کے پاس سے تو اچھی خاصی رقم نکل آئی ہے۔ یہ خالی چیک بک اور کریڈٹ کارڈ لے کر گھومنے والا سیٹھ نہیں لگتا..... اور گاڑی کی چابی بھی ہے..... مرسیڈیز کی چابی ہے۔"

"ابے گاڑی تو پتا نہیں کہاں کھڑی ہوگی..... تو مال ادھر لا؟" دوسری آواز نے کہا۔

ایک لمحے خاموشی رہی۔ اس دوران میں شاید مال ایک ہاتھ سے دوسرے میں منتقل ہوا پھر پہلی ہی آواز نے کہا "گاڑی کے بارے میں بھی اپنا چھوٹو خبر لے آئے گا۔ وہ ادھر ادھر گھومتا رہتا ہے۔ کچھ دیر تو مرسیڈیز میں عیش کریں گے..." پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "استاد' اس کا سوٹ بھی مٹی میں لتھڑا ہوا ہے لیکن ہے بہت شاندار..... یہ بھی اتار لوں۔"

"ابے کانگڑی کے بچے! یہ سوٹ کیا اپنے باپ کو پہنائے گا؟ اپنا تو کا تو دیکھا ہے؟ جو کر دکھائی دے گا..... ویسے خیر..... تو تو سوٹ کے بغیر بھی جوکر ہی ہے۔"

"ابا کو کہاں سے پہناؤں گا استاد! ابا تو قبر میں ہے۔ اب تو شاید اس کی ہڈیاں ہی رہ گئی ہوں گی۔ ہڈیوں پر سوٹ پہنا دوں کیا اچھا لگے گا....."

"تیرے جیسا ہی لگے گا" استاد نے وحشت زدہ سا قہقہہ لگا کر کہا۔ اس کی آواز میں خمار اور زبان میں ہلکی سی لکنت تھی۔ قہقہوں کی مزید آوازیں بھی سنائی دیں۔

پھر پہلی آواز نے ہی منت کے سے انداز میں کہا "استاد! میں تو اس لئے سوٹ اتارنے کو کہہ رہا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی کو بھی نہ آیا تو دو چار سو میں تو آرام سے بک ہی جائے گا۔ ٹائی بھی دیکھو کتنی شاندار ہے..... اور یہ دیکھو اس پر پن بھی لگی ہے..... اس پر یہ جو چمکیلے سے نگینے لگے ہیں شاید یہ ہیرے ہوں....."

اس دوران میں میری ٹائی زور سے کھینچی گئی۔ غنیمت تھا کہ میں پہلے ہی سانس روکے ہوئے تھا ورنہ شاید میرا دم گھٹنے لگتا۔

ایک بار پھر استاد کا استہزائیہ سا قہقہہ ابھرا "بلی کو خواب میں بھی چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔ ابے.....! اب وہ ہیروں وغیرہ والی ٹائی پنوں کا رواج نہیں رہا۔ یہ نقلی ہیرے ہیں..... مگر تو نے زندگی میں کبھی ہیرے دیکھے ہوں تو تجھے پتا ہو۔"

"اب تو دیکھ لئے ہیں استاد! کتنی مرتبہ تو ہیروں کے زیور ٹھکانے لگائے ہیں۔" پہلی آواز نے کہا۔

"اب دو چار مرتبہ ہیرے دیکھنے سے کوئی آدمی جوہری تھوڑا ہی بن جاتا ہے..... اور یہ سوٹ کو بیچنے باچنے کا خیال اپنے بھوسا بھرے دماغ سے نکال دے۔ ہم کو لنڈے کا کاروبار نہیں کرنا ہے۔ تو اس کی گھڑی اتار..... گھڑی.....! مجھے راڈو لگ رہی ہے" یہ استاد کی مخمور آواز تھی۔

دوسرے ہی لمحے کھٹاک سے گھڑی کی چین کھلی اور گھڑی میرے ہاتھ سے کھینچ لی گئی پھر وہی مسرت بھری آواز ابھری "ہاں استاد.....! راڈو ہی ہے..... بیس پچیس ہزار کی تو ہوگی..... اس کی تو چین بھی سونے کی لگ رہی ہے..... یہ تو اس سے بھی بہت زیادہ کی ہوگی۔"

استاد کی آواز ابھری "ابے لنگور کی اولاد! اتنی زیادہ باچھیں مت پھیلا۔ قیمتِ خرید کے بارے میں نہیں..... صرف قیمتِ فروخت کے بارے میں سوچا کر..... یہ دیکھا کر کہ چیز بکے گی کتنے میں۔ کیا سمجھا؟ لا ادھر لا گھڑی۔"

ایک لمحے خاموشی رہی۔ اس دوران میں گھڑی یقیناً استاد کے ہاتھ میں پہنچ گئی تھی۔ اس کی مخمور مگر طمانیت بھری آواز ابھری "اچھی چیز ہے....." پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا "مگر سوچنے کی بات ہے کہ یہ امیر آدمی اس علاقے میں کیا کر رہا تھا۔ مجھے تو کوئی مشکوک معاملہ لگتا ہے۔"

ایک نئی آواز ابھری۔ یہ زیادہ کھردری اور سفاک سی آواز تھی "یہ اس کی معشوقہ بیٹھی ہے نا..... ہوش حواس میں بیٹھی ہے....."

مڑ مڑ ہم لوگوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اس سے پوچھ لیتے ہیں۔۔۔۔"

صفیہ کی ہلکی سی چیخ ابھری۔ شاید اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی گئی تھی۔ میری سانس کی مشق اس وقت ختم ہونے کو تھی۔ سفاک اور کھردری آواز نے صفیہ سے پوچھا "تم اس کی کون ہو جانِ تمنا؟ بیوی تو نہیں لگتیں۔"

"میں ان کی ملازم ہوں" صفیہ نے ناگواری سے جواب دیا۔

مجھے یہ اندازہ کرکے اطمینان ہوا کہ اس صورتِ حال میں بھی اس کا ذہن ٹھیک کام کر رہا تھا۔ اس نے اصل بات انہیں سمجھانے اور زیادہ لمبی چوڑی وضاحتیں کرنے کے بجائے عام فہم جواب دیا تھا۔

مگر ان لوگوں کے لئے شاید یہ جواب کافی نہیں تھا۔ استاد کی استہزائیہ سی آواز سنائی دی "کس قسم کی ملازمت ہے تمہاری؟ رات کی نوکری ہے؟"

صفیہ خاموش رہی۔ سفاک اور کھردری آواز والے نے غالباً اسے ٹھوکا دیا "بولو نا میری دلربا! استاد کچھ پوچھ رہے ہیں۔"

"میں ٹائپسٹ ہوں ان کے دفتر میں" صفیہ نے جواب دیا۔

"باہر بھی ان کے ساتھ پھرتی رہتی ہو۔ کیا پتا باس کو کہاں کچھ ٹائپ کرانے کی ضرورت پیش آجائے۔ ہے نا؟" استاد کی زہریلی سی آواز پھر ابھری۔ اس کے ساتھ ہی دو تین قہقہے سنائی دیے۔ پھر استاد نے غالباً ایک جھٹکے سے ہنسی روک کر ذرا خطرناک انداز میں غرا کر پوچھا "تم دونوں اس علاقے میں کیا کرتے پھر رہے تھے؟"

"میں اپنے ایک رشتے دار کو کچھ سمجھانے بجھانے کے لئے باس کو ساتھ لے کر آئی تھی۔۔۔۔ سفارش کے طور پر۔۔۔۔" صفیہ کمزور سے لہجے میں بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں کچھ خوف بھی جھلک آیا تھا۔ اس کی آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہوں گی وہ یقیناً ایک لڑکی کو اس سے بھی زیادہ خوفزدہ کرنے کے لئے کافی ہوگا۔

"اوہ۔۔۔ بڑا رحمدل باس ہے!" استاد کے لہجے میں اب بھی زہر بھرا ہوا تھا "تمہارے کام سے تمہارے ساتھ آگیا۔ کسی مرد ملازم کے ساتھ تو کبھی کہیں نہیں گیا ہوگا۔"

صفیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ دفعتاً وہی آواز ابھری جو میں اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ سن چکا تھا "استاد! اس سالے کا کرنا کیا ہے؟" اشارہ یقیناً میری طرف تھا۔

استاد موٹی سی ایک گالی دے کر بولا "۔۔۔ کو مار مور کے کہیں پھنکوا دو۔ ہمیں اس سالے کا کیا کرنا ہے۔"

"استاد' موٹی اسامی ہے۔ اس کے بدلے لمبا تاوان مل سکتا ہے" پہلی آواز نے گویا ایک اہم پہلو کی طرف توجہ دلائی۔

"ابے۔۔۔ کے بچے! تجھ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ ہمارے حالات اس قسم کے چکروں میں پڑنے کی اجازت نہیں دیتے۔ ہم مسافر لوگ ہیں" استاد کچھ جھنجلا کر بولا "تاوان کے چکر میں کبھی لینے کے دینے بھی پڑ جاتے ہیں۔ ہمیں اس کے بغیر بھی کیا کمی ہے۔

آسیب زدہ

انوار صدیقی (زیرِ طبع)

عیش سے زندگی بسر ہو رہی ہے۔ کون سی عیاشی ہے جو ہم [illegible] کرتے۔"

سفاک اور کھردری آواز ایک بار پھر ابھری۔ موضوع [illegible] ایک بار پھر میں ہی تھا "استاد! اسے رات کے شغل کے [illegible] لیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ اس کی بکا بوٹی کریں گے۔ ذرا مزہ [illegible] ویسے بھی اس ٹھکانے پر آج یہ ہماری آخری رات ہے۔ یہاں [illegible] بڑی نشانی چھوڑ کر جانی چاہیے۔ کوئی کٹی پھٹی۔۔۔۔ ادھڑی ہوئی [illegible] مسلی ہوئی۔۔۔۔ جلی ہوئی لاش' جس کی شناخت نہ ہوسکے۔ سالے [illegible] ذرا چیرے لگا کر مرچیں بھریں گے۔۔۔۔ ڈرل مشین سے [illegible] سوراخ کریں گے۔۔۔۔ کیلیں ٹھونکیں گے۔۔۔۔ جب سالا بڑے [illegible] مینڈک کی طرح پھدکے گا۔۔۔۔ تو کتنا مزہ آئے گا استاد!"

"آج رات اس شغل کی ضرورت نہیں" استاد کی [illegible] آواز ابھری "آج رات اپنے پاس یہ دوسرا شغل جو موجود ہے اور اب تو ویسے بھی ایک کی جگہ دو دو معشوقائیں ہوگئی ہیں [illegible] فرصت کہاں ملے گی۔"

میں نے صفیہ کے سسکی لینے کی سی آواز سنی۔ شاید اس [illegible] ساتھ کسی نے کوئی حرکت کی تھی یا پھر استاد کی بات سن کر اس [illegible] اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی تھی۔ میری سانس کی [illegible] پوری ہو چکی تھی۔ میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھول [illegible] میرے لئے سب سے زیادہ طمانیت کی بات یہ تھی کہ انہوں [illegible] میرے ہاتھ پاؤں باندھنے یا آنکھوں پر کپڑا باندھنے کی زحمت [illegible] کی تھی۔ شاید ان کے خیال میں شکار کو قابو میں کرکے لانا ہی [illegible] مسئلہ تھا۔ اس کے بعد تو اس میں اتنی سکت یا جرات ہی نہیں [illegible] ہوگی کہ وہ ان کے سامنے ہاتھ بھی ہلا سکے۔

لطف کی بات یہ تھی کہ جب میں نے آنکھیں کھولیں تو ان [illegible] سے کسی کی توجہ بھی میری طرف نہیں تھی اور ایک شخص جو [illegible] طرف پشت کئے کھڑا تھا اس کے ہاتھ میں ڈھیلے ڈھالے انداز [illegible] لٹکی ہوئی کلاشنکوف میرے ہاتھ کی رسائی میں تھی۔ میں چاہتا [illegible] اسے اس کے ہاتھ سے کھینچ کر ان کے سنبھلنے سے پہلے انہیں [illegible] کر سکتا تھا لیکن میں نے صورتِ حال کا ذرا بہتر طور پر جائزہ لے [illegible] مناسب سمجھا۔ میں کوئی کچا قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ زیادہ فکر [illegible] صفیہ کی تھی۔

میں نے دیکھا' وہ ایک دیوار کے قریب ٹوٹی ہوئی کرسی پر [illegible] تھی۔ اس کے قریب میلے سے کپڑوں میں مجہول سا نوجوان [illegible] کھڑا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی اور بال لمبے تھے۔ وہ ایک [illegible]

[illegible] کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بلاشبہ ایک قاتل کی [illegible] تھیں۔ میں جو کھردری اور سفاک سی آواز سنتا رہا تھا وہ [illegible] کی تھی۔ وہ چہرے سے ذہنی بیمار اور سخت اذیت پرست نظر [illegible] تھا۔ وہ نوجوان تھا مگر اس نوجوانی میں اذیت پرستی کے نہ جانے [illegible] کھیل کھیل چکا تھا۔ اس کے چہرے میں بظاہر کوئی [illegible] نہیں تھی۔ اس کے باوجود اس کے اعمال نے گویا اس کا چہرہ [illegible] کر کے رکھ دیا تھا۔

[illegible] صفیہ کے بال بکھر چکے تھے اور مٹی میں لتھڑے نظر آرہے [illegible] ان میں تنکے بھی پھنسے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ بغلوں میں ہاتھ [illegible] سر جھکائے یوں سکڑی سمٹی بیٹھی تھی جیسے اسے سردی لگ [illegible] رہی ہو۔ اس سے دو قدم کے فاصلے پر لکڑی کا ایک تخت پڑا تھا [illegible] میلا کچیلا سا ایک گدا بچھا ہوا تھا اور گاؤ تکیے بھی پڑے تھے۔ [illegible] گاؤ تکیے سے ایک شخص ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ ذرا زیادہ عمر [illegible] بھاری جسم کا تھا۔ اس کے سر پر بڑا سا رومال بندھا ہوا تھا اور [illegible] آنکھیں نشے سے بوجھل تھیں۔ صورت سے وہ بھی کچھ کم سفاک [illegible] نہیں لگتا تھا۔

وہ یقیناً وہی تھا جسے استاد کے لقب سے پکارا جا رہا تھا۔ اس [illegible] کے پہلو میں تراشیدہ بالوں والی ایک سوکھی سڑی سانولی سی لڑکی بیٹھی [illegible] تھی۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں سی جمی ہوئی تھیں اور وہ [illegible] بار بار ان پر زبان پھیر رہی تھی۔ استاد اس کی کمر میں بازو حمائل [illegible] کئے نیم دراز تھا اور اس وقت شاید وہ خود کو کوئی قدیم رومن شہنشاہ [illegible] محسوس کر رہا تھا جو اس وقت اپنے سلطنتِ عظمیٰ کے تخت پر فروکش [illegible] تھا اور اپنی اقلیمِ بے کراں کے سیاہ و سفید کا مالک تھا۔

فرش پر دو تین چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک پر مجھے لٹایا گیا تھا۔ ایک اور چٹائی پر دیوار سے ٹیک لگائے دو نوجوان بیٹھے تھے۔ وہ ٹانگیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ ان میں سے ایک کی گود میں ٹی ٹی اور دوسرے کی گود میں کلاشنکوف رکھی تھی۔ وہ [illegible] بھی گردنیں موڑے استاد۔۔۔۔ یا پھر شاید اس کے پہلو میں [illegible] لڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ایک اور لڑکا استاد کے پیچھے مؤدب انداز میں کھڑا تھا۔ وہ [illegible] سے کچھ زیادہ ہی عمرو عیار قسم کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ بظاہر وہ [illegible] انداز میں کھڑا تھا لیکن اس کی نظریں بے چینی سے چاروں [illegible] گردش کر رہی تھیں۔ اس کے کندھے پر بھی ایک کلاشنکوف [illegible] ہوئی تھی۔ اس کی طرف سے مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ شاید وہ [illegible] آنکھیں کھولے ہوئے دیکھ لے۔ میں نے جلدی سے آنکھیں [illegible] بند کرلیں۔ صرف اتنی سی کھلی رکھیں کہ مجھے کسی نہ کسی حد [illegible] اپنے اردگرد کا منظر نظر آتا رہے۔

[illegible] وہاں کا جائزہ لینے کے سلسلے میں میرے لئے صرف چند سیکنڈ کی [illegible] کافی تھی۔ جائزہ میں نے لے لیا تھا۔ وہ کسی بہت ہی خستہ [illegible] مکان کا ہال نما کمرا تھا جس پر سیمنٹ کی شیٹ کی چھت تھی۔ کمرا کافی بڑا تھا۔ اس میں لکڑی کے دو ٹیڑھے میڑھے سے ستون بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی ناہموار دیواروں پر پھیرا گیا چونا مٹیالا ہو چکا تھا اور جگہ جگہ سے اس کی تہیں اکھڑ چکی تھیں۔ ان دیواروں پر کہیں کہیں بڑے عنابی دھبے نظر آرہے تھے جن پر نظر پڑتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ خون کے تھے۔ انہی کے آس پاس ایسی لمبی لمبی لکیریں بھی نظر آرہی تھیں جیسے خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھ دیواروں پر صاف کئے گئے ہوں۔

ان نشانات کا تاثر بہت عجیب تھا۔ کمزور اعصاب کا آدمی انہیں دیکھتا تو اس کے جسم میں جھرجھری آسکتی تھی۔ ویسے وہاں کا پورا ماحول ہی جسم میں جھرجھری بلکہ کپکپی لانے والا تھا۔ کمرا بہت بڑا ہونے کے باوجود چاروں طرف سے بند تھا۔ وہاں سیلن اور ایک عجیب سی بدبو کا راج تھا۔ شاید وہ نحوست کی بدبو تھی۔ ابھی رات نہیں ہوئی تھی لیکن وہاں گرد آلود سے دو بلب روشن تھے جن کی زرد روشنی وہاں پھیلی ہوئی تھی۔

استاد کے تختِ شاہی کے عقب میں ایک دروازہ کھلا نظر آرہا تھا اور اس کے عقب میں ایک موٹی سی رسی کا پھندا جھولتا نظر آرہا تھا۔ یہ پھانسی کا پھندا تھا اور یہ جھرجھری دلانے والی مزید ایک چیز تھی۔ شاید وہاں مزید ایسی بہت سی چیزیں موجود ہوں لیکن فی الحال ان تک میری نظر نہیں جاسکتی تھی۔

وہ تعداد میں پانچ تھے۔ جسے وہ استاد کے لقب سے پکار رہے تھے وہ ان کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق مکان میں ان پانچوں کے سوا کوئی مزید مسلح فرد موجود نہیں تھا اس لئے میں اپنی حکمتِ عملی آسانی سے طے کر سکتا تھا۔ اپنی جیب میں ہاتھ ڈالے بغیر مجھے یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ میرا مشن پسٹل نکالا جا چکا تھا۔

مجھے میرے اکلوتے ہتھیار سے محروم کرنے کے بعد وہ یقیناً میری طرف سے پوری طرح بے فکر ہوگئے تھے۔ معزز اور کچھ بزنس مین ٹائپ شخصیت ظاہر ہونے سے مجھے اکثر یہ فائدہ ہوتا تھا کہ اکثر بدمعاش اور خطرناک قسم کے افراد میری طرف سے ذرا بھی فکرمند نہیں ہوتے تھے۔ اس وقت بھی کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ وہ مجھے ایک بے کار تربوز کی طرح ایک طرف پھینک کر گویا بھول گئے تھے۔

اسی اثنا میں چٹائی پر دیوار کے سہارے بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے فرش پر لڑھکتی ہوئی شراب کی دو خالی بوتلوں کو پاؤں سے ایک طرف ہٹایا اور استاد کے پہلو میں بیٹھی ہوئی سانولی اور کم رُو سی لڑکی کی طرف اشارہ کرکے بولا "استاد! اس کو تو اب چھٹی دے دو نا۔۔۔۔ ہم لوگ کب تک انتظار میں بیٹھیں گے۔" اس کی آواز میں بھی خمار کی جھلک تھی۔

استاد جیسے کسی خیال سے چونکا۔ اس نے یوں لڑکی کی طرف دیکھا جیسے اب تک وہ بے خیالی میں اسے بازو کے حلقے میں لیے بیٹھا

تھا۔ اس نے فوراً اپنا بازو کھینچ لیا اور بے پروائی سے بولا "ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میری طرف سے تو اسے چھٹی ہی چھٹی ہے۔۔۔۔ بلکہ تم لوگ بھی چاہو تو اچھی طرح اپنا دل خوش کرنے کے بعد اس کی پکی چھٹی ہی کردینا۔۔۔۔ اپنے پاس اب اس سے زیادہ اچھا۔۔۔ زیادہ... تروتازہ۔۔۔ زیادہ خوب صورت مال آگیا ہے۔" اس نے صفیہ کی طرف اشارہ کیا۔ صفیہ گو کہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی' اس کے باوجود اپنی جگہ پر مزید سکڑ سمٹ کر رہ گئی۔

چٹائی پر بیٹھا نوجوان مسرور لہجے میں سانولی لڑکی سے مخاطب ہوا "آجاؤ جانِ تمنا! اب اس شاہی تخت سے اتر آؤ۔ بہت دن تم نے استاد کا دل خوش کرلیا۔ اب کچھ ہم غریبوں کا بھی خیال کرو۔"

سانولی لڑکی نے اجازت طلب سی نظروں سے استاد کی طرف دیکھا۔ استاد نے سرہلا کر گویا اسے اجازت مرحمت فرمادی۔ وہ تخت سے اتری اور جھک کر فرش سے کوئی چیز اٹھانے لگی تو استاد نے ایک بہت ہی کمینی حرکت کی۔ اس نے لڑکی کی پشت پر زور سے لات رسید کی۔ لڑکی اوندھے منہ گھسٹتی ہوئی دور جاگری۔ اس کے حلق سے بے ساختہ عجیب سی چیخ نکل گئی۔

سب نے ہم آہنگ ہو کر ایک بلند قہقہہ لگایا۔ وہ قہقہے نہیں گویا بدروحوں کی بے ہنگم سی آوازیں تھیں جو اس آسیب زدہ مکان میں گونج کر رہ گئی تھیں۔ لڑکی اٹھ کھڑی ہوئی لیکن وہ سسک رہی تھی۔ چٹائی اور فرش پر رگڑ کھانے کی وجہ سے اس کا آدھا چہرہ چھل کر رہ گیا تھا۔ اس نے ڈبڈبائی سی آنکھوں سے استاد کی طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں ایسی بے چارگی اور تذلیل کی ایسی جھلک تھی جسے صرف محسوس کیا جاسکتا تھا' بیان نہیں کیا جاسکتا۔

استاد نے صحیح طور پر اس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ اب صفیہ کی طرف متوجہ تھا۔ اپنے قریب خالی ہونے والی جگہ کو ہاتھ سے تھپکتے ہوئے وہ باچھیں پھیلا کر بولا "آجاؤ میری دلربا! یہاں آجاؤ۔ تمہاری جگہ وہاں نہیں' یہاں ہے۔"

صفیہ نے صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور فوراً سر جھکالیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔ وہ کافی بے باک' جُرات مند اور تیز و طرار لڑکی تھی لیکن اس وقت چوکڑی بھول چکی تھی۔ وہ شاید ہولے ہولے کانپ رہی تھی اور دو ایک مرتبہ اس کے منہ سے گھگیائی ہوئی سی آوازیں بھی نکلی تھیں۔

وہ جب اپنی جگہ سے نہ ہلی تو اس کے قریب کھڑے ہوئے لمبے بالوں والے نوجوان نے اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کیا۔ اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ نوجوان اپنے مخصوص کھردرے اور سفاک لہجے میں بولا "استاد کا حکم نہیں سنا تم نے؟ استاد کے حکم پر دوڑتے ہوئے جانا چاہیے۔ تمہیں پتا ہی نہیں ہے کہ استاد کتنا باکمال آدمی ہے۔ چلو۔۔۔ اٹھو۔۔۔"

اس نے اسی طرح بالوں سے کھینچ کر اسے کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن اسی لمحے استاد کو جیسے کچھ خیال آیا۔ وہ ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے بولا "یار! پہلے اس بھاری لاش کو ٹھکانے لگاؤ۔ اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر پچھلے کمرے میں پھینک دو۔ بعد میں سوچیں گے' اس کا کیا کرنا ہے۔ سالا خواہ مخواہ یہاں جگہ گھیر رہا ہے۔"

روئے سخن ایک بار پھر میری طرف تھا۔ میں نے آنکھوں کو صرف اتنی جھری رکھی تھی کہ کسی کو نظر نہ آسکے۔ ویسے بھی میرے چہرے پر کسی چیز کا سایہ پڑ رہا تھا۔ لمبے بالوں والے نے صفیہ کے بال چھوڑ دیے اور ڈرامائی سے انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا میرے قریب آگیا۔ پھر اس نے پلٹ کر استاد سے اجازت طلب انداز میں پوچھا "پہلے اس کو ہوش میں نہ لے آؤں؟"

"ابے' پہلے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ گھامڑ کے بچے!" استاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں لمبے بالوں والے کے لیے فرعونیت کی نہیں بلکہ کچھ محبت کی جھلک تھی۔

"ہوش میں لاکر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیں گے استاد! ہاتھ پاؤں کھلے بھی ہوں گے تو یہ کیا کرلے گا۔۔۔۔!" اس نے مجھے... ایک موٹی سی گالی سے نوازا۔

"یہ سالا کچھ تھوڑا بہت دل والا معزز آدمی معلوم ہوتا ہے۔ دیکھا نہیں۔۔۔۔ اس کی جیب میں سے مشین پسٹل نکلا تھا۔" استاد نے یاد دلایا۔

"اگر یہ تھوڑا بہت دل والا ہوگا تو اسی کے بل بوتے پر ہوا استاد! جب ہتھیار ہی نہیں رہا تو اس میں اور بکری میں کوئی فرق نہیں رہ جائے گا۔" لمبے بالوں والے نے بے پروائی سے کہا۔

"کبھی کبھی بکری بھی سینگ ماردیتی ہے جانِ عالم پیا!" استاد بدستور محبت اور شفقت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"ایسے سینگوں کی کس کو پروا ہے استاد!" لمبے بالوں والا حقارت سے ہنس کر بولا "میں اسے ہوش میں لاتا ہوں۔ اس سے تھوڑی بہت پوچھ گچھ بھی تو کرنی چاہیے۔"

"ٹھیک ہے گھامڑ کے بچے! تم نہیں مانو گے۔ اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارو۔" استاد نے گویا ازراہِ شفقت اجازت دے دی۔

"تمہیں پتا ہے استاد۔۔۔ اپن کسی کو پانی سے ہوش میں نہیں لاتے۔ ویسے بھی تمہیں معلوم ہوچکا ہوگا کہ اس علاقے میں پانی کی کتنی تنگی ہے۔ کسی کو ہوش میں لانے کا اپنا تو الگ ہی طریقہ ہے۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے اچانک ہی میرے کولہے کے قریب ٹھوکر رسید کی۔

درد کی ایک نئی لہر مجھے برداشت کرنی پڑی اور مجھے اپنے آپ پر غصہ آیا۔ میں نے حرکت میں آنے میں کچھ زیادہ ہی دیر کردی تھی اور مجھے یہ حقارت آمیز ٹھڈا بھی برداشت کرنا پڑا تھا۔ دوسرا نقصان یہ ہوا تھا کہ اب سب کی توجہ میری طرف تھی۔ میں مزید

استقامت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساکت لیٹا رہا۔

استاد مخمور سے انداز میں ہنس کر بولا "ابے! یہ تو ہوش میں آنا۔ تیرا قارمولا اسے زیادہ لمبا ہی بے ہوش نہ کردے۔"

"ارے نہیں استاد۔۔۔۔! ابھی دیکھو کیسا ہوش میں آتا ہے۔" بالوں والے نے مجھے دوسری ٹھوکر رسید کرنے کے لیے ٹانگ اٹھائی۔ میرے خیال میں اب بہت ہوچکا تھا۔ خطرہ خواہ بڑھ چکا تھا لیکن اب کوشش کرنا ضروری ہوگیا تھا ورنہ وہ خبیث کا بچہ ٹھوکریں مار مار کر میرے جسم کو دکھتے ہوئے اعضا کا ایک انبار بنا کر رکھ دیتا۔ میرے لیے زیادہ مشکل مسئلہ اصل میں دونوں لڑکیوں کو بچانے کا تھا۔ اگر اندھا دھند کارروائی کرنے کی گنجائش ہوتی تو پھر مجھے خطرے کی بھی پروا نہیں تھی۔

جانِ عالم پیا کی ٹانگ۔۔۔۔ دوسری ٹھوکر رسید کرنے کے لیے حرکت میں آئی۔ اس کے بعد انہیں پتا نہیں چل سکا ہوگا کہ ان کے ساتھ کیا ہوا۔ وہ ٹھوکر رسید کرنے کی حسرت ان کے دل میں ہی رہ گئی ہوگی کیونکہ ان کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آگئی تھی اور اس کے بعد وہ پلک جھپکتے میں خود فرش پر آگئے تھے۔

میں نے ایک بازو اور ٹانگوں کی مدد سے اسے پلک جھپکتے میں اس طرح جکڑا کہ وہ میری ڈھال بن گیا اور ابھی میں چٹائی سے اٹھا نہیں تھا۔ صرف میں نے رخ تھوڑا سا بدل لیا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی انتہائی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنا ہتھیار سنبھال بھی لیتا اور فائر کرنے میں کامیاب ہوجاتا تو گولی پہلے زلفوں والی سرکار کو لگتی جب کہ ان کی طرف سے ایسا کوئی ردِعمل ظاہر ہی نہیں ہوسکا۔

اسی دوران میں لمبے بالوں والے کی ٹی ٹی میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔ یہ منظر ان کے لیے یقیناً ایسا ہی تھا جیسے بجلی کا کوندا لپک گیا ہو۔ شاید ان کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یہ کیا ہوا تھا اور کیسے ہوا تھا۔ اگر ان میں سے کوئی سمجھ بھی پایا تھا تو شاید اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اسی لیے ان میں سے کوئی بھی فوری طور پر کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کرسکا تھا۔

میرے لیے اتنی مہلت کافی تھی۔ اس وقت شاید میں نے اپنی زندگی کی تمام ترنشانے بازی کے بہترین نمونوں میں سے ایک نمونہ پیش کیا جس کی "تیز رفتاری" بھی ناقابلِ یقین تھی۔ میں نے چشم زدن میں چار افراد پر صرف ایک ایک گولی خرچ کی جس کے دوران میں میں نے یہ خیال بھی رکھا کہ سانولی لڑکی اور صفیہ گولی کی زد میں نہ آنے پائیں۔

میری کوشش کامیاب ہی رہی۔ استاد اور اس کے تین چیلے اپنی اپنی جگہ ڈھیر ہوگئے بلکہ استاد تو اپنے تختِ شاہی سے نیچے ہی آگرا کیونکہ اس وقت وہ تخت کے کنارے پر ہی تھا۔ وہ کچھ عجیب انداز میں گرا تھا اور عجیب ہی انداز میں ساکت ہوگیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی دیر تک مرغا بنا رہنے کے بعد اوندھا ہی لڑھک گیا تھا اور اسی حالت میں رہ گیا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اس کے سینے میں دل کے مقام پر گولی مارنے کی کوشش کی تھی لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ گولی کہاں لگی تھی۔ باقی تینوں آڑے ترچھے گرے تھے لیکن انداز بتا رہا تھا کہ ایک ایک گولی ہی ان کے لیے کافی ثابت ہوئی تھی۔ وہ ذرا تڑپ کر ساکت ہوگئے تھے اور ان کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ مجھے خود بھی اپنے آپ سے اتنی عمدہ کارکردگی کی توقع نہیں تھی۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو شاباش دی۔

سانولی لڑکی غیر ارادی طور پر دیوار سے جا لگی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں اس کے کپڑے تھے اور دوسرا ہاتھ چہرے کے چھلے ہوئے حصے پر تھا۔ وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے یوں میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں کوئی مردہ تھا جو اچانک زندہ ہوگیا تھا۔ صفیہ کرسی سے نیچے پھسل آئی تھی اور وہیں ساکت ہوگئی تھی۔ معلوم نہیں وہ خوف کے باعث پھسل گئی تھی یا اپنی دانست میں اس نے عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا۔

لمبے بالوں والا بدستور میری گرفت میں تھا۔ میں اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی پسینے اور سستی شراب کی بو کے بھبکے محسوس کرسکتا تھا۔ چند لمحے کے لیے منظر جیسے ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ لمبے بالوں والے نے اپنے آپ کو میری گرفت سے چھڑانے کے لیے ذرا بھی زور آزمائی نہیں کی تھی۔ میرے خیال میں جو رائے اس نے میرے بارے میں ظاہر کی تھی وہ خود اس پر صادق آتی تھی یعنی اس کی طاقت کا منبع گویا اس کی ٹی ٹی تھی جو اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی تو وہ یک دم جیسے بے جان سا ہو کر رہ گیا تھا۔

میں نے اس کی گردن بدستور بازو کے شکنجے میں رکھی لیکن اس کی ٹانگوں کو اپنی ٹانگوں کی گرفت سے آزاد کردیا۔ اس کے بعد بھی اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔ تب میں اسے لیے ہوئے اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سانس لینے کی کوشش میں اس کے حلق سے خرخراہٹ کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

میں نے ٹی ٹی کی نال اس کی کنپٹی پر اس طرح رکھی کہ اگر گولی اس کی کھوپڑی سے پار نکل جائے تب بھی میرا بازو زخمی نہ ہو۔ میں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا "تم جیسے خبیث اور مردود' جن کا مشغلہ بے گناہوں کو اذیتیں دے کر ہلاک کرنا ہوتا ہے انہیں میں بھی اذیتیں دے کر ٹھکانے لگانا زیادہ پسند کرتا ہوں لیکن افسوس فی الحال میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ تمہاری قسمت اچھی ہے کہ تمہیں آسان موت نصیب ہورہی ہے۔"

یہ کہہ کر میں نے ٹریگر دبا دیا اور اس سے پہلے کہ اس کا گندا خون میرے کوٹ کی آستین تک پہنچ پاتا' میں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے فرش پر گر پڑا۔ میں نے نہایت اطمینان سے ٹی ٹی کا دستہ اسی کی قمیص سے صاف کیا اور ٹی ٹی اسی کے ہاتھ میں پھنسا دی۔ اسی دوران میں مجھے احساس ہوا کہ اب

صفیہ بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے لمبے بالوں والے کی بیگی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ مارا۔ توقع کے مطابق اپنا مشین پسٹل مجھے اس کی جیب سے مل گیا۔ میں نے اسے ہاتھ میں ہی رکھتے ہوئے آگے بڑھ کر اس کمرے میں جھانکا جس میں پھانسی کا پھندا لٹکا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ایک نیم تاریک چھوٹا سا کمرا تھا۔ اس میں کوئی موجود نہیں تھا تاہم اس میں کچھ ایسی چیزیں پڑی تھیں جو یقیناً اذیت رسانی کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ ان میں سے بعض پر خون لگا ہوا تھا۔

میں اس کمرے کی دہلیز سے پلٹ آیا۔ اس مکان میں ایک اور کمرا تھا مگر وہ کاٹھ کباڑ اور برتنوں چولہے وغیرہ سے بھرا ہوا تھا۔ مکان میں ذرا سی بھی کھلی جگہ نہیں تھی۔ وہ کسی شکستہ حال قسم کے تہ خانے سے مشابہ تھا۔ صرف چند سیکنڈ میں، میں نے اس کا جائزہ لے لیا۔ اس دوران میں لمبے بالوں والے کا بھیجا اس کے سر کے سوراخ سے بہنے لگا تھا۔ سفیدی آمیز سا خون چٹائی پر پھیل رہا تھا۔

ایک گولی ایک نوجوان کی پیشانی میں لگی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور ایک ہاتھ کلاشنکوف کے دستے پر تھا۔ میں نے استاد کی لاش کو سیدھا کرنا چاہا، وہ ایک اور زاویے سے لڑھک گئی۔ اس کے ہاتھ پاؤں مڑے ہی رہے۔ گولی اس کے حلقوم میں گھس کر شاید عقب میں کہیں ریڑھ کی ہڈی کے بالائی حصے میں پیوست ہوگئی تھی۔ میں نے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اپنا پرس اور رقم وغیرہ مجھے اس کی جیبوں سے مل گئی۔ مجھے اپنے پرس سے زیادہ دلچسپی تھی۔ میں اپنی کوئی نشانی یہاں چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

پھر میں مشین پسٹل ہاتھ میں لیے سانولی لڑکی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ بدستور دیوار سے لگی کھڑی تھی "زندہ رہنا چاہتی ہو نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا "فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ اور جو کچھ بھی تم نے دیکھا ہے اس کے بارے میں بھی کسی کے سامنے زبان نہ کھولنا..... ورنہ موت اس کے بعد بھی آسکتی ہے۔ سمجھ گئیں نا؟"

اس نے ایک بار پھر اثبات میں سر ہلایا۔ یہ گویا اس کے لیے ایک نوید تھی۔ اس کے جسم میں جیسے جان سی آگئی۔ اس نے چند سیکنڈ بھی نہیں لگائے اور یوں وہاں سے بھاگی جیسے بدروحیں اس کے پیچھے لگی ہوں۔ اسی دوران میں صفیہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے لمبے بالوں والے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولی "آپ نے اسے بھی مار دیا؟"

میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور وہ گویا سہم کر ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا "تم تو کچھ اس طرح یہ بات کہہ رہی ہو جیسے اسے مار کر میں نے بڑی زیادتی کی ہے۔ اسے کہتے ہیں نیکی برباد گناہ لازم۔ جو کچھ یہ تمہارے ساتھ کر رہا تھا یا آئندہ یہ لوگ جو کچھ تمہارے ساتھ کرنے والے تھے، کیا میں انہیں وہ کرنے دیتا تو بہتر تھا؟ میں تمہیں ان کے رحم پہ چھوڑ دیتا تو تمہیں بہت اچھا لگتا؟ تم اس سے لطف اندوز ہوتیں؟"

"نہیں..... نہیں..... میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" لڑکی دم گڑبڑا گئی اور شرمندہ سی نظر آنے لگی۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ دراصل کیا کہنا چاہتی تھی لیکن مناسب تھا کہ وہ نہ ہی کہتی تو بہتر تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ لمبے بالوں والا میرے قابو میں تھا۔ میں چاہتا تو اسے چھوڑ سکتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے ان زریں خیالات کا اظہار کرتی۔

"یہ معاشرے کی غلاظت ہیں۔" میں نے حقیقی نفرت سے کہا "ناقابلِ اصلاح..... اور بنی نوع انسان کے لیے ہزار ہا اذیتوں کے چلتے پھرتے پیامبر..... میرا بس چلے تو میں ان جیسے سبھی ڈاکوؤں اور اذیت پسندوں کو ختم کردوں۔"

وہ خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنے چہرے کے تاثرات بدلنے کی کوشش کی اور اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے نرمی سے کہا "آؤ..... چلیں۔"

اس نے تھوک نگلا اور سعادت مندی سے میرے ساتھ چل دی۔ باہر آکر مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ گلی میں سناٹا تھا۔ یہ بھی اسی قسم کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں سے ایک تھی جن میں آج ہمارا سفر جاری رہا تھا۔ اس میں بھی بے ترتیب سے مکانات موجود تھے لیکن ان کی کھڑکیاں دروازے یوں بند تھے جیسے ان میں کوئی نہ رہتا ہو۔ پانچ فائروں کی آواز سن کر بھی کسی نے باہر جھانکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جس مکان سے ہم نکلے تھے اس کے دائیں بائیں تین منہدم شدہ مکانات تھے۔ سامنے ایک آدھ پلاٹ خالی تھا جس میں جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر طرف بے ہنگم مکانات پھیلے ہوئے تھے۔

میں ایک طرف کو نکلتا چلا گیا۔ ایک بار پھر بھول بھلیوں جیسی گلیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ ایک جگہ رک کر میں نے صفیہ سے کہا "تم کچھ رہنمائی کرسکتی ہو؟"

"کہاں تک پہنچنے کے لیے؟" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔

"جہاں ہم نے گاڑی چھوڑی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی "کوشش کرتی ہوں۔"

اس کی کوشش کے باوجود ہم کافی دیر تک بھٹکتے رہے لیکن اگر میں خود کوشش کرتا تو شاید اس سے زیادہ بھٹکتے۔ آخر کار ہم اس کھلی سی جگہ میں پہنچ گئے جہاں میں نے گاڑی کھڑی کی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اب گاڑی وہاں نہیں تھی۔ کچی زمین پر ٹائروں کے نشانات بتا رہے تھے کہ اسے ادھر ادھر گھما کر ایک طرف لے جایا گیا تھا اور یہ یقیناً بڑی فنکاری تھی کیوں کہ بغیر چابی کے اس گاڑی کا تالا کھولنا اور اسے اسٹارٹ کرنا کوئی آسان

نہیں تھا۔ اس میں چوروں سے حفاظت کے سارے انتظامات موجود تھے لیکن لے جانے والا ابتدائی تمام انتظامات کو ناکام بنا کر گاڑی لے گیا تھا۔ تاہم وہ زیادہ دور نہیں جاسکتا تھا۔ اگر اس نے اسٹیئرنگ کا ظاہری لاک کھول لیا تھا تب بھی ایک مخصوص کوڈ نمبر نہ دبانے کی وجہ سے ڈیڑھ دو میل کے بعد اسٹیئرنگ وہیل میں خود بخود ایک دوسرا لاک لگ جاتا تھا اور الارم بجنے لگتا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ چور گاڑی کو چھوڑ کر بھاگ جائے گا لیکن کہاں چھوڑ کر بھاگے گا' یہ کہنا مشکل تھا۔ اس لیے میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ صفیہ میری طرف دیکھ کر پریشانی سے بولی "اب کیا ہوگا؟"

"کچھ بھی نہیں۔۔۔" میں نے بڑے شاکرانہ لہجے میں جواب دیا "جو کچھ ہمارے ساتھ ہوچکا ہے شاید وہ کافی نہیں۔ اب مزید تھوڑی سی ورزش ہوگی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اب تم کسی شارٹ کٹ کے ذریعے کسی ایسی قریبی سڑک تک پہنچنے کی کوشش کرو جہاں سے ہمیں ٹیکسی مل جائے۔ گاڑی کی تلاش کا کام میں پولیس کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ خود ہی اطلاع آجائے گی کہ گاڑی کہاں کھڑی ہے۔ البتہ اب مجھے اس کی رپورٹ ضرور کرنی پڑے گی۔ کہیں میل دو میل کے فاصلے کے اندر ہی اس میں کوئی واردات نہ ہوجائے۔" میں نے جواب دیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "ٹیکسی تو یہاں دور دور تک ملنی مشکل ہے۔ ٹیکسی والے تو ان اطراف کا رخ ہی نہیں کرتے۔ رکشا ہی مل جائے تو غنیمت ہے۔"

وہ ایک طرف کو چل دی۔ یہ وہ راستہ نہیں تھا جدھر سے ہم آئے تھے۔ کچھ دیر پہلے ہم پہ جو گزری تھی' صفیہ اب اس کے اثرات سے سنبھلتی دکھائی دے رہی تھی۔ چند قدم چلنے کے بعد وہ میری طرف دیکھتے ہوئے پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "آپ پریشان دکھائی نہیں دے رہے اور نہ آپ کے چہرے سے پچھتاوا ظاہر ہورہا ہے۔"

"تمہارے خیال میں مجھے کیوں پریشان ہونا چاہیے۔۔۔ کیوں پچھتانا چاہیے؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ یہ نہیں سوچ رہے کہ مجھے کیوں کسی کی مدد کرنے کا شوق چرایا تھا؟ کیا کیا خواری اٹھانی پڑ رہی ہے۔۔۔ کس طرح جان جاتے جاتے بچی ہے اور کس طرح میرا بھی حشر خراب ہوتے ہوتے بچا ہے؟"

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "انسان جب پریشانیوں کو خود دعوت نامے بھیج بھیج کر بہ صد اصرار بلاتا ہو پھر اسے اپنے آپ کو پریشان ظاہر کرنے کا حق نہیں ہونا چاہیے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "البتہ لڑکپن میں' میں کافی پریشان رہا کرتا تھا۔"

"کیوں؟" اس نے ذرا تجسس سے پوچھا۔

"اس وقت میں اس قسم کی کتابیں پڑھا کرتا تھا جن کے عنوان ہوتے تھے۔۔۔ پریشان ہونا چھوڑیے۔۔۔ پریشانیاں دور بھگایے۔۔۔ پریشانیوں کا آسان علاج' وغیرہ وغیرہ۔"

صفیہ کی مسکراہٹ ذرا روشن ہوگئی۔ میں یہی چاہتا تھا۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کی شخصیت کے کتنے رخ ہیں۔"

"ایک بھی نہیں۔" میں نے فوراً کہا "میں تو بغیر رخ والی شخصیت کا مالک ہوں۔ رخ تو ماہ رخوں کی شخصیت کے ہوتے ہیں۔ میں بے چارہ کس شمار قطار میں ہوں۔"

اس نے پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن ملتوی کردیا۔ چند لمحے بعد ہم ایک تنگ سی سڑک پر جا پہنچے۔ مجھے یاد آگیا کہ آتے وقت ہم گاڑی میں ادھر سے گزرے تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک درخت کے نیچے دو تین رکشا کھڑے تھے۔

صفیہ بولی "آپ خوش قسمت ہیں کہ یہاں اس وقت اس "کثرت" سے رکشے کھڑے نظر آرہے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ آج تو واقعی قدم قدم پر خوش قسمتی کے ثبوت مل رہے ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

تینوں رکشے والے ایک ہی جگہ کھڑے باتیں کررہے تھے۔ ہم ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے چبھتی ہوئی نظروں سے ہمارا سراپا جائزہ لیا۔ میں نے ان میں سے ایک سے کلفٹن تھانے چلنے کے لیے کہا تو اس نے اور بھی گہری نظروں سے گویا از سرِنو ہمارا سراپا جائزہ لیا۔ پھر باقی دونوں رکشے والوں کی طرف مشورہ طلب سی نظروں سے دیکھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ تینوں پُراسرار سے انداز میں خاموش ہوچکے تھے۔ میرا خیال تھا کہ رکشے والا انکار کردے گا یا پھر ہمارا تفصیلی انٹرویو لے گا لیکن اس نے یہ دونوں کام کرنے کے بجائے خاموشی سے گردن ہلا کر ہمیں اپنے رکشا میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چند لمحے بعد رکشا اچھلتا کودتا شہر کی طرف روانہ ہوگیا۔

کلفٹن تھانے تک کا سفر اتنا طویل محسوس ہوا کہ راستے میں ایک آدھ مرتبہ مجھے شبہ محسوس ہوا کہ شاید ہم چاند پہ جارہے ہیں۔ غنیمت رہا کہ رکشے والے نے راستے میں بھی کوئی سوال نہیں کیا۔

کلفٹن تھانے میں بھی بہت سی چبھتی ہوئی نظروں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہمارا حلیہ ہی ایسا تھا۔ جب میں رحیم گل کے آفس میں گھسنے لگا تو ایک اردلی نے ہمارا راستہ روکنے اور یہ بتا کر ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کی کہ اندر ڈی ایس پی صاحب بھی بیٹھے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے یہ مخلصانہ مشورہ بھی دیا کہ اگر ہمارے ساتھ کوئی واردات ہوئی ہے تو ہمیں پہلے محرر کے پاس جاکر رپورٹ

لکھوانی چاہیے۔

ہمارے ساتھ واردات تمہارے ایس ایچ او نے کی ہے۔ ہم پہلے اسی سے بات کریں گے۔" میں نے اسے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا۔ اسے ہٹانے کے لیے میرا ایک ہاتھ ہی کافی تھا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہم اندر پہنچ چکے تھے۔

میں نے دیکھا رحیم گل اور اس کے علاقے کا ڈی ایس پی اللہ بخش حفظِ مراتب کو بالائے طاق رکھ کر نہایت دوستانہ اور رازدارانہ انداز میں سر جوڑے بات چیت کررہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ اپنی اپنی کرسیوں پر ذرا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ رحیم گل نے ...ن نگاہوں سے ہم دونوں کا سراپا جائزہ لیا اور بولا "تم تو کہہ رہے تھے کہ میں کامران کو ساتھ لے کر آرہا ہوں۔۔۔ کیا یہ کامران ہے؟" اس نے صفیہ کی طرف اشارہ کیا "کیا اس کی جنس بدل گئی ہے؟ اور یہ تم لوگوں نے حلیہ کیا بنا رکھا ہے؟"

"دھیرج میری جان! ایک سانس میں اتنے سوال!" میں نے ایک نظر صفیہ کی طرف دیکھ کر کہا جو کچھ کھسیانی ہوگئی تھی "ہم پہ جو ...وات گزرے ہیں ان میں واقعی کامران کی جنس بھی بدل سکتی ...ی۔۔۔ اور جہاں تک ہمارے حلیے کا سوال ہے تو یہ ہم نے خود ...نہیں بنایا ہے۔۔۔ بلکہ اسے زبردستی بنایا گیا ہے۔"

اس نے ہمیں بیٹھنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں خود ہی کرسی ...سیٹ کر بیٹھ گیا اور صفیہ کو بھی میں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ رحیم ...گل مجھے گھور کر رہ گیا۔ ڈی ایس پی اللہ بخش خاموشی سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

"کچھ ٹھنڈا ونڈا تو پلواؤ یار! آخر ہم تمہیں بہت اہم باتیں بتانے آئے ہیں۔" میں نے کہا۔

رحیم گل نے اور بھی زیادہ سخت نظروں سے مجھے گھورا لیکن وہ ...سمجھ گیا کہ افسری دکھانے کا تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس نے اردلی ...کو بلا کر ٹھنڈا لانے کے لیے کہا۔ اردلی کے جانے کے بعد وہ بولا ...سے زیادہ خوش خلقی کی امید تمہیں کسی پولیس والے سے ...نہیں رکھنی چاہیے۔۔۔ لیکن اب تم ٹھنڈا آنے سے پہلے زبان ...کھول دو۔"

"میری زبان تو اتنی کھلی ہوئی ہے کہ لوگ اسے بند کرانے کے ...جتن کرتے رہتے ہیں۔" میں نے ذرا ٹانگیں پسار کر بیٹھتے ہوئے ...کہا "بہرحال قصہ کچھ یوں ہے کہ میں کامران کو گاڑی میں بٹھا کر ...لا رہا تھا کہ راستے میں ایک جگہ گنے کا رس پینے کو طبیعت مچل گئی۔ ...گرمی بہت لگ رہی تھی نا۔۔۔ میں گاڑی ایک طرف روک کر ...اترنے ہی لگا تھا کہ معلوم نہیں کس طرف سے چار مسٹنڈے ...کلاشنکوفیں لیے گاڑی میں تقریباً گھس آئے۔ بے خبری میں اچانک ...کسی نے میرے سر پر کلاشنکوف کا دستہ مارا۔ یہ ...تھا کہ میں نے اسے اپنے سر پر چوٹ کا گومڑ دکھانے کی کوشش کی

"میں چکرا گیا۔ انہوں نے مجھے اور اس لڑکی صفیہ کو کچے میں گرا دیا اور مجیبوں نے ٹھڈے وغیرہ بھی مارے۔۔۔ اور یہ سب کچھ بھری پُری سڑک پہ ہورہا تھا۔۔۔ ظاہر ہے جس ملک میں تم جیسے پولیس والے ہوں گے وہاں یہی ہوگا۔۔۔"

رحیم گل کے جبڑوں کے عضلات حرکت میں آئے اور میں سمجھ گیا کہ اس نے دانت پیسے تھے لیکن ڈی ایس پی اللہ بخش نہایت صبر و سکون سے بیٹھا سب کچھ سن رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بہرحال وہ لوگ گاڑی لے گئے اور کامران بھی اسی میں رہ گیا۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ وہ اتفاقاً رہ گیا یا وہ لوگ جان بوجھ کر اسے لے گئے اور یہ کہ اس کے پیچھے بھی کوئی سازش کام کررہی ہوگی۔۔۔"

میں جان بوجھ کر رحیم گل کو یہ کہانی سنا رہا تھا کہ اگر میری گاڑی کے ساتھ ساتھ اگر کسی اتفاق کے باعث کارچور بھی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اچھی طرح اس کی دھنائی کریں اور اس سے پوچھیں کہ اس کے باقی مسلح ساتھی کہاں تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ کارچور کا ان ڈاکوؤں اور دہشت گردوں سے کوئی تعلق تھا یا نہیں' جو میرے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے۔ بہرحال میں چاہتا تھا اس بہانے اچھی طرح اس کی ٹھکائی ہوجاتی۔ عین ممکن تھا کہ اس طرح کوئی الگ کہانی بھی سامنے آجاتی۔

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کامران کے بارے میں اب تمہیں کچھ علم نہیں؟" رحیم گل بدستور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"ظاہر ہے۔۔۔ اور کامران کے بارے میں تو ہم بعد میں بات کرتے رہیں گے۔ پہلے تم میری کار چھینے جانے کی اطلاع وائرلیس پر نشر کراؤ۔" میں نے کہا۔

رحیم گل اپنی جگہ سے حرکت کیے بغیر بولا "تمہاری رائے میں تو کامران پرنس سیرا کے قتل کے سلسلے میں بے گناہ ہے نا؟"

"ہاں۔۔۔ میری رائے یہی ہے۔" میں نے بلا تامل کہا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جس مجسمے سے پرنس کے سر پہ وار کرکے اسے ہلاک کیا گیا تھا اس پر ملنے والے فنگر پرنٹس کامران کے ثابت ہوئے ہیں۔" رحیم گل ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

یک دم مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کمرے کا درجہ حرارت کئی ڈگری گر گیا تھا!

میں نے صفیہ کی طرف دیکھا۔ وہ میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا انداز بے چارگی آمیز اور معذرت خواہانہ تھا۔ رحیم گل کے انکشاف پر ایک لمحے کے لیے میں اپنی ساری تیزی و طراری بھول گیا تھا اور اس ایک لمحے میں ان گنت سوالات نے میرے ذہن پر یلغار... کردی تھی۔ کہیں اس بار میں خواہ مخواہ ہی خدائی فوجدار بننے کی کوشش تو نہیں کررہا تھا؟ کہیں یہ میری سنگین غلطی تو نہیں تھی؟

مجھے یاد آیا کہ کامران کس طرح غیر معمولی حد تک پولیس سے خوفزدہ تھا۔ یہ درست تھا کہ ہمارے ہاں شرفا پولیس سے بہت خوفزدہ رہتے تھے لیکن اس کا خوف کچھ زیادہ ہی غیر معمولی تھا۔ میں نے اسے ہر طرح کے تحفظ کی پیشکش کی تھی۔ اس کے باوجود وہ مجھے اور صفیہ کو نچا دے کر بھاگ گیا تھا۔ کہیں پولیس کے بارے میں اس کا یہ خوف درحقیقت اس کے احساسِ جرم ہی کی پیداوار تو نہیں تھا؟ کہیں میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو کر ایک مجرم کی مدد پر کمربستہ نہیں ہو رہا تھا؟

صفیہ کو یقیناً اندازہ تھا کہ میرے ذہن میں کیا سوالات سر ابھار رہے تھے۔ اس کی آنکھوں میں التجا سی جھلک آئی۔ شاید وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ مجھے اتنی جلدی کامران سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ بھی نہیں تھا۔ میں تمام امکانات پر غور ضرور کرتا تھا لیکن ایک بار جو رائے قائم کرلیتا تھا اس سے اتنی جلدی ہٹتا نہیں تھا۔ کوئی واضح، ٹھوس اور ناقابلِ تردید ثبوت ہی مجھے اپنی رائے بدلنے پر مجبور کرسکتا تھا۔

میں نے رحیم گل کی طرف دیکھا۔ وہ کڑی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ بولا "الٹی سیدھی کہانیاں تخلیق کرنے کے معاملے میں تمہارا ذہن کسی رائٹر سے بھی زیادہ زرخیز ہے لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں تمہاری سنائی ہوئی ہر کہانی پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلوں گا..."

"تم چاہو تو آنکھیں کھلی رکھ کر بھی یقین کرسکتے ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا" میں نے شیریں لہجے میں کہا۔

وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا "آنکھیں کھلی رکھنے کی صورت میں تو مجھے اس بات کا یقین بھی مشکل سے آتا ہے کہ یہ شکل تمہاری اپنی ہے۔ تم اوّل درجے کے جھوٹے، دغاباز اور مکار آدمی ہو۔"

"دیکھو... دیکھو... زبان سنبھال کے... انسپکٹر!" میں نے دھمکی آمیز انداز میں انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "میں کم از کم انسپکٹر کے لیول کے کسی آدمی سے بے عزتی کرانے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ بے عزتی کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے میں شہر کا ممتاز بزنس مین اور نہایت معزز آدمی ہوں۔"

"تو کیا تمہاری بے عزتی کرانے کے لیے آئی جی صاحب کو

بلوانا پڑے گا؟" وہ کاٹ کھانے والے لہجے میں بولا۔

"ہاں... کم از کم اس رینک کا آدمی تو ہونا چاہیے... لیکن وہ بھی آکر میری بے عزتی نہیں کریں گے کیونکہ اعلیٰ افسر بہرحال اعلیٰ افسر ہوتا ہے۔ وہ اخلاق، تہذیب اور اعلیٰ انسانی اقدار وغیرہ کے معانی کسی نہ کسی حد تک جانتا ہے۔ بدزبانی، بدتمیزی اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر دوسروں کی بے عزتی کرنے کی عادت تو تم جیسے چھوٹے چھوٹے افسروں میں پائی جاتی ہے جن کی اپنی کوئی عزت نہیں..."

"اچھا... زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں" وہ جلدی سے میری بات کاٹتے ہوئے بولا "تمہاری زبان تو واقعی ایک مرتبہ اسٹارٹ لے لیتی ہے تو اسے بریک لگنے کی نوبت ہی نہیں آتی۔ سنجیدگی سے بات کرو۔ یہ بہت سنجیدہ معاملہ ہے۔"

"تمہارے خیال میں اب تک میں غیر سنجیدگی سے بات کررہا تھا؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں "اب اپنی بے عزتی ہونے کی باری آئی تو تم اپنے افسر صاحب کو یہ تاثر دینے کی کوشش کررہے ہو کہ یہ سب کچھ مذاق میں ہو رہا تھا؟" میں نے ایک نظر ڈی ایس پی اللہ بخش کی طرف دیکھا۔ وہ بے چارہ کافی شریف اور کم گو آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اب تک وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ بس ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لیے بیٹھا تھا۔

"بے تکی ہانکتے رہنے سے تم مصیبت میں بھی پھنس سکتے ہو" رحیم نے گویا مجھے خبردار کیا۔

"مصیبتوں کی کیا بات کرتے ہو رحیم گل پیارے!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تمہارے اس خادم نے پیدائش کے بعد سے اب تک مصیبتوں کے سوا دیکھا ہی کیا ہے... اور میری زندگی میں جتنی بھی مصیبتیں آئیں ان میں سب سے بڑی مصیبت تم ہو۔"

رحیم گل نے نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبالیا۔ چند لمحے وہ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا پھر گویا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے بولا "تمہیں واقعی اُس وقت مذاق سوجھتا ہے جب دوسروں کو مذاق زہر لگ رہا ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں پھر کسی وقت بات کرنی پڑے گی۔ لیکن اگر اس وقت تک پانی سر سے گزر چکا ہوگا تو اس کی ذمے داری مجھ پر نہیں ہوگی۔"

"یقیناً" میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا "پانی سر سے گزرنے کی ذمے داری تم پر بھلا کیسے ہوسکتی ہے۔ اس کی ذمے داری تو محکمۂ آب پاشی پر ہوگی۔"

رحیم گل کے یقیناً سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرے۔ آخر میں نے گویا اس پر ترس کھاتے ہوئے کہا "تمہیں میری کون سی بات مذاق لگ رہی ہے؟"

"وہ جو تم نے بکواس کی تھی کہ راستے میں تمہارا گنّے کا رس پینے کو دل مچل گیا اور تم نے گاڑی روک لی... تمہارا خیال ہے کہ میں تمہاری اس بکواس پر یقین کرلوں گا؟" وہ غرایا۔

"اس میں یقین نہ کرنے والی بھلا کیا بات ہے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"تمہارے طبقے کا آدمی سڑک کے کنارے گاڑی روک کر اس گندی سی مشین سے گنّے کا رس پیے گا جس پر لاتعداد مکھیاں بھنک رہی ہوتی ہیں اور رس نکالنے والے کے ہاتھ بھی رس میں ہی دُھلتے رہتے ہیں؟" وہ بولا۔

"بس...! اتنی سی بات پر تم میرے بیان کو جھوٹ، مذاق اور نہ جانے کیا کچھ سمجھتے رہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا پھر ٹھنڈی سانس لی "رحیم گل! تم واقعی گھامڑ کے گھامڑ ہی رہے۔ بھئی میں نے کتنی مرتبہ تو تمہیں سمجھایا ہے کہ وہ صرف تم جیسے کم ظرف ہی ہوتے ہیں جو گاؤں دیہات سے اور چھوٹی چھوٹی فیملیوں سے نکل کر آتے ہیں لیکن شہر میں آکر بڑے آدمی بن جاتے ہیں تو اپنے پس منظر پر شرمانے لگتے ہیں۔ عجیب عجیب نزاکتیں دکھانے لگتے ہیں جو دراصل کسی نہ کسی کمپلیکس کی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ مجھ میں اس قسم کا کوئی کمپلیکس نہیں ہے۔ میں نے اپنے دیہاتی ہونے پر کبھی کوئی شرم محسوس نہیں کی۔ نزاکتیں دکھانے کے مواقع پر میں بھی نزاکتیں دکھاتا ہوں لیکن میں نے اپنے اندر کے دیہاتی کو کبھی مرنے نہیں دیا۔ اگر وہ کبھی باہر آتا ہے اور اپنی بات منوانا چاہتا ہے تو میں اسے دبانے کی کوشش نہیں کرتا۔ انسان کو اپنے اصل سے فرار حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اکثر اس میں کامیابی نہیں ہوتی۔"

میرے خاموش ہونے کے بعد بھی رحیم گل چند سیکنڈ تک مجھے گھورتا رہا پھر بولا "تمہاری تقریر ختم ہوگئی؟"

"میری تقریروں کا سلسلہ تو زندگی بھر جاری رہے گا۔ موقع ملنے کی دیر ہے۔ سیاستدانوں کی طرح میں بھی زندگی بھر تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گا" میں نے کہا۔

وہ اب قدرے پُرسکون لہجے میں بولا "جو لوگ یہ اعلان کرتے پھرتے ہیں کہ ان میں کوئی کمپلیکس نہیں... بعض اوقات انہی میں سب سے زیادہ کمپلیکسز ہوتے ہیں۔"

"کھسیانی بلی! کھمبا نوچنے کی کوشش مت کرو" میں نے مشورہ دینے کے انداز میں کہا۔

"تم بھی زیادہ بقراط بننے کی کوشش نہ کرو اور اصل موضوع سے مت ہٹو" رحیم گل ترکی بہ ترکی بولا "تمہاری یہ گنّے کے رس والی کہانی میرے حلق سے نہیں اتر رہی۔"

"تم نے اس پر بھنبھناتی مکھیوں کا تصور جو کرلیا ہے۔ اس لیے حلق سے نہیں اتر رہی" میں نے مربیانہ انداز میں کہا "اپنے ملک میں کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں اپنے تصور کو اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دینا چاہیے ورنہ انسان کچھ بھی نہیں کھا سکتا۔ تم تو مکھیوں کے صرف بھنبھنانے کا ذکر کررہے ہو۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ گنّے کے جوس میں وٹامنز کے طور پر مکھیوں کا بھی کچھ جوس شامل ہوتا ہے۔"

"اس کے باوجود تم اسے پینے کی بات کررہے ہو؟" رحیم گل طنزیہ لہجے میں بولا۔

"بھئی میں اس ملک کا باشندہ ہوں۔ ایک سخت جان قوم کا فرد ہوں اور میں سخت جان ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میں غیر ملکیوں جیسا... یا غیر ملکیوں کی چیزوں پر انحصار کرنے والوں جیسا بننا نہیں چاہتا۔ تمہیں معلوم ہے غیر ملکی کھلاڑیوں کی ٹیمیں ہمارے ہاں کھیلنے آتی ہیں تو ان میں سے اکثر اپنا پینے کا پانی ساتھ لاتی ہیں؟"

اس نے خاموشی سے مجھے گھورنے پر اکتفا کیا۔ میں نے بات جاری رکھی "حالانکہ کھلاڑی بڑی سخت جان مخلوق ہوتے ہیں۔ بے پناہ ورزشیں کرتے ہیں اور آٹھ آٹھ گھنٹے گرمی سردی میں میدانوں میں جم کر کھیلتے ہیں اور ہمارے ہاں وہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں قیام کرتے ہیں جہاں پانی کے لئے فلٹر پلانٹ لگے ہوتے ہیں اور جراثیم سے پاک... اسٹرلائنزڈ گلاس فراہم کئے جاتے ہیں۔ اس کے باوجود یہاں کا پانی پی کر ان بے چاروں کے پیٹ خراب ہوجاتے ہیں۔ کیا فائدہ ایسی زندگی کا؟"

وہ بدستور مجھے گھورتا رہا۔ میں نے اس کے گھورنے کی پروا کئے بغیر کہا "دوسری طرف ماشاء اللہ اپنی قوم کی سخت جانی دیکھو۔ جہاں سے پانی سپلائی ہو رہا ہے وہاں پانی میں گدھے اور کتے مرے پڑے رہتے ہیں۔ عوامی قسم کے ریستورانوں کے کچن وغیرہ میں کیڑے چل رہے ہوتے ہیں۔ مرچوں میں پسی ہوئی اینٹیں اور چائے کی پتی میں گندا بھوسا ملا کر کھلایا جا رہا ہے لیکن کھانے والے نہ صرف زندہ ہیں بلکہ ماشاء اللہ اکثر ہٹے کٹے رہتے ہیں۔ وہ تو یونہی کبھی کبھار ڈاکٹروں کی باتوں میں آکر ان کی دوائیں وغیرہ کھا کر بیمار ہوجاتے ہیں ورنہ بیماریاں تو ان کے قریب آتے ہوئے ڈریں۔ میں

ایسا ہی انسان بن کر زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اپنی ثقافت سے رشتہ توڑنا نہیں چاہتا۔ تم تو گنے کے رس پر اعتراض کر رہے ہو' مجھے تو اگر راستے میں ستّو بکتے نظر آجائیں تو میں وہ بھی پینے رک جاؤں گا.... بلکہ میں تو سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ اپنے فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی ستّو سروس شروع کرادوں۔ اس سے میرے ہوٹل کو سات چاند لگ جائیں گے۔"

رحیم گل میز پر سے اپنی موٹی سی سیاہ چھڑی اٹھاتے ہوئے بولا "اگر تم نے بکواس بند نہ کی تو میں یہ چھڑی مار کر تمہاری کھوپڑی توڑ دوں گا۔"

"اگرچہ اس کھوپڑی پر پہلے ہی ایک عدد گومڑ موجود ہے...." میں نے سرہلاتے ہوئے کہا "اس کے باوجود یہ کھوپڑی اس قسم کی چھڑیوں سے ٹوٹنے والی نہیں ہے۔ اس کے لئے تمہیں ڈائنامائیٹ استعمال کرنا پڑے گا...." پھر میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا "لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا آخر تم اتنے خفا کیوں ہو؟ ایک تو ہم اتنی ذلت اور مصیبت اٹھا کر آرہے ہیں۔ اوپر سے تم آنکھیں نکال رہے ہو۔ واقعی ہمارے ہاں کی پولیس بڑی ظالم ہے۔ کامران کے حق میں اچھا ہی ہوا کہ وہ کار چھیننے والوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ تمہارے ہتھے چڑھنے کے مقابلے میں کسی کے بھی ہتھے چڑھ جانا بہتر ہے۔"

"فضل.... خبیث! آخر تم سچ کیوں نہیں بول دیتے؟" وہ بہت ہی زچ ہو کر بولا۔

"میں سچ ہی تو بول رہا ہوں۔ اب اگر تمہیں یقین نہ آئے تو اس میں میرا کیا قصور ہے؟" میں نے بھی ذرا جھنجلاہٹ کا مظاہرہ کیا پھر ملائمت سے کہا "میری داستانِ غم بالکل سچی ہے۔ چلو.... اگر تمہیں گنے کے رس پر اعتراض ہے تو وہ اس میں سے نکال دیتے ہیں۔ گو کہ اس طرح کہانی کچھ بے رس اور پھیکی سی ہو جائے گی لیکن اگر تمہیں اس طرح پسند ہے تو اسی طرح سہی۔ میری گاڑی بہر حال گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی میں کامران کو بھی کھو بیٹھا ہوں۔ ان دو باتوں کے لیے تم مجھے کوئی قسم کھانے کے لیے کہو تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔"

پھر جیسے مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے بُری طرح چونکتے ہوئے کہا "خدا کی پناہ....! تم کیسے غیر ذمّے دار آفیسر ہو۔ تمہارے ساتھ میں بھی بکواس میں الجھ گیا۔ تم نے ابھی تک میری گاڑی کے چھینے جانے کے بارے میں اطلاع ہی نشر نہیں کرائی۔ کیا تم انتظار کر رہے ہو کہ وہ کسی دوسرے صوبے میں پہنچ جائے اور انجن نمبر' چیسز نمبر وغیرہ تبدیل ہونے کے بعد فروخت کے لیے تیار ہو جائے؟"

"کیا میں واقعی یقین کرلوں کہ تم سے سچ مچ گاڑی چھین لی گئی ہے؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے اب ذرا پُرسکون لہجے میں بولا۔

"کیوں.... اس میں یقین نہ کرنے والی کیا بات ہے؟ اس شہر میں تیس چالیس گاڑیاں روزانہ چھینی جارہی ہیں۔ میری گاڑی چھن گئی تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے...." اس نے کچھ کہنا چاہا۔

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں "ماشاء اللہ! کس ڈھٹائی سے اس حقیقت کو تسلیم کیا جارہا ہے۔"

وہ میرا تبصرہ اَن سُنا کرتے ہوئے بولا "لیکن جس طرح بتا رہے ہو.... یقین نہیں آرہا کہ تم سے اس طرح گاڑی چھ جاسکتی ہے۔ تم اتنی خبیث چیز ہو۔ یہ بات میرے دل کو نہیں کہ عام قسم کے ڈاکو' لٹیرے اور رہزن تم سے اس طرح گاڑی چھین سکتے ہیں؟"

"ہوسکتا ہے وہ عام قسم کے رہزن یا ڈاکو نہ رہے ہوں' خاص قسم کے ہوں" میں نے سادگی سے کہا "انہوں نے کون سا اپنا تعارف کرایا تھا یا اپنی درجہ بندی پر کچھ روشنی ڈالی تھی۔ ظاہر ہے وہ بے چارے جلدی میں ہوتے ہیں۔ کاروباری مصروفیات زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ اس قسم کی فضول باتوں میں وقت تو ضائع نہیں کرسکتے۔"

وہ ایک بار پھر مجھے گھورنے لگا۔ میں نے ترحم آمیز لہجے میں کہا "اس طرح گھور گھور کر تمہاری نظر کمزور ہو جائے گی.... اور اگر گھورنا ہی ہے تو کسی دلربا حسینہ کو گھورو۔ مجھے گھورنے سے تمہاری صحت پر اور بھی خراب اثرات مرتب ہوں گے۔ ویسے بھی یہ کام فرصت میں کیا جائے تو بہتر رہتا ہے۔ فی الحال تم میری گاڑی چھینے جانے کی اطلاع نشر کراؤ.... یا اتنے معمولی سے کام کے لیے بھی مجھے کسی اور سے کہنا پڑے گا؟ تمہارے ڈی ایس پی صاحب اس وقت قریب ہی بیٹھے ہیں۔ تمہارے مقابلے میں یہ کافی شریف اور لائق آدمی ہیں۔ میرا خیال ہے انہی سے درخواست کرلوں؟"

ڈی ایس پی اللہ بخش مجھے جانتا تھا اور میرے پس منظر سے تھوڑا بہت واقف تھا۔ وہ بے چارہ مجھ سے خاصا مرعوب اور متاثر رہتا تھا۔ میری موجودگی میں شاذ و نادر ہی زبان کھولتا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ اس بات پر رشک کرتا تھا کہ رحیم گل اس کا ماتحت ہوتے ہوئے مجھ سے اتنا بے تکلف تھا اور ہمارے درمیان نوک جھونک چلتی تھی۔

"اطلاع تو میں نشر کرا دیتا ہوں...." رحیم گل کچھ ناخواستہ اٹھتے ہوئے بولا "لیکن اگر یہ گاڑی چھینے جانے والی بات غلط ہوئی اور گاڑی تمہارے ہی پاس ہوئی تو میں اسے تم سے چھین کر' کسی بارونق چوراہے پر کھڑی کر کے اسے آگ لگا دوں گا۔"

"میں محسوس کر رہا ہوں کہ کافی عرصے سے تمہارا مزاج کچھ تخریب کارانہ سا ہوتا جارہا ہے" میں نے متفکرانہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ویسے تو خیر تمہارے محکمے میں بیشتر لوگوں میں یہ جراثیم پائے جاتے ہیں لیکن تمہاری بیماری زیادہ ہی نمایاں ہو کر سامنے آتی جارہی ہے۔"

پھر میں نے ڈی ایس پی اللہ بخش کو مخاطب کیا "ڈی ایس پی صاحب! اپنے اس بندے پر کڑی نظر رکھیں۔ یہ ضرور کبھی ڈیپارٹمنٹ کی بہت زیادہ بدنامی کا سبب بنے گا۔"

اللہ بخش جو اب تک خاموشی سے بیٹھا مسکرائے جارہا تھا' کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا "ارے نہیں افضل صاحب! اس قسم کے نوجوانوں کی وجہ سے تو ڈیپارٹمنٹ کی کچھ عزت باقی ہے۔"

میں نے حیرت سے رحیم گل کی طرف دیکھا اور سرہلاتے ہوئے کہا "تم نے تو محکمے میں اپنی بڑی مضبوط لابی بنا رکھی ہے!"

"فضول بکواس بند کرو اور یہ بتاؤ تم سے گاڑی کس علاقے میں چھینی گئی تھی.... اگر واقعی چھینی گئی تھی!" وہ منہ بنا کر بولا۔

"خدا تم جیسا شکی بھی کسی کو نہ بنائے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے.... شک کرنا پولیس کا اخلاقی اور محکمہ جاتی فرض ہے لیکن اب ایسا بھی کیا کہ تم لوگ ہمیشہ اسی بے چارے پر شک کرتے رہو جو فریاد لے کر آئے۔"

"اچھا.... فریادی صاحب! بکواس کو رہنے دو اور میرے سوال کا جواب دو۔"

میں نے علاقے کا نام بتایا جہاں سے درحقیقت میری گاڑی چوری ہوئی تھی۔ چھینی نہیں گئی تھی۔ علاقے کا نام سُن کر وہ دروازے کی طرف جاتے جاتے پلٹ آیا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا "تم اس علاقے میں کیا کرنے گئے تھے؟"

"کیوں.... کیا وہ ممنوعہ علاقہ ہے؟" میں نے اُلٹا سوال کردیا۔

"یہی سمجھ لو.... بلکہ آج کل تو وہ ممنوعہ علاقے سے بھی کچھ بڑھ کر ہے۔ ان دنوں تو لوفر لفنگے اور بدمعاش بھی اُدھر کا رخ کرتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ تمہارے طبقے کا آدمی تو وہاں جانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ تم کیسے چلے گئے تھے؟" اس نے جاننا چاہا۔

"یہ آج تم پر طبقہ بندی اتنی کیوں سوار ہے؟" میں نے تیوری پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔ "کیا تمہیں ابھی تک معلوم نہیں ہوسکا کہ مجھ میں تو ہر طبقے کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور اسی لیے میں طبقہ بندی کا قائل نہیں رہا۔ مجھے خود ابھی تک اندازہ نہیں ہوسکا کہ درحقیقت میرا تعلق کس طبقے سے ہے۔ اس لیے تم میرے ساتھ یہ طبقے وغیرہ کے پس منظر میں بات مت کیا کرو۔"

"میرا بس چلے تو میں تم سے بات ہی نہ کیا کروں" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "لیکن کیا کروں.... تم میرے مقدر میں لکھ دیئے گئے ہو۔"

اس نے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور واپس اپنی کرسی پر آبیٹھا۔ گھنٹی بجا کر اس نے اپنے اردلی کو طلب کیا اور اسے حکم دیا "اے ایس آئی اکرم کو بھیجو۔"

ذرا بڑی عمر کا اے ایس آئی اکرم عینک لگاتا تھا اور اس سے مجھے پہلے بھی واسطہ پڑ چکا تھا۔ وہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا تھا اور شریف آدمی تھا۔ رحیم گل کے تھانے میں شرفا کافی معقول تعداد میں نظر آتے تھے۔ اکرم نے ذرا دِقت سے مجھے پہچانا اور پہچاننے کے بعد خاصی گرمجوشی سے سلام دعا کی۔

رحیم گل مجھ سے مخاطب ہوا "انہیں اپنی گاڑی کا نمبر' ماڈل' رنگ اور کمپنی کا نام وغیرہ لکھوادو۔ یہ ابھی وائرلیس پر پیغام نشر کردیں گے۔"

پہلے شاید رحیم گل خود جا کر پیغام نشر کرانے کے ارادے سے اٹھا تھا لیکن بعد میں نہ جانے کیا سوچ کر اس نے ارادہ ملتوی کردیا تھا۔ شاید افسری کا احساس غالب آگیا تھا۔ میں نے گاڑی کی تفصیل اکرم کو بتادی۔ چیسز نمبر مجھے معلوم نہیں تھا۔ اکرم نے گویا مجھے تسلی دی کہ اس کے بغیر کام چل جائے گا۔

وہ کمرے سے جاچکا تو رحیم گل ذرا بدلے ہوئے سے لہجے میں گویا از سرنو بات شروع کرتے ہوئے بولا "بکواس بہت ہوچکی۔ اب تم مجھے سنجیدگی سے.... سیدھی طرح بتادو کہ کیا واقعی کامران تمہیں ملا تھا اور واقعی اسی طرح بچھڑ گیا جس طرح تم بتا رہے ہو؟"

"تمہارے ہاں اپنی سچائی کا یقین دلانے کا طریقہ کیا ہے؟"

میں نے نرمی سے دریافت کیا "تم وہ طریقہ مجھے بتادو۔ میں اسی طرح تمہیں بتا کر یقین دلانے کی کوشش کروں گا۔ مناسب سمجھو تو میں سر کے بل کھڑے ہو کر بتانے کے لیے بھی تیار ہوں۔"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں" وہ خشک لہجے میں بولا پھر اس نے صفیہ کی طرف اشارہ کیا "یہ لڑکی کون ہے؟"

"کامران کی منگیتر" میں نے جواب دیا۔

"اوہ....!" اس نے سیٹی بجانے کے سے انداز میں ہونٹ سکیڑے اور گویا ایک نئے زاویۂ نظر سے صفیہ کا جائزہ لیا۔ صفیہ اپنی کرسی پر کسمسا کر رہ گئی۔ رحیم گل دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "کہیں انہی محترمہ کی فرمائش پر تو تم نے اپنی کہانی نہیں بدل لی ہے؟ لڑکیوں کے معاملے میں تم ویسے بھی بہت رحم دل واقع ہوئے ہو۔"

"میں تو تمہارے بارے میں بھی بہت رحم دل واقع ہوا ہوں" میں نے ترکی بہ ترکی کہا "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ انہی محترمہ کی وجہ سے تو کامران مجھے ملا تھا۔ یہ اپنی جان' عزت آبرو وغیرہ کو خطرے میں ڈالتے ہوئے مجھے اس کے پاس لے کر گئی تھی۔ اسی چکر میں اس بے چاری نے بھی اتنی ذلت اور خواری اٹھائی۔ اسی نے کامران کو قائل کیا تھا کہ اسے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردینا چاہیے اور میں نے اسے تسلیاں دی تھیں کہ پولیس اس کے ساتھ ڈانٹ ڈپٹ تک نہیں کرے گی....

میں نے متاسفانہ سے انداز میں گہری سانس لی "اچھا ہی ہوا اس بے چارے کو میرے بھروسے پر یہاں تک آنے کا موقع نہیں ملا۔ میری کیا عزت رہ جاتی؟ میں اسے تمہارے سپرد کرتا تو یقیناً وہ حیرت سے سوچتا کہ افضل صاحب ایسے لوگوں کو اپنا دوست کہتے پھرتے ہیں جن کی آنکھ میں کسی غلط سلط قسم کے جانور کا بال ہے۔"

"اپنے بارے میں کبھی باریک بینی سے چھان بین کرنا۔ عین ممکن ہے وہ جانور تم ہی ہو۔" وہ نہایت نرمی سے بولا۔ میرے تاثرات دیکھ کر اس نے مجھے بولنے کا موقع نہیں دیا اور بات جاری رکھی "اس سے پہلے کہ تمہارے منہ سے جھاگ نکلنے لگے' میں ایک بار پھر تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ اگر کامران کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم ہے تو وہ ابھی مجھے بتادو تاکہ بعد میں تم پر کوئی ذمے داری نہ آئے۔"

"جو کچھ میں تمہیں بتارہا ہوں اسے تم ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکالے جارہے ہو۔ خیر.... اس میں تمہارا بھی کوئی قصور نہیں۔ دونوں کانوں کے بیچ میں کوئی ایسی چیز ہی نہیں ہے جس میں کوئی بات اٹک سکے" پھر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "کتنی عجیب بات ہے کہ بعض لوگ اس خلا کے ساتھ بھی کافی کامیابی سے زندگی گزار جاتے ہیں.... اور اکثر تو پولیس میں بھرتی ہوجاتے ہیں۔"

اب رحیم گل نے غالباً میری چھیڑ چھاڑ کی طرف دھیان نہ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ پُرسکون لہجے میں بولا "اگر کامران نے آج کل میں اپنے آپ کو پولیس کے سامنے پیش نہ کیا تو اس کے لیے.... بلکہ کسی کے لیے بھی اس کی بے گناہی ثابت کرنا مشکل ہوجائے گا۔ بشرطیکہ وہ بے گناہ ہو۔"

صفیہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگرچہ تمہارے دونوں کانوں کی درمیانی جگہ خالی نہیں ہے پھر بھی تم اس کی بات ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دو۔ تمہیں اس کی منت خوشامد کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ یہ کچھ اور اکڑ جائے گا۔ تمہیں تجربہ نہیں ہے' ان پولیس والوں کو اسی طرح دھمکیاں دینے کی عادت ہوتی ہے۔"

رحیم گل براہِ راست صفیہ سے مخاطب ہوا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ صحیح کہہ رہے ہیں۔ آپ کو تو تھانے کچہری کا تجربہ نہیں ہوگا لیکن اسے بہت تجربہ ہے۔ کیونکہ ہوش سنبھالنے کے بعد سے اس کا زیادہ تر وقت تھانوں' کچہریوں میں ہی گزرا ہے۔ لڑکپن میں ایک جیب کترے کے طور پر اس نے اپنے عظیم الشان کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ اس کے بعد چوری چکاری' ڈکیتی' بلیک مارکیٹنگ' اسمگلنگ اور منشیات فروشی وغیرہ سے ترقی کرتا ہوا' آج دیکھیں کس مقام پر ہے۔"

"یہ سب کچھ پولیس کے تعاون سے ہی ممکن ہوا ہے" میں نے نہایت شکرگزارانہ لہجے میں کہا "پولیس کے تعاون کے بغیر یہ ممکن نہیں تھا۔ پولیس نہ ہوتی تو میں اتنی آسانی سے اس مقام پر نہیں پہنچ سکتا تھا۔"

رحیم گل ایک بار پھر ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ صفیہ کے ہونٹوں پر تمام تر پریشانی اور اعصابی کشیدگی کے باوجود خفیف سی مسکراہٹ اُبھر آئی۔ رحیم گل اس سے مخاطب ہوا "یہ شخص لڑکیوں کی ہمدردیاں حاصل کرنے اور ان کا دل جیتنے کے لیے عجیب عجیب حرکتیں اور عجیب عجیب باتیں کرتا رہتا ہے۔ اگر آپ اس کے چکر میں آئیں تو نقصان میں رہیں گی۔ یہ دنیا کی تمام لڑکیوں کی مدد کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے لیکن اس کے چکر میں پڑ کر ان بے چاریوں کو کوئی فائدہ پہنچنے کے بجائے نقصان ہی پہنچتا ہے۔ وہ نت نئے مسائل میں پھنس جاتی ہیں....."

"ان مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ تو اس وقت تمہارے سامنے ہی بیٹھا ہوا ہے" میں نے صفیہ کو بتایا اور رحیم گل کی طرف اشارہ کیا۔

رحیم گل نے گویا میری موجودگی کو بالکل نظرانداز کردیا اور میری بات بھی ان سنی کردی۔ وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے صفیہ کی طرف متوجہ رہا "اگر آپ کو کامران کے بارے میں کچھ معلوم ہے تو بلا جھجک مجھے بتادیں۔ اسی میں اس کا فائدہ ہے!"

میں نے تو افضل صاحب کی وساطت سے آپ تک لانے کی کوشش کی تھی....." صفیہ تھوک نگل کر بولی "لیکن راستے میں وہ واقعہ پیش آگیا...." اس نے میری سنائی ہوئی کہانی کی تردید نہیں کی اور یہ نہیں بتایا کہ کامران تمام تر تسلیوں اور یقین دہانیوں کے باوجود ہمیں راستے میں اچانک دھکا دے کر بھاگ نکلا تھا۔

اب میں نے ذرا سنجیدگی سے رحیم گل کو مخاطب کیا "آخر تم نے اپنا سارا زور کامران ہی پر کیوں صرف کررکھا ہے؟ تمہاری ساری توجہ اسی بے چارے مسکین پر ہے۔ تم پرنسس سمیرا کے قتل کی تفتیش دوسرے زاویوں سے کیوں نہیں کرتے؟"

"تمہیں کیا معلوم کہ ہم کیا کررہے ہیں اور کیا نہیں کررہے؟" وہ میری طرف دیکھ کر قدرے جارحانہ لہجے میں بولا "تم کیا یہاں آکر ہمارا روزنامچہ چیک کرتے ہو؟"

"اگر تمہاری تکلیف زیادہ بڑھ گئی تو میں یہ بھی کرنے لگوں گا۔ فی الحال میرے پاس ان فضول کاموں کے لیے وقت نہیں ہے" میں نے جواب دیا پھر پوچھا "تم مجھے یہ بتاؤ کہ محض اس مجسمے پر انگلیوں کے نشانات پائے جانے پر کامران کو قاتل کیوں فرض کرلیا ہے؟ وہ کئی گھنٹے وہاں موجود رہا تھا۔ عین ممکن ہے اس نے کئی بار اس مجسمے کو ہاتھ لگایا ہو۔ سمیرا نے اس دوران میں ملازموں کی طرح اس سے دو چار چھوٹے چھوٹے کام بھی لیے تھے۔ ممکن ہے اس نے وہ مجسمہ اسے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ رکھنے کے لیے کہا ہو۔ مجسمے پر انگلیوں کے نشانات ہونا قطعاً کوئی اہم بات نہیں ہے۔ عین ممکن تھا کہ اس مجسمے پر تو میری انگلیوں کے نشانات بھی ثبت ہوجاتے۔ میں نے لاش کے قریب وہ مجسمہ پڑے دیکھا تھا۔ عین ممکن تھا کہ گھبراہٹ میں' میں اسے اٹھا کر دیکھنے لگتا۔"

"کاش ایسا ہوجاتا!" رحیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اس مجسمے پر مجھے تمہاری انگلیوں کے نشانات مل جاتے تو میں پہلی فرصت میں تمہیں پکڑ کر اندر کردیتا۔"

"خیر.... اس قسم کی حسرتیں تو دل میں پالنا چھوڑ دو کیونکہ ایسی حسرتیں تم دل میں لیے ہی اس دنیا سے رخصت ہوجاؤ گے" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "ویسے.... بائے دا وے.... کیا تمہارا مخصوص فارمولا اور تمہاری تفتیش کی انتہا یہی ہے کہ آلۂ قتل پر جس کی انگلیوں کے نشانات ملیں اسی کو پکڑ کے اندر کردو؟"

"نہیں.... اور بھی بہت سے فارمولے ہیں" وہ بڑی متانت سے بولا "مجھے لگتا ہے وہ دن جلد آنے والا ہے جب تمہیں ان فارمولوں سے واسطہ پڑے گا۔ افضل چوہدری! اگر تمہیں لکھنا آتا ہے تو یہ بات کہیں لکھ لو کہ ایک نہ ایک روز تم میرے ہی ہاتھوں پکڑے جاؤ گے۔ مجھے اس کارنامے پر کوئی تمغا ملے گا اور تمہاری یہ حسرت ادھوری رہ جائے گی کہ میں یہ حسرت دل میں لیے اس دنیا سے رخصت ہوں گا۔ کیا سمجھے؟"

"تم جیسے انسانوں کی بعض باتیں سن کر تو ان کی تردید کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا" میں نے ترحم آمیز انداز میں سہلاتے ہوئے کہا "خیر.... فی الحال تم میرا ذکر چھوڑو۔ میرا ذکر تو چلتا ہی رہے گا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے پسندیدہ موضوع ہیں.... لیکن اس وقت کامران کے بارے میں بات ہورہی ہے۔"

"مجھے یقین ہے کہ قتل اسی نے کیا ہے" اچانک رحیم گل نے دوٹوک انداز میں فیصلہ سنادیا۔ میں ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر میں نے صفیہ کی طرف دیکھا۔ اس بے چاری کی حالت پہلے ہی کچھ اچھی نہیں تھی لیکن کامران کے بارے میں اس طرح صاف اور واضح انداز میں اپنی رائے کا اظہار کرکے رحیم گل نے گویا اسے دہلا دیا تھا۔ اس کی رنگت یکدم کچھ پھیکی پڑ گئی۔

ایک ڈرامائی سا وقفہ دے کر رحیم گل بولا "لیکن بہرحال یہ میری ذاتی رائے ہے۔ اصل فیصلہ تو عدالت کو کرنا ہے۔ میں گنتی کے ان چند بچے کھچے پولیس افسروں میں سے ایک ہوں جو نہایت غیرجانبداری سے تمام کچا چٹھا لے جا کر عدالت کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ معاشرے کی تطہیر کی کچھ ذمے داری عدالتوں پر بھی عائد ہوتی ہے۔ ہمیں مناسب گواہ اور مناسب شہادتیں بعض اوقات نہیں ملتیں۔ مختلف قسم کے خوف لوگوں کو عدالتوں میں پیش نہیں ہونے دیتے لیکن حقائق کا عدالتوں کو بھی اندازہ ہوجاتا ہے۔ وہ چاہیں تو کبھی کبھی قانونی موشگافیوں سے پیدا ہونے والی مجبوریوں کے باوجود بہت کچھ کرسکتی ہیں۔"

"کرنے کو تو تم لوگ بھی بہت کچھ کرسکتے ہو لیکن کرتے نہیں ہو" میں نے کہا۔

"ہم تو ان بدنصیبوں میں سے ہیں جو کچھ کرتے ہیں تب بھی گالیاں پڑتی ہیں اور کچھ نہیں کرتے تب بھی گالیاں پڑتی ہیں" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"تم اپنے منہ میاں مٹھو بننے اور اپنی تعریف میں خود ہی تقریریں کرنے کا یہ سلسلہ بند کردو اور ہمیں اجازت دو" میں نے اٹھنے کے لیے پر تولتے ہوئے کہا "تم نے تو اب ایک طرح سے مسئلہ حل کر ہی لیا ہے۔ تمہیں یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہے کہ پرنسس سمیرا کا قاتل کون ہے۔ اب تو صرف اسے تلاش کرنا باقی ہے۔ یہ بھی تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ اسی شہر میں ہے۔ پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ کی خدمات تمہیں حاصل ہیں۔ اسے تلاش کرلو اور فی الحال ہماری جان چھوڑو۔"

"اس کی تلاش تو پہلے ہی سے جاری ہے اور تمہاری جان ابھی ہم نے پکڑی ہی کہاں ہے جو اسے چھوڑنے کا سوال پیدا ہو میری جان!" رحیم گل بولا "تمہاری جان تو ہم کسی دن' نہ چھوڑنے کے لیے پکڑیں گے۔ کبھی نہ چھوڑنے کے لیے۔"

"کبھی کی بات پھر کبھی کرنا.... ابھی تو ہمیں اجازت دو" میں اٹھ کھڑا ہوا۔ صفیہ نے بھی میری تقلید کی تب رحیم گل اچانک اس سے مخاطب ہوا "کامران اب تک کہاں روپوش تھا اور اس نے

آپ کو کہاں ملنے کے لیے بلایا تھا؟"

میرا خیال تھا کہ میں اسے اِدھر اُدھر کی باتوں میں الجھائے رکھنے میں کامیاب رہا تھا اور وہ یہ ضروری سوال کرنا بھول گیا تھا مگر وہ بھولنے والا نہیں تھا اور نہ ہی وہ موٹے دماغ کا آدمی تھا۔ لیکن صفیہ بھی حواس باختہ ہونے والی لڑکی نہیں تھی۔ وہ مجھ سے پہلے ہی کہہ چکی تھی کہ جن کے ہاں کامران نے پناہ لی تھی' ان کا نام ہرگز سامنے نہیں آنا چاہیے تھا اور یہ بھی طے تھا کہ کامران اب دوبارہ وہاں نہیں جائے گا چنانچہ ان بے چاروں کے لیے پریشانی کا باعث بننے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ صفیہ گویا اس سوال کے لیے پہلے ہی سے تیار تھی۔ وہ نظر چرائے بغیر بولی "یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ وہ کہاں روپوش تھا لیکن اس نے ہمارے پڑوس میں فون کرکے مجھے اسی علاقے کے ایک بس اسٹاپ پر ملنے کے لیے بلایا تھا۔ جس علاقے میں افضل صاحب کی گاڑی چھینی گئی ہے۔"

اس نے بڑی عمدگی سے بات بنائی تھی۔ رحیم گل اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ اس نے پلک جھپکائے بغیر پوچھا "اور آپ افضل صاحب کے پاس کیسے جا پہنچیں؟"

صفیہ نے اسے پورا پس منظر بتایا کہ کس طرح کامران شادی کے امیدوار کے طور پر پرنس کیمرا کے ہاں انٹرویو دینے گیا تھا اور کس طرح گیٹ پر اس کی مجھ سے ملاقات ہوئی تھی' میں نے اپنی کسی مصلحت کے تحت اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تھا جو اس کے ہاتھ سے صفیہ کے ہاتھ میں پہنچا تھا۔ روپوش ہونے سے پہلے وہ خود ہی تجویز پیش کرتا رہا تھا کہ افضل صاحب کے پاس چلنا چاہیے' شاید وہ ہماری مدد کریں لیکن پھر شاید اس کی ہمت نہیں پڑی تھی اور اس نے روپوش ہونے کو ہی ترجیح دی تھی۔

صفیہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "..... لیکن دو دن کی روپوشی کے بعد جب اس نے مجھے اس مضافاتی علاقے کے بس اسٹاپ پر ملنے کے لیے بلایا تو میری اکیلے جانے کی ہمت نہیں پڑی۔ تب میں افضل صاحب کے پاس جا پہنچی" اس نے بڑی عمدگی سے معمولی سی ترمیم کرتے ہوئے بات بنائی تھی۔

"اور یہ فوراً آپ کی مدد پر کمربستہ ہوگئے ہوں گے" رحیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "لڑکیوں کی مدد کے لیے یہ ہمیشہ کمربستہ رہتے ہیں۔ یہ ان کا مشغلہ ہے۔"

"اس چکر میں انہوں نے تو بڑی تکلیف اٹھائی۔ اتنی قیمتی گاڑی بھی چلی گئی" صفیہ کچھ کھسیاہٹ اور کچھ تاسف سے بولی۔

"آپ کو افسوس کرنے کی ضرورت نہیں" رحیم گل چبھتے ہوئے لہجے میں بولا "لڑکیوں کی مدد کے سلسلے میں یہ اس سے بھی زیادہ خواریاں اٹھا چکے ہیں۔"

"میں تو تمہاری مدد کے سلسلے میں بھی کافی خواریاں اٹھا چکا ہوں پیارے وردی پوش! انہیں کیوں بھول جاتے ہو؟" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بھولا کہاں ہوں کم ظرف انسان! بھول چکا ہوتا تو اپنے تھانے میں میرے افسر کے سامنے بیٹھ کر اتنی زبان کیسے چلا سکتے تھے؟ اتنی عزت افزائی کیسے کرسکتے تھے؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"عزت افزائی تو خیر میں تمہارے افسروں کی بھی کرتا ہوں..... اور جہاں تک کم ظرفی کا تعلق ہے تو تم مجھے لڑکیوں کے طعنے دے دے کر کم ظرفی پر اتر آنے پر مجبور کر رہے ہو۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں کس کس کی مدد کرچکا ہوں..... کرتا رہا ہوں۔ تم ایک بے خبر محکمے کے چھوٹے سے 'بے خبر افسر' ہو۔ تمہیں تو یہ بھی پتا نہیں ہوتا کہ تمہاری ناک تلے کیا ہو رہا ہے۔"

وہ ایک لمحے خاموشی سے مجھے گھورتا رہا پھر ہاتھ جوڑ کر بولا "اچھا بابا.....! خدا کے واسطے..... اب تم جاؤ۔ ہماری جان چھوڑو۔ جتنی دیر تم یہاں رہو گے' یہاں کوئی کام نہیں ہوسکے گا۔ یہ تھانہ اوندھا ہو جائے گا۔"

"دیکھا تم نے....." میں نے صفیہ سے کہا "میں وہ شخص ہوں جس کے سامنے پولیس والے بھی ہاتھ جوڑتے ہیں..... اور وہ بھی پاکستانی پولیس والے.....! میرا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں آنا چاہیے" پھر میں نے رحیم گل کو مخاطب کیا "اور جہاں تک تھانے کے اوندھا ہونے کا تعلق ہے تو اس کا الزام مجھ پر رکھنے کی کوشش مت کرو۔ جس تھانے کے تم انچارج ہوگے وہ تو بہرحال اوندھا ہی ہوگا۔"

وہ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ میں اور صفیہ رخصت ہونے ہی لگے تھے کہ اے ایس آئی اکرم ہاتھ میں ایک کاغذ لیے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ مجھے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "وائرلیس پر ہمارے پیغام کے جواب میں اطلاع ملی ہے کہ آپ کی گاڑی مل گئی ہے۔ جس جگہ کا آپ نے ذکر کیا تھا وہاں سے کچھ ہی دور اس کا حفاظتی الارم بجنے لگا تھا اور اسٹیئرنگ وہیل لاک ہوگیا تھا۔ دو لڑکے اس میں موجود تھے۔ وہ اُتر کر بھاگ رہے تھے۔ اتفاق سے ایک موبائل وہاں سے گزر رہی تھی۔ پولیس والوں نے انہیں روکنے کی کوشش کی تو ان میں سے ایک نے ٹی ٹی سے کئی فائر کردیے۔ ایک گولی ایک کانسٹیبل کی ٹانگ میں لگی ہے۔ بہرحال لڑکے قابو میں آگئے ہیں لیکن....." وہ ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں خاموش ہوگیا۔

"لیکن کیا....؟" رحیم گل نے دریافت کیا۔

"ان کا کہنا ہے کہ گاڑی انہوں نے کسی سے چھینی نہیں تھی۔ انہیں تو ایک جگہ کھڑی ہوئی ملی تھی۔ وہاں سے انہوں نے تالا توڑ کر اور اگنیشن کی تاریں جوڑ کر چرائی تھی" اکرم نے بتایا "ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی اور نہیں تھا۔ یہ بہرحال ابتدائی معلومات ہیں۔ اصل باتیں تو تفتیش کے بعد ہی پتا چلیں گی۔"

رحیم گل نے سوالیہ سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے بھی کندھے اچکاتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے جن لیٹر...

گاڑی چھینی تھی وہ اسے کہیں اور چھوڑ گئے ہوں گے۔ وہاں سے ان لڑکوں نے چرائی ہوگی۔"

وہ مبہم سے انداز میں سر ہلا کر رہ گیا۔ شاید یہی جواز اس کے ذہن میں آیا تھا۔ بظاہر خواہ وہ میرے بیان پر شک کر رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ دل ہی دل میں اس نے ضرور یقین کرلیا ہوگا۔ وہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ میں کسی سنجیدہ مسئلے کے بارے میں جان بوجھ کر اس سے غلط بیانی کروں گا..... اور یہ حقیقت بھی تھی کہ میں اسے دھوکا دینے کی نیت سے کبھی ایسا نہیں کرسکتا تھا۔ کامران کے بارے میں بھی میں نے صرف اس لیے حقائق میں تھوڑی سی ترمیم کی تھی کہ اگر اسے معلوم ہوجاتا کہ کامران تمام تر تسلیوں اور یقین دہانیوں کے باوجود اچانک مجھے اور صفیہ کو دھکا دے کر راستے میں سے بھاگ نکلا تھا' تو اس کا یہ یقین اور بھی پختہ ہوجاتا کہ وہی قاتل تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ابتدا ہی سے کسی کے بارے میں دل میں یہ یقین بٹھا لے کہ وہ قاتل تھا۔ اس طرح ایک پولیس آفیسر کا ذہن جانبداری کا شکار ہوجاتا تھا اور وہ صحیح طور پر تفتیش نہیں کرسکتا تھا۔ صفیہ نے بھی یقیناً محسوس کرلیا تھا کہ میں اب بھی کامران کو ہر قسم کے نقصان سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے پہلے سے زیادہ ممنونیت تھی۔

رحیم گل بولا "اب تمہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں ان لڑکوں کو گاڑی سمیت یہیں بلوا لیتا ہوں۔ اب ذرا تم ان کی شکلیں دیکھ کر ہی جانا کہ کہیں وہ تم سے گاڑی چھیننے والوں میں شامل تو نہیں تھے۔ عین ممکن ہے تمہیں گاڑی بھی ابھی مل جائے۔"

"بہت خوب!" میں نے تحسین آمیز انداز میں سر ہلایا "تم مجھے پولیس کی عمدہ کارکردگی کا قائل کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"میں تو صرف اپنے فرائض ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم کسی اچھی اور تعمیری بات کے قائل تو ہو ہی نہیں سکتے" وہ منہ بنا کر بولا "تمہاری متعصبانہ اور سڑی ہوئی ذہنیت میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ تمہاری بے ہودہ زندگی ہم لوگوں کو بُرا بھلا کہتے ہوئے ہی گزرے گی خواہ ہم لوگ تمہارے لیے جانیں بھی قربان کردیں۔"

"بس..... بس..... اتنا زیادہ جذباتی ہونے اور اتنے بڑے دعوے کرنے کی ضرورت نہیں" میں نے اسے چمکارا۔

"تازہ ترین مثال ہی دیکھ لو....." وہ تیزی سے بولا "تمہاری گاڑی چرانے والوں کو پکڑنے کے لیے ایک کانسٹیبل نے ٹانگ پر گولی کھائی ہے اور تم یہاں آرام سے بیٹھے باتیں بنا رہے ہو" پھر وہ اکرم کی طرف مڑتے ہوئے بولا "ان لوگوں سے کہو گاڑی اور ان لڑکوں کو یہاں پہنچا دیں۔ یہ ہمارے تھانے کا کیس ہے۔"

اکرم ہچکچاتے ہوئے بولا "لیکن سر..... وہ ان کے علاقے میں پکڑے گئے ہیں اور انہوں نے پولیس پارٹی پر حملہ بھی کیا ہے۔

کانسٹیبل زخمی بھی ہوا ہے۔ کیس تو وہاں بھی درج ہوگا۔ شاید وہ لوگ ابھی انہیں بھیجنے سے انکار کریں۔"

"میرا نام لینا۔" رحیم گل نے بڑے رعب سے کہا "اور یہ بھی کہہ دینا کہ بعد میں انہیں تفتیش کے لیے بندے یا گاڑی ان دونوں میں سے جس چیز کی ضرورت ہوگی وہ انہیں پہنچا دی جائے گی۔"

"اوکے سر!" اکرم نے سلیوٹ کیا اور باہر چلا گیا۔

رحیم گل میری طرف دیکھ کر بولا "تم ایک بار پھر بیٹھ جاؤ۔ آج میرے مقدر کی خرابی کا دن ہے۔ آج تم نہ جانے کب تک میرے سر پر سوار رہو گے۔"

"یہ مقدر کی خرابی کا نہیں، مقدر چمک اٹھنے کا دن ہے ناشکرے انسان!" میں نے دوبارہ کرسی سنبھالتے ہوئے اور صفیہ کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ہمیں وہاں کافی دیر بیٹھنا پڑا۔ اس دوران میں رحیم گل فون پر بھی مصروف رہا اور کمرے سے اندر باہر بھی اس کی آمدورفت جاری رہی لیکن جونہی اسے کچھ دیر بیٹھنے کا موقع میسر آتا وہ مجھے اور صفیہ کو کریدنے کی کوشش کرتا کہ شاید ہمیں کوئی ایسی بات معلوم ہو جو اس کے لیے کارآمد ثابت ہو سکے لیکن ہم اس کی معلومات میں کوئی ایسا اضافہ نہیں کر سکے۔ ہمیں خود کچھ معلوم نہیں تھا ہم اسے کیا بتاتے۔ رحیم گل کو اس بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا "اب چونکہ تمہیں خود اس قسم کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا شوق پیدا ہو گیا ہے اس لیے تم کچھ نکتے ضرور چھپائے رکھنے کی کوشش کرو گے اور آخر میں اپنی کچھ بازی گری دکھانے کی کوشش کرو گے۔"

"دل چھوٹا مت کرو" میں نے اسے تسلی دی "اگر میں نے ایسی کوئی بازی گری دکھائی بھی... تو اس کا کریڈٹ تمہیں دے دوں گا۔ افسران بالا کی طرف سے تعریف و توصیف اور شاباشی تمہارے حصے میں آئے گی۔ تمہارے پاس تعریفی اسناد کا جو پلندہ جمع ہے۔ اس میں ایک دو سرٹیفکیٹس کا اور اضافہ ہو جائے گا۔"

"مجھے خیرات میں کریڈٹ نہیں چاہیے" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولا "اپنا کریڈٹ اپنے پاس رکھو۔"

اس وقت تک ڈی ایس پی اللہ بخش اس کے ساتھ ہیڈ کوارٹر میں کسی میٹنگ کا پروگرام طے کرنے کے بعد رخصت ہو چکا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد قدرے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا "اب تو تمہارا افسر بھی جا چکا ہے۔ اب کس لیے اتنی بے نیازی دکھا رہے ہو؟ انسان کو اپنی اوقات اور دوسروں کے احسان نہیں بھولنے چاہئیں۔"

"یہی مشورہ میرا تمہارے لیے بھی ہے" وہ متانت سے بولا۔

اسی طرح کی باتوں اور رحیم گل کی مصروفیات میں کافی وقت گزر گیا۔ آخر ایک کانسٹیبل نے آکر اطلاع دی کہ دوسرے تھانے سے کار اور کار چور آ گئے ہیں۔

"یہیں لے آؤ" رحیم گل نے حکم دیا۔

چند لمحے بعد دو تین سپاہی دو نوجوانوں کو دھکیلتے ہوئے اندر لائے۔ ان میں ایک ذرا لمبا اور دوسرا چھوٹے قد کا تھا۔ دونوں دُبلے پتلے تھے مگر سخت جان معلوم ہوتے تھے لیکن اس وقت دونوں بُری طرح لنگڑا رہے تھے۔ ان کی شکلیں گو کہ اس وقت بگڑی ہوئی تھیں اس کے باوجود ان کے چہروں سے مسکینی یا مظلومیت نہیں بلکہ خباثت عیاں تھی۔ گو کہ وہ مظلوم اور مسکین نظر آنے کی بھی کوشش کر رہے تھے مگر چہروں پر اعمال کے نقوش اتنے گہرے تھے کہ یہ کوشش ذرا بھی کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔

ان کے ہونٹ سُوجے ہوئے تھے اور ان سے خون رِس رہا تھا۔ ایک کا تو سامنے کا ایک دانت بھی ٹوٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ چہروں پر نیل نمودار ہو چلے تھے اور ورم بھی دکھائی دے رہا تھا۔ یہ تو ظاہری حالت تھی۔ اندرونی حالت شاید اس سے زیادہ بُری تھی۔ میں نے بے اختیار ہلکی سی سیٹی بجاتے ہوئے کہا "اوہ! ان سے تو حد تیز رفتار تفتیش ہو چکی ہے۔ اتنا کوئیک ایکشن...!"

ایک کانسٹیبل جو ان میں سے ایک کی ہتھکڑی پکڑے کھڑا تھا، گہری سنجیدگی سے بولا "رنگے ہاتھوں جو پکڑے گئے ہیں سر... اور پھر انہوں نے تو پولیس پارٹی کو بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو ہمارے قسمت اچھی تھی جو ان میں سے ایک کے ہاتھ سے ٹی ٹی گر گئی ورنہ ہم میں سے کئی تو پنجرے میں پھنسے ہوئے جانوروں کی طرح گاڑی ہی میں اللہ کو پیارے ہو جاتے۔ ہمارے ساتھ یہی مسئلہ ہوتا ہے کہ ہم چوہوں کی طرح گاڑی میں پھنسے ہوتے ہیں۔"

وہ کانسٹیبل غالباً دوسرے تھانے سے آیا ہوا تھا۔ بات اس کی معقول تھی لیکن جس طرح میں رحیم گل کو چھیڑتا رہتا تھا اسی طرح میں نے گویا اسے بھی ذرا چھیڑنے کے لیے کہا "خیر... کوئی بات نہیں۔ اس کی کمی اس وقت پوری ہو جاتی ہے جب مطلوب لوگ تمہارے ہاتھ آتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے ان دونوں نوجوانوں کی طرف دیکھا جن سے صحیح طرح کھڑا بھی نہیں ہوا جا رہا تھا۔

کانسٹیبل بغور میری طرف دیکھ کر رہ گیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ میں کون ہو سکتا تھا۔ میری حالت کچھ ایسی معززانہ نہیں تھی۔ میں کافی جھاڑ پونچھ کے باوجود ابھی تک مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ میرے سوٹ کی حالت تباہ تھی اور شاید اس میں اب بھی کہیں کہیں گھاس پھونس اور تنکے وغیرہ اٹکے ہوئے تھے۔ تمام تر بدحالی کے باوجود بہرحال میں قیمتی لباس وغیرہ کی موجودگی کچھ اشارے دیتی ہے... اور پھر میں "صاحب" کے قریب کرسی پر ٹانگیں پھیلائے بیٹھا تھا اور محسوس کیا جا سکتا تھا کہ مجھے صاحب کی موجودگی کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

تاہم ایک اے ایس آئی جس نے دوسرے نوجوان کی ہتھکڑی پکڑی ہوئی تھی بول اٹھا "سر! پولیس تو جو کچھ بھی کرے وہ ظلم ہی کہلاتا ہے اور یہ صرف ہمارے معاشرے ہی کا کمال ہے کہ یہاں ان انسانوں کے قاتل اور درندوں سے بھی زیادہ بُری فطرت رکھنے والے بھی معصوم اور فرشتے بن جاتے ہیں اور ان کی پشت پناہی کرنے والے بھی مختلف طریقوں کے ذریعے ان کی بے گناہی ثابت کیا کرتے رہتے ہیں۔"

"بہت خوب جا رہے ہو!" میں نے اس کا جذبہ جوش دیکھتے ہوئے کہا "تم تو رحیم گل سے بھی باتونی معلوم ہوتے ہو۔ کیا ان کے ساتھ یہ تیز رفتار تفتیش تم نے ہی کی ہے؟" میرا اندازہ تھا کہ شاید وہ بھی دوسرے تھانے سے آیا تھا۔

وہ ہنسی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "نہیں جناب! میں نے تو نہیں کی۔ لیکن اس قسم کے لوگ بعض اوقات اپنی ہٹ سے بھی بندہ دھتکار پاتے ہیں اور زیادہ تفصیلی تفتیش کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کے پکڑے جانے کے بعد اتنی سی دیر میں بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ یہ کافی دنوں سے پولیس کو مطلوب تھے۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اس سے پہلے بھی یہ کاریں چوری کرنے، ڈکیتی اور اسلحے کے زور پر گاڑیاں چھیننے کے الزام میں بارہ مرتبہ پکڑے جا چکے ہیں لیکن ہر مرتبہ ضمانت پر رہا ہو چکے ہیں یا بری ہو چکے ہیں کیونکہ کوئی تسلی بخش شہادت نہیں تھی۔ ان کی تازہ ترین دو تین وارداتیں جن کے بعد پولیس کو زیادہ سرگرمی سے ان کی تلاش تھی، کافی افسوسناک ہیں... اور شاید یہ اسی بات کا نتیجہ ہے کہ جب مجرم کو اتنی مرتبہ جرم کرنے پر بھی سزا نہیں ملتی تو پھر اس کے حوصلے بہت بڑھ جاتے ہیں۔ وہ درندوں سے زیادہ بے خوف ہو جاتا ہے۔"

اس نے ذرا لمبے قد والے نوجوان کی طرف اشارہ کیا "کچھ ہی دن پہلے اس نے ایک نوجوان سے ایک قیمتی کار چھیننے کی کوشش کی۔ وہ بھی نوجوان خون تھا... اس نے ذرا مزاحمت کی۔ اس نے ٹی ٹی کی نال اس کے منہ میں ٹھونس کر گولیاں چلا دیں۔ اس کا بھیجا باہر آ گیا سر...! اور آپ کو معلوم ہے... وہ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور باہر سے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ کا کورس کر کے آیا تھا۔ چند دن بعد وہ ایک جگہ ملازمت شروع کرنے والا تھا اور والدین اس کے لیے رشتہ ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ سر! آپ ان والدین کی کیفیت کا اندازہ کر سکتے ہیں جنہوں نے اپنی ساری زندگی اکلوتے لڑکے کی پرورش اور اچھی تعلیم میں صرف کر دی تھی... جو ان کی تمام امیدوں اور ارمانوں کا مرکز تھا... اور عین اس وقت جب وہ منزل پر پہنچ چکا تھا، اسے لبِ سڑک محض اس لیے بے دردی سے مار کر پھینک دیا گیا کہ اس نے اپنی وہ گاڑی بچانے کی کوشش کی تھی جو اس نے بڑی ضد اور فرمائش کر کے والدین سے لی تھی۔ وہ ان کے وسائل سے کچھ بڑھ کر تھی لیکن اس کے لیے خود لڑکے نے کچھ پیسے جمع کیے تھے اور والدین نے بھی کچھ کھینچ تان کر کے لے کر دی تھی۔ میں خود بھی دولت مندی کے اس قسم کے مظاہروں کے خلاف ہوں۔ اس طرح بہت سے دوسرے لوگوں کے دلوں میں احساسِ محرومی پیدا ہوتا ہے۔ اس کے باوجود میرے خیال میں کسی کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ سرِراہ کسی سے اس کی قیمتی چیز چھین لے اور مزاحمت پر اس کے منہ میں ٹی ٹی ٹھونس کر اس کا بھیجا اڑا دے۔"

"واہ برخوردار...!" میں نے بے ساختہ کہا "یہ تو تم نے بڑی عقل کی بات کی۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا تمہارے محکمے میں دماغ رکھنے والے اور اس سے سوچ بچار کا کام لینے والے بھی موجود ہیں۔"

وہ اے ایس آئی تھا اور عمر میں مجھ سے کچھ زیادہ ہی تھا لیکن میں نے اسے برخوردار کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا "ہر جگہ ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں سر! کسی بھی محکمے یا کسی بھی طبقے کے بارے میں یہ رائے قائم نہیں کرنی چاہیے کہ اس میں سو فیصد لوگ ایک جیسے ہوں گے۔"

پھر وہ چھوٹے قد کے نوجوان کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے بولا "اس کا بھی ایک کارنامہ آپ کو بتا دوں۔ ان دونوں نے پچھلے دنوں ایک فیشن ایبل علاقے سے ایک خاتون سے کار چھیننے کی کوشش کی۔ خاتون نے شاید مزاحمت کی یا ان کی مرضی کے خلاف کوئی حرکت کی۔ اس نوجوان کے پاس اس وقت خنجر اور ٹی ٹی دو چیزیں موجود تھیں۔ اس نے دونوں استعمال کیں۔ پہلے خاتون کے پیٹ پر خنجر سے وار کیا پھر اس کے چہرے پر گولیاں ماریں۔ وہ سڑک پر اس طرح گری کہ اس کی آنتیں بھی نکل کر سڑک پر پھیل گئیں... اور... اور سر..."

وہ ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر گویا حلق میں اٹکی ہوئی کوئی چیز نگلتے ہوئے بولا "سر! وہ خاتون امید سے تھی... آخر اس نوجوان اور اس خاتون کا... ان دونوں گاڑی والوں کا کیا قصور تھا؟ صرف یہ کہ انہوں نے سعادت مندی سے گاڑی ان بھیڑیوں کے حوالے نہیں کی تھی...؟"

اس نے دانت پیس کر چھوٹے قد کے نوجوان کی گُدی پر ایک زوردار ہاتھ رسید کیا۔ وہ اوندھے منہ گرتے گرتے صرف اس لیے بچ گیا کہ اس کی ہتھکڑی کی زنجیر کانسٹیبل کے ہاتھ میں تھی۔

اے ایس آئی گویا اپنے غیظ و غضب پر قابو پاتے ہوئے بولا "اس وقت یہ یہاں کھڑے کافی مظلوم اور مسکین لگ رہے ہیں۔ ان کی شکلیں دیکھ کر شاید کسی کو اندازہ نہ ہو سکے کہ یہ کیسے کیسے کارنامے انجام دے چکے ہیں۔ یہ تو وہ چند باتیں ہیں جو تھوڑی سی دیر میں ہمارے سامنے آئی ہیں۔ ان کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ان کا تعلق کاریں چھیننے یا چوری کرنے، ڈاکے ڈالنے اور بات بات پر قتل کرنے والے خطرناک مجرموں کے ایک گروہ سے ہے جس کے چار ارکان پچھلے دنوں پکڑے جا چکے ہیں۔ ان کی رہائی کے لیے

دو تین بڑے نامور لوگوں کے فون آچکے ہیں اور دباؤ بھی پڑنا شروع ہوگیا۔ اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ ان معاملات کی جڑیں کہاں تک پہنچتی ہیں اور ڈوریاں کہاں سے ہلائی جاتی ہیں۔"

درحقیقت وہ یہ ساری باتیں تو رحیم گل کے گوش گزار کررہا تھا لیکن بیچ میں میرے بول پڑنے کی وجہ سے روئے سخن میری طرف ہوگیا تھا۔ اب رحیم گل نے مداخلت کی اور اے ایس آئی سے مخاطب ہوا "بھائی! اب کو سب باتوں کا اندازہ ہے۔ رونا بس اس بات کا ہے کہ کہیں کوئی اصلاح کی صورت نظر نہیں آتی۔"

پھر اس نے مجھے مخاطب کیا اور دونوں نوجوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ تم سے گاڑی چھیننے والوں میں تو شامل نہیں تھے؟"

اس سوال پر دونوں نوجوانوں نے بیک وقت سر اٹھا کر سُرخ سُرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔ میں نے نفی میں سرہلایا، تب انہوں نے شاید قدرے مطمئن ہوکر دوبارہ سر جھکالیا۔ رحیم گل نے تیسرے کانسٹیبل سے پوچھا "گاڑی کہاں ہے؟"

"سر! باہر کمپاؤنڈ میں کھڑی ہے۔ اسے کچھ نقصان بھی پہنچ چکا ہے" کانسٹیبل نے جواب دیا۔

رحیم گل سہلاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "فکر کی کوئی بات نہیں۔ نقصان بھی پورا ہوجائے گا۔ فی الحال تم گاڑی رسمی کارروائی کے لیے یہیں چھوڑ جاؤ۔ میں خود ہی بھجوادوں گا۔"

"گاڑی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے" میں نے بے نیازی سے کہا "وہ میری اکلوتی گاڑی نہیں ہے۔ اصل مسئلہ وارداتوں کا ہے۔ وارداتوں کے سلسلے میں کچھ ہونا چاہیے۔"

اے ایس آئی فوراً بول اٹھا "سر! ان بدمعاشوں کی گرفتاری کی خبر باہر جاتے ہی انہیں چھڑانے کے سلسلے میں کچھ خاص شخصیتوں کے فون آنے شروع ہوجائیں گے۔"

رحیم گل پُرخیال انداز میں سہلاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے.... اس مرتبہ ذرا ان خاص شخصیتوں کے نام نوٹ کرنا شروع کرو.... بلکہ ہوسکے تو ہمیں ان کے جو فون آئیں انہیں ٹیپ کرانے کا بھی بندوبست کرو۔ اس مرتبہ ذرا ان خاص شخصیتوں کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ اس مرتبہ ذرا گہرائی سے تفتیش ہوگی۔ ہم سارے شہر میں ہونے والی اس قسم کی وارداتوں کے بارے میں تو کچھ نہیں کرسکتے لیکن اس نیٹ ورک کے کم از کم کسی حصے تک تو ہماری رسائی ہوگی اور ہم اس میں کچھ کمی تو لاسکیں گے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اے ایس آئی کی طرف دیکھ کر کہا "ہاں بھئی.... اب اس معاملے میں غلط آدمی کا سینگ پھنس گیا ہے۔ اب کچھ نہ کچھ تو ہوگا" پھر میں نے اٹھتے ہوئے رحیم گل سے کہا "میں اب چلتا ہوں۔ تم پرنس سیمرا والے معاملے کے ساتھ اب اس معاملے کو بھی دیکھو۔ ضرورت پڑی تو مجھ سے رابطہ کرلینا۔"

"یہاں تو نہ جانے کون کون سا مسئلہ ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔ صرف یہ دو مسائل تھوڑا ہی ہیں۔ مسائل کا ایک [illegible] جال پھیلا ہوا ہے" رحیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا پھر اس نے میز پر رکھی ہوئی ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھی اور ہمارے ساتھ باہر نکلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

کمپاؤنڈ میں آکر میں نے اپنی گاڑی کا جائزہ لیا۔ اس کا [illegible] بڑی بے دردی سے کھول کر گرادیا گیا تھا۔ ریورس کرتے وقت گاڑی کہیں لگ بھی گئی تھی جس کی وجہ سے ایک ٹیل لائٹ ٹوٹ گئی تھی اور کونے میں بہت بڑا ڈینٹ پڑگیا تھا۔ تھوڑی سی مزید توڑ پھوڑ اور ایک اگلے دروازے پر دو گولیوں کے نشان بھی نظر آرہے تھے۔

"اتنی سی دیر میں خاصی دُرگت بن گئی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "رحیم گل ڈیئر! تمہیں معلوم ہے اس گاڑی کا صرف ایک تالا بیس ہزار روپے میں پڑتا ہے.... اور وہ بھی یہاں مارکیٹ میں نہیں ملتا۔ ڈیلر خود امپورٹ کرکے منگوا کر دیتا ہے۔"

"تم میری معلومات میں یہ قیمتی اضافہ کیوں کررہے ہو؟" [illegible] کر بولا "مجھے غصہ آگیا تو میں اس کے باقی سب تالے بھی تڑوا کر پھنکوادوں گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم لوگ اتنی قیمتی گاڑیاں کیوں رکھتے ہو؟ اتنے بے جا اخراجات اور اپنی دولت کی نمائش کیوں کرتے ہو؟ ہماری سڑکوں پر گاڑیاں جہازوں کی رفتار سے تو دوڑنے سے رہیں۔ ایک کم قیمت گاڑی بھی اتنی ہی تیز دوڑسکتی ہے جتنی تمہاری یہ جہاز نما گاڑی۔"

"ایک تو آج کل سب ہم بے چارے دولت مندوں کے خلاف ہوگئے ہیں۔ سب جیلس ہوگئے ہیں۔ اپنی جائز اور حلال کمائی سے بھی ہمیں اچھی چیزیں خریدتے دیکھنا نہیں چاہتے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اچھا یہ بتاؤ پیارے گل.... اگر میں کم قیمت گاڑی رکھتا تو اس کے چھینے جانے یا چوری ہونے کا خطرہ نہ ہوتا؟ یہاں تو دس دس بیس بیس سال پرانی نہایت چھوٹی چھوٹی گاڑیاں.... بلکہ موٹر سائیکلیں بھی چھین لی جاتی ہیں۔"

"اس میں نقصان تو کم ہوتا ہے نا" وہ گویا بڑی دور کی کوڑی لایا۔

"حق تو یہ! اگر کسی نے پیسہ پیسہ جمع کرکے بڑی مشکل سے موٹر سائیکل یا کوئی چھوٹی موٹی گاڑی خریدی ہو۔ اس سے اگر وہ چھن جائے تو اس کے لیے تو اس سے بھی بڑا نقصان ہوگا جتنا میرے لیے بڑی مرسیڈیز چھن جانے کا نقصان ہوسکتا ہے۔"

وہ خاموش رہا تو میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں خود نمائی یا اپنے نودولتیے پن کی تسکین کے لیے ایسی چیزیں نہیں خریدتا۔ میں خود اس کے خلاف ہوں لیکن اب میں کیا کروں.... میں دولت مند ہوں.... اس

لیے دولت مند تو نظر آؤں گا لیکن مجھے اپنی دولت مندی کی نمائش کا [illegible] نہیں ہے۔ بہرحال میں تمہیں اپنے خاندان کا کوئی قریب [illegible] تصور کرتے ہوئے تمہاری نصیحت پر بھی کسی حد تک [illegible] کرنے کی کوشش کروں گا۔"

میں اسے خدا حافظ کہہ کر صفیہ کو ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے تھانے سے نکل آیا۔ چند قدم کے فاصلے پر ہی ہمیں ٹیکسی مل [illegible] پہلے میں نے صفیہ کو اس کے گھر چھوڑا۔ اس نے ٹیکسی اپنے گھر سے کچھ دور ہی رکوالی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ اس وقت تک شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ اس کے حلیے کی خرابی کو زیادہ محسوس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس کا گھر ایک ایسے علاقے میں تھا جہاں زیادہ تر نچلے متوسط طبقے کی رہائش تھی۔ اس نے نمبر اور نشانیوں کی مدد سے اپنے گھر کا پتا مجھے سمجھانے کے بعد کہا "اشد ضرورت کے وقت آپ یہاں مجھ سے ملنے آسکتے ہیں۔ ایک مکان کی اوپر کی منزل پر ہمارا دو کمروں کا ایک چھوٹا سا پورشن ہے جس کی چھت پکی نہیں ہے۔ برسات میں ٹپکتی ہے۔ فون ہمارے ہاں نہیں ہے ورنہ بوقتِ ضرورت آپ مجھے فون کرسکتے تھے اور میں آپ کے پاس حاضر ہوسکتی تھی۔ مالکِ مکان کے ہاں فون ہے اور وہ لوگ ازراہِ عنایت ہمیں بلوا بھی دیتے ہیں۔ آپ چاہیں تو اس پر رابطہ کرسکتے ہیں ویسے میں کوشش کروں گی کہ خود ہی آپ سے رابطہ رکھوں۔"

"اگر کامران نے تم سے رابطہ کیا یا یہاں آیا تو سب سے پہلے تم مجھے اطلاع دو گی" میں نے ہدایت کی۔

"یہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ فیصلہ تو میں دل ہی دل میں پہلے ہی کرچکی ہوں" وہ بولی اور رخصت ہوگئی۔

واپس ہوٹل پہنچ کر اس رات میں نے آرام کیا لیکن دوسرے روز میں صبح ہی سے جلد حرکت میں آگیا۔ میرے سامنے دو نام تھے۔ ایک جمشید کریم اور دوسرا جمال سعیدی۔ جمشید کریم کے بارے میں مجھے معلوم ہوچکا تھا کہ وہ پرنس سیمرا کی ایک کمپنی امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن میں اس کا پارٹنر تھا۔ جمال سعیدی سے بھی اس کا کوئی کاروباری تعلق معلوم ہوتا تھا۔ کامران نے مجھے جو اپنی رام کہانی سنائی تھی اور اس میں ان دونوں کا مبہم سا ذکر مجھے اہم محسوس ہوا تھا۔ کامران نے مجھے بتایا تھا کہ پرنس سیمرا کے ہاں اس کی موجودگی کے دوران میں ان دونوں آدمیوں کا اسے یکے بعد دیگرے فون آیا تھا، ان دونوں سے اس نے برہمی سے بات کی تھی اور شاید اسے ان دونوں کی آمد کی بھی توقع تھی۔ میں ان دونوں سے ملنا اور انہیں کھنگالنا چاہتا تھا کہ یہ کس قسم کی شخصیتیں تھیں، ان کے کاروبار کس نوعیت کے تھے اور یہ کس حیثیت کے لوگ تھے۔

ان کے ٹھکانوں وغیرہ کا پتا لگانے کے لیے میں نے شفیع شاہ کو زحمت دی۔ وہ اس طرح کے کاموں میں بھی ماہر تھا۔ ایسے لوگ جن کا کسی بھی قسم کے کاروبار سے خواہ دکھاوے کی حد تک یا حقیقی تعلق تھا، ان کا پتا چلانا تو اس کے لیے بالکل ہی مشکل نہیں تھا۔ چیمبر آف کامرس کا نیا اور پرانا ریکارڈ اس کے پاس موجود تھا بلکہ بیشتر تفصیل تو اسے زبانی یاد تھی۔ معلومات کے اس کے دوسرے بھی بہت سے ذرائع تھے۔ خود اس کا اپنا ذہن بھی کسی کمپیوٹر سے کم نہیں تھا۔

جمشید کریم کا تو کچھ سراغ موجود تھا کہ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن میں پارٹنر تھا۔ گو کہ اس کمپنی کا دفتر بند ہوچکا تھا لیکن اس سراغ کے سہارے اس کا پتا چلانا آسان تھا۔ جمال سعیدی کے بارے میں بھی میں نے شفیع شاہ کو بتادیا کہ اس کا پرنس سیمرا یا پرنس انڈسٹریز سے کوئی نہ کوئی کاروباری تعلق تھا۔ پہلے اسی حوالے سے اس کا پتا چلانے کی کوشش کی جائے۔

شفیع شاہ نے ایک گھنٹے بعد رپورٹ دینے کے لیے کہا۔ میں نے اس ایک گھنٹے کے دوران میں ناشتا کیا، اخبارات دیکھے اور چند ٹیلی فون کالز کیں۔ ان سب کاموں میں، میں نے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت صرف کیا اور شفیع شاہ کا فون ایک گھنٹے سے پہلے ہی آگیا۔

"سر! جمشید کریم نامی شخص کا امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن میں پارٹنرشپ کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کا اپنا الگ بہت بڑا بزنس بھی ہے۔ اس کے علاوہ یہ شخص بہت بڑا سپلائر بھی ہے۔"

"سپلائر.... ؟ کس قسم کا سپلائر؟" میں نے بات کا[illegible] پوچھا۔

شفیع شاہ دھیرے سے ہنسا "سر! یہ بڑی انڈسٹریز کو [illegible] مال سپلائی کرتا ہے۔ بندرگاہ اور کئی صنعتی علاقوں میں اس کے بڑے بڑے گودام موجود ہیں۔ کافی دولت مند آدمی ہے لیکن امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کو شاید یہ دیوالیہ قرار دلوا کر بند کروانے کی فکر میں ہے تاکہ کروڑوں روپے کے واجبات اور ہرجانوں کی ادائیگی کے دعووں سے بچ سکے۔"

"ایڈریس.... ؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے مجھے اس کے ہیڈ آفس اور گھر کے ایڈریس لکھوائے۔ دونوں ایڈریس ڈیفنس کے تھے۔ شفیع شاہ بولا "عین ممکن ہے ان کے علاوہ بھی اس کے ٹھکانے ہوں لیکن فی الحال انہی کا پتا چل سکا ہے۔"

"اتنا ہی کافی ہے" میں نے کہا "کسی کا اتنا پتا مل جائے تو پھر خواہ وہ پاتال میں بھی جا چھپے اسے ڈھونڈا جاسکتا ہے۔ جمال سعیدی کے بارے میں کیا خبر ہے؟"

"اس کا تو عجیب ہی قصہ ہے سر!" شفیع شاہ کے لہجے سے خفیف سی حیرت کا اظہار ہورہا تھا "مجھے بہت خاص ذرائع سے معلومات کرنے پر پتا چلا ہے کہ یہ شخص درحقیقت افغانی ہے۔ برسوں پہلے افغان جنگ شروع ہوتے ہی یہاں بھاگ آیا تھا۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ یہ وہاں کی حکومت کو مطلوب تھا۔ ملک میں غیر ملکی مداخلت اور ٹوٹ پھوٹ کا عمل شاید اس کے حق میں اچھا

ثابت ہوا۔ یہ شخص اپنے ساتھ کافی دولت لے کر آیا تھا۔ سنا ہے اب تو لوگوں کو یاد بھی نہیں رہا کہ وہ افغانی تھا۔ وہ روانی سے انگریزی، اردو، فارسی، پشتو اور عربی بولتا ہے۔"

"اس میں حیرت کی تو کوئی ایسی خاص بات نہیں۔" میں نے کہا۔ مجھے معلوم تھا شفیع شاہ تھوڑی بہت حیرت کا اظہار بھی کسی بہت ہی بڑی بات پر کرتا تھا۔

"سر! حیرت کی بات یہ ہے کہ ان برسوں کے دوران میں ایک تو اس نے پاکستانی شہریت اور پاسپورٹ وغیرہ سب کچھ حاصل کرلیا۔" شفیع شاہ بولا۔ "خیر... یہ بھی کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے ملکوں کے باشندوں کی ایک بہت بڑی تعداد یہ کارنامہ انجام دے چکی ہے۔ یہ سہولیات ہمارے ہاں ارزاں نرخوں پر بڑی فراخ دلی سے فراہم کی جاتی ہیں۔ اصل حیرت کی بات یہ ہے کہ اس شخص نے آتے ہی بہت بھاری انویسٹمنٹ کرکے پرنس انڈسٹریز کی چاروں صوبوں میں ڈیلر شپ خرید لی۔ چاروں صوبوں میں پرنس انڈسٹریز کی ڈیلر شپ کا مالک ہونا بہت بڑی بات ہے۔ اس ڈیلر شپ سے ہر سال کروڑوں کا خالص منافع کمایا جاتا ہے جب کہ اربوں کی ٹرانزیکشن ہوتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس سے پہلے یہ ڈیلر شپ جن پارٹیوں کے پاس تھی، ان کا انہیں فروخت کرنے کا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ ہر صوبے کی ڈیلر شپ الگ الگ کاروباری اداروں کے پاس تھی اور ان کا بزنس بڑے ہموار انداز میں چل رہا تھا۔ انہیں کوئی مسئلہ درپیش نہیں تھا۔ پرنس انڈسٹریز کو ان سے یا انہیں پرنس انڈسٹریز سے کوئی شکایت نہیں تھی لیکن چاروں الگ الگ پارٹیوں نے اچانک اور بیک وقت ڈیلر شپ ایک غیر ملکی کے ہاتھ بیچ دی اور کوئی خاص وجہ بھی بیان نہیں کی۔ اونچے کاروباری حلقوں میں اس وقت خاصی حیرت کی لہر دوڑ گئی تھی۔"

"ہاں... یہ تو واقعی کچھ حیرت کی بات ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"اس کے بعد سے یہ شخص اور بھی پھلتا پھولتا چلا آرہا ہے۔ اس نے کئی اور چلتے ہوئے بزنس بھی خریدے ہیں جن کی تفصیلات کا ابھی علم نہیں ہوسکا۔ اگر آپ چاہیں گے تو میں وہ بھی حاصل کرلوں گا۔" شفیع شاہ بولا۔

"خیر... فی الحال ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ تفصیلات تم فارغ وقت میں جمع کرتے رہنا۔ شاید کبھی کام آجائیں۔"

"اس وقت اس شخص کا پرنس انڈسٹریز میں بہت زیادہ عمل دخل ہے بلکہ پرنس سمیرا کے والد پرنس سعید کے انتقال کے بعد تو اس نے کمپنی کے سامنے درخواست پیش کی ہے کہ اسے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل کیا جائے تو یہ انڈسٹریز میں بھاری انویسٹمنٹ کرسکتا ہے اور کچھ نئے پلانٹس لگانے میں مدد دے سکتا ہے لیکن سنا ہے بورڈ آف ڈائریکٹرز نے اس کی یہ درخواست مسترد کردی ہے۔ حالانکہ یہ شخص پرنس انڈسٹریز کے کاروبار کا اہم ستون بن گیا تھا

لیکن سننے میں آیا ہے کہ مرحوم پرنس سعید اسے پسند نہیں کرتے تھے، صرف برداشت کرتے تھے۔ اس نے ان کی بے خبری میں ان کے کاروبار میں بڑی ہوشیاری سے نقب لگائی تھی۔"

"یہ واقعی خاصی حیرت کی بات ہے کہ دوسرے ملک سے آیا ہوا ایک شخص ایک نئے ملک میں اتنے پیچیدہ قسم کے کام کر گزرے۔ اس شخص کو تو واقعی ذرا باریک چھلنی میں چھاننا پڑے گا۔ اس کا ایڈریس بتاؤ۔"

"اس نے اپنا ہیڈ آفس تو پوش علاقے میں بنایا ہے۔ سوسائٹی کے علاقے میں ایک کوٹھی میں اس کے دفاتر ہیں لیکن اس کی رہائش بڑی عجیب جگہ پر ہے۔ سپر ہائی وے سے جو سڑک نکلتی ہے، اس سے ہٹ کر ویران سے علاقے میں ہے... جہاں ابھی مستقبل کی ہاؤسنگ اسکیمیں بننے کے صرف اعلانات ہو رہے ہیں۔ سنا ہے وہاں اس نے بہت بڑا محل نما مکان بنا رکھا ہے۔ حیرت ہے کہ وہاں ابھی مستقبل کی رہائشی اسکیموں کا اعلان ہو رہا ہے۔ یعنی فی الحال ویرانہ ہی ہے لیکن اس نے کئی برس پہلے وہاں مکان بنوایا تھا۔ جانے تب وہاں ویرانی کا کیا عالم ہوگا؟ حالانکہ وہ کسی بھی اچھے سے اچھے اور مہنگے سے مہنگے علاقے میں رہنا افورڈ کرسکتا تھا۔"

"ہوسکتا ہے اس کی مصلحتوں کے لحاظ سے یہ ویرانہ اس کے لیے کسی بھی شاندار علاقے سے بہتر ہو۔" میں نے بہت سے امکانات پر غور کرتے ہوئے کہا۔ "بہرحال تم مجھے دونوں جگہوں کے ایڈریس لکھوا دو اور جس حد تک ممکن ہو، سمجھا بھی دو۔"

اس نے جمال سعیدی کے دفتر اور گھر کے پتے نہ صرف مجھے لکھوائے بلکہ اپنی حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں ان دونوں چیزوں کا محل وقوع بھی اچھی طرح سمجھا دیا۔ پھر اس نے پوچھا۔ "کیا مجھے یا "دی سرکل" کے دوسرے لوگوں کو اس سلسلے میں کچھ کرنا ہے؟ ہم الرٹ ہوجائیں؟"

"نہیں... نہیں۔ ابھی صورت حال ایسی نہیں ہے۔ میں تو ابھی کچھ چھیڑ چھاڑ میں لگا ہوا ہوں۔ اگر ضرورت پڑی تو میں سگنل دے دوں گا۔ فی الحال تم لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگے رہو۔" میں نے جواب دیا اور خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔

آفس سے نکل کر میں ہوٹل کے زیر زمین پارکنگ ایریا میں پہنچا اور اپنے لیے وہاں کھڑی ایک دوسری گاڑی نکالی۔ اس کا انتخاب کرتے وقت گویا رحیم گل کی نصیحت پر عمل ہوگیا۔ بہت زیادہ مہنگی یا رنگ کے لحاظ سے بہت نمایاں نظر آنے والی گاڑی نہیں تھی۔ اس میں بیٹھ کر میں پہلے جمشید کریم کے دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ میں نے اسے فون کرکے معلومات کرنے، وقت لینے یا ملاقات کی اجازت وغیرہ لینے کا تکلف نہیں کیا۔

ڈیفنس کے بر لب سمندر کچھ حصہ کمرشل تھا۔ میرا مطلوبہ ایڈریس بھی ایسے ہی ایک حصے کا تھا جو دکانوں اور دفاتر وغیرہ کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں پہنچ کر مجھے اپنی مطلوبہ عمارت تلاش کرنے میں

... لگے کیونکہ وہ کسی بڑی سڑک پر نہیں بلکہ ایک چھوٹی سی ... تھی۔ وہ پلاٹ بھی چھوٹا ہی تھا جس پر عمارت تعمیر کی گئی تھی ... عمارت حیران کن ضرور تھی۔ وہ چار منزلہ تھی اور لمبائی ... کم ہونے کے باوجود اس کا تاثر ایک پرشکوہ قلعے کا سا تھا۔ ... طرف سے بند اور نہایت محفوظ قسم کی فولادی سی عمارت ... دیتی تھی۔ اگر اس کے سامنے ایک جگہ ایک چاق و چوبند ... محافظ نہ کھڑا ہوتا تو شاید سرسری نظر میں اس کا دروازہ بھی نظر ...

... پارکنگ کے لیے بھی باہر ہی تھوڑی سی جگہ مخصوص تھی۔ میں ... گاڑی وہاں چھوڑی اور اندر جا پہنچا۔ مسلح گارڈ نے گہری نظروں سے مجھے دیکھنے پر اکتفا کیا۔ مجھے روکنے یا کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں ... شاید میرے معززانہ حلیے کی وجہ سے اس نے بازپرس کی کوئی ... ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس عمارت پر باہر بھی کسی قسم کا کوئی ... بورڈ آویزاں نہیں تھا جس سے اندازہ ہوتا کہ یہ کس قسم کا ... تھا۔ بیرونی دیوار پر کافی بلندی پر جہاں سے صرف دو چھوٹے چھوٹے ... سے حروف ہے... کے اور وہاں تھے جو ... بہت خوبصورت دکھائی دے رہے تھے۔

... اندر پہنچ کر بھی مجھے یہ احساس نہیں ہوا کہ میں کسی دفتر میں ... آیا تھا بلکہ کچھ یوں لگا جیسے میں کسی ایسے مقبرے میں داخل ... ہو گیا تھا جو زیادہ طویل و عریض تو نہیں تھا لیکن نہایت بارعب اور ... عالیشان ضرور تھا۔ ایک ایسی خنکی اور سکوت نے میرا استقبال ... کیا کہ کسی زندگی کا احساس نہیں تھا۔ میں ایک لابی نما جگہ میں ... تھا جس کا مرمریں فرش آئینے کی طرح جھلملا رہا تھا۔ تین ... طرف بڑے اونچے اونچے منقش بند دروازے دکھائی دے رہے ...

ایک کونے میں خوبصورت اور آرٹسٹک قسم کا ریسپشن بنا ہوا ... کاؤنٹر کے عقب میں ایک اونچی کرسی پر اونچے سے جوڑے ... ایک خوبصورت ریسپشنسٹ نہیں ... کوئی چھوٹی موٹی ملکہ ہو۔ وہ ... اپنی نظروں سے اپنے سامنے نہ جانے کس چیز کو تک رہی ... جیسے اس کے سامنے کوئی غیر مرئی دربار لگا ہوا تھا یا پھر اپنی ... سے کہیں زیادہ خوبصورت، زیادہ حسیات پرور ماحول میں لے گیا ... فون بورڈ اس کے سامنے رکھا ہوا تھا اور اس کی انگلیاں ... بے خیالی میں ریسیور پر رینگ رہی تھیں۔

... میرے سامنے تین بند دروازے تھے اور مجھے نہیں معلوم تھا ... کے پیچھے کیا تھا۔ میں شاید ان میں سے کسی میں بھی داخل ... سامنے ایک دروازے کی طرف قدم بھی بڑھایا۔ لڑکی کی ... طرف نہیں تھی۔ بے دھیانی تھی۔ شاید وہ مجھے آفس کا ہی ... کچھ رہی تھی مگر پھر میں نے سوچا کہ اسے تھوڑی بہت ... ہی لینی چاہیے تھی۔ آخر وہ ریسپشنسٹ تھی۔ آنے ... اخلاقی فرض تھا کہ اسے اپنے استقبال کا موقع دیتے۔

خصوصاً جب کہ وہ خوبصورت بھی تھی۔ اس کے پاس تو خواہ مخواہ بھی رکا جاسکتا تھا۔

میں اس کے قریب جاکر کھنکارا تو یکدم اس کی آنکھوں کی خوابناکی معدوم ہوگئی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے افسوس ہوا۔ کسی کو خوابوں کی خوبصورت دنیا سے حقائق کی بدصورت دنیا میں لے آنا ویسے تو ایک احسان شمار ہونا چاہیے لیکن کبھی کبھی یہ احسان کچھ اچھا نہیں لگتا۔

"جی... فرمائیے؟" اس نے شائستگی سے ... گویا ... سے کہا۔

"مجھے جمشید کریم صاحب سے ملنا ہے۔" میں نے ... سے کہا۔

اس نے گہری نظروں سے میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور قدرے خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ نے اپائنٹمنٹ لیا ہوا ہے؟"

"نہیں... میں نے سوچا پہلے ایک مرتبہ تو ملاقات کرلوں۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "اگر وہ اس قابل لگے کہ آئندہ بھی ان سے ملا جاسکے تو ایسا اپائنٹمنٹ لے کر ملا جائے تو پھر اپائنٹمنٹ لے لیا کریں گے۔"

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ خوش خلقی کے جو تاثرات ایک لمحے پہلے ہی اس کے چہرے پر نمودار ہوئے تھے وہ معدوم ہونے لگے۔ ... ملائمت سے بولی۔ "اگر آپ نے اپائنٹمنٹ نہیں لیا ہے تو آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا۔ وہ اس وقت ایک صاحب کے ساتھ اہم میٹنگ میں مصروف ہیں۔ میٹنگ ختم ہوگی تو میں ان سے پوچھ لوں گی کہ وہ آپ سے مل سکتے ہیں یا نہیں۔ آپ تشریف رکھیے۔" اس نے ایک طرف لگی ہوئی خوبصورت اور قیمتی قسم کی صوفہ نما کرسیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کوئی ایسا طریقہ کریں کہ مجھے تشریف ... رکھنی پڑے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "مجھے تشریف رکھنے کی کوئی خاص عادت نہیں ہے۔ بس یوں سمجھیں کہ طبیعت پائی ہے میں نے۔"

وہ الجھن بھری نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس قسم کا آدمی تھا۔ میرا حلیہ، شکل و صورت یا انداز و اطوار سے یقیناً ... تھا اور انوکھے طریقے سے فری ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا معززانہ حلیہ اور میرے چہرے کا انداز و اطوار کی سنجیدگی میری گفتگو سے میل نہیں کھا رہی تھی۔ میں نے یہ بھی کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ اسے استہزائیہ محسوس نہ ہو۔

آخر اس نے غالباً یہی فیصلہ کیا کہ اپنے دماغ پر زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ وہ ریسیور اٹھاتے ہوئے بولی۔ "ایک منٹ ٹھہریے... میں ذرا ان کی صاحب سے بات کرتی ہوں۔"

جب نچلا اسٹاف کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر رہتا تھا شاید اس

وقت رازی صاحب سے رجوع کیا جاتا تھا۔ اس نے ایک نمبر پنچ کیا اور چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد بولی۔

"سر! ایک صاحب بغیر اپائنٹمنٹ کے جمشید صاحب سے ملنا چاہتے ہیں۔"

پھر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھا "آپ کا نام؟"

میں نے اپنا نام بتایا اور کہا "رازی صاحب اگر راضی ہوں تو میں جمشید صاحب سے فوری ملاقات کرنا چاہوں گا۔"

ریسپشنسٹ نے ماؤتھ پیس سے ہاتھ ہٹا کر صرف میرا نام بتانے پر اکتفا کیا۔ ایک بار پھر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے پوچھا "آپ کہاں سے آئے ہیں اور کس سلسلے میں جمشید صاحب سے ملنا چاہتے ہیں؟"

"میں بہت دور سے آیا ہوں اور بہت ضروری سلسلے میں جمشید صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔ آپ رازی صاحب کو بتا دیجئے کہ جتنی جلدی جمشید صاحب سے میری ملاقات ہو جائے گی، جمشید صاحب کے حق میں اتنا ہی اچھا ہو گا" میں نے جواب دیا۔

اس نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ میرا یہ پیغام فون پر دہرا دیا اور چند سیکنڈ دوسری طرف سے کچھ سننے کے بعد ریسیور رکھتے ہوئے تین دروازوں میں سے ایک کی طرف اشارہ کیا "آپ اندر چلے جائیے" اس کے لہجے میں اب بھی الجھن برقرار تھی۔

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ وہ دروازہ مقفل تھا۔ میں نے اس کی ناب گھمانے کی کوشش کی تو اس نے ذرا بھی جنبش نہ کی لیکن جب میں اسے دروازے سے اکھاڑ کر اپنے آپ کو ہرکولیس ثابت کرنے کے امکانات کے بارے میں غور کر رہا تھا تو کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ غیر مقفل ہو گیا۔ میں سمجھا کہ اندر سے کسی نے آکر ناب گھما کر تالا کھولا ہو گا۔ لیکن جب میں دروازہ کھول کر اندر پہنچا تو دروازے کے دوسری طرف کوئی موجود نہیں تھا۔ تالا اندر کہیں سے غالباً الیکٹرانک نظام کے تحت کھولا گیا تھا۔ یہاں کے دروازے کسی کمپیوٹرائزڈ نظام سے منسلک معلوم ہوتے تھے اور یہ اہتمام میں پہلی بار کسی عام سے کاروباری دفتر میں دیکھ رہا تھا۔

ریسپشن پر پہنچ کر تو مجھے کچھ یوں محسوس ہوا تھا جیسے میں کسی مقبرے میں داخل ہو گیا تھا اور اندر پہنچ کر گویا مقبرے کی قسم بھی واضح ہو گئی۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں اہرامِ مصر میں قدم رکھ رہا تھا لیکن یہ اہرام ذرا جدید قسم کے تھے۔ یہاں فرش پر دبیز قالین تھے۔ چھتوں اور دیواروں میں جدید قسم کی خوبصورت لائٹس نصب تھیں۔ پینٹ بہت عمدہ تھا اور دیواروں پر نامور مصوروں کی کچھ پینٹنگ بھی سلیقے سے آویزاں تھیں۔ فرنیچر نہایت جدید قسم کا تھا۔ گویا بظاہر تو یہاں اہرامِ مصر والی کوئی چیز نہیں تھی لیکن یہاں کی ہوا میں تاثر اہرامِ مصر کا سا تھا۔ میں اہرامِ مصر کی سیر کر چکا تھا اور آج برسوں بعد وہ تاثر ذہن میں تازہ ہوا تھا۔ کیا یہاں بھی کوئی ابدیت کا کفن لپیٹے نئی زندگی کے انتظار میں لیٹی ہوئی تھی؟ میں نے قدرے حیرت سے اپنے آپ سے پوچھا لیکن یہ بھلا کیسے ممکن تھا...

میں ایک خاصے کشادہ ہال میں کھڑا تھا جس میں صرف ایک شاندار میز لگی ہوئی تھی جس پر ایک عدد کمپیوٹر، ایک فون اور انٹرکام موجود تھا لیکن کوئی انسان موجود نہیں تھا۔ ایک دروازے کے دوسری طرف دوسرا کمرا نظر آ رہا تھا اس میں میز کرسیاں اور ان پر اسی قسم کا زیادہ دفتری سامان موجود تھا لیکن وہاں بھی کوئی مرد یا عورت نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اس دفتر کے بیشتر کارکن چھٹی پر تھے۔

اچانک اس کمرے سے بھی آگے کہیں کسی نادیدہ گوشے سے ایک شخص نکل کر مسکراتا ہوا مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ مضبوط جسم کا ایک دراز قد شخص تھا۔ رنگت سرخ و سفید تھی اور شاید اسی لیے اس کے چہرے پر چھوٹی سی فیشن ایبل سیاہ داڑھی زیادہ جچ رہی تھی۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا اور عمدہ قسم کے سوٹ میں تھا۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت کا تاثر خوشگوار ہونا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے کسی مغربی ملک میں تکفین و تدفین کا کام کرنے والے کسی نامعلوم شخص کا خیال آیا جنہیں وہاں انڈر ٹیکر کہا جاتا ہے۔

انڈر ٹیکر بھی گو کہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں ہوتے۔ وہ بھی عام لوگوں کی طرح ہی ہوتے ہیں لیکن نہ جانے کیوں انہیں فلموں یا ٹی وی پر دیکھ کر مجھے عجیب سا تاثر ذہن میں ابھرتا ہے خواہ کوئی اداکار ہی انڈر ٹیکر کا کردار کیوں نہ کر رہا ہو۔ مجھے زندگی میں ایک مرتبہ نیویارک میں اور ایک مرتبہ لندن میں حقیقی انڈر ٹیکرز سے ملاقات کا اتفاق ہو چکا تھا۔ امریکی انڈر ٹیکر میں تو اچھی خاصی حسِ مزاح بھی موجود تھی۔ اس کے باوجود ان لوگوں کو دیکھ کر نہ جانے کیوں یاسیت، سرد مہری اور افسردگی کا احساس ہوتا تھا۔

وہ نوجوان جو اندر سے نکل کر میرے سامنے پہنچ چکا تھا اس کی شخصیت کا تاثر بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ اس کی مسکراہٹ بھی اس تاثر کو دور کرنے میں ناکام تھی وہ مسکراہٹ بھی درحقیقت مسکراہٹ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ بس دانت عجیب سے انداز میں ہونٹوں کے عقب سے جھانک رہے تھے اور اس انداز سے سفاکی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ہونٹوں کے اس نپے تلے سے کھنچاؤ کو مسکراہٹ کہا جا سکتا تھا۔

ایک عجیب بات یہ بھی تھی کہ اس خوش پوش نوجوان کے کندھے پر ایک عدد کلاشنکوف لٹکی ہوئی تھی۔ ایک خوبصورت، آراستہ و پیراستہ دفتر کے ماحول میں کلاشنکوف ویسے بھی عجیب لگ رہی تھی اور پھر ایک سوٹڈ بوٹڈ نوجوان کے کندھے پر اس کی موجودگی نے اسے اور بھی عجیب بنا دیا تھا۔ یہ خاصا افسوسناک تھا کہ اب دفتروں میں داخل ہو کر قلم سے پہلے کلاشنکوف کا...

...نے قریب آکر مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے گویا احساس ...کے پاس صرف کلاشنکوف ہی کی طاقت نہیں تھی بلکہ ...طور پر بھی ایک طاقتور اور مضبوط شخص تھا۔ اس کی ...تھی۔ اس لیے میں نے بھی اسے احساس دلا دیا کہ ...سی گئے گزرے آدمی کا ہاتھ نہیں تھاما تھا۔ اس نے ایک ...میرا سر تا پا جائزہ لے لیا تھا۔ صرف جائزہ ہی نہیں، اس ...نظروں ہی نظروں میں میری تلاشی بھی لے ڈالی تھی۔ اس ...ٹٹولنے کی پوری پوری کوشش کی تھی کہ میرے لباس میں ...ہتھیار پوشیدہ ہو سکتا تھا۔ تاہم اس نے اس حد تک ...مروت کا مظاہرہ ضرور کیا کہ میری باقاعدہ تلاشی لینے کی ...نہیں کی۔

...آپ کو جمشید صاحب سے ملنا ہے؟" اس نے تصدیق ...

...نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا تو اس نے پوچھا ...سلسلے میں؟"

...سلسلہ بہت خاص قسم کا ہے۔ وہ میں صرف انہی کو بتا سکتا ...نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

...ابھی... کوئی اشارہ وغیرہ؟" اس نے مجھے کریدنا چاہا۔

...شارے بازی کے میں حق میں نہیں ہوں" میں نے اپنی ...برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر بھی کچھ ویسے ہی ...کے آثار نمودار ہوئے جیسے میں ریسپشنسٹ کے چہرے پر دیکھ ...نے جلدی سے پوچھا "ویسے آپ کون ہیں؟"

...ان کا سیکریٹری ہوں... کمال" اس نے اختصار سے ...

...کمال صاحب! آپ واقعی بڑے کمال کے آدمی معلوم ہوتے ...کہنے کچھ اس طرح اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ...کوئی بے وقوف آدمی موقع محل دیکھے بغیر کسی نہایت سنجیدہ ...سے بے تکلف ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

...مجھ میں کمال کی کیا بات ہے؟" اس نے تیکھی ...کی طرف دیکھا۔

...سب سے بڑی کمال کی بات تو یہ ہے کہ آپ کا نام کمال ...مسکراتے ہوئے کہا "دوسری کمال کی بات یہ ہے کہ ...کندھے پر یہ کلاشنکوف موجود ہے..." میں نے کلاشنکوف ...چھوتے ہوئے پوچھا "اصلی ہے نا؟"

...نے کوئی جواب دینے کے بجائے ایک قدم پیچھے ہٹ کر ...از سر نو میرا جائزہ لیا۔ اس کی الجھن بڑھ چکی تھی اور وہ یقیناً ...سے میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا جب کہ ...کوشش کر رہا تھا کہ وہ میری صورت اور میرے تاثرات ...کے بارے میں کوئی بھی حتمی رائے قائم نہ کرنے پائے بلکہ اس کی الجھن برقرار ہی رہے۔

میں نے گویا اس کی کیفیت سے بے خبر رہتے ہوئے بات جاری رکھی "شاید زمانہ ہی کمال کا آگیا ہے۔ اب دیکھیں نا... یہ کیا کم کمال کی بات ہے کہ سیکریٹری کے کندھے پر بھی کلاشنکوف موجود ہے! واقعی کلاشنکوف بہت ہی تیزی سے ہمارے کلچر میں داخل ہو گئی ہے۔ بلکہ میرا تو خیال ہے کلچر غائب ہی ہو گیا، صرف کلاشنکوف رہ گئی ہے۔ کوئی زمانہ آئے گا کہ چپراسی کے کندھے پر بھی کلاشنکوف ہو گی... اسٹینو گرافر اور ٹیلی فون آپریٹر لڑکیاں بھی کلاشنکوفیں لیے بیٹھی ہوا کریں گی۔ جھاڑو پوچا کرنے والا بھی ایک کندھے پر کلاشنکوف اور دوسرے پر جھاڑو رکھے آیا کرے گا۔ غرضیکہ ہر طرف کلاشنکوف کی بہار ہو گی... اور انسانی جان پھر بھی پہلے سے زیادہ غیر محفوظ ہو گی۔ کیا خیال ہے؟"

اس نے کوئی خیال ظاہر نہیں کیا، ایک ٹک مجھے گھورتا رہا۔ میں نے گویا یک لخت اس موضوع کا پیچھا چھوڑ دیا اور اس کی ٹائی پکڑ کر بغور دیکھتے ہوئے کہا "عمدہ ٹائی ہے... شاید فرانس کی ہے... انی شلا INITIALED معلوم ہوتی ہے ہاں... وہی ہے... اگر موقع ملا تو میں بھی آپ کو اسی قسم کی دو تین ٹائیاں تحفتاً پیش کروں گا..."

پھر جیسے اچانک مجھے کچھ یاد آیا۔ میں نے چونک کر ماتھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا "لاحول ولا... میں بھی کبھی کبھی بالکل ہی پٹڑی سے اتر جاتا ہوں۔ میں یہاں کس کام سے آیا ہوں اور کن باتوں میں الجھ گیا۔ ہاں... تو کمال صاحب...! جمشید صاحب سے میری ملاقات کرانے کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

وہ بھی گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آیا اور چونک کر ذرا اکڑ جتاتے ہوئے سے انداز میں بولا "وہ اس وقت ایک صاحب سے بہت ضروری بات چیت کر رہے ہیں... لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ وہ اپنی گفتگو کو ذرا مختصر کرتے ہوئے آپ کو ملاقات کے لیے جلدی بلا لیں۔ آپ کو صرف تھوڑی سی دیر انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی۔ آپ یہاں تشریف رکھئے" اس نے مجھے ہال میں موجود اکلوتی میز پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس کے لہجے میں بے پناہ شائستگی آگئی تھی اور وہ روانی سے اردو بول رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اردو اس کی زبان نہیں تھی۔ اس نے غالباً فی الحال مجھ سے جان چھڑا لینے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ شاید وہ جمشید کریم سے ہی میرے بارے میں مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اس کی درخواست کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اس میز پر بیٹھ جانا ہی بہتر سمجھا۔ اس طرح مجھے ذرا بہتر طور پر آفس کا جائزہ لینے کا موقع بھی مل سکتا تھا۔

میں بیٹھ چکا تو وہ اپنی کلاشنکوف سنبھالتے ہوئے واپس چلا گیا۔ میں نے اسے دوسرا کمرا عبور کر کے ایک تیسرے کمرے کے دروازے سے اندر جاتے دیکھا اور تبھی میں نے یہ بھی دیکھا کہ

اس دروازے پر جمشید کریم کے نام کی پیتل کی خوبصورت تختی لگی ہوئی تھی۔ انگریزی حروف میں اس کا نام جھلملا رہا تھا۔

دروازہ صرف چند لمحے کے لیے کھلا تھا اور اسی دوران میں مجھے اندر سے دو افراد کی تیز تیز آوازیں سنائی دی تھیں۔ اگر اتنے فاصلے کے باوجود کمرے کے اندر سے مجھ تک آوازیں پہنچ رہی تھیں تو اس کا مطلب یہی تھا کہ ان کے درمیان خاصی تیز و تند بحث جاری تھی۔ دروازہ آہستگی سے ہلکی سی کلک کے ساتھ دوبارہ بند ہو گیا لیکن میرے کان کھڑے ہو چکے تھے۔

کان تو کھاوتاً کھڑے ہو گئے تھے لیکن میں خود عملاً کھڑا ہو گیا۔ دبیز قالین پر قدموں کی آواز کے سلسلے میں زیادہ احتیاط کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے میں لمبے ڈگ بھرتا فوراً اس دروازے کے قریب جا پہنچا۔ دروازے کے قریب بھی دوسری دیواروں پر ایک مشہور مصور کی پینٹنگ آویزاں تھی۔

مجموعی طور پر یہ کسی انتہائی باذوق آدمی کا دفتر معلوم ہوتا تھا لیکن وہ جو ایک محاورہ ہے کہ ... خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آ ہی جاتی ہے ... تو کچھ اسی طرح جب دولت آتی ہے تو اکثر اس کے ساتھ ذوق بھی خود بخود چلا آتا ہے۔ انسان کے پاس اپنا ذوق نہیں ہوتا تو وہ ذوق کرائے پر لے لیتا ہے یعنی کسی مشہور اور اچھے سے انٹیریئر ڈیکوریٹر کو بھاری فیس دیتا ہے، اس کے مشوروں کے مطابق دل کھول کر روپیہ خرچ کرتا ہے اور اس کا گھر یا دفتر نہایت اچھے طریقے سے آراستہ ہو جاتا ہے ... لیکن یہ طریقہ اختیار کرنے کے لیے بھی بہرحال تھوڑا سا شوق اور کافی حوصلہ تو درکار ہوتا ہی ہے۔

یہ خیالات صرف ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں لپکے تھے لیکن اس وقت میں جمشید کریم کے شوق یا ذوق کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے نہیں بلکہ کسی اور مقصد سے اس دروازے کے قریب پہنچا تھا اس لیے میں نے فوراً دروازے سے کان لگا دیا۔ اب آوازیں خاصی واضح سنائی دے رہی تھیں لیکن مسئلہ یہ آن پڑا کہ زبان میرے لیے اجنبی تھی۔ وہ فارسی میں باتیں کر رہے تھے۔

فارسی بہت شیریں زبان ہے۔ لگتا ہی نہیں کہ اس زبان میں جھگڑا بھی کیا جا سکتا ہے تاہم ان دونوں افراد کے درمیان بہرحال بحث و تکرار جاری تھی اور لہجے نہایت تیز و تند تھے۔ میں نے اسکول کے زمانے میں کئی سال تک بڑے ذوق و شوق سے فارسی پڑھی تھی اور اپنی دانست میں اس زبان پر اچھا خاصا عبور حاصل کر لیا تھا لیکن گزشتہ برسوں میں کاروبار کے سلسلے میں ملکوں ملکوں جانے کا اتفاق ہوا تو ایران کے بھی دو تین چکر لگے۔ قیام گو کہ مختصر ہی رہا لیکن اپنی عادت کے مطابق وہاں کی تہذیب و ثقافت، زبان و بیان اور دوسری تمام چیزوں پر بہت دھیان دیا۔ تب اندازہ ہوا کہ ہمارے اسکولوں میں فارسی خواہ ذوق و شوق سے پڑھی جائے تب بھی وہاں جا کر بولنے اور سمجھنے کے سلسلے میں کوئی خاص کام نہیں آ سکتی۔

تاہم میں نے ایک چیز فوری طور پر محسوس کر لی کہ تکرار میں مصروف دونوں افراد فارسی ضرور بول رہے تھے لیکن ان کا لہجہ ایرانیوں والا نہیں تھا۔ ممکن تھا کہ وہ ... حال میں نے اس بات کا تعین کرنے میں دماغ کھپانے ... ان کی گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی ... فارسی دانی کی صلاحیتوں کو میدان میں لانے کی ...

وہ جملوں میری ہی ... اور زبان ... صلاحیتیں کام آتی گئیں۔ آہستہ آہستہ ہونے والی گفتگو ... سمجھ میں آنے لگی۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے ... ان میں سے کون تھا۔ جمشید کریم کی آواز ... کو مجھلی سی آواز میں بات کرنے والے دوسرے ... اسے اس کے پورے نام سے مخاطب کیا تھا ... تھا اور موضوع گفتگو وہی امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن تھی ...

وہ نامعلوم شخص جمشید کریم پر برہم ہو رہا تھا کہ ... بے پروائی اور غلط فیصلوں کی وجہ سے وہ فرم بند ہوئی تھی ... تشکیل نہیں ہوئی تھی جس کی وجہ سے ... ہوئی تھی، وہ ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے اور ... لوگوں کی نظر میں بلکہ کچھ حکومتی اداروں کی نظر میں ... اور یہ بات سب کے حق میں خطرناک تھی۔

جمشید کریم یہ وضاحت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ... بند ہونے میں اس کا کوئی خاص قصور نہیں تھا بلکہ ... بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں جن میں سے ... شپ تھی۔ پھر کمپنی کے میجر پارٹنر پرنس سعید کا انتقال ہو گیا ... اس کی وراثت کچھ عجیب و غریب سے انداز میں اس کی ... بیٹیوں کو منتقل ہو گئی تھی۔ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن ... کی جگہ پرنسس سیرا میجر پارٹنر ہو گئی تھی لیکن قانون ... اس کے پاس ابھی اختیارات نہیں تھے۔ اس کے علاوہ ... مسائل بھی تھے۔ کمپنی کے کچھ راز بھی باہر چلے گئے ... کلائنٹس سے وعدہ خلافی کے بعد ہی نہیں بلکہ اس سے پہلے ... وفاقی تحقیقاتی ادارہ کمپنی کے پیچھے لگ چکا تھا۔

اس طرح گویا بہت سے مسائل، بہت سی الجھنیں ... تھیں۔ معاملات کچھ زیادہ ہی الجھ گئے تھے۔ کمپنی کو بند کرنا ... تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود کمپنی کی یہ بندش بہرحال عارضی ... اور جمشید کریم کا ارادہ یہی تھا کہ ان مسائل پر قابو پا لیے ... دوبارہ کھولنے کی کوشش کی جائے گی۔ فی الحال تو پرنس ... قتل کی وجہ سے معاملات اور الجھ گئے تھے۔ جمشید کریم کا ... کہ اگر پرنسس کی پارٹنرشپ کا کانٹا نکل گیا تو کمپنی ... آسان ہو جائے گا۔

اس کے علاوہ جمشید کریم نے اس نامعلوم شخص کو ... بھی پوری پوری کوشش کی تھی کہ آخر وہ بھی تو کمپنی کی ...

... وہ اٹھا رہا تھا لیکن بحران کے دنوں میں اس نے پلٹ کر بھی کمپنی یا جمشید کریم کی خبر نہیں لی تھی لیکن اب ... تھی تو برہم ہونے کے لیے آ گیا تھا۔ اس پر اس ... نے مزید برہمی سے کہا کہ وہ ان دنوں یورپ ملک ... میں پھنسا ہوا تھا، یہ جمشید کریم کا فرض تھا کہ وہ ... خواہ کسی بھی ملک میں ہوتا لیکن جمشید اسے تمام تر ... رکھتا۔ آخر دنیا میں یہ جو جدید ترین وسائل اور رابطے ... ایجاد ہو چکے تھے یہ کس لیے تھے؟

... زبان کا مجھے علم نہیں تھا اور پھر زبان بھی جس حال اتنی ... سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اس لیے میں لفظ بہ لفظ تو ... نہیں سمجھ سکا لیکن خلاصہ بہرحال یہی تھا اور انداز وہی ... کسی قسم کی مصیبت میں پھنس جانے کے بعد ایک ... الزام تراشی کرنے والوں کا ہوتا ہے۔ عام طور پر اس ... میں کوئی ایک فریق دوسرے کی بات نہیں مانتا اور اپنی ... پر اڑا رہتا ہے۔

... جتنا کچھ سن چکا تھا میرے لیے وہ بھی بہت تھا اور سب سے زیادہ مجھے اس بات نے چونکایا تھا کہ ایک وفاقی ... کسی وجہ سے امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے ... ایف آئی اے کو بھلا ایک عام کاروباری ادارے ... کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ میں نے خوش گمانی کے ... کہ ایف آئی اے چونکہ مالی معاملات اور بدعنوانیوں ... میں بھی تحقیقات کرتی تھی اور ٹیکس چوری بھی اسی ... آتی تھی جب کہ اکثر پرائیوٹ ادارے سرکاری ... ٹیکس ڈیپارٹمنٹ والوں کی ملی بھگت سے ٹیکس بچاتے ... رہتے تھے اس لیے ان میں سے بعض کے پیچھے ایف ... آئی اے لگ جاتی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش ... کہ اس سے زیادہ غیر معمولی یا چونکا دینے والی بات نہ ہو ... سکتی۔ بہرحال اپنے ذہن کے خاص خانے میں نوٹ ...

... کا سیکریٹری کمال جو اپنے باس کو ذرا جلدی مجھ سے ... کرنے کے لیے اندر گیا تھا اس کی آواز مجھے سرے ... سے نہیں آئی تھی۔ اس نے یقیناً اندر جانے کے بعد ایک ... تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ... دبک کر رہ گیا تھا اور جب تک اندر اس کے باس ... شخص کے ساتھ بحث و تمحیص جاری تھی تب تک ... اور فرض شناس باڈی گارڈ کے طور پر اپنے باس کے ... رہنا چاہتا تھا۔ درحقیقت وہ باڈی گارڈ ہی تھا۔ آج ... بعض لوگوں کے باڈی گارڈ بڑے شائستہ، خلیق اور ... دیتے تھے لیکن وہ روایتی قسم کے اور خونخوار نظر ... باڈی گارڈز سے زیادہ خطرناک ہوتے تھے۔ اکثر ...

اوقات وہ اپنے آپ کو سیکریٹری کہہ کر متعارف کراتے تھے۔

مجھے کمال کے اس کمرے سے جلد برآمد ہونے کی توقع نہیں تھی لیکن میں نے سوچا کہ احتیاطاً اب مجھے اسی میز پر جا بیٹھنا چاہیے جہاں وہ مجھے بٹھا گیا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ کسی وجہ سے وہ اچانک کمرے سے برآمد ہونے کا فیصلہ کر لیتا اور یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی کہ وہ رکوع کی سی حالت میں مجھے دروازے سے کان لگائے دیکھتا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں وہاں سے ہٹنے کے لیے سیدھا ہونے ہی لگا تھا کہ کسی اچھے کلون کی خوشگوار مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی اور گردن گھما کر دیکھے بغیر ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی میرے قریب آ کر دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا تھا۔

میں نے اپنے فطری ردعمل پر قابو رکھتے ہوئے فوراً گردن گھما کر اس طرف نہیں دیکھا۔ میں منتظر رہا کہ شاید کسی گن کی نال بھی میری پسلیوں سے آن لگے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اندر بحث و تکرار بدستور جاری تھی لیکن اب اس طرف سے میرا دھیان ہٹ چکا تھا۔ ویسے بھی مجھے گفتگو کی نوعیت کا اندازہ تو ہو چکا تھا اور میرے خیال میں اتنا ہی کافی تھا۔

میں نے نہایت آہستگی سے گردن گھما کر دیکھا اور قدرے خوشگوار سی ایک حیرت نے میرا استقبال کیا۔ وہ ایک سرو قد اسمارٹ لڑکی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی ریوالور یا پستول وغیرہ نہیں تھا۔ لڑکی کی رنگت گندمی اور نین نقش تیکھے تھے۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو خوبصورت نہ ہوتے ہوئے بھی خوبصورت اور پُرکشش نظر آتی ہیں۔ لباس اور میک اپ نہایت سلیقے کا تھا۔ پہلی نظر میں اس پر کوئی ماڈل ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ وہ نفرت بھری، شک زدہ یا کڑی نظروں سے میری طرف دیکھنے کے بجائے قدرے شرارت آمیز سے انداز میں دیکھ رہی تھی حالانکہ اس کا تعلق یقیناً اسی دفتر سے تھا۔ اس حوالے سے تو اسے مجھ پر برہم ہونا چاہیے تھا، مجھے مشکوک سمجھنا چاہیے تھا بلکہ اگر وہ اچانک شور مچا دیتی تو مجھے اس پر بھی حیرت نہیں ہونی چاہیے تھی لیکن وہ اس کے بجائے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ سرگوشی میں بولی "بُری بات ہے۔ کھوجی پڑوسنوں کی طرح یوں کسی کی کن سوئیاں نہیں لیتے۔"

شخصیت کے اعتبار سے وہ مجھے اچھی خاصی مغرب زدہ دکھائی دی تھی اور میرا خیال تھا کہ وہ انگریزی میں مجھ سے ہم کلام ہو گی لیکن اس نے بامحاورہ اردو بول کے مجھے حیرت کا دوسرا ہلکا سا جھٹکا لگایا تھا۔ فوری طور پر مجھے اندازہ نہیں ہوا کہ وہ کہاں سے برآمد ہوئی تھی۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا "تم کہاں تھیں؟"

"کم از کم وہاں نہیں تھی جہاں سے مجھے خود اپنی بھی کوئی خبر نہ آتی" اس نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔ تاہم اس وقت تک میری سمجھ میں آ چکا تھا کہ وہ کہاں سے آئی ہو گی۔ ایک گوشے سے ...

کشادہ نہیں تھی' دوسرے کلر اسکیم کچھ ایسی تھی کہ سرسری نظر میں اس کی موجودگی کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ میرے اسے نظر سے مزید اوجھل رکھنے کے لیے اس کے قریب ایک خوبصورت سی چوبی اسکرین کھڑی کی گئی تھی۔ ممکن تھا کہ اس طرف کوئی ریسٹ روم وغیرہ بنا ہو جسے پرانے رواج کے مطابق باتھ روم یا واش روم بھی کہا جاسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ راہداری دفتر کے اس حصے کو کسی اور حصے سے ملاتی ہو کیونکہ میرے اندازے کے مطابق اس میں گراؤنڈ فلور پر بھی مزید کمرے ہونے چاہئیں تھے۔

وہ گویا اس راہداری کی طرف سے میری توجہ ہٹانے کے لیے جلدی سے بولی "میں اس الماری میں تھی۔" اس نے ایک خوبصورت دیوار گیر الماری کی طرف اشارہ کیا جو غالباً فائلنگ کیبنٹ کا کام دیتی تھی۔

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے سرگوشی میں کہا "تم بھلا اس میں کیسے ہوسکتی تھیں؟ تم کوئی خشک سی دفتری فائل ہو؟ تم تو کسی خوبصورت سے شاعر کا خوبصورت سا دیوان ہو۔"

وہ بے آواز طریقے سے ہنسی۔ بے آواز ہونے کے باوجود یہ ہنسی خوبصورت تھی۔ اس کے دانت خوبصورت ہموار اور موتیوں کی طرح جھلملاتے ہوئے تھے۔ آواز کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ تصویر ہی دیدہ زیب تھی۔

"میں دیوان نہیں۔۔۔ صرف غزل ہوں" وہ سرگوشی میں بولی۔

"اگر تم غزل ہو تو یقیناً کوئی ایسی ہی غزل ہو جسے مشاعروں میں سُنا کر شاعر مشاعرہ لوٹ لیا کرتے ہیں" میں نے فوراً کہا۔

"میں غزل ضرور ہوں لیکن مجھے مشاعروں میں سنایا نہیں جاسکتا" وہ مسکراتے ہوئے بولی "کیونکہ میرا صرف نام غزل ہے۔"

"کیا واقعی؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

وہ گویا میرے لہجے کی بے یقینی کو محسوس کرتے ہوئے بولی "اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے؟"

"نہیں۔۔۔ بے یقینی والی تو کوئی بات نہیں۔۔۔ بس ویسے ہی ذرا حیرت ہورہی تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "خیر۔۔۔ یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اگر تمہیں پڑھا نہیں جاسکتا تو صرف ساتھ لے جاکر بھی مشاعرہ لوٹا جاسکتا ہے۔۔۔ بلکہ تم تو اگر کسی شاعر کے ساتھ جانے کی ہامی بھرو تو وہ خود لٹنے کو تیار ہو جائے۔"

اچانک اس کے تاثرات کچھ بدل گئے اور وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے سنجیدگی سے بولی "بس۔۔۔ مکھن بہت لگ چکا۔۔۔ اب آپ سیدھی طرح ذرا اصل بات بتائیں۔ کمال جب آپ کو وہاں دوسرے کمرے میں بٹھا کر گیا تھا تو آپ آرام سے وہاں بیٹھنے کے بجائے اس کے پیچھے پیچھے ہی یوں جاسوسوں کی طرح کان لگا کر باتیں سننے کیوں پہنچ گئے؟ کس چکر میں ہیں آپ؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے نظر نہیں چرائی۔ لڑکی۔۔۔ باحوصلہ معلوم ہوتی تھی اور اس وقت اپنے سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے بڑی سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ [illegible] بتا کر مجھے مزید حیران کردیا کہ اسے یہ بھی معلوم تھا [illegible] دوسرے کمرے میں بٹھا کر گیا تھا حالانکہ مجھے کہیں اس کی [illegible] کا احساس نہیں ہوا تھا۔ نہ جانے وہ کہاں سے [illegible]

مجھے خاموش دیکھ کر وہ ذرا اور سخت لہجے میں [illegible] میرے سوال کا جواب کیوں نہیں دے رہے؟ کیا میں [illegible] اور کمال کو بلا کر بتاؤں کہ آپ کیا کررہے تھے؟"

اگر اسے یہ توقع تھی کہ میں اس کی دھمکی سن کر [illegible] تو میں نے اس کی یہ توقع پوری نہیں ہونے دی اور [illegible] لے کر مسکراتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا "آپ [illegible] اگر تمہیں چیخ پکار کرنی ہوتی تو پہلے ہی کرچکی ہوتیں۔ [illegible] سے پیچھے سے آکر مہربان لہجے میں گفتگو کا آغاز نہ کرتیں [illegible] اگر تمہارا نام واقعی غزل ہے تو تمہیں چیخ پکار جیسی [illegible] حرکتیں ہرگز زیب نہیں دیں گی۔"

تب کچھ یوں لگا جیسے کسی شریر بچے نے کسی [illegible] سنجیدہ بننے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنی اس کوشش کو [illegible] زیادہ جاری نہ رکھ سکا۔ سنجیدگی کی برف اس کے چہرے [illegible] پگھل گئی۔ مسکراہٹ کی کرنیں نمودار ہوئیں [illegible] معصوم گردن جیسے لہجے میں بولی "بہت چالاک ہیں آپ!"

"دنیا میں تھوڑے بہت دھکے' تھوڑی بہت ٹھوکریں [illegible] ہیں۔ ٹھوکریں اور دھکے انسان کو کچھ نہ کچھ تو سکھا ہی [illegible] میں نے دوسرے کمرے میں نظر آنے والی میز کی طرف [illegible] "میرا خیال ہے میں وہیں چل کر بیٹھ جاؤں جہاں کمال [illegible] تھا۔ وہاں ایک فاضل کرسی بھی موجود ہے۔ اگر تم [illegible] چل کر اس پر بیٹھ جاؤ۔ وہاں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ اگر [illegible] اچانک نکل آیا تو ہمیں یہاں کھڑے کھسر پھسر کرتے [illegible] دونوں ہی کے بارے میں شک میں مبتلا ہوگا۔ مجھے اپنی [illegible] پروا نہیں ہے لیکن کہیں تمہارے حق میں یہ بات [illegible] ہو۔"

"ہاں۔۔۔ بُری ثابت ہو تو سکتی ہے۔۔۔ لیکن میں [illegible] دیر سے بے فکری سے یہاں کھڑی تمہارے ساتھ [illegible] ہوں کہ مجھے معلوم ہے اب کمال اس وقت تک کمرے [illegible] نکلے گا جب تک جمشید صاحب کا ملاقاتی رخصت نہیں [illegible] ۔۔۔ اور جب وہ رخصت ہونے لگے گا تو ہمیں پتا چل [illegible] لیکن پھر بھی آپ کی تجویز بہرحال مناسب ہے [illegible] بیٹھتے ہیں۔ کمال آئے گا تو یہی سمجھے گا کہ اس کی عدم [illegible] میں نے آپ پر نظر رکھی ہوئی تھی۔"

میں واپس اس میز پر اس طرح جا بیٹھا جیسے [illegible] کام کرتا تھا اور وہ یوں میرے سامنے وزیٹرز چیئر پر [illegible] ملاقاتی تھی' کسی کام سے دفتر آئی ہوئی تھی۔

"تم اس دفتر میں کام کرتی ہو؟" میں نے تصدیق کرلینا بہتر [illegible]

"ظاہر ہے" وہ شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"کیا کام کرتی ہو؟"

"آپ میرا انٹرویو لے رہے ہیں؟" اس نے تیکھی نظر سے [illegible] طرف دیکھا۔

"یہی سمجھ لو" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آپ باہر سے آکر ہمارا [illegible] لینا شروع کردیں۔ دفتروں میں تو لوگ خود انٹرویو دینے آتے [illegible]" وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی خفیف سی مسکراہٹ [illegible] رہی تھی۔

"یہ کوئی ضروری نہیں ہے" میں نے کہا "دفتر کے باہر سے [illegible] انٹرویو لینے بھی آسکتے ہیں۔ کسی اخبار یا رسالے کا نمائندہ [illegible] ہے۔۔۔ اور آج کل تو پرائیویٹ چینل کے لیے پروگرام تیار [illegible] کرنے والے بھی کیمرے لیے کبھی کبھار کسی بھی جگہ نظر آجاتے [illegible] ان میں سے کوئی آسکتا ہے۔"

"میں آپ کو کیا سمجھوں؟" اس نے فوراً سوال کیا۔

"تم مجھے میرے ذاتی سینہ گزٹ کا نمائندہ سمجھ سکتی ہو" میں [illegible] جواب دیا پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "اب تو [illegible] سوال کا جواب دے دو۔"

"سوال کیا تھا؟" وہ مصنوعی معصومیت سے بولی۔

"یہی کہ تم اس دفتر میں کیا کرتی ہو؟" میں نے سوال دہرایا۔

"میں جمشید صاحب کی سیکریٹری ہوں" اس نے گویا کسی فیصلے [illegible] پہنچتے ہوئے گہری سانس لے کر جواب دیا۔ وہ فیصلہ غالباً یہی تھا کہ [illegible] سوال کا جواب دے ہی دیا جائے' اس میں کوئی حرج نہیں [illegible]

"کمال نے بھی کہا تھا کہ وہ جمشید صاحب کا سیکریٹری ہے۔ [illegible] جمشید صاحب کے کتنے سیکریٹری ہیں؟ کیا وہ ہر صنف میں سے [illegible] سیکریٹری رکھنے کے قائل ہیں؟"

[illegible] دھیرے سے ہنسی "اتنے امیر آدمی کے دو سیکریٹری کچھ زیادہ [illegible] ویسے اصل سیکریٹری تو میں ہی ہوں۔ کمال صاحب ذرا [illegible] طرح کے سیکریٹری ہیں۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا "مجھے پہلے ہی اندازہ ہوگیا [illegible]" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "جب میں جمشید [illegible] کے کمرے کے دروازے سے کان لگا کر باتیں سننے کی [illegible] کوشش کررہا تھا تو تم نے مجھے ڈانٹنے ڈپٹنے یا سخت رویہ اختیار کرنے [illegible] کمال کو بلانے کے بجائے دوستانہ رویہ کیوں اختیار کیا جب کہ [illegible] تمہارے لیے اجنبی ہوں؟ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا [illegible] مجھے اس کی صحیح وجہ بتادو۔"

"وجہ بہت معمولی سی ہے۔۔۔" وہ اب شستہ انگریزی میں

روانی سے بولی "میری اس دفتر میں دلچسپی تقریباً ختم ہو گئی ہے۔ یہ تو شاید اتنا اہم معاملہ نہیں تھا۔ میں تو اب کسی اہم معاملے میں بھی ٹانگ اڑانے کی کوشش نہیں کرتی۔"

"لیکن میرا مسئلہ حل ہو گیا لگتا ہے۔ کیا میں اس کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟" میں نے بھی جوابی سوال کر اگھر جی پر ہی آتے ہوئے کہا۔

"میں فی الحال آپ کو نہیں بتا سکتی۔ اس کے پیچھے ایک لمبی کہانی ہے" اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

وجہ جو بھی ہوتی وہ شاید میرے لیے اتنی اہم نہیں تھی۔ میرے لیے تو صرف اس کا رویہ اہم تھا اور وہ میرے لیے امداد ہی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے سوچا اس امداد ہی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی معلومات میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "تم کہاں سے دیکھ رہی تھیں کہ کمال نے مجھے یہاں شکار کیا تھا؟"

"میں دیکھ نہیں رہی تھی، صرف سن رہی تھی" اس نے جواب دیا "تو میرے کمرے میں تم نے میرے ہی ساتھ ایک کمپیوٹر دیکھا ہوگا۔ میں اس میں کھڑی تھی اور آپ لوگوں کی باتیں سن رہی تھی۔ ان سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ یہاں کیا ہو رہا تھا۔"

"اس دفتر میں اتنی ویرانی کیوں نظر آ رہی ہے؟" یہ جاننے کا تجسس مجھے کافی دیر سے تھا۔

"اس دفتر میں ویسے بھی زیادہ لوگ کام نہیں کرتے۔ کل تیرہ افراد ہیں جن میں سے دس آج چھٹی پر ہیں۔ سالانہ کیے گئے کہ فی الحال انہیں چھٹی پر بھیج دیا گیا ہے" اس نے جواب دیا۔

میرے کان کھڑے ہوئے۔ اس دفتر میں بھی شاید کچھ الٹ پھیر جاری تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے دفتر کی طرح یہ بھی بند ہونے والا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس لڑکی غزل کو بھی فارغ کیا جانے والا ہو۔ شاید اسی لیے اس نے یہ بات کی تھی کہ اس دفتر میں اس کی دلچسپی تقریباً ختم ہو چکی تھی اور شاید اسی لیے وہ اس وقت بھی کچھ فارغ فارغ سی نظر آ رہی تھی ورنہ جمشید کی سیکریٹری کی حیثیت سے اس وقت اسے اس کے آس پاس کہیں موجود ہونا چاہیے تھا یا اس کے کمرے سے متصل کسی جگہ باقاعدہ قسم کی سیٹ پر ہونا چاہیے تھا۔ اگر اس کا اس دفتر سے تعلق ٹوٹنے والا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ اس دفتر یا جمشید کے ساتھ اس کی وفاداری بھی متزلزل ہو رہی تھی تو وہ میرے لیے کارآمد بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس کے پاس اس دفتر کے اہم راز ہوں لیکن پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ جن لوگوں کے پاس کسی دفتر یا ادارے کے اہم راز ہوتے تھے عموماً انہیں ناراض کر کے وہاں سے سبکدوش نہیں کیا جاتا تھا اور مجھے اس لڑکی کے رویے میں کہیں خفیف سی ناراضگی پنہاں محسوس ہو رہی تھی۔

میں نے پوچھ لینا ہی بہتر سمجھا "کیا یہ دفتر بھی امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کی طرح بند ہو رہا ہے؟"

وہ دھیرے سے ہنسی "اچھا... تو آپ کو اس دفتر کے بند ہونے کا پتا ہے۔"

"میں جمشید صاحب سے جس مسئلے پر بات کرنے آیا ہوں اس کا تعلق اسی کمپنی سے ہے" میں نے کہا "میرے دوست کا مسئلہ ہے۔"

"اس سے پہلے آپ کبھی یہاں نہیں آئے۔ میں پہلی بار آپ کو دیکھ رہی ہوں۔" وہ وثوق سے بولی۔ اسے گویا اپنی یادداشت پر بہت اعتماد تھا۔

"میں تو کبھی امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے دفتر بھی نہیں گیا" میں نے بتایا "اور اگر یہ دوست کا مسئلہ نہ آن پڑا ہوتا تو مجھے یہاں بھی آنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ اس سے پہلے میں نے جمشید صاحب کا نام بھی نہیں سنا تھا۔"

"بہر حال یہ دفتر بند نہیں ہو رہا..." وہ میرے سوال کی طرف آتے ہوئے بولی "صرف اس کا سیٹ اپ کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے اس میں کچھ لوگوں کا اضافہ ہو جائے۔"

"اوہ..." میں نے گویا اطمینان کی سانس لی "میں تو سمجھا جو موجود ہیں شاید ان کا بھی صفایا ہونے والا ہے۔"

"ممکن ہے ان میں سے کچھ کا صفایا بھی ہو جائے" وہ مبہم مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"کیا ان میں تم بھی شامل ہو؟" میں نے یہ بھی پوچھ ہی لیا۔

"نہیں" اس نے میری غلط فہمی دور کر دی۔

میں نے گویا اطمینان کی سانس لی پھر پوچھا "اندر جمشید صاحب کے پاس کون ہے جس کے ساتھ وہ چیخ پکار میں مصروف ہیں؟"

"یہ چیخ پکار نہیں" کاروباری مسائل پر تبادلۂ خیال کر رہے ہیں" اس نے تصحیح کی "جمشید صاحب کے ساتھ اندر جو صاحب موجود ہیں ان کا نام جمال سعیدی ہے۔ ان کے ساتھ جمشید صاحب کا جب بھی کاروباری مسائل پر تبادلۂ خیال ہوتا ہے تو بات دھیمے سُروں میں شروع ہوتی ہے لیکن رفتہ رفتہ عموماً یہی نوبت آ جاتی ہے۔"

"اچھا... تو یہ جمال سعیدی صاحب ہیں!" میں نے سر ہلایا۔ میں اس اتفاق پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ جمال سعیدی بھی اسی دفتر میں موجود تھا۔ میں اگر یہاں اس سے بات چیت نہ کر سکتا تھا تو کم از کم اس کے درشن تو کر سکتا تھا۔ جمشید اور جمال دونوں سے میرا ایک ہی چھت تلے سامنا ہونے والا تھا۔

"لگتا ہے آپ جمال سعیدی صاحب کو جانتے ہیں" غزل بولی۔

"مجھے ان سے شناسائی کا شرف حاصل نہیں" میں نے لاپروائی سے جواب

دیا "میں نے تو ان کی صورت بھی نہیں دیکھی۔ میں انہیں صرف غائبانہ ہی جانتا ہوں۔ ویسے... شاید مجھے کسی وقت ان سے بھی ملاقات کرنی پڑے گی۔ جمشید صاحب سے ان کا کیا تعلق ہے؟"

"کاروباری تعلق ہے" غزل نے بلا تامل جواب دیا پھر اپنی مخروطی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر دکھاتے ہوئے بولی "ان کے کاروباری معاملات یوں ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے غیر رسمی پارٹنر ہیں۔ میرا مطلب ہے کاغذات پر کوئی معاہدہ نہیں ہے لیکن ان میں قربت اور تعاون باضابطہ قسم کے پارٹنرز سے زیادہ ہے۔"

"بہت خوب" میں نے سر ہلایا۔

ایک لمحے خاموشی رہی گو کہ مجھے احساس تھا اس دوران بھی جمشید کے کمرے میں بحث و تکرار جاری تھی۔ غزل بھی گویا اسی بحث و تکرار کے بارے میں سوچتے ہوئے بولی "میرے خیال میں تو یہ بھی ان کی محبت کا ایک انداز ہے۔ کاروباری مسائل پر ان کے درمیان اکثر اسی طرح بحث و تکرار ہو جاتی ہے جو کبھی کبھی گھنٹوں جاری رہتی ہے لیکن ان کی قربت اور تعاون میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

ذرا توقف کے بعد وہ بولی "دیکھیے... آپ نہ تو اخباری رپورٹر ہیں اور نہ ہی ٹی وی رپورٹر... اس کے باوجود میں نے آپ کو کتنا طویل اور معلوماتی انٹرویو دیا ہے۔ اب آپ بھی تو میری معلومات میں کچھ اضافہ کریں۔ آخر آپ ہیں کون؟"

میں نے اپنا بزنس کارڈ اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے کارڈ پڑھا اور اس کی غزالی آنکھیں کچھ پھیل گئیں "آپ چوہدری گروپ آف کمپنیز اور اس فائیو اسٹار ہوٹل وغیرہ کے مالک ہیں؟" اس نے کارڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا۔

"اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں بالکل اسی طرح حیران ہو رہی ہوں جس طرح آپ یہ جان کر حیران ہوئے تھے کہ میرا نام غزل ہے۔ حالانکہ اس میں بھی حیرت کی کوئی بات نہیں تھی" وہ بھی جواباً مسکراتے ہوئے بولی پھر اس نے گویا اپنی حیرت کی وضاحت کی "دراصل میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح... ان حالات میں آپ سے ملاقات ہوگی۔ میں بہرحال چند سال سے بزنس کمیونٹی میں ہی کام کر رہی ہوں۔ کاروباری اور تاجر طبقے کے بارے میں میری بھی تھوڑی بہت معلومات ہیں۔ آپ کا نام میرے لیے اجنبی نہیں تھا۔"

"جب خوبصورت اور باذوق لڑکیاں ہم جیسے بے ہودہ کاروباری لوگوں کو غائبانہ جاننے لگیں تو ہمیں اپنی خوش قسمتی پر رشک کرنا چاہیے" میں نے کہا۔

"بس... بس... اب آپ زیادہ انکساری نہ دکھائیں" وہ اترا اٹھاتے ہوئے بولی "میں یہ کہنے لگی تھی کہ مجھے گمان تک نہیں تھا آپ سے اسی دفتر میں اس طرح ملاقات ہوگی۔"

"یقیناً آپ کو امید نہیں تھی کہ ایک روز جو شخص آپ کو اپنے باس کے کمرے کے دروازے پر چوروں کی طرح جھکا، دروازے سے کان لگائے ملے گا وہ افضل چوہدری ہوگا" میں نے کہا۔

"ہاں" وہ دھیرے سے ہنسی "آپ کو یہ سُوجھی کیا تھی؟"

"بس... میں نے کچھ عجیب کھوجی سی طبیعت پائی ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایک تو اس طبیعت کے ہاتھوں مجبور ہو کر یہ حرکت کر رہا تھا۔ دوسرے میں اس فکر میں تھا کہ شاید اس طرح سن گن لینے سے مجھے کوئی ایسی بات معلوم ہو جائے جو میرے دوست کی مدد کے سلسلے میں میرے کچھ کام آ سکے۔"

"اگر کسی اچھی سی لڑکی سے آپ کی دوستی ہو جائے تو کیا اس کے سلسلے میں بھی آپ کی طبیعت اسی طرح کھوجی رہتی ہے؟" اس نے شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں۔ اس صورت میں معاملہ عموماً الٹا ہو جاتا ہے" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس کی شوخ مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ کارڈ اٹھا کر اس نے اپنے پتلے سے، نوٹ بک نما پرس میں رکھ لیا اور بولی "یہ میرے پاس محفوظ رہے گا۔ شاید مستقبل میں کبھی آپ سے رابطہ کرنے کی ضرورت پیش آ جائے۔"

"خدا کرے وہ دن جلدی آئے" میں نے دعا کے انداز میں دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "مجھ سے رابطہ دنیا کا آسان ترین کام ہے۔ اس کے لیے آپ کو صرف میرا فون نمبر ملانا ہوگا۔ میں خود سر کے بل ڈرائیو کرتا ہوا آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہوگا۔ میں نے آج تک کسی کو سر کے بل ڈرائیو کرتے ہوئے نہیں دیکھا" وہ بولی۔

"یہ تو میں نے محاورہ بولا ہے۔ جدید دور میں محاوروں میں کچھ تبدیلیاں آ گئی ہیں نا" میں نے کہا۔

وہ ایک لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سنجیدگی سے بولی "افضل صاحب! کیا آپ سچ مچ اتنے ہی فلرٹ ہیں جتنے نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں؟"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں فلرٹ ہوں؟" میں نے گویا بُرا مناتے ہوئے کہا "میں نہ تو فلرٹ ہوں اور نہ ہی نظر آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ میں تو صرف اعلیٰ اخلاق، منکساری اور دوسروں کی قدردانی کی معمولی سی مثال قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اچھا... آپ کہتے ہیں تو مان لیتی ہوں" وہ طویل سانس لے کر بولی۔

دفعتاً جمشید کے کمرے کا دروازہ کھلا اور گویا کسی ٹی وی یا ریڈیو کا والیوم اچانک مکمل کھل گیا لیکن والیوم زیادہ نہیں تھا۔ دو افراد کمرے سے برآمد ہوئے۔ وہ اب کافی حد تک نارمل آوازوں میں باتیں

کررہے تھے۔ میں نے آوازوں سے پہچانا کہ ان میں سے کون جمشید کریم ہو سکتا تھا اور کون جمال سعیدی۔

جمشید کریم کی شخصیت کافی حد تک اپنے باڈی گارڈ نما سیکریٹری سے ملتی جلتی تھی جو ان دونوں کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے برآمد ہوا تھا۔ زیادہ نمایاں فرق یہ تھا کہ جمشید ادھیڑ عمر تھا اور جسمانی طور پر اپنے سیکریٹری کی طرح مضبوط اور سخت جان دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ویسے رنگت اس کی بھی سرخ و سفید تھی۔ اس کے چہرے پر بھی مختصری داڑھی تھی اور وہ بھی تھری پیس سوٹ میں تھا۔ ظاہری طور پر وہ اعلیٰ درجے کا ایک بزنس مین ہی دکھائی دیتا تھا لیکن جب وہ جمال سعیدی سے باتیں کرتا ہوا اس کمرے میں پہنچا جہاں میں اور غزل بیٹھے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھیں ایک بزنس مین کی آنکھیں نہیں تھیں۔ کسی بھی بزنس مین میں وہ تمام اچھائیاں اور برائیاں ہو سکتی ہیں جو کسی بھی عام آدمی میں ہوتی ہیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ جمشید کریم کی آنکھوں میں کوئی ایسی بات تھی جو کسی بزنس مین کی آنکھوں میں نہیں ہو سکتی تھی۔

جمال سعیدی گویا ہاتھی کا بچہ تھا۔ اس کا قد کچھ ایسا خاص نہیں تھا۔ موٹا ہونے کی وجہ سے قد کچھ اور بھی کم لگ رہا تھا۔ چلتے وقت یوں تو اس کا پورا جسم ہی تھل تھل کرتا محسوس ہوتا تھا لیکن توند تو گویا جیلی کا پہاڑ تھی۔ ہر جنبشِ قدم پر تھرتھرا رہی تھی۔ اس کی چندیا روشنی میں چمک رہی تھی تاہم اس کے گرد گولائی میں بھورے اور سفید، ملائم سے دکھائی دینے والے بالوں کی جھالر لہرا رہی تھی۔ وہ گورا چٹا کلین شیو شخص تھا جس کے مرطوب سے ہونٹ غیر معمولی طور پر سرخ تھے۔ وہ بھی سوٹ میں تھا لیکن اس نے ٹائی لگانے کی زحمت نہیں کی تھی اور یہ شاید اپنے حق میں اچھا ہی کیا تھا۔ اس کی ہاتھی جیسی گردن پر ٹائی کا استعمال شاید کچھ اچھا تجربہ محسوس نہیں ہوتا ہوگا۔

غزل انہیں دیکھ کر مؤدبانہ انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے اٹھنے کی زحمت نہیں کی۔ ان دونوں نے قریب سے گزرتے وقت گہری اور متجسس نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ کمال نے سرد سی نگاہوں سے میری طرف دیکھا لیکن تینوں میں سے کوئی ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ جمشید اپنے مہمان کو کمرے کے دروازے تک چھوڑنے گیا جو ریسپشن میں کھلتا تھا۔

دروازہ کمال نے آگے بڑھ کر کھولا۔ اس کا دوسرا ہاتھ اپنی کلاشنکوف پر تھا۔ اس وقت جمشید نے جمال سعیدی کا موٹا سا کندھا تھپکتے ہوئے انگریزی میں کہا "زیادہ پریشان مت ہوا کرو میرے بوڑھے بچے! میں سب کچھ ٹھیک کرلوں گا۔ تم یہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو۔"

جمال سعیدی نے ہانپنے کے سے انداز میں ہنکارا بھرا اور خفگی آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر بولا "اگر تم اس قابل ہوتے تو معاملات اتنا الجھتے ہی کیوں؟" اب اس نے بھی انگریزی میں ہی بات کی تھی۔

پھر وہ رخصت ہو گیا۔ جمشید اسے چھوڑنے اس سے آگے نہیں گیا۔ کمال نے دروازہ بند کر دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر خفیف سی حیرت ہوئی تھی کہ جمال سعیدی کے ساتھ کوئی گن مین یا گارڈ وغیرہ نہیں تھا حالانکہ اپنے تمام تر بے ضرر سے سراپا کے باوجود وہ شفیع شاہ کی رپورٹ کی روشنی میں جمشید سے بھی زیادہ پہنچی ہوئی چیز معلوم ہوتا تھا اور اس قسم کے لوگ خاص طور پر آج کل بغیر گارڈز وغیرہ کے ملتے بھی نہیں تھے۔ پھر میں نے سوچا شاید جمال سعیدی نے اپنے گارڈز کو اندر لانے کی ضرورت محسوس نہ کی ہو اور انہیں باہر کہیں گاڑی وغیرہ میں ہی چھوڑ آیا ہو۔ اپنے غیر رسمی پارٹنر کے دفتر میں تو وہ اپنے آپ کو محفوظ ہی محسوس کرتا ہوگا۔

جمشید اور کمال دروازے سے واپس آتے ہوئے میز کے قریب رُکے۔ جمشید نے بھویں اچکاتے ہوئے غزل کی طرف دیکھا تو وہ نپی تلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میں کوشش کر رہی تھی کہ آپ کے مہمان کو انتظار کی گھڑیاں زیادہ طویل محسوس نہ ہوں۔"

"تھینک یو" جمشید خشک لہجے میں بولا پھر اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ غزل گویا اس کے مبہم سے اشارے کا مطلب سمجھتے ہوئے وہاں سے رخصت ہو گئی۔

جمشید نے اب میری طرف دیکھا اور مشینی سے انداز میں اس کے ہونٹوں پر رسمی مسکراہٹ آگئی "مسٹر افضل چوہدری۔۔۔؟" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے تصدیق چاہی۔ اس کا مطلب تھا کہ کمال نے اندر جا کر اسے کم از کم میری آمد سے تو مطلع کر ہی دیا تھا اور میرا نام بھی بتا دیا تھا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی صحت کچھ ایسی بُری نہیں تھی لیکن اس کا ہاتھ کسی مردہ چوہے کی طرح تھا۔ اس کی اصل قوت گویا اس کی آنکھوں میں۔۔۔ یا پھر شاید آنکھوں سے بھی بہت دور کہیں پوشیدہ تھی۔ آنکھوں میں صرف اس کا عکس جھلک رہا تھا۔ میں نے پلک جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اور آپ غالباً جمشید کریم ہیں؟"

"غالباً نہیں۔۔۔ میں یقیناً جمشید کریم ہوں" وہ نہایت درست تلفظ کے ساتھ اردو میں بولا۔ اس کی شخصیت بظاہر عام سی لیکن آواز بہت خاص تھی۔ اس میں ایک عجیب سا بھاری پن، گونج اور حاکمیت تھی۔ یہ ایک نہایت پُراعتماد شخص کی آواز تھی جسے اپنی کسی نامعلوم طاقت کا احساس تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آپ کا نام میرے لیے نامانوس نہیں ہے۔ معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ دراصل میں ایک بہت ہی بے ہودہ شخص کے ساتھ الجھا ہوا تھا جسے آپ نے رخصت ہوتے ہوئے دیکھ ہی لیا ہوگا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے ٹھکانے لگانے کے بعد آپ سے ملاقات کی جائے۔ مجھے امید ہے کہ میری خوش ادا اور خوش اطوار سیکریٹری نے آپ کو بوریت کا احساس نہیں ہونے دیا ہوگا۔ اسے گفتگو کا سلیقہ ہے۔"

"بے شک" میں نے اس کی تائید کی۔

اس کی بھوؤں میں خفیف سی حرکت ہوئی جیسے اسے مجھ سے اس طرح تائید کی توقع نہیں تھی پھر وہ اندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "آئیے۔۔۔ تشریف لائیے۔ میرے کمرے میں بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔ وہاں ذرا اطمینان سے بات ہو سکے گی۔"

وہ کچھ اس طرح میرا بازو تھام کر کمرے کی طرف لے چلا جیسے مجھے سہارا دے کر لے جا رہا ہو۔ کمال اس کے ہمزاد کی طرح پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا۔ جمشید کے کمرے میں داخل ہو کر ہم گویا اہرام کے اندر واقع ایک اور اہرام میں پہنچ گئے۔ میرا مطلب ہے وہاں سکوت، سردی اور زندگی سے محرومی کا سا احساس موجود تھا لیکن اس کمرے کی ساخت اور آرائش کی خوبصورتی میں کلام نہیں تھا۔ کمرے کی پچھلی دیوار نیم دائرے کی سی صورت میں بلند تھی اور ہلکی سبز روشنی اس کے نیچے سے اوپر کی طرف جا رہی تھی۔ چھت تک پہنچتے پہنچتے یہ روشنی بہت مدھم ہو چکی تھی۔ اس پس منظر میں باقی تمام آرائش اور ساز و سامان بھی بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔

کمرے کا وہ حصہ جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا اس میں شیشے کی خوبصورت تپائی پر چائے کے برتن پڑے تھے۔ بچے کھچے بسکٹ وغیرہ بھی نظر آرہے تھے۔ گویا جمشید اور جمال کی ملاقات کا آغاز خوشگوار ماحول میں ہوا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے تلخ کلامی شروع ہوئی تھی لیکن جمال کے رخصت ہونے تک بہرحال طوفان گزر چکا تھا۔ جاتے وقت اس کا موڈ ٹھیک ہی نظر آرہا تھا۔ غزل مجھے پہلے ہی بتا چکی تھی کہ جن دنوں کاروباری مسائل سنگین ہوتے تھے ان دنوں ان کی ملاقات کا انداز یہی ہوتا تھا۔ اس کی بات ٹھیک ہی معلوم ہوتی تھی۔

جمشید نے مجھے نشست گاہ میں ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی میرے مقابل بیٹھتے ہوئے بولا "کیا پینا پسند کریں گے افضل صاحب؟"

میرے منہ سے غیر ارادی طور پر کوئی بے تکا جواب نکلنے لگا تھا لیکن میں نے بروقت اپنے آپ کو روکا اور فیصلہ کیا کہ ماحول کی سنجیدگی کو برقرار رکھنا چاہیے۔

"کافی۔۔۔ اگر آسانی سے مل جائے تو۔۔۔" میں نے جواب دیا۔

"یہاں تو اسکاچ وہسکی بھی آسانی سے مل جائے گی جناب!" وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

"یہ شوق میں نے نہیں پالے" میں نے جواب دیا۔

"بڑے حوصلے کی بات ہے" اس نے قدرے تحسین آمیز سے انداز میں سر ہلایا پھر کمال کو اشارہ کیا۔ اس نے میز تک جا کر انٹرکام پر نہایت نیچی آواز میں یوں کسی کو کافی اور اسنیکس وغیرہ کے بارے میں ہدایت کی جیسے کوئی بہت رازدارانہ سی بات کر رہا ہو۔ انٹرکام پر بات کرنے کے دوران میں بھی اس کی نظر مجھ پر سے نہیں ہٹی۔ آدمی بہت مستعد معلوم ہوتا تھا۔ جمشید کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ برقرار تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ بات چیت شروع ہونے کے بعد نہ جانے کتنی دیر تک یہ مسکراہٹ اس کا ساتھ دے سکے گی۔

وہ گویا ازسرِنو میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "بڑی خوشی کی

بات ہے کہ چوہدری گروپ آف کمپنیز اور فائیو اسٹار ہوٹل کے مالک جیسی ممتاز شخصیت سے آج ہمیں اپنے ہی دفتر میں شرفِ ملاقات حاصل ہو رہا ہے۔ یہ ایک پُرمسرت موقع ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس طرح اپنی خوشی کا اظہار کروں۔"

میں کہنے لگا تھا کہ تم بھنگڑا یا لُڈی ڈال کر اپنی خوشی کا اظہار کرسکتے ہو۔ ویسے خنک ڈانس یا ہوجمالو کی دُھن پر رقص سے بھی کام چل جائے گا.... لیکن میں نے بہ مشکل اپنے آپ کو یہ کہنے سے باز رکھا۔ زبان کم بخت بار بار پھسلنے کے لیے مچل رہی تھی۔ اس کے بجائے میں نے سنجیدگی سے کہا "اچھا.... تو آپ میری کاروباری حیثیت کے بارے میں جانتے ہیں۔"

"ایک بڑے کاروباری آدمی کو دوسرے بڑے کاروباری آدمی کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلوم ہونا چاہیے" وہ بدستور خوش خلقی سے بولا۔ کمال انتر کام چھوڑ کر ایک کونے میں جا کر بت کی طرح استادہ ہوگیا تھا۔ اس نے ایسی جگہ منتخب کی تھی جہاں سے وہ بوقتِ ضرورت نہایت آسانی سے براہِ راست مجھے نشانہ بنا سکتا تھا۔ کم از کم مجھے تو اس کے اس طرح کھڑے ہونے کا یہی مقصد نظر آیا۔ شاید یہ فرض کیے رکھنا اس کی تربیت کا حصہ تھا کہ کوئی بھی ملاقاتی نہایت پُرسکون اور دوستانہ ماحول میں بیٹھ کر بات کرتے کرتے اچانک کوئی خنجر یا پستول وغیرہ نکال کر اس کے باس پر حملہ آور ہوسکتا تھا۔ سائے کی طرح ساتھ رہنے والے اور اچھے باڈی گارڈ ہمیشہ اسی طرح مستعد رہتے تھے۔ کمال کئی قدم دور کھڑا پلک جھپکائے بغیر سپاٹ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا اور بظاہر سویا سویا سا دکھائی دے رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ شکار کی تلاش میں نکلے ہوئے چیتے کی طرح چوکنا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جمشید بولا "کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ نے کیسے ہمیں ملاقات کی یہ خوشی بخشنے کے بارے میں سوچا؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جب آپ کو میری آمد کا مقصد معلوم ہوگا تو شاید یہ ملاقات آپ کے لیے زیادہ خوشی کا باعث نہ رہے۔"

"آپ بتائیں تو سہی.... میں ہر صدمے کے لیے تیار رہنے کی کوشش کروں گا" وہ اپنی مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

"میں آپ سے امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے پیدا کیے ہوئے ایک مسئلے کے بارے میں بات کرنے آیا ہوں" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے تغیّر سا آیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے واقعی گویا اپنے آپ کو ہر صدمے کے لیے تیار کرلیا اور اسی خوش خلقی سے بولا "اوہ.... پھر وہی امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن....!" اس نے ٹھنڈی سانس لی "یہ کمپنی تو ہمارے لیے مسائل کی فیکٹری بن گئی ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے۔ آپ تو اس کمپنی کے کلائنٹ نہیں تھے آپ کو اس سے کیا شکایت پیدا ہوگئی؟"

شاید کمپنی کے کلائنٹس کی فہرست اسے ازبر رہتی ہو۔ میں نے کہا "شاید یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اس کمپنی کا کلائنٹ نہیں تھا لیکن میرا ایک دوست اس کا کلائنٹ ضرور تھا اور اسے اس کی وجہ سے بھاری نقصان برداشت کرنا پڑا۔"

"کون ہے وہ؟" اس نے بھویں اچکاتے ہوئے بڑے تجسس سے پوچھا۔

"کوڑل جان کڑیالی" میں نے جواب دیا۔

"وہ آپ کا دوست ہے؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ میرے جواب سے اسے گویا دھچکا لگا تھا۔

"جی ہاں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا یہ آپ کے لیے حیرت کی بات ہے؟"

"نہیں.... خیر.... اس میں حیرت کی تو کوئی بات نہیں" وہ جلدی سے گویا سنبھلتے ہوئے بولا "آپ اپنی بات جاری رکھیے۔"

"میرا خیال ہے آپ کو مسئلے کا اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔ اسے نہ تو مال سپلائی کیا گیا' نہ اس کی سیکیورٹی واپس کی گئی اور نہ ہی اس کی شکایات کا کوئی جواب دیا گیا" میں نے اپنے لہجے میں ذرا سرد مہری لاتے ہوئے کہا۔

"جواب کیسے دیا جاسکتا تھا مسٹر افضل....!" وہ متاسفانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا "دفتر ہی بند ہوگیا۔ کمپنی سخت بدنظمی کا شکار چلی آرہی تھی۔ پھر کمپنی کی میجر پارٹنر پرنسس سیمرا کی پُراسرار موت کی وجہ سے حالات اور بھی خراب ہوگئے۔ ایک طرح سے کسی کے پاس فیصلے کا اختیار نہیں رہا۔"

"لیکن اس ساری افراتفری میں میرے کلائنٹ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ ایک طرح سے اس کا نقصان کافی حد تک ناقابلِ تلافی ہے لیکن اگر ہم صرف مالی نقصان کی بھی بات کریں تو اسے مجموعی طور پر پچیس تیس لاکھ کا نقصان پہنچا ہے۔ اس کے لیے یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ وہ زیادہ بڑا بزنس مین نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن ایک بڑے بزنس مین کا دوست ضرور ہے" وہ مسکرایا۔

"میں تو خود کو بھی بڑا بزنس مین نہیں سمجھتا" میں نے کہا۔

"اتنی انکساری اچھی نہیں ہوتی افضل صاحب!" وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ مسکراہٹ تو گویا اس کے ہونٹوں پر چسپاں ہوکر رہ گئی تھی لیکن یہ مسکراہٹ روح سے خالی تھی۔ اس کی آنکھیں اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

"بہرحال بات کوڑل کی ہو رہی تھی" میں نے کہا "مال نہ ملنے سے اسے بہت پریشانی اُٹھانا پڑی۔ اس کے بزنس پر بہت بُرا اثر پڑا۔"

"مجھے افسوس ہے...." وہ بولا گو کہ اس کے لہجے میں تاسف نہیں تھا۔ "لیکن آپ خود بزنس مین ہیں افضل صاحب! آپ کاروبار کی مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہیں۔ جو چیز ہمارے موجود ہی نہ ہو وہ ہم کیسے سپلائی کرسکتے ہیں؟"

"لیکن آپ نے آرڈر قبول کیا.... اس کا کنٹریکٹ سائن کیا۔"

"میں نے نہیں.... کمپنی نے آرڈر قبول کیا" اس نے میری بات کاٹتے ہوئے گویا تصحیح کی۔ میں ان الفاظ کے پیچھے چھپے ہوئے باریک سے فرق کو محسوس کرسکتا تھا "فرد اور کمپنی میں بڑا فرق ہوتا ہے افضل صاحب!"

"مجھے معلوم ہے" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "جیسے انسان کی زبان اور اس کی نیت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔"

"بے شک.... لیکن بڑے کاروبار کمپنی لاز وغیرہ کے مطابق چلتے ہیں۔ حالات میں اونچ نیچ آتی ہی رہتی ہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن بہرحال بُری ساکھ کی کمپنی نہیں تھی۔ وہ برسوں سے کاروبار کررہی تھی۔ فی الحال وہ بحران کا شکار ہوگئی ہے۔ لیکن امید ہے ہم جلد اس پر قابو پالیں گے۔ ہمارے بیشتر کلائنٹ نے صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ کمپنی کا اپنا کروڑوں روپیا ملک میں اور بیرونِ ملک پھنسا ہوا ہے" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"شاید یہ سب درست ہو.... لیکن شاید آپ کو یہ بھی اندازہ ہو کہ میں یہاں کمپنی لاز اور آپ کی کمپنی کے مسائل ڈسکس کرنے نہیں آیا...."

وہ انگلی اُٹھاتے ہوئے بولا "مجھے ایک بار پھر آپ کے بیان کی تصحیح کرنا پڑے گی افضل صاحب! میں کمپنی کا سول پروپرائٹر یا تنہا مالک و مختار ہرگز نہیں ہوں۔ کمپنی میری نہیں' تین افراد کی ہے یعنی میں.... پرنس سعید اور ایک تیسرا شخص جو بیرونِ ملک بیٹھا ہوا ہے۔ باہر کے معاملات وہ سنبھالتا ہے۔ پرنس سعید کا انتقال ہوچکا ہے۔ قانونی طور پر اس کا حصہ پرنسس سیمرا کو منتقل ہونا چاہیے تھا لیکن اس کی عجیب و غریب وصیت کی وجہ سے وراثت کا مسئلہ اُلجھ گیا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ مرے پر سو درے کے مصداق' وراثت منتقل ہونے سے پہلے اس کی وارث خود پُراسرار حالات میں ماری گئی۔ شاید آپ تصور نہیں کرسکتے کہ معاملات کتنے اُلجھے ہوئے ہیں اور کمپنی کس حال کو پہنچ گئی ہے لیکن ان پر بات کرنے کے لیے ہمیں بہت وقت چاہیے اور مجھے اندیشہ ہے کہ ہم کئی دن مغز ماری کرتے رہیں شاید تب بھی کوئی نتیجہ نہ نکلے۔"

"لیکن میں نے کوڑل کا یہ معاملہ اسی لیے ہاتھ میں لیا ہے کہ ناممکن کو ممکن بنایا جائے یعنی کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور نکالا جائے" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"میری ہمدردیاں کوڑل کے ساتھ ہیں" وہ پلک جھپکائے بغیر بولا۔

"اس کے لیے میں اس کی طرف سے آپ کا شکر گزار ہوں مسٹر جمشید....!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ صرف ہمدردیوں سے اس کا کام نہیں چل سکتا۔"

"اس کا کام کس چیز سے چل سکتا ہے؟" اس کے لہجے میں مٹھاس تھی لیکن یہ مٹھاس زہر سے زیادہ خطرناک محسوس ہو رہی تھی۔

"تیس لاکھ روپے سے" میں نے ہموار لہجے میں جواب دیا "یہ اس کا صرف مالی نقصان ہے۔ اسے جو ذہنی کوفت ہوئی یا اس کی ساکھ کو جو نقصان پہنچا' اسے وہ برداشت کرلے گا بشرطیکہ اس کا مالی نقصان پورا ہوجائے۔ اسے اس کی طرف سے قربانی ہی سمجھیں۔"

"تو آپ اسے تیس لاکھ روپے دے دیں نا افضل صاحب! آپ اتنے بڑے بزنس مین ہیں.... اور وہ آپ کا دوست بھی ہے" اس کی خفیف سی مسکراہٹ میں ایک عجیب سا رنگ آگیا۔

"میں تو اسے دے ہی دوں گا...." میں نے اطمینان سے کہا "بلکہ عین ممکن ہے میں نے دے بھی دیے ہوں لیکن حساب کتاب بہرحال حساب کتاب ہوتا ہے۔ جہاں انسان کا حساب نکلتا ہو بعض اوقات وہاں حساب برابر کرنا بہت ضروری ہوجاتا ہے۔"

اس اثنا میں دروازے پر خفیف سی دستک ہوئی۔ کمال نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ دروازہ اندر سے لاک تھا۔ خوشبو میں بسی ہوئی ایک خوش شکل اور خوش ادا لڑکی کافی اور بسکٹوں وغیرہ کی ٹرے اٹھائے اندر آگئی۔ وہ غزل نہیں تھی لیکن اسی قبیل کی چیز تھی۔ میں دل ہی دل میں جمشید کے دفتر کی رنگینیوں کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ کم بخت نے چائے کافی سرو کرنے کے لیے بھی ایک خوش لباس' خوش شکل اور اسمارٹ لڑکی رکھی ہوئی تھی۔

جمشید کوئی جواب دیتے دیتے رہ گیا۔ لڑکی ہم دونوں کے درمیان بیٹھ کر کافی تیار کرنے لگی۔ شکردان اُٹھاتے ہوئے اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ انگریزی میں پوچھا "آپ کتنی شکر لینا پسند کریں گے؟"

"جتنی مناسب سمجھیں ڈال دیجیے...." میں نے بھی مسکراتے

ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا "میری زندگی میں پرہیز وغیرہ کا کچھ زیادہ عمل دخل نہیں ہے... اور نہ ہی میں نے اتنی چھوٹی چھوٹی غیر ضروری باتوں کے لیے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔"

وہ ذرا چونکی۔ اس کی مسکراہٹ کچھ گہری ہوئی لیکن دوسرے ہی لمحے شاید اسے یاد آگیا کہ وہاں جمشید بھی موجود تھا۔ وہ جلدی سے سر جھکا کر کافی تیار کرنے لگی۔ جمشید سے اسے شکر یا کریم کے بارے میں کچھ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آخر وہ باس تھا۔ اس کے بارے میں وہ نہ جانے کیا کچھ جانتی تھی۔ میں اسے مرمریں اور خوبصورت انگلیوں میں چمچہ تھام کر شکر حل کرتے ہوئے دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ اگر اسے واقعی صرف اسی کام کے لیے رکھا گیا تھا تو پھر یہ اس کی خوبصورتی... اور جو بھی صلاحیتیں اس میں موجود تھیں، ان کا زیاں تھا۔

وہ ہمیں کافی کے مگ تھما کر رخصت ہو چکی تو جمشید نے وہیں سے سلسلۂ کلام جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ گہری سانس لے کر وہ بولا "اچھا... تو آپ حساب برابر کرنے آئے ہیں!" میں سمجھ نہیں سکا کہ یہ سوال تھا یا محض بیان۔ تاہم اس کے لہجے میں جس جذبے کی بازگشت تھی اسے میں محسوس کر سکتا تھا۔

"یہی سمجھ لیں... لیکن اصل فیصلہ آج کی بات چیت کے بعد ہوگا کہ میرا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے" میں نے بے پروائی سے کہا اور کافی کی چسکی لی۔ اس کی سفاک سی آنکھیں کافی کے مگ کے اوپر سے میری جانب نگراں تھیں۔ انہیں دیکھ کر رات کے اندھیرے میں جھاڑیوں میں چھپے ہوئے اس بھیڑیئے کا خیال آتا تھا جو اس شکاری کے لیے گھات لگائے بیٹھا تھا جو اسے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اسی لمحے میں نے پہلی بار کمال کو ذرا مضطرب دیکھا۔ اس نے ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر وزن منتقل کیا۔ اس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے کلاشنکوف کے ٹریگر کی طرف گیا لیکن پھر واپس آگیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ دوبارہ بُت کی طرح ساکت ہو چکا تھا۔

جمشید نے اپنی مسکراہٹ کو برقرار رکھنے کی یقیناً بہت کوشش کی تھی لیکن آخرکار وہ غائب ہو چکی تھی۔ وہ اب مسکرانے کے تکلف میں پڑے بغیر بولا "گویا ہماری آج کی یہ ملاقات بہت اہم ہے۔ کبھی کبھی بہت معمولی باتیں کسی بہت بڑے انقلاب کا پیش خیمہ بن جاتی ہیں۔ بڑے کاروباروں کی دنیا میں پچیس تیس لاکھ کی کوئی اہمیت نہیں... لیکن اگر معاملات کو دانش مندی سے ہینڈل نہ کیا جائے تو یہ کسی بڑے فساد کی بنیاد بھی بن سکتے ہیں۔"

"بے شک" میں نے ذرا اگر مجوشی سے کہا "یہی تو میں آپ کو بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ آپ نے کبھی کبھار ایسی خبریں ضرور پڑھی ہوں گی کہ پانچ یا دس روپے کے لیے کسی کو قتل کر دیا گیا... یا دو چار روپے کے سلسلے میں جھگڑا شروع ہوا اور نوبت قتل تک جا پہنچی۔ جب چھوٹے لین دین کی دنیا میں ایسا ہو سکتا ہے تو بڑے لین دین کی دنیا میں پچیس تیس لاکھ کے لیے کچھ جسموں کے گولیوں سے چھلنی ہونے کے امکان کو نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔"

"کیا میں یہ سمجھوں کہ آپ مجھے دھمکی دینے کی کوشش کر رہے ہیں مسٹر افضل؟" اس نے نہایت شیریں لہجے میں کہا۔

"کیا امکانات کی طرف اشارہ کرنے کو آپ کے ہاں دھمکی کہا جاتا ہے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

اس نے کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور اس کے بعد بھی ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ اس دوران میں اس کی نظر میرے چہرے سے نہیں ہٹی۔ آدمی بہت گہرا تھا۔ اس کے چہرے سے اندازہ کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا تھا یا کیا محسوس کر رہا تھا۔ صرف اس کی سفاک آنکھیں اس کی کیفیات کی تھوڑی بہت چغلی کھاتی تھیں۔ میں حیران تھا کہ جمال سعیدی کے ساتھ وہ کیوں کر اتنی چیخ پکار میں مصروف تھا۔ اس طرح چیخ پکار تو عام طور پر بے حد ملی جذباتی سے لوگ کرتے تھے جنہیں ذرا ذرا سی بات پر اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا تھا۔ جمشید تو اس وقت مکمل طور پر ایک ایسا انسان نظر آ رہا تھا جو بڑے سے بڑے طوفان کا مقابلہ نہایت پُرسکون انداز میں کر سکتا تھا اور کسی گہرے سمندر کی طرح اپنے جذبات کے کنکر پتھر اور موتی، سبھی کچھ اپنی تہ میں پوشیدہ رکھ سکتا تھا۔ ہر قسم کے مسائل پر بڑے صبر و سکون سے بیٹھ کر بات کر سکتا تھا۔

عین ممکن تھا کہ وہ پہلودار شخصیت کا مالک ہو اور اس کی شخصیت کا وہ پہلو صرف جمال سعیدی کے لیے مخصوص ہو جیسے بعض لوگ روز مرہ زندگی میں عام لوگوں کے درمیان بہت سنجیدہ، ریزرو اور کم گو نظر آتے ہیں لیکن اگر وہ اپنے کسی خاص اور بے تکلف دوست کے ساتھ بیٹھے ہوں تو ان کا بالکل مختلف روپ ہی سامنے آتا ہے۔

وہ نہایت آہستگی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "نہیں مسٹر افضل! ہم ایسا نہیں کریں گے کیونکہ ہم دونوں نہایت شریف، امن پسند اور سمجھدار بزنس مین ہیں۔ ہم زمانہ غار کے لوگ تو نہیں ہیں نا..."

"بے شک" میں نے بڑے خلوص سے سر ہلایا "ہم تو ان سے کہیں بدتر ہیں۔"

وہ پھر ایک لمحے چپ رہا۔ شاید اسے مجھ سے اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ ایک اور گھونٹ بھر کر وہ بولا "مسئلہ صرف کوٹل کا ہی نہیں ہے افضل صاحب! اور بھی بہت سے متاثرین ہیں جن کا بہت نقصان ہوا ہے... اور صرف کلائنٹ کا ہی نہیں، خود ہمارا بھی بہت نقصان ہوا ہے۔ ہمیں اپنے تمام کلائنٹس سے ہمدردی ہے اور آج کل ہم دن رات اسی مسئلے پر غور کر رہے ہیں۔"

"غور...!" میں نے استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر دہرایا "غور کرنا... کڑی نظر رکھنا... اجازت نہ دینا... یہ تمام ایسے مسلسل کام ہیں جو پچھلے اڑتالیس سال سے ہمارے ملک میں ہو رہے ہیں اور آج تک ان کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ اڑتالیس برس سے ہم اخباروں میں یہی پڑھ رہے ہیں اور خبروں میں یہی سُن رہے ہیں کہ فلاں مسئلے پر غور کیا جا رہا ہے... فلاں سرگرمی پر کڑی نظر رکھی جا رہی ہے اور فلاں غلط کام یا جرم کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ اس قسم کے بیانات سُن سُن کر مجھ جیسے لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں کہیں زخم پڑ گئے ہیں۔ آپ کی یہ غور کرنے والی بات سن کر مجھے اپنے کسی ایسے ہی زخم میں ٹیس سی محسوس ہوئی ہے کیونکہ یہ بھی مجھے کچھ اسی قسم کا بیان محسوس ہوا ہے۔"

ایک بار پھر وہ غیر معمولی آنکھیں کافی کے مگ کے اوپر سے مجھے تک رہی تھیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بہرحال میں زیادہ لمبے مسائل میں الجھنا نہیں چاہتا اور نہ ہی آپ کے سب متاثرین کی بات کرنا چاہتا ہوں۔ میں ان سب کی نمائندگی نہیں کر رہا۔ میں تو کوشش کر رہا ہوں کہ صرف کوٹل کے مسئلے سے غرض رکھوں لیکن اگر ضرورت پڑی تو میں تمام متاثرین کی نمائندگی کرنے کے بارے میں بھی غور کر سکتا ہوں۔"

"ہم ہرگز نہیں چاہیں گے کہ ایسی صورتِ حال پیدا ہو......" اس کا لہجہ اب بھی شیریں تھا "لیکن بالفرض محال ایسی صورتِ حال پیدا ہو بھی جائے تو آپ کس حیثیت میں ان سب کی نمائندگی کریں گے مسٹر افضل؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر وہ سب اس بات پر متفق ہوں کہ میں ان کی نمائندگی کروں تو پھر حیثیت کا کیا سوال رہ جاتا ہے؟"

"ہاں... یہ تو آپ نے ٹھیک کہا..." وہ پُرخیال سے لہجے میں بولا "دراصل میں سمجھا تھا کہ آپ خدائی فوجدار بننے کی کوشش کریں گے۔"

"کبھی کبھی میں وہ بھی بن جاتا ہوں" میں نے اسے مطلع کیا۔

"اوہ... واقعی...؟ یہ تو دلچسپ بات بتائی آپ نے" وہ ایک اور گھونٹ بھر کر اس طرح بولا جیسے واقعی میرے اس انکشاف سے لطف اندوز ہوا ہو۔

گفتگو کے دوران میں میرا بھی کافی پینے کا سلسلہ جاری تھا۔ میں نے ایک چسکی لینے کے بعد کہا "میں آپ کو ایک اور دلچسپ بات بتاتا چلوں۔ میرے پاس لا کی ڈگری بھی ہے اور بار کی رکنیت بھی۔ کبھی کبھی شوقیہ طور پر میں کسی دوست کی قانونی مدد کے لیے خود ہی کالا کوٹ پہن کر عدالت میں بھی جا کھڑا ہوتا ہوں۔ محض پریکٹس میں رہنے کے لیے... اور اگر معاملہ اپنے بس کا نہ لگے تو پھر بڑے اور نامی گرامی وکیلوں کا ایک پورا پینل تو موجود ہی ہے۔ میرا بتانے کا مقصد یہ ہے کہ اگر ہم مناسب سمجھیں تو قانونی جنگ بھی لڑ لیتے ہیں لیکن ہمیں معلوم ہے کہ یہ کافی لمبا راستہ ہے۔ اس کے باوجود اگر ہم آپ کے سب متاثرین کی نمائندگی کا فیصلہ کر ہی لوں اور ابتدا عدالتی چارہ جوئی سے ہی کی جائے تب بھی خاصی سرگرمی دکھائی جا سکتی ہے۔ کافی ہلا گلا ہو سکتا ہے۔ پریس میں میرا ٹھیک ٹھاک اثر رسوخ ہے۔ روزانہ اچھی خاصی جلی سرخیوں کے ساتھ خبریں آ سکتی ہیں۔"

"ہاں... یہ تو واقعی آپ نے پہلے سے بھی زیادہ دلچسپ بات بتائی۔" اس نے آہستگی سے سر ہلایا۔

"اس صورتِ حال کو آپ یقیناً ذرا بھی پسند نہیں کریں گے؟" میں نے کہا۔

"صورتِ حال...؟" اس نے قدرے استہزائیہ لہجے میں کہا "ہم تو اس شخص کو بھی بالکل پسند نہیں کریں گے جو اس قسم کی صورتِ حال کا سبب بنے گا۔"

یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس جملے سے اس کی مراد کیا تھی۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس قسم کے لوگ اگر کسی کو ناپسندیدہ قرار دے دیتے تھے تو اس کا کیا انجام متوقع ہو سکتا تھا۔ میں نے بے پروائی سے مسکراتے ہوئے کہا "ہو سکتا ہے آپ جیسے لوگوں کی نظر میں ناپسندیدہ قرار پانا ہی اس شخص کا پسندیدہ مشغلہ ہو۔"

"میں کسی کو نصیحت کرنا پسند نہیں کرتا... لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ انسان کو اچھے مشاغل اختیار کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ منفی مشاغل انسان کو مصیبت میں ڈالتے ہیں اور ان کی وجہ سے وہ دوسروں کے لیے بھی پریشانیاں کھڑی کرتا ہے... لیکن خیر... یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہم واپس کوٹل کی طرف آتے ہیں" اس نے جو اشارہ دینا تھا، وہ دے دیا تھا۔ اب وہ گویا نرمی سے مسئلہ حل کرنے کی طرف مائل تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "پچیس تیس لاکھ روپے کوئی بڑا مسئلہ نہیں ہے اور گو کہ ہم اتنی زیادہ ادائیگی کرنے کے پابند نہیں ہیں لیکن ہم اسے انا کا مسئلہ بنانا نہیں چاہتے..."

"یہ آپ کی بڑی نوازش ہے کہ آپ اسے انا کا مسئلہ بنانا نہیں چاہتے" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں "لیکن آپ یہ ادائیگی کرنے کے پابند کیوں نہیں ہیں؟"

وہ ترحم آمیز سے لہجے میں بولا "افضل صاحب! آپ چونکہ صرف شوقیہ وکیل ہیں۔ صحیح طور پر پریکٹس میں نہیں ہیں۔ شاید اس لیے آپ کو اپنا ہوم ورک مکمل کرنے کی عادت نہیں رہی۔ اگر آپ نے اس کیس کو صحیح طرح اسٹڈی کیا ہوتا، اپنے کلائنٹ اور دوست سے اچھی طرح تبادلۂ خیال کیا ہوتا... نیز اس کنٹریکٹ کا مطالعہ کیا ہوتا جو ہماری کمپنی کے کلائنٹ مال کا آرڈر دیتے وقت سائن کرتے ہیں... تو آپ کو معلوم ہوتا کہ اخراجات اور ہرجانہ وغیرہ تو دور کی بات ہے۔ ہم تو وہ رقم بھی واپس کرنے کے صحیح معنوں میں پابند نہیں ہیں جو کلائنٹ ایڈوانس کے طور پر جمع کراتا ہے۔ کنٹریکٹ میں لکھا ہے کہ آرڈر پورا نہ کر سکنے کی صورت میں کمپنی، مناسب قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد اپنی صوابدید کے مطابق ایڈوانس واپس کرے گی اور مناسب قانونی تقاضے پورے کرنے... یا اپنی صوابدید وغیرہ کا مطلب تو آپ اچھی طرح سمجھتے ہوں گے۔

اس کی مزید وضاحت کنٹریکٹ کے فارموں پر ایک جگہ نہایت باریک حروف میں کی گئی ہے جسے کوئی پڑھنے کی زحمت نہیں کرتا۔"

میں خاموش تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کا سا کھنچاؤ پیدا ہوا اور وہ قدرے توقف سے بولا "چنانچہ اگر کسی قسم کا اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں کوئی کلائنٹ عدالت سے رجوع کرنے کا فیصلہ کرے تو اسے صرف اپنا ایڈوانس واپس لینے میں برسوں لگ سکتے ہیں۔۔۔"

پھر وہ ڈرامائی سے انداز میں گہری سانس لے کر بولا "لیکن اس قسم کی ناگوار صورتِ حال اس سے پہلے کبھی پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے کمپنی کا کام ایک طرح سے اپنی ساکھ پر چل رہا تھا۔ کنٹریکٹ کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ کلائنٹس ہمارے پاس آنے پر مجبور بھی تھے۔ ہم جیسی سروسز کوئی اور کمپنی مہیا نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ ان حالات کی روشنی میں آپ کا وکیل ہونا تو آپ کے کچھ زیادہ کام نہیں آسکتا۔۔۔ اور جہاں تک آپ کے دوسرے نامی گرامی وکیلوں کے پینل کا تعلق ہے تو اس قسم کے پینل ہمارے پاس بھی موجود ہیں۔ ہم نے کبھی ان پر تکیہ نہیں کیا۔"

"ہوسکتا ہے جن پر آپ تکیہ کرتے ہوں ان کی بھی خاطرخواہ تعداد میرے پاس موجود ہو۔" میں نے ایک نظر کمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا مشورہ تو یہی ہے کہ ہمیں اچھی طرح جانے اور پرکھے بغیر آپ اس قسم کے دعوے نہ کریں تو اچھا ہے مسٹر افضل!" وہ ملائمت سے بولا "تاہم میں اس وقت بھی آپ کے دعوے کو جھوٹا' کھوکھلا یا بے بنیاد قرار نہیں دے رہا۔ ہمارے لیول کے لوگ ایک نظر میں بہت سے اندازے لگا لیتے ہیں۔ آپ میں خود بھی یقیناً یہ صلاحیت موجود ہوگی۔"

"اسی لیے تو میں ایک وکیل کی حیثیت سے آپ کو قانونی نوٹس بھجوانے کے بجائے خود آپ کے پاس آیا ہوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے معلوم تھا کہ وہ نوٹس شاید آپ تک پہنچنے بھی نہ پائے۔ آپ سے بالا بالا کوئی وکیل اس کا رسمی جواب بجھوادے۔ اسی لیے میں نے بقول آپ کے مناسب ہوم ورک کرنے کی بھی زحمت نہیں کی۔"

اب وہ بھی ذرا واضح انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "اور چونکہ میں نے آپ کے بارے میں کچھ اندازے قائم کئے ہیں اسی لیے میں اتنے چھوٹے چھوٹے مسائل پر اتنا وقت ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس کے علاوہ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کا سیٹ اَپ کچھ ایسا تھا کہ میں تو اس کے اس قسم کے تنازعات کے سلسلے میں قانونی طور پر سرے سے جوابدہ ہی نہیں ہوں۔ کمپنی لاز کے مطابق۔۔۔"

میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے اور اس کی بات کاٹتے ہوئے گویا خاصی تکلیف کے سے عالم میں کہا "کمپنیوں کے سیٹ اَپ اور کمپنی لاز وغیرہ کا تو ذکر ہی نہ چھیڑیں جمشید صاحب! یہ بڑا تکلیف دہ موضوع ہے۔ ہم نے مغرب سے جدید معیشت۔۔۔ اسٹاک مارکیٹ۔۔۔ اور کمپنی لاز کے جو گورکھ دھندے درآمد کئے ہیں اس نے سارے معاشی نظام کو ایک عجیب شیطانی نظام میں جکڑ لیا ہے۔ آپ کے سامنے ایک پوری کاروباری ایمپائر کھڑی ہوتی ہے۔ آپ اس میں کروڑوں روپے انویسٹ کردیتے ہیں لیکن جب کوئی جھگڑا کھڑا ہوتا ہے تو آپ کو پتا نہیں ہوتا کہ اس میں اصل جوابدہ کون ہے؟ ایک طویل مدت میں آپ کو اگر یہ پتا چل بھی جاتا ہے تو پھر یہ پتا نہیں چلتا کہ آپ اس کے خلاف فوری اور مؤثر کارروائی کس طرح کرسکتے ہیں؟ برسوں میں جاکر آپ کو پتا چلتا ہے کہ درحقیقت تو کسی کے خلاف صحیح طور پر کوئی کارروائی ہو ہی نہیں سکتی۔ عام طور پر لوگ یہ حیرت انگیز راز جاننے سے پہلے اللہ کو پیارے ہوجاتے ہیں۔ جو باقی بچتے ہیں وہ اس راز کے معلوم ہونے کے بعد صدمے سے اللہ کو پیارے ہوجاتے ہیں۔"

میں نے کافی کا مگ تپائی پر رکھتے ہوئے صوفے کے پشتے سے ٹیک لگا کر گہری سانس لی اور سلسلۂ کلام جوڑا "اسی شیطانی قسم کے معاشی نظام کا شاخسانہ ہے کہ ہمارے ہاں کبھی فنانس کمپنیوں اور کبھی کوآپریٹوز کے نام پر ادارے قائم ہوتے ہیں' انسانوں کے فطری لالچ سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اربوں روپے غتربود کرکے غائب ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ ان کے بھی سیٹ اَپ کو پوری طرح کھنگالیں تو آپ کو پتا چلے گا کہ درحقیقت قانونی طور پر آپ ان کے خلاف کوئی خاص کارروائی نہیں کرسکتے۔ یہ جو پبلک کا اتنا شور برپا ہونے اور مختلف قسم کے دباؤ کی وجہ سے حکومتیں نیم دلی کے ساتھ تھوڑی بہت کارروائی کرتی بھی ہیں تو وہ بے نتیجہ رہتی ہے۔ صرف تحقیقاتی اداروں کے کچھ لوگوں کو فائدہ ہوجاتا ہے۔ چند کروڑ روپے ان کی جیبوں میں چلا جاتا ہے اور بس۔۔۔ اربوں روپے انویسٹ کرنے والوں کے حصے میں اخباری بیانات' دلاسے اور تسلیاں آتی ہیں۔ مغرب کے اسی شیطانی معاشی نظام کی شعبدہ بازیاں ہیں کہ کھربوں کی بین الاقوامی کرنسی اور اثاثے اپنی ملکیت میں رکھنے والی ایمپائرز راتوں رات ریت کے گھروندوں کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔ دوسرے روز یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ ان کی دولت ہے کہاں؟ محض کمپیوٹرز پر اعداد و شمار کی قطاریں رہ جاتی ہیں۔ بی سی سی آئی کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ اسی مغربی معیشت کی بازی گری ہے کہ کھرب پتی لوگ راتوں رات کنگال ہوجاتے ہیں۔ وہی کے شیخ گلداری کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ اسی معاشی ڈھانچے کا کمال ہے کہ مختلف حکومتیں اور ان میں شامل لوگ اپنے منظورِ نظر افراد کو بینکوں سے اربوں روپے اٹھوا کردے دیتے ہیں اور پھر معاف بھی کردیتے ہیں۔ جب کہ دولت دوسروں کی ہوتی ہے جنہیں علم بھی نہیں ہوتا کہ ان کے روپے کا کیا ہورہا ہے اور اگر سب کے سب لوگوں کی ساری کی ساری اجتماعی دولت بھی ڈوب جائے اور

بینک بھی ریت کے گھروندوں کی طرح بیٹھ جائیں تو وہ کچھ نہیں کرسکتے۔ مغرب کا معاشی نظام ایک ایسا شیطانی چکر ہے جس میں ایک بار پھنسنے والا کبھی نہیں نکل سکتا۔۔۔ اور اس سے کسی کو فرار بھی نہیں ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ایک طرف دولت کے دریا بہہ رہے ہیں' کمپیوٹروں پر اعداد و شمار کا ایک طوفان برپا ہے لیکن عام لوگوں کی حالت تباہ ہے۔ امیر ترین ملکوں میں بھی غربت اور معاشی مسائل بڑھ رہے ہیں۔ امریکا میں بھی لوگ کوڑے کے ڈھیروں پر بچا کھانا تلاش کررہے ہیں اور ہمارے ہاں تو اکثریت جس حال میں زندگی گزار رہی ہے اس کا پوچھیں ہی مت۔۔۔"

میں نے حقیقتاً اپنے دل میں دکھ کی ایک لہر محسوس کرتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی اور ایک لمحے کے توقف سے کہا "یہ جو آج دو ہزار کمانے والا بھی پریشان ہے اور دو کروڑ کمانے والا بھی پریشان ہے۔ اس میں زیادہ دخل تو اسی بات کو ہے کہ انسان میں قناعت ختم ہوگئی ہے لیکن اس میں کچھ حصہ اسی مغربی معاشی نظام کی نحوستوں کا بھی ہے۔ مغرب کے معاشی شعبدہ باز برس ہا برس سے اس شیطانی کھیل کو پھیلاتے تو چلے آرہے ہیں لیکن انہیں خود بھی معلوم نہیں کہ اس کی انتہا کہاں ہے۔ یہ جن بوتل سے نکل تو آیا ہے لیکن اسے بوتل میں واپس لے جانے کا طریقہ انہیں خود بھی معلوم نہیں۔ اپنے ساتھ انہوں نے پوری دنیا کو اس جن کے چنگل میں پھنسا دیا ہے۔ وہ خود تو کسی نہ کسی طرح سروائیو کرجائیں گے۔ ان کی بنیادیں مضبوط ہیں اور وہ بے پناہ شاطر ہیں۔ وہ باقی دنیا کا خون چوس کر اپنی بقا کا سامان کرتے رہیں گے لیکن میں اپنے ملک جیسے ملکوں کا سوچتا ہوں۔ ان بے چاروں کا کیا بنے گا؟ دوسرے بہت سے خطرناک سیاسی اور سماجی مسائل تو ہمیں جس تباہی سے دوچار کررہے ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں' لیکن ساتھ ساتھ یہ معاشی نظام ہمیں جس طرف لے جارہا ہے اس کا تصور کرکے میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔"

جمشید اب گویا ایک نئے زاویۂ نظر سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اپنا مگ تپائی پر رکھا اور کندھے اچکا کر بولا "یہ ہمارے حل کرنے کے مسائل نہیں ہیں۔ ہمیں صرف اپنے مسائل پر بات کرنی چاہیے۔"

"ظاہر ہے۔۔۔ آپ ان مسائل پر کیسے بات کرسکتے ہیں۔ آپ اسی نظام کے گورکھ دھندوں سے فائدہ اُٹھانے والوں میں سے ہیں۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے یکدم پینترا بدلتے ہوئے کہا "اچھا۔۔۔ تو آپ کوڑل کو تیس لاکھ کی ادائیگی کررہے ہیں۔"

اس کی مسکراہٹ میں یکدم شاطرانہ رنگ جھلک آیا "میں نے یہ تو نہیں کہا۔"

"تو کہہ دیجئے نا۔۔۔ کہنے میں کون سا زور لگتا ہے اور نہ ہی چیک پر سائن کرنے میں کوئی طاقت صرف ہوتی ہے۔ آپ خود ہی یہ ذکر کرچکے ہیں کہ تیس لاکھ روپے آپ جیسے لوگوں کے لیے کوئی اتنی بڑی رقم نہیں ہے" میں نے سادگی سے کہا۔

"بے شک میں نے ایسا کہا تھا" اس نے تسلیم کیا "لیکن اس سے آپ کو یہ مطلب ہرگز اخذ نہیں کرنا چاہیے کہ ہم اتنی رقمیں خواہ مخواہ ہی اٹھا کر لوگوں کو دیتے رہتے ہیں۔ سرمایہ دار اور بزنس مین کے لیے رقم چھوٹی اور بڑی تو ضرور ہوتی ہے لیکن غیر اہم ہرگز نہیں ہوتی۔"

پھر وہ گویا کچھ سوچتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا "بہرحال۔۔۔ اس سے آپ یہ بھی نہ سمجھیں کہ میں کوڑل کو ادائیگی کرنے سے انکار کررہا ہوں۔ دراصل بزنس مین کو ہر پہلو پر سوچنا پڑتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اگر ہم کوڑل کو ادائیگی کردیتے ہیں تو عین ممکن ہے یہ بات راز نہ رہ سکے۔ اس طرح رفتہ رفتہ دوسرے تمام کلائنٹس جن کی تعداد ہزاروں میں ہے' اپنے ایڈوانس اور ہرجانے وصول کرنے کے درپے ہوجائیں گے بلکہ جن لوگوں نے ایڈوانس جمع نہیں کرایا تھا' صرف آرڈر دیا تھا وہ بھی ہرجانے کے دعوے دار ہوجائیں گے۔ بات کروڑوں تک جاپہنچے گی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم یہ اچھا کام کرکے بُری طرح پھنس جائیں۔ ہم پہلے ہی جن مسائل سے دوچار ہیں وہ کچھ کم نہیں ہیں۔ آپ ہمیں رازداری کی ضمانت تو نہیں دے سکتے نا؟"

"میں کسی بھی قسم کی ضمانت نہیں دے سکتا" میں نے صاف گوئی سے کہا "لیکن میرا خیال ہے یہ بات راز ہی رہے گی۔ ظاہر ہے کلائنٹس کا آپس میں تو رابطہ نہیں ہوتا۔ ایک کلائنٹ کو تمام دوسرے کلائنٹس کے بارے میں تو معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کون ہیں۔ اور کوڑل کو اگر رقم مل جاتی ہے تو وہ اخبار میں اشتہار دے کر عوام کو مطلع کرنے سے تو رہا کہ وہ آپ سے رقم وصول کرنے میں کامیاب ہوگیا ہے۔"

"آپ کی بات درست ہے" اس نے سرہلایا "لیکن ایک کلائنٹ دوسرے کم از کم چار پانچ کلائنٹس سے تو واقف ہوتا ہے۔ اگر وہ صرف ان سے ہی ذکر کردے تب بھی بات پھیلتے پھیلتے کافی پھیل جاتی ہے۔ آپ کوڑل کو زبان بند رکھنے کی تلقین تو کرہی سکتے ہیں۔ اگر آپ کو اس پر کوئی اعتراض ہو تو ہم خود اس سے درخواست کرلیں گے۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ میں تو یہاں کوڑل کے مسئلے کو محض دوسری بات پوچھنے کے لیے بہانہ بنا کر آیا تھا اور دوسری بات ابھی میں نے شروع ہی نہیں کی تھی۔ مجھے کوڑل کا کام ہونے کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ یہ تو بس یونہی اندھیرے میں تیر لگ گیا تھا۔

دکھائی جاسکتی تھی۔ کوڑل کو ہرجانہ تو کیا پہلی رقم ملنے کی بھی امید نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ یہ خبر سن کر بہت خوش ہوگا۔ اب مجھے ذرا نرمی سے کام لیتے ہوئے اس معاملے کو حتمی شکل دے دینا ہی چاہیے تھا۔

میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے.... میں کوژل کو سمجھادوں گا کہ وہ اس بات کا کسی سے ذکر نہ کرے گو کہ یہ مجھے خود غرضی محسوس ہوگی۔ خواہش میری یہی تھی کہ تمام کلائنٹس کے نقصانات کا ازالہ کیا جاتا۔"

"میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ اتنے بہت سے لوگوں کی طرف سے ذمّے داری کا بوجھ نہ اٹھائیں۔ بعض اوقات بہت بڑے کام کے چکر میں چھوٹا کام بھی رہ جاتا ہے" وہ دوستانہ لہجے میں بولا "میں کوشش کروں گا کہ کوژل کو ایک دو دن میں چیک مل جائے۔"

"اور کیش بھی ہوجائے" میں نے لقمہ دیا۔

اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار اُبھر آئے "اب ایسی دل دکھانے والی باتیں نہ کریں مسٹر افضل!" وہ گہری سانس لے کر بولا "یہ تو ممکن ہے کہ ہم کچھ اصولوں یا قانونی بنیادوں پر کسی کو ادائیگی سے انکار کردیں لیکن ہمارے گروپ آف کمپنیز کی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم نے کسی کو ڈس آنر ہونے والا چیک دیا ہو۔"

"آپ کی بات سے مجھے اطمینان ہوا ہے" میں نے کہا اور کوشش کی کہ میری مسکراہٹ اسے دوستانہ محسوس ہو۔

جواباً وہ بھی ذرا دوستانہ انداز میں مسکرایا اور بولا "دیکھ لیں.... ہم نے پہلی ہی بار آپ کی آمد کو کتنی اہمیت دی ہے اور آپ کا کتنا احترام کیا ہے۔ آپ کو صرف مطمئن ہی نہیں' خوش بھی ہونا چاہیے۔ رقم زیادہ بڑی نہ سہی لیکن آپ کی یہ کامیابی بہت اہمیت رکھتی ہے۔ بس.... یہی کام تھا آپ کو؟"

"نہیں۔ ابھی ایک اور کام باقی ہے" میں نے کہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں دوسرے موضوع پر بات شروع کروں گا تو کہیں کوژل کا بنا بنایا کام نہ بگڑ جائے لیکن مجھے یہ خطرہ مول لینا ہی تھا۔

"وہ کیا ہے مسٹر افضل؟" اس کی دونوں بھویں کمان بن گئیں۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ جس رات پرنس سمیرا قتل ہوئی اس رات اس کے اور آپ کے درمیان کیا معاملہ ہوا؟ قتل سے کچھ دیر پہلے....؟" میں نے گویا ایک نئی جنگ شروع کرتے ہوئے کہا جو بظاہر کافی کی میز پر نہایت پُرسکون انداز میں محض لفظوں کے ہتھیاروں سے لڑی جارہی تھی لیکن اس کے نتیجے میں بہت کچھ ہوسکتا تھا۔ بڑے پیمانے پر خونریزی کی نوبت بھی آسکتی تھی۔ مجھے بھی معلوم تھا کہ اس کی کُل حفاظتی فورس کمال نہیں تھا۔ کمال جیسے نہ جانے کتنے خطرناک روبوٹ نما انسان کہاں کہاں ایک اشارے' ایک لفظ کے منتظر تھے اور اسے بھی معلوم تھا کہ بظاہر میں اکیلا اس کے پاس آیا تھا اور بے ضرر دکھائی دے رہا تھا لیکن نہ تو وہ مجھے اکیلا سمجھ سکتا تھا اور نہ بے ضرر۔ ہم دونوں گویا تنے ہوئے رسّے پر چل رہے تھے۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ جیسے منجمد ہو کر رہ گئی۔ اس کا چہرہ یک بیک چہرے کے بجائے ایک ماسک نظر آنے لگا۔ نیم وا ہونٹوں کے عقب سے جھانکتے ہوئے اس کے دانت کسی درندے کے دانتوں سے مشابہ محسوس ہونے لگے۔ بظاہر اس کے پوز میں ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن اس ایک جملے نے اس کی پوری شخصیت کا تاثر ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس پر گویا بجلی سی گری جس نے اس کی ذات پر چڑھا ہوا ایک خول سا اتار کر رکھ دیا لیکن وہ یقیناً کوئی عام آدمی نہیں تھا۔ عام نظر آنے کے باوجود اس میں کوئی خاص بات تھی۔ شاید اسی لیے اس نے دوسرے ہی لمحے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس میں جو تبدیلی آئی تھی وہ محض دو چار سیکنڈ کے لیے تھی تاہم اب اس نے ذرا تشویش سے میری طرف دیکھا۔ پھر اس کی نظر کمال کی طرف گھوم گئی۔

ان کے درمیان گویا کوئی ٹیلی پیتھک رابطہ تھا۔ اس نے نہ تو منہ سے کچھ کہا تھا' نہ کوئی اشارہ کیا تھا اور نہ مجھے اس کی آنکھوں میں کوئی پیغام نظر آیا تھا لیکن کمال نے کچھ اس طرح اپنی جگہ سے حرکت کی جیسے ہوا کے نرم جھونکے سے کوئی ریشمی کپڑا لہرایا ہو۔

میرے اعصاب یک لخت تن گئے۔ میں پلک جھپکتے میں اپنے بغلی ہولسٹر سے مشین پسٹل نکالنے کے لیے تیار تھا لیکن کمال نے نہ تو کلاشنکوف کندھے سے اتارنے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کا ہاتھ کسی بغلی ہولسٹر وغیرہ کی طرف بڑھا۔ اس کی نظر تو مجھ پر ہی رہی لیکن وہ اصل میں ایک گوشے میں سجے ہوئے خوبصورت فریج کی طرف جارہا تھا جو سرسری نظر میں کمرے کی آرائش کا ہی ایک حصہ نظر آرہا تھا۔

اس نے فریج کھولا تو مجھے اس کے سب سے اوپر والے ریک میں ایک خوبصورت بلوری ٹرے میں مخصوص لمبے دستے والے گلاسوں میں' جنہیں ہائی بالز کہا جاتا ہے' چند تیار شدہ ڈرنکس رکھے نظر آئیں۔ کمال نے وہ ٹرے... اٹھائی اور لاکر جمشید کے سامنے رکھ دی۔ وہسکی معلوم ہوتی تھی۔

"آپ واقعی اس قسم کی کوئی ڈرنک نہیں لیتے مسٹر افضل؟" جمشید نے ملائمت سے پوچھا۔ میرے سوال کو اس نے فی الحال پسِ پشت ڈال دیا تھا۔

"نہیں" میں نے غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا۔

"وری گڈ۔ آپ یقیناً ایک مختلف آدمی ہیں۔ کیا یہ بات اس سے پہلے کسی نے آپ کو بتائی مسٹر افضل؟" وہ گلاس اٹھاتے ہوئے بولا۔

"کئی مرتبہ" میں نے جواب دیا "اور کسی کے بتانے سے پہلے بھی مجھے معلوم تھی۔ کچھ تو مجھے قدرت نے مختلف بنایا تھا اور کچھ اس کے بعد میں نے خود مختلف بننے کے لیے بہت محنت کی ہے۔"

"ہوں....!" اس نے پُرخیال انداز میں گلاس کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے ہنکارا بھرا پھر یک دم ہی ایک بڑا سا گھونٹ بھر لیا۔ گھونٹ حلق سے اُترتے ہی جیسے اس کا اعصابی تناؤ بے ہوگیا۔ اس نے صوفے کے پشتے سے ٹیک لگائی اور بڑے سرسری سے انداز میں بولا "ہاں.... تو آپ کیا کہہ رہے تھے مسٹر افضل؟"

"میں یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ جیتی جاگتی پرنس سمیرا کے ایک لاش میں تبدیل ہونے سے پہلے وہاں کیا ہوا تھا؟" میں نے بڑے تحمل سے اپنا سوال دُہرایا۔

اس نے گلاس تپائی پر رکھ کر بے بسی کے اظہار کے لیے بازو پھیلائے "لیکن میں بھلا یہ بات کیسے بتا سکتا ہوں؟ مجھے کیا معلوم....! آپ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"اس لیے کہ آپ وہاں موجود تھے" میں نے سادگی سے کہا۔

"آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ کسی نے آپ کو غلط اطلاع فراہم کی ہے" وہ پُرسکون لہجے میں بولا اور ایک بار پھر گلاس اُٹھا کر اس نے پہلے کے مقابلے میں بہت چھوٹا گھونٹ بھرا بلکہ اسے چسکی ہی کہنا زیادہ مناسب تھا۔ کمال ایک بار پھر اپنی جگہ جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ کسی بُت ہی کی طرح بدستور تاثرات سے عاری تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ بے ہودہ انسان اس طرح ساکت کھڑے کھڑے اپنے آپ کو کیوں تھکا رہا تھا؟ بیٹھ کیوں نہیں جاتا تھا۔

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف ذرا جھکتے ہوئے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "میرے سامنے جھوٹ ہی بولنا شاید آپ کے لیے ذرا بھی نقصان دہ نہ ہو لیکن اگر آپ اپنی اس غلط بیانی پر مصر رہے تو آگے چل کر آپ کے لیے بڑے مسائل پیدا ہوسکتے ہیں۔ اس امر کی ایک ٹھوس شہادت موجود ہے کہ وقوعے کی رات ساڑھے سات بجے آپ نے پرنس سمیرا کو فون کیا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ قانونی طور پر وہ ایک کمپنی میں آپ کی برابر پارٹنر تھی لیکن وہ آپ کو نہیں جانتی تھی۔ آپ نے اس سے اپنا تعارف کرایا۔ اسے امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں بتایا۔ وہ آپ سے ناراض تھی۔ آپ پر برہم ہورہی تھی اور آپ سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں شکایات اس تک پہنچ چکی تھیں۔ بہرحال آپ نے اسے ملنے پر آمادہ کرلیا۔ پھر آپ اس سے چند منٹ بعد ہی ملنے بھی پہنچے۔ آپ وہ آخری فرد تھے جس نے اسے زندہ حالت میں دیکھا۔ یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔"

وہ جیسے پلکیں جھپکانا بھول گیا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں خوف کی نہیں' صرف سوچ کی پرچھائیاں تھیں۔ شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ ان باتوں کی گواہی دینے والا کون ہوسکتا تھا؟ میرا اسے یہ بتانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ جب وہ فون پر پرنس سمیرا سے بات کررہا تھا تو وہاں کامران نامی ایک نوجوان موجود تھا جو قانونی طور سمیرا کے شوہر کے درجے پر فائز ہوچکا تھا۔ بارے میں جو کچھ جمشید کو بتا رہا تھا وہ کامران نے مجھے اتنی تفصیل سے کس حد تک بتایا تھا لیکن اشارے بہرحال مل گئے تھے۔ باقی سب کچھ میں اندازوں سے ہانک رہا تھا اور مجھے محسوس ہورہا تھا کہ تیر نشانے پر بیٹھ رہے تھے۔ مثلاً مجھے یقینی طور پر معلوم نہیں تھا کہ جمشید پرنس سے ملنے واقعی گیا تھا یا نہیں؟ یہ بھی میں نے اندھیرے میں تیر چھوڑا تھا اور میں دل ہی دل میں دعا کررہا تھا کہ کم از کم یہ ضرور نشانے پر لگ جائے کیونکہ میرا یہ اندازہ غلط ہونے پر میرا سارا بیان ہی کچھ کھوکھلا اور بے وزن سا ہوسکتا تھا۔

جب جمشید نے پُرزور انداز میں میری بات کی تردید نہیں کی اور بدستور ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا تو میں نے اندھیرے میں ایک اور تیر چلانے کی کوشش کی۔ میں نے ذرا نیچی آواز میں کہا "جمشید صاحب! آپ یقیناً بہت باخبر آدمی ہوں گے۔ شاید ہر محکمے میں آپ کو اندر کی خبر دینے والے آپ کے مہربان موجود ہوں لیکن مجھے امید ہے کہ ایک بات آپ کو بھی معلوم نہیں ہوگی' جو میں آپ کے فائدے کے لیے آپ کو بتانے لگا ہوں۔ وہ بات یہ ہے کہ پرنس سمیرا کے قتل کی تحقیقات صرف پولیس اور کرائمز برانچ ہی نہیں بلکہ حکومت کی ایک نہایت اہم خفیہ ایجنسی بھی کررہی ہے پولیس' کرائمز برانچ یا سی آئی اے وغیرہ تو اگر کسی قسم کی پوچھ گچھ کے لیے آپ کے پاس پہنچ بھی جائیں تو آپ ان سے نمٹ لیں گے۔ ان کے ساتھ تو شاید آپ کا گھر کا سا معاملہ ہو.... لیکن جو باتیں میں آپ کو بتا رہا ہوں' اگر وہ کسی طرح پہلے خفیہ ایجنسی تک پہنچ گئیں اور آپ ان کے سامنے تردید ہی کرتے رہے تو آپ کا جھوٹ آپ کو مشکوک بنادے گا۔ یہ تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ اگر پرنس سمیرا کے قتل کے معاملے میں آپ کسی خفیہ ایجنسی کی نظر میں مشکوک قرار پاگئے تو آپ کے لیے بڑے سنگین مسائل کھڑے ہوجائیں گے۔"

اس کی مسکراہٹ دھیرے دھیرے واضح سی ہوتی گئی پھر وہ گہری سانس لے کر بولا "میرا آپ کے.... ان کے.... یا کسی اور کے سامنے جھوٹ بولنے کا کوئی ارادہ نہیں کیونکہ مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہمیں پرنس کو قتل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں یا مجھ سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی فرد یہ حماقت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی موت میں تو ہمارا نقصان تھا۔ ہمارے لیے تو اس کی زندگی قیمتی تھی۔ اس کی موت نے تو ہمارے لیے بہت سی اُلجھنیں کھڑی کردی ہیں۔"

"تفتیش کرنے والے دوسرے بہت سے نکتے بھی دریافت کرسکتے ہیں۔ کچھ ایسے پہلو بھی ان کے سامنے آسکتے ہیں جن سے پتا چلے کہ پرنس کی موت سے آپ کی بہت سی اُلجھنیں دور ہوگئی ہیں۔ یہ پیچیدہ معاملات ہیں جمشید صاحب.... اور آپ کو معلوم ہے جب معاملات ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں چلے جائیں جن پر آپ کا کوئی اثر رسوخ نہ ہو تو پھر کچھ بھی ہوسکتا ہے" میں نے مربیانہ انداز میں کہا۔

"میں نے کہا نا کہ میرا جھوٹ بولنے کا کوئی ارادہ نہیں" وہ بظاہر خود اعتمادی اور قدرے بے نیازی سے بات کررہا تھا لیکن میں

دیکھ رہا تھا کہ اس کی بھوؤں کے پاس پسینے کی ننھی ننھی بوندیں نمودار ہوچکی تھیں حالانکہ کمرے میں خنکی پہلے سے زیادہ محسوس ہورہی تھی۔

"فی الحال تو آپ اپنے اس ارادے پر عمل پیرا نظر نہیں آرہے" میں نے کہا۔

اس نے چھوٹا سا ایک گھونٹ بھرا اور ہموار لہجے میں بولا "میں جب پرنس سیمرا کے ہاں سے روانہ ہوا تو وہ زندہ سلامت اور مکمل طور پر صحت مند نظر آرہی تھی۔ میری اس سے ملاقات محض چند منٹ کی تھی اور مجھے اعتراف ہے کہ وہ کچھ خوش گوار ماحول میں نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی کہ قتل وغیرہ کی نوبت آجاتی۔ کاروبار میں گرمی سردی تو چلتی رہتی ہے۔ اس سے زیادہ سنگین باتیں تو میرے آپ کے درمیان ہوچکی ہیں لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے کسی نے ایک دوسرے کو انگلی بھی نہیں لگائی۔"

مجھے ایک خوش گوار سی حیرت ہوئی تھی کہ اس نے اتنی جلدی اس حقیقت کا اعتراف کرلیا تھا کہ وہ پرنس سے ملا تھا۔ اندھیرے میں چھوڑا ہوا میرا سب سے اہم تیر نشانے پر لگ گیا تھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ آپ نے سچ بولنے کا فیصلہ کیا" میں نے طمانیت کا اظہار کیا۔

"کیا اب میں بھی آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟" وہ گلاس کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔

"مثلاً...؟" میں نے جاننا چاہا۔

"مثلاً یہ کہ آپ کی معلومات کے ذرائع کیا ہیں؟"

"کون سی معلومات کے...؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"یہی کہ پرنس سیمرا سے فون پر میری کیا بات چیت ہوئی... پھر یہ کہ میں اس سے ملنے گیا تھا" اس نے جواب دیا "کیونکہ جب میں اس سے ملنے گیا تو وہ اس بنگلے میں تنہا تھی جسے وہ اسٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتی تھی۔ اس کے علاوہ میں یہ بھی جاننا چاہوں گا کہ آپ کو ہم سے بھی پہلے کس نے بتادیا کہ کوئی خفیہ ایجنسی بھی پرنس کے قتل کی تحقیقات کررہی ہے؟"

"جمشید صاحب! اب ایسے سوالات تو نہ کریں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کو معلوم ہے اس قسم کی معلومات کے ذرائع ظاہر نہیں کیے جاتے۔"

اس نے صبر و تحمل سے میرے اس جواب کو برداشت کیا اور اسی خوش گوار لہجے میں بولا "اچھا یہ تو بتادیں کہ آپ یہ ساری پوچھ گچھ کیوں کرتے پھر رہے ہیں؟ آپ کس چکر میں ہیں؟"

"میں حقائق کے چکر میں ہوں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"لیکن آپ پولیس والے تو نہیں ہیں۔ آپ تو وکیل بھی شوقیہ ہیں۔ حقیقت میں تو آپ بزنس کمیونٹی کے آدمی ہیں۔ آپ ان باریکیوں اور مسائل میں کہاں اُلجھتے پھر رہے ہیں؟" اس کے لہجے میں الجھن تھی۔

"اس کی کئی وجوہات ہیں..." میں نے جواب دیا "ایک تو یہ میرا شوق ہے کہ کوئی ایسا معاملہ جس سے کسی نہ کسی حوالے سے میرا بھی کوئی تعلق پیدا ہوجاتا ہے اور وہ پیچیدہ صورت اختیار کرجاتا ہے تو اسے سلجھانا اور حقائق کی تہ تک پہنچنا میں گویا اپنی اخلاقی ذمے داری سمجھ لیتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ ایک بیماری ہے جو مجھے لاحق ہوگئی ہے۔ میں تو پہلے بزنس کو بھی ایک بیماری ہی سمجھتا تھا جو انسان کے اعصاب پر سوار ہوجاتی ہے لیکن اب یہ دوسری بیماری بھی لگ گئی ہے۔"

اس نے تحسین آمیز انداز میں سر ہلایا۔ "کوئی حرج نہیں... دونوں بیماریاں فائدہ مند ہیں۔"

"لیکن کبھی کبھی دونوں میں نقصان بھی ہوجاتا ہے" میں نے کہا۔

"نفع نقصان تو بزنس میں چلتا ہی ہے... اس کے باوجود آپ مجھے نقصان میں رہنے والے آدمی نہیں لگتے" وہ گویا اسی میز پر بیٹھے بیٹھے میری پوری زندگی میں جھانک لینے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔

"چلیں میں اس بات پر آپ سے بحث نہیں کروں گا۔ مجھے نقصان ہو بھی جائے تو میں اسے نقصان نہیں سمجھتا کیونکہ اس کے پیچھے ہی کوئی فائدہ سر اُٹھائے کھڑا ہوتا ہے" میں نے خوش دلی سے کہا "بہرحال میں آپ کو وجوہات بتا رہا تھا۔ بعض اوقات ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ان معاملات میں الجھ جانے والا کوئی کردار میرے پاس مدد کی درخواست لے کر آجاتا ہے اور وہ میرا دوست واقف یا شناسا ہوتا ہے... یا پھر کسی شناسا کی سفارش لے کر آجاتا ہے۔ جیسے اس معاملے کی ابتدا صرف اس طرح ہوئی تھی کہ کوئی آپ کی امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں فریاد لے کر میرے پاس پہنچ گیا تھا پھر پرنس سیمرا سے میری ملاقات ہوگئی۔ بات سے بات نکلتی گئی... پھیلتی گئی اور اُلجھتی گئی۔ اب مجھے یہ جاننے سے بھی دلچسپی ہوچکی ہے کہ پرنس کا قاتل کون ہے۔"

"بہت خوب" اس نے ذرا گرم جوشی سے سر ہلایا "مجھے آپ کی باتیں، آپ کے انداز و اطوار اور آپ کی مستعدی... سب کچھ بہت پسند آیا ہے افضل صاحب! آپ بہت کام کے آدمی ہیں۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ پولیس یا خفیہ ایجنسی کا کوئی آدمی یہاں نہیں پہنچا لیکن آپ پہنچ چکے ہیں۔ مجھے یہ بات بھی بہت پسند آئی ہے اور میں آپ کا قدرداں ہوگیا ہوں۔ آپ حقائق کی تلاش میں ہیں اور مجھے یقین ہے کہ جب آپ حقائق کی تلاش میں نکلتے ہوں گے تو آخرکار انہیں تلاش کر ہی لیتے ہوں گے..."

"بے شک" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "کبھی کبھی تو حقائق مجھے یونہی کسی گلی میں آوارہ پھرتے ہوئے مل جاتے ہیں۔"

"یقیناً مل جاتے ہوں گے" اس نے سنجیدگی سے سر ہلایا "تلاش کرنے والوں کو سب کچھ مل جاتا ہے۔ آپ اس بات کے متمنی ہیں کہ حقائق آپ کو مل جائیں۔ آپ کو چکر دینے میں کوئی مشکل سے ہی کامیاب ہوتا ہوگا..."

"یہی کہہ کر تو لوگ بعض اوقات چکر دینے کی کوشش کرتے ہیں" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"لیکن میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں آپ کو چکر دینے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا، وہ میں نے آپ کو بتادیا ہے۔ مزید بھی جو کچھ آپ پوچھیں گے میں دیانت داری سے اس کا جواب دینے کو تیار ہوں۔ یوں سمجھ لیں کہ میرے تمام پتے آپ کے سامنے میز پر رکھے ہیں۔"

"یہ یک لخت اتنی مہربانی کیوں جمشید صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں تو کافی دیر سے آپ پر مہربان چلا آرہا ہوں۔ آپ نے محسوس دیر سے کیا ہے" اس نے جواب دیا۔

"خیر... تو آپ کا کہنا یہ ہے کہ جب آپ پرنس سیمرا کے ہاں سے رخصت ہوئے تو وہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"بالکل" اس نے بلاتامل جواب دیا "بس اس کا موڈ ٹھیک نہیں تھا اور اس کا رویہ دیکھ کر میرا اپنا موڈ بھی کچھ ٹھیک نہیں رہا تھا۔ وہ کچھ زیادہ ہی مغرور، تنک چڑھی اور اپنے سامنے کسی دوسرے کو کچھ نہ سمجھنے والی عورت تھی۔ مجھے اس سے مل کر سخت مایوسی ہوئی۔ اتنی خوب صورت عورت اتنی بیزار کن بھی ہوسکتی تھی، یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا لیکن بہرحال... میری مایوسی کا اس کی موت سے کوئی تعلق نہیں۔ میں نے یہ ایک لمحے کے لیے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مرجائے۔"

"اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود وہ ایک فرم میں آپ کی پارٹنر تھی!"

"پارٹنر کیا تھی جناب...!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "بس ہمارے پلے پڑگئی تھی۔ یوں سمجھیں کہ پرنس سعید کی طرف سے گویا ہمیں ورثے میں مل گئی تھی۔"

"آپ اسے ذاتی طور پر نہیں جانتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر میں اسے جانتا ہوتا تو کبھی بھول کر بھی اپنے کسی کاروبار کا پارٹنر نہ بناتا۔ وہ ایک قطعی غیر کاروباری عورت تھی۔ صرف اس کا مقدر بہت اچھا تھا کہ اسے وراثت میں اور دوسرے ذرائع سے اتنی دولت مل گئی تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ان لوگوں میں سے تھی جو سونے کا چمچہ بلکہ کفگیر منہ میں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔"

"گویا آپ کی یہ ملاقات خاصی ناخوشگوار اور ناکام رہی؟"

"میں اس کے پاس امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے کچھ کاغذات سائن کروانے گیا تھا تاکہ اس کے مسائل حل کرنے اور کمپنی کو دوبارہ کھولنے کے سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوسکے لیکن ان مسائل پر کوئی بات ہی نہیں ہوسکی۔ اس سے پہلے ایک دو دن سے فون پر کافی بات چیت ہوتی رہی تھی۔ بہرحال اس ملاقات میں اس نے شروع میں ہی مجھ پر بگڑنا شروع کردیا کہ میں تمام معاملات کو بگاڑنے کے بعد اس کے پاس آیا تھا۔ اس کی باتوں پر مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے سوچا بھاڑ میں جائے سب کچھ... جو ہوگا، دیکھا جائے گا۔ حالانکہ کاروبار میں بہت سی باتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں لیکن اس کے طور طریقوں کو برداشت کرنا پھر بھی بہت مشکل تھا۔ آپ اس ملاقات کے اختصار اور اس کی ناگواری کا اندازہ اس بات سے لگالیں کہ میں نے وہاں ایک گھونٹ پانی بھی نہیں پیا۔"

"کمال آپ کے ساتھ تھا؟" میں نے روبوٹ کی طرح کھڑے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ یہ باہر گاڑی میں ہی رہا تھا اور گاڑی گیٹ پر ہی کھڑی رہی تھی" اس نے جواب دیا۔

"پرنس سعید سے تو بہرحال آپ اچھی طرح واقف تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں انہیں ذاتی سطح پر بالکل نہیں جانتا تھا" اس نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا۔ "میرا ان سے کاروباری تعلق تھا اور میں کاروباری طور پر انہیں بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ نہایت اچھے اور کامیاب کاروباری انسان تھے۔ ان کی دیگر خصوصیات کا مجھے کچھ زیادہ علم نہیں۔ صرف امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن میں وہ ہمارے پارٹنر تھے۔ اس کے علاوہ میری کمپنی "جے کے انٹرپرائزز" نے ان کی پرنس انڈسٹریز کے لیے کچھ خدمات انجام دی تھیں البتہ ہمارے ایک دوست ہیں جمال سعیدی..."

"جو کچھ دیر پہلے یہاں سے رخصت ہوئے ہیں" میں نے جلدی سے کہا۔

"آپ انہیں پہچانتے ہیں؟" اس کی آنکھیں ذرا پھیلیں۔

"جی ہاں... اور غائبانہ طور پر جانتا بھی ہوں۔ ان کا ہیڈ آفس ... سوسائٹی میں ہے..." میں نے مکمل ایڈریس بتادیا۔

"آپ بہت باخبر آدمی ہیں افضل صاحب!" وہ گہری سانس لے کر بولا "بہرحال... میں یہ بتانے لگا تھا کہ جمال سعیدی، پرنس انڈسٹریز کے سب سے بڑے ڈیلر ہیں۔ ان کا پرنس انڈسٹریز سے بہت گہرا کاروباری تعلق ہے اور وہ مرحوم پرنس سعید کو ذاتی طور پر بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے جبکہ میرا جمال سعیدی سے بہت گہرا کاروباری اور ذاتی تعلق ہے۔ چنانچہ یوں سمجھ لیں کہ یہ واقفیت، شناسائی اور کاروباری و ذاتی تعلق کی ایک مثلث سی بنی ہوئی تھی جن میں سے ایک فریق اب نہیں رہا۔ پرنس سیمرا زندہ بھی رہتی تو شاید اس کی جگہ نہ لے پاتی۔ وہ پرنس سعید کا متبادل ہرگز نہیں بن سکتی تھی۔ مجھے اب اس کاروباری ایمپائر کا مستقبل مخدوش نظر آتا ہے۔"

ایک لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد وہ سر جھٹک کر بولا "خیر۔۔۔ جس معاملے میں ہم کچھ نہیں کرسکتے اس کے بارے میں سوچنا ہی فضول ہے۔ میں تو اس معاملے کی بات کرنا چاہتا تھا جس کے سلسلے میں کچھ کیا جاسکتا ہے۔ یعنی آپ کچھ کرسکتے ہیں۔"

"میں۔۔۔؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔۔۔ آپ۔۔۔" وہ زور دے کر بولا "آپ بے پناہ سمجھ دار آدمی ہیں۔ آپ کو یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ ہم باحیثیت لوگ ہیں۔ میں چاہتا ہوں' آپ ہمارے لیے بھی کچھ خدمات انجام دیں۔ ہماری بھی نمائندگی کریں۔ عدالتوں میں۔۔۔ یا عدالتوں سے باہر۔۔۔ جہاں کہیں بھی ہماری نمائندگی اور ہمارے مفادات کی حفاظت کی ضرورت پڑے وہاں آپ ہمارے لئے کام کریں۔ ہم اس قابل ہیں کہ آپ جیسے آدمی کے شایانِ شان معاوضہ ادا کرسکیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا "بلکہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو کچھ ایڈوانس وغیرہ کی بات بھی ہوسکتی ہے۔ یہی نہیں' ہم آگے چل کر آپ کے تجویز کردہ اچھے کاروباری منصوبوں میں انوسٹمنٹ بھی کرسکتے ہیں۔"

"آپ اتنے مہذب' گول مول اور شکر میں لپٹے لفظوں میں کیوں بات کررہے ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "صاف سیدھے اور کھردرے الفاظ میں بات کیجئے نا۔۔۔ آپ میری قیمت جاننا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔ ہرگز نہیں" اس نے پُرزور لہجے میں تردید کی "ہم ایسی بے ہودہ بات کیسے کرسکتے ہیں۔ ہم تو چاہ رہے ہیں کہ آپ جیسا کارآمد آدمی ہمارے قریب آجائے۔ ہم اسے اپنے ساتھیوں' اپنے بہی خواہوں میں شمار کرنے لگیں۔ ہم آپ کو خریدنے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

"میں بے قیمت آدمی ہوں۔ کسی اچھے مقصد کے لیے بے دام بھی بِک جاتا ہوں۔"

"انمول کہئے" اس نے گویا تصحیح کی "لفظوں کی معمولی تبدیلی سے بڑا فرق پڑجاتا ہے۔"

"درست ہے" میں نے تسلیم کیا "آپ میرے لیے اچھے الفاظ استعمال کررہے ہیں' اسے میں آپ کا حسنِ ظن سمجھ لیتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں کچھ اور لوگوں کی نمائندگی کررہا ہوں۔ ان کے مفادات کی حفاظت کررہا ہوں۔ میرے خیال میں وہ میری ہمدردی اور کوششوں کے زیادہ مستحق ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آگے چل کر آپ کے اور ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکرا جائیں۔ اس صورت میں دو کشتیوں کا سوار ہونا میرے لیے اچھا نہیں رہے گا۔ اس لیے بہتر ہے مجھے ایک طرف ہی رہنے دیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے دولت یا اچھی پیشکش سے دلچسپی نہیں ہے۔ میں خاصی حد تک دنیا دار اور گناہ گار سا ہی آدمی ہوں۔ میں دنیاوی چیزوں سے بے نیاز نہیں ہوں لیکن میں بے اصول بھی نہیں ہوں۔"

"بہت خوب۔۔۔ بہت خوب! مجھے آپ سے اسی جواب کی توقع تھی۔" وہ جوش سے بولا۔ اس کا چہرہ واقعی کسی دلی مسرت سے جگمگاتا سا دکھائی دینے لگا۔ کمبخت کو ایکٹنگ کا بھی خاصا سلیقہ تھا۔ پھر وہ بڑے مان سے بولا "بہرحال آپ کو ایک بات کا تو وعدہ کرنا ہوگا۔"

"کس بات کا؟" میں نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"خفیہ ایجنسی کو یہ بات معلوم نہیں ہونی چاہیے کہ جس رات پرنس سیمرا قتل ہوئی اس رات میں اس سے ملنے گیا تھا" پھر وہ جلدی سے صفائی پیش کرنے والے انداز میں بولا "مجھے اس سلسلے میں کوئی خوف نہیں ہے اور نہ ہی میرے دل میں کوئی چور ہے۔ اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں آپ کے سامنے بھی اس بات کا اعتراف نہ کرتا۔۔۔ لیکن میں چاہتا ہوں کہ ان دنوں غیر ضروری اُلجھنوں سے بچا رہوں تو اچھا ہے۔"

"میں آپ سے اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کرسکتا جمشید صاحب!" میں نے نہایت صاف گوئی۔۔۔ بلکہ کسی حد تک رکھائی سے کہا۔

میرا خیال تھا کہ کم از کم اس بات پر تو اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوں گے لیکن وہ تو گویا آج خوش مزاجی اور کشادہ دلی کے تمام ریکارڈ توڑنے پر تلا ہوا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ جوش و خروش سے بولا "بہ خدا مجھے آپ کی یہ ادا اور بھی زیادہ پسند آئی۔ یہ صاف گوئی۔۔۔ یہ بے نیازی۔۔۔ یہ دیانت داری۔۔۔! آپ واقعی ایک کمیاب آدمی ہیں۔۔۔ اور ہمیں کمیاب آدمیوں کی تلاش رہتی ہے۔ میں سمجھتا تھا اس طرح کی خصوصیات رکھنے والے لوگ اب ناپید ہوچکے ہیں لیکن آج مجھے ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ افضل صاحب! آپ چاہے مانیں یا نہ مانیں۔۔۔ آپ فی الحال آمادگی ظاہر کریں یا نہ کریں۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک نہ ایک روز ہم ضرور اکٹھے کسی پراجیکٹ پر کام کریں گے۔ کسی بہت بڑے پراجیکٹ پر۔ تم کے ساتھ کام کرتے ہوئے یقیناً بزنس بھی باعثِ راحت بن جائے گا۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ایک طویل عرصے سے مجھے اتنی عمدگی سے مکھن نہیں لگایا گیا تھا۔ میرے خیال میں وہ اس بات کا مستحق ہوچکا تھا کہ میں اس کے سامنے تھوڑی بہت نرمی کا مظاہرہ کرتا۔ آخر وہ بے چارہ اتنی محنت کررہا تھا۔ میں نے گویا اس کی "قدردانی" سے معمولی سا متاثر ہوتے ہوئے ذرا کم رکھائی سے کہا "میں اپنی حد تک تو وعدہ کرسکتا ہوں کہ میرے ذریعے سے یہ بات خفیہ ایجنسی تک نہیں پہنچے گی کہ پرنس سیمرا کے قتل ہونے سے تھوڑی دیر پہلے تک آپ اس کے پاس موجود تھے۔۔۔ لیکن اگر کسی اور ذریعے سے یہ بات ان تک پہنچ گئی تو میں اس کا ذمہ دار نہیں ہو سکتا۔"

"اور کسے یہ بات معلوم ہوسکتی ہے؟" اس کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں۔

"جب مجھے معلوم ہوسکتی ہے تو کسی اور کو بھی معلوم ہوسکتی ہے۔" میں نے جواب دیا "بلکہ عین ممکن ہے مجھے بھی کسی اور ہی ذریعے سے معلوم ہوئی ہو۔ میں خود تو وہاں موجود نہیں تھا۔"

وہ ایک بار پھر پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ اس کا ذہن یقیناً تیزی سے کام کررہا تھا اور وہ اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ ایسا دوسرا ذریعہ کیا ہوسکتا تھا؟ مجھے اُمید تھی کہ جلد ہی اس کا ذہن اس امکان کی طرف چلا جائے گا کہ وہ دوسرا زاویہ کامران ہوسکتا تھا جس کے بارے میں اخبارات میں آچکا تھا کہ قتل کی رات وہ پرنس کے ہاں موجود تھا اور فی الحال پولیس کے تمام تر شبہات کا مرکز وہی تھا۔ جمشید سوچ سکتا تھا کہ وہ تو یہی سمجھ رہا تھا جب پرنس سے اس کی ناگوار سی گفت و شنید جاری تھی تو ان دونوں کے سوا گھر میں کوئی موجود نہیں تھا۔ لیکن عین ممکن تھا کہ کامران کسی خفیہ گوشے میں۔۔۔ کسی کونے کھدرے میں موجود رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی جمشید کا ذہن اس امکان کی طرف بھی جاسکتا تھا کہ شاید میرا اب بھی کسی نہ کسی انداز میں کامران سے رابطہ تھا جس کی حیثیت فی الحال ایک روپوش ملزم کی تھی۔ یہ خیال آنے کے بعد جمشید میرے سلسلے میں بھی کچھ مشکوک ہوسکتا تھا۔ اور میں یہی چاہتا تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ کمال نے جلدی سے آگے بڑھ کر میز سے فون اُٹھا کر کچھ سنا پھر صرف "اچھا" کہہ کر کارڈلیس فون لاکر جمشید کو تھما دیا۔ جمشید بھی "ہیلو" کہنے کے بعد چند لمحے خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا "ہاں۔۔۔ میں نے فون تو کیا تھا۔ لیکن تم کچھ دیر بعد آؤ۔ ابھی میں ذرا مصروف ہوں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ایک میٹنگ چل رہی ہے۔ بس میرا خیال ہے پانچ دس منٹ کی بات ہے۔ ٹھیک ہے" اس نے سوئچ آف کرکے فون کمال کو دے دیا جو اس نے واپس میز پہ لے جاکر رکھ دیا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں ہوسکا کہ فون کس کا تھا۔ دورانِ گفتگو اس نے کوئی نام نہیں لیا۔

"میرا خیال ہے بہت باتیں ہوچکیں۔ اب مجھے چلنا چاہیے" میں نے اٹھنے کے لیے پر تولتے ہوئے کہا۔

وہ گویا سوچوں کے بھنور سے نکل آیا اور اس کے چہرے پر پہلی سی تب و تاب لوٹ آئی "آپ سے ملاقات کا تجربہ نہایت خوشگوار رہا مسٹر افضل! آپ میری پیش کش پر ضرور غور کیجئے گا۔ ہم کسی بڑے پراجیکٹ پر ضرور کام کرسکتے ہیں۔ میرے ساتھ کام کرکے آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔ پرنس سعید جیسا کاروباری جینئس ہی مجھ سے کاروباری تعلق استوار کرنے کے بعد خوش ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں نے اپنی جو چھوٹی سی ایمپائر تعمیر کی ہے۔۔۔ ظاہر ہے یونہی نہیں بن گئی۔ اپنے والدین سے تو مجھے ورثے میں ذہن کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔"

اس نے باقاعدہ کنپٹی پر انگلی مار کر گویا مجھے سمجھایا کہ ذہن کہاں تھا۔ شاید اس کے خیال میں' میں ذہن کے محلِ وقوع کے بارے میں غلط فہمی کا شکار بھی ہوسکتا تھا۔

"یعنی آپ کے خیال میں آپ کی ایمپائر صرف آپ کی ذہانت اور ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ظاہر ہے" وہ انگریزی میں بولا "اور آپ کے خیال میں آپ کی ایمپائر کس طرح وجود میں آئی ہے؟"

"معلوم نہیں" میں نے دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے سادگی سے کہا "مجھے تو کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ شاید یہ اوپر والے کی مرضی تھی" میں نے درویشانہ انداز میں چھت کی طرف انگلی اُٹھائی۔ وہ عجیب سے انداز میں میری طرف دیکھ کر رہ گیا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ مجھے چھوڑنے باہر تک آیا۔ کمال ہمارے پیچھے پیچھے تھا۔ میں نے ہال وغیرہ میں نظر دوڑائی لیکن غزل مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ جمشید اور کمال مجھے استقبالیہ تک چھوڑنے آئے۔ ریسپشنسٹ لڑکی اس وقت اپنے ناخنوں پر پالش لگا رہی تھی۔ اپنے باس وغیرہ کو دیکھ کر اس نے ہڑبڑا کر شیشی کاؤنٹر کے نیچے رکھ دی اور مؤدب ہو کر بیٹھ گئی۔ جمشید اور کمال اس کی طرف دیکھے بغیر وہیں سے واپس ہولیے۔

باہر آکر میں اپنی گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اسے ریورس کررہا تھا

کہ میں نے چھوٹی سی ایک اسپورٹس کار کو گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ کھلی چھت کی اس گاڑی میں پرنس سیمرا کے منگیتر سندر منیر کو دیکھ کر مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ موبائل فون اس کے کان سے لگا ہوا تھا اور وہ ایک ہاتھ سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں اپنی گاڑی میں دبک سا گیا لیکن اس نے میری طرف دیکھا ہی نہیں۔ وہ فون پر بڑے انہماک سے معروفِ گفتگو تھا۔

گاڑی اس نے جمشید کی عمارت کے قریب ہی پارکنگ کی جگہ میں روکی اور فون بند کر کے جیب میں ڈال کر اندر چلا گیا۔ شاید چند منٹ پہلے اسی نے کہیں قریب ہی سے جمشید کو فون کیا تھا۔ میں یہی سوچتا ہوا وہاں سے رخصت ہوا کہ آخر اسے جمشید سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ بلکہ فون پر جمشید کے اندازِ گفتگو سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے درمیان کافی پرانی شناسائی اور میل ملاقات تھی۔ یہ بھی ایک نیا اور قابلِ غور نکتہ سامنے آیا تھا۔

دفعتاً میری نظر عقب نما آئینے پر پڑی۔ ڈیفنس کے سن سیٹ بلیوارڈ پر اس وقت ٹریفک برائے نام تھا۔ ایک سیاہ ہنڈا اکارڈ میرے پیچھے چلی آرہی تھی۔ مجھے کوئی خاص تدبیر کیے بغیر چند لمحے بعد ہی یقین ہو گیا کہ وہ میرا تعاقب کر رہی تھی۔ وہ رنگین شیشوں کی گاڑی تھی۔ اس کے باوجود مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کی جھلک نظر آگئی۔ وہ انسان کم اور نیولا زیادہ معلوم ہو رہا تھا۔

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے راستہ بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ میں کسی ایسی جگہ نہیں جا رہا تھا جسے میں راز رکھنے کی کوشش کرتا۔ میں ہوٹل واپس جا رہا تھا اور میرا وہ ٹھکانا کچھ ایسا خفیہ نہیں تھا۔ وہ سیاہ اکارڈ ہوٹل کے ڈرائیو وے تک میرے تعاقب میں رہی۔ میں نے یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ وہیں رُکی رہی تھی یا واپس چلی گئی تھی۔

میں سیدھا اپنے آفس میں چلا گیا اور ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرنے کے بعد میں نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ نفیس صاحب کی ہاٹ لائن پر ان سے رابطہ کیا۔ وہ یوں تو صرف ایک اہم ترین خفیہ ایجنسی کے سربراہ تھے لیکن مجھے کسی بھی ... ایجنسی سے خاص اور خفیہ معلومات کی ضرورت ہوتی تو وہ مجھے فراہم کرسکتے تھے۔

ہاٹ لائن پر وہ مل گئے اور ان کی آواز سُن کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ان کا موڈ بھی خوش گوار لگ رہا تھا "بہت دن بعد یاد کیا.... اور وہ بھی ہاٹ لائن پر...." وہ شگفتہ لہجے میں بولے "لگتا ہے بہت دن بعد مجھ سے کوئی کام پڑا ہے۔"

"آپ بالکل صحیح سمجھے" میں نے ہنس کر کہا "کراچی کی ایک فرم ہے.... امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن.... مجھے پتا چلا ہے کہ ایف آئی اے اس کے بارے میں تحقیقات کر رہی ہے۔ اگر معلوم ہوسکے کہ تحقیقات کی نوعیت کیا ہے تو بہت اچھا ہو۔"

"مجھے ذرا معلوم کرنا پڑے گا کہ یہ کس ریجن کا کیس ہے اور فائل کس کے پاس ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے "تم ایسا کرو کہ آدھ گھنٹے بعد مجھے فون کرو۔"

میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ آدھے گھنٹے بعد میں نے دوبارہ فون کیا تو وہ بڑے سنجیدہ اور بوجھل لہجے میں بولا "جس نمبر سے تم بات کر رہے ہو یہ بالکل محفوظ ہے نا؟"

"میری معلومات کے مطابق تو محفوظ ہی ہے۔" میں نے خوش گوار لہجے میں کہا "کبھی ٹیپ وغیرہ کرنے کا بندوبست ہوگا تو وہ آپ ہی لوگوں کی طرف سے ہوگا۔"

"خدا نہ کرے کہ یہ نوبت آئے" وہ بولے پھر ان کی آواز کچھ دھیمی ہوگئی۔

"اچھا سُنو۔ ایف آئی اے نے تو بعض شکایات کی بنیاد پر اس فرم کے صرف مالی معاملات کی چھان بین شروع کی تھی.... لیکن کچھ ایسے شواہد سامنے آئے ہیں کہ ایک خفیہ ایجنسی بھی اس کی طرف متوجہ ہوگئی ہے۔ یہ بہت بڑی اور کئی شکلوں میں بزنس کرنے والی فرم ہے لیکن شبہ پایا جا رہا ہے کہ یہ جائز اور قانونی بزنس کے ساتھ ساتھ اسلحے کی تجارت اور اس کی انڈر گراؤنڈ مارکیٹنگ میں بھی ملوث ہے۔"

"اسلحے کی انڈر گراؤنڈ مارکیٹنگ....؟" میں نے دُہرایا اور نہ جانے کیوں میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

"فی الحال یہ ٹاپ سیکرٹ ہے" نفیس صاحب خبردار کرنے والے انداز میں بولے "تمہاری زبان سے یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہونی چاہیے۔"

"آپ کو معلوم ہے قومی رازوں کی حفاظت میرا ایمان ہے" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو ہم ایسی باتیں تمہیں بتا بھی دیتے ہیں۔ اب تم بتاؤ۔ تم کس چکر میں ہو؟ کہیں تمہیں خفیہ ایجنسیوں سے پہلے تو کچھ سن گن نہیں مل گئی؟" انہوں نے پوچھا۔

"یہ میں آپ کو ابھی نہیں، مناسب وقت آنے پر بتاؤں گا" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

فون بند کرنے کے بعد بھی میں کافی دیر تک ساکت بیٹھا رہا۔ ...صاحب نے اسلحے کی انڈر گراؤنڈ مارکیٹنگ کے بارے میں ...رے اندیشوں کی تصدیق کردی تھی۔ میں پہلے ہی محسوس ...تھا کہ پرنس سیمرا کے قتل کے معاملے کو چھیڑنا میرے لیے ...لف قسم کا تجربہ ثابت ہونے والا تھا۔ یہ محض ایک خوب ...عورت کے قتل کا معاملہ نہیں تھا۔ ایک کڑی سے دوسری ...جڑی ہوئی تھی۔ زنجیر بہت طویل معلوم ہوتی تھی اور فی الحال ...ی ہوئی بھی تھی۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا دوسرا سرا ...تھا۔ یوں تو زندگی مجھے ہمیشہ ایک نئے اور انوکھے تجربے سے ...چار کرتی تھی جو میرے سابقہ تجربات سے بہت مختلف ہوتا تھا ...س بار بالکل ہی مختلف تجربات کا دروازہ کھلتا دکھائی دے رہا ...باز کی طرح ایک واقعے کے نیچے دوسرے واقعے کی پرت ...تھی اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سلسلہ کہاں جاکر ...گا لیکن اب جبکہ میں اس معاملے میں ہاتھ ڈال چکا تھا تو اس ...تک پہنچے بغیر مجھے چین بھی نہیں آسکتا تھا۔ میں اب اس سے ...یں کھینچ سکتا تھا۔

...کچھ دیر تک ان معاملات پر غور کرتے رہنے کے بعد میں اُٹھ ...وا۔ آفس سے نکل کر میں ہوٹل کے بڑے دروازے پر آیا۔ ...کے سے انداز میں پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے ...کے سامنے چند قدم ایک طرف کو جاکر میں نے ڈرائیو وے ...پر ڈالی۔ اب وہ سیاہ ہنڈا ایکارڈ وہاں نہیں تھی اور نہ ہی وہ ...شخص کہیں نظر آرہا تھا جو اسے ڈرائیو کر رہا تھا۔ وہ گاڑی ...تک میرے تعاقب میں آئی تھی لیکن اب جا چکی تھی۔ میں ...سے قاصر تھا کہ یہاں تک میرے تعاقب کا مقصد کیا تھا۔

...میرے اندازے کے مطابق وہ جمشید کریم کا آدمی تھا۔ کیا وہ ...میرا ٹھکانا دیکھنے آیا تھا؟ لیکن جمشید کریم کو تو معلوم تھا کہ میں ...تھا۔ اسے میری کاروباری حیثیت کا علم تھا۔ یہ بھی معلوم تھا ...فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک تھا۔ میرے بارے میں وہ جتنا کچھ ...ور سمجھتا تھا اس کے بعد یہ جاننا اس کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ...میرے ٹھکانے کون کون سے ہوسکتے تھے۔ کہیں وہ نیولا نما ...کسی اور کا کارندہ تو نہیں تھا؟ لیکن یہ نکتہ بھی قابلِ غور تھا کہ ...اس وقت سے میرے پیچھے لگا تھا جب میں جمشید کے آفس سے ...تھا۔ اس سے پہلے میرا تعاقب نہیں ہو رہا تھا۔ میں اس معاملے ...پر سوچتا ہی رہتا تھا۔

...بالآخر میں نے اس نیولا نما شخص کا تصور ذہن سے جھٹک ...دیا اور فیصلہ کیا کہ اگر وہ آئندہ نظر آیا تب اس کے بارے ...میں سوچوں گا کہ اس کی اصلیت معلوم کرنے کی کوشش کرنی ...چاہیے یا نہیں؟ یہ فیصلہ کرنے کے بعد میں ٹہلنے کے سے انداز میں ...ہوا اپنے آفس میں واپس آگیا۔ میں نے اپنے آپ کو مختلف ...کاموں میں اُلجھا لیا۔

اس کے بعد میرے دو دن مصروفیات میں ہی گزرے۔ دفتری اور غیر دفتری، دونوں قسم کی مصروفیات ہی جاری رہیں۔ میں اپنے طور پر کچھ معلومات جمع کرنے میں مصروف رہا۔ مجھے کامران کے بارے میں بھی تشویش تھی۔ وہ بدستور غائب تھا۔ میں نے "دی سرکل" کے ان چند خاص خاص لوگوں کو، جو کراچی میں موجود تھے اس کی تلاش میں لگایا۔ شفیع شاہ بھی ان میں شامل تھا۔

کراچی بے شک بہت بڑا شہر تھا، انسانوں کا ایک سمندر اور عمارتوں کا ایک بیکراں جنگل تھا لیکن "دی سرکل" کے لوگ بھی کسی کو ڈھونڈنے کے معاملے میں ناقابلِ یقین صلاحیتوں کے مالک تھے۔ کامران کو ڈھونڈنا انگریزی محاورے کے مطابق گھاس پھونس کے انبار میں سُوئی ڈھونڈنے کے مترادف سہی.... لیکن وہ لوگ اس قسم کی ناممکنات کو ممکن بنانے کی بڑی حد تک صلاحیت رکھتے تھے۔ کامران کے بارے میں تو پھر بھی کئی سُراغ موجود تھے۔ اس سے پہلے ایک آدھ مرتبہ انہوں نے ایسے افراد کو بھی ڈھونڈا تھا جن کے صرف نام اور شکل صورت کی زبانی تفصیل کے سوا انہیں کچھ معلوم نہیں تھا لیکن کامران کے سلسلے میں ابھی تک ناکامی کی رپورٹیں ہی مل رہی تھیں تاہم ابھی انہیں صرف دو ہی دن ہوئے تھے اس لیے میں مایوس نہیں تھا۔

پرنس سیمرا کے قتل کی تفتیش نہایت سست روی سے آگے بڑھ رہی تھی بلکہ شاید یہ کہنا ہی کچھ زیادہ صحیح نہیں تھا کہ وہ آگے

بڑھ رہی تھی۔ ابھی شاید تفتیش وہیں اٹکی ہوئی تھی جہاں پہلے دن تھی۔ پولیس وغیرہ نے کچھ اور لوگوں سے پوچھ گچھ ضرور کی تھی لیکن یہ بھی گویا رسمی کارروائی ہی رہی تھی۔ اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا۔ بات وہیں کی وہیں رہی تھی۔

درحقیقت پرنس سیمرا کے معاملے میں پولیس جس پر بھی ہاتھ ڈالتی تھی وہ کوئی چھوٹا موٹا پھنّے خاں ہی نکلتا تھا اور کسی کے خلاف ابھی تک کوئی ٹھوس ثبوت بھی سامنے نہیں آیا تھا اس لیے پولیس اندھا دھند کسی کو نہیں رگڑ رہی تھی۔ خلافِ توقع اس ضمن میں پولیس پر کوئی خاص دباؤ بھی نہیں پڑا تھا اس لیے اس نے بہترین کارکردگی دکھانے کے چکر میں کسی جلد بازی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

سیمرا کے ملازموں کی خوش قسمتی تھی کہ ان میں سے کوئی اس کے اسٹوڈیو والے بنگلے پر تعینات نہیں تھا ورنہ مالک یا مالکن کے ہاں چوری یا اس کے قتل کی واردات میں بے چارے ملازمین کی بھی خاصی شامت آتی ہے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ پولیس ان میں سے کسی کو پکڑ کر رگڑ دیتی اور وہ بے چارہ چمڑی اُتروانے سے پہلے ہی... یا پھر چمڑی اُتروانے کے بعد قربانی کا بکرا بننے پر رضامند ہو جاتا اور یہ پھندا اپنے گلے میں ڈال لیتا... لیکن اس ضمن میں ایک اچھی بات یہ بھی تھی کہ یہ کیس رحیم گل کے ہاتھ میں تھا اور وہ ان ہتھکنڈوں کا قائل نہیں تھا ورنہ وہ پرنس سیمرا کے رہائشی بنگلے سے بھی کسی ملازم کو اس تفتیش میں گھسیٹ سکتا تھا اور اس کی پتلی گردن میں پھندا فٹ کر سکتا تھا۔ گھریلو نوکروں وغیرہ کی گردن اگر دیکھنے میں موٹی بھی ہو تب بھی پولیس والوں کی نظر میں شاید وہ پتلی ہی ہوتی ہے۔

پرنس سیمرا کے والد پرنس سعید اگر زندہ ہوتے تو شاید پولیس پر اس سلسلے میں بڑا دباؤ ہوتا۔ صحیح معنوں میں کوئی سرپرست یا وارث نہ ہونے کی وجہ سے پولیس پر دباؤ نہیں پڑا تھا۔ صفدر منیر اپنی سی کوشش کر رہا تھا لیکن اس معاملے میں اس کی اپنی پوزیشن کچھ ایسی قابلِ رشک نہیں تھی۔

پرنس کا بہنوئی احمد پرویز خاصی توپ قسم کی چیز تھا۔ وہ واقعی کافی اثر رسوخ والا آدمی تھا۔ وہ چاہتا تو پولیس پر دباؤ بڑھا سکتا تھا لیکن اس قتل سے اس کی اپنی پوزیشن کافی مشکوک ہو گئی تھی۔ پرنس کی فطری یا غیر فطری موت کی صورت میں اس کی وراثت بھی احمد پرویز کی بیوی واجدہ پرویز کو منتقل ہونی تھی۔ وہ پرنس سیمرا کی بڑی بہن تھی۔ بے پناہ دولت مند ہونے اور ایک دولت مند وشاطر آدمی کی بیوی ہونے کے باوجود وہ ایک سیدھی سادی اور گھریلو سی عورت تھی اس لیے اس کی دولت اور اثاثوں میں اضافہ ہونے کا مطلب بھی درحقیقت احمد پرویز ہی کی دولت اور اثاثوں میں اضافہ ہوتا تھا۔

یوں پرنس سیمرا کا قتل خود اسے خاصا مشکوک بناتا تھا۔ اگر وہ کوئی چھوٹا موٹا آدمی ہوتا تو اس قسم کے حالات میں خود پولیس کی زیرِ تفتیش آ جاتا اور اس کے لیے اپنی گردن بچانا مشکل ہو جاتا گو کہ رحیم گل بذاتِ خود بہت بڑا "پھڈے باز" آدمی تھا۔ وہ اگر ضرورت محسوس کرتا تھا تو بڑے بڑے پھنّے خانوں سے "پنگا" لینے سے باز نہیں رہتا تھا لیکن احمد پرویز پر اس نے بھی ابھی باضابطہ طور پر ہاتھ نہیں ڈالا تھا۔ اس سے سختی سے پوچھ گچھ ضروری تھی لیکن اس کی اکڑفوں کی پروا نہیں کی تھی۔ احمد پرویز جیسے آدمی کے لیے یہی سبق کافی تھا کہ انسپکٹر کے عہدے کا ایک آدمی اس کے ساتھ اس طرح پیش آ رہا تھا اور وہ اس کا تبادلہ تک نہیں کرا سکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ رحیم گل کو اگر اس کی خلاف ذرا سا بھی ثبوت مل گیا تو وہ اس پر ہاتھ ڈالنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کرے گا۔

بعض مشہور، دولت مند اور اہم شخصیات کے قتل کے سلسلے میں پولیس پر پریس کا بھی کافی دباؤ پڑ جاتا ہے۔ اخبارات جتنا اس معاملے کو اُچھالتے ہیں، پولیس ایک طرح کے نفسیاتی سے دباؤ میں آ جاتی ہے لیکن پرنس سیمرا کے معاملے میں صرف تین چار دن ایسا ہو سکا تھا۔ اس کے بعد شاید انہیں کچھ چٹپٹا مواد ہاتھ نہیں آ سکا تھا۔ قیاس آرائیاں وہ کہاں تک کرتے؟ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ زندگی بہت تیز رفتار تھی اور لمحوں کی تباہ کاریاں بہت جلد گئی تھیں۔ ہر گزرتا ہوا دن اپنے ساتھ نئے ہنگامے نئی سنسنی خیز خبریں لے کر آتا ہے جن کے سامنے ڈھیروں ڈھیر پرانی خبریں دب جاتی ہیں۔ شاید پرنس کے معاملے میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔

کامران کی البتہ پولیس کو بھی سرگرمی سے تلاش تھی اور اس تمام تر وسائل کے باوجود ابھی تک اسے بھی اس کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا جس کی وجہ سے میری تشویش کچھ بڑھ گئی تھی۔ وہ بے وقوف سا نوجوان تھا۔ اپنے آپ کو خواہ مخواہ مصیبت میں ڈالے ہوئے تھا۔ وہ نہ جانے کن علاقوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا یا کسی جگہ چھپا بیٹھا تھا۔ وہ کسی معقول جگہ پر تو نہیں ہو سکتا تھا اس لیے اسے بیسیوں قسم کے خطرات لاحق ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اس وقت اس کی ذات شبہات کی زد میں تھی۔ اگر وہ اصل قاتل کی نظر میں آ جاتا تو وہ بھی اس کا پتا صاف کر سکتا تھا۔ اس طرح کامران اپنی ذات پر شبہات کے داغ لیے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا۔ پولیس بھی ڈھیلی پڑ جاتی اور اس کو جلد از جلد داخلِ دفتر کرنے کی کوشش کرتی۔ یوں اصل قاتل ہمیشہ کے لیے نظر سے اوجھل رہنے میں کامیاب ہو سکتا تھا۔

ان سب امکانات کی طرف میری نظر تھی اور میں کسی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ میں یا میرے ساتھی کسی نہ کسی سمت میں کچھ نہ کچھ کر رہے تھے تاہم گزشتہ دو دنوں میں کوئی اہم بات سامنے نہیں آئی تھی۔ شفیع شاہ نے رپورٹ دی تھی کہ کامران دوبارہ اس مکان میں پناہ لینے نہیں پہنچا تھا جہاں وہ پہلے جا کر پناہ گزین ہوا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ مکان میری نظر میں آ چکا تھا اور یہ بھی

کہ اس مکان کا مالک... وہ غریب مزدور پیشہ آدمی تمام تر دوستی کشادہ دلی کے باوجود ڈر کے مارے کامران کو دوبارہ پناہ نہ دیتا۔

ان دو دنوں میں صفیہ نے بھی دو مرتبہ فون پر رابطہ کیا تھا۔ اس نے بھی یہی اطلاع دی تھی کہ اسے کامران کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں ملی تھی اور نہ ہی اس نے کسی ذریعے سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ اطلاع بھی تشویش میں اضافہ ہی کرنے والی تھی۔ میری معلومات کے مطابق کامران کے اتنے وسائل نہیں تھے کہ وہ اس طرح روپوش ہو سکتا۔ تاہم میرے خیال میں کسی حد تک باعثِ اطمینان بات یہ تھی کہ ابھی تک اس کے بارے میں کوئی بری خبر نہیں آئی تھی۔ وہ ایک بے وقوف سا نوجوان تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں اس سے ہمدردی ہو گئی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی بُرے انجام سے دوچار ہو۔

اس روز میں آفس میں بیٹھا تھا کہ امبر نے کوڑل کی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے اسے اندر بھیجنے کے لیے کہا تو چند لمحے بعد وہ اس عالم میں کمرے میں داخل ہوا کہ اس کی باچھیں پھیلی ہوئی تھیں اور آنکھیں چھوٹے چھوٹے برقی قمقموں کی طرح چمک رہی تھیں۔ مصافحہ کرتے وقت اس نے کچھ اس طرح میرا ہاتھ تھام کر رہا اور آنکھوں سے لگایا جیسے میں کوئی سیاسی یا غیر سیاسی پیر فقیر یا کوئی پہنچا ہوا بزرگ تھا۔

"خیریت تو ہے کوڑل جان...!" میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے قدرے حیرت سے کہا "یہ اتنی چاپلوسی کس سلسلے میں ہو رہی ہے؟ ابھی تو میں نے تمہیں کوئی وزیر وغیرہ بھی نہیں بنوایا۔"

"دفع کریں وزارت کو سائیں!" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "میں قناعت پسند آدمی ہوں۔ میرے چھوٹے موٹے کام ہو جاتے ہیں سائیں اسی میں خوش ہو جاتا ہوں۔ وزارت سفارت کی مجھے تمنا نہیں ہے۔"

"شکر ہے آج صبح ہی صبح کوئی قناعت پسند آدمی تو دیکھنے کو ملا ورنہ حالات تو کچھ ایسے جا رہے ہیں کہ پانچ دس برس بعد شاید کوئی قناعت پسند آدمی دیکھنے کے لیے کسی میوزیم وغیرہ میں جانا پڑے۔" میں نے ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "بہرحال... تم اپنی باچھیں کھلنے کی وجہ بیان کرو۔"

"سائیں! آپ نے تو کمال کر دیا! میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ خوشی کے مارے کیا کروں... بھنگڑا ڈالوں... ہو جمالو گاتے ہوئے ناچوں... خشک ڈانس کروں... یا صرف قلابازیاں کھانے تک محدود رہوں؟"

"تم فی الحال صرف اس کرسی تک محدود رہو جس پر بیٹھے ہو" میں نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر گویا اسے روکتے ہوئے کہا "یہ آفس ہے اور ان حرکات کے لیے قطعاً موزوں نہیں ہے جن کا تم نے ذکر کیا ہے۔ ان ثقافتی سرگرمیوں کے لیے پہلے تمہیں کوئی مناسب جگہ تلاش کرنی پڑے گی۔ سرِدست تم آرام سے بیٹھے بیٹھے یہ بتاؤ کہ میں نے کیا کمال کر دیا ہے؟ کیا میری وجہ سے کسی سیاست داں نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا ہے؟ کیا میری وجہ سے کسی بیوروکریٹ نے محنت سے کام کرنا شروع کر دیا ہے؟ کیا میری وجہ سے کسی سرکاری اہلکار نے رشوت کے بغیر کام کرنا شروع کر دیا؟ کیا میری وجہ سے کسی وزیر سفیر نے اس قوم کی خون پسینے کی کمائی کو تعیشات میں اُڑانا چھوڑ دیا؟"

"نہیں سائیں! ایسا تو کوئی واقعہ نہیں ہوا" وہ مایوسی سے بولا "اگر ہوا بھی ہوگا تو اخباروں اور فائلوں میں ہوا ہوگا۔"

"تو پھر کون سا کمال ہو گیا؟" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر پوچھا۔

وہ جیب سے ایک چیک نکال کر لہراتے ہوئے بولا "امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن نے مجھے تیس لاکھ کا چیک بھجوا دیا ہے۔ میرے لیے تو یہی بڑا کمال ہے سائیں! میں خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔"

"پاگل ہونے کا پروگرام تم فی الحال ملتوی رکھو" میں نے سنجیدگی سے مشورہ دیا "یہ بتاؤ کہ جس برانچ کا یہ چیک ہے وہاں سے تم نے کنفرم بھی کر لیا ہے یا نہیں کہ چیک کیش ہو جائے گا؟"

"جی سائیں!" وہ طمانیت سے مسکرایا "اسی لیے تو چیک ابھی تک میرے پاس ہی نظر آ رہا ہے۔ یہ کراس چیک ہے لیکن اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے سے پہلے میں دوڑا دوڑا اس برانچ میں گیا جہاں کا یہ ہے۔ وہاں سے میں نے تصدیق کی کہ یہ کیش ہو جائے گا یا نہیں۔ اس برانچ کے منیجر نے بڑی محبت اور شفقت سے مسکراتے ہوئے مجھے تسلی دی کہ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن والے یا تو کسی کو چیک ایشو نہیں کرتے... اور اگر کرتے ہیں تو وہ کیش ضرور ہوتا ہے۔ نیز یہ کہ اگر میں اس کمپنی کے ساتھ کاروبار کرتا رہا ہوں تو یہ بات مجھے معلوم ہونی چاہیے تھی۔ میں نے ذرا شرمندگی کے ساتھ عرض کیا کہ یہ بات مجھے معلوم تو تھی، پھر بھی دل کی تسلی کے لیے چلا آیا۔ اب میں اسے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے جا رہا ہوں۔ میں نے سوچا پہلے یہ خوش خبری آپ کو سُناتا چلوں۔"

سچی بات تو یہ تھی کہ یہ خبر خود میرے لیے بھی خاصی حیرت انگیز تھی۔ جمشید کریم نے واضح طور پر وعدہ نہیں کیا تھا کہ وہ کوڑل کو ادائیگی کر دے گا لیکن اس نے یہ کام کر دیا تھا اور وہ بھی اتنی جلدی۔ اس نے گویا اپنی طرف سے کشادہ دلی اور خیر سگالی کا مظاہرہ کیا تھا۔ تاہم میں نے کوڑل کے سامنے حیرت کا اظہار کرنے کے بجائے بے نیازی سے کہا "اس میں خوشی سے اتنا بے حال ہونے کی کیا بات ہے؟"

"مجھ جیسے چھوٹے بزنس مین کے لیے تو یہ بہت بڑی بات ہے سائیں!" وہ عاجزی سے بولا "میری سیکیورٹی کی رقم صرف بیس لاکھ تھی۔ مجھے تو اس کے ملنے کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ انہوں نے

تمیں لاکھ دے دیے ہیں یعنی ہرجانہ بھی ٹھیک ٹھاک ادا کردیا ہے۔ یہ تو میں نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ میں تو حیران پریشان ہوگیا ہوں سائیں!"

"اب اس حیرانی پریشانی میں تم کیا کرنا چاہتے ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"آپ نے ان کے ساتھ کیا کیا تھا سائیں!" اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے تجسس سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں... میں نے تو جاکر بس شرافت سے درخواست کی تھی۔ نہایت خوش گوار ماحول میں... کافی کے کپ اور وہسکی کے جام پر مذاکرات ہوئے تھے" پھر میں نے وضاحت کرنا بہتر سمجھا "کافی کا کپ میرا تھا... وہسکی کا جام جمشید کا... جو اس وقت امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن اور اس جیسی دوسری نہ جانے کن کن کمپنیوں کا کرتا دھرتا ہے۔"

"ایسی شرافت سے تو یہ کام ہونے والا نہیں تھا سائیں!" وہ سرہلاتے ہوئے مسکرایا۔ "آپ نے ان کو ضرور کوئی اچھا ڈوز دیا ہے۔ بڑے جلدی اور بڑا اچھا اثر ہوا ہے۔"

"چلو تم یہی سمجھ لو۔ تمہارا کام ہوگیا۔ تمہیں تو بس اس سے غرض رکھنی چاہیے۔ جاؤ اب عیش کرو۔ کیا یاد کروگے کہ کسی کام کے آدمی سے واسطہ پڑا تھا" میں نے فیاضی سے کہا۔

"ایسے تو نہیں جاؤں گا سائیں! میں اس لیے تو آپ کی خدمت میں حاضر نہیں ہوا ہوں" وہ معنی خیز سے انداز میں مسکرایا "سیٹھ رمضان نے جب مجھے آپ کے پاس بھیجا تھا تو خبردار کردیا تھا کہ آپ سے کام کرانا کافی منگا ثابت ہوسکتا تھا لیکن جتنا انہوں نے اندازہ کیا تھا میں اس سے چار پانچ گنا زیادہ خرچ برداشت کرنے کے لیے بہ خوشی تیار ہوں۔ بالکل غیر متوقع طور پر یہ چیک ملنے کے بعد میرا کچھ کچھ حاتم طائی بننے کا موڈ ہورہا ہے۔"

"میں تو تم سے پہلے ہی یہ موڈ بنائے بیٹھا ہوں۔ جاؤ میں نے تمہیں فیس معاف کی" میں نے فیاضی سے کہا۔

"یہ نہیں ہوسکتا سائیں!" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا "میں نے آپ سے پہلے ہی کہا ہے کہ مجھے تو اپنی اصل رقم یعنی بیس لاکھ بھی ملنے کی کوئی اُمید نہیں تھی جبکہ مجھے اس کے علاوہ بھی دس لاکھ روپیا مل گیا ہے۔ وہ دس لاکھ روپیا میں آپ کی نذر کرتا ہوں۔ مجھے اپنے نقصان کا ہرجانہ نہیں چاہیے۔ میں سمجھوں گا میرا کوئی نقصان نہیں ہوا۔"

وہ واقعی ذرا مختلف قسم کا بزنس مین معلوم ہوتا تھا ورنہ زیادہ تر تو اسی قسم کے بزنس مین دیکھنے میں آتے تھے جن کے ہاتھ میں اگر پرایا روپیا بھی آجاتا تھا تو ان کا وہ بھی لوٹانے کو دل نہیں چاہتا تھا اور وہ ایسی ادائیگیاں بھی رو پیٹ کر یا بادلِ ناخواستہ کرتے تھے جو ان کے ذمے ہوتی تھیں یا جن کا انہوں نے وعدہ کر رکھا ہوتا تھا... اور ایک یہ شخص تھا جس سے میری کوئی باضابطہ بات چیت ہی نہیں ہوئی تھی' ابھی چیک اس کے اکاؤنٹ میں کریڈٹ بھی نہیں ہوا تھا اور وہ مجھ سے میرا مطالبہ پوچھے بغیر مجھے اتنی ادائیگی کرنے پر تُلا ہوا تھا جس کے بارے میں' میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ ابھی میں نے اس موضوع پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ اگر مجھے اس سے کچھ لینا پڑا تو کیا لوں گا؟ میرا کوئی طے شدہ حساب کتاب تو تھا نہیں۔ تاہم آثار بتاتے تھے کہ یہ مشغلہ میرے لیے کافی منافع بخش ثابت ہوسکتا تھا۔ اگر کامران اور منیر جیسے قلاش کلائنٹس کے ساتھ ساتھ مجھے کوڑل اور پرنسس سیرا جیسے کلائنٹس بھی میسر آتے رہے تو میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں وقت ضائع کررہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ پرنسس سیمرا نے بھی اپنی زندگی میں میرے لیے پہلا اور آخری ٹیلی فون اسی غرض سے کیا تھا کہ وہ کوئی کام میرے سپرد کرنا چاہتی تھی۔ مجھے یہ بھی امید تھی کہ اگر میں اس کے لیے کوئی کام کرتا اور زندگی اسے مہلت دیتی تو وہ بھی کوڑل ہی جیسی فیاضی سے مجھے ادائیگی کرنے کی کوشش کرتی۔

کوڑل نے بریف کیس اپنے سامنے میز پر رکھ لیا تھا اور اس میں سے چیک بک نکال لی تھی۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا "کیا تم واقعی دس لاکھ مجھے دینے کے معاملے میں بالکل سنجیدہ ہو؟"

"ظاہر ہے سائیں! میں آپ سے ایسا بے ہودہ مذاق تو نہیں کرسکتا" وہ قلم بھی نکالتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "یار! اگر تم اس طرح روپیا لٹاتے پھروگے تو خاک کماؤگے۔ تم کس طرح ترقی کروگے؟"

وہ قلم کو کھولے بغیر اس سے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھ کر بولا "سائیں! اگر آپ میری جگہ ہوتے اور آپ کو اس طرح غیر متوقع طور پر نہ صرف اپنی ڈوبی ہوئی رقم بلکہ بہت شاندار قسم کا ہرجانہ بھی مل جاتا تو آپ کیا کرتے؟"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا "ہاں... شاید میں بھی یہی کرتا۔"

"بس... تو پھر پریشانی کی کیا بات ہے" وہ اطمینان سے بولا "جب آپ اپنی ایسی ہی سوچ کے باوجود اتنی ترقی کرسکتے ہیں تو پھر ابھی میرے بھی ترقی کرنے کے امکانات موجود ہیں۔ دیر سویر تو ہوہی جاتی ہے۔ میں پانچ دس سال بعد... آپ سے ذرا بڑی عمر میں ترقی کرلوں گا۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ میرے مزاج میں بڑا تحمل ہے۔"

میں نے ایک لمحے بغور اس کی طرف دیکھنے کے بعد کہا "یار کوڑل! میرے خیال میں تم اتنے بے وقوف آدمی نہیں ہو جتنے نظر آتے ہو۔"

"سائیں! آپ مجھے ابھی تک بے وقوف سمجھتے رہے ہیں؟" وہ گویا بُرا مناتے ہوئے بولا لیکن مجھے معلوم تھا اس کی یہ خفگی مصنوعی تھی۔

"میں نے سمجھنے کی نہیں... صرف نظر آنے کی بات کی تھی۔" میں نے گویا تصحیح کی۔

"بے وقوف نظر آنا تو سچ مچ بے وقوف ہونے سے بھی زیادہ بُری بات ہے سائیں!" وہ کراہ کر بولا۔

"نہیں... نہیں... ایسی کوئی بات نہیں ہے" میں نے گویا اسے تسلی دی "انسان بے وقوف نظر بے شک آئے لیکن اسے بے وقوف ہونا نہیں چاہیے۔ بلکہ ایسے انسان جو بے وقوف نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت بے وقوف ہوتے نہیں ہیں' وہ بڑے فائدے میں رہتے ہیں۔ بعض لوگ اپنی شکل وصورت اور حرکات وسکنات سے بے پناہ چالاک اور تیز طرار دکھائی دیتے ہیں لیکن درحقیقت وہ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں اور اکثر معاملات میں بڑے گھاٹے میں رہتے ہیں۔"

وہ گہری سانس لے کر بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "خیر سائیں! آپ ہمارے دوست ہیں' مہربان ہیں' دلدار ہیں۔ ہم آپ کو چاہے جیسے بھی نظر آئیں اور آپ چاہے ہمیں جیسا بھی سمجھیں۔ ہم بس اب آپ کے مرید ہیں اور ہمیشہ مرید رہیں گے" اس نے ایک لمحے کے لیے ہاتھ جوڑے پھر چیک لکھنے کے لیے قلم سنبھالتے ہوئے بولا "آپ ہماری طرف سے دس لاکھ کا یہ حقیر سا پہلا پہلا نذرانہ قبول فرمائیں۔"

میں نے ایک بار پھر ہاتھ اُٹھا کر اسے رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "کیا تم واقعی دس لاکھ کی رقم سے جان چھڑانے پر تُلے ہوئے ہو؟"

"ہاں سائیں! یہ میرے پاس رہے گی تو مجھے چین نہیں آئے گا۔ یہ مجھے ہضم نہیں ہوگی" اس نے جواب دیا۔

"اچھا... ایسا کرو... اگر یہ رقم تمہیں اتنی ہی بدہضمی کررہی ہے تو پھر یہ چیک میرے نام کاٹنے کے بجائے ایک لڑکی کے نام کاٹو... اور تم ہی میری طرف سے یہ چیک اس لڑکی کو دینے جاؤ گے" میں نے کہا۔

"لڑکی کے نام چیک..." وہ یکدم وحشت زدہ سا ہوکر بولا "اور میں ہی اسے دینے جاؤں؟"

"اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"آپ کے لیے نہیں ہوگی سائیں' میرے لیے تو ہے۔ آپ کو معلوم ہے میں ذرا شرمیلا سا آدمی ہوں۔ اسی لیے تو میں اپنے کام کے چکر میں پرنسس سیمرا تک سے ملنے نہیں جاسکا تھا۔"

"میری معلومات کے مطابق تم نے تین شادیاں کررکھی ہیں کوڑل جان!" میں نے پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہاری دو بیویاں گاؤں میں اور ایک شہر میں ہے۔ تمہیں ان کے پاس جاتے ہوئے شرم نہیں آتی؟"

"ان کی بات اور ہے سائیں!" اس کے چہرے پر ذرا سُرخی آگئی "وہ بیویاں ہیں' غیر لڑکی کی بات ذرا اور ہوتی ہے۔"

"بات چاہے کچھ بھی ہو لیکن یہ کام تم کو کرنا ہے" میں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "وہ بہت اچھی اور شریف لڑکی ہے۔ وہ نہ تو تمہیں کاٹے گی اور نہ ہی ڈانٹے گی بلکہ وہ تمہاری شکرگزار ہوگی۔ اسے مدد کی اشد ضرورت ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سائیں! میں یہ تھوڑی ہی کہہ رہا ہوں کہ لڑکی شریف نہیں ہے۔ میں نے لڑکی کے بارے میں تو کوئی خیال ظاہر ہی نہیں کیا۔ مجھے لڑکی کے نام چیک لکھنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ گزارش کررہا ہوں کہ آپ کے پاس کون سے آدمیوں کی کمی ہے۔ میں آپ کی ہر خدمت کے لیے تیار ہوں لیکن اس خدمت کے لئے آپ کسی اور کی ڈیوٹی لگادیں۔" وہ میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر ایسی مسکینی تھی کہ مجھے ہنسی آگئی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر ارادہ بدلتے ہوئے کہا "اچھا یار... میرا خیال ہے تم اس کام کے لیے موزوں آدمی ہی نہیں ہو۔ میں خود اس کام سے بچنا چاہ رہا تھا لیکن لگتا ہے کہ اسے خود کرنا ہی بہتر رہے گا۔"

"نیک کام ہمیشہ آدمی کو خود اپنے ہاتھ سے ہی کرنا چاہیے۔" وہ جلدی سے بولا۔ اس کے چہرے پر طمانیت آگئی۔ ایک بار پھر قلم سنبھال کر اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"صفیہ کے نام کاٹ دو" میں نے کہا "اور بیرر ہی کاٹنا۔۔۔ بعد میں دیکھیں گے کہ اس کا کیا کرنا ہے۔"

چند لمحے بعد اس نے چیک کاٹ کر میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے چیک اس سے لے کر دراز میں ڈال دیا تو وہ بریف کیس بند کر کے بولا "میرے لائق کوئی اور خدمت سائیں!"

"تم نے یہ خدمت بھی خواہ مخواہ کر دی ہے۔ فی الحال یہی کافی ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سائیں، آپ جیسے یار باش آدمی کے لیے جان بھی حاضر ہے" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے بولا۔ کچھ دیر بعد وہ رخصت ہو گیا۔

دوسرے دن صفیہ کا فون آیا۔ چونکہ اس کے ہاں فون نہیں تھا اور پڑوسیوں کے فون پر اس سے کسی ایمرجنسی میں ہی رابطہ کرنا مناسب تھا اس لیے اس نے کہا تھا کہ کامران کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے وہ خود ہی کہیں نہ کہیں سے روزانہ مجھے فون کر لیا کرے گی۔ اس روز بھی خیر و عافیت کے بعد اس نے پوچھا "کامران کے بارے میں کچھ پتا چلا؟"

"میں اس انتظار میں بیٹھا ہوں کہ اس کے بارے میں مجھے اگر کوئی اطلاع ملے گی تو شاید تمہاری طرف سے ملے گی" میں نے کہا۔

"اس نے مجھ سے رابطہ کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی" اس نے مایوسی سے بتایا "میری سمجھ میں نہیں آتا وہ بے وقوف کہاں غائب ہو گیا ہے اور کس حال میں ہو گا۔ میں چاہتی ہوں کہ اس کے بارے میں قطعاً نہ سوچوں لیکن کبھی نہ کبھی خیال آ ہی جاتا ہے اور جب بھی خیال آتا ہے بڑی وحشت ہوتی ہے۔"

اس کا مطلب تھا کہ کچھ نہ کچھ تعلق تو تھا۔ وہ لاکھ اس سے جان چھڑانا چاہتی تھی لیکن دل کے کسی نہ کسی تاریک گوشے میں کچھ بچی کھچی وابستگی موجود تھی۔ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "تم ایسا کرو۔۔۔ کہ میرے آفس آ جاؤ۔ شاید اس وحشت سے تمہارا پیچھا چھوٹ جائے۔ میں تمہارا دھیان کسی اور طرف لگانے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"آپ واقعی سنجیدگی سے مجھے بلا رہے ہیں؟" اس کے لہجے میں یکدم شگفتگی سی آ گئی۔

"ہاں۔ تمہیں کیا میرے لہجے میں کچھ غیر سنجیدگی کی جھلک محسوس ہو رہی ہے؟"

"نہیں۔۔۔ میں نے سوچا شاید یونہی مروت میں۔۔۔ محض میرا دل رکھنے کو بلا رہے ہوں" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

"مروت میں۔۔۔ اور محض دل رکھنے کے لئے بھی ہر ایک کو تو نہیں بلایا جاتا۔"

"ہاں۔۔۔ یہ بات تو ہے۔" اس نے تسلیم کیا۔

"بس تو پھر فوراً آ جاؤ" میں نے کہا۔

"فوراً تو میں نہیں آ سکتی" وہ بولی "مجھے کم از کم دو گھنٹے لگیں

گے۔"

"کیوں۔۔۔ کیا حیدر آباد سے بول رہی ہو؟"

"نہیں" وہ دھیرے سے ہنسی "ویسے تو میں گھر کے قریب ہی موجود ہوں لیکن اچھے حال میں نہیں ہوں۔ میں نے تو صبح سے اٹھ کر منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا ہے۔ اس لیے گھر جا کر نہا دھو کر تیار ہو کر آؤں گی۔"

"اوہ۔۔۔ یہ بتا کر تو تم خواہ مخواہ مجھے خوش ہونے پر مجبور کر رہی ہو۔ بھئی ہم کھا مڑوں سے ملنے کے لیے اتنا اہتمام۔۔۔؟ تم تو کچھ اس طرح بات کر رہی ہو جیسے ڈیٹ پر آ رہی ہو۔"

"آپ سے ملنا میرے لیے ڈیٹ پر آنے سے زیادہ اہم ہے" وہ اب ذرا کھل کر ہنسی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اس کا ڈپریشن تیزی سے کم ہوا تھا۔

"کہاں سے بول رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ پبلک فون سے نہیں بول رہی تھی۔

"ایک دوست کے گھر سے" اس نے جواب دیا۔

"اوہو۔۔۔ تو دوست بھی پال رکھے ہیں آپ نے!" میں نے طنزیہ سے لہجے میں کہا۔

"میں خاتون دوست کی بات کر رہی ہوں" وہ ڈانٹنے کے سے انداز میں بولی۔

"اوہ۔۔۔" میں نے اپنے لہجے میں معذرت خواہی کا تاثر لاتے

ہِش کی "ایسے نازک نکات پر بات کرتے وقت انسان کو ذرا ...ت سے کام لینا چاہیے۔ کسی کو غلط فہمی بھی ہو سکتی ہے۔"

"زیادہ بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کریں۔ میرا کوئی دوست ...ب بھی آپ کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا؟"

"صرف دوست ہونے کا ذکر سن کر تو شاید نہ پڑتا۔۔۔ لیکن ...ار اس کے گھر میں پایا جانا میری صحت کے لیے نقصان دہ ہو سکتا ...میں نے کہا۔

"چلیں میں آپ کی اس بات سے خوش ہو لیتی ہوں۔۔۔ لیکن ...ت بہرحال کچھ یوں ہے کہ میں اس وقت اپنی ایک دوست کے ...یں موجود ہوں جو اتفاق سے شادی شدہ بھی ہے مگر اب آپ ...اور تشویش کا اظہار مت شروع کر دیجیے گا۔ اس کا شوہر دفتر ...ا ہے۔ وہ موصوفہ خود کچن میں مصروف ہیں اور میں کمرے میں ...ایک ہاتھ سے ان کی شیر خوار بچی کو جھولا جھلا رہی ہوں اور ...ے ہاتھ سے ریسیور تھامے ہوئے ہوں۔"

"بہت خوب۔۔۔ تمہاری یہ رننگ کمنٹری اور منظر کشی بہت ...ا ہے اور میرے لیے کافی حد تک تسلی کا باعث بنی ہے" میں ...کہا "لیکن اب تم اپنی شادی شدہ دوست کی یہ خدمت گزاری ...اپنی مطلب براری یعنی اس کے ٹیلی فون سے فائدہ اٹھانا چھوڑ ...اور جلد از جلد یہاں آ جاؤ۔"

"مجھے بہرحال دو گھنٹے لگ جائیں گے" وہ بولی۔

"بہتر تو یہی تھا کہ تم خواہ مخواہ کے اہتمام میں اتنا وقت ضائع نہ ...نہ۔ یہ ایک کاروباری میٹنگ ہے اور کاروباری میٹنگ میں اگر ...ئی خاتون ہاتھ منہ دھوئے بغیر بھی آ جائے تو میں برداشت کر لوں ..."

"لیکن خود خاتون اس قسم کی حرکت برداشت نہیں کر سکتی نا" ...ہ بولی "وہ تو کاروبار میں بھی سلیقے، سنگار اور اہتمام کی قائل ...ئی ہے۔۔۔ اور اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ کاروبار میں بھی ...ی خوشبو، ذرا سی خوب صورتی کی آمیزش ہو تو یہ خشک ...ولیت بھی دلچسپ اور پُرکشش بن سکتی ہے" پھر اسے جیسے کچھ ...ا آیا اور وہ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولی "لیکن مجھ جیسی ...ی وقلاش لڑکی کے ساتھ آپ کی کیا کاروباری میٹنگ ہو سکتی ...؟ میں نے تو ابھی کوئی ٹیکسٹائل مل، کوئی بسکٹ فیکٹری، کوئی ...ن، کوئی فارماسیوٹیکل کمپنی وغیرہ خریدنے کا ارادہ نہیں کیا" ...ا کا انداز خود استہزائی کا سا تھا۔

"اسی پر تو غور کرنا ہے کہ آخر تم نے اب تک ایسا کوئی ارادہ ...ں نہیں کیا" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ تکلیف زدہ انداز میں ہنسی "افضل صاحب! دل دکھانے ...لے مذاق نہ کریں۔ آدمی امیر ہو اور فیشن کے طور پر اپنے آپ ...و غریب مزدور وغیرہ کہے تو بہت اچھا لگتا ہے۔ اس میں ذرا لطف ...تا ہے لیکن انسان جب سچ مچ غریب ہو تو اسے اپنی غربت کا تذکرہ، اس کی نشاندہی خاصی تکلیف دہ سی محسوس ہوتی ہے۔ کچھ سوئے ہوئے زخم ٹیس دینے لگتے ہیں۔"

"اتنی زیادہ بوجھل گفتگو کرنے اور دیوداس کا زنانہ ایڈیشن بننے کی ضرورت نہیں" میں نے ہلکی سی ڈانٹ پلانے کے انداز میں کہا "میں نے اس قسم کی گفتگو سننے کے لیے میٹنگ کا پروگرام نہیں رکھا۔ ویسے یہ جو تم اتنے طنزیہ انداز میں ٹیکسٹائل مل، بسکٹ فیکٹری، ہوٹل وغیرہ خریدنے کی بات کر رہی ہو۔۔۔ تو یہ کچھ ایسا ناممکن بھی نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے ہماری آج کی میٹنگ کے بعد کوئی ایسا دن بھی آئے جب تم اس قسم کی کوئی انڈسٹری خریدنے کے لیے کسی سے مذاکرات کرنے جاؤ۔"

وہ ایک بار پھر کراہنے کے سے انداز میں ہنسی اور بولی "لڑکیوں کو خواب دکھانے کا ہنر یوں تو اکثر ہی مردوں کو آتا ہے۔۔۔ بلکہ شاید انہیں ورثے میں ملتا ہے۔۔۔ لیکن آپ تو اس فن میں کچھ زیادہ ہی ماہر معلوم ہوتے ہیں افضل صاحب!"

"اس وقت بے اختیار میرے سینے سے ایک آہ نکل گئی ہے لیکن تم اسے سن نہیں سکو گی۔" میں نے مغموم لہجے میں کہا "تم بہت ذہین لڑکی ہو لیکن تمہیں بھی فرق کا پتا نہیں چلا۔ مجھ میں یہی تو خرابی ہے کہ میں خواب دکھانے والا آدمی نہیں ہوں۔"

"آپ سے پہلی ملاقات پر میں نے یہی رائے قائم کی تھی لیکن ابھی ابھی آپ سے اس ٹیلی فونی گفتگو کے دوران میں۔۔۔ پچھلے چند سیکنڈ میں ہی یہ رائے متزلزل ہوئی ہے۔ یقین کی اس عمارت میں دراڑیں سی پڑ گئی ہیں۔"

"کچھ دیر بعد تم آؤ گی تو یہ دراڑیں کنکریٹ سے بھر جائیں گی" میں نے کہا۔

اچانک وہ ہنس دی اور بولی "زیادہ سیریس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بھی سیریس نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ بس یونہی میرا تھوڑا سا مذاق اُڑا رہے ہیں۔"

"بیشتر لڑکیوں کی طرح احمق لڑکی! تمہیں کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔ بس اب تم باتوں میں زیادہ وقت ضائع نہ کرو اور یہاں آنے کے لیے چل پڑو۔"

"کیا وہاں آنے کے بعد مجھے بہت کچھ معلوم ہو جائے گا" وہ ایک بار پھر ہنس کر بولی۔

"یقیناً" میں نے وثوق سے کہا پھر خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ دو گھنٹے سے کافی پہلے آن پہنچی لیکن بہرحال تیار ہو کر آئی تھی اور اس بات کا چلتا پھرتا ثبوت بنی ہوئی تھی کہ اپنی تمام تر غربت کے باوجود وہ اصل سے زیادہ خوب صورت اور اسمارٹ نظر آنے کا سلیقہ رکھتی تھی۔ صاف ستھرے اور سادہ سے مگر عمدہ تراش خراش کے گلابی شلوار قمیص میں وہ بڑی تازہ دم اور نکھری نکھری دکھائی دے رہی تھی۔ چہرہ گو کہ میک اپ کا محتاج نہیں تھا لیکن حسین

ترین عورت بھی چونکہ بناؤ سنگار کے بغیر شاید خود کو مکمل محسوس نہیں کرتی اس لیے وہ بھی اس بار ہلکا سا میک اَپ کیے ہوئے تھی۔ وجود سے کسی عمدہ کلون کی مہک بھی اٹھ رہی تھی۔ وہ اس صفیہ سے بہت مختلف دکھائی دے رہی تھی جسے میں نے پہلی ملاقات میں دیکھا تھا۔ اگر وہ غربت میں اس حد تک اہتمام کر سکتی تھی اور اتنی اچھی نظر آسکتی تھی تو یقیناً خوش حالی میں تو قیامت ڈھا سکتی تھی۔

میں نے گہری نظر سے اس کا سراپا جائزہ لیتے ہوئے کہا "تمہیں دیکھ کر تو شبہ ہو رہا ہے کہ تم بزنس میٹنگ میں نہیں، شادی میں شرکت کے لیے آئی ہو۔"

"خواتین تو بزنس میٹنگ میں بھی اس سے کہیں زیادہ اہتمام کے ساتھ جاتی ہیں افضل صاحب!" وہ ٹھنڈی سی سانس لے کر بولی "بلکہ اس سے زیادہ اہتمام کے ساتھ وہ تو کبھی کبھی سوئم اور چالیسویں میں بھی چلی جاتی ہیں۔ میرے تو وسائل ذرا محدود ہیں اور میں طبعاً سنگار پسند بھی نہیں ہوں اس لیے میں نے اتنے پر ہی اکتفا کیا ہے۔"

میں نے اسے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ شکریہ ادا کرکے بیٹھنے کے بعد بولی "اور یہ سب باتیں آپ کو بھی معلوم ہیں لیکن آپ جان بوجھ کر انجان بنے رہتے ہیں۔ ویسے اگر آپ کو یہ محسوس ہوا ہے کہ میں شادی میں شرکت کے لیے آئی ہوں تو شاید مجھے آپ کی اس رائے سے اختلاف نہیں کرنا چاہیے کیونکہ آپ سے ملنے آنا میرے لیے شادی ہی کے مترادف ہے۔ واضح رہے کہ یہاں شادی سے مراد صرف خوشی ہے۔ میرج یا ویڈنگ نہیں۔"

"وضاحت کی ضرورت نہیں۔۔۔ اتنی اردو مجھے بھی آتی ہے، ماہرِ لسانیات صاحبہ!"

"شکر ہے" وہ گہری سانس لے کر بولی "ورنہ آپ کے طبقے کے لوگوں کو تو یہ ظاہر کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے کہ انہیں اردو نہیں آتی۔"

"مجھے ابھی ویسا بننا کا شوق نہیں چرایا۔"

"یہ بھی غنیمت ہے" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "ویسے آپ سے مل کر خوشی محسوس کرنے کا میرا معاملہ ساحر لدھیانوی والا ہی ہے۔ وہ جو ان کا مشہورِ زمانہ شعر ہے۔۔۔ وہ میرے حسبِ حال ہی ہے۔

تیرا ملنا خوشی کی بات سہی
تجھ سے مل کر اُداس رہتی ہوں

"اوہ۔۔۔" میں کراہ اٹھا "تم نے بھی بے چارے ساحر لدھیانوی کی جنس تبدیل کر دی۔ اسکول میں پڑھنے والی اور شعر جمع کرنے کی شوقین لڑکیاں یہ حرکت کرتی ہیں حالانکہ اس قسم کے اشعار میں اس تبدیلی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ انہیں مذکر مونث کی تخصیص کیے بغیر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولی "لیکن شعر بہت عوامی ہو چکا ہے، میں نے سوچا اسے عوامی انداز میں استعمال کیا جائے۔"

"ابھی صرف ایک ہی بار ملی ہو۔ ابھی سے اُداس رہنے... اتنے طویل قسم کے دعوے کرنے کی نوبت کیسے آگئی؟"

"مستقبل کا اندازہ کرنے کے لیے بعض اوقات ایک ہی... کافی ہوتا ہے" وہ بدستور مسکرا رہی تھی لیکن پھر یکدم سنجیدہ ہو... ہوئے دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر ذرا آگے کی طرف جھکتے ہوئے... "خیر۔۔۔ چھوڑیئے ان فضول باتوں کو۔۔۔ آپ کا وقت قیمتی ہو... آپ نے بتایا تھا کہ یہ بزنس میٹنگ ہے۔ بتائیں ایجنڈا کیا ہے... افسوس کہ میرے پاس کوئی عمدہ سا بریف کیس نہیں ہے ورنہ میں... کھول کر کچھ کاغذات اور نفیس سا قلم بھی نکالتی۔"

"ان تکلفات کے بغیر بھی کام چل جائے گا اور ان کے بغیر... یہ بزنس میٹنگ ہی رہے گی۔ ایجنڈا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہ بتا... تمہیں ڈھنگ سے کوئی کام کرنا آتا ہے؟"

"غریب آدمی کو اگر ڈھنگ سے کوئی کام کرنا آتا ہو تو وہ غر... کیوں رہے؟" وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر بولی "یا پھر شا... بات کچھ یوں ہے کہ غربت چیز ہی بڑی عجیب ہے۔ غربت میں کوئی کا... ڈھنگ سے بھی کرو تو وہ بھی بے ڈھنگا ہو جاتا ہے۔"

"جلی کٹی باتیں مت کرو۔ ذرا سوچ سمجھ کر سنجیدگی سے جوا... دو۔ کوئی کام تو ایسا ہوگا جسے تم ذرا اچھے پیمانے پر اچھے طریقے... انجام دے سکتی ہوگی؟ ایک بزنس کے طور پر چلا سکتی ہوگی؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا۔۔۔!" وہ گویا میرا مطلب سمجھتے ہوئے ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولی "یوں تو میں نے بیوٹیشن کا کورس ٹیکنیکل بورڈ سے بہت اچھے رزلٹ کے ساتھ پاس کیا ہوا ہے اور اس وقت میں ایک بیوٹی پارلر میں پارٹ ٹائم کام بھی کر رہی ہوں، صبح کی شفٹ میں چھوٹے سے ایک اسکول میں پڑھا بھی رہی ہوں۔ میرے انہی دونوں کاموں سے تو کھینچ تان کر گھر کا خرچ چل رہا ہے۔ کرائے کا مکان ہے۔ ہمارا کوئی اور ذریعہ آمدنی نہیں ہے۔ والد کام کرنے سے معذور ہیں۔ میرا خیال ہے میں یہ دونوں کام اپنے طور پر بھی چلا سکتی ہوں۔ اسکول بھی۔۔۔ اور بیوٹی پارلر بھی۔۔۔"

پھر وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولی "لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

میں نے گویا اس کا سوال اَن سُنا کرتے ہوئے پوچھا "تم ان میں سے کس کام کو ترجیح دیتی ہو؟"

"بیوٹی پارلر کو" اس نے بلا تامل جواب دیا "گو کہ اسکول کو خواہ کاروباری نکتہ نظر سے ہی چلایا جائے اس کے باوجود اسے ذرا زیادہ باعزت، زیادہ باوقار اور تعمیری کام سمجھا جاتا ہے لیکن میرے نزدیک اس میں زیادہ مغز ماری اور زیادہ مسائل ہیں۔ میرے لیے نہ جانے کیوں اس میں کشش بھی کم ہے۔ میں اگر کبھی اپنا کوئی کام کرنے کا شیخ چلیانہ خواب دیکھتی ہوں تو وہ بیوٹی پارلر کے بارے میں ہی ہوتا ہے۔ شاید میں کچھ ایسا کام چاہتی ہوں جس میں کچھ خوب صورتی، گلیمر اور رنگینی ہو۔"

میں نے چونکتے ہوئے کہا "رجحان کے اعتبار سے کہیں تم شوبزنس کی لڑکی تو نہیں ہو؟"

اس کی شکل وصورت، جسمانی ساخت وغیرہ نہایت معقول تھی۔ اگر اس میں ایکٹنگ کی کچھ صلاحیت اور ڈانس کے معاملے میں بے باکی موجود ہوتی تو وہ فلم لائن میں بھی چل سکتی تھی۔ اس سے گئی گزری لڑکیاں ہیروئن آرہی تھیں۔ میں اس کے لیے یہ بندوبست بھی کر سکتا تھا لیکن اس کے لیے مجھے اس کو لاہور بھیجنا پڑتا۔ ایک لمحے کے اندر اندر میں نے ان تمام امکانات پر بھی غور کرلیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے جواب سے میری یہ سوچیں دھری کی دھری رہ گئیں۔

"نہیں۔۔۔ شوبزنس کا مجھے قطعاً کوئی شوق نہیں" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "ٹی وی پر یا فلموں میں آنا ان گنت لڑکیوں کا خواب ہوگا لیکن میرا ہرگز نہیں ہے۔ میں اگر شیخ چلیانہ خواب دیکھتی ہوں تو کچھ اور طرح کے دیکھتی ہوں۔ میں کوئی بہت نامور اور کامیاب پروفیشنل یا بزنس وومن ہی بننا چاہتی ہوں۔"

"بس۔۔۔ تو پھر طے ہو گیا، تم اپنا بیوٹی پارلر کھولوگی" میں نے گویا فیصلہ سُنا دیا۔

اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا لیا اور گہری سانس لے کر بولی "تو آپ نے میری سرپرستی فرمانے کا فیصلہ کرلیا!"

"معمولی حد تک۔۔۔ اور وہ بھی اِن ڈائریکٹ انداز میں، تم ایسا سمجھ سکتی ہو لیکن میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوگا، کوئی عمل دخل نہیں ہوگا۔ حتیٰ کہ میرا کوئی مشورہ بھی شامل نہیں ہوگا۔ سب کچھ تمہیں خود ہی کرنا ہوگا۔ میں تمہیں صرف یہ دے سکتا ہوں۔۔۔"

میں نے کوٹل کا دیا ہوا دس لاکھ کا چیک دراز سے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

وہ بغور چیک کو دیکھنے لگی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "بعض لوگوں کو صرف ایک موقع ملنے کی دیر ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ تیزی سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ان میں بے پناہ صلاحیتیں ہوتی ہیں لیکن ان میں سے بعض کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ انہیں وہ ایک موقع نہیں مل پاتا۔ میں تمہیں اوّل الذکر لوگوں میں شمار کر رہا ہوں۔ وہ پہلا موقع۔۔۔ وہ اسٹارٹ۔۔۔ وہ آغاز تمہیں مل رہا ہے جس کی تمہیں شاید اشد ضرورت ہے۔ اب آگے تمہارا نصیب ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کسی حد تک تمہاری صلاحیتوں کا امتحان بھی ہے۔ کسی متوسط سے علاقے میں درمیانی سی جگہ لے کر اوسط درجے سے ذرا بہتر قسم کا ایک بیوٹی پارلر کھولو۔ کچھ پیسا بُرے وقت کے لیے بھی بچا کر رکھنا۔۔۔ ہو سکتا ہے تم بہت آگے نکل جاؤ۔۔۔ ورنہ آسودہ حالی سے گزر بسر کے قابل تو ہو ہی جاؤگی اور اگر خدانخواستہ اتنا بھی نہ ہو سکا تو کم از کم یہ حسرت تو نہیں رہے گی کہ زندگی نے تمہیں ایک موقع بھی نہیں دیا۔"

وہ چیک کا اچھی طرح جائزہ لے چکی تھی اور چند لمحوں سے ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ یکدم ہی اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھا گئی تھی۔ میں خاموش ہوا تو وہ بڑے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "یہ آپ کا چیک تو نہیں ہے۔ اس پر آپ کے دستخط یا آپ کی کسی کمپنی وغیرہ کی مُہر تو نہیں ہے۔"

"تمہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہیے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ کیش ہو جائے گا۔ اسے کراس کرکے اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا" میں نے کہا۔

"میں اسے آپ ہی کی نوازش شمار کروں نا؟"

"نہیں، قسمت کی" میں نے جواب دیا "لیکن تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ کل کلاں کو یہ چیک کاٹنے والا کہیں اپنی نوازش کا صلہ مع سود وصول کرنے میرے پاس نہ پہنچ جائے" وہ اب مسکراتے ہوئے بولی۔

"تو اس میں بھی ڈرنے کی کیا بات ہے؟" میں نے بے پروائی سے کہا "ابھی چند دن پہلے تک تو تم کسی بھی دولت مند آدمی کی داشتہ بننے کے لیے تیار تھیں۔ تم یہی سمجھ لینا کہ یہ ایسے ہی کسی آدمی کی طرف سے پہلی ایڈوانس قسط تھی جس کا حساب کتاب

کرنے وہ ذرا دیر سے پہنچا۔"

اس کے صبیح رخساروں پر سُرخی دوڑ گئی۔ اپنی تمام تر جرأت مندی کے باوجود وہ ایک لمحے کے لیے نظر جھکاتے ہوئے ذرا دھیمے لہجے میں بولی "وہ میں بکواس کر رہی تھی.... دورہ پڑا تھا مجھ پر...."

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "آہ...! کسی لڑکی کو ایسی جاں فزا باتیں کرکے اتنی جلدی نہیں مکرنا چاہیے۔"

"اسی لیے تو کہتے ہیں کہ تقدیر کی دستک پر کان لگائے رکھنا چاہیے۔ دستک سُننے کے باوجود دروازہ نہ کھولنے والے بعد میں پچھتاتے ہیں۔ تقدیر کبھی کبھی لڑکی کے روپ میں بھی تو آسکتی ہے نا" مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ اس کی شربتی آنکھوں میں شوخی کی چمک بھی لوٹ آئی تھی۔

"اور ہم جیسے احمق اس وقت اسے صحیح طور پر خوش آمدید کہنے کے بجائے اُلٹا سیدھا فلسفہ جھاڑنے بیٹھ جاتے ہیں" میں نے پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"خیر... آپ کو خواہ مخواہ یہ غمزدگی اور احساسِ محرومی کی ایکٹنگ کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے بُلاوے پر تقدیر اس لڑکی کے روپ میں دوبارہ بھی آپ کے در پہ دستک دینے آسکتی ہے.... اور بغیر کسی لالچ کے آسکتی ہے.... آپ اپنا یہ چیک واپس لے لیں تب بھی آسکتی ہے" اس کی مسکراہٹ برقرار تھی اور وہ میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔

اس قسم کی پیشکشوں پر بڑے بڑے پارساؤں کے قدم ڈگمگا سکتے تھے۔ میں تو پھر بھی ایک بہت ہی گناہ گار سا آدمی تھا لیکن میں نے بہت ضبط سے کام لیا۔ میرا فلسفہ اب بھی میرے پیروں کی زنجیر تھا۔ اب بھی کچھ روپے پیسے کا لین دین بیچ میں تھا۔ اب بھی کچھ احسان اور کچھ شکرگزاری کے معاملات بیچ میں تھے جنہیں میں ختم بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں اس لڑکی کو اس کی اپنی کوششوں سے ترقی کرتے دیکھنا چاہتا تھا۔ جب شناسائی ذرا طویل ہو جاتی اور میں محسوس کرتا کہ رشتہ خالص دوستی کا رہ گیا ہے تو پھر دوسرے پہلوؤں کی طرف دھیان جاسکتا تھا اور دل اندر ہی اندر ایک قسم کی شرمندگی سے بھی محفوظ رہ سکتا تھا۔

وہ میری آنکھوں میں کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی اور میں کوشش کر رہا تھا کہ وہ کچھ بھی نہ پڑھنے پائے۔ میں نے ایک بار پھر اصل موضوع پر ہی آنا بہتر سمجھا "تم آج سے ہی کسی مناسب جگہ کی تلاش شروع کردو۔ میں قطعاً کوئی مشورہ نہیں دوں گا۔ کسی کام میں دخل نہیں دوں گا" میں نے ایک بار پھر واضح کیا۔

"میں جس علاقے میں رہتی ہوں اور وہاں جن لڑکیوں کے حالات مجھ جیسے ہوتے ہیں' وہ اگر اچانک اس قسم کے کام شروع کردیتی ہیں تو لوگ ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بناتے ہیں" وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"ان سے پہلے تم خود باتیں بنانا شروع کردو۔ میرا مطلب ہے تم پہلے ہی اپنی گلی میں یہ تذکرہ شروع کردو کہ تم کسی آسودہ حال خاتون کے ساتھ پارٹنرشپ میں کام شروع کر رہی ہو...." پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "اور اگر مناسب سمجھو تو اس سے ذرا بہتر قسم کے کسی مکان یا اپارٹمنٹ میں شفٹ ہو جاؤ.... لیکن بس ذرا ہی بہتر جگہ تلاش کرنا۔ زیادہ اونچی نہ اُڑنا ورنہ دس لاکھ روپیہ دیکھتے ہی دیکھتے صاف ہو جائے گا— یہ زیادہ بڑی رقم نہیں ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے" وہ متانت سے سرہلاتے ہوئے بولی "ویسے تو خیر جن لوگوں کے حالات مجھ جیسے ہوں ان کے لیے یہ بہت بڑی رقم ہے لیکن اگر بے پروائی سے خرچ کرنے لگو تو پھر یہ کوئی رقم بڑی نہیں ہوتی۔ آپ مطمئن رہیں' میں اتنی جلدی اوقات بھولنے والی نہیں ہوں۔ بنیادی سرمائے سے ہی اپنے ارمان پورے کرنے شروع نہیں کروں گی۔ پہلے کچھ کرکے دکھاؤں گی۔ اس کے بعد پاؤں پھیلاؤں گی تاکہ پاؤں چادر سے باہر نہ جائیں۔"

"ویری گڈ" میں نے طمانیت سے کہا "تمہاری باتوں سے تو کچھ ذہانت کی خوشبو آرہی ہے۔"

"ذہین تو آپ مجھے پہلے ہی قرار دے چکے ہیں۔"

"لیکن کاروبار کے لیے کچھ اور طرح کی ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض لوگ ویسے ملنے جلنے اور بات چیت کرنے میں بڑے ذہین لگتے ہیں لیکن کاروبار کے معاملے میں نرے چغد ہوتے ہیں اور بعض لوگ جن سے ویسے بات چیت کرکے یا میل جول رکھ کے خیال آتا ہے کہ ایسے فضول آدمی کی بھلا اس دنیا میں کیا ضرورت تھی؟ وہ درحقیقت کاروباری جینئس ہوتے ہیں۔"

"شکر ہے آپ اس طرح کے کاروباری جینئس نہیں ہیں" وہ مترنم ہنسی کے ساتھ بولی "ایسا کاروباری جینئس ہونے کا بھی بھلا کیا فائدہ جس سے بات چیت کرکے خیال آئے کہ ایسے فضول آدمی کی بھلا اس دنیا میں کیا ضرورت تھی۔"

"چلو.... وہ بھی کم از کم کسی ایک میدان میں تو کامیاب ہوتے ہیں۔ کسی شعبے میں تو قابلِ ذکر ہوتے ہیں۔ بعض بے چارے تو بالکل ہی بے سروپا سی زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

اس نے تفہیمی انداز میں سرہلایا پھر ایک لمحے کے توقف سے بولی "آپ نے مجھے کسی دوسرے کا چیک کیوں دیا ہے؟ یا پھر یہ بھی آپ ہی کا کوئی ذیلی ادارہ ہے اور یہ دستخط بھی آپ ہی کے کسی آدمی کے ہیں؟"

میں نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا "نہیں۔ اس چیک پر جس کمپنی کی مُہر ہے اس سے میرا کوئی تعلق نہیں اور جس شخص کے اس پر دستخط ہیں وہ بھی میرا آدمی نہیں۔ یہ چیک یونہی اوپر سے اوپر میرے پاس آرہا تھا۔ میں نے سوچا اسے اپنی اصل آمدنی میں نہ ہی شمار کروں تو بہتر ہے اس لیے میں نے تمہارے نام کا چیک بنوالیا۔

یہ میرے یونہی ذرا شغل شغل میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی کمائی ہے۔"

"امیر ہونے کے واقعی بڑے فائدے ہیں" صفیہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اور یہ محاورہ واقعی صحیح ہے کہ پیسا پیسے کو کھینچتا ہے۔ انسان پہلے ہی کافی امیر ہو تو اس کے ذرا ہاتھ پاؤں ہلانے سے اوپر ہی اوپر سے لاکھوں روپیا چلا آتا ہے جو اس کے لیے نمک کی چٹکی کے برابر ہوتا ہے اور کوئی اس سے نئی زندگی شروع کر سکتا ہے" پھر اس نے چھت کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ پھیلا کر کندھے اچکاتے ہوئے پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈی آہ بھری اور بولی "واہ مالک! تو نے بھی اپنی دنیا میں بڑے دلچسپ تماشے لگا رکھے ہیں۔"

"روپیا ہاتھ میں آتے ہی مالک کا شکر ادا کرنے کے بجائے جلی کٹی باتیں شروع کردیں۔" میں نے اسے گھورا "انسان کی فطرت ہی عجیب ہے۔ وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کے لیے بھی بہتری کا کوئی پہلو نکلا ہے بلکہ پہلے دوسروں سے اپنا موازنہ شروع کردیتا ہے۔ اس کا دھیان شکر کی طرف نہیں' شکوے کی طرف ہی رہتا ہے۔ شاید اس لیے اوپر والے نے خود بھی انسان کو ناشکرا ہی قرار دیا ہے۔"

"ارے.... ارے...!" وہ گویا حیران پریشان ہو کر آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی "آپ تو سیریس ہی ہوگئے اور باقاعدہ وعظ کرنے پر اُتر آئے۔ میں ناشکری تھوڑا ہی کر رہی ہوں' میں تو یونہی ذرا حیرت کا اظہار کر رہی ہوں۔ دنیا بڑی عجیب تماشا گاہ ہے .... یہ تو آپ کو ماننا پڑے گا۔"

"میں بھی کوئی سیریس تھوڑا ہی ہو رہا ہوں۔ مجھے بھی بس یونہی ذرا موقع پا کر لوگوں کو تھوڑی بہت ڈانٹ ڈپٹ کرنے کا شوق ہے" میں نے سادگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے سر! آپ کی ڈانٹ سر آنکھوں پر" وہ مؤدب ہوتے ہوئے بولی۔ اچانک اسے گویا کوئی خیال آیا اور افسردگی کا ایک سایہ سا اس کی چہرے پر آکر گزر گیا۔ وہ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولی "وہ کمینہ کامران نہ جانے کہاں اور کس حال میں ہوگا!"

"ابھی تم نے خود ہی کہا ہے نا کہ یہ دنیا بڑی عجیب تماشا گاہ ہے۔ وہ کسی اور جگہ' کسی اور قسم کے تماشے کا کوئی کردار بنا ہوا ہوگا۔ وہ تماشا فی الحال ہماری آنکھوں سے اوجھل ہے" میں نے ... لہجے میں کہا "ویسے یہ تعلقِ خاطر بھی عجیب ہوتا ہے۔ انسان ... کو کہہ دیتا ہے کہ میں نے فلاں سے تعلق توڑ لیا ہے لیکن اس ... بارے میں فکرمند رہتا ہے' سوچتا رہتا ہے۔ اس کے لیے کچھ نہ ... کرنے کی تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموشی سے سر جھکائے رہنے کے بعد وہ ... دل ہی دل میں اپنا تجزیہ کرنے کے بعد فیصلہ کن لہجے میں بولی "... یہ بات تو طے ہے کہ میں اس سے قطع تعلق کر چکی ہوں ... میں بس یہ چاہتی ہوں کہ اس کے بارے میں میرے ذہن میں ... نقش کسی خوب صورت' اچھی اور خوشگوار یاد کا ثبت ہو۔

میں اپنی آئندہ زندگی میں اس کے بارے میں یہ سوچ کر اطمینان محسوس کروں کہ میں نے اسے کسی اچھے موڑ پر چھوڑا تھا۔ وہ جیسا بھی ہے' دشمن تو بہرحال نہیں ہے نا...." وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

"ہاں.... خیر یہ اچھی سوچ ہے" میں نے سرہلایا "مجھے اُمید ہے تمہاری یہ توقع پوری ہوگی۔ وہ ایک بار سامنے تو آئے۔ اگر وہ کسی بُرے موڑ پر بھی کھڑا ہوگا تو ہم اس موڑ کو مزید موڑ توڑ کر اچھا بنانے کی کوشش کریں گے۔"

"کاش ایسا ممکن ہوسکے" اس کے ہونٹوں پر دھیمی اور افسردہ سی مسکراہٹ برقرار تھی لیکن پھر جیسے یکدم اس نے اس بوجھل پن کو ذہن سے جھٹکا۔ اس کے چہرے کی شگفتگی لوٹ آئی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "اچھا.... تو پھر میں جاؤں؟"

انداز کچھ ایسا تھا جیسے درحقیقت اس کا منشا یہ ہو کہ میں اسے روک لوں۔ جانے سے منع کردوں لیکن میں ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی موجودگی اور اس کے خود سپردگی کے اشارے اور استعارے مجھے آزمائش میں مبتلا رکھتے تھے۔ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "ہاں.... تم جاؤ اور فوراً عملی کام شروع کردو۔"

وہ دھیرے سے ہنسی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ ہنسی گویا کسی خفیف اور بے عنوان سی مایوسی کو چھپانے کا اک بہانہ تھی۔ اس نے میز کے دوسری طرف سے ذرا جھکتے ہوئے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ مجھے وہ ہاتھ تھامنا پڑا۔ اس میں محبت کا گداز' گرم جوشی اور مضبوطی تھی۔ وہ ایک لمحہ جیسے ساکت ہوگیا۔

پھر وہ نہایت خفیف سی جھرجھری لے کر گویا کسی اور دنیا سے واپس آئی اور ہاتھ چھڑا کر میز کے قریب سے ہٹتے ہوئے نہایت مستعدی سے سیلوٹ کرتے ہوئے بولی "یو آر گریٹ سر!" وہ تیزی سے گھومی اور دروازے کی طرف بڑھ گئی لیکن دروازے پر رُک کر وہ پلٹتے ہوئے گویا بات مکمل کرتے ہوئے انگریزی میں ہی بولی "اس کے علاوہ آپ بہت عجیب بھی ہیں سر!"

"ہاں.... وہ تو میں ہوں" میں نے گویا اسے چڑانے کے لیے مسکراتے ہوئے کہا لیکن وہ جواباً نہیں مسکرائی۔ گہری سنجیدگی سے وہ چند لمحے ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی پھر نہایت دھیمی آواز میں بولی "خدا حافظ سر!"

دوسرے ہی لمحے وہ نسیمِ سحری کے ایک سبک خرام جھونکے کی طرح رخصت ہو چکی تھی۔ کمرے میں ایک نہایت خفیف سی خوشبو گویا اس کی موجودگی کی یاد دلانے کے لیے باقی رہ گئی۔ کمرے میں یکدم ہی جیسے گہرا سکوت چھا گیا تھا یا پھر شاید یہ سکوت میرے اندر تھا۔

میں نے اپنے آپ کو دفتر کے کام میں اُلجھانے کی کوشش کی لیکن اندر ہی اندر جیسے کہیں اضطراب کی لہر پھوٹ پڑی تھی۔ آخر کار میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اچانک فیصلہ

کیا تھا کہ مجھے چل کر زرتاج سے ملنا چاہیے۔ کئی دن سے نہ تو اس کا کوئی فون آیا تھا اور نہ ہی وہ خود آئی تھی۔ پہلے میں نے اسے فون کرکے اپنی آمد کی اطلاع دینے کے بارے میں سوچا پھر فیصلہ کیا کہ اچانک جا دھمکنے میں زیادہ لطف رہے گا۔ یہ کسی حد تک اس کے لیے ایک سرپرائز ہوگی۔ قریبی دوست کئی دن کے وقفے کے بعد بغیر اطلاع' اچانک ملیں تو زیادہ لطف آتا ہے۔ ایک خفیف مگر خوش گوار سی حیرت ہوتی ہے۔

میں نے گاڑی نکالی اور اس کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ میرے اندازے کے مطابق اس وقت اسے گھر ہی پر ہونا چاہیے تھا۔ ویسے اس کا آفس بھی اس کے گھر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اس آفس میں وہ کم ہی بیٹھتی تھی۔ اپنے گھر میں بھی اس نے ایک بڑے کمرے کو عمدہ اور باضابطہ قسم کے آفس کی شکل دی ہوئی تھی۔ زیادہ تر وہ وہیں سے اپنے بزنس اور زمینوں کے معاملات کو کنٹرول کرتی تھی۔

میں اس وقت کلفٹن کے علاقے سے گزر رہا تھا جب میری نظر دوسری طرف کی سڑک پر سامنے سے آتی ہوئی ایک گاڑی پر پڑی۔ اسے ایک سانولا سا ادھیڑ عمر مگر خوش پوش اور بارعب شخص ڈرائیو کررہا تھا۔ اس کے پہلو میں سُرخ بھڑکیلے سے لباس میں ایک خوب صورت لڑکی موجود تھی جس کے کھلے ریشمی بال اس کے چہرے کے گرد ہالہ سا بنائے ہوئے تھے۔ لڑکی مرد سے کوئی بات کررہی تھی اور اس کا سر تقریباً مرد کے کندھے پر ہی ٹکا ہوا تھا۔

وہ دورویہ سڑک تھی۔ ایک طرف جانے والا اور دوسری طرف آنے والا ٹریفک رواں تھا اور ایک سڑک سے دوسری پر گاڑی موڑنے کے لیے کافی دور تک بیچ میں کہیں راستہ نہیں تھا۔ وہ بیش قیمت سفید گاڑی دوسری طرف سے فراٹے بھرتی ایک لمحے میں میرے قریب سے گزر گئی لیکن اس پر نظر پڑنے کے باعث میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوگیا جس کے اثرات فوری طور پر معدوم بھی نہیں ہوئے۔

میں نے جو منظر دیکھا تھا وہ کچھ ایسا انوکھا یا انہونا نہیں تھا۔ اس علاقے میں.... بلکہ بہت سے علاقوں میں' آتی جاتی گاڑیوں میں اس قسم کے نظارے عام تھے لیکن بعض اوقات کسی خاص وجہ سے انسان چونک جاتا ہے۔ میرے چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ اس نے مجھے جمشید کریم کے دفتر میں کافی سرو کی تھی۔ وہ ایک خوب صورت اور اسمارٹ لڑکی تھی۔ اب گو کہ میں نے اسے صرف ایک لمحے کے لیے دیکھا تھا لیکن اس وقت وہ مجھے پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت' اسمارٹ اور خوش لباس دکھائی دی تھی۔

اس کا کسی ادھیڑ عمر شخص کے ساتھ گاڑی میں یوں اپنائیت کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے گزرنا بھی کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ وہ جمشید کریم کے دفاتر میں سے کسی دفتر کا کوئی اہم آدمی بھی ہوسکتا تھا۔ اس کا کوئی ذاتی دوست بھی ہوسکتا تھا۔ شوہر بھی ہوسکتا تھا۔ حتیٰ کہ اگر وہ کسی خاص قبیل کی لڑکی تھی تو اس کے لیے وہ کوئی موٹی' اسامی بھی ہوسکتا تھا۔۔۔۔ اور یہ بھی کوئی خاص بات نہیں تھی۔ شہر میں اس قسم کے معاملات بھی عام تھے۔

یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود میرے دل میں کھٹک سی ہوئی۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھ لیا تھا کہ وہ گاڑی اگلے چوراہے سے ایک سروس روڈ پر مڑ رہی تھی۔ سروس روڈ پر مڑنے کا مطلب یہی تھا کہ اسے قریب ہی کہیں رُکنا تھا۔ میں نے فوراً اپنی گاڑی کی رفتار بڑھائی اور کچھ آگے جاکر جونہی مجھے راستہ میسر آیا' فوراً دوسری طرف کی سڑک پر موڑلی۔ جس چوراہے کو میں پیچھے چھوڑ گیا تھا' کچھ دیر بعد میں واپس اس پر پہنچا لیکن راستے میں مجھے ایک سگنل پر گاڑی روکنا پڑی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید میں اس گاڑی کو تلاش نہ کرسکوں اور وہ میرے سروس روڈ پر پہنچنے تک کسی اور طرف نکل چکی ہو لیکن قسمت نے میرا ساتھ دیا۔ میں نے جونہی گاڑی سروس روڈ پر موڑی' وہ گاڑی مجھے ایک سپرمارکیٹ کے سامنے پارکنگ ایریا میں کھڑی نظر آگئی۔

میری مزید خوش قسمتی یہ تھی کہ اسی گاڑی کے قریب پارکنگ کے لیے خاصی جگہ بھی موجود تھی۔ میں نے فوراً گاڑی وہاں لے جارو کی اور چند لمحے گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ دوسری گاڑی اب خالی تھی۔ میں نے سب سے پہلے اس کا نمبر ذہن نشین کرلیا تھا۔ گاڑی جس حصے میں کھڑی تھی وہ سارا ہی کمرشل علاقہ تھا۔ آس پاس بہت سی بڑی بڑی دُکانیں اور مارکیٹیں موجود تھیں جو اعلیٰ درجے کی اشیائے ضرورت اور اشیائے تعیش سے بھری پڑی تھیں جہاں علاقے اور معیار کے حساب سے دُکان دار ہر چیز کی قیمت کے حلیے میں گاہک کی کھال اُتارنا اپنا اخلاقی فرض خیال کرتے تھے۔ جو لوگ یہاں شاپنگ کرنے آتے تھے ان میں سے بیشتر اس کے متحمل بھی ہوسکتے تھے لیکن انہی جگہوں پر میں نے آنکھیں بند کرکے خرچ کرنے والوں کے شانہ بہ شانہ ان کروڑپتیوں کو بھی دیکھا تھا جو دس دس روپے کے لیے دُکان دار سے لڑتے تھے اور جن کی بیگمات وہاں کی قیمتوں سے چڑ کر اسی وقت جمعہ بازار یا منگل بازار چلنے کی فرمائش کردیتی تھیں۔

یقین سے تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ بے جوڑ جوڑا ان میں سے کس دُکان یا مارکیٹ میں گیا ہوگا لیکن جس... دکان کے سامنے گاڑی کھڑی تھی' میں نے سب سے پہلے اسی میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ وہ ڈیپارٹمنٹل اسٹور ٹائپ ایک بہت بڑی دکان تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اسی میں ان کی موجودگی کے امکانات زیادہ تھے۔

اندر پہنچنے پر میرا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ وہ دونوں مجھے گراؤنڈ فلور پر سامنے کے حصے میں ہی نظر آگئے۔ اس ہال نما میں پانچ چھ سیکشن تھے۔ بچوں' عورتوں' مردوں کے ملبوسات' جوتوں' پرفیومز وغیرہ کے شعبے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک آدھ کاؤنٹر پر سیلز مین کے بجائے سیلز گرلز بھی موجود تھیں۔

وہ دونوں زنانہ ملبوسات والے حصے میں تھے جہاں قطار در قطار ہینگروں پر ایک سے ایک بڑھ کر انوکھے فیشن کے خوب صورت' بدصورت' بے ہنگم ہر طرح کے سیکڑوں ملبوسات دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ شوکیسوں میں بھی سجے ہوئے تھے اور کچھ چوبی مجسموں نے زیب تن کررکھے تھے۔ لڑکی ملبوسات دیکھ رہی تھی اور اس کاؤنٹر کی سیلز گرل مستعدی سے اس کے سامنے دھڑا دھڑ ملبوسات ڈھیر کررہی تھی۔

میں اس سے اگلے کاؤنٹر پر جا کھڑا ہوا۔ وہ میک اَپ کے سامان اور پرفیومز کا شعبہ تھا۔ اس پر بھی سیلز گرل ہی موجود تھی۔ وہ لپک کر میرے قریب آئی اور خوش خلقی کے کچھ ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگی لیکن اس وقت میرا دھیان ان دونوں کی طرف زیادہ تھا جو برابر کے کاؤنٹر پر موجود تھے۔ میری کوشش یہ بھی تھی کہ اس لڑکی کی نظر میں نہ آؤں۔ وہ مجھے پہچان سکتی تھی لیکن غنیمت یہ تھا کہ اس کی تمام تر توجہ ملبوسات کی طرف تھی۔ مرد البتہ اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اندر سے مضطرب تھا لیکن کامیابی سے اپنے اضطراب کو چھپائے ہوئے تھا۔

اس شعبے میں اس وقت قطعاً رش نہیں تھا اور یہ بات میرے حق میں زیادہ اچھی نہیں تھی۔ کیونکہ اسی وجہ سے جس جس کاؤنٹر پر اِکا دُکا گاہک موجود تھے' سیلز مین یا سیلز گرلز انہیں اپنی اپنی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش کررہی تھیں۔ میں نے سیلز گرل کو ٹرخانے کا سا اشارہ کرتے ہوئے شوکیسوں میں موجود میک اپ کی مختلف اشیا کا جائزہ لینا شروع کردیا جن کے سر پیر کا مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔

برابر والے کاؤنٹر پر لڑکی نے کچھ ملبوسات مرد کو مشورہ طلب انداز میں دکھانے کی کوشش کی لیکن وہ عدم دلچسپی سے بولا ”تمہیں جو پسند ہے لے لو۔“

لڑکی بھی کچھ عجلت میں معلوم ہوتی تھی۔ اس نے صنفِ نازک کی روایات کے برعکس بہت زیادہ چیزیں نکلوا کر دیکھنے' زیادہ نقص نکالنے' لمبی بات کرنے اور قیمتوں پر بحث و تکرار کرنے کے بجائے نہایت کم وقت میں کئی ملبوسات پیک کرالیے۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا' مرد ادائیگی کرنے کے لیے جیب سے بٹوا وغیرہ نکالنے کے بجائے بڑے نوٹوں کی ایک موٹی سی گڈی نکال رہا تھا۔ اس نے لاپروائی سے چند نوٹ نکال کر سیلز گرل کی طرف بڑھائے جو وہ لے کر اس کاؤنٹر پر چلی گئی جہاں ادائیگی کی جاتی تھی۔ وہاں سے خریدے ہوئے ملبوسات کے ڈبے اور پیکٹ وغیرہ بھی وہیں پہنچادیے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اب وہ اسی کاؤنٹر کا رُخ کریں گے جس پر میں کھڑا تھا۔

میرا اندازہ اس دوران میں یہ رہا تھا کہ سیلز گرل کچھ دیر کے لیے تو میرے اشارے پر پیچھے ہٹ گئی تھی اور خاموش رہی تھی لیکن زیادہ دیر خاموش نہیں رہ سکی تھی۔ وہ میری رہنمائی اور مشاورت پر تُل گئی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ مجھے کوئی چیز خریدنے کے معاملے میں فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آرہی تھی اس لیے میری مدد کرنا اس کا اخلاقی اور پیشہ ورانہ فریضہ تھا۔ شاید اسے اندیشہ تھا کہ اگر اس نے ایک گاہک کو بھی اپنے کاؤنٹر سے خالی آگے جانے دیا تو اسے کامیاب سیلز گرل نہیں سمجھا جائے گا۔

وہ بوٹے سے قد کی متناسب الاعضا لڑکی تھی۔ رنگت زیادہ صاف نہیں تھی لیکن اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں زندگی کی چمک تھی اور اس کی مسکراہٹ خوب صورت تھی جس کی ایک وجہ شاید اس کے موتیوں کی طرح جھلملاتے ہوئے دانت تھے۔ مجموعی طور پر اس کی شخصیت کا تاثر اچھا تھا اور وہ واقعی ایک کامیاب سیلز گرل معلوم ہوتی تھی۔ میں نے کچھ خریدے بغیر آگے بڑھ جانے کا سوچا تھا لیکن اس کے مسلسل استفسار اور خوش خلق مسکراہٹ نے مجھے مجبور کردیا کہ کم از کم ایک اچھی سی پرفیوم تو خرید ہی لی جائے۔

اس طرح مجھے اس نامعلوم جوڑے کا تعاقب کچھ مہنگا پڑ سکتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ میں زرتاج کی طرف تو جا ہی رہا تھا' پرفیوم اسے تحفے کے طور پر پیش کردوں گا۔ پرفیومز کی اس کے پاس یا میرے پاس کوئی کمی تو نہیں تھی لیکن تحفہ تو بہرحال تحفہ ہی ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میں نے کچھ طمانیت سے سیلز گرل سے کچھ پرفیومز دکھانے کے لیے کہا۔ اس نے کھٹاکھٹ بہت سی پرفیومز نکال کر میرے سامنے قطاروں میں کھڑی کردیں۔ میرا دھیان پرفیومز میں کم اور اس جوڑے میں زیادہ تھا جو اس وقت کسی وجہ سے شاید کچھ دیر کے لیے کیش کاؤنٹر پر چلا گیا تھا۔

ابھی ان کا رخصت ہونے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں ان پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ سیلز گرل کو یہ احساس بھی نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ درحقیقت میری توجہ کسی اور طرف تھی۔ اس کے علاوہ مجھے پرفیومز بھی دیکھنی تھیں اور سیلز گرل کی باتوں پر بھی تھوڑا بہت دھیان دینا تھا۔ بیک وقت یہ سب کچھ کرنا خاصی ”کاریگری“ تھی لیکن بہرحال کام چل ہی رہا تھا۔

میں نے تمام پرفیومز کو ایک نظر دیکھ کر نفی میں سرہلایا اور اسے مزید چند پرفیومز کے نام بتائے۔ تب وہ کچھ اور مسکرائی پھر اس نے بیٹھ کر کاؤنٹر کے نیچے سے کوئی چھوٹی اور قدرے خفیہ سی الماری کھول کر چند پرفیومز نکالیں اور میرے سامنے رکھ دیں۔ میں نے جلدی سے ایک اٹھائی' قیمت پوچھی اور پرس سے نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھادیے۔ وہ اپنی اسی روشن مسکراہٹ کے ساتھ بولی ”ادائیگی کیش کاؤنٹر پر کردیجیے۔“ یہ درخواست اس نے انگریزی میں کی تھی۔ اُس کا لہجہ بھی غنیمت تھا۔

میں نے بھی اسی جوڑے والی تکنیک استعمال کی یعنی اس سے

درخواست کی کہ وہ خود ہی جاکر ادائیگی کردے "ٹھیک ہے۔ کوئی مسئلہ نہیں" اس کی مسکراہٹ کچھ اور روشن ہوگئی "لیکن کیا اس سے پہلے میں اس کی گفٹ پیکنگ کردوں؟" اس نے پرفیوم کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں" میں نے پرفیوم اٹھاکر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ میں نے دیکھ لیا تھا' وہ جوڑا اسی کاؤنٹر کی طرف آرہا تھا۔

سیلز گرل مجھے رُکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی "آپ کا کچھ بقایا ہوگا۔"

"میں ذرا آگے جارہا ہوں' مجھے وہیں دے دیجئے گا" میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ ذرا آگے درمیانی راستے ہی میں ایک طرف کو چند گھومنے والے ہینگرز پر کچھ ٹائیاں لٹکی ہوئی تھیں اور غنیمت تھا کہ وہاں کوئی سیلز مین موجود نہیں تھا۔ میں وہاں رک گیا۔ میرا اندازہ درست رہا۔ وہ جوڑا اسی کاؤنٹر پر آن رکا جہاں سے میں ہٹا تھا اور سیلز گرل اپنی تمام تر پیشہ ورانہ خوش خلقی کے ساتھ ان کے سامنے ان کی مطلوبہ چیزیں ڈھیر کرنے میں لگ گئی۔ لڑکی کو ان میں اُلجھا چھوڑ کر وہ میرا بقایا اور رسید لینے چلی گئی۔ وہ لاکر اس نے مجھے دیں اور دوبارہ اپنی جگہ پہنچ گئی۔

ادھیڑ عمر مرد کی ساتھی لڑکی میک اپ کا سامان اور پرفیومز بھی دھڑا دھڑ خرید رہی تھی۔ یہاں بھی کسی قسم کی بحث و تکرار' سودے بازی حتیٰ کہ چیزوں کے انتخاب میں زیادہ نخرے بازی تک نہیں ہوئی اور کئی ڈبے کھٹا کھٹ پیک ہوگئے۔ ایک بار پھر مرد نے نوٹوں کی گڈی ہی نکالی اور سیلز گرل ہی کو ادائیگی کی۔ وہ ایک بار پھر کیش کاؤنٹر پر چلی گئی۔ گاہکوں نے اپنے یہ ڈبے بھی وہیں پہنچوا دیے۔

ادھیڑ عمر شخص کی نوٹوں کی گڈی یقیناً کچھ پتلی ہوچکی تھی اور آثار بتا رہے تھے کہ ابھی اسے اور پتلی ہونا تھا۔ لڑکی دل کھول کر شاپنگ کررہی تھی اور مرد بے نیازی سے ادائیگی کررہا تھا۔ دونوں ہی کا معاملہ "مالِ مفت دلِ بے رحم" والا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے سوچا یہ عمل شاید ابھی کئی مرتبہ اور دُہرایا جائے گا۔ اس لیے میرا وہیں موجود رہنا کچھ زیادہ ضروری نہیں تھا۔ وہ آپس میں بہت کم بات کررہے تھے جس کی وجہ سے میری معلومات میں کچھ اضافہ ہونے کی بھی کوئی خاص امید نہیں تھی۔ شاپنگ سے فارغ ہوکر انہیں بہرحال باہر ہی آنا تھا اور یہ تو میں دیکھ ہی چکا تھا کہ ان کی گاڑی کہاں کھڑی تھی' اس لیے میں نے باہر جاکر ہی ان کا انتظار کرنا بہتر سمجھا۔

میں باہر اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ پھر میں نے گاڑی وہاں سے ہٹاکر ایک اور مناسب جگہ پر کھڑی کرلی تاکہ وہ سامنے سے آئیں تو مجھ پر نظر نہ پڑے۔ اس کے بعد انتظار شروع ہوگیا جو میرے لیے خاصا صبر آزما کام ہوتا تھا تاہم یہ انتظار زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی وہ دونوں لدے پھندے سپر مارکیٹ سے برآمد ہوئے۔ کوئی اور عورت اتنی شاپنگ شاید پورے دن میں بھی نہ کرپاتی جتنی اس لڑکی نے ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں کرالی تھی۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی اور پیکٹ وغیرہ گاڑی میں سیٹ کرنے کے بعد جب وہ دونوں ایک بار پھر اگلی سیٹوں پر بیٹھے تو وہ ایک بار پھر مرد کے کندھے پر گری جارہی تھی۔ اسے گردوپیش کی کوئی پروا یا کسی سے کوئی غرض نہیں تھی لیکن مرد گردوپیش کے بارے میں کچھ چوکنا معلوم ہوتا تھا۔ وہ اپنے گردوپیش سے اتنا بے خبر نہیں تھا لیکن میں اس کی نظر سے اوجھل تھا۔ ویسے بھی وہ مجھے پہچانتا نہیں تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوئے تو میں ان کے پیچھے تھا لیکن میں تعاقب احتیاط سے کررہا تھا تاکہ مرد کو اس کا احساس نہ ہونے پائے۔ یہ دیکھ کر میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ انہوں نے مزید دُکانوں کا رُخ نہیں کیا۔ شاید لڑکی کی فرمائشیں ایک ہی جگہ سے پوری ہوگئی تھیں۔ کچھ دیر بعد وہ ایک چھوٹے لیکن خوب صورت اور مہنگے ریستوران کے سامنے جارُکے۔ ساحلِ سمندر پر واقع اس ریستوران میں ابھی رش نہیں ہوا تھا۔ جوں جوں رات گہری ہوتی تھی توں توں یہاں رونق بڑھتی تھی اور ابھی تو صرف شام کے سرمئی سائے دامن پھیلا رہے تھے۔

مرد نے احتیاط سے گاڑی لاک کی اور وہ دونوں اندر چلے گئے۔ ان کا کھانا کھانے کا پروگرام معلوم ہوتا تھا۔ میں باہر گاڑی میں بیٹھا سوچتا رہ گیا کہ میرا پروگرام کیا ہونا چاہیے۔ زرتاج کی طرف جانے کا پروگرام تو فی الحال دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ بہرحال وہ اتنا اہم پروگرام نہیں تھا لیکن میں سوچ رہا تھا کہ جس چکر میں میں پڑگیا تھا' وہ بھی اہم تھا یا نہیں؟ جمشید کریم کے دفتر میں محض کافی سرو کرنے والی ایک خوب صورت لڑکی اگر ایک ادھیڑ عمر اور نہایت خوش حال دکھائی دینے والے مرد کے ساتھ شاپنگ کرتی اور گھومتی پھررہی تھی تو یہ معاملہ اہم تھا یا نہیں؟ فی الحال تو میں اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ آگے چل کر معاملہ اہم بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ مجھے پہلے بھی کئی بار ایسے تجربات ہوچکے تھے کہ سرِراہ اتفاق سے نظر آنے والا کوئی بظاہر غیر اہم سا کردار' معمولی سا واقعہ آگے چل کر بہت اہم ثابت ہوا تھا۔

چنانچہ میں نے فی الحال ان دونوں کا پیچھا نہ ہی چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ اگر اب تک وقت ضائع ہی ہوا تھا تو مزید کچھ وقت ضائع کرلینے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں تھا۔ ایک خیال میرے ذہن میں یہ بھی آیا کہ موبائل فون پر زرتاج سے رابطہ کرکے اسے بھی وہیں بلالوں۔ اس کا گھر اور دفتر دونوں وہاں سے زیادہ دور نہیں تھے مگر میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کردیا۔ اول تو شاید وہ شارٹ نوٹس پر آنے کے لیے تیار نہ ہوتی اور آبھی جاتی تو یقیناً بات پر بور ہوتی کہ یہ خالصتاً ملاقات برائے ملاقات نہیں تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ نہ جانے کس چکر میں کھینچے پھررہا تھا۔

یہ ارادہ ملتوی کرنے کے بعد میں بھی گاڑی سے اُتر کر اندر ریستوران میں چلا گیا۔ بالائی منزل پر اس ریستوران میں پیچھے سمندر کی طرف ایک کشادہ ٹیرس بھی بنی ہوئی تھی۔ وہاں بھی میزیں لگائی جاتی تھیں۔ لوگ چند قدم کے فاصلے پر جھاگ اُڑاتے سمندر کے نظارے سے محظوظ ہوتے ہوئے کھانے پینے کے لیے وہاں بیٹھتے تھے۔ چاندنی راتوں میں اس طرف رش بڑھ جاتا تھا۔ وہاں بیٹھنے والوں میں نوجوان جوڑے زیادہ ہوتے تھے۔

میرا خیال تھا شاید وہ دونوں بھی وہیں جابیٹھے ہوں لیکن وہ مجھے نیچے ہال میں ہی نظر آگئے۔ وہ سب سے آخر میں ایک کونے کی میز پر موجود تھے۔ ہال میں روشنیاں مدھم تھیں اور میزوں پر شمعیں روشن کرکے ماحول کو مزید رومان پرور بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ ...ق یہ تھا کہ یہ شمعیں برقی تھیں۔ دراصل یہ موم بتیوں کی ساخت کے برقی قمقمے تھے جن کا نقلی شعلے والا حصہ وولٹیج کی کمی بیشی سے کچھ اس طرح دکھائی دیتا تھا جیسے شمع کی لو ہوا کے دوش پر لرز رہی ...

لڑکی کی پیٹھ میری طرف تھی اور اچھا ہی تھا۔ اب تک میں ...ا کی نظر سے بچا ہوا تھا۔ میں نے ایک ایسی میز منتخب کی جو ان ...ے دور نہیں تھی اور میں اپنی نشست سے کنکھیوں سے ان کی تمام ...رکات و سکنات کا جائزہ لے سکتا تھا اور اگر وہ سرگوشیوں میں بات ...نہ کرتے تو ان کی گفتگو بھی کان لگاکر سُن سکتا تھا تاہم میں بظاہر ان ...کی طرف ذرا بھی توجہ دیے بغیر حتی الامکان بے نیازی سے بیٹھ گیا۔ اور یہ بھی کچھ ایسا تھا کہ ان میں سے کوئی بھی صحیح طور پر میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

ابھی میں صحیح طور پر بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ ویٹر سر پر سوار ...گیا۔ رش نہ ہونے کا یہی فائدہ یا نقصان تھا۔ دوسرا ویٹران کا ...آرڈر نوٹ کرکے لے جا بھی چکا تھا۔ مجھے گو کہ کوئی خاص بھوک ...نہ تھی لیکن میں نے سوچا شاید تعاقب طول کھینچ جائے اس لیے ...کھانا کھالینا ہی بہتر تھا چنانچہ میں نے ذرا ہلکے پھلکے سے کھانے کا ...آرڈر دے دیا اور ویٹر نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔

وہ دونوں پبلک مقامات پر...... خصوصاً کسی کھلی جگہ پر بات ...کرنے کے معاملے میں بہت محتاط معلوم ہوتے تھے۔ ابھی تک ...وہ خاموش ہی تھے۔ زیادہ حیرت مجھے لڑکی پر تھی جو لڑکی ہونے ...کے باوجود خاموش تھی۔ البتہ چند لمحے بعد انہوں نے تقریباً سرگوشی ...کے سے انداز میں کچھ بات کی جو میں نہیں سُن سکا۔ بظاہر میں ابھی ...مینیو کا مطالعہ کیے جارہا تھا جیسے وہ محض مینیو نہیں' کوئی دلچسپ ...کتاب یا چیت پٹا اخبار ہو لیکن درحقیقت میرے کان ان دونوں کی ...طرف لگے ہوئے تھے۔ مجھے خود بھی اندازہ نہیں تھا کہ میں ...حقیقت ان کے بارے میں کیا جاننا چاہتا تھا؟ سب سے پہلے تو ...میں ان کی حقیقت جاننا چاہتا تھا کہ وہ دونوں درحقیقت کون ...اور آپس میں ان کا کیا رشتہ کیا تعلق تھا؟ اس کے بعد شاید کچھ اور بھی سمجھ میں آسکتا تھا۔

ریستوران میں بکھرتی ہوئی نہایت مدھم موسیقی کی لہروں کے درمیان اچانک لڑکی کی دھیمی سی آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ وہ کہہ رہی تھی "میں نے تو آپ کو بہت ہی زیادہ زحمت دے ڈالی..... بہت خرچ ہوگیا....."

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" ادھیڑ عمر مرد بھی دھیمی آواز میں بولا "یہ جو کچھ بھی ہے اسے تم اپنا ہی سمجھو۔" اب وہ مطمئن اور پُرسکون معلوم ہوتا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات یا لہجے سے اضطراب کا اظہار نہیں ہورہا تھا۔ شاید شام کا اندھیرا گہرا ہونے اور اس کم روشنی' کم رش والی جگہ پر پہنچنے کے بعد وہ اپنے آپ کو مطمئن محسوس کررہا تھا۔ ان کے اس اندازِ گفتگو سے کم از کم ایک بات تو واضح ہوگئی تھی کہ وہ میاں بیوی نہیں تھے۔

اس کے بعد کھانا آنے تک اور کھانا کھانے کے دوران میں انہوں نے بہ مشکل دو تین مرتبہ ایک دوسرے سے مختصری بات کی ہوگی جو میں نہیں سُن سکا کیونکہ ان کی آوازیں ایک بار پھر سرگوشیوں میں ڈھل گئی تھیں۔ شاید احتیاط پسندی غالب آگئی تھی۔ اس کے علاوہ شاید وہ ایک کم گو جوڑا ہونے کے سلسلے میں کوئی ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ کھانا انہوں نے پُرتکلف کھایا تھا۔ سویٹ ڈش اور چائے کافی وغیرہ کا بھی دور چلا۔ مرد نے ایک سگار بھی سُلگالیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا ریلیکس ہوکر کچھ دیر بیٹھنے کا موڈ تھا مگر دو تین کش لینے کے بعد اس نے میرے اندازے کے خلاف اچانک ویٹر کو اشارہ کرکے بِل طلب کرلیا۔

میں اس وقت اطمینان سے کافی کی چسکیاں لے رہا تھا۔ میں نے ویٹر کو نہیں بُلایا۔ میں نہیں چاہتا تھا اس شخص کو احساس ہو کہ میں اس کی تقلید کررہا تھا۔ میں نے ان کے اُٹھ جانے اور رخصت ہولینے کا انتظار کیا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچ چکے تب میں نے ویٹر کو طلب کیا اور جلدی سے بِل لانے کی ہدایت کی۔ ادائیگی وغیرہ کرکے میں تیزی سے دروازے پر آیا۔ اس وقت ان کی کار حرکت میں آچکی تھی اور ریستوران کے قریب سے ریورس ہوکر مین روڈ کی طرف گھوم چکی تھی۔

جلد ہی میں نے اسے جالیا اور ایک بار پھر تعاقب کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس بار گاڑی ڈیفنس کے اس فیز میں پہنچی جو ابھی پوری طرح آباد نہیں ہوا تھا لیکن جس سڑک پر وہ گاڑی ایک عمدہ بنگلے کے سامنے جاکر رُکی اس پر دونوں طرف نو تعمیر شدہ بنگلوں کی قطار موجود تھی۔ سڑک دو طرفہ تھی۔ بیچ میں پتلی سی گرین بیلٹ بھی موجود تھی۔ وہ گاڑی بنگلے کے گیٹ سے تقریباً جا لگی تھی اور وہ شخص ہارن دے رہا تھا۔ میں اس کے پیچھے سے گزرتا چلا گیا۔ اسے یقیناً شبہ تک نہیں تھا کہ اس کا تعاقب ہورہا ہوگا۔ وہاں روشنی بھی بہت کم تھی۔ اسٹریٹ لائٹس روشن نہیں تھیں۔ صرف بنگلوں ہی

سے روشنی آرہی تھی۔

میں کچھ ہی آگے جاکر گھوم کر دوسری طرف کی سڑک پر واپس آگیا۔ رفتار میں نے بہت کم کرلی تھی۔ گرین بیلٹ کے دوسری طرف سے درختوں کے درمیان سے میں نے دیکھا، اس بنگلے کا گیٹ کھل چکا تھا اور ایک مسلح گارڈ اس شخص کو باقاعدہ سیلوٹ کرنے کے انداز میں سلام کررہا تھا۔ گاڑی اندر چلی گئی۔ میں دوسری طرف کے ایک بنگلے کے سامنے گاڑی روک چکا تھا۔

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس بنگلے نے گویا گاڑی کو نگل لیا تھا۔ گیٹ بند ہوگیا تھا اور ایک بار پھر سڑک پر سناٹا چھاگیا تھا۔ ایک جگہ بنگلوں کے سامنے دو تین گاڑیاں کھڑی تھیں جن میں ڈرائیور یا کوئی اور بھی موجود نہیں تھا۔ میں نے ان سے ذرا ہٹ کر گاڑی ریورس کرکے اس طرح ایک بنگلے کے قریب کھڑی کرلی کہ گرین بیلٹ کے درختوں کے درمیان سے میں دوسری طرف کے اس بنگلے پر آسانی سے نظر رکھ سکتا تھا اور اس طرف کے کسی شخص کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا تھا کہ میں سڑک کے دوسری طرف سے کسی بنگلے کی نگرانی کررہا تھا۔

کافی دیر تک میں گاڑی میں صبر و سکون سے بیٹھا رہا۔ اس دوران میں کئی بنگلوں میں گاڑیاں آئیں۔ کئی بنگلوں سے گاڑیاں رخصت ہوئیں۔ سڑک پر سے بھی کئی گاڑیاں گزریں لیکن کسی نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ پوش علاقوں میں ایک یہ بھی اچھی بات ہوتی ہے کہ کوئی خواہ مخواہ آپ کی ٹوہ میں نہیں لگتا۔ ویسے بھی میری گاڑی کے شیشے رنگین تھے۔ شاید کسی کو صحیح طور پر اندازہ بھی نہیں ہورہا تھا کہ صرف گاڑی ہی پارک تھی یا اس کے اندر بھی کوئی موجود تھا۔

جس بنگلے کی میں نگرانی کررہا تھا اس کے گیٹ کے دونوں پلرز پر دو خوب صورت گلوب تو روشن تھے لیکن اس پر نہ تو کوئی نیم پلیٹ موجود تھی اور نہ ہی کوئی نمبر وغیرہ درج تھا تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ کم از کم نمبر کا تو میں اندازہ کرہی سکتا تھا کیونکہ اس کے دائیں بائیں دونوں بنگلوں پر نمبر موجود تھے۔

نمبر اور لوکیشن وغیرہ ذہن نشین کرنے کے بعد بھی میں گاڑی میں اسی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ دل بہلانے کے لیے میں ٹیپ بھی آن نہیں کررہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی گاڑی کی طرف متوجہ ہو۔ اسی اثنا میں کچھ دور واقع کارنر کے بڑے سے بنگلے کا گیٹ کھلا اور بہت سے افراد باتیں کرتے ہوئے باہر آگئے۔ یک دم اس پُرسکون سی سڑک کا سکوت گویا درہم برہم ہوگیا۔ فضا میں کچھ ہلچل سی محسوس ہونے لگی۔ غور سے دیکھنے پر میری سمجھ میں آگیا کہ کچھ لوگ اس گھر میں مہمان آئے ہوئے تھے اور کچھ لوگ انہیں سی آف کرنے نکلے تھے۔ بچے، بوڑھے، عورتیں مرد اور نوجوان، ہر طرح کی نمائندگی موجود تھی۔

کافی دیر تک طرح طرح کی آوازوں کا شور برپا رہا۔ آخر کار عورتوں نے عورتوں سے بغل گیر ہوکر ان کے رخسار چومے، مردوں نے ایک دوسرے سے مصافحے کیے، کچھ وعدے یاد دلائے، اپنے ہاں آنے کی دعوتیں دیں اور آخر کار کچھ لوگ دو گاڑیوں میں بیٹھ کر رخصت ہوگئے۔ باقی لوگ واپس اندر چلے گئے۔ ایک بار پھر چاروں طرف وہی سکوت تھا اور اس سکوت میں گاڑی میں بند ہوکر بیٹھے بیٹھے میں نے خود کو بہت اعلیٰ درجے کا چغد محسوس کیا۔ جس بنگلے کی میں نگرانی کررہا تھا وہ گہرے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس کا بیشتر حصہ تاریک معلوم ہوتا تھا۔ گیٹ کے عقب میں مسلح گارڈ کی نقل و حرکت کے بھی کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ یہ بھی محسوس کیا جاسکتا تھا کہ اس ادھیڑ عمر مرد اور خوب صورت نوجوان لڑکی کے اس بنگلے سے برآمد ہونے کی فی الحال کوئی امید نہیں تھی۔ کم از کم رات بھر کے لیے ان کا قیام یہیں تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے پوچھا "افضل پیارے! اس صورت میں تم یہاں بیٹھے اُلّو کی طرح اس بنگلے کو گھورتے ہوئے کون سا عظیم کارنامہ انجام دے رہے ہو؟ وہ تو غالباً اندر کسی پرتعیش بیڈ روم میں بقول ساحر چند کلیاں...... بلکہ شاید بہت سی کلیاں نشاط کی چُن رہے ہوں گے اور تم یہاں بیٹھے سوکھ رہے ہو۔ کیا صبح تک اسی طرح یہیں بیٹھے رہو گے؟ عین ممکن ہے وہ کل پورے دن بھی باہر نہ نکلیں۔ پھر کیا کرو گے؟"

میرے اندر کا آدمی اس کا کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا البتہ اس نے اس بات پر میری ہاں میں ہاں ضرور ملائی کہ جو کچھ میں وہاں بیٹھا کررہا تھا وہ کچھ ایسا عقل مندانہ کام نہیں تھا۔ میں نے اس کے بعد اس بنگلے میں کودنے کے بارے میں بھی سوچا۔ اپنے تمام تر معززانہ حلیے کے باوجود مجھے اکثر و بیشتر اس قسم کے کام کرنے کی ضرورت پیش آتی ہی رہتی تھی اور یہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہوتے تھے بلکہ اس قسم کی سرگرمیاں تو بلا مبالغہ میرے معمولات میں شامل تھیں۔

بنگلے میں ایک ہی مسلح گارڈ دکھائی دیا تھا۔ اس قسم کے ایک آدھ گارڈ کا تو ہونا نہ ہونا میری نظر میں تقریباً برابر ہی ہوتا تھا۔ بنگلے میں ان دونوں کے سوا مجھے کسی کی رہائش کے آثار بھی دکھائی نہیں دیے تھے۔ کسی کتے کی بھی جھلک نظر نہیں آئی تھی اور نہ ہی بھونکنے کی آواز سنائی دی تھی۔ کتا بھی موجود ہوتا تب بھی میرے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ حضرت انسان کے سامنے کتا کیا چیز ہے...... مگر یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود میں نے فی الحال بنگلے میں گھسنے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے کون سا کوئی ایمرجنسی درپیش تھی؟ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اس شخص اور اس بنگلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ آئندہ قدم اٹھانے میں آسانی ہے۔ معلومات اس بنگلے کے اندر کودے بغیر بھی حاصل کی جاسکتی تھیں۔ میں اپنے وسائل استعمال کرسکتا تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ دہاں سے رخصت ہونے سے پہلے ہی اپنے "وسائل" کو استعمال میں لے آؤں۔ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی میں نے موبائل فون پر شفیع شاہ سے رابطہ کیا۔ وہ اس وقت گھر پہ موجود تھا اور کھانا کھانے کی تیاری کررہا تھا۔

"کھانے کا پروگرام چند منٹ لیٹ کرلو۔ ایک کام تمہارے سپرد کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں پروگرام ملتوی ہی کردیتا ہوں۔ آپ کام بتائیں۔" وہ خوش گوار لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ ملتوی کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "کھانا تم اطمینان سے کھاؤ۔ کوئی ایسا کام نہیں ہے جس کے لیے فوری طور پر حرکت میں آنا پڑے......"

پھر میں نے اسے پوری صورتِ حال بتائی۔ لڑکی اور اس مرد کی شکل صورت وغیرہ کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اس کی گاڑی کا نمبر، اس بنگلے کا نمبر اور لوکیشن وغیرہ تفصیل سے سمجھائی اور یہ بھی بتایا کہ اس وقت میں اسی کے سامنے موجود ہوں۔ بات جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا "ویسے تو یہ ڈیفنس کا اسی قسم کا حصہ ہے جس میں عموماً لوگوں کو اپنے ساتھ والے مکان کے بارے میں بھی پتا نہیں ہوتا کہ وہ کس کا ہے اور فی الحال اس میں کون رہ رہا ہے یا پہلے کون رہ کر گیا ہے...... لیکن تمہیں اپنے ذرائع سے معلوم کرنا ہے کہ یہ شخص کون ہے، یہ بنگلا کس کا ہے۔ اس کے بعد شاید خود بہ خود ہی واضح ہوجائے کہ لڑکی سے اس کا کیا تعلق ہے...... لیکن اگر واضح نہ ہو تو پھر اس سلسلے میں بھی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنا لیکن لڑکی کی طرف سے زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ بظاہر وہ کسی خاص حیثیت کی مالک معلوم نہیں ہوتی لیکن اس کا تعلق بہت خطرناک لوگوں سے ہے۔"

"آپ ان کی "خطرناکی" کچھ کم کرنے کا پروگرام تو نہیں بنا رہے؟" شفیع شاہ نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

"ابھی صورتِ حال کچھ واضح نہیں ہے اس لیے پروگرام بھی واضح نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا "تم فی الحال اس معاملے کی رپورٹ دو۔ شاید بات کچھ آگے بڑھے۔ مجھے اِدھر اُدھر سے بھی کچھ اطلاعات کا انتظار ہے۔"

"ٹھیک ہے سر! میں خود بھی تیزی سے حرکت میں آتا ہوں اور دوسروں کو بھی ہلاتا ہوں۔ جس قدر جلد ممکن ہوسکا میں آپ کو رپورٹ پیش کردوں گا۔" شفیع شاہ بولا۔

"میں یہاں سے کوچ کرتا ہوں۔" میں نے کہا "تم اب اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ خدا حافظ۔"

میں نے فون بند کرکے جیب میں رکھا اور سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ محتاط نظروں سے میں نے گرد و پیش کا جائزہ لے لیا۔ صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور واپس روانہ ہوگیا۔ میں اب ہوٹل واپس جارہا تھا۔ کام شفیع شاہ کے سپرد کرکے

مجھے اطمینان ہوگیا تھا اور اب میں خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا۔

میں ہوٹل کے قریب پہنچا تو اس عجیب اتفاق پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ عین اسی وقت زرتاج کی بجیرو ہوٹل کے ڈرائیو وے میں مڑ رہی تھی۔ وہ خود ہی ڈرائیو کررہی تھی۔ میں نے گاڑی اس کے پیچھے لگادی اور پارکنگ لاٹ میں بھی عین اس کے پیچھے لے جا روکی۔ وہ گاڑی سے اُتری تو مجھے سامنے کھڑے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ وہ سیاہ جینز اور ڈینم کی نیلی موٹی کھردری سی شرٹ میں تھی۔ اس کے بال ہوا میں اُڑ رہے تھے اور ان سے ایک الگ ہی قسم کی مہک پھوٹ رہی تھی جو اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی کلون کی مہک سے مختلف تھی۔

"تم کہاں آوارہ پھرتی رہتی ہو؟" میں نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا "میں ابھی تم سے ملنے تمہارے گھر گیا تھا لیکن تم وہاں نہیں تھیں۔ شریف لڑکیوں کے یہ لچھن نہیں ہوتے۔"

اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا اور خشمگیں نظروں سے چند لمحے مجھے گھورتی رہی پھر غرانے کے سے انداز میں بولی "تم میرے گھر گئے تھے...... مجھ سے ملنے؟"

"ہاں...... تمہیں یقین نہیں ہے کیا؟" میں نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔

اس کے ہاتھ میں موبائل فون موجود تھا۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے نمبر پنچ کیا اور فون کان سے لگاتے ہوئے بولی "شہلا......؟"

اس نے اپنے گھر پہ ایک اچھی خاصی پڑھی لکھی، سُلجھی ہوئی، شائستہ اور ہنرمند قسم کی خاتون کو ملازم رکھا ہوا تھا۔ اسے وہ نہایت معقول تنخواہ دیتی تھی اور وہ اس کے لیے بہت ہی کارآمد عورت تھی۔ وہ ایک طرح سے اس کی ہاؤس منیجر تھی۔ ہر کام کی نگرانی وہی کرتی تھی۔ تمام نوکر اس کے ماتحت کام کرتے تھے۔ وہ پورے گھر کا نظام چلاتی تھی۔ زرتاج کو کچھ بھی دیکھنے، کچھ بھی کرنے اور کسی سے مغز ماری کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یوں اس کا بہت وقت بچتا تھا جسے وہ زیادہ مفید اور زیادہ منافع بخش کاموں میں استعمال کرتی تھی۔ وہ گھر کے مسائل میں یا دو چار ہزار کی بچت والے کاموں میں اُلجھ کر اپنا وقت قطعاً ضائع نہیں کرتی تھی۔ وہ لاکھوں والے مسائل اور کاموں پر توجہ دیتی تھی۔ وہ انگریزی کی اصطلاح "THINK BIG" کی قائل تھی۔ اگر اس کے پاس وقت بچتا بھی تھا تو وہ اسے میل ملاپ، گپ شپ میں تو استعمال کرلیتی تھی لیکن اس دوران میں بھی چھوٹے چھوٹے اور بیچ بیچ والے مسائل میں اپنی ذہنی توانائی ضائع نہیں کرتی تھی۔

دوسری طرف سے غالباً اثبات میں جواب پاکر وہ بولی "شہلا! کیا میرے گھر سے نکلنے کے بعد افضل صاحب وہاں آئے تھے؟...... نہیں؟ اچھا...... ٹھیک ہے...... نہیں...... دراصل وہ

فرما رہے تھے کہ وہ ابھی ابھی ہمارے گھر آئے تھے۔ سلیمانی ٹوپی پہن کر آئے ہوں گے تمہیں نظر کیسے آسکتے تھے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے وہ کیسی باکمال شخصیت ہیں...... ہاں...... بس یہی پوچھنا تھا۔ اچھا خدا حافظ۔"

اس نے فون بند کر کے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا اور بولی "میں اس وقت گھر سے ہی آرہی ہوں اور میرے نکلنے کے بعد بھی تم وہاں پہنچے ہوتے اور اس کے بعد طوفانی رفتار سے گاڑی چلاتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے یہاں آن پہنچتے تب بھی تصدیق ہوجاتی لیکن افسوس کہ جھوٹ کے پاؤں یا پہیے نہیں ہوتے۔"

"وہ...... دراصل بات یہ ہے......" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "اور یہ بالکل سولہ صد سچی بات ہے کہ میں نکلا تو تمہارے گھر جانے کے ارادے سے ہی تھا لیکن راستے میں ایک ایمرجنسی پیش آگئی......"

"میرا خیال ہے تمہیں یوں نہیں کہنا چاہیے کہ ایمرجنسی پیش آگئی...... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ایمرجنسی نظر آگئی۔ تم ایمرجنسی کے پیچھے چل دیے ہوگے اور میرے گھر جانا تمہیں یاد ہی نہیں رہا ہوگا "ایمرجنسی" یقیناً کافی خوب صورت ہوگی اور اس کا نام نیلم، نائلہ، کٹی، فوزی یا کچھ اور ہوگا......؟"

"بہت خوب!" میں نے تحسین آمیز انداز میں سرہلایا "تم تو جلی کٹی باتیں کرنے میں مکمل طور پر خود کفیل ہوگئی ہو۔ اتنے عرصے بعد ملاقات ہو تو انسان کو کم از کم ایک آدھ بات تو خوش گوار کرلینی چاہیے۔ ویسے بھی کسی خوب صورت لڑکی کے منہ سے بنکاک کے شعلے برآمد...... ہوتے اچھے نہیں لگتے۔"

"جب ملاقات کا آغاز ہی جھوٹ سے ہوگا تو بنکاک کے شعلے تو برآمد ہوں گے...... بلکہ عین ممکن ہے جاپان کا زلزلہ بھی آئے۔"

وہ فون اپنے شولڈر بیگ میں ڈال کر دونوں ہاتھ بغلوں میں دے کر گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہا تھا...... مذاق کر رہا تھا تم سے...... لگتا ہے اب تو تم نے جھوٹ اور مذاق میں امتیاز کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ آئندہ میں مذاق کرتے وقت ہاتھ کھڑا کرلیا کروں گا اور خبردار کرنے کے لیے کچھ ...اس قسم کا تمہیدی جملہ بھی بول دیا کروں گا۔ "واضح رہے کہ فدوی اس وقت مذاق کرنے جارہا ہے......" تمہیں معلوم ہونا چاہیے میں جھوٹ نہیں بولتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ اس سے پہلے میں نے تم سے کب جھوٹ بولا ہے؟"

"تمہارے جھوٹ نوٹ کرنے کے لیے اب میں ایک رجسٹر رکھوں گی...... بلکہ اس مقصد کے لیے رجسٹر سے بھی کہاں کام چلے گا۔ مجھے بہت بڑی میموری والا کوئی کمپیوٹر رکھنا پڑے گا۔ تبھی بتا سکوں گی۔ مجھ غریب کی یادداشت بھلا اتنے بڑے کام کے سلسلے میں کہاں ساتھ دے سکتی ہے۔"

"مبالغہ کرنا کوئی تم لڑکیوں سے سیکھے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اچانک مجھے یاد آیا کہ میں گاڑی سے کلون کی وہ شیشی لیے اُترا تھا جو میں نے آج شام خریدی تھی۔ زرتاج کی گاڑی پر نظر پڑتے ہی وہ مجھے یاد آگئی تھی۔ اس وقت وہ میرے ہاتھ میں تھی۔

میں نے جلدی سے وہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ میں تمہارے لیے تحفہ لایا تھا۔"

اس نے ایک نظر کلون کی طرف دیکھا لیکن اسے تھامنے کے بجائے مجھے گھورتے ہوئے بولی "کیا اچھا طریقہ ہے تحفہ دینے کا......! بالکل ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے سڑک سے پتھر اٹھا کر کسی کو کھینچ کر مارتے ہوئے انسان کہہ دے "یہ لو...... یہ میری طرف سے تمہارے لیے تحفہ ہے۔" اس طرح دیے جاتے ہیں تحفے؟"

"پھر کس طرح دیے جاتے ہیں تحفے؟" میں نے پریشانی سے پوچھا "مجھے اس طرح کے کاموں کا تجربہ نہیں ہے۔ کیا اسے دونوں ہاتھوں پر رکھ کر اور ایک گھٹنا زمین پر ٹکا کر تمہاری خدمت میں پیش کروں؟"

"اگر تحفہ دینے کا سلیقہ نہیں تھا تو کم از کم اس کی گفٹ پیکنگ ہی کرالاتے۔ ذرا دو چار سیکنڈ کے لیے تجسس ہی رہتا کہ نہ جانے اندر کیا ہو۔" وہ ذرا نرم پڑتے ہوئے بولی۔

"یہی تو میرے سیدھا سچا اور دیانت دار ہونے کا ثبوت ہے کہ جو کچھ بھی میرے پاس ہے وہ بغیر کسی لیپا پوتی کے، سامنے رکھ دیتا ہوں۔ میرے جذبات بھی بغیر پیکنگ کے ہیں اور میرا تحفہ بھی۔" میں نے فوراً کہا "اس کے علاوہ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مجھے واقعی ایمرجنسی پیش آگئی تھی۔ تبھی تو میں اس کی پیکنگ تک کے لیے نہیں رک سکا۔"

"کیا ایمرجنسی کو گھر تک چھوڑنے چلے گئے تھے؟" اس نے نہایت ملائمت سے پوچھا۔

"چلو...... یہی سمجھ لو۔" آخر میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اس معاملے کا تعلق ایک لڑکی سے ضرور تھا لیکن بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو......"

"دیکھا......؟ میرا اندازہ بہرحال ٹھیک تھا نا؟" وہ میری بات کاٹتے ہوئے فاتحانہ لہجے میں بولی "بات چاہے کچھ بھی ہو، مسئلہ بہرحال لڑکی کا تھا...... اور بات کا کیا ہے...... بات تو تم کچھ بھی بنا سکتے ہو۔"

"اس لڑکی کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی تھا جو اس کا باپ یا چچا وغیرہ ہرگز نہیں تھا۔" میں نے گویا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

"اسی لیے تو تمہیں اپنا زیادہ اسکوپ نظر آیا ہوگا۔ تم نے سوچا ہوگا کہ ادھیڑ عمر آدمی کو تو میں آسانی سے ایک طرف ہٹا کر اس کے مقام پر فائز ہوجاؤں گا۔" اب زرتاج اپنی شریر مسکراہٹ کو قابو میں رکھنے میں ناکام ہورہی تھی۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"یہ ایک بہت سنگین اور گمبھیر معاملہ تھا۔" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا "میں آج کل ایک ایسے کیس پر کام کر رہا ہوں جو پھیلتا ہی چلا جارہا ہے۔ شاخ میں سے شاخ نکلتی چلی آرہی ہے۔"

"اور اسی حساب سے جوق در جوق لڑکیاں سامنے آتی جارہی ہیں۔" زرتاج نے لقمہ دیا۔

"تمہارے منہ میں گھی شکر...... لیکن فی الحال ایسا نہیں ہو رہا ہے۔" پھر میں نے اِدھر اُدھر دیکھ کر کہا "کم از کم اندر تو چلو تاکہ شرفا کی طرح بیٹھ کر بات کرسکیں...... اور یہ تحفہ تمہیں لینا ہے یا نہیں لینا ہے؟" میں نے ایک بار پھر کلون کی شیشی اس کی طرف بڑھائی جو خوب صورت ڈبے میں بند تھی۔

"خدا کی پناہ......! تحفہ بھی گویا مار پیٹ کر دیا جارہا ہے۔" زرتاج بڑبڑائی اور شیشی میرے ہاتھ سے ایک جھٹکے سے لے کر اس نے بے پروائی سے اپنی گاڑی کے ڈیش بورڈ پر تقریباً پھینک دی۔

"اور یہ تحفہ لینے کا طریقہ تو گویا بہت اچھا ہے۔" میں نے جل کر کہا۔

"بھئی جیسا تحفہ دینے والا ہے اور جیسے اس کے طور طریقے ہیں ویسا ہی تحفہ لینے والا ہے اور ویسے ہی اس کے طور طریقے ہیں۔" وہ اطمینان سے بولی اور گاڑی لاک کر کے میرے ساتھ چل دی۔

ہم آفس میں پہنچ کر بیٹھ چکے تو وہ انگلیوں سے میز کھٹکھٹاتے ہوئے بولی "آج کل کس لڑکی پہ...... میرا مطلب ہے کس کیس پر کام کر رہے ہو؟"

"زرتاج...... زرتاج......! خدا کے لیے کچھ شرم کرو۔ یہ آج تمہیں کیا ہوگیا ہے؟" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا "تم کیوں پہلے اپنی نظر میں اور پھر دوسروں کی نظر میں میری ریپوٹیشن کا بیڑا غرق کرنے پر تلی ہوئی ہو؟ تم تو اس طرح بات کر رہی ہو جیسے میں ہر وقت لڑکیوں کے چکر میں رہتا ہوں......"

"حالانکہ تم تو لڑکیوں کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔" اس نے طنزیہ انداز میں لقمہ دیا۔

"تقریباً یہی بات ہے۔ اس میں جھوٹ کیا ہے۔" میں نے فوراً کہا "لڑکیوں کے معاملے میں مجھ جیسا شریف اور صبر و ضبط رکھنے والا آدمی تمہیں مشکل سے ہی کہیں ملے گا۔"

"میں کیا ڈھونڈنے جارہی ہوں جو مجھے بتا رہے ہو؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"نہیں...... ویسے ہی مطلع کر رہا ہوں۔" میں نے سہم کر کہا "تم خواہ مخواہ میری شہرت ایک پلے بوائے کی سی بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں۔ میرا اپنا ایک فلسفۂ حیات ہے جس پر میں سختی سے کاربند چلا آرہا ہوں۔ تم نے کبھی مجھے لڑکیوں کے پیچھے بھاگتے دیکھا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے زور شور سے نفی میں سرہلایا "تم تو سر جھکائے، نابیناؤں والا چشمہ لگائے اپنے راستے پر چلے جارہے ہوتے ہو۔ لڑکیاں خود ہی لڑھک لڑھک کر تمہارے راستے میں آجاتی ہیں۔" پھر وہ خبردار کرنے کے سے انداز میں انگلی اُٹھاتے ہوئے بولی "میں تمہیں بتا رہی ہوں کہ جلد ہی تمہاری شہرت ایک پلے بوائے سے بھی زیادہ خراب ہوجائے گی۔"

"یہ تم کیا فضول باتیں کر رہی ہو۔ لوگ سُنیں گے تو کیا کہیں گے۔" میں نے خوف زدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔

"سن کر کچھ کہنے کی بات تو چھوڑو۔ یہ سوچو کہ لوگ اپنی آنکھوں سے تمہاری حرکتیں دیکھیں گے تو کیا کہیں گے۔" وہ جلے کٹے ...سے انداز میں بولی "لوگ جب یہ دیکھیں گے کہ ایک اتنا بڑا بزنس مین...... گروپ آف کمپنیز اور فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک بُرے حالوں، مٹی میں لتھڑا...... گندہ شکن آلود سوٹ پہنے...... بال بکھرائے...... بلکہ بالوں میں کچھ تنکے وغیرہ بھی پھنسائے اور کچھ اسی سے ملتے جلتے حلیے کی لڑکی کے ساتھ ایک کھٹارا سے رکشے میں بیٹھا تھانے جارہا ہے، تب وہ کیا سوچیں گے؟ تم نے کبھی اس پہلو پر غور کیا؟"

"اوہ...... مائی گاڈ!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگا لیا "اب میں سمجھا...... یہ طنز کے تیر اس سلسلے میں برسائے جارہے ہیں......! شاید ایسے ہی مواقع کے لیے شاعر نے کہا ہے "جن پہ تکیہ تھا وہی گدے ہوا دینے لگے۔"

"پتے ہوا دینے لگے۔" وہ تصحیح کیے بغیر نہ رہ سکی۔

"مجھے معلوم ہے۔ اتنی اردو مجھے بھی آتی ہے۔ میں نے تو یونہی ذرا منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے تبدیلی کی ہے۔ معلوم نہیں کیوں تکیے کے ساتھ گدے کا استعمال زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ وہ والا تکیہ نہیں ہے جس پر سر رکھ کے سویا جاتا ہے۔ یہ وہ تکیہ ہے جس کے معنی انحصار کرنا ہوتا ہے۔"

"یہ بھی مجھے معلوم ہے...... بلکہ مجھے کیا، چوتھی جماعت کے بچے کو بھی معلوم ہے۔"

"چوتھی جماعت کے بچے کو معلوم ہے، اس پر مجھے حیرت نہیں ہے...... لیکن تمہیں معلوم ہے اس پر مجھے ضرور حیرت ہے۔ کیا تم چوتھی جماعت تک اسکول گئے ہو؟" اس نے نہایت معصومیت سے سوال کیا تھا۔

"نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اسکول کسے کہتے ہیں۔" میں نے بھی اسی معصومیت سے جواب دیا۔

"مجھے تو پہلے ہی شبہ تھا۔" وہ اطمینان سے بولی "تبھی تو تم مصرعوں کو بھی منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے استعمال کرتے ہو۔ شاید یہ بھی تمہارے نزدیک گاجر مولی کی طرح ہیں۔"

"فضولیات میں اُلجھنا اور دوسرے کو بھی اُلجھالینا تم لڑکیوں پر ختم ہے۔ بات لڑکیوں سے ہی شروع ہوئی تھی اور لسانیات پہ جا پہنچی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اس نے چند روز پہلے اس وقت مجھے دیکھ لیا تھا جب میں صفیہ کے ساتھ ایک عجیب مصیبت بھگتنے کے بعد رحیم گل کی طرف جارہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "تم نے یہ نہیں پوچھا کہ اس وقت میں نے یہ مصرع پڑھا کیوں تھا؟"

"چلو یہ بھی بتادو۔" وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بولی۔

"تمہیں شرم دلانے کے لیے۔" میں نے کہا "تم نے اگر مجھے اتنے بجرے حال میں ایک لڑکی کے ساتھ کھٹارا رکشے میں تھانے کی طرف جاتے دیکھ ہی لیا تھا تو بجائے اس کے کہ تم اپنی گاڑی میں میرے پیچھے پیچھے آتیں، مجھ سے پوچھتیں کہ آخر ہم پر کیا بپتا پڑی ہے، میرے ساتھ تھانے چلتیں..... اُلٹا طعنوں کے تیروں سے کلیجا چھلنی کرنے آگئی ہو اور وہ ابھی اتنے دنوں بعد۔ چلو اگر اس وقت تمہیں راستے میں رُکتے اور ہمارا حال پوچھتے ہوئے شرم آرہی تھی تو اتنے دنوں میں کبھی تو پوچھ سکتی تھیں۔ سامنے آکر پوچھنے کی توفیق نہیں تھی تو فون پر ہی پوچھ لیتیں۔ کم از کم یہی پتا کرلیتیں کہ تمہارے اس گھامڑ قسم کے عاشق تھانے دار نے ہمیں اُٹھا کر حوالات میں تو نہیں ڈال دیا۔"

"اس بے چارے کی کیا مجال جو تمہیں حوالات میں ڈالے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "مجھے بہرحال تمہیں اس حال میں تھانے کی طرف مڑتے دیکھ کر کوئی خاص تشویش نہیں ہوئی تھی۔ مجھے معلوم تھا تم نے کسی نئے پھڈے میں ٹانگ..... بلکہ دونوں ٹانگیں اڑا رکھی ہوں گی۔ جس قسم کے کام تم کرتے پھرتے ہو ان میں انسان کے ساتھ ایسی اونچ نیچ تو ہوتی ہی رہتی ہے..... بلکہ اس کے ساتھ اس سے زیادہ بُری بھی ہوسکتی ہے۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ ذرا مسکراتے ہوئے بولی "ویسے میں نے بعد میں رحیم گل کو فون کرکے معلوم کرلیا تھا کہ معاملہ کیا تھا۔"

"اور اس نے تمہیں بتا دیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"جس حد تک اسے معلوم تھا اس حد تک تو بتا ہی دیا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"خدا کی پناہ.....!" میں نے اپنے لہجے میں دنیا جہان کا تاسف سمونے کی کوشش کی "رحیم گل جیسے آفیسر تو اس محکمے کو بالکل ہی لے کر بیٹھ جائیں گے جو کسی راز کو راز بھی نہیں رکھ سکتے۔ اپنے تھانے کی رپورٹ افسروں کو بعد میں دیتے ہیں، دوستوں کو پہلے دے دیتے ہیں۔"

"اس میں راز کی کون سی بات تھی؟ ان کے انکشاف سے کون سا آسمان ٹوٹا پڑ رہا تھا؟ ان میں سے اکثر باتیں تو اخباروں میں چھپی ہیں۔" زرتاج منہ بنا کر بولی "اور تم ہر وقت بے چارے رحیم گل کو بُرا بھلا مت کہتے رہا کرو۔ اس جیسے گنتی کے چند افسروں کی وجہ سے تو یہ محکمہ اب تک چل رہا ہے ورنہ یہ تو بہت پہلے کا بیٹھ گیا ہوتا۔"

"اوہو.....!" میں نے اب گویا ایک نئے زاویۂ نظر سے زرتاج کی طرف دیکھا "لگتا ہے اب اس بے ہودہ آدمی کے لیے تمہارے دل میں محبت کے.... جذبات پیدا ہورہے ہیں۔"

"بکواس مت کرو۔ یہ محبت کے نہیں، احترام کے جذبات ہیں۔ ایک فرض شناس آفیسر کے طور پر بہرحال میں اس کی عزت کرتی ہوں۔ اس جیسے افسروں کی تعداد اب آٹے میں نمک کے برابر رہ گئی ہے۔ وہ عہدے میں چھوٹا سہی لیکن کردار میں بہت بڑا ہے۔ جو کچھ کرنے کے مواقع اسے میسر آتے ہیں، جو کچھ ترغیبات اسے دی جاتی ہیں انہیں قبول کرنے سے باز رہنے کے لیے بڑا حوصلہ اور بڑا مضبوط کردار چاہیے جو آج کل بڑے بڑے واعظوں کے پاس بھی نہیں ہوتا..... اور وہ بے چارہ مثالی کردار کے اس مظاہرے پر داد و تحسین پانے کے بجائے بااثر لوگوں کی دھمکیاں سنتا ہے۔ مشکلات کا سامنا کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنے بعض ماتحتوں کی ناپسندیدگی کو بھی برداشت کرتا ہے۔"

"اگر وہ تمہاری یہ تقریر دل پذیر سن لیتا تو خوشی سے تڑپ کر ہی جان دے دیتا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"خوشی سے تڑپ کر جان دیتا.....! واہ..... کیا تضاد خیالی ہے!" اس نے سرہلایا۔

"میں شادیٔ مرگ والی کیفیت کی بات کررہا تھا۔" میں نے گویا کسی نہایت کم علم اور کوڑھ مغز انسان کو سمجھانے کی کوشش کی "شادی تو اس بے چارے کی قسمت میں نہیں ہے لیکن مرگ کا شکار ہوسکتا تھا۔"

"ایسی منحوس باتیں تو منہ سے مت نکالو۔ انسان کی شکل اچھی نہ ہو تو بات تو اچھی کرلنی چاہیے۔" وہ خفگی آمیز سے انداز میں بولی۔

"دیکھا.....! میں تو پہلے ہی کہہ رہا تھا اس کمینے کے لیے تمہارے دل میں ہمدردیاں بہت بڑھ چکی ہیں۔ کوئی اس کے لیے ہلکی سی بات کرے تو تم سے برداشت نہیں ہوتی۔" میں نے سر جھٹکتے ہوئے حاسدانہ سے لہجے میں کہا پھر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا "اور اس شکل کو تم خراب کہہ رہی ہو؟ تمہاری نظر تو کمزور نہیں ہوگئی ہے؟ چشمے کی ضرورت تو نہیں پڑگئی ہے؟ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کئی پاکستانی فلم سازوں کی آفرز ٹھکرا چکا ہوں جو مجھے ہیرو بنالینا چاہتے تھے۔ اگر آج ہالی ووڈ چلا جاؤں تو وہاں بھی ہاتھوں ہاتھ لیا جاؤں۔"

"..... خیر ہالی ووڈ میں تو تمہارا ہاتھوں ہاتھ لیا جانا سمجھ میں آتا ہے کیونکہ وہاں کارٹون فلمیں بھی بنتی ہیں لیکن پاکستانی فلم سازوں نے کیا سوچ کر بات کی تھی؟ کہیں وہ نابینا تو نہیں تھے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نے صرف اسے گھورنے پر اکتفا کیا تب وہ تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے بولی "اچھا..... میں سمجھ گئی..... سلطان راہی صاحب کا انتقال ہوچکا ہے نا..... انہوں نے سوچا ہوگا کہ میک اَپ وغیرہ کے سہارے تمہاری شکل وصورت کو کافی بہتر بنا کر ان کا خلا پُر کرنے کی کوشش کی جائے لیکن ان کی یہ کوشش ناکام رہتی۔ اچھا ہوا تم نے انکار کردیا۔"

میں اسے گھورتا رہا۔ وہ معصوم سی شکل بنائے بیٹھی رہی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "اب تو تمہاری زبان کی کارکردگی بھی کافی بہتر ہوتی جارہی ہے۔ راکٹ کی رفتار سے چلنے لگی ہے۔"

"یہاں کی آب وہوا اور تمہارے ساتھ نشست وبرخاست کے اثرات ہیں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیا ان دونوں چیزوں نے تمہیں سنجیدگی اور بردباری سے بات کرنا بالکل بھلا دیا ہے؟"

"میں تو سنجیدگی اور بردباری سے ہی بات کرنے کے ارادے سے آئی تھی لیکن معلوم نہیں دن کا وہ کون سا خوش نصیب لمحہ ہوتا ہے جب تم سنجیدہ ہوتے ہو۔" وہ کندھے اُچکا کر بولی۔

"میں تو اس وقت بھی پوری طرح سنجیدہ ہوں۔" میں نے واقعی سنجیدگی سے کہا۔

"اچھا.....؟" اس نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے بے یقینی سے میری طرف دیکھا "اگر سنجیدگی میں تم اتنی بکواس کرتے ہو تو غیر سنجیدگی میں کتنی کرتے ہوگے؟"

"کیا تمہیں اب تک اندازہ نہیں ہوا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ارے ہاں..... میں تو بارہا بھگت چکی ہوں لیکن انسان اپنے صدمات اکثر جلدی بھول جاتا ہے۔ خیر....." اس نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا "اب اگر تمہیں سنجیدگی کا دعویٰ ہے تو پھر کم از کم یہ تو بتادو کہ آج کل تم کن چکروں میں ہو؟ کس کیس پر کام کررہے ہو؟ کیا پرنس سمیرا کے قتل کی تفتیش پولیس کے بجائے تم کررہے ہو؟"

"نہیں..... ایسی بھی بات نہیں ہے کہ میں پولیس کا دردِ سر اپنے ذمے لے لوں۔ آخر یہ اتنا بڑا محکمہ کس لیے سرکاری خرچ پر پل رہا ہے۔ میری تو بس یونہی راہ چلتے کسی معاملے میں ٹانگ پھنس جاتی

ہے۔ میں ذرا کچھ اور زاویوں سے اس معاملے کا جائزہ لے رہا ہوں۔ پولیس اپنا کام کرتی رہے گی۔ پولیس کو تو شاید اندازہ ہی نہ ہوسکے کہ اس معاملے کی کتنی شاخیں نکلتی چلی آرہی ہیں۔ معاملہ صرف پرنس سیمرا کے قتل کا نہیں ہے۔ یہ قتل تو مجھے اور کچھ دوسرے اداروں کے لوگوں کو بہت سے معاملات کی طرف صرف متوجہ کرانے کا سبب بنا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کس کہانی کی تہ سے کیا کہانی نکلتی ہے۔"

"بہت خوب.... بہت خوب۔" اس نے بے آواز تالی بجائی "تم تو بہت ہی مدبرانہ.... یا پھر شاید "جاسوسانہ" گفتگو کرنے لگے ہو۔ اچھے بھلے دیسی زیرو زیرو سیون معلوم ہونے لگے ہو۔ معلوم نہیں مستقبل کے بارے میں تمہارے عزائم کیا ہیں۔"

"بس یہی خرابی ہے تم جیسے لوگوں میں....!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "جب میں سنجیدہ ہوتا ہوں تب بھی تم جیسے لوگ سنجیدہ نہیں ہوتے البتہ میری غیر سنجیدگی کا شکوہ کرتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ تم جیسے لوگوں کی نظر میں بے چارے دیسی ٹیلنٹ کی کوئی قدر نہیں ہوتی۔ وہ ان کا مذاق ہی اُڑاتے رہتے ہیں اور باہر والوں کی فرضی' بے سروپا اور حد سے زیادہ اونچی قسم کی گپوں پر بھی سر دھنتے رہتے ہیں۔ اسی لیے تو میں کوشش کرتا ہوں کہ کسی کو اپنی سرگرمیوں کے بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔"

"اوہو.... تم تو بُرا مان گئے۔" وہ پچکارنے کے سے انداز میں بولی "دراصل میں تو سنجیدہ ہونے کی پوری پوری کوشش کررہی ہوں لیکن بعض شکلیں ہی ایسی ہوتی ہیں کہ انہیں دیکھ کر خواہ مخواہ چھیڑ چھاڑ کرنے کو جی چاہتا ہے۔ انسان بار بار سنجیدگی کی پٹڑی سے اُتر جاتا ہے۔"

میں نے ترحم اور تاسف آمیزی نظروں سے اس کی طرف دیکھا "جب تم اپنی زمینوں پر تھیں تو کیسی اچھی.... سیدھی بچی.... سوبر اور ڈیسنٹ قسم کی لڑکی ہوا کرتی تھیں۔ فلک کج رفتار نے تمہیں کیا سے کیا بنادیا.... افسوس صد افسوس!"

"میں نے کہا نا کہ یہ یہاں کی آب و ہوا اور تمہارے ساتھ نشست و برخاست کے اثرات ہیں لیکن تمہیں زیادہ غم زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اندر سے میں اب بھی ویسی ہی اچھی' سیدھی بچی' سوبر اور ڈیسنٹ وغیرہ وغیرہ ہوں۔ دیسی ٹیلنٹ کی بھی میں بہت بڑی قدر داں ہوں۔ تمہیں تو معلوم ہونا چاہیے' میں تو خود روح کی گہرائیوں تک دیسی ہوں اور دیسی ہی رہوں گی خواہ ہمارے طور طریقے بظاہر کتنے ہی ولایتی ہوجائیں۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "لیکن وہ بات پھر بیچ میں ہی رہ جاتی ہے کہ آخر تم کس چکر میں ہو؟ کیا کرتے پھر رہے ہو؟"

"بتادوں گا.... سب بتادوں گا۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "ممکن ہے' اس سلسلے میں تمہاری مدد کی

ضرورت بھی پڑجائے۔"

"مدد کی تو خیر تمہیں کوئی کمی نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے لوگ ہر وقت تمہاری مدد کو کمربستہ رہتے ہیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوں۔ جب بھی مدد کے لیے پکاروگے' علامہ اقبالؒ کی نظم کا وہی شعر پڑھتی ہوئی آجاؤں گی جو بچپن میں ان کی کتاب میں پڑھا کرتے تھے.... حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے.... کیڑا ہوں اگرچہ . . . میں ذرا سا لیکن میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس بار تمہاری خدمات کس نے حاصل کر رکھی ہیں؟"

"کسی نے بھی نہیں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا' یہ تو معاملے کی نوعیت پر منحصر ہے کہ اس میں دلچسپی لی جائے یا نہیں؟ معاملے کو دیکھتے ہوئے میں خود بھی اپنی خدمات حاصل کرسکتا ہوں۔"

"ہاں بھئی.... تم مرضی کے مالک ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھتے ہوئے بولی "لیکن کیا یہ اتنا نازک معاملہ ہے کہ فی الحال اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جاسکتا؟"

"نہیں' خیر.... اتنا نازک کون سا معاملہ ہوسکتا ہے جس کے بارے میں تمہیں بھی نہ بتایا جاسکے۔ اگر تمہارے پاس بات کرنے کے لیے کوئی موضوع نہیں ہے تو پھر یہ موضوع چھیڑ لیتے ہیں۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ اتنی دیر بکواس کرلی ہے' دل کی بھڑاس نکال لی ہے' اب سنجیدگی سے ایک دوسرے کا حال احوال اور خیر و عافیت پوچھیں گے۔ کافی دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ تمہارا بھی تو کچھ پتا چلنا چاہیے.... آخر تم اتنے دنوں کیا کرتی رہتی ہو۔"

"یہ باتیں بھی ہوں گی۔ میں آج خاص وقت نکال کر آئی ہوں لیکن پہلے تم مجھے اپنی پُراسرار مصروفیات کے بارے میں بتاؤ۔ میں سخت الجھن اور تجسس میں ہوں.... اور اپنی رام کہانی شروع کرنے سے پہلے اچھی سی کافی کا بھی آرڈر دے دو۔ وہ بے کار اور ٹھنڈی ٹھار قسم کی کافی نہیں ہونی چاہیے جو تمہارے ہاں گاہکوں کو پلائی جاتی ہے۔ خود شیف کو فون کرکے کہو کہ بہت اچھی والی.... اسپیشل قسم کی گرما گرم کافی بھجوائے۔ اسے خبردار کردینا کہ اگر کافی بکواس ہوئی تو کپ اس کے سر پر بھی اُلٹا جاسکتا ہے۔"

"شاید اسی خدشے کے پیشِ نظر وہ مینار نما سفید ٹوپی پہنے رہتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر انٹرکام پر کچن میں

سے رابطہ کیا۔ میں پہلی بار یوں براہِ راست اس سے بات رہا تھا۔ وہ بے چارہ بوکھلا گیا۔ میں نے مدعا بیان کرنے کے بعد مہمان کہہ رہا ہے کہ وہ بے کار اور ٹھنڈی ٹھار قسم کی کافی ہونی چاہیے جو تمہارے ہاں گاہکوں کو پلائی جاتی ہے بلکہ وہ اچھی والی' اسپیشل' امپورٹڈ اور گرما گرم قسم کی کافی ہونی ہیے جو مفت خوروں کو پلائی جاتی ہے۔"

"یس سر....! میں ابھی ایسی کافی بھجواتا جس کا صرف خوشبو ان کا دل خوش ہوجائے گا۔" شیف ذرا ٹوٹی پھوٹی سی اردو میں وہ سری لنکن تھا لیکن برسوں پہلے مسلمان ہوچکا تھا۔ کچھ عرصہ لینڈ کے ہوٹلوں میں گزار چکا تھا۔ اس کے بعد سے برسوں سے تان میں تھا لیکن اردو اور انگریزی دونوں ٹوٹے پھوٹے سے از میں ہی بولتا تھا البتہ دونوں زبانیں سمجھتا بہت اچھی طرح تھا۔ کہ اچھے اشعار تک سمجھتا تھا۔ اس کی تنخواہ اور دیگر مراعات انس کے ملازم سے بھی زیادہ تھیں۔ ہوٹل کے پرسنل منیجر نے ایک بار اس کے بارے میں مجھ سے کوئی لیٹر سائن کرواتے بت مجھے بتایا تھا کہ کسی زمانے میں ایک اچھی بھلی ٹی وی آرٹسٹ اس سے شادی کے لیے تیار ہوگئی تھی کیونکہ وہ اپنی سری لنکن بیوی طلاق دے چکا تھا لیکن وہ بیل اس لیے منڈھے نہیں چڑھ سکی ان دنوں وہ ایک اور ہوٹل میں کام کرنے والی خاتون شیف عشق میں گرفتار تھا اور اس کے فراق میں اس نے اپنی لنگڑی لولی اور شاید اس سے کچھ بہتر سنہالی زبان میں شاعری تک شروع کررکھی تھی۔

میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھتے ہوئے زرتاج سے کہا "ہو سکتا ہے۔ اُمید ہے تمہارے لیے کافی تو عمدہ آجائے گی...."

پھر میں نے کافی اختصار سے اسے اپنی داستانِ غم سنائی تاہم ان صاحب نے امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں جو یہ خاص بات مجھے بتائی تھی اس کا میں نے ذکر نہیں کیا۔ بقول ان کے وہ ٹاپ سیکرٹ تھی۔ میں نے فی الحال زرتاج جیسی قریبی انتہائی قابلِ اعتماد دوست سے بھی اس کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا تھا تاہم میرا یہ ارادہ ضرور تھا کہ مناسب وقت آنے پر اسے بتاؤں گا۔ خصوصاً اگر ان معاملات میں اس کی مدد کی ضرورت پڑتی تو اسے ہر پہلو سے آگاہ رکھنا ضروری ہوجاتا۔

کافی دیر تک ہم ان معاملات کے بارے میں تبصرے اور تبصرے کرتے رہے۔ پھر زرتاج اپنے بارے میں بتانے لگی اس کے شوہر شفٹ ہوجانے سے اس کی زمینوں کے معاملات پر فرق نہیں پڑا تھا لیکن اب وہ کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد کچھ سر اٹھانے لگے تھے مگر اس کے لیے اس قسم کے فتنے کوئی اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ صرف چار چھ دن کے لیے وہاں جا ان فتنوں کا سر کچل آئی تھی۔

اس وقت کافی کا دوسرا دور چل رہا تھا اور باتیں جاری تھیں

جب انٹرکام کا بزر بجا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف امبر تھی "ارے.... تم ابھی تک بیٹھی ہو!" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔

"جی سر....! اور بلاّ خراب میں جانا چاہ رہی تھی اس لیے بادل ناخواستہ اور مجبوراً آپ کی گفتگو میں مخل ہو رہی ہوں۔" وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی "آپ کی ٹیلی فونی پیغامات کی ٹرے میں ایک اہم پیغام رکھا ہوا ہے۔ آپ نے وہ دیکھ لیا؟"

"نہیں بھئی.... میں نے باہر سے آنے کے بعد ابھی تک کسی دفتری چیز کو ہاتھ نہیں لگایا۔" میں نے دیانت داری سے جواب دیا۔

"مجھے یہی اندیشہ تھا سر!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اور اسی لیے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ آپ کی توجہ اس طرف دلاؤں لیکن میں آپ کی گفتگو میں مخل بھی نہیں ہونا چاہتی تھی۔"

"کبھی کبھی تو تم بہت ہی باتکلف اور بہت ہی مؤدب قسم کی سیکریٹری بن جاتی ہو امبر!" میں نے حیرت سے کہا "یہاں کچھ ایسے راز و نیاز نہیں ہو رہے تھے۔ تم کسی بھی وقت کوئی اہم تو کیا' غیر اہم بات بھی کرسکتی تھیں۔"

"بس.... میں جھجکتی رہی سر! بہرحال پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں یہاں اپنی خوشی سے بیٹھی رہی ہوں اور اس دوران میں بور نہیں ہوئی ہوں۔ آفس کے کونے میں جو چھوٹا سا ٹی وی لگا ہوا ہے اس پر دلچسپ پروگرام دیکھتی رہی ہوں۔" وہ خوش گوار لہجے میں بولی "بہرحال آپ اب وہ پیغام ضرور دیکھ لیں۔ مجھے وہ کچھ اہم معلوم ہوتا ہے۔"

میں نے پیغامات کی ٹرے میں سے چھپی ہوئی وہ سلپ نکالی۔ اس کے نیچے تین اور سلپ بھی موجود تھیں۔ ان سب پر ایک ہی شخص کا نام درج تھا اور دیگر اندراجات سے پتا چلتا تھا کہ اس شخص نے مختلف اوقات میں چار مرتبہ فون کیا تھا۔ وہ کسی بہت اہم موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے فون نمبر چھوڑے تھے اور درخواست کی تھی کہ میں چاہوں تو اس سے گھر پہ بھی رابطہ کرسکتا ہوں۔ اس کا نام جمیل احمد تھا اور وہ ایڈووکیٹ تھا۔

وہ کوئی غیر معروف شخصیت نہیں تھی۔ بہت بڑا وکیل تھا۔ کسی زمانے میں سیاست میں بھی سرگرم رہا تھا اور ایک آدھ مرتبہ کچھ عرصے کے لیے ایک بہت بڑے حکومتی منصب تک بھی پہنچ گیا تھا لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا تھا کہ سیاست سے کنارہ کش ہوگیا تھا حالانکہ سیاست سے شاذ و نادر ہی کسی کو کنارہ کش ہوتے دیکھا جاتا تھا۔ اس کا تو وہی معاملہ تھا کہ.... چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی......

بعض اوقات تو سیاست خود دھکے دے دے کر انسان کو اپنے ہاں سے نکالتی تھی مگر وہ نہیں نکلتا تھا اور جب سے لوٹا سیاست نے زور پکڑا تھا تو تب سے سیاست سے نکلنا اور بھی مشکل ہوگیا تھا۔ لوٹا سیاست میں زیادہ مزے تھے۔ جس سیاسی کمپنی کے بھاؤ بڑھتے

دیکھے اس میں چلے گئے۔ سیاسی پارٹیاں اب پارٹیاں کم اور مافیا ئیں یا سیاسی کمپنیاں زیادہ بنتی جارہی تھیں۔ تیز وطرار، شاطر اور چلتے پرزے قسم کے لوگ جن کا کسی نہ کسی حوالے سے کچھ نام بھی ہوتا تھا وہ اپنے ریکارڈ سے اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی بڑا لوٹا کیوں نہ ثابت کردیتے لیکن اس کے باوجود کسی نہ کسی سیاسی کمپنی کے دروازے ان کے لئے کھلے رہتے تھے اور کہیں نہ کہیں انہیں خوش آمدید ضرور کہا جاسکتا تھا۔ اس کے باوجود جمیل احمد نے سیاست چھوڑ دی تھی جب کہ وہ تو حکومتی منصب کا مزہ بھی چکھ چکا تھا۔ یہ بلاشبہ بڑی حیرت کی بات تھی۔

فی الحال اس سے بھی زیادہ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس نے اتنے ہنگامی انداز میں مجھے فون کیا تھا۔ میری اس سے کوئی واقفیت یا شناسائی نہیں تھی۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا اس سے تو کسی پارٹی میں بھی میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صرف اخبارات میں دو ایک مرتبہ بہت اونچی قسم کی کاروباری تقریبات کے سلسلے میں اس کی تصویر دیکھی تھی اور وہ صورت سے ہی مجھے نہایت شاطر قسم کی چیز دکھائی دیا تھا۔ اس کے بارے میں ایک اور اہم بات مجھے یاد آئی تھی۔ پرنسس سیرا کے قتل کے بعد جب رحیم گل تفتیش کے لیے وہاں پہنچا تھا تو اس نے تمام چیزوں کا باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔

جس کمرے کو پرنسس، آفس کے طور پر استعمال کرتی تھی اس پر پلاسٹک کے ایک خوب صورت ڈبے میں رحیم گل کو چند وزیٹنگ کارڈ پڑے ملے تھے۔ وہ ان لوگوں کے کارڈ تھے جو پچھلے چند دنوں میں پرنسس سے ملنے آتے رہے ہوں گے۔ ان میں ایک آدھ آرٹ گیلری کے مالکان، ایک دو وکیل، ایک دو صنعت کار، انگریزی اخباروں، رسالوں کے نمائندے وغیرہ شامل تھے۔ مجھے اچانک یاد آیا تھا کہ انہی میں ایک کارڈ جمیل احمد ایڈووکیٹ کا بھی تھا۔ میں اب اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ شخص شاید پرنسس کے قانونی مشیروں میں شامل تھا اور اسی کے معاملات کے سلسلے میں مجھ سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔

امبر بولی "یہ صاحب مجھ سے آپ کے موبائل فون کا نمبر بھی مانگ رہے تھے لیکن میں نے آپ کی اجازت کے بغیر دینا مناسب نہیں سمجھا۔"

"خیر..... ان معاملات میں تو تم بہت سمجھ دار ہو لیکن اجازت لینے کے لیے تو تم میرے موبائل فون پر رابطہ کرسکتی تھیں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"ایک تو میں نے آپ کو ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ باہر بھی تو آپ کی مصروفیات کا کچھ پتا نہیں ہوتا نا......" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی "دوسرے وہ جو عورتوں میں ایک خاص حس ہوتی ہے نا......"

"کون سی؟" میں نے جلدی سے کچھ تشویش کے سے عالم میں پوچھا "عورتوں میں تو بہت سی حسیں ہوتی ہیں جن میں سے کئی تو بالکل فالتو ہوتی ہیں۔"

"سر! آپ کی نظر میں تو شاید بعض عورتیں بھی بالکل فالتو ہوتی ہوں۔"

"نہیں..... نہیں..... میں اتنا گدھا نہیں ہوں کہ جو عورتوں کو فالتو سمجھوں..... خیر..... تم کس حس کی بات کررہی تھیں؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"وہی جو عورتوں میں بعض اَن کہی باتوں کو سمجھ لینے اور اَن دیکھی چیزوں کے بارے میں جان لینے کی حس ہوتی ہے....."

"اچھا.....!" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی "یہ بتا کر تو تم نے مجھے حیران کردیا کہ عورتوں میں کوئی ایسی حس بھی ہوتی ہے ورنہ میرے خیال میں تو اَن کہی تو درکنار، عورتوں کی سمجھ میں تو وہ باتیں بھی نہیں آتیں جنہیں کہہ کہہ کر کسی کی کھوپڑی کھوکھلی ہوجاتی ہے اور بعض اوقات انہیں ان چیزوں کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں ہوپاتا جو ان کی ناک کے نیچے رکھی ہوتی ہیں۔"

"آپ عورتوں کو اتنا انڈر ایسٹی میٹ نہ کیا کریں سر!" امبر کراہ کر بولی "زرتاج بی بی آپ کے پاس بیٹھی ہیں۔ وہ کیا سوچیں گی۔"

"وہ کیا سوچیں گی، تم اس کی فکر چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم نے کیا سوچا تھا؟"

"سر! میں نے اپنی حس کے ذریعے محسوس کیا تھا کہ جمیل احمد صاحب کو اتنی زیادہ ضروری بات نہیں کرنی تھی جتنا وہ ہیجان پھیلا رہے تھے۔ فون تو خیر ویسے بھی ان کی سیکریٹری کررہی تھی لیکن ہدایات وہی دے رہے تھے۔ بہرحال میں نے سوچا، جب آپ آئیں گے تب بتادوں گی اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

"چلو...... اگر تمہارا دل کہہ رہا تھا تو اس بے چارے کا مان رکھنے کے لیے میں بھی اس سے متفق ہوجاتا ہوں۔ میرا خیال ہے جمیل احمد کو گھر فون کرنے کی ضرورت نہیں۔ کل اس کے آفس میں ہی فون کریں گے۔"

"ٹھیک ہے سر! میں آپ کو یاد دلا دوں گی۔" وہ بولی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ زرتاج اس دوران میں آفس کے اس حصے سے ایک انگریزی رسالہ اٹھا لائی تھی جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہ اس کی ورق گردانی کررہی تھی۔ میں نے ریسیور رکھا تو وہ سر اُٹھاتے ہوئے بولی "تم اپنی سیکریٹری کو بھی دانہ ڈالنے سے باز نہیں آتے۔ کسی کو تو بخش دو۔"

"فار گاڈ سیک زرتاج......!" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "تم تو واقعی میری ریپوٹیشن کا بیڑا غرق کرنے پر تلی ہوئی ہو۔ اگر تم دوسروں کے سامنے میرے بارے میں اس طرح باتیں کروگی تو وہ میرے بارے میں کیا سوچیں گے۔"

"سوچیں گی۔" زرتاج نے گویا تصحیح کی "میں اگر کروں گی تو لڑکیوں کے سامنے اس قسم کی باتیں کروں گی تاکہ وہ تم پر اعتبار کرنا چھوڑ دیں۔ پتا نہیں کس کس بے چاری کو، الگ الگ تم نے کیا کیا چکر دیے ہوں گے۔"

"تمہیں تو یک بیک ہی مجھ سے کچھ دشمنی سی ہوگئی ہے حالانکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں۔ ہنسنا ہنسانا، مذاق کرنا، زبان چلانا میری عادت ہے..... لیکن یہ بھی ہمیشہ نہیں ہوتا۔ میری اپنی زبان مچل رہی ہو تو میں موقع محل اور دوسرے کا موڈ دیکھے بغیر بھی شروع ہوجاتا ہوں لیکن کبھی کبھی میں موقع محل کے باوجود بالکل سنجیدہ اور BUSINESS LIKE رہتا ہوں..... کام سے کام رکھتا ہوں۔"

"معلوم نہیں کب آتے ہیں ایسے موقع......!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "آئندہ کبھی ایسا موقع آئے جب تم سنجیدہ اور بزنس لائک نظر آرہے ہو تو مجھے ضرور فون کرنا۔ میں پریس فوٹو گرافروں کو لے کر آؤں گی تاکہ تمہاری کچھ تصویریں محفوظ ہوجائیں، سند رہیں اور بوقتِ ضرورت کام آئیں۔"

"تمہارا تو مجھ پر سے اعتبار ہی اُٹھ گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی دشمن نے تمہیں میرے خلاف بھڑکایا ہے۔ ویسے تو خیر تم جیسے دوستوں کے ہوتے ہوئے مجھے دشمنوں کی ضرورت ہی نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے..... تو پھر ایسے دوستوں کو چلے جانا چاہیے۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"ارے تم تو ناراض ہوگئیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھانے کی کوشش کی۔

"ناراض ہوں میرے دشمن۔" وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی "فرصت میسر آتے ہی میں تو پھر آجاؤں گی۔ فکر نہ کرو..... تمہارے دوست نما دشمن یا دشمن نما دوست قبر تک تمہارا پیچھا نہیں چھوڑیں گے۔"

"خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" میں نے طمانیت سے کہا۔

"اگر کبھی خدا تمہیں توفیق دے اور راستے میں ایک بار پھر کوئی ایمرجنسی پیش نہ آجائے تو تم بھی میری طرف ایک آدھ چکر لگالینا۔"

"تم بلاؤ اور ہم نہ آئیں ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ آپ کا یہ خادم سر کے بل آئے گا زرتاج بیگم!" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مؤدبانہ انداز میں جھکتے ہوئے کہا۔

"کیوں..... کیا پیروں میں کوئی تکلیف ہے؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"میں نے محاورہ بولا ہے۔" میں نے دانت پیس کر کہا۔

"اوہ..... اچھا..... اچھا۔" اس نے سر ہلایا "ایسے اُلٹے سیدھے محاورے نہ بولا کرو۔ میں تو ڈر ہی گئی تھی۔ تم سے کچھ بعید بھی نہیں ہے نا..... اُلٹے سیدھے کام تو تم کرتے ہی رہتے ہو۔ میں نے سوچا کہیں سچ مچ ہی سر کے بل نہ چل پڑو اور بچوں کا ایک ہجوم پیچھے لگالاؤ جو تم پر پتھر برسا رہا ہو۔"

"اس صورت میں بھی تمہیں ڈرنے کے بجائے اپنے بنگلے کے ٹیرس پر کھڑے ہوکر گانا گانا چاہیے تھا "کوئی پتھر سے نہ مارے مرے دیوانے کو۔" میں نے کہا۔

"میں پاگل نہیں ہوں جو اس قسم کے گانے گاؤں گی۔ میں تو نثر میں ان سے درخواست کروں گی کہ اسے اگر مارنا ہی ہے تو ڈنڈے سے مارو، جوتوں سے مارو۔ پتھر سے تو نشانہ خطا بھی ہوجاتا ہے۔"

"تم بہت ہی سنگدل لڑکی ہو۔" میں نے اسے سی آف کرنے کے لیے اس کے ساتھ باہر جاتے ہوئے کہا "عشق کے جراثیم تو تم میں بالکل نہیں ہیں۔"

"بہت تھے..... تم سے ملنے کے بعد بے چارے شرم سے مرگئے۔" وہ بولی۔

میں نے چلتے چلتے راہداری کی چھت کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی اور درد ناک لہجے میں کہا "افسوس! اس دنیا میں کوئی بھی مجھے سمجھ نہیں سکا۔"

"ظاہر ہے..... آج کل کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ وہ گدھوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔" وہ منہ بنا کر بولی "اور پھر گدھوں کی ایک ٹریجڈی تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھتے۔"

اس وقت تک ہم پارکنگ لاٹ میں جا پہنچے تھے۔ وہ پجیرو کے قریب پہنچ کر میری طرف گھوم کر یک دم بدلے ہوئے سے لہجے میں بولی "بہرحال..... تحفے کا بہت شکریہ..... جس طرح بھی سہی..... جس جگہ بھی سہی..... جس انداز میں بھی سہی..... لیکن یہی غنیمت ہے کہ تمہیں کسی کا خیال تو آیا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا' وہ تالا کھول کر تیزی سے گاڑی میں بیٹھ کر ہاتھ ہلا کر روانہ ہو گئی۔

○☆○

میں نے گاڑی کلفٹن کی اس نو تعمیر شدہ پندرہ منزلہ خوب صورت کاروباری عمارت کی تنگ سی پارکنگ لاٹ میں روکی جو شیشے اور سیمنٹ کا خوب صورت امتزاج تھی۔ یہاں زمین چونکہ بہت ہی بیش قیمت تھی اور اس کی پیمائش کے حساب میں چند انچ کی بھی بڑی اہمیت ہوتی تھی اس لیے پارکنگ جیسے "فضول" سے مقصد کے لیے کم سے کم جگہ میں کام چلانے کی کوشش کی گئی تھی البتہ یہ مہربانی کی گئی تھی کہ جن لوگوں کے دفاتر یا دکانیں وغیرہ اس عمارت میں تھیں ان کے لیے پارکنگ کی جگہ زیرِ زمین بنائی گئی تھی لیکن ان کے لیے بھی وہ بہت کم تھی۔ وزیٹرز کے لیے تو عمارت کے تین طرف محض ایک تنگ سی پٹی چھوڑی گئی تھی۔ نتیجہ یہ کہ کاریں ایک دوسرے کی ناک سے ناک جوڑے کھڑی تھیں اور ذرا سی بھی بے احتیاطی سے نکالتے وقت وہ ایک دوسرے سے معانقہ بھی کر سکتی تھیں۔

میں لفٹ کے ذریعے دسویں منزل کی طرف روانہ ہوا۔ بلڈنگ بنے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن لفٹ کی حالت خاصی خراب نظر آنے لگی تھی اور اسے استعمال کرنے والے... ان لوگوں کی "خوش ذوقی" کی کافی نشانیاں اس میں نمودار ہو چکی تھیں جو اپنے کاموں کے سلسلے میں باہر سے اس عمارت میں آتے تھے۔

میں یہاں جمیل احمد سے ملنے آیا تھا جس کا آفس دسویں منزل پر تھا۔ وہ غالباً یہ بلڈنگ بننے کے بعد کہیں اور سے یہاں شفٹ ہوا تھا۔ آج صبح میں نے اس سے رابطہ کیا تھا۔ مجھے امبر نے بتایا تھا کہ کل اس کے فون کچھ اس ترتیب سے آئے تھے کہ پہلے اس کی آپریٹر بولتی تھی۔ وہ سیکریٹری سے بات کراتی تھی پھر سیکریٹری' جمیل احمد سے بات کراتی تھی۔ میں نے امبر کو ہدایت کی تھی کہ آج وہ بھی اسی ترتیب سے یعنی "تھرو پراپر چینل' جمیل احمد سے رابطہ کرے۔ چنانچہ پہلے ہماری آپریٹر نے بات کی' پھر امبر نے بات کی اور دونوں طرف "سیکریٹریوں کی سطح... پر مذاکرات ہوئے۔ اس کے بعد دونوں طرف کے باس لائن پر آئے تھے لیکن میری آواز سنتے ہی جمیل احمد کچھ اس طرح چہکنے لگا تھا اور اس کی آواز سے کچھ اس طرح شہد ٹپکنے لگا تھا جیسے ہم برسوں کے شناسا تھے۔

اس نے بتایا کہ وہ کسی کاروباری سلسلے میں بات کرنے کے لیے مجھ سے ملنا چاہتا تھا اور اس کے لیے میرے آفس آنے کو بھی تیار تھا لیکن میں نے خود ہی کچھ انکساری کی طرف مائل ہوتے ہوئے اس کے دفتر چلے آنے کی ہامی بھر لی تھی۔ وہ ملاقات کا وقت مقرر کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے بتایا کہ میری مصروفیات کا شیڈول کچھ غیر یقینی تھا۔ اس میں کچھ ترمیم اور تبدیلیاں ہو سکتی تھیں اس لیے میں دفتری اوقات کے دوران میں کسی وقت بھی آ سکتا تھا۔ میں یونہی کسی خاص وجہ کے بغیر کسی حد تک اچانک ہی اس کے ہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ اس نے اس پر بھی بہ خوشی آمادگی ظاہر کر دی تھی اور میں ایک گھنٹے بعد ہی یہاں آن پہنچا تھا۔

دسویں منزل پر پہنچ کر مجھے اس کا آفس تلاش کرنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی کیونکہ وہ پورا فلور ہی اس کے پاس تھا اور یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس عمارت کے پورے ایک فلور پر ایک وکیل کا دفتر ہونا اس کی کامیابی کی دلیل تھی۔ ایک تفصیلی قسم کے بورڈ سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دراصل وکیلوں کی ایک فرم تھی جس کا سربراہ جمیل احمد تھا۔ بارہ وکیل اس کے ساتھ یا شاید اس کی ماتحتی میں کام کر رہے تھے۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ یہ فرم صرف مالیات کے شعبے میں کام کرتی تھی۔ مالیات کا شعبہ خود بہت سے شعبوں پر مشتمل تھا۔ یہ فرم غالباً ان سب پہلوؤں کا احاطہ کرتی تھی۔

میں بھاری شیشے کے خوب صورت اور تاریک دروازے کو دھکیل کر اندر پہنچا تو خنک ہوا اور ائر ریفریشنر کی بھینی بھینی مہک نے میرا استقبال کیا۔ نئے اور دبیز قسم کے نفیس قالین میں پاؤں دھنسے جا رہے تھے۔ سامنے ہی خاصی بڑی جگہ ریسپشن کے طور پر مخصوص تھی اور وہاں جو ریسپشنسٹ تشریف فرما تھی وہ خود کسی فرم کی ڈائریکٹر... وغیرہ سے کم نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ نوجوان اور حسین تھی۔ جوانی اور حسن کا اپنا نشہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ ممکن ہے کچھ دوسرے قسم کے نشے بھی اس کے ذہن کو چڑھے ہوئے ہوں۔ اس نے کچھ ایسی نخوت اور ناگواری سے ناک چڑھا کر میری طرف دیکھا جیسے میں گھر کا کوئی نوکر وغیرہ تھا جسے ہنگامی طور پر گھر کا کچھ سودا سلف لینے کے لیے بھیجا گیا تھا لیکن وہ دو تین گھنٹے کی تاخیر سے واپس آیا تھا اور وہ بھی خالی ہاتھ۔

میں نے زندگی میں یہ پہلی ریسپشنسٹ دیکھی تھی جو اس نخوت اور ناگواری سے ناک سکیڑ کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بڑے سے بڑے ادارے کی ریسپشنسٹ بھی رسماً' اخلاقاً یا کم از کم اپنی پیشہ

رانہ ضرورت اور فریضہ سمجھ کر ہی مسکرا لیتی تھی اور اگر اسے مسکرانے کی توفیق نہیں ہوتی تھی یا وہ مردوں کے معاملے میں بہت زیادہ محتاط ہوتی تھی تو کم از کم اپنا چہرہ سپاٹ ہی رکھتی تھی۔ کسی بھی قسم کے جذبات یا تاثرات کا اظہار نہیں کرتی تھی۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا لیکن ایسی نخوت..... اللہ اللہ.....! میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ابھی تو میں کچھ ایسے گئے گزرے حلیے میں نہیں تھا اور شخصیت بھی کچھ ایسی گئی گزری نہیں تھی' اس پر موصوفہ کا یہ عالم تھا۔ اگر غلطی سے کبھی کوئی مفلوک الحال یا غریب مسکین قسم کی شخصیت راستہ بھول کر اس طرف آ نکلی تو اس حسینہ کے تاثرات کیا ہوتے؟

میں نے اپنی طبیعت پر جبر کرتے ہوئے اپنی متانت اور سنجیدگی کو برقرار رکھنا ہی بہتر سمجھا اور اس کے قریب پہنچ کر ذرا گمبھیر سے لہجے میں کہا "مجھے جمیل صاحب سے ملنا ہے۔"

اس نے مجھے ایک نگاہِ غلط انداز سے نوازنے کا کرم فرمایا اور پوچھا "اپائنٹمنٹ لیا ہوا ہے آپ نے؟"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو "بڑے لوگوں سے ملنے کے آداب کا بھی کچھ پتا ہے؟ ان سے ملنے کے لیے پہلے اپائنٹمنٹ لیا جاتا ہے۔ آخر تم جیسے چغد ان دفتروں میں منہ اٹھا کر کیوں آجاتے ہیں؟"

مجھے اس پر کچھ ترس بھی آیا۔ اللہ نے شکل صورت تو واقعی بہت اچھی بنائی تھی۔ خوش لباسی کا سلیقہ بھی کہیں سے سیکھ لیا ہوگا لیکن شاید کسی ڈھنگ کے دفتر میں یہ اس کی پہلی نوکری تھی اور اس کا خیال تھا کہ وہ دنیا کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ چکی تھی۔ یہ ترقی کی آخری حد تھی..... یا پھر ممکن تھا کہ اس دفتر کی پالیسی ہی کچھ ایسی رہی ہو اور ان کے نزدیک خوش خلقی کا مظاہرہ صحت کے لیے نقصان دہ ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ یہ دفتر اور اس میں کام کرنے والے لوگ اس سے کہیں زیادہ اہمیت کے مالک ہوں جتنا کہ نظر آ رہا تھا اور ریسپشنسٹ کو اس کا احساس ہو۔ اسے یہ بھی احساس ہو کہ محض ایک ریسپشنسٹ کی سیٹ پر بیٹھی ہونے کے باوجود وہ بہرحال ایک اہم ادارے کا حصہ تھی۔

ایک لمحے کے اندر اندر یہ تمام امکانات میرے ذہن میں آ گئے۔ میں نے اپنی بوجھل سنجیدگی کو برقرار رکھتے ہوئے کہا "اپائنٹمنٹ تو جمیل صاحب مجھ سے لینا چاہتے تھے اور میرے آفس آنا چاہتے تھے لیکن مجھے تھوڑی سی فرصت میسر تھی اور اس طرف سے گزرنا بھی تھا اس لیے میں نے سوچا خود ہی ملتا چلوں۔"

اب وہ کچھ سنبھلی۔ اس کی نخوت اور ماتھے کی شکنیں کچھ کم ہوئیں۔ وہ انٹر کام کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے ذرا بہتر لہجے میں بولی "کہاں سے تشریف لائے ہیں آپ..... اور آپ کا نام کیا ہے؟ میں جمیل صاحب کی سیکریٹری سے بات کرتی ہوں۔"

میں نے اپنا نام بتایا اور کہا "بس..... صرف اتنا ہی کافی ہے۔ میں کہاں سے آیا ہوں..... کہاں جاؤں گا..... اس قسم کے سوالات کو رہنے دیجیے۔" میں نے کاؤنٹر پر کہنی ٹکاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے فوراً ہی نظر چرا لی اور انٹر کام کا نمبر پنچ کرنے لگی۔ اس کی مرمریں اور مخروطی انگلیوں کی خفیف سی لرزش بتا رہی تھی کہ وہ کچھ نروس ہو چکی تھی۔

"جوزفین! باس سے ملنے ایک مسٹر افضل چوہدری آئے ہیں..." وہ انٹر کام پر بولی اور چند سیکنڈ دوسری طرف سے کچھ سنتی رہی۔ اس نے ریسیور رکھا تو اس کا چہرہ "رُخِ روشن" میں تبدیل ہو چکا تھا۔ حسین تو وہ پہلے ہی تھی لیکن اب گویا اُس کے چہرے پر دو سو واٹ کا بلب روشن ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر کچھ آب و تاب آ گئی تھی اور وہ پہلے سے زیادہ دلکش نظر آنے لگی تھی۔

"اندر چلے جائیے سر! جوزفین آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔" اس نے اپنے موتیوں جیسے ہموار جھلملاتے دانتوں کی نمائش کی۔ یکایک ہی اس کی آواز میں مترنم گھنٹیاں بجنے لگی تھیں۔ بعض لوگوں کے اندر گویا بہت سے بٹن نصب ہوتے ہیں۔ خوش خلقی کا بٹن دبایا تو چھو دکنے لگا' لہجے سے شہد ٹپکنے لگا۔ رکھائی کا بٹن دبایا تو چہرے پر بلیک آؤٹ ہو گیا اور آواز حلق سے کچھ یوں برآمد ہونے لگی جیسے پلگ میں کچرا آ گیا ہو۔

اس نے شیشے کے ایک اور تاریک دروازے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ میں آگے جانے کے لیے کاؤنٹر سے کہنی ہٹا کر سیدھا ہوا تو اسے جیسے کچھ خیال آیا اور وہ شاید خوش خلقی کا کوئی ریکارڈ قائم کرنے کی غرض سے بولی "آئیے سر! میں آپ کو چھوڑ کر آتی ہوں۔"

وہ کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھی اور میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس کی چال بہت دلکش تھی۔ انسان اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا سیدھا جا کر کسی اندھے کنوئیں میں بھی گر سکتا تھا جس کا احساس اسے کافی تاخیر سے ہوتا۔

ہم ایک بہت بڑے ہال سے گزرے جس میں بہت ہی میزوں پر لوگ تندہی اور سرگرمی سے کام میں مصروف تھے۔ کسی کے آگے فائلوں کے انبار تھے' کسی کے سامنے کمپیوٹر سجا ہوا تھا۔ کوئی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کیے فون سے الجھا ہوا تھا اور زور و شور سے ہاتھ ہلا ہلا کر بحث و تمحیص میں مبتلا تھا۔ بعض لوگ عام لباس میں تھے۔ شاید وہ کلرک وغیرہ ہوں۔ بعض کے سیاہ کوٹ' سیاہ ٹائیاں اور نوجوان چہرے بتا رہے تھے کہ وہ زیرِ تربیت وکیل تھے۔

ریسپشنسٹ مجھے ایک کمرے میں لے گئی۔ میں نے دیکھا یہاں سب کمروں کے دروازے سنٹڈ گلاس کے تھے۔ کمروں سے باہر تو دیکھا جا سکتا تھا' کمروں کے اندر نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ دفتر مکمل طور پر ائرکنڈیشنڈ اور وال ٹو وال کارپیٹڈ تھا۔ پورا دفتر نہایت شاندار اور اس کی آرائش نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ ریسپشنسٹ مجھے

جس کمرے میں چھوڑ کر واپس ہوئی وہ بھی سیکریٹری کے بجائے کسی ایگزیکٹو ڈائریکٹر کا کمرا معلوم ہوتا تھا۔

ایک عظیم الشان قسم کی میز کے عقب میں ریپشنسٹ سے بھی کچھ زیادہ شگفتہ ودل فریب قسم کی شخصیت میرے استقبال کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نفیس قسم کے اسکرٹ میں تھی اور میز کے عقب میں ہونے کے باوجود اسے ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک دراز قد لڑکی تھی۔ جوزفین یقیناً وہی تھی۔ مجھے یہ اندازہ تو ہوگیا کہ وہ دیسی میم تھی لیکن اس کے ولایتی میم ہونے کا دھوکا کھایا جاسکتا تھا کیونکہ وہ سُرخ وسپید تھی۔ بال بھورے اور آنکھیں بھی نیلی تھیں۔ اس کی شخصیت اور رکھ رکھاؤ میں نفاست اور نکھار بھی انگریزوں والا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کہاں کوئی دیسی رنگ تھا' کوئی دیسی خوشبو تھی جس کی میں وضاحت یا نشان دہی نہیں کرسکتا تھا' اسے میں صرف محسوس کرسکتا تھا۔ شاید کوئی غیر مرئی چھاپ تھی جو بہت سے برس اس ملک میں گزرنے والوں پر لگ جاتی تھی۔ خواہ وہ انہیں خود بھی نظر نہیں آتی تھی لیکن شاید اسے محسوس کیا جاسکتا تھا۔ کم از کم میں تو محسوس کرہی لیتا تھا۔

"مسٹر افضل چوڈری......؟" اس نے نہایت دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اپنا نازک سا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔

میں نے قدر دانی کے تمام تر احساس کے ساتھ اس ہاتھ کو تھاما۔ اس میں حرارت' گداز اور ایک مبہم سی مضبوطی موجود تھی۔ نہ جانے کیوں فوراً ہی مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ یہ ہاتھ صرف مصافحہ کرنا ہی نہیں' دوسروں کی کمزوریوں سے کھیلنا بھی بخوبی جانتے تھے۔

میں نے اثبات میں سرہلایا تو اس کی مسکراہٹ کچھ اور روشن ہوگئی۔ وہ پُرانے انگریزوں والے لب ولہجے میں نہایت درست تلفظ کے ساتھ بولی "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مسٹر جمیل احمد آپ کا انتظار......"

اس کا جملہ ادھورا رہ گیا جس کا مجھے کوئی افسوس نہیں تھا۔ افسوس اس بات کا تھا کہ اس کا ہاتھ جو ابھی میرے ہاتھ میں ہی تھا' نہ جانے کس طرح آہستگی سے پھسل گیا۔ دراصل اس کے قریب ہی ایک سیاہ دروازہ بے آواز طریقے سے اچانک کھل گیا تھا اور ایک دراز قد گدھا باہر آگیا تھا۔ کم از کم میرا تو اس وقت اسے گدھا ہی کہنے کو جی چاہا تھا لیکن بادل ناخواستہ میں اسے انسان تسلیم کرنے پر مجبور تھا کیونکہ وہ دو ٹانگوں پر چل رہا تھا اور نہایت نفیس قسم کا تھری پیس سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے سر کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ اس کے نقوش تیکھے اور ناک اونچی اور نوکیلی تھی۔ وہ یقیناً کافی عمر کا تھا لیکن اس کا چہرہ سرخ وسپید تھا اور آنکھوں میں جوانوں سے زیادہ چمک تھی۔

وہ یقیناً جمیل احمد ایڈووکیٹ تھا۔ جوزفین مجھے بتانے لگی تھی کہ وہ میرا انتظار کررہا تھا لیکن اس بدبخت سے چند سیکنڈ اور انتظار نہیں ہوسکا تھا۔ منحوس نے مصافحہ ختم ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا تھا اور باچھیں کھلاتا ہوا باہر آگیا تھا۔ وہ اپنی خوش خلقی اور گرم جوشی کا مظاہرہ کچھ دیر بعد بھی کرسکتا تھا۔ یہی سوچ کر مجھے اس پر غصہ آرہا تھا لیکن مجھے صبر کا گھونٹ پینا پڑا۔ آخر اخلاق اور مینرز بھی کوئی چیز ہیں۔ خصوصاً ایسے شخص پر آپ کس طرح غصہ نکال سکتے ہیں جو اس طرح آپ کے استقبال کے لیے بڑھ رہا ہو کہ اس کے دونوں بازو بھی پھیلے ہوئے ہوں اور باچھیں بھی ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلی ہوئی ہوں۔ وہ ایسا آدمی لگتا تو نہیں تھا جو اس طرح کسی کا استقبال کرتا ہو بلکہ میں نے تو محسوس کیا کہ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو کسی خاص غرض کے بغیر کسی کو اپنی خفیف سی مسکراہٹ سے بھی نہیں نوازتے۔

"آیئے...... آیئے مسٹر افضل چوہدری......!" وہ گرم جوشی سے مجھ سے مصافحہ نہیں بلکہ معانقہ کرتے ہوئے بولا۔ آدمی وہ دُبلا پتلا تھا لیکن اس کا جسم مختلف سائز اور ساخت کی آہنی سلاخوں سے بنا ہوا لگتا تھا۔ اگر اسے محض دکھاوے کے طور پر ہی گرم جوشی کا اظہار کرنا تھا تو رسماً ہی گلے مل لینا کافی تھا لیکن وہ کمینہ تو اپنی مضبوطی اور طاقت کا احساس بھی دلانے کی کوشش کررہا تھا۔ میری جگہ اگر کوئی عام سا آدمی ہوتا تو اس کی ہڈیاں کڑکڑا اٹھتیں۔ لنگور کا بچہ اپنے اور میرے سوٹ ٹائی وغیرہ کی خوب صورتی اور نفاست کا بھی خیال نہیں کررہا تھا۔ ان میں شکنیں پڑسکتی تھیں حالانکہ عام حالات میں وہ مجھے رکھ رکھاؤ کا بہت خیال رکھنے والا اور نک چڑھا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن اس وقت اس نے گویا اپنے تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

معلوم نہیں وہ کس توقع پر مجھے اتنے جوش وخروش سے بھینچ رہا تھا۔ شاید وہ میرے حلق سے مداریوں والا کوئی گولا برآمد ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتا تھا۔ جب اس کی یہ کوشش چند سیکنڈ سے زیادہ طول کھینچ گئی تو میں نے اسے ہلکا سا ڈوز دے دینا ہی بہتر سمجھا۔ میں نے اپنی حرکات وسکنات سے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں اس کے ساتھ کسی قسم کی زور آزمائی کررہا تھا کیونکہ اس کی وہ خوب صورت' خوش ادا ... سیکریٹری دلچسپی آمیز نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی مسکراہٹ برقرار رکھی لیکن دوسرے ہی لمحے جمیل احمد کے بازوؤں کا شکنجہ میرے گرد ڈھیلا پڑگیا اور اس نے ہڑبڑا کر مجھ سے الگ ہونے کی کوشش کی۔

میں نے آہستگی سے اسے چھوڑ دیا۔ اس کے لیے دو تین سیکنڈ کا ڈوز ہی کافی تھا۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا تھا اور نتھنے تیزی سے پھول پچک رہے تھے۔ یہی ڈوز اگر لمبا ہوجاتا تو اس کے چہرے پر سُرخی کے بعد نیلاہٹ آجاتی اور جب میں اسے چھوڑتا تو وہ پٹ سے فرش پر گر پڑتا۔

"میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ مجھے آپ کے آنے کی کتنی خوشی ہے مسٹر افضل چوہدری!" وہ اب مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے ذرا مرتعش لہجے میں بولا۔ وہ اس مختصر ڈوز کے اثرات سے سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا۔ غنیمت تھا کہ اب مصافحے میں اس نے اپنی مضبوطی کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کی تھی لیکن کئی لمحے تک بازو کو ضرور اس طرح زور شور سے ہلاتا رہا جیسے ہینڈ پمپ سے پانی نکالنے کی کوشش کررہا ہو۔

"تو نہ بتایئے جمیل صاحب! بغیر بتائے بھی کام چل جائے گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"آہا...... ہاہا...... ہاہا......" اس نے خوش دلی سے ایک مختصر اور مہذبانہ قہقہہ لگایا۔ اس کی خوش دلی بھی مصنوعی تھی اور قہقہہ بھی "میں اِدھر اُدھر سے سن چکا ہوں کہ آپ بڑے زندہ دل اور خوش مزاج آدمی ہیں۔ آج کے دور میں ایسے آدمیوں سے مل کر مجھے تو خاص طور پر بہت ہی خوشی ہوتی ہے کیونکہ اس نئے زمانے اور ماڈرن لائف میں "گردن کاٹ" مقابلے کی دوڑ نے ہماری زندہ دلی اور خوش مزاجی چھین لی ہے۔"

پھر ذرا توقف سے وہ بولا "میں ابھی دوبارہ آپ کے آفس فون کرنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا۔ چلئے نا...... اندر چلئے۔" اس نے اپنے کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ بڑی محبت سے اس نے میرا بازو تھاما ہوا تھا گویا اسے اندیشہ ہو کہ میں اچانک واپس بھاگ لینے کا ارادہ نہ کرلوں۔

میرے خیال میں ملاقات کا آغاز بُرا نہیں تھا۔ سب سے اچھی ت تو یہ تھی کہ اس دفتر میں داخل ہوتے ہی دو خوب صورت یوں سے سامنا ہوا تھا جسے اچھا ہی شگون سمجھنا چاہیے تھا۔ ان ں سے ایک نے ابتدا میں ناک بھوں چڑھائی تھی لیکن جلد ہی اس ا نخوت دور ہوگئی تھی اور دوسری تو سرتاپا خوش خلقی ہی بن کرملی ی کیونکہ اسے میرے یہاں تک پہنچنے سے پہلے ہی معلوم ہوگیا تھا ہ میں وہ شخص تھا جس کا اس کے باس کو بے تابی سے انتظار تھا۔

وہ اس وقت بھی سرتاپا خوش خلقی ہی بنی کھڑی تھی۔ سکراہٹ اس کے ہونٹوں پر گویا منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے ردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی دانست میں آنکھوں ہی نکھوں میں اظہارِ افسوس کرنے کی کوشش کی "تم سے ملاقات ت تشنہ رہی خوب صورت خاتون......! لیکن خیر...... اب تو میں نے یہ دفتر دیکھ لیا ہے۔ امید ہے تم سے آئندہ بھی ملاقات رہے گی ر کچھ بعید نہیں کہ ابھی تمہارے اس لومڑ نما باس سے مل کر ہیں جاتے وقت ہی تم سے ذرا تفصیلی بات چیت ہوجائے...... یا از کم میں اپنا وزیٹنگ کارڈ تو تمہاری خدمت میں پیش کر ہی اس ویسے تو تمہیں میرے فون نمبر...... میرا ٹھکانا معلوم ہو ہی ا ہے اور غالباً تمہیں یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ میں کون ہوں۔ اس ہ رابطہ تو کچھ دشوار نہیں...... اگر تمہاری یہ نپی تلی مسکراہٹ' مصنوعی خوش خلقی کچھ حقیقت کا رنگ اختیار کرسکے تو کیا ہی اچھا ہے!"

شاید اس نے میری آنکھوں میں یہ خاموش پیغام پڑھ لیا تھا اور اس کا بُرا نہیں منایا تھا کیونکہ میں نے دیکھا اس کی مسکراہٹ روشن تر ہوگئی تھی اور اس کی نیلی آنکھوں میں ستاروں جیسی جھلملاہٹ آگئی تھی۔ وہ آہستگی سے اپنی جگہ بیٹھ گئی لیکن اس کا چہرہ ہماری ہی طرف رہا مگر دوسرے ہی لمحے ہم دروازے کے دوسری طرف پہنچ چکے تھے۔

دروازہ ہمارے عقب میں بند ہوگیا۔ اب ہم جمیل احمد کے کمرے میں تھے۔ اب تک میں نے دفتر کا جتنا بھی حصہ دیکھا تھا اسے نہایت شان دار پایا تھا۔ اس کی آرائش بہت معیاری اور وہاں موجود سازو سامان بے حد قیمتی تھا لیکن میں جتنا کچھ دیکھ چکا تھا' جمیل احمد کا کمرا اس سے بھی کہیں بہتر تھا۔ پہلی نظر میں وہ کسی وکیل کے بجائے بہت بڑی انڈسٹری یا بزنس کے مالک کا کمرا دکھائی دیتا تھا۔ پورا دفتر ہی کچھ ایسا تاثر دیتا تھا جیسے یہاں سے کوئی بات بڑا بزنس یا انڈسٹری چلائی جاتی تھی۔ ذرا توجہ سے دیکھنے پر وہ علامتیں دکھائی دیتی تھیں جو وکالت سے اس کے تعلق کی نشان دہی کرتی تھیں۔ مثلاً باہر ہال میں' میں نے کالے کوٹوں والے کچھ نوجوانوں کو دیکھا تھا اور جمیل احمد کے کمرے میں شیشے کے دروازوں والی خوب صورت الماریوں میں بے شمار کتابیں بھری ہوئی تھیں جن میں سے بیش تر قانون کے موضوع پر تھیں۔

جمیل احمد نے خود میرے لیے کرسی کھینچی اور بڑے احترام سے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زندگی میں اس سے پہلے وہ کبھی اتنا خوش نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت مجھے دیکھ کر ہوا تھا۔ میں گویا بچپن میں اس سے بچھڑا ہوا چھوٹا بھائی یا بیٹا تھا جو اتفاقاً اسے مل گیا تھا یا پھر شاید میں اس کا کوئی ایسا لاولد اور قریب المرگ رشتے دار تھا جو اپنی تمام دولت وجائداد اس کے نام پر چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہونے والا تھا یا پھر شاید میں کوئی عرب شیخ تھا جو اپنا تیل کا ایک آدھ کنواں اس کے نام کرنے آیا تھا۔ اس وقت مجھے دیکھ کر وہ جتنا خوش نظر آرہا تھا اس کی وجوہات تو کچھ اسی قسم کی ہوسکتی تھیں۔

سچی بات یہ تھی کہ جب امبر نے مجھے اس کے فون کے بارے میں بتایا تھا تو میں کچھ تشویش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ وہ اتنا بڑا اور دھانسو قسم کا وکیل تھا۔ شاید بار ایسوسی ایشن کا عہدے دار وغیرہ بھی رہا تھا۔ ان دنوں میں بھی دو تین جگہ اپنے آپ کو ایک ایسا وکیل کہہ کر متعارف کراچکا تھا جو باقاعدہ پریکٹس نہیں کرتا تھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ کہیں جمیل احمد کو میرے اس چھوٹے سے' معصوم سے فراڈ کی خبر تو نہیں مل گئی تھی؟ وہ تو شہر کے سب وکیلوں کو جانتا ہوگا۔ حتیٰ کہ ان کو بھی...... جن کے پاس صرف ڈگری یا اس کے ساتھ ساتھ پریکٹس کا اجازت نامہ بھی تھا' اس کے باوجود وہ باقاعدہ پریکٹس نہیں کرتے تھے۔ جمیل احمد کو ان سب کے بارے میں معلومات ہوں گی۔ کہیں وہ مجھ سے اس سلسلے میں تو کچھ معلومات

کرنا نہیں چاہتا تھا کہ آخر یہ کیا چکر چلاتا پھر رہا تھا؟ شاید پرنس نے اس سے میرا ذکر کیا ہو اور پھر اس نے میرے بارے میں معلومات کی ہوں...... لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے ان خیالات کو مسترد کردیا تھا۔ یہ کچھ زیادہ ہی اندیشہ ہائے دور دراز قسم کی باتیں تھیں۔

اب جس طرح جمیل احمد میرے سامنے بچھا جارہا تھا اس سے کوئی نئی ہی کہانی سامنے آتی دکھائی دے رہی تھی۔ زمانے کا دستور تو یہی تھا کہ لوگ اس وقت آپ سے اس طرح ملتے تھے جب انہیں آپ سے کوئی غرض ہوتی تھی' کوئی کام ہوتا تھا۔ میں یہ اندازہ لگانے سے قاصر تھا کہ جمیل احمد کو مجھ سے کیا کام ہوسکتا تھا؟ اس سے پہلے زندگی میں کبھی اس سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اس سلسلے میں اپنے آپ کو اُلجھن میں ڈالنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اب جب کہ میں اس کے آفس تک آن ہی پہنچا تھا تو جلد ہی اس راز سے بھی پردہ اُٹھ ہی جانا تھا۔ کبھی کبھی ایک اجنبی کو بھی دوسرے اجنبی سے کام پڑ ہی جاتا ہے۔ خصوصاً ایسے اجنبیوں کو...... جو غائبانہ طور پر ایک دوسرے کو جان سکتے تھے۔ مختلف ذرائع سے ایک دوسرے کے بارے میں معلومات حاصل کرسکتے تھے اور معاشرے میں غیر نمایاں نہیں تھے۔

وہ میرے مقابل میز کے دوسری طرف جا بیٹھا اور کچھ اس طرح مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھنے لگا جیسے بات شروع کرنے سے پہلے جی بھر کے میری صورت دیکھ لینا چاہتا ہو۔ پھر اس نے میز پر سے ایک خوب صورت سگار بکس اٹھا کر' کھول کر میری طرف بڑھایا۔ اس میں تقریباً ایک ایک فٹ لمبے سگار موجود تھے۔ سگار کیا' اچھے بھلے ڈنڈے معلوم ہورہے تھے جنہیں چھوٹے موٹے فساد اور مار کٹائی میں استعمال کیا جاسکتا تھا۔

"سگار سے شوق فرمائیے افضل صاحب! ہوانا کی بہترین کمپنی کے سگار ہیں۔" وہ غالباً اپنی مسکراہٹ میں خلوص کا کچھ رنگ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"میں نے اپنے آپ کو اس شوق سے محروم ہی رکھا ہے۔" میں نے رسمی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا "بہرحال...... شکریہ۔"

"اوہ......!" اس نے آنکھیں گھمائیں "کوئی اور شوق ہو تو بلا تکلف اس کا حکم فرمایئے۔ آپ کے اس خادم کے ہاں ہر چیز کا بندوبست ہے۔ دنیا کی کوئی بھی بہترین الکحل والی ڈرنک...... یا وائن...... آپ صرف نام لیجیے' ابھی حاضر کردی جائے گی...... لیکن خیال رہے کہ ہم صرف وہی چیزیں رکھنے کا تردد کرتے ہیں جنہیں دنیا میں بہترین سمجھا جاتا ہے ...... عام قسم کی چیزوں کو شمار کریں تو پھر تعداد ہزاروں تک جا پہنچتی ہے۔"

"افسوس' میں اس شوق سے بھی دور ہوں ورنہ آپ کی ان عظیم اور کمیاب سہولیات سے ضرور استفادہ کرتا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا واقعی......؟" اس نے بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا تاثر اُبھرا جیسے وہ کہنا چاہتا ہو "کیوں زیادہ پارسا بننے کی کوشش کررہے ہو؟" لیکن دوسرے ہی لمحے یہ تاثر معدوم ہوگیا اور اس کی جگہ صرف حیرت رہ گئی۔ پھر وہ کندھے اچکا کر بولا "بہرحال...... جو بھی آپ کے شوق ہوں...... جو کچھ بھی آپ کو پسند ہو...... اس کے بارے میں اب...... یا جب بھی آپ کا دل چاہے کبھی ہمیں حکم دے کر دیکھیے گا۔ ہم ہر معاملے میں کام آنے والے...... ساتھ دینے والے لوگ ہیں۔"

وہ جمع کے صیغے میں بات کررہا تھا۔ معلوم نہیں "ہم" سے مراد صرف اس کی اپنی ذات ہی تھی یا وہ اپنی پوری فرم ہی کی بات کررہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "آپ جیسے آدمی کو تو چائے کافی وغیرہ کے لیے پوچھتے ہوئے تو مجھے شرم آرہی ہے۔ یہ تو بہت ہی عام' بہت ہی رسمی اور بہت ہی معمولی سی چیزیں ہیں۔ ہم اپنے بہت ہی رسمی سے ملاقاتیوں کو ان چیزوں کے لیے پوچھتے ہیں۔"

"میں بھی بہت عام سا ہی آدمی ہوں۔ عام سی چیزوں سے ہی بہل جاتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ آپ کی انکساری ہے...... کسرِ نفسی ہے...... یا پھر شاید ابھی آپ تکلف سے کام لے رہے ہیں۔ شرما رہے ہیں...... لیکن خیر...... کوئی بات نہیں...... اور کھل جائیں گے دو چار ملاقاتوں میں......" اس نے گویا خود ہی اپنے مذاق سے محظوظ ہوتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر انٹرکام پر ایک بٹن دبا کر بولا "کافی...... اسنیکس وغیرہ......" صرف اتنا کہہ کر اس نے ریسیور رکھ دیا۔

پھر اس نے خود اپنے لیے سگار بکس سے ایک سگار نکالا' چھوٹے سے خوب صورت چاقو سے اس کا سِرا کاٹا' گیند نما ایک خوب صورت طلائی لائٹر سے اسے سُلگایا اور ایک طویل کش لے کر ریوالونگ چیئر کے پشتے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں۔ وہ گویا اس کش سے پوری طرح لطف اندوز ہورہا تھا۔ اس کے ہونٹوں اور نتھنوں سے دھیرے دھیرے دُھواں خارج ہورہا تھا۔ میں بڑے صبر و تحمل سے بیٹھا ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس نے آنکھیں اسی طرح بند رکھتے ہوئے دوسرا کش لیا اور اس بار بھی دُھواں اسی آہستگی سے اس کے نتھنوں اور ہونٹوں کے گوشوں سے خارج ہوتا رہا۔ لگتا تھا کہ کم از کم اس کے لیے وہ سگار کچھ زیادہ ہی سرور بخش تھا۔ اس کے پہلے کش کے ساتھ ہی وہ گویا کسی اور دنیا میں پہنچ گیا تھا۔ میں نے اسے اس دنیا سے واپس لے آنا ہی بہتر سمجھا اس لیے کھنکار کر اسے چونکانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے اب کام کی بات ہوجائے۔"

"کام کی بات......؟" وہ یک دم ہڑبڑا کر آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اسے تو گویا یاد ہی نہیں رہا تھا کہ اس نے کوئی

ضروری بات کرنے کے لیے کئی مرتبہ مجھے فون کیا تھا۔ پھر وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "ہاں...... یہ آپ نے بڑے کام کی بات کی اب ہمیں 'کام کی' بات کرلینی چاہیے...... لیکن ایسی جلدی کیا ہے...... کافی کا دور تو چل جائے۔"

"کافی کا دور بھی چلتا رہے گا۔ ساتھ ساتھ باتوں کا دور بھی چلتا رہے تو بہتر ہے۔" میں نے کہا۔ "بعض اوقات کوئی کڑوی بات بھی کافی کے ساتھ کافی آسانی سے نگلی جاسکتی ہے۔"

"واہ صاحب! کیا بات کی ہے آپ نے......!" اس نے آہستہ سے میز پر ہاتھ مار کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ معلوم نہیں آج کل کیا بات تھی...... شاید ستاروں کی چال کچھ بدلی ہوئی تھی کہ ان دنوں ہر نیا ملنے والا شخص مجھے مکھن لگانے پر تلا ہوا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم کڑوی باتیں کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ ہم تو ہمیشہ میٹھی میٹھی باتیں کرنے کی کوشش کرتے ہیں......" وہ ایک بار پھر جمع کے صیغے میں بات کرنے لگا تھا "اور پھر مجھے پتا چلا ہے کہ آپ ایک بڑے بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ شوقیہ وکیل بھی ہیں۔ گویا آپ سے تو گہرا تعلق نکل آیا۔ شوقیہ ہی سہی...... لیکن بہرحال ہماری اپنی برادری کے آدمی ہیں۔ آپ سے تو بُرے حالات میں بھی کڑوی بات نہیں کی جاسکتی......"

میں بے آواز طریقے سے' اندر ہی اندر گویا کراہ کر رہ گیا۔ آخر اس کم بخت تک یہ بات پہنچ ہی گئی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھ سے قانونی دفعات پر تبادلۂ خیال نہ شروع کردے۔ ویسے تو میری قانونی معلومات بھی کسی وکیل سے کم نہیں تھیں لیکن زیادہ باریکیوں میں جانے سے میرا پول کھل بھی سکتا تھا لیکن پھر میں نے سوچا کہ میرے پاس تو عذر موجود تھا کہ میں کون سا باقاعدہ پریکٹس کرنے والا وکیل تھا اس لیے میں زیادہ باریکیوں اور تفصیلات سے لاعلم بھی ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ خود وکیلوں کو کون سی ہر بات از بر ہوتی تھی۔ میں نے دیکھا تھا' اچھے بھلے قابل اور نامور وکیل بھی ہر شام بیٹھ کر کتابوں کی مدد سے اگلی صبح کے کیسوں کی تیاری کرتے تھے بلکہ زیادہ بڑے وکیل بن جانے کے بعد تو وہ اپنے دماغوں پر زور ہی کم دیتے تھے۔ ان کا زیادہ بار ان کے معاونین نے اُٹھایا ہوتا تھا۔

میں نے گہری نظر سے جمیل احمد کے چہرے کا جائزہ لیا کہ کہیں وہ مجھے گھیرنے کی کوشش تو نہیں کررہا تھا لیکن اس کے تاثرات سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تو بے چون و چرا مجھے وکیل تسلیم کیے بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں تو شاید شبے کی پرچھائیں تک نہیں تھی' اور یہ بات ویسے بھی اس کے لیے شاید زیادہ اہم بھی نہیں تھی۔ اس کا مسئلہ اصل میں کچھ اور تھا اور اس کا ذہن اسی طرف اٹکا ہوا تھا۔

"یہ تو آپ کی نوازش ہے کہ آپ مجھ سے کڑوی بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے۔" میں نے ملائمت سے کہا "میں آپ کی میٹھی بات سُننے کے لیے ہمہ تن گوش ہوں۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن ابھی شاید اس کی میٹھی بات سُننا میرے مقدر میں نہیں تھا کیونکہ اسی لمحے شیشے کے دروازے پر خفیف سی ٹھک ٹھک ہوئی اور اس نے مجھ سے کچھ کہنے کے بجائے بہ آواز بلند کہا "یس...... کم ان۔"

ایک باوردی' اسمارٹ اور خوش شکل آفس بوائے جس کی جیب پر باقاعدہ "جمیل احمد لاء ایسوسی ایٹس" کے الفاظ انگریزی میں کڑھے ہوئے تھے' کافی اور دیگر لوازمات کی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آگیا۔ جوزفین اس کے ساتھ تھی۔ کافی سرو کرنے کا فریضہ اس نے سنبھالا۔ ہم آفس کے اس حصے میں جا بیٹھے جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

جوزفین نے برتن وغیرہ ہمارے سامنے سجانے کے بعد میرے لیے کافی تیار کرتے ہوئے غیر ضروری حد تک میری طرف جھکتے ہوئے میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا "آپ کے لیے شکر کتنی؟"

اس کی مسکراہٹ کے بعد شکر کی ضرورت نہیں رہ جاتی تھی لیکن یہ کہنا اچھا نہ لگتا اس لیے میں نے کہا "آپ جتنی مناسب سمجھیں' ڈال دیں۔ میں پرہیزی آدمی نہیں ہوں۔ کم یا زیادہ ہونے سے بھی میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

وہ دھیرے سے میرے کان کے قریب ہی ہنسی۔ اس کے وجود سے اُٹھنے والی مہک پہلے ہی میرے رگ و پے میں گدگدی سی کررہی تھی۔ اوپر سے یہ ہنسی بھی خاصی صبر آزما تھی۔ چنانچہ میں نے جلدی سے اپنی توجہ جمیل احمد کی لومڑی نما شخصیت پر مرکوز کرلی۔ اس سے میرے رگ و پے میں دوڑتی ہوئی گدگدی میں خاطر خواہ افاقہ ہوا۔

جوزفین اور آفس بوائے ہمیں کافی وغیرہ دینے کے بعد رخصت ہوچکے تو جمیل احمد پہلی چسکی لینے کے بعد ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "مجھے پتا چلا ہے کہ آپ پرنس سیرا کے قتل کے معاملے میں غیر معمولی دلچسپی لے رہے ہیں۔ شاید پولیس سے بھی زیادہ۔"

"میرا خیال ہے یہ بات اب راز نہیں رہی۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے یہ بھی پتا چلا ہے کہ آپ کامران دانش کی بڑی مدد کررہے ہیں جس پر پولیس پرنس کے قتل کا سب سے زیادہ شبہ کررہی ہے۔"

"آپ کو یہ بھی درست پتا چلا ہے۔ آپ کی معلومات کے ذرائع قابلِ رشک ہیں مسٹر جمیل احمد! کیا یہ باتیں آپ کو رحیم گل نے بتائی ہیں؟" میں نے اس کی مکار آنکھوں میں جھانکا جن میں معصومیت پیدا کرنے کی شاید وہ اس وقت سرتوڑ کوشش کررہا تھا۔

"رحیم گل ہماری معلومات کے ذرائع میں سے صرف ایک ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ وہ کچھ زیادہ ہی دیانت دار آفیسر ہے۔

ذرا ٹیڑھے اور خردماغ قسم کے افسر ہی آج کل دیانت دار ہونا افورڈ کرسکتے ہیں۔ وہ بھی اس صورت میں کہ ان کے پاؤں بہت مضبوط ہوں۔ ظاہر ہے ایسے لوگوں سے کچھ زیادہ معلومات تو نہیں حاصل کی جاسکتیں۔ کچھ بے ضرر سی باتیں ہی معلوم ہوسکتی ہیں جو وہ کسی کو بھی بتا سکتا ہے۔ بہرحال اسی طرح قطرہ قطرہ کرکے معلومات کا دریا بن جاتا ہے۔ بہرحال..... کامران کو اگر آپ کی حمایت حاصل ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اسے بے گناہ سمجھتے ہوں گے؟"

"ظاہر ہے۔" میں نے اختصار سے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے اس کے خلاف پولیس کا کیس بہت مضبوط ہے۔ اس پر شبہ کرنے کی ان کے پاس ٹھوس وجوہات موجود ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے کافی کی پیالی ہونٹوں سے لگالی لیکن اس کی نظر مجھ پر مرکوز رہی۔

"پولیس کا کیا ہے جناب!" میں نے ٹھنڈی سانس لی "پولیس چاہے تو مجھ پر اور آپ پر بھی شبہ کرسکتی ہے کہ ہم پیرس سے ایفل ٹاور چرالائے ہیں۔ آپ وکیل ہیں..... خواہ آپ کی پریکٹس مالیات کے شعبے تک محدود سہی..... لیکن پولیس کو تو آپ اچھی طرح جانتے ہیں۔ عدالت میں پیش کیے جانے والے پولیس کے سب کیس سچے تو نہیں ہوتے۔"

"لیکن سب جھوٹے بھی نہیں ہوتے۔" وہ مسکراتے ہوئے ملائمت سے بولا۔

"ہاں..... یہ میں مانتا ہوں۔" میں نے تسلیم کیا "لیکن کامران وانش کا معاملہ یہ نہیں ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کی گردن پتلی دیکھ کر اس میں پھندا فٹ کردیا جائے۔"

وہ چند لمحے اپنے سگار کے سلگتے ہوئے سرے کو پرُخیال انداز میں گھورتا رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا "کامران کے بارے میں آپ بہت پرُاعتماد معلوم ہوتے ہیں اور اس کی بے گناہی پر مصر ہیں۔ کیا آپ اسے بہت اچھی طرح جانتے ہیں؟ وہ آپ کا دوست وغیرہ تو نہیں؟"

"دوست تو نہیں، صرف وغیرہ ہے۔" میں نے جواب دیا "پرنس کے قتل سے صرف دو دن پہلے میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور وہ بھی صرف چند سیکنڈ کے لیے۔ پرنس کے قتل کے بعد میں نے اسے صرف آدھے گھنٹے کے لیے دیکھا۔ اس کی اور میری شناسائی کل انہی دو ملاقاتوں پر محیط ہے لیکن بعض چہرے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی ایک آدھ بات یقین سے جاننے کے لیے آپ کو لمبی چوڑی شناسائی کی ضرورت نہیں ہوتی۔ کامران کے بارے میں زیادہ کچھ نہ سہی..... لیکن کم از کم ایک بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ کسی کو قتل نہیں کرسکتا۔ ارادتاً تو کیا وہ اشتعال میں بھی کسی کو قتل نہیں کرسکتا تھا..... اور ایک ایسی عورت کو تو قتل کرنے کا شاید وہ کسی بھی کیفیت میں تصور نہیں کرسکتا تھا جس سے وہ بری طرح مرعوب ہو۔"

"چہروں کے بارے میں اتنے وثوق سے بات نہ کریں افضل صاحب! چہرے اکثر دھوکا دیتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں..... یہ بات اکثر کہی جاتی ہے۔ مجھے بارہا اس کا تجربہ بھی ہوا ہے اس لیے میں اس کا قائل بھی ہوں لیکن کامران پر یہ کلیہ، فلرلا گو نہیں ہوتا۔" میں نے وثوق سے کہا "لیکن آپ ان باتوں کو چھوڑیے اور اصل بات کیجیے۔"

یہ بات میں نے اتنی تیزی سے پینترا بدل کر کہی تھی کہ ایک لمحے کے لیے وہ گڑبڑا سا گیا۔ الجھن آمیز سے لہجے میں وہ بولا "کیا مطلب.....؟ میں سمجھا نہیں۔"

"آپ اتنے ناسمجھ نہیں ہیں جمیل صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے ملائمت سے کہا "آپ یقیناً بہت سمجھ دار ہیں۔ آپ کو انسانوں سے معاملہ کرنے کا..... ان سے بات کرنے کا فن یقیناً اچھی طرح آتا ہے لیکن میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ذرا غیر روایتی انسان ہوں۔ میرے ساتھ غیر روایتی طور طریقے زیادہ مناسب رہتے ہیں۔ سیدھی سچی اور براہِ راست بات چیت مجھے زیادہ اپیل کرتی ہے اور اس طرح بات چیت کرنے والے کا وقت بھی بچتا ہے۔"

"میں اب بھی نہیں سمجھا۔" اس نے شاید مزید کچھ دیر انجان بنے رہنا بہتر سمجھا۔

"اگر آپ انجان بنے رہنے پر مصر ہیں تو میں اور بھی زیادہ سلیس، آسان اور عام فہم زبان میں بات کرنے کی کوشش کرتا ہوں جمیل صاحب!" میں نے گہری سانس لے کر صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "اصل میں آپ کو بات کچھ اور کرنی ہے لیکن آپ بات کچھ اور کر رہے ہیں۔ میرا خیال ہے آپ کو جانا شمال کی طرف ہے لیکن پہلے آپ جنوب کی طرف مڑ رہے ہیں۔ شاید پہلے آپ مجھے ٹٹولنا چاہتے ہیں لیکن میں آپ کو بتادوں کہ ان احتیاطی تدابیر یا زیادہ طولانی طریقوں کی ضرورت نہیں۔ آپ کھل کر..... بے تکلفانہ انداز اختیار کرکے اور ٹو دی پوائنٹ گفتگو کرکے اپنا اور میرا وقت بھی بچا سکتے ہیں اور اس طرح ہمارے درمیان بات چیت کے لیے زیادہ بہتر فضا پیدا ہوگی۔ جواب میں وہی دوں گا جو [illegible] رہے ہیں لیکن آپ میرے ساتھ ڈپلومیٹ بننے کی کوشش کرتے رہیں گے تو آپ کے اور میرے درمیان "انڈراسٹینڈنگ" پیدا نہیں ہوسکے گی۔"

میری اس تقریر کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے خوش دلی سے ایک زوردار قہقہہ لگایا جس میں تصنع بہت کم تھا۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے جھانکتا ہوا شاطرانہ پن بھی گویا کچھ کم ہوگیا۔ اس کے تیکھے تیکھے نقوش پر مکاری کا جو ایک نادیدہ سا رنگ چڑھا محسوس ہوتا تھا وہ جیسے کم ہوگیا۔ مجموعی طور پر وہ پہلے سے بھلا انسان دکھائی دینے لگا۔

اس کا قہقہہ تھما تو وہ شیشے کی خوب صورت تپائی پر ہاتھ مار کر بولا "اپنی تمام تر بھرپور جوانی کے باوجود آپ تو بہت پہنچے ہوئے بزرگ ہیں افضل صاحب! آپ انسان کے اندر کافی دور تک جھانک لیتے ہیں۔ یہ کچھ اچھی بات نہیں ہے۔ یہ کسی کی نجی حدود میں زبردستی داخلے TRES PASSING کے مترادف ہے۔ آپ کی اس خطرناک خوبی سے تو محتاط رہنا پڑے گا۔ بہرحال اب میں کامران کے بارے میں آپ کی رائے سے متفق ہونے کے لیے تیار ہوں کیونکہ میں بھی کامران کو دیکھ چکا ہوں وہ ایسا نہیں ہے۔"

اب اس کا انداز تعصب لگانے والا نہیں تھا لیکن میں نے اسے محض ہی تصور کیا اور اس سے متاثر ہوئے بغیر کہا "یہ تبدیلی خوش گوار ہے۔"

وہ سگار کا ایک طویل کش لگانے کے بعد ایک لمحے خاموش رہا۔ اب وہ یقیناً ذرا دوسرے انداز سے اپنے آپ کو مجھ سے بات کرنے کے لیے تیار کر رہا تھا جس کا شاید وہ عادی نہیں رہا تھا۔ آخر وہ ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا "افضل صاحب! کیا آپ ایک بہت بڑی ڈیل کے بارے میں بات چیت کرنے کے موڈ میں ہیں جس میں کروڑوں روپے کا سرمایہ لگائے جانے کے لیے تیار رکھا ہے؟"

"جمیل صاحب! میں اس قسم کا بزنس مین تو نہیں ہوں جن کا اوڑھنا بچھونا ہی بزنس ہوتا ہے۔ جنہیں روپیا کمانے کا ہوکا ہوتا ہے اور جو روپے کی ہوس میں ہی مرجاتے ہیں..... لیکن میں یہ بھی نہیں کہتا کہ میں روپے پیسے سے بے نیاز ہوں اور مجھے اس کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ ظاہر ہے اگر ایسا ہوتا تو میں ایک مفلس و تہی دست شخص سے اتنا بڑا بزنس مین نہ بنتا۔ میں بڑے بڑے سودوں اور بڑے بڑے کاروباروں کی تجاویز توجہ اور دلچسپی سے سنتا ہوں لیکن اس طرح نہیں کہ میری آنکھیں ابل کر حلقوں سے باہر آنے لگیں اور دل حلق میں دھڑکنے لگے یا رال ٹپکنے لگے۔" میں نے اسے اپنا نکتۂ نظر سمجھانے کی کوشش کی جو شاید کافی حد تک اس کی سمجھ میں آگیا۔ وہ خاصے زور شور سے تفہیمی انداز میں سر ہلا رہا تھا۔

ذرا توقف کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے اتنی لمبی تقریر تو کردی اور آپ سے یہ پوچھا ہی نہیں کہ جس بہت بڑی ڈیل کی آپ بات کر رہے ہیں وہ کس کس کے درمیان ہوگی؟ میرا اس سے کوئی تعلق بھی ہوگا یا نہیں؟"

"کیوں نہیں۔" وہ کچھ سوچ کر بولا "اس سے آپ کا بھی تعلق ہوسکتا ہے..... اور اگر تعلق نہ ہو تب بھی اس میں آپ کا کوئی بڑا مفاد ہوسکتا ہے۔ کم از کم اتنا بڑا مفاد کہ آپ جیسا بڑا بزنس مین بھی اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہوجائے۔"

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ بات یک دم کامران کی ذات سے ایک بڑی بزنس ڈیل پر کیسے جا پہنچی تھی لیکن پھر میں نے خود کو تسلی دے لی کہ رفتہ رفتہ ساری بات واضح ہوجائے گی۔ مجھے صبر و سکون سے انتظار کرنا چاہیے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "کیا میں امید رکھوں کہ ہمارے درمیان جو گفتگو ہوگی وہ ہم تک ہی محدود رہے گی؟ خواہ کسی بھی معاملے میں آپ تعاون کریں یا نہ کریں..... کسی بھی بات پر آپ کا جواب خواہ اثبات میں ہو یا انکار میں..... لیکن بات صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گی۔ کیا آپ وعدہ کرسکتے ہیں؟"

"اگر اس میں کسی بے گناہ کا..... میرا..... یا اس ملک کا کوئی نقصان نہ ہو تو میں وعدہ کرسکتا ہوں۔" میں نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد کہا۔

"نہیں..... ان میں سے کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوگا۔" اس نے مجھے یقین دلایا۔

"ٹھیک ہے..... تو پھر میری طرف سے وعدہ سمجھیے۔" میں نے کہا۔

"میرے لیے آپ کا زبانی وعدہ ہی کافی ہے۔" وہ سگار کو ایش ٹرے میں رکھ کر دونوں ہاتھ کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر میز پر بازو ٹکاتے ہوئے بولا۔ وہ شخص مجھے اس قابل ہرگز نہیں لگ رہا تھا کہ اس سے کوئی وعدہ کیا جاتا لیکن اس کی پوری بات سننے کے لیے اسے کوئی تسلی دینا ضروری معلوم ہو رہا تھا۔

اس نے یہ تو کہہ دیا تھا کہ اس کے لیے میرا زبانی وعدہ ہی کافی تھا، اس کے باوجود وہ چند سیکنڈ خاموش رہا اور ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کچھ یوں گہری سانس لی جیسے کوئی شخص اونچے ڈائیونگ بورڈ سے ایسے سوئمنگ پول میں چھلانگ لگانے لگا ہو جس میں یخ پانی بھرا ہو۔

"بات یہ ہے افضل صاحب..... کہ میں چند بہت بڑے سرمایہ داروں کے ایک گروپ کی نمائندگی کرتا ہوں۔ بڑے دولت مندوں کی ایک سینڈیکیٹ سمجھ لیجیے۔ وہ لوگ پرنس انڈسٹریز کو مکمل طور پر خریدنا چاہتے ہیں۔ اس وقت بھی کچھ راستوں سے ان کا پرنس انڈسٹریز میں کچھ اثر و نفوذ ہے لیکن وہ اسے پوری طرح اپنی ملکیت میں لینا چاہتے ہیں اور اس کے موجودہ بورڈ آف ڈائریکٹرز کو ہٹا کر اس کی جگہ اپنا بورڈ آف ڈائریکٹرز مقرر کرنا چاہتے ہیں۔ پرنس سعید کی زندگی میں تو ظاہر ہے یہ ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ ان کی موت کے بعد اس ضمن میں صحیح طور پر کوششیں شروع ہوئیں اور کچھ پیش رفت بھی ہوئی۔ اسی سلسلے میں میری پرنس سمیرا سے بھی کچھ ملاقاتیں ہوئیں اور اس موضوع پر بات چیت ہوئی....."

اس کی اس بات سے یہ وضاحت تو ہوگئی کہ پرنس سمیرا کے پاس اس کا وزیٹنگ کارڈ کیوں موجود تھا۔ اس کا یہ انکشاف میرے لیے واقعی حیرت کا باعث تھا کہ پرنس سعید کے مرتے ہی کچھ سرمایہ دار پرنس انڈسٹریز کو خریدنے کے لیے سرگرم ہوگئے تھے۔ اسے خریدنا ایک چھوٹی سی سلطنت کو خریدنے کے مترادف تھا۔ وہ کوئی فلاپ اور ڈوبتی ہوئی انڈسٹری نہیں تھی جسے اونے پونے داموں خرید لیا جاتا۔ پہلے تو اس کا حجم ہی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ اگر "نفع نہ نقصان" والی حالت میں ہوتی تب بھی اسے خریدنے کے لیے بے

اندازہ دولت درکار تھی لیکن چونکہ وہ بہت چلتی ہوئی اور بہت منافع بخش انڈسٹری تھی اس لیے پہلے تو اسے خریدنے کا تصور ہی محال تھا کیونکہ ایسی انڈسٹریز عام طور پر برائے فروخت نہیں ہوتیں اور اگر کسی طرح ان کے مالکان یا وارثین اور متعلقین کو فروخت کے لیے آمادہ کر بھی لیا جائے تو اس کے لیے ان کی اصل قیمت سے کہیں زیادہ سرمائے کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ ڈیمانڈ کو دیکھتے ہوئے اگر ان کی کئی گنا زیادہ قیمت طلب کی جا رہی ہو تو یہ بھی کچھ زیادہ حیرت کی بات نہیں ہوتی۔

میں نے پوری کوشش کی تھی کہ اس کے انکشاف پر حیرت کا اظہار نہ کروں لیکن جمیل احمد نے گویا تصور کے سہارے میری اندر کی حیرت کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا "دل ہی دل میں آپ ضرور حیران ہو رہے ہوں گے اور آپ کی حیرت بجا ہے۔ آپ سوچ رہے ہوں گے کہ خریداری کے اس عمل کے لیے تو نہ جانے کتنے سرمائے کی ضرورت پڑے گی لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس سلسلے میں سرمایہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جس سینڈیکیٹ کی میں نمائندگی کرتا ہوں اس کے لیے کسی بھی حد تک سرمائے کا بندوبست کرنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ان کے صرف ایک اشارے پر کچھ بینکوں اور مالیاتی اداروں میں کمپیوٹرز کے کچھ بٹن دبائے جائیں گے اور فروخت کنندہ پارٹیاں جہاں چاہیں گی وہاں ان کے کھاتوں میں رقم منتقل ہو جائے گی۔ جتنے کیش کی وہ انڈر ہینڈ ڈیلنگ کرنا چاہیں اتنا کیش بھی وہ جب چاہیں، جس ملک میں چاہیں اور جس کرنسی میں چاہیں، مل جائے گا......"

اب جمیل احمد کی اصل حیثیت میری نظر میں واضح ہوتی جا رہی تھی۔ اس کا ٹھاٹ باٹ اور اس کی فرم کی وسعت کا اصل پس منظر بھی میرے سامنے واضح ہونے لگا تھا بلکہ اب تو مجھے یہ یقین ہونے لگا تھا کہ وہ اپنے آپ کو کچھ سکیڑے سمیٹے بیٹھا تھا۔ بہت سی مصلحتوں کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو نمایاں نہیں کیے ہوئے تھا ورنہ شاید وہ تو اس سے بھی زیادہ ٹھاٹ باٹ، اس سے بھی مہنگی جگہ پر اس سے بھی بڑا دفتر اور اس سے بھی بڑا اسٹاف افورڈ کر سکتا تھا۔ وہ مالیات کا محض ایک کامیاب وکیل نہیں تھا۔ وہ نہ جانے کتنے بڑے اور کیسے کیسے سرمایہ داروں کی سینڈیکیٹ کی نمائندگی کرتا تھا، ان کے مفادات کی نگہبانی کرتا تھا۔ اسے یقیناً ان کی طرف سے بہت سے فیصلے کرنے کی طاقت اور اختیار حاصل تھا۔ اس قسم کے لوگ بہت ہی اہم اور طاقت ور ہوتے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ اہم اور طاقت ور، جتنے کہ وہ نظر آتے ہیں۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہم سمجھ رہے تھے کہ پرنس سعید کی موت کے بعد ہمارا کام آسان ہو جائے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ بات کچھ آگے تو بڑھی لیکن کئی رکاوٹیں سامنے آگئیں جن میں دن بہ دن اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ ویسے تو مرنے والے کا ذکر اچھے الفاظ میں کرنا چاہیے لیکن افسوس کہ مرنے والے ان موصوف کے تصور کے ساتھ کچھ زیادہ اچھے الفاظ میرے ذہن میں نہیں آتے۔ بڈھا بہت ہوشیار، چالاک اور شاطر تھا لیکن میرا خیال ہے زندگی کے آخری دنوں میں بعض ایسے لوگ شاید عقل کی زیادتی کی وجہ سے سنکی ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں نا کہ زیادتی تو اچھی چیز کی بھی بری ہوتی ہے......"

وہ شاید اپنی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرایا اور ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ خود اپنے بارے میں اس کا کیا خیال تھا؟ لیکن بوقتِ ضرورت میں بھی مصلحت سے کام لیتا تھا اس لیے خاموش اور ہمہ تن گوش رہا۔

وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "ایک تو موصوف مرتے مرتے ویسے ہی وراثت کے مسئلے کو خاصا پیچیدہ بنا گئے تھے۔ اوپر سے حالات انہیں مزید پیچیدہ بنائے جا رہے ہیں......"

میرے کان کچھ اور کھڑے ہوئے۔ اگر وہ پرنس سعید کی وراثت کی پیچیدگیوں سے واقف تھا تو پھر وہ یقیناً ایک باخبر آدمی تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "پرنسس سیرا کو میں اس موضوع پر کھل کر بات کرنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا ورنہ وہ کسی سے کھل کر ذرا کم ہی بات کرتی تھی۔ اسے پرنس انڈسٹریز میں سے جو حصہ مل رہا تھا اس سے اسے اس حد تک تو دلچسپی تھی کہ وہ ایک بہت بڑا اثاثہ تھا اور اس سے بہت بڑی آمدنی ہونا تھی جس میں وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہونے کی توقع تھی لیکن وہ پرنس انڈسٹریز کو چلانے میں کوئی عملی دلچسپی نہیں رکھتی تھی بلکہ کچھ وجوہات کی بنا پر اسے پرنس انڈسٹریز پسند ہی نہیں تھی۔ وہ ایک آئیڈیلسٹ قسم کی خاتون تھی۔ اللہ تعالیٰ ازراہ کرم اسے جنت کے کسی گوشے میں جگہ عطا فرمائے۔ اسے اس بات پر آمادہ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ وہ بہت اچھی قیمت پر اپنے شیئرز فروخت کر دے، ہم کہیں اور، کسی ایسی جگہ اس کا سرمایہ انویسٹ کروا دیں گے جہاں سے اتنا ہی...... بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ منافع ملتا رہے گا اور کام بھی اس کی پسند اور آئیڈیلز کے مطابق ہو گا۔ اس سے میرے مذاکرات کا رخ اس طرف جا رہا تھا لیکن ساتھ ہی اس نے مطلع کیا کہ اگر ہمارے درمیان کچھ طے بھی پا جاتا تب بھی فوری طور پر اس پر عمل درآمد ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کا سنکی باپ کچھ ٹیڑھی شرائط لگا گیا تھا جن پر عمل درآمد کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔ ہم نے کہا...... کوئی بات نہیں، ہم صبر و سکون سے انتظار کر لیں گے۔ ہم بڑے صابر لوگ ہیں۔ ویسے بھی اتنے بڑے بڑے معاملات اتنی جلدی تو طے نہیں پاتے......"

اس نے ایک گہری سانس لی اور گفتگو کے اس موڑ پر پہنچ کر اس کے چہرے پر غم کے بادل چھا گئے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خاصے رنجیدہ سے لہجے میں بولا "افسوس کہ ہم انتظار ہی کرتے رہ گئے اور اس دوران میں کسی بدبخت نے پرنسس کو ٹھکانے لگا کر نہ صرف ایک خوبصورت ہستی کو زندگی سے محروم کر دیا بلکہ ہمارا کیا سارا محنت بھی برباد کر دی اور ایک بہت بڑے سودے کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ بھی حائل کر دی۔"

جمیل احمد کے لہجے میں غم کا تاثر حقیقی تھا لیکن یہ غم یقیناً پرنسس کے لیے نہیں تھا بلکہ سودے کی راہ میں بڑی رکاوٹ حائل ہونے کا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "لیکن دوسری اس سے بھی بڑی رکاوٹ کا آپ نے کیا حل سوچا تھا؟"

اس کے چہرے سے رنج و غم کا بادل فوراً چھٹ گیا۔ اس سے ایک اہم کاروباری سوال کیا گیا تھا اس لیے اس کی ذہنی صلاحیتیں یکدم پہلے کی طرح بیدار ہو گئیں۔ وہ بھویں اچکاتے ہوئے بولا "آپ کا مطلب ہے پرنسس سیرا کی دوسری بہن......!"

"ہاں۔ باقی آدھے حصے کی تو وہ پرنسس سیرا کی زندگی میں ہی مالک تھی اور پرنسس کی موت کے بعد یوں سمجھیں کہ پرنس انڈسٹریز کا کنٹرول اس کے ہاتھ میں آگیا ہے جبکہ اس کا اپنا کنٹرول اس کے شوہر احمد پرویز کے ہاتھ میں ہے۔"

وہ دھیرے سے ہنسا "یہ بات آپ نے درست کہی۔ آپ کی معلومات بھی کافی درست معلوم ہوتی ہیں" اس نے ستائشی انداز میں سرہلایا۔

"احمد پرویز ایک انتہائی شاطر، سفاک، متکبر اور خود غرض بزنس مین ہے" میں نے کہا "کیا آپ نے اسے پہلے ہی اپنا حصہ بیچنے پر آمادہ کر لیا تھا؟"

اس نے بڑے تحمل سے سرہلایا اور گویا کوئی مشکل مسئلہ کسی طالب علم کو سمجھانے کا آغاز کرتے ہوئے بولا "یہ دنیا بڑی عجیب جگہ ہے مسٹر افضل......"

"مجھے ہوش سنبھالتے ہی اس کا اندازہ ہو گیا تھا" میں نے لقمہ دیا۔

اس نے میری دخل اندازی کا برا منائے بغیر مسکراتے ہوئے بات جاری رکھی "بعض اوقات یہاں وہ کام زیادہ آسانی سے ہو جاتے ہیں جو بظاہر مشکل نظر آ رہے ہوتے ہیں اور وہ کام بہت اٹکتے ہیں جو آسان دکھائی دے رہے ہوتے ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کو کسی بھی ایسے آدمی سے معاملہ کرنا مشکل دکھائی نہیں دیتا جو خالص بزنس مین ہو۔ بس بنیادی طور پر اسے بزنس مین ہونا چاہیے...... اس کے علاوہ اس میں کون کون سی انسانی خصوصیات پائی جاتی ہیں، ان کی ہمیں زیادہ پروا نہیں ہوتی۔ وہ خواہ بہت نیک، پرہیزگار اور رحم دل آدمی ہو اور خواہ شاطر، متکبر، چالاک، خود غرض اور لالچی وغیرہ ہو...... ہم اس سے نمٹ سکتے ہیں۔ بزنس مین میں...... بلکہ تقریباً ہر انسان میں بنیادی عنصر لالچ کا ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کے لالچ کو ہینڈل کرنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ لیں تو پھر آپ اس سے کوئی بھی معاملہ کر سکتے ہیں۔"

مجھے دل ہی دل میں اس کی بات سے اتفاق کرنا پڑا۔ اس نے قدرے افسوس کے سے عالم میں ایک گہری سانس لے کر سلسلۂ کلام جوڑا "ہمیں سب سے زیادہ دشواری ان آئیڈیلسٹ اور انٹلیکچوئل قسم کے لوگوں سے معاملہ کرنے میں پیش آتی ہے جو کسی اتفاق یا وراثت کی وجہ سے بڑے بزنس میں آ جاتے ہیں ورنہ بزنس کرنا اس قسم کے لوگوں کے مقدر میں نہیں ہوتا۔ اگر خوش قسمتی سے کوئی بزنس اتفاق یا وراثت کے تحت ان کے پاس آ بھی جاتا ہے تو یہ بہت جلد اس کا تیا پانچا کر دیتے ہیں لیکن اگر کوئی آئیڈیلسٹ اور انٹلیکچوئل ہونے کے باوجود بہت طویل عرصے تک بہت دولت مند رہے تو سمجھنا چاہیے کہ اس کا مقدر بہت ہی زوردار ہے۔ اس صورت میں ان کی احمقانہ خود اعتمادی بہت ہی بڑھ جاتی ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ وہ کاروباری معاملات میں بھی بہت ہوشیار اور ذہین ہیں۔ ایسے لوگوں سے معاملہ کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ یہی ہمارے ساتھ ہوا۔ پرنسس سیرا کو کہ پرنس انڈسٹریز کو چلانے یا اس میں اپنا حصہ رکھنے میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ اس کے باوجود ہمیں اس سے معاملہ کرنے میں دانتوں پسینے آ گئے جبکہ بقول آپ کے...... احمد پرویز ایک ٹیڑھا آدمی تھا لیکن اس سے معاملہ کرنے اور اسے قابو میں کرنا ہمیں زیادہ مشکل محسوس نہیں ہوا۔ ایسے آدمیوں کا سب سے بڑا مسئلہ روپیا اور آئندہ کے لیے زیادہ سے زیادہ بڑے مفادات ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا "پیسا پھینک تماشا دیکھ" کا فارمولا ہمیں اکثر بہت کارآمد محسوس ہوا ہے۔ پرنس انڈسٹریز میں اس کے شیئر کی جو کچھ مارکیٹ ویلیو تھی یا مستقبل میں اسے اس سے جو کچھ پھل پھول مل سکتے تھے، ہم نے اس سے کہیں زیادہ اس کے سامنے پھینک دیا۔ اپنی تمام تر خباثتوں کے باوجود وہ خالص بزنس مین ہے۔ وہ بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا؟"

وہ جواب طلب سے انداز میں میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جمیل صاحب! آپ یقیناً تقریر کے فن سے واقف ہیں۔ انسانوں کی نفسیات سے بخوبی آگاہ ہیں۔ دلیل سے قائل کرنا آپ کو خوب آتا ہے۔ زندگی کے بارے میں آپ کا تجربہ بھی بیکراں معلوم ہوتا ہے۔" پھر میں نے ذرا صاف گوئی سے کام لیا "میرا اندازہ ہے کہ لوگوں کی کمزوریوں سے کھیلنا، انہیں بے وقوف بنانا اور سہانے خواب دکھانا بھی آپ خوب جانتے ہوں گے۔"

میں نے ایک لمحے کے لیے رک کر اس کے تاثرات کا جائزہ لیا لیکن اس کے چہرے پر ناگواری نہیں ابھری۔ وہ بدستور شفقت اور تحمل مزاجی سے مسکراتا رہا۔ اس نے یقیناً میرے الفاظ کا برا نہیں منایا تھا بلکہ شاید اس نے انہیں بھی اپنی تعریف میں شمار کیا تھا۔ چنانچہ میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "شاید اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر آپ نے سیاست میں بھی نمایاں مقام حاصل کیا تھا لیکن اچھی خاصی کامیابیوں کے باوجود آپ نے سیاست چھوڑ کیوں دی؟ یہ تو ہیروئن کا نشہ چھوڑنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک

جھکتے ہوئے خوش دلی سے بولا "آپ نے تو یکدم موضوع ہی بدل دیا لیکن کوئی حرج نہیں۔۔۔ یہ تبدیلی بھی خوش گوار ہے۔ میں آپ کے سوال کا جواب ضرور دوں گا۔ اس سے ہمارے درمیان بہتر انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہوگی۔ یہ سوال اکثر ناواقفانِ حال مجھ سے کرتے ہیں لیکن میں عموماً اس کا صحیح جواب نہیں دیتا تاہم آپ کو میں صحیح جواب دوں گا۔"

"نوازش" میں نے کہا۔

ایک لمحے پُرخیال انداز میں خاموش رہنے کے بعد وہ بولا "درحقیقت میں نے سیاست نہیں چھوڑی۔ میں نے صرف شہرت کے پیچھے بھاگنا چھوڑا ہے۔ اب میری خبریں، تصویریں اور تقریریں نہیں چھپتیں۔ میں کسی پارٹی میں نہیں ہوں لیکن درحقیقت میں اب بھی سیاست میں ہوں۔"

میں نے اپنے چہرے پر تھوڑی سی حیرت کا اظہار کرنے کی کوشش کی جس سے وہ محظوظ ہوا اور ذرا زیادہ خوش دلی سے بولا "مجھے اب پتا چلا ہے کہ سب سے زیادہ مزہ تو اس سیاست میں آتا ہے جو پردے کے پیچھے رہ کر کی جاتی ہے۔"

یہ اس نے بہت گہری بات کی تھی یا یوں کہئے کہ یہ اس نے زیادہ گہری سیاست کی بات کی تھی۔ میری اس کی ذات میں دلچسپی زیادہ بڑھ گئی۔ میں اس کی طرف زیادہ متوجہ ہوگیا۔ وہ اب بولا تو اس کا لہجہ کچھ متاسفانہ سا ہوگیا "میں جب ظاہری سیاست میں تھا تو بڑی تکلیف میں تھا۔ جس طرح ہیروئن کا مریض جب تک اس کے نشے میں گرفتار ہوتا ہے بڑی تکلیفیں، مصیبتیں اور ذلتیں اٹھاتا ہے لیکن نشے کی دھن میں سب کچھ ہنسی خوشی برداشت کرتا رہتا ہے اسی طرح مجھے بھی اس وقت وہ تکلیفیں اور ذلتیں محسوس نہیں ہوتی تھیں۔ میں اپنے آپ کو تسلی دے لیتا تھا کہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے یہ سب کچھ تو برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔ سیاست میں آنے کے بعد کبھی آپ لوگوں کو الو بنانے کے نت نئے طریقوں پر غور کررہے ہوتے ہیں۔ کبھی آپ اپنی سیاسی غلطیوں پر پردہ ڈالنے کے خوبصورت طریقوں کی تلاش میں ذہن لڑا رہے ہوتے ہیں۔ کبھی عوام کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بھاگے پھرتے ہیں اور کبھی اپنے لیڈر کی نظر میں اپنے آپ کو کارآمد اور اہم ثابت کرنے کے لیے دُم ہلاتے پھرتے ہیں۔ آپ کو خدا کی خوشنودی کی اتنی فکر نہیں ہوتی جتنی آپ کو اپنی پارٹی کے لیڈر کی خوشنودی کی فکر ہوتی ہے۔

"اس کے علاوہ بھی آپ کو بہت سے لوگوں کی خوشنودی کی فکر کرنا ہوتی ہے۔ اپنی پارٹی کے سیاسی کارکنوں کے ساتھ ساتھ آپ کو اپنے حلقے کے کارکنوں کو زیادہ خوش رکھنا ہوتا ہے۔ آج کی سیاست میں وہ پارٹی کا زیادہ اہم عنصر شمار ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ اخبار والوں کی خوشنودی کا خیال رکھنا ہوتا ہے۔ کچھ خوش خلقی سے ٹھیک رہتے ہیں۔ کچھ لفافوں سے خوش رہتے ہیں اور کچھ کے لیے کچھ دوسرے بندوبست کرنے پڑتے ہیں جس کے بعد ان کے دماغ درست ہو جاتے ہیں۔ ان سب کاموں کے ساتھ ساتھ خود اپنی پارٹی کی سیاست میں اور ملکی سیاست میں آپ کا جو جوڑ توڑ جاری رہتا ہے اس میں آپ کو ہر وقت ہر کام پر نظر رکھنا پڑتا ہے۔ ہر وقت مستعد رہنا پڑتا ہے۔ چوکسی کرنا پڑتی ہے۔ بلکہ شاید یہ چوکسی سے بھی زیادہ کوئی بڑی چیز ہے۔ شاید کوئی ہشت پہلو قسم کی جنگ ہے۔ اس کے علاوہ اگر بدقسمتی سے آپ پر وہ دور چل رہا ہو جب آپ اپوزیشن میں ہوں تو آپ کی یہ ساری تکلیفیں، مصیبتیں اور ذلتیں کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔ یعنی انسان کو اگر لوٹ مار، سودے بازی اور اقربا پروری مچائے رکھنے کی طاقت یا عہدے وغیرہ حاصل ہوتے ہیں تو اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتے۔۔۔ جان جوکھوں میں ڈالنی پڑتی ہے۔ یہ کانٹوں کا بستر ہے۔ مقابلہ بڑا سخت ہے۔ ساری پارٹی کو ہی بڑی محنت کرنا پڑتی ہے۔ کوئی نیا نعرہ سوچنا پڑتا ہے۔ کوئی نیا شوشا چھوڑنا پڑتا ہے جو عوام میں مقبول ہو۔ انہیں الو بنانے کے وہ طریقے سوچنے پڑتے ہیں جن کے ذریعے وہ آپ کی خاطر ہنسی خوشی گردن کٹانے کے لیے تیار ہو جائیں اور ان کا یہ ایمان ہو جائے کہ آپ کے سوا ان کا کوئی نجات دہندہ نہیں۔ باقی ساری دنیا ان کی دشمن ہے۔ اس کے بعد کہیں جاکر سیاست میں کوئی مقام بنتا ہے۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوا تو میں نے کہا "اور آپ نے ان سارے مسائل سے گزرنے کے بعد سیاست چھوڑ دی۔ جبکہ آپ کو کامیابی نصیب ہو چکی تھی۔"

"ہاں۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے اس سے بہتر راستہ نظر آگیا" وہ طمانیت سے بولا پھر اس کا انداز کچھ مبہم ہوگیا "مجھے کچھ لوگ مل گئے اور کچھ ایسا سیٹ اپ بنتا چلا گیا کہ میں نے محسوس کیا ہمارے پاس تو اس سے زیادہ طاقت ہے جتنی میں نے ظاہری سیاست میں آنے کے بعد اور اتنی ہمہ طرف قسم کی ذلتیں اٹھانے کے بعد حاصل کی تھی۔ پھر کچھ میرے دماغ نے اور کچھ دوسرے لوگوں کے وسائل نے کام دکھایا۔ اب میں پہلے سے زیادہ خوش حال اور پہلے سے زیادہ طاقت ور ہوں۔ پہلے میں کچھ نہ کچھ بننے کی فکر میں رہتا تھا۔ اب خود میں اور میرے مہربان مل کر کسی کو کچھ بنانے کی پوزیشن میں ہیں۔ اب آپ کے اس خادم کو بادشاہ گر کہا جاتا ہے۔ اسی دفتر میں۔۔۔ جہاں اس وقت آپ بیٹھے ہیں۔۔۔ اور آپ کے اس خادم کے غریب خانے پر بہت سے ایسے فیصلے ہوتے ہیں جن سے آپ کی سیاست میں تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ بڑے بڑے بُت اوندھے منہ گر جاتے ہیں۔ بہت سے نئے بُت سامنے آجاتے ہیں۔ جن کاموں کے لیے ہم سیاست میں دوسروں کے محتاج رہتے تھے اب وہ کام ہم خود کرسکتے ہیں۔ ہم ڈوریاں ہلاتے ہیں تو صوبائی حکومتیں لرزنے لگتی ہیں۔ پارٹیوں کے لیڈر اِدھر سے اُدھر دوڑنے لگتے ہیں۔"

وہ گویا کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرایا پھر بولا

"ظاہری سیاست اور شہرت کا اپنا ایک نشہ ہوتا ہے لیکن میں اب اس نشے کی کمی محسوس نہیں کرتا۔ میں اپنے آپ کو زیادہ مطمئن، خوش اور پُراعتماد محسوس کرتا ہوں۔"

کمرے میں چند لمحے کے لیے بوجھل سی خاموشی چھا گئی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ درحقیقت میں یہ اندازہ بھی کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ شخص اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے کا کس حد تک عادی تھا؟ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ ایسا نہیں تھا۔ وہ ایک گرگِ باراں دیدہ تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کچھ حلقے ہوتے ہیں جن میں بیٹھ کر اپنے آپ کو بڑھا چڑھا کر پیش کرنے والا شخص نہیں رہتا تھا۔ ویسے بھی اگر اس نے ایک کامیاب مقام پر پہنچ کر سیاست چھوڑ دی تھی اور اب وہ اپنی نامعلوم سینڈیکیٹ کی طرف سے پرنس انڈسٹریز کو خریدنے کی بات کررہا تھا تو وہ یقیناً کوئی معمولی آدمی نہیں رہا تھا۔ اس کے بارے میں میرا پہلا اندازہ ہی زیادہ صحیح تھا کہ وہ تو سنکناً اپنے آپ کو کچھ گھٹا کر پیش کرتا ہوگا۔ میرے سامنے تو وہ کسی وجہ سے کچھ کھل رہا تھا۔ شاید صرف اس لیے کہ اسے مجھ سے کوئی کام تھا۔

"آپ میرے جواب سے مطمئن ہوگئے؟" اس نے پوچھا۔

"یقیناً" میں نے جواب دیا "بات معقول ہے۔۔۔ سمجھ میں آتی ہے۔"

"تو پھر ہم اب واپس اپنے اصل موضوع کی طرف آجائیں؟" اس نے بڑی شائستگی سے اجازت چاہی۔

"ضرور، ضرور" میں نے جلدی سے کہا "آپ نے یہ تو بتادیا کہ جب تک احمد پرویز اپنی بیوی کے توسط سے پرنس انڈسٹریز کے آدھے حصے کا مالک تھا تب تک تو اسے وہ حصہ فروخت کرنے پر رضامند کرنا زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا لیکن اب۔۔۔ جبکہ پرنس میرانی کی موت کے بعد باقی آدھا حصہ بھی اس کی بیوی کے توسط سے ہوتا ہوا اس تک پہنچ چکا ہے یا جلدی پہنچ جائے گا اور وہ پرنس انڈسٹریز کی کنٹرولنگ اتھارٹی بن جائے گا تب بھی کیا آپ اسے اتنی ہی آسانی سے انڈسٹریز مکمل طور پر فروخت کرنے پر آمادہ کرسکیں گے؟ اس کے مطالبات نامعقول حد تک تو نہیں بڑھ جائیں گے؟"

"ویسے تو خیر ہمیں نامعقول آدمیوں کو معقول بنانا بھی اچھی طرح آتا ہے لیکن ایسا ہم انتہائی ناگزیر حالات میں کرتے ہیں۔ جو کام زیادہ روپیا خرچ کرنے سے ہوسکتا ہو وہاں ہم زیادہ روپیا خرچ کرنے سے نہیں کتراتے۔ محض رقم بچانے کے لیے ہم کبھی بھی لڑنا پسند نہیں کرتے۔ ہم روپیا پانی کی طرح بہاتے ہیں اور پھر اسی انداز میں کماتے ہیں۔ ہم زیادہ کفایت شعار، بخیل یا دانتوں سے پکڑ کر پیسا خرچ کرنے والوں کی طرح کام نہیں کرتے۔ ہاں۔۔۔ اگر مسئلہ روپے پیسے سے بھی کسی طرح حل نہ ہورہا ہو اور ہمارے نزدیک اسے حل کرنا بھی ضروری ہو تو پھر ہم کسی اور طریقے پر غور کرتے ہیں لیکن اس وقت مسئلہ احمد پرویز نہیں ہے۔ اگر احمد پرویز کنٹرولنگ اتھارٹی بن جاتا۔۔۔ یا اس کے بننے کے آثار ہوتے تب بھی کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ اس کے اور ہمارے درمیان انڈر اسٹینڈنگ پیدا ہو گئی ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ تھوڑے عرصے بعد وہ بھی اس سینڈیکیٹ میں شامل ہو جس کی میں نمائندگی کرتا ہوں۔"

"پھر تو ویسے بھی کوئی مسئلہ نہیں رہے گا۔ گھر کی بات ہو جائے گی" میں نے کہا۔

"بے شک" اس نے تائید کی "لیکن ہم پرنس انڈسٹریز کا مسئلہ بہرحال اس سے پہلے ہی طے کرنا چاہتے ہیں اور ہم چاہتے ہیں بعد میں بھی احمد پرویز کا اس سے کوئی تعلق نہ رہے۔ ہم پورے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو بہرحال تبدیل کریں گے اور ان کے اوپر سے بھی کچھ دوسرے لوگ اس انڈسٹری کو چلائیں گے۔ یہ بات بہرحال طے ہو چکی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ احمد پرویز کنٹرولنگ اتھارٹی نہیں بن رہا ہے اور اس سے اس کا آدھا حصہ خریدنا ہمارے مسئلے کا حل نہیں ہے۔۔۔ گوکہ ہم وہ آدھا حصہ تقریباً خرید ہی چکے ہیں۔"

"تو پھر مسئلہ کیا ہے اور میں اس میں کہاں فٹ ہوتا ہوں" میں نے دریافت کیا۔

"سارے مسئلے کا حل ہی آپ کے پاس ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میرے پاس۔۔۔؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"جی ہاں۔۔۔ اب اتنے معصوم نہ بنئے" وہ اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے مجھے واقعی سب کچھ معلوم تھا اور میں محض اس کے صبر کا امتحان لینے اور اس کے ساتھ دوستانہ چھیڑچھاڑ کی غرض سے انجان بن رہا تھا۔ مجھے یہ بھی فکر تھی کہ کہیں اس وقت اپنے آپ کو اتنا انجان ظاہر کرنا میرے لیے نقصان کا باعث نہ ہو لیکن میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ مجھے اپنے تاثرات برقرار ہی رکھنا پڑے تاہم میں نے فوری طور پر مزید کچھ بولنے سے پرہیز کیا۔

وہ چند سیکنڈ منتظر سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر دانہ ڈالنے کے سے انداز میں بولا "یہ خاموشی اور لاعلمی ترک کیجئے افضل صاحب! یہ بہت بڑی ڈیل ہے۔ اربوں روپے کا سودا ہے۔ اس میں بیٹھے بٹھائے۔۔۔ محض ذرا سی زبان ہلا کر کروڑ دو کروڑ آپ کو بھی مل سکتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ کافی خوش حال آدمی ہیں لیکن اگر بیٹھے بٹھائے انسان کو کروڑ دو کروڑ مل رہا ہو تو اس میں کیا حرج ہے؟"

"بیٹھے بٹھائے تو انسان کو سو دو سو بھی مل رہا ہو تو اسے بہت خوش ہونا چاہیے اور مجھے کروڑ دو کروڑ ملنے پر قطعاً کوئی اعتراض نہیں ہے بشرطیکہ وہ کسی ناجائز کام کے عوض نہ مل رہا ہو۔۔۔"

"ہرگز نہیں" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "آپ کو قطعاً کسی ناجائز کام کے لیے نہیں کہا جارہا۔۔۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ

کو سرے سے کسی کام کے لیے ہی نہیں کہا جارہا۔ آپ کو تو صرف ذرا زبان ہی ہلانی ہے۔"

"لیجیے..... میں زبان ہلا دیتا ہوں....." میں نے زبان منہ سے نکالی اور ہلا کر اسے دکھادی پھر ہاتھ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میں زبان ہلا چکا ہوں۔ لائیے..... میرے حصے کا کروڑ دو کروڑ کہاں ہے؟ بلکہ اب کروڑ کی بات تو جانے ہی دیجئے.....دو کروڑ ہی ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا لیکن یہ قہقہہ ایک کراہ محسوس ہوا۔ اس کی آنکھوں نے ہنسی کا ساتھ نہیں دیا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں کہیں ہلکی سی سفاکی نمودار ہوچکی تھی لیکن وہ گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے خوش گوار لہجے میں بولا "میں آپ کی حس مزاح سے لطف اندوز ہوا ہوں افضل صاحب! لیکن میرا خیال ہے یہ مذاق کا موقع نہیں ہے۔"

"لیکن مجھے تو خود آپ کی باتیں مذاق لگ رہی ہیں۔ ان کے جواب میں مذاق کے سوا میں کیا کرسکتا ہوں؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے پتا چلا ہے آپ خاصے باخبر آدمی ہیں افضل صاحب! معاشرے کے تمام کارآمد حلقوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ انسپکٹر رحیم گل جو اس کیس پر کام کررہا ہے وہ بھی آپ کا قریبی دوست ہے۔ اس کے علاوہ آپ کے اپنے بھی کچھ ذرائع ہیں۔ ان کے بارے میں میری معلومات کچھ مبہم ہیں..... لیکن بہرحال.... مجھے اندازہ ہے کہ آپ کچھ ایسے بے خبر اور بے دست وپا قسم کے آدمی نہیں۔ آپ کو تازہ ترین صورت حال کا علم ہونا چاہیے۔"

"آپ میرے بارے میں جو بھی تجزیہ پیش کرنے کی کوشش کررہے ہیں اس سے مجھے کچھ زیادہ اختلاف نہیں ہے.... لیکن کبھی کبھی کسی وجہ سے باخبر آدمی بھی کسی معاملے میں بے خبر رہ جاتا ہے۔ آپ خود اپنی زبان سے وضاحت کیوں نہیں کردیتے؟"

اس نے کچھ یوں ٹھنڈی سانس لی جیسے دل ہی دل میں کہہ رہا ہو "معلوم تو تمہیں سب کچھ ہے برخوردار..... لیکن کسی مصلحت کے تحت اگر میری زبان سے ہی سننا چاہتے ہو تو یونہی سہی.... فی الحال میرا کام اٹکا ہوا ہے اس لیے تمہارے نخرے سہہ لیتا ہوں۔"

مجھے تھوڑی سی خوشی بھی تھی کہ میرے "باخبر" ہونے کا رعب ان لوگوں تک بھی پھیلا ہوا تھا جو خود مجھ سے کہیں زیادہ باخبر تھے۔ میرے وسائل وغیرہ کا بھی انہیں کچھ کچھ اندازہ تھا اور وہ اندر ہی اندر ان سے کچھ مرعوب بھی تھے تاہم اس وقت اپنی بے خبری پر مجھے اندر ہی اندر کچھ شرمندگی بھی تھی جس کا میں اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اس عمرو عیار کے تیچے کا اشارہ کس طرف تھا۔

آخر وہ اس طرف آتے ہوئے بولا "پرنس سعید کی قدرے عجیب وغریب وصیت تو آپ کے علم میں ہے نا.... کہ پرنس سمیرا

صرف اس صورت میں اس کی دولت وجائداد اور پرنس انڈسٹریز کے آدھے حصے کی مالک ہوگی جب وہ کسی ایسے شخص سے شادی کرلے گی جو پرنس انڈسٹریز کا ملازم ہوگا؟"

"جی ہاں' مجھے معلوم ہے" میں نے تسلیم کیا۔

"تو پھر اس کی دوسری اہم شق بھی آپ کو معلوم ہونی چاہیے" وہ بولا "آگے چل کر پرنس سعید نے لکھا تھا کہ اگر پرنس سمیرا ایسا کرلیتی ہے تو پھر اسے یہ اختیار حاصل ہوگا کہ وہ اپنی اس موروثی دولت وجائداد کو جس طرح چاہے استعمال کرے' جس کے چاہے نام کرے۔"

"دراصل وصیت نامہ میں نے خود نہیں دیکھا..... مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے جتنا مجھے بتایا گیا" میں نے گویا معذرت کی "بہرحال..... اس شق سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق یہ پڑتا ہے افضل صاحب..... کہ اپنی موت سے کچھ پہلے پرنس سمیرا خود اپنا وصیت نامہ بھی تیار کرواکے اپنے وکیل کے پاس محفوظ کراچکی تھی..... بلکہ اس کا کچھ اس طرح کا انتظام تھا کہ وہ جونہی کوئی ایسا کام کرتی تھی جس کی کوئی قانونی دستاویز بھی

تھی' فوراً ہی وہ دستاویز اس کے ایک خاص وکیل کے پاس پہنچ محفوظ ہوجاتی تھی کیونکہ اسے خود اپنے بارے میں یقین نہیں تھا اہم دستاویزات کی حفاظت کرسکتی ہے۔ کاغذات تیار بھی وہی کرتا تھا' اسی کے پاس رہتے تھے۔ وہ بھی ایک معتبر اور بڑا ہے۔ پرنس نے نظریۂ ضرورت کے تحت کامران دانش سے شادی کی تھی اس کا نکاح نامہ بھی اس کے پاس محفوظ ہے....."

اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پھر ایک لمحے توقف "پرنس سمیرا کی وصیت یہ تھی کہ اس کی موت کی صورت میں کی موروثی جائداد کا وارث اس کا شوہر ہوگا البتہ اس کی اپنی وجائداد جو وراثت ملنے سے پہلے موجود تھی' وہ اس کے بچوں تقسیم کی جائے گی..... بشرطیکہ اس کے بچے ہوئے..... برسبیل بتاتا چلوں کہ ڈاکٹروں نے پرنس کو بتایا تھا کہ اس کے ہاں اولاد نہیں ہوگی۔ وہ واقعی دونوں شادیوں کے دوران کبھی تو نہیں ہوئی لیکن اسے امید تھی کہ شاید کبھی وہ شادی تو ماں بن جائے۔ اس لیے اس نے یہ شق رکھی تھی لیکن احتیاطاً یہ اضافہ کردیا تھا کہ اگر اس کے ہاں اولاد نہ ہو تو ذاتی دولت وجائداد تین فلاحی اداروں کو دے دی جائے اس نے نام بھی لکھے تھے بہرحال..... یہ ہمارا موضوع نہیں ہمارا موضوع یہ ہے کہ وہ مرچکی ہے.... اب اس کے وصیت کی رو سے اس کا شوہر اس کی موروثی دولت وجائداد..... جس مالیت اربوں میں ہے "کا مالک ہے..... کیونکہ وہ اپنے والد کی شرط پوری کرچکی ہے۔ اس کا وصیت نامہ کل صبح چند گواہوں کی موجودگی میں کھولا جاچکا ہے.....اور میرا یہ کہنا اب ضروری نہیں رہا اس کا شوہر کامران دانش ہے۔"

میرے جسم میں نہ جانے کیوں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اتنی دیر مجھے یہ بتانے کی کوشش کررہا تھا۔

"آپ کا مطلب ہے کہ کامران دانش اس وقت اربوں کی دولت وجائداد کا قانونی مالک ہے؟" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔ مجھے خود اپنا انداز بے وقوفانہ محسوس ہوا۔

"جی ہاں" وہ ذرا تیکھے لہجے میں بولا "اگر اس پر پرنس کے قتل کے شبے میں مقدمہ چلتا بھی ہے تب بھی ہمارے ملک کے قانون کے مطابق اسے اس دولت وجائداد سے محروم نہیں کیا جاسکتا جس کا وہ مالک بن چکا ہے۔ اول تو ہمیں امید ہے کہ وہ رہا ہوجائے گا۔ اس کے خلاف کیس زیادہ مضبوط نہیں ہے۔ ہماری پیشکش یہ ہے کہ اگر وہ اتنی ہی قیمت میں پرنس انڈسٹریز کا باقی حصہ بھی ہمیں فروخت کردے جس قیمت میں ہم احمد پرویز سے خرید رہے ہیں..... تو ہم اس کا کیس بھی لڑیں گے اور ننانوے فیصد امکان ہے کہ ہم اسے بری کرالیں گے۔"

"مقصد یہ کہ آپ کی سینڈیکیٹ اس کے لیے اربوں روپے تیار رکھے بیٹھی ہے؟" میں نے ایک بار پھر بے وقوفوں کی طرح تصدیق چاہی۔

"بے شک!" اس نے سادگی سے جواب دیا گویا یہ کوئی معمولی سی بات ہو۔

"اب آتے ہیں دوسرے سوال کی طرف..... کہ میں اس معاملے میں کہاں فٹ ہوتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"سارا معاملہ اب آپ پر ہی تو آن پڑا ہے کیونکہ کامران کو آپ نے ہی کہیں چھپا رکھا ہے۔ برائے کرم کامران کو سامنے لے آیئے تاکہ معاملات کے مزید الجھنے سے پہلے ہم یہ سودا طے کرلیں اور اس کی بہتری کے لیے بھی جو کچھ کرسکتے ہیں وہ کریں۔ اس میں اگر آپ اپنا کچھ انٹرسٹ رکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اس ڈیل میں کچھ رقم آپ کو بھی مل سکتی ہے۔ میں نے کروڑ دو کروڑ کی بات کی تھی....."

وہ اپنی بات مکمل نہیں کرسکا کیونکہ مجھے بڑے زور کی ہنسی آگئی تھی۔ وہ خفگی آمیز سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ شاید وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی پیش کش کو سنجیدگی سے نہیں لے رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے تقدیر کی ستم ظریفی پر ہنسی آرہی تھی۔

اس سے بڑی ستم ظریفی کیا ہوسکتی تھی کہ کامران نے غربت سے تنگ آکر اپنی منگیتر کے ہوتے ہوئے پرنس سمیرا سے چند لاکھ کے معاوضے کے لیے دکھاوے کی شادی کی تھی۔ اس وقت وہ اربوں کا مالک بن سکتا تھا۔ اسے صرف چند کاغذات پر دستخط کرنے کی ضرورت تھی..... مگر افسوس کہ وہ اس خرگوش کی طرح نہ جانے کن تاریک کونوں کھدروں میں چھپتا پھر رہا تھا جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں۔

اربوں کی رقم جس کے انتظار میں تھی وہ خود نہ جانے کہاں اور کس حال میں تھا؟ معلوم نہیں اسے آج دو وقت کی روٹی بھی نصیب ہوئی تھی یا نہیں؟ اس کے سر پر کسی چھت کا سایہ بھی تھا یا نہیں؟ یہی سب کچھ سوچ کر مجھے تقدیر کی ستم ظریفی پر ہنسی آگئی تھی مگر اس ہنسی نے میرے دل کی گہرائیوں میں کہیں خراش سی ڈال دی تھی۔

میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ تقدیر کو انسان سے ایسا مذاق نہیں کرنا چاہیے!

میری ہنسی چند سے بعد خود ہی ختم ہو گئی۔ دل سے اٹھنے والا ہر لہر اس ہنسی پر غالب آگئی تھی۔ میری زندگی بہت سے عجیب و غریب واقعات سے عبارت تھی لیکن یہ واقعہ مجھے کچھ زیادہ ہی عجیب اور منفرد محسوس ہوا تھا جس کا براہ راست میری ذات سے تو کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں تو محض اس کا تماشائی تھا لیکن اس کی عبرت آموزی کو فی الحال صرف میں ہی محسوس کر رہا تھا۔

میں نے صرف کامران دانش کو ہی نہیں اس کی منگیتر صفیہ کو بھی زندگی بھر کی غربت اور مسائل کی مستقل کشمکش سے تنگ آکر عجیب و غریب باتیں کرتے سنا تھا‘ عجیب و غریب فیصلے کرتے دیکھا تھا۔ اس کی منگیتر اپنی غربت اور خوابوں کی شکستگی سے اتنی تنگ آچکی تھی کہ کسی دولت مند آدمی کی داشتہ بننے پر تیار ہو گئی تھی اور اس کے لئے اصرار کر رہی تھی۔ کامران خود چند لاکھ روپے حاصل کرنے کے لئے اپنی بچپن کی منگیتر کو قائل کرکے ایک دولت مند عورت سے عارضی شادی کرنے پر تیار ہو گیا تھا۔ خیر دس لاکھ روپے تو بہت بڑی رقم تھی اور اس رقم کے لئے ایک ارب پتی حسین عورت سے دکھاوے کی شادی کرنا بھی کوئی ذلت کا کام نہیں تھا۔ اس قسم کے کاموں کی تو نہ جانے کتنے نوجوان اپنے دلوں میں آرزو لئے پھرتے ہیں۔

کامران دانش تو شاید اس سے کہیں کمتر رقم کے لئے اس سے کہیں گھٹیا کام انجام دینے کے لئے تیار ہو جاتا۔ وہ زندگی کے مسائل کا تو جوں توں مقابلہ کر ہی رہا تھا مگر قسمت کی مزید ستم ظریفی یہ رہی تھی کہ پرنس سمیرا جیسی عورت کے قتل کا الزام اس پر آتا دکھائی دینے لگا تھا جس کے بعد وہ بے چارہ غربت وغیرہ کے مسائل کو تو بھول گیا تھا‘ جان بچانے کی فکر پڑ گئی تھی۔

مجھے وہ منظر نہیں بھولتا تھا جب میں اس سے ملنے ایک نہایت عسرت زدہ علاقے کے جھونپڑی نما مکان میں پہنچا تھا جس کے ایک کمرے سے وہ میلے کپڑوں اور بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ اس طرح نمودار ہوا تھا جیسے کسی کھوہ سے کوئی سہما ہوا جانور نکل رہا ہو۔ اس وقت تو اسے اپنے اس مزدور دوست کے گھر میں پناہ بھی مل گئی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا‘ اب وہ کہیں اس سے بدتر حال میں نہ ہو۔ اس وقت شاید اس کا کوئی جاننے والا بھی اسے دو چار سو روپے ادھار دینے پر تیار نہ ہوتا لیکن خود اس سمیت یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو سکتی تھی کہ چند نامعلوم ارب پتی اسے اربوں روپیا دے کر بھی واپس نہ لینے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ میری واقعی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس ستم ظریفی پر ہنسوں نہیں تو کیا کروں؟ اس وقت اگر یہ خبر کوئی جا کر خود کامران کو بھی سناتا تو شاید وہ دیوانوں کی طرح قہقہے لگانے لگتا۔

جمیل احمد بدستور خفگی آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ غالباً جب اس نے محسوس کیا کہ میں پوری طرح سنجیدہ ہو چکا تھا تو وہ ذرا تیکھے سے لہجے میں بولا "کیا میں نے آپ کو کوئی لطیفہ سنایا تھا۔"

"جی ہاں" میں نے بلا تامل جواب دیا "میرے لئے یہ کسی لطیفے سے کم نہیں تھا۔ ایک ایسا لطیفہ جس کی تہ میں بہت بڑی ٹریجڈی دفن تھی۔"

جمیل احمد نے پرخیال انداز میں تھوڑی کھجائی۔ بڈھے کی آنکھیں اس عمر میں بھی عقابی تھیں۔ اس کی نظریں شاید میری سوچ کی گہرائیوں تک پہنچنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "افضل صاحب! میرا خیال تھا کہ میں اور آپ جس طبقے کے فرد ہیں وہاں افسانوی باتیں نہیں کی جاتیں۔"

"ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو لیکن کبھی کبھی افسانوی باتیں کرنا پڑ ہی جاتی ہیں" میں نے ملائمت سے کہا "کیونکہ وہ جو اوپر والا ہے نا..... وہ بڑی عجیب و غریب طاقتوں کا مالک ہے۔ وہ کبھی کبھی انسان کی زندگی کو افسانوی بنا دیتا ہے۔"

اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا اور چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اپنی دانست میں اس نے میرے بارے میں سب اندازے لگا لیے ہوں گے کہ میں کس قسم کا آدمی تھا لیکن اب شاید وہ الجھن میں پڑ گیا تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میرے سلسلے میں بہت سے لوگوں کے ساتھ یہی ہوتا تھا۔

آخر وہ دھیرے سے سر ہلاتے ہوئے بولا "اگر آپ کے خیال میں اس معاملے میں افسانوی پہلو یہ ہے کہ کامران دانش جیسے مفلس نوجوان کو بیٹھے بٹھائے اربوں روپیا مل رہا ہے‘ تو میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ میرے لئے اس میں کوئی افسانویت نہیں۔ میں مالیات کی دنیا کا آدمی ہوں اور میرا تعلق صرف اس ملک کی حد تک مالی معاملات سے نہیں ہے۔ میں بین الاقوامی سطح پر بڑے دولت مندوں کے مالی مسائل کے سلسلے میں خدمات انجام دیتا ہوں۔ میں مالیات کی دنیا میں آئے دن بڑے عجیب و غریب تماشے دیکھتا ہوں۔ میں بہت سے لوگوں کو عرش سے فرش پر آتے اور فرش سے عرش کی طرف جاتے دیکھ چکا ہوں۔ آپ خود ایک بڑے بزنس مین ہیں۔ آپ کو بھی ان معاملات کا علم ہوگا۔"

"میں اتنا بڑا بزنس مین بھی نہیں ہوں کہ اس قسم کے افسانوی واقعات پر چند لمحوں کے لئے بھی حیران ہونا چھوڑ دوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میری ہنسی دراصل میری حیرت کا اظہار تھی۔ اگر آپ کو میری حیرت سے تکلیف پہنچی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔"

"نہیں..... نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں" وہ جلدی سے بولا۔ اس کا لہجہ کچھ بدل گیا۔ اس میں پہلی سی خوشگواری واپس آنے لگی "دراصل آپ کی ہنسی سے مجھے وہم ہوا تھا کہ شاید آپ میری پیشکش کو مذاق سمجھ رہے ہیں۔ ہم کاروباری معاملات کو نہایت سنجیدگی سے طے کرنے والے لوگ ہیں۔"

"ہاں..... مجھے یہ بات سمجھ لینی چاہئے تھی۔ کاروبار آپ لوگوں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہوتا ہے" میں نے سر ہلاتے ہوئے تسلیم کیا۔

"چلئے میں سنجیدہ ہو جاتا ہوں..... بہت زیادہ سنجیدہ....." میں نے اپنے چہرے پر حد سے زیادہ سنجیدگی پیدا کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ میرے چہرے پر سنجیدگی سے زیادہ رنجیدگی پیدا ہو گئی ہوگی۔

"بالکل ٹھیک" وہ گویا طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولا "تو پھر ہم دوبارہ کام کی بات کی طرف آتے ہیں۔"

"یہی تو میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس میں کام کی بات کہاں ہے" میں نے کہا "میرا مطلب ہے کہ میں اس معاملے میں کہاں فٹ ہوتا ہوں؟"

"اس سادگی پر کون نہ مر جائے اے خدا" وہ ٹھنڈی سانس لے کر مسکراتے ہوئے بولا "افضل صاحب! آپ بہت اچھی سمجھ چکے ہیں کہ ہمیں آپ سے کیا کام ہے لیکن آپ بن رہے ہیں..... یا پھر شاید مجھے یہ کہنا چاہئے کہ آپ ہمیں بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"بنانا اور بگاڑنا تو اوپر والے کا کام ہے جمیل صاحب! یہ مجھ غریب کے بس کی بات کہاں" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ویسے بھی اکثر لوگوں کو جو کچھ بننا ہوتا ہے وہ بن چکے ہوتے ہیں۔ انہیں مزید کچھ بنانا کسی کے اختیار میں نہیں ہوتا۔"

"چلئے ہم محاورتاً بھی اپنے بننے اور بگڑنے کی بات نہیں کرتے....." وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ہم صرف کام کے بننے اور بگڑنے کی بات کرتے ہیں۔ آپ یقیناً اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ ہمارا کام بنانا یا بگاڑنا آپ کے اختیار میں ہے۔ میں آپ کو اتنے واضح الفاظ میں تو بتا چکا ہوں کہ ہمیں کامران دانش کی ضرورت ہے جسے آپ نے کہیں چھپا رکھا ہے۔ آپ سے ہمیں صرف اتنا سا ہی کام ہے کہ اسے سامنے لے آیئے۔ ہم خود ہی اس سے تمام معاملات طے کر لیں گے۔ اگر آپ اس کے مفادات کی حفاظت کے لئے اس ڈیل کے دوران میں اس کے ساتھ رہنا چاہیں تو ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ بھی میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اس کام میں اگر آپ اپنا کروڑ دو کروڑ کا انٹرسٹ رکھنا چاہیں تو ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

یہ بات وہ واقعی پہلے بھی کہہ چکا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ محض اتنے سے کام کے لئے وہ اتنی کشادہ دلی اور فیاضی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ شاید بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ شاید اس ڈیل کے کچھ اور پہلو بھی تھے جن کی وہ وضاحت کرنے والا تھا لیکن اگر بات صرف اتنی سی تھی تو پھر واقعی اس کی گفتگو حیران کر دینے والی تھی۔

اسے خود بھی اپنی کشادہ دلی اور فیاضی کا احساس تھا اور وہ اسے جتائے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے خاموش دیکھ کر بولا "افضل صاحب..... اہم آن..... اس میں اتنی سوچ بچار اور ہچکچاہٹ کی کیا بات ہے؟ ہم جیسے فراخ دل لوگ آپ کو آج کی دنیا میں بہت کم ملیں گے جہاں ہزار دو ہزار کے لئے انسان‘ انسان کا گلا کاٹنے کے درپے ہے۔ میں آپ کو پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ ہم شاہانہ انداز میں روپیا خرچ کرنے والے لوگ ہیں۔ ہم کوئی کام کنجوسی سے نہیں کرتے۔"

وہ جمع کے صیغے میں بات کرتا تھا۔ شاید اپنے کلائنٹس کی ترجمانی کرتے وقت وہ اپنے آپ کو بھی انہی میں شامل کر لیتا تھا۔ ان کی فیاضی اور کشادہ دلی اس کی اپنی فیاضی اور کشادہ دلی ہوتی تھی۔ ان کی دولت مندی اس کی اپنی دولت مندی تھی۔ ان کی خطرناکی‘ اس کی اپنی خطرناکی تھی۔ یہ اپنائیت‘ اتنا مان اور ایسا جذبہ کہیں کہیں دیکھنے میں آتا ہے۔ اتنا مجھے اندازہ تھا کہ یہ محض اس کی خوش فہمی نہیں تھی۔ اس کے کلائنٹس نے واقعی سب کچھ اس پر چھوڑ رکھا ہوگا۔ وہ ان کی ناک کا بال ہوگا اس لئے اس انداز گفتگو میں اسے حق بہ جانب سمجھا جا سکتا تھا۔

"کیا واقعی کام صرف اتنا ہی ہے کہ میں کامران دانش کو سامنے لے آؤں؟" میں نے تصدیق چاہی "اس کے سوا آپ مجھ سے کچھ نہیں چاہتے۔"

"نہیں۔ ہرگز نہیں" اس نے فوراً جواب دیا اور اس کی آنکھوں میں امید کی چمک ابھری۔ شاید اس نے محسوس کیا تھا کہ میں اِدھر اُدھر کی باتیں ختم کرکے آمادگی کا اظہار کرنے والا تھا۔

"آپ کا خیال ہے کہ کامران دانش کو میں نے کہیں چھپا رکھا ہے؟" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں مزید پوچھا۔

"ہاں۔ ہمارا یہی خیال ہے اور میں اس کا اظہار بھی کر چکا ہوں۔ اسی لئے آپ کو اس ملاقات کی زحمت دی گئی ہے" وہ بلا تامل بولا۔

"آپ کے خیال میں مجھے اس گدھے کا اچار ڈالنا تھا یا مربہ؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"کیا مطلب؟" وہ ذرا حیران ہوا۔

"مطلب یہ کہ کسی اعتبار سے وہ چغد اس قابل ہے کہ میں اسے چھپا چھپا کر رکھوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ ایک لمحے کے لئے گڑبڑایا لیکن پھر سنبھل کر بولا "یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ میں اسے ذاتی طور پر نہیں جانتا۔ میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں..... البتہ میں نے اس کے بارے میں معلومات کرائی تھیں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ وہ روایتی سا تعلیم یافتہ ایک غریب نوجوان ہے جیسے کہ ہمارے ملک میں لاکھوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں جو اکثر بے روزگار رہتے ہیں۔ اسی قسم کے نوجوان فرسٹریشن کا شکار ہو کر نہ جانے کس کس کے آلۂ کار بن کر اپنی اور دوسروں کی زندگی جہنم بنائے رکھتے ہیں۔"

تب ایک نئے خیال نے میرے ذہن میں سر ابھارا۔ میں نے پوچھا "آپ کو خیال نہیں آیا کہ اس قسم کے نوجوان کو آپ خود تلاش کرکے زیادہ آسانی سے اس قسم کی کسی ڈیل کے لئے آمادہ

کر سکتے تھے۔ شاید بہت ہی سستے داموں آپ کا کام ہو جاتا۔ وہ بے چارہ تو شاید چند کروڑ کا ذکر سن کر بھی خوشی سے مرنے کے قریب ہو جاتا۔"

"میں آپ کے سامنے معصوم بننے کی کوشش نہیں کروں گا" وہ گویا دیانتداری سے اعتراف کرنے لگا "ہم لاکھ فراخ دل اور شاہ خرچ سہی۔۔۔ لیکن ہمیں پہلا خیال یہی آیا تھا۔ فطری سی بات تھی۔ بڑے سے بڑا حاتم طائی بھی پہلے اس قسم کی کوشش کرنے کے بارے میں ضرور سوچے گا۔ کسی کو تلاش کرنے کے سلسلے میں ہمارے وسائل بھی کچھ کم نہیں ہیں لیکن ایک ہی دن کوشش کر کے ہمیں اندازہ ہوا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا اور جو ڈیل ہم کرنا چاہ رہے ہیں اس میں وقت کی بڑی اہمیت ہے۔ ہم وقت ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بہت سے معاملات میں نہ جانے کیوں بلاوجہ ہی بہت سی بدنصیبیاں آڑے آنے لگتی ہیں۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ پرنس سعید کے وصیت نامے کی وجہ سے ہمیں پہلے ہی پرنس سمیرا کے ساتھ اس ڈیل کو مکمل کرنے میں تاخیر ہو گئی ورنہ یہ معاملہ براہ راست مالکن سے ہی طے پا جاتا۔ اب یہ وراثت جس کے ہاتھ میں گئی ہے وہ ویسے ہی نظروں کے سامنے سے غائب ہو گیا ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ ہم اسے تلاش ہی کرتے رہ جائیں اور یہ معاملہ اب کسی اور وجہ سے بگڑ جائے۔"

"چنانچہ آپ نے اپنی دانست میں اس تک پہنچنے کا شارٹ کٹ تلاش کیا؟" میں نے گہری سانس لے کر صوفے پر اپنے آپ کو ذرا ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھتے ہوئے کہا "آپ کے خیال میں میری مدد سے آپ کامران تک نہایت آسانی سے اور کم سے کم وقت میں پہنچ سکتے ہیں؟"

"ہاں۔ خیال تو ہمارا یہی تھا لیکن آپ کو قائل کرنا اور منانا تو کامران کو تلاش کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام محسوس ہو رہا ہے" وہ متاسفانہ لہجے میں بولا "گو کہ ہمیں اندازہ تھا یہ شارٹ کٹ ہمارے لئے مہنگا ثابت ہو گا لیکن ہم نے سرمائے کی پروا نہیں کی۔ ہم نے سوچا کہ کام بگڑ جانے کی نسبت کام مہنگے داموں ہو جانا زیادہ بہتر ہے۔ اس لئے ہم نے نہایت دوستانہ فضا میں آپ سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ سرمائے کو ہم نے اس لئے بھی مسئلہ نہیں بنایا کہ آج ہم جتنا لگائیں گے اس سے نہ جانے کتنا زیادہ کمائیں گے۔۔۔ اور کب تک کماتے رہیں گے۔ پرنس انڈسٹریز سونے کے انڈے دینے والی مرغی ہے۔"

"میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ وہ چغد کامران کس اعتبار سے اس قابل ہے کہ میں اسے چھپا چھپا کر رکھوں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"ہمیں پتا چلا تھا کہ آپ کو اس کی بے گناہی پر بڑا اصرار تھا اور آپ اس کی بہت حمایت کر رہے تھے بلکہ آپ تو باضابطہ طور پر خود عدالت میں جا کر اس کی وکالت کے لئے بھی تیار تھے۔۔۔ حالانکہ میرے خیال میں آپ نے ایک مدت سے وکیلوں والا کالا کوٹ نہیں پہنا ہو گا۔۔۔ بہرحال ان سب اطلاعات کی بنا پر ہم اسی نتیجے پر پہنچے کہ کسی وجہ سے آپ کی بہت زیادہ ہمدردیاں اس نوجوان کے ساتھ ہوں گی اور اب آپ نے ہی اس کے تحفظ کی خاطر اسے غائب کر رکھا ہو گا۔ آپ کا ارادہ مناسب وقت پر اسے سامنے لانے کا ہو گا۔ ہم نے سوچا ہم وہ مناسب وقت لانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اس لئے ہم نے آپ سے رابطہ کیا۔ اب چونکہ بات چیت آپ کے توسط سے ہونا تھی اس لئے ہم نے سوچا کہ وہ آپ کے اور ہمارے شایانِ شان طریقے سے ہونی چاہئے۔ کامران سے براہ راست معاملہ ہوتا تو ہم اس سے اس کی اوقات کے مطابق بات کرتے۔ اگر وہ زیادہ چالاک بنتا یا ہاتھ سے نکلتا دکھائی دیتا تو پھر ہم بتدریج اپنی پیشکش بڑھاتے چلے جاتے لیکن ظاہر ہے آپ جیسے لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر تو اس طرح بات چیت کامیاب نہیں ہو سکتی جس طرح عورتیں سبزی کا بھاؤ تاؤ کرتی ہیں۔"

اس کے استدلال میں وزن تھا اور وہ بڑی معقولیت سے بات کر رہا تھا۔ کچھ چالاکی اور شاطرانہ پن تو ہر کاروباری گفتگو کے پیچھے کارفرما محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہاں بھی تھا اور میں اسی کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں خاموش رہا تو ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "اگر آپ کو اندیشہ ہے کہ اسے پرنس سمیرا کے قتل کے الزام میں زیادہ ہی رگڑنے کی کوشش کی جائے گی تو اب یہ خیال بھی آپ دل سے نکال دیں۔ ہمارا اور آپ کا اثر رسوخ مل کر اسے قتل کی دس بیس وارداتوں کے الزام سے تو بچا ہی سکتا ہے۔ گو کہ سمیرا جیسی تو اکیلی عورت کا قتل بھی دس بیس دوسرے آدمیوں کے قتل پر بھاری ہے۔۔۔ اس کے باوجود ہم کچھ نہ کچھ کر لیں گے اور ہمیں معلوم ہے آپ بھی کچھ ایسے گئے گزرے نہیں ہیں۔"

"اگر بات صرف اثر رسوخ استعمال کرنے کی ہو تب تو شاید اس قتل کے الزام سے چھڑانے کے لئے آپ کا یہ خادم اکیلا ہی کافی ہو۔۔۔ خواہ وہ قتل پرنس سمیرا ہی کا کیوں نہ ہو۔۔۔ لیکن میں چاہتا ہوں وہ ہمارے اثر رسوخ کی وجہ سے نہیں بلکہ سچ مچ اپنی بے گناہی کی وجہ سے اس الزام سے بری ہو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اگر وہ واقعی بے گناہ ہے تو پھر کام بہت ہی آسان ہو جائے گا" وہ جلدی سے بولا "اس کا بال بھی بیکا نہیں ہو گا۔ وہ حوالات یا جیل میں کسی وی آئی پی یا بڑے سیاسی لیڈر کی طرح ٹھاٹ سے رہے گا۔ اسے بی وی اور اے سی تک کی سہولتیں حاصل ہوں گی۔ خدمت گار بھی ہو گا۔ کھانا اپنی پسند کا ملے گا۔۔۔"

"کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ جیل سے واپس آنے سے انکار کر دے" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے خیال ظاہر کیا۔

وہ دھیرے سے ہنسا اور بولا "اس کی چند دن پہلے کی اوقات کے مطابق تو یہ بات درست ہو سکتی ہے لیکن اب وہ خود بھی تو کوئی معمولی آدمی نہیں رہا۔ وہ پرنس سعید کے آدھے ورثے کا مالک ہے

اور یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مقدمے کی سماعت بھی کم سے کم وقت میں ختم ہو جائے گی۔ اگر کسی جائز یا ناجائز کام کے لئے اپنا اثر رسوخ استعمال کرنا آپ کی عادت نہیں ہے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ کامران بہرحال بچ جائے گا۔ بس اب آپ اسے سامنے لے آئیے۔"

میں نے ایک آہ بھری اور غمناک لہجے میں کہا "یہیں آکر تو مسئلہ اٹک رہا ہے۔ آپ کی پیشکش اتنی عمدہ اور سب کے لئے اتنی فائدہ مند ہے کہ فوراً کہیں سے کامران کو پکڑ کے لاؤں اور آپ کے سامنے پیش کردوں لیکن افسوس کہ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

"کیوں نہیں کرسکتے؟" اس نے ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں ہے" میں نے سادگی سے جواب دیا "کتنا آسان سا جواب ہے آپ کے سوال کا.... لیکن ہم ابھی پہلو پر بات کئے بغیر ساری باتیں کئے جارہے ہیں۔ آپ نے بہت ہی کمزور سی بنیادوں پر یہ مفروضہ قائم کرلیا ہے کہ میں نے اسے کہیں چھپا رکھا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں نے اسے کہیں نہیں چھپا رکھا۔ میں تو خود اس کی تلاش میں ہوں۔ میں تو آپ کی اس عظیم الشان پیشکش سے پہلے ہی اسے منظر عام پر لانا چاہتا تھا۔ میں نے اس کے لئے اپنی سی کوشش بھی کی تھی لیکن میں اس پر اعتماد کرتے ہوئے ایک لمحے کے لئے اس کی طرف سے غافل ہوا اور وہ نکل بھاگا۔ اس وقت سے اب تک میں خود اسے تلاش کرانے کے لئے نہ جانے کیا کیا جتن کرچکا ہوں۔ اب بتائیں میں آپ کے سامنے کامران کو کہاں سے لاؤں؟"

میں خاموش ہوا تو کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا لیکن اب اس سکوت میں تناؤ اور کشیدگی کی آمیزش تھی۔ وہ پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یقیناً میرے بارے میں پہلے بھی کچھ اچھے خیالات تو نہیں تھے 'وہ صرف کاروباری مصلحتوں اور اپنے لائف اسٹائل میں شامل ہوجانے والی منافقت کے تحت رنگ بدل بدل کر مجھ سے کبھی محبت' کبھی گرمجوشی' کبھی اپنائیت اور کبھی شفقت سے بات کررہا تھا لیکن اب تو جیسے میرے بارے میں اس کے ذہن میں کوئی اچھا خیال بالکل ہی نہیں رہا تھا۔ وہ منافقت سے کام لیتے ہوئے مسکرانا بھی بھول گیا تھا۔

"آپ کو شاید میری بات کا یقین نہیں آیا" میں نے ملامت سے کہا۔

اب اس نے منافقت سے کام نہیں لیا اور صاف طور پر بولا "اس میں یقین کرنے والی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کامران کو اپنی حیثیت کا علم نہ ہو۔ اپنی حیثیت اور وسائل کا علم ہوتے ہوئے وہ آپ جیسے مضبوط آدمی کا سہارا چھوڑ کر کیسے بھاگ سکتا تھا؟"

"میں اصرار کررہا تھا کہ وہ پولیس کے سامنے پیش ہوجائے کیونکہ میرے خیال میں اس نے فرار ہو کر اپنی پوزیشن مشکوک بنائی تھی اور اپنے لئے مسائل کھڑے کرلئے تھے لیکن پولیس کے سامنے پیش ہونے کے تصور سے اس کی روح فنا ہو رہی تھی۔ اس کے مقابلے میں اس نے بھاگ جانے کو ترجیح دی حالانکہ میں نے بھی اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا" میں نے دیانتداری سے بتایا۔

"اور وہ آپ کے سمجھانے سے بھی قائل نہیں ہوا؟" جمیل احمد بے یقینی سے بولا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ انگریزی میں بولا "ناممکن... میں اس بات پر یقین نہیں کرسکتا۔"

"آپ کو یقین دلانے کے لئے مجھے کیا کرنا ہوگا؟" میں نے یکدم ہی سرد لہجے میں کہا "کیا مجھے آپ کا یہ سفید بالوں سے بھرا سر دیوار سے ٹکرانا پڑے گا؟"

"کیا مطلب؟" وہ ہکا بکا رہ گیا۔ شاید اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ میں یوں اچانک بھی پٹری سے اتر سکتا تھا۔

"مطلب یہ کہ بعض اوقات کوئی شخص کسی صحیح بات کو بھی تسلیم کرکے نہیں دے رہا ہوتا۔ ایسے میں اگر اس کے بال مٹھی میں جکڑ کر دو چار مرتبہ اس کا سر زور زور سے دیوار سے ٹکرایا جائے تو اپنی جگہ سے کھسکی ہوئی اس کی کھوپڑی ٹھکانے پر آجاتی ہے اور وہ صحیح بات کو مان لیتا ہے" میں نے گویا کسی ناسمجھ بچے کو کوئی سائنسی فارمولا نہایت نرمی و شفقت سے سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ دھیرے سے ہنسا لیکن اس ہنسی کے دوران میں اس کے دانت کسی بھیڑیئے کے دانتوں کی طرح ہونٹوں کے عقب سے جھانکتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے لہجے میں بولا "آپ مذاق کے معاملے میں بھی کافی جرأت مند ہیں افضل صاحب!"

"کون کم بخت مذاق کررہا ہے" میں نے ملامت سے کہا۔

"اچھا... خیر... ہم دیکھیں گے...." اس نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا اور مسکراتے ہوئے بات کو بظاہر مذاق میں ہی ٹالنے کی کوشش کی لیکن میں نے محسوس کرلیا تھا کہ بات سیدھی اس کے دل پر لگی تھی۔ تاہم ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ نرم لہجے میں بولا "ہمیں امید تھی کہ اس معاملے میں ہمیں جھوٹ سننے کو نہیں ملے گا افضل صاحب!" لہجہ بے شک نرم تھا لیکن اس میں بلا کی سرد مہری تھی۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے اس سے بھی زیادہ سرد لہجے میں کہا "آپ کا مطلب ہے میں جھوٹ بول رہا ہوں جمیل احمد ایڈووکیٹ صاحب؟"

مجھے زندگی میں شاید صرف دو چار ہی ایسے افراد سے واسطہ پڑا تھا جنہوں نے میرے اس طرح گھورنے کے جواب میں نظر نہیں چرائی تھی۔ وہ ان میں سے ایک تھا۔

"یقین ممکن ہے" وہ آنکھ جھپکے بغیر بولا۔

میں نے اس کی میز پر رکھا ہوا ٹیلی فون کا ایک کارڈلیس سیٹ

جائیں گی۔"

میں نے اس کی میز کے کنارے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے حقارت سے کہا "مجھے بتایا گیا تھا کہ میں نے دس گیارہ ماہ کی عمر میں چلنا شروع کیا تھا۔ اس وقت شاید میری ٹانگیں کانپی ہوں۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے مجھے یاد نہیں کہ کبھی میری ٹانگیں کانپی ہوں۔۔۔ اور محض کسی کا نام سُن کر ٹانگیں کانپنے کا تصور تو میرے لئے کسی لطیفے سے کم نہیں۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ صرف تمہارا دل رکھنے کے لئے پوچھ رہا ہوں۔۔۔ کوئی ایک آدھ نام تو ایسا بتادو جسے سن کر تمہارے خیال میں ٹانگیں کانپنے کی نوبت آسکتی ہو؟"

وہ ایک لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا پھر گویا کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "ان میں سے ایک نام سیٹھ واحد کا ہے۔"

یہ نام سنتے ہی میرے ذہن میں یادوں کا ایک ریلا سا آیا۔

سیٹھ واحد ایک ایسی شخصیت تھا جسے کسی تفصیلی تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ کسی بھی محفل میں اس کا صرف نام ہی لیا جانا کافی تھا۔ سننے والے کے ذہن میں سارا پس منظر خود بہ خود آجاتا تھا۔ اس وقت جس قسم کی گفتگو ہورہی تھی اسے مدِنظر رکھتے ہوئے کم از کم جمیل احمد کے منہ سے اس کا نام سن کر اگر میری ٹانگوں میں لرزش نہیں تو رگ وپے میں ایک خفیف سی سنسنی ضرور دوڑنی چاہئے تھی۔۔۔ اور شاید دوڑی بھی ہو لیکن میں اس کی طرف توجہ نہیں دے سکا۔ میں یادوں کے ریلے میں زیادہ الجھ کر رہ گیا۔

سیٹھ واحد کی شہرت ملک کے سب سے بڑے اسمگلر کی سی تھی۔ وہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں سونے اور الیکٹرونکس کی اس نقل وحرکت کا بادشاہ تھا جسے اسمگلنگ بھی کہہ سکتے تھے اور ناجائز یا متوازی تجارت بھی۔ کہنے کو اس کی شہرت اتنے بڑے اسمگلر کی تھی لیکن آج تک نہ تو وہ گرفتار ہوا تھا اور نہ ہی صحیح معنوں میں اس پر کوئی مقدمہ چلا تھا۔

اس کے ملک سے باہر جانے یا واپس آنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جب، جہاں چاہتا تھا، چلا جاتا تھا۔ اس کے پس پردہ دھندے تو اپنی جگہ تھے، ان میں سے بھی بہت سے دھندوں کی شاید مجھ جیسے باخبر آدمی کو بھی ہوا نہ لگی ہو، لیکن ان سے قطع نظر اب تو اس کے جائز اور قانونی کاروباروں کا بھی کچھ شمار نہیں تھا۔ چھوٹے موٹے کارخانے اور کارپوریشنیں تو وہ اس طرح خرید لیتا تھا جیسے بچے ٹکٹ جمع کرتے ہیں۔ غیر ممالک میں اس کے دفاتر تھے۔

نہایت معتبر ذرائع سے مجھے معلوم تھا کہ ہر مرتبہ ملک میں انتخابات سے پہلے اس کی تجوریوں کے منہ کھل جاتے تھے اور بڑے بڑے سیاسی مگرمچھ اس کے در دولت پر حاضری دے کر فیضیاب ہوتے تھے اور بعد میں وزیر سفیر بن کر نیکی کا بدلہ نیکی سے اتارنے کی روایت کو آگے بڑھاتے تھے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے سرکاری لوگوں کی غیر سرکاری تقریبات میں وی آئی پی پروٹوکول ملتا تھا بلکہ ایسی اکثر بڑی بڑی شخصیتوں کی دعوت پر تو وہ جاتی نہیں پاتا تھا۔ اس کے پاس وقت ہی نہیں ہوتا تھا۔ ملک کی بہت سی بڑی بڑی جانی پہچانی سیاسی اور سماجی شخصیات اپنی تقریبات میں اس کی آمد کو اپنے لئے ایک اعزاز تصور کرتی تھیں۔

میرے ذہن میں یادوں کا جو ریلا آیا تھا اس نے مجھے ماضی کی بہت دور افتادہ بھول بھلیوں میں پہنچا دیا تھا۔ مجھے وہ وقت یاد آیا تھا جب میں نوجوان تھا اور سیٹھ واحد والی فیلڈ میں ہی قدم جمانے کی کوشش کررہا تھا۔ میرا کراچی کا وہ پہلا یا دوسرا چکر تھا۔ انہی دنوں میں راحیلہ کے عشق میں گرفتار ہوا تھا اور وہ عشق آج بھی میرے پاؤں کی زنجیر تھا۔

سیٹھ واحد کا کاروبار، ان دنوں بھی کراچی، لاہور، پشاور اور نہ جانے کہاں کہاں پھیلا ہوا تھا لیکن مجھ 'ابھرتے' ہوئے نوجوان کی شہرت' کی خوشبو اس تک بھی جا پہنچی تھی اور اس نے کسی رابطے کے ذریعے مجھے بلوایا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔ اپنا کاروباری شریک بنانا چاہتا تھا۔ اس وقت گو کہ میری اخلاقیات کچھ زیادہ بلند نہیں ہوئی تھیں اور کسی بھی طریقے سے جلد از جلد ترقی کرنے کی تمنا میرے دل میں مچل رہی تھی لیکن نہ جانے کیوں میرے منہ سے انکار ہی نکلا تھا۔ قدرت نے میرے حق میں یہ بہتر ہی کیا تھا۔

اب میرا یہ ایمان اور نظریہ تھا کہ انسان کو اتنا کچھ ہی ملتا ہے جتنا اس کے مقدر میں ہوتا ہے لیکن کم از کم یہ اس کے اپنے اختیار میں ہوتا ہے کہ وہ اس کے لئے جائز، قانونی اور حلال طریقے اختیار کرے یا ناجائز، غیر قانونی اور حرام طریقے سے اپنے حصے کا مال و متاع حاصل کرے۔ انسان کے سامنے راستے دونوں کھلے ہوتے ہیں۔ کوئی راستہ خواہ مخواہ آسان نظر آرہا ہوتا ہے اور کوئی راستہ خواہ مخواہ مشکل دکھائی دیتا ہے حالانکہ حقیقت میں دونوں ہی راستوں پر یکساں دشواریاں ہوتی ہیں۔ کسی بھی ایک راستے پر چلنا انسان کے اختیار میں ہوتا ہے۔ اسی لئے جزا اور سزا کا نظام رکھا گیا ہے ورنہ تو انسان یہی کہہ کر خدا کے سامنے بری الذمہ ہوسکتا تھا کہ میں نے تو وہی کچھ کیا جو میرے مقدر میں لکھ دیا گیا تھا۔ اس لئے اس میں میرا کیا قصور؟

مجھے جونہی تھوڑی سی عقل آئی تھی میں نے وہ راستہ چھوڑ دیا تھا اور پلٹ کر اس طرف نہیں دیکھا تھا۔ اس کے باوجود میں نے ترقی کی تھی۔ اگر میں سیٹھ واحد کے زیر سایہ رہ کر ترقی کرتا تو آج میری شہرت بھی اسی قسم کی ہوتی اور ضمیر کی خلش آج بھی میری ہم سفر ہوتی خواہ میں اسے بے حسی کے کتنے ہی ٹکڑے ٹکڑے ڈوز دے کر سلانے کی کوشش کرتا کیونکہ بعد کے دنوں میں یہ تو طے ہوگیا تھا کہ میرے پاس ضمیر نام کی چیز موجود تھی۔

بہرحال سیٹھ واحد سے شہر کے ایک گنجان آباد علاقے کی خاصی اونچی سی عمارت کے اس آفس میں، جہاں روشنی نہ جانے کیوں بہت کم تھی، مجھے اپنی وہ پہلی ملاقات آج بھی یاد تھی۔ اس کے بعد بھی دو تین مرتبہ مختلف ذرائع سے سیٹھ واحد کے پیغامات

ملے تھے لیکن میں محتاط اور مؤدبانہ انداز میں اس سے دور ہی رہنے میں کامیاب رہا تھا۔ پھر شاید اس نے بھی پلٹ کر میری طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا تاہم یہ اس کی نوازش تھی کہ اس نے میرے انکار کو اپنی توہین نہیں سمجھا تھا۔ انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔

حیثیت اور وسائل کے اعتبار سے وہ اس وقت بھی ایک ہاتھی تھا اور میں اس کے سامنے تقریباً چیونٹی تھا لیکن اس نے چیونٹی کی آزادی سلب کرنے یا اس پر اپنی مرضی ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی تھی اور ہم بڑی خاموشی سے اپنے اپنے راستوں پر ہو لئے تھے۔ اس عرصے میں نہ جانے کیا کچھ ہو چکا تھا' کتنے انقلابات آچکے تھے۔ میں نے بھی اپنی جگہ بہت ترقی کی تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ حیثیت کے اعتبار سے میں آج بھی اس کے سامنے بس تقریباً چیونٹی ہی تھا کیونکہ اس دوران میں وہ خود نہایت تیزی سے پھیلتے پھیلتے نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا تھا۔

دولت بہت بڑی طاقت ہے اور اس میں شک نہیں تھا کہ سیٹھ واحد نے اپنی اس طاقت کو بہت ہی سلیقے سے استعمال کیا تھا۔ اس طاقت سے مزید طاقت حاصل کی تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ہمارے ملک میں طاقت کے سرچشمے کہاں کہاں تھے۔ وہاں وہاں وہ کسی نہ کسی قسم کی انویسٹمنٹ کئے رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ کہ اب وہ اس سے بھی کہیں زیادہ طاقت ور آدمی تھا جتنا کہ اسے ہونا چاہئے تھا۔ اگر کوئی غیر ملکی اس موضوع پر ریسرچ کرتا کہ ہمارے ہاں ایک طرف کتنی غربت تھی اور کیسی کیسی عسرت زدہ بستیوں میں لوگ کس کس حال میں زندگی بسر کر رہے تھے لیکن دوسری طرف بعض لوگوں کے پاس کتنی دولت تھی' تو وہ شاید حیرت سے بے ہوش ہو جاتا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ جس ملک میں اتنے دولت مند موجود تھے اس کا شمار اب تک غریب ملکوں میں کیوں ہوتا تھا؟ اس پر سے غربت کی چھاپ کیوں نہیں ہٹ سکی تھی؟

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سیٹھ واحد کا نام سُن کر بہت سے لوگوں کی ٹانگیں کانپ سکتی تھیں۔ خصوصاً اس کی مخالفت کا تصور کر کے ضرور کانپ سکتی تھیں۔ اس لحاظ سے جمیل احمد کے دعوے میں کچھ ایسا مبالغہ نہیں تھا لیکن اب اس کا کیا کیا جاتا کہ میں آدمی ہی ذرا دوسری قسم کا تھا۔ میرا فلسفۂ حیات ہی کچھ اور تھا۔ جب میں نے زندگی اور اس کی حقیقت کو اپنی بساط کے مطابق سمجھ لیا تھا تو پھر بہت سی باتوں کا خوف میرے دل سے نکل گیا تھا لیکن یہ بات بے چارے جمیل احمد کو معلوم نہیں تھی۔ اسے تو بس یہ معلوم تھا کہ سیٹھ واحد کے ایک اشارے پر نہ جانے کیا سے کیا ہو سکتا تھا..... اور یہ بات بہت سے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے کافی تھی۔

میں نے ایک ہلکا سا قہقہہ لگایا گو کہ میں اس وقت خود کو اتنا بھی ترنگ میں محسوس نہیں کر رہا تھا کہ اس قسم کی باتوں پر قہقہے لگاتا لیکن میں نے سوچا اس ڈرامے باز کو ذرا ڈرامائی انداز میں ہی جواب دینا چاہئے۔ حقیقت تو یہ تھی کہ وہ ڈرامے بازی نہیں کر رہا تھا اور نہ ہی مبالغے سے کام لے رہا تھا۔ وہ تو حقائق کو بہت نرم کر کے اور کم سنگینی کے ساتھ لانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اصل میں تو میں نے ہی اسے کھلنے پر مجبور کیا تھا۔ اس کے باوجود میں نے دل ہی دل میں اسے ڈرامے باز کا خطاب اس لئے دیا تھا کہ اس کی شخصیت بڑی ڈرامائی سی تھی۔ وہ کسی اونچے درجے کے ڈرامے کا کوئی اہم کردار معلوم ہوتا تھا اور اگر ہم آنجہانی شیکسپیئر کے قول کے مطابق اس دنیا کو ایک اسٹیج سمجھ لیتے تو پھر یہ بات درست ہی تھی۔ جمیل احمد واقعی ایک اعلیٰ درجے کے ڈرامے کا ایک اہم کردار تھا۔

میں قہقہہ لگانے کے بعد بھی ایک لمحے کے لئے خاموش رہا اور استہزائیہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا تو وہ خفگی آمیز لہجے میں بولا "اس میں فلمی ولن کی طرح قہقہہ لگانے کی کیا بات تھی؟"

میں نے ملائمت سے کہا "اگر یہ کسی فلمی ولن کا قہقہہ ہوتا تو اس کے پیچھے پوری گھن گرج کے ساتھ ایک مکالمہ بھی لڑھکتا ہوا آتا لیکن میں گھن گرج سے مکالمہ بولنے کے بجائے نہایت محبت سے تمہیں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ سیٹھ واحد کا نام سننے کے بعد میری ٹانگیں بالکل نہیں کانپیں۔ اگر تم چاہو تو ہاتھ لگا کر دیکھ سکتے ہو..... بلکہ اگر تمہارے پاس کپکپاہٹ ناپنے کا کوئی آلہ ہے تو اسے کام میں لا سکتے ہو۔"

اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ ایک لمحے اسی طرح خفگی آمیز انداز میں مجھے گھورنے کے بعد وہ کچھ تشویش آمیز انداز میں بولا "تمہاری خود اعتمادی ضرورت سے بہت زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے تم اتنے ذہین آدمی نہیں ہو جتنا میں تمہیں سمجھ رہا تھا۔ مجھے تو حیرت ہے کہ تم اب تک زندہ کیسے ہو۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اگر تم نے اس بات پر حیران ہونا شروع کر دیا تو پھر قدم قدم پر حیران ہی ہوتے رہو گے کیونکہ قدم قدم پر تمہیں ایسے لوگ نظر آئیں گے جنہیں تمہارے حساب سے مر چکے ہونا چاہئے تھا..... لیکن قدرت کے اپنے کچھ عجیب ہی حساب کتاب ہیں۔ جن کے بارے میں تم جیسے لوگ سوچتے ہیں کہ وہ زندہ رہنے کے زیادہ اہل ہیں' بعض اوقات وہ بہت جلد اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

وہ کچھ نہ بولا تو میں نے گہری سانس لے کر کہا "خیر..... چھوڑو ان باتوں کو..... میں اصل میں یہ کہنے لگا تھا کہ کامران کے بارے میں' میں نے تمہیں جو کچھ بتایا ہے وہ تم اپنی سینڈیکیٹ کو بتانا اور اس کے بعد خاص طور پر سیٹھ واحد سے میرے بارے میں مشورہ کر لینا کہ کیا میری بات پر اعتبار نہ کرنا اور مجھے ڈرانا دھمکانا کوئی مناسب حرکت ہے۔ مجھے یقین ہے وہ تمہیں اس سلسلے میں کوئی معقول مشورہ دے سکے گا۔ وکیل کو ہمیشہ کلائنٹ کو مشورے دیتے ہی نہیں رہنا چاہئے' کبھی کبھی اس سے مشورہ لے بھی لینا چاہئے۔"

"میں کسی سے بھی مشورہ لے لوں گا لیکن خدا کے لئے تم مجھے کوئی مشورہ دینے کی کوشش نہ کرو" وہ گویا جل کر بولا۔

"حالانکہ میرے ہی مشورے ایک بہتر زندگی گزارنے میں تمہیں ڈیل کارنیگی کی کتابوں سے زیادہ مدد دے سکتے ہیں" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن افسوس..... مجھے بچپن ہی سے اس ناقدری کا سامنا رہا ہے جس کا اس وقت تم مظاہرہ کر رہے ہو۔"

اس نے میری اس بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے بجائے آگے جھکتے ہوئے اچانک ذرا نرم لہجے میں' کچھ دلچسپی سے پوچھا "تم سیٹھ واحد کو ذاتی طور پر جانتے ہو؟ میرا مطلب ہے..... ان سے تمہاری میل ملاقات ہے؟"

"انہوں نے تمہیں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا؟" میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔

"ان سے ابھی اس موضوع پر کوئی بات نہیں ہو سکی" اس نے کہا۔

"میری ان سے زندگی میں صرف ایک ملاقات ہوئی ہے لیکن مجھے امید ہے وہ مجھے نہیں بھولے ہوں گے" میں نے اس سے کہیں زیادہ اعتماد سے کہا جتنا میں اس وقت محسوس کر رہا تھا۔ "اور اہم بات میرے خیال میں یہ نہیں ہے کہ میں سیٹھ واحد کو جانتا ہوں یا نہیں انہیں تو بے شمار لوگ جانتے ہیں۔ غائبانہ طور پر بھی جانتے ہیں۔ اہم بات یہی ہے کہ وہ مجھے جانتے ہوں' تم میرے بارے میں کوئی بھی پالیسی طے کرنے سے پہلے ان سے میرے بارے میں بات ضرور کر لینا۔"

پھر میں نے نرم اور دوستانہ لہجے میں پوچھا "سیٹھ واحد کے علاوہ اپنی سینڈیکیٹ کے دوسرے سیٹھوں کے نام بتانا پسند کرو گے؟"

"وہ سب تقریباً اسی کیلیبر کے لوگ ہیں....." اس کے لہجے میں کچھ فخر جھلک آیا "ان کی تعداد سات ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک بادشاہ ہے۔ مثلاً حامد مصطفیٰ ہیں....."

"حامد مصطفیٰ شیرازی کی بات کر رہے ہو؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تصدیق چاہی "وہی جن کا سات سو بحری جہازوں کا فلیٹ ہے اور جو پاکستان میں بیس BASE بھی نہیں آتے..... ان کا ہیڈ آفس روم میں ہے؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور ذرا چبھتے ہوئے سے لہجے میں بولا "شاید ان سے بھی تمہاری صرف ایک بار ملاقات ہوگئی ہوگی اور تمہارے خیال میں وہ بھی اب تک تمہیں نہیں بھولے ہوں گے؟"

"اس میں کیا شک ہے" میں نے اطمینان سے کہا..... "تم ان سے بھی کبھی میرے بارے میں بات کر کے دیکھنا۔ اس میں اتنا طنز فرمانے کی کوئی بات نہیں ہے۔"

اسے شاید ایک خفیف سا جھٹکا لگا لیکن اس نے اس کا کوئی خاص اظہار نہیں ہونے دیا البتہ اب وہ بولا تو اس کے لہجے سے اندازہ ہوا کہ وہ کافی حد تک سیدھا ہو چکا تھا "میری تو روزانہ ہی دن میں ایک دو مرتبہ ان سے بات ہوتی ہے چاہے وہ دنیا میں کہیں بھی ہوں۔"

اسے میں ایک عجیب اتفاق ہی کہہ سکتا تھا کہ ابھی اس نے اپنی سینڈیکیٹ میں سے دو نام ہی لئے تھے اور ان دونوں سے واقعی میری ماضی میں ایک ایک اہم ملاقات ہو چکی تھی۔ عجیب اتفاق تھا کہ ایک مرتبہ حامد مصطفیٰ شیرازی نے بھی کسی کے توسط سے باقاعدہ مجھے ملاقات کا پیغام بھیجا تھا' ایک بہت پُر تکلف بزنس ڈنر کا اہتمام ہوا تھا جس کے لئے حامد مصطفیٰ خاص طور پر اٹلی سے اپنے ذاتی طیارے میں آیا تھا۔ میں اس وقت کاروبار کی دنیا میں آگے آچکا تھا۔ کراچی میں میرا فائیو اسٹار ہوٹل تعمیر ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود حامد مصطفیٰ کے سامنے بھی میری مالی حیثیت ہاتھی کے سامنے چیونٹی والی ہی تھی۔ یہ تو میری خوش قسمتی تھی کہ میرے تمام کاروبار بہت جلد میری کوشش سے خالصتاً پرائیویٹ انٹرپرائز بن گئے تھے۔ اگر میں نے ان کے شیئرز مارکیٹ میں رکھے ہوتے تو سیٹھ واحد اور حامد مصطفیٰ جیسے دولت کے پہاڑ تو مجھے خرید کر ایک طرف پھینک سکتے تھے۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ میری اس تمام تر بے وقعتی کے باوجود حامد مصطفیٰ بھی میرے لئے ایک بزنس پروپوزل لے کر آیا تھا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ ملانا چاہتا تھا۔ اس سے بھی میں نے نہایت تشکر اور احترام کے ساتھ معذرت کی تھی۔ میں کوشش کے باوجود معلوم نہیں کر سکا تھا کہ اس کا بزنس پوری طرح "کلین" تھا یا نہیں..... لیکن میں نے اس کے منصوبے میں شریک نہ ہونا ہی بہتر سمجھا تھا۔ کاروبار کی دنیا میں قدرت نے شاید میرے لئے ایک راستہ متعین کر دیا تھا اور وہ مجھے اسی پر چلانا چاہتی تھی۔ شاید اسی لئے میرے دل میں اپنی آزادی' اپنی الگ حیثیت اور اپنا جداگانہ تشخص برقرار رکھنے کی خواہش ایسے مواقع پر کچھ زیادہ ہی ابھر آتی تھی اور میں اس لالچ میں نہیں آیا تھا کہ اتنے بڑے لوگوں کے ساتھ مل کر میں نہ جانے کیا سے کیا بن جاؤں۔ عین ممکن تھا کہ ان لوگوں کے زیر سایہ رہ کر میں کچھ بھی نہ بن پاتا جس طرح بڑے درختوں کی جڑوں کے آس پاس اگنے والے چھوٹے درخت عموماً پنپ نہیں پاتے۔

"کچھ اور نام بتانا پسند کرو گے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"نہیں" وہ گویا جل کر بولا "تم کہہ دو گے کہ وہ بھی تمہارے بڑے قدرداں ہیں۔"

"قدرداں تو میں نے ان دونوں کو بھی قرار نہیں دیا" میں نے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا "میں تو تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ یہ لوگ میرے لئے بہرحال ہوا نہیں ہیں اور میں ان کے لئے کچھ ایسا کیڑا مکوڑا بھی نہیں ہوں۔ تم کچھ اسی قسم کی سچویشن تخلیق کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ تم اتنے پرانے وکیل ہو..... جہاں دیدہ انسان..... بلکہ گرگ باراں دیدہ قسم کی چیز ہو..... اتنے بڑے

مقام پر پہنچے ہوئے.... اتنی طاقتور سینڈیکیٹ کی تکیل تمہارے ہاتھ میں ہے لیکن تمہیں اب تک یہ سلیقہ نہیں آیا کہ سب کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکنا چاہئے۔"

اس کے چہرے کی سرخی کچھ بڑھ گئی۔ وہ گھٹے گھٹے سے لہجے میں بولا "میں نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ میں نے تو تمہیں تمہاری حیثیت سے بڑھ کر احترام اور اہمیت دی لیکن تم بانس پر ہی چڑھ گئے۔"

"جب مجھے اپنے پیروں کے قریب زیادہ سانپ بچھو اور کنکھجورے وغیرہ رینگتے نظر آتے ہیں تو احتیاطاً میں بانس پر چڑھ جاتا ہوں۔ اس مقصد کے لئے میں مضبوط قسم کا ذاتی بانس ساتھ رکھتا ہوں" میں نے سنجیدگی سے کہا "اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔ میرے دماغ میں ایک پھرکی فٹ ہے۔ پھرکی سمجھتے ہو نا؟ جب کوئی مجھے سچا ہونے کے باوجود جھوٹا سمجھتا ہے یا بلاوجہ مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یہ پھرکی گھوم جاتی ہے۔ اس کے بعد کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ میں کیا کہہ ڈالوں اور کیا کر گزروں۔"

"تم مجھے کچھ کھسکے ہوئے لگتے ہو۔" وہ شک زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"بے شک۔" میں نے نہایت سعادت مندی سے تسلیم کیا "اسی لئے تو مجھ سے بات چیت کرتے وقت بہت محتاط رہنا چاہئے۔ خصوصاً ان لوگوں کو.... جن کے دماغوں میں کسی نہ کسی وجہ سے فرعونیت بھری ہوتی ہے۔ اپنی غرض کے تحت وہ خواہ کتنی ہی خوش خلقی اور خلوص کا لبادہ اوڑھ لیں لیکن جونہی انہیں احساس ہوتا ہے کہ ان کی غرض پوری نہیں ہو رہی.... کام ان کی مرضی کے مطابق نہیں ہو رہا تو فوراً ان کے پھن پٹاری سے باہر آجاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی فرعونیت اور منافقت کا زہر نکالنے کے کئی نسخے میرے پاس ہیں۔ کوشش کرو کہ ان میں سے کوئی نسخہ مجھے تم پر نہ آزمانا پڑے۔ زندگی میں آئندہ بھی کبھی میرے ساتھ کوئی ڈیلنگ کرنے کی ضرورت پیش آئے تو احتیاط سے کرنا...."

پھر میں نے خاصے خوشگوار لہجے میں کہا "جس طرح شیشے کے سامان کے ڈبوں پر لکھا ہوتا ہے۔ ہینڈل ود کیئر۔ کبھی کبھی تو میرا جی چاہتا ہے تم جیسے لوگوں سے ملتے وقت میں اپنی ٹائی یا کوٹ کی پشت پر لکھوا کر آیا کروں۔ ڈیل ود کیئر۔ شاید اس سے کچھ فرق پڑ جائے۔"

اس نے ایک نظر گھڑی کی طرف دیکھا اور خاموش رہا۔ میں نے جانے کے لئے پر تولتے ہوئے کہا "میری اس جھاڑ پونچھ سے تمہاری طبیعت کچھ بہتر ہوئی یا نہیں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شاید کچھ زیادہ ہی خفا ہو چکا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا "آج کی اس گفتگو سے ہم اس نتیجے پر پہنچے کہ ضروری نہیں ہر گفتگو کسی نتیجے پر پہنچے" اس کے بعد میں کہنا چاہتا تھا کہ میں چلتا ہوں' جتنا وقت ضائع ہو چکا اسی پر صبر کر لینا چاہئے' مزید وقت ضائع کرنے سے کیا فائدہ.... لیکن عین اسی وقت اس کے انٹرکام کا بزر بج اٹھا۔ کچھ دیر پہلے کافی آجانے کے بعد اس نے اپنی سیکریٹری کو ہدایت کی تھی کہ اسے نہ تو کوئی فون کال دی جائے اور نہ ہی انٹرکام پر ڈسٹرب کیا جائے۔ اس کے باوجود انٹرکام بزر بج اٹھا تھا۔ میری وجہ سے اسے پہلے ہی غصہ آ رہا تھا۔ اس نے انٹرکام کا ریسیور کچھ اس طرح اٹھایا جیسے پلک جھپکتے میں اسے چبا جائے گا۔

ریسیور کان سے لگاتے ہی اس کے تاثرات یکدم بدل گئے۔ پہلے اس کی سکڑی ہوئی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں۔ پھر اس کا منہ کھل گیا۔ وہ بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا.... جوزفین نے اس کے کان میں نہ جانے کیا پھونکا تھا کہ وہ غصہ' ناراضگی' بات چیت کے ناکام ہونے کا صدمہ وغیرہ' سبھی کچھ بھول گیا تھا۔ اس کے چہرے پر صرف حیرت ہی حیرت تھی۔

وہ بے یقینی سے بولا "کیا وہ یہاں آ چکے ہیں؟ آفس میں....؟"

دوسری طرف سے یقیناً اس کی سیکریٹری کا جواب اثبات میں تھا کیونکہ اس نے فوراً ریسیور رکھ دیا۔ آنے والا جو کوئی بھی تھا' یقیناً جمیل احمد کے لئے بہت بڑا' بہت اہم آدمی تھا کیونکہ اس کا نام سنتے ہی اس کے جسم میں چیتے کی سی مستعدی اور چستی آ چکی تھی۔ انٹرکام کا ریسیور رکھتے ہی وہ اس طرح ایک جھٹکے سے اٹھا کہ اگر میز بڑی اور وزنی نہ ہوتی تو الٹ جاتی۔ وہ اس طرح اٹھ کر گرتا پڑتا دروازے کی طرف بھاگا جیسے ایک لمحہ تاخیر ہونے کی صورت میں اسے کوئی کڑی سزا بھگتنی پڑے گی۔

ایک اتنے بڑے' کامیاب وکیل اور نہایت اہم آدمی کا یہ طرزِ عمل میرے لئے حیران کن تھا۔ اس نے جس انداز میں میرا استقبال کیا تھا میں تو پہلے اسی پر حیران ہوا تھا۔ لیکن اب اس کے موجودہ انداز کے سامنے تو میرا استقبال بہت ہیچ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ شاید وہ دوڑتا ہوا دروازے سے نکل جاتا اور آنے والے کے عین سامنے پہنچ کر ہی رکتا لیکن غنیمت یہ رہا کہ آنے والا اس وقت تک دروازے پر ہی پہنچ چکا تھا۔

میں ایک طرف کھڑا سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ جمیل احمد کا اگر بس چلتا تو شاید وہ آنے والے کے سامنے سجدے میں گر پڑتا یا پھر کم از کم رکوع کی سی حالت میں تو چلا ہی جاتا لیکن ارد گرد کافی لوگ جوزفین کے کمرے میں نظر آ رہے تھے' شاید ان کے سامنے ایسا کرتے ہوئے جمیل احمد کو کچھ شرم آ گئی ہو۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا اس شخصیت کی ترقی کا راز صرف یہی تھا؟ خوشامد.... خوشامد....

پھر میں اسی نتیجے پر پہنچا کر صرف خوشامد کافی نہیں تھی۔ کچھ دوسرے عوامل بھی رہے ہوں گے۔ پھر میں نے اس شخص کو بھی دیکھ لیا جس کے سامنے وہ بچھا جا رہا تھا۔ اس کی شاید سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے ہاتھ چومے' پیروں میں گر جائے یا قالین کی جگہ خود بچھ جائے اور نو وارد سے درخواست کرے کہ وہ اس کے جسم پر

پاؤں رکھتا ہوا آگے بڑھے۔

صرف وہی نہیں‘ اس کا تقریباً پورا عملہ اس وقت اسی کیفیت سے دوچار تھا۔ دفتر کے بیشتر لوگ اس کے پیچھے پیچھے جوزفین کے کمرے تک آ گئے تھے اور اس کا حال احوال پوچھنے کے بہانے سے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس کے اپنے دو مسلح گارڈ ان کے علاوہ تھے جن کی خوفناک سیاہ سب مشین گنیں یوں ان کے ہاتھوں میں تھیں جیسے وہ کوئی ذرا سی بھی مشکوک حرکت دیکھتے ہی برسٹ ماردیں گے اور وہ ان کاموں میں بہت زیادہ ماہر معلوم ہوتے تھے۔ ان کی زندگی کا عکس ان کے چہروں سے جھانک رہا تھا اور اس زندگی میں شاید قتل و غارت کے سوا کوئی قابلِ ذکر بات نہیں تھی۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ آنے والا کسی کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ حتیٰ کہ وہ تو جمیل احمد کی طرف بھی نہیں دیکھ رہا تھا جو مصافحے کے لئے اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کر رہا تھا مگر وہ شاید جمیل احمد سے مصافحہ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر اس نے گویا بادلِ ناخواستہ اپنے مریل سا ہاتھ جمیل احمد کے ہاتھ میں جانے دیا۔ جمیل نے انتہائی عقیدت اور احترام سے اس سے مصافحہ کیا‘ اس کا ہاتھ چوما‘ پھر آنکھوں سے لگایا۔

جب وہ بولا تو اس کے لہجے سے اس قدر شہد ٹپک رہا تھا جو شاید ملکی ضروریات پوری کرنے کے علاوہ ایکسپورٹ بھی کیا جا سکتا تھا "سر.....! میرے آقا..... میرے پیرو مرشد.....! ایک مدت کے بعد آپ نے اس خادم کو اس اعزاز سے نوازا کہ آپ خود یہاں تشریف لائے۔ اس اعزاز پر میں جتنا بھی خوش ہوں‘ کم ہے۔ اس کے باوجود میں یہی کہوں گا کہ آپ نے اتنی زحمت کیوں کی؟ مجھے حکم کیا ہوتا..... جہاں آپ فرماتے میں وہاں حاضر ہو جاتا۔"

آنے والے کے حلق سے عجیب منمناتی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی "میرے پاس کچھ وقت تھا اور میں ادھر تمہارے پڑوس میں اپنے دوست سے بھی ملنے آیا ہوا تھا....." اس نے ملک کی ایک اعلیٰ شخصیت کا نام لیا جس کا طویل و عریض اور عالی شان بنگلا وہاں سے تھوڑے ہی فاصلے پر تھا "میں نے سوچا تم سے بھی ملتا چلوں۔ ایک ضروری بات کرنا تھی۔"

"زہے نصیب..... زہے نصیب..... اندر تشریف لایئے" وہ اس کے لئے خود دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

نووارد نے اپنے گارڈز سمیت سبھی کو دروازے پر ہی رکنے کا اشارہ کردیا۔ اس ہجوم سے شاید وہ گھبرا گیا تھا۔ اسے وحشت سی ہو رہی تھی۔ ویسے بھی وہ اعصاب زدہ شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں بندروں کا سا اضطراب تھا۔ وہ سب سے جان چھڑا کر گویا ایک چھوٹی سی چھلانگ لگا کر کمرے میں آ گیا۔ باقی سب لوگ اپنی اپنی میزوں کی طرف واپس چل دیئے۔ صرف اس کے دونوں گارڈ دروازے کے دونوں طرف جم کر کھڑے ہو گئے۔ گنیں بدستور ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ شاید وہ انہیں کندھوں پر لٹکانے کا تکلف بہت کم کرتے تھے۔

میں ہنٹنڈ گلاس کے عقب سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ جوزفین کی میز وغیرہ کا بیشتر حصہ بھی مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ جوزفین نے نووارد کے استقبال کے لئے صرف اپنی جگہ سے اٹھنے اور کئی سو واٹ کی نہایت حسین مسکراہٹ ہونٹوں پر سجانے پر اکتفا کیا تھا۔ نووارد اگر کوئی اور ہوتا تو شاید اس چہرے اور اس مسکراہٹ پر ریشہ خطمی ہو جاتا لیکن اس شخص نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

البتہ میں دم بخود سا کھڑا نووارد کی طرف دیکھ رہا تھا کیونکہ میں نے اسے پہچان لیا تھا گو کہ میں نے اسے برسوں بعد دیکھا تھا لیکن اس میں کچھ اتنی زیادہ تبدیلیاں نہیں آئی تھیں۔ بس اس کے سر کے بال کچھ زیادہ سفید ہو گئے تھے اور چہرے پر معمولی سی شکنیں نمودار ہوئی تھیں۔ بڑھتی عمر نے بس یہیں تک اس کی شخصیت پر اپنے پنجے گاڑے تھے تاہم ان معمولی سی تبدیلیوں سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔

وہ آج بھی وہی پرانا سیٹھ واحد تھا!

آج شاید اتفاقات کا دن تھا۔ میں نے اس وقت‘ اس دفتر میں‘ یوں اچانک اس سے ملاقات کا تصور بھی نہیں کیا تھا..... اور وہ بھی اس کا ذکر آنے کے چند لمحے بعد ہی.....! واقعی انسان آنے والے کسی بھی لمحے کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اس کے دامن میں آپ کے لئے کیا حیرت چھپی ہو۔

سیٹھ واحد کے اندر آتے ہی کمرے میں پھیلی ہوئی ایئر فریشنر کی خوشبو پر چنبیلی کی مہک غالب آ گئی تھی۔ یہ بڑی تیز اور ریچ قسم کی دیسی خوشبو تھی۔ برسوں پہلے بھی میں نے یہ بات حیرت سے نوٹ کی تھی کہ وہ بالوں میں چنبیلی کا تیل لگاتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی روش پر قائم تھا۔ اس نے اپنی خو نہیں بدلی تھی۔ برسوں پہلے بھی وہ بے پناہ دولت مند آدمی تھا اور اس وقت سے اب تک اس نے نہایت تیز رفتاری سے ترقی کی تھی۔ اب تو اس کی دولت کا اندازہ کرنا مشکل تھا لیکن اس کی وضع قطع وہی تھی۔

اس کے جسم پر نہایت سستا سا ایک سوٹ تھا۔ جس کی تراش خراش بھی اس کے جسم سے میل نہیں کھاتی تھی۔ سوٹ سرمئی تھا تو ٹائی لال پیلے رنگ کی تھی۔ پیروں میں گھسے پٹے سے جوتے تھے۔ ہاتھ میں ایک معمولی اور قدرے میلا سا ایک سوتی رومال تھا جسے بار بار ناک پر رکھ کر وہ شوں شوں کئے جا رہا تھا۔ چہرہ ستا ہوا اور نہایت عام سا تھا۔

سرسری نظر میں وہ ایک پریشان حال‘ دکھ بیماری‘ گھریلو مسائل اور کم تنخواہ کا ستایا ہوا کلرک معلوم ہوتا تھا۔ اگر وہ سڑک کے کنارے تنہا کھڑا ہوتا تو شاید کوئی خالی رکشے والا اسے متوقع سواری سمجھ کر اس کے قریب آ کر رکشے کی رفتار بھی کم کرنے کی زحمت نہ کرتا۔ اگر وہ کسی چلتی پھرتی سی اجنبی عورت کی طرف بھی راہ چلتے نظر بھر کر دیکھ لیتا تو شاید وہ برا منا جاتی کہ اس غریبانہ سے

جرات کیونکر ہوئی۔

اگر کسی اجنبی کو اچانک سیٹھ واحد کا نظارہ کرانے کے بعد اس کی حیثیت کے بارے میں بتایا جاتا تو دو طرح کے ردِعمل سامنے آ سکتے تھے۔ وہ ہنستے ہنستے دہرا بھی ہو سکتا تھا اور اسے حیرت کا شدید جھٹکا بھی لگ سکتا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں جب میں نے برسوں پہلے اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھا تھا تب بھی محسوس کیا تھا اور آج غور سے دیکھ رہا تھا تب بھی محسوس کر رہا تھا کہ وہ کسی عام آدمی کا چہرہ نہیں تھا اور خود اپنے دل میں جھانک کر میں بڑے یقین سے کہہ سکتا تھا کہ یہ محض نفسیاتی اثر نہیں تھا..... اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ مجھے پہلے سے اس کی اصل حیثیت کا علم تھا۔

میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ بغیر تعارف کے بھی کبھی اچانک میرے سامنے آیا ہوتا یا میں نے کہیں سرِراہ ذرا بھی توجہ سے اس کی طرف دیکھا ہوتا تو میں ضرور سوچتا کہ اس شخص میں کوئی بہت ہی خاص بات تھی۔ وہ بہت عام‘ بہت معمولی سا آدمی نظر آنے کے باوجود عام اور معمولی آدمی نہیں تھا۔ خاص طور پر اس کی آنکھیں تو کسی بہت ہی خاص آدمی کی آنکھیں تھیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان میں خاص بات کیا تھی۔ وہ کوئی طلسماتی قسم کی آنکھیں نہیں تھیں۔ ان میں شیر کی سی چمک نہیں تھی۔ اس کی نظریں عقابی نہیں تھیں۔ اس کے باوجود اس کی آنکھوں میں کوئی خاص بات تھی۔ کوئی راز تھا جو دریافت کئے جانے کا منتظر تھا۔

اس وقت تو خیر اس نے آنکھ اٹھا کر ابھی میری طرف دیکھا ہی نہیں تھا لیکن میرے ذہن میں برسوں پہلے کا تاثر تازہ ہو گیا تھا حالانکہ اس وقت میں زندگی کے معاملات میں اتنا تجربہ کار نہیں تھا اور مردم شناسی کا بھی مجھے کوئی خاص دعویٰ نہیں تھا لیکن ذہن پر وہ تاثر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ کسی کو شاید بچھڑی ہوئی محبوبۂ دلنواز کی آنکھیں بھی اس طرح یاد نہ ہوں جس طرح مجھے اس کی آنکھیں یاد تھیں اور اس وقت گو کہ وہ صرف جمیل احمد کی طرف متوجہ تھا لیکن میں اب بھی اس کی آنکھوں کی ان پُراسرار خصوصیات اور نامعلوم قوت کو محسوس کر سکتا تھا۔

وہ جمیل احمد سے ہاتھ چھڑا چکا تھا لیکن جمیل احمد گویا اب بھی اس کے گلے کا ہار بننے کے لئے بے تاب تھا۔ وہ نہایت محبت و احترام سے اسے بازو سے تھام کر ایک کرسی کی طرف لے جا رہا تھا۔ سیٹھ واحد نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اکثر نیم وا ہی رہتی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے ان میں وہ غیر معمولی پن محسوس کیا تھا جس کی تشریح بھی میرے بس کی بات نہیں تھی۔ عام آدمی شاید یہ سمجھتا کہ وہ نشے میں ہے‘ مخمور آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ سیٹھ واحد شراب نہیں پیتا تھا۔

پوری طرح آنکھیں کھول کر وہ کبھی کبھار ہی کسی کی طرف دیکھتا تھا اور اس وقت اگر کوئی عام آدمی بھی ذرا توجہ دیتا تو ان آنکھوں کے غیر معمولی پن کو محسوس کر سکتا تھا۔ ان میں کوئی پُراسرار دنیا آباد تھی جس کی وسعتوں کا اندازہ نہیں ہوتا تھا اور جب وہ اپنے مخصوص انداز میں نیم وا آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا تھا تو مجھے کچھ یوں لگتا تھا جیسے دنیا اس کے سامنے بازیچۂ اطفال تھی اور قطعی عدم دلچسپی سے اس کا نظارہ کر رہا تھا۔ اسے دنیا کے کھیل تماشے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور انسان بھی اس کے نزدیک نہایت ہی غیر دلچسپ مخلوق تھے۔ بہت کم لوگ یا بہت کم چیزیں ایسی تھیں جو اسے پوری طرح آنکھیں کھول کر اپنی طرف دیکھنے پر مجبور کرتی تھیں۔ لیکن پھر میں یہ بھی سوچتا تھا کہ جو انسان دنیا اور دنیا والوں کے بارے میں ایسی بے نیازی اور عدم دلچسپی کا شکار ہوتا وہ اس تندہی سے ہر وقت‘ ممنوعہ اور غیر ممنوعہ دونوں طریقوں سے دولت کمانے میں مصروف نہیں رہ سکتا تھا۔

جمیل احمد نے اسے اپنی میز کے قریب ایک بھاری بھرکم مخملیں کرسی تک لے جانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کمرے کے وسط میں ہی رک گیا تھا اور اپنے مخصوص انداز میں نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے مضطربانہ انداز میں رومال سے ناک رگڑتے ہوئے شوں شوں کی ہلکی سی آوازیں نکالتے ہوئے بولا "بڈھے شیطان! تم سچ مچ بڈھے کب ہو گے؟ میں برسوں سے تمہیں اسی طرح دیکھتا آ رہا ہوں۔ تمہیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے جیسے وقت ایک جگہ ٹھہر گیا ہے۔"

جمیل احمد نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا۔ سیٹھ واحد کا کہا ہوا ہر لفظ گویا اس کے لئے خراجِ تحسین تھا۔ وہ قربان جانے والے انداز میں بولا "سر! اگر میں بڈھا ہو جاؤں گا تو آپ جیسے بڑے لوگوں کی خدمت کون کرے گا؟"

"ہاں..... یہ بھی ٹھیک ہے" سیٹھ واحد نے سر ہلایا "ہم جیسے لوگوں کی خدمت میں ہی تمہاری سدا بہار جوانی کا راز پوشیدہ ہے اور میں تمہاری اس خوبی کا بھی معترف ہوں کہ تم خوشامد بہت اچھی کرتے ہو جمیل احمد! مجھے تمہارا خوشامد کا انداز بہت پسند ہے۔ بہت سے لوگ ناک بھوں چڑھا کر ارشاد فرماتے ہیں کہ انہیں خوشامد بالکل پسند نہیں۔ حقیقت میں وہ زیادہ خوشامد پسند ہوتے ہیں۔ میں سیدھا سچا آدمی ہوں۔ صاف مان لیتا ہوں کہ میں خوشامد پسند ہوں۔"

میرے خیال میں وہ جھوٹ بول رہا تھا۔ میرے خیال میں اسے خوشامد پسند نہیں تھی لیکن شاید یہ اس کم بخت کا دوسرے کو خوش فہمی یا غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کا ایک انداز تھا۔ جمیل احمد کو اگر وہ تھوڑا بہت بھی پسند کرتا ہوگا تو شاید اس بنیاد پر کرتا ہوگا کہ وہ بہت زیادہ کارآمد آدمی تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ محض خوشامد کی بنیاد پر کسی کو پسند یا ناپسند کر سکتا تھا۔ اول تو اس قسم کے لوگ پسند ناپسند کو بیچ میں لاتے ہی نہیں‘ وہ صرف آدمی کی صلاحیتوں سے غرض

رکھتے ہیں۔ اس کے کام سے کام رکھتے ہیں۔

جمیل احمد اس کے تبصرے سے ذرا بھی خفت' خجالت یا شرمندگی کا شکار نہیں ہوا۔ اس کی مسکراہٹ' اس کے چہرے اور آنکھوں کی چمک دمک میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس نے اس بات پر بھی کوئی کھسیاہٹ محسوس نہیں کی کہ یہ سب کچھ وہاں میری موجودگی میں کہا گیا تھا۔ اس سے میں اندازہ کرسکتا تھا کہ اکیلے میں کس طرح اس کی خاطر تواضع' ہوتی ہوگی۔

وہ اسی محبت اور گرمجوشی سے بولا "اس عزت افزائی کا شکریہ.... لیکن آپ آگے تشریف تو لے چلئے" اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا "پھر میں آپ کو ایک صاحب سے ملواتا ہوں۔ آپ کو ان سے مل کر یقیناً خوشی ہوگی...."

میرا تعارف کرانا تو درکنار' اسے میری طرف اشارہ بھی کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ سیٹھ واحد وہیں کھڑے کھڑے میری طرف گھوم گیا اور اسی دوران میں بولا "تم غالباً ان کی بات کررہے ہو...."

اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں صرف یہی نہیں' اس کی باچھیں بھی کھل گئیں۔ وہ یکدم ہی دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھا "افضل! میرے دوست.... میرے برخوردار.... میری جان....! بہت بے مروت آدمی ہو تم! اسی ملک میں رہتے ہوئے بھی تم نے کبھی فون تک نہیں کیا۔ آج برسوں بعد ملاقات ہورہی ہے۔"

اس کا یہ انداز جمیل احمد کو تو ششدر کردینے کے لئے کافی تھا ہی.... لیکن خود میرے لئے بھی کچھ کم حیران کن نہیں تھا۔ برسوں پہلے کی سرسری سی ملاقات کے بعد میرا اس سے کوئی رابطہ نہیں رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کا نہ صرف مجھے پہچان لینا بلکہ اس گرمجوشی کا اظہار کرنا میرے لئے بھی غیر متوقع تھا جب کہ ہمارے درمیان بزنس کی بھی کوئی لائن نہیں بن سکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس نے تو میرا نام بھی ذہن سے کھرچ کر پھینک دیا ہوگا لیکن اسے تو نہ صرف نام' شکل صورت وغیرہ یاد تھی بلکہ اس کے رویّے میں بھی پہلے سے زیادہ گرمجوشی تھی۔

وہ صحیح معنوں میں "ٹھاہ" کرکے میرے سینے سے آلگا۔ آدمی وہ مختصرالوجود تھا لیکن سر سے پاؤں تک پتھر کا بنا ہوا لگتا تھا۔ اس نے بھی مجھے بازوؤں کے حلقے میں لے کر کافی زور سے بھینچا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی سانس رکتی محسوس ہوئی۔ اس میں بہرحال جمیل احمد جیسے دراز قد اور تندرست و توانا نظر آنے والے آدمی سے زیادہ طاقت تھی۔ جمیل کو تو میں نے جواباً اپنے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ کر ہلکا سا ہی ڈوز دیا تھا تو وہ چوکڑی بھول گیا تھا لیکن سیٹھ واحد کے بارے میں مجھے اندازہ ہوا کہ اسے اگر میں اپنی طاقت کا احساس دلانا چاہتا تو مجھے اس کو خاصا تگڑا ڈوز دینا پڑتا۔ پتھر کو آسانی سے نہیں دبایا جاسکتا۔ میں نے سنا تھا سیٹھ واحد نے بچپن اور لڑکپن میں نہایت ناسازگار حالات کا سامنا کیا تھا۔ شاید وہ اس وقت سے ہی پتھر کی طرح سخت جان تھا۔ اسی لئے زمانے کی ٹھوکروں میں بکھرا نہیں تھا۔ اس کے بارے میں کچھ باتیں سن کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے شاید مجھ سے بھی زیادہ سختیاں برداشت کی تھیں۔

میں نے اس پتھر کو بھینچنے کی کوشش نہیں کی البتہ اسے موقع دیا کہ وہ اچھی طرح مجھ پر زور آزمائی کا شوق پورا کرلے۔ آخرکار اسے کھانسی آگئی تب اس نے مجھے چھوڑا اور چند لمحے منہ پر رومال رکھ کر آہستہ آہستہ کھوں کھوں کرنے کے بعد رشک آمیز سی نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "افضل! میرے دوست.... میرے برخوردار....! تم تو بالکل نہیں بدلے.... بس تھوڑے سے میچور اور پہلے سے زیادہ ہینڈسم نظر آنے لگے ہو۔ آخر تم کس چکی کا آٹا کھاتے ہو میری جان؟ یہ اس قسم کی جوانی کا نسخہ کیا ہے؟ کچھ ہم بڈھوں کھنڈوں کو بھی بتاؤ میرے یار!"

"میں آٹا نہیں' چکی کھاتا ہوں واحد صاحب!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اس نے خاصا زوردار قہقہہ لگایا اور میرے کندھے پر ہلکا سا گھونسا رسید کیا۔

"تم اب بھی ویسے ہی بدمعاش ہو جیسے لڑکپن میں تھے.... بلکہ شاید اب زیادہ ہوگئے ہو" اس کا گھونسا بھی پتھر کی طرح ہی میرے کندھے پر لگا تھا تاہم غنیمت تھا کہ یہ پتھر کسی نے زیادہ قوت سے کھینچ کر نہیں مارا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ویسے آپ اور جمیل صاحب جیسے بڈھے کھنڈوں' کو دیکھ کر بہت سے جوانوں کا بھی بڈھے کھنڈے' ہونے کو دل چاہ سکتا ہے۔ اگر بڑھاپا آنا اس کو کہتے ہیں تو پھر بڑھاپا آنے میں کوئی حرج نہیں۔"

اس نے پھر ایک قہقہہ لگایا جس کے ساتھ اسے ہلکی سی کھانسی آگئی۔ وہ پہلے اپنے سینے اور پھر میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا "اسے کہتے ہیں بوڑھوں کا دل رکھنا...."

میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے میری بات کو خوشامد قرار نہیں دیا تھا۔ پہلے تو جمیل احمد اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے نشست گاہ کی طرف جانے کی کوشش کررہا تھا۔ اب سیٹھ واحد میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اس طرف لے چلا اور ذرا پھولی پھولی سی سانسوں کے درمیان بولا "بڑے بوڑھوں نے ٹھیک ہی کہا ہے.... یار زندہ' صحبت باقی.... انسان زندہ رہے تو کسی نہ کسی موڑ پر ملاقات ہوہی جاتی ہے...." پھر اسے کوئی بڑا اہم نکتہ سوجھا۔ وہ صوفوں اور مخملیں کرسیوں وغیرہ کے قریب پہنچ کر رکتے ہوئے بولا۔ "ویسے تم نے ایک بات پر غور کیا افضل میاں' قربتیں بڑھانے کے ذرائع اور انسان کے وسائل جتنے بڑھ گئے ہیں اتنا ہی انسان ایک دوسرے کے زیادہ قریب آنے کے بجائے اور بھی دور ہوگیا ہے۔ اب فون ہیں' موبائل فون ہے' فیکس ہے' کاریں ہیں' ہوائی جہاز ہیں مگر

انسان ایک دوسرے سے نہیں ملتا۔ جب یہ چیزیں نہیں تھیں تو انسان ایک دوسرے سے زیادہ ملتا تھا۔ بلا ضرورت بھی مل لیتا تھا۔ بغیر کام کے بھی مل لیتا تھا۔"

"اب کسی کے پاس وقت ہی کہاں ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہاں..... وقت بچانے والی مشینیں جو ایجاد ہوگئیں ہیں۔ اس لئے اب کسی کے پاس وقت نہیں رہا۔ ملنے سے پہلے اپائنٹمنٹ لینا پڑتا ہے" اس نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا اور یکدم اسے پہلے سے ذرا زیادہ زور کی کھانسی آگئی۔

تاہم کھانسی جلد ہی تھم گئی اور وہ رومال میں شوں شوں کرتے ہوئے بولا "میرا دل چاہتا ہے دنیا کے سارے ڈاکٹروں کو کسی توپ کے سامنے باندھ کر اڑادوں۔ میں دنیا کے قابل ترین ڈاکٹروں کے پاس ہو آیا.... ہانگ کانگ اور برازیل وغیرہ میں روحانی علاج کرنے والی ان موٹی موٹی بے ہودہ عورتوں کے پاس بھی ہو آیا جن کے معجزاتی علاج کے بڑے افسانے سنے تھے.... لیکن کوئی بھی میری کھانسی کا علاج نہیں کرسکا۔ ایک اور طریقہ میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ میں اپنی کھانسی کے جراثیم ان سب ڈاکٹروں وغیرہ کے پھیپھڑوں میں بھی داخل کرادوں۔ کم بخت مسیحا اور معالج بنے پھرتے ہیں۔ لاکھوں روپے خرچ کرادیتے ہیں۔ میرے ساتھ ساتھ وہ بھی کھانسیں گے تو دل کو کچھ تو تشفی ہوگی۔"

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ شفا دواؤں میں نہیں' ڈاکٹروں کے ہاتھ میں نہیں.... شفا کسی اور کے ہاتھ میں ہے۔ کبھی اس کی طرف بھی رجوع کرکے دیکھے.... لیکن فی الحال میں نے اسے یہ مشورہ نہیں دیا۔ قدرت کے کام بڑے غور کی دعوت دیتے ہیں۔ قدرت بعض لوگوں کو اتنا نوازتی ہے کہ اس کی نعمتوں کا شمار ممکن نظر نہیں آتا لیکن کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی تشنگی' کمی' تکلیف یا بے بسی ضرور رکھ دیتی ہے۔ شاید اس لئے کہ انسان کو اپنی اوقات یاد آتی رہے۔ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ اس کے پاس سب کچھ آگیا۔ وہ دنیا کی ہر چیز پر قادر ہوگیا۔

سیٹھ واحد میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک صوفے پر بٹھانے لگا۔ جمیل احمد ایک طرف دم بخود سا کھڑا تھا۔ وہ سیٹھ واحد کا مجھ سے ملنے کا انداز دیکھ کر اور اس کی مجھ سے گفتگو سن کر ابھی تک حیران پریشان تھا۔ سردست تو وہ کمرے میں گویا ایک فالتو سا شخص ہوکر رہ گیا تھا۔ سیٹھ واحد تو گویا اسے بھول ہی گیا تھا اور میں جان بوجھ کر اس کی طرف توجہ دینے سے گریز کررہا تھا۔ آخر وہ خود ہی ڈھیٹ بن کر آگے آگیا اور ہم تینوں ہی ایک دوسرے کو بیٹھنے کا کہتے ہوئے بیٹھ گئے۔

سیٹھ واحد اب بھی میری طرف ہی متوجہ رہا اور مسکراتے ہوئے بولا "ویسے ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کہ میں نے اتنے عرصے سے تمہیں نہیں دیکھا تھا۔ انسان زیادہ لمبے عرصے بعد کسی کو دیکھتا ہے تو کچھ نہ کچھ تبدیلی کا احساس ہوتا ہے جو اپنے ساتھ کبھی کبھی خوشگوار حیرت بھی لے کر آتی ہے.... جیسا کہ اس وقت تمہارا معاملہ ہے....!"

اس نے ایک گہری سانس لی۔ ایک بار پھر تھوڑی سی شوں شوں کی اور بولا "تم نے بہت ترقی کی ہے افضل! میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں ـــ مجھے سب پتا چلتا رہا ہے۔ لاہور اور کراچی دونوں جگہ تم نے کاروبار اچھا سیٹ کرلیا ہے۔ تمہارا ہوٹل بھی اچھا جارہا ہے۔ تمہیں تو اتنی بھی توفیق نہیں ہوسکی کہ ہوٹل کے افتتاح پر ہی مجھے بلالیتے...." اسے گویا برسبیلِ تذکرہ شکوہ کرنے کا بھی خیال آگیا۔

"بلانا تو معمولی بات ہے' میں تو افتتاح ہی آپ سے کرالیتا۔ آپ جیسے مہربان کے ہاتھوں افتتاح ہوتا' اس سے اچھی کیا بات تھی لیکن ان دنوں آپ کسی لمبے ہی پروگرام پر مڈل ایسٹ گئے ہوئے تھے۔ وہاں بھی آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن رابطہ ہو نہیں سکا تھا۔" میں نے فوراً کہا۔

یہ بات اتفاق سے مجھے یاد آگئی تھی۔ افتتاح وغیرہ تو شاید میں اس سے نہ کراتا لیکن یہ حقیقت تھی کہ میں نے اسے مدعو ضرور کرنا چاہا تھا اور زندگی میں کئی اہم مواقع پر وہ مجھے یاد بھی آیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ جس ریپوٹیشن کا مالک تھا اس طرح کے لوگوں میں سب سے بہتر لگتا تھا۔ شاید اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ موجود تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ میرے لیے نیک خواہشات ہی رکھتا ہو اور شاید اسی لیے میں بھی اپنے دل کے کسی گوشے میں خفیف سے احترام کے جذبات رکھتا تھا۔ ذرائع خواہ کچھ بھی رہے ہوں.... لیکن وہ جس مقام پر تھا اور جتنی طاقت کا مالک تھا اس کے باوجود میں نے اس میں وہ فرعونیت اور وہ خباثتیں نہیں دیکھی تھیں جو اس سے کہیں کمتر لوگوں میں موجود تھیں۔ آج کل تو چوہا بھی ذرا سے وسائل میسر آنے پر دُم پر کھڑا ہوجاتا تھا۔

اس کی آنکھیں جو ذرا دیر کے لیے پوری طرح کھل گئی تھیں' اب پھر نیم وا ہوچکی تھیں۔ میری بات سن کر وہ مزید سکڑ گئیں۔ وہ شاید ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا "لمبے پروگرام پر تو میں صرف ایک بار ہی مڈل ایسٹ گیا ہوں.... اور تم سے یا جمیل احمد سے کیا پردہ.... وہ پروگرام روپوشی کا تھا۔ میں احتیاطاً کچھ عرصے کے لیے روپوش ہوگیا تھا ورنہ اس وقت کی حکومت کی ایک بہت اعلیٰ شخصیت خواہ مخواہ مجھ سے تیس چالیس کروڑ روپیا اینٹھ لیتی۔"

"ہمارے ہاں ہر دورِ حکومت میں کسی نہ کسی انداز میں ایسی ہی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں" میں نے تاسف سے کہا۔

"ارے.... ان چکروں کا کیا پوچھتے ہو۔ سینہ زخموں سے بھرا پڑا ہے" سیٹھ واحد خرخراہٹ زدہ سی ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا "اس ملک میں بہت سے لوگ اپنی دانست میں بعض کتابیں لکھ کر بڑی سنسنی پھیلانے اور بڑی توپ چیز بننے کی کوشش کرتے رہتے ہیں لیکن اگر کبھی زندگی میں مجھے اپنی سرگزشت لکھنے کا موقع ملے اور اس میں' میں تمام واقعات کسی مصلحت اور خوف کے بغیر

دیانتداری سے لکھ سکوں تو نہ جانے کن کن ایوانوں میں زلزلہ آجائے۔ بڑے بڑے سرکاری دفتروں اور بڑے بڑے سرکاری افسروں کی نہ جانے کیسی کیسی بھیانک تصویریں لوگوں کے سامنے آجائیں۔"

"تو پھر کسی مصنف کی خدمات حاصل کرکے لکھ ڈالیں نا کتاب" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ تو خود بہت اعلیٰ طریقے سے چھاپ سکتے ہیں۔ اس پراجیکٹ میں بھی بہت سا روپیا لگا کر بہت سا روپیا کما سکتے ہیں۔"

"میں کیسے لکھ سکتا ہوں......!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میں تو سب سے زیادہ مصلحتوں کا اسیر ہوں۔ بہت منگا پڑے گا مجھے یہ پراجیکٹ...... خیر...... یہ دل جلانے والی باتیں چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم میرے وکیل کے دفتر میں کیوں پائے جارہے ہو؟ یا پھر یہ تمہارا بھی وکیل ہے اور مجھے اتفاق سے ابھی تک پتا نہیں چل سکا؟"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے ابھی ان کی وکالت سے فیض یاب ہونے کا اعزاز حاصل نہیں ہوسکا" میں نے جمیل احمد کی طرف دیکھا "انہوں نے تو مجھے ٹیلی فونی سمن بھیجا تھا۔ میں حاضر ہوگیا۔"

وہ تھوڑا سا ہنسا' تھوڑا سا کھانسا پھر خوش دلی سے بولا "خیر...... تم اتنے سعادت مند نہیں ہو" پھر اس نے جمیل کی طرف دیکھا۔ اسے گویا میرے یاد دلانے پر یاد آیا تھا کہ جمیل احمد بھی وہاں موجود تھا ورنہ وہ جیسے اسے بھول ہی چکا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ایسا نہیں تھا۔ یہ محض ظاہری انداز و اطوار تھے۔ درحقیقت وہ کسی کو بھی نہیں بھولتا تھا' کوئی بات بھی نہیں بھولتا تھا۔

جمیل احمد اتنی دیر سے گویا چوکڑی بھولا ہوا تھا۔ اس کے تاثرات یکدم بدلے۔ اس کی تیزی' طراری اور شاطرانہ پن واپس آتا دکھائی دیا۔ وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "وہ پرنس انڈسٹریز والی ڈیل افضل صاحب پر آکر اٹک گئی ہے۔"

"افضل پر......؟" سیٹھ واحد کی نیم وا آنکھیں ایک لمحے کے لیے پھر پوری کھل گئیں اور گھنی بھویں کمان بن گئیں "افضل کا پرنس انڈسٹریز سے کیا تعلق؟"

جمیل احمد نے دھیمے لہجے میں اسے رام کہانی سنانی شروع کی جس سے وہی تاثر ملتا تھا کہ کامران دانش کو میں نے کہیں چھپایا ہوا تھا۔ میں نے اس کی بات میں ذرا بھی مداخلت نہیں کی اور نہ ہی اپنی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ میں خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا اور مسکراتا رہا۔

آخر میں جمیل احمد بولا...... "کل شام جب آپ دبئی میں تھے اور میری آپ سے فون پر بات ہو رہی تھی تو آپ جلدی میں تھے۔ میں نے مختصراً آپ کو بتایا تھا کہ لاہور کے ایک بزنس مین کی وجہ سے کام خراب ہو رہا ہے جس کے کراچی میں بھی بزنس وینچرز ہیں......"

"اور مجھ گدھے نے اس کا نام بھی جاننے کی زحمت نہیں کی تھی" سیٹھ واحد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"آپ اس وقت نیویارک جارہے تھے اور دوسرے ٹیلی فون پر آپ کی کسی سے بات چل رہی تھی۔ آپ نے کہا تھا کہ بعد میں اس موضوع پر بات کریں گے اور آپ خود مجھے فون کریں گے لیکن آپ کا فون نہیں آیا......"

"میں خود آگیا" سیٹھ واحد بات کاٹتے ہوئے بولا "میری جس دوسرے فون پر بات ہو رہی تھی وہ سیٹلائٹ ٹیلی فون تھا اور سمندر میں بہت دور گئے ہوئے ایک بحری جہاز پر ایک شخص سے میری بات ہو رہی تھی۔ اس وقت وہ زیادہ ضروری تھی۔ اس لیے میں نے زیادہ لمبی بات نہیں کی تھی۔ پھر میرا نیویارک جانے کا پروگرام کینسل ہوگیا۔ آج صبح میں نے سوچا چلو پاکستان چل کر دیکھ ہی لیتے ہیں وہ کون سا بزنس مین ہے جس کی وجہ سے سیٹھ واحد کا کام خراب ہو رہا ہے...... بلکہ صرف سیٹھ واحد ہی کا نہیں...... تقریباً اسی جیسے چھ دوسرے آدمیوں کا بھی......"

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور کہا "راستے میں غالباً آپ نے یہ فیصلہ بھی کرلیا ہوگا کہ اس مردود بزنس مین کو سمندر میں غرق کروانا ٹھیک رہے گا یا اس کی گاڑی کو کسی ٹرک سے چکنا چور کروانا زیادہ مناسب رہے گا۔"

میری بات سے گویا سیٹھ واحد کو روحانی صدمہ پہنچا۔ وہ تکلیف زدہ سے لہجے میں بولا۔ "ایسی دل دکھانے والی باتیں نہ کرو برخوردار! تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں تشدد پسند آدمی نہیں ہوں۔ میں تو کبھی کبھار اپنے جانی دشمن کو بھی معاف کردیا کرتا ہوں۔ اگر کوئی چھچھوندر بہت ہی بری طرح گلے میں پھنس جائے' صرف اسے نکالنے کا بندوبست کرتا ہوں۔ یہ کوئی ایسی زیادتی کی بات نہیں۔ سانس کی آمدورفت جاری رکھنے کے لیے گلے کو صاف رکھنا تو ضروری ہے نا...... اور سانس لینے کا سب کو حق حاصل ہے۔ کسی کو کسی کی سانس بند کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔"

پھر وہ جمیل احمد کی طرف دیکھ کر بولا "تم نے تو بہت ہی غلط آدمی کو میرے سامنے لاکر بٹھادیا۔ اس کے ساتھ تو میں کوئی سختی بھی نہیں کرسکتا۔"

"اگر دل میں ایسا کرنے کا کوئی ارمان ابھر رہا ہے تو تم اسے پورا کرنے کی کوشش کرسکتے ہو" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ معلوم نہیں کیوں اس وقت غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں ایک چیلنج سا جھلک آیا تھا حالانکہ میں غیر ضروری طور پر کسی کو چیلنج کرنے سے گریز ہی کرتا تھا۔ خصوصاً سیٹھ واحد کے سامنے تو ایسا کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں "آپ" سے تم پر بھی اُتر آیا تھا۔

سیٹھ واحد کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا لیکن اس نے اپنی خوش مزاجی میں فرق نہ آنے دیا اور مسکراتے ہوئے بولا "یہی تو مسئلہ ہے۔ انتہائی ناگزیر حالات کے بغیر تو میں مکھی مارنے کے احکامات بھی جاری نہیں کرتا۔ ایسی باتوں کو انا کا مسئلہ نہیں

[بنا]تا' سر جھکا کر اور دوسروں کو ان کی بہتری اور بقا کا زیادہ [سے زیادہ] موقع دے کر زندہ رہنے کا قائل ہوں۔ یاد ہے جب تم نے پہلی ملاقات میں میری پیشکش کو ٹھکرایا تھا تو تم اتنے سے تھے......" اس نے انگلی اور انگوٹھے کے درمیان ذرا سا فاصلہ رکھتے ہوئے وہی اشارہ کیا جو کسی چیز کے چھوٹے پن کو ظاہر کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کے باوجود میں نے اسے انا کا مسئلہ نہیں بنایا۔ خواہ مخواہ کے تصادم میں وقت' توانائی اور روپیا ضائع ہوتا ہے خواہ وہ تصادم کتنے ہی معمولی حریف سے ہو۔ میرے اس فلسفے کی وجہ سے بعض اوقات میرے ساتھی بھی مجھے بزدل قرار دے دیتے ہیں لیکن بعد میں وہ قائل ہوجاتے ہیں کہ میں بزدل نہیں' عقلمند تھا......"

پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور نیم وا آنکھوں سے پُر خیال انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اور تمہارا معاملہ تو میرے لیے کچھ عجیب سا ہی ہے۔ میں نے جب پہلے تمہیں دیکھا تھا' اس وقت بھی...... اور آج بھی چند لمحوں کے لیے تو میرے دل میں کچھ ایسے جذبات اُبھر آتے ہیں جیسے تم میرے بچھڑے ہوئے بیٹے ہو۔"

میں نے بے اختیار قہقہہ لگایا اور کہا "خواہ مخواہ میرے باپ بنے اور فلمی سین تخلیق کرنے کی کوشش نہ کرو۔ بے شک میرا باپ دنیا میں نہیں ہے لیکن اب بھی اسی کا بیٹا کہلانا اور محسوس کرنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ وہ ایک سیدھا سادہ' معصوم اور غریب سا دیہاتی تھا جس نے زندگی میں کبھی اپنے قول و فعل سے کسی کو ذرا سی بھی تکلیف نہیں پہنچائی۔"

"مجھ میں اس کے مقابلے میں بس ایک ہی خرابی ہے کہ میں غریب نہیں ہوں۔" سیٹھ واحد ہلکی سی کھانسی کے ساتھ بولا "ورنہ اگر کوئی مجھے قریب سے جان سکے اور میرے دل میں جھانک سکے تو میں بھی ایک نہایت سیدھا سادہ اور معصوم سا دیہاتی ہوں" اس کے لہجے میں واقعی ہلکی سی افسردگی آگئی "مجھے آج تک کسی نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ حتیٰ کہ میری تینوں بیویوں نے بھی نہیں...... اور اولاد میری تینوں بیویوں سے نہیں ہے۔"

"اچھا...... زیادہ ڈراما کرنے کی کوشش نہ کرو اور اصل کام کی بات کرو" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

اس نے ایک نازک موضوع چھیڑ دیا تھا۔ اس سے پہلے بھی بات چیت ایک خطرناک سے موڑ پر ہی تھی۔ اس کے باوجود اب ماحول میں کوئی تناؤ نہیں رہا تھا اور ایک بے عنوان سی اپنائیت و بے تکلفی کی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ مجھے اعتراف تھا کہ یہ میرا نہیں' سیٹھ واحد کی عجیب و غریب سی شخصیت کا کمال تھا ورنہ میں نے اس سے ہلکی پھلکی سی چھیڑ چھاڑ کرڈالی تھی اور اس کی وجہ محض یہ تھی کہ میں اپنے دل میں شاید ایک بے نام سی جھنجلاہٹ محسوس کر رہا تھا کہ مجھے خواہ مخواہ ایک ایسے معاملے میں اپنی صفائیاں پیش کرنا پڑ رہی تھیں جس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا اور اس سلسلے میں کم از کم جمیل احمد نے ابھی تک میرے سچ پر یقین نہیں کیا تھا۔

"اصل کام کی بات بس اتنی سی ہے کہ وہ آدمی...... کیا نام ہے اس کا؟ کامران دانش......؟ ہاں...... وہ آدمی ہمیں دے دو" وہ بڑے پیار سے بولا۔

"کاش وہ آدمی میری جیب میں رکھا ہوتا تو میں نکال کر تمہارے حوالے کرتا اور اس بک بک سے نجات پاتا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "سیٹھ واحد! کیا تمہارے خیال میں' میں اتنا احمق ہوں کہ اتنی بڑی خوش نصیبی ایک شخص کا انتظار کر رہی ہو...... اس کے ساتھ ساتھ مجھے بھی اتنا بڑا فائدہ پہنچنے کی اُمید ہو۔ اس کے باوجود میں اسے چھپا کر رکھوں؟"

"ہوسکتا ہے تمہیں ہماری پیشکش پر بھروسا نہ ہو...... ہوسکتا ہے اس میں تمہیں اپنا انٹرسٹ کم محسوس ہو رہا ہو...... ہوسکتا ہے تم مزید کسی قسم کی ضمانت کی ضرورت محسوس کر رہے ہو......" سیٹھ واحد نرم لہجے میں بولا "شاید تمہارے ذہن میں یہ امکان موجود ہو کہ ہم خطرناک لوگ ہیں۔ اس آدمی کے سامنے آتے ہی اسے لے اڑیں گے۔ اسے تھوڑی بہت رقم دے کر...... یا بالکل ہی سوکھے سوکھے...... محض گن پوائنٹ پر اس سے کاغذات پر دستخط کرالیں گے......"

"خیر...... اب ایسا بھی اندھیر نہیں مچا ہوا ہے" میں نے ہنس کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "جس کام میں میری ٹانگ اڑی ہوئی ہو اس میں اب اتنی بھی دھونس دھاندلی نہیں چل سکتی۔ میرا نام افضل چوہدری ہے اور میں کوئی کیچوا نہیں ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے...... مجھے معلوم ہے......" سیٹھ واحد نے بھی ہلکا سا قہقہہ لگایا "تم اب یتیم و یسیر قسم کی چیز نہیں ہو۔ بہت پاؤں پھیلالئے ہیں تم نے...... لیکن ہم جو بات کر رہے ہیں وہ تمہاری مرعوبیت کے سائے میں نہیں کر رہے ہیں۔ تم تو یونہی خواہ مخواہ بیچ میں نکل آئے ہو لیکن میں تمہیں ایمانداری سے بتارہا ہوں...... تم بیچ میں نہ بھی ہوتے تب بھی یہ ایک صاف ستھری ڈیل تھی۔ ہم کامران دانش جیسے بے ضرر اور عام سے آدمی سے براہِ راست بھی معاملہ کر رہے ہوتے' تب بھی کوئی بے ایمانی یا بدمعاشی دکھانے کی کوشش نہ کرتے۔ ہم اس ڈیل میں کوئی گند ڈالنا نہیں چاہتے...... اور پھر اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ہم اپنی ضرورت کے تحت مارکیٹ سے ایک اچھی چیز خریدنا چاہتے ہیں۔ ہم اس کی صحیح قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ہمیں اس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔ ہم یہ سودا فائدے کے لیے کر رہے ہیں اور ان سب باتوں کے باوجود اگر تمہارے ذہن میں کوئی اندیشہ' کوئی ابہام' کوئی مطالبہ موجود ہے تو بلا تکلف بات کرو۔ اب میرے اور تمہارے آمنے سامنے آنے سے تو صورتِ حال بالکل ہی بدل گئی ہے۔"

"کوئی خاص نہیں بدلی" میں نے نرم لہجے میں کہا "اس لیے کہ وہ بدنصیب جو سارے فساد کی جڑ ہے وہ نہ جانے کہاں دھکے کھا رہا

مزید بڑھا دیا تھا۔ اس کی سیاہ شیروانی اور بگلے جیسی سفید کلف لگی شلوار کے رنگوں کے تضاد نے اس کی شخصیت کو اور نکھار دیا تھا۔ وہ اپنے دیسی حلیئے کے ساتھ اپنی جگہ ایک منفرد اور متاثر کن شخصیت کا مالک تھا۔

اس کے دائیں بائیں دونوں پہلوؤں میں شیروانی کی جیبیں کچھ پھولی پھولی سی لگ رہی تھیں۔ اس کے سرتاپا نفیس حلیئے میں یہ عیب نہیں ہو سکتا تھا لیکن میرے خیال میں یہ اس کی مجبوری تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ڈرائیور ہونے کے ساتھ ساتھ سیٹھ واحد کا دیسی اور غیر رسمی باڈی گارڈ بھی ہوگا۔ اس کی شیروانی کی دونوں جیبوں میں یقیناً گنیں موجود تھیں۔ اس دوران میں اِکّا دُکّا گاڑیاں آس پاس پارک ہوئی تھیں اور ان میں سے اترنے والے لوگوں میں سے کوئی خوفزدہ اور کوئی متجسس نظروں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے اور کافی دور دور رہتے ہوئے ہی گزرتا چلا گیا تھا کیونکہ سیٹھ واحد کے دونوں گارڈز الرٹ حالت میں گنیں سنبھالے کھڑے تھے۔ ان کی نظریں یوں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں جیسے انہیں ہر ایک پر ہی دشمن ہونے کا شبہ ہو۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ گزرنے والوں کی نظروں سے مجھے اندازہ ہوا' وہ سمجھ رہے تھے کہ یہ انتظامات میرے لیے تھے۔ انہیں شاید گمان بھی نہ گزرا ہو کہ یہ سارے انتظامات اور سارا... ٹھاٹ باٹ اس پست قد مجہول سے شخص کا تھا جس کے چھدرے کھچڑی بال ہوا میں لہرا رہے تھے' جو معمولی سے ایک سوتی رومال سے بار بار ناک پکڑ کر شوں شوں کر رہا تھا۔ جو معمولی قسم کے ایک شکن آلود اور ڈھیلے ڈھالے سے سوٹ میں تھا اور جو اپنے مُتے ہوئے چہرے سے بیمار و بیزار دکھائی دے رہے تھا۔

ایک اچھی بات یہ تھی کہ سیٹھ واحد کو غالباً اپنے آپ کو نمایاں کرنے کا قطعاً کوئی شوق بھی نہیں تھا۔ شاید اسی لیے اسے اپنے حلیئے اور کسی کی پسند ناپسند کی پروا بھی نہیں تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس طرح شارعِ عام پر کھڑے ہو کر لوگوں کی نظر میں آنا بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھلتے ہی وہ جلدی سے اس میں گھس گیا۔ مجھے اس نے اپنے برابر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

گاڑی میں سیٹوں کی دو کے بجائے تین قطاریں تھیں۔ ڈرائیور کا کمپارٹمنٹ الگ تھا اور اس سے بات کرنے کے لیے شیشے کی دیوار میں مائیک لگا ہوا تھا۔ دروازے بند ہوتے ہی کچھ یوں محسوس ہوا جیسے ہم ایک چھوٹے سے پُرتعیش جہاز میں آن بیٹھے تھے۔ پھر یہ جہاز بے آواز طریقے سے سڑک پر ہلکورے لینے لگا۔ بند گاڑی کی خنک اور خوشبودار فضا میں سیٹھ واحد کے سر میں لگے ہوئے چنبیلی کے تیل کی خوشبو گویا اور بھی تیز ہو گئی تھی اور پہلے سے موجود ہلکی ہلکی خوشبو پر غالب آگئی تھی۔

آرام سے پھیل کر بیٹھتے ہی وہ بولا "اب تم مجھے کامران دانش کے بارے میں ساری بات بتا دو۔"

میں نے نجی پہلوؤں کو چھوڑ کر باقی ساری بات اسے بتا دی۔ وہ میرے خاموش ہونے کے بعد بھی خاموش ہی رہا۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چند لمحے وہ گاڑی کے تاریک شیشے سے باہر دیکھتا رہا۔ بلند و بالا عمارتیں اور گاڑیوں کے ریلے گزرتے جا رہے تھے۔ ڈرائیور کو کوئی ہدایت نہیں دی گئی تھی لیکن اسے گویا معلوم تھا کہ کہاں جانا تھا۔

"کیا تمہیں میری بات کا یقین نہیں آیا" میں نے پوچھا۔

"آگیا ہے" اس نے نہایت اختصار سے جواب دیا "میں تو حیران ہو رہا ہوں کہ کیا تقدیر کسی انسان کو اس طرح بھی دھکا دیتی ہے... یا یوں کہو کہ کیا کبھی انسان تقدیر کو بھی اس طرح دھکا دیتا ہے! وہ جب تمہیں دھکا دے کر بھاگا تو درحقیقت اپنی خوش قسمتی کو دھکا دے کر بھاگ رہا تھا۔"

"اگر انسان کو آنے والے وقت کا اندازہ ہو تو کوئی بھی اس قسم کی... بلکہ کسی بھی قسم کی حماقت نہ کرے" میں نے کہا۔ "بہر حال تم اس کی ایک اچھی سی تصویر تو مجھے فراہم کر دو..." وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"اس شہر میں اس قسم کے غیر اہم... نہایت عام اور بے سراغ شخصیت کو تلاش کرنا ہے تو بہت مشکل... لیکن میں اپنی سی کوشش کروں گا اور اپنی سینڈیکیٹ کے دوسرے سیٹھوں سے بھی کہوں گا کہ وہ بھی اپنے وسائل استعمال کریں لیکن اس سلسلے میں قسمت پر ہی بھروسا کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس کی اور ہماری قسمت میں ہوا تو شاید کوئی غیبی قوت اسے ہمارے سامنے لا کھڑا کرے ورنہ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"تم بھی قسمت پر یقین رکھتے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں" وہ بلا تامل بولا۔ "بلکہ میں تو یقین ہی قسمت پر رکھتا ہوں۔"

"یعنی تمہیں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے وہ تم نے اپنی عقل سے بنایا ہے۔ تم جو کچھ بھی ہو اپنی عقل سے بنے ہو؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ارے برخوردار...! میں کیا اور میری عقل کیا...!" وہ خوش دلی سے بولا "مجھ سے اور تم سے کہیں زیادہ عقلمند لوگ جو اپنی تمام تر چالاکیوں کو بھی بروئے کار لاتے ہیں' سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں۔ عقل بھی تبھی کام آتی ہے جب قسمت اچھی ہو۔ قسمت اچھی نہ ہو تو اچھے بھلے عقلمندانہ کام بھی حماقت ثابت ہوتے ہیں اور قسمت اچھی ہو تو حماقتیں بھی عقلمندیاں بن جاتی ہیں۔"

"جہاں تک کامران کا معاملہ ہے تو اسے میرے آدمی بھی تلاش کر چکے ہیں... پولیس بھی تلاش کر رہی ہے۔ اب تم اور تمہارے ساتھی بھی اپنے وسائل استعمال کر کے دیکھ لیں۔ شاید مل ہی جائے۔ میں نے تو اس شخص کی طرف سے صبر کر لیا ہے" میں نے کہا۔

وہ متاسفانہ انداز میں بولا "مجھے اس شخص کی قسمت بہت ہی خراب لگتی ہے۔ یہ مجھے انہی لوگوں میں سے لگتا ہے جو سونے میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں تو وہ مٹی ہو جاتا ہے۔"

گاڑی اب اس طویل سڑک پر ہلکورے لے رہی تھی جس کے ایک سرے پر پہنچ کر کلفٹن کی تعمیرات تقریباً ختم ہو جاتی تھیں۔ اس سے آگے مستقبل کے منصوبے زیرِ غور یا زیرِ تعمیر تھے۔ چند منٹ بعد گاڑی ایک نہایت خوبصورت بنگلے کے سامنے جا رکی جو شاید اس سڑک پر بہت پہلے سے تعمیر ہوا تھا لیکن اس کا نیا پن اور خوبصورتی برقرار رکھنے پر یقیناً بہت توجہ دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے حفاظتی انتظامات بھی زبردست تھے۔ ایک تو اس کے طرزِ تعمیر میں ہی حفاظتی پہلوؤں کا بہت خیال رکھا گیا تھا' اوپر سے مزید حفاظتی انتظامات بھی کیے گئے تھے۔ اونچی دیواریں' خاردار چمکتی تاریں جن میں شاید کرنٹ دوڑانے کا بھی انتظام تھا' تھوڑے تھوڑے فاصلے پر فلڈ لائٹس وغیرہ۔ گیٹ بھی زبردست تھا۔ مجموعی طور پر وہ پورا بنگلا چھوٹے سے ایک خوبصورت قلعے کی طرح تھا۔

گاڑی کا ہارن بجا۔ اندر سے غالباً گاڑی کو دیکھ لیا گیا تھا اور پہچان لیا گیا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے گیٹ خود کار انداز میں کھلتا چلا گیا اندر دونوں طرف دو چاق و چوبند مسلح گارڈ کھڑے تھے۔ سیٹھ واحد مجھ سے مخاطب ہوا "یہ میرا بہت ہی خفیہ ٹھکانا ہے۔ عام طور پر جب میں باہر سے آتا ہوں تو ایک آدھ دن کے لیے یہاں پایا جاتا ہوں لیکن بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے اور میرے ساتھ تو آج تک یہاں کوئی نہیں آیا۔ ایسے کسی آدمی کو تو ساتھ لانے کا میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا جس سے زندگی میں صرف ایک دو ملاقاتیں ہی ہوئی ہوں..."

پھر وہ مشفقانہ انداز میں مسکرایا "لیکن تمہاری بات دوسری ہے۔"

میرے لیے سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ یہ اس کی کسی بہت ہی خاص اور سب سے زیادہ دل پسند داشتہ کا گھر تھا جہاں وہ شاہانہ ٹھاٹ باٹ کے ساتھ رہتی ہوگی اور یہ سب سیٹھ واحد ہی کی نوازشات ہوں گی۔ اس تصور سے ایک لمحے کے لیے میری دھڑکنیں تیز ہوئیں کہ وہ یقیناً کوئی غیر معمولی طور پر خوبصورت اور پہلی نظر میں ہی دل موہ لینے والی عورت ہوگی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ شوبزنس کی کوئی خوش شکل' خوش ادا' نووارد اور تر و تازہ لڑکی ہو۔

ہم گاڑی سے اترے تو سیٹھ واحد میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔ گارڈز وہیں کھڑے رہ گئے۔ اس بنگلے کا لان قابلِ دید تھا۔ اتنے سرسبز' ہموار اور تر و تازہ لان کم ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ اس مخملیں فرش کو نہایت خوبصورت رنگا رنگ پھولوں والے پودوں سے آراستہ کیا گیا تھا۔ بنگلے میں سوئمنگ پول بھی موجود تھا۔ عام طور پر کوٹھی یا بنگلے میں اگر سوئمنگ پول موجود ہو تو پیچھے کی طرف ہوتا ہے۔ لیکن اس میں بنگلے لان کے ایک حصے میں تھا۔ شاید اس

لیے کہ اس طرف مزید کچھ تعمیر ہونے کی توقع نہیں تھی۔ یہ اس لائن کا آخری مکان تھا۔ اس سے آگے' کافی دور نشیب میں سمندر جھاگ اڑاتا دکھائی دیا تھا لیکن یہ اس وقت کی بات تھی جب گاڑی گیٹ پر رکی تھی۔ مکان کے اندر سے تو ارد گرد کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ گرد و پیش کا نظارہ کرنے کے لیے چھت یا ٹیرس پر جانا ضروری تھا۔

سیٹھ واحد میرا ہاتھ پکڑ کر دھڑا دھڑ اندر گھستا چلا جا رہا تھا۔ وہ بغیر اطلاع بغیر دستک ہر کمرے کو کھول کر اس میں جھانکتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ گویا مجھے بھی اپنی نجی زندگی میں جھانکنے کا موقع فراہم کر رہا تھا اور اس میں بالکل بھی ہچکچا نہیں رہا تھا گو کہ اگر صحیح معنوں میں دیکھا جاتا تو ذرا بے تکلفانہ ماحول میں یہ اس کی اور میری پہلی ملاقات تھی جب کہ اس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت ریزرو قسم کا آدمی تھا۔ اس سے تو رسمی ملاقات کے لیے بھی بہت سے لوگوں کو بہت طویل انتظار کرنا پڑتا تھا۔

آخر ہم ایک لاؤنج نما ہال سے گزر کر اچانک ایک بیڈ روم کے دروازے پر جا پہنچے۔ دروازہ کھلا ہی تھا۔ وہ ایک نہایت شاندار اور پُرتعیش بیڈ روم تھا۔ زندگی کی ہر وہ آسائش وہاں موجود تھی جس کا کسی بیڈ روم میں تصور کیا جا سکتا تھا۔ اس کے وسط میں ایک خوبصورت اور شاہانہ قسم کے بیضوی بیڈ پر' کاٹن کے نہایت اجلے اجلے آرام دہ سے لباس میں ایک عورت گاؤ تکیوں کے سہارے نیم دراز تھی۔

تین اچھی خوش شکل اور خوش لباس لڑکیاں جو خادمائیں معلوم تو نہیں ہوتی تھیں لیکن یقیناً خادمائیں ہی تھیں' اس کی خدمت گزاری میں مصروف تھیں۔ ایک اس کے سرہانے بیٹھی نہایت پیار سے آہستہ آہستہ اس کے بالوں میں برش کر رہی تھی۔ ایک اس کے پہلو میں بیٹھی ایک خوبصورت ٹرے میں اس کے ناخن تراش رہی تھی۔ ایک کسی ہلکی آلے سے اس کے پیروں کو مساج کر رہی تھی۔

خوبصورتی کے مختلف پیمانے ہوتے ہیں۔ اس عورت کو بھی خوبصورت کہا جا سکتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ خوبصورتی ایک عجیب سی زباہت' شفقت اور شاید ممتا کی تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اس عورت کی عمر کم از کم ستر برس تھی اور اس کے بال روئی کے گالوں کی طرح سفید تھے۔ اس کے چہرے پر شکنیں تھیں مگر وہ بری نہیں لگ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ ان بوڑھی آنکھوں میں انتظار کے چراغ روشن تھے۔ شاید اسی لیے ان میں اتنی چمک تھی ورنہ اس عمر میں ان آنکھوں کو دھندلا جانا چاہیے تھا۔

سیٹھ واحد پر نظر پڑتے ہی وہ تیزی سے اٹھنے لگی۔ لڑکیوں نے جلدی سے اپنے کام چھوڑ کر اسے سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کی لیکن وہ ان کی مدد کے بغیر ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ٹانگیں بیڈ سے نیچے

سیٹھ واحد کو گھورنے لگی۔ سیٹھ واحد اس بچے کی طرح سہمے سہمے انداز میں اس کی طرف بڑھا جو اسکول سے بھاگ کر گھر پرے اڑا کر آرہا تھا اور گھر پر اس کی شکایت اس کی آمد سے پہلے ہی پہنچ چکی تھی۔

وہ جا کر عورت کے قدموں میں بیٹھ گیا جس نے شاید اپنی آواز کو حتی الامکان بارعب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "کہاں رہ گئے تھے تم؟"

"کہیں بھی نہیں اماں۔۔۔ ائرپورٹ سے سیدھا یہیں آرہا ہوں" اس شخص نے خوف سے سکڑتے ہوئے جواب دیا۔ یہ وہ شخص تھا جس سے نہ جانے کتنے طرم خان خوفزدہ رہتے تھے۔

"جھوٹ بول رہے ہو۔۔۔۔" بڑی بی نے آنکھیں نکالیں "میں ایرپورٹ فون کر کے معلوم کر چکی ہوں۔ وہاں سے تم پونے دو گھنٹے پہلے روانہ ہوئے تھے۔"

"اماں۔۔۔! مجھے راستے میں دو ایک کام پڑ گئے تھے" سیٹھ واحد نے اپنے بیان میں ترمیم کی۔ میں اب بغور اس عورت کو دیکھ رہا تھا جو یقیناً سیٹھ واحد کی ماں تھی۔ وہ واحد کے مقابلے میں زیادہ خوش شکل اور گوری چٹی تھی پھر بھی واحد کی شکل میں بہر حال اس کی جھلک موجود تھی لیکن شاید وہ زیادہ اپنے باپ پر گیا ہو۔

"تو پھر پہلے جھوٹ کیوں بولا تھا؟" اماں پہلے سے زیادہ غصے سے بولیں۔ انہوں نے اپنی مخملیں سی جوتی اٹھائی جو نرم، چمک دار اور کسی غیر ملک کی بنی ہوئی لگتی تھی۔ انہوں نے شپ شپ کر کے دو تین جوتیاں اس کی کمر پر رسید کر دیں۔

سیٹھ واحد نے سر جھکا کر نہایت سعادت مندی سے جوتیاں کھائیں پھر جھنجلاہٹ سے بولا "اماں کام تو پڑتے ہی رہتے ہیں نا" چھو بتا رہا تھا کہ اس کی یہ جھنجلاہٹ مصنوعی تھی ورنہ در حقیقت وہ اس عمل سے بہت محظوظ ہوا تھا۔ اماں نے بھی جوتیاں بظاہر تو بڑے غصے میں ماری تھیں لیکن در حقیقت کوشش کی تھی کہ بیٹے کو چوٹ نہ لگنے پائے۔ لڑکیاں اس دوران میں گویا کان دبا کر کمرے سے نکل گئی تھیں۔ میں دروازے سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے کھڑا تھا۔

"کام۔۔۔ کام۔۔۔" اماں نے غصے میں اس کی نقل اتارتے ہوئے اسے ایک جوتی اور رسید کی۔ اس بار جوتی سر پر پڑی تھی۔ یہ جوتیاں وہ آدمی کھا رہا تھا جس کے ایک اشارے پر لاشیں گر سکتی تھیں۔۔۔ اور گرتی تھیں۔ میں بڑی دلچسپی اور انہماک سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا بلکہ سچ پوچھیے تو میں مبہوت رہ گیا تھا۔ میں نے یہاں سیٹھ واحد کی کسی داشتہ سے سامنا ہونے کا یقین لے کر آیا تھا لیکن اس کی جگہ مجھے جو کچھ دیکھنے کو ملا تھا اس سے مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا لیکن اب میں اس جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ اب تو بس اک خوشگوار سی حیرت تھی۔ مدتوں بعد ایسی خوشگوار حیرت سے واسطہ پڑا تھا۔

اور میں یہاں تیری صورت دیکھنے کو ترستی ترستی مر جاؤں گی۔ اب تو صرف یہی ایک وعدہ رہ گیا ہے کہ تو جب بھی ملک سے باہر جایا کرے گا تو واپسی پر سب سے پہلے میرے پاس حاضری دیا کرے گا۔ اس کے بعد کچھ اور کرے گا۔ اس کے سوا تو اب میری تجھ سے کسی موقع پر ملاقات ہی نہیں ہوتی۔ اب تو نے اس وعدے میں بھی ڈنڈی مارنی شروع کر دی ہے۔"

"اماں! چھوٹی موٹی ہیرا پھیری تو ہو ہی جاتی ہے۔ اب معاف کر دیں نا۔۔۔" وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھے بیٹھے اپنی ماں کی ٹانگیں دبانے لگا۔

اماں نے ازراہِ کرم جوتی تو واپس قالین پر پٹخ دی لیکن ان کے گلے شکوے جاری رہے "ایک تو تو نے اپنا گھر بھی الگ بنا رکھا ہے۔ مجھ اکیلی بڑھیا کو اس اُجاڑ بیابان لق و دق گھر میں پھینک رکھا ہے۔۔۔"

"اماں! یہ اجاڑ بیابان لق و دق گھر ہے؟" سیٹھ واحد نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں "یہاں اتنے ملازم اور ملازمائیں ہیں۔۔۔ ٹی وی ہے۔۔۔ وی سی آر ہے۔۔۔ ڈشیں لگی ہوئی ہیں۔ اتنے بہت سارے چینلز ہیں۔ مجھ سے کینیڈا میں ایک مرتبہ ہمارے ملک کی ایک بہت بڑی ایکٹرس کہہ رہی تھی کہ بوڑھوں اور بیماروں کے لیے ٹی وی وقت گزاری کا بہت اچھا ذریعہ ہے۔"

"یہ نوکر چاکر، ٹی وی، ڈشیں اور وی سی آر کیا اولاد کا بدل ہوتے ہیں؟" اماں نے گویا اس کی عقل پر ماتم کرتے ہوئے کہا "اس طرح تو دنیا کے سب امیر اور دولت مند بیٹوں کو چاہیے کہ وہ اپنی ماؤں کے اوپر یہ سب چیزیں لاد کر انہیں اونچی اونچی دیواروں والی ایسی ہی خوبصورت قبروں میں دفن کر دیا کریں۔۔۔" انہوں نے اپنے استخوانی سے ہاتھوں سے چاروں طرف اشارہ کیا۔

"بعض امیر بیٹے تو یہ بھی نہیں کرتے اماں!" سیٹھ واحد ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ان کی ساری دولت مندی کے باوجود ان کی مائیں۔۔۔ یا باپ۔۔۔ یا پھر دونوں بڑی قابلِ رحم زندگی گزارتے ہیں۔"

"احسان دھر رہا ہے مجھ پر۔۔۔؟" اماں ایک بار پھر لال پیلی ہو گئیں "لے جا اٹھا کر اپنی یہ ساری چیزیں۔۔۔ اور اپنا یہ بھائیں بھائیں کرتا بنگلا بھی اپنے پاس رکھ۔۔۔ مجھے کیا کرنا ہے ان ساری چیزوں کا؟ میں کون سا اس کی دیواروں کو چاٹتی ہوں؟ میں تو ایک کمرے میں پڑی رہتی ہوں۔۔۔ اور تیرے ٹی وی وی سی آر یا ڈش وغیرہ پر میں تو لعنت بھیجتی ہوں۔ میری وقت گزاری کی تو فکر نہ کر۔۔۔ میرا وقت تو اللہ کی یاد میں بہت اچھا گزر جاتا ہے۔ نمازیں۔۔۔ نفل وغیرہ پڑھتی رہتی ہوں۔ تسبیح کرتی رہتی ہوں۔ مجھے تمہاری ان خرافات سے کیا دلچسپی ہے۔ ملازم لڑکیاں چلائے رکھتی ہیں تو کبھی کبھار کوئی پروگرام دیکھ لیتی ہوں۔ ان سب سے کہیں بہتر تھا کہ تو میرے پاس رہا کرتا۔ چاہے ہم اپنے گاؤں کے اسی کچے گھر

اس بار سیٹھ واحد نے ایک بہت ہی لمبی ٹھنڈی سانس لی اور غمزدہ لہجے میں بولا۔

"اللہ نے ٹھیک ہی فرمایا ہے۔۔۔۔ بندہ واقعی بڑا ناشکرا ہے۔ کسی بھی حال میں خوش نہیں رہتا۔ اب آپ کو گاؤں کا وہ کچا گھریاد آتا ہے۔۔۔۔ حالانکہ مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا سا تھا تو اس گھر میں روز کِل کِل ہوتی تھی۔ کبھی یہ نہیں ہوتا تھا' کبھی وہ نہیں ہوتا تھا۔ آپ ابا کو طعنہ دیا کرتی تھیں کہ اس گھر میں ریڈیو تک تو ہے نہیں۔۔۔۔ ریڈیو تو خیر دور کی بات ہے' اس گھر میں تو کبھی کبھی کھانے کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے شبہ ہوتا ہے کہ ابا اس رستا گیر کی گولی سے نہیں' آپ کے طعنوں سے مرے تھے۔"

"ہٹ۔۔۔۔ تیرے منہ میں خاک۔۔۔۔" بڑی بی نے سیٹھ واحد کو لات رسید کی مگر اس لات کے پیچھے محض اتنی ہی قوت تھی کہ کوئی چھوٹی موٹی بلی بھی شاید اس کا نوٹس نہ لیتی۔ "میں کہاں طعنے دیتی تھی اس جنتی کو۔۔۔۔ ہماری تو وہ پیار محبت کی لڑائی ہوتی تھی" بڑی بی کی آواز اچانک ہی بیچ بیچ گلوگیر ہوگئی "تیرے پاس دنیا بھر کی دولت ہے۔ کیا تیری بیویاں تجھ سے نہیں لڑتیں۔"

"ایسا ویسا۔۔۔۔!" سیٹھ واحد کراہ کر بولا۔ بڑی بی نے گویا اس کا کوئی خوابیدہ زخم چھیڑ دیا تھا "کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے کہ انہیں کسی آدم خور شیر کے سامنے پھنکوا دوں لیکن مجھے ڈر ہے کہ ان کے سامنے سے تو آدم خور شیر بھی منہ پھیر کر گزر جائے گا۔"

"موئے سب مرد بیویوں کو بُرا بھلا کہتے ہی مرجاتے ہیں" اماں گویا جل کر بولیں۔

"ہاں۔۔۔۔ جیسے ابا مرگئے" سیٹھ واحد ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اسی طرح ایک روز میں بھی مرجاؤں گا۔"

"اللہ نہ کرے" اماں فوراً ہی اپنا غصہ بھول کر تڑپ اٹھیں۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوما' سر پر ہاتھ پھیرا' اس کے بُری طرح بکھرے ہوئے کھچڑی بالوں کو مزید بکھیرا اور بیڈ پر اپنے قریب ہاتھ مارتے ہوئے بولیں "یہاں بیٹھ میرے پاس۔"

سیٹھ واحد اٹھ کر ان کے پاس بیڈ پر بیٹھ تو گیا لیکن رو دینے کے سے انداز میں بولا "اماں! میں نے آپ کے پاس حاضری دے لی ہے۔ اب مجھے جانا ہے۔"

"ابھی سے جانا ہے؟" اماں نے ایک بار پھر آنکھیں نکالیں "ابھی تو میں نے صحیح طرح تمہاری شکل بھی نہیں دیکھی۔ ابھی تو تم نے صحیح معنوں میں اس گھر میں پاؤں بھی نہیں ٹکایا اور جانے کی فکر پڑ گئی۔ میرے پاس آنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ جا کر اپنی تینوں چنڈال بیویوں کے پاس حاضری دے" اماں چند سیکنڈ پہلے اس کی بیویوں کی طرف داری کر رہی تھیں لیکن اب ان کی ذات میں روایتی ساس بیدار ہوگئی۔

"میں بیویوں کے پاس نہیں جاؤں گا اماں!" سیٹھ واحد کراہ کر بولا "ان کے پاس تو میں انتہائی فالتو وقت میں جاتا ہوں جو میرے پاس شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ مجھے بہت سے کام ہیں۔ مجھے ان کے سلسلے میں جانا ہے۔ کراچی میں میرا قیام بہت مختصر ہے۔"

"وہ تو ہمیشہ ہی ہوتا ہے" اماں جلے بھنے لہجے میں بولیں "میں تو ہزار مرتبہ کہہ چکی ہوں۔۔۔۔ یہ کام تجھے کھا جائیں گے واحد! آخر تو ہر وقت دولت کمانے کے چکر میں کیوں پڑا رہتا ہے؟ کیا کرے گا تو اتنی دولت کما کے؟"

"اماں! مجھے دولت کمانے کا نشہ ہوگیا ہے" سیٹھ واحد اتنی دیر میں پہلی بار مسکرایا "اور آپ کو تو پتا ہی ہے کہ نشہ بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔۔۔۔"

"اور ایک روز انسان کی جان لے لیتا ہے" اماں ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

"جان تو ویسے بھی جانی ہی ہے۔ بستر پر سسک سسک کر مرنے کے بجائے اگر ہنگامہ خیز انداز میں چلی گئی تو زیادہ اچھا ہوگا۔ پتا نہیں چلے گا۔ زیادہ اذیت نہیں ہوگی" سیٹھ واحد نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"جان تو اسی طرح جائے گی جس طرح اللہ میاں نے لکھ دیا ہوگا۔ اللہ میاں تجھ سے پوچھ کر جان لینے کا طریقہ طے نہیں کریں گے" اماں ایک بار پھر جل کر بولیں "خیر مجھے اس سے کیا لینا۔۔۔۔ اللہ میاں جانیں اور تو جان۔۔۔۔ جیسے تیرے اعمال ہوں گے اس حساب سے اللہ میاں تجھ سے نمٹ لیں گے۔"

"میرے اعمال بالکل ٹھیک ٹھاک ہیں اماں! آپ میری فکر نہ کریں" سیٹھ واحد نے ان کے کندھے دباتے ہوئے انہیں تسلی دی۔

"ہاں۔۔۔۔ میں تو بہت چاہتی ہوں کہ تیری فکر نہ کیا کروں۔ اپنا دل پتھر کرلوں لیکن پتا نہیں اللہ میاں ماں کا دل کس مٹی سے بناتے ہیں۔۔۔۔" انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی پھر بولیں "خیر۔۔۔۔ دفع کر ان باتوں کو۔۔۔۔ تجھ سے یہ باتیں کرنے کا پہلے کبھی فائدہ ہوا ہے جو اب ہوگا؟ میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ اگر تُو نے مجھے قید خانے میں ہی رکھنا ہے تو میرے لیے کوئی چھوٹا قید خانہ تلاش کرلے۔ میرے لیے تو کسی غریبانہ سے علاقے میں ایک دو کمرے کا مکان ہی کافی رہے گا۔ میرے لیے اتنا خرچا کیوں کر رکھا ہے۔ میں اکیلی جان اتنے سارے کمرے تو استعمال نہیں کرسکتی۔ ان میں نوکر ہی اینڈتے پھرتے ہیں۔"

"واہ اماں! یہ بھی خوب کہی۔۔۔۔ میں آپ کو کسی غریبانہ سے علاقے کے ایک دو کمرے کے مکان میں ڈال دوں۔۔۔۔؟" سیٹھ واحد استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"ارے ہاں۔۔۔۔ وہاں کوئی پاس پڑوس تو ہوگا۔ ہم عمر عورتیں تو ہوں گی۔ کہیں آنا جانا ہوگا۔ کسی کے پاس اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملے گا۔ کسی سے دو بات کرنے کا موقع ملے گا۔ کبھی کسی سے مشورہ لے لیا۔۔۔۔ کبھی مشورہ دے دیا۔۔۔۔ کسی کا رشتہ کرا دیا۔۔۔۔"

"کسی کا رشتہ تڑا دیا" سیٹھ واحد نے لقمہ دیا۔

"تیرے منہ میں خاک" اماں نے اسے ایک چپت رسید کی "تجھے پتا نہیں کہ میں کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہتی۔"

"پتا ہے اماں۔۔۔۔ لیکن بہرحال۔۔۔۔ میں آپ کو ان حالوں میں نہیں رکھ سکتا۔ اب آپ ایک بڑے آدمی کی اماں ہیں۔ آپ کو اپنے اور اس کے شایانِ شان طریقے سے ہی رہنا ہوگا۔ میں تو کوشش کرتا رہتا ہوں کہ نوجوانی کے زمانے کی کوئی حسرت آپ کے دل میں نہ رہے۔ مجھے یاد ہے جب میں چھوٹا تھا تو دو کمروں کے مکان میں ہم اٹھارہ بیس افراد رہتے تھے۔ اس وقت آپ ابا سے اسی بات پر لڑا کرتی تھیں کہ اس گھر میں تو پاؤں پھیلانے کی بھی جگہ نہیں۔ رات کو ٹانگیں پسار کر سونے کی کوشش کرو تو کسی کے منہ پر جا لگتی ہے۔ اب تو آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آدمی کم ہیں' کمرے زیادہ۔"

"لیکن اب نہ وہ نوجوانی ہے اور نہ تیرے ابا ہیں" بڑی بی ٹھنڈی سانس لے کر بولیں "جب وہی نہ رہے تو ان خالی بھائیں بھائیں کرتے کمروں کا میں کیا کروں گی۔"

"اب میں نوجوانی اور ابا جی کو تو واپس لانے سے رہا اماں!" اس بار سیٹھ واحد بھی گویا جل کر بولا "انسان کو جو چیز میسر ہوتی ہے اس کا کبھی شکر ادا نہیں کرتا۔ جو چیز اس کے پاس نہیں ہوتی اسی کا رونا روتا رہتا ہے۔ واقعی انسان کو خوش کرنا اللہ کو خوش کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔۔۔۔"

بڑی بی اب دانتوں میں انگلی دبائے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سیٹھ واحد فیصلہ کن لہجے میں بولا "بہرحال۔۔۔۔ جس طرح آپ چاہتی ہیں اس طرح تو میں آپ کو نہیں رکھ سکتا۔ لوگ کیا کہیں گے۔۔۔۔ یہ اس آدمی کی ماں ہے جس کی دولت مندی کے قصے دوسرے ملکوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر مجھے گاؤں ہی واپس بھیج دے" اماں نے منت سی کی۔

"گاؤں میں بھی اب کچھ نہیں رکھا اماں! وہاں بھی اب بے سکونی ہے۔ اب آپ وہاں بھی نہیں رہ سکیں گی۔ انسان نے ہر جگہ انسان کا سکون اجاڑ رکھا ہے۔ نفرتوں کے عفریت ہر جگہ پاؤں پھیلا چکے ہیں" سیٹھ واحد تلخی سے بولا۔

"اچھا۔۔۔۔!" اماں نے شکست خوردہ سے انداز میں سر جھکا لیا "مجھے معلوم ہے تو میری کوئی بات نہیں مانے گا۔ اپنی چلائے گا۔ کم از کم اتنا ہی کرلیا کر۔۔۔۔ کہ میرے پاس ذرا زیادہ دیر کے لیے آجایا کر۔۔۔۔ تو ہوا کے گھوڑے پر سوار آتا ہے' ابھی میں صحیح طرح تیری شکل بھی نہیں دیکھ پاتی۔۔۔۔ اور تو غائب ہوجاتا ہے۔"

سیٹھ واحد کچھ سوچ کر بولا "اچھا۔۔۔۔ آج میں ذرا زیادہ دیر کے لیے آپ کے پاس رک جاتا ہوں۔ آج دوپہر کا کھانا میں آپ کے ساتھ ہی کھاؤں گا۔ ذرا خانساماں کو بلوا کر کہہ دیں کہ میرے لیے بھی کھانا تیار کرے۔"

بڑی بی بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے ذرا فخر سے بولیں "وہ تو میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ آج تو دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھائے گا۔"

"آپ کو پتا ہے میرے لیے پرہیزی کھانا ہونا چاہیے" سیٹھ واحد بولا۔

"ارے۔۔۔۔ پتا ہے۔۔۔۔ سب پتا ہے۔ تیرے بارے میں مجھ سے زیادہ کسے پتا ہوگا" بڑی بی نے ہلکی سی ڈانٹ پلانے کے انداز میں کہا "میں نے پرہیزی ہی کھانا تیار کرنے کے لیے کہا ہوا ہے لیکن میرے ساتھ رہ کر تو بدپرہیزی بھی کرلے گا تو تجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

اس دوران میں سیٹھ واحد حسبِ معمول وقفے وقفے سے ہلکا ہلکا کھانستا رہا تھا۔ اب پرہیز اور بدپرہیزی کا ذکر آیا تو بڑی بی کا دھیان اس طرف بھی چلا گیا اس بار وہ بولیں تو ان کے لہجے میں تشویش جھلک آئی تھی "یہ تمہاری کھانسی ٹھیک ہوکر نہیں دے رہی۔ اس زمانے میں تو سنا ہے موئے ٹی بی کے مریض بھی ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ تمہاری یہ معمولی سی کھانسی دنیا بھر کے ڈاکٹروں سے ٹھیک نہ ہوئی مگر پھر بھی تمہیں سبق حاصل نہ ہوا۔ تم نے میرے اس معمولی سے نسخے پر عمل کرکے نہ دیا۔"

"کون سا نسخہ اماں؟" سیٹھ واحد نے عدم دلچسپی سے پوچھا۔

"وہی۔۔۔۔ کچے امرود کی راکھ بنا کر شہد کے ساتھ چاٹنے والا" اماں نے یاد دلایا۔

"ارے ہاں۔۔۔۔" سیٹھ واحد کو گویا یاد آگیا "اس پر بھی عمل کیا تھا۔ ملک کے ایک بہت بڑے حکیم صاحب کو بتا کر ان کے ہاں سے تیار کرا کے منگوایا تھا یہ نسخہ بھی۔۔۔۔ اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے تین نسخے اپنے بھی تیار کروا کے بھیجے تھے۔ کسی سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"ارے۔۔۔۔ ان بڑے حکیم صاحب کا کیا بھروسا" بڑی بی بدگمانی سے بولیں "وہ کون سا وہاں خود بیٹھ کر نسخے تیار کرتے ہوں گے۔ ان کے ملازمین ہی سارے کام کرتے ہوں گے۔۔۔۔ اور ملازموں کا کیا بھروسا۔۔۔۔ کچے امرود کی راکھ کی جگہ اُپلے کی راکھ ہی بھیج دی ہو۔ فائدے کے بجائے الٹا نقصان ہوگیا ہو۔"

"اماں! اس طرح نہیں ہوتا۔ دنیا کے کام اس طرح نہیں چلتے۔ اتنا بڑا دوا خانہ۔۔۔۔ بلکہ دواؤں کے کارخانے ہیں ان کے۔" سیٹھ واحد نے بے چارگی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی۔

"مجھے سب پتا ہے دنیا کے کام کیسے چلتے ہیں۔ میں دنیا کو تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ تم میری ماں نہیں ہو" اماں نے ایک بار پھر آنکھیں نکالیں "اتنا سا کام تم خود اپنے ہاتھ سے نہیں کرسکتے تھے؟"

"یعنی میں خود بیٹھ کر کچے امرود کو جلا کر اس کی راکھ تیار کرتا؟" سیٹھ واحد کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"ہاں۔۔۔۔ لیکن اسے پہلے سے دہکتے ہوئے کوئلوں پر جلانا ضروری تھا" اماں نے درست طریقۂ کار کی ضرورت کا احساس دلایا "اس کے بعد خالص شہد تلاش کرنا بھی بہت ضروری تھا۔۔۔۔ اور خالص شہد حاصل کرنے کا آج کی دنیا میں ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے۔"

"وہ کیا؟" سیٹھ واحد نے مردے سے لہجے میں پوچھا۔

"وہ یہ کہ کہیں شہد کی مکھیوں کا چھتا تلاش کرکے تم خود اپنی نگرانی میں اترواتے اور اس سے شہد نکالتے" اماں نے نہایت اطمینان سے کہا۔

سیٹھ واحد پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اماں خفا ہوتے ہوئے بولیں "اس میں اس طرح دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والی کیا بات ہے؟ یہ کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں ہے.... اور تمہارے پاس تو ویسے بھی ہر وقت اتنے آدمیوں کی فوج ظفر موج موجود رہتی ہے۔ پتا نہیں کن کاموں کے لیے اتنے مسٹنڈے پالے ہوئے ہیں.... اور کچھ نہیں تو اتنی بڑی بڑی بندوقیں اٹھا کر موت کے فرشتوں کی طرح ساتھ ساتھ گھومتے رہتے ہیں۔ بلکہ ان کا بس چلے تو شاید توپیں اٹھا کر گھومنے لگیں۔ ان سے تم اپنی نگرانی میں اتنا کام نہیں لے سکتے کہ وہ کسی درخت سے تمہیں شہد کا چھتا اتار دیں؟"

"نہیں اماں! میں ان سے یہ کام نہیں لے سکتا" سیٹھ واحد نے صاف صاف معذرت کرلی پھر ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "اور خدا کے لیے اب آپ میری جان چھوڑ دیں۔ آپ نے خوب اچھی طرح میری خبر لے لی ہے۔ اب میری جان بخش دیں۔ کم از کم یہی خیال کرلیں کہ میرے ساتھ کوئی آیا ہوا ہے جو بے چارہ ابھی تک دروازے پر ہی کھڑا ہوا ہے۔"

اماں کے دل کی بھڑاس اب اچھی طرح نکل چکی تھی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے مشفقانہ اور معذرت خواہانہ سی نظر سے میری طرف دیکھا اور بولیں "ہاں..... میں نے دیکھ تو لیا تھا لیکن جب بیٹے کی ملاقات اتنے دنوں بعد ہوئی ہو تو پہلے انہیں اپنی باتیں کرلینی چاہئیں۔ مجھے امید ہے کہ یہ حق تو تمہارا مہمان ایک ماں کو ضرور دے گا۔ کیوں بیٹا؟" انہوں نے دور سے ہی مجھ سے پوچھا۔

میں گویا دروازے پر کھڑے کھڑے کسی اور ہی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مسکراتے ہوئے کہا "اماں جی! یہ حق تو آپ صرف واحد کو ہی نہیں' مجھے بھی جوتیاں مار کر لے سکتی ہیں۔"

"اماں نے تحسین آمیز نظروں سے سیٹھ واحد کی طرف دیکھا اور ستائشی انداز میں سرہلاتے ہوئے بولیں "یہ بھی سعادت مند بچہ ہے۔ نیک والدین کی اولاد معلوم ہوتا ہے شاید اسی لیے تم اسے یہاں تک لے آئے' ڈرائنگ روم میں نہیں بٹھایا۔ اچھا ہی کیا۔"

"مجھے معلوم تھا یہ ڈرائنگ روم میں بٹھانے والا مہمان نہیں ہے" سیٹھ واحد بولا۔

"یہاں آؤ بیٹا! میرے پاس آؤ۔" اماں نے اشارہ کیا۔

میں قریب پہنچا تو انہوں نے بیڈ پر اپنے قریب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک طرف سیٹھ واحد بیٹھا تھا۔ دوسری طرف انہوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا لیکن میں نے کہا "اگر اجازت ہو تو میں بھی کچھ دیر کے لیے آپ کے قدموں میں بیٹھ جاؤں؟"

اس سے پہلے کہ اماں کوئی جواب دیتیں' سیٹھ واحد مجھے ڈانٹنے کے سے انداز میں بولا "اب اماں کے سامنے زیادہ سعادت مند بن کر مجھ سے زیادہ ان کے چہیتے بننے کی کوشش نہ کرو۔ جہاں اماں کہہ رہی ہیں وہیں بیٹھ جاؤ۔"

اماں ٹھنڈی سانس لے کر بولیں "بیٹا! یہیں بیٹھ جاؤ...." انہوں نے بیڈ کو تھپتھپایا "یہ بچپن میں بھی بڑا حاسد بچہ تھا۔ اس بات کو بالکل پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کی ماں کسی اور کو زیادہ پسند کرے۔ شاید اسی لیے یہ اکلوتا ہی رہا۔"

میں ان کے برابر بیٹھ گیا۔ انہوں نے مجھے پیار کیا' دعائیں دیں۔ پھر میرے بارے میں پوچھنے لگیں مجھ سے زیادہ ان کے سوالوں کے جواب سیٹھ واحد دیتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اماں مجھ سے مل کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ ایک تو ویسے بھی وہ احساس تنہائی کی ماری ہوئی تھیں۔ میں ان کے لیے گویا باہر کی دنیا کا آدمی تھا۔ دوسرے جب انہیں معلوم ہوا کہ میری والدہ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے مرچکی تھیں اور میرے لڑکپن میں میرے والد بھی قتل ہوگئے تھے تو ان کی محبت و شفقت کی انتہا نہ رہی۔ وہ مجھے اپنا دوسرا بیٹا بنانے پر تل گئیں۔ سیٹھ واحد نے بڑی مشکل سے انہیں باز رکھا۔ وہ خود کہہ چکا تھا کہ وہ میرے لیے اپنے دل میں پدرانہ جذبات محسوس کرتا تھا۔ یوں یہ کچھ عجیب سا سلسلہ بن رہا تھا۔ میں نے سردست یہی بہتر سمجھا کہ زندگی جس طرح گزر رہی تھی اسی طرح گزرنے دی جائے۔ ان دونوں ہی کی شفقت سے مستفیض ہوئے بغیر بھی گزارا ہو رہا تھا اور بہت اچھا ہو رہا تھا اس لیے میں نے زیادہ جذباتی ہونے کی کوشش نہیں کی۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ ماں بیٹے کی انتہائی نجی ملاقات تھی۔ میں پہلے ہی اس کا جس حد تک تماشا کرچکا تھا وہی کافی تھا۔ چند منٹ بعد میں نے اجازت چاہی تو اماں ہکا بکا رہ گئیں پھر سنبھل کر بولیں "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ابھی تو تم نے یہاں دو گھونٹ پانی تک نہیں پیا۔ میں نے اس لیے نہیں پوچھا کہ اب کھانا لگنے ہی والا ہے۔ تم کھانا کھا کر جاؤ گے۔ واحد کی اماں کے گھر سے تو دشمن بھی کچھ کھائے پیے بغیر نہیں جاسکتا۔"

میں نے زیادہ انکار کیا تو اماں لال پیلی ہوگئیں۔ انہوں نے اپنی مخملیں جوتی اٹھا کر بلا تامل ایک مجھے بھی رسید کردی۔ وہ پھول کی طرح سبک تھی۔ سیٹھ واحد نے انتہائی معذرت خواہانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ تب اماں ایک جوتی اور رسید کرتے ہوئے بولیں "بے شرم! جوتی کھا کر ہنستا ہے۔ تجھے اتنا بھی پتا نہیں کہ جوتیاں کھا کر روتے ہیں۔ شرمندہ ہوتے ہیں۔"

"اماں! اب اس کی رونے اور شرمندہ ہونے کی عمر نہیں رہی" سیٹھ واحد نے گویا اپنی ماں کو سمجھایا "اوپر سے اس کا جسم فولاد کی طرح ہے۔ اسے اگر مارنا ہی ہے تو کوئی گرز اٹھا کر مارو.... تلوار مارو' کلہاڑی مارو.... اور کچھ نہیں تو کم از کم کوئی موٹا سا ڈنڈا ہی اٹھا کر مارو۔"

"ہوئے چل.... تیرے منہ میں خاک۔ مائیں کوئی اپنے بچوں کو تکلیف پہنچانے کے لیے تھوڑا ہی مارتی ہیں۔ یہ تو صرف ایک اشارہ ہوتا ہے۔ عقلمند را اشارہ کافی است.... اور شرم محسوس کرنے والے کو تو پھول کی پتی سے مارنا بھی کافی ہوتا ہے.... پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر...."

"بس.... اماں بس۔" سیٹھ واحد نے ان کی بات کاٹتے ہوئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "اب دو دو سو سال پرانے اشعار سنا کر بور مت کیجیے گا۔ کھانا لگوایے۔ بھوک لگ رہی ہے۔"

مجھے کھانے کے لیے رکنا ہی پڑا۔ ڈائننگ روم' ڈائننگ ٹیبل اور کھانا' سبھی کچھ بہت عمدہ تھا۔ گھر میں ہر کام کے لیے ایک ملازم یا ملازمہ موجود تھی۔ سیٹھ واحد نے واقعی اپنی ماں کو اس الگ گھر میں ملکاؤں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ کھانے کے بعد کافی سوئمنگ پول کے کنارے ایک رنگین چھتری تلے بیٹھ کر پی گئی۔

سوئمنگ پول کو دیکھ کر اماں کو جلنے کڑھنے کا ایک اور بہانہ ہاتھ آگیا۔ اس کی طرف اشارہ کرکے اور سیٹھ واحد کو خفگی آمیز نظروں سے دیکھتے ہوئے بولیں "یہ ایک اور فضول خرچی کررکھی ہے اس منحوس لڑکے نے...."

سیٹھ واحد نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور میری طرف دیکھ کر بولا "یہ بارہ ملیں ہیں تمہارے اس خادم کو.... اس چھپن سالہ گرگ باراں دیدہ کو "لڑکا" کہہ رہی ہیں۔"

"تو اس میں ہا ہا ہا کرنے کی کیا بات ہے؟" اماں نے خشمگیں نظروں سے اسے گھورا۔ "شکر کرو میں نے تمہیں بچہ نہیں کہا۔ بیٹے بیٹیاں تو سو سال کی بھی ہو جائیں..... اگر مائیں زندہ ہوں تو ان کے لیے وہ بچے بچیاں ہی رہتی ہیں۔"

اسے ڈانٹ پلا کر وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولیں "یہ سوئمنگ پول اس نے میرے لیے بنوایا ہے۔ اب تم ہی بتاؤ..... میں ستر بہتر سال کی بڑھیا..... میں سوئمنگ پول میں تیرتی اچھی لگوں گی؟ شرم سے ڈوب نہیں مروں گی میں؟"

"اماں آپ اکثر بتایا کرتی تھیں نا.... کہ شادی سے پہلے لڑکپن میں آپ گاؤں کی نہر میں کپڑوں سمیت تیرتی تھیں اور دور دور نکل جاتی تھیں۔ میں نے سوچا آپ تیراکی میں ماہر ہیں۔ شاید کبھی بڑھاپے میں بھی آپ کا دل تیرنے کو چاہنے لگے..... تو آپ کو اپنی اس خواہش کو دل میں ہی دبانا نہ پڑے" سیٹھ واحد سنجیدگی سے بولا۔

"میں نے تو آج تک اس میں ایک ٹانگ بھی نہیں ڈبوئی" اماں ٹھٹھا کی سی لے کر چڑنے کے انداز میں بولیں "وہ منحوس مارے نوکر ہی' جب سمجھتے ہیں کہ میں سو رہی ہوں' تو اس میں اٹکھیلیاں کرتے ہیں۔ میں نے تو آج تک صرف ایک مرتبہ اس کے کنارے بیٹھ کر وضو کیا ہے۔ اس وقت بھی میں زیادہ جھکنے کی وجہ سے اس میں گرتے گرتے بچی تھی۔ تب سے میں نے تو اس کے زیادہ قریب جانے سے بھی توبہ کرلی۔"

"چلیں.... آپ نے اس میں ایک مرتبہ وضو کرلیا' میں سمجھوں گا اس کی قیمت وصول ہوگئی" سیٹھ واحد مسکراتے ہوئے بولا "اور جہاں تک نوکروں کی اٹکھیلیاں کرنے کا تعلق ہے تو مجھے امید ہے آپ ان پر بھی کبھی خفا نہیں ہوں گی۔ آپ ہی تو کہا کرتی ہیں کہ چیز فالتو اور بیکار پڑی ہو تو اسے کوئی بھی استعمال کرلے' اس میں کوئی حرج نہیں۔ آخر بے چاروں نوکروں کا بھی دل ہے۔ وہ کب تک چیزوں کو اتنے قریب سے دیکھ دیکھ کر ترستے رہیں گے؟"

سیٹھ واحد کو دیکھ کر یہ گمان گزرتا تھا کہ شاید وہ انہی لوگوں میں سے تھا جنہیں کوئی نفسیاتی سی بیماری لاحق ہوئی ہے کہ وہ بے پناہ دولت مند ہونے کے باوجود بے پناہ کنجوس ہوتے ہیں۔ بخل انہیں ایک بیماری کی طرح چمٹ جاتا ہے اور ان کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ وہ کوئی اچھی چیز استعمال نہیں کرتے' دنیا کی کسی آسائش سے لطف اندوز نہیں ہوتے۔ ایک روپیا خرچ کرتے ہوئے بھی ان کی جان نکلتی ہے اور وہ دولت کے بحرِ بیکراں کے کنارے رہتے ہوئے بھی سوکھے کے سوکھے ہی دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔

لیکن آج سیٹھ واحد کی شخصیت کے جو روپ میرے سامنے آتے جا رہے تھے اور اس کے بارے میں جس طرح میری معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک شاہ خرچ' فراخدل اور دولت کی زیادہ پروا نہ کرنے والا آدمی تھا۔ ایسے آدمیوں کے پاس عموماً زیادہ دولت جمع نہیں ہوتی لیکن کبھی کبھی غیر معمولی مثالیں بھی دیکھنے میں آجاتی ہیں۔

شاید وہ کفایت شعار صرف اپنی ذات کی حد تک تھا ورنہ باقی تو وہ ہر مد میں' ہر موقع پر' ہر کام میں وہ بے تحاشا خرچ کرتا تھا اور اس کا طرزِ زندگی ہر پہلو سے ایک بہت بڑے دولت مند آدمی کے شایانِ شان تھا۔ اپنی ذات کی شاید اسے پروا ہی نہیں تھی یا پھر اچھا لباس اور خود اپنی گرومنگ اس کے خیال میں بے معنی ہوچکی تھی۔ وہ شاید ان منزلوں سے گزر چکا تھا جب اپنے آپ کو اچھے مہنگے اور نفیس لباس سے آراستہ کرکے یا خوشبوؤں سے مہکا کر انسان سمجھتا ہے کہ اس کی شخصیت میں کچھ بہتری' کچھ نکھار آگیا ہے۔ شاید زندگی نے اسے یہ اعتماد بخش دیا تھا کہ وہ ہر حلیے' ہر لباس میں اہم تھا۔ اس کے لیے ان مصنوعی سہاروں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

اماں اس کی بات کے جواب میں ٹھنڈی سانس لے کر بولیں "مجھے تو لگتا ہے تو نے اپنے چاروں بنگلے نوکروں ہی کے لیے بنوائے ہیں۔ تو یونہی دن رات دولت کماتا اور اپنے جسم پر مسخروں جیسا یہ سوٹ لٹکائے ہلکان ہوتا آخر کار ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو جائے گا اور نہ جانے کون کون تیری دولت پر عیش کرے گا۔ مجھے تو لگتا ہے تو کماتا ہی دوسروں کے لیے ہے۔"

"اس دنیا میں زیادہ تر انسان دوسروں کے لیے ہی کماتے ہیں اماں!" سیٹھ واحد نے بڑے رسان سے سمجھایا "لیکن انہیں یہ

خوش فہمی ہوتی ہے کہ وہ اپنے لیے کما رہے ہیں۔ ایک انسان اکیلا اپنی ذات پر آخر کتنا خرچ کرلے گا؟ بس۔۔۔ یہ کسی طاقت نے ہمیں اس کام پر لگا رکھا ہے۔ یہ دنیا کا نظام چلانے کے اس کے بہانے ہیں۔ آپ ان باتوں پر مغموم نہ ہوا کریں۔"

"میں کیوں مغموم ہونے لگی۔۔۔!" اماں استہزائیہ لہجے میں بولیں "یہ باتیں میں نے ہی تو تجھے سمجھائی تھیں گدھے کہیں کے! اب بڑا بقراط بن کر بیٹھا میرے سامنے ہی دہرا رہا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ آپ نے بتائی تھیں" سیٹھ واحد نے سہلایا "مجھے یاد نہیں رہا تھا کہ یہ آپ ہی کی بتائی ہوئی باتیں ہیں۔ میں سمجھا تھا کہ عقل کی باتیں ہیں، کسی اور نے بتائی ہوں گی۔"

اماں نے گھور کر اسے دیکھا لیکن مزید ڈانٹ ڈپٹ سے پرہیز کیا۔ انہوں نے آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا بنا کر آسمان کی طرف دیکھا پھر اٹھتے ہوئے بولیں "میں اب نماز پڑھنے جارہی ہوں۔ پھر میں تسبیح کروں گی۔ میری واپسی تک تم دونوں یہیں رہنا۔"

میں کافی ختم کرچکا تھا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اماں! میں تو اجازت چاہوں گا۔ میں تھوڑی سی دیر کے لیے آفس سے نکلا تھا لیکن کئی گھنٹے ہوگئے ہیں۔ مجھے اب لازماً واپس پہنچنا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔" اماں نے تھوڑی دیر کی ہچکچاہٹ کے بعد بادلِ ناخواستہ اجازت دے دی "واحد کو تو یہاں آنے کے لیے وقت نہیں ملتا۔ تمہارے پاس وقت ہوا کرے تو تم ہی آجایا کرو" ان کی دعوت میں خلوص بھی تھا اور حسرت بھی۔

"اچھا اماں۔۔۔ میں کوشش کروں گا" میں نے جواب دیا انہوں نے مجھے جھکنے کا اشارہ کیا۔ میں جھکا تو انہوں نے میری پیشانی چوم کر مجھے خدا حافظ کہا اور اندر چلی گئیں۔

سیٹھ واحد مجھے رخصت کرنے پورچ تک آیا اور وہاں رک کر گاڑی سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا "یار! اگر تمہیں اماں کی باتوں سے بوریت ہوئی ہو یا ان کا جوتی مارنا برا لگا ہو تو مجھے معاف کردینا۔ میں زیادہ محبت میں آکر تمہیں یہاں لے تو آیا تھا لیکن بعد میں سوچ رہا تھا کہ شاید میں نے غلطی ہی کی۔ مجھے ذرا تاخیر سے خیال آیا تھا کہ تم بور ہورہے ہو گے۔"

"غلط خیال آیا تھا تمہیں" میں نے زور دے کر کہا "درحقیقت آج تم نے مجھے یہاں لا کر مجھ پر احسان کیا ہے۔ دل میں کہیں ایک صحرا سا پھیلا ہوا ہے۔ اس پر آج چند چھینٹے پڑے ہیں۔ ماؤں کی ایسی باتوں سے کوئی بدنصیب ہی بور ہوسکتا ہے۔ تم بہت خوش نصیب انسان ہو۔ اس لیے نہیں کہ تمہارے پاس بہت سی دولت ہے۔ صرف اس لیے کہ تمہارے پاس اس طرح جوتیاں مارنے والی ماں موجود ہے۔"

سیٹھ واحد مسکرایا۔ اب اس کی مسکراہٹ بہت مختلف قسم کی تھی۔ میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "مجھے خوشی ہے کہ میں نے تمہارے بارے میں جیسے اندازے لگائے، میں تمہیں ویسا ہی پارہا ہوں۔ زندگی کے بارے میں تم گہرا ادراک رکھتے ہو۔ تم سطحی آدمی نہیں ہو۔"

"مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے" میں نے کہا "میں اصل میں یہ کہنے لگا تھا کہ شاید یہ ماں کی جوتیوں ہی کی برکت ہے کہ تم اپنی تمام تر بدمعاشیوں کے باوجود ابھی تک نہ صرف بچے ہوئے ہو بلکہ دن بہ دن زیادہ سے زیادہ پھل پھول رہے ہو۔"

"تم مجھ پر کن بدمعاشیوں کا الزام عائد کرنے کی کوشش کررہے ہو؟" وہ خفیف سی کھانسی کے ساتھ بولا "میں ایک نہایت شریف آدمی ہوں۔ کبھی ڈرگز کے دھندے کے قریب نہیں گیا حالانکہ مجھ پر بہت دباؤ تھا۔ بہت طاقت ور قسم کے لوگ مجھے تو بندوق کے زور پر اس کاروبار میں گھسیٹنے پر تلے ہوئے تھے اور بہت زیادہ دولت کی کشش بھی تھی جو ہم جیسے لوگوں کی کمزوری ہوتی ہے لیکن میں اپنے فیصلے پر ڈٹا رہا کہ نہیں۔۔۔ یہ کام نہیں کرنا ہے۔ اس کے علاوہ شراب میں نہیں پیتا۔ داشتائیں میں نہیں رکھتا۔ میں نے ایک ٹرسٹ بنا رکھا ہے۔ جس کے تحت نہ جانے کتنے فلاحی کام ہوتے ہیں۔ کتنے ہی یتیموں اور بیواؤں کے وظیفے بندھے ہوئے ہیں۔ یتیم خانوں اور اسپتالوں کو امداد جاتی ہے۔ اِدھر اُدھر آوارگی کرنے کے بجائے میں نے سیدھے سادے شریفانہ طریقے سے تین شادیاں کررکھی ہیں۔ وہ بھی صرف اولاد کی چاہ میں۔۔۔ ورنہ شاید ایک پر ہی قناعت کرتا۔"

"وہ سب مجھے معلوم ہے" میں نے سہلایا "لیکن اماں کی جوتی ان سب پر بھاری ہے۔"

وہ ہنسنے لگا۔ ہنسی کے ساتھ اسے کھانسی آگئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "تم پرنس انڈسٹریز کیوں خریدنا چاہتے ہو؟"

"کوئی بھی بزنس مین اس قسم کی کوئی چیز کیوں خریدنا چاہتا ہے؟" سیٹھ واحد نے الٹا مجھ سے ہی سوال کردیا پھر خود ہی جواب دیا "ظاہر ہے۔۔۔ منافع کے لیے۔"

"لیکن پرنس انڈسٹریز ہی کیوں؟" میں نے سوال کیا "انڈسٹریز تو بہت سی بک رہی ہیں بہت سستے داموں بک رہی ہیں بلکہ بعض کے بارے میں تو کہنا چاہیے کہ کوڑیوں کے دام مل رہی ہیں۔ خود حکومت بہت سی انڈسٹریز بیچ رہی ہے۔ انڈسٹریز کا جمعہ بازار لگا ہوا ہے۔ یار لوگوں نے بہت اچھا دھندا بنایا ہوا ہے۔ جن کے صحیح جگہوں پر مراسم ہیں، کوڑیوں کے دام انڈسٹری لیتے ہیں، اس کی صرف ایک قسط دیتے ہیں اور اس کے نام پر اس کی کل قیمت سے زیادہ قرض لے لیتے ہیں۔ اس کے بعد باقی قسطوں کا بھی اللہ حافظ۔۔۔ اور انڈسٹری بھی جائے بھاڑ میں۔ تم ایسا ہی کوئی کام کیوں نہیں کرتے؟ تمہاری تو بہت اوپر تک رسائی ہے۔۔۔ اور مقصد بھی صرف دولت کمانا ہی ہے۔"

وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا اور ایک لمحے خاموش رہا پھر گہری سانس لے کر بولا "میرے برخوردار دوست! پہلی بات تو یہ کہ سیٹھ واحد نے کبھی کوئی پٹی ہوئی چیز نہیں خریدی۔

جو چیزیں بک رہی ہیں ان کا پرنس انڈسٹریز سے کیا مقابلہ؟ پرنس انڈسٹریز اس قسم کی ہیرا پھیریوں کے بغیر بھی سونے کی کان ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس وقت جس قسم کی یہ لوٹ مچی ہوئی ہے اور افراتفری برپا ہے، میں اس میں حصہ لینا نہیں چاہتا۔ بے شک میں دولت کمانا چاہتا ہوں۔۔۔ لیکن ایسی دولت جو میرے ہاتھ اور اختیار میں بھی رہے۔ معلوم نہیں کیوں میرا دل کہتا ہے کہ یہ لوگ جتنی آسانی سے دولت سمیٹ رہے ہیں اتنی ہی آسانی سے یہ ان لوگوں کے ہاتھوں سے چلی جائے گی۔ کوئی انہونی ہوجائے گی اور وقت کا پہیہ الٹا چلنے لگے گا۔ آخر ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔"

میں اب دم بہ خود سا کھڑا تھا۔ یہ باتیں وہ شخص کررہا تھا جس کی شہرت ملک کے سب سے بڑے بدنام اسمگلر کی تھی جب کہ اس وقت نہ جانے کیسے کیسے پارسا اور نیک نام جو اخباروں میں راستی، دیانت داری، قناعت پسندی، ایثار اور حب الوطنی کے درس دیتے نہیں تھکتے تھے، ہر اس چیز پر جھپٹ رہے تھے جو ان کی رسائی میں آسکتی تھی۔ جس کے ہاتھ جو آرہا تھا، لے کر بھاگ رہا تھا عجب افراتفری اور چھینا جھپٹی مچی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے لوگوں کو کل کی فکر ہی نہیں تھی۔۔۔ یا پھر شاید یوں کہنا چاہیے کہ انہیں کل ہی کی فکر تھی کہ کل نہ جانے کیا ہو، موقع ملے نہ ملے، کچھ باقی رہے نہ رہے، لہٰذا جتنا سمیٹا جاسکتا ہے، سمیٹ لو۔ ہاتھ روکے صرف وہی بیٹھا تھا جس کا کہیں ہاتھ نہیں پڑ رہا تھا۔

ایسے میں سیٹھ واحد جیسی شہرت رکھنے والے شخص کی باتیں میرے لیے حیران کن تھیں۔ اس کا صبر و سکون اور بہتی گنگا دیکھ کر بھی ایک طرف کھڑے رہنا حیرت انگیز تھا۔ شاید وہ آنے والے وقت کا بھی صحیح ادراک رکھتا تھا جب کہ لوگوں نے کل کی فکر کرنا چھوڑ دی تھی۔ وہ سب کچھ آج ہی کر گزرنے پر تلے ہوئے تھے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کے علاوہ پرنس انڈسٹریز کو خریدنا میرے ان باقی ماندہ خوابوں میں سے ایک خواب بھی ہے جو ابھی تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوئے۔"

"لیکن تم اسے اکیلے تو نہیں خرید رہے" میں نے کہا "جمیل احمد نے مجھے بتایا ہے کہ سات بڑے دولت مندوں کی ایک سنڈیکیٹ اسے خرید رہی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ فی الحال وہ میری مجبوری ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میرے پاس زیادہ رقم کا بندوبست نہیں ہے۔۔۔ اور اس خریداری میں ساری ادائیگی منی چاہیے۔ اس لیے میں سنڈیکیٹ کے ساتھ مل کر سودا کرنے کے لیے مجبور ہوں۔ دوسرے ملکوں کے بینکوں میں میری جو رقمیں ہیں انہیں میں فی الحال یہاں لانا نہیں چاہتا۔ یہاں میرے زیادہ اثاثے انڈسٹری اور جائیداد کی صورت میں ہیں۔ ان میں سے بعض کو بیچ باچ کر زیادہ رقم جمع کرنا چاہوں تو شاید کافی وقت لگ جائے اور مارکیٹ میں جونہی یہ خبر پھیلی ہے کہ پرنس انڈسٹریز کے بکنے کا امکان پیدا ہوگیا ہے۔۔۔ تب سے ایک عجیب کھلبلی مچ گئی ہے۔ زبردست جوڑ توڑ اور بھاگ دوڑ شروع ہوگئی ہے۔ اگر ہم نے جلدی کچھ نہ کیا تو اس کے شیئرز کی قیمت بہت چڑھ جائے گی۔ اس لیے فی الحال میں نے سنڈیکیٹ کے ساتھ مل کر چلنا ہی بہتر سمجھا ہے لیکن ممکن ہے آگے چل کر میں اکیلا ہی پرنس انڈسٹریز کا مالک بن جاؤں اور اس کا کنٹرول میرے ہی ہاتھ آجائے۔ عین ممکن ہے کہ میں اس کے مارکیٹ میں بکھرے ہوئے شیئرز بھی خرید لوں۔ خواہ اس کے لیے مجھے اپنے موجودہ اثاثوں میں سے کچھ ایسے اثاثوں کو بیچنا پڑے جو زیادہ منافع بخش نہیں ہیں۔"

"ہنہہ۔۔۔ یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ یہ بتاؤ کہ پرنس انڈسٹریز کو خریدنا تمہارے باقی ماندہ خوابوں میں سے ایک کیوں کر ہوگیا؟" میں نے پوچھا۔

"پرنس سعید کی زندگی میں بھی میں ایک بار سنک میں مبتلا ہوا تھا اور میں نے پرنس انڈسٹریز کو خریدنے کی کوشش کی تھی۔ میں پرنس سے ملا تو اس نے انڈسٹریز کو بیچنے کی بات کرنا تو درکنار، مجھ سے ایک بزنس مین کے شایانِ شان سلوک بھی نہیں کیا۔ معلوم ہے اس کی وجہ کیا تھی؟"

"سنا ہے اسے اپنی انڈسٹریز سے بہت محبت تھی۔ وہ اُسے اولاد کی طرح۔۔۔ بلکہ شاید اولاد سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ اس لیے اسے تمہاری زبانی اس کی فروخت کی بات سننا ناگوار گزرا ہوگا" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ ضمنی وجہ تھی" سیٹھ واحد بولا "اصل وجہ میری ریپوٹیشن تھی۔"

مجھے نہ جانے کیوں ہنسی آگئی۔ میں نے نرمی سے کہا "اس کے باوجود تم نے کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔ 'بد اچھا بدنام برا' والا محاورہ خواہ مخواہ تو ایجاد نہیں ہوا۔"

سیٹھ واحد تائید کے سے انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "پچھلے کئی برس سے میں اپنی ریپوٹیشن ہی تبدیل کرنے کے منصوبے پر تو کام کررہا ہوں۔ اسی لیے تو اتنے انڈسٹریز وغیرہ کے جھمیلے پال لیے ہیں ورنہ یہ میرا مزاج کہاں تھا۔"

"بہت دیر کردی" میں نے تاسف سے کہا "گئی ہوئی عزت واپس نہیں آتی۔"

"آجائے گی۔۔۔ آجائے گی" وہ بے پروائی سے بولا "اب اتنی بھی پریشانی کی بات نہیں ہے۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ زیادہ تر جگہوں پر میری کتنی عزت ہے۔"

"مجھے اندازہ ہے" میں نے زور دے کر کہا۔

وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا "زندگی میں پہلی بار مجھے صرف پرنس سعید کے رویے سے توہین کا احساس ہوا۔ وہ اپنے آپ کو کوئی بہت ہی اونچی، پارسا اور دوسروں سے بہت برتر قسم کی چیز سمجھتا تھا۔ پہلے میں نے دل ہی دل میں اس کے بارے میں کچھ نامناسب سے پروگرام بھی بنائے لیکن پھر اپنی فطری نرم دلی کے باعث وہ خیالات ذہن سے جھٹک دیے۔"

"یہ تم نے اس بے چارے کے حال پہ بڑا کرم کیا لیکن تم اس کی روح کو بخشنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ اب بعد از مرگ اس کی انڈسٹریز خرید کر عالم بالا میں اس کی روح کو تڑپانا چاہتے ہو۔ اس سے تمہیں کیا ملے گا؟"

"بہت سا منافع..... اور بہت سی خوشی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہے..... تم اپنے جوڑ توڑ میں لگے رہو۔ مجھے اجازت دو" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس نے بے نیازی سے اپنا مختصر مگر پتھر سا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا اور میرے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا

"ڈرائیور تمہیں چھوڑ دے گا..... اور یاد رکھنا کہ تمہیں کامران دانش کی ایک اچھی سی تصویر کا بندوبست کرنا ہے۔ جونہی تصویر تمہیں مل جائے مجھے فون کر دینا۔ میرا کوئی آدمی آکر تم سے لے لے گا۔ میں آج کل ان نمبروں پر پایا جاؤں گا....."

اس نے جیب میں سے چند کارڈ نکالے۔ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد اس نے ایک کارڈ میرے حوالے کیا۔ اس پر صرف اس کا نام اور چند فون نمبرز تھے۔ ان میں سے دو موبائل فون کے نمبر تھے۔ ان موبائل نمبروں کے بارے میں اس نے بتایا۔ "ان میں سے ایک تو اسی کار میں لگا ہوا ہے جس میں تم واپس جاؤ گے۔ تصویر کے بارے میں اطلاع براہ راست مجھے ہی دینا۔ میں ان میں سے کسی نہ کسی فون پر مل جاؤں گا۔"

گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ گیٹ کھل چکا تھا گھر میں موجود رہنے والے گارڈ اپنے ہتھیار ہاتھوں میں لیے مستعدی سے گیٹ کے باہر دونوں طرف جا کھڑے ہوئے تھے۔ سیٹھ واحد کے ساتھ آنے والے دونوں گارڈز اس کے دائیں بائیں کھڑے ہو چکے تھے۔ گیٹ کھلتے ہی چاروں گارڈیوں مستعد ہو گئے تھے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ ابھی کوئی اندر گھس آئے گا۔ میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ چند لمحے بعد گاڑی کشادہ اور ویران سی سڑک پر ہلکورے لینے لگی۔ میں نے ڈرائیور کمپارٹمنٹ کی شیشے کی دیوار پر آویزاں ہینڈ سیٹ کے ذریعے ڈرائیور کو مطلع کیا کہ ہمیں واپس اسی عمارت پر جانا تھا جہاں سے ہم آئے تھے۔ مجھے وہاں سے اپنی گاڑی لینی تھی۔

میں نے ہینڈ سیٹ واپس اس کے کریڈل میں لٹکایا ہی تھا کہ میری جیب میں موجود موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون جیب سے نکالا۔ دوسری طرف امبر تھی۔ وہ معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولی "سر! میں نے سوچا آپ کی واپسی کا پروگرام نہ جانے کتنا لمبا ہو جائے اس لیے آپ جہاں بھی ہیں وہاں آپ کو اطلاع دے دی جائے۔"

"کس بات کی اطلاع؟" میں نے دریافت کیا۔

"سر! صفیہ بی بی آپ سے ملنے آئی ہیں" امبر نے بتایا۔

"اوہ..... میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے کیسے رابطہ کیا جائے۔ اس کے ہاں فون تو ہے نہیں" میں نے اطمینان کی گہری سانس لے کر کہا۔

"سر! اس کے ہاں فون نہیں ہے تو کیا ہوا۔ اس کے پاس دل تو ہے..... اور دل کو دل سے راہ ہوتی ہے" امبر کے لہجے سے شرارت جھلک رہی تھی "آپ اپنے جاننے والیوں کے بارے میں صرف سوچ لیا کریں۔ وہ خود ہی پہنچ جایا کریں گی۔"

امبر میرے پاس آنے سے پہلے بھی خاصی تیز و طرار، قدرے شوخ اور کسی حد تک جہاندیدہ سی لڑکی تھی۔ لیکن میری سیکریٹری کی حیثیت سے ذمے داریاں سنبھالنے کے بعد اس نے کافی عرصہ بالکل سنجیدہ و مؤدب رہ کر اور سر جھکا کر صرف کام سے کام رکھتے ہوئے گزارا تھا لیکن اب رفتہ رفتہ میرے دوستانہ رویے سے شہ پاکر تھوڑا بہت ہنسی مذاق کرنے لگی تھی تاہم اس کا مذاق بھی دوستانہ ہی ہوتا تھا۔ اس کی باتیں ایسی نہیں ہوتی تھیں جنہیں سن کر کوفت ہوتی۔ وہ میری اور میرے حلقۂ احباب کی بہت جلد مزاج آشنا ہو گئی تھی اور اسی ذہنی سطح پر آکر بات کرتی تھی۔

"لگتا ہے صفیہ تمہارے سامنے نہیں بیٹھی ہے جو اس طرح چہک رہی ہو" میں نے کہا۔

"نہیں سر! میں تو اپنے کمرے میں بیٹھی ہوں۔ میں نے اسے آپ کے کمرے میں بٹھا دیا ہے....." پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا "میں نے غلطی تو نہیں کی سر؟"

"ہرگز نہیں امبر!" میں نے ملائمت سے کہا "تمہیں بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ کسے میرے کمرے میں بٹھانا ہے اور کسے میرے سر پر بٹھانا ہے..... لیکن بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہی ہو۔ مجھے صفیہ سے ایک ضروری کام تھا اور میں اس کے ہاں جاتے ہوئے ہچکچا رہا تھا....."

"کیوں سر؟ کیا اس کی گلی میں کوئی رقیب بھی رہتا ہے؟" امبر نے معصومیت سے پوچھا۔

"رقیبوں کو ہم کب خاطر میں لاتے ہیں امبر ڈیئر!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہ مصلحت اور وضع داری کی بات ہے۔ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ انسان ایک بڑی سی اور مہنگی گاڑی میں بیٹھ کر نچلے متوسط طبقے کی ایک لڑکی کے گھر جائے جو نہایت گنجان گلی میں رہتی ہو۔ اس طرح کی باتیں لڑکی کے حق میں اچھی نہیں ہوتیں۔"

"سر! آپ لنڈے کی جینز پہن کر سائیکل پر بیٹھ کر چلے جایا کریں" امبر نے بڑے خلوص سے مشورہ دیا۔

"اتنی زحمت تو میں تب کروں نا جب اس سے میرا کوئی افیئر چل رہا ہو۔ تم نے اور زرتاج نے تو شاید فرض کر لیا ہے کہ جو لڑکی ایک بار کسی فٹ پاتھ پر میرے قریب سے بھی گزر جاتی ہے وہ بھی مجھ پر عاشق ہو جاتی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے امبر ڈیئر! میں ایسا گلفام نہیں ہوں۔ تم اور زرتاج کیوں مجھے خوش فہمی کی بلندیوں پر پہنچا کر مروانے پر تلی ہوئی ہو؟" میں نے کراہنے کے سے انداز میں کہا۔

"مریں آپ کے دشمن سر! ویسے معاملہ تو کچھ ایسا ہی ہے جیسا آپ بیان کر رہے ہیں۔ اب آپ اپنی وضع داری' شرافت یا دوسروں کا پردہ رکھنے کی خاطر اس کا اعتراف نہ کریں تو بات دوسری ہے۔ بہر حال ہماری تو یہی دعا ہے کہ آپ اسّی نوّے سال کی عمر میں بھی صنفِ نازک میں یونہی مقبول رہیں۔ لڑکیاں یونہی آپ کے گرد منڈلاتی رہیں" وہ نہایت درویشانہ لہجے میں بولی۔

"یہ تم دعا دے رہی ہو یا بد دعا؟" میں نے مصنوعی خفگی سے کہا "اسّی نوّے سال کی عمر میں مرد کے گرد جو لڑکیاں منڈلاتی ہیں وہ عام طور پر نرسیں ہوتی ہیں اور اس وقت انہیں دیکھ کر انسان اپنے بال نوچنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔"

"یہ ضروری نہیں ہے سر!" وہ ملائمت سے بولی "اور یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ انسان بال نوچنے کے علاوہ کچھ کرے.... بہر حال یہ بتائیے کہ آپ واپس آ رہے ہیں یا نہیں؟ میں صفیہ کو بٹھائے رکھوں یا نہیں؟"

"ضرور بٹھائے رکھو۔ میں سیدھا دفتر ہی آ رہا ہوں۔ مجھے اس سے ایک بہت ضروری کام ہے" میں نے تیزی سے کہا۔

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا سر!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ پھر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں ایک لمحے کے لیے فون کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

میں آفس پہنچا تو صفیہ نشست گاہ میں بیٹھی انگریزی کا ایک فیشن میگزین الٹ پلٹ رہی تھی۔ میرے پہنچتے ہی اس کے چہرے پر ایک خاص رنگ آیا اور وہ مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی "خدا کا شکر ہے کہ آپ جلدی آ گئے۔"

"بیٹھ جاؤ.... بیٹھ جاؤ۔" میں نے اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے اشارہ کیا "میں تمہارا پروفیسر نہیں ہوں جو احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی ہو۔"

"خدا نہ کرے جو آپ میرے پروفیسر ہوں" وہ فوراً بولی "اور پھر احترام صرف یہ پروفیسروں ہی کا تو نہیں کیا جاتا۔"

"بہر حال.... میں آیا نہیں' بلوایا گیا ہوں۔ امبر نے موبائل فون پر مجھے اطلاع دی کہ تم آئی ہوئی ہو۔ یہ سن کر میں فوراً چلا آیا" میں نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔

"واہ.... موبائل فون بھی کتنے کام کی چیز ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اور.... میرا خیال ہے میں بھی کچھ ٹھیک ہی چیز ہوں جو آپ میری آمد کا سن کر فوراً چلے آئے۔"

"مجھے تم سے ایک ضروری کام تھا" میں نے کہا۔

"اوہ.... اچھا ہوا آپ نے فوراً ہی میری خوش فہمی دور کر دی" وہ مایوسی سے بولی "میں تو سمجھی تھی میری وجہ سے آپ فوراً آ گئے۔ کم از کم چند لمحے تو کسی کو خوش فہمی میں مبتلا رہنے دیا کریں۔ آپ کا کیا جاتا ہے؟"

"دیکھو صفیہ.... ! یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ میں بہت سیریس ہوں" میں نے واقعی سنجیدگی سے کہا۔

"میں کب مذاق کر رہی ہوں سر!" وہ حیرت اور تاسف کے تاثرات چہرے پر لاتے ہوئے بولی پھر یکدم اس کا لہجہ غمزدہ ہو گیا "یہ بھی ایک عام ٹریجڈی ہے سر.... کہ بعض لوگ دیانتداری سے اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو اسے مذاق سمجھا جاتا ہے۔ خیر.... چھوڑیے ان باتوں کو.... یہ بتائیے کہ آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟ کام تو ہم جیسے لوگوں کو آپ جیسے لوگوں سے پڑتے رہتے ہیں۔"

"پہلے تم بتاؤ کہ اس طرح اچانک' بغیر اطلاع کیسے آ گئیں؟"

"میں آپ کو پروگریس رپورٹ دینے آئی تھی سر!" اس نے اب ذرا سنجیدگی سے جواب دیا "ادھر سے گزر رہی تھی۔ میں نے سوچا فون وغیرہ کے تکلفات میں پڑنے کے بجائے خود حاضر ہو کر سب کچھ بتاتی چلوں۔"

"کیسی پروگریس رپورٹ؟" میں نے واقعی قدرے حیرت سے پوچھا۔

"سر! آپ نے مجھے کسی کام سے لگایا تھا اور اس کے لیے وسائل بھی مہیا کیے تھے۔ آپ بھول بھی گئے؟" پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "خیر.... کوئی بات نہیں بڑے لوگوں کا یہی اسٹائل ہوتا ہے۔"

"بہت تجربہ ہے تمہیں بڑے لوگوں کے اسٹائل کا؟" میں نے اسے گھورا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کوئی نئی بحث شروع کرتی' میں نے جلدی سے کہا "تمہارا مطلب ہے میں نے تمہیں کوئی کام شروع کرنے کا جو مشورہ دیا تھا اس سلسلے میں تم نے کوئی عملی قدم اٹھالیا ہے؟"

"جی سر!" اس نے سر خم کرتے ہوئے جواب دیا "میں نے درمیانے درجے کے ایک چلتے ہوئے بیوٹی پارلر کا سودا کیا اور اس کا بیعانہ بھی دے دیا ہے۔"

"اگر وہ چلتا ہوا بیوٹی پارلر ہے تو اس کا مالک یا مالکن اسے کیوں بیچ رہی ہے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"سر! وہ اس سے کہیں زیادہ بڑے ایک پراجیکٹ پر کام کرنے کے لیے ملک سے باہر جا رہی ہے" اس نے جواب دیا "میں اسے جانتی ہوں اور جب سے اس نے اپنا بیوٹی پارلر بیچنے کا ارادہ کیا تھا تب سے میرے دل میں حسرتوں کا ایک طوفان برپا تھا۔"

"چنانچہ موقع ملتے ہی تم نے سب سے پہلے اپنی حسرتوں کے اس طوفان کو روکا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ میری ٹھنڈی سانس کا مطلب سمجھ گئی۔ تیزی سے بولی "سر! یہ مت سمجھئے گا کہ یہ عجلت میں کیا جانے والا کوئی جذباتی فیصلہ ہے۔ میں اس بیوٹی پارلر اور اس کی مالکن' دونوں کے ان اور آؤٹ سے اچھی طرح واقف تھی۔ مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ پہلے ہی دن سے منافع دینے والی جگہ ہے۔ اس کی مالکن نے اپنی مجبوری کی وجہ سے مناسب قیمت میں دے دیا ہے کیونکہ اس کی باہر جانے کی تاریخ سر پر آ گئی ہے اور وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے اس کی

فروخت کا کوئی باقاعدہ بندوبست نہیں کر سکی تھی۔ مجھے یہ فائدہ ہو گا کہ میں بالکل نئے سرے سے سارا سیٹ اپ بنانے اور بہت زیادہ بھاگ دوڑ سے بچ گئی۔ نئی جگہ میں یہ سب کچھ کرنے کے باوجود رسک زیادہ ہوتا ہے۔ انسان کے اندازے غلط ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔"

"باتیں تو تم عقلمندوں والی کر رہی ہو۔ اب دیکھتے ہیں نتیجہ کیا نکلتا ہے۔"

"نتیجہ انشاء اللہ اچھا ہی نکلے گا سر!" وہ اعتماد سے بولی "میں آپ کو بہت کچھ کر کے دکھاؤں گی۔"

"خیر.... اس میں تو مجھے شک نہیں ہے" میں نے سر ہلایا "بہت کچھ کر گزرنے کے بہت زیادہ آثار تمہاری شخصیت میں موجود ہیں۔ مجھے تو حیرت اس پر ہے کہ اب تک تم بہت کچھ کر گزرنے سے کیسے باز رہی ہو۔"

"مجھ پر بہت سی ناروا قسم کی پابندیاں تھیں سر! وہ ہٹ گئی ہیں تو...."

"تو تم نے پر پُرزے نکال لئے ہیں" میں نے جملہ مکمل کر دیا۔

"جی نہیں" وہ پُرزور لہجے میں بولی "وہ ہٹ گئی ہیں تو میں ایکشن میں آئی ہوں اور اب میری صلاحیتیں کھل کر سامنے آئیں گی۔"

"اچھا خیر.... دیکھیں گے۔ یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ قسمت کو کیا منظور ہے" میں نے جلدی سے کہا "بہر حال.... یہ ایک مسئلہ تو حل ہوا۔ مجھے تمہاری یہ پروگریس رپورٹ سن کر خوشی ہوئی ہے۔"

"ابھی پروگریس رپورٹ مکمل کہاں ہوئی ہے سر! میں ایک نہیں' دونوں مسئلے حل کر کے آپ کے پاس آئی ہوں" اس کے لہجے میں ذرا فخر جھلک آیا۔

"دوسرا مسئلہ کیا تھا؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا" اس نے ٹھنڈی سانس لی "دوسرا مسئلہ میری مناسب رہائش کا تھا۔ میں نے آپ کی ہدایت کے مطابق زیادہ اونچی پرواز کی کوشش نہیں کی ہے۔ گلشن میں ایک مناسب سے پراجیکٹ میں دو کمروں کا اپارٹمنٹ کرائے پر لے لیا ہے۔ اس کی ایک خوبی تو یہ ہے کہ اس میں فون موجود ہے اور دوسری خوبی یہ ہے کہ وہاں بھی نچلے متوسط طبقے کے لوگ ہی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ماحول بہت مختلف اور بہتر ہے۔ وہاں لوگ ایک دوسرے کی نجی زندگی میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کرتے۔ بس آپ کی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔ خود بھی آرام و سکون سے رہیں اور دوسرے بھی آرام و سکون سے رہیں۔"

"بہت خوب" میں نے سر ہلایا "اس معیار کی جگہوں پر ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ تمہیں اتنے کم وقت میں وہاں کے ماحول کی اس خوبی کا کیونکر پتا چل گیا؟"

"میری اس دوست نے مجھے بتایا ہے جو اب تک اس میں رہتی رہی ہے۔ اب وہ اور اس کا شوہر کچھ ترقی کر کے کلفٹن کے ایک بڑے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو رہے ہیں۔ میں نے اس کی خصوصیات کے بارے میں جان کر فوراً اس پر قبضہ کر لینا بہتر سمجھا۔"

"ٹھیک....!" میں نے سر ہلایا "کم از کم تمہارے بیان کی حد تک تمہارا یہ فیصلہ بھی عقلمندانہ معلوم ہوتا ہے۔"

"یہ وہاں کا فون نمبر ہے...." اس نے ایک چٹ میری طرف بڑھائی "کل میں وہاں شفٹ ہو جاؤں گی۔"

"بہت خوب" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "تم تو بہت فاسٹ جا رہی ہو بھئی۔ مجھے تم سے ایسی کارکردگی کی امید نہیں تھی۔ حیرت ہے.... اب تک تمہیں کس چیز نے ترقی سے روکا ہوا تھا؟"

"پیسے کی کمی نے' سر!" وہ سادگی سے بولی "اتنی سیدھی سی بات آپ کی سمجھ میں نہیں آئی؟ مجھے اس پر حیرت ہے!"

"تمہاری حیرت بجا ہے" میں نے تسلیم کیا۔

"سر! بعض لوگوں کا معاملہ بہت اچھی اور طاقتور گاڑی کا سا ہوتا ہے لیکن وہ صرف ایک ہی وجہ سے ایک جگہ کھڑی ہوتی ہے۔"

"ان میں پیٹرول نہیں ہوتا" میں نے گہری سانس لے کر اس کی بات مکمل کی۔

"جی سر! بس اتنی سی بات ہے" اس نے بھویں اُچکائیں۔

"یہ تم نے کیا سر سر کی گردان شروع کر رکھی ہے" میں نے ہلکا سا ڈانٹنے کے انداز میں کہا۔

"سر! آپ دوست ہیں.... مہربان ہیں.... اس کے باوجود آپ کو سر کہنا اچھا لگتا ہے" وہ مسکرائی۔

"بعض اوقات لڑکیاں ایسی بات کرتی ہیں کہ دل چاہتا ہے کچھ اٹھا کر ان کے سر پر رسید کر دیا جائے...." پھر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی "لیکن کیا کروں' مجھے تمہارا سر عزیز ہے۔"

"مجھے بھی اپنا سر بہت عزیز ہے سر!" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔

"اچھا.... اب تم یہ بتاؤ کہ اس خاتون کی جگہ کب سے تم خود اس بیوٹی پارلر کو چلانا شروع کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بقیہ رقم کی ادائیگی کر کے میں جس دن سے چاہوں اس کی جگہ بیٹھ سکتی ہوں لیکن اس سے پہلے میں دو تین چھوٹے چھوٹے کام کرنا چاہتی ہوں" صفیہ سنجیدگی سے بولی "میں ذرا اس کی جھاڑ پونچھ کر کے اور اس میں چند ایک چھوٹے موٹے اضافے اور تبدیلیاں کر کے اسے ایک نئے اور زیادہ بہتر پارلر کی شکل دینا چاہتی ہوں۔ پرانی گاہک خواتین تو آتی ہی رہیں گی' میں چاہتی ہوں کہ نئے سرے سے اس کا افتتاح کیا جائے اور اسے کچھ پبلسٹی دینے کی کوشش کی جائے۔"

"آئیڈیا تو اچھا ہے لیکن اخبارات اور ٹی وی کی پبلسٹی بہت

منگی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ اپنے اصل کام کرنے کے بعد تمہارے پاس اتنا فاضل سرمایہ نہیں بچے گا کہ تم اسے پبلسٹی پر خرچ کرسکو اور پبلسٹی جب تک خوب زور دار اور موثر نہ ہو تب تک اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا" میں نے سمجھایا۔

"میں منگی اور باقاعدہ مہم کے انداز میں کی جانے والی پبلسٹی کی بات نہیں کررہی ہوں۔ میرا مقصد تو صرف اتنا ہے کہ کسی باعزت سی شخصیت کے ہاتھوں افتتاح ہوجائے۔ چار چھ اخباروں رسالوں میں تصویر آجائے۔ کہیں کہیں تھوڑا بہت تذکرہ آجائے..... بس اتنا ہی کافی ہے۔ بیوٹی پارلر تو چلا چلایا ہی ہے۔ بس اسے تھوڑا سا سہارا اور مل جائے تو بہت اچھا ہے" ابھی سے اس کے انداز سے لگنے لگا تھا جیسے وہ کافی عرصے سے کاروبار کررہی تھی "میں کم خرچ پبلسٹی کی بات کررہی ہوں۔ یہ زیادہ موثر ثابت ہوتی ہے۔"

"ہاں..... یہ آئیڈیا زیادہ اچھا ہے۔ افتتاح کے لیے کوئی شخصیت ہے تمہارے ذہن میں؟"

"شخصیت تو میرے سامنے ہی بیٹھی ہوئی ہے" وہ اطمینان سے بولی۔

"تمہارا مطلب ہے، میں.....؟" میں نے بے یقینی سے تصدیق چاہی۔

اس نے بڑی مسکینی سے اثبات میں سرہلا دیا۔ مجھے بہت زور کی ہنسی آگئی اور آتی ہی چلی گئی۔ وہ دونوں ہاتھ گود میں ٹکائے خفگی آمیز سی نظروں سے ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میری ہنسی تھمی تو وہ مصنوعی غصے سے بولی "اس میں اتنا ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہونے والی کون سی بات تھی؟ میں نے کوئی لطیفہ سنایا تھا آپ کو؟"

"ہاں۔ یہ لطیفہ ہی تھا" میں نے جواب دیا "تم نے آج تک کسی مرد کو بیوٹی پارلر کا افتتاح کرتے دیکھا ہے؟"

"نہیں دیکھا تو کیا ہوا" وہ اطمینان سے بولی "کوئی تو پہلی بار روایت کو توڑتا ہے نا..... اور وہ جو انگریزی کا مقولہ ہے۔

THERE IS ALWAYS A FIRST TIME.

کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی وقت تو کوئی کام پہلی مرتبہ ہوتا ہے۔ ویسے میرا خیال ہے ہم نے خواہ دیکھا یا سنا نہ ہو لیکن کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی کچھ مرد ضرور بیوٹی پارلرز کا افتتاح کرچکے ہوں گے اور زیادہ امکان یہ ہے کہ وزیروں سفیروں کے ہاتھوں ہر کام انجام پایا ہوگا۔ وزیروں سفیروں کو تو لوگ دنیا کی ہر چیز کا افتتاح کرنے کے لیے بلا لیتے ہیں نا۔"

"لیکن میں تو وزیر سفیر بھی نہیں ہوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے لیے آپ وزیر سفیر سے زیادہ اہم ہیں" وہ ایک عجیب معصومانہ سی سنجیدگی سے بولی۔ مجھے اس کی یہ سنجیدگی واقعی بہت عجیب لگی۔ میرے محسوسات میں ایک عجیب سی لہر آکر گزر گئی لیکن ماحول کو سنجیدگی اور بوجھل پن سے بچانے کے لیے میں ایک بار پھر ہنسنے لگا۔

وہ گویا جل کر بولی "ہنسیں..... ہنسیں..... خوب ہنسیں آپ۔ یہ کوئی نئی کہانی نہیں ہے۔ اس دنیا میں غریبوں کے خلوص اور محبت کا ہمیشہ اسی طرح مذاق اڑایا جاتا ہے۔"

"ابھی تو صرف میں ہنس رہا ہوں لیکن جب تم مجھ سے افتتاح کراؤ گی تو پورا شہر ہنسے گا" میں نے ملائمت سے کہا "اور یہ امیری غریبی کی فلمی کہانی بیچ میں مت لے آنا۔ میری نظر میں تم پہلے بھی غریب نہیں تھیں..... اور جلد ہی شاید دوسروں کی نظر میں بھی نہ رہو۔ تمہارا خلوص میرے سر آنکھوں پر ہے۔ صرف یہ خلوص ہی تو ہمارے بے عنوان تعلق کی بنیاد ہے..... لیکن کاروبار میں اس قسم کے نجی محسوسات کو آگے نہیں رکھا جاتا۔ سب سے پہلے تو یہ بنیادی اصول سیکھ لو۔"

اب وہ دلچسپی اور حقیقی دلچسپی سے میری بات سن رہی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تم شو بزنس کی کسی خوبصورت اور مقبول لڑکی سے افتتاح کراؤ۔ پریس بھی آسانی سے آجائے گا۔ تصویریں بھی آسانی سے چھپ جائیں گی۔ دلچسپی سے دیکھی بھی جائیں گی..... اور سچی بات یہ ہے کہ ایسے چہروں کے ہاتھوں افتتاح کی تصویریں اخبارات و رسائل میں سجتی بھی ہیں۔"

"لیکن..... سر....." وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "یہ کام بھی آپ کو ہی کرنا پڑے گا۔ میرے کہنے سے کون آئے گی۔"

"فکر نہ کرو..... کوئی اچھا بندوبست ہوجائے گا....." میں نے سوچتے ہوئے کہا "بلکہ ایسا کرتے ہیں لاہور سے کسی نئی..... بڑی..... فلم اسٹار کو بلا لیتے ہیں۔ صرف فرسٹ کلاس کا جہاز کا ریٹرن ٹکٹ دینا پڑے گا..... ٹھہرانے کے لیے ہمارا فائیو اسٹار ہوٹل موجود ہے۔ امید ہے وہ کوئی اور لمبا چوڑا مطالبہ نہیں کرے گی۔ چند گھنٹے کے لیے آکر چلی جائے گی۔ اس کی وجہ سے بہت اچھی کوریج مل جائے گی۔"

"کیا واقعی سر.....؟" صفیہ کی آنکھوں میں چمک آگئی "ایسا ہوجائے گا؟ کوئی بڑی فلمی ہیروئن آجائے گی؟" اس کے لہجے میں کچھ بے یقینی سی تھی۔

"کیوں نہیں بھئی..... مانا تمہارا بیوٹی پارلر زیادہ بڑا اور دولت مندانہ قسم کا نہیں ہوگا لیکن اس کا افتتاح بہرحال کسی بڑی ہیروئن سے کرادیں گے۔ افتتاح سے آگے تم جانو اور تمہارا کام" میں نے کہا۔

اس کے لیے گویا یہ ایک اور بہت بڑی خوشخبری تھی۔ ابھی میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ لاہور میں فلم انڈسٹری میں بھی میری ٹانگ پھنسی ہوئی تھی اور ایک کہنہ مشق ڈائریکٹر ایک فلم کمپنی میں میرا پارٹنر تھا۔

"کس لڑکی سے بات کریں گے آپ؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"کسی سے بھی نہیں" میں نے اطمینان سے جواب دیا "کیونکہ میں جب بھی کسی لڑکی سے بات کرتا ہوں تو عام طور پر کوئی نہ کوئی جنجال میرے گلے پڑ جاتا ہے....."

"جیسے مجھ سے بات کرکے پڑگیا ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"تم تو خیر اتنا بڑا جنجال نہیں ہے۔ اس سے کہیں بڑے بڑے جنجال میرے گلے پڑتے رہے ہیں....." میں نے سرد آہ بھر کر کہا۔

"جتنی بڑی لڑکی، اتنا بڑا جنجال" وہ ایک بار پھر بات کاٹتے ہوئے بولی "میں ذرا چھوٹی لڑکی ہوں اس لیے میرا جنجال بھی چھوٹا ہے۔"

"تم کہاں سے چھوٹی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا "اچھا بھلا تو قد ہے تمہارا۔"

"میں قد کی نہیں، حیثیت کی بات کررہی ہوں۔"

"آج تمہیں حیثیت کا کمپلیکس کچھ زیادہ ہی ستا رہا ہے..... حالانکہ آج سے تمہاری حیثیت بلند ہونا شروع ہوچکی ہے۔ بہرحال..... میں کہہ رہا تھا کہ میں کسی لڑکی سے نہیں بلکہ موٹے موٹے شیشوں کا چشمہ لگانے والے ایک کرخت صورت سے مرد سے بات کروں گا۔ وہ خود ہی سب کچھ کرلے گا۔ جس ہیروئن کے شیڈول میں بھی تھوڑی بہت گنجائش ہوئی وہ آجائے گی۔ تم اپنے انتظامات مکمل کرکے مجھے بتادینا۔"

"ویری گڈ۔ یہ مسئلہ تو نہایت عمدہ طریقے سے حل ہوگیا" وہ طمانیت سے بولی۔ "اب آپ بتائیے..... آپ کو مجھ سے کیا کام تھا؟"

"تمہارے پاس کامران کی کوئی اچھی سی تصویر ہے؟ کوئی کلوز اپ وغیرہ..... جس میں اس کے نین نقش بہت اچھی طرح واضح ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ میرے پاس بیگ میں ہی ہے" وہ اپنے شولڈر بیگ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی "اس کی کیا ضرورت آن پڑی؟"

"پولیس کے اور میرے علاوہ بھی کچھ لوگ اسے تلاش کرنے کی کوشش کریں گے" میں نے کہا۔ اس نے ہینڈ بیگ کے ایک علیحدہ خانے سے کامران کی ذرا بڑے سائز کی ایک عمدہ رنگین تصویر میری طرف بڑھائی تو میں نے کہا "اس کی تصویر ابھی تک پرس میں لیے پھرتی ہو اور کہتی ہو کہ اس کے لیے تمہارے دل میں کوئی جگہ نہیں۔"

"ٹھیک ہی تو کہتی ہوں" وہ بلا تامل بولی "اب جگہ صرف پرس میں رہ گئی ہے۔ دل میں نہیں۔ کچھ عرصے بعد پرس میں بھی نہیں رہے گی۔ دل شکستگی اور لاتعلقی کی ایک منزل آتی ہے جب انسان یادوں کا کچرا بھی کونے کھدروں سے نکال پھینکتا ہے۔"

"بہت سفاک ہو تم" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"سفاک نہیں..... شکستہ دل ہوں۔ آپ یہ بتائیے کہ آپ کامران کی یہ تصویر کن لوگوں کے لیے لے رہے ہیں۔ آپ کے اور پولیس کے علاوہ کون کامران کو تلاش کرنے میں دلچسپی لینے لگا؟" وہ گویا جذباتیت میں الجھنے سے گریز کررہی تھی۔

میں ابھی تک الجھن میں تھا کہ کامران کے بارے میں سیٹھوں کی سینڈیکیٹ کا جو نیا معاملہ سامنے آیا تھا اس کے بارے میں صفیہ کو بتاؤں یا نہیں؟ اس کی زندگی میں پہلے ہی پچھتاوؤں، محرومیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اب جب کہ اس کی زندگی میں کچھ خوشگواری پیدا ہونے کے آثار نمودار ہورہے تھے، یہ انکشاف اسے ایک نئے اور زیادہ شدید پچھتاوے سے دوچار کرسکتا تھا لیکن یہ اس سے بہتر تھا کہ یہ بات اسے بعد میں معلوم ہوتی جب وہ کامران سے اور بھی زیادہ دور جاچکی ہوتی۔ میں نے اسے بتادینا ہی بہتر سمجھا۔ میں چاہتا تھا وہ کامران کے بارے میں اپنے فیصلے پر نظرثانی کرلے تاکہ زندگی میں آگے چل کر کبھی کوئی بہت بڑا پچھتاوا اس کے دل کا ناسور نہ بن جائے۔

ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد میں نے کہا "صفیہ! میں تمہیں کامران کے بارے میں ایک ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جو ویسے تو بڑی خوشی کا باعث ہونی چاہیے تھی لیکن اس وقت جو صورت حال ہے اس میں شاید تم یہ بات سن کر صدمے سے خون تھوکنے لگو۔"

"ابھی اور اسی وقت خون تھوکنے لگوں گی؟" صفیہ نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلا کر مسکراتے ہوئے پوچھا "سنا ہے صدمے سے خون تھوکنے میں تو بڑا وقت لگتا ہے۔ دھیرے دھیرے دل کو گھن لگتا ہے۔"

"صدمہ بہت بڑا ہو تو فوراً بھی دل خون ہوسکتا ہے اور خون تھوکنے کی نوبت آسکتی ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"مجھے امید ہے کہ اب میں کامران کے بارے میں کسی بھی خبر کی خوشی یا صدمہ اپنے دل پر نہیں لوں گی" وہ مضبوط لہجے میں بولی۔

"اگر انسان اپنے دل پر..... اپنے محسوسات پر اتنا حاوی ہونے کے قابل ہوجائے تو اس دنیا کے بہت سے مسئلے حل ہوجائیں گے" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"آپ اتنا سسپنس پیدا کرنے اور بات کو گھمانے پھرانے کے بجائے اگر سیدھی طرح اصل بات بتادیں تو کیا زیادہ اچھا نہیں ہوگا؟" وہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ اب بھی برقرار تھی۔

"اچھا..... تو پھر دل تھام کر سنو....." میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے اسے سب کچھ بتادیا۔

اس نے نہایت صبر و سکون سے سب کچھ سنا۔ میرے خاموش ہونے کے بعد بھی وہ کچھ نہ بولی اور نہ ہی اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی آئی۔ البتہ جیسے اس کی نظریں کہیں دور بھٹک رہی تھیں گو کہ بظاہر وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"کہیں کھو گئی ہو؟ کیا تمہاری تلاش میں رکشا لے کر جانا پڑے گا؟" میں نے پوچھا

"نہیں..... میں یہیں ہوں۔ آپ ڈھونڈنے کی کوشش تو کریں" اس کی مسکراہٹ واضح تر ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک لوٹ آئی۔

"کیا کامران کے بارے میں اپنے فیصلے پر نظرثانی نہیں کروگی؟ گی؟"

"صرف اس لیے کہ اس کے پاس بہت دولت آنے والی ہے؟" اس نے ترحم آمیز سی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ سے ایسی گھٹیا سوچ کی توقع نہ تھی۔

"یہ بھی ایک اہم فیکٹر ہے لیکن دوسرے عوامل بھی ہیں۔ اس کی پوزیشن بالکل تبدیل ہو رہی ہے نا..... حالات مکمل طور پر ہی بدل جائیں گے..... بالکل پلٹا کھا جائیں گے" میں نے اپنے مؤقف کا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

"لیکن دل کے حالات روز روز پلٹا نہیں کھاتے افضل صاحب!" وہ گہری سنجیدگی سے بولی "جو دل سے اُتر گیا سو اُتر گیا..... میرا خیال ہے آپ ابھی تک مجھے سمجھ نہیں پائے۔"

"عورت کو سمجھنے کا دعویٰ کوئی بے وقوف ہی کر سکتا ہے..... اور جہاں تک تمہارا مسئلہ ہے..... تو میرا خیال ہے ابھی تو تم خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکی ہو کوئی اور کیا سمجھے گا..... لیکن مجھے یاد پڑتا ہے..... زیادہ پرانی بات نہیں ہے جب تمہاری باتوں سے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے روپیا پیسا زندگی میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے اور مسلسل غربت انسان کو زندگی سے بیزار کر دیتی ہے' اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی چھین لیتی ہے۔"

"میں اپنے اس نظریے پر اب بھی قائم ہوں۔ مجھے اس سے انکار تو نہیں ہے" وہ اطمینان سے بولی "لیکن اس میں کامران کہاں سے آگیا؟ کامران سے میں اس کی غربت کی وجہ سے تو قطع تعلق نہیں کرنا چاہ رہی تھی۔ غربت اور امارت تو ثانوی چیزیں ہیں..... کبھی کبھی غربت دور بھی ہو جاتی ہے..... معجزے بھی رونما ہو جاتے ہیں جیسا کہ اس وقت رونما ہوتا دکھائی دے رہا ہے..... لیکن انسان کی فطرت نہیں بدلتی۔ کامران سے دراصل میرا مزاج بالکل نہیں ملتا۔ دیر سے ہی سہی..... لیکن غنیمت ہے کہ پتا تو چل گیا۔"

"نہیں..... کوئی ایسی خاص دیر نہیں ہوئی" میں نے اسے تسلی دی "بعض لوگوں کو تو شادی کے بھی پندرہ بیس برس بعد پتا چلتا ہے کہ ان میاں بیوی کی آپس میں انڈر اسٹینڈنگ نہیں۔ ظاہر ہے اس وقت کچھ نہیں ہو سکتا..... اور اگر کچھ ہوتا ہے تو وہ پہلے سے بھی بُرا ہوتا ہے۔ تم اور کامران زیادہ عقلمند ہو کہ تمہارے درمیان شادی سے پہلے ہی طلاق ہو گی پھر بھی..... میرا مشورہ ہے کہ تم اپنے فیصلے پر نظرثانی کرو۔ ابھی وقت ہے۔"

"یہ آپ کی اچھائی کی دلیل ہے کہ آپ مجھے اس طرح سمجھا رہے ہیں۔ آج کے دور میں کوئی کسی کو اس طرح مشورے نہیں دیتا۔ میں آپ کا شکریہ تو ادا کر ہی نہیں سکتی۔" وہ ایک لمحے کے لیے سر جھکاتے ہوئے بولی "میں چاہوں تو کامران کی واپسی پر اس سے پہلے ہی کی طرح مل سکتی ہوں۔ اسے تو معلوم ہی نہیں ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں یہاں میرے دل کی کائنات میں کیا انقلاب آچکا ہے..... لیکن میں محض دولت کے لیے اس طرح قلابازی نہیں کھا سکتی۔ اگر دل اس سے نہیں مل رہا تو میں زندگی بھر کے لیے اس کے ساتھ بندھ کر گھٹنا نہیں چاہتی۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں افضل صاحب!"

"اچھا بابا.....! سمجھ لیا" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے "اب مجھے بخش دو۔ بھاڑ میں ڈالو ان معاملات کو..... یہ تم دونوں کا خانگی معاملہ ہے۔"

وہ ہنس دی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "ویسے..... آپ جو کچھ بتا رہے ہیں کیا یہ سب کچھ واقعی بالکل سچ ہے؟"

"نہیں۔ میں رائٹر بننے کی مشق کر رہا ہوں۔ آزمائشی طور پر پہلے کہانی گھڑ کر تمہیں سنا رہا ہوں" میں نے جل کر کہا۔

"خفا نہ ہوں....." وہ دھیرے سے ہنس کر بولی "میرا مطلب یہ سب کچھ واقعی بالکل افسانوی سا نہیں ہے؟"

"آج کے دور میں حقیقی زندگی افسانے سے زیادہ افسانوی ہو گئی ہے۔ اگر ہمیں اس دنیا میں ہر شخص کی کہانی معلوم ہو جائے..... ہر ایک کے بارے میں ہمیں پتا چل جائے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے تو شاید حیرت کی زیادتی سے ہمارا ہارٹ فیل ہو جائے۔ ہمارا انتقال پُرملال ہو جائے۔ شاید اسی لیے قدرت بہت سی باتوں کو رازہی رکھتی ہے" میں نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔

"وہ تو درست ہے..... مگر یہ تو بہت بڑی بات ہے....." وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"بات بڑی نہیں..... اصل میں ہماری اوقات چھوٹی ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن اوپر والا چونکہ بہت بڑا ہے..... سب سے بڑا ہے..... چنانچہ اس کے لیے کوئی بھی بات بڑی نہیں۔ بہرحال..... میں صرف یہ جاننے میں دلچسپی رکھتا ہوں کہ حالات میں اس نئی تبدیلی کے باوجود تمہارے فیصلے میں تبدیلی کا کوئی امکان نہیں؟"

"نہیں" اس نے غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا "میں نے اپنے لیے جو راستہ منتخب کر لیا ہے..... یا یوں کہیے کہ قدرت نے میرے لیے جو راستہ مقرر کر دیا ہے اب میں یکسوئی اور صبر و سکون سے اسی پر چلوں گی۔ اِدھر اُدھر نہیں دیکھوں گی۔ شاید اسی پر آگے میرے لیے کوئی بہتر منزل ہو۔"

وہ بڑے مضبوط ارادے کی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس پر زیادہ زور نہیں دیا اور اس موضوع کو یہیں ختم کر دیا۔ ہر انسان کو اپنی نجی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار تھا۔ بہر حال پہلی ملاقات پر اس نے اپنی سوچ کے ایک رخ سے مجھے حیران کیا تھا۔ آج دوسرے رخ سے حیران کر دیا تھا۔ ابھی اس کی ذات میں میرے لیے اور نہ جانے کتنی حیرتیں پنہاں تھیں۔

کچھ دیر بعد وہ رخصت ہو گئی تو میں نے سیٹھ واحد کو فون کر کے

اطلاع دے دی کہ کامران کی تصویر میرے پاس آگئی تھی۔ چند منٹ بعد ہی اس کا ایک مسلح آدمی میرے پاس آن پہنچا اور کامران کی تصویر کو کچھ اس طرح حفاظت سے اپنی تحویل میں لے کر روانہ ہوا جیسے وہ محض تصویر نہیں کوئی زندہ سلامت شخص ہو۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ تو صرف تصویر کا معاملہ تھا' اگر واقعی کامران خود اس سینڈیکیٹ کے آدمیوں کو مل گیا تو اسے کس حفاظت اور اہتمام سے بگ باس کے پاس لایا جائے گا..... اور ان لوگوں میں غالباً بگ باس سیٹھ واحد ہی تھا۔ باضابطہ طور پر نہ سہی لیکن غیر رسمی طور پر شاید اسے یہی حیثیت حاصل تھی۔

اس روز کوئی اور قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ دوسرے روز صبح میں ایک کاروباری ملاقات کے لیے چلا گیا جو ناشتے کی میز پر ہی تھی۔ یہ باہر کے ایک چھوٹے سے وفد سے ملاقات تھی۔ ترقی یافتہ ملکوں کے لوگ ہر وقت' وقت بچانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔ ایسی کاروباری ملاقاتیں جو زیادہ تر صرف بات چیت تک ہی محدود رہتی تھیں ان کے لیے انہوں نے اب ایک عرصے سے بزنس لنچ' کے بعد بزنس بریک فاسٹ' کا رواج بھی نکال لیا تھا۔ صبح صبح اس قسم کی بات چیت سے نمٹنے کے بعد مزید بہت سے کام نمٹانے کے لیے ان کے پاس دن کا زیادہ وقت بچ جاتا تھا۔

اس ملاقات سے فارغ ہو کر اور اپنے گروپ آف کمپنیز کے اصل آفس کا ایک چکر لگا کر میں لنچ کے بعد اپنے ہوٹل والے آفس پہنچا تو امبر نے اس روز کی ڈاک میرے سامنے لا رکھی۔ رسمی اور کاروباری قسم کے خطوط وہ کھول لیتی تھی۔ جس جس پر کارروائی اس کے بس میں ہوتا تھا وہ بھی کر لیتی تھی یا اسٹاف کے متعلقہ لوگوں کو پہنچا دیتی تھی۔ میرے لیے صرف وہی ڈاک لاتی تھی جسے بس ایک نظر دیکھنا' اس پر کوئی نوٹ لکھنا یا دستخط کرنا ضروری ہوتا تھا۔ کبھی بھار کوئی بھولا بھٹکا ایسا خط آجاتا تھا جس پر پرسنل' یا کانفیڈنشل' لکھا ہوتا تھا تو اسے وہ نہیں کھولتی تھی۔

اس روز اس نے ڈاک کی ٹرے میرے سامنے رکھی اس سے پہلے کہ میں ڈاک کی طرف توجہ دیتا' اس نے چٹکی میں پکڑ کر ٹرے سے ایک لفافہ نکالا اور اسے ہوا میں لہراتے ہوئے بولی "اس پر 'انتہائی نجی' لکھا ہوا ہے لیکن اس کی اوقات انتہائی نجی نظر نہیں آرہی ہے۔ عام ڈاک کا لفافہ ہے..... میلا کچیلا اور شکن زدہ ہے..... ایڈریس بھی الٹا سیدھا اور نامکمل سا ہے۔ مجھے تو حیرت یہی ہے کہ یہ منزل تک کیسے پہنچ گیا۔ اگر ہمارا ہوٹل مشہور نہ ہوتا تو یہ بھی آپ تک نہ پہنچتا۔ لگتا ہے آپ کی کسی بہت ہی غریب جاننے والی نے کہیں بہت ہی دور دراز سے لکھا ہے۔ پتا نہیں آپ کی شناسائیاں کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کبھی کبھی تو میں سوچتی ہوں کہ اگر چاند' مریخ یا زہرہ پر بھی لڑکیاں پائی جاتیں تو آپ کے لیے یقیناً وہاں سے بھی خط' فون یا فیکس وغیرہ آیا کرتے۔"

میں نے لفافہ اس کے ہاتھ سے لے کر ذرا سخت نظروں سے اسے گھورا "میرا خیال ہے میری ریپوٹیشن خراب کرنے کے معاملے میں تم نے بھی زرتاج کے ساتھ گٹھ جوڑ کر رکھا ہے؟ کیا وہ تمہیں کچھ رشوت وغیرہ دیتی ہے؟"

"رشوت؟" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "ہماری ایسی قسمت کہاں..... ہم تو پرائیویٹ ملازم ہیں۔ ہمیں تو کوئی پرائیویٹ کاموں کے لیے بھی..... میرا مطلب ہے گٹھ جوڑ وغیرہ کے لیے بھی رشوت نہیں دیتا..... اور خاص طور پر زرتاج بی بی.....؟ وہ کیا رشوت دیں گی۔ وہ تو ویسے ہی موقع پاتے ہی مجھے شکی شکی سی نظروں سے گھورتی رہتی ہیں۔"

"اس سے ذرا بچ کر رہنا۔ وہ بہت خطرناک لڑکی ہے" میں نے گویا اسے ڈرایا۔

"مجھے معلوم ہے سر!" وہ اطمینان سے بولی "بھلا کوئی بے ضرر اور عام سی لڑکی آپ کی دوست کیسے بن سکتی ہے۔"

میں نے اسے مزید ایک لمحے سختی سے گھورنے پر اکتفا کیا۔ اس نے مسکین سی شکل بنا کر سر جھکا لیا۔ میں نے لفافے کا جائزہ لیا۔ امبر نے اس کے بارے میں جو کچھ کہا تھا' ٹھیک ہی تھا۔ میں نے اسے چاک کیا اور خط کو الٹ پلٹ کر سب سے پہلے اسے ارسال کرنے والے کا نام تلاش کرنے کی کوشش کی۔ خط کے آخر میں جو نام لکھا تھا اسے پڑھ کر میں یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

وہ نام کامران تھا۔ تاہم کوئی ایڈریس وغیرہ نہیں تھا۔ حتیٰ کہ خط سے یہ بھی پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں سے لکھا گیا تھا۔ میں نے اسے تیزی سے پڑھنا شروع کیا۔ نہ جانے کیوں کامران کی رائٹنگ پر کسی لڑکی کی رائٹنگ کا گمان گزر رہا تھا۔ اس نے لکھا تھا:

افضل صاحب!

سب سے پہلے معذرت چاہوں گا کہ آپ نے مجھ غریب اجنبی کی خاطر اتنی زحمت اٹھائی لیکن میں نے آپ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا لیکن شاید کوئی غیبی ہاتھ ہوتا ہے جو انسان کو اِدھر اُدھر لیے پھرتا ہے۔ مجھے شاید اسی غیبی ہاتھ نے دھکا دیا تھا اور میں آپ کو دھکا دے کر بھاگ نکلا تھا۔ معلوم نہیں اس کے بعد آپ نے مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی ہوگی یا جھنجلا کر میرے حال پر چھوڑ دیا ہوگا۔

اگر آپ نے' پولیس یا کسی اور نے بھی مجھے کراچی میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہوگی تو ظاہر ہے میں انہیں نہیں مل سکا..... تبھی یہ خط لکھنے کی نوبت آئی ہے۔ میں کسی کو کراچی میں نہیں مل سکتا تھا کیونکہ میں اسی روز کراچی سے نکل گیا تھا۔ ایک پرانا مہربان شناسا اچانک راستے میں مجھ سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ میرے لیے بڑا اہم مددگار بن گیا۔ وہ نہ صرف اپنے ساتھ محفوظ طریقے سے مجھے کراچی سے باہر لے گیا بلکہ اس نے میرے لیے ایک محفوظ ٹھکانے کا بھی بندوبست کر دیا۔ یوں گویا میرا فوری نوعیت کا مسئلہ حل ہو گیا۔

چند دن پہلے تک میری زندگی اس ملک کے ان لاکھوں نوجوانوں جیسی ہی تھی جو غربت اور بیروزگاری کے بھنور میں پھنسے' فکرِ معاش اور دوسری پریشانیوں میں غلطاں و پیچاں اِدھر اُدھر

پھرتے رہتے ہیں۔ ان کے روز و شب میں بڑی یکسانیت ہوتی ہے۔ روزانہ نت نئی مایوسیوں کے سوا ان کی زندگی میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوتی۔۔۔ لیکن پچھلے چند دنوں میں میری زندگی نے ایسا پلٹا کھایا ہے اور ہر قدم پر مجھے ایسے واقعات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے کہ ابھی تک میرا سر گھوم رہا ہے۔ یقین نہیں آتا کہ یہ میں ہی ہوں اور اپنی ہی زندگی گزار رہا ہوں۔

میں اس وقت ایک ساحلی بستی میں ہوں۔۔۔ بلکہ اسے بستی نہیں کہنا چاہیے۔ یہ اچھا بھلا ایک قصبہ ہے۔ بلوچستان کی حدود میں شامل ہے لیکن کراچی سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ مکمل اتا پتا میں آپ کو ابھی تو نہیں، لیکن جلد ہی دے دوں گا بلکہ شاید خود ہی آپ تک پہنچ جاؤں گا۔ میں چاہتا ہوں ابھی مجھے چند دن کی مہلت اور حاصل رہے اور کوئی مجھے آکر نہ پکڑے۔ دراصل مجھے کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے اچانک اور اتفاقاً میں کسی بہت ہی پُر اسرار سلسلے کے قریب پہنچ گیا ہوں۔ افضل صاحب یہاں کوئی بہت بڑی گڑبڑ جاری ہے اور ایسا لگتا ہے کہ معاملہ گھوم پھر کر پرنس انڈسٹریز سے ہی ملتا ہے لیکن ابھی تک میں صحیح معنوں میں کوئی کارآمد بات معلوم نہیں کر پایا ہوں۔ میں اس سلسلے میں اپنے طور پر کچھ کرنا چاہتا ہوں۔ میں ابھی کسی کو اس طرف متوجہ کرنا نہیں چاہتا۔ اگر میں واقعی معاملات کی چند اہم کڑیاں ملانے میں بھی کامیاب ہوگیا تو شاید یہ میرا بہت بڑا کارنامہ سمجھا جائے اور شاید اس کے بعد پولیس مجھے بخش دے، مجھے پرنس سمیرا کے قتل کے شبہے سے بالاتر قرار دے دے۔

بس۔۔۔ فی الحال میں آپ کو اتنا ہی بتا سکتا ہوں۔ بڑی مشکل سے، چھپ چھپا کر بڑی دشواریوں سے آپ کو یہ خط روانہ کر رہا ہوں۔ معلوم نہیں، آپ تک پہنچ بھی سکے گا یا نہیں۔۔۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ یہ صرف میں اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے لکھ رہا ہوں۔ اصل بات چیت تو آپ سے چند دن بعد ہی ہوگی۔ میرا یا میرے اصل تفصیلی خط کا انتظار کیجیے گا۔ مخلص اور معذرت خواہ۔

کامران

یہ ایک نہایت غیر متوقع اور عجیب و غریب خط تھا۔ میں اس کے مندرجات کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے کئی لمحے تک خاموش بیٹھا رہا۔ "سر! آپ تو اس خط کو پڑھتے ہی کہیں کھو گئے" امبر کی آواز نے مجھے چونکایا۔

"ہاں۔۔۔ یہ بہت سنگین اور سنجیدہ معاملہ ہے امبر! تم اپنے کمرے میں جاؤ اور مجھے کچھ سوچنے دو" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ وہ میرے لہجے کے اُتار چڑھاؤ اور آنکھ کے اشارے کو بخوبی سمجھتی تھی۔ فوراً چلی گئی۔

میں نے خط کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ کسی رجسٹر سے پھاڑے گئے عام سے کاغذ پر عام سے بال پوائنٹ سے لکھا گیا تھا۔ کاغذ پر بھی اِکا دُکا میل کے دھبے موجود تھے۔ لفافہ عام ڈاک کا تھا اور اس پر مہر اتنی دھندلی اور نامکمل تھی کہ ایک حرف بھی یقینی طور پر نہیں پڑھا
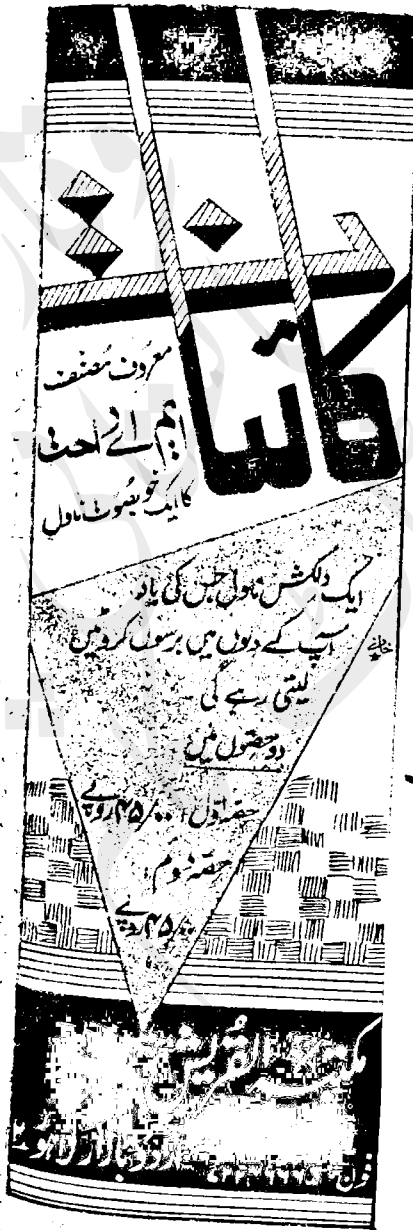
جاسکتا تھا۔ دوسری مہر البتہ کراچی کی تھی جو صاف نظر آرہی تھی۔ وہ آج ہی کی تاریخ کی تھی۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اصل مہر دوسری تھی جو اس مقام کی ہوسکتی تھی جہاں سے خط چلا تھا۔ گوکہ یہ بھی ضروری نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ کامران خود کہیں اور موجود رہا ہو اور خط اس نے کہیں اور جاکر ڈالا ہو۔ تاہم اس سے کچھ نہ کچھ سراغ ہاتھ آسکتا تھا۔

میں ابھی خط کو ہاتھ میں لیے انہی سوچوں میں الجھا بیٹھا تھا کہ رحیم گل بغیر کسی اطلاع کے کمرے میں داخل ہوا۔ وہ وردی میں تھا اور خلافِ معمول بہت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ یعنی سچ مچ سنجیدہ۔ ایک خیال اچانک میرے ذہن میں لپکا۔ پولیس تو اپنے وسائل کی بنا پر بہت کم وقت میں بلوچستان کی ان ساحلی بستیوں کے بارے میں مطلوبہ معلومات حاصل کرسکتی تھی جو کراچی سے زیادہ دور نہیں تھیں۔

وہ میرے سامنے آن پہنچا اور عجیب سے انداز میں ایک ٹک مجھے گھورنے لگا۔ کامران کا خط میرے ہاتھ میں تھا لیکن میں نے اسے میز کے نیچے چھپایا ہوا تھا۔ میں ابھی الجھن میں تھا کہ خط اسے دکھاؤں یا نہیں۔ میں نے اپنا لہجہ کچھ شگفتہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "خیریت تو ہے؟ پرانے قرض خواہوں کی طرح کیوں گھور رہے ہو؟"

"میں تمہیں اپنے ساتھ ایک جگہ لے جانے کے لیے آیا ہوں" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"کیا گرفتار کرکے لے جارہے ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"گرفتار کرکے تو میں کسی دن تمہیں سیدھا پھانسی کے تختے پر لے جاؤں گا" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"عدالت میں پیش کیے بغیر؟" میں نے پوچھا۔

"عدالتیں اگر سب مجرموں کو سزا دینے میں کامیاب ہوسکتیں تو اس معاشرے کی حالت بہت بہتر ہوتی" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "آؤ۔۔۔ چلیں۔"

لیکن میں نے اٹھنے کے بجائے وہ خط اور لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ اٹھتے اٹھتے بیٹھ گیا اور بغور پڑھنے لگا۔ اس نے صحیح طور پر سمجھنے کے لیے خط کو ایک بار نہیں، دوبار پڑھا۔ لفافے کا بہت باریک بینی سے معائنہ کیا اور یقیناً اسی نتیجے پر پہنچا جس پر میں پہنچا تھا۔ اس کے تاثرات میں صرف ایک لمحے کے لیے عجیب سا تغیر آیا۔

"یہ تمہیں کب ملا ہے؟" اس نے پوچھا۔ خط پر کوئی تاریخ وغیرہ درج نہیں تھی۔

"ابھی۔۔۔ چند منٹ پہلے" میں نے جواب دیا۔

خلافِ توقع اس نے اس خط کے بارے میں مجھ سے مزید سوالات نہیں کیے اور اٹھتے ہوئے بولا "اس کے بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔ پہلے تم میرے ساتھ چلو۔ میری ہی گاڑی میں۔"

خط اس نے لفافے سمیت تہ کرکے اپنی جیب میں رکھ دیا۔ میں اس کے ساتھ باہر آیا جہاں اس کی لینڈ کروزر کھڑی تھی۔ پچھلی سیٹ پر صرف ایک مسلح اے ایس آئی موجود تھا۔ رحیم گل نے خود ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد

گاڑی شہر کے گنجان آباد' پرانے اور بہت زیادہ ٹریفک والے علاقوں سے گزرتی ہوئی بالآخر ایک تنگ سی سڑک پر جا رکی۔ سامنے ایک پیلی سی سالخوردہ عمارت نظر آ رہی تھی جیسے عموماً پرانے وقتوں میں سرکاری کوارٹر ہوا کرتے تھے۔ اس کی حالت تباہ تھی۔ پلاسٹر جھڑ رہا تھا۔ پیلے رنگ کی تہیں اکھڑ چکی تھیں۔ چھجوں کے سریئے سیمنٹ سے باہر جھانک رہے تھے۔

"یہ کون سی جگہ ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہیں نہیں معلوم؟" رحیم گل نے اس سے بھی زیادہ حیرت سے میری طرف دیکھا پھر جواب کا انتظار کیے بغیر بولا "ہاں.... تمہیں بھلا کیا پتا ہو گا.... تم امیر آدمی ہو۔ تمہیں کبھی ادھر کا رخ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ہو گی۔ یہ سرکاری اسپتال کا عقبی حصہ ہے۔"

"اسپتال....؟" میں نے بے یقینی سے ادھر ادھر دیکھا۔ اس عمارت کے پچھلے گیٹ پر دونوں طرف کچرے کے ڈھیر تھے جن سے تعفن اٹھ رہا تھا۔ ڈھیروں کے اوپر ایسا کچرا بھی تھا جو اسپتالوں سے ہی پھینکا جاتا ہے۔ خون اور پیپ آلود پٹیاں' روئی کے گولے' استعمال شدہ سرنجوں سے بھرے ہوئے شاپنگ بیگ' دواؤں کی شیشیاں اور اسی طرح کا دوسرا کاٹھ کباڑ۔ فضا میں اسپتال کی سی مخصوص بُو تو پھیلی ہوئی تھی لیکن اس پر دوسری غلاظتوں کا تعفن غالب تھا۔ سڑک پر ایک طرف سے گٹر کا غلیظ پانی بہتا ہوا آ رہا تھا۔ اسی ماحول میں آس پاس بہت سی چیزوں کی دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ سامنے ایک کیبن میں ریستوران بھی قائم تھا جس میں کھانے اور چائے وغیرہ کی فروخت جاری تھی۔

میں رحیم گل کی رہنمائی میں اندر اسی عمارت کے ایک الگ تھلگ سے حصے میں پہنچا۔ یہ بھی اصل پرانی عمارت کی طرح ہی بوسیدہ اور خستہ حال تھا۔ برآمدے میں ایک دروازے کے سامنے ادھیڑ عمر سا ایک شخص بینچ پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں دو کانسٹیبل گنیں لیے بیزاری کے سے عالم میں بیٹھے تھے۔ رحیم گل کو دیکھ کر چوکنا ہو گیا۔ اس کے جسم پر ڈھیلا ڈھالا سبز چغا اور پاجامہ تھا۔ وہ اسپتال کا ملازم معلوم ہوتا تھا۔

رحیم گل کا اشارہ پا کر اس شخص نے دروازے کا تالا کھول دیا۔ اس دروازے پر مردہ خانے کا دھندلا سا بورڈ آویزاں تھا۔ میرے ذہن میں مردہ خانے کا جو تصور تھا اس کے مطابق اسے سرد خانہ بھی ہونا چاہیے تھا۔ ترقی یافتہ ملکوں کی طرح نہ سہی لیکن اس کے تھوڑے بہت غریبانہ سے لوازمات تو ہونے چاہئیں تھے۔ دروازہ کچھ خاص قسم کا ہوتا جس سے ٹھنڈک باہر نہ جاتی لیکن وہ عام سا لکڑی کا دروازہ تھا۔

دروازہ کھلا تو بدبو کے ایک خوفناک بھبکے نے ہمارا استقبال کیا۔ سامنے ایک نیم تاریک اور پُراسرار سا ہال تھا جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں جسم میں سنسنی کی لہری دوڑتی تھی۔ درودیوار پر خون کے بڑے بڑے نشانات تھے جنہیں صاف کرنے کی شاید نیم دلانہ کوششیں کی گئی تھیں۔ وہاں ٹھنڈک برائے نام تھی۔ فضا میں سڑاند سی رچی ہوئی تھی۔ سامنے ہی لوہے کے پہیے دار ٹھیلوں پر بے ترتیبی سے لاشیں پڑی تھیں۔ کچھ کپڑے سے ڈھکی ہوئی تھیں۔ کچھ بغیر ڈھکی تھیں۔

کانسٹیبلوں کو شاید معلوم تھا کہ رحیم گل کون سی لاش دیکھنے آیا تھا۔ وہ آگے جا کر لاش تلاش کرنے لگے۔ رحیم گل اور میں ایک طرف کھڑے تھے۔

"یہ مردہ خانہ ہے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ وہاں بیسیوں لاشیں موجود تھیں۔

"ظاہر ہے۔ اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" وہ تلخ لہجے میں بولا "یہ ایک بدنصیب ملک کا اسپتال اور اس کا مردہ خانہ ہے۔ وہ ملک جس کے بڑوں کو چھینا جھپٹی سے اور چھوٹوں کو ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنے سے فرصت نہیں ہے۔ جہاں لاشوں پر سیاست ہوتی ہے۔ یہاں کچھ لاشیں ایسی حالت میں بھی آتی ہیں کہ کمزور دل کا آدمی انہیں دیکھ لے تو کئی ہفتے تک نیند سے چیخیں مار کر اٹھتا رہے۔ سمندر کی طرح پھیلے ہوئے اس شہر میں صرف دو سرکاری اسپتالوں میں مردہ خانے ہیں اور وہاں بھی ایک عرصے سے اس حساب سے لاشیں آ رہی ہیں کہ لگتا ہے جلد ہی شہر قبرستان میں تبدیل ہو جائے گا۔ ہم لوگوں سے تو زندہ لوگ نہیں سنبھالے جاتے' ہم اتنے مُردے کیسے سنبھالیں گے.... اور پھر اس ملک میں تعلیم اور صحت کے شعبے پر جتنا کچھ خرچ کیا جا رہا ہے اور جس انداز سے خرچ کیا جا رہا ہے اس میں تو اسپتالوں کی یہی حالت ہو گی اور زندوں اور مردوں کی اسی طرح مٹی پلید ہو گی.... لیکن بلند و بالا ایوانوں میں بیٹھے لوگوں کو ان مسائل کی کیا پروا....!"

تلخی اس کے لہجے میں ہی نہیں' اس کے چہرے پر بھی تھی۔

اس اثنا میں اسپتال کے ملازم اور کانسٹیبلوں نے مل کر اس کی مطلوبہ لاش تلاش کر لی تھی۔ انہوں نے ہمیں اشارے سے قریب بلایا۔ ہم لاشوں کے اس بھیانک بازار سے بہ مشکل گزرتے ہوئے وہاں تک پہنچے۔

لوہے کی ریڑھی پر ہمارے سامنے ایک کٹی پھٹی اور مسخ شدہ سی لاش پڑی تھی۔ لاش کی حالت بہت خراب تھی لیکن میں اسے پہچان سکتا تھا۔ میرے رگ و پے میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

وہ کامران دانش کی لاش تھی!

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگرانی ابھی جاری ہے باقی واقعات بارھویں اور آخری حصے میں پڑھیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سرکش

12

محمود احمد مودی

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کامران دانش کی لاش تھی۔ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ شاید یہ میری نظر کا دھوکا تھا۔ لاش کا چہرہ بھی کافی بگڑا ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس میں کامران کی شباہت موجود تھی۔ میں نے سوچا شاید بات صرف شباہت ہی کی ہو۔ یہ کوئی اور ایسا نوجوان ہو جس کی شکل کامران سے تھوڑی بہت ملتی ہو۔ کامران بھلا ایسے دردناک انداز میں کیونکر مر سکتا تھا؟

ابھی کچھ دیر پہلے ہی تو مجھے اس کا خط موصول ہوا تھا جس میں اس نے خوش خبری لکھی تھی کہ شاید کسی بہت بڑی گڑبڑ کا سرا اس کے ہاتھ آگیا تھا۔ وہ اس سلسلے میں مزید معلومات جمع ہوتے ہی اور مناسب موقع ملتے ہی مجھے تفصیلات سے آگاہ کرے گا۔ ابھی تو وہ خط بھی رحیم گل کی جیب میں تھا۔ ابھی تو ہم صحیح معنوں میں اس کے مندرجات پر غور بھی نہیں کرنے پائے تھے اور اس حالت میں اس کی لاش ہمارے سامنے آگئی تھی۔ نہیں۔ نہیں۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کوئی غلط فہمی تھی۔ یہ ضرور کوئی اور نوجوان تھا جس پر ہمیں کامران دانش کا دھوکا ہو رہا تھا۔

میں زیادہ دیر تک اپنے آپ کو ان طفل تسلیوں سے نہ بہلا سکا۔ کسی کو دھوکے میں رکھنا اور خود دھوکے میں رہنا میری عادت بھی نہیں تھی۔ حقیقت کتنی بھی تکلیف دہ' کتنی بھی ناقابلِ یقین اور کتنی بھی ناقابلِ برداشت ہو' اس کا اعتراف کرلینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ خود کو جھوٹی تسلیاں دینے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ موت اور زندگی کے درمیان ایک باریک سی لکیر ہی تو حائل تھی۔ اسے عبور کرتے کون سی دیر لگتی تھی؟ کامران کا خط نہ جانے کس طرح اور کہاں کہاں رُلتا کھلتا میرے پاس پہنچا تھا۔ اگر اس کے ساتھ ساتھ ہی کامران کی لاش بھی آن پہنچی تھی تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں تھی۔ آج کل تو ویسے بھی انسان کم اور لاشیں زیادہ اِدھر سے اُدھر سفر کررہی تھیں "کھچا کھچ" بھرا ہوا یہ مردہ خانہ اس کرب انگیز حقیقت کا آئینہ دار تھا۔

میں غیر ارادی طور پر ذرا پیچھے ہٹا تو دیوار کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی چند انچ اونچی ایک سلیب سے میرا پاؤں ٹکرا گیا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ اس سلیب پر بھی کئی لاشیں رکھی ہوئی تھیں۔ بعض پر پڑی ہوئی چادریں خون سے تر تھیں۔ میں ذرا سنبھل کر کھڑا ہو گیا اور اپنے آپ کو طفل تسلیوں کے دائرے سے باہر لے آیا۔ میں نے یقین کرلیا کہ کامران مرچکا تھا۔ حیرت اور بے یقینی کی جگہ تاسف اور دکھ کی ایک سرد سی لہر نے لے لی۔

اَن گنت سوالوں نے ایک ساتھ ذہن پر یلغار کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے عارضی بے حسی کو ڈھال بناتے ہوئے اس یلغار کو روکنے کی کوشش کی۔ میں چاہ رہا تھا کہ میرا ذہن چند لمحے کے لیے شل سا ہو جائے تاکہ میں ان گنت سوالوں کی اذیت سے بچ سکوں۔ یہ سوال اس لیے بھی زیادہ اذیت ناک محسوس ہو رہے تھے کہ فی الحال مجھے ان کے جواب ملنے کی اُمید نہیں تھی۔

رحیم گل نے اسپتال کے ملازم کو اشارہ کیا۔ اس نے پوری لاش پر سے کپڑا ہٹا دیا۔ اسے پوری لاش کہنا ہی غلط تھا۔ درحقیقت وہ ادھوری سی لاش تھی۔ نامکمل اور اعضا بُریدہ سی لاش۔ اس کی ایک ٹانگ تقریباً پوری ہی غائب تھی۔ دوسری ٹانگ بھی کچھ اس طرح کچلی مسلی اور کٹی پھٹی سی تھی جیسے کسی بھاری دندانے دار چیز سے اس کا قیمہ بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ دوسرے زخم اور چیر پھاڑ اس کے علاوہ تھی۔ اس بچے کھچے جسم پر کپڑوں کی جگہ بھی محض چند چیتھڑے ہی رہ گئے تھے۔

چند دن پہلے تک میں نے اس نوجوان کو تندرست و توانا' زندہ سلامت اور بے نقص و بے عیب دیکھا تھا۔ آج وہ محض شکستہ و مسخ شدہ اعضا کا ایک کراہیت انگیز ڈھیر تھا۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے اور اس کے بارے میں سوچتے ہوئے میرا دل خراب ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود میں نے چند لمحے کے لیے اپنے محسوسات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن میری کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

اس کی یہ حالت درندوں کی چھینا جھپٹی کا شاخسانہ بھی ہو سکتی تھی اور انسانوں کی درندگی کا نمونہ بھی۔ انسان اب انسان کو زیادہ سے زیادہ اذیت دے کر مارنے یا مُردوں سے بدتر حال میں چھوڑنے کے معاملے میں نت نئے طریقے' نت نئے پہلو دریافت کررہا ہے۔ اس معاملے میں وہ درندوں سے اور پرانے زمانے کے مخبوط الحواس' اذیت پرست حکمرانوں سے بہت آگے نکل آیا تھا۔ درندہ' انسان کو یا اپنے شکار کو ہلاک کرتا ہے تو اس کا مقصد اسے سسکا سسکا کر' تڑپا تڑپا کر یا زیادہ سے زیادہ اذیت دے کر ہلاک کرنا نہیں ہوتا' اسے تو صرف اپنا پیٹ بھرنے اور جلد از جلد اس "کام" کو ختم کرنے سے غرض ہوتی ہے۔ یہ وصف صرف حضرتِ انسان میں ہی پایا جاتا ہے کہ وہ اپنی بیمار ذہنیت' اپنی اذیت پرست فطرت اور اپنی نس نس میں پھیلی ہوئی درندگی و خباثت کی تسکین کے لیے جان بھی نہ جانے کن کن طریقوں سے لیتا تھا۔ چنانچہ کامران کی یہ حالت کچھ انسانوں کی طبع آزمائی کا نتیجہ بھی ہو سکتی تھی۔ شہر میں ایک عرصے سے جو کچھ ہو رہا تھا اس کے بعد تو اب کچھ بھی بعید از امکان نہیں رہا تھا۔

آخر کار میں نے رحیم گل کی طرف دیکھا جو پتھرایا ہوا سا چہرہ لیے کھڑا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں پوچھا "یہ سب کیا ہے؟"

"کیا سب کیا ہے؟" اس نے انجان بنتے ہوئے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے اپنی آواز کو سرگوشی کی حد تک نیچے لانے کی کوشش کی تاکہ اسپتال کا ملازم اور کانسٹیبل نہ سننے پائیں "مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہاری کھوپڑی پر ایسا گھونسا رسید کروں کہ تمہارا یہ بے

مصرف وجود بھی یہاں پڑی ہوئی ان بہت سی لاشوں میں شامل ہو جائے اور تمہاری یہ بے مغز کھوپڑی کسی پچکے ہوئے تربوز کی طرح اِدھراُدھر بکھر جائے۔ یہاں تو تمہاری لاش کو کھپانے کے لیے جگہ بھی نظر نہیں آرہی۔"

اس نے نیم وا سی آنکھوں سے نہایت پُرسکون انداز میں۔۔۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کسی حد افسردگی سے میرا جائزہ لیا پھر گہری سانس لے کر بولا "مکالمے اچھے بول لیتے ہو۔ کاش تم سیدھے سادے انداز میں بات کرنے کے عادی ہوتے۔"

میں نے اس موقع پر اس سے بحث میں الجھنے کے بجائے اپنے غم وغصے پر قابو رکھتے ہوئے کہا "اسے کس نے اس حال کو پہنچایا ہے؟"

"یہ ہمیں ابھی معلوم کرنا ہے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا "ویسے پولیس سرجن کی ابتدائی رپورٹ کے مطابق اس کی یہ حالت کسی مگرمچھ کی وجہ سے ہوئی ہے۔"

"مگرمچھ۔۔۔؟" میں نے بے یقینی سے دہرایا۔ میں بیچ ایک لمحے کے لیے اپنا غم وغصہ بھول گیا۔ میں یہ توقع نہیں کررہا تھا کہ رحیم گل کو ایسے موقع پر بھی مذاق سوجھ سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مذاق نہیں کررہا تھا۔

اس نے اثبات میں سرہلایا تو میں نے پوچھا "تم کس قسم کے مگرمچھ کی بات کررہے ہو؟ چار ٹانگوں پر رینگنے والے کسی مگرمچھ کی۔۔۔ یا دو ٹانگوں پر چلنے والے مگرمچھ کی؟"

"میں استعاروں اور تشبیہات میں بات نہیں کررہا۔" وہ قدرے ناگواری سے بولا "جس حد تک مجھے معلوم ہوسکا ہے وہ تمہیں سیدھے اور سچے انداز میں بتانے کی کوشش کررہا ہوں۔" اس نے اسپتال کے ملازم کو اشارہ کیا۔ اس نے لاش کو دوبارہ کپڑے سے ڈھانپ دیا اور ہم مردہ خانے سے باہر آگئے۔ اس نے کسی کو کوئی ہدایت نہیں دی، کسی سے کچھ نہیں پوچھا اور مجھے ساتھ لیے وہاں سے کچھ دور برآمدے میں آن کھڑا ہوا۔ وہ یقیناً کسی سوچ میں تھا۔ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا لیکن ساتھ ساتھ مجھ سے بات بھی کیے جارہا تھا۔

میں نے کہا "میں نے آج تک کراچی میں چار ٹانگوں والے مگرمچھوں کے اس حد تک سرگرم عمل ہونے کے بارے میں نہیں سنا تھا کہ وہ انسانوں کا یہ حشر کرنے لگیں۔ میں نے کراچی میں کہیں مگرمچھ دیکھا ہی نہیں۔۔۔ حالانکہ یہ شہر سمندر کے کنارے واقع ہے۔ مگر میں نے کسی ساحلی علاقے میں مگرمچھ پائے جانے کے بارے میں آج تک نہیں سنا۔ برسوں پہلے نہ جانے کس چکر میں یہاں کے چڑیا گھر جانا ہوا تھا تو وہاں میں نے ایک مریل سا مگرمچھ دیکھا تھا۔ وہ بھی اتنا مختصرالوجود تھا کہ اسے مگرمچھ کے بجائے کنگ سائز قسم کی چھپکلی کہنا زیادہ مناسب تھا۔"

رحیم گل نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خاموشی سے پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں کسی نے فش فارم وغیرہ کی طرح "ایلیگیٹر فارم" کھول لیا ہو؟ اپنے نجی حوض بنا کر مگرمچھوں کی فارمنگ اور بریڈنگ شروع کردی ہو؟ دو ٹانگوں والے مگرمچھ تو بہت سے لوگوں نے بہت بڑی تعداد میں برسوں سے پالے ہوئے ہیں جو اپنے آقاؤں کے اشارے پر نت نئے انداز میں شہر میں تباہی پھیلاتے اور انسانوں کو بھنبھوڑتے پھرتے ہیں۔ کہیں اب کسی نے نجی سطح پر چار ٹانگوں والے مگرمچھوں کی افزائشِ نسل تو شروع نہیں کردی اور کہیں وہ اپنے معتوبین کو ان مگرمچھوں کے سامنے تالاب میں تو نہیں پھنکوا دیتا؟"

رحیم گل گویا کسی ناسمجھ بچے پر ترس کھاتے ہوئے گہری سانس لے کر کچھ مشفقانہ سے لہجے میں بولا "افضل! میری جان۔۔۔ اگر تم نے کوئی چیز نہ دیکھی ہو تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ وہ اس دنیا میں یا اس شہر میں کہیں پائی نہیں جاتی۔۔۔"

"یہ تو میں اکثر خود لوگوں سے کہا کرتا ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یہی بات کبھی خود سے بھی کہہ لیا کرو۔" اس نے مربیانہ انداز میں مشورہ دیا۔

"میں تو بہت پہلے سے ہی اس کا قائل ہوں۔" میں نے کہا۔

"شکر ہے کہ تم کسی بات کے تو قائل ہو۔" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"میرے سوال کا جواب پھر بھی رہ گیا۔ وہ مگرمچھ کراچی میں کہاں پایا جاتا ہے جس نے کامران کو اس انجام سے دوچار کیا ہے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"اتنے جذباتی انداز میں کیوں پوچھ رہے ہو؟" رحیم گل نے مجھے گھورا "کیا تم ابھی گنڈاسا لے کر جاؤ گے اور اس کے ٹکڑے کردو گے؟ اس سے پہلے شاید تم دو چار بڑھکیں بھی مارو گے۔ اوئے مگرمچھا! میں تیرے ٹوٹے کرن لئی آیاں واں۔۔۔ تیرے دو ٹوٹے میں ایس لئی کراں گا۔۔۔ فیر تن ٹوٹے ایس لئی کراں گا۔۔۔" وغیرہ وغیرہ۔۔۔؟"

"اگر تم بکواس کرنے میں اپنی زبان کی اتنی توانائی خرچ کرنے کے بجائے تھوڑی سی توانائی میری بات کا جواب دینے میں خرچ کرلیتے تو کہیں بہتر ہوتا۔" میں نے کافی تحمل سے کہا۔

"تم کراچی کی بات کیوں کیے جارہے ہو؟" وہ خفیف سی چڑچڑاہٹ کے ساتھ بولا "تمہیں کچھ دیر پہلے کامران کا خط مل چکا ہے۔ اس میں اس نے خود لکھا ہے کہ وہ کراچی میں نہیں تھا۔ وہ اسی روز کراچی سے نکل گیا تھا جس روز تمہیں جُل دے کر۔۔۔ بلکہ شاید دھکا دے کر بھاگا تھا۔" اس نے تصحیح کی "کیا تم اتنی جلدی یہ بات بھول گئے؟"

"میں بھولا نہیں ہوں لیکن لاش کی یہ حالت دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے گمان گزرا کہ کامران شاید کراچی میں اس انجام سے دوچار ہوا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں یہ گمان گزرا تو شاید ٹھیک ہی گزرا۔۔۔" اس کے لہجے میں شاید حقیقی افسردگی جھلک آئی "تشدد سے مسخ شدہ۔۔۔ کٹی پھٹی۔۔۔ ادھوری۔۔۔ ادھ جلی اور انسانیت کی انتہائی بے توقیری کا احساس دلانے والی لاشیں اب اس شہر کی شناخت بن گئی ہیں۔"

"یہ سب تم لوگوں کا قصور ہے۔" میں نے فوراً کہا۔

"ہاں۔۔۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "گناہ گار تو صرف ہم ہی ہیں۔ باقی تو سب یہاں فرشتے ہیں اور اپنی فرشتوں والی عظیم صفات کے سہارے اس شہر کو جنت بنانے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"بہت سی باتوں کی ذمے داری بہرحال گھوم پھر کر تم لوگوں پر آتی ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

"اچھا اپنی چونچ بند رکھو اور ایک طویل ولایعنی بحث مت شروع کرو۔" وہ بیزاری سے بولا۔

"کامران کے بارے میں جو کچھ تمہیں معلوم ہوسکا ہے وہ سب مجھے بتا دو۔ میری چونچ بند ہو جائے گی۔" میں نے کہا۔

"ہم تمہارے آفس واپس چلیں گے۔ وہاں بیٹھ کر آرام سے بات کریں گے لیکن اس سے پہلے میں ذرا میڈیکو لیگل آفیسر سے مل لوں۔ تم میرے ساتھ چلو گے؟"

"ہاں۔۔۔ چلے چلتا ہوں۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "مدت سے بہت سے گوشے آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ ذرا ان کی حالت ہی دیکھتے چلیں۔"

"حالت تو ہر چیز کی دن بدن خراب سے خراب تر ہی ہورہی ہے۔۔۔ اور معلوم نہیں خرابی کا یہ سلسلہ کہاں جارکے گا۔ شاید رکے گا ہی نہیں۔۔۔ اور کسی موڑ پر کوئی عبرتناک انجام ہمارا منتظر ہوگا۔" اس نے بوجھل لہجے میں کہا اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

میڈیکو لیگل آفیسر کے دفتر کے سامنے ایک ہجوم لگا ہوا تھا۔ اس ہجوم میں ہر عمر کے مرد اور عورتیں شامل تھیں۔ بیشتر چہروں پر وحشت، پریشانی اور غم واندوہ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ بہت سے افراد تیز تیز آوازوں میں باتیں کررہے تھے۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ ہم بھیڑ کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے تو کئی لوگوں نے ناپسندیدہ سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

ہم دروازہ کھول کر اندر جا پہنچے۔ اس بڑے سے کمرے میں کئی افراد تھے جن میں کئی پولیس والے بھی تھے۔ ان میں سے دو تین نے رحیم گل کو سیلیوٹ کیا۔ میڈیکو لیگل آفیسر ایک میز پر موجود تھا۔ اسے کئی افراد نے گھیرا ہوا تھا۔ ان میں پولیس والے بھی تھے اور اسپتال کے عملے سے تعلق رکھنے والے بھی۔ ان کے سفید کوور آل اور اسٹیتھیسکوپ ان کی شناخت تھے۔ ممکن ہے وہ میڈیکل کالج کے طالب علم رہے ہوں۔

وہ سب بیک وقت میڈیکو لیگل آفیسر کو اپنی اپنی بات سمجھانے کی کوشش کررہے تھے۔ اس کے سامنے میز پر کاغذوں اور فائلوں کا ایک چھوٹا سا انبار تھا۔ اس کا چہرہ پسینے میں بھیگا ہوا تھا اور تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کا بس نہیں چل رہا، اپنے بال نوچتا ہوا کسی جنگل کی طرف نکل بھاگے۔ رحیم گل اگر انتظار کرتا کہ ایم ایل او اس کی طرف متوجہ ہو تو شاید پورا دن ہی گزر جاتا۔ اس نے شاید یہی محسوس کرتے ہوئے ایک دو افراد کو پیچھے ہٹایا اور اس کے عین سامنے جا پہنچا۔ اس نے سر اٹھا کر رحیم گل کی طرف دیکھا، تھکے تھکے سے انداز میں مسکرایا اور ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "آپ خود آگئے رپورٹ لینے؟ کسی کانسٹیبل کو بھیج دیا ہوتا۔"

"مجھے لاش کو ایک نظر دیکھنا تھا اور کسی اور کو بھی دکھانا تھا۔ اس لیے خود چلا آیا۔" رحیم گل بولا۔ اس نے ایم ایل او سے میرا تعارف کرانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

"آپ بیٹھیں۔" ایم ایل او نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا جس پر پہلے ہی کوئی بیٹھا ہوا تھا۔

"بیٹھنا تو دور کی بات ہے اس وقت یہاں کھڑا ہونا بھی اپنے اور آپ کے ساتھ زیادتی ہے۔" رحیم گل بولا "بس وہ ابتدائی رپورٹ مجھے دے دیں۔ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔"

ایم ایل او نے بے دھیانی سے سرہلایا اور اپنے سامنے پڑے ہوئے کاغذات کے بے ترتیب انبار میں غوطہ زن ہوگیا۔ ساتھ ہی اس کی بات بھی جاری تھی "انسپکٹر صاحب! آپ اندازہ نہیں کرسکتے کہ ہم کس قدر پریشر میں کام کررہے ہیں۔" اس نے پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ شاید اسے مطلوبہ رپورٹ نہیں مل رہی تھی "ہر طرف سے ہم پہ پریشر ہے۔"

"میں بہت اچھی طرح اندازہ کرسکتا ہوں۔ ہم سب پہ بہت زیادہ پریشر ہے۔" رحیم گل گہری سنجیدگی سے بولا "اور یہ پریشر شاید اللہ کا عذاب ہے جو ہمارے اعمال کے نتیجے میں ہم پر نازل ہوا ہے۔"

میں نے اسے ہلکی سی کہنی مار کر سرگوشی میں کہا "میں اعمال کی بات کرتا ہوں تو تم بُرا منا جاتے ہو۔"

اس نے مجھے گھورا اور نیچی آواز میں بولا "یہ باتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آسکتیں جاہل آدمی! میں کسرِ نفسی کے اظہار کے لیے اس طرح بات کررہا ہوں ورنہ میرے اعمال کم از کم تم سے تو بہتر ہی ہوں گے۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، ایم ایل او نے پن کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک تین چار کاغذ تلاش کرکے اس کی طرف بڑھا دیئے اور بولا "تفصیلی پوسٹ مارٹم رپورٹ تین چار دن بعد مل سکے گی۔ کام بہت زیادہ ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا بڑا

پریشر۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔ اب یہ کوئی ایمرجنسی کیس نہیں رہا۔" رحیم گل اس کی بات کاٹتے ہوئے کچھ خشک سے لہجے میں بولا اور واپسی کے لیے مڑگیا۔

میں نے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے برآمدے میں پہنچ کر کہا "اے پڑھے لکھے اور عالم وفاضل انسان! میں اس وقت خود کو تمہارا بچہ جمہورا محسوس کررہا ہوں۔"

"تمہیں اس پر شکر کرنا چاہیے کہ تمہاری کچھ توحیثیت بنی ورنہ اس سے پہلے توتم اس قابل بھی نہیں تھے۔" وہ بولا۔

"لگتا ہے آج تم نے بہت اعلیٰ درجے کی بھنگ پی رکھی ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"اگر مجھے کچھ پینا ہی ہوتا تو پہلے میں کچھ لوگوں کا خون پیتا۔" وہ بولا۔

"تم یہ حسرت دل میں ہی لیے پھرتے رہو گے اور وہ خود نہ جانے کتنے لوگوں کا خون پی جائیں گے جن کا تم خون پینا نہیں چاہتے ہو۔" پھر میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا "بہرحال پرنسس سیرا کے قتل کے سلسلے میں تمہیں جس پر سب سے زیادہ شبہ تھا وہ تو اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ اس کیس کے سلسلے میں اب تک تو تمہارے پاس یہ مصروفیت تھی کہ تم کامران کو تلاش کررہے تھے۔ اب کیا کرو گے؟"

"کامران کو تلاش کرنے کے علاوہ بھی ہم بہت کچھ کررہے تھے۔ اب بھی کرتے رہیں گے اور آئندہ بھی جو کچھ کرنا ہوگا' ضروری نہیں کہ وہ تمہیں بتا کرہی کریں۔" وہ بولا۔

"ٹھیک ہے.... تمہاری مرضی۔" میں نے کندھے اچکائے "میں جو کچھ کروں گا اس کے بارے میں بھی تمہیں کچھ نہیں بتاؤں گا۔ امکان یہی ہے کہ زیادہ نقصان میں تم ہی رہو گے۔"

"مجھے معلوم ہے تم بھی اس سلسلے میں بہت مستعد ہوئے پھر رہے ہو لیکن مجھے یقین ہے تم وقت ہی ضائع کرو گے اور اگر تم کچھ معلوم بھی کرلو گے تو مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوگی۔"

"ظاہر ہے کام سے کیسے دلچسپی ہوتی ہے؟ کام سے تو ہر کوئی فرار چاہتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں اپنے حصے کا کام خود کرنے کا عادی ہوں۔ مجھے تمہاری گائیڈلائن پر چلنے کی ضرورت نہیں۔" وہ منہ بنا کر بولا۔

"لیکن جونہی میں تمہیں کسی کام کا کریڈٹ دینے کے لیے بلاؤں گا' تم بھاگے بھاگے آؤ گے۔" میں نے اسے چڑایا۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا۔"

"وقت تو پہلے ہی بہت کچھ بتا چکا ہے۔ تمہارا ماضی اس سلسلے میں خاصا داغ دار ہے۔" میں نے کہا۔

"کم ظرف لوگ اگر آڑے وقت میں کبھی کسی کے ذرا بھی کام آجاتے ہیں تو بعد میں اسی طرح جتاتے ہیں۔"

اس وقت تک ہم گاڑی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اے ایس آئی نے جلدی سے اس کے لیے دروازہ کھولا۔ اس بار بھی ڈرائیونگ سیٹ رحیم گل نے ہی سنبھالی۔ واپسی کا سفر خاموشی سے کٹا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس سے پہلے بھی میں صرف اپنے خیالات کو منتشر رکھنے کے لیے ہی بول رہا تھا ورنہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ بہت دیر کے لیے سکوت اختیار کرلیا جائے۔

میں خاموش ہوتا تھا تو ذہن فوراً کامران کی لاش کی طرف چلا جاتا تھا۔ یوں تو کسی بھی بے گناہ کی لاش دیکھنے کے بعد میرے دل میں دیر تک ایک بے عنوان سی افسردگی اور رنج بستگی چھائی رہتی تھی لیکن اس وقت تو میں لاشوں کا ایک بھیانک بازار دیکھ کر آرہا تھا جن میں سے نہ جانے کتنی بے گناہوں کی تھیں اور وہ محض لاشیں نہیں تھیں' نہ جانے کس کس کی درندگی' بربریت اور بہیمانہ مشقِ ستم کی خاموش تصویریں تھیں جو دل کو لہو کردینے والی سوچوں کو جنم دیتی تھیں۔ دل میں زیادہ افسردگی اور رنج بستگی اس احساس سے پھیلی تھی کہ ان جیتے جاگتے انسانوں کو اس حال کو پہنچانے والوں میں سے کسی کے بھی پکڑے جانے کی کوئی امید نظر نہیں آتی تھی۔ انہیں صرف دستِ قدرت ہی اپنی گرفت میں لے سکتا تھا۔

میری ان اداس سوچوں کے درمیان کامران کی کہانی تاسف اور پچھتاووں کا ایک الگ ہی مجموعہ تھی۔ خوش قسمتی جب اسے ڈھونڈتی پھر رہی تھی تو وہ زندگی سے بھی محروم ہوگیا تھا۔ اس سے پہلے غربت اور اس کے مسائل تو اپنی جگہ تھے لیکن وہ کم از کم زندہ تو تھا۔ شاہراہِ حیات پر خواہ گرتے پڑتے ہی سہی' لیکن اپنا سفر جاری تو رکھ سکتا تھا۔ ہاتھ پاؤں تو مار سکتا تھا۔ خوش قسمتی خواہ اسے گلے نہ لگاتی' کم از کم وہ زندہ تو رہتا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اب میں یہ خبر صفیہ کو کیسے سناؤں گا۔ بے شک وہ اس سے قطع تعلق کے ارادے کا اظہار کرچکی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ یہ خبر سن کر اس کے دل پر خاصا گہرا زخم آئے گا جس کے مندمل ہونے میں نہ جانے کتنا عرصہ لگے اور اگر اس نے کامران کی لاش کی حالت دیکھ لی تو نہ جانے کتنے برسوں کے لیے اس کے ذہن پر بدصورت یادوں کے گہرے نقوش ثبت ہوجائیں جو اسے نہ جانے کب تک زندگی کی کسی بھی خوب صورتی سے لطف اندوز نہ ہونے دیں۔ یہ اندیشہ بہرحال موجود تھا کہ لاش تدفین کے لیے اس کے قریبی عزیزوں کے حوالے کی جائے گی تو صفیہ اسے دیکھ لے گی۔ اگر وہ صرف چہرہ دیکھتی تب بھی اسے کچھ کم تکلیف نہ ہوتی۔ کامران کے چہرے کی حالت بھی اچھی نہیں تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ مجھے یہ خبر صفیہ کو نہیں سنانی چاہیے تھی۔ اسے یہ خبر اخبارات میں ہی پڑھنے کو ملتی تو بہتر تھا۔ ابھی تو اس نے کامیابیوں کی سیڑھی پر پہلا قدم ہی رکھا تھا۔ برسوں کی محرومیوں کے بعد شاید پہلی بار اسے دور کہیں منزل کا نشان نظر آیا تھا۔ میں نے

اس کی آنکھوں میں امید کے ستارے جھلملاتے دیکھے تھے۔ اس ابتدائی مرحلے پر ہی اسے دکھ دینے والی کوئی خبر سنانے کے لیے میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

مجھے سیٹھ واحد اور اس کی سینڈیکیٹ کا بھی خیال آرہا تھا۔ وہ لوگ گویا اسے بھکاری سے بادشاہ بنانے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ اس قسم کے لوگ کسی کے ساتھ اتنی مہربانی کا سلوک کرنے کا فیصلہ روز روز نہیں کرتے تھے۔ سیٹھ واحد نے توکامران کو تلاش کرانے کے لیے کتنے جوش وخروش سے مجھ سے اس کی تصویر بھی منگوائی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ یہ خبر اس کے لیے بھی ایک بڑے دھچکے کا سبب بنے گی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اسے بھی یہ خبر کسی اور ہی ذریعے سے مل جائے تو اچھا ہے۔

اسی بوجھل سی خاموشی کے سائے میں ہم آفس پہنچ گئے۔ میں نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے اپنی ریوالونگ چیئر پر ڈھیر ہوتے ہی کہا "اب مجھے وہ سب کچھ بتادو جو تمہیں معلوم ہے ورنہ میں تمہارے ساتھ وہی سلوک کروں گا جو تم لوگ اپنے "ڈرائنگ روم" میں زیرِ تفتیش ملزموں سے کرتے ہو۔"

وہ اس وقت تک میرے مقابل ایک کرسی پر بیٹھ چکا تھا۔ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا "اتنی بے تابی....؟"

"اسپتال میں' میں نے تم سے تفصیل معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تمام راستے بھی میں خاموش رہا۔ اب یہاں پہنچ کر تم سے پوچھ رہا ہوں تو اسے بھی بے تابی کہہ رہے ہو۔" میں نے اسے گھورا "میرا خیال ہے مجھے تمہارے بوڑھے ہونے.... بلکہ بسترِ مرگ پر پہنچنے کا انتظار کرنا چاہیے؟"

اس نے گویا میری بات کو جواب کے قابل نہ سمجھا اور جیب سے کامران دانش کا وہ خط نکال کر ایک بار پھر بغور دیکھنے لگا جو میں نے ہی اسے دیا تھا۔ پھر وہ اسپتال سے لائی ہوئی ابتدائی میڈیکل رپورٹ کا جائزہ لینے لگا۔ کئی منٹ تک کمرے میں سکوت رہا۔ آخر میں نے انگلیوں سے میز کھٹکھٹاتے ہوئے کہا "میں بھی یہاں موجود ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ کاغذات سے نظر ہٹائے بغیر بولا۔

"کبھی کبھی میں اپنی موجودگی کا احساس منہ پر گھونسا مار کر بھی دلاتا ہوں۔" میں نے غصیلے سے لہجے میں کہا۔

"کس کے منہ پر گھونسا مار کر....؟ اپنے منہ پر؟" اس نے اب سر اٹھا کر سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔ سامنے والے کے منہ پر۔" میں نے واضح کیا۔

"وہ وقت دور نہیں جب تم دولتی مار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا کرو گے۔" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"اور اس کے بعد تم ٹیاؤں ٹیاؤں کرتے ہوئے بھاگ جایا کرو گے۔" میں نے کہا۔

"تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ کامران کو کس نے ہلاک کیا؟" آخر وہ مزید الجھنے کے بجائے اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ اسے غالباً کسی مگرمچھ یا مگرمچھوں نے ہلاک کیا ہے۔"

"اس کے علاوہ بھی تمہیں کچھ معلوم ہوگا۔" میں نے ذرا تحمل سے کام لیتے ہوئے کہا "کیا وہ مگرمچھ اسے سرِراہ کہیں چلتے ہوئے مل گئے تھے؟ کیا کامران دریا میں رہنے لگا تھا اور دریا میں رہتے ہوئے اس نے مگرمچھ سے بیر مول لے لیا تھا؟ کیا اس کے اور مگرمچھ کے درمیان کوئی کاروباری رقابت پیدا ہوگئی تھی... یا پھر مسئلہ دوسری قسم کی رقابت کا تھا؟ کیا کامران نے کسی مگر مچھنی کو نگاہِ التفات سے دیکھ لیا تھا؟ میرا مطلب یہ ہے کہ معاملے کا کچھ پس منظر تو ہوگا۔ ہر معاملے کا کوئی نہ کوئی پس منظر ضرور ہوتا ہے۔"

"پس منظر ہی تو مجھے معلوم نہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میں اپنے طور پر اسے سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

"تم اپنے ننھے سے دماغ پر اتنا بوجھ مت ڈالو۔ تمہیں جو کچھ معلوم ہے صرف وہ صحیح طور پر بتادو۔ میں نے پہلے بھی یہی گزارش کی تھی اور اب پھر دست بستہ یہی گزارش کررہا ہوں۔" میں نے بظاہر گویا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے کہا۔

"اچھا.... دست بستہ گزارش کررہے ہو....!" اس نے ذرا مطمئن انداز میں سرہلایا "تو پھر بتا دیتا ہوں۔ یہاں سے تقریباً ستر اسی میل دور بلوچستان کی حدود میں ایک قصبہ ہے۔ میگھانی اس کا نام ہے اور میگھ قبیلہ اس میں آباد ہے۔ چھوٹا مگر طاقت ور اور جنگ جو قسم کا قبیلہ ہے۔ اس کی زیادہ تر قوت اسی قصبے میں مرتکز ہے اور قصبہ ایک طرح سے سمندر کے قریب ہی آباد ہے۔ ایک کٹی پھٹی لیکن بہت بڑی سمندری کھاڑی وہاں تک پھیلی ہوئی ہے جو اتنی گہری ہے کہ بڑے سمندری جہاز بھی اس میں آجاتے تھے۔"

"تم "تھے" کا صیغہ استعمال کررہے ہو۔ اس کا مطلب ہے اب نہیں آسکتے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"آتو سکتے ہیں لیکن اب آتے نہیں ہیں۔ وہ ایک متروک کھاڑی ہے۔ کسی زمانے میں وہ شپ بریکنگ کے لیے بھی استعمال ہوتی تھی۔ کراچی کے ساحلوں سے بہت دور اس الگ تھلگ جگہ کو گویا اس کام کے لیے مخصوص کردیا گیا تھا جہاں زیادہ تر اسی قبیلے کے مزدور جہازوں کی چیرپھاڑ اور توڑپھوڑ میں لگے رہتے تھے۔ یہی روزگار کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ پھر رفتہ رفتہ کچھ مسائل اور ٹیکسوں کے جھگڑوں کی وجہ سے شپ بریکنگ انڈسٹری گڈانی کے قریب منتقل ہوتی چلی گئی۔"

"قصبے کے لوگوں نے احتجاج نہیں کیا کہ روزگار کا ایک بڑا ذریعہ ان سے دور جارہا تھا؟" میں نے دریافت کیا "بعض بستیاں' گاؤں یا قصبے تو درحقیقت ایسے ہی کسی روزگار کی وجہ سے وجود میں آجاتے ہیں اور اس روزگار کے ختم ہونے پر وہ بھی ختم ہوجاتے

ہیں۔"

"مجھے صحیح طرح تو معلوم نہیں۔ یہ کافی پرانی بات ہے۔ اس وقت کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن کچھ عرصے پہلے میں نے وہ قصبہ اچھی طرح دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے وہاں شپ بریکنگ ختم ہونے سے اگر کوئی فرق پڑا تھا تو وہ عارضی ہی رہا ہوگا..... یا پھر شاید کوئی خاص فرق ہی نہیں پڑا۔ لوگوں نے متبادل ذرائع روزگار تلاش کرلیے۔ آس پاس کی زمین بنجر نہیں ہے۔ کچھ لوگ کھیتی باڑی اور مزدوری وغیرہ میں لگ گئے۔ کچھ لوگ اپنے صدیوں پرانے اور آبائی پیشے ماہی گیری کی طرف لوٹ گئے۔ مچھلی وہاں کثرت سے پائی جاتی ہے اور ماہی گیری وہاں پہلے بھی ہوتی تھی۔ مچھلی کے جو عام اور شوقیہ، مگر دھتی قسم کے شکاری ہیں وہ بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں کیونکہ کئی مربع میل میں پھیلی ہوئی یہ کھاڑی بعض مقامات پر کناروں کی طرف بہت کم گہری ہے۔ لوگ پانی میں اتر بھی جاتے ہیں خواہ انہیں تیراکی نہ آتی ہو..... اور جنہیں تیراکی آتی ہے وہ تو بہت دور تک چلے جاتے ہیں۔ شہروں سے جانے والے مچھلی کے شکار کے شوقین مناسب جگہیں دیکھ کر بنسیاں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔"

"اب تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شپ بریکنگ کے خاتمے کے بعد اس قصبے نے زیادہ ترقی کی ہے۔ وہاں زیادہ خوش حالی نظر آتی ہے۔ ایک دور افتادہ قبائلی قصبے کا جو تصور ذہن میں ابھرتا ہے وہ اس سے کافی مختلف ہے۔ ضرورت کی ہر چیز وہاں ملتی ہے۔ ایک چھوٹا سا ہوٹل بھی ہے۔ ٹیلی فون ایکسچینج تو بعض فنی دشواریوں کی وجہ سے نہیں ہے لیکن چند ٹیلی فون لائنیں کسی اور قصبے سے پہنچی ہوئی ہیں۔ کچی اور پکی دونوں طرح کی سڑکیں ہیں۔ ماحول خاصا معقول محسوس ہوتا ہے۔ پولیس اسٹیشن بھی ہے۔"

"تو پھر ماحول معقول کیسے ہوا؟" میں نے اس کی بات کاٹی "جہاں پولیس اسٹیشن موجود ہو وہاں کا ماحول تو معقول رہ ہی نہیں سکتا۔"

اس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا اور گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا "اب اگر میں مکمل سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں تو تم ٹریک سے ہٹنے لگے ہو۔ کیا تمہاری چونچ کچھ دیر بند نہیں رہ سکتی؟ یا اس میں سے کوئی معقول بات برآمد نہیں ہوسکتی؟"

"معقول بات کسی معقول آدمی سے ہی کی جاسکتی ہے لیکن خیر..... چلو..... میں تم سے الجھنا نہیں چاہتا اس لیے فی الحال تمہیں آدمی..... بلکہ معقول آدمی ہی تسلیم کرلیتا ہوں۔" میں نے صلح جویانہ لہجے میں کہا "تمہیں اصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ میکھانی قصبے کا یہ تفصیلی تعارف تم صرف یہ بتانے کے لیے کرا رہے ہو نا کہ کامران کی لاش وہاں پائی گئی تھی؟"

"ہاں۔" وہ قدرے خفیف سے لہجے میں بولا "میں چاہ رہا تھا کہ تم سارے پس منظر اور ماحول کو اچھی طرح سمجھ لو۔"

"شکریہ..... شکریہ۔" میں نے جلدی سے کہا "مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنے عقل مند ہوگئے ہو۔ کامران کی لاش کھاڑی کے کس حصے میں پائی گئی تھی؟" میں اسپتالوں کی ابتدائی کارروائیوں کے باوجود کچھ ایسی علامتیں دیکھ چکا تھا جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ لاش پانی اور کیچڑ میں رہی تھی۔

"ہاں۔" رحیم گل کا لہجہ اب بھی غصیلا سا تھا۔

"اور کھاڑی میں مگرمچھ پائے جاتے ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں..... سنا ہے اب پائے جانے لگے ہیں۔ پہلے نہیں تھے۔" اس کے لہجے میں خفگی کچھ کم ہوگئی "کھاڑی کے کچھ حصے خطرناک مشہور ہوگئے ہیں۔ وہاں رات کو مگرمچھ نمودار ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ کامران کسی وجہ سے رات کو کھاڑی میں اترا تھا جہاں کسی مگرمچھ نے اسے دبوچ لیا۔ صبح کچھ لوگوں نے اس حالت میں اس کی لاش کنارے پر پڑی دیکھی جس حالت میں تم نے دیکھی ہے۔"

"یہ عجیب بات ہے کہ مگرمچھ انسان کو مارنے کے بعد لاش کا کچھ حصہ کھانے کے بعد باقی کنارے پر پھینک جائے۔" میں نے کہا "اس کے دانت چونکہ دوسرے جانداروں کے دانتوں کی طرح کام نہیں کرتے بلکہ وہ محض دندانے دار شکنجے کا کام دیتے ہیں اور چونکہ اس کی زبان بھی نہیں ہوتی اس لیے وہ اپنے شکار کو چبا نہیں پاتا اور سالم نگلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر شکار ذرا بڑا ہو اور وہ اسے سالم نہ نگل سکے تو پھر وہ دو تین طریقے استعمال کرتا ہے۔ اگر اسے شکار کے نکل بھاگنے کا اندیشہ نہ ہو تو وہ اسے بار بار دانتوں سے کچل کر نرم ٹکڑوں میں تبدیل کرکے نگل جاتا ہے۔ شکار بہت بڑا ہو اور مگرمچھ کو بہت بھوک لگی ہو تو وہ قریب ہی کوئی چٹان، درخت یا پتھر وغیرہ تلاش کرکے شکار کو جبڑے ہی میں دبا کر رکھتے ہوئے اس طرح اس سے بار بار ٹکراتا ہے جس طرح دھوبی گھاٹ پر دھوبی کپڑے دھوتے ہیں۔ اس طرح شکار نرم پڑ جاتا ہے یا ملغوبے میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اگر یہ کرنے کا موقع میسر نہ ہو تو مگرمچھ جتنا شکار کھا سکتا ہے اتنا کھا کر باقی سڑنے کے لیے کہیں کسی کھوہ وغیرہ میں چھپا دیتا ہے۔ جب وہ گل سڑ کر نرم ہوجاتا ہے تو پھر وہ اسے نگل جاتا ہے۔ کیا یہ کچھ عجیب سی بات نہیں کہ مگرمچھ نے ان میں سے کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا اور صرف ایک ٹانگ ہڑپ کرنے اور جسم کو کسی حد تک دانتوں سے چھیدنے کے بعد کنارے پر پھینک دیا؟"

رحیم گل اس دوران میں خاموشی اور گہری سنجیدگی سے میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن جونہی میں خاموش ہوا اس کے چہرے پر استہزائیہ سے تاثرات آگئے اور وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا "ایک تو ان کمبخت مگرمچھوں میں عقل نام کو نہیں ہوتی۔ دوسرے انسان کے پاس ان کے بارے میں جتنا علم ہے یہ بعض اوقات اس سے ہٹ کر بھی کچھ حرکتیں کر گزرتے ہیں اور انسان کو الجھن میں ڈال جاتے ہیں حالانکہ انہیں ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے۔ قدر

نے ان کے لیے جو قواعد و ضوابط مقرر کردیے ہیں اور جن کا انسان اچھی طرح مشاہدہ و مطالعہ کرچکا ہے انہیں ان تک محدود رہنا چاہیے لیکن یہ کبھی کبھی ان سے تجاوز بھی کرجاتے ہیں۔"

"طنز فرمانے کی کوشش کررہے ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔ میری یہ جرات کہاں۔" وہ سہم کر بولا "طنز کے جملہ حقوق تو حضور والا کے نام محفوظ ہیں۔"

"ایسی تو خیر کوئی بات نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا "تم شوق سے طنز فرماؤ لیکن یہ تمہاری صحت کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔"

"اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ بُرا مت مناؤ۔" وہ یک دم نرم پڑتے ہوئے بولا "میں اصل میں یہ کہنے لگا تھا کہ شاید مگرمچھ کے پاس لاش چھپا کر رکھنے کے لیے کوئی مناسب جگہ موجود نہ ہو۔ وہ اپنی دانست میں کنارے پر اسے سڑنے کے لیے ہی چھوڑ گیا ہو اور وہ اس کے خیال میں محفوظ جگہ ہو۔ اس سے پہلے بھی وہاں کنارے پر مختلف مقامات پر اس طرح کئی ادھ کھائی اور کئی پھٹی سی لاشیں مل چکی ہیں۔ زیادہ تر وہ اِدھر اُدھر سے آنے جانے والوں اور ناواقف لوگوں کی لاشیں تھیں جو اس قسم کے خطرات سے آگاہ نہیں تھے۔ مقامی باشندے تو ان معاملات میں ہوشیار رہتے ہیں اور احتیاط کرتے ہیں۔ شاید اسی لیے اس قسم کے واقعات سے ان میں تو کچھ زیادہ خوف اور ہیجان نہیں پھیلا البتہ کراچی اور اِدھر اُدھر کے دوسرے چھوٹے موٹے شہروں سے جانے والے کافی خوف زدہ ہوچکے ہیں اور ان کی وہاں آمدورفت کافی کم ہوگئی ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "کامران کو جانے کے لیے جگہ بھی ملی تو کیسی۔۔۔! اس سے پہلے اس نے شاید کبھی میگھانی کا نام بھی نہیں سنا ہوگا لیکن اچانک وہ وہاں جا پہنچا۔"

رحیم گل میز پر رکھے ہوئے کامران کے خط کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس میں اس نے کسی مہمان کا ذکر کیا ہے جو اسے وہاں لے گیا لیکن مجھے وہاں سے جو رپورٹ موصول ہوئی ہے اس میں کسی مہمان کا ذکر نہیں ہے۔ مجھے اطلاع ملی ہے کہ وہ اکیلا وہاں پہنچا تھا اور وہاں کے چھوٹے سے اکلوتے ہوٹل میں ٹھہرا تھا جو درحقیقت چند کمروں کے ایک مکان پر مشتمل ہے۔ وہاں اس نے اپنے آپ کو مچھلی کا شکاری ظاہر کیا تھا اور یہ بتا دیا تھا کہ وہ کراچی سے آیا ہے۔ تم نے اس کے فرار ہونے کی جو صورتِ حال بتائی تھی اس سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی لیکن اس نے ہوٹل میں پندرہ دن قیام کے لیے پیشگی کرایہ ادا کیا اور جتنی دیر بھی اسے ٹھہرنے کا موقع نصیب ہوا اتنے وقت وہ وہاں کے معیار کے حساب سے "صاحبوں" والے انداز میں خرچ کرتا رہا اور اس کے پاس مچھلی کے شکار کا نہایت عمدہ قسم کا سامان بھی موجود تھا۔"

"صرف یہی نہیں' میرا خیال ہے اس طرح کے اور بھی بہت سے پریشان کن سوالات ہوں گے جو اپنا جواب مانگ رہے ہوں گے۔ یہ بتاؤ تمہیں کامران کی موت کی اطلاع کیسے ملی اور پھر لاش یہاں تک کیسے پہنچی؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمہاری خوش قسمتی تھی کہ کامران کے پاس اس کا شناختی کارڈ موجود تھا جو اس کی ہلاکت کے بعد بھی محفوظ رہا اور اس کی جیب میں موجود رہا۔"

میں بظاہر خواہ رحیم گل سے کسی طرح بھی گفتگو کررہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں اندر سے مضطرب تھا۔ شاید اسی اضطراب کے باعث میں نے ایک بار پھر رحیم گل کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اگر شناختی کارڈ رابطے کا ذریعہ بنا ہے تو اس صورت میں پہلے اس کے گھر اطلاع جانی چاہیے تھی اور اگر اس کے گھر اطلاع گئی ہوتی تو اس کے ماموں اور صفیہ وغیرہ اسپتال میں موجود ہوتے۔۔۔ بلکہ صفیہ تو شاید پہلے مجھے فون کرتی یا دوڑی دوڑی میرے پاس آتی۔"

"ہاں۔۔۔ خیر لڑکیوں میں تو یہ بیماری عام ہے۔ وہ اکثر معاملات میں دوڑی دوڑی سب سے پہلے تمہارے پاس آتی ہیں۔" رحیم گل فوراً بول اٹھا۔

میں نے ایک بار پھر غصے سے اسے گھورا "ابھی چند سیکنڈ پہلے تم نے سنجیدہ ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔"

"تو میں کوئی طنزیہ مزاحیہ بات تھوڑا ہی کررہا ہوں۔ میں سنجیدگی سے ہی یہ کہہ رہا ہوں۔" رحیم گل نے اطمینان سے جواب دیا۔

"میرے ساتھ ٹریجڈی یہی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں کسی لڑکی کے بارے میں سیدھے سبھاؤ بھی کوئی بات کرتا ہوں تو تم جیسے عیب جو خواہ وہ مرد ہوں یا عورت۔۔۔ اسے فوراً لے اڑتے ہیں۔"

"اگر تم ذرا صبر و سکون سے میری پوری بات سن لیتے تو تمہیں یہ آہ و زاری کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔" رحیم گل منہ بنا کر بولا "میگھانی میں کامران کی لاش کے بارے میں اطلاع سب سے پہلے وہاں کے تھانیدار کو دی گئی تھی۔ حالانکہ ہم نے کامران کی تلاش کے سلسلے میں کراچی کے آس پاس کے چند چھوٹے موٹے شہروں اور قصبوں کے تھانوں کو بھی احتیاطاً مطلع کر رکھا تھا لیکن اتفاق سے میگھانی کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا تھا۔ وہاں کے تھانے کو اس سلسلے میں کوئی اطلاع نہیں دی تھی لیکن کسی تھانے کی حدود میں اگر کوئی لاش پائی جاتی ہے اور اس کے بارے میں کوئی سراغ ملتا ہے کہ اس کا تعلق کسی اور علاقے سے ہے تو وہاں کی پولیس عموماً پہلے اس کے گھر یا لواحقین کو اطلاع دینے سے پہلے متعلقہ تھانے کو اطلاع دیتی ہے۔ آگے پھر تمام ذمّے داری ان کی ہوجاتی ہے۔ یوں کامران کے ایڈریس کے حوالے سے سب سے پہلے اطلاع اس علاقے کے تھانے میں آئی۔ یہاں کا تو ہر تھانہ اس سلسلے میں پہلے ہی الرٹ تھا۔ فوراً ہی مجھے اطلاع مل گئی۔ میری

میگھانی کے ایس ایچ او سے فون پر تفصیلی بات چیت ہوئی۔ اسی کی بنیاد پر میں تم سے اتنی دیر سے تفصیلی بات چیت کررہا ہوں۔ میں نے فوری طور پر لاش اس سے یہاں منگوالی۔ یہ ہے سارا قصہ!"

اس نے طویل سانس لی پھر بولا "اب روٹین میں اس کے متعلقین کو اطلاع ہوجائے گی۔ اس ضمن میں اگر تمہاری کوئی تجویز ہے یا تم کوئی ردوبدل چاہتے ہو تو بتا دو۔" وہ یکایک ہی ظاہری طور پر بھی خاصا مہربان دکھائی دینے لگا تھا۔ دلی طور پر تو وہ حقیقی دوست ہی تھا' یہ تو مجھے اچھی طرح معلوم ہی تھا۔ اس کا آنکھیں دکھانا' لال پیلا ہونا' دھمکیاں دینا' سب کچھ مصنوعی ہوتا تھا۔

"میں بیچارہ کوئی تجویز پیش کرنے یا تم پولیس والوں کی روٹین میں کوئی ردوبدل کرنے کی پوزیشن میں کہاں ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں تو ایک شریف آدمی ہوں۔ پولیس کے معاملات پر تو صرف بدمعاش اثر انداز ہوتے ہیں۔" اس سے پہلے کہ وہ کوئی جوابی حملہ کرتا' میں نے جلدی سے کہا "بہرحال یہی غنیمت ہے کہ پولیس اتنی مستعد تو ہوگئی ہے کہ ایسے علاقے سے اتنی جلدی اطلاع بھی مل گئی اور لاش منتقل بھی ہوگئی۔۔۔ پولیس نے ابتدائی معائنہ بھی کرلیا ورنہ عین ممکن تھا کہ چار دن تک کامران کا شناختی کارڈ ہی دریافت نہ ہو پاتا۔ اس کے بعد چار دن تک یہ طے نہ ہو پاتا کہ اس کا ایڈریس درحقیقت کس تھانے کی حدود میں آتا ہے۔ اس کے بعد چار دن تک لاش میگھانی سے یہاں بھجوانے کے لیے ایمبولینس یا دوسری گاڑی وغیرہ کا بندوبست نہ ہو پاتا۔ غرضیکہ بہت کچھ ہوسکتا تھا۔"

"تم جیسے بدگمان اور بدزبان آدمی بھی دنیا میں کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔" وہ ترحم آمیز سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"اچھا یہ بتاؤ تمہیں یہ بات بھی وہیں کے تھانیدار نے بتائی ہے کہ کامران تنہا میگھانی پہنچا تھا۔۔۔ اس کے ساتھ کوئی نہیں تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اسے ویسے تو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔" رحیم گل نے جواب دیا "لاش ملنے کے بعد وہ جتنی بھی معلومات حاصل کرسکا تھا وہ اس نے مجھے منتقل کردی تھیں۔ اگر میرے کسی سوال کا جواب اس کے پاس نہیں تھا تو اس نے بعد میں فون کرکے اس کا جواب مہیا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے بہت تعاون کیا۔ اچھا پولیس آفیسر معلوم ہوتا ہے۔"

"تمہاری طرح۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میری طرح ہونا تو خیر بہت مشکل ہے۔" وہ اطمینان سے بولا "اس کے لیے تو بڑی ریاضت کی ضرورت ہے البتہ اگر وہ مجھ جیسا بننے کی کوشش کررہا ہو تب بھی بڑی بات ہے۔ اسے ابتدا میں ہی دانتوں پسینے آگئے ہوں گے۔"

"اسے کہتے ہیں کمال ڈھٹائی کے ساتھ خودستائشی میں جتلا ہونا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "جاہل سے جاہل قسم کا خود پرست بھی ایسی بات کرتے وقت تھوڑی بہت انکساری کا اظہار کرلیتا ہے۔"

"میں نے تو تمہیں کبھی انکساری کا اظہار کرتے نہیں دیکھا۔" وہ معصومیت سے بولا۔

"میری بات چھوڑو۔ میں تو تم سے بھی بڑا جاہل ہوں۔ تم سے بھی زیادہ خود پرست ہوں۔" میں نے کہا۔

"شکر ہے تم نے اعتراف تو کیا۔" اس نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔

"اس کے ساتھ تمہاری طرف سے بھی اعتراف ہوگیا کہ میرے بعد تمہارا ہی نمبر ہے۔" میں نے کہا "دو عظیم آدمیوں کے ان عظیم اعترافات کے بعد یہ بتاؤ کہ تم مزید تفتیش کے لیے میگھانی کب جارہے ہو؟"

"میرا جانا تو کافی دنوں تک ممکن نہیں ہے۔ شاید میں دو یا تین افراد پر مشتمل پولیس پارٹی بھیج دوں۔" رحیم گل نے جواب دیا۔

"کامران کا خط پڑھ کر بھی تمہارا تجسس بیدار نہیں ہوا؟ اس نے لکھا ہے کہ وہ اتفاقاً ہی کسی بہت پُراسرار سلسلے کے قریب پہنچ گیا تھا اور وہاں کوئی بہت بڑی گڑبڑ جاری ہے۔"

رحیم گل منہ بنا کر بولا "میں اب محسوس کررہا ہوں کہ تمہارا یہ کامران مرحوم خاصا چُغد قسم کا نوجوان تھا۔ میں محض اس کے دیے ہوئے اشاروں پر اپنا قیمتی وقت برباد کرنا نہیں چاہتا۔ میگھانی اور اس کے گردونواح کا علاقہ میرا دیکھا ہوا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ وہاں کوئی بہت "پُراسرار سلسلہ" اور بہت "بڑی گڑبڑ" ہوسکتی ہے۔ معلوم نہیں اس بے چارے کے نظریات اور معیار کیا رہے ہوں۔ اس کی نظر میں جو سلسلہ "بہت پُراسرار" اور جو گڑبڑ "بڑی گڑبڑ" رہی ہو شاید دوسروں کی نظر میں وہ بالکل معمولی باتیں ہوں۔ اس کی موت کے بعد اب صورتِ حال بہت بدل گئی ہے۔ میں یونہی موہوم امکانات کے سہارے اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارتے پھرنا افورڈ نہیں کرسکتا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں یہاں کیسے کیسے سنگین معاملات میں پھنسا ہوا ہوں۔"

"مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے۔ میں تو پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ پولیس کے محکمے کا سارا بوجھ ہی تمہارے نازک کندھوں پر ہے۔ اگر تم نہ ہوتے تو شاید پولیس کا محکمہ ہی نہ ہوتا۔ دنیا کتنے سکھ میں ہوتی۔" میں نے حسرت سے ٹھنڈی سانس لی۔

"بُرا یا بھلا۔۔۔ جیسا بھی ہے۔۔۔ اگر یہ محکمہ بھی نہ ہوتا تو تم جیسوں کی عقل ٹھکانے آجاتی۔ بلبلاتے ہوئے جنگلوں کی طرف بھاگتے دکھائی دیتے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا "میں اب چلتا ہوں۔"

"یہی ہم دونوں کے حق میں بہتر ہے۔" میں نے فوراً کہا "کامران کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بارے میں مجھے بتانا مت بھولنا۔"

"ہرگز نہیں حضور والا! میں ایسی غلطی کیسے کرسکتا ہوں۔" وہ جل کر بولا۔

"ظاہر ہے۔۔۔ ابھی تمہیں نوکری کرنی ہے۔" میں نے متانت سے سرہلایا۔

وہ خونخوار نظروں سے مجھے دیکھتا ہوا رخصت ہوچکا تو میں نے آنکھیں بند کرکے کرسی کے پشتے پر سرٹکالیا اور چشمِ تصور سے ایک بار پھر کامران کی لاش کو دیکھنے لگا۔ میرے دل میں اداسی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ وہ واقعی ایک بدنصیب نوجوان تھا اور بہت ہی عجیب وقت پر ایک دل خراش انجام سے دوچار ہوا تھا۔ اس کی موت اسے کراچی سے دوڑا کر میگھانی لے گئی تھی۔ معلوم نہیں وہ کس معاملے کی ٹوہ میں لگ گیا تھا اور کس طرح موت کے منہ میں جا پہنچا تھا۔ اس کا خط رحیم گل میرے سامنے میز پر ہی چھوڑ گیا تھا۔ یہ خط بھی اس نے یقیناً چھپ چھپا کر نہایت رازدارانہ طریقے سے لکھا تھا۔ رحیم گل نے مجھے بتایا تھا کہ میگھانی میں فون موجود تھے لیکن اس نے مجھے فون کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خط بھی اس نے شاید میگھانی سے پوسٹ نہ کیا ہو۔ اس کا اندازِ تحریر بتا رہا تھا کہ وہ سخت احتیاط کررہا تھا اور خوفزدہ بھی تھا۔ وہ کس سے خوف زدہ تھا اور کیوں اتنی احتیاط کررہا تھا؟ اس بدنصیب کا میرے خیال میں مجھ پر اتنا حق ضرور بنتا تھا کہ میں ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ اگر وہ مجھے یہ خط لکھنے کے بجائے خود چلا آتا تو شاید اس وقت اس کی کٹی پھٹی لاش لاوارث سے انداز میں اسپتال کے مردہ خانے میں نہ پڑی ہوتی۔ شاید وہ اس وقت ایک ارب پتی کی حیثیت سے نئی زندگی شروع کرنے کے لیے تیاریوں اور بھاگ دوڑ میں مصروف ہوتا۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اگر قدرت نے اس کے لیے یہ انجام لکھ دیا تھا تو پھر اسے کون بدل سکتا تھا!

ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا۔ دوسری طرف شفیع شاہ تھا۔ وہ اپنے مخصوص دھیمے اور پُرسکون انداز میں بولا "سر! آپ نے ڈیفنس کے ایک بنگلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی ذمے داری مجھے سونپی تھی، اس کی رپورٹ حاضر ہے۔ میں نے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"اسی لیے تو میں نے یہ کام تمہارے سپرد کیا تھا۔" میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ اس بنگلے کی بات کررہا تھا جس میں ایک ادھیڑ عمر مرد اور جمشید کریم کے دفتر میں کام کرنے والی نوجوان خوب صورت لڑکی کو جاتے دیکھ کر میں نے خود بھی کچھ دیر نگرانی کی تھی۔ وہ دونوں ایک مہنگے شاپنگ سینٹر میں شاپنگ کرنے اور ایک عمدہ ساحلی ریستوران میں کھانا کھانے کے بعد وہاں پہنچے تھے۔

"سر! وہ بنگلا تو اسی تحقیقاتی ایجنسی کے ایک اعلیٰ افسر کا ہے جو جمشید کریم کی امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں تحقیقات کررہی ہے۔" شفیع شاہ نے بتایا "اور ان دنوں اس میں مستقل طور پر درحقیقت کوئی بھی نہیں رہ رہا ہے۔ پہلے یہ کرائے پر اٹھا ہوا تھا اب اس میں کرائے دار بھی نہیں ہیں۔ صرف یہ افسر صاحب کبھی کبھی چند دنوں کے لیے آکر ٹھہرتے ہیں اور کوئی نئی لڑکی ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ دراصل وہی چند دن اس میں قیام کرتی ہے۔ افسر صاحب اس دوران میں آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی پوری رات بھی یہیں گزارتے ہیں۔ چند دن بعد دونوں غائب ہوجاتے ہیں۔ کچھ وقفے کے بعد افسر صاحب پھر کسی نئی لڑکی کے ساتھ نمودار ہوتے ہیں اور یہی معمول دہرایا جاتا ہے۔"

"نام کیا ہے ان افسر صاحب کا؟" میں نے مزید سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آئی۔ کے درانی۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"شادی شدہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔۔۔ اچھے بھلے بڑے بڑے بچے ہیں اس کے۔" شفیع شاہ نے جواب دیا۔

"اس کی اپنی اصل رہائش کہاں ہے؟ کیا یہ بیوی بچوں کے ساتھ نہیں رہتا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"اصل رہائش بیوی بچوں کے ساتھ ہی ہے۔ سرکاری طور پر رہائش کے لیے سوسائٹی میں بنگلا ملا ہوا ہے لیکن شہر کے کئی پوش علاقوں میں اس سے کہیں بہتر کئی بنگلوں کا مالک ہے۔ وہ سب عزیزوں، رشتے داروں کے ناموں پر ہیں۔ زبردست پیدا گیر افسر ہے لیکن بہت شاطر ہے۔ کبھی کوئی واضح ثبوت نہیں چھوڑتا اور شاید بہت اوپر تک لائن سیٹ کی ہوئی ہے۔ کبھی گرفت میں نہیں آیا، کبھی اس کے خلاف کوئی انکوائری نہیں ہوئی۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"اور ایسا افسر امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں تفتیش کا انچارج ہے جس پر ملک کے حساس اداروں کو اسلحے کی انڈر گراؤنڈ مارکیٹنگ کا شبہ ہے۔۔۔!" میں نے تلخ لہجے میں کہا "ستم ظریفی ہے جس کمپنی کے بارے میں وہ تحقیقات کررہا ہے اس میں "نامعلوم" قسم کی خدمات انجام دینے والی ایک خوب صورت لڑکی اس کے ساتھ اس کے بنگلے پر رہ رہی ہے اور وہ اسے شاپنگ بھی کرا رہا ہے!"

"ہمارے ہاں اکثر ادارے اکثر معاملات کی جو بھی تحقیقات کرتے ہیں ان میں سے بیشتر میں اندرونِ خانہ یہی کچھ یا اس سے ملتی جلتی دوسری حرکتیں ہو رہی ہوتی ہیں۔ اسی لیے اکثر تحقیقات کا جو انجام ہوتا ہے ان پر ایک دردمند انسان صرف رو سکتا ہے۔" شفیع شاہ بولا "اگر کبھی کبھار حقیقت سے قریب کوئی رپورٹ تیار بھی ہوجاتی ہے تو اوپر جاکر اس کا جو انجام ہے وہ اس سے بھی زیادہ افسوس ناک ہوتا ہے۔"

میں ایک لمحے کے لیے غیر ارادی طور پر خاموش رہا۔ دل میں وہی تاسف ابھر آیا تھا جو اکثر بہت زیادہ سوچ بچار میں الجھا دیتا ہے۔ ایک طرف ہر چھوٹے سے بڑا افسر نظام کی ایسی تیسی [illegible]

تھا۔ ایک طرف لیڈر نہ جانے کیسے کیسے بھیانک جھوٹ کے نقاب پہن کر لوگوں کو بے وقوف بنانے اور جانوروں کی طرح ایک دوسرے سے لڑوانے میں مصروف تھے۔ دوسری طرف خود عوام بھی کچھ کم نہیں تھے۔ کچھ میں تو ویسے ہی جہالت اور تنگ نظری نسل در نسل منتقل ہورہی تھی۔ کچھ وہ خود بھی اس سے پیچھا چھڑانے کو تیار نہیں تھے۔ وہ خود بھی حسبِ توفیق اپنے پیروں پر کلہاڑی چلانے کے عمل کو دل وجان سے آگے بڑھاتے تھے اور جس کا جہاں تک بس چلتا تھا وہاں تک وہ بھی اس افراتفری، لوٹ مار میں سے کچھ نہ کچھ کھسوٹنے، کچھ نہ کچھ کر گزرنے کی فکر میں تھا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ سب طبقات ہر بُرے کام کو اپنا حق سمجھ کر کررہے تھے۔ کسی زمانے میں یہ سب کچھ کرتے وقت لوگ اور کچھ نہیں تو کم از کم تھوڑا سا شرمسار ہی ہولیا کرتے تھے۔ اب تو ہر بُرا کام اعلانیہ اور فخریہ کیا جارہا تھا۔ نظام کی ایسی تیسی کرنے میں ہر کوئی حسبِ توفیق کچھ ایسے "خشوع وخضوع" سے ہاتھ بٹا رہا تھا جیسے یہ اس کا اولین اخلاقی اور سماجی فرض تھا۔ ظاہر ہے ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔ اور میرا اندازہ تھا کہ ہم تو حد سے بھی آگے گزر چکے تھے۔ ہمیں کسی طاقت کی مہربانی سے کوئی اضافی مہلت ملی ہوئی تھی لیکن آخر کبھی نہ کبھی ہر قسم کی مہلت ختم ہوجاتی ہے۔ ڈھانچے زمین بوس ہوجاتے ہیں۔ بہت سے عظیم الشان دور قصۂ پارینہ بن جاتے ہیں۔ میں اسی وقت کی آمد سے ڈرتا تھا۔۔۔ اور وہ مجھے زیادہ دور دکھائی نہیں دیتا تھا۔

امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن نے شاید رشوت میں صرف ایک خوب صورت لڑکی ہی درانی کے ہمراہ نہیں کی تھی، بھاری رقم بھی پیش کی ہوگی۔ بڑے نوٹوں کی جو گڈی نکال کر وہ بے نیازی سے لڑکی کی شاپنگ کی ادائیگی کررہا تھا، ممکن تھا وہ گڈی بھی اسی رقم میں سے ہو۔ رقمیں کہاں سے آتی تھیں، کہاں کہاں گھومتی ہوئی کہاں جاتی تھیں، یہ بھی ایک عجیب شیطانی چکر تھا۔ اگر کسی کو قریب سے اس کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملتا تو شاید اس پر بھی نظامِ قدرت کے کچھ عجیب وغریب پہلو واضح ہوتے۔

"لڑکی کے بارے میں کچھ معلومات ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ وہ کھارادر کے دو کمروں کے ایک تنگ وتاریک فلیٹ سے نکلی ہے اور کچھ ہی عرصہ پہلے کلفٹن کے ایک اچھے اور مہنگے اپارٹمنٹ میں پہنچی ہے۔ ترقی کا سفر ابھی جاری ہے۔ اس کا کنبہ کئی افراد پر مشتمل ہے۔ لگتا ہے سب خاموشی سے اس کے ہم سفر ہیں۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"میرا خیال ہے امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن میں اس کا مصرف یہی ہوگا؟"

"میرے خیال میں تو جمشید کریم کے ہاں جو تین چار لڑکیاں موجود ہیں سبھی کا مصرف یہی ہے۔" شفیع شاہ کے لہجے میں ہلکی سی تلخی اور ہلکی سی سفاکی تھی۔ مجھے غزل یاد آئی۔ وہ بھی جمشید کریم کے دفتر میں مجھ سے ٹکرائی تھی۔ وہ تو بہت ہی باذوق اور نفیس لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ پھر میں نے سوچا باذوق اور نفیس لوگ تو ہر لائن میں پائے جاسکتے ہیں۔

شفیع شاہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس لڑکی کا نام تہمینہ ہے۔ شاید کچھ افسوس کی سی بات ہے کہ وہ خاصی پڑھی لکھی ہے۔ اس نے فلسفے میں ایم اے کیا ہوا ہے۔"

"شاید بہت سی تلخیوں سے گزرنے کے بعد زندگی کا فلسفہ بھی اس کی سمجھ میں آگیا ہو۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا "شاید یہ "وِش فل تھنکنگ" ہے کہ ہم اسے لالچ اور ہوس کے بجائے مجبوریوں کی غلام پائیں۔ خیر۔۔۔ یہ تو ضمنی باتیں بیچ میں آگئیں۔ یہ بتاؤ لڑکی ابھی اسی بنگلے میں رہ رہی ہے؟"

"جی ہاں۔۔۔ ہماری نگرانی کے دوران میں وہ صرف ایک مرتبہ تھوڑی دیر کے لیے درانی کی عدم موجودگی میں اس کے ڈرائیور کے ساتھ اپنے کلفٹن والے اپارٹمنٹ میں گئی تھی۔ شاید اپنا جمع کیا ہوا کچھ سازوسامان پہنچانے۔" شفیع شاہ نے جواب دیا "میرا خیال ہے اب تو وہ صرف اسی وقت وہاں سے نکلے گی جب درانی کا اس سے دل بھر جائے گا۔۔۔ یا شاید دل بھرنے سے پہلے ہی وہ کسی اور وجہ یا مصلحت کے تحت اسے رخصت کردے گا۔ بہرحال وہ اپنا مقصد پورا کرکے جائے گی۔ تحقیقاتی رپورٹ اب بدل جائے گی۔ کچھ کی کچھ ہوجائے گی۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "شفیع شاہ! تم ایک کام کرو۔۔۔ بلکہ اپنے علاوہ بھی کچھ لوگوں کو اس کام پر لگادو۔ جن لوگوں نے یہ معلومات جمع کرنے کے سلسلے میں کام کیا ہے وہی اس کام کے لیے بھی موزوں رہیں گے۔ کام صرف یہ ہے کہ درانی کے مختلف رشتے داروں کے نام پر جو مہنگے مہنگے بنگلے ہیں ان کی ملکیت کے کاغذات کی فوٹو کاپیاں حاصل کرنی ہیں۔ نیز اگر درانی سے ان کی رشتے داری کا کوئی مبہم سا بھی ثبوت مل جائے تو وہ بھی بہتر ہے۔ یہ کام مشکل تو نہیں ہے؟"

"ہرگز نہیں سر!" شفیع شاہ اطمینان سے بولا "کام مشکل ہو تب بھی اسے چھوڑا تو نہیں جاسکتا۔ اگر کام ناگزیر ہو تو اسے کرنا ہی پڑتا ہے۔ چاہے وہ مشکل ہو یا آسان۔ اس قسم کے کام تو کہیں تھوڑی بہت رقم خرچ کرکے۔۔۔ اور جہاں رقم سے بات نہ بنے وہاں تھوڑی بہت دھونس دھمکی سے ہوجاتے ہیں۔"

"کوشش کرو کہ چند دن کے اندر اندر یہ کام ہوجائے۔ اس دوران میں اگر درانی کی کرپشن کے کچھ اور ثبوت بھی ہاتھ آسکیں تو وہ بھی جمع کرلو۔" میں نے ہدایت کی۔

"مقصد یہ کہ درانی کی فائل تیار کرنی ہے۔" شفیع شاہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "جب یہ محض مالی بے ضابطگیوں یا ٹیکس چوری پر دوسروں کی چھوٹی بڑی فائلیں تیار کرسکتے ہیں تو ان

کے عظیم الشان کارناموں کی فائلیں بھی تو تیار ہونی چاہئیں۔ ہماری فائل ذرا زیادہ رنگین، سنگین، زیادہ جی اور باتصویر ہوگی۔ تم ایک چھوٹا کیم کارڈ اور انفراریڈ اسکوپ بھی تیار رکھو۔ اگر موقع مل گیا تو شاید آج رات ہی تھوڑی سی شوٹنگ ہو جائے۔ یہ ذرا مشکل کام ہے۔ صرف تم اور میں کریں گے۔"

"غالباً اِن ڈور شوٹنگ ہوگی؟" شفیع شاہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسا۔

"ہاں... بلکہ کچھ زیادہ ہی اِن ڈور ہوگی۔ ظاہر ہے آؤٹ ڈور شوٹنگ میں تو کچھ ہاتھ آنے سے رہا۔" میں نے کہا۔

"آپ نے درانی کو اچھی طرح ہی گھیرنے کا پروگرام بنالیا ہے۔"

"یہ اہم پوسٹ پر بیٹھا ہوا گھاگ افسر ہے۔ اس کو گھیرنے سے یقیناً کچھ سنسنی خیز انکشافات سامنے آئیں گے۔ اس نے زندگی میں نہ جانے کتنے بڑے بڑے لوگوں کو ہراساں کیا ہوگا اور اپنا مطلب پورا ہونے پر نہ جانے کیسے کیسے سنگین رازوں کو اپنے کسی ذاتی قبرستان میں دفن کردیا ہوگا یا پھر طویل عرصے تک ان کا خراج وصول کرتا رہا ہوگا۔ اس پر ذرا مضبوطی سے ہی ہاتھ ڈالنا پڑے گا۔ یہ آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔ گرگِ باراں دیدہ قسم کی چیز ہوگا۔ تم اگر متعلقہ محکموں سے اس کی جائداد کے کاغذات کی نقلیں نکلوالو گے اور پھر ہم تھوڑی سی "شوٹنگ" کرلیں گے تو کام کافی آسان ہوجائے گا۔"

"کاغذات کی نقول میں جلدی حاصل کرلوں گا۔ یہ زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ اخباری لوگ بھی کسی نہ کسی انداز میں یہ کام کرتے رہتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ اکثر اس قسم کے ثبوت ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں ہم انہیں اجتماعی اور تعمیری مقصد کے لیے استعمال کریں گے۔" شفیع شاہ بولا۔

"کبھی کبھی اخباری لوگ بھی ایسے اسکینڈلز کو منظرِ عام پر لاتے ہیں اور اس سے اجتماعی فائدہ ہوتا ہے۔ قوم کی پیٹھ پر سوار کسی پیر تسمہ پا قسم کے کرپٹ افسر سے جان چھوٹ جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"عام طور پر وہ لوگ اس وقت ایسا کرتے ہیں جب وہ راز ویسے بھی راز نہیں رہا ہوتا اور اس وقت بھی عموماً انہیں کوئی ذاتی عناد، ذاتی غرض یا ذاتی نقصان ہی ایسا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ قومی اور اجتماعی سوچ ہمارے کسی بھی شعبے میں ذرا کم ہی پائی جاتی ہے۔"

"خیر... ان تمام خرابیوں کے ساتھ ہی ہمیں اپنی بساط کے مطابق کام کرتے رہنا ہے۔" میں نے کہا "تم کیمرے وغیرہ کا بندوبست کرکے مجھے اطلاع دینا۔"

"وہ سب چیزیں تو موجود ہیں سر!" شفیع شاہ بولا "میں انہیں گاڑی میں رکھ لوں گا۔ اصل کام مناسب موقع کا انتظار کرنا ہے۔ مناسب موقع ہمیں آج رات بھی ہاتھ آسکتا ہے۔"

"تم مجھے کسی وقت بھی اطلاع دے سکتے ہو۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر! جونہی مجھے شوٹنگ کے لیے سیٹ تیار ہوتا دکھائی دے گا، میں فون کرکے ڈائریکٹر کو بلوالوں گا جو اتفاق سے چیف کیمرا مین بھی ہوگا۔" شفیع شاہ قدرے شریر سے لہجے میں بولا۔

"ضروری نہیں ہے کہ ڈائریکٹر، چیف کیمرا مین بھی ہو۔ تم دہری ذمے داری مجھ پر ڈالنے کی کوشش مت کرو۔ یہ کچھ گھٹیا سا کام ہے۔ شاید یہ تمہیں ہی انجام دینا پڑے۔" میں نے کہا۔

"سر...! یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" وہ خفگی آمیز سے لہجے میں بولا "اب آپ گھٹیا قسم کے کام میرے سپرد کرنے لگے ہیں؟"

"یہ ایک ایسا گھٹیا کام ہے جس کے لیے بہت بڑھیا آدمی کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"آپ میرا دل رکھنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن خیر۔" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"ابھی سے مغموم ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے مربیانہ لہجے میں کہا "ابھی تو یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ صورتِ حال کیا ہوگی۔ تم سے مجھے ایک اور ضروری کام بھی ہے۔ ایک ساحلی قصبہ ہے... میگھانی... اس کے بارے میں مجھے زیادہ سے زیادہ معلومات جمع کرکے دو۔ کبھی اس جگہ کا نام سنا ہے؟"

وہ ایک بار پھر اپنے مخصوص دھیمے انداز میں ہنسا "اس کے بارے میں معلومات جمع کرنے کے لیے مجھے کہیں جانے کی ضرورت تھوڑا ہی پڑے گی۔ اس کے بارے میں تو میں خود ایک مرقع معلومات ہوں۔ کسی زمانے میں ہمارے اپنے فشنگ ٹرالر میگھانی کی کھاڑی تک جاتے رہے ہیں۔ بعد میں کچھ مسائل کی وجہ سے میں نے انہیں ادھر جانے سے روک دیا تھا۔ ہمیں کچھ ایسی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ میرا دیکھا ہوا علاقہ ہے۔ وہاں کے بارے میں ہر بات مجھے معلوم ہے۔"

"یہ تو بہت بڑا مسئلہ حل ہوگیا۔" میں نے سچ مچ بڑی طمانیت محسوس کرتے ہوئے کہا "اس سلسلے میں تو تمہارے ساتھ میٹنگ رکھ کر ہی کام چل جائے گا۔"

"کیا وہاں بھی کوئی کام آن پڑا ہے؟" اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"ابھی میں صحیح طور پر کچھ کہہ نہیں سکتا۔ میں اس سلسلے میں سوچ رہا ہوں اور کچھ انتظار کررہا ہوں۔ شاید وہاں کے لیے بھی باقاعدہ کوئی پروگرام بنانا پڑے۔" میں نے جواب دیا۔ حقیقت یہی تھی کہ ابھی اس ضمن میں میرے ذہن میں ابہام تھا لیکن میں کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہا تھا۔

"اور کوئی حکم؟" شفیع شاہ نے دریافت کیا۔

"فی الحال کچھ نہیں۔" میں نے کہا "میں تمہاری آئندہ ٹیلی فون کال کا منتظر رہوں گا۔"

اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میں نے ابھی ریسیور رکھا ہی تھا کہ میرے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس فون پر میرے ہیلو کہتے ہی دوسری طرف اطمینان بھرے انداز میں گہری سانس لی گئی پھر ہلکی سی کھانسی کے ساتھ کہا گیا "خدا کا شکر ہے کہ تم شہر میں ہی موجود ہو۔"

وہ سیٹھ واحد تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اگر میں شہر میں موجود نہ ہوتا تو کیا کوئی بڑا نقصان ہوجاتا؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ نقصان تو تمہارے موجود ہوتے ہوئے بھی ہوچکا ہے۔" اس کے لہجے سے بہت سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ میری دھڑکن ایک لمحے کے لیے تیز ہوئی لیکن میں خاموش رہا۔ ذرا توقف کے بعد وہ خود ہی بولا "ابھی ابھی ایک خبر مجھ تک پہنچی ہے جو اگر سچی ہوئی تو بہت افسوسناک ہوگی۔ اس کی تصدیق یا تردید کے لیے میرے آدمی ٹیلی فونز پر مصروف ہیں لیکن میں نے سوچا اتنی دیر میں تم سے بات کرلوں۔ شاید کسی اتفاق کے تحت تمہیں اس سلسلے میں کوئی صحیح اطلاع مل چکی ہو۔"

"بات کیا ہے؟ بلا تمہید بتاؤ نا... اتنا سسپنس کیوں پیدا کررہے ہو۔" میں نے مصنوعی خوش مزاجی سے کہا۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ سرکاری اسپتال میں ایک لاش آئی ہے۔ مرنے والے کا نام کامران دانش بتایا جارہا ہے۔ کیا یہ درست ہے؟ تم اس کی تردید یا تصدیق کرسکتے ہو؟" اس کے لہجے میں اضطراب تھا۔

میں ایک لمحے خاموش رہا۔ میری خاموشی تاسف کی خاموشی بھی تھی اور حیرانی کی بھی۔ تاسف تو کامران کے انجام کا تھا اور حیرانی سیٹھ واحد کے اس قدر باخبر ہونے پر تھی۔ اس شخص کے وسائل اور ذرائع یقیناً حیرت انگیز تھے۔ اس سے بات چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایک تو مجھے اس میں اب کوئی مصلحت نظر نہیں آرہی تھی دوسرے ویسے بھی جس شخص کو اتنی جلدی یہ اُڑتی اُڑتی سی خبر مل گئی تھی اس کے لیے اصل اور پوری بات معلوم کرلینا بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس کے آدمی حرکت میں آچکے تھے۔ صرف چند سیکنڈ یا چند منٹ کی بات تھی کہ سارا معاملہ اس کے علم میں آجاتا۔ یوں بھی اسے اطلاعات فراہم کرنے والے نہ جانے کہاں کہاں بیٹھے تھے۔ تبھی تو یہ خبر... مبہم انداز میں ہی سہی، لیکن اتنی جلدی اس تک پہنچ تو گئی تھی۔

"تمہاری خاموشی اس خبر کی تصدیق کررہی ہے۔" سیٹھ واحد بولا۔ وہ دیکھنے میں اول جلول سا آدمی دکھائی دیتا تھا لیکن یقیناً اول جلول تھا نہیں۔ اڑتی چڑیا کے پر گننا بھی جانتا تھا اور پر کاٹنا بھی۔

"تمہیں صحیح اطلاع ملی ہے سیٹھ واحد!" بالآخر میں نے گہری سانس لے کر کہا "میں چند منٹ پہلے ہی اس کی لاش دیکھ کر آیا ہوں۔ وہ اسی کامران دانش کی لاش ہے جس کی تمہیں تلاش تھی۔"

وہ ایک لمحے کچھ بھی نہ بول سکا اور میرا اندازہ تھا کہ یہ اس پر بہت بڑا صدمہ گزر جانے کی نشانی تھی۔ وہ بڑے بڑے نقصانات اور صدموں کا بظاہر کوئی نوٹس نہ لینے والا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن اگر وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی اندرونی حالت اچھی نہیں تھی اور وہ اس صدمے سے سنبھلنے کی کوشش کررہا تھا۔

"تم نے فوری طور پر مجھے اطلاع نہیں دی افضل!" اس کی آواز بالآخر ابھری۔ اس کے لہجے میں خفیف سا شکوہ تھا۔

"میں ابھی اس کے لیے ہمت جمع کررہا تھا۔" میں نے جواز گھڑا "اس کے علاوہ میری دو تین ٹیلی فون کالز آگئی تھیں۔ میں مختصر گفتگو کرکے ان سے جان چھڑانے کی کوشش کررہا تھا۔ ابھی میں اس کوشش میں کامیاب ہی ہوا تھا کہ تمہارا فون آگیا۔"

اس نے ہنکارا بھرا اور غالباً اپنے شکوے کو طول نہ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ دوبارہ بولا تو اس کے لہجے سے بوجھل پن غائب ہوگیا تھا۔ صرف ایک مبہم سا تاسف رہ گیا تھا "قدرت نے اس کے ساتھ بھی ایک مذاق کیا اور ہمارے ساتھ بھی۔" یہ کہہ کر اس نے ایک طویل سانس لی اور گویا اس صدمے کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی "بہرحال... جو ہونا تھا وہ تو ہوچکا۔ کامران اس دنیا میں کسی بھی مقام پر ہوتا تو اسے واپس لایا جاسکتا تھا لیکن جہاں وہ جاچکا ہے وہاں سے اسے واپس نہیں لایا جاسکتا بلکہ اگر غلطی سے ہم بھی وہاں چلے گئے تو واپس نہیں آسکیں گے۔ اس لیے بہتر ہے یہیں رہتے ہوئے اپنے دوسرے مسائل کو دیکھنے کی کوشش کریں۔"

"یہ تم نے عقل مندی کی بات کی ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں ایک بے وقوفی کا کام بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

"وہ کیا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"اسے تم سانپ گزر جانے کے بعد لکیر پیٹنا کہہ سکتے ہو۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا "کامران کو تو جیسے اور جس وجہ سے بھی مرنا تھا وہ مرچکا لیکن میں اس کی تفصیلات جاننا چاہتا ہوں۔ میں اپنے طور پر تو کوشش کروں گا ہی... لیکن اگر تمہیں اس سلسلے میں کچھ معلوم ہے تو دوستی اور اپنائیت کے اس بے عنوان رشتے کے تحت بتاؤ جو میرے اور تمہارے درمیان قائم ہوچکا ہے۔"

میں ابھی اس رشتے کے بارے میں تو کچھ زیادہ پُریقین نہیں تھا لیکن میں نے اسے اس سلسلے میں اس حد تک بتانے میں کوئی حرج نہ سمجھا جس حد تک وہ پولیس اور اسپتال وغیرہ میں موجود اپنے ذرائع سے معلوم کرسکتا تھا البتہ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ کامران کی طرف سے آج ہی مجھے ایک خط بھی موصول ہوا تھا۔ جس طرح شیر کی خالہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے شیر کو درخت پر چڑھنا نہیں سکھایا تھا اور ایک داؤ بچا کر رکھا تھا اس

طرح میں بھی بعض لوگوں کو پوری بات نہیں بتاتا تھا۔ ایک آدھ بات صرف اپنے تک محدود رکھتا تھا۔

اس نے ساری بات خاموشی سے سنی پھر بولا "کیا واقعی یہ کامران کی لاش میگھانی سے آئی ہے؟ یہ سب کچھ میگھانی میں ہوا ہے؟" اس کے لہجے سے بے یقینی سی جھلک رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے یہ بے یقینی کچھ عجیب سی لگی۔

"یہ مصدقہ سرکاری رپورٹ ہے۔" میں نے کہا "تمہیں اس پر حیرت کیوں ہے؟ کیا میگھانی میں ایسا نہیں ہوسکتا تھا... یا نہیں ہونا چاہیے تھا؟"

"نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ جیسے کچھ کہتے کہتے رک گیا اور شاید اسی لیے اسے کھانسی آگئی۔

"شاید وہ تمہاری دوستی اور اپنائیت کے بے عنوان رشتے والی بات محض مکالمے بازی ہے۔ مجھے لگ رہا ہے اس رشتے کے دعوے کے باوجود تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"بدگمان ہونے کی ضرورت نہیں میری جان!" وہ مشفقانہ لہجے میں بولا "میں کچھ نہیں چھپا رہا ہوں۔ چھپانے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں... میں تو فی الحال صرف حیران ہورہا ہوں۔ زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہورہی ہے کہ اس احمق کامران کو بھاگ کر جانے کے لیے یہی جگہ ملی تھی.....؟"

"میں تو اس بات کا قائل ہوگیا ہوں کہ آدمی خود کہیں نہیں جاتا، اسے تقدیر لے جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ یہ تم نے سولہ آنے صحیح بات کی ہے۔" پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "خیر... اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس سلسلے میں کیا کیا جاسکتا ہے... اب پرنس انڈسٹری کو کس راستے سے خریدا جاسکتا ہے... یا پھر ہمیں یہ آئیڈیا ہی ڈراپ کردینا چاہیے۔ مجھے اپنے ساتھیوں سے ٹیلی فون کانفرنس کرنی پڑے گی۔ ان میں سے دو تین ملک سے باہر ہیں۔"

"تم ان مسائل پر غور کرو۔ مجھے کچھ اور مسائل پر غور کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"مثلاً...؟" اس نے جاننا چاہا۔

"فی الحال اس سوال کو جانے دو۔" میں نے اسے ٹالا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میگھانی کے معاملے میں اس نے بھی مجھے ٹالا تھا۔ وہ اس جگہ کا نام سن کر یقیناً چونکا تھا لیکن اس نے مجھے اپنے چونکنے کی صحیح وجہ نہیں بتائی تھی۔

"چلو... جانے دیتے ہیں۔" وہ خوش مزاجی سے بولا پھر اس نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔

اس کے بعد میں دیر تک بیٹھا صفیہ کو کامران کے بارے میں مطلع کرنے کا ارادہ کرتا رہا لیکن میں نے اپنے اندر اس کی جرأت محسوس نہ کی۔ آخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ جب اسے پولیس یا اخبارات کے ذریعے اس بات کا پتا چلے گا اور وہ مجھ سے رابطہ کرے گی تو میں یہی ظاہر کروں گا کہ مجھے بھی اسی وقت پتا چلا ہے۔

اسی رات میں اپنے ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں کھانا کھاتے ہوئے آئندہ کے لائحۂ عمل کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ موبائل فون پر شفیع شاہ کی کال موصول ہوئی۔

"سر! آپ فوراً آجائیں۔" وہ بلا تمہید بولا۔

"کہاں آجاؤں بھئی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"لوکیشن پر۔" اس نے جواب دیا "لگتا ہے آج ہمیں سین شوٹ کرنے کا موقع مل جائے گا۔ حالات ہر لحاظ سے موافق اور سازگار معلوم ہوتے ہیں۔ ادھیڑ عمر ہیرو آج پھر نوجوان ہیروئن کو شاپنگ کرا کے لایا ہے۔ لگتا ہے یہ لڑکی عمر بھر کے لیے شاپنگ انہی دنوں میں کر ڈالے گی۔ دونوں نے آج ایک فور اسٹار ہوٹل میں کھانا بھی کھایا ہے۔ ہیرو مجھے کچھ ترنگ میں بھی لگتا ہے۔ کل ان کی ملاقات کا ناغہ بھی ہوچکا ہے۔ کل کی رات ہیرو نے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ گزاری ہے جبکہ ہیروئن اپنے گھر جانے کے بجائے بنگلے پر ہی شاید اس کا انتظار کرتی رہی۔ بہرحال آج پھر دونوں ساتھ ہیں اور بنگلے ہی کی طرف محوِ سفر ہیں۔ مجھے حالات ہر لحاظ سے موزوں محسوس ہورہے ہیں۔"

"بڑے بے ہودہ وقت پر تم نے یہ اطلاع دی ہے۔ میں اس وقت کھانا کھا رہا تھا۔"

"کھانا تو بعد میں بھی کھایا جاسکتا ہے سر!" شفیع شاہ بولا "آپ کو معلوم ہے نیشنل جیوگرافک سوسائٹی والے کبھی کبھی محض کسی کلی کے کھلنے کا چند سیکنڈ کا منظر فلمانے کے لیے یا کسی گینڈے کا اس کی گرل فرینڈ سے ملاقات کا چند منٹ کا شاٹ لینے کے لیے ہفتوں پہلے کسی خفیہ جگہ پر کیمرا فٹ کرکے انتظار کرتے رہتے ہیں لیکن اگر وہ خاص موقع ہاتھ سے نکل جائے تو ازسرِنو ساری محنت اور نہ جانے کتنا انتظار کرنا پڑتا ہے۔"

"اچھا اب تم اپنے آپ کو نیشنل جیوگرافک سوسائٹی والوں کے ساتھ ملانا مت شروع کردو، میں آرہا ہوں۔ سامان تمہارے پاس تیار ہے نا؟" میں نے دایاں ہاتھ نیپکن سے صاف کرتے ہوئے کہا۔ بائیں ہاتھ سے میں نے فون تھام رکھا تھا۔

"سب کچھ تیار ہے سر! حتیٰ کہ ہیرو ہیروئن بھی لوکیشن کے قریب پہنچ چکے ہیں اسی لیے تو آپ کو فون کررہا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ میں اکیلا یہ کام نہیں کرسکتا۔ ایک آدمی اگر کیمرامین کے فرائض انجام دے گا تو دوسرے کو گردوپیش پر نظر رکھنے اور کسی غیر متوقع رکاوٹ سے نمٹنے کے لیے قریب ہی موجود رہنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں چند منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں جتنا کھا چکا تھا اسی پر صبر کرتے ہوئے میں نے واش روم میں جا کر ہاتھ دھوئے اور چند لمحے بعد ہی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ میں نے زیادہ تیز رفتاری سے ڈرائیونگ کی ضرورت محسوس

نہیں کی، اس کے باوجود میں جلد ہی منزل پر پہنچ گیا کیونکہ رات گہری ہو چکی تھی اور ان علاقوں کی سڑکوں پر ٹریفک بہت کم رہ گیا تھا جن سے مجھے گزرنا تھا۔

درانی ان دنوں اپنے جس بنگلے کو عشرت کدے کے طور پر استعمال کر رہا تھا اس سے کافی دور سڑک کے کونے پر چھوٹی سی ایک کمرشیل بلڈنگ تھی جس کے نیچے دکانیں اور اوپر غالباً تینوں منزلوں پر دفاتر تھے۔ اس وقت دکانیں اور دفاتر سبھی بند تھے۔ عمارت تاریک نظر آرہی تھی۔ اس کے سامنے پارکنگ کے لیے مختصر مگر عمدہ جگہ موجود تھی جس کے سامنے سبزے کی چھوٹی سی باڑھ بھی موجود تھی۔ وہاں مجھے شفیع شاہ کی سفید گاڑی کھڑی نظر آگئی۔ وہ بہت دور سے مگر نہایت عمدہ جگہ سے بنگلے کی نگرانی کر رہا تھا۔ کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ اس گاڑی سے اتنی دور کے بنگلے کی نگرانی کی جارہی تھی۔ گاڑی میں اس کی موجودگی کا پتا بھی نہیں چل رہا تھا۔

میں نے گاڑی اس کے برابر لے جا روکی اور اپنی گاڑی سے اس کی گاڑی میں منتقل ہو گیا۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ پر تھا اور میری آمد کے بعد صحیح طور پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا "تم خود ہی نگرانی کا کام کر رہے ہو؟"

"نہیں سر! بے کار اور مکھی مار قسم کے کام کے لیے تو ایک اور آدمی کو لگایا ہوا ہے۔ وہ سڑک کے دوسرے کونے پر گاڑی میں ہے۔" شفیع شاہ نے بتایا "میں تو آج خاص طور پر اس مہم کے خیال سے ان کے پیچھے لگا تھا۔"

شفیع شاہ کی گاڑی میں ہی ہم نے گلی کا ایک چکر لگایا۔ میں نے دوسرے آدمی کو بھی دیکھ لیا۔ وہ بھی مناسب جگہ پر جما ہوا تھا۔ ہم نے پچھلی گلی کا بھی چکر لگایا۔ گاڑی پچھلی گلی میں رینگ رہی تھی۔ اس طرف سے بنگلے کی دیوار پھاند کر اندر گھسنا آسان تھا۔ میں نے شفیع شاہ سے کہا "کیا خیال ہے۔ کام شروع کر دیا جائے؟"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولا "وہ ابھی چند منٹ پہلے ہی تو گھر میں داخل ہوئے ہیں۔ ابھی گوہرِ مراد ہاتھ نہیں آئے گا۔"

"تمہیں اس قسم کے کاموں کا بہت تجربہ معلوم ہوتا ہے۔" میں نے اسے گھورا۔

"ہر معقول بات تجربے کی بنیاد پر ہی نہیں، عقل کے سہارے بھی کی جاسکتی ہے سر!" وہ دانشورانہ لہجے میں بولا۔

گاڑی ایک بار پھر پہلے والی جگہ پر آن کھڑی ہوئی۔ بنگلا نیم پُراسرار اور نیم تاریک نظر آرہا تھا۔ صرف پورچ میں تھوڑی روشنی نظر آرہی تھی۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اندر کوئی موجود تھا یا نہیں۔ میں نے شفیع شاہ سے پوچھا "اندر کون کون ہے؟"

"صرف ایک گارڈ... ایک ڈرائیور جو کبھی آڑے وقت میں اکیلی تہمینہ کے لیے گاڑی چلاتا ہے ورنہ عام طور پر درانی خود ہی تہمینہ کو ساتھ لیے پھرتا ہے۔ گارڈ اور ڈرائیور کے علاوہ بس وہ دونوں ہی ہیں۔ ہمارا ہیرو اور ہماری ہیروئن۔ میں نے خود بھی صرف ان چاروں کو ہی دیکھا ہے اور ہمارے آدمی نے جو رپورٹ دی ہے۔ اس کے مطابق بھی ان کے سوا اس گھر میں کوئی اور دکھائی نہیں دیتا۔ حتیٰ کہ کوئی گھریلو ملازم یا ملازمہ بھی نظر نہیں آتی۔ اب اگر ہمارے گھسنے پر اچانک کسی کونے کھدرے سے کوئی نامعلوم شخصیت نکل کر سامنے آجائے تو کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اس کے لیے بھی تیار رہنا ہی پڑے گا۔"

"میرا خیال ہے تم اب مزید تاخیر مت کرو۔" میں نے کہا "اندر چلتے ہیں۔ آخر ہمیں شوٹنگ کے ابتدائی انتظامات بھی تو کرنے ہیں۔ گارڈ اور ڈرائیور کو خاموشی سے قابو میں کرنا ہے۔ بقول تمہارے، کونے کھدرے سے کوئی نکل آیا تو اس کو بھی دیکھنا پڑے گا۔ ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ بیڈ روم کس طرف ہے۔ وہ تلاش کر کے خاموشی سے کیمرے کے لیے کوئی جگہ بھی تلاش کرنی پڑے گی جو سب سے زیادہ مشکل کام ہے۔ اگر ہمیں کچھ انتظار کرنا بھی پڑا تو اندر جا کر "لوکیشن" پر ہی کرلیں گے۔ یہاں بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔"

"جیسے آپ کی مرضی۔" شفیع شاہ نے کندھے اُچکا دیے۔

اس نے چھوٹے سائز کا عمدہ کیم کارڈ اور انفراریڈ اسکوپ انہی چیزوں کے اسٹریپ کی مدد سے کمر سے باندھا اور ہم گاڑی سے اتر کر پیدل عقبی گلی کی طرف یوں ٹہلنے کے سے انداز میں چل دیئے جیسے رات کو اس وقت دو بے فکروں کو چہل قدمی کی سوجھی ہو۔ علاقے کی سڑکوں پر اس وقت تقریباً ویرانی ہی نظر آتی تھی جس سے ہم صحیح معنوں میں استفادہ کر رہے تھے۔

عقبی گلی میں تقریباً تاریکی ہی تھی۔ بنگلے کی عقبی دیوار کافی اونچی تھی لیکن یہ ہمارے لیے کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس دیوار پر مزید کوئی حفاظتی انتظام نہیں تھا۔ پہلے میں نے شفیع شاہ کو اپنے کندھوں پہ کھڑا کر کے دیوار پر چڑھایا۔ وہ دیوار سے نیچے نہیں کودا بلکہ اس نے دیوار پر اوندھا لیٹ کر ہاتھ نیچے لا کر مجھے چڑھنے میں مدد دی اور ہم یکے بعد دیگرے پنجوں کے بل عقبی لان پر کود گئے۔

ہم نے پہلے تو دیوار ہی کے زیرِ سایہ ساکت رہتے ہوئے سُن گُن لینے کی کوشش کی لیکن بنگلا تو جیسے بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ اس میں دو چار افراد کی موجودگی کا تو پتا ہی نہیں چل رہا تھا۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد شفیع شاہ نے کیمرا اور انفراریڈ اسکوپ پھول دار پودوں کے ایک جھنڈ کے قریب رکھ دیا تاکہ اگر آگے کہیں ہاتھا پائی کی نوبت آجائے تو انہیں نقصان نہ پہنچے۔ ماحول کو "محفوظ" بنانے کے بعد ہم آکر یہ چیزیں اٹھا کر لے جاسکتے تھے۔ ہم دونوں نے مختلف سمتوں سے اصل عمارت کے گرد گھوم کر سامنے پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

میں جس طرف سے بے آواز قدموں کے ساتھ دیوار سے لگ کر چلتا ہوا آگے بڑھا، یہ بنگلے کی ذرا تنگ بغلی گلی تھی۔ اسی طرف مجھے سرونٹ کوارٹر بھی نظر آئے لیکن ان کے دروازوں پر تالے جھول رہے تھے اور اندر تاریکی تھی یعنی جو ڈرائیور ہماری معلومات کے مطابق بنگلے میں موجود تھا وہ بھی اس وقت کہیں اور تھا۔ عملی طور پر یہ بنگلا آج کل زیادہ تر خالی ہی رہتا تھا شاید اسی لیے یہاں کوئی خاص حفاظتی انتظامات نظر نہیں آرہے تھے اور درانی نے یہاں غیر ضروری افراد کی بھیڑ بھاڑ بھی نہیں رکھی تھی۔ مصلحت اسی میں تھی۔

مجھے اصل عمارت کے سامنے والے ایک کونے تک پہنچنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ وہاں سے مجھے گیٹ کے قریب باؤنڈری وال کے قریب بنا ہوا وہ چھوٹا سا کمرا نظر آگیا جو گیسٹ ہاؤس کے طور پر استعمال ہوتا ہوگا۔ کمرے میں روشنی تھی مگر اس کے دروازے کا رُخ میری طرف نہیں تھا۔ میری طرف کی دیوار میں چھوٹی سی صرف ایک روشن دان نما کھڑکی تھی۔ اس میں سلاخیں تھیں اور کھڑکی کھلی تھی مگر اس میں سے اندر کا منظر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کم از کم جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس کمرے میں سے باتوں کی نہایت مدھم سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے کان لگا کر سنا۔ آوازیں مردانہ تھیں۔ دو افراد گپ شپ کے انداز میں باتیں کر رہے تھے لیکن نہایت احتیاط سے اور نیچی آواز میں۔ حالانکہ اس بات کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا کہ خاصی دور دور تک کوئی ان کی آواز سنے گا لیکن وہ دونوں گویا اپنی سی پوری کوشش کر رہے تھے کہ ان کی آوازیں کمرے سے باہر نہ جانے پائیں۔

دوسری طرف روشنی کا ایک مستطیل پورچ کے فرش تک جارہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ پورچ کا فرش خوب صورت ٹائلوں کا تھا اور اس روشنی میں جھلملا رہا تھا۔ پورچ میں کوئی اور لائٹ آن نہیں تھی۔ روشنی کے مستطیل سے ذرا ہٹ کر وہی سفید گاڑی کھڑی تھی جس میں پہلی مرتبہ درانی اور تہمینہ کو دیکھ کر میں چونکا تھا لیکن اس وقت مجھے ان کے نام معلوم نہیں تھے۔

میں نے رکوع کی سی حالت میں پنجوں کے بل درمیانی فاصلہ عبور کیا اور چھوٹے سے کمرے کی چھوٹی سی کھڑکی والی دیوار سے چپک کر جا کھڑا ہوا لیکن میں نے کھڑکی سے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس دوران میں شفیع شاہ بنگلے کی اصل عمارت کے دوسرے کونے پر پہنچ چکا تھا لیکن اس طرف چونکہ چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلتا تھا اس لیے اس نے سامنے آنے یا اپنی موجودگی کا کوئی اور اشارہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ہمیں پہلے صورتِ حال کو اچھی طرح سمجھنا تھا۔

آخر میں نے سلاخوں والی کھڑکی سے اندر دیکھنے کا خطرہ مول لیا۔ عین ممکن تھا کہ اِدھر میرے سر کا کچھ حصہ اور ایک آنکھ کھڑکی کے فریم میں نمودار ہوتی اور اُدھر دوسری طرف سے کوئی چہرہ براہِ راست میری طرف دیکھ رہا ہوتا۔ یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی۔ ہمیں یہاں اپنی کارروائی کے دوران میں سب سے زیادہ اس بات کا خیال رکھنا تھا کہ کوئی غیر معمولی آواز نہ پیدا ہونے پائے۔

میری قسمت اچھی تھی کہ کمرے کے اندر سے کسی آنکھ نے میرا استقبال نہیں کیا حالانکہ وہاں چار آنکھیں موجود تھیں۔ میرا مطلب ہے کہ وہاں دو افراد موجود تھے۔ کمرے میں لوہے کی ایک میز اور چند کرسیوں کے سوا کوئی فرنیچر نہیں تھا۔ دونوں افراد میز پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے تقریباً سر جوڑے بیٹھے تھے اور کسی ایسے موضوع پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے جو ان کے لیے یقیناً بے حد دلچسپی کا باعث تھا۔ دونوں کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔

میں نے ان کی باتیں سننے کی کوشش نہیں کی۔ میری توجہ ان کے تاثرات پر تھی جن سے میں ان کے انہماک کا اندازہ کرنا چاہتا تھا۔ ان میں سے ایک یقیناً گارڈ تھا اور دوسرا ڈرائیور۔ دونوں باوردی تھے۔ گارڈ کی گود میں اس کی کلاشنکوف رکھی تھی۔ ڈرائیور کی ٹوپی لوہے کی میز پر پڑی تھی۔ وہ گنجا، سانولا اور ادھیڑ عمر تھا جبکہ گارڈ خاصا صحت مند، دراز قد، جوان اور مضبوط معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کھڑکی سے سر ہٹا لیا اور بنگلے کے دوسرے کونے کی طرف دیکھا۔ اُدھر اندھیرا تھا لیکن اسی ملگجے اندھیرے میں دیوار کی اوٹ سے مجھے صرف دو انگلیاں متحرک نظر آئیں۔ یہ سگنل تھا۔ شفیع شاہ اس کونے پر دیوار کی اوٹ میں اپنی موجودگی کی اطلاع دے رہا تھا۔ پھر انگلیاں غائب ہو گئیں۔

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد شفیع شاہ نے وہی پرانا حربہ استعمال کیا یعنی دیوار کی اوٹ میں رہتے ہوئے کوئی چیز پھینک کر معمولی سے کھٹکے کی آواز پیدا کی۔ میں نے اسی لمحے ایک بار پھر کھڑکی کے کونے سے اندر جھانکا۔ ڈرائیور اور گارڈ گو کہ باتوں میں الجھے ہوئے تھے لیکن گرد و پیش سے بالکل ہی بے خبر معلوم نہیں ہوتے تھے۔ خصوصاً گارڈ اپنے فرائض کی انجام دہی میں بڑا مستعد معلوم ہوتا تھا۔ وہ اس خفیف سے کھٹکے پر بھی بات ادھوری چھوڑ کر یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھوں میں آگئی۔

"تم نے یہ آواز سنی؟" اس نے ڈرائیور سے تصدیق چاہی۔

"ہاں... کچھ کھٹکا سا تو ہوا ہے۔" ڈرائیور متذبذب سے لہجے میں بولا "شاید لان پر بلّی نے کچھ گرایا ہے۔ آج کل ادھر بلّیاں بہت ہو گئی ہیں۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا اور گھوم کر دروازے سے باہر دیکھنے لگا۔

"میں ذرا دیکھ لوں۔" گارڈ بولا "بلّی کے بجائے کوئی بِلّا بھی ہو سکتا ہے... دو ٹانگوں والا بِلّا... آج کل وہ بھی تو بہت ہو گئے ہیں۔ موقع پاتے ہی ہر گھر میں گھسنے کی کوشش کرتے ہیں۔" وہ ذرا ہی اجڈ جاہل قسم کا گارڈ نہیں تھا۔ تھوڑی بہت بات کرنا جانتا تھا۔

وہ میز کے عقب سے نکل کر دروازے کی طرف بڑھا۔ ڈرائیور اس کے ساتھ تھا اور یہ میرے حق میں بہت ہی اچھا ہوا تھا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ وہ دونوں اکٹھے کمرے سے نکلیں۔ اس طرح میرا کام آسان ہوجاتا۔ شفیع شاہ چونکہ اس جگہ سے کچھ دور تھا اور دروازے کا رخ اسی کی طرف پڑ رہا تھا اس لیے زیادہ ذمے داری میرے کندھوں پر ہی آن پڑی تھی۔ شفیع کا زیادہ کام اب صرف مجھے کور فراہم کرنا رہ گیا تھا۔

اُدھر وہ دونوں دروازے سے نکل کر کچھ آگے پہنچے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ملگجے اندھیرے میں دیکھنے لگے' اِدھر میں بھی ان کے عقب سے دیوار کی اوٹ سے دبے قدموں نکل آیا۔ وہ دروازے سے باہر آنے والی روشنی کے مستطیل میں کھڑے تھے لیکن نہ جانے کیوں انہوں نے لان وغیرہ کا جائزہ لینے کے لیے کوئی لائٹ آن نہیں کی۔

انہیں ایک آدھ سیکنڈ سے زیادہ دیکھنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ میں نے عقب سے یکے بعد دیگرے دونوں کی گدی پر مشین پسٹل کا دستہ رسید کیا۔ ان دونوں ضربوں کے درمیان شاید ایک سیکنڈ سے بھی کم وقفہ رہا تھا ورنہ ڈرائیور کو چیخ مارنے کی مہلت مل جاتی۔ شفیع شاہ نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اسی لمحے وہ گویا اڑ کر دیوار کی اوٹ سے نکل کر وہاں تک پہنچا۔ وہ دونوں فرش پر ڈھیر نہیں ہونے پائے۔ اس نے انہیں دونوں بازوؤں پر تھام لیا۔ میں نے پھرتی سے مشین پسٹل جیب میں رکھا اور ان دونوں کی ٹانگیں بغلوں میں دبا کر اٹھالیں۔ دوسرے ہی لمحے ہم انہیں اٹھا کر واپس کمرے میں لے آئے۔

شفیع شاہ نے اپنی جیکٹ کی جیبوں سے نائلون کی باریک ڈوری اور ٹیپ نکالی۔ ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے اور ہونٹوں پر ٹیپ چپکانے میں بھی ہم نے زبردست پھرتی کا مظاہرہ کیا اور انہیں میز کی آڑ میں ڈال کر کمرے سے نکل آئے۔ کمرے کا دروازہ ہم نے آہستگی سے بند کردیا۔ یہ کام ہماری خواہش کے مطابق چند لمحوں میں نہایت صفائی سے ہوگیا تھا اور مکان کا سکوت بھی قطعاً متاثر نہیں ہوا تھا۔

اس کے بعد ہم نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر بے آواز قدموں سے برآمدے میں پہنچ کر اندرونی دروازے پر قسمت آزمائی کی اور اسے غیر مقفل پایا۔ اگر وہ مقفل بھی ہوتا تو مجھے امید تھی کہ اس کی چابی گارڈ کی جیب یا لوہے کی اس میز کی کسی دراز میں مل جاتی جو بیرونی کمرے میں رکھی ہوئی تھی۔

اب ہم دونوں کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ ایک صاف ستھری اور پُرسکون سی راہداری گویا مجھے اندر آنے کی دعوت دے رہی تھی۔ اس میں صرف ایک چھوٹا سا گلوب روشن تھا۔ میں نے اندر پہنچ کر اسے بھی آف کردیا لیکن یہ خیال رکھا کہ سوئچ دبانے سے کھٹکا نہ پیدا ہونے پائے۔ راہداری تاریکی میں ڈوب گئی۔ اب صرف لاؤنج کی طرف سے کچھ روشنی آرہی تھی جس کی وجہ سے اندھیرا گہرا نہیں تھا۔

"تم جا کر کیمرا وغیرہ لے آؤ۔ میں فی الحال یہیں کھڑا ہوں۔" میں نے دیوار سے چپک کر کھڑا ہوتے ہوئے کہا۔ میری سرگوشی سن کر شفیع شاہ نے ملگجے اندھیرے میں اثبات میں سر ہلایا اور مدھم ہوا کے جھونکے کی طرح کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر وہاں سے رخصت ہوگیا۔ میں نے دروازہ کھلا ہی رہنے دیا۔ وہاں کھڑے کھڑے چند سیکنڈ کے بعد مجھے احساس ہوا کہ مدھم سی کچھ آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں لیکن ان کی نوعیت کا اندازہ کرنا ذرا مشکل تھا۔ شاید خاصے فاصلے پر کسی بند کمرے میں نہایت مدھم آواز میں ٹی وی یا ریڈیو چل رہا تھا۔ یہ بھی ایک سہولت تھی۔ اس سے ہم آسانی سے جان سکتے تھے کہ درانی اور تہمینہ کس کمرے میں موجود تھے۔ ہمیں پورے بنگلے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔

شفیع شاہ جلد ہی لوٹ آیا۔ اس نے کیمرا اور انفراریڈ اسکوپ مجھے تھما دیا۔ میں نے گن جیب میں رکھ لی اور ہم دبے قدموں آگے بڑھے۔ لاؤنج میں روشنی تھی لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ سائڈ بورڈ پر وہاں بھی ایک ٹی وی موجود تھا لیکن وہ بند تھا۔ کہیں اور ٹی وی چلنے کی آواز اب ذرا سی واضح ہوگئی تھی۔ اس نے ہماری رہنمائی کی اور ہم دیگر کمروں کے بند دروازوں کو چھوڑتے ہوئے اس کمرے کے سامنے جارکے۔

اس کمرے کے دروازے کے نیچے روشنی کی پتلی سی لکیر بھی دکھائی دے رہی تھی اور بڑی سی کھڑکی پر گوکہ پردے پھیلے ہوئے تھے لیکن ان کے عقب میں روشنی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کھڑکی اور دروازے کے سوا کمرے میں جھانکنے کا کوئی اور راستہ نہیں تھا اور یہ دونوں راستے بھی بند تھے۔ دروازہ ویسے ہی بند تھا۔ کھڑکی کے شیشوں والے پٹ بھی بند تھے اور اندر پردے پھیلے ہوئے تھے لیکن قریب پہنچ کر میں نے کھڑکی کا پوری طرح جائزہ لیا تو ایک طرف مجھے عمودی پٹی کی طرح تقریباً آدھ پون انچ چوڑی جگہ خالی دکھائی دے گئی جس کو پردہ ڈھانپنے سے قاصر رہا تھا۔ اسے بہت زیادہ احتیاط سے نہیں پھیلایا گیا تھا۔

میں نے اس پٹی پر آنکھ جما کر شیشے سے اندر کا منظر دیکھا اور میرے اعصاب کو خاصا زوردار جھٹکا لگا۔ تہمینہ شان دار ڈبل بیڈ پر اوندھی لیٹی ہوئی تھی اور جس حالت میں لیٹی ہوئی تھی اس پر اچانک نظر پڑنا انسان کے سر پر کوئی چھوٹا موٹا ہتھوڑا پڑنے کے برابر تھا۔ سامنے ہی سائڈ بورڈ پر ٹی وی چل رہا تھا جس کا ریموٹ کنٹرول تہمینہ کے ہاتھ میں تھا۔ ٹی وی یقیناً وی سی آر سے منسلک تھا جو اس کے قریب ہی رکھا تھا۔ یہ ایک عجیب ستم ظریفانہ قسم کا اتفاق تھا کہ وی سی آر کے ذریعے جو کچھ وہ دیکھ رہی تھی اسی سے ملتی جلتی کوئی چھوٹی موٹی چیز تیار کرنے کی فکر میں ہم کیمرا وغیرہ

اٹھائے اتنے جتن کرتے یہاں تک چلے آئے تھے۔ جنہیں ہم فلمانا چاہ رہے تھے وہ پہلے ہی وہاں بیٹھے اسی قسم کی مغربی فلم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ بیڈ پر وہ اکیلی تھی۔ دوسرے ہی لمحے درانی مجھے باتھ روم کے دروازے پر کھڑا نظر آیا۔ وہ دانت برش کر رہا تھا مگر محض دانت برش کرنے کے لیے کوئی اس حالت میں نہیں آسکتا تھا جس حالت میں وہ تھا۔ وہ بھی بصد اشتیاق ٹی وی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں اور حلقوں سے ابلی پڑ رہی تھیں۔ وہ باتھ روم کے دروازے پر ہی کھڑے کھڑے اور برش کرتے کرتے ہی حلق سے عجیب گھگھیائی ہوئی سی آوازیں نکال رہا تھا۔ گاہے گاہے وہ تہمینہ پر بھی نظر ڈال لیتا تھا اور گویا ریشہ خطمی ہونے لگتا تھا۔

اس کے برعکس تہمینہ نہایت پُرسکون انداز میں گہری نظر سے فلم دیکھ رہی تھی۔ اس کی اندرونی کیفیات کے بارے میں کم از کم بند کمرے سے باہر کھڑے ہو کر تو کچھ کہنا مشکل تھا البتہ ظاہری طور پر اس کا انداز نہایت سنجیدہ و مدبرانہ نظر آرہا تھا۔ وہ لطف اندوز ہونے کے بجائے گویا کسی مطالعاتی اور مشاہداتی کام میں محو تھی۔ جہاں میں کھڑا تھا کم از کم وہاں سے مجھے ایسا ہی تاثر مل رہا تھا۔

میں نے جلدی سے کیمرے کا کیس کھولا اور سرگوشی میں شفیع شاہ سے کہا "ہم بہت اچھے وقت پر پہنچ گئے ہیں۔"

دھندلی روشنی میں شفیع شاہ مسکرا دیا۔ میں نے انفراریڈ اسکوپ اسے تھما دیا۔ اسے استعمال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ کمرے میں کافی روشنی تھی اور مجھے امید تھی کہ وہ دونوں لائٹس آف نہیں کریں گے۔ دفعتاً درانی بے تابی سے مڑا اور باتھ روم میں چلا گیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کلیاں کرنے گیا تھا اور جلد ہی برآمد ہوجائے گا۔ میں نے جلدی سے کیمرا آن کرکے اپنی آنکھ کی جگہ اس کا لینس شیشے پر ٹکا دیا۔ باتھ روم سے اس کے برآمد ہونے کا "شاٹ" خاصا دلچسپ نظر آسکتا تھا۔

کمرے میں دیکھنے کے لیے ہمیں پردے کے کنارے پر جو عمودی سی پٹی جھری کے طور پر دستیاب تھی اس سے پورے کمرے کو تو صحیح طور پر کور نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن ہمارے مقصد کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ شیشے سے آنکھ لگا کر جس حد تک میں دیکھ سکتا تھا اسی حد تک کیمرا بھی دیکھ سکتا تھا اور دکھا سکتا تھا۔ حتیٰ کہ میں ٹی وی کو بھی شوٹ کرسکتا تھا جس سے معلوم ہوسکتا تھا کہ وہ لوگ کیا دیکھ رہے تھے۔

درانی شاید الٹی سیدھی کلیاں کرکے میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہی جلدی باتھ روم سے برآمد ہوا اور اچھی بھلی عمر کا آدمی ہونے کے باوجود جوانوں کی سی پھرتی اور بے تابی سے دو قلانچیں بھر کر اچھل کر بیڈ پر جا گرا۔ تہمینہ نے ریموٹ ہاتھ سے رکھ دیا اور... ٹی وی سے نظر ہٹالی۔ اس کے بعد اس کی شخصیت کے کچھ نئے ہی زاویے مجھ پر منکشف ہوتے گئے۔

شفیع شاہ اس دوران میں میری طرف پشت کئے لاؤنج میں چاروں طرف اور اوپر جانے والی سیڑھیوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ آخر میں نے ایک ہاتھ سے اس کا کندھا چھو کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور سرگوشی میں کہا "باقی شوٹنگ تم کرو۔"

وہ بھی سرگوشی میں بولا "سر! میں نے پہلے بھی احتجاج کیا تھا اب ایک بار پھر کر رہا ہوں.... یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ اس کام کو آپ گھٹیا اور صبر آزما محسوس کرنے کے بعد میرے سپرد کر رہے ہیں۔ آپ پہلے ہی اس ارادے کا اظہار کرچکے تھے۔"

وہ یہ سب کچھ کہہ ضرور رہا تھا لیکن اسی دوران میں کیمرا تھام چکا تھا اور میری پوزیشن سنبھال رہا تھا۔ گن اس نے جیب میں رکھ لی تھی۔ میں نے بے آواز طریقے سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا "حوصلہ کرو نوجوان! جونیئر اور چھوٹا ہونے کے کچھ نقصانات تو ہوتے ہیں۔"

اب اس کی جگہ میں نے گن نکال لی اور نگرانی کرنے لگا۔ ہم یہ اطمینان تو کرچکے تھے کہ نچلی منزل پر درانی اور تہمینہ کے سوا کسی کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا لیکن ہم نے اوپر جانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ہمیں زیادہ امید تو یہی تھی کہ اوپر بھی کوئی موجود نہیں تھا لیکن اگر اچانک سیڑھیوں پر کوئی نمودار ہوجاتا تو اس کا بندوبست کرنا پڑتا۔

کچھ دیر بعد شفیع شاہ کیمرے سے آنکھ ہٹا کر میری طرف گردن گھماتے ہوئے سرگوشی میں بولا "سر! اس جگہ سے سین کچھ اچھا شوٹ نہیں ہو رہا۔ کیمرے کو زیادہ ہلایا جُلایا نہیں جاسکتا۔"

"اب ہم دروازہ کھول کر تو اندر جانے سے رہے۔" میں نے سرگوشی میں جواب دیا "ہمیں اس فلم کو کسی عالمی مقابلۂ فحاشی میں بھیج کر ایوارڈ حاصل نہیں کرنا ہے۔ بس تم یہ خیال رکھو کہ درانی اور یہ لڑکی آسانی سے شناخت ہوسکیں.... اور ہمیں زیادہ وقت بھی ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارے پاس بس ایک نمونہ.... ایک مثال ہونی چاہیے۔ اس سے یہ ثابت کرنا آسان ہوجائے گا کہ درانی کس قبیل کا آدم ہے۔ تم زیادہ فنکاری دکھانے کے چکر میں نہ پڑو۔"

"اوکے سر!" وہ مستعدی سے بولا "ڈائریکٹر تو آپ ہی ہیں۔ میں تو صرف قائم مقام کیمرا مین ہوں۔"

دو تین منٹ بعد وہ بولا "ہمارا مقصد تو اتنی فلم سے بخوبی پورا ہوجائے گا۔"

"بس.... تو پھر چلو۔ کیمرا آف کرو۔" میں نے ہدایت کی "جتنی جلدی ہم اس بے ہودہ کام سے چھٹکارا پالیں اتنا ہی اچھا ہے۔"

شفیع شاہ نے کیمرا بند کیا اور ہم نہایت خاموشی سے باہر آگئے۔ ہم نے گیٹ ہاؤس میں جھانکا۔ گارڈ اور ڈرائیور ابھی تک بے ہوش ہی تھے۔ ہم نے ان کے ہاتھ پاؤں کھول دئے اور منہ پر

سے ٹیپ بھی ہٹادی۔

"ہوش میں آنے کے بعد جب انہیں اندازہ ہوگا کہ گھر میں کوئی ڈاکا نہیں پڑا ہے' کچھ چوری نہیں ہوا ہے... تو شاید یہ درانی سے اس واقعے کا ذکر ہی نہ کریں۔" میں نے امید ظاہر کی۔

"اور اگر ذکر کیا بھی... تو سب مل کر حیران ہوتے رہیں گے کہ آخر انہیں بے ہوش کرنے والوں کا مقصد کیا تھا۔" شفیع شاہ بولا۔

ہم جس راستے اور جس طریقے سے آئے تھے اسی راستے اور اسی طریقے سے واپس گلی میں پہنچ گئے اور کچھ دیر بعد دوبارہ شفیع شاہ کی گاڑی میں جا بیٹھے۔ شفیع شاہ کیمرا وغیرہ پچھلی سیٹ پر رکھتے ہوئے طمانیت کی گہری سانس لے کر بولا "یہ کام تو خلافِ توقع بہت ہی آسان ثابت ہوا۔"

"بے شک۔" میں نے تائید کی "کاش ہم درانی اور تہمینہ کے تعاون کا شکریہ ادا کرسکتے۔ گارڈ اور ڈرائیور نے بھی ہماری پہلی کوشش پر ہی بروقت بے ہوش ہو کر ہمارا کام آسان کیا۔ وہ بھی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔"

"یقیناً۔" شفیع شاہ نے سرہلایا "ہم ان کے لیے دعا گو رہیں گے۔ اب کیا پروگرام ہے؟"

آج کا سب سے اہم پروگرام یہی تھا۔ کل جس قدر جلد ممکن ہوسکے تم اس کی ایک کاپی تیار کرا کے سب سے پہلے مجھے پہنچادو اور دو تین کاپیاں مختلف جگہوں پر محفوظ کردو۔" میں نے ہدایت کی پھر پوچھا "درانی کی پراپرٹی کے ثبوت حاصل کرنے کے سلسلے میں کام شروع ہوگیا ہے نا؟"

"جی ہاں۔ میں نے آدمیوں کو لگا دیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کوشش کرو کہ اس کے بینک اکاؤنٹس کا بھی پتا چل سکے۔ ویسے یہ کام سب سے زیادہ مشکل ہے۔ ایسے لوگ زیادہ تر سرمایہ ایسے شعبوں میں انویسٹ کئے رکھتے ہیں جہاں اس کا سراغ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ بینکوں یا مالیاتی اداروں میں ان کی رقمیں ہوں تو وہ بھی ایسے طریقوں سے رکھی جاتی ہیں کہ انہیں تلاش کرنا سمندر میں کسی ایک خاص مچھلی کو تلاش کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ بہرحال درانی بہت ہی اہم محکمے میں بہت ہی اہم عہدے پر ہے اور ہر اعتبار سے جی بھر کے کرپٹ ہے۔ معلوم نہیں کب سے اور کس حساب سے دولت سمیٹ رہا ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ قیمتی جائداد کے علاوہ اس کے پاس اچھا خاصا سرمایہ بھی ہوگا لیکن اس کا سراغ لگانا بہت مشکل ہوگا۔ وہ تو اپنے جیسے لوگوں' ٹیکس چوروں' بلیک مارکیٹیوں' اسمگلروں اور غبن فراڈ وغیرہ کرنے والوں کو پکڑنے پر مامور ہے۔ وہ تو خود نہ جانے کتنے ہتھکنڈوں سے واقف ہوگا۔ ایسے لوگ اپنے جرائم کا سراغ کہاں چھوڑتے ہیں۔"

"ہم اپنی سی کوشش کریں گے۔ بینکوں اور انویسٹمنٹ کے اداروں میں اپنے جو کنکشنز ہیں ان سے کچھ کام لینے کی کوشش کریں گے اور دوسری ڈوریاں بھی ہلائیں گے۔" شفیع شاہ بولا۔ وہ کسی بھی معاملے میں مایوس ہونے والا آدمی نہیں تھا۔

"ہاں... کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" میں نے اس کی تائید کی "میں اب چلتا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے ہر مرحلے کے بارے میں اطلاع دیتے رہنا۔" پھر میں اسے شب بخیر کہہ کر اس کی گاڑی سے اتر کر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور ہوٹل واپس آگیا۔ مجھے اپنا رات کا کھانا چھوڑ کر جانا پڑا تھا۔ یہ "صدمہ" میں ابھی بھولا نہیں تھا اس لیے میں نے دوبارہ کھانا منگوا کر یہ دکھ دور کیا پھر اپنے کمرے میں جا کر سوگیا۔

دوسرے روز دوپہر کے قریب میں اپنے آفس میں تھا کہ اچانک دروازہ کھلا اور میں نے صفیہ کو سامنے کھڑے پایا۔ وہ دروازے ہی سے ٹیک لگا کر کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھیں سرخ اور متورم تھیں۔ چہرے پر ایک عجیب سی وحشت تھی۔ اس کا ایک ہاتھ اپنے شولڈر بیگ پر تھا اور وہ ایک ٹک میری طرف دیکھے جارہی تھی۔ وہ اس صفیہ سے کافی مختلف نظر آرہی تھی جس سے اب تک میری ملاقات ہوتی رہی تھی۔

میرا ماتھا ٹھنکا لیکن دوسرے ہی لمحے میری سمجھ میں آگیا کہ بات کیا ہوسکتی تھی۔ تاہم میں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے اور اپنا لہجہ خوشگوار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "خیریت تو ہے صفیہ؟ اتنی پریشان سی کیوں نظر آرہی ہو؟ اور یہ دروازے پر ہی کیوں کھڑی ہو؟ یہاں آکر بیٹھو۔" میں نے کرسیوں کی طرف اشارہ کیا مگر جب وہ اپنی جگہ سے نہ ہلی اور وہیں کھڑی ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی تو میں نے اس کی طرف قدم بڑھایا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ اچانک ہی میرے سینے سے آن لگی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ سینے سے لگ کر روتی ہوئی لڑکی کا تصور بھی میرے لیے ایک آزمائش سے کم نہیں تھا لیکن میں نے کچھ دیر اسے رونے دیا۔ میرے اندازے کی تصدیق ہوچکی تھی۔ میں چاہتا تھا اس کے دل کا غبار ہلکا ہوجائے۔ کچھ دیر بعد میں نے اس کے آنسو پونچھے اور اس کا بازو تھام کر اسے ایک کرسی پر بٹھایا۔ اتنی سی دیر میں اس کی حالت کافی بہتر ہوچکی تھی۔

"بات کیا ہے صفیہ؟" میں نے اپنی جگہ پر جا کر بیٹھتے ہوئے ملائمت سے پوچھا۔

اس نے سر اٹھا کر مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں ابھی بھیگی ہوئی تھیں اور ان میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے "آپ اب بھی انجان بنے رہنے کی اداکاری جاری رکھیں گے؟ بہت حوصلے والے آدمی ہیں آپ!" وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔

میں نے ایک بے عنوان سی شرمندگی محسوس کی اور میں ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ وہ گویا مزید کچھ سنبھلتے ہوئے بولی "آئی ایم سوری... میرا خیال ہے مجھے اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا۔

میں تو بڑی غیر جذباتی... دنیا دار... بے حس... بلکہ کسی حد تک سفاک بننے کی مشق کررہی تھی... مگر ابھی کچی ہوں نا... پہلی ہی چوٹ پر بکھر گئی۔"

میں نے اب بھی کچھ بولنے سے گریز کیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر وہ گویا اتمامِ حجت کے لیے بولی "میں کچھ دیر پہلے دوسرے رشتے داروں کے ساتھ کامران کی لاش دیکھ کر آرہی ہوں۔ پولیس نے ہمیں باضابطہ شناخت کے لیے بلایا تھا..."

"اوہ...!" میں نے اب بھی صرف متاسفانہ سے انداز میں ایک گہری سانس لینے پر اکتفا کیا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "رحیم گل سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس نے بتایا کہ آپ کو تو وہ کل ہی لاش دکھا چکا تھا۔ آپ نے مجھے اطلاع دینے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی؟"

"بات ضرورت کی نہیں' ہمت کی تھی صفیہ!" آخر میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میں واقعی تم سے بہت زیادہ معذرت خواہ ہوں کہ اس خبر کو چھپائے بیٹھا رہا لیکن یقین کرو... میں یہ خبر تمہیں سنانے کی ہمت اپنے اندر نہیں پارہا تھا۔ میرا بس چلے تو میں دنیا میں کسی کو بھی اس قسم کی کوئی بری خبر نہ سناؤں۔ میں ابھی تک اس کے لیے ہمت ہی جمع کررہا تھا اور دعا کررہا تھا کہ تمہیں کسی اور ہی ذریعے سے اس بات کا پتا چل جائے تو بہتر ہے۔ میری اس کم ہمتی پر تم مجھے مزید لعن طعن کرنا چاہو تو کرسکتی ہو۔ میں برا نہیں مناؤں گا۔"

"آئی ایم سوری...!" اب اس کی معذرت کا لہجہ دوسرا تھا۔ اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا "میرا خیال بھی یہی تھا کہ وجہ صرف یہی ہوسکتی ہے۔ میں خود اس کے بارے میں آپ کے سامنے بیٹھ کر جو جو بکواس کرتی رہی تھی اس کے بعد اصولاً تو مجھے اس کی موت پر اتنا جذباتی نہیں ہونا چاہیے لیکن کیا کروں... آخر بچپن کا ساتھی تھا... اور پھر قسمت نے اس کے ساتھ عجیب ہی مذاق کیا۔ زندگی کے آخری دنوں میں خواہ مخواہ اتنی ہلچل برپا نہ ہوتی تو زیادہ اچھا رہتا۔ اگر جواں مرگی ہی اس کے نصیب میں لکھی تو عام سے... سیدھے سادے حادثاتی سے انداز میں رخصت ہوجاتا۔"

"تم اب بھی یہی فرض کرنے کی کوشش کرو۔" میں نے مشورہ دیا۔ اس موقع کے لیے مجھے کوئی اور مناسب مشورہ نہ سوجھا۔

"ہاں... آپ ٹھیک کہتے ہیں۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی "موت تو بس موت ہی ہے۔ خواہ اس کے بارے میں کچھ بھی فرض کرلیا جائے۔ قابلِ ذکر بات تو بس یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی زندگی کی کہانی ختم ہوجاتی ہے۔ کامران دانش کی کہانی ختم ہوگئی۔ ہمیں ابھی زندگی کے صحرا میں گھسنا ہے اور اپنی اپنی کہانیوں کے لیے انجام تلاش کرنا ہے۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ ہم سب کی کہانیاں ایک دوسرے میں الجھی ہوئی ہیں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"یہی چیز تو زندگی کو زیادہ پیچیدہ بناتی ہے۔" وہ آہ بھر کر بولی۔

چند لمحے کمرے میں گہرا سکوت رہا۔ وہ افسردگی سے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ میں زندگی میں شاذ و نادر ہی بوکھلاہٹ کا شکار ہوتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی اچانک آمد اور رویّے نے چند منٹ کے لیے مجھے بوکھلا دیا تھا۔ اب میں سنبھل چکا تھا تو مجھے احساس ہورہا تھا کہ اس کو حوصلہ دینے کے لیے مجھے کچھ کہنا چاہیے لیکن میرے ذہن کے قید خانے سے گویا سارے الفاظ فرار ہوگئے تھے اور پھر مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں نے اکثر یہی محسوس کیا تھا کہ حوصلہ کوئی ایسی چیز نہیں جو کوئی کسی دوسرے کو دے سکے۔ یہ تو خود بخود اندر سے پھوٹتا تھا۔ نہ جانے کس رگِ جاں سے جنم لیتا تھا۔

میں ابھی مناسب الفاظ کے تعاقب میں ہی بھاگ رہا تھا کہ وہ سر اٹھاتے ہوئے ایک مغموم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "آپ نے میرے رویّے کا برا تو نہیں منایا؟"

"کس رویّے کا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

وہ سوال کا جواب دینے کے بجائے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی "عجیب بات ہے کہ مجھے آپ پر غصہ بھی تھا کہ آپ نے کل مجھے اس بات کی اطلاع نہیں دی اور میں آپ ہی کے سینے پر سر رکھ کر رونے بھی لگی۔ میں کامران کی لاش دیکھ کر اپنے رشتے داروں کے ساتھ گھر واپس جانے تک بالکل نہیں روئی تھی۔ آنسو شاید اندر ہی اندر انگارے بن کر میرے وجود کو جلا رہے تھے۔ شکر ہے کہ اس شہرِ نا پُرساں میں کوئی تو تھا جس کے سینے پر سر رکھ کر ان آنسوؤں کو بہنے کے لیے راستہ دیا جاسکتا تھا۔ اگر آپ نے اس کا برا نہیں منایا تو میں آپ کی شکر گزار ہوں۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی "اتنی زیادہ رسمی گفتگو سن کر مجھے غصہ آنے لگتا ہے۔"

"اس غصے کا شکریہ... ایسا غصہ خوش نصیبوں کے حصے میں آتا ہے۔" وہ بولی اور چند لمحے پُرخیال سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی پھر اچانک اس نے ذرا بدلے ہوئے سے لہجے میں کہا "افضل صاحب! کیا کامران کی موت کچھ پُراسراریت کے پردوں میں لپٹی ہوئی نہیں ہے؟"

ابھی میں نے اسے کامران کے خط کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اس کے باوجود اس نے کامران کی موت میں پنہاں پُراسراریت کو محسوس کرلیا تھا۔ اس کی چھٹی حس تیز تھی اور وہ بلاشبہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رحیم گل نے اسے کامران کے خط کے بارے میں بتا دیا ہو یا کم از کم کوئی اشارہ تو دے ہی دیا ہو لیکن میں نے اس سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا اور اعتراف کرلیا "بے شک۔ میں بھی محسوس کررہا ہوں کہ اس کی موت حادثاتی نہیں ہے۔ میں ذرا یہاں پہلے سے پھیلے ہوئے کچھ کام نمٹالوں پھر میں اس معاملے کو ضرور دیکھوں گا۔ میں خود بھی

جاؤں گا۔"

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو مجھے بھی ساتھ لے چلئے گا۔" وہ بولی۔

میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور بلا تامل کہا "ہرگز نہیں۔ ابھی میں نے میگھانی کے بارے میں زیادہ معلومات جمع نہیں کی ہیں لیکن مجھے اندازہ ہے وہ جگہ اس قابل نہیں ہوگی کہ میں تمہیں ساتھ لے جاؤں۔ اس سے میرا کام آسان ہونے کے بجائے میری مشکلات میں اضافہ ہوگا۔"

خلافِ توقع اس نے اس پر اصرار نہیں کیا اور اٹھنے کے لیے پر تولتے ہوئے بولی "میں اب چلتی ہوں۔ مجھے اس وقت گھر پہ ہونا چاہیے۔ کامران کے والدین تو نہیں ہیں لیکن جن ماموں کے گھر اس کی اور اس کی بہن کی زندگی کا بیشتر حصہ گزرا ہے وہاں ایک کہرام برپا ہے.... اور پھر رسمی طور پر فی الحال وہ لوگوں کی نظر میں تو میرا منگیتر ہی تھا۔ مجھے بھی اس وقت گھر پہ ہی ہونا چاہیے.... اور سوگ منانا چاہیے۔ میرا اپنا سوگ تو یہ تھا جو میں نے آپ کے ساتھ بیٹھ کر منایا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا اب میں لوگوں کے لیے سوگ کس طرح مناؤں گی۔ بہرحال.... مجھے جانا تو ہے۔" وہ سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"کیا لاش تم لوگوں کو مل گئی ہے؟" میں نے پوچھا۔ افسردگی کا اپنا ایک عجیب سا سحر ہوتا ہے۔ ابھی تک میں اس سحر کے زیرِ اثر تھا لیکن اب دھیرے دھیرے اس سحر کی گرفت سے آزاد ہو رہا تھا۔ شاید یہ افسردگی چھوت کے مرض کی طرح تھی اور اس وقت ازسرِ نو اس مرض کا حملہ مجھ پر صفیہ کی وجہ سے ہوا تھا۔

"ابھی تک تو پوسٹ مارٹم ہی نہیں ہوا۔" اس نے بھی اب قدرے نارمل لہجے میں بتایا "لیکن شاید آج ہی کسی وقت بھی ہو جائے۔ لاش ہمیں کسی بھی وقت مل سکتی ہے اور ہمیں اس کو ہنگامی طور پر دفن کرنا پڑے گا کیونکہ اس کی حالت اچھی نہیں ہے اور پوسٹ مارٹم کے بعد شاید مزید خراب ہو جائے۔" اس کی آواز جیسے ایک بار پھر حلق میں پھنسنے لگی۔ وہ تیزی سے باہر جانے کے لیے گھوم گئی۔

میں اسے چھوڑنے باہر تک آیا۔ وہ ٹیکسی میں آئی تھی اور ٹیکسی باہر ہی کھڑی تھی۔ اب وہ کافی حد تک پُرسکون نظر آرہی تھی۔ ٹیکسی میں بیٹھ کر وہ رخصت ہو چکی تو مجھے کچھ پچھتاوا سا محسوس ہونے لگا۔ میں اسے چھوڑنے ہی چلا جاتا تو کیا حرج تھا؟ شاید میں نے اس کی اس حد تک دلداری نہیں کی جس کی وہ مجھ سے توقع لے کر آئی تھی.... دوسرے ہی لمحے میری سوچوں کا پانسا پلٹ گیا۔ شاید میں خواہ مخواہ ہی احساسِ جرم کا شکار ہو رہا تھا۔ شاید اسے میری دلداری کی کچھ اتنی زیادہ ضرورت نہیں تھی۔ وہ کچھ عجیب سی ہی لڑکی تھی۔ اس کے بارے میں کچھ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا.... یا پھر شاید بیشتر لڑکیاں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

میں واپس آفس میں جا بیٹھا لیکن ایک عجیب سے اضطراب نے مجھے گھیر لیا تھا۔ آفس کے کام میں میرا دل نہیں لگ رہا تھا اور مجھے صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ میں کیا سوچ رہا تھا، کیا چاہ رہا تھا۔ آخر کار میں اٹھ کھڑا ہوا اور پہلے آفس سے پھر ہوٹل سے ہی نکل آیا۔ معلوم نہیں اس لڑکی صفیہ نے میری ذات کی گہرائیوں میں مدفون کسی چنگاری کو ہوا دے دی تھی یا یہ وہی ازلی.. اضطراب تھا جو کسی کینہ پرور پرانے دشمن کی طرح اچانک ہی کسی تاریک گوشے سے نکل کر مجھ پر حملہ آور ہو جاتا تھا۔

کچھ دیر ہوٹل کے پارکنگ لاٹ میں ٹہلنے کے بعد آخر میں اپنی گاڑی میں بیٹھا اور بے مقصد سے انداز میں ایک طرف روانہ ہو گیا۔ شاید مجھے فرار چاہیے تھا۔ لیکن کس چیز سے فرار؟ یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔

یہ بے وجہ سا فرار بھی شاید میری قسمت میں نہیں تھا۔

جس سڑک پر میرا ہوٹل واقع تھا اسی پر چند فرلانگ آگے جا کر ایک اور معیاری ہوٹل تھا۔ یہ فور اسٹار ہوٹلز کی ایک عالمی چین سے منسلک تھا۔ اسی کمپنی کے ساتھ فرنچائزڈ تھا۔ اس کے اور ہمارے معیار میں تھوڑا سا ہی فرق تھا۔ میں اس ہوٹل کے سامنے سے.... لیکن سڑک کی دوسری طرف سے گزر رہا تھا کہ اس کے کھلے ڈرائیو وے میں میں نے درانی کی گاڑی سے تہمینہ کو اترتے دیکھا۔ ڈرائیور اس کے لیے دروازہ کھول رہا تھا۔ وہ وردی میں تھا لیکن سر پہ ٹوپی کی جگہ پٹی بندھی تھی۔ یہ میری کل رات کی کارروائی کی نشانی تھی۔ اگر گاڑی ہوٹل کے صدر دروازے پر رکی ہوتی تو شاید میں انہیں نہ دیکھ پاتا کیونکہ ان کے اور میرے درمیان آرائشی پودے وغیرہ حائل ہوتے لیکن صدر دروازے کے سامنے کافی دور تک گاڑیاں کھڑی تھیں جن کی وجہ سے ڈرائیور نے گاڑی سڑک کے قریب ہی روکی ہوئی تھی اور ڈرائیور کے ساتھ تہمینہ کے آنے کا مطلب یہ تھا کہ درانی اس کے ساتھ موجود نہیں تھا۔

میں تہمینہ کو گاڑی سے برآمد ہوتے دیکھ کر نہ جانے کیوں اس بری طرح چونکا کہ اضطراری طور پر بریک لگانے لگا تھا لیکن کسی غیبی قوت نے ہی مجھے اس حرکت سے باز رکھا ورنہ شاید میرے پیچھے آتا ہوا ڈرائیور اپنی گاڑی میری گاڑی میں ٹھونک دیتا اور اس کے پیچھے بھی یہ سلسلہ خاصی دور تک جاتا۔ میں آگے نکلتا چلا گیا۔

دوسری طرف کی سڑک پر آنے کے لیے مجھے کافی دور تک جانا پڑا۔ پھر راستہ ملا اور وہاں بھی رکنا پڑا۔ ٹریفک کا بہاؤ اتنا تیز تھا کہ فوراً گاڑی موڑی نہیں جا سکتی تھی۔ ویسے بھی میرے آگے دو تین گاڑیاں سگنل کھلنے کی منتظر تھیں اور میں ان کے پیچھے پھنسا کھڑا تھا۔ خدا خدا کر کے جب میں گھوم کر دوسری طرف کی سڑک پر آ کر واپس فور اسٹار ہوٹل کراؤن پہنچا تو تہمینہ، اس کی گاڑی اور ڈرائیور کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔

میں نے اپنی گاڑی پارکنگ لاٹ میں کھڑی کرتے وقت بھی

سب گاڑیوں کا جائزہ لیا لیکن درانی والی گاڑی یا اس کا ڈرائیور کہیں نظر نہ آیا۔ شاید وہ تہمینہ کو یہاں اتار کر چلا گیا تھا۔ اس صورت میں تہمینہ کا ملنا ذرا مشکل معلوم ہوتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اوپر کسی کمرے میں چلی گئی ہو۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ یہاں بھی اس کی کوئی اسامی مقیم ہو اور وہ فارغ وقت میں اس کے ساتھ کوئی وعدہ نبھانے آئی ہو۔ وہ ایک غیر معمولی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی رگ و پے میں شاید غیر معمولی توانائیاں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا۔

لابی میں پہنچ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس قسم کے کسی ہوٹل میں یہ پتا چلانا ذرا مشکل ہی ہوتا تھا کہ کون سا وزیٹر کہاں گیا۔ خصوصاً جبکہ وزیٹر خاتون ہو تو اس کی نشانیاں اور حلیہ وغیرہ بتا کر اس کے بارے میں پوچھنا زیادہ معیوب لگتا ہے اور پوچھنے والا دوسروں کی نظر میں مشکوک ہوجاتا ہے۔ میں اس سلسلے میں ابھی کوئی ترکیب سوچ ہی رہا تھا کہ آڈیٹوریم کی طرف جانے والے راستے کے قریب کافی بار میں مجھے ایک بھڑک دار نارنجی ساری کی جھلک نظر آئی۔

تہمینہ بھڑک دار نارنجی ساری میں ہی تھی۔ کچھ اس رنگ کی وجہ سے اور کچھ اپنے خوب صورت سراپا اور رنگ روپ کی وجہ سے وہ گاڑی سے اترتے وقت کچھ ایسی ہی دکھائی دی تھی جیسے عورت نہیں کوئی حسین شعلہ برآمد ہوا ہو۔ میں ٹہلنے کے سے انداز میں کافی بار کی طرف چل دیا۔ لابی اور اس کے آس پاس کے راستوں پر کافی چہل پہل تھی۔ شاید آڈیٹوریم اور کسی ہال میں تقریبات وغیرہ چل رہی تھیں۔ مہمانوں کی گاڑیاں بھر بھر کر آرہی تھیں لیکن کافی بار میں صرف تین چار افراد ہی بیٹھے تھے۔

ان میں سے ایک تہمینہ تھی۔ وہ باقی افراد سے دور ایک کونے کی میز پر الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ میں نے ایک ستون کی اوٹ سے اس کا جائزہ لیا۔ یوں تو ہوٹل کا تقریباً ہر گوشہ ہی روشنیوں سے جگمگ جگمگ کررہا تھا لیکن تہمینہ پر ایک فانوس کی پہلو دار روشنی کچھ زیادہ ہی پڑ رہی تھی اور اس نے اس کے خوب صورت سراپا کو گویا مزید اُجال دیا تھا۔

غنیمت تھا کہ آس پاس سے گزرتے ہوئے لوگ کچھ ایک دوسرے میں اور کچھ یہاں کے ماحول میں الجھے ہوئے تھے۔ کسی کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔ میں چند سیکنڈ کے لیے اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ اتنی سنجیدگی، تمکنت اور بُردباری سے بیٹھی ہوئی تھی کہ کوئی اس کی طرف بے باکی سے دیکھنے کی جُرات بھی ذرا مشکل سے ہی کر سکتا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ اس وقت اس کے چہرے پر کچھ تقدس بھی نظر آرہا تھا۔

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ کیا یہ واقعی وہی لڑکی تھی جسے کل رات میں نے درانی کے بیڈ روم میں دیکھا تھا؟ کچھ متحرک پرچھائیاں میرے ذہن پر حملہ کررہی تھیں اور میری بے یقینی میں اضافہ کررہی تھیں۔ وہ نہایت پُرسکون انداز میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ شاید کسی کا انتظار کررہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ درانی کا ہی انتظار کررہی ہو۔ ان کے درمیان یہاں ملاقات طے پائی ہو۔

میں نے بہ مشکل اس کی طرف سے نظر ہٹائی تاکہ یکسوئی سے کچھ سوچ سکوں۔ سوال یہ تھا کہ میں اچانک اسے سرِراہ دیکھ کر اس کے پیچھے پیچھے بھاگا کیوں آیا تھا؟ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ میں اس سے کچھ بات کرنا چاہتا تھا لیکن ساتھ ہی مجھے یہ احساس بھی ہورہا تھا کہ اس سے بات کرنا قبل ازوقت تھا۔ ابھی معاملہ کچا تھا اور درانی جیسی چیز پر کچا ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ ابھی اس کے بارے میں میرے آدمی مواد جمع کررہے تھے اور اس لڑکی کو چھیڑنا درانی ہی کو چھیڑنے کے مترادف تھا۔

اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں ستون کی اوٹ سے نکلا اور دونوں ہاتھ پینٹ کی جیبوں میں ڈالے ٹہلنے کے سے انداز میں چلتا ہوا سنہری زنجیروں سے بنے ہوئے جنگلے کے درمیان سے گزر کر کافی بار میں جا پہنچا۔ تہمینہ نے گردن گھمائے بغیر آنکھوں کی خفیف سی حرکت کے ساتھ ایک ادائے بے نیازی سے میری طرف دیکھا۔ میں نے یہی ظاہر کیا جیسے میری اچانک اس پر نظر پڑی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کا کوئی رنگ نہیں اُبھرا تھا اس کے باوجود میں سیدھا اس کی طرف چلا گیا اور اس سے اجازت لیے بغیر کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا۔

اس نے نہ تو مجھے خوش آمدید کہا اور نہ ہی مسکرا کر میرا استقبال کیا لیکن اس کی پیشانی پر ناگواری کی شکنیں یا آنکھوں میں برہمی کا رنگ بھی نہیں جھلکا۔ وہ اسی پُرسکون انداز میں میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے انداز میں ہلکی سی نخوت بھی تھی۔

"تم سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی تہمینہ!" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔ میں اس وقت ایک ایسے آدمی کا کردار ادا کرنے کی کوشش کررہا تھا جو کسی لڑکی سے نہایت معمولی سی واقفیت کے بعد کہیں سرِراہ ملاقات ہونے پر خواہ مخواہ کمبل ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔

خلافِ توقع اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا افضل صاحب؟" اس نے دھیمی اور دلکش آواز میں پوچھا۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ جمشید کریم کے دفتر میں جب میں نے اسے دیکھا تھا، اس نے مجھے صرف کافی سرو کی تھی اور شکر ڈالتے وقت صرف ایک نظر میری طرف دیکھا تھا۔ ہمارا ایک دوسرے سے تعارف نہیں کرایا گیا تھا۔ میں نے تو خیر اس کے پیچھے آدمی لگا کر اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرایا تھا لیکن وہ بھی میرے بارے میں کچھ ایسی بے خبر نہیں تھی۔ اس نے نہ صرف مجھے پہچان لیا تھا بلکہ اسے میرا نام بھی معلوم تھا۔

"یہ سوال تو میں تم سے بھی کرسکتا ہوں۔" میں نے اب ذرا اطمینان سے مسکراتے ہوئے کہا "جہاں تک مجھے یاد ہے اس دفتر میں اس بدذوق جمشید کریم نے تو ہمیں ایک دوسرے سے متعارف نہیں کرایا تھا۔"

"لیکن بعد میں انہوں نے ہی مجھے آپ کے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تھا۔" وہ اب ذرا واضح مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"مجھے بھی اسی طرح کسی اور مہربان نے تمہارے بارے میں بتا دیا ہوگا۔" میں نے کہا "انسان کو کسی کی ذات میں دلچسپی ہو تو اس کے بارے میں جاننے کے کچھ نہ کچھ ذرائع تلاش کرہی لیتا ہے۔"

"اچھا... تو آپ یہ بتانا چاہ رہے ہیں کہ آپ نے میری ذات میں دلچسپی محسوس کی؟" وہ بے باکی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ مسکراہٹ کچھ اور واضح ہوگئی۔

"بہت زیادہ۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اسے ابھی قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ میری دلچسپی کی نوعیت کیا تھی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا تو اس نے نظر چرالی۔ میں نے ملائمت سے پوچھا "آپ جمشید کریم کے ہاں کیا کرتی ہیں؟"

"میں امپورٹ اینڈ ایکسپورٹ کارپوریشن میں گیسٹ ریلیشنز منیجر ہوں۔" اس نے ایک ادائے خاص سے جواب دیا۔

"بہت خوب۔" میں نے ستائشی انداز میں سرہلایا "اب امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کرنے والی کمپنیاں بھی گیسٹ ریلیشنز منیجر رکھنے لگیں۔"

"گیسٹ ریلیشنز منیجر کی ضرورت تو ہر کاروباری ادارے کو پڑ سکتی ہے۔ اب یہ اپنے اپنے نظریات اور حیثیت کی بات ہے کہ کون رکھنا افورڈ کرسکتا ہے اور کون نہیں۔" وہ خاصی سنجیدگی سے بولی۔

"خصوصاً تم جیسی خوش شکل، خوش ادا گیسٹ ریلیشنز منیجر رکھنے اور پھر اس سے صحیح طور پر "گیسٹ ریلیشننگ" کا کام لینے کے لیے تو بہت ہی بڑا دل اور خصوصی حوصلہ چاہیے۔" یہ بات گو کہ میں نے خاصے چبھتے ہوئے لہجے میں کہی تھی اور وہ کچھ ایسی کوڑھ مغز بھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس کے سر سے گزر گئی۔

وہ اب اپنے موتیوں جیسے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی "اب میں آپ کی اس بات کے جواب میں عام لڑکیوں کی طرح انکساری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ تو نہیں کہوں گی کہ جی میں تو بس معمولی شکل و صورت کی عام سی لڑکی ہوں اور حسن تو بس دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔"

"تو پھر تم کیا کہو گی؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"خوش شکل اور خوش ادا تو میں ہوں۔" وہ اداکاراؤں کے سے انداز میں کندھے اچکا کر بولی "اسی لیے ماڈلنگ کے سلسلے میں مجھے بہت سی آفرز آرہی ہیں اور میں سوچ رہی ہوں کہ اس فیلڈ میں بھی تھوڑی سی طبع آزمائی کرکے دیکھ ہی لیا جائے۔"

"بہت نیک خیال ہے۔" میں نے سرہلایا "مجھے یقین ہے کہ تم اپنی عظیم اور گراں مایہ صلاحیتوں کی بدولت اس فیلڈ میں دھوم مچا دو گی۔ لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کی جو ناقابلِ بیان صلاحیتیں تم میں موجود ہیں ان کی وجہ سے ہر ایڈورٹائزر چاہے گا کہ اس کی پروڈکٹ کے اشتہار میں تم اور صرف تم کام کرو۔"

اس نے اب بھی اس تعریف کو تعریف ہی سمجھا اور مسکراتے ہوئے بولی "جی ہاں... مجھے یقین ہے کہ میں اس فیلڈ میں آؤں گی تو کم از کم کچھ فضول سی ماڈلز کا چراغ تو ضرور گُل کردوں گی۔" پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی "اب یہی دیکھ لیجئے کہ ابھی میں کسی پروڈکٹ کے اشتہار میں آئی نہیں ہوں... بلکہ سچ پوچھئے تو ابھی میں نے کسی ایڈورٹائزنگ کمپنی کے دفتر میں قدم بھی نہیں رکھا لیکن آج ایک مشہور انگریزی اخبار کا کلچرل رپورٹر میرا انٹرویو کرنے آرہا ہے۔ میں دراصل اسی کا انتظار کررہی ہوں۔"

"بہت خوب۔" میں نے ایک بار پھر تحسین آمیز انداز میں سر ہلایا "اخبار والوں کو تو اپنے صفحات سجانے کے لیے آپ جیسے چہروں کی ضرورت رہتی ہے..."

اس لمحے ویٹر ہمارے سر پہ آن کھڑا ہوا۔ تہمینہ نپی تُلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "آپ کیا کھانا پینا پسند کریں گے؟ ویسے تو مجھے معلوم ہے کہ آپ اس سے بھی اچھے ہوٹل کے مالک ہیں۔ شاید آپ کو یہاں کی چیزیں پسند نہ آئیں۔"

اس پر ویٹر نے ذرا ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا لیکن مؤدبانہ سے انداز میں خاموش ہی کھڑا رہا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ میں اس وقت اپنی دولت مندی کی کچھ جھوٹی سچی کہانیاں سنا کر لڑکی کو متاثر کرنے کی کوشش کررہا تھا اور اگر اس نے اس بات کو سچ بھی سمجھا تھا تب بھی شاید کسی قسم کا ردِعمل ظاہر کرنا آدابِ ملازمت کے خلاف سمجھا ہو۔

"ہوٹل کا مالک ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں نے ادھر اُدھر بیٹھ کر کھانا پینا بالکل چھوڑ دیا ہے۔" میں نے نیچی آواز میں کہا "موقع محل کے اعتبار سے تو میں اب بھی کسی نانبائی کے تندور پر بیٹھ کر کھانے سے بھی دریغ نہیں کرتا لیکن اس وقت میں کچھ کھانے پینے کی ضرورت محسوس نہیں کررہا۔"

اس نے اپنے لیے آئس کریم کی آمیزش والی ایک کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا اور ویٹر کے جانے کے بعد اپنے پرس سے ایک کارڈ نکالتے ہوئے بولی "آپ کبھی گھر تشریف لائیے نا... آپ جیسے لوگوں سے مل کر تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے۔"

"یقیناً ہوتی ہوگی۔" میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے سنجیدگی سے کہا اور کارڈ پر نظر ڈالی۔ اس پر اس کے کلفٹن کے اپارٹمنٹ کا پتا اور فون نمبر درج تھا۔

میرے اندر کوئی غیبی قوت کسی تاریک گوشے سے نہایت

مدھم سرگوشیوں میں گویا مجھے خبردار کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ ابھی مجھے اس کی اصلیت اور اصلی معاملے کی طرف نہیں آنا چاہیے اور درانی والے چکر کو نہیں چھیڑنا چاہیے ' ابھی معاملہ کچا تھا اور میں بے وجہ یا بے فائدہ قسم کی جذباتیت کا بھی قائل نہیں تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں نہ جانے کیوں غبار سا بھرا ہوا تھا۔ معلوم نہیں اصل وجہ کیا تھی' میں اس وقت زیادہ باریکی سے تجزیہ کرنے سے تو قاصر تھا لیکن میں یہ محسوس ضرور کررہا تھا کہ میری اندرونی کیفیت اس وقت کچھ عجیب سی تھی۔ شاید اسی کیفیت کے تحت میں نے ان مبہم سی آوازوں کی طرف توجہ نہیں دی اور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا "کھارادر والا فلیٹ تم لوگوں نے چھوڑ دیا کیا؟"

"کھارادر.....؟" وہ بُری طرح چونکی۔ اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں اور خوب صورت میک اپ کی آڑ میسر ہونے کے باوجود مجھے اس کی رنگت کچھ پھیکی پڑتی محسوس ہوئی۔ مجھے ان لوگوں پر ترس آتا تھا جو اپنا ماضی معیوب نہ ہونے کے باوجود اس سے ڈرتے تھے۔ محض اس لیے کہ وہ غربت اور تنگدستی کے سایوں میں چھپا ہوتا تھا۔ شرمندہ تو اسے اپنے حال پر ہونا چاہیے تھا لیکن اس میں شاید اس نے اپنے لیے فخر کے کچھ پہلو تلاش کرلیے تھے۔

وہ فوراً ہی سنبھل کر بولی "ہم کھارادر میں تو کبھی نہیں رہتے تھے.... ہاں البتہ میری ایک رشتے کی خالہ وہاں رہتی تھیں۔ کبھی کبھار ان کے ہاں چلے جاتے تھے۔ اب تو ان کا بھی انتقال ہوچکا ہے۔ اس کے بعد سے ان کے ہاں آنا جانا ختم ہی ہوگیا۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے بڑی ادا سے میز پر ذرا جھکتے ہوئے پوچھا "آپ کو کس نے بتایا؟"

"میں نے کہا نا کہ بات دلچسپی کی ہوتی ہے۔ بتانے والے تو بہت مل جاتے ہیں اور بہت کچھ بتا بھی دیتے ہیں........" میں نے بے پروائی سے کہا۔ میں اس کے وزٹنگ کارڈ کو انگلیوں میں گھما رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے کارڈ کو توجہ سے دیکھا اور کہا "میں تمہارے گھر ضرور آؤں گا لیکن میرا خیال ہے ان دنوں آنے کا تو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ان دنوں تو تم خود درانی کے بنگلے پر رہ رہی ہو۔ جب تم درانی کی خاطر داری سے فارغ ہوجاؤ تو مجھے فون کرنا۔ میں خود تمہارے ہاں آؤں گا یا تمہیں اپنے ہاں مدعو کروں گا۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

وہ دم بخود بیٹھی رہ گئی۔ چند لمحے وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ تاہم وہ زیادہ دیر بدحواس رہنے والی لڑکی نہیں تھی۔ اس نے جلد ہی اپنے آپ کو سنبھال لیا اور محسوس کرلیا کہ اب میٹھی میٹھی باتیں کرنے اور میٹھی میٹھی باتیں سننے کا وقت گزر چکا ہے۔ اب لائحہ عمل بدلنے کی ضرورت تھی۔ وہ میز پر کچھ آگے کو جھک آئی۔ اس کے چہرے پر یک بیک سرد مہری اور آنکھوں میں سفاکی در آئی۔ میرا خیال تھا کہ میری ہر بات اسے مزید بدحواس کرنے کا باعث بنے گی لیکن وہ نہ صرف جلدی سنبھل گئی بلکہ شاید اس نے جواباً مجھے بھی بدحواس کرنے کا ارادہ باندھا۔

وہ جب بولی تو اس کی آواز زخمی ناگن کی پھنکار سے مشابہ تھی "آپ ان دنوں میری نگرانی کرارہے ہیں اور میرے بارے میں معلومات جمع کرارہے ہیں افضل صاحب؟"

"میں ایسے فضول کاموں میں وقت اور توانائیاں ضائع کرنے کا قائل نہیں ہوں۔" میں نے اعتراف سے گریز کیا "تم جیسے کردار تو آج کی ماڈرن سوسائٹی میں عام ہوگئے ہیں۔ قدم قدم پر نظر آنے لگے ہیں۔ ان کی نگرانی کرانے' معلومات جمع کرانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ذرا غور سے دیکھو' سب کچھ خود ہی سمجھ میں آجاتا ہے۔ معلومات کے ثمر خود ہی جھولی میں آن گرتے ہیں۔ سوال خود اپنا جواب تلاش کرلاتے ہیں۔"

"شاعری نہ بگھاریں۔ میری بات کا جواب دیں۔" وہ گویا دانت پیس کر بولی۔

میں نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "پیسے کی خاطر اس دنیا میں نہ جانے کیا کچھ ہورہا ہے۔ ہر بھیانک کہانی کی قبر کو کریدو تو گھوم پھر کر اس کی تہ سے پیسے کا فساد ہی نکلے گا۔ پیسے کی خاطر اب بے غیرتی بھی بڑھ گئی ہے۔ پیسے کی خاطر غیرت کا جنازہ تو صدیوں سے نکلتا آرہا ہے لیکن اب یہ کام بڑے پیمانے پر ہونے لگا ہے۔ اس کے طور طریقے بھی کافی ماڈرن ہوگئے ہیں۔ زیادہ عبرت اور افسوس کا مقام تو وہ ہوتا ہے کہ جو کام جمشید کریم تم سے لینے کی کوشش کررہا ہے' بعض لوگ تو اپنی بیویوں سے بھی وہ کام لیتے ہوئے نہیں ہچکچاتے۔"

وہ ایک لمحے کچھ اس طرح مجھے گھورتی رہی جیسے قتل کردینا چاہتی ہو۔ پھر بولی "آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ جمشید کریم نے تمہارے ذمّے جو کام لگایا تھا وہ تم نے درانی سے کرالیا ہے یا نہیں؟ درانی نے امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں اپنی تحقیقاتی رپورٹ بدل لی ہے یا ابھی اس کے بیڈ روم میں اس کے ساتھ تمہارے مذاکرات چل رہے ہیں؟"

اس کی بے خوفی میں ایک لمحے کے لیے دراڑ سی پڑی لیکن پھر شاید اس نے یہی سوچا کہ اب بات تو کھل ہی رہی تھی' اب ذرا ڈٹ کر' جرأت اور حوصلے سے صورتِ حال کا مقابلہ کرنا چاہیے تھا۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ مجھے صحیح طور پر جانتی نہیں تھی' دوسرے اسے نہ جانے کس کس طرح کی پشت پناہی حاصل تھی۔

وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر الفاظ کو گویا چباتے ہوئے بولی "مجھے معلوم ہے آپ بہت بڑے آدمی ہیں افضل صاحب.....!"

مجھے یہ معلوم تھا کہ ان جیسے لوگوں کی ڈکشنری میں "بڑے آدمی" کا مطلب دولت مند یا بڑے عہدے پر بیٹھا ہوا آدمی ہوتا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "لیکن آپ بڑا آدمی ہونے کے زعم میں مارے نہ جایئے گا۔"

"مشورے اور تنبیہ کا شکریہ۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "لیکن یہ اطلاع میرے لیے نئی ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں۔ میں تو آج تک ہر کام اپنے آپ کو بہت چھوٹا سا آدمی سمجھ کر ہی انجام دیتا آرہا ہوں۔"

"اس انکساری کے ساتھ تو آپ اور بھی زیادہ جلدی مارے جائیں گے۔" وہ فوراً بولی "آپ ایک کاروباری آدمی ہیں۔ آپ کو جمشید کریم اور درانی جیسے لوگوں سے نہیں الجھنا چاہیے۔ آپ اس کے متحمل نہیں ہوسکیں گے۔"

"اس مشورے کا بھی شکریہ.... لیکن اس قسم کے لوگوں سے الجھنا میری ہابی ہے۔" میں نے کہا "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرے پاس تمہاری اور درانی کی ایک نہایت دلچسپ فلم ہے جس کی چند کاپیاں ایسی جگہوں پر محفوظ کردی گئی ہیں جہاں سے وہ اس وقت منظرِ عام پر آجائیں گی جب کسی بھی انداز میں میرے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تمہارے بارے میں تو میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ تم تو اس میدان کی بہت بڑی فنکارہ معلوم ہوتی ہو..... تمہیں تو شاید ابھی بہت آگے تک جانا ہے.... اس قسم کے انکشافات شاید تمہاری صحت پر کوئی خاص اثرات نہ ڈال سکیں لیکن درانی ایک بہت اہم محکمے میں' بہت اہم عہدے پر ہے.... شادی شدہ ہے.... اس کے جوان بچے ہیں.... وہ فلم اسے خودکشی پر مجبور کرسکتی ہے۔"

اس کی سانسیں کچھ تیز ہوگئی تھیں۔ مرتعش لہجے میں وہ بولی "یہ تو وقت بتائے گا کہ وہ فلم کسے خودکشی پر مجبور کرتی ہے.... لیکن میں آپ کو اتنا ضرور بتادینا چاہتی ہوں کہ مجھے آپ سے مل کر سخت مایوسی ہوئی ہے۔ جب میں نے آپ کو دفتر میں دیکھا تھا.... کافی پلائی تھی اور بعد میں جمشید صاحب نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا تھا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ اس قسم کے آدمی ہوں گے۔"

"کم و بیش یہی الفاظ میں تمہارے لیے بھی استعمال کرسکتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری بات چھوڑیں...." وہ ناک سکیڑ کر بولی "میں تو اس معاشرے کی بساط پر ایک معمولی سا مہرہ ہوں۔ میرا کیا ہے... میں تو کبھی اِدھر کھسکادی جاتی ہوں.... کبھی اُدھر۔ وقت آئے گا جب میں پٹ جاؤں گی۔ اٹھا کر ایک طرف ڈال دی جاؤں گی۔ مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے اسی لیے وہ وقت آنے سے پہلے اپنے کچھ منصوبے مکمل کرلینا چاہتی ہوں تاہم میرا حال یا مستقبل اتنا اہم نہیں ہے۔ آپ اپنے بارے میں سوچیں۔ آپ دولت مند طبقے کے ایک اہم فرد ہیں۔ آپ کے تو بہت بڑے بڑے منصوبے ہوں گے۔ بہت سی زندگیاں' بہت سے مستقبل آپ سے وابستہ ہوں گے۔ آپ کی زندگی زیادہ قیمتی ہے۔ یہ زندگی اگر محض بے مقصد سے انداز میں آگ سے کھیلتے ہوئے ضائع ہوگئی تو یہ بڑے افسوس کی بات ہوگی۔"

"اس پُرذہانت اور ہمدردانہ گفتگو پر تو میں تمہارا بہت ہی زیادہ شکرگزار ہوں لیکن آخر میں کب تک تمہارا شکریہ ادا کرتا رہوں گا۔" میں نے دوستانہ سے لہجے میں کہا "مجھے اپنے ہر سوال کا جواب بھی چاہیے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں درحقیقت درانی نے کیا رپورٹ تیار کی تھی... یا کرنا چاہتا تھا؟ جمشید کریم نے اس میں کیا تبدیلیاں کرائیں یا کرانا چاہتا ہے؟ فی الحال یہ کام کس مرحلے میں ہے؟ کہاں پہنچا ہے؟ تم درانی سے کیا وعدے لینے میں کامیاب ہوئی ہو؟"

اس نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی اور ترحم آمیز سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہمدرد بزرگ کسی نادان بچے کو کچھ سمجھا سمجھا کر تھک گیا ہو۔ اس کے ہونٹوں پر زہریلی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ جیٹھی جیٹھی سی آواز میں بولی "یہ خاصے مشکل سوالوں کی فہرست ہے افضل صاحب! کیا یہ بہتر نہیں کہ ان سوالوں کے جوابات آپ درانی سے ہی حاصل کرنے کی کوشش کریں؟ میں تو محض ایک کٹھ پتلی ہوں۔ جس طرح نچایا جاتا ہے' ناچنے لگتی ہوں۔ بہرحال میں اس پر کوئی شکوہ' شکایت یا رونا دھونا نہیں کرتی۔ کسی کے سینے سے لگ کر آنسو بہا کر ہمدردیاں تلاش نہیں کرتی۔ یہ زندگی میری اپنی منتخب کردہ ہے اور میں اس کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہوں لیکن.... لیکن بہتر یہی ہے کہ آپ بڑے لوگ اپنے سوالوں کے جواب ایک دوسرے سے ہی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

"وہ تو میں کروں گا ہی...." میں نے ملائمت سے کہا "مجھے تمہاری باتوں سے ذہانت اور کچھ بچی کھچی اچھائی کی خوشبو آرہی ہے۔ اگر مجھے تمہارا تعاون حاصل ہوجاتا تو بہتر تھا۔ اس طرح شاید وہ گھٹیا زندگی تباہ ہونے سے بچ جاتی جو تم نے اپنے لیے بڑے شوق سے منتخب کی ہوئی ہے۔"

"مجھے آپ کی گڈبکس میں آنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولی "میں جس طرف ہوں.... جس حال میں ہوں' جس مقام پر ہوں' مجھے وہیں رہنے دیجئے۔"

"بہت خوب۔" میں نے تحسین آمیز انداز میں سرہلایا "بدکرداری میں بھی انسان کا کوئی کردار ہونا چاہیے۔ مجھے تمہاری یہ بات پسند آئی۔"

"بہت شکریہ شہنشاہِ معظم!" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ وہ کسی بھی انداز میں میری پیش قدمی سے متاثر ہوتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ اپنے مقصدِ حیات اور نظریات میں بڑی مضبوط معلوم ہوتی تھی۔ وہ خوف زدہ ہوکر' لالچ میں آکر یا کسی بھی اور جذبے سے متاثر ہوکر میری مدد کے لیے تیار نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے

اس پر غصہ بھی آیا۔ کچھ غصہ پہلے ہی میرے لاشعور میں کہیں کلبلا رہا تھا۔

میں اسے گھور رہا تھا اور فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے اس کے بارے میں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ پچھلے چند سیکنڈ سے وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ مجھ سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ اس کی نظریں میرے عقب میں اِدھر اُدھر کہیں بھٹک رہی تھیں۔ میں یہی سمجھا کہ شاید اس کی نظریں اس رپورٹر کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں جسے اس سے انٹرویو لینے کے لیے آنا تھا۔ عام طور پر اس قسم کی لڑکیاں تو رپورٹروں کو انتظار کراتی تھیں مگر نہ جانے کیا وجہ تھی کہ وہ رپورٹر سے پہلے آکر بیٹھ گئی تھی۔

دفعتاً اس کی نظریں ایک بار پھر میرے چہرے پر آن ٹکیں اور وہ دوبارہ میز پر جھکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "مجھے اور درانی کو بلیک میل کرنا آپ کو بہت مہنگا پڑے گا افضل صاحب!"

میں اپنی کنپٹیوں میں کہیں ہلکی سی تپش محسوس کر رہا تھا۔ میں نے میز پر دونوں کہنیاں ٹکا کر اپنا چہرہ اس کے قریب لاتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "یہ بلیک میل نہیں ہے محترمہ تمینہ صاحبہ! یہ ایک انتہائی کرپٹ آفیسر کو ایک قومی جرم سے روکنے کی کوشش ہے جبکہ وہ آفیسر اس سے پہلے ہی نہ جانے کتنے سنگین جرائم کا ارتکاب کرچکا ہے.... بلکہ شاید اس کی پوری پیشہ ورانہ زندگی ایسے ہی جرائم سے عبارت ہوگی...."

ایسی باتیں چھڑتی تھیں تو میرا پرانا دردِ دل جاگ اٹھتا تھا اور بات لمبی ہوجاتی تھی لیکن اس وقت بات لمبی نہ ہونے پائی۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ دو سائے میرے دائیں بائیں آن کھڑے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دو سخت سی چیزیں میرے دونوں کندھوں سے آن لگیں۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا' وہ سائے نہیں' دو فیشن ایبل سے نوجوان تھے۔ ان پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ان کا تعلق تو یقیناً نچلے متوسط طبقے سے تھا لیکن شاید وہ اونچے طبقے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے یا داخل ہوچکے تھے۔ لمبے بال' جینز' جوگرز' ہاتھوں میں کڑے' منہ میں چیونگم اور شکل پہ خباثت۔ دونوں نے چمڑے کی سیاہ جیکٹیں پہنی ہوئی تھیں اور دونوں کا ایک ایک ہاتھ جیکٹ کی جیب میں تھا۔

وہ تقریباً مجھ سے چپک کر آن کھڑے ہوئے تھے اور دونوں نے اپنی اپنی جیب میں موجود گن کی نال میرے کندھے سے لگادی تھی۔ ان میں سے ایک تو اوسط سے قد کاٹھ کا تھا۔ دوسرا ذرا لمبا تڑنگا اور کچھ مضبوط دکھائی دیتا تھا۔ رنگت دونوں کی گندمی تھی اور شکلیں بھی عام سی تھیں لیکن اس وقت وہ دونوں یقیناً اپنے آپ کو انگریزی فلموں کے گینگسٹر یا مافیا کے اہم نمائندے سمجھ رہے تھے۔

لمبے نوجوان نے چیونگم چباتے ہوئے' نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی سے ذرا بلند آواز میں کہا "ہمارا خیال ہے کہ یہ خوب صورت خاتون تمہاری باتوں سے بیزار ہو رہی ہیں۔ تم ان کا پیچھا چھوڑو اور باہر چل کر ذرا ہم سے بات کرو۔"

"کیا... کیا یہیں بات نہیں ہوسکتی؟" میں نے اپنے لہجے میں ذرا خوف کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں۔" نوجوان غرایا "ہوسکتا ہے ہمیں تم سے کسی دوسری زبان میں بات کرنی پڑجائے... اور تم دیکھ ہی رہے ہو یہاں کا فرنیچر کتنا خوب صورت ہے.... شیشے ہیں.... فانوس ہیں.... خوب صورت لائٹس ہیں.... مہنگی کراکری ہے۔ جھلمل جھلمل کرتا فرش ہے.... ہوٹل والوں سے فی الحال ہماری کوئی دشمنی نہیں جو ہم ان کی چیزوں کا بیڑا غرق کریں۔"

ظاہر تھا انہیں ہوٹل والوں سے کوئی ایسی ہمدردی نہیں تھی۔ بات صرف یہ تھی کہ کسی قسم کا ہنگامہ برپا کرنے کی صورت میں یہاں ان کے پکڑے جانے یا پہچانے جانے کے امکانات زیادہ تھے اور وہ یہ خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ وہ دونوں یقیناً تمینہ کی نگرانی کر رہے تھے اور شاید اس کی حفاظت پر مامور تھے۔ میں نے اس پہلو پر نہیں سوچا تھا کہ اس پر نظر رکھنے والا بھی کوئی آس پاس موجود ہوسکتا ہے۔ شاید ایسا صرف اس وقت ہوتا ہو جب درانی اس کے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔

"یہ دونوں کون ہیں؟" میں نے ذرا خوف زدہ سے لہجے میں تمینہ سے پوچھا۔

وہ کچھ جھلائے ہوئے سے انداز میں بولی "آپ نے کیا ہر بات مجھ سے ہی پوچھنے کا تہیہ کررکھا ہے؟ جس سوال کا جس سے تعلق ہو کبھی ڈائریکٹ اس سے بھی پوچھ لیا کریں۔"

"اٹھو..." لمبے نوجوان نے اب گن کی نال میرے کندھے میں زیادہ سختی سے چبھوتے ہوئے درشت لہجے میں کہا "باہر چلو۔ تمہیں اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیں گے۔ اپنا تفصیلی تعارف بھی کرادیں گے۔ اپنا شجرۂ نسب بھی بتادیں گے۔" دوسرے نوجوان نے بھی اس کی تقلید میں گن کی نال زیادہ سختی سے میرے دوسرے کندھے میں چبھوئی۔

میں نے رحم طلب انداز میں تمینہ کی طرف دیکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے مجھے دروازے کی طرف چلنے کے لیے ٹہوکا دیا۔ بولنے کا فریضہ صرف دراز قد نوجوان نے سنبھالا ہوا تھا۔ وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز اور سرگوشی کے انداز میں بولا "چیخ پکار یا کسی کو آواز دینے کی کوشش نہ کرنا ورنہ ہم مجبوراً ہوٹل کا یہ خوب صورت فرش گندا ہونے کی پروا نہیں کریں گے۔"

وہ دونوں میرے دائیں بائیں چپک کر چلنے لگے۔ کبھی کبھی دونوں کی جیبوں میں چھپی ہوئی گن کی نال میرے دائیں یا بائیں طرف پسلیوں میں کہیں چبھ جاتی۔ میں ان کی ہدایت کے مطابق سعادت مندی سے ان کے ساتھ چلتا ہوا پارکنگ لاٹ میں

جہاں ایک چھوٹی سبز جیپ آڑی ترچھی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بند جیپ تھی اور اس میں کئی ڈینٹ پڑے ہوئے تھے۔

اوسط قد کاٹھ کے نوجوان نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ پارکنگ لاٹ میں کوئی نہیں تھا۔ لمبے نوجوان نے اب اپنی گن نکال لینے میں کوئی حرج محسوس نہ کیا اور اسی سے مجھے پچھلی سیٹ پر دھکیلا۔ میں بلا حیل وحجت کے بیٹھ گیا۔ نوجوان میرے قریب آبیٹھا۔ گن اس نے اس طرح میرے پہلو میں گھسیڑ دی کہ اگر کوئی کھڑکی سے جھانک کر دیکھے تو اسے نظر نہ آسکے لیکن اس وقت میں گن کے بارے میں نہیں ان دونوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

وہ کون ہو سکتے تھے؟ کیا وہ جمشید کریم کے آدمی تھے؟ زیادہ امکان اسی بات کا تھا۔ جمشید کریم کا رویہ گو کہ میرے ساتھ صلح جویانہ تھا لیکن اس قسم کے لوگوں کے گرگے بعض اوقات اپنے طور پر بھی کارروائیاں کرتے رہتے ہیں اور باس سے اجازت یا مشورہ لینے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔

میں نے اپنی دانست میں انہیں کریدنے کی معمولی سی کوشش کی۔ جیپ اس وقت چل پڑی تھی جب میں نے گویا ڈرتے ڈرتے کہا "میں ایک بات تم لوگوں کو بتانا چاہتا ہوں.... اگر تم جمشید کریم کے آدمی ہو.... تو وہ تمہاری اس حرکت کو پسند نہیں کرے گا۔"

نہ جانے کیوں لمبے نوجوان کے حلق سے بندر کے خوخیانے کی سی آواز نکلی اور وہ گویا اپنے ٹی ٹی کا دستہ میری کھوپڑی پر رسید کرنے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بولا "کیا ہم نے تم سے کسی کی پسند ناپسند کے بارے میں کچھ پوچھا؟ بلاوجہ کیوں بڑبڑ کر رہے ہو؟ ہم کسی کے آدمی نہیں ہیں... بلکہ ہم تو سرے سے آدمی ہی نہیں ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" میں بے ساختہ یہ کہتے کہتے رک گیا۔ ظاہری بات تھی کہ وہ بکواس کر رہا تھا۔ اس قسم کے لوگ کسی نہ کسی کے اشارے پر ہی سب کچھ کرتے پھرتے تھے۔ ہوٹل میں وہ محض تمینہ کے چہرے پر ناگواری اور برہمی دیکھ کر یا شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا کوئی خفیف سا اشارہ پا کر محض خدمتِ خلق کے لیے مجھے وہاں پر اغوا کرنے نہیں چلے آئے تھے۔

میں بظاہر سہم گیا اور خاموش رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ دراز قد نوجوان نے اپنے ساتھی کو کوئی ہدایت نہیں کی تھی اور نہ ہی اس نے کچھ پوچھا تھا لیکن گاڑی تیزی سے فراٹے بھر رہی تھی۔ اس کا رخ ٹاور کی طرف تھا۔ سفر مختصر ہی ثابت ہوا۔ جلد ہی گاڑی بینکوں اور انشورنس کمپنیوں کے صدر دفاتر کی بلند وبالا عمارتوں کے درمیان گھوم گئی اور آخر کار ایک چاردیواری کے درمیان جا رکی۔

یہ چاروں طرف سے اونچی عمارتوں میں گھرا ہوا ایک خالی پلاٹ تھا جس پر شاید مستقبل میں کوئی بلند وبالا عمارت ہی تعمیر ہونی تھی لیکن فی الحال یہ باقاعدہ پارکنگ لاٹ کے طور پر استعمال ہو رہا تھا۔ مجھے خود بھی دو تین مرتبہ یہاں گاڑی کھڑی کرنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ اس علاقے میں چونکہ دفاتر میں جلدی چھٹی ہو جاتی تھی اس لیے اس وقت یہاں صرف دو تین گاڑیاں ہی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بھی لاوارث سی معلوم ہوتی تھیں۔ ان پر گرد کی موٹی تہ جمی ہوئی تھی۔ سہ پہر تک تو یہاں ایک مسلح گارڈ بھی ہوتا تھا لیکن اس وقت آس پاس بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چاروں طرف قبرستان کی سی ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔

دراز قد نوجوان پہلے خود جیپ سے اُترا پھر اس نے ٹی ٹی سے مجھے اترنے کا اشارہ کیا۔ اس اثنا میں ڈرائیونگ کرنے والا نوجوان گاڑی سے اتر چکا تھا۔ وہ دراز قد سے کمزور لیکن زیادہ پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بھی جیکٹ کی جیب سے پستول نکال لیا اور مجھے ایک زنگ خوردہ اسٹیشن ویگن کی آڑ میں چلنے کا اشارہ کیا۔

میرا خیال تھا کہ شاید وہ مجھے وہاں لے جا کر مارپٹائی کرنے اور مجھے سبق سکھانے کی کوشش کریں گے۔ میں نے کوئی ایسی سنگین حرکت نہیں کی تھی کہ وہ فوراً ہی مجھے مارنے پر تل جاتے۔ میرے اور تمینہ کے درمیان ہونے والی گفتگو بھی یقیناً انہوں نے نہیں سنی تھی۔

خلافِ توقع گاڑی کی آڑ میں پہنچتے ہی دراز قد نوجوان نے پستول کی نال میرے پیٹ پر اور چھوٹے قد کے نوجوان نے کنپٹی پر رکھ دی۔ دراز قد بولا "ایک ساتھ ٹریگر دبانا۔ اس طرح زیادہ مزہ آئے گا۔"

میں یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ محض مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش نہیں کر رہے تھے۔ وہ بڑی سنجیدگی سے یہ بات کر رہے تھے اور ایک انسان کو یہاں تخلیئے میں گولی مارنا ان کے نزدیک ایک ایسا کام تھا جس سے وہ لطف اندوز بھی ہونا چاہتے تھے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہیں میرے بارے میں کچھ معلوم تھا یا نہیں۔ اگر معلوم تھا تو یقیناً انہیں اس کی کوئی پروا نہیں تھی اور اگر معلوم نہیں تھا تو شاید معلوم کرنے سے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی۔ یہ سفا... اور یہ بے نیازی قابلِ غور تھی۔

چھوٹے قد والا بولا "اگر مزہ ہی لینا ہے تو پہلے صرف پیٹ میں گولی مارو۔ پھر دیکھنا کیسا تڑپتا ہے۔ کچھ دیر بعد کنپٹی اور گولی مار... گے..." اس نے ایک دو جگہوں کے نام بھی تجویز کیے جنہیں سُ... ایک لمحے کے لیے میری کنپٹیاں تپ اٹھیں۔ میں نے انہیں... تبادلۂ خیال کا موقع نہیں دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنے پروگرا... عمل درآمد کے سلسلے میں الجھن میں پڑ گئے تھے اور اسی ایک لمـ... استعمال کرتے ہوئے میرے دونوں ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حر... میں آئے۔

چھوٹے قد والے کا پستول تو اس کے ہاتھ سے نکل گیا... دراز قد کا ٹی ٹی میرے وار کے باوجود اس کے ہاتھ میں ہی رہا... اس کا رخ آسمان کی طرف ہو گیا اور ایک گولی بھی چل گئی کہ...

اضطراری طور پر اس کی انگلی سے ٹریگر دب گیا تھا۔ بلند عمارتوں کے درمیان اس خالی اور ویران جگہ پر اس فائر کی آواز بے معنی سے انداز میں دوسرے ہی لمحے فضا میں معدوم ہو گئی۔ کسی عمارت کی کھڑکی نہیں کھلی۔ کسی طرف سے کوئی متوجہ نہیں ہوا۔ ایک عرصے سے شہر میں اس قسم کی اِکاّ دُکاّ آوازوں پر تو لوگوں نے توجہ دینا ہی چھوڑ دیا تھا۔ یہاں تو شاید کوئی موجود ہی نہیں تھا۔ موجود بھی ہوتا تو شاید بند رہنے والے ایئرکنڈیشنڈ دفاتر کی کھڑکیوں سے اس قسم کی آواز کو کسی کے کانوں تک پہنچنے کا راستہ مشکل سے ہی ملتا.... اور مل جاتا تو شاید کوئی اس کے بارے میں سوچنے کی زحمت نہ کرتا۔

یہ تو خیر بعد کی باتیں تھیں۔ فائر کی آواز معدوم ہونے سے پہلے ہی میری ٹانگ حرکت میں آ چکی تھی اور دراز قد نوجوان دھپ سے زمین پر گر چکا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے ٹی ٹی کا رخ میری طرف کرتے ہوئے دوسرا فائر کر پاتا، میں نے اس کی وہ کلائی پکڑ کر مروڑی اور بے رحمی سے ویگن کے فینڈر پر ماری۔ کڑاکے کی ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کے حلق سے ہلکی سی اذیت زدہ سی چیخ برآمد ہوئی۔

اس دوران میں چھوٹے قد کا نوجوان مجھ پر حملہ آور ہو چکا تھا لیکن وہ واضح طور پر بوکھلاہٹ کا شکار تھا۔ بوکھلاہٹ میں اسے کچھ نہیں سوجھا تھا اور اس نے عقب سے مجھ پر گھونسے برسانے شروع کر دیے تھے۔ اس قسم کے گھونسوں کا شاید لڑکپن میں بھی مجھ پر کبھی اثر نہیں ہوا تھا۔

ان دونوں کو مجھ جیسے شریف، مہذب اور خوش لباس دکھائی دینے والے شخص سے، جو خوف زدہ بھی نظر آ رہا تھا، یقیناً کسی مزاحمت کی توقع نہیں تھی بلکہ شاید اس قسم کی کارروائیوں کے دوران میں انہیں کبھی مزاحمت سے واسطہ ہی نہیں پڑا تھا۔ خصوصاً ہتھیاروں کے سامنے اس قسم کی مزاحمت کے بارے میں تو انہوں نے شاید کبھی سوچا ہی نہیں ہوگا۔ ان کے ہاتھ پاؤں پھول چکے تھے اور وہ میرے لیے بہت آسان شکار ثابت ہو رہے تھے۔

دراز قد کا جونہی بازو ٹوٹا، اس کے ہاتھ سے نہ صرف ٹی ٹی نکل گئی بلکہ شاید اس کے جسم سے جان بھی نکل گئی۔ میں نے اس کا سر گاڑی کے عقبی حصے سے ٹکرایا اور نتیجہ دیکھے بغیر اسے چھوڑ دیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ زمین پر ڈھیر ہو جائے گا۔ چھوٹے قد والے کی طرف پلٹتے ہوئے میں نے اچانک اس کی گردن ایک ہاتھ کے شکنجے میں جکڑ لی۔ اس کی آنکھیں باہر آنے لگیں۔ اس لمحے شاید اسے میرے چہرے پر بھی کوئی ایسا تاثر نظر آیا کہ اس کی آنکھوں میں موت کی دہشت اتر آئی۔

میں نے اپنے سینے میں کہیں ایک عجیب سا تموّج محسوس کیا۔ ایک لمحے کے لیے شاید مجھے اپنے آپ پر قابو نہیں رہا۔ اس نوجوان کی گردن تو میرے ایک ہاتھ کے شکنجے میں ہی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی چمڑے کی جیکٹ مٹھی میں جکڑتے ہوئے اسے زمین سے اونچا اٹھا کر اتنے زور سے اسٹیشن ویگن پر دے مارا کہ میرے حساب سے اس کی کئی ہڈیاں ٹوٹ جانی چاہییے تھیں لیکن جو کچھ ہوا وہ میرے اندازے سے کافی مختلف تھا۔

اس کا سر توپ کے گولے کی طرح گاڑی کے پچھلے شیشے سے ٹکرایا۔ گاڑیوں کے شیشے عام طور پر آسانی سے نہیں ٹوٹتے اور ان کے درمیان ربر کی سی پتلی شفاف تہ بھی ہوتی ہے لیکن نہ جانے کس طرح اس کا لمبے بالوں سے ڈھکا ہوا بڑا سا سر اس شیشے کو توڑتا ہوا اندر گھس گیا اور وہیں پھنس کر رہ گیا۔ تازہ نمودار ہونے والے اس شگاف کے کناروں پر خنجر کی طرح نوکیلے دانت سے بن گئے تھے۔

اس کا چہرہ اور سر یقیناً بری طرح ادھڑ کر رہ گیا تھا اور نوکیلے کنارے اس کی گردن میں پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔ وہ خود تو یقیناً اپنا سر اس شگاف سے باہر نکالنے کے قابل ہی نہیں رہا تھا لیکن اس وقت اگر کوئی اور بھی ایسی کوشش کرتا تب بھی اس کی موت یقینی تھی۔ اب اس کے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا اور یہ ایک اذیت ناک موت تھی۔ میں نے اس کی گردن سے بُری طرح خون ابلتے دیکھا۔

اس دوران میں دراز قد نے اپنے شکستہ بازو کو دوسرے ہاتھ سے تھامتے ہوئے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی۔ اس کے حواس اس حد تک مختل تھے کہ اس نے اپنے قریب ہی گری ہوئی ٹی ٹی تک اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ گو کہ میری نظر اس پر بھی تھی اور اس کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی تھی لیکن وہ پانسا پلٹنے کے لیے قسمت آزمائی تو کر سکتا تھا۔

میرے خیال میں اب اس کا زندہ رہنا بھی مناسب نہیں تھا۔ اس کے ساتھی کی، ذبح ہوتے بکرے جیسی ہلکی سی خرخراہٹ بتا رہی تھی کہ وہ زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ میں نے دراز قد نوجوان کی ٹی ٹی اٹھائی۔ اچھا ہی ہوا کہ عین اسی لمحے اس نے پلٹ کر دہشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ کم از کم اسے یہ معلوم ہو گیا ہو گا کہ اسے موت کس طرح آ رہی تھی۔ میں نے صرف ایک گولی چلائی جو اس کی پیشانی پر دونوں آنکھوں کے درمیان پیوست ہو گئی۔ میں نے اس کی پیشانی پر ایک سرخ سوراخ نمودار ہوتے دیکھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ گرا اور کچی زمین پر دور تک لڑھکتا چلا گیا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر ٹی ٹی کو ایک ٹشو پیپر سے اچھی طرح صاف کیا اور دوبارہ اسی کے ہاتھ میں پھنسا دیا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں موجود ٹی ٹی سے اس نے خود اپنی پیشانی میں گولی ماری تھی یا یہ کسی اور کی کارروائی تھی، اس قسم کے سوالوں پر غور کرنے کا کام میں نے دوسروں کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں گویا آسمان کے اس ٹکڑے کو تک رہی تھیں جو اونچی عمارتوں کے درمیان نظر آ رہا تھا۔

میں نے وہاں مزید وقت ضائع نہیں کیا۔ صرف یہ جائزہ لیا کہ

میری کوئی چیز تو وہاں نہیں گری تھی۔ میرا مشین پسٹل وہاں گر گیا تھا جسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ میں نے اسے اٹھا کر ٹشو پیپر سے ہی صاف کر کے جیب میں ڈالا، کپڑے جھاڑے، ٹائی وغیرہ درست کی۔ دو فائروں اور دیگر آوازوں کے بعد تاخیر سے ہی سہی، لیکن کسی نہ کسی کے اس طرف متوجہ ہونے کا امکان موجود تھا۔

میں تیزی سے اس چار دیواری کے نیم شکستہ گیٹ سے نکلا اور ایک طرف کو مڑ گیا۔ اب میں ایک عمارت کے زیرِ زمین اور نیم تاریک پارکنگ ایریا میں تھا۔ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا میں تیزی سے وہاں سے نکلا۔ چند لمحے بعد میں نے اپنے آپ کو اس عمارت کے طویل ڈرائیو وے میں پایا۔ اب میں اطمینان سے اس طرح سڑک کی طرف چل دیا جیسے میں تاخیر سے اپنے آفس سے اٹھا تھا۔ یہ مختصر مگر بھیانک کارروائی بہت کم وقت میں ہوئی تھی لیکن محسوس کچھ یوں ہو رہا تھا جیسے یہ سب کچھ سلو موشن میں اور بہت دیر میں ہوا تھا۔

سڑک پر آکر میں نے گھڑی دیکھی۔ صرف چند منٹ پہلے میں ہوٹل میں موجود تھا۔ سڑک پر ٹریفک بہت کم ہو چکا تھا۔ شام کا دھندلکا پھیلنے کے ساتھ ہی شہر کے اس حصے میں ویرانی چھانے لگتی تھی۔ دفاتر تو اس سے بہت پہلے ہی خالی ہو جاتے تھے۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے سامنے ہی ایک ٹیکسی نظر آگئی۔ میں نے تیزی سے سڑک عبور کی اور لپک کر اس میں بیٹھ گیا۔ ڈرائیور کو ہوٹل چلنے کے لیے کہا تو اس نے نخرے نہیں دکھائے۔ وہ بھی گویا کہیں نہ کہیں جانے کے لیے جلدی میں ہی تھا۔ برق رفتاری سے اس نے مجھے ہوٹل پہنچا دیا۔

ادائیگی کے لیے ایک نوٹ اسے تھما کر میں بقایا لیے بغیر جلدی سے ایک بار پھر کافی بار میں پہنچا۔ یہ دیکھ کر میں نے قدرے حیرت کے ساتھ ساتھ اطمینان بھی محسوس کیا کہ تہمینہ اب بھی اپنی میز پر موجود تھی اور اس کا وہ رپورٹر اب بھی نہیں آیا تھا جس کی وہ منتظر تھی۔ معلوم نہیں یہ رپورٹر والی کہانی درست بھی تھی یا نہیں۔ نہ جانے وہ اسی کا انتظار کر رہی تھی یا درحقیقت اب انہی دونوں نوجوانوں کی واپسی کی منتظر تھی جو مجھے ساتھ لے کر گئے تھے۔ شاید اسے توقع تھی کہ وہ واپس آکر اسے اپنی مہم کے بارے میں بتائیں گے۔

اس میں شک نہیں تھا کہ وہ مضبوط اعصاب کی لڑکی تھی لیکن اس وقت کچھ نہ کچھ مضطرب ضرور تھی۔ اس کی انگلیاں مضطربانہ انداز میں میز پر رقصاں تھیں۔ اس کے سامنے کولڈ ڈرنک کا خوب صورت مگر خالی گلاس رکھا تھا۔ اس نے مجھے تنہا واپس آتے دیکھا تو ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھیں پھیلیں مگر اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پا لیا اور غالباً اپنی انگلیوں کی مضطربانہ حرکت کو چھپانے کے لیے بغلوں میں ہاتھ دے کر بیٹھ گئی۔ اب وہ خفگی آمیز سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں ہاتھ ملتے ہوئے یوں ایک بار پھر اس کے مقابل جا بیٹھا جیسے بات کرتے کرتے اٹھ کر چند لمحے کے لیے کہیں چلا گیا تھا۔ اس نے میرے عقب میں دور تک دیکھا۔ شاید اس کی نظریں انہی دونوں نوجوانوں کو تلاش کر رہی تھیں۔ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا "۔۔۔ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ فلم درانی کو خودکشی پر مجبور کر سکتی ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ مجھے اس فلم کو استعمال کرنے پر مجبور نہ کرے۔"

اس نے گویا میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ اب ایک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔ آخر کار وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی "وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"کون دونوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی دونوں جو تمہیں ساتھ لے گئے تھے۔" وہ گویا خود پر جبر کرتے ہوئے بولی۔

"مجھے تو کوئی ساتھ نہیں لے گیا تھا۔" میں نے دائیں بائیں دیکھ کر حیرت سے کہا "میں تو ذرا واش روم تک گیا تھا۔ واش روم تک جانے کے لیے تو دو دو آدمیوں کی ضرورت نہیں پڑتی۔"

اس نے ایک بار پھر اس راستے کا جائزہ لیا جو کافی بار کے سامنے سے لابی تک جا رہا تھا۔ اس پر بہت سے لوگ آجا رہے تھے لیکن ظاہر تھا کہ اسے کہیں ان دونوں کی جھلک نظر نہیں آسکتی تھی جن کی اسے تلاش تھی۔ شاید وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ کس انجام سے دوچار ہو چکے تھے تاہم میں نے پہلی بار اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں دیکھیں۔

وہ سرسراتی سی آواز میں بولی "آپ مجھے صحیح طرح بتاتے کیوں نہیں۔۔۔۔ وہ دونوں کہاں ہیں؟"

"بھئی تم عجیب ہی لڑکی ہو۔۔۔۔" میں نے گویا تنگ آکر کہا "معلوم نہیں تمہیں کن دونوں کا خیال ستانے لگا ہے۔ شاید تم کسی واہمے کا شکار ہو یا پھر تمہیں ایک ایک کے تین تین نظر آتے ہیں۔ اگر تمہاری آنکھوں میں یہ خرابی ہے تو تمہیں سنجیدگی سے اس کا علاج کرانا چاہیے۔ یہاں تو کافی دیر سے میں اکیلا ہی تمہارے سامنے بیٹھا ہوا ہوں البتہ میں چند منٹ کے لیے اٹھ کر واش روم ضرور گیا تھا۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھنے لگی گویا سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو کہ آخر میں کس قسم کا آدمی تھا۔ اب اس کے انداز میں کچھ بے چارگی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "اور ہاں۔۔۔۔ وہ تمہارا رپورٹر اب تک کیوں نہیں آیا؟ کیا اب تمہارا انٹرویو بھی مجھے ہی لینا پڑے گا؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ یقیناً کچھ اور سوچ رہی تھی۔ پھر دل ہی دل میں وہ کسی فیصلے پر پہنچ گئی۔ اٹھتے ہوئے بولی "میں جا رہی ہوں۔"

وہ یکدم ہی جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ حیرت

اور کچھ مایوسی کا اظہار کرنے کی کوشش کی "تم تو شاید ناراض ہو گئیں۔ میں تو تم سے کاروباری گفتگو کرنے آیا تھا۔ بہرحال۔۔۔ اگر تم کوئی جواب دینا نہیں چاہتیں تو کم از کم درانی کو میرا یہ پیغام ضرور دے دینا کہ اس نے زندگی میں بہت لوٹ مار، بہت عیاشی کر لی۔ اب وہ کم از کم ایک کام تو دیانت داری سے انجام دے دے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں وہ جو بھی رپورٹ تیار کرے وہ دیانت داری سے تیار کرے ورنہ اس کے اپنے بارے میں ایک بہت سنسنی خیز فائل تیار ہے اور جس ایجنسی کا وہ عہدے دار ہے اس سے بھی زیادہ اہم اور بااختیار کوئی ایجنسی خود اس کے بارے میں تحقیقات شروع کر دے گی۔"

پھر جیسے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا اور میں نے متفکرانہ سے لہجے میں کہا "مگر میں تو یہ پیغام ہی غلط پیامبر کی زبانی بھیج رہا ہوں۔ تمہاری ڈیوٹی تو یقیناً اس رپورٹ کو تبدیل کرانے پر لگی ہوئی ہے۔ تم بھلا اس قسم کا پیغام اسے کیونکر دے سکتی ہو۔ میرا خیال ہے مجھے خود ہی اس سے بات کرنی پڑے گی۔"

اس کے وجود میں جیسے پھر ایک ابال سا آیا۔ وہ جاتے جاتے میری طرف جھک کر دھیمی لیکن زہریلی سی آواز میں بولی "آپ کو بات کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب تو وہ خود آپ سے بات کرے گا۔ وہ ڈرنے یا ڈگمگانے والا آدمی نہیں ہے۔"

"ظاہر ہے۔۔۔ ظاہر ہے۔" میں نے متانت سے اس کی تائید میں سر ہلایا "ڈرنے اور ڈگمگانے والے آدمی یہ سب کچھ تھوڑا ہی کر سکتے ہیں جو وہ نہ جانے کب سے کر رہا ہے۔ ان سب کاموں کے لیے بھی اختیارات اور موقع کے باوجود حوصلہ بھی درکار ہوتا ہے۔ آدمی تو وہ یقیناً حوصلہ مند ہے۔ لیکن اب اس کے حوصلے کا امتحان شروع ہونے والا ہے۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔"

"ہاں۔۔۔۔ بے شک۔۔۔۔ ہر چیز کی ایک حد ہوتی ہے۔" اس نے عجیب سے انداز میں میرے الفاظ دہرائے اور وہاں سے چل دی۔ اس وقت وہ یقیناً پریشانی اور ذہنی خلفشار کا شکار تھی لیکن اس کی چال کی دلکشی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

وہ نظر سے اوجھل ہو چکی تو میں نے گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا لیا۔ وہ بل ادا کر کے نہیں گئی تھی۔ شاید اسے اچھے یا برے، کسی بھی قسم کے حالات میں بیشتر جگہوں پر بل ادا کرنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ میں نے اپنے لیے کافی کا آرڈر دیا پھر گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر اپنے موبائل فون پر شفیع شاہ سے رابطہ کیا۔

"شفیع ڈیئر! میں غیر ارادی سے انداز میں کچھ جلد بازی کا مظاہرہ کر بیٹھا ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "میں نے درانی کی تازہ ترین رفیقِ شب کو کچھ زیادہ ہی جلدی چھیڑ دیا ہے اور اسی کی زبانی ایک طرح سے درانی کے لیے چیلنج بھی بھجوا دیا ہے۔۔۔۔"

پھر میں نے اسے کچھ دیر پہلے پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا اور سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "زیادہ امکان یہی ہے کہ میرے ہاتھوں مرنے والے وہ دونوں گرگے جمشید کریم کے ہوں گے جو شاید تہمینہ کی حفاظت یا پھر کسی اور کام کے لیے مامور ہوں گے۔ اس صورت میں یہ ایک طرح سے جمشید کریم کے لیے بھی چیلنج ہو گیا ہے۔ یعنی اپنی اپنی کچھار میں بیٹھے ہوئے دو خطرناک درندوں سے تھوڑے سے وقت میں تقریباً ایک ساتھ چھیڑ چھاڑ ہو گئی ہے۔ چنانچہ ایک تو فوری طور پر بہت زیادہ الرٹ ہو جانے کی ضرورت ہے۔ دوسرے درانی کی پراپرٹی کے بارے میں ثبوت حاصل کرنے کا کام زیادہ تیزی سے کرنا ہو گا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ہوشیار ہو جائے اور اس سلسلے میں کوئی بندوبست کر ڈالے۔"

"وہ اس سلسلے میں اتنی جلدی کچھ نہیں کر سکتا۔" شفیع شاہ اطمینان سے بولا "جائدادوں کے کاغذات اتنی جلدی تبدیل نہیں کیے جا سکتے۔ دوسرے میرا خیال ہے کہ وہ یہ جائدادیں اپنے رشتے داروں کے نام پر خرید کر اور ان کے نام پر کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی جعلی کمپنی بنا کر، اس کی طرف سے تھوڑا بہت انکم ٹیکس وغیرہ ادا کر کے مطمئن ہے۔ وہ یہی محسوس کرتا ہو گا کہ اس نے بڑے پکے بندوبست کر رکھے ہیں لیکن جھوٹ آخر جھوٹ ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں جب بھی کسی قسم کی تحقیقات یا پوچھ گچھ ہو گی، جھوٹ در جھوٹ کھلتا چلا جائے گا۔ ان سب باتوں سے قطع نظر بھی ہمارا کام اندازے سے پہلے ختم ہو جائے گا۔ چونکہ اس کام کا مقصد نیک ہے شاید اس لیے قدرت خود بہ خود آسانیاں فراہم کر رہی ہے۔ جس محکمے میں اس قسم کے افسر پائے جاتے ہیں وہیں کسی نہ کسی کونے کھدرے میں ان کا کوئی نہ کوئی مخالف بھی موجود ہوتا ہے جو عموماً کمزور ہونے کی وجہ سے دُبکا بیٹھا ہوتا ہے۔ اگر اسے کوئی مضبوط سہارا میسر آجائے تو وہ بھی بڑا کام دکھا جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک کلرک سے ہمارا رابطہ ہو گیا ہے۔ ہم اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جونہی اسے یقین ہو گیا کہ اس کا کچھ نہیں بگڑے گا وہ بڑے کارنامے دکھائے گا۔"

"یہ تو تم نے بڑی اچھی خبر سنائی۔" میں نے کچھ طمانیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ہم شاید ایک دو دن میں ہی اپنا کام ختم کر لیں۔" شفیع شاہ بولا۔

"ان کاغذات اور ان کی چند نقلوں کی فائلیں بھی مختلف اور محفوظ مقامات پر رکھوا دینا۔ انہیں ہوٹل والے یا دوسرے آفس سے دور ہی رکھنا۔" میں نے ہدایت کی۔

"میرا یہی ارادہ ہے۔" شفیع شاہ بولا۔

میں نے اسے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ویٹر کافی لے آیا اور میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن میرے ذہن میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔ میں اب صحیح معنوں میں پوری سنجیدگی اور یکسوئی سے پرنس سیرا کے قتل سے لے کر اب تک کے واقعات

پر غور کرنے اور ان کا سر پیر تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ابھی تک میں یہ طے نہیں کرپایا تھا کہ ان میں سے کن واقعات کا ایک دوسرے سے تعلق تھا۔ ڈائریکٹ یا ان ڈائریکٹ تو سبھی واقعات کا سرا کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی انداز میں ایک دوسرے سے ملتا دکھائی دے رہا تھا لیکن میں ابھی تک کسی بھی نکتے کے بارے میں کسی یقینی نتیجے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ اگر کم از کم یہی واضح ہوجاتا ہے کہ پرنسس سیمرا کا قاتل کون تھا تو شاید دوسری بہت سی باتوں کی وضاحت بھی ہوسکتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک نکتہ شروع سے میرے ذہن میں کھٹک رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اس نکتے کی بنیاد پر قاتل پر ہاتھ ڈال دوں' باقی کام پولیس خود ہی کرلے گی لیکن میں اس سلسلے میں بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ کچھ اور باتوں سے میرے خیال کی تصدیق ہوجائے تو اچھا ہے۔ معاملہ بڑا نازک تھا اور میں رحیم گل یا کسی اور کے سامنے ذرا بھی خجالت اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔

وہیں بیٹھے بیٹھے میں نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ مجھے صبح جاکر پرنس انڈسٹریز کے نوری آباد والے پلانٹ کا جائزہ بھی لینا چاہیے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر میں کسی واقفیت کے سہارے اپنی اصل حیثیت میں وہاں جاتا اور اگر وہاں واقعی کوئی گڑبڑ جاری تھی تو وہاں کے کرتا دھرتا مجھے اس کی ہوا لگنے نہیں دے سکتے تھے۔ مجھے انجان بن کر اس انڈسٹری کا قریب سے جائزہ لینے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے تھی۔ ایک تدبیر میرے ذہن میں آرہی تھی۔ اس کے ذریعے اپنے مقصد میں جلد کامیاب ہونے کے امکانات تو بہت کم تھے لیکن کوشش کرکے دیکھ لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ مجھے یہ بھی امید تھی کہ شاید پلانٹ پر جانے سے معلومات کا کوئی ذریعہ نکل آئے۔

کامران کے خط اور اس کی المناک موت نے ان معاملات کے سلسلے میں مجھے وہاں تک جانے پر مجبور کردیا تھا جہاں کے بارے میں عام حالات میں شاید میں نہ سوچتا اور یہ گتھیاں اگر مجھے آسانی سے سلجھتی دکھائی نہ دیتیں تو شاید میں انہیں جہاں کی تہاں چھوڑ دیتا لیکن اب جیسے کوئی غیبی طاقت مجھے ان ہفت پہلو معاملات کی تہ تک جانے اور اس سلسلے میں ہر کوشش کرنے پر مجبور کررہی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں کافی ختم کرکے اور بل ادا کرکے وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔

دوسری صبح میرا ذرا جلدی ہوٹل سے نکلنے کا ارادہ تھا لیکن گزشتہ رات چونکہ کوشش کے باوجود مجھے بہت تاخیر سے نیند آئی تھی اس لیے صبح میں جلدی بیدار نہ ہوسکا اور اس کے بعد بھی ایک عجیب سی کاہلی کے زیر اثر ہر کام میں ہی دیر ہوتی چلی گئی۔ آخر کار گیارہ بجے کے قریب میں ہوٹل سے نکلا تو غیر ارادی طور پر میری رفتار تیز تھی۔

صدر دروازے سے نکل کر میں پارکنگ لاٹ کی طرف جانے کے لیے دائیں طرف مڑا ہی تھا کہ کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ میں تو بروقت رک کر اپنی دانست میں ٹکرانے سے بچ گیا لیکن آنے والا نہ رک سکا۔۔۔ اور در حقیقت وہ آنے "والا" نہیں بلکہ آنے "والی" تھی۔ وہ مجھ سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچی۔ گرنے سے بچنے کی وجہ یہ تھی کہ میں نے اسے بازوؤں میں تھام لیا تھا۔

قدرے آہستگی سے میں نے اسے چھوڑا تو وہ مرتعش سانسوں کے درمیان بولی "آئندہ آپ اچانک موڑ مڑتے وقت ہارن ضرور دیا کریں۔"

"تمہیں بھی تیز رفتاری سے گریز کرنا چاہیے۔ تم پستول سے نکلی ہوئی گولی کی طرح چلتی ہو۔" میں نے الزام عائد کیا۔

"چلیں۔۔۔ ٹھیک ہے۔ آئندہ دونوں خیال رکھیں گے اور حادثات سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ اس قسم کے ٹریفک کے حادثے کبھی کبھی جان بھی لے لیتے ہیں۔" وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ میں نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ کل والی صفیہ سے قطعی مختلف نظر آرہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ رات کو سکون سے سوئی تھی اور نیند نے اس کے حواس اور اعصاب پر بہت اچھا اثر ڈالا تھا۔ وہ بالکل تازہ دم اور شگفتہ نظر آرہی تھی۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھوں میں بھی گزشتہ روز کے المیے کا کوئی نقش دکھائی نہیں دے رہا تھا حالانکہ ابھی تو شاید کامران کی لاش انہیں نہیں ملی تھی اور تدفین بھی نہیں ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کی اس تبدیلی کو سفاکی کا نام دوں یا پھر یہ سمجھوں کہ اس نے حالات سے کچھ الگ ہی انداز سے سمجھوتا کرنا سیکھ لیا تھا۔ شاید اس کی نظر میں دھیرے دھیرے سب باتیں بے معنی ہوتی جارہی تھیں۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک عجیب لڑکی تھی۔

"شکر ہے تم نے جلد ہی صلح کا پرچم بلند کرلیا۔" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں بہت صلح جو لڑکی ہوں۔ حالات سے بھی جلد صلح کرلیتی ہوں اور انسانوں سے بھی۔" اس نے سنجیدگی سے کہا پھر میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولی "ویسے آپ کے حلیے سے لگ تو نہیں رہا کہ آپ باہر جارہے ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ آپ باہر ہی جارہے ہیں۔"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔ کیا تم مجھ سے ملنے آئی تھیں؟"

"ظاہر ہے۔ ابھی میری اوقات اتنی بلند تو نہیں ہوئی کہ میں اس ہوٹل میں ناشتا کرنے یا دوپہر کا کھانا کھانے آنے لگوں اور نہ ہی میری آپ کی سیکریٹری سے اتنی دوستی ہوئی ہے کہ میں روزانہ اس سے ملنے کے لیے بے چین ہونے لگوں۔" وہ بولی۔

"تو پھر کس سے ملنے کے لیے بے چین ہونے لگی ہو؟ مجھ حقیر پُر تقصیر سے؟" میں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔

"اس کے جواب میں تو اگر میں ہاں بھی کہہ دوں گی تب بھی آپ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر جلدی سے بولی "آپ جا کہاں رہے ہیں؟"

"یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ پہلے تم یہ بتاؤ تمہارے پاس تین چار گھنٹے فالتو ہیں؟" میں نے کہا۔

"اگر فالتو نہیں بھی ہوں گے تو آپ کے کہنے پر میں انہیں فالتو قرار دے دوں گی۔" وہ بلا تامل بولی "اور اگر وہ گھنٹے آپ کے ساتھ گزریں گے تو پھر فالتو نہیں رہیں گے۔"

میں نے اسے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرکے پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "دن چڑھے ایسی نیم عاشقانہ سی گفتگو نہیں کیا کرتے۔ معدہ خراب ہوجاتا ہے۔"

"مقدر خراب ہونے کی نسبت معدہ خراب ہوجانا پھر بھی غنیمت ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر میرے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے بولی۔

"اچھا یہ بتاؤ۔۔۔۔ کیا تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟" میں نے راستے میں پوچھا۔

"یہ آج کیا آپ کو میرا انٹرویو لینے کا خیال آگیا ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا "اگر یہ انٹرویو ہے تو میں یہ ضرور کہوں گی کہ یہ بڑی تاخیر سے لیا جارہا ہے۔"

"دیر آید درست آید۔ تم میرے سوال کا جواب دو۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اس دوران میں ہم گاڑی تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ وہ برابر بیٹھ گئی۔

"ہاں۔۔۔۔ آتی ہے۔" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی "پیٹ کاٹ کر ڈرائیونگ اسکول کو فیس دے کر بڑے جتن سے سیکھی تھی پھر اپنی ایک دوست کی گاڑی پر خوب پریکٹس بھی کی تھی ور بڑی ماہر ڈرائیور بن گئی تھی۔"

"کیوں کیا تھا یہ سب تردّد تم نے؟" میں نے گاڑی پارکنگ اٹ سے نکالتے ہوئے پوچھا۔

"آپ یہ سوال کرنے میں حق بہ جانب ہیں۔" وہ سرہلاتے وئے بولی "میرے حالات تو سائیکل خریدنے کی بھی اجازت نہیں یتے تھے تو پھر میں ڈرائیونگ سیکھنے کا تردّد کیوں کررہی تھی؟ دراصل اس وقت یہ امید پیدا ہوچلی تھی کہ چند ماہ بعد مجھے ایک بڑی کمپنی میں ایسی ملازمت مل جائے گی جس میں کسی بستر خلاتے میں مکان اور گاڑی بھی مل جائے گی۔ میں نے بڑی مستعدی دکھائی۔ گاڑی ملنے سے پہلے ہی نہ جانے کتنے خواب دیکھ ڈالے اور دن رات ایک کرکے ڈرائیونگ میں بھی مہارت حاصل کرلی تاکہ کسی کی محتاجی نہ رہے کیونکہ کمپنی کی طرف سے ڈرائیور نہیں ملتا تھا۔"

"پھر کیا ہوا؟" اس کے خاموش ہونے پر میں نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا۔۔۔!" وہ ایک اور آہ بھر کر بولی "فلکِ کج رفتار کو میری یہ چھٹکی خوشیاں ایک آنکھ نہ بھائیں۔ وہ ملازمت بڑے گھرانے کی ایک مجھ سے زیادہ خوش شکل' مجھ سے زیادہ خوش لباس اور مجھ سے زیادہ پڑھی لکھی لڑکی کو مل گئی جسے درحقیقت مکان' ملازمت یا گاڑی کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ پہلے ہی سوسائٹی میں ایک خاصے بڑے بنگلے میں رہتی تھی۔ گھر میں تین تین گاڑیاں تھیں اور ملازمت وہ محض اس لیے کرنا چاہتی تھی کہ وہ گھر پہ پڑے پڑے "بور" ہوجاتی تھی۔ کمپنی کے بڑے صاحب کو وہ بہت پسند آگئی تھی۔"

"لڑکی! تمہاری یہ دل گداز' دل خراش اور المناک داستان سن کر میرا دل چاہ رہا ہے کہ ابھی جا کر اس کمپنی کے دفتر کو آگ لگادوں اور اسی آگ میں اس بڑے صاحب کا چرغا بنادوں لیکن افسوس کہ اس وقت میں جلدی میں ہوں' کسی اور کام سے جارہا ہوں۔ اس کے علاوہ آگ لگانے کا ضروری سامان بھی میرے پاس نہیں ہے۔"

"آپ جیسے لوگوں کو ہم غریبوں کا مذاق اڑانے کے سوا کیا آتا ہے۔" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"تم اسے مذاق اڑانا کہتی ہو؟" میں نے گویا بُرا مناتے ہوئے کہا "میں تو تمہارے ساتھ اظہارِ ہمدردی کی کوشش کررہا تھا۔ پچھلے چند منٹ میں تم نے اتنی ٹھنڈی سانسیں لی ہیں کہ گاڑی میں اے سی چلانے کی ضرورت محسوس نہیں ہورہی۔ تمہاری ان سانسوں کی وجہ سے میرا دل پگھل گیا تھا۔"

"حیرت ہے!" اس نے سرہلایا "اصولاً تو دل کو گرم سانسوں سے پگھلنا چاہیے۔ ٹھنڈ سے تو چیزیں پگھلتی نہیں' جمتی ہیں۔ خصوصاً جن میں پہلے ہی برفانی سی خصوصیات پائی جاتی ہوں۔"

میں نے سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا تو وہ جلدی سے موضوع بدلتے ہوئے بولی "ڈرائیونگ سیکھنے اور اس محنت کے ضائع جانے کے بعد تنگی کے کچھ دن ایسے بھی آئے ہیں جب میں سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ ٹیکسی چلانا شروع کردوں۔"

"او میرے خدا۔۔۔۔!" میں نے بے اختیار آسمان کی طرف دیکھ کر ایک ٹھنڈی سانس لی "تم تو اس شہر میں امن وامان کا مسئلہ پیدا کردیتیں بلکہ یوں کہو کہ امن وامان کا مسئلہ تو پہلے ہی موجود ہے اور کافی سنگین ہے۔ تم اسے سنگین تر بنادیتیں۔ کتنا بُرا لگتا جب تمہیں سڑکوں پر سے گزرتے دیکھ کر لوگ ہاتھ ہلا ہلا کر روکنے کے لیے آوازیں لگایا کرتے۔ "ٹیکسی۔۔۔۔ ٹیکسی۔۔۔!" تم نے اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا تھا؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور مجھے گھورنے پر اکتفا کیا۔ میں نے سگنل کھلنے پر گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "ویسے تمہیں مشکل سے چند دن ٹیکسی چلانے کی مہلت ملتی۔ مرد ڈرائیوروں کی تو کنپٹی پر پستول رکھ کر ڈاکو انہیں

ٹیکسی سے اتار دیتے ہیں اور ٹیکسی لے اڑتے ہیں۔ تمہاری کنپٹی پر پستول رکھ کر وہ تمہیں لے اڑتے اور ٹیکسی وہیں چھوڑ جاتے۔ اس کے بعد۔۔۔ تمہاری داستان تک بھی نہ ہوتی داستانوں میں۔۔۔ آج تم یوں میرے پاس بیٹھی مجھے خونخوار نظروں سے نہ گھور رہی ہوتیں۔"

"میں تو کچھ مردانہ روپ وغیرہ دھارنے کے بارے میں بھی سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔" اس نے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بتایا۔

"واہ۔۔۔ واہ!" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "تم تو واقعی شیخ چلی کا زنانہ ایڈیشن ہو۔"

"جی نہیں۔ میں سفاکی کی حد تک حقیقت پسند ہوں۔" وہ غصیلے لہجے میں بولی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے خاموش رہ کر سوچا' واقعی۔۔۔ کیا وہ سچ نہیں کہہ رہی تھی؟

تاہم میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا "اس قسم کے چکر صرف فلموں میں چلتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں تو معاملہ یہ ہے کہ۔۔۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ سات پردوں میں چھپی ہوئی عورت کو بھی سو میل دور سے تاڑ لیتے ہیں۔"

"خیر۔۔۔ دفع کریں میرے منصوبوں کو۔۔۔ یہ بتائیں کہ آپ اس وقت کس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے روانہ ہوئے ہیں؟ میں نے آپ کو اس سے پہلے اس حلئے میں باہر جاتے تو کیا' اپنے ہوٹل والے گھریلو قسم کے دفتر میں بھی بیٹھے نہیں دیکھا۔ یہ شکن آلود شلوار قمیص۔۔۔ آج غالباً شیو بھی نہیں بنایا ہے۔۔۔ بلکہ شاید منہ بھی نہیں دھویا ہے۔ اپنے حساب سے شاید آپ اس وقت منہ اندھیرے کہیں جا رہے ہیں۔ اس "جلد بازی" کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟"

"میں "جلد بازی" کی وجہ سے۔۔۔ اور اپنی دانست میں "منہ اندھیرے" اٹھ کر نہیں جا رہا ہوں۔" میں نے اس کی غلط فہمی دور کی "یہ حلیہ میں نے جان بوجھ کر رکھا ہے۔ میں ایک مہم پر جا رہا ہوں۔"

"اور میں اس مہم میں آپ کے ساتھ شریک ہوں؟" اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

"صرف اس حد تک کہ تم باہر گاڑی میں بیٹھ کر میرا انتظار کرو گی اور اگر میں ڈیڑھ دو گھنٹے تک واپس نہ آیا تو تم گاڑی لے کر واپس آجاؤ گی۔"

"اوہ۔۔۔!" وہ کچھ مایوس ہوگئی۔

"غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی "میں کوئی جیمس بانڈ جیسی مہم پر نہیں جا رہا ہوں جس میں شرکت سے تم محروم رہ جاؤ گی۔ میں صرف اس کارخانے کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے جا رہا ہوں جس میں کامران ملازم تھا۔"

"اوہ۔۔۔ آپ پرنس انڈسٹریز جا رہے ہیں۔۔۔ نوری آباد۔۔۔؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا پھر ایک لمحے کے توقف سے پوچھا "اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟"

"نہیں۔۔۔ حیرت کی تو کوئی بات نہیں۔۔۔" اس نے مبہم سے لہجے میں جواب دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کامران کے تذکرے پر یک دم بجھ سی گئی تھی۔ وہ ایک ٹک اپنے سامنے سڑک کو گھورنے لگی تھی۔ شاید وہ حقائق کے خارزار سے بہ مشکل نکلنے میں کامیاب ہوئی تھی لیکن میں نے اسے واپس وہیں دھکیل دیا تھا لیکن یہ بھی ایک مجبوری تھی۔ بعض حقیقتیں خود کانٹوں کی طرح آپ کے دامن سے چمٹ جاتی ہیں۔ انہیں الگ کرنے کی کوششوں میں دامن تار تار ہونے لگتا ہے۔

میں نے ملائمت سے پوچھا "تم میری طرف کس سلسلے میں آئی تھیں؟"

وہ دھیمی آواز میں بولی "رخشی۔۔۔ جس سے میں بیوٹی پارلر خرید رہی ہوں۔۔۔ اس نے ایک سیل ڈیڈ تیار کرائی تھی جس پر پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق آج دستخط ہونے تھے۔ بیچ میں یہ کامران والا واقعہ پیش آگیا۔ رخشی کو تو اس واقعے کے بارے میں کچھ معلوم بھی نہیں تھا۔ وہ آج سیل ڈیڈ لے کر پروگرام پوچھنے میرے پاس آئی تو میں نے اسے کامران والے سانحے کے بارے میں بتایا۔ وہ بے چاری بھی حیران پریشان رہ گئی۔ اس کے باہر جانے کی تاریخ بھی طے ہو چکی ہے اور وہ جلد از جلد اس معاملے کو نمٹا دینا

چاہتی تھی لیکن اس سانحے کے بارے میں جاننے کے بعد اس نے اس ڈیل پر عمل درآمد کا پروگرام تین چار دن آگے بڑھا دیا ہے۔ تاہم سیل ڈیڈ کے کاغذات وہ میرے پاس ہی چھوڑ گئی تھی۔ میں چاہ رہی تھی کہ ایک نظر آپ اسے دیکھ لیتے۔ آپ بہرحال کاروباری معاملات کو مجھ سے کہیں بہتر سمجھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ واپسی پر دیکھ لیں گے۔ اب مہلت تو مل ہی چکی ہے۔" میں نے کہا پھر پوچھا "کامران کی لاش کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟"

"وہ شاید ہمیں کل مل سکے گی۔" اس نے بتایا "اور فوراً ہی اسے دفن کرنا ہوگا۔ انتظامات تو مکمل ہیں۔" پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ وضاحت کے سے انداز میں بولی "اب میں اس کے بارے میں قطعاً جذباتی نہیں ہوں۔ اب یہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے پاس پڑوس میں کوئی موت ہو جاتی ہے' انسان تھوڑی دیر کے لیے افسوس کرتا ہے' پھر سوچتا ہے 'اچھا میں دفتر ہو آؤں اور فلاں فلاں ضروری کام نمٹاتا ہوا ذرا جلدی گھر آجاؤں گا اور جنازے میں شرکت کرلوں گا۔ کچھ اسی قسم کی کیفیت میری ہے۔"

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے نرم لہجے میں کہا اور ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب سر جھکائے بیٹھی تھی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے ہموار لہجے میں پوچھا "تم نے پرنس انڈسٹریز دیکھی ہوئی ہے؟ میرا مطلب ہے تمہیں اس کا محلِ وقوع معلوم ہے؟"

"ہاں۔ میں کامران کے ساتھ ایک مرتبہ موٹر سائیکل پر وہاں جا چکی ہوں۔" صفیہ نے جواب دیا۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا "تم ہائی وے پر اس کے ساتھ چالیس پچاس میل دور موٹر سائیکل پر گئی تھیں؟"

"ہاں۔۔۔ وہ بھی مانگے کی موٹر سائیکل پر۔" اس نے مزید بتایا۔

"واقعی جوانی دیوانی ہوتی ہے۔" میں نے ترحم آمیز سے انداز میں سر ہلایا۔

"اس میں بے چاری غریب جوانی کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں تو موت میں چلی گئی تھی۔ کامران مجھے وہ جگہ دکھانے پر تلا ہوا تھا جہاں وہ کام کرتا تھا حالانکہ وہاں وہ کوئی ایسی قابلِ فخر حیثیت میں کام نہیں کرتا تھا لیکن اس کے خیال میں ہمارا یہ سفر ایک طرح سے ایڈونچر بھی تھا اور پکنک بھی۔ واپسی میں ہم نے وہیں انڈسٹریل ایریا کے قریب ہی ایک چھپر ریستوران سے کھانا بھی کھایا تھا جہاں کھانے کے ساتھ ساتھ کئی ڈرائیور شاید مجھے سویٹ ڈش سمجھ کر گھور رہے تھے۔"

"شکر کرو کہ صرف گھور رہے تھے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "اب تو مجھے بھی یقین آتا جا رہا ہے کہ مرحوم کامران صاحب۔۔۔ اللہ تعالیٰ انہیں فردوس بریں میں جگہ عطا فرمائے۔۔۔ غیر معمولی طور پر بے وقوف واقع ہوئے تھے۔"

"اتنے دنوں سے میں آپ کو یہی بتانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ میرا اس سے قطع تعلق کا فیصلہ بے سبب تو نہیں تھا۔ مجھ میں اب اپنی برباد زندگی کو مزید برباد کرنے کا حوصلہ نہیں رہا تھا۔" وہ بولی پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا "میں ایک بات اور آپ کو بتانا بھول گئی۔ کامران کے ذہن میں کچھ نہ کچھ خلل ضرور تھا۔ بچپن میں وہ ایک بار ایک اونچے چھجے سے سر کے بل گر گیا تھا۔ اس کے سر کی ہڈی چٹخ گئی تھی۔ وہ ٹھیک تو ہوگیا تھا لیکن اس کے بعد سے ہمیں اس کی عادات واطوار میں کبھی کبھار کسی عجیب سی تبدیلی کا احساس ہونے لگا تھا جس کی ہم کوئی وضاحت بھی نہیں کرسکتے تھے۔ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے کہ اس میں کسی قسم کا پاگل پن' سنک یا خبط پیدا ہوگیا تھا لیکن کوئی نہ کوئی نفسیاتی گڑبڑ ضرور ہوگئی تھی۔ وسائل کی کمی کی وجہ سے اس کے کسی اچھی جگہ پر پیچیدہ قسم کے ٹیسٹ تو نہیں ہوسکے لیکن بعض ڈاکٹروں نے ہمیں محض ایکسرے وغیرہ دیکھ کر ہی بتا دیا تھا کہ اب شاید وہ زندگی بھر مکمل طور پر نارمل نہ ہوسکے۔"

تب مجھے اس سے ملاقات اور بات چیت کے بعض لمحے یاد آئے اور ہمیں دھکا دے کر اس کے بھاگنے کا منظر یاد آیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی مگر محض اس بنا پر ان واقعات کے سلسلے میں اس شخص کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا جو اب تک پیش آچکے تھے۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد صفیہ ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں بولی "میرا خیال ہے اب آپ کامران کی پُراسرار موت کے سلسلے میں ہی کچھ سرگرم ہونے لگے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں جب کامران ہی اس دنیا میں نہیں رہا تو اب اِدھر اُدھر مغز ماری سے کیا حاصل؟ آپ اب اس معاملے کو ختم ہی کیوں نہیں کر دیتے؟ آپ کا وقت یقیناً بہت قیمتی ہے۔"

"میرے خیال میں تو معاملہ ختم نہیں' بلکہ شروع ہی اب ہوا ہے۔ پہلے میری نظر صرف سطح تک جا رہی تھی' اب کچھ گہرائی کی جھلک نظر آنے لگی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "کامران کی موت کا معاملہ یقیناً دوسرے بہت سے معاملوں سے جڑا ہوا ہے۔ وہ غریب اپنی جان دے کر کچھ اہم معاملات کی طرف اشارہ دے گیا ہے۔ اگر کسی نے بھی ان کی طرف توجہ نہ دی تو اس بے چارے کی یہ غیر ارادی سی قربانی رائگاں چلی جائے گی۔"

اس نے اپنی بات پر اصرار نہیں کیا اور خاموش رہی تاہم میں نے محسوس کیا کہ اب اس کے چہرے پر پہلی سی شگفتگی نہیں رہی تھی۔ ہم ٹول ٹیکس پلازا سے گزرے تو میں نے راستہ روکنے والے شخص کو ایک نوٹ دینے کے بعد گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے اپنی دانست میں صفیہ کی طبیعت کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے دوبارہ کوئی ہلکا پھلکا موضوع چھیڑنے کی غرض سے سڑک پر بنے ہوئے ان چھوٹے چھوٹے ہٹ نما کمروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تم تو خواہ مخواہ بیوٹی پارلر وغیرہ کھولنے کے چکر میں پڑی ہوئی ہو۔ کسی

بلند دیوار میں نصب یہ مضبوط آہنی گیٹ بھی دیوار ہی کا ایک حصہ معلوم ہو رہا تھا۔ باہر کوئی بھی نہیں تھا البتہ گیٹ پر کال بیل کا ایک بٹن نظر آ رہا تھا۔ میں نے وہ دبایا تو چند لمحے بعد چھوٹا سا ایک بغلی گیٹ کھلا اور موٹی موٹی مونچھوں والے ایک کرخت صورت مسلح گارڈ نے باہر جھانکا۔

"کیا ہے؟" اس نے کندھے پر لٹکی کلاشنکوف کی نال تقریباً میری طرف جھکاتے ہوئے پوچھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور لہجہ کھُردرا تھا۔

"بھرتی کے لیے آیا ہے۔" میں نے ذرا کم پڑھے لکھے اور مزدور پیشہ سے لوگوں والا لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔

اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر گویا اطمینان کیا کہ میں اکیلا تھا پھر مجھے اندر آنے کے لیے راستہ دے دیا۔ اندر ایک بڑا سا باضابطہ گیٹ ہاؤس موجود تھا۔ تین مسلح اور چاق و چوبند گارڈ مزید نظر آ رہے تھے۔ سامنے ہی شاید انتظامی بلاک تھا۔ سرسبز لان' برآمدے اور شیشوں کے دروازوں والے کمرے دکھائی دے رہے تھے۔ دوسری طرف کافی پیچھے دور تک شیڈ نما عمارتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا جن سے مشینوں کی خفیف سی گھڑگھڑاہٹ یہاں تک پہنچ رہی تھی۔

ایک گارڈ نے میری تلاشی لی اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ میرے پاس کوئی خطرناک چیز نہیں تھی تو اس نے سامنے کے بلاک میں ایک کونے کی طرف اشارہ کیا "اس دفتر میں جاؤ۔"

اس دفتر میں پہنچ کر میں نے دیکھا اس کے دروازے پر انگریزی اور اردو میں "دفترِ روزگار" کی تختی آویزاں تھی۔ مجھے اس جگہ کو دیکھ کر ایک خفیف اور بے عنوان سی خوشی کا احساس ہوا۔ یہ کسی ترقی یافتہ ملک کا کارخانہ معلوم ہوتا تھا۔

میں تاریک شیشے کا دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ سامنے ایک بڑے سے ہال میں دس بارہ میزیں لگی ہوئی تھیں۔ سب پر لوگ کام میں مصروف تھے۔ ایک کونے میں دو میزوں پر دو لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ ایک کی میز پر کمپیوٹر بھی موجود تھا۔ میرے داخل ہونے پر سب نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ان میں سے کس سے رجوع کروں' دفعتاً مجھے اپنے دائیں ہاتھ پر شیشے کا ایک کیبن سا نظر آ گیا۔ اس پر تختی آویزاں تھی "بھرتی کے لیے فارم یہاں سے حاصل کریں۔"

میں اس کیبن پر پہنچا تو شیشے کی دیوار کے عقب سے کلرک نے میرا سراپا جائزہ لیا اور میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی تصدیق چاہی "بھرتی کے لیے آئے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو اس نے ایک فارم نکال کر ونڈو سے باہر رکھا اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہاں بیٹھ کر اسے پُر کرو۔"

میں نے دیکھا قریب ہی چھوٹی سی ایک میز کرسی خالی تھی۔ میں نے اس پر بیٹھ کر اطمینان سے فارم پُر کیا۔ اس پر تین تصویریں اور شناختی کارڈ کی کاپی لگانے کی ہدایت تھی۔ وہ سب چیزیں میں لایا تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی اس سلیقے سے کسی مقصد کے لیے فارم نہیں بھرا تھا۔

میں فارم بھر کر اٹھا تو شیشے کے کیبن میں بیٹھے ہوئے کلرک نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میرے ہاتھ سے فارم لے کر اس نے باریک بینی سے اس کا جائزہ لیا پھر شاید مطمئن ہو کر ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہاں پرسنل منیجر کے پاس چلے جاؤ۔ یہ فارم ساتھ لے جاؤ۔"

میں اس دروازے پر پہنچا۔ وہاں کوئی چپراسی وغیرہ موجود نہیں تھا۔ کسی نے مجھے روک کر دروازے سے باہر ہی میرا انٹرویو لینے کی کوشش نہیں کی۔ میں سیدھا اندر چلا گیا۔ ایئرکنڈیشنڈ کمرے میں ایک سوٹڈ بوٹڈ آدمی شاندار میز کے عقب میں بالکل فارغ بیٹھا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ ٹائی کی گرہ درست کر کے ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔

میں نے فارم اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس نے دو تین مرتبہ فارم کو اور دو تین مرتبہ مجھے دیکھا۔ آخر تصدیق چاہی "بھرتی کے لیے آئے ہو؟"

"جی سر!" میں نے عاجزانہ لہجے میں جواب دیا۔

"لیبر کے طور پر بھرتی کے لیے آئے ہو؟" اس نے مزید تصدیق چاہی۔

"جی سر!" میں اس کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

"بیٹھ جاؤ۔" اس نے اپنے سامنے پڑی شاندار کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ میں گویا کچھ ڈرتے اور ہچکچاتے ہوئے بیٹھ گیا۔

اس نے ایک زبردست ہنکارا بھرا اور ایک بار پھر ذرا بلند آواز میں پوچھا "اچھا.... تو تم لیبر بھرتی ہونے آئے ہو؟"

وہ بارُعب شخصیت کا مالک تھا۔ میں نے گویا اس سے مرعوب ہوتے ہوئے سہم کر کہا "ج.... ج.... جی سر!"

"کیا راتوں رات تمہارے حالات اتنے خراب ہو گئے ہیں؟" پرسنل منیجر مجھے غصے سے گھورتے ہوئے بولا۔

"کک.... کیا مطلب سر؟" میں نے بوکھلانے کی اداکاری کی۔

تب اس نے اپنی میز کی دراز سے ایک اخبار نکالا اور غصے سے میری طرف پھینکا۔ اخبار میری گود میں آ گرا۔

میں نے ایک نظر اخبار کی طرف اور ایک نظر پرسنل منیجر کی طرف دیکھا گویا میری سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ معاملہ کیا تھا حالانکہ میں کم از کم اتنا تو سمجھ ہی چکا تھا کہ معاملہ خراب ہو چکا ہے۔ آخر میں نے اخبار اٹھا کر سیدھا کیا۔ بات میری سمجھ میں آنے میں جو کسر تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ پرسنل منیجر مجھے کیا دکھانا اور کیا بتانا چاہ رہا تھا۔

یہ کئی روز پہلے کا وہی شام کا اخبار تھا جس میں پرنس سمیرا کے قتل کے بارے میں تفصیلی رپورٹ نہایت نمایاں قسم کی

سرخیوں کے ساتھ چھپی تھی۔ ان تصویروں میں ماہدولت کی بھی ایک عمدہ قسم کی تصویر شامل تھی۔ خبر میں جہاں میرا تذکرہ آیا تھا اس کئی سطروں میں میرا تعارف بھی تھا۔ پرسنل منیجر یہ سب کچھ پڑھ کر یاد رکھے ہوئے تھا اور یقیناً مجھے پہچان چکا تھا۔ صرف یہی نہیں' اس نے وہ اخبار بھی سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں تھی۔ پرنس سمیرا کے قتل کی خبر یقیناً اس کے لیے بہت اہم رہی ہو گی۔ وہ جس انڈسٹری کا ملازم تھا' سمیرا اس کے مالک کی ... تھی۔ وہ زندہ رہتی تو اس انڈسٹری کی آئندہ مالک بھی ہو سکتی تھی ... مالکان میں سے ایک تو ضرور ہوتی۔

میں نے گہری سانس لے کر سر اٹھا کر پرسنل منیجر کی طرف دیکھا ... کوشش کی کہ میرے چہرے سے تھوڑی بہت شرمندگی کا اظہار ہو جائے۔ پھر میں نے ذرا بدلے ہوئے لہجے میں کہا "ایک تو یہ بخت اخبار انسان کو کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتے۔"

وہ بھی اب ذرا نرم لہجے میں بولا "میں نے صرف اس اخبار کی ... سے ہی آپ کو نہیں پہچانا ہے' میں ویسے بھی آپ کو پہچانتا ... ہوں۔"

"یہ تو اور بھی بُری بات تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں شہر ... اس حد تک بدنام ہو چکا ہوں۔" میں نے افسوس سے کہا۔

وہ شاید میری بات پر توجہ دیے بغیر بولا "میں چند سال ہوٹل ... انڈسٹری میں بھی کام کر چکا ہوں اور اس شعبے میں میری دلچسپی آج ... برقرار ہے۔ میں تمام بڑے ہوٹلوں کے مالکان کو صورت سے ... جانتا ہوں اور ان میں سے بعض مجھے بھی پہچانتے ہیں۔"

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر مسٹر.... " میں نے مصافحے ... کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"وجاہت علی۔" اس نے کسی خاص گرمجوشی کے بغیر میرا ہاتھ ... تے ہوئے کہا پھر ذرا آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا "اس ڈرامے ... کی وجہ پوچھ سکتا ہوں؟"

"کون سی ڈرامے بازی؟" میں نے نہایت معصومیت سے ... یافت کیا۔

"یہی.... یہاں لیبر کے طور پر بھرتی ہونے کے لیے اُمیدوار بن ... آنا۔" وہ تحمل سے بولا "میرا خیال ہے آپ جیسے لوگوں کے پاس ... اس قسم کے مذاق کے لیے وقت نہیں ہوتا۔"

"میں ذرا مختلف قسم کا کاروباری آدمی ہوں۔ میرے پاس ... ت ہی وقت ہے لیکن مجھے فارغ آدمی پھر بھی نہیں کہا جا سکتا۔" ... نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے آپ یہاں وقت ضائع کرنے تو بہرحال ... ں آئے ہوں گے۔ چنانچہ میرا سوال پھر بھی اپنی جگہ برقرار رہتا ... ہے۔" اس نے اپنی دانست میں ایک تیز و طرار اور شاطر انسان بننے کی کوشش کرتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا اور نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا "میں آپ کی اس حرکت کا مقصد جاننا چاہتا ہوں۔"

"بہت تجسس ہے آپ کو؟" میں نے بھی پلک جھپکائے بغیر پوچھا۔

"یقیناً ہونا چاہیے۔" وہ بولا "میں یہاں ایک ذمے دار پوسٹ پر بیٹھا ہوں۔ اس قسم کا ڈراما میری نظر سے گزرے تو مجھے

اصولاً اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

"وجاہت صاحب! یہاں کسی بھی قسم کا ڈراما آپ کی نظر سے گزرے تو کیا آپ اس کی وجہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"یقیناً... لیکن عام طور پر یہاں ڈرامے ہوتے نہیں ہیں۔ یہاں صرف کام ہوتا ہے۔"

"ڈراما بھی ایک کام ہے... اور بہت سنجیدہ کام ہے وجاہت صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور میرا یہ ڈراما جو شروع ہونے سے پہلے ہی فلاپ ہو گیا ہے' یہ ایک طرح سے آپ ہی لوگوں کے فائدے کے لیے تھا۔"

"ہم لوگوں کے فائدے کے لیے...؟" وہ قدرے حیران ہوا۔

"ہاں۔ میں آپ کے مرحوم مالک کی بیٹی کے قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر پرنس سیرا کا قاتل پکڑا جائے اور اسے اس کے جرم کی مناسب سزا مل جائے تو میرے خیال میں اس سے آپ کو بھی خوشی ہونی چاہیے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ خوشی تو ہمیں ہوگی... لیکن آپ نے یہ کام کب سے سنبھال لیا؟" وہ معقولیت سے بولا "یہ کام تو پولیس کا ہے۔"

"پولیس تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس قسم کے کام کس طرح انجام دیتی ہے... اور اگر بعض کیسوں پر وہ صحیح طرح کام کر بھی لے تب بھی وہ محض اپنا فرض نبھا رہی ہوگی۔ وہ زیادہ گہرائی میں جانے کی کوشش نہیں کرے گی جبکہ میں محض اپنے شوق کے تحت کچھ بھاگ دوڑ کر رہا ہوں۔ میں اس معاملے کے سارے سیاق و سباق کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ شاید آپ اس معاملے میں میری کچھ مدد کر سکیں۔"

"میں بھلا کیا مدد کر سکتا ہوں؟" وہ حیرت سے بولا "میں نے پرنس سیرا کو زندگی میں صرف ایک مرتبہ ایک تقریب میں دیکھا تھا۔ وہ بھی ذرا دور سے... مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ انہیں کیوں قتل کیا گیا ہے' کون ان کا قاتل ہو سکتا ہے۔ پولیس رسمی پوچھ گچھ اور چھان بین کے لیے یہاں آچکی ہے اور کچھ افراد سے بیان لے چکی ہے جن میں' میں بھی شامل ہوں۔ میں نے انہیں بھی یہی بتایا تھا۔ اس سلسلے میں اخبارات میں جتنے لوگوں کے بیانات آتے رہے ہیں اور جو قیاس آرائیاں ہوتی رہی ہیں' میری معلومات بھی صرف انہی تک محدود ہے۔"

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ مضطربانہ انداز میں اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا "ویسے... بائی دا وے... آپ یہاں لیبر کے طور پر بھرتی ہو کر کس قسم کی معلومات حاصل کرنے کی توقع لے کر آئے تھے؟"

"یہ تو مجھے بھی معلوم نہیں۔" میں نے اعتراف کیا "لیکن کچھ باتیں بس اسی طرح اچانک اور اتفاقاً معلوم ہو جاتی ہیں۔"

"میں آپ کا یہ شوق پورا کرنے کے لیے آپ کو ملازم [illegible] سکتا تھا۔ ہفتہ دس دن آپ لیبر کے طور پر کام کرتے تو آپ کی ٹھکانے آجاتی۔ گو کہ ہمارے ہاں کام زیادہ سخت نہیں ہے آپ جیسے آدمی کے لیے تو وہ بھی بہت سخت ہوتا۔ آپ کو ہو جاتا کہ... ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات... خواہ وہ پرنس انڈسٹریز ہی کا ہو۔"

میں دھیرے سے ہنس دیا۔ میں نے اس کی غلط فہمی دور [illegible] اور اسے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ میں کس قسم کا آدمی [illegible] اس کے بجائے میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "چلیں... آپ ایک موقع تو دیں۔ شاید میں کوئی سبق ہی سیکھ سکوں۔"

"جی نہیں۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں نفی میں [illegible] "اب جبکہ میں حقیقت سے آگاہ ہو چکا ہوں تو میں ایسا نہ کر سکتا۔ میں کسی ایسے آدمی کو لیبر بھرتی نہیں کر سکتا جو مزدوری کرنے نہیں بلکہ کچھ دوسرے عزائم لے کر آرہا ہے [illegible] اس کے اپنے ہاں نہ جانے کتنے لوگ ملازم ہیں۔ اسے ملازم [illegible] کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"سوچ لیں وجاہت صاحب!" میں نے قدرے معنی خیز [illegible] میں کہا "ہو سکتا ہے اس سے پہلے بھی آپ یہ اصول تو [illegible] ہوں۔"

"مثلاً کب...؟" اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

"آپ نے حال ہی میں عمران نامی ایک شخص کو بھی ملازم رکھا ہے جو نہ صرف ٹی وی آرٹسٹ رہا ہے بلکہ اسے [illegible] سیرا کا دوسرا شوہر ہونے کا "اعزاز" بھی حاصل رہا ہے۔ [illegible] بات بھی خاصی دلچسپ نہیں ہے کہ ایک شخص اس انڈ[illegible] مزدور کے طور پر کام کر رہا ہے جو اس کے مرحوم سسر کی ملکیت [illegible] اور فی الحال اس کی سابق اور مقتول بیوی بھی اس کے مالک[illegible] شامل ہے۔"

وہ ذرا چونکا لیکن پھر کرسی سے ٹیک لگا کر گہری سانس [illegible] ہوئے بولا "وہ سابق شوہر ہے افضل صاحب! بہت سے ل[illegible] بھی حیثیت سے "سابق" ہو جانے کے بعد نہ جانے کس ک[illegible] پہنچ جاتے ہیں۔ وہ تو ویسے بھی ہمیشہ کا ناکام اور بودا آدمی [illegible] زندگی کے ہر میدان میں ناکام ہی رہا ہے۔ اس کے حالات بہت خراب تھے۔ وہ کسی کی سفارش لے کر میرے پاس آیا [illegible] ...کی شہرت کیونکہ ابھی تک کسی نہ کسی حد تک اس کے [illegible] زنجیر ہے اور اسے خود کو یہ کمپلیکس کچھ زیادہ ہی ہے کہ لوگ [illegible] پہچانتے ہیں اس لیے وہ اپنے آپ کو اس پر بھی آمادہ نہیں پاتا کہ شہر میں کہیں کوئی چھوٹا موٹا کام کرلے یا کوئی معمولی نوکری [illegible] یا کہیں نان چھولوں کا خوانچہ ہی لگا لے۔ اس نے بہتر سمجھا کہ شہر سے دور منہ چھپا کر مزدوری کرتا رہے۔ بھرم بھی قائم [illegible]

[illegible]ال روٹی بھی چلتی رہے۔ میں نے اس کے مسئلے کو سمجھتے ہوئے اس سے تعاون کیا تھا... اور بس...! آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آپ سے میں معذرت چاہوں گا۔"

دفعتاً انٹرکام کا بزر بج اٹھا۔ وجاہت نے ریسیور اٹھایا۔ انٹرکام پر ابھرنے والی آواز اتنی تیز تھی کہ اسے میں بھی سن سکتا تھا۔ کوئی شخص کہہ رہا تھا "سر! بلڈنگ نمبر تین میں سیکیورٹی والوں کو [illegible] کیا گیا ہے۔ شاید کوئی مزدور احمد پرویز صاحب سے الجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ آپ بھی وہاں پہنچ جائیں تو بہتر ہے۔"

وجاہت بندوق سے نکلی گولی کی سی تیزی سے اچھل کر کرسی [illegible] اٹھ کھڑا ہوا اور انٹرکام کا ریسیور رکھ کر اس خرگوش کی تیزی [illegible] دروازے کی طرف لپکا جس کے پیچھے شکاری کتے لگے ہوں۔ [illegible] یقین نہ آیا کہ آرام دہ قسم کی ملازمت کرنے والا ایک سونڈ[illegible] شخص جو فربہی مائل بھی تھا اور انداز و اطوار سے آرام طلب دکھائی دیتا تھا' اتنی پھرتی سے حرکت کر سکتا تھا۔ وہ مجھے شاید [illegible] ہی بھول گیا تھا اور باہر کی طرف دوڑا جا رہا تھا۔

میرے خیال میں اس کا تعاقب کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ [illegible] بھی اس کے پیچھے لپک پڑا۔ بیرونی ہال میں اپنی اپنی میزوں پر کام [illegible]تے ہوئے کارکن کام چھوڑ کر حیرت سے ہمیں دیکھنے لگے۔ شاید [illegible] گمان گزرا ہو کہ میں کسی خطرناک ارادے سے وجاہت کے [illegible]ب میں تھا اور وہ مجھ سے جان بچا کر بھاگ رہا تھا۔ ہم آندھی [illegible] کی طرح ان کی میزوں کے درمیان سے گزر گئے۔

شیشے کے بیرونی دروازے کے قریب ایک شخص کھڑا تھا۔ اس [illegible] جانے کیا سوچ کر اچانک دروازہ کھول دیا اور یہ وجاہت کے [illegible] اچھا ہی ہوا ورنہ شاید وہ دروازہ کھولنے میں بھی ایک دو [illegible] ضائع نہ کرتا اور سیدھا اسی میں سے گزر جاتا۔ یہ بعد کی بات [illegible] وہ باہر کس حالت میں پہنچتا۔

عمارت سے نکل کر وہ پختہ روش پر دوڑتا چلا گیا۔ دوڑتا بھی [illegible] سے تو ہوا کے دوش پر اڑتا کہنا چاہیے تھا۔ میں اس کی رفتار [illegible] دل میں اسے داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ میں تو خیر بغیر کسی [illegible] کے اس کے تعاقب میں چلا جا رہا تھا لیکن کوئی عام آدمی [illegible] شاید اس کی گرد کو بھی نہ پا سکتا۔ احمد پرویز کے نام نے [illegible] جسم میں گویا بجلی بھر دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ فی الحال احمد پرویز ہی بگ باس تھا لیکن کسی بگ باس کے نام کا بھی کسی [illegible] عہدے دار پر اتنا اثر دیکھ کر مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ممکن [illegible] ردِعمل کی وجہ بگ باس کے نام کے بجائے کچھ اور رہی ہو۔ [illegible]نس انڈسٹریز کی یہ ایک شاخ ہی بہت بڑے رقبے پر پھیلی [illegible]۔ بلڈنگ نمبر تین تک پہنچتے پہنچتے وجاہت علی ہانپنے لگا۔ [illegible] لیے بہرحال یہ اچھی خاصی ورزش تھی۔ یہ عمارت بھی [illegible] عمارتوں کی طرح ایک بہت بڑے شیڈ سے مشابہ تھی لیکن یہ [illegible] بہت خوب صورتی' سلیقے اور جدت سے بنا ہوا تھا اور اس کی تعمیر میں یقیناً نہایت اعلیٰ میٹریل استعمال ہوا تھا۔

عمارت کا بڑا سا گیٹ اس وقت کھلا تھا۔ وجاہت ہانپتا کانپتا اندر چلا گیا۔ میں خاموشی سے اس کے پیچھے تھا لیکن اسے شاید اس بات کا علم ہی نہیں تھا۔ اندر قطار در قطار دور تک مشینیں نصب تھیں۔ بہت سے لوگ کور آل' ٹوپیاں اور دستانے پہنے وہاں موجود تھے۔ وہ کسی صنعتی ادارے کے کارکنوں کے بجائے کسی لیبارٹری کے کارکن معلوم ہو رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے کور آل اور ٹوپیاں خاکی رنگ کی تھیں تاہم ان کے دستانے ویسے نہیں تھے جیسے بعض کارخانوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ دستانے سرجیکل قسم کے ہی تھے۔

عام حالات میں تو وہ سب اپنی اپنی مشینوں پر پائے جاتے ہوں گے لیکن اس وقت ان میں سے بیشتر ایک کونے کی مشین کے گرد جمع تھے جس کے آس پاس کافی جگہ خالی تھی۔ کارکنوں کے اس بڑے سے دائرے کے وسط میں درحقیقت تین افراد سب کے مرکزِ نگاہ تھے۔ ان میں سے ایک تو یقیناً فورمین یا سپروائزر قسم کی چیز تھا۔

دوسرا یقیناً کارکن تھا اور اس کی حیثیت لیبر ہی کی تھی کیونکہ اس کے جسم پر باقی سب لوگوں جیسا لباس تھا۔ اس کی شکل مجھے کچھ مانوس سی لگی اور فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا کہ وہ کون تھا۔ وہ یقیناً پرنس سیرا کا دوسرا اور سابق شوہر' سابق ٹی وی آرٹسٹ عمران تھا۔ اس کی ٹوپی لمبی ڈوریوں کی مدد سے اس کی گردن میں لٹکی ہوئی تھی اور اس کے کھچڑی بال منتشر دکھائی دے رہے تھے۔

اس کی عمر چالیس کے قریب ہی ہوگی لیکن شاید نامساعد حالات اور بے اعتدالیوں نے وقت سے پہلے اس کی شخصیت کو زوال کی طرف دھکیل دیا تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی' چوڑے بھاری اور جسم فربہی مائل دکھائی دے رہا تھا۔ کندھوں میں جھکاؤ تھا مگر کھنڈر ہوتی ہوئی یہ عمارت ابھی تک خاصی شان دار تھی۔ وہ اس وقت بھی اچھے بھلے ہجوم میں نمایاں دکھائی دے رہا تھا اور ایک عجیب شانِ بے نیازی سے تیسرے شخص کے سامنے سر اٹھائے کھڑا تھا۔ تیسرا شخص جو اسے شعلہ بار نظروں سے گھور رہا تھا' احمد پرویز تھا۔

احمد پرویز گو کہ قد میں اس سے چھوٹا اور معمولی شکل صورت کا مالک تھا لیکن وہ گینڈے کی طرح گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا اور بہترین تراش خراش کے نفیس سوٹ میں تھا۔ دولت اور حاکمیت کا اپنا ایک رعب ہوتا ہے۔ شاید اسی رعب کی وجہ سے وہ شخصیت میں کمتر ہونے کے باوجود عمران پر غالب نظر آرہا تھا۔ عمران گویا اپنی بے نیازی اور بے بنیاد اکڑفوں سے اسے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

سپروائزر تیز و تند لہجے میں عمران کو ڈانٹنے کے سے انداز میں کچھ سمجھا رہا تھا لیکن وہ شاید اس کا ایک لفظ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ تو بس اس وقت استہزائیہ سے انداز میں احمد پرویز کو گھورنے میں

مصروف تھا۔ احمد پرویز جواباً اسے قہر آلود نظروں سے نواز رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چند لمحے پہلے ہی ان کے درمیان سخت الفاظ کا تبادلہ ہو چکا ہے۔

وجاہت کو دیکھتے ہی مزدوروں کا ہجوم ایک طرف سے کائی کی طرح چھٹ گیا۔ احمد پرویز کو بھی فوراً ہی اس کی آمد کا احساس ہو گیا اور اس کی گینڈے جیسی گردن اس کی طرف گھوم گئی۔ میں جلدی سے مزدوروں کی آڑ میں ہو گیا تاکہ وہ مجھے نہ دیکھنے پائے۔ عین ممکن تھا کہ اس وقت اور اس جگہ وہ مجھے پہچان ہی نہ پاتا لیکن میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس وقت اپنے اصل جھگڑے کو بھول کر اس حیرت انگیز سوال میں الجھ جائے کہ میں اس بدلے بدلے سے حلیے میں یہاں کیوں موجود تھا؟

وجاہت علی کے لیے ہجوم میں خود بہ خود راستہ بن چکا تھا۔ وہ تیزی سے ان تینوں کے قریب پہنچا۔ سپروائزر نے اسے دیکھتے ہی اپنی تقریر روک لی اور اس کے لیے میدان چھوڑ دیا۔ وجاہت نے نہایت مؤدبانہ انداز میں احمد پرویز کو سلام کیا مگر اس نے جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ وہ عام حالات میں بھی ایک نہایت متکبر انسان تھا۔ اس وقت تو ویسے ہی غصے میں تھا۔

وجاہت نے سلام کا جواب نہ پا کر بھی قطعاً کھسیاتا ہوئے بغیر سپروائزر کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سب لوگ احمد پرویز کے اس قسم کے سلوک کے عادی تھے "یہ کیا ہنگامہ ہے؟" وجاہت نے سپروائزر سے پوچھا۔

"سر! احمد صاحب نے چند لمحے پہلے عمران نامی اس شخص کو پہلی مرتبہ یہاں دیکھا ہے اور کھڑے پیروں نوکری سے نکال دیا ہے لیکن یہ یہاں سے جانے کے لیے تیار نہیں ہے۔"

وجاہت علی نے یہ سن کر ایک طویل سانس لی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی لیکن یہ بات سن کر گویا اسے اطمینان ہوا تھا اور اس کا سینہ کچھ آہستگی سے پھولنے پچکنے لگا تھا۔ شاید وہ اس سے زیادہ سنگین معاملے کی توقع لے کر آیا تھا۔ احمد پرویز نے کچھ بولنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ صرف نظروں سے ہی بتانے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا تھا اور کیا چاہتا تھا۔

وجاہت علی، عمران کی طرف متوجہ ہوا اور اپنے لہجے میں رعب اور معقولیت کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "کیشیئر کے پاس چلے جاؤ۔ وہ ابھی تمہارا حساب صاف کر دے گا۔"

"لیکن میرا قصور کیا ہے؟" عمران بارعب لہجے میں بولا۔ اس کی گردن اب بھی تنی ہوئی تھی۔

"اگر بڑے صاحب تمہیں یہاں نہیں دیکھنا چاہتے اور انہوں نے تمہیں نکال دیا ہے تو پھر تمہیں قصور پوچھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر خیریت چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔"

"مجھے دھمکیاں مت دو۔ میں سرمایہ داروں کی دھمکیوں میں

آنے والا نہیں ہوں۔" عمران کی آواز اب کچھ بلند ہو
طریقہ ہے.... کوئی انصاف ہے کہ ایک شخص کو اس کا
اس کی کوئی غلطی بتائے بغیر نوکری سے نکال دیا جا
داروں کے اسی رویے کی وجہ سے دنیا میں سرمایہ دار
خلاف تحریکیں چلتی آئی ہیں اور ان میں سے زیادہ تر
ہوتی آئی ہیں۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا کہ جب چاہو انس
کے طور پر بھرتی کر لو اور جب چاہو کان سے پکڑ کر نکا
سرمایہ داروں کا یہ ظلم نہیں چلے گا۔ مزدوروں کے
سازشیں نہیں چلیں گی۔ میں اس کے خلاف احتجاج کر
کورٹ میں جاؤں گا۔ اخبارات میں اس ظلم کی رپور
گا...."

اس نے گویا باقاعدہ تقریر شروع کر دی تھی۔ ا
مزدور لیڈر کا سا ہو گیا تھا۔ آخر اداکار تھا۔ نہ جانے کی
بنا پر اس میدان میں ناکام رہا ہو لیکن اس کا انداز تو
وہ نہایت مختصر نوٹس پر کسی بھی کردار میں ڈھل جانے
رکھتا تھا۔

اپنی تقریر کے اس ابتدائی موڑ پر پہنچ کر ہی اس۔
کر یوں متوقع سی نظروں سے اپنے چاروں طرف
مزدوروں کو دیکھا جیسے وہ فوراً اس کی حمایت میں نعرے
کر دیں گے لیکن وہ مزدور یا تو بہت عقل مند تھے، اس
تقریروں کے جھانسے میں آنے والے نہیں تھے یا پھر
تھے، اپنے حالات اور اپنی شرائطِ کار سے مطمئن
خاموش کھڑے ٹکر ٹکر اس کی طرف یوں دیکھتے رہے
دلچسپ تماشا پیش کر رہا ہو۔ حتیٰ کہ اب تو وجاہت علی
بھی کچھ پُرسکون نظر آ رہے تھے۔ احمد پرویز کے
غضب کے آثار کچھ کم ہو گئے تھے۔ اب وہ کچھ اس ط

طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی انتہائی احمق انسان کی حرکات و سکنات پر اپنا غصہ ضبط کر رہا ہو۔

اس سارے دل شکن ردِ عمل کے باوجود عمران نے ہمت نہ ہاری۔ وہ شاید اپنی تقریر میں کچھ روح پھونکنے کے لیے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ اس کا سلسلہ جوڑنے لگا تھا مگر وجاہت نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ وہ ذرا غصیلے لہجے میں اس سے مخاطب ہوا۔ "گدھے کہیں کے.....! اگر تم نے زندگی میں بھی ڈھنگ سے کوئی بھی کام کیا ہوتا' سنجیدگی سے کہیں بھی کوئی کام کیا ہوتا تو تمہیں معلوم ہوتا کہ تمہیں یہاں تین مہینے کے لیے پروبیشن پر رکھا گیا ہے اور اگر طالب علمی کے زمانے میں تم نے ذرا بھی دھیان سے پڑھا ہوتا تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوتا کہ پروبیشنری پیریڈ کا مطلب کیا ہوتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" عمران احتجاجی لہجے میں چیخا "لیکن....."

وجاہت نے اس کی بات کاٹ دی "لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ پروبیشنری پیریڈ کے دوران میں تمہیں کسی وقت بھی برخاست کیا جا سکتا ہے اور اس کے لیے کوئی وجہ بتانا بھی ضروری نہیں۔"

"پھر بھی مجھے کوئی نوٹس وغیرہ تو ملنا چاہیے تھا۔" عمران کا احتجاج جاری تھا۔

"نوٹس تمہیں نوٹوں کی شکل میں مل جائے گا۔" وجاہت بولا۔ "جتنے دن تم نے کام کیا ہوگا' تمہیں اس سے ایک ماہ زیادہ کی تنخواہ مل جائے گی۔"

"پروبیشنری پیریڈ تین ماہ کا ہوتا ہے۔ میں تین ماہ کی تنخواہ لے کر جاؤں گا۔" عمران نے اڑیل پن کا مظاہرہ کیا۔

تب احمد پرویز نے پہلی مرتبہ زبان کھولی اور وجاہت کی طرف دیکھ کر نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اختصار سے بولا "اسے ایک روپیا بھی دینے کی ضرورت نہیں۔ اسے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھواؤ اور باہر پھنکوا دو۔" ان الفاظ میں اس نے گویا بات ختم کر دی لیکن وہ وہاں سے گیا نہیں۔ وہیں کھڑا رہا۔ شاید وہ اپنے حکم پر عمل درآمد ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔

"میں فیکٹری کے دروازے پر تادمِ مرگ بھوک ہڑتال کروں گا' اگر مجھے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھا کر پھینکا گیا تو میں وہ ہنگامہ برپا کروں گا کہ پرنس انڈسٹریز میں پہیا جام ہو جائے گا۔" عمران نے چیخ کر اعلان کیا۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ اس اعلان پر عمل درآمد کرانے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔

احمد پرویز حقارت سے منہ بناتے ہوئے غرایا "تم سے پہلے بھی بہت سے کیڑے مکوڑے اس قسم کے ہتھکنڈے آزما کر ہمارے لیے مسئلے کھڑے کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ ہمیں ان سے نمٹنا اچھی طرح آتا ہے۔ ہمارے سامنے اس طرح بلیک میلر بننے کی کوشش وہی کرتے ہیں جنہیں زندگی سے دلچسپی نہیں ہوتی۔"

"یہ..... یہ کھلی دھمکی ہے۔ اتنے لوگوں کے سامنے مجھے صاف طور پر دھمکی دی جا رہی ہے۔ اگر مجھے کچھ ہوا تو ان سب کو اس بات کی گواہی دینی پڑے گی کہ مجھے یہاں دھمکیاں دی گئی تھیں۔" اس نے اردگرد کھڑے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اب بھی اس کی طرف اسی طرح دیکھ رہے تھے جیسے وہ ذہنی توازن کھو بیٹھا ہو اور وہ سنجیدگی سے دل ہی دل میں اس پر ترس کھا رہے ہوں۔

"یہ سب تمہارے جنازے میں بہت محبت سے شرکت کرنے آئیں گے۔" احمد پرویز غرایا۔

وجاہت مؤدبانہ انداز میں اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کسی حد تک گڑگڑانے کے سے انداز میں بولا "سر! مجھے اس معاملے کو ہینڈل کرنے دیجیے..... میں اس سے بات کر لوں گا۔" اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ بات بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ بات بڑھانے والی تھی بھی نہیں..... لیکن عمران کے رویّے سے یقیناً احمد پرویز کی انا مجروح ہوئی تھی۔ عمران کا رویّہ واقعی گلے پڑنے والا تھا۔ جس قسم کے اس کے حالات تھے ان حالات میں بعض لوگ اسی طرح بڑے اداروں یا دولت مند لوگوں کے گلے پڑ کر کچھ حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ کوشش کبھی کامیاب بھی ہو جاتی تھی اور کبھی لینے کے دینے بھی پڑ جاتے تھے۔

"تم اس معاملے کو کیا ہینڈل کرو گے....." احمد پرویز یک دم وجاہت پر برس پڑا "تم نے ہی تو اس گند کو..... اس مصیبت کو نہ جانے کہاں سے اٹھا کر ہمارے سروں پر مسلط کیا ہے۔ کیا تمہیں معلوم نہیں تھا یہ کون ہے؟؟"

"معلوم تھا سر!" وجاہت ایک لمحے کے لیے سر جھکاتے ہوئے ذرا دھیمے لہجے میں بولا "مجھے معلوم تھا یہ سابق ٹی وی آرٹسٹ اور میڈم سمیرا کا سابق شوہر ہے۔ اس کے حالات بہت خراب تھے میں نے سوچا' بجائے اس کے کہ یہ کہیں اِدھر اُدھر الٹے سیدھے کام کرتا یا محنت مزدوری کرتا پھرے اور لوگوں کو بتاتا پھرے کہ ایک مشہور' خاندانی اور کروڑپتی عورت کا سابق شوہر ہے' اسے یہیں ملازم رکھ لیا جائے۔ ایک طرح سے گھر کی بات گھر میں رہے۔ میں نے تو یہ بھی سوچا تھا کہ اگر اس نے یہاں شرافت سے کام کیا تو اسے کسی معقول اسامی پر کسی دفتر میں بٹھا دیں گے۔"

"میں شرافت ہی سے تو کام کر رہا تھا۔" عمران چلایا "میں یہاں کون سی بدمعاشی دکھا رہا تھا۔ بس آج ان کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔" اس نے احمد پرویز کی طرف اشارہ کیا "انہیں تو میری صورت سے ہی نفرت ہے۔ اب میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟! میں صورت تو تبدیل کرنے سے رہا۔ یہ میرے اختیار میں نہیں؟ سرمایہ دار ہر بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں....."

احمد پرویز نے اب بھی اس کی بات کا براہِ راست اسے جواب دینے کی زحمت نہیں کی اور وجاہت کو مخاطب کیا "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ شخص یہاں کام کرنے نہیں' کسی سازش کا موقع تلاش کرنے کی غرض سے آیا ہے۔ اسے کہیں سے بھنک پڑ گئی ہے کہ پرنس انڈسٹریز میں سمیرا کے حصے کا مالک' اس کی موت کی صورت میں اس کا شوہر ہوگا۔ اس کے علاوہ شاید اسے کچھ معلومات گڈمڈ ہو کر بھی ملی ہیں جن سے شاید اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سمیرا کے شوہر کا پرنس انڈسٹریز میں ملازم ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ یہاں کچھ اس قسم کا بندوبست کرنے کے چکر میں آیا ہے کہ اپنے آپ کو پرنس انڈسٹریز کا ملازم بھی ثابت کر سکے اور یہ دعویٰ بھی کر سکے کہ یہ ابھی تک سمیرا کا شوہر ہے یعنی سمیرا اپنی موت تک اس کی قانونی بیوی تھی۔"

یہ میرے لیے بھی ایک دلچسپ انکشاف تھا۔ وجاہت کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "یہ کیسے ہو سکتا ہے سر؟ ان کے درمیان تو کئی برس..... پہلے طلاق ہو چکی تھی۔ اخباروں میں خبریں آ چکی تھیں۔"

"شاید اس کا خیال ہے کہ کاغذی کارروائیوں میں کوئی کمی رہ گئی تھی اور اب یہ اس بات سے مکر سکے گا کہ اس نے سمیرا کو طلاق دی تھی۔ شاید اب یہ ثابت کرنے کے چکر میں ہے کہ قانونی طور پر طلاق واقع نہیں ہوئی تھی اور سمیرا کے مرنے تک دراصل یہی اس کا شوہر تھا۔ اس طرح یہ بھی وراثت کی اس کھینچا تانی میں شریک ہونا چاہتا ہے۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ اس طرح یہ زیادہ نہیں تو کچھ حصہ ہی لے مرے۔ یہ بہت بڑا شیخ چلی ہے اور اس کے شیخ چلی پن نے ہی اسے زندگی میں کچھ کرنے نہیں دیا۔ عقل سے اتنا پیدل ہے کہ یہاں گھستے ہی اس نے اپنی دانست میں رازدارانہ انداز میں لوگوں سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال بھی شروع کر دیا۔ میں یہاں کبھی کبھار دورے پر آتا ہوں لیکن مجھ تک یہ باتیں پہنچ گئیں۔ تم یہاں پرسونل منیجر ہو۔ روزانہ دفتر آتے ہو لیکن تمہیں ان باتوں کی شاید ہوا بھی نہیں لگی۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے تم خاصے نااہل ہوتے جا رہے ہو وجاہت علی!"

"معافی چاہتا ہوں سر! شاید میں اپنی آنکھیں اور کان پوری طرح کھلے نہیں رکھ سکا۔" وجاہت نے ندامت آمیز لہجے میں فوراً اپنی کوتاہی تسلیم کر لی۔ یہ اس کی عقل مندی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ احمد پرویز کے چہرے پر اس کے لیے برہمی کے آثار کچھ کم ہو گئے۔

میں نے یہ بھی محسوس کیا کہ یک دم عمران کی اکڑفوں کچھ کم ہو گئی تھی۔ وہ ایک ایسا غبارہ دکھائی دیا جس کی کافی ہوا ایک بیک نکل گئی تھی تاہم وہ جلدی ہمت ہارنے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کم از کم اپنی احمقانہ سوچوں کے معاملے میں وہ کافی ثابت قدم معلوم ہوتا تھا کیونکہ وہ فوراً ہی بول اٹھا "اس میں شیخ چلی والی کوئی بات نہیں ہے۔ تم لوگوں کو اس وقت پتا چلے گا جب میں تمہیں' تمہاری بیوی کو اور پرنس سعید کے پورے خاندان کو عدالت میں کھینچوں گا۔"

وہ اب احمد پرویز سے "آپ" کے بجائے "تم" سے مخاطب تھا۔ وہ اپنے آپ کو پہلے سے بھی زیادہ بے خوف ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن حقیقت میں میرے اندازے کے مطابق اندر سے وہ خوف زدہ تھا۔ احمد پرویز نے اس کی طرف جس حقارت سے دیکھا اس حقارت سے شاید کوئی کسی کیڑے مکوڑے کی طرف بھی نہیں دیکھتا ہوگا۔

"گدھے کہیں کے.....!" وہ دانت پیس کر بولا "پرنس سعید کا اب کون سا خاندان باقی رہ گیا ہے؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ سمیرا کے حصے کی دولت اور جائداد کے سلسلے میں جو بھی میرے راستے میں رکاوٹ بنے گا میں اسے عدالت میں دیکھ لوں گا۔" عمران نے وضاحت کی۔

"ضرور..... ضرور....." احمد پرویز نے سہلاتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا "کسی اچھے وکیل کو فیس ادا کرنے کے لیے تم ابھی سے سڑک پہ کھڑے ہو کر چندہ جمع کرنا شروع کر دو۔" پھر اس نے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے چار تگڑے سے مسلح محافظوں کو قریب آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس اُلّو کے پٹھے کو اٹھا کر باہر پھینک آؤ۔"

گارڈز کے کندھوں پر کلاشنکوفیں بھی لٹکی ہوئی تھیں لیکن عمران کے سلسلے میں انہیں کلاشنکوفوں کو ہاتھ لگانے کی بھی

ضرورت نہیں تھی۔ وہ تیزی سے عمران کی طرف بڑھے تو وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے چلّایا "نہیں۔۔۔ نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔۔۔ میں خود ہی چلا جاؤں گا۔"

اس نے جلدی سے ٹوپی اتار پھینکی اور کورآل بھی اتارنے لگا۔ شاید وہ وہاں سے پُروقار انداز میں رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن اس نے اب اس کا موقع کھودیا تھا۔ چاروں گارڈز نے اسے کچھ اس طرح آن دبوچا جیسے قسائی بکرے کو دبوچتے ہیں۔ انہوں نے اسے ڈنڈا ڈولی کرلیا اور باہر کی طرف لے چلے۔ وجاہت نے ایک بار پھر مداخلت کی کمزور سی کوشش کی اور احمد پرویز کو سمجھانا چاہا۔ "سر! ہمارے کارخانوں کی کبھی یہ روایت نہیں رہی۔۔۔"

"شٹ اپ!" احمد پرویز نے اسے بھی جھاڑ پلائی "اچھی روایات شرفا کے لیے ہوتی ہیں۔ لٹیروں لفنگوں کے لیے نہیں۔" وہ بھی گارڈز کے پیچھے پیچھے دروازے کی طرف چل دیا۔ اس طرف سے مزدوروں کی بھیڑ کائی کی طرح چھٹ گئی۔

"میری تین ماہ کی تنخواہ تو دے دیں۔" عمران محافظوں کی گرفت میں جھولتے ہوئے چلّایا۔

"وہ بھی تم عدالت کے ذریعے ہی لے لینا۔" احمد پرویز نے بلند اور کڑک دار آواز میں کہا۔ میں اس وقت اپنی جگہ سے کھسک کر ذرا اور زیادہ مزدوروں کی آڑ میں ہوگیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دروازے کی طرف بڑھتے وقت احمد پرویز کی نظر مجھ پر پڑجائے۔

عمران اسی حالت میں دروازے کے قریب پہنچ کر مایوسی سے چلّایا "اچھا۔۔۔ فی الحال میری ایک مہینے کی تنخواہ ہی دے دیں۔"

"اس کے بارے میں بھی ہم چند مہینے سوچیں گے۔" احمد پرویز نے بہ آوازِ بلند جواب دیا۔ اس کے چہرے سے بدستور غیظ و غضب کا ہی اظہار ہورہا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس وقت وہ اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہورہا تھا۔

"تم جیسے سرمایہ دار سیدھے جہنم میں جائیں گے۔" عمران چلّایا پھر اس نے حلق پھاڑ کر نعرہ لگایا "سرمایہ داری مردہ باد۔۔۔!" کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اس حالت میں بھی تقریر شروع کردیتا لیکن گارڈز نے اسے دو چار ماہرانہ قسم کے جھٹکے دے کر اس ارادے سے باز رکھا۔ کہیں کہیں سے مزدوروں کی دبی دبی سی ہنسی سنائی دے رہی تھی۔ کچھ مزدور شاید اس ارادے سے گارڈز اور عمران کو گھیرے میں لے کر چل دیے تھے کہ اگر گارڈز کو کوئی دشواری پیش آئے تو وہ ان کی مدد کرسکیں۔

دروازے سے نکلتے ہی احمد پرویز دو عمارتوں کے درمیان بنی ہوئی ایک پختہ روش کی طرف مڑگیا۔ شاید وہ اپنے آفس کی طرف جارہا تھا۔ گارڈز مین گیٹ کی طرف جارہے تھے جو وہاں سے کافی دور تھا۔ کھلی جگہ میں آکر عمران ایک بار پھر چلّایا "میں واپس آؤں گا۔۔۔ میرے مزدور بھائیو! میں واپس آؤں گا۔ میں ان کارخانوں کا مالک بن کر واپس آؤں گا لیکن میں تم مزدور بھائیوں کے شانہ بشانہ کھڑے ہوکر سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف جدوجہد کروں گا۔"

وہ مزدور عام اور چٹے اَن پڑھ مزدوروں کی نسبت کچھ سمجھ دار اور ذرا پڑھے لکھے معلوم ہوتے تھے لیکن بہت سمجھ دار بہت پڑھے لکھے تو بہرحال معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اس کے باوجود وہ عمران کے اس گھسے پٹے لیڈرانہ جھانسے میں آنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے لیے عمران کا یہ اعلان گویا لطیفے سے کم نہیں تھا۔ میں نے کئی مزدوروں کو بلند آہنگ قہقہہ لگاتے سنا۔ اب چونکہ احمد پرویز بھی دور جاچکا تھا اس لیے وہ کھل کر ہنس رہے تھے۔

وجاہت اس گروپ کے پیچھے چلا جارہا تھا جو عمران کو "دھوم دھام" سے رخصت کرنے جارہا تھا۔ راستے میں ایک فٹ پاتھ نما روش کے قریب ایک سوزوکی پک اپ کھڑی تھی۔ گیٹ چونکہ کافی دور تھا اس لیے گارڈز نے یقیناً یہ سوچا کہ عمران کو ڈنڈا ڈولی کرکے وہاں تک لے جانا ایک اچھی بھلی مشقت ہوگی اس لیے انہوں نے اسے پک اپ میں لاد لیا اور خود بھی اس میں چڑھ کر عمران کو دبوچ کر بیٹھ گئے۔ پک اپ میں ڈرائیور موجود تھا۔ انہوں نے اسے گیٹ کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

وجاہت کو شاید اب بھی عمران سے ہمدردی تھی۔ وہ پک اپ کے قریب کھڑے ہوکر اسے ہمدردی آمیز انداز میں ڈانٹتے ہوئے بولا "تم نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری۔ تمہیں صاحب سے نہیں الجھنا چاہیے تھا۔"

"ایسی تیسی تمہارے صاحب کی۔۔۔" عمران نے جواب دیا۔ رسی جل گئی تھی مگر بل ابھی تک نہیں گیا تھا "میں اس سے کب الجھا تھا۔ وہ تو مجھے تلاش کرتا ہوا وہاں پہنچا تھا اور میری صورت دیکھتے ہی گویا اس کا فیوز اڑ گیا تھا۔" پھر اس نے وجاہت کو اپ گراں قدر مشورے سے نوازا "ویسے تم لوگ اب اس کی اتنی جی گیری کرنا چھوڑ دو۔ یہ اب زیادہ دن کے لیے تمہارا باس نہیں ہے۔ اس نے ان کارخانوں میں اپنا حصہ بیچ دیا ہے۔ بس کیرا کے حصے کا فیصلہ ہونا باقی ہے پھر تم لوگوں کے سروں پہ نئے مالکان آبیٹھیں گے۔"

"ان میں تم بہرحال شامل نہیں ہوگے۔" وجاہت نے بدمزگی سے کہا اور پک اپ کے پاس سے ہٹ گیا۔ شاید اسے اندازہ ہو تھا کہ اس شخص کو کچھ سمجھانا فضول تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ پرنس انڈسٹریز کے بارے میں تازہ ترین معلومات رکھتا تھا۔ اس سے بھی تصدیق ہوتی تھی کہ وہ واقعی کیرا کے ذ کی دولت اور املاک کا مالک بننے کا خواب لے کر یہاں آیا تھا۔ مزدور کے طور پر بھرتی ہوکر اپنی دانست میں کچھ مصلحتوں کے تقاضے پورے کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جدوجہد میں کچھ ڈرامائی رنگ پیدا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

وجاہت پک اپ کے پاس سے ہٹ گیا۔ مزدوروں کی ٹولیاں بکھر گئی اور وہ لوگ سست رفتاری سے بلڈنگ نمبر تین کی طرف

واپس جانے لگے۔ پہلے میں نے سوچا کہ جلد از جلد گیٹ تک پہنچنے کی کوشش کروں اور گارڈ جب عمران کو باہر پھینک چکے ہوں تو اس سے متعارف ہوکر اس کا ہمدرد بن کر اس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں لیکن میں نے فوراً ہی اپنا یہ ارادہ ترک کردیا۔ عمران محض ایک لالچی اور احمق سا آدمی تھا۔ وہ واقعی یہاں۔۔۔ اپنے ہی چکر میں آیا تھا۔ میں جس قسم کی معلومات کے چکر میں تھا وہ مجھے اس سے حاصل نہیں ہوسکتی تھیں۔

وجاہت سے بھی کوئی امید رکھنا بے کار تھا۔ اب جبکہ وہ مجھے پہچان چکا تھا تو وہ مجھے پرنس انڈسٹریز میں گھسنے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ اگر مجھے معلومات حاصل کرنا ہی ہوں گی تو میں اس کے لیے کوئی اور طریقہ سوچوں گا۔ تاہم میں نے یونہی ذرا وجاہت کو چھیڑنے کے لیے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "ہاں۔۔۔ تو پھر وجاہت صاحب۔۔۔! مجھے بھرتی کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے؟ اتنے کم پیسوں میں اتنا معزز مزدور آپ کو کبھی نہیں مل سکے گا۔"

وہ اب تک میری موجودگی سے بے خبر تھا۔ میرے مخاطب کرنے پر بُری طرح چونک پڑا اور خوف زدہ سے انداز میں میری طرف مڑا "آپ یہاں بھی آگئے؟" حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ اس وقت بھی پسینے سے تر تھا۔

"میں ابھی تھوڑا ہی آیا ہوں۔ میں تو آفس سے آپ کے ساتھ ساتھ ہی ہوں۔ آخر مجھے یہاں ملازمت حاصل کرنی ہے۔ میں آپ کا پیچھا کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس نے خوف زدہ سی نظروں سے بلڈنگ نمبر تین کی طرف دیکھا جس کے اندر سے اب مشینیں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ جو مزدور باہر آئے تھے وہ بھی اب واپس اندر جارہے تھے۔ وجاہت کی نظر میں شاید اب بھی کچھ دیر پہلے کا منظر گھوم رہا تھا۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے اس نے اچانک میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے اور رو دینے والے انداز میں بولا "خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دیجیے افضل صاحب! آپ کو نوکری کا مذاق سوجھ رہا ہے اور میری نوکری سچ مچ خطرے میں پڑی ہوئی ہے۔ احمد صاحب ابھی تو صرف تھوڑی بہت جھاڑ پلا کر چلے گئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ میرے نام بہت سخت قسم کا شوکاز نوٹس ضرور جاری کریں گے۔ میں نے تو اپنی دانست میں عمران کو یہاں ملازم رکھ کر نیکی کی تھی۔ ابھی تو وہ نیکی ہی میرے گلے پڑی ہوئی ہے۔ اب آپ نہ جانے کس چکر میں یہاں گھسنے کی فکر میں ہیں۔ آپ تو یقیناً کھڑے پیروں مجھے یہاں سے نکلوا کر ہی چھوڑیں گے۔"

"آپ تو بہت ہی بودے آدمی نکلے وجاہت صاحب! میں تو سمجھتا تھا آپ مجھے پہچاننے کے بعد بھی ایک اعزاز سمجھ کر ہی مجھے ملازمت دے دیں گے۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

"اگر آپ مجھے مزید بے وقوف بنانے کی کوششیں ترک کردیں تو میں آپ کا بہت ہی شکر گزار رہوں گا۔" وہ جلے بھنے انداز میں بولا "معلوم نہیں لوگوں نے کس کس چکر میں یہاں کا رخ کرنا شروع کردیا ہے۔"

وہ تیز تیز قدموں سے اپنے آفس کی طرف واپس چل دیا۔ میں بھی اس کے پیچھے تھا لیکن میں نے اسے مزید تنگ نہیں کیا۔ کافی آگے جاکر ہمارے راستے جدا ہوگئے۔ وہ اپنے آفس کی طرف مڑگیا اور میں گیٹ کی طرف چل دیا۔ میں نے اس پک اپ کو گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف کھڑے دیکھا جس میں عمران کو لاد کر لے جایا گیا تھا۔ گارڈز بھی گیٹ ہاؤس کے قریب کھڑے دوسرے گارڈز سے ہنسی مذاق کررہے تھے۔ شاید وہ چند لمحے پہلے ہی عمران کو باہر پھینک کر واپس آئے تھے لیکن جب میں گیٹ سے نکلا تو عمران مجھے دور دور تک کہیں نظر نہیں آیا۔ وہاں کوئی سواری بھی میسر نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کہاں غائب ہوگیا تھا۔ شاید اسے کسی آتی جاتی گاڑی میں لفٹ مل گئی ہو۔

میں نے اس کے تصور کو ذہن سے جھٹک دیا اور اس طرف چل دیا جہاں میں صفیہ کو گاڑی میں چھوڑ کر آیا تھا۔ میں وہاں پہنچا تو صفیہ گاڑی میں ہی موجود تھی اور سیٹ ترچھی کیے، آنکھیں بند کیے اطمینان سے نیم دراز تھی۔ میں اس کی بے خوفی اور بے نیازی دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے انگلی سے کھڑکی کا شیشہ کھٹکھٹایا تو اس نے آنکھیں کھولیں لیکن ساتھ ہی اس کا ہاتھ کلو

کمپارٹمنٹ کی طرف بھی بڑھ گیا تھا۔ شاید وہ کھڑکی میں کسی اجنبی اور مشکوک چہرے کو دیکھتے ہی گن نکالنے کے لیے تیار تھی۔ مجھے اس احساس سے نہ جانے کیوں کچھ اطمینان ہوا کہ وہ زیادہ ڈرپوک لڑکی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ ڈرپوک لڑکیاں مرد کے لیے نازک ذمّے داری ہوتی ہیں۔

میری شکل دیکھ کر اس کا گلوو کمپارٹمنٹ کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ گود میں آن گرا اور اس نے مسکراتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے کہا "استراحت فرمانے کے لیے اچھی جگہ منتخب کی تم نے۔"

"میں اپنے آپ کو ماحول سے لاتعلق کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس بے ہودہ سی جگہ پر وقت گزارنے کا یہی ایک طریقہ میری سمجھ میں آیا تھا۔"

پھر میں نے گاڑی سپرہائی وے کی طرف جانے والی چھوٹی سڑک کی طرف موڑی تو وہ بولی "آپ سنائیں..... کیسا رہا آپ کا دورہ؟ اپنے مقصد میں کچھ کامیابی ہوئی؟"

"کامیابی بس یہی ہے کہ ایک اچھی لڑکی کے ساتھ لمبی ڈرائیو اور گپ شپ ہوگئی۔ اس کے علاوہ تو اس سفر میں بس خاک ہی پھانکی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اچھی سی لڑکی کے ساتھ لمبی ڈرائیو پر جانا ہی تھا تو کسی اچھے علاقے کی طرف، تو جاتے۔ اسے بھی صرف کارخانوں کی لمبی لمبی دیواریں اور اونچی اونچی چمنیاں دکھانے لے آئے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"لڑکی کو چونکہ مستقبل میں بہت بڑی سرمایہ دار بننا ہے اس لیے میں اسے دکھانے لایا تھا کہ دولت ایسی جگہوں پر جنم لیتی ہے۔ بہرحال..... اب شہر چل کر کسی اچھی سی جگہ پر کھانا کھاتے ہیں۔ شاید اس طرح اس بے ہودہ دورے کی کچھ تلافی ہو جائے۔"

"یہیں آس پاس کسی چھپر ریستوران میں کیوں نہ کھالیا جائے؟" اس نے تجویز پیش کی۔

"بھئی تم ابھی سے اپنی اوقات بدلنے کی مشق شروع کرو۔" میں نے مشورہ دیا "ایک منٹ پہلے تم خود ہی اس علاقے کو بے ہودہ قرار دے چکی ہو۔ اس کے علاوہ تم کامران کے ساتھ ایک مرتبہ یہاں کھانا کھانے کا تجربہ بھی بیان کرچکی ہو جس میں کچھ ڈرائیوروں وغیرہ کے گھورنے کا تذکرہ تھا۔ اس کے باوجود تم دوبارہ یہیں کھانا کھانے کی تجویز پیش کررہی ہو؟"

"میں اس قسم کے تجربات سے گھبرانے والی نہیں ہوں۔ ہمارے ہاں لڑکی کو اس قسم کے تجربات سے تو قدم قدم پر واسطہ پڑتا رہتا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"اس کے باوجود میں نہیں چاہوں گا کہ تم یہاں کا کھانا کھا کر اپنے معدے پر اتنا بوجھ ڈالو جتنا کسی بھینس یا اونٹی کو ڈالنا پڑتا ہے۔" میں نے کہا "کھانا ہم شہر میں کسی ڈھنگ کی جگہ پر کھائیں گے۔"

"شہر میں پھر آپ کے اپنے ہوٹل سے زیادہ ڈھنگ کی جگہ کون سی ہوسکتی ہے۔"

"اگر تمہاری نظر میں وہ ڈھنگ کی جگہ ہے تو پھر وہیں سہی۔" میں نے فوراً اس کی تجویز کی تائید کردی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "لگتا ہے پرنس انڈسٹریز میں آپ کا دورہ بے کار ہی رہا ہے؟"

"ہاں..... بس معمولی سا ایک تماشا دیکھنے کو مل گیا....." میں نے کہا اور اسے عمران کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بارے میں بتایا۔

پوری بات سُن کر وہ ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد بولی "بعض اوقات تو میں یہ سوچ کر حیران ہوتی رہتی ہوں کہ دولت و جائداد کے لیے آخر انسان کیا کچھ کرسکتا ہے؟"

"بھائی، بھائی کا گلا کاٹ دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر انسان اور کیا کرے گا۔"

"جب کوئی بہت دولت مند انسان اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کے لواحقین کو دیکھ کر کچھ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بھوکے بھیڑیوں کا ایک غول اس کی لاش کی تکا بوٹی کرنے کے لیے جھپٹ رہا ہے۔ وہ جس طرح اس کی دولت و جائداد کے حصے بخروں کے لیے ایک دوسرے کو بھنبھوڑتے ہیں اس سے کم از کم مجھے تو کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے جیسے وہ دولت و جائداد پر نہیں بلکہ مرنے والے کی لاش پر ہی جھپٹ رہے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟"

"کاش میں بتا سکتا.....!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میرا خیال ہے انسان کو جس مٹی سے بنایا گیا ہے اس میں سب سے زیادہ آمیزش لالچ اور ہوس کی ہے۔ بزرگوں نے تو بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ زر، زن اور زمین فساد کی جڑ ہیں۔ میرے خیال میں تو یہ فہرست کچھ اور مختصر ہوگئی ہے۔ اب تو شاید صرف زر اور زمین فساد کی جڑ ہوگئی ہیں۔ زر اور زمین آپ کے پاس ہو تو زن خود بہ خود چلی آتی ہے۔ اس لیے اصل جھگڑا اب صرف زر اور زمین کے حصول کا رہ گیا ہے۔"

وہ چند سیکنڈ خاموشی سے کھڑکی سے باہر بے آب و گیاہ میدان کو تکتی رہی پھر گردن گھما کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "وہ تو غنیمت ہے کہ پرنس سیرا اپنے پیچھے وارثوں اور دعوے داروں کی فوج نہیں چھوڑ گئی ورنہ معلوم نہیں اس وقت کیسا میدانِ کارزار گرم ہوتا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ اتنی بہت سی دولت و جائداد..... جس کے لیے نہ جانے کون کون کیا کیا کچھ کرسکتا تھا وہ کامران کو صرف ایک رات کی شادی کی وجہ سے مل جاتی بشرطیکہ وہ زندہ رہتا؟"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا "یقیناً مل جاتی۔ اس کے لیے اسے بس دو تین قابل وکیلوں کی ضرورت پڑتی۔ وہ بھی شاید سیٹھوں کی سینڈیکیٹ اسے خود ہی فراہم کردیتی۔ دنیا میں قدرت کے اس طرح کے کھیل تماشے جاری رہتے ہیں۔ کبھی کبھی کروڑپتی لوگ راتوں رات کنگال بھی ہوجاتے ہیں۔"

ایک بار پھر وہ چند لمحے کے لیے خاموش رہی۔ سڑک کی طرف تکتے ہوئے وہ نہ جانے کیا سوچ رہی تھی۔ دفعتاً وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی "معلوم نہیں انسان پیدا ہی کیوں ہوتا ہے۔ اس دنیا میں اگر انسان نہ ہوتا تب بھی کیا فرق پڑتا؟ انسان نے واقعی زمین پر فساد پھیلانے کے سوا کیا کیا ہے؟"

"خدا خیر کرے..... تم پر ڈپریشن غلبہ پا رہا ہے۔" میں نے گویا کوئی خطرہ محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کبھی ڈپریس نہیں ہوتے؟"

"ہونے لگتا ہوں لیکن میں فوراً ڈپریشن سے پیچھا چھڑانے کے لیے حرکت میں آجاتا ہوں۔ زمین پر انسان کے پھیلائے ہوئے زہریلے اور منفی اثرات کو کم کرنے کے لیے اگر میں ایک ذرّے کے برابر بھی کوشش کرسکتا ہوں تو میں اس میں لگ جاتا ہوں۔ اگر سوچنے سمجھنے اور محسوس کرنے والے لوگ ایسا نہ کریں تو ڈپریشن انہیں کھا جاتا ہے۔ توڑ پھوڑ دیتا ہے۔ میں اپنی ذرّہ برابر کوشش کو بھی حقیر سمجھ کر ترک نہیں کرتا۔" میں نے جواب دیا۔

"اب ہر انسان تو آپ کی طرح نہیں ہوسکتا نا۔" وہ طویل سانس لے کر بولی "کچھ لوگوں کو اللہ نے ڈپریشن سے مغلوب ہونے کے لیے بھی پیدا کیا ہوگا۔"

یونہی باتیں کرتے جب ہم ٹول پلازا سے گزر چکے تو ایک جگہ مجھے سامنے سے آتی ہوئی ایک گاڑی سپرہائی وے کو کراس کرکے بائیں طرف ایک نیم پختہ سڑک پر اترتی دکھائی دی۔ یہ سڑک سپرہائی وے کو یونیورسٹی روڈ سے ملاتی تھی لیکن ابھی یہ باقاعدہ طور پر نہیں بنی تھی لیکن بے صبری چونکہ ہم میں سے اکثر کا قومی شعار ہے اس لیے جونہی یہ اس قابل ہوئی تھی کہ اس پر سے جوں توں گاڑی گزر سکے، یار لوگوں نے اسے رگیدنا شروع کردیا تھا اس لیے اب یہ خاصی صبر آزما حالت میں تھی۔

جس گاڑی کو میں نے اس سڑک پر مڑتے دیکھا تھا اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ تھا اس کے باوجود میں نے اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر موجود شخص کو پہچان لیا کیونکہ وہ ذرا الگ ہی قسم کے چہرے مہرے کا مالک تھا۔ اسے دیکھ کر کسی نیولے کا تصور ذہن میں آتا تھا۔ اس شخص کو میں دو ایک مرتبہ اپنا تعاقب کرتے دیکھ چکا تھا جس کا نہ تو کوئی مقصد میرے ذہن میں آسکا تھا اور نہ میں اس شخص کے بارے میں جان سکا تھا کہ وہ کون تھا اور کس کی ہدایت پر میرا تعاقب کررہا تھا۔

اس وقت یہ اتفاق مجھے بہت خوشگوار محسوس ہوا کہ وہ سامنے سے آرہا تھا اور اس کے باوجود اس نے مجھے نہیں دیکھا۔ ایک تو خاصے فاصلے کی وجہ سے اس نے میری گاڑی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ دوسرے اس کے اور میرے درمیان چھوٹی سی ایک نیلی گاڑی حائل تھی۔ زاویہ کچھ ایسا تھا کہ میں اس گاڑی کی آڑ میں تھا لیکن میں نے اسے صحیح طور پر دیکھ لیا تھا۔

میں جب اس موڑ کے قریب پہنچا تو میں نے بھی رفتار نہایت کم کرتے ہوئے گاڑی اسی سڑک پر موڑ دی۔ صفیہ چونکتے ہوئے بولی "کہیں آپ کوئی ایسا "شارٹ کٹ" اختیار کرنے کی فکر میں تو نہیں ہیں جو اصل راستے سے بھی لمبا ہوگا؟"

"میں اس وقت شارٹ کٹ یا "لانگ کٹ" کے چکر میں نہیں بلکہ اس شخص کے چکر میں ہوں جو آگے سیاہ گاڑی میں جارہا ہے۔" میں نے اصل بات اسے بتادی "جب یہ گاڑی اس طرف مڑی ہے تو شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو۔ کچھ عجیب سا آدمی ہے۔ نیولے کی سی شکل والا....."

"اتنی دور سے میں تو یہ بھی نہیں دیکھ سکی کہ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود بھی تھا یا نہیں۔" وہ ذرا سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی "بہرحال..... اگر نیولا نما کوئی شخص موجود بھی تھا تو آپ اس کے چکر میں کیوں پڑ گئے؟ کیا آپ اتنے بدذوق ہوچکے ہیں؟ اگر تعاقب ہی کرنا ہے تو کم از کم مجھ سے بہتر کسی خوش شکل، خوش ادا خاتون کا کیجئے۔ تعاقب کرنے کے لیے کیا یہ نیولا ہی رہ گیا ہے؟"

"کبھی کبھی کسی خوش شکل، خوش ادا خاتون پر کسی نیولے کو بھی ترجیح دینی پڑتی ہے۔" میں نے اپنے اور اگلی گاڑی کے درمیان کافی فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے کہا۔ اس سڑک پر ویسے بھی گاڑی سست رفتاری سے ہی چلائی جاسکتی تھی۔ اگلی گاڑی میں نیولا نما شخص کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

"کون ہے یہ نیولا؟" صفیہ نے پوچھا۔

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا "یہ کوئی خطرناک نیولا معلوم ہوتا ہے۔ پرنس انڈسٹریز کا ہمارا دورہ تو بالکل بے کار رہا۔ شاید اس کا پیچھا کرکے کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔"

"اب بے چارے ہم جیسے غریبوں کو کیا معلوم کہ آپ کے لیے کام کی بات کون سی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "مجھے تو صرف یہ معلوم ہے کہ اس وقت میرا انگریزی فلموں والی کار چیزنگ دیکھنے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔ انسان کے پیٹ میں پہلے ہی چوہے دوڑ رہے ہوں تو وہ کار میں اِدھر اُدھر لڑھکتا اور ڈیش بورڈ یا ونڈ اسکرین وغیرہ سے سر پھوڑنا کہاں اچھا لگتا ہے۔"

"ضروری نہیں ہے کہ یہاں انگریزی فلموں والی کار چیزنگ ہو۔ اپنے ہاں زیادہ تر کام دیسی اسٹائل میں ہی ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے تو سڑک ہی دیکھ لو۔ خالص دیسی قسم کی ہے۔ پتھروں اور دھول مٹی کا ایک ناہموار مجموعہ ہے۔ مصطفےٰ زیدی مرحوم نے اس قسم کی سڑکیں دیکھ کر تو برسوں پہلے اپنا وہ مشہورِ زمانہ شعر کہہ دیا

تھا۔ انہی پتھروں پہ چل۔۔۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی کیونکہ کار ایک دم ایک خاصے ہی بڑے گڑھے میں چلی گئی تھی جسے میں بروقت نہیں دیکھ سکا تھا۔ چھوٹی موٹی گاڑی تو وہیں پھنس سکتی تھی۔

گاڑی زوردار ہچکولے کے ساتھ گڑھے سے نکل آئی تو میں نے کہا "اس قسم کے راستوں پر انسان کی تو کیا شعر کی بھی ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔"

"اور آپ ایسے بے ہودہ آدمی کے پیچھے جانے کے لیے ایسے راستوں سے گزر رہے ہیں۔" اس نے ناک بھوں چڑھائی۔

"میں اس سے زیادہ بے ہودہ راستوں پر اس سے زیادہ بے ہودہ آدمیوں کے پیچھے بھی جاچکا ہوں۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ میرے خیال میں سڑک کی شکستہ حالی میرے حق میں اچھی ہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ نیولا نما شخص کی تمام تر توجہ ڈرائیونگ پر ہوگی اور اسے تعاقب کا احساس نہیں ہوسکے گا۔ ویسے بھی وہ اپنے عقب میں گردوغبار کا ایک چھوٹا سا بادل چھوڑتا جارہا تھا اور میں نے اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ بھی کافی رکھا تھا لیکن ایک نامناسب بات یہ تھی کہ اس کے اور میرے درمیان کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ مجھے یہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ اسے تعاقب کا احساس نہ ہوجائے۔ اس صورت میں وہ جہاں جارہا تھا وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کرسکتا تھا۔

صفیہ بولی "آپ کب تک بے ہودہ راستوں پر بے ہودہ لوگوں کے پیچھے اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے رہیں گے؟ آپ بے ہودگی کی دلدل سے نکلنے کے لئے دوسروں کی تو مدد کرتے رہتے ہیں لیکن کبھی اپنے بارے میں بھی سوچیں۔"

"چراغ تلے اندھیرا ہی رہنے دو۔" میں نے کہا "ویسے میرے اپنے خیال میں تو میری زندگی کچھ ایسی بے ہودہ بھی نہیں ہے۔ میری زندگی کا ہر لحہ کوئی نہ کوئی مقصدیت لیے ہوئے ہوتا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ مائی گاڈ۔۔۔!" وہ کراہنے کے سے انداز میں بولی "اسے آپ مقصدیت کہتے ہیں؟"

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور کہا "تمہیں کیا معلوم میں کیا کچھ کرتا ہوں؟"

"ہاں۔۔۔ یہ بات تو ہے۔" اس نے یک دم تسلیم کرلیا "ابھی تو میں آپ کو صحیح طور پر جانتی ہی نہیں۔ بہرحال۔۔۔ امید ہے جلد ہی جان جاؤں گی۔"

"ہاں۔ اگر اسی طرح میرے ساتھ دھکّے کھاتی رہیں تو جلدی جان جاؤ گی۔"

"میں آپ کے ساتھ دھکّے تو کیا ڈنڈے۔۔۔ جوتے۔۔۔ حتیٰ کہ گولی کھانے کے لیے بھی تیار ہوں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"واقعی۔۔۔؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا اور ایک بار پھر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ عجیب خواب ناک سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

"ہاں۔۔۔ واقعی۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا کوئی خالی پیٹ بھی اتنا رومینٹک ہوسکتا ہے۔"

"یہ رومانویت نہیں، خالص حقیقت پسندی ہے۔ میں یہ بات بہ قائمی ہوش وحواس کہہ رہی ہوں۔" وہ زور دے کر بولی۔

"لڑکیاں واقعی عجیب ہوتی ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" وہ فوراً بولی "اور جو مجھ جیسی غریب ہوتی ہیں وہ اور بھی زیادہ عجیب ہوتی ہیں۔"

"بھئی اب تم ہروقت یہ اپنی غربت کا رونا رونا چھوڑ دو۔ اب تم ایسی غریب نہیں رہی ہو اور مستقبل کی تو تم مجھے بہت ٹھیک ٹھاک قسم کی سرمایہ دار معلوم ہوتی ہو۔ معلوم نہیں اُس وقت اس بندۂ حقیر کے لیے تمہارے جذبات یہی رہیں گے یا تبدیل ہوجائیں گے۔"

"خدا آپ کی زبان مبارک کرے۔" وہ جلدی سے بولی "اور جہاں تک جذبات کا تعلق ہے تو وہ اور شدید ہوجائیں گے۔"

سفر نہایت سست رفتاری سے جاری تھا لیکن ہم کافی فاصلہ طے کرچکے تھے۔ صفیہ کے ساتھ باتوں کے باوجود مجھے احساس تھا کہ ہم کافی دور نکل آئے تھے اور شاید یونیورسٹی روڈ پہنچنے ہی والے تھے۔ اس ناہموار سڑک میں کئی گھماؤ پھیراؤ بھی تھے۔ اچانک مجھے دائیں ہاتھ پر اس سڑک سے خاصے فاصلے پر ایک طویل وعریض محل نما مکان دکھائی دیا۔ میری نظر اس پر اچانک ہی پڑی تھی۔ شاید اسی لیے مجھے کچھ یوں محسوس ہوا تھا جیسے لق ودق ویرانے میں وہ مکان اچانک ہی زمین کے سینے پر اُبھر آیا ہو۔

اس کے ساتھ ہی مجھے اپنے ذہن میں ایک کوندا سا لپکتا محسوس ہوا۔ دراصل مجھے شفیع شاہ کی فراہم کردہ ایک اطلاع یاد آگئی تھی۔ اس نے مجھے جمال سعیدی کے بارے میں رپورٹ دیتے ہوئے بتایا تھا کہ اس نے سپرہائی وے کے قریب ویرانے میں ایک شاندار، محل نما بنگلا بنا رکھا ہے۔ جمال سعیدی، جمشید کریم کا قریبی دوست تھا اور ان کے درمیان باضابطہ اور درپردہ قسم کے کاروباری تعلقات بھی تھے۔ اس کے علاوہ جمال سعیدی کے پاس پرنس انڈسٹریز کی پورے ملک کے لیے ڈیلرشپ بھی تھی۔ اس کا یہ ڈیلرشپ حاصل کرنا اپنی جگہ ایک حیرت انگیز واقعہ تھا کیونکہ اس نے یہ ایک پرانے اور جمے جمائے ڈیلر سے حاصل کی تھی۔۔۔ بلکہ یوں کہیے کہ چھینی تھی۔

یہ واقعہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ حیرت انگیز تھا کہ جمال سعیدی درحقیقت پاکستانی بھی نہیں تھا۔ برسوں پہلے وہ ایک پڑوسی ملک میں جنگ کے آغاز پر پناہ گزیں کے طور پر پاکستان آیا تھا مگر جلد ہی شاید تمام ملکی ادارے اور پھر شاید وہ خود بھی اس حقیقت کو بھول گیا تھا۔ مجھے فوراً ہی یقین ہوگیا کہ یہ اسی جمال سعیدی کا مکان تھا گو کہ ابھی میں اس سے کافی دور تھا لیکن محلِ وقوع وہی تھا جو

شفیع شاہ نے مجھے سمجھایا تھا۔ نہ جانے کیوں چند لمحے کے لیے میرے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہوگئیں۔ ویرانے میں کھڑا یہ عظیم الشان مکان اپنے اندر ایک عجیب سی پُراسراریت لیے ہوئے تھا۔

میں بالکل بھول گیا کہ ایک لمحہ پہلے میری صفیہ سے کیا باتیں ہورہی تھیں، وہ کیا کہہ رہی تھی اور میں کیا محسوس کررہا تھا۔ میری تمام تر توجہ اس گاڑی پر مرتکز ہوکر رہ گئی تھی جس میں وہ نیولا نما شخص موجود تھا۔ وہ گاڑی مکان کی طرف مڑچکی تھی اور میں دور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ سڑک اس مکان کے سامنے تک تو ناہموار تھی لیکن وہاں سے اس کا جو حصہ یونیورسٹی روڈ تک جارہا تھا وہ نہایت عمدہ طریقے سے بنا ہوا اور صاف ستھرا تھا۔ صرف یہی نہیں، اس سڑک سے اس مکان تک بھی چھوٹی سی ایک ہموار اور معیاری سڑک بنی ہوئی تھی۔ اس مکان میں آمدورفت شاید یونیورسٹی روڈ کی طرف سے ہی رکھی جاتی تھی۔ اس وقت شاید وہ نیولا نما شخص کسی اتفاق کے تحت سپرہائی وے کی طرف سے آرہا تھا۔ شاید قدرت کو اس سے میرا سامنا کرانا تھا۔

گاڑی مکان کے سامنے صرف ایک لمحے کے لیے رکی تھی۔ پھر خود کار سے انداز میں گیٹ کھل گیا تھا اور گاڑی اندر چلی گئی تھی۔ گیٹ اسی روانی سے بند ہوگیا تھا جس روانی سے کُھلا تھا۔ فاصلہ خاصا تھا۔ میں دیکھ نہیں سکا کہ گیٹ کے عقب میں کوئی موجود تھا یا نہیں۔ میں نے رفتار کچھ اور کم کردی تھی اور بغور اس مکان کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ صفیہ نے بھی شاید محسوس کرلیا تھا کہ میں بہت خاص توجہ سے مکان کا جائزہ لے رہا ہوں۔ وہ بالکل خاموش ہوگئی تھی۔

مکان کے طرزِ تعمیر اور ڈیزائن میں تو کچھ ایسی جدّت نہیں تھی لیکن وہ ماربل اور دوسرے خوب صورت پتھروں سے بنے ہوئے کسی چھوٹے موٹے قلعے سے کم نہیں تھا۔ کچھ اور قریب پہنچ کر مجھے اس کی وسعت کا اندازہ ہوا۔ اس کی اصل دومنزلہ عمارت بھی کچھ کم لمبی چوڑی نہیں تھی۔ اس سے بھی زیادہ رقبہ اس کے اردگرد احاطے کی صورت میں موجود تھا جس میں شاید لان وغیرہ ہوگا۔ کچھ درخت چار دیواری سے باہر بھی جھانک رہے تھے۔ چار دیواری زیادہ بلند نہیں تھی پھر بھی اپنی ساخت اور میٹریل وغیرہ کی وجہ سے کسی قلعے کی فصیل سے ہی مشابہ محسوس ہورہی تھی۔ اس پر چاروں طرف خاردار تاروں کا جنگلا بھی موجود تھا جس کی وجہ سے گویا اس کی اونچائی میں اضافہ ہوگیا تھا۔

اوپر کی منزل پر کچھ عجیب سی ساخت کا ایک اونچا سا کمرا بنا ہوا تھا جو کسی حد تک واچ ٹاور سے مشابہ تھا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ واچ ٹاور ہی کا کام دیتا ہو۔ اس میں عجیب سی ساخت کے روشن دان سے بنے ہوئے تھے تاہم ان میں سے کسی گن کی نال یا کوئی محافظ جھانکتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دوسری منزل کے چاروں طرف خاصی چوڑی ایک جنگلے دار بالکونی بھی بنی ہوئی تھی۔ دوسری منزل کے کسی بھی دروازے سے، کسی بھی سمت سے کوئی نکل کر اس بالکونی پر آسکتا تھا اور مکان کے چاروں طرف گھوم سکتا تھا۔ نیچے کا اور گردوپیش کا منظر آسانی سے دیکھ سکتا تھا۔

مکان گویا اپنی چار دیواری تک ہی محدود نہیں تھا۔ چار دیواری سے باہر بھی چاروں طرف خاصی دور تک سرسبز لان پھیلا ہوا تھا جس کے گرد نیچی سی ایک خوب صورت کنگرے دار دیوار بنائی گئی تھی۔ اس سرسبز مٹی میں بھی رنگا رنگ پھولوں سے لدے پودے بہار دکھا رہے تھے۔ مکان اور احاطے کے علاوہ اس بیرونی لان کو بھی شامل کیا جاتا تو بہت بڑا رقبہ بنتا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ جمال سعیدی نے اس زمین پر مفت میں ہی قبضہ کیا ہو۔ اس علاقے میں۔۔۔ بلکہ اس کے اردگرد بھی بہت دور دور تک لینڈ مافیا کچھ زیادہ ہی سرگرم تھی۔ بہت بڑے پیمانے پر زمینوں پر قبضے ہورہے تھے کیونکہ ضروریاتِ زندگی میسر تھیں اور جہاں میسر نہیں تھیں وہاں بھی کھینچ تان کر بااثر لوگ لے ہی آتے تھے۔ راتوں رات بڑی بڑی بستیاں تعمیر ہوجاتی تھیں۔ زمینوں کے اصل دعوے دار کہیں اور بیٹھے روتے پیٹتے اور مقدمے بازیاں کرتے رہ جاتے تھے۔ بستیاں سرکاری طور پر بھی منظور ہوجاتی تھیں یہ بہت بڑا اور بہت منظّم ناجائز کاروبار تھا۔

مکان کے سامنے پہنچنے تک میں نے گاڑی کی رفتار رینگنے کی حد تک کم کردی تھی۔ اب مجھے اس کی پیشانی پر جلی حروف میں "ہتورنگ پیلس" لکھا دکھائی دیا۔ اپنی تمام تر وسعت، خوب صورتی اور صفائی ستھرائی کے باوجود نہ جانے کیوں وہ مکان ویرانی کا تاثر دے رہا تھا۔ حالانکہ بیرونی لان تک کی گھاس اور پھول پودے خوب سرسبز اور تروتازہ تھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی اچھی طرح نگہداشت کی جاتی تھی اور بہت اچھی طرح خیال رکھا جاتا تھا۔ اس کے باوجود کچھ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے اس بند قلعے میں کوئی نہیں رہتا تھا۔ نیولا نما شخص کو بھی گاڑی سمیت گویا اس مکان نے نگل لیا تھا۔ گیٹ کچھ اس قسم کا تھا کہ اس سے اندر کی ذرا سی جھلک بھی نہیں دیکھی جاسکتی تھی۔

میں مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کچھ آگے جاکر غیر ارادی طور پر رک گیا تھا۔ میرا سر مستقل طور پر مکان کی طرف گھوما ہوا تھا۔ گاڑی سڑک کے پختہ حصے پر پہنچ چکی تھی۔ یہاں کوئی باقاعدہ آبادی نہیں تھی۔ چاروں طرف ہُو کا عالم تھا۔ سڑک کی حالت بتاتی تھی کہ ادھر سے کافی گاڑیاں گزرتی رہی تھیں لیکن شاید حالت خراب ہوجانے کی وجہ سے ہی آمدورفت کم ہوگئی تھی۔ اس وقت تو دور دور تک کوئی دوسری گاڑی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

مکان کے گیٹ پر کوئی گارڈ یا عام سا کوئی روایتی چوکی دار بھی موجود نہیں تھا البتہ گیٹ کے ساتھ ہی باہر گو کہ سیمنٹ کی ایک بڑی سی بینچ موجود تھی لیکن اس پر بھی کوئی نہیں تھا۔ یہ بھی کچھ عجیب

سی ہی بات تھی تاہم مجھے یقین تھا کہ اندر کئی مسلح محافظ موجود ہوں گے۔ بظاہر کسی کے نظر نہ آنے کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی غیبی آنکھ ہمیں دیکھ رہی تھی۔

اس احساس نے صرف میرے ہی اعصاب میں گدگدی نہیں کی بلکہ شاید صفیہ کو بھی اضطراب میں مبتلا کر دیا۔ وہ ہولے سے میرا بازو دباتے ہوئے بولی "آپ رک کیوں گئے؟ چلیں نا....."

تب میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا "ڈر گئیں؟"

"ہاں۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے اعتراف کیا پھر سر جھٹک کر بولی "عجیب بات ہے.... بظاہر یہاں ڈرانے والی کوئی چیز نظر نہیں آ رہی۔ اس کے باوجود خوف محسوس ہو رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

"بعض جگہیں ایسی بھی ہوتی ہیں جہاں خوف کے جراثیم ہوا میں موجود ہوتے ہیں۔ انسان کی حساسیت اگر زیادہ بڑھی ہوئی ہو تو وہ جراثیم اس پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔" میں نے اپنا تجزیہ بیان کیا۔

اسی لمحے تیز سی غراہٹ کے ساتھ تقریباً بیک وقت دو گاڑیوں کے انجن بیدار ہوئے پھر ان کے آگے بڑھنے کی آواز سنائی دی۔ آواز مکان کے عقب سے اس حصے سے آئی تھی جہاں میری نظر دور سے آتے ہوئے بھی نہیں پہنچ سکی تھی۔ پلک جھپکتے میں مکان کے دونوں پہلوؤں سے دو گاڑیاں برآمد ہوئیں اور نہایت تیزی سے میری گاڑی کے آگے اور پیچھے پہنچ کر اس طرح رکیں کہ ٹائر بری طرح پختہ سڑک پر چرچرا اٹھے۔ عین ممکن تھا ٹائروں کی کچھ ربر بھی جلی ہو اور تھوڑا بہت دھواں بھی بلند ہوا ہو لیکن میری نظر گاڑیوں کے ٹائروں کی طرف نہیں، سیٹوں کی طرف گئی تھی۔

گاڑیوں میں سے ایک کھلی جیپ تھی اور دوسری ایک پرانے ماڈل مگر نہایت عمدہ کنڈیشن کی لینڈ کروزر۔ دونوں میں صرف دو دو آدمی موجود تھے۔ ایک ایک ڈرائیو کر رہا تھا اور ایک ایک ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ یہ دونوں فاضل افراد خوفناک قسم کی گنیں سنبھالے ہوئے تھے۔ ایک کے پاس تو شاید اوزی سب مشین گن تھی۔ ان میں سے تین باریش اور سرخ و سپید تھے۔ صرف لینڈ کروزر ڈرائیو کرنے والا کلین شیو اور غالباً مغربی لباس میں تھا مگر وہ بھی سرخ و سپید تھا۔

مجھے یقین تھا کہ گاڑیاں ڈرائیو کرنے والوں کے پاس بھی ہتھیار ضرور ہوں گے مگر وہ فوری طور پر نظر نہیں آ سکتے تھے۔ ان کی گاڑیاں جونہی میری گاڑی کے قریب آئی تھیں، میں نے ایک لمحے میں ان کا جائزہ لے لیا تھا۔ گو کہ انہوں نے نہایت برق رفتاری سے آ کر آگے اور پیچھے، دونوں طرف سے میرا راستہ روکا تھا اور وہ نمودار بھی مکان کے عقب سے ہوئے تھے جہاں سے میں کسی کی آمد کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میں چاہتا... تو ان کے درمیان پہنچنے سے پہلے گاڑی بھگا سکتا تھا اور شاید وہ مجھے روک بھی نہ پاتے۔ صرف کچھ دیر کے لیے صفیہ کے اندیشے کے مطابق انگریزی فلموں والی کار چیزنگ جاری رہتی.... لیکن میں نے وہاں سے ہلنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہ خواہ مخواہ اپنے آپ کو مشکوک بنانے والی بات ہوتی البتہ اس دوران میں میرا [illegible] پسٹل نہایت تیزی سے گلوو کمپارٹمنٹ سے میری جیب میں [illegible] ہو گیا تھا۔

صفیہ کا ہاتھ ابھی تک میرے بازو پر تھا اور اس کی گرفت سخت ہو چکی تھی۔ وہ یقیناً خوف زدہ تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً پوری پوری کوشش کر رہی تھی کہ خوف اس کے چہرے سے عیاں نہ ہو لیکن اس کے اعصاب یقیناً تنے ہوئے تھے۔ میری مسکراہٹ سے اسے حوصلہ ملا۔ اس نے بھی مسکرانے کی کوشش کی اور میرا بازو چھوڑ دیا۔ بظاہر وہ ریلیکس ہو کر بیٹھ گئی۔ اتنا بھی کافی تھا۔

اس دوران میں دونوں گن بردار گاڑیوں سے اتر کر میری گاڑی کے دائیں بائیں دونوں کھڑکیوں پر پہنچ چکے تھے۔ ان کے چہرے سپاٹ تھے لیکن گنیں انہوں نے یوں مستعدی سے تھامی ہوئی تھیں جیسے وہ قانون نافذ کرنے والے کسی ادارے کے اہلکار تھے اور انہوں نے بڑے زور شور سے تعاقب کے بعد کسی مفرور مجرم کو پکڑا تھا۔ میں نے بٹن دبا کر اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کر دیا۔ صفیہ نے اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ نیچے نہیں کیا۔ اس طرف کھڑے ہوئے شخص نے اس کی فرمائش بھی نہیں کی۔ اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے گاڑی کے حرکت میں آتے ہی وہ اندھا دھند فائرنگ کر دے گا۔ بغیر کسی وجہ کے ان کا یہ جارحانہ انداز قابل غور تھا۔

"خیریت تو ہے؟ یہ آپ لوگ اس طرح گنیں اٹھائے ہم پر کیوں چڑھے آ رہے ہیں؟" میں نے بے خوفی سے، لیکن نرم اور شائستہ لہجے میں پوچھا۔

"آپ ادھر کس لیے کھڑا ہے؟" میری کھڑکی پر جھکے ہوئے شخص نے بھی غالباً اپنی دانست میں خاصی شائستگی سے پوچھا لیکن اپنے لہجے کے اکھڑپن پر اسے کوئی اختیار نہیں تھا۔

"ہم غلطی سے ادھر آ گئے ہیں اور اب راستہ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ ہم سوچ رہے تھے شاید مکان سے کوئی نکلے تو اس سے راستہ پوچھ لیں۔ اگر ہم سیدھے جائیں تو کیا یونیورسٹی پہنچ جائیں گے؟" میں نے اپنے لہجے میں بیک وقت بے خوفی اور سادگی برقرار رکھنے کی کوشش کی۔ اس معزز شہری کی طرح سوچتا ہو کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا تو اسے ڈرنے یا خوف زدہ ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ حالانکہ آج کل انہی معزز اور [illegible] شہریوں کی اکثریت زیادہ پریشان رہتی ہے، جنہوں نے کوئی [illegible] نہیں کیا ہوتا تھا۔

"آپ یونیورسٹی روڈ تو بعد میں جائے گا۔۔۔ پہلے امارے ساتھ پیلس میں جائے گا۔" اس نے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

"کیوں؟" میں نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ام کو آرڈر ملا اے۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ وہ زیادہ بھاری بھرکم یا جسیم نہیں تھا لیکن اس کی جسمانی ساخت سے سخت جانی عیاں تھی۔ اس کا گن پکڑنے کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے اسلحے کے استعمال میں مہارت حاصل تھی۔ میں نے ایک نظر آگے اور پیچھے دیکھا۔ دونوں گاڑیوں کے ڈرائیور اپنی اپنی جگہ جمے بیٹھے تھے لیکن ایک ٹک ہماری ہی طرف دیکھ رہے تھے۔ گاڑیوں کے انجن بدستور اسٹارٹ تھے۔

"کس نے آرڈر دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بڑے خان نے۔" اس نے جواب دیا۔ اس کی عمر تیس بتیس کے قریب تھی اور اس کی آنکھوں میں عقاب کی سی چمک تھی۔ اس کے چہرے پر سب سے خاص چیز اس کی آنکھیں ہی تھیں۔

"بڑا خان کون ہے؟" میں نے فوراً پوچھا۔

وہ یقیناً میرے سوالوں سے زچ ہوگیا۔ اس کے سپاٹ لہجے میں کچھ کرختگی آگئی اور وہ گن کو خفیف سی حرکت دیتے ہوئے بولا "اندر چلو اور خود دیکھ لو۔"

دلچسپ بات یہ تھی کہ میری آمد کے وقت میرے اندازے کے مطابق یہ چاروں افراد مکان کے عقب میں اپنی گاڑیوں ہی میں موجود تھے اور مجھے مکان کے سامنے رکے چند لمحے گزرے ہی تھے کہ مکان کے اندر کسی طرح ہمیں دیکھ بھی لیا گیا تھا اور مکان کے باہر عقب میں موجود افراد تک یہ حکم بھی پہنچ گیا تھا کہ ہمیں گھیر کر اندر لایا جائے۔ وہ چاروں چاق و چوبند افراد بلا تاخیر اس حکم پر عمل درآمد کرانے بھی آن پہنچے تھے۔ اس کا مطلب تھا مکان کے باہر بظاہر کسی کے نظر نہ آنے کے باوجود سڑک پر نظر رکھنے اور باہر موجود آدمیوں تک حکم پہنچانے کا کوئی نہایت عمدہ اور مؤثر نظام موجود تھا۔

مجھے پہلے ہی نہ جانے کیوں کچھ اسی قسم کی کارروائی کی توقع تھی لیکن اتنی تیز رفتاری کی توقع میں نہیں کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے چند منٹ تو مکان کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے گا۔ میں خود مکان کے اندر جانا چاہتا تھا ورنہ میں اس وقت مزاحمت اور ان لوگوں سے نمٹنے کی کسی حکمت عملی پر غور کرتا۔ یہ تو ایک طرح سے میرے دل کی مراد بر آئی تھی البتہ اب صرف یہ دعا کرنے کی ضرورت تھی کہ ہمیں زندہ سلامت اس مکان سے نکل آنے کا موقع بھی مل جائے۔ خطرہ تو بہرحال مول لینا ہی تھا۔

"کیا ہمیں گاڑی سے اترنا پڑے گا؟" میں نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔" عقابی آنکھوں والے شخص نے جواب دیا "گاڑی پیلس کی طرف موڑو لیکن بھاگنے کی کوشش کی تو بہت بُرا ہوگا۔"

"میں کیوں بھاگوں گا؟ میں کوئی چور ڈاکو تو نہیں ہوں۔" میں نے ذرا خفگی کا اظہار کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے لیکن سڑک کے کنارے کھڑے رہے۔ گنوں کا رخ ہماری گاڑی کی طرف ہی رہا۔ آگے پیچھے دونوں گاڑیاں ذرا کھسک گئیں۔ اب میں آسانی سے گاڑی مکان کی طرف موڑ سکتا تھا۔ میں گاڑی گیٹ تک لے گیا۔ دونوں گاڑیاں تیزی سے چکر کاٹ کر میرے عقب میں رہیں۔

میری گاڑی کے گیٹ تک پہنچتے ہی گیٹ تیزی سے کھل گیا۔ ڈرائیو وے میں دو آدمی دونوں طرف کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں بھی گنیں نظر آ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے گاڑی اندر لانے کا اشارہ کیا۔ میں نے ایک لمحے سوچا پھر تن بہ تقدیر ہو کر جوا کھیلنے کا فیصلہ کرتے ہوئے گاڑی اندر لے گیا۔ میرے عقب میں گیٹ خود بخود بند ہوگیا۔ اس کے خود کار نظام کا لیور شاید گیٹ ہاؤس میں تھا۔ ہمیں گھیر کر لانے والی دونوں گاڑیاں باہر ہی رہ گئیں۔

ہم ایک نیم دائرے میں گھومتے ہوئے ایسے ڈرائیو وے میں پہنچ چکے تھے جہاں ایک وقت میں پندرہ بیس گاڑیاں آگے پیچھے کھڑی ہو سکتی تھیں جبکہ اتنی ہی تعداد میں گاڑیوں کی دوسری قطار بھی بن سکتی تھی۔ میرے انجن بند کر کے گاڑی سے اترنے تک گیٹ ہاؤس سے ایک اور شخص نکل کر ہمارے قریب آ چکا تھا۔ صفیہ کے قریب کھڑا ہوگیا جو دوسری طرف کے دروازے سے اتر رہی تھی۔ وہ صفیہ پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک کلاشنکوف تھی۔ وہ بھی باریش، سرخ و سپید اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ یہاں زیادہ تر لوگ ملتی جلتی شکلوں اور ملتے جلتے حلیوں والے تھے۔ گو کہ ان کی کوئی مخصوص وردی نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں انہیں دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ وہ کسی کی نجی فورس، ذاتی سیکیورٹی فورس کے آدمی تھے۔ وہ یقیناً بے حد منظم تھے۔ اپنے آپ کو بہت بااختیار بھی محسوس کرتے تھے۔ شاید ان کا ایک دائرۂ اختیار تھا جس میں ان کی حکومت چلتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ ہمارے ہاں قدم قدم پر ایک حکومت کے متوازی کتنی تعداد میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں موجود تھیں۔ جہاں اتنی کھچڑی پکی ہوئی ہو وہاں حکومت کی دال کیسے گل سکتی تھی۔

مجھے مزید حیرت اس وقت ہوئی جب گاڑی سے اترتے ہی استقبال کرنے والے ایک کلاشنکوف بردار کا ہاتھ سیدھا میرے کوٹ کی اس جیب میں چلا گیا جس میں مشین پسٹل موجود تھا۔ دوسرے ہی لمحے میرا مشین پسٹل اس کے ہاتھ میں تھا جبکہ اس کے دوسرے ہاتھ میں کلاشنکوف پہلے ہی سے موجود تھی۔ اس معاملے میں اس کی نظر بھی عقابی ہی معلوم ہوتی تھی۔ تبھی تو اس کا ہاتھ سیدھا اسی جیب کی طرف گیا تھا جس میں ہتھیار موجود تھا۔ اس نے میری کسی اور جیب کو ٹٹولنے یا تلاشی لینے کی زحمت نہیں کی۔ میں چاہتا تو اسے جیب میں ہاتھ ڈالنے کا موقع نہ دیتا۔ اس سے ایک طرف ہٹ جاتا یا پھر ذرا طاقت سے اس کا ہاتھ روک دیتا لیکن اب جبکہ میں نے اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ

دیا تھا اور ان کی کچھار میں آ ہی گیا تھا تو میرے خیال میں اس قسم کی کوششیں فضول تھیں۔ اس سے شروع ہی میں بدمزگی پیدا ہو سکتی تھی۔ اگر مجھے مزاحمت یا محاذ آرائی والا انداز اختیار کرنا ہوتا تو اس کے لیے باہر کی کھلی فضا ہی بہتر تھی۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ صفیہ میرے ساتھ تھی جو اس قسم کے معاملات میں اناڑی تھی۔ ابھی تک مجھے یقین تھا کہ اس مکان میں میرا یہ دورہ کچھ ایسا خطرناک ثابت نہیں ہوگا اور میں صفیہ سمیت بہ خیر و عافیت واپس آ جاؤں گا اس لیے میں کوئی ہنگامہ شروع کر کے اس امکان کو مدھم نہیں کرنا چاہتا تھا۔

جس شخص نے میری جیب سے مشین پسٹل نکالا تھا وہ خاصی شائستگی اور نرمی سے بولا "جب آپ واپس جائے گا تو آپ کا پسٹل آپ کو مل جائے گا۔"

یہ ایک اچھا شگون تھا کہ کم از کم اس محافظ کے خیال میں میری واپسی کا امکان موجود تھا۔ میں نے بے پروائی سے کہا "پسٹل کا کیا ہے۔۔۔ اگر واپس نہ بھی ملا تو میں یہ لے جاؤں گا۔" میں نے دوسرے محافظ کی اوزی سب مشین گن کو چھوا "یہ زیادہ زبردست اور تباہ کن گن ہے۔"

ان کے چہرے سپاٹ ہی رہے۔ ان میں غالباً حسِ مزاح نہیں تھی اور اگر انہوں نے یہ سمجھا تھا کہ میں یہ بات سنجیدگی سے کر رہا تھا تو شاید انہوں نے اس پر کوئی ردِ عمل ظاہر کرنا غیر ضروری خیال کیا تھا۔ صفیہ جلدی سے میرے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی تیسرا محافظ بھی آگیا تھا۔ اب ہم تین مسلح افراد کے درمیان کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک نے ہمیں طویل و عریض برآمدے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

لمبے چوڑے لان سے گزر کر اور برآمدے کی مرمریں سیڑھیاں چڑھ کر ہم وکٹورین طرز کے ایک بلند و بالا اور مضبوط چوبی دروازے تک پہنچے جس پر پیتل کا کام بھی کیا گیا تھا۔ یہ مکان کئی قسم کے طرزِ تعمیر کا مجموعہ تھا۔ ایک طرح سے چوں چوں کا مربہ تھا۔ شاید بنوانے والے کو جس طرزِ تعمیر کی جو بھی چیز اچھی لگی تھی وہ اس میں اپنالی گئی تھی۔ بہرحال چوں چوں کا مربہ ہوتے ہوئے بھی اس میں خوب صورتی اور شان و شوکت کے علاوہ مضبوطی جھلک رہی تھی۔

ہمارے ساتھ آنے والے جس شخص نے مجھ سے مختصر سی بات کی تھی، اسی نے جیب سے ایک سنہری چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ اس نے نہ تو کال بیل بجائی تھی اور نہ ہی دستک دی تھی۔ دروازہ کھول کر اس نے ہمیں اندر جانے کا اشارہ کیا۔ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد ہم اندر چلے گئے۔ صفیہ نے اب مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔ وہ تینوں محافظ باہر ہی رہ گئے۔ دروازہ ہمارے عقب میں ہلکی سی کلک کی آواز کے ساتھ بند ہوگیا۔

میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے کا تالا نہایت جدید، مضبوط اور پُرپیچ ساخت کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ باہر سے چابی سے اور اندر سے غالباً نمبروں کے ملاپ سے کھلتا تھا کیونکہ مجھے اس پر تجوری کے تالوں سے مشابہ دو ڈائل نظر آئے جن پر ہندسے تھے۔ ان لوگوں کا اپنے مطلوبہ افراد کو اندر لانے کا طریقہ بڑا محفوظ اور سائنٹفک تھا۔ باہر والے محافظوں نے ہمیں گیٹ سے اندر دھکیل دیا تھا اور خود باہر ہی رہے تھے۔ چار دیواری کے اندر والے محافظوں نے ہمیں مکان کے اندر دھکیل دیا تھا اور خود باہر ہی رہے تھے۔

ہم نے اپنے آپ کو ایک طویل و عریض اور آراستہ و پیراستہ ہال میں پایا لیکن یہ آرائش قدیم اور قبائلی طرز کی تھی۔ فرش پر دبیز اونی قالین، دیواروں پر آرائش غالباً لمبے گاؤ تکیے، چھوٹے پایوں والی رنگین اور منقش چوبی کرسیاں، حتیٰ کہ بتی لائٹ بھی پرانی اور شاہانہ سی ساخت کی تھیں۔ میں تالے کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکا تھا کیونکہ ہال میں تو کوئی نہیں تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اندر سے کوئی ہمارے استقبال کے لیے برآمد ہونے ہی والا ہوگا۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ ہال کے پچھلے محرابی دروازے کا دبیز، خوب صورت ریشمی پردہ لہرایا اور تقریباً ویسا ہی ایک باریش شخص برآمد ہوا جیسا ہم اب تک دیکھتے آ رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی عمر ذرا زیادہ تھی۔ اس کے بالوں میں کچھ سفیدی جھلک رہی تھی اور اس نے زیادہ بھاری بھرکم گن نہیں اٹھا رکھی تھی۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی قمیص پر کمر کے گرد ایک گن بیلٹ پر لپٹی ہوئی تھی جس میں صرف ایک عدد ماؤزر جھول رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اتنی کرختگی بھی نہیں تھی جتنی ہم باہر والوں کے چہروں پر دیکھ چکے تھے۔

اس طویل و عریض ہال کا پون حصہ آراستہ تھا اور اتنے ہی فرش پر قالین پڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ساتھ آگے جانے کے لیے راستہ چھوڑ دیا گیا تھا اور مرمریں فرش نظر آ رہا تھا۔ ایک طرف خوب صورت چوبی جنگلے سے آراستہ سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ یہ کمرا غالباً ایک ثانوی ڈرائنگ روم تھا۔ کم اہم اور رسمی مہمانوں کو یہیں ریسیو کر کے، یہاں بٹھا کر، یہیں خاطر مدارات اور بات چیت کر کے رخصت کر دیا جاتا ہوگا۔

ایک چیز جس نے سب سے زیادہ میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی وہ بائیں ہاتھ پر ایک بڑا سا دروازہ تھا جس میں کوئی پٹ نظر نہیں آ رہا تھا لیکن میں نے محض احتیاطاً اس کی طرف زیادہ توجہ سے نہیں دیکھا کیونکہ سامنے سے آنے والا شخص ہماری طرف آ رہا تھا۔ میں نے صرف ایک نظر ہی اس دروازے کی طرف دیکھا تھا اور ایک نظر میں زیادہ سے زیادہ جو کچھ دیکھا جا سکتا تھا وہ مجھے نظر آگیا تھا۔ اس دروازے سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں اور ان کے اختتام پر دوسرا دروازہ تھا۔ وہ دروازہ بند تھا لیکن میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ تہ خانے کا دروازہ تھا۔

تہ خانے کی سیڑھیوں کا دروازہ شاید غلطی سے کھلا رہ گیا تھا۔ اس کا اندازہ مجھے آنے والے کے تاثرات سے ہوا۔ میں نے گو کہ دروازے کی طرف بظاہر ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی لیکن اس کی نظر فوراً دروازے کی طرف گئی اور اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔

وہ کچھ بڑبڑایا۔ اس کی بڑبڑاہٹ میرے لیے ناقابلِ فہم تھی لیکن یہ اندازہ آسانی سے ہوگیا تھا کہ اس نے کسی کی بے پروائی کے بارے میں ناگواری کا اظہار کیا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر سوئچ بورڈ پر ایک سوئچ دبایا۔ بظاہر وہ بھی دوسرے سوئچوں کی طرح لائٹ سوئچ ہی معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے دبانے پر محض سرسراہٹ کی سی آواز کے ساتھ دیوار کے اندر سے ایک اور پتلی سی دیوار برآمد ہوئی۔ اس نے کھلے دروازے کی جگہ کو پُر کردیا۔ اس پر بڑی سی ایک خوب صورت پینٹنگ بھی موجود تھی۔ کسی بہت بڑے آبشار کا خوب صورت منظر تھا۔

نیچے جانے والی سیڑھیاں چھپ گئیں۔ تہ خانے میں جانے کا راستہ نیچے سے تو بند ہی تھا' اب اوپر سے بھی بند ہوگیا۔ وہ پینٹنگ دیوار پر ہی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چند لمحے پہلے اس دیوار میں کوئی دروازہ موجود تھا۔ مجھے یہ بات کچھ عجیب محسوس ہوئی کہ آنے والے شخص نے دروازہ کھلا دیکھ کر تو ناگواری کا اظہار کیا تھا لیکن اسے بند کرنے کے طریقے کے بارے میں کسی رازداری سے کام نہیں لیا تھا۔ اس نے اسے ہمارے سامنے بند کرکے گویا اس راز سے آگاہ کردیا تھا کہ اسے کھولنے بند کرنے کا سوئچ کہاں تھا۔ شاید اسے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ ہم اس کی یہ کارروائی دیکھ رہے تھے۔ اس کے خیال میں شاید اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

دروازہ بند ہوتے ہی وہ ہماری طرف متوجہ ہوا اور خاصی شائستگی سے بولا "آپ میرے ساتھ آئیں۔ آپ کو سردار نے بلایا ہے۔"

میں نے اثبات میں سرہلایا اور ہم اس کے پیچھے چل دیئے۔ صفیہ بدستور مضبوطی سے میرا ہاتھ تھامے ہوئے تھی گویا ہم بڑی بھیڑبھاڑ والی جگہ سے گزر رہے تھے اور اسے اندیشہ تھا کہ مجھ سے بچھڑ نہ جائے۔ اس کے گداز ہاتھ میں اس وقت حرارت کی کمی تھی اور اس کی جگہ خفیف سا ارتعاش محسوس ہورہا تھا تاہم وہ کوشش کررہی تھی کہ چہرے سے خوف زدہ نظر نہ آئے۔

اندر سے وہ مکان اور بھی زیادہ پُرشکوہ اور شاندار معلوم ہورہا تھا۔ شاید یہ اس کی شاہانہ آرائش کا تاثر تھا۔ ہمیں کچھ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ہم کسی چھوٹے موٹے بادشاہ یا پھر بہت بڑے قبائلی سردار کے محل میں پہنچ گئے تھے جس نے رہائش اور آرائش کے سلسلے میں قدیم اور جدید روایتوں میں امتزاج پیدا کردیا تھا۔

لاؤنج نما ایک راہداری سے گزر کر ہم جس کمرے میں پہنچے وہ بھی بیرونی ہال کی طرح طویل وعریض تھا لیکن اس کی آرائش زیادہ شاہانہ تھی۔ یہاں زیادہ سازوسامان موجود تھا۔ یہاں کچھ اس طرح دیواروں کے ساتھ ترکی ساخت کی بہت سی کرسیاں رکھی تھیں جیسے اس ہال میں دربار لگتا ہو۔ اس کی تصدیق توفی الحال نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ کرسیاں خالی تھیں لیکن دلچسپ بات یہ تھی کہ وہاں واقعی کافی حد تک شاہانہ قسم کا ایک تخت موجود تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اسے فوم کے بہت موٹے گدے سے آرام دہ بنالیا گیا تھا۔

گو کہ یہ گدا ایک خوب صورت زرتار چادر میں چھپا ہوا تھا اس کی موجودگی محسوس کی جاسکتی تھی۔

۔۔۔اور اس تخت پر گاؤ تکیوں کے سہارے جمال سعیدی دراز تھا! اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسا ہم کاسٹیوم فلموں تخیلاتی پینٹنگز وغیرہ میں بادشاہوں کو دیکھتے ہیں۔ میں نے جمشید کریم کے دفتر میں دیکھا تو وہ خیمہ نما ایک ڈھیلے ڈھالے پیس سوٹ میں تھا۔ ایک تو اس کی جسامت کسی ہاتھی سے کم تھی' اوپر سے سوٹ بھی ڈھیلا ڈھالا تھا واقعی خیمہ معلوم ہو اس وقت وہ ایک اور طرح کے "خیمے" میں تھا۔ یہ سفید کپڑے کا ایک ڈھیلا ڈھالا گاؤن نما لبادہ تھا۔ گلے میں مو موٹی چین اور انگلیوں میں قیمتی پتھروں کی انگوٹھیاں تھیں۔ تھل تھل کرتے جسم پر چربی کی تہوں میں پڑے ہوئے کل ریشمی لبادے میں پانی کی لہروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

پرانے زمانے کے بادشاہوں کے دائیں بائیں مور چھل ہلانے کے لیے کھڑے ہوتے تھے۔ اس کے دائیں دو محافظ ایم پی فائیو گنیں لیے کھڑے تھے۔ ان کے حلیے بھی تقریباً وہی تھیں جو ہم اب تک دیکھتے آرہے تھے۔ واقعی سعیدی کے پاس اس قسم کے لوگوں کی شاید کوئی چھوٹی موجود تھی۔ باہر ہم نے جو ایک کلین شیو نوجوان دیکھا تھا غلطی سے بھرتی ہوگیا تھا۔ ممکن ہے پہلے وہ بھی ایسا ہی میں کسی وجہ سے اس نے داڑھی صاف کرادی ہو۔

اس کے علاوہ اس گھر میں شاید بغیر گن کے بھی رواج نہیں تھا۔ اب تک جمال سعیدی کے علاوہ جسے بھی گن اٹھائے ہوئے ہی دیکھا تھا اور گن بھی کوئی معمولی نہیں۔ کلاشنکوف' اوزی اور ایم پی فائیو جیسی چیزیں تھیں۔ لگتا تھا سب لوگ کہیں محاذِ جنگ پر رہ رہے اس کمرے میں بھی' جہاں مجھے لانے سے قبل میرا مشین پسٹل بھی لے لیا گیا تھا جو' ان گنوں کے سامنے مسکین سی چیز معلوم ہوتا' اس کے علاوہ میرے ساتھ غیر مسلح اور "غیرلڑاکا" قسم کی لڑکی تھی' وہاں بھی جمال دائیں بائیں دو گارڈ خوف ناک قسم کی گنیں اٹھائے تھے۔

بہت سے لوگوں میں بہت عجیب وغریب قسم ہوتے ہیں اور بعض اوقات وہ بہت سی دولت اور حاصل ہوجانے کے بعد بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑ ہے بادشاہوں کی سی رہائش اور ان کی طرح نش جمال سعیدی کا کمپلیکس رہا ہو یا پھر ایس کا کوئی پس منظر جدت اور قدامت کے درمیان معلق ایک دلچسپ ہوتا تھا۔

میرے ساتھ آنے والے شخص نے مجھے اشارہ جمال سعیدی کے قریب' اس کے عین سامنے پہنچ جا اس کی خاموش ہدایت پر عمل کیا۔ صفیہ بدستور میرا

ہاتھ پکڑے ہوئے میرے ساتھ تھی۔ ہم اس جوڑے کی طرح اس کے سامنے جا کھڑے ہوئے جسے کسی غلط سلط جرم میں پکڑ کے لایا گیا تھا۔ جمال سعیدی کے پپوٹے گویا اس کی آنکھوں پر جھکے جارہے تھے اور اسے ان کو اٹھانے میں دقت پیش آرہی تھی۔ وہ خاموشی اور گہری سنجیدگی سے ہمارا جائزہ لے رہا تھا۔

ہمارے ساتھ آنے والا بڑی عمر کا شخص الٹے قدموں دروازے کی طرف جارہا تھا۔ میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھا اور پوچھا "کیا اب مجھے بادشاہ سلامت کے سامنے کورنش بھی بجالانا پڑے گا؟"

وہ ہکا بکا سا رہ گیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ خود جمال سعیدی نے اسے اس مشکل سے نکالا۔ اس کی گونجیلی سی ہنسی نے کمرے کا سکوت درہم برہم کردیا۔

"نہیں۔۔۔ اس کی ضرورت نہیں۔" وہ ایسی ہی بھاری اور گونجیلی سی آواز میں بولا۔ شخصیت کے برعکس اس کی آواز دلکش تھی۔ بعض موٹے لوگوں کی آواز بڑی باریک ہوتی ہے۔ وہ بولتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہاتھی کے وجود میں مقید چوہا فریاد کررہا ہے لیکن جمال سعیدی کا معاملہ ایسا نہیں تھا۔ اس کی آواز کسی پیشہ ور صداکار سے زیادہ دلکش' بھاری اور گونجیلی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اسے جمشید کریم کے دفتر میں اس سے بحث وتکرار کرتے سنا تھا۔ اس وقت اس کی آواز اتنی اچھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ شاید جذبوں کے اُتار چڑھاؤ' موڈ اور موقع محل کے اثرات ہر چیز پر ہوتے ہیں۔

پھر اس نے اپنے قریب کی دو کرسیوں کی طرف اشارہ کیا "بیٹھ جائیے۔" اس کے لہجے سے یہ تو اندازہ ہوتا تھا کہ اردو اس کی زبان نہیں تھی لیکن وہ نہایت عمدگی سے اسے بولنے پر قادر معلوم ہوتا تھا۔ ہم بیٹھ چکے تو وہ بولا "میں نے نہ صرف یہ جاننے کے لیے آپ کو زحمت دی ہے کہ کون سا تجسس آپ کو میرے اس تہہ خانے کی طرف لے آیا تھا؟"

اس کا مطلب تھا کہ جونہی میں نے باہر اس کے مکان کے سامنے گاڑی روکی تھی' اسے اندر بیٹھے بیٹھے معلوم ہوگیا تھا کہ میں مکان کا جائزہ لے رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر اس کے آدمیوں میرے بارے میں پیغام مل گیا تھا اور چند منٹ بعد ہمیں اس کے حضور میں پیش کیا جاچکا تھا۔ اس کا مطلب شاید یہ بھی ہوسکتا تھا کہ گیٹ میں کہیں وڈیو کیمرا نصب تھا جو سامنے والی سڑک وغیرہ پر نظر رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ میں نے ہال میں چاروں طرف نظر دوڑائی کہ شاید کہیں مانیٹر کے طور پر استعمال ہونے والا ٹی وی سیٹ موجود ہو لیکن مجھے کہیں ایسا ٹی وی یا کوئی اسکرین دکھائی نہیں دیا۔

"مجھے نہ تو کوئی تجسس تھا اور نہ ہی میں آپ کے مکان کو دیکھنے کے لیے اس طرف آیا تھا۔ میں تو راستہ بھول کر اس طرف آنکلا تھا۔" میں نے خاصے شائستہ بلکہ کسی حد تک مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا "میں نے اپنی دانست میں یونیورسٹی روڈ کی طرف جانے کے لیے شارٹ کٹ اختیار کیا تھا لیکن اب میں محسوس کررہا تھا کہ بھٹک گیا ہوں۔ کسی سے پوچھنا چاہ رہا تھا اس لیے رک گیا تھا مسٹر۔۔۔؟" میں نے گویا اس کا نام جاننے کے لیے سوالیہ انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"بہت خوب۔۔۔ بہت خوب۔۔۔!" اس نے متانت سے سر ہلایا۔ وہ گویا کسی اچھے شعر پر داد دے رہا تھا۔ پھر وہ ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور گہری سانس لے کر بولا "ہمارا یوں اجنبیوں کی طرح گفتگو کرنا بہت ہی نامناسب معلوم ہوگا جبکہ ہم ایک دوسرے کو کم از کم اس حد تک تو جانتے ہی ہیں کہ ایک دوسرے کا صحیح نام لے کر مخاطب کرسکیں۔"

"اچھا۔۔۔؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا "مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ہم ایک دوسرے سے واقف ہیں لیکن مجھے یاد نہیں آرہا کہ ہمارے درمیان واقفیت کب ہوئی تھی۔"

"کبھی کبھی ملاقات کے بغیر بھی واقفیت ہوجاتی ہے۔" میں نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں دھیرے دھیرے سرد مہری آرہی تھی۔ شاید وہ مجھ سے سنجیدگی کی توقع کررہا تھا۔

"یقیناً۔۔۔ یقیناً۔" میں نے سرہلایا "تاہم اگر آپ مجھے اپنا نام یاد دلا سکیں تو آپ کی بڑی نوازش ہوگی۔"

"وہ تو میں یاد دلا ہی دوں گا لیکن میں چاہتا ہوں آئندہ آپ میرے نام کے علاوہ بھی کچھ باتیں یاد رکھیں افضل چوہدری صاحب!" اس کے لہجے میں کچھ تیکھا پن آگیا۔ اس کے موٹے موٹے سرخ اور مرطوب ہونٹوں پر ہلکا سا کھنچاؤ تھا۔

"اوہ۔۔۔ مائی گاڈ۔۔۔! آپ تو واقعی میرا نام جانتے ہیں۔" میں نے آنکھیں پھیلا کر حیرت کا اظہار کیا "میرا خیال ہے اصولاً اب مجھے بھی آپ کا نام یاد آجانا چاہیے۔ میرا خیال ہے آپ جمال سعیدی صاحب ہیں؟"

"آپ کی بڑی نوازش کہ آپ نے اس ناچیز کو پہچان لیا۔" وہ قدرے زہریلے لہجے میں بولا "میرے پاس بہت سے ایسے نسخے ہیں جن سے انسان کی یادداشت بہت تیز ہوجاتی ہے لیکن وہ میں انتہائی ناگزیر حالات میں آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔"

"آپ کے آباؤ اجداد شاید حکیم تھے؟" میں نے نہایت سنجیدگی سے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں۔۔۔" وہ بلا تامل بولا "لیکن ان کی حکمت ذرا دوسری قسم کی تھی۔ ان کی حکمت کا تعلق جڑی بوٹیوں سے نہیں تھا۔"

اسی اثنا میں ایک طرف کا دروازہ کھلا اور وہی نیولا نما شخص اندر آگیا جس کا تعاقب کرتے ہوئے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ آج میں پہلی بار اسے قریب سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی شکل واقعی نیولے جیسی لیکن آنکھیں سانپ جیسی تھیں۔ وہ کافی قیمتی اور فیشن ایبل پینٹ شرٹ اور بلیزر میں تھا لیکن وہ بہت ہی سوکھا سڑا سا آدمی تھا۔ کپڑے اس کے جسم پر کچھ یوں نظر آرہے تھے جیسے کسی ڈھانچے پر لٹکا دیئے گئے ہوں مگر اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات تھی کہ اسے ڈھانچے کی طرح بے جان نہیں سمجھا جاسکتا تھا۔

ایک ناقابلِ بیان قسم کی قوت تو اس کی آنکھوں میں ہی مقید

تھی جس کا احساس فوری طور پر اس طرح ہوا کہ اس نے گہری نظر سے صفیہ کی طرف دیکھا تو صفیہ نے جلدی سے ایک بار پھر میرا بازو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جیسے کہیں چنگاریاں سی سُلگ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ نہ جانے کیوں اس کے ڈھانچا نما جسم میں غیر معمولی قوت مقید محسوس ہوتی تھی حالانکہ اس نے مجھ سے مصافحہ بھی نہیں کیا تھا۔

وہ ہوا کے ایک سُبک رفتار جھونکے کی طرح کمرے میں داخل ہوا تھا اور جمال سعیدی کے "تختِ شاہی" پر اس کے قریب ہی بیٹھ گیا تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور عجیب انداز میں مسکرانے کے بعد میری طرف دیکھنے لگے۔ وہ دونوں ایک دلچسپ تضاد کی تصویر تھے۔ جمال سعیدی تھل تھل کرتا ایک چھوٹا سا پہاڑ تھا اور دوسرا ہڈیوں کی مالا۔ انہیں اکٹھے بیٹھے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ وہ دونوں مل کر ایک خطرناک جوڑی بنتے تھے۔

جمال سعیدی پیار بھرے انداز میں نیولا نما شخص کا کندھا تھپکتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "اس کے نام سے آپ واقف نہیں ہوں گے لیکن صورت آشنا ضرور ہوں گے افضل صاحب یہ ضرغام ہے....."

اس نے اس کا صرف نام بتانے پر اکتفا کیا۔ اس کی حیثیت واضح نہیں کی کہ وہ کون تھا' اس کی کیا حیثیت تھی۔ پھر وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ضرغام سے مخاطب ہوا "افضل صاحب راستہ بھول کر ہمارے غریب خانے کی طرف آنکلے تھے ضرغام!"

دونوں نے ہم آہنگ ہو کر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ دونوں کی آوازیں بھی بہت مختلف تھیں۔ میں نے اپنے کان ذرا تپتے محسوس کیے لیکن فوراً ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس میں توہین محسوس کرنے یا تاؤ کھانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میں نے محض وقت گزاری یا اسے ذرا الجھائے رکھنے کی خاطر جو الٹی سیدھی باتیں کی تھیں ان میں تھوڑی بہت نکتہ آرائی کا حق اسے دینا چاہیے تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ مجھے صحیح طور پر اندازہ بھی نہیں تھا کہ اس قسم کے جھوٹ اس کے سامنے نہیں چلیں گے۔ وہ میرے اندازوں سے زیادہ باخبر آدمی نکلا تھا۔

ضرغام کھرکھراتی سی آواز میں بولا "انہوں نے سرہائی وے پر مجھے سامنے سے آتے دیکھ لیا تھا۔ شاید میری صورت دیکھ کر یہ راستہ بھول گئے ہوں۔"

میری یہ خوش فہمی دور ہوگئی کہ سرہائی وے پر اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا۔ کم بخت نے بے خبر نظر آنے کی بہت اچھی اداکاری کی تھی۔ اس کی آواز کچھ ایسی تھی جیسے زنگ آلود لوہے پر ریگ مال رگڑا جارہا ہو۔ یہ آواز سن کر نہ جانے کیوں مجھے اپنے رگ و پے میں سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔

"واقعی....." میں نے اثبات میں سرہلایا "تمہاری صورت اتنی حسین ہے کہ انسان اسے دیکھ کر راستہ بھول سکتا ہے۔"

اس نے میرے الفاظ کو دل پر نہیں لیا۔ اگر لیا بھی تھا تو کم از کم چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا اور مسکرا دیا۔ مسکراتے ہوئے اس کی صورت کچھ اور عجیب دکھائی دینے لگی۔

"اس میں کیا شک ہے....." اس کی کھرکھراتی آواز میں ناگواری نہیں تھی "میری صورت میں کچھ تو کشش ہوگی جو آپ یہاں تک کھنچے چلے آئے۔"

گویا اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کا تعاقب کیا جارہا تھا۔ اس نے مجھے ڈاج دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب تھا اسے اس بات کی کوئی خاص پروا نہیں تھی کہ میں اس کے پیچھے پیچھے مکان تک پہنچ جاتا۔ اس میں کوئی ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ یہ مکان بہرحال کوئی خفیہ ٹھکانا تو نہیں تھا۔ کسی عام راستے سے ہٹ کر ذرا ویرانے میں ضرور بنا ہوا تھا لیکن بہت نمایاں تھا۔ فوراً اپنی طرف توجہ مبذول کراتا تھا اور آبادیوں سے کچھ اتنا زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ جمال سعیدی یہاں کسی سے چھپ کر نہیں، علی الاعلان رہتا تھا۔ یہ اس کی باقاعدہ رہائش تھی۔ کوئی خفیہ پناہ گاہ نہیں تھی۔ اس علاقے میں تیزی سے ترقیاتی کام جاری تھا۔ عین ممکن تھا پانچ دس سال بعد یہاں بھی مکان ہی مکان ہوں۔ کوئی نہ کوئی مکان تو ہر علاقے اور ہر ہاؤسنگ اسکیم کا پہلا مکان ہوتا ہی ہے۔ یہاں کا پہلا مکان جمال سعیدی کا تھا اور اس نے اس وقت بنالیا تھا جب یہاں مزید پانچ دس سال تک تعمیرات کا رجحان ہونے کے آثار دکھائی نہیں دیتے ہوں گے۔

جمال سعیدی نے میری طرف دیکھتے ہوئے مشفقانہ سے انداز میں سرہلایا جس سے اس کے جبڑوں کا گوشت بھی ہل اٹھا۔ اس کی آنکھیں اب پوری طرح کھلی تھیں اور ان میں سوچوں کے سائے تھے۔ اس سے پہلے کہ میں ضرغام کو کوئی جواب دیتا' جمال سعیدی سنجیدگی سے بولا "راستہ نہ بھولا کریں افضل صاحب! راستہ بھولنا بہت بری اور خطرناک عادت ہے۔ راستہ بھول کر آپ کبھی کریم کے دفتر میں جا پہنچتے ہیں۔ کبھی جمال سعیدی کی کٹیا تک آجاتے ہیں۔ آپ کا اس شہر میں بزنس ہے..... ہوٹل ہے۔ آپ نے اس شہر کی بہت خاک چھانی ہوگی۔ آپ یہاں اجنبی تو نہیں ہیں۔ راستے یاد رکھا کریں۔"

"ہمارے اجنبی ہونے کی کیا پوچھتے ہیں جمال صاحب!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہم جیسے لوگ اپنے آپ کو اس شہر میں تو کیا' پورے وطن میں اجنبی محسوس کرتے ہیں۔ جو صدیوں سے اور نسل در نسل سے یہاں رہ رہے تھے' ان کو کچھ کرنے..... بلکہ سوچنے تک کی ہمت نہیں پڑتی جو فی الحال میں آکر پناہ لینے والے چند سال بعد کرنے لگتے ہیں۔ تو یہاں کے اصل باشندوں کو ان کے سامنے مجرموں کی طرح ہونا پڑتا ہے۔ انہیں ہمارے ہاں کے راستوں اور گلیوں سے زیادہ واقفیت ہوجاتی ہے اور وہ زیادہ دلیری سے یہاں اپنی مرضی کا ہر کام کرتے پھرتے ہیں۔ یہاں کی تو کہانی ہی جمال سعیدی صاحب! یہاں تو اکثر "الٹے بانس بریلی کو" والا معاملہ رہا ہے "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" والی صورت

ہے۔ دوسروں کی لڑائیاں لڑنے' دوسروں کے جھمیلے نمٹانے' دوسروں کی تالش کرنے' اور دوسروں کو سر پر بٹھانے میں ہی ہماری تو بیشتر توانائیاں خرچ ہوتی رہیں اور اس کے جواب میں ہم جوتے کھاتے رہے۔ ہماری اپنی لٹیا ڈوب گئی مگر ہم نے ذرہ برابر پروا نہیں کی۔ ہم تو عجیب ہی لوگ ہیں۔"

وہ دونوں چند لمحے پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر جمال سعیدی پہلو بدل کر بولا "مجھے محاوروں کی مار مارنے کی کوشش نہ کریں افضل صاحب! آپ پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے "یہ سروائیول آف دی فٹسٹ" SURVIVAL OF THE PITTEST کا زمانہ ہے۔ جو سخت جان ہوگا' ہر طرح کی سختیاں برداشت کرسکتا ہوگا وہی زندہ رہ جائے گا۔ باقی سب مارے جائیں گے۔ یہ رونا دھونا' منہ بسورنا اور شکوے شکایتیں کرنا ترک کریں اور ہماری طرح PITTEST بننے کی کوشش کریں۔"

"خدا نہ کرے کہ میں تمہاری طرح PITTEST بننے کی کوشش کروں۔" میں نے جلدی سے کہا "تمہارا نظریۂ حیات ذرا مختلف ہے جمال صاحب! میرا خیال ہے جو صحیح ہوگا' سچا ہوگا اور اچھا ہوگا وہی سروائیو کرے گا' باقی مارے جائیں گے۔ صحیح' سچا اور اچھا آدمی اگر سوسائٹی میں اَن فٹ یا مِس فٹ بھی نظر آرہا ہوگا تب بھی کسی نہ کسی وسیلے سے اس کی بقا کا سامان ہوجائے گا۔ غلط' جھوٹا' دوسروں کے حق میں بُرا ثابت ہونے والا' کسی نہ کسی انداز میں دوسروں کو ضرر پہنچانے والا آدمی وقتی طور پر خواہ کتنے ہی فائدے میں نظر آئے' اس پر کتنا ہی عروج دکھائی دے لیکن آخر کار ذلت اور تباہی اس کا مقدر ہے۔"

"کوئی اور بات کریں افضل صاحب!" جمال سعیدی اپنا گول مٹول سا ہاتھ ہلاتے ہوئے قدرے بیزاری سے بولا "آپ دنیا دار آدمی ہیں۔ آپ کے منہ سے وعظ اچھا نہیں لگتا۔"

"یہ وعظ نہیں' یہ تو ایک موٹا سا بنیادی نکتہ ہے۔ دنیا بھی آخر کسی اصول پر ہی چل رہی ہے۔ اصول کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہلتا لیکن لوگوں کو اب اس کا اندازہ نہیں رہا۔ لوگوں نے اپنے اپنے اصول بنا لیے ہیں اور انہی کو صحیح سمجھتے ہیں۔" میں نے نہایت نرم لہجے میں کہا۔

وہ کچھ اور بیزار ہوگیا۔ ایک کے بجائے دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "میں نے آپ سے اس قسم کا لیکچر سننے کے لیے آپ کو نہیں بُلایا افضل صاحب!"

"تو پھر کس لیے بلایا ہے؟" میں نے بڑی محبت سے پوچھا۔

"میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ آپ میری بات سنیں۔۔۔ اور دھیان سے سنیں۔" اس کے لہجے میں ایک خاص قسم کی سختی در آئی۔

"سنائیں۔۔۔ سنائیں۔" میں نے گویا ہمہ تن گوش ہوتے ہوئے کہا "میں تو ہر ایک کی بات بڑی توجہ سے سنتا ہوں۔ ہر ایک کی بات سننے سے کچھ نہ کچھ حاصل ہوتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ آج کل ہر کوئی اپنی اپنی ہانک رہا ہے۔ دوسرے کی کوئی نہیں سنتا۔"

"اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ کم از کم آپ میری بات توجہ سے سنئے گا۔" وہ گویا دانت پیستے پیستے رہ گیا۔

"ارشاد۔۔۔ ارشاد۔۔۔" میں نے کرسی پر ذرا آگے کھسکتے ہوئے سعادت مندانہ لہجے میں کہا "میں اب بھی ان کمیاب لوگوں میں شامل ہوں جو دوسروں کی بات سنتے ہیں۔ آج کل ایسے تو ی چراغ اور دوربین' دونوں چیزیں بیک وقت ساتھ لے کر ڈھونڈنے سے ملتے ہیں۔"

"افضل صاحب!" وہ گہری سانس لے کر بولا "آپ بھی کاروباری آدمی ہیں اور ہم بھی۔ ایک دوسرے سے الجھنا یا ایک دوسرے کی ٹوہ میں رہنا نہ تو ہمیں زیب دیتا ہے اور نہ ہی ہمارے مفاد میں ہے لیکن ہمیں کچھ یوں محسوس ہورہا ہے جیسے کچھ عرصے سے آپ نے اپنی توجہ کاروبار پر مرتکز رکھنے کے بجائے اِدھر اُدھر منہ مارنا اور دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا شروع کردیا ہے۔"

"یہ "ہم" سے آپ کی مراد کون کون ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"میں۔۔۔ میرا کاروباری ساتھی جمشید کریم۔۔۔ اور کچھ دوسرے لوگ جو منظرِ عام پر نہیں آتے۔" اس نے جواب دیا۔

"منظرِ عام پر کیوں نہیں آتے؟" میں نے فوراً دوسرا سوال جڑ دیا "ان کی شکلیں اس قابل نہیں ہیں یا اعمال۔۔۔؟"

"موضوع سے ہٹنے اور بات کو الجھانے کی کوشش نہ کریں افضل صاحب!" اب اس کا انداز واضح طور پر تنبیہی کا سا ہوگیا۔ وہ بالکل سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ ضرغام ایک ٹک مجھے گھور رہا تھا۔ اس کی آنکھیں واقعی سانپ کی طرح تھیں۔ میں نے اب تک اسے پلک جھپکتے نہیں دیکھا تھا۔

جمال سعیدی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ان کے منظرِ عام نہ آنے سے میری مراد یہ ہے کہ وہ لوگ پبلک فگر نہیں ہیں۔ زیادہ جانے پہچانے نہیں ہیں۔ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور دوسروں سے بھی یہی توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے کام سے کام رکھیں۔ بات آپ کی ہورہی تھی۔ آپ کا ہوٹل بھی اچھا چل رہا ہے۔۔۔ بزنس بھی سیٹ ہے۔۔۔"

"اسی لیے تو مجھے کچھ وقت میسر آنے لگا ہے اور میں نے سوچا ہے ہر وقت مزید دولت کمانے کے جنون میں مبتلا رہنے کے بجائے اپنے ضمیر اور اپنے شوق کی تسکین کے لیے بھی کچھ ایسے چھوٹے موٹے کام کرلیے جائیں جو دوسرے لوگ نہیں کرتے۔ کم از کم مجھ جیسے لوگ نہیں کرتے۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹ دی تھی۔

اب اس کی آنکھوں میں برہمی کے سائے نمودار ہونے لگے تھے۔ موٹے لوگ عموماً خوش مزاج ہوتے ہیں اور بات چیت کے معاملے میں ان میں قوتِ برداشت زیادہ ہوتی ہے لیکن شاید جمال سعیدی کی قوتِ برداشت جواب دینے لگی تھی۔ اس کا لہجہ کچھ بدل گیا "ہم چاہتے ہیں آپ اپنے ضمیر اور شوق کی تسکین کے لیے کچھ اور لوگوں کو تختۂ مشق بنائیں' کچھ اور ٹھکانے ڈھونڈلیں۔ آپ نہ جانے کس کے مالی نقصان کی شکایت لے کر جمشید کریم کے پاس پہنچ گئے تھے۔ اس نے پابند نہ ہوتے ہوئے بھی وہ شکایت نہ صرف دور کردی بلکہ ہرجانہ بھی ادا کردیا اور تیس لاکھ کا چیک بجھوادیا۔ یہ صرف آپ کی خاطر ہماری طرف سے خیر سگالی کا اظہار تھا۔"

"یا پھر شاید اس بات کی کوشش تھی کہ میں آپ کی "سرگرمیوں" کی طرف مزید توجہ نہ دوں۔" میں نے لقمہ دیا۔

میں نے سرگرمیوں کا لفظ معنی خیز انداز میں استعمال کیا تھا لیکن اس نے اس سلسلے میں کوئی صفائی پیش کرنے کی کوشش نہیں کی اور میری بات گویا ان سنی کرتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "بعض لوگ خیر سگالی کے جذبے کی قدر نہیں کرتے۔ کبھی کبھی وہ بڑے نقصان میں رہتے ہیں۔"

"کیا میں اسے ایک دھمکی سمجھوں؟" میں نے یک دم اپنا موڈ تبدیل کرتے ہوئے سرد لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے اس کے لیے لفظ "وارننگ" زیادہ مناسب رہے گا۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

"کیا عجیب زمانہ آگیا ہے۔۔۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "جنہیں بہت پہلے بہت سی باتوں پر وارننگز ملنی چاہئے تھیں' وہ خود دوسروں کو وارننگ دیتے ہیں۔"

"آپ شاید میری بات کو سنجیدگی سے نہیں لے رہے ہیں۔" وہ بولا۔

"نہیں۔" میں نے اطمینان سے اعتراف کیا "اس قسم کی دھمکیاں اور وارننگز میں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال دیتا ہوں حالانکہ معاملہ ایسا بھی نہیں ہے کہ دونوں کانوں کے درمیان جگہ خالی ہو۔" میں نے ایک بار پھر بے پروا نظر آنے کی کوشش کی۔

اس کی شاید سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے حالات اور اپنی بات کی سنگینی کا احساس دلانے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کرے۔ اس نے ضرغام کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں سلگتی چنگاریوں کو جیسے ہوا مل رہی تھی۔ اس نے گویا جمال کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ کر گزرنے کا مشورہ دیا۔ اس کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے دونوں گارڈز کی انگلیاں بے چینی سے ٹریگرز پر مچل رہی تھیں لیکن جمال سعیدی اب بھی تحمل کا دامن بالکل ہی ہاتھ سے چھوڑ دینے پر تیار نہیں تھا۔ میری بے خوفی اس قسم کی "مافیائی" شخصیتوں کو بھی الجھن میں ڈال دیتی تھی۔ کمرے کے ماحول میں چند لمحے کے لیے بے پناہ سکوت اور کشیدگی پھیل گئی۔

اس سکوت میں سرسراہٹ کی خفیف سی آواز سے ارتعاش پیدا ہوا۔ ایک اور باریش شخص بڑی سی' خوب صورت اور تین منزلہ ٹرالی قالین پر دھکیلتا ہوا پردے کے عقب سے نمودار ہوا تھا۔ وہ ٹرالی ہمارے سامنے لے آیا۔ اس پر ٹھنڈا' گرم' بسکٹ' کیک' اسنیکس اور خاطر مدارات کے دوسرے نہ جانے کون کون سے لوازمات موجود تھے۔ اوپر نیچے بڑی سی ٹرالی کے تینوں شیشے لدے پھندے ہوئے تھے۔

"آپ کیا پسند فرمائیں گے؟" نو وارد نے مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے بڑے صبر اور استقامت سے جواب دیا حالانکہ پیٹ میں چوہوں کا ٹورنامنٹ جاری تھا اور پیاس سے حلق میں کانٹے بھی پڑ رہے تھے۔ ایسے میں ٹشو پیپر میں لپٹی ہوئی اور یخ دکھائی دینے والی کولڈ ڈرنکس کی بوتلوں اور آئس ٹرے میں رکھی ہوئی برف کی کیوبس وغیرہ کو دیکھ کر ہاتھ روکے رکھنا بڑے صبر اور حوصلے کا کام تھا۔ مجھے یقین تھا کہ صفیہ مجھ سے بھی زیادہ کڑی آزمائش سے گزر رہی تھی۔ میرے الفاظ نے اسے بھی ہاتھ اور زبان روکے رکھنے پر مجبور کردیا تھا۔

"کھاپی لیں افضل صاحب! کچھ تو کھاپی لیں۔۔۔" جمال اب دوستانہ لہجے میں بولا "میرے اس غریب خانے سے تو دشمن بھی کچھ کھائے پئے بغیر نہیں جاتا۔۔۔ اور آپ تو ابھی دشمن بھی نہیں ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ میں دشمن نہیں ہوں۔۔۔ اور منافق بھی نہیں ہوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "مجھے منافقت کے یہ کھیل اچھے نہیں لگتے۔ آپ کا دل تو چاہ رہا ہو کہ آپ سامنے والے کو ایک بڑے سے پیالے میں بہت سا زہر گھول کر دے دیں لیکن آپ اسے ٹھنڈا' گرم' کیک اور پیسٹریاں پیش کررہے ہوں۔ آپ کا دل تو چاہ رہا ہو کہ آپ کے ہاتھ میں ایک نوکیلا اور تیز دھار خنجر ہو جسے آپ سامنے والے کے عین دل کے مقام پر پیوست کردیں لیکن اس کی جگہ آپ اس کے لیے گلدستہ لیے کھڑے ہوں۔ کھانا پینا تو انہی کے ساتھ اچھا لگتا ہے جن سے دل ملا ہوا ہو۔ میں ان ڈراما بازیوں کا قائل نہیں ہوں۔"

وہ میری صاف گوئی پر ایک لمحے کے لیے دم بخود رہ گیا پھر سنبھل کر بولا "ہم آپ سے دل ہی تو ملانے کی کوشش کررہے ہیں افضل صاحب!"

"آپ یہ کوشش نہ ہی کریں تو آپ کی بڑی نوازش ہوگی جمال صاحب!" میں نے اچانک اٹھتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے آپ کو جو کہنا تھا آپ کہہ چکے۔ اب میں چلتا ہوں۔"

اس نے اس پر اعتراض نہیں کیا بلکہ کچھ اور خوش خلقی سے بولا "کم از کم کولڈ ڈرنک ہی لے لیجئے۔ دل ٹھنڈا کرنے میں کچھ مدد ملے گی۔"

"دل اس قسم کی ڈرنکس وغیرہ سے ٹھنڈا نہیں ہوتا جمال صاحب!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "دل ٹھنڈا کرنے کے لیے کچھ اور طرح کی تدبیریں کرنی پڑتی ہیں۔"

"آپ کوئی تجویز پیش تو کریں۔ اگر کوئی تدبیر ہمارے بس میں ہوئی تو ضرور کریں گے۔" وہ صلح جویانہ لہجے میں بولا۔

"مناسب وقت آنے پر بتادوں گا۔۔۔ لیکن مجھے معلوم ہے آپ اس پر عمل نہیں کرسکیں گے۔" میں نے کہا۔

اس اثنا میں ذرا بڑی عمر کا وہی گارڈ نمودار ہو چکا تھا جو ہمیں یہاں تک لایا تھا۔ جمال سعیدی نے اسے طلب نہیں کیا تھا لیکن نہ جانے اسے کیسے علم ہوگیا تھا کہ ہم جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہاں پُراسرار قسم کا کوئی خود کار نظام کام کرتا تھا۔ جمال یا ضرغام نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ بڑی عمر کے گارڈ نے ہمیں صرف مکان کے چوبی دروازے سے نکالنے کا فریضہ انجام دیا۔ باہر برآمدے میں وہی تینوں گارڈ گویا ہمارے ہی منتظر کھڑے تھے جنہوں نے کچھ دیر پہلے ڈرائیو وے میں ہمارا استقبال کیا تھا۔

وہ گاڑی تک ہمارے ساتھ آئے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ چکے تو ایک گارڈ نے واسکٹ کی اندر کی جیب سے میرا مشین پسٹل نکال کر نہایت احترام سے میری خدمت میں پیش کرتے ہوئے بڑی شائستگی سے کہا "تکلیف معاف۔۔۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے دور ہی سے گیٹ ہاؤس میں کسی کو اشارہ کیا۔ باہر جانے کے لیے ڈرائیو وے کے دوسرے سرے پر دوسرا گیٹ تھا۔ وہ روانی سے کھل گیا۔ اس کا کنٹرول بھی یقیناً گیٹ ہاؤس میں ہی تھا۔ میری گاڑی سے آگے ضرغام کی گاڑی کے علاوہ تین بیش قیمت گاڑیاں اور کھڑی تھیں۔ ایک تازہ ترین ماڈل کی پجیرو' ایک مرسیڈیز اور ایک بی ایم ڈبلیو۔ میں ان کے نمبر ذہن نشین کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ان کے قریب سے گاڑی نکال کر دوسرے گیٹ سے باہر آگیا اور ایک بار پھر ہم پختہ مین روڈ پر جا پہنچے۔ کوئی ہمارے پیچھے نہیں آیا۔

تب صفیہ نے یوں ایک طویل سانس لی جیسے وہ دیر سے سانس روکے ہوئے تھی۔ اس نے گردن گھما کر خوف زدہ سی نظروں سے مکان اور اس کے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ میں نے ابھی گاڑی کی رفتار رینگنے کی حد تک ہی رکھی تھی۔ وہ جھرجھری سی لے کر بولی "یقین نہیں آرہا کہ ہم محض بات چیت کے بعد خیرو عافیت سے واپس آگئے ہیں۔ اس سارے سیٹ اپ کو دیکھ کر خوف سا آتا ہے۔ ذرا اس ویرانے کو تو دیکھیں۔۔۔ ان لوگوں کو دیکھ کر اور پھر اس ویرانے کو دیکھ کر تو یہی خیال آتا ہے کہ یہ چاہیں تو کسی کو مار کر یہاں دفن بھی کردیں۔۔۔ کون پوچھنے والا ہے۔"

میں نے مکان کے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ ریتیلی سی زمین پر کہیں کہیں اونچی نیچی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے سرہلاتے ہوئے کہا "شاید یہاں بارہا ایسا ہو بھی چکا ہو۔۔۔ اگر میں کوئی عام' معمولی اور گمنام آدمی ہوتا اور ان سے اس طرح بات کرتا تو شاید میرے ساتھ بھی یہی ہوتا۔"

"کوئی عام' معمولی اور گمنام آدمی ان سے اس طرح بات ہی کہاں کرسکتا تھا۔" صفیہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

میں نے گاڑی کی رفتار بڑھادی۔ مکان سے دور نکل آنے کے بعد گویا صفیہ کو کچھ اطمینان ہوا اور اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ کر سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے گویا مجھے مطلع کیا مگر اس قسم کے لوگوں کو پہلی بار قریب سے دیکھا ہے۔"

"میرے ساتھ رہو گی تو تمہیں اکثروبیشتر ایسے لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملتا رہے گا۔ یہ خاصا خطرناک سودا ہے۔ رفاقت سے بچنے کی کوشش کیا کرو۔"

"میں اس کے بارے میں سوچوں گی۔" کافی دیر بعد پہلی بار اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

یونیورسٹی روڈ پہنچ کر میں نے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھادی۔ اب میں جلد از جلد ہوٹل پہنچنا چاہتا تھا تاہم میرا ذہن ابھی سعیدی میں ہی پھنسا ہوا تھا۔ اس کے دھمکی آمیز انداز نے مجھے کافی بدمزہ کیا تھا لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی محسوس کررہا تھا ایک لحاظ سے یہ ملاقات اچھی ہی رہی تھی۔ میری معلومات میں اضافہ ہوا تھا۔ مجھے بہت کچھ دیکھنے کا موقع ملا تھا اور جو کچھ میں نے دیکھا تھا اس کے بارے میں مجھے جلد از جلد کوئی لائحۂ عمل طے کرنا تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں ایک خاکہ سا ترتیب بھی پانے لگا تھا لیکن اس پر غور کرنے سے پہلے میں کھانا کھانا چاہتا تھا۔ میرے ساتھ بے چاری صفیہ بھی بھوکی مررہی تھی جس کے دن کل ویسے ہی اچھے نہیں گزر رہے تھے۔

لگتا کچھ یوں تھا جیسے کھانا اس روز ہماری قسمت میں نہیں تھا۔ ہم جب ہوٹل پہنچے تو ایک نئی حیرت ہماری منتظر تھی۔ امبر' شفیع شاہ' میرا اکاؤنٹس منیجر' جنرل منیجر اور اسٹاف کے دو تین افراد میرے کمرے میں کچھ حیران پریشان سے کھڑے تھے۔ افراد کی موجودگی کے باوجود کمرا نہ جانے کیوں خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ مجھے اور صفیہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ اِدھر اُدھر بکھر سے گئے۔

"کیا کوئی میٹنگ ہورہی ہے؟" میں نے شفیع شاہ کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے خوش مزاجی سے کہا "کیا تم لوگ کوئی اسٹاک ایشن وغیرہ بنانے پر غور کررہے ہو؟"

شفیع شاہ مسکرایا لیکن مجھے اس کی مسکراہٹ کچھ پھیکی سی محسوس ہوئی۔ میں حسبِ عادت دھم سے اپنی کرسی پر جاگرا۔ امبر تھکے تھکے انداز میں میرے مقابل بیٹھ گئی۔ باقی سب لوگ اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے تھے اور ٹکر ٹکر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھا پھر میری نظر امبر کے چہرے پر جارکی۔ میں نے اسی سے پوچھنا بہتر سمجھا "بات کیا ہے؟ تم لوگوں کے منہ کیوں لٹکے ہوئے ہیں؟ کیا تم لوگوں کی باجماعت جیب کٹ گئی ہے؟"

کسی نے میرے مذاق پر مسکرانے تک کی کوشش نہیں کی۔ امبر گویا کسی ناخوشگوار خواب کی یادوں سے باہر آتے ہوئے بولی "سر! بہت بُری خبر ہے۔ وفاقی حکومت کے ایک تحقیقاتی ادارے نے کچھ دیر پہلے ہمارے دفتر پر چھاپا مارا تھا۔ تمام دفتری کمروں سے وہ لوگ سارا ریکارڈ' ساری فائلیں' سارے کاغذات' حتیٰ کہ کمپیوٹر' گیس' فون اور پانی وغیرہ کے وہ بل تک لے گئے جن کی

ادائیگی بھی نہیں ہوئی۔ میرے کمرے میں بھی انہوں نے کاغذ کا پرزہ تک نہیں چھوڑا۔"

میرے ذہن نے ان الفاظ کے مفہوم کو قبول کرنے میں خاصی سستی کا مظاہرہ کیا۔ میں چند لمحے قطعی خاموش رہا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میری سماعت ٹھیک طور پر کام کررہی تھی جو کچھ میں نے سنا تھا' امبر نے وہی کہا تھا۔ میں نے شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا "میں تو ابھی ابھی یہاں پہنچا ہوں اور دفاتر کا جائزہ ہی لے رہا تھا۔ اندازہ ہورہا ہے کہ کاروباری دفاتر کی تاریخ میں اتنا زبردست چھاپا شاید ہی کبھی پڑا ہوگا جس میں ردّی کی ٹوکریاں تک الٹ کر خالی کی گئیں اور ان میں کاغذوں کے جو پرزے موجود تھے وہ بھی سمیٹ کرلے جائے گئے۔ وہ تو غنیمت ہے کہ ان لوگوں کی کارروائی دفتری کمروں تک محدود رہی۔ اگر عام کمروں یا مختلف ہالز وغیرہ میں یہ خبر پھیل جاتی کہ یہاں کسی قسم کا چھاپا پڑا ہے تو ہیجان پھیل جاتا۔ ہوٹل کے مہمان اور دوسرے لوگ نہ جانے کیا سمجھتے۔"

تب مجھے اندازہ ہوا کہ کمرا خالی خالی کیوں لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی میز کا جائزہ لیا۔ اس پر کوئی فائل' خط یا کاغذ تو کیا' چھوٹی سی کوئی چٹ تک نہیں تھی۔ میں نے اٹھ کر کیبنٹوں' الماریوں اور دیوار گیر درازوں وغیرہ کو کھول کر دیکھا۔ ہر چیز خالی تھی اور گویا میرا منہ چڑا رہی تھی۔ میں واپس اپنی کرسی پر آبیٹھا۔

امبر ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی "میرے کمرے' اکاؤنٹس سیکشن' جنرل منیجر کے کمرے۔۔۔ حتیٰ کہ جس کمرے میں ٹیلی فون بورڈ لگا ہے اس کی بھی یہی حالت ہے۔"

اسٹاف کے لوگ سر جھکائے کھڑے تھے۔ ان میں تو جیسے کچھ بولنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ میں نے شفیع شاہ کی طرف دیکھا اور تصدیق طلب انداز میں کہا "آئی۔ کے۔ درانی۔۔۔؟"

"ظاہر ہے سر! اس کے علاوہ کون اتنی مستعدی دکھا سکتا تھا؟ آج تک کسی محکمے سے ہمارے معاملات اس اسٹیج پر نہیں پہنچے کہ اسے یوں چھاپا مارنے کی ضرورت پیش آجائے۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے تائید کی "گو کہ میں اس وقت یہاں موجود نہیں تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ اسی کی کارروائی ہے۔"

"جی سر۔۔۔!" امبر نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے تصدیق کی "ڈائریکٹر کے عہدے کا ایک شخص پارٹی کی قیادت کررہا تھا۔ اس نے اپنا نام آئی کے درانی ہی بتایا تھا۔ آٹھ دس آدمی تھے۔ ان میں سے بعض وردی میں تھے۔"

"تم موبائل فون پر کم از کم مجھے اطلاع تو دے دیتیں۔" میں نے امبر سے کہا تاہم میرے لہجے میں برہمی نہیں تھی۔ مجھے احساس تھا کہ اگر مجھے اطلاع مل بھی جاتی تو میں کیا کرسکتا تھا؟ میں کسی حکومتی ادارے۔۔۔ خصوصاً مرکزی ادارے کو بذریعہ طاقت تو اس کی کارروائی سے نہیں روک سکتا تھا۔ اس سے تو بات اور بھی خراب ہوجاتی بلکہ شاید درانی تو دل سے چاہتا ہو کہ میں ایسا ہی کروں تاکہ اس کے لیے ایک طرف تو کوئی مزید سخت قدم اٹھانے کا جواز پیدا ہوجائے دوسرے جب میں اس کے خلاف کوئی جوابی کارروائی کروں تو وہ کہہ سکے کہ یہ محض انتقامی کارروائی تھی' من گھڑت الزامات تھے کیونکہ ایک 'فرض شناس' افسر نے کچھ بدعنوانیوں کی تفتیش کے لیے ایک ممتاز کاروباری شخص کے خلاف کارروائی کی تھی اس لیے اگر اب اس افسر کے خلاف کچھ چیزیں منظرعام پر آرہی تھیں تو یہ محض کھسیانی بلی کے کھمبا نوچنے کے مترادف تھا۔ درانی نے غالباً خوب سوچ سمجھ کر اپنی چال چلنے میں پہل کردی تھی۔ مجھے اعتراف تھا کہ اس کا ردِعمل میری توقع کے خلاف تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب اس کی عارضی محبوبۂ دلنواز اور رفیقِ شب تہمینہ اسے مجھ سے اپنی ملاقات کا احوال سنائے گی اور بتائے گی کہ میں نے کیا کہا تھا' تو وہ خوف زدہ ہوجائے گا۔۔۔ لیکن وہ خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ اس نے الٹا مجھے خوف زدہ کرنے کی ٹھانی تھی۔۔۔ اور وہ یوں ذرا فائدے میں تھا کہ اس کے ساتھ سرکاری اختیارات کی طاقت تھی۔

امبر مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولی "سر! میں اب آپ کو اطلاع دینے لگی تھی۔۔۔ وہ بھی مجھے شفیع شاہ صاحب نے آکر یاد دلایا تھا۔۔۔ سچی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کی کارروائی نے ہمیں بوکھلا دیا تھا۔"

"آپ لوگ بیٹھ جائیں نا۔۔۔ کھڑے کیوں ہیں۔" میں نے نرمی سے کہا اور سب کو بیٹھنے کا اشارہ کیا "کاروبار میں اس قسم کی اونچ نیچ تو آتی رہتی ہے۔" وہ سب میز کے اردگرد بیٹھ چکے تو میں نے جنرل منیجر کو مخاطب کیا "آپ تو کاروبار کی دنیا میں اتنے پرانے اور سینئر آدمی ہیں۔ بہت نشیب و فراز دیکھ چکے ہوں گے۔ کم از کم آپ کو تو اتنا بدحواس نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں بدحواس نہیں' حیران ہوں سر!" ادھیڑ عمر اور متاثر کن شخصیت کے مالک جی ایم صاحب سنبھلتے ہوئے بولے "یہ سب کچھ ہمارے لیے بالکل غیر متوقع تھا۔ اس قسم کی کارروائیاں یوں اچانک نہیں ہوتیں۔ صورتِ حال خراب ہونے کے کچھ نہ کچھ آثار پیدا ہوتے ہیں۔۔۔ کوئی نوٹس آتا ہے۔۔۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم کوئی سن گن ملتی ہے۔ اتنی مستعدی تو امریکی ادارے بھی نہیں دکھاتے۔ اس طرح پیروں تلے سے زمین تو وہ بھی نہیں نکالتے۔"

بے چارے جی ایم صاحب کی حیرت بجا تھی۔ انہیں پس منظر نہیں معلوم تھا۔ پس منظر سے صرف میں اور شفیع شاہ آگاہ تھے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کبھی کبھی کوئی ایسی وجہ پیدا ہوجاتی ہے کہ ہمارا کوئی محکمہ اس طرح مستعد ہوجاتا ہے۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی متعلقہ افسر کی دُم پر پاؤں آجاتا ہے۔ ویسے انہوں نے اپنے اس ایکشن کا کوئی جواز تو پیش کیا ہوگا؟"

"جی ہاں۔۔۔" جی ایم صاحب نے اثبات میں سرہلایا "درانی صاحب کا کہنا تھا کہ ان کی اطلاعات کے مطابق اس ہوٹل کی تعمیر سے لے کر اب تک کی ٹیکسوں کی ادائیگی میں کچھ گھپلے تھے اور ہوٹل کی تعمیر میں جو سرمایہ صرف ہوا اس کے جائز اور قانونی ہونے

کی شہادتیں بھی ناکافی تھیں۔"

"آپ نے اس گدھے کو یہ بتایا تھا کہ ہوٹل کی تعمیر کے سلسلے میں تمام متعلقہ محکموں نے کلیئرنس دی تھی جن میں انکم ٹیکس کا محکمہ بھی شامل تھا۔۔۔ اس کے بعد سے ہر سال آڈٹ وغیرہ کے لوازمات پورے ہو رہے ہیں اور تفصیلی جانچ پڑتال کے بعد انکم ٹیکس وغیرہ کے محکمے ہمارے گوشوارے قبول کرتے اور ہمیں کلیئرنس دیتے چلے آ رہے ہیں جس کے بعد ان معاملات کو چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔۔۔ اور اگر کوئی اتھارٹی اسے چیلنج کرتی تو ٹیکس کے محکموں کے متعلقہ اہلکاروں کو بھی اس میں گھسنا پڑے گا؟"

"وہ سب تو بہت سی تاویلوں سے اپنی جان بچا جائیں گے اور اگر انہیں گھسینا بھی پڑا تو درانی اپنی نامعلوم ذاتی پرخاش کی وجہ سے انہیں قربانی کا بکرا بنانے سے دریغ نہیں کرے گا۔ یہ سب باتیں ہوئی تھیں۔ ہم نے خاموش رہ کر انہیں سب کچھ اٹھا کر لے جانے نہیں دیا تھا لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اس ادارے کو کتنے اختیارات حاصل ہیں۔ یہ تو اپنی جگہ خود دہشت کی علامت ہے۔ ان کے پاس بہت سی ایسی شقیں موجود ہیں جن کے تحت یہ گڑے مردے اکھاڑ سکتے ہیں اور بڑے کاروباروں کے حساب کتاب میں اگر کوئی محدب عدسہ لے کر صرف غلطیاں ہی تلاش کرنے بیٹھ جائے تو برسوں کے معاملات میں کچھ غلطیاں تو پکڑی ہی جاسکتی ہیں۔۔۔ خصوصاً جب کسی سے آپ کی ٹھن جائے۔"

جی ایم صاحب کی بات معقول تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے "وہ تو ہوٹل سیل کرانے اور چند دن کے اندر اندر آپ کو بھی گرفتار کرانے کی دھمکی دے کر گیا ہے۔"

مجھے اپنے ساتھ ساتھ ان سب لوگوں کا مورال بھی بلند رکھنا تھا۔ شفیع شاہ کے سوا باقی سب کو تسلی تشفی کی ضرورت تھی۔ ویسے تو میری آمد کے بعد سے ان کے چہروں پر رونق آگئی تھی اور وہ پرسکون انداز میں بیٹھے تھے لیکن ان کا حوصلہ مزید بڑھانے کے لیے میں نے ایک قہقہہ لگایا اور بے پروائی سے کہا "ان باتوں سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ بعض افسروں کو اپنی دہشت پھیلانے کا شوق ہوتا ہے۔ اسے بھی اپنا شوق پورا کرلینے دیں۔ دو چار جھٹکے لگیں گے تو ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کسی چکر میں ہو۔ اگر مجھے گرفتار کر بھی لیا جائے تو اس سے کوئی آسمان نہیں ٹوٹ پڑے گا۔ میں دو چار دن میں ضمانت پر باہر آجاؤں گا۔ مجھے پھانسی تو وہ چڑھوانے سے رہا۔ ہم کاروباری لوگ ہیں۔ چور، ڈاکو، قاتل یا دہشت گرد تو نہیں ہیں۔ ہمارے ہاتھ صاف ہیں۔ وہ ہمارے حسابات میں کوئی ایسا بڑا گھپلا دریافت نہیں کرسکتا جس پر کوئی خاص کارروائی ہوسکے۔ اگر وہ اتنا پُراعتماد ہوتا تو ساتھ ہی مجھے بھی گرفتار کرنے کی کوشش کرتا۔ یہ صرف ہراساں کرنے کی کارروائی ہے اور اس کا بہترین جواب یہ ہے کہ آپ ہراساں نہ ہوں۔"

سب کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی۔ میں نے ذرا طمانیت سے کہا "گفتگو کو آگے بڑھانے سے پہلے ٹھنڈے گرم وغیرہ کا ایک دور چلنا چاہیے تاکہ ہم لوگ ذرا اور بہتر طور پر سکون اور یکسوئی سے اس میں حصہ لے سکیں۔"

میں نے امبر کی طرف دیکھا اور اس نے جلدی سے فون پر سب کی پسند کے مطابق ٹھنڈے اور گرم وغیرہ کا آرڈر دیا۔ میں نے صفیہ کی طرف دیکھ کر اسے تسلی دی "تم دل چھوٹا مت کرنا کہ اب معاملہ صرف ٹھنڈے گرم پر ٹل جائے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں ذرا اس چھوٹی سی ہنگامی میٹنگ سے فارغ ہولوں پھر کھانا بھی چلے گا۔"

"خدا کی پناہ۔۔۔!" صفیہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولی "آپ کو کھانے کی پڑی ہوئی ہے۔ آپ سمجھ رہے ہیں میں یہاں کھانے کے انتظار میں بیٹھی ہوں۔ اس تازہ افتاد کی خبر سن کر میں تو کھانے کو بھول ہی گئی تھی۔"

"لیکن میں نہیں بھولا ہوں۔" میں نے فوراً کہا "جو پروگرام طے ہوگیا اس پر ہر حال میں عمل ہونا چاہیے، یہ میرا اصول ہے۔ عمل درآمد میں تھوڑی بہت تاخیر البتہ برداشت کی جاسکتی ہے۔ مثلاً دوپہر کا کھانا رات کو کھایا جاسکتا ہے۔ آپ سب لوگ تو یقیناً کھانا کھاچکے ہوں گے؟" میں نے باقی لوگوں کی طرف دیکھا۔

سب کی طرف سے اثبات میں جواب ملا پھر امبر بولی "لنچ سے فارغ ہو کر ہی ہم سب دوبارہ اپنے اپنے کاموں پر بیٹھے تھے جب وہ مصیبت نازل ہوئی۔"

چند منٹ بعد جب سب اپنی اپنی پسند کے مطابق ٹھنڈے یا گرم سے لطف اندوز ہو رہے تھے تو ساتھ ساتھ دوستانہ سے ماحول میں اس سنگین مسئلے پر میٹنگ بھی چل رہی تھی۔ اکاؤنٹس منیجر قدرے تشویش کے عالم میں بولا "ہمارے پاس تو کوئی ریکارڈ نہیں رہا۔ ہمارے لیے تو ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کے بل بنانا بھی مشکل ہو جائے گا۔"

"کیا وہ ریسپشن پر مہمانوں کے اندراجات کے تازہ ترین کارڈز بھی لے گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"خدا کا شکر ہے وہ چھوڑ گئے ہیں۔ اس طرف وہ گئے ہی نہیں۔" اکاؤنٹس منیجر نے جواب دیا۔

"بس۔۔۔ انہی کی مدد سے بل بنانے کی کوششیں کیجئے گا۔ کچھ اخراجات کے بارے میں خود مہمانوں سے پوچھ لیجئے گا۔ نقصان بے شک برداشت کرلیجئے گا لیکن مہمانوں کو ناراض مت کیجئے گا۔ یہ دو چار دن کی مشکل ہوگی۔ اس دوران آپ سب لوگ ہنگامی انداز میں یہ کوشش کریں کہ جن جن کاغذات کی بھی ڈپلیکیٹ کاپی حاصل کی جاسکتی ہو، وہ حاصل کرلیں خواہ اس پر کتنا ہی خرچ آئے۔ اس سلسلے میں آپ لوگ اپنے اپنے کام کی نوعیت کے حساب سے شعبے بانٹ لیں۔ ہر شخص اپنے اپنے شعبے کے کاغذات کی ڈپلیکیٹس حاصل کرنے یا تیار کرانے کی کوشش کرے۔"

پھر میں نے جی ایم صاحب کو مخاطب کیا "آپ شفیع شاہ کی موجودگی میں آج ہی کسی وقت اپنے گروپ آف کمپنیز کے قانونی مشیروں سے میٹنگ رکھیں اور جلد از جلد ہائی کورٹ میں ایک رٹ

دائر کرنے کی تیاری کریں۔ اس میں سب سے اہم نکتہ یہی رکھیں کہ کسی مناسب اور غیر جانبدار نگران یا کسٹوڈین کی موجودگی کے بغیر ہمارا تمام ریکارڈ اٹھایا گیا ہے اس لیے ہمیں کاغذات میں ردوبدل یا بعض دستاویزات کی چوری کا اندیشہ ہے۔ اس صورت میں ہمارے خلاف کوئی بھی کارروائی کی گئی تو ہم اسے چیلنج کرنے میں حق بہ جانب ہوں گے۔ اس کے علاوہ بے شمار نکتے وکلا حضرات خود ہی رٹ میں شامل کرلیں گے۔ وہ ان کاموں میں بہت ماہر ہیں۔ درانی کے اختیارات اپنی جگہ۔۔۔ لیکن ہم ہر مرحلے پر عدلیہ سے مدد لے کر اس کے پیروں تلے سے زمین نکالنے کی کوشش کریں گے۔ اس قسم کے کرپٹ آفیسر ایسی جنگ میں زیادہ دیر نہیں ٹِک سکتے۔"

اب میں اس بات کو راز رکھنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کررہا تھا کہ درانی سے میری چپقلش درحقیقت آج سے پہلے ہی شروع ہو چکی تھی۔ میں نے ان سب کی موجودگی میں ہی شفیع شاہ سے پوچھا "اس کی پراپرٹی کے بارے میں ثبوت حاصل کرنے کی کارروائی تو میرے خیال میں کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھی ہوگی۔ ہمارے آدمیوں کو اس کے لیے زیادہ مہلت نہیں مل سکی۔"

"اس کے باوجود میرے پاس آپ کو سنانے کے لیے خوشخبری ہے۔" شفیع شاہ اطمینان سے اپنے گلاس میں کیوبس ہلاتے ہوئے بولا۔ وہ موجودہ بحران سے قطعاً متاثر نہیں تھا اور اپنی کولڈ ڈرنک سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

"ان حالات میں خوشخبری کی اشد ضرورت ہے۔ فوراً سنا ڈالو۔" میں نے اشتیاق سے کہا۔

"اس کے چار بیش قیمت بنگلے تو کراچی میں ہیں جن کے بارے میں دستاویزی ثبوت مل گئے ہیں۔ دو اسلام آباد میں ہیں۔ ان کے بارے میں ہمارے آدمی چھان بین کر رہے ہیں اور ثبوت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ سب اس کے قریبی رشتے داروں کے نام پر ہیں جو ضرورت پڑنے پر قطعاً ثابت نہیں کرسکتے کہ انہوں نے کس طرح اور کس کمائی سے یہ بنگلے خریدے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے ایک بینک اکاؤنٹ کا بھی پتا چلا ہے جس کے سلسلے میں شاید اس نے کسی پر اعتماد نہیں کیا اور اسے اپنے اصل دستخط کے ساتھ آپریٹ کرتا ہے لیکن بینک والوں کو اس کی اصل حیثیت کا علم نہیں ہے۔ اس میں لاکھوں روپیا موجود ہے۔ پچھلے دنوں بھی اس نے اس اکاؤنٹ سے کسی خاتون کے نام چار لاکھ کا چیک کاٹا ہے۔ اس چیک کی فوٹو کاپی بھی حاصل کرلی گئی ہے۔"

"ویری گڈ۔۔۔!" میں نے بے اختیار جوش سے میز پر ہاتھ مارا "تم نے تو کمال کردیا شفیع شاہ! میرا دل چاہ رہا ہے تمہارے ہاتھ چوم لوں۔"

"سر! اس میں مجھ سے زیادہ کچھ دوسرے لوگوں کا کمال ہے۔" وہ قدرے شرمیلے سے انداز میں سر جھکاتے ہوئے بولا۔

"انہیں تم نے فراخ دلی سے انعام وغیرہ دیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی سر! وہ سب اپنی جگہ خوش ہیں اور مزید کام جاری ہے۔"

اس نے جواب دیا۔

"جتنا ہوگیا ہے یہی میری توقعات سے زیادہ ہے۔ کل ہی سے تم کچھ ایسا انتظام کرو کہ خاص خاص اخباروں میں اس سلسلے میں خبریں آنی شروع ہو جائیں لیکن دو باتوں کا خیال رکھنا۔ ایک تو یہ ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ رپورٹروں کو مواد اور دستاویزی ثبوت ہماری طرف سے فراہم کئے جارہے ہیں۔ دوسرے یہ نہ ہو کہ مواد اور دستاویزی ثبوت تو ہم مہیا کریں لیکن ان کی بنیاد پر کوئی رپورٹر بالا بالا ہی سودے بازی کرلے اور خبر کو پی جائے۔ ان کی توقعات تم خود ہی پوری کرا دینا۔ بجائے اس کے کہ وہ کہیں اور سودے بازی کی کوشش کریں۔ وڈیو کیسٹ کی کاپیاں بھی ان لوگوں کو پہنچوا دو۔ امید ہے وہ انہیں دیکھ کر دیر تک اپنی اپنی کرسیوں پر اچھلتے رہیں گے۔"

"یہ کام آج سے ہی شروع ہو جائے گا۔" شفیع شاہ بولا "اس قسم کے کاموں کے لیے اخباری لائن کا ہی ایک بہت مناسب آدمی میرے ہاتھ میں ہے۔ وہ میڈیا میں کوئی بھی خبر "پلانٹ" کرنے میں بہت ماہر ہے۔ کسی کو پتا نہیں چلنے پاتا کہ خبر کی اصل سورس کیا ہے، اصل ماخذ یا منبع کیا ہے۔۔۔ اور کام بڑے عمدہ طریقے سے ہو جاتا ہے۔ وہ شخص ہمیشہ کچھ مسائل سے دو چار رہتا ہے۔ اس کے مسائل ہم جیسے لوگ حل کرتے رہتے ہیں اور وہ ہم جیسے لوگوں کے مسائل حل کرتا رہتا ہے۔ یوں امدادِ باہمی کے تحت دونوں کا کام چلتا رہتا ہے۔ آدمی مضبوط بھی ہے۔ اس سے اچھے بھلے لوگ ڈرتے ہیں۔"

شفیع شاہ پہلے بھی مجھے اس کے بارے میں بتا چکا تھا اور شاید وہ کچھ موقع۔۔۔ پر ہمارے کام بھی آچکا تھا۔ مجھے یہ سن کر اطمینان ہوگیا کہ اس کی خدمات اب بھی حاصل کی جاسکتی تھیں۔ شفیع شاہ میں یہ بھی بڑی خوبی تھی کہ وہ کام کے لوگوں سے کبھی رابطے ٹوٹنے نہیں دیتا تھا اور فلسفہ اس کا یہ تھا کہ سڑک پر جھاڑو دینے والا آدمی بھی بہت کام کا ہوتا ہے۔۔۔ اور حقیقت یہ تھی کہ وہ کبھی نہ کبھی اس سے بھی کوئی اہم کام لے لیتا تھا۔ وہ "داشتہ آید بکار" کا قائل تھا لیکن اس میں داشتہ سے اس کی مراد رکھی ہوئی چیز نہیں بلکہ دوسرے والی داشتہ ہوتی تھی۔ کسی اور کی داشتہ۔۔۔! وہ خود تو اس قسم کی علت پالنے کا قائل نہیں تھا۔

ہر محاذ پر ضروری اقدامات کی ہدایات دینے کے بعد میں نے بھی کافی اطمینان محسوس کیا اور اسٹاف کے چہروں پر بھی طمانیت نظر آنے لگی۔ میں نے ان سب کو مخاطب کیا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔۔۔ اس قسم کی چھوٹی موٹی آزمائشیں زندگی میں آتی رہتی ہیں۔ ہم مل جل کر ہمت اور زیادہ محنت سے ان کا مقابلہ کریں گے اور بہ خیر و خوبی ان آزمائشوں سے گزر جائیں گے۔ کسی کی دھمکیوں سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس ہوٹل کو کوئی بند نہیں کرسکتا۔ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اب آپ لوگ اپنی اپنی سیٹ پر جائیں اور اس کارروائی کا توڑ کرنے کے لیے پہلے سے زیادہ تندہی اور تیزی سے کام شروع کردیں۔ کسی بھی معاملے میں کوئی

ایسی رکاوٹ درپیش ہو جس سے نمٹنا آپ کو مشکل محسوس ہو تو ہمارے ہرفن مولا اور ٹربل شوٹر جناب شفیع شاہ سے رابطہ کریں۔"

میں نے مسکرا کر محبت سے شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ باقی سب لوگ بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔

وہ مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "سر! کیا آپ مجھے بھگانا چاہتے ہیں؟"

"نہیں۔ میں تمہیں ابھی یہیں بٹھانا چاہتا ہوں۔ باقی سب کو بھگانا چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ اسٹاف کے لوگ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میری تدبیر اور تقریر کا کم از کم اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کمرے سے نکلتے وقت وہ لوگ ہنس ہنس کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے۔ کمرے میں صرف میں، شفیع شاہ اور صفیہ رہ گئے۔

میں نے صفیہ سے پوچھا "ہماری اس میٹنگ اور تقریروں سے تم بور تو نہیں ہو رہیں؟"

"نہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "میں تو سبق حاصل کر رہی ہوں۔ واقعی بڑے لوگوں کے بڑے مسائل ہیں۔ ہر شخص 'دولت' بڑے کاروبار اور زندگی کی اعلیٰ ترین آسائشوں کی شدید خواہش رکھتا ہے لیکن کسی کو اندازہ نہیں کہ یہ چیزیں اپنے ساتھ کتنے مسائل لے کر آتی ہیں۔ غربت کے بھی اپنی جگہ بڑے فائدے ہیں۔ انسان سکون سے ٹانگیں پھیلا کے سو تو سکتا ہے۔"

"عبرت پکڑو۔ کل جب تم بہت بڑی بزنس وومین بن جاؤ گی تو تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

شفیع شاہ اس سے مخاطب ہوا "بی بی! آپ باس کی باتوں سے حوصلہ مت ہاریئے گا۔ اگر آپ دولت مند بننے کی کوششوں میں مصروف ہیں تو اپنی کوششیں جاری رکھیے۔ باس آپ کو ڈرا رہے ہیں۔ ہمارے مسائل کاروبار کی وجہ سے نہیں بلکہ اکثر و بیشتر غلط سلط قسم کے لوگوں کے ساتھ سینگ پھنساتے رہنے کی وجہ سے ہیں۔"

"ہاں... یہ تو شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" صفیہ سر ہلاتے ہوئے بولی "آج صبح سے آپ کے باس کے ساتھ رہ کر یہ اندازہ تو مجھے بھی ہوا ہے۔ بعض لوگ تو مصیبتوں کو دعوت دیتے ہیں' یہ خود مصیبتوں کے گھر جا کر انہیں پکڑ پکڑ کر... کھینچ کھینچ کر لاتے ہیں۔"

"مجھے ایک بار پھر وہی ترمیم شدہ مصرع پڑھنا پڑے گا... جن پہ تکیہ تھا وہی گدے ہوا دینے لگے۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

شفیع شاہ جلدی سے بولا "لیکن بی بی...! اس زندگی کا اپنا ہی ایک الگ مزہ ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ آپ کچھ کر رہے ہیں۔ آپ کی زندگی کا کوئی مقصد ہے۔ آپ لاکھوں بھیڑ بکریوں میں سے ایک نہیں ہیں۔"

صفیہ نے کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔ میں نے شفیع شاہ سے کہا "میرا خیال ہے ذرا درانی سے بھی بات ہو جائے۔ ذرا دیکھیں تو سہی وہ شیر کا ادھیڑ عمر بچہ کیا کہتا ہے۔"

"دفتر میں تو اس سے رابطہ مشکل ہوگا۔ آپ اس کے موبائل نمبر پر فون کیجیے۔" شفیع شاہ نے مشورہ دیا اور جیب سے چھوٹا سا ایک کمپیوٹر نکالا جس میں وہ عارضی طور پر فون نمبرز اور دوسری چھوٹی موٹی معلومات محفوظ کرتا تھا۔ اس کی مدد سے اس نے مجھے ایک موبائل فون نمبر بتایا۔

میں نے وہ نمبر ملایا اور دوسری طرف سے ایک بھاری اور بارعب سی آواز سن کر تصدیق چاہی "درانی صاحب...؟"

"جی... اور آپ کون ہیں؟" اس نے جاننا چاہا۔ میں نے اسے دیکھا ہوا تھا اور وہ کسی خاص یا قابلِ ذکر شخصیت کا مالک نہیں تھا لیکن آواز خاصی رعب دار تھی۔

"آپ کے تازہ ترین متاثرین میں سے ایک۔" میں نے جواب دیا "یعنی ایک چغد شہری جو بڑی تگ و دو سے اس ملک میں نت نئے کاروباری ادارے قائم کرتا ہے کہ خود بھی چار پیسے کمائے اور بے روزگاری دور کرنے میں ... حکومت کا کچھ ہاتھ بٹائے۔ یہ چغد شہری کچھ زیادہ ہی چغد ثابت ہو رہا ہے کیونکہ یہ دیانت داری سے ہر سال حکومت کے خزانے میں مختلف ٹیکسوں کی مد میں کروڑوں روپے جمع کراتا آرہا ہے۔ ایسے بے ہودہ شہری کے تو تمام بزنس وینچرز واقعی پہلی فرصت میں بند کر دینے چاہئیں۔"

"مطمئن رہو... ایک ایک کر کے سب بند ہو جائیں گے۔ جیسا تم کہہ رہے ہو' ایسا ہی ہوگا۔" اس کا لہجہ یک دم زہریلا سا ہو گیا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کون بول رہا ہوں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "جب بھی کسی بدمعاش پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے وہ اسی طرح چیں چیں کرتا ہے۔ حکومت پر کروڑوں روپے ٹیکس ادا کرنے کا احسان دھرتا ہے۔ اپنی ہیرا پھیریوں کو بالکل بھول جاتا ہے۔ معصوم بن جاتا ہے۔ یہ ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں۔ ہم آئے دن کی قصے کہانیاں سنتے ہیں۔ مدت ہوئی ہم نے ان سے متاثر ہونا چھوڑ دیا ہے۔"

میں ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگا کر اور ٹانگیں ذرا پھیلا کر بیٹھتے ہوئے بولا "اس مرتبہ کوئی نئی کہانی شروع ہوتی نظر آرہی ہے درانی صاحب! اس میں گھسی پٹی باتیں کم ہوں گی' نئی باتیں زیادہ۔ کئی نئے کردار بھی اس کہانی میں متعارف کرائے جائیں گے جو یقیناً عوام میں بڑی مقبولیت حاصل کریں گے۔"

مجھے اندیشہ تھا کہ شاید اس نے اپنے موبائل فون کو بھی ٹیپ کرانے کا بندوبست کر رکھا ہو۔ اس لیے میں کھل کر کوئی بات کرنا یا اسے خبردار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میری فون کال کو بلیک میل کی شہادت کے طور پر بھی استعمال کر سکتا تھا۔ اس وقت وہ یقیناً چھوٹے سے چھوٹے ثبوت کی تلاش میں تھا جس کے ذریعے' مجھے مضبوطی سے جکڑنے میں کچھ مدد مل سکے۔ میں اس کا یہ کام آسان کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن کچھ باتیں اس کے کان میں ڈال بھی دینا چاہتا تھا۔

"تم مجھے دھمکی دے رہے ہو؟ بلیک میل کرنا چاہتے ہو؟" وہ غرایا۔

"ارے نہیں صاحب! میری کیا مجال کہ میں آپ کو دھمکی

دوں یا بلیک میل کرنے کی کوشش کروں۔ میں تو خواب میں بھی ایسا کرنے کا نہیں سوچ سکتا۔" میں نے اپنے لہجے سے خوف ظاہر کرنے کی کوشش کی "میں تو ایک عام آدمی ہوں۔ آپ کی رعایا ہوں۔ رعایا بھلا بادشاہ سلامت کو دھمکی دینے یا بلیک میل کرنے کا تصور کرسکتی ہے؟ انہیں زن بچوں سمیت کولہو میں نہیں پلوا دیا جائے گا؟ مجھ جیسے چھڑے چھانٹ... جن کی کوئی زن کوئی بچہ نہیں ہے انہیں یاروں دوستوں اور پڑوسیوں کے ساتھ بھی کولہو میں پلوایا جاسکتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج کل کے زمانے میں کولہو کا کام تھانے کچہری، ٹیکسوں کے دفاتر، خفیہ ایجنسیوں اور تفتیشی محکموں وغیرہ سے لیا جاتا ہے اور بادشاہ سلامت کی جگہ آپ جیسے افسروں اوران کے سرپرستوں نے لے لی ہے۔"

"تم جتنی زیادہ زبان چلا رہے ہو اتنا ہی اپنا کیس زیادہ خراب کررہے ہو۔" وہ بولا۔

"مجھے معلوم ہے جناب! میں تو اپنا کیس پہلے ہی بہت زیادہ خراب کرچکا ہوں۔ میں نے سوچا اگر اس میں مزید خرابی کی گنجائش ہے تو وہ بھی نہ رہنے دی جائے۔ بیڑا غرق ہونے میں جو کسر ہے وہ پوری کردی جائے۔ آپ جیسے مہربان روز روز کہاں ملتے ہیں۔ انہیں دل کے ارمان نکالنے کا پورا پورا موقع دینا چاہیے۔"

"چند دن بعد تمہاری یہ چہچہاہٹ بند ہوجائے گی۔ ابھی تو ہم نے تمہارے بارے میں چھان بین کا صرف آغاز کیا ہے۔ ابھی تو صرف تمہاری فائل کھولی ہے۔ تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔" اس کا لہجہ واقعی طوفان کی آمد کا پتا دے رہا تھا لیکن میرے اندر بھی گویا کوئی ہٹیلا انسان بیدار ہوچکا تھا اور میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ مجھے اس سے مرعوب نہیں ہونا تھا۔

"اب تو جس کے ساتھ جو کچھ ہوگا وہ اسے بھگتنا ہی پڑے گا درانی صاحب!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "میں نے کبھی یہ سوچ کر کوئی قدم نہیں اٹھایا کہ میں جو کچھ بھی کروں گا اس کا نتیجہ صرف میرے ہی حق میں اچھا ہوگا۔ میں بُرے نتائج کے لیے بھی تیار رہتا ہوں لیکن میرا خیال ہے آپ کو اس کی عادت ہرگز نہیں ہوگی۔ اگر آپ کی توقعات کے خلاف کچھ ہوگیا تو آپ کو بڑی تکلیف ہوگی درانی صاحب!"

"یہ صاف طور پر دھمکی ہے۔" وہ گویا کچھ اور بھڑک کر بولا۔

"اگر یہ ٹیلی فون ٹیپ ہورہا ہے تو اس دھمکی کو بھی میرے اعمال نامے میں شامل کرلیجیے۔ میں بھی یہ دیکھنا چاہوں گا کہ دنیا کی کون سی عدالت اسے دھمکی قرار دیتی ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"تم اوور کانفیڈنٹ آدمی معلوم ہوتے ہو مسٹر افضل چوہدری!" دفعتاً اس کے لہجے میں کچھ نرمی آگئی۔ شاید وہ پینترا بدلنے کے بارے میں سوچ رہا تھا "تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ اس قسم کے معاملات میں اوور کانفیڈنس کتنا مہنگا پڑتا ہے۔ اتنے عرصے سے بزنس میں ہونے کے باوجود ابھی تک تم نے شاید صرف بہاریں ہی بہاریں دیکھی ہیں جو یقیناً کچھ ناقابل یقین سی بات ہے۔ تمہارا انداز بتاتا ہے کہ تم کبھی کسی طوفان، کسی بحران سے نہیں گزرے جس پر مجھے بجا طور پر حیرت ہے۔ میرے خیال میں ار... دیکھے بغیر کوئی شخص اتنا بڑا بزنس اسٹیبلش نہیں کرسکتا۔ تم شاید ایسا پائر کھڑی کرکے خود کو واقعی شہزادہ محسوس کرنے لگے ہو۔ ہم ... ہی یہ خناس تمہارے دماغ سے نکال دیں گے۔"

"بہت خوب۔ اسے کہتے ہیں دھمکی...!" میں نے تحسین ... لہجے میں کہا "آپ خواہ مخواہ مجھ غریب کی عاجزانہ گفتگو کو دھمکی قرار دینے پر تلے ہوئے تھے۔ میں بھی آپ سے کچھ اسی قسم کی باتیں کہنا چاہتا ہوں لیکن ظاہر ہے میں تو آپ کی رعیت میں ہوں... میں بھلا کیسے کہہ سکتا ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"اس قسم کے معاملات ٹیلی فون پر طنز و مزاح فرمانے سے طے نہیں ہوتے۔" اس نے اب پہلے کی نسبت کچھ اور رسان سے ... مجھے سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس نرمی کی تہ میں بھی فرعونیت بہرحال محسوس کی جاسکتی تھی "اس سے پہلے کہ میں باقاعدہ وارنٹ بھیج کر تمہیں بلواؤں، تم وقت لے کر مجھ سے ملو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہارا کیس خراب نہ ہو تو تمہیں یہ رویہ ترک کرکے کوئی مد... کرنا ہوگی۔"

جن سے وہ لمبی رقموں کے مطالبے کرتا ہوگا ان سے بھی شاید اس کا اندازِ گفتگو یہی ہوتا ہو۔ شاید اس نے اپنا اندازِ گفتگو بھی بدلنے کی زحمت نہیں کی تھی خواہ اس کے ذہن میں یہ امکان بھی موجود رہا ہو کہ ٹیلی فون دوسری طرف بھی ٹیپ ہوسکتا تھا۔ وہ نہایت بے خوف اور دھڑلے سے سب کچھ کرنے والا آفیسر معلوم ہوتا تھا۔ میرا خیال ہے فون پر یا بالمشافہ گفتگو میں اس کا بس اتنا اشارہ دے دینا ہی کافی ہوتا ہوگا، لوگ خود ہی اسے خوش کرنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کردیتے ہوں گے۔ اکثر کیسوں میں تو شاید اسے کوئی اشارہ بھی دینے کی ضرورت پیش نہیں آتی ہوگی۔ میرا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ مجھے بلا کر شاید وہ کیسٹ کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا جس کا شوشہ میں تمینہ کے سامنے چھوڑ آیا تھا۔ ابھی تو اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے بارے میں ہم اور بھی کچھ کرچکے تھے۔ وہ فون پر وڈیو کیسٹ کے بارے میں کوئی اشارہ دینے کے معاملے میں احتیاط کررہا تھا۔

"ضرور... ضرور... آپ سے ملاقات ضرور ہوگی درانی صاحب!" میں نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا "لیکن ابھی نہیں... کچھ دن بعد... جب میرے نکتہ نظر سے حالات ہماری ملاقات کے لیے سازگار ہوجائیں گے۔"

"لگتا ہے تمہیں اپنے کیس سے... بلکہ اپنے مستقبل سے ... کوئی دلچسپی نہیں۔" اس کے لہجے میں ایک بار پھر تندی آگئی ... اس نے فون بند کردیا۔

میں نے سلسلہ منقطع کرکے مسکراتے ہوئے صفیہ اور شفیع شاہ کی طرف دیکھا "بھئی اس شکاری کو بہت ہی بے خوفی سے شکار کی عادت پڑی ہوئی ہے۔" میں نے شفیع شاہ کو بتایا کہ اس نے

میری باتوں کے جواب میں کیا کہا تھا اور کون سی بات کس موڑ میں کی تھی۔ شفیع شاہ نے صرف کندھے اُچکانے پر اکتفا کیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "میرا خیال ہے سب محاذوں پر سرگرم ہونے کے ساتھ ساتھ ہمیں کچھ ڈوریاں بھی ہلادینی چاہئیں تاکہ درانی کو معلوم ہوجائے کہ ہم کچھ ایسے یتیم ویسیر بھی نہیں ہیں...." پھر میں نے خود ہی تصحیح کی "ویسے ہمارے پاس "ڈوریاں" نہیں صرف ایک ہی ڈوری ہے جسے ہم ضرورت پڑنے پر ہلاتے رہتے ہیں۔"

"لیکن وہ ڈوری بے شمار ڈوریوں پر بھاری ہے..." شفیع شاہ میرا اشارہ سمجھتے ہوئے ذرا سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے بولا "بلکہ وہ ڈوری نہیں، رسّا ہے۔ آہنی تاروں کا بنا ہوا رسّا۔"

صفیہ کو ان باتوں کے پس منظر کا علم نہیں تھا اس لیے وہ کبھی میری اور کبھی شفیع شاہ کی شکل دیکھ رہی تھی۔ درحقیقت اسے تو درانی سے ہماری چپقلش کے اصل پس منظر کا بھی علم نہیں تھا۔ میں نے نفیس صاحب کا اسلام آباد کا نمبر ملایا۔ انہیں تلاش کرنے کے لیے کئی نمبر ملانے پڑے۔ آخر وہ ایک موبائل نمبر پر مل گئے۔ موڈ بھی خوشگوار ہی معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹتے ہی بولے "کوئی نیا گل تو نہیں کھلایا برخوردار؟"

انہیں معلوم تھا کہ میں کوئی زحمت دینے کے لیے ہی انہیں فون کرتا تھا "یہ محاورہ خواتین سے گفتگو کرتے وقت استعمال کیا جائے تو زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے سر!" میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"اچھا... مجھے گرامر کے نشیب و فراز مت سمجھاؤ اور کام کی بات کرو۔ اس وقت میں کسی اور کے گھر پر ہوں۔" وہ ملائمت سے بولے۔

"آپ کتنے مشینی سے آدمی ہوتے جارہے ہیں۔ جذبات اور محسوسات نام کی کوئی چیز آپ میں نہیں رہی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔" وہ بولے۔

"آپ کا کس سے مقابلہ پڑگیا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ہمارا تو پوری دنیا سے مقابلہ رہتا ہے۔" وہ بھی جواباً ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "ہماری کیا پوچھتے ہو... ہم تو ہر وقت گویا حالت ... میں رہتے ہیں۔ تم اپنی سناؤ۔ مسئلہ کیا ہے؟"

"سرایوں تو آپ کا ہر سرکاری دفتر اور محکمہ ہی بجائے خود ... مسئلہ ہے لیکن ان میں بعض افسر تو بہت ہی سنگین مسئلہ بن ... گئے ہیں۔ آپ نے خود معلومات کرکے مجھے بتایا تھا کہ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں اسلحے کی انڈر گراؤنڈ مارکیٹنگ کا شبہ پایا جارہا ہے اور ایک خفیہ ایجنسی اس کے بارے میں تحقیقات کررہی ہے لیکن بعد میں ایک دوسرے تحقیقاتی ادارے کو ... کی چھان بین سونپ دی گئی اور جس افسر کو ابتدائی رپورٹ تیار کرنے کی ذمے داری دی گئی ہے اس کا عالم یہ ہے..." میں نے انہیں درانی کے کرتوت ذرا تفصیل سے بتائے۔

میں نے یہ نہیں بتایا کہ اس کی کرپشن کے کچھ ثبوت میں نے خود حاصل کیے تھے۔ اصل بات بتانا مجھے کچھ اچھا نہیں لگا اور یہ مصلحت کے بھی خلاف تھا۔ میں نے بات بناتے ہوئے کہا "یہ شخص اتنی دیدہ دلیری سے سب کچھ کررہا ہے کہ اس کی کرپشن کی خبریں نہ صرف اخبار والوں تک پہنچ چکی ہیں بلکہ کچھ ثبوت بھی ان کے ہاتھ لگ چکے ہیں۔ اب تک تو وہ کچھ مصلحتوں اور کچھ اس کے عہدے کے تھوڑے بہت خوف کی وجہ سے ان خبروں کو دبائے بیٹھے تھے لیکن اب حالات کچھ بدل رہے ہیں۔ ویسے بھی خبریں بھلا کب تک چھپی رہ سکتی ہیں۔ کسی ایک اخبار کے ذرا سا اشارہ دینے کی دیر ہے۔ باقی سب کے لیے وہ بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوگا اور وہ اس موضوع کو لے اُڑیں گے۔ اداروں اور افراد کی جو بدنامی ہوگی اسے تو خیر جانے دیجیے کیونکہ اداروں اور ایسے افراد کو اپنی بدنامی کی اب کوئی پروا نہیں رہ گئی ہے لیکن آپ اب یہ سوچیں کہ ایسا آدمی امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں جو رپورٹ تیار کرے گا وہ کیا ہوگی؟ میرا خیال ہے آپ خود بھی اپنے تخیل کی مدد سے چند سطروں میں اس رپورٹ کا خلاصہ لکھ سکتے ہیں۔"

میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا تو نفیس صاحب اچانک بولے "تم ایک منٹ بعد مجھے دوبارہ فون کرو۔" اس کے ساتھ ہی انہوں نے فون بند کردیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ جہاں بیٹھے تھے وہاں اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہتے تھے بلکہ بات کرنے کے لیے کہیں اور جارہے تھے۔

میں نے ایک منٹ بعد دوبارہ نمبر ملایا تو انہوں نے فوراً کال ریسیو کی اور بولے "ہاں... اب میں گاڑی میں بیٹھ کر تم سے بات کروں گا۔ دراصل اس معاملے کی تفتیش پہلے ایک خفیہ ایجنسی کو کرنا تھی۔ وہی کرتی تو ٹھیک تھا لیکن بعد میں یہ معاملہ کسی کی مداخلت پر اس ادارے کے سپرد کردیا گیا جو پہلے ہی خاصا بدنام ہے اور ویسے بھی اس کا دائرۂ کار زیادہ تر مالی معاملات تک محدود ہے... لیکن... خیر... یہ ردّوبدل اور جوڑ توڑ تو سب جگہ چلتا ہی رہتا ہے۔ تم بتاؤ، تمہارا کیا مسئلہ ہے؟ اس سارے معاملے میں تمہاری ٹانگ کہاں پھنسی ہوئی ہے؟"

"میں نے اپنی عادت سے مجبور ہوکر درانی کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے بارے میں دیانت داری سے تحقیقات کرے کیونکہ اس کی کرپشن کی کہانیاں پہلے ہی زبان زدِعام ہونے کے آثار پیدا ہورہے ہیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بار ایک جھوٹی رپورٹ اس کے گلے کا پھندا بن جائے... لیکن اس نے اس پیغام کو اپنی ذاتی توہین سمجھا اور جواب میں اپنے اختیارات کے ذریعے فرعونیت کا مظاہرہ کرنے پر اُتر آیا..."

میں نے انہیں درانی کی ساری کارروائی اور اس سے ہونے والی بات چیت سے آگاہ کیا۔ وہ خاموشی سے ساری بات سُنتے رہے۔ میرے خاموش ہونے پر انہوں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور متاسفانہ لہجے میں بولے "آخر تم نے یہاں بھی سینگ

پھنسالیا... اور یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔"

"سر...! آپ بھی یہ کہہ رہے ہیں؟" میں نے حیرت اور صدمے سے کہا "کیا آپ لوگ انتظار کررہے ہیں کہ ہر محکمہ اور اس کا ہر افسر ایسا ہی ہو جائے... اور آخر کار خدانخواستہ یہ ملکی ڈھانچا زمیں بوس ہو جائے؟ ویسے اس کے زمیں بوس ہونے میں اب کسر بھی کیا رہ گئی ہے؟"

انہوں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید وہ کسی سوچ میں تھے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولے "ہم اپنی ملاقاتوں کے دوران میں ان موضوعات پر بارہا تبادلۂ خیال کر چکے ہیں۔ تمہیں معلوم ہے ان موضوعات پر میرے محسوسات بھی تم سے مختلف نہیں ہیں اور میں بھی وہی کچھ چاہتا ہوں جو تم چاہتے ہو۔ اس ملک' اس معاشرے کے بارے میں میرے خواب بھی وہی ہیں جو تمہارے ہیں لیکن مسئلہ یہ ہے کہ سب کچھ بہت اُلجھ چکا ہے۔ اتنے مسائل ہیں' اتنی پیچیدگیاں ہیں کہ اکثر اوقات مجھ جیسا بہت بااختیار آدمی بھی اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے اور شاید تم یقین نہیں کرو گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی کبھی میرا بھی اپنے بال نوچنے کو دل چاہتا ہے۔"

"یہ تو اور بھی زیادہ افسوس کا مقام ہے۔" میں نے کہا۔

"بے شک۔" انہوں نے تسلیم کیا "لیکن فی الحال ہم صرف تمہارے اور درّانی کے مسئلے پر بات کریں گے۔ میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تم نے بہت غلط وقت پر بہت غلط آدمی کے ساتھ سینگ پھنسائے ہیں۔"

"سر! آپ بھی یہ کہہ رہے ہیں؟" میں نے پہلے سے زیادہ حیرت اور صدمے سے یہ الفاظ دُہرائے "کاش یہ سننے سے پہلے مجھے موت آگئی ہوتی۔"

"خیر... تمہیں اتنی آسانی سے موت نہیں آئے گی۔ موت سے پہلے تمہیں نہ جانے کیا کیا سُننا پڑے گا۔" وہ اطمینان سے بولے "دراصل میں اتفاق سے درانی کو غائبانہ طور پر جانتا ہوں۔ آج تک اس سے ملاقات تو نہیں ہوئی لیکن میں اس کے خاندانی پس منظر سے واقف ہوں۔ بہت بڑے خاندان سے اس کا تعلق ہے...."

"ظاہر ہے سر!" میں نے ہلکی سی تلخی سے کہا "بے چارے چھوٹے خاندانوں والے تو ایسے عہدوں تک پہنچتے ہی مشکل سے ہیں... اور اگر پہنچ بھی جائیں تو اتنے دھڑلے سے ان کی یہ سب کچھ کرنے کی جُرأت ذرا مشکل سے ہی ہوتی ہے جو کچھ یہ کررہا ہے۔ بڑے پیمانے کی ہر خباثت اور بُرائی انسان میں کسی نہ کسی قسم کی پشت پناہی کی وجہ سے آتی ہے۔ ویسے بائے دا وے... آپ اس کے خاندان کو بڑا کس اعتبار سے کہہ رہے ہیں؟ کیا خاندان کے افراد کی تعداد بہت زیادہ ہے؟"

"بکواس مت کرو۔" انہوں نے اپنے مشفقانہ انداز میں ڈانٹ پلائی "تم میرا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے ہو۔ اس کے کچھ قریبی عزیز بہت بڑے زمیں دار ہیں اور اس کے سگے تایا کو صوبہ سرحد میں بہت بڑے پیر صاحب کی حیثیت حاصل ہے۔ وہاں لوگ ان کو مانتے نہیں' بلکہ تقریباً پوجتے ہیں۔ جن خاندانوں میں یہ سب چیزیں ہوتی ہیں وہ عموماً سیاست میں بھی ضرور آجاتے ہیں۔ اس خاندان میں بھی ہر دور حکومت میں کوئی نہ کوئی وزارت ضرور رہی ہے۔ ہر حکومت میں ان کا اثر رسوخ رہا ہے۔ ویسے آئی کے درانی کسی حد تک اپنے خاندان سے کٹا ہوا سا ہے لیکن آڑے وقت میں بہرحال یہ لوگ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ہر جائز و ناجائز مسئلے میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں۔"

"یہ بھی کوئی نئی بات نہیں۔ سب کچھ حسبِ روایت ہے۔" میں نے کہا۔

"اور تمہیں اس کے ساتھ سینگ پھنساتے وقت ان روایات کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔" نفیس صاحب بولے "لیکن تمہیں یہ سب معلومات حاصل ہی نہیں ہو سکی ہوں گی؟"

"حاصل کرنا چاہتے تو کرلیتے۔" میں نے جواب دیا "لیکن ہم نے تو ساری توجہ صرف اس بات پر دی کہ وہ کتنا کرپٹ آفیسر ہے۔ نہ صرف دونوں ہاتھوں سے لوگوں کو لوٹ رہا ہے بلکہ عیاشی اور روپے پیسے کی خاطر ملکی مفادات کا سودا کرنے سے بھی نہیں چوکتا اور اپنے اس طرزِ عمل پر خود کو چور محسوس کرنے کے بجائے ہم جیسے درویشوں کو آنکھیں بھی دکھاتا ہے۔"

"اب رو کیوں رہے ہو ماڈرن درویش؟ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" نفیس صاحب بولے "مسئلہ یہ ہے کہ میں اس معاملے میں تمہاری کوئی خاص مدد نہیں کرسکتا۔ اس لیے تمہیں ٹیکسوں کے معاملات میں گھیرا ہے۔ ٹیکسوں اور مالیات کے معاملات ایسے ہیں جن میں ہم اپنی سرکاری یا نجی' دونوں حیثیتوں میں کوئی دخل نہیں دیتے۔"

"یہ آپ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں؟" میں نے اپنے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز ہوتی محسوس کیں۔

"ہاں۔" وہ سنجیدہ ہی معلوم ہوتے تھے "ہماری بھی کچھ حد... ہیں۔ بعض معاملات میں کوئی قدم اُٹھانا خود ہمارے لیے نقصان... ثابت ہو سکتا ہے۔ ہماری غیر جانب داری' اصول پسندی اور دیانت... داری پر حرف آسکتا ہے۔"

"یعنی ایک انتہائی کرپٹ' بددیانت اور نہایت اطمینان سے... ملک کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے آفیسر کو ذرا آؤٹ آف دی و... جا کر معمولی سی سرزنش کرنے سے آپ کی اصول پسندی' دیانت... داری اور غیر جانب داری پر حرف آسکتا ہے؟" میں نے صدمہ... آمیز حیرت سے کہا۔ میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر کچھ تلخی... جھلک آئی۔

"بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میرے اور اس کے درمیان... بہت فاصلہ' بہت لاتعلقی ہے۔ میرے اس کو سرزنش کرنے کی... تک نہیں بنتی۔ میرے اس اقدام کو کوئی غلط رنگ بھی دیا جا... ہے۔" وہ نرمی سے بولے۔

"آج شاید میری زندگی کا سب سے زیادہ حیرت انگیز... سُننے کا دن ہے۔" میں نے واقعی قدرے بے یقینی سے کہا "میں نے تو سُنا تھا جس عہدے پر آپ بیٹھے ہیں' اس مقام پر بیٹھے ہوئے شخص کے اشارے پر حکومتیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔"

انہوں نے تلخ سے انداز میں ایک قہقہہ لگایا "یہ ناکام سیاست دانوں کا پھیلایا ہوا تاثر ہے۔ ہمارے معاشرے میں برسوں سے اتنا جھوٹ پھیلایا جارہا ہے کہ افسانے حقائق معلوم ہونے لگے ہیں اور حقیقتیں افسانہ دکھائی دینے لگی ہیں۔ یہ فضول سی باتیں ہیں۔ کوئی بھی بہت بڑا کام کوئی اکیلا شخص انجام نہیں دے سکتا ...واہ وہ کتنے ہی اہم اور بڑے عہدے پر بیٹھا ہو۔ ان معاملات میں ...ت سے عوامل کام کرتے ہیں۔"

"مقصد یہ کہ آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کریں گے؟" کسی ...ت سے مایوسی گویا میرے دل میں نقب لگانے کی کوشش کررہی ...ی۔

"نہیں... یہ بات نہیں ہے۔" وہ گہری سانس لے کر بولے ...صرف اس لیے کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا کہ یہ تمہارا معاملہ ہے۔ ...ی اور کی بات ہوتی تو میں صاف انکار کردیتا۔ تم نے مجھے آزمائش ...ڈال دیا ہے۔"

میری کچھ ڈھارس بندھی لیکن دوسرے ہی لمحے انہوں نے ...یا مجھے پھر مایوسی کے گڑھے کی طرف دھکا دینے کی کوشش کی ...رحال تم زیادہ اونچی امیدیں نہ رکھنا۔ درحقیقت میں اس سے ...راست بات نہیں کروں گا۔ میں کسی کے ذریعے اسے اپنی ...خفگی کا پیغام بھجواؤں گا لیکن میں اس سلسلے میں زیادہ خوش فہمی ...کا شکار نہیں ہوں۔ ممکن ہے اس کا خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلے۔"

"یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے ایک بار پھر بے یقینی سے کہا ...ے بڑے سمجھ دار لوگوں میں یہ تاثر عام ہے کہ آپ کی طرف ...ملک کی بہت بڑی بڑی شخصیتوں میں سے بھی کسی کو اگر یہ پیغام ...کہ ان کی کسی بات پر آپ کی پیشانی پر شکن آئی ہے تو اس کی ...ں کانپنے لگیں گی۔"

وہ ایک بار پھر کراہنے کے سے انداز میں ہنسے "شاید ماضی میں ...سیٹ پر بیٹھی ہوئی کسی شخصیت کے بارے میں یہ تاثر درست ...لیکن میرے بارے میں نہیں... اور پھر میرے ساتھ تو مسئلہ یہ ...کہ چند ماہ بعد میں ریٹائر ہونے والا ہوں۔ مجھے ایک سال کی ...ایکسٹینشن ملی تھی۔ وہ سال بھی ختم ہونے والا ہے۔ ہوتا عام طور پر ...ہے کہ جب کسی کی ریٹائرمنٹ کی تاریخ قریب آتی ہے تو لوگ ...کے کاموں کے سلسلے میں اسے ٹالنا شروع کردیتے ہیں۔ کرسی ...سب تجھ ہے۔ ابھی کرسی ملنے کے آثار پیدا ہوتے ہیں کہ لوگ ...کے آگے پیچھے چکر لگانے لگتے ہیں' آپ کے واری صدقے ...لگتے ہیں اور اگر کرسی چھننے کے آثار پیدا ہوتے ہیں تو لوگ ...آپ کے سائے سے بچنا شروع کردیتے ہیں۔"

"بعض لوگوں کا تو یہ معاملہ بھی اُلٹ ہوتا ہے۔" میں نے کہا ...کے ریٹائرمنٹ کے دن قریب آتے ہیں تو وہ بھولے بسرے کام ...انا شروع کردیتے ہیں۔ جاتے جاتے اپنے کچھ بڑے بڑے مسائل حل کرا جاتے ہیں۔"

"ہاں... شاید بعض لوگوں کا معاملہ ایسا ہوتا ہو..." وہ مبہم سے لہجے میں بولے "لیکن میرا معاملہ بہت مختلف ہے۔ کچھ حالات بھی مختلف ہیں۔ میں تمہیں فون پر تفصیل نہیں بتا سکتا... بلکہ شاید ملاقات پر بھی نہیں بتا سکتا۔ بس یوں سمجھو کہ ہمارا ہر کام ہی اُلٹ ہو گیا۔ جیسا کہ تم خود کہہ چکے ہو کہ ہمارے بارے میں تاثر یہ ہے کہ ہم سیاست پر اثر انداز ہوتے ہیں... لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت سیاست ہم پر اثر انداز ہو چکی ہے۔ ذلت کا ایک سیلاب ہے جو ہمیں بہا کرلے جاتا دکھائی دیتا ہے لیکن ہم بڑی مشکل سے اپنا دامن بچا کر وقت پورا کررہے ہیں۔" وہ اب جمع کے صیغے میں بات کررہے تھے۔ شاید ان کا اشارہ اپنے پورے محکمے کی طرف تھا یا پھر وہ اپنے ساتھ ساتھ اپنے قریبی ساتھیوں اور ہم خیال رفقا کی بات کررہے تھے۔

"آپ کے دم سے ہمیشہ میری ہمت بندھتی تھی اور میں اپنے آپ کو ہر قسم کی برائیوں' خباثتوں اور فرعون صفت لوگوں کے سامنے بڑا مضبوط محسوس کرتا تھا..." میں کہے بغیر نہ رہ سکا "لیکن آج آپ سے بات کرکے بڑی مایوسی ہوئی ہے۔"

"وقت وقت کی بات ہے۔" ان کے لہجے کی تہ میں ایک خفیف سی افسردگی اور شاید کسی حد تک شکستگی بھی تھی۔

"تو پھر میں کیا اُمید رکھوں؟" میں نے پوچھا۔

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میرے چاہنے کو چھوڑیں۔" میں بے اختیار استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا "آپ اپنی تمام تر بے بسی کے ساتھ جو کرسکتے ہیں وہ بتا دیں۔"

"ٹھیک ہے... میں اپنی سی کوشش کروں گا۔" وہ کمزور لہجے میں بولے "ویسے تمہیں اس شخص سے اُلجھنے کی کیا پڑی تھی؟"

"میرا بس چلے تو میں پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ایسے تمام افسروں سے الجھ جاؤں جن کے بوجھ سے اب ملک کی کمر ٹوٹنے میں تھوڑی ہی کسر رہ گئی ہے... مگر افسوس کہ یہ میرے بس کی بات نہیں۔" میں نے حقیقی تاسف سے کہا "جب یہ آپ جیسے لوگوں کے بس کی بات نہیں تو میں بے چارہ کس شمار قطار میں ہوں۔"

"بس... اب زیادہ المناک قسم کے مکالمے بولنے کی کوشش نہ کرو۔ میں کوشش کروں گا کہ وہ تمہیں زیادہ پریشان نہ کرے۔" نفیس صاحب نے طویل سانس لے کر کہا "تین چار دن بعد دوبارہ بات کریں گے۔"

"بہت بہتر۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔ شفیع شاہ اور صفیہ اس دوران میں کم از کم وہ کچھ تو سُنتے ہی رہے تھے جو میں کہہ رہا تھا اور اس سے ہی شفیع شاہ کو تو کیا' صفیہ کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ گفتگو کچھ زیادہ امید افزا نہیں رہی تھی۔ گو کہ اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ میں کس سے بات کررہا تھا اور اس کی کیا حیثیت تھی۔ میرے فون بند کرتے ہی وہ بولی "شاید بات بنی نہیں۔"

"بات بنانے والا تو اوپر بیٹھا ہے۔۔۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ سب تو چھوٹے چھوٹے دنیاوی سلسلے ہیں اور یہ صرف اسی وقت کام آتے ہیں جب اوپر والے کی مرضی ہوتی ہے۔ بہرحال۔۔۔ مایوسی کی بھی کوئی بات نہیں ہے۔"

پھر میں نے شفیع شاہ سے کہا "فی الحال تم ذرا ہوٹل کے اسٹاف کے ساتھ کچھ وقت گزارو۔ انہیں کاغذات کے بغیر ہوٹل کا نظام چلانے میں جو دشواری ہو اور جو مسئلہ وہ حل نہ کرسکتے ہوں اسے حل کرنے میں تم جو بھی مدد کرسکتے ہو وہ کرو۔ شام کو میں، تم اور زرتاج ایک میٹنگ کریں گے۔ ایک آدھ دن میں ہمیں ایک چھوٹا سا مشن انجام دینا ہے۔ اگر اس میں زرتاج بھی ہماری مدد پر آمادہ ہوگئی تو اچھا ہوگا۔ وہ بڑی زبردست قسم کی کمانڈو ہے۔"

"ٹھیک ہے سر!" شفیع شاہ اٹھتے ہوئے بولا "آپ کو جب بھی میری ضرورت ہو مجھے بُلوا لیجیے گا۔ میں کہیں آس پاس ہی ہوں گا۔ مجھے ذرا پریس کے محاذ پر بھی کارروائی شروع کرانے کا بندوبست کرنا ہے۔" شاید صفیہ کی موجودگی کی وجہ سے اس نے یہ نہیں پوچھا کہ میں کس قسم کے مشن کا پروگرام بنا رہا تھا۔ شاید وہ یہی سمجھ رہا ہو کہ میرے ذہن میں درّانی کے بارے میں کوئی منصوبہ ترتیب پا رہا تھا لیکن میرے ذہن میں درانی کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔ میں محض درانی میں الجھ کر دوسرے معاملات کی طرف سے سست پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی یہ سب معاملات کسی نہ کسی موڑ پر، کسی نہ کسی انداز میں ایک دوسرے سے الجھے ہوئے تھے۔

شفیع شاہ دروازے کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے کہا "میں سوچ رہا ہوں اس چھوٹے سے مشن کے سلسلے میں لاہور سے راحیلہ اور ٹونی کو بھی بلوا لوں۔"

"پھر یہ مشن چھوٹا سا تو نہیں رہے گا۔" شفیع جاتے جاتے رک کر مسکراتے ہوئے بولا "اتنے خاص خاص لوگوں کو بُلوا رہے ہیں تو کوئی خاص ہی کام ہوگا۔ بڑا مشن ہوگا۔"

"نہیں۔۔۔ کام تو معمولی سا ہی ہے لیکن ذرا خطرناک لوگوں کا معاملہ ہے۔ اس لیے میں سوچ رہا ہوں کہ ان سے نمٹنے کے لیے ذرا خطرناک لوگوں کو ہی جمع کروں۔۔۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "مثلاً تم اور زرتاج تو موجود ہی ہو۔۔۔ راحیلہ اور ٹونی بھی آجائیں گے۔۔۔ بعد میں اگر ضرورت پڑی تو سردار، شیخ شبیر اور حنیف کو بھی بُلوا لیں گے۔ وہ بھی بڑے کام کے آدمی ہیں۔"

"کیا آپ درانی کا پتّا ہی صاف کرانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟" آخرکار شفیع شاہ نے پوچھ ہی لیا لیکن اس دوران میں وہ اس طرح اپنے ناخنوں کا جائزہ لے رہا تھا گویا اس نے سبزیوں کے نرخوں کے بارے میں مجھ سے رائے طلب کی ہو۔

"نہیں۔۔۔ نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "یہ درّانی کا پتّا صاف کرنے کا معاملہ نہیں ہے۔ درانی کا پتّا صاف کرنا مسئلے کا حل نہیں ہے۔۔۔ اور اس کا پتّا صاف کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ تم اکیلے بھی جا کر یہ کام کرکے آسکتے ہو لیکن اس سے بات اور بگڑ جائے گی۔ یہ مسئلہ کئی اور مسئلوں سے جڑا ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ درانی میں الجھ کر باقی پہلوؤں کی طرف سے ہمارا دھیان ہٹ جائے۔ عین ممکن ہے کچھ لوگ یہی چاہتے ہوں۔ میں ان کی توقعات پوری کرنا نہیں چاہتا۔ درانی کے سلسلے میں تو کام شروع ہو ہی چکا ہے۔ میں چاہتا ہوں اس دوران میں ہم ایک اور سلسلے کو بھی دیکھ لیں۔ اس کی طرف آج ہی میری نظر گئی ہے۔"

"ٹھیک ہے سر! ہم اسے آج شام میٹنگ میں ڈسکس کرلیں گے۔" شفیع شاہ نے کہا اور رخصت ہوگیا۔

میں نے معذرت خواہانہ انداز میں صفیہ سے کہا "تم یقیناً بور ہورہی ہوگی اور سوچ رہی ہوگی کہ یہ آج میں کس بے ہودہ شخص کے چکر میں پھنس گئی لیکن بس۔۔۔ تمہیں صرف چند منٹ کی بوریت اور برداشت کرنی ہوگی۔ اس کے بعد ہم ان ساری منحوس باتوں کا سلسلہ ختم کردیں گے اور اچھی اچھی باتیں کریں گے۔ دوستی کی باتیں۔۔۔ کامیابی کی باتیں۔۔۔ حسین مستقبل کی باتیں۔"

"آپ سے کس نے کہا کہ میں بور ہورہی ہوں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی "میں تو آج اپنے تصورات سے ایک بالکل مختلف افضل چوہدری کو دیکھ رہی ہوں۔۔۔"

"اور پریشان ہورہی ہوں۔" میں نے لقمہ دیا۔

"جی نہیں۔ پریشان نہیں، میں صرف حیران ہورہی ہوں اور شاید کچھ سنسنی بھی محسوس کررہی ہوں۔"

"اس سنسنی میں کیا تم اپنی بھوک کو بھی بھول گئی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ واقعی۔۔۔ میں تو بھول ہی گئی ہوں۔"

"لیکن میں نہیں بھولا ہوں۔ ہم کھانا ضرور کھائیں گے، اچھی اچھی باتیں بھی ضرور کریں گے۔" میں نے گویا اسے ڈھارس دی "میں صرف ایک کال اور کرلوں۔"

"آپ اطمینان سے کال کریں۔ میں آپ کی اس تشفی سے بھی آرام سے بیٹھی رہوں گی۔" صفیہ مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے راحیلہ کا لاہور کا نمبر ملوایا۔ وہ مجھے آفس میں مل گئی۔ اتفاق کچھ ایسا ہوا تھا کہ کافی دنوں سے کاروباری معاملات میں بھی میری اس سے براہِ راست بات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اس کو اپنا نام بتانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی لیکن اس وقت وہ میری آواز سن کر بولی "کون صاحب بول رہے ہیں؟ آواز جانی پہچانی لگ رہی ہے۔"

"میں افضل چوہدری بول رہا ہوں۔" میں نے بھی بڑی سنجیدگی سے رسمی انداز میں اپنا نام بتایا۔

"یہ نام بھی کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا ہے۔۔۔ لیکن یاد نہیں آرہا کہ آپ سے کب اور کہاں ملاقات ہوئی تھی۔۔۔!" وہ گویا سوچنے پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"جہنم میں۔" میں نے جواب دیا "آپ وہاں چمگادڑ بنی ہوئی تھیں اور میں اپنے اعمال کی سزا کاٹ رہا تھا۔ میں نے "چمگادڑ" کے عنوان سے آپ کی شان میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔"

"اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ خوب یاد دلایا۔ آپ سے تو لوگ جہنم میں بڑے تنگ تھے۔ آپ دوبارہ دنیا میں کیسے پہنچ گئے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"داروغہ جہنم کی غلطی سے۔۔۔ یا پھر شاید مجھے اپنی اصلاح کا ایک اور موقع دیا گیا ہے لیکن آپ اپنی سُنائیں۔"

"مجھے تو مزید سزا کاٹنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ میری سزا میں یہ بھی شامل ہے کہ میں آپ کی باتیں سُنوں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"بس۔۔۔ بہت ہوچکی۔ یہ فضول باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نے تمہیں بہت ضروری کام سے فون کیا ہے۔" میں نے ہلکی سی ڈانٹ پلانے کے انداز میں کہا۔

"وہ تو مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔ بغیر کام کے آپ بھلا کیسے فون کرسکتے ہیں سیٹھ صاحب!"

"دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ تم سامنے ہوتیں اور طنز فرمانے کی تمہاری اس کوشش پر کوئی بھاری سی چیز اُٹھا کر میں تمہارے سر پر دے مارتا لیکن میری یہ کوشش بھی یقیناً مجھے مہنگی پڑتی۔ وہ چیز ٹوٹ جاتی۔"

"اور اس صدمے سے آپ کا ہارٹ فیل ہوجاتا۔ سیٹھ لوگ بھلا نقصان کہاں برداشت کرسکتے ہیں۔"

"تمہیں اتنے عرصے سے برداشت کررہے ہیں۔ اس سے بڑا نقصان کیا ہوگا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور اب مزید نقصان اُٹھانے کا ارادہ کیا ہے۔ چنانچہ تمہارے لیے ہدایت یہ ہے کہ فوری طور پر اپنا مختصر سامان ایک پوٹلی میں باندھو اور لاٹھی ٹیکتی ہوئی فوراً کراچی پہنچ جاؤ۔ صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے میں تمہیں کراچی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ ٹونی کو بھی ساتھ لانا ہے۔"

"کیا لوگوں نے تمہیں سرِراہ پکڑ کر مارنا شروع کردیا ہے۔۔۔ تم چاہتے ہو کہ ہم دونوں آکر تمہیں چھڑائیں؟"

"ہاں۔۔۔ یہی سمجھ لو۔" میں نے جواب دیا "اور مذاق بہت ہوچکا۔ یہ بات میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ یہاں تمہاری اور ٹونی کی ضرورت آن پڑی ہے۔"

"حیرت ہے!" وہ بولی "یقین نہیں آرہا کہ تمہیں وہاں بھی کسی کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم ہمیں اپنے کلرکوں کے عہدے پر فائز کرکے بھول گئے ہو۔"

"تم اپنے آپ کو کلرک کہہ رہی ہو؟" میں نے بے یقینی سے کہا "اتنا بڑا کاروبار سنبھالے بیٹھی ہو اور اپنے آپ کو کلرک کہہ رہی ہو۔"

"کام تو کلرکوں والے ہی ہیں۔" وہ مغموم لہجے میں بولی۔

"پھر بھی خدا کا شکر کرو۔ تم میں اہلیت تو کلرکوں والے کام کی بھی نہیں تھی۔ یہ تو میری دولت کی دریا دلی تھی کہ تمہیں اہم کام سونپ دیے اور مزید اہم کاموں کے لیے تمہیں کراچی بلا رہا ہے۔ بس اب چوں چرا بند کرو اور پہلی میسر فلائٹ میں سیٹیں حاصل کرنے کے لیے ٹریول ایجنٹ کو فون کرو۔"

"اگر صبح تک کسی بھی فلائٹ میں سیٹیں نہ ملیں تو۔۔۔؟" اس نے گویا مجھے ڈرایا۔

"تمہیں ہر حال میں پہنچنا ہے۔ خواہ جہاز کی دُم سے لٹک کر پہنچو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"اگر جہاز کی دُم پر بھی رش ہو تو ہم لوگ کسی چوہے وغیرہ کی دم پکڑ کر آجائیں؟"

"ہاں۔۔۔ ضرور آجائیں۔" میں نے جواب دیا "بس ذرا ہوشیار رہنا۔ چوہا کسی اور طرف نہ لے جائے۔ بعض چوہے بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔"

"اُف! تم بہت خبیث ہو۔"

"ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔" میں نے کہا "اور ہاں۔۔۔ آفاق کو فون کرکے کہنا ہے کہ ہمیں یہاں بھی لاہور کی طرح کبھی کبھار کسی ماہر فلمی میک اپ مین کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ایسے کسی کارآمد آدمی کے نام پتے اور فون نمبر سے مجھے آگاہ کردے اور ہمارے بارے میں اسے فون کرکے اطلاع بھی دے دے تاکہ ہمیں اس کو کچھ سمجھانے کی ضرورت نہ پڑے۔"

"اوکے باس! کوئی اور حکم؟" اس نے سعادت مندی سے پوچھا۔

"حکم تو بہت سے ہیں لیکن ان کے بارے میں بعد میں بات ہوگی۔" میں نے شرارت سے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ میرے لہجے کی شرارت کو محسوس کرتے ہوئے جواباً کچھ کہتی میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

پھر میں نے اٹھتے ہوئے صفیہ سے کہا "اس سے پہلے کہ مجھے کوئی اور کام یاد آجائے، ڈائننگ ہال میں چلتے ہیں۔"

"آپ کھانا کھلانے پر کیوں تلے ہوئے ہیں؟ اب تو دل بھی نہیں چاہ رہا۔" صفیہ یہ کہتے ہوئے ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بعض اوقات دل نہیں چاہ رہا ہوتا لیکن معدہ چاہ رہا ہوتا ہے۔۔۔ اور دل سے زیادہ معدے کی بات پر دھیان دینا چاہیے۔ جیسے میں دیتا ہوں۔" میں نے دروازے کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ دھیرے سے ہنس دی۔ ہم ڈائننگ ہال میں آبیٹھے۔ کھانے کا آرڈر دینے کے بعد میں نے ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا "آج کا دن بہت ہی واہیات انداز میں گزرا۔ اگر تم ساتھ نہ ہوتیں تو یہ اور بھی زیادہ واہیات محسوس ہوتا۔"

"ہوسکتا ہے یہ میری ہی وجہ سے واہیات گزرا ہو۔" صفیہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔ لڑکی کی وجہ سے دن واہیات کیسے گزر سکتا ہے؟ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ۔۔۔ اور اس رنگ میں بھنگ ڈالنے والے عناصر دوسرے ہوتے ہیں۔" میں نے فوراً کہا۔

دفعتاً وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "افضل صاحب! میری آپ سے شناسائی کو جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں گزرے۔ آپ یقیناً اپنے

بُرے بھلے کو مجھ سے زیادہ سمجھتے ہوں گے۔ میں خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتی کہ آپ کو کوئی مشورہ دے سکوں لیکن میں کم از کم اپنی تشویش کا اظہار تو کرسکتی ہوں۔ کہیں آپ کسی مسئلے کو ضرورت سے زیادہ تو نہیں پھیلا رہے؟ کہیں آپ کسی غیر ضروری تصادم کی تیاری تو نہیں کررہے؟ میں چاہتی ہوں آپ محتاط رہیں اور اگر کسی سے الجھنے سے گریز کیا جاسکتا ہے تو گریز ہی کریں۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' وہ تشویش زدہ سی ہوکر بولی "آپ کو میری بات بُری تو نہیں لگی؟"

میں ہنس دیا "بُری بھلا کیوں لگے گی؟ تمہاری یہ تشویش تمہارے خلوص کی علامت ہے.... اور خلوص بھلا کس کو برا لگتا ہے؟ تمہاری اس تشویش کا شکریہ.... لیکن تمہاری یہ تشویش بھی غیر ضروری ہے۔ تمہیں تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ اس قسم کے دھندوں میں اکثر پھنسے ہی رہتے ہیں۔ جب تم ہمیں اچھی طرح جاننے لگوگی تو عین ممکن ہے تم خود بھی ان معاملات میں ہمارا ہاتھ بٹانے لگو۔ ہم عجیب سے لوگ ہیں۔ ہمارے ساتھ رہنے والوں پر ہمارا رنگ بہت جلدی چڑھ جاتا ہے۔"

"یعنی آپ کو سمجھاتے سمجھاتے میں خود بھی آپ کے ساتھ شریک ہوجاؤں گی؟" وہ ہنسی۔

"ہاں.... اس کا بہت زیادہ امکان ہے۔" میں نے جواب دیا پھر ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا "لیکن تم فی الحال ایسی کسی بات کے بارے میں مت سوچو جو تمہیں فکرمند کردے۔ میں نے کہا تھا کہ یہاں بیٹھ کر ہم کھانے کے ساتھ ساتھ خوش کن باتیں کریں گے۔ دوستی کی باتیں.... کامیابی کی باتیں.... حسین مستقبل کی باتیں۔"

"کس کی کس سے دوستی....؟ کس کی کامیابی؟ کس کا حسین مستقبل....؟" اس نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"تمہاری ہم سب لوگوں سے دوستی.... جس کا ابھی آغاز ہورہا ہے۔ تمہاری کامیابی جس کے ابھی صرف آثار نمودار ہورہے ہیں۔ تمہارا حسین مستقبل جس کی ابھی صرف بنیاد رکھی جارہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کی باتیں سن کر دل میں جلترنگ سے بجنے لگتے ہیں۔" وہ بہت دھیمے لہجے میں بولی۔

"یہی میں چاہتا ہوں۔"

"کیا آپ سب لوگوں سے ایسی ہی باتیں کرتے ہیں؟"

"کیا تم نے مجھے پاگل سمجھا ہوا ہے؟ سب لوگ تو اس قابل نہیں ہوتے کہ ان سے ایسی باتیں کی جائیں۔ بعض لوگوں کو تو دیکھ کر یا ان کی ایک آدھ بات سن کر ان سے بات کرنے کے بجائے انہیں لات رسید کرنے کو جی چاہتا ہے۔ میں صرف ان لوگوں سے ایسی باتیں کرتا ہوں جن کے بارے میں امید نظر آتی ہے کہ وہ دنیا میں کوئی اچھا کردار ادا کرسکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں دنیا کے سارے خوش خیال' خوش باش اور خوش گمان لوگ اس دنیا کو اپنے اور دوسروں کے لیے ایک زیادہ بہتر جگہ بنانے کی کوشش کریں۔ میں ان کی ہمت بڑھاتا ہوں' انہیں حوصلہ دیتا ہوں اور اگر مجھ سے ہوسکتا ہے تو وہ بھی کرتا ہوں۔"

"میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ دنیا میں آپ جیسے بھی پائے جاتے ہیں۔" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔

"ابھی تم نے دنیا میں دیکھا ہی کیا ہے۔ بہت سے لوگ جنہیں بہت جہاندیدہ سمجھا جاتا ہے درحقیقت وہ بھی اس دنیا کا بہت تھوڑا حصہ دیکھ پاتے ہیں' بہت کم لوگوں سے مل پاتے ہیں لیکن سمجھتے ہیں کہ یہی کل دنیا ہے۔"

کھانے کے بعد وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی "مجھے بہت پہلے گھر میں ہونا چاہیے تھا۔"

"ٹھیک ہے.... تم اب جاؤ.... آج کے دن واقعی تمہیں دیر تک باہر نہیں رہنا چاہیے تھا۔ میری وجہ سے تمہیں دیر ہوگئی...."

"معذرت خواہی چھوڑیں۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔ ان لوگوں کو کامران کی لاش ملنے کا امکان تھا لیکن میں یہ ناخوشگوار موضوع چھیڑنا نہیں چاہ رہا تھا اور وہ بھی اس سے بچ رہی تھی۔

میں نے جلدی سے کہا "رخشی سے بیوٹی پارلر خریدنے کا تم اب فائنل کرہی ڈالو۔ میں کاغذات وغیرہ دیکھ کر کیا کروں گا تو بس ایک جوا ہے اور تمہیں یہ جُوا کھیلنا ہے۔"

میری طرف سے محض اتنی سی بات سن کر اس کے دل سے گویا کوئی بوجھ اُتر گیا اور وہ رخصت ہوتے وقت پہلے سے زیادہ مطمئن نظر آنے لگی۔ اسے دروازے پر سی آف کرکے میں آفس میں آبیٹھا۔ آفس میں تھوڑی بہت اسٹیشنری آچکی تھی تاکہ کوئی چھوٹا موٹا کام کرنا ہو تو کرسکوں۔

ابھی مجھے آفس میں بیٹھے چند منٹ ہی گزرے تھے کہ انٹرکام پر اطلاع دی کہ کوئی پولیس انسپکٹر مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ خیال مجھے یہی آیا کہ شاید وہ رحیم گل تھا لیکن فوراً ہی خیال آیا کہ اسے تو امبرا اچھی طرح پہچانتی تھی۔ اول تو وہ امبر کے پاس تکلف ہی نہیں کرتا تھا۔ سیدھا میرے پاس چلا آتا تھا۔ کسی وجہ سے امبر کے پاس رک بھی جاتا تو وہ اتنے تکلف سے اس کی آمد کی اطلاع نہ دیتی۔

"کون ہے؟ کس علاقے سے آیا ہے؟ کیوں ملنا چاہتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے بتایا کہ وہ اندرون شہر کے ایک تھانے سے آیا تھا اور کوئی ضروری بات کرنے کے لیے مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ نام احمد رضا ہے۔

"اسے دس منٹ کے لیے روکو۔ اس دوران اپنی طرف سے اس کی خاطر مدارات کرو۔ دس منٹ بعد اسے میرے پاس بھیج دینا۔" میں نے ہدایت کی۔

میں جس علاقے میں طبع پرنس اینڈ سنز میں ذرا سا نکلا تھا' ابھی تک اسی میں تھا۔ اس علاقے میں ایک

سے ملنا مجھے مناسب معلوم نہ ہوا۔ میں آفس کے عقبی دروازے سے نکلا، لفٹ کے ذریعے اپنے کمرے میں پہنچا اور تھری پیس سوٹ پہن کر حلیہ درست کر کے واپس آگیا۔ دس منٹ سے زائد وقت گزر چکا تھا۔ میں نے انٹر کام پر امبر سے کہا کہ وہ احمد رضا کو بھیج دے۔

وہ ایک بھاری بھرکم، کرخت صورت اور پختہ عمر شخص تھا۔ وردی میں تھا اور ہاتھ میں ایک فائل بھی دُہری کر کے تھامے ہوئے تھا۔ وہ ٹشو پیپر سے منہ صاف کرتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔ میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور یہ دیکھ کر ذرا اطمینان کی سانس لی کہ اس کے ہونٹوں پر خوش خلقی کی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

مصافحے کے بعد میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "معاف کیجئے گا، میں ذرا اوپر گیا ہوا تھا اس لیے آپ کو انتظار کی زحمت اٹھانا پڑی۔ آپ کیا کھانا پینا پسند فرمائیں گے؟"

"کھانا پینا....؟ نہیں جی.... نہیں.... وہ.... آپ کی سیکرٹری نے کافی خاطر تواضع کی ہے۔ بڑے اچھے اخلاق کی خاتون ہے۔" وہ پہلے سے زیادہ واضح مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ فائل اس نے میز پر رکھ دی اور بیٹھے بیٹھے ہی اپنی بیلٹ درست کرنے لگا پھر اس نے گہری نظر سے میرا اور کمرے کا جائزہ لیا۔ چند سیکنڈ کمرے میں سکوت رہا۔

"فرمائیے.... میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" میں نے ہی یہ سکوت توڑا۔

"خدمت تو چلتی رہے گی جی...." وہ کچھ متذبذب سے لہجے میں بولا "ویسے کوئی خاص بات نہیں ہے.... آپ اس کو روٹین کی کارروائی سمجھیں۔ ضابطے کی تفتیش ہے۔ آپ مشتاق بوبی اور جیدی کالا نام کے دو نوجوانوں کو جانتے ہیں؟"

"جی نہیں...." میں نے بچ مچ ذہن پر زور دے کر دیانت داری سے جواب دیا۔

"یہ تصویریں دیکھیں۔ شاید آپ شکل سے پہچانتے ہوں۔" اس نے پاسپورٹ سائز کی دو بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں میرے سامنے رکھ دیں۔ وہ دو اول جلول سے نوجوانوں کی تصویریں تھیں لیکن نہ جانے کیوں ان کی شکلیں مجھے کچھ مانوس محسوس ہو رہی تھیں پھر میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ یہ یقیناً ان دو نوجوانوں کی کافی پرانی تصویریں تھیں جو دو دن پہلے ہی میرے ہاتھوں شہر کے مرکزی علاقے میں ایک خالی پارکنگ لاٹ میں.......... مارے گئے تھے۔ وہ اس وقت اپنی دانست میں ایک اچھے ہوٹل سے مجھے اغوا کر کے لے گئے تھے جب میں تہمینہ سے الجھا ہوا تھا۔ تہمینہ نے مجھے ان کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔

میں نے اپنے چہرے سے ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں نے انہیں پہچان لیا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر سادگی اور حیرت کے آثار پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "نہیں.... میں تو نہیں جانتا انہیں.... کون ہیں یہ؟"

اس نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر دو رنگین تصویریں فائل سے نکال کر میرے سامنے رکھ دیں "شاید انہیں آپ پہچانتے ہوں۔" وہ بغور میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔

وہ بھی انہی نوجوانوں کی تصویریں تھیں لیکن تازہ ترین تھیں۔ ان میں وہ مُردہ اور کافی خراب حالت میں نظر آ رہے تھے یعنی جیسی حالت میں، میں نے انہیں چھوڑا تھا۔ ان کی تقریباً ایسی ہی تصویریں آج کے اخباروں میں بھی چھپ چکی تھیں لیکن بلیک اینڈ وہائٹ اور کافی پرانی تصویریں دیکھنے کے بعد کوئی مشکل سے ہی کہہ سکتا تھا کہ یہ انہی نوجوانوں کی تصویریں تھیں۔ پولیس نے میرے پاس پہنچنے میں بڑی مستعدی دکھائی تھی لیکن یہ مستعدی میرے لیے ناقابلِ یقین تھی۔

"نہیں.... میں انہیں بھی نہیں پہچانتا۔" میں نے نفی میں سر ہلایا پھر سادگی سے پوچھا "کیا یہ بھی انہی.... دونوں نوجوانوں کی تصویریں ہیں؟"

"جی ہاں۔" اس نے اطمینان سے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "وہ جو بلیک اینڈ وہائٹ تصویریں ہیں وہ پولیس ریکارڈ کی ہیں۔ کافی پرانی ہیں۔ یہ دونوں ہسٹری شیٹر تھے لیکن کافی عرصے سے پولیس کو ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ کل ان کی لاشیں ملی ہیں...."

اس نے جھٹکے دار لہجے میں مجھے تفصیل سے اس جگہ کے بارے میں بتایا جہاں سے لاشیں ملی تھیں۔ ظاہر ہے مجھے اس جگہ کے بارے میں کچھ جاننے کی ضرورت نہیں تھی لیکن میں ایک شریف اور معزز آدمی کی سی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے سنتا رہا۔ پھر وہ بولا "ویسے تو یہ دونوں سؤر کے پتر بڑے خبیث تھے مفرور تھے.... کوئی آٹھ آٹھ دس دس تو قتل کیے ہوئے تھے انہوں نے.... ڈاکے مارے تھے.... بھتا خوری بھی کافی عرصے کی تھی لیکن پولیس کے ہتھے نہیں چڑھتے تھے...."

یہ میرے لیے ایک حیرت انگیز اطلاع تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اکثر و بیشتر بھرے پرے شہر میں مصروف سڑکوں پر اسی طرح اپنی وہ پرانی جیپ یا چوری کی کوئی گاڑی دوڑاتے پھرتے ہوں گے جس طرح مجھے اغوا کرنے کے بعد دوڑاتے جا رہے تھے۔ میرے علاوہ بھی وہ نہ جانے کس کس کو کہاں کہاں سے اغوا کر کے اس کا کیا حشر کر چکے ہوں گے لیکن وہ پولیس کے ہتھے نہیں چڑھے تھے جو جگہ جگہ سڑکوں اور چوراہوں پر چیکنگ کے لیے کھڑی تھی۔

اس کی بات جاری تھی "ویسے تو یہ اسی قسم کے لوگوں میں ہیں جن کی موت کی خبر سن کر پولیس والوں کے منہ سے "خس کم جہاں پاک" ... مگر جی تفتیش تو کرنی پڑتی ہے نا۔ ابھی نہیں چل رہا کہ کس نے انہیں قتل کیا ہے۔ حالانکہ اس نے بڑا نیک کام انجام دیا ہے اور ہمیں پولیس مقابلے کی بدنامی سے بھی بچا لیا ہے لیکن پھر بھی ہمیں تحقیقات تو کرنی ہیں اور اگر وہ شخص.... پکڑا جاتا ہے تو اسے جیل بھی بھجوانا پڑے گا۔

ویسے آپس کی بات ہے.... ہم کوشش کریں گے کہ اسے کم سے کم سزا ہو اور اسے زیادہ تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔"

"لیکن آپ مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہے ہیں اور یہ تصویریں کیوں دکھا رہے ہیں؟" میں نے الجھن آمیز لہجے میں پوچھا۔

"دراصل.... جی بات یہ ہے کہ ہمیں ایک خاتون کا گمنام ٹیلی فون موصول ہوا ہے جس کا کہنا ہے کہ اس نے اتفاق سے ایک دفتر کی کھڑکی سے ان دونوں نوجوانوں کو قتل ہوتے دیکھا ہے۔ اس نے قسمیں کھا کر ہمیں یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ دونوں ایک ہی شخص کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں اور اتفاق سے وہ اس شخص کو پہچانتی ہے۔" وہ ڈرامائی سے انداز میں مسکرایا۔

"اور وہ شخص میں ہوں.... یعنی.... آپ کا مطلب ہے....؟" میں نے اپنی آنکھیں زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی کوشش کی۔ اس کے ساتھ ہی صدمے کی شدت سے گویا میری آواز گلے میں اٹک گئی۔

"ہاں جی.... ہمارا تو اصل میں کوئی مطلب نہیں.... خاتون کا مطلب یہی تھا۔" اس نے کافی حد تک باچھیں پھیلاتے ہوئے اثبات میں گردن ہلائی۔

"اور آپ نے اس کی بات کا یقین کر لیا؟" صدمے کی شدت سے گویا میری آنکھوں میں آنسو آتے آتے رہ گئے۔

"ہمارے یقین کو چھوڑیں جی.... ہم تو ابھی اپنی رائے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں...." پھر وہ ذرا معنی خیز انداز میں مسکرایا "آپس کی بات ہے.... مجھے ذاتی طور پر تو اس بات پر پہلے ہی یقین نہیں آیا تھا۔ خاتون نے ہمیں آپ کی حیثیت کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ مجھے تو اس وقت ہی ہنسی آگئی تھی۔ ہمیں تو پتا ہے آپ جیسے امیر کبیر اور صاحبِ حیثیت آدمی ایسے کاموں میں اپنے ہاتھ گندے تھوڑی کرتے ہیں۔ بندہ مروانا ہی ہو تو لاکھ دو لاکھ کسی خانہ خراب کرائے کا قاتل کو دے کر صاف ستھرے طریقے سے گردن بچا لیتے ہیں.... اور آج کل تو ویسے ہی اس کام پر بڑی بہار آئی ہوئی ہے۔ بندہ مروانا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں رہا۔ ایک شریف اور معزز آدمی میں کہاں اتنا دم خم ہوتا ہے کہ اکیلا اس قسم کے دو دو پیشہ ور بدمعاشوں اور قاتلوں کا یہ حشر کر دے.... اور آپ کو دیکھنے کے بعد تو میرا یقین اور بھی پکا ہو گیا ہے...."

میں نے ایک گہری سانس لے کر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کہ اس کی باتوں سے مجھے اطمینان ہوا تھا۔ اس کی بات معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ جاری تھی "خاتون نے خود میرے ساتھ بات کی تھی اور مجھے ایک منٹ میں اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اس چکر میں کسی معزز آدمی کو پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔ گمنام کالوں میں سے بھی ہم صرف انہی پر کارروائی کرتے ہیں جن میں ہمیں کچھ جان نظر آتی ہے۔ تجربے کی وجہ سے ہمیں اتنا اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ کون ہمیں بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے، کون صحیح مخبری کر رہا ہے.... کون گھر کا بھیدی ہے اور لنکا ڈھا رہا ہے۔ کون کس طرح کے چکر میں ہے۔ ان سب باتوں کا ہمیں کافی اندازہ ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی.... میں نے سوچا چلو فرض ادا ہو جائے گا.... کارروائی تو ڈل جائے گی.... ٹھیک ہے ناجی؟"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے تھوک نگل کر گویا مسکرانے کی کوشش کی۔

اس نے جیب سے قلم نکالا، فائل کھولی اور زرد سا ایک کاغذ نکال کر اپنے سامنے رکھتے ہوئے بولا "بس تو پھر آپ کے بیان میں، اس سلسلے میں مختصراً یہی لکھوں تاکہ آپ کو اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں.... اور مفرور ملزمان یعنی مقتولین کو آپ کسی حیثیت سے جانتے پہچانتے نہیں؟"

"جی ہاں.... جی ہاں.... بالکل۔" میں نے جلدی سے کہا۔

اس نے کاغذ پر کئی منٹ تک سر جھکائے رکھنے کے بعد دو تین سطریں مکمل کیں۔ کاغذ پر پہلے سے بھی کچھ لکھا ہوا تھا۔ فائل میری طرف کھسکاتے ہوئے وہ بولا "اس کے نیچے اپنے دستخط ثبت فرما دیں۔"

میں نے دیکھا' کاغذ پر پہلے سے جو کچھ لکھا ہوا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ فلاں دن' فلاں وقت پر موصول ہونے والی گمنام ٹیلی فون کال میں جو کچھ کہا گیا' افسر مذکور نے بہ ذات خود جا کر متعلقہ شخص سے انکوائری کی اور یہ بیان حاصل کیا... دستخط کرنے سے پہلے میں نے شکر گزارانہ انداز میں مسکرا کر اس کی طرف دیکھا تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرایا اور بولا "میں نے آپ کا کام کتنا آسان کردیا ہے اور کتنے سادہ انداز میں تفتیش کی ہے۔"

"واقعی...! آپ بہت مہربان' دیانت دار اور تجربہ کار افسر معلوم ہوتے ہیں۔ میں آپ کے اس تعاون کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" پھر دستخط کردینے کے بعد بھی میں نے فائل اپنے سامنے ہی رکھتے ہوئے کہا "آپ ایک منٹ اور ٹھہر جائیں۔"

میں نے انٹر کام پر کیشئر کو کچھ ہدایات دیں۔ کچھ دیر بعد وہ آیا اور ایک دبیز لفافہ میز پر رکھ کر چلا گیا۔ میں نے وہ لفافہ فائل میں رکھ کر اسے فائل واپس دیتے ہوئے کہا "ہم آپ جیسے مخلص افسروں کے بڑے قدر دان ہیں۔"

"اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔" وہ فائل کو دُہری کر کے مضبوطی سے ہاتھ میں دباتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

"بس... یہ آپ کے حُسنِ اخلاق کے جواب میں ہمارے خلوص کا معمولی سا اظہار ہے۔" میں نے انکساری سے کہا۔ اس نے رخصت ہوتے وقت بڑی گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔

اس کے جانے کے بعد میں کئی منٹ تک اپنی کرسی پر ساکت بیٹھا رہا اور سوچتا رہا۔ یہ مشتاق بوبی اور جیدی کا کا پیشہ ور بدمعاش اور کرائے کا قاتل تھے اور آج کل غالباً جمشید کریم کے لیے خدمات انجام دے رہے تھے جس نے انہیں تمینہ کی نگرانی اور اسے مختلف خطرات سے بچانے کے لیے تعینات کیا ہوگا۔ آخر تمینہ اس کا ایک "قیمتی اثاثہ" تھی اور آج کل ایک اہم پراجیکٹ پر کام کررہی تھی۔ خصوصاً درانی جیسے آدمیوں کا قرب حاصل ہونے کے بعد اسے غالباً اپنے اوپر بڑا ناز اور زعم تھا۔ اس نے مشتاق بوبی اور جیدی کا کا کے قتل کے بعد شاید جمشید کریم کی ہدایت پر خود پس منظر میں رہتے ہوئے مجھے پھنسوانے کی اپنی سی ایک لنگڑی لولی کوشش کی تھی۔ شاید انہیں خود بھی اپنی اس کوشش کی کامیابی کا زیادہ یقین نہ رہا ہو۔ مسئلہ یہ تھا کہ وہ دونوں بدمعاش خود پولیس کو مطلوب اور اس کے معتوب تھے اس لیے جمشید کریم صاف طور پر ان سے اپنے تعلق کا اظہار نہیں کرسکتا تھا لیکن بہرحال وہ اس کے اپنے آدمی' اس کے خدمت گار تھے۔ اسے ان کی موت پر غصہ تو ہوگا اور یہ ضروری نہیں تھا کہ ایک کوشش ناکام ہونے کے بعد وہ دوسری کوشش نہ کرے۔ مجھے پھنسوانے یا مروانے کی اس کی کوششیں آئندہ بھی جاری رہ سکتی تھیں اور اب چونکہ اسے زیادہ بہتر طور پر اندازہ ہوگیا تھا کہ میں آسانی سے قابو میں آنے والا شکار نہیں تھا اس لیے توقع یہی رکھنی چاہیے تھی کہ وہ آئندہ جو کچھ بھی کرے گا' زیادہ بہتر انتظامات کے ساتھ کرے گا۔

اچانک مجھے ایک خیال اور آیا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ وہ دونوں بدمعاش دراصل درانی ہی کے آدمی رہے ہوں؟ بہت سے خطرناک بدمعاش اس قبیل کے کرپٹ افسران کے زیر سایہ پرورش پاتے تھے۔ انہیں بھی ایسے لوگوں کی ضرورت پڑتی رہتی تھی اور وہ نہایت عمدگی سے ان سے کام لیتے رہتے تھے... لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کردیا۔ درانی دھڑلے کا آدمی تھا۔ اگر وہ دونوں بدمعاش اس کے آدمی ہوتے اور اسے تمینہ کی زبانی معلوم ہوجاتا کہ وہ شاید میرے ہاتھوں انجام کو پہنچے تھے' پھر تو وہ مجھے زیادہ سنگین انداز میں قابو میں کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ یقیناً اس کے آدمی نہیں تھے اور تمینہ نے شاید کسی مصلحت کی وجہ سے درانی سے ان کے بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔

آخر کار میں نے ان سب الجھی سوچوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے اور ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے شفیع شاہ کا موبائل نمبر ملایا اور اس سے پوچھا "تم کہاں ہو اس وقت؟"

"میں تو فی الحال ہوٹل ہی کے بیسمنٹ میں موجود ہوں۔" اس نے بتایا۔

"تمہارے پاس کچھ اور لوگ بھی ہیں؟"

"جی سر...!" اس نے جواب دیا "جی ایم صاحب ہیں... پرسونل منیجر ہیں..."

"اچھا... تم ذرا آفس میں آجاؤ۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

چند لمحے بعد ہی وہ میرے سامنے بیٹھا تھا۔ میں نے خنجر کی سی ساخت کے' اسٹیل کے ایک خوب صورت قلم کو پہلی بار ذرا توجہ سے دیکھتے ہوئے اور انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا "شفیع شاہ! یہ جو لڑکی ہے نا تمینہ... یہ یقیناً ان دنوں بلبل کی طرح چہک رہی ہے۔ کہیں پولیس کے کانوں میں رس گھول رہی ہے اور کبھی اپنے سرپرستوں کو نہ جانے کیا کیا نغمے سُنا رہی ہے۔ اس کی تھوڑی سی چہکار ہمیں بھی سُننا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے سر!" شفیع شاہ نے سر ہلایا۔

"یہ اپنے اپارٹمنٹ پر... یا درّانی کے بنگلے پر... جہاں بھی ہے... موقع مناسب دیکھ کر اسے اُٹھالو۔ ہمیں اس سے بات کرنی ہی پڑے گی۔" میری آواز اب سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ "یہ کام آج رات تک ہوجانا چاہیے۔ آج رات ہمیں زرتاج کے ساتھ میٹنگ کرنا تھی لیکن کل صبح سے پہلے لاہور سے راحیلہ اور ٹونی بھی پہنچ جائیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ میٹنگ ان کے پہنچنے کے بعد ہی رکھ لی جائے تاکہ ایک ہی نشست میں کام کی تمام تفصیلات طے ہوجائیں۔ فی الحال آج رات تک تم یہی کام کرلو۔ جس کسی کی بھی ضرورت ہو اسے ساتھ لے لو۔"

"فکر نہ کریں سر! کام ہوجائے گا۔ اسے اُٹھانے کے بعد کہاں لے جانا ہے؟" اس نے جذبات سے عاری لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے تم اپنے بنگلے پر ہی لے جاؤ اور مجھے اطلاع دو۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا۔

"ٹھیک ہے سر!" اس نے اطمینان سے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

شفیع شاہ کے جانے کے بعد میں مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔ مجھے امید تھی کہ تمینہ ہمارے قابو میں آگئی تو شاید اور بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوں۔ اس کے علاوہ درانی پر کچھ نفسیاتی دباؤ بھی پڑے گا۔ گو کہ اب وہ اس سلسلے میں کچھ زیادہ پُر امید نہیں رہا تھا۔ درانی دباؤ میں آنے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن کم از کم اس لڑکی کو ہی تھوڑا سا سبق سکھایا جاسکتا تھا جو تھوڑے تھوڑے دنوں کے لیے کچھ اہم اور فرعون صفت مردوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن کر رہنے کے بعد شاید خود کو کنگ میکر سمجھنے لگی تھی۔ میں اسے اس کی حیثیت یاد دلانا چاہتا تھا۔ اپنی دانست میں شاید اس نے بہت ترقی کرلی تھی لیکن میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ دراصل یہ ترقی نہیں' تنزلی تھی۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ پستی میں جاچکی تھی۔

میری یہ حسرت پوری نہ ہوسکی کہ تمینہ کو سبق سکھایا جائے۔ دو گھنٹے بعد شفیع شاہ کا فون آیا اور اس نے معذرت خواہانہ سے انداز میں اطلاع دی "سر! وہ لڑکی اب نہ تو درانی کے بنگلے پر ہے اور نہ ہی اپنے اپارٹمنٹ میں موجود ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے غائب کردیا گیا ہے۔"

"اوہ...!" میں گہری سانس لے کر رہ گیا "کیا کوئی اس کی نگرانی نہیں کررہا تھا؟"

"جی نہیں۔" شفیع شاہ نے جواب دیا "اب چونکہ آپ اس سے بات کر بیٹھے تھے اور وہ اس حقیقت سے باخبر ہوچکی تھی کہ اس کی نگرانی کی جارہی تھی اس لیے اب نگرانی جاری رکھنا بے کار ہی محسوس ہوا تھا۔"

اس کی دلیل معقول تھی پھر بھی مجھے یہی خیال آیا کہ اسے تمینہ کی نگرانی ختم نہیں کرانی چاہیے تھی تاہم میں نے اس سے یہ بات نہیں کہی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "جمشید کریم اور درانی اپنے مہرے بڑے ہوشیاری سے کھیل رہے ہیں۔ ان کا یہ مہرہ پٹنے سے بچ گیا... لیکن خیر... کوئی فرق نہیں پڑا۔ مہروں کو پٹنے سے بچانے کے لیے صرف ہوشیاری ہی کافی نہیں ہوتی۔"

"تمینہ کی تلاش بہرحال جاری ہے۔" شفیع شاہ بولا "میں نے کچھ لوگوں کی ڈیوٹی لگائی ہے۔"

"دفع کرو... اب اس کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اتنا اہم مہرہ بھی نہیں ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "وہ ہاتھ آجاتی تو اچھا تھا لیکن اگر ہاتھ نہیں آئی تو اس میں پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اب "انتظار کرو اور دیکھو" والے انگریزی محاورے پر عمل کرو۔ تمینہ کو یقیناً جمشید کریم نے غائب کیا ہوگا یا غائب ہونے کی ہدایت کی ہوگی۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "اخبارات میں درانی کے خلاف مہم شروع ہونے کے انتظامات ہوگئے؟"

"جی سر!" اس نے جواب دیا "پہلے صرف کچھ شوشے چھوڑے جائیں گے۔ ہلکے پھلکے انداز میں مہم شروع ہوگی پھر وہ لوگ درانی کا ردِعمل دیکھ کر اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کریں گے۔"

"کہیں اخبارات یا صحافی دھونس' دھمکی یا لالچ میں نہ آجائیں۔ درانی اپنے آپ کو بچانے کے لیے اپنے پورے محکمے کو استعمال کرنے کی کوشش کرے گا... اور اس محکمے کی بہرحال بڑی دہشت ہے۔ اسے بے حساب اختیارات بھی حاصل ہیں اور اس میں موجود درانی جیسے نہ جانے کتنے لوگ ان اختیارات کے بے دریغ اور ناجائز استعمال کے عادی بھی ہوچکے ہیں۔"

"سر! میں پوری کوشش کروں گا کہ اخبارات اور صحافی اس سلسلے میں دھونس' دھمکی اور لالچ میں نہ آنے پائیں۔" شفیع شاہ بولا۔

"جہاں ضرورت پڑے وہاں تم اس مقصد کے لیے اپنے تمام تر مالی وسائل بھی استعمال کرسکتے ہو۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"مجھے معلوم ہے سر!" وہ آہستگی سے بولا "دیکھتے ہیں کہ درانی کے خلاف مہم شروع ہونے کے بعد اس کا اگلا قدم کیا ہوتا ہے۔ ہمیں ہر طرح کے ردِعمل کے لیے تیار رہنا ہوگا۔"

"ہم تو ہر وقت' ہر مصیبت اور ہر بلا کے لیے تیار ہی رہتے ہیں سر!" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "اچھا ہوا کہ زندگی کا یہ فارمولا آپ نے شروع میں ہی ہمیں سکھا دیا تھا۔ اسی لیے اب کسی بھی قسم کے مسائل سے دوچار ہونے پر ہمیں کوئی خاص تکلیف نہیں ہوتی۔" ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "میرے لیے اور کیا حکم ہے سر؟"

"تم فی الحال منقار زیر پر رہو۔" میں نے کہا اور فوراً ہی پوچھ لیا "اتنی گاڑھی اردو سمجھ میں آتی ہے؟"

"چھوٹا سا جملہ ہے سر! اس میں صرف ایک ہی لفظ مشکل ہے۔ اتفاق سے اس کا مطلب بھی معلوم ہے۔ آپ کا حکم ہے کہ چونچ' پر میں دبا کر رکھو... یعنی آرام سے سر جھکا کر ایک طرف بیٹھ جاؤں۔ یہی کام میرے لیے زیادہ مشکل ہے۔"

"صرف چھ گھنٹے کی بات ہے۔ تمہیں صرف راحیلہ اور ٹونی کے آنے تک آرام سے بیٹھنا ہے۔ اس کے بعد پھر تھوڑی سی مصروفیت درپیش ہے۔ اب تم گھر جا کر آرام سے سو جاؤ اور وہ جن بننے کی کوشش نہ کرو جو اپنے آقا سے ہر وقت کوئی نہ کوئی کام پوچھتا رہتا تھا اور ایک لمحے بھی فارغ نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اس جن کا انجام کچھ اچھا نہیں ہوا تھا۔" میں نے گویا اسے ڈرانے کی کوشش کی۔

"کیا انجام ہوا تھا اس کا؟" شفیع شاہ نے جاننا چاہا۔

"مالک اسے کام بتاتے بتاتے تھک گیا تھا لیکن وہ کام کرتے کرتے نہیں تھکتا تھا۔ آخر جن تھا۔ پلک جھپکتے میں ہر کام ختم کر کے آجاتا تھا اور اپنے آقا کے سر پہ سوار ہوجاتا تھا "کیا حکم ہے میرے آقا؟" بے چارے آقا کے پاس کام ختم ہوگئے۔ وہ اپنی اوقات کے مطابق تمام کام کروا چکا تھا۔ آخر کار جن کی مستعدی

سے تنگ آکر اس نے لکڑی کا ایک گول اور چکنا شہتیر زمین میں گڑوایا۔ اسے تیل میں تر کیا اور جن کو حکم دیا کہ اس پر چڑھ جاؤ' اگر نیچے آؤ تو دوبارہ چڑھو۔ چنانچہ جن بے چارہ اس پر بڑی مشکل سے چڑھتا لیکن پھسل کر پھر نیچے پہنچ جاتا اور نئے سرے سے اوپر پہنچنے کی جدوجہد میں مصروف ہو جاتا۔"

"ایک مستعد اور ایفی شینٹ جن کا یہ دردناک انجام۔۔۔!" شفیع شاہ نے آہ بھری۔

"شاید اس کا آقا کچھ قناعت پسند تھا ورنہ انسانوں کے کام کہاں ختم ہوتے ہیں۔ خصوصاً جبکہ کام کروانے کے لیے صرف زبان ہلانی پڑے۔" میں نے کہا "تمہارے لیے تو صرف چھ گھنٹے کا بریک ہے۔ اس کے بعد کام ہی ہم تیار رکھے ہیں۔"

اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس رات میں سویا ہوا تھا کہ فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے میں نے گھڑی دیکھی۔ صبح کے چھ بج رہے تھے جس کا مطلب تھا کہ میں سات آٹھ گھنٹے سو چکا تھا لیکن محسوس یہی ہو رہا تھا' جیسے ایک آدھ گھنٹا پہلے ہی سویا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر غنودگی زدہ آواز میں ہیلو کہا تو دوسری طرف سے راحیلہ کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی "اوہو۔۔۔ شہنشاہِ عالم وہاں آرام سے اپنے فائیو اسٹار ہوٹل کے سوئٹ میں استراحت فرما رہے ہیں۔۔۔ خوابِ خرگوش اور خوابِ لنگور وغیرہ کے مزے لے رہے ہیں اور ہم یہاں رعایتی ٹکٹ والی فلائٹ میں دھکے کھا رہے ہیں۔"

"کیا جہاز سے ہی بول رہی ہو؟" میں نے ایک نظر ریسیور کو دیکھنے کے بعد قدرے حیرت سے کہا "کیا جہاز لینڈ کر رہا ہے اور تم اپنا موبائل فون استعمال کر رہی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ میں موبائل فون تو استعمال کر رہی ہوں لیکن جہاز لینڈ نہیں کر رہا بلکہ لینڈ کر چکا ہے۔ ہمیں باہر دھکا دیا جا چکا ہے اور اب میں اور ٹونی یتیموں کی طرح ارائیول لاؤنج میں پڑے ہوئے ہیں۔"

"تو پھر یہ کیوں کہہ رہی تھیں کہ ہم فلائٹ میں ہی دھکے کھا رہے ہیں؟" میں نے خفگی کا اظہار کرنے کی کوشش کی "میں تو ڈر گیا تھا کہ شاید رن وے پر جہاز کے پہیے نے کھلنے سے انکار کر دیا ہے۔ طیارہ فضا میں ہی چکر لگا رہا ہے اور اب تم مجھ سے درخواست کرو گی کہ اس سلسلے میں بھی' میں ہی کچھ کروں۔۔۔"

"اور تم سائیکلیں ٹھیک کرنے والے کسی مستری کو ساتھ لے کر دوڑے آؤ گے۔" اس نے لقمہ دیا "ویسے جہاز کی حالت دیکھ کر یہی لگ رہا تھا کہ اسے سائیکلیں مرمت کرنے والے مستری ہی ٹھیک کرتے ہوں گے۔ اوپر سے مسافر اور ان کے لاتعداد بچے بھی کچھ ایسے ہی تھے کہ اومنی بس کی یاد تازہ ہو رہی تھی۔ شاید اسی لیے جہاز سے اُتر آنے کے بعد بھی محسوس ہو رہا ہے کہ ابھی اسی میں دھکے کھا رہے ہیں۔"

"لگتا ہے تمہارے نخرے کافی بلند ہو گئے ہیں۔ اوقات بھولتی جا رہی ہو۔"

"ظاہر ہے۔۔۔ آخر اب میں چوہدری گروپ آف کمپنیز کی ریزیڈنٹ ڈائریکٹر ہوں۔" وہ اپنا لہجہ بارعب بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"تو پھر نائٹ کوچ سے آنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا۔

"سیٹیں نہیں مل رہی تھیں۔ بہت رش تھا۔۔۔ اور نائٹ کوچ بھی لیٹ آئی ہے۔ ہم تو سمجھ رہے تھے' ہمیں ہنگامی طور پر اہم کام کے لیے بلایا گیا ہے اس لیے یہاں ہمارا عظیم الشان استقبال ہو گا۔ سرخ قالین بچھے ہوں گے۔ بچے گلدستے لیے کھڑے ہوں گے۔۔۔"

"اور نتھو خان کا بینڈ بج رہا ہو گا۔" میں نے بات مکمل کی۔

"مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہ ہوتا۔" وہ اطمینان سے بولی "بہر حال۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیے تھا۔ اب یہ حال تو نہیں ہونا چاہیے کہ ہمیں لینے کے لیے کوئی گدھا گاڑی تک موجود نہیں ہے۔"

"تم اس شہر میں پیدا ہوئیں' پلی بڑھیں اور جوان ہوئیں تھیں جس کے بعد کافی عرصے کے لیے دماغی توازن بھی کھو بیٹھی تھیں۔ کیا اتنے طویل عرصے کے دوران میں تمہیں کسی نے نہیں بتایا کہ ' ٹیکسیاں بھی چلتی ہیں اور وہ ایسے ہی مواقع پر کام آتی ہیں؟" میں نے گویا اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹیکسیاں تو میں نے بہت دیکھی ہیں اور ان کا مصرف بھی معلوم ہے لیکن کیا ہماری اب یہی عزت رہ گئی ہے کہ ہم نائٹ کوچ۔۔۔ بلکہ لیٹ نائٹ کوچ میں دھکے کھاتے ہوئے آئیں اور یہاں سے ٹیکسی میں بیٹھ کر فقیروں کی طرح تمہاری خدمت میں حاضری دیں؟"

"تم ان چیزوں کو کچھ زیادہ ہی ڈی گریڈ کر رہی ہو۔۔۔ میں نے آج تک فقیروں کو نائٹ کوچ اور ٹیکسیوں میں سفر کرتے نہیں دیکھا۔"

"وہ تمہیں بتا کر تو سفر نہیں کریں گے۔ تمہیں بتانا اور بی بی سی کو بتانا ایک برابر ہے۔ انہیں انکم ٹیکس والوں کو اپنے پیچھے تو نہیں لگوانا ہے۔" راحیلہ بولی۔

"جس طرح تمہاری زبان چل رہی ہے اس سے تو لگتا ہے کہ سفر خاصا خوشگوار گزرا ہے۔ تم خواہ مخواہ شاعروں سے بھی زیادہ مبالغہ کرنے کی کوشش کر رہی ہو۔"

"تم اِن ڈائریکٹ مجھے جھوٹی قرار دینے کی کوشش کر رہے ہو؟" وہ غرائی "ذرا سوچ سمجھ کر بات کرنا۔ ابھی تو واپسی کی فلائٹ بھی تیار کھڑی ہے۔ ہم الٹے پیروں۔۔۔ بلکہ یوں کہو کہ الٹے ٹکٹوں واپس چلے جائیں گے۔"

"آخر تم اتنا رُعب جھاڑنے اور احسان جتانے پر کیوں تُلی

ہوئی ہو؟ کیا چاہتی ہو؟"

"اُف خدایا۔۔۔!" اس نے گویا سر پیٹ لیا "انسان کو دماغ سے اس حد تک بھی محروم نہیں ہونا چاہیے۔ ایک گھنٹے سے میری رام کہانی جاری ہے اور ابھی تک تمہاری سمجھ میں یہی نہیں آیا کہ میں کیا چاہتی ہوں۔"

"بعض لوگ زندگی بھر چیں چیں کرتے رہیں تب بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ چاہتے کیا ہیں۔ یہ ان کے اندازِ گفتگو کا کمال ہوتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"غلط فہمی ہے تمہاری۔ یہ سننے والے کی خالی کھوپڑی کا کمال ہوتا ہے۔ بہر حال۔۔۔ وضاحت کے ساتھ یہ فدویہ کچھ یوں عرض گزار ہے کہ اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو تو گاڑی لے کر ذرا ہمیں لینے آجائیے۔"

"تم وہاں سے روانہ ہوتے وقت اطلاع نہیں دے سکتی تھیں' تاکہ میں گاڑی بھجوانے کا انتظام کرا دیتا؟ اور اگر ائرپورٹ پر ہی آکر نازل ہونے کے بعد فون کرنا ضروری تھا تو مجھ غریب کو بخشتے ہوئے کیا شفیع شاہ کو فون نہیں کر سکتی تھیں؟ مجھے ہی اس وقت منہ اندھیرے نیند سے جگانا ضروری تھا؟"

"جوابات ان سوالات کے کچھ یوں ہیں حضورِ والا۔۔۔ کہ وہاں سے ہم ہنگامی انداز میں روانہ ہوئے ہیں۔ آخری لمحے تک ہمیں علم نہیں تھا کہ ہم کس فلائٹ سے روانہ ہو پائیں گے۔ دوسری بات یہ کہ عین سر پہ پہنچ کر اطلاع دینے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ تیسری بات یہ کہ جب ہماری ڈائریکٹ بڑے سیٹھ صاحب سے سلام دعا ہے تو ہم ایروں غیروں کو تکلیف کیوں دیں۔"

"اچھا۔۔۔ وہ شفیع شاہ ایرا غیرا ہو گیا؟ اس نے سن لیا تو کراٹے کا ہاتھ مار کر تمہاری صراحی دار گردن توڑ دے گا۔ وہ تو اپنے خاندان کی کسی نہایت قدیم بزرگ خاتون کا بھی شاید اتنا احترام نہیں کرتا جتنا تمہارا کرتا ہے۔"

"احترام اپنی جگہ ہے۔ میں کب اس کے احترام کی بے قدری کر رہی ہوں۔ بوقتِ ضرورت میں بھی اس کے ساتھ اس کے خاندان کی کسی نہایت "قدیم" بزرگ خاتون کی سی شفقت سے پیش آؤں گی۔ آخر اس بے چارے کا کوئی خاندان جو نہیں ہے۔ اب تو ہم ہی اس کا خاندان ہیں۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ ہیں لیکن اس وقت ہم اسے تکلیف دینا نہیں چاہتے تھے۔ تمہیں نیند سے اٹھا کر دوڑانے میں جو لطف ہے وہ اسے زحمت دینے میں کہاں۔ میں تو دعا کر رہی تھی کہ جس وقت میں تمہارا ڈائریکٹ نمبر ملاؤں اس وقت تم گہری نیند سو رہے ہو اور کوئی اچھا سا خواب دیکھ رہے ہو۔ فون کی گھنٹی اتنی زور سے بجے کہ تم بستر سے نیچے گر پڑو۔"

"یہ کوسنے' بددعائیں دینے اور بدفال منہ سے نکالنے کی عادت ابھی تک گئی نہیں۔" میں نے افسوس سے کہا "اب تو اللہ نے حالات کافی بہتر کر دیے ہیں۔ اب تو کبھی منہ سے کوئی اچھی بات نکال لیا کرو۔ دوسروں کے بارے میں کبھی نیک تمناؤں کا اظہار کر لیا کرو۔ شکل اچھی نہ ہو تو انسان بات ہی اچھی کر لے۔"

"دیکھو۔۔۔ شکل پہ مت جانا۔ شکل اللہ کی بنائی ہوئی ہے اور اللہ کے کاموں پر رائے زنی ہمیں زیب نہیں دیتا ورنہ میں بھی تمہاری شان میں ایک طویل قصیدہ پڑھ سکتی ہوں۔ اب تم نے کافی دیر باتیں کر لی ہیں۔ یقیناً تمہاری غنودگی دور ہو گئی ہو گی۔ اب جلدی سے گاڑی نکالو اور راکٹ کی رفتار سے ائرپورٹ کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ تب تک ہم ذرا کافی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔"

"واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کیا شاہانہ انداز پایا ہے۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا "محترمہ! ذرا خوابوں کی دنیا سے باہر آکر بات کریں۔ اطلاعاً عرض ہے میں آپ کا ڈرائیور نہیں' باس ہوں۔"

"اسی لیے تو جگایا ہے۔" وہ اطمینان سے بولی "ڈرائیور کو بھلا بے وقت جگانے کی جرأت میں کیسے کر سکتی تھی؟ وہ تو خفا ہو کر نوکری چھوڑ کر چلا جاتا۔ باس کو تنگ کرنے میں یہ فائدہ ہے کہ وہ نوکری چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔۔۔ ہاں۔۔۔ تو پھر کتنی دیر میں پہنچ رہے ہو؟"

"کس گدھے نے تم سے کہہ دیا کہ میں پہنچ رہا ہوں؟" میں نے غرانے کی کوشش کی "میں ائرپورٹ والوں کو فون کر رہا ہوں۔ میں نے اکثر دیکھا ہے وہاں باہر پارکنگ ایریا کے قریب کوڑا اٹھانے کا ایک ٹرک کھڑا رہتا ہے۔ میں ائرپورٹ پر سول ایوی ایشن کے کسی ذمے دار افسر سے کہتا ہوں کہ تمہیں اس ٹرک میں لدوا کر یہاں پہنچوا دے۔ اس سے بہتر انتظام تمہارے لیے نہیں ہو سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر یہ کوڑا واپسی کی فلائٹ سے لاہور جا رہا ہے۔" اس نے دھمکی دی "تم یہاں کوڑا کرکٹ کے بغیر ہی گزارا کرو۔"

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے ریسیور رکھا اور اچھل کر بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرے ہی لمحے میں پھرتی سے حرکت میں آچکا تھا۔ چند منٹ بعد میری گاڑی شاہراہ فیصل پر فراٹے بھر رہی تھی۔

میں جب ائرپورٹ پہنچا تو وہ دونوں ارائیول لاؤنج میں ہی ایک بینچ پر بیٹھے تھے۔ کافی کے کاغذی کپ اس وقت بھی ان کے ہاتھوں میں تھے اور بسکٹوں کا ایک کھلا ڈبا ان دونوں کے درمیان رکھا تھا۔ ٹونی ڈھیلی ڈھالی شرٹ' جیکٹ اور جینز میں تھا اور حال ہی میں کالج سے نکلنے والا کوئی ایسا نوجوان معلوم ہو رہا تھا جس کا کھلنڈرا پن ابھی گیا نہیں تھا۔

راحیلہ ڈھیلی ڈھالی جرسی اور ٹراؤزر میں تھی۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی اور شکن آلود قمیص جرسی سے نیچے لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے بال ترشوا کر کچھ اور چھوٹے کروا لیے تھے اور ان کی پونی ٹیل بنا رکھی تھی۔ ریشمی بھورے بالوں کی یہ پونی ٹیل اس کے سر کی خفیف

سی حرکت کے ساتھ ہی زور سے ہلتی تھی۔ اس حلیے میں وہ بھی کوئی بہت ہی لاابالی قسم کی کالج گرل معلوم ہوتی تھی۔ دونوں خاصے عمر چور تھے۔ اپنی اصل عمر سے کم از کم دس دس سال چھوٹے دکھائی دیتے تھے۔ ٹونی کی صرف آنکھیں کسی حد تک اس کی عمر کا سراغ دیتی تھیں۔ ان شفاف نیلی آنکھوں میں نوجوانوں والی سطحیت نہیں تھی اور جب وہ پُرخیال انداز میں کسی طرف نظر بھر کر تکتا تھا تو اس کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کی سرد مہری اور مبہم سی سفاکی جھلک آتی تھی جو اس جیسے کھلنڈرے اور لاابالی نظر آنے والے نوجوانوں کی آنکھوں میں نہیں ہونی چاہیے تھی۔

راحیلہ کو بہت قریب سے اور بہت غور سے دیکھنے پر صرف شبہ ہوتا تھا کہ وہ شاید اس عمر کی بے پروا اور نوخیز لڑکی نہیں ہے جیسی نظر آتی ہے۔ کچھ وقت اس کے ساتھ گزارنے کے بعد کسی اجنبی کا یہ شبہ قوی تر ہو سکتا تھا۔ میں اسے کافی دنوں بعد دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے کچھ اور کھلی کھلی سی دکھائی دے رہی تھی۔

میں نے ٹونی سے معانقہ کرنے کے بعد بغور راحیلہ کی طرف دیکھا تو وہ بسکٹ چباتے ہوئے بولی "مجھ سے زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اس طرح کی کوشش کرنے والوں کے پہلو میں خنجر گھونپ دیا کرتی ہوں۔"

"مجھے بتانے کی ضرورت نہیں، مجھے تو معلوم ہے۔" میں نے فوراً کہا "کچھ دیر پہلے ٹی وی سے بھی خبر آرہی تھی کہ لاہور سے آنے والی فلائٹ جب دریائے سندھ کے اوپر سے گزر رہی تھی تو جہاز کا دروازہ کھل گیا تھا اور دو تین لاشیں غڑپ سے دریا میں گری تھیں۔ کسی نے ان کے پہلو میں خنجر گھونپ دیا تھا۔ بے چارے ٹی وی والوں کو کیا معلوم کہ وہ تم تھیں جس کے ہاتھوں وہ لوگ انجام کو پہنچے تھے۔"

ٹونی مسکرانے لگا اور راحیلہ نے خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا۔ میں نے جلدی سے کہا "خوبرو مردوں کو زیادہ گھورا نہ کرو۔ نظر جلدی خراب ہو جائے گی۔"

راحیلہ نے ٹونی کی طرف دیکھا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "یہ کون صاحب ہیں؟ کچھ دیکھے ہوئے سے لگ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے دو تین سال پہلے چڑیا گھر میں دیکھا تھا لیکن یاد نہیں آرہا کہ پنجرے کے اندر دیکھا تھا یا باہر۔۔۔؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" ٹونی نے کندھے اچکائے "میں تو کبھی بچپن میں بھی چڑیا گھر نہیں گیا۔"

"ٹونی! تمہارا بھی جواب نہیں۔" راحیلہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تم کسی لومڑی سے بھی زیادہ مکار ہو۔ صاف جان بچا جاتے ہو۔"

"میرا باس سے مذاق نہیں ہے۔۔۔ اور ہاں۔۔۔ مجھے اگر تشبیہ دینی ہے تو لومڑ سے دو۔ مونث چیزوں یا جانداروں کے ساتھ تشبیہ دیا جانا مجھے بالکل پسند نہیں۔" ٹونی بولا۔

"اچھا۔۔۔! تو یہ تمہارے باس ہیں؟" راحیلہ نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں پھر مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی "بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔"

میں نے ایک نظر اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دیکھا اور اپنے ہاتھ پیچھے لے جاتے ہوئے کہا "میں چھوٹے موٹے لوگوں سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا۔ میں آج کل ذرا مغرور ہونے کی پریکٹس کر رہا ہوں۔"

"یہ ہاتھ اگر کسی مغرور آدمی کی کھوپڑی پر پڑ جائے تو اس کا بھیجا بھی باہر آسکتا ہے۔" وہ اپنے ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے سہلانے اور پھر اس پر پھونک مارنے کے بعد بولی۔

میں نے چھت کی طرف دیکھا اور تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا "زیادہ اونچی چھوڑنے سے بھی کبھی چھت گر پڑتی ہے۔"

"اگر تمہارا بے تکی ہانکنے کا شوق پورا ہو گیا ہو تو اب ہم چلیں؟" وہ ذرا سنجیدگی سے بولی۔

"تم نے میری پھرتی کی داد نہیں دی۔ میں تم لوگوں کے کافی کے کپ خالی ہونے سے پہلے یہاں پہنچ گیا۔" میں نے کہا۔

"یہ ہمارے دوسرے کپ ہیں۔ ایک ایک کپ ہم پی چکے ہیں۔" راحیلہ نے آنکھیں نکالیں۔

"پھر بھی میری پھرتی قابل داد ہی رہے گی۔" میں نے کہا۔

"خیر۔۔۔ تمہاری کیا بات ہے۔ تم تو داد لوگوں سے چھینتے پھرتے ہو۔" وہ بولی۔

ان دونوں کے بیگ ان کے پیروں کے پاس پڑے تھے۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اب فضول بکواس بند کرو اور اپنی اپنی یہ پوٹلیاں اٹھا کر خاموشی سے میرے پیچھے آجاؤ۔"

راحیلہ کو مزید کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر میں واپسی کے لیے مڑ گیا۔ وہ دونوں اپنے اپنے بیگ اٹھائے میرے پیچھے آنے لگے۔ چند قدم چل کر میں نے راحیلہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا "کم از کم تمہیں تو میں کوڑے کے ٹرک پر ہی لادنے آیا ہوں۔"

"اپنا پرانا کام ابھی تک چھوڑا نہیں تم نے؟" وہ ملائمت سے بولی۔

"میں تو کام ہر تھوڑے دن بعد چھوڑ دیتا ہوں لیکن پھر مزید کچھ کچرا آجاتا ہے۔ مجبوراً مجھے پھر میدانِ عمل میں نکلنا پڑتا ہے۔" میں نے جواب دیا "ویسے ٹونی کو میں معزز آدمیوں والی گاڑی میں لے جاؤں گا۔"

خلافِ توقع راحیلہ خاموش رہی لیکن پارکنگ لاٹ میں آکر جب میں نے ان کے بیگ رکھوانے کے لیے مرسڈیز کی ڈکی کھولی تو وہ بول اٹھی "تمہارے کوڑا اٹھانے کے ٹرک کا ڈیزائن کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے۔ اب تو یہ بالکل کار معلوم ہو رہا ہے۔"

"لیکن اس کا کام آج تک نہیں بدلا۔ اب بھی یہ کوڑا ڈھونے کے ہی کام آتا ہے۔" میں نے ڈکی بند کرتے ہوئے کہا۔ پھر

میں ڈرائیونگ سیٹ پر آبیٹھا اور راحیلہ میرے برابر آن بیٹھی۔ گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے گویا از سرِنو اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ویسے یہ بات میں سنجیدگی سے کہنا چاہتا ہوں کہ تم پہلے سے کچھ زیادہ کھلی کھلی لگ رہی ہو۔ اب تک تو بڑھاپا آجانا چاہیے تھا لیکن تمہیں تو ریورس گیئر لگا ہوا ہے۔ خیر سے ستّر اسّی سال تو عمر ہو چکی ہوگی؟"

"ستّر اسّی سال۔۔۔؟" استہزائیہ انداز میں میری طرف دیکھا "ستّر اسّی سال تو میری عمر دو ڈھائی سو سال پہلے تھی۔۔۔ اور بڑھاپا آئے میرے دشمنوں پر۔۔۔ میری تو ابھی کھانے کھیلنے کی عمر شروع ہوئی ہے۔"

"کیا کھانے اور کیا کھیلنے کی؟" میں نے فوراً پوچھا۔

وہ میرا سوال ان سنا کرتے ہوئے بولی "اور یہ جو میں کھلی کھلی نظر آرہی ہوں نا۔۔۔ یہ تم سے دوری کا فیض ہے۔ تم سر پہ سوار نہیں ہو تو وہاں لاہور میں ہم سب بہت خوش ہیں۔ سب کی صحت بہتر ہوگئی ہے۔"

ٹونی فوراً پچھلی سیٹ سے بولا "یہ ان کا ذاتی بیان ہے سر! دوسروں کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔"

"چمچہ گیری مت کرو۔" راحیلہ نے پلٹ کر اسے ڈانٹا "باس کو اوقات پر رکھنا ضروری ہے ورنہ وہ سر پر چڑھ جاتے ہیں۔"

میں نے گاڑی پارکنگ لاٹ سے نکالتے ہوئے کہا "راحیلہ! مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ تمہارا وزن بھی ایک ڈیڑھ چھٹانک بڑھ گیا ہے۔"

"غلط خیال ہے تمہارا۔" وہ بولی "اگر میرا وزن ایک ڈیڑھ چھٹانک بڑھ چکا ہوتا تو اب تک میں ڈائٹنگ شروع کر چکی ہوتی۔ صبح آنکھ کھلتے ہی سب سے پہلے میں ویٹ مشین پر کھڑی ہوتی ہوں۔ پھر ایک گھنٹا ایکسرسائز کرتی ہوں۔ وہی پرانا روٹین ہے۔۔۔ لیکن خیر۔۔۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ اگر شکل پہ کچھ نکھار نظر آرہا ہے تو اس کی وجہ وہی ہے۔ یعنی تمہارے سائے سے بچے رہنا۔۔۔ لیکن تم سے ہماری خوشی کہاں دیکھی جاتی ہے۔ اگر خود آکر ہمارے سروں پر سوار نہیں ہوئے تو ہمیں یہاں بلالیا۔ اب ساری صحت اور تازگی خاک میں مل جائے گی۔"

"اچھی امیدیں رکھا کرو اور منہ سے اچھی بات نکالا کرو۔" میں نے مشورہ دیا "عین ممکن ہے یہاں بڑھاپے کی رہی سہی علامتیں بھی دور ہو جائیں۔ نظر ٹھیک ہو جائے۔ ہلتے ہوئے دانت جم جائیں۔ ہاتھ پیروں کا رعشہ ختم ہو جائے۔"

"میری آڑ لے کر اپنی علامات بیان کرنے کی کوشش مت کرو اور یہ بتاؤ کہ تم نے ہمیں یوں ہنگامی طور پر کیوں بلوایا ہے؟" راحیلہ بولی۔

"ایک چیز ہوتی ہے۔۔۔ صبر" میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کبھی اس کا نام سنا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ہاں۔۔۔ خیر۔۔۔ تمہارا صبر سے کیا تعلق۔" میں نے افسوس سے کہا "صبر کا مادہ تو معقول لوگوں میں پایا جاتا ہے لیکن فی الحال تمہیں بھی تھوڑا بہت صبر کرنا پڑے گا۔ اس طرح کی باتیں کہیں آرام سے بیٹھ کر کی جاتی ہیں۔ چلتی گاڑی میں نہیں۔"

"مرضی کے مالک ہو تم۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "چاہو تو کسی عمارت کی چھت سے چھلانگ لگانے کے دوران بھی اہم نوعیت کی گفتگو چھیڑ دیتے ہو اور چاہو تو بند گاڑی میں سفر کے دوران بھی بات چیت کے لیے موقع مناسب نہیں سمجھتے۔"

کافی دنوں بعد راحیلہ سے آمنے سامنے نوک جھونک ہو رہی تھی شاید اس لیے میں اس میں زیادہ الجھ گیا تھا اور ہوٹل سے روانہ ہوتے وقت میں بہت عجلت میں تھا چنانچہ ایئرپورٹ کی طرف آتے وقت بھی اور اب واپسی کے دوران بھی میں اس بات کا کوئی خاص خیال نہیں رکھ سکا تھا کہ میرا تعاقب تو نہیں ہو رہا تھا۔ ویسے بھی جب میں تعاقب کے سلسلے میں چوکنا رہتا تھا تو زیادہ تر گاڑیوں پہ ہی نظر رکھتا تھا۔ موٹر سائیکلوں پر میری توجہ کم ہی جاتی تھی۔

اس روز خاصے طویل عرصے کے بعد مجھے اچانک احساس ہوا کہ تعاقب تو موٹر سائیکلوں پہ بھی کیا جاسکتا تھا۔ خصوصاً طاقت ور قسم کی موٹر سائیکلوں پر تعاقب اور بعض وارداتوں میں بہت سی آسانیاں حاصل ہو جاتی تھیں۔ گاڑی تو پھر بھی رش یا تنگ جگہ میں پھنس جاتی ہے۔ موٹر سائیکل کو تو نکلنے کے لیے بہت کم جگہ درکار ہوتی ہے اور لہریے دار راستہ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔

ان سب باتوں کا احساس مجھے قدرے تاخیر سے ہوا۔ اس وقت ہم اس سرراہے پر پہنچ چکے تھے جہاں راشد منہاس روڈ آکر شاہراہ فیصل سے ملتی تھی۔ مجھے سگنل پر رکنا پڑا تھا اور اسی لمحے عقب سے دو ہیوی قسم کی موٹر سائیکلیں گاڑی کے عین آگے آکر دائیں بائیں طرف سے یوں ترچھی ہو کر رک گئیں کہ اگر میں اسی لمحے خطرے کا احساس ہونے پر گاڑی نکالنا بھی چاہتا تو نکال نہیں سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے گاڑی کو پہلے ریورس کرنا اور پھر پہلا گیئر لگا کر دائیں یا بائیں موڑ کر تیزی سے نکلنے کی کوشش کرنا پڑتی جس کے لیے چند سیکنڈ درکار تھے اور میرے پاس شاید چند سیکنڈ کی بھی مہلت نہیں رہی تھی۔

دونوں موٹر سائیکلوں پر دو دو نوجوان تھے۔ پیچھے بیٹھے ہوئے دونوں نوجوانوں کے پاس وہ چرمی کیس تھے جن میں گٹار رکھے جاتے ہیں اور موٹر سائیکلوں کے رکنے تک وہ ان کی زپ کھول چکے تھے۔ افسوس کا مقام یہ تھا کہ ان کیسوں سے گٹاروں کے بجائے عدد کلاشنکوفیں نمودار ہو رہی تھیں۔ موٹر سائیکلیں چلانے والے نوجوان اپنی جگہ پر ہی جمے رہے اور انہوں نے موٹر سائیکلیں بھی اسٹارٹ ہی رکھیں۔ دوسرے دونوں نوجوانوں کا گنیں نکالنے اور موٹر سائیکلوں سے اترنے کا انداز ہی بتا رہا تھا کہ وہ کسی کمانڈو

کم نہیں تھے۔

شہر میں جس طرح کاریں چھیننے یا کار سواروں کو لوٹنے کی وارداتیں عام تھیں اس کے پیش نظر یہ بھی سمجھا جاسکتا تھا کہ شاید ان نوجوانوں کا اسی طرح کا کوئی ارادہ تھا اور اگر ہم اس بات کا یقین ہونے تک کوئی ایک ردّعمل ظاہر نہ کرتے تو چند نہایت قیمتی سیکنڈ بھی ضائع ہو جاتے تھے لیکن میری کسی حس نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ لوگ گاڑی چھیننے یا لوٹنے کی نیت سے نہیں رک رہے تھے۔ بات اس سے کچھ بڑھ کر تھی۔

سڑک پر اس وقت ... نہیں تھا اور اس لیے تو مجھے یوں لگا جیسے سڑک اچانک ... ہو گئی تھی۔ وہ ... والے تو سگنل پر رکنے بھی ... تھے شاید گڑبڑ کے آثار محسوس کرتے ہی سگنل توڑ کر نکلتے چلے گئے تھے۔ کچھ شاید بلا ضرورت ہی راشد منہاس روڈ کی طرف مڑ گئے تھے۔ کچھ کی طرف شاید میری توجہ بھی نہیں جاسکی۔ میری توجہ تو درحقیقت صرف ان نوجوانوں پر تھی جو نہایت پھرتی سے گنیں نکال کر گاڑی سے ذرا آگے دائیں بائیں دونوں طرف ایک ایک گھٹنے کے بل سڑک پہ کھڑے ہو گئے تھے۔

مجھے یہ بھی احساس تھا کہ راحیلہ اور ٹونی کے پاس اس وقت ہتھیار نہیں ہوں گے۔ جہاز سے سفر کرتے وقت ہم لوگ الجھنوں سے بچنے کے لیے احتیاطاً ہتھیار ساتھ نہیں رکھتے تھے۔۔۔ ٹونی تو پچھلی سیٹ پر نیم دراز تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ موٹر سائیکلوں سے اترتے ہوئے نوجوانوں کو دیکھ بھی پایا تھا یا نہیں۔ میرے پاس تو اتنا بھی وقت نہیں تھا کہ انہیں کوئی ہدایت دے سکتا۔ بمشکل چار یا پانچ سیکنڈ میں یہ ہوا تھا کہ موٹر سائیکلیں ہمارے سامنے آکر رک چکی تھیں اور نوجوان گٹار کے کیسوں سے گنیں نکال کر پوزیشن بھی سنبھال چکے تھے۔

میں ہلکی سی چیخ کے انداز میں صرف اتنا ہی کہہ پایا "راحیلہ۔۔۔ ٹونی۔۔۔"

مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑے گپ شپ کے موڈ میں بیٹھے آرہے تھے اور شاید وہ خاطرخواہ پھرتی سے فوری طور پر حرکت میں نہیں آسکیں گے لیکن میرا خیال غلط تھا۔ ان کے نام میری زبان پر بعد میں آئے' وہ اس سے پہلے ہی دروازے کھول کر باہر پھسل چکے تھے۔ ممکن ہے وہ گاڑی کے نیچے رینگ گئے ہوں۔ میں صرف انہیں ایک طرف کے دروازوں سے ہی اترتے دیکھ سکا۔ میں خود اس وقت اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اتر رہا تھا۔

یہ بھی غنیمت تھا کہ میں افراتفری میں بھی ہوٹل سے روانہ ہوتے وقت اپنا مشین پسٹل ساتھ لینا نہیں بھولا تھا۔ وہ اس وقت میرے ہاتھ میں آچکا تھا۔ مجھے اس وقت تک ان کے ارادے کا اندازہ ہو چکا تھا۔ وہ دو طرف سے اندھا دھند گاڑی پر فائرنگ کر کے اندر موجود ہم تینوں افراد کو ہلاک کر دینا چاہتے تھے۔ ہمیں اغوا کرنے کی کوشش کرنا' کوئی دھمکی دینا یا کسی بھی قسم کی کوئی بات کرنا ان کا مقصد نہیں تھا۔ وہ یہ کارروائی ایک آدھ منٹ کے اندر اندر مکمل کر کے انہی موٹر سائیکلوں پر فرار ہو جانا چاہتے تھے۔ اسی لیے ان کے ساتھیوں نے موٹر سائیکل اسٹارٹ ہی رکھے تھے اور وہ ان کے ہینڈل ہی تھامے بیٹھے تھے۔ وہ اس کارروائی میں اور کسی بھی انداز سے حصہ نہیں لے رہے تھے۔

اس قسم کی کارروائیوں میں عموماً اچھے بھلے تجربہ کار لوگ بھی گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے' چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہوں کی طرح مارے جاتے ہیں اور شاید ہمارا بھی یہی حشر ہوتا۔ ہم صرف ایک دو سیکنڈ کے فرق سے بازی پلٹ سکتے تھے۔ اگر بقا کی آرزو میں وہ ایک دو سیکنڈ ہمارے پلڑے میں پڑ جاتے تو زندگی کی روشنی ہمارے ہی سروں پہ رہتی اور اگر یہ ایک یا دو سیکنڈ ان کے پلڑے میں چلے جاتے تو بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ہم بھی موت کی تاریک وادیوں میں اتر جاتے اور ہمارے خون میں نہائے ہوئے جسم گاڑی میں پڑے رہ جاتے۔

انہیں ایک یا دو سیکنڈ کی تاخیر ہو گئی۔ وہ پوزیشن لے کر گنیں سنبھالنے کے بعد شاید ٹریگر دبانے ہی والے تھے جب میرے مشین پسٹل نے نہایت معمولی سی آواز کے ساتھ چار گولیاں اگلیں۔ نہایت منصفانہ طریقے سے دو دو گولیاں دونوں نوجوانوں کے حصے میں آئیں اور وہ ٹریگر دبانے کی حسرت دل میں لیے سڑک پر ڈھیر ہو گئے۔ دونوں کا انداز تقریباً یکساں ہی تھا۔ دونوں کی ایک ایک ٹانگ ان کے نیچے مڑ کر رہ گئی تھی اور چہرے اذیت سے بگڑ کر رہ گئے تھے۔ ایک کی گن ذرا دور جا گری تھی۔ دوسرے کی اس کے اپنے سینے پر ہی آگری تھی۔

موٹر سائیکل سوار نوجوانوں کے بارے میں' میں الجھن میں ہی رہ گیا کہ انہیں بھی شوٹ کر دیا جائے یا زندہ پکڑنے کی کوشش کی جائے۔ میرے اس ایک لمحے کے تذبذب کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ "زوں" کی زوردار آواز کے ساتھ بیک وقت ہوا ہو گئے۔ ان کا یہ ردّعمل میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ میرا تو خیال تھا کہ اپنے ساتھیوں کو ڈھیر ہوتے دیکھ کر شاید وہ بھی کہیں سے ہتھیار نکالیں گے اور موٹر سائیکلوں سے اتر کر اپنے ادھورے رہ جانے والے مشن کی تکمیل کی کوشش کریں گے لیکن انہوں نے تو انہیں گرتے دیکھتے ہی موٹر سائیکلیں گولی کی رفتار سے بھگانے کی کوشش کی تھی۔

میں گاڑی سے نکل کر پہلو کے بل سڑک پر گر چکا تھا۔ میں سیدھا کھڑا ہوا تو ٹونی۔۔۔ کو میں نے گاڑی کی اوٹ سے برآمد ہوتے دیکھا۔ راحیلہ گاڑی کے عقب میں پہنچ چکی تھی۔ وہ بھی وہاں سے نکل آئی۔ انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ بات ختم ہو گئی تھی۔ یہ شاید ہماری زندگی کا کسی سے مختصر ترین ٹکراؤ تھا جو زندگی کا خطرناک ترین۔۔۔ اور شاید آخری ٹکراؤ بھی ثابت ہو سکتا تھا کیونکہ اس وقت ہمیں اس قسم کے کمانڈو ایکشن کی ذرا سی بھی توقع نہیں تھی۔

اگر ہمیں بے پروائی اور غفلت کی حالت میں بھی کوئی مصیبت سامنے دیکھ کر بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آنے کی مشق نہ ہوتی تو آج ہمارا پتا صاف ہوچکا ہوتا۔ اپنی تمام تر پھرتی کے باوجود بھی ہم بال بال ہی بچے تھے۔ پھرتی ان نوجوانوں نے بھی کچھ کم نہیں دکھائی تھی۔ بس شاید قسمت نے ہی ان کا ساتھ نہیں دیا تھا۔

میں نے کافی وثوق سے فرض کرلیا تھا کہ راحیلہ اور ٹونی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوگا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان دونوں کے ہاتھوں میں تقریباً ایک جیسے دو چھوٹے چھوٹے اور چپٹے پستول نظر آرہے تھے۔ میں نے انہیں گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس وقت تک سڑک پر گرنے والے دونوں نوجوان خفیف سے جھٹکے لے کر ساکت ہوچکے تھے اور موٹر سائیکلوں پر فرار ہونے والے دونوں نوجوان نظر سے اوجھل ہوچکے تھے۔

میں نے ان کا تعاقب کرنے کے بارے میں ایک لمحے کے لیے سوچا لیکن پھر خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کردیا۔ گاڑی میں بیٹھ کر دو ہیوی موٹر سائیکلوں کا تعاقب کرنا ایک بے کار سی کوشش تھی۔ خصوصاً جبکہ انہیں آگے نکلنے کا موقع بھی مل چکا تھا اور اس سڑک پر آگے جا کر دائیں بائیں مڑنے کے لیے کئی راستے تھے۔

اس سے پہلے کہ کوئی صحیح طور پر سمجھ پاتا کہ وہاں کیا ہوا تھا میں نے راحیلہ اور ٹونی کے بیٹھتے ہی پسٹل جیب میں رکھا اور اسٹیئرنگ وہیل سنبھالا۔ دروازہ بند کرتے ہوئے میں نے دیکھا ابھی نوجوانوں کا خون سڑک پر پھیلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ دونوں کی لاشیں ایک دوسرے سے اتنے فاصلے پر پڑی تھیں کہ میں ان کے درمیان سے گاڑی گزار سکتا تھا۔ اس دوران میں سگنل بھی کھل چکا تھا۔ صرف سگنل بند ہونے اور کھلنے کے درمیانی وقفے میں یہ سب کچھ ہوچکا تھا۔

گاڑی اسٹارٹ ہی تھی لیکن اب میں نے سیدھے جانے کے بجائے اسے غلط لین سے راشد منہاس روڈ کی طرف موڑلیا۔ اب گاڑی کو ذرا اِدھر اُدھر گھما پھرا کر لے جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے رفتار بھی بڑھا دی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ بولی "تم نے تو لاشوں پر ایک نظر ڈالنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ کیا تم نے پہچان لیا تھا، وہ کون تھے؟"

"نہیں۔" میں نے جواب دیا "لیکن میرے لیے یہ جاننا اہم نہیں تھا کہ وہ کون تھے۔ وہ تو محض مہرے تھے اور مہروں کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ زیادہ ضروری یہ جاننا ہوتا ہے کہ کس مہرے کو کون سا ہاتھ حرکت دے رہا ہے۔ اس کا مجھے اندازہ ہوچکا ہے۔"

"کون ہے وہ؟" راحیلہ نے دریافت کیا۔

میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ جشید کریم کے گرگے تھے۔ اس کا طریقۂ واردات بھی میری سمجھ میں آتا جارہا تھا۔ اس نے دراصل اپنے مستقل گرگے پالے ہوئے نہیں تھے جن سے اس کی کوئی باقاعدہ وابستگی ظاہر ہوتی۔ وہ ضرورت پڑنے پر کام کی نوعیت کے حساب سے بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کی خدمات حاصل کرتا تھا۔ بعض اونچے درجے کے دھندے باز اس طریقۂ کار کو زیادہ محفوظ اور صاف ستھرا سمجھتے تھے۔ وہ خود گروہ باز بننے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔ بوقتِ ضرورت ماہر اور مشاق لوگوں کی خدمات معقول معاوضے پر حاصل کیں اور اپنا کام کروالیا۔ اگر کام نہ بنا اور معاملہ بگڑ گیا تو ہاتھ جھاڑ کر، منہ پھیر کر لاتعلق ہوگئے اور وقفہ دے کر اسی طرح کے دوسرے پیشہ وروں کی خدمات حاصل کرلیں۔ اس قسم کے لوگوں کی اگر کوئی واردات ناکام ہو بھی جاتی تھی اور کوئی ہرکارہ کسی کے ہتھے چڑھ بھی جاتا تھا تو خدمات حاصل کرنے والا صاف مکر سکتا تھا کہ اس کا تو اس شخص سے کوئی تعلق نہیں، اس نے تو کبھی اس کی شکل تک نہیں دیکھی... اور یہ سچ بھی ہوسکتا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ جشید کریم خود ہی براہِ راست اس قسم کے پیشہ ور ڈاکوؤں، ڈاکوؤں یا دہشت گردوں کی خدمات حاصل کرتا ہو۔ یہ خدمت انجام دینے کے لیے بھی بہت سے دار ہوں گے۔ جشید کریم جیسے لوگ اپنی حیثیت صاف ستھرا رکھنے والے معزز آدمی کی سی رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جبکہ جمال سعیدی کا معاملہ ذرا مختلف معلوم ہوتا تھا۔ وہ خاص وفادار آدمیوں کی ایک چھوٹی سی مستقل فوج اپنے گرد رکھنا پسند کرتا تھا جو اس کے اشارے پر کچھ بھی کر گزرتے ہوں اور پکڑے جانے کی صورت میں اپنی جان سے گزر جاتے ہوں گے لیکن اپنے آقا کے خلاف زبان نہیں کھولتے ہوں گے۔ طریقۂ کار مختلف ہی سہی لیکن اصل میں دونوں ایک ہی تھے۔ بوقتِ ضرورت اپنے اپنے طریقۂ کار کے مطابق ایک دوسرے کے بھی کام آتے ہوں گے۔ یہ جو مجھ پر تازہ حملہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، یہ ممکن تھا کہ اس کا انتظام تو جشید کریم نے کیا ہو لیکن اشارہ سعیدی ہی کی طرف سے ملا ہو کہ یہ شخص کچھ زیادہ ہی ہماری راہ میں روڑے اٹکاتا نظر آرہا ہے، اس کا پتا صاف کردو۔

"تمہیں محض نام بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے اطمینان سے کہا "بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اطمینان سے جب تم دونوں کو تفصیل سے سب کچھ بتاؤں گا تب معاملہ سمجھ میں آئے گا۔"

اس نے ہلکا سا ہنکارا بھرا اور ٹراؤزر کا پائنچا ذرا اونچا کرکے اپنا پستول پنڈلی سے بندھے ہوئے چھوٹے سے ہولسٹر میں رکھنے لگی۔ ٹونی بھی اپنا پستول شاید ایسے ہی کسی ٹھکانے پر پہنچا چکا تھا۔ راحیلہ سیدھی ہوتے ہوئے بولی "یہاں تو ہمارا استقبال ہی عجیب طریقے سے ہونے لگا تھا۔ لگتا ہے حالات واقعی خاصے خراب ہیں۔" اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"تم شاید اب تک یہی سمجھ رہی تھیں کہ میں مذاق کررہا ہوں اور یہ دراصل تمہیں لاہور سے اپنے قریب بلانے کا بہانہ تھی۔ خوش فہم ہو تم...!" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گاڑی گلشن جمال کے قریب سے اسٹیڈیم کی طرف جانے والی سڑک پر موڑ لی۔

"حقیقت کو خوش فہمی قرار دے کر اپنی کھسیاہٹ مٹانے کا بڑا اچھا موقع ملا ہے تمہیں۔" راحیلہ نے سر ہلایا "لیکن مجھے زیادہ غصہ مت دلانا۔ پستول میں نے رکھ ضرور لیا ہے لیکن وہ میری رسائی سے دور نہیں ہے۔"

"چند لمحے پہلے موقع پڑنے پر تو تم دونوں کے یہ پستول کوئی کام نہیں دکھا سکے۔" میں نے انہیں ذرا چھیڑا۔

"ہم گن نکالنے میں ہماری نسبت ذرا پھرتی دکھا گئے۔ اس پر اترانے کی ضرورت نہیں۔" راحیلہ منہ بنا کر بولی لیکن حقیقت یہ سنجیدگی سے صفائی پیش کرنے کی ایک کوشش تھی۔

"اُستاد بہرحال استاد ہی ہوتا ہے۔" عقب سے ٹونی کی آواز آئی۔

"ٹونی! خدا کے لیے باس کو مکھن لگا لگا کر اس کا دماغ خراب مت کرو۔ اس کا دماغ جتنا خراب ہے اتنا ہی کافی ہے۔" راحیلہ اس کی طرف مڑ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی "میں تم سے پہلے بھی دست بستہ گزارش کرچکی ہوں۔"

"بھئی میں تو باس کا طرف دار ہوں، باس ہی کی طرف رہوں گا۔" ٹونی نے اطمینان سے جواب دیا۔

ہم اس طرف جارہے تھے جہاں یہ سڑک کارساز کی طرف آنے والی سڑک سے ملتی تھی۔ ہم اس موڑ کے قریب پہنچے ہی تھے کہ مجھے حیرت کا ایک خفیف سا جھٹکا لگا۔ میں نے ان دونوں موٹر سائیکل سواروں میں سے ایک کو اس موڑ پر نمودار ہوتے ہوئے دیکھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر گاڑی کو بائیں طرف سڑک سے اتارتے ہوئے تقریباً روک ہی لیا۔ میرا خیال تھا شاید دوسرا بھی اس کے پیچھے ہی ہو لیکن وہ نظر نہیں آیا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ وہ اسی سڑک پر مڑ رہا تھا جس سے ہم آرہے تھے لیکن وہ دوسری طرف کی لین میں تھا۔ سڑک کچھ زیادہ چوڑی نہیں تھی اور ٹریفک کو دو سمتوں میں تقسیم کرنے کے لیے ان کے درمیان تقریباً ایک فٹ اونچی دیوار کھڑی تھی۔ موٹر سائیکل سوار دوسری طرف کی لین میں آندھی طوفان کی طرح اس طرف بڑھتا چلا گیا جدھر سے ہم آرہے تھے۔ شاید وہ کچھ حواس باختہ تھا یا پھر تیز رفتاری کی وجہ سے اس کی تمام تر توجہ موٹر سائیکل چلانے پر تھی۔ اس نے ہماری گاڑی کی طرف دیکھا تک نہیں تھا۔

ان دونوں موٹر سائیکل سواروں نے یقیناً اپنے راستے جدا کرلیے تھے اور ہماری ہی طرح ان کا مقصد بھی کچھ دیر اِدھر اُدھر ہونے کے بعد کسی خاص سمت میں نکلنا تھا۔ یہ موٹر سائیکل سوار شاید فیصل پر آگے جا کر کارساز سے مڑ گیا تھا اور اب اس متوازی سڑک پر ایک طرح سے واپسی کا سفر کررہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اس میں اس کی کوئی اور مصلحت رہی ہو۔ بہرحال یہ ایک دلچسپ اتفاق تھا۔

چند سیکنڈ بعد ہی مجھے یقین ہوگیا کہ دوسرا موٹر سائیکل سوار اس کے پیچھے نہیں آرہا تھا۔ تب میں نے تیزی سے گاڑی اس تنگ سی سڑک پر گھمائی اور اس کے پیچھے روانہ ہوگیا۔ اس وقت تک وہ کافی آگے جاچکا تھا۔ راحیلہ اور ٹونی نے بھی اسے موڑ پر نمودار ہوتے ہی دیکھ لیا تھا۔ راحیلہ نے بے اختیار دبی دبی سی آواز میں سیٹی بجائی تھی اور ٹونی آگے جھکتے ہوئے آہستگی سے بولا تھا "یہ تو وہی ہے۔"

میں نے اس وقت ان کے ردِعمل پر کوئی تبصرہ نہیں کیا تھا لیکن جب میں گاڑی موڑ کر اس کے تعاقب میں روانہ ہوچکا تو میں نے کہا "میں نے تو اپنی دانست میں انہیں نکل جانے دیا تھا لیکن ان میں سے اب یہ ایک پنچھی دوبارہ نظر آہی گیا ہے تو اس سے ملنے کی کوشش کر ہی لیتے ہیں۔ شاید قدرت نے کسی مصلحت کے تحت اسے اور ہمیں اس طرف بھیجا ہے اور اس طرح ہم سے اس کا سامنا کرایا ہے۔"

"بے شک... بے شک۔" راحیلہ نے بڑے زور و شور سے تائید میں گردن ہلائی۔ میں نے اسے گھورا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی توجہ دوبارہ سڑک پر مرتکز کرنی پڑی۔ وہ ایک تنگ، ناہموار اور کنارے سے ٹوٹی پھوٹی بے ہودہ سی سڑک تھی۔ موٹر سائیکل سوار اس پر اڑا چلا جارہا تھا۔ وہ ہم سے کافی آگے تھا لیکن میری نظر میں تھا۔ اس کی موٹر سائیکل ہر قسم کے راستوں پر سفر کرنے کے لیے موزوں تھی تاہم مجھے امید تھی کہ اس بار وہ ہماری نظر سے اوجھل نہیں ہونے پائے گا بشرطیکہ ہماری گاڑی ٹریفک میں یا کسی تنگ جگہ پر نہ پھنس جاتی۔

اچانک موٹر سائیکل کی رفتار کم ہوئی اور پھر میں نے اسے بائیں طرف مڑتے دیکھا۔ اس طرف خاصی دور تک ایک رہائشی علاقہ نظر آرہا تھا جو کچی آبادی ہی معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی حالت زیادہ خراب نہیں تھی اور یہ کافی عرصے سے آباد معلوم ہوتا تھا۔ سڑک کے کنارے بنے ہوئے تمام مکانات کے نیچے دکانیں موجود تھیں اور ایک گنجان آباد علاقے کے تمام لوازمات موجود تھے۔ مکانوں اور دکانوں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی سڑک کے کنارے کافی رونق دکھائی دینے لگی۔ آتے وقت بھی میں سڑک کے دوسری طرف سے اسی علاقے کے سامنے سے گزرا تھا لیکن اس وقت میں نے اس طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

جب میں اس مقام پر پہنچا جہاں سے میں نے موٹر سائیکل سوار کو بائیں طرف مڑتے دیکھا تھا تو اندازہ ہوا کہ وہ شاید اس آبادی کا سب سے بڑا بازار تھا۔ وہ بھی ایک کشادہ گلی سے زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس میں بھی دونوں طرف بیشتر جگہ دکانوں کے چبوترے، ٹھیلوں، خوانچوں وغیرہ نے روک لی تھی۔ کہیں کہیں

رکشے ٹیکسیاں بھی کھڑی تھیں۔ تاہم اتنی گنجائش باقی تھی کہ ہماری گاڑی جیسی ایک گاڑی آرام سے گزر سکتی تھی لیکن اگر سامنے سے دوسری گاڑی آجاتی تو مسئلہ پیدا ہوجاتا۔

میں اس نوجوان کو پانے کے سلسلے میں مایوس ہوگیا کیونکہ اس بازار میں دائیں بائیں اور شاید آگے بھی کتنے ہی تنگ راستے اور گلیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ موٹر سائیکل سوار کسی بھی پُرپیچ راستے پر غائب ہوسکتا تھا جبکہ میری گاڑی ان میں سے بیش تر گلیوں میں داخل بھی نہیں ہوسکتی تھی لیکن اس وقت مجھے ایک اور خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا جب میں نے اس نوجوان کو کافی آگے پان سگریٹ کی ایک دکان پر کھڑے دیکھا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی قریب ہی ایک بند دکان کے سامنے ترچھی کھڑی تھی۔

وہ ہماری طرف پشت کئے کھڑا تھا اور جس وقت میری اس پر نظر پڑی اس وقت دکان دار اسے سگریٹ کا پیکٹ تھما رہا تھا۔ میں نے جلدی سے گاڑی ترچھی کرکے کچھ ٹھیلوں اور ایک دکان کے چبوترے کی آڑ میں روک لی۔ اب اگر نوجوان پلٹ کر دیکھ بھی لیتا تو اسے گاڑی کا کچھ ہی حصہ دکھائی دیتا اور وہ اسے پہچان نہ پاتا۔ اس کے تو شاید وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ جس گاڑی کے مسافروں کو وہ اور اس کے ساتھی کچھ دیر پہلے موت کی نیند سلانے پہنچے تھے اور ناکام رہے تھے، اب وہی گاڑی اس کے تعاقب میں یہاں تک آن پہنچی تھی۔

اس قسم کے علاقوں میں زیادہ اچھی اور بیش قیمت گاڑی کچھ زیادہ ہی نمایاں دکھائی دینے لگتی ہے، لیکن غنیمت یہ تھا کہ اس کی طرف متوجہ ہونے والے بہت زیادہ لوگ بازار میں موجود نہیں تھے۔ صبح کا وقت تھا۔ ابھی گہما گہمی شروع نہیں ہوئی تھی۔ کچھ دکانیں تو ابھی بند ہی تھیں۔ میں گردن ترچھی کرکے اس نوجوان کو دیکھ سکتا تھا۔

وہ سگریٹ کا پیکٹ لے کر بند دکان کے سامنے آگیا تھا اور شٹر کی طرف منہ کرکے بے تابی سے ایک سگریٹ سلگا رہا تھا۔ گوکہ فاصلہ کافی تھا لیکن میں یہاں سے بھی اس کے ہاتھوں میں خفیف سا ارتعاش دیکھ سکتا تھا۔ مضطربانہ انداز میں دو تین کش لے کر اس نے شٹر کی طرف دھواں اگلا پھر شٹر کے کچھ اور قریب ہوتے ہوئے اس نے جیب سے ایک موبائل فون نکالا۔ دوسرے ہی لمحے وہ نمبر پنچ کرنے لگا۔ سگریٹ بدستور اس کی انگلیوں میں دبی ہوئی تھی۔

"راحیلہ.... ٹونی....!" میں نے نوجوان پر سے نظر ہٹائے بغیر نیچی آواز میں کہا "پیدل آگے جاکر اسے دونوں طرف سے کور کرو۔ میں گاڑی آہستہ آہستہ قریب لا رہا ہوں۔ اسے گاڑی میں بٹھانا ہے۔ کوشش کرنا تمہاری گنیں نظر نہیں آئیں۔ اگر شور مچانے کی کوشش کرے تو ختم کردینا۔"

وہ دونوں خاموشی سے گاڑی سے اُتر گئے۔ راحیلہ نے اپنا پستول جرسی کی جیب میں اور ٹونی نے جیکٹ کی جیب میں ہاتھ سمیت ٹھونس لیا تھا۔ وہ لاابالی سے انداز میں، نوجوان کی [illegible] دیکھنے کے بجائے دوسری طرف کی دکانوں کو دیکھتے ہوئے غیر[illegible] سی تیزی سے آگے بڑھے۔ چند لمحے بعد میں نے انہیں نوجوان [illegible] سر پہ پہنچتے دیکھا۔ وہ دائیں بائیں اس سے جُڑ کر کھڑے ہو[illegible] تھے۔ ٹونی کے ہونٹوں کی خفیف سی حرکت میں بہ مشکل ہی دیکھ [illegible]

اس وقت تک نوجوان موبائل فون کان سے لگا کر بات [illegible] کرچکا تھا لیکن اپنے پہلوؤں میں غالباً راحیلہ اور ٹونی کے پستول [illegible] چبھن محسوس کرتے ہی اس نے اضطراری سے انداز میں فون [illegible] سے ہٹالیا۔ ٹونی نے ہاتھ بڑھا کر نہایت اطمینان سے فون اس [illegible] ہاتھ سے لے لیا۔ اس نے ذرا بھی مزاحمت نہیں کی۔ ٹونی نے [illegible] اس کے آف کا سوئچ دبا کر اسے جیب میں ڈال لیا۔ اس وقت [illegible] میں گاڑی آگے بڑھا چکا تھا۔

نوجوان غالباً ٹونی کی ہدایت پر سڑک کی طرف گھوم چکا [illegible] سڑک کے کنارے کنارے دو چار قدم کا فاصلہ بھی طے کرچکا [illegible] میں نے گاڑی ان کے قریب لے جاکر روکی تو دیکھا نوجوان [illegible] زرد پڑچکا تھا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں سے چھوٹ کر نیچے [illegible] تھی اور وہیں پڑی سلگ رہی تھی۔ اس کی موٹر سائیکل بھی [illegible] کھڑی رہ گئی تھی۔

میں نے ہاتھ پیچھے لے جاکر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ [illegible] اسے تقریباً ریگتی ہوئی گاڑی میں دھکیل دیا۔ راحیلہ پہلے ہی [illegible] میں گھس چکی تھی اور ٹونی کے اس نوجوان کو دھکیلنے میں جو کمی [illegible] تھی، وہ اس نے پوری کردی۔ ایک ہاتھ میں وہ پستول جیب [illegible] نکال چکی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے نوجوان کو بازو [illegible] کر اندر گھسیٹ لیا۔ اس نے گاڑی میں داخل ہونے [illegible] مزاحمت تو نہیں کی تھی لیکن اس کے انداز میں تذبذب [illegible] تاہم ٹونی کے دھکیلتے ہی اس نے اپنے آپ کو گاڑی میں پایا۔

وہ ٹونی اور راحیلہ کے درمیان پھنسا بیٹھا تھا۔ [illegible] اس کی پسلیوں کے نیچے پستول ٹکے ہوئے تھے اور اس کی [illegible] پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ شاید وہ اسے کوئی ڈراؤنا خواب [illegible] اور اسے توقع ہو کہ ابھی اس کی آنکھ کھلے گی تو وہ در [illegible] مشن میں کامیابی کا منظر دیکھ رہا ہوگا۔ دروازہ بند ہوچکا [illegible] گاڑی کی رفتار بڑھا چکا تھا۔

کچھ ہی آگے آکر ایک موڑ پر مجھے گاڑی ریورس کر[illegible] مل گیا اور میں نے واپس ہولینا ہی بہتر سمجھا کیونکہ [illegible] بتدریج تنگ ہورہا تھا۔ شاید گزرنے میں دشواری [illegible] ہمیں راستہ بھی معلوم نہیں تھا۔ نہ جانے اس طرف سے نکلنے کا کوئی مناسب راستہ تھا یا نہیں۔ کسی کو شاید احساس بھی نہیں ہوسکا تھا کہ وہاں کیا ہوا تھا اور ہم [illegible] ہوچکے تھے۔

بازار سے نکل کر جونہی میں نے گاڑی راشد منہاس [illegible]

[illegible] موڑی، نوجوان نے شاید محسوس کیا کہ یہ اس کے لیے [illegible] آزمائی کا آخری موقع تھا۔ یہاں تک پھر بھی کچھ رونق تھی [illegible] آگے سڑک پر برائے نام ٹریفک تھا۔ چنانچہ اس نے لوگوں کو [illegible] کرنے کی غرض سے چیخنے کے لیے اچانک منہ کھولا لیکن ٹونی [illegible] کی طرف سے غافل نہیں تھا اور اس کے لیے اس قسم کی کوئی [illegible] غیر متوقع نہیں تھی۔ بجلی کی سی تیزی سے اس کا ایک بازو [illegible] اس کی گردن کے گرد حمائل ہوا اور ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ [illegible] کے حلق سے صرف "اوغ" کی آواز برآمد ہوسکی۔

میری نظر صرف ایک لمحے کے لیے عقب نما آئینے کی طرف [illegible] تھی اور اسی ایک لمحے میں مجھے یہ منظر دکھائی دیا۔ گاڑی سیدھی [illegible] پر لانے کے بعد میں نے ایک بار پھر عقب نما آئینے کی طرف [illegible] اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مجھے عقب سے ٹھک کی ہلکی [illegible] آواز سنائی دی تھی۔ میں نے دیکھا راحیلہ اپنے پستول کے دستے [illegible] طرح پھونک مار رہی تھی جیسے اسے مٹی لگ گئی ہو۔ نوجوان کی [illegible] کی ناکام کوشش پر اسے سبق سکھانے کے لیے راحیلہ نے بھی [illegible] کی کھوپڑی پر پستول کا دستہ رسید کردیا تھا۔

ادھر ٹونی کے بازو کا شکنجہ اس کی گردن کے گرد سخت تر ہوچکا [illegible] نوجوان کی آنکھیں حلقوں سے اُبل پڑ رہی تھیں۔ ٹونی کے [illegible] میں یہ اندازہ کرنا تو مشکل تھا ہی.... کہ وہ کن کن فنون میں [illegible] لیکن اس کے چھریرے جسم کو دیکھ کر اس کی طاقت کے بارے [illegible] اندازہ کرنا بھی کسی اجنبی کے لیے بہت مشکل تھا تاہم اب اس [illegible] کے شکنجے میں جکڑے جانے اور راحیلہ سے کھوپڑی پر پستول [illegible] کی ضرب کھانے کے بعد یقیناً اسے کافی حد تک اندازہ [illegible] تھا کہ وہ خاصے "غلط" قسم کے لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ [illegible] حلقوں سے ابھری ہوئی آنکھوں میں اب صرف دہشت [illegible] راحیلہ کے پستول کا دستہ کھوپڑی پر پڑنے کے بعد ان آنکھوں [illegible] یقیناً نیلے پیلے ستارے بھی ناچ گئے ہوں گے۔

"ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھنا۔" میں نے نرم لہجے میں ٹونی کو ہدایت [illegible] کہیں گردن نہ ٹوٹ جائے یا دم نہ گھٹ جائے۔ فی الحال اسے [illegible] رکھنا ہے۔ ابھی اس سے کچھ ضروری باتیں پوچھنی ہیں۔"

[illegible] اس کا ایک بازو راحیلہ نے قابو میں کر رکھا تھا۔ وہ اسے [illegible] کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ کوشش کرتا تب بھی کامیاب [illegible] ہوسکتا تھا۔ ٹونی نے شاید اپنی گرفت کچھ ہلکی کرلی۔

[illegible] کچھ دیر بعد ہم راشد منہاس روڈ پر جا پہنچے اور بائیں طرف کچھ [illegible] پہنچنے کے بعد ڈرائیو ان کے قریب سے میں نے گاڑی گلستانِ [illegible] کی طرف موڑ لی۔ مین روڈ پر فلیٹوں کے بڑے بڑے پراجیکٹس [illegible] سامنے تو کافی ٹریفک نظر آرہا تھا لیکن اگلی چورنگی سے میں نے [illegible] طرف گاڑی موڑی تو ویرانی کے آثار شروع ہوگئے۔ ان [illegible] میں کہیں کہیں گوٹھ، کہیں اِکا دُکا مکانات، کہیں زیرِ تعمیر منصوبے [illegible] تجاوزات تھیں مگر زیادہ تر زمین خالی تھی اور ہر طرف تقریباً ویرانی ہی دکھائی دیتی تھی۔

گاڑی کے شیشے تاریک تھے اس لیے ہمیں ٹریفک والی جگہوں پر بھی یہ اندیشہ نہیں تھا کہ پچھلی سیٹ پر کسی کی نظر پڑجائے گی اور وہ دیکھ لے گا کہ نوجوان کو کس پوزیشن میں لے جایا جارہا تھا۔ ان دنوں تو بھرے پُرے علاقوں میں سادہ اور شفاف شیشوں والی گاڑیوں میں بھی علی الاعلان کسی کو اس طرح لے جایا جارہا ہوتا تھا تو لوگ نظر بچاکر، کنی کترا کر گزر جاتے تھے۔ سب نے صرف اپنی اپنی بقا سے غرض رکھنے کا اُصول اپنالیا تھا اور دوسروں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ یہ نوجوان تو خیر پیشہ ور قاتل اور بدمعاش تھا۔ یہی سلوک آئے دن شہر کے گلی کوچوں اور بازاروں میں شریفوں اور بے گناہوں کے ساتھ بھی ہوتا رہتا تھا۔ محض کسی بے بنیاد اور احمقانہ سی مخالفت کی بنیاد پر بھی کسی کو یونہی اٹھا کر کسی لرزہ خیز انجام سے دوچار کرنے کے لیے لے جایا جاسکتا تھا۔

چند منٹ یونہی ویران سی سڑکوں پر چکرانے کے بعد میں نے ٹونی کو ہدایت کی "اس کی گردن چھوڑو.... البتہ اگر یہ چیخنے کی کوشش کرے تو گولی اس کے حلق میں اُتار دینا۔"

ٹونی نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ نوجوان کی اُبھری ہوئی آنکھیں کچھ نیچے ہوگئیں اور وہ تھوڑا سا کھانسنے کے بعد کچھ دیر ہانپتا رہا پھر بولا "تم لوگ مجھے کہاں لے جارہے ہو؟" اس کے حلق سے اس کوّے کی سی آواز نکلی تھی جس کا گلا کسی نے دبا رکھا ہو۔ میں سست رفتاری سے گاڑی ڈرائیو کررہا تھا اور وقفے وقفے سے عقب نما آئینے میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سخت وحشت زدہ دکھائی دے رہا تھا۔

"کہیں تو لے ہی جائیں گے میری جان۔" میں نے شیریں لہجے میں کہا "اتنے معمولی سے سوال پر اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

پھر میں نے ٹونی سے کہا "تم نے اس کی تلاشی نہیں لی۔"

ٹونی نے ایک ہاتھ سے گن اس کی پسلیوں پر ہی رکھی اور دوسرے سے اس کی تلاشی لینے لگا۔ راحیلہ نے اب اس کی کنپٹی پر گن رکھی ہوئی تھی۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے جینز کی بیلٹ میں اڑسا ہوا ایک ٹی ٹی اور ٹانگ سے بندھا ہوا ایک خوف ناک قسم کا خنجر برآمد ہوا۔ ٹونی نے مجھے اطلاع دی کہ اس کے علاوہ اس کے پرس میں ہزار ہزار کے بہت سے نوٹ بھرے ہوئے، بلکہ ٹھنسے ہوئے تھے۔ کچھ دوسری چھوٹی موٹی چیزیں اور سلیپنگ پلز کا ایک پتا بھی تھا۔ ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت میں کوئی مدد ملتی۔ اس قسم کے لوگ عموماً ایسی کوئی چیز اپنے پاس نہیں رکھتے تھے۔ خصوصاً کسی مشن پر روانہ ہوتے وقت تو وہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ ان کے پاس ان کی شناخت میں مدد دینے والی کوئی چیز موجود نہ ہو۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"رحمان۔" اس نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں اختصار سے جواب دیا۔

"کیسا افسوس کا مقام ہے...!" میں نے ٹھنڈی سانس لی "نام کیا ہے اور کرتوت کیا ہیں۔" پھر میں نے عقب نما آئینے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس سے پہلے بھی اسی طرح کمانڈو ایکشن کے ذریعے سرِ راہ... یا دوسرے طریقوں سے بہت سے لوگوں کو قتل کیا ہوگا؟"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ یک دم اس قسم کا اعتراف کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ راحیلہ نے اس طرح اس کا بازو مروڑا کہ بے اختیار اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ راحیلہ کھردرے لہجے میں بولی "صاحب نے تم سے کچھ پوچھا ہے۔ بہتر ہے راستے میں ہی سوالوں کے جواب دے دو ورنہ جہاں ہم تمہیں لے جا رہے ہیں وہاں سوال دوسرے طریقوں سے کئے جاتے ہیں۔ کوشش کرو کہ وہاں پہنچنے تک ہمارے پاس کوئی سوال باقی نہ بچے۔"

وہ اب بھی کچھ نہ بولا تو ٹونی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لگتا ہے یہ اپنا حشر خراب کرائے بغیر زبان نہیں کھولے گا۔" اس کے ساتھ ہی۔ ں کا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے نوجوان کے رخسار کی ہڈی پر ایک خاص ٹیکنیک سے گھونسا رسید کیا۔ وہ بُری طرح بلبلا اٹھا۔ دوسرے ہی لمحے اس جگہ سرخ ابھار نمودار ہونے لگا۔

"اسے وہیں لے چلتے ہیں...." میں نے معنی خیز لہجے میں کہا "وہاں دوسری بہت سی چیزیں موجود ہیں جن سے بڑے بڑے سخت جان سوراؤں کی زبانیں کھل جاتی ہیں۔"

تب وہ اچانک پہلے سے کہیں زیادہ خوف زدہ انداز میں تقریباً چلّا اٹھا "نہیں.... نہیں.... میں بتاتا ہوں.... ہاں.... ہم نے اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں کو قتل کیا ہے۔"

"کافی پیسے ملتے ہوں گے اس کام کے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا "کتنے؟"

"مختلف ریٹ ہیں.... اسامی کے حساب سے...." وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں اٹک اٹک کر بولا "کوئی چھوٹا موٹا آدمی ہو جس کے قتل پر زیادہ شور شرابا ہونے کا خطرہ نہ ہو تو ہم کم پیسوں میں کام کر دیتے ہیں.... جتنا بڑا اور اہم آدمی ہو.... یا جس کے قتل میں خطرہ زیادہ ہو.... کام مشکل ہو.... اتنے ہی پیسے زیادہ...."

"ہمیں ٹھکانے لگانے کے کتنے ملنے تھے؟"

"چالیس لاکھ۔" اس نے کراہنے کے سے انداز میں جواب دیا۔

"چالیس لاکھ....؟" میں واقعی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا "کافی بڑی رقم ہے۔"

"آپ بڑے آدمی ہیں نا...." وہ بولا۔

میں نے استہزائیہ سا قہقہہ لگایا اور راحیلہ کو مخاطب ک لو... ایک پیشہ ور قاتل گواہی دے رہا ہے کہ ہم بادولت بڑ ہیں اور ہم بادولت کی اتنی اوقات ضرور ہے کہ ہمارے قتل پر چالیس لاکھ خرچ کئے جا سکتے ہیں۔"

"بعض لوگوں کو تم نے جتنا تنگ کیا ہے اگر وہ افور ہوں تو شاید چالیس کروڑ میں بھی تمہارا پتا صاف کرا ہو جائیں۔" راحیلہ منہ بنا کر بولی پھر اس نے رحمان کے با تکلیف دہ سا جھٹکا دے کر اسے اذیت ناک انداز میں ک مجبور کیا اور پوچھا "تمہیں ملنے تھے یہ چالیس لاکھ؟"

"نہیں...." وہ تکلیف زدہ سے انداز میں بولا "ہم چا صرف پانچ پانچ لاکھ ملنے تھے۔ باقی آدھی رقم کچھ دوسرے جاتی تھی۔ کئی جگہ حصہ تقسیم ہوتا ہے۔ ایڈوانس ہم ایک ایک لاکھ لیا تھا۔"

"کس نے یہ کام تمہارے سپرد کیا تھا؟" میں نے پوچھ

"احمد کمال نامی ایک شخص نے۔" اس نے جواب د

میرا اندازہ درست ثابت ہوا تھا۔ اس حملے کی کڑیا کریم سے ہی جا کر ملی تھیں۔ احمد کمال اس کا سیکریٹری باڈی گارڈ بھی تھا۔ شاید اس قسم کے کام کرانے کے لیے کے لوگوں سے رابطے کا ذریعہ وہی تھا اور وہی معاملات تھا۔ تاہم میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا "یہ احمد کمال کو

"بس.... کوئی امیر آدمی معلوم ہوتا ہے.... میں ا نہیں جانتا۔ ہمارا گینگ لیڈر اسے زیادہ جانتا تھا۔ اس ہمارا اس سے تعارف ہوا تھا۔ اس کے بعد سے جب ضرورت ہوتی ہے وہ خفیہ فون نمبروں کے ذریعے ہم سے رابطہ کرلیتا ہے۔" اس نے اٹک اٹک کر بتایا۔

"بہت خوب۔ یعنی تمہارا باقاعدہ کوئی گینگ اور ا لیڈر بھی ہے۔" میں نے طویل سانس لی "کون ہے وہ پایا جاتا ہے؟"

"اس کا نام نور ہے.... وہ آج کل ہانگ کانگ ہے۔"

"واہ! ایک کا نام رحمان.... ایک کا نام نو رکھی تم نے اپنے ناموں کی۔" میں نے سر ہلایا "اچھا اسی طرح اچانک گولیوں سے چھلنی کر دیتے ہو یا کچھ کو ا بھی مارتے ہو؟"

"اگر ٹارچر کر کے مارنے کا آرڈر ملے تو اس ط ہیں.... جیسا حکم ملے۔" اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے گارمنٹ فیکٹری وغیرہ میں موصول ہونے والے آرڈر کا ہو.... کہ صاحب! جیسا کپڑا تیار کرنے کا آرڈر آتا ہے کر دیتے ہیں۔"

"تم چاروں کے علاوہ گینگ میں اور کتنے آدمی ہی

پوچھا۔

"ہم چاروں اور گینگ لیڈر نور کے علاوہ تین لڑکے اور تھے۔ ان میں سے ایک پولیس کے ہاتھوں مرچکا ہے اور دو دشمنوں کے ہاتھوں۔" اس نے جواب دیا۔

"دو آج اس خاکسار کے ہاتھوں مارے گئے جسے آج تم لوگوں کے تازہ ترین شکار بننے کا شرف حاصل کرنا تھا۔" میں نے کہا۔

"اور ہم ساتھ میں یونہی بونس میں مارے جاتے۔" راحیلہ نے لقمہ دیا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "گینگ لیڈر ہانگ کانگ بھاگا ہوا ہے۔ اس کا مطلب ہے اب صرف ایک تم رہ گئے ہو اور ایک وہ جو دوسری موٹر سائیکل پر کسی طرف نکل گیا ہے؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا تو میں نے پوچھا "ٹھکانا کہاں ہے تمہارا؟"

"بہت سے ٹھکانے ہیں۔ ہر علاقے میں ہم نے کسی فلیٹ یا مکان پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ جیسے حالات اور جیسا موقع ہوتا ہے وہاں جا گھستے ہیں۔"

"بہت خوب! ٹونی! سن لو۔۔۔ یہ ہے زندگی گزارنے کا صحیح طریقہ۔" میں نے کہا۔

"یس سر! یہ ایک عظیم انسان ہے۔ ہمیں اس کو سیلیوٹ کرنا چاہیے۔" ٹونی بولا۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر اسے سیلیوٹ کرو۔ اس کا کافی مالی نقصان بھی ہوگیا ہے وہ بھی پورا کردو۔" میں نے عقب نما آئینے میں ٹونی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کی خدمات حاصل کرنے والا تو اب اسے بقیہ ادائیگی نہیں کرے گا کیونکہ کام پورا نہیں ہوسکا لیکن تم اسے ادائیگی کردو۔ یہ بھی ایک انوکھی مثال ہوگی۔ شکار نے خود اپنے قتل کا معاوضہ ادا کیا۔ ہم نقدِ جاں تو اس کی خدمت میں پیش نہیں کرسکے۔ کچھ کیش اس کی خدمت میں پیش کردو۔"

یہ کہتے ہوئے میں گاڑی کچے میں اُتار چکا تھا۔ کچھ آگے کافی بڑے رقبے میں گھنی جھاڑیاں پھیلی دکھائی دے رہی تھیں۔ دور تک ویرانی کا راج تھا۔ میں نے جھاڑیوں کے قریب گاڑی لے جا روکی۔ وہاں زمین بہت ناہموار تھی۔ راحیلہ جلدی سے اتر کر اگلی سیٹ پر آگئی۔ ٹونی نے اسی طرف کے کھلے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحمان سے کہا "جاؤ۔"

"کہاں۔۔۔؟" اس نے بے اختیار احمقانہ سے انداز میں پوچھا۔

"ابے گدھے! ہم تجھے چھوڑ رہے ہیں۔" ٹونی دانت پیس کر بولا۔

شاید اس کے لہجے کی سفاکی سے خوف زدہ ہو کر رحمان دروازے کی طرف کھسک گیا۔ جونہی وہ منہ پھیر کر اُترنے لگا ٹونی نے اس کی پیٹھ پر ایک زوردار لات رسید کی۔ وہ اوندھے منہ جھاڑیوں میں جا گرا۔ ٹونی قدرے بلند آواز میں بولا "یہ سیلیوٹ تھا۔۔۔ اور یہ ہماری طرف سے کیش ہے۔۔۔" یہ کہہ کر اس نے دو فائر کیے۔ ویرانے میں فائروں کا دھماکا زیادہ بلند محسوس ہوا۔ نوجوان اس وقت کانپتے ہاتھ پیروں سے اٹھنے کی کوشش کررہا تھا جس وقت دو گولیاں اس کی کھوپڑی میں اتر گئیں۔ وہ جھاڑیوں کے درمیان ہی ڈھیر ہوگیا۔

"اس کی امانتیں بھی واپس کردو۔" میں نے ٹونی سے کہا۔ اس نے نوجوان کا موبائل فون اور اس کا نوٹوں سے بھرا ہوا بٹوہ اس کی لاش پر پھینک دیا اور میں نے گاڑی واپسی کے لیے موڑ لی۔

راحیلہ پلٹ کر دیکھتے ہوئے تاسف سے بولی "تم نے بے چارے کو بالکل ہی مروا دیا۔"

"تو کیا تمہارے خیال میں آدھا یا چوتھائی مروانا چاہیے تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ دیر تو اور ساتھ رکھتے۔ کچھ اور پوچھ گچھ کرتے تو کچھ اور مفید باتیں معلوم ہوتیں۔ معلومات میں اضافہ ہوتا۔" وہ بولی۔

"اتنا وقت نہیں تھا۔ یہ معاشرے کی غلاظت تھی جلدی اس سے پیچھا چھوٹ گیا اتنا ہی اچھا ہے۔ اسے کہاں ساتھ اٹھائے پھرتے۔ وقت کم ہے، مقابلہ سخت۔ اس غلاظت تو بہت بڑھ چکی ہے۔ ہم مکمل صفائی تو نہیں کرسکتے مکمل صفائی تو کوئی بھی نہیں کرسکتا۔ ہمارے پاس تو مزید تفتیش کرکے اس کے مزید کسی ساتھی تک پہنچنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ ہم زیادہ باریکیوں میں جانے کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ اپنے ایک شبہے کی تصدیق کرنا تھی۔ وہ ہوگئی۔ وہی سب سے ضروری کام تھا۔"

وہ کندھے اچکا کر رہ گئی اور خاموشی سے کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ پستول ایک بار پھر اس کے ہولسٹر میں تھا۔ ٹونی بھی اب خالی ہاتھ دکھائی دے رہا تھا اور یوں اطمینان سے سیٹ پر نیم دراز تھا جیسے اس نے بہت دیر سے اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کی تھی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ بولی "یہاں آتے ہی دم لینے کا بھی موقع نہیں ملا۔ آتے ہی کام سر پر اور وہ بھی بہت مختلف قسم کا کام۔۔۔!"

"اسی لیے تو تمہیں یہاں بلوایا ہے۔ تم سے کاغذی کام تھوڑا ہی کروانا تھا۔ کاغذی اور دفتری کام کرنے والے بھی بہت ہیں۔" میں نے کہا۔

"کاغذی اور دفتری کام ہمارے لیے کام تھوڑا ہی ہے وہ تو آرام ہوتا ہے۔" راحیلہ نے اعتراف کیا۔

"میں نے یہی سوچا کہ آرام کر کر کے تمہاری بڈیوں کو زنگ لگ گیا ہوگا۔ جوڑ کڑکڑانے لگے ہوں گے۔ بڑھاپے میں ویسے بھی حالت اچھی نہیں رہتی۔ یہاں ذرا تمہاری فزیو تھراپی ہوجائے گی۔" میں نے کہا۔

"تم خود اپنی فزیو تھراپی کرانے لاہور کیوں نہیں آگئے؟" وہ بولی۔

"وہاں فی الحال کوئی مسئلہ جو درپیش نہیں تھا۔ جہاں کام ہوگا وہیں توجہ دینی پڑے گی نا۔ یہاں مسائل در مسائل نکلے ہوئے ہیں۔ ایک چکر کی جڑ سے دوسرا چکر برآمد ہو رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"مسائل اور چکروں کی تو خیر وہاں بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ صرف تمہارے آنے کی دیر تھی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "جہاں تم ہوگے وہاں مسائل ہی مسائل ہوں گے۔ چکر ہی چکر ہوں گے۔ تمہارے تو پاؤں میں بھی چکر ہے اور قسمت میں بھی۔ عجب چکردار سی قسمت پائی ہے تم نے۔ پیدائشی طور پر ہی چکروں میں خود کفیل معلوم ہوتے ہو۔"

"دل کے پھپھولے پھوڑنے کی مشق شروع کردی؟" میں نے اسے گھورا۔

"مشق تو بہت پرانی ہے۔ میں کبھی آؤٹ آف پریکٹس ہوئی ہی نہیں۔" وہ اطمینان سے بولی "البتہ تمہیں شاید عادت نہ رہی ہو۔ اتنے دنوں بعد سامنا ہوا ہے۔"

"میری عادت بھلا کیسے چھوٹ سکتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے میں مسلسل ہی تمہاری جھک جھک سن رہا ہوں۔ اتنے دن آمنا سامنا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ٹیلی فون پر تو رابطہ رہتا ہی تھا۔ اس پر بھی کام کی بات کم اور اسی قسم کی جھک جھک زیادہ سننے کو ملتی تھی۔" میں نے تکلیف زدہ سے انداز میں کہا۔

"خدا کا شکر ادا کرو کہ تمہیں یہ جھک جھک سننے کو ملتی ہے۔ تم خوش نصیب ہو۔ کہیں تم پر ایسا وقت نہ آجائے کہ یہ جھک جھک سننے کے لیے ترسا کرو۔" وہ درویشانہ انداز میں بولی۔

"مانا کہ بڑھاپے کے باعث قبر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہو لیکن نہ جانے کیوں اس کے باوجود وہ وقت بہت دور لگتا ہے جب تمہاری جھک جھک سے نجات ملے گی۔ اس لیے خواہ مخواہ ایسی دل خوش کرنے والی باتیں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے اپنے لہجے سے مایوسی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

اس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورا اور گویا دانت کچکچا کر بولی "یہ آج تمہیں مجھ کو بڑھیا ثابت کرنے کا اس قدر شوق کیوں چرایا ہے؟"

"میں کب ایسی کوشش کررہا ہوں۔ حقائق تو حقائق ہی ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات انہیں ثابت کرنے کی کوشش نہیں کرنی پڑتی۔" میں نے جواب دیا۔

باتیں کرتے ہوئے ہم لوگ یونیورسٹی روڈ پر پہنچ گئے اور میں نے گاڑی نیپا کی طرف موڑلی۔ راحیلہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی

"آج تو پورے شہر کا چکر لگا کر ہوٹل پہنچنا پڑے گا۔"

"شکر کرو کہ بات شہر کا چکر لگانے پر ہی ٹل گئی۔" پچھلی سیٹ سے ٹونی بولا "ورنہ شاید اس وقت ہماری روحیں عالمِ بالا کا چکر لگا رہی ہوتیں۔"

"اب بھی ذرا ہوشیار رہنا اور پیچھے نظر رکھنا۔ اب کہیں کوئی اور پیچھے نہ چلا آرہا ہو۔ یہ جو اپنے افضل صاحب ہیں نا۔۔۔ ان میں مقناطیس کی سی کشش پائی جاتی ہے۔ لوگ کھنچے چلے آتے ہیں۔ بس ذرا تکلیف کی بات یہ ہوتی ہے کہ ان کے ہاتھوں میں اسلحہ ہوتا ہے۔" راحیلہ بولی۔

ٹونی ذرا ترچھا ہو کر بیٹھ گیا اور وقتے وقتے سے پیچھے نظر ڈالنے لگا۔ اب میں بھی چوکنا تھا اور عقب نما آئینے پر نظر ڈالتا جارہا تھا گو کہ مجھے اتنی جلدی کسی دوسری کوشش کا اندیشہ نہیں تھا۔

ہم خیریت سے ہوٹل پہنچ گئے۔ کاؤنٹر کلرک نے جلدی سے انہیں کمروں کے نمبر دیئے اور ایک پورٹر ان کے بیگ اوپر لے گیا۔ میں نے ان سے کہا "اب تم لوگ رات کے کھانے تک آرام کرسکتے ہو۔ رات کا کھانا آٹھ بجے ڈائننگ روم میں کھایا جائے گا۔ شفیع شاہ اور زرتاج بھی کھانے پر موجود ہوں گے۔ اس کے بعد میرے کمرے میں میٹنگ ہوگی۔ کل کا پروگرام طے کیا جائے گا۔ کوئی اعتراض؟"

"اعتراض کرکے ہمیں اپنی کھوپڑیاں نہیں تڑوانی ہیں۔" راحیلہ بولی "ایسے موقع۔۔۔ پر تو ہم جیسے فرماں بردار ماتحت "یس سر" کہہ کر پھرتی سے باس کو سیلیوٹ کرتے ہیں۔"

"اگر تم اتنی فرماں بردار ہوتیں تو ہماری زندگی کچھ اور ہی طرح کی ہوتی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ایک تو ناشکری کی باتیں کررہے ہو، اوپر سے اتنی ٹھنڈی آہیں بھر رہے ہو۔ ہم تمہارے پاس سے رخصت ہی ہوجائیں تو اچھا ہے۔" راحیلہ نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور ٹونی کے ساتھ لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ میں آفس کی طرف جانے لگا تھا لیکن مجھے یاد آیا کہ ابھی تو میں نے ناشتا بھی نہیں کیا تھا۔ میں ڈائننگ ہال میں جا بیٹھا۔

ناشتے کے بعد میں نے شفیع شاہ کو فون پر اطلاع دی کہ ٹونی اور راحیلہ آگئے تھے۔ میں نے اسے رات کے کھانے پر اکٹھے ہونے اور میٹنگ کے پروگرام کی بھی اطلاع دی پھر زرتاج سے رابطہ کیا۔ وہ گھر سے اپنی کچھ دفتری مصروفیات کے سلسلے میں نکلنے ہی والی تھی۔

"خیریت تو ہے۔۔۔ یہ آج علی الصباح منہ اندھیرے میری یاد کیسے آگئی اور فون کرنے کا خیال کیسے آگیا؟" اس نے حیرت سے پوچھا "ابھی تو صرف ساڑھے نو بجے ہیں۔ اس وقت تو تمہارے خوابوں کی درمیانی ریلیں چلتی ہوں گی شاید۔"

"غلط خیال ہے تمہارا۔ دنیا میں ایک تم ہی پنکچوئل نہیں ہو۔ کچھ لوگ تم سے بھی کہیں پہلے بیدار ہو کر نہ جانے کن کن

مراحل اور مسائل سے نمٹ کر دفتر میں بھی آن بیٹھتے ہیں اور کبھی کبھی تو انہیں راتوں کو سونا نصیب ہی نہیں ہوتا۔"

"اس کی وجہ تو خیر کچھ اور ہو سکتی ہے۔ راتوں کو سونا نصیب نہ ہونے کے پیچھے کئی عوامل کارفرما ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے ان کا تعلق پچھلے جنم میں پرندوں کی کسی خاص نسل سے رہا ہو۔ اس کے علاوہ ان کی مشکوک اور غلط سلط قسم کی سرگرمیاں بھی ان کے سونے کی راہ میں رکاوٹ ہو سکتی ہیں۔" وہ خاصے عالمانہ لہجے میں بولی "بہرحال تم نے اس وقت فون کر کے مجھے ایک خوشگوار حیرت سے دوچار کیا ہے۔"

"اب میں تمہیں چھوٹے سے ایک "ناخوشگوار صدمے" سے چار آٹھ کرنے والا ہوں۔ دراصل میں مجھے ایک چھوٹی سی مہم کے سلسلے میں تمہاری ضرورت آن پڑی ہے۔"

"مجھے تو پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی کام آن پڑا ہو گا جو ہم غریبوں کی یاد آ گئی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"ایک تو شاید دنیا کی تمام لڑکیوں کو موقع بے موقع طنز فرمانے اور ہر بات کا غلط مطلب اخذ کرنے کی عادت ہوتی ہے۔"

"خیر لڑکیوں کے معاملے میں تمہارے تجربے کو کون چیلنج کر سکتا ہے۔" اس موضوع پر زرتاج نے گویا فوراً ہتھیار ڈال دیئے۔

"اگر تمہیں میرے مطلب پرست ہونے کا اتنا ہی یقین ہے تو ٹھیک ہے... میں اس موضوع کو رہنے ہی دیتا ہوں۔ ہم تمہارے بغیر بھی کام چلا لیں گے۔" میں نے کہا۔

"اوہو... تمہیں تو خفا ہونا بھی آتا ہے۔ کاش میں اس وقت تمہاری صورت دیکھ سکتی۔" وہ گویا محظوظ ہوتے ہوئے بولی "اب باقاعدہ رونا مت شروع کر دینا۔ چلو... جلدی سے کام بتاؤ... شاباش..." اس نے گویا کسی بچے کو پچکارا۔

"تم نے خود ہی ایک مرتبہ پیشکش کی تھی کہ کسی مہم کے سلسلے میں اگر میری ضرورت پڑے تو میری خدمات سے بھی استفادہ کر لیا جائے۔" میں نے یاد دلایا۔

"ہاں۔ مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔ میں وعدہ کر کے بھولنے اور پیشکش کر کے واپس لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ کیا ابھی آجاؤں؟" وہ اطمینان سے بولی۔

"نہیں... خیر... اب اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ ابھی تو اس سلسلے میں صرف میٹنگ ہو رہی ہے۔ وہ بھی رات کو کھانے کے بعد..." میں نے بتایا "آج رات کا کھانا تم ہمارے ساتھ کھاؤ۔"

وہ ہنسنے لگی۔ میں نے اپنے لہجے سے ذرا خفگی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"ہنسی مجھے اس بات پر آ رہی ہے کہ تم ایک بے ہودہ سے آدمی ہو اور وہ کام بھی یقیناً بے تکا اور بے ہودہ سا ہی ہو گا لیکن تم اس کے لیے اتنی سنجیدگی سے ڈنر اور میٹنگ کا اہتمام کر رہے ہو جیسے دو بین الاقوامی کمپنیوں کے ایک دوسرے میں ضم ہونے کے لیے مذاکرات ہو رہے ہیں۔"

"اندازہ تو تمہارا درست ہے لیکن میں اپنی قومی روایات کے مطابق اسے تسلیم نہیں کروں گا۔ فرض کرو کام بے ہودہ بھی ہو تو اسے منظم طریقے سے اور تمیز سے کرنے کی صورت میں شان و شوکت پیدا ہو جاتی ہے۔"

"کتنا شوق ہے تمہیں شان و شوکت پیدا کرنے کا۔" استہزائیہ انداز میں مزید ہنس کر بولی "اگر کہیں نقب بھی لگا[ؤ] تو ذرا شان و شوکت سے لگایا کرو۔"

"ہاں... اگر وقت میسر ہو تو اس طرح کا کام بھی شان و شوکت سے کرنے میں کوئی حرج نہیں... البتہ ایمرجنسی ہو تو بات [اور] ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا کھانے پر شیطان کے... میرا مطلب ہے تمہارے سارے چیلے جمع ہو رہے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ صرف خاص خاص اور چیدہ چیدہ لوگوں کی [میٹنگ] ہے۔" میں نے بتایا "میں شفیع شاہ، تم... ٹونی اور راحیلہ [...] وہ دونوں بھی لاہور سے آ چکے ہیں۔"

"اچھا...!" وہ گویا کچھ چونکی۔ میں نے محسوس کیا [کہ] راحیلہ کے نام پر چونکی تھی لیکن اس سلسلے میں کوئی تبصرہ [کیے بغیر] بولی "بڑی خوشی کا مقام ہے کہ ہم بھی تمہارے خاص [الخاص] چیدہ چیدہ لوگوں میں شامل ہو گئے۔"

"بہت عرصے سے شامل ہو۔ تم تک اطلاع ذرا دیر [سے پہنچی] ہے۔ لائن میں کچھ خرابی ہو گی... تمہاری طرف۔"

"ہاں... لائن میں یہ خرابی ہے کہ جس پیغام کا انتظار [ہو وہ] اس لائن پر سنائی نہیں دیتا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے [کر بولی] "بہرحال... میں پہنچ جاؤں گی۔ میرے لائق اور کوئی خدمت؟"

"اوہ... اتنی سعادت مندی!" میں نے کراہ کر کہا "[جی چاہ] رہا ہے یہیں خوشی سے پھڑک کر جان دے دوں۔"

"ابھی اس قسم کی کوشش نہ کرنا۔" وہ مشفقانہ سے [انداز میں] بولی "ابھی دنیا میں نہ جانے کس کس کو تمہاری خدمت [کی ضرورت] ہے۔"

"یہ تمہارا حسن نظر ہے اور تم اس فدوی کی عزت [افزائی] کر رہی ہو ورنہ من آنم کہ من دانم۔" میں نے انکساری [سے کہا] "اس سے پہلے کہ فدوی فارسی کے ساتھ ساتھ [...] شروع کر دے، مجھے اجازت لے لینی چاہیے۔ خدا حافظ۔"

میں نے بھی اسے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع [کیا اور] لے کر لباس تبدیل کرنے کے ارادے سے اوپر [اپنے کمرے میں] آ گیا۔

اس روز مزید کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ شام [کو مقرر] شدہ وقت سے کچھ پہلے ہی ڈائننگ ہال میں جا بیٹھا۔ [تھوڑی دیر میں] شفیع شاہ بھی آ گیا۔ وہ بھی وقت سے پہلے آ گیا تھا۔ اس [نے]

کارگزاری کی رپورٹ دی۔ تہمینہ بدستور غائب تھی۔ دوسرے روز سے اخبارات میں درانی کے خلاف خبروں کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا۔

تھوڑی دیر بعد راحیلہ اور ٹونی بھی آ پہنچے۔ وہ اب پہلے سے زیادہ تازہ دم اور خوش لباس نظر آ رہے تھے۔ راحیلہ نے گویا وضاحت کی "میں تو بہت دیر سے تیار بیٹھی ہوئی تھی۔ ٹی وی پر ایک سڑا ہوا پروگرام دیکھ کر وقت گزار رہی تھی۔"

"کیوں... کیا تمہارے نیچے آنے پر کوئی سخت قانونی پابندی لگ چکی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے سوچا باس نے آٹھ بجے بلایا ہے تو آٹھ بجے ہی جائیں گے۔" وہ کندھے اچکا کر گھڑی دیکھتے ہوئے بولی "یہ چند منٹ پہلے بھی مجھے ٹونی لے آیا ہے۔ اس بے صبرے نے آ کر میرے دروازے پر دستک دے دی۔"

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" میں نے متاسفانہ انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا "چند منٹ پہلے آنے کے جرم میں تمہیں چودہ سال قید بامشقت کاٹنی ہو گی۔"

"رحم... میرے آقا...!" وہ میرے قریب کرسی پر بیٹھتے ہوئے گلوگیر سی آواز میں بولی۔

"اچھا جاؤ معاف کیا۔" میں نے شاہانہ انداز میں کہا "کیا یاد کرو گی کس باس سے پالا پڑا تھا۔"

"اور پھر پڑا ہی رہا تھا۔" اس نے لقمہ دیا۔

زرتاج ٹھیک آٹھ بجے پہنچی۔ وہ نہایت سادہ لیکن نفیس لباس میں تھی۔ ہمیشہ کی طرح منفرد اور خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے راحیلہ سے ہاتھ ملایا۔ راحیلہ اس کے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایک لمحے کے لیے دونوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان کے ہاتھ مضبوطی سے ایک دوسرے کی گرفت میں تھے اور ہونٹوں پر ملنسارانہ مسکراہٹ تھی۔ انہوں نے خاصی گرمجوشی سے ایک دوسرے کا حال دریافت کیا۔ میں دل ہی دل میں اپنے اس تاثر کو غلط قرار دینے کی کوشش کرتا رہا کہ اس گرمجوشی کی تہ میں کہیں سرد مہری کی لہر تھی۔

"کیا میٹنگ شروع ہو گئی؟" آخر زرتاج نے میرے مقابل بیٹھتے ہوئے دریافت کیا۔

"میٹنگ تمہارے بغیر کیسے شروع ہو سکتی تھی؟" میں نے کہا "ویسے بھی شاید تم ایجنڈا بھول رہی ہو۔ پہلے کھانا کھایا جائے گا۔ خالی پیٹ تو میٹنگ، میٹنگ کم اور قراردادِ تعزیت زیادہ معلوم ہو گی۔ ویسے بھی میٹنگ اوپر میرے کمرے میں ہونی ہے۔"

"یہ تمہیں اچانک میٹنگ میٹنگ کھیلنے کی کیا سوجھی؟ سیدھی طرح نہیں بتا سکتے تھے کہ مسئلہ کیا ہے... کام کیا ہے؟" زرتاج نے کہا پھر وہ جواب کا انتظار کیے بغیر بولی "مجھے تو بس یہ مل بیٹھ کر کھانا کھانے کا بہانہ لگتا ہے۔"

"کافی حد تک تم ٹھیک ہی سمجھی ہو۔ اصل مقصد تو مل بیٹھنا ہے لیکن ہم لوگوں میں ایک بُری عادت ہے کہ جب مل بیٹھتے ہیں تو کچھ نہ کچھ کر بھی گزرتے ہیں فی الحال تم صبر و سکون سے اپنے سامنے پڑے ہوئے مینیو سے اپنی پسند کی کھانے پینے کی چیزیں منتخب کرو۔ یہ گزارش باقی ساتھیوں کے لیے بھی ہے۔" میں نے ٹونی، شفیع شاہ اور راحیلہ کی طرف دیکھا۔

"تم یہ مؤدبانہ گزارش نہ کرتے تب بھی ہم یہی کام کرتے۔" راحیلہ اپنے سامنے سے مینیو اٹھاتے ہوئے بولی "میں نے تو دوپہر کا وقت بھی سو کر گزار دیا۔ یوں سمجھو کہ تمہاری اس ضیافت کے انتظار میں میں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔"

"اکثر عقلمند لوگ ضیافتوں اور شادی بیاہ کے کھانوں سے پہلے یہی کرتے ہیں۔" میں نے سرہلایا۔

کھانا خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ زرتاج کی آمد کے بعد چند لمحے کے لیے مجھے فضا میں ایک بے عنوان سی سرد مہری اور تناؤ کا احساس ہوا تھا۔ شاید وہ میرا وہم ہی رہا ہو، تاہم چند ہی لمحے بعد مجھے یوں محسوس ہوا جیسے وہ خفیف سی سرد مہری اور تناؤ اسی فضا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا پھر ہم سب میرے کمرے میں آ گئے۔ درحقیقت وہ کمرا نہیں سوئٹ تھا۔ اس کا آدھا حصہ ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ہم اسی میں تپائی کے گرد صوفوں پر بیٹھ گئے۔ ٹونی، راحیلہ اور زرتاج منتظر سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

چند سیکنڈ کے سکوت کے بعد میں نے کہا "تم تینوں تو اس طرح میری طرف دیکھ رہے ہو جیسے میں تقریر شروع کرنے والا ہوں۔"

"خدا نہ کرے جو تم بھی تقریر کرنے لگو۔" راحیلہ بولی "اور خدا ہم پر اتنا بُرا وقت نہ لائے کہ ہمیں تمہاری تقریر سننی بھی پڑے۔ اگر تم نے ایسی کوئی کوشش بھی کی تو ہم تمہیں اٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینک دیں گے۔"

"جس محفل میں صدرِ محفل کی یہ عزت ہو اس محفل سے تو واک آؤٹ کر جانا چاہیے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ چاروں بیٹھے ٹکر ٹکر میری طرف دیکھتے رہے۔

"کیا تم لوگ مجھے روکنے کی بھی کوشش نہیں کرو گے؟" میں نے امید بھرے لہجے میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" راحیلہ نے نفی میں سرہلایا۔

"لعنت ہے تم پر۔" میں نے یک دم دوبارہ بیٹھتے ہوئے کہا "جب کوئی روکنے والا ہی نہ ہو تو پھر جانے کی کوشش کرنے کا کیا فائدہ۔ ویسے بھی اس وقت میری کہنی میں درد ہے۔ میں واک آؤٹ کا پروگرام ملتوی کرتا ہوں۔"

"آج ہماری معلومات میں یہ گراں قدر اضافہ ہوا کہ تم کہنی کے بل واک آؤٹ کرتے ہو۔" راحیلہ نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"مذاق اور فضول بکواس بہت ہوچکی۔ اب میں تم لوگوں کو سنجیدگی سے سارا قصہ سنانا چاہتا ہوں" میں نے حقیقتاً سنجیدگی سے کہا "یہ ایک شہزادی کی کہانی ہے۔"

"ہم شہزادیٔ کہانی نہیں سنیں گے۔" راحیلہ نے فوراً میری بات کاٹی "یہ جن بھوتوں کا زمانہ ہے۔ ہمیں کسی جن بھوت کی کہانی سناؤ۔"

"ذرا صبر سے کام لو۔" میں نے اسے گھورا "اس کہانی میں بہت سے جن بھوت موجود ہیں.. بلکہ اصل میں یہ کہانی جنات ہی کی ہے۔ ایک ماڈرن اور صرف نام کی شہزادی تو اس میں صرف ڈیکوریشن کے لیے موجود ہے۔"

"ٹھیک ہے... پھر سناؤ" راحیلہ نے سرہلا کر گویا اجازت دے دی۔

"اور اب تم اپنی چونچ بند رکھنا ورنہ میں یہ جگ اٹھا کر تمہاری خالی کھوپڑی پر ماردوں گا۔" میں نے شیشے کے جگ کی طرف اشارہ کیا۔

"مانا کہ ہوٹل تمہارا اپنا ہے لیکن ایک جگ کا نقصان کیوں کرتے ہو۔" وہ ہمدردانہ لہجے میں بولی۔ میں نے اسے گھورنا جاری رکھا تو وہ مسکین سی شکل بناتے ہوئے بولی "اچھا... اب میں بالکل نہیں بولوں گی۔ پکا وعدہ۔"

میں نے انہیں پرنس سیمرا کے قتل سے شروع ہونے والے واقعات سنائے اور بتایا کہ کس طرح ان سب کا ایک دوسرے سے تعلق نکلتا چلا آیا تھا۔ شفیع شاہ تو ان تمام حالات سے آگاہ تھا۔ زرتاج کو بھی کچھ معاملات کا علم تھا لیکن اب وہ پوری کہانی سے باخبر ہورہی تھی۔ راحیلہ اور ٹونی کے لیے تو بہرحال یہ سارا قصہ نیا تھا۔ آخر میں، میں نے انہیں جمال سعیدی کے قلعہ نما مکان "نورنگ پیلس" میں اپنی "پیشی" کا واقعہ سنایا۔

تمام پس منظران کے علم میں آچکا تو میں نے کہا "فی الحال جو سب سے اہم کام درپیش ہے وہ نورنگ پیلس میں گھسنا ہے۔ مجھے وہاں جس تہ خانے کی جھلک نظر آئی ہے، مجھے شبہ ہے کہ وہاں کوئی بہت اہم چیز موجود ہے جو ہمیں جمال سعیدی کی اصل سرگرمیوں کا پتا دے گی۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے۔" راحیلہ بے پروائی سے بولی "کل ہی زبردست طریقے سے مسلح ہو کر چلتے ہیں اور اس مکان پر دھاوا بول دیتے ہیں۔"

"میں نے ایسے احمقانہ مشورے لینے کے لیے تمہیں اتنی دور سے نہیں بلوایا ہے۔" میں نے ایک بار پھر غصے کا اظہار کرنے کے لیے اسے گھورا "شاید تم بھول رہی ہو کہ اس قسم کے معاملات میں ہم ایسے تصادم سے گریز کرتے ہیں جس کا بہت شور شرابا ہو۔ لوگ اور ادارے اس طرف متوجہ ہوں اور مخالفین کے ساتھ ساتھ خود ہمارے آدمیوں کے بھی ہلاک یا زخمی ہونے کا امکان موجود ہو۔ اس طرح کے باقاعدہ تصادم کی نوبت تو ہم کبھی انتہائی مجبوری کی حالت میں آنے دیتے ہیں ورنہ ہماری پہلی ترجیح تو یہی ہوتی ہے کہ نہایت خاموشی سے اور بظاہر پُرامن سے انداز میں اپنا مقصد حاصل کرلیں۔ اگر مخالفین کو ٹھکانے بھی لگانا پڑے تو اس طرح لگایا جائے کہ زیادہ شور شرابا نہ ہو۔ لوگوں کو بعد میں ہی پتا چلے کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ ہماری کارروائی کے دوران لوگوں کی توجہ اس طرف مبذول نہ ہو۔ ہم نوعمر قسم کے بدمعاشوں اور دہشت گردوں کا گروہ بنائے نہیں بیٹھے ہیں۔ ہمارا مقصد تعمیری ہے۔"

"تعمیری مقصد کے لیے بھی کبھی کبھی تخریبی راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔" راحیلہ مسکرائی۔

"تخریب تو بہرحال اس میں بھی کچھ نہ کچھ ہوگی لیکن ہمیں اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹنا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا... یہ اس قسم کی کارروائی ہے۔" راحیلہ نے تفہیمی انداز میں سرہلایا "میں سمجھی تھی کہ اس قلعہ نما مکان میں گھسنے کے ساتھ ساتھ جمال سعیدی کو یہ بھی بتانا ہے کہ ہم بھی کچھ کم بدمعاش نہیں ہیں۔"

وہ یقیناً سب کچھ سمجھ رہی تھی۔ اسے اچھی طرح اندازہ تھا کہ میں کیا چاہتا تھا اور ہمارے طریقۂ کار میں کیا کیا مصلحتیں پیش نظر رکھی جاتی تھیں لیکن وہ بن رہی تھی۔ اب بھی چھیڑ چھاڑ کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھی لیکن بظاہر سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کررہی تھی۔

"وہ ہماری تمہاری بدمعاشی سے اتنی آسانی سے مرعوب ہونے والا نہیں ہے۔ وہ خود بہت بڑا بدمعاش ہے۔" میں نے کہا "بہت سے لوگ یہاں پہلے ہی چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں قائم کیے بیٹھے ہیں۔ اس نے بھی باہر سے آکر یہاں اپنی ایک چھوٹی سی بادشاہت قائم کرلی ہے۔ ہمارے اداروں کی کرپشن سے بھی اس نے یقیناً پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اسی لیے شاید اسے ہمارے ہاں کے قوانین اور پابندیوں وغیرہ کی کوئی خاص پروا نہیں ہے۔ دوسری بہت سی مصلحتوں کی وجہ سے اس نے اپنا وہ قلعہ نما مکان بھی ایسے علاقے میں بنایا ہے جو ابھی غیر آباد ہے۔"

"آپ کا منصوبہ کیا ہے؟" ٹونی نے دریافت کیا۔

میں نے تپائی پر موجود ایک بڑے سے کاغذ پر مارکر سے خاکہ بناتے ہوئے انہیں سمجھانا شروع کیا "اس مکان کے سامنے کی طرف سے کچھ فاصلے سے یہ ناہموار اور کچی پکی سی سڑک گزرتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ مکان میں سامنے کی طرف کہیں وڈیو کیمرے نصب ہیں جن کے ذریعے کسی بھی گزرنے والے یا مکان کے گیٹ پر پہنچنے والے کو دیکھا جاسکتا ہے۔ کسی کے بارے میں بھی ذرا سا شک وشبہ محسوس کرتے ہی یا کسی کو مشکوک انداز میں مکان کی طرف بڑھتے دیکھ کر وہ نہ صرف فوراً ہوشیار ہوجاتے ہیں بلکہ مکان کے احاطے میں اور پچھلی طرف موجود گارڈز کو بھی یک دم خبردار کرسکتے ہیں۔ ان کے درمیان رابطے کا کوئی ذریعہ موجود ہے۔"

"مکان کے سامنے کی طرف کوئی گارڈ نہیں ہوتا؟" ٹونی نے تصدیق چاہی۔

"نہیں۔ اپنی شان وشوکت اور مضبوطی سے قطع نظر یہ مکان کسی خصوصی اہمیت کا حامل نظر نہیں آتا۔ جمال سعیدی نے اپنی سی کوشش کی ہے کہ کوئی ایسا غیر ضروری کام نہ کرے جس کی وجہ سے مکان کی طرف لوگوں کی زیادہ توجہ مبذول ہو یا پھر شاید کسی غلط ارادے سے آنے والے کو زیادہ سے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا رکھنے کے لیے وہ سامنے والے گیٹ پر گارڈز تعینات نہیں رکھتا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس طرف وڈیو کیمروں کی آنکھیں ہی گارڈز کا کام دیتی ہیں اور ضرورت پڑنے پر چند سیکنڈ میں گارڈز پچھلی طرف سے آگے آجاتے ہیں۔ کوشش کی گئی ہے کہ عام حالات میں تمام مسلح افراد عام لوگوں اور راہ گیروں وغیرہ کی نظر سے اوجھل ہی رہیں۔ غیر ضروری توجہ سے بچنا بہرحال جمال سعیدی کی پالیسی معلوم ہوتی ہے۔"

وہ سب خاموش رہے۔ اب راحیلہ بھی سنجیدہ معلوم ہوتی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے سلسلۂ کلام جوڑا "ہمیں سامنے کی طرف سے تو مکان تک جانے کا رسک لینا ہی نہیں ہے تاکہ اندر موجود افراد کو قطعاً پتا نہ چلے کہ باہر کوئی آیا ہے۔ اگر اندر موجود افراد کو علم ہوگیا کہ باہر کچھ ایسے لوگ آئے ہیں جن سے انہیں کسی قسم کا خطرہ لاحق ہوسکتا ہے تو وہ نہ صرف قلعہ بند ہوسکتے ہیں بلکہ مقابلے کی صورت میں خاصی خونریزی کا بھی خطرہ ہے۔ اس طرح ہمارے لیے اپنا اصل مقصد پورا کرنا بھی تقریباً ناممکن ہوجائے گا۔"

"تمہارا ارادہ پچھلی طرف سے اوپر جانے کا ہے؟" زرتاج نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" میں نے خاکے میں نشان دہی کی "وہ کھلا علاقہ ہے۔ اگر ہم نے مکان کے دائیں بائیں پہلوؤں سے بھی وہاں تک پہنچنے کی کوشش کی تب بھی میرا اندازہ ہے کہ مکان کے عقب میں موجود مسلح محافظ ہمیں دیکھ لیں گے۔ اس لیے بہتر ہے کہ ان کی نظر میں رہتے ہوئے ہی اس طرح اُن تک پہنچنے کی کوشش کی جائے کہ انہیں خطرے کا احساس نہ ہو۔ صرف انہیں ہوشیار کیے بغیر ان کے قریب پہنچنے کے لیے ہمیں خاصا کھڑاگ کرنا پڑے گا۔ ہم ایک بار صرف انہیں خطرے کا احساس دلائے بغیر ان کے قریب پہنچ جائیں، پھر نہایت خاموشی سے انہیں قابو میں کرنا، بے ہوش کرنا یا ہلاک کرنا ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ قریب پہنچ کر مسلح جنگجو اور گوریلا ٹائپ لوگوں کو بھی قابو میں کرنا، بے ہوش کرنا یا ناگزیر حالات میں ختم کردینا آپ جیسے "ماہرفن" کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اسی لیے آپ کو خاص طور پر زحمت بھی دی گئی ہے ورنہ دوسرے ساتھیوں یا عام کارکنوں سے بھی کام چلایا جاسکتا تھا۔"

"مکھن لگانے کا شکریہ۔" راحیلہ ایک بار پھر بول اٹھی تاہم اس کے لہجے و انداز میں مکمل سنجیدگی تھی۔

"اگر اب تم نے کوئی غیر ضروری بات کی تو شاید تم یہ کہتی ہوئی پائی جاؤ کہ گھونسا مارنے اور بتیسی باہر نکالنے کا شکریہ..." میں نے کہا۔

"آخر تم اس میٹنگ کو اتنا غم ناک بنانے پر کیوں تُلے ہوئے ہو؟" وہ ملائمت سے بولی "پیٹ بھرے ہونے کے باوجود اب تو یہ تعزیتی اجلاس معلوم ہونے لگا ہے۔"

"غم والی اس میں کوئی بات نہیں۔ یہ ایک سنجیدہ مسئلہ ہے۔ ہم اس پر سنجیدگی سے غور کررہے ہیں۔ تمہارے سوا یہاں سب سنجیدہ ہیں۔" میں نے کہا۔

"واقعی...؟" اس نے باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھا پھر چہرے پر مسکینی طاری کرکے سر جھکاتے ہوئے بولی "میں سمجھی تھی کہ دل میں یہ سب ایسی ہی باتیں سوچ رہے ہیں جیسی میں زبان سے کررہی ہوں۔ آئی ایم سوری... ویسے میں جو کچھ بھی کہہ رہی تھی اپنی دانست میں سنجیدگی سے ہی کہہ رہی تھی لیکن اب میں آپ لوگوں کے نکتۂ نظر کے مطابق سنجیدہ رہنے کی کوشش کروں گی۔"

سنجیدہ نظر آنے کی کوشش میں درحقیقت وہ رنجیدہ نظر آنے لگی۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا "پیلس میں اندر اور باہر جو مسلح افراد موجود رہتے ہیں وہ قبائلی قسم کے افراد کی ایک پلٹن ہے۔ وہ دھن کے پکے، اسلحے پر سب سے زیادہ انحصار کرنے والے اور کرخت مزاج سے لوگ ہیں۔ جسمانی طور پر طاقت ور ضرور ہیں لیکن خالی ہاتھ زیادہ تیزی طراری دکھانے کے اہل نہیں ہیں۔ ہمیں سب سے زیادہ کوشش یہ کرنی ہے کہ انہیں اسلحہ استعمال کرنے کا موقع نہ ملے تاکہ اگر ایک طرف کوئی کارروائی ہورہی ہو تو دوسری طرف والوں کو پتا نہ چلنے پائے کیونکہ جو کچھ کرنا ہے صرف ہم پانچوں کو ہی کرنا ہے اور ایک جگہ رہتے ہوئے ہی کرنا ہے البتہ مکان کی اصل عمارت میں داخل ہونے کے بعد ہم مختلف سمتوں میں بکھر جائیں گے۔"

"آپ کو یقین ہے کہ مکان کے پچھلی طرف وڈیو کیمرے نصب نہیں ہیں؟" شفیع شاہ نے قدرے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے یقین ہے لیکن میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس سلسلے میں تم لوگوں کو میرے وجدان پر ہی بھروسا کرنا پڑے گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اپنے وجدان کے چکر میں ہمیں مروا نہ دینا۔" زرتاج بولی۔

"مارے جانے کا امکان تو اس میں ہر طرح سے موجود ہے۔ جس کو مارے جانے کا ڈر ہے وہ اپنے گھر ہی رہے۔" میں نے کہا۔

"خیر... ساتھ چلنے کا وعدہ کر کے گھر رہ جانے والے لوگ تو نہیں ہیں ہم افضل صاحب!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "آپ نے ابھی ہم کو آزمایا ہی نہیں ہے۔"

"واہ... واہ! کیا عمدہ مکالمہ بولا ہے۔ کسی فلم کی یاد تازہ ہو گئی ہے جو بچپن میں ڈیڑھ روپے والی کلاس میں بیٹھ کر دیکھی تھی۔" شفیع شاہ تالی بجانے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ٹونی نے بھی اس اشارے میں اس کا ساتھ دیا۔ زرتاج یوں آداب بجالائی جیسے اسے مشاعرے میں کسی اچھے شعر پر داد ملی ہو۔ راحیلہ کا چہرہ اس دوران میں پتھرایا ہوا سا رہا۔

"اب راحیلہ سنجیدہ ہوئی ہے تو تم لوگ مسخرے پن پر اُتر آئے ہو۔" میں نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ٹونی... شفیع شاہ! تم لوگوں سے یہ امید نہیں تھی۔ تم تو سنجیدہ انسان ہو۔"

"شاید قریب بیٹھے ہوئے لوگوں سے جراثیم لگ گئے ہوں۔" شفیع شاہ سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولا۔

زرتاج نے اسے گھور کر دیکھا کیونکہ اس کے قریب وہی بیٹھی تھی۔ پھر وہ بولی "تم تو خود ایک جراثیم ہو۔ تمہیں جراثیم بھلا کیا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔"

"جب دنیا میں انسان کو انسان سب سے زیادہ ضرر پہنچا سکتا ہے تو جراثیم کو جراثیم ضرر کیوں نہیں پہنچا سکتا۔" شفیع شاہ چیلنج کرنے والے انداز میں بولا۔

"انسان کی بات ہی کچھ اور ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے تم کنفیوشس بننے اور اس کے بارے میں فلسفہ جھاڑنے کی کوشش مت کرو۔ یہی کافی ہے کہ تم نے اپنے آپ کو جراثیم تسلیم کرلیا۔" زرتاج نے اسے جھاڑ پلائی۔

"ایسا اسمارٹ اور ہینڈسم جراثیم کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔" ٹونی بھی بول اٹھا۔

"تم نے بھی اپنے دوست کو مکھن لگانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔" زرتاج نے اس کی طرف دیکھ کر طنزیہ انداز میں گردن ہلائی "ویسے تم دونوں ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے... یا یوں کہو کہ ایک ہی پھیپھڑے کے جراثیم لگتے ہو۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے انہیں گویا اپنی موجودگی کا احساس دلایا اور شائستگی سے کہا "اگر آپ خواتین و حضرات کا اس جراثیمی بحث کو طول دینے کا ارادہ ہو تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔ میٹنگ پھر کسی دن پر رکھ لیتے ہیں۔ بشرطیکہ اس کی ضرورت باقی رہی۔"

"سوری... سوری۔" ان تینوں نے تقریباً ہم آواز ہو کر کہا اور ایک بار پھر سنجیدہ شکلیں بنا کر بیٹھ گئے۔ شفیع شاہ بولا "آپ کہہ رہے تھے کہ مکان کے پچھلی طرف وڈیو کیمروں کی موجودگی کا امکان نہیں ہے۔"

"البتہ مکان کی باؤنڈری وال کے اوپر چاروں طرف خاردار تاروں کا جنگلا بھی بنا ہوا ہے اور میرا اندازہ ہے کہ ان میں کرنٹ دوڑتا ہے۔" میں نے سلسلۂ کلام جوڑا "پچھلی طرف موجود مسلح محافظوں سے نمٹنے کے بعد ان تاروں کو کاٹنے کا بھی بندوبست کر کے چلنا ہوگا۔ کم از کم اتنا بڑا شگاف کرنا ہوگا کہ ایک ایک کر کے ہم سب خیریت سے گزر سکیں۔"

"یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجئے۔" شفیع شاہ بولا۔

"ہمیں تھوڑی سی بہروپ بازی بھی کرنی پڑے گی۔ اس کا بھی میں نے بندوبست کرلیا ہے۔ لاہور سے آفاق نے فون پر ایسا بندوبست کرا دیا ہے کہ ہمیں ہر سہولت حاصل ہو جائے گی۔ اگر ہم اپنے اصل حلیوں میں، خواہ گاڑی میں یا پیدل ان کے قریب پہنچتے ہیں تو وہ ہمارے پہنچنے تک بے پناہ مستعد ہوں گے۔ مجھے تو وہ شکل سے پہچان بھی لیں گے۔ ممکن ہے اس دوران میں وہ اپنے رابطے کے ذریعے سے اندر کسی کو مطلع بھی کردیں کہ ہم مکان کی طرف آرہے ہیں۔ صرف اسی سے بچنے کے لیے ہمیں ذرا بہروپ بازی کا ڈراما کرنا ہے ورنہ اس کی کوئی ضرورت نہ ہوتی۔ میں چاہتا ہوں ہم ان کے قریب اس طرح پہنچیں کہ وہ ہماری طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہ کررہے ہوں اور ہمارے بارے میں اندر اطلاع دینے کی زحمت نہ کریں۔ بہروپ بازی کے سب انتظامات ہو چکے ہیں۔ میں آج فون پر کنفرم کرچکا ہوں۔ ایک جگہ سب تیاریاں مکمل ہیں۔ اب ہمیں صرف یہ طے کرنا ہے کہ یہ چھوٹا سا آپریشن۔ یہ مائنر سرجری کب کرنی ہے۔"

"جو کام جتنی جلدی ہو جائے۔ اچھا ہے۔" زرتاج طویل سانس لے کر بولی "تاکہ مجھ جیسے پارٹ ٹائم خدائی فوجدار اپنی اصل مصروفیات جاری رکھ سکیں۔"

"ہم سب ہی پارٹ ٹائم خدائی فوجدار ہیں۔" شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا "فل ٹائم تو ہم صرف بزنس مین ہیں۔"

اس کے بعد کافی دیر تک ماحول کی سنجیدگی برقرار رہی اور میں نے انہیں جزئیات سمجھانا شروع کیں کہ کس طرح کیا کیا جائے گا اور اگر کوئی بات خلاف توقع ہو گئی تو اس صورت میں کیا کیا جائے گا۔ بات زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی۔ سنجیدگی سے بات ہوئی تو آدھا گھنٹے میں سب کچھ طے ہو گیا۔ اس کے بعد کافی منگوائی گئی اور ایک بار پھر خوش گپیاں ہونے لگیں۔

○☆○

دوسرے روز دوپہر کے کھانے کے فوراً بعد ہم پانچوں میری گاڑی میں ہوٹل سے روانہ ہوئے۔ شفیع شاہ ڈرائیو کررہا تھا۔ ہوٹل سے ہم لوگ سیدھے سراب گوٹھ سے کچھ فاصلے پر واقع ایک اسٹوڈیو میں پہنچے۔ وہاں سے مجھے فون پر اطلاع مل چکی تھی۔ افراد وہاں کچھ انتظامات کے ساتھ ساتھ ہمارے منتظر تھے۔ اسٹوڈیو میں اپنی صحیح شکلوں اور اصل حلیوں کے ساتھ داخل

ہوئے تھے لیکن جب ہم وہاں سے برآمد ہوئے تو ہمارے لیے ایک دوسرے کو بھی پہچاننا مشکل تھا۔ اسٹوڈیو سے نکلتے وقت ہم کار میں روانہ نہیں ہوئے۔ ہماری سواری بھی بدل چکی تھی۔ میری گاڑی گیٹ پر کھڑے ہوئے ایک شخص نے سنبھال لی جو حلیے سے ڈرائیور ہی معلوم ہوتا تھا۔ باہر اسٹوڈیو کے گیٹ کے قریب ایک انتہائی کھٹارا قسم کا ٹرک کھڑا تھا۔ اس کا پچھلا حصہ کھلا اور سپاٹ تھا۔ اس پر سیمنٹ کے بلاک لدے ہوئے تھے جن سے خاصا بڑا ایک چبوترا سا بن گیا تھا۔ اس چبوترے پر کنسٹرکشن میں کام آنے والا کچھ دوسرا چھوٹا موٹا سامان بھی تھا۔ بیلچہ، تسلا، مٹی میں لتھڑی ہوئی ایک بند بوری، حتیٰ کہ ایک پہیے والی ایک ہاتھ گاڑی بھی اوندھی رکھی ہوئی تھی۔ اسی طرح کا کچھ دوسرا کاٹھ کباڑ بھی تھا۔

اسی کاٹھ کباڑ کے درمیان جگہ بنا کر ہم پانچوں ٹرک پر چڑھ کر بلاکوں کے اوپر بیٹھ گئے۔ میں، شفیع شاہ اور ٹونی مزدوروں والے حلیے میں تھے۔ پھٹی پرانی اور سیمنٹ وغیرہ میں لتھڑی ہوئی بے ہنگم سی شلوار قمیصیں ہمارا لباس تھیں۔ میرے سر پر میلی سی ایک پگڑی، شفیع شاہ کے سر پر پرانی سی ایک گھسی پٹی سندھی ٹوپی اور ٹونی کے سر پر ایک میلی جال دار ٹوپی تھی۔ تینوں ہی کے چہروں پر مختلف اقسام کی مونچھوں کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔ میرے تو بائیں گال پر موٹا سا ایک مسّا بھی نظر آرہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی کچھ چھوٹی موٹی تبدیلیاں تھیں جنہوں نے ہمیں ہمارے جاننے والوں کے لیے بھی ناقابلِ شناخت بنا دیا تھا۔

زرتاج اور راحیلہ پتھر توڑنے والی عورتوں کے روپ میں تھیں۔ اپنے میلے کچیلے پھولدار سوتی گھاگروں اور چولیوں کے ساتھ وہ اپنی شخصیت میں اور بھی بہت سی تبدیلیاں لیے ہوئے تھیں۔ حتیٰ کہ ان کی سرخ و سپید رنگت کو بھی ان کے حلیوں کی مناسبت سے سانولا کر دیا گیا تھا۔ حلیے تبدیل ہونے کے بعد جب ہماری پہلی بار ایک دوسرے پر نظر پڑی تھی تو ہم سب کو خوب ہنسی آئی تھی۔ ٹرک پر سوار ہوتے وقت بھی ہم ہنس بول رہے تھے لیکن اب ہمارا انداز بدل چکا تھا۔ ہم محض خوش مزاج سے مزدور نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ سب نے اپنے لہجے اور زبان بھی حسبِ توفیق بدل لی تھی۔

سب سے زیادہ حیران مجھے زرتاج نے کیا تھا۔ اس کی تو چال ڈھال بھی بدل گئی تھی اور وہ اس حلیے میں سب سے زیادہ "جچ" رہی تھی۔ وہ تو نہایت روانی سے کچھ راجستھانی سی زبان بھی بولنے لگی تھی۔ میں نے ٹرک پر چڑھتے وقت جب اس سے کہا "بھئی تم تو اس گیٹ اپ میں بہت ہی جچ رہی ہو۔ خاندانی خانہ بدوش معلوم ہو رہی ہو۔" تو وہ کاجل بھری آنکھیں ذرا مٹکا کر تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اپنے کام سے کام رکھ رے چھورے۔ میرے ساتھ پٹر پٹر جبان چلانے کی جرورت نا ہے!"

اوپر پہنچ کر بیٹھنے کے بعد راحیلہ مجھے کہنی مارتے ہوئے بولی "خوش ہو جاؤ۔ تمہیں "چھورا" کہہ دیا ہے۔"

"کیا معلوم اس زبان میں چھورا دراصل چھوارے کو کہا جاتا ہوں۔" میں نے شک زدہ لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ مجھے معلوم ہے.... چھورا لڑکے کو کہتے ہیں۔" راحیلہ نے گویا مجھے تسلی دی۔

ٹرک حرکت میں آیا تو اس کے تمام انجر پنجر کھڑ کھڑا نے لگے۔ ایسا لگتا تھا کہ تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد ایک ایک چیز گرتی چلی جائے گی اور منزل پر پہنچنے تک صرف چیسز پر انجن اور اگلی سیٹ پر ڈرائیور باقی رہ جائے گا اور وہ بھی شاید بیٹھا نہیں ہو گا بلکہ گیئر پاؤں پھنسائے کھڑا ہو گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ٹرک اپنے تمام کھڑ کھڑاتے حصوں کو کسی نہ کسی طرح ساتھ لیے، ایک لڑی میں پروئے رواں دواں رہا۔ اسے ہمارا ہی ایک آدمی چلا رہا تھا لیکن وہ بھی ہم سے ملتے جلتے ہی حلیے میں تھا۔ کچھ فاصلہ چھوڑ کر ہمارا ہی آدمی میری گاڑی لیے آرہا تھا لیکن اب ہم اس سے اور وہ ہم سے بظاہر قطعی لاتعلق تھا۔

ٹرک کا کیبن اونچا نہیں تھا۔ اگر کوئی سامنے سے بھی دیکھتا تو اسے دور سے ہی اندازہ ہو جاتا کہ کنسٹرکشن کے سامان اور مزدوروں سے.... لدا ہوا کوئی ٹرک چلا آرہا تھا۔ ہمارے چاروں طرف سہارا لینے یا ٹیک لگانے کے لیے کوئی چیز نہیں تھی۔ ہم سب کاٹھ کباڑ کے درمیان پھنس پھنس کر گویا ایک بڑے سے تخت نما چبوترے پر بیٹھے تھے لیکن سب کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے برسوں سے اسی طرح سفر کے عادی چلے آرہے ہوں۔ زرتاج شاید اس ڈرامے میں حقیقت کا کچھ زیادہ ہی رنگ بھرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے خشک شدہ سیمنٹ سے لتھڑا ہوا ایک تسلا اٹھایا اور اسے دف کی طرح بجانے کی کوشش کرتے ہوئے گانے لگی:

تمہارے کاجر یو بنا کے اپنے نینن ماں بند کر لیوں
پھیر کہیں جانے نہ دیوں

دوسری گاڑیوں موٹر سائیکلوں وغیرہ کی نسبت ہم ذرا بلندی پر تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ گاڑیوں میں اور موٹر سائیکلوں پر کئی افراد گردنیں اٹھا اٹھا کر دلچسپی آمیز نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ زرتاج کی آواز گو کہ بلند نہیں تھی اور ٹریفک کے شور میں دوسرے لوگ تو اسے سن بھی نہیں سکتے تھے لیکن اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ گانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس کے انداز یا آواز کی نہیں تھی۔ بات کچھ اور تھی۔

دراصل زرتاج اور راحیلہ دونوں کی خوب صورتی کو مفلسانہ گیٹ اپ اور مصنوعی سیاہی میں چھپانے کی پوری کوشش تو کی گئی تھی لیکن وہ کم بخت ان حلیوں میں بھی اچھی پُرکشش لگ رہی تھیں۔ اب ان کی شخصیت میں کچھ اور طرح کی کشش پیدا ہو گئی تھی۔ اگر ہم تین "موئے پچھل موئے" ان کے ساتھ نہ ہوتے تو [illegible]

بھڑک اٹھنے کے عادی قسم کے حضرات ضرور ان کے پیچھے لگ جاتے یا کم از کم کچھ آوازیں تو ضرور کستے۔

میں نے نیچی آواز میں زرتاج سے کہا "بھئی.... گانے کی نہیں ہو رہی ہے۔ ہم اسٹوڈیو سے ضرور نکلے ہیں لیکن کسی فلم کی شوٹنگ نہیں کر رہے ہیں۔"

"بہت ہی بدذوق آدمی ہو تم۔" اس نے خفگی سے میری طرف دیکھا "میں تو چاہ رہی تھی کہ ایک خطرناک کام پر بھی ہم ہنستے گاتے اور بے فکری سے روانہ ہوں۔ اس کے علاوہ تمہیں اپنی اداکارانہ اور گلوکارانہ صلاحیتوں سے آگاہ کرنا مقصود تھا۔"

"میں آگاہ بھی ہو گیا اور قائل بھی ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"جیسے باس کی مرضی۔" اس نے کندھے اچکائے اور تسلا ایک طرف رکھ دیا۔ وہ اسے اپنی موٹی موٹی دھات کی چوڑیوں اور ہاتھ کی تھاپ سے بجانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"جو کچھ آپ گا رہی تھیں.... یا یوں کہیے کہ گانے کی کوشش کر رہی تھیں اس کا مطلب تو بتا دیجیے۔" ٹونی اس کی طرف ذرا جھکتے ہوئے نیچی آواز میں بولا۔

"کمال ہے! اتنے آسان سے بول آپ کی سمجھ میں نہیں آئے؟" زرتاج نے اس کی کم فہمی پر افسوس کیا۔ ٹونی نے مسکین سی شکل بنا کر نفی میں سر ہلایا۔

"اس کا مطلب ہے.... میں آپ کو کاجل بنا کر آنکھوں میں بند کر لوں اور پھر کہیں جانے نہ دوں۔" یہ ایک لڑکی کے اپنے محبوب کے لیے جذبات ہیں۔" زرتاج بولی۔

"آپ اتنی بھی وضاحت کی ضرورت نہیں۔" میں نے قریب سے کہا "وہ انہیں کسی قرض خواہ کے جذبات تو سمجھنے سے رہا۔ یہ اتنا کم عمر، کم عقل اور نادان نہیں ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے.... لیکن جو بات کسی سے پوچھی جائے اسے اچھی طرح سیاق و سباق کے ساتھ سمجھانا اس کا اخلاقی فرض ہے۔" زرتاج نے بڑے خلوص سے کہا پھر وہ دوبارہ ٹونی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی "آپ کے لیے کبھی کسی لڑکی نے ایسے جذبات کا اظہار کیا؟" ٹونی نے کوئی جواب دینے کے بجائے شرمیلے سے انداز میں سر جھکا لیا۔

"یہ بہت شریف، سیدھے اور "فول پروف" قسم کے نوجوان ہیں۔" میں نے ٹونی اور شفیع شاہ کی طرف اشارہ کیا "تم ان سے مشکل سوال کر کے انہیں امتحان میں مت ڈالو.... خصوصاً میرے سامنے۔"

"مجھے تو یہ اتنے شریف اور سیدھے نہیں لگتے۔" زرتاج تنقیدی نظر سے ان کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "اور شفیع شاہ کو تو خیر میں خاصی اچھی طرح جانتی بھی ہوں۔ میرے خیال میں تو یہ دونوں میسنے اور گھنے ہیں۔ ویسے بھی کوئی لڑکی اگر ان میں سے کسی کے سامنے اس قسم کے جذبات کا اظہار کر دے تو کیا یہ شریف اور سیدھے کے بجائے بدمعاش اور ٹیڑھے ہو جائیں گے؟"

ٹونی کے ساتھ ساتھ شفیع شاہ نے بھی سر جھکا لیا تھا۔ میں نے کہا "نہیں.... یہ تو ایسے ہی رہیں گے لیکن تم ان کے نفسیاتی تجزیے اور تحلیلِ نفسی وغیرہ کا کام اپنے ذمے مت لو۔"

"میں تو کوشش کر رہی تھی کہ یہ بے ہودہ سفر اچھے طریقے سے کٹ جائے مگر لگتا ہے تم کچھ کرنے ہی نہیں دو گے۔" زرتاج نے کہا پھر وہ راحیلہ کو کہنی مار کر بولی "بھئی تم ہی کوئی گانا وانا سناؤ۔ میرا گانا تو ان لوگوں سے برداشت نہیں ہوا۔ شاید تمہارا گانا برداشت ہو جائے۔"

"اس سے فرمائش مت کرو۔" میں نے جلدی سے کہا "یہ کہیں بے خیالی میں میڈونا وغیرہ کا کوئی گانا نہ شروع کر دے۔ آس پاس سے جو لوگ اسے تاڑتے ہوئے گزر رہے ہیں وہ شدید قسم کے شکوک میں مبتلا ہو جائیں گے۔"

"لفنگوں والا اندازِ گفتگو مت اختیار کرو۔" راحیلہ نے مجھے گھورتے ہوئے نیچی آواز میں غرانے کے سے انداز میں کہا۔ وہ اس وقت سنجیدہ نظر آنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی اور زرتاج کے بارے میں، میں نے محسوس کیا تھا کہ اس مرتبہ کی ملاقاتوں میں وہ راحیلہ سے اپنا رویہ نہایت دوستانہ اور بے تکلفانہ رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

ہم سپر ہائی وے کے بجائے یونیورسٹی روڈ کی طرف سے نورنگ پلیس جا رہے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اگر ہم پیچھے کی طرف سے مکان تک پہنچنا چاہتے تھے تو پھر یونیورسٹی روڈ کی طرف سے جانا بہتر تھا۔ ڈرائیور کو سب کچھ معلوم تھا اور بوقتِ ضرورت میں کھڑکی کی جھک کرا سے ہدایات بھی دے سکتا تھا۔ منزل کے قریب پہنچنے کے آثار شروع ہوئے تو متوقع صورتِ حال کے پیشِ نظر سبھی کو خاموشی اپنی لپیٹ میں لینے لگی۔ فقرے بازی، چھیڑ چھاڑ اور چہلیں بند ہو گئیں۔ یہ خوف نہیں بلکہ اس مہم میں اپنا اپنا کردار ادا کرنے کے خیال سے اعصاب میں ریگ بھرنے والا خفیف سا تناؤ تھا۔

یونیورسٹی روڈ پر بہت آگے جا کر ہم بغلی سڑک پر آچکے تھے پھر کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ٹرک نے اس سڑک کو بھی چھوڑ دیا۔ ایک زیرِ تعمیر ہاؤسنگ اسکیم کے عقب میں پہنچنے کے بعد ہم نے کھلے میدان میں سفر شروع کیا۔ ایک خاص سمت میں ٹرک رواں تھا اور غنیمت تھا کہ زمین زیادہ ناہموار نہیں تھی ورنہ رسیوں سے بندھے ہونے کے باوجود شاید بلاک اِدھر اُدھر کھسکنے لگتے اور ان کے ساتھ ہمارا بھی حشر خراب ہو جاتا۔

مکان ہمیں دور سے ہی نظر آگیا۔ دور سے وہ کافی چھوٹا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم اس کی عقبی دیوار کی سیدھ میں بڑھ رہے تھے۔ بظاہر ہم آڑے ترچھے بیٹھے تھے لیکن درحقیقت سب کی نظر مکان کی طرف ہی تھی۔ میں نے دور سے ہی دیکھ لیا، مکان کے عقب میں ایک ہٹ سا بنا ہوا تھا جس کے سامنے دو مسلح افراد ٹہلتے دکھائی

دے رہے تھے۔ ان کے کندھوں پر گنیں لٹکی ہوئی تھیں۔ قریب ہی دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ غالباً وہی گاڑیاں تھیں جن میں مسلح افراد نے مجھے اور صفیہ کو اس وقت روکا تھا جب ہم پہلی بار اس مکان کے سامنے سے گزرنے لگے تھے۔

ہم کچھ اور قریب پہنچے تو اندازہ ہوا کہ وہ ہٹ ایک باقاعدہ قسم کا گارڈ روم تھا۔ کافی بڑا ہٹ تھا۔ اسے "روم" کہنا بھی شاید صحیح نہیں تھا۔ وہ تو بجائے خود ایک مکان تھا۔ ٹہلتے ہوئے مسلح محافظوں نے بھی ٹرک کو دور سے ہی دیکھ لیا تھا اور ٹہلنا ترک کر کے اس کی طرف دیکھنے لگے تھے لیکن ان کے انداز میں تشویش نہیں تھی۔ فاصلہ کچھ کم ہونے پر شاید انہیں اچھی طرح اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ وہ کس قسم کا ٹرک تھا۔ شاید اس قسم کے ٹرک کبھی کبھار یہاں سے گزرتے بھی ہوں۔ اس کے باوجود انہوں نے غالباً آواز دے کر اپنے ساتھیوں سے کچھ کہا تھا کیونکہ ہٹ سے مزید تین مسلح افراد نکل کر باہر آن کھڑے ہوئے تھے۔

میرا اندازہ تھا کہ گارڈ روم میں کل یہی "نفری" تھی۔ اندر مزید کوئی آدمی نہیں رہا تھا۔ وہ بھی پانچ تھے اور ڈرائیور کو چھوڑ کر ہم بھی پانچ ہی تھے۔ ان کی تعداد ہمارے برابر ہونا ہمارے حق میں اچھا تھا۔ اس طرح ہمارا کام آسان ثابت ہونے کی امید تھی۔ وہ پانچوں بڑے انہماک اور یکسوئی سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے تاہم انہوں نے اپنی مختلف اقسام کی گنیں کندھوں سے نہیں اتاری تھیں بلکہ ان کے ہاتھ گنوں کی طرف بڑھے بھی نہیں تھے۔

مجھے یہی توقع تھی اور ان کے اسی ردِ عمل کے لیے ہم نے اتنا تردد کیا تھا۔ انہوں نے ٹرک اور اس میں سوار افراد کے بے ضرر ہونے کا تاثر لے لیا تھا۔ شاید انہیں یہ توقع بھی رہی ہو کہ ہم مکان کے قریب سے گزرتے چلے جائیں گے لیکن جب ہم انہی کی طرف بڑھتے چلے گئے تب بھی انہیں کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ بس وہ چوکنا کھڑے ہماری طرف دیکھتے رہے۔ ہمارے ڈرائیور نے ٹرک کی رفتار کافی کم کرلی تھی تاکہ ایک تو انہیں اچھی طرح ٹرک اور ٹرک سواروں کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے۔ دوسرے اس ویرانے میں ٹرک کی گھڑگھڑاہٹ زیادہ بلند نہ ہو۔ ہم چاہتے تھے کہ مکان کے اندر سامنے والے گیٹ کی طرف موجود محافظوں تک کسی بھی قسم کی کوئی آواز نہ ہی پہنچے۔ انہیں بھی کسی قسم کے تجسس یا تشویش میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے تھا۔

ٹرک ان لوگوں سے چھ سات قدم کے فاصلے پر ہی رک گیا۔ ہٹ کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا پھر بھی اس کا بیشتر حصہ باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا لیکن میں نے ٹرک پر بیٹھے بیٹھے کافی حد تک اندر کا بھی جائزہ لے لیا تھا۔ میرا اندازہ یہی تھا کہ اندر کوئی اور شخص موجود نہیں تھا۔ اس وقت وہاں یہی پانچوں محافظ تعینات تھے اور وہ پانچوں باہر آچکے تھے۔ ان میں سے تین تو وہی تھے جنہوں نے مجھے سامنے والی سڑک پر روکا تھا۔ اس وقت ان کے ساتھ ایک چوتھا شخص بھی تھا جو کلین شیو نوجوان تھا۔ وہ اس وقت نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی جگہ دوسرے دو محافظ موجود تھے۔

اچھی بات یہ تھی کہ انہوں نے ابھی تک نہ تو اپنی کلاشنکوفیں وغیرہ کندھوں سے اتاری تھیں اور نہ ہی آگے بڑھ کر ٹرک کو گھیرے میں لیا تھا جو ہمارے حق میں بہت اچھا تھا۔ اس کی وجہ یقیناً وہی تھی کہ ابھی تک انہوں نے ہماری طرف سے کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ وہ ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑے تھے۔ ان میں سے صرف ایک شخص کا ہاتھ اس کی گن پر تھا اور وہ آنکھیں سکیڑے ٹرک کا جائزہ لے رہا تھا۔

ہمارا ڈرائیور ٹرک میں ہی بیٹھا رہا۔ اسے صرف بات بگڑنے پر یا کوئی ایمرجنسی پیش آنے پر کچھ کرنا تھا ورنہ صرف ٹرک سنبھالے بیٹھے رہنا تھا۔ وہ ایک طرح سے ہماری "ریزرو فورس" تھا۔ سب سے پہلے میں چھلانگ لگا کر ٹرک سے اترا۔ میرے ہاتھ میں ایک مڑا تڑا خاک آلودہ کاغذ تھا۔ میں وہ لیے سیدھا اس محافظ کے پاس پہنچا جس کا ہاتھ گن پر تھا۔ اس کا چہرہ کچھ پھولا پھولا اور رنگت تانبے کی سی تھی۔ وہ ایک تند خو اور بد مزاج آدمی معلوم ہوتا تھا۔ جسمانی طور پر خاصا مضبوط تھا۔ جسمانی طور پر درحقیقت وہ سبھی خاصے مضبوط تھے۔

میں نے کاغذ محافظ کی طرف بڑھاتے ہوئے اور اپنا لہجہ پٹھانوں کا سا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "خوچہ! یہ حیات گل ٹھیکیدار کا بلڈنگ کدر بنتی اے؟ یہ اس کا ایڈریس اے مگر ام کو نئیں ملتی اے۔" اس کاغذ پر اسی علاقے کا ایک الٹا سیدھا ایڈریس درج تھا۔

وہ بھی ایک ہی کائیاں آدمی تھا۔ اس کا ایک ہاتھ بدستور گن پر رہا اور اس نے اپنا دوسرا خالی ہاتھ بھی کاغذ پکڑنے کے لیے نہیں بڑھایا۔ اس کی نظر بھی بدستور مجھ پر مرتکز رہی۔ اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اور ان کی گہرائیوں میں کہیں خفیف سا درندگی کی جھلک موجود تھی۔ اس کے باوجود ایک لمحے کے لیے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید اس کی تیز نظریں میرے بہروپ کے لوازمات کو ایک طرف ہٹاتے ہوئے میری اصل شکل دیکھ رہی تھیں۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ یہ شخص ان محافظوں میں سے نہیں تھا جو مجھے پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ اس کے باوجود اسے یہ شبہ ہو جاتا تو خطرے کا باعث ہوسکتا تھا کہ میں گیٹ اپ میں تھا۔

"کون ٹھیکیدار حیات گل۔۔۔؟" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ کافی روانی سے اور صحیح اردو بولنے پر قادر تھا۔ اس کی نظر بدستور میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ میں نے کسی سادہ لوح شخص کی طرح ذرا گڑبڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وہ ٹھیکیدار ہے۔۔۔ اس کا نام حیات گل اے۔ وہ اس ایڈریس پر بلڈنگ بناتی اے۔۔۔ اپی ام اور کیا بتائے کہ اسے

تمہیں کس نے بھیجا ہے؟" یہ سوال اچانک ہی اس نے پشتو میں کردیا تھا۔ میں اس کا سوال سمجھ گیا تھا اور پشتو میں اس کا جواب بھی دے سکتا تھا۔ تھوڑی بہت پشتو میری سمجھ میں بھی آتی اور تھوڑی بہت میں بول بھی سکتا تھا لیکن مجھے اس پر عبور نہیں تھا۔ بولنے سے میری پول بھی کھل سکتی تھی کہ پشتو میری زبان نہیں تھی۔ پشتو درحقیقت ان لوگوں کی بھی زبان نہیں تھی اس لیے اس امکان کی طرف میرا ذہن نہیں گیا تھا کہ کوئی اچانک پشتو میں مجھ سے کوئی سوال کرسکتا تھا۔ ظاہر ہے اول تا آخر میرے سارے اندازے درست ثابت نہیں ہوسکتے تھے اور میری تمام توقعات بھی پوری نہیں ہوسکتی تھیں۔

شاید میں ایک لمحے کے لیے سچ مچ گڑبڑا جاتا کیونکہ میں نے ذہن میں اس ڈرامے کا جو اسکرپٹ ترتیب دیا تھا' یہ اس سے مختلف ایک مکالمہ بیچ میں آن ٹپکا تھا۔ بہرحال کسی بھی قسم کی گڑبڑ کے امکانات کو میں نے ذہن میں رکھا تھا لیکن یہ درحقیقت کوئی خاص گڑبڑ نہیں تھی۔ میرے ساتھی بھی ٹرک سے اتر کر ہمارے قریب آن پہنچے تھے اور بظاہر ہونقوں کی طرح ہمارے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہے تھے لیکن درحقیقت ان میں سے ہر ایک غیر محسوس طور پر ایک خاص حکمتِ عملی کے ساتھ ایک ایک محافظ کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ یعنی ہم سب کو ایک وقت میں ایک ایک شخص سے ہی نمٹنا تھا اور یہ ہمارے لیے قطعاً کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ خصوصاً جبکہ گنیں ان کے ہاتھوں میں نہیں تھیں اور وہ فوری طور پر فائر کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

میں نے ایک نظر سرسری سے انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف بھی دیکھ لیا تھا۔ سب صحیح پوزیشن پر کھڑے تھے۔ ٹونی تو جیسے غیر ارادی طور پر ایک بیلچہ بھی ہاتھ میں لے کر آگیا تھا لیکن حقیقت میں یہ قطعاً کوئی غیر ارادی حرکت نہیں تھی۔ وہ جان بوجھ کر' سوچ سمجھ کر بیلچہ ساتھ لایا تھا۔ اس طائرانہ جائزے میں بھی میں نے محسوس کرلیا کہ زرتاج اور راحیلہ نے جن محافظوں کے قریب پوزیشن سنبھالی تھی وہ بڑی دلچسپی سے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ وہ باقی محافظوں کے مقابلے میں کم عمر بھی تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آگئی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ ان دونوں نے دو محافظوں نے بھی سر سے پاؤں تک ان کا جائزہ لیا ہو یا کم از کم کن انکھیوں سے ہی کچھ اندازے لگانے کی کوشش کی ہو۔ میں ان کے تاثرات پر نظر نہیں ڈال سکا۔ مجھے فوری طور پر دوبارہ اس محافظ کی طرف متوجہ ہونا پڑا جو منتظر انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی میرے چہرے سے نہیں ہٹی تھی اور اس کا ہاتھ گن سے نہیں ہٹا تھا۔ اس نے باقی لوگوں کی طرف بھی دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"تمہ خانہ خراب۔۔۔ ام کو۔۔۔" میں نے پشتو میں جواب دینے کے بجائے کہا اور ذرا پریشانی آمیز سے انداز میں اپنے سر تک ہاتھ لے گیا جس پر سختی سے پگڑی لپٹی ہوئی تھی جو بوقتِ ضرورت ہیلمٹ کا کام دے سکتی تھی۔

میرا سر کی طرف ہاتھ لے جانا ایک سگنل تھا۔ اس کے ساتھ ہی ویرانے میں ایک ساتھ ہی کئی مبہم سی آوازیں ابھریں۔ مجھے اپنی توجہ صرف اپنے شکار کی طرف مرتکز رکھنی پڑی۔ میرا پاؤں اچانک ہی مشینی انداز میں حرکت میں آیا تھا اور اس کے پیروں سے ذرا اوپر بیک وقت دونوں ٹانگوں سے ٹکرایا تھا۔ وہ اوندھے منہ گرا۔ اس کا ناک منہ سپاٹ ہونے میں شاید ہی کچھ کسر رہی ہو۔ اس سے پہلے کہ وہ ذرا بھی سنبھل پاتا' میں اپنے نیفے سے مشین پسٹل نکال چکا تھا۔ تیزی سے جھکتے ہوئے میں نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر اتنی قوت سے اس کا دستہ رسید کیا کہ دوسرے ہی لمحے مجھے اندیشہ محسوس ہوا شاید میں نے اس کی ہلاکت کا ساماں کردیا تھا۔ وہ ضرب کسی ہتھوڑے کی ضرب سے کم نہیں تھی اور اس کے سر کی ہڈی شاید ٹوٹ کر اندر دھنس گئی تھی حالانکہ سر کی ہڈی بہت مضبوط ہوتی ہے۔ اچھے بھلے سنگین حادثوں میں بھی مشکل سے ہی چٹختی ہے۔ قدرت نے اسے پورے جسم کو کنٹرول کرنے والی طاقت یعنی دماغ کی حفاظت کے لیے غیر معمولی طور پر مضبوط بنایا ہے مگر میری ضرب غیر ارادی طور پر کچھ زیادہ ہی زوردار ہوگئی تھی۔

بہرحال اس وقت اس کے طبی تجزیے کا موقع نہیں تھا۔ میں اور میرے ساتھی ہمیشہ غیر ضروری خونریزی اور ہلاکت خیزی سے ہمیشہ گریز کرتے آئے تھے۔ یہ ہماری زندگی کے اہم ترین اُصولوں میں سے ایک تھا۔ انتہائی ناگزیر حالات میں کوئی ہمارے ہاتھوں انجام کو پہنچتا تھا اور وہ عموماً کوئی ایسی شخصیت ہوتی تھی جس کے بوجھ سے نجات پاکر شاید بے زبان زمین بھی راحت محسوس کرتی تھی۔ اس مشن پر آتے وقت بھی میں نے محافظوں اور دوسرے لوگوں سے نمٹنے کے سلسلے میں اسی ہدایت کی یاددہانی کرائی تھی لیکن چونکہ ان لوگوں کے لیے میرے دل میں بہرحال کوئی نرم گوشہ بھی موجود نہیں تھا اس لیے میں نے اپنے ساتھیوں کو "فری ہینڈ" بھی دیا تھا کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں اپنے شکار سے نمٹیں' احتیاط کی اپنی سی کوشش ضرور کریں لیکن اس احتیاط میں ہاتھ اتنا ہلکا بھی نہ رہے کہ معرکہ لمبا ہو جائے۔ اس مشن کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ اس میں جو کچھ بھی کیا جاتا اس کا پہلی کوشش میں ہی نتیجہ خیز ہونا بہتر تھا' ورنہ بات لمبی بھی ہوسکتی تھی' بگڑ بھی سکتی تھی اور لینے کے دینے بھی پڑ سکتے تھے۔ ان لوگوں سے صحیح طور پر واسطہ نہ پڑنے کے باوجود ان کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ بے دریغ اسلحہ استعمال کرنے والے لوگ تھے اور انسانی جان کی ان کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔ خصوصاً ایسی انسانی جان کی۔۔۔ جس کے بارے میں انہیں شبہ ہوتا کہ وہ کسی بھی اعتبار سے ان کی مخالفت پر مائل تھی۔

اس کے علاوہ اس قسم کے زیادہ تر لوگ اس لیے بھی میری ہمدردی کے مستحق نہیں ہوتے تھے کہ یہ ایک طرح سے بے رحم اور انسانیت کش مشینوں کے کل پرزے ہوتے تھے۔ اس قسم کے لوگ اپنے مالک' آقا یا باس کے حکم پر آنکھیں بند کرکے کسی بھی انسان کو کسی بھی انداز میں قتل کرسکتے تھے۔ تاراج کرسکتے تھے۔ انسانیت سوز انداز میں کسی کو بھی سسکا سسکا کر مار سکتے تھے۔ اس قسم کے لوگوں کی اپنی کوئی سوچ' اپنا کوئی ضمیر نہیں ہوتا۔ جب تک دنیا میں اس قسم کے کرائے کے کارندے یا اندھی عقیدتوں کے زیر اثر ہر بد ترین کام کو جہاد سمجھ کر انجام دینے والے دستیاب رہیں گے تب تک مختلف اقسام کی نت نئی مافیائیں بنتی رہیں گی۔ بہت سے لوگ کسی نہ کسی گوشے میں اپنی اپنی مافیا کے ساتھ اس وقت تک راج کرتے رہیں گے جب تک حالات ان کا ساتھ دیں گے۔ اکثر ایسے لوگوں کو ان کے اعمال کا حساب لینے کے لیے دستِ قدرت ہی دبوچتا ہے لیکن بظاہر بہانہ کچھ بھی بن جاتا ہے۔

اس شخص کو وہیں ساکت چھوڑ کر میں تیزی سے سیدھا ہوا تو یہ دیکھ کر رگ وپے میں طمانیت کی لہر دوڑ گئی کہ میرے چاروں ساتھیوں نے باقی چاروں محافظوں کو بھی ذرا سا ہنگامہ پیدا کیے بغیر لمبالٹا دیا تھا۔ ٹونی نے غالباً بیلچے سے ہی کام لیا تھا۔ اس کے سامنے جو شخص چاروں خانے چت پڑا تھا اس کا چہرہ ایک طرف سے بالکل بگڑ کر رہ گیا تھا۔ میرے خیال میں تو اس کے زندہ بچنے کی امید بھی کم تھی۔

زرتاج اور راحیلہ کے ہاتھوں میں گلوک نظر آرہے تھے جو انہوں نے اپنے گھاگروں کی لمبی چوڑی جیبوں سے برآمد کیے تھے۔ یہ مختصر مگر خوف ناک گنیں تھیں۔ شفیع شاہ خالی ہاتھ نظر آرہا تھا مگر اس نے اپنے شکار کے ساتھ نہ جانے کیا کیا تھا کہ وہ سب سے زیادہ مڑا تڑا پڑا تھا اور نزع کے سے عالم میں خفیف سے جھٹکے لے رہا تھا۔

اسی اثنا میں ٹرک کا ڈرائیور ٹرک سے پتلی سی ایک سیڑھی اور سیمنٹ کا ایک تھیلا اٹھا کر لے آیا تھا۔ اس مڑے تڑے اور آدھے خالی تھیلے میں سیمنٹ کی ایک مٹھی بھی نہیں تھی۔ وہ اس میں سے تیزی سے کچھ چیزیں نکال کر زمین پر رکھنے لگا۔ وہ ربڑ کے نے دستانے اور کچھ اوزار تھے۔

وہ ابھی چیزیں نکال ہی رہا تھا کہ ہم سب نے اپنے اپنے شکار کو لے جا کر ہٹ میں پھینک دیا۔ ہم نے اندر جانے کی بھی زحمت نہیں کی اور انہیں سامنے نظر آنے والے ہال نما کمرے میں ہی کاٹھ کباڑ کی بوریوں کی طرح پھینک دیا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ زرتاج اور راحیلہ نے جن دو افرا کو غالباً میرے ہی جیسی کسی ترکیب سے گرا کر گلوک کے دستوں سے بے ہوش کیا تھا' انہیں وہی دونوں اپنے اپنے کندھوں پر اٹھا کر ہٹ تک لائیں۔ اگر کوئی دیکھتا تو ضرور حیران ہوتا کہ انتہائی متناسب خدوخال کی مالک وہ خانہ بدوش لڑکیاں جو کچھ ایسی مضبوط یا جسیم بھی دکھائی نہیں دیتی کتنا وزن اٹھانے کی عادی تھیں جو انہوں نے اچھے بھلے تن و توش کے مالک دو لمبے تڑنگے نیم مردہ آدمیوں کو یوں اٹھا کر کندھوں پر ڈال لیا تھا جیسے وہ چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔ یہ ساری کارروائی نہایت خاموشی اور تیزی سے مشینی انداز میں جاری تھی۔

ان پانچوں بے ہوش' نیم مردہ افراد کو کاٹھ کباڑ کی طرح پھینک کر ہم نے ہٹ کا دروازہ بند کیا اور بولٹ چڑھا کر تالا لگا دیا جو وہیں کنڈی میں لٹکا ہوا تھا اور کھلا تھا مگر اس کی نہیں تھی۔ دروازہ مقفل ہونے کے بعد اب اگر اندر پڑے ان لوگوں میں سے کسی کو ہوش آبھی جاتا تو وہ دروازہ توڑ کر ہی آسکتا تھا اور دروازہ کافی مضبوط تھا۔ آسانی سے ٹوٹنے والا نہیں رہتا تھا۔

اس دوران میں ڈرائیور نے دیوار کے ساتھ سیڑھی لگا دی تھی۔ شفیع شاہ نے ربڑ کے موٹے دستانے پہنے اور چند اوزار لے کر کسی بندر کی سی پھرتی سے سیڑھی پر چڑھتا چلا گیا۔ پہلے اس نے نہایت محتاط انداز میں سر دیوار سے ذرا اونچا کرکے اندر جھانکا اور سگنل دیا کہ احاطے میں اس طرف کوئی نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ مکان سے باہر ہی یہ گارڈ روم بنا کر اور گارڈز مقرر کرکے سعیدی اور دوسرے لوگ مطمئن رہتے ہوں اور اندر اس کی نگرانی کے لیے کسی کے موجود رہنے کی ضرورت محسوس نہ کی ہو۔

شفیع شاہ نے ٹیسٹر لگا کر دیکھا۔ خاردار تاروں میں کرنٹ نہیں تھا لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ کسی بھی لمحے آجاتا یا پھر شاید ان میں صرف رات کو ہی کرنٹ چھوڑا جاتا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ سرے سے میرا اندازہ ہی غلط ہو۔ نہ جانے کیوں مجھے وہم سا تھا کہ ان تاروں میں برقی رو ضرور دوڑتی ہوگی۔ اگر اس وقت نہیں تھی تو اس کی کوئی وجہ ہوسکتی تھی۔ شفیع شاہ بھی شاید میرے وہم میں شریک تھا اس لیے اس نے چیک کرلینے کے باوجود ربڑ کے دستانے نہیں اتارے اور ان سمیت ہی اس تیزی سے تاریں کاٹ کر رکھ دیں جیسے کوئی درزی تیز قینچی سے جالی دار کپڑا کاٹ رہا ہو۔ اس نے آہنی پٹیوں کے درمیان اتنا بڑا شگاف پیدا کردیا کہ چاہتے تو ہم بھی گزر سکتے تھے۔

ہم چاہتے تو بغیر سیڑھیوں کے بھی اس دیوار پر چڑھ سکتے تھے لیکن اب ایک چیز میسر تھی تو اس سہولت سے فائدہ اٹھانا ہی مناسب سمجھا گیا۔ شفیع شاہ ذرا ایک طرف کو ہٹتے ہوئے سیڑھی پر ہی گن ہاتھ میں لیے احاطے میں جھانکتا رہا کہ اگر کوئی سامنے آئے تو اسے وہیں ٹھنڈا کرسکے۔ اس دوران میں ہم چاروں یکے بعد دیگرے سیڑھی سے اوپر چڑھ کر' پھر دیوار پر سے دوسری طرف کود گئے۔

ڈرائیور وہیں موجود رہا۔ اسے وہیں ٹرک میں جا...

...ابت کی گئی تھی۔ ہم پانچوں کے اندر جا پہنچنے کے بعد بھی مکان کے ...ندر سے کوئی اس طرف نہیں آیا۔ ہم نے سیڑھی بھی اندر منتقل ...لی تھی اور ضرورت کی چند دوسری چھوٹی موٹی چیزیں بھی ہمارے ...اتھ تھیں۔ سیڑھی اندر کی طرف سے دیوار کے سہارے کھڑی کر ...ے چھوڑ دی گئی تھی۔

بیشتر بڑے مکانوں کی طرح یہ مکان بھی اسی طرز پر بنا ہوا تھا کہ ...ر دیواری کے تقریباً وسط میں اصل عمارت تھی۔ اصل عمارت ...ے چاروں طرف چکر لگایا جاسکتا تھا۔ تین طرف لان کے ساتھ ...تھ دیوار سے جڑی ہوئی پختہ روش جا رہی تھی۔ ہم بیک کورٹ ...ڈ میں کھڑے تھے۔ دائیں طرف سے مکان کے سامنے تک پہنچنے ...لے لان اور پختہ روش موجود تھی جو زیادہ چوڑی نہیں تھی۔ ...ں طرف کشادہ ڈرائیو وے سامنے والے گیٹ تک جا رہا تھا ...ایک گیٹ ہاؤس بھی تھا اور مسلح محافظ بھی وہیں موجود رہتے تھے۔

مجھے ٹونی اور راحیلہ کو اس راستے سے آگے بڑھنا تھا۔ زرتاج ...شفیع شاہ کو ہم نے دوسرے راستے سے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مکان ...سامنے پہنچ کر ہم دونوں طرف سے آن ملتے اور ہمارے درمیان ...محافظ وغیرہ ہوتے۔ ہم عمارت کے اس کونے سے جھانک کر ...تک نظر ڈال سکتے تھے کیونکہ گیٹ اسی سیدھ میں مکان کے ...ے کونے پر تھا۔

شفیع شاہ اور زرتاج رکوع کی سی حالت میں اپنے راستے پر ...ہو چکے تھے لیکن جب میں نے بصد احتیاط دیوار کی اوٹ سے ...ال کر اپنی طرف کی کشادہ سی گلی میں جھانکا تو مجھے فوری طور پر ...یچھے کرنا پڑا۔ وہاں سے میری نظر گیٹ تک چلی گئی تھی لیکن ...سے کافی ادھر' اصل عمارت کے کونے کے قریب ایک مسلح ...بڑے اطمینان سے ایک اسٹول پر بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ وہ ...سے ٹیک لگائے ہوئے تھا اور اس کے کندھے پر ایک اوزی ...رہی تھی۔ اس کے پرلی طرف ایک جیپ کھڑی تھی۔ اگر مکان ...احاطے میں کوئی اور گاڑی موجود تھی تو وہ مجھے یہاں سے نظر ...آئی تھی۔

...مسلح محافظ نہیں بلکہ اسٹول پر گویا ایک رکاوٹ بیٹھی ہوئی ...۔ اور بہت ہی غلط جگہ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ تو غنیمت تھا کہ زیادہ ہی انہماک سے اخبار کے مطالعے میں معروف تھا۔ ...ی لیے اس نے مجھے جھانکتے نہیں دیکھا اور اگر اس سے پہلے ...ہڑ کی تھوڑی بہت آوازیں پیدا ہوئی تھیں تو وہ بھی اس کی ...تک نہیں پہنچی تھیں۔ یہاں سے مجھے گیٹ ہاؤس اور ...ے محافظ نظر نہیں آئے تھے۔ وہ دوسری طرف سے پہنچنے ...شفیع شاہ اور زرتاج کو پہلے نظر آتے لیکن ہمارا ان سے پہلے ...ی کرتے ہوئے دوسرے کونے کے قریب پہنچنا ضروری تھا۔ ...ں نے اپنے مشین پسٹل پر سائیلنسر فٹ کیا اور دیوار کے ...لگ کر دبے قدموں آگے بڑھنے لگا۔ ٹونی اور راحیلہ کو میں نے فی الحال دیوار کی اوٹ میں ہی رہنے کی ہدایت کی البتہ سرگوشیوں میں انہیں سمجھا دیا کہ وہ کونے سے جھانک کر دیکھتے رہیں اور جونہی میں اشارہ کروں' حتی الامکان تیز رفتاری سے میرے پیچھے آجائیں۔ میں گن ہاتھ میں لیے' ٹریگر پر انگلی رکھے' دیوار کی طرف پشت کیے آگے بڑھ رہا تھا اور محافظ میری آمد سے بے خبر تھا۔

میں اس وقت آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کرچکا تھا جب وہ گہری سانس لے کر سر اٹھا کر غالباً اخبار کا کوئی اور صفحہ دیکھنے کے لیے اسے الٹنے لگا اور اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑی۔

حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اس کھلے منہ سے شاید کوئی غصے سے بھری آواز یا مکالمہ برآمد ہوتا' اس کے ساتھ ہی اس کا ہاتھ کندھے سے گن اتارنے کے لیے بھی بڑھا تھا لیکن میں نے اسے ان دونوں ہی کاموں کی مہلت نہیں دی۔ حیرت اس کی آنکھوں میں ہی منجمد ہوکر رہ گئی' کھلا ہوا منہ ایک جھٹکے سے بند ہوگیا اور گن کی طرف بڑھا ہوا ہاتھ یک دم نیچے آگیا "تھوم" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ اس کی پیشانی میں ایک سرخ سوراخ نمودار ہوگیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ سجدے میں جانے کے سے انداز میں اسٹول سے لڑھک گیا۔ ڈرائیو وے کا فرش بھی ماربل کا تھا۔ محافظ سر کے بل اس پر گرا۔ وہ یقیناً فرش تک پہنچنے سے پہلے ہی مرچکا تھا لیکن اگر اس کے مرنے میں کوئی کسر رہ جاتی تو وہ اس طرح گرنے سے پوری ہوجاتی۔ اس کی گن بھی اس کے ساتھ ہی فرش سے ٹکرائی تھی۔ دونوں کے اس طرح فرش پر آکر گرنے سے اچھی خاصی آواز پیدا ہوئی تھی۔ اسٹول اس کے ساتھ نہیں گرا تھا ورنہ اچھی خاصی کھڑکھڑاہٹ سی بلند ہوتی۔

اس کے گرنے تک میں' ٹونی اور راحیلہ کو آگے آنے کا اشارہ کرچکا تھا اور خود مزید آگے بڑھ چکا تھا۔ اگلے کونے کے قریب سامنے کے لان پر موجود کسی شخص نے شاید محافظ کو گرتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے تشویش زدہ سی آواز میں پکار کر کچھ پوچھا۔ شاید اسے گمان گزرا تھا کہ اسٹول پر بیٹھا ہوا محافظ چکرا کر گرا تھا۔ شاید اس کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں ہوسکتی تھی کہ اس طرف سے تین افراد دیوار سے چپکے' گنیں ہاتھوں میں لیے اجل کے فرشتوں کی طرح چلے آرہے تھے۔

ہم نے دوڑتے قدموں کی آوازیں سنیں۔ پھر وہ عمارت کے کونے سے اچانک ہی ہمارے سامنے آگیا۔ وہ بھی ایک مسلح محافظ تھا۔ اس کی گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ انہیں روکنے اور خاموش رکھنے کے لیے گولی استعمال کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہم پر نظر پڑتے ہی اس نے مشینی انداز میں گن سیدھی کی مگر اس بار راحیلہ کا گلوک حرکت میں آیا اور ہلکی سی "تھوم" ہی کی آواز کے ساتھ وہ بھی فرش پر آگیا۔ وہ اپنی جھونک میں اوندھا گرا تھا۔

ہم نے اس پر دوسری نظر ڈالنے کی زحمت نہیں کی اور تیزی

سے مزید آگے بڑھ گئے۔ اب گیٹ ہاؤس ہمارے سامنے تھا۔ دو مسلح محافظ اس کے سامنے کھڑے تشویش زدہ نظروں سے اسی طرف دیکھ رہے تھے اور تیسرا گیٹ ہاؤس کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ اس کا بالائی آدھا دھڑ نظر آ رہا تھا۔ گنیں ان کے ہاتھوں میں تھیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی گنیں استعمال کرنے کا موقع نہ مل سکا۔

اس وقت تک دوسرے کونے کی طرف سے زرتاج اور شفیع شاہ بھی پہنچ چکے تھے۔ وہ تینوں محافظ دونوں طرف سے گولیوں کی زد میں آ گئے۔ وہ گنیں سیدھی کئے بغیر ڈھیر ہو گئے اور کوئی شور شرابا نہیں ہوا۔ مجھے امید تھی کہ سائیلنسر لگی گنوں کی مدھم آوازیں اس طویل و عریض بند مکان میں اندر تک نہیں پہنچی ہوں گی اور اگر کسی حد تک پہنچی بھی ہوں گی تو شاید انہیں کوئی اہمیت نہیں دی گئی ہو گی۔ اس قسم کے مضبوط قلعوں میں اور مسلح محافظوں کے حصار میں بیٹھے ہوئے لوگ بڑے مطمئن ہوتے ہیں کہ انہوں نے ہر خطرے کے سامنے بند باندھا ہوا ہے اس لیے انہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

محافظ ڈھیر ہو چکے تو میں نے لپک کر گیٹ ہاؤس میں جھانکا مگر اس میں مزید کوئی محافظ موجود نہیں تھا۔ اس کی کھڑکی میں ہمیں جو محافظ نظر آیا تھا وہ گولی کھانے کے بعد آدھا کھڑکی سے باہر اور آدھا اندر لٹکا ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا مکان کی اصل عمارت سے باہر اور چار دیواری کے اندر صرف یہی پانچ محافظ موجود تھے۔ ان میں وہ محافظ بھی موجود تھا جسے میں نے اس سے پہلے اپنی یہاں "پیشی" کے موقع پر جیب سے اندرونی دروازے کی چابی نکالتے دیکھا تھا۔

میں نے سب سے پہلے اس کی تلاشی لی اور مجھے میری مطلوبہ چیز فوراً ہی مل گئی۔ ایک ہی رنگ میں دوسری کچھ چابیوں کے ساتھ وہ خوب صورت چابی بھی موجود تھی۔ میرے ساتھی میرے چابی تلاش کرنے سے پہلے ہی بھاگ کر برآمدے کے دروازے کے دونوں طرف دیوار سے چپک گئے تھے۔ شفیع شاہ اور زرتاج دروازے کے ایک طرف تھے' ٹونی اور راحیلہ دوسری طرف۔ یہ ساری کارروائی منٹوں کے نہیں' سیکنڈوں کے حساب سے ہو رہی تھی اور اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ کے دوران میں ہم مسلسل رکوع کی سی حالت میں جھکے ہوئے تھے۔ مبادا کسی کھڑکی سے ہمیں دیکھ نہ لیا جائے۔ کھڑکیاں کافی اونچائی پر تھیں اور ایئر کنڈیشننگ یا کسی اور وجہ سے وہ بند تھیں۔ ان کے عقب میں گہرے رنگوں کے پردے پھیلے دکھائی دے رہے تھے۔ مکان کسی بڑے مقبرے کی طرح سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔

میں نے دروازے پر پہنچ کر اس طرح احتیاط سے تالا کھولا کہ کلک کی آواز بھی پیدا نہ ہونے پائے اور اس کے فوراً بعد میں نے دروازہ نہیں کھولا۔ میں نے ایک لمحے کا توقف کیا' سن گن لینے کی کوشش کی لیکن اندر اگر کوئی خفیف سی آواز ابھرتی تو اسے اس ساؤنڈ پروف دروازے سے باہر سننا بہت مشکل تھا۔ آخر میں نے ایک گھٹنے کے بل بیٹھ کر نہایت آہستگی سے اس دروازے اندر جھانکا۔ میرا سر جھکا ہوا تھا۔ کوئی گولی میری کھوپڑی کسی اور حصے میں سوراخ کرتی ہوئی نہیں گزری میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں موجود تھا۔

سامنے ہال خالی پڑا تھا اور اس سے آگے وہ راہداری دکھائی دے رہی تھی جس سے گزر کر میں جمال نشست گاہ میں پہنچا تھا جہاں وہ تخت شاہی قسم کی ایک تھا۔ اس کے سامنے پیش ہونے کے لیے مجھے کچھ فاصلہ تھا اور اس دوران میں مجھے گرد و پیش کا کافی حد تک ہو گیا تھا۔ مکان کی ساخت کافی حد تک میری سمجھ اس کے باوجود مکان میں گھسنا' باہر سے یہاں تک آنے میں زیادہ خطرناک تھا۔ ان کھلی جگہوں کے بارے میں تھا کہ کہاں کون موجود ہو گا اور کس خطرے سے جائے گا لیکن ان بند کمروں اور نامعلوم گوشوں کے بارے سے کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کہاں سے اچانک کیا طرح باہر آ جائے کہ ہمیں اس کے بارے میں خبردار دو لمحے کی تاخیر ہو جائے اور یہ تاخیر ہمیں مہنگی پڑ جائے کسی بھی ساتھی کو کوئی گزند پہنچتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

سب سے پہلے ہال میں' میں داخل ہوا اور میں انتظار کیا کہ شاید کسی طرف سے کوئی آثار دکھائی دے ایسا نہیں ہوا۔ تب میں نے اپنے ساتھیوں کو اندر کیا۔ اندر آ کر وہ سب ایک دوسرے سے کچھ فاصلے انہوں نے اپنا رخ بھی مختلف سمتوں میں رکھا۔ ہم ان نظر رکھنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں سے کسی کی آمد ہو سکتا تھا۔

وہیں ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں راحیلہ کو میں نے اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ اوپر کی کی ذمے داری تھی۔ سیڑھیوں کے قریب ہی وہ موجود تھا جس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ اس کے خانے کی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ قریب ہی وہ تھا جس کے ذریعے میں نے یہ دروازہ بند ہوتے بھی اسی سے ہو گا لیکن مکان کو کھنگالے بغیر اور سے نمٹے بغیر ہم اسے کھولنے کا رسک نہیں لے سکتے

دروازہ یقیناً کسی موٹر کے ذریعے رولرز پر عمل میں ایک خاص قسم کی آواز پیدا ہوتی تھی جو سکوت کے عالم میں یقیناً کافی دور تک سنی جا سکتی میں کسی سمت سے اچانک کسی کا آ نکلنا خطرناک اور ہم بے فکری سے تہ خانے میں داخل بھی ہم نہیں چاہتے تھے کہ کوئی اچانک ہمارے سروں کے بجائے ہم ان کے سروں پر اچانک جا پہنچنا چا

گولی چلانے میں پہل کرنے کا موقع دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کے پاس، میں جس قسم کی گنیں دیکھ چکا تھا، وہ اگر انہیں استعمال کرتے تو برسٹ ہی مارتے اور مکان کے کسی ایک حصے میں برسٹ مارے جانے سے کسی اور جگہ موجود دوسرے افراد بھی ہوشیار ہوسکتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ وہاں جو کوئی بھی موجود ہو اس کے ہوشیار ہونے سے پہلے ہی اس سے نمٹ لیں۔

اسی طے شدہ حکمتِ عملی کی وجہ سے ہم تہ خانے کے دروازے کو چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ہال سے متصل ہی وہ دوسرا لمبا چوڑا کمرا تھا جسے جمال سعیدی نے اپنا اصل ڈرائنگ روم بنا رکھا تھا۔ میں نے اس کمرے میں جھانکا تو جمال سعیدی مجھے وہیں نظر آگیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تخت اس کی پسندیدہ ترین چیز تھی۔ وہ اسی پر چاروں خانے چت پڑا سو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان نہیں، کوئی ہاتھی کا بچہ پڑا سو رہا تھا۔ اس کے آس پاس کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ اکیلا ہی پڑا تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ اس نے سونے کے لیے بھی کسی بیڈ روم وغیرہ میں جانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا۔ وہ گن لیے اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ میں اور زرتاج آگے کا "سروے" کرنے کے لیے روانہ ہوگئے۔ ہماری واپسی تک شفیع شاہ کو جمال سعیدی کا خیال رکھنا تھا اور اگر وہ نیند سے بیدار ہو جاتا تو اس کے ردِعمل کے مطابق اس سے نمٹنا تھا۔ ڈرائیو وے میں مجھے رنگین شیشوں والی ایک گہرے نیلے رنگ کی پجیرو کے علاوہ کوئی گاڑی دکھائی نہیں دی تھی اس لیے میرا اندازہ تھا کہ شاید نیولا نما وہ شخصیت تو اس وقت مکان میں موجود نہ ہو جس سے میرا پہلے واسطہ پڑ چکا تھا۔

آگے راہ داری میں دونوں طرف کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔ زرتاج نے ایک طرف کی دیوار کے ساتھ چپک کر اس طرف کے دروازے کھول کھول کر اندر جھانکنے کی ذمے داری سنبھالی اور میں نے دوسری طرف کے۔ یہ دروازے ہمیں غیر مقفل ہی ملے اور کئی کمروں میں کسی خطرے نے بھی ہمارا استقبال نہیں کیا لیکن ان میں جھانکنے پر ایک طرح سے ہمارے سامنے ہر قدم پر ایک نئے جہانِ حیرت کے در کھلتے چلے گئے۔

جب ہم ایک دوسرے کو اشارہ کرتے کہ فلاں کمرے میں خطرے والی کوئی بات نہیں تھی تو ایک دوسرے کی طرف والے کمرے میں بھی جھانک لیتے تھے۔ ویسے تو ان میں کوئی بہت زیادہ باعثِ حیرت چیز بھی نہیں تھی لیکن اس اعتبار سے ہم حیران ہونے میں حق بہ جانب بھی تھے کہ اس ویرانے میں کوئی اس قسم کے مکان کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بظاہر تو مکان باہر سے بھی بہت جدید اور انوکھا نظر نہیں آتا تھا۔ اندر سے بھی اس کے کمروں کی ترتیب اور نقشہ کچھ پرانے اسٹائل کا ہی تھا لیکن ایک تو اس کی تعمیر میں انتہائی مہنگا میٹریل استعمال کیا گیا تھا دوسرے اس میں ایک نہایت جدید اور بڑے [illegible] نما مکان کے تمام لوازمات موجود تھے۔ اس میں جمنازیم، بلیئرڈ روم، لائبریری وغیرہ سب کچھ موجود تھے۔ جمنازیم میں ورزش کا تمام جدید سامان موجود تھا۔ نہ جانے اسے کون استعمال کرتا ہوگا۔ جمال سعیدی کے تھل تھل کرتے بدن کو دیکھ کر تو اندازہ ہوتا تھا وہ زندگی میں کبھی ورزش کے سامان کے قریب بھی نہیں پھٹکا ہوگا۔

کئی انتہائی پُرتعیش اور آراستہ و پیراستہ بیڈ رومز بھی موجود تھے اور یہ تمام کمرے نہایت کشادہ تھے۔ کچھ کمرے اوپر کی منزل پر بھی تھے جہاں ہم نے راحیلہ اور ٹونی کو بھیجا تھا۔ کم از کم جتنے کمرے ہم نے دیکھے تھے ان میں ابھی تک تو ہمیں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ اس اعتبار سے تو پورے مکان کو دیکھ کر ہی حیرت ہو رہی تھی کہ آخر یہ کس کے لیے بنایا گیا تھا؟ اس میں اتنی آسائشیں اور گنجائش کس کے لیے رکھی گئی تھی؟

اگر جمال سعیدی کی کوئی فیملی بھی تھی اور اس نے اسے یہاں رکھا ہوا تھا تو وہ یقیناً مختصر تھی۔ ابھی تک اس کی موجودگی کے کوئی آثار نظر آنا شروع نہیں ہوئے تھے۔ اب تک یہاں صرف مسلح محافظ ہی دکھائی دیے تھے اور وہ یقیناً سرونٹ کوارٹرز اور مکان کے عقب میں بنی ہوئی ہٹ وغیرہ میں ہی رہتے ہوں گے۔ پھر میں نے خود کو یہ سمجھا کر اپنی حیرت دور کرنے کی کوشش کی کہ مکان کی اس کشادگی، ان آسائشوں اور ان سہولیات کا کوئی نہ کوئی مصرف ضرور ہوگا...... یا کبھی نہ کبھی مصرف نکل ہی آتا ہوگا۔

مجھے اور زرتاج کو کمروں میں کسی کو دیکھنے کی جو حسرت محسوس ہو رہی تھی وہ یک دم ہی دور ہوگئی۔ راہداری کے اختتام پر بائیں طرف جو دروازہ تھا وہ عام دروازوں کی نسبت بہت بڑا تھا اور چوپٹ کھلا تھا۔ زرتاج اس طرف تھی۔ میری طرف کا دروازہ بھی کھلا ہی تھا۔ یہاں سے کچھ خفیف سی آوازیں آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ صرف آوازیں ہی نہیں، کچھ خوشبوئیں بھی آرہی تھیں جن سے مجھے اندازہ ہوا کہ میں جس دروازے کی طرف کھسک رہا تھا وہ غالباً کچن کا تھا اور اس کے سامنے دوسری طرف ڈائننگ روم تھا۔ ادھر کی ذمے داری زرتاج کی تھی۔

ہم دونوں بلی کی طرح دبے قدموں آگے کھسک کر اپنے اپنے حصے میں آنے والے دروازے کی طرف گھوم گئے۔ یوں ہماری ایک دوسرے کی طرف پشت ہوگئی اور ہم ایک دوسرے کی کارگزاری سے بے خبر ہوگئے۔ میرے سامنے واقعی ایک طویل و عریض اور ماڈرن کچن تھا۔ اس کے اندر ہی چار کرسیوں کی ایک خوب صورت ڈائننگ ٹیبل بھی موجود تھی جس پر ایک جوڑا [illegible] تھا جو ایک دوسرے سے سر جوڑے بیٹھا تھا۔

میں فوری طور پر ان کی شکلیں نہیں دیکھ سکا لیکن یہ تاثر فوراً ہی مل گیا کہ وہ راز و نیاز میں کھوئے ہوئے تھے اور دنیا [illegible] سے بے خبر تھے۔ ان کے سامنے کھانے کے برتن بھی سجے

تھے لیکن شاید وہ کھانا کھا چکے تھے یا پھر کھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ کچن میں صرف وہی دونوں نہیں تھے، ان کی طرف پشت کیے ایک عورت اور بھی کھڑی تھی۔ وہ سنک پر کوئی برتن دھو رہی تھی۔ کچن میں مائیکرو ویو اوون، کوکنگ رینج، ڈیپ فریزر، فریج وغیرہ سبھی کچھ نظر آرہا تھا۔ وہ گھر کے بجائے کسی بڑے ہوٹل کا کچن معلوم ہوتا تھا۔ سنک پر کھڑی عورت ملازمہ معلوم ہوتی تھی۔ سرگوشیاں کرتا ہوا جوڑا اس کی موجودگی سے اور وہ جوڑے کی موجودگی سے بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک عجیب سی کاہلی تھی۔ شاید وہ بہت تھکی ہوئی تھی۔ اس شخص کے ہاتھ میں چونکہ کوئی ہتھیار نہیں تھا اور نہ ہی وہ میری طرف متوجہ تھا اس لیے میں نے ارادہ کیا کہ اسے شوٹ کرنے یا زیادہ گزند پہنچانے سے گریز کیا جائے۔

"ہینڈز اپ۔" میں نے تیزی سے کہا۔ اسی اثنا میں، میں نے اپنے عقب میں زرتاج کو بھی یہی کہتے سنا۔ اس کے بعد بھی کچھ آوازیں سنائی دیں جن میں زرتاج کی سائیلنسر لگی گن سے فائروں کی آواز بھی شامل تھی لیکن میں پلٹ کر نہیں دیکھ سکا کیونکہ میں اپنے حصے کے "کام" میں الجھ کر رہ گیا تھا۔

میرے ہینڈز اپ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ وہ شخص اتنی تیزی سے اٹھا کہ اس کی کرسی تو الٹ ہی گئی لیکن میز بھی اچھل کر رہ گئی۔ وہ میری طرف گھوما تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ وہ جمشید کریم کا سیکریٹری احمد کمال تھا جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ درحقیقت وہ جمشید کا باڈی گارڈ تھا اور یقیناً کوئی کمانڈو قسم کی چیز تھا لیکن اس وقت وہ جمشید کو نہ جانے کہاں چھوڑ کر اور شاید اپنے فرائض کو ذہن سے جھٹک کر یہاں بیٹھا نہ جانے کس خاتون سے راز و نیاز کر رہا تھا۔ اس کی یہاں موجودگی یہ بھی ظاہر کرتی تھی کہ جمشید کریم اور جمال سعیدی درحقیقت ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے۔ ان کے درمیان ظاہری طور پر بھی تعلق تو تھا لیکن حقیقت میں اس کی جڑیں کہیں زیادہ گہری معلوم ہوتی تھیں۔

احمد کمال کی نظر ایک لمحے کے لیے مجھ سے ملی۔ اس نے پگڑی باندھے ایک مزدور قسم کے شخص کو اپنے اوپر گن تانے دیکھ کر غالباً اس سے مرعوب ہونا اور اس کی ہدایت پر عمل کرنا اپنی توہین سمجھا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے حرکت میں آیا اور اسی لمحے میں نے دیکھا کہ میز پر اس کے قریب ہی جھلملاتا ہوا ایک خوف ناک قسم کا خنجر موجود تھا۔ ایسا خنجر یقیناً کٹلری کا حصہ تو نہیں تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر رکھے جانے والے چھری کانٹوں سے اس کا کوئی میل نہیں تھا۔ وہ یقیناً بہت ہی اونچے درجے کے شکاریوں کے مطلب کا خنجر تھا۔

میں کچھ نہیں سکا کہ ایک خاتون کے قریب بیٹھ کر کھانا کھاتے اور راز و نیاز کرتے وقت اس قسم کا خوف ناک خنجر احمد کمال کے قریب میز پر کیوں موجود تھا؟ لیکن یہ اس قسم کے سوالات پر غور کرنے کا وقت نہیں تھا کیونکہ وہ خنجر پلک جھپکتے میں احمد کمال کے ہاتھ میں پہنچ چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ یوں ہلا جیسے وہ میری طرف اشارہ کرنے لگا ہو۔

اس کے ہاتھ کی اس حرکت کا مقصد بہت ہی بروقت میری سمجھ میں آگیا اور میں بجلی کی سی تیزی سے ایک طرف ہوگیا۔ یہ پلک جھپکنے میں ہونے والا زندگی اور موت کا فیصلہ تھا۔ بجلی کی سی لپک کے ساتھ خنجر چوکھٹ میں پیوست ہو چکا تھا اور تھرتھرا رہا تھا۔ اگر اسی تیزی سے میں اپنی جگہ سے نہ ہٹا ہوتا تو وہ چوکھٹ کے بجائے میرے سینے میں پیوست ہوتا۔ چوکھٹ میں تو وہ شاید صرف ایک آدھ انچ کی گہرائی تک گڑ سکا تھا لیکن میرے سینے میں یقیناً دستے تک اتر جاتا۔

میں شاید اب بھی احمد کمال کو شوٹ نہ کرتا لیکن اس بدبخت نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ اسے اپنے اس شاندار اور مشاقانہ وار کی کامیابی کا بھی یقین ضرور ہوگا اس کے باوجود خنجر پھینکتے ہی اس کا ہاتھ اپنی بغل کی طرف بھی چلا گیا۔ وہ بغلی ہولسٹر سے گن نکال رہا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں گن کی جھلک بھی دیکھ لی۔ مجبوری تھی۔ اس کا وقت پورا ہو چکا تھا۔ مجھے ٹریگر دبانا پڑا۔ گولی اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر اتر گئی تاہم میں نے یہ خیال رکھا تھا کہ اس کے برابر کھڑی عورت گولی کی زد میں نہ آنے پائے۔

اس کے لیے ایک ہی گولی کافی تھی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے ایک کرسی کو اپنے ساتھ لیتا ہوا ڈھیر ہوگیا۔ اس کا منہ اور آنکھیں کچھ اس طرح کھلی کی کھلی رہ گئیں جیسے آخری لمحے میں اس نے حیرت سے کچھ کہنا چاہا ہو لیکن موت نے اسے مہلت نہ دی ہو۔ اس کے قریب کھڑی عورت کا ہاتھ اس کے منہ پر پہنچ گیا تھا لیکن اس نے چیخ نہیں ماری۔ وہ عقل مند معلوم ہوتی تھی لیکن سنک پر برتن دھوتی عورت برتن سمیت اچانک گھوم گئی تھی۔

اس نے کمرے کا منظر دیکھا، مجھے دیکھا، میرے ہاتھ میں موجود گن کو دیکھا پھر اس کی نظر شاید میرے عقب میں ڈائننگ روم تک چلی گئی۔ اس دوران میں اس کی آنکھیں پھیلتی ہی چلی گئیں پھر اس کے حلق سے ایک ایسی بے ہودہ اور کریہہ چیخ برآمد ہوئی کہ میں اسے گولی مارتے مارتے رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں موجود چینی کا برتن فرش پر گر کر زوردار آواز کے ساتھ ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ میں اس کی چیخ کا سلسلہ بیچ میں سے ہی منقطع کرنے لگا تھا لیکن میں نے بہ مشکل اپنی انگلی کو اضطراری سے انداز میں ٹریگر پر دباؤ بڑھانے سے روکا۔ ایک تو وہ ذرا بڑی عمر کی عورت تھی۔ دوسرے اس کے چہرے اور مجموعی شخصیت پر کچھ ایسی مسکینی سی طاری تھی کہ شاید انتہائی ناگزیر حالات میں بھی اسے قتل کر کے مجھے پچھتاوا محسوس ہوتا۔

"خبردار......" میں نے گن کا رخ اس کی طرف کرتے ہوئے تیزی سے کہا "اب اور آواز نہ نکالنا۔"

اس نے بھی سختی سے اپنے منہ پر ہاتھ جمالیا۔ اس دوران میں

دوسری عورت بھی پہلے احمد کمال کی طرف اور پھر میرے عقب میں ڈائننگ روم کی طرف دیکھ چکی تھی اور اس کی آنکھیں بھی پہلے سے زیادہ پھیل رہی تھیں۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اب بھی گھوم کر ڈائننگ روم کی طرف دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ دونوں عورتیں کسی بھی لمحے کوئی ایسی حرکت کر سکتی تھیں جو میرے لیے کسی پریشانی کا باعث بن سکتی تھی بلکہ پریشانی اسی لمحے شروع ہوتی دکھائی دی۔

میز کے قریب کھڑی عورت نے ہاتھ اچانک منہ سے ہٹا کر یوں ہوا میں لہرایا جیسے چکر آنے لگا ہو اور وہ سہارے کے لیے کوئی چیز تلاش کر رہی ہو۔ تب میں نے دیکھا وہ درحقیقت عورت نہیں، بہت ہی کم عمر لڑکی تھی۔ اس کا جسم ذرا بھرا بھرا تھا اور میں صحیح طور پر اس کا چہرہ دیکھ ہی نہیں سکا تھا۔ اس لیے بس ایک مبہم سا ابتدائی تاثر ملا تھا جیسے وہ پچیس تیس برس کی عمر کی کوئی پختہ کار سی عورت ہو لیکن اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹایا اور میں نے ذرا صحیح طور پر اس کی طرف دیکھا تو پتا چلا کہ وہ تو بہ مشکل اٹھارہ سال کی لڑکی تھی۔

وہ بلاشبہ اتنی خوب صورت تھی کہ اس کے چہرے کو محض چاند چہرہ کہہ دینا بہت ناکافی لگتا۔ سرسری نظر میں اس پر کسی سفید فام لڑکی کا بھی گمان گزر سکتا تھا کیونکہ اس کے بال سنہرے، آنکھیں نیلی اور رنگت سرخ و سفید تھی لیکن ذرا توجہ سے دیکھنے پر احساس ہوتا تھا کہ اس کے حسن میں مشرقیت کی اپنی ایک مخصوص کشش موجود تھی۔ اس کے حسن کی تب و تاب میں مغرب کا پھیکا پن نہیں تھا۔ اس کے ہونٹ جو اس وقت شاید خوف سے تھر تھرا رہے تھے، اس عالم میں بھی یاقوت کی طرح دمک رہے تھے۔

اس کی کم عمری اور معصومیت کے ساتھ ساتھ اس کی خوف سے پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھے ترس بھی آیا اور میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ وہاں جو کچھ بھی ہو رہا تھا وہ کم از کم اس کے سامنے نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن یہ گداز کی محض ایک لہر تھی جو اسی لمحے میں گزر گئی۔ مجھے نہیں معلوم تھا وہ کون تھی اور اس گھر میں ہونے والی سرگرمیوں میں اس کا کیا کردار تھا۔ بعض معصوم اور نوخیز چہرے اپنے پیچھے بڑی بھیانک کہانی لیے ہوتے ہیں۔ وہ بڑے بڑے پھولوں والے خوب صورت جامنی رنگ کے میکسی نما لبادے میں تھی جس نے اس کے رنگ و روپ کو کچھ اور نمایاں کر دیا تھا۔ اس ڈھیلے ڈھالے لبادے میں بھی اس کے خدوخال قیامت ڈھا رہے تھے اور اس کے چہرے سے بھی ظاہر ہونے والی کم سنی پر شک ہونے لگتا تھا۔

اسے چکراتے دیکھ کر میں لپک کر اس کے قریب پہنچا۔ میرے ایک ہاتھ میں گن تھی۔ دوسرے بازو سے میں نے اسے سہارا دیا تو وہ گویا پوری ہی مجھ پر آن گری لیکن اس کا بوجھ، بوجھ نہیں گویا نسیم سحری کا ایک جھونکا تھا جو میرے بازو میں سمٹ آیا تھا..... لیکن نسیم سحری کے جھونکے میں بھلا یہ گداز، یہ حرارت کیونکر ہو سکتی تھی۔ احمد کمال اگر اس سے سر جوڑ کر بیٹھنے کے دوران میں دنیا جہاں سے بے خبر تھا تو اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں تھی۔

میں نے اسے ایک کرسی پر بٹھایا اور وہ آنکھیں بند کیے چند لمحے آگے پیچھے جھولتی رہی۔ میں نے ایک ہاتھ سے اسے سہارا دیے رکھا کہ کہیں وہ کرسی سمیت پیچھے نہ گر جائے۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور دونوں ہاتھ میز پر جما کر بیٹھ گئی۔ اب وہ سنبھل گئی تھی اور خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"تم کون ہو؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔ شاید یہی سوال وہ مجھ سے کرنا چاہ رہی تھی لیکن میں نے پہل کر دی تھی۔

"میں..... میں ارمیلا ہوں..... جمال سعیدی کی بیوی....." اس نے جیتی جیتی سی آواز میں جواب دیا۔

"بیوی.....؟" میں نے دہرایا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے سر پر ڈنڈا رسید کر دیا تھا۔ اس انکشاف نے مجھے اچھی خاصی، روحانی تکلیف پہنچائی تھی۔ ایک لمحہ پہلے میرے ذہن میں اس امکان کا سایہ لہرایا تھا کہ شاید وہ جمال سعیدی کی بیٹی ہو لیکن پھر میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر اس کی بیوی کوئی انتہائی خوب صورت عورت رہی ہو تب بھی اس ہاتھی کے بچے کی بیٹی مشکل سے ہی ایسی ہو سکتی تھی اور اس امکان کی طرف تو میرا ذہن بالکل ہی نہیں گیا تھا کہ سترہ اٹھارہ سال کی یہ پری صورت لڑکی اس کی بیوی بھی ہو سکتی تھی۔

لڑکی کو گویا پہلے ہی توقع تھی کہ مجھے حیرت کا ایسا ہی جھٹکا لگے گا۔ اس نے بہت ہی مدھم آواز میں اس تعارف میں اضافہ کیا۔ "جمال سعیدی کی پانچویں بیوی....."

"اوہ..... مائی گاڈ۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا حالانکہ میں جس حلیے میں تھا اس میں بہتر یہی تھا کہ انگریزی کے الفاظ میرے منہ سے نہ نکلتے۔

"تم انگریزی سمجھتے ہو؟" اس نے اچانک انگریزی میں ہی پوچھا۔ اس کے لہجے میں روانی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ اچھی خاصی پڑھی لکھی تھی۔

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔ تب اس نے شاید میرے حلیے سے کچھ مطلب اخذ کرتے ہوئے پشتو میں پوچھا "پشتو سمجھتے ہو؟"

میں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ اس نے یہ نہیں سوچا کہ اگر میں یہ دونوں زبانیں نہیں سمجھتا تھا تو میں نے دونوں زبانوں میں اس کا سوال کیونکر سمجھا تھا؟ شاید میرے نفی میں سر ہلانے سے اس نے یہ مطلب اخذ کیا ہو کہ میں اس کا سوال بھی نہیں سمجھا تھا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا جیسے اسے پھر چکر آنے لگا ہو لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر فرش پر

آڑی ترچھی پڑی احمد کمال کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وحشت زدہ لہجے میں بولی "تم نے اسے مار دیا.....!"

معلوم نہیں یہ سوال تھا یا محض بیان..... بہرحال یہ الفاظ ادا کرتے وقت اس کی آنکھوں میں میرے لیے بے پناہ نفرت تھی۔ میں نے نرمی سے کہا "اگر میں اسے نہ مارتا تو یہ مجھے مار دیتا..... بلکہ اپنے خیال میں تو مار ہی چکا تھا....." میں نے انگوٹھے سے اپنے عقب میں اشارہ کیا جہاں چوکھٹ میں خنجر یقیناً اب تک پیوست تھا، تاہم میں نے مڑ کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ پھر میں نے احمد کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ایک ٹی ٹی اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ وہ گن نکالنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ صرف اسے گولی چلانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ میری دلیل نے شاید ارمیلا کو قطعاً متاثر نہیں کیا۔ ملازمہ ٹائپ عورت کو اس دوران میں، میں چند لمحے کے لیے بھول چکا تھا۔ اب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ سنک سے ٹیک لگائے کھڑی تھی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میرے عقب میں دیکھ رہی تھی۔

پھر میں نے ارمیلا کی آنکھوں میں بھی خوف کی کچھ اور گہری پرچھائیاں نمودار ہوتے دیکھیں۔ وہ بھی میرے عقب میں دیکھ رہی تھی۔ میں چونکا کہ آخر میرے عقب میں ایسی کون سی بلا نمودار ہو رہی تھی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو پیچھے مجھے صرف زرتاج کھڑی نظر آئی۔ گن اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے چہرے پر مصنوعی سانولے پن کے ساتھ ایک عجیب سی سختی نمودار ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ اس کی آنکھوں میں بھی ایک خاص قسم کی سرد مہری اور سفاکی تھی۔ ایک تو اس کا حلیہ عجیب تھا۔ اوپر سے اس تبدیلی کی وجہ سے اس کی شخصیت کا تاثر اور بھی زیادہ بدل کر رہ گیا تھا۔ وہ زرتاج نہیں، کوئی اور ہی دکھائی دے رہی تھی۔

ملازمہ اور ارمیلا شاید اس کا یہ روپ دیکھ کر ہی خوف زدہ ہو گئی تھیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے تو اسے ڈائننگ روم میں کارروائی کرتے بھی دیکھا ہو گا۔ میری تو اس طرف پشت تھی۔ اب گھما نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ بڑے سے کھلے دروازے سے اندر کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک ہال نما کمرا تھا اور اس میں اتنی بڑی ڈائننگ ٹیبل لگی ہوئی تھی جس پر شاید دو درجن سے بھی زیادہ افراد کھانا کھا سکتے تھے لیکن اس وقت اس پر صرف تین افراد موجود تھے۔ حقیقت میں تو صرف ایک ہی اس طرح موجود تھا کہ اس کا سر میز پر ٹکا ہوا تھا۔ باقی دو الٹی ہوئی کرسیوں کے قریب فرش پر پڑے تھے۔

وہ تینوں اپنی زندگی کا آخری کھانا پورا نہیں کھا سکے تھے لیکن میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ زرتاج کے لیے بھی انہیں ہلاک کرنا اسی طرح ناگزیر ہو گیا تھا جس طرح میرے لیے احمد کمال کو.....! ان تینوں کی خوف ناک گنیں ان کے پاس ہی موجود تھیں۔ کھانا کھاتے وقت بھی شاید انہوں نے گنیں کرسیوں کے سہارے یا ڈائننگ ٹیبل پر ہی رکھی ہوئی ہوں گی اور زرتاج کے "ہینڈز اپ" کہنے کے باوجود وہ یقیناً انہیں اٹھا چکے تھے کیونکہ مرنے کے بعد بھی آڑی ترچھی حالت میں پڑے ہونے کے باوجود ان کے ہاتھ گنوں پر اور انگلیاں ٹریگرز پر تھیں لیکن زرتاج نے انہیں گولی چلانے کی مہلت نہیں دی تھی۔ یہ بات بھی شاید طے تھی کہ اگر کوئی گن لے کر ان لوگوں کے سر پہ پہنچتا تو پھر موت ہی انہیں اپنی گنیں استعمال کرنے اور گولیاں چلانے سے باز رکھ سکتی تھی۔

ان تینوں محافظوں کی صورتیں مجھے نظر آ رہی تھیں اور یہ صورتیں میرے لیے بالکل ہی ان دیکھی نہیں تھیں۔ ان میں سے دو تو وہی تھے جنہیں میں نے پچھلی مرتبہ اپنی یہاں آمد کے موقع پر جمال سعیدی کے دائیں بائیں گنیں لیے کھڑے دیکھا تھا۔ تیسرا وہ تھا جو میری خاطر مدارت کے لیے ٹرالی پر بہت کچھ رکھ کر لایا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ میں نے اور صفیہ نے ان میں سے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ ان تینوں کے منہ تھوڑے تھوڑے کھلے ہوئے تھے اور ان میں نوالے نظر آ رہے تھے۔ ایک کے منہ سے تو نوالہ تھوڑا سا باہر آ گیا تھا۔

یہ منظر کچھ عجیب ہی انداز میں زندگی کی ناپائیداری کا احساس دلاتا تھا۔ یوں تو کوئی بھی انسان اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کون سا نوالہ اس کی زندگی کا آخری نوالہ ثابت ہو لیکن قابلِ غور بات یہ تھی کہ جو لوگ خوف ناک قسم کی بندوقوں پر بہت زیادہ انحصار کرتے تھے اور کھانا بھی بندوقوں کے سائے میں کھاتے تھے وہ بھی اندازہ تک نہیں کر سکتے تھے کہ کون سا نوالہ انہیں پوری طرح چبانا بھی نصیب نہیں ہو گا۔

میں نے اس منظر سے نظر ہٹالی اور ربو جھل خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ اس اثنا میں ٹونی اور راحیلہ بھی اوپر سے واپس آ گئے تھے اور جمال سعیدی والے کمرے میں جانے کے بعد ہم تک آن پہنچے تھے۔ میں نے ارمیلا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان تینوں کو بتایا "یہ جمال سعیدی کی پانچویں بیوی ہیں۔"

مجھے خود احساس ہوا کہ میرا انداز کچھ ایسا تھا جیسے ہم وہاں کسی تقریب کے سلسلے میں جمع تھے اور میں میزبان یا کسی اہم مہمان کا تعارف دوسرے مہمانوں سے کرا رہا تھا۔ ان تینوں کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے پھیلیں لیکن جلد ہی انہوں نے اپنی حیرت پر قابو پا لیا اور زرتاج ٹھنڈی سانس لے کر بولی "بعض لوگ اپنے دولت مند اور طاقت ور ہونے کا بہت ہی ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

ارمیلا نے مجروح سے نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب نہ دیا۔ ٹونی نے گویا مجھے رپورٹ دی "اوپر صرف تین بیڈ روم، ایک لائبریری اور لاؤنج ہے۔ ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے وہاں کوئی نہیں ہے۔"

"ٹھیک۔" میں نے طمانیت سے کہا پھر ارمیلا اور ملازمہ

ٹائپ عورت کی طرف اشارہ کیا "انہیں انہی ڈائننگ چیئرز پر باندھ دو اور منہ پر ٹیپ چپکا دو۔ ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھنا۔"

ٹونی نے اپنی بڑی بڑی جیبوں سے مطلوبہ چیزیں نکالیں۔ راحیلہ نے اس کا ہاتھ بٹایا۔ انہوں نے حیرت انگیز پھرتی سے یہ کام کر ڈالا۔ جس وقت ارمیلا کے خوب صورت اور یاقوتی ہونٹوں پر ٹیپ چپکائی جا رہی تھی، اس نے عجیب افسردہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہو "کیا اب یہ بھی ضروری تھا؟"

میں نے اس خاموش شکوے پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور جو لاش جہاں پڑی تھی، اسے وہیں چھوڑ کر ہم اس شاہی ڈرائنگ روم نما کمرے میں آ گئے جس میں جمال سعیدی اب بھی چت پڑا خراٹے لے رہا تھا لیکن اس کے خراٹوں کی آواز بلی کی خرخراہٹ سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ یہ کچھ عجیب سی بات تھی کہ وہ یہاں بڑا گہری نیند سو رہا تھا اور اس کی پانچویں نہایت حسین اور نوخیز بیوی کچن میں احمد کمال کے ساتھ سر جوڑے کوئی بہت ہی خاص بات کر رہی تھی۔ اس قسم کی صورت حال میں بہت سے دلچسپ سوالات جنم لیتے تھے جو انسان کے تجسس کو ابھارتے تھے لیکن اس وقت ہم ان سے کہیں زیادہ اہم اور سنگین سوالات کے جوابات کی تلاش میں یہاں آئے تھے۔

شفیع شاہ گن تھامے جمال سعیدی کے سرہانے جا کھڑا تھا۔ میں نے اب ذرا اچھی طرح اس کمرے کا جائزہ لیا۔ ایک چیز مجھے ایسی نظر آئی جو میں اس سے پہلے اپنی آمد کے موقع پر نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے میرے تجسس کو دور کر دیا۔ کمرے میں ائرکنڈیشننگ کے لیے فالس سیلنگ بنی ہوئی تھی۔ عام طور پر یہ مصنوعی چھت اصل چھت سے کچھ نیچی ہوتی ہے لیکن اس کمرے میں مصنوعی چھت ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہیں پھیلی ہوئی تھی بلکہ جہاں جمال سعیدی کا تخت تھا تقریباً وہیں سے کمرے کی اصل چھت شروع ہو جاتی تھی۔ مصنوعی اور اصل چھت کے درمیان جو تین چار فٹ کا فاصلہ تھا وہاں خلا نہیں تھا، وہ لمبی پٹی کسی بہت بڑی گاڑی کے ڈیش بورڈ کی طرح تھی۔

اس ڈیش بورڈ پر دو ٹی وی اسکرینیں اور کئی ڈائل، بٹن وغیرہ اُبھرے ہوئے تھے۔ ٹی وی اسکرینیں خاصی بڑی تھیں۔ ان پر اس وقت بھی مکان کے سامنے سے گزرنے والی سڑک کا منظر دو مختلف زاویوں سے نظر آ رہا تھا۔ اس وقت بھی ایک بڑی ڈاج پک اپ مکان کے سامنے سے گزر رہی تھی جس کے پچھلے حصے میں بھی چند دیہاتی سے مرد اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ سب قدرے متجسس انداز میں مکان کی طرف ہی دیکھ رہے تھے۔ ہم بہت اچھی طرح ان کے چہرے ٹی وی اسکرینوں پر دیکھ سکتے تھے۔ وڈیو کیمرا جہاں کہیں بھی فٹ تھا، اس میں گویا کوئی زوم لینس لگا ہوا تھا جو تمام جزئیات نمایاں کر کے دکھا رہا تھا۔

کمرے میں نشستوں وغیرہ کی ترتیب کچھ ایسی تھی کہ جمال سعیدی تو تخت پر بیٹھے بیٹھے ذرا گردن اُٹھا کر یا لیٹے لیٹے بھی ان ٹی وی اسکرینوں اور ڈیش بورڈ نما حصے کا جائزہ لے سکتا تھا لیکن اس کے سامنے بیٹھے ہوئے مہمان اس حصے کی موجودگی سے ہی آگاہ نہیں ہو سکتے تھے۔ گویا میرا اندازہ درست ہی نکلا تھا کہ وڈیو کیمرا بہرحال موجود تھا اور یہ دونوں ٹی وی اسکرینیں اس کے مانیٹرز تھے۔ ان کے پاس جو دوسرے ڈائل اور سوئچ وغیرہ نظر آ رہے تھے ان کا مصرف میں فی الحال سمجھنے سے قاصر تھا۔ بڑی پک اَپ مکان کے سامنے سے گزرتی چلی گئی اور دونوں اسکرینوں پر ایک بار پھر صرف سڑک کے ایک مخصوص ٹکڑے اور گیٹ کے سامنے کا منظر رہ گیا جس میں کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

شفیع شاہ نے خاموشی سے تخت کی ایک سائڈ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ سائڈ بھی سامنے سے نہیں دیکھی جا سکتی تھی لیکن شفیع شاہ نے شاید اجل کے فرشتے کی طرح جمال سعیدی کے سرہانے کھڑے کھڑے اِدھر اُدھر کچھ تاک جھانک بھی کی تھی۔ میں نے جھانک کر اس طرف دیکھا جدھر وہ اشارہ کر رہا تھا۔ اس طرف تین سوئچ اور نصب تھے۔ جمال سعیدی تخت پر بیٹھے بیٹھے نیچے کی طرف ہاتھ بڑھا کر کوئی بھی سوئچ دبا سکتا تھا۔ اس موٹے نے گھر میں نہ جانے کس کس میکنزم کا جال پھیلایا ہوا تھا۔ فی الحال ہمیں اس کے ان چکروں سے دلچسپی نہیں تھی۔ ہمارا سب سے بڑا مقصد اس کے تہ خانے کی تلاشی لینا تھا اور ہم یہ سمجھ کر مطمئن نہیں ہونا چاہتے تھے کہ ہمارے پاس بہت وقت تھا۔ ہم نے تمام محافظوں کو راستے سے ضرور ہٹا دیا تھا اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ ہمارے لیے اب یہاں کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔

ہم نے جو کچھ بھی کیا تھا نہایت ہی تیزی سے کیا تھا اور تہ خانے کا جائزہ لے کر آئندہ لائحہ عمل طے کر کے ہم جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتے تھے۔ غیر ضروری طور پر ہم یہاں ایک منٹ بھی رُکنا نہیں چاہتے تھے۔ فی الحال ہم جمال سعیدی کے تخت کے قریب جس طرح کھڑے تھے اس سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کمرا نہیں، آپریشن تھیٹر تھا اور ہم جمال سعیدی جیسے ہاتھی کے بچے کو آپریٹنگ ٹیبل پہ لٹائے فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس کا آپریشن کہاں سے شروع کیا جائے؟ کم بخت کی نیند بہت گہری تھی۔ ابھی تک اسے احساس نہیں ہو سکا تھا کہ اس کے گرد کچھ لوگ جمع تھے۔ اس کی، چھوٹے سے گنبد سے مشابہ توند اسی تواتر سے پھول پچک رہی تھی۔

میں نے شفیع شاہ اور ٹونی کو اشارے سے سمجھایا کہ فی الحال ہمیں جمال سعیدی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس کے منہ پر بھی ٹیپ لگا دینی چاہیے۔ زرتاج نے اشارے سے پوچھا کہ اس کا بھی قصہ پاک کیوں نہیں کر دیتے؟ میں نے سرگوشی میں کہا "اس کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کے ہاتھ میں گن نہیں ہے اور یہ ہمیں دیکھتے ہی شوٹ کرنے کی کوشش نہیں کر سکتا۔"

"لیکن سارے بندوق برداروں کی باگ ڈور تو اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اسی کی ہدایات کے مطابق کسی بھی شخص کی طرف سے ذرا سا بھی خطرہ محسوس کرتے ہی اسے چھلنی کر دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔" زرتاج سرگوشی میں بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے...." میں نے تسلیم کیا "لیکن فوری طور پر ہمیں اس کی طرف سے جان کا کوئی خطرہ نہیں ہے اس لیے فی الحال ہم اسے نہیں مارتے۔ اندازہ تو میرا یہی ہے کہ یہ موت کا مستحق ہی ٹھہرے گا لیکن ہم اسے یہ سزا بعد میں بھی دے سکتے ہیں۔ اگر ہمیں اپنی ذاتی عدالتِ انصاف سے اس کو موت کی سزا دینے کے لیے دوبارہ بھی کسی مہم کا منصوبہ تیار کرنا پڑا تو کر لیں گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" میں سرگوشی میں بات تو زرتاج سے کر رہا تھا لیکن راحیلہ، شفیع شاہ اور ٹونی بھی کان لگا کر سُن رہے تھے تاہم اس دوران میں ہماری نظر جمال سعیدی پر ہی تھی۔ ہماری سرگوشیوں سے اس کی نیند میں کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔

زرتاج کندھے اُچکا کر رہ گئی۔ میں نے شفیع شاہ اور ٹونی کو جمال کے ہاتھ پاؤں باندھنے کا اشارہ کیا۔ ہمارا اندازہ تھا کہ ہماری موجودگی اور سرگوشیوں سے تو بے شک اس کی نیند میں خلل نہیں پڑا تھا لیکن جونہی شفیع اور ٹونی اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کے لیے اسے چھوئیں گے، وہ بیدار ہو جائے گا اس لیے پہلے اسے قابو میں کر لینا ہی بہتر تھا۔

طے یہ پایا کہ شفیع شاہ اور ٹونی سرہانے اور پاؤں کی طرف کھڑے ہو کر یک دم اس کے ہاتھ پاؤں قابو میں کریں گے جبکہ زرتاج اور راحیلہ پھرتی سے ان کے گرد بندشیں کس دیں گی۔ ان چاروں نے اپنی گنیں کرسیوں پر رکھ دیں۔ زرتاج اور راحیلہ نے ڈوری سنبھال لی۔ شفیع شاہ نے اس کے دونوں بازو اور ٹونی نے پیروں کے قریب سے اس کی شہتیر نما ٹانگیں اچانک گرفت میں لے لیں۔ زرتاج اور راحیلہ یقیناً خاطر خواہ پھرتی سے اپنا کام انجام دے سکتی تھیں لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

اسی لمحے گویا کمرے میں زلزلہ سا آ گیا۔ جمال سعیدی کی نیند یقیناً عجیب تھی۔ ایک لمحہ پہلے وہ دنیا مافیہا سے بے خبر محوِ خواب تھا، دھیمی آواز میں خراٹے لے رہا تھا لیکن جسم کو ہاتھ لگتے ہی جیسے اس ہاتھی کے بچے کا کوئی بٹن دب گیا اور اس کے جسم میں کرنٹ دوڑ گیا۔ میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ اس کی آنکھ پہلے کھلی تھی یا وہ حرکت میں پہلے آیا تھا۔

اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی تھی جس میں خوف کی بھی آمیزش تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے چاروں ہاتھ پیروں کو زوردار جھٹکا دیا تھا۔ شفیع شاہ اور ٹونی دور جا گرے تھے اور یہ خاصا حیرت ناک واقعہ تھا کیونکہ وہ دونوں تو کیا، اگر ان میں سے کوئی ایک بھی کسی پر ہاتھ ڈال دیتا تھا تو پھر اس کی گرفت سے نکل جانا بہت مشکل ہوتا تھا خواہ وہ شخص کتنا ہی طاقتور ہوتا۔ ان کے جسم فولادی تھے اور ان میں بے اندازہ طاقت مقید تھی جبکہ جمال سعیدی کے بارے میں میرا.... اور شاید مرے ساتھیوں کا بھی یہی اندازہ تھا کہ وہ محض گوشت اور چربی کا پہاڑ تھا۔ اس سے نہ تو پھرتی کی توقع کی جا سکتی تھی اور نہ ہی اس میں کوئی خاص طاقت ہونی چاہیے تھی لیکن اس نے تو ہم سب کے اندازے غلط ثابت کر دیے تھے۔

زرتاج اور راحیلہ بھی اس اُٹھا پٹخ کی زد میں آ کر چوٹ کھا سکتی تھیں لیکن انہوں نے نہایت پھرتی سے اپنے آپ کو بچا لیا۔ ان سے کہیں زیادہ پھرتی سے جمال سعیدی اٹھ بیٹھا۔ جناتی سائز کے اس گدے کی طرح جس میں بہت سے اسپرنگ لگے ہوئے تھے۔ اس کی یہ پھرتی اس وقت بھی میرے لیے ناقابلِ یقین ہوتی جب وہ پوری طرح بیدار اور ہوشیار ہوتا اور اچانک اسے جان کا خطرہ محسوس ہوتا۔ اس وقت تو وہ گہری نیند سے اٹھا تھا۔ آدمی خواہ کتنا بھی ہوشیار اور پھرتیلا ہو گہری نیند سے اٹھتے وقت کم از کم چند سیکنڈ کے لیے تو اس کے حواس پوری طرح بیدار نہیں ہوتے لیکن اس موٹے تھل تھل کرتے جسم میں تو کوئی شیطانی روح مقید معلوم ہوتی تھی جس میں کسی درندے کی سی خصوصیات بھی پائی جاتی تھیں۔ وہ تو اس طمانیت کے ساتھ سویا ہو گا کہ وہ اپنے محفوظ اور مضبوط قلعے میں آرام کر رہا تھا جس کے گرد خطرناک ہتھیاروں سے مسلح محافظ گشت کرتے تھے۔ اچانک کسی خطرے کا سر پہ آ پہنچنا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود اپنے ہاتھ پیروں پر کسی کی گرفت محسوس کرتے ہی نہ صرف وہ نیند سے اٹھ بیٹھا تھا بلکہ اسے گویا خطرے کی سنگینی کا بھی پوری طرح احساس ہو گیا تھا۔

اس کی آنکھیں جن پر سے پپوٹے اوپر کو اُٹھانا اسے گویا ایک مشکل کام محسوس ہوتا تھا، اس وقت بُری طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ پپوٹے گویا بھوؤں سے جا ملے تھے۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ صورتِ حال فوری طور پر اس کی سمجھ میں آ گئی تھی لیکن یہ احساس یقیناً اسے فوری طور پر ہو گیا تھا کہ وہ دشمنوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کا ہاتھ فوری طور پر تخت کی دائیں سائڈ پر گیا۔

وہ یقیناً کوئی سوئچ دبانے لگا تھا۔ مجھے امید تھی کہ سوئچ دبانے سے اسے اب کوئی امداد میسر نہیں آ سکتی تھی لیکن میں یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جو سوئچ وہ دبانے جا رہا تھا اس کا مصرف کیا تھا اور اسے دبانے کے نتیجے میں کیا ہو سکتا تھا چنانچہ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی کلائی پر گن کا دستہ رسید کیا۔ اس کے حلق سے بھیانک سی غراہٹ خارج ہوئی اور اس کے پھُولے پھُولے چہرے پر بلا کی وحشت آ گئی۔ اس لمحے وہ مجھے محض ایک تھل تھل کرتا انسان نہیں بلکہ ایک عجیب الخلقت قسم کا بھیانک درندہ محسوس ہوا۔

اس کا ہاتھ تخت کی سائڈ سے واپس آ گیا لیکن میں نے تیزی سے

نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ سوئچ دبانے سے باز رہا تھا یا اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ ٹونی اور شفیع شاہ جو قالین پر جا گرے تھے' خود ان کے لیے بھی یہ اپنی زندگی کا ایک حیرت انگیز تجربہ تھا شاید اسی لیے انہیں ردِعمل ظاہر کرنے میں ایک دو سیکنڈ کی تاخیر ہوئی۔ میں اس دوران میں نہ صرف جمال سعیدی کی کلائی پر گن کا دستہ رسید کر چکا تھا بلکہ ایک ثانیے کے لیے مجھے خیال بھی آیا تھا کہ اسے ٹھنڈا کر دیا جائے۔ گن میرے ہاتھ میں تھی اور زرتاج کی اس بات کی بازگشت میرے ذہن میں تھی کہ بُرائی کی اصل جڑ تو وہی تھا۔ جن دھندوں کا ہمیں اس پر شبہ تھا ان کا منتظمِ اعلیٰ اور ان سے تمام تر فائدے اٹھانے والا تو وہی تھا لیکن اسی لمحے بجلی کے کوندے کی طرح یہ خیال بھی میرے ذہن میں لپکا کہ اگر ہمارے شبہات کی تصدیق بھی ہو جاتی تب بھی نہ جانے کتنے سوالات جواب طلب رہ جاتے۔ ان سوالوں کے جواب جمال سعیدی سے ہی مل سکتے تھے۔ جواب خواہ ہم حاصل کرتے یا کوئی سرکاری محکمہ..... بہرحال ان کا سامنے آنا ضروری تھا۔ صرف اسی خیال سے میری انگلی تلے ٹریگر دبتے دبتے رہ گیا۔

ٹونی اور شفیع شاہ کا ردِعمل ایک دو سیکنڈ کی تاخیر سے سامنے آیا لیکن وہ اتنا ہی شدید تھا۔ وہ دونوں حیرت انگیز ذہنی ہم آہنگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیک وقت اپنی جگہ سے اچھلے اور ایک لمبی زقند لگا کر جمال سے آ ٹکرائے۔ ٹونی کی ٹکر جمال کے سینے پر پڑی اور شفیع شاہ نے اس کے قریب تخت کے کنارے پر پاؤں جماتے ہوئے اس کے سر پہ کراٹے کا ہاتھ رسید کیا۔ جمال دھپ سے تخت پر ہی چت گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کی حرکتِ قلب بند نہ ہو گئی ہو۔ ٹونی کی ٹکر کے نتیجے میں ایسا بھی ہو سکتا تھا۔ یہ اس کی نہایت خطرناک ٹکر تھی جو وہ عین دل کے مقام پر رسید کرتا تھا۔

میں نے لپک کر جمال کی نبض دیکھی۔ نبض چل رہی تھی۔ اس کے سینے پر چربی کی جو تہیں تھیں انہوں نے یقیناً ضرب کی شدت کو کم کر دیا تھا اور ویسے بھی وہ غیر معمولی طاقت اور قوتِ برداشت کا مالک معلوم ہوتا تھا ورنہ بیک وقت کھوپڑی پر شفیع شاہ کا کراٹے کا ہاتھ اور سینے پر ٹونی کی یہ خاص ٹکر کھانے والا شخص مشکل سے ہی بچ سکتا تھا۔ وہ دونوں تخت سے اتر کر اب بھی تیار کھڑے تھے کہ جمال ذرا بھی حرکت کرے تو وہ اس پر کوئی اور داؤ آزمائیں مگر وہ بے ہوش ہی رہا۔ زرتاج اور راحیلہ اس دوران میں اپنی کرسیوں سے اٹھ چکی تھیں اور تذبذب کے عالم میں کھڑی تھیں کہ اب وہ کیا کریں؟

میں چند لمحے جمال کی کلائی تھامے ہی کھڑا رہا۔ میں اس کی نبض کے بارے میں اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ کہیں وہ چند سیکنڈ کی تاخیر سے تو رُکنے والی نہیں تھی؟ زرتاج اس عالم میں بھی فقرے بازی سے باز نہیں رہ سکی اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے میرے کندھے پر گویا ہلکی سی "دستک" دیتے ہوئے بولی "چلو..... اب چھوڑ بھی دو..... اتنی خوب صورت کلائی تو نہیں کہ اسے تمام کر بُت بن کر کھڑے ہو گئے ہو۔"

میں نے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے کہا "تمہارے خیال میں کیا میں اتنا گدھا ہوں کہ کلائی خوب صورت ہوتی تو اسے تھام کر بُت بن کر صرف کھڑا ہی رہتا؟"

"معاف کرنا..... میرے منہ سے غلط بات نکل گئی۔" زرتاج نے معذرت کی "تم سے بھلا اتنی شرافت کی توقع کیونکر کی جا سکتی ہے۔"

راحیلہ اسے آہستگی سے کہنی مارتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی "اور ذرا سنجیدگی و متانت تو ملاحظہ ہو جیسے دنیا کے سب سے بڑے نبض شناس ڈاکٹر یا حکیم ہیں اور اس موٹی کلائی میں نبض کی باریکیاں تلاش کر رہے ہیں۔"

میں نے کلائی چھوڑ دی اور ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم دونوں کی موجودگی میں دنیا کا کوئی کام سنجیدگی سے نہیں ہو سکتا۔"

"دنیا کا سب سے سنجیدہ آدمی کتنے دکھ سے یہ شکوہ کر رہا ہے۔" راحیلہ نے مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے اسے اور زرتاج کو اشارہ کیا "تم دونوں کا کام آسان ہو گیا ہے۔ اب جلدی سے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو اور منہ پر ٹیپ چپکا دو۔ شکر ہے کہ یہ سفرِ آخرت پر روانہ نہیں ہوا۔"

پھر میں اس کی کھوپڑی ٹٹول کر دیکھنے لگا تو راحیلہ بولی "اگر کھوپڑی چٹخی بھی ہو گی تو ایکسرے کے بغیر پتا نہیں چلے گا عظیم سرجن صاحب!"

"تم خاموش رہو زمانۂ غار کی جاہل لڑکی! ہماری انگلیاں ہی ایکسرے مشین ہیں۔" میں نے دھیمے لیکن شاہانہ سے لہجے میں کہا۔

زرتاج جلدی سے طنزیہ لہجے میں راحیلہ سے مخاطب ہوئی "ہاں..... تمہیں معلوم نہیں پرسوں بھی موصوف کو سول اسپتال سے بُلاوا آیا تھا کہ ہماری ایکسرے مشین خراب ہو گئی ہے' براہِ مہربانی آ کر ذرا تین چار سو مریضوں کا اپنی انگلیوں سے ایکسرے کر جائیں۔ معلوم ہے موصوف نے کیا جواب دیا؟"

راحیلہ فوراً اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولی "موصوف نے کہا ہو گا کہ اس طریقۂ کار کے تحت تو میں صرف نوجوان اور حسین خواتین کے ایکسرے کرتا ہوں۔"

میں نے پلٹ کر خونخوار نظروں سے اسے گھورا اور جمال سعیدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ نوجوان اور حسین خاتون ہے؟"

"ایسی بیگار تو خیر کبھی کبھی گلے پڑتی ہے نا۔" راحیلہ بولی۔

شفیع شاہ نے اس موقع پر مداخلت کی اور سنجیدگی سے بولا "میں نے ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا۔ اس دیوزاد کی کھوپڑی چٹخی نہیں ہو گی۔"

"میں نے بھی زیادہ زور سے ٹکر رسید نہیں کی تھی۔" ٹونی نے بھی گویا صفائی پیش کی۔

"اب تو تم یہی کہو گے۔" راحیلہ نے پھرتی سے جمال سعیدی کے پاؤں نائیلون کی ڈوری سے باندھتے ہوئے کہا "حالانکہ میزائل کی طرح اُڑ کر بے چارے کے سینے سے ٹکرائے تھے۔ نہ جانے بے چارے کے ننھے سے معصوم دل پر کیا گزری ہوگی۔"

"ہوش میں آئے گا تو پاس بیٹھ کر محبت سے پوچھ لینا۔" ٹونی جلے بھُنے سے انداز میں بولا۔

جمال سعیدی کے بے ہوش ہونے کا یہ فائدہ ہوا کہ اس کے ہاتھ سامنے کی طرف بندھنے کے بجائے اس کی پشت پر باندھے گئے۔ شفیع شاہ نے اسے تھوڑا سا الٹ پلٹ کیا اور زرتاج نے اس کے ہاتھ پیچھے لا کر باندھ دیے۔ اسے کروٹ کے بل لٹا دیا گیا اور ہونٹوں پر ٹیپ چپکا دی گئی۔ میرے ساتھی نہایت ماہرانہ انداز میں اس کام سے فارغ ہو چکے تو میں نے راحیلہ اور ٹونی سے کہا "تم دونوں دوبارہ اوپر کی منزل پر چلے جاؤ اور جو بالکونی مکان کے چاروں طرف موجود ہے اس میں سامنے کی طرف دونوں کونوں پر کھڑے ہو جاؤ۔ تمہارے پاس دوربینیں بھی موجود ہیں۔ ان کے ذریعے یونیورسٹی روڈ اور سپرہائی وے' دونوں طرف سے اس مکان کی طرف آنے والی سڑک پر نظر رکھو۔ مکان کے اندر تو ہم نے ہر خطرے کا صفایا کر دیا ہے یا اس پر قابو پالیا ہے لیکن باہر سے کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور باہر کی طرف چل دیے۔ میں' شفیع شاہ اور زرتاج بھی ان کے پیچھے پیچھے ہی باہر آئے۔ بیرونی ہال میں پہنچ کر وہ سیڑھیوں سے اوپر چلے گئے اور ہم تینوں تہ خانے کے اس سلائیڈنگ دروازے کے سامنے رک گئے جو بظاہر ایک بہت بڑی پینٹنگ نظر آتا تھا۔ میں نے وہ سوئچ دبایا جس کے ذریعے میں نے اس دروازے کو بند ہوتے دیکھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک بار سوئچ دبانے سے دروازہ کھلتا ہوگا۔ دوسری بار دبانے سے بند ہوتا ہوگا۔

میں نے اس سوئچ کو کئی مرتبہ دبایا لیکن دروازے میں جنبش تک نہ ہوئی۔ میں پیچ و تاب کھا کر رہ گیا۔ جس مقصد کے لیے اتنی تگ و دو کی تھی اور قبل از وقت ہی جس کام کے سلسلے میں ہم خاصا خون بہا چکے تھے' کیا وہ تشنۂ تکمیل ہی رہ جاتا تھا؟ یہ سوچ کر مجھے اپنی پیشانی سے پسینہ پھوٹتا محسوس ہوا۔ میں نے اس بورڈ پر موجود تمام ہی سوئچوں کو کئی کئی بار دبا کر دیکھا لیکن کسی سے کوئی لائٹ آن آف ہو گئی اور کسی سے کوئی پنکھا چلا اور بند ہو گیا۔

زرتاج اور شفیع شاہ متفکر سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ آنے لگا کہ میں نے کیوں فرض کر لیا تھا کہ جس سوئچ سے میں نے دروازہ بند ہوتے دیکھا ہے' اسی سے کھلے گا؟ اتنی معمولی سی بات کی وجہ سے ساری مہم ناکام ہو سکتی تھی۔ مجھے جمال سعیدی کے تخت والے کمرے میں موجود سوئچوں کا خیال آ رہا تھا۔ شاید ان میں سے کسی سوئچ کو دبانے سے تہ خانے کا دروازہ کھلتا ہو لیکن اس کی تلاش میں ہم تمام سوئچوں کو آن کر کے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ مجھے وہی اندیشہ تھا کہ نہ جانے کس سوئچ کو دبانے سے کیا ہوتا ہو۔ جمال جیسی مافیائی شخصیتوں سے کچھ بعید نہیں تھا کہ انہوں نے اپنے ٹھکانے پر کیا کیا بندوبست کر رکھا ہو۔ وہ تو دشمنوں میں گھر جانے کے بعد یا اپنے ساتھ دشمنوں کو بھی مار مرنے کی غرض سے خودکشی کا بندوبست بھی کر کے رکھ سکتے تھے کہ سوئچ دبایا اور پورا مکان دھماکے سے اُڑ گیا۔ خود اپنا وجود' دشمن یا گرفتاری کے لیے آنے والے افراد' اپنے جرائم کے ثبوت' سب کچھ ایک لمحے میں ناپید ہو گیا۔ اس قسم کے لوگوں کے ذہن کن کن خطوط پر کام کرتے ہیں' اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک الگ ہی کیس ہوتا ہے۔ صرف یہی اندیشہ مجھے تمام سوئچوں کو آزمانے سے باز رکھے ہوئے تھا۔ کوئی سوئچ کہیں کسی اور کو خطرے سے خبردار کرنے کے لیے بھی ہو سکتا تھا۔ مزید گڑبڑ یہ ہو گئی تھی کہ شفیع شاہ اور ٹونی کے ہاتھوں جمال سعیدی بھی بے ہوش ہو چکا تھا۔

"کچن میں چل کر جمال سعیدی کی پانچویں بیوی سے پوچھتے ہیں کہ اسے یہ دروازہ کھولنے کا طریقہ معلوم ہے یا نہیں۔" میں نے کہا اور جھنجلاہٹ میں اس بڑی سی پینٹنگ پر ایک لات رسید کی مگر اس پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ میری ٹانگ البتہ جھنجھنا کر رہ گئی۔

ہم تینوں اکٹھے ہی کچن کی طرف چل دیے۔ راستے میں زرتاج نہایت پُرخیال انداز میں بولی "میں سوچ رہی ہوں جمال سعیدی کی باقی چار بیویاں نہ جانے کہاں ہوں گی!"

میں نے اسے گھورتے ہوئے ٹھنڈی سانس لی "محترمہ خوب! ہم یہاں جان پر کھیل کر کیا معلوم کرنے آئے ہوئے ہیں اور انہیں یہ جاننے کی فکر پڑی ہوئی ہے کہ اس منحوس کی باقی چار بیویاں کہاں ہیں۔"

"یہ بھی کوئی کم اہم بات تو نہیں۔۔۔ آخر سوچنے کی بات ہے۔" زرتاج نے اپنے مؤقف کا دفاع کیا۔

"ہاں۔۔۔ واقعی۔" میں نے جل کر کہا "عنقریب عالمی سیاست اسی نکتے کے گرد گھومے گی کہ جمال سعیدی کی باقی چار بیویاں کہاں ہیں۔ میری دعا ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں' آرام سے ہوں۔ شاید جمال کے وطن میں ہوں۔"

"پھر بھلا آرام سے کیسے ہو سکتی ہیں۔" زرتاج بولی۔

"شاید وہ جنت میں ہوں۔۔۔ اور اگر نہیں ہیں تو۔۔۔ تم دعا کرو وہ وہاں پہنچ جائیں۔" میں نے کہا "ہم اس کی پانچویں بیوی سے تہ خانے کے دروازے کے بارے میں پوچھیں گے تم اس سے اس کی سوکنوں کے بارے میں پوچھ لینا۔"

ہم کچن تک پہنچ چکے تھے۔ میں نے دیکھا' دونوں عورتیں اسی حالت میں بیٹھی تھیں جس میں ہم انہیں چھوڑ کر گئے تھے۔ ارمیلا اب بھی ایک ٹک احمد کمال کی لاش کو دیکھ رہی تھی اور اس کے پھول سے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اگر احمد کمال کی جگہ جمال سعیدی کی لاش پڑی ہوتی' کیا تب بھی اس نوخیز حسینہ کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں ہوتیں؟

وہ دونوں ہمیں دوبارہ آتے دیکھ کر خوف زدہ ہو گئیں۔ میں نے ارمیلا کے ہونٹوں سے ٹیپ ہٹائی اور اکھڑ' اجڈ لوگوں والے لہجے میں بگڑی ہوئی سی اردو میں پوچھا "تمہیں خبر ہے کہ اُدھر جو تہ خانہ ہے اس کا دروازہ کیسے کھلتا ہے؟"

اس نے خوف زدہ انداز میں سر ہلایا۔ میرے ایک ہاتھ میں گن تھی۔ ذرا پیچھے جا کر دوسرے ہاتھ سے میں نے چوکھٹ میں پیوست خنجر ایک جھٹکے سے نکال لیا۔ دونوں چیزوں کو معنی خیز انداز میں ہاتھوں میں اُلٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد میں نے دوبارہ اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم سے ٹھیک ٹھیک بات کرو۔" میں صرف آنکھوں' تاثرات اور حرکات و سکنات سے اسے دہشت زدہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں حقیقت میں اس پر کوئی سختی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میرے دل میں اس کے لیے نرم گوشہ پیدا ہو چکا تھا بلکہ وجہ محض یہ تھی کہ میرے خیال میں واقعی اسے وہ بات معلوم نہیں تھی جو میں اس سے پوچھ رہا تھا۔

وہ اس وقت کچھ اور خوف زدہ ہو گئی جب میں نے اس کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ تیزی سے نفی میں سر ہلاتے ہوئے مرتعش لہجے میں بولی "خدا کی قسم مجھے نہیں معلوم۔۔۔ اگر معلوم ہوتا تو ضرور بتا دیتی۔۔۔ مجھے اس مکان۔۔۔ یہاں کے تہ خانے۔۔۔ یا کسی بھی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔۔۔"

اسی لمحے ملازمہ نے "اوع اوع" کی سی آوازیں نکالتے ہوئے سر ہلایا جیسے کہہ رہی ہو کہ میرے منہ سے ٹیپ ہٹاؤ' میں بتاتی ہوں۔ میں نے بے تابی سے اس کے ہونٹوں سے ٹیپ ہٹا دی جس پر وہ کراہ کر رہ گئی پھر ہانپنے کے سے انداز میں بولی "تم۔۔۔ تم مالکن کو کچھ نہ بولو۔۔۔ میں بتاتی ہوں۔۔۔ میرے کو معلوم ہے۔۔۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ تیزی سے کہتی چلی گئی "صاحب جس تخت پر بیٹھتا ہے اس تخت کے ایک طرف تین بٹن ہیں۔۔۔ لال رنگ کا بٹن دباؤ۔۔۔ تہ خانے کا دروازہ کھل جائے گا۔۔۔ خدا کا واسطہ مالکن کو کچھ مت بولو۔"

"یہ بات غلط نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے ملازمہ کو گھورا۔

"ٹھیک۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں بالکل ٹھیک بولتی ہوں۔۔۔ میرے کو معلوم ہے۔" "تو تھوک نگل کر رہ گئی۔

ہم نے جلدی سے ان دونوں کے ہونٹوں پر دوبارہ ٹیپ چپکائی اور ایک بار پھر جمال سعیدی کے کمرے میں آ گئے۔ وہ بدستور بے ہوش تھا۔ اگر ہمیں اتنی آسانی سے دروازہ کھولنے کا طریقہ معلوم نہ ہو جاتا تو ہم اسی کے منہ پر پانی چھڑک کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرتے لیکن یہ بات طے تھی کہ اس سے ہمیں آسانی سے یہ اتنی سی بات معلوم نہیں ہو سکتی تھی۔ اس پر شاید ہمیں اذیت پسندوں والے طریقے آزمانے پڑتے۔

میں نے اس کے تخت کے قریب جھک کر سُرخ سوئچ دبایا اور دوسرے ہی لمحے واقعی کچھ فاصلے سے خفیف سی گھڑگھڑاہٹ کی آواز ابھری۔ ملازمہ کی اطلاع درست ہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دروازہ کھولنے کا سوئچ یہاں تھا جبکہ بند کرنے کا سوئچ تہ خانے کے قریب ہی تھا۔ ہم تیزی سے وہاں پہنچے۔ بڑا سا دروازہ واقعی کھلا تھا۔ پینٹنگ غائب ہو چکی تھی۔

ہم تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچے تو ایک اور دروازہ ہمارا منتظر تھا لیکن یہ لوہے کا ایک عام سا دروازہ معلوم ہوتا تھا اور اس میں ایک عام سا ہی تالا لگا ہوا تھا۔ شفیع شاہ نے اس پر گن سے دو فائر کیے اور وہ ٹوٹ گیا۔ دروازہ کھولتے وقت مجھے بھی اپنی دھڑکن قدرے تیز محسوس ہوئی۔

اندر پہنچ کر ہم نے دیکھا' وہ ایک نہایت کشادہ اور صاف ستھرا تہ خانہ تھا اور اس کے بیشتر حصے میں چھت تک لکڑی کے بڑے بڑے صاف ستھرے نئے صندوق اوپر تلے رکھے تھے۔ ان پر ٹین کی

پٹیاں بھی چڑھی ہوئی تھیں۔ اسٹینسل کے ذریعے چھپے ہوئے حروف میں ان پر پرنس ایڈسٹریز کا نام اور پتا درج تھا۔ صندوقوں کی وہ قطار جو زیادہ بلندی پر نہیں تھی اس پر سے ہم نے دو صندوق اُتارے۔ وہ کافی وزنی تھے۔ انہیں اُتارنے میں ہم تینوں کی خاصی قوت صرف ہوئی۔

انہیں کھولنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس قسم کے امکانات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اپنے ساتھ بھی چند سادہ سے اوزار لائے تھے لیکن انہیں استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ تہ خانے کی ایک دیوار پر لکڑی کے شیلفوں میں نہایت عمدہ قسم کے بہت سے اوزار موجود تھے۔ یقیناً یہاں یہ صندوق صرف ذخیرہ ہی نہیں کئے جاتے تھے بلکہ انہیں کھولنے یا پیک کرنے کا بھی انتظام تھا۔ ان کے ڈھکنے۔۔۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ اوپر کے تختے پر ایک غیر ملکی فرم کا نام چھپا ہوا تھا۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ بھی تھی کہ ان پر شپمنٹ وغیرہ کے اسٹکرز بھی چپکے ہوئے تھے۔

ہم نے پہلا صندوق کھول کر اس میں جھانکا تو جھانکتے ہی رہ گئے۔ نہایت عمدہ قسم کے پیکنگ میٹریل کے ذریعے اندر خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے میں صاف ستھری چمکتی ہوئی نئی کلاشنکوف رکھی تھی۔ صرف اوپر کے خانوں میں پانچ گنیں تھیں۔ صندوق کی ساخت بتا رہی تھی کہ اس سے نیچے بھی کئی خانے موجود تھے۔ ایک لمحے کے لیے ہم تینوں ساکت کھڑے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ پھر میں نے وہاں موجود بہت سے صندوقوں پر نظر ڈالی اور میری روح کی گہرائیوں تک میں ایک سرد سی لہر اُتر آئی۔ بہت سی حقیقتوں کے بارے میں ہم سُنتے رہتے ہیں، پڑھتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی سنگینی کا صحیح طور پر احساس نہیں ہوتا۔ لاشعور کے کسی تاریک گوشے میں ہم اپنے آپ کو فریب دیتے رہتے ہیں کہ شاید یہ حقیقت نہیں، فسانہ ہے لیکن حقیقت کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا کچھ اور ہی اثر رکھتا ہے۔

ہم نے دوسرا صندوق کھولا تو اس میں اسی طرح اوزی گنیں رکھی دکھائی دیں۔ یہ مختلف ملکوں کی گنیں تھیں لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ صندوق پر چھپا ہوا غیر ملکی فرم کا ایڈریس ایک ہی تھا۔ پھر ہم نے چیک کیا تو جتنے بھی صندوقوں کے بالائی حصے پر ہم نظر ڈال سکے ان پر اسی فرم کا نام چھپا ہوا دکھائی دیا۔ صندوقوں پر چپکے ہوئے اسٹکروں کے ذریعے ہماری معلومات میں مزید اضافہ ہوا کہ یہ سارا "مال" امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے توسط سے منگوایا گیا تھا لیکن انہوں نے یہ پرنس ایڈسٹریز کے لیے امپورٹ کیا تھا اور صندوقوں پر اسی کے نام و پتے کو نمایاں کیا گیا تھا۔ یہ کچھ عجیب سی بات تھی۔۔۔ لیکن اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ یہاں ایک وقت میں اتنی زیادہ تعداد میں اسلحہ موجود تھا۔ یہ دھندا نہ جانے کب سے اسی پیمانے پر جاری تھا۔ اس حساب سے نہ جانے کتنا اسلحہ انڈر گراؤنڈ مارکیٹ میں کھپایا جا چکا تھا اور جمال سعیدی ہی اس [illegible]

کتنے لوگ چھوٹے بڑے پیمانے پر حسبِ توفیق یہ دھندا کر رہے [illegible] اس لیے کوئی تعجب کی بات نہیں تھی کہ خطرناک ترین ہتھیار [illegible] گلی پھیلے ہوئے تھے۔ جھونپڑیوں تک میں پہنچے ہوئے تھے [illegible] معاشرے کی بنیادوں میں آتش فشاں پل رہے تھے اور اس [illegible] نتائج آئے دن دیکھنے میں آ رہے تھے۔ لوگوں میں اسلحے کی زبردست [illegible] طلب پیدا کر دی گئی تھی اور وہ گروہ در گروہ اس کے خریدار تھے [illegible] سوچ کر بھی جھرجھری آتی تھی کہ یہ چلن ہمیں کس انجام کی طرف لے جا رہا تھا۔ کئی دوسرے ملکوں کا انجام دیکھ کر بھی ہمارے [illegible] کے لوگ اس سے سبق حاصل کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ شاید [illegible] اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی آنکھوں پر طرح طرح کے تعصبات کی پٹیاں باندھ دی گئی تھیں۔

ہم شاید کچھ دیر اور اسی طرح گم صم کھڑے ان صندوقوں [illegible] دیکھتے رہتے لیکن اچانک ٹونی دوڑتا ہوا تہ خانے کے بالائی دروازے [illegible] تک پہنچا اور گویا ایک ہی زقند میں نیچے آ گیا۔ وہ جب بولا تو اس کی سانس پھولی ہوئی نہیں تھی لیکن لہجے میں دبا دبا ہیجان ضرور تھا۔ [illegible] سپرہائی وے کی طرف سے دو ٹرک آتے دکھائی دے رہے ہیں [illegible] سڑک کی خراب حالت کی وجہ سے ان کی رفتار سست ہے لیکن [illegible] خیال ہے وہ اسی مکان کی طرف آ رہے ہیں۔ ان پر بہت سے قبا[ئلی] قسم کے افراد لدے ہوئے ہیں اور ان کے پاس ہتھیار بھی [illegible] آ رہے ہیں۔ یہ بظاہر ممکن تو نظر نہیں آتا لیکن نہ جانے کیوں [illegible] محسوس ہو رہا ہے کہ کسی طرح ان لوگوں کو یہاں گڑبڑ کی اطلاع [مل] گئی ہے اور وہ یہاں والوں کی مدد کے لیے آ رہے ہیں۔ شاید جمال سعیدی کے لیے کمک آ رہی ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں ہم مقابلہ کریں تو ہمیں پوزیشن سنبھال لینی چاہیے۔"

میں نے اسے واپس اوپر چلنے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں اس کے ساتھ برق رفتاری سے اوپر پہنچے۔ راحیلہ اوپر ہی موجود تھی [illegible] اب وہ بالکونی کے بجائے ایک کمرے میں تھی اور کھڑکی کے [illegible] کھلے پٹ سے دوربین کے ذریعے سپرہائی وے کی طرف سے [illegible] ہوئے دو کھلے ٹرکوں کو دیکھ رہی تھی جو ویسے بھی دکھائی دے [رہے] تھے لیکن میں نے ٹونی سے دوربین لے کر دیکھا تو نقشہ واضح ہو[ا] ٹونی کا خیال درست تھا۔ ان میں سے جتنے لوگوں کے چہرے دوربین کے ذریعے صاف دکھائی دے رہے تھے ان سب کی نظریں مکان کی طرف تھیں۔ ان چہروں پر ایک عجیب سی وحشت تھی اور وہ [illegible] اٹھائے گویا محاذِ جنگ کی طرف آ رہے تھے۔

میں نے صرف ایک لمحے سوچا۔

ہم سب کے پاس ہلکے ہتھیار تھے لیکن یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں [تھا]۔ ہم نے جن مسلح محافظوں کو ٹھکانے لگایا تھا ان کے بھاری [ہتھ]یار لے کر ہم مقابلے پر جم سکتے تھے۔ تہ خانے میں جتنے ہتھیار [موجو]د تھے وہ تو ایک چھوٹی سی فوج کو مسلح کرنے کے لیے کافی تھے۔ [ی]ہ امید تھی کہ وہاں موجود بعض پیٹیوں میں ایمونیشن بھی ہو گا۔

[آ]نے والوں کی تعداد سے بھی میں خوف زدہ نہیں تھا اور مجھے [معل]وم تھا کہ میرے ساتھی بھی ان باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے [تھے]۔ اس لحاظ سے بھی ہم فائدے میں تھے کہ ہم ایک مضبوط اور [محف]وظ مکان میں تھے۔ ہم اس میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ سکتے تھے اور [بہ]ت دیر تک مقابلہ جاری رکھ سکتے تھے۔ اس مکان کی تعمیر میں یقیناً [ایس]ے امکانات کو بھی محفوظ رکھا گیا تھا۔ غرضیکہ وہاں رکنا یا مقابلہ [ک]رنا ہمارے لیے کوئی ایسا خوف زدہ کرنے والا مسئلہ نہیں تھا۔

مسئلہ صرف یہ تھا کہ یہ سب کچھ ہماری مصلحتوں کے خلاف [تھا]۔ ہمیں ایسا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی اس میں [ہما]را کوئی فائدہ تھا۔ خواہ مخواہ اپنے اوپر حالتِ جنگ طاری کرنا [ہما]ری نظر میں بہت بڑی حماقت تھی۔ ہمارے درمیان یہ طے تھا کہ [اس] قسم کے معاملات میں ہم ایسے تصادم سے ہر ممکن گریز کریں [گے] جس میں بہت شور شرابا ہو۔ لوگ اور ادارے ہماری طرف [متو]جہ ہوں اور مخالفین کے ساتھ ساتھ خود ہمارے آدمیوں کے بھی [مرنے] یا زخمی ہونے کا امکان موجود ہو۔

میں خود اپنے ساتھیوں کو تلقین کرتا رہتا تھا کہ اس قسم کے [تصاد]م کی نوبت تو صرف شدید مجبوری کی صورت میں آنے دی [جائ]ے۔ مثلاً اگر کہیں ہم چوہوں کی طرح کسی "چوہے دان" میں [پھنس] جائیں اور جان پر آ بنی ہو تو پھر اس چوہے دان سے نکلنے کے [لیے] اس قسم کا تصادم مول لیا جا سکتا تھا ورنہ ہر حال میں ہماری پہلی [کوش]ش یہی ہونی چاہیے کہ نہایت خاموشی سے اور بظاہر پرسکون سے [ا]نداز میں اپنا مقصد حاصل کر لیں۔ اگر دشمنوں کو ٹھکانے لگانا بھی [ہو] تو اس طرح لگایا جائے کہ زیادہ شور شرابا نہ ہو۔ لوگوں کو بعد [میں] ہی پتا چلے کہ وہاں کیا ہوا تھا۔ ہماری کارروائی کے دوران کسی [کی] توجہ اس طرف مبذول نہ ہو۔

جب ہم اس مہم پر روانہ ہونے کے سلسلے میں میٹنگ کر رہے [تھے] تب میں نے اپنے ساتھیوں کو اسی مفہوم کا لیکچر دیا تھا۔ اس [پر] عمل درآمد زیادہ ضروری محسوس ہو رہا تھا۔ صرف [اس] لیے میں نے ان ساری باتوں پر غور کیا۔ اپنے ساتھیوں کو [میں نے کہ]ا "فوراً نکل چلو۔ ایک لمحہ بھی ضائع نہ کرو۔ سب کچھ جس [طرح ہ]ے اسی طرح چھوڑ دو۔"

[ہم]ارا اصل مقصد پورا ہو چکا تھا۔ ہمیں جو کچھ دیکھنا تھا وہ ہم [دیکھ چ]کے تھے۔ اب اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے تھا؟ اس پر بعد میں [سوچا ج]ا سکتا تھا۔ فی الحال یہاں کوئی بہت بڑا ہنگامہ برپا کرنے یا اس قسم کے ہنگامے میں الجھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میرے ساتھی میرا حکم سن کر ایک لمحے کے لیے ہچکچائے لیکن پھر شاید ان کے ذہن میں میری ہدایات اور ہماری طے شدہ "پالیسی" تازہ ہو گئی۔ ہم کوئی قبائلی جھگڑا گولیوں کی بوچھاڑوں کے ذریعے نمٹانے کی غرض سے یہاں نہیں آئے ہوئے تھے۔ ہم بجلی کی سی تیزی سے نیچے آئے اور جس راستے سے مکان میں داخل ہوئے تھے اسی راستے سے انتہائی پھرتی سے نکل گئے۔

سب سے آخر میں میں نے عقبی دیوار پر چڑھ کر سیڑھی اوپر کھینچی اور کاٹیج کی چھت پر کود کر نیچے کود گیا۔ ڈرائیور ٹرک اسٹارٹ کر چکا تھا جو بظاہر کھٹارا تھا لیکن اس کا انجن بہت عمدہ حالت میں تھا۔ چند لمحے بعد ہی ہم پہلے کی طرح مزدوروں کے سے انداز میں ٹرک پر بیٹھے تیزی سے واپس جا رہے تھے۔ روانہ ہوتے وقت ہم اور ٹرک اس کاٹیج کی آڑ میں تھے جس میں ہم نے مسلح محافظوں کو بے ہوش یا نیم مردہ کر کے کاٹھ کباڑ کی طرح پھینکا تھا۔ سامنے والی سڑک کی طرف سے ٹرکوں میں آنے والے افراد ہمیں کم از کم روانہ ہوتے وقت نہیں دیکھ سکے ہوں گے۔ ہمیں صرف اتنی ہی مہلت درکار تھی کہ ہم اس مکان سے ذرا دور ہو جاتے۔ اس کے بعد کوئی ہمیں دیکھتا تو تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ ہم کیا کر کے آ رہے تھے۔

جلد ہی ہم یونیورسٹی روڈ پر جا پہنچے۔ مکان اور اس کے سامنے سے گزرنے والی سڑک کچھ دیر پہلے ہی ہماری نظر سے اوجھل ہو چکی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ٹرک شاید اب مکان تک پہنچے ہوں۔ ابھی ان ٹرکوں پر سوار افراد کو مکان میں داخل ہونے اور صورتِ حال کو سمجھنے کے لیے بھی کچھ وقت درکار تھا۔ اچانک مجھے عقب میں بہت دور سے فائرنگ کی تڑتڑاہٹ سنائی دی۔ فاصلے کی وجہ سے ہمیں وہ آوازیں ہلکی سنائی دیں لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان کا مرکز وہ مکان ہی تھا۔

میں طمانیت سے مسکرا دیا۔ ہمارے اندازے اور ہماری حکمتِ عملی درست ہی رہی تھی۔ دونوں ٹرکوں میں بھرے ہوئے وہ افراد اس مکان کی طرف ہی آ رہے تھے۔ اگر ہمیں یہ اندازہ لگانے میں تاخیر ہو جاتی یا ہم ان کی آمد سے بے خبر رہتے تو ہم اس مکان میں محصور ہو کر رہ جاتے۔ ہمیں بادلِ ناخواستہ اور بلا ضرورت ان سے مقابلہ کرنا پڑتا اور اس ویرانے میں محاذِ جنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی جس کا انجام نہ جانے کیا ہوتا۔

اب وہ لوگ شاید مکان کو گھیرے میں لے کر آزمائشی طور فائرنگ کر رہے تھے کہ اندر سے کوئی جواب آئے تو وہ باقاعدہ جنگی قسم کی کارروائی شروع کریں۔ انہیں اندازہ تک نہیں تھا کہ ان کے مطلوبہ افراد اب مکان میں موجود نہیں تھے۔ یہ معمّا میرے لیے بھی واقعی حیرت کا باعث بنا ہوا تھا کہ آخر وہ اس طرح اچانک کیونکر آن پہنچے تھے؟

مکان کے باہر اور اندر موجود مسلح محافظ تو سنبھلنے سے پہلے ہی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے یا بے ہوش ہو گئے تھے۔ جمال سعیدی، احمد کمال، ارمیلا اور ملازمہ کو بھی کچھ کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ہم نے انہیں اتنی مہلت نہیں دی تھی کہ وہ کسی بھی ذریعے سے کسی کو کوئی اطلاع دے سکتے۔ جمال سعیدی کو البتہ جب ہم قابو میں کرنے لگے تھے تو اسے ایک سوئچ تک ہاتھ لے جانے کا موقع مل گیا تھا لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اسے دبانے میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں؟

اگر میں فرض کر لیتا کہ وہ اسے دبانے میں کامیاب ہو گیا تھا تب بھی یہ سوچنا کچھ عجیب ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہاں سے کافی دور موجود کچھ افراد اس کے ذریعے خطرے سے آگاہ ہو گئے تھے۔ دوسرا امکان یہی نظر آتا تھا کہ مکان میں موجود کوئی نہ کوئی فرد ہماری نظر سے اوجھل رہنے میں کامیاب ہو گیا تھا اور اس نے کہیں چھپے رہ کر کسی ذریعے سے کہیں خطرے کی اطلاع دی تھی۔ وہ ذریعہ ٹیلی فون نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ٹیلی فونوں کی تاریں ہم نے کاٹ دی تھیں اور مکان میں ٹیلی فون سیٹ بھی ہم نے ایسی جگہوں پر رکھے دیکھے تھے جہاں وہ ہماری نظر میں رہے تھے۔

مزید حیرت کی ایک بات یہ بھی تھی کہ اس مکان سے اگر کسی طرح اس نامعلوم مقام پر خطرے کی اطلاع پہنچ بھی جاتی تو وہاں سے اتنے بہت سے افراد اسلحہ اٹھا کر یوں سرِعام اس کی نمائش کرتے ہوئے فوری طور پر مدد کے لیے پہنچ سکتے تھے۔ یہ بڑی غور طلب سی بات تھی بلکہ بہت سے لوگوں کو اس پر فکر مند ہونا چاہیے تھا لیکن فکر مند ہونے کے لیے شاید بے چارہ صرف عام آدمی رہ گیا تھا جنہیں درحقیقت اس قسم کے مسائل پر فکر مند ہونا چاہیے تھا انہیں اپنے ہی چکروں سے فرصت نہیں تھی۔ انہوں نے شہر کو۔۔۔ بلکہ شاید ملک کو ہی اس کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔

فی الحال اس معمے میں سر کھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اس لیے میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا۔ یونیورسٹی روڈ پر ایک درخت کے نیچے میری گاڑی ہماری منتظر تھی۔ ہم ٹرک سے اتر کر جلدی سے اس میں بیٹھ گئے۔ اپنے گیٹ اپ کی جن جن چیزوں سے ہم چھٹکارا پا سکتے تھے وہ ہم نے ہٹا دیں۔ میں نے اپنی پگڑی اتار دی۔ مونچھیں اور مسّا نوچ کر پھینک دیا تاکہ اس گاڑی میں بیٹھ کر ہم زیادہ عجیب نظر نہ آئیں۔ اس گاڑی کو جس شخص نے اب تک سنبھالا ہوا تھا وہ ٹرک میں ڈرائیور کے ساتھ جا بیٹھا اور ٹرک فوراً چورنگی سے ٹیمپرکینٹ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس نے اپنا راستہ بدل لیا تھا تاکہ ہمارے اور اس کے درمیان بالکل ہی کوئی تعلق نظر نہ آئے۔

گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ شفیع شاہ نے سنبھالی اور ہم شہر کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔ میں نے ڈیش بورڈ سے موبائل فون اٹھایا اور رحیم گل سے رابطہ کیا۔ اس سے رابطہ بھی اس کے موبائل فون پر ہی ہوا۔

"تم اس وقت کہاں ہو اور کیا کر رہے ہو؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"خیریت تو ہے؟ یہ اتنی تیزی سے کیوں بول رہے ہو؟ تمہارے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے؟" اس نے اطمینان سے پوچھا۔

"کیا اچھی بات ہے کہ ایک پولیس والا بھی پولیس کے بارے میں سوال کر رہا ہے۔" میں نے اب جسم کو ذرا ڈھیلا چھوڑ کر سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "تمہارا اندیشہ درست نہیں۔ پولیس تو ظاہر ہے، شریفوں کے پیچھے ہی لگی رہتی ہے۔ جن کے پیچھے اسے لگنا چاہیے ان کے وہ آگے لگی رہتی ہے۔"

"شروع ہو گئے۔۔۔!" وہ غرایا۔

"میں نے تم سے کچھ پوچھا تھا۔ اگر تم سیدھی طرح جواب دے دیتے تو مجھے شروع ہونے کی ضرورت پیش نہ آتی۔" میں نے کہا۔

"میں اس وقت ایک ریستوران میں ہوں اور دو ڈی ایس پی صاحبان کے ساتھ کھانا کھا رہا ہوں۔" اس نے گویا خود پر جبر کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت خوب۔ تم لوگ کھانے میں ہی لگے رہنا۔ شہر کو سیلاب لے جائے۔" میں اسے مزید چھیڑے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم اپنا بکواس کا شوق بعد میں پورا کر لینا۔ میں اب فون کر رہا ہوں۔" وہ شاید اندر ہی اندر بل کھا کر لیکن لہجے میں تحمل برقرار رکھتے ہوئے بولا۔

"سنو۔۔۔ سنو۔۔۔ میں تمہیں ایک بہت اہم بات بتانا چاہتا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا "یہ بھی اچھا ہی ہے کہ اس وقت تم اپنے دو چھوٹے موٹے افسران کے ساتھ بیٹھے ہو۔ شاید ان میں سے کوئی تمہارے کام ہی آجائے۔ میں تمہیں ایک بہت بڑا موقع دے رہا ہوں جس سے تمہارا نام مقام افسران بالا کی نظر میں اونچا ہو سکتا ہے۔ ذرائع ابلاغ سے تمہیں جو شہرت ملے گی اس کے علاوہ ہوگی۔ اگر محکمے کی مالی حالت بہتر ہوئی تو شاید کوئی موٹا انعام بھی مل جائے۔"

"مجھے ان سب باتوں کی پروا نہیں ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا "میں صلہ و ستائش کی تمنا سے بے نیاز ہو کر کام کرتا ہوں۔ اصل اہمیت کام کی ہوتی ہے۔ اس کام سے اس ملک کو یا قوم کو کچھ فائدہ ہو جائے اور میرا ضمیر طمانیت محسوس کرے، میرے لیے صرف یہی صلہ بہت ہوتا ہے۔ تم یہ تمہید مت باندھو، اصل بات بتاؤ۔" وہ اپنے لہجے میں مخصوص پیشہ ورانہ سرد مہری رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ اسے دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔

"اس کے لیے تمہیں دوسرے علاقے کی پولیس کے ساتھ مل کر کام کرنا پڑے گا لیکن کریڈٹ بہرحال تمہارے ہی کھاتے میں آئے گا۔"

"میں نے کہا نا کہ یہ باتیں اہم نہیں ہیں۔ تم اصل بات بتاؤ۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔ اب وہ اپنے لہجے کی بے تابی چھپانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔

"اس کے لیے تمہیں بہت پھرتی سے حرکت میں آنا پڑے گا۔"

"اب تمہیدیں باندھتے رہو گے یا اصل بات کی طرف بھی آؤ گے؟" وہ شاید بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"تم نے کبھی جمال سعیدی کا نام سنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہا لیکن مجھے امید تھی کہ کم از کم مجھ سے بات کرتے ہوئے وہ اس ایک لمحے کی خاموشی میں کوئی ڈپلومیٹک جواب نہیں سوچ رہا ہوگا۔ وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "میں نے صرف اس کا نام ہی نہیں سنا بلکہ میں غائبانہ طور پر اسے کافی حد تک جانتا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے تم یہ بھی جانتے ہو گے کہ وہ غیر ملکی ہے لیکن بڑے دھڑلے سے یہاں کا باشندہ بنا بیٹھا ہے اور اتنے بڑے پیمانے پر بزنس کر رہا ہے جتنے بڑے پیمانے پر شاید وہ اپنے ملک میں بھی کرنے کا نہیں سوچ سکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"اپنے ملک میں تو شاید اس کا بھاری بھرکم وجود اب تک کسی مارٹر گن کے گولے کی زد میں آکر چیتھڑے ہو کر اڑ چکا ہوتا۔ اسے ترکِ وطن بہت راس آیا ہے۔۔۔ لیکن خیر۔۔۔ بات یہاں تک بھی رہتی تو غنیمت تھا۔ میرے ذہن میں اس کے بارے میں کچھ دوسرے قسم کے شبہات ہیں۔۔۔"

"مثلاً۔۔۔؟" اب میں نے اس کی بات کاٹی۔

"فی الحال میں ان کا اظہار نہیں کر سکتا۔" آخر کار وہ ڈپلومیٹک ہو ہی گیا۔ اس کے لہجے میں مصلحت کوشی آہی گئی لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ آخر وہ سرکاری آدمی تھا۔ اس کی اپنی کچھ مجبوریاں تھیں اور اس وقت وہ اپنے سینئرز کے ساتھ بیٹھا لنچ کر رہا تھا۔ کسی اچھے مقصد کے لیے تو خیر وہ اپنی مجبوریوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا اور قواعد و ضوابط کے خول میں بند ہونے کے باوجود نہ جانے کیا کچھ کر گزرتا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا دم غنیمت تھا۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ جمال سعیدی پہلے ہی اس کی نظر میں مشکوک افراد کی فہرست میں شامل تھا۔ اس طرح میرے لیے اسے اس کام پر آمادہ کرنا آسان ثابت ہو سکتا تھا جو میں اسے سونپنے والا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "وہ ان لوگوں میں شامل ہے جن کی طرف میں دیکھتا ہوں اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ جاتا ہوں۔ نظر دوسری طرف پھیر لیتا ہوں۔" پھر اس نے اعتراف کر لیا "میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ بعض لوگوں کے سلسلے میں میرا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے جیسے انسان کسی مہلک اور خوف ناک مرض کی تباہ کاریاں دیکھتا ہے تو سوچتا ہے کہ کاش وہ اس کا خاتمہ کر سکتا۔۔۔ لیکن یہ اس کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ صبر کے سوا اسے کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔"

میں یونہی رحیم گل کا قائل نہیں تھا۔ پولیس کے محکمے میں تو دور کی بات تھی، اب تو مذہبی رہنماؤں میں اس قسم کے لوگ نایاب ہوتے جا رہے تھے۔ اس کی یہ خوبی بھی نہ جانے کتنی ستائش کی مستحق تھی کہ وہ دیانت داری سے صرف ڈیوٹی نہیں نبھاتا تھا بلکہ گرد و پیش پر بھی نظر رکھتا تھا۔ جو چیزیں اس کے فرائض کے دائرے میں نہیں آتی تھیں ان کے بارے میں بھی خبر رکھتا تھا۔ آج کل تو اپنے فرائض ہی دیانتداری سے انجام دینے والے نایاب ہوتے جا رہے تھے چہ جائیکہ کوئی اتنا "فاضل درد" اپنے دل میں پالتا تھا۔

میں نے اندر ہی اندر بے پناہ اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا "بس تو پھر سمجھ لو کہ تمہیں صبر کے علاوہ بھی کوئی چارا نظر آنے والا ہے۔ یہ دوسری قسم کا چارا ہوگا۔۔۔ سرسبز قسم کا چارا۔۔۔ جی بھر کے چرنا۔"

"میں اس وقت کھانا بیچ میں چھوڑ کر بیٹھا ہوا ہوں۔ میں تمہاری بے سروپا بکواس سننا ہرگز پسند نہیں کروں گا۔ صرف کام کی بات کرو۔ بے تکی ہانکنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔" وہ تنبیہ کرنے کے سے انداز میں بولا۔

"ورنہ۔۔۔؟" میں نے چیلنج کرنے کے سے انداز میں کہا۔

"ورنہ تم خواہ کہیں بھی ہو، میں تمہیں تلاش کر کے شوٹ کر دوں گا۔" وہ بولا۔

"ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اس سے پہلے کہ اس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑتا، میں نے کہا "خیر۔۔۔ میں تم سے یہ پوچھنے لگا تھا کہ تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ جمال سعیدی کا سپر ہائی وے اور یونیورسٹی روڈ کے درمیان ایک ویران مقام پر بڑا عالی شان قلعہ نما مکان ہے؟"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ میں ایک بار اس کا دیدار کر چکا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارے ذہن میں یقیناً بہت سے سوالات بھی ابھرے ہوں گے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"میرے ذہن میں ابھرنے والے سوالات کی بات چھوڑو۔" وہ ٹالنے والے انداز میں بولا "میرے ذہن میں تو سوالات کا بہت بڑا عجائب خانہ کھلا ہوا ہے۔"

"اس مکان میں اس وقت اسلحے کی ایک بہت بڑی کھیپ موجود ہے۔ اگر تم جلد از جلد حرکت میں آجاؤ اور وقت ضائع کیے بغیر اس علاقے کی پولیس کے ساتھ مل کر فوری طور پر چھاپا مارو تو یہ بہت بڑی کھیپ پکڑنے کا سہرا تمہارے سر بندھ سکتا ہے اور بات صرف اسلحے تک ہی محدود نہیں رہے گی۔ جب تم اتنے سنگین معاملے میں اتنی مضبوط بنیاد اور اتنے بڑے، ٹھوس ثبوت کے

ساتھ جمال سعیدی پر ہاتھ ڈالو گے تو یقیناً اور بہت سے انکشافات ہوں گے۔ بڑی بڑی باتیں سامنے آئیں گی اور شاید پرنس سمیرا کے قتل کی گتھی کو بھی سلجھانے میں کچھ مدد ملے۔ وہ تو خالصتاً تمہارا کیس ہے اور کافی اہم ہے۔ شاید اس کی بھی کوئی شاخ جمال سعیدی تک پہنچتی ہو۔"

وہ جب بولا تو اس کے لہجے سے کچھ یوں لگا جیسے وہ یک دم چوکنا سا ہو گیا ہو "تمہاری اس اطلاع کا ذریعہ کیا ہے؟" اس نے محتاط لہجے میں پوچھا۔

"فوراً وہی تھکے پولیس والے بن گئے نا....." میں نے افسوس سے کہا "وہی خواہ مخواہ کی جرح بازی اور فضول سوالات شروع کر دیے۔ تمہیں آم کھانے سے مطلب ہے یا پیڑ گننے سے؟"

"مائی ڈیئر! میں بہت سنجیدہ ہوں۔" اس کے لہجے سے واقعی کچھ زیادہ ہی سنجیدگی جھلک رہی تھی۔

"اور میں تمہاری حالت پر رنجیدہ ہوں۔ بہرحال تمہاری اطلاع کے لیے بتا رہا ہوں کہ یہ ٹپ مجھے ایک بہت ہی معتبر ذریعے سے ملی ہے۔ بڑی ساؤنڈ ٹپ ہے۔ تم اس کے بارے میں شک میں نہ پڑو۔ آنکھیں بند کر کے چل پڑو۔ بہت فائدے میں رہو گے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "انہی لوگوں کے اندر کے ایک ذریعے سے اطلاع ملی ہے۔ وہ "ذریعہ" اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ کر آیا ہے لیکن اس وقت وہ اپنی جان بچا کر بھاگنے کی فکر میں ہے۔ میں تمہیں اس کی فراہم کردہ کچھ اور اطلاعات سے بھی استفادہ کرنے کا موقع دے رہا ہوں۔ وہاں تمہیں چند لاشیں بھی ملیں گی۔ کچھ لوگ زخمی بھی ملیں گے۔ یہ ان لوگوں کی آپس کی لڑائیوں کا شاخسانہ ہے۔ تم پولیس کی کافی نفری لے کر جانا کیونکہ وہاں شاید چالیس پچاس مسلح قبائلی قسم کے لوگ بھی ملیں گے جو یقیناً اس مکان میں کسی کا گھسنا پسند نہیں کریں گے لیکن مجھے یہ بھی امید ہے کہ وہ پولیس سے تصادم مول نہیں لیں گے۔"

"تمہاری ان لوگوں کے اندرونی حلقوں تک رسائی کیسے ہو گئی جو تمہیں اندرونی جھگڑوں کی خبریں بھی دینے لگے؟" رحیم گل نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے میری جو کاروباری لائن ہے اس میں ہر طرح کے آدمی سے واسطہ پڑتا ہے۔" میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

"مجھے تمہارے کاروبار اور تمہاری لائن' دونوں کا اچھی طرح اندازہ ہے۔" وہ اب بھی چبھتے ہوئے لہجے میں ہی بولا۔

میں نے اپنے لہجے سے اب ذرا بیزاری کا اظہار کرنے کی کوشش کی اور بات ختم کرنے کے سے انداز میں کہا "ٹھیک ہے بھئی..... تم مرضی کے مالک ہو' اس اطلاع پر ایکشن لو یا نہ لو۔ میرے پاس تو ایک خبر آئی تھی۔ میں نے ایک باضمیر اور فرض شناس شہری کی طرح اسے اپنے شناسا پولیس آفیسر تک پہنچا دیا۔ اب یہ اس پولیس آفیسر کی صوابدید پر ہے کہ وہ اس پر کارروائی کرے یا یہیں بیٹھا طنز و مزاح سے شغل فرماتا رہے۔"

"جناب باضمیر اور فرض شناس شہری صاحب!" وہ تیکھے لہجے میں بولا "آپ ایسی چھوٹی موٹی چیز بھی نہیں ہیں۔ قسم کے کاموں کے لیے اس حقیر فقیر کو ہی یاد فرماتے رہتے ہیں۔ عہدے میں محض انسپکٹر ہے..... اور یہ تو میرے علاقے کا کیس نہیں ہے۔ آپ اس علاقے کے ذرا بڑے پولیس افسران سے راست بھی رابطہ فرما سکتے تھے۔"

"بھئی جو بات تم میں ہے وہ کسی اور میں کہاں۔" میں نے ذرا پیار سے کہا "اتنا اہم اور سنگین معاملہ کسی مک مکا کرنے والے آفیسر کے ہاتھ میں نہیں دیا جا سکتا۔ اگر وہ صرف عہدے سے بڑا ہوا لیکن کردار میں چھوٹا ہوا تو اس کے تو وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اس معاملے کو دبانے کے لیے تو لمبا مال چلے گا۔ بلکہ عین ممکن ہے اس علاقے کی پولیس کی آنکھوں پر پہلے ہی مال کی پٹی بندھی رہتی ہو۔ اسی لیے تو میں تمہیں ان پر سوار کرنا چاہتا ہوں تاکہ اگر وہ پہلے سے ہی ان سے ملے ہوئے ہوں تو تمہیں اس کا بھی اندازہ ہو جائے اور اگر آپ رکاوٹ کرنے کی کوشش کریں تو تم ان کے راستے کی دیوار بن سکو۔"

"یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ضرورت پڑنے پر کبھی کبھار مکھن لگا لیتے ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر ملامت سے بولا "کے باوجود میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش ضرور کروں گا کہ میں تم مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہے ہو وہ اتنا آسان ہے....."

"ہمارے ہاں کی پولیس کے لیے تو کوئی بھی معقول کام نہیں ہوتا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پڑی بلا کوئی نئی بات نہیں بتا رہے ہو۔"

"پہلے میری پوری بات سن لو پھر کچھ کہو۔

"جس ملک سے جمال سعیدی کا تعلق ہے' تمہیں معلوم ہے کچھ برس پہلے اس کے اور ہمارے درمیان سیاسی معلوم مضبوط قرابت داری تھی۔ ہمیں اپنی نہیں' اس کی بقا کی پڑی رہتی تھی۔ اس حوالے سے آج تک جمال سعیدی کے ملک میں کچھ مضبوط سیاسی رابطے چلے آ رہے ہیں اور تمہیں ہی ہے کہ اس ملک کے بارے میں ہماری پالیسیوں میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی خواہ ہم نے ان ناز برداریوں کی بھاری قیمت ادا کی ہو۔ جمال سعیدی نے اتنی مضبوط کرنے میں اس سارے پس منظر سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہمارے ہاں بھی کچھ اہم لوگوں کے مفادات وہاں سے وابستہ انہوں نے بھی اس کی پوری پوری مدد کی ہے اور ضرورت بھی کر سکتے ہیں۔ ہمارے سرحدی صوبے کے ایک وزیر خاص طور پر جمال سعیدی پر بہت مہربان ہیں اور کوئی بھی

پڑنے پر وہ اس کی مدد کرنے کی پوری پوری کوشش کریں گے' اتنا مجھے یقین ہے۔"

میں نے حقیقتاً دل کی گہرائیوں میں ایک عجیب سی کسک محسوس کرتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایک تو یہ بڑی مصیبت ہے کہ ہمارے ملک میں کسی بھی بُرے کام کے بارے میں چھان بین کرو تو اس کی تہ میں ایک بڑا آدمی نکل آتا ہے لیکن کیا تم بھی ان باتوں کی پروا کرنے لگے ہو؟"

"اگر مجھے پورا یقین ہو کہ جو کچھ میں کر رہا ہوں وہ بالکل ٹھیک ہے اور جن اطلاعات کی بنیاد پر میں کارروائی کر رہا ہوں وہ بھی سو فیصد صحیح ہیں تو پھر میں کسی کی پروا نہیں کرتا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا "لیکن اگر بعد کے حالات سے یہ ثابت ہو جائے کہ مجھے ملنے والی اطلاعات غلط تھیں اور ان کی بنیاد پر میں نے جو کارروائی کی وہ بھی غلط تھی تو اس سے جو الجھن اور دشواریاں پیدا ہوں گی وہ تو اپنی جگہ ہوں گی لیکن میں خود اپنی نظر میں بھی اپنے آپ کو بہت ذلیل محسوس کروں گا۔ اس تصور سے مجھے زیادہ خوف آتا ہے۔"

"اطلاع کے بارے میں تو میں تمہیں گارنٹی دے سکتا ہوں کہ اطلاع درست ہے۔" میں نے کہا۔

"جمال سعیدی جیسے آدمی کے معاملے میں مجھے کم از کم سرچ وارنٹ بھی لے لینا چاہیے۔ یہ کام ویسے ہی ہمارے ہاں کچھ آسان نہیں ہے' اس جیسے آدمی کے معاملے میں اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ یہ کہانیوں' ڈراموں اور فلموں والا سلسلہ نہیں ہے کہ ادھر پولیس آفیسر صاحب مجسٹریٹ یا کسی اور اتھارٹی کو فون کرتے ہیں اور پھر ان کا اردلی جا کر اتنے آرام سے سرچ وارنٹ لے آتا ہے جتنے آرام سے کوئی ڈاک خانے سے ڈاک ٹکٹ بھی نہیں لا سکتا۔ حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی لیے اکثر پولیس والے اس چکر میں ہی نہیں پڑتے اور اس کے بغیر ہی کام چلانے کی کوشش کرتے ہیں جس پر آئے دن اخبارات میں طوفان برپا ہوتا رہتا ہے۔ ہم اگر کوئی اچھا کام کرنا بھی چاہیں تو کیسے کر سکتے ہیں؟ ہماری جان ہر طرف سے مصیبت میں پھنسی ہوئی ہے۔"

"تمہاری یہ داستانِ غم سن کر میرا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ خلاصہ اس کا شاید یہ ہے کہ تم کچھ نہیں کر سکتے۔ بہتر ہوتا کہ تم مجھے شروع میں خلاصہ ہی سنا دیتے۔ ہم دونوں کا خاصا قیمتی وقت ضائع ہونے سے بچ جاتا۔" میں نے جل کر کہا لیکن میرے لہجے میں نرمی برقرار رہی۔

"بات کا غلط مطلب اخذ کرنا تم جیسے کوڑھ مغز لوگوں کی خاص عادت ہوتی ہے۔" وہ اطمینان سے بولا "میں نے یہ تو نہیں کہا جو تم سمجھ رہے ہو۔"

"تو پھر یہ اتنا بہت سا رونا رونے کا کیا مطلب ہے؟" میں نے خفگی سے پوچھا۔

"میں اس جہانِ رنگ و بو میں چکراتے ہوئے تم جیسے عظیم گدھے کو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ معاملہ بہرحال نازک ہے۔ مجھے مروا نہ دینا۔ وہ والا معاملہ نہیں ہونا چاہیے کہ۔۔۔ چڑھ جا بیٹا سولی پر' رام بھلی کرے گا۔ اب تم نے اتنے وثوق سے اطلاع دی ہے تو کچھ نہ کچھ تو۔۔ کرنا ہی پڑے گا۔"

"فی الحال تو تم صرف لفظوں کی جگالی کر رہے ہو۔۔۔ اور جہاں تک مروانے کا سوال ہے تو کیا اس سے پہلے میں نے تمہیں کبھی مروایا ہے؟ ہمیشہ تمہاری عزت اور شان میں کچھ اضافہ ہی کیا ہے۔"

"بالکل درست فرمایا عالم پناہ! اب اگر اجازت ہو تو میں باقی کھانا کھا لوں؟"

"ظاہر ہے۔۔۔ کھائے بغیر تو تم لوگ کہیں سے ہلنے کا سوچ نہیں سکتے۔۔۔ اور مصیبت یہ ہے کہ کھانے کے بعد تم لوگوں سے ویسے ہی ہلا نہیں جاتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر تم کم سے کم وقت ضائع کرتے تو اچھا تھا۔ ابھی تو تم کو دوسرے علاقے کی پولیس سے بات کر کے انہیں قائل بھی کرنا پڑے گا۔"

"علاقے کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ انہیں سمجھانے میں وقت نہیں لگے گا۔ زیادہ تر علاقوں کے افسران تمہارے اس خادم کی بات آنکھیں بند کر کے مانتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"حیرت ہے!" میں نے حقیقتاً حیرت سے کہا "نہیں تو تم جیسے آدمی کے سائے سے بھی دور بھاگنا چاہیے۔ تم جیسے تو ہی کو اُن سے تو ان کے لیے دشواریاں پیدا ہوتی ہوں گی۔"

"میں اپنی اصول پرستی سے انہیں تنگ نہیں کرتا۔ بس ضرورت جو کام لینا ہوتا ہے وہ لے لیتا ہوں۔ ان کے سامنے اور ناصح بننے کی کوشش نہیں کرتا۔ یہ اوپر والے کا کرم ہے کہ ان میں سے بیشتر اس حقیرِ پُرتقصیر کے سامنے مریدوں کی طرح رہتے ہیں۔"

"پتا نہیں ان بے چاروں کو تم نے کیا کیا چکر دے رکھے ہیں۔ بہرحال۔۔۔ تو میں امید رکھوں کہ تم حرکت میں آ رہے ہو؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یقیناً۔" اس نے بلا تامل جواب دیا "اگر تم کہتے ہو تو میں کھانا کھانے کا پروگرام بھی ملتوی کر دیتا ہوں۔ میرے ساتھی تو کھانا کھا چکے ہیں۔"

"بہتر تو یہی تھا کہ تم مزید وقت ضائع نہ کرتے۔ کھانا کیا ہے۔۔۔ کھانا تو تم ویسے بھی دن میں آٹھ دس مرتبہ کھاتے ہو۔ دو نوالے کم ہو جائیں گے تو تمہاری صحت پر کچھ منفی اثرات نہیں پڑیں گے۔" میں نے کہا۔

"یہ نصیحت اس دھڑلے سے تم جیسا کوئی فاقہ کش ہی کر سکتا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "وقت بچانے کی خاطر میں کھانے پر کوئی سمجھوتا نہیں کرنا چاہتا۔"

"یقین نہیں آ رہا کہ تم اس قدر عقل مند ہو چکے ہو۔"

"خدا حافظ۔" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے بھی فون بند کر دیا اور دل ہی دل میں خاصی طمانیت محسوس کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر کہا "ہمیں اپنا کام ادھورا چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اس کے باوجود یہ مسئلہ تقریباً اسی انداز میں حل ہو گیا جس طرح میں چاہتا تھا۔ معاملہ انہی ہاتھوں میں چلا گیا جن میں' میں اسے پہنچانا چاہتا تھا۔"

"جمال سعیدی خواہ کتنا ہی بڑا مگرمچھ سہی۔۔۔ لیکن اگر رحیم گل اس معاملے میں ہاتھ ڈالنے پر تیار ہو گیا ہے تو پھر وہ اسے ضرور رگڑ ڈالے گا۔" زرتاج وثوق سے بولی "اس قسم کے معاملات میں آئی جی' ڈی آئی جی سے رجوع کرنے کی نسبت اس شخص سے رجوع کرنا زیادہ بہتر ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ شخص اتنی زیادہ دھونس' دھمکیوں' لالچ اور دباؤ کا مقابلہ کیسے کر جاتا ہے۔"

"اوپر والا بھی تو آخر اپنے صحیح بندوں کا خیال رکھتا ہے۔ اس کی مدد شاملِ حال رہتی ہے۔" میں نے کہا پھر گردن گھما کر اسے گھورا "میں پہلے بھی تمہارے منہ سے اس کمینے کی تعریفیں سن چکا ہوں۔ آج کل تم اس کے بہت گُن گانے لگی ہو۔ مجھے تمہارے عزائم کچھ ٹھیک نہیں لگتے۔"

"ظاہر ہے انسان کو اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو سوچنا ہی پڑتا ہے۔" وہ کندھے اچکا کر بولی "پہاڑ سی زندگی یونہی کسی مبہم اور بے عنوان سے انتظار کے سہارے تو نہیں گزاری جا سکتی۔"

گاڑی میں یک دم سکوت چھا گیا۔ مجھے دھچکا سا لگا۔ ایک تو ویسے بھی زرتاج کی بات قطعی غیر متوقع تھی۔ دوسرے راحیلہ کی موجودگی میں تو میں تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ زرتاج ایسی بات کر سکتی تھی۔ کبھی یہی بات میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی تو اس نے جواب میں بڑی افسانوی سی باتیں کی تھیں۔ زندگی ایک مبہم اور بے عنوان سے انتظار کے سہارے ہی گزارنے کا عزم ظاہر کیا تھا۔ رحیم گل کو وہ اس کی تمام تر محبت' اس کے تمام تر خلوص کے باوجود خاطر میں لانے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن اب جیسے اس نے یک دم ہی حقیقت پسندی کی طرف چھلانگ لگائی تھی اور اس کا اظہار بھی ایسے عجیب مواقع پر اچانک ہی کر ڈالا تھا۔

میں نے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اس موقع پر کوئی نہ کوئی ردِعمل ضرور ظاہر کرے گی' اور کچھ نہیں تو استہزائیہ انداز میں ہنس ہی دے گی لیکن وہ انجان بنی کھڑکی کے شیشے کے پار دیکھ رہی تھی۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس نے یہ بات سنی ہی نہیں تھی۔ وہ شاید اس معاملے میں زیادہ ہی بُردباری اور متانت کا مظاہرہ کرنے پر تُلی ہوئی تھی جس کا سب سے اچھا طریقہ یقیناً یہی تھا کہ وہ بات سن کر بھی انجان بن جاتی۔

میں زرتاج سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا اس نے رحیم گل سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا؟ کیا اس کے اندر کوئی انقلاب رونما ہو چکا تھا؟ اگر اس کا جواب اثبات میں ہوتا تو مجھے اس پر خوشی ہی ہوتی۔ میری اپنی زندگی جیسی بھی تھی اور میں اسے کبھی میسر نہ آسکنے والی محبت کے انتظار میں خواہ جس طرح بھی گزار رہا تھا لیکن میں کسی اور کی خوب صورتی و بھرپور جوانی کو صحرا میں کھڑے تنہا درخت کی طرح انتظار کی کڑی دھوپ میں جھلتے اور مرجھاتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ خود اذیتی کی یہ مشق میری اپنی ذات تک محدود رہتی تو ٹھیک تھا۔ میں کسی اور کو اس بیماری میں مبتلا کرنا نہیں چاہتا تھا تاہم میں زرتاج سے کچھ بھی نہ پوچھ سکا' اسے کچھ بھی نہ بتا سکا۔ اس نے بے دھڑک اپنی بات کر دی تھی لیکن میں اس بات کو آگے نہ بڑھا سکا۔ اگر اس کی تصدیق ہو جاتی تو میرے ذہن سے ایک بوجھ اتر جاتا۔ میں خود کو زرتاج کی زندگی کی بے کیفی اور بے مقصدیت کا ذمے دار محسوس کرتا تھا۔ میرا یہ موہوم سا احساسِ جرم ختم ہو جاتا۔

شاید ہمارے درمیان چھا جانے والے ایک عجیب سے بوجھل پن کو محسوس کرتے ہوئے شفیع شاہ نے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سر! آپ کو کچھ اندازہ ہوا کہ اسلحے کی اسمگلنگ کا پرنس انڈسٹریز سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ میری معلومات کے مطابق تو وہ صاف ستھری انڈسٹری ہے اور اسے صاف ستھرے طریقے سے چلایا جا رہا ہے۔"

"ہم نے پولیس کو اس سلسلے میں صحیح ٹریک پر ڈال دیا ہے۔ اب اس قسم کے سوالوں کے جواب حاصل کرنا اس کا کام ہے۔" میں نے موضوع کی اس تبدیلی پر دل ہی دل میں شفیع شاہ کا شکر گزار ہوتے ہوئے کہا "ہمیں کچھ کام پولیس کے لیے بھی چھوڑ دینا چاہیے۔ اسی لیے میں نے رحیم گل جیسے آدمی کی ٹانگ اس معاملے میں اڑا دی ہے۔ وہ کچھ نہ کچھ تو معلوم کر ہی لے گا۔"

"دیکھا۔۔۔ آخر تمہیں بھی کسی نہ کسی مرحلے پر قائل ہونا ہی پڑتا ہے کہ وہ کام کا آدمی ہے۔" زرتاج فاتحانہ لہجے میں بولی۔

"خدا کی پناہ۔۔۔! ابھی سے اس کمینے کی کیسی حمایت شروع ہو گئی ہے!" میں نے زرتاج کی طرف دیکھ کر حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

زرتاج غصے سے نتھنے پھُلا کر کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "بس۔۔۔ بس۔ زیادہ خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ اب اس کا نام سن کر تمہارے دل میں جلترنگ' ہارمونیم اور طبلے وغیرہ بجا کریں گے۔ آئندہ ہم اس کے بارے میں تبصرے کرنے میں احتیاط برتیں گے۔۔۔ بلکہ کوشش کریں گے کہ زیادہ خالص قسم کے تبصرے تمہاری غیر موجودگی میں کیا کریں۔"

زر تاج کے چہرے پر غیظ و غضب کے آثار معدوم ہو گئے۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم اس خبیث کے قائل تو بہت ہیں لیکن اس کے منہ پر کبھی اعتراف کر کے نہیں دیں گے۔ آخر دل گل بھی تو کوئی چیز ہے۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد... والا معاملہ ہے۔ گو کہ وہ خوباں سے زیادہ خوبانی معلوم ہوتا ہے... اور وہ بھی سڑی ہوئی... لیکن خیر... اب ہم تمہاری دل شکنی تو نہیں کر سکتے۔ دوستوں کی خاطر ہم تو بڑی بڑی بے ہودہ چیزوں کو بھی برداشت کر لیتے ہیں۔ اب اسے بھی برداشت کرنے کی کوشش کیا کریں گے۔"

اس اثنا میں ہم ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ شفیع شاہ عقبی راستے سے گاڑی اندر لے گیا۔ ہمارے اصل کپڑے گاڑی میں ہی موجود تھے۔ سب اپنے حلیے درست کرنے کمروں میں چلے گئے۔ زر تاج' راحیلہ کے ساتھ چلی گئی اور شفیع شاہ' ٹونی کے ساتھ ہولیا۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔

سب سے پہلے میں ہی اپنا حلیہ درست کر کے اور تیار ہو کر واپس نیچے آگیا اور اپنے آفس میں جا بیٹھا۔ چند لمحے بعد ہی زر تاج آفس میں داخل ہوئی اور دروازے پر ہی رکتے ہوئے بولی "میں جا رہی ہوں۔"

"مانا کہ تم بہت بڑی جاگیردارنی' بہت بڑی بزنس وومن ہو لیکن اب ایسی بھی کیا مصروفیت...!" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "چند منٹ ہم غریبوں کے پاس بھی بیٹھو۔ کچھ ٹھنڈا گرم تو پیتی جاؤ۔"

"مزدور کی مزدوری پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کرنا چاہتے ہو غریب آدمی؟" وہ قریب آکر کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے بولی "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میرا پسینہ بہت پہلے خشک ہو چکا ہے۔"

"جو مزدوری تم نے ہمارے ساتھ مل کر کی ہے اس کا کوئی معاوضہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ میں تو یونہی تمہاری خاطر مدارت کر کے تمہیں ٹرخانے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آئندہ بھی اگر کسی سلسلے میں ضرورت پڑے تو مابدولت کو یاد کر لینا۔ ہم یونہی تمہارے لیے مار دھاڑ اور جنگ و جدل سے بھرپور ڈراما پیش کرتے رہیں گے۔" وہ فراخ دلی سے بولی لیکن پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ انگلی اٹھاتے ہوئے بولی "دیکھو... کبھی کسی سلسلے میں میرا نام نہ آنے پائے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ خدا نخواستہ اگر تم کسی مشکل صورتِ حال میں بھی پھنس جاؤ تب بھی میرا نام تمہاری زبان پر نہیں آنا چاہیے بلکہ اس ضمن میں کبھی اشارتاً بھی کوئی بات نہ کرنا۔ رحیم گل کے سامنے بھی نہیں۔"

"اخاہ...!" میں نے چھت کی طرف دیکھ کر آنکھیں گھمائیں "معلوم نہیں وہ محاورہ اس موقع پر فٹ بیٹھتا ہے یا نہیں... لیکن میرا خیال ہے مجھے کہہ دینا چاہیے۔ سوت نہ کپاس جولاہوں سے لٹھم لٹھا... ابھی تو باضابطہ کسی تعلق کا اعلان نہیں ہوا اور ابھی سے کتنی احتیاطیں شروع کر دیں اس لنگور کے بارے میں منجوا... جو اسے لنگور کہا۔" اس نے آنکھیں نکالیں "گھونسا مار کر جبڑا توڑ دوں گی۔ تم خود لنگور سے بھی بدتر نظر آتے ہو گے۔"

میں جواباً خاموشی سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ آخر وہ سٹپٹا کر بولی "یہ اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟" پھر خود ہی سر ہلا کر بولی "شاید تم کسی اُداس اُلو کی طرح میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں کسی خوش و خرم اور عقل مند زرافے کی طرح تمہارے اندر کے بدلتے موسموں کا نظارہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر انٹرکام پر اسپر کو کھانے پینے کی کچھ چیزیں بھجوانے کی ہدایت کی۔ ریسیور رکھ کر میں دوبارہ زر تاج کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "تمہیں یقیناً اندازہ ہوگا کہ میں نے تمہیں بات کرنے کے لیے روکا ہے۔ کھانے پینے کا تو ایک بہانہ ہے۔ شکر ہے وہ تینوں شیطان ابھی اوپر ہی الجھے ہوئے ہیں یا شاید انہوں نے جان بوجھ کر ابھی نیچے نہ آنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کے سامنے اس موضوع پر بات نہیں ہو سکتی۔"

"ہاں... مجھے معلوم ہے تم نے مجھے کس سلسلے میں بات کرنے کے لیے روکا ہے۔" وہ اطمینان سے بولی "تمہارے دل میں گدگدی ہو رہی ہوگی۔ میں نے رحیم گل کے بارے میں بکواس جو کر دی۔"

"یہ محض بکواس ہی ہے یا واقعی تم اس معاملے میں سنجیدہ ہو؟ کیا واقعی تمہارے اندر کوئی انقلاب آچکا ہے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ میں اب بھی اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

یک دم اس کی تیزی و طراری کچھ کم سی ہو گئی۔ وہ سر جھکائے ہوئے دھیمے سے لہجے میں بولی "اس میں انقلاب وغیرہ کی تو ایسی کوئی بات نہیں... یہ زندگی کے عام سے مسائل ہیں... میں نے بہت حقیقت پسند بن کر سوچا... بلکہ یوں سمجھو کہ سفاکی سے اپنا تجزیہ کرنے پر اپنے آپ کو آمادہ کیا تو میں نے اپنے آپ کو بڑی تکلیف میں پایا۔ شاید میں اتنی مضبوط لڑکی نہیں ہوں جتنی باہر سے نظر آتی ہوں... یا پھر شاید میں زندگی کے صرف کچھ معاملات میں مضبوط ہوں... ہر معاملے میں مضبوط نہیں ہوں۔ شاید کوئی ہر معاملے میں مضبوط ہوتا بھی نہیں ہے۔ انسان تو آخر انسان ہی رہتا ہے وہ مافوق الفطرت تو نہیں بن سکتا۔"

میں دم بخود بیٹھا سن رہا تھا۔ گو کہ وہ دھیمے لہجے میں بات کر رہی تھی لیکن اس کی آواز کا شیشہ جیسے میرے ذہن کی لوح پر الفاظ کندہ کرتا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میں نے تنہائی کی حدت سے جلتی راتوں میں بارہا اس موضوع پر سوچا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ تم کبھی اس لڑکی کے انتظار کے قفس سے نہیں نکل سکو گے جس کا نام راحیلہ ہے۔ میرا یہ یقین دن بہ دن پختہ ہوتا جا رہا تھا پھر جب کل وہ یہاں پہنچی تو اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے دل میں امید کی آخری کرن نے بھی دم توڑ دیا۔ وہ میرے لیے فیصلے کا لمحہ تھا۔ یک دم ہی میرے اندر جیسے کسی جھنجلاہٹ آمیز جذبے نے سرگوشی کی کہ اب بے یقینی اور بے ثمری کا یہ سفر ختم ہو جانا چاہیے۔ کشتی کو کسی کنارے لگ جانا چاہیے۔ ہماری طرح روز و شب گزارنے والے جب زندگی کے کسی موڑ پر سود و زیاں کا حساب کرنے بیٹھتے ہیں تو ان کے دامن میں پچھتاوؤں کے سوا کچھ بھی نہیں نکلتا۔ وہ کمزور لمحہ اس وقت ایک طاقتور فیصلے کا سبب بن گیا۔ میں یک دم ایک ہی زقند میں اس سارے فاصلے کو پھلانگ گئی جو ایک بھیانک خلیج کی طرح میرے سامنے پھیلا ہوا تھا۔ مجھے جیسے کسی غیبی قوت نے دھکا دے دیا۔ میرا کام جیسے آسان ہو گیا۔ جن عوامل نے مجھ سے یہ فیصلہ کرایا ان میں شاید رحیم گل کی محبت کی طاقت بھی شامل تھی۔ ہر سچا جذبہ اپنے اندر ایک طاقت تو رکھتا ہے نا...."

اس نے نیم سوالیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ میرے اندر ایک بھیانک سناٹا پھیل گیا تھا۔ پھر مجھے یہ محسوس کر کے قدرے حیرت بھی ہوئی کہ میری سوچوں میں کہیں خفیف سی تلخی بھی گھلی ہوئی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو ٹٹولنے کی کوشش کی۔ کیا مجھے اس کے فیصلے سے دکھ پہنچا تھا؟ کیا اس سے میری انا کچھ مجروح ہوئی تھی؟ کیا لاشعوری طور پر میں یہی چاہتا تھا کہ وہ ساری زندگی میرے انتظار میں بیٹھ کر گزار دے؟ کیا اس میں میری انا اور میری مردانگی کی تسکین کا کوئی پہلو پنہاں تھا؟ کیا اس احساس سے میری تشنہ زندگی کے کسی گوشے میں انجانی راحت کی شمع روشن رہتی تھی کہ ایک ایسی لڑکی میرے انتظار میں زندگی بتا رہی تھی جو خود اس قابل تھی کہ اس کی آنکھ کے ایک موہوم سے اشارے پر بیسیوں قابلِ فخر نوجوان اپنی زندگی انتظار کی صلیب پر مصلوب کرنے کے لیے تیار ہو سکتے تھے؟

میں نے بہت دیانت داری سے اپنے دل' ذہن اور ضمیر کے اندھیرے گوشوں میں ان سوالوں کے جواب تلاش کیے اور اسی نتیجے پر پہنچا کہ ان سب کے جواب نفی میں ہی تھے۔ اس کا زندگی بھر کا انتظار یقیناً میرے دل' ذہن اور ضمیر پر بوجھ تھا کیونکہ میں اس کے انتظار کا کوئی صلہ نہیں دے سکتا تھا۔ میں اس کی کوئی توقع پوری نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے کیا حق پہنچتا تھا کہ میں اس کی زندگی کو پیاس کا صحرا بنائے رکھتا؟ وہ زندگی جو اس کی سوچ میں محض معمولی کی تبدیلی سے بہت خوب صورت اور پُر بہار ہو سکتی تھی۔ نا آسودہ محبتوں کی ٹیسوں اور تشنۂ تعبیر خوابوں کی اذیت کا کیا ہے... انہیں تو انسان چند برسوں میں' چند مہینوں میں اور بعض اوقات تو چند دنوں میں بھول جاتا ہے۔ جب متبادل سہارے مل جاتے ہیں تو مطلوبہ سہاروں کی خواہشیں ذہن میں جلد ہی دھندلا جاتی ہیں۔

وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ شاید میری ذات کا کوئی گوشہ اس کی محبت میں بھی جلا تھا۔ میں زندگی بھر اسے اچھی دوست دیکھنا چاہتا تھا لیکن میں اسے ہمیشہ تشنہ کام اور اس کی زندگی کو ہمیشہ ایک کارِ زیاں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ درحقیقت اس نے خود کو ہی نہیں' مجھے بھی ایک بے عنوان اذیت سے آزاد کر دیا تھا۔

"کیا میں نے کوئی غلط فیصلہ کیا؟" اس کی آواز نے مجھے چونکایا۔

"نہیں۔ تم نے بہت صحیح اور بہت بروقت فیصلہ کیا۔" میں نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

"تم اس پر خوش ہو؟" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔

"ہاں۔ میں خوش ہوں کیونکہ تم نے مجھے ایک انجانے احساسِ جرم کے بوجھ سے آزاد کر دیا ہے۔ میں تمہاری زندگی میں موجود رہنے والے خلا اور ویرانی کا ذمے دار ہمیشہ خود کو محسوس کرتا رہتا... اور یقین کرو کچھ عرصے بعد تم خود بھی اپنے آپ کو بہت خوش محسوس کرو گی۔ رحیم گل بہت اچھا آدمی ہے اور وہ صحیح معنوں میں تمہارا قدرداں بھی ہوگا۔ تم نے کم از کم دو زندگیوں کو تو بے مقصدیت کی بھینٹ چڑھنے سے بچا لیا ہے۔ تمہیں پانے کی طلب رحیم گل کے دل میں اتنی شدید ہے کہ تمہارے انتظار میں اس چغد نے اپنی زندگی کو بے ثمر کر لینا تھا۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"شاید میرے اس فیصلے سے تمہاری اس سنگ دل حسینہ کے ذہن میں بھی کچھ تحریک پیدا ہو۔ شاید اس کے پتھر دل میں بھی تبدیلی کی کوئی کونپل پھوٹے۔" اب زر تاج بھی مسکرائی۔ اس کے چہرے پر زندہ دلی کی علامتیں واپس آرہی تھیں۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "شاید اسے بھی احساس ہو کہ دو زندگیوں کے بارے میں تو بُرا یا بھلا... مگر کوئی فیصلہ تو ہو گیا ہے۔ شاید اس طرح وہ بھی قائل ہو سکے کہ باقی دو زندگیوں کے بارے میں بھی اب کچھ سوچ ہی لینا چاہیے۔"

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"اُف... کیسی دل کی گہرائیوں سے آواز نکلی ہے۔" وہ آنکھیں سکیڑ کر بولی۔

میں نے اس کا تبصرہ اَن سنا کرتے ہوئے پوچھا "تم نے رحیم گل کو اس ضمن میں کوئی اشارہ دیا ہے؟"

"بھئی میں اشارے بازیوں کی قائل نہیں ہوں۔ میں تو کھٹاک سے سیدھی بات کرتی ہوں۔ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان پر ہوتا ہے اور میں اسے زیادہ مصلحت آمیز یا گھماؤ پھراؤ والے الفاظ میں بھی نہیں لپیٹتی۔"

"ہاں۔ اپنی اس عادت کا عملی مظاہرہ تو تم آج گاڑی میں

واپس آتے وقت کر چکی ہو۔" میں نے سرہلایا "الفاظ گو کہ مبہم ہی تھے لیکن انکشاف بڑا واضح تھا جو تم نے کھٹاک سے ہم سب کے سر پر دے مارا تھا۔"

"ویسے آپس کی بات ہے۔۔۔ اس میں میرے ارادے کو دخل نہیں تھا۔" اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ اعتراف کیا "وہ تو بالکل غیر ارادی طور پر اچانک ہی منہ سے بات نکل گئی تھی لیکن میں نے اس پر کوئی پچھتاوا محسوس نہیں کیا۔ گاڑی میں جو ہم پانچ افراد موجود تھے وہ سب ہی گویا اپنائیت کی ایک عجیب و غریب زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے سامنے ان کا کوئی راز گویا راز نہیں ہے۔ حتیٰ کہ میں ٹونی تک کے بارے میں ایسا ہی محسوس کرتی ہوں حالانکہ وہ لاہور میں رہتا ہے اور ایک آدھ مرتبہ جب کسی کام سے یہاں آیا ہے تو اس سے مختصری دو تین ملاقاتیں ہی ہوئی ہیں لیکن لگتا یہی ہے جیسے میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔ شاید ہم سب کی ذہنی سطح ایک ہی ہے اس لیے تمہارے خاص خاص ساتھیوں سے اپنائیت کا سا رشتہ استوار ہونے میں دیر نہیں لگتی۔"

"میرے یہ ساتھی بڑے قیمتی لوگ ہیں۔ میں نے زندگی میں روپے پیسے کی صورت میں جو کچھ کمایا ہے وہ میری نظر میں زیادہ اہم نہیں ہے۔ میرا اصل سرمایہ میرے دوست ہی ہیں جن میں تم بھی شامل ہو۔ درحقیقت میں نے زندگی میں یہ چند دوست ہی "کمائے" ہیں۔ اس طرح کی کمائی بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔" میں نے ایک گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگایا "میرا سوال اپنی جگہ ہی رہ گیا۔ میں پوچھ رہا تھا کہ کیا رحیم گل تمہارے اس فیصلے سے آگاہ ہے؟"

"ابھی سے کیسے آگاہ ہو جائے گا وہ۔۔۔" وہ بھی اپنے آپ کو ذرا ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھتے ہوئے بولی "کل ہی تو میرے دل کی عدالت میں اس فیصلے نے حتمی شکل اختیار کی ہے۔ اب کوئی مناسب موقع آئے گا تو بات ہو جائے گی۔ وہ ہفتے میں میرے گھر یا دفتر کا کم از کم ایک چکر تو ضرور لگاتا ہے اور جب بھی بات چیت میں وقفہ آتا ہے اس دوران میں اُداس اُداس نظروں سے میری طرف دیکھتا رہتا ہے۔"

"بے چارہ۔۔۔!" میں نے ٹھنڈی سانس لی "آج کے دور میں ایسے سچے عاشق قسمت والوں کو ہی نصیب ہوتے ہیں۔"

"اور تم جیسے بھی۔" وہ ترکی بہ ترکی بولی "فرق صرف یہ ہے کہ تم کسی اور کے حصے میں آگئے ہو۔"

"میری بات چھوڑو۔۔۔ مجھ پر تو تم لعنت بھیجو۔۔۔"

"ہو تو تم اسی قابل۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"میں کہنے یہ لگا تھا کہ اپنے اس فیصلے کے بارے میں پہلی فرصت میں اسے اشارہ دے دو لیکن ذرا خیال رکھنا۔۔۔ کہیں وہ خوشی کے مارے پھڑک کر تمہارے قدموں میں ہی جان نہ دے دے۔"

"اب ایسی بد فال تو منہ سے مت نکالو۔" اس نے مجھے گھورا۔

"یہ بد فال نہیں۔۔۔ رشک و حسد کے ملے جلے جذبات ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یہ رشک و حسد بیچ میں کہاں سے آگیا؟" اس نے گھورنا جاری رکھا۔

"بس۔۔۔ آ ہی جاتا ہے کہیں نہ کہیں سے۔۔۔ یہ معرفت کی باتیں ہیں۔ تم جیسی کوڑھ مغز لڑکیاں انہیں نہیں سمجھ سکتیں۔" میں نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر اب اس کوڑھ مغز لڑکی کو اجازت دو۔" وہ کرسی سے اٹھنے ہی لگی تھی کہ ویٹر ٹرالی لیے کمرے میں داخل ہوا۔ ٹرالی پر کافی اور لوازمات موجود تھے۔ اسے رکنا پڑا۔

ہم اس وقت کھانے پینے میں مصروف تھے جب راحیلہ نے شریر بچوں کی طرح کمرے میں جھانکا۔ اس کے ہونٹوں پر شریر بچوں جیسی ہی مسکراہٹ تھی۔ پھر میں نے دیکھا اس کے عقب سے ٹونی اور شفیع شاہ بھی جھانک رہے تھے۔

"میرا خیال ہے ہمیں یہ پوچھنے کی ضرورت تو نہیں کہ کیا اندر آسکتے ہیں۔" راحیلہ اندر آتے ہی چہکی۔

"نہیں۔ تمہیں بھلا کیا ضرورت ہے۔" میں نے سادگی سے کہا "اس قسم کے سوالات تو مہذب اور شائستہ لوگ کیا کرتے ہیں۔"

"جبکہ تمہاری صورت دیکھتے ہی انسان کو تہذیب و شائستگی سے نفرت ہو جاتی ہے۔" راحیلہ یہ کہتے ہوئے اندر آگئی۔ اس نے اسنیکس پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا پھر اس نے پلٹ کر ٹونی اور شفیع شاہ کی طرف دیکھا جو اندر آکر اس کے پیچھے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں کھڑے تھے۔

"تم بھی کھاؤ نا بھئی۔۔۔ اپنا ہی مال سمجھ کر کھاؤ۔" وہ ان دونوں سے مخاطب ہوئی "ایک تو تم دونوں باس کے سامنے آکر ایسے مؤدب اور شائستہ ہو جاتے ہو جیسے تم نے باس کا بہت بھاری قرضہ دینا ہے حالانکہ کچھ دیر پہلے اوپر تم ہی لوگ کہہ رہے تھے کہ باس کے آفس میں چل کر کھانے پینے کی کچھ چیزوں پر ہاتھ صاف کرتے ہیں۔" پھر اس نے میری طرف دیکھ کر مجھے اطلاع دی "ہمیں اوپر ہی خبر مل گئی تھی کہ تم نے زرتاج کی خاطر مدارت کے لیے کچھ منگوایا ہے۔ تبھی تو ہم دوڑے دوڑے آگئے ورنہ ہم آرام سے تاش کی ایک بازی لگانے بیٹھ گئے تھے۔"

وہ ایک بار پھر منہ چلانے لگی۔ میں ایک ٹک اسے گھور رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو میں نے پوچھا "کیا اس وقت تم سیدھی شمالی افریقہ سے آرہی ہو؟"

"نہیں۔۔۔ کیوں؟" اس نے بے پروائی سے پوچھا۔

"سنا ہے وہاں کے بعض علاقوں میں قحط پڑا ہوا ہے۔ تمہیں دیکھ کر اس خبر کی تصدیق ہو رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔۔ اب تو ہم تمہیں شمالی افریقہ سے آئے ہوئے ہی لگیں گے۔ اتنے مشکل مشکل کام لیتے ہو ہم سے۔۔۔ اس کے بعد جھوٹے منہ پانی کو بھی نہیں پوچھتے۔ اگر ہم خود ہی بے شرم بن کر کھانے پینے آجاتے ہیں تو فاقہ زدہ کہہ کر طنز فرماتے ہو۔ دنیا اسی کا نام ہے۔" اس نے چھت کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا تمہارے کمرے کا ٹیلی فون کسی دشمن نے کاٹ دیا ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "مجھے بھی معلوم ہے کہ میں روم سروس کو فون کر کے جو چاہوں منگوا سکتی ہوں اور ڈائننگ ہال میں جا کر بھی ہم جو چاہیں کھا پی سکتے ہیں لیکن جو مزہ میزبان کی منگوائی ہوئی چیزوں پر ہاتھ صاف کرنے میں ہے وہ خود منگوا کر کھانے میں کہاں۔"

"لگتا ہے بچپن کی گندی عادتیں ابھی تک گئی نہیں ہیں۔" میں نے افسوس سے کہا "سنا ہے بچپن میں بھی کہا کرتی تھیں کہ جو مزہ کسی کے باغ میں درخت پر چڑھ کر چوری کے امرود توڑ کر کھانے میں ہے وہ بازار سے خرید کر کھانے میں کہاں۔۔۔ لیکن اب تو تم کافی بڑی ہو گئی ہو۔ اب تو اس قسم کی عادتیں چھوڑ دو۔"

"یہی تو انسان کی ٹریجڈی ہے۔۔۔" وہ ایک کرسی کھینچ کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی "کہ جب وہ چھوٹا اور کم عمر ہوتا ہے تو اپنی عمر سے کہیں زیادہ بڑا اور مدبر نظر آنے کی کوشش کرتا ہے اور جب وہ بڑا۔۔۔ بلکہ کافی بڑا ہو جاتا ہے تو اپنی عمر سے کہیں چھوٹا نظر آنے کی کوشش کرتا ہے۔۔۔ بلکہ بعض اوقات تو بچہ ہی بننے پر تُلا رہتا ہے۔ ٹھنڈی آہیں بھرتا ہے۔ گانے گاتا ہے۔۔۔ کوئی لوٹا دے مجھے میرے وہ بچپن کے دن۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔"

میں نے شفیع شاہ اور ٹونی کی طرف دیکھا جو ابھی تک کھڑے ہوئے تھے۔ میں نے کرسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "خدا کے لیے اب تم دونوں بھی بیٹھ جاؤ۔ تم کس انتظار میں کھڑے ہو؟ یہ خاتون تمہیں بھی اپنی طرح بدتمیز اور بد تہذیب بنانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی ہیں لیکن تم بن کر ہی نہیں دے رہے۔"

"ہم مرتے دم تک مہذب اور شائستہ رہنے کی کوشش کریں گے سر!" ٹونی نے بڑے خلوص سے وعدہ کیا۔ وہ دونوں کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔

راحیلہ ٹونی کو گھورتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی "اوپر کمرے میں یہی سب سے زیادہ اچھل رہا تھا کہ چل کر باس کو تنگ کرتے ہیں۔ ویسے یہ دونوں ہی منافق ہیں۔ تمہارے سامنے آکر بالکل بدل جاتے ہیں۔ پیٹھ پیچھے ذرا دوسرے انداز میں باتیں کرتے ہیں۔"

"سر۔۔۔!" شفیع شاہ نے احتجاجی سی صدا بلند کی۔

"تم انہیں منافق ہی رہنے دو۔ میرا مطلب ہے کہ یہ جہاں ہیں اور جیسے ہیں انہیں وہیں اور ویسا ہی رہنے دو۔" میں نے راحیلہ کو مشورہ دیا پھر ان دونوں کو مخاطب کیا "تم اب ہاتھ باندھ کر مت بیٹھو اور کھانے پینے کی جو بھی چیزیں نظر آرہی ہیں ان پر ٹوٹ پڑو ورنہ تم دیکھتے ہی رہ جاؤ گے اور یہ فاقہ زدہ خاتون پلیٹیں بھی نہیں چھوڑیں گی۔ عین ممکن ہے پلیٹوں کے بعد ٹرالی بھی چبا جائیں۔"

زرتاج اس دوران خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتی رہی تاہم اس کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی جیسے وہ اس چھیڑ چھاڑ سے محظوظ ہو رہی ہو لیکن کافی ختم کرتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی "میں اب چلوں گی۔ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔ رحیم گل اپنی کارروائی کے بارے میں جو بھی خبر دے اس سے مجھے بھی مطلع کرنا۔"

"ہمیں بیچ میں وسیلہ بنانے کی تو پہلے بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ پہلے بھی اس سے تمہارا براہِ راست رابطہ تھا لیکن اب تو کچھ زیادہ ہی "ڈائریکٹ ڈائلنگ" ہو سکتی ہے۔ تم اس سے براہِ راست بھی رپورٹ لے سکتی ہو۔" میں نے بظاہر سادگی سے کہا "عین ممکن ہے کچھ عرصے بعد ویسے بھی وہ تمہیں اپنی ہر کارروائی کی رپورٹ دیا کرے۔۔۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہر کارروائی کی رپورٹ دینے پر مجبور ہو جائے۔"

اس نے قہر آلود نظروں سے مجھے گھورا اور دھیمی آواز میں بولی "اللہ کسی کو اتنا کم ظرف اور پیٹ کا ہلکا بھی نہ بنائے۔"

"لوگ دوسروں کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے وقت اپنی باتیں اور اپنی حرکتیں کتنی جلدی بھول جاتے ہیں۔" میں نے کراہ کر کہا اور فریادی سے انداز میں چھت کی طرف دیکھا۔ زرتاج مزید کچھ کہے بغیر راحیلہ سے ہاتھ ملا کر رخصت ہو گئی۔

اس کے جانے کے بعد چند لمحے گہرا سکوت رہا پھر راحیلہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "یہ دلکش لڑکی بھی اپنی زندگی کے بارے میں کسی فیصلے پر پہنچ ہی گئی۔"

"رفتہ رفتہ سب ہی اپنی اپنی زندگی کے بارے میں کسی نہ کسی فیصلے پر پہنچ ہی جائیں گے" میں نے غمناک لہجے میں کہا۔ "آخر میں صرف میں اور تم ہی رہ جائیں گے۔ زندگی کے آخری ایام میں تم کسی پر کٹی فاختہ کی طرح اور میں کسی اُداس الو کی طرح کسی ٹنڈ منڈ درخت پر بیٹھ کر پچھتاووں سے لبریز اور دردناک قسم کے گیت گایا کریں گے جنہیں سن کر آوارہ کتے بھونکا کریں گے۔ درحقیقت وہ بہت لعنت و ملامت کر رہے ہوں گے۔"

"بکواس مت کرو۔۔۔" راحیلہ کے گلاب سے چہرے پر کچھ اور گلاب کھل اٹھے۔ اس نے کن انکھیوں سے ٹونی اور شفیع شاہ کی طرف دیکھا "میں لوگوں کے سامنے زرتاج کی طرح اپنی پرائیویٹ لائف کے بارے میں گفتگو کرنا پسند نہیں کرتی۔"

"کون لوگ؟ کہاں ہیں لوگ۔۔۔؟" میں نے انجان بن کر چاروں طرف دیکھا پھر میری نظر ٹونی اور شفیع شاہ پر آن رکی "تم

انہیں "لوگ" کہہ رہی ہو؟ ارے بھئی یہ لوگ تھوڑا ہی ہیں۔ یہ تو ٹونی اور شفیع شاہ ہیں۔"

"ہاں۔ ہم تو بعض اوقات خود اپنی آواز سن کر بھی یہی کہتے ہیں کہ ہم نے کچھ نہیں سنا۔" ٹونی معصومیت سے بولا۔

"تم دونوں اول درجے کے اُچکے اور جھوٹے ہو۔ میں تمہیں خوب سمجھتی ہوں۔" راحیلہ انہیں گھونسا دکھا کر بولی۔

ٹونی اور شفیع شاہ نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر شفیع شاہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اوپر سے ہمیں کیسی میٹھی میٹھی باتیں کر کے یہاں لائی تھیں۔ یہاں پہنچتے ہی بے عزتی شروع کردی۔ طرح طرح کے القابات سے نواز رہی ہیں۔"

"یونہی دنیا بدلتی ہے' اسی کا نام دنیا ہے۔" ٹونی نے اس سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تم دونوں حضرات اتنی ٹھنڈی آہیں بھر کر یہاں در و دیوار پر برف جمانے کی کوشش مت کرو اور یہ گرم گرم کافی پیو تاکہ تمہاری سانسوں میں کچھ گرمی پیدا ہو۔" میں نے ٹرالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کے علاوہ میں یہ مشورہ بھی دوں گا کہ اس خاتون کی باتوں پر بالکل دھیان نہ دو۔ اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکالنے کی بھی زحمت مت کرو۔ دونوں کان مضبوطی سے بند کرو۔ تمہیں اندازہ ہونا چاہیے کہ جب سے یہ لڑکی لاہور سے آئی ہے تب سے ہذیانی سی کیفیت میں مبتلا ہے۔"

"اور ہذیان کی وجہ سامنے بیٹھی ہے۔" راحیلہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے لقمہ دیا۔ ٹونی اور شفیع شاہ نے گویا میرے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور خاموشی سے اپنے لیے کافی انڈیلنے لگے۔ راحیلہ اپنے لیے پہلے سے کافی انڈیل چکی تھی۔ وہ اس میں کریم یا دودھ ملائے بغیر چسکیاں لینے لگی۔ اس کی ڈائٹنگ میری سمجھ سے باہر تھی۔ کافی میں تو وہ کریم اور دودھ تک ڈالنے سے پرہیز کرتی تھی لیکن باقی سب چیزیں' حتیٰ کہ کریم والی پیسٹریاں تک چٹ کر جاتی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی ڈائٹنگ میں صحت کا کوئی عظیم فلسفہ کارفرما ہوگا اس لیے میں نے اس موضوع پر اس سے کبھی تبادلۂ خیال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

کافی ختم کر کے شفیع شاہ اٹھتے ہوئے بولا "سر! مجھے کچھ کاموں کے سلسلے میں اِدھر اُدھر جانا ہے۔ میں اجازت چاہوں گا۔"

ٹونی بھی اٹھتے ہوئے بولا "اور اگر آپ اجازت دیں تو میں ٹونی کے بچہ جمہورا کے طور پر اس کے ساتھ رہ لوں؟ اس طرح میرا بھی کچھ سیر سپاٹا ہو جائے گا۔"

میرے جواب دینے سے پہلے شفیع شاہ اسے خبردار کرنے کے سے انداز میں بولا "میرے ساتھ رہ کر سیر سپاٹے کے بجائے "مارکٹاپا" بھی ہو سکتا ہے۔" پھر اس نے گویا وضاحت کی "اب یہ مت پوچھنا کہ مارکٹاپا کیا ہوتا ہے۔ یہ میں نے سیر سپاٹا کے ساتھ قافیہ ملانے کی کوشش کی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" ٹونی نے سر ہلایا "شعر و شاعری تو تمہارے خون میں رچی ہوئی ہے۔ بعض اوقات تو زخم لگنے پر خون بھی نہیں نکلتا۔ شعر ہی نکل آتا ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے ہم میں سے کوئی بھی مارکٹاپا سے گھبرانے والا نہیں ہے۔ بعض اوقات تو وہ بھی ہمارے سیر سپاٹے ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تم دونوں یہ پروگرام اوپر ہی سے بنا کر آئے ہو۔" میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "خواہ مخواہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش مت کرو کہ ابھی ابھی اچانک یہ پروگرام بن گیا ہے۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور نظریں جھکا لیں۔ ٹونی سر کھجانے لگا۔ راحیلہ منہ بنا کر بولی "میں تو تمہیں پہلے ہی خبردار کر چکی ہوں کہ یہ دونوں اول درجے کے اچکے اور بدمعاش ہیں۔"

"اس سے پہلے کہ تمہاری مزید عزت افزائی ہو' تم چلے ہی جاؤ۔" میں نے کہا۔

ٹونی نے یوں راحیلہ کو گھورا جیسے کہہ رہا ہو "آپ سے تو میں بعد میں نمٹوں گا۔" پھر وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ بولی "انی! تم نے کبھی سوچا ہے ہم کتنے خوش قسمت ہیں؟ ہماری کوئی فیملی نہیں..... ہم سب قریبی ساتھیوں کا کوئی خاندان نہیں..... لیکن ہمیں اس کی کمی کی محسوس نہیں ہوتی۔ ہم سب ایک فیملی ہی کی طرح ہیں۔ ایک عجیب اور انوکھی فیملی..... !" وہ گویا اس تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرائی۔

"شاید ہم فیملی سے کچھ بہتر ہی ہیں۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا "فیملی میں تو بہت سے مسائل..... بہت سے جھگڑے..... بہت سی پیچیدگیاں اور بہت سی کمینگیاں بھی ہوتی ہیں۔ ہمارے درمیان وہ سب نہیں ہیں۔"

"ہاں..... یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" اس نے تسلیم کیا۔

"خدا کا شکر ہے تم نے زندگی میں میری کسی ایک بات سے تو اتفاق کیا۔" میں نے طمانیت کی سانس لی "اب تم میری ایک بات اور مان لو۔"

"کیا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"فیملی بنانے میں کتنے ہی مسائل' کتنے ہی جھگڑے' کتنی ہی پیچیدگیاں سہی..... لیکن انسان فیملی بنائے بغیر رہ نہیں سکتا۔" میں نے مدبرانہ لہجے میں گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... یہ بات تو ہے۔" اس نے سادگی سے میری اس بات کو بھی تسلیم کر لیا۔

میں نے بظاہر سرسری سے انداز میں بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا "اور فیملی' شادی کے بغیر نہیں بنتی اور ہر انسان کی سرتوڑ کوشش ہوتی ہے کہ وہ شادی سے محروم نہ رہ جائے حالانکہ سب کو معلوم ہے یہ بور کے لڈو ہیں۔ جو کھائے وہ بھی پچھتائے اور جو نہ

کھائے وہ بھی پچھتائے۔"

اب ذرا اس کے کان کھڑے ہوئے۔ وہ تیکھی نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی "تم کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"میری ایک درخواست مدت سے تمہارے پاس زیرِ التوا پڑی ہوئی ہے۔ میں ایک بار پھر اس کی طرف تمہاری توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ خدا کے لیے اب تو اسے جھاڑ پونچھ کر ذرا توجہ سے دیکھ لو۔" میں نے کراہنے کے سے انداز میں کہا۔

خلافِ توقع اس بار وہ یک دم ہتھے سے نہیں اکھڑی۔ اس کے چہرے پر الجھن' سرد مہری یا جھنجلاہٹ کے آثار بھی نہیں ابھرے۔ خاموش بیٹھی' ہونٹوں پر نہایت مبہم سی مسکراہٹ لیے میری طرف دیکھتی رہی۔ اچانک اس نے پوچھا "کیا زرتاج نے واقعی رحیم گل کا انتخاب کر لیا ہے؟ کیا وہ سیریس ہے؟ کیا وہ اس سے شادی کرلے گی؟"

"ایک سانس میں تین سوال۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی "بعض عورتوں کو ہمیشہ اپنی شادی سے زیادہ دوسروں کی شادیوں کی فکر رہتی ہے۔ بہرحال تمہارے تینوں سوالوں کا جواب صرف ایک "ہاں" ہے۔ اسی لیے تو مجھے بھی تمہارے پاس پڑی ہوئی اپنی پرانی گرد آلود درخواست ایک بار پھر یاد آگئی ہے۔ اب ہمیں بھی شادی کر ہی لینی چاہیے۔ شادی کر کے پچھتانا بہرحال شادی نہ کر کے پچھتانے سے بہتر ہے۔ مستقبل قریب میں ہمیں بھی ایک فیملی کی بنیاد رکھ ہی دینی چاہیے۔ ہمارا بھی ایک بھرا پُرا گھر ہونا چاہیے جس میں مسائل ہوں..... جھگڑے ہوں' پیچیدگیاں ہوں' کمینگیاں ہوں۔ نالائق سی اولادیں ہوں جو ہمارے بڑھاپے میں ہی جائیداد کے بٹوارے پر لڑنا شروع کر دیں اور ہمارے مرنے کے بعد محفل میں بیٹھ کر کہا کریں "ابا نے بھلا ہمارے لیے کیا چھوڑا؟ صرف ایک فائیو اسٹار ہوٹل..... چند بنگلے اور چند انڈسٹریز۔ وہ چاہتے تو اس سے زیادہ بھی کما سکتے تھے لیکن انہوں نے کبھی ڈھنگ سے کام کیا ہی نہیں..... اور وہ ہماری اماں..... ! ہمیں تو معلوم ہی نہیں ماں کی محبت کیا ہوتی ہے۔ انہوں نے کبھی ہمیں وقت ہی نہیں دیا۔ انہیں تو ابا کے ساتھ گھومنے سے ہی فرصت نہیں تھی' وغیرہ وغیرہ۔ ہمیں ان عظیم روایات کو قائم رکھنے کے سلسلے میں اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور شادی کیے بغیر اس دنیا سے رخصت نہیں ہونا چاہیے۔"

اس بار وہ اس قسم کی باتوں پر لال پیلی ہونے اور مجھے آنکھیں دکھانے کے بجائے جھرجھری سی لے کر بولی "اگر مستقبل بعید کا نقشہ اتنا ہی برا ہے تو اتنی مصیبتوں اور جھنجٹوں میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نقشہ تو کم و بیش سب کے مستقبل کا یہی ہوتا ہے لیکن میں نے کہا نا کہ بور کے ان لڈوؤں کو کھا کر پچھتانا..... نہ کھا کر پچھتانے سے بہتر ہے ورنہ زندگی بھر انسان کچھ زیادہ ہی بے قرار اور پیاسی روح کی طرح بھٹکتا رہتا ہے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ویسے میں تاریک پہلو کی طرف کچھ زیادہ ہی نظر رکھتا ہوں اس لیے میں نے مستقبل کا کچھ زیادہ ہی منفی نقشہ کھینچ دیا۔ تمہیں اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان بدترین حالات کے لیے تیار رہتا ہے لیکن اگر اچھے نتائج سامنے آجائیں تو غیر متوقع خوشی حاصل ہوتی ہے۔ انہیں اوپر والے کی طرف سے بونس سمجھنا چاہیے۔"

"آخر تم کوئی اور اچھی سی لڑکی تلاش کر کے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ کوئی بھی لڑکی تم سے شادی کرنے پر تیار ہو سکتی ہے۔" آج وہ بڑی رسان سے اور بڑے ہمدردانہ سے انداز میں اس موضوع پر بات کر رہی تھی۔

"تم مجھے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش مت کرو کہ کوئی بھی لڑکی مجھ سے شادی کرنے پر تیار ہو سکتی ہے..... اور میں کسی "اچھی سی لڑکی" سے شادی کرنا بھی نہیں چاہتا۔ میں تو تم جیسی بے ہودہ' بُری اور نکمی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ جب تم جیسی واہیات لڑکی مجھ سے شادی کرنے پر تیار نہیں ہو رہی تو اچھی لڑکی کہاں سے تیار ہو جائے گی؟" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

خلافِ توقع وہ نہ تو مسکرائی اور نہ ہی اس نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی اس کے برعکس وہ پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کا ذہن شاید کہیں اور تھا۔ شاید اس کے اندر کا موسم بھی تبدیل ہو رہا تھا۔ میں نے امید بھرے لہجے میں جلدی سے کہا "اب تو زرتاج نے بھی شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ عمر کی ریت ہماری مٹھی سے بھی پھسلتی جا رہی ہے۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے.....!" وہ اچانک سر جھکا کر مرتعش اور عجیب سے لہجے میں بولی۔

"کیا.....؟" میں نے حیرت سے کہا "کیا تمہیں مجھ سے ڈر لگتا ہے؟ کیا میری شکل کسی جن بھوت سے ملتی ہے؟"

"مجھے..... مجھے شادی سے ڈر لگتا ہے۔" وہ سر اٹھائے بغیر اسی سنجیدہ اور مرتعش لہجے میں بولی۔ یہ میرے لیے حقیقتاً حیرت کی بات تھی۔ وہ ضدی' سرکش اور مضبوط لڑکی جو بھیانک ترین خطرات سے نہیں ڈرتی تھی' شادی سے ڈرتی تھی۔

"بعض کمسن اور نادان لڑکیوں کے بارے میں تو سننے میں آتا ہے کہ وہ شادی سے ڈرتی ہیں لیکن تم نہ تو کمسن ہو اور نہ ہی نادان....." میں نے دھیمے لہجے میں کہا "تم تو شادی کے تجربے سے گزر چکی ہو۔"

"اسی لیے تو ڈرتی ہوں۔" وہ فوراً بولی "شادی انسان کے آئیڈیلز کی موت ہوتی ہے اور میں دوسری مرتبہ اپنے آئیڈیلز کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کرسکوں گی۔"

"ان سب پہلوؤں پر ہم نہ جانے کتنی مرتبہ بات کر چکے ہیں۔ لمبی لمبی بحث ہو چکی ہے۔ تمہارے ذہن میں جتنے بھی اندیشے اور خدشات ہیں' میں ان سب کے بارے میں تمہیں قائل کر چکا ہوں۔

اب تو بات صرف فیصلے پر آکر اٹکی ہوئی ہے۔ میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں... خدا کے لیے فیصلہ کر بھی چکو۔ وقت بہت تیزی سے گزر رہا ہے۔ تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا... ایک روز تم آئینہ دیکھو گی اور اپنا سر سفید پاؤ گی۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"تو پھر اس وقت شادی کرلیں گے۔" وہ سر اٹھاتے ہوئے دھیرے سے مسکرائی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ پھر اپنے مخصوص غیر سنجیدہ موڈ میں نہ آجائے۔

"اگر ہم اس وقت شادی کریں گے تو ہماری شادی کی وڈیو کسی فلم یا ڈرامے میں کامیڈی سین کے طور پر دکھائی جائے گی۔ دیکھو... تم ایک بار پھر اس بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ آج فیصلہ ہو جانا چاہیے۔" میں نے آہستگی سے میز پر گھونسا مارا۔

"میرا خیال ہے تمہیں زرتاج کے فیصلے نے کچھ زیادہ ہی جذباتی کردیا ہے۔" وہ بدستور مبہم سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔

میرا خیال اس کے برعکس تھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ زرتاج کے فیصلے کے بارے میں سن کر وہ خود اندر سے ہل گئی تھی۔ اس نے فضول سی دلیلوں کی بنیاد پر اپنے انکار کی جو عمارت کھڑی کی تھی مجھے اس میں دراڑیں پڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ میں چاہ رہا تھا آج اس عمارت کے قائم رہنے یا نہ رہنے کے بارے میں کوئی فیصلہ ہو ہی جائے... اور میں محسوس کررہا تھا کہ آج فیصلہ ہو سکتا تھا۔ اس تصور سے میری دھڑکنیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ تاہم میں نے اس کے اندر کی کیفیتوں کے بارے میں کوئی خیال آرائی نہیں کی۔ میں غلطی پر بھی ہو سکتا تھا۔

"ہاں... زرتاج کے فیصلے نے میرا احساسِ زیاں بڑھا دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں آج مجھے معلوم ہو جائے کہ ایک موہوم سی امید کے سہارے زندگی کو ایک بے ثمر درخت کی طرح گزار دینا عقل مندی ہے یا بے وقوفی؟ آج میں نے محسوس کیا ہے کہ زرتاج ہم دونوں سے زیادہ عقل مند ہے۔"

"تو اب عشق میں عقل بھی گھس آئی؟" اس نے گہری سانس لی۔ اس کی مسکراہٹ کچھ اور پھیکی پڑ گئی۔

"ہاں... زندگی کے ہر معاملے میں کبھی کبھی عقل کے خانے کو بھی تھوڑا بہت ٹٹول لینا چاہیے۔"

"بشرطیکہ وہ خانہ خالی نہ ہو۔" اس نے لقمہ دیا۔

"آج مذاق نہیں چلے گا۔ کم از کم اس وقت نہیں چلے گا۔" میں نے اپنے لہجے سے سختی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

اس نے ایک بار پھر سر جھکالیا۔ کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ آخر وہ بولی تو اس کی آواز ایک بار پھر مرتعش تھی "دیکھو... تمہیں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا... شادی کے بعد دونوں فریقوں کو ایک دوسرے سے بہت سی مایوسیاں ہوتی ہیں۔ مجھے تو شاید تم سے نہ ہوں کیونکہ میں نے تمہارے بہت قریب رہ کر تمہیں ہر اعتبار سے پرکھ لیا ہے۔ تم بہت اچھے انسان ہو۔ ایسا انسان جو اکثر صرف خوابوں اور خیالوں میں ملتے ہیں۔"

"زندگی میں پہلی بار اس روبرو تعریف کا شکریہ۔" میں کھل کر باچھیں پھیلائیں "یقین نہیں آرہا کہ یہ تم کہہ رہی ہو۔"

اس نے گویا اپنی ہی دھن میں بات جاری رکھی۔ "لیکن ہو سکتا ہے شاید تمہیں زندگی میں بہت سی مایوسیاں ہوں۔ شاید میں اتنی اچھی نہیں ہوں جتنا اچھا تم نے اپنے ذہن میں میرا بت تراش رکھا ہے۔ شاید میں تمہارے معیار پر پوری نہیں اتر سکوں..."

میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی "میرا کوئی معیار نہیں ہے۔ میرا معیار صرف تم ہو۔"

"شادی سے پہلے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔ جب تک کوئی چیز رسائی میں نہیں ہوتی تب تک بات کچھ اور ہوتی ہے۔ رسائی میں آنے اور حقِ تصرف کا یقین پختہ ہو جانے کے بعد بات کچھ اور ہو جاتی ہے... دھیرے دھیرے محسوسات میں تبدیلیاں آنی شروع ہوتی ہیں۔ میں اس وقت کی بات کررہی ہوں۔ اگر اس وقت تمہیں میرے بارے میں بہت سی مایوسیوں کا احساس ہو... تمہیں یہ احساس ہو کہ میرے بارے میں تمہاری بہت سی توقعات پوری نہیں ہوئیں... اور تمہیں کسی قسم کا احساسِ زیاں ہو کہ تم نے مجھ سے شادی کرکے غلطی کی... تمہارے پاس تو فلاں بڑے اچھے اچھے مواقع موجود تھے... اگر تمہیں اس طرح کا کوئی بھی احساس ہو تو پلیز اس کا میرے سامنے اظہار نہ کرنا... زندگی میں کبھی ایسی کوئی بات مجھ سے نہ کہنا۔ اگر ایسا کوئی احساس پیدا ہو بھی جائے تو اسے دل میں ہی رکھنا... کبھی مجھ پر ظاہر نہ ہونے دینا۔ بس میری تم سے یہی ایک فرمائش ہے، یہی ایک مطالبہ ہے۔ میں زندگی میں تم سے اور کچھ بھی نہیں مانگوں گی۔"

ایک لمحے کے لیے تو میں تحیر اور بے یقینی کے عالم میں اپنی جگہ دم بخود سا بیٹھا رہ گیا۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ میری تمنا کی شدتوں کے مقابلے میں اس کی فرمائش، اس کا مطالبہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی صرف ایک آدھ میٹھے بول کے عوض کسی بڑے خزانے کی کنجی آپ کے سپرد کردے۔

"کیا... کیا تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟" میں نے ہڑبڑا کر پوچھا اور اچانک میز پر جھکنے کی کوشش میں کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ میں نے زندگی میں کبھی خود کو اتنا احمق، اتنا ہونق محسوس نہیں کیا تھا۔

"میرا خیال ہے مجھے یہ جوا کھیلنا ہی پڑے گا۔ اس کے بغیر تم مجھے چین سے رہنے نہیں دو گے۔" وہ سر اٹھائے ہوئے بغیر دھیمی سی آواز میں بولی۔ اس کے ہونٹوں پر وہی مبہم اور مدھم سا مسکراہٹ تھی جو وقفے وقفے سے نمودار ہو جاتی تھی۔ یہ مسکراہٹ اب مجھے کچھ پُراسرار سی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ اندیشہ بھی محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھ سے مذاق تو نہیں کررہی تھی۔

"کیا واقعی... ؟ کیا واقعی... ؟" میں نے اپنی دانست میں تقریباً چیخ کر پوچھا لیکن میرے حلق سے کچھ ایسی آواز نکلی جیسے کوئی چوہا کسی کے پاؤں تلے آگیا ہو۔ میں بے اختیار کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ریوالونگ چیئر میرے عقب میں دیوار سے جا ٹکرائی۔

اس نے سر اٹھا کر قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی "ہاں... بھئی... واقعی... کیا اب مجھ سے اس کا اسٹامپ پیپر لکھواؤ گے؟ وکیلوں کو بلواؤ گے؟"

"میرے دل کی عدالت کے جج نے میری زندگی اور موت کے مقدمے کا فیصلہ سنا دیا۔ اب وکیلوں کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا اور تیزی سے میز کے گرد گھوم کر اس کے قریب جا پہنچا۔ شاید میرے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات تھے کہ وہ گھبرا کر یک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے آواز ذرا ہلکی ہی رکھتے ہوئے "یاہو" کا ایک نعرہ لگایا اور اسے کسی بڑی سی گڑیا کی طرح بازوؤں پر اٹھا لیا۔

"ارے... ارے... یہ کیا ہو رہا ہے... !" وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی "یہ آفس ہے... میرا تماشا بنواؤ گے کیا؟" اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ میں اسے اسی طرح اٹھائے ہوئے چکر دینے لگا۔

"یہ آفس بھی میرا ہے اور اب تم بھی میری ہو... مجھے کسی کی پروا نہیں۔" میں نے اسے گھماتے ہوئے ایک عجیب سی سرشاری کے عالم میں کہا۔

"چھوڑ دو مجھے... ورنہ میں تمہارا سر توڑ دوں گی... ناک توڑ دوں گی..." وہ میرے سر پر ہلکے ہلکے گھونسے برسا رہی تھی۔ میرا سر تو خیر ذرا غیر معمولی طور پر مضبوط تھا لیکن اگر وہ خاص ٹیکنیک استعمال کرتی اور پوری قوت سے گھونسے رسید کرتی تو کسی عام آدمی کی کھوپڑی چٹخا بھی سکتی تھی۔

"آج تم خواہ مجھے سر سے پاؤں تک توڑ دو لیکن یہ مت کہو کہ مجھے چھوڑ دو۔" میں نے کہا اور اسے دو چار چکر اور دے ڈالے۔ آخر اس نے دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچ لی۔ میں پھر بھی اسے گھماتا رہا۔ اس نے دباؤ بڑھا دیا۔ میری آنکھیں باہر آنے لگیں۔ اسے تو شاید چکر آنے ہی لگے ہوں گے لیکن میری آنکھوں کے سامنے بھی کمرا گھومنے لگا۔

آخر میں نے یک دم اسے چھوڑ دیا۔ اس کے پیروں میں ہلکے پھلکے جوتے تھے۔ سبز قالین پر وہ پنجوں کے بل کسی بلی کی طرح بے آواز طریقے سے تن گئی لیکن اس کا چہرہ ابھی تمتما رہا تھا اور بال کچھ منتشر ہو چکے تھے۔

"خدا کی پناہ... !" وہ طویل سانس لے کر بال درست کرتے ہوئے بولی "تمہارے اندر تو ابھی تک کسی نوعمر لڑکے کی سی چلبلی روح مقید ہے۔"

"تو تمہارے خیال میں، میں اور کیا ہوں؟" میں نے گردن سہلاتے ہوئے کہا "مجھ سے زیادہ چلبلی روح والا نوعمر لڑکا تمہیں پورے ملک میں نہیں مل سکتا تھا۔ میں تو تم سے شادی کے انتظار میں بوڑھا ہو رہا تھا۔ اب میری عمر کا الٹا سفر شروع ہوگا۔ اپنی اسی ویں سالگرہ پر میں سو کلومیٹر کی ریس میں حصہ لوں گا۔"

"اور پہلے ہی کلومیٹر پر لاٹھی ٹیکتا ہوا راستے میں کسی گھر میں گھس جاؤں گا اور کانپتی ہوئی آواز میں گھر والوں سے پوچھوں گا "تھوڑا سا کھانسی کا شربت ہوگا آپ لوگوں کے پاس؟" یہ کہتے ہوئے زمین پر ہی لیٹ جاؤں گا۔" اس نے میرے ہی انداز میں ٹکڑا لگایا۔

"غلط فہمی ہے تمہاری... اسی سال کی عمر میں تو ہم آٹھویں ہنی مون پر جائیں گے۔" میں نے ذرا اکڑ کر کہا۔ اتفاق ہے اسی وقت مجھے ذرا کھانسی آگئی۔ راحیلہ نے اچھے خاصے زور سے زخرا دبا دیا تھا۔ میں نے گلا سہلاتے ہوئے کہا "ویسے تم شادی سے پہلے ہی خود کو بیوہ کرنے لگی تھیں۔ کسی نہ کسی فلمساز کو دوبارہ "کنواری بیوہ" کے نام سے تمہاری زندگی پر فلم بنانی پڑتی۔"

"اگر وہ فلم واقعی میری زندگی پر ہوتی تو ٹیکنیکل یہ نام ذرا غلط ہوتا۔" وہ بے ساختہ سے انداز میں بولی اور منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ اس کا چہرہ ابھی تمتما رہا تھا۔ پھر وہ کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

میں بھی واپس اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔ اپنے ہیجان پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے کاغذ قلم سنبھالا اور کہا "ہم دونوں اتفاق سے کچھ زیادہ ہی لاوارث واقع ہوئے ہیں اس لیے اپنی شادی کی بات چیت بھی ہمیں خود ہی طے کرنی پڑے گی اور اب اگلے مراحل بھی خود ہی طے کرنے پڑیں گے۔ بتاؤ... تاریخ کیا رکھی جائے؟ مہمانوں کی فہرستیں تیار کرنے کا کام کس کس کے سپرد کیا جائے؟ شادی کی تقریب لاہور میں رکھی جائے یا کراچی میں؟"

میں قلم تھامے کاغذ پر یہ تمام اہم پوائنٹس نوٹ کرنے کے لیے بالکل تیار تھا۔ راحیلہ حیرت سے ایک ٹک مجھے دیکھ رہی تھی "تمہارا دماغ تو صحیح ہے؟ کیا ایک ہی دن میں... بلکہ ایک ہی شام میں سب کچھ طے کرلو گے؟ کہیں یہ سب پروگرام طے کرنے کے بعد تم یہ فیصلہ نہ کرلو کہ شادی بھی آج ہی کرلیتے ہیں۔"

پھر وہ رسان سے سمجھانے والے انداز میں بولی "ذرا سکون کی سانس لو۔ میں اتنے بڑے فیصلے کی آزمائش سے گزری ہوں۔ ابھی تو چند دن مجھے اس کے ہیجان سے سنبھلنے کے لیے ہی درکار ہوں گے۔ اس کے بعد کچھ سوچیں گے۔ بہرحال تم اپنی عقل کو ٹھکانے پر رکھو۔ کم از کم تین چار ماہ سے پہلے شادی کی نوبت نہیں آسکتی۔"

"کیوں... کیا تمہیں کسی پہنچے ہوئے بزرگ نے منع کر رکھا ہے کہ اس سے پہلے شادی مت کرنا؟" میں نے غصے سے پوچھا "کیا ستاروں کی چال موافق نہیں ہے یا کوئی اور مسئلہ درپیش ہے؟"

وہ دھیمے لہجے میں انگریزی میں بولی "مجھے اس خیال سے مانوس تو ہونے دو کہ میں تم سے شادی کے لیے ہامی بھر بیٹھی ہوں۔"

"کیوں... کیا تمہارے خیال میں تم..... کسی غیر انسانی مخلوق سے شادی کرنے کی ہامی بھر بیٹھی ہو جو تمہیں اس خیال سے مانوس ہونے میں اتنا وقت لگے گا؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"تقریباً یہی سمجھ لو۔" وہ شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"اور یہ اچانک تم نے پٹری کیوں بدل لی؟ انگریزی کیوں بولنی شروع کردی؟" میں نے جاننا چاہا۔

"بعض باتیں اپنی زبان میں کہنا کچھ مشکل سا کام لگتا ہے۔ پرائی زبان کا سہارا لینا پڑ جاتا ہے۔ مجھے تو بہت دیر سے تمہاری باتوں کا جواب دینے میں دقت پیش آرہی ہے۔ تمہیں شاید آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ اندر سے میں بہت شرمیلی لڑکی ہوں۔"

"اچھا لطیفہ ہے..." میں نے کہا اور اس کے بعد زور سے "ہاہاہا" بھی کردیا۔ مجھے معلوم تھا وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ مجھ سے زیادہ کسے اندازہ ہو سکتا تھا کہ اندر سے وہ کیسی تھی' کس مزاج اور کن عادات کی مالک تھی۔ وہ بھی یقیناً میرے باطن سے اچھی طرح واقف تھی۔ اس کے باوجود انجان بنے رہنے اور نہایت سنجیدگی سے ایک دوسرے کو چھیڑنے اور ایک دوسرے کا مذاق اڑانے میں بڑا لطف آتا تھا۔

وہ قہر آلود نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی "چراغ الہ دین کے جن کی طرح زیادہ ہاہاہا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی میں نے باضابطہ طور پر ہاں نہیں کی ہے۔ میں اپنا فیصلہ واپس بھی لے سکتی ہوں۔"

"ایسی اہم باتیں کہہ کر مکرنے والوں کے ساتھ میں بہت برا سلوک کیا کرتا ہوں۔" میں نے بھی جواباً اسے خونخوار نظروں سے گھورا۔

"کیا کرلوگے تم؟" اس نے اکڑ کر پوچھا۔

"عین ممکن ہے میں تمہیں گولی مار کر لاش سمندر میں پھکوا دوں۔ بھوکی مچھلیاں تمہیں نوچ کر کھائیں گی اور وہ بھی تمہاری طرح جھوٹی اور ہرجائی ہوجائیں گی۔ وہ بھی اپنے پھپھلوں سے کوئی وعدہ کرکے مکر جایا کریں گی۔"

"جاہل آدمی! مچھلیوں کا کوئی پھپھلا نہیں ہوتا۔ وہ ہرمافروڈائٹ ہوتی ہیں۔" اس نے اپنی دانست میں میری معلومات میں اضافہ کیا۔

"ہرمافروڈائٹ...؟" میں نے جان بوجھ کر انجان بنتے ہوئے پوچھا "وہ کیا ہوتا ہے؟"

"اسی لیے تو کہتی ہوں اگر تو بچپن میں کچھ عرصہ دل جمعی سے اسکول اور کالج چلے جاتے تو جہالت کا یہ عالم نہ ہوتا۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ ہرمافروڈائٹ کا مطلب آجانے سے میری ساری جہالت دور ہوجاتی؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"کچھ فرق تو پڑتا۔" وہ بولی۔

میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "مجھے یاد تو پڑتا ہے کہ کالج کے زمانے میں' میں نے زولوجی کی کتاب میں یہ لفظ پڑھا تھا لیکن اس وقت مطلب یاد نہیں آرہا۔"

اس نے گویا مجھ پر ترس کھاتے ہوئے کہا "ہرمافروڈائٹ وہ جاندار ہوتے ہیں جو نر اور مادہ دونوں ہوتے ہیں۔"

"بہت خوب... یعنی ٹو اِن ون... اوپر والے کے کام بھی نرالے ہیں۔" میں نے تعجب کا اظہار کیا "وفا اور بے وفائی کا جھگڑا ہی نہیں۔ ایک مکمل اور خود کفیل جاندار اسی کو کہا جاتا ہے... لیکن... بہرحال ان کے اپنے کچھ مسائل اور پیچیدگیاں ہوں گی۔ بہرکیف یہ خیال رکھنا کہ تمہارا یہ انکشاف مجھے تم کو گولی مارنے اور تمہاری لاش سمندر میں پھینکنے سے باز نہیں رکھ سکے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ ماردینا گولی۔" وہ بیزاری سے بولی "روزروز تمہاری بک بک سننے سے تو گولی کھا کر مرجانا بہتر ہے۔"

"واہ۔ واہ! تم تو ابھی سے برسوں پرانی بیوی جیسے مکالمے بولنے لگی ہو۔ شادی کے بعد کیا عالم ہوگا!" میں نے حیرت اور ارمندی کا اظہار کیا۔

"اسی لیے میرا مشورہ ہے اب بھی سوچ لو۔ ابھی وقت ہے" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"مفت مشورے کا شکریہ... لیکن تم اٹھ کر کہاں چل دیں؟" میں نے پوچھا۔

"اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتی ہوں۔"

"آرام کے لیے اللہ نے رات بنائی ہے۔ دو منٹ مجھے شادی کی تیاریوں اور مختلف تفصیلات طے کرنے کی تو ابھی اجازت نہیں دے رہیں لیکن تمہارے ہامی بھرنے کی خوشی میں کچھ چھوٹا موٹا جشن تو ہوجانا چاہیے... اور کچھ نہیں تو آج رات پانچوں ساتھیوں کو یکجا ہو کر نہایت شاندار ڈنر کرنا چاہیے۔ ان کو بھی اطلاع دے دیتے ہیں۔"

"مجھے معلوم تھا تمہاری تان کھانے پر ہی آکر ٹوٹے گی۔ ہر وقت کھانے پینے پر ہی تلے رہتے ہو۔"

"شکر کرو' پیتا نہیں ہوں۔ صرف کھاتا ہوں۔ اگر پیتا ہوں تو بے ضرر سی چیزیں پیتا ہوں۔ تم ہی بتاؤ بھلا کھانے کے سوا میری زندگی میں کون سی دلچسپی ہے؟ ایک کھانے کے سوا رکھا کیا ہے...!" میں نے طویل سانس لی۔

"کل بھی ہم نے شاندار ڈنر کیا تھا۔" وہ بولی۔

"شکر ہے تم نے چھ ماہ پہلے کے کسی ڈنر کا حوالہ نہیں دیا اور یہ نہیں کہہ دیا کہ فی الحال ہمیں اسی پر اکتفا کرنا چاہیے۔ انسان کو دن میں کم از کم تین مرتبہ کھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ کی بھی نوبت آسکتی ہے۔ یہ اس کی مرضی ہے۔"

"کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اتنا پیٹو ہونے کے باوجود تمہاری توند کیوں نہیں ہے۔" وہ بولی۔

"یہ ایک خاندانی راز ہے جو شادی کے بعد بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔" میں نے شان بے نیازی سے کہا "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں جتنا پیٹو ہوں اتنا ہی اعلیٰ درجے کا فاقہ کش بھی ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی "صرف کوہان کی کسر ہے ورنہ پورے اونٹ ہوتے... اور اونٹ بھی وہ جو پانی کا نہیں بلکہ خوراک کا ذخیرہ کرلیتا ہے۔ بہرحال تم ڈنر کا پروگرام بنالو۔ مجھے معلوم ہے تم اس کے بغیر باز نہیں آؤ گے۔ جس کو چاہے مدعو کرلینا لیکن وقت دس بجے سے پہلے کا مت رکھنا۔ میں اب دس بجے سے پہلے نہیں آؤں گی۔"

"بہت بہتر ملکہ عالیہ!" میں نے سر جھکاتے ہوئے کہا "مہمان خصوصی ویسے بھی ہمیشہ لیٹ آتا ہے۔ آج کے ڈنر کی مہمان خصوصی تم ہوگی۔"

"میں اس اعزاز کے بغیر ہی ٹھیک ہوں۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی "اور ہاں... ڈنر کے موقع پر اعلان کرنے مت بیٹھ جانا کہ خواتین و حضرات! برسوں کی کشمکش اور کھینچا تانی کے بعد آخر کار راحیلہ نے مجھ سے شادی کے لیے ہامی بھرلی ہے۔ اس خوشی میں آپ لوگ تالیاں بجائیے۔" ابھی تم کسی سے اس کا ذکر بھی نہ کرنا۔ فی الحال یہ بات صرف میرے اور تمہارے درمیان رہنی چاہیے۔"

"کیوں... کیا یہ اتنی ہی بری بات ہے؟" میں نے حیرت سے کہا "میرا بس چلے تو میں گاڑی پر لاؤڈ اسپیکر فٹ کرا کے شہر میں اعلان کروا دوں۔ اخباروں میں چھپوا دوں۔ ریڈیو اور ٹی وی سے نشر کروا دوں۔"

"مجھے تم سے اسی بھانڈپن کا اندیشہ ہے۔ اسی لیے تو کہہ رہی ہوں۔ مجھے اس پر کوئی شرمندگی نہیں ہے لیکن پھر بھی... دوسروں کو دھیرے دھیرے آگاہ کرنا ہی بہتر رہے گا۔ یک دم سب کے سامنے ڈھول پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔" وہ ملائمت سے بولی۔

"تم واقعی عجیب چیز ہو۔" میں نے منہ بنایا "زرتاج کو دیکھا تم نے؟ وہ اپنی فیصلے پر پہنچی کیا دھڑلے سے اعلان کردیا۔"

"مگر زرتاج میں اور مجھ میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔" وہ مسکرائی "اگر زرتاج ہی کے فیصلے نے مجھے بھی فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی ہے۔ اس کے باوجود مجھ میں اس کی طرح یک دم بے ساختگی سے سب کے سامنے اس کا اظہار کردینے کی جرأت نہیں۔ مجھے خود پر حیرت ہوتی ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "یہ کچھ احساسات ہیں۔ جس طرح ایڈیٹر کا مراسلہ نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں ہوتا' اسی طرح ہونے والے شوہر کا ہونے والی بیوی کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ تم جو چاہو اور جو مناسب سمجھو وہ کرتے رہنا۔ خدا حافظ۔"

وہ بہرحال آخری فیصلے کا اختیار مجھے دے کر رخصت ہوگئی۔

میں دیر تک ایک عجیب سرشاری کے عالم میں بیٹھا رہا۔ کئی بار مجھے شبہ ہوا کہ وہ سب کچھ میں نے راحیلہ کے منہ سے خواب کے عالم میں تو نہیں سنا تھا؟ اور یہ خواب جلد ہی ٹوٹ تو نہیں جائے گا؟ لیکن رفتہ رفتہ مجھے یقین آہی گیا اور پھر میرے اعصاب بھی معمول پر آگئے۔ میں نے شفیع شاہ اور ٹونی کو موبائل فون پر خصوصی ڈنر کے پروگرام سے مطلع کیا۔ انہوں نے نہ تو کسی خاص حیرت کا اظہار کیا اور نہ ہی اس سلسلے میں کوئی سوال کیا لیکن جب میں نے زرتاج سے رابطہ کرکے اسے مدعو کیا تو وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"میں جب تمہارے ہاں سے رخصت ہوئی تھی اس وقت ہی بتا دیتے۔" وہ بولی "اب تو میں نے ایک اور بزنس ڈنر پر پہنچنے کی ہامی بھرلی ہے۔" لیکن میرے کچھ کہنے سے پہلے وہ خود ہی بول اٹھی "خیر... اس سے تو میں معذرت کرلوں گی۔ تمہاری فضول' بے ہودہ اور بے موقع دعوتوں پر پہنچنا زیادہ ضروری ہے... مگر یہ بتاؤ کہ میرے آنے کے بعد اتنے مختصر سے وقت میں تمہیں کون سی خوش خبری سننے کو مل گئی؟ کیا راحیلہ نے شادی کے لیے ہاں کردی ہے؟"

ایک لمحے کے لیے تو میں گڑبڑا گیا۔ یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے آپ جسم کے کسی حصے کو سب سے زیادہ بچانا چاہ رہے ہوں لیکن کوئی حریف عین اسی حصے کو تاک کر وار کردے۔ اس کے تخیل نے یک دم صحیح سمت میں پرواز کی تھی لیکن مجھے بہرحال راحیلہ کی بات کا بھرم رکھنا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا "یہ عظیم واقعہ تو جس دن رونما ہوگا اس دن میں صرف دو چار قریبی ساتھیوں کو نہیں بلکہ دو چار ہزار افراد کو اپنے ہوٹل میں ڈنر کراؤں گا۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم بھی تمہیں اپنی زندگی میں ہی شادی کے گھاٹ اترتے دیکھ لیں تو اچھا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "بہرحال... وجہ کچھ بھی ہو... اگر بات خوشی کی ہے اور تم ڈنر پر بلا رہے ہو تو میں آجاؤں گی اور کچھ؟"

"بس... ہماری فرمائشیں تو ایسی ہی بے ضرر قسم کی ہوا کرتی ہیں۔" میں نے جواب دیا پھر جلدی سے کہا "میں سوچ رہا ہوں اگر تمہارا وہ باوردی عاشق زاد آج رات فارغ ہوا تو اسے بھی بلالوں۔"

"وہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گی۔ بہرحال اگر وہ آیا تو تم اس کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بکواس نہ کرنا۔"

"مجھے کیا ضرورت ہے بکواس کرنے کی... تم لوگوں کو جو بھی بکواس کرنی ہو آپس میں خود ہی کرتے رہنا۔" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا۔

"اس بے چارے کا آنا مشکل ہی لگتا ہے۔ تم نے خود ہی تو اسے لمبے چکر میں پھنسا دیا ہے۔" وہ بولی۔

"ارے نہیں۔۔۔ وہ بڑا پھرتیلا آدمی ہے۔ رات تک تو وہ ایسے نہ جانے کتنے چکر نمٹا دے گا۔ اگر وہ بھی کھانے پر آجائے تو اچھا ہے۔ کھانے کی میز ہوگی۔۔۔ اس پر طرفہ یہ کہ تم موجود ہوگی۔۔۔ ان لوازمات کی موجودگی میں تو وہ بڑی آسانی سے تفصیلی رپورٹ دے دے گا۔ جمال سعیدی کے نورتنگ پیلس میں اس کے چھاپے کے دوران میں جو کچھ ہوا ہوگا' تمام تر جزئیات کے ساتھ بتا دے گا۔"

"وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے جتنا تم اسے سمجھتے ہو۔" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"فی الحال تو شاید نہ ہو۔ شادی کے بعد ہو جائے گا۔" میں نے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

مجھے رحیم گل سے رابطہ کرنے اور ڈنر وغیرہ کی بات کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ابھی میں نے ریسیور رکھا ہی تھا کہ رحیم گل یوں دروازہ کھول کر تیزی سے اندر آگیا جیسے وہ باہر کھڑا انتظار ہی کر رہا تھا کہ میں بات ختم کروں تو وہ اندر آجائے۔ اس کا چہرہ کچھ عجیب' ملی جلی یا پھر شاید متضاد سی کیفیات کا مظہر تھا۔ وہ تھکا ہوا بھی لگ رہا تھا اور سخت غصے میں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے سے بے بسی کی جھنجلاہٹ بھی جھلک رہی تھی۔ وہ وردی میں ہی تھا لیکن خلافِ معمول اس کی وردی زیادہ صاف ستھری اور نفیس حالت میں نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بڑی بھاگ دوڑ اور مشقت میں مصروف رہا تھا۔ آنکھیں سرخ تھیں۔

وہ میرے مقابل آکر میز کے دوسری طرف ایک جھٹکے سے رک گیا اور ڈرامائی انداز میں ایک ٹک مجھے گھورنے لگا جیسے ہپناٹائز کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی آنکھیں کسی ہپناٹسٹ کے بجائے زخمی درندے کی آنکھیں معلوم ہو رہی تھیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ مجھے کچا چبانے کی فکر میں تھا۔

"کیا بات ہے؟ تمہاری آنکھوں سے ہلاکت کے شعلے کیوں برآمد ہو رہے ہیں؟ کیا جمال سعیدی کے آدمیوں نے بہت مارا ہے؟" میں نے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

"جمال سعیدی کے آدمی تو خیر مجھے کیا ماریں گے لیکن میں تمہیں بہت ماروں گا۔" وہ غرایا۔

میں یوں ہنس دیا جیسے کسی بچے نے مجھے کوئی گھسا پٹا سا لطیفہ سنایا ہو لیکن مجھے لطیفے سے زیادہ اس کی معصومیت پر ہنسی آئی ہو "تمہاری اس قسم کی باتوں پر مجھے وہی مصرع پڑھنا پڑتا ہے۔ ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ ویسے سیاق و سباق کے بغیر باتیں کرنا کوئی اچھی عادت نہیں ہے۔"

وہ بدستور خونخوار نظروں سے مجھے گھورتا رہا۔ نتھنے پھولتے پچکتے رہے۔ میں نے ملائمت سے کہا "ویسے تم کسی معزز آدمی کے سامنے بیٹھنے کے قابل تو نہیں ہو لیکن میں ازراہِ اخلاق تمہیں دعوت دے رہا ہوں کہ اپنے سامنے پڑی اس کرسی پر بیٹھ جاؤ اور صحیح پس منظر کے ساتھ بیان کرو کہ آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟"

"میں تمہارا سارا معززانہ پن ایک گھونسے میں نکال دوں گا۔" اس نے گھونسا ہوا میں لہرایا۔

"اوہو۔۔۔ آج تو تمہیں کچھ زیادہ ہی زوردار دورہ پڑا ہے۔" میں نے اپنی جگہ سے اٹھے بغیر ہمدردانہ انداز میں سرہلایا "لیکن ڈاکٹر کو بھی جب تک تکلیف کے بارے میں صحیح طور پر نہ بتایا جائے وہ بھلا کیسے کوئی دوا تجویز کر سکتا ہے؟ میں تو تم سے کوئی بڑی خبر سننے اور پھر تمہیں ایک بہت بڑی خوشخبری سنانے کے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا لیکن تم نے آتے ہی یوں چیخنا شروع کردیا جیسے تمہاری دُم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا ہے اور اٹھانا بھول گیا ہے۔"

"خوش خبری۔۔۔؟" وہ سرہلاتے ہوئے خونخوار لہجے میں بولا "خوش خبری سننا چاہتے ہو تم مجھ سے۔۔۔؟" اس نے زور سے میز پر گھونسا مارا "تو پھر سنو۔۔۔ خوش خبری یہ ہے کہ آج تم نے مجھے افسروں کے سامنے جتنا ذلیل کرایا ہے اتنا میں کبھی زندگی میں نہیں ہوا تھا۔"

"خیر۔۔۔ ہر چیز کا کوئی نہ کوئی پہلا دن تو ہوتا ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا لیکن پھر میں نے ذرا سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی بہت زیادہ وحشت زدہ اور پریشان نظر آرہا تھا۔ میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا "آپ تم آرام سے بیٹھ کر بات کرو ورنہ میں پیپرویٹ کھینچ ماروں گا۔"

میں نے سچ مچ پیپرویٹ اٹھالیا۔ میرا خیال تھا کہ میری دھمکی پر وہ اور بھی مشتعل ہوگا لیکن خلافِ توقع وہ جلدی سے بیٹھ گیا تاہم اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ میں نے نرمی سے پوچھا "کیا دشواری پیش آئی؟ تم کس طرح افسران کی نظروں میں ذلیل ہوگئے؟ کیا جمال سعیدی کے اس قلعہ نما مکان میں داخلہ دشوار تھا؟ کیا تمہیں مایوسی کا منہ دیکھنا پڑا؟ کچھ تو بتاؤ۔ اس چیں چیں کے پس منظر پہ کچھ تو روشنی ڈالو۔"

"چھاپا مارنے میں واحد دشواری یہ پیش آئی کہ ہم وہاں سے کوئی اسلحہ برآمد نہیں کرسکے۔" وہ گویا انگارے چباتے ہوئے بولا "میں اتنے جوش و خروش سے اس علاقے کی پولیس کی دستیاب نفری کو تقریباً زبردستی اٹھا کر وہاں لے گیا۔ علاقے کا ایس ایچ او پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ اسے یہ خبر ٹھیک نہیں لگتی۔ کسی نے غلط مخبری کی ہے' وہ جمال سعیدی کو جانتا ہے' اس کے گھر سے اس طرح اسلحے کی کھیپ برآمد ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اس کے آدمیوں کے پاس ہتھیار ضرور ہوتے ہیں لیکن۔۔۔"

"ظاہر ہے اس سے تو اسی قسم کی باتیں سننے کی امید کی جاسکتی تھی۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا "علاقے کی پولیس نے اسے اپنا حصہ دی نے خرید کر جیب میں ڈال رکھا ہوگا۔ مانا کہ وہ ویرانے میں بنا ہے لیکن علاقے کی پولیس پھر بھی اس کی سرگرمیوں سے بالکل ہی بے خبر تو نہیں ہو سکتی۔"

"لیکن میں تو اچانک ان کے سر پہ جا پہنچا تھا۔ میں نے تو اس تھانے کے پولیس افسروں کو پہلے سے فون کرکے اپنی آمد سے بھی مطلع نہیں کیا تھا۔۔۔ اور پھر تمام وقت میری ان پر نظر رہی تھی۔ وہ کسی طرح بھی جمال سعیدی کو خبردار نہیں کرسکتے تھے کہ اس کے گھر چھاپا پڑنے والا تھا۔ اگر وہ بکے ہوئے تھے تب بھی میرے سامنے جمال سعیدی کو کوئی اطلاع دینے سے معذور تھے۔ اس کے باوجود۔۔۔"

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ کر ایک طویل سانس لی۔ سانس کیا تھی گویا ایک پھنکار تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنی آنکھوں میں غیظ و غضب کا تاثر بڑھاتے ہوئے مجھے گھورا۔ میں نے نرمی سے کہا "بار بار مجھے اس طرح گھورنے میں اپنی انرجی ضائع کرنے کے بجائے اگر تم صحیح الدماغ انسانوں کی طرح سیدھے سادے انداز میں مجھے ساری بات بتاتے جاؤ تو اس میں تمہاری بھی بھلائی ہے اور میری بھی۔ ہاں۔۔۔ تو۔۔۔ اس کے باوجود کیا ہوا؟" میں نے مشفقانہ سے انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"اس کے باوجود جب ہم وہاں پہنچے تو وہاں نہ تو اسلحے کی کھیپ تھی اور نہ ہی کوئی قبائلی۔" رحیم گل نے جلے بھنے لہجے میں جواب دیا "وہاں صرف جمال سعیدی کے چند محافظوں وغیرہ کی لاشیں تھیں اور وہ ان کے بارے میں رپورٹ درج کرانے کے لیے موبائل فون پر ڈی آئی جی صاحب سے بات کر رہا تھا۔"

میں ایک لمحے کے لیے ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میرے رگ و پے میں برقی سی لہر دوڑ گئی۔ راحیلہ کی طرف سے آج مجھے جو خوش کن فیصلہ سننے کو ملا تھا اس نے میرے جسم میں ایک نئی' زندگی بخش حرارت دوڑا دی تھی لیکن رحیم گل جو کچھ کہہ رہا تھا اس کی وجہ سے وہ حرارت گویا ایک دم مفقود ہوگئی۔ میرے اندر برف کی بوچھار سی ہوگئی۔ وہ جو دل میں ایک نئی ترنگ سی ابھری تھی وہ دم توڑنے لگی۔

ایک لمحے کے نہایت تناؤ زدہ سکوت کے بعد میں نے سنبھلتے ہوئے پوچھا "تم لوگوں کو وہاں کوئی تہ خانہ بھی ملا یا نہیں؟"

"تہ خانہ تو مل گیا۔ وہ تو کھلا ہی تھا لیکن افسوس کہ اس میں اسلحے کے بجائے پھلوں کی پیٹیاں پڑی تھیں۔" اس کے لہجے میں اب بھی برہمی تھی "ہمارے آدمیوں نے ایک ایک پیٹی کو کھول کر دیکھا۔ میں نے خود ان کا ہاتھ بٹایا لیکن ان میں سیبوں' انگوروں اور خوبانیوں وغیرہ کے سوا کچھ نہیں تھا۔ جمال سعیدی نے بتایا کہ اس کا ایک دور کا عزیز جو اس کے ساتھ اسی گھر میں رہتا ہے' پھلوں کا کاروبار کرتا ہے۔ وہ پھلوں کا آڑھتی ہے اور اکثر کوئی بڑی کھیپ خود بھی خرید کر رکھ لیتا ہے۔ جمال نے ازراہِ مہربانی اسے اپنا تہ خانہ استعمال کرنے کی اجازت دے رکھی ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر سرہلاتے ہوئے کہا "سائنس نے واقعی بڑی ترقی کرلی ہے۔ پولیس کے پہنچنے تک اسلحے کی پیٹیاں پھلوں کی پیٹیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔"

"کیا تم حسبِ عادت پولیس پر طنز فرمانے کی کوشش کر رہے ہو؟" اس نے آنکھیں سکیڑ کر ایک نئے انداز سے مجھے گھورا۔

"نہیں۔ پولیس پر تو ایک زمانہ صبح سے شام تک طنز کرتا رہتا ہے۔ میں کرلوں گا تو کیا فرق پڑ جائے گا۔۔۔ بلکہ میں تو سوچ رہا ہوں کہ اپنی یہ عادت ترک ہی کردوں۔ خواہ مخواہ اپنی انرجی ضائع کرنے سے کیا فائدہ۔"

"حیرت ہے!" وہ زہریلے لہجے میں بولا "جن کی پوری زندگی ضائع ہو رہی ہے۔۔۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ضائع ہو چکی ہے' انہیں بھی انرجی ضائع ہونے کی فکر ستانے لگی۔"

"لگتا ہے طنز فرمانے کا شوق تمہاری طرف منتقل ہو رہا ہے۔" میں نے کہا' پھر جلدی سے پوچھا "خیر۔۔۔ یہ باتیں چھوڑو۔۔۔ یہ بتاؤ فون پر مجھ سے بات ہونے کے کتنی دیر بعد تم پولیس فورس کے ساتھ وہاں جا پہنچے تھے؟"

"ایک گھنٹا تو لگ ہی گیا تھا۔" اس نے اب سیدھی طرح جواب دیا "جس وقت تم نے مجھے فون کیا میں اندرونِ شہر کے ایک ریستوران میں کھانا کھا رہا تھا۔ میں فوراً ہی کھانا چھوڑ کر اس علاقے کے پولیس اسٹیشن پہنچا۔ ظاہر ہے اس میں بھی کچھ وقت لگا۔ پھر وہاں کے لوگوں کو قائل کرنے اور بغیر وارنٹ کے چھاپا مارنے کے لیے تیار کرنے میں بھی کچھ دیر لگی۔ نورتنگ پیلس بھی وہاں سے قریب نہیں تھا۔ وہاں پہنچنے میں بھی کچھ وقت لگا۔ اس سے کم وقت میں یہ سب کچھ ممکن ہی نہیں تھا۔ اب تم یہ فرمانے کی کوشش مت کرنا کہ پولیس نے ایکشن لینے میں دیر کردی۔"

"نہیں۔۔۔ خیر۔۔۔ میں یہ فرمانے کی جرأت تو کر ہی نہیں سکتا۔ اتنے کم وقت میں تو واقعی تم نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا۔ اس پر طنز فرمانے کے بجائے میں تمہیں خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں۔ اس سے بھی زیادہ خراجِ تحسین ہمیں مل کر جمال سعیدی کو پیش کرنا چاہیے۔ وہ ہمارے اندازوں سے زیادہ بڑا فنکار معلوم ہوتا ہے۔"

یہ کہتے وقت میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ ہم نے دو ٹرکوں میں جن قبائلی ٹائپ لوگوں کو جمال سعیدی کے مکان کی طرف آتے دیکھا وہ شاید اس کے لیے صرف لڑاکا فورس کے طور پر ہی نہیں آرہے تھے بلکہ اس کے اسلحے کی پیٹیوں کی جگہ پھلوں کی پیٹیاں رکھنے کا بندوبست بھی کر کے آرہے تھے۔۔۔ لیکن کیا انہیں معلوم تھا کہ اس کی ضرورت پیش آئے گی؟ یہ بھی ممکن تھا کہ جمال سعیدی کے پاس وہیں آس پاس کوئی دوسرا بندوبست موجود رہا ہو۔ یہ قدرے پُراسرار سا سلسلہ ضرور تھا لیکن ناممکنات میں سے بہرحال نہیں تھا۔ کاش ہمیں وہاں سے راہِ فرار اختیار نہ کرنی پڑتی۔ ہاتھ آیا ہوا

شکار نکل گیا تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو صبر پر آمادہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جمال سعیدی نے تمہیں کیا کہانی سُنائی؟"

"ہم سے پہلے وہ فون پر ڈی آئی جی صاحب کو گلو گیر آواز میں اپنی کہانی سُنا رہا تھا کہ مزدوروں کے حلئے میں نظر آنے والی دو عورتوں اور تین مردوں نے اس کے ہاں کمانڈو ایکشن کیا تھا۔ اس کے ایک پارٹنر کے سیکریٹری اور کئی محافظوں کو ہلاک کر دیا تھا۔ کئی کو شدید زخمی کر دیا تھا۔ وہ مزدور ہرگز نہیں ہو سکتے تھے۔ وہ مزدوروں کے روپ میں یقیناً منجھے ہوئے دہشت گرد یا کمانڈو تھے۔"

"یہ الفاظ خود جمال سعیدی نے استعمال کیے تھے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" اس نے معاندانہ سے لہجے میں جواب دیا۔ مجھے اس پر ہنسی آگئی۔ وہ ایک بار پھر ذرا زیادہ خفا ہوتے ہوئے بولا "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"ہنسی کے تو اس میں بہت سے نکتے پنہاں ہیں لیکن اب میں تم جیسے جاہل آدمی کو کیا سمجھاؤں۔" میں نے مربیانہ لہجے میں کہا "کیا ستم ظریفی ہے کہ ایک شخص جو خود نہ جانے کتنے بہت سے دہشت گردوں کا سردار ہے' خود عملی طور پر بھی دہشت گرد معلوم ہوتا ہے' دہشت پسندانہ ذہنیت کا مالک ہے۔ دہشت گردی کو بہت بڑے پیمانے پر ایندھن فراہم کرتا ہے' وہ اپنے سے کہیں بہتر انسانوں کو دہشت گرد کہہ رہا ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ وہ اس سے بہتر انسان تھے؟" اس نے مجھے گھورا۔

"جو اس قسم کے لوگوں کو سبق سکھاتے ہیں' میرے خیال میں وہ ان سے بہتر قرار دیے جانے کے مستحق ہوتے ہیں۔" میں نے بات بنانے کی کوشش کی۔ میری زبان ذرا پھسل گئی تھی جس پر میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا تھا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے کہ جمال سعیدی اس حد تک بُرا آدمی ہے کہ اسے اس قسم کا سبق سکھایا جانا چاہیے؟" اس نے مجھے گھورنا جاری رکھا۔

"لگتا ہے اُلٹے بانس بریلی کو چل پڑے ہیں۔" میں نے ذرا چڑنے کی اداکاری کی "یار تم تو ہر وقت نرے پولیس والے کے پولیس والے ہی رہتے ہو۔ تم نے تو اُلٹا مجھ سے ہی تفتیش شروع کر دی۔ میں نے تو تمہارے افسروں کی نظر میں تمہارا مقام اونچا کرانے کی کوشش کی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ ویسے تو تم میں ترقی کرنے کی صلاحیت ذرا کم ہی ہے۔ میں نے سوچا تھا شاید اس طرح ہی تمہارا عہدہ کچھ بڑھ جائے۔ شاید تم انسپکٹر کے عہدے سے کچھ آگے کھسک جاؤ۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ہمارے محکمے نے اب کسی بھی قسم کے کارنامے پر وقت سے پہلے ترقی دینا چھوڑ دیا ہے۔ اس سے پروموشن کے نظام میں بڑی گڑبڑ ہو جاتی تھی۔ اب اس قسم کے کارناموں پر صرف نقد انعام اور تعریفی سرٹیفکیٹ دیے جاتے ہیں۔" اس نے میری معلومات میں اضافہ کیا پھر زہریلے لہجے میں بولا "اور یہ جو تم نے میری عزت افزائی کا عظیم موقع فراہم کر کے میری آنے والی نسلوں پر جو احسان فرمایا تھا اس میں درحقیقت میری چٹنی اُڑتے اُڑتے بچی ہے۔ ابھی مصیبت پوری طرح ٹلی نہیں ہے۔ ابھی میرے بارے میں زیادہ باریکی سے چھان بین ہو سکتی ہے۔"

"اس لیے تم نے اس سے پہلے ہی اس سلسلے میں میرے بارے میں باریک بینی سے چھان بین شروع کر دی ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"چھان بین تو میں ابھی کروں گا برخوردار!" اس نے دھمکی آمیز انداز میں سرہلایا "تم نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ میں اس چکی میں پسنے سے بچ گیا۔"

"دل چھوٹا کرنے کی ضرورت نہیں... چکیاں بہت ہیں۔ زندگی رہی تو آئندہ کسی چکی میں پس جاؤ گے۔" میں نے خلوص سے کہا۔

"ظاہر ہے..." وہ سرہلاتے ہوئے زہریلے لہجے میں بولا "جن کے تم جیسے مار آستین قسم کے دوست ہوں ان کا یہی انجام ہے۔ کہیں وہ گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پس جاتے ہیں اور کہیں گیہوں کے ساتھ ہونے کا بہانہ بھی ضروری نہیں ہوتا۔ ویسے ہی پس جاتے ہیں۔"

"تم کس منہ سے مجھے آستین کا سانپ کہہ رہے ہو۔ تم تو آستین کے اژدہے ہو۔" میں نے غصے سے کہا "اگر تمہارے جیسے دوست نہ ہوتے تو تم بہت پہلے پس چکے ہوتے۔ تمہاری ہڈیوں کا بھی سرمہ بن چکا ہوتا لیکن میں احسان جتانا پسند نہیں کرتا۔ تمہیں معلوم ہے میرا ظرف بہت بڑا ہے۔"

"ہاں... مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے۔" اس نے اثبات میں سرہلایا "تمہارا ظرف تو پچھلے دنوں ظروف کی عالمی نمائش میں بھی رکھا گیا تھا۔"

میں نے یک دم اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے کہا "ان احمقوں نے ظاہر کر دیا ہوگا کہ جمال سعیدی کے ہاں تم چھاپا مارنے کی غرض سے پہنچے تھے؟"

"ظاہر ہے... تمہاری فراہم کردہ اطلاع کی روشنی میں ہم یہی سمجھ رہے تھے کہ اندر بہت سے قبائلی چھپے بیٹھے ہوں گے۔ ممکن ہے ہم پر فائر کھول دیا جائے۔ اس لیے ہم نے مکان کے قریب پہنچتے ہی پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ للکارنا شروع کر دیا تھا۔ کافی شور شرابا کیا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اندر تو جمال سعیدی

کی مظلومیت کی کہانی شروع ہو چکی تھی۔ جب ہمارے لیے گیٹ کھلوایا گیا تو ہمارا انداز بھی چھاپا مارنے والا تھا۔ اگر ہمیں صحیح طور پر معلوم ہوتا کہ اندر کیا صورت حال ہے تو ہم جمال سعیدی کے سامنے بہانہ بنا سکتے تھے کہ ہمیں اس مکان میں گڑبڑ کی اطلاع ملی تھی اور ہم اس کی مدد کے لیے آئے ہیں لیکن ہم یہ بہانہ نہیں بنا سکے اور ہمارا انداز بھی اسے سب کچھ بتانے کے لیے کافی تھا۔ رہی سہی کسر حلقہ پولیس انسپکٹر نے پوری کر دی۔ اس نے صاف بتا دیا کہ وہ لوگ میرے اصرار پر چھاپا مارنے آئے ہیں۔ اس پر جمال سعیدی نے رو رو کر ڈی آئی جی صاحب سے مزید فریاد کی کہ ایک تو اس کے گھر پر حملہ ہوا ہے' اس کے آدمی مارے گئے ہیں' اوپر سے ایک دوسرے علاقے کا ایس ایچ او اس کے علاقے کی پولیس فورس کو ساتھ لے کر اسی کے ہاں دھاوا بول رہا ہے۔ اگر میری جگہ کوئی اور ایس ایچ او ہوتا تو ڈی آئی جی صاحب شاید اسے ٹیلی فون پر ہی معطل کر دیتے۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "وہ تو غنیمت رہا کہ میں نے ڈی آئی جی صاحب سے فون پر بات کرتے وقت یہ ظاہر نہیں کیا کہ میں نے کس کی اطلاع پر یہ کارروائی کی تھی ورنہ تم بھی لپیٹ میں آجاتے۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ میں نے ایک گمنام اطلاع پر کارروائی کی تھی۔ اس پر ڈی آئی جی صاحب نے تمام تر لحاظ داری کے باوجود مجھے خاصی جھاڑ پلائی کہ کیا مجھ جیسے آفیسر کو اتنا بھی معلوم نہیں کہ اتنے بڑے بڑے لوگوں کے خلاف گمنام اطلاعات پر اس انداز میں کارروائی نہیں کی جاتی۔"

"بڑے بڑے لوگ...!" میں بے ساختہ کراہ اٹھا "رحیم گل زیرک! آخر ہمارے ہاں بڑا آدمی کہلانے کا معیار کیا ہے؟"

"اگر تمہیں اب تک معلوم نہیں ہے تو تم بہت بڑے گدھے ہو۔" رحیم گل جل کر بولا "یہ بات تو چھوٹے سے چھوٹے افسر کو بھی معلوم ہے کہ ہمارے ہاں بڑا آدمی کسے کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے پہلا لازمہ تو دولت ہے جس کے بارے میں کوئی نہیں پوچھتا کہ وہ آپ کے پاس کہاں سے آئی۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے لوازمات ہیں۔ سیاسی اثر رسوخ' سیاسی بلیک میلنگ' اسلحے کی طاقت' غنڈا گردی کی طاقت' امن و امان درہم برہم کرنے کی طاقت۔ جن کے پاس یہ سب کچھ ہے انہیں ہمارے بڑے سرکاری افسران بھی "بڑے" یا "اہم" لوگ قرار دے کر ان کی چاپلوسی میں لگے رہتے ہیں۔"

"مجھے یہ بات معلوم تو بچپن سے ہے۔ یونہی ذرا یادداشت تازہ کرنے کے لیے تم سے پوچھ رہا تھا۔" میں نے کراہنے ہی کے انداز میں کہا "یونہی ذرا تم جیسے بے ہودہ لوگوں کی صحبت میں بیٹھ کر اپنی یادداشت کے لیے ریفریشر کورس کرواتا رہتا ہوں۔ بہرحال... افسوس ہے کہ حالات نے وہ رُخ اختیار نہیں کیا جو میں چاہ رہا تھا یا جس کی مجھے توقع تھی۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے تو سب کا بھلا چاہا تھا۔ تمہارا... اپنا... اس ملک کا... اور ہم سب کی آنے والی نسلوں کا... لیکن بعض اوقات نیک خواہشات بھی قبول نہیں ہوتیں۔ شاید اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت ہوتی ہوگی۔ اوپر والا اپنے کاموں کو بہتر سمجھتا ہے۔ میں تم سے معذرت خواہ ہوں کہ تمہیں انعام و اکرام وصول کرنے کے بجائے جھاڑ سُننا پڑی لیکن تم اس مایوسی کا اندازہ نہیں کر سکتے جس کا اس وقت مجھے سامنا ہے..." میں نے ایک طویل اور سرد سانس لی۔

"اس قسم کی مولویانہ تقریر سے کام نہیں چلے گا۔" وہ کچھ بدلے ہوئے سے لہجے میں بولا "یہ مت سمجھو کہ میں اتنی آسانی سے تمہاری جان چھوڑ دوں گا۔ ابھی تو میری اپنی جان بھی صحیح معنوں میں نہیں چھوٹی ہے اور اگر میری جان چھوٹ گئی تب بھی میں تمہاری جان اس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اصل بات نہیں معلوم کر لوں گا۔"

"کون سی اصل بات...؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"یہی کہ تمہیں وہ اطلاع کہاں سے ملی تھی؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ وہ بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"کون سی اطلاع؟" میں نے انجان بننے کی کوشش کی۔

وہ دانت پیس کر بولا "وہی جس کی بنیاد پر تم نے مجھے دوڑایا تھا کہ جمال سعیدی کے ہاں تہ خانے میں اسلحے کی بہت بڑی کھیپ موجود ہے... وہاں بہت سے قبائلی ٹائپ لوگ بھی ہوں گے... ہو سکتا ہے وہ مزاحمت کریں... وغیرہ وغیرہ۔ تمہیں یہ باتیں کیسے معلوم ہوئی تھیں؟"

میں نے چند لمحے اسے گھورنے کے بعد گہری سانس لے کر کہا "پیارے انسپکٹر! اگر میں چاہوں تو سرے سے اس بات سے ہی منکر ہو سکتا ہوں کہ میں نے تمہیں کوئی اطلاع دی تھی لیکن تم چونکہ میرے دوست ہو اس لیے میں ایسا نہیں کروں گا۔ مجھے ایک ایسے شخص نے اطلاع دی تھی کہ جو کچھ عرصے پہلے تک جمال سعیدی ہی کا کارندہ تھا لیکن... کچھ اختلافات کی وجہ سے وہ اسے چھوڑ کر فرار ہو چکا ہے۔"

"کہاں ہے وہ... اور تمہارا اس سے کیا تعلق ہے؟"

"ظاہر ہے وہ روپوش ہے۔ کبھی کبھی مجھے فون کر کے کوئی اہم بات بتا دیتا ہے۔ پہلے کبھی کبھار وہ میرے ہوٹل میں ٹھہرا کرتا تھا۔ اس دوران میں اس سے کچھ دوستی ہو گئی تھی۔ وہ خود تو جمال سعیدی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا لیکن اس امید پر مجھے اس کے بارے میں دو تین مرتبہ کچھ باتیں بتا چکا ہے کہ میں اس کے خیال میں اثر رسوخ والا آدمی ہوں' شاید میں خود پس منظر میں رہتے ہوئے جمال سعیدی کو کوئی نقصان پہنچا سکوں اور یوں اس کے جذبۂ انتقام کی تسکین ہو سکے۔ گھر کا بھیدی ہے' لنکا ڈھانے کی کوشش کر رہا

ہے۔"

"اس سے پہلے تو تم نے اس کی فراہم کردہ کوئی اطلاع مجھ تک نہیں پہنچائی۔" رحیم گل چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"اس سے پہلے اس نے جو دو تین باتیں بتائیں ایک تو وہ اتنی اہم نہیں تھیں۔ دوسرے وہ کچھ تاخیر سے بتا رہا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ ان کے بارے میں کوئی ثبوت حاصل نہیں ہوسکے گا اس لیے تمہیں زحمت دینا فضول ہے۔" میں نے روانی سے کہا "لیکن اس بار اس نے مجھے جو اطلاع دی وہ اتنی سنگین تھی کہ میں نے سوچا تمہیں زحمت دے ہی دی جائے لیکن شاید ہماری قسمت اچھی نہیں تھی۔ جمال سعیدی ہم سے پہلے ہاتھ دکھا گیا۔"

"تمہیں کیوں اتنا یقین ہے کہ تمہارے اس مخبر کی اطلاع درست ہی تھی؟ تم نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ شاید وہ تمہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کررہا ہوں؟" رحیم گل بدستور تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"میں نے اس سلسلے میں اپنی چھٹی حس پر بھروسا کیا تھا۔ یہ تو بہرحال تمہیں بھی معلوم ہے کہ جمال سعیدی کوئی ٹھیک آدمی نہیں ہے۔ بات صرف ثبوت کی ہے۔ اگر اس کے واقعات سے ہمت نہ ہاری جائے اور کوشش جاری رکھی جائے تو ثبوت بھی کبھی نہ کبھی مل ہی جائے گا۔" میں نے نہایت متانت سے کہا۔

"چھٹی حس....؟" وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسا "پہلے اپنی پانچ حسوں سے تو صحیح طرح کام لینا سیکھ لو۔ بہرحال.... تم نے یہ مخبروں والی کہانی خوب گھڑی ہے.... اور فی البدیہہ گھڑی ہے۔ تم اِدھر اُدھر ہر میدان میں منہ تو مارتے ہی رہتے ہو۔ مجھے حیرت ہے کہ تم نے اب تک کہانی کار یا ڈراما نگار بننے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ جس روانی سے تم کہانی گھڑتے ہو' مجھے امید ہے تم اس میدان میں بھی جھنڈے گاڑ سکتے ہو۔"

"اس فیلڈ میں پیسہ نہیں ہے۔ میں صرف اس فیلڈ میں کام کرتا ہوں جس میں پیسہ ہو۔" میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"شہرت تو ہے۔" وہ بولا۔

"خالی شہرت کو کیا میں شہد لگا کر چاٹوں گا؟" میں نے منہ بنا کر کہا "شہرت کا مجھے قطعاً کوئی شوق نہیں ہے۔ مجھ جیسے آدمی کے لیے گمنامی زیادہ فائدہ مند ہے۔ اگر مجھے مشہور ہونا ہوتا تو میں کہانی کار' ڈراما نگار یا اداکار بنے بغیر بھی ہوسکتا تھا لیکن میں تو میڈیا کے لوگوں سے منہ چھپاتا پھرتا ہوں۔"

"خیر.... یہ منہ اسی قابل ہے کہ تم اسے میڈیا کے لوگوں سے چھپا کر رکھو۔ تم تو واقعی اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئے کہ میں تمہیں رائٹر بننے کا مشورہ دے رہا ہوں۔ زیادہ نفیس طنز تو تمہاری خالی کھوپڑی کے اوپر سے گزر جاتا ہے۔ میرا اشارہ اصل میں تمہاری فراٹے سے جھوٹ بولنے کی صلاحیت کی طرف تھا بلکہ اشارہ کیا.... میں نے تو صاف طور پر عرض کیا تھا کہ یہ مخبری والی کہانی تم نے عین وقت پر خوب گھڑی ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے تم نے ان الفاظ کو کچھ زیادہ قابلِ توجہ نہیں سمجھا۔"

"ارے ہاں.... میں تو روانی میں ان الفاظ کو اَن سُنا کر گیا۔" میں نے چونک کر کہا پھر غضب ناک نظر آنے کی کوشش کی "یعنی تم نے صاف طور پر مجھے جھوٹا قرار دینے کی کوشش کی ہے؟"

"جھوٹا....؟" اس نے افسردہ سے لہجے میں دُہرایا "یہ تمہارے لیے بہت چھوٹا لفظ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارے لیے کیا لفظ استعمال کروں.... بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ تمہارے سلسلے میں تو الفاظ استعمال کرنا وقت کا زیاں محسوس ہوتا ہے۔ تمہارے ساتھ تو کسی اور ہی زبان میں بات کرنی چاہیے۔"

"وہ تو خیر تم پولیس والوں کی عادت ہوتی ہے لیکن میرے معاملے میں تمہاری یہ پُرانی حسرت بدستور حسرت ہی رہے گی۔ بہرحال تم نے اگر آئندہ مجھے اس دھڑلے سے جھوٹا قرار دینے کی کوشش کی تو میں تمہیں ڈنڈا ڈولی کرکے باہر پھنکوا دوں گا۔"

"تمہاری یہ حسرت بھی حسرت ہی رہے گی۔" وہ غرایا "میں تمہیں ڈنڈا ڈولی کرانے کی بھی زحمت نہیں کروں گا۔ ضرورت پڑی تو میرے آدمی تمہیں گھسیٹتے ہوئے یہاں سے لے جائیں گے۔"

"میں تمہیں جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے سے منع نہیں کرسکتا کیونکہ میری یہ کوشش فضول ہوگی۔ تم اس سے باز نہیں آؤ گے۔" میں نے اداسی سے کہا "لیکن تمہاری بکواس اب میری برداشت سے باہر ہوچکی ہے۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

"اس وقت میں اتنی آسانی سے جانے کے لیے نہیں آیا ہوں۔" وہ کچھ پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا "مجھے کچھ ضروری سوالوں کے جواب چاہئیں۔ اگر تم شرافت سے جواب نہیں دو گے تو میں تمہیں تھانے بھی بُلوا سکتا ہوں۔"

وہ واقعی سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ میرے سینے سے بے اختیار ایک کراہ سی نکل گئی اور میں نے چھت کی طرف دیکھ کر کہا "کسی نے ٹھیک ہی کہا تھا.... پولیس والوں کی دوستی اچھی نہ دشمنی۔ میں تو سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں کہ انسان ان سے دشمنی تو خواہ مخواہ لے لے لیکن ان سے دوستی کبھی نہ کرے۔ میں تو تمہیں جمال سعیدی والے مشن پر بھیج کر پچھتا رہا ہوں۔ اس مہم سے کچھ وصول تو کچھ نہیں ہوا لیکن تم خواہ مخواہ دماغی توازن سے محروم ہوگئے۔"

"یہ تو تمہیں چند دن بعد پتا چلے گا کہ میرا دماغی توازن درست ہے۔" وہ نتھنے پھلاتے ہوئے بولا "میں جمال سعیدی کے ہاں کئی لاشیں دیکھ کر آرہا ہوں.... اور لاشیں خواہ کسی کی بھی ہوں ان کا معاملہ سنگین ہوتا ہے۔ میں اس معاملے کی بہت باریک بینی سے تفتیش کروں گا۔"

"ماشاء اللہ....!" میں نے استہزائیہ انداز میں اس کا جائزہ لیا "بہت لائق اور محنتی افسر ہوگئے ہو اب تو تم۔ میں ہمیشہ سے لائق اور محنتی ہوں۔ تم میرے بارے میں کتنا ہی کامیڈین بننے کی کوشش کرتے رہو' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ گویا میرے استہزائیہ انداز کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا "مجھے پتا چلا ہے کہ لاہور سے تمہارے دو قریبی ساتھی ٹونی اور راحیلہ بھی آئے ہوئے ہیں اور آج دوپہر زرتاج اور شفیع شاہ بھی یہاں آئے تھے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ دو سے پانچ بجے کے درمیان تم پانچوں کہاں تھے؟"

"اوہ...." میں نے آنکھیں پھیلائیں "تم نے تو واقعی اس وقت خود کو شرلاک ہومز محسوس کرنا شروع کردیا ہے لیکن میرے حساب سے صحیح معنوں میں کمینے پن پر اتر آئے ہو۔ بہرحال.... جہاں سے تم نے میرے دوستوں کی آمد کے بارے میں معلوم کیا ہے' وہیں سے باقی باتیں بھی معلوم کرلو۔" میں نے بے نیازی اور بیزاری کے اظہار کے لیے منہ پر ہاتھ رکھ کر زوردار جمائی لی اور کہا "تم نے دیکھا....؟ تمہاری باتوں سے مجھے کتنی لمبی لمبی جمائیاں آنے لگی ہیں۔"

"تمہاری جمائیاں دھری رہ جائیں گی۔" وہ دانت پیس کر بولا "عنقریب تم جس شکنجے میں پھنسنے والے ہو اس میں تم جمائیوں کو بھول جاؤ گے اور تمہاری لمبی لمبی چیخیں نکلیں گی۔"

"پولیس والے تو شاید مجھ جیسے ہر خوش و خرم شخص کو دیکھنے کے بعد ہی خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ کوئی نئی دھمکی نہیں ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تمہاری بھلائی کے لیے کہہ رہا ہوں' شرافت اور سنجیدگی سے میرے سوال کا جواب دے دو۔" وہ مجھے اپنے سنجیدہ ہونے کا یقین دلانے کی پوری پوری کوشش کررہا تھا۔

"جن کی لاشوں کا تم ذکر کررہے ہو ان لوگوں کے کاروبار کی وجہ سے نہ جانے کہاں کہاں کتنی لاشیں گری ہوں گی۔ تم ان کے غم میں کیوں دُبلے ہونے لگے اور تم نے کیوں اس طرح تفتیش شروع کردی جبکہ وہ تمہارا علاقہ بھی نہیں ہے؟" میں نے ذرا بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔

"لاش بہرحال لاش ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں تفتیش کرنا ہماری اہم ترین ذمّے داریوں میں سے ایک ہے۔" وہ بدستور سنجیدگی سے بولا۔

"اب اگر میں تمہاری ذمّے داریوں اور فرائض کے بارے میں کوئی بات کروں گا تو بحث بہت لمبی ہوجائے گی۔ ہمارے درمیان تو بغیر کسی بات کے بھی بحث بہت لمبی ہوجاتی ہے۔ اس لیے میں اس سے گریز کرتے ہوئے صرف اتنا کہوں گا کہ تم تفتیش ضرور کرو' میں تمہارے راستے کی رکاوٹ ہرگز نہیں بنوں گا لیکن بغیر کسی ثبوت کے مجھ پر یا میرے کسی ساتھی پر الزام عائد کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ بھی مت سوچنا کہ تم اپنے اختیارات سے کوئی ناجائز فائدہ اٹھاؤ گے تو میں تمہیں بخش دوں گا۔ اگر تم فضول قسم کی فرض شناسی میں اُلجھ گئے تو میں بھی غور کرنے پر مجبور ہو جاؤں گا کہ میرا اثر رسوخ کہاں کہاں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے تمہارا اثر رسوخ کہاں کہاں ہے۔" وہ طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "اگر ضرورت پڑی تو میں تمہارے اثر رسوخ کی بھی ایسی تیسی کردوں گا لیکن فی الحال میں نے اپنے اختیارات کا جائز فائدہ اُٹھانے کے بارے میں بھی نہیں سوچا۔ ناجائز فائدہ اٹھانا تو دور کی بات ہے۔ اگر میں صرف رسمی کارروائی کرنے کا ارادہ کروں تب بھی تمہاری گاڑی' اس دفتر اور تمہارے یا تمہارے ساتھیوں کے کمروں کی تلاشی سے آغاز کروں۔ عین ممکن ہے ان میں سے کسی جگہ پر مجھے مزدوروں والے کپڑے اور وہ گنیں مل جائیں جن سے فائر کرکے جمال سعیدی کے آدمیوں کو ہلاک کیا گیا ہے۔"

حقیقت یہ تھی کہ ان میں سے کچھ چیزیں گاڑی میں اور کچھ کمروں میں واقعی موجود تھیں۔ ابھی ہم نے ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بارے میں سوچنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ میری گن تو میری جیب میں موجود تھی لیکن میں نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ "اگر تم دوست بن کر یا مجھے چکر دے کر کسی طریقے سے تلاشی لینے کی کوشش کرتے تو شاید کامیاب ہوجاتے لیکن اب چونکہ تم کچھ اس قسم کے پولیس والے بننے کی کوشش کررہے ہو جس کے دل میں شرفا سے زیادہ خبیثوں کا درد ہوتا ہے اس .... لیے میں تمہیں اس کرسی کے نیچے جھانکنے کی بھی اجازت نہیں دوں گا جس پر تم بیٹھے ہو۔ اس کے لیے بھی تمہیں سرچ وارنٹ حاصل کرنا پڑے گا۔"

اس نے زہریلے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی۔ "تمہارا خیال ہے کہ سرچ وارنٹ حاصل کرنا کوئی مشکل کام ہے؟ میں یہیں بیٹھے بیٹھے سرچ وارنٹ منگوا سکتا ہوں۔ مجھے تمہارے سامنے سے ایک لمحے کے لیے اُٹھ کر کہیں جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی اور تم اس دوران میں ان چیزوں کو غائب بھی نہیں کرسکو گے۔"

"ہم آج تک ایسی چیزوں کو غائب کرنے کے پاگل پن میں مبتلا ہی نہیں ہوئے جو ہمارے پاس موجود ہی نہ ہوں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "تاہم میں تمہیں ایک بات ضرور یاد دلانا چاہوں گا۔ شاید بڑھاپے کے باعث تمہاری یادداشت خاصی خراب ہوگئی ہے۔ آج ہی چند گھنٹے پہلے جب میں نے فون پر تمہیں جمال سعیدی کے ہاں چھاپا مارنے کے لیے کہا تھا تو تم نے ارشاد فرمایا تھا کہ سرچ وارنٹ لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ مجھے تمہارے اِس وقت کی اور اب کی باتیں سُن کر' تمہارے تیور دیکھ کر تو کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے تم درحقیقت جمال سعیدی جیسے لوگوں کے مفادات کے لیے کام کررہے ہو۔ لگتا ہے مال نے کام دکھا دیا ہے۔ سنا ہے اس قسم کے لوگ دل کھول کر روپیہ خرچ کرتے ہیں۔"

خلافِ توقع اس نے مزید غضبناک ہونے کے بجائے ایک

ٹھنڈی سانس لی اور افسوس زدہ سے لہجے میں بولا۔ "پولیس کو اس کے فرائض کی ادائیگی سے روکنے کے لیے تم جیسے شاطر لوگوں کے پاس یہ بھی ایک بڑا حربہ ہوتا ہے جو زیادہ تر کارگر بھی رہتا ہے۔ بڑے اطمینان سے کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں پولیس آفیسر فلاں کام اس لیے کر رہا ہے کہ اس کو فلاں جگہ سے مال مل گیا ہے اور چونکہ پولیس کی شہرت اچھی نہیں اس لیے زیادہ تر لوگ آنکھیں بند کر کے اس الزام کو درست تسلیم کر لیتے ہیں۔" وہ سچ مچ مغموم نظر آنے لگا۔

"یہ تو بڑی زیادتی ہے۔ زیادہ تر لوگوں کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔ "بہرحال...... اب تم بتاؤ کہ تمہارا کیا پروگرام ہے؟ تم کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ اگر تم فون کر کے سرچ وارنٹ منگوانا چاہتے ہو تو یہ فون حاضر ہے۔" میں نے فون اس کی طرف کھسکایا۔ "کوئی اور کارروائی کرنا چاہتے ہو تو اس کا شوق بھی پورا کر لو۔"

"سرچ وارنٹ کے بارے میں، میں نے تم سے پہلے بھی غلط نہیں کہا تھا اور اب بھی غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"کمال ہے.....!" میں نے سر ہلایا۔ "دو متضاد باتیں بیک وقت صحیح قرار دے دیتے ہو، یہ تم پولیس والوں کا ہی کمال ہے۔"

"میرا مطلب تھا کہ یہ کام کبھی بہت آسان بھی ثابت ہو سکتا ہے اور کبھی بہت دشوار۔" اس نے بات بنائی۔ "یہ ایک قسم کا جُوا ہے اور جب معاملہ تم جیسے جھوٹے کو گھر تک پہنچانے کا ہو تو میں جُوا کھیل سکتا ہوں۔"

"تو پھر کھیلو۔" میں نے فون کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہیں کس نے روکا ہے؟"

"خود میں نے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "انسان کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا کہہ رہا ہے۔ عقل کی بات اگر دشمن بھی کہہ رہا ہو تو اس پر توجہ دینی چاہیے۔ میں نے چند لمحے پہلے ہی تمہاری اس بات پر غور کیا تھا کہ واقعی یہ میرے علاقے کا کیس نہیں ہے۔ میں کیوں اس میں سر کھپا رہا ہوں، کیوں اپنے لیے کام بڑھا رہا ہوں اور کیوں اپنے تعلقات خراب کر رہا ہوں؟ چنانچہ میں نے اس سلسلے میں مستعدی دکھانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ اگر کبھی متعلقہ تفتیشی افسر نے مجھ سے میری رائے مانگی تو میں اسے اپنی بے لاگ رائے سے ضرور مطلع کر دوں گا۔"

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "اس واقعے سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح انسان پر اچانک دیوانگی کا دورہ پڑ سکتا ہے اسی طرح اچانک کبھی اسے عقل بھی آ سکتی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ کبھی اچانک اس پر عقل کا دورہ بھی پڑ سکتا ہے۔"

حقیقت یہ تھی کہ میں دل ہی دل میں خوش ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ کمبخت رحیم گل بھی بڑا بدمعاش تھا۔ وہ اب تک خواہ مخواہ کی مصنوعی خفگی اور رعب جھاڑ رہا تھا۔ اس کا کچھ بھی کرانے کا ارادہ نہیں تھا۔ وہ مجھ پر صرف یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا اصل بات کافی حد تک سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس کے کھ اعتراض نہیں تھا۔

"مجھ پر عقل کا زیادہ شدید دورہ پڑنا تمہارے لیے نقصان بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" وہ خبردار کرنے والے انداز میں بولا۔

"میری بات تو چھوڑو۔ یہ دورہ خود تمہارے اپنے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ زیادہ عقل تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔"

"بالکل اسی طرح جیسے عقل سے بالکل ہی محروم ہونا تمہارے لیے نقصان دہ ثابت ہو رہا ہے۔" وہ ترحم آمیز نظروں سے طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"تم نے مسلسل بے ہودہ قسم کی گفتگو کر کے خود کو ایک نہایت عظیم خوشخبری سے محروم کر لیا ہے۔" میں نے جواباً اس سے زیادہ ترحم آمیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

"خوشخبری.....؟" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "کیا تم کبھی کسی انسان کو کوئی خوشخبری بھی سُننے کو مل سکتی ہے؟"

"خوشخبری ملتی ہی ہم جیسے انسانوں سے ہے احمق کہیں کے!" میں نے بزرگانہ لہجے میں کہا۔ "لیکن خوشخبری سُننے کے لیے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنا پڑتا ہے۔ تم اس قابل ہرگز نہیں کہ تمہیں کوئی خوشخبری سُنائی جائے۔"

اس کا تجسس یقیناً بیدار ہو چکا تھا لیکن بظاہر وہ بے نیازی آنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "تم خوشخبری مجھے پہلے سُنا دو اس کے قابل بعد میں ہو جاؤں گا۔"

"اس قسم کے احمقانہ وعدوں پر تو خوشخبریاں نہیں سُنائی جاتیں لیکن میں تم پر ترس کھا کر یہ خوشخبری سُنا رہا ہوں۔" میں نے بڑی کشمکش کے بعد دل ہی دل میں اس فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "دراصل خوشخبری کیا..... بس ایک قسم کی ٹپ ہے۔ خوشخبری کے بارے میں ایک ٹپ ہے۔ کسی مقام پر ایک بہت بڑی خوشخبری تمہارا انتظار کر رہی ہے اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم کب اس تک پہنچتے ہو۔"

"الفریڈ ہچکاک بننے اور زیادہ سسپنس پیدا کرنے کی کوشش مت کرو۔" وہ بیزاری ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ کچھ بھی کہنا ہے اپنے مخصوص بے ہودہ انداز میں یکدم کہہ ڈالو۔

"اگر مجھ پر بے جا تنقید کا سلسلہ جاری رکھو گے تو میں خوشخبری کے بارے میں ٹپ دینے کا ارادہ ملتوی بھی کر سکتا ہوں۔" میں نے دھمکی دی۔

وہ اچانک ہی اُٹھتے ہوئے بولا۔ "میں خوشخبری سُننے کا ارادہ ملتوی کر سکتا ہوں۔ تم جیسے کم ظرف آدمی سے کیا خوشخبری سُننا جو ذرا سی بات بھی اس طرح ترسا ترسا کر سناتا ہو۔ میں جا رہا ہوں۔ ویسے بھی میں تمہارے ساتھ کافی مغزماری کر چکا ہوں۔"

"تم تو کسی حساس دوشیزہ کی طرح بُرا مان گئے۔ بیٹھو..... اب تم اتنی آسانی سے تو نہیں جا سکتے...... اور ہاں...... اتنی بڑی غلط بیانی مت کرو کہ تم نے میرے ساتھ مغزماری کی ہے۔ مغزماری کا دعویٰ صرف وہ کر سکتا ہے جس کے پاس مغز موجود ہو۔"

وہ بادل ناخواستہ بیٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔ "تم نے وہ فلم دیکھی تھی..... "حسینہ مان جائے گی"" میں تو خیر اس وقت چھوٹا تھا جب یہ ریلیز ہوئی تھی لیکن تم تو اس وقت بھی تیس چالیس کے ہو گے......"

"میں تو خیر اس وقت فوت ہو چکا تھا اور تم شاید پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔" اس نے جل کر گویا تصحیح کی۔ "اتنی کسرِ نفسی سے کیوں کام لے رہے ہو؟"

"میں نے سوچا کہیں تم بُرا نہ منا جاؤ۔"

"نہیں..... میں تو بالکل بُرا نہیں مناتا۔ تم چاہو تو میرے سامنے فیڈر یا چوسنی بھی منہ میں لے کر بیٹھ سکتے ہو..... اور جہاں تک فلم کا تعلق ہے تو مجھے یاد نہیں کہ اس نام کی بھی کوئی فلم بنی تھی۔"

"فلموں کے بارے میں تمہاری معلومات بہت کم ہیں..... بلکہ زندگی کے زیادہ تر معاملات میں تمہاری معلومات کمزور ہی ہیں۔ اس فلم کا نام تو میں نے یونہی ایک استعارے کے طور لیا تھا۔ یہ فلم کا نام نہیں، یوں سمجھو تمہاری زندگی کا خلاصہ تھا، ایک اُمید تھی جس کے گرد تمہاری زندگی گھوم رہی تھی لیکن اب تمہاری اُداس جوانی کو منزل مل جائے گی۔ تمہاری ویران اور کسی اُجڑی ہوئی چراگاہ جیسی بے کیف زندگی میں بہار آ جائے گی۔"

وہ ایک لمحے کچھ اس طرح میری طرف دیکھتا رہا کہ جیسے میرا دماغ چل گیا ہو۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "عام حالات میں بھی تم جیسے مخبوط الحواس کی باتوں کو سمجھنا کار دارد ہوتا ہے لیکن اس وقت تو شاید تم پر بالکل ہی ہذیانی کیفیت طاری ہے۔"

"جب بھی کسی ذہنی معذور کو کوئی شخص عقل کی بات بتانے کی کوشش کرتا ہے تو اسے یہی محسوس ہوتا جیسے سامنے والے پر ہذیانی کیفیت طاری ہے۔" میں نے گویا اس پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔ "میں اصل میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اب تمہاری زندگی میں جو فلم چلنے والی ہے اس کا نام ہو گا "حسینہ مان گئی ہے" یوں سمجھ لو اب اس پُرانی فلم کا پارٹ ٹو...... یعنی حصہ دوم شروع ہو رہا ہے۔"

وہ اب بھی اُلجھن آمیز نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے دانت پیس کر کہا۔ "یار! تم تو بالکل ہی کھاڑ ہو۔ خیر اس میں حیرت کی بھی کوئی بات نہیں ہے۔ ظاہر ہے کھاڑ ہو تبھی پولیس میں ہو۔ اچھا یہ بتاؤ...... تم زرتاج سے شادی کرنے کی خواہش میں مرے جا رہے تھے نا؟"

وہ یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اس کی تھکی تھکی آنکھوں میں چمک سی آ گئی۔ وہ جب بولا تو اس کا لہجہ ہی بدلا ہوا تھا۔ "یہ تم اتنی دیر سے مجھے زرتاج کے بارے میں اشارے دینے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جل کر کہا۔ "مگر اشارے کنایے، تم جیسے گدھوں کی سمجھ میں کہاں آتے ہیں۔ ڈائریکٹ نام لے کر بات کی تو کیسا بارہ ہزار وولٹ کا کرنٹ لگا۔"

"چغد کہیں کے.....! آج کل زمانہ ہی ڈائریکٹ بات کرنے کا ہے تمہاری طرح اُلٹی سیدھی پہیلیاں کون بجھواتا ہے۔ تم اتنی سیدھی سی بات سیدھی طرح مجھے نہیں بتا سکتے تھے؟" اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کے وجود میں گویا ایک نئی روح حلول کر گئی تھی۔ مگر پھر یکدم ہی وہ بجھ سا گیا اور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "مگر یہ بات مجھ سے پہلے تمہیں کیسے معلوم ہو گئی ہے۔ میں تو تقریباً ہر ہفتے ہی اس سے ملتا ہوں لیکن مجھے تو ایسا کوئی اندازہ نہیں ہوا کہ وہ مجھ سے شادی کے لیے تیار ہے۔"

"کیونکہ تمہارے دُم نہیں ہے اور تم چلتے بھی دو ٹانگوں پر ہو۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ تم اوّل درجے کے گدھے ہو۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "یہ کوئی پرانی خبر نہیں ہے جو میں تم تک پہنچا رہا ہوں۔ یہ آج کی تازہ خبر ہے۔ زرتاج نے بھی ظاہر ہے منہ پھاڑ کر تو مجھ سے یہ بات نہیں کہی تھی۔ یہ تو میں نے خود ہی اس کی باتوں سے اندازہ لگایا ہے کہ اگر آئندہ تم نے اس سے شادی کی درخواست کی تو وہ قبول کر لے گی۔ گویا میں تمہارے ساتھ دوسرے نکتۂ نظر سے بھی نیکی کر رہا ہوں۔ یعنی میں تمہیں خطرے سے خبردار کر رہا ہوں۔"

اس کے چہرے کی رونق بحال ہو گئی۔ اس نے پُراشتیاق لہجے میں تصدیق چاہی۔ "کیا واقعی زرتاج نے اس قسم کی کوئی بات کی تھی؟"

"بات نہیں کی تھی احمق! مانا کہ وہ آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی ہے، ماڈرن ہے، کردڑپتی ہے، ڈیفنس میں رہتی ہے لیکن اس کے وجود میں بہرحال ایک مشرقی روح مقید ہے۔ باتیں تو کچھ اور ہو رہی تھیں لیکن مجھے اس کی باتوں سے ایک مبہم سا اشارہ ملا ہے۔ اس لیے میں بھی تم سے اشارے میں ہی بات کر رہا تھا۔ میں نے اس سے وضاحت نہیں چاہی تھی لیکن میری سمجھ میں جو باتیں آئیں وہ میں نے تمہیں بتا دی ہیں اگر میں نے غلط مطلب اخذ کیا ہے اور اس کی وجہ سے غلط نتائج برآمد ہوئے تو اس کی خادم پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہو گی۔"

"کس خادم پر؟" اس نے معصومیت سے پوچھا۔

"بھئی اس خادم پر......" میں نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ "یعنی مجھ پر۔"

"اچھا.... اچھا....." اس نے سمجھداری سے سر ہلایا۔ "تم

خود اپنا ذکر کر رہے تھے۔ بڑی گھماؤ پھراؤ والی اردو میں اپنا ذکر کرتے ہو۔"

"اب تم شادی کی پُرانی مسترد شدہ درخواست نکالو اور جھاڑ پونچھ کر دوبارہ اس کی خدمت میں لے جاؤ۔ بہت زیادہ امکان نظر آرہا ہے کہ اس بار تمہاری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا جائے گا۔ کب ہمت کر رہے ہو؟"

"دوبارہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟" اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "میں نے تو آج تک ایک مرتبہ بھی اس سے شادی کی درخواست نہیں کی۔ اس موضوع پر تو سرے سے کبھی بات ہی نہیں ہوئی۔ بس میرا مدعا اس پر واضح تھا اور اس کا انکار مجھ پر ظاہر تھا۔ اب بات کرنے کی کوشش کروں گا۔ شاید اب بھی لفظوں میں بات نہ ہونے پائے۔ شاید اب بھی میں خاموشی ہی کی زبان میں بات کروں اور وہ خاموشی کی زبان میں ہاں کر دے۔"

"اور کوئی نو آموز افسانہ نگار اس پر "گونگی محبت" یا "عشق بے زباں" کے عنوان سے افسانہ لکھ ڈالے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں تمہیں ایک اور اہم بات بتاتا ہوں۔ آج رات ڈنر پر ہم چند افراد جمع ہو رہے ہیں۔ شفیع شاہ، ٹونی اور راحیلہ کے علاوہ زرتاج بھی ہوگی۔ میں میزبان ہوں۔ یونہی ذرا مل بیٹھنے کا بہانہ ہے۔ ویسے تو خیر یہ شرفا اور معززین کا چھوٹا سا اجتماع ہوگا.... لیکن ..... چلو خیر تمہیں بھی بُلا لیتے ہیں کیا یاد کرو گے۔ مروت اور وضع داری بھی کوئی چیز ہے۔"

اس نے ہونٹ بھینچ لیے لیکن میں نے گویا اس کی کیفیت سے بے خبر رہتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "اس ڈنر میں تم باتوں باتوں میں زرتاج کو ٹٹول کر دیکھو۔ واضح رہے کہ میں صرف باتوں باتوں میں ٹٹولنے کے لیے کہہ رہا ہوں، تمہارا ذہن کہیں ہاتھوں کی طرف نہ چلا جائے۔ بعد میں تم کہہ دو گے کہ مجھ سے سُننے میں غلطی ہوئی تھی....."

"بکواس مت کرو" وہ غصے سے بولا۔ "میں نہیں آرہا ہوں تمہارے ڈنر وزر میں.... میرے پاس تم جیسے فضول لوگوں کے پاس بیٹھنے کے لیے وقت نہیں ہے...."

"شاید اسی لیے ڈیڑھ گھنٹے سے بیٹھے ہوئے ہو۔" میں نے لقمہ دیا۔

"وہ تو میں سرکاری فرائض کی انجام دہی کے سلسلے میں بیٹھا ہوا ہوں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "ڈیوٹی کے سلسلے میں تو انسان کو گدھے کے ساتھ بھی بیٹھنا پڑتا ہے۔"

"ہاں ..... یہ بات تو ٹھیک ہے۔" میں نے اتفاق کیا۔ "لیکن تمہارے منہ سے اس جملے کی ترتیب غلط ہو گئی ہے۔ تمہیں تو یوں کہنا چاہیے کہ ڈیوٹی کے سلسلے میں گدھے کو بھی انسان کے ساتھ بیٹھنا پڑتا ہے اور یہ بہرحال گدھے کی لیے بڑا آزمائش کا کام ہے۔"

وہ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے تصدیق چاہی۔ "تو پھر تم ڈنر میں نہیں آرہے ہو؟"

"نہیں۔" وہ خفگی سے بولا۔ "مجھے ویسے بھی لوگوں کے سامنے اپنے نجی مسائل چھیڑنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ زرتاج سے میری ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔ اگر میں نے ضرورت محسوس کی تو موقع مناسب دیکھ کر بات کرلوں گا ورنہ جیسے میں کہہ چکا ہوں ... شاید خاموشی کی زبان میں ہی بات ہو جائے۔"

"اور کوئی نکاح خواں خاموشی کی زبان میں نکاح پڑھا دے۔ خاموشی ہی کی زبان میں ایجاب و قبول ہو جائیں۔ اس کے بعد تم میاں بیوی خاموشی سے زندگی گزارنا شروع کردو اور خاموشی ہی کی زبان میں ہر بات کیا کرو۔" میں نے ایک جھٹکے سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ "خدا کے لیے تم اپنی خاموشی کو اتنا طول مت دے دینا۔"

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟" وہ مسکرایا۔ "شادی کے بعد میاں بیوی خاموش کیسے رہ سکتے ہیں؟ زندگی اب اتنی آئیڈیل بھی نہیں ہو سکتی۔"

"شکر ہے تمہیں یہ بات معلوم ہے۔" میں نے گویا اطمینان کی سانس لی۔

"اب میں چلتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"میں نے تمہاری زندگی کی جتنی بڑی خوشخبری تمہیں سُنائی ہے اس کے بعد ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ تم اپنے خرچ پر میرے ہی ہوٹل میں دس بیس دوستوں کو مجھ سمیت عظیم الشان ڈنر دیتے لیکن تم اتنے سڑیل اور ناشکرے انسان ہو کہ اُلٹا میں تمہیں ڈنر دے رہا ہوں اور تم میری دعوت کو پائے حقارت سے ٹھکرا کر جا رہے ہو۔"

"یہ میں آج پہلی بار سُن رہا ہوں کہ دعوت کو بھی پائے حقارت سے ٹھکرایا جا سکتا ہے۔" وہ قدرے حیرت سے سرہلا کر بولا۔ "اور اس لفظ کو سُن کر نہ جانے کیوں مجھے سری پائے یاد آجاتے ہیں۔"

"پرانا کاروبار انسان کو کسی نہ کسی بہانے یاد آہی جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں..... یہ بات تو ہے۔" اس نے مجھے گھورتے ہوئے سنجیدگی سے اثبات میں سرہلایا۔ "اس سے پہلے کہ میرا تمہارے بھی سری پائے بنانے کو جی چاہے، میں چلا ہی جاؤں تو بہتر ہے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے سکون کی سانس لی۔ غنیمت ہی رہی تھی کہ وہ اپنے مفروضوں اور اندازوں پر زیادہ نہیں اڑا تھا۔ وہ دوست ضرور تھا لیکن مجھے معلوم تھا اس میں ایک آدھ ٹیڑھی رگ بھی موجود تھی۔ اگر اس پر قانون پسندی کا زیادہ ہی شدید دورہ پڑ جاتا تو وہ میرے لیے کوئی مشکل کھڑی کر سکتا تھا لیکن اچھا ہی ہوا تھا کہ بات صرف کھوکھلی دھمکیوں پر ٹل گئی تھی۔ میں نے احتیاطاً فوراً فون کر کے اپنے ایک آدمی کو بلایا اور اسے بتایا کہ میری گاڑی

اور کہاں میں کچھ چیزیں موجود تھیں۔ میں نے اسے تفصیلی ہدایات کے ساتھ سمجھایا کہ انہیں کہاں کہاں اور کس طرح ٹھکانے لگانا تھا۔

یہ کام ہو چکنے کے بعد مجھے کچھ اور اطمینان ہو گیا۔ اس رات ڈنر پر ہم پانچوں دوست پھر یکجا ہوئے اور حسبِ روایت چھیڑ چھاڑ اور جملے بازی چلتی رہی لیکن یہ سُن کر سبھی کو افسوس ہوا کہ اس مشن میں ہماری محنت ضائع ہی گئی تھی لیکن سب سے کم افسوس اور مایوسی خود مجھے تھی۔ دل ہی دل میں میرا یہ عزم کچھ اور پختہ ہو گیا تھا کہ اب تو مجھے ہر حال میں جمال سعیدی پر ہاتھ ڈالنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کوئی نہ کوئی سبیل نکل آئے گی۔ اب کم از کم یہ تو طے ہو چکا تھا کہ اس کی اصلیت کیا تھی۔ وہ کس طرح ہمارے ملک کی بنیادوں میں بارود بھر رہا تھا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس بات کی تصدیق ہونا زیادہ بڑا مسئلہ تھا۔ اس سے نمٹنا اب مجھے کچھ زیادہ سنگین مسئلہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ اس لیے اب میرا ذہن کافی حد تک ہلکا تھا اور میرے خوشگوار موڈ کی وجہ سے رفتہ رفتہ سبھی چہکنے لگے تھے۔ میں نے زرتاج کو یہ بھی بتا دیا کہ میں نے رحیم گل کو اس کے بارے میں اشارہ دے دیا تھا۔ جس پر وہ خفا بھی ہوئی اور اس نے مجھے چند خطابات سے نوازا لیکن مجھے معلوم تھا اس کی یہ خفگی مصنوعی تھی۔ ہماری محفل نہایت خوشگوار ماحول میں ختم ہوئی۔

اگلے تین چار دن میں ویسے تو کوئی زیادہ ہنگامہ خیز واقعہ پیش نہیں آیا لیکن ہر محاذ پر کسی نہ کسی حد تک پیش قدمی جاری رہی۔ میں کسی بھی طرف سے غافل نہیں تھا۔ میں نے بیکھانی کے بارے میں تمام ضروری معلومات جمع کر لی تھیں اور ان کی روشنی میں دوستوں کو بھی سمجھا دیا تھا کہ انہیں کس وقت کیا کرنا تھا اور میرے بیکھانی روانہ ہونے کے بعد ہمیں کس طرح آپس میں رابطہ رکھنا تھا اور کون سا سگنل ملنے پر کس کو کیا کرنا تھا۔ ہمارے پورے لائحہ عمل کا خاکہ سا بن چکا تھا۔ صرف جزئیات طے ہونا باقی تھیں وہ مجھے روانہ ہوتے وقت طے کرنی تھیں۔ میں کسی بھی روز روانہ ہونے کے لیے تیار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں وہاں جاؤں گا تو بہت سی اہم باتیں سامنے آئیں گی۔

میں صرف درّانی والے معاملے کی وجہ سے رُکا ہوا تھا۔ ایک تو میں نے اپنے گروپ آف کمپنیز کی طرف سے اس کے خلاف اختیارات کے ناجائز استعمال کی جو پٹیشن دائر کی ہوئی تھی وہ سماعت کے لیے منظور ہو گئی تھی اور تاریخ مل گئی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ کم از کم پہلی پیشی پر موجود رہ کر عدالت کے موڈ کا اندازہ کرلوں، اس کے بعد ہمارے وکیل اس معاملے سے نمٹتے رہیں۔ مجھے یقین تھا کہ درّانی اوّل تو عدالت میں پیش نہیں ہوگا۔ سرکاری وکیل اس قسم کے معاملات کو گھسیٹتے رہتے ہیں۔ سرکاری محکموں کو بے شمار تحفظات حاصل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود اکثر فیصلے ان کے خلاف ہو جاتے ہیں جس کی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ اکثر متعلقہ افسر اپنی فرعونیت کے زعم میں پیش نہیں ہوتے۔ ان کے وکیل عدم دلچسپی سے کیسوں کو ہینڈل کرتے ہیں۔ اکثر کیس بوگس اور کھوکھلے ہوتے ہیں۔ ان سب عوامل کی وجہ سے ان کی اکثر کارروائیاں کالعدم قرار پا جاتی ہیں۔ مجھے یقین تھا کہ درّانی نے اگر تمام تر دلچسپی کے ساتھ بھی قانونی کارروائی کے تقاضے پورے کیے اور اپنے محکمے کی طاقت بھی استعمال کی تب بھی وہ عدالت میں نہیں ٹک سکے گا۔ حد سے زیادہ بدعنوان شخص بہرحال اپنی کارروائیوں کے دفاع میں سینہ تان کر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب کہ اس کا سامنا کسی مضبوط حریف سے ہو جائے۔

دوسری طرف اخباروں میں اس کے خلاف مہم شروع ہو چکی تھی۔ اس کی عیاشیوں اور بیش قیمت جائیدادوں کے بارے میں دستاویزی ثبوتوں کے ساتھ ٹھوس قسم کی اسٹوریز سامنے آچکی تھیں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ انہی سے محکمے میں کافی کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس نے رپورٹروں اور اخباروں کو اس سلسلے میں دھمکانے اور ان ڈائریکٹ طریقوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کی تھی لیکن شفیع شاہ اس محاذ پر پوری طرح چوکس تھا۔ اس کی یہ کوششیں کامیاب نہیں ہو سکی تھیں۔

ادھر نفیس صاحب نے بھی اپنی ناپسندیدگی کے جذبات ان ڈائریکٹ طریقے سے ہی اس تک پہنچا دیے تھے۔ ان کا صرف اتنا کر دینا ہی کافی تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ سب سے زیادہ درانی کے پیروں تلے سے اسی وجہ سے زمین نکلی ہوگی۔ مجھے پتا چلا تھا کہ محکمے میں اس کے خلاف فضا تیار ہونے لگی تھی اور وہ بُری طرح بوکھلا چکا تھا۔ ہوٹل پر چھاپا مارتے وقت اور تمام کاغذات وغیرہ اٹھوا کر لے جاتے وقت شاید اس کے وہم گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس نے غلطی سے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا تھا۔ وہ یقیناً اب تک بڑی بڑی کاروباری شخصیتوں کو ایک ہی دھمکی سے تھر تھر کانپتا دیکھنے کا عادی تھا۔

قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اسے میرے بارے میں بہت سی اہم باتیں معلوم نہیں تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مجھے اپنا کاروبار اپنی جان، عزت اور انا سے زیادہ عزیز نہیں تھا۔ اس نے آج تک یہی دیکھا ہوگا کہ جس کا جتنا زیادہ بڑا کاروبار تھا اسے وہ اتنا ہی زیادہ عزیز تھا۔ بعض کو تو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ عزیز ہوتا ہے اور دولت سے چمٹے رہنا ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔ اپنی دولت اور کاروبار کو بچانے کے لیے وہ بڑی بڑی زیادتیاں بھی برداشت کر لیتے تھے۔ میرا معاملہ یہ نہیں تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو..... یا یوں کہیے کہ اپنی روح کو اس بات کی تربیت دی تھی اور اندر ہی اندر اپنے آپ کو ہمیشہ تیار رکھا تھا کہ اگر کبھی ہاتھ جھاڑ کر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھی الگ تھلگ کھڑے ہونا پڑ جائے تو دل و جان پر کوئی خاص صدمہ نہ گزرے۔ دولت چیز ہی

ایسی ہے۔ یہ انسان کے پاس جتنی زیادہ آتی ہے' اس کی اتنی ہی زیادہ محبت دل میں گھر کرتی چلی جاتی ہے۔ اس سے محروم ہونا' قطع تعلق کرنا اتنا ہی زیادہ دشوار..... بلکہ تقریباً ناممکن ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس قسم کے صدمے بعض لوگوں کی جان لے لیتے ہیں۔

میں نے اپنے آپ کو سمجھ لیا تھا کہ میں کاروبار کی دنیا میں بہرحال اب زیادہ بڑا نہ سہی' ایک چھوٹا موٹا ہاتھی تو ضرور تھا اور مثل مشہور ہے کہ مرا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ اگر مجھ پر بہت بُرا وقت بھی آجاتا' میرا تقریباً سب کچھ چھین جاتا تب بھی میں اس قابل تو رہ سکتا تھا کہ بغیر ہاتھ پاؤں مارے بھی باقی زندگی سفید پوشی اور عزت و آرام سے گزار سکتا تھا اور اگر تھوڑے سے ہاتھ پاؤں مار لیتا تو شاید از سرِنو بھی بہت کچھ کر سکتا تھا۔ انسان کو بھلا اور کیا چاہیے ہوتا ہے؟ اس سے زیادہ کی طلب تو ہوس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور ہوس کا کیا ہے..... ہوس تو ایک بیکراں دلدل ہے۔ اس میں قدم رکھنے کے بعد تو نکلنا کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ درّانی کو نہیں معلوم تھا کہ میری یہ بے نیازی اور بے خوفی بھی میرا بہت بڑا ہتھیار تھی۔ خود درّانی اس ہتھیار سے محروم تھا۔ اس نے تو اپنی دولت و املاک جائز ذرائع اور محنت سے بھی حاصل نہیں کی تھی' اس کے باوجود وہ یقیناً اس سے محرومی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے شاید یہ تصور ہی سوہانِ روح ہوتا۔ نفیس صاحب سے میری فون پر بات ہوئی تو انہوں نے تصدیق کی کہ درانی بوکھلا چکا تھا لیکن آدمی ضدی تھا۔ ایسا کوئی قدم مشکل سے ہی اٹھا سکتا تھا جس سے ظاہر ہوتا کہ اس نے اپنی غلطی پر شکست تسلیم کر لی ہے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ اس کے خلاف محکمہ جاتی کارروائی شروع کیے جانے پر غور ہو رہا تھا۔ اگر اس کی کرپشن کا اسکینڈل زیادہ پھیل جاتا تو وہ معطل بھی ہو سکتا تھا۔ سرکاری محکموں میں اس قسم کے کام بھی خاصی سست رفتاری سے ہوتے تھے لیکن درانی کے محکمے اور اس کی پوزیشن کو دیکھتے ہوئے نفیس صاحب کے خیال میں جو کچھ ہو رہا تھا وہ کافی تیز رفتاری سے ہو رہا تھا۔ درانی شاید اب عدالتی کارروائی شروع ہونے سے پہلے ہوٹل کے کاغذات واپس کرنے کا کوئی باعزت راستہ تلاش کر رہا تھا۔

ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ پرنس میرا کا قتل بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا جو درحقیقت ان سب واقعات کا نقطۂ آغاز تھا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ اس کے قاتل کو بھی درحقیقت مجھے ہی تلاش کرنا ہوگا۔ اس کی تصدیق کے لیے میں پرنس کے منگیتر صفدر منیر کے گھر جا کر اس سے ملاقات کرنا چاہتا تھا۔ ذاتی طور پر کسی کے گھر جا کر مشاہدہ کرنے سے بعض اوقات غیر متوقع طور پر بھی بہت سی باتوں کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

اس شام شاید میں اس کے ہاں جا چکا ہوتا لیکن کچھ دفتری مصروفیات میں اُلجھا رہنے کی وجہ سے نہ جا سکا۔ رات کو میں کھانا کھانے کے ارادے سے ڈائننگ ہال میں جا کر بیٹھا تو اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ارادہ باندھ رہا تھا کہ کل ضرور اس کے ہاں جاؤں گا۔ اچانک میں نے ایک ایسے شخص کو ڈائننگ ہال میں داخل ہوتے دیکھا کہ سارے پروگرام میرے ذہن سے نکل گئے اور میں غیر ارادی طور پر ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

وہ جمال سعیدی تھا جو مست ہاتھی کی طرح جھومتا ڈائننگ ہال میں گھس آیا تھا اور ایک جگہ رک کر میزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہیڈ ویٹر لپک کر اس کے پاس پہنچا تھا اور غالباً اس کی رہنمائی کے لیے اپنی خدمات پیش کر رہا تھا لیکن وہ اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ اس روز ہال میں کچھ رش نظر آرہا تھا۔ کوئی میز خالی نہیں تھی۔ میں خود ایک کونے میں صرف دو کرسیوں والی ایک میز پر بیٹھا تھا۔ اس قسم کی چھوٹی میزیں الگ ہی ایک دیوار کے ساتھ لگی ہوئی تھیں اور عام طور پر ان پر جوڑے آکر بیٹھتے تھے۔

میں اس وقت پانی کا گلاس اٹھانے لگا تھا جب میری نظر جمال سعیدی پر پڑی تھی اور میرا ہاتھ گلاس پر ہی ساکت رہ گیا تھا۔ وہ اس وقت خیمہ نما تھری پیس سوٹ میں تھا اور اپنے تمام تر موٹاپے کے باوجود بالکل تازہ دم دکھائی دے رہا تھا۔ چند دن پہلے کے واقعے کا کوئی اثر اس کی شخصیت پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ خونخوار سی شکل والے دو باریش گارڈ اس کے ساتھ تھے جن کے کندھوں پر کلاشنکوفیں موجود تھیں اور ان کے ہاتھ ان کے دستوں پر ہی ٹکے ہوئے تھے۔ وہ گہرے رنگوں کی ڈھیلی ڈھالی مگر نفیس شلوار قمیصوں میں تھے۔ سروں پر گرم ٹوپیاں تھیں۔ ان کی عقابی نظروں نے چند لمحے میں ہال کا جائزہ لے ڈالا تھا۔

کلاشنکوف برداروں کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے ہال میں موجود مہمانوں میں اضطراب کی سی لہر پیدا ہوئی۔ باتوں کی تیز بھنبھناہٹ اور برتنوں پر چھری کانٹوں کی کھنک ایک لمحے کے لیے کچھ مدھم پڑی مگر پھر جیسے سب کچھ معمول پر آگیا۔ سب پہلے ہی کی طرح اپنی اپنی باتوں اور کھانے پینے میں لگ گئے۔ اس وقت تک جمال سعیدی کی نظر مجھ پر پڑ چکی تھی۔ میں پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا ردِعمل کیا ہوگا۔

مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں پر ڈھلکے ہوئے پپوٹے کچھ اور اوپر اُٹھ گئے۔ موٹے موٹے' تربوز کی قاشوں جیسے سرخ ہونٹ کچھ پھیل گئے اور وہ اپنے مخصوص انداز میں ہلکورے سے لیتا ہوا میری طرف بڑھا۔ دونوں محافظ مستعدی سے اس کے دائیں بائیں چلے آرہے تھے۔ ان کی مضطرب عقابی نظریں گرد و پیش سے ذرا بھی غافل نہیں تھیں۔ میں نے جمال سعیدی کے گھر میں جتنے بھی محافظ دیکھے تھے' یہ دونوں مجھے ان سب سے زیادہ مستعد' تجربہ کار اور پھرتیلے معلوم ہوئے۔

میرے ہاتھ میز پر ہی ساکت تھے لیکن جمال سعیدی کے ہاتھ دوستانہ انداز میں پھیل چکے تھے اور میرے قریب پہنچنے تک وہ گویا مجھ سے بغل گیر ہونے کے لیے بے تاب نظر آنے لگا تھا۔ میں

[بظاہر خا]موش طور پر اطمینان کی سانس لی۔ اس کی آمد کا انداز قطعی [دوست]انہ تھا۔ مجھے بھی اپنی جگہ سے اٹھنا ہی پڑا۔ میں نے اسے [بہرحال] تو اپنے ساتھ بغل گیر ہونے کا موقع نہیں دیا لیکن دونوں [ہاتھ]وں سے نہایت مضبوطی سے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے مجھے [اس] کی تھل تھل کرتی توند سے تقریباً لگنا ہی پڑا جس کی تھرتھراہٹ [سے] اندازہ ہوا کہ وہ خوش دلی اور خاموشی سے ہنس رہا تھا۔ [جب] تک اس کی اس خاموش ہنسی کا سلسلہ تھما اور مصافحہ ختم ہوا تو وہ [میرے] کندھے پر اپنا جناتی سائز کا ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "آپ [سے] دوبارہ مل کر بڑی خوشی ہوئی افضل صاحب! بڑی اچھی بات ہے [ک]ہ آپ بھی یہاں ایک کونے میں گھسے بیٹھے ہیں۔ ہم یہاں کھانا کھانے آئے تھے لیکن یہاں تو کوئی میز ہی خالی نظر نہیں آرہی۔ اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ کا خود اپنے ہوٹل میں کم از کم اتنا اثر رسوخ تو ہوگا کہ ہم جیسے چھوٹے موٹے شناساؤں کو کوئی میز دلوا سکیں۔"

"ارے صاحب..... ! آج کل مالکوں کو کون پوچھتا ہے۔" [می]ں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "لیکن ہم جیسے غریبوں کے اس [بھٹی]ارخانے میں آپ جیسے معززین بھی روز روز نہیں آتے۔ اس [لی]ے میں اپنی سی کوشش کرتا ہوں۔"

اس بار وہ ذرا باآواز ہنسا۔ اس کی توند میں ایک بار پھر تلاطم برپا ہوا۔ "آپ کی انکساری کا جواب نہیں افضل صاحب! یہ وہ [خو]بی ہے جو آج کل کے لوگوں میں عنقا ہو چکی ہے۔" اس نے ایک [با]ر پھر محبت سے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ کوئی عام سا آدمی اس کی محبت کے اس اظہار پر بھی لڑکھڑا سکتا تھا۔

"میں ذرا پُرانے خیالات کا آدمی ہوں کچھ پُرانی قدروں کو سینے سے لگا کر رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" میں نے نہایت متانت سے مسکراتے ہوئے کہا اور ہیڈ ویٹر کو اشارہ کیا کہ ہمارے لیے میز کا بندوبست کرے۔ ایسے مواقع کے لیے عموماً چار چھ کرسیوں والی ایک آدھ میز "ریزورڈ" کی تختی لگا کر روک کر رکھی جاتی ہے۔ یہ تختی یوں تو کئی میزوں پر ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بیشتر سچ مچ ریزورڈ ہوتی ہیں لیکن ایک آدھ اس لیے بھی روک کر رکھی جاتی ہیں کہ اگر کوئی بہت ہی اہم شخصیت آن پہنچے جسے ریزرویشن کے بغیر بھی ٹھہرانا ناگزیر ہو تو کام آسکے۔ جمال سعیدی اس قسم کی شخصیت ہرگز نہیں تھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا میرے ساتھ بیٹھنے کا موڈ تھا۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے اس کا موقع دے دیا جائے۔

ہیڈ ویٹر نے مؤدبانہ انداز میں ہمیں ایک بڑی میز کی طرف چلنے کا اشارہ کیا لیکن جمال بولا۔ "ہمارا کام تو اس میز سے بھی چل جائے گا کیونکہ میرے گارڈز کھانا نہیں کھائیں گے۔ یہ کھڑے رہیں گے۔"

"ارے..... جمال صاحب! یہاں آپ ہمارے مہمان ہیں۔ یہاں انہیں اتنا الرٹ رہنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اطمینان سے بیٹھ سکتے ہیں۔ کھانا کھا سکتے ہیں۔ یوں سمجھ لیجیے کہ آپ کی حفاظت ہماری ذمّے داری ہے البتہ اگر آپ کے کچھ اصول ہیں' پروٹوکول وغیرہ کا مسئلہ ہے تو پھر ٹھیک ہے..... لیکن بیٹھنا آپ کو بڑی میز پر ہی پڑے گا۔ یہ میز آپ کے شایانِ شان نہیں ہے۔" میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ یہ میز آپ کی جسامت سے مناسبت نہیں رکھتی..... لیکن میں نے نہیں کہا۔ میں اور بھی بہت کچھ کہنا چاہتا تھا جو میں نے نہیں کہا۔ وہ بھی یقیناً کہنا کچھ اور چاہتا تھا لیکن کہہ کچھ اور رہا تھا۔ ہم دونوں اس وقت ماڈرن دور کی دوستیوں اور دشمنیوں کے منافقت بھرے ڈراموں کے دو کردار تھے۔ میں تو یونہی ذرا لطف اندوز ہونے کے لیے اس کردار میں الجھ گیا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کی مصلحت اور مقاصد کیا تھے؟

میں اس کا ہاتھ پکڑ کر بڑی میز کی طرف لے چلا۔ اس نے کہا۔ "میں یہ کہنے کی جسارت تو نہیں کر سکتا کہ آپ کسی کی حفاظت کرنے کے اہل نہیں ہیں لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ میں نے اپنی حفاظت کے سلسلے میں کبھی اپنے مہمانوں' میزبانوں یا خیر خواہوں کو تکلیف نہیں دی۔ یہ میرے اصولوں کے خلاف ہے۔"

"چلیے جناب! آپ اپنے اصولوں پر عمل کرتے رہیے۔" میں نے اسے بٹھانے کے بعد خود بھی بیٹھتے ہوئے گہری سانس لے کر کہا۔ "ہم آپ کی جو خدمت کر سکتے ہیں' وہی سہی..... اس وقت کھانا ہماری طرف سے ہے۔ آپ اس وقت صرف لفظی طور پر نہیں' سچ مچ ہمارے مہمان ہیں۔"

وہ ایک بار پھر خوشدلی سے ہنسا۔ "سوچ لیجیے افضل صاحب! میں بہت پیٹو آدمی ہوں..... اور دعوت قبول کرنے میں' میں ذرا بھی تکلف نہیں کرتا۔ آپ نے تو ہمارے ہاں کھانے پینے کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا تھا لیکن میں ایسا موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔"

"میں اس وقت ذرا تکلف میں آگیا تھا۔ اب آؤں گا تو تکلف نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔ "پیٹو تو میں بھی کچھ کم نہیں ہوں لیکن پھر بھی..... ہم جیسے دو آدمی مل کر بھی آخر کتنا کھا جائیں گے۔ اس ہوٹل میں بڑا ذخیرہ ہے..... اور سپلائی کا ایک باقاعدہ نظام بھی ہے۔ ہم چاہیں تو یہیں بیٹھے مرتے دم تک کھاتے رہیں۔"

"واہ..... کیا خوبصورت تصور ہے.....!" اس نے گویا کسی شعر پر داد دی۔ "انسان مرتے دم تک کھاتا رہے..... یا یوں کہنا چاہیے کہ کھاتے کھاتے مرجائے۔ میری نظر میں یہ ایک خوبصورت موت ہوگی۔"

"نہیں..... میں اس حد تک پیٹ پرست ہونا پسند نہیں کروں گا۔" میں نے کہا۔

"آپ کے حق میں یہی بہتر ہے۔ ورنہ آپ بھی میرے جیسے ہو جائیں گے۔" وہ ہنسا' پھر اس نے مینیو اٹھا کر آرڈر لکھوانا شروع کیا۔ میں نے اپنی پسند کی ایک آدھ چیز اس میں شامل کی۔ میں نے دیکھا اس دوران میں اس کے دونوں گارڈز کچھ اس طرح کینہ توز

سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے مجھ سے ان کی کوئی پرانی دشمنی چلی آرہی ہو۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا جمال نے انہیں میرے بارے میں کچھ بتا رکھا تھا؟ تاہم جونہی میں نے سرسری سے انداز میں ان کی طرف دیکھا' انہوں نے نظر چرالی اور ہال کا جائزہ لینے لگے۔ وہ جمال سعیدی کے دائیں بائیں مستعد کھڑے تھے۔

ہیڈ ویٹر جاچکا تو جمال سعیدی دونوں بازو میز پر ٹکاتے ہوئے رسمی انداز میں بولا۔ "اور سُنائیے کیسی گزر رہی ہے؟ کاروبار کیسا جا رہا ہے؟"

"بہت اچھی گذر رہی ہے۔ کاروبار بھی بہت اچھا جا رہا ہے۔" میں نے بھی رسمی انداز میں جواب دیا۔

"لیکن پچھلے دنوں ہم پہ کچھ اچھی نہیں گزری۔" وہ گہری سانس لے کر بولا۔

"کیوں ...... کیا ہوا؟" میں نے معصوم بنتے ہوئے مصنوعی تشویش سے پوچھا۔

"کمال ہے ......!" اس نے حیرت کا اظہار کیا۔ "کیا آپ کو معلوم نہیں؟ یہ واقعہ تو اخبارات میں بھی آیا تھا..... اور میرا خیال تھا کہ آپ کو تو اخبارات میں پڑھے بغیر بھی معلوم ہو گا۔"

"وہ کیسے؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"اس لیے کہ آپ تو بہت باخبر آدمی ہیں۔ گردوپیش کی بہت خبر رکھتے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"بہت غلط خبر دی ہے کسی نے آپ کو۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "میں ہر بات کی تو خبر نہیں رکھتا۔ میں صرف اپنی دلچسپی کے معاملات کی خبر رکھتا ہوں۔ اخبارات بھی زیادہ توجہ یا تفصیل سے نہیں پڑھتا۔ آپ اب اتنا سسپنس پیدا نہ کریں۔ خود ہی بتا دیں آخر ہوا کیا؟"

"بس ..... جو کچھ بھی ہوا بہت بُرا ہوا....." اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر بہت دھیمے اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں وہ واقعہ سنانا شروع کیا جس کے ذمّے دار ہم ہی تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ زیادہ تفصیل میں نہیں جا رہا تھا۔ اختصار سے بات کر رہا تھا اور اس دوران میں اس کی نظر مسلسل میرے چہرے پر تھیں۔ سچویشن کے مطابق اس وقت ڈرامے میں میرا جو بھی کردار بنتا تھا' میں نے اسے حتی الامکان عمدگی سے ادا کرنے کی کوشش کی۔ کسی بات پر میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں' کسی پر تاسف اور ہمدردی کا اظہار کیا' بیچ بیچ میں استعجابیہ لہجے میں کوئی سوال کیا۔

وہ خاموش ہوا تو میں نے نہایت افسوس اور ہمدردی سے کہا۔ "یہ تو بہت بُرا ہوا جمال صاحب! آخر وہ کون لوگ ہو سکتے تھے؟"

وہ مسکرایا۔ "بہت اچھا اور معصوم سا سوال ہے افضل صاحب! اگر مجھے معلوم ہو تا کہ وہ کون لوگ تھے تو شاید اس وقت وہ دنیا میں نہ ہوتے....."

میں نے غیر محسوس سے انداز میں قدرے اطمینان کی سانس لی کہ شاید وہ ہمارے ڈرامے کو بالکل بھی سمجھ نہیں پایا تھا اور قطعی بے خبر تھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے گویا خود ہی اپنی بات کی تردید کی۔ "لیکن نہیں..... شاید میں غلط کہہ رہا ہوں....." وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "اس دنیا میں دشمن تو ہمارے بہت سے ہیں اور بعض اوقات ہمیں اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ کون سی حرکت کس دشمن کی ہے لیکن ہم انجان بن جاتے ہیں۔ ہم اسے ڈھیل دیتے ہیں۔ ہم کبھی اپنے وقت پر' ایسے موقع پر اور ایسے انداز میں جا کر اسے مارتے ہیں کہ اسے حیران ہونے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔ اس وقت غلطی اس کے وہم گمان میں بھی نہیں ہوتا۔"

"اوہ ....!" میں نے صرف تھوڑی سی آنکھیں پھیلانے پر اکتفا کیا۔

"یہ بات تو طے ہے کہ انہوں نے حلیے بدلے ہوئے تھے۔" اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "کیونکہ جو کچھ انہوں نے کیا وہ ان کے حلیوں سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ بہرحال..... زندگی میں یہ سب کچھ تو چلتا ہی رہتا ہے۔" اس نے بے پروائی سے اپنے بھاری بھرکم کاندھے اچکائے۔

اس نے گویا بات ختم کر دی تھی۔ میں نے اس پر مزید کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کی بھی اس موضوع سے دلچسپی یکدم گویا کافور ہو گئی۔ اور وہ ہال میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد کھانے کے ابتدائی مرحلے کی چیزیں یعنی سوپ وغیرہ آ گئے اور ہم بظاہر ان سے لطف اندوز ہونے لگے۔

اچانک وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولا۔ "آپ کی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں افضل صاحب!"

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ یہ بات آپ کے بجائے کسی خوبصورت سی لڑکی نے کہی ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔"

"بہت خوب..... بہت خوب!" اس نے میز پر ہاتھ مار کر کراکری کو جھنجھناتے ہوئے ایک گونجیلا سا قہقہہ لگایا۔ "بات تو آپ نے واقعی ٹھیک کہی ہے۔ مجھ جیسے ہاتھی کے بچے کے منہ سے اس قسم کی تعریف سن کر بھلا کسے خوشی ہو سکتی ہے۔"

"کسی خاتون کو ہو سکتی ہے۔" میں نے اس کا دل رکھنے کے لیے جلدی سے کہا۔

"نہیں ..... نہیں اسے بھی نہیں ہوگی۔" اس نے ہاتھ ہلا کر گویا اس خیال کو مسترد کر دیا۔ "لیکن آپ کو ہونی چاہیے افضل صاحب! اس لیے کہ خوبصورت لڑکیاں تو آئے دن ہی آپ کی آنکھوں ..... بلکہ اور بھی بہت سی چیزوں کی تعریف کرتی ہوں گی لیکن ہم جیسا تعریف کرنے والا کبھی کبھی ہی ملتا ہے۔"

"ہاں..... یہ بات تو ہے۔" میں نے تسلیم کر لیا۔

"دراصل آنکھوں کا تذکرہ اس لئے نکل آیا کہ مجھے ایک بار پھر اپنے گھر میں گھسنے والے دشمنوں کا خیال آگیا تھا۔" وہ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ "انہوں نے حلیے بدلے ہوئے تھے۔ لیکن نہ جانے کس طرح کے بعض لوگ حلیے تبدیل کرتے وقت زیادہ باریکیوں میں نہیں جاتے۔ آنکھوں کو اکثر بھول جاتے ہیں حالانکہ اب تو آنکھوں کو یکسر تبدیل کرنا بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں رہا۔ بھوؤں کو گھنا کر لیا جاتا ہے اور کانٹیکٹ لینس کے ذریعے آنکھوں کا رنگ بھی چھپا لیا جاتا ہے اور اگر مار دھاڑ ہونے اور اس میں چشمہ گر جانے کا اندیشہ نہ ہو تو تاریک چشمہ اس مسئلے کا سب سے آسان حل ہے اسی لیے تاریک چشمہ جرائم پیشہ لوگوں میں بہت مقبول ہے....."

وہ بڑے سرسری سے انداز میں بات کر رہا تھا جیسے محض وقت گزاری کے دوران میں کسی دوست یا شناسا کی معلومات میں تھوڑا سا اضافہ کر رہا ہو۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اگر اس موقع پر میں اس سے نظر چرانے کی کوشش کرتا تو یہ اور بھی غلط حرکت ہوتی لیکن وہ میری طرف دیکھنے کے بجائے اپنے سوپ کے پیالے کی طرف متوجہ ہو چکا تھا اور شغل کے انداز میں سوپ کا چمچہ بھر کر سر جھکائے چسکیاں لے رہا تھا۔

میں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ جب ہم اس کے ہاں گئے تھے تو میک اپ مین نے ہماری آنکھوں میں کچھ تبدیلیاں کی تھیں یا نہیں؟ مجھے یاد پڑتا تھا کہ راحیلہ ٹونی اور شفیع شاہ کی آنکھوں اور بالوں کے رنگ تبدیل کیے گئے تھے کیونکہ ان تینوں کی آنکھیں بلوری اور بال بھورے یا ہلکے رنگ کے تھے۔ گو کہ تینوں کے بالوں اور آنکھوں کا رنگ ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ لیکن وہ شیڈز بہرحال اتنے عام نہیں تھے اور ان کا جو حلیہ بنایا جا رہا تھا' اس سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں رکھتے تھے اس لیے انہیں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ اس میں خاصی محنت اور وقت صرف ہوا تھا لیکن میری اور زرتاج کی آنکھیں اور بال سیاہ تھے جو بہت زیادہ لوگوں کے ہوتے ہیں اور ہمارے حلیوں کے ساتھ بھی غیر موزوں معلوم نہ ہوتے اس لیے انہیں زیادہ نہیں چھیڑا گیا تھا۔ صرف ان کی نفاست ختم کی گئی تھی۔

میں یہ اندازہ بھی لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ جمال واقعی کچھ بھانپ چکا تھا یا محض شوشا چھوڑ کر مجھے اور میرے توسط سے میرے ساتھیوں کو نفسیاتی الجھن میں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا؟ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ امکان دونوں ہی باتوں کا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال پُرسکون رہتے ہوئے 'انتظار کرو اور دیکھو' کی پالیسی اپنانی چاہیے۔ شاید وقت خود ہی بہت سے سوالوں کے جواب فراہم کر دے۔ میں نے بھی بظاہر سرسری سے انداز میں کہا۔ "اس کا مطلب ہے اگر آپ دوبارہ ان لوگوں کو کسی بھی حلیے میں دیکھیں گے تو پہچان لیں گے؟"

"یقیناً" وہ سر اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بے ساختہ بولا لیکن پھر گویا مصلحت نے اسے اس بیان میں تبدیلی پر مجبور کر دیا۔ "شاید میں کچھ زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو رہا ہوں۔ مجھے 'یقیناً' نہیں بلکہ 'شاید' کہنا چاہیے۔"

میں نے گہری سانس لے کر اپنے سوپ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ارے صاحب! آپ مرضی کے مالک ہیں جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔ ویسے ..... بائی دا وے ..... آپ ایسے کون سے کام کرتے ہیں جو آپ کے اتنے دشمن ہیں؟"

وہ گویا میرے سوال سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کوشش کر رہا تھا کہ اس کے خیال میں' میں نے سوال مذاق میں کیا تھا۔ "جناب! ان باتوں کا تو آپ کو مجھ سے زیادہ علم ہونا چاہیے۔ اِدھر آدمی کے پاس چار پیسے آئے..... اِدھر وہ سوسائٹی میں ذرا نمایاں ہوا' اِدھر اس کے بیسیوں دشمن پیدا ہو گئے۔ آپ کے دشمن نہیں ہیں کیا؟"

"میں تو خود دشمن بناتا ہوں نا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "میں تو لوگوں کو پکڑ پکڑ کے ..... ان کے بلوں سے..... میرا مطلب ہے ان کے گھروں سے کھینچ کھینچ کے باہر لاتا ہوں اور انہیں دشمنی پر آمادہ کرتا ہوں۔ یہ میرا مشغلہ ہے بلکہ یوں کہیئے مجھے یہ بیماری لاحق ہے لیکن میری یہ دشمنی بد فطرت' خبیث' جرائم پیشہ اور ملک یا معاشرے کی جڑیں کھوکھلی کرنے والے لوگوں سے ہوتی ہے۔ اچھے لوگوں کا میں بہت بڑا قدر داں ہوں۔"

"شاید لوگوں کی نظروں میں آپ خود اچھے نہ ہوں افضل صاحب!" وہ مسکراتے ہوئے بڑی ملائمت سے بولا۔

"ہاں ..... اگر ہر فرد یا گروہ اچھائی اور برائی کے اپنے الگ پیمانے بنا لے گا اور ان سے ہر ایک کو ناپے گا پھر تو نہ جانے کون کون' کس کس کو گردن زدنی قرار دے دے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اب تو بہت زیادہ ڈھٹائی کا دور آگیا ہے۔ اب تو خبیث قسم کے مجرم کی نظر میں دیانتدار پولیس آفیسر برا آدمی ہے' رند بلانوش کی نظر میں واعظ بہت برا آدمی ہے۔ ڈاکو کی نظر میں چوکیدار بہت برا آدمی ہے اور درندہ صفت لوگوں کی نظر میں وہ بہت برے ہیں جو انہیں ان کی درندگی کے مظاہروں سے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ ان سب لوگوں کے بکواس کرنے سے اچھائی اور برائی کے اصل پیمانے بدل تو نہیں جائیں گے۔ ان کے بنائے ہوئے معیار تو دنیا میں رائج نہیں ہو جائیں گے۔"

"بہت خوب..... بہت خوب" جمال سعیدی نے چمچہ رکھ کر اپنے موٹے موٹے ہاتھوں سے خاموش تالی بجانے کا اشارہ کیا۔ "آپ کو تو سیاسی لیڈر ہونا چاہیے تھا افضل صاحب!"

"خدا نہ کرے!" میں نے جلدی سے کہا۔ "آپ مجھے بددعا تو نہ دیں۔"

"آپ اسے بد دعا سمجھتے ہیں؟" وہ حیرت سے بولا۔ "کیا آپ نے واقعی کبھی سیاست کی طرف آنے کا نہیں سوچا؟"

"نہیں' خدا نے مجھے اس طاعون سے محفوظ رکھا ہے۔" میں نے متشکرانہ لہجے میں کہا۔ "یہ سیاست ہی تو ہے جس کی وجہ سے آج انسانیت اپنا دریدہ بدن اور تار تار پیرہن لیے خاک بہ سر پھر رہی ہے۔ خصوصاً ہمارے خطے میں..... کیونکہ ہم نے سیاست کو سیاست نہیں رہنے دیا' اسے خباثت بنا دیا۔ ہم نے اس کے معانی ہی تبدیل کر دیے۔ اب کوئی ہمارے ساتھ بد معاشی' چالاکی' منافقت یا دھوکے بازی کر جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں' وہ میرے ساتھ بڑی سیاست کر گیا۔"

وہ اب اپنی نیم وا آنکھوں میں ایک نیا انہماک لیے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے موٹے موٹے سُرخ ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی جیسے وہ میری باتوں سے لطف اندوز بھی ہو رہا ہو لیکن میرے بارے میں پہلے سے زیادہ الجھن میں بھی پڑ گیا ہو۔

"آپ بہت خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہیں افضل صاحب!" آخر وہ بولا۔ بظاہر اس نے گویا یہ بات مذاق میں کہی تھی۔

"وہ تو میں ہوں۔" میں نے بھی بظاہر گویا مذاق میں ہی اعتراف کیا۔ اس اثنا میں کھانا آگیا اور کھانا لانے والے ویٹر کے پیچھے پیچھے راحیلہ بھی چلی آئی۔ وہ قریب پہنچنے سے پہلے ہی چہکی۔ "میں تمہارے آفس میں جھانک کر آرہی ہوں۔ میں فوراً سمجھ گئی تھی کہ تم یہاں ہوں گے۔ جہاں کھانا..... وہاں افضل۔"

جمال سعیدی کی اس کی طرف پشت تھی لیکن وہ ایسی غیر معمولی جسامت کا آدمی تھا کہ اگر راحیلہ نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ دی ہوتی تو عقب سے دیکھ کر بھی اسے پہچان لیا ہوتا مگر وہ اپنی دُھن میں چلی آرہی تھی البتہ قریب آکر اس نے اچانک جمال کا چہرہ دیکھا۔ میں دل ہی دل میں اس کی حاضر دماغی کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ذرا بھی نہیں چونکی اور نہ ہی اس نے ذرا سی بھی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کا طرزِ عمل بالکل ایسا ہی رہا جیسے اس کے خیال میں میرے ساتھ کوئی نامعلوم مہمان بیٹھا تھا۔

جمال کے گارڈز راحیلہ کو قریب آتے دیکھ کر کچھ زیادہ چوکنا ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھ گنوں پر کچھ اس طرح جم گئے تھے جیسے پلک جھپکتے میں وہ انہیں کندھوں سے اتار لیں گے حالانکہ صاف نظر آرہا تھا کہ راحیلہ بالکل خالی ہاتھ تھی اور عام حالات میں کسی گڑیا کی طرح بے ضرر نظر آتی تھی۔ اس کے باوجود اسے تیزی سے آتے دیکھ کر دونوں گارڈز ضرورت سے زیادہ مستعد ہو گئے تھے۔ وہ قریب آکر رُک چکی تو دونوں گارڈز کچھ یوں اس پر نظر جما کر کھڑے ہو گئے جیسے اسے گولیوں سے چھلنی کرنے کا کوئی بہانہ تلاش کر رہے ہوں۔ جمال کی سوالیہ نظر بھی اس پر جم کر رہ گئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے میں نے محسوس کیا کہ اس کی نظر سوالیہ نہیں تھی۔ وہ تو گہری نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں راحیلہ کو دو چار چھوٹے موٹے خطابات سے نوازا اور بہ زبان خاموشی ڈانٹا۔

"کیا تمہارا ابھی اسی وقت یہاں آنا ضروری تھا؟"

بظاہر میں نے ہونٹوں پر بڑی خوش خلق سی مسکراہٹ سجا کر جمال کو مخاطب کیا۔ "ان سے ملیے..... یہ میری دوست ہیں' کراچی اور لاہور میں ہمارے گروپ آف کمپنیز کی ریزیڈنٹ ڈائریکٹر ہیں۔"

"بہت خوب..... بہت خوب!" جمال نے زور زور سے اپنا بڑا سا سر ہلا کر گویا کسی اچھے شعر کی داد دی۔ اس نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ راحیلہ کو باقاعدہ تعظیم دینے کے لیے اپنی کرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور بڑی تہذیب و شائستگی سے اس نے سر خم کیا۔ جواباً راحیلہ نے بھی مصنوعی لیکن خوبصورت مسکراہٹ سے نوازا۔ جمال نے تو شاید مصافحے کے لیے بھی ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا لیکن راحیلہ دونوں ہاتھ پیچھے باندھے کھڑی تھی اور اس کا ہاتھ آگے لانے کا کوئی ارادہ نظر نہیں آتا تھا۔ شاید اس لیے جمال نے بھی ارادہ ترک کر دیا اور میری طرف دیکھ کر نہایت شیریں لہجے میں بولا۔ "اب نام بھی بتا دیجیے۔"

"راحیلہ" میں نے جواب دیا۔

"بہت خوب..... بہت خوب" جمال نے ایک بار پھر سر ہلایا اور انگریزی میں راحیلہ سے مخاطب ہوا۔ "بلاشبہ آپ ایک خوبصورت اور دلکش خاتون ہیں یہ بات یقیناً مجھ سے پہلے بھی بہت لوگوں نے آپ کو بتائی ہوگی۔"

راحیلہ جسے عام طور پر انکساری کا اظہار کرنے اور میری طرح خود استہزائی کی عادت تھی اس موقع پر ذرا بھی انکساری کا تکلف کیے بغیر بولی۔ "جی ہاں..... لیکن پہلی ملاقات میں اس سے پہلے کسی نے نہیں بتایا تھا۔" وہ بھی یکدم انگریزی پر آگئی تھی۔

"ہو سکتا ہے یہ ہماری پہلی ملاقات نہ ہو۔" جمال کا لہجہ اب بھی شیریں تھا۔ "میرا مطلب ہے..... بعض لوگوں سے مل کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آپ انہیں برسوں سے جانتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ یہ بات میں نے اسکول کے زمانے میں ایک زنانہ رسالے کے افسانے میں پڑھی تھی۔" راحیلہ بھی نہایت مشاش بشاش لہجے میں بولی۔ "بہرحال اس خوش کن گفتگو کا بہت شکریہ۔ آپ یقیناً خواتین میں بہت مقبول ہوں گے۔"

اس نے ایک ہلکا مگر گونجیلا سا قہقہہ لگایا۔ "مقبول ہوں تو نہیں..... لیکن مقبول ہونے کی کوششیں کرتا رہتا ہوں۔ اس سراپا کے ساتھ بھلا کوئی خواتین میں کیسے مقبول ہو سکتا ہے؟" اس نے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔ گفتگو ابھی انگریزی میں ہی جاری تھی۔

راحیلہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ "تم اکثر ادھورا ہی تعارف کراتے ہو۔ تم نے ان کا نام تو بتایا نہیں۔"

"اوہ..... سوری۔ یہ جمال سعیدی ہیں۔ شہر کے بہت بڑے بزنس مین۔" میں نے جلدی سے کہا۔ راحیلہ نے جمال کے نام سے کا واقفیت کا یہ اچھا ثبوت دیا تھا۔

"تشریف رکھیے..... تشریف رکھیے خاتون..... اور جناب

کھانا کھا کر ہماری عزت افزائی فرمائیے۔" جمال نے خود آگے بڑھ کر راحیلہ کے لیے کرسی کھسکائی۔

"شکریہ۔" راحیلہ بیٹھے بغیر بولی۔ "شاید آپ کی عزت افزائی کا پھر کوئی موقع نکل آئے۔ میں کھانا کھا چکی ہوں۔ میں تو یونہی گزرتی ہوئی اس طرف نکل آئی تھی۔ آپ گفتگو اور کھانا جاری رکھیے۔"

"آپ غالباً یہیں ٹھہری ہوئی ہیں؟" جمال نے چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خلیق مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔ وہ راحیلہ کے رویے سے قطعاً بددل نہیں ہوا تھا۔

"جی ہاں..... فی الحال تو یہیں ہوں لیکن شاید کل تک گھر منتقل ہو جاؤں۔ میرا اپنا ایک گھر بھی ہے یہاں۔" راحیلہ نے اپنی رہائش کے بارے میں ابہام پیدا کر کے اچھا ہی کیا تھا۔ اس سے پہلے جمال سعیدی اس سے اس کا ایڈریس معلوم کرنے کی کوشش کرتا' وہ چار انگلیاں ہلا کر خدا حافظ کہتے ہوئے رخصت ہو گئی۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈائننگ ہال سے غائب ہو چکی تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ جمال سعیدی کو ایسے خونخوار صورت گارڈز کے ساتھ میری میز پر بیٹھے دیکھ کر کھٹک گئی تھی۔ گو کہ بظاہر ہم نہایت خوشگوار اور مہذبانہ ماحول میں کھانا کھا رہے تھے لیکن راحیلہ یقیناً کوئی احتیاطی تدبیر کرنے گئی تھی۔

جمال سعیدی نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنی کرسی سنبھال کر کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اور انگریزی کی بجائے اردو کی پٹڑی پر آتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "عمدہ خاتون تھیں..... بہت عمدہ..... کافی دنوں بعد اس قبیل کی کسی خاتون سے ملنے کا اتفاق ہوا۔"

اس کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے نئے ماڈل کی کسی کار کی تعریف کر رہا ہو۔ میں نے کھانا کھاتے ہوئے خاموشی سے اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ چند لمحے بعد میں نے ڈائننگ ہال کے ایک کونے میں ٹیپو ٹونی کو موجود پایا۔ اس میز پر پہلے تین کاروباری سے افراد بڑے زور و شور سے بات چیت میں مصروف نظر آرہے تھے۔ اب ٹونی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ چائے یا کافی کا کپ لیے بیٹھا تھا اور بظاہر کسی کی بھی طرف نہیں دیکھ رہا تھا لیکن میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ہم پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ راحیلہ نے احتیاطی تدبیر کے طور اسے یہاں بھیج دیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ کاروباری افراد تو رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ شاہ نمودار ہو گیا۔ شاید وہ کہیں آس پاس ہی موجود تھا اور راحیلہ نے موبائل فون پر اس سے رابطہ کر کے اسے بُلا بھیجا تھا۔ یا ممکن تھا کہ اتفاقاً وہ خود ہی چلا آیا ہو اور راحیلہ نے اسے بھی یہاں بھیج دیا ہو۔ وہ کچھ زیادہ ہی احتیاط برت رہی تھی۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ خود بھی کہیں سے ڈائننگ ہال کی نگرانی کر رہی ہو۔ شاہ بھی ٹونی کے ساتھ چائے یا کافی نوشی میں شریک ہو گیا تھا۔ میں اور جمال سعیدی اب خاموشی سے کھانا کھا رہے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جمال کے پاس اب باتیں ختم ہو گئی تھیں۔ کبھی کبھی سر اٹھا کر وہ اِدھر اُدھر کا جائزہ لے لیتا تھا لیکن اسے یقیناً معلوم نہیں تھا کہ کسی میز سے اس کی نگرانی ہو رہی تھی۔ کھانے کے بعد جمال سعیدی نے نہایت اطمینان سے کافی کے تین مگ نوش کیے پھر ہوانا کا عمدہ سگار سُلگا کر اس کے کش لینے لگا۔ سگار اس نے مجھے بھی پیش کیا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ وہ نہایت مسرور' مطمئن اور مگن نظر آرہا تھا۔ اسے گویا کہیں جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ فرصت ہی فرصت تھی اور وہ کھانے' کافی اور سگار وغیرہ سے اچھی طرح لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی تھی' اس کا اندازہ اس کے چہرے سے لگانا قطعی ناممکن تھا۔

اس کے گارڈز بدستور مجسموں کی طرح اس کے دائیں بائیں استادہ تھے۔ لگتا تھا کہ وہ یوں ساکت کھڑے رہنے سے اکتائے یا تھکتے نہیں تھے۔ صرف ان کی آنکھیں حرکت کرتی تھیں۔ آخر کار جمال نے اپنے کنگ سائز سگار کا آخری کش لے کر اسے ایش ٹرے میں مسلا اور ویٹر کو بل لانے کا اشارہ کیا لیکن میں نے ویٹر کی طرف دیکھ کر نفی میں گردن ہلا دی۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

"بل نہیں آئے گا جمال صاحب!" میں نے کہا۔ "میں نے عرض کیا تھا نا کہ آج کی شام آپ ہمارے مہمان ہیں۔"

"واقعی.....؟" وہ کاہلی آمیز سے انداز میں مسکرایا۔ "آپ نے تو واقعی ہمیں اپنا نمک کھلا دیا۔"

"آج کے دور میں ان باتوں کی کون پروا کرتا ہے جمال صاحب! نمک حرامی بہت آسان ہو گئی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ کو بھلا اس کی کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟"

"کیوں نہیں آسکتی جناب!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "میں تو بڑا گناہ گار سا انسان ہوں۔ آپ کی طرح ریفارمر نہیں ہوں۔ مصلح قوم نہیں ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"وہ تو میں بھی نہیں ہوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ریفارمر اور مصلح قوم بننا تو بہت دور کی بات ہے۔ میں تو صرف انسان بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ابھی تو میں اس میں بھی کامیاب نہیں ہوا۔"

"آپ نے اپنے لئے کام ہی بڑا مشکل چُن لیا ہے افضل صاحب!" وہ میرے کندھے پر ہاتھ مار کر ہنسا۔ "اچھا..... خدا حافظ....." وہ ہاتھی کی طرح جھومتا جھامتا رخصت ہو گیا۔ اس نے تو پلٹ کر نہیں دیکھا لیکن اس کے خونخوار صورت گارڈز نے ڈائننگ ہال کے دروازے پر پہنچ کر یوں پلٹ کر دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ "تم سے پھر ملاقات ہوگی" میں نے مشفقانہ سے انداز میں ان کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا دیا۔ وہ جلدی سے گھوم کر دروازے سے نکل گئے۔

انہیں گئے ہوئے بہ مشکل ایک منٹ ہی ہوا ہو گا کہ راحیلہ دوبارہ ڈائننگ ہال میں نمودار ہوئی۔ وہ تیر کی طرح میری میز کی طرف آئی۔ اس کے پیچھے پیچھے ٹونی اور شفیع شاہ بھی آ گئے۔ وہ تینوں میرے آس پاس بیٹھ گئے۔

"بہت بے صبرے ہو تم لوگ....!" میں نے متاسفانہ انداز میں سر ہلایا۔ "ہوٹل سے ان کے نکلنے کا بھی انتظار نہیں کیا اور آ کر میرے سر پر سوار ہو گئے۔"

"چلے گئے ہیں وہ" راحیلہ نے اطلاع دی۔ "میں نے انہیں گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہوتے دیکھ لیا ہے۔ تبھی تو آئی ہوں۔"

"اور چونکہ یہ آ گئی ہیں اس لیے ہم بھی آ گئے ہیں۔" ٹونی نے گویا صفائی پیش کی۔

"ہو سکتا ہے ابھی ہال میں اس کا کوئی آدمی موجود ہو۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھے بغیر کہا۔

"اب اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ دفع کرو" راحیلہ ...بے پروائی سے بولی۔ "یہ بتاؤ یہ بلا کس طرح اور کس سلسلے میں نازل ہوئی تھی؟ یہ کس قسم کی ملاقات تھی؟ کیا باتیں ہو رہی تھیں؟"

وہ سب کچھ جاننے کے لئے بے تاب نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے شروع سے آخر تک اس ملاقات کا احوال سنا دیا۔ ساری باتیں دہرا دیں۔ تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر راحیلہ بولی۔ "خاصی منافقانہ سی ملاقات تھی۔ اس سے کوئی بات واضح نہیں ہوئی۔ یہ شبہ بھی ہوتا ہے کہ وہ اصل بات سمجھ چکا ہے اور یہ امکان بھی نظر آتا ہے کہ وہ بلف کر رہا ہے۔ شاید وہ کسی شکاری کی طرح رات کے سناٹے میں پتھر پھینک کر ردِ عمل دیکھنا چاہتا ہے۔"

"دونوں صورتوں میں ہمیں صرف ہوشیار ہی رہنا ہے۔ کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس وقت اس کا پتا صاف کر ہی دیا ہوتا تو بہتر رہتا۔" راحیلہ بولی۔ "اب یہ ہاتھی پہلے سے زیادہ بڑا خطرہ بن کر منڈلاتا رہے گا۔"

شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی لیکن میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ چند لمحے بعد راحیلہ سر جھٹک کر بولی۔ "بھاڑ میں گیا جمال سعیدی! تم کھانا کھلواؤ۔ یہ دو یتیم مسکین بچے بھی بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں۔" اس نے ٹونی اور شفیع شاہ کی طرف اشارہ کیا۔

"کس کے بچے؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"ظاہر ہے..... اپنے والدین کے...." اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کچھ دیر پہلے تو تم نے کہا تھا کہ تم کھانا کھا چکی ہو۔" میں نے اسے گھورا۔

"وضع داری بھی آخر کوئی چیز ہے۔ اب ہم اس موٹے کے سامنے تو بھوک سے بلبلا کر نہیں کہہ سکتے تھے کہ حضورِ والا! اللہ کے نام پر ہمیں کھانا کھلا دیجئے۔" راحیلہ منہ بنا کر بولی۔

ان تینوں نے اپنے لیے کھانا منگوایا اور میں سامنے بیٹھا انہیں کھاتے دیکھتا رہا۔ اسی اثنا میں ہیڈ ویٹر ایک لفافہ لے کر میرے پاس آیا اور بولا۔ "سر! یہ جی ایم صاحب نے بھجوایا ہے۔ کوریئر سروس سے آیا ہے۔ ارجنٹ ڈلیوری ہے۔"

اس طرح بے وقت کوریئر سروس اور ارجنٹ ڈلیوری کے عموماً اہم قسم کے کاروباری خطوط آتے تھے لیکن ایسا اتفاق کم ہی ہوتا تھا۔ زیادہ اہم باتیں تو فون پر ہوتی تھیں اور ہنگامی طور پر اگر کاغذات کی ضرورت بھی پڑتی تھی تو فیکس پر آ جاتے تھے بشرطیکہ اوریجنل کی شرط نہ ہوتی۔ میں نے لفافے کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو قطعی غیر کاروباری خط معلوم ہوا۔ وہ بالکل سادہ لفافہ تھا اور اس پر کمپیوٹر سے ٹائپ شدہ میرے نام و پتے کی چٹ کاٹ کر چپکائی گئی تھی۔ لفافے پر واپسی کا کوئی ایڈریس نہیں تھا۔ میں نے چند لمحے کے تذبذب کے بعد احتیاط سے اسے کھولا۔ اندر سے خاصا بڑا اور صاف ستھرا کاغذ برآمد ہوا جس پر کمپیوٹر سے ٹائپ شدہ حروف میں بغیر کسی القاب وغیرہ کے لکھا تھا۔

"کراچی کے قبرستان کس بُری طرح بھر گئے ہیں۔ کہیں پاؤں رکھنے کو بھی جگہ نہیں ہے۔ خصوصاً اچھے علاقوں کے قبرستانوں کا تو یہ حال ہے کہ وہاں مردہ تو کیا، مردے کی ایک انگلی بھی دفن نہیں کی جا سکتی..... اور تم ایک خوشحال آدمی ہو، ظاہر ہے کسی اچھے علاقے کے قبرستان میں ہی دفن ہونا پسند کرو گے۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ تمہیں ایک آدھ نہیں، پوری پانچ قبروں کی ضرورت پڑے گی۔ آخر تمہارے چار ساتھی بھی تو تمہارے ساتھ دفن ہوں گے۔ تم نے اس مسئلے کا کوئی حل سوچا ہے؟ خواہ کتنی ہی رقم خرچ ہو، خواہ کتنی ہی بڑی سفارش لگانی پڑے، تم ہر حال میں اپنی پسند کے کسی قبرستان میں پانچ قبروں کا بندوبست کر کے رکھو۔ انسان کو موت خواہ کتنی ہی ذلت سے آئے لیکن اس کی تجہیز و تدفین تو ذرا عزت و آبرو سے ہونی چاہئے۔ کیا خیال ہے؟"

خط کے آخر میں بھی کوئی نام نہیں تھا۔ اس قسم کے خط کے آخر میں نام کی توقع رکھی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اگر نام موجود بھی ہوتا تو یقیناً فرضی ہوتا۔ خط بھجواتے وقت کوریئر سروس کے فارم میں بھی اگر واپسی کا کوئی پتا لکھوایا گیا ہو گا تو یقیناً وہ فرضی ہوگا۔ اس سلسلے میں کسی قسم کی تفتیش بے کار تھی۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے خط کو دوبارہ پڑھا۔ ایک لمحے کے لئے میرے رگ و پے میں خون کی گردش ذرا سست پڑی لیکن پھر میں نے خود کو سنبھال لیا۔ میرے تینوں ساتھی کھانا کھاتے ہوئے پُر تجسس نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں مسکرایا۔

ایک لمحے کے لئے میں فیصلہ نہ کر پایا کہ مجھے خط ان کو دکھانا چاہئے یا نہیں؟ پھر میرے اندر سے کوئی آواز ابھری "میرے ساتھی! ان سے کچھ بھی چھپانا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے خط شفیع شاہ کی طرف بڑھایا تو راحیلہ اسے درمیان سے اچکتے ہوئے بولی "لیڈیز فرسٹ!"

"ہم 'لیڈیز' ہو....؟" شفیع شاہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا پھر سر جھٹک کر بولا۔ "اچھا ہوا بتا دیا، ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا۔"

"ورنہ اس سلسلے میں کچھ کرتے۔" میں نے لقمہ دیا۔ شفیع شاہ نے اندر ے جھینپتے ہوئے سے انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ راحیلہ نے ہونوں کو گھورا پھر خط پڑھنے لگی۔ ایک ہاتھ سے اس نے دھیرے برے کھانا کھانا جاری رکھا۔ دوسرے ہاتھ میں خط تھامے پڑھتی ی۔ خط پڑھ کر اس نے کسی تبصرے کے بغیر شفیع شاہ کی طرف مار دیا۔ اس نے بھی کم و بیش اسی انداز میں بغور خط پڑھا اور ٹونی طرف بڑھا دیا۔ خط پڑھ چکنے کے بعد بھی تینوں کے تاثرات میں لی تبدیلی نہ آئی لیکن چند لمحے ہم چاروں ہی خاموش رہے۔ وہ ال بدستور کھانا کھاتے رہے۔

آخر راحیلہ نے ہی یہ سکوت توڑا۔ "حیرت ہے! لوگ آج کل زمانے میں بھی ایسی ڈرامائی حرکتیں کرتے ہیں۔ کون ہو سکتا ہے خط لکھنے والا ماڈرن سلطانہ ڈاکو؟"

"جمال سعیدی۔" ٹونی نے بلا تامل کہا۔ شفیع شاہ نے کوئی ہو کرنے سے گریز کیا۔ وہ خاموش تھا اور کسی خیال میں الجھا ہوا۔

"نہیں۔" راحیلہ نے فوراً نفی میں سر ہلاتے ہوئے ٹونی کے ل کی تردید کر دی۔ "جمال سعیدی بہ نفسِ نفیس جا کر اپنا پیغام ر کرنے والا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے ڈرامائی لغات میں الجھنے کا عادی معلوم نہیں ہوتا۔"

میں خود کو بھی اس ضمن میں کوئی رائے دینے سے قاصر وس کر رہا تھا تاہم اپنے ساتھیوں کی سوالیہ نظروں کو محسوس تے ہوئے میں نے کہا۔ "وہ جمشید کریم بھی ہو سکتا ہے۔ اس پانچ آدمی ہمارے ہاتھوں مارے جا چکے تھے۔ وہ کرائے کے سے اور دہشت گرد سہی..... لیکن بہرحال ان کی خدمات جمشید یم نے حاصل کی تھیں۔ وہ ان سے جو کام لینا چاہتا تھا ہو نہیں سکا۔ پھر جمال سعیدی کے ہاں اس کا چھٹا اور اہم ترین آدمی احمد بھی مارا گیا۔ ہو سکتا ہے اس حملے کے بارے میں جمال سعیدی نے اس سے بات چیت کرتے ہوئے ہمارے متعلق شبہات کا اظہار کر دیا ہو اور اب وہ اپنے طور پر ہمارے بارے میں کوئی نئی منصوبہ بندی کر رہا ہو۔"

وہ تینوں چند لمحے خاموش رہے پھر راحیلہ بولی۔ "لیکن وہ دونوں ایک ہی تھالی کے چٹے بٹے ہیں۔ دونوں مل کر بھی کوئی لائحہ عمل تیار کر سکتے ہیں۔ مل کر قدم اٹھانے سے ان کی طاقت بھی بہت بڑھ جائے گی۔"

"اس صورت میں یہ بھی ممکن ہے کہ اس خط کے بھیجے جانے میں جمال سعیدی کی مرضی بھی شامل ہو۔" شفیع شاہ نے پہلی بار زبان کھولی۔ "اور شاید وہ اسی کے بارے میں ہمارے ردِ عمل کا جائزہ لینے یہاں آیا ہو۔" ٹونی بولا۔ "اگر یہ اس اتفاق سے نہ مل جاتے تو شاید وہ خود انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔ شاید اس کے اندازے کے مطابق خط باس کو مل چکا تھا لیکن درحقیقت وہ اس کے اندازے سے ذرا لیٹ ہو گیا۔ اس کی یہاں موجودگی محض اتفاق تو نہیں ہو سکتا۔ وہ یقیناً کچھ نہ کچھ سوچ کر آیا تھا۔"

"اس مفروضے میں بہت سے شاید ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "لیکن چونکہ فی الحال ہمارے پاس اس سے بہتر کوئی مفروضہ نہیں..... چنانچہ ہم اسی گزارے لائق مفروضے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔"

"اب کرنا کیا ہے؟" ٹونی نے جاننا چاہا۔

"کچھ بھی نہیں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ "ظاہر ہے اس قسم کے خطوں کا جواب تو نہیں دیا جا سکتا۔ یہ اندھیرے میں تیر چلانے سے بھی زیادہ احمقانہ حرکت ہو گی۔ ہمیں صبر و سکون سے اس کے کسی عملی اقدام کا انتظار کرنا ہو گا جس نے یہ خط لکھا ہے۔ تم تینوں کو اب ہمیشہ سے بھی کچھ زیادہ ہوشیار اور مستعد رہنا ہو گا۔" پھر میں نے شفیع شاہ کو مخاطب کیا۔ "تم آج کل زیادہ بھاگ دوڑ میں مصروف ہو۔ تم ذرا زیادہ ہوشیار رہنا۔ میرا خیال ہے میں زرتاج کو بھی مزید خبردار کر دوں۔"

"وہ بھی سوچے گی کہ ہمارا ساتھ دے کر کس مصیبت میں پھنس گئی۔" راحیلہ مسکرائی۔

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔" میں نے کہا۔ "اونٹوں والوں سے دوستی رکھنے کے لئے گھر کے دروازے تو بڑے رکھنے پڑتے ہیں۔ ویسے وہ گھبرانے والی لڑکی نہیں ہے۔"

"گھبرانے والی ہوتی تو اس طرح کے کام میں اس انداز سے ہمارا ساتھ نہ دیتی۔" شفیع شاہ بولا۔

میں نے خط کو پرزے پرزے کر کے ایش ٹرے میں ڈال دیا۔ ٹونی بولا۔ "یہ آپ نے کیا کیا۔ شاید یہ خط کبھی شہادت کے طور پر کام آ جائے۔"

"اتنی موہوم امیدوں کو دل میں جگہ مت دو" میں نے ملائمت سے کہا۔ "بالکل سادہ لفافے میں..... سادہ کاغذ پر..... بغیر کسی القاب اور بغیر کسی نام و پتے کے..... کمپیوٹر کے ذریعے لکھا گیا خط بھلا کیا شہادت بنے گا۔"

اس رات محفل برخاست ہونے تک ہم گویا اس خط کو تو بھول چکے تھے۔ ہم ہمیشہ کی طرح ہنس بول رہے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ کم از کم میں اسے نہیں بھولا تھا۔ اپنے ساتھیوں کے بارے میں میرا یہی خیال تھا۔ میں اس وقت تک خط بھیجنے والے کے بارے میں کسی نتیجے..... پر نہ پہنچ سکا تھا۔ جمال سعیدی کے الفاظ کی بازگشت میرے ذہن میں ابھری تھی۔ 'بعض اوقات ہمیں اندازہ بھی ہو جاتا ہے کہ کون سی حرکت کس دشمن کی ہے لیکن ہم انجان بن جاتے ہیں۔ ہم کبھی ایسے وقت پر ایسے موقع پر اور ایسے انداز میں جا کر اسے مارتے ہیں کہ اسے حیران ہونے کی بھی مہلت

نہیں ملتی' اس وقت خطرہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا'

اگر جمال سعیدی اس سوچ کا آدمی تھا تو پھر وہ اس قسم کا خط لکھنے یا لکھوانے کے حق میں نہیں ہو سکتا تھا جس سے دشمن الرٹ ہو جاتا اور نہ جانے کب تک الرٹ ہی رہتا۔ وہ تو شاید صرف کچھ دیر کے لئے ہمارے ساتھ لفظوں کے ذریعے چوہے بلی کا کھیل کھیلنے اور درحقیقت اپنے بے پروا انداز سے ہمیں خوش فہمی اور بے فکری میں جتلا کرنے آیا تھا۔ یہ خط اور اس کا رویہ' ایک دوسرے سے کافی مختلف قسم کی چیزیں تھیں۔ نیند نے مجھے ان الجھی ہوئی سوچوں سے نجات دلا دی۔

دوسرا دن خیریت سے ہی گزرا۔ شام کو میں آفس میں بیٹھا ہوا تھا کہ امبر نے بتایا کہ کوئی خاتون فون پر مجھ سے بات کرنا چاہتی تھیں لیکن وہ اپنا نام نہیں بتا رہی تھیں۔ انہوں نے ہوٹل کے ٹیلیفون بورڈ کے توسط سے فون کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ان کے پاس میرا ڈائریکٹ نمبر نہیں تھا جس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ وہ کوئی قریبی جاننے والی نہیں تھی۔ ویسے بھی خیر قریبی جاننے والی کو نام چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں نے ایک لمحے سوچا اور فیصلہ کیا کہ نام نہ بتانے والی خاتون سے بھی بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آخر وہ خاتون تھیں۔ میں نے امبر سے لائن ملانے کے لئے کہا۔

میں نے ہیلو کہا تو اس خاتون نے بڑے شکی سے لہجے میں تصدیق چاہی۔ "آپ افضل صاحب ہی بول رہے ہیں نا؟"

میں نے انہیں یقین دلانے کے ساتھ ساتھ ذہن پر زور دیا۔ یہ آواز سن کر ذہن میں کوئی گھنٹی تو بجی تھی لیکن اس کی آواز بہت ہی مدھم تھی۔ خود خاتون کی آواز بھی نہایت مدھم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کے آس پاس کوئی موجود تھا اور وہ اس سے رازداری برتتے ہوئے فون پر بات کرنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کی آواز مجھے کچھ سنی ہوئی لگ رہی تھی لیکن یاد نہیں آ رہا تھا کہ کہاں سنی تھی۔

جب انہیں یقین آ گیا کہ میں افضل ہی بول رہا ہوں تو شناسائی کی الجھن انہوں نے خود ہی حل کر دی۔ "میں واجدہ بول رہی ہوں.... واجدہ پرویز.... احمد پرویز کی بیوی" خاتون نے رازدارانہ سے انداز میں بتایا اور میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ آواز میں نے صرف ایک ہی مرتبہ' بہت مختصر سے جملوں کی حد تک سنی تھی اور اس وقت موقع محل بھی بہت مختلف تھا۔ پرنس سیمرا کی لاش دریافت ہونے کے موقع پر میرا اس سے سامنا ہوا تھا اور پہلے اس نے مجھے ہی قاتل سمجھ کر چیخنا شروع کر دیا تھا۔ اس عورت کو مجھے فون کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی؟ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ پرنس سیمرا کی بڑی بہن تھی۔

"جی.... فرمایئے؟" میں نے نہایت شائستگی سے کہا۔

"وہ...." وہ ایک پھر گڑبڑا کر رہ گئی۔ اس نے مجھے فون تو کر لیا تھا لیکن شاید وہ اب بھی الجھن میں تھی کہ مجھ سے بات کس... کرے۔ اس نے اس الجھن کا اظہار بھی کر دیا۔ "میری سمجھ... نہیں آ رہا کہ مجھے آپ سے بات کرنی بھی چاہئے یا نہیں..."

"تو پھر آپ پہلے فیصلہ کر لیجئے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"نہیں.... نہیں" وہ جلدی سے بولی۔ "میرا مطلب... معلوم نہیں آپ میری درخواست پر توجہ دیں گے یا نہیں... اس کی اہمیت کو محسوس کر سکیں گے یا نہیں...." لہجے میں... بہت پریشانی اور وحشت سی معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ بات تو کیجئے" میں نے اخلاص سے کہا۔ "بات... اپنی اہمیت خود منوا لیتی ہے۔"

"میں آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہوں... فون پر نہیں...." آخر اس نے گویا جرأت سے کام لیتے... اصل مقصد بیان کر ڈالا۔ "بات بہت ضروری اور اہم ہے... ایسا کیجئے.... میں آج شام اپنی ایک دوست کو سی آف کرنے... پورٹ جاؤں گی۔ اسے انٹرنیشنل ٹرمینل پر سی آف کرنے... میں موقع دیکھ کر ڈومیسٹک ڈیپارچر لاؤنج میں آ جاؤں گی... گیٹ نمبر تین کی طرف جانے والے راستے پر مجھے ملئے... بیلٹ کے قریب.... وہ ذرا محفوظ سی جگہ ہے.... آڑ میں... ادھر سے صرف مسافروں کا گزر ہوتا ہے۔"

میں نے اس جگہ کا نقشہ ذہن میں لانے کی کوشش کی...

"کتنے بجے؟"

"آپ ٹھیک سات بجے وہاں پہنچ جائیے گا۔" ...

"ساڑھے چھ بجے میری دوست کی فلائٹ ہے۔ میں اسے... کر کے ذرا گرد و پیش کا جائزہ لیتی ہوئی سات بجے تک... جاؤں گی۔ جب میں خود آپ کے قریب آ کر آپ کو مخاطب... تب تک مجھ سے بات کرنے کی کوشش نہ کیجئے گا۔"

"آپ کس سلسلے میں بات کرنا چاہتی ہیں؟" میں نے... نرمی سے پوچھا۔

"فون پر میں آپ کو یہ بھی نہیں بتا سکتی۔" اس کے... بے بسی اور وحشت تھی۔

"کیا یہ فون ٹیپ ہوتا ہے؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"دیکھیں.... ایسی باتیں بھی فون پر نہیں ہو سکتیں..."

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہی... ایک لمحے خاموش رہا تو وہ بڑی مایوسی سے بولی۔ "تو... نہیں آئیں گے؟"

"میں ضرور آؤں گا۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"میں.... میں آپ کا انتظار کروں گی۔" اس کا... رنگ سے یکدم کچھ بدل سا گیا۔ دوسرے ہی لمحے... ہو گیا۔

سلسلہ منقطع ہونے کے بعد بھی میں چند سیکنڈ تک ریسیور کان سے ہی لگائے بیٹھا رہا جیسے واجدہ پرویز کی آواز مجھے دوبارہ سنائی دینے لگے گی۔ یہ ایک نہایت ہی غیر متوقع فون کال تھی اور اس نے واقعی مجھے حیران کردیا تھا۔ آخر واجدہ پرویز مجھے کیا بتانا چاہتی تھی؟ اور اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ تھا کہ مجھے ہی کیوں بتانا چاہتی تھی؟ میں اس کا کوئی ایسا قریبی واقف تو نہیں تھا۔ وہ ایک نہایت دولت مند اور صاحبِ حیثیت آدمی کی بیوی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کے حلقۂ احباب میں نہ جانے کیسے کیسے لوگ شامل ہوں گے۔ کیا ان میں سے کسی کو بھی اس نے اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ اس سے وہ بات کی جاسکتی؟ کہیں یہ کوئی چال تو نہیں تھی؟ مجھے اس کے میاں کا خیال آیا جس کے مزاج میں خاصی فرعونیت پائی جاتی تھی اور جو پہلی ملاقات میں ہی مجھ سے اور رحیم گل سے خار کھا گیا تھا۔ اس کے گھر پہ اس سے دوسری ملاقات کے دوران میں تو رحیم گل نے اس کی دُم پر کافی زور سے پاؤں رکھ دیا تھا اور پھر آکر اس ملاقات کی روداد بھی مجھے سنائی تھی۔

کہیں احمد پرویز نے ہی تو مجھے گھیرنے کے لیے کوئی سازش تیار نہیں کی تھی؟ شاید وہ اپنی بیوی کو اس سازش پر عمل درآمد کے لیے استعمال کررہا ہو۔ میں نے اس پہلو پر بہت سوچا لیکن اس کا امکان مجھے کم ہی نظر آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ احمد پرویز زیادہ لمبے چکروں میں پڑنے اور اس کے لیے اپنی بیوی کو استعمال کرنے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ میں نے ریسیور تو رکھ دیا تھا لیکن واجدہ پرویز کی آواز جیسے اب بھی میرے کانوں میں اُبھر رہی تھی۔ اس لیے نہیں کہ وہ کوئی بہت خوب صورت اور ناقابلِ فراموش آواز تھی یا اس آواز کی مالک بذاتِ خود بہت حسین تھی بلکہ صرف اس لیے میں خود اس کے تمام جملے اپنے ذہن میں دہرانے کی کوشش کررہا تھا کہ شاید اس کے لہجے کے زیروبم میں کہیں مجھے اصل بات کا کوئی سراغ مل سکے۔ وہ کچھ خوف زدہ بھی معلوم ہوتی تھی لیکن اسے بھلا کس کا خوف ہوسکتا تھا؟ کہیں وہ اپنے شوہر سے ہی تو خوف زدہ نہیں تھی؟

پھر میں نے ان تمام سوالات کو ذہن سے جھٹک دیا اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو جھاڑ پلائی کہ آخر ایسے پیچ در پیچ سوالوں میں سر کھپانے کی کیا ضرورت تھی؟ صرف دو گھنٹے ہی کی تو بات تھی۔ واجدہ پرویز نے سات بجے مجھے ملاقات کے لیے بلایا تھا اور اس وقت پانچ بجے تھے۔ دو گھنٹے بعد تمام سوالوں کے جوابات مل سکتے تھے اگر یہ کوئی سازش تھی تو وہ بھی سامنے آجاتی۔ میں نے اس موضوع پر بھی سر نہیں کھپایا کہ سازش آخر کیا ہوسکتی تھی اور میں اس سے بچنے کے لیے کیا کرسکتا تھا؟ میں نے اپنے آپ کو تن بہ تقدیر ہی چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے یہی سوچا کہ اگر یہ کوئی سازش تھی تب بھی اس کا کچھ اندازہ ہونے پر ہی اس سے بچاؤ کی تدبیر کی جاسکتی تھی۔

چھ بجے کے قریب میں نے فون کرکے راحیلہ کو اس کے کمرے سے بلایا۔ وہ بہت نکھری نکھری اور تازہ دم لگ رہی تھی۔ شاید آرام کرکے اٹھی تھی اور نیچے ہی آنے کے لیے تیار ہورہی تھی کہ میں نے بلا تمہید نہایت سنجیدگی سے کہا "میں ائرپورٹ پر ایک عورت سے ملنے جارہا ہوں۔"

"سبحان اللہ! کیسی خوش کن اطلاع ہے۔" وہ قہر آلود نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی "اور یہ اطلاع مجھے ہی دینا ضروری تھی؟"

"ظاہر ہے..... تبھی تو دے رہا ہوں۔ میں کبھی کوئی غیر ضروری کام نہیں کرتا۔"

"ہاں..... وہ تو مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ دن بھر تم کچھ بھی کرتے ہو وہ سب بہت ہی ضروری ہوتا ہے۔" وہ خفگی سے میں بولی "شامتِ اعمال سے اب ہماری شادی کے آثار بھی ہورہے ہیں۔ شادی کے بعد بھی غالباً مجھے روزانہ اسی قسم کی ضروری اطلاعات سننے کو ملا کریں گی۔ میں ذرا فلاں بس اسٹاپ پر ایک عورت سے ملنے جارہا ہوں..... میں نہر والے پُل پر ایک لڑکی سے ملنے جارہا ہوں..... میں ذرا گندے نالے کے کنارے بھلا جمعدارنی سے ملنے جارہا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ..... تمہارا خیال ہے صبح شام تم مجھے اس قسم کی اطلاعات دیتے رہو گے تو ہماری ازدواجی زندگی بہت خوش گوار گزرے گی؟"

"گزرنی تو چاہیے۔" میں نے اپنی سنجیدگی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اسی لیے تو میں تم سے شادی کررہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تم ایک نہایت کشادہ دل لڑکی ہو۔" پھر میں نے شکی نظروں سے اسے گھورا "کہیں یہ محض میری خوش فہمی تو نہیں؟"

"یقیناً..... تمہاری زندگی میں خوش فہمیوں کا تو بہت ہی عمل دخل ہے۔" وہ بولی "اگر تمہیں اس قسم کی کشادہ دل لڑکی ضرورت ہے تو پھر تم کوئی اور لڑکی تلاش کرلو۔"

"یہ مشورہ تو اب تم بہت تاخیر سے دے رہی ہو۔ دو سال پہلے اٹھارہ بیس امیدوار لڑکیاں تھیں، انہیں تو میں نے جواب دے دیا ہے۔ اب نئی لڑکی تلاش کرنے میں خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا۔" میں نے فکر مند لہجے میں کہا "تم خود ہی میرے مطلب کی لڑکی بننے کی کوشش کیوں نہیں کرتیں؟ اگر میں بس اسٹاپ پر کسی عورت سے، نہر والے پل پر کسی لڑکی سے اور گندے نالے کے کنارے بھلا جمعدارنی سے ملنے چلا جایا کروں گا تو اس میں بھلا تمہارا کیا نقصان ہے؟"

"میں نفع نقصان کی بحث میں نہیں پڑوں گی۔ بس تمہاری کھوپڑی توڑ دوں گی۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"اُف خدایا.....!" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا "تم بھی وہی روایتی قسم کی لڑکی نکلیں۔ میں خواہ مخواہ تمہارے بارے میں خوش فہمی کا شکار تھا۔"

"اب بھی وقت ہے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرلو۔" اس نے خوش دلی سے کہا "ابھی کیا بگڑا ہے؟"

"ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔ بگڑنے کا عمل تو شادی کے بعد شروع ہوتا ہے۔" میں نے سہلایا پھر غصے سے اسے گھورا "ویسے میری درخواست قبول کرتے وقت تو تم بڑی معصوم اور مسکین بنی ہوئی تھیں۔ صرف ایک ہی معمولی سی شرط یا فرمائش سامنے رکھ رہی تھیں اور میں نے سوچا تھا کہ چلو اسے پورا کرنا یا اس بات کا خیال رکھنا تو کچھ زیادہ مشکل نہیں..... لیکن اب ایک آدھ دن گزرتے ہی تم نے پھیلنا شروع کردیا۔ شادی کی نوبت آنے تک تو نہ جانے کیا ہوگا..... اور پھر شادی کے بعد نہ جانے کیا ہوگا.....!" میں گویا اس تصور سے کانپ اُٹھا۔

"اگر تم نے اسی طرح آوارگی جاری رکھی تو دنیا والے ایک روز اخباروں میں پڑھیں گے کہ ایک نہایت محبت کرنے والی بیوی نے اپنے شوہر کو کلاشنکوف کا برسٹ مار کر ہلاک کردیا۔" اس نے سرسری لہجے میں کہا۔

"اگر محبت میں تمہارا یہ عالم ہے تو نفرت میں کیا عالم ہوگا۔" میں نے آنکھیں سکیڑ کر اسے گھورا۔

"خود ہی اندازہ کرلو۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"یہ شادی تو بڑا خطرناک سودا ہے۔" میں نے بظاہر تشویش زدہ نظر آنے کی کوشش کی "اس سے تو بہتر ہے کہ میں جاپان کے کسی آتش فشاں پہاڑ سے شادی کرلوں۔ اس میں کم خطرات پوشیدہ ہوں گے۔"

"یقیناً۔" اس نے تائید کی "لیکن خیال رہے..... پہاڑ مذکر ہوتا ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم اپنے لیے کوئی چھوٹی موٹی پہاڑی تلاش کرلو۔ لیکن پہاڑی آتش فشاں نہیں ہوتی۔"

میں چند لمحے خاموشی سے اسے گھورتا رہا پھر میں نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا "کیا واقعی تم بھی مجھے آوارہ اور عیاش قسم کا آدمی سمجھتی ہو؟"

"نہیں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تو پھر یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے اچانک گرج کر کہا۔

"تمہیں مواقع تو حاصل رہے ہیں نا....." وہ میرے گرجنے سے ذرا بھی متاثر ہوئے بغیر اطمینان سے بولی "مجھے معلوم ہے اس ذہن میں تم نے ایک فلسفہ گھڑا ہوا ہے۔ تم پیشہ ور عورتوں کے قریب نہیں جاتے۔ کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اٹھاتے۔ جو لڑکیاں حقیقتاً شریف ہوتی ہیں ان پر ڈورے ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے لیکن جو لڑکیاں ذرا آزاد خیال ہوں، ان کی تم سے دوستی استوار ہوجائے اور وہ کسی بات میں کوئی حرج بھی محسوس نہ کرتی ہوں تو پھر تم بھی کچھ ایسے پرہیزگار اور پارسا نہیں رہتے۔"

"تم خود ہی سوچو اس طرح میرے لیے مواقع کتنے محدود ہوجاتے ہیں۔ تمہیں تو مجھ پر ترس آنا چاہیے۔" میں نے مظلومانہ لہجے میں کہا۔

"ترس.....؟" اس نے آنکھیں نکالیں "میں تو تمہاری شخصیت کا یہ بے ہودہ پہلو بھی درست کرنے کی فکر میں ہوں۔ شادی کے بعد تمہیں اپنی یہ محدود سرگرمیاں بھی ترک کرنی پڑیں گی۔"

"یعنی..... شادی ہوئی نہیں..... اور اصلاحی پروگرام بھی ترتیب پاگیا!" میں نے بے یقینی سے آنکھیں پھیلائیں۔

"یہ تو ہوتا ہی ہے۔" اس نے بے نیازی سے کندھے اچکائے "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"یعنی جیسی لڑکی سے چاہو شادی کرلو، نتائج وہی نکلیں گے۔" میں نے کراہ کر کہا۔

"بے شک۔" اس نے جواب دیا۔

"معلوم نہیں مرد اس کے باوجود شادی کرنے سے باز کیوں نہیں رہتے۔ گدھے کہیں کے!" میں نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"یہ ایک راز ہے جس پر دنیا بھر کے سائنس دانوں کو مل کر ریسرچ کرنی چاہیے۔" اس نے سنجیدگی سے سہلاتے ہوئے کہا۔

"مصیبت یہ ہے کہ سائنس داں خود بھی تو شادی شدہ ہوتے ہیں۔ وہ تو ویسے ہی اس قسم کے موضوعات پر ریسرچ کے لیے نااہل قرار پاجائیں گے۔ خود اپنی حماقتوں پر ریسرچ کرنا تو ذرا مشکل کام ہے نا۔ خیر..... تم اس بات کو چھوڑو..... یہ بتاؤ کہ تم نے لڑکیوں کے بارے میں میرے کردار کا جو نفسیاتی تجزیہ پیش کیا ہے، یہ معلومات تمہیں کہاں سے حاصل ہوئیں؟ یہ تو ٹاپ سیکرٹس ہیں جو تمہارے ہاتھ لگ گئی ہیں۔"

"معلومات مجھے کہاں سے حاصل ہونا تھیں بھلا۔" وہ تیزی سے بولی "میں کیا اس سلسلے میں کہیں سروے کرتی رہی ہوں؟ یہ تو میرے اندازے ہیں۔ آخر اتنے عرصے سے تمہارے اتنے قریب رہ رہی ہوں۔"

"ایسی لڑکیاں بھی نری مصیبت ہی ہوتی ہیں جن کا مشاہدہ اتنا تیز ہو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"اسی لیے تو بار بار کہہ رہی ہوں، ابھی وقت ہے..... سوچ لو..... اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرلو۔" وہ بولی۔

"مصیبت یہ ہے کہ مابدولت کو مصیبت مول لینے کا شوق ہے اور مابدولت ضدی بھی واقع ہوئے ہیں۔ جو منہ سے نکل گیا۔ سو نکل گیا" میں نے شاہانہ انداز میں کہا۔

"مزید کتنی مصیبتیں مول لینے کا ارادہ ہے؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"ذرا اس پہلی مصیبت سے نمٹ لیں پھر دیکھیں گے۔" میں نے اس کی طرف اشارہ کیا۔

"لگتا ہے تم ساری شام اسی قسم کی فضول باتوں میں گزار دو گے۔ یہ بتاؤ مجھے اوپر سے کس لیے بلوایا ہے؟"

"بتایا تو ہے کہ میں ایک عورت سے ملنے جارہا ہوں۔" میں نے جان بوجھ کر اس سے آگے کچھ نہ کہا۔

"تو مجھے اس سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے مشورہ طلب انداز میں پوچھا "تمہارے ساتھ چل کر اس عورت کی کھوپڑی توڑنی چاہیے یا تمہیں رسیوں سے باندھ کر یہیں بٹھانا چاہیے؟"

"تمہیں اس قسم کی کوئی بے ہودہ حرکت نہیں کرنی چاہیے بلکہ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اپنے اور میرے حق میں دعائے خیر کرنی چاہیے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "مجھے فون کرکے بلایا گیا ہے۔ یہ کوئی سازش بھی ہوسکتی ہے اس لیے میں تمہیں خبردار کرکے جارہا ہوں کیونکہ شفیع شاہ بھی یہاں نہیں ہے۔ کاموں کے سلسلے میں نکلا ہوا ہے۔ تم اور ٹونی اپنے اپنے کمروں میں ذرا ہوشیاری سے رہنا اور نیچے کی بھی خبر رکھنا۔"

"ٹونی تو آج بھی شفیع شاہ ہی کے ساتھ ہے۔" اس نے بتایا۔

"اس صورتِ حال میں تو تمہیں اور بھی زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"ہم تو خیر ہر وقت ہی ہوشیار رہتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی "لیکن اگر یہ کوئی سازش ہے تو میں سازش کرنے والوں کی معلومات کی داد دوں گی۔ انہوں نے تمہیں عورت سے ملنے کا بہانہ کرکے بُلایا ہے۔ انہیں معلوم تھا عورت کا نام سن کر تم رہ نہیں سکو گے۔ دوڑے چلے آؤ گے۔"

میں نے دانت پیس کر اسے گھورا اور کہا "میں اس عورت کو جانتا ہوں۔ وہ چالیس سے اوپر کی ہے۔ خاصے بڑے بچوں کی ماں ہے۔ شریف اور گھریلو قسم کی عورت ہے۔ خود بھی کروڑپتی خاندان سے تعلق رکھتی ہے اور ایک کروڑپتی آدمی کی بیوی ہے۔"

"ان سب باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ منہ بنا کر بولی "ان میں سے کوئی بھی بات تمہیں اس پر عاشق ہونے سے نہیں روک سکتی۔ اس کی جو بھی خصوصیت تم بتا رہے ہو وہ اس کی ڈس کوالیفکیشن نہیں بلکہ کوالیفکیشن شمار ہوگی۔"

"تم تو بہت ہی بے ہودہ لڑکی ہو۔" میں نے متاسفانہ انداز میں سرہلایا "تمہارے بارے میں میرے تمام اندازے غلط ہی ثابت نہ ہوجائیں۔ تمہیں پوری بات جانے بغیر کسی شریف عورت کے بارے میں ایسے ریمارکس نہیں دینے چاہئیں۔ میں پرنس سیمرا کا قصہ سناتے وقت اُس کے بارے میں بتا بھی چکا ہوں۔ وہ مقتولہ کی بڑی بہن واجدہ پرویز ہے.... احمد پرویز کی بیوی۔"

"میں عورت کے بارے میں ریمارکس نہیں دے رہی۔" وہ اطمینان سے بولی "میں تو تمہارے بارے میں ریمارکس دے رہی ہوں۔ میں تمہیں جانتی ہوں، عورت کو نہیں۔"

"اگر اسے تم جانتا کہتی ہو تو لعنت ہے تمہارے جاننے پر۔"

"تم نے کیا یہ فضول سی بات بتانے اور ایک غیر ضروری سی ہدایت دینے کے لیے مجھے بلایا تھا؟" اس نے آنکھیں نکالیں "یہ بات تم فون پر بھی کہہ سکتے تھے۔"

"ہوسکتا ہے کسی کو تمہاری پھٹکار زدہ صورت دیکھنے کا شوق ہو اور اسے تم سے روبرو بات کرکے ہی اطمینان ہوتا ہو۔" میں نے جواز پیش کیا۔

"خبردار.... جو تم نے میری صورت کو پھٹکار زدہ کہنے کی کوشش کی.... تمہاری صورت شناخت کے قابل نہیں رہے گی۔" وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے بولی۔

"سوچ لو.... کیا تم مستقبل میں ایک ناقابلِ شناخت آدمی کی بیوی کہلانا پسند کروگی؟"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا.... بشرطیکہ دو چار افراد نے گواہی دے دی کہ وہ آدمی ہی ہے۔"

"گواہی کیا، لوگ تو اظہارِ ہمدردی بھی کریں گے کہ دیکھو اب بے چارے انسانوں کی شادیاں چڑیلوں سے بھی ہونے لگیں، ایسا لگتا ہے اس بے چارے کے لیے تو لڑکیوں کا کال پڑگیا تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"جب کوئی چیز میسر آجاتی ہے تو اس کے بارے میں ایسی ہی ناقدری کی باتیں کی جاتی ہیں۔" اس نے افسوس سے سرہلایا۔

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "مزید ناقدری کی باتیں میں واپس آکر کروں گا۔ اب میں ائرپورٹ جارہا ہوں۔" میں اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"اس نے تمہیں ائرپورٹ پر ہی کیوں بُلایا ہے؟" وہ میرے ساتھ دروازے تک آتے ہوئے بولی "کیا وہیں سے وہیں تمہارا اس کو بھگا کر لے جانے کا ارادہ ہے یا وہ تمہیں بھگا کر لے جانے کی نیت سے آرہی ہے؟"

"میں نے اس کا حدود اربعہ تمہیں بتایا ہے۔ اس کے باوجود تم بھاگنے بھگانے کی باتیں کررہی ہو۔ تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا کہ وہ اس قبیل کی عورت نہیں ہے؟" میں نے خفگی سے کہا۔

"اچھا.... ٹھیک ہے.... جب تم اکیلے واپس آجاؤ گے تو میں یقین کرلوں گی۔" اس نے گویا مجھے تسلی دی پھر بولی "میں اپنے کمرے میں واپس جارہی ہوں۔"

"تم چاہو تو میری جگہ آفس میں بیٹھ سکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"نا بابا....!" وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے بولی "پتا نہیں کیسے اول جلول لوگ تم سے ملنے آتے ہوں گے۔ وہ تمہاری جگہ مجھے بیٹھا دیکھیں گے تو خواہ مخواہ انہیں حیرت کا شدید جھٹکا لگے گا کہ بیٹھے بیٹھائے یہ افضل صاحب کو کیا ہوگیا۔"

"بہت خوش ہوں گے وہ۔" میں نے کہا۔

"اسی لیے تو میں اوپر جارہی ہوں۔ ان کی خوشی مجھ سے دیکھی نہیں جائے گی۔"

میں اسے خدا حافظ کہہ کر پارکنگ لاٹ سے اپنی گاڑی لے کر ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس روز شفیع شاہ اور ٹونی کافی مصروف تھے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ فون کرکے ان میں سے کسی ایک کو بلالوں کہ وہ میرے 'ہمزاد' کے طور پر ساتھ رہے۔ دور رہ کر نگرانی کرتا رہے اور کسی معاملے میں مداخلت کی ضرورت پڑے تو کود پڑے۔ مخدوش قسم کے حالات میں اکثر شفیع شاہ اور کبھی کبھار کوئی اور اس قسم کے ہمزاد کے طور پر ڈیوٹی سنبھالتا تھا لیکن اس وقت میں نے بغیر کسی خاص وجہ کے اس احتیاط کو ترک کردیا تھا اور اکیلا ہی ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوگیا تھا تاہم میں چوکنا ضرور تھا۔ میں نے تمام راستے یہ خیال رکھا کہ میرا تعاقب تو نہیں ہورہا تھا؟ اس سلسلے میں اپنے اطمینان کے لیے میں نے کچھ فالتو چکر بھی کاٹا۔ یعنی راستے میں کئی ایسی بغلی سڑکوں پر بھی گاڑی گھمائی جن پر ٹریفک برائے نام تھا۔ آخر مجھے یقین ہوگیا کہ میرا تعاقب نہیں کیا جارہا تھا۔

واجدہ پرویز نے ائرپورٹ پر سات بجے کا ملنے کا وقت دیا تھا۔ میں پونے سات بجے ہی ڈیپارچر لاؤنج سے ذرا آگے اس کی بتائی ہوئی جگہ پہنچ کر دیوار کے قریب کھڑا ہوگیا۔ ائرپورٹ پر میری توقع سے زیادہ گہما گہمی تھی۔ مسافر گویا درودیوار سے اُبلے پڑ رہے تھے اور کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے وہ بلبلوں کی طرح فرش سے باہر آرہے تھے۔ اسپتال، ریلوے اسٹیشن، بڑے کلینک، بس اسٹاپ.... غرض کہ ہر جگہ انسانوں کا یہ بیکراں ہجوم دیکھ کر کبھی تو حیرت ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ اکثر ائرپورٹس پر بھی اب تو اکثر یہی سماں نظر آتا تھا۔ چند منٹ میں نے اسی بات پر حیران ہونے کے شغل میں منہمک ہوکر گزار دیے۔

سات بج گئے لیکن واجدہ لاؤنج کی طرف آتی دکھائی نہ دی۔ گویا اب اصل انتظار شروع ہورہا تھا۔ مسافروں کا زیادہ ہجوم طویل و عریض لاؤنج میں ہی تھا۔ وہاں سے لوگ مختلف مراحل سے فارغ ہوکر اور بورڈنگ کارڈ وغیرہ لے کر تنہا یا ٹولیوں کی صورت میں میرے سامنے سے گزرتے جارہے تھے۔ راستے میں کچھ حصے پر کنویئر بیلٹ نما متحرک راستہ بھی بنا ہوا تھا۔ کچھ لوگ اس پر بھی آکر کھڑے ہورہے تھے اور یوں قدرے تیزی سے خود بہ خود آگے روانہ ہوجاتے تھے جیسے ان کے پیروں میں پہیئے لگے ہوں اور کوئی انہیں ڈوری سے اپنی طرف کھینچ رہا ہو۔

انتظار شاید سبھی کے لیے کوفت کا باعث ہوتا ہے۔ میرے لیے ہمیشہ کچھ زیادہ ہی صبر آزما ہوتا تھا۔ میں مختلف حیلے بہانوں سے خود کو بہلانے کی کوشش کررہا تھا۔ کبھی میں اِدھر اُدھر کی چیزوں حتیٰ کہ لائٹوں وغیرہ کا بھی جائزہ لینے لگتا تھا اور کبھی اپنے سامنے سے گزرتے ہوئے انواع و اقسام کے چہروں کے بارے میں دل ہی دل میں قیاس لگانے کی کوشش کرتا۔

اس دوران میں قومی اور پرائیویٹ ائرلائنوں کی کئی ائر ہوسٹیس اپنی اپنی ڈیوٹی پر جانے کے لیے ہلکی پھلکی ٹرالیوں پر اپنے ٹرولنگ بیگ رکھے، بنی سنوری سامنے سے گزریں۔ ان میں سے کئی اس قابل تھیں جنہیں دیکھ کر مجھے ایک لمحے کے لیے خیال آیا کہ انسان کو کبھی کبھی بلا ضرورت بھی ہوائی سفر کرلینا چاہیے۔ ایک نے تو معطر سا جھونکا چھوڑ کر آگے بڑھ جانے کے بعد گردن گھما کر پیچھے بھی دیکھا اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ میرا خیال ہے یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ بھی ابھری تھی۔ اگر راحیلہ وہاں موجود ہوتی تو میں اُسے جلانے کے لیے ٹکٹ اور بورڈنگ کارڈ کے بغیر ہی اس کے پیچھے چل دیتا۔

پھر میں نے سانولے سے ایک دُبلے پتلے نوجوان کو دیکھا جس کے لمبے لمبے بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے۔ وہ میلی سی شرٹ اور پرانی جینز میں تھا۔ شرٹ، جینز سے باہر تھی۔ اس کی کلائی میں نقرئی کڑا اور انگلیوں میں انگوٹھیاں تھیں۔ وہ حلئے سے نچلے طبقے کا فرد معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے ہاتھ میں ایک نہایت شاندار، نیا اور بیش قیمت بریف کیس تھا۔ وہ مضطربانہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا، چیونگم چباتا چلا جارہا تھا۔

ایک لمحے کو خیال آیا کہ شاید اس کا بریف کیس بڑے نوٹوں کی گڈیوں سے بھرا ہوا ہو اور یہ رقم اس نے بینک سے نکلوائی ہو۔ چیک کے ذریعے نہیں.... ٹی ٹی یا کلاشنکوف کے ذریعے.... اور اب وہ اسے کسی محفوظ جگہ پہنچانے جارہا ہو۔ پھر مجھے خیال آیا کہ وہ اتنا بے وقوف نہیں ہوسکتا تھا کہ اگر اس کے پاس کوئی ایسی رقم موجود ہوتی تو وہ اسے ایسا عمدہ بریف کیس خریدنے سے پہلے اپنا حلیہ بہتر بنانے کی کوشش کرتا.... لیکن ساتھ ہی مجھے یہ بھی خیال آیا کہ بعض لوگوں کے عجیب عجیب کمپلیکس ہوتے ہیں جو ان سے عجیب عجیب حرکتیں کراتے ہیں، کوئی بعید نہیں تھا کہ میرا پہلا خیال ہی درست ہو۔

ایک مفلوک الحال سی بڑی بی تنہا جاتی دکھائی دیں۔ انہوں نے ایک پوٹلی بڑی محبت سے سینے سے لگائی ہوئی تھی۔ وہ بھی کچھ اس طرح دزدیدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی جارہی تھیں جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ کوئی ان کے ہاتھوں سے وہ پوٹلی اچک کر نہ لے جائے۔ ان کے بارے میں بھی مجھے یہی گماں گزرا کہ شاید ان کی مفلوک الحالی محض لوگوں کی نظروں کو دھوکا دینے کی کوشش ہو۔ ان کی پوٹلی میں ہیروں کے پرانے خاندانی زیورات ہوں جن کی مالیت آج کے دور میں لاکھوں.... بلکہ شاید کروڑوں میں ہو۔

پھر مجھے خود ہی یہ خیال بھی آیا کہ یہ میرا ذہن دولت کی طرف کیوں جارہا تھا۔ دنیا میں ابھی کچھ لوگ تو ایسے باقی ہوں گے جن کی نظر میں دولت کے علاوہ بھی کچھ چیزیں اہم ہوں گی۔ عین ممکن ہے بڑی بی کی پوٹلی میں نوجوانی کے زمانے کی کچھ نشانیاں ہوں۔ عطر کی کوئی خالی شیشی ہو، دھندلائی ہوئی سی کوئی انگوٹھی ہو، پرانا سا کوئی رومال ہو.... اور یہ چیزیں انہیں زمانے بھر کی دولت سے زیادہ عزیز ہوں۔

یہ سب مشاہدے اور یہ سب سوچیں وقت گزارنے کا بہانہ تھیں۔۔۔ اور وقت بہرحال گزرتا جارہا تھا۔ ساڑھے سات بج چکے تھے۔ میری نظریں واجدہ پرویز کی تلاش سے بھی غافل نہیں ہوئی تھیں لیکن وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ اس سے فون پر بات کرتے وقت کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس جیسی وقت کی پابند عورتیں دنیا میں کم ہی پائی جاتی تھیں لیکن اب وہ نہ جانے کہاں تھی۔ میں اپنے غصے کی لہر کو دبانے کے لیے اپنا ذہن اِدھر اُدھر الجھانے کی کوشش کررہا تھا۔

اسی اثنا میں ایک سفید پوش اور سفید ریش بڑے میاں اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ اچھے بھلے معزز آدمی معلوم ہورہے تھے۔ سر پر کلف لگی سفید دوپلی ٹوپی اور پیروں میں سلیم شاہی تھی۔ کرتہ پاجامہ بھی سفید اور کلف لگا تھا۔ کندھے پر رومال تھا۔ قریب آکر انہوں نے کچھ دبی اور رازدارانہ سی آواز میں خالص عربی لہجے میں السلام علیکم کہا۔ قد میں وہ مجھ سے کافی چھوٹے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ قدرے رازدارانہ انداز میں مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے۔

مجھے یہی گمان گزرا کہ شاید وہ واجدہ کے ملازم ہوں اور اس کا کوئی پیغام لائے ہوں کہ وہ کیوں اپنے وعدے کے مطابق نہیں پہنچ سکی۔ میں جلدی سے تجسس کے سے انداز میں ان کی طرف جھک گیا۔ وہ نہایت درست شین قاف کے ساتھ خطیبانہ لہجے لیکن نیچی آواز میں بولے "برخوردار! میں کوئی پیشہ ور بھکاری نہیں۔۔۔۔ میں خود ایک چھوٹا موٹا تاجر ہوں لیکن اس وقت بڑی مشکل میں پھنس گیا ہوں۔۔۔"

"اُف میرے خدا۔۔۔! یہاں بھی۔۔۔۔!" میں بے اختیار کراہ کر رہ گیا اور سیدھا ہوگیا۔ میں نے بیزاری سے ان کی طرف دیکھا لیکن وہ ذرا بھی خجالت زدہ نظر نہیں آئے۔ اس کھیل کے پرانے کھلاڑی معلوم ہوتے تھے۔ پہلے بھی نہ جانے کیسی کیسی سچویشن کا سامنا کرچکے ہوں گے۔ تاہم انہوں نے اپنی داستانِ غم سنانے کا پروگرام ملتوی کردیا۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ پہلے تو صرف سڑک کے کنارے یا کسی بازار میں کسی سیدھے شریف اور سفید پوش سے راہ گیر کو روک کر اس قسم کا کوئی فنکار کہانی سنایا کرتا تھا کہ اسے قریبی شہر یا گاؤں جانا تھا اور اس کی جیب کٹ گئی تھی اس لیے سخت مجبوری کی حالت میں وہ صرف کرائے کا طالب تھا۔۔۔۔ لیکن کیا اب ائرپورٹ پر سنانے کے لیے بھی کوئی کہانی تیار ہوگئی تھی؟ کیا بڑے میاں یہ کہنا چاہتے تھے کہ وہ لاہور، اسلام آباد یا پشاور جارہے تھے مگر ان کی جیب کٹ گئی اور اب میں انہیں ان کی منزل کا ٹکٹ لے دوں؟

تاہم بڑے میاں کی زبانی مجھ میں کوئی تازہ ایجاد شدہ کہانی سننے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے میں نے سپنے تلے لہجے میں کہا "قبلہ! یہ مت سمجھیے گا کہ آپ کی داستانِ غم سننے کے بعد میں آپ کو سو پچاس روپے دے کر جان چھڑانے کی کوشش کروں گا۔ اس کے بجائے میں آپ کو لاہور، اسلام آباد، پشاور یا کوئٹہ کی کسی تیار فلائٹ کا ٹکٹ دلوا کر بیچ جہاز میں بٹھوادوں گا اور پھر آپ کو وہاں سے واپس آنا بھی مشکل ہوجائے گا۔"

وہ خاموش واپس لاؤنج کی طرف روانہ ہوگئے۔ اپنے شکار کے بارے میں اندازہ غلط ہوجانے کے باوجود وہ مایوس معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اور نہ ہی ان کے وقار اور متانت میں کوئی فرق آیا تھا۔ وہ ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں۔۔۔۔ کے قائل معلوم ہوتے تھے۔

میں ایک بار پھر دوسرے چہروں میں الجھ کر وقت گزارنے کی مشق کرنے لگا۔ حتیٰ کہ آٹھ بج گئے۔ واجدہ پرویز کے دیے ہوئے وقت سے ایک گھنٹا اوپر ہوگیا تھا اور اب وقت گویا گزارے نہیں گزر رہا تھا۔ ایک ایک سیکنڈ جیسے رینگتا ہوا گزر رہا تھا البتہ میری رگوں میں لہو کی گردش کافی تیز ہوتی جارہی تھی۔ مجھے ایک قسم کا توہین کا احساس ہورہا تھا۔ کیا واجدہ پرویز نے مجھ سے کسی قسم کا مذاق کیا تھا؟ لیکن وہ مذاق کرنے والی عورت معلوم نہیں ہوئی تھی۔ خصوصاً کسی اجنبی سے۔۔۔۔ تو پھر کیا اسے کوئی مجبوری آن پڑی تھی؟ کیا وہ اپنی دوست کو سی آف کرنے بھی نہیں آئی تھی؟

آخر میری تابِ انتظار جواب دے گئی تاہم میں نے ائرپورٹ کی حدود سے نکلنے سے پہلے خاصا لمبا چکر کاٹ کر انٹرنیشنل ڈیپارچر لاؤنج میں جاکر بھی اچھی طرح ہر طرف کا جائزہ لیا لیکن مجھے واجدہ پرویز کا کہیں نام و نشان تک دکھائی نہ دیا۔ میرا غصہ کچھ اور بڑھ گیا۔ میں نے ایک ائرلائن کے کاؤنٹر سے ٹیلی فون ڈائرکٹری مانگی، اس میں احمد پرویز کے گھر کے فون نمبر تلاش کرکے نوٹ کیے اور شکریہ ادا کرکے ڈائرکٹری واپس کرنے کے بعد لاؤنج کے ایک گوشے میں بینچ پر جا بیٹھا جہاں لوگوں کا شور شرابا ذرا کم پہنچ رہا تھا۔ اپنے موبائل فون پر میں نے نمبر ملایا۔

دوسری طرف کسی مرد نے فون ریسیو کیا لیکن اطمینان کی بات یہ تھی کہ وہ احمد پرویز معلوم نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ سر، سر کہہ کر بات کررہا تھا۔ میرا خون گوکہ اس وقت کھول رہا تھا لیکن میں نے نہایت شائستگی سے اس سے درخواست کی "بیگم واجدہ پرویز سے بات کرائیے۔"

وہ شاید ایک لمحے کے لیے ہچکچایا پھر بولا "آپ کی تعریف۔۔۔؟"

میرا دل چاہا کہ اپنا نام افضل چوہدری کے بجائے افضل چیمہ بتاؤں لیکن میں نے صرف افضل ہی کہنے پر اکتفا کیا۔ لائن شاید کہیں اور ملائی گئی تھی۔ چند لمحے بعد ایک نسوانی آواز سنائی دی لیکن وہ واجدہ پرویز کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ میں نے تصدیق چاہی "آپ واجدہ پرویز بول رہی ہیں؟"

"جی نہیں۔ میں ان کی سیکرٹری بول رہی ہوں۔ آپ کو کس سلسلے میں ان سے بات کرنی ہے؟" عورت نے جاننا چاہا۔

میں بے اختیار ایک طویل ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ واجدہ بے شک ایک سادگی پسند اور قدرے گھریلو سی عورت نظر آتی تھی لیکن مجھے شاید یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ وہ بہرحال ایک بہت دولت مند آدمی کی بیوی تھی۔ اس کے گھر پر اس کی ایک عدد سیکرٹری بھی پائی جاتی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ دولت مند بیگمات کی کسی نمائشی قسم کی تنظیم یا کلب کی عہدیدار بھی ہو لیکن میں نے کبھی کہیں اس کا تذکرہ نہیں پڑھا تھا۔

میں نے اپنے غصے پر قابو رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "سلسلہ فی الحال تو کوئی نہیں ہے لیکن آپ ان سے بات تو کرائیے۔ شاید کوئی سلسلہ بن جائے۔"

"جی۔۔۔ کیا مطلب۔۔۔؟" سیکرٹری قدرے تیزی سے بولی۔

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ اسے محض کوئی بے ہودہ اور فضول کال سمجھ کر فون بند نہ کردے اس لیے میں نے جلدی سے کہا "معاف کیجیے گا۔۔۔۔ میں کسی اور خیال میں کہہ گیا تھا" پھر میں نے صحیح طور پر اپنا تعارف کرایا اور کہا "ان سے کہیے مجھے ان سے ان کی چھوٹی بہن پرنسس سیمرا کے قتل کے سلسلے میں کچھ بات کرنی ہے۔"

"ایک منٹ ہولڈ کیجیے۔" سیکرٹری کا لہجہ اب نارمل ہوگیا اور دوسرے ہی لمحے میرے کانوں میں دوسری نسوانی آواز اُبھری۔ میں نے اسے پہچان لیا۔ یہ یقیناً واجدہ پرویز کی آواز تھی۔ گوکہ اس آواز میں کرختگی نہیں تھی لیکن اس میں شیرینی اور لوچ بھی نہیں تھا۔ ایک بار سننے کے بعد دوبارہ سننے پر اسے آسانی سے پہچانا جاسکتا تھا۔ تاہم آج شام چند گھنٹے پہلے اس نے جس طرح مجھ سے بات کی تھی، اب انداز اس سے مختلف تھا۔

"جی۔۔۔۔ فرمائیے افضل صاحب؟" اس کا لہجہ نہایت ہی رسمی تھا۔

"کیا آپ ائرپورٹ کا راستہ بھول گئی تھیں؟" میں نے اپنی دانست میں اپنے لہجے کی مٹھاس میں اپنے تمام تر غصے کا زہر سمونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ٹیلی فون کو میں نے کچھ اس طرح سختی سے پکڑا ہوا تھا جیسے مجھے اندیشہ ہو کہ کوئی اسے مجھ سے چھین کر لے جائے گا۔

"میرا مطلب ہے کہ ائرپورٹ تو اپنی جگہ قائم ہے۔ اس کا محلِ وقوع ذرا بھی نہیں بدلا اس کے باوجود آپ وہاں نہیں پہنچ سکیں۔ ایسی کیا مجبوری آن پڑی تھی؟" میں نے اپنے آپ کو دانت پیسنے سے باز رکھتے ہوئے کہا۔

"میری سمجھ میں اب بھی کچھ نہیں آیا افضل صاحب!" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی "آخر آپ نے کس لیے فون کیا ہے؟"

"میں نے یہ جاننے کے لیے فون کیا ہے کہ یہ کس قسم کا ڈراما تھا۔ اس کا اسکرپٹ کس نے لکھا تھا۔۔۔ ہدایت کار کون تھا اور اس میں میرا کردار کیا تھا؟ کردار سمجھ میں نہ آنے کی وجہ سے میں اسے صحیح طور پر ادا نہیں کرسکا۔ کیا یہ دو ٹانگوں والے کسی گدھے کا کردار تھا؟"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہی جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ کیا بولے۔۔۔۔ اور جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں قدرے تیزی تھی "آپ شہر کے ایک ممتاز اور معزز آدمی ہیں افضل صاحب! یہی سوچ کر میں نے آپ کا فون ریسیو کرلیا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کو بھی نچلے طبقے کے تھرڈ کلاس لوگوں کی طرح فون پر خواتین سے الٹی سیدھی باتیں کرنے کی بیماری لاحق ہے۔۔۔ اور بڑی حیرت کی بات ہے کہ یہ حرکت آپ اپنا نام بتا کر کرتے ہیں۔ ہمارے طبقے کے لوگوں کے پاس اس قسم کے ٹٹ پونجیاں مشاغل کے لیے وقت کہاں ہوتا ہے۔ مجھے تو شبہ ہورہا ہے آپ کوئی اور صاحب ہیں۔۔۔۔ خواہ مخواہ افضل صاحب کا نام استعمال کررہے ہیں۔"

اچھی بات یہ تھی کہ موبائل فون تیار کرنے والے اپنے ٹیلی فون سیٹ کی تیاری میں اچھا اور مضبوط میٹریل استعمال کررہے تھے ورنہ جتنی سختی سے اس وقت میں نے ٹیلی فون سیٹ کو پکڑ رکھا تھا، شاید وہ پچک جاتا یا اس کے ٹکڑے ہوجاتے۔ اس کا مقصد واضح ہوچکا تھا۔ وہ معصوم بن رہی تھی اور یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ اس نے مجھے فون نہیں کیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں آواز پہچاننے میں غلطی نہیں کررہا تھا۔

میں نے اپنے دماغ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا کہ شاید کسی وجہ سے اس کا ائرپورٹ آنے کا پروگرام ملتوی ہوگیا ہو لیکن اس وقت وہ کسی مجبوری کی وجہ سے اس کا اعتراف نہ کرپارہی ہو۔ اگر وہ پہلے بھی اپنے گھر سے ہی فون کررہی تھی تو اس وقت اس کا انجان بننا سمجھ میں آتا تھا۔ اس نے پہلے ہی بتادیا تھا کہ اس کے گھر کی ٹیلی فون لائنیں قابلِ اعتماد نہیں تھیں۔ شاید میرا یوں گرمی کھانا کچھ مناسب نہیں تھا۔

میں نے یک دم پٹڑی بدلتے ہوئے ذرا معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "میرا خیال ہے مجھے کوئی غلطی فہمی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں نے آپ سے اس قسم کی گفتگو کی۔۔۔۔ یا پھر شاید کسی نے مجھ سے مذاق کیا تھا۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش تو ضرور کروں گا کہ اصل میں معاملہ کیا ہے لیکن فی الحال بات یہیں ختم کرتے ہیں۔"

میں نے اسے کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر فون بند کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب میرا واپس چلے جانا ہی بہتر تھا چنانچہ میں نے پارکنگ لاٹ کا رخ کیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہی میری کھوپڑی ٹھنڈی ہوچکی تھی۔ لیکن الجھن بہرحال باقی تھی۔ زندگی میں ان دنوں پہلے ہی الجھنوں اور معموں کی کچھ کمی نہیں تھی۔ لیکن یہ واجدہ پرویز ایک اور معمالے کر چلی آئی تھی۔

جب میں ہوٹل پہنچ کر گاڑی سے اُتر کر اندر جارہا تھا تو اچانک

میرے تخیل نے قلابازی کھائی۔ ایک نیا نکتہ' ایک نیا خیال' ایک نیا اندیشہ بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میں معاملے کے اصل رخ کی طرف دیکھ ہی نہیں پایا تھا؟ یہ بھی تو ممکن تھا کہ بے چاری واجدہ پرویز نے واقعی مجھے فون نہ کیا ہو۔ کسی اور نے ہی اس کی آواز بنا کر یہ ڈراما کیا ہو..... لیکن مقصد کیا ہو سکتا تھا؟

کیا کوئی کافی دیر کے لیے مجھے ہوٹل سے ہٹانا چاہتا تھا؟ کیوں....؟ جب کہ اس دوران میں شفیع شاہ اور ٹونی بھی ہوٹل میں موجود نہیں تھے۔ صرف راحیلہ ہوٹل میں تنہا رہ گئی تھی.....!

یہ خیال ذہن میں آتے ہی جیسے کوئی تیر سا دل میں اُتر گیا۔ ایک طویل عرصے سے میں یہ سمجھتا آرہا تھا کہ شاید میں خوف سے نا آشنا ہو چکا تھا۔ میں نے بڑی محنت اور شعوری کوشش سے خود کو اس بات کا عادی بنایا تھا کہ کسی بھی معاملے میں خوف محسوس کرنا چھوڑ دوں لیکن اب یہ احساس ہوا کہ یہ محض میری خوش فہمی تھی کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس وقت خوف اچانک ایک سرد لہر کی طرح میرے جسم میں اتر آیا تھا لیکن میں نے کوشش کی کہ اس خوف سے مفلوج یا کمزور ہونے کے بجائے ایک نئی طاقت' ایک نئی توانائی حاصل کروں۔

دوسرے ہی لمحے میں بگولے کی طرح اپنے آفس کی طرف دوڑا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ میں آمد و رفت کے لیے زیادہ تر عقبی راستہ استعمال کرتا تھا ورنہ ناواقف لوگ تو شاید اس بات پر حیران ہوتے کہ بظاہر اچھا بھلا معزز نظر آنے والے ایک شخص کو یہ کس قسم کا دورہ پڑا کہ آرام سے چلتے چلتے یکایک آندھی طوفان کی طرح دوڑ پڑا جب کہ اس کے پیچھے پیچھے ڈاکو یا پولیس بھی نظر نہیں آرہی۔ اگر جاننے والے اور ہوٹل کے عملے کے لوگ دیکھتے تو حیرت سے یہی سوچتے کہ یوں تو افضل صاحب اپنے ہوٹل کو ہر قسم کے تماشے سے محفوظ رکھنے کے لیے سرتوڑ کوشش کرتے ہیں لیکن اس وقت خود تماشا پیش کر رہے ہیں۔

اپنے آفس میں جانے کے بجائے میں نے پہلے امبر کے کمرے پر ہی رک کر دروازے سے جھانکتے ہوئے وحشت زدہ لہجے میں پوچھا "راحیلہ کہاں ہے؟" یہ سوال میں نے پہلے ہی کر دیا اور یہ بعد میں دیکھا کہ امبر کمرے میں موجود بھی تھی کہ نہیں؟ شاید اتفاق سے یا کسی مصروفیت کی وجہ سے وہ موجود تھی۔ وہ فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ سر اٹھا کر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی "جی.....؟"

اس نے میرا سوال ہی نہیں سنا تھا۔ اس وقت مجھے شاید پہلی بار اس پر غصہ آیا۔ دل چاہا کہ وہی ریسیور اس کے ہاتھ سے لے کر اس کی کھوپڑی پر دے ماروں "راحیلہ کہاں ہے؟" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں اپنا سوال دہرایا۔ مجھے چھوٹی موٹی یا بے بنیاد باتوں پر اور بلاوجہ کبھی غصہ نہیں آتا تھا لیکن آج کا دن شاید کچھ مختلف تھا۔ اس وقت خوف میرے ذہن میں ایک بگولے کی سی صورت اختیار کر چکا تھا اور میں یہ سوچنے کے قابل بھی نہیں تھا کہ میں راحیلہ کو امبر کی تحویل میں دے کر نہیں گیا تھا اور نہ ہی میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ راحیلہ کی نقل و حرکت پر نظر رکھے۔

"مجھے تو معلوم نہیں سر! شاید..... اپنے کمرے میں ہوں گی۔" اس نے سہمے سہمے لہجے میں جواب دیا۔ وہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے میرے چہرے پر کوئی عجیب تبدیلی نظر آرہی تھی۔

"تم بہت ہی نکمی لڑکی ہو۔" میں نے اسے جھاڑ پلائی اور لاؤنج کی طرف دوڑا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس بھی ہو گیا کہ اسے بلاوجہ ہی جھاڑ پلائی تھی لیکن اب تاسف کے اظہار یا معذرت کا وقت نہیں تھا۔ میں نے لفٹ کے انتظار میں بھی چند لمحے ضائع نہیں کیے حالانکہ ایک لفٹ نیچے ہی آرہی تھی اور سیکنڈ فلور پر تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے نیچے پہنچنے' رکنے اور دوبارہ روانہ ہونے سے پہلے میں راحیلہ کے کمرے تک پہنچ جاؤں گا کیونکہ اس کا کمرا ساتویں فلور پر تھا۔

میں ایک ساتھ چار چار سیڑھیاں پھلانگتا چلا گیا۔ اس وقت اگر اسٹاپ واچ وغیرہ کے ذریعے میرے اس مختصر سے سفر کا دورانیہ ناپنے کا کوئی بندوبست ہوتا تو شاید پتا چلتا کہ میں نے کم سے کم وقت میں ساتویں منزل پر پہنچنے کا کوئی ریکارڈ قائم کیا تھا۔ مجھے اپنی جسمانی اور اعصابی مضبوطی کے بارے میں ہمیشہ بڑا اطمینان رہا تھا اور حالات نے اکثر آزمائشی مرحلوں میں مجھے کافی حد تک ایک غیر معمولی آدمی ثابت کیا تھا۔ اس کے باوجود اس روز میں جس رفتار سے ساتویں منزل پر پہنچا اس سے میرا بھی سر گھوم گیا۔

"راحیلہ.....!" میں نے اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دیتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں پکارا۔ میں نے بہ مشکل اپنی آواز پر قابو رکھا تھا ورنہ شاید یہ نام ایک چیخ' ایک پکار کی صورت میں میرے حلق سے برآمد ہوتا۔ اندر سے کوئی جواب نہ آیا۔ میں نے ناب گھمائی۔ دروازہ مقفل تھا۔

میں نے پہلے سے ذرا بلند آواز میں پکارا اور دستک دی۔ اس بار بھی کوئی جواب نہ آیا۔ کسی بے عنوان اندیشے سے میری دھڑکنیں بہت تیز ہو چکی تھیں حالانکہ میں اپنے آپ کو سمجھانے کی بھی کوشش کر رہا تھا کہ شاید راحیلہ اپنے کمرے سے باہر ہو' اپنی مرضی سے کہیں گئی ہو..... اور اگر اندر موجود ہو تب بھی جواب نہ آنے کی کوئی وجوہات ہو سکتی تھیں لیکن دل میں نہ جانے کیوں ہول سا بیٹھ گیا تھا۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کچھ ہو چکا ہے۔

سیدھا طریقہ تو یہ تھا کہ میں نیچے ریسپشن پر فون کر کے اس کے کمرے کی ڈپلیکیٹ چابی منگواتا اور آرام سے دروازہ کھول کر اندر صورت حال کا جائزہ لیتا لیکن بعض اوقات ہنگامی سی صورت حال میں انسان پر کچھ ایسا خبط سوار ہوتا ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ مسئلے سے ہنگامی انداز میں نمٹنا زیادہ صحیح ہے اور اس میں کم وقت صرف ہو گا۔ میں نے بھی اس وقت وہی طریقہ اختیار کیا جس میں چند سیکنڈ بھی انتظار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یعنی میں پیچھے ہٹ کر راہداری کی دوسری دیوار تک پہنچا۔ میرا ارادہ پوری قوت سے دروازے کو کندھے سے ٹکرانے کا تھا۔ اسٹارٹ کے لیے گو کہ جگہ کم تھی اور دروازہ معیاری و مضبوط تھا اس کے باوجود مجھے امید تھی کہ دو تین ٹکروں میں کام بن ہی جائے گا۔

میری پہلی ٹکر ہی کچھ زیادہ کامیاب ہو گئی۔ یعنی میں دروازے سے گزرتا چلا گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے حیرت بھی ہوئی کہ کیا دروازہ اتنا ہلکا پھلکا اور غیر مرئی سا ہو گیا تھا کہ میری ٹکر سے ہوا کے جھونکے کی طرح اڑتا چلا گیا لیکن فوراً ہی میری سمجھ میں آگیا کہ عین اسی لمحے جب میری زوردار ٹکر دروازے پر پڑنے والی تھی' دروازہ خود بہ خود کھل گیا اور میں کسی ارنے بھینسے کی طرح گزرتا چلا گیا تھا۔

میں نے یہ ٹکر رسید کے لیے اتنی قوت مجتمع کی تھی کہ عین ممکن تھا' میں یونہی بگولے کی طرح گزرتا ہوا کمرے کے دوسری طرف بڑی کھڑکی کے شیشے کو توڑتا ہوا باہر جا گرتا جیسا کہ میں نے پیٹر سیلر کی ایک فلم میں دیکھا تھا لیکن فلموں میں تو چونکہ کامیڈی تخلیق کرنے کے لیے ایسے واقعات گھڑے جاتے ہیں اس لیے ان کا انجام بخیر ہوتا ہے یعنی ہیرو کھڑکی کا شیشہ توڑتا ہوا سوئمنگ پول یا کسی اور نرم چیز پر جا گرتا ہے جس سے اس کا حلیہ خراب ہونے کے سوا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن میں اگر کھڑکی سے گزر جاتا تو میری زندگی کا یہ سین کامیڈی سے ٹریجڈی میں تبدیل ہو جاتا کیونکہ میں ہوٹل کے کمپاؤنڈ میں جا کر گرتا جس کا فرش کنکریٹ کا تھا۔

ساتویں منزل سے تو خیر سوئمنگ پول میں گر کر بھی انسان کا ملیدہ بن سکتا ہے لیکن کنکریٹ کے فرش پر گرنے کے بعد تو بے چارے افضل چوہدری کی باقیات کو پہچاننا بھی مشکل ہوتا لیکن میں بہرحال کھڑکی سے دو چار قدم پہلے ہی اپنے آپ کو بریک لگانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر میں بہت آہستگی سے گھوما۔

میرے آہستگی سے گھومنے کی وجہ یہ تھی کہ ابھی اندیشوں نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ میں پلٹ کر دیکھوں گا تو کوئی خبیث صورت قسم کا شخص گن ہاتھ میں پکڑے میرا نشانہ لیے کھڑا ہو گا۔ اچھا ہوا کہ میں نے اس سلسلے میں حفظ ماتقدم کے طور پر کچھ دیکھے بھالے بغیر' گھومتے گھومتے ہی کوئی کارروائی نہیں کر ڈالی۔ کیونکہ جب میں پلٹا تو دروازے کے عقب میں راحیلہ کھڑی تھی جو آہستگی سے دروازہ بند کر رہی تھی لیکن حیرت سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میں کچھ بھی نہ بول سکا اور بے اختیار ایک بہت ہی طویل سانس لے کر رہ گیا۔ راحیلہ گلابی رنگ کے ایک بڑے باتھ روب میں تھی اور اس کے بالوں سے ابھی پانی نچڑ رہا تھا۔ اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی بھینی بھینی سی تازگی آمیز مہک پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ بولنے میں پہل اسی نے کی "تم اپنے سینگ اور دُم کہاں بھول آئے؟ اور ہاں..... تمہیں تو چاروں ہاتھ پیروں سے دوڑتے ہوئے نتھنوں سے شوں شوں کی آوازیں نکالتے ہوئے آنا چاہیے تھا۔ تم صرف دو ٹانگوں پر کیسے چلے آرہے ہو؟"

اسے نہیں معلوم تھا کہ میں اس وقت کوئی مزاحیہ بات سننے' اس سے لطف اندوز ہونے یا اس کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس وقت میرے دل کی دھڑکنیں کیسی بے ترتیب تھیں اور ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا۔ میں نے یک دم ہی آگے بڑھ کر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ بُری طرح مچلنے اور اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

جب وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوئی تو اس کا چہرہ بُری طرح تمتما رہا تھا لیکن اس پر پانی کی بوندیں بھی چمک رہی تھیں۔ شعلہ و شبنم کی تشبیہہ کا صحیح مفہوم اس وقت میری سمجھ میں آیا۔ ان دونوں چیزوں کو یکجا دیکھنا واقعی ایک عجیب تجربہ تھا۔

"یہ کیا بکواس تھی؟" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"تم ٹھیک تو ہو نا؟" میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بڑی مٹھاس سے پوچھا۔

اس نے میرے دونوں ہاتھ جھٹک دیے اور گویا پھر کسی اندیشے کے تحت ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی "کسی کی خیریت پوچھنے کے لیے کیا تم نے اب یہ نیا طریقۂ کار اختیار کیا ہے؟ میں محسوس کر رہی ہوں کہ جب سے میں نے تم سے شادی کے لیے ہامی بھری ہے تم کچھ زیادہ ہی فری ہونے لگے ہو۔"

پھر وہ ایک کرسی سے ایک تولیا اٹھا کر اپنے بالوں پر لپیٹتے ہوئے بولی "اگر تم صرف ایک منٹ اور صبر کر لیتے تو میں ذرا اطمینان سے واش روم سے باہر آتی۔ میں نے چیخ کر کہا تھا کہ ذرا صبر کرو' میں ابھی دروازہ کھولتی ہوں۔"

"مجھے تمہاری آواز سنائی نہیں دی۔ شاید شاور کھلا ہو گا..... لیکن حیرت ہے مجھے پانی گرنے کی بھی آواز سنائی نہیں دی....." میں نے اب صحیح معنوں میں اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا۔

وہ بات کاٹتے ہوئے بولی "خیر یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو جب سے یہاں آئی ہوں تبھی سے محسوس کر رہی ہوں کہ تمہارے حواس جواب دیتے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے سوچ کر تشویش ہونے لگتی ہے کہ آخر تمہارا بنے گا کیا؟"

"اب تو جو کچھ بھی بنے گا اس کی آدھی ذمے دار تم ہو گی۔" میں نے جواب دیا اور ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا "یہ بتاؤ یہاں کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی تھی؟ کسی نے تمہارے کمرے میں گھسنے کی کوشش تو نہیں کی تھی؟"

"تمہارے علاوہ تو کسی نے ایسی کوشش نہیں کی۔" اس نے

جواب دیا "ویسے ..... یہ تمہیں سوجھی کیا تھی... کیا تم نے کوئی غلط سلط چیز کھالی تھی جس کے اثرات برداشت نہیں ہو رہے تھے... یا کسی قسم کا کوئی دورہ وغیرہ پڑا تھا؟"

"آج کل واقعی نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "کسی کے لیے پریشان ہونے یا اس کے بارے میں فکر مند ہو کر بھاگنے کا یہ صلہ ملتا ہے آج کل... اس طرح بے عزتی کرانی پڑتی ہے۔"

"وہی تو میں جاننا چاہ رہی ہوں کہ آخر اچانک میرے بارے میں تشویش کیوں ہو گئی تھی؟"

"شاید برسوں بعد آج میری نامعلوم حس نے میری غلط رہنمائی کی..... یا پھر شاید میں کسی واہمے کا شکار ہو گیا تھا۔ مجھے اچانک کچھ ایسا لگا تھا جیسے تمہیں کچھ ہو گیا ہے۔"

"اور تمہارا خیال ہے کہ میں بالکل ناکارہ اور نکمی لڑکی ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں کر سکتی نا؟"

"بے خبری میں بعض اوقات اچھے بھلے طُرّم خاں بھی مارے جاتے ہیں۔"

"تم تو واجدہ پرویز سے ملنے گئے تھے۔" اچانک وہ آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی "تمہیں تو وہاں صرف اپنی "معلوم" حسوں کو بیدار رکھنا چاہیے تھا۔ یہ نامعلوم حس اچانک کیوں بیدار ہو گئی؟"

"معلوم نہیں۔" میں نے بے بسی سے کندھے اچکائے "شاید اس لیے کہ بہت دیر تک وہاں کسی مضطرب اُلو کی طرح انتظار کرنے کے باوجود واجدہ نہیں آئی.... اور پھر میں نے اسے فون کیا تو وہ نہایت صفائی سے مکر گئی کہ اس نے تو سرے سے... مجھے کبھی فون ہی نہیں کیا۔"

"بہت خوب..... بہت خوب۔" اس نے بے آواز تالی بجائی اور میرے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ ایسی بھی سیدھی سادی، شریف اور گھریلو عورت نہیں جیسی تم اسے ثابت کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ خاصی اچھی فنکارہ معلوم ہوتی ہے۔"

"فی الحال یہ چکر میری سمجھ میں نہیں آیا اس لیے کوئی رائے دینے سے پرہیز کروں گا۔"

"اوہو... یہ اتنے پرہیزی کب سے ہو گئے تم؟" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"اب پرہیزی بن جانے میں ہی عافیت ہے۔ ذرا سی بد پرہیزی کی کوشش کرتا ہوں تو تم بے چین بکری کی طرح بلبلانے لگتی ہو... گھونسے چلانے لگتی ہو۔"

"بات کو کہیں سے کہیں لے جانے میں تمہارا جواب نہیں۔" اس نے غصے سے مجھے گھورا۔

"تم یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ اچانک غسل فرمانے کی کیا سوجھی تھی؟ شام جب میں نے تمہیں نیچے بلایا تو تم اچھی خاصی صاف ستھری اور تازہ دم نظر آ رہی تھیں۔ اگر اس وقت تمہیں واش روم سے برآمد ہونے میں دو تین سیکنڈ کی بھی تاخیر ہو جاتی تو شاید دروازہ یا اس کا تالا ٹوٹ چکا ہوتا اور اس فلور پر اچھا خاصا تماشا لگ جاتا۔"

"جہاں تم جیسے احمق پائے جاتے ہیں وہاں تماشے تو بہرحال لگے ہی رہتے ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی "اب میں اپنے نہانے اور منہ دھونے کا شیڈول باقاعدہ اور باضابطہ طور پر تیار کر کے تم سے اس کی منظوری... حاصل کر کے تو اس پر عمل نہیں کر سکتی۔ میں تو اپنی مصروفیات اور موسم کی مناسبت سے دن میں دو دو تین تین مرتبہ نہا لیتی ہوں۔"

"اچھا.....؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھا "تمہاری مصروفیات کچھ مشکوک قسم کی معلوم ہوتی ہیں۔ لگتا ہے مجھے نئے سرے سے تمہارے بارے میں کچھ تفتیش اور تحقیقات کرنا پڑیں گی۔"

"بکواس مت کرو اور اب فوراً یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ مجھے تیار ہونا ہے۔" وہ کچھ کھسیا کر بولی۔

"کس سے ملنے کے لیے؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"تمہاری ایسی قسمت کہاں کہ کسی ڈھنگ کے آدمی سے ملنے جا سکیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تمہاری قسمت میں تو تم جیسا گھامڑ ہی لکھا ہوا ہے۔ گھوم پھر کر وہی سامنے آ جاتا ہے۔"

"شکر کرو یہ گھامڑ بھی بروقت تمہارے ہاتھ لگ گیا۔ اگر یہ پیس بھی جمعہ بازار کی کلیئرنس سیل وغیرہ میں نکل جاتا تو ہاتھ ملتی رہ جاتیں۔" میں نے احسان جتانے والے انداز میں کہا۔

"ہاں..... اس صورت میں تو بات ہاتھ ملنے پر ہی ٹل جاتی... لیکن اب تو کہیں زندگی دیواروں سے سر پھوڑتے ہی نہ گزرے۔" اس نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔

"اپنے ہونے والے مجازی خدا کو اتنا بھی ڈی گریڈ نہیں کیا جاتا۔ اس کی انا بھی مجروح ہو سکتی ہے۔" میں نے گویا خبردار کیا۔

وہ اٹھ کر میرے سامنے آ کھڑی ہوئی اور دھمکی آمیز انداز میں چٹکی بجاتے ہوئے بولی "اس سے پہلے کہ انا کے ساتھ ساتھ تمہاری ناک یا کان بھی مجروح ہو جائیں، تم فوراً یہاں سے رخصت ہو جاؤ۔"

"آخر تمہیں ایسی کیا تیاری کرنی ہے؟ تم میرے سامنے بھی تیار ہو سکتی ہو۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ میں کون سا تمہاری تیاریوں میں مداخلت کروں گا یا کسی چیز پر اعتراض کروں گا۔" میں نے سادگی سے کہا۔

اس کا گھونسا قطعی غیر متوقع طور پر حرکت میں آیا۔ شاید میرا جبڑا اس کا نشانہ تھا لیکن میں نہایت صفائی سے بروقت صوفے سے نیچے پھسل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا گھونسا صوفے کی پشت گاہ پر پڑا اور وہ خود میرے اوپر گرتے گرتے بچی۔ نہایت پھرتی سے [illegible]لی کی طرح تڑپ کر ایک طرف کو ہٹی۔ میں نہایت صابرانہ [illegible]میں گہری سانس لیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اب تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔" وہ غصے سے بولی۔

"ٹھیک ہے..... میں جا رہا ہوں قدر ناشناس عورت! ایک [illegible] آئے گا جب تم میرے پیچھے پیچھے دُم ہلاتی پھرو گی..... اور [illegible] دُم بھی کسی سے مستعار لینی پڑے گی..... مگر میں تمہیں ذرا [illegible] گھاس نہیں ڈالوں گا..... خدا حافظ۔" میں نے بارعب لہجے میں [illegible] اور پُر وقار انداز میں قدم اٹھاتا دروازے کی طرف چل دیا۔

[illegible] دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے پلٹ کر ذرا آہستگی سے کہا۔

"[illegible] بے آبرو ہو کر ترے ہوٹل سے ہم نکلے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور ہونٹ بھینچے کھڑی مجھے گھورتی [illegible]۔ میں باہر آ گیا اور اس بار نہایت صبر و سکون سے لفٹ کے [illegible] نیچے پہنچا۔ اپنے کمرے میں جانے سے پہلے میں نے ایک بار [illegible] امبر کے کمرے میں جھانکا۔ وہ میز پر ساکت بیٹھی خلا میں گھور [illegible] تھی۔

"سوری امبر ڈیئر!" میں نے شگفتہ لہجے میں کہا "مجھے ذرا ایک [illegible]اک گڑبڑ کا اندیشہ محسوس ہوا تھا اس لیے کچھ ٹینشن میں تھا۔ [illegible]اب ٹھیک ہے۔"

"اوہ..... تھینک گاڈ!" اس نے گہری سانس لے کر کہا اور [illegible] کے چہرے پر جیسے رونق لوٹ آئی۔

"اب میں سکون سے گھر جا سکوں گی۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ [illegible]نے میٹھی مسکراہٹ کے ساتھ اسے شب بخیر کہا اور اپنے آفس [illegible] آ بیٹھا۔ اب جب کہ میں اپنے آپ کو پُرسکون محسوس کر رہا تھا [illegible] کچھ دیر آرام سے تنہائی میں بیٹھ کر سوچ بچار کرنا چاہتا تھا۔

[illegible] میری سوچ بچار وقفے وقفے سے زندگی کے دیگر معمولات کے [illegible] ساتھ دوسرے دن تک جاری رہی۔ دوسرے روز دوپہر کے [illegible] بھی میرا ذہن کچھ اسی قسم کے مسائل میں الجھا ہوا تھا جن کا [illegible] ملکی یا کاروباری زندگی سے کوئی تعلق نہیں تھا اور اس وقت [illegible] میں اپنے دفتری کام نمٹا رہا تھا۔ اچانک امبر دروازہ کھول کر [illegible] آئی اور میز کے قریب پہنچ کر رازدارانہ انداز میں بولی "سر! [illegible] برقع پوش عورت آپ سے ملنے آئی ہے۔ ٹیکسی میں آئی ہے۔ [illegible]نے باہر اسے اترتے بھی دیکھا تھا۔ میں اتفاق سے اس وقت [illegible] سے آ رہی تھی۔"

فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹیکسی میں تنہا آنے والی برقع پوش [illegible] کو اس وقت تک ذرا عجیب ہی نظروں سے دیکھا جاتا ہے [illegible] تک ان کے بارے میں کچھ معلومات حاصل نہ ہو جائیں۔ [illegible] جب کہ وہ کمروں کی طرف جانے کی کوشش کریں۔

"[illegible] نام نہیں بتایا اس نے؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں سر! اس کا کہنا ہے کہ ایک بہت اہم کام کے سلسلے میں [illegible] کے پاس آئی ہے اور آپ اسے جانتے ہیں۔ وہ تو میرے سامنے بھی نقاب چہرے سے نہیں ہٹا رہی۔" امبر نے بتایا۔

میں نے ذہن پر زور دیا۔ میں کسی برقع پوش خاتون سے واقف نہیں تھا۔ میں نے احتیاطاً پوچھا "عورت ہی معلوم ہوتی ہے نا؟"

"جی سر! بظاہر تو عورت ہی معلوم ہوتی ہے۔" امبر نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "ویسے اچھے ڈیل ڈول کی مالک ہے۔"

"بھیج دو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر برقع کے اندر سے کوئی مُوا مرد برآمد ہو گیا تو میری بدقسمتی ہو گی۔ میرے حق میں دعائے خیر کرنا۔"

"سر! عین ممکن ہے یہ اس بے چارے کی بدقسمتی ہو۔" امبر مسکراتے ہوئے بولی اور رخصت ہو گئی۔ میں نے اپنی جیب میں موجود مشین پسٹل کو تھپتھپایا اور بظاہر بے پروائی سے لیکن درحقیقت پوری طرح مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ چند لمحے بعد ایک نفیس قسم کے برقع میں جو عورت کمرے میں داخل ہوئی وہ خاصی لمبی تڑنگی اور مردمار قسم کی دکھائی دے رہی تھی۔ عورت اگر لمبی تڑنگی اور ذرا نمایاں ڈیل ڈول کی ہو تو نہ جانے کیوں برقع میں اور بھی زیادہ جسیم دکھائی دیتی ہے۔ تاہم اس عورت کی جسامت اور برقع پوشی کے باوجود اس کے خدوخال سے نسوانیت نمایاں تھی۔ مجھے اس کے بارے میں چند سیکنڈ بھی تجسس اور تشویش میں مبتلا نہیں رہنا پڑا کیونکہ اس نے اندر آتے ہی نقاب الٹ دیا۔

وہ واجدہ پرویز تھی!

یوں تو اس عورت میں خوب صورتی کے تمام لوازمات موجود تھے۔ آنکھیں خوب صورت تھیں، نقوش تیکھے تھے، رنگ گورا تھا اور لمبی تڑنگی ہونے کے باوجود وہ بے ڈول نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں وہ خوب صورت نہیں لگتی تھی۔ بظاہر اس میں کوئی کمی نظر نہیں آتی تھی تاہم اس وقت برقع میں وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ یہ ایک عجیب بات تھی۔ وہ میری میز کے سامنے آ رکی۔ میں پلک جھپکائے بغیر چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ کچھ مضطرب معلوم ہوتی تھی اور اس دوران میں شاید اندر ہی اندر اپنے اس اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اچانک وہ بلا تمہید بولی "میں چاہتی ہوں کہ جتنی دیر بھی میں اس کمرے میں موجود رہوں اس دوران میں نہ تو کوئی اندر آئے اور نہ ہی آپ... کوئی فون وغیرہ اٹینڈ کریں تاکہ ایک تو وقت ضائع نہ ہو، دوسرے مجھے کوئی یہاں بیٹھے نہ دیکھے۔ ممکن ہے آپ کے ہوٹل کے اسٹاف میں سے کوئی مجھے پہچانتا ہو۔"

"میں کوشش کروں گا کہ آپ کی ان خواہشات کی تکمیل کا انتظام ہو سکے بشرطیکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ آپ نے کس سلسلے میں مجھے شرفِ ملاقات بخشنے کا فیصلہ کیا ہے۔" میں کوشش کے باوجود اپنے لہجے کا تیکھا پن نہ چھپا سکا تاہم میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ ضرور کر دیا۔

وہ بیٹھتے ہوئے بولی "مجھے معلوم ہے آپ مجھ سے ناراض ہوں

گے لیکن میں مجبور تھی اس لیے آپ کو وقت دے کر اور ملاقات طے کرنے کے باوجود کل نہیں آسکی۔۔۔۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا' چلو برخوردار افضل! کم از کم ایک معما تو حل ہوا کہ فون خود انہی موصوفہ نے کیا تھا'

زبان سے میں نے کہا "وعدہ کر کے آپ کا نہ آنا اتنا تکلیف دہ نہیں تھا جتنا بعد میں آپ کا انجان بن جانا۔"

"وہ میری مجبوری تھی۔۔۔۔" وہ اپنے پرس سے ایک ٹشو پیپر نکال کر پیشانی سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولی "میرے شوہر اس وقت میرے پاس موجود تھے اور ان کے سامنے میں ہرگز یہ ظاہر نہیں کرسکتی تھی کہ میں نے آپ کو فون کر کے ملنے کی کوشش کی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ کے فون نے مجھے اچھی خاصی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ مجھے اپنے شوہر کے سامنے بات بنانا مشکل ہو گیا تھا کہ میرے لیے آپ کا فون کیوں آیا تھا۔ مجھے بالکل انجان بننا پڑا کہ شاید آپ نے کسی غلط فہمی کی بنا پر مجھے فون کر ڈالا ہے۔ شکر ہے وہ کچھ مطمئن ہو گئے تھے۔"

اس کی آنکھوں اور چہرے سے اس کی ذہنی کشیدگی اور اعصابی تناؤ کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس پر کسی بھی قسم کی خفگی کا اظہار کرنے کے بجائے اسے بولنے کا موقع دینا بہتر تھا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "دراصل میری اس دوست کا اس فلائٹ سے جانے کا پروگرام کینسل ہو گیا تھا۔ اس بات کی اطلاع دینے کے لیے جب اس کا فون آیا' اس وقت تک خلافِ توقع میرے شوہر گھر آچکے تھے۔ انہوں نے بھی سن لیا تھا کہ میری دوست کا پروگرام کینسل ہو چکا تھا۔ اس کے بعد گھر سے نکلنے کا کوئی جواز نہ رہا۔ یہ اطلاع اور اچانک میرے شوہر کی آمد۔۔۔۔ یہ دونوں ایسی غیر متوقع تبدیلیاں تھیں کہ میں کچھ بدحواس سی ہو گئی۔ گھر سے نکلنے کے لیے میں کوئی دوسرا بہانہ نہ بنا سکی اور میرے شوہر نے مجھے اس کا موقع بھی نہیں دیا۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتے میں دل ہی دل میں کتنی شرمندہ تھی۔" اس نے سر جھکا لیا۔ شرمندگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

"میں آپ کے لیے پینے کو کچھ منگواؤں؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ اچانک مجھے آدابِ میزبانی کا خیال آگیا تھا اور میرے دل میں اس کے بارے میں غم و غصہ بھی نہیں رہا تھا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "اس وقت میں ان تکلفات کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ مجھے معلوم ہے کل آپ کو کتنی کوفت ہوئی ہو گی اسی لیے آج میں نے جلد از جلد اس کی تلافی کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس وقت میں درحقیقت یہاں سے کچھ ہی دور واقع ایک آڈیٹوریم میں ہونے والے خواتین کے ایک سیمینار میں شریک ہوں جو کافی دیر جاری رہے گا۔ میری گاڑی وہیں کھڑی ہے اور ڈرائیور اس میں بیٹھا ہے۔ میں پچھلے دروازے سے نکل کر یہ برقع پہن کر یہاں آئی ہوں جو میں گھر سے اپنے ہینڈ بیگ میں چھپا کر چلی تھی۔"

اس کا مطلب تھا سیدھی' شریف اور مزاجاً گھریلو سی دکھائی دینے والی عورت بھی اگر کبھی چاہتی تو کسی مجبوری' خواہش یا ضرورت کے تحت تھوڑی بہت فنکاری دکھا سکتی تھی۔

"یہ سارا تردد کیسا ہے۔۔۔۔؟ میں اصل بات جاننے کے لیے بے چین ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ میں اصل موضوع پر اس سے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں میں جھوٹ کی کوئی علامت تلاش کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں مجھے الجھن اور پریشانی کے سوا کچھ نہ ملا۔

"میں خود بھی اصل بات کسی کو بتانے کے لیے کتنے ہی دن سے پریشان اور بے چین ہوں۔ وقت نے مجھے ایک عجیب سی آزمائش میں ڈال دیا ہے۔ میں اپنے دل پر ایک ناقابلِ برداشت بوجھ لیے رہی ہوں۔ ایک اذیت ناک الجھن یہ بھی تھی کہ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ بات کسے بتاؤں؟ ایسا کوئی بھی نظر نہیں آتا جسے یہ بات بتا کر میں توقع رکھ سکتی کہ نتیجہ میری خواہش کے مطابق نکلے گا۔" وہ ایک بار پھر الجھن آمیز سے انداز میں خاموش ہو گئی۔

"لیکن پھر آپ فیصلے پر پہنچ گئیں۔" میں نے گویا اسے بات جاری رکھنے کے لیے اکسایا۔

"جی ہاں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "آپ میرے لیے اجنبی ہیں لیکن میں نے جوا کھیلنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

"غالباً اس بات کا تعلق آپ کی چھوٹی بہن پرنس ہمراز کے قتل سے ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔" اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے چمک ابھری اور معدوم ہو گئی "بہت سوچنے کے بعد میرا دھیان آپ کی طرف گیا اور رفتہ رفتہ میرا ارادہ مضبوط ہو تا گیا۔ آپ کو اس معاملے سے دلچسپی بھی ہے۔ آپ کی پوزیشن بھی اتنی مضبوط ضرور ہے کہ آپ اس معاملے میں ٹانگ اڑا کر کچھ کرنا چاہیں تو کرسکتے ہیں اور مجھے پس منظر میں رکھتے ہوئے خود کوئی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ متعلقہ پولیس آفیسر بھی آپ کا اچھا دوست ہے۔ فرض کرنے کے لحاظ سے آپ مجھے موزوں آدمی دکھائی دیے۔ بس اب ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ آپ کے دل میں میرے لیے تھوڑی سی ہمدردی پیدا ہو جائے اور آپ اس معاملے کو اس طرح ہینڈل کرنے کے لیے تیار ہو جائیں جس طرح میں چاہتی ہوں۔ آپ میری مجبوری کو سمجھ سکیں۔"

"آپ اصل بات تو کیجئے۔ باقی باتوں پر تو بعد میں افہام و تفہیم ہوتی رہے گی۔" میں نے ملائمت سے کہا "آپ غالباً پرنس کا قتل کے بارے میں کچھ جانتی ہیں۔"

اس تصور سے مجھے اپنے جسم میں کچھ سنسنی محسوس ہوئی

تھی کہ شاید وہ مجھے اپنے شوہر کے بارے میں کچھ بتانا چاہ رہی تھی۔ شاید وہی پرنس سیرا کا قاتل تھا اور اپنے شوہر کے بارے میں ایسی بات بتانا واقعی اس جیسی عورت کے لیے بہت بڑی آزمائش تھی۔ اس انکشاف کے ساتھ وہ اپنے آپ کو پس منظر میں رکھنا چاہتی تھی۔ اپنا اتنا بڑا راز کسی کے ہاتھ میں دے کر خود پس منظر میں رہنے کی خواہش بچکانہ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

"میں "کچھ" نہیں بلکہ "سب کچھ" جانتی ہوں۔" وہ ذرا تند سے لہجے میں بولی "میرا مطلب ہے کہ میں یہ جانتی ہوں کہ سیرا کا قتل کس نے کیا تھا..... اور میرا خیال ہے یہی بات سب سے اہم ہے۔ اتنا جان لینا ہی سب کچھ جان لینے کے مترادف ہے۔ پولیس کو اگر صرف اتنا ہی معلوم ہو جائے تو باقی باتیں وہ خود ہی معلوم کر لے گی۔"

"ہاں۔ آپ کا خیال درست ہے۔ آپ بتائیں تو سہی آپ کے خیال میں پرنس سیرا کا قاتل کون ہے؟" میں نے نہایت نرمی سے دریافت کیا۔

"میں اپنا خیال ظاہر نہیں کر رہی..... بلکہ میں نے اپنی آنکھوں سے اسے سیرا کو قتل کرتے دیکھا تھا۔" وہ جاگتی ہوئی آنکھوں سے گویا کوئی خواب دیکھتے ہوئے جھرجھری سی لے کر بولی۔ "وہ صفدر منیر تھا۔" اس نے جیسے اپنے گلے میں پھنسا ہوا کوئی گولا اگل دیا۔

"صفدر منیر.....؟" میں یک دم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ شاید وہ اپنے شوہر پر سے قتل کا شبہ ہٹانے کی کسی سازش میں شریک تھی اور اسی مہم پر نکلی ہوئی تھی۔

"آپ کو بہت حیرت ہوئی؟" اس نے ہلکی سی تلخی سے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔" میں نے اپنا لہجہ ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "صفدر منیر کو تو سیرا کے قتل سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ اس کی خاطر وہ اپنی بیوی کو طلاق دے رہا تھا اور اسی کی مدد سے وہ بہت بڑا آدمی بننے جا رہا تھا۔ اس نے زندگی بھر کے لیے جو پلاننگ کی تھی، سیرا کے قتل سے تو وہ برباد ہو کر رہ گئی۔ سیرا کے قتل سے تو کسی اور کو فائدہ پہنچ رہا تھا۔"

اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ ابھری۔ اس میں افسردگی بھی تھی اور تلخی بھی۔ بوجھل سی سانس لے کر وہ بولی "میں سمجھ گئی..... آپ کا اشارہ میرے شوہر کی طرف ہے۔ آپ کا خیال درست ہی ہے۔ میرے شوہر بھی کوئی فرشتہ صفت آدمی نہیں ہیں۔ بہت زیادہ دولت کے لیے وہ بھی کسی کو قتل کرا سکتے ہیں لیکن سیرا کے بارے میں ایسا سوچنے کی ان میں ہمت نہیں تھی البتہ اس معاملے میں ان کا کردار کچھ اور ہے۔ میں اس کے بارے میں بھی آپ کو بتاؤں گی لیکن پہلے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیں کہ آپ کو میری بات پر یقین کرنا ہے یا نہیں..... میں آپ کے پاس قیاس آرائیوں یا اندازوں کے بارے میں نہیں بلکہ آنکھوں دیکھی صورتِ حال کے بارے میں بات کرنے آئی ہوں۔"

"معذرت خواہ ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا "میرا خیال ہے مجھے کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے آپ کی پوری بات سن لینی چاہیے۔"

"جی ہاں..... اور اس کے بعد مجھے صاف صاف بتا دیجئے گا کہ آپ کو اس بات پر یقین آیا یا نہیں..... اور یہ کہ اس سلسلے میں آپ کا ارادہ کیا ہے۔" وہ اب کچھ پُرسکون لہجے میں بولی "آپ چاہیں گے تو ہم بات یہیں ختم کر دیں گے۔ ہم دونوں ہی فرض کر لیں گے کہ میں یہاں آئی ہی نہیں تھی۔"

"بالکل ٹھیک۔" میں نے طمانیت کی سانس لے کر کہا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ وہ خفا ہو کر چلی نہ جائے۔ بڑی مشکل سے اس گتھی کے کھلنے کے آثار پیدا ہوئے تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میں نے آپ کی بات کا برا نہیں منایا ہے۔ آپ میرے شوہر پر شبہ کرنے میں حق بہ جانب ہیں۔ پولیس خود ابھی تک ڈھکے چھپے انداز میں ان کے بارے میں تفتیش کرتی پھر رہی ہے۔ اسی لیے وہ کبھی اصل قاتل تک نہیں پہنچ سکے گی۔ دولت کے لالچ میں قتل والی تھیوری بھی درست ہے۔ اس دنیا میں تو بعض اوقات چند ہزار روپوں کے لیے نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا ہے اور ہمارے بارے میں تو خود ہمارے پیارے نبیؐ نے فرمایا ہے کہ میری امت کا فتنہ مال ہے....."

اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ مذہبی رجحان بھی رکھتی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "بظاہر تو بے شک یہی نظر آتا ہے کہ سیرا کو قتل کرنے میں صفدر منیر کا بہت بڑا نقصان تھا..... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میرے اندازے کے مطابق اس وقت وہ بہت زیادہ اشتعال میں آگیا تھا جب وہ اچانک پتھر کا وہ بت اٹھا کر اس کے سر مار بیٹھا۔ ظاہر ہے اشتعال کے عالم میں انسان اپنے نفع و نقصان کا حساب کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ دوسری بات یہ کہ پرنس انڈسٹریز کے معاملات اس قدر پھیلے ہوئے اور الجھے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ خود صفدر منیر کا کردار اتنا الجھا ہوا ہے کہ یہ فیصلہ کرنا کم از کم ہم لوگوں کے لیے مشکل ہے وہ سیرا کو مار کر فائدے میں رہا ہے یا نقصان میں؟"

"آپ کی یہ بات بھی اپنی جگہ الجھی ہوئی لیکن دلچسپ ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر حزن و ملال کے سائے برقرار رہے اور وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی "اس رات بظاہر تو میں اس وقت سیرا کے اسٹوڈیو میں پہنچی تھی جب آپ اس کی لاش کے قریب بیٹھے تھے لیکن درحقیقت میں اس سے پہلے بھی وہاں آچکی تھی اور اس وقت میں نے سیرا کو صفدر کے ہاتھوں قتل ہوتے دیکھا تھا....." اس کی آواز ایک لمحے کے لیے رندھ سی گئی۔

"اوہ..... میں کچھ اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا اس یاد کی اذیت کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے بولی "سیرا کے گھر اور اسٹوڈیو کے طور پر استعمال ہونے والے دونوں بنگلوں کی ایک ایک فاضل چابی میرے پاس ہی تھی۔ میں جب چاہتی تھی اس کے پاس چلی جاتی تھی۔ اس رات بھی میں اچانک بغیر کسی پروگرام کے اس کے اسٹوڈیو چلی گئی تھی۔ میرے ساتھ ڈرائیور بھی نہیں تھا۔ گاڑی میں خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ اسٹوڈیو پہنچ کر حسبِ عادت میں تالا کھول کر سیدھی اندر چلی گئی۔ میں نے کافی دور سے ہی بڑے ہال میں بحث و تکرار کی آوازیں سنیں۔ سیرا اکثر وہیں بیٹھ کر کام کرتی تھی۔ میں نے آوازیں بھی پہچان لیں۔ وہ سیرا اور صفدر کی آوازیں تھیں۔ اس سے پہلے بھی میں نے انہیں کئی بار بحث و تمحیص کرتے سنا تھا لیکن اتنے غصے سے بات کرتے کبھی نہیں سنا تھا۔ میں دروازے کی طرف جانے کے بجائے بغلی دیوار کی کھڑکی کی طرف چلی گئی اور کان لگا کر سننے لگی۔"

ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ بولی "ان کے درمیان بحث شاید کافی دیر سے جاری تھی اور میں اس کا بیشتر حصہ نہیں سن سکی تھی لیکن جو باتیں میں سن سکی تھی اور میری اپنی بھی جو معلومات تھیں ان کی روشنی میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ موضوعِ بحث کیا تھا۔ پرنس انڈسٹریز کو سیٹھوں کی کوئی سینڈیکیٹ خریدنا چاہ رہی تھی۔ سیرا اپنا حصہ بیچ دینے کے لیے تیار تھی..... بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ بضد تھی جب کہ صفدر اسے منع کر رہا تھا۔ ایک دوسرے پر بہت سے الزامات بھی لگائے گئے۔ بحث سنگین صورت اختیار کر گئی۔ میں اس دوران میں کھڑکی کے ایک کونے سے جھانک کر اندر دیکھنے لگی تھی۔ صفدر غصے میں شاید اسے تھپڑ یا گھونسا مارنے کے لیے جھپٹا لیکن کسی چیز سے الجھ کر گر پڑا۔ شاید اسے خاصے زور کی چوٹ لگی۔ اس کا غیظ و غضب کچھ اور بڑھ گیا۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح اٹھا۔ سیرا اس وقت بھی اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔ اس کے گویا وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اسے صفدر کی طرف سے کوئی خطرہ ہو سکتا تھا۔ صفدر نے نہایت پھرتی سے کالے پتھر کا وہ بت اٹھایا اور سیرا کی کھوپڑی پر پوری قوت سے دے مارا۔ وہ فرش پر گری اور ساکت ہو گئی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ مر چکی تھی اور اس کے ساتھ ہی گویا میرے جسم سے جان نکل گئی....." یاد کے اس زخم سے اٹھنے والی ٹیس نے اسے کچھ دیر کے لیے رونے پر مجبور کر دیا۔ چند لمحے وہ خاموشی سے ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھتی رہی۔ میں نے اسے دل کا غبار نکالنے کا موقع دیا۔

آخر جب میں نے محسوس کیا کہ وہ جواب دینے کے قابل ہو گئی ہے تو پوچھا "آپ کا ردِعمل کیا تھا؟"

"شرم ناک....." اس نے بلا تامل جواب دیا "چند لمحے تک مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا اور جب یقین آیا تو دنیا گویا میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگی۔ جب مجھ میں اتنی جان آئی کہ صحیح طور پر حرکت کر سکتی تو میں دبے قدموں وہاں سے بھاگ لی کیونکہ صفدر ابھی وہاں سے نکلنے کی تیاریاں کر رہا تھا اور میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ مجھے وہاں دیکھے ورنہ وہ مجھے بھی قتل کر دیتا....."

پھر اس نے شاید میرے تاثرات دیکھے اور بولی "آپ شاید میری بات پر حیران ہو رہے ہوں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ صفدر منیر کے بارے میں کوئی یہ نہیں جانتا کہ وہ کتنا خطرناک آدمی ہے اور کتنے خطرناک لوگوں سے اس کے روابط ہیں۔ مجھ جیسی عورت..... احمد پرویز جیسے آدمی کی بیوی بھی اس سے خوف زدہ رہتی تھی۔ میں اتفاق سے اسے نوجوانی کے زمانے سے جانتی ہوں۔ وہ ایک پُراسرار اور مافیائی قسم کی شخصیت ہے اور مافیائی قسم کے لوگوں سے ہی اس کے رابطے ہیں۔ وہ ایک مہذب، خوش اطوار اور پڑھے لکھے شخص کے لبادے میں چھپا ہوا ایک بھیڑیا ہے۔"

"حیرت ہے!" میں کہے بغیر نہ رہ سکا "آپ کی بہن کو زندگی بھر شادی کرنے کے لیے کوئی ڈھنگ کا آدمی نہیں مل سکا۔ اس نے پہلے جن دو شخصیات سے شادی کی وہ بھی عجیب و غریب تھیں اور یہ تیسرا آدمی منتخب کیا تو یہ آپ کے بیان کی روشنی میں کمال کی چیز ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" وہ افسردگی سے بولی "یہ شاید اسے کسی کی بددعا لگی ہوئی تھی۔ ماں باپ کی تو وہ ہمیشہ نافرمان رہی۔ اس کے مزاج میں ایک عجیب سی سرکشی تھی۔ ویسے بظاہر وہ کچھ ایسی نافرمان بھی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ بس اس نے شادی کے معاملے میں کبھی ڈیڈی کی نہیں مانی۔ شاید اسے اسی بات کی سزا مل رہی تھی کہ دنیا کی باقی ہر نعمت اسے بہت افراط سے حاصل تھی لیکن زندگی میں کوئی ہم سفر صحیح نہیں مل سکا۔ ہر بار کوئی عجیب ہی آدمی اسے ٹکرا جاتا تھا اور وہ اس کے چکر میں آجاتی تھی حالانکہ وہ کوئی ایسی بے وقوف بھی نہیں تھی۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھی۔ دنیا گھومے ہوئے تھی۔ دولت و جائیداد کے معاملات بڑی عمدگی سے سنبھالے ہوئے تھی۔ غرض کہ اور کسی بھی اعتبار سے بے وقوف معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کا یہ تیسرا انتخاب تو پچھلے دو سے بھی بڑھ کر تھا۔ صفدر نہ صرف سانپ کی طرح زہریلا اور خطرناک تھا بلکہ شادی شدہ بھی تھا۔"

"آپ نے کبھی سیرا کو سمجھانے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے پوچھا "ہو سکتا ہے وہ اس حقیقت سے باخبر رہی ہو کہ صفدر ایک مافیائی قسم کی شخصیت ہے اور مافیائی شخصیتوں سے اس کے رابطے ہیں۔"

"میں نے اسے کئی مرتبہ خبردار کیا لیکن وہ ایسی باتوں کو خاطر میں کہاں لاتی تھی۔" واجدہ دکھ سے بولی "جس نے ان معاملات میں کبھی باپ کی نہیں مانی وہ میری بھلا کیا مانتی۔ ہنس کر کہتی تھی کہ یہ تو بہت اچھی بات تھی کہ صفدر خطرناک آدمی تھا۔ بے ضرر شوہر بھلا کس کام کا؟ اس کا کہنا تھا کہ اس جیسی لڑکی کے لیے خطرناک

شوہر ہی سوٹ کرتا ہے۔ اسے ایسے ہی شوہر کی ضرورت تھی۔ جہاں تک اس کی پہلی بیوی کا تعلق تھا تو وہ بھی کوئی مسئلہ نہیں تھی' اسے وہ طلاق دے رہا تھا۔ سیمرا نے شاید کبھی یہ سوچنے یا دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ اس کی بیوی کون تھی' کس قسم کی عورت تھی اور نہ ہی سیمرا نے کبھی اس بات پر کوئی پچھتاوا یا خلش محسوس کی کہ صفدر کی بیوی کو محض اس کی وجہ سے طلاق ہو رہی تھی۔ وہ اس قسم کی جذباتی سوچوں میں الجھنے کی قائل نہیں تھی۔"

کمرے میں چند سیکنڈ گہرا سکوت رہا پھر میں نے پوچھا "صفدر نے یہ حرکت کر گزرنے کے بعد فوری طور پر کیا کیا؟"

"وہ چند سیکنڈ کے لیے سیمرا پر جھکا' اس کی نبض دیکھی جس سے یقیناً اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکی تھی۔ اسے شاید صرف خفیف سا دھچکا لگا تھا جیسے کسی کے ہاتھ سے غیر ارادی طور پر گلاس گر کر ٹوٹ جائے لیکن پھر میں نے اسے یونہی کندھے اچکاتے دیکھا جیسے دل میں سوچ رہا ہو' چلو کوئی بات نہیں..... ایک گلاس ہی تو تھا..... اگر ٹوٹ گیا تو کیا ہوا۔ پھر اس نے نہایت اطمینان سے مجسمے کا سر صاف کیا۔ اس نے اسے سر کی طرف سے ہی پکڑا تھا۔"

"اس مجسمے پر کامران دانش کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے تھے۔" میں نے اسے بتایا۔

"ہاں..... مجھے معلوم ہے۔ پولیس کی تفتیش سے پتا چلا تھا کہ اس واقعے سے پہلے کامران وہاں موجود تھا۔ سیمرا نے اسے کھانا وغیرہ لینے بھیجا تھا۔ اس کی عدم موجودگی میں صفدر وہاں پہنچا۔ اس کے ہاتھوں سیمرا کا قتل ہوا اور وہ رخصت بھی ہو گیا۔ کامران واپس آیا تو اسے سیمرا کی لاش ملی اور وہ حواس باختہ ہو کر بھاگ گیا۔ ممکن ہے اسی دوران میں اس نے مجسمے کو ہاتھ لگایا ہو یا پھر شاید اس سے پہلے جب وہ وہاں موجود تھا تو سیمرا نے مجسمہ اسی سے اٹھوا کر اپنے قریب منگوایا ہو کیونکہ وہ اس جگہ نہیں رکھا ہوتا تھا جہاں صفدر کا ہاتھ اچانک ہی اس پر پڑ گیا۔"

"اس کے بعد جو وہ وہاں سے رخصت ہو گیا؟"

"میں نے رخصت ہوتے نہیں دیکھا لیکن وہ اپنا کوٹ پہننے لگا تھا جو اس نے ایک کرسی پر لٹکایا ہوا تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ رخصت ہونے لگا تھا۔ میں ہڑبڑا کر اس سے پہلے ہی وہاں سے نکل بھاگی۔"

"یہ ایک غیر فطری سا ردِ عمل تھا۔ آپ کو وہاں شور مچانے یا پولیس کو فون کرنے کے لیے کسی طرح فون تک پہنچنے کا خیال نہیں آیا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"شور.....؟" وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی "آپ نے وہ جگہ..... وہ بنگلا..... وہ علاقہ دیکھا ہوا تو ہے۔ وہاں میرا شور کون سنتا؟ میری پہلی ہی چیخ کے دوران میں شاید وہ میرے سر پر آن پہنچتا اور میرا گلا دبا دیتا یا مجھے گولی مار دیتا۔ وہاں تو گولی کی آواز کی طرف بھی شاید کسی کی توجہ نہ جاتی۔ البتہ فون تک پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ فون تو میری اس گاڑی میں بھی موجود تھا جس میں بیٹھ کر میں وہاں پہنچی تھی۔ اسی میں بیٹھ کر میں عجیب و غریب کیفیت میں وہاں سے گھر آ گئی۔ گھر آ کر کچھ دیر میں میری حالت سنبھل گئی لیکن فیصلہ میں پھر بھی نہ کر سکی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔"

"آپ کے شوہر اس وقت کہاں تھے؟"

"وہ نوری آباد والے کارخانے میں تھے۔"

"آپ کو انہیں اطلاع دینے کا خیال نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے ان کی سلامتی بھی عزیز تھی۔" وہ بولی "صفدر کے صحیح طور پر گرفت میں آنے کا واحد طریقہ یہی تھا کہ وہ رنگے ہاتھوں پکڑا جاتا۔ مجھے معلوم تھا کہ اب خواہ ہم میاں بیوی کچھ بھی کہیں' اس کے شاطر وکیل اور اس کی پشت پناہی کرنے والے پُراسرار اور خطرناک لوگ اسے بچا کر نکال لے جائیں گے اور اگر وہ کچھ عرصہ جیل میں رہ بھی گیا تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس کے نہ جانے کیسے کیسے مددگار باہر ہوں گے۔ جس کسی نے بھی سامنے آکر اس پر قتل کا الزام عائد کیا ہوگا اس کی زندگی خطرے میں رہے گی اور وہ جلد یا بدیر جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ اس خوف نے مجھے کسی بھی فیصلے پر نہ پہنچنے دیا۔"

"آپ نے بہت بڑی غلطی کی۔" میں نے تاسف سے کہا "آپ نے بہت سے لوگوں کو بلاوجہ بہت سی تکلیفوں میں مبتلا رکھا۔ اسی چکر میں ایک بے گناہ کی جان بھی چلی گئی اور قاتل آج تک آزاد رہا۔ آپ کم از کم ایک گمنام ٹیلی فون کال کر کے پولیس کو یہ اطلاع دے سکتی تھیں۔ پولیس اور..... خاص طور پر انسپکٹر رحیم گل خواہ صفدر پر قتل کا الزام ثابت نہ کر پاتا لیکن ایک بار شک کا بیج اس کے ذہن میں پھوٹ پڑتا اور صحیح سمت میں اس کی ذرا سی رہنمائی ہو جاتی تو پھر وہ اسی طرف لگا رہتا اور صفدر کو سزا دلوانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال ہی لیتا۔ وہ اس قسم کے معاملات میں بہت ضدی ہے۔ اگر ایک بار اسے خود کسی وجہ سے کسی بات کا یقین ہو جائے تو پھر وہ اسے ثابت کر کے چھوڑتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے اسے یقین ہی نہ آتا۔" واجدہ افسردگی سے بولی "بہرحال میں اپنی غلطی تو تسلیم کر رہی ہوں اور اسی کی تلافی کا کوئی طریقہ تو میں تلاش کر رہی ہوں۔"

"خیر..... تو آپ کے گھر پہنچنے کے بعد کیا ہوا؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"کچھ دیر بعد صفدر کا فون آ گیا۔ کہنے لگا کچھ دیر پہلے اس کی سیمرا سے فون پر بات ہوئی تھی۔ کسی وجہ سے وہ پہلے ہی غصے میں لگ رہی تھی پھر ان کے درمیان یونہی نوک جھوک سی ہوئی اور سیمرا نے فون بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد وہ دوبارہ سیمرا کو فون کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ فون نہیں اٹھا رہی تھی۔ اس نے درخواست کی کہ میں جا کر ذرا اسے سمجھاؤں اور خیال رکھوں کہ

جذباتی حرکت نہ کر گزرے۔ میں سمجھ گئی' وہ چاہتا تھا کہ میں جا کر لاش دریافت کروں۔ میں نے سوچا کہ شاید لاش جلد دریافت کر لینا بہتر ہی ثابت ہوگا۔ اس لیے میں وہاں چلی گئی اور اتفاق سے وہاں میں نے آپ کو وہاں موجود پایا۔"

"آپ نے مجھے دیکھ کر یوں چیخ ماری تھی جیسے واقعی آپ مجھے قاتل سمجھ رہی ہوں۔" میں نے کہا "اب میں آپ کی اداکارانہ صلاحیتوں... اداکارانہ صلاحیتوں کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"شاید ہر انسان کے اندر ایک اداکار چھپا ہوتا ہے۔" وہ ذرا توقف سے بولی "مجھے اس وقت ایک انجان اور بے خبر انسان کا کردار ادا کرنا تھا۔ عام طور پر اس قسم کی صورتِ حال میں جائے واردات پر اچانک پہنچنے والے کا ردِ عمل یہی ہوتا ہے کہ وہ جسے بھی لاش کے قریب جھکا ہوا دیکھتا ہے اسے ہی قاتل سمجھتا ہے۔ پولیس بھی اکثر یہی سمجھتی ہے۔ فلموں' ڈراموں میں بھی اسی طرح دکھایا جاتا ہے۔"

"شکر ہے آپ نے اپنے الزام پر اصرار نہیں کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اصل بات مجھے معلوم جو تھی۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی "مجھے غلطی کا اظہار کرنے پر پہلے ہی ندامت تھی۔"

"پھر جب پولیس نے کامران دانش کو اپنے تمام تر شبہات کا ہدف بنایا تب آپ کا ردِ عمل کیا تھا؟" میں نے پوچھا "پھر بھی آپ نے زبان کھولنے کے بارے میں نہیں سوچا؟"

"بہت سوچا..... اور پھر اس پر عمل بھی کیا۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا..... وہ کیسے؟" میں نے حیرت سے پوچھا کیونکہ اس نے اگر واقعی زبان کھولی تھی تو پھر حالات بہت مختلف ہونے چاہئیں تھے۔

"میں نے صرف اپنے شوہر کے سامنے زبان کھولی۔ میں نے ان کو ساری بات بتا دی۔ وہ پہلے تو کچھ خفا ہوئے جس کی مجھے توقع تھی پھر بہت ہی لمبی سوچوں میں الجھ گئے۔ انہوں نے پورا ایک دن اسی سوچ بچار میں گزار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں اس بات کو اتنی دیر چھپا کر خود بھی شریکِ جرم بن گئی تھی لیکن انہوں نے خود بھی تاخیر میں اضافہ کر دیا۔ دوسرے دن انہوں نے مجھے مشورہ..... بلکہ حکم دیا کہ اب مجھے زبان بند رکھنی چاہیے اور حالات جس نہج پر جا رہے تھے انہیں جانے دینا چاہیے تھا' وہ خود ہی بعد میں صفدر کو اس کے کیے کی سزا دینے کا کوئی اور طریقہ نکالیں گے۔"

"یعنی یہ معاملہ ٹھنڈا پڑنے کے بعد کبھی کرائے کے قاتلوں سے اس کو ٹھکانے لگوا دیں گے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"شاید ان کا مقصد یہی رہا ہو۔" وہ غیر واضح لہجے میں بولی۔ "اگرچہ وہ اپنی زبان سے اپنے شوہر کے ایسے عزائم کی تصدیق تو نہیں کر سکتی تھی "لیکن مجھے معلوم ہے وہ ایسا کر نہیں سکتے۔ بے شک ان کے پاس وسائل ہیں' دولت ہے' ان کا کافی اثر رسوخ بھی ہے اور وہ اپنے رویے سے بہت تند خو بھی دکھائی دیتے ہیں لیکن مزاجاً وہ درحقیقت ایسے قوی نہیں ہیں۔ وہ اس طرح کی کوئی حرکت نہیں کر سکتے۔ خصوصاً صفدر منیر کا کوئی بندوبست کرنے کے بارے میں تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے۔ وہ اسے آنکھیں ضرور دکھاتے رہتے ہیں لیکن دل ہی دل میں وہ اس سے خوف زدہ رہتے ہیں۔ وہ شاید اس کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔"

"بہرحال آپ نے شوہر کے مشورے یا حکم پر عمل کیا؟"

"جی ہاں..... لیکن میں اس پر خوش نہیں تھی۔ پھر کامران دانش کے پُراسرار انداز میں مارے جانے کی خبر آئی۔ اس کے بعد سے تو ہم میاں بیوی کو بالکل ہی چپ لگ گئی۔ لیکن اب یہ خاموشی میرے لیے بالکل ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی ہے۔ میں کسی کی مدد کی اشد ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میں نے اچانک ہی آپ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کیا۔ کل وقت طے کرنے کے باوجود ملاقات نہیں ہو سکی۔ اسی لیے آج میں فون کیے بغیر ہی اچانک آ گئی۔ میں نے سوچا کل کی گڑبڑ سے آپ جتنی کوفت اٹھا چکے ہیں اس کے بعد اگر میں نے آج بھی ملاقات کے لیے وقت طے کرنے کی غرض سے آپ کو فون کیا تو کہیں آپ غصے میں مجھے بُرا بھلا کہنا ہی شروع نہ کر دیں۔"

"خیر ابھی میں اتنا غصہ ور اور بد اخلاق نہیں ہوا کہ خواتین کو برا بھلا کہنے لگوں۔"

"میں آپ سے مدد لینے تو آ گئی ہوں لیکن مسئلہ یہی ہے کہ میں اتنی دیر زبان بند رکھ چکی ہوں کہ اب واقعی اپنے آپ کو صفدر ہی کے درجے کا مجرم محسوس کر رہی ہوں۔ اب تو میں سامنے آنے کی بالکل ہی ہمت نہیں کر سکتی۔ اب تو نہ صرف یہ کہ میں قانون کی طرف سے کسی ہمدردی کی مستحق نہیں ٹھہروں گی بلکہ میرے اپنے شوہر کی حمایت بھی شاید مجھے حاصل نہ رہے۔ معلوم نہیں وہ مجھ سے کتنے ناراض ہوں اور اس کا انجام کیا ہو۔ خواہش میری یہی ہے کہ انصاف کے تقاضے بھی پورے ہو جائیں اور مجھے سامنے بھی نہ آنا پڑے..... لیکن میرا خیال ہے یہ کچھ زیادہ ہی بڑی خواہش ہے..... اور کافی خود غرضانہ بھی ہے۔ میں اس کی مستحق نہیں ہوں کہ میری یہ خواہش پوری ہو۔ آپ چاہیں تو انکار بھی کر سکتے ہیں۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں ہوگا۔"

پھر اس نے گویا مجھے خبردار کیا "لیکن اگر آپ نے مجھے سامنے لانے اور کسی کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ یہ باتیں میں نے آپ کو بتائی تھیں تو میں صاف مکر جاؤں گی۔ میں ہرگز تسلیم نہیں کروں گی کہ میں کبھی آپ سے ملی تھی یا آپ سے میری اس موضوع پر کبھی کوئی بات ہوئی تھی۔"

"بہت خوب۔" میں نے سہلایا۔

وہ خفیف سی شرمندگی کے ساتھ بولی۔ "اگر آپ مجھے واقعی

تھوڑی سی ہمدردی کا ثبوت دینا چاہتے ہیں اور آپ کے پاس اتنا وقت اور حوصلہ ہے کہ بغیر کسی غرض کے میری کچھ مدد کر سکیں تو اس کے لیے آپ کو مجھے بیچ میں لائے بغیر ہی کچھ کرنا ہوگا۔ کوئی ایسا طریقہ سوچنا ہوگا جس میں میرا نام بیچ میں لانے کی ضرورت نہ پڑے۔" پھر اس نے قدرے التجائیہ سے لہجے میں پوچھا "کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں؟" التجا کے ساتھ ساتھ اس کے لہجے میں امید کا پرتو بھی تھا۔

"میں کوشش کروں گا لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کر رہا۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

"بہرحال آپ رازداری کا وعدہ کر رہے ہیں نا؟"

"ہاں۔" میں نے بلا تامل جواب دیا "کیونکہ آپ نے مجھ سے شناسائی نہ ہونے کے باوجود اتنی اہم بات کے سلسلے میں مجھ پر بھروسا کیا ہے تو میں آپ کا نام سامنے نہ لانے کا وعدہ کرتا ہوں خواہ اس معاملے میں کوئی پیش رفت ہو یا نہ ہو۔"

"شکریہ .... میرے لیے اتنی تسلی ہی کافی ہے۔" اس نے اطمینان کی گہری سانس لی "آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ جب سے یہ واقعہ ہوا ہے تب سے میں کیسے ذہنی کرب، تناؤ اور خوف کے عالم میں وقت گزار رہی ہوں۔ آپ سے کل کی ملاقات کا پروگرام گڑبڑ ہو جانے کے بعد میں نے یہ ارادہ ہی ترک کر دیا تھا لیکن آج صبح پھر گویا کسی غیبی طاقت نے مجھے مجبور کر دیا اور خواتین کے اس سیمینار کی آڑ میں مجھے پروگرام بنانے کا موقع مل گیا۔"

"ایسا بھی کیا خوف...!" اس نے ملائمت سے کہا "آپ کوئی ایسی معمولی یا لاوارث عورت تو نہیں ہیں جو سچی بات کے سلسلے میں اتنی خوف زدہ رہیں۔"

"جی ہاں... جو لوگ میری اور میرے شوہر کی پوزیشن سے واقف ہیں وہ تو یہ بات سن کر یہی کہیں گے ..... لیکن اصل کیفیت کو صرف میں ہی محسوس کر سکتی ہوں۔ جس دن میں سیمرا کو قتل ہوتے دیکھ کر خوف زدہ انداز میں اس بنگلے سے نکل کر بھاگی تھی اس کے بعد سے ایک عجیب سا خوف میرا پیچھا کر رہا ہے۔"

"یہ سچ کو چھپانے کا خوف ہے۔" میں نے فوراً کہا "جب ہم کسی پر ظلم اور زیادتی کو دیکھ کر چپ رہتے ہیں، اپنی زبان کو تالا لگا لیتے ہیں تو کوئی نہ کوئی خوف ہمارا تعاقب کرنے لگتا ہے۔ اپنی دانست میں ہم خوف اور برے نتائج سے بچنے کے لیے ہی خاموشی اختیار کرتے ہیں لیکن خوف پھر بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتا اور برے نتائج کسی نہ کسی دوسری شکل میں ہمارے منتظر رہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی اِن ڈائریکٹ سزا ہوتی ہے۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں لیکن زبان بند رکھنے والا اپنی مجبوری خود ہی بہتر سمجھ سکتا ہے۔ کوئی دوسرا اس پر صرف تبصرے کر سکتا ہے۔ مشورے دے سکتا ہے۔" اس کے لہجے کی تہ میں ہلکی سی تلخی پنہاں تھی۔

"آپ برا نہ محسوس کریں۔ میں آپ پر تنقید نہیں کر رہا اور نہ ہی واعظ بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں صرف ایک فلسفہ بیان کر رہا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا "ہو سکتا ہے صفدر حیات کا ایسا ہوا نہ ہو جیسا آپ نے تصور کر رکھا ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" وہ مضطرب انداز میں بولی "اسے یقیناً کچھ خطرناک لوگوں کی پشت پناہی حاصل ہے۔ جب سے میری اس سے شناسائی ہوئی ہے کئی بار ایسا اتفاق ہو چکا ہے کہ کسی شخص کے بارے میں اس نے ناپسندیدگی یا نفرت کا اظہار کیا اور کچھ عرصہ بعد وہ شخص غائب ہو گیا یا عبرت ناک انداز میں مارا گیا۔"

"یہ تو خاصی دلچسپ بات بتائی آپ نے۔"

"میں تو پھر بھی کسی حد تک گھر کی دنیا میں مگن رہنے والی عورت ہوں لیکن میرے شوہر تو باہر کی دنیا میں رہتے ہیں اور ہر جگہ میں ان کی رسائی ہے۔ وہ آسانی سے خوف زدہ ہونے والے تو بھی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود میں نے سیمرا کے قتل کے بارے میں حقیقت انہیں بتائی تو وہ خوف زدہ ہو گئے تھے اور انہیں چپ لگ گئی تھی۔ انہوں نے صرف یہی تبصرہ کیا تھا کہ صفدر ایک ایسا سانپ ہے جس کے راستے میں نہ آنا ہی بہتر ہے۔ ہم بچوں والے لوگ ہیں، ایک زندگی تو ضائع ہو ہی چکی ہے، ہم دوسری زندگیاں داؤ پر نہ لگائیں۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ صفدر اتنا معمولی آدمی نہیں ہے، جتنا نظر آتا ہے۔ شاید کبھی وہ معمولی تو رہا ہو لیکن اب اس کی جڑیں کہیں اور پہنچ چکی ہیں۔ اپنے شوہر کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے زبان بند رکھنے کے باوجود میں محسوس کرتی ہوں کہ میری نگرانی ہو رہی ہے۔ میں جہاں جاتی ہوں کوئی نادیدہ آنکھ میری نگرانی کرتی ہے۔ شاید ہمارے ٹیلی فون بھی ٹیپ ہوتے ہیں۔ میں کوئی ثبوت تو پیش نہیں کر سکتی لیکن میرا دل کہتا ہے کہ یہ سب میرا واہمہ نہیں ہے۔"

"ہمیں دلیل کے ساتھ سوچنا چاہیے۔" میں نے کہا "اگر آپ کے خیال میں یہ سب آپ کا وہم نہیں ہے اور اس کے پیچھے صفدر کا ہاتھ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ جب آپ سیمرا کے اسٹوڈیو سے خوف زدہ انداز میں نکل کر فرار ہو رہی تھیں تو اس وقت اس نے آپ کو دیکھ لیا تھا؟"

"یہ عین ممکن ہے۔" اس نے تائید کی۔

"اگر ایسا ہوا ہوتا اور صفدر واقعی اتنا خطرناک ہوتا تو وہ آپ کو اتنی کہ آپ اسے ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہیں تو وہ آپ کو اتنی مہلت نہیں دے سکتا تھا۔ اب تک وہ آپ کی زبان ہمیشہ کے لیے میں بند کر چکا ہوتا۔ وہ اتنے دن تک اپنے سر پر تلوار لٹکی نہ رہنے دیتا۔ آپ کو تو شاید سیمرا کے اسٹوڈیو سے اپنے گھر تک پہنچنے کی بھی مہلت نہ ملتی۔"

وہ الجھن آمیز سے انداز میں خاموش رہی تو میں نے کہا "تھوڑا زیادہ حقیقت پسند بن کر سوچنے کی کوشش کیجیے۔ کیمیا اصل میں

آنکھوں نے آپ کی نگرانی اور غیبی کانوں نے آپ کی ہر بات سننے کی کوشش اس وقت سے تو شروع نہیں کی جب سے آپ نے یہ بات اپنے شوہر کو بتائی ہے کہ سیمرا کا قاتل صفدر ہے؟"

"نہیں... نہیں..." میرا مطلب سمجھتے ہوئے اسے جھٹکا سا لگا اور اس نے پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا "میرے شوہر ایسے نہیں ہو سکتے..... وہ ایسا نہیں کر سکتے۔"

"آپ ایک شوہر پرست عورت ہیں اور آپ کا یہ جذبہ قابلِ قدر ہے۔ آپ کے طبقے میں آپ جیسی عورت اب کم ہی پائی جاتی ہے۔ لیکن یہ دنیا بہرحال ایک عجیب جگہ ہے..... اور جہاں بہت زیادہ دولت اور طاقت کے حصول کی کشمکش جاری رہتی ہے ان طبقوں کا تو بہت ہی عجیب حال ہے۔ وہاں کچھ بھی ممکن ہے اور کسی بھی چہرے کے پیچھے سے کوئی ناقابلِ یقین کہانی برآمد ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے اس بات میں آپ کے شوہر کا کچھ مفاد پوشیدہ ہو کہ آپ اپنی زبان بند رکھیں، قتل کا الزام صفدر پر نہ آئے اور کسی طرح کامران ہی قاتل ثابت ہو جائے۔"

"یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے!" وہ بے یقینی سے بولی۔ اس کی آنکھیں اب بھی پھیلی ہوئی تھیں۔

"یہ میں محض ایک نظریہ پیش کر رہا ہوں۔ ضروری نہیں ہے کہ یہ درست ہی ہو۔ بہرحال یہ بھی ایک امکان ہے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ جو کچھ آپ سوچ رہی ہیں وہی درست ہو۔ میں ابھی اس پر مزید سوچوں گا اور جلد ہی کوئی ایسا قدم اٹھانے کی کوشش کروں گا جس سے حقیقت سامنے آجائے لیکن آپ کو سامنے نہ آنا پڑے۔ آپ کے خاندان میں وراثت کی تقسیم اور خاص طور پر بزنس انڈسٹریز کی تقسیم اور فروخت کا معاملہ بہت پیچیدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس میں بہت سے زاویوں سے سوچ بچار کی ضرورت ہے اور کوئی بھی بات ممکن ہو سکتی ہے۔ اس لیے میں آپ سے بھی گزارش کروں گا کہ جہاں تک آپ کا ذہن کام کرتا ہے وہاں تک آپ بھی خوش گماں اور خوش فہم بن کر نہیں بلکہ سفاکی کی حد تک حقیقت پسند ہو کر سوچنے کی کوشش کیجیے۔"

"میں کوشش تو کروں گی..." وہ تھوک نگل کر بولی "لیکن آپ کی بات میرے دل کو نہیں لگ رہی۔"

"حقائق ہماری کوششوں سے بھی سامنے آتے ہیں اور کبھی کبھی ان تک پہنچنے کا خود بہ خود کوئی ذریعہ بھی نکل آتا ہے اور کبھی کبھی حقائق خود بھی اپنے آپ کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔" میں نے غیر ارادی طور پر ذرا فلسفیانہ سے لہجے میں کہا "ہم تھوڑا سا انتظار کر لیتے ہیں۔ شاید میں اس دوران میں کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جس طرح آپ قطعی غیر متوقع طور پر ایک انکشاف لے کر سامنے آئی ہیں کسی طرح کوئی اور ایسا ذریعہ نکل آئے جس سے کوئی انکشاف ہو۔ آپ ان ساری الجھنوں کو ذہن سے جھٹک دیں اور خاموشی سے گھر بیٹھیں۔ یوں سمجھ لیں کہ اب یہ میرا سردرد ہے۔"

"بہت شکریہ۔" اس کے لہجے میں طمانیت جھلک آئی "مجھے امید تھی کہ آپ سے مل کر کچھ نہ کچھ بات ضرور بنے گی۔ شکر ہے میرا اندازہ درست نکلا۔" پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب میں چلتی ہوں۔ آپ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش نہ کیجیے گا۔ میں خود ہی کوئی مناسب موقع اور مناسب ذریعہ دیکھ کر آپ سے رابطہ کر لیا کروں گی۔"

اس نے دہرا نقاب چہرے پر گرایا اور جانے کے لیے مڑی تو میں نے پوچھا "آپ کے لیے گاڑی منگواؤں؟"

"جی نہیں... میں جس ٹیکسی میں آئی تھی اسے میں نے روک رکھا ہے۔" اس نے کہا اور رخصت ہو گئی۔

اسے مجھ سے یا مجھے اس سے رابطہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ چند گھنٹے بعد ہی رحیم گل کا فون آیا اور خلافِ معمول وہ کسی تمہید یا چھیڑ چھاڑ کے بغیر بولا "میرے پاس ایک افسوسناک اطلاع ہے۔ بظاہر تو اس سے تمہارا کوئی تعلق نہیں بنتا لیکن چونکہ تم پرنس سیمرا والے معاملے میں گہری دلچسپی لے رہے ہو اس لیے میں نے سوچا یہ خبر اخبارات میں آنے سے پہلے تمہیں سنا دوں۔ تقریباً دو گھنٹے پہلے واجدہ پرویز کو جمخانہ والی سڑک پر قتل کر دیا گیا ہے۔ وہ خواتین کے سیمینار میں شرکت کر کے گھر واپس آنے کے لیے روانہ ہوئی تھی۔"

"نہیں ...." بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور میں نے گویا اس دھچکے سے سنبھلنے کے لیے سہارے کے طور پر ریسیور کو مضبوطی سے تھام لیا "کیسے .... کیسے ہوا یہ...؟"

"بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ موٹر سائیکل پر سوار تین نوجوانوں نے اس کے ڈرائیور سے گاڑی چھیننے کی کوشش کی لیکن اس کی..... اور شاید واجدہ کی بھی مزاحمت پر دونوں کو گولی ماردی۔" اس کے لہجے میں تاسف تھا "تمہیں معلوم ہے اس قسم کے واقعات کا کوئی گواہ میسر نہیں آتا۔ بڑی مشکل سے ایک گواہ میسر آیا ہے۔ وہ ایک پارکنگ لاٹ میں چوکیدار ہے۔ اس نے بھی خاصی دور سے یہ واقعہ رونما ہوتے دیکھا تھا اس لیے اس کا اندازہ ہے کہ یہ گاڑی چھیننے کی کوشش تھی جو ناکام ہو گئی۔ ممکن ہے اصل بات کچھ اور ہو اور ڈرائیور کو چار اور واجدہ کو پانچ گولیاں ماری گئی ہیں گویا یہ یقین کرنا مقصود تھا کہ دونوں لازماً موقع پر ہی مر جائیں۔ کسی کے زندہ رہنے کا کوئی امکان نہ رہے۔"

اس اطلاع نے واقعی میرے دل پر ایک گہری خراش ڈال دی۔ میں تو ابھی یہی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اس نے مجھے جو بات بتائی تھی وہ رحیم گل کو بتائی جائے یا نہیں... کہ وہ اس دنیا سے رخصت ہو گئی تھی۔ کیا برقع والی احتیاط کے باوجود کسی نے اسے میرے ہاں آتے دیکھ لیا اور پہچان لیا تھا؟ اس صورت میں تو شاید اسے میرے ہاں سے جاتے ہوئے ہی مار دیا جاتا۔ ممکن ہے اس

وقت فوری طور پر کہیں سے چھینی گئی موٹر سائیکلیں اور ماہر پیشہ ور قاتلوں کا فوری طور پر بندوبست نہ ہوسکا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ میرے ہاں آنا ہی واجدہ کے فوری قتل کا باعث نہ بنا ہو بلکہ اسے قتل کیے جانے کا پروگرام پہلے ہی سے طے ہو لیکن نامعلوم لوگوں کو مناسب موقع اب ہاتھ آیا ہو۔

"کوئی سراغ۔۔۔" گو کہ مجھے موہوم سی بھی امید نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں یہ سوال میری زبان سے پھسل گیا۔

وہ خود استہزائی انداز میں ہنسا "بھری پری سڑکوں پر رونما ہونے والے اس قسم کے واقعات کا کوئی گواہ نہیں ملتا تو سراغ کہاں سے ملے گا؟ موٹر سائیکل یقیناً چھینی ہوئی ہوگی۔ اسلحہ بے حساب موجود ہے۔ دہشت گردی اور اس کی سرپرستی کے ٹریننگ کیمپ گلی گلی کھلے ہوئے ہیں۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ شاید میں غلط کہہ رہا ہوں۔۔۔ سارا قصور ہم پولیس والوں کا ہے جن میں آدھے سے زیادہ جاہل' کاہل' کرپٹ اور نااہل ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ ان میں سے بھی اکثریت بڑے بڑے سرکاری اور غیر ملکی سفارتی لوگوں کی حفاظت پر لگی رہتی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ خود پولیس افسروں کو اپنی حفاظت کے لیے کافی پولیس چاہیے ہوتی ہے۔ باقی جو بچتی ہے ان میں سے جو بے چارے ایماندار اور فرض شناس ہیں ان کی لاکھوں آنکھیں ہونی چاہئیں تاکہ وہ ہر وقت شہر کے گلی کوچے اور ہر موڑ پر نظر رکھ سکیں۔"

"یہ اس قسم کی باتیں کرنے کا موقع نہیں ہے۔" میں نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی "تم کہاں سے بول رہے ہو؟"

"آفس سے۔" اس کے لہجے میں تھکن جھلک آئی "میں ابتدائی تفتیش اور واجدہ کی لاش اسپتال پہنچانے کے بعد واپس آیا ہوں۔"

"احمد پرویز پہنچ گیا تھا؟"

"ہاں۔۔۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ پوسٹ مارٹم نہیں ہونے دے گا۔ یہ محض وقت کا زیاں اور لاش کی بے حرمتی ہوگی جب کہ موت کی وجہ صاف ظاہر ہے۔" رحیم گل نے بتایا۔

"وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" میں نے کہا "مجموعی طور پر اس کا ردِعمل کیا تھا؟"

"وہ مجھے ایک بالکل مختلف احمد پرویز دکھائی دیا۔ اس نے نہ تو مجھ سے الجھنے کی کوشش کی اور نہ ہی پولیس کے محکمے کو اس کی نااہلی پر بُرا بھلا کہا۔ اس نے ڈی آئی جی اور آئی جی صاحبان سے اپنی شناسائی کے حوالے بھی نہیں دیے۔ اس میں وہ پرانی اکڑفوں بالکل ہی دکھائی نہیں دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس واقعے نے اسے بالکل توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہے بلکہ میں یہ بھی کہوں تو شاید غلط نہ ہو کہ میں نے اسے اندر ہی اندر کچھ خوف زدہ بھی محسوس کیا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا سامنا ایسے احمد پرویز سے ہوگا۔"

"تم نے اس سلسلے میں کیا کارروائی کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو وہی روایتی سے اقدامات کیے ہیں۔" وہ سنبھل کر بولا "جائے واردات کا تفصیلی معائنہ کیا جارہا ہے۔ کار کے فنگر پرنٹس تلاش کیے جارہے ہیں۔ گولیوں کے خول جمع کرکے ان کا معائنہ کیا جارہا ہے۔ پولیس کو الرٹ کروایا گیا ہے۔ کچھ جگہوں پر ناکا بندی کردی گئی ہے۔ یہ سب خانہ پری کی باتیں ہیں۔ سانپ گزر جانے کے بعد لکیر پیٹنے والی بات ہے۔ جب تک گشت پر اور مختلف مقامات پر تعینات رہنے والی پولیس چوکس نہیں ہوگی۔ لوگ دیانت داری سے اپنے فرائض انجام نہیں دے گی تب تک اس قسم کی وارداتوں کی روک تھام بڑی مشکل ہے۔ مہیا کیے گئے وسائل ہی بہت کم ہیں پھر ان میں مستعد' بے خوف اور دیانت دار اہل کاروں کی تعداد اور بھی کم ہے۔ واردات کے بعد تو منصوبہ بندی کے تحت ایسے ماہر اور مشاق لوگوں کو غائب ہونے کے لیے پانچ دس منٹ کی مہلت بھی کافی ہے۔ کوئی بھی گھر ان کی پناہ گاہ ہوسکتا ہے۔"

مجھے اس کی بے چارگی کا احساس تھا۔ گندے پانی کے بہتے ہوئے ایک ریلے میں بے چارہ ایک تنکا کیا کرسکتا تھا؟ مگر وہ پھر بھی بڑی ہمت والا "تنکا" تھا۔ اپنی سی کوشش کرتا ہی رہتا تھا۔ میں نے بوجھل دل سے کہا "بہرحال۔۔۔ جو کچھ ہوا بہت بُرا ہوا۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" وہ گہری سانس لے کر بولا "جس طرح ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں اسی طرح بعض اوقات ایک قتل چھپانے کے لیے مزید کئی قتل کرنے پڑتے ہیں لیکن لہو بہرحال خود قاتل کا سراغ دیتا ہے۔ صورتِ حال بڑی مایوس کن ہے لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں قاتل کے قریب پہنچ رہا ہوں۔"

"کبھی کبھی خوش گمانی میں مبتلا ہونا بھی اچھا ہوتا ہے۔ میں تم سے پھر بات کروں گا۔ شاید ہمیں ایک بہت ضروری ملاقات کرنی پڑے۔" میں نے کہا اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر پوچھا "کوئی اور بات جو تمہیں اہم' خاص یا عجیب لگی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ ایک بات عجیب لگی۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "واجدہ پرویز کے ہینڈ بیگ میں ایک سیاہ برقع موجود تھا جب کہ وہ برقع نہیں پہنتی تھی اور قتل کے وقت بھی وہ برقع میں نہیں تھی۔"

"اچھا۔۔۔؟" میں نے لہجے میں دلچسپی کا اظہار کرنے کی کوشش کی "اور تمہارے خیال میں اس کا مطلب کیا ہوسکتا ہے؟"

"میرے خیال میں اس کا مطلب یہ ہے کہ واجدہ پرویز کسی سے خفیہ ملاقات کے ارادے سے گھر سے نکلی تھی۔ اب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ ملاقات ہوچکی تھی یا ابھی ہونا تھی۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "ہوسکتا ہے تمہارا خیال درست ہو۔ بہرحال۔۔۔ اگر اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہو تو مجھے ضرور بتانا۔ میں بھی ایک ٹریک پر کام کررہا ہوں۔" میں نے

اسے اشارہ دے دینا بہتر سمجھا۔

"کوشش کرنا کہ وہ ٹریک تمہیں مجھ سے دور نہ لے جائے۔" اس نے خبردار کرنے والے انداز میں کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

میں اس کے بعد دیر تک خیالات میں الجھا رہا۔ واجدہ کی ناگہانی موت کی خبر نے واقعی دل بوجھل کردیا تھا۔ اب میں ایک اور پہلو پر بھی غور کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ سیرا کے قتل سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ جن لوگوں تک پھیلتا جارہا تھا شاید وہ اتنے غیر اہم نہیں تھے جتنے میں سمجھ رہا تھا۔ مرعوب نہ ہونا میں نے اپنی عادت بنالی تھی اور اگر کوئی فرد' گروہ یا ٹولا غلط کار تھا' خبیث تھا تو پھر خواہ وہ کتنا ہی خطرناک تھا' میری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ میں خود آگے بڑھ کر بھی بلاسبب اس سے الجھنے میں کوئی خوف محسوس نہیں کرتا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ میری یہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی ہوتی تھی کہ سچائی کی طاقت میرے ساتھ ہے لیکن آج میں پہلی بار سوچنے پر مجبور ہوا کہ کہیں میں غیر ضروری الجھنیں تو مول نہیں لے رہا تھا؟ کہیں میں مافیائی لوگوں کو بہت ہی کتر بیانوں سے تو نہیں ناپنے لگا تھا؟ مافیاؤں نے تو ان ملکوں میں بھی مہذب معاشرے کو ناکوں چنے چبوا رکھے تھے جہاں قانون کی حکمرانی تھی۔ ہمارے ہاں تو صورتِ حال اور بھی ابتر تھی۔ ترقی یافتہ ملکوں میں تو مافیائیں خواہ کتنی ہی طاقتور سہی لیکن بہرحال مافیائیں ہی کہلاتی تھیں اور قانون ان کی بیخ کنی کے لیے اپنی سی کوشش کرتا رہتا تھا۔ ہمارے ہاں تو مسئلہ اور بھی گمبھیر تھا۔ مافیاؤں نے اپنے اوپر طرح طرح کے خول چڑھا رکھے تھے اور وہ ملکی نظام میں دخیل تھیں۔ مجھے سوچ لینا چاہیے تھا کہ کہیں میں اپنے لیے اتنی پریشانی تو مول نہیں لے رہا تھا جن سے نمٹنا میرے لیے مشکل ہوجاتا؟

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ ایسی مایوسی و دل شکستگی کا مقام بھی نہیں آیا تھا کہ میں اس قسم کے سوالات پر غور کرنے لگتا۔ ابھی تو میں نے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طاقت کو پوری طرح آزمایا نہیں تھا۔ ہم میں اتنا دم خم تو موجود تھا کہ اچھی خاصی بڑی ہستیوں کا مقابلہ کرسکتے۔ ابھی تو ہم پر کوئی ایسی قابلِ ذکر آزمائش نہیں پڑی تھی۔ میں اسی فیصلے پر پہنچا کہ جن لوگوں کے ساتھ ہم بالواسطہ یا بلاواسطہ الجھ چکے تھے انہیں اب سبق سکھانا ضروری تھا۔ وہ معاشرے کے ناسور تھے۔

اپنے اس فیصلے پر طمانیت محسوس کرتے ہوئے میں نے ایک بار پھر آج صورتِ حال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے بارے میں سوچا۔ واجدہ پرویز نے جو انکشاف کیا تھا اس سے ایک بڑا معما حل ہوا تھا لیکن اب اس کے اپنے قتل نے ایک بڑا سوالیہ نشان کھڑا کردیا تھا۔ میں نے اس نکتے پر بھی بہت غور کیا تھا کہ جب اس نے اپنے شوہر کو بتایا کہ سیرا کا قاتل صفدر تھا تو احمد پرویز نہ صرف وہ خاموش رہا بلکہ اس نے اپنی بیوی کو بھی زبان بند رکھنے کی تلقین کی اور پولیس کو کامران دانش ہی کی تلاش میں بھٹکنے دیا۔ تمام شبہات اس کی طرف مرتکز رہنے دیے۔ اس نے پولیس کی غلط فہمی دور کرنے اور صحیح سمت میں اس کی رہنمائی کرنے کی کوئی ذرا سی بھی کوشش نہیں کی۔ میں چونکہ اب ان لوگوں کی وراثت کی پیچیدگیوں اور پرنس انڈسٹریز کی صورتِ حال سے اچھی طرح واقف تھا اور کاروباری دنیا کے پیچ وخم سے بھی آشنا تھا اس لیے رفتہ رفتہ احمد پرویز کے اس ردِعمل کی وجہ میری سمجھ میں آنے لگی تھی۔

آخر کار میں نے اپنے آپ کو افسردگی کے خول سے نکالا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اب حرکت میں آنا ضروری ہوگیا تھا تاکہ ذہن پر چھائی ہوئی دھند کچھ چھٹ سکتی۔ سب سے پہلے صفدر منیر کے گھر کا جائزہ لینا ضروری تھا۔ اس کا وزٹنگ کارڈ میرے پاس موجود تھا۔ اس نے ایک مرتبہ درخواست بھی کی تھی کہ میں کبھی اس کے گھر پر اسے "شرفِ ملاقات" بخشوں۔ عین ممکن تھا کہ گھر پہ اس سے بھی ملاقات ہوجاتی۔ اس وقت اس سے ملاقات کرنا زیادہ سود مند ثابت ہوسکتا ہے۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ تینوں نوجوان بھی اس وقت اس کے گھر پر ہی موجود ہوتے جنہوں نے فائرنگ کرکے واجدہ اور اس کے ڈرائیور کو ہلاک کیا تھا لیکن اگر وہ میرے سامنے آجاتے تب بھی میرے پاس انہیں پہچاننے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کہ وہ واقعی وہی نوجوان تھے۔ تاہم میں کچھ اندازے ضرور لگا سکتا تھا۔

صفدر منیر کا مکان ہی پہلے تو میرے اندازوں سے بہت مختلف ثابت ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ چھوٹا سا کوئی ماڈرن بنگلا ہوگا لیکن وہ پرانے کلفٹن کے علاقے میں واقع ایک پرانا اور طویل و عریض بنگلا ثابت ہوا جس کے احاطے میں برگد کھڑے تھے اور ان کی بالائی جڑیں کسی سادھو کی جٹاؤں کی طرح زمین پر پھیلی ہوئی تھیں۔ لکڑی کا پرانا سالخوردہ گیٹ چوپٹ کھلا تھا جیسے مکینوں کو اس دور میں بھی چوری ڈاکے وغیرہ کی کوئی پروا نہیں تھی۔ شاید ایسا اس لیے کہ مکین خود نہ جانے کیسے خطرناک ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کا سردار تھا۔

لان کی گھاس جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھی۔ درختوں پر پتوں میں چھپے ہوئے نہ جانے کس کس نسل کے پرندے وقفے وقفے سے چہچہا رہے تھے۔ سالخوردہ چوبی گیٹ پر صرف نمبر کی پرانی سی تختی آویزاں تھی۔ کوئی نام وغیرہ نہیں تھا۔ دیواروں پر سیاہی مائل کائی سی جمی ہوئی تھی۔ دیکھنے میں یہ بنگلا آسیب زدہ سا تھا لیکن اس کی مارکیٹ ویلیو کا اندازہ لگانا قطعاً مشکل نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر کسی بھی بلڈر کے منہ میں پانی آسکتا تھا اور وہ فوراً ہی اسے زمین بوس کرکے اس کی جگہ دس بیس منزلہ عمارت بنانے کے منصوبے تصور ہی تصور میں شروع کرسکتا تھا۔ صرف اس کی زمین ہی کروڑوں کی مالیت کی تھی۔

میں نے احتیاطاً گاڑی باہر ہی چھوڑ دی حالانکہ ڈرائیو وے بہت بڑا تھا۔ اس میں مجھے صفدر منیر کی کینوس کی چھت والی سرخ

گاڑی بھی کھڑی دکھائی دے گئی۔ اس کی چھت اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی۔ یہ گاڑی دیکھنے میں تو چھوٹی سی تھی لیکن یہ فورڈ کا ایک مہنگا اور اسپورٹس ماڈل تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ صفدر اچھی خاصی موٹی اسامی تھا اور مہنگے ذوق رکھتا تھا۔ ابھی تو میں نے صرف اس کا مکان اور گاڑی ہی دیکھی تھی جو سبھی کو نظر آجانے والی چیزیں تھیں۔ ابھی اس کے خفیہ اثاثوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا اور وہ اثاثے کن ذرائع سے بنے ہوں گے، اس سلسلے میں تو کچھ کہنا بہت ہی مشکل تھا۔

ڈرائیو وے میں مجھے کوئی دوسری گاڑی یا موٹر سائیکل دکھائی نہیں دی البتہ برآمدے کے ستون کے ساتھ ایک اچھی قسم کی سائیکل کھڑی تھی۔ شاید صفدر نے ورزش کے نقطۂ نظر سے رکھی ہو، شاید وہ اپنے آپ کو فٹ رکھنے کا اہتمام کرتا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ سائیکل کسی نوکر وغیرہ کے لیے مخصوص ہو۔ میں نے صرف دزدیدہ نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لیا کیونکہ عین ممکن تھا کسی کھڑکی، کسی روزن سے کوئی میرا بھی جائزہ لے رہا ہو۔ میں نے کال بیل بجائی اور بظاہر بڑے صبر و سکون سے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ حقیقت یہ تھی کہ اندر سے میں مضطرب تھا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور گرد و پیش پر میری غیر محسوس انداز میں نظر تھی۔ میں پوری طرح چوکنا تھا۔ اندر آنے کے بعد اس مکان کا آسیب زدگی کا سا تاثر اور بھی گہرا ہوگیا تھا۔ ہر طرف کچرا، گرد و غبار، سوکھے پتے اور پرندوں کی غلاظت پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا یہی تھا کہ اب کسی کو اس مکان کی دیکھ بھال سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

چند لمحے بعد لکڑی کا پرانا اور بھاری بھرکم دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کھلا اور اس کے عقب سے ایک چہرہ طلوع ہوا۔ وہ ایک ماہتابی چہرہ تھا اور اس کا سامنے آنا واقعی طلوع ہونے ہی کا سا عمل تھا کیونکہ اس آسیب زدہ سے ماحول کو اس نے یک دم جگمگا سا دیا تھا۔ وہ بہ مشکل بیس بائیس سال کی لڑکی تھی اور بے حد خوب صورت تھی لیکن یہ اتنی اہم بات نہیں تھی۔ خوب صورت لڑکیاں تو نظر آتی رہتی تھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ وہ زندگی سے بھرپور چہرہ تھا۔ ابھی میری نظر چہرے سے نیچے نہیں گئی تھی لیکن زندگی کی اس بھرپور مقناطیسی کشش اور چمک نے گویا آنکھوں کو اسیر کرلیا تھا۔ چلبلا پن گویا صرف اس کی آنکھوں سے ہی نہیں، ابرو، لب و رخسار... غرضیکہ چہرے کے ہر حصے سے پھوٹا پڑ رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میری نظر اس کے چہرے سے نیچے پھسلتی، وہ میرا سراپا جائزہ لے چکی تھی اور اس کی آنکھوں کا چلبلا پن کچھ بڑھ چکا تھا "جی، فرمایئے؟" اس کی آواز سے بھی گویا ہنسی کا آبشار پھوٹا پڑ رہا تھا لیکن میں نے کچھ فرمانے سے پہلے اس کا سراپا جائزہ لے لینا بہتر سمجھا۔ چہرے سے نیچے اس کی شخصیت گویا مزید صبر آزما ہوتی چلی گئی تھی۔ چہرے سے وہ صرف بیس بائیس سال کی لگتی تھی لیکن اس کے بھرپور خدوخال گویا عمر کی ان حدود سے آگے نکل گئے تھے۔

آخر میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر پُرسکون لہجے میں پوچھا "صفدر منیر صاحب کا گھر یہی ہے؟"

"جی ہاں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ اس کی نظر میرے چہرے سے نہیں ہٹ رہی تھی اور وہ گویا ایک بے تاب ہنسی کو بڑی مشکل سے اپنی آنکھوں اور ہونٹوں کے قفس میں قید کیے ہوئے تھی۔ پہلے مجھے گمان گزرا کہ شاید وہ اس بات سے محظوظ ہو رہی تھی اور دل ہی دل میں میرا مذاق اڑا رہی تھی کہ میں نے بہت گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا تھا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ ایسی بات نہیں تھی۔ نظروں کی اس محویت سے تو شاید وہ لطف اندوز ہوئی تھی اور مجھ سے کہیں زیادہ گہری نظروں سے خود اس نے میرا جائزہ لیا تھا۔ شاید اس طرح ملنا، دیکھنا اور بات کرنا اس کی عادت تھی یا اس کا اسٹائل تھا۔ اگر یہ واقعی اس کی عادت یا اسٹائل تھا تو بہت سوں کے لیے بہت تباہ کن ثابت ہوسکتا تھا اور شاید خود اس کے اپنے لیے بھی... لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ ہر ایک کے ساتھ اس کا یہ انداز نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہوسکتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں زندگی کی بھرپور چمک اور چلبلاپن اپنی جگہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ بے پناہ چالاکی بھی جھلکتی تھی۔ وہ کم عمر ضرور تھی لیکن بے وقوف ہرگز نہیں تھی۔ شاید وہ کچھ زیادہ ہی چالاک، زیادہ ہی تیز و طرار تھی۔ وہ لمبے سے ایک میکسی نما لبادے میں تھی جو ڈھیلا ڈھالا ہونے کے باوجود اس کے نشیب و فراز کی حشر خیزی کو چھپانے میں ناکام تھا۔ اس پر سامنے کی طرف دل کی شکل کی دو جیبیں لگی ہوئی تھیں۔ اب اس نے اپنے خوب صورت ہاتھ اپنی جیبوں میں ٹھونس لیے تھے۔

"کیا وہ گھر پر ہیں؟" میں نے ملا ئمت سے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے پہلے ہی کی طرح مقید ہنسی سے کھنکتی آواز میں جواب دیا۔

میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا "ان سے کہئے میں ان سے ملنے آیا ہوں۔"

اس نے کارڈ اندر لے جانے سے پہلے وہیں کھڑے کھڑے پہلے خود بڑے غور سے اسے پڑھا اور گویا ایک نئے زاویۂ نظر سے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک بڑھ گئی تھی۔ اس نے اندر جاکر صفدر سے پوچھنا بھی ضروری نہ سمجھا کہ وہ مجھ سے ملنا بھی چاہتا تھا یا نہیں؟ وہ مجھے اندر آنے کے لیے بڑی گرمجوشی اور خوش خلقی سے دعوت دیتے ہوئے ایک طرف کو ہٹ گئی۔ میں اس کے قریب سے گزرا تو اعصاب میں گدگدی کرنے والی خوشبو کا ایک جھونکا میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔

وہ آہستگی سے دروازے کا بولٹ چڑھانے لگی۔ پرانی ساخت کا مضبوط تالا کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ پہلے ہی بند ہوچکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر غیر محسوس سے انداز میں اپنی جیب میں موجود پستول کو چھوا اور پوچھے بغیر نہ رہ سکا "آپ کون ہیں؟" میں ...ی دل میں یہ نتیجہ تو اخذ کرچکا تھا کہ وہ صفدر کی بیوی نہیں ...ی تھی۔ بیوی تو یقیناً میکے بیٹھی ہوگی۔ اس سے طلاق کی ...ائی چل رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ اتنی کم عمر نہیں ہوسکتی تھی۔

"میں...؟" اس نے بڑے معصوم سے انداز میں ایک انگلی گویا الجھن کے عالم میں سر کھجایا پھر جیسے دل ہی دل میں فیصلے پر ...ہوئے جلدی سے بولی "جی میں صفدر صاحب کی خادمہ ہوں... گھر کی ملازمہ ہوں... گھر کے کام کاج وغیرہ کرتی ہوں۔"

"بہت خوب...!" میں نے بے اختیار کہا اور ستائشی انداز سرہلایا۔

"کیوں... کیا میں ملازمہ کے طور پر ٹھیک نہیں ہوں؟" اس ...اپنے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گویا اپنے آپ کو ...نے کے لیے پیش کیا۔ اس دوران میں وہ ضرورت سے کچھ ...وہی قریب کھڑی تھی۔

"نہیں... نہیں... تم تو کچھ زیادہ ہی ٹھیک ہو۔" میں نے سر ...ا اور دل میں سوچا "جس گھر میں تم جیسی ملازمہ ہو وہاں بیوی کی ...ا کیا ضرورت اور اہمیت رہ جائے گی؟" صفدر نے شاید بیوی سے ...دگی کے فوراً بعد ہی یہ بندوبست کرلیا تھا اور اس دوران میں وہ ...س کیرا جیسی چیز کو بھی گھیر چکا تھا۔ خبیث بہت ہی اونچے ...ے کا فنکار معلوم ہوتا تھا۔

"میرا خیال ہے جس وقت صفدر کی بیوی اس کے ساتھ رہتی ...ی اس وقت تو تم اس گھر میں نہیں ہوگی؟" میں نے پوچھ ہی لیا۔

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر شریر سے انداز میں دھیرے سے ہنسی ...س گھر میں بیوی موجود ہو وہاں مجھ جیسی خادمہ کیسے ٹک سکتی ہے؟ آپ خود ہی سوچیں سر!"

میں نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ ہم ہال کے ملگجے سے ...ھیرے میں دروازے کے قریب ہی رک کر باتیں کرنے لگے ...ے۔ اسے بھی جیسے اندر جانے کی کوئی جلدی نہیں تھی اور میں گویا ...س کے لیے قطعاً اجنبی نہیں تھا۔ میرے وزیٹنگ کارڈ نے تو گویا ...س پر کچھ زیادہ ہی جادو کا سا اثر کیا تھا۔ اس کارڈ سے میری ...اروباری حیثیت کا کافی حد تک اندازہ ہوتا تھا اور شخصیت اس ...کے سامنے ہی تھی۔

دفعتاً اندر سے ایک خمار زدہ گھڑگھڑاتی ہوئی سی آواز ابھری ...کون آیا ہے کنّی؟"

میں نے صفدر کو بہت مختلف آواز میں بات چیت کرتے سنا تھا ...لیکن اس وقت بھی میں نے پہچان لیا۔ یہ صفدر ہی کی آواز تھی۔ وہ ...نشے میں معلوم ہوتا تھا۔ کنّی یقیناً یہی دلچسپ اور عجیب خادمہ تھی جو ...اس وقت نہایت اطمینان سے مجھ سے ہم کلام تھی۔ کنّی غالباً اس ...کا عرفیت یا پیار کا نام تھا اور بہت مناسب تھا۔ لوگ عام طور پر بلی ...کی کنّی کہہ کر بلاتے ہیں۔ وہ بھی ایک خوب صورت بلی ہی معلوم ہوتی تھی جس میں زندگی کی توانائی کچھ زیادہ ہی بھری ہوئی تھی۔ خلوت میں شاید وہ خونخوار بھی ثابت ہوتی ہو۔

وہ وہیں کھڑے کھڑے بہ آواز بلند بولی "ایک بہت معزز آدمی تم سے ملنے آیا ہے۔ میں اسے تمہارے پاس لا رہی ہوں۔"

یہ میں نے پہلی خادمہ دیکھی تھی جو عمر میں اپنے سے بڑے مالک کو "تم" کہہ کر مخاطب کررہی تھی۔ خیر... یہ کوئی اہم بات نہیں تھی۔ وہ تو یقیناً ہر اعتبار سے ہی ایک انوکھی خادمہ تھی۔

وہ رازدارانہ سے انداز میں میری طرف جھکی تو مجھے اس کے وجود سے مہک کے ساتھ ساتھ خفیف سی حرارت بھی پھوٹتی محسوس ہوئی۔ اس نے مجھے نیچی آواز میں مطلع کیا "صفدر صاحب اس وقت "شغل" کررہے ہیں اور میں ان سے پوچھے بغیر ہی آپ کو ان کے پاس لے جارہی ہوں لیکن امید ہے وہ بُرا نہیں منائیں گے۔ میرے ساتھ آیئے۔"

اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور میں اپنے حواس کو سنبھالتا اس کی رہنمائی میں چل دیا گو کہ وہ کسی بھی طرح رہنمائی کی اہل معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو راستہ بھٹکانے والوں میں سے تھی۔ وہ سیدھا مجھے طویل و عریض لاؤنج میں لے گئی جہاں صفدر ایک صوفے پر نیم دراز تھا۔ ٹانگیں پھیلا کر اس نے تپائی پر ٹکائی ہوئی تھیں۔ تپائی پر بوتل، گلاس، آئس ٹرے وغیرہ موجود تھی۔ سگریٹوں کا کثیف دھواں چھت سے فرش تک پھیلا محسوس ہورہا تھا۔ گو کہ اتنے بڑے لاؤنج میں وہ اکیلا ہی بیٹھا پی رہا تھا اس کے باوجود وہسکی اور سگریٹوں وغیرہ کی بُو سے مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں کسی مغربی ملک کے پُرہجوم بار میں گھس آیا تھا۔

صفدر نے سرخ سرخ آنکھیں پھاڑ کر میری طرف دیکھا۔ وہ جینز اور ٹی شرٹ میں تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر وحشت تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں گلاس تھا اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ سلگ رہی تھی۔ وہ معدے میں نہ جانے کتنی انڈیل چکا تھا لیکن پوری طرح حواس میں معلوم ہوتا تھا اور مجھے دیکھ کر تو شاید اس کے حواس کچھ اور تیز ہوگئے۔ وہ گلاس رکھ کر اٹھا اور بڑے احترام و عقیدت سے جھکتے ہوئے میرا ہاتھ دونوں ہاتھوں میں تھام کر ملا۔

"افضل صاحب... افضل صاحب...! یہ آج اچانک میرے نصیب کیسے جاگ اٹھے۔" وہ عاجزی سے بولا۔ اس کی آواز خمار زدہ ضرور تھی حتیٰ کہ اس میں ہلکی سی تتلاہٹ بھی آچکی تھی لیکن وہ بہکا ہوا قطعاً نہیں تھا "آپ نے بغیر اطلاع یوں اچانک آکر صحیح معنوں میں مجھے سرپرائز دیا ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کبھی آپ اچانک یوں میرے غریب خانے پر تشریف لائیں گے۔"

اس نے بڑے اصرار سے مجھے اپنے قریب ہی صوفے پر بٹھایا۔ وہیں اس کا موبائل فون بھی پڑا ہوا تھا۔ وہ اس نے اٹھا کر تپائی پر رکھ دیا اور بڑی محبت سے مجھ سے مخاطب ہوا "کیا چلے گا؟ اسکاچ... جن... یا واڈکا...؟ اس وقت گھر میں تینوں موجود

ہیں۔"

"شکریہ۔ میں پیتا نہیں ہوں۔" میں نے ذرا خشک لہجے میں کہا "نہ جانے کس طرح میں یہ شوق پالنے سے بچ گیا۔"

اس نے ایک عجیب وحشت زدہ سا قہقہہ لگایا اور میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر بولا "ارے افضل صاحب! شرمانے یا تکلفات میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ مجھے دوستوں کی طرح سمجھیں تو یہ میرے لیے ایک اعزاز ہوگا اور دوستوں میں اس طرح کا تکلف نہیں چلتا۔ خصوصاً ہمارے طبقے میں۔"

وہ اس وقت خاصا بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ یہ وہ دھیما' مہذب اور وضع دار نظر آنے والا صفدر نہیں تھا جس سے میں ملا تھا۔ وہ حواس میں ضرور تھا لیکن حرکات و سکنات سے ظاہر ہونے والی ایک عجیب سی وحشت بتا رہی تھی کہ الکحل کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور تھا۔ کہیں وہ کچھ بھلانے یا اس وقت ذہن کسی طرف سے ہٹانے کے لیے تو اس طرح سوگوار سے ماحول میں بیٹھا نہیں پی رہا تھا؟ میں نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "اگر مجھے شوق ہوتا تو میں ذرا بھی تکلف نہ کرتا۔ اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں میں تکلف کی کیا ضرورت ہے؟ میں واقعی بالکل بھی پینے پلانے کا عادی نہیں ہوں۔"

"بہت عجیب بات ہے!" اس نے بے یقینی سے سر جھٹکا۔ اس وقت کنی ایک بار پھر دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے سامنے کھڑی کچھ عجیب سی نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ صفدر اس سے مخاطب ہوا "اری احمق لڑکی! افضل صاحب آئے ہیں۔۔۔ ان کی کچھ خاطر مدارات کر۔۔۔ تجھے معلوم نہیں ہے یہ بہت بڑے آدمی ہیں۔"

"مجھے معلوم ہو چکا ہے۔" اس نے میرا وزیٹنگ کارڈ انگلیوں میں گھماتے ہوئے اسے دکھایا "لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں ان کی کیا خاطر مدارات کروں۔ اوپر کمرے میں لے جاؤں انہیں؟"

"احمق۔۔۔ الو کی پٹھی۔۔۔!" صفدر نے گویا اسے کھینچ کر مارنے کے لیے اِدھر اُدھر کوئی موزوں چیز تلاش کی جو اسے نہیں ملی۔ کنی نے اس دوران میں اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ ایک لمحے کے بعد صفدر برہمی سے بولا "بہت ہی بے ہودہ ہوتی جا رہی ہو تم۔۔۔ تمہیں تو اس کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں ہے۔ افضل صاحب کے لیے کھانے پینے کے لیے کچھ تو لاؤ۔"

"مجھے بس ایک کولڈ ڈرنک لا دو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کنی سے کہا اور وہ کچن میں چلی گئی۔

"بہت کمال کی ملازمہ ڈھونڈی ہے آپ نے۔" میں نے نیچی آواز میں کہا "میں نے آج تک کسی گھر میں ایسی ملازمہ نہیں دیکھی۔"

"ملازمہ کیا ہے جی۔۔۔ بس۔۔۔" اس نے متوحش سی ہنسی کے ساتھ جملہ ادھورا چھوڑ دیا "اس کی مہربانی ہے کہ گھر سنبھالے ہوئے ہے۔ موڈ نہ ہو تو کوئی کام نہیں کرے گی۔ آپ کو پسند ہے تو آپ لے جائیں۔"

اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے گھر میں رکھے ہوئے کسی گلدان یا ایش ٹرے کا ذکر کر رہا ہو جو اس کے کسی معزز مہمان کو پسند آ گیا ہو۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولا "اسے معلوم ہو گیا ہے کہ آپ ایک دولت مند آدمی ہیں۔ وجیہہ اور جوان بھی ہیں۔ وہ بڑی خوشی سے آپ کے ساتھ چل دے گی۔ اس کی زندگی کا واحد مقصد زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جونہی اس کے پاس اتنی دولت جمع ہو گئی کہ اس کی باقی زندگی عیش و آرام سے گزر سکے تو یہ امریکا چلی جائے گی اور وہیں کہیں سیٹل ہو جائے گی۔ لوگ دولت کمانے کے لیے امریکا جانا چاہتے ہیں۔ یہ دولت خرچ کرنے کے لیے امریکا جانا چاہتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ تیس پینتیس سال کی عمر سے پہلے پہلے اپنی مطلوبہ دولت کے ساتھ امریکا پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو اس کے حلقۂ احباب میں آنے والے بہت سے امریکیوں کو بھی دانتوں پسینے آ جائیں گے۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا تو وہ بولا "آپ نے میری فراخ دلانہ پیشکش کا کوئی جواب نہیں دیا۔"

"مجھے ایسی لڑکیوں سے بھی کوئی دلچسپی نہیں جنہیں ڈیکوریشن پیس کی طرح ایک گھر سے اٹھا کر دوسرے گھر میں رکھا جا سکتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ویری گڈ۔۔۔ ویری گڈ۔۔۔" اس نے ستائشی انداز میں سر ہلایا۔ دفعتاً اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے فون اٹھایا اور بٹن دبا کر کان سے لگایا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ذرا تیزی سے بولا "میں اس وقت تم سے بات نہیں کر سکتا۔ میرے پاس مہمان بیٹھے ہیں۔۔۔"

میں گہری نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے کے خطوط میں تناؤ جھلک آیا تھا۔ چند سیکنڈ اس نے کچھ سنا پھر قدرے جھنجلائے ہوئے سے انداز میں بولا "میں نے کہا نا کہ اس وقت میں بات نہیں کر سکتا۔" اس نے فون نہ صرف بند کر دیا بلکہ ڈس کنیکٹ بھی کر دیا۔ اب اس پر کوئی کال آ ہی نہیں سکتی تھی۔

اس نے گلاس میں بچی ہوئی وہسکی ایک ہی سانس میں معدے میں انڈیلی اور قدرے مصنوعی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجاتے ہوئے میری طرف جھک کر رازدارانہ سے انداز میں بولا "میں تو یہی کہوں گا کہ آپ کفرانِ نعمت کر رہے ہیں۔"

"کس کا ذکر کر رہے ہیں؟ وہسکی کا یا کنی کا؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"دونوں کا۔" وہ آنکھ دبا کر بولا۔

"میری طرف سے بھی آپ ہی ان دونوں نعمتوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک خمار زدہ سا قہقہہ لگایا اور اپنے لیے گلاس میں مزید انڈیلنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ میں نے ...یا کہ فون آنے کے بعد سے اس کا ذہن کہیں اور چلا گیا تھا ...ظاہر کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کی توجہ مجھ پر ...تھی۔ آخر وہ رہ نہ سکا۔ مزید ایک گھونٹ بھر کر ایک انگلی ...ہوئے معذرت خواہانہ انداز میں بولا "میں ابھی آیا۔" وہ ...ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

...غالباً باتھ روم میں چلا گیا لیکن عجیب بات تھی کہ وہ باتھ ...بھی اپنا موبائل فون ساتھ لے جانا نہیں بھولا تھا۔ اس ...نے ہی کنی چھوٹی سی ایک خوب صورت ٹرے میں کولڈ ڈرنک ...س وغیرہ بڑے سلیقے اور نفاست کے ساتھ ٹشو پیپر وغیرہ ...سجائے ہوئے لے کر آ گئی۔ گلاس میں برف کی کیوبس بھی ...تھیں۔

...جھک کر چیزیں ہٹا کر ٹرے رکھنے لگی تو میں غور سے اس کی ...دیکھ رہا تھا۔ وہ اپنے مخصوص شریر انداز میں مسکرائی۔ ہنسی ...کی طرح اس کے رُوئیں رُوئیں سے پھوٹ رہی تھی "کیا ...رہے ہیں؟" وہ کھنکھناتی آواز میں بولی "اچھی طرح دیکھ لیں۔" ...اور جھک گئی۔

"تم واقعی عجیب چیز ہو۔" میں نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔

"اس میں کیا شک ہے۔" وہ سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بڑی ...بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "مجھ جیسی چیزیں روز ...پیدا نہیں ہوتیں۔"

"دنیا والوں کے حق میں یہ اچھا ہی ہے۔" میں نے ٹھنڈی ...لے کر کہا پھر اپنے سنسناتے ذہن کو کسی اور طرف لگانے لگا ...معلومات حاصل کرنے کی غرض سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے ...اس گھر میں صرف تم دونوں ہی رہتے ہو؟"

"جی ہاں۔ ہم دونوں جس قسم کے انسان ہیں اس لحاظ سے تو ...یہاں رہنے کے لیے ہم ہی کافی ہیں۔" وہ شوخ لہجے میں بولی۔ ...نہیں سکا کہ اس کا مطلب کیا تھا۔ اس کی بات کے بہت ...مفہوم نکلتے تھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "لیکن یہاں ...دوسرے لوگ بھی آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ ایک طرح کا ...خانہ ہے۔"

"...کون لوگ؟" میں نے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"...آپ کیا یہاں جاسوسی کرنے آئے ہیں؟" اس نے بلا تکلف ...

...اندر ہی اندر ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا لیکن میں نے ...اظہار نہیں ہونے دیا اور جوابی حملہ کیا "کیا یہاں ایسی کوئی ...ہے جس کی جاسوسی کی ضرورت پیش آئے؟ اور کیا میں تمہیں ...سے کوئی جاسوس نظر آتا ہوں؟"

"...جاسوسی کے قابل تو یہاں بہت سی چیزیں ہیں۔" وہ بدستور ...لہجے میں بولی "ایک تو میں ہی ہوں جس کی بہت زیادہ جاسوسی ...کی جا سکتی ہے۔"

"...اس میں تو شک نہیں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ آپ صورت سے کیا نظر آتے ہیں تو فی الحال اسے رہنے دیجیے۔ اس کا جواب میں آئندہ کسی ملاقات پر دوں گی جب ہمارے درمیان اس سے زیادہ بے تکلفی ہو جائے گی۔"

"تمہیں امید ہے ہمارے درمیان اس سے زیادہ بے تکلفی بھی ہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔۔۔ انسان کو مستقبل سے ہمیشہ اچھی امیدیں رکھنی چاہئیں۔" وہ ایک آنکھ ذرا دباتے ہوئے بولی "ویسے میں آپ کے سوال کا جواب بہرحال دے دیتی ہوں۔ یہاں جو لوگ آتے جاتے رہتے ہیں ان میں زیادہ تر دوسرے شہروں سے آنے والے صفدر صاحب کے کاروباری شناسا اور دوست وغیرہ ہوتے ہیں۔ کبھی کبھار باہر سے بھی کوئی پارٹی آ جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہی ہو گا صفدر صاحب کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس ہے۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ حالانکہ میرے ہی سوال کا جواب دے رہی تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے یہ احساس ہو رہا تھا جیسے وہ مجھے باتوں میں لگائے رکھنے اور میرا دھیان بٹائے رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ عین اسی لمحے اس نے جو سوال کیا اس سے میرے شبہے کو تقویت ملی۔

"کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہائے اللہ۔۔۔! کتنی اچھی بات ہے۔" اس نے یوں بے اختیار تالی بجا کر دونوں ہاتھ بھینچ لیے جیسے بہت ہی دلچسپ' مزیدار اور خوشی کی خبر سننے کو ملی ہو۔

"اس میں اتنی خوشی کی کیا بات ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"یہ مت پوچھیں۔ یہ بات بس مجھ تک ہی رہنے دیں۔" وہ بڑی ترنگ میں بولی۔

"کیا تمہیں ہر غیر شادی شدہ مرد سے مل کر اسی طرح خوشی ہوتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب میں اتنی بھی گری پڑی نہیں ہوں کہ ہر ایک سے ملتی اور اس کے غیر شادی شدہ ہونے پر خوشی کا اظہار کرتی پھروں۔" وہ یک دم ہی کچھ اکڑ سی گئی۔

اسی اثنا میں صفدر لوٹ آیا۔ میں اس وقت کولڈ ڈرنک کی چسکیاں لے رہا تھا۔ موبائل فون صفدر کی جیب میں تھا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور بڑھ چکی تھی۔ وہ ایک بار پھر میرے برابر ہی بیٹھتے ہوئے بولا "اور سنائیے۔۔۔ آج آپ نے کیسے اس خادم کے گھر تک آنے کی زحمت کر لی؟"

"میں ادھر سے گزر رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی مجھے ایک بُری خبر ملی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ یہ خبر آپ کو بھی سناتا چلوں۔ حالانکہ یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ انسان پہلی بار بھی کسی کے گھر جائے تو بُری خبر ہی لے کر جائے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

صفدر نے جواباً کچھ بولنے سے پہلے کنی کی طرف دیکھا اور وہ

گویا اس کا اشارہ سمجھتے ہوئے فوراً وہاں سے چلی گئی۔ صفدر سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے گلاس سنبھال کر ذرا تشویش سے بولا "بری خبر۔۔۔؟ کیسی بری خبر۔۔۔؟ اپنی زندگی تو اب گویا بری خبریں سننے کے لیے ہی وقف ہو کر رہ گئی ہے۔ آپ بھی سنا دیجئے۔ کوئی حرج نہیں۔"

"واجدہ پرویز کو آج تین موٹر سائیکل سواروں نے گولی مار دی۔" میں نے کہا۔

"کب۔۔۔ کہاں۔۔۔ کیوں۔۔۔؟" وہ بری طرح چونک کر آنکھیں پھیلاتے ہوئے وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ اگر یہ ایکٹنگ تھی تو بلاشبہ بہت عمدہ ایکٹنگ تھی۔۔۔ اور میرے خیال میں یہ ایکٹنگ ہی تھی۔ اگر کوئی شخص اتنی پینے کے بعد بھی ایسی ایکٹنگ کر سکتا تھا تو وہ یقیناً داد کا مستحق تھا۔ مجھے اس واقعے کے بارے میں جو کچھ رحیم گل سے معلوم ہو سکا تھا وہ اس کے گوش گزار کرنا پڑا اور یہ خاصا صبر آزما کام تھا۔ جب آپ کو معلوم ہو کہ سامنے والا آپ سے زیادہ جانتا ہے لیکن انجان بن کر پوچھ رہا ہے تو اسے کچھ بتانے کے لیے دل پر خاصا جبر کرنا پڑتا ہے۔

"اوہ خدایا!" سب کچھ سن کر اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا اور مرتعش آواز میں بولا "یقین نہیں آ رہا۔۔۔ میں تو اظہارِ افسوس کے لیے بھی نہیں جا سکتا۔ احمد پرویز تو میری صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ بہرحال۔۔۔ واجدہ اچھی عورت تھی۔۔۔ میں اسے برسوں سے جانتا تھا۔۔۔" اس نے ہچکی سی لی۔

"اچھی عورت تو پرنس کیمرا بھی تھی۔" میں نے گویا یونہی برسبیلِ تذکرہ کہا۔

"جی ہاں۔۔۔" اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے میری طرف دیکھا "بلاشبہ وہ بھی بہت اچھی عورت تھی۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ واجدہ کسی اور انداز میں اچھی تھی۔۔۔ وہ کیمرا سے بہت مختلف تھی۔۔۔ معلوم نہیں اکثر اچھے لوگ اس دنیا سے اتنی جلدی کیوں چلے جاتے ہیں۔"

"یا بھیج دیے جاتے ہیں۔" میں نے ٹکڑا لگایا "اور خبیث و شیطان صفت لوگ اپنے چہروں پر نہ جانے کتنے چہرے سجائے بہت لمبے عرصے تک زندہ رہتے ہیں۔"

"جی ہاں۔۔۔ آپ سچ کہہ رہے ہیں۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں اب نمی بھی تیرنے لگی تھی۔ معلوم نہیں یہ خمار کے باعث تھی یا اس نے اپنی اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے کسی طرح آنسوؤں کی تھیلی سے "برآمد" کی تھی پھر اس نے نئی سگریٹ سلگانے کے لیے سگریٹ کا پیکٹ اٹھایا مگر وہ خالی تھا۔

"کنی!" اس نے ہانک لگائی "ذرا میرے بیڈ روم سے سگریٹ تو دینا۔"

مگر کنی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ جیسے گھر میں ہی نہیں تھی۔ صفدر کو شاید سگریٹ کی طلب شدید تھی۔ وہ بڑبڑایا "ایک تو یہ الو کی پٹھی ہر تھوڑی دیر بعد نہ جانے کہاں غائب ہو جاتی ہے۔" یہ کہہ کر وہ خود اٹھ کھڑا ہوا اور معذرت کر کے سگریٹ لینے چلا گیا۔ دفعتاً میری نظر اس جگہ پر پڑی جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ جہاں صوفے کے پشتے اور نیچے کے کشن کا جوڑ تھا وہاں مجھے کسی جھلملاتی چیز کی جھلک دکھائی دی۔ وہ اوپر نیچے کے فوم کے درمیان پھنسی ہوئی کوئی چیز تھی۔ میں نے چٹکی سے پکڑ کر اسے کھینچ لیا اور اسے دیکھ کر میرے دل میں طمانیت کی ایک لہر سی دوڑ گئی۔ وہ ایک گھڑی تھی۔

مجھے اس گھر کی تفصیلی تلاشی لینے کا موقع ملنے کی قطعاً کوئی امید نہیں تھی لیکن اگر مجھے ایسا کوئی موقع مل بھی جاتا تب بھی شاید یہ گھڑی مجھے مشکل سے ہی ملتی جو اس وقت اپنی جگہ بیٹھے بٹھائے مل گئی۔ شاید یہ امدادِ غیبی تھی۔ یہ گھڑی ایک اہم شہادت ثابت ہو سکتی تھی اور مستقبل قریب میں کام آ سکتی تھی۔ یہ ایک قیمتی اور بغیر سیل والی آٹومیٹک گھڑی تھی جو دن اور تاریخ بھی بتاتی تھی۔ یہ گھڑی میں نے صفدر کی کلائی میں اس روز دیکھی تھی جب وہ پرنس کیمرا کے اسٹوڈیو میں پہنچا تھا اور بظاہر اس پر "انکشاف" ہوا تھا کہ کیمرا قتل ہو چکی تھی۔

اس وقت اس گھڑی کا شیشہ چٹخا ہوا تھا اور یہ آٹھ بج کر چند منٹ پر رکی ہوئی تھی۔ پولیس سرجن نے کیمرا کی موت کا وقت تعین کرنے کے سلسلے میں اپنی رپورٹ میں یہی لکھا تھا کہ اس کی موت آٹھ اور نو بجے کے درمیان کسی وقت واقع ہوئی تھی۔ واجدہ نے مجھے جو کچھ بتایا تھا اس کے مطابق اس دوران میں اسٹوڈیو میں آ کر کیمرا کو قتل کر کے جا چکا تھا۔ بعد میں وہ دوبارہ معصوم اور انجان بن کر جائے وقوعہ پر پہنچا تھا۔

واجدہ نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے جب صفدر کو کیمرا پر حملہ آور ہوتے دیکھا اس وقت وہ کسی چیز میں الجھ کر گرا بھی تھا جس سے اس کے اشتعال میں اور بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ شاید یہ گھڑی اسی وقت بہت زور سے کسی چیز سے ٹکرا کر رکی تھی اور اسی تاریخ اسی دن، اسی وقت پر رک گئی تھی۔ صفدر نے نہ تو اسے ٹھیک کرایا تھا اور نہ ہی اس سے نجات حاصل کی تھی۔ یہ آج بھی اسی حالت میں تھی۔ شاید اس نے اسے بے پروائی سے اتار کر پھینک دیا تھا۔ اس نے غالباً اسے کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے خیال میں ہمارے ہاں ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف توجہ نہیں دی جاتی تھی اور وہ اپنی دانست میں صاف بچ نکلا تھا۔ اب اس نے دوسرے ممکنہ خطرے واجدہ پرویز کا بھی صفایا کرا دیا تھا۔ فی الحال وہ ٹینشن میں تھا لیکن اسے امید ہو گی کہ وہ اپنی اس واردات میں بھی صاف بچ نکلے گا۔

میں نے گھڑی جیب میں ڈال لی تھی اور ایک بار پھر اپنی کولڈ ڈرنک کی چسکیاں لینے لگا تھا۔ اسی اثنا میں وہ لوٹ آیا۔ وہ نیا پیکٹ کھول کر سگریٹ سلگا چکا تھا۔ میرے قریب بیٹھ کر وہ پہلے کی نسبت پُرسکون لہجے میں بولا "آپ کو اس واقعے کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ آپ کہیں اتفاق سے جائے وقوعہ کے آس پاس تو موجود نہیں تھے؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا "آپ کو معلوم ہے پولیس انسپکٹر رحیم گل میرا دوست ہے۔ میں نے اتفاق سے کسی کام سے اسے فون کیا تو اس نے اس تازہ واقعے کے بارے میں بتایا۔"

"اوہ۔۔۔!" اس نے قدرے طمانیت سے سر ہلایا "کتنی دیر ہوئی اس سے بات ہوئے؟"

"یہاں آنے سے چند منٹ پہلے ہی ہوئی تھی۔" میں نے جواب دیا پھر سرسری سے انداز میں کہا "احمد پرویز بھی اسپتال پہنچ گیا تھا۔ اس نے کل دوپہر دس بجے رحیم گل سے ملاقات طے کی ہے۔ رحیم گل بتا رہا تھا کہ وہ اپنا تفصیلی بیان ریکارڈ کرانا چاہتا ہے۔ شاید وہ اپنی بیوی کے قتل کے سلسلے میں کوئی اہم بات بتانا چاہتا ہے۔"

"اچھا۔۔۔!" صفدر کی بھویں غیر ارادی سے انداز میں یک لخت پھڑک اٹھیں۔ میں بظاہر بے پروائی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا "کل دس بجے۔۔۔؟"

"ہاں۔۔۔ میرا خیال ہے یہی وقت بتایا تھا۔ میں نے کچھ زیادہ توجہ سے اس کی بات نہیں سنی تھی۔۔۔ واجدہ پرویز کے قتل کی خبر سن کر مجھے جو جھٹکا لگا تھا، اس وقت تک میں اس سے سنبھلا نہیں تھا۔" میں نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا پھر ذہن پر زور دینے کی ایکٹنگ کی "ہاں۔۔۔ مجھے یاد آ گیا۔ یقیناً یہی وقت بتایا تھا۔ رحیم گل کہہ رہا تھا کہ احمد پرویز خود پولیس اسٹیشن آ کر باضابطہ طور پر اپنا بیان ریکارڈ کرائے گا۔ شاید اس کی بیوی نے ایک آدھ دن پہلے ہی کوئی اہم بات اسے بتائی تھی۔۔۔ اور آج وہ بے چاری ماری گئی۔" میں نے افسوس زدہ سے انداز میں گہری سانس لی۔

"اچھا۔۔۔؟" صفدر نے بھویں اچکائیں پھر وہ بھی اپنے لہجے میں کچھ دکھ سمونے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "معلوم نہیں یہ کیا چکر چل رہا ہے۔ بہرحال۔۔۔ میری زندگی اور میرے مستقبل کے تمام پروگرام تو اسی دن برباد ہو گئے تھے جس دن کسی ظالم نے کیمرا جیسی حسین اور زندہ دل لڑکی کو زندگی سے محروم کیا تھا۔۔۔" پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور وہ مجھے سمجھانے کے سے انداز میں بولا "عین ممکن ہے یہ واجدہ پرویز والا واقعہ درحقیقت گاڑی چھیننے کی ناکام واردات ہو۔"

"ہاں۔۔۔ عین ممکن ہے۔" میں نے کندھے اچکائے "آج کل نہ جانے کیسے کیسے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔"

صفدر نے گلاس تپائی پر رکھ دیا تھا۔ یک بیک پینے پلانے سے گویا اس کا دل بھر گیا تھا۔ اس کے چہرے پر تناؤ بڑھ گیا تھا۔ میں نے کولڈ ڈرنک ختم کر کے اٹھتے ہوئے کہا "میں اب چلتا ہوں۔ میں نے آپ کا کافی وقت خراب کر لیا اور آپ کو کوئی اچھی خبر بھی نہ سنائی۔"

"ارے نہیں جناب! یہ تو آپ کی نوازش ہے کہ آپ بھولے بھٹکے ادھر آ نکلے۔ خبروں کا کیا ہے۔ اچھی بُری خبریں تو زندگی میں ساتھ ساتھ ہی چلتی ہیں۔" وہ بھی اٹھتے ہوئے بولا "لیکن بہتر ہوتا کہ آپ کھانا کھا کر ہی جاتے۔ کنی بہت اچھا کھانا پکاتی ہے۔"

"اچھا۔۔۔! تو اسے کھانا پکانا بھی آتا ہے؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"ارے صاحب! بڑی ہر فن مولا قسم کی لڑکی ہے۔ تبھی تو میں نے سارا گھر اسے سونپ رکھا ہے۔" وہ میرے ساتھ دروازے کی طرف چلتے ہوئے بولا۔

"خیر۔۔۔ پھر کبھی وقت ملا تو اس کے ہاتھ کا پکا ہوا کھا کر دیکھیں گے۔"

وہ میرے ساتھ گیٹ تک آیا اور یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ کنی ڈرائیو وے میں نہایت مشاقی سے سائیکل چلا رہی تھی۔ ہم گیٹ پر پہنچے تو اس نے بھی وہیں پہنچ کر سائیکل چھوڑ دی اور ہانپتی ہنستی اور دمکتی آنکھوں سے بے باکی سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولی "پھر کب آئیں گے؟" صفدر کی موجودگی کی اسے گویا کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

"شاید بہت جلد۔" میں نے جواب دیا۔

"امید تو یہی ہے۔" اس نے آنکھ دبائی پھر باہر جھانک کر میری گاڑی کی طرف دیکھتے ہوئے رشک سے بولی "آپ کی گاڑی بہت شاندار ہے۔ آج کل میں دعا کر رہی ہوں کہ مجھے بھی اللہ کا کوئی نیک اور سخی بندہ اسی قسم کی کوئی گاڑی تحفتاً پیش کر دے۔"

"مجھے تمہاری دعا کے الفاظ کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "تمہیں اس قسم کی دعا میں تو یہ کہنا چاہیے کہ اللہ کا کوئی گناہ گار اور عیاش مگر فراخ دل اور احمق بندہ اس قسم کی گاڑی تحفتاً پیش کر دے۔"

صفدر نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی "اب تم اتنی زیادہ بکواس بھی مت کیا کرو۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "ویسے آپ اسے سچ مچ خادمہ قسم کی چیز مت سمجھ لیجیے گا۔ یہ بڑی ڈراما باز لڑکی ہے۔ اس کا اپنا پچاس ساٹھ لاکھ کا ٹاؤن ہاؤس ہے اور ہنڈا اکارڈ گاڑی ہے۔ یہ تو یونہی ذرا دوستی اور شغل میں میرے پاس کبھی چند دن گزار جاتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی نہیں ہے اور اس کے خواب بہت اونچے ہیں۔"

اگر وہ سچ کہہ رہا تھا تو پھر اس لڑکی کے عجیب ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا۔ اس دنیا میں واقعی قدم قدم پر عجیب کردار پڑے ہوئے تھے لیکن فی الحال میں اپنا ذہن اس میں الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ میری اصل توجہ صفدر پر تھی۔ میں غیر محسوس طریقے سے اس کی تمام حرکات و سکنات اور تاثرات پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ میرا یہاں آنے کا مقصد ہی باریک بینی سے اس کا جائزہ لینا اور اس پر اپنی باتوں کا ردِعمل دیکھنا تھا۔ میں چاہتا تو اس وقت بھی اسے گردن سے پکڑ کے اور قابو کر کے رحیم گل کے حوالے کر کے ساری بات بتا سکتا تھا۔ باقی تفتیش وہ خود کر سکتا تھا لیکن میں صفدر کو مزید کچھ ڈھیل دے رہا تھا۔ میں ایک تجربہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید میرا تجربہ کامیاب ہو جاتا۔ میں گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت

ہولیا۔ کئی نے کچھ زیادہ ہی جوش و خروش سے ہاتھ ہلاتے ہوئے مجھے خدا حافظ کہا۔ میں عقب نما آئینے میں کچھ دور تک اس کا عکس دیکھتے ہوئے سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ زمانہ واقعی بہت تیز رفتار ہوگیا تھا خصوصاً اونچے طبقے میں تو وقت کچھ زیادہ ہی تیزی سے انقلاب لا رہا تھا یا پھر شاید وہ لوگ خود ہی بہت تیز رفتار تھے۔ پوری کوشش کررہے تھے کہ کسی معاملے میں دنیا سے پیچھے نہ رہیں۔

مین روڈ پر آنے کے بعد بھی میں نے پیچھے توجہ رکھی اور یہ یقین کرنے کے بعد مجھے خفیف سی حیرت ہوئی کہ میرا تعاقب نہیں کیا جارہا تھا۔ میں نے راستے ہی میں موبائل فون پر شفیع شاہ سے رابطہ کیا اور اسے دو ایڈریس سمجھا کر ہدایت کی کہ وہ ان جگہوں کی نگرانی کا بندوبست کرے پھر میں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ مجھے کس کس وقت کس کس بات کی اطلاع دینا ضروری تھا۔ ایک فون میں نے رحیم گل کو بھی کیا۔ گو کہ وہ اس وقت بہت مصروف تھا لیکن اس نے توجہ سے میری بات سن لی۔ پھر میں ہوٹل واپس پہنچ کر اپنے معمولات میں الجھ گیا۔ راحیلہ کو میں نے تازہ ترین صورتِ حال سے تو آگاہ کردیا لیکن فی الحال اسے کوئی ذمے داری نہیں سونپی۔

رات بارہ بجے کے بعد مجھے وہ ٹیلی فون کال موصول ہوئی جس کا مجھے انتظار تھا۔ شفیع شاہ نے بتایا "سر! اب تمام مہمان اور تعزیت کرنے والے رخصت ہوچکے ہیں۔ اوپر کے ایک کمرے میں اسے جاتے دیکھا گیا ہے۔ شاید وہ اس کی اسٹڈی ہے۔ کچھ دیر سے وہ وہیں ہے۔"

"نگرانی میں کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر!" شفیع شاہ نے جواب دیا "اس کے بنگلے کے سامنے والا بنگلا اتفاق سے ہمارے ایک جاننے والے کا ہی نکل آیا تھا۔ ہم نے اپنے آدمی کو اس کی چھت پر واقع ایک کمرے میں بھجوا دیا تھا۔ وہاں سے سامنے والے بنگلے پر نظر رکھنا زیادہ آسان ہوگیا تھا۔ مجھے ابھی ابھی رپورٹ ملی ہے کہ اب میدان صاف ہے۔ سامنے والے بنگلے پر سکوت چھا چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ کوئی بھی ضروری بات ہو تو فوراً مجھے اطلاع کرنا۔" میں نے یہ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ایک نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے جو مردانہ آواز سنائی دی اس سے غنودگی اور تھکن عیاں تھی۔

"احمد پرویز صاحب سے بات کرائیں۔" میں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

"سر! وہ بہت تھکے ہوئے ہیں اور انہوں نے کہا ہے اب وہ کسی سے بات نہیں کریں گے۔ آپ کو شاید معلوم ہی ہو اس گھر پہ کیا حادثہ گزرا ہے...!" وہ کوئی خاصا مہذب اور شائستہ ملازم معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "مجھے اسی حادثے کے بارے میں ان سے بات کرنی ہے۔ تم انہیں میرا نام بتاؤ اور کہو کہ مجھے صرف تعزیت نہیں کرنی ہے۔ میری بات تعزیت سے کہیں زیادہ اہم ہے۔"

اس نے شاید بادلِ ناخواستہ ہولڈ کرانے کے لیے کہا۔ چند سیکنڈ بعد کلک کی آواز ابھری اور وہ بولا "بات کیجیے۔" دوسرے لمحے احمد پرویز کی آواز ابھری۔ اس آواز سے وہ رعب اور کرارا پن غائب تھا جو اس کی پہچان تھا۔ اس کی جگہ شکستگی، تھکن اور غنودگی غالب تھی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے اکھڑے اکھڑے سے انداز میں قدرے بیزاری سے پوچھا "آپ کو مجھ سے کیا بات کرنے کی ضرورت پیش آگئی؟"

"بات کرنے کی ضرورت تو اصل میں آپ کو تھی لیکن آپ کو اس کا علم نہیں ہے۔" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا "میں نہیں چاہتا کہ آپ کا انجام بھی آپ کی بیوی جیسا ہو اس لیے میں آپ سے بات کرنے میں اپنا قیمتی وقت اور توانائی صرف کررہا ہوں۔ میرا ابھی اور اسی وقت آپ سے ملنا ضروری ہے...." پھر میں نے کچھ اور وضاحت کی کہ میرا اس سے ملنا کیوں ضروری تھا۔

"ٹھیک ہے.... آجایئے۔" میری بات ختم ہونے پر وہ شکست خوردہ سے انداز میں بولا۔

میں نے فون بند کیا اور فوراً ہی ہوٹل سے نکل کھڑا ہوا۔ اس بار میں اپنی گاڑی میں روانہ نہیں ہوا۔ میں نے ہوٹل کے کاموں میں استعمال ہونے والی ایک عام اور سستی سی گاڑی نکالی تاہم اس پر ہوٹل کا نام یا کوئی نشان وغیرہ نہیں تھا۔ اس بار بھی میں تعاقب کے سلسلے میں ہوشیار رہا۔ سڑکوں پر ٹریفک بہت کم تھا۔ بہت جلد مجھے اندازہ ہوگیا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں تھا۔ چند منٹ بعد ہی میں نے گاڑی ڈیفنس میں احمد پرویز کے شاندار بنگلے سے کچھ دور لے جا کر روکی۔ گاڑی میں نے ایک دوسرے بنگلے کے گیٹ کے قریب چھوڑ دی اور پیدل احمد پرویز کے بنگلے پر پہنچا۔

بنگلا کیا ایک چھوٹا موٹا قلعہ تھا۔ اس کی چار دیواری اور گیٹ کافی اونچا تھا۔ دیوار زرد پتھر کی تھی۔ میں نے کال بیل کا بٹن دبایا تو گھنٹی اندر نہیں بلکہ گیٹ کے قریب ہی کہیں بجی۔ اس کے جواب میں گیٹ یا بغلی گیٹ نہیں کھلا اور نہ ہی انٹر کام پر کوئی آواز ابھری بلکہ گیٹ میں چھوٹا سا ایک مستطیل شگاف پیدا ہوگیا اور دو بڑی بڑی مونچھوں نے باہر جھانکا۔ ایک لمحے کی تاخیر سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان مونچھوں کے ساتھ ایک عدد چہرہ بھی منسلک تھا مگر مونچھیں اتنی بڑی تھیں کہ چہرہ ضمنی چیز معلوم ہوتا تھا۔

دو سرخ سرخ آنکھوں نے مجھے گھورا پھر کاٹ کھانے والے انداز میں پوچھا گیا "کیا بات ہے؟"

"یہ کارڈ احمد پرویز صاحب کو بھجواؤ۔" میں نے سخت لہجے میں کہا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ مونچھوں کے نیچے تقریباً گھسیڑ دیا جہاں میرے اندازے کے مطابق اس کا منہ ہونا چاہیے تھا۔ وہ ہڑبڑا کر پیچھے ہٹا اور مونچھوں کی جگہ میں نے ایک ہاتھ نمودار ہوتے دیکھا۔

اس نے کارڈ تھام لیا اور ایک جھٹکے سے بولا "اچھا۔" اس کے ساتھ ہی چھوٹی سی وہ کھڑکی بند ہو گئی۔

مجھے چند منٹ بنگلے کے سامنے ٹہلنا پڑا۔ آخر بغلی گیٹ کھل گیا اور مونچھوں والی گرانڈیل شخصیت نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیک وقت دو ہتھیاروں کلاشنکوف اور ماؤزر سے مسلح تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس کے نیفے میں ٹی ٹی اور ڈھیلی ڈھالی فراک نما قمیص کی جیب میں پستول بھی موجود رہا ہو۔ اس سے چند قدم پیچھے ماربل کے ایک فٹ پاتھ نما راستے پر ایک باوردی ملازم میرا منتظر تھا۔ اس کی رہنمائی میں میں ایک ہال سے گزر کر سیڑھیوں کے ذریعے اوپر پہنچا۔ تمام راستہ دبیز قالین سے ڈھکا ہوا تھا۔ قلعہ نما اس طویل و عریض بنگلے پر اس وقت موت کا سا سکوت طاری تھا۔ قالین کی وجہ سے ہمارے قدموں کی آہٹ تک نہیں ابھر رہی تھی۔

ایک ٹیرس پر رک کر ملازم نے سامنے چند قدم کے فاصلے پر نظر آنے والے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا "صاحب اس کمرے میں ہیں۔" وہ مجھے وہیں کھڑا چھوڑ کر واپسی کے لیے مڑ گیا اور چند سیکنڈ میں غائب ہو گیا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر ملگجے اندھیرے میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ فضا میں مختلف پھولوں اور بھیگے بھیگے سبزے کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے ہی تقریباً تاریکی میں ڈوبا ہوا وہ بنگلا نظر آ رہا تھا جس کی بالائی منزل سے یقیناً اس وقت بھی ہمارا آدمی اس بنگلے کی نگرانی کر رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر آہستگی سے کمرے کے دروازے پر دستک دی جس کی کھڑکیوں کے بلائنڈز کے عقب میں روشنی نظر آ رہی تھی "آجائیے دروازہ کھلا ہے۔" ایک بہت ہی دھیمی سی آواز سنائی دی۔ کمرا تقریباً ساؤنڈ پروف تھا۔ آواز شاید بہ مشکل ہی باہر پہنچی تھی۔ میں اندر چلا گیا۔

ایک نہایت شاندار رائٹنگ ٹیبل کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر جو احمد پرویز نیم دراز تھا وہ مجھے اس احمد پرویز سے بہت مختلف نظر آیا جسے میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا۔ وہ ایک مضمحل، شکست خوردہ اور ڈھیلا ڈھالا انسان نظر آ رہا تھا جس میں اکڑ فوں نام کو نہیں تھی۔ وہ ابھی تک سوٹ میں تھا لیکن یہ سوٹ شکن آلود تھا۔ ٹائی ڈھیلی ہو کر ایک طرف کو مڑی ہوئی تھی۔ اس نے سرخ سرخ آنکھوں سے خفگی آمیز سے انداز میں مجھے گھورا۔ بہت کم وقت میں اس کی آنکھوں کے گرد حلقے بھی نمودار ہو چکے تھے۔ اس کی آنکھیں وحشی وحشی سی لگ رہی تھیں۔ چہرہ ستا ہوا تھا۔ شاید آج ہی آج میں اس کی عمر میں دس سال کا اضافہ ہو گیا تھا۔

تاہم مجھے اس سے کوئی ہمدردی محسوس نہیں ہوئی۔ وہ کوئی بہت بڑا خبیث یا بدمعاش تو نہیں تھا لیکن ہمدردی کا مستحق بھی بہرحال نہیں تھا۔ میں نے ایک کرسی کھینچ کر اس کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہے کہ میں درحقیقت یہاں کس لیے آیا ہوں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے دانت بھینچ لیے پھر اسے گھورتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں کہا "میں تمہیں صرف تھوڑا سا ذلیل کرنے آیا ہوں کیونکہ تم ذلیل ہونے کے مستحق ہو لیکن مجھے معلوم ہے تمہیں کوئی ذلیل نہیں کرے گا کیونکہ تم بہت دولت مند آدمی ہو۔ معاشرے میں تمہاری بڑی عزت ہے۔"

میرا خیال تھا کہ میرے الفاظ اسے کچوکے لگائیں گے اور اس کی پرانی فرعونیت کسی نہ کسی حد تک عود کر آئے گی لیکن اس کے چہرے پر کوئی تغیر نہ آیا۔ وہ اسی طرح بیٹھا خفگی آمیز مگر شکست خوردہ سے انداز میں مجھے گھورتا رہا۔ میں نے اسی گھٹے گھٹے لیکن غصیلے لہجے میں کہا "تمہاری بیوی جو تمہارے مقابلے میں کہیں زیادہ معقول اور شریف عورت تھی۔ تمہارے معصوم بچوں کی ماں تھی، جرم بے گناہی میں ماری جا چکی ہے اور کسی نہ کسی حد تک تم بھی اس کی موت کے ذمے دار ہو۔"

وہ ایک جھٹکے سے کچھ سکڑ سمٹ سا گیا جیسے کسی نے کوئی چیز اسے چبھو دی ہو تاہم اس نے احتجاج یا تردید نہیں کی۔ اس کے ہونٹوں کو جیسے تالا لگ گیا تھا۔ میں نے اسے زبان سے اذیت پہنچانے کا عمل جاری رکھا "تمہاری بیوی سے غلطی ہو گئی تھی کہ وہ بہن کو قتل ہوتے دیکھنے اور اصل قاتل سے واقف ہونے کے باوجود خوف کے باعث خاموش رہی لیکن اس نے جلد ہی تمہیں اصل بات بتا کر اپنی غلطی کی تلافی کر دی تھی مگر وہاں سے تمہاری کمینگی کا کھیل شروع ہو گیا۔ تم نے بھی زبان بند رکھی اور اسے بھی زبان بند ہی رکھنے پر قائل کر لیا۔ وہ شوہر پرست عورت دبک کر بیٹھ گئی..."

اس کی آنکھیں ذرا پھیلیں لیکن اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ مجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی تھی۔ اسے یقیناً اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی بیوی مجھ سے ملی تھی یا اس نے کسی ذریعے سے مجھے اصل بات بتائی تھی۔ اب وہ اس دنیا میں نہیں تھی اس لیے اس سلسلے میں بات کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تم بہرحال مضبوط پوزیشن کے مالک تھے۔ تمہارا اثر رسوخ بھی تھا۔ تم چاہتے تو حقیقت سامنے لا سکتے تھے اور اس کے نتائج کا مقابلہ بھی کر سکتے تھے۔ اگر اس کے نتیجے میں تمہیں کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی تھا تو تمہیں اس کا سامنا کرنا چاہیے تھا۔ مردانگی کا تقاضا یہی تھا لیکن تم نے نہ صرف اپنی بیوی سے بھی زیادہ بزدلی کا ثبوت دیا بلکہ تم نے چالاکی دکھانے اور اپنا گیم کھیلنے کے لیے بھی اس موقع کو غنیمت جانا۔ پولیس کامران دانش کو قاتل سمجھ رہی تھی اور سرگرمی سے اسے تلاش کر رہی تھی۔ وہ بے وقوف بھی ڈر کے مارے چھپتا پھر رہا تھا۔ تم نے پولیس کو اسی غلط فہمی میں اور بے چارے کامران دانش کو اس بھیانک خوف میں گرفتار رہنے دیا۔ حتیٰ کہ وہ بے چارہ بھی پُراسرار حالات میں مارا گیا..."

میں نے ایک گہری سانس لی اور اپنے لہجے کی تیزی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ابھی مجھے ان پُراسرار حالات کے بارے میں بھی حقائق معلوم کرنے ہیں لیکن کامران بہرحال زندگی سے محروم ہو چکا ہے۔ میرے نقطۂ نظر کے مطابق اس کی موت کے بھی تم کسی نہ کسی حد تک ذمے دار ہو۔ کبھی کبھی صحیح وقت پر بولا ہوا ایک سچ بہت سی جانیں بچا سکتا ہے، بہت سی تباہیوں کو ٹال سکتا ہے۔ کوئی ایک انسان ذرا سا خطرہ مول لے کر، ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے بہت سے انسانوں کی بقا کا سامان کر سکتا ہے مگر وہ ایسا نہیں کرتا۔"

میں نے کچھ اور نفرت سے اسے گھورا "تمہارے اس طرزِ عمل کی وجہ کوئی اور شاید نہ سمجھ سکے لیکن میں سمجھ گیا ہوں۔ میں نے اس پر بہت سر کھپایا ہے۔ تم نے اپنی بیوی کو بھی اذیت میں مبتلا رکھا۔ وہ بے چاری چکی کے دو پاٹوں میں پستی رہی۔ اسے شوہر کی خوشنودی عزیز تھی اس لیے اس نے زبان بند رکھی لیکن دوسری طرف مقتولہ بہن کی محبت بھی جوش مارتی تھی اور یہ خواہش بھی شدت سے ابھرتی تھی کہ انصاف کے تقاضے پورے ہوں، اصل قاتل کو سزا ملے۔ اصل قاتل کو شاید شروع ہی سے شبہ ہو چکا تھا کہ تمہاری بیوی حقیقت سے آگاہ ہے۔ غیبی آنکھیں تمہاری بیوی کی نگرانی کرنے لگی تھیں۔ شاید تمہارے گھر کے فون بھی ٹیپ ہو رہے ہوں۔ حتیٰ کہ اس موت نے اسے آن ہی لیا جس کے خوف سے اس نے ابتدا ہی میں زبان کو تالا لگا لیا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ موت سے قبل اس نے یہ راز کم از کم مجھ تک منتقل کر دیا تھا ورنہ تمہارے سوا کوئی بھی اس سے واقف نہ ہوتا اور اب اس کی موت کے بعد شاید تم اور بھی زیادہ سختی سے زبان بند کر لیتے کیونکہ اب تو تمہاری پوزیشن زیادہ شرمناک ہو گئی ہے۔"

اتنی دیر میں وہ پہلی بار اپنی آرام دہ کرسی پر کسمسایا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا "شکر کرو کہ میں نے اس معاملے میں ٹانگ اڑا دی ہے ورنہ واجدہ کے بعد شاید اب تمہارا نمبر ہوتا۔ سمیرا کے قتل سے جو سلسلہ شروع ہوا ہے وہ نہ جانے کہاں جا کر رکتا۔ اس تمام عرصے میں تمہارے زبان بند رکھنے کی بڑی وجہ صرف اور صرف لالچ تھا۔ کامران دانش کے روپ میں تمہیں بہت ہی اچھا قربانی کا بکرا نظر آ گیا تھا اور تم نے اسی کو پولیس کا ٹارگٹ بنا رہنے دیا۔ صرف اس لیے کہ تمہیں اس کی قانونی پوزیشن کا علم ہو گیا تھا۔ تمہیں پتا چل گیا تھا کہ اگر وہ سامنے آ گیا اور بے گناہ ثابت ہو گیا تو سمیرا کے شوہر کی حیثیت سے پرنس سعید کی وصیت کے مطابق وہ آدھی پرنس انڈسٹریز اور دوسرے اثاثوں کا مالک ہو جاتا۔ وہ راتوں رات معجزاتی انداز میں گویا فقیر سے بادشاہ بن جاتا لیکن تم نے یہ گوارا نہ کیا۔ ایک تو وہ دوسرا آدھا حصہ بھی تمہیں اپنی طرف آتا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے شاید ایک مفلس قلاش نوجوان کا راتوں رات تمہاری ہمسری کے قابل ہونا بھی تمہیں گوارا نہیں تھا۔ یہ تمہاری ضد، انا اور فرعونیت پر ایک تازیانہ تھا۔ تمہیں اپنی انا، ضد اور رعونت بھی تو بہت عزیز ہیں نا... دولت کے لالچ کے ساتھ ساتھ یہ ایک دوسری بڑی خرابی ہے تم میں..."

پہلی بار اس کے حلق سے خفیف سی ایک آواز برآمد ہوئی۔ یہ کراہنے کی سی آواز تھی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر رحم طلب سے انداز میں مجھے خاموش ہونے کا اشارہ کیا لیکن میں نے بات جاری رکھی "تم نے اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل نہیں کیا، کسی کے قتل کا حکم نہیں دیا اور باقاعدہ طور پر کسی کے قتل کی سازش تیار نہیں کی اس کے باوجود تم کسی قاتل سے کم نہیں ہو۔ تم ایک خاموش قاتل ہو۔ تم نے اپنی خاموشی سے تین سادہ دل، بے ضرر اور شریف انسانوں کو قتل کیا ہے اور ان میں سے ایک تو تمہاری وفا شعار بیوی تھی۔ آج جب تم اپنی بیوی کی لاش پر، اسپتال پہنچے جہاں اس سارے چکر میں خواہ مخواہ لقمۂ اجل بن جانے والے ڈرائیور کی لاش بھی موجود تھی، تب بھی تم نے زبان بند رکھی۔ رحیم گل سے تمہاری ملاقات ہوئی لیکن تم نے اب بھی اس سے کچھ نہیں کہا۔ گویا تم نے اب بھی بھیڑ کی کھال میں چھپے ہوئے ایک بھیڑیا صفت قاتل کو بچ نکلنے کا پورا پورا موقع دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم کس قسم کے انسان ہو احمد پرویز!"

اس کے دونوں ہاتھ کرسی کے ہتھوں پر تھے۔ اس نے اتنے زور سے ہتھوں کو پکڑا ہوا تھا کہ اس کی انگلیاں سفید سفید سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ اس کے ہونٹ ہلے مگر کوئی آواز برآمد نہ ہوئی۔ میں نے نفرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہمارے ہاں کے لوگوں میں دولت کی ہوس کبھی ختم کیوں نہیں ہوتی۔ جرائم پیشہ لوگ تو خیر ایک الگ ہی ذہنیت کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ تو ہر قبیح جرم کے ذریعے دولت کھینچنے میں لگے ہی رہتے ہیں لیکن تم جیسے معزز لوگ جن کے پاس بے تحاشا دولت ہوتی ہے اور ابھی مزید دولت کی آمد کا سلسلہ جاری ہی ہوتا ہے، وہ بھی بعض اوقات معجزاتی انداز میں یا کسی بھی نامناسب اور ناجائز ذریعے سے حاصل ہونے والی دولت کی تاک میں رہتے ہیں۔ آخر کس لیے؟ جب کہ دنیا کی ہر بڑی سے بڑی نعمت انہیں پہلے ہی حاصل ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اس کی سرخ آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی تھی۔ میں نے بے رحم سے لہجے میں کہا "اب آنسو بہانے کی کوشش نہ کرنا۔ آنسو بہانے کا وقت اب گزر چکا ہے۔ تم چاہتے تو کامران دانش، اپنی وفادار بیوی اور ڈرائیور کو مرنے سے بچا سکتے تھے۔ اب تم اپنی سیاہ سوچ پر سفیدی پھیرنے کی کوشش مت کرنا۔ اب اس کا وقت گزر چکا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تمہاری قانونی پوزیشن کیا ہے۔ تمہیں کوئی سزا مل سکتی ہے۔ میرا خیال ہے ہمارے ہاں اس قسم کی شہادتوں کو چھپانے پر سزا کا قانون موجود ہے لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ اس کے تحت تمہیں کوئی خاص سزا

مل سکے گی۔ اگر تمہارے ضمیر میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہے تو شاید ضمیر ہی تمہیں کوئی سزا دے سکے۔"

پھر میں نے پُرخیال انداز میں سرہلایا "تمہیں سزا دلوانے کا ایک طریقہ اور ہے کہ میں خواہ مخواہ اس معاملے میں ٹانگ اڑائے رکھنے کا ارادہ ترک کردوں اور تمہیں اسی شخص کے رحم و کرم پر چھوڑ دوں جو تمہاری سالی اور بیوی کی موت کا ذمے دار ہے۔ وہ تمہیں بھی چھوڑے گا نہیں.... اور یہ تو تمہیں اچھی طرح معلوم ہی ہے کہ وہ کتنا خطرناک آدمی ہے۔ کیسے خطرناک آدمیوں سے اس کے مراسم.... بلکہ شاید پارٹنرشپ ہے۔ تم کہاں تک اپنی حفاظت کا انتظام کرو گے؟ اور وہ تو ایسے لوگ ہیں کہ تمہارے تمام تر حفاظتی انتظامات کے باوجود بھری پُری سڑک پر بھی تمہیں گولیوں سے چھلنی کر کے جاسکتے ہیں اور اس کے بعد بھی شاید کوئی کچھ نہ کرسکے۔"

اچانک میری جیب میں موجود موبائل فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ خوف زدہ سے انداز میں تقریباً اچھل پڑا۔ میں نے موبائل فون جیب سے نکالا تو احمد پرویز تھوک نگل کر رہ گیا۔ اس کے اندر یقیناً زبردست شکست و ریخت جاری تھی اور اس نے میری کسی بات کی تردید نہیں کی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے اندازے درست ہی تھے۔ خوف اور بدحواسی بھی اس پر غلبہ پاچکی تھی۔ مجھے اس کی حالت دیکھ کر خوشی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تھا وہ کچھ نہ کچھ اذیت سے گزرے۔ اس نے کچھ نہ کرتے ہوئے بھی جو کچھ کیا تھا اسے اس کی کچھ نہ کچھ سزا تو ملے۔

میں نے موبائل فون نکال کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف شفیع شاہ تھا "سر! آپ وہیں ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں وہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے سوال کا مطلب کیا تھا اور وہ بھی آسانی سے سمجھ سکتا تھا کہ میرے جواب کا مطلب کیا تھا۔

"وہ اپنے ٹھکانے سے روانہ ہوچکا ہے۔ اس نے راستے میں دو آدمیوں کو ساتھ لیا ہے جو دو مختلف جگہوں پر اس کے انتظار میں کھڑے ہوئے تھے۔ اب اس کا رخ اسی طرف معلوم ہوتا ہے جہاں کا آپ نے اندازہ ظاہر کیا تھا۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"ٹھیک ہے.... آنے دو۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "دوسری جگہوں سے بھی تمہارا رابطہ ہے نا؟"

"جی سر! ایک ایک لمحے کی خبروں کا تبادلہ ہورہا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کس صورتِ حال میں کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

"جی سر!" جواب ملا اور میں نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔

احمد پرویز ٹکر ٹکر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے فون جیب میں رکھتے ہوئے کہا "بعض ڈاکوؤں اور خبیثوں کی عمر بڑی لمبی ہوتی ہے۔ شاید اس کی بھی لمبی ہو۔ ویسے میں تو یہی چاہتا ہوں کہ لمبی نہ ہو لیکن کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا۔ حالات پر میرا اختیار نہیں ہے۔ ابھی اس خبیث کا تذکرہ ہوا اور اطلاع مل گئی کہ وہ آرہا ہے۔ وہ تمہارے لیے آرہا ہے۔ کیا خیال ہے.... تمہارے اس مضبوط مکان کی بلند و بالا دیواریں اور ایک دو مسلح محافظ تمہیں بچا سکتے ہیں؟؟"

وہ یک دم سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ خوف نے اس میں ایک نئی زندگی بھردی۔ اس کی میز پر دو جام اور ایک موبائل فون موجود تھا۔ وہ ان کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "میں اور آدمی بلوالیتا ہوں۔" وہ کافی دیر بعد بولا تھا۔ اس کے حلق سے عجیب پھنسی پھنسی سی آواز نکلی تھی۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا "اس کی ضرورت نہیں۔ مجھے تم سے کوئی ہمدردی نہیں ہے لیکن فی الحال میں مصلحت کے تحت تمہاری حفاظت کروں گا.... اور میں اکیلا نہیں ہوں۔ مطمئن رہو۔ تمہاری حفاظت کا معقول بندوبست موجود ہے۔ بس اس وقت تمہاری حیثیت ذرا کم ہوگئی ہے۔ اس وقت تمہاری حیثیت چارے کی سی ہے اور تمہیں اس پر صبر کرنا پڑے گا۔ کسی گارڈ، کسی چوکی دار کو مت بلاؤ۔ کسی کو ہوشیار رہنے کی ہدایت مت کرو۔ بس.... خاموشی سے بیٹھ کر تماشا دیکھو۔ میں ذرا دیکھنا چاہتا ہوں کہ آنے والا کیا طریقۂ کار اختیار کرتا ہے۔ آیا وہ اپنی آمد کی اطلاع دے کر مین گیٹ کے راستے آتا ہے یا کوئی اور راستہ اختیار کرتا ہے۔ تم جس طرح بیٹھے ہو اسی طرح بیٹھے رہو۔ ہمیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے تیزی سے پوچھا "میری بات سمجھ میں آگئی ہے نا؟" اس نے اثبات میں سرہلایا تو میں نے پوچھا "تم تعاون کے لیے تیار ہو؟"

"ہاں۔" اس کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔

"گڈ۔ شاید اسی طرح تمہارے کیے کی ایک آدھ فیصد تلافی ہوجائے۔ تمہیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ کسی کو پکارنے یا مدد کے لیے بلانے کی ضرورت نہیں۔ جتنا زیادہ ہنگامہ ہوگا اتنی ہی زیادہ جانیں خطرے میں پڑیں گی اور خونریزی کا امکان بڑھ جائے گا۔ اس لیے تم صرف ڈمی بن کر بیٹھے رہنا۔ اس میں تمہارے لیے زیادہ عافیت ہے۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اسے یہ ہدایت دیں پھر جیب سے چھوٹا سا آلہ نکال کر اس کی میز کے نیچے چپکا دیا۔

وہ بغور میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے میز کے نیچے اشارہ کرتے ہوئے اسے مزید ہدایت کی "تم اس کے بارے میں بالکل بے خبر رہنا۔ تم سمجھنا کہ تم نے یہ چیز دیکھی ہی نہیں۔ اوکے؟"

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور آہستگی سے اثبات

میں سرہلایا۔ شاندار ریوالونگ چیئر پر اس کا وجود کچھ سکڑا سمٹا ہوا سا لگ رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کمرے میں تین دیواروں پر چھت سے فرش تک بھاری بھرکم خوب صورت آرائشی پردے آویزاں تھے۔ باقی ایک دیوار پر لکڑی کی خوب صورت پینلنگ تھی۔ اسی دیوار میں کھڑکی تھی جس کے نیچے اسپلٹ ائرکنڈیشنر رکھا تھا۔ میں از سرِنو ایک بار کمرے کا جائزہ لینے کے بعد ایک دبیز پردے کے پیچھے چلا گیا۔ چھپنے کے لیے وہ جگہ بری نہیں تھی۔ وہاں دھول مٹی کی بو نہیں تھی۔ پردوں کے پیچھے بھی حیرت انگیز حد تک صفائی تھی۔ میں پردوں کے درمیان ایک باریک سی جھری بنائے کمرے پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ احمد پرویز بار بار ٹشو پیپر سے چہرہ خشک کر رہا تھا۔ وہ یقیناً مضبوط اعصاب کا مالک تھا لیکن آج اس کے اعصاب امتحان در امتحان سے گزر رہے تھے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ پردے کی طرف نہ دیکھے۔

ہمارا انتظار طویل ثابت نہیں ہوا لیکن طویل محسوس ضرور ہوا۔ پہلے کچھ فاصلے سے مدھم سی کچھ آوازیں ایسی سنائی دیں جیسے موٹے موٹے چوہے ننگے فرش پر دوڑ رہے ہوں۔ اس کے چند لمحے بعد ٹیرس کے فرش پر قدموں کی آہٹ ابھری۔ ٹیرس کے فرش سے اوپر کھلا آسمان تھا اس لیے وہاں قالین نہیں تھا۔ چند لمحے بعد تیزی سے دروازے کی ناب گھومی اور گویا پلک جھپکتے میں دو نوجوان اندر آگئے۔ وہ ڈھیلی ڈھالی قیصوں اور جینز میں تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ٹی ٹی تھی۔ ان کے پیچھے پیچھے صفدر اندر آیا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک پستول نظر آرہا تھا۔

دونوں نوجوانوں نے پھرتی سے میز کے دونوں طرف پہنچ کر احمد پرویز کو نشانے پر لے لیا۔ صفدر کا پستول والا ہاتھ بے نیازی سے اس کے پہلو میں لٹکا ہوا تھا۔ شام میں نے اسے خمار زدہ دیکھا تھا لیکن اب تک یقیناً اس کا نشہ پوری طرح اتر چکا تھا اور وہ اس چیتے کی طرح چوکنا نظر آرہا تھا جو شکار پر نکلا ہوا تھا۔ احمد پرویز خوف زدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میری تسلیاں اپنی جگہ تھیں لیکن وہ سچ مچ خوف زدہ تھا۔ خوف زدہ ہونے کی اداکاری نہیں کر رہا تھا۔

"تم کہاں سے آئے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ اس کی حیرت بھی حقیقی تھی۔

"انسان کو جہاں پہنچنے کی لگن ہو وہاں کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ مل ہی جاتا ہے۔" صفدر مسکرایا۔ اس وقت وہ واقعی ایک مختلف انسان نظر آرہا تھا۔ نہایت سفاک اور زبردست سازشی۔۔۔! وہ پستول سے اپنی ران تھپکتے ہوئے آنکھوں سے اپنے دونوں ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "میرے یہ دوست سپاٹ دیواروں، پائپوں، حتیٰ کہ نوکیلے حفاظتی جنگلوں پر بھی چڑھنے میں بڑے ماہر ہیں۔ تھوڑے بہت ہنر انہوں نے مجھے بھی سکھا دیے ہیں۔ یہ بھی ایک اچھا اتفاق ہے کہ میں اس بنگلے کی ساخت سے اچھی طرح واقف ہوں۔"

اس کی سفاک مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوگئی "یہی نہیں بلکہ میں تو آپ کی کچھ خاص عادات سے بھی واقف ہوں۔ مجھے معلوم ہے جب آپ زیادہ پریشان اور الجھے ہوئے ہوتے ہیں تو رات گئے تک یہاں اسٹڈی میں بیٹھتے ہیں۔ تنہا بیٹھ کر سوچ بچار کرتے ہیں۔ یہ ایک طرح سے آپ کی اسٹڈی کم اور مراقبہ گاہ زیادہ ہے۔ ہمیں تو اور بھی زیادہ بہتر طور پر ایک دوسرے کے گھربار اور عادات سے واقف ہونا چاہیے تھا۔ آخر ہم ایک دوسرے کے ہم زلف بننے والے تھے۔ آپ تو بہت خوش ہوں گے کہ آپ اس رشتے میں پھنسنے سے بال بال بچ گئے۔۔۔ لیکن میں آپ کو زیادہ دن خوش ہونے کا موقع نہیں دے سکتا۔ میں پہلے ہی کافی خطرہ مول لے چکا ہوں۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟" احمد پرویز نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

"میں نے تمہاری بیوی کو کافی دن زندہ رہنے دیا اور میں اس دوران میں بہت پریشان رہا۔ جس رات میں غصے میں سیرا کو مار بیٹھا اور اس بنگلے سے نکلا تو میں نے تمہاری بیوی کی گاڑی گلی کے موڑ پر مڑتے دیکھی۔ مجھے یقین ہوگیا کہ وہ کچھ دیکھ چکی تھی لیکن میں اس کا تعاقب نہیں کرسکا پھر میں نے اس سے فون پر بات کی تو اس نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ وہ کچھ جان چکی تھی بلکہ میری درخواست پر وہ اسٹوڈیو آنے کے لیے بھی تیار ہوگئی۔ وہ بالکل بے خبر بنی ہوئی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مصلحتاً ایسا کر رہی تھی۔ وہ خوف زدہ تھی۔ کسی جھگڑے میں پڑنا نہیں چاہتی تھی۔ بہن کی محبت کو اس نے دبا لیا تھا۔ شاید یہ تصور بھی اس کے احساسات پر غالب آگیا تھا کہ اب بہن کی وراثت بھی اس کی طرف منتقل ہونے والی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ کوئی بات تمہیں بتائے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس نے تمہیں ضرور بتا دیا ہوگا لیکن تم بھی خاموش رہے۔ تمہاری مصلحتوں کو سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا لیکن میں اس خطرناک راز کے ساتھ اس عورت کو زندہ رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا۔۔۔ اور کئی دن کی نگرانی کے بعد آخر مجھے موقع تلاش کرنا ہی پڑا۔"

"موٹر سائیکل پر جن تین نوجوانوں نے واجدہ کو روکا اور ہلاک کیا۔۔۔ ان میں دو کیا یہی ہیں؟" احمد پرویز نے گویا ہمت کرتے ہوئے پوچھا۔

"غیر ضروری سوالات نہیں کیا کرتے۔" صفدر مسکرایا "مجھے پتا چلا ہے کہ کل تم نے اس ہیرو ٹائپ پولیس انسپکٹر سے ملنے اور کوئی بیان دینے کا پروگرام بنا رکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے تم نے اب مصلحتوں کو بالائے طاق رکھنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔۔۔ لیکن اب بہت دیر ہوچکی ہے مائی ڈیئر احمد پرویز! اب میں تمہیں زبان کھولنے کی اجازت نہیں دے سکتا اور وہ گدھا انسپکٹر تو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ اس خبیث کے دماغ میں دیانت داری کا خناس ہے۔ ابھی تک میں اسے چکر دینے میں کامیاب رہا ہوں۔ اس کے پاس جانے کا تو تمہیں سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ ساری بات ہی گھوم جائے

گی۔ اس گدھے کو تو خریدا بھی نہیں جاسکتا اور وہ آسانی سے ہاتھ آنے والا بھی نہیں لگتا۔ اس قسم کے گدھے جان دے دیتے ہیں لیکن ہم جیسوں کی بات نہیں مانتے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ واجدہ کے بعد مجھے بھی مار کر تم بچ جاؤ گے؟" احمد پرویز کمر کھراتی سی آواز میں بولا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں ڈیئر احمد پرویز۔۔۔!" صفدر مشفقانہ سے لہجے میں بولا۔ وہ شاید اس وقت اپنی پوزیشن سے کچھ زیادہ ہی لطف اندوز ہو رہا تھا "ہم تمہیں نہیں ماریں گے۔ تم خود اپنے آپ کو مارو گے۔ تم خودکشی کرو گے۔ کم از کم ظاہر تو یہی ہوگا اور اخباروں میں یہی آئے گی۔ کاروباری الجھنیں۔۔۔ بیوی کا قتل۔۔۔ اخبارات ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے حساب سے قیاس آرائیاں کریں گے۔ پولیس بھی ان سے متفق ہوجائے گی۔"

پھر وہ میز کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولا "اکثر دولت مند لوگ اپنے بیڈ روم میں سائڈ ٹیبل کی دراز میں یا پھر اسٹڈی میں میز کی دراز میں۔۔۔ اور بعض اوقات تو دونوں ہی جگہ ریوالور یا پستول ضرور رکھتے ہیں۔ امید ہے تمہاری اس میز کی دراز میں بھی ایسا کچھ ضرور ہوگا۔۔۔"

اس نے آگے بڑھ کر احمد پرویز کی ریوالونگ چیئر کو دھکا دیا۔ کرسی احمد پرویز سمیت کونے میں دیوار سے جا ٹکرائی۔ دونوں نوجوان بدستور اسے کور کیے ہوئے تھے۔ صفدر نے جھک کر میز کی درازیں کھولیں۔ ایک دراز میں اسے پستول مل ہی گیا۔

"بہت اچھا ہوا کہ یہاں تمہارا اپنا پستول موجود ہے۔" صفدر اسے بائیں ہاتھ میں نچاتے ہوئے بولا "اب خودکشی کا ڈراما حقیقت سے زیادہ قریب نظر آئے گا ورنہ ہمیں اپنے ہی پستول سے گزارا کرنا پڑتا۔ اس پستول کی گولی تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کرے گی اور یہی تمہارے ہاتھ میں پھنسا ہوا پایا جائے گا۔ یہاں ہماری آمد کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔ اس لیے سیدھا سادہ خودکشی کا کیس ہوگا۔"

احمد پرویز کرسی میں سکڑا سمٹا ہوا تو تھا ہی۔۔۔ لیکن اب وہ گویا اور سکڑ گیا اور خوف زدہ سی آواز میں بولا "تم سے کس نے کہا کہ میرا رحیم گل سے ملنے اور کسی قسم کا بیان دینے کا ارادہ ہے؟"

"ہمیں یونہی اتفاق سے اڑتی اڑتی سی خبریں مل جاتی ہیں۔۔۔ ہمارے اپنے بھی کچھ ذرائع ہیں۔ یونہی ہمارے کام چلتے رہتے ہیں۔" صفدر بولا۔

"لیکن میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تمہیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔" احمد پرویز گھٹی گھٹی آواز میں بولا۔

صفدر طنزیہ سے انداز میں ہنسا "مجھے معلوم تھا تم یہی کہو گے لیکن ہم اتنے احمق نہیں ہیں کہ تمہاری بات پر یقین کرلیں۔"

اس نے اپنا پستول جیب میں رکھ لیا اور احمد پرویز کے پستول کا میگزین نکال کر چیک کیا "پستول تو لوڈڈ ہے۔" وہ طمانیت سے بولا "احمد پرویز! تم ہمارے لیے آخری خطرہ ہو۔ تم راستے سے ہٹ جاؤ گے تو ہماری بہت سی دشواریوں کا خاتمہ ہوجائے گا۔ اگر تم اپنی خودکشی کے سلسلے میں کوئی خط وغیرہ بھی لکھ دیتے تو بہت اچھا ہوتا لیکن مجھے معلوم ہے تم میری یہ درخواست نہیں مانو گے اس لیے ہمیں اس کے بغیر ہی کام چلانا پڑے گا۔ کرسی ذرا دوبارہ یہاں میز کے قریب لے آؤ۔ تمہاری لاش وہاں کونے میں گھسی ہوئی کرسی پر کچھ اچھی معلوم نہیں ہوگی۔"

اس نے اشارہ کیا۔ احمد پرویز نے اس کی ہدایت پر عمل نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ بہادری دکھانے کی کوشش کر رہا تھا بلکہ وجہ یہی تھی کہ اس میں خوف کے باعث اپنی جگہ سے ہلنے کی سکت نہیں تھی۔ اسے شاید یہ یقین نہیں تھا کہ میں بروقت پردے کے پیچھے سے نکل کر مداخلت کروں گا اور اگر مداخلت کرنے کی جرأت کر بھی بیٹھا تب بھی شاید تین مسلح اور مشاق قسم کے بدمعاشوں کے سامنے شاید میری اپنی جان کے لالے پڑ جائیں۔ میں اس کی کیفیت کو سمجھتے ہوئے مسکرا دیا۔ مجھے مداخلت کرنے میں پہل کرنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔

عین اسی لمحے خاموشی سے دروازے کی ناب گھومی اور دروازہ گویا ہوا کے جھونکے سے بے آواز طریقے سے کھل گیا لیکن اندر آنے والا ہوا کا جھونکا نہیں، رحیم گل تھا۔ وہ وردی میں تھا اور اس کے ہاتھ میں ٹی ٹی تھی۔

"ہینڈز اَپ۔" وہ گرجا۔ وہ تینوں اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے تیزی سے گھومے۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ اس کی وردی کی پروا کیے بغیر فائر کردیں گے۔ اس وقت تک میں بجلی کی سی تیزی سے پردے کے پیچھے سے نکل آیا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ ان تینوں کی توجہ اس سے پہلے پردے یا دروازے کی طرف نہیں رہی تھی اس لیے انہیں صورتِ حال کو سمجھنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہوگئی۔ میں نے ایک نوجوان کی کلائی پر اپنے مشین پسٹل کے دستے سے وار کیا اور ساتھ ہی دوسرے کی کنپٹی پر فلائنگ کک رسید کی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور جس کی کلائی پر پسٹل کا دستہ پڑا تھا اس کے ہاتھ سے ٹی ٹی بڑے زور سے قالین پر گری۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی کلائی ٹوٹ گئی ہوگی۔

رحیم گل نے صفدر کے ہاتھ پر ٹھوکر رسید کی۔ گولی چل گئی مگر اس کا رخ چھت کی طرف رہا۔ اس کے ساتھ ہی پستول اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن وہ عقاب کی طرح جھپٹ کر رحیم گل سے الجھ پڑا۔ وہ بھی اس سے اس کی ٹی ٹی چھیننے کی فکر میں تھا۔ اس نے رحیم گل کی کلائی گرفت میں لے لی تھی اور دونوں قالین پر ڈھیر ہوچکے تھے۔ احمد پرویز ہکا بکا رہا تھا۔ وہ مار دھاڑ شروع ہوتے ہی میز کے نیچے گھس گیا تھا۔

رحیم گل نہایت آسانی سے صفدر سے نمٹ لیتا لیکن اسی دوران میں شفیع شاہ اندر آیا اور اس نے اس کا کام بہت ہی آسان کردیا۔ اس نے صفدر کی پسلیوں میں ایسی ٹھوکر رسید کی کہ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح بلبلا کر دور جا گرا۔ میں اس دوران میں

دونوں نوجوانوں کو گردن سے پکڑ کر ان کے سر آپس میں ٹکرا چکا تھا جس کے بعد وہ بالکل ڈھیلے پڑ گئے تھے اور قالین سے اٹھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

شفیع شاہ کے ہاتھ میں بھی گن تھی لیکن اسے صرف ایک لات ہی چلانی پڑی۔ ہم تینوں گولی انتہائی ناگزیر حالت میں چلانا چاہتے تھے۔ رحیم گل نے اٹھتے اٹھتے ٹی ٹی ہولسٹر میں رکھ لی۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب اس کی بھی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ کام ایک ڈیڑھ منٹ میں نمٹ گیا تھا۔

صفدر پسلیوں پر ہاتھ رکھے پڑا کراہ رہا تھا۔ تکلیف میں شاید وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اس کی جیب میں ایک پستول موجود تھا۔ رحیم گل نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کے منہ پر ایسا تھپڑ رسید کیا کہ اس کا منہ گھوم گیا اور ہونٹ پھٹ گئے۔ مجھے امید تھی کہ جب کچھ دیر بعد اس تھپڑ کے اثرات ظاہر ہوں گے تو صفدر کی شکل خاصی بدل چکی ہوگی۔ ساتھ ہی اس نے صفدر کو دو تین گندی گندی گالیوں سے نوازا۔ بوقتِ ضرورت وہ یہ کام بھی کرلیتا تھا۔ تہذیب و شائستگی کو بالائے طاق رکھ دیتا تھا اور "مستحق" لوگوں کو ان کے اعمال کی مناسبت سے مغلظات سے نوازتا تھا۔ پھر اس نے اس کی ناف کے نیچے اچانک گھٹنا رسید کیا۔ صفدر ایک بار پھر بری طرح بلبلا اٹھا۔ اب اس میں ذرا بھی دم خم نہیں رہا تھا۔

رحیم گل نے اسے قالین پر پٹخ دیا۔ لگتا تھا کہ اسے صفدر پر کچھ زیادہ ہی غصہ آرہا تھا۔ وہ اسے ایک خاصی نامناسب سی جگہ پر مزید ایک ٹھڈ رسید کرتے ہوئے بولا "تم جیسے بھیڑ کی کھال میں چھپے ہوئی بھیڑیوں کو پکڑنے میں ہمیں سب سے زیادہ دشواری پیش آتی ہے۔"

پھر اس نے آواز دی۔ دو اے ایس آئی کلاشنکوفیں لیے مستعدی سے اندر آگئے۔ اب وہاں ان کے کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا تاہم وہ چند لمحے کلاشنکوفیں ادھر اُدھر گھماتے ہوئے چوکنا سے انداز میں کمرے کا جائزہ لیتے رہے جیسے انہیں زبردست پولیس مقابلے کا اندیشہ ہو۔ رحیم گل نے انہیں قابو میں آئے ہوئے تینوں افراد کو ہتھکڑیاں لگانے اور ان کے ہتھیار قبضے میں لینے کا حکم دیا۔ ان میں سے ایک نے کلاشنکوف کندھے پر لٹکائی اور خاصی مستعدی سے یہ کام انجام دیا۔ دوسرا اسی طرح چاق و چوبند کھڑا رہا۔

رحیم گل ذرا طنزیہ سے انداز میں بہ آوازِ بلند بولا "سیٹھ صاحب! خطرہ ٹل گیا ہے۔ میز کے نیچے سے نکل آیئے۔"

احمد پرویز نے کسی خوف زدہ خرگوش کی طرح میز کے نیچے سے سر نکالا پھر دھیرے دھیرے باہر آکر کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ یوں ہانپ رہا تھا جیسے میلوں دوڑ کر آیا ہو حالانکہ وہ کمرے کے اس کونے میں ہی رہا تھا۔ پولیس والوں نے دونوں نوجوانوں کو کھڑا کیا تو ان میں سے ایک جس کی گدی پر میں نے فلائنگ کک رسید کی تھی، سنبھل چکا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور چہرہ خاصا بھیانک نظر آرہا تھا۔

وہ رحیم گل کو گھورتے ہوئے اور کمال جرأت کا مظاہرہ کر[تے] ہوئے سانپ کی طرح پھنکارا "اوئے پولیسیئے! ابھی وقت ہے [اگر] زندگی چاہتا ہے تو اب بھی ہمیں چھوڑ دے۔ بات یہیں ٹل جا[ئے] گی۔ اچھی طرح سوچ لے....."

رحیم گل نے اس کے پیٹ میں زوردار لات رسید کی [تو وہ] دُہرا ہوگیا اور پھر اس نے وہیں بیش قیمت نفیس قالین پر ا[لٹی] کردی۔ رحیم گل نے گریبان سے پکڑ کر بے رحمی سے جھٹکا [دیتے] ہوئے صفدر کو سیدھا کیا اور دانت بھینچ کر بولا "تجھے بھی [اگر] ڈائیلاگ بولنا ہے تو بول لے دو ٹانگوں والے کتے!"

صفدر سے سیدھا کھڑا نہیں ہوا جارہا تھا تاہم اس نے ب[اری] اور رحیم گل کی طرف باری باری اس طرح دیکھا جیسے کہ رہا ہ[و] سمجھ رہے ہو ہمارے پکڑے جانے سے بات ختم ہوجائے گی؟ [تم] سے تو ہم کسی نہ کسی طرح نمٹ لیں گے۔ منہ سے البتہ وہ کچھ نہ[یں] بولا۔

رحیم گل اسے چھوڑ کر احمد پرویز کی طرف متوجہ ہوا اور [د]ھیمی مگر غیظ آلودسی آواز میں بولا "اس سارے معاملے میں تمہا[را] کردار بھی مجھ پر واضح ہوچکا ہے۔ میں سرکاری وکیل کے علاو[ہ] دو چار دوسرے اچھے وکیلوں سے مشورہ کروں گا کہ تمہارے خ[لاف] میں کیا کیا جاسکتا ہے۔ میں اگر تمہیں کوئی سزا نہ بھی دلوا سکا [تو] بھی تمہیں اتنا گھسیٹوں گا ضرور کہ تمہیں اپنی پیدائش پر شرمن[دگی] ہونے لگے گی۔"

سردست اس نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ ہم باہر آئے تو ہم[نے] دیکھا، احمد پرویز کے ملازم اور گارڈز وغیرہ ٹیرس پر موجود [تھے۔] پولیس نے بنگلے کو گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ نیچے پہنچ کر کچھ دیر [بعد] رحیم گل اپنے تینوں مجرموں کو ایک موبائل میں بٹھانے کے [بعد] اپنی لینڈ کروزر میں بیٹھنے سے پہلے مضبوطی سے مجھ سے مصافحہ کر[تے] ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "بہت شکریہ۔"

ان دو الفاظ میں اس کے تمام جذبات سمٹے ہوئے تھے۔ [مجھے] اچھی طرح احساس تھا کہ میں نے اس کے لیے کتنا اہم کام کیا [تھا] لیکن وہ زیادہ لمبے چوڑے الفاظ میں تشکر کا اظہار نہیں کرسکتا [تھا۔] یہ اس کی مجبوری تھی۔ میں اور شفیع شاہ وہاں سے الگ ا[لگ] گاڑیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔

دوسرے روز مجھے ایک اور خوش خبری سننے کو ملی۔ [نفیس] صاحب نے مجھے اسلام آباد سے فون کیا اور مختصر الفاظ میں [خیر و] عافیت دریافت کرنے کے بعد بولے "درانی کے بارے میں تو [تمہیں] پتا چل ہی گیا ہوگا؟"

"نہیں سر! مجھے تو کچھ پتا نہیں چلا۔ کیا ہوا؟" میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"حیرت ہے! میں تو سمجھ رہا تھا تم نے اس کے محکمے میں [بھی] جاسوس چھوڑ رکھے ہیں اور خود بھی کراچی میں بیٹھے ہو اس [لیے] تمہیں فوری طور پر خبر مل گئی ہوگی۔" وہ بولے۔

"ارے صاحب! ہمارے ذرائع اتنے مستعد کہاں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "آپ کو اسلام آباد میں بیٹھ کر بعض خبریں ہم سے پہلے مل جاتی ہیں حالانکہ ان کا تعلق ہم سے ہوتا ہے....." ذرا توقف سے میں نے کہا "لیکن بہت سی اہم خبریں شاید کبھی آپ تک نہیں پہنچ پاتیں جن کے بارے میں شاعر نے کہا ہے "خاک ہوجائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک....." یا پھر شاید آپ وہ خبریں سننا ہی نہیں چاہتے۔ ان کی طرف سے کان بند کرلیتے ہیں۔"

"میں نے تمہیں خوش خبری سنانے کے لیے فون کیا تھا۔ تمہاری طنزیہ باتیں سننے کے لیے نہیں۔" وہ خشک لہجے میں بولے "اگر تمہیں خوش خبری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے تو بھاڑ میں جاؤ۔"

"آئی ایم سوری سر!" میں نے جلدی سے مؤدبانہ لہجے میں کہا "یہ کم بخت زبان خواہ مخواہ پھسل جاتی ہے۔"

"یہ زبان تمہیں کسی روز مروا دے گی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے "خوش خبری بہرحال یہ ہے کہ درانی کو معطل کردیا گیا ہے۔ اس کے خلاف محکمہ جاتی تحقیقات شروع ہوگئی ہیں۔"

"یاھُو.....!" میں نے حفظِ مراتب کا خیال کیے بغیر فوراً ایک نعرۂ مستانہ بلند کیا۔ اس وقت راحیلہ بھی میرے پاس آفس میں بیٹھی تھی۔ وہ حیرت سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"یہ کیا بے ہودگی ہے!" دوسری طرف سے نفیس صاحب غرائے۔

"سوری سر! میں ذرا جذباتی ہوگیا تھا۔" میں نے فوراً سنبھلتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اپنے ذرائع سے بھی یہ اطلاع شاید جلد ہی مل جائے اور یہ دو تین روز تک شاید اخباروں میں بھی آجائے۔ اب جلد ہی تمہارے ہوٹل کا دفتری ریکارڈ وغیرہ واپس ملنے کی بھی کوئی صورت نکل آئے گی۔" نفیس صاحب بولے۔

"آپ نے اس سلسلے میں جس حد تک بھی اپنا اثر رسوخ استعمال کیا اس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں سر!" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔

"اس میں میرے اثر رسوخ کا ذرا کم اور تمہاری بدمعاشیوں کا زیادہ دخل ہے۔" نفیس صاحب بولے "بہرحال اگر میں تمہارے تھوڑا بہت کام آسکا ہوں تو اس کی مجھے خوشی ہے۔ میری ریٹائرمنٹ میں صرف ایک ہفتہ رہ گیا ہے۔ خواہش تو میری یہ تھی کہ میں اپنی ملازمت کے آخری دنوں میں کوئی خاص کام، کوئی بڑا کارنامہ انجام دے کر جاتا لیکن ایسا کرنے کا موقع نہیں مل سکا تو میں نے سوچا چلو کچھ دوستوں کے چھوٹے موٹے جائز کام ہی کرجاؤں۔ کم از کم وہ تو اچھے الفاظ میں یاد کریں گے۔"

"سر! آپ کو خبیثوں اور وطن دشمنوں کے سوا سبھی اچھے الفاظ میں یاد کریں گے۔ آپ کے لیے آخری دنوں میں کوئی کارنامہ انجام دینا ضروری نہیں تھا۔ آپ کی ملازمت کا پورا ریکارڈ ہی بہت سے قابلِ فخر کارناموں سے بھرا ہوا ہے۔" میں نے خلوص سے کہا۔

"میں انہیں اپنے کارنامے نہیں سمجھتا۔ وہ تو بس میری طرف سے اپنے فرائض کی دیانت داری سے ادائیگی کی حقیری کوششیں تھیں۔" وہ بڑے انکسار سے بولے "مجھے تو اس بات کی ہی بڑی خوشی ہے کہ میں عزت و آبرو سے اپنی ملازمت کی مدت پوری کرکے جارہا ہوں اور اس عہدے پر پہنچنے کے بعد بھی خیر و عافیت سے ریٹائرمنٹ کی عمر کو پہنچ گیا ورنہ اس عہدے پر تو سیاسی نزلہ بہت گرتا ہے۔ سیاسی بنیادوں پر ترقی تنزلی، اکھاڑ پچھاڑ جاری رہتی ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں اس عہدے پر پہنچنے کے بعد بھی کسی اکھاڑ پچھاڑ اور سیاسی کھینچا تانی کا شکار ہوئے بغیر جارہا ہوں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ آپ کی ملازمت کے آخری دنوں میں بھی ہمیں آپ کو کوئی تکلیف دینا ہی پڑے گی۔" میں نے احتیاطاً انہیں پیشگی خبردار کرتے ہوئے کہا "شاید آپ کے شاندار ریکارڈ میں مزید ایک آدھ سنہرے باب کا اضافہ ہوجائے۔"

"کیا تم نے پھر کوئی چکر چلایا ہوا ہے؟" ان کے گویا کان کھڑے ہوئے۔

"آپ تو ایسے کہہ رہے ہیں جیسے میں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی چکر چلائے رکھتا ہوں۔"

"ہاں..... اس میں کیا شک ہے۔ جہاں تک تمہاری ٹانگ کی رسائی ہے وہاں تک تو تم ٹانگ اڑانے کی پوری پوری کوشش کرتے رہتے ہو۔" وہ بولے "میرا خیال ہے تم امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے چکر میں بہت سرگرم ہو رہے ہو۔ وہ معاملہ بہت پھیلا ہوا ہے۔ جو رپورٹیں مجھ تک پہنچ رہی ہیں ان کی روشنی میں میں تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تم صرف اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بل بوتے پر اس معاملے میں بہت زیادہ الجھنے کی کوشش نہ کرنا اور مجھے اطلاع دیے بغیر کوئی بڑا قدم نہ اٹھانا۔"

"آپ ہمیں ڈرانے کی کوشش کررہے ہیں جبکہ آپ کو معلوم ہے ہم لوگ ریڈ ڈاٹ جیسی بین الاقوامی اور عجیب و غریب ہشت پہلو قسم کی طاقت سے بھی الجھ گئے تھے۔" میں نے انہیں یاد دلایا۔

"جہالت بھی ایک نعمت ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے "ذرا نرم الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ لاعلمی میں بھی بڑی راحت ہے۔ جب تک آدمی کسی چیز کی ہولناکی سے بے خبر رہتا ہے تب تک خاصے مزے میں رہتا ہے۔ آگہی بڑا عذاب ہے۔ تم بھی لاعلمی میں ریڈ ڈاٹ سے جا ٹکرائے تھے۔"

"لیکن آگہی حاصل ہوجانے کے بعد بھی پیچھے نہیں ہٹے تھے بلکہ پہلے سے زیادہ تندہی سے ڈٹ گئے تھے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں شاید یاد نہیں..... اور کچھ کے بارے میں تو تمہیں معلوم بھی نہیں کہ اس وقت تمہارے متوازی کتنی طاقتیں کام کررہی تھیں۔ بہرحال تمہارا جذبہ اور جرأت قابلِ قدر تھی۔ اسی نے سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔"

"وہ جذبہ اور جرأت آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔" میں

نے کہا۔

"لیکن اس جذبے اور جُرات کو بے مہار نہ چھوڑ دینا۔ میں ایک بار پھر تمہیں یہی مشورہ دوں گا۔ بلکہ نصیحت کروں گا کہ مجھے بتائے بغیر کوئی اہم قدم نہ اٹھانا۔" وہ زور دے کر بولے۔

"جناب! میں تو آپ کو پہلے ہی خبردار کر رہا ہوں کہ شاید ہمیں آپ کو تکلیف دینی پڑے۔ اگر میرا ایسا کوئی ارادہ ہوتا تو میں یہ بات کیوں کرتا۔"

"خیر۔۔ مجھے تمہاری طرف سے اطمینان تو ہے کہ تم کوئی حماقت نہیں کرو گے لیکن کبھی کبھی غیر ارادی طور پر بھی انسان سے کوئی حماقت سرزد ہو جاتی ہے۔ بہت محتاط رہنا۔" ان کا لہجہ افسرانہ تھا اور کچھ ناصحانہ۔

"سر! میرا خیال ہے کہ بڑے پیمانے پر اسلحے کی ناجائز تجارت کے ذریعے ملک کی بنیادوں میں بارود بھرنے میں امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے ساتھ ایک بہت طاقت ور مافیائی قسم کی شخصیت بھی شریک ہے۔ اس کا نام جمال سعیدی ہے۔ وہ ایک غیر ملکی ہے لیکن۔۔۔"

میرا انہیں یہ بتانے کا ارادہ نہیں تھا کہ جمال سعیدی کے سلسلے میں، میں کیا کچھ معلوم کر چکا تھا اور اپنی آنکھوں سے کیا دیکھ چکا تھا تاہم میں انہیں اس کے بارے میں کچھ اشارے ضرور دینا چاہتا تھا مگر انہوں نے ہنستے ہوئے میری بات کاٹ دی اور بولے "مجھے معلوم ہے۔ وہ شخص بھی ہماری لسٹ پر ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جمشید کریم بھی غیر ملکی ہے۔ اس کا تعلق ہمارے ایک دوسرے قریبی ملک سے ہے۔ وہ جمال سعیدی سے بھی بہت پہلے سے یہاں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو یہاں رچ بس چکے ہیں۔ قانونی طور پر یہاں کے باشندے بن چکے ہیں اور اب تو کسی کے لیے یہ جاننا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ یہ اصل میں غیر ملکی تھے۔ یہ اس ملک میں رچ بس ضرور گئے لیکن اس کے خیر خواہ کبھی نہیں بن سکے۔"

"کیا ان کی نگرانی ہوتی ہے؟" میں نے اس نئی اطلاع پر حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"مستقل طور پر تو نہیں۔۔۔ البتہ کبھی کبھار ان پر نظر رکھی جاتی ہے۔ خصوصاً جب یہ کسی غیر ملکی دورے سے واپس آتے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"بہت خوب!" میں نے قدرے طنزیہ لہجے میں کہا "اتنی خطرناک حد تک مشتبہ لوگوں کی نگرانی کا اتنا شاندار انتظام۔۔۔!"

"طنز فرمانے کی ضرورت نہیں۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے "مشکوک افراد کی حیثیت سے یہ حال ہی میں نظر میں آئے ہیں۔ ہمارے ہاں کارروائی اسی طرح درجہ بدرجہ آگے بڑھتی ہے۔ اس کے علاوہ ہمیں ان کی طرف سے اس لیے بھی زیادہ تشویش نہیں ہے کہ یہ ہمیشہ کے لیے ملک چھوڑ کر کہیں نہیں بھاگ سکتے۔ ان کے بہت زیادہ مفادات یہاں پھیلے ہوئے ہیں۔"

"ایک تو یہ بیوروکریسی ہمارے ہر شعبے میں گھسی ہوئی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہر کام کچھ زیادہ ہی طریقے سلیقے سے ہوتا ہے۔ آخر میں صرف طریقہ سلیقہ ہی رہ جاتا ہے۔ کام کا کچھ پتا نہیں چلتا کہ اس کا کیا بنا۔ آپ کا خفیہ ادارہ تو اس خیال سے مطمئن بیٹھا ہو گا کہ یہ ہمیشہ کے لیے ملک چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتے۔ یعنی آپ لوگوں کو یہ اطمینان ہے کہ اگر یہ کبھی غائب بھی ہوئے تو آپ انہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ گستاخی معاف سر! یہ آپ لوگوں کی خوش فہمی بھی تو ہو سکتی ہے۔ پچاسوں لوگ ملک سے باہر بھاگ جاتے ہیں۔۔۔ ہزاروں ملک میں ہی غائب ہو جاتے ہیں۔ ان کا کچھ پتا نہیں چلتا۔ آپ ان لوگوں کی بات کر رہے ہیں جن کے اتنے وسائل ہیں، اندرون اور بیرونِ ملک نہ جانے کہاں کہاں رابطے ہیں۔"

"تمہیں ان کے بارے میں زیادہ تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" نفیس صاحب نے گویا مجھے تسلی دی "ابھی ان لوگوں کو اندازہ نہیں ہے کہ خفیہ ادارے ان کی طرف متوجہ ہو چکے ہیں۔ فی الحال یہ صرف پولیس کو ہی اپنے لیے خطرہ سمجھتے ہیں اور اس کا بندوبست کیے رکھتے ہیں۔ وہ خطرہ درحقیقت ان کے لیے خطرہ نہیں ہے۔ پولیس بعض اوقات تو ان کے لیے مددگار کا رول ادا کرتی ہے۔ ہم چاہتے ہیں یہ ابھی اسی طرح مطمئن رہیں۔"

"اچھا جناب۔۔۔! آپ کی مصلحتیں آپ کے ساتھ۔" میں نے ان سے بحث میں الجھنے سے گریز کرتے ہوئے کہا "لیکن مجھے اچانک آپ کو زحمت دینے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔"

"دیکھا جائے گا۔" وہ بے پروائی سے بولے "ویسے تو کراچی میں چشتی صاحب موجود ہیں۔ انہیں تم میرا ہی متبادل سمجھو لیکن اگر معاملہ زیادہ ہی اہم ہو اور تم مجھے ہی اس بڑھاپے میں اور ریٹائرمنٹ کے آخری دنوں میں زحمت دینا ضروری سمجھو تو کسی بھی ذریعے سے اطلاع دے دینا۔ میں چند گھنٹوں کے نوٹس پر بھی پہنچ جاؤں گا۔"

"بہت شکریہ۔" میں نے گہری طمانیت سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ انہوں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے ریسیور رکھا تو راحیلہ ایک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔ شاید وہ میرے یاہو کا نعرہ لگانے پر ابھی تک حیران تھی اور کچھ خفگی بھی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اسے چڑانے کے لیے ایک بار پھر پہلے سے زیادہ پُرجوش انداز میں ایک کے بجائے دونوں ہاتھ ہوا میں بلند کرتے ہوئے یاہو کا نعرہ لگایا لیکن احتیاطاً آواز اتنی رکھی کہ کمرے سے باہر نہ جانے پائے۔

میرے بازو ہوا میں بلند ہی رہ گئے۔ ایک لمحے کے لیے میں انہیں واپس نیچے لانا بالکل بھول گیا کیونکہ عین اسی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تھا اور دو کلاشنکوف بردار دندناتے ہوئے اندر آ گئے تھے۔ تاہم ان کا ارادہ فائرنگ کرنے کا نہیں لگتا تھا اس لیے میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ ان کی کلاشنکوفوں کا رخ فرش کی

طرف تھا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیصوں میں تھے۔ دونوں کے گلے میں لمبے لمبے رنگین مفلر جھول رہے تھے اور وہ چہروں سے ڈاکو یا کرائے کے قاتل معلوم ہو رہے تھے۔ دونوں خاصے جسیم تھے اور کینہ توز نظروں سے صرف مجھے گھور رہے تھے۔ راحیلہ کی طرف ان کی توجہ نہیں تھی۔ شاید لڑکی ہونے کے ناتے انہوں نے اسے بے ضرر شمار کیا تھا۔

راحیلہ کا ہاتھ تیزی سے قمیص کے نیچے جانے لگا تھا لیکن میں نے اس کی طرف کن انکھیوں سے صرف ایک نظر دیکھ کر زیرِ لب تیزی سے "نو" کہا اور وہ رک گئی۔ کلاشنکوف بردار شاید یہ سمجھے کہ میں نے ان پر نظر پڑتے ہی دونوں ہاتھ فضا میں بلند کر لیے تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر فاتحانہ سے انداز میں مسکرائے گویا کہہ رہے ہوں "دیکھا۔۔۔؟ اپنی کتنی دہشت ہے!"

تب میں نے نہایت اطمینان سے ہاتھ نیچے کر لیے۔ انہوں نے کلاشنکوفیں سیدھی کیں لیکن اس وقت تک ان کے پیچھے ایک اور شخص بڑے بارعب سے انداز میں قدم اٹھاتا ہوا اندر آ چکا تھا۔ وہ سوٹڈ بوٹڈ تھا اور کچھ اس طرح اندر آ رہا تھا جیسے گارڈ آف آنر کا معائنہ کر رہا ہو۔ وہ درانی تھا۔ اس کے چہرے پر زبردست تناؤ، کشیدگی اور میرے لیے نفرت تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے امبر کا خوف زدہ سا چہرہ نمودار ہوا۔

اس نے منمناتی سی آواز میں گویا صفائی پیش کی "سر! میں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن۔۔۔"

میں نے بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر اسے واپس جانے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ طوفانِ بدتمیزی تم جیسی مہذب لڑکی سے کہاں رکنے والا ہے امبر ڈیئر! تم جا کر آرام سے ٹیلی فون بورڈ سنبھالو اور کالز وغیرہ اٹینڈ کرو۔"

وہ واپسی کے لیے مڑنے لگی تو درانی تحکمانہ انداز میں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "نہیں۔۔۔ تم اپنے کمرے میں نہیں جاؤ گی لڑکی! تم بھی یہیں بیٹھو۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ گی تو سیکیورٹی والوں کو بلا لو گی۔ میں کسی قسم کی ڈسٹربنس اور ہنگامہ نہیں چاہتا۔ میں صرف دو منٹ کے لیے بات کرنے آیا ہوں۔"

اس کے ان الفاظ کے ساتھ ایک کلاشنکوف بردار کی کلاشنکوف کا رخ امبر کی طرف ہو گیا تھا۔ اس نے اجازت طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے سر کو خفیف سی جنبش دی اور وہ سہمے سہمے سے انداز میں اندر آ گئی۔ درحقیقت میں اس کے انداز پر ہی مسکرایا تھا۔ وہ اتنی سہمی ہوئی نہیں تھی جتنا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسرے شخص کی کلاشنکوف کا رخ میری طرف تھا لیکن درانی نے دونوں کی گنوں کی نال نیچی کرنے کا اشارہ کیا۔ انہوں نے بادلِ ناخواستہ گنیں تو نیچی کر لیں لیکن کچھ اس طرح میری طرف دیکھتے رہے جیسے ذرا سا اشارہ ملتے ہی نہ جانے کتنے برسٹ مار کر میرے پرخچے اڑا دیں گے۔ میں ایک نہایت ہی تحمل مزاج بزرگ کی طرح مسکرانے کی کوشش کرتا رہا۔

درانی غرانے کے سے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا "اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں معطل ہو گیا ہوں تو بالکل بے دست وپا ہو گیا ہوں۔ ابھی تو میں صرف معطل ہوا ہوں۔ نوکری سے نکالا نہیں گیا ہوں۔۔۔ لیکن اگر نکال دیا گیا تب بھی میرے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ سرکاری نوکری میں پھر بھی انسان کے ہاتھ پاؤں کچھ بندھے ہوئے ہوتے ہیں۔ میں کوئی بھی کارروائی کرتے وقت قانونی قاعدوں ضابطوں کے بارے میں سوچنے پر مجبور تھا۔ نوکری سے نکلنے کے بعد میں زیادہ آزاد ہو جاؤں گا۔"

"یعنی شتر بے مہار ہو جاؤں گا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اس نے میرے الفاظ پر کوئی خاص توجہ دیے بغیر غصیلے سے انداز میں بات جاری رکھی "تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ میرا تعلق ایک بہت بڑے گھرانے سے ہے جو قبائلی بھی ہے اور جاگیردار بھی۔۔۔ یعنی دو آتشہ معاملہ ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ہمارے ہاں دشمنی بہت لمبی چلتی ہے۔ اپنی روایت کے مطابق میں نے تمہیں خبردار کر دیا ہے لیکن یہ پہلا اور آخری موقع ہے کہ اس طرح بات ہو رہی ہے۔ آج کے بعد بات نہیں ہو گی، باقی کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے تحسین آمیز انداز میں تالی بجائی "تمہاری اور تمہارے ان چمچوں کی پرفارمنس قابلِ تحسین تھی درانی ڈیئر! ڈائیلاگ ڈلیوری بھی بہت عمدہ تھی۔ افسوس کہ یہاں کوئی کیمرا نہیں تھا جس کے ذریعے تمہاری اس عظیم الشان پرفارمنس کو عوام الناس تک پہنچایا جا سکتا۔ اس کا مجھے افسوس رہے گا۔"

راحیلہ نے نہایت سنجیدگی سے اور بڑے زور شور سے میری تائید میں سر ہلایا۔ درانی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس کے جبڑوں کے پھڑکتے ہوئے عضلات نے بتایا کہ اس نے دانت پیسے تھے۔ میں نے نہایت نرم اور دوستانہ لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر تمہیں صرف اتنی سی بات ہی کہنی تھی، اتنا سا پیغام ہی مجھ تک پہنچانا تھا تو ٹیلی فون پر بھی کہہ سکتے تھے۔ تم نے خواہ مخواہ خود بھی زحمت کی اور اپنے ان دو گدھوں پر کلاشنکوف کا وزن بھی لادا۔۔۔"

ان دونوں گدھوں کی رنگت سرخ و سفید تھی لیکن میرے منہ سے اپنے لیے گدھے کا لقب سن کر ان کے چہرے مزید سرخ ہو گئے۔ انہوں نے بے چینی سے کلاشنکوفوں کو حرکت دی۔ وہ صرف درانی کے اشارے کے منتظر تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ درانی کے معمولی سے اشارے پر گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتے تھے لیکن مجھے اس بات کا بھی یقین تھا کہ درانی اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا تھا کہ علی الاعلان ہمیں ہمارے ہی ہوٹل میں مروا کر خود اپنے لیے پھانسی کا راستہ ہموار کر لیتا۔ اسے یقیناً اتنا اندازہ تو تھا کہ یہاں فائرنگ کرنے کے بعد وہ یا اس کے ساتھی فرار نہیں ہو سکتے تھے۔ فی الحال وہ صرف ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش کرنے آیا

تھا۔

درانی نے اپنی زبان سے میرے اس اندازے کی تصدیق بھی کردی۔ گو کہ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا لیکن وہ مسکراتے ہوئے اپنے آدمیوں کو تحمل سے کام لینے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ اسے مارنا ضرور ہے لیکن اس کے قتل کے الزام میں ہمارا کتا بھی جیل نہیں جائے گا۔"

"کتوں کی جیل ویسے بھی ابھی ہمارے ہاں نہیں بنی ہے جہاں تمہارے آدمیوں کو رکھا جاسکے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"مجھے معلوم ہوچکا ہے کہ تم چہکتے بہت زیادہ ہو۔" درانی میری طرف دیکھ کر گویا خون کے گھونٹ پیتے ہوئے بولا "کچھ دن اور چہک لو۔ اس شہر کی کوئی سڑک بہت جلد تمہارے خون کا ذائقہ بھی چکھے گی۔"

اس نے اپنے آدمیوں کو واپس چلنے کا اشارہ کیا اور وہ تینوں تیزی سے کمرے سے رخصت ہوگئے۔ میں، راحیلہ اور امبر تینوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ راحیلہ حیرت سے بولی "یہ کیا چیز تھی بھئی؟"

"یہ درانی تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"وہ تو میں سمجھ گئی تھی لیکن مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ کیا اس قسم کے سرکاری افسر بھی پائے جاتے ہیں؟" وہ تعجب سے بولی۔

"سرکاری افسر تو عجیب و غریب اقسام کے پائے جاتے ہیں۔ تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے۔" میں نے پہلے سے زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور ذرا یہ بھی غور کرو کہ کلاشنکوفیں اور کلاشنکوف بردار محافظ کتنے عام ہوگئے ہیں۔ چند سال پہلے تک جمعدار اس طرح جھاڑو اٹھائے بھی نہیں پھرتے تھے جس طرح اب بچہ بچہ کلاشنکوف اٹھائے پھر رہا ہے۔"

"ہاں.... مہربانی ہے بہت سے مہربانوں کی۔" راحیلہ نے بھی ٹھنڈی سانس لی "سب کو ایک دوسرے کے خلاف "معروفِ جہاد" کر رکھا ہے۔ اس طرح لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرتیں بھردی ہیں کہ ہر کوئی اس تاک میں ہے کہ دوسرے کو فنا کرکے ہی اسے دنیا اور آخرت میں جنت ملے گی۔"

ان باتوں میں ہمیں شاید ایک ڈیڑھ منٹ بھی نہیں گزرا تھا کہ درانی اور اس کے دونوں آدمی لوٹ آئے لیکن اس بار ان کے آنے کا انداز مختلف تھا بلکہ یہ کہنا چاہیے ...کہ وہ آئے نہیں بلکہ لائے گئے تھے۔ کمرے میں وہ تینوں ہی داخل نہیں ہوئے تھے بلکہ اچھا خاصا ایک چھوٹا سا جلوس چلا آیا تھا۔ درانی کے دونوں آدمی اپنے ہی مفلروں کے پھندے میں اس طرح پھنسے ہوئے تھے کہ ان کے بازو ان کے پہلوؤں سے چپک کر رہ گئے تھے۔ ان کی کلاشنکوفیں ہوٹل کے سیکیورٹی کے دو باوردی اور چاق و چوبند جوانوں کے پاس تھیں جن کے اپنے ماؤزر ان کے پہلوؤں میں ہولسٹروں میں لٹکے ہوئے تھے۔ ان دونوں آدمیوں کی پشت پر ٹونی اور شفیع شاہ تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں گنیں تھیں جن کی نال ان کی کمر سے لگی ہوئی تھی۔ سیکیورٹی کے انچارج داؤد نے درانی کو قابو میں کیا ہوا تھا اور اس کی کمر پر اپنے ماؤزر کی نال رکھی ہوئی تھی۔ ان تینوں کے چہروں پر عجیب سی جھنجلاہٹ اور کھسیاہٹ تھی۔

میں نے امبر کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ دراصل وہ جب چند منٹ پہلے ان تینوں کے پیچھے خوف زدہ سے انداز میں آئی تھی تو اپنے کمرے سے اٹھتے اٹھتے یقیناً ایک خفیہ بٹن دبا کر سیکیورٹی والوں کو الارم کے ذریعے مطلع کردیا تھا کہ اس طرف ان کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے شفیع شاہ اور ٹونی بھی ہوٹل میں موجود تھے۔ انہیں بھی اطلاع ہوگئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ جس وقت درانی اپنی دھمکیوں سے ہمیں مرعوب اور خوف زدہ کرنے کی کوشش کررہا تھا اس وقت بھی ان میں سے کوئی عقبی دروازے کی طرف سے اور کوئی سامنے کی راہداری کے کسی ستون کی اوٹ سے کمرے پر نظر رکھنے کے لیے بھی پہنچ چکا ہو لیکن کوئی حقیقی خطرہ محسوس نہ کرنے کی وجہ سے انہوں نے مداخلت نہ کی ہو البتہ اب ان کے واپس جاتے وقت انہوں نے گھات لگا کر نہایت خاموشی سے انہیں قابو میں کرلیا تھا۔ کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا تھا، کوئی اٹھا پٹخ نہیں ہوئی تھی، کوئی گولی نہیں چلی تھی اور وہ انہیں مجرموں کی طرح پکڑ کے لے آئے تھے۔

"ان کا کیا کرنا ہے سر؟" شفیع شاہ نے کچھ اس طرح پوچھا جیسے وہ سازو سامان کے کچھ بنڈل یا کارٹن تھے جن کے بارے میں وہ جاننا چاہ رہا تھا کہ انہیں کہاں رکھنا تھا۔

"یہ تو تم نے خاصا مشکل سوال کردیا ڈیئر!" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا "مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ ہمارے یہ معزز مہمان ہمیں نہایت عمدہ قسم کی فلمی دھمکیاں دینے کے لیے تشریف لائے تھے جو اس میں ٹیپ ہوچکی ہیں....." میں نے میز کی دراز سے چھوٹا سا ایک ٹیپ ریکارڈر نکال کر انہیں دکھایا حالانکہ جس وقت درانی دھمکیاں دے رہا تھا اس وقت یہ ٹیپ ریکارڈر آن نہیں تھا۔ یہ بس یونہی دراز میں پڑا رہتا تھا۔ کبھی بوقتِ ضرورت کام آسکتا تھا۔ اس پر درانی کی گفتگو ہرگز ٹیپ نہیں ہوئی تھی لیکن میں نے سوچا شوشہ چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

میں نے ٹیپ ریکارڈر میز پر رکھتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا "یہ دونوں حضرات جو کلاشنکوفیں اٹھائے ہوئے آئے تھے، یہ تو ہمارے بہت زیادہ معزز اور خاص الخاص مہمان ہیں۔ ان کی کلاشنکوفوں سے کلپ نکال لو اور انہیں ذرا زیادہ عزت افزائی کے ساتھ باہر سڑک تک چھوڑ آؤ۔ درانی صاحب ذرا کم معزز آدمی ہیں۔ انہیں ذرا کم عزت افزائی کے ساتھ ان کی گاڑی تک پہنچا دو۔"

وہ میرا مطلب سمجھ گئے۔ شفیع شاہ اور ٹونی نے درانی کے دونوں آدمیوں کی ٹانگوں کے پچھلی طرف نہایت مہارت سے بظاہر ہلکی سی کک لگائی۔ وہ دونوں بوریوں کی طرح دھپ سے قالین پر گر پڑے۔ بازوؤں کے گرد مفلر کسا ہونے کی وجہ سے وہ جلدی اٹھنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ سیکیورٹی کے جوانوں اور ٹونی و شفیع شاہ نے مل کر انہیں ڈنڈا ڈولی کرکے اٹھالیا۔ داؤد چوہدری بدستور درانی

[...]ے ماؤزر لگائے کھڑا رہا۔ راحیلہ نے پھرتی سے اٹھ کر دونوں [...]نکوں سے کلپ نکال لیے اور خالی گنیں انہی کے پیٹ پر رکھ [...] کچھ دیر پہلے انہیں اٹھائے ہوئے آئے تھے۔

"چلئے جناب!" داؤد نے درانی کو باہر چلنے کا اشارہ کرتے [...] نہایت مؤدبانہ انداز میں کہا "کم عزت افزائی" کا مطلب یہی [...]ے گن پوائنٹ پر اس کی گاڑی تک پہنچا دیا جائے اور [...]ت افزائی" کا مطلب یہ تھا کہ کلاشنکوف برداروں کو ڈنڈا ڈولی [...]ے باہر لے جاکر سڑک پر پھینک دیا جائے۔ جاتے جاتے وقت درانی [...]ن نظروں سے میری طرف دیکھا انہیں الفاظ میں بیان کرنا [...]شکل ہے۔

اس روز اس واقعے کے بعد سکون ہی رہا اور ہمارے باقی [...]لات میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی۔ دوسرے روز دس بجے کے [...] ہمارے بڑے وکیل نے مجھے مطلع کیا کہ درانی کا محکمہ ہمارا [...] ریکارڈ واپس کرنے کے لیے رضامند ہوچکا تھا بشرطیکہ ہم ہائی [...]ٹ سے پٹیشن واپس لے لیتے۔ محض ایک شخص، درانی کی وجہ [...] محکمے کی بڑی بدنامی ہو رہی تھی۔ یہ محکمے والوں کا کہنا تھا۔ شاید [...] خیال تھا کہ ویسے ان کا محکمہ بہت نیک نام تھا۔ وکیل صاحب [...]یہ بھی بتایا کہ محکمہ جاتی تحقیقات کے نتیجے میں درانی کے برطرف [...] ہوجانے کے بہت زیادہ امکانات تھے۔ یہ بات مجھے شفیع شاہ بھی بتا [...] تھا۔ اسے یہ بات محکمے کے اندر کے آدمیوں سے معلوم ہوئی [...]

[...] وکیل صاحب میری مرضی معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ہم پٹیشن [...] لینے کے لیے تیار تھے یا نہیں؟ میری چونکہ محکمے سے کوئی لڑائی [...] تھی اور میرا مسئلہ تقریباً حل ہوچکا تھا اس لیے مجھے عدالتی [...]ہ کو آگے بڑھانے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے صرف [...] لمحے سوچا پھر وکیل صاحب کو اجازت دے دی کہ وہ پٹیشن [...] لینے کی کارروائی مکمل کرلیں اور ہوٹل کے جنرل منیجر اور [...] منیجر کو ساتھ لے کر اس ایجنسی کے دفتر سے اپنا ریکارڈ بھی [...] لے لیں۔ جی ایم اور پی ایم کو اس لیے ساتھ لے جانا [...]وری تھا کہ وہ دیکھ لیں، ہمارا کوئی ضروری ریکارڈ یا کوئی اہم [...] غائب نہ کردی گئی ہو۔

تھوڑی دیر میں یہ خوش خبری ہوٹل کے تمام دفتری اسٹاف [...] پہنچ چکی تھی۔ یہ ہماری ایک بہت بڑی اخلاقی فتح تھی۔ حالات [...]ول کی طرف واپس آرہے تھے۔ گزشتہ روز درانی، جو بدمزگی پیدا [...]یا تھا اس کی ناخوشگوار یاد کے باوجود میں کافی اطمینان محسوس [...]ہا تھا بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہ تھا کہ میں کسی حد تک ترنگ میں [...] دوپہر کے قریب راحیلہ اور ٹونی سے باتوں کے دوران میں [...]انک مجھے یاد آیا کہ رحیم گل نے تو صفدر اور اس کے دو مددگار [...] ساتھیوں کو قابو میں کرنے کے بعد ان کے بارے میں کوئی خبر ہی [...]ہ دی تھی کہ ان سے تفتیش میں کوئی اہم بات معلوم ہوئی تھی یا [...]یں؟ معاملہ کہاں تک پہنچا تھا؟

یہ بڑی غیر معمولی سی بات تھی کہ اس نے اس سلسلے میں کوئی فون نہیں کیا تھا ورنہ وہ تو چھوٹی چھوٹی باتوں کے بارے میں بھی فون کرتا رہتا تھا۔ میں نے بھی اسی لاشعوری سی توقع کے باعث اسے فون نہیں کیا تھا کہ جب کوئی خاص بات ہوگی تو وہ خود ہی فون کرلے گا لیکن اب چونکہ اس کی طرف سے خاموشی کو تقریباً دو دن گزر گئے تھے اس لیے مجھے خود ہی فون کرلینا چاہیے تھا۔

یہ سوچ کر میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ امبر اردو کا ایک اخبار لیے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کی رنگت کچھ اڑی اڑی اور آنکھیں پھیلی پھیلی سی تھیں۔ ٹیلیفون کی طرف بڑھتا ہوا میرا ہاتھ رک گیا۔ امبر میز کے قریب پہنچ کر اخبار میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "سر! آپ نے یہ دیکھا!"

وہ شام کے اخباروں میں سے ایک تھا۔ صبح کے اہم انگریزی اور اردو کے اخبار میں سرسری نظر سے دیکھ چکا تھا۔ شام کے اخبارات میں کبھی کبھار ہی دیکھتا تھا جب کچھ زیادہ ہی فرصت میسر ہوتی تھی یا ان میں ہماری دلچسپی کی کسی خبر کی طرف کوئی نشان دہی کردیتا تھا۔ ہوٹل میں بہرحال سبھی اخبار آتے تھے اور امبر تو شام کے اخباروں پر بھی ایک نظر ضرور ڈالتی تھی۔ یہ اخبار ہوٹل کی لابی میں نہیں رکھے جاتے تھے۔ ہوٹل کے مختلف دفتری شعبوں میں ہی گردش کرتے تھے۔ امبر ایک باتصویر خبر کی طرف اشارہ کررہی تھی جس کی سرخی کافی نمایاں تھی۔ اس سرخی کے نیچے وجیہہ اور اسمارٹ انسپکٹر رحیم گل کی مسکراتی تصویر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ وردی میں تھا۔ ٹوپی اور تاریک چشمے کے باوجود میرے لیے اس کو پہلی نظر میں ہی پہچاننا مشکل نہیں تھا۔ یہ ایک عمدہ پورٹریٹ تھا جو میں اس کے گھر میں بھی دیکھ چکا تھا۔

فوری طور پر مجھے یہی خیال آیا کہ شاید پرنس سیمرا کے قتل کا معمّا حل ہونے اور صفدر کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں آنے میں کچھ تاخیر ہوگئی ہے۔ آج خبر آرہی ہے اور چونکہ اس کامیابی کا سہرا رحیم گل کے سر ہی بندھنا تھا اس لیے اسی سلسلے میں اس کی تصویر چھپی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی ایک باوردی پولیس والے کی تصویر اور نظر آرہی تھی جو لہولہان اور مُردہ معلوم ہوتا تھا۔ تب میں نے ذرا ڈرتے ڈرتے سرخی پر نظر ڈالی اور میرا دل بیٹھنے لگا۔ سیاہ پٹی میں سفید الفاظ گویا کانٹوں کی طرح میری آنکھوں میں پیوست ہوگئے۔ سرخی تھی۔

"نامعلوم دہشت گردوں کی فائرنگ سے انسپکٹر رحیم گل اور ایک کانسٹیبل ہلاک۔"

نیچے ضمنی سرخی تھی۔

"گھات لگا کر پولیس موبائل کو نشانہ بنایا گیا اور اندھا دھند فائرنگ کی گئی۔"

یہ جلی الفاظ تو میں نے پڑھ لیے لیکن باریک الفاظ میں خبر کا متن میری آنکھوں کے سامنے دھندلانے لگا۔

آخرکار میں نے ہمت کر کے خبر پڑھ ڈالی۔ خبر مختصر ہی تھی اور اس میں اس سے زیادہ معلومات نہیں تھیں جتنی سرخیوں میں ظاہر کر دی گئی تھیں۔ لگتا یہی تھا کہ خبر چھپنے کے لیے جانے تک کرائم رپورٹر کچھ زیادہ تفصیلات معلوم نہیں کر سکے تھے۔ وہ خبر شام کے دوسرے اخباروں میں بھی موجود تھی اور اتنی ہی مبہم تھی۔ واقعہ رات کے پچھلے پہر کا تھا۔ رحیم گل اپنے تھانے میں بہت دیر تک مصروف رہنے کے بعد رات کے پچھلے پہر ایک اے ایس آئی اور دو کانسٹیبلوں کے ساتھ موبائل میں روانہ ہوا تھا۔

اسے راستے میں اپنے گھر اُترنا تھا جب کہ اے ایس آئی اور کانسٹیبلوں کو آگے کہیں جانا تھا۔ تھانے سے کچھ ہی دور ایک دفتری عمارت کی آڑ میں کچھ دہشت گرد گھات لگائے بیٹھے تھے۔ عمارت اس وقت ویران اور تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس کے اردگرد بھی اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ یک دم فائرنگ شروع ہونے پر پولیس کی گاڑیاں اکثر موت کے قفس ثابت ہوتی تھیں۔ شاید ان کے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔ فوری طور پر انہیں کچھ کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ رحیم گل گاڑی ڈرائیو کرنے والے کانسٹیبل کے ساتھ آگے بیٹھا تھا اس لیے وہ دونوں ونڈ اسکرین چکنا چور ہونے کے ساتھ ہی مارے گئے۔ پچھلے حصے میں موجود اے ایس آئی کو پوزیشن لے کر جوابی فائرنگ کرنے کی مہلت مل گئی۔ اس کے پاس ایک ایس ایم جی موجود تھی۔ اس کی فائرنگ کی وجہ سے دہشت گرد فرار ہو گئے۔ اے ایس آئی نے انہیں محض ہیولوں کی سی صورت میں ایک گاڑی میں فرار ہوتے دیکھا لیکن وہ نہ تو کوئی ایسی چیز دیکھ سکا جو ان کی شناخت میں مدد دیتی اور نہ ہی ان کا تعاقب کر سکا کیونکہ موبائل کے اگلے دونوں وہیل برسٹ ہو چکے تھے اور تعاقب کرنے کے لیے اس کے پاس نفری بھی نہیں تھی۔

تین اخباروں میں تقریباً ملتے جلتے مفہوم کی یہ خبر پڑھنے کے بعد میں دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ راحیلہ اور ٹونی نے بھی خبر دیکھ لی تھی۔ وہ بھی دم بے خود بیٹھے تھے۔ امبر بھی میرے سامنے غم زدہ بیٹھی تھی۔ میرے دل کی گہرائیوں میں ایک دراڑ سی پڑ گئی تھی جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وقت بھی اسے نہیں بھر سکے گا۔ حواس گویا شل ہو کر رہ گئے تھے۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

تاہم میں نے چند لمحے بعد خود کو سنبھالنے کی کوشش کی اور نہ جانے کس موہوم اُمید کے سہارے اس کے تھانے کا نمبر ڈائل کیا۔ شعوری طور پر تو میرا مقصد اس واقعے کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرنا اور تفصیلات معلوم کرنا تھا لیکن لاشعور میں شاید کسی معجزے کی تمنا بھی ہوئی تھی۔ شاید اسی لیے میں نے رحیم گل کا ڈائریکٹ نمبر ڈائل کیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کے کمرے میں کوئی نہ کوئی موجود ہوگا۔ کچھ بعید نہیں تھا کہ اس کے ماتحتوں اور افسران کا جمگھٹا لگا ہو گا۔ تھانے کے عام نمبر پر تو فون محرر وصول کرتا تھا اور وہ نمبر آسانی سے نہیں ملتا تھا۔ اس وقت تو مجھے رحیم گل کا ڈائریکٹ نمبر بھی آسانی سے ملنے کی اُمید نہیں تھی مگر مل گیا اور دو ہی گھنٹیوں کے بعد "ہیلو" کی جو آواز سنائی دی وہ بلاشبہ رحیم گل ہی کی تھی۔

میں نے اسے اپنا وہم سمجھا۔ میں اس نمبر پر اس آواز سننے کا کافی حد تک عادی تھا شاید اسی لیے میرا لاشعور میرے ساتھ کوئی شرارت کر رہا تھا۔ میں چند لمحوں تک کچھ بھی نہ بول سکا تب تیسری مرتبہ ذرا زور سے بولا "ہیلو ..... کون ہے بھئی؟ بات کرنی ہے یا نہیں؟"

"بات تو بہت لمبی کرنی ہے لیکن پہلے یقین تو آجائے کہ تم زندہ ہو خبیث آدمی!" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اچھا ..... تو یہ تم ہو!" وہ دھیرے سے ہنسا "میں یہی سوچ رہا تھا کہ اب تک تمہارا فون کیوں نہیں آیا۔ میں موبائل فون پر تمہارے کال کی توقع کر رہا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں تھا کہ تم قبر میں بھی موبائل فون ساتھ لے کر جاؤ گے ورنہ موبائل پر ہی کرتا۔ ویسے بھی اس وقت میں نے اپنی دانست میں فون تمہیں نہیں کیا ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ تمہاری کرسی پر تمہاری جگہ اس وقت کوئی ذمے دار افسر بیٹھا ہوگا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق تم تو اس وقت عالمِ ارواح میں ہو..... اور میرا خیال ہے روحوں سے..... خصوصاً بد روحوں سے ٹیلیفون پر تو بات نہیں کی جا سکتی۔"

"بد روحوں سے تو ٹیلی فون پر رابطہ زیادہ آسان ہوتا ہے۔" وہ ایک بار پھر ہنسا "میری روح..... بلکہ بقول تمہارے بد روح..... اس کمرے اور اس فون سے اتنی مانوس ہے کہ اسے چھوڑ کر جانے پر آمادہ ہی نہیں ہے۔ اس نے جسم کے قفس سے آزاد ہونے کے بعد بھی ان چیزوں پر قبضہ برقرار رکھا ہوا ہے اور اپنی ٹیلیفون کالز خود ہی ریسیو کر رہی ہے' خود ہی جواب دے رہی ہے اور اس کام میں کافی مصروف ہے۔ ابھی میں ریسیور رکھتا ہوں کہ دوسرے ہی لمحے پھر گھنٹی بج جاتی ہے۔"

وہ گویا اس صورتِ حال سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ میں نے غصیلے سے انداز میں غراتے ہوئے کہا "ڈریکولا کی طرح ہنسنا بند کرو اور یہ بتاؤ کہ یہ کیا چکر ہے؟"

"کون سا چکر؟" وہ معصومیت سے بولا۔

"اب اتنا معصوم بننے کی ضرورت نہیں۔" میں نے آواز نیچی رکھتے ہوئے لیکن اس میں زیادہ سے زیادہ غصہ سمونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "یہ شام کے اخباروں میں تمہاری موت کی خبر کیوں چھپی ہوئی ہے؟ میں' امبر' راحیلہ اور ٹونی تو اس وقت یہاں تعزیتی اجلاس منعقد کیے بیٹھے ہیں۔ شفیع شاہ کی نظر سے شاید شام کے اخبارات نہیں گزرے ورنہ وہ بھی کہیں سے کراچی آچکا ہوتا۔"

"اچھا ۔۔۔؟ کیا واقعی تم لوگوں کو میرے مرنے کا صدمہ ہوا تھا؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔

"نہیں۔ ہم تو خوشی کے مارے ڈانس کر رہے تھے۔ شادیانے بجا رہے تھے لیکن افسوس کہ یہ خبر غلط نکلی۔" میں نے جل کر کہا "لگتا ہے تم اس صورت حال سے بہت لطف اندوز ہو رہے ہو۔ شاید اس وقت باچھیں کھلی پڑ رہی ہیں۔"

"اگر مجھے اپنے دو آدمیوں کے مارے جانے کا دکھ نہ ہوتا تو شاید اس وقت ایسا ہی ہوتا۔ اگر ہر انسان کو مرنے کے بعد کسی طرح چوری چھپے اپنی موت پر دنیا کا ردِّعمل دیکھنے کا موقع ملا کرتا تو کافی لطف رہتا۔ اس پر عجیب عجیب انکشافات ہوتے۔ مثلاً مجھے لے لو ۔۔۔ وہ پیشہ ور مجرم اور دہشت گرد جو کسی نہ کسی وجہ سے آزاد پھر رہے ہیں اور جو آئے دن مجھے ہلاک کرنے کی دھمکیاں دیا کرتے تھے' اس وقت اخبارات کو میری "ناگہانی موت" پر نہایت درد بھرے الفاظ میں تعزیتی پیغامات بھیج رہے ہیں۔"

"ظاہر ہے ۔۔۔ سیاست بھی کوئی چیز ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بہرحال ۔۔۔۔ مرنے کے بعد مجھے پتا چلا ہے کہ میں خاصا مشہور آدمی ہوں۔" وہ بولا "صرف شام کے تین اخبارات میں میری موت کی خبر چھپنے سے خاصی ہلچل مچ گئی ہے۔"

"اکثر خبیث لوگ اسی طرح مشہور ہوتے ہیں لیکن درحقیقت یہ شہرت نہیں' رسوائی ہے۔ شہرت اور رسوائی میں بڑا فرق ہے لیکن انہیں یہ فرق نظر نہیں آتا۔"

"بہت جلے بھنے لگ رہے ہو۔" وہ بُرا منائے بغیر بولا۔

"نہیں ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ ہرگز نہیں۔ ہم تو خوشی سے ہواؤں میں اڑے جا رہے ہیں۔ کمینے آدمی! تمہاری وجہ سے دو تین شرفا کو ہارٹ اٹیک ہوتے ہوتے بچا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس میں میرا کیا قصور ہے؟" وہ معصومانہ سے لہجے میں بولا۔

"تمہارا قصور یہ ہے کہ جیسے ہی تمہیں پتا چلا تھا کہ تمہارے بارے میں ایسی کوئی خبر چھپ گئی ہے' تمہیں کم از کم اپنے قریبی لوگوں کو فون کرکے اطلاع دے دینی چاہیے تھی کہ اگر یہ خبر ان کی نظر سے گزرے تو وہ پریشان نہ ہوں' تم اپنی تمام تر بے شرمی کے ساتھ حسبِ سابق زندہ اور سلامت ہو' فی الحال کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔" میں نے واقعی جل کر کہا۔

"زرتاج کو تو میں نے اطلاع دے دی تھی۔" وہ بے ساختہ بولا۔

"ہاں ۔۔۔ اب زرتاج کے علاوہ تمہیں دنیا میں بھلا کوئی کہاں نظر آئے گا۔ کسی اور کو اطلاع دینے کا خیال بھلا تمہیں کیسے آسکتا تھا۔" میں نے مزید جل کر کہا۔

"میں نے جان بوجھ کر اطلاع نہیں دی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا' تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو کچھ تشویش ہوتی ہے یا نہیں۔"

وہ بدستور شگفتہ لہجے میں بولا "پھر بھی تمہارا فون میری توقع سے کہیں زیادہ تاخیر سے آیا۔ اب تک تو میں پچاسوں کالیں ریسیو کرچکا ہوں۔"

"ہم نے اخبار کافی تاخیر سے دیکھے ۔۔۔ بلکہ ہمیں تو اب بھی امیر نے لاکر دکھائے ہیں ۔۔۔ لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ میں یا میرے ساتھی غمزدہ' پریشان یا تشویش زدہ ہیں۔ ہم نے تو خبر پڑھتے ہی بیک زبان کہا تھا "خس کم جہاں پاک ۔۔۔" لیکن افسوس کہ یہ محض ایک سہانا خواب تھا۔ تم سے بھلا اتنی آسانی سے ہماری جان کیسے چھوٹ سکتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی پھر یک دم لہجہ بدلتے ہوئے کہا "منحوس آدمی! اب بتا بھی دو یہ کیسے ہوا؟ اخبار میں یہ خبر کیسے آ گئی؟ کیا یہ تمہاری اپنی شرارت تھی؟"

"نہیں ۔۔۔ میری عمر اب شرارتوں کی نہیں رہی ۔۔۔ اور میں تو خیر بچپن میں بھی شرارتی نہیں تھا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا "یہ سب دراصل غلط فہمی میں ہوا لیکن اچھا ہی ہوا۔ اس میں شاید قدرت کی کوئی مصلحت تھی۔ مجھے اس سے کچھ فائدہ ہی پہنچنے کی امید ہے۔ گو کہ یہ غلط فہمی زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکے گی۔ کل کے اخباروں میں اس کی تردید آجائے گی لیکن اس غلط فہمی کا اتنی دیر تک برقرار رہنا بھی غنیمت ہے۔"

اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر بتانے لگا "میں واقعی اسی موبائل میں جانے کے لیے تھانے سے نکلا تھا اور اس میں بیٹھ بھی گیا لیکن تھانے کے گیٹ پر عین اسی وقت میرا ایک بزنس مین دوست کچھ پریشانی کے عالم میں آن پہنچا۔ اسے اپنے ایک نہایت جائز کام کے سلسلے میں میری مدد کی فوری ضرورت تھی۔ میں موبائل سے اتر کر اس کے ساتھ اس کی گاڑی میں بیٹھ کر چل دیا۔ اگر اس وقت دہشت گردوں کا ایجنٹ کہیں سے میری نگرانی کر رہا تھا تو شاید وہ یہ تبدیلی نہیں دیکھ سکا۔ اور اگر تھانے میں ان کا کوئی مخبر تھا تو وہ انہیں اس کی اطلاع نہیں دے سکا۔ موبائل دوسرے راستے سے روانہ ہوئی جدھر سے میں اپنے گھر بھی جاتا تھا۔ میں اپنے دوست کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ کر دوسرے راستے سے روانہ ہوگیا۔ موبائل پر راستے میں گھات لگا کر فائرنگ کی گئی۔ اس وقت ڈرائیور کانسٹیبل کے ساتھ میں نہیں' ایک سب انسپکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دونوں ہلاک ہوگئے۔ ایک اے ایس آئی گاڑی سے کود کر فائرنگ کرنے میں کامیاب ہوا۔ بہرحال صبح جب پولیس والے جائے وقوعہ پر اور پھر اسپتال پہنچے تو دونوں جگہ کچھ دوسرے لوگ موجود تھے جنہیں صحیح صورتِ حال کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے میرا نام لیا۔ اخباروں کی کاپیاں پریس میں جانے کا وقت ہو رہا تھا اور صبح کے اخبار تو مارکیٹ میں آبھی چکے تھے۔ شام کے اخبار اس خبر کو اہم سمجھتے ہوئے 'مس' نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے زیادہ تحقیق میں پڑے بغیر عجلت میں خبر لگا دی۔ گو کہ انہیں اخبار مارکیٹ میں آنے تک اپنی غلطی کا اندازہ ہو چکا تھا جو دراصل ان کی بھی غلطی نہیں

ہمارے محکمے کے لوگوں کی غلطی تھی لیکن اب اس سلسلے [میں کچھ] نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تو وہ کل کے اخبارات میں ہی اس کی [تردید کریں] گے۔ شاید ہمارے آدمیوں کی ہڑبونگ پر ہمارے لتے بھی [لیے جائیں۔] یہ ہے میری کل داستانِ غم۔"

[و]اقعی تمہارا زندہ بچ جانا ایک داستانِ غم ہی ہے۔" میں نے [ٹھنڈی س]انس لے کر کہا۔

[ہ]مارے دو آدمی تو بہرحال جرمِ بے گناہی میں مارے گئے [۔۔۔" ا]س کے لہجے میں تاسف جھلک آیا "میں صرف اس خیال [سے] زیادہ غم زدہ نہیں ہوں کہ انہیں شہادت نصیب ہوئی [ہے۔"]

[ی]ہ بتاؤ کہ اس حملے کا سلسلہ کہاں جا کر ملتا ہے؟ کچھ اندازہ [ہے]؟" میں نے دریافت کیا۔

[کی]وں نہیں ۔۔۔۔ بہت اچھی طرح اندازہ ہوچکا ہے۔" وہ [گہری سانس لے]تے بولا "یہ سلسلہ صفدر منیر اور اس کے دو ساتھی گرگوں [کی گرفت]اری سے جڑا ہوا ہے۔"

[کی]ا صفدر منیر اور اس کے ساتھی گرگوں کے پیچھے ایسے لوگ [ہیں جو] اس طرح پولیس موبائل پر ۔۔۔ اور خصوصاً تم جیسے پولیس [افسر پر ح]ملہ کرنے کی جُرات کر سکیں؟" میں نے پوچھا۔

[ت]م کس دنیا میں بیٹھے ہو بھولے بادشاہ!" وہ ٹھنڈی سانس [لے کر بو]لا "یہاں تو ایسے ایسے گروہ موجود ہیں جو ملک کی بہت بڑی [شخصی]ات پر حملوں کے منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ میں بے چارہ [کیا چیز ہ]وں۔"

[یہ] تو مجھے معلوم ہے لیکن میرا مطلب ہے ۔۔۔۔ کیا صفدر منیر [او]ر پکڑے جانے والے گرگوں کی جڑیں وہاں تک پہنچ رہی [ہیں؟" میں] نے جاننا چاہا۔

[ب]ے شک۔" رحیم گل نے جواب دیا "ان کا تعلق اس قسم [کے گرو]ہوں میں سب سے بڑے گروہ سے ہے جنہوں نے اس شہر کی [معیشت] اور معاشرت' دونوں کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ ان کے ڈاکوں [اور] اس سلسلہ تو اپنی جگہ ۔۔۔ لیکن شہر میں کچھ ایسی مافیائی قسم [کی] شخصیت بھی ہیں جو انہیں بادلِ ناخواستہ بھتے دینے کے [علاوہ] خوشی سے بڑی بڑی رقمیں دیتی ہیں اور اسی حساب سے [ان سے] ناجائز اور مجرمانہ کام کراتی ہیں۔ یعنی یہ لوگ ان کے [لیے] کی گوریلا فورس کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اسی قسم [کی] شخصیتوں میں سے ایک جمشید کریم ہے۔ یہ دونوں گرگے [بھی] جمشید کریم کے لیے خدمات انجام دے رہے تھے۔ صفدر [منیر اور ج]مشید کریم میں چونکہ اندرونِ خانہ گہرا کاروباری گٹھ جوڑ ہے [اس لیے ج]ب کبھی صفدر منیر کو کوئی ضرورت پڑتی ہے یا اس پر [کوئی ا]فتاد پڑتی ہے تو جمشید کریم اسے کرائے کے گوریلے فراہم کرتا [ہے۔ کس]ی کو قتل کرنا' اغوا کرنا' ٹارچر کرنا' گھر لوٹ لینا' راتوں میں [کسی کی د]کان' دفتر یا مارکیٹ کو آگ لگا دینا ان کے کرائے کے

گوریلوں کے معمولات میں ویسے ہی شامل ہے۔ کسی کی خصوصی فرمائش پر اس قسم کا کوئی کام کرنا ان کے لیے قطعاً کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔ پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہر شعبے میں بہت بڑی بڑی جگہوں پر ان کے ایسے ایسے سرپرست بیٹھے ہوئے ہیں جن کے بارے میں تم سوچ بھی نہیں سکتے۔"

"انہوں نے یہ سب کچھ مان لیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت کچھ مان لیا ہے۔ بہت کچھ مجھے خود اندازہ ہے۔ محکمے کے پاس بہت کچھ معلومات موجود ہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ اب یہ کام ہمارے محکمے کے بس کا نہیں رہا۔ خصوصاً جب کہ محکمے میں اس قدر کرپشن ہے اور اس کرپشن کے باوجود اگر کوئی کچھ کرنے لگتا ہے تو اس کے ہاتھ باندھ دیے جاتے ہیں ۔۔۔ بلکہ بعض اوقات تو وہ زیرِ عتاب بھی آجاتا ہے۔ یہ ایک بہت پُراسرار' طویل اور گمبھیر چکر ہے جس کا ایک بہت معمولی سا سرا میرے ہاتھ آیا ہے۔ ابھی میں نے صرف اپنی بساط کے مطابق ہی کچھ کرنے کی کوششیں شروع کی تھیں کہ کچھ اعلیٰ شخصیات کا دباؤ پڑنے لگا۔ میں اس دباؤ کو خاطر میں نہیں لایا تو تھانے کو بم سے اڑانے اور مجھے گولیوں سے چھلنی کرنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں۔ گزشتہ رات اس سلسلے میں ٹریلر بھی پیش کردیا گیا۔ کبھی اصل فلم بھی چل سکتی ہے ۔۔۔ بلکہ یوں کہو کہ اس فلم میں میرا کردار تو رات ہی انجام کو پہنچ چکا ہوتا۔ وہ تو محض ایک اتفاق نے بچالیا۔"

"میرا خیال ہے انہی ساری باتوں کی وجہ سے تم نے صفدر منیر اور ان گرگوں کی گرفتاری کی خبر بھی اخبارات میں نہیں آنے دی۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ تم ٹھیک سمجھے ۔۔۔ اور اخبارات سے یہ خبر چھپانا لوہے کے چنے چبانے کے مترادف محسوس ہوا۔ بعض اوقات اخباروں میں کوئی خبر چھپوانا کارے دارد معلوم ہوتا ہے اور بعض اوقات کوئی خبر چھپانے میں دانتوں پسینے آجاتے ہیں۔ بہرحال جن تک پہنچنی تھی' ان تک پہنچ گئی اور مختلف پہیے حرکت میں آگئے۔"

"تمہیں جمشید کریم پر ہاتھ ڈالنے کے لیے تو کچھ کرنا چاہیے تھا۔" میں نے کہا۔

"تم کچھ 'کرنے کی بات کر رہے ہو ۔۔۔ میں تو سب کچھ کرنے پر تیار تھا۔ میں نے اسے باقاعدہ گرفتار ۔۔۔ کرنے کے لیے چھاپا مارا تھا لیکن تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ غائب ہو چکا ہے۔" اس نے ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔

میرے حلق سے بے اختیار ایک کراہ سی نکل گئی "لعنت ہے ۔۔۔!" میں نے زیرِلب کہا لیکن مجھے صحیح طور پر خود بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ لعنت میں نے کس پر بھیجی تھی۔ اسی لمحے ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں نے تیزی سے کہا "اگر جمشید کریم غائب ہوگیا ہے تو پھر کہیں جمال سعیدی بھی غائب نہ ہوجائے کیونکہ یہ ایک زنجیر کی دو مضبوط ترین کڑیاں ہیں۔"

تمہاری اگر اتنی اوقات نہیں ہے کہ اس پر ہاتھ ڈال سکو تو کم از کم اس پر نظر رکھنے کا بندوبست تو کرلو۔ ممکن ہے تمہیں جلد یا بدیر اس پر ہاتھ ڈالنے اور کسی بہت بڑے کیس کا کریڈٹ لینے کا موقع مل جائے۔"

"تمہارا خیال صحیح ہے۔ میں کافی افسوس کے ساتھ تمہیں اطلاع دے رہا ہوں کہ وہ ہاتھی کا بچہ بھی غائب ہوچکا ہے۔" اس نے کسی خاص تاسف کے بغیر کہا۔ میرا دل بیٹھ سا گیا اور یک دم ہی میرے حواس میں تلخی سی در آئی۔

"کیا واقعی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ یہ مصدقہ اطلاع ہے۔ میں نے اسے تلاش کرایا تھا مگر وہ کہیں نہیں ملا۔"

"تمہیں اس کو تلاش کرنے کا خیال کیونکر آگیا؟ میری اطلاع پر تم نے اس کے ہاں چھاپا مارا تھا اور وہ ناکام رہا تھا تو تم مجھ سے بہت خفا تھے۔ تمہیں اس کے سامنے کافی خفت اٹھانی پڑی تھی اور میرا خیال تھا آئندہ تم اس کے پاس بھی نہیں پھٹکو گے۔ پھر تم نے اسے کس سلسلے میں تلاش کرانے کی کوشش کی تھی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"دماغ صرف تمہارے پاس ہی نہیں..... تھوڑا سا دماغ ہمارے پاس بھی ہے....."

"یہ تو بڑی حیرت انگیز اطلاع ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

وہ میرے الفاظ پر توجہ دیے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اتنا اندازہ تو مجھے بھی ہوچکا ہے کہ یہ ایک زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ میرے پاس کچھ اطلاعات بھی تھیں اور صفدر منیر کے ساتھ جو دو گرگے ہاتھ لگے ہیں' ان سے بھی بڑی اہم معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ انہی کی بنیاد پر تو میں نے جمشید کریم کو پکڑنے کا پکا بندوبست کرلیا تھا لیکن افسوس کہ ذرا سی تاخیر ہوگئی اور وہ ہمارے ہاتھ سے پھسل گیا۔ یہ دونوں گرگے کوئی عام اور معمولی قسم کے بدمعاش نہیں ہیں۔ یہ بڑے نامی گرامی دہشت گرد ہیں۔"

"انہوں نے آسانی سے تو زبان نہیں کھولی ہوگی؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"اس قسم کے لوگ آسانی سے زبان کہاں کھولتے ہیں۔ جب وہ خون کی الٹیاں کرنے لگے اور موت کی دعائیں مانگنے لگے تب ان کی زبان کھلی۔" اس نے جواب دیا۔

"تم بھی اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہو؟"

"اگر تمہیں معلوم ہوجائے کہ یہ لوگ دوسروں کے ساتھ کیا کچھ کرتے رہے ہیں تو تم کہو گے کہ اس قسم کے لوگوں کے ساتھ ہر ہتھکنڈا نہ صرف جائز ہے بلکہ ان کے اعمال کے مقابلے میں نہایت کمتر ہے۔ میں محض شک کی بنا پر کسی کے ساتھ اس قسم کے ہتھکنڈے استعمال نہیں کرتا۔ حتیٰ الامکان احتیاط کرتا ہوں۔ صرف "مستحق" کو ان نوازشات کا مزہ چکھاتا ہوں۔ پہلے یقین کر لیتا ہوں کہ جن سے واسطہ پڑا ہے' وہ واقعی بہت اونچے درجے کے فنکار ہیں۔ کم از کم اتنا فرق تو ہے مجھ میں اور دوسرے پولیس والوں میں۔"

"بہرحال..... اگر جمشید کریم اور جمال سعیدی ہی غائب ہوگئے تو سمجھو ساری جدوجہد ہی بےکار ہوگئی۔" میں نے تھکی ہوئی بوجھل سانس لے کر کہا "فساد کی جڑ اور سرغنہ ہی غائب ہوگیا۔ اب صرف دو چار پتّوں کو سنبھالے بیٹھے رہو۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اصل کہانی توانہی کے قابو میں آنے کے بعد سمجھ میں آنا تھی۔ فی الحال تو صرف پرنسس میرا کے قتل کا معاملہ حل ہوا ہے۔ اس سے آگے معاملہ کہاں تک جارہا تھا اور یہ تانا بانا کہاں تک پھیلا ہوا تھا' اس کی تفصیلات کا اب سامنے آنا مشکل ہوگا۔ کاش مجھے اندازہ ہوتا کہ یہ لوگ غائب ہونے میں اتنی پھرتی دکھائیں گے تو میں اپنے کم وسائل کے ساتھ ہی ان کی نگرانی کا بندوبست رکھتا۔ میں تو اسی غلط فہمی میں رہا کہ یہ اتنے بڑے مگرمچھ ہیں' کہانی نہیں بھاگیں گے۔"

"میں بھی اسی غلط فہمی میں رہا۔" رحیم گل نے اعتراف کیا۔ "دوسرے ہمارے پاس نفری کی بھی کمی ہوتی ہے۔ بہرحال میں نے اعلیٰ افسران سے کہہ کر شہر بھر کی پولیس کو الرٹ کرادیا ہے۔ بس اڈے وغیرہ پر بھی نظر رکھی جارہی ہے لیکن ایک دشواری یہ بھی ہے کہ ان لوگوں کے نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں شامل نہیں ہیں اور ایئرپورٹ سیکیورٹی والے اس معاملے میں کوئی تعاون نہیں کررہے۔"

"یہ ایک اور افسوس ناک پہلو ہے کہ ایسے سنگین معاملات میں بھی ہمارے اداروں کے درمیان مفاہمت نہیں ہے۔ اس کمزوری سے بھی خطرناک لوگ پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ لگتا ہے ہمارے اداروں نے اس قسم کے لوگوں کو ہر طرح کی سہولتیں فراہم کرنے کا تہیہ کررکھا ہے۔" میرے لہجے میں ایک بار پھر پرانی تلخی در آئی۔

"بہرحال..... امید نہیں ہے کہ یہ لوگ اتنی آسانی سے ملک چھوڑ سکیں گے۔" رحیم گل نے گویا امید کا پہلو تلاش کیا "ان کے مستقل غائب ہونے کو بھی یہ لوگ ترجیح نہیں دے سکتے۔ ان کے یہاں بہت لمبے چوڑے مفادات پھیلے ہوئے ہیں۔ اتنے بڑے سیٹ اپ کو چھوڑ کر یہ ہمیشہ کے لیے غائب نہیں ہوں گے۔ ان سانپوں نے عارضی طور پر اپنے بلوں میں پناہ لی ہوگی۔"

"میں نے ملک کی ایک اہم شخصیت کو بھی اس قسم کی حرکتیں روکنے پر مبنی گفتگو کرتے ہوئے سنا تھا۔" میں نے افسوس سے کہا "اس طفل تسلی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر ان کی روپوشی عارضی ہوگی تب بھی عین ممکن ہے کہ جب وہ دوبارہ نمودار ہوں تو حالات ان کے حق میں ہوں۔ کوئی ان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے اور مجھے ڈر ہے میرے اندیشے کے مطابق وہ مستقل طور پر غائب ہوگئے تو ہمارے ملک کے خیرخواہوں کے لیے اطمینان کا کوئی پہلو نہیں ہوگا۔ انہیں اس ملک کو جتنا نقصان پہنچانا تھا' وہ پہنچا چکے ہیں۔ ان کا نیٹ ورک اب بھی کسی نہ کسی انداز میں کام کرتا رہے گا۔ ممکن ہے وہ کہیں نہ کہیں بیٹھ کر کسی نہ کسی طریقے سے اسے کنٹرول کرتے رہیں۔ مکمل نیٹ ورک تو ہمارے اداروں کی نظر میں بھی نہیں ہے اور جس طرح کا ہمارا نظام ہوچکا ہے..... ہمارے ادارے جس حال کو پہنچ چکے ہیں اسے دیکھتے ہوئے اب مجھے امید نہیں کہ یہاں اس قسم کے فتنوں کا جڑ سے خاتمہ کیا جاسکتا ہے۔ جو پھیلنا تھا' پھیل چکا سو پھیل چکا۔ اس کے بعد لوگوں کو اس فتنے کے ساتھ ہی زندگی گزارنی ہوتی ہے۔ یہ ہمارے ہاں کی روایت بن چکی ہے۔"

برخلافِ توقع وہ بحث و تمحیص میں الجھے بغیر دھیمے لہجے میں بولا "مجھے اور تم جیسے لوگوں کو ان ہی حالات میں اپنی سی کوششیں جاری رکھنی ہیں ورنہ حالات بدتر ہونے ہی کی توقع رکھی جاسکتی ہے بہتر ہونے کی نہیں۔"

"حالات بہتر ہونے کی توقع تو شاید ہماری کوششوں کے باوجود نہیں رکھی جاسکتی لیکن بہرحال ہم اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ بہتری کے لیے جدوجہد جاری رکھنی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بس..... اسی نکتے پر آکر تو بات ختم ہوجاتی ہے میرے چاند۔" وہ شگفتہ لہجے میں بولا "اسی جدوجہد میں کسی روز تم میری ہلاکت کی خبر اخباروں میں پڑھو گے جو صحیح ہوگی۔ اس کے بعد تم کسی امید کے سہارے فون کرو گے تو میں جواب دینے کے لیے موجود نہیں ہوں گا۔ زندگی اسی کا نام ہے۔ کارواں اسی طرح گزرتے ہیں۔ ان میں ہر رنگ ہر ڈھنگ دیکھنے میں آتا ہے۔"

"اگر کچھ اور لوگ بھی مخلص ہوتے' جدوجہد کرتے تو رنگ ہی بہتر بھی ہوسکتے تھے۔" میں نے اسی تاسف سے کہا جو برسوں سے میرے دل میں بسا ہوا تھا "بہرحال..... تم رابطہ رکھنا اور کوئی بات سامنے آئے تو مجھے ضرور بتانا۔"

"اور تم بھی۔" اس نے تاکید کی۔ میں نے خدا حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کردیا۔ امبر' راحیلہ اور ٹونی کے چہروں پر رونق آچکی تھی۔ رحیم گل سے میری گفتگو کا تقریباً مکمل مفہوم سمجھ چکے تھے۔ رحیم گل کی جو باتیں نہ سننے کی وجہ سے ان کی سمجھ میں نہیں آسکی تھیں' میں نے وہ بھی انہیں بتادیں۔ اسی اثنا میں شفیع شاہ ایک اخبار بغل میں دبائے' چہرے پر قدرے تشویش کے آثار لیے کمرے میں داخل ہوا اور بلا تمہید بولا۔

"سر! چند منٹ پہلے میں نے ایک سگنل پر گاڑی روکی تو ایک لڑکے کے ہاتھ میں لہراتے ہوئے اس اخبار پر نظر پڑی....." اس نے اخبار بغل سے نکالا۔

"تمہیں رحیم گل کی تصویر اور اس کی ہلاکت کے بارے میں

سرخی نظر آئی ہوگی اور تم پریشان ہوگئے ہوگے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"یس سر!" اس نے تسلیم کیا پھر اس کی نظر میز پر بکھرے ہوئے اخبارات پر پڑی۔ شاید ہمارے چہروں پر اطمینان دیکھ کر اس کی الجھن کچھ بڑھ گئی۔

"اطمینان سے بیٹھ جاؤ کچھ ٹھنڈا یا گرم پیو۔" میں نے مشورہ دیا۔

اس نے بیٹھتے ہوئے ایک بار پھر باری باری ہم سب کے چہروں کا جائزہ لیا اور تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "اس کا مطلب ہے وہ زندہ ہے۔"

"ہاں..... شکر کا مقام ہے کہ وہ کمینہ زندہ ہے۔" میں نے کہا پھر اسے بھی رحیم گل سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ جمشید کریم اور جمال سعیدی کے غائب ہونے کی خبر سُن کر اسے بھی دھچکا لگا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔ یہ اچھا شگون نہیں ہے۔" وہ پُرخیال انداز میں بولا "نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ ان کا غائب ہونا ان کے منظر عام پر رہنے سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"تمہارا یہ اندیشہ درست بھی ہوسکتا ہے۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"انہوں نے غائب ہونے میں ہم سب کے اندازوں سے زیادہ پھرتی دکھائی۔" شفیع شاہ بولا "بظاہر تو ابھی ان کے لیے کوئی ایسا سنگین خطرہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ صرف صفدر منیر اور کرائے کے گوریلوں کے طور پر خدمات انجام دینے والے دو دہشت گردوں کی گرفتاری ان کے لیے اتنی تشویش کا باعث تو نہیں ہونی چاہیے تھی جب کہ ان کا نہایت کارآمد حلقوں میں بہت زیادہ اثر رسوخ بھی ہے۔"

"جو لوگ ملک میں اس قسم کے کام کررہے ہیں ان کا خفیہ اطلاعات کا نظام ہمارے خفیہ اداروں سے بہتر کام کررہا ہے۔ شاید اسی لیے کہ ہر جگہ ان کے ایجنٹ موجود ہیں۔ انہیں یقیناً اندازہ ہوگیا ہے کہ آنے والا وقت ان کے لیے بہت برا ہوسکتا ہے اس لیے وہ بہت صحیح وقت پر غائب ہوئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"بہرحال صفدر منیر تو رحیم گل کے قابو میں ہے۔ وہ جمشید کریم کا خاص آدمی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے نہ جانے کن کن چکروں میں شریک رہے ہوں۔ اس کے علاوہ بھی جمشید کریم اور جمال کے کچھ خاص گرگوں پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی جاسکتی ہے۔ ان سے شاید کچھ اشارہ مل سکے کہ جمشید اور جمال کہاں غائب ہوئے ہیں۔" شفیع شاہ بولا۔

"یہ کام تم پولیس کے لیے چھوڑ دو۔ رحیم گل ان خطوط پر تو کام کرہی رہا ہے۔ میرا خیال ہے صفدر کی تو اس نے ٹھیک ٹھاک طریقے سے کمال آئووادی ہوگی اور اس سے زیادہ جو کچھ

معلوم ہوسکا ہوگا وہ معلوم کرلیا ہوگا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "ہمیں دوسری سمت میں کام کرنا چاہیے۔ شاید کسی کو تو کچھ کامیابی حاصل ہو ہی جائے۔ میں ذرا میگھانی کا ایک چکر لگالیتا ہوں۔ اگر چند دن وہاں رہنا پڑا تو رہ جاؤں گا۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس جگہ کو کھنگال لینا چاہیے۔ کامران دانش کی موت کے بعد سے وہاں جانے کا ارادہ کیا ہوا ہے لیکن یہاں الجھا ہونے کی وجہ سے نہیں جاسکا۔ شاید وہاں سے ان دونوں عظیم شخصیات کا کچھ سراغ ہاتھ آسکے یا ان کے چکروں کا مزید کوئی سرا ہاتھ آسکے۔"

"یا پھر شاید کوئی نیا چکر شروع ہوسکے۔" ٹونی نے لقمہ دیا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔" راحیلہ بول اٹھی۔

"جی نہیں۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا "وہ کوئی ایسی رومان پرور جگہ نہیں ہے جہاں تم میرے ساتھ جاؤ۔"

"اگر رومان پرور جگہ ہوتی تو کون کمبخت تمہارے ساتھ جانے کی فرمائش کرتا۔" وہ منہ بنا کر بولی "اس صورت میں تو تمہارے ساتھ جانے سے کہیں بہتر ہوتا کہ میں کسی لنگور کے ساتھ چلی جاتی۔"

"تمہارا خیال ہے کہ شاید اس طرح تمہیں دیکھ کر لوگ وہ مشہورِ زمانہ مصرع گنگناتے "پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔" اس بہانے تم خود کو حور کہلوانے کی کوشش کرتیں لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہاری یہ حسرت پھر بھی پوری نہ ہوتی۔" میں نے کہا۔

"آج کل واقعی نیکی کا زمانہ نہیں ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میں تو اس خیال سے تمہارے ساتھ جانے کی پیش کش کررہی تھی کہ تمہیں کوئی یتیم لاوارث سمجھ کر مار پٹائی یا خون خرابا کرنے کی کوشش نہ کرے۔ وہاں کے بارے میں جو میٹنگیں ہوتی رہی ہیں اور میرے سامنے جو معلومات جمع کی گئی تھیں' ان کے مطابق تو وہ کچھ خطرناک اور پُراسرار سا علاقہ ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"اسی لیے تو تمہیں ساتھ نہیں لے جارہا ہوں۔" میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا "ویسے اگر وہاں میرا ایک آدھ دن خیریت سے گزرنے کی امید ہوگی تو تمہاری موجودگی میں وہ بھی نہیں گزرے گا۔ تمہیں شاید وہاں آنا تو پڑے..... بلکہ تم تینوں ہی کو آنا پڑے گا..... لیکن راستہ اور طریقہ مختلف ہوگا۔ میرا خیال ہے اب ہم اس سلسلے کو... فائنل کرہی لیں اور میں صبح روانہ ہوجاؤں۔" میرا ذہن اس سلسلے میں تیزی سے کام کررہا تھا۔

"بالکل ٹھیک ہے۔" راحیلہ بھی قدرے جوش و خروش سے بولی۔

"میں اپنے کمرے میں جارہی ہوں۔" امبرا اٹھتے ہوئے بولی۔

وہ عقل مند لڑکی تھی۔ اسے معلوم تھا اب جس موضوع پر بات شروع ہورہی تھی اس میں اس کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہم ذرا قریب قریب ہوکر بیٹھ گئے۔ کچھ نقشے بھی نکالے گئے۔ تمام تفصیلات طے کی گئیں۔ میں نے شفیع شاہ کو کچھ چیزوں کا انتظام کرنے کے لیے بھی کہا اور آخر کار دوسرے روز میرے روانہ ہونے کا پروگرام طے پاگیا۔ یہ بھی طے پاگیا تھا کہ میں اکیلا ہی روانہ ہوں گا۔

دوسرے روز میں آر سی ڈی ہائی وے کے ذریعے اس سفر پر روانہ ہوا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس سفر کے لیے جیپ مناسب رہے گی' اسی لیے میں نے اس کا بندوبست کیا تھا اور علی الصباح روانہ ہوگیا تھا۔ مختصر مگر ضروری سامان میرے ساتھ تھا۔ ہمارے ہاں اب ایسی سڑکیں جنہیں ہائی وے کہا جاتا ہے' ہائی وے کے نام پر دھبہ ہی ہیں لیکن یوں تو بہت سی دوسری چیزیں بھی ہیں اور ہم ہر چیز سے گزارا کرنے کے عادی ہیں اس لیے میں بھی کہہ سکتا ہوں کہ چھوٹی موٹی رکاوٹوں سے قطع نظر جہاں تک ہائی وے پر میرا سفر جاری رہا وہ تقریباً خوش گوار ہی تھا۔

اس کے بعد میں نے اپنی حاصل کردہ معلومات اور نقشے کی روشنی میں گاڑی دائیں طرف کچے میں اتار لی۔ یوں تو وہ ہموار پگڈنڈی دور سے نظر آتی تھی لیکن مجھے کوئی گاڑی اپنے سے پہلے یا بعد میں اس طرف مڑتی دکھائی نہیں دی۔ وہ بل کھاتی پگڈنڈی جلد ہی پہاڑوں کے درمیان غائب ہوتی دکھائی دی۔ ان میں سے بعض پہاڑ دیوار کی طرح بالکل سیدھے کھڑے تھے لیکن وہ دیوار کی طرح ہموار نہیں تھے۔ ان پر گڑھے' دراڑیں اور عجیب سے شگاف پڑے ہوئے تھے۔ کہیں سیاہ کائی جمی ہوئی تھی اور کہیں سے سیاہی مائل گھاس پھونس نے سر نکالا ہوا تھا۔

ان پہاڑوں کی حالت دیکھ کر نہ جانے کیوں گمان گزرتا تھا شاید صدیوں پہلے سمندر یہاں تک تھا اور یہ بلند و بالا چٹانیں سمندر میں ہی ڈوبی ہوئی تھیں اور صدیوں تک ڈوبی ہی رہی تھیں لیکن پھر مزید کچھ صدیوں کے تغیر و تبدل کے بعد سمندر دھیرے دھیرے میلوں پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن ان چٹانوں پر ہمیشہ کے لیے اپنے نقوش چھوڑ گیا تھا۔ یہ پرانے وقتوں کی باتیں تھیں کہ سمندر اور دریا قدرت کے اشاروں پر کسی طرف کو ہٹ جاتے تھے' راستے بدل لیتے تھے' فطری تغیر و تبدل کے تحت سکڑ سمٹ جاتے تھے' وسعت اختیار کرلیتے تھے مگر اب انسان بہت سرکش اور مغرور ہوگیا تھا۔ وہ سمندروں کو پیچھے دھکیلنے اور دریاؤں کے راستے بدلنے کی کوششوں میں لگا رہتا ہے۔ میں نے گزشتہ دنوں ہی دیکھا تھا کراچی میں کلفٹن اور ڈیفنس کے ایک دور افتادہ حصے میں ایک چینی فرم کے تعاون سے سمندر کو پیچھے دھکیل کر' دیوار کھڑی کرکے کچھ خشک زمین حاصل کی گئی تھی اور ڈیفنس کو مزید وسعت دینے کے لیے اس میں پلاٹ بنائے جارہے تھے۔

یہاں شاید صدیوں پہلے سمندر خود ہی پیچھے ہٹ گیا تھا مگر یہاں کوئی آکر آباد نہیں ہوا تھا۔ زمین کے ٹکڑوں کا بھی اپنا اپنا نصیب ہوتا ہے۔ یہاں سے میلوں آگے سمندر کے عین کنارے آبادی تھی۔ ان پہاڑوں کے درمیان کہیں تو بالکل یوں محسوس ہوتا تھا

آگے جانے کے لیے قطعاً کوئی راستہ نہیں ہوگا اور پگڈنڈی معدوم ہوتی دکھائی دیتی تھی لیکن چٹان کے عین قریب پہنچ کر احساس ہوتا تھا کہ پگڈنڈی آگے بھی جارہی تھی۔

میری معلومات کے مطابق میگھانی کی آبادی اچھی خاصی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اس راستے پر بھی اچھی خاصی آمدورفت رہتی ہوگی لیکن اپنے سفر کے دوران میں اس کی ویرانی دیکھ کر مجھے کچھ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے ابھی کسی نے اس راستے کو دریافت ہی نہیں کیا تھا۔ پندرہ بیس کلو میٹر تک سفر کسی حد تک بلندی کی طرف جاری رہا تھا۔ اس کے بعد ایک تو پگڈنڈی نہایت دشوار گزار اور ناہموار ہوگئی دوسرے نشیب کی طرف جانے لگی۔ ایک طرف پہاڑیاں تھیں اور دوسری طرف گہری کھائیاں۔ راستے میں کہیں چھوٹے بڑے پتھر تھے جن کے بارے میں گماں گزرتا تھا کہ گاڑی ان پر سے گزری تو وہ اپنی جگہ سے کھسک جائیں گے اور گاڑی توازن کھو بیٹھے گی۔ کہیں ایسے ٹیڑھے میڑھے اور بے ہنگم گڑھے تھے جن کے بارے میں شبہ ہوتا تھا کہ گاڑی کا پہیہ ان میں چلا گیا تو وہیں پھنسا رہ جائے گا۔

میں نے بارہا خدا کا شکر ادا کیا کہ میرے یہ اندیشے غلط ثابت ہوتے رہے۔ نئی پیجرو زرتاج کی تھی اور بہت لاجواب گاڑی ثابت ہورہی تھی۔ اس دشوار گزار راستے کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ اس طرف اچھی خاصی آبادی کا قصبہ کیسے بس گیا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ لوگ کسی بھی شہر سے تقریباً کٹے ہوئے تھے۔ ہمارے ہاں اکثر علاقوں میں زندگی ویسے بھی کچھ کم دشوار گزار نہیں ہے۔ ایسے علاقوں میں اور بھی دشوار گزار ہوجاتی ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ اس کے باوجود ہمارے ہاں بہت سی آبادیاں ایسی جگہوں پر ہیں جہاں تک رسائی بہت مشکل ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میگھانی میں اگر کچھ پُراسرار سرگرمیاں جاری تھیں تو پھر یہ شاید اس کی خوبی شمار ہوتی ہو کہ اس کا راستہ اتنا دشوار گزار تھا اور یہ علاقہ کسی بھی شہر سے صحیح طور پر منسلک نہیں تھا۔ ایسی جگہیں بعض لوگوں کے لیے جنت ہوتی ہیں۔

خدا خدا کرکے میرا سفر ختم ہوا اور مجھے نشیب میں سمندر کے کنارے آباد وہ قصبہ دکھائی دیا۔ سفر گو کہ طویل نہیں تھا لیکن مجھے بہت طویل محسوس ہوا تھا۔ کسی زمانے میں مجھے اس قسم کے سفر کی بڑی مشق تھی۔ اب بھی کافی حد تک وہی مشق کام آئی تھی۔ پہلے میں نے بلندی پر ہی گاڑی روک کر قصبے کا جائزہ لیا۔ فطری حسن کے اعتبار سے وہ ایک قابلِ دید جگہ تھی لیکن کئی پہلوؤں سے تضادات کا مجموعہ بھی تھی۔

ساحل بہت خوب صورت تھا۔ یہاں سمندر کا پانی دو رنگ کا دکھائی دے رہا تھا۔ سبز رنگ اور نیلا۔ میں نے غیر ممالک میں بھی کئی خوب صورت ساحلوں کا نظارہ کیا تھا لیکن ایک ہی ساحل پر دو رنگوں کا ایسا خوب صورت امتزاج کہیں نہیں دیکھا تھا۔ اردگرد کی پہاڑیاں بے آب وگیاہ نہیں تھیں۔ ان میں سے بیشتر سبزے سے ڈھکی ہوئی تھیں لیکن یہ سبزہ کچھ سیاہی مائل تھا۔ کچے پکے مکانات میں کہیں ترتیب اور کہیں بے ترتیبی دکھائی دے رہی تھی۔

قصبے میں لمبا سا ایک مین بازار نظر آرہا تھا۔ اس کے دائیں بائیں کچھ گلیاں سیدھی نظر آرہی تھیں لیکن ان سے ہٹ کر بہت سے مکان بے ترتیبی سے بھی بنے ہوئے تھے جن میں سے بعض کو تو محض جھونپڑیاں ہی کہا جاسکتا تھا۔ سر چھپانے کے یہ ٹھکانے تیار کرنے میں ہر طرح کا تعمیراتی سامان استعمال کیا گیا تھا۔ لکڑی کے تختے، ٹین کی چادریں، بلاک، اینٹیں، پتھر، مٹی، سیمنٹ، چٹائیاں، گھاس پھونس، بلیاں، بانس۔۔۔۔ غرض کہ جسے جو میسر آیا تھا اس نے اسے استعمال کرتے ہوئے رہنے کا ٹھکانا بنالیا تھا۔ کچھ مکانات چھوٹی موٹی پہاڑیوں پر بھی بکھرے ہوئے تھے۔

بیشتر مکانات کے طرزِ تعمیر سے غربت عیاں تھی مگر کئی مکانوں کے سامنے اچھی خاصی معقول گاڑیاں بھی کھڑی دکھائی دے رہی تھیں۔ چھوٹے ڈاج ٹرک تو کافی نظر آرہے تھے جو اس قسم کے علاقوں میں کار کا کام انجام دیتے ہیں اور باربرداری میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ بعض جگہوں پر تو مجھے پے جیرو بھی کھڑی دکھائی دیں۔ فضا میں مچھلی کی بو بھی پھیلی ہوئی تھی لیکن مجھے کہیں ماہی گیری کے لوازمات دکھائی نہیں دیے۔ گو کہ ساحل پر کئی چھوٹی بڑی کشتیاں اور دو چار لانچیں بھی بندھی ہوئی تھیں لیکن ان میں جال وغیرہ نہیں تھے اور ان کی حالت بتاتی تھی کہ وہ ماہی گیری کے لیے استعمال نہیں ہوتی تھیں۔ شاید محدود پیمانے پر ماہی گیری ہوتی ہو اور کہیں مچھلیاں ذخیرہ کی جاتی ہوں۔

بہت سے گھروں کے پاس میں نے جست کی چادروں کے بڑے بڑے ٹینک رکھے دیکھے۔ ان میں یقیناً پینے کا پانی ذخیرہ کیا جاتا تھا جو نہ جانے کہاں سے آتا تھا۔ کہنے کو اس بستی کے لوگ سمندر کے کنارے بیٹھے تھے لیکن یہاں یقیناً پینے کا پانی میسر نہیں تھا۔ شاید کہیں سے ٹینکروں کے ذریعے آتا ہو"یہاں زمین کا پانی تو یقیناً کھارا ہوگا۔" میں نے دل ہی دل میں اندازہ لگایا۔

میں نے جس جگہ گاڑی روکی ہوئی تھی۔ وہاں سے ایک وقت میں صرف ایک ہی گاڑی گزرنے کی جگہ تھی لیکن عجیب اتفاق تھا کہ ابھی تک نہ تو سامنے سے کوئی گاڑی آئی تھی اور نہ ہی عقب سے کسی گاڑی نے مجھے اوور ٹیک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس پورے راستے میں ٹریفک حیرت انگیز حد تک کم تھا۔ اس قصبے کا سکوت اور ٹھہراؤ بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں تھا۔ چاروں طرف ایک عجیب سا سکون اور خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

اس قسم کی آبادیوں میں عام طور پر گلی کوچوں میں بچے بہت زیادہ تعداد میں کھیلتے کودتے اور دوڑتے بھاگتے نظر آتے ہیں لیکن یہاں گلیوں یا کھلی جگہوں پر بچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ لوگوں کی آمدورفت بھی بہت کم تھی۔ ذرائع نقل وحمل بھی کچھ

[...]ادہ حرکت میں دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ کہیں کہیں اِکّا دُکّا [...]اڑی یا گدھا گاڑی وغیرہ آتی جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ آبادی [...]اصی بڑی تھی۔ اس کے مقابلے میں یہ خاموشی اور سکون مجھے کچھ [...]ب لگ رہا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میں ایک [...]ی جگہ سے آرہا تھا جہاں اب زندگی اپنی رونق اور خوب صورت [...]اموں کے ساتھ نہیں بلکہ تمام تر بدصورتی کے ساتھ رواں دواں [...]ی۔ اس مشینی اور بارودی زندگی کی چیخ چنگھاڑ میں ہر شخص [...]سرے کا گلا کاٹ کر، اسے کچل کر آگے نکل جانے کی فکر میں تھا۔ [...]شاید دو ڈھائی گھنٹوں میں وہاں سے نکل کر یہاں پہنچ کر مجھے ایسا [...]سوس ہورہا تھا جیسے میں ایک قطعی مختلف دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ [...]شاید یہاں کے حساب سے یہ ماحول، یہ خاموشی، یہ سکون غیر فطری [...]نہیں تھا مگر مجھے لگ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں شبہ سا ہوتا تھا جیسے یہاں [...]کی تو می آبادی کہیں گئی ہوئی ہے۔

میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی ایک اور تہہ شدہ نقشہ نکالا اور ایک نئے زاویۂ نظر سے قصبے کا جائزہ لیا۔ اس بلندی پر بیٹھ کر قصبے کا جائزہ لینا نہ جانے کیوں ایک پُرلطف سا عمل محسوس ہورہا تھا۔ یہ [...]نقشہ شفیع شاہ نے کچھ خصوصی ذرائع سے حاصل کیا تھا۔ اس کی مدد [...]ے قصبے کو سمجھنا بالکل آسان ہوگیا۔ نقشے میں جن چند خاص خاص جگہوں کی نشاندہی کی گئی تھی وہ مجھے وہیں بیٹھے بیٹھے نظر آگئیں یا ان کے بارے میں اندازہ ہوگیا کہ وہ کہاں تھیں لیکن اس دوران میں، میں نے محسوس کیا کہ قصبے کے مین بازار سے گزرتے ہوئے تین چار افراد نے میری گاڑی کی طرف دیکھا تھا اور کچھ چونکے تھے۔

میری گاڑی جہاں کھڑی تھی وہاں کم از کم مین بازار سے گزرنے والے لوگ اسے آسانی سے دیکھ سکتے تھے اور شاید یہاں کے لوگوں کو نہایت آسانی سے یہ اندازہ بھی ہوجاتا تھا کہ کون سی گاڑی اجنبی تھی۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے میری گاڑی کی طرف متوجہ ہونے والوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہا بھی تھا۔ بظاہر وہ اسی طرح نارمل انداز میں اِدھر اُدھر چلتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہوگئے جیسے اپنے اپنے کاموں سے جارہے ہوں لیکن میری نامعلوم حس نے مجھے گویا خبردار کیا کہ بہت جلد بہت سے لوگ قصبے میں ایک اجنبی کی آمد سے باخبر ہوجائیں گے۔ بہرحال یہ تو جلد یا بدیر ہونا ہی تھا۔ میں اپنی آمد کو خفیہ رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔

میں نے نقشہ تہہ کرکے گلو کمپارٹمنٹ میں رکھا اور بچی کھچی ڈھلان پر گاڑی آگے بڑھادی۔ چند منٹ بعد میں نے مین بازار سے گزر کر گاڑی ایک پہاڑی کے دامن میں واقع میگھانی ہوٹل کے سامنے لے جا روکی۔ یہ ہوٹل نہیں بلکہ ایک غریبانہ قسم کا موٹیل معلوم ہوتا تھا کیونکہ یہ الگ الگ کمروں پر مشتمل تھا۔ یہ نیم پختہ کمرے دو قطاروں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے آگے گھاس کی باڑھ وغیرہ لگا کر انہیں خوب صورت بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

لوکیشن کے اعتبار سے یہ ایک شاندار جگہ تھی۔ اگر کسی ترقی یافتہ ملک میں ہوتا تو اس کی شان ہی کچھ اور ہوتی لیکن یہاں اس کی ہر چیز سے کچھ نہ کچھ پسماندگی اور غربت عیاں تھی۔

جس حصے میں ہوٹل کا استقبالیہ دفتر اور دوسرے لوازمات تھے وہ کمروں سے ہٹ کر بنا ہوا تھا۔ یہ اچھی بھلی عمارت تھی لیکن ہنرمندی کا کمال یہ تھا کہ صرف گارے، لکڑی کے تختوں اور سرکنڈوں سے بنی ہوئی تھی۔ اس کی انفرادیت بھی شاید یہی تھی۔ اس میں خوب صورتی پیدا کرنے کی پوری کوشش کی گئی اور ڈیزائن کسی محل کا سا بنایا گیا تھا۔ اس کے سامنے کافی بڑے حصے میں خاردار تاروں کا جنگلا لگا ہوا تھا جس کے اندر کھلے آسمان تلے لوہے کی میزیں اور کرسیاں ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ وہیں گوشت مرغیاں وغیرہ تلنے اور باربی کیو کا انتظام تھا لیکن اس وقت وہاں کوئی ملازم یا گاہک نظر نہیں آرہا تھا۔ اس پورے موٹیل نما ہوٹل پر بھی ویرانی کا تاثر غالب تھا۔ میں جس بازار سے گزر کر آیا تھا اس میں مجھے تقریباً ہر اس چیز کی دکان نظر آئی تھی جس کی ضرورت کسی بھی بڑی آبادی کو ہوسکتی تھی لیکن وہاں بھی مجھے کوئی خاص رونق نظر نہیں آئی تھی۔

میں نے پے جیرو ہوٹل کے قریب اس چھوٹے سے میدان میں روکی تھی جسے غالباً پارکنگ کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ وہاں دو تین گاڑیاں پہلے سے کھڑی ہوئی تھیں۔ میں گاڑی سے اتر کر چھڑی کا سہارا لے کر لنگڑاتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ چھڑی اور لنگڑانے کا ڈراما صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے تھا کہ میں جسمانی طور پر ہٹا کٹا نظر آنے کے باوجود اس وقت کسی تکلیف میں مبتلا تھا یا مجھے کوئی چوٹ وغیرہ لگی ہوئی تھی۔ اس طرح میرے قریب آنے والا مجھ سے کچھ زیادہ خطرہ محسوس نہ کرتا اور مجھے کسی حد تک معذور ہی شمار کرتا۔

میں جس کمرے میں داخل ہوا وہ غالباً استقبالیہ اور لابی دونوں کا کام دیتا تھا۔ اس میں ایک طرف دیوار کے ساتھ پلاسٹک کی چند نہایت پرانی اور ازکارِ رفتہ قسم کی کرسیاں اور بوسیدہ سی ایک تپائی رکھی تھی۔ دوسری طرف ویسا ہی ایک پرانا سا کاؤنٹر تھا جس کے عقب میں کوئی موجود تھا لیکن اس سے پہلے میری نظر اس کے پیچھے دیوار پر لگی ہوئی ایک بڑی سی تصویر پر گئی۔ وہ کافی بڑا اور فریم شدہ رنگین فوٹوگراف تھا۔

دھندلی ہونے کے باوجود وہ ایک جاذبِ نظر تصویر تھی۔ اس میں نہایت ہی حشر خیز قسم کے جسم کی مالک ایک نوجوان لڑکی تیراکی کے لباس میں ایک نہایت کریہہ قسم کے بہت بڑے مگرمچھ کی پیٹھ پر سوار تھی۔ ویسے تو یہ منظر اسی طرح ہوتا تب بھی کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ مغربی دنیا کے فوٹوگرافر کسی نہ کسی گوشے سے اس قسم کے نظارے پیش کرتے رہتے ہیں لیکن اس تصویر کا یہ معاملہ بھی نہیں تھا۔ سرسری نظر میں تو وہ اس طرح کھینچی گئی تصویر لگتی تھی

لیکن ذرا توجہ سے دیکھنے پر اندازہ ہوجاتا تھا کہ لڑکی الگ تھی اور مگرمچھ الگ...... دو نیگیٹو کو جوڑ کر یہ کاریگری دکھائی گئی تھی۔

تصویر کے آگے جو شخص بیٹھا تھا اس کا میں صرف بالائی دھڑ ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس کی صحیح عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ اس کی صفاچٹ قسم کی چندیا کم روشنی میں بھی چمک رہی تھی اور اس کی موٹی موٹی بھوؤں میں چند سفید بال دکھائی دے رہے تھے۔ وہ خاصی عمر کا معلوم ہوتا تھا مگر اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ اس کی رنگت پرانے تانبے جیسی تھی اور وہ سرخ سرخ آنکھوں سے ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ لمبا اور دُبلا آدمی تھا مگر نہ جانے کیوں کسی بھینسے کی طرح سخت جان معلوم ہوتا تھا۔ اس کے چہرے پر سب سے نمایاں چیز گہرے زخم کا ایک لمبا نشان تھا جو اس کی بائیں آنکھ سے ٹھوڑی تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک بدصورت نشان تھا مگر اس نے اس کی شخصیت میں کوئی خاص بات پیدا کردی تھی۔ شاید کوئی اچھا بھلا بدمعاش بھی اس سے الجھنے سے پہلے ایک دو لمحے کے لیے کچھ سوچتا ضرور۔

اس نے مجھے تصویر کا جائزہ لیتے بڑے غور سے دیکھا تھا۔ جب میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس کے سیاہی مائل موٹے موٹے ہونٹ ذرا پھیلے۔ وہ مسکرایا تھا۔ اس مسکراہٹ میں گوکہ آنکھوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا تھا لیکن وہ ایک آنکھ ذرا دباتے ہوئے بولا "کیسا تصویر اے صاب؟ چھوکری کو دیکھ کر ادر پٹاخا بولا کہ نئیں......؟" اس نے کنپٹی پر انگلی ماری۔

"مگرمچھ زیادہ اچھا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا۔

اسے خفیف سے جھٹکا لگا لیکن وہ فوراً ہی سنبھلتے ہوئے ذرا زیادہ واضح انداز میں مسکرایا اور سرہلاتے ہوئے بولا "ہاں صاب! آپ ٹھیک بولتا اے! مگرمچھ سنتا تو بہت خوش ہوتا۔" پھر اس نے موٹا سا ایک پرانا اور بدحال رجسٹر اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کاروباری سے لہجے میں پوچھا "بولو صاب! ہم آپ کا کیا خدمت کرے؟"

"ایک کمرا مل جائے گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"بالکل مل جائے گا صاب! آج کل تو مچھلی کے شکار کا سیزن نئیں اے...... اس لیے اِدر بالکل رش نہیں ہے۔ تھوڑے کمرے میں لوگ اے...... زیادہ کمرا خالی اے۔"

"سیزن نہیں ہے؟" میں نے آہستگی سے دہرایا "لیکن میں تو یہاں مچھلی کے شکار کے لیے ہی آیا ہوں۔ میرے خیال میں تو اس طرف جس قسم کی کھاڑیاں پائی جاتی ہیں ان میں شکار کے لیے کوئی خاص سیزن نہیں ہوتا۔"

"آپ بالکل ٹھیک بولا صاب!" اس نے خاصے پُرجوش انداز میں میری تائید میں سرہلایا "سیزن تو شکاری لوگ ہی بنالیتا اے۔ اس علاقے میں نہ کبھی پانی کم ہوتا اے اور نہ مچھلی...." پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ ذرا معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "ویسے بھی صاب! امارا تو خیال اے کہ آدمی جب بھی سچے دل سے کسی چیز کی تلاش میں نکلتا اے...... وہ اس کو ضرور ملتا اے۔"

"یہ تم نے بڑے تجربے کی بات کی ہے۔" میں نے ستائشی انداز میں سرہلایا۔

اس کی باچھیں صحیح طور پر پھیل گئیں اور وہ رجسٹر کھولتے ہوئے بولا "میرا خیال اے آپ لازمی کراچی سے آیا اے۔ آپ کا نام سیٹھ صاب؟"

میں نے اثبات میں سرہلایا اور اسے اپنا صحیح نام ہی بتادیا۔ میرے خیال میں یہی بہتر تھا۔ مجھے اس کے چہرے پر ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس سے شبہ ہوتا کہ وہ میرے نام سے واقف تھا یا پہلے سے میرے بارے میں خبردار تھا۔ اس نے اطمینان سے سرجھکا کر رجسٹر میں میرا نام وغیرہ نوٹ کیا اور سراٹھانے سے پہلے ہی بولا "خالی کمرے کا کرایہ دو سو روپیہ روز ہوگا صاب! کھانا وغیرہ بھی اگر آپ بولے گا تو مل جائے گا۔ شاید اس علاقے کے حساب سے یہ آپ کو کرایہ تھوڑا زیادہ لگے گا لیکن صاب! آپ کا شکایت کرنے سے پہلے ای ہم بتادیتا اے کہ ادر کی ٹاؤن کمیٹی نے ام پر ٹیکس لگایا ہوا اے۔ ابھی آپ خود دیکھو صاب! اور...... ایسا علاقے میں بھی ہرچیز پر طرح طرح کا ٹیکس اے...." اس کا لہجہ ہمدردی طلب سا ہوگیا۔

"کرائے کی کوئی بات نہیں...... تم مجھے کوئی اچھا سا کمرا دینا جس میں زیادہ سہولیات ہوں۔" میں نے پرس نکالتے ہوئے کہا۔

"کمرا ادر سب ایک جیسا ہے صاب! امارا ہوٹل کا مالک بولتا اے' سب انسان برابر اے...... اس لیے امارے ہوٹل کا سب کمرا برابر اے۔" اس نے صاف گوئی سے بتایا۔

"یہ سن کر بہت حیرت ہوئی۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا "میں دنیا میں کافی گھوما ہوں۔ مسجد کے بعد پہلی جگہ ملی ہے جہاں سب انسانوں کو برابر سمجھا جارہا ہے اور انہیں ایک جیسی جگہ دی جارہی ہے۔ میں یقیناً تمہارے صاحب سے ملنا پسند کروں گا۔ ان سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟"

"شاید لندن میں...... شاید پیرس میں...... یا پھر شاید استنبول میں......" اس نے اطمینان سے جواب دیا "ہمارے کو ٹھیک طرح معلوم نئیں اے۔ وہ باہر کے دورے پر گیا ہوا اے۔ جب وہ ملک میں ہوتا اے اس وقت بھی زیادہ کراچی میں رہتا اے۔ اس کا بہت بڑا کاروبار اور زمینداری اے۔ وہ امارے قبیلے کا سردار اے لیکن سچی بات یہ اے کہ اب میگھانی سے...... یا اس ہوٹل سے اس کو کوئی خاص دلچسپی نہیں اے۔ یہ ہوٹل تو اس نے ایک طریقے سے میرے سپرد ہی کردیا اے...... بس سال دو سال میں ہمیں جمع ہونے والی آمدنی ان کے خدمت میں بھیج دیتا ہوں۔ وہ بہت بڑے آدمی ہیں صاب! میں ان کا ایک چھوٹا سا غلام ہوں۔"

"اچھا......!" میں نے تفہیمی انداز میں سرہلایا "کیا نام ہے تمہارے سردار صاحب کا؟"

"سردار فاروق خان میگھانی۔" اس نے خاصے فخر سے بتایا۔

"اور تمہارا؟"

"مشکی خان میگھانی۔" اس کا لہجہ اب بھی فخریہ ہی رہا۔

"تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی مشکی خان!" میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ اس کا ہاتھ کافی حد تک استخوانی سا ہی تھا لیکن جب وہ میرے ہاتھ میں آیا تو مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں نے کوئی بھاری سا آہنی پنجا تھام لیا ہو۔

"امارے کو بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوا اے سیٹھ افضل صاب!" وہ پہلے سے زیادہ گرمجوشی سے بولا۔ اس نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے اپنی طاقت کا احساس دلانے کی بھی کوشش کی۔ وہ دبلا ضرور تھا مگر بیل کی طرح مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ زیادہ سے زیادہ ڈھیلا رکھنے کی کوشش کی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ یہاں مجھ سے پہلے اگر میرے بارے میں کچھ معلومات نہیں پہنچ سکی تھیں تو میرا تاثر ایک عام اور ڈھیلے ڈھالے سے آدمی کا بنے۔ میں مناسب وقت آنے سے پہلے اپنی کسی غیرمعمولی صلاحیت کا مظاہرہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

مشکی خان سے مصافحہ کا مرحلہ طے ہوچکا تو میں نے جان بوجھ کر اس کے سامنے پرس اس طرح کھولا کہ وہ دیکھ سکے کہ اس میں ہزار ہزار کے بہت سے نوٹ ٹھنسے ہوئے تھے۔ میں نے دو نوٹ کاؤنٹر پر رکھتے ہوئے کہا "دس دن کا پیشگی کرایہ...... ہوسکتا ہے کہ مجھے اس سے زیادہ دن ٹھہرنا پڑجائے میں مچھلیوں کا شکار کھیلنے آیا ہوں تو اب اچھی طرح شکار کھیلے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

وہ نوٹ اٹھا کر جلدی سے کاؤنٹر کے نیچے کسی دراز میں ڈالتے ہوئے خوش دلی سے بولا "ارے صاب....! اگر مچھلیاں آپ کے ہاتھ آجائیں تو آپ ضرور ان کا شکار کھیلیں...... بلکہ اگر آپ چاہیں تو مگرمچھوں کا بھی شکار کھیلیں۔ ہمارے علاقے میں مگرمچھ بھی پائے جاتے ہیں مگر ابھی تک سرکار کو ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں اے' اس لیے ان کے شکار پر نہ تو کوئی پابندی لگی اے اور نہ ہی شکار کا کوئی لائسنس یا فیس وغیرہ مقرر ہوئی اے......" اس نے نہ جانے کیوں کچھ اس انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا جیسے کوئی بلیغ بولی ہو۔

"مگرمچھ تو ہر جگہ پائے جاتے ہیں مشکی خان!" میں نے اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "لیکن ان میں سے اکثر تو اتنے بڑے اور خطرناک ہوتے ہیں کہ سرکار ان کی طرف دیکھ کر بھی آنکھیں بند کرلیتی ہے۔ ویسے بھی ہمارے بڑے بوڑھے ہمیں سمجھاتے آئے ہیں کہ دریا میں رہ کر مگرمچھ سے بیر رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ حالانکہ بعض مگرمچھ اتنے بدمعاش ہوتے ہیں کہ انہیں پہلی فرصت میں ٹھکانے لگادینا ہی بہتر ہوتا ہے۔"

اس نے ایک بار پھر بلغمی سی آواز نکالتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا "آپ بالکل ٹھیک بولا صاب....! لیکن ہمارے سردار کا فرمان اے کہ مگرمچھ کے قریب تبھی جاؤ جب تم کو بھروسا ہو کہ تمہارے پاس اس کو کلٹی کرنے کا بندوبست اے۔ خالی زخمی مگرمچھ زیادہ خطرناک ہوتا اے۔"

"زخمی تو کوئی بھی درندہ زیادہ خطرناک ہوتا ہے مشکی خان! جب اس سے پنگا لے لیا تو ماردیا مرجاؤ۔" میں نے مربیانہ انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا۔

اس نے بھی کچھ بے خیالی کے سے عالم میں میری تائید میں سرہلایا۔ درحقیقت وہ گہری نظروں سے ابھی تک میرا جائزہ لے رہا تھا پھر یک دم اس نے کچھ چونکتے ہوئے کاؤنٹر پر پڑی ایک زنگ آلود سی گھنٹی پر دو تین مرتبہ ہاتھ مارا۔ گھنٹی گویا بجی نہیں بلکہ کراہ اٹھی۔ اندر سے ڈھیلی ڈھالی شوار قمیص میں ملبوس ایک نوعمر سا لڑکا لپک کر باہر آیا۔ اس کی رنگت گہری سانولی اور بال بہت گھنگریالے تھے۔

"صاب کو کمرا نمبر دس میں چھوڑ آؤ اور کبھی کبھی صاب کے پاس چکر لگاتے رہنا۔ صاب کے آرام کا خیال رکھنا۔" مشکی خان نے بارعب لہجے میں اسے ہدایت کی اور پیچھے لگی ہوئی مگرمچھ اور لڑکی والی تصویر کے نیچے آویزاں چھوٹے سے ایک بورڈ سے ایک چابی اتاری جس کے ساتھ پلاسٹک کا ایک ٹیگ منسلک تھا۔ اس پر دس نمبر ابھرا ہوا تھا۔

"میرا سامان گاڑی میں ہے۔" میں نے لڑکے کو بتایا۔ اس نے مستعدی سے سرہلایا اور میرے ساتھ چل دیا۔ میں اب بھی لنگڑاتے ہوئے آہستہ آہستہ چل رہا تھا اور محسوس کررہا تھا کہ مشکی خان کی نگاہیں میرا تعاقب کررہی تھیں۔ پجیرو میں میرے ایک مختصر سے سفری بیگ کے علاوہ مچھلی کے شکار کا نہایت جدید قسم کا سامان اور ایک ریڈیو بھی موجود تھا۔ لڑکے نے مسکراتے ہوئے سب سامان اٹھالیا اور میں اس کی رہنمائی میں کمرا نمبر دس تک پہنچا۔

اندر پہنچ کر سامان رکھوانے اور لڑکے کو ٹپ دے کر فارغ کرنے کے بعد میں نے اطمینان سے کمرے کا جائزہ لیا تو احساس ہوا کہ کمرا کافی کشادہ اور پختہ تھا۔ اس درجے کے ہوٹل یا موٹیل کے کمرے اتنے بڑے نہیں ہوتے تھے۔ تاہم کمرا اور اس میں موجود ہرچیز پرانی اور سالخوردہ تھی۔ فرنیچر نہایت مختصر اور بوسیدہ تھا۔ بیڈ کے گدے کے بارے میں مجھے شبہ محسوس ہوا کہ اس میں کھٹمل نہ ہوں۔ اس کمرے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے عقب میں بڑی سی ایک کھڑکی تھی جس میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کھڑکی سے دور تک سمندر اور نیلی دھندلاہٹ میں لپٹے ہوئے پہاڑوں کا نظارہ کیا جاسکتا تھا جسے دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ یہ ہمارے ملک کا ایک خوب صورت مگر گمنام گوشہ تھا اور

اسے ترقی دے کر نہ جانے کیا سے کیا بنایا جاسکتا تھا۔ مگر پھر مجھے خیال آیا کہ ہمارے ہاں تو ایسے مقامات نہ جانے کتنی تعداد میں تھے جنہیں ترقی دے کر نہ جانے کیا سے کیا بنایا جاسکتا تھا۔ دستِ قدرت نے تو ہمیں نوازنے میں کوئی کمی روا نہیں رکھی تھی مگر..... میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس "مگر" سے آگے بات بہت لمبی ہو جاتی تھی۔

چند لمحے کھڑکی سے سمندر کا نظارہ کرنے کے بعد میں اپنے مختصر سے بیگ سے کپڑے نکال کر بوسیدہ اور پرانی الماری میں لٹکانے لگا جو ذرا سے ہاتھ لگانے پر اِدھر اُدھر ہلنے لگتی تھی۔ میں تن کے کپڑوں کے علاوہ صرف ایک سوٹ اور دو شلوار سوٹ لے کر آیا تھا۔ میں نے مشکی خان کے سامنے خواہ مخواہ یہ ارادہ ظاہر کیا تھا کہ میں یہاں دس دن سے زیادہ بھی رک سکتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں تو دس دن بھی رکنا نہیں چاہتا تھا۔ میں تو جلد از جلد کچھ ضروری معلومات حاصل کر کے اور اندرونِ خانہ حالات کی کچھ ٹوہ لے کر واپس چلے جانا چاہتا تھا۔

میں اپنا بیگ الماری کے سب سے اوپر کے خانے میں رکھ رہا تھا تو میرا ہاتھ الماری کے تختے پتلی سی کسی چکنی چیز سے ٹکرایا۔ میں نے اسے انگلی سے باہر کی طرف کھسکایا تو وہ فرش پر آگری۔ وہ چھوٹا سا کوئی فوٹو تھا جو اوندھا فرش پر گرا تھا۔ میں نے اسے اٹھایا تو مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ وہ کامران دانش کی تصویر تھی۔ وہ اسی تصویر کا چھوٹے سائز کا پرنٹ تھا جو کچھ دن پہلے میری فرمائش پر صفیہ نے مجھے دی تھی۔

پاسپورٹ سائز کے اس پرنٹ کو میں کافی دیر تک الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اس کی پشت پر چند ماہ پہلے کی کوئی تاریخ درج تھی۔ غالباً اس تاریخ کو یہ تصویر کھینچی گئی تھی۔ پرنٹ بھی کچھ میلا اور ذرا مڑا تڑا سا تھا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ کامران کے اپنے پرس یا جیب میں ہی موجود رہا ہوگا۔ اس کا مطلب تھا کہ کامران بھی اس کمرے میں قیام کر چکا تھا۔ کیا مجھے جان بوجھ کر وہی کمرا دیا گیا تھا یا محض یہ ایک اتفاق تھا؟ میں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ کرسکا۔ تصویر کو میں نے واپس وہیں رکھ دیا جہاں وہ پڑی تھی۔ اب وہ میرے کسی کام کی نہیں تھی۔ تصویر والا ہی دنیا میں نہیں رہا تھا۔

میں کچھ دیر تک بیڈ پر تکیوں کے سہارے نیم دراز رہا اور سوچتا رہا کہ میرا آئندہ کا لائحۂ عمل کیا ہونا چاہیے۔ ریڈیو میں نے آن کردیا تھا اور اسے کارنس پر رکھ دیا تھا۔ وہ دھیمی آواز میں بج رہا تھا۔ میرے موبائل فون نے یہاں کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میں ہوٹل میں استقبالیہ کاؤنٹر پر سیاہ رنگ کا پرانے ماڈل کا ایک فون رکھا دیکھ چکا تھا لیکن وہ یقیناً ہوٹل کا اکلوتا فون تھا۔ اس پر تو صرف وہی باتیں کی جاسکتی تھیں جو میں جان بوجھ کر مشکی خان کو سنانا چاہتا تھا جن کے بارے میں، میں محسوس کر رہا تھا کہ انہیں مشکی خان بھی سن لیتا تو کوئی حرج نہیں تھا۔ میرے پاس رابطے کا ایک اور ذریعہ بھی تھا لیکن فی الحال میں اسے استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔

ویسے بھی مجھے بہرحال قصبے کا ایک چکر لگانا تھا۔ ویسے تو مجھے امید تھی کہ کچھ مخصوص لوگوں تک میری آمد کی اطلاع پہنچ چکی ہوگی لیکن اگر نہیں پہنچی تھی تو میرے اِدھر اُدھر گھومنے پھرنے سے پہنچ جاتی۔ چنانچہ کچھ دیر بعد میں کمرے سے نکل کھڑا ہوا۔ میں نے آتے وقت بازار میں ایک جگہ پبلک کال آفس کا بورڈ دیکھا تھا۔ میں چھڑی کے سہارے لنگڑاتا ہوا دھیرے دھیرے ٹہلنے کے انداز میں اس طرف چل دیا۔

وہ تقریباً ویسا ہی بازار تھا جیسے عام طور پر دیہات اور قصبوں میں ہوتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ ذرا ترقی یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ محلِ وقوع عجیب ہونے کے باوجود اس قصبے میں بجلی موجود تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ کچھ عرصے پہلے ہی یہاں سے چند میل دور ایک جزیرہ نما مقام پر ایک بڑا تھرمل بجلی گھر لگایا گیا تھا۔ اس قصبے میں شاید حال ہی میں بجلی آئی تھی اور یہاں کے لوگوں نے اس سے استفادہ کرنے کی سب سے بہتر صورت شاید یہ سوچی تھی کہ جگہ جگہ ڈشیں لگالی تھیں اور دو ایک عام سے چائے خانوں میں بھی میں نے کلر ٹی وی اور وی سی آر چلتے دیکھے جہاں کچھ گاہک بیٹھے بڑے ذوق و شوق سے فلم دیکھ رہے تھے۔

میں نے جہاں پی سی او کا بورڈ دیکھا تھا وہ درحقیقت ایک میڈیکل اسٹور تھا۔ وہیں باہر چبوترے پر ایک میز کرسی رکھ کر پبلک کال آفس کا سلسلہ چلانے کا انتظام تھا۔ میڈیکل اسٹور کا مالک شاید عوام کی فلاح کی خاطر ڈاکٹر کے فرائض انجام دیتا تھا۔ جس وقت میں وہاں پہنچا وہ ایک مریض کی مرہم پٹی سے فارغ ہوتے ہی اسے انجکشن لگانے کی تیاری کر رہا تھا اور دوسرے دو تین مریض غالباً اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ پبلک فون پر گاہکوں کو اٹینڈ کرنے کے لیے دوسرا آدمی موجود تھا۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ایک رسالے کے مطالعے میں منہمک تھا۔ ٹیلی فون پر نہ جانے کیوں مکھیاں بھنک رہی تھیں۔

"کراچی ایک فون ہوسکتا ہے جناب؟" میں نے بڑے احترام اور شائستگی سے پوچھا۔

اس نے ہڑبڑا کر رسالہ ایک طرف اوندھا رکھا اور میری ہی طرح احترام اور شائستگی سے بولا "کیوں نہیں جناب.....!" پھر وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "آپ جہاں کہیں وہاں فون ہوسکتا ہے اور کافی کفایت سے ہوسکتا ہے۔ نمبر بتائیں۔" اس نے مستعدی سے بال پوائنٹ سنبھال لیا اور کلپ بورڈ پر ہاتھ رکھ لیا۔

میں نے اسے ایک نمبر بتایا اور چند لمحے کی کوشش کے بعد اس نے نمبر ملا دیا۔ ساتھ ہی اس نے قریب رکھی ایک اسٹاپ واچ کا بٹن بھی دبا دیا تھا۔ وہ دبلا پتلا... سانولا سا نوجوان تھا جس کے دانت کافی زرد تھے۔ ریسیور مجھے تھمانے کے بعد وہ دوبارہ رسالے کے

مطالعے میں منہمک نظر آنے کی کوشش کرنے لگا لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ اب اس کا دھیان مطالعے میں نہیں تھا۔ اس کے کان یقیناً میری طرف لگ چکے تھے۔ میں اس کے قریب پڑے اسٹول پر بیٹھ چکا تھا۔

دوسری طرف سے میری مطلوبہ آواز سنائی دی تو میں نے کہا "میں میگھانی پہنچ گیا ہوں اور ہوٹل میں ٹھہر گیا ہوں۔"

"ہمیں معلوم ہوچکا ہے۔" دوسری طرف خفیف سی ہنسی کے ساتھ کہا گیا۔

"عجیب اتفاق ہے کہ مجھے اس ہوٹل میں وہی کمرا ملا ہے جس میں میرے اندازے کے مطابق کامران دانش بھی ٹھہر چکا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے آئندہ تمہیں اس سے زیادہ عجیب اتفاقات پیش آئیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا "یہ بتاؤ جگہ کیسی ہے اور وہ ہوٹل کیسا ہے جہاں تم ٹھہرے ہوئے ہو؟"

"جگہ...... بس ٹھیک ہے......" میں نے مبہم لہجے میں کہا "یہاں خوب صورتی بھی ہے اور بدصورتی بھی......" بازار کے سرے پر مجھے ایک دلدل نظر آئی تھی جو تقریباً سمندر تک چلی گئی تھی۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کے کنارے کنارے قدِ آدم گھاس اگی ہوئی تھی جو کسی حد تک قدرتی حفاظتی باڑھ کا کام دے رہی تھی اور مزید اچھی بات یہ تھی کہ اس باڑھ کے ساتھ ساتھ دو تین جگہ چھوٹے چھوٹے بورڈ نصب کر کے لوگوں کو خبردار کردیا گیا تھا کہ اس سے آگے دلدل تھی۔ قدرے حیرت کی بات یہ تھی کہ ٹاؤن کمیٹی کی طرف سے لگائے گئے ان بورڈوں پر خبردار کرنے کا اعلان انگریزی میں بھی لکھا گیا تھا۔ اس دلدل کی اپنی ایک بُو تھی جو مچھلی کی خفیف سی بُو کے ساتھ مل کر ماحول کی خوب صورتی کے تاثر کو کم کر رہی تھی۔

"خوب صورتی! اور بدصورتی...... بلکہ شاید ہر طرح کے تضادات دنیا میں ہر جگہ ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔" دوسری طرف سے کہا گیا "یہ بتاؤ کہ مچھلیوں کے شکار پر کب نکل رہے ہو؟"

"پہلے کچھ اندازہ تو ہو کہ مچھلیاں کہاں پائی جاتی ہیں۔ تبھی شکار کا کوئی صحیح پروگرام بن سکتا ہے۔ ویسے اِدھر اُدھر مچھلیوں کے لیے چارا ڈالنا تو شروع کردیا ہے۔ اب دیکھتا ہوں کب کوئی مچھلی آکر منہ مارتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اس دوران میں ایک باڈی بلڈر ٹائپ شخص جس کی عمر پینتیس سال کے قریب ہوگی، اس دکان کے قریب آن کھڑا ہوا۔ دکان کے آگے لوہے کے موٹے موٹے پائپوں کے سہارے کافی بڑا ٹین کا چھجا نصب تھا۔ وہ انہی میں سے ایک پائپ سے ٹیک لگا کر دونوں بازو اس طرح بغل میں دبا کر کھڑا ہوگیا تھا جیسے اپنے بازوؤں کے پٹھوں کی نمائش کر رہا ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے بازوؤں کے پٹھے کافی حد تک شاندار تھے بلکہ یہ کہنا بھی بے جا نہیں تھا کہ وہ مجموعی طور پر ہی ایک شاندار جسم کا مالک تھا لیکن اس پر زوال کے آثار نمودار ہونا شروع ہوچکے تھے جس کی پہلی نشانی یہ تھی کہ اس کی توند نمودار ہوتی دکھائی دینے لگی تھی۔

اس نے شاید بڑے اہتمام سے ایسے کپڑے پہنے تھے جن میں اس کی جسمانی ساخت کی زیادہ سے زیادہ نمائش ہوسکے یعنی ایک پرانی سی چست جینز، تو ہی سے بھی کم آستینوں کی ایک چست ٹی شرٹ جس پر تیل کی معمولی سی چکناہٹ بھی نظر آرہی تھی۔ اس کے ایک بازو کے مسل پر بڑی سی مکڑی کا ٹیٹو بھی گدا ہوا تھا۔ وہ اپنے بازو کا مسل پھڑکاتا تو اس کے ساتھ ساتھ مکڑی اپنی جگہ سے حرکت کرتی دکھائی دیتی تھی۔ اچھا آئیڈیا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس علاقے میں مجھے اس قسم کا کوئی نمونہ نظر آئے گا۔ اس کے چہرے پر مختصر لیکن گھنی داڑھی تھی۔ مونچھیں خاصی بارعب، موٹی موٹی آنکھوں میں سرخی اور بال تیل میں چپڑے ہوئے تھے۔

وہ کچھ اس قسم کا باڈی بلڈر معلوم ہوتا تھا جسے باڈی بلڈنگ ترک کیے کئی سال ہوچکے تھے۔ شاید اسے باڈی بلڈنگ کے زمانے میں بھی اپنی باڈی پر ناز کرنے اور اس کی بلاضرورت نمائش کرنے کی عادت تھی جو ابھی تک برقرار تھی حالانکہ اس قسم کے بھی بہت سے لوگوں نے یہ سوچ کر یہ عادت ترک کردی تھی کہ اب تو رہبرانِ ملک و ملت کی مہربانیوں سے اسلحہ بہت عام ہوگیا ہے۔ جسمانی قوت اب کچھ ایسی قابلِ فخر، قابلِ نمائش یا قابلِ بھروسا چیز نہیں رہی تھی۔ بارہ سال کا ایک بچہ ٹی ٹی کا ایک ٹریگر دباتا تھا اور اچھا بھلا پہلوان ایک طرف کو لڑھک جاتا تھا۔ اب تو اس قسم کی جان رکھنے والے بھی اگر داداگیری، بدمعاشی یا دوسرے مجرمانہ دھندے کرتے تھے تو اسلحے کے زور پر ہی کرتے تھے۔ میں نے تو بات کرتے وقت غیر محسوس طور پر اس کا جائزہ لیا۔ اس کے چست کپڑوں میں مجھے کسی ہتھیار کی موجودگی کے آثار دکھائی نہیں دیے۔

وہ بدستور اپنی جگہ جما کھڑا تھا اور کچھ اس طرح مجھے گھور رہا تھا جیسے میرا کوئی پرانا قرض خواہ تھا اور مسلسل وعدہ خلافیوں پر بُری طرح خار کھا کر فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے ساتھ کیا سلوک کیا جائے۔ میں نے محسوس کیا کہ پبلک فون کا مالک نوجوان بھی اسے دیکھ کر اپنی جگہ سکڑ سمٹ گیا تھا اور رسالے کے مطالعے میں زیادہ منہمک نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پہلے مجھے گمان گزرا کہ شاید باڈی بلڈر صاحب کو بھی کہیں فون کرنا تھا اور وہ اس بات پر خار کھا رہے تھے کہ میں ان کی آمد سے پہلے فون کیوں سنبھالے بیٹھا تھا، انہیں میدان بالکل صاف اور ٹیلی فون بالکل فارغ کیوں نہیں ملا تھا...... لیکن پھر مجھے اندازہ ہوا کہ موصوف کی توجہ کا مرکز میں ہی تھا، ٹیلی فون سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں نے بات جاری رکھی "ویسے تو یہ اپنے محلِ وقوع اور

ماحول کے اعتبار سے ایک خوب صورت اور پُرسکون قصبہ ہے لیکن یہاں کوئی عجیب بات ضرور ہے جسے میں صرف محسوس کرسکتا ہوں' بیان نہیں کرسکتا۔ بہرحال ابھی میں اِدھراُدھر پھروں گا اور دیکھوں گا کہ کامران دانش کی موت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوسکتی ہیں یا نہیں۔ اس کے علاوہ بھی شاید کوئی کام کی بات معلوم ہوسکے۔"

"ہمیں جب حرکت میں آنا ہو تو ہمیں سگنل دے دینا۔" دوسری طرف سے کہا گیا۔

"وہ تو شاید تمہیں خود بہ خود ہی مل جائے۔" میں نے کہا اور خدا حافظ کہہ کر فون بند کردیا۔ نوجوان نے جلدی سے رسالہ چھوڑ کر اسٹاپ واچ بند کی اور وقت دیکھ کر مجھے رقم بتادی۔ اسے ادائیگی کرکے میں نے اپنی چھڑی سنبھالی اور لنگڑاتا ہوا اس شخص کے قریب سے گزر کر بازار میں چل دیا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی لیکن جب میں اس کے قریب سے گزرا تو اس کی آنکھوں میں خونخواری کچھ اور بڑھ گئی۔ میرا جی چاہا کہ اسے آنکھ ماردوں لیکن میں نے بہ مشکل اپنی اس خواہش پر قابو رکھا۔ میں اپنا سراپا ایک مسکین شخص کا سا رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ میرا طرزِ عمل بھی فی الحال اسی کے مطابق ہوتا تو بہتر تھا۔ بہرحال ہوٹل سے نکل کر فون کرنے کا شاید مشکی خان کے سامنے فون کرنے سے زیادہ فائدہ ہوا تھا۔ میری توقع سے زیادہ جلدی کوئی میری طرف متوجہ ہوگیا تھا اور اس نے اپنے آپ کو میری نظروں سے اوجھل رکھنے کی تکلفاً بھی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ تاہم اس نے میرا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس لیے کہ اس کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہ وہاں کھڑے کھڑے بھی آسانی سے دیکھ سکتا تھا کہ میں کہاں جارہا تھا اور اگر میں اس کی نظر سے اوجھل بھی ہوجاتا تب بھی وہ آسانی سے میرے بارے میں معلوم کرسکتا تھا۔۔۔۔ بلکہ شاید اسے پہلے ہی سے معلوم ہو۔

راستے میں دیسی طرز کے ایک مخصوص ریستوران سے مجھے کڑاہی گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو آئی اور مجھے یاد آیا کہ ابھی میں نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ ریستوران میں صرف چند گاہک موجود تھے۔ باہر سڑک کے کنارے بھی لوہے کی میزیں' کرسیاں اور ایک آدھ چارپائی بھی موجود تھی۔ میں جان بوجھ کر کاؤنٹر کے قریب ہی ایک میز پر جا بیٹھا۔ کاؤنٹر پر ایک معقول صورت سا ادھیڑ عمر شخص موجود تھا۔ اس کا لباس صاف ستھرا بلکہ کافی حد تک معززانہ تھا۔ شاید وہ اس ریستوران کا مالک ہی ہو۔ اس نے گہری نظر سے میرا جائزہ لیا۔

میں نے فوراً سر پر سوار ہونے اور فراٹے سے زبانی مینیو سنانے والے بیرے کو کڑاہی گوشت کا آرڈر دیا۔ اس کے جانے کے بعد کاؤنٹر پر بیٹھا شخص میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا اور دوستانہ لہجے میں بولا "کیسا لگا ہمارا قصبہ؟"

میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے پوچھا "یعنی تمہیں مجھ پر نظر ڈالتے ہی معلوم ہوگیا کہ میں یہاں کا رہنے والا نہیں ہوں؟"

ارے صاحب! یہ کوئی لندن یا نیویارک تو نہیں ہے جہاں پڑوسی کو پڑوسی کا پتا نہ ہو۔" وہ بھی دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے صاف اردو میں بولا "یہاں ویسے تو چاہے ہم لوگ سال سال ایک دوسرے سے نہ ملیں لیکن ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ضرور ہیں۔ دو میل دور سے دیکھ کر بتا دیتے ہیں کہ چھوٹیں کا بھیا کہیں اور کا۔"

میں نے سر ہلایا اور خاموش رہنے پر اکتفا کیا تو اس نے اپنا سوال دہرایا۔ میں نے محتاط لہجے میں کہا "قصبہ تو بہت اچھا ہے۔۔۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ جگہوں کے اچھے یا بُرے ہونے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ جگہیں اہم نہیں ہوتیں اہم تو لوگ ہوتے ہیں۔ فرق تو لوگوں سے پڑتا ہے۔ میری نظر میں تو ہر وہ جگہ اچھی ہے جہاں کے لوگ اچھے ہیں۔"

اس نے زور و شور سے میری تائید میں سر ہلایا۔ اس دوران میں وہ اٹھ کر جانے والے گاہکوں سے پیسے بھی لیتا جارہا تھا۔ ایک گاہک کو رخصت کرنے کے بعد وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔ آپ کو یہاں لوگ بھی اچھے ہی ملیں گے۔۔۔" پھر اس کے چہرے پر غیر معمولی سنجیدگی جھلک آئی اور آواز شاید غیرارادی طور پر کچھ نیچی ہوگئی "سوائے کچھ لوگوں کے۔۔۔"

میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور کہا "آپ کی یہ اطلاع کچھ تشویش ناک ہے۔"

"اچھے بُرے لوگ تو ہر جگہ ہی ہوتے ہیں۔" وہ نظر چراتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔۔۔ اسی لیے تو ہر جگہ کا ہی حال خراب ہے۔ کہتے ہیں ایک مچھلی سارے جل کو گندہ کرتی ہے۔ جہاں بہت سی مچھلیاں گندی ہوں وہاں تو حال زیادہ خراب ہوتا ہے۔" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے گہری سانس لے کر کہا "پھر بھی بعض جگہوں پر اچھے اور بُرے لوگوں کا تناسب اتنا خطرناک نہیں ہوتا اور ان کے درمیان کچھ نہ کچھ حدود ضرور باقی رہتی ہیں جو اچھے اور بُرے میں امتیاز کرنے میں مدد دیتی ہیں لیکن بعض جگہ اچھے اور بُرے اس طرح خلط ملط ہوجاتے ہیں کہ کچھ پتا نہیں چلتا' اچھا کون ہے اور بُرا کون؟ کہیں ایسا بھی ہوتا ہے کہ تھوڑے سے بُرے لوگ بہت زیادہ اچھے لوگوں پر غالب آجاتے ہیں' انہیں یرغمال بنالیتے ہیں۔ یہ صورتیں زیادہ بری اور خطرناک ہوتی ہیں۔ ایسی جگہوں کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔"

وہ پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اس نے کچھ کہنے کا ارادہ کیا لیکن پھر ملتوی کردیا۔ شاید کوئی مصلحت آڑے

ی تھی۔ بعض مصلحتیں بہت سے لوگوں کو اجتماعی خودکشی کی ف لے جاتی ہیں۔ چند لمحوں کے لیے ہمارے درمیان تناؤ آمیز خاموشی کی دیوار کھڑی ہوگئی حالانکہ اس دوران میں بیروں کی فت آوازیں' گاہکوں کی بھنبھناہٹ اور ٹی وی کی آواز بدستور نجتی رہی تھی۔

کشیدہ سی خاموشی کے اس احساس میں اس وقت اضافہ ہوگیا ب میں نے اسی باڈی بلڈر ٹائپ شخص کو ریستوران میں داخل وتے دیکھا جسے میں اس سے پہلے فون کرتے وقت دیکھ چکا تھا۔ وہ بڑھا میری میز کی طرف آیا اور یوں میرے مقابل بیٹھ گیا جیسے میرا ناشنا سا تھا اور اس وقت اس جگہ اس کے ساتھ میرا ملاقات کا پروگرام طے تھا۔ دونوں کہنیاں اس نے یوں میز پر نکالیں کہ میں ب سے بھی اس کے ورزشی بازوؤں اور ان میں سے ایک کے سل پر ہر چند سیکنڈ بعد متحرک نظر آنے والے ٹکڑے کا نظارہ کرسکوں۔

"تمہارا نام افضل چودھری ہے نا؟" اس نے اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں تصدیق چاہی۔ الفاظ اور لہجہ کھردرا ضرور تھا لیکن پھر بھی زیادہ توہین آمیز نہیں تھا۔ یہ یقیناً اس کا نارمل لہجہ تھا۔ بیشتر لوگوں سے وہ اسی انداز میں گفتگو کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ریستوران کا مالک بھی اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ کچھ سکڑ سمٹ گیا تھا اور اچانک ہی چھوٹے موٹے کاموں میں زیادہ مصروف نظر آنے لگا تھا۔ گاہکوں کی باتوں کی بھنبھناہٹ تک یک دم بہت مدھم پڑگئی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا؟" میں نے اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"یہ کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں۔" وہ منہ بنا کر بولا "مجھے پتا چلا تھا کہ تم میگھانی ہوٹل میں آکر ٹھہرے ہو۔ میں نے وہاں سے معلوم کرلیا۔"

"کیوں؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ میں کوشش کررہا تھا کہ نہ تو اس سے مرعوب نظر آؤں اور نہ ہی جارحانہ انداز اختیار کروں۔

"یونہی۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا "یہاں کسی اجنبی کا آنا ایک خبر ہوتی ہے۔ مجھے ویسے بھی اجنبیوں سے کچھ زیادہ دلچسپی ہے۔ تمہیں شاید اندازہ ہوگیا ہوگا کہ یہاں لوگوں کے لیے کچھ زیادہ دلچسپیاں موجود نہیں ہیں۔ تفریح کا کوئی سامان نہیں ہے۔ ڈش اور ٹی وی کے بعد اجنبی لوگ ہی ہماری تفریح کا تھوڑا بہت سامان ہوتے ہیں۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں تمہارے لیے دلچسپی اور تفریح کا سامان ثابت ہوں گا؟" میں نے پلک جھپکائے بغیر پوچھا۔

"امکانات تو کافی نظر آرہے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ وہ بھی اچھی خاصی اردو بول رہا تھا۔ صرف لہجہ ذرا جھٹکے دار تھا۔

اس دوران میں ویٹر کڑاہی گوشت اور نان لے آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ چیزیں رکھنے کے بعد اس شخص کی موجودگی کی وجہ سے ویٹر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ اس کی طرف سے کسی حکم کا منتظر تھا لیکن اس نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے بغیر محض ہاتھ سے حقارت آمیز سے انداز میں اسے جانے کا اشارہ کردیا۔

"کھانا کھاؤ۔" میں نے کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے نہایت سرسری اور رسمی لہجے میں کہا۔

"فی الحال تم ہی کھاؤ۔" اس نے کچھ اس طرح کہا جیسے مستقبل میں مجھے کچھ کھانا نصیب ہونے کا معاملہ ذرا مشکوک تھا۔ میں نے بے نیازی سے کھانا کھانا شروع کردیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اس دوران میں کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ شاید اسے میری بے نیازی پر تاؤ آرہا تھا۔

دو لقمے حلق سے اتارنے کے بعد میں نے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "اگر کسی اجنبی کا یہاں آنا اتنی ہی بڑی خبر ہوتا ہے اور تم اس کے بارے میں اتنے ہی باخبر رہنے کی کوشش کرتے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ چند دن پہلے ایک اور اجنبی بھی یہاں آیا تھا۔ اس کا نام کامران دانش تھا اور وہ بھی اسی ہوٹل میں ٹھہرا تھا جہاں میں ٹھہرا ہوں۔۔۔ یا پھر شاید اسے وہاں ٹھہرایا گیا تھا۔"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے اس نام کا ایک آدمی یہاں آیا تھا۔" وہ اطمینان سے بولا "مرنے کے بعد کسی کو بُرے الفاظ میں یاد نہیں کرنا چاہیے لیکن میں اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ بہت ہی پاگل کا بچہ تھا اس لیے مگرمچھوں کا نوالہ بن گیا۔ یہ ایک افسوس ناک حادثہ تھا۔ یہاں سے کچھ دور ایک کھاڑی ہے جو مچھلیوں کے شکار کے لیے بہت اچھی ہے لیکن رات کو وہاں سے مچھلیاں بھاگ جاتی ہیں اور مگرمچھ آجاتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ گدھا رات کو وہاں کیا کرنے چلا گیا تھا۔"

میں نے ہموار لہجے میں کہا "مگرمچھوں نے عام طور پر پانی کے قریب کوئی کھوہ وغیرہ بنا رکھی ہوتی ہے۔ وہ اپنے شکار کو ہلاک کرنے کے بعد وہاں چھپا دیتے ہیں اور اس کے گلنے سڑنے کا انتظار کرتے ہیں تاکہ اسے آسانی سے نگل سکیں کیونکہ وہ کسی بھی چیز کو چبائے بغیر نگلتے ہیں۔ کامران کو ہلاک تو یقیناً کسی مگرمچھ نے ہی کیا تھا لیکن اس کی لاش سنا ہے ساحل پر پائی گئی تھی۔"

اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر خفیف سی طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی "اتنی باریکی سے تو اس کے بارے میں پولیس نے بھی چھان بین نہیں کی تھی۔ میری معلومات کے مطابق تم پولیس والے بھی نہیں ہو اور نہ ہی اس قسم کی کسی دوسری ایجنسی سے تمہارا تعلق ہے۔ پھر تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ گچھ کررہے ہو؟ کیا وہ تمہارا کوئی رشتے دار تھا؟"

"نہیں۔ رشتے دار تو نہیں تھا لیکن ہر انسان میں دلچسپی رشتے

داری کی وجہ سے تو نہیں لی جاتی" میں نے منہ چلاتے ہوئے جواب دیا "بلکہ رشتے داروں میں تو انسان کی دلچسپی دن بدن کم ہی ہوتی جاتی ہے۔"

"تو پھر اس سلسلے میں دلچسپی لینے کی وجہ؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال ہے اس کی موت کے پیچھے کوئی کہانی تھی۔ میں وہ کہانی جاننا چاہتا ہوں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں نے یہ موقع مناسب سمجھ کر اپنا اصل مقصد واضح کر دینا بہتر سمجھا تھا۔

"یہ پولیس کے کرنے کے کام ہیں۔ تم ان چکروں میں کہاں پڑ گئے ہو سیٹھ!"

"پولیس پر چونکہ کام کا بہت بوجھ ہے۔۔۔ اس کے علاوہ بہت سے کام وہ کرنا نہیں چاہتی، بہت سے کام وہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی اس لیے کبھی کچھ اور لوگوں کو بھی بعض کام اپنے ذمے لے لینے چاہئیں" میں نے بدستور ملائمت سے کہا۔

اس نے یوں میری طرف دیکھا جیسے میں واقعی اس کے لیے تفریح اور دلچسپی کا سامان ثابت ہونے لگا تھا "آج کل جو کام لوگوں کے ذمے ہیں، وہ انہیں انجام نہیں دیتے" ان میں ڈنڈی مارنے میں لگے رہتے ہیں۔ تم دوسروں کے کام اپنے ذمے لے رہے ہو۔۔۔ اور وہ بھی پولیس کے کام۔۔۔ جن میں انسان کی جان جانے کا بھی ڈر ہوتا ہے۔ خود پولیس نے اپنے وہ کام کرنے چھوڑ دیے ہیں جن میں جان جانے کا ڈر ہوتا ہے۔"

"جان کا کیا ہے مری جان!" میں نے اس کی طرف دیکھ کر مشفقانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔ "جان تو اک دن جانی ہی ہوتی ہے۔۔۔ بلکہ کبھی کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ جان کی جتنی زیادہ حفاظت کرو، اتنی ہی جلدی چلی جاتی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ تم اپنے اس شاندار اور پلے پلائے جسم کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہو گے؟"

اسے شاید کچھ جھٹکا سا لگا۔ وہ شاید یہ توقع لے کر میرے سامنے آ کر نہیں بیٹھا تھا کہ چھڑی کا سہارا لے کر اور لنگڑا کر چلنے والا ایک شخص اس کے ساتھ اتنے اطمینان اور بے خوفی سے گفتگو کرے گا۔

"نہیں۔" اس نے تیزی سے جواب دیا "لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں چلتی ٹرین کے آگے جا کر لیٹ جاؤں یا دو گروپوں کے درمیان گولیوں کی بوچھاڑ میں جا کر کھڑا ہو جاؤں جبکہ میرا ان لوگوں میں سے کسی سے بھی کوئی تعلق، واسطہ نہ ہو۔"

"یہاں ان میں سے کون سی صورتِ حال ہے؟ تم چلتی ٹرین ہو یا دو گروپوں کے درمیان گولیوں کی بوچھاڑ ہو رہی ہے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"یہ تو میں نے ایک مثال دی ہے" وہ جھلا کر بولا پھر اس نے شکی سی نظروں سے مجھے گھورا۔ "کیا تم واقعی کوئی سیٹھ ہو؟ مجھے پتا چلا ہے کہ شہر میں تمہارا فائیو اسٹار ہوٹل اور دوسرے بزنس ہیں؟ کیا یہ سچ ہے؟"

"ہاں۔۔۔ سچ تو ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن مجھے تمہاری معلومات پر حیرت ہے۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ تمہاری معلومات کے ذرائع کیا ہیں؟ سی آئی ڈی۔۔۔ سیکرٹ سروس یا اسکاٹ لینڈ یارڈ۔۔۔؟"

"اتنے موٹے موٹے نام لینے کی ضرورت نہیں۔ ہم سیدھے سادے لوگ ہیں۔ سیدھے سادے طریقوں سے کام چلا لیتے ہیں" وہ منہ بنا کر بولا "اگر تم بھی سیدھے سادے طریقے سے مجھے بتا دو کہ تم اپنی عیش و آرام کی زندگی چھوڑ کر کس لیے یہاں آئے ہو۔۔۔ تو شاید تمہارے حق میں اچھا ہو۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ سیٹھ شہر میں صرف عیش و آرام ہی کی زندگی گزارتے ہیں؟ شہر میں ان کی جان کو تو بیسیوں عذاب لگے ہوتے ہیں۔ ان سے جان چھڑانے کے لیے کبھی کبھی وہ سارے بکھیڑوں سے نکل کر ایسی جگہوں کی طرف بھاگ آتے ہیں۔۔۔" میں نے گرد و پیش کی طرف اشارہ کیا "یا پھر ملک سے باہر چلے جاتے ہیں۔ وہاں بھی کوئی نہ کوئی ایسا ہی ٹھکانا تلاش کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ٹھکانے ان ترقی یافتہ ملکوں کی مناسبت سے زیادہ خوب صورت، زیادہ سرسبز اور زیادہ صاف ستھرے ہوتے ہیں۔ لوگ زیادہ ماڈرن اور اپنے کام سے کام رکھنے والے ہوتے ہیں۔ موقع ملتا ہے تو میں بھی ایسی جگہوں کی طرف نکل جاتا ہوں لیکن کبھی کبھی طبیعت پر اپنا دیسی پن غالب آتا ہے تو بیگھانی جیسی کوئی جگہ تلاش کر لیتا ہوں۔ بعض سیٹھوں بے چاروں کو تو ملک سے باہر یا ملک کے اندر، کہیں بھی جانے کی توفیق نہیں ہوتی۔ وہ بے چارے اپنی بے شمار مصروفیات میں ہی پھنس کر گھن چکر بنے، اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

میں نے ایک لمحے توقف کیا پھر پوچھا "میری بات تمہاری سمجھ میں آئی؟"

"تم اب یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تم یہاں تفریح کے لیے آئے ہو؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔۔۔ میں اصل میں تو یہاں مچھلی کے شکار کے لیے آیا ہوں لیکن ساتھ میں اگر کامران کی موت کے بارے میں بھی اصل باتیں معلوم ہو جائیں تو کوئی حرج نہیں" میں نے کہا۔

"مچھلی کے شکار کے لیے تو یہاں کبھی کبھار تھوڑے بہت لوگ آ جاتے ہیں۔۔۔ اور آج کل تو سیزن ہی نہیں ہے۔ یہ جگہ مچھلی کے شکار کے لیے کچھ زیادہ مشہور تو نہیں ہے۔"

"تو پھر کس چیز کے لیے مشہور ہے؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"کسی بھی چیز کے لیے نہیں" وہ گویا چڑ کر بولا "کسی زمانے میں یہاں ماہی گیری ضرور ہوتی تھی۔ اب وہ بھی نہیں ہوتی۔"

"کیوں۔۔۔ کیا مچھلیاں یہاں سے فرار ہو گئی ہیں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"یہی سمجھ لو۔ کچھ یہاں مگرمچھوں کی آمد کی وجہ سے۔۔۔ اور کچھ بڑے ٹرالروں کے شکار کی وجہ سے میلوں دور تک مچھلی کی کمی ہو گئی ہے۔ چھوٹی لانچوں والے زیادہ دور دراز تک نہیں جا سکتے۔" اس نے بُرا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

"جہاں مگرمچھ آ جاتے ہیں وہاں سے مچھلیاں تو بھاگ ہی جاتی ہیں" میں نے دانشورانہ انداز میں سر ہلایا "اس کے باوجود مچھلی کے شکار کے لیے آنے والوں کے ہاتھ کچھ نہ کچھ تو لگتا ہی ہو گا۔ میں نے اسی بازار میں مچھلیوں کے شکار کے سامان کی ایک دکان بھی دیکھی ہے جو ان دنوں بھی کھلی ہوئی ہے۔"

"روزی کمانے کی آس پر لوگ کسی نہ کسی چیز کی دکان کھول کر تو بیٹھے ہی رہتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ انہیں دیکھ کر دوسرے بھی اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے بیٹھ جائیں۔۔۔ اور ساتھ ساتھ اپنی قیمتی جان کو بھی خطرے میں ڈالیں" اس نے اب صاف لفظوں میں خبردار کیا۔

"میری جان کو کس کی طرف سے خطرہ ہے۔۔۔؟ تمہاری طرف سے؟" میں نے پانی کا المونیم کا گلاس اٹھاتے ہوئے نہایت سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ مگرمچھوں کی طرف سے" اس نے شاطرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا "جو لوگ اس علاقے سے بہت اچھی طرح واقف نہیں ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ مچھلی کے شکار پر آئیں اور خود مگرمچھ کا شکار بن جائیں۔"

"مجھے چیلنج قبول کرنا بہت پسند ہے" میں نے چند گھونٹ پانی پی کر گلاس واپس رکھتے ہوئے نہایت اطمینان سے کہا "چاہے وہ چار ٹانگوں والے مگرمچھ کی طرف سے ہو اور چاہے دو ٹانگوں والے مگرمچھوں کی طرف سے۔"

میں نے ایک بار پھر کھانا شروع کر دیا تاہم میری نظر اس پر تھی۔ اس کے چہرے پر صرف ایک لمحے کے لیے اشتعال کی سرخی آ گئی مگر معدوم ہو گئی۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر مجھے گھورنے لگا۔ شاید وہ میرے بارے میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ وہ مجھے چھڑی کے سہارے لنگڑا کر چلتے دیکھ چکا تھا اور یہ بھی جانتا تھا کہ میں تنہا قصبے میں آیا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس کے باوجود میں اتنا مطمئن اور بے فکر کیوں تھا؟

اس نے پینترا بدلتے اور قدرے نرم لہجے میں بات کرنے کا فیصلہ کیا لیکن اس نرم لہجے میں بھی بہرحال دھمکی پنہاں تھی "میرا مشورہ یہی ہے کہ تم مچھلی کا شکار کرنے یا چیلنج قبول کرنے کا شوق پورا کرنے کسی اور علاقے کی طرف نکل جاؤ۔ ملک میں ایک سے ایک اچھے علاقے موجود ہیں جہاں بہت اچھی نسل کی مچھلیاں بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔ کچھ علاقے تو تمہارے شہر کراچی سے بہت قریب بھی ہیں۔"

"اب یہاں آ گیا ہوں تو قسمت آزمائی کر کے دیکھ ہی لوں" میں نے مطمئن انداز میں منہ چلاتے ہوئے کہا۔ وہ چند لمحے ایک ٹک مجھے خونخوار نظروں سے گھورتا رہا لیکن میں اس دوران میں گویا اس کی موجودگی سے بے خبر ہو گیا۔

میرا خیال تھا کہ اگر اس کے صبر کا چھوٹا سا پیمانہ لبریز ہو گیا تو وہ وہیں اٹھا پٹخ کرنے کی کوشش کرے گا اور میں بظاہر بے پروا نظر آنے کے باوجود اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کیے بیٹھا تھا لیکن میرا یہ اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ضرور ہو گیا لیکن خلافِ توقع ہاتھ پاؤں چلانے کے بجائے ٹھنڈی سانس لے کر گویا اٹھا پٹخ کے پروگرام کو کسی اور وقت کے لیے ملتوی کرتے ہوئے بولا "تم یہ نہیں کہہ سکو گے کہ تمہیں کسی نے خبردار نہیں کیا تھا۔"

"میں تو ویسے بھی شکوہ شکایت کرنے کا عادی نہیں ہوں" میں نے نہایت صابرانہ لہجے میں کہا اور بدستور کھانے میں مصروف رہا۔

وہ تیزی سے گھوما اور اکڑتا ہوا ریستوران سے نکل گیا۔ میں نے بہ آوازِ بلند اسے عقب سے پکارا "سنو۔۔۔ تم نے اپنا نام تو بتایا ہی نہیں۔"

وہ پلٹ کر دوبارہ میری میز کے قریب آیا اور ذرا جھکتے ہوئے غرانے کے سے انداز میں بولا "مجھے بلڈوزر عرف اسٹریچر کہتے ہیں۔ جب میں کسی کو بلڈوز کرتا ہوں تو اسے اسٹریچر پر ڈال کر لے جایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلا مرحلہ تابوت میں ڈال کر لے۔۔۔ جانے کا ہوتا ہے" ایک لمحے کے توقف سے اس نے داد طلب سے انداز میں پوچھا "کیسا نام ہے؟"

اپنی دانست میں اس نے اپنا یہ نام بتا کر بڑی ذہانت اور بذلہ سنجی کا ثبوت دیا تھا۔ میں نے مربیانہ انداز میں سر ہلایا پھر سرسری سے لہجے میں کہا "اچھا ہے۔۔۔ بس ذرا غیر انسانی سا نام لگتا ہے۔ ویسے تم نے تابوت کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس حساب سے تو تمہارا نام بلڈوزر عرف اسٹریچر عرف تابوت ہونا چاہیے تھا۔ اس طرح اس میں ذرا زیادہ وزن پیدا ہو جاتا۔"

وہ چند سیکنڈ پُرخیال انداز میں مجھے گھورتے ہوئے ٹھوڑی کھجاتا رہا پھر پلٹ کر خاموشی سے چل دیا۔ اس کے جانے کے بعد بھی چند سیکنڈ تک ماحول میں تناؤ اور کشیدگی کا احساس برقرار رہا۔ میں نے کاؤنٹر پر موجود شخص کی طرف دیکھا جو میرے اندازے کے مطابق ریستوران کا مالک ہی تھا۔ وہ دزدیدہ نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی وہ ہمدردانہ سے انداز میں بول اٹھا "میرا خیال ہے کہ آپ ایک شریف اور معزز آدمی ہیں۔ آپ کو اس گینڈے کے بچے سے نہیں الجھنا چاہیے تھا۔"

"شریف اور معزز لوگوں میں یہ رواج بہت بڑھ گیا ہے کہ وہ اس قسم کے گینڈے کے بچوں سے نہیں الجھتے۔ اسی لیے رفتہ رفتہ انہوں نے شرفا کو تگنی کا ناچ نچانے کے بجائے ٹھیل ڈال دی ہے" میں نے ملائمت سے کہا

"ویسے اس کا اصل نام کیا ہے؟"
"اصل نام تو کسی کو بھی معلوم نہیں۔ سب اسے صرف بھٹی کے نام سے جانتے ہیں۔ ویسے اس کی عرفیت بلڈوزر ہی ہے۔ یہ زیادہ اسی نام سے پہچانا جاتا ہے" اس نے جواب دیا۔
"کیا یہ اتنا ہی بڑا بدمعاش ہے جتنا اپنے آپ کو ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا؟"
"اس سے کہیں زیادہ بڑا" اس نے خوف زدہ سی نظروں سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا "بڑی حیرت کی بات ہے کہ آپ کے ساتھ اس نے اتنی نرمی دکھائی۔ اتنے سوال وجواب کرنے والوں کو تو یہ لوگ فوراً اٹھا کر لے جاتے ہیں۔"
"یہ لوگ۔۔۔؟" میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
"جی ہاں صاحب! یہ چار اسی قسم کے آدمیوں کا ٹولا ہے۔ صحیح معنوں میں قصبے پر اب انہی کا راج ہے۔ یہ چاروں اپنے زمانے کے بڑے جانے پہچانے دہشت گرد اور بدمعاش ہیں۔ برسوں پہلے جیل توڑ کر بھاگ گئے تھے۔ کچھ عرصہ روپوش رہے۔ جب معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تو یہاں نمودار ہوئے اور تب سے اب تک یہیں ہیں۔"
"جیل توڑ کر بھاگے ہوئے۔۔۔؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ چند لمحے کے لیے میں کھانے کو بھول گیا "کیا کسی کو یہاں ان کی موجودگی کا علم نہیں ہے؟ کوئی ان کو پکڑنے نہیں آیا؟"
اس نے بے چارگی سے کندھے اچکائے "میں کیا کہہ سکتا ہوں صاحب! علم تو ہو گا۔ کئی برس سے یہ یہاں ہیں۔ یہاں پولیس بھی ہے' تھانہ بھی ہے۔ سارے قصبے والوں کو پتا ہے تو پولیس کو بھی پتا ہو گا۔ معلوم نہیں کیوں آج تک انہیں پکڑنے کے لیے کوئی پارٹی نہیں آئی۔ شاید یہ بجھارتیں میرے اور آپ جیسے شریف آدمیوں کے بوجھنے کی نہیں ہیں۔۔۔"
وہ کاؤنٹر پر آنے والے ایک گاہک سے پیسے لینے کے لیے چند لمحے کو خاموش ہوا اور اس کے جانے کے بعد گہری سانس لے کر بولا "شاید یہ بھی اتنے زیادہ افسوس کی بات نہیں تھی کہ کوئی ان کو پکڑنے نہیں آیا۔ اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ الٹا انہوں نے اس قصبے کو پکڑ لیا ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے قابو میں کر لیا ہے۔ اس زمانے میں ہمارا سردار ادھر ہی رہتا تھا۔ وہ ایک شریف آدمی ہے لیکن معلوم نہیں یہ لوگ کس حوالے سے سردار سے ملے اور پھر معلوم نہیں اندر ہی اندر کیا گڑبڑ ہوئی' رفتہ رفتہ قصبے پر عملی طور پر جیسے ان کا قبضہ ہو گیا۔ قصبے کا وہ طبقہ جو زیادہ تر ماہی گیری کرتا تھا' بہت زیادہ غربت کا شکار تھا' اس کو انہوں نے آہستہ آہستہ اپنے ساتھ ملا لیا۔"
وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر متاسفانہ سے انداز میں ہوا میں گھورنے لگا۔ میں دم بخود سا بیٹھا تھا۔ مجھے اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ مجھے کس قسم کی افسوس ناک کہانی سنانے جا رہا تھا۔ کم و بیش یہی کہانی' کسی نہ کسی انداز میں ملک کے بہت سے حصوں میں دہرائی جا رہی تھی۔ کہیں اس پر قبائلی اثر و نفوذ کے سائے تھے' کہیں مذہبی اور کہیں سیاسی اثر و نفوذ کے۔۔۔ دھیرے دھیرے ادھر ادھر مختلف کونے کھدروں میں تبدیلیاں کروٹیں لے رہی تھیں' آتش فشاں تخلیق کیے جا رہے تھے اور ایسا لگتا تھا کہ کسی کو آنے والی تباہ کاریوں کا نہ تو اندازہ تھا اور نہ ہی کوئی فکر تھی بلکہ بعض جگہوں پر تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دانستہ یا نادانستہ سرکاری سطح پر ایسے عوامل کی مدد اور سرپرستی کی جا رہی تھی جو ملک اور معاشرے کی جڑوں میں بارود بھر رہے تھے اور بڑے پیمانے پر دوسری طرح کی بیسیوں خرابیوں اور مسائل کے لیے فضا ہموار کر رہے تھے۔ مختلف محاذوں پر طرح طرح کی آگ بھڑکا کر سارے معاشرتی ڈھانچے کو زمیں بوس کرنے اور یہاں ایک اور ہی دنیا آباد کرنے کے منصوبوں پر کام ہو رہا تھا۔ ایسی دنیا جہاں ہر طرف لوٹ مار' افراتفری' چند سکوں کے لیے قتل و غارت یا عصمت فروشی' اسلحے کی ریل پیل' مصنوعی آسائشوں کا لالچ' ہر طرح کا بحران' معاشی کساد بازاری' خوفناک قسم کی چھینا جھپٹی اور انتہائی عدم تحفظ کا احساس غالب ہو۔ دنیا کے بہت سے خطوں کا یہ حال ہو چکا تھا اور ہمارے ہاں مختلف سمتوں سے اس پر کام ہو رہا تھا لیکن کسی کو ان خطرات کا ادراک نہیں تھا اور کوئی ان سے بچاؤ کے سلسلے میں مخلص اور سنجیدہ نہیں تھا۔ ہر کوئی اپنے "گیم" میں لگا ہوا تھا۔
وہ شخص بھی شاید میری طرح کچھ اندیشوں میں گرفتار تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "رفتہ رفتہ ان کے گھروں میں کسی نہ کسی حد تک خوشحالی نظر آنے لگی۔ رنگین ٹی وی' وی سی آر اور ڈشیں نظر آنے لگیں اور اس کے ساتھ ساتھ جدید قسم کا اسلحہ بھی۔۔۔ لوگوں کے رہن سہن کے ساتھ ساتھ ان کے طور طریقے۔۔۔ حتیٰ کہ بات چیت کرنے کے انداز بھی بدل گئے ہیں۔ پہلے وہ غربت کے باوجود سلجھے ہوئے اور محبت کرنے والے نظر آتے تھے' اب وہ بدمعاش' لالچی اور نفرت کرنے والے معلوم ہوتے ہیں۔"
"تمہارے سردار کا اس دوران میں کیا رویہ رہا؟" میں نے دریافت کیا۔
"بہت سے دوسرے سرداروں کے برعکس اس کی دولت و جائداد یہاں اپنے آبائی علاقے میں کم تھی۔ بس ایک حویلی اور تھوڑی سی زمین تھی لیکن بہرحال وہ خاندانی سردار تھا۔ اس کی زیادہ توجہ کاروبار اور صنعت کاری کی طرف ہو چکی تھی۔ اس لیے اس کے زیادہ کاروباری معاملات شہر میں ہی چلتے تھے۔ یہاں سے اس کو کچھ زیادہ آمدنی نہیں تھی اور اس نے یہاں اپنی آمدنی کے ذرائع بڑھانے پر زیادہ توجہ بھی نہیں دی۔ پھر جب سے یہاں بھٹی اور اس کے ساتھیوں کا اثر رسوخ بڑھا اس نے یہاں رہنا بھی بہت کم کر دیا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ وہ زیادہ تر ملک سے باہر رہتا

ہے۔ اس کے کاروبار ملک سے باہر بھی پھیل چکے ہیں۔ یہاں یہ چار کا ٹولا کافی حد تک سیاہ و سفید کا مالک بن چکا ہے۔ دوسرے بہت سے لوگ بھی ان کے ساتھ ہیں۔ صرف مجھ جیسے کچھ لوگ یہ سب کچھ دیکھ کر کڑھتے ہیں۔ سردار نے قصبے کو جیسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ سردار عام طور پر ایسا کرتے نہیں ہیں لیکن شاید اس کی کوئی وجہ ہو۔"

میری فرمائش پر کھانے کے بعد کڑک چائے آچکی تھی۔ میں نے اس کی چسکی لے کر گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں کہا "مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے دیہات میں بھی اسی قسم کی کہانی سننے کو ملے گی۔"

"بات شہر اور دیہات کی نہیں ہے۔ ملک تو ایک ہی ہے نا۔۔۔ سب جگہ ملتی جلتی سی کہانی چل رہی ہے۔ واردات کے طریقے اور عمل کرنے والے چہرے ذرا بدلے ہوئے ہوتے ہیں" وہ قدرے تلخ لہجے میں بولا۔

"تمہارے خیال میں یہاں کیا ہو رہا ہے؟ اندر ایک کہانی چل رہی ہے؟ یہ لوگ اندرونِ خانہ کیا انقلاب لائے ہیں؟" میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

یکدم ہی اس کا چہرہ سپاٹ سا ہو گیا۔ اس نے خوف زدہ سی نظروں سے ایک بار پھر سڑک کی طرف دیکھا اور کندھے اچکا کر کافی مختلف لہجے میں بولا "مجھے کیا معلوم۔۔۔۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں تو آپ کو صرف وہ باتیں بتا رہا ہوں جو سب کو معلوم ہیں۔ جن کے بارے میں کبھی کبھی مجھ جیسے دو چار لوگ بیٹھ کر نیچی آواز میں تبادلۂ خیال کر لیتے ہیں۔ اس سے آگے میں اپنی ذمّے داری پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔"

"آہ۔۔۔۔ یہ مصلحت کوشی۔۔۔!" میں دھیرے سے ہنس دیا۔

"نہیں صاحب۔۔۔۔! آپ ایسے بولیں۔۔۔۔ ہائے رے انسان کی مجبوریاں۔۔۔۔!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن یقیناً ایک سلجھا ہوا اور ذہین انسان تھا۔

اچانک کسی گاڑی کے انجن کی گھرگھراہٹ سنائی دی جو تیزی سے قریب آتی گئی۔ پھر ایک نہایت پرانی سی سبز جیپ ریستوران کے عین سامنے آن رکی۔ ریستوران کا مالک یکدم ہی کچھ اس طرح سیدھا اور مجھ سے لاتعلق سا ہو کر بیٹھ گیا تھا جیسے وہ مجھ سے قطعاً کوئی بات نہیں کر رہا تھا بلکہ شاید وہ تو میری موجودگی سے بھی لاعلم تھا۔ اس کا انداز دیکھ کر مجھے گمان گزرا کہ شاید جیپ میں بلڈوزر کے ساتھی آئے ہوں گے جن کی عرفیتیں ٹریکٹر، کرین یا ریلوے انجن وغیرہ ہوں گی مگر جب میں نے سر اٹھا کر صحیح طور پر جیپ کی طرف دیکھا تو مجھے اس میں صرف ایک ہی شخص نظر آیا اور وہ پولیس کی وردی میں تھا۔

وہ گاڑی سے اتر کر ریستوران میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا وہ اکیلا ہی دو تین آدمیوں کے برابر تھا۔ اس کے تھل تھل کرتے وجود میں جمال سعیدی کی جھلک نظر آتی تھی لیکن کئی فرق بڑے نمایاں تھے۔ جمال سعیدی سرخ و سپید تھا۔ اس پولیس انسپکٹر کی رنگت سانولی تھی۔ جمال سعیدی کے تھل تھل کرتے وجود سے قطعِ نظر اس کے چہرے سے نہ جانے کیوں احساس ہوتا تھا کہ وہ درحقیقت ایک صحت مند آدمی تھا اور بوقتِ ضرورت بے پناہ پھرتی کا مظاہرہ بھی کر سکتا تھا۔ اس کی پھرتی کا مظاہرہ ہم دیکھ بھی چکے تھے۔ یوں میرے اس اندازے کی تصدیق بھی ہو چکی تھی لیکن اس انسپکٹر کے چہرے پر تھکن اور بیزاری تھی۔ وہ گویا بڑی کوشش سے اپنے بھاری وجود کو گھسیٹے پھر رہا تھا۔ اس کی عمر پچاس سے اوپر ہوگی۔ ٹوپی کے نیچے اس کے بال جتنے نظر آ رہے تھے ان میں سفیدی نمایاں تھی۔

وہ سیدھا میری میز کی طرف آیا اور مجھ سے پوچھنے یا میری دعوت کا انتظار کرنے کے تکلف میں پڑے بغیر میرے مقابل کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ اپنا بڑا سا گول مٹول ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے بولا "مجھے انسپکٹر جمشید گوریانی کہتے ہیں۔ میں یہاں کے اکلوتے تھانے کا ایس ایچ او بھی ہوں" وہ پھولی پھولی سی سانسوں کے درمیان بول رہا تھا جس طرح عموماً تھوڑی سی مشقت سے تھک جانے والے موٹے افراد بولتے ہیں۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر" میں نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

مجھے اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں پڑی۔ وہ خود ہی بولا "آپ سیٹھ افضل ہیں اور کراچی سے آئے ہیں۔"

میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قصبے میں میرے آنے کے تھوڑی دیر بعد ہی سب کو پتا چل گیا ہے کہ میں کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں؟"

"یہاں عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے" وہ متانت سے بولا "چھوٹا سا قصبہ ہے۔ اجنبی فوراً نظر آ جاتے ہیں۔"

"کہیں ایسا تو نہیں کہ اجنبیوں پر بطورِ خاص نظر رکھی جاتی ہو؟" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "اور مختلف طریقوں سے خوف و دہشت پھیلا کر ان کی آمد روکنے کی بھی کوشش کی جاری ہو؟ شاید کامران دانش کی موت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہو۔"

اس نے افسوس زدہ سے انداز میں سر ہلایا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا "جب اجنبی لوگ آتے ہی اس قسم کی باتیں شروع کر دیں تو پھر ان کی حفاظت کا خیال رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کامران دانش نے تو اس قسم کی کوئی بات نہیں کی ہوگی لیکن میرا خیال ہے اسے کسی چیز کی ٹن گن مل گئی ہوگی جس کی وجہ سے اسے بظاہر مگرمچھ نے ہلاک کر دیا۔"

"تمہارے خیال میں جس طرح بھی اس کی موت واقع ہوئی تھی میں نے اپنی رپورٹ میں لکھ دیا تھا" وہ بدستور نرم لہجے میں بات کر رہا تھا "میں تو پوری کوشش کرتا ہوں کہ میرے علاقے میں کوئی

ناخوش گوار واقعہ رونما نہ ہو۔ اسی لیے میں آپ کی آمد کی خبر ملتے ہی آپ کو بھی بعض خطرات سے آگاہ کرنے چلا آیا ہوں۔"

"بہت خوب۔ آپ تو کافی فرض شناس پولیس آفیسر معلوم ہوتے ہیں۔"

وہ میرے لہجے میں چھپے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بولا "اگر آپ کو واقعی مچھلی کے شکار سے کوئی دلچسپی ہے تو میں آپ کو ایک دو جگہوں کے بارے میں بتا دوں گا جہاں واقعی مچھلی پائی جاتی ہے۔ آپ صرف وہیں تک محدود رہیں اور صرف دن میں شکار کریں، دن میں ہی باہر نکلیں۔ رات کو اپنے ہوٹل کے کمرے تک محدود رہیں۔ ہرگز باہر نہ نکلیں، چاہے کوئی آپ سے کچھ بھی کہے۔ اس علاقے میں کچھ خطرات پائے جاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ دانستہ یا نادانستہ ان میں الجھیں۔ مجھے آپ اپنا ہمدرد اور دوست شمار کریں۔ میں واقعی تہِ دل سے چاہتا ہوں کہ آپ خیر و عافیت سے اپنے گھر واپس چلے جائیں۔"

"کس قسم کے خطرات؟" میں نے اب ذرا سخت نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح کچھ تھکی تھکی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"خطرات تو بس خطرات ہوتے ہیں۔ کبھی وہ انسانوں کی شکل میں ہوتے ہیں اور کبھی مگرمچھوں کی شکل میں" وہ اب بھی نرمی سے بولا "ان کے بارے میں چھان بین کرنے کے بجائے ان سے بچنا بہتر ہوتا ہے۔"

میں نے چائے کا کپ میز پر رکھ کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "کیا عجیب زمانہ آ گیا ہے۔ جیلیں توڑ کر بھاگے ہوئے دہشت گرد اور پولیس دونوں ایک ہی جیسی باتیں کرنے لگے ہیں، ایک جیسے مشورے دینے لگے ہیں۔ یہ کوئی اچھی علامت نہیں۔ دہشت گردوں، بدمعاشوں اور پولیس میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے تھا۔"

وہ ذرا چونکا۔ اس کی سانسوں کی شوں شوں کچھ تیز ہو گئی "آپ کس کی بات کر رہے ہیں؟"

"ابھی کچھ ہی دیر پہلے آپ کی جگہ ایک گینڈا نما شخص بیٹھا ہوا تھا جو اپنا نام بلڈوزر بتا رہا تھا۔ وہ بھی کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا جیسی آپ کر رہے ہیں۔ آپ کے الفاظ کی تہ میں بھی درحقیقت یہی مشورہ چھپا ہوا ہے کہ میں واپس چلا جاؤں تو بہتر ہے۔ وہ ذرا زیادہ واضح طور پر یہی مشورہ دے رہا تھا۔ آپ کے اور اس کے خیالات میں کتنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔"

"آپ کو کس نے بتایا کہ وہ جیل توڑ کر بھاگا ہوا ہے؟" وہ اب ذرا چونکنے کے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"کبھی کبھی ہوائیں میرے کانوں میں سرگوشیاں کرتی ہیں اور کچھ اہم باتیں بتا جاتی ہیں۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اسے اور اس کے ساتھ جیل توڑ کر بھاگے ہوئے مجرموں اور بدمعاشوں کو آپ نے آج تک گرفتار کیوں نہیں کیا؟"

"اس لیے کہ مجھے آج تک ایسا کوئی آرڈر نہیں ملا" اس نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا پھر اس کے لہجے میں استہزائیہ سا رنگ جھلک آیا "ہم تو حکم کے بندے ہیں جناب! جیسا حکم ملتا ہے اس پر عمل کرتے ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ برس ہا برس سے ہمارے ملک میں کیا تماشا لگا ہوا ہے؟ آج ایک آدمی پچاس قتل کرتا ہے، کروڑوں کی پراپرٹی تباہ کرتا ہے، دوسرے طریقوں سے پچاسوں گھر اجاڑتا ہے۔ ہم جان پر کھیل کر اس کو پکڑ کے جیل میں ڈالتے ہیں، کل کو حالات اس کے حق میں موافق ہو جاتے ہیں۔ اوپر سے آرڈر آتے ہیں، ان جیسے سب کو چھوڑ دو۔ ہم ان کو نہ صرف چھوڑتے ہیں بلکہ سیلیوٹ بھی کرتے ہیں۔ وہ جواب میں ہمیں گالیاں دیتے ہیں۔ ہر دو چار سال بعد یہی تماشا ہوتا ہے۔ جب ہم کو یہی تماشا دیکھنا ہے تو ہمیں کیا پڑی ہے جیتے جی سولی پر ٹنگے رہنے کی؟ ہم بھی انسان ہیں جناب! ہمارا بھی گھربار، بیوی بچے ہوتے ہیں۔ ہم لوہے کی مشینیں یا غیر انسانی مخلوق نہیں ہیں۔"

میں چند لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے میرے حواس پر برف کی بوچھاڑ سی کر دی تھی۔ وہ شکل سے تھوڑا سا اجڈ اور کچھ گاؤدی نظر آ رہا تھا مگر درحقیقت ایسا تھا نہیں۔ ایک بار پھر میرے اس نظریے کو تقویت ملی تھی کہ ہر مشکل مسئلے کے بہت سے پہلو ہوتے ہیں۔ ہر پہلو کا جائزہ لیے بغیر انصاف کی بات نہیں کی جا سکتی۔

آخر میں نے ایک متاسفانہ سی طویل سانس لے کر کہا "چنانچہ تم نے بلڈوزر اور اس کے ساتھیوں سے سمجھوتا کر لیا۔۔۔۔ اور مزے میں ہو۔۔۔؟"

"مزے میں تو جناب اس دنیا میں کوئی بھی نہیں ہے۔۔۔" وہ ٹوپی اتار کر اپنے کھچڑی بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "کچھ اپنے خریدے ہوئے اور کچھ دوسروں کے مسلط کیے ہوئے عذاب تقریباً سبھی کے گلے پڑے ہوئے ہیں اور سبھی کو انہیں بھگتنا ہے۔"

وہ میرے سوال کو ایک ایسے فلسفے میں گول کر گیا جس میں بڑی حد تک حقیقت تھی۔ پھر ٹوپی دوبارہ سر پر رکھتے ہوئے وہ بولا "اور پھر سوال صرف بلڈوزر اور اس کے ساتھیوں کا نہیں ہے جناب! بہت سے لوگ ان کے ساتھ ہیں، ان سے خوش ہیں، انہیں اپنا آقا بنائے ہوئے ہیں۔"

"بہت سے لوگوں کو اپنے بُرے بھلے کی تمیز نہیں ہوتی۔ عیّار اور شاطر لوگ ان کے ذہنوں میں بہت سا جھوٹ بھر دیتے ہیں۔ وہ کوتاہ نظر ہو جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں اور چھوٹے چھوٹے وقتی مفادات میں الجھ کر اچھی قدریں، اچھے نظریات سب کچھ بھول جاتے ہیں" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ ہنسنے لگا۔ اس کی توند میں بھونچال سا آ گیا۔ لوہے کی میز بھی اس کی توند کے زیروبم سے تھوڑا سا ہلنے لگی۔ میں نے اسے گھورا

"اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟"

"اب تو کوئی عقل کی، تمیز کی..... کسی کو سمجھانے سُدھارنے کی بات کرتا ہے تو اس پر ہنسی ہی آتی ہے جناب! یہ دوسری بات ہے کہ اس ہنسی کے ساتھ مجھ جیسے لوگوں کے دل سے ایک ٹیس سی بھی اٹھتی ہے لیکن یہ اب ایک غیر اہم سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ ایک بڑے اور مالدار آدمی ہو کر بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔ دولت والے تو بڑے دنیا دار ہوتے ہیں۔ وہ تو اب بالکل ہی اس قسم کی باتوں میں نہیں الجھتے۔ اس قسم کی باتیں کرنے والا اب اس سماج میں دیوانہ سا لگتا ہے کیونکہ کوئی اس کی بات پر کان نہیں دھرتا۔ میں تو پھر بھی اچھا آدمی ہوں جناب..... کہ آپ کی بات پر صرف ہنس رہا ہوں۔ بعض اوقات تو لوگوں کو کوئی عقل کی بات سمجھانے والے کے سینے پر ٹھاہ سے گولی آکر لگتی ہے۔"

"یہ پہاڑ جیسا تن و توش رکھتے ہوئے بھی تم نے بہت جلد ہمت ہار دی انسپکٹر جمشید!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"اگر آپ کے پاس پین موجود ہے تو میری ایک بات لکھ کر رکھ لیں جناب!" وہ کچھ عجیب اُداس سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ایک روز آپ بھی ہمت ہار جائیں گے۔"

اس نے اتنی قطعیت کے ساتھ یہ بات کہی تھی کہ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ پھر اچانک ہی مجھے اس سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ شاید یہ خوف اس کی ذات سے نہیں، آگہی کے احساس سے تھا۔ مجھے یوں لگا کہ اس کے موٹے، تھل تھل کرتے اور بظاہر بے حس سے نظر آنے والے وجود کے اندر کوئی نہایت نازک اور حساس آدمی چھپا بیٹھا تھا جو مجھ سے کہیں زیادہ تجربہ کار، جہاندیدہ اور سرد و گرم چشیدہ تھا۔ وہ اپنے وجود میں نہ جانے کتنی تلخیاں سمیٹے ہوئے تھا اور اس کی ذات کے صحرا میں نہ جانے کتنے تجربات کی دھول اڑ رہی تھی۔ کمبخت نے ایک بار تو میری ذات کے مضبوط قلعے کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ بعض اوقات کسی دور افتادہ اور پسماندہ سی جگہ پر کسی عجیب شخصیت سے آپ کی ملاقات ہو جاتی ہے جو آپ کی شخصیت پر گہرے نقوش چھوڑ جاتی ہے۔ مجھے کچھ یوں لگا کہ وہ بھی ایسی ہوئی کوئی شخصیت ثابت ہونے والا تھا۔

وہ کچھ اس طرح اٹھ کھڑا ہوا جیسے صرف ستانے کے لیے یہاں آن بیٹھا تھا اور اب اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ وہ توند پر اپنی بیلٹ درست کرتے ہوئے بولا "آپ یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ آپ کو کسی نے خبردار نہیں کیا تھا۔"

"عجیب بات ہے....." میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "بالکل یہی بات مجھ سے بلڈوزر نے بھی جاتے وقت کہی تھی۔"

"بعض اوقات بات ایک ہی ہوتی ہے..... الفاظ بھی ایک جیسے ہوتے ہیں لیکن نیتوں میں فرق ہوتا ہے" اس نے مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور تھل تھل کرتا گاڑی کی طرف چل دیا اور چند لمحے بعد اس میں بیٹھ کر نظر سے اوجھل ہو گیا۔

ریستوران کے مالک کو غالباً جب یقین ہو گیا کہ وہ بہت دور جا چکا تھا تب وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوا اور نفرت سے بولا "حرام خور کہیں کا.....!" اس کا یہ تبصرہ انسپکٹر جمشید کے لیے تھا "یہ اور اس کا ماتحت عملہ..... سب بِکے ہوئے ہیں۔ اسی لیے ابھی تک یہاں ٹِکے ہوئے ہیں ورنہ اب تک ان کے تبادلے ہو چکے ہوتے۔"

تاہم مجھے اب انسپکٹر جمشید سے نفرت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ صرف ایک تاسف رہ گیا تھا۔ کسی سے نفرت کرنا بہت آسان ہے۔ نفرت کے لیے بہت معمولی سا جواز کافی ہوتا ہے اور بعض اوقات تو جواز کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ کوئی بھی آکر آپ کی کسی دُکھتی رگ کو چھیڑ کر آپ کے دل میں کسی کے خلاف نفرت کی آگ بھڑکا سکتا ہے۔ آپ خود بھی اسے خوب ہوا دے سکتے ہیں لیکن کسی کے مؤقف کو سمجھنے اور اس پر کان دھرنے کے لیے بڑے تحمل، حوصلے اور اعلیٰ ظرفی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ لوگ ہر معاملے میں خود کو بالکل بے قصور، معصوم اور بری الذمہ سمجھتے ہیں اور اپنی کوتاہیوں کا بوجھ لادنے کے لیے بھی دوسروں کے کندھے تلاش کرتے رہتے ہیں۔

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "آج کل رگ پٹھوں کے زور پر بدمعاشی دکھانے کا زمانہ نہیں۔ میں نے بلڈوزر کے پاس کوئی ہتھیار نہیں دیکھا۔ کیا وہ اپنے ہاتھ پیروں کے زور پر ہی بدمعاشی دکھاتا پھرتا ہے؟"

ریستوران کا مالک تلخ انداز میں ہنسا۔ اسے شاید میری بات کافی بچکانہ لگی تھی۔ وہ محتاط انداز میں سڑک کا جائزہ لینے کے بعد بولا "آپ نے اسٹیج پر کبھی بازیگر کے کرتب تو دیکھے ہوں گے؟ وہ چٹکی بجاتا ہے، ہوا میں ہاتھ مارتا ہے، کبھی اس کے ہاتھ میں گیند کبھی پھول اور کبھی تاش کا پتّا آجاتا ہے۔ بلڈوزر اور اس کے ساتھی بھی ایک طرح کے بازیگر ہیں۔ اکثر تو ان کے پاس ہتھیار موجود ہی ہوتے ہیں لیکن اگر نہ ہوں تب بھی ضرورت پڑنے پر چٹکی بجاتے ہی ان کے ہاتھ میں ہتھیار آجاتے ہیں۔ یہ کسی سڑک پر کسی گلی میں کھڑے ہو کر مخصوص انداز میں آوازیں دیں اور سیٹی بجائیں تو ہتھیار ان کے ہاتھ میں آجاتا ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کون سا سبزی والا، کون سا گدھا گاڑی والا یا کون سا خوانچے والا اپنے سامان میں ان کے لیے ہتھیار چھپائے پھر رہا ہو۔"

"اوہ مائی گاڈ.....!" میں متاسفانہ انداز میں صرف اتنا ہی کہہ سکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ادائیگی کرکے میں ریستوران سے باہر آگیا۔

میری وہ رات میگھانی ہوٹل میں خیریت سے گزر گئی۔ میں گہری نیند نہیں سو سکا۔ سوتے میں بھی گویا چوکنا ہی رہا اور میرے کان دروازے کی طرف لگے رہے کہ شاید کسی بھی لمحے کوئی مشکوک آواز سنائی دے جائے۔ میرے لیے تو دروازہ ٹوٹنے کی آواز بھی غیر متوقع نہ ہوتی۔ گوکہ میں دروازہ مقفل کرکے اور بولٹ چڑھا کر سویا تھا لیکن وہ کھوکھلا، کمزور اور سالخوردہ دروازہ بلڈوزر جیسے آدمی کی دو لاتیں بھی نہیں سہہ سکتا تھا۔

میرے سرہانے نہایت نیچی آواز میں ریڈیو چلتا رہا اور جب ریڈیو کا وقت ختم ہوا تو میں نے اسی سے منسلک ٹیپ ریکارڈر پر ایک کیسٹ نہایت دھیمی آواز میں چلا دی۔ یہ کیسٹ آٹومیٹک سسٹم کے تحت ریورس اور ریوائنڈ ہو سکتی تھی۔ میرے سونے کے دوران میں بھی کمرے میں دھیمی دھیمی موسیقی ابھرتی رہی۔ یہ آواز میرے کمرے سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ میں موسیقی کا اتنا زیادہ شوقین نہیں تھا کہ سونے کے لیے بھی مجھے اس کی مدد کی ضرورت ہوتی لیکن کمرے میں ہر وقت ریڈیو یا ٹیپ ریکارڈر چلائے رکھنے میں ایک مصلحت تھی۔ رات کے دوران میں دو ایک مرتبہ مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ سناٹے میں دور کہیں کسی انجن کی گھرگھراہٹ ابھری تھی۔ شاید وہ کسی لانچ کے انجن کی آواز تھی جو کبھی معدوم ہوئی اور کبھی دوبارہ سنائی دینے لگی۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سمندر میں کہیں نقل و حرکت جاری تھی۔ تاہم میں نے حرکت میں آنے کی کوشش نہیں کی۔ میگھانی میں یہ میری پہلی رات تھی۔ میں ابھی حالات کو ذرا بہتر طور پر سمجھنا چاہتا تھا۔

دوسرے روز میں نے فیصلہ کیا کہ اگر میں مچھلی کے شکار پر آنے کا دعویٰ کر چکا تھا تو مجھے مچھلی کے شکاری کا بھی تھوڑا سا کردار ادا کر لینا چاہیے تھا۔ میں جن لوگوں کی نظر میں تھا انہیں نہ جانے یقین آتا یا نہیں کہ میں واقعی مچھلی کے شکار میں دلچسپی لے رہا تھا..... لیکن کوشش کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میرے پاس شکار کا تو جدید قسم کا سامان موجود تھا لیکن میں سامان کی مقامی دکان پر جا پہنچا کہ شاید وہاں سے مچھلی کا چارا ہی مل جائے۔ دکان دار بے چارہ بیٹھا مکھیاں مار رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس کی باچھیں کھل گئیں۔ میرا اندازہ درست تھا۔ اس نے شکار کے لیے چارے کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ ٹین کے ڈبوں میں سیاہی مائل کیچڑ بھر کر ان میں کیچوے رکھے ہوئے تھے۔ اس کے پاس اوسط درجے کی اور مختلف اقسام کی بنسیاں، ڈور اور کانٹے وغیرہ بھی موجود تھے لیکن ان کی مجھے ضرورت نہیں تھی۔

دکان دار نے بطور خاص مجھے اسپیشل کیچوے نکال کر ایک تھیلی میں ڈال کر دیے جو اتنے صحت مند تھے کہ چھوٹے موٹے سانپ معلوم ہو رہے تھے۔ شاید وہ باڈی بلڈر ہوں اور کیچووں میں بلڈوزر جیسے مقام کے حامل رہے ہوں۔ میں اس دکان دار کی ہمت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا جو اس علاقے میں گاہک کے نام و نشان نہ ہونے کے باوجود اس قسم کے سامان کی دکان کھولے بیٹھا تھا۔ اگر لائسنس میں کچھ کما بھی لیتا ہو گا تب بھی بے کاری کے یہ دن گزار کر بدحال ہی رہتا ہو گا۔

میں نے اسے کچھ فالتو رقم دی جو اس نے میرے بے حد اصرار کے بعد رکھی ورنہ وہ مسلسل انکار کیے جا رہا تھا۔ تھوڑی سی رقم پا کر وہ بہت زیادہ شکرگزار ہوا۔ میں نے موقع مناسب سمجھتے ہوئے اس سے فوراً مچھلی کے شکار کے لیے ساحل پر کسی موزوں جگہ کی تلاش کے سلسلے میں رہنمائی چاہی۔ اس نے نہایت تفصیل سے مجھے دو جگہوں کے بارے میں سمجھا دیا۔ وہ بے چارہ تو میرے ساتھ چلنے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ میری اس لاعلمی پر اس نے مجھے شک زدہ انداز میں نہیں دیکھا۔

جیپ میں بیٹھ کر میں قصبے سے نکل کر ساحل کے ساتھ ساتھ اس کی بتائی ہوئی سمت میں روانہ ہوا۔ یہ ناہموار اور ٹیڑھا میڑھا ساحل تھا۔ چند منٹ کے سست رفتار سفر کے بعد ہی میں مطلوبہ مقام تک جا پہنچا لیکن جیپ مجھے کچھ دور ہی چھوڑنی پڑی کیونکہ وہاں دلدلی زمین شروع ہو گئی تھی اور جیپ اس میں دھنسی جا رہی تھی۔ مجھے لمبوتری سی ایک مسطح چٹان پر پہنچنا تھا جو زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس تک پہنچنے کے لیے ایک محفوظ خشک پٹی بھی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس پر جیپ نہیں چل سکتی تھی اس لیے سامان اٹھا کر میں پیدل ہی وہاں تک پہنچا۔

چٹان پر پہنچ کر مجھے اردگرد کا منظر بہت ہی خوب صورت معلوم ہوا۔ سورج کی نقرئی شعاعیں دور تک سمندر پر دلفریب انداز میں رقصاں تھیں۔ نشیب و فراز میں کہیں سبزہ، کہیں درخت، پہاڑیوں میں گھرے ہوئے اونچے نیچے رنگارنگ سے مکانات، یہ سب کچھ نظروں کو بہت بھلے لگ رہے تھے۔ میں گوکہ یہاں تفریح کے لئے نہیں آیا تھا اس کے باوجود میں نے ایک عجیب سی فرحت محسوس کی۔ مجھے مچھلی کے باضابطہ شکار کا بھی کوئی تجربہ نہیں تھا لیکن اس وقت میں خود کو شکاری ہی محسوس کر رہا تھا۔ نہایت انہماک اور لگن سے میں نے ایک نہایت صحت مند قسم کا کیچوا منتخب کرکے کانٹے میں لگایا اور پانی میں ڈور ڈال کر چٹان پر بیٹھ گیا۔

میں خود تو اپنے آپ کو مچھلی کا شکاری محسوس کر ہی رہا تھا لیکن اگر اس وقت کوئی اور بھی مجھے دیکھتا تو شاید یہی محسوس کرتا۔ میں نے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کیا کہیں سے میری نگرانی کی جا رہی تھی؟ کئی جگہیں ایسی تھیں جہاں سے دوربین کے ذریعے نہایت آسانی سے میری تمام حرکات و سکنات کا جائزہ لیا جا سکتا تھا اور کوئی بعید نہیں تھا کہ لیا بھی جا رہا ہو۔

اس جگہ سے کچھ آگے کھاڑی اتنی گہری معلوم ہو رہی تھی کہ شاید کوئی بحری جہاز بھی وہاں تک آسکتا تھا تاہم جہاں میں نے ڈور ڈالی ہوئی تھی وہاں میرے اندازے کے مطابق پانی کم ہی گہرا تھا۔ پانی کی سطح پر لہریں زیادہ تیز نہیں تھیں۔ پلاسٹک کا فلوٹر خاصے

پُرسکون انداز میں سطح آب پر تیر رہا تھا۔

آدھے گھنٹے تک سنکر اسی طرح تیرتا رہا جس کا مطلب تھا کہ ابھی تک کوئی مچھلی اس کانٹے کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی جس میں "چارا" یعنی کیچوا پھنسا ہوا تھا۔ یہ خاصی مایوس کن صورتِ حال تھی۔ میرا صبر و ضبط جواب دینے لگا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ مچھلی کے شکار کے لیے واقعی بڑے صبر و تحمل کی ضرورت ہوتی تھی۔

عین اس وقت جبکہ میں مچھلی کے شکار کی اداکاری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ڈوری لپیٹنے کا ارادہ کر رہا تھا' اچانک پلاسٹک کا سنکر ڈوب گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ مچھلی نے چارے پر منہ مارا تھا۔ میں نے جلدی سے ڈوری کو ڈھیل دینا شروع کی۔ مچھلی یقیناً پھنس چکی تھی اور کانٹے کو دور لیے جا رہی تھی۔ میں نے اسے دور جانے کا موقع دیا۔ آخر میں نے محسوس کیا کہ ڈوری کو کھینچنے کا عمل رک گیا تھا۔ چنانچہ میں نے تیزی سے چرخی کے ذریعے ڈوری لپیٹنا شروع کی اور جب سنکر دوبارہ سطح آب پر دکھائی دینے لگا تو بنسی کو ایک جھٹکا دے کر کانٹا باہر نکالا اور یہ دیکھ کر میں خود اپنی نظروں میں شرمندہ ہو گیا کہ کانٹا خالی تھا۔ مچھلی' چارا نہایت صفائی سے کھا گئی تھی اور اس نے شاید کانٹے پر منہ نہیں مارا تھا۔ شاید مچھلیوں کو بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کنارے پر کوئی اناڑی بیٹھا ہے۔

میں نے چند لمحے سوچنے کے بعد ہمت کر کے دوبارہ چارا لگایا اور ایک بار پھر ڈوری ڈال کر بیٹھ گیا۔ اس بار چند منٹ بعد ہی ایک مچھلی پھنس گئی لیکن وہ اتنی چھوٹی تھی کہ میں نے اس پر ترس کھا کر اسے کانٹے سے نکال کر دوبارہ کھاڑی میں چھوڑ دیا۔ اتنی چھوٹی مچھلی کو پکڑنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری اس حرکت پر مچھلیاں خوش ہونے کے بجائے شاید بُرا منا گئیں کیونکہ اس کے بعد کوئی مچھلی نہیں پھنسی۔ آخر کار میں اپنے اس شغل سے اکتا کر ہوٹل واپس آگیا۔

اس رات شاید میں ہوٹل کے کمرے میں کچھ گہری نیند سو گیا تھا۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ اس وقت رات کا کون سا پہر تھا جب میں نے کچھ یوں محسوس کیا جیسے کوئی خواب میں مجھے پکار رہا تھا۔ پھر مجھے اچانک ہی احساس ہوا کہ یہ خواب کی نہیں' حقیقت کی دنیا کی بات تھی۔ کسی نے نہ صرف پہلے سے زیادہ بلند آواز میں مجھے پکارا تھا بلکہ میری پسلیوں میں کسی چیز سے ٹہوکا بھی دیا گیا تھا۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور پھرتی سے اٹھنا چاہا لیکن فوراً ہی مجھے احساس ہوا کہ میرا ایک دم اٹھ کر بیٹھنا ٹھیک نہیں تھا۔ میرے دائیں بائیں اور پائنتی کی طرف چار کلاشنکوف بردار کھڑے تھے اور ان کی کلاشنکوفوں کا رخ میری ہی طرف تھا۔ ان میں سے ایک بلڈوزر تھا۔ باقی تینوں بھی اسی قبیل کے آدمی تھے۔ ان میں سے صرف ایک ذرا پستہ قد تھا لیکن وہ بھی گٹھے ہوئے ورزشی جسم کا مالک تھا۔

وہ چاروں مغربی اکھاڑوں میں لڑنے والے وہ نچلے درجے کے ریسلر معلوم ہو رہے تھے جو عام طور پر سینڈیکیٹ کے لیے لڑتے ہیں۔ ریسلنگ کی دنیا میں ان کا کوئی خاص مقام نہیں ہوتا مگر وہ بے ایمانی کے سہارے بڑے مقابلے جیتنے یا رِنگ میں فساد ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن کلاشنکوفیں بہرحال ان کے پاس بھی نہیں ہوتیں۔ بلڈوزر عین میری پائنتی کے پاس کھڑا تھا اور سب سے پہلے میری اسی سے نظریں ملی تھیں۔ باقی تینوں اس سے زیادہ خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

اچٹتی سی نظر سے ان تینوں کا جائزہ لینے کے بعد میں نے دوبارہ بلڈوزر کی طرف دیکھا تو وہ خباثت بھرے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ وہ گن کو جنبش دیتے ہوئے بولا "اٹھو سیٹھ افضل! تمہیں مچھلی کے شکار کا بہت شوق ہے نا...... اور تم کہیں اور جانے پر بھی تیار نہیں ہو۔ اس لیے ہم نے سوچا ہے' تمہیں یہاں ذرا اچھی طرح مچھلی کا شکار کھلایا جائے لیکن اس کے لیے تمہیں ذرا اس وقت رات کو باہر چلنے کی زحمت کرنا پڑے گی۔ رات کو مچھلی کے شکار کا لطف ہی کچھ اور ہے۔"

میں آہستگی سے اٹھ بیٹھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا۔ میں اسے مقفل کر کے سویا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ڈپلیکیٹ چابی سے تالا کھول کر اندر آئے تھے۔ کمرے کی لائٹ آن تھی اور میرے سرہانے کارنس پر نہایت نیچی آواز میں ٹیپ چل رہی تھی۔ یہ دونوں چیزیں میں اسی طرح چھوڑ کر سویا تھا۔ میرے سرہانے کھڑے ہوئے شخص نے میرے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر یوں میرا مشین پسٹل نکال لیا جیسے اسے پہلے سے علم تھا کہ وہ وہاں ہو گا۔ شاید اسے اندازہ تھا کہ اگر آدمی کے پاس چھوٹا موٹا ہتھیار ہو تو اجنبی جگہ پر سوتے وقت عموماً وہ اسے تکیے کے نیچے ہی رکھتا ہے۔ اس نے مشین پسٹل کو ایک نظر دیکھ کے ستائشی انداز میں سہلایا اور اسے جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

"اگر اجازت ہو تو چلنے سے پہلے میں یہ ٹیپ ریکارڈر بند کر دوں؟" میں نے قدرے خوف زدہ لہجے میں کہا اور ٹیپ ریکارڈر کی طرف اشارہ کیا جس پر اس وقت بھی ایک غم زدہ سا گیت دھیمی آواز میں چل رہا تھا۔ مجھے اجازت دینے کے بجائے میرے سرہانے کھڑے ہوئے شخص نے خود ہی ہاتھ بڑھا کر اس کا بٹن دبا دیا۔ کمرے میں اُداسی بکھیرتی ہوئی غم زدہ سی آواز خاموش ہو گئی۔

تب میں نے ذرا اور خوف زدہ سے لہجے میں پوچھا "تم لوگ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"بتایا تو ہے..... مچھلیوں کے شکار پر" بلڈوزر نے خباثت بھری مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"تو پھر میں اپنی فشنگ راڈ بھی ساتھ لے لوں؟" میں نے گویا کسی بہت بڑی احمقانہ خوش فہمی کے تحت پوچھا۔

"ضرور۔ ضرور۔" بلڈوزر فراخ دلی سے بولا "لیکن چارا ساتھ مت لینا....."

اس سے آگے اس نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کا مقصد واضح تھا۔ شاید وہ یہی کہنا چاہتا تھا "چارا آج تم خود ہو گے۔"

اس تنگ سے کمرے میں چاروں کی موجودگی سے جیسے ایک ہجوم سا ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں چلانے کی بھی جگہ نہیں رہی تھی۔ ان چاروں نے نہایت مستعدی سے مجھے گھیرا ہوا تھا اور وہ میری طرف سے ذرا بھی بے پروا دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میری فشنگ راڈ اور اس کے ساتھ چھوٹی موٹی چیزوں کا تھیلا دیوار کے قریب موجود تھا۔ وہ دونوں چیزیں پستہ قد شخص نے اٹھا لیں۔ اس نے تھیلے کی ڈوری ڈھیلی کر کے اس میں جھانک کر غالباً یہ اطمینان بھی کر لیا کہ اس میں کوئی خطرناک چیز موجود نہیں تھی۔

"چلو..... اٹھو" بلڈوزر نے کہا اور چاروں نے بیک وقت گنوں کو حرکت دی۔ میں نے بیڈ سے پاؤں نیچے کر کے جوگرز پہنے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ قربانی کے بکرے کی طرح میں ان کے نرغے میں باہر کی طرف چل دیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ بکرا دو ٹانگوں پر چل رہا تھا۔ باہر آ کر میں نے ہوٹل کے استقبالیہ کمرے کی طرف دیکھا۔ مجھے وہاں اندھیرا نظر آیا۔

انہوں نے مجھے میری ہی پجیرو میں بٹھایا۔ پستہ قد نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ باقی تینوں گنوں سمیت مجھے گھیر کر بیٹھ گئے۔ پجیرو کے پیچھے ڈبل کیبن کی ایک بھاری ڈاٹسن پک اَپ ادھورے چاند کی مدھم سی چاندنی میں جھلملا رہی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بھی ایک شخص موجود تھا۔ وہ ان کا پانچواں ساتھی تھا۔ ان کی گاڑی پجیرو سے بھی زیادہ کارآمد تھی۔

رات کے سناٹے میں پجیرو کا انجن غرایا اور اس کے ساتھ ہی پک اپ بھی اسٹارٹ ہو گئی۔ میں نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ پک اپ پجیرو کے پیچھے پیچھے ہی روانہ ہوئی تھی۔ میں نے دیکھا گاڑی اسی طرف جا رہی تھی جدھر میں آج دن میں مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن سمندر سے دور ہی رہتے ہوئے ہم اس جگہ کو چھوڑ کر آگے بڑھتے چلے گئے۔ ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد ڈرائیور کے فرائض انجام دینے والے پستہ قد شخص نے گاڑی ساحل کی طرف گھمائی اور چند لمحے بعد ہی ہم چٹانوں کے درمیان گھری ہوئی ایک اور کھاڑی کے قریب جا پہنچے۔ یہاں بھی دلدلی سی بُو پھیلی ہوئی تھی لیکن پجیرو کے پہیے دھنستے محسوس نہیں ہوئے۔

کھاڑی کی سطح پر بھی مدھم لہریں دھندلی چاندنی میں جھلملا رہی تھیں اور دور سے سمندری موجوں کا شور اس سکوتِ شب میں کسی حرماں نصیب کی مسلسل آہوں کی طرح سنائی دے رہا تھا۔ میں ان کے نرغے میں گاڑی سے اُترا تو ماحول کی پُراسراریت نے ایک بار تو میری ریڑھ کی ہڈی میں بھی سرد سی لہر دوڑا دی۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ جس بُو کو میں دلدل کی بو سمجھا تھا شاید وہ دلدل کی نہیں تھی۔ شاید اس قسم کی بو مذبح خانوں کے آس پاس محسوس ہوتی تھی۔

پک اپ کا ڈرائیور بھی ہمارے قریب آن کھڑا تھا۔ وہ ان کی طرح لمبا تڑنگا' مضبوط اور باڈی بلڈر ٹائپ نہیں تھا تاہم ایسا گیا گزرا بھی نہیں تھا اور خالی ہاتھ بھی نہیں تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ماؤزر تھا۔ اب میں پانچ افراد کے نرغے میں تھا۔ چند سیکنڈ کے لیے میں نے جدوجہد کے امکانات پر غور کیا۔ امکانات زیادہ روشن تو نہیں تھے اور خطرات زیادہ تھے اس کے باوجود میں نے کچھ کرنے کے بارے میں سوچا لیکن فوراً ہی ارادہ ملتوی کر دیا۔ ابھی میری معلومات میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تھا۔ ویسے بھی نہ جانے کیوں میرا دل چاہ رہا تھا کہ انہیں کچھ دیر اور خوش ہو لینے کا موقع دیا جائے۔

"آگے چلو" عقب سے بلڈوزر نے میری کمر میں کلاشنکوف کی نال چبھوتے ہوئے حکم دیا۔

"کیا پانی میں اُتر جاؤں....؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"ہاں۔ پانی میں اتر جاؤ..... بے فکر رہو' ہم بھی تمہارے ساتھ ہیں" اس نے گویا مجھے تسلی دی۔ انہوں نے بدستور مجھے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ گنیں اسی طرح ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ ہم چھ کے چھ افراد شڑپ شڑپ کرتے پانی میں آگے بڑھے۔ چند قدم آگے پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں پانی کافی دور تک گہرا نہیں تھا۔ اچانک میں نے دیکھا' پانی میں ایک کھمبا سا سر اٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر وہ رک گئے۔

اس وقت پانی ہم سب کی تقریباً کمر تک پہنچ چکا تھا۔ پہلے میں یہی سمجھا تھا کہ شاید وہ مجھے کھاڑی میں ڈبونے کا ارادہ رکھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ میری لاش صبح کھاڑی میں تیرتی پائی جائے لیکن جب وہ بامقصد سے انداز میں اس کھمبا نما چیز کے پاس رکے تو اچانک مجھے احساس ہوا کہ ان کے ذہن میں کچھ اور تھا۔ پستہ قد شخص نے اپنی گن دوسرے ساتھی کو تھمائی اور یکدم ہی غڑپ سے پانی میں بیٹھ گیا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ اس نے کوئی بھاری سی چیز میرے ٹخنے سے ذرا اوپر ایک ٹانگ کے گرد گھمائی تھی اور شاید کوئی کھٹکا سا دبا دیا تھا۔ یہ کھٹکا سا گویا میرے پاؤں کے قریب نہیں بلکہ میرے ذہن میں دبا تھا۔ میرے ذہن میں بجلی کا جھماکا سا ہوا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔ مجھ سے بہت بڑی حماقت ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اپنے آپ پر حد سے زیادہ خود اعتمادی اور کسی کو تھوڑی سی ڈھیل دے دینا یا اپنی جدوجہد کا فیصلہ ایک لمحے کے لیے مؤخر کر دینا بھی انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ بازی بالکل پلٹ جاتی ہے۔

اس وقت تک انہوں نے دائرہ بڑا کر لیا تھا اور مجھ سے کچھ دور ہٹ گئے تھے۔ پستہ قد شخص بھی پانی میں کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے اپنی ٹانگ کو حرکت دی اور میرے بدترین شبہے کی تصدیق ہو گئی۔ پھر میں نے ذرا جھک کر اور پانی میں چھپی ہوئی اپنی ایک ٹانگ ذرا اوپر

اٹھا کر اسے ٹٹول کر اور پھر کھمبے کو بھی اوپر سے کافی نیچے تک ٹٹول کر اپنے اندازوں کی تصدیق کی اور ایک لمحے کے لیے میرے رگ وپے میں یخ بستگی سی اُتر آئی۔ مجھے ساحل پر ہی کچھ کر گزرنا چاہیے تھا۔ جو بھی ہوتا دیکھا جاتا۔ شاید وہ اس سے بدتر نہ ہوتا جو اب ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔۔۔ لیکن اب اس پچھتاوے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ڈھارس دینے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب تھا۔

وہ کھمبا دراصل سیمنٹ یا کنکریٹ کی مضبوط بنیاد کے ساتھ پانی میں نصب تھا۔ شاید جب وہ نصب کیا گیا ہو' اس وقت پانی وہاں تک نہ آیا ہو۔ اس کے ساتھ لوہے کی ایک موٹی زنجیر منسلک تھی جس کے سرے پر ہتھکڑی نما آہنی حلقہ تھا۔ پستہ قد نے وہ حلقہ میرے پاؤں میں ڈال کر کھٹ سے بند کردیا تھا۔ اب میرے پاؤں میں گویا بیڑی تھی جو چار پانچ فٹ اونچے اس کھمبے سے منسلک تھی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اس زنجیر سے زور آزمائی کرکے بھی دیکھا لیکن کھمبا' زنجیر یا اس کی کوئی کڑی ٹس سے مس نہ ہوئی اور مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ اس معاملے میں میری شہ زوری کسی کام نہیں آئے گی۔

شاید یہ کھمبا کبھی یہاں کوئی بڑی لانچ باندھنے کے لیے نصب کیا گیا ہو۔ عین ممکن تھا' اب بھی بوقتِ ضرورت اس سے یہ کام لیا جاتا ہو لیکن فی الحال میں صحیح معنوں میں قربانی کے بکرے کی طرح اس سے بندھ چکا تھا۔ وہ سب اب میری طرف دیکھ کر زور زور سے ہنس رہے تھے۔ رات کے اس سناٹے میں سیاہی مائل چٹانوں کے درمیان اس کھاڑی میں میرے گرد پانی میں کھڑے ہنستے ہوئے وہ کسی ڈراؤنی فلم کے کردار یا آسیب معلوم ہو رہے تھے جو انسانی روپ دھار کر آگئے تھے۔

بلڈوزر گویا اس صورتِ حال سے کچھ زیادہ ہی لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا "اس طرح یہاں کمر کمر تک پانی میں کھڑے ہو کر رات کے سناٹے اور تنہائی میں مچھلی کے شکار میں جو مزہ ہے اسے تم جیسا شوقین ہی محسوس کرسکتا ہے۔"

"میری فشنگ راڈ تو دے دو" میں نے اپنا لہجہ پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔ کیوں نہیں" وہ خوش دلی سے ہنسا "راڈ کے بغیر بھلا تم مچھلی کیسے پکڑو گے؟ ویسے بھی ہم چاہتے ہیں کہ صبح تم اپنے مچھلی پکڑنے کے سازوسامان سمیت پائے جاؤ۔ تمہارے اپنے جسم کے کچھ پارٹس بے شک غائب ہوں لیکن تمہارا شکار کا سامان ضرور موجود رہنا چاہیے" اس نے اپنے ساتھی سے راڈ لی اور مزید کچھ دور ہٹنے کے بعد میری طرف اچھال دی۔ اب شاید میں راڈ کی موجودگی میں بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس کی رسائی سے بھی دور چلے گئے اور تقریباً کنارے پر ہی پہنچ چکے تھے۔ میرے چھوٹے موٹے سامان کا تھیلا اس نے کنارے پر کچھ دور پھینک دیا۔

پھر اس نے جیب سے ایک چابی نکالی جو زنگ آلود سی دکھائی دے رہی تھی۔ دور سے اس نے چابی مجھے یوں دکھا کر لہرائی جیسے کسی بھوکے جانور کو اس کی خوراک دکھا کر للچا رہا ہو۔ وہ بڑے مسرور لہجے میں بولا "یہ تمہاری قسمت کی چابی ہے جو اب نذیرل کے پاس رہے گی" اس نے چابی اپنے پستہ قد ساتھی کی طرف بڑھادی جس نے اسے اپنی چمڑے کی جیکٹ کے سامنے والی جیب میں ڈال لیا۔

میں اب سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھے کس انجام سے دوچار کرنا چاہتے تھے۔ یہاں یقیناً مگرمچھ پائے جاتے تھے یا رات کو کسی وقت آتے تھے۔ جب کوئی مگرمچھ مجھے ہلاک کردیتا تو وہ فائر وغیرہ کرکے یا کسی اور طریقے سے مگرمچھ کو ڈرا کر بھگادیتے اور میرے پاؤں کی بیڑی کھول کر میری لاش کنارے پر کہیں ڈال دیتے۔ لاش یقیناً ادھ کھائی اور مسخ شدہ ہوتی۔ دوسرے روز اسے "دریافت" کرلیا جاتا۔ ایک اور افسوسناک موت کی کہانی کراچی کی طرف سفر کرتی۔ کسی پر کوئی الزام نہ آتا۔ تحقیقات کے لیے کوئی ادھر کا رخ نہ کرتا۔ کامران دانش کے ساتھ بھی یقیناً یہی ہوا تھا۔ بلاشبہ یہ ایک دردناک موت تھی۔

یہ سمجھ لینے کے باوجود میں نے بلڈوزر سے تصدیق چاہی "کامران دانش کے ساتھ بھی یہی کیا گیا تھا؟"

"مجبوری تھی" اس نے بڑے اسٹائل سے کندھے اچکائے "گدھا یہاں آکر ہماری جاسوسی میں لگ گیا تھا۔ ہمیں ایسے آدمی بالکل پسند نہیں جو ہماری جاسوسی کی کوشش کرتے ہیں۔"

"اسے یہاں کون لایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہمارا ہی ایک آدمی لایا تھا جو پرنس انڈسٹریز میں ملازم ہے۔ اسے کامران بہت مصیبت کے عالم میں ملا تھا۔ ہمارے آدمی نے سوچا وہ اپنے حالات کی وجہ سے ہمارا وفادار بن جائے گا۔ یہاں روپوش ہوکر ہمارے لیے کام کرے گا۔ یہاں اس کے سارے مسئلے حل ہوجاتے لیکن وہ کمینہ یہاں آکر ہماری جاسوسی میں لگ گیا۔ ہمیں معلوم ہے' تم بھی ہماری جاسوسی کے لیے آئے ہو۔۔۔ بلکہ تمہارے تو بہت اونچے پروگرام ہوں گے۔ تم جیسے لوگوں نے ہمارا ناک میں دم کردیا ہے اسی لیے ہم یہاں اجنبیوں کی آمدورفت بند کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ بڑی مشکل سے ایک اتنا شاندار اڈا بنا ہے۔ لوگ اس کی بھی جڑوں میں بیٹھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"آخر یہاں ایسا کون سا چکر ہے جس پر پردہ ڈالنے کے لیے تم لوگ اتنا تردّد کررہے ہو؟" میں نے اب گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"اب اتنا معصوم بننے کی کوشش نہ کرو" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا "تمہیں بہت سی باتوں کا اندازہ ہوچکا ہے۔ تمہارے بارے میں ساری رپورٹ ہم تک پہنچ چکی ہے۔ ہمیں امید نہیں تھی کہ تم یہاں تک بھی آنے کی ہمت کرلوگے۔۔۔ اور وہ بھی اکیلے۔۔۔ لیکن

شاید تم چپکے چپکے ثبوت تلاش کرنے کے چکر میں چلے آئے۔ چلو۔۔۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ چوہا خود چل کر چوہے دان تک آپہنچا۔"

"شاید مجھے اتنی زیادہ معلومات نہیں ہیں جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ تم مجھے بتا ہی کیوں نہیں دیتے" میں نے کسی حد تک التجائیہ سے لہجے میں کہا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہا۔ میری موت چونکہ اب یقینی ہوچکی تھی شاید اس لیے اس نے مجھے بتانے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ نہایت اطمینان سے وہ بولا۔ "ہمارے باس جمال سعیدی کے اسلحے کی اسمگلنگ کے روٹ کا سب سے اہم اسٹیشن یہی ہے۔ کئی مغربی ملکوں سے آنے والے مخصوص کمپنیوں کے مال بردار بحری جہاز کراچی آتے وقت اپنا راستہ تھوڑا سا بدل کر پہلے رات کے وقت میں اِدھر سے ہوتے ہوئے گزرتے ہیں اور دس بیس پیٹیاں خاموشی سے اِدھر اتار جاتے ہیں۔ بظاہر یہ مال امپورٹ ایکسپورٹ کارپوریشن کے لیے آتا ہے لیکن اصل کاغذات میں اس کی کہیں انٹری نہیں ہوتی۔ ان پیٹیوں میں اسلحہ بالکل الگ الگ حصوں میں ہوتا ہے۔ کوئی حصہ کہیں۔۔۔ کوئی کہیں۔۔۔ تاکہ اگر کبھی کہیں چیکنگ بھی ہوجائے تو انہیں مشینوں کے پُرزے کہہ کر بچنے کی کوشش کی جائے۔ بعض اوقات کچھ حصوں کی کھیپ ایک جہاز سے پہنچتی ہے اور دوسرے حصوں کی کھیپ' دوسرے جہاز سے۔۔۔ یہاں ان کی اسمبلنگ ہوتی ہے۔ اسمبلنگ کے بہترین ماہر یہاں تیار کیے گئے ہیں۔ یہاں سے مال تیار ہو کر جمال سعیدی کے مختلف گوداموں میں جاتا ہے۔ اس راستے پر کوئی خاص چیکنگ نہیں ہے جو تھوڑی بہت ہے اس کا ہم نے بندوبست کر رکھا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ تو جمال سعیدی تمہارا باس ہے" میں نے گہری سانس لے کر کہا "جب سے اس نے یہاں پنجے گاڑے' قصبے کے حالات بدل گئے۔ لوگوں کے طور طریقے بدل گئے۔"

"بے شک۔۔۔ وہ سردار سے بھی دوستی گانٹھ چکا ہے" بلڈوزر نے فخر سے بتایا "سب کچھ بالکل ٹھیک چل رہا تھا لیکن تمہیں نہ جانے کیوں اپنی کمزور سی ٹانگ ان معاملات میں اڑانے کا اتنا زیادہ شوق چڑھ گیا۔ تمہاری وجہ سے ہمارے باس کو فی الحال روپوش ہونا پڑا ہے۔ اب تمہیں معلوم ہوجائے گا کہ بعض اوقات پرائے معاملات میں اڑائی جانے والی ٹانگ میں بیڑی بھی پڑجاتی ہے اور عیش و آرام میں رہنے والوں کو مگرمچھ بھی کھاجاتے ہیں۔"

"کیا ہمارے ہاں واقعی اسلحے کی اتنی بڑی انڈر گراؤنڈ مارکیٹ موجود ہے؟ اتنی کھپت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً" وہ مسکرایا "ایشیائی ملکوں میں چند ایک ایسے ہیں جہاں خاص طور پر ناجائز اسلحے کی کھپت بہت زیادہ ہے کیونکہ وہاں لوگ جذبۂ جہاد کے ساتھ ایک دوسرے کا صفایا کرنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ دنیا میں جب تک احمق باقی ہیں' عقلمند بھوکے نہیں مرسکتے۔ ان کی تجارت زیادہ سے زیادہ مستحکم ہوتی رہے گی۔"

"عقلمند نہیں۔۔۔ انہیں خبیث اور شیطان کہو" میں نے نفرت سے کہا۔

اس نے قہقہہ لگایا اور بولا "میں جن احمقوں کا ذکر کررہا ہوں ان میں تم بھی شامل ہو۔ تم ذرا دوسری طرح کے احمق ہو لیکن بہرحال احمق ہی ہو۔"

اس نے اپنے ساتھیوں کو چلنے کا اشارہ کیا لیکن مخاطب مجھ سے ہی رہا "امید ہے اب تمہاری تسلی ہوگئی ہوگی اور اب تم آرام سے مرسکو گے۔ ہم جارہے ہیں۔ آج رات ایک جہاز کو کچھ "فالتو کارگو" یہاں اتارتے ہوئے گزرنا ہے۔ ہم چل کر مال وصول کرلیں۔ بہرحال نذیرل یہاں موجود رہے گا۔ وہ تمہارا خیال رکھے گا۔ میرا مطلب ہے وہ اس بات کا خیال رکھے گا کہ مگرمچھ تمہاری ایک آدھ ٹانگ الگ کرکے تمہیں زندہ حالت میں نہ چھوڑ جائے۔"

"جہاز کب یہاں پہنچ رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم جان کر کیا کروگے؟ تم شاید اس وقت تک زندہ نہ رہو۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "اس کے پہنچنے میں ابھی ایک ڈیڑھ گھنٹا ہے۔"

"وہ کہاں پہنچے گا؟" میں نے بہ آوازِ بلند پوچھا۔

"تم بھی کیا یاد کروگے۔۔۔ تمہارے ہر سوال کا جواب دے دیتا ہوں۔۔۔ یہ تمہاری زندگی کے آخری سوالات ہیں" وہ اطمینان سے بولا "جہاز وہاں پہنچے گا جہاں آج تم مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کررہے تھے۔ ہمیں وہاں بیٹھ کر مچھلیاں پکڑنے والے سخت زہر لگتے ہیں۔ شکر کرو کہ ہم نے تمہیں اس وقت دوربار رائفل سے گولی نہیں ماری تھی۔"

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ احمق وہ تھا یا میں؟ شاید دونوں ہی رہے ہوں۔ ہر انسان سے اپنی زندگی میں کچھ نہ کچھ حماقتیں ضرور ہوتی ہیں۔ عقلِ کل تو کوئی بھی نہیں ہے۔ اس وقت وہ بھی مجھے تھوڑا سا احمق محسوس ہوا تھا۔ اس نے میرے کمرے میں موجود ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر کی اہمیت کو محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ کوئی عام "ٹو اِن ون" قسم کی چیز نہیں تھی۔ اس میں ایک طاقتور اور حساس ٹرانسیٹر بھی موجود تھا۔ جب ریڈیو یا ٹیپ کو آف کیا جاتا تھا تو ٹرانسیٹر آن ہوجاتا تھا۔ میں اسی لیے اسے ہر وقت دھیمی آواز میں چلائے رکھتا تھا کہ اگر کبھی مجھے کمرے سے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تو میں اسے آف کرنے کا موقع تو تلاش کرہی لوں گا۔ اس کے بعد کمرے میں ہونے والی تمام گفتگو کوسٹ گارڈ کے ایک چھوٹے بحری جہاز پر سنی جاسکتی تھی جو وہاں سے پچیس تیس میل دور ایک جزیرے پر لنگر انداز تھا۔

صرف یہی نہیں' میری فشنگ راڈ کے موٹے دستے میں بھی مختصر سا ایک ریلے سسٹم موجود تھا جو اپنے آس پاس ہونے والی

گفتگو کو میرے کمرے میں موجود ریڈیو تک منتقل کرتا تھا اور وہ اسے کوسٹ گارڈ کے جہاز کے ریڈیو روم میں منتقل کرتا تھا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ کمرے میں میرے ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر کے آف ہونے کے بعد سے اب تک کی تمام گفتگو کوسٹ گارڈ کے جہاز میں سنی جارہی تھی۔

اس جہاز پر کوسٹ گارڈ کی ایک خاص ٹیم کے علاوہ راحیلہ' شفیع شاہ' ٹونی اور چشتی صاحب بھی موجود تھے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ چشتی صاحب کی جگہ خود نفیس صاحب موجود ہوتے لیکن ان کی موجودگی کنفرم نہیں تھی۔ اس سلسلے میں میرے پاس کوئی تازہ ترین اطلاع نہیں تھی۔ میرے تینوں ساتھیوں کی موجودگی تو بہرحال یقینی تھی۔ وہ کوسٹ گارڈ کی ٹیم کے شانہ بشانہ کسی بھی کارروائی میں عملی حصہ لے سکتے تھے۔

یہ سب انتظامات اپنی جگہ بہت اچھے اور بہت تسلی بخش تھے لیکن ایک مسئلہ بڑا غلط اٹک گیا تھا اور وہ مسئلہ میں خود تھا۔ جو مال بردار جہاز کارگو کی آڑ میں اسلحہ لے کر آرہا تھا اور جسے بلڈوزر اور اس کے ساتھی ریسیو کرنے گئے تھے' تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچنے والا تھا اور کوسٹ گارڈ کے جہاز کو بھی اپنے آپ کو غیر نمایاں رکھتے ہوئے جزیرے سے یہاں تک پہنچنے کے لیے کم و بیش اتنا ہی وقت درکار تھا۔ مگرمچھ اگر میری بُو پاکر اس سے پہلے اس طرف آنکلتے تو میرا انجام عبرت ناک ہی ہوسکتا تھا۔

وہ لوگ کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ ان میں چار ڈانسن میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوگئے۔ پستہ قد شخص جس کا نام بلڈوزر نے نذیرل بتایا تھا' کلاشنکوف لیے کنارے پر ٹہلنے لگا۔ ادھورا چاند بھی اب دھندلے سفید بادلوں کے پیچھے جاچکا تھا۔ چاندنی مکمل طور پر معدوم تو نہیں ہوئی تھی لیکن برائے نام ہی باقی رہ گئی تھی۔ ماحول مزید دھندلا گیا تھا۔ نذیرل کبھی کبھی گردن گھما کر میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ میں اتنی کم روشنی میں اتنے فاصلے سے اس کے تاثرات کا صحیح جائزہ تو نہیں لے سکتا تھا لیکن محسوس کرسکتا تھا کہ اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں میرے لیے نفرت تھی۔ اس قسم کے لوگ شاید دنیا میں نفرت کرنے کے لیے ہی پیدا ہوتے ہیں۔

اچانک وہ رک کر میری طرف دیکھتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں بولا "تم مچھلی نہیں پکڑ رہے۔ تمہارے پاس وقت بہت کم ہے۔ قسمت آزمائی کرکے دیکھ لو۔ دیکھتے ہیں کون کس کو پکڑتا ہے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ ایک بار پھر ٹہلنے لگا۔ میں نے اس کی نظر بچا کر ایک بار پھر زنجیر اور کھمبے سے صحیح طور پر زور آزمائی کی۔ میں نے اتنا زور لگایا کہ پانی میں کھڑا ہونے کے باوجود ایک بار تو مجھے پسینہ آگیا۔ میں اپنے آپ کو غیر معمولی طاقت کا مالک محسوس کرتا تھا۔۔۔ اور انسانی پیمانوں کے مطابق شاید میرا یہ خیال درست بھی تھا۔۔۔ لیکن اس کھمبے اور موٹی آہنی زنجیر سے نجات حاصل کرنے کے لیے میری یہ طاقت ناکافی تھی۔

چند منٹ ٹہلنے کے بعد نذیرل شاید بور ہوگیا۔ کنارے پر چھوٹا سا ایک پتھر پڑا تھا۔ وہ اس پر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر دھیرے دھیرے کش لینے لگا۔ گن اس نے ٹانگ کے سہارے کھڑی کرلی تھی۔ ایک سگریٹ کے بعد اس نے دوسری سلگالی۔ شاید اس کے لیے انتظار کی گھڑیاں گزارنا مشکل ہورہا تھا۔ آخر وہ مضطربانہ سے لہجے میں بولا "یہ الو کے پٹھے مگرمچھ بھی آج معلوم نہیں کہاں مرگئے ہیں۔ لگتا ہے آج کہیں اور ان کی دعوت ہوگئی۔ انہیں معلوم ہی نہیں ہے کہ ہم نے یہاں ان کے لیے دعوت کا انتظام کیا ہوا ہے۔"

شاید اس کمبخت کے الفاظ میں جادو کا اثر تھا۔ اسی لیے میرے عقب میں پانی میں ہلچل سی ہوئی اور دھیمی سی ایک غراہٹ نما آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' پانی کی سطح پر لمبا سا ایک ہیولا نمودار ہورہا تھا۔ میرے لیے یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ وہ کیا چیز تھی۔ ہلکی روشنی کے باوجود میں اسے تقریباً صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک جسیم مگرمچھ تھا۔ اندھیرے میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اپنی تمام تر بے خوفی کے باوجود میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ ٹھنڈے پانی میں اتنی دیر سے کھڑے رہنے کے اثرات تھے۔

نذیرل نے بھی مگرمچھ کو دیکھ لیا تھا۔ وہ مسرور سے لہجے میں بولا۔

"تھا جس کا انتظار' وہ شاہکار آگیا۔ ماشاء اللہ کافی بڑا ہے۔"

غیر ارادی طور پر میں نے بنسی کو یوں مضبوطی سے پکڑ لیا جیسے وہ کوئی بہت بڑا ہتھیار تھا اور اتنے جسیم مگرمچھ سے بچاؤ میں مجھے مدد دے سکتا تھا۔ نذیرل نے مزید تبصرہ کیا "بھوکا بھی معلوم ہوتا ہے۔" پھر اس نے ٹارچ سے مگرمچھ پر روشنی ڈالی۔ روشنی میں اس کا کراہت آمیز سراپا مزید واضح ہوا تو مجھے ایک اور جھرجھری سی آگئی۔

روشنی آنکھوں پر پڑنے کا مگرمچھ پر ردِعمل حیرت انگیز تھا۔ وہ کچھ خوف زدہ سا ہوگیا۔ اس نے اتنے زور سے دم ہلائی کہ پانی میں بھونچال سا آگیا اور جھاگ پیدا ہوگیا۔ اس کی دم کی ایک ضرب میرا کام تمام کرنے کے لیے کافی تھی۔ مگرمچھ نے پانی میں غوطہ لگایا۔ پانی کی ہلچل سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ دور جارہا تھا۔

"اوہ۔۔۔ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے اس پر ٹارچ سے روشنی نہیں ڈالنی چاہیے تھی۔ میں بھول گیا تھا" نذیرل تاسف سے بولا "لیکن۔۔۔ خیر۔۔۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ وہ شکار کو دیکھ گیا ہے۔ جلد ہی واپس آئے گا۔ عین ممکن ہے وہ اپنے ساتھیوں کو بلانے گیا ہو۔ شاید بڑے مگرمچھ جو کچھ بھی کھاتے ہوں' اتحاد اور اتفاق سے کھاتے ہوں۔"

وہ یقیناً اس صورتِ حال سے لطف بھی لے رہا تھا۔ استہزائیہ سے لہجے میں بولا "تم اپنی بنسی اور ڈور سے اس مگرمچھ کو پکڑنے کی

کوشش کیوں نہیں کرتے؟ یہ بھی ایک ریکارڈ ہوگا کہ ایک صاحب نے مچھلی پکڑنے کی ڈور سے مگرمچھ پکڑ لیا۔"

تب میں نے اپنے جسم میں پھیلنے والے خفیف سے ارتعاش پر قابو پایا اور جیب سے گتے کی ایک چپٹی سی ڈبیا نکالی۔ اس میں بڑے سائز کا ایک بھاری اور مضبوط اسپیشل کانٹا موجود تھا۔ میں نے وہ کانٹا ڈوری میں لگایا۔ اپنے اور نذیرل کے درمیان فاصلے کا اندازہ کیا اور بنسی کو تیزی سے ہوا میں گھمانے لگا۔ ڈوری اور بنسی سے شائیں شائیں کی آواز آنے لگی۔ نذیرل بے تحاشا ہنسنے لگا۔ شاید اس کے خیال میں خوف کی شدت سے میرا دماغ چل گیا تھا۔

میرے ذہن میں اچانک ہی ایک تدبیر آئی تھی اور میں نے خدا پر بھروسا کرتے ہوئے قسمت آزمائی کا فیصلہ کرلیا تھا۔ موت تو سامنے نظر آہی رہی تھی۔ اس مرحلے پر کسی بھی انداز سے قسمت آزمائی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ یک دم ہی فشنگ راڈ کو نیچے لاتے ہوئے میں نے اپنا داؤ کھیلا۔ "چھک" کی سی آواز کے ساتھ کانٹا نذیرل کی گردن پر جاکر پڑا۔ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ سلگتی ہوئی سگریٹ اس کے گریبان میں چلی گئی۔ یہ میرے لیے ایک اور غیبی امداد تھی جس نے اسے بُری طرح بوکھلا دیا۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا' پہلے وہ کدھر توجہ دے۔ ایک بار اس نے بوکھلاہٹ میں اپنی گردن پر ہاتھ مارا۔ مجھے اس سے اسی حرکت کی توقع تھی۔ اس طرح اس نے کانٹے کو اپنی گردن میں اور بھی گہرا پیوست کرلیا۔ مچھلی کے کانٹے کی ساخت ہی ایسی ہوتی ہے کہ وہ آسانی سے نہیں نکلتا اور اس سے جتنی چھیڑ چھاڑ ہو یا اس پر دباؤ پڑے اتنا ہی اور گہرا پیوست ہوتا جاتا ہے۔ وہ گوشت کو پھاڑے بغیر باہر نہیں آتا۔

نذیرل کے حلق سے ایک اور چیخ نکلی اور اس نے گردن سے ہاتھ ہٹا کر سگریٹ گریبان سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اسے کامیابی ہوئی مگر اس دوران میں میرے ڈوری کھینچنے کی وجہ سے وہ غیر ارادی طور پر پانی کے کچھ قریب آچکا تھا۔ اس کی کلاشنکوف اچھل کر کچھ دور جاگری تھی اور اب وہ اس سے دو قدم کے فاصلے پر تھی۔ میں نے چرخی کو لاک کر رکھا تھا۔ اس نے گن کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تو میں نے ڈھیل نہیں دی اور گردن میں شدید تکلیف کے باعث وہ رکنے پر مجبور ہوگیا۔ وہ ہاتھ بڑھا کر بھی کلاشنکوف نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"نذیرل۔۔۔ میری جان! تم ادھر جانے کی کوشش نہیں کروگے بلکہ میری طرف آؤگے" میں نے نرمی سے کہا "میرے پاس آکر تم میری بیڑی کھول دو تو میں تمہارا یہ کانٹا نکال دوں گا۔ میری مدد کے بغیر یہ کانٹا نہیں نکل سکتا کیونکہ تم اسے دیکھ نہیں سکتے۔ اگر تم اسے الٹے سیدھے طریقے سے۔۔۔ زور زبردستی کرکے نکالنے کی کوشش کروگے تو تمہاری گردن کی کوئی نازک رگ کٹ جائے اور تم اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچنے سے پہلے مرجاؤ۔۔۔"

وہ حلق سے تکلیف زدہ سی آوازیں نکال رہا تھا لیکن اس نے میری بات توجہ سے سن لی تھی اور اپنی جگہ ساکت ہوکر رہ گیا تھا۔ ڈوری تنی ہوئی تھی۔ میں نے اس پر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔ وہ بُری طرح چیخ اٹھا۔ میں نے ملائمت سے کہا "سوچ کیا رہے ہو' آؤ۔۔۔ میری طرف آجاؤ۔۔۔ میری جان بخش کر اگر تمہاری جان بچ سکتی ہے تو سودا مہنگا نہیں۔۔۔ میں خاموشی سے بھاگ جاؤں گا۔ بیڑی یہیں چھوڑ جاؤں گا۔ تم کہہ دینا مگرمچھ میری تکا بوٹی کرکے لے گئے۔"

"بعد میں تو انہیں پتا چل جائے گا کہ تم زندہ ہو" وہ اذیت زدہ لہجے میں بولا۔

"تب تک تم اپنے بچاؤ کا بندوبست کرلینا۔۔۔ یا اب بھی انہیں سچ سچ بتا دینا۔ اگر تمہارے دوستوں کو تم سے ذرا بھی محبت ہوگی تو وہ تمہیں معاف کردیں گے۔ زندگی بہت اہم ہے۔ میری جان۔۔۔ آؤ۔۔۔ آؤ۔۔۔" میں نے ڈور کو ایک اور خفیف سا جھٹکا دیا۔ وہ ایک بار پھر اذیت سے چلایا پھر اس نے نائلون کی اس انتہائی مضبوط ڈور کو گردن کے قریب سے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"اس طرح بھی تم اپنا بچاؤ نہیں کرسکتے" میں نے ڈور کو بنسی کی مدد سے ہی کچھ کھینچا تو وہ اس کے ہاتھ سے پھسلنے لگی اور وہ آخر کار حلق سے کربناک سی آوازیں نکالتا ہوا دھیرے دھیرے میری طرف آنے لگا۔ میرے رگ و پے میں طمانیت کی لہر دوڑ گئی۔ یہ میری زندگی کا حسین ترین شکار تھا۔ میں ڈور کھینچتا رہا اور وہ میرے قریب آتا رہا۔ میں نے بنسی بائیں ہاتھ میں پکڑ لی تھی اور دائیں ہاتھ سے چرخی گھما کر ڈور دھیرے دھیرے لپیٹ رہا تھا۔ یہ زندگی اور موت کی ایک عجیب کشمکش کے لمحات تھے۔

میرے قریب پہنچ کر اس نے میری فرمائش کے بغیر ہی جیب میں ہاتھ ڈال کر چابی نکالی۔ میں نے بائیں ہاتھ سے مضبوطی سے بنسی کو پکڑ کر ذرا دور ہی رکھا اور دایاں ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "چابی مجھے دے دو۔"

اس کی گردن سے خون کی ایک موٹی دھار بہتی ہوئی اس کے گریبان میں جارہی تھی۔ وہ سخت تکلیف میں تھا اور اب اس میں اندیشہ ہائے دور دراز میں گرفتار ہونے کی ہمت نہیں تھی۔ اس نے چابی میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ میں نے اسے مٹھی میں بند کرتے ہوئے اسی ہاتھ سے اچانک ہی اس کی کنپٹی پر پوری قوت سے ایک گھونسا رسید کیا اور ڈور ڈھیلی چھوڑ دی۔ وہ اوندھے منہ پانی میں گرا اور ڈبکیاں کھانے لگا۔ اسے چکر آگیا تھا یا پھر گھونسے سے اس کے حواس معطل ہوگئے تھے۔۔۔ وہ خود کو بچانے کی جدوجہد نہیں کررہا تھا۔

میں نے اسے ڈوبنے دیا اور پانی میں ٹٹول کر بیڑی میں سوراخ میں چابی لگائی۔ کھٹکے کے خفیف سے احساس کے ساتھ آہنی حلقہ کھل گیا۔ میں نے پھرتی سے اسے نذیرل کی ٹانگ میں پھنسا کر دوبارہ مقفل کردیا۔ میں نے اس کی جیب سے اپنی بیچو کی چابیاں بھی

نکال لیں اور پھر بے رحمی سے کانٹا اس کی گردن سے کھینچ لیا۔ خون بھل بھل بہنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ خون کی بُو بہت تیزی سے مگرمچھوں کو اس طرف کھینچ کر لائے گی۔

میں اسے ڈوبتا چھوڑ کر تیزی سے پانی سے نکلا اور اس کی کلاشنکوف اٹھا کر جیپ میں جا بیٹھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے ساتھی کہاں تھے لیکن اس طرف جانے سے پہلے میرا اپنے کمرے میں جانا ضروری تھا۔ میری فشنگ راڈ کے دستے میں جو مختصر سا ریلے سسٹم نصب تھا اس کے ذریعے کوسٹ گارڈ کے جہاز پر موجود افراد سے میری بات نہیں ہو سکتی تھی لیکن میرے کمرے میں جو ریڈیو سیٹ موجود تھا اسے ٹُووے کیا جا سکتا تھا اور میری ان سے بات ہو سکتی تھی۔ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے میں ان کی پوزیشن سے واقف ہونا اور یہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ کیا کر رہے تھے۔

راستے میں وہ کھاڑی بھی آئی تھی جہاں آج میں مچھلیاں پکڑنے چٹان پر بیٹھا تھا اور جہاں اس وقت وہ لوگ موجود تھے۔ مجھے ان کی نظروں سے بچتے ہوئے جانا تھا اس لیے میں نے ہیڈ لائٹس آف رکھیں اور اصل راستے سے بہت دور رہتے ہوئے ناہموار راستوں سے گزرا۔ یوں مجھے کمرے تک پہنچنے میں کافی دِقت پیش آئی اور خاصا وقت بھی لگ گیا لیکن یہی غنیمت تھا کہ میں خیر وعافیت سے کمرے تک پہنچ گیا۔ ہوٹل کے استقبالیہ اور دیگر کمرے اسی طرح تاریکی اور سکوت میں ڈوبے ہوئے تھے جس طرح میں انہیں چھوڑ کر گیا تھا۔

اندر پہنچ کر یہ دیکھ کر میں نے سکون کی سانس لی کہ ریڈیو جوں کا توں کارنس پر موجود تھا۔ میں نے اس کا ایک خفیہ بٹن دبا کر اسے ٹُووے ریڈیو میں تبدیل کیا۔ ریڈیو کے ڈائل پر ایک چھوٹا سا سرخ بلب روشن ہوا اور مجھے دوسری طرف سے سگنل ملا "سی جی ون ٹو تھری..... پوزیشن پلیز..... " یہ آواز میرے لیے اجنبی تھی۔

"اے سی..... ایم ٹین..... " میں نے کوڈ ورڈز ادا کیے اور پوچھا "کیا چشتی صاحب جہاز پر موجود ہیں؟" گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔

"چشتی صاحب تو نہیں ہیں لیکن نفیس صاحب موجود ہیں" جواب ملا۔ یہ جان کر مجھے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ مجھے جہاز پر ان کی موجودگی کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ شاید وہ آج ہی کسی وقت پہنچے تھے۔ ان کے منصب کے لحاظ سے یہ بہت زیادہ اہم مہم نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کس طرح ادھر کیا سوچ کر آ گئے تھے۔ شاید انہیں کافی فاضل وقت میسر آ گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے ریڈیو پر ان کی آواز اُبھری "کیا حال ہیں بدمعاش!" وہ جب کافی خوش گوار موڈ میں ہوتے تھے تو مجھے بدمعاش کہہ کر پکارتے تھے۔ جواب کا انتظار کیے بغیر وہ بولے "ہمیں تمہارے بارے میں سخت تشویش تھی۔ ریڈیو پر موصول ہونے والی آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ تم ان بیچ بچ کے بدمعاشوں کے ہتھے چڑھ گئے ہو۔ اب کیا صورتِ حال ہے؟"

"بس..... قسمت اچھی تھی..... کسی نہ کسی طرح ان کے چنگل سے نکل آیا ہوں بلکہ یوں کہیے کسی مگرمچھ کی ضیافت کا سامان بننے سے بال بال بچا ہوں..... اس وقت اکیلا اور خطرے سے دور ہوں۔ آپ اس جہاز پر کیسے پائے جا رہے ہیں؟ آپ کی آمد کی تو کوئی توقع نہیں تھی اور یہ کام آپ کے شایانِ شان بھی نہیں تھا۔"

"شایانِ شان کو تو چھوڑو..... " وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے "تمہیں کیا معلوم کہ کبھی کیا کچھ کرنا پڑ جاتا ہے۔ یہ معاملہ کچھ کم اہم نہیں ہے۔ اس کی جڑیں وہاں تک جا رہی ہیں جہاں تک تمہاری نظر نہیں جا سکتی۔ ایک تو میں اس لیے آ گیا کہ یہ اسلحے کے ایک بہت بڑے بین الاقوامی ایکٹ کا حصہ ہے جس کا تعلق ہمارے خطے کی سیاست سے بھی ہے۔ دوسری بات یہ کہ کل میری ملازمت کا آخری دن ہے۔ میں نے چارج ہینڈ اوور کرنے کی تمام کارروائی مکمل کر لی ہے۔ عملی طور پر میں بالکل فارغ ہو چکا ہوں۔ میں نے سوچا اس فارغ وقت میں ایک اور کام کا کریڈٹ مل جائے تو کیا حرج ہے۔ ذاتی طور پر جانے کی بات ہی کچھ اور ہوتی ہے..... "

پھر اچانک گویا انہیں خیال آیا اور وہ یکدم پٹڑی بدلتے ہوئے بولے "تم ٹھیک تو ہو نا؟"

"جی ہاں..... فی الحال تو ٹھیک ہوں" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "آپ نے اپنی صورتِ حال نہیں بتائی؟"

"ہم نے اس جہاز کو اسپاٹ کر لیا ہے۔ وہ ہمارے ایک بڑے مہرباں اور ترقی یافتہ ملک کا کارگو شپ ہے۔ وہ غالباً اسی کھاڑی کی طرف بڑھ رہا ہے جس کا تذکرہ ہم نے کچھ دیر پہلے ریڈیو پر سنائی دینے والی گفتگو میں سنا تھا۔ ہم اپنی تمام لائٹس وغیرہ آف رکھ کر بہت دور سے اس کا تعاقب کر رہے ہیں۔ وہ ساحل کے قریب پہنچ چکا ہے۔ ہم ان لوگوں کو رنگے ہاتھوں پکڑیں گے۔ غیر ملکی کارگو شپ کا معاملہ ہے۔ ثبوت ذرا ٹھوس ہونے چاہئیں۔"

"ساحل پر جو لوگ کھیپ وصول کرنے کے لیے موجود ہیں وہ شاید چھاپے کے وقت بھاگنے کی کوشش کریں۔ انہیں روکنے کے لیے میں اکیلا ہی ہوں گا اور میرے پاس صرف ایک کلاشنکوف ہے..... لیکن مجھے امید ہے کہ میں انہیں روک لوں گا۔"

"کیا 'کیا جائے..... تمہیں خود ہی جیمس بانڈ کی طرح اکیلے ہر جگہ جانے کا شوق ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

"جہاں بڑے بڑے ٹولے پورے تام جھام کے ساتھ جاتے ہیں وہاں کچھ ہاتھ نہیں آتا' ان کا سراغ ملتے ہی سب ہوشیار ہو جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"بہرحال فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ جلد سے ہی صورتِ حال کو کنٹرول کر لیں گے" نفیس صاحب نے اعتماد سے کہا "ہمارے پاس سب بندوبست ہے۔ یہ کارگو شپ ہے۔ اُمید ہے اس کے عملے کے لوگ..... اور اگر اس پر کچھ دوسرے لوگ بھی موجود ہوئے تو وہ مقابلے کی کوشش نہیں کریں گے۔ ساحل والے بدمعاش بھی راہِ فرار اختیار کرنے کی کوشش کریں گے۔ کوشش کرنا کہ انہیں تم صرف زخمی کر کے روک سکو۔ ہلاک نہ کرنا۔ اگر کچھ بھاگ بھی گئے تو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"میرے ساتھی بھی جہاز پر موجود ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں..... بالکل..... طے شدہ پروگرام کے مطابق وہ نہ صرف موجود ہیں بلکہ پوری سرگرمی سے اس آپریشن میں حصہ بھی لیں گے۔ میں نے انہیں خصوصی اجازت دلوائی ہے۔ کیا تم ان میں سے کسی سے بات کرو گے؟"

"نہیں..... اس کی ضرورت نہیں..... میں اب کھاڑی کی طرف روانہ ہوتا ہوں۔ میرا خیال ہے' ہمارے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے اپنے بیڈ کے سرہانے پڑی گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے..... اللہ حافظ..... محتاط رہنا۔" انہوں نے رابطہ منقطع کر دیا۔

اس بار میں کمرے سے نکلا تو میں نے ریڈیو اور دیگر مختصر سا سامان بھی بیگ میں ڈال کر ساتھ لے لیا۔ زیادہ امکان یہی نظر آ رہا تھا کہ مجھے اس کمرے میں دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جیپ میں بیٹھ کر میں ایک بار پھر اس کھاڑی کی طرف روانہ ہوا جہاں میں نے صبح پتلی سی بلند چٹان پر بیٹھ کر مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ جیپ مجھے کھاڑی سے بہت دور ہی درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب چھوڑنا پڑی ورنہ وہ لوگ میری آمد سے آگاہ ہو سکتے تھے۔ وہاں تک سفر میں نے ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر کیا تھا۔ باقی فاصلہ میں نے گھپ اندھیرے میں کسی گوریلے یا درندے کی طرح طے کیا۔

آخر مجھے چھوٹا سا وہ پگڈنڈی نما راستہ نظر آ گیا جس پر چلتے ہوئے میں نے چوڑی دیوار سے مشابہ اس پتلی چٹان پر پہنچ سکتا تھا جہاں میں آج صبح بیٹھا تھا۔ گرد و پیش پر نظر رکھنے کے لیے وہ ایک بہترین جگہ تھی۔ اس کے پہلو میں اور سامنے کی طرف وہ گہرے پانی والی کھاڑی تھی جو تین طرف سے پہاڑیوں میں گھری ہوئی تھی۔ خشکی سے اس پہاڑی تک پہنچنے کا ایک ہی تنگ سا راستہ تھا جو پہاڑیوں کے درمیان سے ہی گزرتا تھا۔ پگڈنڈی نما راستے پر احتیاط سے چلتے ہوئے میں ان لوگوں کی نظر میں آئے بغیر بلندی پر پہنچ سکتا تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ لوگ کھاڑی میں موجود تھے اور ان کے پاس کوئی لانچ بھی تھی جس کا انجن انہوں نے اسٹارٹ ہی رکھا ہوا تھا۔ مجھے انجن کی مدھم سی آواز سنائی دی تھی۔ میں نے رکوع کی سی حالت میں چلتے ہوئے تنگ پگڈنڈی نما راستہ طے کیا اور چوڑی دیوار سے مشابہ چٹان پر جا پہنچا۔ میری قسمت اچھی تھی کہ چٹان پر پہنچتے ہی مجھے خطرے کا احساس ہو گیا ورنہ صورتِ حال میرے حق میں بہت خراب ہو جاتی۔ میری ساری احتیاط بے کار جاتی اور قبل از وقت میری موجودگی کا راز کھل جاتا۔

دراصل چٹان کے عین کنارے پر ایک شخص سمندر کی طرف منہ کیے سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ وہ یقیناً انہی کا ساتھی تھا اور گرد و پیش پر..... خصوصاً سمندر پر نظر رکھنے کے لیے وہاں موجود تھا۔ اس امکان کی طرف میرا ذہن ہی نہیں گیا تھا کہ ان کا کوئی ساتھی وہاں بھی موجود ہو سکتا تھا۔ وہ تو اچھا ہوا کہ اس کی میری طرف پشت تھی اور میں نہایت محتاط انداز میں' بے آواز قدموں سے چٹان پر پہنچا تھا اس لیے وہ فوری طور پر میری آمد سے باخبر نہیں ہو سکا۔

عین اس وقت جب کہ میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا' اسے غالباً اپنے قریب کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ تیزی سے پلٹا کھانے ہی لگا تھا کہ میں نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر نہایت نپے تلے انداز میں کلاشنکوف کا دستہ رسید کیا۔ وہ وہیں ساکت ہو گیا لیکن اسی لمحے ایک اور گڑبڑ ہوتے ہوتے بچی۔ اس کے پاس بھی کلاشنکوف موجود تھی۔ شاید وہ اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر چٹان کے کنارے سے پانی میں جا گرتی اور اس کے چھپاکے سے نیچے والے اوپر کی طرف متوجہ ہو جاتے اور انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہو جاتا لیکن میں نے بروقت اسے دوسرے ہاتھ سے دبوچ لیا۔ یوں میرے پاس دو کلاشنکوفیں ہو گئیں۔

میں نے بے ہوش شخص کو گھسیٹ کر ایک طرف کیا اور اس کی جگہ خود سینے کے بل لیٹ کر پہلے دائیں جانب نیچے کھاڑی کے کنارے کی طرف جھانکا۔ وہاں سے لانچ کے انجن کی آواز اور لوگوں کے باتیں کرنے کی گونجیلی سی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ مجھے مگرمچھ کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ کر صرف چار افراد روانہ ہوئے تھے لیکن اس وقت نیچے نو افراد موجود تھے۔ وہ سب کے سب ایک بڑی لانچ میں بیٹھے خوش گپیوں کے سے انداز میں باتیں کر رہے ہیں۔ ان میں وہ چاروں افراد بھی شامل تھے جو مجھے دوسری کھاڑی پر چھوڑ آئے تھے۔ ان کے علاوہ بھی ایک شخص کی صورت میرے لیے جانی پہچانی تھی اور اسے وہاں دیکھ کر مجھے خاصی حیرت ہوئی تھی۔ وہ میگھانی ہوٹل کا استقبالیہ کلرک تھا۔ لانچ کے کھلے حصے میں لائٹ آن تھی اور اس کی چندیا اس روشنی میں چمک رہی تھی۔ باقی صورتیں میرے لیے نئی تھیں۔ جس شخص کو میں نے بے ہوش کیا تھا اسے بھی میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔

اچانک ان لوگوں میں سے ایک نے سمندر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیزی سے کچھ کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا لیکن ان سب میں خوشی کی لہر سی دوڑ گئی اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نے سمندر کی طرف دیکھا۔ ایک بحری جہاز کی روشنیاں دکھائی دے رہی

تھیں۔ انہیں یقیناً اسی کا انتظار تھا۔ ان میں سے کچھ انجن کے کیبن کی چھت پر اور کچھ پچھلے حصے پر چڑھ گئے۔ بیچ کی جگہ انہوں نے خالی کردی۔ لانچ کافی بڑی اور نہایت عمدہ کنڈیشن میں تھی۔

جہاز تیزی سے قریب آرہا تھا۔ میں نے اس کے عقب میں اور دائیں بائیں سمندر کی بیکراں تاریکی میں نظر دوڑائی' بہت آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن مجھے کچھ نظر نہ آیا لیکن جب جہاز کھاڑی کے عین قریب پہنچ چکا تو مجھے دور تاریکی میں ایک زیادہ تاریک ہیولا دکھائی دیا۔ وہ ہیولا بھی اسی سمت میں بڑھ رہا تھا۔ میری دھڑکنیں کچھ تیز ہوگئیں۔

آخر کار جہاز کھاڑی کے دہانے پر آن رکا۔ لنگر ڈال دیا گیا۔ جہاز آگے بھی آسکتا تھا لیکن شاید انہوں نے کھاڑی میں لانا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ مختصر لوگ لانچ کو جہاز کے قریب لے گئے۔ بلڈوزر اس مہم کا انچارج معلوم ہوتا تھا۔ سب اس کی ہدایات کے تحت کام کر رہے تھے۔ میں بہت سے باوردی سفید فاموں کو جہاز کے عرشے اور نچلے حصوں میں چلتے پھرتے دیکھ رہا تھا۔

پھر لکڑی کی کافی بڑی بڑی پیٹیاں گھوں اور رسّوں کی مدد سے جہاز سے لٹکائی جانے لگیں اور لانچ میں موجود افراد انہیں سنبھال سنبھال کر بڑی مشاقی اور مہارت سے لانچ میں رکھنے لگے۔ مزید افسوس کا مقام یہ تھا کہ اس کارگوشپ کا تعلق اس بڑے اور ترقی یافتہ ملک کی ایک بہت بڑی جہاز راں کمپنی سے تھا جس کے ہم ویسے ہی مقروض و ممنون رہتے تھے۔ دست بستہ اس کے احکامات پر عمل کرتے تھے۔ اس کی ہدایت پر اِدھر اُدھر جاکر دوسروں کی جنگیں لڑنے پر بھی کمربستہ رہتے تھے اور ان جنگوں کی "برکت" سے ویسے بھی ہمارے ہاں اسلحے کی ریل پیل ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود وہاں کے کچھ لوگ نجی طور پر بھی ہمارے زیر زمین دنیا کے بڑے بڑے گرگوں کے اسلحے کی ناجائز تجارت میں حسب توفیق مدد دینے میں مصروف تھے۔ میں وہاں کھلے آسمان تلے' سمندر کے کنارے' اونچی جگہ پر ٹھنڈی ہوا میں لیٹا تھا اس کے باوجود یہ سب کچھ دیکھ کر میری کنپٹیوں میں چنگاریاں سی بھری جا رہی تھیں۔

اچانک فضا میں ایک دوسرے جہاز کے انجن کی مدّھم سی آواز ابھری جو دھیرے دھیرے تیزی ہوتی جارہی تھی۔ کارگوشپ پر یقیناً وہ آواز سن لی گئی تھی اور میں وہاں بھگدڑ کے آثار نمودار ہوتے دیکھ رہا تھا۔ ایک پیٹی تو اس وقت بھی رسے کے ذریعے لٹکائی جارہی تھی۔ پیٹیوں کی منتقلی کا کام ابھی بیچ میں تھا۔ دو سفید فام افراد نے جہاز سے جھک کر لانچ والوں کو ایک اور جہاز کی آمد سے خبردار کیا۔

وہ تھوڑی دیر کے لیے گھبراہٹ کا شکار نظر آئے لیکن پھر میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ انہوں نے راہِ فرار اختیار کرنے کے بجائے ہتھیار سنبھالنا شروع کردیے اور لانچ کے اندر ہی پوزیشنیں سنبھالنے لگے۔ اس وقت تک کوسٹ گارڈز کے جہاز والوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ کارگوشپ والے اور دیگر افراد ان کی آمد سے باخبر ہو چکے تھے چنانچہ انہوں نے اپنی لائٹس آن کردیں۔ اس جہاز پر فلڈلائٹس بھی نصب تھیں۔ وہ جہاز اپنا رخ ذرا سا بدلتے ہوئے اس طرح آگے آنے لگا کہ کارگوشپ کے دوسری طرف بھی دیکھا جاسکے۔ شاید ان لوگوں کو اندازہ تھا کہ ادھر کوئی لانچ وغیرہ موجود تھی۔

جلد ہی فلڈلائٹس وغیرہ کی وجہ سے وہ حصہ تیز روشنی میں نہا گیا۔ اب کوسٹ گارڈز کے جہاز کا جلی نام اور نشان وغیرہ دیکھا جاسکتا تھا۔ جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن تیز رفتار تھا۔ اس سے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے اعلان کیا جانے لگا "کوسٹ گارڈ کی طرف سے سیون اسٹار شپنگ لائن اور اس لانچ کے افراد کو باخبر کیا جاتا ہے کہ اسلحہ کی اسمگلنگ کے جرم میں انہیں اور اس جہاز کو حراست میں لیا جارہا ہے۔ اپنی نقل و حرکت بند کردیں اور اپنے آپ کو پرامن طریقے سے قانون کے حوالے کردیں۔" اس کے ساتھ ہی وہ لوگ لنگر ڈالنے لگے۔ اعلان دو مرتبہ انگریزی میں دہرایا گیا۔

اس اعلان کا جواب انہیں گولیوں کی بوچھار کی صورت میں ملا۔ وہ ایک محفوظ جہاز تھا اور اس کی ساخت میں روبہ جنگی حکمت عملی کی پیش نظر رکھا گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر بے حد حیرت ہوئی کہ کہنے کو غیر ملکی جہاز کارگو تھا لیکن اس پر مسلح افراد موجود تھے۔ وہ بھی پوزیشنیں لے کر فائرنگ کرنے لگے تھے۔ یہ دیدہ دلیری کی انتہا تھی۔ لانچ والوں نے بھی اندھا دھند فائرنگ شروع کردی تھی۔ میں نے کوسٹ گارڈز کے جہاز کے عرشے پر سفید چست لباسوں میں کچھ افراد کو اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھا۔ پھر وہ غائب ہوگئے۔

کارگوشپ اور لانچ سے زبردست فائرنگ جاری تھی۔ شاید وہ توقع کر رہے تھے کہ وہ کوسٹ گارڈ کے جہاز کو بھاگنے پر مجبور کردیں گے۔ لانچ سے تو جہاز پر ایک ہینڈ گرینیڈ بھی پھینکا گیا لیکن اتفاق سے وہ اس تک پہنچنے کے بجائے پانی میں گر گیا۔ تیز روشنی میں بہت سے افراد میری نظر میں تھے لیکن میں نے ہاتھ روکے رکھا اور کسی کو نشانہ نہیں بنایا۔ کوسٹ گارڈ کے جہاز پر پُراسرار سکوت طاری تھا۔ لانچ سے اس پر ایک اور گرینیڈ پھینکا گیا اور اس کی سائڈ میں قدرے بلندی پر ایک شگاف سا نمودار ہوتا دکھائی دیا۔

اس کے بعد یکدم ہی گویا گرد و پیش کی ہر چیز تھرا اٹھی۔ کوسٹ گارڈ کے جہاز سے مشین گنوں کے ذریعے خوف ناک فائرنگ شروع ہوگئی تھی۔ لانچ میں تو شاید فوراً ہی کئی افراد اس فائرنگ کا نشانہ بن گئے کیونکہ اس پر پوزیشن لینے کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی۔ کارگوشپ پر بھی کچھ چیخ و پکار سنائی دی۔ کوسٹ گارڈ کے جہاز پر شاید ہلکی مارٹر گن بھی موجود تھی۔ ایک الگ ہی قسم کی گونج دار آواز کے ساتھ ایک فائر ہوا اور کارگوشپ کے اگلے حصے کا ایک بالائی کونا اڑ گیا۔ دوسرا فائر ہوا تو اس سے نیچے کا کچھ اور حصہ اڑ گیا۔

یہ شاید انہوں نے نظر ٹھیک کیا تھا۔ اس کے بعد اصل ظلم

پیش کی جاسکتی تھی۔ کارگوشپ غرقاب بھی ہوسکتا تھا اور اس پر نہ جانے کتنی مالیت کا دوسری کمپنیوں کا جائز اور قانونی مال بھی لدا ہوا تھا۔ وہ علاقہ بحری جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ کوسٹ گارڈ کی طرف سے پیش کیا گیا ٹریلر ہی کافی رہا۔ چند سیکنڈ بعد ہی کارگوشپ سے میگافون کے ذریعے اعلان کیا گیا کہ وہ لوگ گرفتاری دینے اور ہتھیار ڈالنے کے لیے تیار تھے بلکہ انہوں نے تھوڑی سی فائرنگ بھی غلط فہمی کے تحت کی تھی ورنہ وہ تو پہلے ہی گرفتاری پیش کردیتے۔ بے چارے......!

لانچ میں جو افراد زندہ بچ گئے تھے اور زخمی ہونے سے بھی محفوظ رہے تھے۔ انہوں نے راہِ فرار اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ساحل سے لانچ کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ لانچ گھومی اور ساحل کی طرف بڑھی۔ اچانک اس سے ذرا آگے مارٹر گن سے ایک گولا پانی میں پھینکا گیا۔ یہ اس کے لیے گویا رکنے کا اشارہ تھا۔ لانچ لہرا گئی اور تین افراد نے ہتھیار چھوڑ کر اس پر سے پانی میں چھلانگ لگادی۔ شاید انہیں تیر کر خیریت سے ساحل پر پہنچنے کا امکان نظر آیا تھا۔ احمقوں کو شاید بوکھلاہٹ میں یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ مشین گن کی گولیوں کی رسائی تو ساحل تک بھی آسانی سے ہوسکتی تھی۔

تاہم نہ جانے کیوں ان کے ساحل پر پہنچ جانے کے بعد بھی جہاز کی طرف سے ان پر فائرنگ نہیں ہوئی۔ فائرنگ اب دونوں طرف سے بند ہو چکی تھی۔ میرے خیال میں اب میرے لیے بھی اپنی موجودگی کا ثبوت دینا ضروری ہوگیا تھا۔ وہ تینوں ساحل پر بھاگنے لگے تھے اور ان میں بلڈوزر بھی شامل تھا۔ میں نے دیوار نما چٹان پر سے جھکتے ہوئے بہت محتاط انداز میں ان کی ٹانگوں کو ہدف بناتے ہوئے ایک برسٹ مارا۔ وہ تینوں تقریباً ایک ساتھ ڈھیر ہوگئے۔ کوسٹ گارڈ والے نہایت آسانی سے اندازہ کرسکتے تھے کہ یہ کارروائی کس کی تھی۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور ایک طرف کو جاکر روشنی کی زد میں آگیا۔ میں نے جہاز کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلایا تاکہ مجھے دیکھ لیا جائے۔ سفید لباس میں کوئی شخص جہاز کے عرشے پر نمودار ہوا اور اس نے جواباً ہاتھ ہلایا جس کا مطلب تھا کہ مجھے دیکھ لیا گیا تھا۔ وہ چونکہ فلڈلائٹس کے عقب میں تھا اس لیے میں اسے نہیں پہچان سکا۔ اس دوران میں کوسٹ گارڈ کے جہاز سے ایک فولڈنگ سیڑھی کھول کر کارگوشپ تک پہنچائی جارہی تھی اور لاؤڈ اسپیکر پر اس کے عملے وغیرہ کو ہدایت کی جارہی تھی کہ وہ سیڑھی کے ذریعے ایک ایک کرکے کوسٹ گارڈ کے جہاز پر آجائیں۔ ان کے جہاز کو کوسٹ گارڈ کے آدمی خود اپنی تحویل میں لے کر ساتھ لے جائیں گے۔

اس ہدایت پر جلد ہی عمل شروع ہوگیا۔ میں نے ایک سفید فام باوردی شخص کو بندر کی طرح چاروں ہاتھ پیروں کے بل اس سیڑھی کے راستے دوسرے جہاز پر جاتے دیکھا۔ تب میں نے دونوں کلاشنکوفیں کندھوں پر لٹکائیں اور تنگ سے راستے کے ذریعے نشیب کی طرف چل دیا۔ بلڈوزر اور اس کے ساتھیوں کی لانچ خود ہی کنارے پر آکر ریت میں پھنس چکی تھی۔ مجھے امید تھی کہ میں اسے ریت سے نکال کر اسی کے ذریعے کوسٹ گارڈ کے جہاز تک پہنچ جاؤں گا۔

تنگ راستے سے اتر کر میں کھاڑی کی طرف گھوما اور آگے بڑھا تو راستے میں مجھے بلڈوزر اور اس کے دو ساتھی پڑے نظر آئے جو میری ہی چلائی ہوئی گولیوں سے زخمی ہوئے تھے۔ دونوں ساتھی بے ہوش تھے۔ صرف بلڈوزر ہوش میں تھا اور وہ بھی حرکت کرنے سے معذور تھا۔ مجھے دیکھ کر اس تکلیف کے عالم میں بھی اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

میں نے اس کے قریب رک کر ملائمت سے کہا "حیران ہونے کی ضرورت نہیں...... افضل کو تو مگرمچھ کھا چکے ہیں۔ میں تو صرف اس کی روح ہوں۔"

میں اسے اسی طرح حیران چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ مجھے معلوم تھا کہ جلد ہی ان لوگوں کو بھی کوسٹ گارڈ کے جہاز پر منتقل کرلیا جائے گا اور فوراً ہی ان سے دوسرے لوگوں کے بارے میں معلومات حاصل کرلی جائیں گی جو قصبے میں موجود تھے اور اس تجارت کے اہم ستون تھے۔ اس وقت تک کوسٹ گارڈ کے دوسرے آدمی خشکی کے راستے قصبے میں پہنچ چکے ہوں گے۔ انہیں جہاز سے وائرلیس پر ہدایات دی جائیں گی اور وہ ان لوگوں کو گرفتار کرلیں گے۔ اگر کوئی فرار ہوگیا تو بعد میں دوسرے اداروں کی مدد سے اسے تلاش کیا جائے گا۔

یہ سب کچھ سوچتا ہوا میں لانچ کی طرف پہنچا۔ پہلے میں نے اس میں چڑھ کر صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ چار افراد مر چکے تھے اور تین زخمی حالت میں پڑے کراہ رہے تھے۔ میں نے ان کے ہتھیار اٹھا کر انجن والے کیبن میں جمع کردیے۔ مبادا کوئی زخمی مجھے کسی اور طرف متوجہ پاکر کوئی گن اٹھا کر مجھ پر ہی غصہ نکال بیٹھے۔ انہوں نے میری کارروائی کے دوران میں کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ یقیناً ہمت ہار چکے تھے اور انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کا دھندا اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ وہ اب اپنے لیے مصائب میں اضافہ کرنا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے لانچ کو دھکا لگایا۔ اس میں کچھ زیادہ قوت صرف نہیں ہوئی اور لانچ ریت سے نکل گئی۔ اسے خود چلاتے ہوئے میں کوسٹ گارڈ کے جہاز تک پہنچا جو زیادہ دور نہیں تھا۔ لانچ کو میں نے اس کے پہلو میں لگادیا۔ میرے لیے موٹے رسّے کی ایک سیڑھی لٹکائی گئی۔ اس وقت تک دھات کی دوسری' طویل اور فولڈنگ سیڑھی کے ذریعے کارگوشپ کے عملے وغیرہ کی منتقلی کا کام جاری تھا۔

میں موٹے رسّے کی سیڑھی کے ذریعے اوپر جا پہنچا۔ جہاز کے لوئر ڈیک پر بہت سے افراد نظر آرہے تھے۔ صورتِ حال کوسٹ

گارڈ کے ہتھیار برداروں کے کنٹرول میں تھی۔ انہوں نے کارگو شپ سے آنے والے سفید فاموں کو ایک طرف دیوار کے ساتھ کھڑا رکھا۔ وہ نو دس تو ہی تھے۔ ابھی مزید افراد سیڑھی کے ذریعے آرہے تھے۔ نفیس صاحب، ٹونی اور شفیع شاہ بھی مجھے نظر آگئے۔ وہ تینوں نیوی والوں کی طرح سفید یونیفارم نما لباس میں تھے۔ ٹونی اور شفیع شاہ کے پاس ہلکی مشین گنیں تھیں۔

"مبارک ہو نفیس صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کسی نقصان کے بغیر خاصا اہم آپریشن مکمل ہو گیا ہے۔ اس سے شاید بہت بڑی بڑی سازشوں کی کڑیاں ملیں گی۔"

"ہاں..... لگتا تو یہی ہے..... ابھی ابھی مجھے پتا چلا ہے کہ اس جہاز پر ایٹمی تابکاری سے متاثرہ فاضل کیمیکل وغیرہ کے ڈرم بھی لدے ہوئے ہیں۔ یہ انتہائی مہلک مادّے بھی ہمارے ساحلوں پر نہ جانے کب سے پھینکے جارہے ہیں۔"

"واقعی.....؟" میں نے حیرت سے کہا "یہ افواہیں تو کافی عرصے سے سننے میں آرہی تھیں لیکن بعد میں انہیں محض افواہیں ہی قرار دے کر دبا دیا گیا تھا۔"

"ان افواہوں میں کافی حد تک حقیقت ہے۔ اس قسم کے جہاز کثیر المقاصد طریقوں سے ایک ایک چکر میں نہ جانے کیا کیا خدمات انجام دے کر جارہے ہیں۔" نفیس صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے "لیکن تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ یہ آپریشن بغیر کسی نقصان کے ہو گیا ہے۔ نقصان تو بہت بڑا ہوا ہے۔"

"وہ کیا.....؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

وہ خاموش ہی رہے پھر انہوں نے بے بسی سے ٹونی اور شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ ان میں گویا بولنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ تب میں نے محسوس کیا کہ ٹونی اور شفیع شاہ کے چہروں پر عجیب سی وحشت نظر آرہی تھی۔ پہلے میں اسے صورت حال کی کشیدگی اور تناؤ کا نتیجہ سمجھا تھا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس قسم کی معرکہ آرائی ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے سر جھکا لیا۔ ان میں بھی گویا بولنے کی ہمت نہیں تھی۔

نفیس صاحب تھوک نگل کر بولے "افضل.....! ہمارے پاس تمہارے لیے ایک بری خبر ہے..... ایک بہت ہی بری خبر.....!"

وہ تینوں ایک طرف کو ہٹ گئے اور تب میں نے دیکھا کہ عقب میں بینچ پر چادر سے ڈھکا ہوا کوئی انسانی جسم موجود تھا۔ میں نے ہولناک اندیشے کے تحت آگے بڑھ کر جھپٹ کر اس پر سے چادر ہٹائی۔ مجھے ابھی تک وہاں راحیلہ نظر نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ جہاز کے اپر ڈیک پر یا پھر کہیں اور مصروف ہو گی مگر وہ اس چادر تلے اس عالم میں موجود تھی کہ اس کی بائیں آنکھ سے ذرا اوپر پیشانی میں سوراخ تھا اور خون سے اس کا چہرہ اور سفید مردانہ قمیص کا کالر سرخ تھا۔ گولی غالباً اس کے سر سے پار نکل گئی تھی

لیکن پہلی نظر میں مجھے یہی گمان گزرا کہ یہ کسی قسم کا مذاق تھا کیونکہ اس کے چہرے پر اذیت کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ پہلے تو مجھے کچھ یونہی لگا تھا کہ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ یہ ایک بے روح اور منجمد سی مسکراہٹ تھی۔ میں نے بے اختیار اس کے سینے پر سر رکھ دیا۔ میں اس کی دھڑکنیں سننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی دھڑکنیں کسی شکستہ بربط کے تاروں کی طرح خاموش تھیں۔

مجھے کچھ یوں لگا جیسے آسمان ٹوٹ کر میرے سر پر آن گرا تھا اور زمین پیروں تلے سے نکل گئی تھی۔ کائنات کی ہر چیز تہس نہس ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود گویا صرف راحیلہ کے دل کی دھڑکنیں ہی خاموش نہیں تھیں بلکہ میرے چاروں طرف غضب کی خاموشی تھی۔ بعد از قیامت کا سکوت تھا۔ یہ سکوت ایک مہلک زہر کی طرح ہر مسام جاں سے میرے وجود میں اتر رہا تھا اور میرا رواں رواں مر رہا تھا۔

یک دم نہ جانے کس طرح میں سیدھا ہوا اور جب بولا تو مجھے خود اپنی آواز پھٹی پھٹی محسوس ہوئی "یہ کس طرح ہوا؟"

نفیس صاحب نے جہاز کی سائڈ کی طرف اشارہ کیا۔ لوہے کی موٹی دیوار میں گول گول سوراخوں کی ایک لائن موجود تھی۔ اس قسم کے جہازوں سے، ایسے سوراخوں سے گنیں نکال کر فائرنگ کی جاتی تھی۔ نفیس صاحب بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولے "اس سوراخ سے گن کی نال نکال کر یہ فائرنگ میں حصہ لے رہی تھی..... پھر سوراخ سے آنکھ لگا کر باہر کا جائزہ لینے لگی..... کارگو شپ سے فائرنگ ہو رہی تھی..... ایک گولی اسے لگ گئی..... ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے....."

میں نے قطار میں کھڑے سفید فاموں کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی کوئی خاص فکر مند یا شرمندہ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بڑی بے نیازی سے سب کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"فائرنگ تم لوگ کر رہے تھے؟" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں انگریزی میں پوچھا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ان میں سے کئی نے بے نیازی سے کندھے اچکا دیے۔ ایک البتہ سپاٹ اور جذبات سے عاری لہجے میں بولا "وی آر سوری....."

میرے ذہن میں یک دم ہی کوئی آتش فشاں پھٹ پڑا۔ کلاشنکوف اس وقت بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھے روک پاتا، میں نے کلاشنکوف سیدھی کی اور ان سب پر ایک برسٹ مار دیا۔ وہ سب ہی گرتے دکھائی دیے۔ میں شاید کندھے سے دوسری کلاشنکوف بھی اتار کر ان پر خالی کر دیتا لیکن مجھے چاروں طرف سے بیک وقت بہت سے لوگوں نے دبوچ لیا۔ شاید ان میں ٹونی اور شفیع شاہ بھی شامل تھے۔

آخری آواز جو میں نے سنی وہ نفیس صاحب کی تھی۔ وہ نہایت تاسف زدہ لہجے میں کہہ رہے تھے "تم نے بہت بُرا کیا افضل.....! تم نے بہت بُرا کیا....."

اس کے بعد میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا۔

○☆○

وہ میری زندگی کا ایک عجیب دور تھا۔ راحیلہ کی موت نے گویا مجھے اندر سے مار دیا تھا۔ دنیا کی ہر چیز میرے لیے بے معنی ہو چکی تھی۔ کسی کام میں دل نہیں لگتا تھا۔ ہر کام... کارِ زیاں لگتا تھا۔ ہر چیز بے مصرف معلوم ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ زندگی بھی! میری بے ثمر محبت اپنے پیچھے جو زخم چھوڑ گئی تھی، مجھے لگتا تھا کہ اسے وقت بھی کبھی نہیں بھر سکے گا۔ دوست، احباب، ساتھیوں اور شناساؤں نے اسی طرح سمجھایا جس طرح سمجھانے کا حق ہوتا ہے لیکن الفاظ میرے لیے اپنے معانی کھو چکے تھے۔ سب نے میری دلجوئی کی اپنی سی کوششیں کیں لیکن جو دل پارہ پارہ ہو چکا ہو وہ بھلا کیسے بہل سکتا تھا۔ زرتاج اور رحیم گل تقریباً روزانہ ہی میرے پاس آتے اور گھنٹوں بیٹھے مجھے سمجھاتے رہتے لیکن ان کے الفاظ گویا میرے شل ذہن اور یخ بستہ حواس کے آس پاس سے گزر جاتے۔

شفیع شاہ اور ٹونی کو زیادہ لفاظی نہیں آتی تھی لیکن بے چاروں سے جو بھی بن پڑتا تھا، کہتے رہتے تھے اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ میرے دل کا زخم اپنے سینے میں سجالیں اور خوشی اگر کہیں کوہ کاف میں بھی ملتی ہو تو لاکر میرے دامن میں ڈال دیں۔ لاہور کے سب ساتھی بھی آئے تھے۔ ہر ایک نے میرا دکھ بٹانے کے لیے اپنے سے جتن کیے تھے۔ آخر وہ انسان تھے۔ اتنا ہی کر سکتے تھے۔ کوئی معجزہ تو ان کے بس میں نہیں تھا۔

راحیلہ کو کراچی میں ہی ڈیفنس کے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا۔ پہلی چند راتیں تو میں روزانہ اس کی قبر پر جاتا رہا۔ میں قبر کے پاس بیٹھا گھنٹوں خیالوں ہی خیالوں میں اس سے باتیں کرتا رہتا۔ شاید میرا یہ عمل جاری رہتا اور رفتہ رفتہ مجھے دیوانگی کے قریب لے جاتا لیکن ہوا یہ کہ اس کے بعد خفیہ اداروں نے مجھے حراست میں لے لیا تھا۔

میری جذباتی حالت سے قطع نظر، یہ چکر میگھانی والے آپریشن کے بعد سے ہی چل رہا تھا۔ شاید مجھے اسی روز حراست میں لے لیا جاتا لیکن نفیس صاحب کا اثر رسوخ کام آگیا۔ دراصل سفید فاموں پر میرے برسٹ مارنے والا معاملہ بہت سنگین صورت اختیار کر گیا تھا۔ ان میں پانچ موقع پر ہی مر گئے تھے اور چار شدید زخمی تھے۔ وہ امریکی باشندے تھے۔ جہاز بھی امریکی تھا۔ ایف بی آئی کی ٹیم تفتیش کے لیے پہنچ گئی تھی۔ حکومت پر سخت دباؤ تھا۔ "الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے" والا معاملہ تھا۔ قرضوں کی معیشت میں جکڑے ہوئے ملکوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ آج کل بڑی طاقتیں کسی ملک کو غلام بنانے کے لیے فوجیں نہیں بھیجتیں، معاشی مشیر بھیجتی

ہیں۔ معیشت ان کے قابو میں آجائے تو آپ خود بہ خود ان کے اشاروں پر ناچنے لگتے ہیں۔ ہماری کرپشن، بے ہنگم سیاست، ایک دوسرے کے خلاف ہر وقت مصروفِ جہاد رہنے کی عادت، بے ایمانی اور حرام خوری نے ان کا کام بہت آسان کر دیا تھا۔

ان کے دباؤ کے تحت خفیہ اداروں نے مجھے حراست میں لے لیا تھا۔ نفیس صاحب نے میری صفائیاں پیش کرنے کی بڑی کوششیں کیں۔ انہیں بتایا کہ کس کس طرح، کن موقعوں پر میں نے وطن کی دشمن سرگرمیوں میں مصروف قوتوں کے خلاف لڑنے میں حسبِ مقدور ان اداروں کا ہاتھ بٹایا تھا لیکن کوئی میرے بارے میں ان کی وکالت پر کان نہیں دھر رہا تھا۔ وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ آدمی کرسی پر ہو تو شیر ہوتا ہے۔ کرسی چھن جائے تو لوگ اسے چوہا سمجھنے لگتے ہیں..... اور پھر یہاں تو معاملہ سُپر پاور کے دباؤ کا تھا۔ نفیس صاحب کو تو خود لینے کے دینے پڑتے نظر آرہے تھے۔ ان سے وضاحت طلب کی جارہی تھی کہ وہ اپنی خفیہ ایجنسی کی مہمات میں عام شہریوں کو کیوں شریک رکھتے رہے تھے؟

مجھے تفتیش کے بدنام زمانہ مراکز میں بھی لے جایا گیا لیکن غنیمت رہا کہ بات صرف پوچھ گچھ اور تفتیش تک ہی محدود رہی۔ دراصل باہر نفیس صاحب سمیت بہت سے لوگ میرے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے اس لیے میں بہت سے حربوں کا نشانہ اور تختۂ مشق بننے سے بچا رہا ورنہ عین ممکن تھا کہ میں غمِ جاناں کو بھی بھول جاتا۔ بہت سے ذمے دار افسران اس دوران میں مجھ سے سب سے زیادہ زور و شور کے ساتھ یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتے رہے کہ میں کسی ملک کا ایجنٹ تو نہیں تھا؟ جب بھی گھما پھرا کر کسی نہ کسی زاویے سے یہی سوال کیا جاتا، مجھے بے اختیار ہنسی آجاتی لیکن یہ وہ ہنسی ہوتی تھی جو کرب کی پیداوار ہوتی ہے، جس کی تہ میں خون کے آنسو مچل رہے ہوتے ہیں۔

بہت سے لوگوں کی کوششوں اور میرے اپنے بہت سے وسائل کے استعمال کے بعد میرا معاملہ عام پولیس اور عدالت کے سپرد کیا گیا جس کے بعد کارروائیوں کا سامنا ہمارے لیے کچھ آسان ہو گیا لیکن یہاں بھی پانچ کروڑ روپیا نقد زرِ ضمانت کے طور پر سرکاری خزانے میں جمع کرانے کے بعد میری ضمانت منظور ہوئی۔ اس کے ساتھ شخصی ضمانت بھی شامل تھی۔

شخصی ضمانت سیٹھ رمضان نے دی اور زرِ ضمانت یعنی پانچ کروڑ روپے سیٹھ واحد نے جمع کرائے حالانکہ میں نے بہت اصرار کیا کہ یہ رقم میں خود بھروں گا۔ میں کوئی ایسا گیا گزرا تو نہیں تھا، یہ رقم تو آسانی سے بھر سکتا تھا لیکن سیٹھ واحد نے بھرنے نہیں دی۔ اس کا کہنا تھا کہ دوستوں کو بھی تو دوستی کے اظہار کا کوئی موقع ملنا چاہیے تھا۔ سیٹھ رمضان نے میری شخصی ضمانت دی تھی، یہ بھی بہت بڑی بات تھی۔ میں جن اداروں کے زیرِ عتاب آگیا تھا اور جس پوزیشن میں تھا اس میں میری ضمانت دینا کسی کی حمایت میں

پھانسی کے پھندے تک جانے کے لیے تیار رہنے کے مترادف تھا۔ کاروباری دنیا میں اس قسم کے دوستوں کا میسر ہونا بڑی غیر معمولی بات تھی۔

میں بظاہر تو واپس آگیا تھا اور اپنے معمولات زندگی میں حصہ لینے کے لیے آزاد تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ چوبیس گھنٹے میری نگرانی ہو رہی تھی' میرے ٹیلی فون ٹیپ ہو رہے تھے شاید موبائل فون بھی بچا ہوا نہیں تھا۔ میں نے سنا تھا کہ موبائل فون کو بھی اس کے اپنے ڈیجیٹل ایکس چینج سے ٹیپ کرنے کی ٹیکنالوجی موجود تھی۔ ایف بی آئی کی ٹیم اپنی رپورٹ مکمل کر کے چلی تو گئی تھی لیکن امریکی دباؤ ابھی جاری تھا۔

انہی دنوں مجھے اس محاورے کے مبنی بر صداقت ہونے کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوا کہ مصیبت تنہا نہیں آتی۔ ایک رات میں زرتاج کے ہاں سے واپس آ رہا تھا کہ مجھے موبائل فون پر اطلاع ملی کہ میرے ہوٹل میں بم کا دھماکا ہوا تھا اور اس کا تقریباً ایک چوتھائی حصہ منہدم ہو گیا تھا۔ کئی لوگ مر گئے تھے اور بہت سے زخمی ہو گئے تھے۔ دل جو پہلے ہی زخم زخم تھا' اس خبر سے اس پر ایک گھاؤ کا اضافہ ہو گیا۔

میں جب ہوٹل پہنچا تو وہاں فائر بریگیڈ کی گاڑیاں اور ایمبولینس اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ سائرن گونج رہے تھے۔ پولیس بھی پہنچ چکی تھی۔ ایک ہجوم ہوٹل کے گرد جمع تھا۔ بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ میں گاڑی دوسری طرف کی سڑک کے کنارے روک کر ایک طرف بظاہر یوں کھڑا ہو گیا جیسے میں کسی اور کی تباہی کا نظارہ کرنے آیا تھا لیکن اس وقت میرے دل کی کیا کیفیت تھی' یہ میں ہی بہتر جانتا تھا۔

ہوٹل کی دائیں طرف کی تین منزلیں متاثر ہوئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا' بم ان میں سے کسی منزل پر رکھا گیا تھا۔ خوب صورت عمارت کے گویا پہلو میں شگاف پڑ گیا تھا اور وہ بد صورت نظر آنے لگی تھی۔ کافی حصے میں ملبا بکھر گیا تھا۔ کچھ نقصان اس سے بھی ہوا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آگ پر قابو پا لیا گیا تھا۔

دھیرے دھیرے یہ منظر میری آنکھوں کے سامنے دُھندلانے لگا۔ میں نے رخساروں پر ہاتھ پھیرا تو احساس ہوا کہ ان پر آنسوؤں کی نمی تھی۔ راحیلہ کی موت کے بعد یہ دوسرا موقع تھا جب میری آنکھوں میں آنسو آئے تھے۔ یہ ہوٹل میری نوجوانی کا ایک خوب صورت خواب تھا جو آج ٹوٹ گیا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کی مرمت ہو سکتی تھی' کسی نہ کسی طرح نقصان کا ازالہ ہو سکتا تھا' جانی نقصانات پر متعلقین کو دھیرے دھیرے صبر آ سکتا تھا لیکن اس ہوٹل کا اب کوئی مستقبل نہیں تھا۔ اس درجے کے جس ہوٹل میں دھماکا ہو جائے' آئندہ نہ جانے کتنے برسوں تک کوئی اس کا رخ کرنے کے بارے میں مشکل سے ہی سوچ سکتا تھا۔ چند منٹ بعد میں نے خاموشی سے آنکھیں خشک کر لیں۔ پھر مجھے جمال سعیدی یاد آگیا۔ اس نے کہا تھا "ہم دشمن کو ڈھیل دیتے ہیں۔ ہم کبھی ایسے وقت پر' ایسے موقع پر اور ایسے انداز میں جا کر اسے مارتے ہیں کہ اسے حیران ہونے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔ اس وقت خطرہ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔"

کچھ دیر بعد میں اپنے شکستہ خوابوں کی کرچیاں آنکھوں میں لیے اندر چلا گیا۔

دوسرے روز تک مجھے پتا چل سکا کہ مرنے والوں اور زخمی ہونے والوں میں کچھ مہمان' کچھ ریستوران وغیرہ میں آنے والے گاہک' دو تین ویٹر اور نیچے بنے ہوئے شاپنگ آرکیڈ کے کچھ دکان دار شامل تھے۔ باقی اسٹاف اور قریبی دوست بخیر و عافیت ہی رہے تھے۔ امبر تو اس وقت گھر جا چکی تھی۔ نونی اور شفیع شاہ ہوٹل میں ہی موجود تھے لیکن خوش قسمتی سے وہ بالکل محفوظ رہے تھے۔

یہ بھی غنیمت تھا کہ اس واقعے کی تفتیش آخر میں رحیم گل کے پاس ہی آگئی تھی ورنہ اس سے ذرا اونچے درجے کے افسروں نے عجیب ہی ٹیڑھے ٹیڑھے سوال جواب شروع کر دیے تھے۔ اب تو حکامِ بالا کی نظریں بھی بدل سی گئی تھیں۔ صرف ایک بے چارے نفیس صاحب تھے جو ریٹائر ہونے کے باوجود اب تک ہر معاملے میں میرے شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ ان کا جتنا بھی اثر و رسوخ باقی تھا وہ اسے میرے لیے کام میں لانے کی کوشش کرتے تھے۔

ہوٹل بھی میرے دل کی طرح اُجڑ سا گیا تھا۔ اسی اُجڑے ہوئے ہوٹل کے کافی بار میں بیٹھے ہوئے ایک روز میں نے ان سے پوچھا "آپ ان معاملات میں ماہر بھی ہیں اور آپ کی معلومات کے ذرائع ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے..... آپ کچھ تو رائے دیں کہ یہ ہوٹل میں بم بلاسٹ والی حرکت کس کی ہو سکتی ہے؟ مجھے ڈپلومیٹک نہیں' صحیح اور سچی رائے چاہیے۔ ویسے بھی اب آپ ریٹائر ہو چکے ہیں۔ آپ کو ڈپلومیٹک رائے دینے کی زیادہ ضرورت نہیں رہی۔ اب تو آپ سو فیصد سچ بول سکتے ہیں' بے لاگ رائے دے سکتے ہیں۔"

"جمال سعیدی۔" انہوں نے سگار کا طویل کش لے کر جواب دیا "وہ خود تو مفرور ہے لیکن اس کا نیٹ ورک یہاں کام کر رہا ہے۔ اس کے آدمی اس قسم کی کارروائیوں میں بہت ماہر ہیں۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی جس سے میرے سینے میں ایک ٹیس سی اٹھی مگر میں نے مسکراتے ہوئے کہا "نفیس صاحب! آپ اتنے بڑے' اتنے منظم' اتنے طاقت ور ادارے کے سربراہ تھے اس کے علاوہ بھی ملک میں دوسرے بڑے منظم ادارے مؤثر طور ایجنسیاں موجود ہیں جن پر اس غریب ملک کے بے شمار وسائل خرچ ہوتے ہیں۔ کہنے کو وہ سب کام کر رہے ہیں لیکن کیا یہ بات عجیب نہیں کہ دہشت گرد اور اس ملک کا خون چوس کر اپنی جیبوں میں بارود بھرنے والے اپنی تمام تر دہشت گردی اور ہر ایک قسم کے ناجائز کاروباروں کا جال پھیلانے کے بعد خطو سے آتے

ہی نہایت اطمینان سے ملک سے فرار ہو جاتے ہیں لیکن ان کے نیٹ ورک کام کرتے رہتے ہیں؟"

نفیس صاحب نے افسردہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر کرب کی لکیریں ابھر آئیں۔ وہ دھیمے لہجے میں بولے "اس کا جواب اتنا طویل ہے کہ میں بتانے لگا تو میری عمر گزر جائے گی اور تم بوڑھے ہو جاؤ گے۔ میں صرف اتنا ضرور کہوں گا کہ قصور وار صرف ہم ہی نہیں ہیں۔"

پھر وہ منہ پھیر کر دھیرے دھیرے سگار کے کش لینے لگے۔ مجھے معلوم تھا وہ اداس ہو چکے تھے۔ وہ اس موضوع پر مزید بات کرنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے بھی مزید کچھ نہ کہا۔ ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ اب مجھے کسی بھی بات کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا تھا۔

نفیس صاحب ان دنوں کراچی میں ہی مقیم تھے۔ کچھ عرصے بعد وہ اسلام آباد میں اپنے ذاتی مکان کی تعمیر شروع کرنا چاہتے تھے۔ اس کے لیے نقشہ وہ کراچی کے ایک آرکیٹکٹ سے بنوا رہے تھے لیکن وہ نقشے کی وجہ سے نہیں' ویسے ہی کراچی میں مقیم تھے۔

ایک روز اچانک رات گئے وہ بغیر کسی اطلاع اور بغیر کسی پروگرام کے میرے پاس پہنچے ورنہ وہ بڑے ضابطہ پسند آدمی تھے۔ فون کر کے' وقت طے کر کے آتے تھے یا مجھے اپنے پاس بلاتے تھے۔ وہ ڈیفنس میں اپنے بیٹے کے بنگلے پر مقیم تھے۔ وہ نہایت مشکل اور ناموافق حالات میں بھی اپنے چہرے سے فکر مندی کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے لیکن اس روز وہ کچھ فکر مند دکھائی دے رہے تھے۔ انہوں نے اپنے عقب میں دروازہ بھی کچھ خاص انداز میں بند کر کے باقاعدہ مقفل کیا۔

بیٹھتے ہی وہ بلا تمہید بولے "فضل! میرے پاس تمہارے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔"

"اچھی خبروں کا انتظار کرنا تو میں نے چھوڑ دیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امریکیوں کے قتل والا معاملہ ٹھنڈا پڑنے کے بجائے سنگین سے سنگین تر ہوتا جا رہا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولے "کبھی کبھی جذباتیت کا ایک لمحہ زندگی بھر کا روگ بن جاتا ہے۔"

"مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں ہے۔ اب تو یہ زندگی ہی ایک روگ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ زخم بھر جائیں گے لیکن میں نہیں چاہتا تم مزید جذباتیت میں پھنسے رہو۔ غور سے میری بات سنو۔ اس کے بعد تمہیں میری رہنمائی میں اور عقل و شعور کی مدد سے فیصلہ کرنا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم جیسا آدمی ایک نامنصفانہ سے قضیے میں الجھ کر رائگاں چلا جائے۔" وہ میری طرف جھکتے ہوئے نیچی آواز میں بولے گویا انہیں اندیشہ ہو کہ کمرا بگڈ BUGGED تھا' ہماری گفتگو کہیں سنی جا سکتی تھی۔

"تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ ریٹائر یا بے دخل ہو جانے کے بعد مجھ جیسے آدمی کی بھی کیا حیثیت رہ جاتی ہے لیکن پھر بھی..... کچھ نہ کچھ رابطے ہیں جو اب بھی کام آ رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کی آنکھوں میں میرے لیے شرم لحاظ ہے اس لیے کچھ نہ کچھ کام ہو جاتے ہیں' کچھ نہ کچھ اطلاعات بروقت مل جاتی ہیں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تمہیں جلد دوبارہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ کوئی بعید نہیں کہ عدالتی کارروائی کے بعد تمہیں یہیں عمر قید یا سزائے موت دے دی جائے۔ اگلے ماہ ایف بی آئی کی ایک خصوصی ٹیم یہاں آ رہی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تمہیں اس کے حوالے کر دیا جائے حالانکہ دونوں ملکوں کے درمیان مجرموں کے تبادلے یا تحویل کا معاہدہ باضابطہ طور پر موجود نہیں ہے..... لیکن تمہیں معلوم ہی ہے کہ..... ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات....."

"جرمِ ضعیفی کی نہیں..... جرمِ قرضہ خوری اور الف لیلوی قسم کے اللے تللوں کی....." میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ان سنی کرتے ہوئے بولے "اگر تمہیں ان کے حوالے کر دیا گیا تو پھر نہیں کہا جا سکتا کہ تمہارا مستقبل کیا ہو گا۔"

"وہ تو ویسے بھی اس دنیا میں کوئی انسان یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"یہ اس قسم کی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔ تم معاملے کی سنگینی کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" وہ سگار کو مضطربانہ انداز میں انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولے۔

"آپ کیا چاہتے ہیں؟" میں نے افسردگی کی کوکھ سے جنم لینے والی اپنی مسکراہٹ پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"میں چاہتا ہوں تم یہاں سے نکل جاؤ۔" وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولے۔

"نکل جاؤں..... کیا مطلب.....؟" میں ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"مطلب یہ کہ تم خاموشی سے لندن یا پیرس کی طرف نکل جاؤ..... بلکہ ان حالات میں فرار ہو کر گمنامی کی زندگی گزارنے کے لیے لندن زیادہ مناسب ہے۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولے۔

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں!" میں نے حیرت سے کہا "آپ کو معلوم ہے' میرا پاسپورٹ سرکاری تحویل میں ہے۔ میرا نام ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں ہے۔ اس کے علاوہ حالیہ تمام تر دھچکوں کے باوجود میرا یہاں کافی بڑا کاروبار پھیلا ہوا ہے۔ اس صورتِ حال میں بھلا میں کیسے نکل سکتا ہوں..... اور وہ بھی ہمیشہ کے لیے.....؟"

"میں ان تمام پہلوؤں کا جائزہ لینے کے بعد بات کرنے

تمہارے پاس آیا ہوں۔" وہ بدستور نیچی آواز میں بولے "مرا ہوا ہاتھی بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے۔ میرے اب بھی کچھ رابطے ہیں جو ہمارے کام آجائیں گے۔ تمہارے لیے یہیں سے دوسرے پاسپورٹ کا بھی انتظام ہوسکتا ہے لیکن ایگزٹ کنٹرول لسٹ میں نام ہونے کی وجہ سے تم یہاں سے جہاز میں سوار نہیں ہوسکو گے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم لانچ کے ذریعے دبئی کی طرف نکل جاؤ۔ اس کا بندوبست تم خود بھی کرسکتے ہو ورنہ سیٹھ واحد کردے گا۔ یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کام ہے۔ وہاں تم دو چار دن گزارنا۔ اس کے بعد ایک شخص آکر تم سے ملے گا۔ وہ تمہیں تمہارا اپنا پاسپورٹ دے گا جس پر پاکستان سے تمہارے ایگزٹ اور دبئی میں انٹری کی مہر وغیرہ بھی ہوگی۔ ویزا وغیرہ بھی موجود ہوگا۔ اس پاسپورٹ کے ذریعے تم وہاں سے لندن کی طرف پرواز کرجانا۔ رابطے کا طریقہ میں تمہیں بتا دوں گا۔ اس کے ذریعے تم مجھے اپنے پتے وغیرہ سے آگاہ کرتے رہنا۔ وہاں بھی تمہیں ہر قسم کی مدد اور رہنمائی میسر آتی رہے گی۔ سیٹھ واحد بھی اس ضمن میں بہت کارآمد ثابت ہوگا۔"

"اور یہ جو چوبیس گھنٹے میری نگرانی ہورہی ہے؟" میں نے کہا۔

"ضرورت کے وقت انہیں غچا دینا اور دو چار گھنٹوں کے لیے ان کی نظر سے اوجھل ہونا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ جب برے لوگ انہی طریقوں سے فرار ہوسکتے ہیں' ہر شعبے میں ان کے بھی کچھ نہ کچھ ہمدرد نکل آتے ہیں تو پھر ایک اچھا آدمی کیوں نہیں نکل سکتا۔"

"اچھا ہونا مجھے کافی مہنگا پڑ رہا ہے۔" میں ایک بار پھر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

"کبھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے۔ ان راستوں پر کبھی کبھی تو اس سے بھی کہیں زیادہ تکلیفیں اٹھانی پڑجاتی ہیں۔ تمہیں تو انشاءاللہ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ آزمائشیں تو مردوں پر آتی ہی رہتی ہیں...." انہوں نے ہاتھ بڑھا کر میرا کندھا تھپکا پھر سگار کا کش لے کر بولے "ضروری نہیں کہ تم ہمیشہ کے لیے باہر رہو۔ ہم حالات کا جائزہ لیتے رہیں گے۔ ویسے امریکی اس قسم کے کیسوں کی فائل کبھی بند نہیں کرتے لیکن اگر کبھی حالات سازگار دکھائی دیے تو تم واپس آجانا۔ تب تک تمہارے ساتھی یہاں تمہارا بزنس چلاتے رہیں گے۔ اگر چند برس بعد ضرورت پڑی تو میں کوشش کروں گا کہ رفتہ رفتہ تمہارا بزنس یہاں وائنڈ اَپ کرکے تمہارا پیسا ہانگ کانگ یا سوئزرلینڈ کے توسط سے وہیں پہنچایا جاسکے جہاں تم اس وقت رہ رہے ہوگے۔"

"کیا عجیب بات ہے کہ ایک ملک کی کمپنی کارگو کی آڑ میں ہمارے ہاں اسلحہ اسمگل کرتی ہے۔ ہمارے ساحلوں کو تابکاری کے مہلک اثرات سے آلودہ کرتی ہے۔ اس کے آدمی ہمارے حساس سرکاری اداروں سے فائرنگ کا تبادلہ کرتے ہیں' اس میں میری ہونے والی بیوی ماری جاتی ہے.... اور ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے کئی مہمات میں جان ہتھیلی پر رکھ کر ملک دشمن طاقتوں سے ٹکر لی.... ان حالات میں ایک جذباتی لمحے میں اگر اس مجرم کمپنی کے کچھ آدمی میرے ہاتھوں مارے جاتے ہیں تو میں اپنی حکومت کے بھی زیرِ عتاب ہوں اور وہاں والے بھی مجھے بھیڑ بکری کی طرح ہانک کر لے جانے کی تیاری کررہے ہیں۔" میں نے حقیقتاً متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"آج کی دنیا میں بھی "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کا پرانا قانون چل رہا ہے۔" نفیس صاحب نے ٹھنڈی سانس لی "اس کے باوجود شاید ایسی نوبت نہ آتی لیکن ہمارے ملک میں جس انداز کی سیاست ہوتی رہی ہے اور جس طرح حکومتیں چلائی جاتی رہی ہیں اس کا نتیجہ یہی نکلنا تھا۔ کچھ لوگوں کے اعمال کی سزا بہت زیادہ لوگوں کو.... بلکہ پوری قوم کو بھگتنا پڑتی ہے۔"

کمرے میں ایک لمحے بوجھل سی خاموشی رہی پھر میں نے کہا "آپ مجھے لندن جانے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ وہ بھی ایک طاقت ور اور ترقی یافتہ مغربی ملک کا دارالحکومت ہے۔ ہم ایشیائیوں کی ٹانگ کھینچنے' انہیں سزا دینے اور نقصان پہنچانے کا سوال آتا ہے تو یہ ملک اپنے اختلافات بھلا کر ایک ہوجاتے ہیں۔ کیا امریکی حکومت وہاں سے مجھے زیادہ آسانی سے نہیں کھینچ لے گی۔"

"تم وہاں بالکل ایک گمنام آدمی بن کر رہنا۔ نمایاں ہونے کی قطعاً کوئی کوشش نہ کرنا۔ کسی دور افتادہ مضافاتی علاقے میں رہائش اختیار کرلینا۔" نفیس صاحب نے مشورہ دیا۔

"یہاں میری شخصی ضمانت سیٹھ رمضان نے دی ہوئی ہے میں تو جرمِ بے گناہی کی لپیٹ میں ہوں ہی.... لیکن میرا ضمیر یہ گوارا نہیں کرتا کہ ایک دوست کو اس کی ہمدردی کے عوض زیادہ بڑی مصیبت میں ڈال جاؤں اور خود جان بچا کر نکل جاؤں۔ میرے فرار سے اس کی شامت آجائے گی۔ میں خود پھانسی چڑھ جانا یا کسی جیل میں باقی عمر گزار لینا اس سے بہتر سمجھتا ہوں۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

"تم سے بات کرنے سے پہلے میں سیٹھ رمضان سے بات کرکے آرہا ہوں۔ اسے اندھیرے میں رکھنا میں نے بھی گوارا نہیں کیا۔" نفیس صاحب نے سرگوشی میں یہ بتا کر مجھے حیران کردیا "ضامن کی زیادہ شامت نہیں آتی۔ جب اصل شکاری نکل جائے تو کوئی نقشِ قدم کو پیٹ کر کیا کرے گا۔ اس کے باوجود میں نے سیٹھ رمضان کے تحفظ کے بارے میں بھی سوچ لیا ہے۔ اسے ہم سال ڈیڑھ سال کے لیے علاقہ غیر کی طرف نکال دیں گے۔ امید ہے اتنے عرصے بعد وہ واپس آکر گردن نیچی رکھ کر باقی زندگی گزار سکے گا۔ وہ یہ قربانی دینے کے لیے بھی تیار ہے۔"

"شکر ہے زندگی میں چند ایسے لوگ بھی میرے دوست بن گئے تھے جو بظاہر زیادہ اچھے دکھائی نہیں دیتے مگر بہت سے اچھوں سے اچھے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کل ہی سے یہ انتظامات شروع کردوں گا۔" نفیس

صاحب کی آواز کچھ اور نیچی ہوگئی "مجھے اس ضمن میں اگر کوئی بات کرنی ہوا کرے گی تو میں خود آکر کروں گا اور اگر تمہیں کوئی بات کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اس نمبر پر فون کرکے مجھے بلوا لینا...." انہوں نے ایک کاغذ پر مجھے ایک نمبر گھسیٹ کردیا "اور اس سلسلے میں تم ہمیشہ پبلک فون سے فون کرنا۔ تمہارے اپنے ہوٹل کے قریب اسی سڑک کے کونے پر بھی پبلک فون موجود ہے۔ ہر ممکن احتیاط کرنا۔ تمہاری نگرانی نرم کرانے کے سلسلے میں بھی میں ہی میں کچھ انتظامات کرتا ہوں۔"

"یعنی آپ نے مجھے دھکا دینے کا تہیہ کرہی لیا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔" وہ خفیف سی افسردگی سے بولے "ورنہ جو کچھ ہونے کا اندیشہ ہے' اگر وہ ہوگیا تو میری اپنی باقی زندگی بھی مزید پچھتاووں میں ہی گزرے گی۔ تم صبح سے ہی تیاریاں شروع کردو۔ کل کے بعد تمہیں کسی وقت بھی روانہ ہونے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔"

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ میرے اندر ایک عجیب سی کشمکش جاری تھی۔ ایک مجبور کشمکش....! ان کے جانے کے بعد میں اپنے کمرے کی کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ رات ڈھل رہی تھی مگر سڑک پر اس وقت بھی کچھ ٹریفک تھا۔ رنگین شیشے کے پار روشنیاں متحرک نظر آرہی تھیں۔ گو رات کے سکوت اور سناٹے کا احساس بھی غالب تھا مگر زندگی بھی رواں دواں تھی۔ زندگی اسی طرح رواں دواں رہتی ہے۔ چھوٹے بڑے کردار آتے جاتے رہتے ہیں۔

اس لمحے میرا دل اپنے خالق سے سرگوشیاں کرنے لگا "اے ربِ کائنات! میں تیرا ایک بہت ہی حقیر اور گناہ گار سا بندہ ہوں۔ سراپا گناہ.... سراپا لغزش.... میری اپنی زندگی کا آغاز کچھ اچھا نہیں تھا لیکن جونہی مجھے تھوڑی سی سمجھ' تھوڑی سی عقل عطا ہوئی میں نے صحیح کو صحیح اور غلط کو غلط سمجھنے کی کوشش کی۔ بشری کمزوریاں مجھ پر غالب رہیں تو میں ان پر شرمندہ رہا۔ میں نے ہمیشہ اچھائی اور اچھی قدروں کو افضل سمجھا اور میرا ایمان رہا کہ جیت ہمیشہ اچھائی اور اچھی قدروں ہی کی ہوتی ہے خواہ راستے میں کتنی ہی مشکلات آئیں اور برائی خواہ کتنی ہی طاقتور ہوتی نظر آئے لیکن شکست اس کا مقدر ہوتی ہے۔ اس کا عروج عارضی اور ناپائیدار ہوتا ہے۔ یہی سوچ کر میں اچھائی اور اچھی قدروں کے لیے اپنی بساط کے مطابق لڑتا بھی رہا۔ اس راستے میں تو نے بھی میری مدد کی۔ تبھی میں بعض ایسے کام کرنے میں بھی کامیاب ہوا جو بظاہر ناممکن نظر آتے تھے۔ اب جو مجھ پر یہ مشکلات سی آئی ہیں ان سے بھی میرا ایمان' میرا نظریہ متزلزل نہیں ہوا ہے۔ شاید مجھ سے ہی غلطی سرزد ہوئی۔ شاید میرے سارے طریقے ہی غلط تھے۔ شاید مجھے زندگی گزارنے کا ڈھب ہی نہیں آیا.... لیکن کچھ بھی سہی.... مجھے امید ہے یہ مشکلات عارضی ہوں گی.... تجھے منظور ہوگا تو میں پھر واپس آؤں گا۔ تجھے منظور ہوگا تو تیری ذاتِ لازوال پھر مجھ سے کوئی کام لے گی۔ تجھے منظور ہوگا تو میرے یہ کمزور ہاتھ پھر بہت طاقتور ہوں گے۔ یوں تو یہ زندگی بھی بہت مختصر.... بہت عارضی ہے.... لیکن یہ اتار چڑھاؤ اس سے بھی مختصر' اس سے بھی زیادہ عارضی ہیں۔ اگر یہ کوئی آزمائش ہے تو اس میں پورا اُترنے کی طاقت بھی مجھے تو ہی عطا کرے گا۔ میری زندگی کی کشتی بہرحال تیرے ہی سپرد ہے۔ تو میرا خدا ہی نہیں' میرا ناخدا بھی ہے۔ تو جدھر لے جائے گا میں بصد خوشی اُدھر ہی جانے کو تیار ہوں۔"

دل ہی دل میں خالقِ کائنات سے یہ سرگوشیاں کرنے کے بعد گویا مجھے قرار سا آگیا۔ بہت دنوں سے دکھ سے بوجھل دل جیسے یک دم ہلکا پھلکا سا ہوگیا اور میں آرام سے سوگیا۔

میں نے نفیس صاحب کی تجویز قبول کرلی۔ شاید اسی میں واقعی میری بہتری تھی۔ دل ویسے بھی کچھ اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ اگلے دو دنوں میں سب تیاریاں مکمل ہوگئیں۔ مجھے اپنے ساتھیوں کو جو کچھ سمجھانا تھا' سمجھا دیا۔ تیسری رات بارہ بجے سے کچھ پہلے ایک ویٹر چائے کی ٹرے اور لانڈری شاپ کا ایک بڑا لفافہ لیے میرے کمرے میں آیا۔ دروازہ اپنے عقب میں بند کرنے کے بعد اس باوردی ویٹر نے اپنی ٹوپی اتاری اور زیرِ مونچھ مسکرایا۔ وہ نفیس صاحب تھے۔ ان کی مونچھیں نقلی تھیں جو انہوں نے اتار کر مجھے دے دیں۔

لانڈری کا بڑا پلاسٹک بیگ وہ بیڈ پر پھینکتے ہوئے بولے "اس میں ویٹر کی دوسری یونیفارم ہے۔ تم جلدی سے یہ پہن لو۔ میں یہیں بیٹھوں گا۔ تم ٹرالی لے کر باہر چلے جاؤ۔ عقبی دروازے سے ہوٹل سے نکلنا۔ سب تیاریاں مکمل ہیں۔ سب کچھ اسی طرح ہے جس طرح میں نے تمہیں بتایا تھا۔ تمہارا سامان لانچ پر پہنچ چکا ہے۔"

"اوکے سر!" میں نے انہیں سلیوٹ کیا اور پلاسٹک بیگ اٹھا کر باتھ روم میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد میں باہر آیا تو انہی کی طرح ویٹر معلوم ہورہا تھا۔ وہ ویٹر کی وردی میں ایک صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھے سگار پی رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھے اور مجھے گلے سے لگا کر میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولے "گڈ لک مائی بوائے....! اینڈ ڈونٹ بی ڈس ہارٹنڈ...."

"آئی ایم ناٹ ڈس ہارٹنڈ ایٹ آل سر!" میں نے ان سے الگ ہوکر مسکراتے ہوئے کہا اور ٹرالی دھکیلتا ہوا باہر چلا گیا۔

نیچے پہنچ کر ٹرالی کچن میں چھوڑ کر جب میں ہوٹل کے عقبی دروازے سے باہر نکلا تو رحیم گل ایک پولیس موبائل لیے گلی میں موجود تھا۔ وہ موبائل میں اکیلا تھا' وردی میں تھا اور ڈرائیونگ سیٹ پر تھا۔ میں خاموشی سے اس کے برابر جا بیٹھا۔ ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ پولیس موبائل میں جانے کا فائدہ یہ تھا کہ اسے راستے میں روکے جانے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔

چند منٹ بعد ہی ہم کیماڑی جا پہنچے۔ اندر نشیب میں جہاں سے دن میں کرائے کی لانچیں چلتی تھیں وہاں ایک بڑی سی تقریباً نئی اور کیبن والی لانچ سیڑھیوں سے لگی کھڑی تھی۔ بس اسٹاپ نما

حصے میں سیٹھ رمضان' سیٹھ واحد' ان کے مسلح گارڈز' ٹونی' شفیع شاہ' امبر' زرتاج اور صفیہ موجود تھیں۔ وہ سب الگ الگ مقامات سے الگ الگ گاڑیوں میں وہاں پہنچے تھے اور مجھے معلوم تھا کہ یہاں باہر انہوں نے اپنی اپنی گاڑیاں اِدھر اُدھر چھوڑی تھیں۔

میں چند لمحے ان سب کے گھیرے میں کھڑا رہا۔ سب خاموش تھے۔ شاید کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بولا جائے۔ آخر میں نے ہی یہ سکوت توڑا "تم سب تو اس طرح خاموش ہو جیسے میرے جنازے کو کندھا دینے آئے ہو۔"

"بکواس مت کرو۔" رحیم گل نے مجھے ڈانٹ پلائی۔

"ہاں... بدفال منہ سے نکالنے کی ضرورت نہیں۔" زرتاج نے مجھے گھونسا دکھایا لیکن میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں نمی چمک رہی تھی۔

سیٹھ واحد ایک ہاتھ سے رومال ناک پر رکھ کر شوں شوں کرتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولا "میں نے اپنے دبئی' لندن اور پیرس آفس کو فون کر دیے ہیں۔ کوئی بھی مسئلہ ہو وہاں جا کر صرف اپنا نام لے دینا۔ سب کچھ حاضر ہو جائے گا... اور اگر کبھی مجھے یہاں فون کرنے کی ضرورت پیش آئے تو اماں جی والے فون پر کرنا۔"

"بہت بہتر... اور بہت شکریہ مائی ڈیئر! شاید یہ درویش تمہیں مزید زحمت نہ دے۔" میں نے اس سے گلے ملتے ہوئے کہا "اور دیکھو... تم اماں جی کا بتایا ہوا جوشاندہ ضرور پی لیا کرو۔"

"پی لوں گا... پی لوں گا یار...! اس وقت تو یہ کم بخت جوشاندہ کہاں سے بیچ میں آگیا۔" وہ ہلکی سی کھانسی کے ساتھ بولا "دیکھو... جوشاندے کے نام کے ساتھ ہی کھانسی شروع ہو گئی۔"

میں نے سیٹھ رمضان سے گلے ملتے ہوئے کہا "میری وجہ سے شاید تمہیں بہت تکلیف اٹھانی پڑے۔ اس کے لیے میں پیشگی معافی چاہتا ہوں۔"

"یار...! ایسی فضول رسمی باتیں کائے کو کرتا ہے۔" سیٹھ رمضان گلوگیر آواز میں بولا پھر اس نے اپنے گارڈ سے کلاشنکوف لے کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اگر تو سمجھتا ہے کہ ہم تیری خاطر اتنی قربانی بھی نہیں دے سکتے تو یہ لے... مجھ منحوس کو ابھی گولی مار دے اور لاش سمندر میں پھینک دے۔ ایسی زندگی سے تو بہتر ہے سیٹھ رمضان کو مچھلیاں کھا جائیں۔"

"وہ تو ایک نہ ایک دن کھائیں گی ہی... اور اس کی وجہ سے ان کے معدے بھی خراب ہوں گے۔" میں نے اس کا گال پر بوسہ دیتے ہوئے کہا "کیونکہ تو آدمی نہیں 'ہیرا ہے ہیرا۔"

سیٹھ رمضان ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھنے لگا۔ صفیہ سے گویا رہا نہ گیا۔ وہ میرا بازو پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔ میں نے دیکھا اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ وہ دھیمی لیکن گلوگیر آواز میں بولی "سر! آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیے۔ میں یہاں رہنا نہیں چاہتی... میں آپ کے ساتھ جانا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہیں اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا صفیہ ڈیئر! میرے اکیلے جانے کا بندوبست ہی مشکل سے ہو رہا ہے۔ دوسرے میں تم سے شادی نہیں کر سکتا..."

"شادی کرنے کو کون کہہ رہا ہے۔" وہ تڑپ کر بولی "آپ مجھے نوکر کے طور پر اپنے ساتھ رکھ لیجیے۔ میں زندگی بھر آپ کی خدمت کروں گی۔ آپ کا ہر کام کروں گی۔"

"تم بہت اچھی لڑکی ہو صفیہ! نوکر بننا تمہارا منصب نہیں ہے۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا "تمہیں ابھی بہت ترقی کرنی ہے۔ جب تم ایک کامیاب اور دولت مند لڑکی بن جاؤ گی تو کوئی اچھا سا لڑکا دیکھ کر اس سے شادی کر لینا۔"

"ترقی... دولت... اچھا سا لڑکا... ہونہہ... مائی فٹ...!" اس نے غصے سے کہا اور دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا لیا۔ آنسو اس کے ہاتھوں کے درمیان سے امنڈتے دکھائی دینے لگے۔

سیٹھ واحد نے اپنے مخصوص مضطربانہ انداز میں پکارا "ٹائم ہو رہا ہے۔ تمہیں صبح کا اُجالا نمودار ہونے سے پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیے۔"

میں صفیہ کو بازو سے پکڑ کر باقی لوگوں کے پاس واپس لے آیا۔ وہ بلا جھجکاہٹ زار و قطار رو رہی تھی اور کسی کو بھی اس کے آنسوؤں کی طرف توجہ دینے کا خیال نہیں تھا۔ زرتاج میرا اور رحیم گل کا ایک بازو تھامتے ہوئے مرتعش آواز میں بولی "ہم دونوں بہت جلد تم سے ملنے آئیں گے... تم جہاں بھی ہوئے ہم وہیں آئیں گے..."

"ضرور۔" میں نے اس کا اور رحیم گل کا کندھا تھپتھپایا "مگر روانہ ہونے سے پہلے شادی کرنا نہ بھول جانا۔ ہنی مون کے اخراجات میرے ذمے..."

"تم بہت..." آواز زرتاج کے حلق میں دم توڑ گئی۔ شاید اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مجھے کیا کہے۔

میں ان سب کو خدا حافظ کہہ کر کائی اور سیلن سے تعفن زدہ سیڑھیاں اتر کر لانچ میں پہنچا۔ لانچ کے باوردی کیپٹن اور اس کے ایک ساتھی نے میرا استقبال کیا۔ باقی لوگ اوپر کھڑے رہ گئے۔ چند لمحے بعد لانچ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ حرکت میں آگئی۔ میری زندگی کا ایک طویل باب ختم ہو رہا تھا... اور شاید ایک نیا باب شروع ہونے کو تھا۔ لانچ ایک نئے راستے پر' ایک نئی منزل کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔

میں دیر تک پچھلے حصے میں کھڑا کنارے پر کھڑے ہیولوں کی طرف دیکھ کر ہاتھ ہلاتا رہا حتیٰ کہ وہ میری آنکھوں کے سامنے دُھندلانے لگے۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کی وجہ فاصلہ تھی... یا میری آنکھوں میں نمی آگئی تھی۔

(ختم شد)

سرکش

2

محمود احمد مودی

24

کافی دیر تک تو میں اس ڈائری کے اوراق پلٹنے کی
ہمت ہی نہ کر سکا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے ہاتھوں
میں لرزش ہے اور میں نہیں چاہتا تھا کہ راشد اس لرزش کو
محسوس کر سکے۔ کئی بار میں ویران سرحدی علاقوں میں رینجرز
میں گھر چکا تھا اور وہ بھی اس عالم میں کہ وہ اندھا دھند گولیاں
برسا رہے ہوتے تھے اور میں جوابی فائرنگ کر رہا ہوتا تھا لیکن
اس وقت بھی کبھی میرے ہاتھوں میں لرزش نہیں آئی تھی۔
میں خود بھی حیران تھا کہ آج کیا میں موت و حیات کی کشمکش
سے بھی زیادہ سنگین مسئلے میں الجھ گیا ہوں جو میری یہ حالت
ہو رہی ہے کہ دل ڈوبا جا رہا ہے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا
چھا رہا ہے۔

میں نے اپنے آپ پر لعنت بھیجی اور بظاہر بڑی بے پروائی
سے ڈائری کے ورق الٹنے لگا۔ ہر صفحے پر مختصری تحریر تھی اور
بیشتر تحریروں کا تعلق میری ذات سے نہیں تھا۔ پھر وہ تاریخیں
شروع ہوئیں جن دنوں میں کراچی گیا تھا۔ ان تاریخوں میں میرا
ذکرہ شروع ہوا۔ ایک جگہ لکھا تھا:۔

"آج ساحل پر پانچ بدمعاشوں سے معرکہ رہا۔ بڑا لطف آیا۔
ہم نے مار مار کر ان کا بھرکس نکال دیا" اے "بھی اچھا فائٹر ہے۔
جاندار آدمی ہے۔ داؤ پیچ بھی خوب جانتا ہے۔ تعلیم یافتہ زیادہ
نہیں ہے۔ مگر رموز جانتا ہے۔ ہر طرح کے لوگوں میں اٹھ
بیٹھ سکتا ہے اور سلیقے کی گفتگو بھی کر سکتا ہے۔ غرضیکہ اس
میں بہت سی خوبیاں ہیں جو بہت سی لڑکیوں کو اس سے محبت
کرنے پر مجبور کر سکتی ہیں مگر میں اس سے کبھی محبت نہیں
کر سکتی۔ جانے کیوں؟ لیکن میں سوچتی ہوں کہ دل لگی میں کیا
حرج ہے۔ ایسے جذباتی آدمیوں کو الو بنانے میں بڑا لطف
آتا ہے۔ ویسے جب تک میں اس سے ملی نہیں تھی اور
صرف غائبانہ طور پر اسے جانتی تھی تو اس کے لئے میرے دل
میں ممنونیت اور عزت تھی کیونکہ اس نے راشد کو خرکاروں
کے چنگل سے نکالا تھا اور ایک طرح سے ہمارے گھرانے کو
تباہی سے بچایا تھا۔ اس سے ملنے کے بعد بھی گو کہ ممنونیت
کے جذبات میرے دل میں باقی ہیں مگر نہ جانے کیوں میرا اسے
دکھ پہنچانے کو دل چاہنے لگا ہے۔ میں خود بھی اپنی اس نفسیاتی
کیفیت کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ شاید یہ بھی اذیت پرستی ہی کی
کوئی قسم ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ
شخص میرا حریف ہے اور میں اسے نیچا دکھانا چاہتی ہوں اور کبھی
میں سوچتی ہوں کہ شاید میں اس لئے اس کا دل دکھانا چاہتی
ہوں کہ یہ مجھے کوئی اچھا شخص معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی
زندگی میں کوئی نہ کوئی خفیہ پہلو ضرور ہے۔ کہیں نہ کہیں کوئی
نہ کوئی کجی ضرور ہے — یہ بات بہرحال طے ہے کہ یہ شخص
اتنا بھولا، سیدھا اور بے ضرر نہیں جتنا کہ نظر آتا ہے۔ ابو کو بھی
اس کے بارے میں کوئی شک ضرور ہے لیکن ابو بہت گہرے
آدمی ہیں۔ وہ کسی کے بارے میں اپنی رائے کسی پر ظاہر نہیں
کرتے۔ اپنے پیاروں پر بھی نہیں۔"

اس سے آگے لکھا تھا۔

"آج تو موصوف نے اظہار محبت کر ہی دیا۔ میں نے بھی

بڑی معصومیت سے اس اظہارِ محبت کو قبول کرلیا ہے۔ عہد و پیماں بھی ہو گئے ہیں اور میں نے بڑی سنجیدگی سے اس ڈرامے کو حقیقت کا رنگ دیا ہے۔ مجھے تو یہ محبت وغیرہ بڑی فضول چیز لگتی ہے۔ آج کی دنیا میں ان افسانوی چیزوں کی گنجائش کہاں؟ ہاں ' بس اتنا ضرور ہے کہ کوئی آپ کو اچھا لگتا ہے اور کوئی برا۔

جو اچھا لگتا ہے اس کے بارے میں سوچیں کہ اس کے ساتھ آپ کی زندگی عمدگی سے گزر سکتی ہے یا نہیں؟ اگر گزر سکتی ہے تو سیدھی طرح اس سے شادی کرلیں۔ اللہ اللہ خیر صلاّ۔ فراق میں آہیں بھرنا.... راتوں کو تارے گننا... یہ سب فضول باتیں ہیں۔ کہنے اور سننے میں تو یہ باتیں اچھی لگتی ہیں مگر عملی دنیا میں اگر انسان ان چکروں میں الجھ جائے تو دیوانہ ہی ہو جائے۔ اور میرا فی الحال دیوانی ہونے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

اس سے اگلے صفحے پر لکھا تھا۔

"میری چھٹی حس عام طور پر مجھے لوگوں کے بارے میں ٹھیک ہی بتاتی ہے۔ میرا شبہ درست ہی نکلا۔ موصوف اسمگلر معلوم ہوتے ہیں۔ آج "اے" کو سیٹھ واحد کی گاڑی لینے آئی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کے مراسم اور روابط اونچی جگہوں پر ہیں۔ ہوسکتا ہے یہ سیٹھ واحد ہی کا کارندہ ہو۔ مجھے تو اب گھر میں اس کی موجودگی سے الجھن ہونے لگی ہے۔ کہیں اس کی وجہ سے ہم بھی کسی سرکاری ایجنسی کی نظر میں نہ آجائیں۔

"موصف ہیں تو اسمگلر اور خوش فہمی انہیں یہ ہے کہ میں ان سے شادی کرلوں گی۔ اونہہ! اگر اسمگلنگ کی لائن میں موصوف دولت کے انبار بھی لگالیں تب بھی میں ان سے شادی کا تصور تک نہیں کرسکتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک بہتر اور پُرمسرت زندگی گزارنے کے لئے دولت کو بہت اہم سمجھتی ہوں لیکن میں ہرگز نہیں چاہتی کہ وہ دولت اسمگلنگ کے ذریعے حاصل کی گئی ہو اور اس کے تحفظ کی کوئی ضمانت نہ ہو۔ مجھے دولت کے ساتھ ساتھ تحفظ بھی چاہئے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ آج آپ کا شریکِ حیات لکھ پتی یا کروڑ پتی ہو اور کل کو وہ اچانک قانون کی یا حالات کی گرفت میں آجائے تو رسوائی الگ ہو اور عین ممکن ہے کہ آپ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو جائیں۔ خیر... یہ بحث تو الگ ہے "اے" مجھے ویسے ہی پسند نہیں۔ میں تو جمیل سے شادی کروں گی۔ جمیل ہماری طرح کاروباری خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ والدین کا اکلوتا لڑکا ہے۔ خوبصورت اور وجیہہ ہے۔ باہر سے ایم بی اے کرکے آیا ہے۔ ویسے بھی کافی پڑھا لکھا ہے۔ ہر لحاظ سے موزوں نوجوان ہے۔ ابو بھی اسے بہت پسند کرتے ہیں اور ابو کو یقیناً میرے فیصلے سے خوشی ہوگی۔ جمیل کے بارے میں جو بات مجھے سب سے زیادہ پسند آئی ہے وہ یہ کہ اس نے آج تک گھٹیا اور افسانوی عاشقوں کی طرح مجھ سے اظہارِ محبت نہیں کیا لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھے پسند کرتا ہے۔ میرے لئے اس کی طرف سے رشتے کا پیغام ضرور آئے گا اور اس وقت مجھے ہاں کہنے میں ایک لمحے کا بھی تامل نہ ہوگا۔"

اس سے آگے بھی ڈائری میں میرے اور جمیل ۔

ے میں کافی کچھ لکھا ہوا تھا لیکن میرے لئے صورتِ حال کو حیلہ کی سوچ کو اور راہِ محبت میں اپنے مقام کو سمجھنے کے لئے ہی کافی تھا۔ میرے خیال میں اس وقت میرے تن بدن میں ۔ لگ جانی چاہئے تھی۔ میری سانسوں میں شعلوں کی ں آجانی چاہئے تھی اور میری زبان پر لفظوں کا آتش فشاں ٹ پڑنا چاہئے تھا لیکن اس کے برعکس میں ڈائری بند کرکے ں راشد کو تھمانے کے بعد بھی قطعی خاموش رہا۔

من مندر میں جیسے ایک بے عنوان سناٹا اور برف زاروں کی یخ بستگی پھیل گئی تھی۔ کہیں کوئی آواز رہی تھی نہ کسی ۔ے کی آہٹ۔ کہیں خواہشوں کی تپش رہی تھی نہ کسی طرب خیال کی چنگاری۔ ایک آن میں جیسے سب کچھ فنا لیا تھا۔ جیسے کسی نادیدہ ہاتھ نے کوئی غیر مرئی سوئچ آف کردیا اور اندر کی دنیا کی برقی رَو منقطع ہو گئی ہو۔ ہر چیز اپنی جگہ تھم ں ہو' ہر چنگاری برف کی طرح جم گئی ہو۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ شد نے پہلے پہل آکر جب اس معاملے کی تمہید باندھی تھی بں بارود کی طرح بھڑک اٹھا تھا مگر اب یہ یکایک مجھے کیا ہو گیا ؟

شاید پہلے مجھے بات کا یقین نہیں تھا اس لئے میں ردِ عمل اظہار کرسکتا تھا مگر اب یقین آجانے کے بعد میں اندر سے ٹ پھوٹ کر رہ گیا تھا اور شاید یہ میری زندگی کی خطرناک ترین ست تھی۔ میں اپنی اندر کی کیفیت سے خوف زدہ ہو گیا تھا۔ یا بس خاموش بیٹھا خالی خالی نظروں سے راشد کی طرف تا رہا۔

بالآخر راشد تھوک نگل کر بولا "مجھے اچھا نہیں لگ رہا کہ ں اس طرح یہاں بیٹھ کر آپ سے اپنی بہن کے بارے میں ں موضوع پر بات کروں... لیکن میں پہلے ہی وضاحت کر چکا ں کہ مجھے یہ ناگوار فریضہ کیوں انجام دینا پڑ رہا ہے۔ انی بھیا! ا کہہ چکا ہوں کہ آپ کو یہ سب کچھ بتانے سے میرا مقصد پ کو ایک مہلک دھوکے کے طلسم سے آزاد کرانا اور حقائق ں دنیا میں واپس لانا ہے۔ مجھے آپ سے بہت عقیدت ہے ' بت ہے لیکن راحیلہ بھی میری بہن ہے۔ میں نہیں چاہوں کہ آپ ردِ عمل کے طور پر اسے کوئی گزند پہنچانے کی کوشش یں۔ آپ کو یہ سب کچھ بتا کر میں اپنی دانست میں تو میں نے پ کے ساتھ بھلائی کی ہے۔ مجھے یہ سوچ کر بھی آپ کے ں آنا پڑا کہ اگر کسی وقت کسی اور ذریعے سے یہ خبر اچانک پ کو ملی تو نہ جانے آپ کا ردِ عمل کیا ہو۔ اور..."

"چند منٹ پہلے تم یہ سب کچھ مجھے سمجھا چکے ہو" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے نرم لہجے میں کہا "اب یہ باتیں ہرانے کی ضرورت نہیں۔ تم نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ مجھے سارے اس اقدام سے خوشی ہوئی ہے۔ تم نے واقعی مجھے اس طلسم سے آزاد کرواکے میرے ساتھ نیکی کی ہے۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ میرے ردِ عمل کے بارے میں تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر میں راحیلہ کو گزند پہنچانا چاہتا تو دنیا کی کوئی طاقت مجھے نہیں روک سکتی تھی لیکن تم اطمینان رکھو۔ راحیلہ کو میں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتا۔ جن سے انسان کو محبت ہو یا محبت رہی ہو' انہیں بھلا وہ کس منہ سے کچھ کہہ سکتا ہے؟ کس طرح انہیں نقصان پہنچا سکتا ہے؟"

میں نے بہت دھیمے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں یہ باتیں کی تھیں۔ پُرسکون اور پُراعتماد آدمیوں کے سے انداز میں... ان لوگوں کے سے لہجے میں جنہیں بڑے بڑے صدمات نہایت خاموشی سے سہہ لینے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ جھیل کی طرح ہوتے ہیں۔ دکھ کا پتھر اس میں پھینکو تو کرب کی چند لہریں پیدا ہوں گی اور بس... اس کے بعد پھر وہی پُرسکون سطح۔ مجھے اپنے بارے میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ میں اس قسم کا انسان بننے پر فی الحال قادر تھا۔ میرے اعصاب مضبوط تھے' بوجھ اور دھچکے سہنے کے قابل تھے۔

"آپ واقعی عظیم آدمی ہیں انی بھائی" راشد جذبات سے گلوگیر آواز میں بولا "کوئی آپ کو صحیح طور پر سمجھ جائے تو وہ آپ کی عزت کرنے پر مجبور ہو جائے۔ راحیلہ نے آپ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ میں نے نہایت سرسری طور پر دیکھا ہے۔ اس کے باوجود وہ مجھے بہت سخت اور ناروا لگا ہے۔ تاہم میں ایک سچے دوست کے طور پر آپ سے یہی التجا کروں گا کہ اس کی کوئی بات دل کو مت لگائیں۔ مجھے تو وہ کبھی کبھی نفسیاتی مریضہ لگتی ہے۔"

میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور شاید اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا۔ میں نے بدستور دھیمے لہجے میں کہا۔ "تمہیں معلوم ہے کہ میرا نام محمد افضل ہے۔ ذات کے ہم چوہدری تھے لیکن چونکہ ہمارے پاس اپنی زمین نہیں تھی اس لئے نہ ہمیں کبھی چوہدری سمجھا گیا اور نہ ہم نے اپنے نام کے ساتھ کبھی "چوہدری" لگانے کی جرات کی۔ چوہدری تو ہمارے علاقے میں صرف وہی تھے جن کی زمینوں پر ہم کام کرتے تھے۔ میں کہنا یہ چاہ رہا تھا کہ گاؤں میں مجھے "فجا" کہہ کر پکارا جاتا تھا لیکن اس خالص دیہاتی اندازِ تخاطب کے پیچھے کوئی مکر' فریب یا ریاکاری پوشیدہ نہیں ہوتی تھی۔ شہر میں مجھے "انی" کہا جاتا ہے لیکن مجھے رفتہ رفتہ تجربہ ہو رہا ہے کہ اس "شہری" اور بظاہر سلجھے ہوئے اندازِ تخاطب کے پیچھے کتنی الجھی ہوئی منافقتیں بھی میری زندگی میں چلی آتی ہیں۔ میں راحیلہ کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے زندگی کے ایک اہم تجربے سے روشناس کرایا ہے۔ اب میں شیریں' رسیلے اور اپنائیت بھرے لفظوں سے اتنی جلدی متاثر نہیں ہوا کروں گا۔ بلکہ ان

لفظوں کے پیچھے چھپے ہوئے اصل مفہوم و معنی کو بروقت سمجھنے کی کوشش کیا کروں گا۔"

"آپ دل شکستہ نہ ہوں انی بھائی..." راشد نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

میں ہنس دیا لیکن اپنی یہ ہنسی خود مجھے ایک کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی تاہم بظاہر میرے رویے میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں نے مربیانہ لہجے میں کہا "میں دل شکستہ نہیں ہوں۔ دکھ بہرحال ضرور ہے لیکن شکست کا لفظ اب میری زندگی سے نکل چکا ہے۔ زندگی کی جنگ میں جتنی شکست مجھے کھانی تھی وہ میں کھا چکا۔ اب میں صرف فتوحات حاصل کرنے کے لئے نکلا ہوا ہوں۔ لفظ "شکست" سے مجھے چڑ ہے۔"

میں نہیں چاہتا تھا کہ راشد گھر جاکر کسی بھی مرحلے پر راحیلہ کو میرے بارے میں بتائے کہ حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد صدمے سے میرا برا حال ہوگیا تھا۔ میں اندر سے خواہ ریت کے گھروندے کی طرح ڈھیر ہوگیا تھا لیکن بظاہر میں سنگ مرمر کے محل کی طرح کھڑا رہنا چاہتا تھا۔

"اچھا تو میں اب چلتا ہوں۔ آئندہ ملاقات ہوتی رہے گی۔" راشد اٹھتے ہوئے بولا۔

"اس طرح بھلا تم کیسے جاسکتے ہو؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "ابھی تو تم نے کھانا بھی نہیں کھایا۔ اس ایک موضوع کے علاوہ ہم نے کسی موضوع پر بات بھی نہیں کی۔ گپ شپ بھی نہیں کی۔ یہ بھلا کوئی طریقہ ہے آنے اور جانے کا؟"

"وہ... دراصل انی بھائی! میں راؤنڈ ٹکٹ لے کر آیا تھا اور اب ایئرپورٹ سے آتے وقت اپنی واپسی کی سیٹ کنفرم کرکے آیا ہوں۔ مجھے ساڑھے نو بجے والی فلائٹ سے واپس جانا ہے اور راحیلہ کی رخصتی کی رسموں میں شرکت بھی کرنی ہے۔ میں تو بہت ضروری کام سے حیدر آباد جانے کا بہانہ کرکے گھر سے نکلا تھا اور کہہ کر آیا تھا کہ گیارہ بجے تک ہر حالت میں واپس آجاؤں گا۔ میرے انتظار میں راحیلہ کی رخصتی نہیں ہوگی" اس نے بتایا۔

"میں تمہاری فلائٹ مس نہیں ہونے دوں گا" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "پندرہ منٹ کے نوٹس پر کھانا میز پر لگ جائے گا۔ پندرہ منٹ میں تم کھا لینا پھر میں خود تمہیں ایئرپورٹ چھوڑنے جاؤں گا اس لئے پندرہ ہی منٹ میں پہنچادوں گا۔ بوقت ضرورت میں راحیلہ سے بھی زیادہ تیز رفتاری اور اس کے ساتھ ساتھ مشاقی اور مہارت کا مظاہرہ کرسکتا ہوں۔ تمہارے پاس چونکہ سامان بھی نہیں ہے اس لئے تمہیں ایئرپورٹ پر زیادہ جلدی پہنچنے کی ضرورت نہیں۔"

میری دلیل کے سامنے اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور میں نے چچا میاں کو بلا کر کھانا لگانے کی ہدایت کردی۔ کھانا کچھ عجیب سی فضا میں کھایا گیا۔ راشد بھی خاموش رہا اور میں بھی چاہنے کے باوجود کچھ نہ بول سکا۔ کھانے کے بعد میں آندھی طوفان کی رفتار سے راشد کو ایئرپورٹ چھوڑ آیا۔

گھر میں حالانکہ میں پہلے بھی تنہا ہی رہتا تھا لیکن آج جیسے وہ گھر نہیں ویرانہ لگ رہا تھا۔ در و دیوار کاٹنے کو دوڑ رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں، وقت کس طرح گزاروں۔ وقت تو گویا تھم کر رہ گیا تھا یا پھر شاید میں وقت کی سولی پر مصلوب ہوگیا تھا۔

میں بیڈ پر نیم دراز تھا۔ ٹیلی فون میرے پاس ہی سائیڈ ٹیبل پر موجود تھا۔ بہت دیر تک تو میں بے حس و حرکت فون کو گھورتا رہا اور گزرے لمحوں کی ان گنت پرچھائیاں میری نظروں کے سامنے سے گزرتی رہیں۔ پھر قطعی غیرارادی طور پر میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور تکیے کے سہارے بیٹھ کر ریسیور اٹھا کر راحیلہ کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

میرے لئے یہ پہلا اتفاق تھا کہ پہلی ہی کوشش پر لاہور سے کراچی کا وہ نمبر مل گیا۔ فون راحیلہ کی امی نے ریسیو کیا۔ نام سنتے ہی پرجوش لیکن شکوہ آمیز لہجے میں بولیں "حد ہے انی! تم سے تو یہ امید نہیں تھی۔ ہم نے تو اتنے چاؤ سے تمہیں راحیلہ کی شادی کا کارڈ بھیجا اور تم آئے ہی نہیں۔ اب ایسی بھی کیا بے مروتی۔"

"میں نے اسی سلسلے میں فون کیا ہے آنٹی!" میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان شگفتہ بنانے کی کوشش کی "ڈاک کی گڑبڑ کی وجہ سے مجھے آپ کا بھیجا ہوا کارڈ آج ہی ملا ہے۔ شاید اب بھی کم از کم رخصتی کے وقت ہی پہنچ جاتا لیکن کراچی کی صرف ایک ہی فلائٹ باقی ہے اور میرے ٹریول ایجنٹ نے بتایا ہے کہ اس میں بھی کوئی سیٹ ملنا ممکن نہیں۔ اس لئے اب سوائے معذرت کے کیا کرسکتا ہوں؟ اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں نا؟"

"ہاں بیٹا! تمہارا تو واقعی کوئی قصور نہیں" پھر انہوں نے ڈاک کے محکمے کو دو چار جلی کٹی سنائیں اور بولیں "تمہارے نہ آنے کا سب کو بے حد افسوس ہے۔ راشد تو بہت ہی پریشان نظر آرہا تھا۔ اسے کوئی بہت ضروری کام یاد آگیا تھا، اس وقت حیدر آباد گیا ہوا ہے۔ ایک گھنٹے میں واپس آجائے گا۔"

"اچھا؟" میں نے سادگی سے کہا "خیر... وہ آئے تو اسے میرا سلام کہئے گا" پھر میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "کیا میں راحیلہ سے بات کرسکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں" آنٹی نے بڑے اطمینان سے کہا "وہ اپنے کمرے میں سہیلیوں میں گھری بیٹھی ہے۔ میں فون اس کے کمرے میں منتقل کرواتی ہوں۔"

چند لمحے بعد ملی جلی نسوانی آوازوں کی بھنبھناہٹ سی سنائی دی پھر راحیلہ نے دھیمی سی آواز میں "ہیلو" کہا۔

"شادی مبارک ہو" میں نے آہستگی سے کہا۔ دوسری طرف فوراً سناٹا چھا گیا۔ شاید آنٹی نے راحیلہ کو یہ نہیں بتایا تھا کہ فون کس کا ہے۔ اور میری آواز پہچانتے ہی اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔ اس کے بعد اس نے غالباً کسی نہ کسی طرح سہیلیوں کو کمرے سے باہر بھیج دیا تھا کیونکہ چند لمحے بعد وہ دوبارہ بولی تو پس منظر سے کسی قسم کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"کس لئے فون کیا ہے؟" اس نے سخت سے لہجے میں سرگوشی کی۔

"صرف مبارکباد دینے کے لئے" میں نے سادگی سے کہا "اتنا حق تو برے آدمیوں کو بھی دے دیا جاتا ہے کہ وہ خوشی کے موقع پر مبارکباد دے سکیں۔"

وہ گویا میری بات پر توجہ دیئے بغیر بولی "میرا خیال ہے میرا وہ بے غیرت بھائی تمہارے پاس پہنچا ہوا ہے.... میری ڈائری بھی الماری سے غائب ہے۔ شاید اس نے وہ بھی تمہیں دکھادی ہے..."

"راشد کو بے غیرت مت کہو" میرے لہجے میں قدرے تیزی آگئی۔ راشد کے لئے یہ لفظ سن کر حقیقتاً مجھے غصہ آگیا تھا "تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے تمہیں ایسا سمجھدار اور معاملہ فہم بھائی عطا کیا ہے۔ وہ عمر میں تم سے چھوٹا مگر تم سے زیادہ بالغ نظر ہے۔ اس وقت اس نے اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھداری کا مظاہرہ کیا ہے۔"

"وہ ہے کہاں؟" اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد پوچھا۔

"واپسی کے لئے روانہ ہوچکا ہے۔ ایک آدھ گھنٹے میں پہنچنے والا ہوگا" میں نے جواب دیا "امید ہے تم اسے کچھ نہیں کہوگی۔"

وہ خاموش رہی۔ اس کی سانسیں کچھ مرتعش سی تھیں۔ میں فون پر اس کی سانسوں کی آواز سن رہا تھا۔ ایک لمحے کے سکوت کے بعد میں نے کہا "میں نے تم سے صرف چند مختصر سی باتیں کرنے کے لئے فون کیا ہے..."

"میں نے فون صرف اس لئے سن لیا ہے کہ کہیں تم امی سے کوئی الٹی سیدھی بات نہ کرنے لگو" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی "ورنہ درحقیقت میں اس وقت کچھ بھی سننے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ کیا تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس وقت لڑکی کتنے لوگوں میں گھری ہوتی ہے جب اس کی رخصتی قریب ہو؟ وہ تو شکر ہے اس وقت صرف میری بے تکلف سہیلیاں ہی میرے پاس موجود تھیں جنہیں میں نے آسانی سے باہر بھیج دیا..."

"مجھے تم سے کوئی زیادہ لمبی چوڑی باتیں نہیں کرنی ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "کہنے کے لئے اب رہ ہی کیا گیا ہے۔ مجھے تمہاری صرف ایک غلط فہمی دور کرنے کی خواہش ہے۔ میں ایک برے پیشے سے ضرور وابستہ ہوں لیکن میں بذات خود اتنا برا آدمی نہیں ہوں جتنا تم نے فرض کرلیا ہے۔ اگر خود پرستی کا الزام آنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ شاید میں ان سیکڑوں بڑے بڑے سیٹھوں سے بہتر انسان ہوں جو بڑے عالیشان دفتروں میں بیٹھے بظاہر معززانہ دھندوں میں مصروف ہیں لیکن جن کی اصلیت سے کوئی واقف نہیں۔ لیکن خیر.... اس بحث کو چھوڑو۔ میں تم سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس غیرضروری مذاق سے تمہیں کیا حاصل ہوا؟"

"ضروری تو نہیں کہ ہر کام کچھ حاصل کرنے کے لئے ہی کیا جائے۔ کچھ کام بے مقصد بھی ہوتے ہیں" اس کے لہجے میں ہلکی سی شگفتگی آگئی۔

"کم از کم تمہیں اپنے بارے میں ایسا نہیں کہنا چاہئے۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "اب تو میں یقین نہیں کرسکتا کہ زندگی میں کوئی کام تم نے بغیر کسی مقصد کے بھی کیا ہوگا۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہی۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ میرے اس سوال کی تہہ میں چھپے ہوئے کرب سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرائی ہو۔ پھر وہ دھیمے سے لہجے میں بولی "شاید میں نے اپنی ڈائری میں بھی ایک جگہ لکھا ہے کہ غالباً میں اذیت پرست ہوں۔"

"میرے خیال میں تو یہ اذیت پرستی نہیں ہے" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "اور اگر ہے بھی تو ایک لڑکی کو اذیت پرستی کی تسکین کا یہ طریقہ زیب نہیں دیتا۔ میرے خیال میں تو یہ بیمار سوچ کی علامت ہے۔ انسان کو اذیت پہنچانے کے اور بھی کئی طریقے ہیں۔"

"بہرحال ہوگا کچھ" وہ بے پروائی سے بولی "اس وقت میں نہ بحث کرنا چاہتی ہوں اور نہ کوئی لیکچر سننے کی متحمل ہوسکتی ہوں۔ میری سہیلیاں دروازے اور کھڑکیوں سے جھانک رہی ہیں۔ شاید وہ حیران ہورہی ہیں کہ آخر میں ایسی کون سی شخصیت سے باتیں کررہی ہوں کہ جس کے بارے میں ان سے بھی رازداری برت رہی ہوں۔ انہیں کیا معلوم کہ میں شخصیت کو نہیں بلکہ ان باتوں کو فی الحال راز رکھنا چاہتی ہوں جو ہم اس وقت کررہے ہیں۔"

"راحیلہ...." میں نے اپنے لہجے کی لرزش پر قابو رکھنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں کامیاب رہا "تم نے جو کچھ

بھی کیا اس پر تمہیں ذرا بھی پچھتاوا نہیں ؟ "

" نہیں " اس نے بلا تامل جواب دیا " ہاں البتہ یہ ضرور تسلیم کرتی ہوں کہ ڈائری لکھتے وقت میں تمہیں تصور ہی تصور میں جتنا برا آدمی سمجھ رہی تھی اتنے برے شاید تم نہیں ہو۔ اور شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو کہ تم بظاہر معزز نظر آنے والے بہت سے انسانوں سے بہتر ہو لیکن میں تمہارے لئے اپنے دل میں محبت محسوس نہیں کرتی۔ نہ پہلے کبھی کی تھی۔ بس ؟ یا مزید تشریح چاہتے ہو ؟ "

" نہیں۔ مجھے کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے " میں نے ہموار لہجے میں کہا " بلکہ تمہاری ڈائری پڑھنے کے بعد تو تم سے بات کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن میں بس یونہی دل کی کسک کے ہاتھوں مجبور ہو کر تمہیں فون کر بیٹھا راحیلہ ! میں اتنا ضرور کہوں گا کہ تم نے جو کچھ بھی کیا اچھا نہیں کیا۔ میں خواہ برا آدمی ہی سہی لیکن خدا کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ کوئی اس کے برے بندوں کا بھی دل دکھائے۔ "

وہ خاموش رہی۔

" میں تمہیں بددعا نہیں دیتا۔ لیکن میری یہ خواہش ضرور ہے کہ کبھی تم بھی ٹھکرائے جانے کی اذیت کو محسوس کر سکو " میں نے کہا " خدا حافظ۔ "

وہ اب بھی خاموش رہی میں نے فون بند کر دیا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونا چاہتا تھا لیکن گزشتہ برسوں میں میرے شب و روز کچھ ایسی سنگدلانہ فضا میں گزرے تھے کہ میں رونا بھول گیا تھا۔ دل کی گہرائیوں سے آنسو اگر امڈتے بھی تھے تو انگاروں کی طرح اندر ہی اندر سینے کو جلاتے تھے، آنکھوں تک نہیں آتے تھے۔ یہ آتش سیال اگر آنکھوں کے راستے بہہ جاتی تو وجود میں کچھ ٹھنڈک سی پڑ جاتی۔

بہت دیر تک میں بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ آج سلمیٰ بے تحاشا یاد آ رہی تھی۔ وہ بڑی بے مثال عورت تھی۔ اگر وہ امریکا نہ چلی گئی ہوتی تو آج میں ضرور اس کی زلف کے سائے میں پناہ لینے پہنچ جاتا۔ وہ یقیناً بکھرے ہوئے مردوں کو سمیٹنے کا فن خوب جانتی تھی۔

میں آج ٹوٹ گیا تھا، بکھر گیا تھا اور پچھتاوا مجھے یہ ہو رہا تھا کہ جب زلفِ یار ہم پر مہربان تھی، کسی کا دستِ طلب ہماری طرف دراز تھا تو ہم اپنی دانست میں کسی کی وفا کی زنجیر سے بندھے ہوئے تھے۔ اپنے آپ کو خود ساختہ پاکبازی کی سولی پر مصلوب کئے ہوئے تھے۔ آج پتا چلا تھا کہ اس وفا اور اس پاکبازی کا صلہ تذلیل اور خود سوزی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اب مجھے ہر چیز پر افسوس ہو رہا تھا۔ چند لمحے پہلے میں نے فون پر جو گفتگو کی تھی اس پر بھی افسوس ہو رہا تھا۔ نہایت احمقانہ گفتگو تھی۔ مجھے بھلا ضرورت ہی کیا تھی فون کرنے کی۔

میں نے اپنے ملازم چچا میاں کو آواز دی اور انہیں بوتل، گلاس اور دیگر لوازمات میز پر سجانے کا حکم دیا۔ انہوں نے خاموشی سے میرے حکم کی تعمیل کی اور میں پینے بیٹھ گیا۔

آدھی بوتل ختم ہوئی تو میری کھوپڑی گویا کچھ ہلکی ہو کر ہوا میں تیرنے لگی۔ لیکن دل کا بوجھ جوں کا توں رہا۔ میں نے بوتل اٹھا کر باہر آ کر گاڑی میں رکھی اور سمن آباد کی طرف روانہ ہو گیا۔

وہ گلی کوچے مجھے یاد تھے جن سے گزر کر کافی عرصہ پہلے میں شرفو کے ساتھ ایک پرانی سی کوٹھی پر پہنچا تھا۔ اب اس کوٹھی پر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ اس کی حالت کافی بدل چکی تھی لیکن چند ایک نشانیوں کی مدد سے میں نے پہچان لیا کہ یہ وہی کوٹھی ہے۔

میری گاڑی پورچ میں رکتے ہی ایک شخص نے دروازہ کھول کر جھانکا۔

یہ وہی بنگالی ملازم تھا جسے میں نے پچھلی مرتبہ یہاں آمد پر بھی دیکھا تھا۔ میں گاڑی ہی میں بیٹھا رہا۔ وہ خود ہی میرے قریب آ گیا اور آنکھیں سکیڑ کر... اجنبی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

" جا کر میڈم سے کہو کہ ٹھیکیدار افضل صاحب آئے ہیں۔ جو پہلے بھی ایک مرتبہ شرفو کے ساتھ آئے تھے " میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔

" اوہ ... آپ شرفو دادا کے دوست ہیں " نوجوان کے سانولے چہرے سے اجنبیت غائب ہو گئی اور اس کی باچھیں کھل گئیں " آئیے ... آئیے ... تشریف لائیے۔ "

میں اس کے ساتھ اندر پہنچا۔ اب اس گھر میں کافی خوشحالی آ چکی تھی۔ ہر چیز بدلی بدلی اور نکھری نکھری تھی۔ لگتا تھا کہ میڈم کا دھندہ زوروں پر جا رہا تھا۔ میڈم سے ملاقات ہوئی وہ بھی پہلے سے زیادہ زرق برق لباس میں نظر آ رہی تھی۔ جیولری بھی خوب لاد رکھی تھی اور میک اپ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ شبابِ گم گشتہ کا سراغ پانے کے لئے کوشاں ہے۔

اس نے مجھے جس لڑکی کے پاس بھیجا وہ اتفاق سے وہی لڑکی تھی جس سے پہلے بھی یہیں میری ملاقات ہو چکی تھی۔ مجھے اس اتفاق پر تو حیرت نہیں ہوئی لیکن یہ جان کر میں حیران رہ گیا کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

" تم ایک بار پہلے بھی اس کوٹھی خانے پر آئے تھے " وہ ایک چھوٹے سے آئینے میں اپنے میک اپ کا جائزہ لیتے ہوئے بے نیازی سے بولی۔

" حیرت ہے " میں نے گلاس خالی کر کے تپائی پر رکھتے ہوئے بوجھل لہجے میں کہا " مجھے معلوم نہیں تھا کہ تمہارے طبقے کی لڑکیوں کی یادداشت اتنی اچھی ہوتی ہے۔ کیا کوئی دکاندار مدتوں پہلے صرف ایک بار آنے والے گاہک کی شکل یاد رکھ سکتا ہے ؟ "

" تم ٹھیک کہتے ہو " وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی " ہمارا کام شکلیں یاد رکھنا نہیں، رقمیں یاد رکھنا ہوتا ہے۔ لیکن شاید یہاں صرف میں ہی ایک ایسی ہوں جسے کچھ خاص شکلیں یاد رہ جاتی ہیں۔ "

" کیا خصوصیت ہے میری شکل میں ؟ " میں نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرا چہرہ پسینے سے تر تھا " تقریباً عام سی صورت ہے میری۔ "

" نہیں۔ اتنی زیادہ عام سی بھی نہیں ہے۔ اچھے خاصے وجیہہ آدمی ہو تم " وہ بدستور بے پروائی سے بولی " یہ میں خواہ مخواہ تمہارا دل بڑھانے کے لئے نہیں کہہ رہی ہوں اور نہ ہی میں تمہاری وجاہت کو خصوصیت قرار دے رہی ہوں۔ بلکہ تمہارے چہرے کی اصل خصوصیت یہ ہے کہ اس پر معصومیت بہت زیادہ ہے۔ اور معصومیت ایک ایسی چیز ہے جس پر ہمارے قبیل کے لوگوں کی نظر سب سے پہلے جاتی ہے۔ "

میں خاموش رہا۔ دوسرا گلاس تیار کرتا رہا۔

وہ ایک لمحے کے توقف سے بولی " تمہارے چہرے کی اس معصومیت کو دیکھتے ہوئے ہی مجھے شبہ گزرتا ہے کہ تم درحقیقت اس قماش کے آدمی نہیں ہو جس قماش کے بننے کی کوشش کرتے ہو۔ اور درحقیقت تم نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے۔ پہلی بار تم یہاں آئے تھے تو درحقیقت خود نہیں آئے تھے۔ شرفو تمہیں ساتھ لایا تھا۔ اس مرتبہ یوں لگتا ہے کہ شاید تم کہیں سے شکست کھا کر آئے ہو۔ شاید کسی عورت سے۔ مرد کی یہ عجیب فطرت ہے کہ کسی عورت سے شکست کھاتا ہے تو پناہ لینے بھی کسی عورت ہی کے پاس پہنچتا ہے۔ عام طور پر کسی شکست خوردہ اور ٹوٹی پھوٹی عورت کے پاس۔ شاید اس طرح لاشعوری طور پر اسے کچھ تسکین ملتی ہے۔ کہ شکست خوردہ صرف وہی نہیں ہے، عورت بھی شکست خوردہ ہو سکتی ہی۔ یعنی وہ صرف تماشا دیکھنے آتا ہے یا ایک لطیف سا انتقام لینے آتا ہے۔ تم بھی تماشا دیکھنے آئے ہو۔ لطیف سا انتقام لینے آئے ہو۔ "

" کیا بکواس ہے " میں خود کلامی کے سے لہجے میں بڑبڑایا۔ " میں یہاں اپنے آپ کو بہلانے آیا ہوں۔ تم سے پیچیدہ قسم کے فلسفوں پر لیکچر سننے نہیں آیا۔ "

" میں تمہیں لیکچر نہیں دے رہی " وہ سادگی سے بولی۔ " اور نہ ہی یہ کوئی پیچیدہ فلسفہ ہے۔ یہ تو بالکل سیدھی سی بات ہے۔ میں دراصل یہ بتانا چاہ رہی تھی کہ تم دو مرتبہ یہاں آئے لیکن دونوں مرتبہ اپنی مرضی سے نہیں آئے۔ مرد یہاں یونہی آنا شروع کر دیتے ہیں پھر رفتہ رفتہ اپنی مرضی سے بھی آنے لگتے ہیں۔ "

" تمہیں اس پر کوئی اعتراض ہے ؟ " میں نے تلخ لہجے میں پوچھا۔

" نہیں۔ دکاندار کو گاہکوں کی آمد پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے "

اس نے بے نیازی سے جواب دیا لیکن میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ اس کے دل کی آواز نہیں تھی [illegible]

وہ شاید مجھے یہاں آنے سے روکنا چاہتی تھی۔ کیا اسے مجھ سے ہمدردی پیدا ہو چکی تھی ؟ لیکن یہ بھلا کس طرح ممکن تھا ؟ صرف ایک ملاقات میں اس قبیل کی عورت کو بھلا مجھ سے کیونکر ہمدردی ہو سکتی تھی ؟ بوتل خالی ہو چکی تھی اور میرا سر بری طرح گھوم رہا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں کسی بھنور میں آن پھنسا ہوں۔

" تمہارا نام کیا ہے ؟ " میں نے ہچکی لے کر پوچھا۔

" افشاں " وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

" افشاں ! آؤ مجھے ڈوبنے سے بچالو " میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اور وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے رکھے ہوئے اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

علی الصباح جب میں لڑکھڑاتا ہوا گھر پہنچا تو یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ چچا میاں میرے انتظار میں جاگ رہے تھے۔ [illegible] مجھے سہارا دے کر اندر لے گئے اور راستے میں سرگوشی نما [illegible] میں بولے " خدا کا شکر ہے صاحب ! آپ خیریت سے گھر پہنچ گئے۔ آپ کو ایسی حالت میں گاڑی نہیں چلانی چاہئے تھی "

" مجھے صرف چلنے میں دقت ہو رہی ہے۔ گاڑی میں بالکل ٹھیک چلا کر لایا ہوں " میں نے اپنی دانست میں پُر اعتماد لہجے میں کہا۔

" اس عالم میں انسان کو یہی لگتا ہے کہ وہ ہر کام بالکل ٹھیک کر رہا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا " چچا میاں بولے انہوں نے مجھے بیڈ پر لٹا کر میرے جوتے اتارے، ایئر کنڈیشنر آن کیا لیکن کمرے سے باہر نہیں گئے۔ ہاتھ باندھ کر [illegible] ایک طرف کھڑے رہے۔

" کیا بات ہے ؟ " میں نے غنودگی زدہ لہجے میں پوچھا

" اگر آپ برا نہ مانیں تو میں کچھ عرض کروں جی "

ہچکچاتے ہوئے اور قالین کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

" اس سے پہلے تو آپ کبھی اتنے مؤدب اور تکلف پسند نہیں ہوئے " میں نے قدرے سنبھل کر انہیں گھورا۔

" اصل میں .... جو کیفیت آپ کی ہے اس کیفیت میں دل آبگینہ ہو جاتا ہے۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور ٹوٹ گیا " وہ [illegible] ملتے ہوئے بولے " مجھے معلوم ہے آج وہ لڑکا آپ کے [illegible] کوئی بری خبر لایا تھا۔ اس کے بعد سے آپ بکھر کر رہ گئے [illegible] مجھے یہ بھی اندازہ ہے کہ وہ خبر کیا ہو سکتی ہے۔ صاحب جی [illegible] کسی زمانے میں ایک چھوٹو.... لیکن اچھا خاصا وحشی [illegible]

مجھے بھی ایک روز ایسی ہی ایک خبر سے واسطہ پڑا تھا اور میں بھی یونہی ٹوٹ کر یونہی بکھر کر رہ گیا تھا۔ وہ جو تھی نا... جسے میں نے چاہا تھا... زندگی جس کے نام کر دی تھی... اس نے جو کچھ کیا وہ سب اس کے نزدیک ایک مذاق تھا۔ دل لگی تھی۔ اسے اس پر کوئی افسوس نہیں تھا۔ پچھتاوا نہیں تھا۔ گھر والوں نے اس کے لئے جسے منتخب کیا وہ شہنائیوں کی گونج میں اطمینان سے اس کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں جلتا رہا، کڑھتا رہا، اپنے آپ کو برباد کرتا رہا حتیٰ کہ راستے کا پتھر بن گیا۔ کسی نے ٹھوکر ماری تو وہاں جا گرا، کسی نے ٹھوکر ماری تو یہاں آن گرا۔ یونہی عمر تمام ہونے کو آئی ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ آپ جیسا مالک میسر آ گیا۔ کبھی سوچتا ہوں تو فخر محسوس ہوتا ہے کہ کہنے کو نوکر ہیں مگر مالکوں جیسی عزت ہے۔ پورا گھربار آپ نے مجھ پر چھوڑا ہوا ہے۔ کبھی نوکروں والا سلوک نہیں کیا لیکن اس سے پہلے میں نے بہت دھکے کھائے ہیں اور آپ کے ہاں نہ آتا تو شاید ابھی دھکے ہی کھا رہا ہوتا۔ دوسری طرف "وہ" ہے۔ اس نے کیا کھویا؟ اس کا کیا بگڑا؟ کچھ بھی نہیں۔ اس نے ایک بھرپور زندگی گزاری۔ آج وہ نواسے نواسیوں والی ہے۔ ایک بڑے عالیشان گھر میں رہتی ہے۔ اسے شاید یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ کوئی رفاقت علی بھی تھا جس نے اس کی خاطر اپنے آپ کو راکھ کر لیا۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے گویا آنسو پینے کی کوشش کی۔ میں دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور بغور اس کی بات سن رہا تھا۔ میرے حواس یک لخت ہی بیدار ہو گئے تھے۔

"صاحب جی! آپ مجھے بتائیں کہ اس سودے میں نقصان کس کا ہوا؟" اس نے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی آواز میں پوچھا "صرف اور صرف میرا ہی ہوا نا۔ برباد صرف میں ہی ہوا نا؟ اگر اس کے ساتھ جبر ہوا ہوتا تب بھی میرے اس حد تک دکھی ہونے کا کچھ نا کچھ جواز ہوتا۔ میری بربادی سے اگر وہ آگاہ بھی ہو جاتی تب بھی اس کے لئے کیا فرق پڑتا؟ شاید غرور حسن کچھ اور بڑھ جاتا۔ اور عالم یہ تھا صاحب جی کہ جب یہ حادثہ مجھ پر گزرا تو دل آتش فشاں بنا ہوا تھا۔ اپنے آپ سے، اس سے، پوری دنیا سے نفرت ہو رہی تھی۔ بڑی خوفناک آگ بھڑک رہی تھی سینے میں۔ اور جس طرح محبت بہت بڑی قوت ہے اس طرح نفرت بھی بہت بڑی طاقت ہے۔ جس طرح کسی کی محبت میں انسان اپنے آپ کو اچھے سے اچھا بنانے اور بلندیوں کی طرف جانے کی فکر کرتا ہے، اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ تیزی کے ساتھ انسان نفرت کی قوت کے سہارے اوپر جا سکتا ہے۔ ضرورت صرف اس جذبے کو صحیح طور پر استعمال کرنے کی ہوتی ہے۔ جیسے بجلی ہی کی مثال لے لیجئے۔ ننگے تار کو چھوئیں گے تو شاک مہلک ثابت ہوگا۔ اسی قوت کو مقید رکھ کر اور صحیح سمت میں چلا کر آپ دنیا بھر کے کام انجام دے سکتے ہیں۔ نفرت بھی بڑا طاقتور کرنٹ ہے صاحب جی، ان گنت وولٹ کا کرنٹ۔ اسے سینے میں مقید رکھنے اور صحیح سمت میں چلائیں تو بڑے بڑے ناممکن کام ممکن ہو جائیں گے۔ میرے شب و روز اسی پچھتاوے میں تو گزرتے ہیں کہ کاش میں نے ایسا ہی کیا ہوتا تو آج اس حال میں نہ ہوتا۔ اب میں اس خوف سے کانپ رہا ہوں کہ کہیں آپ نے بھی وہی کہانی تو دہرانی شروع نہیں کر دی؟ مجھ سے یہ سب کچھ نہیں دیکھا جائے گا صاحب جی۔ آپ تو پہلے ہی بہت باصلاحیت آدمی ہیں۔ اگر آپ کو شکست ہو بھی گئی ہے تو آپ نفرت کے کرنٹ کو سینے میں مقید کر لیں۔ قسم سے آپ ناقابل شکست چیز بن جائیں گے۔ ورنہ جس راستے پر آپ چل رہے ہیں اس کا انجام اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوگا جو میرا ہوا۔"

چچا میاں خاموش ہو گئے لیکن میرے ذہن میں اب بھی ان کی آواز کی بازگشت گونج رہی تھی۔ میں دم بخود ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کھچڑی سے بالوں والا یہ منحنی اور مجہول سا شخص اپنے سینے میں تجربات کا ایسا خزینہ چھپائے ہوئے ہوگا۔ انہوں نے باتیں بھی کچھ ایسے پُراثر انداز میں کی تھیں کہ ہر لفظ جیسے ذہن میں نقش ہو گیا تھا حالانکہ جب انہوں نے بات شروع کی تو اس وقت میری کھوپڑی گویا خلا میں معلق تھی لیکن ان کے چند جملوں نے ہی میرا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ نیند، خمار سب کچھ غائب ہو گیا تھا۔ شاید یہ چچا میاں کے انداز بیاں کا نہیں بلکہ ان کے لفظوں کی تہ میں چھپی ہوئی صداقت کا کمال تھا۔ گزشتہ شام سے لے کر اب تک کا اپنا طرز عمل مجھے نہایت ہی احمقانہ محسوس ہونے لگا تھا۔

"میں جواب کا منتظر ہوں صاحب جی!" چچا میاں ہاتھ ملتے ہوئے بولے۔

"جواب....؟" میں نے پلکیں جھپکتے ہوئے دہرایا تو اپنا لہجہ مجھے خود بھی خاصا احمقانہ محسوس ہوا۔ پھر میں نے سنبھل کر تھوک نگلتے ہوئے کہا "آپ مطمئن رہیں چچا میاں۔ آپ کا بہت بہت شکریہ کہ آپ نے بروقت اور نہایت اچھے پیرائے میں مجھے سمجھایا ہے۔ میری آنکھیں کھول دی ہیں۔ دراصل انسان زندگی میں کبھی نہ کبھی اپنے آپ کو گدھا ثابت کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔ کچھ خوش قسمت لوگ ہوتے ہیں جنہیں ایسے وقت میں آپ جیسا کوئی ہمدرد میسر آ جاتا ہے اور وہ اس کی بات پر کان بھی دھر لیتے ہیں۔ ورنہ بیشتر تو سیدھے گڑھے میں جا گرتے ہیں۔ بہرحال... آپ مطمئن رہیں۔ اب میں آپ کو قطعاً گدھا نظر نہیں آؤں گا۔ میں گدھا بننے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں بہت طاقتور آدمی بننے کا عزم لے کر گھر سے نکلا تھا اور فی الحال میں صرف طاقت کی ابجد سے واقف ہوا ہوں۔ ابھی تو زندگی سے محظوظ ہونے کا وقت آیا ہے اور ابھی سے میں اپنے آپ کو تباہ کرنے چلا تھا... لعنت ہے مجھ پر..."

چچا میاں مطمئن ہو کر مسکرائے اور بتی بجھا کر کمرے سے باہر چلے گئے۔ میں نائٹ لیمپ کی مدھم روشنی میں بیڈ پر لیٹا بہت دیر تک بہت کچھ سوچتا رہا۔ اپنا انداز فکر تبدیل ہونے پر مجھے بڑا اطمینان اور خوشی تھی۔ واقعی اگر میں شراب پی پی کر تباہ ہو جاتا اور جو تھوڑا بہت اثاثہ غلط سلط طریقوں سے بنایا تھا وہ کوٹھی خانوں کی نذر کر دیتا تو اس سے راحیلہ کی صحت پر کیا اثر پڑتا؟ اسے کیا غم ہوتا؟ کون سا دکھ پہنچتا؟ کوڑی کوڑی کو محتاج تو میں ہوتا۔ نشے میں دھت ہو کر نالیوں میں تو میں پڑا پایا جاتا۔ کسی کا کیا جاتا؟ عین ممکن تھا کہ مجھے تو چچا کی طرح کہیں ڈھنگ کی نوکری بھی میسر نہ آتی۔

"راحیلہ ڈیئر!" میں نے تصور ہی تصور میں اسے مخاطب کیا "زندگی میں کسی موڑ پر اگر ہمارا آمنا سامنا ہوا تو مجھے دیکھ کر تمہیں بہت مایوسی ہوگی۔ میرا نہ تو گریباں چاک ہوگا اور نہ میری حالت مجنوں کی سی ہوگی۔ تم نے مجھے برباد کرنے میں کوئی کسر تو نہیں چھوڑی لیکن میری قسمت اچھی ہے کہ جب بھی میں تباہی کی طرف جانے لگتا ہوں مجھے اچانک ہی کوئی جھٹکا لگتا ہے اور میرا انداز فکر بدل جاتا ہے۔ اپنی خامیاں مجھے صاف نظر آنے لگتی ہیں۔ اب تم ملو گی تو میں پہلے سے زیادہ اعتماد کے ساتھ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تم سے بات کروں گا۔ امید ہے کہ میرے حالات بھی پہلے سے بہتر ہوں گے۔ تمہیں مجھ پر ہنسنے، زیر لب مسکرانے یا میری حالت سے لطف اندوز ہونے کا موقع نہیں ملے گا۔ اذیت کوشی کی حسرت ہی رہ جائے گی تمہیں۔"

تصور میں راحیلہ سے یہ گفتگو کرنے کے بعد میں بڑے سکون سے سو گیا۔ ایک عجیب قسم کی طمانیت اور احساس فتح مندی سے سرشار ہو گیا تھا میں۔

شام کو میں اٹھا تو بالکل تازہ دم تھا۔ کھانا کھانے کے بعد تیار ہو کر میں گھر سے نکلا اور اس ہوٹل میں پہنچا جہاں میری اپنے گروہ کے ارکان کے ساتھ ہفتہ وار میٹنگ ہوتی تھی۔ میرا گروہ بنیادی طور پر فی الحال صرف چار مستقل ارکان پر مشتمل تھا۔ ضرورت پڑنے پر ہم عارضی طور پر کچھ لوگوں کی خدمات حاصل کر لیتے تھے۔

ابھی تک تو میں اپنے ان مستقل ساتھیوں سے بھی نہایت محتاط تھا۔ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کا انہیں بھی علم نہیں تھا۔ ان سب کے ٹھکانوں وغیرہ کا البتہ مجھے علم تھا۔ میں ہی ان سے رابطہ قائم کرتا تھا اور اگر ہنگامی طور پر ان میں سے کوئی مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا تو اس کا ایک الگ طریقہ تھا۔

جس ریستوران میں ہم جمع ہوتے تھے اس میں ایک تہ خانہ نما ہال بھی تھا۔ عام طور پر کاروباری لوگوں کی میٹنگز، لنچ یا ڈنر اور دوسری چھوٹی موٹی تقریبات یہیں منعقد ہوتی تھیں۔ اسی ہال کے ایک گوشے میں الگ تھلگ سی میز پر ہم بھی کاروباری لوگوں ہی کے سے انداز میں جمع ہوتے تھے۔ اکثر اوقات تو میرے ساتھی بغل میں ایک آدھ رجسٹر یا فائلیں وغیرہ بھی دبا کر لاتے تھے۔

بعض اوقات ہمیں واقعی حساب کتاب کرنے، روٹ طے کرنے یا بعض دوسرے معاملات ایک دوسرے کو سمجھانے کے لئے کاغذ قلم کی ضرورت پڑتی تھی اور اس مقصد کے لئے ہم جو کاغذ استعمال کرتے تھے، جانے سے پہلے میں باتھ روم میں جا کر انہیں پرزہ پرزہ کر کے فلش میں بہا دیتا تھا۔ ہماری میز ہمارے لئے سنیچر کی شام کو ریزرو رہتی تھی اور ویٹر وغیرہ ہمیں بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

اس شام میں میٹنگ کی صدارت کے لئے پہنچا تو معمول سے کہیں زیادہ پرجوش تھا۔ میں اب انقلابی انداز میں اپنے کام کو آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ جلد از جلد اور زیادہ سے زیادہ ترقی کرنا اب میرا نصب العین بن گیا تھا۔

میرے چاروں ساتھی مخصوص میز پر موجود تھے اور میرے ہی منتظر تھے۔ پہلے کولڈ ڈرنکس وغیرہ کا دور چلا پھر میٹنگ شروع ہوئی۔ آئندہ کے لئے میں نے جو پروگرام طے کیا اور جو تجاویز پیش کیں انہیں سن کر سب خوش تو بہت ہوئے کیونکہ میری ترقی میں ہی ان کی ترقی بھی پنہاں تھی تاہم وہ میری بے تابی اور جوش و خروش پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ بالآخر ایک ساتھی جس کا نام شفیع تھا، بول ہی اٹھا "سر! آج تو ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے آپ کے ذہن اور جسم میں کوئی کرنٹ دوڑ گیا ہو۔ مستعد تو ہم نے آپ کو پہلے بھی بارہا دیکھا ہے لیکن اس مرتبہ تو بات ہی کچھ اور ہے۔"

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کم بخت نے جیسے میرا ذہن پڑھ لیا تھا۔ چچا میاں کی طرح اس نے بالکل وہی "کرنٹ" کا لفظ استعمال کیا تھا۔ مجھے اس کا تبصرہ سن کر خوشی بھی ہوئی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ میں کرنٹ کو سینے میں مقید کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"تمہارا بہت بہت شکریہ راحیلہ!" میں نے تصور ہی تصور میں بہ زبانِ خموشی کہا۔ آج اس کی یاد سے دل میں صرف ایک میٹھی سی کسک ابھری تھی۔ قابل برداشت بلکہ لذت انگیز سی کسک۔ دل میں خنجر سا نہیں اترا تھا۔

"ہاں۔ کرنٹ تو واقعی میرے رگ و پے میں دوڑ گیا ہے

شفیع!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا" اب تم سب کمر کس لو۔ ہم لوگ اس میدان میں تہلکہ مچانے والے ہیں۔"

"اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے" میرا دوسرا ساتھی سردار علی بولا" آپ جیسا باس میسر ہو اور ہم اس کے باوجود تہلکہ نہ مچائیں تو کیا فائدہ ہماری زندگی کا۔"

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ کھانے وغیرہ کا دور چلا۔ بالآخر رات کو بارہ بجے کے قریب ہماری میٹنگ ختم ہوئی۔ جن کاغذوں پر ہم نے حساب وغیرہ کیا تھا اور خاکے یا نقشے بنائے تھے' انہیں تہ کر کے میں نے اپنی جیب میں رکھا اور باتھ روم میں جا کر پرزہ پرزہ کر کے فلش میں بہا دیا۔

کچھ دیر بعد ہم ریستوران سے نکل آئے۔ میری کار ریستوران سے کچھ دور ایک سینما کی پارکنگ لاٹ میں اندھیرے میں کھڑی ہوئی تھی۔ شفیع کے پاس اسپورٹس موٹر سائیکل تھی۔ وہ کار رکھنے کا متحمل بھی ہو سکتا تھا مگر اسے موٹر سائیکل چلانے کا بہت شوق تھا۔ وہ اچھا خاصا موٹر سائیکلسٹ تھا۔ بہت سے کرتب وغیرہ بھی دکھا سکتا تھا۔

میرے مختصر سے گروہ میں شفیع بہت کام کا آدمی تھا۔ وہ بہت اچھا لڑاکا تھا۔ ہتھیاروں کے ساتھ بھی اور ہتھیاروں کے بغیر بھی۔ خطرناک ترین صورتِ حال میں کار یا ٹرک کو مضبوط ترین محاصرے میں سے نکال لے جانے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اسی کے ساتھ بے پناہ وفادار اور سعادت مند بھی تھا۔

اس قسم کے ساتھی عام طور پر سرکش ہو جاتے ہیں۔ اپنے طور پر جلد ہی ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگتے ہیں یا بعض اوقات ان کے مطالبات حد سے بڑھ جاتے ہیں۔ لیکن شفیع میں ابھی تک میں نے اس قسم کے رجحانات بھی نہیں دیکھے تھے۔ اس نے قاسم خان جیسے خود غرض آدمی کا بھی آخری وقت تک ساتھ دیا تھا حالانکہ وہ اسے کمیشن بھی اس سے کہیں کم دے رہا تھا جتنا اب میں دے رہا تھا۔

شفیع سے مجھے بڑی امیدیں وابستہ تھیں۔ وہ اس وقت بھی ایک طرح سے میرا غیر رسمی نائب ہی تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر میں اپنی لائن میں کوئی بڑی چیز بن گیا تو شفیع ہی میرا دست راست ہو گا اور میں اسے باقاعدہ نائب کا درجہ دے دوں گا۔

میرے دوسرے دو ساتھی سردار علی اور حنیف خان اکٹھے رہتے تھے۔ یہ بھی نوجوان اور غیر شادی شدہ تھے۔ بظاہر یہ کپڑے اور ہوزری کے چھوٹے موٹے بیوپاری تھے۔ مال لانے اور لے جانے کی ساری ذمے داری ان کی ہوتی تھی۔ اب میں نے بذات خود کھیپ لانے یا لے جانے کے لئے ساتھیوں کے ہمراہ جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ بہت مشاق ہو گئے تھے اور مجھے ان پر بھروسہ بھی تھا۔

میرے گروہ کا چوتھا خاص ساتھی شبیر شیخ تھا۔ بظاہر منحنی اور مجہول نظر آنے والا یہ شخص بھی بے مثل صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی شخص سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ کتنا پھرتیلا اور طاقتور ہے۔ اژدھے کی طرح اگر وہ ایک بار کسی کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا تو پھر جان سے مار کر ہی چھوڑتا تھا۔ اس کی ایک اہم خوبی یہ تھی کہ وہ صرف جسمانی طور پر ہی نہیں' ذہنی طور پر بھی بے حد پھرتیلا اور مستعد تھا۔ کسی بھی صورتِ حال میں فوری طور پر فیصلہ کرنا اس کی خصوصیت تھی اور عام طور پر وہ فیصلہ درست ہی ہوتا تھا۔ مال لینے اور دینے کے سلسلے میں پارٹیوں سے سودے بازی' معاملات کی تکمیل' معاہدے کرنا' رابطے برقرار رکھنا اور بعض جگہوں پر نذرانے پہنچانا اور اس قسم کی کئی دوسری ذمے داریاں اس کے سپرد تھیں۔ اس کے علاوہ ہر اس کھیپ کے ساتھ بھی شبیر ہی جاتا تھا جسے ذرا سا بھی خطرہ لاحق ہوتا تھا۔ کسی بھی قسم کا خطرہ۔

میرا گروہ مختصر لیکن نہایت ہی مکمل قسم کا تھا۔ ان چاروں آدمیوں کی موجودگی سے میری وہ تمام ضروریات اور توقعات پوری ہو جاتی تھیں جو کسی بڑے سے بڑے گروہ سے وابستہ کی جا سکتی تھیں۔ گویا بہت سے دیگر معاملات کی طرح میں اس معاملے میں بھی خوش قسمت تھا۔

باہر آ کر ہم نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملایا۔ میرے ساتھیوں کی گاڑی اور موٹر سائیکل ریستوران کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ وہ تو وہیں سے رخصت ہو گئے اور میں ٹہلتا ہوا سینما ہاؤس کی طرف چل دیا۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں اپر مال کی طرف چل دیا۔ مال پر نہر والے پل سے میں گلبرگ کی طرف مڑنے کے لئے گاڑی کو دائیں ہاتھ پر لانے ہی لگا تھا کہ عقب سے کسی نے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا" نہیں... اس کی ضرورت نہیں سیدھے ہی چلتے رہو" اس کے ساتھ ہی ایک ٹھوس سی چیز میری کنپٹی سے آ لگی۔

اسٹیئرنگ وھیل پر ایک ثانیے کے لئے میرے ہاتھوں میں لرزش سی آئی اور جسم میں سنسنی کی لہر دوڑی مگر دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ پر قابو پا لیا اور گاڑی کو اسی ٹریک پر رواں رکھا۔

اپر مال پر اس وقت ویرانی چھانے لگی تھی۔ اکا دکا گاڑیوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ میں نے صرف ایک بار عقب نما آئینے کی طرف دیکھا۔ گاڑی کے اندر گھٹا ٹوپ اندھیرے میں میرے پیچھے ایک نہیں دو ہیولے نمودار ہو چکے تھے۔ چند سیکنڈ پہلے ہی میں نے عقب نما آئینے کی طرف دیکھا تھا۔ اس وقت یہ ہیولے یقیناً سیٹوں کے پیچھے دبکے ہوئے تھے۔

میں نے جب سینما ہاؤس کی پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالی اس وقت چونکہ شو ختم نہیں ہوا تھا اس لئے وہ شخص وہاں

موجود نہیں تھا جو عام طور پر گاڑیوں کی آمد اور رخصت کے وقت موجود رہتا تھا۔ البتہ جس وقت میں نے گاڑی کھڑی کی تھی اس وقت وہ ضرور موجود تھا اور اس نے مجھ سے پیسے لے کر مجھے ٹکٹ بھی دیا تھا۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ اس قسم کے لوگ کتنی عمدگی سے گاڑیوں کی نگرانی کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اس کے باوجود جانے کیوں سینما کی پارکنگ لاٹ میں گاڑی کھڑی کر کے کسی حد تک اطمینان سا رہتا تھا۔

میں کبھی غیر محتاط نہیں رہتا تھا اور میری چھٹی حس ہمیشہ بیدار رہتی تھی کیونکہ میرا تجربہ تھا کہ چوکنا رہتے ہوئے خواہ مہینوں خیریت سے گزر جائیں لیکن ادھر آپ حالات کی ہمواری اور سازگاری سے مطمئن ہو کر ذرا بے فکر ہوئے اور وہیں صیاد نے چھاپا مار دیا۔ اس لئے نہایت پرسکون حالات میں بھی چوکنا رہنے کو میں نے اپنا شعار بنا لیا تھا لیکن آج شاید میں کچھ دیر کے لئے اپنے اصول پر کاربند نہیں رہ سکا تھا۔

جس وقت میں نے تاریکی میں پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالی میری حسیات میں خفیف سا ارتعاش ضرور پیدا ہوا تھا۔ شاید میری کسی حس نے مجھے خبردار کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں گاڑی میں اکیلا نہیں ہوں مگر میں نے اس طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میں آج کی میٹنگ سے کچھ زیادہ ہی خوش تھا اور آنے والے چند دنوں کے تصور میں مگن تھا۔ برسوں میں پہلی بار آج میں اس طرح مگن ہوا تھا اور آج ہی صیاد نے آن دبوچا تھا۔

مجھے خوف یا پریشانی سے زیادہ یہ الجھن ستا رہی تھی کہ آخر یہ تھے کون لوگ؟ سرکاری آدمی تو یہ ہو نہیں سکتے تھے کیونکہ انہیں اس طرح آنے کی ضرورت نہیں تھی... وہ علی الاعلان کسی بھی جگہ مجھے روک سکتے تھے۔ کسی اور گروہ سے ابھی تک میری رقابت نہیں چلی تھی اور نہ ہی میرے خیال میں کسی گروہ کو یہ علم ہو سکتا تھا کہ میں کس وقت کہاں پایا جا سکتا ہوں۔

ایک خیال میرے ذہن میں یہ آیا کہ کہیں یہ دونوں افراد کاریں چھیننے والے کسی گروہ سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ میں نے حال ہی میں یہ نئی گاڑی خریدی تھی۔ پھر مجھے اپنا یہ خیال خود ہی مسترد کرنا پڑا۔ اگر کار حاصل کرنا ہی ان کا مقصد ہوتا تو جب وہ تاریک پارکنگ لاٹ میں کار کے کسی دروازے کا قفل کھول کر اندر بیٹھنے میں کامیاب ہو چکے تھے تو وہ اسے لے کر بھی جا سکتے تھے۔ اس کے لئے انہیں کار کے مالک کا انتظار کرنے اور اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔

بالآخر میں نے یہ سوچ کر پوری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز کر لی کہ جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔ وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔ ایئرپورٹ سے کچھ پہلے اس شخص نے مجھے بائیں طرف

مڑنے کا حکم دیا جس نے میری کنپٹی پر ریوالور رکھا ہوا تھا۔ کینٹ ایریا کے تقریباً آخری آباد حصے میں پہنچ کر اس نے مجھے دائیں طرف مڑنے کا حکم دیا۔ اس راستے پر بھی ہم تقریباً دو میل کا فاصلہ طے کر چکے تو مجھے ایک بار پھر تشویش ہونے لگی۔ آبادی کا سلسلہ اب ختم ہو چکا تھا۔ آگے کہیں کھیت تھے اور کہیں درختوں کے جھنڈ۔

مجھے ان دونوں کی بے خوفی پر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ مجھ سے زیادہ تشویش زدہ تو انہیں ہونا چاہئے تھا کیونکہ یہ علاقہ ویران سہی لیکن بہرحال چھاؤنی کا علاقہ تھا۔ یہاں مختلف محفوظ مقامات پر فوجی چوکیاں بھی تھیں جو سڑک سے نظر نہیں آتی تھیں۔ کبھی کبھار یہاں فوجی گاڑیاں بھی گشت کرتی رہتی تھیں۔ رات کے اس پہر ویرانے میں ایک سویلین گاڑی کو دیکھ کر وہ مشکوک سمجھ کر روک بھی سکتے تھے۔

اچانک ایک خیال سے میرا جسم سرد سا پڑ گیا۔ کاروں کے بعض لٹیرے بالکل خبط الحواس یا نفسیاتی مریض قسم کی چیز بھی ہوتے ہیں۔ کار حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ خواہ مخواہ اور قطعی بلا ضرورت و بلا جواز مالک کو بھی قتل کر کے لاش کسی ویرانے میں پھینک دیتے ہیں۔ معلوم نہیں اس طرح وہ اپنے کون سے انتقامی جذبے کی تسکین کا سامان کرتے ہیں۔ اب مجھے عقب نما آئینے کی طرف بھی زیادہ توجہ رکھنے کی ضرورت تھی اور کنپٹی پر ٹکی ہوئی نال کے دباؤ پر بھی۔ اس حالت میں جب کوئی ٹرائیگر دبانے کا فیصلہ کرتا ہے تو غیر ارادی طور پر ریوالور پر اس کے ہاتھ کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ مجھے یہی خیال رکھنا تھا کہ اگر اس مخصوص انداز میں ریوالور پر دباؤ بڑھے تو میں اسی لمحے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاؤں۔

سڑک اتنی تنگ اور ناہموار تھی کہ گاڑی ذرا بھی تیز چلانا ممکن نہیں تھا۔ اگر وہ مجھے یوں ہی ڈرائیونگ کے دوران ہی گولی مار دیتے تب بھی پھرتی سے آگے آکر اور مجھے دروازے سے دھکیل کر ڈرائیونگ سنبھالنا ان کے لئے زیادہ مشکل نہیں تھا۔ میں حد سے زیادہ مستعد ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے اعصاب وائلن کے تاروں کی طرح تنے ہوئے تھے۔

"کیا سرحد پار جانا ہے؟" بالآخر میں نے بے خوفی کا اظہار کرنے کے لئے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

ریوالور والے نے بے آواز سا قہقہہ لگایا اور پہلے ہی کی طرح پُرسکون لہجے میں بولا "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ اس راستے سے سرحد کا رخ کرنے والے کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔"

اب مجھے حقیقتاً جھٹکا سا لگا۔ اس جملے کا مطلب یہی تھا کہ یہ لوگ میری اصل حیثیت سے واقف تھے اور یہ میرے لئے بہت ہی زیادہ تشویش کی بات تھی۔ میں یکدم اپنی جگہ سن سا ہو گیا۔

"بائیں طرف کچے میں موڑ لو" ریوالور والے نے حکم دیا۔

میں نے اس حکم کی بلا چون و چرا تعمیل کی۔ اس طرف غیر محسوس طور پر ہم نشیب میں اترتے چلے گئے۔ ناہموار کچے میدان کے اختتام پر جنگل پھیلا ہوا تھا۔ جنگل کے قریب پہنچ کر اس نے مجھے گاڑی روکنے کا حکم دیا۔ میں نے گاڑی روکتے وقت بھی ایک لمحے کے لئے سوچا کہ میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاؤں یا نہیں لیکن پھر میں نے کچھ دیر اور انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔

"ہیڈ لائٹس بھی آف کر دو" اس نے حکم دیا "اور پہلے تم اتر کر..... دونوں ہاتھ اٹھائے سامنے والے درخت تک جاؤ اور پھر ہماری طرف گھوم جاؤ۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو اس نے میری کنپٹی پر ریوالور کی نالی کا دباؤ تکلیف دہ حد تک بڑھا دیا اور سفاک لہجے میں کہا "میں صرف تین تک گنوں گا۔ ایک ....."

میں فوراً گاڑی سے اتر گیا اور دونوں ہاتھ اٹھائے اس درخت کی طرف چل دیا جس کی طرف اس نے اشارہ کیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان کے اور میرے درمیان زیادہ فاصلہ پیدا ہو کیونکہ اس طرح میرے لئے کوئی کارروائی کرنا تقریباً ناممکن ہو جاتا اور اندازے کی ذرا سی غلطی جان بھی لے سکتی تھی۔

ابھی میں درخت سے تین چار قدم ادھر ہی تھا کہ عقب سے آواز آئی "بس اب ہماری طرف گھوم جاؤ۔"

میں آہستگی سے ان کی طرف گھوم گیا۔ وہ گاڑی سے اتر آئے تھے۔ ایک تو دروازے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اور دوسرا بونٹ کا سہارا لئے ہوئے تھا۔

چاند کی ابتدائی تاریخیں تھیں اور آسمان پر تارے بھی خال خال ہی تھے۔ ہر طرف ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا تاہم میری آنکھیں اس قسم کے ماحول میں کافی حد تک بہتر طور پر دیکھنے کی عادی تھیں۔ میں اتنے فاصلے سے بھی ان دونوں کا جائزہ لے سکتا تھا۔

وہ شخص جو تمام راستے میری کنپٹی پر ریوالور رکھے آیا تھا، دراز قد اور نوجوان تھا اور کچھ ہیرو ٹائپ سا معلوم ہوتا تھا۔ بال پیشانی پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کا لباس بھی کھلنڈرے اور چلبلے قسم کے نوجوانوں والا تھا۔ گریبان کھلا تھا اور گلے میں طلائی لاکٹ چمک رہا تھا۔ اس کا جسم ورزشی تھا۔ کندھے چوڑے اور کمر پتلی۔ ریوالور کا رخ اس نے اب بھی میری طرف کیا ہوا تھا۔

ریوالور اس کے ساتھی کے ہاتھ میں بھی موجود تھا جو مجھے اب نظر آیا تھا۔ وہ ریوالور کو ڈھیلے ڈھالے انداز میں انگلیوں میں جھلاتے ہوئے تھا گویا اسے اس کی کوئی خاص ضرورت نہ

ہو، صرف مجھے تنبیہہ کرنے کے لئے اٹھا رکھا ہو۔ وہ پستہ قد تھا اور گینڈے کی طرح مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ اس کا چہرہ مجھے بہت زیادہ صاف طور پر تو نظر نہیں آرہا تھا لیکن جس حد تک نظر آرہا تھا اس سے بھی میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ بے پناہ سفاک آدمی تھا۔ اتنا سفاک آدمی کہ نہایت سرد مہری اور سکون سے کسی کو ذبح کر دے اور پھر اس کی لاش پھلانگ کر ایک طرف کھڑا ہو کر نہایت اطمینان سے کسی مشروب کی چسکیاں لینے لگے۔ میں اب کافی مردم شناس ہو چلا تھا۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ اس قسم کے خاموش طبع سے آدمی کتنے خطرناک ہوتے ہیں۔

"مذاکرات کے لئے یہ جگہ کتنی مناسب ہے" دراز قد اور ہیرو ٹائپ نوجوان مسکراتے ہوئے بولا "خوبصورت..... پُرسکون اور پُرفضا مقام ہے نا؟"

"کس موضوع پر مذاکرات کرنا چاہتے ہو؟" میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"چرس کے موضوع پر" نوجوان نے اطمینان سے جواب دیا۔ اور جیب سے پیکٹ نکال کر ایک ہی ہاتھ میں رکھتے ہوئے اسے کھولا اور بڑے اسٹائل سے ایک سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبالی۔ سفاک صورت اور پستہ قد شخص نے اپنی جیب سے لائٹر نکال کر اس کی سگریٹ کو شعلہ دکھایا مگر خود سگریٹ نہیں لی۔

شعلے کی روشنی میں ایک لمحے کے لئے مجھے نوجوان کا چہرہ صاف نظر آیا۔ وہ اتنا کم عمر بھی نہیں تھا جتنا مجھے اندھیرے میں دکھائی دیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ سفاکی اس کی آنکھوں سے بھی عیاں تھی۔ وہ دونوں پیشہ ور قاتل معلوم ہوتے تھے۔ وہ بھی بڑے غور سے میرا سراپا جائزہ لے رہے تھے۔

"چرس" میں نے دھیمے لہجے میں دہرایا "موضوع تو بہت اچھا منتخب کیا ہے تم نے مذاکرات کے لئے" ان کی اس بات نے مجھے مزید بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کیونکہ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ میرے بارے میں تھوڑا بہت نہیں بلکہ تقریباً سبھی کچھ جانتے تھے۔ وہ بھی جو بڑی بڑی سرکاری ایجنسیاں تک نہیں جانتی تھیں۔ جن کا کام ہی خفیہ باتوں کا پتا چلانا تھا۔

"ہمیں معلوم ہوا ہے کہ تم چرس کی ایک بہت بڑی کھیپ ایک قریبی ملک کو سپلائی کرنے کے انتظامات مکمل کر چکے ہو" نوجوان سگریٹ کا کش لے کر گویا اصل موضوع پر آتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔

میں فوری طور پر اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اب انجان بننے کی اداکاری کرنا فضول تھا۔ وہ واقعی سب کچھ جانتے تھے لیکن حیرت مجھے یہ تھی کہ آخر وہ کون لوگ تھے جنہیں میں نہیں جانتا تھا اور جو میرے بارے میں سب کچھ جانتے تھے؟

"ہاں" بالآخر میں نے کہا "میں اس قسم کی منشیات ملک سے باہر بھیجنے میں عار محسوس نہیں کرتا۔ البتہ منشیات کو اندرون ملک پھیلانے میں کبھی ملوث ہونا پسند نہیں کروں گا۔ چرس باہر بھیجنے کے دھندے میں میں نے پہلی مرتبہ ہاتھ ڈالا ہے اور وہ بھی مجبوراً۔ مجھے جلد از جلد بڑی رقم کی ضرورت ہے؟"

"بہت خوب" ہیرو ٹائپ نوجوان طنزیہ لہجے میں بولا۔ "لائن کیا اپنائی ہے اور رعب ڈال رہے ہو حب الوطنی کا۔ بھئی واہ۔"

"میں حب الوطنی کا رعب قطعاً نہیں ڈال رہا ہوں" میں نے تحمل سے کہا "صرف اپنے مزاج کی بات کر رہا ہوں۔ لیکن تم اس بحث کو چھوڑو اور اپنا مقصد بیان کرو۔ ظاہر ہے تم یہاں مجھے افکار کے تبادلے کے لئے نہیں لائے ہو۔"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے" نوجوان بولا "ہم دراصل تم سے یہ پوچھنے کے لئے تمہیں یہاں لائے ہیں کہ کیا تم یہ کھیپ بھیجنے کا پروگرام ملتوی نہیں کر سکتے؟"

"نہیں" میں نے وجہ پوچھنے سے پہلے ہی فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا "میں اس منصوبے پر اپنی پوری پونجی لگا چکا ہوں اور مال کے لئے ادائیگی بھی کر چکا ہوں۔ لیکن تمہیں کیا تکلیف ہے جو تم مجھے روکنا چاہتے ہو؟"

"ہمیں بہت سخت تکلیف ہے" نوجوان سنجیدگی سے بولا "ہمیں ایک بہت ہی دور دراز کے ملک سے چرس کا بہت

بڑا آرڈر ملا ہے۔ اس قسم کے آرڈر جو ہمارے شایانِ شان ہوں ہم کبھی نہیں چھوڑتے۔ ہر حال میں انکی تکمیل کرتے ہیں۔ آرڈر اتنا بڑا ہے کہ شاید یہ ہمارے ملک کی اسمگلنگ کی سب سے بڑی کھیپ ہو۔ جہاں جہاں بھی مال ملنے کے ذرائع موجود تھے ان سب کو کھنگال کر ہم جتنا بھی مال جمع کر سکتے تھے کر لیا ہے۔ جس طرح ہم تمہیں اپنا پروگرام ملتوی کرنے کے لئے کہہ رہے ہیں اسی طرح اور بھی کئی چھوٹی پارٹیوں کا پروگرام ہم نے کینسل کرایا ہے۔ ہمارے پاس صرف چار دن ہیں اور ہمیں ان چار دنوں میں مطلوبہ مقدار پوری کرنی ہے۔"

"اگر تم اتنی ہی بڑی پارٹی ہو جتنا کہ اپنی باتوں سے ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہو..." میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "تو تم نے انہیں کیوں نہیں منع کر دیا جو مجھے مال دے رہے ہیں؟"

"وہ علاقہ غیر کے لوگ ہیں اور ان سے ہم الجھنا نہیں چاہتے" نوجوان نے گویا غیر ارادی طور پر صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔ "وہ تم سے رقم پکڑ چکے ہیں۔ اور تب تک اپنے وعدے سے نہیں ہٹیں گے جب تک تم خود انہیں منع نہ کر دو۔ تمہیں رقم کی فکر میں دبلے ہونے کی ضرورت نہیں۔ جس قیمت میں تم سودا کر چکے ہو وہ تمہیں ہم سے مل جائے گی۔"

"لیکن جہاں میں مال پہنچانے کا سارا بندوبست کر چکا ہوں وہاں سے مجھے سارے خرچ نکال کر بھی پانچ گنا رقم حاصل ہو گی۔ اگر تم تین گنا دینے کا وعدہ کرو تو شاید میں تمہاری پیش کش قبول کر لوں" میں نے کہا۔

"ہم سے کاروبار کر رہے ہو؟" نوجوان کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور غراہٹ بھی۔

"ہم میں اور دوسرے کاروباری لوگوں میں تھوڑا ہی سا تو فرق ہے۔ اور وہ یہ کہ وہ مختلف حکومتی اداروں کی اجازت سے کاروبار کرتے ہیں۔ مختلف اداروں میں کاغذات میں۔ ان کا اندراج ہوتا ہے، ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔ اور ہم کسی سے اجازت نہیں لیتے، کہیں ہمارا اندراج نہیں ہوتا اور کہیں ہمارا ریکارڈ تیار ہو جانا ہماری موت کے مترادف ہوتا ہے۔ ورنہ باقی معاملات تو ہمارے کافی حد تک ملتے جلتے ہوئے ہیں" میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

"خیر.... ہمیں سبق پڑھانے کی ضرورت نہیں" نوجوان بولا "ہم تمہیں یہ بتانا چاہ رہے تھے کہ ہمارے سامنے زیادہ کاروباری بننے والوں کا انجام خراب ہی ہوتا ہے۔ اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہم کون ہیں تو تم ابھی خوف سے چیخیں مارتے ہوئے بھاگ نکلو گے۔"

"تو پھر بتا ہی دو کہ تم کون ہو" میں نے نیم استہزائیہ لہجے میں کہا "مجھے بھی کافی عرصہ ہو گیا ہے چیخیں مارے ہوئے۔ سنا ہے چیخیں مارنے سے معدہ درست رہتا ہے۔"

پستہ قد شخص نے پہلی مرتبہ گفتگو میں دخل دیا اور اس کی آواز سن کر ایک لمحے کے لئے میرے جسم میں سرسراہٹ سی ہوئی۔ اس کی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی۔ وہ ریوالور کو ٹرائیگر گارڈ کی مدد سے انگلی میں گھماتے ہوئے قدرے بیزاری سے بولا "جی! ایک تو تم بات کو لمبا بہت کر دیتے ہو۔ میں نے تمہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ یہ لاتوں کا بھوت ہے، باتوں سے نہیں مانے گا۔ قصہ ختم کرو۔"

اس نے ریوالور کو کھلونے کی طرح ہوا میں اچھال کر زبردست مشاقی سے اس طرح کیچ کیا کہ نال میرے سینے کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔

نوجوان دوسرے ہاتھ سے اس کا ریوالور جھکانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "اگر ہمیں تمہاری زبان سے انکار سن کر خاموشی سے چلے جانا ہوتا تو ہمیں اتنی دور آکر جھک مارنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہم وہیں کہیں مال پر ہی گاڑی سڑک کے کنارے رکوا کر تم سے بات کر لیتے۔ اس علاقے میں کئی ایسے آدمیوں کی لاشیں گیدڑ، چیلیں، کوّے اور گدھ کھا چکے ہیں جنہوں نے ہماری بات ماننے سے انکار کیا تھا۔"

"اگر تم یہ بتا دو کہ تم لوگ کون ہو تو شاید مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی رہے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"یہ بتانا ضروری نہیں ہے" نوجوان بولا "ہم درحقیقت تم سے یہ سوال کر رہے ہیں کہ تم زندہ رہنا چاہتے ہو یا نہیں؟ تمہیں صرف ہاں یا نہیں میں اس کا جواب دینا ہے۔"

میں نے جواب دیا لیکن غیر انسانی زبان میں۔ میں نے دراصل حلق سے اُلو کی آواز نکالی تھی۔ انہیں یہی محسوس ہوا ہو گا کہ اُلو عین ان کے قریب ہی کہیں بولا ہے۔ اس ویرانے میں کسی کے بھی سر پر اُلو بولے تو وہ بدشگونی کے وہم میں مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

پستہ قد شاید زیادہ ضعیف الاعتقاد تھا۔ اس نے فوراً اوپر دیکھا اور صرف اسی کی توجہ میں ایک لمحے کے لئے خود پر سے ہٹانا چاہتا تھا۔ میں فوراً زمین پر گر پڑا۔ ہیرو ٹائپ نوجوان نے فائر کرنے میں ایک ثانیے کی بھی تاخیر نہیں کی اور تقریباً اس کے ساتھ ہی پستہ قد شخص کا ریوالور بھی گرجا لیکن میں سانپ کی طرح لہرا کر لوٹتے ہوئے درخت تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ انہوں نے کافی عقل مندی کا مظاہرہ کیا تھا کہ مجھے درخت تک پہنچنے کا حکم نہیں دیا تھا اور اس سے دو قدم پہلے ہی روک لیا تھا لیکن زمین پر لوٹ لگا کر میں نے یہ فاصلہ ایک لمحے میں طے کر لیا تھا۔ یہی سب سے مشکل مرحلہ تھا۔ گولیاں مجھے چھوتی ہوئی گزری تھیں۔ ریوالور استعمال کرنے کے معاملے

میں ان کی مشاقی واقعی بے مثل تھی۔ اگر میری جگہ اوسط درجے کی لڑائی بھڑائی کا تجربہ رکھنے والا کوئی شخص ہوتا تو زمین پر گرنے سے پہلے ہی گولیوں کا نشانہ بن چکا ہوتا۔ آخر میں اب کوئی عام آدمی نہیں رہا تھا۔ انہیں میرے بارے میں یقیناً سب کچھ معلوم تھا لیکن میری صلاحیتوں کے بارے میں انہوں نے شاید غلط اندازے قائم کیے تھے یا پھر وہ اپنے بارے میں بہت ہی زیادہ زعم میں مبتلا تھے جس کی وجہ سے اب تک انہوں نے میرے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کیا تھا جیسا اوسط درجے کے بدمعاشوں کے ساتھ بڑے گروہ باز اختیار کرتے ہیں۔

جب تک میں درخت کی آڑ لینے میں کامیاب ہوا تب تک دو گولیاں اور میرے بالوں کو تقریباً چھوتی ہوئی گزر چکی تھیں۔

جس وقت انہوں نے مجھے درخت کی طرف بڑھنے کا حکم دیا تھا اس وقت میں سامنے پھیلے ہوئے جنگل کا اچھی طرح جائزہ لے چکا تھا۔ اس میں پناہ لینے اور روپوش ہونے کی بڑی گنجائش تھی۔

درخت کی آڑ میں پہنچ کر میں نے صرف ایک لمحے توقف کیا اور یہ لمحہ ان دونوں نے تذبذب کی سی کیفیت میں گنوا دیا۔ میں درخت کی سیدھ میں جنگل کی طرف دوڑتا چلا گیا۔ ...وہ بھی میرے تعاقب میں دوڑے اور انہوں نے ایک ایک فائر اور کیا لیکن یہ محض گولیاں ضائع کرنے ہی کے مترادف تھا کیونکہ میں اب گھپ اندھیرے میں پہنچ چکا تھا۔

میں جنگل کی زندگی کا عادی تھا اور مجھے بہت سے ایسے کاموں کی مشق تھی جو میری ہی لائن کے دوسرے آدمیوں کو بڑی عمر اور تجربے کے باوجود نہیں ہو سکتی تھی۔ میں بھی اب درختوں کو بڑی وقت کے ساتھ دیکھ پا رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جب وہ گھنے جنگل میں داخل ہوں گے تو ان کی عقل ٹھکانے آجائے گی۔

دوڑتے دوڑتے ہی میں نے جوتے اتار پھینکے اور پھر بندر کی سی پھرتی سے ایک درخت پر چڑھ گیا۔ یہ حفاظتی تدبیر تو کم ہی تھی، درحقیقت ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ عام طور پر اس قسم کی صورت حال میں دشمن سے بچ کر بھاگنے والے بھاگتے ہی چلے جاتے ہیں اور دشمن بھی ان کو نیچے ہی تلاش کرتے ہیں اور تلاش کرنے والے اگر تعداد میں زیادہ ہوں اور جنگ کی حکمت عملی سے کچھ واقف ہوں تو کامیاب ہو جاتے ہیں۔

جان بچا کر بھاگنے والے کو درخت پر چڑھنے کا خیال کم ہی آتا ہے اور پھر بلی یا بندر کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ تلاش کرنے والوں کو بھی کم ہی یہ امید ہوتی ہے کہ ان کا شکار کسی درخت پر چڑھا بیٹھا ہو گا۔

میں اس وقت محفوظ انداز میں درخت پر پناہ لے چکا تھا

جب میں نے ان دونوں کو گھنے درختوں کے درمیان پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے دیکھا۔ ان کے وجود تقریباً تاریکی ہی کا حصہ معلوم ہو رہے تھے۔

یہ میری خام خیالی ہی تھی کہ گھنے جنگل میں انہیں کسی تعاقب کا شاید تجربہ نہ ہو۔ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ دراز قد نوجوان تو شاید اس معاملے میں کچھ اناڑی تھا لیکن اس کا ساتھی پستہ قد اور پختہ العمر شخص ہرگز اناڑی نہیں تھا۔ اس اندھیرے میں گو کہ وہ بمشکل ایک ہیولا ہی دکھائی دے رہا تھا لیکن اس ہیولے کی حرکات و سکنات سے بھی میرے لئے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ میری طرح اس کے اندر بھی ایک درندہ چھپا ہوا تھا جو اس وقت جنگل کی فضا، اس ماحول اور اس صورت حال میں پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ وہ یقیناً اندھیرے میں محض آواز پر درست نشانہ لگا سکتا تھا۔ وہ ایک دوسرے کی طرف پشت کئے ہوا میں گویا میری بو سونگھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

جس درخت پر میں بیٹھا تھا اس سے کچھ دور ہی وہ رک گئے۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس سمت میں اور کس انداز میں آگے بڑھیں۔

"ٹارچ روشن کرو..." یہ تیز سرگوشی یقیناً لمبے نوجوان کی تھی۔

"ہاں... تاکہ وہ دور سے ہمیں دیکھ لے" پستہ قد پھنکارا۔ "اسے معمولی آدمی مت سمجھو۔ تم نے اس کے بھاگنے اور گولیوں سے بچنے کا انداز نہیں دیکھا؟ تمہاری شیخی خوری کی عادت سے اس نے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ جتنی دیر تم لمبی لمبی باتیں کرتے رہے وہ اس دوران اپنے گرد و پیش کی چیزوں کا فاصلہ ناپتا رہا اور موقع ملتے ہی اس طرح بھاگ نکلا کہ ہم جیسے نشانہ بازوں کو بھی جل دے گیا۔"

"خیر.... جو ہوا سو ہوا۔ اب اسے پکڑنے کی فکر کرو" نوجوان نے بدمزگی سے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ نوجوان

www.paksociety.com

صلاحیتوں کے اعتبار سے اس پست قد شخص کا ہم پلہ نہیں تھا لیکن اپنے گروہ میں کسی وجہ سے اسے پست قد پر برتری حاصل تھی۔ اس کے لہجے میں تحکم کی جھلک تھی۔

"اس جنگل میں اسے تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے گھاس کے انبار میں سوئی تلاش کرنا" پست قد نے یہ محاورہ انگریزی میں بولا تھا جس پر مجھے تھوڑی سی مزید حیرت ہوئی کیونکہ وہ شکل و صورت سے کچھ زیادہ پڑھا لکھا آدمی نظر نہیں آتا تھا۔

وہ ایک قدم اور آگے بڑھے پھر پست قد نے سرگوشی نما لہجے ہی میں پوچھا "تم نے اطمینان کرلیا تھا کہ اس کے پاس ریوالور نہیں ہے ؟"

"ہاں" نوجوان نے جواب دیا "وہ پینٹ شرٹ میں ہے اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی کسی جیب میں ریوالور کی موجودگی کے آثار نہیں ہیں اور نہ ہی وہ بغلی ہولسٹر لگائے ہوئے تھا۔ میں نے گو کہ اس کی تلاشی نہیں لی لیکن یہ بات میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس پاس ریوالور نہیں ہے۔"

وہ کمبخت ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ عام حالات میں جب میں باہر نکلتا تھا تو میرے پاس ریوالور نہیں ہوتا تھا۔ البتہ میری پنڈلی پر ایک چرمی نیام بندھی رہتی تھی جس میں ایک پتلا دو دھاری خنجر موجود رہتا تھا۔ اس وقت یہ خنجر میرے ہاتھ میں تھا اور مجھے صرف موقع کا انتظار تھا۔

پست قد نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا "وہ بالکل ناک کی سیدھ میں دوڑا تھا۔ میرا خیال ہے کہ درختوں سے بچتا بچاتا وہ سیدھا ہی آگے بڑھا ہوگا اور اب تک زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ میں اور تم درمیان میں کچھ فاصلہ رکھ کر الگ الگ آگے بڑھتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ حصے کا جائزہ لیا جاسکے۔ اگر کامیابی نہ ہو سکی اور واپسی کا ارادہ ہو تو سیٹی بجا کر مجھے سگنل دے دینا۔ میں تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔ تم اس سیدھ میں آگے بڑھو" اس نے انگلی کے اشارے سے نوجوان کے لئے سمت متعین کی اور جواب کا انتظار کئے بغیر اسے وہیں چھوڑ کر ایک طرف کو چل دیا۔ وہ غالباً کافی دور جاکر نوجوان کے متوازی چلنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

چند ہی لمحے بعد وہ میری نظر سے اوجھل ہوگیا۔ اس کا ہیولا تاریکی ہی کا ایک حصہ بن گیا۔ اس کے جانے کا مجھے بڑا افسوس ہوا۔ اصل خطرہ مجھے اسی سے لاحق تھا اور میں چاہ رہا تھا کہ وہ خواہ چند سیکنڈ کے لئے ہی سہی مجھے تنہا مل جائے۔

نوجوان محتاط انداز میں ادھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھا حتیٰ کہ عین اسی درخت کے نیچے آن پہنچا جس پر میں بیٹھا تھا۔ میں نے نہایت نپے تلے انداز میں اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ کسی خونخوار درندے کی طرح مچلا لیکن میں اسے گرفت میں لیتے ہوئے زمین پر لڑھک چکا تھا اور میرا خنجر اس کے پہلو میں پیوست ہو چکا تھا۔ لیکن میری تمام تر کوشش کے باوجود وہ دلدوز انداز میں چیخنے میں کامیاب ہوگیا گو کہ دوسرے ہی لمحے میرا ہاتھ سختی سے اس کے منہ پر جم چکا تھا لیکن اس کی ادھوری سی چیخ بہرحال جنگل کے سکوت کو مرتعش کرچکی تھی۔ اس پر چھلانگ لگاتے وقت میری کوشش یہ تھی کہ اس کے ہاتھ سے ریوالور نکل جائے، خنجر اس کے دل میں اتر جائے اور وہ چیخ بھی نہ نکال سکے۔

ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا لیکن وہ میرے ہاتھ بھی نہیں آسکا۔ کچھ زیادہ ہی دور جاگرا اور اندھیرے میں اسے تلاش کرنا تقریباً ناممکن ہوگیا۔ میں اپنا خنجر اس کے پہلو سے نکال کر اس کی قمیص سے صاف کرکے اسے ہاتھ میں تھامے تقریباً چوپایوں کے سے انداز میں واپس اسی طرف چل دیا جدھر سے آیا تھا۔

یکایک ایک فائر گونجا۔ گولی شاید کسی درخت سے ٹکرائی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ پست قد نے اپنے ساتھی کی چیخ سن لی تھی لیکن وہ ابھی مجھے نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے محض مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے اندازاً فائر کیا تھا۔ اگر نوجوان کا ریوالور میرے ہاتھ آچکا ہوتا تو میں ضرور اس پست قد اور درندہ نما شخص سے آنکھ مچولی کے لئے رکتا، خواہ عقل اور منطق مجھے اس کی اجازت نہ دیتی۔ کیونکہ میرے اندر کا درندہ نہ صرف بیدار ہوچکا تھا بلکہ اس کی خون کی پیاس بھی کچھ زیادہ ہی ابھر آئی تھی ...تاہم خودکشی تو درندہ بھی نہیں کرتا اور ریوالور کے بغیر اندھیرے میں اس گرگِ باراں دیدہ سے آنکھ مچولی محض خودکشی ہی کے مترادف تھی۔

میں جنگل سے نکلنے کے لئے چوپایوں کے سے انداز میں دوڑتا چلا گیا۔ چند لمحے بعد میں نے اپنے عقب میں ایک اور فائر کی آواز سنی لیکن اس کے بارے میں بھی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ یہ فائر بھی اندازاً ہی کیا گیا تھا۔ اس شخص کو ہرگز اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ میں واپس جارہا ہوں۔

جنگل سے نکل کر میں گاڑی کی طرف دوڑا۔ گاڑی کے دروازے کھلے تھے۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ چابی اگنیشن ہی میں موجود تھی۔ حتی الامکان پھرتی سے میں نے دروازے بند کئے اور ڈرائیونگ سیٹ سنبھال کر گاڑی اسٹارٹ کرکے یو ٹرن لیا اور ایکسیلریٹر پر دباؤ بڑھاتا چلا گیا۔ کافی دور نکل آنے کے بعد میں نے ہیڈلائٹس آن کیں۔

پست قد شخص کو اس کے حال پر چھوڑ دینا ہی کافی بڑی سزا تھی۔ رات کے اس پہر بغیر سواری کے اس علاقے میں رہ جانے والے کی خیر و عافیت کی کوئی ضمانت نہیں دی جاسکتی تھی ...اس کا نوجوان ساتھی تو دنیا کے تمام جھمیلوں سے ہی آزاد ہوچکا تھا۔ میں نے اس کے پہلو میں خنجر پیوست کرنے کے بعد اسے چھوڑا ہی اس وقت تھا جب اس کی دھڑکنیں معدوم ہوچکی تھیں۔

میرا واپسی کا سفر خیریت سے کٹ گیا لیکن جب میں گھر پہنچا تو میرا حلیہ دیکھ کر ایک بار پھر چچا میاں کے ہوش اڑ گئے۔

"پریشان نہ ہوں چچا میاں!" میں نے انہیں تسلی دی "میرا کسی سے جھگڑا ہوگیا تھا۔ اب وہ چکر نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ آپ کی بات میری سمجھ میں آگئی ہے اور میں نے اپنے آپ کو شراب کے سمندر میں غرق کرنے یا عشرت کدوں کی بھول بھلیوں میں گم کرنے کا ارادہ ترک کردیا ہے۔ آپ اطمینان سے جاکر سو جائیں۔"

میرے لہجے سے انہیں میرے بے قائمی ہوش و حواس ہونے کا یقین ہوگیا اور وہ مطمئن ہوکر سرونٹ کوارٹر میں چلے گئے۔ تاہم میں کافی دیر تک جاگتا رہا۔ اس پورے واقعے نے میرے اعصاب پر کوئی خاص اثر نہیں ڈالا تھا۔ مجھے صرف یہ سوال پریشان کررہا تھا کہ آخر وہ لوگ کون تھے؟ کس گروہ سے تعلق تھا ان کا؟ اور ان سوالوں کے جواب حاصل کئے بغیر میں نے ان میں سے ایک کو ٹھکانے لگا کر کہیں غلطی تو نہیں کی تھی؟ جب میں اس سلسلے میں کسی خاص نتیجے پر نہیں پہنچ سکا تو سب کچھ ذہن سے جھٹک کر یہ سوچ کر سو گیا کہ جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔

دو دن بعد جبکہ ہماری کیمپ جانے کی تیاریاں آخری مرحلوں پر تھیں، رات کے تقریباً بارہ بجے فون کی گھنٹی بجی۔ میں اس وقت سونے کے لیے لیٹ چکا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو قدرے مانوس سی ایک مردانہ آواز سنائی دی "افضل"

"جی" میں نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا

"کیسے مزاج ہیں؟" بڑی ملائمت سے پوچھا گیا۔

میں ایک لمحے خاموش رہا۔ ذہن پر زور دیا لیکن فیصلہ نہ کرسکا کہ ایسا کون شناسا ہوسکتا ہے جسے میرے گھر کا فون نمبر معلوم ہو۔

"معاف کیجئے... میں نے آپ کو پہچانا نہیں" بالآخر میں نے شائستگی سے کہا۔

جواباً دوسری طرف سے ہلکا سا قہقہہ سنائی دیا "کمزور یادداشت ہمارے پیشے کے لئے بالکل اچھی نہیں ہے ڈیئر افضل! ہم جیسے لوگوں کا ذہن تو کمپیوٹر کی مانند ہونا چاہئے۔ ایک بار آواز سنی تو سماعت میں محفوظ ہوگئی۔ ایک بار چہرہ دیکھا تو ذہن پر نقش ہوگیا..."

اچانک میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا اور میں نے وہ آواز پہچان لی۔

"سیٹھ واحد...!" میں نے سرسراتی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"گڈ" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "اس کا مطلب ہے تمہاری یادداشت زیادہ بری نہیں۔"

میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ میں تو اب تک یہی سمجھے بیٹھا تھا کہ میرا ٹھکانا بہت محفوظ ہے اور میرے بارے میں کسی کو کچھ علم نہیں لیکن یہ محض میری خام خیالی تھی۔

"آپ... آپ کیا لاہور سے بول رہے ہیں؟" میں تھوڑا سا ہکلا گیا۔

"نہیں۔ کراچی سے بول رہا ہوں" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"آپ کو میرا اتا پتا.... میرا مطلب ہے فون نمبر وغیرہ... کہاں سے ملا؟" میں نے حیرت کے اس جھٹکے سے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ بے حد خوشگوار موڈ میں معلوم ہوتا تھا۔ ورنہ ایک طویل عرصہ پہلے جب میں اس سے ملا تھا تو اس کے بارے میں میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ شاذو نادر ہی ہنستا ہوگا۔

"ڈرو نہیں" وہ بولا "تمہارا اتا پتا... تمہارے ٹھکانے وغیرہ سب محفوظ ہیں۔ ہمیں اگر کسی کے ٹھکانے کا علم ہو تو ضروری نہیں کہ وہ غیر محفوظ ہی ہو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ میرا اپنا ایک شعبۂ خبر رسانی ہے جس پر میں ہر ماہ لاکھوں روپے خرچ کرتا ہوں۔ اس شعبے کا کام یہی ہے کہ وہ میرے مطلب کی ہر بات کا علم رکھے۔"

"بہت خوب" میں اب سنبھل چکا تھا "کیسے کیسے یاد کیا؟"

"کوئی خاص کام نہیں تھا" وہ سرسری لہجے میں بولا "بس تمہیں مبارک باد دینی تھی۔ تم اب بہت کام کے آدمی بن گئے ہو۔ میرے ایک خاصے اہم آدمی کا تم نے اتنی عمدگی سے پتہ صاف کیا ہے کہ میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے پہلے

ہی معلوم تھا کہ تم آگے چل کر کوئی زبردست چیز بنو گے۔ جس رفتار سے تم آگے بڑھ رہے ہو اسے دیکھ کر تو میں سنجیدگی سے سوچنے لگا ہوں کہ تمہیں اپنا جانشین بناؤں۔ ویسے بھی میری کوئی نرینہ اولاد نہیں ہے۔"

"تو.... وہ ہیرو ٹائپ سا نوجوان آپ کا آدمی تھا؟" میری زبان ایک بار پھر لڑکھڑائی۔

"ہاں" وہ قدرے بے پروائی سے بولا۔

"اگر اس نے اتنی لمبی چوڑی گفتگو کرنے کے بجائے شروع میں ہی مجھے بتادیا ہوتا کہ وہ آپ کا آدمی ہے تو یہ سب کچھ ہرگز نہ ہوتا۔ میں بھی اتنی کھینچ تان سے بچ جاتا اور اس کی جان بھی نہ جاتی" میرا لہجہ معذرت خواہانہ ہوگیا۔ مجھے اگر اس لائن میں رہنا تھا تو سیٹھ واحد جیسے لوگوں سے اس قسم کے واقعات پر معذرت کے بغیر چارہ نہیں تھا۔ بلکہ میں تو صرف معذرت کررہا تھا' میری جگہ میری ہی جتنی حیثیت کا کوئی اور آدمی ہوتا تو شاید وہ اسی وقت ریسیور رکھ کر پہلی فلائٹ سے کراچی پہنچتا اور سیٹھ واحد کے قدموں میں گر پڑتا۔

"تمام تفصیلات مجھے معلوم ہوچکی ہیں" سیٹھ واحد بولا۔ "میں دراصل اس وقت ملک سے باہر تھا جب میرے احکامات پر عمل درآمد ہوا۔ غلطی میرے آدمیوں ہی کی تھی۔ انہوں نے گدھے اور گھوڑے دونوں ہی کو ایک لاٹھی سے ہانکنے کی کوشش کی۔ اس وقت تک مجھے بھی صحیح طور پر معلوم نہیں ہوسکا تھا کہ لاہور سے جو پارٹی چرس کی اتنی بڑی کھیپ کو ہینڈل کررہی ہے وہ دراصل تم ہی ہو۔ میں نے قاسم خان سے علیحدگی کے بعد تمہارے بارے میں ہر قسم کی معلومات تو رکھی تھیں لیکن پھر دوسرے بہت سے معاملات کی وجہ سے تم میرے ذہن سے نکل گئے تھے۔ میرے آدمیوں کو تو تمہارے بارے میں علم ہی نہیں تھا کہ تم سے ہماری کچھ شناسائی رہی ہے۔"

"میں واقعی بے حد شرمندہ ہوں سیٹھ صاحب!" میں نے حقیقی شرمندگی سے کہا "کیا نام تھا اس نوجوان کا؟"

"ریاست خان" سیٹھ واحد نے جواب دیا "لیکن تم اس معاملے کو ذہن پر سوار مت کرو۔ اگر میں تم سے ناراض ہوتا تو اس وقت تم سے فون پر بات نہ کررہا ہوتا۔ پھر تو بات گولیوں ہی کی زبان میں ہوتی۔ میں مان رہا ہوں کہ غلطی میرے آدمیوں کی اور خصوصاً ریاست خان کی تھی۔ اس نے ذاتی طور پر شیخی جھاڑنے کے چکر میں میرا نام استعمال کرنے میں تاخیر کی۔ خیر اسے اپنی غلطی کی سزا مل گئی۔ بڑی غلطیاں کرنے والے کو میری طرف سے بھی یہی سزا ملتی ہے جو تم نے اسے دی۔ اس ضمن میں معذرت وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو اصول کی بات کرتا ہوں۔ میں خواہ مخواہ کسی پر رعب جھاڑنے کا قائل نہیں۔ میں نے تو یہ سوچ کر فون کیا ہے کہ چلو اس بہانے تم سے گپ شپ ہی ہوجائے گی۔ ویسے بھی ہم تو جرأت مند اور باصلاحیت لوگوں کے سب سے بڑے قدردان ہیں۔ کبھی میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا تکلف یاد کرلینا' تم سے مل کر بہت خوش ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ میں اپنا مال بھیجنے کا پروگرام برقرار رکھ سکتا ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"ضرور۔ ضرور" وہ خوش دلی سے بولا "اور اس مہینے میں پورے ملک میں ہم دو ہی آدمی ہوں گے جن کا یہ آئٹم باہر جائے گا۔"

"بہت شکریہ" میں نے غیر محسوس طور پر اطمینان کی سانس لی۔

"مجھے تم اپنے دوستوں ہی میں شمار کرو" سیٹھ واحد...

"یہ تو میری خوش قسمتی ہے جناب! کیونکہ آپ جیسے لوگ ہر ایک کو تو دوست نہیں بناتے" میں نے ممنونیت سے کہا۔

"ہاں۔ یہ درست ہے" وہ بلا تامل بولا "لیکن تم جیسے لوگوں کی مجھے تلاش رہتی ہے۔ خدانخواستہ اگر کبھی تم محسوس کرو کہ آزادانہ طور پر کام کرنے کے لئے تمہارے حالات موزوں نہیں رہے تو بلا تامل آکر میرے ساتھ مل جانا۔ میرے ساتھ بیشتر ایسے ہی لوگ شامل ہیں جن کا کبھی اپنا "کاروبار" ...اب اس نوجوان ریاست خان کو ہی لے لو جس کا تمہارے ہاتھوں پتہ صاف ہوا ہے۔ پڑھا لکھا نوجوان تھا۔ کئی سال ام... میں رہا۔ وہاں چھوٹے موٹے دھندے کرتا تھا۔ وہاں سے ... تو استاد لبھو سے آن ٹکرایا۔ استاد لبھو کا چھوٹے پیمانے پر "کاروبار" تھا۔ دونوں پارٹنر بن گئے بلکہ ایک طرح سے ریاست خان نے ہی زیادہ تر اختیارات سنبھال لئے۔ یہ دونوں بہت جا... ابھر آتے لیکن ریاست خان میں دو بڑی خامیاں تھیں جن میں نے بھی زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ ایک تو یہ کہ وہ جلد... نوجوان تھا' دوسرے اس میں شیخی بگھارنے کا مرض کبھی کبھی بڑے غلط موقعوں پر عود کر آتا تھا۔ امریکا کی ایکشن فلموں... اس کا دماغ کافی حد تک خراب کیا ہوا تھا۔ نتیجہ یہ کہ ان کا کارو... بکھرنے لگا چنانچہ دونوں میرے ساتھ آن ملے۔ میں... انہیں بڑی عزت دی۔"

"آپ کا.... مطلب ہے کہ ریاست خان کے ساتھ ... پستہ قد آدمی تھا وہ استاد لبھو تھا؟" فرطِ حیرت سے میں ایک... پھر ہکلانے لگا۔

"ہاں۔ لیکن اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟ کیا... جانتے ہو اسے؟" سیٹھ واحد نے پرتجسس لہجے میں پوچھا

"نہیں۔ میں اس سے واقف نہیں ہوں" میں ...

...مدی سے کہا "مجھے یہ نام بڑا عجیب لگا تھا۔ آدمی تو وہ اچھا خاصا ...قول نظر آرہا تھا۔"

"دراصل اس نے اپنا نام بدلا نہیں ہے" سیٹھ واحد ہنس ...ر بولا "بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ آدمی بڑے کام کا ...ہے۔ شاید اسی لئے وہ تمہارے ہاتھ سے بچ گیا۔"

"جی ہاں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آدمی بہت ...صلاحیت بھی ہے اور خوش قسمت بھی۔ میں اگر تھوڑا بہت ...ف زدہ ہوا تھا تو اسی سے ہوا تھا اور میرا ارادہ اسی کا پتہ صاف ...رنے کا تھا مگر وہ بس یونہی.... غیر محسوس طور پر ہی ہاتھ سے ...ل گیا۔"

"شاید قدرت مجھے زیادہ نقصان سے بچانا چاہتی تھی" ...یٹھ واحد شگفتہ لہجے میں بولا۔

"شاید" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اچھا... خدا حافظ۔ کبھی کراچی آؤ تو ضرور ملنا" سیٹھ واحد ...لا۔

"بہت بہتر۔ خدا حافظ" میں نے ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔

ریسیور رکھنے کے بعد کافی دیر تک میں صحیح معنوں میں پرسکون نہیں ہوسکا۔ میرے ذہن میں جیسے کوئی چرخی سی چل رہی تھی۔ ایک تو میرے لئے یہی جھٹکا کچھ کم نہیں تھا کہ ...نادانستگی میں میرے ہاتھوں سیٹھ واحد کا آدمی مارا گیا تھا اور یہ خالصتاً میری خوش قسمتی تھی کہ اس واقعے کے باعث میرے اور سیٹھ واحد کے درمیان دشمنی کا آغاز ہونے کے بجائے دوستی کی بنیاد پڑ رہی تھی۔

اس سے کہیں زیادہ زوردار جھٹکا یہ جان کر لگا تھا کہ وہ پستہ قد جس پر نظر پڑتے ہی میری چھٹی حس غیر معمولی طور پر مجھے کچھ ناقابلِ فہم سے سگنل دینے لگی تھی ... استاد لبھو تھا۔

استاد لبھو کی بدولت ہی میری زندگی اس موڑ پر پہنچی تھی جس کے بعد میرے روز و شب میں زیادہ تر ہنگامہ خیزی کا عمل دخل رہا تھا۔ مجھے زندگی کا پہلا شدید جذباتی صدمہ اسی شخص کی بدولت پہنچا تھا۔ اس کی مخبری کی وجہ سے میرا اور میرے ابتدائی ساتھی اشرف خان کا دھندا اچانک چوپٹ ہوا تھا۔ ...ہمیں یک دم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر حتیٰ کہ مجھے اپنی محبوبہ زرینہ کو بھی چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔

اشرف خان گولی کا نشانہ بن گیا تھا اور جانبر نہیں ہوسکا تھا۔ کچھ عرصے بعد جب میں زرینہ کو لینے پہنچا تھا تو وہ مجھے ناگفتہ بہ حالت میں نظر آئی تھی اور اس نے میرے ساتھ آنے سے انکار کردیا تھا۔

میں نے استاد لبھو کو اس وقت دیکھا نہیں تھا لیکن سنا ضرور تھا کہ وہ کسی پڑھے لکھے مگر انتہائی بدمعاش قسم کے نوجوان کے ساتھ مل کر اپنا گروہ چلا رہا ہے۔ میری معلومات

کے مطابق استاد لبھو درحقیقت بنیادی طور پر مچھیرا تھا اور یہی کاروبار کرتے کرتے اسمگلنگ کی لائن میں آگیا تھا۔ اس وقت بھی میں نے سنا تھا کہ وہ بے پناہ سفاک آدمی ہے لیکن میرے دل میں اس کے خلاف انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور میں نے اپنی دانست میں اسے سبق دینے کے لئے ڈھونڈ ڈھانڈ کر اس کے ایک ساتھی کو قتل کردیا تھا اور اس کے لئے پیغام چھوڑا تھا کہ میں اسے بھی بخشوں گا نہیں اور ایک نہ ایک روز اسے ضرور قتل کروں گا۔ میں نے حقیقتاً پورے جوش و جذبے اور صداقت کے ساتھ اپنے آپ سے یہ عہد کیا تھا کہ میں استاد لبھو کو زندہ نہیں چھوڑوں گا اور مجھے اپنا یہ عہد آج بھی اچھی طرح یاد تھا۔

یقیناً استاد لبھو کو بھی میرا وہ رقعہ ضرور یاد ہوگا جو اسے اپنے مقتول ساتھی کے قریب سے ملا ہوگا لیکن اسے یہ ہرگز نہیں معلوم تھا کہ رقعہ لکھنے والا دراصل کون ہے؟ وہ نہ تو میرے نام سے آشنا تھا اور نہ ہی صورت سے۔ اب تک میں بھی صرف اس کے نام سے ہی آشنا تھا لیکن اب میں نہ صرف اس کی صورت دیکھ چکا تھا بلکہ مجھے اس کا واضح سراغ بھی مل چکا تھا۔

اب مسئلہ صرف یہ تھا کہ وہ میری لائن کے بہت ہی بڑے آدمی کی پناہ میں تھا لیکن محض اس بنا پر میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا' معاف نہیں کرسکتا تھا۔ اگر میں تحمل اور ہوشیاری سے چلتا تو سانپ بھی مر سکتا تھا اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے بچ سکتی تھی۔ میں نے فیصلہ یہ کیا کہ میں مال بھیجنے کی مہم سے فارغ ہوکر اس سلسلے میں سوچوں گا۔ اس کھیپ کو بحفاظت منزل تک پہنچانا میرے لئے بہت ہی اہم تھا اور اس پر میرے مستقبل کے کئی بڑے بڑے منصوبوں کا دارومدار تھا۔

اس فیصلے پر پہنچ جانے کے باوجود مجھے بہت دیر بعد نیند آئی۔ سیٹھ واحد نے آج فون کرکے میرے ذہن میں خاصی

ہلچل برپا کر دی تھی۔

اس ایک کھیپ نے میرے وارے نیارے کر دیے تھے ایک ہی جھٹکے میں' میں بہت آگے پہنچ گیا تھا۔ اب میں اس پوزیشن میں تھا کہ اپنے گروہ کو تھوڑا سا اور پھیلا کر خود آرام سے بیٹھ جاؤں اور صرف احکامات جاری کروں یا حکمت عملی تیار کروں۔ کسی بھی مہم پر میرا ساتھ جانا ضروری نہیں تھا۔ میرے وسائل اتنے ہو چکے تھے کہ میں اس لائن کے بہترین کارندوں کی خدمات حاصل کر سکتا تھا۔

فوری طور پر میں نے ایک کام یہ کیا کہ اپنے وکیل کے مشورے اور مدد سے کچھ رقم کو جائز ذریعۂ آمدن سے حاصل شدہ ظاہر کر کے مال روڈ کی ایک ذیلی سڑک پر امپورٹ ایکسپورٹ کا ایک آفس کھول لیا۔ درحقیقت یہ آفس پہلے سے قائم تھا اور خاصا آراستہ و پیراستہ تھا۔ فرم بھی انکم ٹیکس اور چیمبر آف کامرس وغیرہ میں رجسٹرڈ تھی۔ میں نے اس کے حقوق ملکیت خرید لئے تھے کیونکہ اس کے مالکان مستقلاً پاکستان سے باہر جا رہے تھے۔ فرم بھی کوئی خاص چل چلا نہیں رہی تھی۔ مدت سے کوئی آرڈر نہیں ملا تھا۔ دفتر بھی اکثر بند ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھار وہ لوگ نیم دلی سے کھول لیتے تھے۔ مجھے ایسے ہی کسی دفتر اور فرم کی تلاش تھی۔ نئے سرے سے اپنا دفتر قائم کرنے کی نسبت اسے خریدنے میں میرا کافی وقت بچ گیا اور زیادہ تردد بھی نہیں کرنا پڑا۔ میں نے ابتدا میں صرف تین افراد پر مشتمل اسٹاف رکھا۔

ایک کرسچین لڑکی تھی کیتھرین۔ جو بیک وقت ریسپشنسٹ بھی تھی' ٹیلی فون آپریٹر بھی اور میری سیکریٹری بھی۔ ایک منظور صاحب تھے جو بیک وقت ہیڈ کلرک' اکاؤنٹنٹ اور ٹائپسٹ تھے۔ ایک ریاض صاحب تھے جو امپورٹ منیجر تھے۔ درحقیقت میرا جائز کاروبار سارا کا سارا انہی کو چلانا تھا۔ مجھے تو امپورٹ ایکسپورٹ کا کچھ اتنا زیادہ علم نہیں تھا۔ تاہم خواہش میری یہی تھی کہ میرا جائز کاروبار بھی کسی نہ کسی حد تک تو چل ہی پڑے۔ میں باقاعدگی سے آفس جانے لگا تھا۔

اپنے اسٹاف کے مؤدبانہ سلاموں کا جواب دیتا ہوا جب میں بیرونی کمرے سے گزر کر دبیز قالین پر چلتا ہوا اپنے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں داخل ہوتا اور اپنی خاصی لمبی چوڑی اور شاندار میز کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھتا تو اپنے آپ کو کافی معزز آدمی محسوس کرتا۔ ذہن میں لڑکپن کے کچھ خواب ابھر آتے۔ اس زمانے میں خوابوں کی رسائی زیادہ سے زیادہ یہیں تک ہوتی تھی۔ یونہی بس کبھی موہوم سا خیال آتا تھا کہ کیا کبھی ایسا بھی ہوگا؟ کیا میں بھی کسی ایئر کنڈیشنڈ آفس میں' گھومنے والی کرسی پر کسی بڑے صاحب کی طرح بیٹھ سکوں گا؟

دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی اس خواہش پر خود ہی ہنسی آ جاتی تھی۔ یہ بات خواب کی حد تک تو مجھے ٹھیک لگتی تھی لیکن عالم بیداری میں سوچتا تھا تو بڑی ناقابلِ عمل سی لگتی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ زندگی میں بعض خواہشیں جو کبھی بالکل انہونی سی لگتی ہیں بالآخر پوری ہو جاتی ہیں۔

خواہشات تو میری بھی پوری ہوتی جا رہی تھیں لیکن بس ایک کجی سی رہ گئی تھی جس کی وجہ سے کبھی کبھی ایک بے عنوان سی خلش بے چین کرنے لگتی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ کچھ ٹھیک طریقے سے نہیں ہو رہا۔ بس تھوڑی سی گڑبڑ رہ گئی۔ پھر میں اپنے آپ کو مطمئن کرنے اور اپنے ضمیر کو تھپکی دینے کی کوشش کرتا کہ میاں! اس گڑبڑ کے بغیر یہ سب کچھ اتنی جلدی کہاں ممکن ہوتا؟

"گڑبڑ" نہ ہوتی تو ایک قصبے کا ایک مفلوک الحال لڑکا جوانی ہی میں دی مال کے اس آراستہ و پیراستہ دفتر میں کیسے پہنچ سکتا تھا؟ پس منظر اور پیش منظر میں وہ اتنے آدمیوں کا باس کیونکر ہو سکتا تھا؟ اس کے پاس بلیک اور وہائٹ منی کی صورت میں لاکھوں کی رقمیں کہاں ہوتیں؟ ماڈل ٹاؤن کی کوٹھی اور یہ رائل سیلون کار کہاں سے آتی؟

پھر میں اپنی لائن کے جن چند لوگوں کو جانتا تھا ان کا جائزہ لیتا اور ان کی شخصیت کا تجزیہ کرتا تو دل کو کچھ اور اطمینان ہو جاتا۔ خود پرستی سے قطع نظر میں اپنے آپ کو ان سے کچھ بہتر محسوس کرتا۔ ان میں سے بعض میں تو انسانی اور اخلاقی اقدار کا کوئی تصور ہی نہیں تھا۔ وہ حد درجہ ظالم اور سفاک تھے۔ ...بوقت ضرورت تو میں بھی سفاک بن جاتا تھا لیکن کسی نہ کسی اصول کے تحت۔ دوسرے یہ کہ مجھے اپنے سے کمزور آدمی پر ہاتھ اٹھانا بہت ہی معیوب لگتا تھا۔ آج تک زیادہ تر میری پنجہ آزمائی انہی لوگوں سے ہوئی تھی جو اپنے آپ کو بڑی توپ چیز سمجھتے تھے اور مجھے عموماً اپنے دفاع اور اپنی بقا کی خاطر ہی انہیں سبق سکھانا پڑا تھا۔

جبکہ میری لائن کے بعض لوگ بلا ضرورت ہی اپنے سے کمزور لوگوں کو کچل ڈالنے میں لذت محسوس کرتے تھے۔ میں تو پھر بھی اپنے پیشے کے بارے میں خفیف سے احساس جرم کا شکار رہتا تھا۔ جبکہ ان لوگوں کو احساس جرم چھو کر بھی نہیں گزرا تھا۔ میرے ذرائع آمدن خواہ کچھ بھی تھے لیکن جتنے بھی ضرورت مندوں اور مستحقین کے بارے میں مجھے علم تھا ان کی میں دامے درمے اور سخنے ہر ممکن مدد کرتا رہتا تھا اور اس قسم کی کوئی بھی بھلائی کرتے وقت اپنے آپ کو مخفی رکھنے کی پوری کوشش کرتا تھا جبکہ میرے طبقے کے بیشتر لوگوں میں اس قسم کے معاملات میں دلچسپی لینے کا تصور ہی موجود نہیں تھا۔

معلوم نہیں مجھ جیسے لوگوں کی نیکیاں بارگاہ ایزدی میں

قبول ہوتی ہیں یا نہیں مگر میرا دل ایسا کرنے کو چاہتا تھا اس لئے میں کر گزرتا تھا۔ اور بعض اوقات سوچتا تھا کہ وہ نیلی چھتری والا قادر مطلق ہے، کیا معلوم کب کس گناہ گار پر مہربان ہو جائے اور کب اپنے کسی نیک بندے کی معمولی سی غلطی پر اس سے ناراض ہو جائے۔

میری لائن کے چند ایک لوگ اور بھی تھے جو میری طرح بلکہ مجھ سے بھی زیادہ خدا ترس اور فیاض تھے۔ لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ ان کی خدا ترسی اور فیاضی وغیرہ کی وجہ ان کا احساس جرم ہوتا تھا۔ وہ ایک طرف غلط سلط دھندے کرتے تھے تو دوسری طرف کچھ نیک کام کر کے ترازو کے پلڑے برابر رکھنے کی کوشش کرتے تھے اور انہیں پورا یقین ہوتا تھا کہ انہیں ان کے اچھے کاموں کا اجر ملے گا۔ مجھے یقین نہیں ہوتا تھا، میں بس فطرت سے مجبور ہو کر اچھے کام کرتا تھا اور محض ایک موہوم سی امید ہوتی تھی کہ شاید کبھی میرے کسی اقدام کو شرف قبولیت ملے۔

میری ایک کوشش یہ بھی ہوتی تھی کہ لہو و لعب سے بچوں لیکن میں بہت زیادہ پارسا بھی نہیں تھا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ جب بھی میں کسی معاملے میں روش سے ہٹنے لگتا تھا، خود ہی اپنے آپ کو سرزنش کر لیتا تھا۔

اس زمانے میں نائٹ کلب بھی موجود تھے اور بڑے ہوٹلوں میں تقریباً روزانہ ہی فلور شو بھی منعقد ہوتے رہتے تھے۔ میں ان میں کبھی کبھار ہی جاتا تھا، جب مجھے ڈھونڈے سے بھی کوئی اور مصروفیت نہیں ملتی تھی اور جب میں اپنے آپ کو بہت ہی اداس اور تنہا تنہا محسوس کرتا تھا۔ بازار حسن میں بھی مجھے کچھ زیادہ خاص حسن محسوس نہیں ہوتا تھا گو کہ چند ایک مرتبہ مجھے اس جگہ کو بھی کھنگالنا پڑا لیکن میں جب بھی گیا دوسرے لوگوں کے ساتھ ہی گیا۔ بلکہ یوں سمجھئے کہ ان لوگوں کو خوش کرنے کے لئے اور ان کا ساتھ دینے کے لئے ہی گیا۔

ورنہ میں اپنے بعض ہم پیشہ لوگوں کو دیکھتا تھا کہ جیب میں بھی چپٹی بوتل موجود ہے، کار کے گلوز کمپارٹمنٹ میں بھی بوتل رکھی ہے۔ لڑکھڑاتے ہوئے ہر اس تفریح گاہ میں پہنچ رہے ہیں جہاں رقص و سرود کی محفل گرم ہے اور رات گئے گرتے پڑتے واپس آ رہے ہیں۔ ان کے کندھوں پر ہمیشہ ہی کسی نہ کسی حسینۂ دلنواز کی زلفیں پریشاں رہتی تھیں۔ میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ اس قسم کی حسینائیں میری نظر میں جچتی ہی نہیں تھیں اور بے خودی و مدہوشی میں ادھر ادھر لڑکھڑاتے پھرنا اب مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا تھا۔

مجھ پر جب راحیلہ کی بے وفائی کا انکشاف ہوا تھا تب ضرور اپنے آپ کو خمار کے سمندر میں غرق کر دینے اور دل کو ہر طرح سے برباد کرنے کو طبیعت چاہنے لگی تھی مگر جلد ہی کچھ تو چچا میاں کے سمجھانے پر اور کچھ اپنی افتادِ طبع کے باعث میں سنبھل گیا تھا۔ ایک آدھ دن کے لئے میرا جو حال رہا تھا اب اس کے متعلق سوچ کر ہنسی آتی تھی۔ تاہم راحیلہ کی یاد اب بھی پرانے زخم کی طرح دل میں باقی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میں زندگی میں کبھی اس لڑکی کو بھلا سکوں گا۔ گو کہ میں یہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھا کہ اب مجھے اس سے محبت ہے یا نفرت؟

کبھی کبھی میرے دل میں ایک تیز و تند، طوفانی قسم کی لہر اٹھتی جو مجھے مجبور کرتی کہ میں راحیلہ کو تباہ برباد کر دوں لیکن جب میں اس سلسلے میں کوئی عملی قدم اٹھانے کا سوچتا تو ایک متضاد سی قوت مجھے روک دیتی اور میں اپنے آپ کو عجیب بے بسی کی سی حالت میں پھنسا ہوا محسوس کرتا۔ اس کشمکش سے نجات پانے کے لئے میں ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتا اور اپنے آپ کو ادھر اُدھر کی مصروفیات میں الجھا لیتا۔

میں زندگی کے مختلف مراحل پر اپنا تجزیہ کرنے کی کوشش کرتا رہتا تھا تاکہ خود پرستی سے قطع نظر یہ اندازہ رہے کہ میں کتنے پانی میں ہوں؟ میری خوبیاں اور خامیاں کیا ہیں؟ میں زندگی کے میدان میں کچھ آگے بھی بڑھ رہا ہوں یا نہیں؟ کس کس مسئلے پر مجھے اصلاح کی ضرورت ہے؟ میں اپنے آپ سے مطمئن بھی ہوں یا نہیں؟ زندگی سے میں نے کچھ سیکھا ہے یا نہیں؟

کچھ نہ کچھ عرصے کے بعد میں اس قسم کے سوالات پر ضرور فلسفیوں کے سے انداز میں غور کر لیتا تھا۔ اس سے مجھے اپنی ذات کا وزن متعین کرنے میں بہت مدد ملتی تھی۔ میرا چونکہ کوئی مخلص مشیر یا قریبی دوست تو تھا نہیں اس لئے اپنی زندگی کے ہر اچھے اور برے پہلو کا مجھے خود ہی جائزہ لینا ہوتا تھا۔

سردست میں اپنے آپ کو کافی مطمئن اور پُراعتماد محسوس کرتا تھا جبکہ میری لائن میں اعتماد اور اطمینان دونوں ہی چیزیں عنقا تھیں۔ میں اپنی لائن کے ایک صاحب کو جانتا تھا جو کراچی میں رہتے تھے۔ ڈیفنس میں بہت بڑا بنگلا تھا ان کا، بڑے ٹھاٹ تھے۔ لیکن عالم یہ تھا کہ بے وقت اگر کوئی پانچ دس سیکنڈ کے لئے مسلسل کال بیل بجا دیتا تھا تو وہ بیڈ کے نیچے چھپ جاتے تھے۔ نوکر گیٹ پر جا کر دیکھتے تھے کہ آنے والا کون ہے۔ وہ آ کر بیگم صاحب کو بتاتے تھے اور بیگم صاحب تسلی دے کر میاں کو بیڈ کے نیچے سے نکالتی تھی کہ خطرے کی کوئی بات نہیں۔

یہ بات ان کی موجودگی میں ہی میرے ایک دوست نے مجھے بتائی جو ان کا بھی دوست تھا۔ وہ صاحب ان دنوں کراچی سے لاہور آئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا "جناب! اگر آپ کو اتنا ہی ڈر لگتا ہے تو آپ یہ کام کرتے ہی کیوں ہیں؟ دولت تو اب آپ کے پاس خاصی ہے۔ کوئی اور بزنس کر لیں۔"

وہ صاحب آہ بھر کر بولے "ارے لئی میاں! اب آپ کو کیا بتائیں۔ ہمیں تو اب ہمارے آدمی یہ دھندہ چھوڑنے نہیں دیتے۔ وہ بولتے ہیں، سیٹھ صاحب! آپ کا کیا جاتا ہے؟ آپ آرام سے بیٹھے رہیں۔ ہم آپ کو کما کر کھلائیں گے۔ سچی بات ہے، میں تو ہاتھ بھی نہیں ہلاتا۔ میرا تو بس روپیہ لگا ہوا ہے جو ہر مرتبہ اتنے منافع کے ساتھ واپس آ جاتا ہے جتنا دنیا کے کسی اور کاروبار میں ممکن نہیں۔ اس لئے ہم بھی چپ کر کے بیٹھے رہتے ہیں کہ چلو بھئی جب تک دھندہ چل رہا ہے چلنے دو۔ ڈر بس یہی لگتا ہے کہ یہ کمبخت لوگ اگر ڈوبیں تو کہیں ہم کو بھی ساتھ نہ لے ڈوبیں۔"

بڑا معقول استدلال تھا ان کا۔ آدمی بھی بڑے ہی معقول اور مرنجاں مرنج تھے۔ انہیں دیکھ کر کوئی شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ ان کا اصل پیشہ کیا ہے؟

ایک اور صاحب تھے۔ باریش اور بڑے باعمل۔ وہ تو مذہبی نکتۂ نگاہ سے اسمگلنگ کو درست ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مذہب میں تو اسمگلنگ کا کوئی تصور ہی موجود نہیں۔ یہ تو ایک قسم کی تجارت ہی ہے۔

میں ان کی شکل دیکھتا رہ جاتا تھا۔ یہ اور اسی قسم کے کئی دیگر عجوبۂ روزگار لوگ تھے جن سے کبھی کبھار مجھے واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ بہرحال ان سب سے مجھے کچھ نہ کچھ سیکھنے کا موقع ملتا تھا۔

زندگی کافی آرام سے گزر رہی تھی۔ دولت خاصی تیزی سے آ رہی تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں میرا جائز کاروبار بھی خاصا پھلنے پھولنے لگا۔ میں نے ایکسپورٹ منیجر کے طور پر جس شخص کو رکھا تھا وہ خاصا کام کا آدمی تھا۔ اس کی وجہ سے کاروبار چلنے لگا تھا اور اب تو میں بھی کام کو سمجھتا جا رہا تھا۔ دوسرا دھندہ بھی بغیر کسی خاص جدوجہد کے پھیلتا جا رہا تھا۔ شاید قسمت کافی مہربان تھی۔ آج کل مجھ پر وہ مثال صادق آ رہی تھی کہ مٹی میں ہاتھ ڈال رہا تھا تو سونا ہو رہی تھی۔

کراچی میں بھی میرے خاصے روابط استوار ہو رہے تھے۔ وہی صاحب جن کا میں ذکر کر چکا ہوں کہ مسلسل کال بیل بجنے پر بیڈ کے نیچے جا گھستے تھے، بظاہر بڑے دلیر آدمی معلوم ہوتے تھے۔ کئی بار فون پر مجھے پیشکش کر چکے تھے "اپنا ائی بھائی! ادھر کراچی میں اگر کبھی لانچوں وغیرہ کی ضرورت پڑے... ادھر سمندری راستے کا کوئی کام ہو تو بلاتکلف مجھے بتانا۔ سب انتظام ہو جائے گا" ان کا نام سیٹھ رمضان تھا اور جانے کیوں وہ میرے بڑے مداح معلوم ہوتے تھے۔

ایک بار انہوں نے مجھے یہ مشورہ بھی دیا کہ مجھے اپنا اصل ہیڈ کوارٹر کراچی کو بنانا چاہئے، لاہور میں کیا رکھا ہے۔ ایک دو مرتبہ تو میں نے ان کی اس تجویز پر نہایت سنجیدگی سے غور بھی کیا۔ وہاں سیٹھ واحد بھی تھا جو میرے مہربانوں اور قدر دانوں میں شامل تھا۔ مجھے امید تھی کہ اگر میں کراچی میں بھی ہاتھ پاؤں پھیلانے کی کوشش کروں تو ناکام نہیں رہوں گا۔

اس موضوع پر سوچ بچار کرتے کرتے بالآخر چھ ماہ بعد مجھے اتنی فرصت میسر آ ہی گئی کہ چند دن کے لئے کراچی جا کر حالات کا جائزہ لے سکوں اور اپنے لئے میدان ہموار کر سکوں۔ ... میں نے فوراً اپنے ٹریول ایجنٹ کو فون کر کے ٹکٹ منگوایا اور دوسرے دن کراچی جا پہنچا۔

رات کی فلائٹ تھی۔ تقریباً ڈھائی بجے میں کراچی پہنچا۔ ایئرپورٹ پر اترتے ہی دل میں جیسے کوئی بھولی بسری ٹیس ابھر آئی۔ جانے کہاں سے اس نغمے کی بازگشت سنائی دے رہی تھی۔ اسس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو! اسی ایئرپورٹ پر میں نے پہلی بار راحیلہ کو دیکھا تھا۔ ذہن کے تاریک افق پر وہ بھولی بسری تصویریں ابھر آئیں۔

اس روز پہلی بار اسے دیکھ کر میں کیسا مبہوت ہو کر رہ گیا تھا۔ سرو قد، نازک اندام، رنگت نہایت ہی صاف اور اجلی اجلی اس کے لمبے لمبے بھورے بال کسی حد تک سنہرے پن کی طرف مائل تھے اور ریشم کے سلجھے ہوئے تاروں کی طرح ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ ویلوٹ کے ٹراؤزر اور سرخ ساٹن کی شرٹ میں تھی۔

وہ منظر اپنی تمامتر جزئیات کے ساتھ میرے حافظے پر نقش تھا۔ وہ اتنی نکھری نکھری لگ رہی تھی کہ اس کے گرد روشنی کا ایک ہالا سا رقص کرتا محسوس ہو رہا تھا اور ہوا میں اس کے وجود سے جیسے تازگی اور خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے اس طرح فرحت کا احساس ہوا تھا جیسے میں نے علی الصباح صاف ستھری ہوا میں چہل قدمی کرتے ہوئے کسی سرسبز لان میں شبنم سے نہائے ہوئے نو شگفتہ پھولوں کو دیکھ لیا ہو۔

پھر اس کی رفاقت میں گزرے ہوئے وہ چند دن۔ وہ میری سادہ و بے پناہ محبت۔ وہ میرا بے کراں خلوص۔ وہ اس کا اقرارِ محبت۔ وہ ایک طویل عرصے کی خط و کتابت۔ اور پھر اچانک انکشاف ہوتا کہ یہ سب کچھ تو مذاق تھا۔ میں تو اس کی نظر میں بہت حقیر و بے وقعت تھا۔

دل سے جیسے ایک قطرۂ خون سا ٹپکا اور میں نے یہ سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا۔ مجھے یہ سب کچھ یاد نہیں رکھنا چاہئے تھا۔ لیکن جانے کیوں شکست بھلائے نہیں بھولتی۔ تاہم اب زخم جیسے مندمل ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے کنویئر بیلٹ سے اپنا چھوٹا سا سوٹ کیس اٹھایا اور باہر آگیا۔ رات کے اس پہر سیٹھ رمضان بہ نفسِ نفیس مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ میں نے فون پر اسے اپنی آمد کی اطلاع دے دی تھی۔ اس کا اصرار تھا کہ میں اس کے گھر پر ہی قیام کروں لیکن میں نے اسے خلافِ مصلحت سمجھتے ہوئے معذرت کرلی تھی۔
۔۔ تاہم وہ مجھے لینے ضرور آگیا تھا۔ وہ بڑی گرم جوشی سے مجھ سے بغلگیر ہوا اور دیر تک حال دریافت کرتا رہا۔

اس کے ڈرائیور نے سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے لیا۔ ہم پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیئے۔ راستے میں ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے اور دوسرے دن کے لئے ملاقات کا پروگرام طے کرتے رہے۔ سیٹھ رمضان نے میرے لئے انٹر کان میں کمرا ریزور کرادیا تھا تاہم اس کا اصرار اب بھی یہ تھا کہ میں اس کے گھر چلوں۔ میں حسبِ سابق اسے ٹال رہا تھا۔

"یار.... اپنے انی بھائی! گھر پر آرام سے رات بھر باتیں کریں گے" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ہم پچھلی سیٹ پر بیٹھے اس طرح باتیں کر رہے تھے کہ ڈرائیور صحیح طور پر نہ سن سکے۔ گو کہ وہ ویسے ہی مشینی انداز میں ڈرائیونگ کر رہا تھا اور ہم سے قطعی لاتعلق اور بے خبر نظر آرہا تھا۔

سیٹھ رمضان گو کہ عمر میں مجھ سے کہیں بڑا تھا لیکن اس کے اندازِ تخاطب میں بے تکلفی کے ساتھ ساتھ میرے لئے ایک بے عنوان سے احترام کی آمیزش ہوتی تھی۔

"باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی سیٹھ صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں کئی دن کا پروگرام بنا کر آیا ہوں۔ اس چکر میں کوئی نہ کوئی فیصلہ کر کے ہی جاؤں گا۔"

"انی بھائی! تم بھی سوچتے ہوگے کہ میں تمہیں کراچی بلانے کے لئے کیوں اتنا پیچھے پڑا ہوا ہوں۔ میری اس میں کیا غرض یا مفاد پوشیدہ ہے؟ لازمی بات ہے کہ انسان کسی کا اصرار دیکھ کر اس پہلو پر ضرور سوچتا ہے" وہ صاف گوئی سے بولا "میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میری بھی اس میں غرض پوشیدہ ہے لیکن بڑی سادہ اور معصوم سی غرض۔ دیکھو یار.... میرے یہاں پاؤں خاصے مضبوط ہیں۔ اثر و رسوخ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں بذاتِ خود ایک کمزور اور بزدل آدمی ہوں، اس بات کا اعتراف کرنے میں مجھے کوئی عار نہیں۔ لیکن میرے پاس سخت جان، سفاک اور ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے والے کئی آدمی موجود ہیں۔ لیکن میں چونکہ ذاتی طور پر ایک ڈرپوک اور بودا آدمی ہوں، اس لئے مجھے ہر طرف سے ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ میرا ایک سچا دوست ہو۔ سچا، کھرا اور بہت قابلِ اعتماد دوست۔ جس سے میرے دل کو حوصلہ ملے۔ میں اپنے آپ کو مضبوط محسوس کروں۔ مجھے یقین ہو کہ دنیا میں میرا بھی کوئی ہے۔ قسم سے میں دنیا میں اپنے آپ کو بہت تنہا محسوس کرتا ہوں۔ اپنی بیوی اور بچے بھی مجھے اکثر غیر غیر سے لگتے ہیں۔ تم مجھے بہت دلیر، سچے اور کھرے آدمی لگتے ہو اور میرا خیال ہے، تم بہت اچھے دوست ثابت ہوسکتے ہو۔ اور بات صرف جذباتی سہارے ہی کی نہیں ہم کاروباری طور پر بھی ایک دوسرے کے لئے بے پناہ مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ تم ملک کے اس سرے پر ہونے والے کاروبار کے بھیدی ہو۔ میں اس طرف کی مارکیٹ کا کیڑا ہوں۔ اور خاص طور پر سمندری راستے سے جتنا بھی کاروبار ہو رہا ہے اس میں ہمارا حصہ معمولی سہی لیکن ہمیں علم ہر چیز کا ہے۔ بولو کیا کہتے ہو؟" اس کے لہجے میں واقعی بے پناہ معصومیت اور سادگی تھی۔ اس وقت تو گویا خود مجھے بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اپنی ہی لائن کے آدمی سے مخاطب ہوں۔

"تمہیں تصدیق کی کیا ضرورت ہے یار" میں نے بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میں تمہارا دوست نہیں تو اور کیا ہوں؟"

"اپنے الفاظ پر قائم رہنا" وہ میرا ہاتھ تھپکتے ہوئے بولا
"میں کیا تمہیں الفاظ سے ہٹنے والا انسان نظر آتا ہوں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ تم صحیح معنوں میں جوان مرد ہو، اسی لئے تو سیٹھ رمضان تم سے ایسی باتیں کر رہا ہے۔ کسی عام آدمی کے سامنے ہاتھ پھیلا کر مجھے برادرانہ تعاون کی بھیک مانگنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ بھی مسکراتے ہوئے بولا۔

اس دوران ہم انٹر کان پہنچ چکے تھے۔ سیٹھ رمضان مجھے میرے کمرے میں پہنچانے کے بعد رخصت ہوگیا۔ ہم نے دوسرے روز شام کو ملاقات کا پروگرام طے کیا تھا۔

دوسرے روز میں تقریباً سہ پہر کو بیدار ہوا۔ دیر سے بیدار ہونے کے باوجود میں ورزش کا ناغہ نہیں کیا کرتا تھا۔ میں نے کمرے میں ہی کچھ دیر ورزش کی پھر اپنا سوئمنگ کاسٹیوم لے کر کچھ دیر تیراکی کرنے کے ارادے سے سوئمنگ پول کی طرف چل دیا۔ میرا کمرا فرسٹ فلور پر ہی تھا۔ نیچے آکر میں کافی بار کے قریب سے گزر کر سوئمنگ پول کے قریب بنے ہوئے برآمدہ نما حصے میں داخل ہوا۔

سوئمنگ پول پر صرف تین چار غیر ملکی موجود تھے۔ ایک سفید فام جوڑا کنارے پر لگی ہوئی آرام دہ کرسیوں پر نیم دراز تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ برآمدہ نما حصے میں ایک طرف دو خواتین اور غالباً ایک لڑکا کھڑا ہے لیکن میں نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ میں غیر ارادی طور پر سوئمنگ پول کی طرف ہی دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

برآمدے میں کھڑے ہوئے ان تین افراد کے قریب سے گزرنے لگا تو ایک شناسا آواز نے مجھے چونکا دیا "انی بھائی!" کسی نے مجھے پکارا۔

میں نے ٹھٹک کر دیکھا اور جانے کیوں میرے ہاتھ سے سوئمنگ کاسٹیوم جسے میں نے گولا سا بنا کر تھاما ہوا تھا، گرتے گرتے بچا۔ مجھے پکارنے والا راشد تھا اور اس کے عقب میں جو دو عورتیں دیوار کے قریب کھڑی تھیں ان میں سے ایک اس کی امی یعنی آنٹی ریحانہ تھیں اور دوسری راحیلہ۔ ان کے ساتھ شاید کوئی اور بھی تھا جو اُن سے پیچھے کہیں رہ گیا تھا اور وہ اسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

راشد پہلے کی نسبت زیادہ خوش لباس اور کچھ پختہ سا نظر آرہا تھا۔ آنٹی مضمحل اور کمزور دکھائی دے رہی تھیں۔ راحیلہ کی شخصیت پر بہت نکھار آیا ہوا تھا۔ میں نے آخری بار جب راحیلہ کو دیکھا تھا، اس میں اور آج کی راحیلہ میں وہی فرق تھا جو کچے اور پکے ہوئے پھل میں ہوتا ہے۔

وہ ہلکے گلابی رنگ کے فرنچ گاؤن میں تھی اور باقاعدہ بیگمات کی طرح بنی سنوری ہوئی تھی۔ دراز قد تو وہ تھی ہی لیکن اس وقت خاصی اونچی ہیل اور اوپر کی طرف بنے ہوئے بالوں کے جوڑے کی وجہ سے اور بھی دراز قد لگ رہی تھی۔ اس نے خاصا گہرا میک اپ بھی کیا ہوا تھا اور خاصے روایتی انداز میں جیولری بھی پہنے ہوئے تھی۔ وہ کسی ملکہ کی سی شان سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔

ایک لمحے کے لئے میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ اس کا یہ روپ مجھے عجیب سا لگا۔ میں نے اسے ڈینم کی جینز اور کھدر کی مردانہ قمیصوں میں کھلے بالوں کے ساتھ دیکھا تھا۔ جب وہ لپ اسٹک بھی نہیں لگاتی تھی اور لکھ پتی باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود قلاش غیر ملکی سیاحوں کی طرح جدھر منہ اٹھتا تھا چل دیتی تھی۔ روایتی اور بنی سنوری بیگمات کو دیکھ کر وہ بہت ہنستی تھی۔
... آج وہ خود بے حد سلیقہ مند لیکن بہرحال کسی حد تک روایتی "بیگم صاحب" ہی لگ رہی تھی۔

بہرحال اس کی شخصیت کا سحر آج بھی اس کے ساتھ تھا۔ آج وہ اک برقِ تپاں تھی، آج بھی اک شعلۂ رقصاں تھی۔ بظاہر وہ بڑی بے پروائی، رکھائی اور سرد مہری سے گردن ذرا اکڑائے کھڑی تھی اور اس کی جھیل سی گہری آنکھوں میں بلا کا سکون تھا مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس قفسِ وجود میں آج بھی بجلیاں مقید ہیں۔

اس نے مجھے دیکھ کر کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ بظاہر تو میں بھی پُرسکون تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس قطعی غیر متوقع ملاقات پر مجھے عجیب سا دھچکا لگا تھا۔ میں نے سوچا ہی نہیں تھا کہ میں اس ہرجائی کے شہر آیا ہوا ہوں تو اس سے ملاقات بھی ہوسکتی ہے، اچانک ہی کہیں سامنا ہوسکتا ہے۔

راشد نہایت گرمجوشی سے ملا۔ آنٹی نے سر پر ہاتھ پھیر کر دعا دی۔ راحیلہ نے سر کی صرف ایک خفیف سی جنبش پر اکتفا کیا۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی رمق تک نہ ابھری۔ سر بھی اس نے محض مروتاً ہلایا تھا۔

رسمی جملوں اور گلے شکووں کے تبادلے کے بعد میں نے پوچھا "انکل کہاں ہیں؟"

"امریکا گئے ہوئے ہیں" راشد بولا "ان کا کاروبار آج کل بہت مندا ہے۔ ٹیکسٹائل ایکسپورٹ کی حالت بہت خراب ہے۔"

راحیلہ گویا راشد کو تنبیہہ کرنے کے سے انداز میں بولی۔ "کیا ضروری ہے کہ تم ابو کے کاروباری معاملات یوں سرِ راہ کھڑے ہو کر دوسروں سے ڈسکس کرو؟"

مجھے تو اس کی بات پر یا لہجے کی بیگانگی اور کھردرے پن پر کوئی خاص حیرت نہیں ہوئی کیونکہ مجھے اسی قسم کی کسی بات کی توقع تھی لیکن راشد نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ تاہم وہ بولا کچھ نہیں۔

اس دوران ایک نوجوان جو نفیس تراش خراش کے گہرے نیلے سوٹ میں تھا، تیز تیز قدموں سے ہماری طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ انگلی پر کار کی چابی گھماتا ہوا آرہا تھا۔ شاید وہ پیچھے کہیں کسی سے بات کرنے کے لئے رہ گیا تھا اور راحیلہ، آنٹی اور راشد اسی کے انتظار میں کھڑے تھے۔

راحیلہ نے اس انداز میں قدم بڑھایا جیسے وہ اس نوجوان کے آتے ہی آگے چل دینا چاہتی ہو لیکن آنٹی اور راشد وہیں رکے رہے اس لئے اسے بھی رکنا پڑا۔ نوجوان نے قریب آکر تیکھی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

راشد بے چارہ گویا پوری طرح تہذیب اور شائستگی کے تقاضے نبھانے کی فکر میں لگا ہوا تھا۔ وہ اس نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ جمیل بھائی ہیں.... راحیلہ کے میاں۔"
-- پھر اس نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور جمیل بھائی! ان سے ملئے، یہ محمد افضل ہیں، میرے محسن۔"

"اوہ... میں سمجھ گیا" جمیل نے انتہائی طنزیہ لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے سے شائستگی اور ملائمت قطعی مفقود ہوگئی اور اس کی جگہ کسی حد تک غیر انسانی سا کھردرا پن اور سختی ابھر آئی جسے محسوس کر کے میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

جمیل بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مجھے راحیلہ نے تمہارے متعلق سب کچھ بتادیا ہے" اس نے اب براہِ راست مجھے مخاطب کیا تھا اور بے حد اہانت آمیز لہجے میں مخاطب کیا تھا۔ "راحیلہ نے اس لئے احتیاطاً پہلے ہی مجھے تمہارے بارے میں سب کچھ بتادیا تھا کہ کل کو کہیں تم اسے اس کے خطوط کی بنیاد

پر بلیک میل کرنے نہ پہنچ جاؤ۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ خطوط اس کے لکھے ہوئے نہیں تھے۔ راحیلہ اپنی کسی دوست سے لکھواتی تھی۔ بلاوجہ انہیں سنبھال کر رکھنے کی زحمت نہ کرنا۔"

مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میرے کانوں کی لویں گرم ہوتی جا رہی ہیں اور لہو میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مار رہا ہے۔ تاہم میں نے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں کہا "میرا خیال تھا کہ راحیلہ کا شوہر کوئی پڑھا لکھا اور مہذب انسان ہوگا مگر جتنی حیرت مجھے اب تک راحیلہ کے طرزِ عمل پر ہوتی رہی ہے، اس سے کہیں زیادہ اب تم سے مل کر ہو رہی ہے۔ کسی نے تمہیں یہ بھی نہیں بتایا کہ بزرگوں کی موجودگی میں اتنی گھٹیا گفتگو نہیں کی جاتی" میں نے آنٹی کی طرف اشارہ کیا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ ان کا چہرہ سفید پڑ چکا ہے۔ راحیلہ کے چہرے پر تذبذب کے آثار تھے۔ شاید وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ موجودہ صورتِ حال میں اس کا ردِ عمل کیا ہونا چاہئے۔

"اخاہ... تو اب آپ مجھے گفتگو کا سلیقہ سکھائیں گے" وہ پہلے سے زیادہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ مجھ سے الجھنا چاہ رہا تھا جبکہ میں اس وقت اور اس جگہ کسی سے بھی الجھنے سے پرہیز کرنا چاہتا تھا۔ وہ حتی الامکان تن کر کھڑا تھا پھر بھی قد میں مجھ سے کچھ چھوٹا لگ رہا تھا حالانکہ وہ اس وقت اونچی ہیل کے جوتوں میں تھا اور میں باتھ روم سلیپر پہنے ہوئے تھا۔

وہ ایک قدم اور آگے بڑھا اور دستک دینے کے سے انداز میں میرے سینے پر انگلی مارتے ہوئے بولا "سنو مسٹر افضل چوہدری! میں پڑھا لکھا ضرور ہوں۔ لندن میں بھی کئی سال رہا ہوں لیکن میں خالص شہری بابو قسم کی چیز نہیں ہوں۔ اچکوں سے نمٹنا میں خوب جانتا ہوں۔"

"یہ بات تم کس اُچکے کو سنا رہے ہو؟" میں نے انتہائی تحمل سے پوچھا۔

"تمہیں" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

شاید وہ دیکھ بھی نہ سکا ہو کہ کب میرا ہاتھ حرکت میں آیا۔ میں نے پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا۔ وہ خاصے تن و توش کا آدمی تھا لیکن اس گھونسے نے اسے فرش سے خاصا اوپر اچھال دیا۔ وہ سوئمنگ پول کے کنارے پختہ روش پر جا گرا لیکن وہاں بھی وہ سنبھل نہیں سکا اور لڑھکتا ہوا سوئمنگ پول میں جا گرا۔

تیرنا اسے غالباً آتا ہوگا لیکن اس وقت وہ تھری پیس سوٹ اور اس کے لوازمات زیبِ تن کئے ہوئے تھا اس لئے اسے دقت پیش آ رہی تھی اور وہ غوطے کھا رہا تھا۔ شیشے کی ایک دیوار کے عقب میں کافی بار میں ایک دیٹریہ منظر دیکھ کر اپنی جگہ رک گیا۔ ٹرے اس کے ہاتھوں پر تھی اور وہ دم بخود سوئمنگ پول کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے باہر آنے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔ سوئمنگ پول کے آس پاس سوائے ان چند سفید فاموں کے کوئی نہیں تھا۔

سوئمنگ پول میں تیرتے ہوئے ایک سفید فام مرد نے سہارا دے کر جمیل کو ریلنگ تک پہنچنے اور پول سے نکلنے میں مدد دی۔ اس دوران آنٹی تو دیوار سے لگ کر ہانپنے لگی تھیں اور راحیلہ نے اضطراری انداز میں ایک قدم آگے بڑھایا تھا لیکن پھر پیچھے ہٹ گئی تھی اور دانت پیستے ہوئے مجھے برا بھلا کہہ رہی تھی۔ میں اس کی طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ کیسی مرد مار لڑکی تھی۔ جوڈو کراٹے میں بھی دسترس رکھتی تھی۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس نے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید زرق برق اور عروسی قسم کے لباسوں اور جڑاؤ زیورات نے اسے کچھ زیادہ ہی نسوانیت کے بوجھ تلے دبا دیا تھا یا پھر ویسے ہی شاید شادی کے بعد وہ خالصتاً "بیگم صاحب" بنتی جا رہی تھی۔

سوئمنگ پول سے نکلتے ہی جمیل ایک بار پھر بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح میری طرف لپکا۔ وہ اپنے لباس سے پانی بھی جھٹکتا ہوا آ رہا تھا۔ وہ غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ شاید گالیاں بھی دے رہا تھا لیکن اس کے منہ سے پانی کے چھینٹے اڑ رہے تھے اور الفاظ سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

وہ دیوانوں کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ میں نے جھکائی دیتے ہوئے اس کی کنپٹی پر ایک ہاتھ رسید کیا۔ ایک بار پھر وہ دور جا گرا اور اس مرتبہ اوندھے منہ گرا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا جب راحیلہ میرے قریب آ کر ناگن کی طرح پھنکاری۔ "تمہیں یہ غنڈہ گردی بہت مہنگی پڑے گی... بہت بڑا بدمعاش سمجھتے ہو تم اپنے آپ کو...؟ لیکن ہم یہاں لاوارث نہیں پڑے ہیں۔ میں تمہیں برباد کر دوں گی اسمگلر کے بچے!"

اس وقت تک مجھے بری طرح غصہ آ چکا تھا۔ میری رگ و پے میں چنگاریاں تیر رہی تھیں۔ اگر آنٹی ریحانہ کا احترام اور راحیلہ کے لیے میرے لاشعور میں بسی ہوئی وہ کمبخت محبت مانع نہ ہوتی تو میں جمیل کی ابھی کچھ اور پٹائی لگاتا۔ مگر آنٹی ریحانہ کا ڈھلے ہوئے لٹھے کی طرح سفید چہرہ اور پھٹی پھٹی آنکھیں دیکھ کر مجھے شرم آ گئی۔ تاہم راحیلہ کی دھمکی نے مجھے مزید سلگا دیا۔

"اگر تمہیں اپنے اس چغد شوہر کی زندگی عزیز نہیں ہے تو ضرور کوئی جوابی کارروائی کرنا" میں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا۔ اپنی آواز مجھے خود بھی کسی درندے کی غراہٹ سے مشابہ محسوس ہوئی "یاد رکھنا، اگر تم لوگوں میں سے کسی نے بھی مجھ سے الجھنے یا کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو تمہیں اس گدھے کی لاش کسی ویران سڑک پر ملے گی اور آوارہ کتے اسے گھسیٹتے پھر رہے ہوں گے۔"

راشد آگے بڑھ کر سہارا دے کر جمیل کو اٹھا رہا تھا۔ میں گھوم کر ان کے قریب سے گزرتا ہوا اپنے کمرے کی طرف واپس چل دیا۔ میرا اب سوئمنگ کرنے کا موڈ نہیں رہا تھا۔

اپنے کمرے میں آ کر میں نے غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور تیار ہو کر بیٹھ گیا۔ میرا خیال تھا کہ پولیس شاید مجھے حراست میں لینے آئے۔ ظاہر ہے راحیلہ اور جمیل دونوں ہی کا تعلق معمولی قسم کے خاندانوں سے تو تھا نہیں۔ مجھے یقین تھا کہ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی جگہ ان کا اتنا تعلق واسطہ ضرور ہوگا کہ وہ پولیس وغیرہ کے ذریعے مجھے ہراساں کرنے کی کوشش کر سکیں اور کچھ نہ سہی تو مجھ پر مہذب اور شائستہ لوگوں کی چار دیواری اور ایک اعلا درجے کے ہوٹل میں ہنگامہ آرائی اور مار پیٹ کا الزام تو ثابت ہو ہی سکتا تھا۔ اس کے تو کئی عینی شاہد موجود تھے۔ باقی کوئی بات ثابت کرنا تو بہت دور کا معاملہ تھا۔ بہرحال میں ہر قسم کی صورتِ حال کے لئے تیار بیٹھا تھا اور میں نے سوچ لیا تھا کہ کس قسم کی صورتِ حال میں مجھے کیا کرنا ہوگا۔

میں چاہتا تو الجھن سے بچنے کے لئے فوری طور پر یہ ہوٹل چھوڑ کر کسی اور ہوٹل میں بھی منتقل ہو سکتا تھا اور سیٹھ رمضان کو فون کر کے اس تبدیلی کی اطلاع بھی دے سکتا تھا لیکن میرے دل نے گوارہ نہیں کیا کہ اس طرح اپنا ٹھکانا چھوڑ کر جاؤں۔ میں نے یہی فیصلہ کیا کہ راحیلہ اور اس کے شوہر کو اپنے تیر آزمانے کا موقع دے ہی دوں تاکہ ان کا ارمان بھی نکل جائے اور انہیں اندازہ ہو جائے کہ ان کا واسطہ کسی چیز تنا بیے سے نہیں۔

جمیل کا پتہ پاک کرانے کے بارے میں بھی میں نے کوئی بڑ نہیں ہانکی تھی۔ اس کا پتہ صاف کرانا واقعی میرے لئے کوئی مشکل نہیں تھا مگر اس پہلو پر سوچتے وقت مسئلہ پھر وہی آن کھڑا ہوتا تھا کہ راحیلہ کے بارے میں ابھی تک میں کوئی حتمی رویہ نہیں اپنا سکا تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ مجھے اس سے محبت تھی یا نفرت؟

آج کے واقعے کے حوالے سے مجھے اپنا خون کھولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا لیکن چشمِ تصور سے جب میں یہ دیکھتا کہ راحیلہ اس نوجوانی میں بیوہ ہو گئی ہے تو مجھے اس پر ترس آنے لگتا۔ اپنے اس اندازِ فکر پر مجھے خود بھی جھنجلاہٹ محسوس ہوتی تھی لیکن میں یکسو نہیں ہو پاتا تھا۔ دل کے ہاتھوں بڑے بڑے مضبوط آدمی بھی بے بس ہو جاتے ہیں۔

راحیلہ نے محبت کے نام پر تو میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا سو کیا تھا لیکن اس کا شادی کے بعد کا رویہ تو میرے لئے بالکل ہی ناقابلِ فہم تھا۔ میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ کیا وہ اس باب کو جہاں کا تہاں بند نہیں کر سکتی تھی؟ آج اگر ہمارا سامنا ہو ہی گیا تھا تو ہم رسمی انداز میں سرِراہ چند رسمی سی باتیں کر کے اپنی اپنی راہ لے سکتے تھے۔ لیکن اس نے نہ جانے کیوں اپنے شوہر کو میرے بارے میں اتنا بھڑکائے رکھنا ضروری سمجھا تھا؟ کیا میں واقعی اس کی نظر میں آوارہ گرد اور چیز تنا بیہ قسم کا لونڈا تھا جو اس کی بے وفائی کا انکشاف ہونے کے بعد کسی بھی گھٹیا ہتھکنڈے کے ذریعے اس سے انتقام لینے کی کوشش کر سکتا تھا؟ اور اس لئے اس نے حفظِ ماتقدم کے طور پر اپنے شوہر نامدار کو سب کچھ بتا دیا تھا؟

میں نے جس طرح ٹوٹ کر اس سے محبت کی تھی اس کے بعد اس کے دل میں میرا یہی مقام تھا تو پھر لعنت ہونی چاہئے تھی مجھ پر۔ یہ مقام بنا سکا تھا میں اس کی نظر میں اپنا! یہ سوچ کر مجھے بڑی شرم آئی۔ لیکن پھر میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ اس کا اور میرا صرف تین چار دن کا تو ساتھ رہا تھا۔ اگر اس مختصر سے عرصے میں وہ مجھے صحیح طور پر نہیں سمجھ سکی تھی تو میں نے بھی اسے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔

چلئے یہاں تک بھی ٹھیک تھا لیکن سب سے زیادہ افسوس تو مجھے اپنی بے لوث محبت پر تھا۔ کیا میری محبت میں بھی کوئی اثر نہیں تھا؟ بے غرض اور بے لوث محبت کے اثر کو تو سب مانتے آئے ہیں۔ مانا کہ راحیلہ پر میری محبت کا کوئی اثر نہیں ہوا تھا اور اس نے محض تفریحِ طبع کی خاطر میرے ساتھ ڈراما رچایا تھا لیکن کم از کم اتنا تو ہو سکتا تھا کہ وہ میرے سامنے شرمندہ رہتی۔ مجھ سے نظر چراتی۔ لیکن وہ تو گویا مجھ پر زبردست خار کھائے ہوئے تھی۔ جیسے میں اس کا مجرم تھا۔ اس کا حریف تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ جمیل نے بھی حد کر دی تھی۔ وہ راحیلہ کا کزن تھا۔ پڑھا لکھا اور دولت مند تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں اس کا جو خاکہ بنایا تھا اس کے مطابق اسے نہایت شائستہ، روشن خیال اور بُردبار نوجوان ہونا چاہئے تھا اور بظاہر وہ نظر بھی ایسا ہی آتا تھا لیکن مجھ سے تعارف ہوتے ہی اس کے وجود پر سے گویا کوئی کینچلی سی اتر گئی تھی۔

اس کا رویہ کچھ اسی قسم کا تھا جیسے نچلے طبقے کا کوئی اکھڑ اور گھمنڈی قسم کا گبھرو اپنی نوبیاہتا بیوی کے ساتھ کہیں جا رہا ہو اور راستے میں اس کی دلہن نے گھونگٹ کی اوٹ سے منہ نکالتے ہوئے کسی راہگیر کی طرف اشارہ کر کے چلا کے کہہ دیا ہو۔۔ شیدے! یہ تھا وہ لفنگا جو شادی سے پہلے روز راستے میں مجھے چھیڑا کرتا تھا" اور اس وقت "شیدے" کا جو ردِ عمل ہو سکتا تھا کچھ اسی قسم کے رویے کا مظاہرہ جمیل نے کرنے کی کوشش کی۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راحیلہ اور اس کے شوہر

سے میری ان حالات میں ملاقات ہوگی۔

میں بہت دیر تک بیٹھا پولیس کا انتظار کرتا رہا اور اخبارات کی ورق گردانی کرتا رہا لیکن کوئی نہ آیا۔ بالآخر آٹھ بجے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ آٹھ بجے کا وقت سیٹھ رمضان کے ساتھ طے تھا۔ ہمیں کھانا اسی ہوٹل میں اکٹھے ہی کھانا تھا اور بہت سے کاروباری معاملات پر گفتگو کرنی تھی۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھلا۔ آنے والا سیٹھ رمضان ہی تھا۔ وہ اپنے ساتھ دو "کام" کے آدمیوں کو لے کر آیا تھا۔ ان میں سے ایک سوٹ میں تھا۔ وہ ایک خوبصورت بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا اور سگار کے کش لے رہا تھا۔ دوسرا نفیس قسم کی شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ اس نے بڑے سلیقے سے بالوں کی تہیں جمائی ہوئی تھیں اور رات کے وقت بھی قدرے تاریک شیشوں کی عینک لگائی ہوئی تھی۔ وہ بہت کم پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا مگر اس کے وجود اور پہناوے سے دولت کی خوشبو آرہی تھی۔

میں نے گرمجوشی سے ان کا استقبال کیا۔ اندر آکر بیٹھنے کے بعد سیٹھ رمضان نے اپنے ساتھ آنے والوں کا تعارف کرایا۔ سوٹ والے کا نام نادر شاہ تھا اور شلوار قمیص والے کا جاوید بھٹی۔ یہ ان بیسیوں آدمیوں میں سے تھے جن کی خدمات سے سیٹھ رمضان استفادہ کرتا تھا۔ نادر شاہ مڈل ایسٹ سے الیکٹرانک کا سامان اور پرزے وغیرہ "درآمد" کرنے میں خاصا اہم مقام رکھتا تھا۔ جاوید بھٹی کی لانچیں چلتی تھیں۔ کچھ باربرداری میں، کچھ مسافر برداری میں اور کچھ ماہی گیری میں۔ سیٹھ رمضان، نادر شاہ اور دوسرے کئی لوگوں کے کاروبار کا دارومدار اس کی لانچوں پر تھا۔

مجھے یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ وہ تقریباً ان پڑھ لیکن بے پناہ دولت مند آدمی تھا اور جتنے خطرناک لوگوں سے اس کے تعلق واسطے تھے ان کا نام سن کر چھوٹے موٹے لوگوں کے تو ہوش اڑ جاتے تھے لیکن جاوید بھٹی کی اس خصوصیت نے مجھے بے پناہ متاثر کیا کہ اس میں غضب کی انکساری تھی۔ یوں ادب اور عاجزی سے بات کرتا تھا جیسے کوئی معمولی سا ماہی گیر ہو لیکن ساتھ ہی سمندری جھڑپوں میں پانچ دس آدمیوں کو اڑوا دینے کا قصہ بھی یوں سرسری سے انداز میں سناجاتا تھا جیسے گاجر مولی کاٹ کر پھینک دینے کی بات کر رہا ہو۔

اچانک سیٹھ رمضان کو جیسے کچھ یاد آیا اور وہ چونکتے ہوئے بولا "ارے ہاں یار ... جو بات سب سے پہلے پوچھنی چاہئے تھی وہ تو میں بھول ہی گیا۔ تم بھی سوچو گے کہ میں کیسا بے پروا میزبان ہوں۔ یہاں کئی ویٹر بھی اپنے دوست ہیں۔ کبھی کبھار ان سے کسی قسم کی مخبری کا کام لینا پڑجاتا ہے۔ ان میں سے ایک ویٹر کو معلوم ہے کہ تم میرے مہمان ہو۔ وہ بتارہا تھا کہ سوئمنگ پول پر تمہارا کسی سے جھگڑا ہوگیا تھا اور تم نے گھونسا مار کر اسے سوئمنگ پول میں پھینک دیا تھا۔ پھر اس کی نکسیر پھوڑ دی تھی؟ سنا ہے اسے یہاں سے سیدھا کسی پرائیویٹ اسپتال میں لے جایا گیا ہے۔ کیا قصہ تھا؟"

"کوئی خاص بات نہیں تھی" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "ایک شناسا ہی تھا۔ ذرا بدتمیزی دکھا رہا تھا۔ ہیرو بننے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"تھا کون؟" نادر شاہ نے پوچھا۔

"غالباً کسی کارخانے دار کا بیٹا ہے" میں نے جواب دیا۔

"آج تو رات گئے تک ہم تمہارے ساتھ ہی ہیں" سیٹھ رمضان بولا "لیکن اس کے بعد بھی اگر کوئی گڑبڑ ہو، کوئی ضرورت پڑے، کوئی تھانے کچہری کا معاملہ ہو تو بلا تکلف فون کھڑکا دینا۔ تم میرے مہمان ہو۔ اس شہر میں کوئی آنکھ اٹھا کر تمہاری طرف نہیں دیکھ سکتا۔ یہ کارخانے دار ٹائپ لوگوں کو ہم کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔"

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ وہ بڑے وثوق سے بات کر رہا تھا "حیرت ہے" میں نے آہستگی سے کہا "تمہاری باتیں سن کر یقین نہیں آتا کہ تم وہی سیٹھ رمضان ہو جو اپنے بارے میں خود کہتا ہے کہ وہ رات کو بے وقت کال بیل کی آواز سن کر بیڈ کے نیچے گھس جاتا ہے۔"

میں نے ذرا جھجکتے ہوئے ہی یہ بات کی تھی کہ کہیں سیٹھ کچھ کھسیانا نہ ہوجائے لیکن اس کے چہرے پر ذرا بھی کھسیاہٹ کے آثار نمودار نہیں ہوئے اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، نادر شاہ گہری سنجیدگی سے بولا "وہ سیٹھ کی کوئی نفسیاتی گرہ معلوم ہوتی ہے ... کھوپڑی میں کہیں کچھ اٹکا ہوا ہے۔ ورنہ اپنا سیٹھ عام حالات میں ایسا بزدل آدمی نہیں ہے۔"

میں سیٹھ کو بہت زیادہ تو نہیں جانتا تھا لیکن نادر شاہ کی بات مجھے معقول محسوس ہوئی۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا۔ میں نے اپنے کپ سے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا "میں نہیں سمجھتا کہ آج کے واقعے کے سلسلے میں تم لوگوں کو کوئی زحمت کرنی پڑے گی۔ انہیں اگر کچھ کرنا ہوتا تو اب تک کر چکے ہوتے ویسے اس قسم کے لوگوں سے نمٹنے کے لئے میں خود ہی کافی ہوں۔ اگر اس شہر میں کسی حد تک نووارد ہونے کی وجہ سے مجھے کوئی دقت پیش آتی تو ظاہر ہے میں سیٹھ رمضان کو ضرور تکلیف دیتا۔ اور اگر معاملہ زیادہ ہی بڑھ جاتا تو اس کے لئے بھی میں نے ایک فون نمبر نکال کر رکھا ہوا تھا۔"

"وہ کس کا؟" سیٹھ رمضان نے دلچسپی آمیز لہجے میں پوچھا۔

"سیٹھ واحد کا" میں نے جواب دیا۔

ایک لمحے کے لئے تو وہ تینوں چپ سے ہوگئے۔ پھر سیٹھ رمضان نے مسکراتے ہوئے پوچھا "تو ان سے بھی دوستی ہے؟"

"دوستی کا دعویٰ تو نہیں کرسکتا" میں نے جواب دیا "ہاں شناسائی ضرور ہے لیکن کچھ اس قسم کی شناسائی ہے کہ اگر کسی ذاتی کام کے لئے کہوں تو وہ انکار نہیں کریں گے۔"

"یہ جان کر تو بہت ہی خوشی ہوئی کہ آپ کی ان سے شناسائی ہے" جاوید بھٹی کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "تاہم اتنے چھوٹے معاملے میں تو ان جیسے آدمی کو زحمت دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس قسم کے معاملات کے لئے تو ہم غریب غربا ہی کافی ہیں۔ آپ حکم کریں، اس چھوکرے کو کچھ عرصے کے لئے غائب کراتا ہے۔ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے چھٹی کرانی ہے یا پھر مڈل ایسٹ کے کسی ویران ساحل پر پہنچوا دیں؟ لمبی جیل کاٹ کر ہی واپس آئے گا اور کئی دن تک ریت اگل نہ پائے گا۔"

"تم تو بہت ہی سنجیدہ ہونے لگے یار" میں نے ہنس کر کہا۔ "میرا اسے اتنی سخت سزا دینے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ہاں اگر اس نے بات بڑھائی تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو اس بات کو ختم ہی سمجھو۔ ہمیں تو اپنے کام کی بات کرنی چاہئے۔"

"کام کی بات کھانے کے بعد ہوگی" سیٹھ رمضان اٹھتے ہوئے بولا "چلو نیچے ڈائننگ ہال میں چلیں۔"

ڈائننگ ہال میں کھانے کے دوران بھی نپی تلی آوازوں اور گول مول الفاظ میں کاروبار کی باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد ہم کمرے میں واپس آئے اور مزید ایک نشست جمی جس میں بہت سے معاملات طے پاگئے۔

سیٹھ رمضان سے طے ہوا کہ کل وہ دن میں ہی آجائے گا اور مزید چند کام کے لوگوں کو ساتھ لے کر آئے گا۔ وہ ایسے لوگ تھے جن کے تعاون اور مدد کی مجھے یہاں نئے سرے سے اپنا کاروبار جمانے کے سلسلے میں اشد ضرورت تھی۔ ان کی آشیرواد کے بغیر کام آگے بڑھ ہی نہیں سکتا تھا۔

کاروبار کا جو سلسلہ طے پا رہا تھا، میں اس سے بے حد مطمئن اور خوش تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کراچی کا میدان میرے لئے لاہور سے زیادہ زرخیز ثابت ہوگا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ کراچی میں کام ضرور شروع کروں گا لیکن خود ابھی لاہور ہی میں رہوں گا۔ البتہ شفیع کو کراچی بھیج دوں گا۔ وہ بخوبی یہاں کام سنبھال سکتا تھا اور ہر لحاظ سے موزوں تھا۔ وہ زبردست صلاحیتوں کا مالک تھا اور ساتھ ہی میرا وفادار بھی۔ مجھے نہ صرف یہ یقین تھا کہ وہ تمام معاملات سے نمٹ سکتا ہے بلکہ یہ اطمینان بھی تھا کہ روپے پیسے کے معاملے میں بھی وہ کبھی مجھے دھوکہ دینے کا خیال بھی دل میں نہ لائے گا۔ وہ صرف اسی کو اپنا حق سمجھتا تھا جو اس سے طے کیا جاتا تھا یا پھر اپنی خوشی سے اسے دیا جاتا تھا۔

○☆○

کراچی میں میرا "بزنس" میری توقعات سے کہیں زیادہ اچھی طرح سیٹ ہوگیا۔ شفیع کے بارے میرے اندازے درست ہی نکلے۔ اس نے نہ صرف کام کو اچھی طرح سنبھال لیا تھا بلکہ اپنے طور پر اسے آگے بھی بڑھایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک سال کے اندر اندر میری کراچی کی آمدنی لاہور کی آمدنی سے کہیں زیادہ ہوچکی تھی۔

کبھی کبھی تو میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا تھا کہ میں خود بھی کراچی میں سکونت پزیر ہوجاؤں لیکن پھر کئی وجوہات کی بنا پر یہ ارادہ ملتوی کردیتا تھا۔ ایک خاص وجہ تو یہ تھی کہ لاہور کا اپنا جو ایک مزاج تھا میں اس کا عادی ہوگیا تھا اور یہاں رچ بس گیا تھا۔ دوسرے میرے خیال میں میرے کراچی جانے سے بزنس میں کوئی خاص فرق نہیں پڑ سکتا تھا۔ میری غیر موجودگی میں بھی کام اسی لگن اور اسی جانفشانی و تندہی سے انجام دیا جارہا تھا جس طرح میں خود انجام دے رہا تھا۔

کسی مہینے میں کراچی چلا جاتا تھا اور کسی مہینے شفیع لاہور آجاتا تھا اور سارا حساب کتاب ہوجاتا تھا۔ ادھر میرا جائز بزنس بھی اچھا خاصا چل نکلا تھا۔ غرضیکہ ہر طرف سے روپیہ آرہا تھا۔ کوئی غیبی ہاتھ تھا جو میرے لئے راستے کھولتا جارہا تھا۔ میرے بعض مسائل تو میری کسی خاص کوشش کے بغیر ہی یوں حل ہوجاتے تھے کہ میں خود بھی حیران رہ جاتا تھا اور اب مجھے یہ یقین ہوتا جارہا تھا کہ اپنی کامیابیوں پر اترانا بڑی حماقت کی بات ہوتی ہے۔ کامیابیاں خالصتاً اپنی محنت اور ذہانت کی پیداوار نہیں ہوتیں۔

ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگ میرے اس نظریے سے اختلاف کریں لیکن مجھے میری زندگی اور تجربے نے یہی سکھایا تھا کہ کام کی نوعیت خواہ کیسی بھی ہو، جب تک اس کا وقت نہیں آتا اور جب تک اوپر والے کو منظور نہیں ہوتا تب تک وہ کام نہیں ہوتا۔ اگر تدابیر لڑانے سے اور فارمولوں پر عمل کرنے سے مقاصد پورے ہوسکتے تو بہت سے کتابی کیڑے آج آپ کو بہت کامیاب نظر آتے۔ لوگ سب کچھ کتابوں سے سیکھ لیتے۔

ہر موضوع پر تو کتابیں موجود ہیں۔ پریشان ہونا چھوڑیے جینا شروع کیجئے، لکھ پتی بنئے، گھر بیٹھے بادشاہ بنئے، گھر بیٹھے فلاں بنئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اگر بغیر مشیتِ ایزدی کے یہ سب کچھ ممکن ہوتا تو ہر

شخص کتابوں کی مدد سے جو چاہتا بن چکا ہوتا۔ ایک مغربی مصنف کی کتابوں کی پوری سیریز لوگوں کی لائبریریوں میں دیکھ کر تو میں بہت ہی حیران ہوتا تھا۔ موصوف نے کتابوں کے ذریعے پوری دنیا کے سارے ہی مسائل حل کردیے تھے۔ پڑھنے والوں کا تو مجھے علم نہیں تھا تاہم میری معلومات کے مطابق مصنف کے اپنے بیشتر مسائل ان کتابوں کی کروڑوں کی رائلٹی سے حل ہوگئے تھے۔ میرے ذاتی خیال میں ان کتابوں سے ایک ہی چیز ممکن تھی اور وہ یہ کہ "گھر بیٹھے الو بنیے۔

لیکن بہرحال یہ میرے ذاتی خیالات ہیں۔ ہوسکتا ہے بہت سے لوگوں کا تجربہ اس سے مختلف ہو۔ تاہم مجھے مشیت ایزدی والے نظریے پر پوری طرح تجربوں کے بعد یقین آنے سے ایک طرح کا قرار سا آگیا تھا۔ پہلے کبھی مجھے اپنے آپ پر جو گھمنڈ سا ہونے لگتا تھا... اب وہ ختم ہوگیا تھا۔ پہلے کبھی الجھے ہوئے معاملات کے باعث مجھ پر اعصابی تناؤ سا ہونے لگتا تھا' اب میں بالکل مطمئن' پرسکون اور پراعتماد رہتا تھا۔

جوان ہونے تک میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں میرے پاس کبھی اتنی دولت بھی آئے گی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اس وقت کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ میں آگے چل کر کیا بنوں گا اور کس طرح بنوں گا؟ اور اب جو کچھ میں بن چکا تھا اس کے بارے میں کبھی سوچنے بیٹھتا تھا تو مجھے خود بھی صحیح طور پر اندازہ نہیں ہوپاتا تھا کہ میں یہ سب کچھ کب' کس طرح اور کیوں بن گیا تھا؟

دولت کا کوئی مصرف اب میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کاروبار کو جس حد تک بڑھانا میرے بس میں تھا وہ میں بڑھا چکا تھا۔ زیر زمین دھندوں میں بہت سے دھندے ایسے تھے جن میں' میں ملوث ہونا نہیں چاہتا تھا اور جائز کاروباروں میں میری سرمایہ کاری کے امکانات محدود ہی تھے کیونکہ تمام تر قانونی چکروں اور وکیلوں کی مدد کے باوجود میری بیشتر دولت بلیک منی ہی تھی۔ گوکہ اس کا خاصا حصہ وہائٹ میں تبدیل ہوکر درست کاروباروں میں لگتا جارہا تھا لیکن باقی جو کی توں ہنڈیوں کی شکل میں اور تجوریوں میں محفوظ ہورہی تھی۔

جائز کاروبار کے سر پر اب میرے ٹھاٹ باٹ کافی بڑھ چکے تھے۔ معززین شہر اور خاص خاص سیٹھوں میں میرا شمار ہونے لگا تھا۔ چندے مانگنے والے' سماجی تنظیموں کی سرپرستی کی پیشکش کرنے والے' مختلف بروشرز کے لئے اشتہار مانگنے والے' بغیر کسی خاص دوستی یا شناسائی کے مختلف ڈنرز یا کسی اور تقریب میں مدعو کرنے والے اب بے حساب آنے لگے تھے۔ میری حتی الامکان کوشش ہوتی تھی کہ ان میں سے کسی کی دل شکنی نہ کروں۔

تقریبات اور ڈنرز میں اب ہر عمر کی خواتین کا میرے گرد جھمگٹا رہنے لگا تھا۔ ان میں سے بیشتر وہ ہوتی تھیں جنہیں شوہر کے طور پر کسی عقل کے اندھے کی ضرورت ہوتی تھی۔ عام طور پر تمہید تو وہ خود ہی باندھ لیتی تھیں' باقی مضمون ان کے شاطر والدین پورا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مثلاً کسی اعلا درجے کے ہوٹل میں ہونے والے ڈنر میں کوئی لڑکی پلیٹ اٹھائے اپنی دو تین خاص دوستوں کے ہمراہ کباب ہزاروں حصہ بڑی ناز و ادا سے چباتی ہوئی قریب آتی اور نہایت نپے تلے انداز میں دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے عموماً ناک میں بولتی "ہائے انی! ہاؤ آر یو؟ مجھے پہچانا؟ مسز غنی کے ہاں ڈنر پر آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ میں باٹلی والا کی لڑکی ہوں... ... آپ کا اور میرا نام کتنا ملتا جلتا ہے... ہے نا؟ آپ نے تو مسز غنی والے ڈنر میں ابو سے وعدہ کیا تھا کہ آپ ہمارے ہاں آئیں گے مگر آپ آئے ہی نہیں۔"

میں نہایت انکساری سے دانت نکال کر کہتا "جی... وہ بس فرصت ہی نہیں ملی... کاروباری مصروفیات ہی اتنی رہتی ہیں۔"

"وہ تو ہمیں اچھی طرح اندازہ ہے" محترمہ فنی صاحبہ اٹھلا کر کہتیں "ہم تو اپنے ابو کی مصروفیات دیکھ کر ہی پریشان ہوتے رہتے ہیں۔ مہینے میں چار دن بمشکل سے گھر رہتے ہوں گے۔ کبھی ایران... کبھی جاپان... کبھی مڈل ایسٹ... کبھی انگلینڈ... بھئی کبھی کبھی تو ہم ان کی صورت دیکھنے کو ترس جاتے ہیں۔ ایسا بھی کیا کاروبار کہ انسان کی سوشل لائف ہی ختم ہوکر رہ جائے۔"

"ہاں۔ یہ تو آپ نے بالکل درست کہا" میں ان کی تائید میں سر ہلاتا اور ان کا چہرہ جو کسی بیوٹی پارلر کے حسن کارکردگی کا چمکتا دمکتا ثبوت ہوتا تھا' اس پر مزید رونق آجاتی۔ پھر وہ مجھے مچھلی کے کباب چباتے ہوئے دیکھ کر کاجل سے سجی آنکھوں کو پھیلاتے ہوئے کہتیں "ارے... آپ کو مچھلی کے کباب بہت پسند ہیں؟ کبھی ہمارے ہاں آیئے۔ مچھلی کے کباب تو آپ کو ہم کھلوائیں گے.... اور ہاں' ابو جاپان سے ہائی فائی سیٹ لائے ہیں۔ قسم سے شرلے بیسی کو سننے کا لطف دوبالا ہوجائے گا۔ تو پھر کب آرہے ہیں آپ؟"

میں کوئی گول مول اور غیر حتمی سا وعدہ کرلیتا۔

کبھی کبھی کانٹا پھینکنے کا فریضہ کسی محترمہ کی والدہ انجام دیتیں۔ وہ کسی امپورٹیڈ ہیئر کلر کی بدولت چمکتے دمکتے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بڑی شفقت سے کہتیں "ارے انی بیٹا! کبھی گھر آؤ نا۔ اب تو اپنی شملا کے اگزام بھی ختم ہوگئے ہیں۔ کچھ دنوں بعد تو وہ مزید تعلیم کے لئے اسٹیٹس چلی جائے گی۔ آج کل تو گھر میں خوب رونق ہے۔ اس سنڈے کو آجاؤ.... اور ہاں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟ اپنی شملا جو ہے نا... وہ

پائے بہت عمدہ بناتی ہے۔"

اس موقع پر قریب کھڑی محترمہ شملا اپنی پلیٹ سے کچھ چباتے ہوئے حسب توفیق شرمانے کی کوشش کرتیں لیکن صحیح طور پر پتا نہ چلتا کہ ان کے رخساروں کی سرخی حیا کی مرہون منت ہے یا بلش اسٹک کی؟

میں مسکراتے ہوئے کہتا "آنٹی' میں تو ذرا دیہاتی سا آدمی ہوں۔ مجھے ان ولایتی کھانوں سے ذرا کم ہی دلچسپی ہے۔ ایپل پائی کے بجائے میں پائے زیادہ شوق سے کھاؤں گا۔"

اس پر آنٹی حلق سے ایک مصنوعی قہقہہ برآمد کرتیں اور اپنی صاحبزادی اور ایک آدھ ساتھی خاتون کی طرف دیکھ کر بڑی محبت سے کہتیں "کتنی خوشی کی بات ہے کہ اب ہمارے نوجوانوں میں اپنے کلچر کے بارے میں کوئی احساس کمتری نہیں رہا۔ ہمیں احساس کمتری ہونا بھی نہیں چاہئے۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو ہم سب کی جڑیں گاؤں میں ہیں" پھر وہ گویا بڑا فخر محسوس کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر کہتیں "تمہارا کیا خیال ہے کہ شملا کو پائے پکانے نہیں آتے؟ بھئی وہ تو میں نے اسے سب سے پہلے پکانے سکھائے تھے۔ اپنا کلچر پہلے۔ باہر کی چیز بعد میں۔ تو پھر کب آرہے ہو تم؟"

میں ان سے بھی کوئی گول مول سا وعدہ کرلیتا۔ مجھے اندازہ ہوتا تھا کہ اس خاتون نے اسی روز جاکر اپنے خانساماں کو طلب کرکے پائے پکانے کا حکم دیا ہوگا اور ان کا ذائقہ وغیرہ دیکھنے کے بعد خانساماں کو اپنی کارکردگی زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کی سخت تاکید کی ہوگی۔

سچی بات یہ تھی کہ کبھی کبھی میں نہایت سنجیدگی سے سوچنے لگتا تھا کہ مجھے اب شادی کرلینی چاہئے۔ جس قبیل کے لوگوں کا میں نے تذکرہ کیا ہے ان سے مجھے کوئی بغض نہیں تھا اور نہ ہی میں ان کے سامنے احساس کمتری میں مبتلا تھا بلکہ اب تو میں ان لوگوں کے انداز و اطوار سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔

مجھے صرف ایک ہی چیز اس طبقے کی کسی لڑکی سے شادی سے باز رکھے ہوئے تھی اور وہ یہ کہ مجھے ان میں خلوص کی بڑی شدید کمی محسوس ہوتی تھی۔ ان کا رہن سہن' ان کے طور طریقے' ان کی گفتگو' غرضیکہ ان کی ہر چیز مجھے کھوکھلی اور مصنوعی لگتی۔ اس تصنع اور کھوکھلے پن سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔ خلوص' محبت' بے غرضی اور سچائی کی کہیں مجھے رمق بھی نظر نہیں آتی تھی۔ کھرا پن کہیں نہیں تھا۔ اسی لئے مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی تھی کہ اگر میں نے اس طبقے میں شادی کرلی تو وہ نبھ سکے گی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں

سوتے ہوئے بھی رات کے کسی پہر میرے حلق میں کانٹے پڑنے لگتے تھے اور اپنا طویل و عریض بنگلا مجھے بہت سونا سونا لگتا تھا لیکن راحیلہ کے بعد آج تک کسی لڑکی نے اس شدت سے دل کے دروازے پر دستک نہیں دی تھی کہ اسے اپنانے کی خواہش مجھے بے بس کردیتی۔

میری زندگی میں صنف نازک کا میرے ساتھ سلوک اچھا نہیں رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس پری چہرہ شمع پر فدا ہوا تھا مگر وہ صرف ایک بار نوازشات کی انتہا کرکے یوں لاتعلق اور اور پھر غائب ہوگئی تھی جیسے اسے میرے جذبات سے کوئی غرض ہی نہیں تھی۔ باپ نے دولت کے لالچ میں اس کی شادی ایک ایسے شخص سے طے کردی تھی جس کی بیٹیاں بھی شمع سے بڑی عمر کی تھیں اور اس نے مجھ سے پہلی اور آخری ملاقات پر روتے ہوئے کہا تھا "افضل! تم گواہ ہو کہ میں نے کس طرح اپنے کردار کی حفاظت کی ہے۔ لیکن مجھے اس کا کیا صلہ ملا؟ چنانچہ میں نے سوچا کہ ایک گناہ تو کرلوں تاکہ دل کو اطمینان رہے کہ زندگی بھر میں جس جہنم میں جلوں گی وہ میرے گناہ کی سزا ہے۔"

وہ اپنے اس فلسفے کو سینے سے لگائے اس پہلی اور آخری ملاقات کے بعد یوں غائب ہوگئی تھی جیسے گاؤں میں وہ کبھی تھی ہی نہیں۔ جاتے وقت اس نے مجھے مطلع کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔ میرے لڑکپن کے معصوم عشق' میری بے لوث طوفانی چاہت کی اس کی نظر میں گویا کوئی اہمیت ہی نہیں تھی۔ اسے معلوم تھا کہ میں نے اس کی یاد میں کس طرح جاگ جاگ کر راتیں گزاردی ہیں۔ کس طرح میں ہر روز انتظار کی سولی پر مصلوب رہا ہوں اور کس طرح دیوانہ وار

میں اسے چاہتا ہوں مگر اس نے شہر جانے سے پہلے مجھے الوداع کہنا بھی ضروری نہیں سمجھا تھا۔

دوسری لڑکی وہ خانہ بدوش لالی تھی۔ اس سے میرے عشق میں خواہشوں کی آمیزش ضرور تھی مگر اس کے باوجود میں اس کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔ وہ میرے لئے کوئی سربستہ راز نہیں رہی تھی اور اس کا سماجی مقام بھی جو کچھ تھا وہ ظاہر ہی تھا اس کے باوجود میں اس کے بارے میں جذباتی ہو چلا تھا۔ جانے کیا کیا سوچنے لگا تھا' کیا کیا ارادے باندھنے لگا تھا مگر مجھ سے رقمیں اینٹھنے کے بعد جب اس نے دیکھا کہ میں مزید رقمیں لانے کی پوزیشن میں نہیں رہا تو کیسی حقارت سے مجھے ٹھوکر مار دی' کس طرح اجنبی بن گئی' کس طرح آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ پتھر توڑنے والی' شہر شہر کی خاک چھاننے والی جاہل لڑکی اتنی شاطر' اتنی سفاک اور بے مہر ہو گی۔ کسی منجھی ہوئی طوائف سے بھی زیادہ۔

پھر راحیلہ میری زندگی میں آئی تھی۔ اس نے تو انتہا ہی کر دی تھی۔ میں اپنے محسوسات کی اس سے زیادہ توہین کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے شبہ ہونے لگا تھا کہ شاید اب میں زندگی میں کبھی کسی لڑکی کو چاہ نہیں سکوں گا۔

اب میرے پاؤں مضبوط تھے اور میرے گرد جو یہ سماجی تتلیاں منڈلا رہی تھیں' کبھی کبھی میرا جی چاہتا تھا کہ میں بھی انہیں کھلونا سمجھوں' ان کے جذبات و احساسات سے کھیلوں' ان کی شکست سے لطف اندوز ہوا کروں۔ اور یہ میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ وقت اور زندگی نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا۔ یہ سب بہت شاطر' بہت تجربہ کار اور پل پل روپ بدلنے والے لوگ تھے لیکن انہیں چکر دینا بھی اب میرے بائیں ہاتھ کا کام تھا لیکن جانے وہ کون سا جذبہ تھا' میرا کون سا وصف تھا جو مجھے اس قسم کی حرکتوں سے باز رکھتا تھا۔

میں اسی تذبذب کے دور سے گزر رہا تھا کہ ایک روز جیم خانہ میں ایک نہایت رنگا رنگ تقریب میں شاہانہ سے میری ملاقات ہو گئی۔

شاہانہ کوئی نو عمر' غیر معمولی طور پر حسین یا افسانوی عادات کی مالک لڑکی نہیں تھی۔ وہ چالیس سال کی عمر کو پہنچتی ہوئی ایک دراز قد اور خوش شکل عورت تھی۔ اچھے رہن سہن کی بدولت بمشکل تیس کی لگتی تھی۔ اس کی شخصیت میں عجیب سی کشش تھی جسے اس نے نہایت عمدہ میک اپ اور خوبصورت تراش خراش کے لباس سے دوبالا کر لیا تھا۔ اس کے انداز و اطوار میں بلا کی تمکنت تھی۔ خاندانی دولت مند لگتی تھی۔

اس کے ساتھ اوسط درجے کے لباس میں ایک قبول صورت سی لڑکی تھی جو مؤدبانہ انداز میں اس کے پیچھے پھر رہی تھی۔ اپنے طرز عمل سے وہ اس کی سیکریٹری لگ رہی تھی۔ تقریب میں کئی فوٹو گرافر بھی موجود تھے اور میں دیکھ رہا تھا کہ وہ سب اسی عورت کے گرد منڈلا رہے تھے اور بار بار فلیش لائٹ کے جھماکوں سے اس کی آنکھیں چندھیائے دے رہے تھے۔ ...کوئی کسی کرسی پر کھڑا ہو کر اس کی تصویر بنا رہا تھا کوئی ایک گھٹنے کے بل کھڑا ہو کر اور کوئی اس کی تصویر بنانے کی کوشش میں لیٹا ہی جا رہا تھا۔

کئی دوسری بیگمات بھی کیمروں کی زد میں آنے کے لئے اس عورت سے باتیں کرتے ہوئے بہانے بہانے سے اس کے ساتھ چپکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ دو تین مرد اور ایک خاتون جو میرے اندازے کے مطابق صحافی تھے' بار بار اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ بڑے تحمل سے مسکراتے ہوئے سب سے باتیں کر رہی تھی۔ بعض باتوں کے جواب میں وہ اپنی سیکریٹری کی طرف اشارہ کر دیتی اور وہ اپنی ڈائری کھول کر دیکھنے کے بعد استفسار کرنے والے کو کوئی جواب دیتی۔

میں اس تقریب میں براہِ راست مدعو تھا لیکن اپنے ایک دوست مسعود کے ساتھ گیا تھا۔ مسعود ایک ممتاز ایکسپورٹر تھا اور چیمبر آف کامرس کا عہدے دار بھی تھا۔

میں نے مسعود سے پوچھا "یار! یہ عورت کون ہے؟"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "تم اسے نہیں جانتے؟ حالانکہ تم تو ہر قسم کے اخبارات و رسائل بڑے ذوق و شوق سے پڑھتے ہو۔ اس کی تصاویر اور انٹرویوز زیادہ تر انگریزی اخبارات اور رسائل میں چھپتے رہتے ہیں۔ نہایت خاص خاص اور بہت بڑے آدمیوں کی تقریبات میں شریک ہوتی ہے لیکن بہت سوشل خاتون سمجھی جاتی ہے۔ تم نے کبھی بیگم شاہانہ ٹوانہ کے بارے میں کچھ نہیں پڑھا؟"

"اوہ...!" میرے ہونٹوں سے بے اختیار سیٹی سی نکل گئی۔ "میں اسے اس لئے نہیں پہچان سکا کہ یہ اپنی چھپنے والی تصویروں کی نسبت کہیں بہتر ہے۔"

"ہاں... بہت سی خواتین بس یونہی سی ہوتی ہیں لیکن تصویروں میں بڑی غضب کی چیز نظر آتی ہیں اور بعض جو حقیقتاً غضب کی ہوتی ہیں تصویروں میں بس یونہی ہو کر رہ جاتی ہیں" مسعود بولا "بعض اخبارات و رسائل میں ویسے ہی رنگین تصاویر کی ریڑھ لگی ہوتی ہے۔ پریس والے معلوم نہیں ان بے چاری خواتین سے کون سی پرانی دشمنی نکالتے ہیں کہ دو کی جگہ چار آنکھیں' ایک کی جگہ دو ناکیں اور وہ بھی منہ میں گھسی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اچھی بھلی پری چہرہ عورتوں کی تصویروں سے بچوں کو ڈرانے کا کام لیا جاتا ہے۔"

"میں نے سنا ہے کہ پریس کی پلیٹیں ہل جانے کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے" میں نے مسعود پر اپنی معلومات کا رعب جھاڑا۔

"اس کا مطلب ہے پریس کی پلیٹیں بھی کھانے کی پلیٹوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوتیں۔ ادھر ادھر ہلتی رہتی ہیں" مسعود سادگی سے بولا۔

میں ہنس دیا اور ایک بار پھر بیگم شاہانہ کی طرف دیکھنے لگا۔ دفعتاً میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ وہ بھی گہری گہری نگاہوں سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

شاہانہ کے متعلق کافی معلومات میرے ذہن میں محفوظ تھیں۔ اس کے بارے میں شادی سے پہلے کی کوئی بات منظر عام پر نہیں آئی تھی کہ وہ کون تھی' کیا تھی' کہاں سے آئی تھی اور کس خاندان سے اس کا تعلق تھا۔ ہاں البتہ اس کی پہلی شادی کے بعد سے یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ اس کا خاندانی پس منظر جاگیردارانہ تھا کیونکہ اس کا شوہر ایک بڑا جاگیردار تھا اور یہ شادی لندن میں ہوئی تھی۔

شاہانہ نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں۔ اس کے تینوں شوہر معمر اور بے پناہ دولت مند تھے۔ تینوں ہی شادی کے تھوڑے تھوڑے عرصے بعد انتقال کر گئے اور شاہانہ کو ہر ایک کی دولت اور جائیداد میں سے خاصا خاصا حصہ ملا تھا۔ اس وقت وہ ذاتی دولت اور اثاثوں کے لحاظ سے شہر کی دولت مند ترین شخصیتوں میں شمار ہوتی تھی۔

کچھ عرصہ قبل ہی اس نے چوتھی شادی پھر ایک زمیندار سے کی تھی جو شادی کے بعد وزیر بن گیا تھا۔ معظم اس کا نام تھا اور وہ بھی خاصا عمر رسیدہ آدمی تھا۔ ملک میں ان دنوں خاصا افراتفری کا دور تھا۔ مشرقی پاکستان کو بنگلا دیش بنے زیادہ دن نہیں گزرے تھے۔ سنا تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی سے چند سال قبل شاہانہ نے مشرقی پاکستان میں کوئی چھوٹی سی انڈسٹری لگائی تھی جو بظاہر سقوط کے بعد اس کے ہاتھ سے چلی گئی تھی اور اسے خاصا بھاری مالی صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا۔

کاروباری حلقوں میں ازراہ مذاق کہا جاتا تھا "بے چاری شاہانہ کو اپنا وہی نقصان پورا کرنے کے لئے تو چوتھی شادی کرنا پڑی ہے" اس کے علاوہ مذاق ہی مذاق میں یہ بھی کہا جاتا تھا کہ اگر معظم نے شاہانہ سے شادی نہ کی ہوتی تو شاید دو چار سال زیادہ جی لیتا مگر اب کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔

مسعود نے کہنی مار کر مجھے خیالات سے چونکا دیا "میں نے شروع ہی سے محسوس کر لیا تھا کہ تم اس کی طرف بار بار دیکھے جا رہے ہو" وہ سرگوشی نما لہجے میں بولا۔

"وہ ہے ہی بار بار دیکھنے کی چیز پیارے!" میں نے طویل سانس لے کر دھیمی آواز میں ہی جواب دیا۔

"حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ بھی بار بار تمہاری طرف دیکھ رہی ہے" مسعود بولا "اور یہ کوئی معمولی بات نہیں۔ جس کی طرف وہ آنکھ اٹھا کر دیکھ لے لوگ اس کی خوش قسمتی پر رشک کرتے ہیں۔"

"چھوڑو یار! کیوں بانس پر چڑھا رہے ہو" میں نے سر جھٹک کر کہا "ہماری طرف دیکھ کر کیا کرے گی بے چاری! ہم میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔"

"یہی تو تمہیں معلوم نہیں" مسعود مسکرایا "یا شاید معلوم ہے مگر انکساری برت رہے ہو۔ بھائی! تم اچھے بھلے ہینڈسم آدمی ہو اور پھر یہ جو قد کاٹھ... یہ ورزشی جسم پایا ہے تم نے... یہ آج کے دور میں کم ہی دیکھنے میں آتا ہے۔ خصوصاً ہماری کلاس میں۔ ہماری کلاس کے لوگوں کو تو آرام طلبی اور کاروبار کے جوڑ توڑ۔ یہ دو چیزیں تباہ کر کے رکھ دیتی ہیں۔ معلوم نہیں تم کاروبار اور صحت دونوں کو بیک وقت کس طرح سنبھالے ہوئے ہو۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اسی دوران ڈنر شروع ہو گیا اور ہم دوسرے ہال میں آ گئے۔ مسعود کو اس کے کچھ دوسرے شناسا مل گئے اور وہ کھانے کے دوران ان کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ...میں ٹہلتا ہوا کچھ لینے کے لئے ایک میز کے قریب پہنچا۔ میں نے اسپرٹ لیمپ پر رکھے ہوئے بڑے سے نقرئی برتن سے مچھلی کا ایک ٹکڑا اٹھانے کے لئے بڑے سے چمچے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ عین اسی لمحے ایک مرمریں ہاتھ بھی چمچ کی طرف بڑھا۔ میرا ہاتھ اس ہاتھ سے ٹکرا گیا۔

سوری کہتے ہوئے اضطراری انداز میں' میں نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور نظر اٹھا کر دیکھا۔ وہ وہی سراپا قیامت شاہانہ تھی۔ ...وہ بھی اضطراری انداز میں سوری کہہ کر ہاتھ پیچھے کھینچ چکی تھی۔ اپنی اس بے خیالی پر ہم دونوں ہی مسکرا دیئے۔ اس کی مسکراہٹ میں نوازشات کی کہکشاں جھلملا رہی تھی اور آنکھوں میں التفات کی ان کہی کہانیاں مچل رہی تھیں۔ قطعی غیر متوقع طور پر یوں اسے سامنے پا کر میں مسحور ہو گیا۔

مجھے مسعود کی بات کا یقین آ گیا۔ وہ یقیناً تقریب کی گزشتہ کارروائی کے دوران میری طرف دیکھتی رہی تھی اور اس مختصر سے مشاہدے میں وہ مجھے اچھی طرح جان چکی تھی۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں میری ذات کے جزیرے کا مکمل مشاہدہ کر چکی تھی۔ یقیناً وہ ایک نظر میں لوگوں کو جان لینے کا ہنر جانتی تھی۔ یہ وصف رکھنے والی عورتیں بہت غیر معمولی عورتیں ہوتی ہیں۔

"لیجئے نا۔" اس نے مسکراتے ہوئے ڈش کی طرف اشارہ کر کے انگریزی میں کہا۔

"پہلے آپ لیجئے" میں نے بھی انگریزی ہی میں کہا اور وہ لیڈیز فرسٹ والا محاورہ بھی جڑ دیا۔

"چلئے میں پہل کر لیتی ہوں۔ کہیں پہلے آپ' پہلے آپ

میں گاڑی ہی نہ نکل جائے۔"

اس نے مسکراتے ہوئے ڈش کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ایک چھوٹا سا ٹکڑا اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

"آپ کے ہوتے ہوئے کوئی گاڑی کہیں نہیں جاسکتی" میں نے دھیمی آواز میں کہا "آپ کے ابرو کا اشارہ پاکر ہر گاڑی اسی اسٹیشن پر ٹھہر جائے گی۔ شاید آپ کو اپنی جنبشِ ابرو کی طاقت کا اندازہ نہیں۔"

"بہت اچھی طرح اندازہ ہے" وہ بہت دھیمی آواز میں بولی "یہی طاقت تو تمہیں میرے قریب کھینچ کر لائی ہے" پھر اس نے گھنیری پلکیں اٹھا کر تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا "ویسے آدمی تم تیز بھی ہو اور دلیر بھی۔ یکدم بہت لمبی چھلانگ لگانے کے عادی معلوم ہوتے ہو۔"

"میں تو سمجھتا ہوں کہ مجھے چھلانگ لگانے میں بہت تاخیر ہوگئی۔ آپ اب تک تھیں کہاں؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکا۔

"تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟" ایک لمحے کے لئے اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

"معلوم ہے۔ لیکن مجھے اس سے کوئی غرض نہیں" میں نے جواب دیا "مجھے تو صرف اس سے غرض ہے کہ میری نظر میں آپ کیا ہیں۔"

وہ میرے بہت قریب کھڑی تھی اور خوشبوؤں کے سیلاب میں اس کے وجود سے امنڈتی ہوئی انوکھی سی خوشبو کو میں علیحدہ ہی محسوس کرسکتا تھا۔ گفتگو جس طرح یکدم ہی اس عجیب نہج پر آگئی تھی اس سے میری رگ و پے میں گدگدی سی ہونے لگی تھی۔ تاہم بظاہر ہمارا انداز ایسا ہی تھا جیسے ہم نہایت ہی سرسری اور رسمی گفتگو کررہے ہوں، جیسے کہ اس قسم کی پارٹیز میں عموماً لوگ پلیٹیں ہاتھوں میں لے کر ٹہلتے ٹہلتے ایک دوسرے سے متعارف ہونے کے بعد کرنے لگتے ہیں۔

وہ بڑے ہموار لہجے میں بولی "تم مجھے میرے گھر آکر بتاؤ کہ میں تمہاری نظر میں کیا ہوں۔"

"زہے نصیب" میں نے فوراً کہا "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مقدر یوں کسی پر اچانک بھی مہربان ہوسکتا ہے۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ مقدر تم پر پہلی بار مہربان ہورہا ہے" وہ قدرے شوخ لہجے میں بولی "تم مجھے مقدر کا سکندر لگتے ہو۔ جانے کتنی بار مقدر کی مہربانیوں سے مستفید ہوچکے ہو۔"

"یہ آپ کا خیال ہے نا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے خیال میں تو مقدر نے میرے ساتھ بڑی زیادتی کی ہے کہ آپ کو آج تک میری نظروں سے اوجھل رکھا۔ میں کب آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوسکتا ہوں؟"

"آج ہی" اس نے اختصار اور اطمینان سے جواب دیا۔

"کب اور کس طرح؟" میں نے دھڑکنوں کو اعتدال میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ڈنر کے بعد جب میں رخصت ہونے لگوں تو تم بھی چل دینا۔ اپنی گاڑی میں میری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے آنا۔ بس اتنی سی بات ہے" اس نے پُرسکون لہجے میں کہا اور پُرتمکنت انداز میں آگے بڑھ گئی۔ دو چار قدم آگے جاتے ہی اسے عورتوں اور مردوں کی ایک چھوٹی سی ٹولی نے گھیر لیا۔ یہ عام سے بزنس مین اور ان کی بیویاں تھیں۔ رپورٹروں اور فوٹو گرافروں میں سے کوئی اب اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ سب بڑے جوش و خروش سے مختلف ڈشوں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے میں مصروف تھے۔

میں کھانا پینا بھول گیا تھا اور دم بخود سا اپنی جگہ کھڑا تھا۔ جب میں نے اس عورت کو دیکھا تھا اور مسعود نے مجھے اس کے متعلق بتایا تھا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ قلعہ اتنی آسانی سے فتح ہوسکتا ہے۔ ہماری چند منٹ کی گفتگو کے دوران کوئی بھی خاص طور پر ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا تھا۔

کچھ دیر بعد تقریباً سبھی لوگ ڈنر سے فارغ ہوگئے۔ ڈنر کے بعد موسیقی کا پروگرام تھا لیکن میں نے دیکھا کہ شاہانہ الوداعی انداز میں اپنے شناساؤں سے مل رہی تھی۔ میں بھی جانے کے لئے پر تولنے لگا۔ مسعود نے مجھے دروازے کی طرف کھسکتے دیکھا تو قریب آکر حیرت سے بولا "جارہے ہو کیا؟"

"ہاں یار! بڑی زبردست نیند آرہی ہے" میں نے خواہ مخواہ جماہی لینے کی کوشش کی اور آواز کو بھی بوجھل بنایا۔

"حیرت ہے!" وہ مجھے سرتاپا دیکھتے ہوئے بولا "یہاں آتے وقت تم نے تو کہا تھا کہ میں خاص طور پر موسیقی کے پروگرام کے لئے جارہا ہوں۔ ویسے بھی آج تو ویک اینڈ ہے۔ سنیچر کی رات ہے جو ہم عام طور پر جاگ کر ہی گزارتے ہیں۔ صبح تو چھٹی ہے۔ دن بھر آرام سے سوئیں گے۔"

"نہیں یار! میرا ابھی سونے کو جی چاہ رہا ہے تو ابھی سوؤں گا"۔ میں نے اس سے بازو چھڑاتے ہوئے کہا۔ کیونکہ میں دیکھ چکا تھا کہ شاہانہ ہال سے باہر جاچکی تھی۔

مسعود کو قدرے پریشان چھوڑ کر میں تیزی سے باہر آیا اور طویل و عریض سرسبز لان سے گزر کر ایک طرح سے شارٹ کٹ اختیار کرتے ہوئے پارکنگ لاٹ تک پہنچا۔ پارکنگ لاٹ بھی کچھ کم طویل و عریض نہیں تھی لیکن اس وقت گاڑیوں سے بھری ہوئی تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاندار اور چم چم کرتی گاڑی وہاں موجود تھی۔

شاہانہ جدید ترین ماڈل اور مونگیا رنگ کی ایک مرسڈیز میں بیٹھ رہی تھی۔ ایک معمر اور باوردی ڈرائیور اس کے لئے دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ شاہانہ نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈرائیور کو غالباً آگاہ کیا کہ میں ان کے پیچھے آؤں گا۔ ڈرائیور نے سعادت مندی سے سر ہلا کر صرف ایک نظر میری طرف دیکھ کر ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

آگے پیچھے ہماری گاڑیاں جیم خانہ سے نکلیں تو میں نے گیٹ سے کچھ دور جیم خانہ کی دیوار کے ساتھ پھیلی ہوئی سبزے کی پٹی پر ایک بوڑھے اور آٹھ دس سال کے ایک بچے کو بیٹھے دیکھا۔ ان کے جسموں پر میلے کچیلے چیتھڑے جھول رہے تھے۔ وہ جیم خانہ سے نکلنے والی ہر گاڑی کی طرف پُرامید انداز میں ہاتھ پھیلا رہے تھے اور اس کڑکڑاتی سردی میں وہ تھر تھر کانپ رہے تھے مگر ہر گاڑی ان کے قریب سے گزرتی چلی جاتی تھی۔

میں بھی ان کے سامنے سے گاڑی نکال لے گیا لیکن اس ایک لمحے میں، میں نے اس معصوم سے بچے کی آنکھوں میں جس طرح امید کے ستارے ٹوٹتے دیکھے اس نظارے نے یکلخت ہی گویا مجھے کسی اونچی چوٹی سے دھکیل دیا۔ میں کار کا ہیٹر آن کرچکا تھا مگر یک لخت مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے ہیٹر کار میں حرارت نہیں پھیلا رہا بلکہ برف کی بوچھاڑ کررہا ہے۔ ...میرے ذہن پر تھوڑی سی وھسکی اور نہایت عمدہ کھانے کا جو خمار تھا وہ یک دم کافور ہوگیا۔ میرے حواس میں عجیب سی ٹھنڈک آن بسی۔

اگر وہ پیشہ ور بھکاری تھے تب بھی قابلِ رحم تھے۔ رات کا پہر اور شہر کا یہ کنارا۔ ایسی غضب کی سردی اور ان کے جسموں پر جھولتے ہوئے چیتھڑے۔ اور پھر ان کی عمریں بھی تو کیسی تھیں۔ ایک اتنا کم سن اور معصوم کہ ابھی اس کی آنکھوں نے نشیب و فراز اور محرومی و آسودگی پر حیران یا افسردہ ہونا بھی نہیں سیکھا تھا۔ دوسرا اتنا ضعیف تھا کہ زندگی کی مزید ناانصافیوں کو سہنے کی اس میں سکت ہی نظر نہیں آتی تھی۔ مگر جانے کس طرح وہ قرض جان چکانے کے لئے اپنے آپ کو گھسیٹ رہا تھا۔

ان تمام سوچوں اور ساری کیفیت نے صرف ایک لمحے میں مجھ پر غلبہ پالیا اور مجھے خود احساس نہیں ہوا کہ کب میرا پاؤں ایکسیلریٹر سے ہٹ کر بریک پر جاپڑا۔ اپنی ہی گاڑی کے ٹائروں کی چرچراہٹ سن کر میں چونکا۔ دوسرے ہی لمحے گاڑی ریورس کرکے میں اس بوڑھے اور بچے تک پہنچ چکا تھا۔

وہ اس مرتبہ پُرامید انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے اور لڑکھڑاتے قدموں سے گاڑی کی طرف بڑھے۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور اتنے قریب سے ان کے چہرے کی لجاجت اور بے بسی دیکھ کر میرا جسم جیسے مزید سرد پڑ گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ مجھے ان پر ترس نہیں آرہا تھا بلکہ میں ان سے اپنے آپ کو خوف زدہ محسوس کررہا تھا جیسے میں ان کا مجرم ہوں۔

میں نے اپنے بٹوے سے پانچ سو روپے نکال کر بوڑھے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ روپے لو اور فوراً یہاں سے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوجاؤ۔ میں چند منٹ بعد دوبارہ یہاں سے گزروں گا، اس وقت تک میں تمہیں یہاں بیٹھا ہوا نہ دیکھوں۔"

اس نے کانپتے ہاتھوں سے نوٹ تھامے۔ بے یقینی سے میری طرف دیکھا اور لرزتی آواز میں بولا "اتنے پیسوں میں تو پورا مہینہ آرام سے گزر جائے گا جی.... اب مجھے یہاں بیٹھنے کی کیا ضرورت ہے.... لیکن کیا واقعی آپ یہ رقم مجھے دے رہے ہیں؟"

"ہاں۔ ہاں۔ تمہیں ہی دے رہا ہوں۔ شاید میں تمہارا مقروض ہوں۔ جن آسائشوں پر میرا قبضہ ہے شاید ان میں کچھ تمہارا بھی حصہ تھا" میں نے تیزی سے کہا "بس اب فوراً اپنے گھر کی طرف روانہ ہوجاؤ۔ کہاں رہتے ہو؟"

اس کی سمجھ میں شاید صرف میرا سوال ہی آیا تھا۔ کینٹ والے پل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اس پل کے نیچے جھگی ڈال رکھی ہے صاحب جی! وہی ہمارا گھر ہے... میری بیوہ بیٹی اور نواسے نواسیاں کھانے کا انتظار کررہی ہوں گی... میں تو خود جلد سے جلد وہاں پہنچنا چاہتا ہوں جی.... اللہ آپ کو خوش رکھے..."

میں نے اس کی مزید دعائیں سنے بغیر ایکسیلریٹر دبا دیا اور ٹائروں کی زوردار چرچراہٹ کے ساتھ میری گاڑی سرکش عفریت کی طرح آگے بڑھی۔ شاہانہ کی گاڑی کی عقبی سرخ بتیاں مجھے نہر والے پل کے پاس معدوم ہوتی نظر آگئی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کی گاڑی گلبرگ کی طرف مڑ چکی تھی۔

چند ہی سیکنڈ میں، میں نے اسے جالیا کیونکہ وہ بہت ہی دھیمی رفتار سے ہلکورے لیتی ہوئی جارہی تھی۔ غالباً عقب نما آئینے میں میری گاڑی کو دیکھنے کے بعد شاہانہ کے ڈرائیور نے رفتار تیز کی۔ اس بوڑھے اور بچے کو دیکھ کر میرے ذہن کو جو جھٹکا سا لگا تھا، میں اس سے سنبھل چکا تھا اور کوشش کررہا تھا کہ اپنے خیالات شاہانہ پر مرکوز کردوں۔

چند منٹ کے سفر کے بعد شاہانہ کی گاڑی جس کوٹھی میں داخل ہوئی وہ کسی محل سے کم نہیں تھی۔ اس کے دروازے پر اونچے سے طرّے والا ایک باوردی اور مسلح محافظ کھڑا تھا جو گاڑی کو دیکھ کر یکدم مستعد ہوگیا لیکن مشینی سے انداز میں ناک کی سیدھ میں دیکھتا رہا۔

شاہانہ کے ڈرائیور نے گاڑی سے اتر کر نہ صرف اپنی

گاڑی کا بلکہ میری گاڑی کا بھی دروازہ کھولا۔ جس ڈرائیوے میں ہماری گاڑیاں رکی تھیں وہ بیڈ منٹن کے تین چار کورٹ بنانے کے لئے کافی تھا اور دائیں ہاتھ پر جو لان پھیلا ہوا تھا وہ کسی چھوٹے موٹے اسٹیڈیم کے برابر تھا۔ کوٹھی کی ساخت بھی عام آدمی کو مبہوت کردینے کے لئے کافی تھی۔
سیڑھیاں چڑھ کر ہم برآمدے میں پہنچے جس کا فرش ماربل کا تھا اور عمدہ پالش کی بدولت دھیمی روشنی میں آئینے کی طرح جھلملا رہا تھا۔ اندر نہ جانے کس طرح ہماری آمد کی اطلاع ہوچکی تھی کہ شاہانہ کو کوئی بیل وغیرہ بجانے کی ضرورت پیش نہیں آئی اور جیسے ہی ہم بلند و بالا منقش چوبی دروازے تک پہنچے ایک باوردی بٹلر نے دروازہ کھول دیا۔ دروازہ کھولتے ہی وہ ہاتھ باندھ کر اور نظریں جھکا کر غلاموں کی طرح ایک طرف کھڑا ہوگیا۔

شاہانہ اس کی طرف دیکھے بغیر ایک ملکہ کی سی تمکنت سے سر اٹھائے آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس کی رہنمائی میں، میں جس طویل و عریض بیڈ روم میں پہنچا وہ آرائش کے لحاظ سے قدامت اور جدت کا ایک حسین امتزاج تھا۔ مثلاً اس کی چھت میں قدیم طرز کے دو بڑے بڑے نہایت خوبصورت فانوس آویزاں تھے مگر وہ سانک کنٹرولڈ تھے۔ تالی بجانے پر روشن ہوگئے تھے۔
جہازی سائز کا بیضوی بیڈ شاہی انداز میں چاروں طرف سے حریری جالیوں میں گھرا ہوا تھا۔ باقی فرنیچر وکٹورین اسٹائل کا تھا مگر ساتھ ہی وہاں دورِ جدید کی بعض برقی اور مشینی سہولتیں بھی موجود تھیں۔ محض یہ جنت نظیر کمرا ہی اپنی جگہ ایک علیحدہ کائنات تھا۔
آج کل میں خود بھی کسی معمولی کوٹھی میں نہیں رہتا تھا لیکن اس کوٹھی کی وسعت اور آرائش دیکھ کر میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بہرحال شاہانہ کا رہن سہن دیکھ کر مجھے کچھ ایسا زیادہ حیران ہونے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا اپنا ازدواجی پس منظر جاگیردارانہ تھا۔ اس کا موجودہ شوہر بھی نہ صرف بڑا جاگیر دار بلکہ وزیر بھی تھا۔
ایک آرام کرسی پر جسے محض ایک نظر دیکھ کر ہی آرام کا احساس ہوتا تھا، ڈھیر ہوتے ہوئے اس نے شاید کوئی نادیدہ بٹن دبایا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے چراغ کے جن کی طرح ایک اور ملازم ہاتھ باندھے آن حاضر ہوا تھا۔
"دیکھو... مجھے بیڈ روم میں کوئی فون نہ دینا" اس نے ملازم کو ہدایت کی "اسلام آباد سے اگر صاحب کا فون بھی آئے تو کہہ دینا کہ میں سوچکی ہوں۔"
ملازم نے نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھے بغیر اثبات میں سر ہلایا۔ تب شاہانہ نے مخمور سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا پیو گے؟"
"صرف بلیک کافی" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اس کی ہدایت پر میں بھی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوچکا تھا اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں ایک ننھا منا اور ہلکا پھلکا سا بچہ ہوں اور پریاں مجھے ہواؤں میں جھولا جھلا رہی ہیں
ملازم جا چکا تو وہ اپنی جیولری اتار کر بے پروائی سے نیلگوں شیشے کی ایک تپائی پر پھینک کر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "معظم اسلام آباد گیا ہوا ہے کم از کم ایک ہفتے بعد واپس آئے گا۔"

یہ اطلاع گویا خاص طور پر میرے لئے تھی۔ میں نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے ایک بار پھر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

"اچھا.... تو تم بزنس کرتے ہو؟" وہ اپنے خوبصورت ریشمی بالوں کا جوڑا کھول کر انہیں آرام کرسی کے پشتے پر پھیلا کر گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ میں سحر زدہ سی نظروں سے ان بالوں کو دیکھ رہا تھا جو گدیلے پشتے سے یوں نیچے کو لٹکے ہوئے تھے جیسے پگھلے ہوئے سونے کا چھوٹا سا آبشار گر رہا ہو۔
میں نے بمشکل اس کے جلووں کے سحر سے آزاد ہوتے ہوئے قدرے چونک کر کہا "میں نے کب کہا ہے کہ میں بزنس کرتا ہوں؟"
"کہا تو ہم نے آج ایک دوسرے سے کچھ بھی نہیں" وہ مخمور سے لہجے میں بولی "زبان سے کہے بغیر ہی ہم نے ایک دوسرے کی باتیں سمجھی ہیں۔"
وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کی ساری باتیں سمجھ چکے تھے۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں اسے برسوں سے جانتا ہوں۔ ملازم کافی کے برتن ٹرالی پر رکھے، اجازت پا کر اندر آیا اور پھر اس کا اشارہ پا کر لوٹ گیا۔ شاہانہ نے خود میرے لئے کافی تیار کی۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے ہم پھر بار بار خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ کافی کا مگ تپائی پر رکھ کر اس نے تالی بجائی اور فانوسوں کی روشنی معدوم ہوگئی۔ کمرے میں صرف دیوار گیر رنگین قمقموں کی مدھم اور خوابناک روشنی باقی رہ گئی۔
کئی گھنٹے بعد جب بیڈ سائیڈ ٹیبل کا کلاک مترنم سی ٹک ٹک کے ساتھ صبح کے سات بجنے کا اعلان کر رہا تھا تو وہ سرشار لہجے میں بولی "محمد افضل چوہدری! تم چاہو تو فرض کرسکتے ہو کہ تمہیں پارس پتھر مل گیا ہے۔ کچھ استفادہ کرنا چاہو تو کرلو۔ کوئی کام کہیں اٹکا ہوا ہے تو مجھے بتادو۔ کوئی مسئلہ درپیش ہو تو صرف اشارہ کردو۔"

"ہوسکتا ہے مجھے اپنا ایک مسئلہ حل کرانے میں تم سے مدد لینی پڑے..." میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا۔

"تمہارے شوہر کے پاس جو منسٹری ہے وہ میرے لئے بڑی اہم ہے... لیکن فی الحال اس موضوع کو رہنے دو۔ تم مجھے ملی ہو... تمہارا التفات ملا ہے۔ پہلے مجھے کچھ عرصے تک تو اس خوشی کو محسوس کرلینے دو۔ میری روح میں پیاس کا ایک صحرا پھیلا ہوا تھا۔ اسے کچھ دیر تو اپنی محبت کی شبنم جذب کرنے دو۔"
"اتنی رومینٹک باتیں مت کرو" وہ گویا تڑپ کر بولی۔
"میرے برسوں کے خوابیدہ زخموں سے لہو رِسنے لگے گا۔ محبت کو میں نے سترہ سال کی عمر میں الوداع کہہ دیا تھا کیونکہ میری پہلی اور آخری محبت کا انجام بہت دردناک ہوا تھا۔ میں گجرات کی رہنے والی ہوں جو خوبصورت عورتوں کی سرزمین ہے..."

"اگر تم گجرات کی رہنے والی ہو تو پھر وہ یقیناً خوبصورت عورتوں کی سرزمین ہوگی۔ مجھے اس میں ذرہ برابر بھی شبہ نہیں" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔
لیکن وہ گویا میری سرگوشیاں نہیں سن رہی تھی۔ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی "گجرات صرف خوبصورت عورتوں ہی کی نہیں، محبت کی سرزمین بھی ہے۔ صرف ایک میں ہی بدنصیب تھی جسے اس کی محبت نہیں مل سکی اور جس کے محبوب کا سر تن سے جدا کرکے اس کی لاش نہر میں پھینک دی گئی۔ بس اس کے بعد سے کبھی محبت کا نام لینے کو جی نہیں چاہا۔ معاملہ کچھ اور ہی بن گیا۔ اور بس یونہی بھٹکتے بھٹکاتے کچھ زندگی گزر گئی اور کچھ گزر جائے گی۔ تم بس ایسی اداس کردینے والی باتیں مت کرو۔ رُت بہت اچھی ہے اور حالات بہت موزوں۔ اچھی اچھی باتیں کرو۔ دل میں خوشی کے پھول کھلانے والی باتیں۔"

وہ ذرا بھی اداس نظر نہیں آرہی تھی۔ اس نے اتنے برسوں میں اپنے اوپر نہ جانے کتنا مضبوط خول چڑھا لیا تھا۔
"ٹھیک ہے... میں دل کی بات دل ہی میں رکھوں گا۔ مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "اچھا... یہ تو بتاؤ کہ معظم کی عدم موجودگی میں یوں رات بھر میرا یہاں رہنا... میرا مطلب ہے گھر میں اتنے نوکر وغیرہ بھی موجود ہوتے ہیں ... کیا تمہیں کبھی کسی کی طرف سے چغلی لگنے یا کوئی اسکینڈل بننے کا خوف محسوس نہیں ہوا؟"

"ہمارے ہاں نوکر اندھوں، گونگوں اور بہروں کی طرح رہتے ہیں۔ صرف اپنے فرائض سے متعلق بات سنتے اور کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں نوکروں کو اچھی بھلی فرموں اور کمپنیوں کے ایگزیکٹو آفیسرز سے زیادہ تنخواہیں ملتی ہیں اس لئے ایسی نوکریوں سے ہاتھ دھونا کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتے ہیں" پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی "ویسے بھی یہ دنیا کا کارخانہ اس ہاتھ دو اس ہاتھ لو والے اصول پر ہی زیادہ چل رہا ہے۔ میں جب کبھی شہر سے باہر یا ملک سے باہر جاتی ہوں اور معظم گھر پر ہوتا ہے تو میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ پیچھے یہاں کیا ہوتا ہے۔ در و دیوار بہ زبانِ خموشی بہت سی کہانیاں سناتے ہیں لیکن میں ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتی۔"
پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا، ہنس کر بولی "ویسے جن دنوں میری دوسری شادی کا زمانہ چل رہا تھا اس وقت ایک نوکر نے اس قسم کی حماقت کرنے کی کوشش کی تھی۔ کسی بات پر ہم نے اسے نوکری سے نکال دیا تھا۔ کافی دن اسے کہیں اور نوکری نہیں ملی۔ آدمی ذرا تیز طرار اور تھوڑا سا پڑھا لکھا تھا اور اسے ہم پر بہت غصہ تھا۔ اس نے ایک اخبار نویس سے مل کر اس کے ہاتھ کچھ تاریک راتوں کے افسانے فروخت کرنے کی کوشش کی تھی۔ اخبار والوں کو تو وہ اسکینڈل چھاپنے کی جرأت نہیں ہوسکی البتہ ہمیں علم ہوگیا کہ فلاں سابق نوکر نے اس قسم کی کوشش کی تھی..." وہ بات ادھوری چھوڑ کر عجیب سے انداز میں مسکرا کر خاموش ہوگئی۔
"پھر کیا ہوا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔
"کچھ بھی نہیں" وہ بڑی سادگی سے بولی "سابق نوکر کی لاش ایک گندے نالے میں پائی گئی تھی... اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ کام میرا نہیں تھا۔ میرا ہاتھ اس میں ہرگز نہیں تھا۔ یہ کام میرے شوہر نے کرایا تھا" وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ "دیکھو نا... شادی کے بعد تو عورت مرد کی ذمے داری بن جاتی ہے نا۔ عورت کی رسوائی مرد کی رسوائی ہوجاتی ہے۔ اس لئے اسے زحمت کرنا پڑی" اس نے ایک طویل سانس لی "تو یہ ہے زندگی۔"

"ہاں۔ یہ ہے زندگی" میں نے آہستگی سے کہا۔
اس روز میں دن چڑھے باقاعدہ اور پُرتکلف قسم کا ناشتا کرکے وہاں سے رخصت ہوا۔ ایک ہی رات میں مجھے خود ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں رہتا ہی اسی گھر میں ہوں۔ شاہانہ مجھے گاڑی تک چھوڑنے آئی۔ میں گاڑی میں بیٹھ چکا تو وہ کھڑکی پر جھکتے ہوئے بولی "میں ایک بار پھر کہہ رہی ہوں کہ کوئی مسئلہ ہو تو بتادو۔"

"بتادوں گا۔ آئندہ کسی ملاقات پر بتادوں گا" میں نے کہا۔ "یا تمہارا آئندہ ملنے کا کوئی ارادہ نہیں؟"
"ارادے تو نہ جانے کیا کچھ ہیں مگر وقت کا کچھ پتا نہیں ہوتا" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی اور پیچھے ہٹ گئی "بہرحال جیسے تمہاری مرضی۔"
"اگلی ملاقات کے لئے وقت نہیں دیا تم نے" میں نے کہا۔
"آج رات یہیں آجاؤ" وہ بولی "لیکن آنے سے پہلے فون کرلینا کیونکہ اس وقت تو مجھے خود نہیں معلوم کہ رات

گئے تک میری مصروفیات کیا ہوں گی ۔ میری سیکریٹری آئے گی تو مجھے بتائے گی ۔ کل رات چھٹی کرنے سے پہلے اس نے نہ جانے کس کس کو وقت دیا ہے ۔ مجھے کچھ معلوم نہیں ۔ "

" ٹھیک ہے ' میں آٹھ بجے کے قریب فون کروں گا ۔ اگر تمہاری کوئی مصروفیت نہ ہوئی تو رات کا کھانا ہم انٹر کان میں کھائیں گے " میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا ۔

" ٹھیک ہے " وہ ادھوری سی انگڑائی لے کر بولی اور واپسی کے لئے مڑ گئی ۔ میں نے گاڑی " آؤٹ " والے گیٹ سے نکالی اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا ۔ میں اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا اور سرشار محسوس کر رہا تھا ۔

اسی رات شاہانہ سے اگلی ملاقات میں کھانے کے کئی گھنٹے بعد میں نے اس کی دوبارہ یاددہانی پر کہا " ہاں ... مجھے ایک کام ہے تو سہی اور مجھے امید ہے کہ معظم کے تعاون سے وہ ہو سکتا ہے ۔ "

" ضروری نہیں کہ تم کوئی ایسا ہی کام بتاؤ جو صرف معظم ہی کے تعاون سے ہو سکتا ہو " وہ ایک طلائی سگریٹ ہولڈر میں پھنسی ہوئی پتلی غیر ملکی سگریٹ کا طویل کش لیتے ہوئے بولی " تم صرف کام بتاؤ ۔ یہ میں خود ہی دیکھ لوں گی کہ وہ کس کے تعاون سے ہو سکتا ہے ۔ "

" میرے پاس کافی دولت ہے ... بلیک منی ہے ... " میں نے دھیمے لہجے میں کہا " میں چاہتا ہوں کہ وہ وہائٹ منی میں تبدیل ہو جائے ۔ میرے ذہن میں کئی منصوبے ہیں جن میں سے کسی ایک یا دو بڑے منصوبوں پر میں کام شروع کرنا چاہتا ہوں لیکن مسئلہ صرف یہی ہے کہ میرے پاس اپنی بیشتر دولت کا کوئی جواز موجود نہیں ۔ "

" یہ کونسا مشکل کام ہے " وہ بے نیازی سے بلوری ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولی " ہو جائے گا ۔ لیکن اس ضمن میں کچھ چھوٹے لوگوں سے بھی کام لینا پڑے گا اور ان کے لئے تمہیں اس دولت میں سے کچھ نکالنا پڑے گا ۔ "

" میں اس کے لئے تیار ہوں " میں نے بلا تامل کہا ۔

" بس تو سمجھ لو کہ تمہارا کام ہو گیا " وہ بولی " معظم آئے گا تو میں اس سے کہہ دوں گی ۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا اگر معظم تمہیں فون کرے یا اپنے آفس بلوائے تو تم میرے دوست کی حیثیت سے نہیں میرے دور پار کے کزن کی حیثیت سے بات کرو گے ... اور اگر وہ تم سے اس ضمن میں بات ہی نہ کرے تو تمہیں بھی از خود کچھ جتانے کی ضرورت نہیں ۔ بس تم اطمینان سے سیدھی طرح صرف کام کی بات کرنا ۔ سمجھ گئے نا ؟ "

" بالکل سمجھ گیا " میں نے سعادت مندی سے سر ہلا کر کہا ۔ " تم سے ملاقات کے بعد میں ویسے بھی کچھ زیادہ سمجھدار ہوتا جا رہا ہوں ۔ "

ہماری ملاقاتیں جاری رہیں حتیٰ کہ ایک روز شاہانہ نے فون پر مجھے اطلاع دی " کل معظم واپس آ رہا ہے ... "

" اوہ .... " میں نے تاسف سے کہا " اس کا مطلب ہے ہماری ملاقاتیں ختم ... ؟ "

" تم چاہو تو یہ مطلب اخذ کر سکتے ہو ورنہ ایسی تو کوئی بات نہیں " اس نے مترنم سا قہقہہ لگایا " اس کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں اور میری اپنی ۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ ملاقاتیں اب کچھ کم ہو جائیں گی اور میرے گھر پر نہیں ہوا کریں گی " اس نے ایک بار پھر مترنم سا قہقہہ لگایا " ویسے زیادہ دل برداشتہ ہونے کی بھی ضرورت نہیں ۔ معظم اکثر شہر سے یا ملک سے باہر جاتا رہتا ہے ۔ "

" اوہ ... پھر ٹھیک ہے " میں نے گویا سکون کی سانس لی اس کے بعد چار پانچ دن اس طرح گزر گئے کہ اس سے سامنا تک نہیں ہوا ۔ اس روز میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا کہ میری سیکریٹری کیتھرین نے بڑے پُرجوش لہجے میں انٹر کام پر اطلاع دی " سر ! وہ .... منسٹر معظم صاحب آپ سے بات کرنا چاہتے ہیں ۔ "

" کیتھی ! تم یوں خوش معلوم ہو رہی ہو جیسے وہائٹ ہاؤس سے ہمیں صدرِ امریکا کا فون آ گیا ہو " میں نے پُرسکون لہجے میں کہا ۔

" وہ .... سر .... میرا مطلب ہے .... پھر بھی .... " وہ گڑبڑا کر رہ گئی ۔

" خیرات کراؤ " میں نے ہموار لہجے میں کہا " اور ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا لیا ۔ دوسری طرف سے معظم نے میری آواز سنتے ہی یوں بے تکلفی سے پنجابی میں میری خیر و عافیت دریافت کی جیسے میں اس کا پرانا دوست ہوں ۔ میں نے حتی الامکان خوش خلقی کے ساتھ متانت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی باتوں کا جواب دیا ۔

ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ بولا " میری بیوی بتا رہی تھی کہ تمہیں ایک مسئلہ درپیش ہے .... اندازاً رقم کتنی ہو گی ؟ "

" ایسی باتیں ٹیلی فون پر تو نہیں ہوتیں نا جناب ! " میں نے محتاط لہجے میں کہا " اور پھر میرا خیال تھا کہ مجھ سے سوالات کرنے کے بجائے مجھے راستے بتائے جائیں گے کہ مجھے کیا کیا کرنا چاہئے ۔ "

" بڑے احتیاط پسند معلوم ہوتے ہو یار ! " اس نے ایک بے ہنگم سا قہقہہ لگایا " خیر ' ایسا کرو کہ اس سنیچر کی شام تم میرے دفتر میں آ جاؤ ۔ سنیچر کو میں اپنے اسٹاف کو جلدی چھٹی دے دیتا ہوں ۔ صرف ایک دو ضروری آدمی ہوتے ہیں اور کوئی اپائنٹمنٹ بھی نہیں ہوتا ۔ ہم اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے ۔ ٹھیک ہے ؟ "

"ٹھیک ہے" میں نے متانت سے کہا "میں چار بجے حاضر ہو جاؤں گا۔"

○☆○

معظم کے توسط سے میرا مسئلہ حل ہو گیا۔ مجھے اپنی دولت کے تقریباً دس فیصد حصے سے ہاتھ دھونا پڑے لیکن میرے خیال میں یہ سودا مہنگا نہیں تھا۔ جو لوگ اس ضمن میں مجھ سے تعاون کر رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ آئندہ بھی وہ انہی شرائط پر میری یہ خدمت بجالاتے رہیں گے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس سودے بازی میں معظم کا کوئی حصہ تھا یا نہیں؟ اور اگر تھا تو کتنے فیصد تھا؟ بظاہر وہ بالکل دوستانہ، بے غرض اور بے لوث انداز میں میرا کام یوں کر رہا تھا جس طرح عام طور پر قریبی رشتے داروں کے کرائے جاتے ہیں۔ لیکن وہ مجھے بے غرض و بے لوث آدمی لگتا ہی نہیں تھا۔ وہ ادھیڑ عمر تھا اور بہت ہی خرانٹ قسم کی چیز تھا۔

میری بلیک منی کے وہائٹ منی میں تبدیل ہونے کا عمل بہت آہستہ آہستہ مکمل ہوتا تھا۔ اس میں تقریباً چھ ماہ لگتے تھے۔ اس دوران رقم کی دوسری کھیپ تیار ہو سکتی تھی اور اس کے علاوہ میں اپنے اس پروجیکٹ کی منصوبہ بندی کر سکتا تھا جو مدتوں سے ایک خواب کی طرح میرے ذہن میں جاگزیں تھا۔

اگلی مرتبہ سیٹھ رمضان لاہور آیا تو میں نے ڈنر کے دوران اس کے سنگاپور، ہانگ کانگ اور تھائی لینڈ کے دوروں کے رنگین افسانے سنتے ہوئے اچانک کہا "یار! میں کراچی میں ایک بہت بڑا اور بہت ہی شاندار ہوٹل تعمیر کرانا چاہتا ہوں۔ فائیو اسٹار یا کیا کم از کم فور اسٹار۔"

سیٹھ رمضان نے گلاس رکھ کر حیرت سے میری طرف دیکھا "تم گھاس تو نہیں چر گئے ہو؟ پی میں رہا ہوں، بہک تم رہے ہو۔"

"کیوں؟ اس میں بہکنے کی کیا بات ہے؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"دیکھو بھئی" اس کی آواز تقریباً سرگوشیوں میں ڈھل گئی "ہماری زیادہ تر دولت بلیک منی ہے۔ بالفرض ہم کسی معجزے کے تحت کسی بڑے پروجیکٹ کے لئے اسے باہر لانے میں کامیاب ہو بھی جائیں ....."

"ہمیں ہونا چاہئے" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں بہت عرصے سے یہ سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم دولت کما کر اپنی پسند کے منصوبوں میں نہیں لگا سکتے، بے دھڑک خرچ نہیں کر سکتے تو پھر اس کا فائدہ کیا ہے؟ کیا ہم کاغذات کے یہ ٹکڑے محض اس لئے کماتے ہیں کہ انہیں خفیہ مقامات پر

مصرف ہے اور دولت بھی ایسی جس کے لئے ہماری جان ہتھیلی پر رہتی ہو۔"

"اس لیکچر کو رہنے دو" سیٹھ رمضان نے بیزاری سے ہاتھ ہلایا "تمہیں بھی اچھی طرح معلوم ہے کہ ہم بلیک منی کو اس امید پر محفوظ رکھتے ہیں کہ شاید کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی طرح اسے وہائٹ میں تبدیل کرنے کا موقع مل جائے۔ دوسری بات یہ کہ دنیا بھر کی آسائشیں حاصل کر لینے کے بعد بھی کوئی شخص دولت کمانا بند نہیں کر دیتا۔ دنیا بھر کے وہ تمام دولت مند جنہیں کمپیوٹرز کی مدد سے بھی اپنی دولت اور اثاثوں کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہو پاتا وہ بھی زندگی کے آخری لمحے تک مزید دولت کمانے کی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ ہمیشہ باقاعدگی سے دفتر آتے ہیں، ہمیشہ نئے نئے منصوبوں میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں۔ ہمیشہ جہاں جو بچت ممکن ہو سکتی ہے وہاں بچت کرتے ہیں۔ اور تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ ایک خاص حد سے گزر جانے کے بعد دولت کمانا درحقیقت انسان کی ضرورت نہیں رہتا، اس کا محبوب ترین مشغلہ بن جاتا ہے۔ ادھر ادھر پھیلا ہوا اس کا کاروبار اس کے لئے شطرنج کی بساط بن جاتا ہے اور اسے نہایت مشاقی اور مہارت سے مہروں کو ادھر ادھر کھسکانے میں سب سے زیادہ لطف آتا ہے، ایک ناقابل بیان لذت حاصل ہوتی ہے۔ کہ اس کے فلاں اقدام سے فلاں جگہ اتنے لاکھ ڈالر، روپے یا ریال ادھر سے ادھر ہو گئے۔ فلاں جگہ یہ تغیر رونما ہو گیا۔ فلاں جگہ کی معیشت میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ بس اتنی سی لذت کا کھیل ہے یہ سارا۔"

"تم موضوع سے بہت دور نکل گئے ہو" میں نے ہموار لہجے میں کہا "یہ سب باتیں تو مجھے بھی معلوم ہیں۔"

"میں موضوع ہی کی طرف آنے لگا تھا" سیٹھ رمضان گھونٹ بھر کر بولا "میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر ہم کسی طرح اپنی ساری دولت بھی جھونک دیں تب بھی فائیو اسٹار ہوٹل بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ سرمایہ داری ہم دونوں صرف اپنے آپ تک محدود رکھیں گے" میں نے ملائمت سے کہا۔ "کمپنی پرائیوٹ لمیٹڈ ہو گی لیکن اس کے پیچھے سرمایہ کاروں کی ایک ٹولی ہو گی۔ فنانسروں کی ایک ٹیم ہو گی جو اس منصوبے کے لئے خاطر خواہ سرمایہ فراہم کرے گی۔ ضرورت پڑنے پر بینکوں سے قرض بھی لیا جائے گا۔ سرمائے کی فراہمی کے مطابق سب کے شیئرز ہوں گے۔ اکیاون فیصد شیئرز خرید کر مینجنگ ڈائریکٹر بننے کے لئے میں اس پروجیکٹ میں اپنی ساری دولت جھونکنے کے لئے تیار ہوں۔"

سوچنے پر مائل ہوا اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "ہم نے جو کمپنیاں قائم کی ہوئی ہیں میرے خیال میں تو وہ کسی شمار قطار میں نہیں ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے، بین الاقوامی فائیو اسٹار ہوٹلوں کی مرکزی کمپنیاں ہمیں گھاس ڈالیں گی؟"

"میں نے کہا نا، اس پروجیکٹ میں ہم اکیلے نہیں ہوں گے" میں نے کہا "ہم ایک آدھ ایسی کمپنی کو بھی اپنے ساتھ شامل کریں گے جس کی شہرت بین الاقوامی طور پر اچھی ہو۔ خواہ وہ سرمایہ برائے نام لگائے۔ اس کے علاوہ مجھے اب تک کی مختصری کاروباری زندگی میں یہ تجربہ ہوا ہے کہ باہر کے لوگ نام کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ آپ جو منصوبہ پیش کر رہے ہیں اس کی کامیابی کے امکانات کتنے روشن ہیں؟ سرمائے کی فراہمی کی کتنی ٹھوس ضمانتیں آپ فراہم کر رہے ہیں؟ وہ انسپکشن کریں گے۔ اور پھر مطمئن ہونے کے بعد ہی آپ کو فائیو اسٹار یا فور اسٹار ہوٹل کا اجازت نامہ دیں گے۔ اس کے بعد آپ آئندہ بھی وہ معیار برقرار رکھتے ہیں یا نہیں، یہ دیکھنے کے لئے ان کی معائنہ ٹیمیں اچانک آتی رہیں گی۔"

"یہ سب کچھ تو مجھے معلوم ہے" سیٹھ رمضان گویا کان پر سے مکھی اڑاتے ہوئے بولا "میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ... فی الحال تو ہوٹل انڈسٹری ٹھیک ہی جا رہی ہے۔ ہمارا پروجیکٹ مکمل ہونے تک اگر اس کا زوال شروع ہو گیا تو ہم مارے جائیں گے۔"

"یہ تو نہایت غیر کاروباری بات کی ہے تم نے" میں نے کھانا شروع کرنے کے لئے نیپکن گود میں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "اگر ہم لوگ اس طرح ڈرنے لگیں تو پھر کبھی کوئی پروجیکٹ شروع ہی نہ کر سکیں۔"

"میں حالات میں عدم استحکام دیکھ رہا ہوں" وہ متفکرانہ لہجے میں بولا۔

"بس۔ بس" میں نے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔ "زیادہ دانشور بننے کی کوشش مت کرو۔ ہوٹل نہ بھی چلا تو ہم کوئی فاقوں تو نہیں مر جائیں گے۔ میں تو دیوالیہ ہونے کے بعد بھی جینے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔ مجھ میں ابھی تک بان کی کھری چارپائی پر سونے اور چٹنی، لسی کے ساتھ روٹی کھا کر پیٹ بھر لینے اور پھر بھی مگن رہنے کی صلاحیت باقی ہے۔ اور پھر میں تو ہر معاملے میں مقدر کا قائل ہوں۔ مقدر جہاں بھی لے جائے گا وہیں صبر و شکر کے ساتھ قیام کر لیں گے۔"

"اچھا یار... جیسے تمہاری مرضی" سیٹھ رمضان گویا ہتھیار ڈالتا ہوا بولا "ہم نے تو تمہارے ساتھ دوستی کی ہے۔ اب کسی معاملے میں پیچھے تو نہیں ہٹ سکتے نا۔ فی الحال تو کھانا کھانے دو۔"

"بس اب تم کراچی واپس جاتے ہی سنجیدگی سے اس پروجیکٹ پر کام شروع کر دو" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "وہاں شفیع میرے کاروبار کو ہینڈل کر رہا ہے۔ وہ تمہارے اندازے سے کہیں زیادہ کام کا آدمی ہے۔ بوقتِ ضرورت تم کسی معاملے میں اس سے بھی تبادلۂ خیال کر سکتے ہو۔ اس کام کے لئے تم ابھی سے زمین ہموار کرنی شروع کر دو۔ میں اگلی مرتبہ کراچی آؤں گا تو تم سے پروگریس رپورٹ لوں گا۔"

"اوکے سر!" اس نے بیٹھے بیٹھے مجھے سیلوٹ کیا پھر یکے بعد دیگرے دو تین قابیں اپنی طرف کھینچ لیں۔

دوسرے دن سیٹھ رمضان واپس کراچی چلا گیا اور میں نے پہلے سے زیادہ سنجیدگی اور گہرائی سے اپنے منصوبے پر غور و خوض شروع کر دیا۔

اس سے اگلے روز جبکہ میں اپنے آفس میں بیٹھا تھا اور بے پناہ مصروف تھا، انٹرکام کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے کیتھرین دھیمے اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولی "سر! ایک صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں... انہوں نے ٹائم بھی نہیں لیا ہوا۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ آپ ان سے ضرور مل لیں گے۔ میں نے انہیں بتایا بھی کہ آج آپ بے پناہ مصروف ہیں مگر..." اس کے لہجے سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس نے اس نامعلوم شخص کے بے پناہ اصرار پر مجبور ہو کر مجھے اطلاع دی تھی۔

"نام کیا ہے ان صاحب کا؟" میں نے ایک فائل کے تمام کاغذات پر دستخط کرنے کے بعد اسے ایک طرف کھسکاتے ہوئے پوچھا۔

"آفاق علی... سر" کیتھرین نے فوراً جواب دیا۔

"نام تو کچھ مانوس سا لگتا ہے" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "لیکن مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں ان صاحب کو جانتا ہوں۔ یہ ہیں کون صاحب؟ کیا کرتے ہیں؟"

"سر... انہوں نے بتایا ہے کہ یہ فلم ڈائریکٹر ہیں" کیتھرین نے جواب دیا

"اوہ... مجھے یاد آگیا" میں نے اس شخص کا نام بعض فلمی اشتہاروں یا چھوٹی موٹی خبروں میں پڑھا تھا۔ شاید ایک آدھ رسالے میں، سرسری انداز میں اس کا انٹرویو بھی دیکھا تھا۔ مگر میں اس شخص کو ذاتی طور پر ہرگز نہیں جانتا تھا۔ پھر وہ کیوں مجھ سے ملنے آیا ہے؟ یہی سوچتے ہوئے بالآخر میں نے کیتھرین کو ہدایت کی "اسے اندر بھیج دو۔"

کچھ دیر بعد جو شخص دروازہ کھول کر میرے آفس میں داخل ہوا وہ پختہ العمر اور فربہی مائل تھا۔ اس کا لباس

معقول اور صاف ستھرا لیکن بال بکھرے ہوئے تھے اور ان میں سفیدی جھلک رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ پان چبا رہا تھا۔ انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ اس کی رنگت سانولی اور آنکھوں کے پپوٹے بھاری تھے۔ مجھے یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوئی کہ اس شخص نے اچھا وقت دیکھا ہوا تھا۔

میں نے کرسی سے قدرے اٹھ کر اس استقبال کیا اور اس نے نہایت ہی مؤدبانہ انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا۔ میرا اشارہ پاکر وہ بیٹھ چکا تو ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے نرمی سے کہا "جی.... فرمایئے.... کیسے زحمت کی آپ نے آفاق صاحب؟"

اس نے مضطربانہ سے انداز میں پہلو بدلا اور مسکراتے ہوئے بولا "نام تو آپ کو معلوم ہو ہی گیا۔ شاید یہ بھی معلوم ہو کہ میں ایک فلم ڈائریکٹر ہوں۔"

"جی ہاں... مجھے یاد آگیا ہے کہ میں نے فلموں کے اشتہاروں وغیرہ میں آپ کا نام پڑھا ہے۔ ویسے مجھے فلم دیکھنے کا کافی عرصے سے اتفاق نہیں ہوا۔ مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں۔ تین گھنٹے مسلسل سینما ہال میں بیٹھے رہنے کا حوصلہ نہیں پڑتا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آپ بڑے آدمی ہیں.... آپ کا ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے آپ تین گھنٹے ایک بے مقصد سی تفریح میں ضائع کرنے کے متحمل کہاں ہوسکتے ہیں" اس نے میری تائید میں سرہلایا "کاش آپ نے میری ایک فلم دیکھی ہوتی "تنہائی"... وہ میری ذاتی فلم تھی یعنی اس کا ہدایت کار ہونے کے ساتھ ساتھ فلمساز بھی میں تھا۔"

"اچھا!" میں نے گویا اخلاقاً دلچسپی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"وہ پچھلے سال کی کامیاب ترین فلم تھی" اس کے لہجے میں ہلکا سا فخر جھلک آیا۔

"بہت خوب!" میں نے بدستور نرمی سے کہا "افسوس کہ ہم ایک اچھی فلم دیکھنے سے محروم رہے۔"

"وہ اب بھی شہر کے دو پرانے سینماؤں میں لگی ہوئی ہے لیکن وہ دونوں سینما آپ کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ تاہم اگر کبھی آپ کے پاس بہت ہی فالتو وقت ہوا اور آپ کا دل چاہا تو میں ایک پرنٹ منگوا کر آپ کو یہ فلم اسٹوڈیو کے پروجیکشن ہال میں دکھادوں گا۔ یقیناً آپ کو پسند آئے گی" اس کے لہجے میں ایک التجا سی تھی کہ میں وہ فلم ضرور دیکھوں۔ مگر یہ التجا انا کے پردے میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں ابھی تک اس کی آمد کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔

اسے گویا خود بھی اس بات کا احساس تھا۔ وہ اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا "میری یہاں آمد کا مقصد کچھ عجیب

شروع کروں.... آپ نہ جانے کیا سمجھیں...." پھر جیسے ا[illegible] آداب مجلس کا خیال آگیا، انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ [illegible] کرتے ہوئے بولا "اگر آپ محسوس نہ کریں تو میں سگر[illegible] نوشی جاری رکھوں؟"

"ضرور۔ ضرور" میں نے کہا "میں خود سگریٹ نو[illegible] عادی نہیں ہوں لیکن میں سگریٹ نوشوں کو نفرت کی [illegible] سے نہیں دیکھتا۔ آپ شوق سے سگریٹ نوشی جاری ر[illegible] بلکہ میرا خیال ہے ساتھ ساتھ کچھ چائے نوشی بھی ہوجا[illegible]

وہ شکریہ ادا کرکے سگریٹ کے گہرے گہرے کش لی[illegible]... میں نے انٹر کام پر کیشئرین کو ہدایت کی کہ چائے [illegible] بھجوادے۔ میں جب دوبارہ آفاق علی کی طرف متوجہ ہوا [illegible] پہلے کی نسبت زیادہ مطمئن اور پُرسکون نظر آرہا تھا اور [illegible] آمیز نظروں سے دفتر کی آرائش و زیبائش کا جائزہ لے رہا [illegible] اس کے چہرے سے اب خود اعتمادی جھلکنے لگی تھی۔ شا[illegible] مجھ سے اتنی خوش خلقی کی توقع لے کر نہیں آیا تھا، اس [illegible] شروع میں کچھ مضطرب سا تھا۔

میں نے اپنے سامنے رکھی ہوئی فائلیں ایک طر[illegible] کھسکاتے ہوئے کہا "آپ کو جو کچھ بھی کہنا ہے بلا تکلف [illegible] جھجک کہئے آفاق صاحب! میں بہت سیدھے سادے اندا[illegible] بات کرنے اور سننے کا عادی ہوں۔ اگر آپ کو مجھ سے کو[illegible] ہے تو بلا تکلف کہہ ڈالیے۔ میرے بس کا ہوگا تو کردوں گا [illegible]"

"شکریہ۔ آپ نے یہ بتا کر میری جھجک دور کردی" وہ نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "میں درحقیقت آپ کے پاس ایک تجویز لے کر آیا ہوں۔ اگر آپ اسے قبول کرلیتے ہیں تو میرے کچھ مسائل حل ہوجائیں گے اور آپ کو بھی کئی قسم کے فوائد حاصل ہونے کا بہت زیادہ امکان ہے۔ یہ خیال مجھے یوں آیا کہ تین چار روز قبل میں نے ایک ہوٹل کی ایک تقریب میں آپ کو ایک صاحب سے باتیں کرتے سنا تھا جو غالباً آپ کے خاصے بے تکلف دوست تھے۔ میں اس وقت چند لوگوں کے ساتھ آپ کے قریب ہی کھڑا تھا اور میں معذرت خواہ ہوں کہ غیر ارادی طور پر میرے کان آپ کی گفتگو پر لگ گئے تھے۔ آپ ان صاحب کو بتا رہے تھے کہ بچپن میں آپ کو فلمیں دیکھنے کا کیسا زبردست شوق ہوا کرتا تھا اور فلم اسٹوڈیوز کے بارے میں آپ کیسے کیسے خواب دیکھا کرتے تھے۔"

"ہاں.... "میں دھیرے سے ہنس دیا "انسان کا بچپن بھی بس عجیب ہی دور ہوتا ہے.... سہانا.... معصوم اور ناقابلِ فراموش دور۔"

"بے شک" ایک لمحے کے لئے وہ کھوسا گیا لیکن پھر حقائق کی دنیا میں واپس آتے ہوئے بولا "میں نے سوچا، شاید اس بچپن کی پرچھائیاں اب بھی آپ کے ذہن میں موجود ہوں۔ شاید آپ کو اب بھی فلموں سے اور اسٹوڈیوز سے وہی دلچسپی ہو اور اس دنیا سے تعلق استوار کرنے کی وہی لگن دل میں موجود ہو۔ محض اسی امید کے سہارے میں اجنبی ہونے کے باوجود آپ سے ملنے چلا آیا ہوں۔ میں اپنے شناساؤں اور فلمی لوگوں کے پاس نہیں گیا کیونکہ انہیں اگر معلوم ہوجائے کہ کوئی شخص کسی معاملے میں مجبور ہے تو وہ اس کی مجبوری سے شرمناک حد تک فائدہ اٹھاتے ہیں۔"

اس دوران چپراسی چائے اور دیگر لوازمات لے آیا۔ وہ چائے بنانے کے بعد ہمارے سامنے رکھ کر جاچکا تو آفاق نے سگریٹ کا گہرا کش لے کر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "میں بہت مشکل میں پھنس گیا ہوں۔ کئی برس سے میں فلم انڈسٹری میں صرف ڈائریکٹر کے طور پر کام کر رہا تھا۔ اچھے ڈائریکٹرز میں شمار ہوتا ہے میرا۔ کافی حد تک سلیقے سے کام کرتا ہوں۔ جہاں تک حالات اجازت دیتے ہیں وہاں تک فلم کو سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک عام تاثر یہ ہے کہ فلمی دنیا شاید جاہل اور ان پڑھ لوگوں سے بھری پڑی ہے لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ وہاں پڑھے لکھے، مہذب اور شائستہ لوگوں کی بھی کوئی کمی نہیں جو اچھی فلمیں بنانے میں حتی المقدور تعاون کرتے ہیں۔ خود آپ کا یہ خاکسار بھی ایم اے ہے۔ میں نے فلسفے اور پولیٹکل سائنس میں ایم اے کیا ہوا ہے۔ میں پڑھاتا تھا ایک پرائیوٹ کالج میں۔ اتفاقاً ہی فلمی دنیا میں آگیا اور پھر ایسا دل لگا کہ اور کسی کام میں طبیعت ہی نہ جمی۔"

چند لمحے وہ پُرخیال انداز میں خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتا رہا۔ میں بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کپ رکھتے ہوئے بولا "میں نے بڑی محنت سے ڈائریکٹر کے طور پر اچھا مقام حاصل کیا تھا اور پھر بڑی محنت سے اس مقام کو برقرار رکھا تھا۔ اس وقت تک میرا نظریہ یہی تھا کہ ہر جگہ، ہر شعبے میں صرف محنت ہی انسان کی کامیابی کی ضامن ہوتی ہے لیکن اب میرا نظریہ تھوڑا سا تبدیل ہوگیا ہے۔ محنت کا پھل انسان کو ضرور ملتا ہے لیکن غیر معمولی اور بے مثل کامیابی انسان کو صرف مقدر سے ہی ملتی ہے اور جب مقدر انسان سے روٹھتا ہے تو اس کی کوئی پیش نہیں جاتی۔ ساری صلاحیتیں اور تیزی و طراری دھری رہ جاتی ہے اور جب مقدر انسان پر مہربان ہوتا ہے تو اس کے متعلق لوگوں کی سب منفی پیش گوئیاں دھری رہ جاتی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کے فلاں کام میں کامیابی کی ایک فیصد بھی امید نہیں جبکہ وہی کام اس کی زندگی بدل کر رکھ دیتا ہے۔ فلمی دنیا میں جاکر تو انسان کا میرے اس نظریے پر یقین بہت ہی پختہ ہوجاتا ہے۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا "میرا خیال ہے میں نے بات کچھ طویل کردی۔ دراصل ایک تو میں چاہتا ہوں کہ بات کچھ صحیح طور پر آپ کی سمجھ میں آجائے۔ دوسرے آپ کو اس پر یقین بھی آجائے.... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ڈائریکٹر کے طور پر میں اچھا بھلا کام کررہا تھا۔ عزت اور سفید پوشی سے گزربسر ہورہی تھی۔ کچھ رقم جمع ہوئی تو میں نے ذاتی فلم بھی شروع کردی۔ ڈسٹری بیوٹر بھی اچھا مل گیا۔ اس نے مجھے کافی سہارا دیا۔ ایک چوتھائی فلم میرے سرمائے سے مکمل ہونے کے بعد اس کی طرف سے قسطوں میں رقم آنی شروع ہوگئی اور فلم شیڈول کے مطابق مکمل ہوگئی.... اور جب ریلیز ہوئی تو سپرہٹ ہوئی۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ فلمی دنیا میں ایک چیز ہٹ ہوجائے تو راتوں رات آدمی کی تقدیر پلٹ جاتی ہے۔"

"ہاں۔ اس کا مجھے اندازہ ہے" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھ پر بھی قسمت بہت مہربان ہوئی" وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "مجھے بطور ہدایت کار سائن کرنے کے لئے بیسیوں فلمساز میرے پاس آنے لگے۔ فنانسروں کی طرف سے بھی پیشکشیں موصول ہونے لگیں کہ اگر میں فلم بنانا چاہتا ہوں تو وہ سرمایہ لگانے کے لئے تیار ہیں لیکن میں نے کسی کو گھاس نہ ڈالی۔ فلم سے جو آمدنی میرے حصے میں آئی تھی اس سے میں نے پگڑی دے کر اسٹوڈیو میں ایک عمدہ قسم کا آفس لیا اور "آفاق فلمز" کے نام سے ایک با[illegible]ہ کمپنی بنا کر ذاتی سرمائے سے بیک وقت دو نئی

فلمیں شروع کردیں۔ دونوں فلمیں پنجابی تھیں کیونکہ پنجابی فلموں کی مارکیٹ اچھی جارہی ہے اور میرا ارادہ تھا کہ روایتی انداز کی چیزوں کے ساتھ ساتھ پنجابی فلموں میں کچھ نئے رجحانات بھی دینے کی کوشش کروں گا۔"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرا کر ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا اور نئی سگریٹ سلگانے کے بعد بولا "پیسہ آتا تو نظر آتا ہے جاتا نظر نہیں آتا۔ لاشعوری طور پر ایک تو ہم نجی زندگی میں زیادہ خرچ کرنے لگتے ہیں۔ دوسرے پیشہ ورانہ اخراجات بھی بہت بڑھ گئے تھے۔ میری ایک فلم کی کامیابی نے مجھے بہت کچھ دیا تھا لیکن ظاہر ہے دفتر کے قیام اور اتنے زیادہ اخراجات کے ساتھ ساتھ دو فلموں کی تیاری .... اور بدقسمتی سے میری شوٹنگز بھی کچھ لیٹ ہوتی رہیں حالانکہ سہولت کی خاطر میں نے دونوں فلموں میں ایک ہی ہیرو کو کاسٹ کیا تھا۔ ... قصہ مختصر یہ کہ دونوں فلمیں تقریباً چوتھائی بنی تھیں کہ میرے پاس رقم بالکل ختم ہوگئی لیکن خیر... یہ کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا اور میں نے اس امکان کو پہلے ہی مدِنظر رکھا تھا۔ میرے ایک پیغام پر ایک بہت بڑا ڈسٹری بیوٹر رقم لے کر پہنچ گیا۔ شوٹنگز جاری رہیں لیکن عین اس وقت جبکہ دونوں فلمیں تقریباً آدھی بن چکی تھیں، دل کا دورہ پڑنے سے ہیرو کا انتقال ہوگیا۔"

یہ کہتے ہوئے آفاق نے یوں سینے پر ہاتھ رکھا جیسے اس ذکر سے اسے خود بھی دل کا دورہ پڑنے لگا ہو۔ پھر وہ خود استہزائی کے سے انداز میں ہنس کر بولا "میں جب فلم انڈسٹری میں نیا نیا آیا تو مجھے کئی بار یہ دیکھنے کا اتفاق ہوا کہ کسی اداکار کے انتقال کی خبر سن کر فلمساز یا ہدایت کار سب سے پہلے اس فکر میں پڑجاتے تھے کہ ان کی فلم میں اس اداکار کا کتنا کام باقی تھا۔ مجھے ان کی ذہنیت پر بڑا افسوس ہوتا تھا کہ وہ یہ سوچنے کی زحمت بھی نہیں کرتے کہ ایک اداکار کی موت سے ایک پورا خاندان اجڑ گیا ہے۔ اس عورت پر جانے کیا گزر رہی ہوگی جس کا سہاگ اجڑ گیا ہے۔ ان بچوں کا نہ جانے کیا عالم ہوگا جن کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا ہے۔ ان کے مالی حالات نہ جانے کیا ہوں گے اور آگے چل کر ان کا نہ جانے کیا حال ہوگا۔ کوئی بھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتا۔ سب کو اپنی اپنی فلموں کی فکر پڑجاتی ہے۔ میں اس اندازِ فکر پر ان لوگوں کو دل ہی دل میں لعنت ملامت کیا کرتا تھا کہ کیسے بے حس اور خودغرض لوگ ہیں۔ لیکن ...."

وہ ایک بار پھر خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرایا اور سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے بولا "جب مجھے اپنی فلموں کے ہیرو مظفر رشید کی موت کی خبر ملی تو سب سے پہلا خیال مجھے بھی یہی آیا کہ میری فلموں کا کیا بنے گا؟ تحت الشعور میں کہیں اپنی اس کمینگی پر شرمندگی کا احساس بھی موجود تھا لیکن فکر بہرحال فلموں کی تھی اور دل گویا ڈوبتا جارہا تھا۔ میری فلمیں اس مرحلے میں تھیں کہ نہ تو میں ڈپلی کیٹ سے کام لے کر انہیں مکمل کرسکتا تھا، نہ کہانی تبدیل کرسکتا تھا اور نہ ہی کوئی اور طریقہ اختیار کرسکتا تھا۔ میں نے مرحوم کی بیوہ اور بچوں سے حتی الامکان ہمدردی کا اظہار کیا، ان کی بے حد دلجوئی کی اور کسی کے سامنے بھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی کہ مظفر رشید کی موت سے میرا اتنا نقصان ہوگیا ... تاہم اس کے چہلم وغیرہ کے بعد میں نے بڑے بڑے فلمی جغادریوں سے مشورے کیے اور خود بھی دن رات غور کیا لیکن فلموں کو مکمل کرنے کا کوئی طریقہ سمجھ میں نہ آیا۔ یوں میری وہ فلمائی ہوئی ریلیں جن پر لاکھوں روپیہ صرف ہوچکا تھا، بے وقعت ردی کے ڈبے بن کر رہ گئیں۔ ڈسٹری بیوٹر نے اپنی رقم کی واپسی کا تقاضا شروع کردیا کیونکہ معاہدے میں یہی درج تھا کہ میں اسے فلمیں مکمل کرکے دوں گا۔ بس .... خلاصہ میری آپ بیتی کا یہی ہے کہ یہ دو فلمیں مجھے لے کر بیٹھ گئیں۔ کامیابی ایک غیر متوقع تحفے کی طرح میری دہلیز پر آئی اور یکلخت ہی روٹھے ہوئے دوست کی طرح لوٹ گئی۔ میں اس وقت گویا شکنجے میں پھنسا ہوا ہوں۔ تقدیر یکدم کچھ زیادہ ہی نامہربان ہوگئی ہے۔ آج کل تو بطور ڈائریکٹر بھی مجھے سائن کرنے کے لئے کوئی فلم ساز قریب نہیں پھٹک رہا۔ صرف ایک فلم کا کام ہے میرے پاس۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ اسی سے بال بچوں کا پیٹ پال رہا ہوں۔ قرض خواہوں نے ناک میں دم کیا ہوا ہے... سفید پوشی کا بھرم رکھنا مشکل ہوگیا ہے۔ مجھ جیسے لوگ جنہوں نے اچھے دن دیکھے ہوئے ہوں اور جن کا اٹھنا بیٹھنا اچھے طبقوں میں ہو، وہ ان لوگوں میں زیادہ گر کر بات بھی نہیں کرسکتے جن کے درمیان انہوں نے شاہانہ انداز میں وقت گزارا ہو۔"

"میں آپ کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟" میں اس کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔

"میں آپ سے کچھ مانگنے نہیں آیا...." اس کے ہونٹوں پر مجروح سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"وہ تو میں سمجھ رہا ہوں" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا "ظاہر ہے معزز اور خوددار لوگ کسی کے پاس کچھ مانگنے نہیں جاتے۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ میرا خیال ہے آپ میرے پاس کوئی پیشکش، کوئی تجویز لے کر آئے ہوں گے۔"

"آپ کا خیال درست ہے" اس کے چہرے پر طمانیت آگئی "میں اب ان نامکمل فلموں کی تو آپ سے بات نہیں کر رہا۔ ظاہر ہے وہ اسی طرح آپ کے لئے بھی بیکار ہیں جس طرح میرے لئے۔ لیکن میں یہ چاہ رہا تھا کہ میری فلم کمپنی جو تھوڑی بہت گڈول .... ساکھ .... باقی رہ گئی ہے وہ، اور میرا دفتر بک جائے۔ گوکہ اس طرح مجھے کوئی بہت زیادہ رقم تو نہیں مل جائے گی لیکن پھر بھی مجھ پر سے قرض خواہوں کا بوجھ تقریباً ہٹ ہی جائے گا اور میں سکون کی سانس لے کر کچھ اور سوچ سکوں گا، کوئی کام کرسکوں گا۔ اب آپ سوچیں گے کہ میں کمپنی کا نام اور دفتر فروخت کرنے آپ ہی کے پاس کیوں آیا ہوں؟ میں نے اپنے شناسا حلقوں میں اس کے لئے کوشش کیوں نہیں کی؟ تو اس کی وجہ بھی میں آپ کو بتاتا چلوں۔ کیونکہ حدیث شریف ہے کہ مال کو فروخت کرتے وقت اس کا کوئی عیب یا نقص چھپانے کی کوشش نہ کرو..."

میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ ایک فلمی آدمی حدیث کا حوالہ دے رہا تھا۔ وہ نہایت سنجیدگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے جب وہ آفس لیا تھا اس وقت بھی ایک بہت بڑا فلمساز ملک عبدالعزیز اپنے کسی دوست کے لئے وہ آفس پگڑی پر خریدنا چاہتا تھا لیکن اس وقت ان لوگوں کی یہ خواہش کچھ زیادہ شدید نہیں تھی اور انہوں نے اس سلسلے میں کچھ زیادہ سرگرمی نہیں دکھائی تھی۔ لیکن جیسے ہی میں آفس خرید چکا، انہیں گویا یکایک ہی احساس ہوا کہ وہی آفس خریدنا ان کے لئے بہت زیادہ ضروری ہے۔ ملک صاحب کا دوست تو شاید اس سلسلے میں کچھ ایسا زیادہ پُرجوش بھی نہیں ہے لیکن ملک صاحب نے اسے اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ مدعی سست گواہ چست والا معاملہ ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اپنی تمام تر خواہش کے باوجود وہ معقول قیمت بھی دینے پر آمادہ نہیں ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ میں آج کل مجبور ہوں اور وہ میری مجبوری سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں جوکہ دنیا کی پرانی رسم ہے۔ وہ اتنی کم آفر دے رہے ہیں کہ وہ آفر کے بجائے محض مذاق ہی معلوم ہورہی ہے۔ اور دوسرے لوگوں کو چونکہ معلوم ہے کہ ملک صاحب وہ آفس لینا چاہ رہے ہیں اس لئے کوئی آگے آنے کی ہمت ہی نہیں کر رہا۔ ان حالات میں مجھے ایک شریف مگر مالی طور پر مضبوط اور دلی طور پر بے خوف گاہک کی ضرورت ہے جو ان حالات میں بھی نہ صرف چیز کی صحیح قیمت لگاسکے اور اپنی منصفانہ ذہنیت کا مظاہرہ کرسکے بلکہ ملک صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات بھی کرسکے۔"

"آپ نے کیونکر محسوس کرلیا کہ مجھ میں یہ صفات موجود ہیں اور میں آپ کا مطلوبہ گاہک ثابت ہوسکتا ہوں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مدت ہوگئی ہے انسانوں کو پڑھتے ہوئے" وہ بھی مربیانہ انداز میں مسکرایا "وہ جو کسی شعر میں کچھ اسی قسم کا مفہوم ادا کیا گیا ہے کہ مضمون بھانپ لیتے ہیں لفافہ دیکھ کر۔ تو میں بھی چہرہ دیکھ کر کافی حد تک انسان کو بھانپ لیتا ہوں۔ شیکسپیئر نے کہا تھا کہ دنیا ایک اسٹیج ہے اور ہم سب اداکار۔ لیکن میرا خیال ہے کہ دنیا ایک بہت بڑی لائبریری ہے اور ہم سب اس میں رکھی ہوئی کتابیں۔ چہرہ ہمارا سرورق ہوتا ہے اور سرورق دیکھ کر کتاب کی نوعیت کا اندازہ ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد ورق الٹتے جایئے۔ ہر صفحے پر ایک نیا مضمون ہوگا، ایک نئی کہانی ہوگی۔ کبھی کبھی سرورق سے کتاب کی نوعیت کا اندازہ کرنے میں غلطی بھی ہوجاتی ہے۔ مثلاً سرورق آپ کو بے حد سادہ و سپاٹ لگا مگر بعد میں اتفاقاً کتاب کھولی تو بے حد دلچسپ و رنگین نکلی۔ یا سرورق دیکھ کر آپ نے سوچا کہ بڑی رنگارنگ کتاب ہے مگر اوراق الٹنے پر پتا چلا کہ بالکل بے ربط، غیر دلچسپ اور کھوکھلی ہے۔ بہرحال ... ہیں سب کتابیں۔ رنگارنگ اور مختلف النوع کتابیں۔ ہر ایک کا اپنا ایک مزاج ہے۔ اپنا ایک ڈھنگ ہے۔ اگر پڑھنے کا سلیقہ ہو، زبان کی شدبد ہو تو ہم سب کتابیں پڑھ سکتے ہیں۔"

"مگر کتابوں کو تو موت نہیں آتی آفاقی صاحب! جبکہ ہم لوگ مرجاتے ہیں" میں نے کہا۔

"کچھ کتابیں شاید آوٹ آف ڈیٹ ہوجاتی ہیں.... زیادہ پرانی ہوجاتی ہیں ... یا پھر وہ زمانے سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ اس لئے قدرت انہیں گودام میں ڈال دیتی ہے۔ لیکن زندہ رہنے والی کتابیں بہرحال زندہ رہتی ہیں۔ اب آپ دیکھیں ناکہ کتنے لوگ آج ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ بعض کو اس دنیا سے رخصت ہوئے سیکڑوں اور بعض کو ہزاروں سال گزر چکے ہیں مگر ان کا نام زندہ ہے۔ ان کی باتیں آج بھی دہرائی جاتی ہیں یا یوں کہیں کہ ان معدوم کتابوں میں جو کہانیاں درج تھیں وہ آج بھی لوگوں کو یاد ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے کوٹ کی جیب سے ایک نقرئی ڈبیا نکالی اور اس میں سے ایک پان نکال کر منہ میں رکھ لیا۔ اس نے مجھے بھی پان پیش کیا لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کردیا۔

اس کی ظاہری شخصیت کوئی ایسی متاثر کن نہیں تھی لیکن آدمی ذہین اور سلجھا ہوا تھا۔ اس کی گفتگو میں ذہانت کی جھلک تھی۔ میں اسے پسند کرنے لگا تھا۔ وہ پان چباتے ہوئے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

"ہم کچھ بزنس کی بات کر رہے تھے" ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے گویا اسے یاد دلایا۔

"بات تو اب آپ کو کرنی ہے جی۔ میں نے تو بزنس آپ کے سامنے رکھ دیا ہے" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"آپ چاہتے ہیں وہ آفس میں خرید لوں؟" میں نے گویا تصدیق چاہی۔

"آفس ہی نہیں، میں تو کمپنی کا نام .... اس کی ساکھ بھی بیچنا چاہتا ہوں" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا "بلکہ میں تو چاہتا ہوں، آپ ان چیزوں کے ساتھ مجھے بھی خرید لیں۔ میں دراصل کچھ اس قسم کی تجویز لے کر آیا ہوں کہ اگر آپ کا

فلمسازی کا پروگرام بن سکتا ہو تو آپ کو ہر چیز تیار مل جائے گی۔ دفتر موجود ہے۔ کمپنی موجود ہے۔ فلمی دنیا کا ایک بھیدی آپ کے سامنے موجود ہے۔ میں کوئی بہت غیر معمولی قسم کا انسان ہونے کا دعویٰ تو نہیں کرتا لیکن بہرحال اس خاکسار کا فلمی دنیا میں تھوڑا بہت نام ہے' تھوڑا بہت کام بھی آتا ہے۔ میری خدمات جس صورت میں آپ چاہیں گے آپ کے لئے حاضر ہوں گی۔ کنٹریکٹ کی بنیاد پر۔ ملازمت کی بنیاد پر۔ یا جس طرح بھی آپ چاہیں۔ اور جب چاہیں آپ مجھے طلب فرماسکتے ہیں۔ میں دوسرے ہر کام پر آپ کے بلاوے کو ترجیح دوں گا۔"

"شکریہ" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اور کاروبار منتقل کرنے کے لئے آپ کی ڈیمانڈ کتنی ہے ؟"

"مجھے اگر تین لاکھ روپے مل جائیں تو میرے مسائل حل ہوسکتے ہیں" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"اور اس کے بعد اگر میں معززانہ طریقے سے فلمسازی شروع کرنا چاہوں تو کتنی رقم سے کام چل جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر کوئی اناڑی آدمی فلمی دنیا میں داخل ہو تو عین ممکن ہے کہ پچاس لاکھ خرچ کرنے کے بعد بھی وہ پہلی فلم مکمل نہ کرپائے" اس نے جواب دیا "اور اگر مجھ جیسا کوئی شخص آپ کے ساتھ ہو تو آپ صرف دو لاکھ روپے سے بھی نہایت شان و شوکت سے فلمسازی شروع کرسکتے ہیں اور آپ کی فلم انشاءاللہ .... مکمل بھی ہوگی۔"

"کیا ہم ابھی آپ کا دفتر دیکھنے جاسکتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اسی وقت؟" اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں "کیا آپ مصروف نہیں ہیں؟"

"مصروف تو میں بہت ہوں" میں نے جواب دیا "لیکن کسی نئے کاروبار کے لئے موقع محل دیکھنے جانا بھی بہرحال ایک مصروفیت ہے۔"

"آپ واقعی ایک انقلابی بزنس مین ہیں۔ آپ کے متعلق میرے اندازے میری توقعات سے کچھ زیادہ صحیح نکلے ہیں" وہ اپنی حیرت کو دباتے ہوئے ستائشی لہجے میں بولا "آپ کی جگہ کوئی روایتی بزنس مین ہوتا تو سوچنے کے لئے وقت مانگتا' ... پھر بھاؤ تاؤ کرتا اور عین ممکن ہے کہ آخر میں انکار کردیتا۔"

"میرے پاس اس قسم کے چھوٹے موٹے معاملات پر غور و خوض کرنے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ میں تو صرف ہاں یا نہ میں فیصلہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد آگے میری قسمت" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کی تجویز کے معاملے میں فیصلہ تو میں "ہاں" میں کرچکا ہوں۔ اب میں صرف یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کا آفس اس طرح سیٹ ہوسکتا ہے یا نہیں جس طرح میں چاہتا ہوں۔ اگر مجھے اس کا امکان نظر آیا تو یہ معاملہ طے سمجھیں۔ روایتی قسم کے بزنس مین ویسے تو بہت مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کے پاس کسی سے ملاقات کے لئے وقت نہیں ہوتا لیکن ان کے سامنے کوئی تجویز پیش کی جائے تو اس کے بارے میں سوچ بچار کرنے کے لئے انہیں ہفتوں درکار ہوتے ہیں۔ اور میں روایتی قسم کا بزنس مین اس لئے نہیں ہوں کہ یہ بزنس مجھے ورثے میں نہیں ملا۔ میں پھونک پھونک کر قدم اٹھانے کا قائل نہیں۔ میں نے ہنگامی انداز میں سب کام کیے اور ہنگامی انداز میں ہی سب کچھ ہوتا چلا گیا۔"

"اسی انداز میں کاروبار کرنا میری زندگی کی سب سے بڑی حسرت ہے" وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اور اسے خوشامد مت سمجھئے گا .... حقیقت یہ ہے کہ مجھے آپ میں اپنے آئیڈیل بزنس مین کی جھلک نظر آئی تھی اسی لئے میں بغیر کسی جان پہچان کے 'منہ اٹھا کر آپ کے پاس چلا آیا۔'

"ویسے آپ آئے تو کچھ غلط وقت پر ہی ہیں" میں نے کہا "اس میں کوئی شک نہیں کہ مجھے فلمی دنیا میں قدم رکھنے کا شوق تھا لیکن پچھلے چند برسوں میں حالات اور مصروفیات کچھ ایسی رہیں کہ میں اپنے اس شوق کی طرف توجہ نہیں دے سکا اور یہ بات گویا میرے ذہن سے نکل گئی۔ آپ کے آنے سے کچھ ہی عرصہ پہلے میں ایک بہت بڑا پروجیکٹ شروع کرچکا ہوں جس کی وجہ سے میں چاہتا ہوں کہ اب زیادہ سے زیادہ سرمایہ میرے ہاتھ ہی میں رہے۔ لیکن آپ نے باعزت انداز میں فلمسازی شروع کرنے کا جو خرچ بتایا ہے اس سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ یہ کوئی زیادہ مہنگا "نسخہ" نہیں ہے۔ اتنی گنجائش تو نکالی جاسکتی ہے .... اور چونکہ آپ نے مجھ سے کاروباری انداز میں بات نہیں کی اس لئے میں بھی آپ سے کاروباری انداز میں باتیں نہیں کررہا اور نہ ہی مصلحت کوشی سے کام لے رہا ہوں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ اگر میں نے فلمسازی کا حتمی فیصلہ کرلیا تو ہم دونوں ایک دوسرے کے اچھے ساتھی ثابت ہوں گے۔"

"مجھے بھی کچھ یہی محسوس ہورہا ہے" اس کے لہجے میں طمانیت کی جھلک تھی۔

"تو پھر آیئے .... مجھے ذرا آفس ایک نظر دکھا دیجئے" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر مجھے یاد آگیا کہ میں کچھ کام ادھورا چھوڑ کر جارہا تھا۔ میں نے انٹرکام پر ایکسپورٹ منیجر کو ان کے بارے میں چند ہدایات دیں پھر ہم باہر آگئے۔

گاڑی میں اسٹوڈیو کی طرف جاتے ہوئے راستے میں میں نے کہا "اگر آج ہماری بات فائنل ہوجاتی ہے تو میں فرصت کا کوئی دن نکال لوں گا اور ہم بیٹھ کر فلمسازی کا بھی کوئی لائحہ عمل تیار کرلیں گے۔ آغاز کے لئے تو میرا خیال ہے ہم انہی دو

کہانیوں پر نئے سرے سے بھی فلمیں شروع کرسکتے ہیں جو آپ نے ادھوری چھوڑ دی ہیں۔ بلکہ اگر ہم چاہیں تو نیا ہیرو کاسٹ کرکے صرف وہی مناظر ری شوٹ کرلیں جن میں سابق ہیرو کا کام تھا۔ باقی کاسٹ تو دستیاب ہے نا؟"

"جی ہاں۔ باقی کاسٹ تو دستیاب ہے۔ ہیروئن سمیت سب سے ڈیٹس بھی مل جائیں گی۔ ان کا کام وہیں سے آگے بڑھایا جاسکتا ہے جہاں سے چھوٹا تھا۔ اس طرح آپ کا بہت سا وقت بچ جائے گا" وہ اب مطمئن اور پُر اشتیاق نظر آنے لگا تھا جس وقت وہ میرے پاس آیا تھا اس وقت خاصا افسردہ اور شکستہ دل نظر آرہا تھا۔

"یار .... اس لائن میں کچھ پیسہ وغیرہ بھی ہے یا بس شوق اور رنگینیوں کی کشش میں ہی انسان اس لائن سے چمٹا رہتا ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

اس نے یوں حیرت سے میری طرف دیکھا گویا اسے یقین نہ آرہا ہو کہ میں اتنا سادہ بھی ہوسکتا ہوں۔ پھر وہ گویا کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر جھٹک کر بولا "اگر آدمی تھوڑا سا ذہین ہو اور ساتھ ہی معمولی سا خوش قسمت بھی' تو اس لائن میں اس کے لئے پیسہ ہی پیسہ ہے۔ آپ نے دیکھا نہیں اس لائن میں قدم رکھنے والے بہت سے لوگ راتوں رات کیا سے کیا بن گئے؟ ہیرو' ہیروئنوں کو لے لیجئے .... فلمسازوں کو لے لیجئے ... ہدایت کاروں کو لے لیجئے ... اسٹوڈیو اونرز کو لے لیجئے۔ بے شک آپ ان لوگوں کو ذاتی طور پر نہیں جانتے لیکن ان کے بارے میں پڑھا تو ہوگا؟"

"ہاں ... کچھ عرصہ پہلے تک تو میں خاصی دلچسپی سے فلمی لوگوں کے انٹرویوز .... خبریں اور حالات و واقعات وغیرہ پڑھتا رہتا تھا" میں نے جواب دیا "لیکن اب تو سرسری سی نظر ڈالنے کی فرصت بھی مشکل سے ہی ملتی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ کے لئے اس لائن میں قدم رکھنا بڑا دلچسپ اور مفید تجربہ ثابت ہوگا" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "یہ بڑی دلچسپ' عجیب اور رنگا رنگ دنیا ہے۔ محسوس کرنے والے کے لئے بھی وہاں بہت کچھ ہے اور حاصل کرنے والے کے لئے بھی۔ وہاں رنگینی بھی ہے اور سنگینی بھی۔ دولت و شہرت بھی ہے اور سامان عبرت بھی۔ کھنکتے قہقہے بھی ہیں اور سنائی نہ دینے والی سسکیاں بھی۔"

"میرے خیال میں تو پھر وہ کوئی ایسی عجیب دنیا نہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ساری دنیا ہی ایسی ہے۔ یہ تمام خصوصیات .... یہ ساری چیزیں دنیا کے ہر شعبے میں ہی پائی جاتی ہیں۔ انہیں دیکھنے کے لئے صرف قوت مشاہدہ درکار ہے۔"

"ہاں .... یہ بھی آپ نے درست کہا" وہ گہری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ شاید وہ میرے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔

ہم اس وقت ملتان روڈ پر تھے اور ڈرائیور پوری کوشش کر رہا تھا کہ گاڑی فراٹے بھرنے لگے مگر ہر قدم پر یا تو کوئی گڑھا سامنے آجاتا تھا یا پھر لمحہ لمحہ کرتا ہوا تانگہ راستے میں حائل ہوجاتا تھا۔ ٹرک' تانگے' ریڑھے' سائیکلیں غرضیکہ ہر چیز اپنے اپنے اسٹائل کے مطابق سڑک پر رواں دواں تھی اور گرد و غبار کا ایک طوفان اڑ رہا تھا۔ غنیمت تھا کہ میری گاڑی ایئرکنڈیشنڈ تھی اور شیشے چڑھے ہونے کی وجہ سے ہم اس گرد و غبار سے محفوظ تھے۔ خدا خدا کرکے ہم چوک یتیم خانے سے آگے نکلے تو ٹریفک کچھ کم ہوا اور گاڑی کی رفتار بڑھی۔ بالآخر ہم اسٹوڈیو جا پہنچے۔

وہی مانوس گیٹ اور محرابی سا بورڈ دیکھ کر میرے دل کی دھڑکن نہ جانے کیوں کچھ تیز ہوگئی۔ یہ وہ جگہ تھی جس کے میں بچپن میں خواب دیکھا کرتا تھا۔ برسوں پہلے کا وہ منظر دھندلی سی فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے چلنے لگا جب میں اسکول کے ایک طالب علم کی حیثیت سے تقریری مقابلے میں شرکت کے لئے لاہور آیا تھا اور موقع پاکر اسٹوڈیو کی سیر کے لئے نکل کھڑا ہوا تھا۔

مجھے آج بھی یاد تھا کہ اس وقت میں کس طرح منہ اٹھائے گیٹ سے اندر جانے لگا تھا مگر چوکیدار خان بابا نے اپنی نسوار کی ڈبیا رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھے بغیر ایک موٹا سا ڈنڈا میری راہ میں حائل کردیا تھا اور جب میں نے سادگی سے کہہ دیا تھا کہ میں شوٹنگ دیکھنے اندر جانا چاہتا ہوں تو خان صاحب کو جیسے جلال آگیا تھا۔ ڈنڈا لہراتے ہوئے اور حقارت سے میری نقل اتارتے ہوئے موصوف نے کہا تھا "شوٹنگ دیکھنے آیا ہے اور ہم سے پوچھے بغیر اندر جاتا ہے۔ خانہ خراب ادھر دیکھو...." انہوں نے بائیں ہاتھ سے اشارہ کیا تھا۔

اس وقت میں نے دیکھا تھا کہ گیٹ کے قریب آٹھ دس

آدمی کندھے سے کندھا جوڑے گویا کسی کے استقبال کے لئے کھڑے تھے۔ کسی کا حلیہ معقول تھا۔ کوئی بہت ہی شکستہ حال نظر آرہا تھا۔ کسی کا چہرہ ستا ہوا تھا اور کوئی بیمار نظر آرہا تھا۔ ان میں ایک چیز مشترک تھی اور وہ یہ کہ سب کے چہروں پر امید کا پرتو تھا اور زندگی سے ان کا ناتا گویا محض اسی امید کے سہارے قائم تھا۔

خان صاحب نے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

"یہ سب بھی شوٹنگ دیکھنے کا واسطے آیا ہے .... اور آج سے نہیں، بڑی مدت سے آیا ہوا ہے۔ ان میں سے کوئی صبیحہ کا عاشق ہے۔ کوئی شمیم آرا پر فدا ہے۔ کوئی نیلو پر جان دیتا ہے اور کوئی مسرت نذیر کے لئے زندگی قربان کرنے کو تیار ہے۔ ابھی تو ہم نے ان میں سے کسی کو اندر جانے نہیں دیا۔ تم تو ابھی پہلی دفعہ آیا ہے اور منہ اٹھا کر اندر جا رہا ہے۔ پیچھے ہٹو خانہ خراب" خان صاحب نے ڈنڈے سے مجھے پیچھے دھکیل دیا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس وقت میں کس طرح دل مسوس کے ایک طرف کو کھڑا ہو گیا تھا اور شرمندگی و خجالت سے کس طرح میرے کانوں کی لویں تپنے لگی تھیں۔

حیرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ خان صاحب آج بھی وہی تھے۔ صرف ان کے بالوں میں سفیدی آگئی تھی۔ جب میری گاڑی گیٹ کے قریب پہنچی تو خان صاحب ہڑبڑا کر اپنی لوہے کی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے باقاعدہ ہمیں سیلیوٹ جھاڑا حالانکہ انہیں میری یا آفاق کی صورت نظر نہیں آئی ہوگی کیونکہ گاڑی کے شیشے رنگین تھے۔ انہیں صرف باوردی ڈرائیور اور چم چم کرتی لمبی سی مرسیڈیز نظر آرہی تھی اور درحقیقت یہ دولت کی انہی علامات کو سلام تھا، مجھے نہیں۔ میں اگر آج بھی وہی اپنے لڑکپن والی معمولی سی شلوار قمیص پہنے، بال تیل میں چپڑے اور شکل پر وہی خالص دیہاتیوں والی حیرت اور سادگی لئے یہاں آتا تو وہ آج بھی ڈنڈے سے میرا راستہ روک لیتے۔ ایسے ہی موقعوں پر مجھے احساس ہوتا تھا کہ شیخ سعدی" کی حکایتیں واقعی حکایتیں نہیں، حقیقتیں تھیں۔ یا پھر شاید وہ شکایتیں تھیں۔ معاشرے کی بے حسی، اندھے پن اور فرد ناشناسی کی شکایتیں۔

گیٹ ایک طرف سے کھلا تھا لیکن وہ جگہ میری گاڑی گزرنے کے لئے ناکافی تھی۔ خان صاحب نے لپک کر دوسرا گیٹ کھولا اور ڈرائیور نے گاڑی اندر دوسری گاڑیوں کے ساتھ لے جا کھڑی کی۔ اسٹوڈیو کے کمپاؤنڈ کا فرش آج بھی اینٹوں کا تھا۔ کینٹین میں آج بھی اسی طرح بھیڑ بھاڑ تھی جس طرح میں نے کئی برس پہلے دیکھی تھی۔ کمپاؤنڈ میں بہت سے لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں ادھر ادھر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور ہم اترے تو میں نے محسوس کیا کہ سبھی لوگوں نے متجسس انداز میں ہماری طرف دیکھا تھا۔ پھر جب ہم اندرونی گیٹ کی طرف بڑھے تو کئی لوگوں نے آفاق کو پہچانتے ہوئے خاصے احترام سے بلکہ بعض نے تو بہت ہی جھک جھک کر سلام کیا۔

اندرونی حصے میں بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ تبدیلی آبھی کیسے سکتی تھی؟ وسط میں وہی بیضوی لان تھا اور اس کے ارد گرد برآمدے کے ستونوں کے عقب میں دفتروں کی قطاریں۔ اوپر کی منزل پر بھی اسی ساخت کی بالکونیوں کے عقب میں دفاتر کے دروازے نظر آرہے تھے۔

آفاق گراؤنڈ فلور ہی کے برآمدے میں کچھ دور چلنے کے بعد بالآخر ایک دروازے پر رک گیا جس پر "آفاق فلمز" کی تختی آویزاں نظر آرہی تھی۔ دروازے پر موٹا سا تالا لگا ہوا تھا اور تالے پر گرد کی تہ بتا رہی تھی کہ اسے کافی دنوں سے کھولا نہیں گیا۔ آفاق نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا کہ آفس کافی کشادہ تھا اور اس کی ترتیب و آرائش بتاتی تھی کہ آفاق نے بڑے چاؤ سے اسے تیار کروایا تھا لیکن اب یہاں ایک عجیب سی اداسی برس رہی تھی۔ میزیں کرسیاں قدرے بے ترتیب سی نظر آرہی تھیں ... ہر چیز پر گرد کی ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی۔

ایک طرف شیشے اور لکڑی کے پارٹیشن سے ایک چھوٹا کمرا سا بنا ہوا تھا۔ آفاق نے بتایا کہ یہ اس کا کمرا تھا۔ دفتر میں کئی کارکنوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی اور بہت سا ضروری سامان بھی موجود تھا لیکن میرے نقطۂ نظر سے اس آفس کی نئے سرے سے ترتیب و آرائش ضروری تھی۔ میرے حساب سے اس میں سب سے بڑی کمی یہ تھی کہ یہ کوئی اعلیٰ درجے کا آفس نظر نہیں آتا تھا۔

ہر بڑے سے بڑے آدمی میں کوئی نہ کوئی کمپلیکس، کوئی نہ کوئی نفسیاتی گرہ ضرور ہوتی ہے۔ میرا کمپلیکس شاید یہ تھا کہ میں اپنے سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو اب بہت شاندار دیکھنا پسند کرتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ جب میں شاندار چیزیں رکھنے کا متحمل ہو سکتا ہوں تو کیوں نہ رکھوں؟ اس ضمن میں، میں کاروباری مصلحتوں کا خیال نہیں رکھتا تھا۔ کاروباری گرگوں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ زیادہ ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت سے انسان دوسرے لوگوں اور محکموں کی نظر میں آجاتا ہے۔ مگر مجھے اس کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ لاشعوری طور پر شاید میں لوگوں کی نظر میں ہی آنا چاہتا تھا۔ اور جہاں تک محکموں کا تعلق تھا ان سے میرے معاملات بہت خوش اسلوبی سے چل رہے تھے۔ کاغذات کی حد تک میرے ہاتھ بالکل صاف تھے۔

میں نے کوٹھی بھی قدرے چھوٹی لیکن بہت شاندار اور منفرد ڈیزائن کی خریدی تھی اور اس کی آرائش بھی ایک

نہایت جدت پسند ادارے سے کرائی تھی۔ ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کو میں نے اپنی زیر زمین سرگرمیوں کا ہیڈ کوارٹر بنا لیا تھا۔ اپنی گلبرگ والی کوٹھی کی آرائش و زیبائش مکمل ہونے کے بعد جب میں وہاں منتقل ہوا تو ڈرائیو وے میں قدم رکھتے ہی میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ انسان پر اچھے دن آتے ہیں تو اسے اپنے برے دن بڑی شدت سے یاد آنے لگتے ہیں مجھے اباجی یاد آگئے تھے۔ اباجی نے نہ جانے کہاں سے قرض لے کر جب مجھے کالج میں داخل کرانے کا بندوبست کیا تھا تو میں نے اس خیال سے کہ وہ اپنی جان کو نہ جانے کس عذاب میں ڈال رہے تھے، ان سے کہا تھا "ابا آخر آپ مجھے مزید تعلیم کیوں دلانا چاہتے ہیں؟ یہیں رہ کر یا پھر شہر جا کر چھوٹی موٹی نوکری تو میں اب بھی کر سکتا ہوں اور ہم پر کوئی اتنا زیادہ بوجھ تو ہے نہیں کہ ہمیں بہت زیادہ کمائی کی ضرورت ہو۔"

"تم نہیں سمجھ سکتے بیٹا" انہوں نے پگڑی اتار کر کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا "بات صرف کمائی کی نہیں ہوتی۔ انسان کے کچھ خواب بھی ہوتے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ تم روپیہ بھی بہت سا کماؤ لیکن ساتھ ہی مشہور اور بڑے آدمی بنو۔ روپیہ تو بہت سے لوگوں کے پاس ہے لیکن وہ سب بڑے اور مشہور آدمی تو نہیں ہیں نا؟" پھر جیسے ان کی نظر اپنے خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگی تھی اور انہوں نے کیسے حسرت آمیز لہجے میں کہا تھا "میرا جی چاہتا ہے کہ شہر میں تمہارا بڑا سا بنگلا ہو۔ تمہاری بیوی کوئی پڑھی لکھی میم قسم کی عورت ہو۔"

خود ایک ان پڑھ دیہاتی ہونے کے باوجود ان کا ذہن شکست خوردہ اور پسماندہ نہیں تھا اور ان کی سوچ بلند تھی۔ ان میں احساسِ کمتری نہیں تھا اس لئے انہوں نے کبھی اپنی ہم پلہ کسی جاہل لڑکی کو بہو بنانے کے متعلق نہیں سوچا تھا۔ اسی موقع پر انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا تھا "فصل کٹنے پر میں تم لوگوں کے لئے کبھی پیاز اور کبھی لہسن کی بوری یا پھر گنوں کا گٹھڑ لے کر آیا کروں گا اور بنگلے کے باغیچے میں کھیلتے ہوئے میرے گول مٹول اور سرخ و سپید چہروں والے پوتے پوتیاں شور مچایا کریں گی۔ داداجی آگئے .... داداجی آگئے۔ پھر وہ دوڑ کر میری ٹانگوں سے چمٹ جایا کریں گے۔"

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس مسرت آگیں تصور سے اباجی کے چہرے پر کیسی سرخی آگئی تھی۔ ان کی آنکھیں ہوا میں جانے کیا دیکھ رہی تھیں۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا تھا "اباجی! اگر میں بڑا اور امیر آدمی بن گیا اور شہر میں میرا بنگلا ہوا تو کیا آپ میرے ساتھ نہیں رہا کریں گے؟ آپ بھلا پھر کس طرح لہسن پیاز کی بوری یا گنوں کا گٹھڑ لے کر آیا کریں گے؟"

"نہیں بیٹا" ابا نے سر کھجاتے ہوئے کہا تھا "میں تو بالکل سیدھا سادا دیہاتی سا آدمی ہوں۔ میں بھلا بنگلے میں رہتا کہاں اچھا لگوں گا۔ تم بس اتنی مہربانی کرنا کہ اپنے دوستوں وغیرہ کو یہ بتانا مت شروع کر دینا کہ یہ بڈھا ہمارا نوکر ہے۔ جیسا کہ کئی پڑھے لکھے اور دولتمند بیٹے اپنے دیہاتی والدین کے بارے میں کہنے لگتے ہیں۔ تم مجھے اباجی ہی کہا کرنا۔ اکیلے میں بھی اور سب کے سامنے بھی۔ تاکہ میں جی بھر کے اس خوشی کو محسوس کر سکوں کہ میں ایک لائق، مشہور اور سعادت مند لڑکے کا باپ ہوں۔"

میں ایک ٹک اباجی کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ اس وقت میرا قد ان سے اونچا ہو چکا تھا لیکن وہ مجھے بہت زیادہ بلند قامت دکھائی دیتے تھے۔ بہت ہی اونچے۔ وہ بہت کم باتیں کیا کرتے تھے لیکن جو بھی کرتے تھے وہ گویا دل میں کھب کر رہ جاتی تھیں۔ اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ اٹھ کر ان کے سینے سے چمٹ جاؤں اور کسی ننھے بچے کی طرح زور زور سے رونے لگوں لیکن ایک عجیب سی جھجک مانع رہی تھی۔

وہ آنسو جو لڑکپن میں رک کے رہ گئے تھے اس وقت میری آنکھوں میں آگئے تھے جب میں نے آراستہ و پیراستہ کوٹھی میں قدم رکھا تھا اور اسی رات مجھے اس وقت بھی رونا آیا تھا جب میں فرانسیسی ویلوٹ کی پوشش اور انگلینڈ کی میٹرس سے آراستہ بیڈ پر سونے کے لئے لیٹا تھا۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ

اباجی زندگی بھر بان کی کھری اور جھلنگا سی چارپائی پر سوتے رہے تھے۔

آج آفاق کے دفتر میں قدم رکھتے وقت بھی مجھے اباجی یاد آگئے تھے۔ میں جب بھی ترقی کے کسی زینے پر قدم رکھتا تھا' کوئی بڑی آسائش کی چیز یا کوئی بیش قیمت چیز خریدنے لگتا تھا تو مجھے اباجی ضرور یاد آتے تھے۔ میں سوچتا تھا کہ ابھی ان کا آدھا خواب تشنۂ تعبیر ہے۔ میرے پاس دولت تو ان کے تصورات سے زیادہ آچکی تھی لیکن میں کوئی مشہور آدمی نہیں تھا۔ آج میں آفاق کے دفتر کا معائنہ کرتے وقت سوچ رہا تھا کہ شاید فلمی دنیا میں قدم رکھنا میرے لیے شہرت کا سبب بن جائے۔ میرا ہیرو بننے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ ہیرو کے طور پر بھی میں کامیاب ہو جاتا لیکن فی الحال یہ میری خواہش نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے افراد میں صرف ہیرو' ہیروئن ہی تو مشہور نہیں ہوتے۔ بڑے ہدایت کار اور فلمساز بھی تو مشہور ہوتے ہیں۔ اسٹوڈیو اونر بھی تو مشہور ہوتے ہیں۔

میں خیالات کی دنیا سے باہر آیا اور ایک بار پھر توجہ سے دفتر کا جائزہ لینے لگا۔ درحقیقت میں نے ابھی سے ذہن میں نقشہ بندی شروع کردی تھی کہ کہاں کیا تبدیلی لائی جائے گی اور نئے سرے سے دفتر کی آرائش و زیبائش کیسے کی جائے گی۔

دیواروں پر کچھ فریم شدہ فلمی پوسٹرز بھی آویزاں تھے۔ ایک پوسٹر پر ایک لڑکی کی تصویر کافی نمایاں تھی۔ وہ جینز جیکٹ میں تھی۔ پیروں میں فل بوٹ تھے اور بال تراشیدہ تھے۔ ہاتھ میں پستول نظر آرہا تھا۔ چہرے پر گہرا اور خالص فلمی قسم کا میک اپ تھا۔ فلم میں اس کا کردار شاید ماڈرن لڑکی کا تھا اور اسے جینز جیکٹ اور کٹے ہوئے بالوں وغیرہ کی مدد سے ماڈرن لڑکی ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی گئی تھی۔ وہ غالباً فلم کی ہیروئن تھی۔

اسی لڑکی کی نہایت خوبصورتی سے فریم شدہ تصویر آفاق کی میز پر بھی موجود تھی۔ عام طور پر خاصی چہیتی شخصیتوں کی تصویریں اس طرح دفتر میں میز پر سجا کر رکھی جاتی ہیں۔ اس لڑکی کی صورت مجھے کچھ شناسا سی لگ رہی تھی لیکن یاد نہیں آرہا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔ میں نے ذہن پر زیادہ زور دینے کی کوشش بھی نہیں کی اور یہی سوچ کر مطمئن ہوگیا کہ میں نے کہیں اس کے انٹرویو یا فلمی اشتہار میں اس کی تصویر دیکھی ہوگی۔

تاہم میں نے سرسری سے لہجے میں آفاق سے پوچھ لیا۔ "یہ لڑکی کون ہے؟"

"آپ اسے نہیں پہچانتے؟" اس نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"نہیں" میں نے سادگی سے کہا "لیکن شکل کچھ مانوس سی لگ رہی ہے۔ شاید میں نے پہلے بھی کہیں اس کی تصویر دیکھی ہے۔"

"ضرور دیکھی ہوگی" وہ گہری سانس لے کر بولا "ارے صاحب! اسے تو اب ملک کا بچہ بچہ پہچانتا ہے۔ یہ مشہور فلمی ہیروئن ستارہ ہے جس کی اب تک صرف دو فلمیں ریلیز ہوئی ہیں لیکن دو فلموں نے ہی دھوم مچادی ہے۔ گلی گلی میں اس کا نام گونج رہا ہے۔ اور اسے ہیروئن بنانے والا آپ کا یہ خادم' یہ خاکسار ہے" اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر قدرے جھکتے ہوئے کہا "پہلی فلم میں اسے میں نے ہی کاسٹ کیا تھا۔ اس فلم کا میں ہدایت کار تھا اور اس میں قطعی ایک نئی لڑکی کو کاسٹ کرنے کے لئے نہ تو میرا پروڈیوسر رضامند تھا اور نہ ہی ڈسٹری بیوٹر لیکن میں نے نہ جانے کیسے کیسے جتن کر کے انہیں آمادہ کیا اور جب فلم نے کھڑکی توڑ ہفتے منائے تو ان دونوں نے تھپکیاں دے دے کر میری کمر توڑ ڈالی۔ وہ فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی میں اسے اپنی ذاتی فلم "تنہائی" میں کاسٹ کرچکا تھا۔ میری اس فلم نے بھی ڈائمنڈ جوبلی کی اور اس سے بہت پہلے ہی ستارہ کے گھر کے سامنے فلمسازوں کی لائن لگ چکی تھی۔ اس وقت وہ دوسرے نمبر پر انڈسٹری کی مصروف ترین ہیروئن ہے۔ جلد ہی اس کی دو فلمیں ایک ساتھ ریلیز ہونے والی ہیں۔ میرا خیال ہے اس کے بعد وہ پہلے نمبر پر آجائے گی اور اگر ان دونوں میں سے ایک فلم بھی فلاپ ہوگئی تو شاید وہ تیسرے نمبر پر چلی جائے۔ دوسری منڈیوں کی طرح فلم کی منڈی کے بھاؤ بھی روزانہ ہی گھٹتے اور بڑھتے رہتے ہیں۔"

دیگر چیزوں کی طرح ستارہ کی فریم شدہ تصویر پر بھی گرد کی ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس کے شیشے پر انگلی پھیرتے ہوئے وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا "میں جب اسے بازارِ حسن سے فلم انڈسٹری میں لایا اس وقت وہ وہاں کی ناکام ترین رقاصہ اور مغنیہ تھی لیکن میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ اس لڑکی میں اداکاری کا زبردست ٹیلنٹ ہے اور بظاہر دیکھنے میں اس کا چہرہ کوئی ایسا قیامت خیز نہیں' صرف ایک بے نام سی کشش ہے اس میں لیکن اسکرین پر یہ چہرہ تہلکہ مچادے گا۔ جب وہ پہلی مرتبہ میرے پاس آئی تو اس کا خیال تھا کہ میں نے اسے فلم میں کوئی چھوٹا موٹا رول دینے کے لئے بلایا ہے اور وہ اسی پر بہت خوش تھی۔ اس وقت میں ایک اور فلم کمپنی کے دفتر میں بیٹھا کرتا تھا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں اسے ہیروئن لے رہا ہوں اور اس کا فلمی نام بھی میں نے ستارہ رکھ دیا ہے تو وہ بدحواس اور پریشان سی ہوگئی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں سنجیدہ ہوں۔ اس کا خیال تھا کہ فلمی لوگ عیاشی کی خاطر اس جیسی لڑکیوں کو اس قسم کے جھانسے دیتے رہتے ہیں اور میں بھی انہی میں سے ایک ہوں۔"

آفاق نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور عجیب سے انداز میں بولا "ایگریمنٹ سائن کرنے کے بعد جب تک شوٹنگ شروع نہیں ہوگئی تب تک اسے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ ہیروئن بن چکی ہے لیکن کیمرے کے سامنے اس کی کارکردگی نے مجھے مبہوت کردیا۔ کوئی کہہ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ پہلی بار کیمرے کا سامنا کر رہی ہے۔ وہ پیدائشی اداکارہ معلوم ہوتی تھی۔ مجھے اس پر ذرا بھی محنت نہیں کرنی پڑی ورنہ اچھی بھلی اسٹیج اور ٹی وی کی منجھی ہوئی لڑکیاں بھی جب فلم میں آتی ہیں تو بعض اوقات ہدایت کار کو رُلا دیتی ہیں کیونکہ فلم کا اپنا ہی ایک الگ انداز ہے۔ مجھے آج بھی اس بات پر خوشی اور فخر ہے کہ ستارہ کے بارے میں میں نے صرف ایک نظر میں جو فیصلہ کیا تھا وہ خود میری توقعات سے بھی زیادہ صحیح تھا۔ پھر ایک روز اس نے باتوں باتوں میں مجھے اپنی زندگی کی کہانی سنائی جو نہایت دلخراش اور دردناک تھی۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ وہ ایک معزز اور شریف گھرانے کی لڑکی تھی اور فلموں میں محض چھوٹے موٹے رول حاصل کرنے کے شوق میں نہ جانے کن کن نوسربازوں کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی بالآخر بازارِ حسن پہنچ گئی تھی۔ اور جب وہ اپنی تقدیر پر شاکر ہو کر وہاں کے ماحول میں ڈھل گئی اور اطمینان سے شب و روز گزارنے لگی تھی تو میں اس سے جا ٹکرایا تھا جو اس کی فرمائش یا درخواست کے بغیر' اس سے کسی قسم کا خراج وصول کیے بغیر اسے ہیروئن بنانے کے لئے لے آیا تھا۔ اس ستم ظریفی پر اسے ہنسی بھی آتی تھی اور رونا بھی۔"

"اس کا مطلب ہے' وہ تو اب تمہاری بے حد شکر گزار ہوگی؟" میں نے قدرے دلچسپی سے پوچھا۔

"شکر گزار.....؟" وہ تلخ سے انداز میں ہنسا "ہاں.....جب تک میرا کام ٹھیک چل رہا تھا وہ میری بے پناہ شکر گزار تھی۔ اس کی شکر گزاری مجھ سے سنبھالے نہیں سنبھلتی تھی۔ اس کا ڈیرا میرے ہی دفتر میں رہتا تھا۔ یہیں وہ دوسرے پروڈیوسروں سے معاملات طے کرتی تھی لیکن جیسے ہی میری کمر ٹوٹی اس نے اپنا شکر گزاری کا بوریا بستر سمیٹا اور نہ جانے کس شاخ پر اپنا آشیاں بنالیا۔ اب تو عالم یہ ہے کہ اگر کبھی سامنا ہوتا بھی ہے تو عام طور پر میں اسے نظر نہیں آتا۔ مجھ پر سے اس کی نظر اچٹتی ہوئی کسی اور سمت میں چلی جاتی ہے۔ اگر ناگزیر حالات میں مجھ پر نظر پڑ جائے تو وہ دور سے ہی خالص امریکی انداز میں صرف دو انگلیاں ہلا کر "ہائے" کہنے پر اکتفا کرتی ہے اور ایک مصنوعی سی مسکراہٹ میری طرف اچھالتے ہوئے آگے بڑھ جاتی ہے۔"

"بہت خوب" میں نے آہستگی سے کہا "خیر.... اس لائن کی عورتوں کا یہ ہرجائی پن اور طوطا چشمی کوئی نئی یا غیر متوقع چیز نہیں۔"

"نہیں۔ ضروری نہیں کہ یہ فارمولا سبھی پر فٹ آتا ہو" ...وہ گہری سانس لے کر بولا "اس لائن میں آپ کو احسان مندی اور وفاداری کی بھی عدیم المثال کہانیاں ملیں گی" پھر وہ سر جھٹک کر بولا "خیر... ان باتوں کو چھوڑیئے۔ یہ بڑے لمبے قصے ہیں۔ بڑی طویل کہانیاں ہیں۔ یہ بتایئے کہ آفس دیکھنے کے بعد اب آپ کی کیا رائے ہے؟"

"رائے لے کر کیا کریں گے آپ؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بس یہ معاملہ طے ہی سمجھیں۔ کل آپ میری سیکریٹری کو فون کرلیجئے گا۔ وہ آپ کو کوئی مناسب وقت بتادے گی۔ آپ اس دفتر اور اپنی فلم کمپنی سے متعلق تمام ضروری کاغذات لے کر آجایئے گا۔ میرا وکیل بھی موجود ہوگا۔ سیل ڈیڈ تیار ہونے کے بعد میں کل ہی آپ کو ادائیگی کردوں گا۔ ٹھیک ہے؟"

"بہت شکریہ۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی نے مجھے دلدل سے نکال لیا ہے اور وہ بھی اس وقت جب میں ناک تک دھنس چکا تھا" وہ طمانیت سے گہری سانس لے کر بولا۔

"خیر... اب حالات اتنے برے بھی نہیں تھے آپ کے۔ آپ ذرا جلدی گھبرا جانے والے آدمی معلوم ہوتے ہیں" میں نے کہا۔

"ہاں۔ میں زیادہ مضبوط اعصاب کا آدمی نہیں ہوں" اس نے تسلیم کیا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "آپ کو ایک زحمت کرنا پڑے گی۔ میں اس آفس کی نئے سرے سے آرائش کرانا چاہتا ہوں۔ یہ سارا فرنیچر' کیبن وغیرہ سب ہٹ جائیں گے۔ فرنیچر نیا آئے گا اور میں بتادوں گا' کس قسم کا آئے گا۔ لکڑی اور شیشے کا باقی کام بھی جس طرح ہوگا وہ بھی میں آپ کو سمجھادوں گا لیکن یہ سارا کام آپ کو اپنی نگرانی میں کرانا ہوگا۔ آپ اس دفتر میں میرے ساتھ ہی بیٹھا کریں گے اور میں جس انداز میں کام شروع کروں گا اس سے شاید آپ کو سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملے۔ آپ کو کسی اور کی فلم سائن کرنے کی شاید ضرورت ہی نہ پڑے۔ اس طرح گویا آپ اپنی ہی قائم کی ہوئی فلم کمپنی سے ہی وابستہ رہیں گے۔ جب مجھے اطمینان ہو جائے گا کہ میرا یہ کام کچھ چل نکلا ہے تو میرے کاروبار کا یہ شعبہ تقریباً مکمل طور پر آپ کو ہی سنبھالنا پڑے گا۔ میرا طریق کار یہی ہے کہ جب میں اپنے کاروبار کو پھیلاتا ہوں یا کسی نئے شعبے کو اپنے کاروبار میں شامل کرتا ہوں تو اپنے بھروسے کے کسی آدمی کو اس اضافی حصے کا مختارِ کل بنادیتا ہوں۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ

میں ہر معاملے کی تفصیلات اور گہرائی میں جاسکوں ۔ میں صرف شروع شروع میں زیادہ وقت دیتا ہوں ۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ آپ اپنے آپ کو کس حد تک بھروسے کا آدمی ثابت کرتے ہیں ۔ "

" جب آپ مجھے میری توقعات سے کہیں بڑھ کر نواز رہے ہیں تو میں بھی اتنا کمینہ ثابت نہیں ہوں گا کہ آپ کی توقعات پر پورا نہ اتر سکوں ۔ " وہ ممنونیت سے مغلوب لہجے میں بولا " میں تو صرف ایک موہوم سی امید لے کر آپ کے پاس آیا تھا ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرے اتنے بہت سے مسائل یوں چٹکی بجاتے ہی حل ہوجائیں گے ۔ لوگ برسوں دھکے کھاتے ہیں تب بھی انہیں کوئی ایسی ہستی نہیں ملتی جو ان کے کسی کام آنے کی اہلیت بھی رکھتی ہو اور ان پر مہربان بھی ہوجائے ۔ ایک بار پھر میرا یہ یقین بحال ہونے لگا ہے کہ میں ایک خوش قسمت انسان ہوں ۔ "

" فی الحال آپ یہاں یہ ظاہر نہ ہونے دیجئے کہ آپ نے آفس وغیرہ بیچ دیا ہے " میں نے کچھ سوچ کر کہا " بلکہ یہی تاثر دیجئے گا کہ آپ کے پاس کہیں سے کچھ رقم آگئی ہے اور آپ نئے سرے سے کام جمانے کی کوشش کررہے ہیں ۔ "

" بہت بہتر " وہ سعادتمندی سے بولا " آپ کا ہر فیصلہ میرے حق میں زیادہ بہتر نظر آرہا ہے ۔ "

" میں ہر بات میں آپ کی بہتری سوچوں گا تو یہ امید رکھ سکوں گا کہ آپ بھی میری بہتری سوچیں گے ۔ آیئے اب چلتے ہیں " میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا " میں آپ کو کہاں ڈراپ کروں ؟ "

" کوئی بات نہیں .... میں چلا جاؤں گا رکشے سے " وہ دفتر کے دروازے پر ہی رکتے ہوئے بولا ۔

" برادرم ! تکلف مت کرو " میں نے مسکراتے ہوئے کہا " ہمیں اب بہت دور تک ساتھ چلنا ہے ۔ "

وہ شرمیلے سے انداز میں میرے ساتھ ہولیا ۔ اسٹوڈیو کے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے پوچھا " آپ کے پاس گاڑی نہیں ہے ؟ "

" تھی ۔ بک گئی " اس نے آہستگی سے کہا " اب کل آپ ادائیگی کریں گے تو اس میں سے گنجائش نکال کر کوئی چھوٹی موٹی گاڑی لے ہی لوں گا ۔ "

" اگر گنجائش نہ نکلے تو مجھے بتادیجئے گا ۔ میرے پاس ایک کرولا گھر پر فاضل کھڑی ہے ۔ وہ لے لیجئے گا ۔ زیادہ پرانی نہیں ہے " میں نے کہا ۔

" کرولا .... ؟ " وہ ہچکچاتے ہوئے بولا " میرا خیال ہے کرولا تو میں زیادہ پرانی بھی خریدنے کا متحمل نہیں ہوسکوں گا ۔ "

" میں آپ سے فوری طور پر تو اس کی قیمت نہیں مانگ رہا " میں نے کہا " آپ قسطوں میں اپنے حساب میں سے کٹوا دیجئے گا ۔ "

وہ ایک لمحے بالکل خاموش رہا ۔ ہم گاڑی تک پہنچ چکے تھے اور ڈرائیور نے مستعدی سے ہمارے لئے دروازہ کھول دیا تھا ۔ آفاق بالکل اضطراری سے انداز میں رک کر میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا " سر ! مجھے سچ سچ بتادیجئے ۔ آپ واقعی بالکل سنجیدہ ہیں ؟ آپ میرے ساتھ مذاق تو نہیں کررہے ہیں ؟ "

" میری کس بات سے تمہیں شبہ ہوا کہ میں تمہارے ساتھ مذاق کررہا ہوں ؟ " میں نے مربیانہ لہجے میں نرمی سے پوچھا ۔

" یہ عنایتیں .... یہ نوازشیں .... یہ مہربانیاں .... مجھے لگ رہا ہے کہ یہ سب کچھ ایک خواب ہے .... اور جب میری آنکھ کھلے گی تو کچھ بھی نہیں ہوگا " وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا ۔

" جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنا چھوڑ دو " میں نے اس کا کندھا تھپکا " قسمت انسان پر صرف نامہربان ہی نہیں رہتی ۔ مہربان بھی ہوتی ہے " وہ عمر میں مجھ سے بڑا تھا لیکن مجھے بہت چھوٹا دکھائی دے رہا تھا ۔ اس کے انداز و اطوار میں بہرحال ایک بے عنوان سی معصومیت اور آنکھوں میں ایک راست باز انسان کی سی طمانیت کی جھلک تھی ۔ میرا رویہ خود بخود ہی اس سے کچھ اس قسم کا ہوگیا تھا جیسا بزرگوں کا بچوں کے ساتھ ہوتا ہے ۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا " میں کسی سے اس قسم کا مذاق کرنے کی کوشش نہیں کرتا جس سے اس کے محسوسات کو دھچکا پہنچ سکتا ہو ۔ اب تو صرف یہ دعا کیجئے کہ ہمارا ساتھ ہم دونوں ہی کے لئے انقلاب آور ثابت ہو ۔ "

" میں اس رفاقت کو نتیجہ خیز بنانے کے لئے اپنی تمام توانائیاں صرف کروں گا " اس نے خلوص اور عزم سے کہا ۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہم اسٹوڈیو کے گیٹ سے نکلنے لگے تو چوکیدار خان بابا نے ایک بار پھر بڑے جوش و خروش سے ایڑیاں بجاکر ہمیں سلام کیا ۔ جانے کیوں بار بار مجھے وہ وقت یاد آرہا تھا جب مجھے اور میرے دوست راجو کو اسی اسٹوڈیو کے ایک سیٹ سے شوٹنگ کے دوران ڈنڈا ڈولی کرکے باہر پھینک دیا گیا تھا کیونکہ راجو کو وہاں فرش پر پھیلی ہوئی بجلی کی موٹی موٹی تاروں میں سے کسی تار سے شاک لگ گیا تھا اور وہ سیدھا خیمہ آرا پر جاگرا تھا اور خیمہ آرا ہارڈ بورڈ کی ایک دیوار پر جاگری تھی جس کی وجہ سے وہ چھوٹا سا سیٹ پورا ہی گر پڑا تھا ۔

مجھے یقین تھا کہ اگر آج میں اسٹوڈیو میں کوئی سچ مچ کی دیوار بھی گرادیتا تو کوئی مجھے اٹھاکر باہر نہیں پھینک سکتا تھا ۔

○☆○

آفس میری مرضی کے مطابق سیٹ ہونے میں تقریباً

بیس دن لگ گئے ۔ میں اس دوران اپنے دیگر معاملات میں بہت مصروف رہا ۔ کراچی کا بھی ایک چکر لگا جہاں ہوٹل کی تعمیر کے سلسلے میں سیٹھ رمضان نے سرمایہ کاروں کی سینڈیکیٹ بنانے کے کام میں کافی پھرتی دکھائی تھی ۔ چار سیٹھ سرمایہ کاری کرنے کے لئے تیار ہوچکے تھے ۔ پانچواں سیٹھ رمضان خود تھا اور چھٹا میں ۔ اب ہمیں مزید کسی سرمایہ کار کی ضرورت نہیں تھی ۔

کاغذی کارروائیاں جاری تھیں ۔ تمام متوقع حصے داروں کی کمپنیوں کے بارے میں تفصیلات ' مالی استحکام کے بارے میں بینکوں کی رپورٹیں اور ضمانت نامے اور دیگر تمام ضروری کاغذات تیار ہوچکے تھے ۔ اب ہمارا ایک باہمی معاہدہ تیار ہورہا تھا جسے ایک اجلاس میں فائنل کرنے کے بعد ہمیں اس پر دستخط کرنے تھے اور پھر ہوٹل تعمیر کرنے کے سلسلے میں ایک بین الاقوامی کمپنی سے مذاکرات کرنے تھے ۔ تمام مراحل بحسن و خوبی طے ہورہے تھے ۔ سیٹھ رمضان بہت اچھا دوست ' ہمدرد اور شریک کار ثابت ہورہا تھا ۔ ادھر اس نوجوان شفیع شاہ نے بھی کراچی میں میرا کاروبار عمدگی سے سنبھالا ہوا تھا ۔

میں اپنا فلمی دفتر دیکھنے صرف ایک مرتبہ جاسکا جب وہاں کام ختم ہوچکا تھا ۔ آفاق نے سارا کام میری مرضی کے مطابق کرایا تھا اور اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی پہلے والا دفتر تھا ۔ دروازے سے لے کر پچھلی دیوار تک ہر چیز بدل چکی تھی ۔ اب یہ کسی بڑے اور مستحکم ادارے کا دفتر معلوم ہوتا تھا اور اس کی ہر چیز سے ' دفتر کو چلانے والوں کی خوش ذوقی کا اظہار بھی ہوتا تھا ۔ میں نے آفاق کو ہدایت کی کہ وہ بنیادی ضرورت کے تین چار آدمیوں پر مشتمل اسٹاف بھی رکھ لے ۔ میں نے اسے بتایا کہ میں تقریباً ایک ہفتے بعد دفتر آنا شروع کروں گا ۔

ایک ہفتے بعد میں دفتر پہنچا تو یہ دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ وہاں ایک لڑکی اور تین مردوں پر مشتمل اسٹاف موجود تھا ۔ سب مستعدی سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے ۔ پرانا ریکارڈ اور تمام ضروری کاغذات وغیرہ نئی فائلوں میں لگائے جارہے تھے ۔ ہر چیز سے خوبصورتی ' سلیقہ اور نیا پن عیاں تھا لیکن ماحول سے یوں لگ رہا تھا جیسے یہاں کام کافی عرصے سے اسی طرح مستعدی کے ساتھ ہورہا ہے ۔

آفاق کو میری آمد کی اطلاع تھی ۔ میں نے ابھی آفس میں داخل ہوکر سرسری نظر ادھر اُدھر ڈالی ہی تھی کہ وہ اپنے کیبن سے نکل آیا ۔ یہ کیبن اوسط درجے کے ایک کمرے کے برابر ہی تھا اور اس کی دیواروں کا بیشتر حصہ ٹنٹڈ گلاس کا تھا ۔ اس شیشے سے صرف اندر بیٹھنے والا باہر کا منظر دیکھ سکتا تھا ۔ باہر والوں کو اندر صرف نیلگوں روشنی ہی نظر آسکتی تھی ۔ دوسری طرف ایسا ہی ایک کیبن میرے لئے تیار کیا گیا تھا ۔ باقی جگہ میں اسٹاف کی میزیں خوبصورتی سے سیٹ کی گئی تھیں اور جدید قسم کی فائلنگ کیبنٹس ' شیلف اور دوسرا دفتری سامان آراستہ کیا گیا تھا ۔

آفاق نے غالباً باقی لوگوں کو بھی میرے متعلق بتادیا تھا کیونکہ وہ مجھے دیکھ کر احتراماً اٹھ کھڑے ہوئے تھے ۔ یہ میرا اسٹاف تھا مگر میں آج پہلی مرتبہ انہیں دیکھ رہا تھا ۔ آفاق نے ان سے میرا تعارف کرایا ۔ لڑکی کا نام رضوانہ تھا اور وہ ریسپشنسٹ اور ٹائپسٹ تھی ۔ ایک صاحب کا نام عبدالوحید تھا ' وہ کیشئر اور اکاؤنٹنٹ تھے ۔ ایک صاحب جن کا نام لیاقت تھا ' کلرک تھے اور تیسرے صاحب افتخار احمد تھے جنہیں جنرل منیجر کی حیثیت سے رکھا گیا تھا ۔ میں نے سرسری نظر میں ہی محسوس کرلیا کہ کارکنوں کے معاملے میں آفاق کا انتخاب برا نہیں تھا ۔ دوسرے اس نے مختصر عملے کے ذریعے زیادہ سے زیادہ کام سمیٹنے کا بندوبست کیا تھا ۔

تعارفی اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے آفاق سے کہا " ان دونوں فلموں کے اسکرپٹ لے کر میرے پاس ہی آجاؤ ۔ آج کا دن تو میرے خیال میں ضروری معاملات پر تبادلۂ خیال میں ہی گزر جائے گا ۔ "

آفاق نے اثبات میں سرہلایا اور میں اپنے کیبن میں جابیٹھا ۔ کیبن کا دروازہ میں نے کھلا ہی رہنے دیا ۔ اس کیبن کی آرائش بھی میرے ذوق کے مطابق کی گئی تھی ۔ چند لمحے بعد ہی آفاق کئی فائلیں اٹھائے میرے سامنے آن بیٹھا ۔

فائلیں میز پر رکھتے ہوئے وہ مسکرا کر بولا " سر .... آپ کو اپنا آفس پسند آیا ؟ "

" ہاں آفاق ! تمہاری اس ابتدائی کارکردگی سے مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے " میں نے اسے داد دینے میں قطعاً بخل یا مصلحت کوشی سے کام نہیں لیا " میں نے جو کام جس طرح تمہیں بتایا تھا وہ اسی طرح ہوا ہے ۔ "

" انشاء اللہ آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا " وہ مسرور لہجے میں بولا ۔ ... اس کے تاثرات ایسے ہی تھے جیسے میرے الفاظ سے اس کی محنت وصول ہوگئی ہو ۔

میرا اشارہ پاکر بیٹھتے ہوئے وہ نہایت طمانیت سے بولا ۔ " اللہ عزتیں رکھنے والا ہے سر .... ایسا دفتر اس وقت پورے اسٹوڈیو میں کسی کا نہیں ہے ۔ خود اسٹوڈیو کے مالک کا بھی نہیں ہے ۔ خوش قسمتی سے اس ہال کا رقبہ بھی زیادہ تھا ۔ آہستہ آہستہ جب آپ کی یہاں کے ماحول سے شناسائی ہوگئی تو آپ دوسرے دفتروں کو بھی دیکھئے گا ۔ یہاں فلمیں تو بڑی خوبصورت بنتی ہیں لیکن دفتروں میں گویا سلیقہ اور خوبصورتی رکھنے کا بالکل ہی " رواج " نہیں ہے ۔ دفتروں میں آپ کو سستے قسم کے صوفے ملیں گے جن کے اسپرنگ جواب دے

چکے ہوں گے اور نشستوں میں گڑھے پڑ چکے ہوں گے۔ معمولی میزیں ملیں گی جن پر چائے کی پیالیوں کے نشانات اور سگریٹ سے جلائے جانے کے نشانات ہوں گے۔ سگریٹ کے ٹوٹوں سے بھری ہوئی ایش ٹرے ہر میز پر ہوگی بلکہ ٹوٹے فرش پر بھی بکھرے ہوئے ہوں گے۔ میلے کچیلے پردے ہوں گے جن سے کچھ لوگ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ بھی پونچھتے ہوں گے۔ ہارڈ بورڈ کے پارٹیشن ہوں گے۔ کونے کھدروں میں پان کی پیکوں کے نشانات ہوں گے۔ میں جب اس دفتر میں کام کروا رہا تھا تو کئی شناساؤں نے مجھ سے کہا کہ یار دفتر پر اتنی رقم کیوں ضائع کر رہے ہو؟ اگر کہیں سے روپیہ آ ہی گیا ہے تو فلم شروع کرو۔ دفتر تو بعد میں بھی بجتا بنتا رہے گا۔ میں نے ان سے یہی کہا کہ بھئی اطمینان رکھو، فلم بھی شروع کریں گے اور اسی ٹھاٹ باٹ سے شروع کریں گے۔ وہ لوگ یہی سمجھ رہے ہیں کہ میں نے کوئی چکر چلا کر کوئی بڑا فنانسر پھانسا ہے۔"

"کس قسم کا چکر؟" میں نے پوچھا۔

"یہی کوئی لڑکی وغیرہ کو بیچ میں ڈال کر" وہ متاسفانہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "بحران میں پھنسے ہوئے لوگ کبھی کبھار یہ بھی تو کرتے ہیں۔ فلموں میں کام کرنے کی شوقین یا ویسے ہی کچھ چلتی پھرتی قسم کی لڑکیوں کو آگے کر دیتے ہیں.... پینے پلانے کی محفلیں جمتی ہیں... ہوش و خرد کے سودے ہوتے ہیں۔ سب کو آسانی سے اپنے اپنے مطلب کی چیزیں مل جاتی ہیں۔ سب بحران سے نکل آتے ہیں۔ بہرحال.... لوگ میرے بارے میں خواہ کچھ بھی سوچتے ہوں، میرا ضمیر مطمئن ہے کہ میں نے اپنی سطح سے گر کر کوئی کام نہیں کیا۔ ویسے بھی چند دن بعد اصل بات سب کے سامنے آ ہی جائے گی کہ درحقیقت میرے توسط سے ایک بڑے فلمساز نے اس ٹریڈ میں قدم رکھ دیا ہے۔"

"میں تو صرف اپنے بچپن کے ایک خواب کی تعبیر دیکھنے اور چند تجربات کرنے اس میدان میں آیا ہوں آفاق" میں نے آہستگی سے کہا "ضروری نہیں کہ میں کوئی بڑا فلمساز ثابت ہو سکوں۔"

"سر....! آپ اسے خوشامد مت سمجھئے گا۔ آپ آدمی بڑے ہیں تو یقیناً فلمساز بھی بڑے ہی ثابت ہوں گے" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"دیکھتے ہیں.... وقت کیا دکھاتا ہے" میں نے آہستگی سے کہا "اب ذرا آپ مجھے پہلی فلم کی کہانی سنا دیں۔ کل ہم پروجیکشن روم میں اس کی تیار شدہ ریلیں بھی دیکھ لیں گے۔ پھر فیصلہ کریں گے کہ فلم کو نئے سرے سے شروع کیا جائے یا قابلِ استعمال حصوں کو کام میں لایا جائے۔"

"یہ دو فلموں کے اسکرپٹ ہیں سر" اس نے فائلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "پہلی کا نام ہے "زمین" یہ مکمل طور پر کمرشل فلم ہے۔ بارہ مسالوں والی۔ صرف کہیں کہیں اس میں ہم پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے لوگوں کے ذوق کی جھلک دکھائیں گے۔ گولیاں چلیں گی لیکن اتنی نہیں چلیں گی جتنی دوسری جنگ عظیم میں چلی تھیں۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک لڑکا...."

اچانک مجھے آفس کے بیرونی حصے میں کچھ ہلچل کا احساس ہوا۔ میں نے رنگین شیشے کے پار دیکھا۔ دو لحیم شحیم آدمی دراز وار اندر آ چکے تھے۔ ایک کے چہرے پر چھوٹی لیکن گھنی داڑھی تھی۔ دوسرے کی موٹی موٹی مونچھیں بڑے بارعب انداز میں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ دونوں گہرے رنگوں کی شلوار قمیصوں میں تھے۔ گریبان کھلے ہوئے تھے اور چہروں پر خشونت طاری تھی۔ وہ انہی لوگوں میں سے تھے جنہیں سو قدم دور سے دیکھ کر پہچانا جا سکتا ہے کہ وہ بہت نڈر قسم کے بدمعاش ہیں۔

وہ میرے اور آفاق کے کیبنوں کی طرف دیکھتے ہوئے سرکش ہاتھیوں کی طرح آگے بڑھے چلے آ رہے تھے۔ رضوانہ نے کمال جرأت سے کام لیتے ہوئے نہایت مستعدی سے ریسپشن کاؤنٹر کے عقب سے نکل کر ان کے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کی۔

"رکئے جناب.... سنئے.... آپ کو کس سے ملنا ہے؟" اس نے حتی الامکان پُر اعتماد لہجے میں کہا۔ مجھے اس لڑکی کا یہ انداز اس کی جرأتمندی اور فرض شناسی بے حد پسند آئی۔

دونوں آدمیوں نے ایک لمحے کے لئے رک کر خالصتاً بدمعاشوں والے انداز میں مخمور سی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، مسکرائے اور ان میں سے ایک بولا "کاکی دیاں پھرتیاں تے ویکھن والیاں نیں۔"

دوسرے نے صرف ایک ثانئے کے لئے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر وہی پہلی سی خشونت اور کرختگی چھا گئی۔ اس نے یوں لڑکی کو ایک طرف دھکیل دیا جیسے وہ کوئی نہایت ہی حقیر اور کمزور سی مخلوق ہو۔ میں یہ سب کچھ بغور دیکھ رہا تھا۔ لڑکی لڑکھڑا کر کاؤنٹر سے ٹکرائی۔ یقیناً اسے چوٹ بھی آئی ہوگی۔ اور یہ اس بے چاری کی زندگی کی پہلی ملازمت کا پہلا دن تھا۔

وہ دونوں لحیم شحیم آدمی یوں قدم رکھتے ہوئے میرے کیبن تک آئے گویا پیروں کی دھمک سے زمین کو ہلانا چاہتے ہوں۔ کمرے میں گھس آنے کے بعد۔ یکے بعد دیگرے انہوں نے مجھے اور آفاق کو گھورا۔ آفاق کا چہرہ فق تھا اور آنکھیں گویا جھپکنا بھول گئی تھیں۔

موٹی موٹی اور اوپر کو مڑی ہوئی مونچھوں والا نہایت

[اطمی]نان سے میری نہایت نفیس۔ شاندار اور صاف ستھری میز [پر] پاؤں ٹکا کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاؤں میں نہایت موٹے تلے [والی] پشاوری چپل تھی جس پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی۔ ان دونوں [کے] نتھنوں سے کچھ اس طرح سوں سوں کی آواز خارج ہو رہی [تھی] جیسے بن مانس سانس لے رہے ہوں۔

اچانک داڑھی والے نے آفاق کا گریبان پکڑ کر ایک [جھٹک]ے سے اسے اس کی کرسی سے اٹھا لیا اور بھیڑیے کی طرح [غرا]یا "کیوں بے اُچکے! نکرو کے بچے! آخر تو نے آفس کسی اور [کو کیسے] دے ہی دیا نا؟" اس نے آفاق کو رعونت بھرے انداز میں [ایک] جھٹکا دیا۔

"میں نے آفس دیا نہیں ہے...." آفاق گھٹی گھٹی آواز [میں] بولا۔ اس کی گردن کی نسیں ابھر آئی تھیں اور سانولے [چہ]رے پر پسینے کے قطرے نمودار ہو چکے تھے۔ بڑی مشکل [سے] وہ مزید بول پایا "میں نے تو پارٹنرشپ کی ہے ان سے" اس [نے] کن انکھیوں سے میری طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ میں [اپنی] جگہ بے حس و حرکت بیٹھا تھا اور کسی قسم کا ردِعمل ظاہر [کئے ب]غیر یہ ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

"ابے تو ہمیں چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے؟" جھاڑ [جھنکا]ڑ داڑھی والے نے آفاق کو ایک زوردار جھٹکا دے کر تین [چار موٹی] موٹی گالیاں دینے کے بعد کہا "ہم تو خود ساری دنیا کو [انگلیو]ں پر نچاتے ہیں۔ تو ہمیں نچانے کی کوشش کر رہا ہے؟ [تیر]ے خیال میں اسٹوڈیو میں کوئی ایسا کام بھی ہو سکتا ہے جس کا [ہمیں] پتا نہ چلے؟ ہم نے تجھے بڑے شریفانہ انداز میں پیغام [بھجو]ایا تھا کہ یہ آفس ملک صاحب کے سوا کسی کو مت دینا۔ مگر [شر]افت کی زبان تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟"

"مگر ملک صاحب تو فرنیچر کی قیمت بھی نہیں دے رہے [تھے]" آفاق نے گویا جرأت کرتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز [میں ک]ہا۔

"تجھے چاہئے تھا کہ جو وہ دے رہے تھے اسے بھی تبرک [سمجھ کر لے لیتا]۔ ناشکرے! ہم چاہتے تو تجھے ویسے ہی بھگا دیتے" پھر [وہ] جیسے کچھ یاد آ گیا "سنا ہے تو نے پروڈیوسروں کی ایسوسی[ایشن] میں ملک صاحب کی شکایت بھی کی تھی.... ابھی تو ہمیں [تجھ] سے اس کا بھی حساب لینا ہے.... تیرا خیال تھا کہ ایسوسی[ایشن] میں شکایت کر کے تو کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دے رہا [ہے]۔ بڑی ہلچل مچ جائے گی اس طرح؟"

اس دوران مونچھوں والا بدستور میز پر پاؤں ٹکائے ایک [ٹک] مجھے گھور رہا تھا لیکن میں اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ [میں] بغور داڑھی والے کی کارروائی دیکھ رہا تھا اور مکالمے بازی [سن] رہا تھا۔

داڑھی والا آفاق کو ایک اور جھٹکا دیتے ہوئے بولا "جب تجھے معلوم تھا کہ تجھ میں اتنی جان نہیں کہ ہم جیسوں سے تو کیا اسٹوڈیو کے کسی قلی سے بھی ٹکر لے سکے تو پھر تو نے ملک صاحب کی مرضی کے خلاف چلنے کی جرأت کس طرح کی؟"

آفاق نے کوئی جواب نہ دیا۔ تب داڑھی والے نے کسی بے وقعت گٹھری کی طرح اسے کرسی پر پٹخ دیا۔ پھر وہ اسی رعونت سے میری طرف دیکھتے ہوئے زہریلے انداز میں مسکرایا اور مربیانہ سے انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "تجھے بھی دیکھ لیں گے ٹمبکٹو کے شہزادے! بڑا شاندار سوٹ پہن کے، سینہ چوڑا کر کے بیٹھا ہے.... یقیناً بہت بڑا فلمساز بننے کے خواب دیکھ رہا ہوگا تو" اس کے دانت غراتے ہوئے کسی بھیڑیے کی طرح ہونٹوں کے عقب سے جھانک رہے تھے۔ "دھرے رہ جائیں گے تیرے یہ خواب۔ بہت مہنگا پڑے گا تجھے یہاں قدم رکھنا۔"

میں بدستور خاموشی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب داڑھی والے نے بھی میز پر پاؤں رکھ لیا تھا۔ اس کے پاؤں میں بھی بھاری بھرکم پشاوری چپل تھی اور اس پر خوب گرد جمی ہوئی تھی۔ صرف اس کا رنگ اس کے ساتھی کی چپل سے مختلف تھا۔

مونچھوں والے نے بھی گویا کچھ بولنا ضروری سمجھا۔ قدرے آگے کو جھکتے ہوئے وہ بھاری آواز میں بولا "صرف دو چار تماشے دیکھ کر ہی بھاگ جائے گا تو۔ ہمیں پتا ہے بزنس مین کا دل کتنا سا ہوتا ہے۔ اتنا سا" اس نے انگلی اور انگوٹھے کی مدد سے یوں اشارہ کیا جیسے کسی چیز کو چٹکی میں پکڑنے لگا ہو۔

"ہاں... یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو" میں نے گویا تھوک نگل کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "بزنس مین لڑائی جھگڑے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

پھر میں نے اٹھتے ہوئے کہا "لیکن آپ لوگ ناراض کیوں ہیں؟ ایسا کون سا مسئلہ آن پڑا ہے؟ آپ لوگ یہ آفس لینا چاہتے ہیں تو لے لیں۔ اس میں لڑائی جھگڑے والی کیا بات ہے؟ روپے پیسے کا بھی کوئی مسئلہ نہیں۔ اگر میں اس سودے میں لاکھ دو لاکھ کا نقصان بھی برداشت کر لوں گا تو کون سی بڑی بات ہے۔"

میں نے میز کے عقب سے نکلتے ہوئے داڑھی والے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "آؤ باہر چل کر بات کرتے ہیں۔ یہاں میرے دفتر والے خوفزدہ ہو رہے ہیں۔"

داڑھی اور مونچھوں والا دونوں ہی گویا جھاگ کی طرح بیٹھ گئے۔ ان کے چہروں سے خشونت اور کرختگی معدوم ہو گئی اور اس کی جگہ فاتحانہ مسکراہٹ نے لے لی۔ ہم تینوں کیبن سے نکلے۔ وہ میرے دائیں بائیں تھے۔

باہر برآمدے میں آ کر میں ایک ستون کے قریب رک گیا۔

...میں کن انکھیوں سے ادھر اُدھر کا جائزہ لے چکا تھا۔ دائیں بائیں جن دفاتر کی قطار تھی ان میں سے بیشتر بند تھے۔ اسٹوڈیو کے اس حصے میں اس وقت کوئی خاص رونق نہیں تھی۔ اکا دکا لوگ ادھر اُدھر آ جا رہے تھے۔ بیضوی لان کے کچھ حصے پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے کھلی ہوا میں گہری سانس لیتے ہوئے دھیمے اور ملائم لہجے میں کہا "دراصل آپ لوگوں کے آنے سے چند لمحے پہلے ہی آفاق دفتر کی سیٹنگ وغیرہ دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ یہ سارا کام اسی نے کرایا ہے.... اور سچی بات ہے کہ مجھے بھی بہت پسند آیا ہے۔ چنانچہ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں شیشے ٹوٹیں۔ میزیں الٹیں۔ ہڑبونگ مچے۔ چیزیں تباہ ہوں اور میرے دفتر میں کام کرنے والوں کو کوئی چوٹ آئے ....."

ان کی گویا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرا یہ باتیں کرنے کا مقصد کیا ہے۔ وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے خاموشی سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور شاید اپنے مطلب کی بات شروع ہونے کے منتظر تھے۔ میں نے یکدم ہی مونچھوں والے کے دائیں پاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔
"آپ نے یہ پاؤں رکھا ہوا تھا نا میری میز پر؟"

اس نے قطعی اضطراری طور پر اور قدرے احمقانہ انداز میں اثبات میں سرہلا دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے مشینی انداز میں اس کے پاؤں پر پاؤں مارا۔ اسے یقیناً یہی محسوس ہوا ہو گا کہ اس کے پاؤں پر من بھر وزنی کوئی ہتھوڑا آن پڑا ہے۔ پاؤں پر پاؤں مارنے کی یہ بھی ایک خاص ٹیکنک تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے پاؤں کا ملغوبہ بننے میں تھوڑی سی ہی کسر رہ گئی ہو گی۔

بے اختیار وہ ایک ٹانگ کے بل دائرے میں ناچنے لگا۔

اس وقت تک داڑھی والا سمجھ چکا تھا کہ میں جیسے لہجے میں بات کر رہا تھا میرے عزائم ویسے نہیں ہیں۔ اس نے بڑے خونخوار انداز میں مجھے دبوچنے کے لئے بازو پھیلائے ۔ لیکن میں نے اسے اس کی مہلت نہیں دی۔ اس کے منہ پر میں نے پوری قوت سے گھونسا رسید کیا جس نے اسے لان کے اردگرد کھنچی ہوئی ڈیڑھ دو فٹ اونچی دیوار تک پہنچا دیا۔ اگر وہ کوئی عام سا آدمی ہوتا تو وہیں گرتا اور خاصی دیر کے لئے بے حس و حرکت ہو جاتا لیکن وہ بھینسے کی طرح مضبوط تھا۔

مار سہنے کی بھی انہیں یقیناً عادت رہی ہو گی لیکن اب شاید وہ "خلیفہ" بن چکے تھے اور کافی عرصے سے انہیں کہیں مار نہیں پڑی تھی۔ غالباً وہ بدمعاشی میں نام کما چکے تھے اور اس منزل پر تھے جہاں کسی بدمعاش کے نام کی دہشت ہی کافی ہوتی ہے اور جہاں وہ جا کر کھڑا ہو جائے وہاں کوئی دم مارنے کی جرأت نہیں کرتا۔ خصوصاً میرے معاملے میں تو انہیں شاید بہت ہی غیر متوقع صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہیں یقیناً گمان بھی نہیں رہا ہو گا کہ ایک نفیس اور جھلملاتی ہوئی آفس میں عقب میں بیٹھا ہوا سوٹڈ بوٹڈ آدمی جس کے سامنے اور فائلوں کا ڈھیر ہو' اٹھ کر وہ کچھ بھی کر سکتا ہے جو میں کے ساتھ کیا تھا۔ اب بھی شاید انہیں یہ معلوم نہیں تھا محض ٹریلر تھا' اصل فلم تو ابھی باقی تھی۔

مونچھوں والے نے' جس کا پاؤں کچلا جا چکا تھا تکلیف کی پروانہ کرتے ہوئے اور مزید ہاتھا پائی کی زحمت بچنے کے لئے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال جانے کس خفیہ جیب سے لمبی نال کا ایک مکروہ صور ریوالور نکالا۔ یہ غالباً بیرٹا ریوالور تھا۔ خطرناک ترین ریوالو سے ایک۔ اس کیلیبر کے ریوالور کی گولی انسانی جسم ہوتی ہے تو اپنے عقب میں نہایت ہی بھیانک شگاف جاتی ہے۔

میں نے ریوالور کا رخ اپنی طرف ہونے سے پہلے کی کلائی پر ٹھوکر رسید کی جو اس کی کلائی کو بیکار کردینے کافی تھی۔ ریوالور ہوا میں اچھلا اور نہ جانے کہاں جا گرا۔ توجہ بیک وقت دونوں ہی بدمعاشوں پر تھی۔ اس داڑھی والے کو نہ جانے کہاں سے لکڑی کا ایک چپٹا' اور تقریباً دو فٹ لمبا ٹکڑا مل گیا تھا جو شاید کسی قسم کے شکستہ ٹکڑا تھا۔ یہ ٹکڑا کسی بھی ہتھیار سے کم خطرناک تھا۔ خصوصاً ایک پیشہ ور بدمعاش کے ہاتھ میں۔

کسی گینڈے ہی کی طرح ناک کی سیدھ میں مجھ پر ہوئے اس نے لکڑی کا وہ ٹکڑا پوری طاقت سے گھما دونوں یقیناً منجھے ہوئے بدمعاش تھے لیکن ان کی حرکات غیر معمولی پھرتی نہیں تھی۔ میں جھکائی دے کر ایک طر ہٹ گیا اور داڑھی والے کا گھمایا ہوا وہ تختہ نما ٹکڑا "شا" کی آواز کے ساتھ مونچھوں والے کے جبڑے پر پڑا۔ یقی کے کان اور کنپٹی پر بھی ضرب آئی تھی۔ وہ کٹے ہوئے کی طرح دھب سے گرا اور وہیں بے حس و حرکت ہو

داڑھی والا ایک لمحے کے لئے تو دم بخود رہ گیا اور یہ لمحہ ہی میرے لئے کافی تھا۔ میں نے اس کی کلائی پر کرا ہاتھ رسید کیا۔ ایک اذیت ناک کراہ کے ساتھ چوبی ٹکڑ کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ مجنونانہ انداز میں مڑا لیکن کرنے سے پہلے ہی میرا گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ اب تو م نہیں حقیقتاً ہی اس کی شکل بگڑ گئی۔ مجھے یقین تھا کہ کل تو اس کی صورت پہچانے جانے کے قابل ہی نہیں رہے

اس کے سنبھلنے سے پہلے میں نے اس کی گردن کراٹے کا ایک اور ہاتھ مارا۔ وہ "اوغ" کی آواز کے سا بری طرح لڑکھڑایا۔ میں نے اسے جیو جستو والی ٹیکنک ہوا میں اچھال کر زمین پر دے مارا۔ اب وہ چت پڑا آنکھ

...بھتے ہوئے تیزی سے پلکیں جھپکا رہا تھا۔ وہ بے ...ں ہوا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کے حواس اس کا ...وڑ چکے ہیں اور وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہے کہ اس کے ...کیا ہے؟

...دگرد کافی لوگ جمع ہو چکے تھے لیکن ان میں سے قریب ...ں آیا تھا البتہ ایک شخص کو میں نے بہ آواز بلند کہتے سنا۔ ...ں سی فلم کی شوٹنگ ہو رہی ہے بھئی؟"

...اس فلم کا نام ہے "سونار کی ایک لوہار کی" بڑی سبق ...ہے" کسی نے خوشدلی سے جواب دیا۔

...ایسی عمدہ فلمیں کبھی کبھار ہی بنتی ہیں" کسی دوسرے ...لگایا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان دونوں بدمعاشوں کا ...کر وہ لوگ بہت خوش تھے۔

...گرد و پیش کی طرف خاص توجہ دیے بغیر ہاتھ جھاڑ کر ...آفس میں واپس آگیا۔ رضوانہ' آفاق اور دیگر کارکن ...حصے کے وسط میں کھڑے تھے۔ ان کے چہرں پر ملے ...تاثرات تھے۔ شاید اس بات پر انہیں خوشی ہوئی تھی ...کے دفتر میں آکر بدمعاشی جھاڑنے والوں کی درگت بنی ...شاید اس بات پر حیرت بھی تھی کہ میں یہ کچھ بھی ...ہوں۔ اس کے ساتھ ہی شاید انہیں یہ اندیشہ بھی ستا رہا ...ب کہیں اور بات نہ بڑھ جائے۔ صورتحال کہیں ایسی نہ ...کہ میں بھی اسے سنبھال نہ سکوں۔

...ں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس قسم کے اندیشوں میں مبتلا ...صلہ ہار بیٹھیں ۔ چنانچہ میں نے وہیں رک کر رضوانہ ...پر رکھے ہوئے ٹیلیفون سیٹ کا ریسیور اٹھایا اور اپنے ...ادمی شبیر شیخ کا نمبر ڈائل کیا۔

"ہیلو شبیر! کیا حال ہے؟" یہ رسمی جملہ میں نے محض اس ...تھا کہ وہ میری آواز پہچان لے۔ میں اس وقت کوئی کوڈ ...تعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔

...وہ میری آواز پہچان چکا تو میں نے کہا "تمہیں معلوم ہے نا ...نے اسٹوڈیو میں ایک آفس لیا ہے؟..... ہاں..... ٹونی اور ...ویسلی بھیج دو..... بس ادھر اُدھر منڈلاتے رہیں۔ اندر ...مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔ صرف آفس پر نظر ...۔ کوئی بھی مخصوص ہتھیار لے کر یا ویسے ہی جارحانہ انداز ...در جاتا دکھائی دے یا کسی قسم کا ہنگامہ شروع کرنے کی ...کرے تو بلا تردد اسے اڑا کر رکھ دیں... ہاں... بعد میں ...ئے گا.... ان سے کہہ دینا کہ محض ریوالور تک ہی محدود ...۔ کوئی زیادہ خطرناک ہتھیار استعمال کرنے کی ضرورت ...۔ اور ان کے ریوالور بھی اس وقت تک کسی کو نظر نہیں ...چاہئیں جب تک ان کے استعمال کرنے کی ضرورت نہ ...ے۔ سمجھ گئے؟... خدا حافظ۔"

اس کے بعد میں نے اعجاز صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ یہ ایک معروف اور دھانسو قسم کے وکیل تھے جو ہمارے فوجداری معاملات سے نمٹتے تھے۔ ان سے رابطہ قائم ہونے پر میں نے کہا "اعجاز صاحب! براہِ کرم چند منٹ کے لئے اسٹوڈیو والے علاقے کے تھانے میں آجایئے.... جی ہاں۔ صرف چند منٹ کا کام ہے۔ بس رسمی سی کارروائی ہے.... جی ہاں۔ آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ اپنے مسائل سے نمٹنا تو ہمیں خود ہی ہوتا ہے لیکن ضابطے کی کارروائی مکمل رکھنے سے انسان بعد میں بھی سرخرو رہتا ہے... جی ہاں۔ میں بھی پانچ منٹ میں پہنچ رہا ہوں... جی ہاں یہ علاقہ ایس پی منور صاحب کا ہے۔ انہیں بھی فون کر کے میں صورتحال بتا دوں گا۔ تاکہ وہ تھانے والوں کو کہہ دیں اور ہمارا زیادہ وقت برباد نہ ہو۔ وقت تو ہم دونوں کا ہی بے حد قیمتی ہے۔ اور میں تو اس وقت بہت ہی ضروری کام کر رہا تھا لیکن دو عدد چڑ قناطیے قسم کے اُچکوں نے آکر رنگ میں بھنگ ڈال دی۔"

چند لمحے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ فون پر گفتگو کے دوران میری نظر باہر کی طرف ہی رہی تھی۔ آفس کے دو دروازے تھے۔ ایک تو باہر کی طرف چوبی دروازہ تھا جو درحقیقت حفاظتی دروازہ تھا۔ دوسرا شیشے کا دروازہ تھا جس کے عقب میں بلائنڈز لگے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان سے میں نے دیکھا کہ داڑھی والا بدمعاش جو چت پڑا آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا' بالآخر مضمحل سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

سر جھٹک کر اس نے ادھر اُدھر دیکھا پھر اس کی نظر اپنے بے ہوش ساتھی پر پڑی اور وہ تقریباً گھسٹتا ہوا اس کے قریب پہنچا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ جھگڑا ختم ہونے کے بعد کوئی ان کی مدد کے لئے' حتیٰ کہ انہیں سہارا دے کر اٹھانے کے لئے بھی آگے نہیں بڑھا تھا اور نہ ہی ان کے لئے کوئی کمک آئی تھی۔ ان کی پشت پناہی کرنے والے یا ان کے مزید ساتھی یقیناً اسٹوڈیو ہی میں کہیں موجود ہوں گے لیکن کوئی ان کی مدد کے لئے نہیں پہنچا تھا۔

ایک منحنی سے لڑکے نے' جو میلے کچیلے کپڑوں میں تھا' اتنا کرم ضرور کیا کہ کہیں سے ایک گلاس میں پانی لا کر داڑھی والے کو دے دیا اور اس نے اپنے بے ہوش ساتھی کے چہرے پر چھینٹے مارے جس سے وہ چند لمحے بعد ہوش میں آگیا اور اٹھ بیٹھا۔ انہوں نے آپس میں کچھ بات کی اور اس دوران ایک بار بھی مڑ کر آفس کی طرف نہیں دیکھا۔ ایک دوسرے کا سہارا لے کر وہ اٹھے اور زخمی کتوں کی طرح لنگڑاتے ہوئے ایک طرف کو چلے گئے۔

میں نے اپنے دفتر والوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

" آپ لوگ اطمینان سے اپنی اپنی میز پر بیٹھ کر اپنا کام کریں۔ کوئی آپ کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ میں تھوڑی دیر کے لئے باہر جا رہا ہوں۔ میری عدم موجودگی میں بھی آپ لوگوں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایک آدھ منٹ بعد میرے آدمی باہر موجود ہوں گے۔ آپ خواہ انہیں نہ دیکھ سکیں لیکن وہ آپ کی حفاظت کے لئے پوری طرح مستعد ہوں گے اور کسی نے پھر بے ہودگی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تو اس کا حشر ان دونوں سے بھی بدتر ہو گا جو ابھی وہاں سے رخصت ہوئے ہیں؛" میں نے باہر کی طرف اشارہ کیا۔

ان کے چہروں پر طمانیت پھیل گئی ورنہ جس وقت بدمعاشوں نے آفس میں گھس کر بکواس شروع کی تھی اس وقت غالباً میرے کارکن یہی سوچ رہے ہوں گے کہ ان کے ساتھ تو " سر منڈاتے ہی اولے پڑے " والا معاملہ ہوا ہے۔ خصوصاً اب آفاق تو بہت مطمئن بلکہ خوش نظر آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی کچھ کہہ سکتا، میں آفس سے نکل آیا۔

اپنا کام کر کے واپس اسٹوڈیو آنے میں مجھے تقریباً آدھا گھنٹہ لگا۔ برآمدے میں پہنچ کر یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ وہاں کسی قسم کی کوئی گڑبڑ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ ٹونی اور ٹیڈی میری توقع کے عین مطابق برآمدے میں موجود تھے۔ ٹونی تو آفس کے دروازے سے چند قدم کے فاصلے پر ایک ستون سے ٹیک لگائے بظاہر لاتعلقی سے کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا اور ٹیڈی کاغذات کا ایک پلندہ ہاتھ میں پکڑے دنیا مافیہا سے بے خبر برآمدے میں نہایت ہی ست انداز میں قدم اٹھاتا ہوا ٹہل رہا تھا۔ سرسری نظر میں دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ وہ کوئی چھوٹا موٹا اداکار ہے اور اپنے مکالمے یاد کر رہا ہے۔

ٹونی اور ٹیڈی درحقیقت میرے خاص آدمی شبیر شاہ ہی کے چھوٹے بھائی تھے اور شبیر شاہ ہی کی طرح بظاہر نہایت کمزور، دبلے پتلے اور بانس کی طرح لمبے تھے لیکن تھے شبیر شاہ ہی کی طرح بڑے کام کی چیز۔ شبیر شاہ کی تو خیریات ہی اور تھی۔ وہ تو ہر قسم کے بحران کا سدباب کرنے کا بادشاہ تھا۔ کسی بھی قسم کا ہتھیار استعمال کرنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اور جسمانی طور پر بھی وہ جتنا نحیف نظر آتا تھا درحقیقت اتنا ہی ناقابل شکست تھا۔ اگر وہ ایک بار کسی کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا تو پھر اس کے لئے بیر تسمہ پا ہی ثابت ہوتا تھا۔ اس کی گرفت کی نسبت شاید آکٹوپس کی گرفت سے نکلنا آسان ہوتا۔

شبیر شاہ کے دونوں بھائیوں میں بھی کافی حد تک اسی کی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ فرق بس یہ تھا کہ وہ اس جیسے پختہ کار نہیں تھے۔ بظاہر انہوں نے آنکھ اٹھا کر بھی میری طرف نہیں دیکھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ درحقیقت وہ مجھے دور ہی سے دیکھ چکے ہیں۔

آفس میں بھی مجھے ماحول بالکل پرسکون نظر آ[illegible] کچھ خطوط ٹائپ کر رہی تھی جو ہمیں مختلف اداروں [illegible] باقی لوگ بدستور حسابات اور ریکارڈ وغیرہ درست [illegible] مصروف تھے۔ آفاق میرے ہی کیبن میں موجود [illegible] کی فائل پر جھکا ہوا تھا۔ میری طرف دیکھ کر وہ [illegible]

میں اپنی نشست پر بیٹھتے ہوئے کہانی کے بار[illegible] شروع کرنے ہی لگا تھا کہ مجھے اپنے حلیے کا خیال آ گیا [illegible] بدمعاشوں سے جھڑپ کے دوران میرا سوٹ شکن [illegible] تھا اور قمیض پر کچھ دھبے لگ گئے تھے۔ میں [illegible] طلب کیا اور اسے حکم دیا " جا کر ڈرائیور سے کہو [illegible] میرا جو ایک فاضل سوٹ لٹکا ہوا ہے وہ دے [illegible] چپراسی سوٹ لے آیا تو میں نے باتھ روم میں [illegible] تبدیل کیا اور واپس اپنی نشست پر آ بیٹھا۔

" ہاں ..... تو ہم کیا بات کر رہے تھے؟ " [illegible] سلسلۂ کلام جوڑا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا اور میں [illegible] ذرا کسی کام سے چند سیکنڈ کے لئے اٹھ کر کیبن [illegible] تھا۔

" میں آپ کو کہانی سنا رہا تھا " آفاق فائل [illegible] ہوئے پرسکون لہجے میں بولا۔ پھر اس نے د[illegible] نہایت اختصار کے ساتھ کہانی سنائی۔ میرے کوئی [illegible] سے پہلے وہ بولا " فلمی دنیا میں کہانی سنانا بھی ایک [illegible] مجھے نہیں آتا۔ البتہ کسی کسی کہانی نویس کو آتا ہے [illegible] کہانی نویس جب کہانی سناتا ہے تو جہاں چوہدری [illegible] آتے ہیں وہاں فلمی چوہدری کی طرح گرج برس بھی [illegible] جہاں ہیروئن کے مکالمے آتے ہیں وہاں ناک پر [illegible] ٹک بھی لیتا ہے اور جہاں جذباتی سچویشن آتی ہے [illegible] چوہدری صاحب کے قدموں میں گرتی ہے وہاں کہ[illegible] ہدایت کار کے پیروں میں گر جاتا ہے۔ اس طرح کہ[illegible] کچھ اور ہو جاتا ہے۔ میں نے تو سیدھے اور سپا[illegible] کہانی سنائی ہے۔ شاید آپ کو اس نے زیادہ اپیل [illegible] یہ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس پر بہت اچھی [illegible]

اس کا مجھے اندازہ ہے " میں نے چشم تصو[illegible] سچویشنز کو دیکھتے ہوئے کہا۔ " ظاہر ہے فلم بناتا تو ٹیم [illegible] اس میں جب دوسرے لوگوں کے کمالات شامل [illegible] اس کی شکل ہی کچھ اور نکل آئے گی۔ اس میں [illegible] ہنرمندی شامل ہو گی۔ ڈائریکٹر کی ذہانت شامل ہو گی [illegible] اس کی تراش خراش کا عمل مکمل کرے گا۔ دیگر [illegible] کوششوں سے اس کے مختلف رنگ ابھریں گے [illegible] چیز ہی کچھ اور بن جائے گی۔ کہانی کے اس خلاصے [illegible]

[illegible]ی ہے۔ اصل دیکھنے کی چیز تو وہ مکان ہو گا جو اس نقشے [illegible]ہو گا۔ "

[illegible]بالکل درست کہا آپ نے سر! " آفاق قدرے پرجوش [illegible]بولا " اس کا مطلب ہے آپ اس ٹریڈ کو اچھی طرح سمجھتے [illegible]

[illegible]میں کسی ٹریڈ کو سمجھوں یا نہ سمجھوں لیکن جب بھی [illegible] قدم رکھتا ہوں تو پھر میں بہت ہی تیزی سے اسے [illegible]اہوں۔ کوئی مجھے تربیت دے یا نہ دے، میں بہت ہی [illegible] میں اس کے نشیب و فراز سے واقف ہو جاتا ہوں " [illegible]کہا " اور یہ سب اوپر والے کا کرم ہے ورنہ جس [illegible]ور جس ماحول میں میں نے آنکھ کھولی تھی وہاں شاید [illegible]باڑی کے سوا کچھ نہ سیکھ پاتا "

[illegible]مجھے امید ہے کہ فلم انڈسٹری میں آپ کی آمد نیک فال [illegible]" آفاق نے دھیمے لہجے میں بولا " یہاں آپ جیسے [illegible] کی سخت ضرورت ہے۔ ماحول بہت خراب ہوتا [illegible] کچھ ایسے لوگ یہاں گھس آئے ہیں جنہوں نے ہر [illegible]ڈہ گردی کا مظاہرہ کرنا اپنا شعار بنا لیا ہے۔ وہ اپنا ہر کام [illegible]غنڈوں کے ذریعے کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ [illegible] نامی گرامی بدمعاش روپے پیسے، شراب، عورت [illegible] نامعلوم چیزوں کے چسکے میں ان کے در پر پڑے [illegible] جس کی وجہ سے مجھ جیسے لوگوں کو بعض اوقات بڑی [illegible]یش آتی ہے جو بدمعاشوں سے مراسم نہیں رکھتے۔ یا [illegible]کہ جن کے پاس بدمعاشوں کو دینے کے لئے کچھ [illegible]۔ جو تھوڑے بہت پڑھے لکھے بھی ہوتے ہیں اور [illegible]نے کام پر ہی تکیہ کر کے انڈسٹری میں رہنا چاہتے ہیں۔ [illegible]پوری کوشش ہوتی ہے کہ ہم کسی معاملے میں [illegible] کے راستے میں نہ آئیں پھر بھی کسی نہ کسی مسئلے پر [illegible] جاتا ہے۔ اب اس معاملے کو لے لیجئے ..... بھئی یہ [illegible]تھا۔ میں جس کو چاہتا دیتا۔ ظاہر ہے مجھے اپنا چار پیسے [illegible]بچنا تھا لیکن مجھے نادر شاہی انداز میں حکم دیا جا رہا تھا کہ [illegible]ہر حال میں ملک صاحب یا ان کے دوست کو دینا ہے۔ [illegible]آپ کی جگہ کوئی عام بزنس مین ہوتا تو اس کی عزت [illegible] جاتی اور ساتھ ہی میری بھی اچھی خاصی مٹی پلید [illegible]ادمی یہی سمجھتا کہ میں نے اسے مروا دیا ..... حالانکہ [illegible]یشہ نہیں تھا کہ یہ لوگ اس معاملے میں اتنا آگے [illegible] گے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ملک یا اس کا [illegible] آفس کے پیچھے کیوں مرے جا رہے ہیں۔ یہ کوئی [illegible]ولی جگہ تو ہے نہیں۔ اسٹوڈیو میں آئے دن کوئی نہ [illegible]الی ہوتا رہتا ہے ..... اور پھر اسی اسٹوڈیو میں آفس بنانا [illegible]روری نہیں۔ قریب ہی دو دوسرے دو اسٹوڈیو بھی ہیں۔

..... آخر انہوں نے اس معمولی سے مسئلے کو اتنا گمبھیر کیوں بنا دیا ہے؟ "

" آپ اس مسئلے میں ہرگز ذہن نہ کھپائیں۔ اس قسم کے سارے مسائل آپ میرے لئے چھوڑ دیں اور اپنی تمامتر توجہ کام پر مرکوز رکھیں۔ آپ اپنے ذہن میں صرف یہ رکھیں کہ ہمیں بہت خوبصورت فلمیں بنانی ہیں۔ آپ کی راہ میں جو بھی دشواریاں آئیں گی انہیں دور کرنا میرا کام ہے۔ آج کے واقعے کے بعد آپ کو یقیناً یہ اطمینان بھی ہو گیا ہو گا کہ میں آپ لوگوں کی حفاظت کرنے کا اہل ہوں۔ " میں نے کہا۔

" ہاں سر! مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ کے ہاتھ بہت لمبے ہیں " آفاق مسکرایا۔

" میری پالیسی ہے کہ شریفوں کے لئے میں بے پناہ شریف آدمی ثابت ہوؤں اور بدمعاشوں کے لئے ایک ایسا بدمعاش کہ وہ بدمعاشی سے توبہ کر لیں " میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا " میرا بزنس بہت پھیلا ہوا ہے اور خصوصاً اب جن جن شعبوں میں قدم رکھنے کا میں ارادہ رکھتا ہوں ان میں مجھے کسی بھی قسم کے حالات سے واسطہ پڑ سکتا ہے اور پڑتا بھی رہا ہے چنانچہ میں نے کچھ ایسے انتظامات کئے ہوئے ہیں کہ خواہ مخواہ میرے مخالف بن جانے والے یا ادھر ادھر بکھرے ہوئے کرائے کے قاتل اور لفنگے مجھے پریشان نہ کر سکیں۔ "

" سر! ویسے یہ دو آدمی جو ہمارے ہاں ہنگامہ کرنے آئے تھے، کوئی چھوٹے موٹے بدمعاش یا لفنگے نہیں تھے " آفاق بولا " کسی چھوٹے موٹے بدمعاش یا لفنگے کی تو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ ایک اجنبی فلمساز کے کمرے میں یوں دندناتے ہوئے گھس آئے اور ایک ڈائریکٹر کے گریبان پر یوں چھوٹتے ہی ہاتھ ڈال دے۔ یہ دونوں خاصے اونچے درجے کے بدمعاش ہیں۔ بلو اور جوجی کے ناموں سے مشہور ہیں۔ قتل کی کئی وارداتوں میں ملوث ہیں۔ آج کل ملک ہی ان کا سرپرست خاص بنا ہوا ہے۔ یہ اور اسی قسم کے کئی دوسرے پیشہ ور بدمعاش ملک کے حواری اور مصاحبوں کی طرح اس کے گرد جمع رہتے ہیں۔ پروڈیوسروں یا ڈائریکٹروں کی ایسوسی ایشنز بھی ان کے سامنے گویا بے بس سی ہو کر رہ گئی ہیں۔ کسی ایسوسی ایشن سے ان کی شکایت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ جہاں یہ دیکھتے ہیں کہ عہدیداروں کو خوفزدہ کیا جا سکتا ہے وہاں خوف زدہ کر دیتے ہیں اور جہاں دیکھتے ہیں کہ کچھ بات بگڑنے لگی ہے اور ملک کو فلمسازی میں کوئی رکاوٹ پیش آنے لگی ہے تو یہ لوگ مسکین بن کر ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ موقع مناسب دیکھ کر چاقو، خنجر اور پستول لہرانے لگتے ہیں۔ سیٹ پر کام کرتی ہوئی چھوٹی [illegible] اداکاراؤں کو کلائی سے پکڑ کر گھسیٹ

لیتے ہیں۔ سب لوگ چپ کھڑے دیکھتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے شوٹنگ پیک اپ ہوئی۔ تھوڑا بہت شور شرابا ہوا۔ دو چار لوگ ادھر ادھر دوڑے۔ بالآخر انہوں نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور چند منٹ کے تعطل کے بعد شوٹنگ دوبارہ شروع ہوگئی کیونکہ فلمساز کو یہ فکر تھی کہ شفٹ بیکار نہ چلی جائے اور ہزاروں روپے کا فاضل خرچ نہ پڑ جائے اور ہدایت کار کو یہ فکر تھی کہ ملک صاحب اس کا نام اپنے دشمنوں کی فہرست میں نہ لکھ لیں۔ تھانہ کچہری ان بدمعاشوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں..... بلکہ شاید ان کے کچھ شناسا وہاں موجود ہیں جو ان کا احتساب کرنے کے بجائے ان سے حق دوستی نبھاتے ہیں۔"

"فکر کی کوئی بات نہیں آفاق" میں نے ایک پینسل انگلیوں میں گھماتے ہوئے بے پروائی سے کہا "بدمعاشوں کا ایک قبیلہ تو یہ ہوتا ہے جس کے لوگ گریبان کھولے پھرتے ہیں۔ نیفے میں ہتھیار رکھتے ہیں۔ اکثر اوقات کہیں نہ کہیں ہنگامہ کرکے دہشت پھیلاتے رہتے ہیں۔ جسمانی طور پر بھی یہ تگڑے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ لوگ ان سے ڈرتے ہیں اور بعض اوقات یہ ایک مخصوص علاقے پر ایک مخصوص حکمت عملی سے گویا حکومت سی کرنے لگتے ہیں۔ تھانوں میں ان کا ریکارڈ موجود ہوتا ہے۔ کبھی کبھار یہ جیل بھی چلے جاتے ہیں مگر زیادہ عرصہ اندر نہیں رہتے۔ ان بدمعاشوں کا نام خواہ کتنا ہی گونجنے لگے اور کسی علاقے میں ان کی خواہ کتنی ہی دہشت پھیل جائے لیکن میرے خیال میں یہ ہلکے بدمعاش ہوتے ہیں۔"

آفاق ہمہ تن گوش تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کے برعکس کچھ لوگ ہوتے ہیں جو بظاہر بالکل بے ضرر اور عام سی شخصیت کے مالک ہوتے ہیں لیکن ان میں غیر معمولی صلاحیتیں ہوتی ہیں تاہم بدمعاشی ان کا پیشہ نہیں ہوتی۔ یہ بظاہر بالکل امن و سکون سے اسی معاشرے میں دیگر شرفاء کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ صرف ضرورت پڑنے پر یہ لوگ تیغ بے نیام بنتے ہیں۔ پلک جھپکنے میں یہ لوگ ایسا کام دکھا کر صاف بچ نکلتے ہیں جو پیشہ ور بدمعاش ایڑی چوٹی کا زور لگانے پر بھی انجام نہیں دے سکتے۔ ان لوگوں کا کہیں کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہوتا، ...کوئی انہیں صحیح طور پر نہیں جانتا۔ یہ لوگ بالکل عام آدمیوں کی طرح رہتے ہیں۔ کسی کو بے جا تنگ نہیں کرتے، کہیں ہنگامہ نہیں مچاتے نہ کہیں بدمعاشی نہیں جھاڑتے۔"

آفاق بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے بات جاری رکھی "خوش قسمتی سے ایسے کچھ لوگوں سے میری شناسائی ہے۔ وہ میری عزت بھی کرتے ہیں اور میری بات بھی مانتے ہیں لیکن میں نے ان کے تعاون [illegible] ناجائز فائدہ نہیں اٹھایا۔ ان کی مدد سے کبھی کسی [illegible] کیا۔ کسی پر حملہ نہیں کرایا۔ کسی سے جھگڑا کر[illegible] نہیں کی۔ ان کو میں نے عام طور پر صرف اپنے دفا[ع] [illegible] استعمال کیا ہے اور وہ بھی بدمعاش قسم کے لوگوں [illegible] میں۔ ورنہ شریف آدمی کی تو میں چھوٹی موٹی زیاد[تی] [illegible] ہوں۔ فرعون صفت لوگوں کو میں برداشت نہی[ں] [illegible] خصوصاً جبکہ وہ اپنے زعم میں مجھ سے آ ٹکرا[ئیں] [illegible] میرے لئے دشواریاں پیدا کرتے ہیں۔ میں نے خو[د] [illegible] کچھ زیادہ آرام دہ ماحول میں پرورش نہیں پائی اس [illegible] اتنا تر نوالا نہیں ہوں جتنا نظر آتا ہوں۔ چنانچہ آپ [illegible] قسم کے معاملات میں ذرا بھی گھبرانے کی ضرور[ت] [illegible] ہماری پالیسی یہی رہے گی کہ ہم پوری توجہ، سکون [illegible] سے اپنا کام کریں گے لیکن جیسے ہی کوئی ہمارے [illegible] اڑانے کی کوشش کرے گا اس کی ٹانگ توڑ دی [جائے گی]۔"

"جس وقت بلو اور جوجی نے دفتر میں داخل [illegible] گریبان پکڑا اس وقت میں واقعی بدحواس ہوگیا تھا [illegible] میں بالکل مطمئن اور بے خوف ہوں۔ اس کی وجہ صرف [illegible] میں نے آپ کی طاقت کا مظاہرہ دیکھ لیا ہے بلکہ [illegible] کے بعد سے یکایک ہی میرے دل سے موت کا خ[وف] [illegible] گیا ہے۔"

"یہ تو بہت ہی اچھا ہوا" میں نے مسکراتے [illegible] "میرے ساتھی خواہ کسی بھی حیثیت میں میرے [illegible] رہے ہوں انہیں بالکل بے خوف ہونا چاہئے۔ [illegible] دوسری کہانی کا جائزہ لے لیں۔ وہ کہانی بھی مختصر [illegible]"

آفاق نے چند منٹ میں کہانی مجھے سنادی۔ [illegible] ٹھیک ہی تھی اور میرے خیال میں ایک اچھا ڈائر[یکٹر] [illegible] بڑی جان ڈال سکتا تھا۔ بہرحال ان دونوں کہانیوں [illegible] تو فلمائے جا ہی چکے تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے اندازہ [illegible] آفاق کام کے معاملے میں کتنے پانی میں تھا۔

"ہیروئن کون تھی ان دونوں فلموں کی؟"

"وہی..... ستارہ" اس نے دھیمے لہجے میں [illegible]

"اسے مسلسل کاسٹ کرنے کی میرے ذ[ہن] [illegible] وجوہات ہوسکتی ہیں" میں نے دوستانہ انداز میں [illegible] کہ تم نے پہلی مرتبہ اسے کاسٹ کیا اور وہ فلم [illegible] اسے خوش بختی کی علامت سمجھنے لگے۔ دوسر[ی] [illegible] اس پر کچھ مہربان لگتے ہو۔ تیسری وجہ یہ کہ شا[ید] [illegible] اداکارہ ہو۔ ان میں کون سی وجہ صحیح ہے؟"

"اس میں تو کوئی شک نہیں افضل صاحب [illegible] لئے میرے دل میں نرم گوشہ موجود ہے [illegible]

[illegible] کاسٹ کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی۔ کام کے معاملے میں [illegible] بڑا بے مروت ہوں۔ کام اپنی جگہ اور ذاتی محسوسات اپنی [جگہ]۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ بہت اچھی اداکارہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا [چاہ]ئے کہ وہ پیدائشی اداکارہ ہے۔ اس نے اداکاری کہیں سے [نہ]یں سیکھی لیکن اداکاری کے بارے میں اسے شاید ہی میں [نے] کبھی کچھ بتایا ہو۔ وہ کہانی سنتے ہی کردار کو اس طرح سمجھ [لیتی ہ]ے جیسے کسی غیبی طاقت نے اس کے سامنے اس کردار کی [تمام] تر جزئیات کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا ہو۔ اس کی عمر کچھ زیادہ [نہیں] لیکن زندگی کے بارے میں اس کا مشاہدہ بہت گہرا معلوم [ہوتا ہ]ے۔" آفاق نے یہ سب کچھ مجھے قدرے پرجوش لہجے [میں] بتایا "دوسرے اس کا چہرہ فلم اسکرین کے لئے بہت ہی [مناس]ب کاسٹ۔ میں نے پہلے دن اس پر نظر ڈالتے ہی کہہ دیا تھا [کہ] یہ لڑکی اسکرین پر غضب ڈھائے گی لیکن دوسرے بہت لوگوں نے مجھ سے اتفاق نہیں کیا تھا۔"

"بھئی تم نے تو اس کی اتنی تعریف کردی ہے کہ ایک تو [مجھ]ے ملنے کا اشتیاق پیدا ہوگیا ہے" میں نے مسکراتے [ہو]ئے کہا "دوسرے میں سوچ رہا ہوں کہ اگر ہم نے فلم کوری[ئر] [illegible] بھی کیا تو شاید اسی لڑکی کو لینا پڑے۔"

"کہانیوں کے لحاظ سے موزوں ترین تو وہی ہے۔ لیکن اس کے بڑے نخرے ہیں" وہ قدرے ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"تم نے اس کے کردار کا جو نقشہ کھینچا ہے اس سے میرا [اندا]زہ ہے کہ نخرے بڑھ جانے کا مطلب اس کا معاوضہ بڑھ جانا ہے نا؟" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

آفاق نے اثبات میں سر ہلایا "وقت سے فائدہ اٹھانا وہ کچھ [زیا]دہ ہی اچھی طرح جانتی ہے۔ سب فلمساز یکدم اس کی [طرف] دوڑ پڑے ہیں۔"

"ہم اسے اس کا منہ مانگا معاوضہ دیں گے۔ حتیٰ کہ وہ [رقم] بھی دے سکتے ہیں جو دوسرے فلمساز دینے سے انکار [کر] چکے ہوں" پھر میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ [ب]شرطیکہ ہمیں واقعی اس کی اشد ضرورت محسوس ہو۔ وہ [ہمار]ے لئے ناگزیر ہو۔"

"آپ کل تیار شدہ ریلوں میں اس کا کام دیکھئے گا۔ پھر [فیصلہ] کیجئے گا۔ میں خود اس سلسلے میں کچھ نہیں کہوں گا" آفاق [نے کہا]۔

میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ایک بار پھر مجھے آفس میں کسی [کی آ]مد کا احساس ہوا۔ میں نے شیشے کی دیوار کے پار دیکھا۔ ایک [باوردی] پولیس والا آفس میں داخل ہورہا تھا۔ اس کے پیچھے وہی دونوں بدمعاش تھے جن کا میں نے حلیہ بگاڑا تھا۔ وہ [اس و]قت مرہم پٹی وغیرہ کرواچکے تھے اور بالکل کارٹون نظر [آرہے] تھے۔

رضوانہ نے اس بار بھی نہایت مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں ریسپشن پر ہی رکنے کا اشارہ کیا۔ اس مرتبہ کسی بدمعاش نے حقارت سے اس کا ہاتھ جھٹکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ تینوں کاؤنٹر پر رک گئے۔ تب میں نے دیکھا کہ وہ پولیس والا عہدے کے اعتبار سے اے ایس آئی تھا۔

دروازہ بند ہونے کی وجہ سے رضوانہ اور اے ایس آئی کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اسے رکنے اور سامنے صوفے پر بیٹھ کر انتظار کرنے کے لئے کہہ رہی تھی۔ بالآخر انہیں بیٹھنا پڑا۔ تب رضوانہ نے انٹرکام پر مجھ سے رابطہ قائم کیا۔

"سر..... وہی دونوں بدمعاش ایک پولیس آفیسر کے ساتھ آئے ہیں۔ پولیس آفیسر آپ سے ملنا چاہتے ہیں" رضوانہ نے قدرے بلند آواز میں کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ ان دونوں کو سنانے کے لئے واضح طور پر بدمعاش کہہ رہی تھی جس پر وہ پیچ و تاب کھاکر رہ گئے۔ لیکن رضوانہ کو گویا ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ میں ان سب کو صاف طور پر دیکھ رہا تھا جبکہ وہ باہر سے مخصوص رنگین شیشے کے پار نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"ان سے کہو میں اس وقت ضروری گفتگو کر رہا ہوں۔ انہیں چند منٹ انتظار کرنا پڑے گا" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"بہت بہتر سر" اس نے انٹرکام کا ریسیور رکھتے ہوئے کہا۔ ...پھر وہ کہنیاں کاؤنٹر پر ٹکا کر اے ایس آئی کو میرا جواب سنانے لگی۔ وہ کچھ کسمسایا لیکن پھر مدبرانہ انداز میں سر ہلا کر آرام سے بیٹھ گیا۔ وہ بظاہر سرسری سے انداز میں گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا اور پوری کوشش کر رہا تھا کہ مرعوب نظر نہ آئے۔ دونوں بدمعاش کھڑے ہی تھے اور کینہ توز نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے دل ہی دل میں کہہ رہے ہوں "ذرا دیکھنا بچو! اب پتا چلے گا تمہیں۔"

"ہاں تو ہم کیا بات کر رہے تھے؟" میں نے آفاق کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بے پروائی سے کہا۔

"ہم کاسٹنگ کے مسئلے پر بات کر رہے تھے" آفاق سنبھلتے ہوئے بولا "ویسے بہتر یہی ہوگا کہ کل آپ تیار شدہ ریلیں دیکھ لیں۔ اس کے بعد طے کریں گے کہ ہم کہاں کہاں سے ری شوٹ کریں گے۔ اسی مناسبت سے ہم کاسٹنگ کے بارے میں بھی فیصلے کریں گے۔"

"درست ہے" میں نے اس کی بات سے اتفاق کیا "اچھا آفاق...! یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ رفتہ رفتہ میرا یہ فلمسازی کا شعبہ مکمل طور پر تمہیں ہی سنبھالنا ہوگا۔ ابتدا میں کچھ تو اسے سیٹ کرنے کی غرض سے اور کچھ شوق شوق میں شاید میں کافی وقت دیتا رہوں لیکن آگے چل کر یہ ممکن نہیں رہے گا۔ اس لئے میں ابتدا ہی سے تمہیں اپنا نقطۂ نظر سمجھاتا چلا جاؤں گا کہ میں کن بنیادوں پر اپنا کام استوار کرنا چاہتا ہوں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تم پبلک ریلیشننگ پر بھی خصوصی توجہ رکھنا... پریس سے ہمارے ادارے کے خصوصی تعلقات ہونے چاہئیں۔ یہ وہ پہلو ہے جس پر دوسرے فلمساز اور فلمی ادارے زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فلمی فوٹو گرافر تصویریں لینے کے لئے اور انٹرویوز لینے کے لئے ہمارے اور ہماری کاسٹ کے آگے پیچھے پھرتے ہیں 'بس یہی کافی ہے۔ لیکن وہ اس باریک نکتے کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اس طرح تو پریس میں زیادہ تر وہی چھپ پاتا ہے جو پریس والے چاہتے ہیں۔ ہماری زیادہ توجہ اس امر پر ہونی چاہئے کہ پریس میں زیادہ تر وہ چھپے جو ہم چاہیں۔ جس کا ہمیں اس انداز میں فائدہ پہنچے جس طرح ہم چاہیں۔ تم میری بات سمجھ رہے ہو نا؟"

"بالکل سمجھ رہا ہوں" وہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "بلکہ اس نکتے کو تو میں نے فلم انڈسٹری میں آتے ہی سمجھ لیا تھا اور تبھی سے اس پر عمل پیرا ہوں۔ اسی سے تو مجھے آگے آنے میں مدد ملی ہے۔"

"شو بزنس میں پبلسٹی کی اہمیت کو بہت کم لوگ سمجھتے ہیں۔ مجھے پچھلے دنوں اپنے کاروبار کے سلسلے میں کئی ملکوں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہالی ووڈ اور اٹلی کی فلمی دنیا کو بھی قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور سچی بات یہ ہے کہ میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دیگر چیزوں کی طرح پبلسٹی کا بھی وہاں کیسا منظم شعبہ ہے۔ ہمارا ملک ترقی پذیر سہی لیکن بنیادی ضروریات تو ہماری بھی وہی ہیں۔ ہم ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ بہت سے تجربے کر سکتے ہیں۔ دوسری بہت سی باتوں سے قطع نظر ہمیں یہ ضرور ذہن میں رکھنا ہے کہ شو بزنس اور پبلسٹی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو یہاں بزنس ہوتا ہی کم ہے 'شو ہی شو ہوتی ہے۔ اسی لئے تم اپنے مطلب کے رپورٹروں اور فوٹو گرافروں سے تعلقات بہت خوشگوار رکھنا۔ اکثر و بیشتر یہاں دفتر میں یا اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں وغیرہ میں پریس کانفرنسیں کرتے اخراجات کی پروا مت کرنا۔ اس مد میں خرچ کی ہوئی رقم ضرور ملتا ہے۔ میں ذاتی حیثیت میں پبلسٹی سے بہت دور رہا ہوں اور ہمیشہ میری کوشش رہی ہے کہ کسی اخبار میں کسی سلسلے میں میرا نام نہ آئے' ذرائع ابلاغ میری طرف قطعاً متوجہ نہ ہوں۔ اب بھی میں ذاتی طور پر اپنے نام کو سامنے لانا نہیں چاہوں گا لیکن ہماری فلموں اور ادارے کو دوسروں سے کہیں زیادہ شہرت حاصل ہونی چاہئے۔"

"اس کی آپ فکر ہی نہ کریں" آفاق مسکراتے ہوئے بولا "مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہاں 'کون آدمی کام کا ہے اور سب سے میرے تعلقات بہت اچھے ہیں۔ شکر ہے 'ان لوگوں کی نظر میں اپنی بڑی عزت ہے۔ لوگوں کے آڑے وقت میں کام آیا ہوں میں۔"

"بہت خوب" میں نے طمانیت سے سر ہلایا "اگر تو اس مقصد کے لئے کسی اچھے اور موزوں سے آدمی کو ریلیشنز منیجر کے طور پر بھی رکھ سکتے ہو۔ معقول تنخواہ معقول کام لو۔"

"میرے خیال میں فی الحال تو اس کی ضرورت..." آفاق کچھ سوچ کر بولا "کام جب کافی بڑھ جائے گا اور پاس اتنا وقت نہیں ہوگا کہ اس طرف توجہ دے سکوں اس مقصد کے لئے کوئی زبردست قسم کا آدمی رکھ لیں گے۔"

"چلیں۔ یہ مسئلہ بھی طے ہو گیا۔ باقی باتیں اب ہی چھوڑنی پڑیں گی۔" میں نے فائلیں ایک طرف ہوئے کہا "میرا خیال ہے کہ اب اے ایس آئی صاحب کو بلا ہی لیا جائے۔ بے چارے باہر بیٹھے جمائیاں لے رہے ہیں ان سے پوچھیں یہ کیا چاہتے ہیں....."

"ضرور۔ ضرور" آفاق نے اثبات میں سر ہلایا دیکھتے ہوئے بولا "یہ دونوں بدمعاش بھی بڑی جلدی کروا کے اپنے پیروں پر چلتے ہوئے آ گئے۔ کافی معلوم ہوتے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ انہیں دو چار روز آرام کرنے کی ضرورت پڑے گی۔"

"تمہارا خیال درست ہی ہے" میں نے مسکرا کر کہا "ابھی ان کی چوٹیں صحیح طور پر ٹھنڈی نہیں ہوئیں آج رات یہ سوئیں گے تو کل ان سے اٹھا نہیں جائے گا۔ انہیں واقعی تین چار روز آرام کرنا پڑے گا۔"

پھر میں نے انٹر کام پر رضوانہ کو ہدایت کی کہ وہ ہوئے تینوں آدمیوں کو میرے پاس بھیج دے۔ میں کہ اے ایس آئی صاحب اس وقت تک ست نظر آ رہے تھے لیکن رضوانہ کی زبانی میرا پیغام سنتے ہی وہ اٹھے اور پھر موصوف نے اپنے تاثرات بھی تبدیل کوشش کی۔ غالباً ان کا مقصد یہ تھا کہ ان کے چہرے سے سخت گیری عیاں ہو۔ مجھے ان حضرت کی اس کوشش پر ہنسی آتے آتے رہ گئی۔

اندر آ کر اے ایس آئی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے بغیر مشینی انداز میں اکڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بولا "اسسٹنٹ سب انسپکٹر محمود حسن میرا نام ہے۔"

"تشریف رکھئے" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔ دونوں بدمعاشوں کو میں نے قطعی نظر انداز کر دیا۔ وہ دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے اور کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔

اے ایس آئی بیٹھ تو چکا تھا لیکن نہایت آرام دہ کرسی میں بھی قدرے بے آرام نظر آ رہا تھا۔ میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔ "جی... فرمایئے؟"

"ان دو نوجوانوں نے آپ کے خلاف شکایت کی ہے..." اے ایس آئی نے بالکل رٹے رٹائے انداز میں بولنا شروع کیا۔ "کہ یہ آپ کے دفتر میں' دفتر کے سابق مالک کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے آئے تھے لیکن آپ ان سے بہت بری طرح پیش آئے۔ جب انہوں نے احتجاج کیا تو آپ نے اپنے ساتھیوں سے انہیں پٹوایا اور انہیں قتل کرانے کی کوشش کی۔"

"بہت خوب... اچھی کہانی ہے.." میں نے آہستگی سے سر ہلاتے ہوئے کہا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا... وہ نظر چرانے لگا۔

"آپ شاید اس وقت تھانے سے نہیں آ رہے ہیں؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں... میں ایک کیس کی تفتیش کے سلسلے میں ایک اور جگہ بیٹھا ہوا تھا جب یہ نوجوان میرے پاس پہنچے..." پھر وہ قدرے فاتحانہ سے لہجے میں بولا... "لیکن میں نے ان کا میڈیکل کرا لیا ہے... بڑی شدید ضربیں آئی ہیں ان کو..."

"یقیناً آئی ہوں گی.." میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا... "میں جب کسی چھٹے ہوئے بدمعاش کو مارتا ہوں تو پوری کوشش کرتا ہوں کہ وہ کچھ عرصے اس مار کو یاد رکھے۔ ویسے برسبیل تذکرہ... آپ نے ایف آئی آر درج کرنے سے پہلے ہی ان کا میڈیکل کرا لیا؟"

"ہاں... بالکل... ضرورت پڑنے پر ایسا بھی کیا جا سکتا ہے۔" اس کا اعتماد ابھی تک برقرار تھا۔ "ایف آئی آر درج کرنے کے لئے ہی تو میں آپ کو لینے آیا ہوں... آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا..."

"مجھے...؟" میں نے قدرے استہزائیہ سے لہجے میں کہا۔ "کیوں؟ آپ کا کیا خیال ہے... میں آپ کو تھانے نہیں لے جا سکتا؟" وہ قدرے تیکھے لہجے میں بولا "آپ بڑے سیٹھ... بڑے فلمساز یا کچھ اور ہوں گے تو ہوا کریں۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں... میں ان لوگوں کے سخت خلاف ہوں جو اپنی دولت کے گھمنڈ میں رہتے ہیں..."

"ماشاء اللہ... ماشاء اللہ..." میں نے ستائشی انداز میں سر ہلایا۔ "آپ کے خیالات قابل قدر ہیں... ویسے ایک بات تو بتائیں۔ ان معزز اور بے پناہ شریف نوجوانوں سے کیا آپ کی قریبی رشتے داری ہے جو انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ آپ کس کیس کی تفتیش کے سلسلے میں کہاں گئے ہوئے ہیں؟ اور یہ تھانے جانے کے بجائے سیدھے وہیں پہنچے؟"

"یہ ایک اتفاق تھا..." وہ اب کچھ گڑبڑایا۔ میں پلکیں جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا اور وہ بار بار نظر چرا رہا تھا۔

"اس قسم کے اتفاقات یقیناً اکثر و بیشتر ہی پیش آتے رہتے ہوں گے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"آپ ادھر اُدھر کی باتوں میں میرا وقت ضائع نہ کریں جی... اور تھانے چلنے والی بات کریں..." وہ اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں بولا۔

"تو آپ مجھے تھانے لے جانے کے لئے آئے ہیں؟" میں نے اس بار سرد لہجے میں کہا۔

"ہاں... یہ بات کیا میں آپ کو لکھ کر دوں؟" وہ قدرے تیزی سے بولا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کے کھردرے سے رخساروں پر سرخی جھلک آئی تھی۔

"مسٹر اے ایس آئی...!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے اور کاٹ دار لہجے میں کہا "آپ فرما رہے ہیں کہ میں آپ کا وقت ضائع نہ کروں۔ وقت تو میرا ضائع ہو رہا ہے۔ آپ نے اپنی دانست میں بڑی پھرتی دکھائی ہے اور ان اُچکوں کی مدد کرنے کے لئے کافی دردِ سری مول لی ہے لیکن آپ کی اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں تھانے ہو آیا ہوں۔ آپ بھی کچھ دیر بعد جب تھانے تشریف لے جائیں گے تو آپ کو ایس ایچ او صاحب بتائیں گے کہ آپ کو اس سلسلے میں کیا کرنا ہے۔ بہتر ہوگا کہ ان لفنگوں کو آپ ساتھ ہی لے جائیں تاکہ آپ بعد میں انہیں تلاش کرنے کی زحمت سے بچ جائیں کیونکہ ان کے خلاف میرے دفتر میں گھس کر قاتلانہ حملے کی کوشش' غنڈہ گردی اور آتشیں اسلحہ وغیرہ کے استعمال کی مختلف دفعات کے تحت ایف آئی آر درج ہو چکی ہے۔ ایس ایچ او صاحب ان کی گرفتاری کے لئے احکامات جاری کر چکے ہیں۔ میں ایک معزز اور پابند قانون شہری ہوں۔ میں کبھی کوئی کچا کام نہیں کرتا۔ میرا وکیل جو میرے فوجداری معاملات ہینڈل کرتا ہے' تھانے میں موجود ہے اور کوشش کر رہا ہے کہ اس کیس

کی کارروائی حتی الامکان تیزی سے آگے بڑھے تاکہ میرا اور قانون کے محافظوں کا قیمتی وقت ضائع نہ ہو۔"

اے ایس آئی کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا... "اگر آپ اس وقت تھانے سے آئے ہوتے تو آپ کے علم میں ہوتا کہ میری ایف آئی آر میں کیا لکھا ہے... میں نے تو تمام تفصیل لکھوادی ہے کہ مجھے ان دونوں بدمعاشوں کو کس طرح بے بس کر کے اپنا دفاع کرنا پڑا۔ میں نے انہیں کہاں کہاں ضربیں لگائیں' یہ بھی ایف آئی آر میں درج ہے... اور یہ میرا حقِ خود حفاظتی تھا جسے میں نے استعمال کیا۔ ظاہر ہے اگر میں اپنا دفاع نہ کرتا تو یہ آچکے مجھے مار چکے ہوتے اور میرے آفس میں اس وقت آپ کو شیشے کی کرچیاں اور بیش قیمت فرنیچر کے ٹکڑے بکھرے ہوئے نظر آتے۔ ظاہر ہے کوئی بھی شخص کسی کے ہاتھوں اپنی جان و مال تباہ کرانا نہیں چاہتا۔ انہیں تو میرا شکرگزار ہونا چاہئے کہ میں نے اپنا حقِ خود حفاظتی استعمال کرتے ہوئے انہیں ہلاک نہیں کر دیا۔ جبکہ انہوں نے مجھے ہلاک کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ ریوالور بھی نکالا تھا اور لکڑی کا ایک تختہ بھی بطور ہتھیار استعمال کیا تھا۔ وہ دونوں چیزیں بھی میں نے تھانے پہنچوادی ہیں۔ ان پر ان کی انگلیوں کے نشانات موجود ہیں۔"

پھر میں نے اے ایس آئی کی طرف قدرے جھکتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا "یقیناً آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ آپ کو اب کیا کرنا ہے؟" پھر میں نے اس کی سہولت کے لئے وضاحت کی "آپ کے لئے ضروری ہو گیا ہے کہ آپ ان دونوں کو حراست میں لے کر جلد از جلد تھانے پہنچیں۔ ...اگر آپ نے ہاتھ آئے ہوئے ملزمان کو کسی بھی طرح نکل جانے کا موقع دے دیا تو خود آپ پر فرائض سے غفلت برتنے کا الزام آسکتا ہے۔ بہتر ہو گا کہ میں اس سلسلے میں ایس پی صاحب سے آپ کی بات بھی کرادوں..."

میں نے حیران پریشان اے ایس آئی کو کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر فون پر ایک نمبر ڈائل کیا۔ سلسلہ ملنے پر میں نے کہا۔ منور صاحب! میں افضل بول رہا ہوں... جی ہاں... چند منٹ پہلے جس سلسلے میں آپ کو فون کیا تھا وہ مسئلہ خود ہی حل ہو گیا۔ ...وہ ایک اے ایس آئی صاحب ان دونوں کو ساتھ لے کر میرے پاس آئے ہیں... جی ہاں وہی پرانا ہتھکنڈہ کہ اپنا جرم دوسروں پر تھوپنے کی کوشش کی جائے... جی ہاں... لیجئے اے ایس آئی صاحب سے خود بات کر لیجئے۔"

میں نے ریسیور اے ایس آئی کو تھما دیا۔ اس نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں ریسیور کان سے لگایا اور تھوک نگلنے کے بعد "جی... جی" کرنے لگا۔ میری نظر بدمعاشوں پر تھی۔

ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ غالباً انہوں نے نکا[illegible] بھاگنے کا ارادہ بھی کیا تھا لیکن پھر یہ سوچ کر رہ گئے تھے کہ ا[illegible] قسم کی کوشش کرنے سے بات اور بگڑ سکتی تھی۔ یا پھر شا[illegible] انہوں نے میری آنکھوں سے یہ ارادہ پڑھ لیا تھا کہ میں انہیں بھاگنے ہرگز نہیں دوں گا۔

اے ایس آئی نے کافی دیر تک فون پر "جی... جی..." کرنے کے بعد بالآخر "جی بہت بہتر" کہہ کر ریسیور رکھا اور ا[illegible] دونوں بدمعاشوں کی طرف دیکھا جنہیں کچھ دیر پہلے تک ا[illegible] کی سرپرستی حاصل تھی۔ اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ ا[illegible] نے ان دونوں کی مزید سرپرستی کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ وہ جھاگ کی طرح بیٹھ چکا تھا اور مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ ان دونو[ں] بدمعاشوں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ مردہ سے لہجے میں بولا۔ "مجبوری ہے... تم دونوں کو میرے ساتھ چلنا پڑے گا" وہ ا[illegible] کھڑا ہوا۔

میں نے بدمعاشوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "مجھے افسوس ہے کہ ملک نے تمہاری مدد کے لئے مزید بدمعاشوں نہیں بھیجا... اور مجھے یہ بھی امید نہیں کہ وہ جیل میں تم۔ ملنے یا تمہاری ضمانت کرانے کی کوشش کرے گا۔ کرائے. بدمعاشوں کی بدقسمتی یہی ہوتی ہے کہ جب وہ کہیں کھا جاتے ہیں تو ان کے آقا انہیں ان کے حال پر چھوڑ د[یتے] ہیں۔ بہرحال اگر تمہاری اس سے ملاقات ہو جائے تو اسے [بتا] دینا کہ میں نے اسے معاف نہیں کیا ہے... میں اس قبیل لوگوں کو معاف نہیں کیا کرتا... ویسے بائی دی وے... یہ ملک ہے کیا چیز؟"

"تمہیں جلد ہی علم ہو جائے گا..." مونچھوں وا[لا] بدمعاش سرہلاتے ہوئے بولا۔ تاہم اب اس کی آواز میں وہ خم نہیں تھا۔

وہ جا چکے تو آفاق نے گہری سانس لی اور دھیمے لہجے میں [بولا] "مجھے خود بھی حیرت ہے سر...! جس وقت یہ دونوں بدمعا[ش] آپ سے مار کھا کر لیٹے ہوئے تھے تو ملک نے ان کے کمک کے طور پر مزید بدمعاشوں کو کیوں نہیں بھیجا؟ اس کے آٹھ دس آدمی تو ہر وقت اس کے سامنے حاضر رہتے "شاید اسے اندازہ ہو گیا ہو کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ...یا کوئی اور مصلحت اس کے پیشِ نظر رہی ہو..." میں[نے] خیال ظاہر کیا... "ویسے اس کا آفس ہے کہاں؟"

"اوپر کی منزل پر بائیں طرف ہے... اگر وہ اپنے آفس [کے] سامنے بالکونی نما حصے میں کھڑا ہو تو ہمارے آفس کے سا[منے] برآمدہ نما حصے کا آسانی سے جائزہ لے سکتا ہے۔" آفاق نے

"کیا وہ بہت بڑا فلمساز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جب وہ انڈسٹری میں آیا تو اسے چند بہت اچھے لوگ

گئے اور اس نے شروع شروع میں دو تین اچھی فلمیں بنائیں جنہوں نے خاصا بزنس کیا۔" آفاق نے بتایا" لیکن آدمی چونکہ وہ بنیادی طور پر بدقماش اور بدنیت ہے اس لئے جلد ہی اچھے لوگ اس کا ساتھ چھوڑتے چلے گئے اور اس کے گرد اسی جیسے لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ اب وہ ان فلمسازوں میں شامل ہے جن کی فلمسازی زیادہ تر بدمعاشی کے سہارے چل رہی ہے۔ سلجھے ہوئے ہنرمند اور اداکار اس کے لئے کام کرنا پسند نہیں کرتے۔ اس کی فلمیں بنتی بھی خاصی سست رفتاری سے ہیں اور بزنس بھی کوئی خاص نہیں کرتیں مگر اسے اس بات کی کوئی زیادہ پروا نہیں ہے۔ روپیہ اس کے پاس بہت ہے۔ خاصا تگڑا زمیندار ہے۔ اس کی ایک سلطنت تو غالباً اس کی زمینداری ہوگی۔ اس کی دوسری سلطنت فلم انڈسٹری ہے جہاں اس کی بہت سی اغراض پوری ہوتی ہیں۔ آدمی گو کہ خاصی عمر کا ہے لیکن ہے عیش پسند۔ زیادہ تر یہیں پڑا رہتا ہے۔ زمینوں پر تو کبھی کبھار ہی جاتا ہے۔ اپنے فلمی کاروبار کو بھی زمینداری کی طرح ہی چلاتا ہے۔ میں نے اس کے بارے میں یہ بھی محسوس کیا ہے کہ وہ اپنے سامنے کسی کو ابھرتے اور نمایاں ہوتے دیکھ نہیں سکتا خواہ اس سے اسے کوئی نقصان نہ پہنچ رہا ہو لیکن اپنے اردگرد کسی کو بھی اپنے سے برتر ہوتے دیکھ کر اس کے سینے پر سانپ لوٹنے لگتے ہیں۔ شاید وہ اپنی بوٹیاں نوچنے لگتا ہے۔ ایسا کینہ پرور انسان میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔ پولیس میں بھی چھوٹے موٹے عہدوں پر اس کے دوست' رشتے دار یا پھر شاید اس کے گاؤں کے دو چار آدمی ہیں جن سے اسے بعض اوقات بڑی مدد مل جاتی ہے۔"

"بہت خوب۔۔" میں نے سب کچھ بغور سننے کے بعد کہا۔ "وہ ہے کس علاقے کا زمیندار؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" آفاق بولا "بلکہ شاید صحیح طور پر کسی کو بھی معلوم نہیں..."

"خیر... کوئی بات نہیں" میں نے بے پروائی سے سر جھٹکا اور انٹر کام پر رضوانہ کو ہدایت کی... "میں اب اپنے دوسرے آفس جا رہا ہوں۔ کوئی فون کرے تو اسے بتا دیجئے گا۔ وہاں سے پانچ بجے میں گھر چلا جاؤں گا۔ آپ کی میز پر میرے تمام فون نمبر وغیرہ موجود ہیں۔"

"لیس سر!" اس نے مستعدی سے کہا اور میں ریسیور رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"آفاق! کل تم پروجیکشن ہال میں وہ تیار شدہ ریلیں دیکھنے کا بندوبست کر رکھنا تاکہ کل ہی ہم کاسٹنگ کے بارے میں فیصلہ کرلیں۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"بہت بہتر سر!" آفاق بولا اور مجھے رخصت کرنے باہر آیا۔ ...میں نے کن انکھیوں سے ادھر دیکھا جدھر میرے اندازے کے مطابق ملک کا آفس ہونا چاہئے تھا۔ اوپر کی منزل کے طویل بالکونی نما حصے میں کئی افراد کھڑے تھے۔ دو تین آدمی دیوار پر پاؤں ٹکائے نیچے ہی جھانک رہے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں اور آفاق آفس سے باہر آئے تو کئی آدمی متجس انداز میں ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔

میں نے گپ شپ کرنے کے سے انداز میں آفاق سے کہا "غیر محسوس انداز میں ادھر دیکھ کر بتاؤ کہ کیا بالکونی میں ملک بھی کھڑا ہے؟ اگر کھڑا ہے تو کونسا ہے؟"

"ملک وہاں نہیں ہے۔ میں پہلے ہی دیکھ چکا ہوں..." آفاق بولا "اس کے آفس کے سامنے کچھ ویرانی سی نظر آرہی ہے۔ میرے خیال میں تو اس کا آفس ہی بند ہے۔ بہت مکار آدمی ہے۔ جب غنڈوں کو بھیجنے کے بعد اس نے دیکھا ہوگا کہ وار الٹ گیا ہے تو کھسک گیا ہوگا۔"

"خیر... کوئی بات نہیں..." میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اب ہم اس دریا میں کود ہی پڑے ہیں تو کسی دن مگرمچھ سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔" میں ہاتھ ہلا کر باہر کو چل دیا۔

اپنے دوسرے آفس پہنچ کر میں نے ایک آدھ فائل دیکھی اور چند خطوط سائن کئے۔ اسی اثنا میں میرے وکیل نے فون کرکے مجھے اطلاع دی۔۔ "وہ دونوں اچھے حوالات میں پہنچ گئے ہیں چوہدری صاحب۔ میں کوشش کروں گا کہ پولیس کل ہی عدالت سے ان کا کم از کم دو ہفتے کا ریمانڈ لے لے۔ ویسے اگر آپ ڈی آئی جی صاحب سے فون کرا دیں تو پھر ملک پورا زور لگا کر بھی ان کی ضمانت نہیں کرا سکے گا۔ کافی دن لگ جائیں گے اسے..."

"اتنے چھوٹے سے معاملے میں میں اتنا اوپر جانا نہیں چاہتا..." میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ڈی آئی جی صاحب کی نظر میں میں بہت بڑا اور بہت معزز آدمی ہوں اور ان کی سفارش میں نے اب تک کسی بڑے ہی کام کے لئے بچا رکھی ہے۔ اتنے چھوٹے معاملے میں ان سے کچھ کہہ کر میں اپنا تاثر خراب کرنا نہیں چاہتا۔"

"رائٹ سر" وکیل بولا... "ان کی ویسے ہی کافی کھنچائی ہو جائے گی۔ یاد کریں گے کہ کسی پر ہاتھ ڈالا تھا..." اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور میں نے اس کا شکریہ ادا کرکے فون رکھ دیا۔ میں واقعی بہت سے اعلیٰ افسران کی نظر میں بے حد معزز آدمی تھا اور یہ مقام میں نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ کسی نہ کسی بہانے سے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں پارٹیاں... رفاہی تنظیموں کو چندے... سماجی بہبود کے دیگر بہت سے کاموں میں حتی الامکان مدد... یہ سب کچھ میں محض کام کے لوگوں کی نظر میں مقام حاصل کرنے کے لئے ہی نہیں کرتا تھا بلکہ واقعی میرا دل بھی چاہتا تھا۔ اپنے اصل دھندے کی وجہ سے میرے دل میں جو خلش سی رہتی تھی' ان کاموں سے میں اسے کم کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ گو کہ مجھے معلوم تھا کہ میری ان نیکیوں کو قبولیت حاصل نہیں ہو سکتی لیکن پھر میں سوچتا تھا کہ خدا کی ذات بڑی بے نیاز' بڑی غفور الرحیم ہے۔ کیا معلوم کس گھڑی اپنے کس گناہ گار بندے پر اس کی نظر کرم ہو جائے۔

اپنی شخصیت کی اس دورنگی سے میں خوش نہیں تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ کاش میں پوری طرح اور حقیقتاً ہی اتنا معزز اور بے عیب آدمی ہوتا جتنا لوگ مجھے سمجھتے تھے۔ میرے ساتھ کوئی ایسا تاثر یا ایسی کوئی کمزوری وابستہ نہ ہوتی جس کے عیاں ہونے کا مجھے خوف رہتا۔

اب بھی میں پوری پوری کوشش کرتا تھا کہ میرے ضمیر پر کم سے کم بوجھ رہے۔ میں کسی کمزور پر ظلم نہیں کرتا تھا۔ بلکہ کمزوروں کی حتی الامکان مدد کرتا تھا۔ خود پرستی سے قطع نظر شاید میں بنیادی طور پر واقعی ایک اچھا آدمی تھا۔ اب تو میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ اگر میرے دو تین بڑے اور جائز کاروبار مستحکم ہو گئے یعنی وہ دو تین بڑے پروجیکٹس کامیاب ہو گئے جن پر میں آج کل محنت کر رہا تھا' تو میں اسمگلنگ چھوڑ دوں گا۔ اگر میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا کام کچھ اور پھیل جاتا' ادھر کراچی میں ہوٹل والا منصوبہ کامیابی سے مکمل ہو جاتا اور اِدھر فلمسازی بھی چمک اٹھتی تو پھر اسمگلنگ سے چمٹے رہنا محض میرے زیادہ لالچی ہونے کی دلیل ہوتا۔

دولت بڑھانے کا بے شک مجھے چسکا پڑ چکا تھا۔ اور یہ چسکا درحقیقت ہر انسان میں موجود ہوتا ہے لیکن ان کا بس نہیں چلتا کہ وہ کس طرح دولت حاصل کریں اور کس طرح اس میں اضافہ کرتے چلے جائیں۔ صحیح معنوں میں درویش صفت کوئی لاکھوں میں ایک ہی ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے لوگ جو بظاہر درویش صفت بھی نظر آتے ہیں' درحقیقت مجبور ہوتے ہیں۔ اپنی مجبوری کو انہوں نے درویشی کا نام دے دیا ہوتا ہے۔ میری نظر میں دولت بڑھانے کا جو چسکا مجھے پڑ چکا تھا وہ اتنا معیوب نہیں تھا لیکن میں اس جنون میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ چسکے کی تو پھر بھی کوئی حد ہوتی ہے' جنون کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ میں چاہتا تھا کہ ہمیشہ دولت میری غلام رہے' میں دولت کا غلام نہ بن جاؤں۔ میرے اشارے پر دولت ادھر سے ادھر ہو' دولت کے اشارے پر میں خزاں رسیدہ پتے کی طرح ادھر سے ادھر نہ اڑتا پھروں۔

○☆○

دوسرے روز میں اسٹوڈیو پہنچا تو آفاق مجھے پروجیکشن روم میں لے گیا... جو ایک چھوٹے سے سینما ہال سے مشابہ تھا۔ وہاں ہمارے علاوہ پانچ چھ آدمی اور موجود تھے۔ آفاق نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ وہ مختلف شعبوں سے وابستہ لوگ تھے... جو ان فلموں کی تیاری کے دوران آفاق کے ساتھ کام کر چکے تھے اور آفاق کا خیال تھا کہ نئے سرے سے ان فلموں پر کام شروع کرتے وقت ہم انہی کے کنٹریکٹ بحال رکھیں گے اور انہی کی خدمات سے استفادہ کریں گے۔

دروازے بند کرکے بتیاں بجھا دی گئیں اور آپریٹر نے فلم شروع کی۔ میں تنقیدی نظر سے فلم کے ایک ایک شاٹ اور ایک ایک سچویشن کا جائزہ لے رہا تھا۔ ساتھ ہی میں عوامی نقطۂ نظر سے بھی یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس میں کون سی چیزیں اکثریتی طبقے کو اپیل کریں گی۔

میری توقعات کے مطابق فلم میں جان تھی۔ کہانی سننے میں جو چیزیں معمولی محسوس ہوتی تھیں' فلم کی صورت میں وہ خاصی دلچسپ اور ڈرامائی محسوس ہونے لگی تھیں۔ پہلی دو ریلیں دیکھ کر ہی مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ آفاق ایک اچھا بلکہ بہت اچھا ہدایت کار تھا۔ میں نے اس نئے میدان کے لئے کام کا آدمی چنا تھا اور مجھ پر قسمت کی مزید مہربانی یہ تھی کہ وہ صرف کام میں ہی اچھا نہیں تھا بلکہ فطرتاً بھی اچھا آدمی تھا۔

پردۂ فلم پر' میں نے ہیرو مظفر رشید کا کام بھی دیکھا۔ وہ بہت تازہ دم' چنچل اور پھرتیلا لگ رہا تھا۔ زندگی کی توانائی سے بھرپور۔ اس کی حرکات و سکنات' چال ڈھال' بولنے کا انداز' سب کچھ اتنا پرکشش تھا' اتنا جوش و خروش تھا اس کی ہر ادا میں کہ یقین نہیں آتا تھا' وہ اس فلم کی تکمیل کے دوران مر چکا ہے۔ مجھے اس کے لئے اپنے دل میں کسک محسوس ہوئی۔ پہلی بار احساس ہوا کہ زندگی اتنی بے وفا بھی ہو سکتی ہے۔ فنکاروں کی موت اس اعتبار سے اور بھی زیادہ درد انگیز لگتی ہے کہ وہ تو دنیا سے گزر جاتے ہیں مگر ان کی پرچھائیاں اسکرین پر متحرک رہ جاتی ہیں۔ ان کی جنبشِ ابرو سے لے کر ان کی اچھل کود' مکالمے' تاثرات اور ان کے لہجے کے ہزاروں رنگ تک سبھی کچھ محفوظ ہوتا ہے۔ جب بھی دیکھو یوں لگتا ہے جیسے وہ زندہ

سلامت آپ کے سامنے موجود ہیں۔ ابھی اسکرین سے اتر کر ہنستے مسکراتے آپ کے پاس آبیٹھیں گے۔

فلم کی ہیروئن ستارہ کی تصویر میں نے پہلی بار آفاق کے آفس میں اس وقت دیکھی تھی جب میں ان کے آفس کا سودا کرنے آیا تھا۔ بعد میں تزئین و آرائش کے دوران وہاں سے اس قسم کی تصویریں اور فلمی پوسٹر وغیرہ ہٹا دیے گئے تھے۔ بہرحال مجھے اس وقت بھی فریم شدہ تمام تصاویر میں ستارہ کا چہرہ کچھ مانوس محسوس ہوا تھا اور اب فلم کے پردے پر تو اسے متحرک دیکھ کر کچھ زیادہ ہی مانوسیت کا احساس ہو رہا تھا مگر اس کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

آفاق نے بتایا تھا کہ رنگین تصویروں کے ساتھ اس کے انٹرویوز ملک کے تقریباً ہر اخبار' رسالے میں چھپ چکے تھے۔ بالآخر میں ایک بار پھر اسی نتیجے پر پہنچا کہ میں نے کہیں اس کی تصویریں دیکھی ہوں گی۔

ہماری پہلی فلم میں وہ ایک ماڈرن لڑکی کا کردار ادا کر رہی تھی اور جتنی ریلوں میں بھی اس کا کام تھا' آفاق نے اس کے ملبوسات پر حد سے زیادہ توجہ رکھی تھی۔ اسکرٹ' میکسیاں' جینز' میکسیکن ہیٹ اور جو کچھ بھی سنسر کوڈ کی حدود میں رہتے ہوئے ممکن تھا' وہ اس نے ستارہ کو پہنادیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہر لباس میں وہ خوب جچ رہی تھی اور اس نے بہت جم کر کام کیا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ دوسری فلم میں اس کا کردار ایک ان پڑھ دیہاتی لڑکی کا تھا اور وہ اس میں بھی اسی طرح فٹ تھی جیسے انگوٹھی میں نگینہ.... اس کا مطلب یہی تھا کہ متنوع قسم کے کردار کرنے کے معاملے میں وہ کسی بھی معروف اور منجھی ہوئی اداکارہ سے کم نہیں تھی اور کاروباری نقطۂ نظر سے بھی اس کی دو فلمیں ہٹ ہوجانے کے بعد اس کے نام کی باکس آفس ویلیو کسی بڑی ہیروئن سے کم نہیں تھی۔ اس اعتبار سے آفاق کا یہ فیصلہ بالکل درست تھا کہ فلمیں دوبارہ بنانے کی صورت میں بھی ہیروئن کے طور پر اسے ہی کاسٹ کیا جائے۔

دونوں فلموں کی دو تین ریلیں ایسی تھیں جنہیں معمولی کاٹ چھانٹ کے بعد استعمال کیا جاسکتا تھا۔ لیکن میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے فیصلہ کرلیا تھا کہ ہم فلم کو شروع سے ہی دوبارہ بنائیں گے۔ میرا خیال تھا کہ میں کچھ زائد رقم خرچ کرکے ان میں مزید کچھ رنگ بھر سکتا تھا' مزید خوبصورتی پیدا کرسکتا تھا۔ فی الحال مجھے اس بات کی پروا نہیں تھی کہ فلمیں اگر ہٹ نہ ہوئیں تو میری کتنی رقم ڈوبے گی۔ اوّل تو زیادہ امکان اسی بات کا تھا کہ تینوں سرکلس کے لئے ڈسٹری بیوٹر ہمیں ہماری لاگت کے مساوی رقم تو دے ہی دیں گے۔ اوور سیز کے لئے ہمیں جو تھوڑی بہت رقم ملے گی' اسے ہم اپنا منافع شمار کرسکتے تھے۔

فلم ہٹ ہونے کی صورت میں ہمیں ڈسٹری بیوٹرز کے منافع میں سے حصہ مل سکتا تھا۔

تقریباً تین گھنٹے بعد ہم پروجیکشن روم سے نکلے تو میں دل ہی دل میں کئی اہم فیصلے کرچکا تھا۔ آفاق میرے ساتھ آفس کی طرف جاتے ہوئے بولا "دولت کی طاقت کے میں نے بے شمار کرشمے دیکھے ہیں پھر بھی جانے کیوں میں جب کوئی نیا کرشمہ دیکھتا ہوں تو حیران بلکہ مبہوت سا ہو جاتا ہوں۔ آج صبح ستارہ کا فون آیا تھا۔ خدا کی شان ہے....."

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور سر جھٹک کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میرے زوال کے دن چونکہ بد سے بدتر ہوچلے تھے اس لئے پچھلے دنوں تو یہ عالم ہوگیا تھا کہ اگر میں ستارہ کو فون کرتا تھا تو وہ گھر پر ہوتے ہوئے بھی اپنی ملازمہ سے کہلوادیتی تھی کہ وہ گھر پر نہیں ہے۔ اسٹوڈیو آنا میں نے تقریباً چھوڑ ہی دیا تھا لیکن اگر کبھی آہی جاتا تھا اور اتفاق سے اس سے سامنا ہو ہی جاتا تھا تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ اس کا رد عمل کیا ہوتا تھا۔ دور سے ہی دو انگلیاں ہلا کر "ہائے" کہہ کر اپنے چمکیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے گزر جاتی تھی۔ اور اگر سیٹ پر ہوتی تھی تو اپنے کام میں مصروف ہوجاتی تھی۔ لیکن آج اس نے مجھے خود فون کیا تھا۔"

"کیا کہہ رہی تھی؟" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"پوچھ رہی تھی کہ میں نے اپنی نامکمل فلموں کے بارے میں کیا فیصلہ کیا ہے" وہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرایا "شاید اسے یہ اطلاع مل گئی ہو کہ میں نے اپنا ادارہ بیچ دیا ہے یا مجھے کوئی فنانسر میسر آگیا ہے۔"

"تم نے اسے کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اسے پروگرام بتادیا تھا کہ ہم آج دوپہر تک تیار شدہ ریلیں دیکھ کر فارغ ہوں گے۔ اس کے بعد کوئی فیصلہ کریں گے" اس نے بتایا۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "میرا اب اس عورت کی صورت دیکھنے کو بھی دل نہیں چاہتا لیکن جہاں تک کاروبار کا تعلق ہے تو جس فلم کے لئے میں کہانی کی مناسبت سے اسے موزوں سمجھوں گا' ہر حال میں اسے ہی کاسٹ کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے ایسے ہی ساتھیوں کی ضرورت ہے" میں نے طمانیت سے کہا "جو کام اور جذبات کو الگ الگ رکھیں۔ یہی درحقیقت پیشہ ورانہ دیانت داری ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ اپنے پیشے سے مخلص ہیں۔ اور جو لوگ اپنے پیشے کے ساتھ مخلص ہوتے ہیں وہ اس پیشے میں ضرور نام پیدا کرتے ہیں۔"

ہم اس دوران دفاتر کے سامنے والے برآمدے میں پہنچ چکے تھے۔ اچانک میں نے سامنے سے ایک دراز قد عورت کو آتے دیکھا۔ وہ جاپانی عورتوں کے لباس کیمونو جیسی کوئی چیز پہنے ہوئے تھی جس کا رنگ انتہائی بھڑکیلا نارنجی تھا جس کی طرف خواہ مخواہ ہی نظر اٹھتی ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں جاپانی پنکھا بھی تھا جو عام طور پر جاپانی کلینڈروں پر لڑکیوں کے ہاتھ میں دیکھنے میں آتا ہے۔ اس کے بال بھی جاپانی اسٹائل میں بنے ہوئے تھے۔

اس کی ناک جاپانی لڑکیوں کی طرح مختصر یا بیٹھی ہوئی سی نہیں تھی بلکہ تیکھی تھی اور نہ ہی اس کا قد چھوٹا تھا۔ وہ اچھی خاصی دراز قد تھی اور اس کے کندھے بھی چوڑے تھے۔ اس کے باوجود اس وقت اس کی شخصیت کا مجموعی تاثر ایک جاپانی لڑکی کا سا ہی بن گیا تھا۔ وہ قدرے اونچی ایڑی کی مخملیں جوتیاں پہنے کھٹ کھٹ کرتی برآمدے میں چلی آرہی تھی۔ اس کی خوبصورت' صراحی دار گردن ایک انجانے احساسِ تفاخر سے یوں اٹھی ہوئی تھی جیسے کوئی ملکہ اپنی سلطنت کے دورے پر نکلی ہوئی ہو۔

قاتل آنکھوں پر لمبی لمبی پلکیں یوں جھکی ہوئی تھیں جیسے وہ ہر چیز کا اچھی طرح جائزہ لینے کے باوجود کسی کو یہ احساس نہ ہونے دینا چاہتی ہو کہ وہ کس طرف متوجہ ہے۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں قدرے ابھری ہوئی تھیں اور ہونٹ گویا دستِ قدرت نے خصوصی توجہ اور اہتمام سے تراشے تھے۔ اس کے پیچھے ایک نو عمر لڑکا بیوٹی باکس اٹھائے تقریباً دوڑتا ہوا چل رہا تھا..... دائیں بائیں دو آدمی تھے جو تیز قدموں سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے باری باری کچھ کہنے کی کوشش کر رہے تھے اور وہ محض نیم توجہی سے سرہلاتی جارہی تھی۔ وہ فلمی میک اپ میں تھی۔ غالباً کسی سیٹ کی طرف جارہی تھی۔

اگر اس کا تفصیلی اور تنقیدی جائزہ لیا جاتا تو شاید اسے بہت زیادہ حسین قرار نہ دیا جاسکتا لیکن مجموعی طور پر وہ پھر بھی حسین تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جن کا تنقیدی اور تفصیلی جائزہ لینے کا انسان کو ہوش ہی نہیں رہتا۔ پہلی نظر میں ہی انسان کے حواس پر دھند سی چھانے لگتی ہے۔ انہیں درحقیقت دیکھا نہیں' محسوس کیا جاتا ہے۔ جیسے خوشبو اور ہوا کو آپ دیکھ نہیں سکتے' اس کا تنقیدی جائزہ نہیں لے سکتے مگر محسوس کرسکتے ہیں۔ آپ کے اعصاب پر یہ سب چیزیں جو اثر ڈالتی ہیں اسے آپ ضرور محسوس کرسکتے ہیں۔ بظاہر نظر نہ آنے والی خوبصورتی آپ کے محسوسات کو جو تماشے دکھاتی ہے اس سے آپ یقیناً بے خبر نہیں ہوں گے۔

"یہ ستارہ ہے" آفاق نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے سرگوشی کی۔

"میں نے پہچان لیا ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

میں نے آفاق کی میز پر اس کی تصویر دیکھی تھی اور ابھی میں دو نامکمل فلموں میں اس کے دو مختلف رول دیکھ کر آرہا تھا۔ کیا میں اب بھی اسے نہ پہچانتا؟ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ ہیئر اسٹائل' لباس اور میک اپ وغیرہ کی تبدیلیوں سے اس کی شخصیت یکسر بدل کر رہ جاتی تھی اور فلمی کیریئر میں ایک عورت کے لئے یہ چیز بہت اہمیت رکھتی ہے۔

اسے دیکھ کر میری وہ الجھن ایک بار پھر عود کر آئی تھی کہ میں نے اسے پہلے کہیں دیکھا ہے۔ وہ ہمارے ہی آفس کے سامنے رک چکی تھی۔ اس دوران میں اور آفاق دروازے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ ستارہ کی لمبی سیاہ پلکیں اٹھیں اور اس نے مخمور سے انداز میں آفاق کی طرف دیکھا۔ جیسے ابھی اس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ حالانکہ میرا خیال تھا کہ وہ ہمیں سامنے سے آتا دیکھ چکی تھی۔ بہرحال ان اداؤں پر اس کا حق تھا' آخر وہ اداکارہ تھی۔

آفاق کو دیکھتے ہی وہ چونکی۔ اس کے انداز میں یکلخت بے تکلفی آگئی۔ نہایت اپنائیت سے اس نے آفاق سے ہاتھ ملایا اور جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں گرمجوشی تھی "میں تمہاری طرف ہی آرہی تھی آفاق۔"

پھر وہ اس شخص کی طرف مڑی جو دائیں ہاتھ پر تھا۔ وہ پستہ قد اور فربہی مائل تھا۔ اس کا لباس شکن آلود لیکن بیش قیمت تھا۔ آنکھیں سرخ اور کچھ متورم سی تھیں جیسے وہ راتوں کو دیر تک جاگتا رہا ہو۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے ستارہ سپاٹ لہجے میں بولی "آپ دیکھ رہے ہیں شیخ صاحب کہ آج میری سیکریٹری میرے ساتھ نہیں ہے۔ وہ چھٹی پر ہے' کل وہ آئے گی تو ڈائری دیکھ کر بتائے گی کہ میرے پاس کون سی ڈیٹس خالی ہیں۔ زبانی تو مجھے کچھ یاد نہیں رہتا۔ پہلے ہم ڈیٹس دیکھ لیں اس کے بعد ہی آپ سے بات کچھ آگے بڑھ سکتی ہے۔ اگر آپ ایک مخصوص مدت میں فلم مکمل کرنا چاہتے ہیں تو پھر میں ڈیٹس کا حساب کتاب لگا کر ہی فلم سائن کرسکوں گی نا؟ میں کوئی وعدہ خلافی کرکے بدنامی مول لینا نہیں چاہتی۔ یہ میرے کیریئر کا وہ دور ہے جب میرا نام جمبو جیٹ کی رفتار سے اوپر جارہا ہے اور درحقیقت اسی زمانے میں مجھے زیادہ سنبھل کر چلنے کی ضرورت ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میں لالچ میں مبتلا ہوکر آنکھیں بند کرکے ہر کنٹریکٹ سائن کرتی چلی جاؤں اور پھر کام کی زیادتی' وعدہ خلافیوں کے ردعمل اور دیگر دشواریوں کی وجہ سے میرے اعصاب ٹوٹ پھوٹ کر رہ جائیں۔ مجھے اپنی جسمانی و ذہنی صحت اور تازگی بہت عزیز ہے۔ ایک ایکٹریس کا یہی تو سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں شیخ صاحب؟"

اس نے پستہ قد شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔
... وہ ایک ثانئے کے لئے گڑبڑا سا گیا پھر سنبھل کر مسکراتا ہوا بولا "بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو تم... یہ عقل مندی کی باتیں اتنی جلدی کس نے سکھا دیں تمہیں ؟"

ستارہ کے چہرے پر مسکراہٹ یا نرمی کی رمق تک نہ ابھری۔

"زمانے اور وقت نے" وہ بدستور سپاٹ اور سرد لہجے میں بولی "زمانہ بہت بڑا استاد ہے اور میں بڑی ہونہار شاگرد ہوں... اچھا خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" پستہ قد شخص آگے بڑھتے ہوئے بولا "کل یا پرسوں ملاقات ہوگی۔"

ستارہ دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہوگئی جو اس کے بائیں ہاتھ پر مؤدبانہ انداز میں کھڑا تھا۔ ایک نظر گھڑی کی طرف دیکھ کر وہ چٹکی بجا کر بولی "تم اب سیٹ پر جاؤ اور اپنی نگرانی میں سیٹ لگوانے کا کام کراؤ۔ مجھے یقین ہے کہ شوٹنگ مزید ایک گھنٹے سے پہلے شروع نہیں ہوسکے گی۔ میں تو پابندیٔ وقت کا اصول اپنا کر پچھتا رہی ہوں۔ میرے علاوہ گویا کسی کو بھی وقت کی کوئی پروا نہیں ہے۔ میں بھی ایک گھنٹے بعد سیٹ پر پہنچوں گی۔"

"بہت بہتر میڈم!" یہ کہہ کر وہ شخص بھی تیزی سے آگے بڑھتا چلا گیا۔

اب ستارہ گویا یکسو ہوکر آفاق کی طرف متوجہ ہوئی۔ اپنے ساتھ آنے والے دو آدمیوں سے بات کرتے وقت جس طرح اچانک اس کے چہرے، آنکھوں اور لہجے میں رُکھائی اور سرد مہری در آئی تھی وہ اسی طرح ایک ہی ثانئے میں غائب بھی ہوگئی تھی۔ جیسے یک لخت ہی بلند و بالا چوٹیوں پر جمی ہوئی برف پگھل جائے۔ بلاشبہ اسے اپنے تاثرات بدلنے میں ملکہ حاصل تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ بغور تو نہیں لیکن کن انکھیوں سے غیر محسوس طور پر میرا جائزہ لے چکی ہے لیکن بظاہر وہ میری طرف سے بے نیاز نظر آنے کی پوری کوشش کررہی تھی۔ میں اپنی جگہ دم بخود کھڑا تھا کیونکہ جیسے ہی میں نے اس کی آواز سنی تھی، میرے ذہن میں ایک چھناکا سا ہوا تھا اور یک لخت ہی جیسے کوئی پتھر میری سوچ کے راستے سے ہٹ گیا تھا، کوئی گرہ سی کھل گئی تھی۔ کوئی گتھی سلجھ گئی تھی۔

میں نے اسے پہچان لیا تھا۔ اور اس کی آواز نے اسے پہچاننے میں میری مدد کی تھی ورنہ فراموشیوں کی گرد بہت گہری تھی۔ نامکمل فلموں کی ریلیں دیکھتے وقت بھی میں نے اس کی آواز سنی تھی لیکن اس وقت زیادہ توجہ نہیں دی تھی اور ویسے بھی ساؤنڈ ریکارڈنگ کے لوازمات اور مشینی عمل سے کچھ نہ کچھ فرق پڑجاتا ہے۔ اس کی اصل آواز میں گوکہ بہت تبدیلی آچکی تھی۔ اس میں وہ بے ساختگی ن[illegible] رہی تھی۔ بہت ناپ تول کر بولنے لگی تھی وہ۔ الفاظ تراش خراش اور سج دھج کے ساتھ ہونٹوں پر آتے تھے۔ مگر بہرحال لہجے اور آواز کا اپنا ایک بنیادی رنگ ہوتا[illegible] اس کے لہجے اور اس کی آواز کا رنگ میرے ذہن کے ن[illegible] خانوں میں کہیں محفوظ تھا۔

وہ واقعی تغیرات زمانہ کا ایک ایسا شاہکار تھی کہ تصویر[illegible] میں میں اسے پہچان نہیں سکا تھا تو یہ کوئی حیرت کی بات ن[illegible] تھی۔ اس کی ذات میں آئے ہوئے انقلابات کو دیکھنے والا تو[illegible] تصویرِ حیرت بن جاتا۔ ان دونوں کو ہی علم نہیں ہوسکا تھا کہ[illegible] حیرت کا کتنا شدید جھٹکا برداشت کرچکا ہوں۔ میرے اعصا[illegible] میں ابھی تک خفیف سی جھنجھناہٹ اور رگ وپے میں ا[illegible] میٹھی سی سنسنی باقی تھی۔ ستارہ دوستانہ انداز میں آفاق[illegible] کندھے پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالتے ہوئے بولی "می[illegible] اطلاعات کے مطابق تم نے نیا جنم لے لیا ہے۔ شاید اس[illegible] گردن کچھ اکڑ گئی ہے۔ اب ایسی بھی کیا بے رخی؟ مانا کہ تم[illegible] آفس بہت شاندار بنالیا ہے لیکن کیا مجھے اندر چلنے کے[illegible] بھی نہیں کہوگے ؟"

"کیوں نہیں" آفاق اس کے لئے دروازہ کھولتے ہو[illegible] سپاٹ لہجے میں بولا "اچھا ہوا تم آگئیں۔ ورنہ کچھ دیر بعد خود تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتے۔"

آفاق کے اس رویّے سے غالباً ستارہ کو بھی حیرت کا جھ[illegible] لگا مگر اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ صرف اس کی آنکھو[illegible] میں ایک لہر سی آکر گزر گئی۔ شاید اسے توقع تھی کہ آفاق ا[illegible] سے گلے شکوے کرے گا، طوطا چشمی کے طعنے دے گا اور ا[illegible] کے ہرجائی پن پر اسے شرمندہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ او[illegible] ان سب متوقع باتوں کے جواب بھی ستارہ کے پاس یقیناً تیا[illegible] ہوں گے مگر آفاق ایک ذہین آدمی تھا۔ اس نے ایسا کوئی ذکر[illegible] نہیں چھیڑا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ایسی باتوں کا کوئی فائدہ نہی[illegible] ہے۔ اس نے یقیناً اپنی زندگی کا یہ باب بند کردیا تھا۔ وہ ا[illegible] ستارہ کے ساتھ اپنا طرزِ عمل خالصتاً کاروباری رکھنا چاہتا تھا۔

ہم دونوں ستارہ کے پیچھے پیچھے آفس میں داخل ہوئے۔ ریسپشن پر رک کر اس نے چاروں طرف دیکھا، سیٹی بجا[illegible] کے سے انداز میں ہونٹ سکیڑے پھر مسکراتے ہوئے آفا[illegible] سے ہی مخاطب ہوئی "واہ۔ واہ۔ یہاں کے در و دیوار سے ا[illegible] دولت کی خوشبو آنے لگی ہے۔"

"اور یہ خوشبو تمہیں بہت پسند ہے" آفاق گویا بے ساختہ بولا۔

"مجھے نہیں، سبھی کو پسند ہے" ستارہ نے گہری سنجیدگی سے تسلیم کی۔ آفاق کو خاموش دیکھ کر وہ مسکرادی پھر اسی شان دلربائی سے آگے بڑھتی چلی گئی۔ دونوں کیبنوں کے وسط میں پہنچ کر وہ رک گئی۔

"کس طرف ؟" اس نے پوچھا۔

"ادھر" آفاق نے میرے کیبن کی طرف اشارہ کیا اور وہ نیلگوں شیشے کا دروازہ کھول کر اندر پہنچ گئی۔ اس نے یہ انتظار نہیں کیا کہ ہم میں سے کوئی اسے بیٹھنے کے لئے کہے۔ اس نے خود ہی میری ریوالونگ چیئر کے عین مقابل، میز کی دوسری طرف ملاقاتیوں والی کرسیوں میں سے ایک منتخب کی اور اسی مخصوص تمکنت کے ساتھ بیٹھ گئی جیسے کوئی ملکہ اپنے درباریوں میں جلوہ افروز ہوئی ہو۔

اس کے ساتھ آنے والا لڑکا جس نے اس کا بیوٹی بکس اٹھایا ہوا تھا، باہر ریسپشن پر ہی صوفے پر بیٹھ گیا۔ بڑا تربیت یافتہ لڑکا تھا۔ میں اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ آفاق میرے بائیں ہاتھ پر تھا۔

میں نے ایک بار پھر ستارہ کی طرف بغور دیکھا کہ کہیں میں اسے پہچاننے میں غلطی تو نہیں کررہا؟ کہیں میری بے مثل یادداشت میرے ساتھ مذاق کرنے پر تو نہیں تل گئی؟ اسی لمحے اس نے میری طرف دیکھا اور ہماری نظریں جیسے ایک دوسرے میں الجھ کر رہ گئیں۔ اس کی آنکھوں میں بھی برق سی کوندی اور جیسے ماضی کے کھنڈر میں بکھرے ہوئے یادوں کے سارے ہی موتی جھلملا اٹھے۔ ایک ایک نقش کہن عریاں ہوگیا۔ بھولی بسری سب باتوں کی کڑیاں جیسے اسی ایک لمحے میں مل گئیں۔

وہ بھی حیرت کے اس جھٹکے سے جلد سنبھل گئی۔ بالکل اسی طرح جس میں سنبھل گیا تھا۔ آفاق جو ہمارے اتنا قریب تھا، نہیں جان سکا کہ شناخت کے اس ایک لمحے میں ہمارے وجود کس کس طرح اندر ہی اندر اتھل پتھل ہوئے، احساسات پر کیسا زلزلہ گزرا اور رگ وپے میں کیسی قیامت مچی۔ بظاہر تو ہم پُرسکون ہی رہے۔ ان پہاڑوں کی طرح جن کے اندر آتش فشاں مچلتے ہیں۔

پھر ستارہ کے ہونٹوں پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ طلوع ہوئی۔ میں بھی مسکرادیا۔

"تو یہ تم ہو" وہ کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے گہری سانس لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئی بولی۔

"ہاں... اور یہ تم ہو" میں نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہ ہنس دی۔ زندگی سے بھرپور ہنسی تھی اس کی۔ جیسے وہ اس صورت حال سے بہت محظوظ ہورہی ہو "تم تو بہت ہی غضب کی چیز ہوگئی ہو لالی!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اور تمہیں بھی تو وقت نے ہیرے کی طرح تراش دیا ہے افضل!" وہ ترکی بہ ترکی بولی۔

آفاق نے الجھن آمیز سی نظروں سے یکے بعد دیگرے ہماری طرف دیکھا پھر ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں بولا "آپ دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟"

"بہت اچھی طرح" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"پھر تو آپ ہر بات خود ہی کرسکتے ہیں۔ میرے خواہ مخواہ ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ آدمی بلاشبہ ذہین تھا۔

"میری ضرورت محسوس ہو تو بلا لیجئے گا" وہ جاتے جاتے ایک لمحے کے لئے دروازے پر رک کر بولا۔

اس کے جانے کے بعد چند لمحے سکوت طاری رہا۔ پھر ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے جیسے گمشدہ رفاقتوں کے خزانے تلاش کررہے ہوں۔ وہ ہاتھوں کی مخروطی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھیں خوابناک سی دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید وہ خواب ہی دیکھ رہی تھی۔ ان جنت نشان جزیروں کے خواب جنہیں ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔

میں چشم تصور سے گندمی سی رنگت والی اس خانہ بدوش لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو پتھر توڑتی تھی، مٹی ڈھوتی تھی یا اسی طرح کا کوئی اور محنت مزدوری کا کام کرتی تھی۔ سجلو کنسٹرکشن کمپنی جہاں پل تعمیر کررہی تھی وہاں قریب ہی ایک میدان میں وہ اپنے قبیلے کے دیگر لوگوں کے ساتھ ایک بوسیدہ سے خیمے میں مقیم تھی۔

پھر مجھے اس کا وہ لحیم شحیم اور خوفناک صورت باپ یاد آیا جو خیمے میں پڑا اینڈ تا رہتا تھا یا پھر دوسری جنگ عظیم کے زمانے کی ایک بندوق کندھے سے لٹکائے پھرتا تھا جو نہ جانے کب سے فائر کرنا بھول چکی تھی۔

مجھے وہ لمحے یاد آئے جو میں اور وہ لڑکی زندگی سے چرا لیا کرتے تھے۔ میں سمجھتا کہ میں لالی کے باپ سے بچ بچا کر لالی سے ملتا ہوں اور اپنی ہوشیاری کی بدولت ان ملاقاتوں سے من چاہے انداز میں مستفید ہوتا ہوں۔ بہت بعد میں جاکر مجھے معلوم ہوا کہ باپ تو اس کھیل میں شریک تھا اور بیٹی کے لئے میں محض ایک احمق سا عاشق تھا جس سے وہ پیسے بٹور رہی تھی۔ کمپنی کے حساب میں گھپلا کر کر کے میں نے انہیں خوب عیش کرائی تھی اور میری بدولت اچھی خاصی پونجی بنالی تھی انہوں نے۔

مجھے اس وقت اس بات کا صدمہ نہیں تھا کہ لالی مجھ سے رقمیں ٹھگتی رہی تھی۔ دکھ تو اس بات کا تھا کہ اسے مجھ سے کوئی عشق وغیرہ نہیں تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ وہ مجھ پر مرتی ہے مگر جب میرے پاس رقمیں آنا بند ہوئیں اور الٹا میرے پھنسنے کا خطرہ پیدا ہوا تو اس نے اس صفائی سے مجھ سے دامن چھڑایا اور اس ڈھٹائی سے مجھے دھتکارا کہ میں نے اپنے آپ کو نہایت نچلے درجے کے الوؤں کا جدِ امجد محسوس کیا۔

وہ اس وقت اس میلے کچیلے اور پیوند زدہ خیمے میں رہ کر اتنا کچھ سیکھ چکی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب تو وہ جانے کیا شے بن چکی ہوگی۔ اس کی ظاہری شخصیت میں بھی بڑی تبدیلیاں آئی تھیں۔ رنگت خاصی نکھر آئی تھی، وہ سلوناپن نہیں رہا تھا۔ نوجوانی کی وہ تپش جو اس زمانے میں اس کے گرد ہالا بنائے رکھتی تھی اور فاصلے سے بھی محسوس کی جاسکتی تھی، اب رخصت ہوچکی تھی۔ مگر اس کی جگہ جس طرح وقت نے اس کے نقوش اور خدوخال کو تراشا تھا اس سے کچھ اور ہی طرح کی خوبصورتی اور کشش پیدا ہوگئی تھی۔ پہلے وہ سرما کی دھوپ تھی تو اب گرما کی چاندنی۔

وہ بھی ایک ٹک میری طرف دیکھے جارہی تھی۔ شاید وہ بھی چشم تصور سے میری جگہ سجاد کنسٹرکشن کمپنی کے اس شعلہ صفت اور نوجوان ٹائم کیپر کو دیکھ رہی تھی جو سب کی آنکھ بچاکر، موقع ملتے ہی اس کے خیمے میں آگھستا تھا۔

"لالی سے ستارہ بننے کے لئے تم نے یقیناً بہت طویل سفر کیا ہوگا" بالآخر میں نے مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

"یقیناً۔ تمہارے اندازوں سے کہیں زیادہ طویل سفر۔ اور صبر آزما بھی" وہ یادوں کی بھول بھلیوں سے نکلتے ہوئے خوشگوار لہجے میں بولی "اور تم نے بھی تو ایک معمولی ٹائم کیپر سے ایک بہت بڑا سیٹھ اور فلمساز بننے تک بہت طویل سفر طے کیا ہوگا۔"

"ظاہر ہے" میں نے تسلیم کیا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "فلمساز تو تم نے مجھے اس دفتر میں بیٹھے دیکھ کر سمجھ لیا۔ لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں کوئی سیٹھ وغیرہ قسم کی چیز بھی ہوں؟"

"ظاہر ہے کہ جو باہر کی دنیا سے یکدم بڑے ٹھاٹ باٹ سے فلمی دنیا میں وارد ہوتا ہے وہ کہیں اور سے ہی دولت کما کر آیا ہوتا ہے اسی لئے وہ سیٹھ ہی قسم کی کوئی چیز ہو سکتا ہے" اپنے چمکدار اور ہموار دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولی "ویسے تمہارے بارے میں یہ بات میں محض مفروضے کے سہارے نہیں کہہ رہی۔ میں نے بہت اونچے درجے کے کاروباری حلقوں میں تمہارے تذکرے سنے تھے۔ بہت بزنس ہے تمہارا اور بیشتر ایکٹرسوں کو شہر کے بڑے دولت مندوں کے بارے میں عموماً خاصی معلومات ہوتی ہیں۔ مخواہ کی... غیر ضروری سی معلومات۔ جو بعض اوقات بڑی کارآمد ثابت ہوتی ہیں" اس نے مترنم سا قہقہہ لگایا "میں نے سنا تھا کہ اس شہر میں محمد افضل چوہدری بھی ہے ایک۔ بہت آدمی۔ جو نظروں میں بھی کھب جاتا ہے۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ تم ہی ہوگے" وہ مخروطی انگلی سے میرے سینے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک بار پھر ہنس دی۔

اس کے ناخنوں پر عنابی رنگ کی نیل پالش تھی۔ اس کے ہاتھ اس وقت بھی گداز تھے جب وہ پتھر توڑتی تھی۔ اب پہلے کی نسبت کچھ بھرے بھرے سے لگ رہے تھے اور نظروں ہی نظروں میں یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ان کی نرمی و گداز میں اضافہ ہوچکا ہے۔

پھر اس نے ہینڈ بیگ کھول کر غیر ملکی سگریٹوں کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ ہولڈر میں لگانے کے بعد اس نے مجھے بھی سگریٹ آفر کی۔ میں نے پیکٹ سے سگریٹ لیتے ہوئے کہا "میں سگریٹ نہیں پیتا۔ لیکن جب کوئی خاتون خصوصاً تم جیسی خاتون آفر کرے تو خواہ مخواہ ہی پینے کو جی لگتا ہے۔"

وہ ہنس دی۔ پھر اس نے اپنی اور میری سگریٹ طلائی لائٹر سے سلگائی اور ایک طویل کش لے کر دھواں میرے چہرے پر پھینکتے ہوئے بولی "عادی میں بھی نہیں لیکن یونہی کبھی کبھی اپنی برائیوں میں ایک برائی کا اضافہ کو جی چاہتا ہے۔ ویسے شکر ہے کہ میں عادی کسی بھی نہیں ہوں۔"

"تمہارے گرانڈیل قسم کے والد بزرگوار کا کیا حال ہے؟" میں نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لے کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میرا باپ...." وہ عجیب سے انداز میں ہنس دی "اب بے چارہ گرانڈیل نہیں رہا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا ہے۔ نشوں نے اس کو بالکل تباہ کر کے رکھ دیا۔ شراب، چرس، افیم، راکٹ، کچھ بھی تو نہیں چھوڑتا وہ۔ میں اسے جتنا سمجھا سکتی تھی سمجھایا۔ ان چیزوں سے بچانے کی جتنی کوشش کر سکتی تھی وہ میں نے کی۔ ہر پابندی لگا کر دیکھ لی۔ تنگ آکر میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ ہم ایک دوسرے کی زندگی میں کوئی مداخلت نہیں کرتے۔"

"بہت افسوس ہوا سن کر۔ وہ بڑا بے مثل قسم کا باپ ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہارے لہجے میں چھپا ہوا خفیف سا طنز بجا ہے" وہ ہموار لہجے میں بولی اور میں ایک بار پھر دل ہی دل میں اس کی دیگر خوبیوں کے ساتھ اس کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو میرے لہجے میں چھپے ہوئے طنز کو شاید ہی محسوس کر پاتی۔

وہ سگریٹ کا کش لے کر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "تم اپنے تجربے کی روشنی میں چاہے اسے بے غیرت سمجھو یا لالچی لیکن میرے خیال میں وہ نہ بے غیرت ہے نہ لالچی۔ اسے سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ بظاہر ایک جاہل، ان پڑھ اور سیدھا سا آدمی ہے لیکن درحقیقت اس کا ذہن کسی دانشور، مفکر یا فلسفی سے زیادہ گہرا ہے۔ اسے سمجھنے کے لئے ایک مدت چاہئے۔ میرے لئے وہ واقعی ہمیشہ ایک عظیم اور بے مثل باپ رہا ہے۔ مجھے اس کو برباد ہوتے دیکھ کر شدید دکھ ہوتا ہے۔ لیکن اب میں اس کے معاملے میں تھک گئی ہوں۔ میں خود جس تیزی سے اوپر آرہی ہوں اس سے میرے اپنے بکھیڑے اتنے بڑھتے جارہے ہیں کہ ان سے نمٹنے کے لئے فولاد کے اعصاب چاہئیں۔"

"اچھا چھوڑو ان اداس کردینے والی باتوں کو" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ آفاق تمہیں کہاں ملا تھا؟"

"ہیرا منڈی میں۔ کوٹھے پر" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "بعض لڑکیوں کو تو حالات اور مجبوریاں دھکیل ڈال کر گھسیٹتی ہوئی وہاں تک لے جاتی ہیں۔ اور مجھ جیسی بعض لڑکیاں دولت کا تعاقب کرتی ہوئی اپنی تمام تر چالاکیوں کے باوجود خود بخود ہی وہاں پہنچ جاتی ہیں۔ ویسے مجھے اس کا کوئی خاص افسوس نہیں ہے۔ ظاہر ہے میں کوئی ایسی پاکباز لڑکی تو تھی نہیں۔ جیسی تھی وہ تم جانتے ہو۔ میں جتنا عرصہ بھی کوٹھے پر رہی بڑی شان سے رہی۔ افسوس تو مجھے بس اپنے باپ کا ہے۔ جب تک ہم غریب اور خانہ بدوش تھے، دنیا کی ٹھوکروں میں ادھر ادھر لڑھکتے پھرتے تھے تب تک وہ بڑا دھڑلے کا آدمی تھا اور جب ہماری کچھ تقدیر پلٹی، دنیا سے لطف اندوز ہونے کا وقت آیا تو وہ اس دنیا سے ہی غافل ہوگیا۔ اس نے نشوں کے سہارے اپنی ایک الگ ہی دنیا بسالی۔ اور اب وہ اپنی اسی نامعلوم دنیا میں مگن رہتا ہے۔"

"آفاق تمہیں کوٹھے پر دیکھتے ہی تم پر مہربان ہوگیا تھا؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"تقریباً یہی ہوا تھا" وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ مت سمجھنا کہ میں نے اس پر نوازشات کا کوئی سلسلہ شروع کیا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ اپنے دو تین ساتھیوں کے ہمراہ میرے کوٹھے پر گانا سننے آیا تھا۔ حالانکہ گانا وانا مجھے کوئی خاص نہیں آتا تھا پھر بھی اچھے خاصے باذوق لوگ میرے کوٹھے پر آتے رہتے تھے۔ آفاق اس روز تھوڑی سی پیے ہوئے بھی تھا۔ بڑے خوشگوار موڈ میں تھا۔ گانے کے دوران اس نے مجھ سے دو چار باتیں کیں۔ میں نے اپنی عادت کے مطابق بڑے نپے تلے انداز میں جواب دیا۔ نہ جانے کیوں آفاق کچھ زیادہ ہی پھڑک اٹھا۔ اچانک ہی یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ نشے میں دھت ہے۔ میرا خیال ہے اس پر کوئی تخلیقی دورہ سا پڑا تھا۔ کہ ایک دم اٹھ کر میرے گرد چکر لگانے لگا۔ انگلیوں کی مدد سے چوکور فریم سا بنا کر اس میں میرے چہرے وغیرہ کا جائزہ لینے لگا۔ پھر اپنے ساتھیوں سے بولا "یہ لڑکی اسکرین پر تہلکہ مچادے گی۔ یہ پیدائشی اداکارہ ہے......"

"بالکل صحیح کہا تھا اس نے۔" میں نے لقمہ دیا۔ "بڑا ذہین ہے کمبخت!"

وہ ہنس دی۔ پھر سگریٹ کا کش لے کر ایک بار پھر دھواں میرے چہرے پر چھوڑتے ہوئے بولی۔ "اس نے دوسرے دن مجھے اسٹوڈیو بلایا لیکن میں نہیں گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ مذاق کررہا ہے، شغل کر رہا ہے۔ فلمی دنیا کے چھوٹے موٹے لوگ اس بازار کی لڑکیوں کو اس قسم کے چکر دیتے رہتے ہیں اور اچھی بھلی حرافہ قسم کی لڑکیاں ہیروئن بننے کے چکر میں خوار ہوتی رہتی ہیں۔ کچھ اس فکر میں ہوتی ہیں کہ چھوٹے موٹے رول ہی ملنے لگیں تو ذرا مارکیٹ ویلیو بڑھ جائے۔ زیادہ آسودہ حال قسم کے لوگ ان کے کوٹھے پر آنے لگیں اور وہ انہیں فخر سے بتا سکیں کہ وہ کوئی معمولی قسم کی مغنیہ یا رقاصائیں نہیں بلکہ "فلم سٹار" ہیں۔"

میں مسکرا دیا۔ وہ سگریٹ کو ہولڈر سے نکال کر ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولی۔ "بعض بے چاری واقعی ہیروئن بننے کے خواب دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ بعض ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں اپنی اوقات کا علم ہوتا ہے۔ وہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوتیں اور ان چکروں میں نہیں پڑتیں۔ بعض اچھی خاصی، خوش شکل اور باصلاحیت ہونے کے باوجود شو بزنس میں دلچسپی نہیں لیتیں۔ اپنے حالات یا کسی نامعلوم نفسیاتی وجوہات کے تحت وہ بس خاموشی سے سر جھکائے کولھو کے

ہیں لی طرح کوٹھوں پر ہی دولت سمیٹنے میں لگی رہتی ہیں۔ بعض ایسی ہوتی ہیں جو کسی بھی معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتیں مگران کی مائیں جو عام طور پر ان کی نائیکہ بھی ہوتی ہیں' انہیں لئے ادھر اُدھر پھرتی رہتی ہیں۔"

"تمہارا تعلق ان میں سے کونسی قسم سے تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میری منزل فلم لائن ہی تھی لیکن ابھی میں اس کے لئے کوئی حکمت عملی ہی سوچ رہی تھی کہ آفاق خود ہی مجھ سے آن ٹکرایا۔" اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "دوسرے روز اس نے پیغام بھیجا کہ وہ میرا اسکرین ٹیسٹ لینا چاہتا ہے لیکن میں نہیں گئی۔ اسکرین ٹیسٹ کی آڑ میں بعض لڑکیوں کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اس کی وجہ سے یہ اصطلاح ایک مذاق بن کر رہ گئی ہے۔ مجھے جب آفاق کا پیغام ملا تو میری ساتھی لڑکیوں نے 'حتیٰ کہ میری نائیکہ نے بھی مجھے خوب چھیڑا کہ "جا.... ری .... جا کے اسکرین ٹیسٹ دے آ۔" حالانکہ ہمیں یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ آفاق کوئی نام نہاد قسم کا فلمساز یا ہدایتکار نہیں ہے پھر بھی ہمیں اس کی بات کا یقین نہیں تھا۔ کئی لڑکیوں کے قصے ہمارے علم میں تھے جو اسکرین ٹیسٹ اور نہ جانے کون کون سے ٹیسٹ نہ جانے کن کن لوگوں کو دے کر واپس آگئی تھیں اور ان کے حصے میں صرف وعدے ہی آئے تھے۔"

"اور وعدے بھی مشکوک قسم کے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"مشکوک کیا' جھوٹے ہی سمجھو۔" وہ پہلو بدل کر بولی۔ "کافی عرصہ پہلے کا ایک قصہ بھی ہمارے علم میں تھا۔ ایک صاحب تھے جو ہر تھوڑے عرصے بعد اخبار میں اشتہار دے دیتے تھے کہ ایک فلم کے لئے نئے چہروں کی ضرورت ہے۔ ڈاک کے ڈھیر لگ جاتے تھے تو پھر سب خواہش مندوں کو مطلع کر دیا جاتا تھا کہ ان کا اسکرین ٹیسٹ لیا جائے گا جس کا خرچ انہیں ہی برداشت کرنا ہوگا۔ یہ کوئی اتنا زیادہ غیر منصفانہ مطالبہ محسوس نہیں ہوتا تھا اور ہیرو ہیروئن بننے کے خواہش مندان سستے زمانوں میں بھی دو چار سو روپے فی کس بھیج دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے اچھی خاصی رقم جمع ہو جاتی ہوگی۔"

"یقیناً" میں نے خیال ظاہر کیا۔ میں توجہ سے اس کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ یقیناً اس دنیا کی بھیدی ہو چکی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "وہ صاحب مقررہ تاریخوں پر خواہشمندوں کے گروپ بنا کر انہیں کسی ویران مقام پر لے جاتے تھے کہ آؤٹ ڈور شوٹنگ میں اسکرین ٹیسٹ لیا جائے گا۔ وہاں امیدوار بے چارے باری باری کیمرے کے سامنے بڑے جوش و خروش سے ڈائیلاگ بولتے رہتے تھے۔ لڑکیاں تو بڑے بڑے متاثر کن رقص بھی پیش کرتی تھیں۔ ان بے چاروں کو یہ معلوم ہی نہیں کہ کیمرے میں ریل تک نہیں ہے۔ کرائے کا کیمرہ یو نہی چل رہا ہوتا تھا۔ تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ایک عرصے تک یہی دھندا کرنے والے وہ صاحب آج کل بڑے فلمساز اور ہدایت کار ہیں۔ اپنے پاس آنے وا[لے بے] شمار امیدواروں میں سے تو معلوم نہیں انہوں نے کسی کو ہیروئن بنایا یا نہیں تاہم خود وہ انہی کے پیسے سے فلم میں کامیاب ہو ہی گئے۔"

"حیرت ہے؟" میں نے پلکیں جھپکائیں۔

"میں بتانے اصل میں یہ لگی تھی کہ کسی زمانے میں سانولی سی لڑکی بھی اسکرین ٹیسٹ دینے ان صاحب [کے پاس] پہنچی تھی۔" ستارہ بولی۔ "اس روز راوی کے کنار[ے] سنسان مقام پر "شوٹنگ" ہو رہی تھی۔ حسب معمو[ل] کیمرہ چل رہا تھا اور وہ محترمہ بڑے جوش و خروش سے [رقص] کر رہی تھیں کہ حقیقی شوٹنگ کے سلسلے میں ایک نا[مور] ہیرو صاحب وہاں پہنچ گئے جن کا وہ عروج کا زمانہ تھا۔ ا[ب] موصوف ریٹائر ہو چکے ہیں۔ اس زمانے میں وہ صرف ہیرو ہی نہیں تھے' عملی زندگی میں بھی ہیرو نظر آنے کی کوشش کرتے تھے۔ مطلب یہ کہ وہ حضرت بدمعا[شی میں] بھی پاؤں رکھتے تھے۔ اس روز بھی ان کے ساتھ یونٹ کے علاوہ دو تین چمچے بھی تھے۔ موصوف کی نظر رقص کرتی ہوئی اس سانولی سی لڑکی پر پڑی وہ اپنی شوٹنگ کو بھول گئے۔ وہ حضرت اس حد تک جذباتی ہوئے کہ [لڑکی] کو اٹھا کر اپنی کار میں ڈالا اور فرار ہو گئے۔"

"اوہ......" میں نے ہلکی سی سیٹی بجائی۔

"تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ وہ لڑکی بعد میں بہت بڑی ہیروئن بن گئی۔" ستارہ نے یہ کہہ کر نئی سلگائی۔

"وہ کس طرح؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"دراصل ان صاحب نے جنہوں نے وہ نام نہاد [فلم] بنائی ہوئی تھی' اس واقعے سے ذاتی طور پر بڑی زبردس[ت توہین] محسوس کی۔ مانا کہ ہیرو صاحب کے سامنے ان کی کوئی [حیثیت] نہیں تھی لیکن بہرحال ان کے پاس اتنا تو تھی جو خا[صی] ہوئی تھی۔ دو ایک اخباروں میں ان کے تھوڑ[ے بہت] تعلقات تھے۔ وہ وہاں جا کر روئے پیٹے۔ اخباروں کو چٹخارے دار خبر ہاتھ آگئی۔ دوسرے دن بڑی بڑی سر[خیاں] لگئیں کہ نامور ہیرو صاحب نے دن دہاڑے ایک نو آمو[ز لڑکی] کو اغوا کر لیا۔ معاملہ کچھ سنگین ہو گیا۔ تھانے کچہری آگئی۔ بڑے ہیرو صاحب نے لڑکی سے کہا کہ اگر و[ہ بیان] میں کہہ دے کہ اسے اغوا نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ خود ا[پنی مرضی سے] ہیرو صاحب کے ساتھ ایک اور جگہ شوٹنگ دیکھنے گئی [تھی] تو وہ اسے لازماً فلموں میں کام دلوا دیں گے۔ لڑکی نے یہ جوا [کھیلنے] کا فیصلہ کر لیا۔ ویسے بھی اس نے سوچا ہوگا کہ جو ہونا تھا وہ [ہو] ہی چکا۔ اس نے ہیرو صاحب کی بات پر عمل کیا اور پھر ہیرو [صاح]ب نے واقعی اسے ایک فلم میں کام دلوا دیا۔ ایک کلب [ڈانس]ر کا رول تھا۔ ظاہر ہے اس رول میں اداکاری وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی مگر اس چھوٹے سے رول نے ہی اسے [کہیں] سے کہیں پہنچا دیا۔ بعد میں وہ صف اول کی ہیروئن بنی اور ہیرو صاحب سے طویل عرصے تک اس کا عشق بھی چلا۔"

"بہت خوب" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اس قسم کے واقعات کی وجہ سے ہمارا کسی خوش فہمی [میں] مبتلا ہونے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔" ستارہ اصل موضوع پر [آ]تے ہوئے بولی۔ "اور پھر آفاق نے مجھے ہیروئن لینے کا ارادہ [ظا]ہر کیا تھا۔ ایک اُردو فلم میں جبکہ اس وقت میرا اُردو کا لہجہ بھی [در]ست نہیں تھا۔ اس لئے میں کچھ زیادہ ہی بے یقینی میں مبتلا [تھی]۔ بھلا کوئی اتنا بڑا رسک کیسے لے سکتا ہے؟ لیکن بعد میں [مجھے اس]کا اندازہ ہوا کہ وہ واقعی اپنی پیشکش کے بارے میں بے حد [سنجی]دہ تھا۔ وہ کئی بار خود آیا اور سمجھا بجھا کر مجھے ساتھ لے گیا۔ [میر]ی نائیکہ بھی شروع میں ساتھ جاتی رہی۔ کچھ عرصہ پہلے [اس] کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"پہلی فلم میں آفاق نے تم پر بہت محنت کی ہوگی؟" میں [نے] کریدا۔

"کوئی خاص نہیں۔ میں بہت تیزی سے ہر چیز سیکھ لیتی [ہو]ں۔" وہ بولی۔ "لیکن میں یہ ضرور کہوں گی کہ اس نے بہت رسک ضرور لیا۔ میری خاطر اپنے فنانسر سے بھی لڑا اور اپنی [ا]ن کوششوں کا کوئی خراج وصول کرنے کی بھی اس نے [کو]شش نہیں کی۔ اپنے کام کے ساتھ وہ بہت مخلص ہے۔"

"میرا خیال ہے وہ صرف کام سے ہی نہیں تم سے بھی [مخلص] ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"خلوص میرے دل میں بھی اس کے لئے کافی ہے لیکن [اس] کے ساتھ ایک مسئلہ یہ ہے کہ وہ خاصا جذباتی آدمی ہے" وہ [ایک] طویل کش لے کر بولی "حالانکہ وہ ایک طویل عرصے سے [فلم] انڈسٹری میں ہے۔ اب تک اسے جذباتیت سے نجات [حاص]ل کر لینی چاہئے تھی۔ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ [یہاں] تو صرف سیلولائیڈ کے فیتے پر جذبات کی تجارت ہوتی ہے۔ [لوگوں نے] اپنے حقیقی جذبات تو سب نے اپنی ذات سے نکال کر نہ [جانے] کہاں رکھ دیئے ہیں۔"

"خیر۔ ایسی بھی کوئی بات نہیں" میں نے مسکراتے [ہو]ئے کہا "ہر جگہ ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ تمہارا [کی]ا خیال ہے کہ یہاں کسی کی محبت میں مبتلا ہو کر راتوں کو تکیے میں منہ چھپا کر رونے والی عورتیں موجود نہیں ہوں گی؟ یہاں کسی کے لئے سب کچھ قربان کر دینے والے مرد نہیں ہوں گے؟ بات صرف یہ ہے کہ تم خود زندگی کے راستے پر بہت آگے نکل گئی ہو۔ وقت سے پہلے تم نے سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ لہٰذا جذبات تمہاری زندگی سے نکل گئے ہیں۔"

"کیا واقعی تمہارا میرے بارے میں یہ خیال ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں ہلکے گلابی ڈورے اور ہونٹوں پر پُراسرار سی مسکراہٹ تھی۔

"نظر تو یہی آتا ہے۔" میں نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

"خیر..." وہ بالوں میں انگلیاں پھیر کر سر جھٹکتے ہوئے بولی۔ "میں فی الحال تم سے اس معاملے میں بحث نہیں کروں گی کہ میری ذات میں جذبات کو دخل ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو کس حد تک۔ میں تو آفاق کی بات کر رہی تھی۔ تقریباً سبھی ہیروئنوں کے ساتھ کام کیا ہے اس نے۔ کسی اور کے بارے میں تو کبھی جذباتی نہیں ہوا۔"

"انسان ہر ایک کے ساتھ تو جذباتی نہیں ہوتا نا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جذباتی تو وہ تبھی ہوتا ہے جب کوئی ایسی ہستی نظر آتی ہے جس کے بارے میں دل گواہی دیتا ہے کہ یہی تو ہے وہ جس کی عمر بھر سے تلاش تھی۔ میرا خیال ہے کہ آفاق کے لئے وہ ہستی تم تھیں۔ وہ تم پر پہلی نظر میں ہی عاشق ہو گیا تھا۔"

"لیکن میں اس پر عاشق نہیں ہو سکتی" وہ صاف گوئی سے بولی "اس کی ایک خاصی معقول سی بیوی ہے' تین خاصے بڑے بچے ہیں۔"

"تو کیا بے چارے شادی شدہ آدمی کو کسی پر عاشق ہونے کا حق حاصل نہیں؟" مجھے اس کے انداز پر ہنسی آگئی۔

"میں نے یہ کب کہا؟" وہ نہایت معصومیت سے بولی۔

"میری طرف سے اسے پوری پوری اجازت ہے کہ وہ مجھ پر دل

و جان سے عاشق رہے۔ میں ہرگز برا نہیں مناؤں گی لیکن جواباً وہ میری طرف سے عشق کی توقع نہ رکھے۔ اگر میرا دل کہتا تو میں بھی ضرور اس پر عاشق ہو جاتی۔ مگر میرے دل نے ابھی تک مجھے ایسا کوئی مشورہ نہیں دیا۔ اور اسے دھوکا دینے کو بھی میرا دل نہیں چاہتا۔ اسی لئے میں پچھلے دنوں اس سے دور ہوتی چلی گئی تھی۔ ادھر وہ کاروباری طور پر ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کے لوگ اس قسم کے حالات میں زیادہ جذباتی ہوئے رہتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات سے ان کے دل کو ٹھیس لگ جاتی ہے۔ ایسے میں اس سے دور رہنا ہی اس کے حق میں بھی بہتر تھا اور میرے حق میں بھی۔ مجھے معلوم ہے کہ اس نے مجھے خود غرض' بے حس اور نہ جانے کیا کیا سمجھا۔ اور کہا ہو گا۔ شاید دل ہی دل میں اور عین ممکن ہے کہ کسی کے سامنے یہ بھی کہا ہو کہ آخر رہی نا طوائف کی طوائف ....."

"نہیں۔ کم از کم مجھ سے اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میرے سامنے اس نے تمہارے بارے میں کوئی خاص جذباتیت کا مظاہرہ بھی نہیں کیا بلکہ اس کے رویے سے مجھے تو اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کبھی تمہارے بارے میں اتنا جذباتی رہا ہے یا سنجیدگی سے تم پر عاشق رہا ہے۔"

"کبھی وہ تو بیوی بچوں کو چھوڑنے پر تیار پھر رہا تھا۔" ستارہ بولی۔

"حیرت ہے ....." میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "بہر حال اب تو یوں لگتا ہے کہ کام کے سوا اسے کسی بھی چیز سے دلچسپی نہیں رہی۔"

"میرا اس سے دوری اور رکھائی اختیار کرنا اس کے حق میں بہتر رہا ہے۔ اور اس عرصے میں اس نے گویا دوسرا جنم لے لیا ہے" ستارہ بولی "مجھے خبر ملی کہ اسے کوئی بہت تگڑا فنانسر مل گیا ہے اور وہ بڑے زور شور سے دوبارہ فلمسازی شروع کرنے والا ہے تو میں دوبارہ اس سے ملنے کا پروگرام بنائے بغیر نہ رہ سکی۔ فلموں کی میرے پاس کمی نہیں ہے اور اگر میں ہر ایرے غیرے کی فلم پکڑنا شروع کردوں تو پھر میرے دروازے پر فلمسازوں کی بہت طویل قطار لگ جائے لیکن آفاق سے میں نے خود ہی دوبارہ رابطہ قائم کیا تو اس سے وہ یہی سمجھ رہا ہو گا میں زیادہ سے زیادہ فلمیں حاصل کرنے کی ہوس میں مبتلا ہوں اور مطلب کی خاطر دوبارہ اس کی طرف آئی ہوں۔ حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ میں اس کی فلم کو دوسرے بہت سوں کی فلموں ... ترجیح دینا چاہتی ہوں۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی۔ اور ایک وجہ ... یہ بھی ہے کہ اس کمبخت کو واقعی فلم بنانے کا سلیقہ ہے ... اس کی فلم میں کام کرنے کے بعد انسان کو اپنے

"اس کا مطلب ہے اس میدان کے لئے مجھے ٹھیک آدمی مل گیا ہے؟" میں نے طمانیت سے کہا۔

"آدمی کیا تمہیں ہیرا مل گیا ہے ہیرا" وہ بولی۔

"اور یہ ہیرا خود ہی چل کر میرے پاس آیا تھا" میں

"اس معاملے میں تم ہمیشہ خوش قسمت رہے ہو" شریر سے انداز میں مسکرائی "بڑے سے بڑے حالات میں تمہیں ہیرے میسر آجاتے ہیں۔ جیسے اس دور افتادہ ... کے ایک میلے کچیلے خیمے میں تمہیں میں مل گئی تھی۔"

"ہاں ... واقعی ....." میں ہنس دیا۔ "تم تو کچھ زیادہ ... خش قسم کا ہیرا تھیں لیکن ناتراشیدہ۔ تراش خراش ... اب مکمل ہوئی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ تم وہی جاہل ... اور خانہ بدوش لڑکی ہو۔"

"دیکھو ..... یہ باتیں تنہائی میں تو ٹھیک ہیں۔ کہ... میں بیٹھ کر اور خصوصاً کسی اخبار نویس کے سامنے تو ا... بات کبھی مت کرنا" وہ مسکراتے ہوئے بولی "تم ... بہت سے اخبارات و رسائل میں شائع ہونے والے انٹرویوز نہیں پڑھے۔ ان کے مطابق میرا تعلق بہاو... ایک خاصے معزز گھرانے سے ہے جہاں میر... ٹھیکیداری وغیرہ کرتے تھے۔ چھوٹی موٹی سڑکیں اور موٹے پل وغیرہ تعمیر کرنے کے ٹھیکے لیا کرتے ... شوٹنگ دیکھنے لاہور آئی تھی جہاں ایک فلم کے سیٹ ... صاحب نے مجھے دیکھ لیا اور فوراً اپنی اگلی فلم میں کام ... پیشکش کردی۔ وغیرہ وغیرہ۔"

"اوہ ..... ہاں ....." میں نے ہنستے ہوئے کہا "مجھے یا... کہ میں نے اس قسم کا تمہارا کوئی انٹرویو پڑھا تھا ... تصویریں بھی دیکھیں تھیں۔ لیکن ظاہر ہے تصویر... بھی تم پر زبردست ملمع چڑھا ہوا تھا اور تحریر میں بھی ... مجھے گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ تم لالی ہو۔ بہر حال ... پریشان نہیں ہونا چاہئے ۔ میں اس میدان میں ... ہوں لیکن مجھے یہاں کے آداب معلوم ہیں۔ زمان... نے ہی بہت کچھ نہیں سکھا' ہم نے بھی سیکھا ہے۔"

"وہ تو نظر آرہا ہے" وہ فوراً بولی۔ پھر اس ... مخصوص ادائے بے نیازی سے بالوں کو جھٹکا دیا "م... کر رہی تھی۔ شو بزنس کے تقاضوں کے مطابق م... بھی کہتی رہوں اور میں نے خواہ اپنا کیسا بھی امیج بنا لیا ... دوسری اداکاراؤں کی طرح اپنی اصلیت بے نقاب ہو... اندیشے سے خوفزدہ نہیں رہتی۔ انڈسٹری کے لوگو... تک کی کہانی تو معلوم ہی ہے۔ اگر سب لوگوں کو ... معلوم ہو جائے تب بھی مجھے کوئی خاص پروا نہیں ...

...نے خوفزدہ ہونا چھوڑ دیا ہے۔"

"مجھے اندازہ ہو چکا ہے" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہم نے اپنی اور آفاق کی ...ات پر تو اتنی دیر بکواس کرلی۔ کام کی کوئی بھی بات نہیں ہوئی۔"

"دراصل ہم ایک زمانے کے بعد ملے ہیں۔ نہ جانے کتنے انقلابات سے گزر کر آج پھر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہیں۔ جانے اس میں تقدیر کی کتنی مصلحت ہے۔ مانا کہ ...م دنوں کا وقت بہت قیمتی ہے لیکن اتنے برسوں کی روداد کے لئے اگر ہم نے چند منٹ ضائع کر ہی لئے تو کیا ہوا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا" میں نے کہا "مجھے تو آفاق کا خیال آگیا تھا۔ وہ سوچ رہا ہو گا کہ ہم نہ جانے کن بکھیڑوں میں ...ڑ گئے۔ ویسے بائی دی وے ..... بڑا سوز اور گہرائی آگئی ہے ...ارے لہجے میں۔"

"ذات میں بھی آگئی ہے لیکن وہ ابھی تم محسوس نہیں کرسکو گے۔" وہ انہی مخمور سی آنکھوں سے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "ویسے بائی دی وے ...... تم واقعی بڑے ...یک ٹھاک کاروباری آدمی ہو گئے ہو۔"

"دفتر میں بیٹھتا ہوں تو کاروبار خود بخود ہی مجھ پر سوار ہو جاتا ہے۔" میں نے کہا "دفتر سے اٹھنے کے بعد میں کاروبار کو بھول جاتا ہوں۔ بشرطیکہ کوئی ایمرجنسی نہ آن پڑے۔ تمہیں میرے بارے میں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ میں کتنا سوشل آدمی ہوں؟ مختلف سماجی حلقوں سے کیسے مراسم ہیں میرے۔"

"ہاں۔ ... کچھ اڑتی اڑتی سی خبریں سنی تھیں" وہ مبہم سے لہجے میں بولی۔

میں نے فی الحال اس کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں سمجھا اور اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ "کام کی بات شروع کرتے ہوئے سب سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ ہم آفاق کی وہ دونوں فلمیں نئے سرے سے بنا رہے ہیں جو مظفر رشید کی موت اور پھر آفاق کے حالات کی وجہ سے ادھوری رہ گئی تھیں۔ ان میں سے چند ریلیں اگرچہ اب بھی جزوی طور پر استعمال ہو سکتی ہیں لیکن میں نے سوچا ہے کہ فلمیں نئے سرے سے ہی بنائی جائیں۔ دونوں کی ہیروئن ظاہر ہے تم ہی ہو گی۔ تمہارا معاوضہ آج کل کیا جا رہا ہے؟"

"معاوضہ مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف ہوتا ہے۔ لیکن تم معاوضے کی بات چھوڑو" وہ بے پروائی سے سر جھٹک کر بولی "تمہارے ذہن میں اب بھی اسی لالی کا تصور ہے جو پیسے کے لئے سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت جوں جوں بڑھتی جاتی ہے توں توں اس کی ہوس بھی بڑھتی جاتی ہے لیکن مجھ میں ایک عجیب انقلاب آیا ہے۔ میں یہ احمقانہ دعویٰ نہیں کروں گی کہ مجھ میں دولت کی طلب ختم ہو گئی ہے لیکن یہ ضرور کہوں گی کہ اب کچھ قرار سا آگیا ہے۔ اطمینان سا ہو گیا ہے کہ دولت اپنی دسترس میں ہے۔ رفتہ رفتہ آہی جائے گی۔ جس زمانے کا تصور تمہارے ذہن میں ہے اس زمانے میں تو پیسہ ایک خواب تھا۔ اس لئے اس کی ہوس زیادہ تھی۔ اسی لئے ہم اس پر بھوکے کتوں کی طرح جھپٹتے تھے۔ اس کی خاطر روح' جسم' جذبوں اور انا' غرضیکہ ہر چیز کا سودا کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ اب حالت اتنی بری نہیں رہی۔ دوسروں کے ساتھ تو میں اب بھی پیسوں کے معاملے میں بڑی بدلحاظ ہوں لیکن اب تمہارا اور آفاق کا معاملہ ظاہر ہے بہت مختلف ہے۔ تم جو بھی رقم کنٹریکٹ میں لکھ دو گے میں اس پر آنکھ بند کر کے سائن کردوں گی۔ اگر کچھ بھی نہیں دو گے تب بھی کام کروں گی اور شاید ہمیشہ کرتی رہوں' خواہ میری مصروفیات کتنی ہی بڑھ جائیں۔"

"تمہاری ذات میں تو واقعی انقلاب آگیا ہے" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ میں اس کی مخلصانہ پیشکش سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ بڑے آسودہ سے انداز میں مسکرادی۔

"لیکن ہم تمہاری اس پیشکش سے کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تم نے اب تک زیادہ سے زیادہ رقم کا جو کنٹریکٹ سائن کیا ہے ہم تمہیں اس سے دس ہزار زیادہ دیں گے۔ کیونکہ ہم یہاں ایک بڑا کاروباری ادارہ قائم کر رہے ہیں' دوستوں کے تعاون سے چلنے والا کوئی خیراتی ادارہ نہیں۔ گزارش بس اتنی سی ہے کہ دوستی میں ہمارے کام کو دوسروں کے کام پر تھوڑی سی ترجیح دینا۔ اگر کبھی معاہدوں سے ہٹ کر بھی کچھ تعاون کرنا پڑے تو دریغ نہ کرنا۔"

"یہ تو وقت بتائے گا کہ میں تمہیں اور تمہارے ادارے کو کتنی ترجیح دیتی ہوں" وہ مسکرائی۔

"کہانی تو دونوں فلموں کی تمہیں اچھی طرح معلوم ہو گی۔ کیونکہ ظاہر ہے تم دونوں فلمیں آدھی سے زیادہ مکمل کرا چکی تھیں۔ اس لئے اپنے کردار وغیرہ کے بارے میں تمہیں کچھ جاننے کی ضرورت نہیں۔ اس صورت میں میرا خیال ہے تم ابھی اور اسی وقت کنٹریکٹ سائن کر سکتی ہو؟" میں نے کہا۔

"ظاہر ہے" اس نے کندھے اچکائے "اس کے لئے مجھے کوئی سوچ بچار تو کرنی نہیں ہے۔"

"بہت خوب" میں نے کہا "ہم اس نئے ادارے کی فلم میکنگ کا آغاز انہی دو فلموں سے کر رہے ہیں۔ ویسے میری کوشش ہو گی کہ ہم ایک وقت میں صرف ایک فلم پر ہی توجہ دیں اور اسے مختصر ترین مدت میں مکمل کر کے ایک ریکارڈ قائم

کریں اور اس کے بعد اسی رفتار سے دوسری فلم مکمل کرنے میں جت جائیں۔ میں بہت تیز رفتاری سے کام کرنے کا عادی ہوں۔ یہ تو محض ابتدا ہے جو میں تمہیں اتنے آرام سے بیٹھا نظر آرہا ہوں۔ جب کام کا آغاز ہوجائے گا تب تم مجھے اتنی باتیں کرتے نہیں دیکھو گی۔ اور جب میرے ساتھی میری منشاء کے مطابق کام کرنے کے عادی ہوجائیں گے تو پھر میں تمہیں یہاں شاذ و نادر ہی نظر آیا کروں گا۔ مجھے اپنے دوسرے معاملات کی طرف زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے جن سے مجھے اصل آمدنی ہوتی ہے۔"

پھر میں نے انٹرکام پر آفاق کا نمبر دیا۔ وہ گویا منتظر ہی بیٹھا تھا۔ اس نے فوراً دوسری طرف سے ریسور اٹھایا۔

"آفاق! ستارہ سے میری بات ہوگئی ہے۔ آکر دونوں فلموں کے کنٹریکٹ تیار کرلو اور ستارہ سے سائن کرالو" میں نے کہا۔

"بہت بہتر" اس نے ہموار لہجے میں کہا۔

چند لمحے بعد وہ دو فارم لئے ہوئے میرے کیبن میں آگیا۔ نہایت خوشگوار ماحول میں گپ شپ کے دوران فارم بھرے گئے اور ستارہ نے واقعی اندراجات پر ایک نظر ڈالنے کی بھی زحمت نہیں کی اور سائن کردیئے۔

"خدا ہم سب کو یہ آغاز مبارک کرے۔" میں نے خود ہی اپنے آپ کو دعا دی۔

"آمین۔" ان دونوں نے ایک ساتھ کہا۔

"اب میں چلتی ہوں۔" ستارہ گھڑی دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولی۔ ہم نے وہیں بیٹھے بیٹھے اسے خدا حافظ کہہ دیا اور وہ رخصت ہوگئی۔ کمرے میں ایک مخصوص مہک باقی رہ گئی جو دیر تک اس کی یاد دلاتی رہی۔

اس کے جانے کے بعد آفاق محتاط لہجے میں بولا۔ "سر! آپ ستارہ کو کس زمانے سے جانتے ہیں؟"

"جب تم نے اسے دریافت کیا' اس سے بس ذرا پہلے سے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جن گلی کوچوں میں تمہارا آنا جانا رہا ہے وہاں سے تھوڑا بہت گزر ہمارا بھی رہا ہے۔"

اس نے مزید کچھ نہیں پوچھا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا" اب تم جلد از جلد باقی کاسٹ مکمل کرلو تاکہ اس کے بعد شوٹنگ کا شیڈول تیار کیا جاسکے۔ تمہارے اندازے کے مطابق کاسٹنگ کا کام کب تک مکمل ہو جائے گا؟"

"ایک ہفتے یا زیادہ سے زیادہ دس دن میں" آفاق نے جواب دیا۔

"ویسے تو تم جو مناسب سمجھو وہی کرنا۔ لیکن اگر ہوسکے تو صرف ہیرو کے معاملے میں مجھ سے مشورہ کرلینا۔ تمہارے ذہن میں کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہماری کہانیوں کے لحاظ سے تو مظفر رشید ہی موزوں ترین آدمی تھا اور اس وقت انڈسٹری میں مجھے اس کا کوئی متبا[ل] نظر نہیں آتا۔ ایک نوجوان ہے جو فی الحال ثانوی کردار ادا کر[تا] ہے۔ اگر اسے مسلسل کئی چانس ملیں تو شاید وہ مظفر رشی[د] کی جگہ لینے میں کامیاب ہوجائے لیکن فی الحال ہم اس پر رِ[سک] نہیں لے سکتے۔ کیونکہ اس کے بارے میں میں اس طر[ح] پُراعتماد نہیں ہوں جس طرح میں کسی نئے یا چھوٹے اداکار کو بڑے رول میں کاسٹ کرتے وقت ہوتا ہوں۔" اس نے

"پھر تم نے کیا سوچا ہے" میں نے مختلف الفاظ میں سوال دُہرایا۔

"اگر مارکیٹ ویلیو کے حساب سے دیکھا جائے تو ا[س] وقت سلمان ساہی ٹاپ پر ہے۔ لیکن اسے ڈائریکٹروں [اور] فلمسازوں نے عجیب ڈگر پر ڈال دیا ہے۔ سوائے بے [تحاشا] مار دھاڑ کے اس سے کوئی کام ہی نہیں لیتے حالانکہ وہ بہت [اچھا] ایکٹر ہے۔ بہت ایکسپریشن ہے اس کے پاس بشرطیکہ کوئی [اس] سے کام لے۔ ٹاپ ہیرو بنا دیا گیا ہے اسے۔ میں اسے کاسٹ کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ مار دھاڑ ہماری فلم میں بھی ہے لیکن ساتھ ہی ایکٹنگ اور ایکسپریشن کے بھی زبرد[ست] مواقع موجود ہیں۔ میرا خیال ہے کہ سلمان ساہی خود بھی تبدیلی کو پسند کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ تم اسے کاسٹ کرلو" میں نے کہا" و[یسے] میری ایک تجویز تھی۔ حتمی فیصلہ بہرحال تمہارا ہی ہوگا۔ فلم "مہندی" کی جو کہانی تم نے مجھے سنائی ہے اور جو [فلمیں] میں نے دیکھیں ہیں اس کے لئے تو سلمان ساہی مجھے مناسب محسوس ہوتا ہے۔ البتہ دوسری فلم "چاند دیر[...] آنگن کا اجالا" کے لئے میں راشد کو بہت موزوں محس[وس] کررہا ہوں۔ اس کی میں نے ایک دو فلمیں اور بہت تصویریں دیکھیں ہیں۔ بڑا جاندار ایکٹر ہے..... اور پھر اُرد[و] پنجابی دونوں ہی فلموں میں بڑی مارکیٹ ہے اس کی۔"

"اس کا مطلب ہے ان معاملات پر اچھی خاصی گہری [نظر] ہے آپ کی۔" آفاق بغور میری طرف دیکھتے ہوئے مسکر[ایا]

"آپ اتنے لاعلم معلوم نہیں ہوتے جتنے نظر آتے ہیں" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "خود میرے ذہن [میں] بھی آیا تھا۔ خصوصاً ستارہ کے ساتھ راشد کی جوڑی بہت جچے گی لیکن مسئلہ یہ ہے کہ راشد بہت ہی لاابالی' غیر سنجید[ہ] اپنے کیریئر کے معاملے میں قطعی بے پروا آدمی ہے۔ [...] ساہی کے پاس حالانکہ اس سے زیادہ فلمیں ہیں مگر وہ ا[پنے کام] میں بڑی باقاعدگی رکھتا ہے۔ اپنے دیئے ہوئے شیڈول [کی] حتی الامکان پابندی کرتا ہے۔ جبکہ راشد کا یہ عالم ہے کہ سیٹ [پر کام] کرتے کرتے کہے گا کہ میں ذرا باہر سگریٹ پینے جارہا ہ[وں]

سب لوگ سیٹ پر بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہ جائیں گے اور اگلے روز مختلف ذرائع سے پتا چلے گا کہ وہ تو کسی حسین ساتھی کے ہمراہ مری کے کسی ہوٹل میں پڑا ہے۔ جن لوگوں نے بھی اسے کاسٹ کیا ہوا ہے' ان میں سے بیشتر سر پر ہاتھ رکھے رو رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر اس کا یہی عالم رہا تو قسمت کب تک اس کا ساتھ دے گی۔"

"تم اس سے صرف کنٹریکٹ سائن کروالو۔ اس کی پابندی کروانا میرا کام ہوگا۔" میں نے کہا" لیکن شرط صرف یہی ہے کہ تم اسے فلم کے لئے موزوں محسوس کرو۔"

"موزوں نہیں' وہ موزوں ترین رہے گا۔" آفاق نے کہا۔

"بس تو پھر تم اسے سائن کرکے باقی کاسٹ بھی مکمل کرلو اور کام شروع کرنے کے انتظامات کرلو۔ میں اب فلم کی مہورت پر ہی آؤں گا۔" میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "مہورت بڑی دھوم دھام سے ہونی چاہئے اور پبلسٹی کے پہلو کو نظرانداز مت کرنا۔ میں اس دوران چند روز کے لئے کراچی ہو آؤں گا۔ مجھے وہاں اپنے چند کاروباری معاملات کا جائزہ لینا ہے۔ یہاں تمہیں کسی معاملے میں فکرمند یا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے دو آدمی جن کی موجودگی کو کوئی محسوس نہیں کرسکے گا' ہر وقت اس آفس کے آس پاس موجود رہیں گے۔ قانونی معاملات کے لئے میرا وکیل موجود ہے۔ مالی معاملات کی صورت یہ ہے کہ ایک اکاؤنٹ میں دو لاکھ روپے موجود ہیں جس پر تمہارے سائن چلیں گے۔ اس کے علاوہ اگر ہنگامی طور پر رقم کی ضرورت پڑے تو تم میرے مال والے آفس میں جنرل منیجر کو فون کرکے منگوا سکتے ہو۔ کسی بہت ہی اہم معاملے میں میری ضرورت ہو تو اسی جنرل منیجر سے میرا کوئی نہ کوئی فون نمبر لے سکتے ہو۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ میں کس وقت کہاں موجود ہوں۔ اور کوئی مسئلہ؟"

آفاق نے ایک لمحے سوچا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں۔ میرے خیال میں اب اور کوئی مسئلہ نہیں رہا۔"

"بس تو پھر مجھے اجازت۔" میں نے اٹھ کر ریک سے اپنا بریف کیس اٹھاتے ہوئے کہا۔ "میں یہیں سے سیدھا ایئرپورٹ جارہا ہوں۔"

☆○☆

کراچی ایئرپورٹ پر صرف شفیع شاہ ہی نہیں بلکہ سیٹھ رمضان بھی مجھے لینے آیا ہوا تھا اور وہ کچھ زیادہ خوش نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کا آنا بھی خالی از علت نہیں تھا جبکہ اس کے چہرے پر بھی بارہ بجے ہوئے تھے۔ مجھے ہوا میں کسی گڑبڑ کی بو محسوس ہوئی۔ تاہم مجھ سے گلے ملتے ہی اس کا چہرہ صحیح حالت پر آگیا اور اس کے لہجے میں گرمجوشی بھی آگئی۔ شفیع شاہ ہمیشہ کی طرح پُرسکون تھا۔ اس کے چہرے پر شاذ و نادر ہی کوئی تاثر ہوتا تھا۔ وہ ایک وجیہہ اور خوش شکل نوجوان تھا لیکن اس میں لڑکیوں کو شاید اس لئے کشش کی کمی محسوس ہوتی ہو کہ اس کے چہرے پر موت کی سی سرد مہری طاری رہتی تھی۔ بعض اوقات تو اس کا چہرہ بالکل کسی مجسمے کا چہرہ محسوس ہوتا تھا اور آنکھیں کسی شفاف بھورے پتھر سے تراشی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

باہر سیٹھ رمضان کی سیاہ مرسیڈیز موجود تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ شفیع شاہ نے سنبھال لی۔ ایئرپورٹ کی حدود سے نکلتے ہی میں نے پوچھا "مسئلہ کیا ہے؟"

"ایک تو یہ سالا کوئی بھی مسئلہ ہو فوراً میرے چہرے کی منڈیر سے جھانکنے لگتا ہے" سیٹھ رمضان نے اپنے آپ کو ایک موٹی سی گالی دی۔

"خیر... اپنی اتنی زیادہ عزت افزائی کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے چہرے کی منڈیر سے جھانکنے والے مسائل کو میرے علاوہ شاید ہی کوئی دوسرا پڑھ سکے۔ تمہیں اس سلسلے میں زیادہ فکرمند نہیں ہونا چاہئے۔ مسئلہ بتاؤ" میں نے اسے ٹھوکا دے کر کہا۔

"میں نہیں چاہتا کہ تمہارے آتے ہی ہم مسائل کا ادھار کھاتہ کھول کر بیٹھ جائیں" سیٹھ رمضان پہلو بدلتے ہوئے بولا "تمہارے لئے ہوٹل میں کمرا ریزرو ہے۔ وہاں چلنا ہے تو چلو' ورنہ گھر چلو۔ آرام سے کھانا وانا کھاؤ... چائے وائے پیو۔ اس کے بعد بیٹھ کر گپ شپ کریں گے اور آخر میں مسائل پر تبادلۂ خیال کریں گے۔"

"تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ زندگی کے بارے میں میرا فارمولا کیا ہے۔ میں کڑوا پہلے کھاتا ہوں۔ یعنی مشکل کام پہلے کرتا ہوں' عیش و آرام بعد میں" پھر میں نے شفیع کا کاندھا تھپکتے ہوئے کہا "ہوٹل کی طرف ہی لے چلو۔"

اس نے مڑ کر دیکھے بغیر آہستگی سے اثبات میں سر ہلادیا۔ میں ایک بار پھر سیٹھ رمضان کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"راستے ہی میں مجھے سب کچھ بتادو۔"

"ٹھیک ہے" سیٹھ رمضان گہری سانس لے کر بولا "ہم نے ہوٹل تعمیر کرنے کی غرض سے یہاں جو ایک نئی پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی قائم کی تھی اس کا چوتھا حصے دار سیٹھ کرامت دغا دے گیا ہے۔ صورتِ حال اس وقت یہ ہے کہ میری ٹیکسٹائل ملز کا پرسنل منیجر ہمارے کاغذات لے کر اس کمپنی سے مذاکرات کرنے امریکا گیا ہوا ہے جس کے نام سے ہم یہاں ہوٹل قائم کرنا چاہتے ہیں۔ ان کاغذات میں سیٹھ کرامت کا نام بھی شامل ہے اور اس کی انڈسٹریز وغیرہ کی تفصیل بھی درج ہے۔ منیجر نے مجھے ٹیلکس کے ذریعے مطلع کیا کہ مذاکرات

تقریباً کامیاب ہو چکے ہیں۔ آج کل میں اگلہ مرحلہ یہ آنے والا ہے کہ غیر ملکی کمپنی ہم سے مالی استحکام کے ثبوت کے طور پر بینک گارنٹی مانگے گی جس کے لئے ہم چاروں پارٹنرز نے طے کیا تھا کہ یہ مرحلہ آتے ہی اپنے اپنے حصے کا روپیہ اپنی نئی کمپنی کے اکاؤنٹ میں ڈال دیں گے اور ساتھ ہی چاروں پارٹنرز بینک کو بھی تحریری طور پر بھی مطلع کردیں گے کہ ہم اس منصوبے پر عمل در آمد کا قطعی اور حتمی ارادہ رکھتے ہیں جس کے بعد بینک ہمیں گارنٹی لیٹر جاری کردے گا۔ سیٹھ کرامت کے ذمے پچاس لاکھ روپیہ جمع کرانا تھا مگر عین اس مرحلے پر آکر وہ مُکر گیا ہے کہ اس نے اس قسم کا کوئی معاہدہ کیا تھا۔"

ایک ثانیے کے لئے میری پیشانی پر ایک نس پھڑپھڑائی لیکن میں نے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں کہا "لیکن معاہدہ تو ہمارے پاس تحریری اور قانونی شکل میں موجود ہے۔"

"اس قسم کے کاروباری لوگ جب وعدہ شکنی پر آتے ہیں تو انہیں اس قسم کے معاہدوں کی کوئی خاص پروا نہیں ہوتی۔"

سیٹھ رمضان بولا "اس نے کہہ دیا ہے کہ ہم چاہیں تو اس معاہدہ کی بنیاد پر عدالت میں اس پر دعویٰ دائر کرسکتے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ اس قسم کے معاملات کے فیصلے ہونے میں برسوں لگ جاتے ہیں جبکہ ہماری پوزیشن اس وقت بہت نازک ہے۔"

"ہاں۔ اس کا مجھے اندازہ ہے" میں نے کہا "مسئلہ پچاس لاکھ روپے کا نہیں ہے۔ ابتدائی بینک گارنٹی کے لئے ہمیں جو دو کروڑ روپے کا فکسڈ ڈیپازٹ ظاہر کرنا ہے اس میں ہم اپنے اپنے حصے کے علاوہ یہ رقم بھی مل جل کر ڈال سکتے ہیں۔ گو کہ اس سے ہمارے دیگر کام متاثر ہوسکتے ہیں لیکن بات رقم کی نہیں' اصول اور ساکھ کی ہے۔"

"ہاں۔ اگر ہم اصولی طور پر دیکھیں تو اس نے گویا اپنے اس بودے پن سے ہم سب کی توہین کی ہے اور دوسروں کے سامنے بھی ہمیں ذلیل کرانے کا بندوبست کیا ہے" سیٹھ رمضان بولا "ادھر دو چار دن میں ہمیں بینک گارنٹی کے لئے خط آنے والا ہے۔ ہم خواہ رقم پوری بھی کرلیں لیکن ساتھ ہی باہر کی فائیو اسٹار کمپنی کو اس بات سے مطلع کریں کہ ہمارا ایک پارٹنر اس منصوبے میں شریک نہیں ہورہا تو ہمارا تاثر کتنا خراب ہوگا کہ ابتدا میں ہی جن کا یہ حال ہے کہ پہلا معمولی سا مرحلہ آتے ہی ایک پارٹنر تو دوڑ لگا گیا' ان کا آگے چل کر کیا بنے گا؟ اور یہ لوگ پروجیکٹ کا کیا حال کریں گے؟ کہیں تماشا تو نہیں بنا دیں گے؟ ساری پریشانی مجھے اس بات سے ہورہی ہے۔"

"تم نے اسے سمجھایا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سمجھایا تھا بھئی... اتنا تو میں نے پوری زندگی میں

اپنی بیگم کو بھی نہیں سمجھایا" سیٹھ رمضان برا سا منہ بنا کر "اور نہایت شرافت سے سمجھایا۔ لیکن شاید کسی بہت ہی قسم کی ہستی نے اس کے کان میں پھونک دیا ہے کہ انڈسٹری میں آئندہ دو چار سال میں زوال آنے والا ہے کسی دوسرے پروجیکٹ کی طرف متوجہ ہوگیا ہے۔ میں اس سے پوچھا تھا کہ اگر اسے یہی ذلالت دکھانی تھی تو اس کے لئے آمادہ کیوں ہوا؟ کمپنی میں تھوڑا سا ابتدائی سرمایہ کیوں ڈالا تھا؟ بڑے اطمینان سے بولا کہ شاید اس کا دماغ خراب ہوگیا تھا۔ شفیع شاہ تو کہہ رہا تھا کہ اس کا جھٹکا کردیتے ہیں مگر نے اسے باز رکھا کہ اس سے مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

"ہاں۔ یہ تو تم نے بہت اچھا کیا" میں نے کچھ سو ہوئے کہا "تم نے اسے یہ بتایا تھا کہ ہم لوگوں کے نزدیک تو وعدہ بھی پتھر پر لکیر ہوتا ہے جبکہ یہ تو ایک تحریری اور معاہدہ ہے؟"

"اس کی سمجھ میں فی الحال کوئی بھی بات نہیں آرہی" رمضان نے اکتاہٹ زدہ لہجے میں جواب دیا "ہم تمہارا انتظار کررہے تھے کہ جس طرح تم کہو گے اس طرح کریں گے۔ اسی لئے میں نے فون پر گفتگو کے دوران بھی یہ نہیں چھیڑا تھا۔ ویسے بھی کل تک ہمیں تھوڑی بہت تھی کہ شاید وہ راہ راست پر آجائے لیکن کل یہ امید ٹوٹ"

میں نے ہنکارا بھرتے ہوئے اپنے کان کی لو آہستگی سے مسلی تو وہ مجھے معمول سے کچھ گرم محسوس ہوئی۔ کار اس وقت نرسری کے سگنل پر پہنچ کر رک چکی تھی۔

"سیٹھ کرامت اس وقت کہاں ملے گا؟" میں نے

"میری معلومات کے مطابق اس وقت وہ شادی کی تقریب میں جیمخانہ میں ہوگا" ڈرائیونگ سیٹ سے شاہ نے پُرسکون آواز میں جواب دیا۔

"ٹھیک ہے... تو پھر ہوٹل کے بجائے ادھر ہی چ" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "میں وقت ضائع کا قائل نہیں۔"

جب ہم جیمخانہ پہنچے تو وہاں روشنیوں اور خوشبوؤں کا گویا ایک سیلاب آیا ہوا تھا۔ در و دیوار پر رنگین قمقمے جھلملا رہے تھے۔ عمارت کی چار دیواری میں ہی نہیں بلکہ اس سے باہر بھی سڑک کے دونوں طرف چمکتی دمکتی کاروں کی قطاریں تھیں۔ ہر طرف رنگین پیرہن لہرا رہے تھے۔ خوش انداز اور خوش لباس خواتین کی ٹولیوں کی ٹولیاں گاڑیوں سے اتر کر اندر جارہی تھیں۔ جانے کون خوش نصیب تھا جو حسن کے اس سیلِ رواں میں کسی عروسِ محفل کا ہاتھ تھامنے جارہا تھا۔

گاڑی کھڑی کرنے کے لئے ہمیں جیم خانہ سے کافی فاصلے پر جگہ میسر آئی۔ گاڑی سے اتر کر ہم تینوں فٹ پاتھ پر ٹہلنے کے سے انداز میں نہایت اطمینان سے جیم خانہ کی طرف واپس چل دیئے۔

میرا بریف کیس شفیع شاہ نے اٹھایا ہوا تھا۔ وہ اس وقت فیشن کے مطابق ڈھیلی ڈھالی سی پتلون اور ایک خوبصورت جاپانی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس کے لمبے اور بے ترتیب بال خوشگوار ہوا کے جھونکوں سے کچھ اور بکھر کر رہ گئے تھے۔

بظاہر وہ کسی خوشحال گھرانے کا کھلنڈرا سا لڑکا نظر آتا تھا مگر وہ کتنا اچھا منتظم اور کتنا گہرا اور خطرناک انسان تھا' یہ صرف میں ہی جانتا تھا۔ اس وقت وہ ایک ہاتھ میں بریف کیس لٹکائے اور دوسرا ہاتھ جیکٹ کی جیب میں ڈالے بظاہر بے فکری اور بے پروائی سے میرے ساتھ ساتھ چلا آرہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اس کی عقابی نظریں مشاقی سے ہر طرف کا جائزہ لیتی رہتی ہیں۔

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کا ہاتھ جس جیب میں ہے اس میں ایک جرمن لیوگر بھی موجود رہتا ہے۔ اس کے بغلی ہولسٹر میں ایک چپٹا اور چھوٹا سا پستول بھی موجود ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی پنڈلی کے ساتھ چمڑے کی نیام میں ایک پتلا سا خنجر بھی بندھا رہتا تھا۔ ان تین ہتھیاروں کی موجودگی میں وہ آٹھ دس مسلح آدمیوں کی ٹولی سے زیادہ خطرناک تھا اور اگر کسی معرکے میں اس کے یہ تینوں ہتھیار ناکارہ ہوجاتے یا چھن جاتے تب بھی آسانی سے قابو میں آنے والا نہیں تھا۔ وہ بلاشبہ میرا دستِ راست تھا۔ کراچی میں میرا بے پناہ پھیلا ہوا کام اس نے نہایت حسن و خوبی سے سنبھالا ہوا تھا۔

میں اس کی طرف سے بالکل مطمئن اور بے فکر تھا۔ اس کی ایک اور بڑی خوبی جو مجھے بے حد پسند تھی' یہ تھی کہ وہ بھی میری ہی طرح "عورت پروف" تھا۔ وہ نوجوان اور خوبرو تھا' اونچے طبقے کا فرد نظر آتا تھا اور جن طبقوں میں اس کا اٹھنا بیٹھنا تھا ان میں ہر قدم پر مہربان نگاہیں اس کا استقبال کرتی تھیں مگر وہ کسی کے سحر میں گرفتار نہیں ہوتا تھا۔ کسی کی خاطر اپنے آپ کو برباد کرنے پر نہیں تل جاتا تھا۔ اس کی نظر میں یہ سب زندگی کی راہ میں بکھرے ہوئے ہرجائی کھلونے تھے۔ وہ ان کھلونوں سے دل بہلاتا تھا' کھیلتا تھا اور دل بھرتے ہی آگے بڑھ جاتا تھا۔ دل گیر ہوتا' کسی کی زلفوں کا اسیر ہوتا اور پا بہ حلقہ زنجیر ہوتا تو اس نے گویا سیکھا ہی نہیں تھا۔

ہم عمارت کے اندرونی دروازے پر پہنچے تو ایک صاحب نے جو تھری پیس سوٹ میں تھے اور کوٹ کے کالر پر گلاب کی ایک کلی بھی لگائے ہوئے تھے' یوں دانت نکال کر گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا جیسے ہم ان کے پرانے شناسا ہوں اور اس تقریب کے سب سے اہم مہمان بھی ہم ہی ہوں۔ دلہا سے بھی زیادہ اہم۔ ہم نے رسمی سے انداز میں ان سے سلام دعا کی اور آگے بڑھ گئے۔

وہ ایک بہت بڑا اور آراستہ وپیراستہ ہال تھا جو اس وقت روشنیوں سے جگمگا رہا تھا۔ گوکہ بیٹھنے کے لیے بڑی ترتیب اور سلیقے سے کرسیاں بھی لگی ہوئی تھیں لیکن بیشتر لوگ ٹولیوں کی صورت میں ادھر اُدھر کھڑے گپ شپ میں مشغول تھے۔ چاروں طرف بھنبھناہٹ کی گونج سی محسوس ہو رہی تھی جس میں سرگوشیوں' مترنم قہقہوں' کھردری آوازوں' دبی دبی ہنسی اور بے حجاب فقروں' غرضیکہ سبھی طرح کے آہنگ کا امتزاج تھا۔

ہال کے ایک سرے پر بہت خوبصورت اسٹیج بھی نظر آرہا تھا مگر فی الحال اسٹیج پر کوئی نہیں تھا۔ ہم نے ادھر اُدھر نظریں دوڑائیں مگر سیٹھ کرامت کہیں نظر نہ آیا۔

شفیع شاہ بولا۔ "آتے وقت میں نے دیکھا تھا' کچھ مہمان لان پر بھی ملگجے اندھیرے میں ٹولیاں بنائے کھڑے ہیں۔"

"چلو وہاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ شاید سیٹھ صاحب وہیں ہوں"... میں نے مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ہم ہال سے نکل آئے اور سیڑھیاں اتر کر لان کی طرف چل دیئے۔

طویل وعریض لان پر ملگجی سی روشنی تھی۔ سبزے کی باڑھ اور سرو قامت پودوں کے گرد رنگین' آرائشی بتیوں کی جھالریں لپٹی ہوئی تھیں۔ کچھ لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں اِدھر اُدھر کھڑے گپ شپ میں مشغول تھے۔ کبھی کبھی کوئی مخمور سا قہقہہ سنائی دے جاتا تھا۔ باوردی بیرے مشروبات طشتریوں میں سجائے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔

ہم بھی مہمانوں ہی کی طرح لان پر ٹہلنے کے سے انداز میں غیر محسوس طور پر ہر چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے ادھر ادھر چکرانے لگے۔ اتنی کم روشنی میں کسی کو پہچاننے کے لئے خاصا قریب جانے کی ضرورت تھی لیکن میری اور شفیع شاہ کی آنکھیں اس سے بھی کم روشنی میں بہت دور تک دیکھنے کی عادی تھیں۔ ہم دونوں نے ایک طویل عرصے تک راتوں کو گھپ اندھیرے میں ویرانوں کی خاک چھانی تھی۔

بالآخر سیٹھ کرامت ہمیں نظر آگیا۔ وہ ایک دور افتادہ گوشے میں دو احمق سے نوجوانوں کے ساتھ کھڑا تھا۔ تینوں کے ہاتھوں میں گلاس تھے اور گوکہ ان کے آس پاس کوئی نہیں تھا اس کے باوجود وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ باتوں کے دوران کبھی کبھی وہ نوجوان منہ پر ہاتھ رکھ کر بے ڈھنگے انداز میں نہایت بھونڈی آواز میں کھی کھی کرنے لگتے' سیٹھ کرامت شاید انہیں کوئی ایسا واقعہ سنا رہا تھا جو ان کے نزدیک بہت ہی پُر لطف تھا۔ ان میں سے ایک نوجوان بے حد موٹا تھا اور موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگائے ہوئے تھا۔ ہر بار ہنسی کے ساتھ اس کا جسم تھل تھل کرنے لگتا تھا۔

دوسرا میانہ قامت اور خوش پوش تھا۔ دونوں یقیناً دولتمند گھرانوں سے تھا۔ مفلسوں کا بھلا اس قسم کی تقریبات میں کیا کام؟ وہ جس انہماک سے سیٹھ کرامت کی باتیں سن رہے تھے اس سے ان کے چہرے پر برستی ہوئی حماقت اور بھی نمایاں ہو رہی تھی۔

سیٹھ کرامت ایک ادھیڑ عمر رنڈوا تھا۔ اس کے بچے تھے جن میں سے کوئی ابھی جوان نہیں تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا آدمی تھا جس کے سر کے بیشتر بال جھڑ چکے تھے۔ اس کی آنکھوں سے مکاری جھلکتی تھی۔ وہ ہمیشہ بے ہنگم لباس میں ہوتا تھا۔ تقریبات میں بھی جہاں ڈنر سوٹ پہن کر آنے کی درخواست کی جاتی تھی' سیٹھ کرامت اس حال میں پہنچ جاتا تھا کہ پتلون ایک رنگ کی ہوتی تھی اور کوٹ دوسرے رنگ کا..... اور قمیص عام طور پر پتلون سے باہر ہوتی تھی۔ پیروں میں عام طور پر ہاتھ کی بنی چپلیں ہوتی تھیں۔ اگر کبھی بہت زیادہ "فیشن ایبل" ہو جاتا تھا تو سینڈل پہن لیتا تھا۔

اسے دیکھ کر کسی اجنبی کو شبہ تک نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ کتنا دولت مند آدمی ہے۔ دفتر میں عموماً وہ کرسی پر اکڑوں بیٹھا ہوتا تھا۔ اس کی میز پر چھ سات ٹیلی فون تھے اور وہ سب کے سب اکثر مصروف ہی ہوتے تھے۔ کسی پر سودے کی بات چل رہی ہے۔ کسی پر کسی چیز کا بھاؤ بڑھنے کی خبر آرہی ہے تو کسی پر بھاؤ گھٹنے کی۔ سیٹھ کرامت کا کوئی ایک کاروبار نہیں تھا۔ بیسیوں دھندے تھے۔ جس کام میں بھی چار پیسے کا منافع نظر آتا تھا وہ اس میں رقم لگا دیتا تھا۔

اپنے حلیے سے قطع نظر وہ گاڑی ہمیشہ نئے ماڈل کی اور خاصی مہنگی رکھتا تھا۔ کوٹھی بھی اس کی بہت شاندار تھی اور زیادہ تر باہر کے سامان سے سجی ہوئی تھی۔ معلوم نہیں ان چیزوں پر اس نے کیسے دل کڑا کر رقم خرچ کرلی تھی۔

سیٹھ رمضان کی معرفت اس سے میرا تعارف ہوا تھا اور پھر نہ جانے کس طرح خود بخود ہی ہمارے مراسم بڑھتے چلے گئے تھے۔ میں جب بھی کراچی آتا اس سے ضرور ملاقات ہوتی اور کم از کم ایک وقت کا کھانا ہم ضرور اکٹھے کھاتے۔ ہوٹل کی تعمیر کے لئے ہم نے فنانسروں کی جو سینڈیکیٹ بنائی تھی اس میں شرکت کے لئے اس سے بات چیت سیٹھ رمضان اور شفیع شاہ نے آگے بڑھائی تھی اور وہ کسی خاص ردوقدح کے بغیر اس کے لئے تیار ہوگیا بلکہ اس کے تیار ہونے کے بعد ہمیں دوسرے دو سیٹھوں کو انکار میں جواب دینا پڑا تھا جو ہمارے ساتھ روپیہ لگانے کو تیار تھے۔ ہم نے ان دو سیٹھوں پر اکیلے سیٹھ کرامت کو اس لئے ترجیح دی تھی کہ وہ مالی طور پر ان دونوں کی نسبت کہیں زیادہ مستحکم تھا اور اس وقت تک ہمارا خیال تھا کہ وہ لین دین اور زبان کا بھی بہت کھرا ہے۔

ہم کئی منٹ تک کچھ دور کھڑے انتظار کرتے رہے کہ شاید وہ دونوں احمق سے نوجوان سیٹھ کرامت کو تنہا چھوڑ کر کسی اور طرف چلے جائیں مگر ان کی گفتگو کا سلسلہ ختم ہونے میں نہ آیا۔ بالآخر ہم نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کیا اور ٹہلتے ہوئے ان کے قریب اس طرح جا کھڑے ہوئے کہ میں سیٹھ کرامت کے دائیں طرف تھا اور شفیع شاہ بائیں طرف' سیٹھ رمضان سامنے تھا مگر وہ دو قدم ہٹ کر کھڑا ہوا تھا۔

ان تینوں نے باری باری ہم تینوں کو دیکھا۔ نوجوانوں کے چہروں پر تو محض خفیف سی بدمزگی کے آثار تھے گویا انہیں بات ادھوری رہ جانے کی وجہ سے کوفت ہوئی ہو۔ سیٹھ کرامت کو البتہ حیرت کا جھٹکا سا لگا تھا۔ یک لخت ہی اسے گویا سانپ سونگھ گیا۔ روشنی نہایت کم ہونے کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ شفیع شاہ نے ریوالور جیکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے ہی اس کی نال سیٹھ کرامت کی پسلیوں سے لگا دی ہے۔

"ہیلو کرامت!" میں نے دھیمے اور خوشگوار لہجے میں کہا۔

"ہیلو..... سلاما لیکم..... تم..... اس وقت..... اور یہاں!" وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا۔

"تمہارا کیا خیال تھا کہ ہم یہاں نہیں پہنچ سکتے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"نہیں..... نہیں..... میرا مطلب ہے....." وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہوگیا۔ اس کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

"بات کیونکہ بہت ضروری تھی لہٰذا ہم نے سوچا' تمہیں فوری طور پر اطلاع ملنی چاہئے۔" میں نے اپنا لہجہ خالصتاً کاروباری بناتے ہوئے کہا "تمہارے لئے ایک افسوسناک خبر ہے' مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا کہ اس خوشگوار موقع پر گپ شپ کے دوران میں تمہارے لئے یہ خبر لے کر آگیا ہوں لیکن مجبوری ہے..... سیٹھ کرامت! تمہارا سیمنٹ کا ایک جہاز ڈوب گیا ہے' تمہیں فوری طور پر کچھ دیر کے لئے دفتر چلنا ہوگا۔ انشورنس کی کارروائی کے سلسلے میں فوری طور پر کچھ ضروری اقدامات کرنے ہیں" میں نے ان دونوں نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا "میرا خیال ہے تمہیں اپنے دوستوں سے معذرت کرلنی چاہئے۔"

سیٹھ کرامت کو کچھ کہنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ عینک والا موٹا نوجوان بول اٹھا "ہم چلتے ہیں کرامت بھائی' پھر کسی وقت گپ شپ رہے گی۔ اس وقت تو ظاہر ہے یہ بری خبر سن کر آپ کا دل برا ہو گیا ہوگا۔ ہمیں بھی بڑا افسوس ہوا..... اچھا..... خدا حافظ....." وہ دونوں وہاں سے چلے دیئے۔

سیٹھ کرامت پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ ان آنکھوں میں ایک خاموش التجا دم توڑ رہی تھی' شاید وہ ان نوجوانوں کو روکنا چاہتا تھا۔ گوکہ اسے فائدہ اس طرح کچھ بھی نہ ہوتا۔ ایک بار تو اس کے ہونٹ پھڑپھڑائے بھی۔ شاید اس نے ان نوجوانوں کو پکارنا چاہا تھا لیکن اسی لمحے غالباً شفیع شاہ نے اس کی پسلیوں پر ریوالور کی نال کا دباؤ بڑھا دیا تھا۔

"آؤ چلیں سیٹھ کرامت!" میں نے اس کی کلائی بظاہر نرمی سے لیکن درحقیقت آہنی گرفت میں لیتے ہوئے کہا "ہمیں کچھ ضروری گفتگو کرنی ہے اور میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے کیونکہ مجھے دوسرے معاملات بھی دیکھنے ہیں۔"

"تم لوگ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟" بالآخر وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔

"تمہیں کسی خراب جگہ پر لے جانے کا ارادہ ہرگز نہیں ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا "ہمیں تو معمولی سا کاروباری

مسئلہ طے کرنا ہے۔ اگر وہ خوش اسلوبی سے طے ہوگیا تو ہم چھوٹا موٹا جشن بھی منائیں گے۔۔۔ تھوڑی سی تفریح بھی کریں گے۔ تم قدم تو بڑھاؤ۔"

شفیع نے اسے ریوالور کی نال سے ٹھوکا دیا اور وہ ہمارے گھیرے میں گیٹ کی طرف چل دیا۔۔۔ جب ہم ذرا زیادہ روشنی سے گزرے تو میں نے دیکھا، سیٹھ کرامت کا رنگ واقعی فق ہوچکا تھا اور اتنی سی دیر میں ہی اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جم چکی تھیں۔

"کچھ ہشاش بشاش نظر آنے کی کوشش کرو یار!" میں نے اس کی کلائی پر دباؤ ذرا سا بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لوگ کیا سوچیں گے کہ معزز آدمیوں کی اس ٹولی میں یہ شخص اتنا بدحواس کیوں نظر آرہا ہے۔ تمہارے چہرے پر تو یوں ہوائیاں اڑ رہی ہیں جیسے تمہیں پھانسی کے تختے پر لے جایا جارہا ہو۔۔۔ ابھی تو ہم نے تم سے کچھ کہا ہی نہیں۔"

اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ الٹا کلائی پر دباؤ ذرا سا بڑھ جانے کی وجہ سے وہ کراہ اٹھا۔ گیٹ سے باہر آتے ہی وہ بولا۔۔۔ "میرا ڈرائیور میری واپسی کا انتظار کرے گا۔"

"ہم پہلے تمہیں ڈرائیور کے پاس ہی لے جارہے ہیں۔" میں نے کہا "کہاں کھڑی ہے تمہاری گاڑی؟"

"ادھر۔۔۔ فٹ پاتھ کے ساتھ۔" اس نے دوسری طرف کے فٹ پاتھ کی طرف اشارہ کیا۔

ہم اسی طرف بڑھنے لگے۔ میں نے بدستور پُرسکون لہجے میں کہا "تمہارا بریف کیس یقیناً گاڑی میں ہوگا۔ تم ڈرائیور سے بریف کیس لوگے اور اسے ہدایت کروگے کہ وہ گھر جاکر پیغام دے کہ تمہیں اچانک ایک کاروباری پریشانی کے سلسلے میں شہر سے باہر جانا پڑرہا ہے۔ شاید دو تین روز لگ جائیں۔۔۔ یہ پیغام تمہارے ہی فائدہ کے لئے ہے۔ تمہارے بچے پریشان نہیں ہوں گے۔

"دو۔۔۔ تین۔۔۔ دن۔۔۔" وہ ہکلایا۔

"فکر نہ کرو۔ ہم تمہیں بور نہیں ہونے دیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"اور۔۔۔ وہ۔۔۔ بریف کیس تو میری گاڑی میں نہیں ہے۔۔۔ میں تو یہاں شادی میں آیا تھا۔ ظاہر ہے۔۔۔" اس نے گویا ہمارے راستے میں ایک رکاوٹ کھڑی کرتے ہوئے کہا۔

"اب ایسی باتیں مت کرو کرامت کہ ہمیں سڑک پر تمہارے پہلو میں دو چار گولیاں اتار کر تمہیں ٹریفک کے ریلے میں اچھال پھینکنے پر مجبور ہوجائیں۔ بہت سے گاڑیوں والے فوری طور پر بریک نہیں لگا سکیں گے اور تمہاری لاش کو روندتے ہوئے گزرتے چلے جائیں گے۔ آج کل تو کتے بھی اس قسم کی موت مرنا پسند نہیں کرتے۔ تم تو پھر بھی خاصے معزز قسم کے انسان ہو"

میں نے اس کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے کہا "تم ڈرائیور سے صرف اتنا ہی کہنا جتنا میں نے کہا ہے۔ اس سے زیادہ ایک بھی کہا تو خواہ مخواہ تمہارے ڈرائیور کو تمہاری موت کا الم… منظر دیکھنا پڑے گا۔"

وہ تھوک نگل کر رہ گیا۔

سڑک پار کرتے وقت میں نے کہا "مجھے معلوم ہے بر… کیس تمہاری گاڑی میں ہوگا اور اس میں تمہاری چیک بک ہوگی۔ یہ تو شادی کا موقع تھا۔ مجھے یقین ہے، تم جنازے میں جاتے ہوگے تو تمہاری گاڑی میں بریف کیس اور اس میں تم… اہم کاروباری چیزیں ضرور موجود ہوتی ہوں گی۔ تم ان لوگوں… سے ہو جو کسی کی آخری رسوم میں شرکت کے وقت بھی کو… کاروباری معاملہ طے کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ میں نے چ… ہی ملاقاتوں میں تمہارا خاصا مشاہدہ کرلیا تھا۔ افسوس کہ م… تمہاری اس خاصیت کا اندازہ نہیں کرسکا تھا کہ تم اتنا ٹھونک… کر کی جانے والی باتوں سے بھی پھر سکتے ہو۔"

ہم دوسری طرف کے فٹ پاتھ پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن خیر۔۔۔ تمہیں بھی ہمارے بارے میں اندازے لگانے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم شریفوں کے ساتھ شریف اور بدمعاشوں کے لئے بہت بڑے بدمعاش ہیں۔"

اس دوران ہم اس کی گاڑی کے پاس پہنچ چکے تھے۔ اس کا ڈرائیور بڑے آرام سے اپنی سیٹ پر نیم دراز ٹیپ پر ایک انگریزی دُھن سن رہا تھا اور شاید سر بھی دُھن رہا تھا۔ سیٹھ کرامت پر اس کی نظر اچانک پڑی اور وہ ہڑبڑا کر ٹوپی سر پر رکھ کر اور ٹیپ بند کرکے گاڑی سے نکل آیا۔ بوکھلاہٹ میں اس نے ہمیں باقاعدہ ایڑیاں بجا کر سیلیوٹ بھی ماردیا۔

"میرا بریف کیس دے دو۔۔۔" سیٹھ کرامت ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "بچوں سے کہہ دینا مجھے ایک کاروباری پریشانی کے سلسلے میں اچانک ہی شہر سے باہر جانا پڑ رہا ہے۔ شاید دو تین دن لگ جائیں۔ وہ پریشان نہ ہوں۔"

مجھے خوشی ہوئی کہ اس نے ہماری ہدایت پر حرف بہ حرف عمل کیا تھا اور ضرورت سے ایک لفظ بھی زیادہ نہیں بولا تھا۔ اس ہدایت پر عمل میری زبان نے نہیں، سیٹھ کرامت کی پسلیوں پر ٹکی ہوئی ریوالور کی نال نے کرایا تھا۔ ریوالور کے زور پر کسی سے بات منوانا بھی بڑا نازک فن ہے۔ ریوالور کی اپنی بھی ایک زبان ہوتی ہے۔ نال کا دباؤ کب بڑھایا جائے، کب گھٹایا جائے، کب اس کے ذریعے تنبیہہ کی جائے اور کب اس کے ذریعے بتایا جائے کہ شکار کو کس سمت میں مڑنا ہے۔ ان سب باتوں کا ایک طریقہ ہوتا ہے۔ اور ریوالور اگر کسی ماہرِ فن کے ہاتھ میں ہو تو اناڑی سے اناڑی شکار بھی اس کی زبان سمجھنے لگتا ہے۔ اس وقت ریوالور شفیع شاہ کی جیب میں اس کی گرفت میں تھا اور شفیع شاہ خود بہت کم بولتا تھا، زیادہ تر مذاکرات اس کا ریوالور ہی کرتا تھا۔

ڈرائیور نے نہایت مستعدی سے ڈیش بورڈ کے نیچے سے سیٹھ کرامت کا بریف کیس نکال کر ادب سے اسے پیش کیا۔ بریف کیس کچھ ایسا زیادہ بریف کیس بھی نہیں تھا۔ اچھا خاصا چھوٹا موٹا سوٹ کیس ہی معلوم ہوتا تھا۔

"تم اب گھر چلے جاؤ" سیٹھ کرامت نے مزید عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے ہدایت کی اور وہ سلام کرکے گاڑی میں بیٹھ گیا۔

ہم سیٹھ کرامت کو گھیرے میں لئے واپس اسی طرف گھوم گئے جدھر سے آئے تھے۔ ہماری گاڑی اس طرف کافی دور کھڑی تھی۔ گاڑی کے پاس پہنچ کر شفیع شاہ نے چابیاں سیٹھ رمضان کو پکڑادیں۔

"ڈرائیو تم کرو رمضان" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا "ہم اپنے معزز مہمان کے پاس بیٹھیں گے۔"

ہم پچھلی سیٹ پر اس طرح بیٹھ گئے کہ کرامت میرے اور شفیع شاہ کے درمیان تھا۔ میں نے اب کرامت کا ہاتھ چھوڑ دیا اور وہ اس طرح اپنے ہاتھ کے جوڑ کو سہلانے لگا جیسے اس کا ہاتھ کسی شکنجے سے آزاد ہوا ہو۔

"جانا کدھر ہے؟" سیٹھ رمضان نے اسٹیرنگ وھیل سنبھالتے ہوئے پوچھا۔ ہمارے خاص ٹھکانوں کا اسے بھی علم نہیں تھا۔

"ڈیفنس میں ہمارا ایک چھوٹا سا مہمان خانہ ہے" میں نے جواب دیا "وہیں چلنا ہے۔ شفیع شاہ تمہیں راستہ بتاتا جائے گا۔ پہلے تم سن سیٹ بلیوارڈ تک پہنچو۔"

چند لمحے بعد گاڑی مین کلفٹن روڈ پر فراٹے بھرنے لگی۔ کھڑکیوں کے تاریک شیشے چڑھے ہوئے تھے اور گاڑی کے اندر انجن کی ہلکی سی سرسراہٹ کے علاوہ کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

"میں نے تم لوگوں کے بارے میں ٹھیک ہی سنا تھا" بالآخر سیٹھ کرامت کسی حد تک خودکلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ اب اس کی حالت کافی سنبھل چکی تھی۔ "کس دیدہ دلیری سے تم لوگ مجھے ایک شاندار اور پُرہجوم تقریب سے اٹھا لائے ہو۔۔۔ تمہیں ذرا بھی خوف نہیں کہ بعد میں تمہاری شناخت بھی ہوسکتی ہے۔۔۔ تم لمبے چکر میں بھی پھنس سکتے ہو۔۔۔ میں شہر کا کوئی معمولی آدمی تو نہیں ہوں۔"

"معمولی آدمی تو ہم بھی نہیں ہیں" میں نے ملائمت سے کہا۔ "اور پھر یہ کہ ہم کوئی کچا کام نہیں کرتے۔ کوئی عمارت گراتے ہیں تو اس طرح نہیں کہ ملبہ اپنے ہی اوپر آن گرے اور اگر کبھی ناگزیر حالات میں خطرہ مول لینا بھی پڑ جائے تو ایسا کیا گھبرانا؟ خطرات کے بغیر بھی بھلا کوئی زندگی ہے؟ ویسے بائی دی وے۔۔۔ تم نے ہمارے بارے میں کیا سن لیا؟ کچھ ہمیں بھی بتاؤ۔"

"یہی کہ تم کوئی اچھے آدمی نہیں ہو۔ تمہارے کاروبار کچھ مشکوک قسم کے ہیں۔ میں نے اڑتی اڑتی سی یہ بات سنی تھی لیکن یقین نہیں کیا تھا۔ آج یقین آگیا" وہ بولا۔

"ماشاءاللہ۔۔۔ بہت خوب۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "رمضان سیٹھ! کچھ سنا تم نے؟ کرامت صاحب کیا فرمارہے ہیں؟ ہمارے کاروبار پر انہیں شک ہے۔۔۔ اور یہ خود تو بے چارہ بڑی معصوم روح ہے۔ سیدھا پنگھوڑے سے نکل کر ہمارے درمیان آبیٹھا ہے۔"

مجھے حقیقتاً غصے کی ایک ہلکی سی لہر چھو کر گزر گئی تھی۔ میں نے ناگواری سے سیٹھ کرامت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جب شہر میں بیماریاں وبائی شکل میں پھیلتی ہیں تو تم دواؤں کے اسٹاک زیرِ زمین پہنچادیتے ہو تاکہ ایڑیاں رگڑتے ہوئے مریض منہ مانگی قیمتیں ادا کرنے پر تیار ہوجائیں۔ بجٹ آنے سے پہلے تم نہ جانے کن کن چیزوں کے ذخیروں سے گودام بھر دیتے ہو اور لوگ ذرا ذرا سی چیزوں کے لئے بازاروں میں دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ جہاں تمہارا بس چلتا ہے، تم ضرور تمندوں پر چھری چلانے سے ذرا بھی نہیں ہچکچاتے۔ اور ہمیں فرق سمجھا رہے ہو مشکوک اور صاف ستھرے کاروباروں کا؟"

وہ خاموش رہا۔

میں نے اپنا لہجہ اعتدال پر لاتے ہوئے کہا "تمہارا خیال ہے ہم تمہیں نہیں جانتے۔ لیکن ضرورت پڑنے پر ہم تمہارا شجرۂ نسب تک کھود نکالیں گے۔ تمہاری ہی نہیں تمہارے آباؤاجداد کی ہیراپھیریوں کی بھی پوری فہرست تیار کرالیں گے" ایک لمحے

کے توقف کے بعد میں نے نہایت ملائمت سے کہا "یقین کرو سیٹھ! تمہارے مقابلے میں ہم بہت زیادہ شریف اور نیک دل لوگ ہیں' ..... تمہیں ہم سے کئے ہوئے اچھے بھلے تحریری معاہدے سے منحرف ہونے کی کیا سوجھی تھی؟"

"یہی اڑتی اڑتی سی باتیں سن کر میں نے تمہارے ساتھ تعلق واسطہ جوڑنا بہتر نہیں سمجھا تھا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"حالانکہ فکر مند ہمیں ہونا چاہئے تھا کہ ہم اتنے بڑے فراڈیے کے ساتھ ناتا جوڑ رہے تھے" میں نے حقارت سے کہا۔ "اگر تم اتنے ہی پارسا تھے تو تمہیں پہلے ہی تسلی کرلینی چاہئے تھی۔ تمہیں کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ہم لوگوں سے تعلق جوڑنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے اور جوڑ کر توڑنا تو بہت ہی مشکل ہے۔ اس کوشش میں کبھی کبھی زندگی کی ڈور بھی ٹوٹ جاتی ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سیٹھ کرامت مصالحانہ لہجے میں بولا "بات اب میری سمجھ میں آگئی ہے۔ میں معاہدے پر عملدرآمد کے لئے تیار ہوں۔ صبح تم لوگ میرے دفتر آجاؤ' ہم بیٹھ کر کارروائی مکمل کرلیں گے۔ مجھے کہیں لے جانے اور خواہ مخواہ زیادہ وقت برباد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"لیکن مسئلہ یہ ہے کہ بات اب ہماری سمجھ میں بھی آگئی ہے۔ اور وہ یہ کہ ہر کسی پر آنکھیں بند کرکے بھروسا نہیں کیا جاسکتا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب تو جس طرح بات طے ہو رہی ہے اسی طرح ہونے دو ..... اور پھر ہمیں دفتر آنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تمہارا دفتر تو اس وقت ہمارے ساتھ ہی چل رہا ہے" میں نے اس کے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

تین تلواروں والے چوراہے سے شفیع شاہ کی ہدایت کے مطابق سیٹھ رمضان نے گاڑی بائیں طرف موڑ لی۔ ابھی زیادہ رات نہیں بجی تھی مگر ڈیفنس کی سڑکوں پر ویرانی نظر آرہی تھی' کہیں کہیں اکا دکا کاریں آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

دفعتاً شفیع شاہ بولا "باس! ایک کار ہمارا پیچھا کررہی ہے" اس نے مڑ کر نہیں دیکھا تھا البتہ چند منٹ سے وہ عقب نما آئینے کی طرف ایک ٹک دیکھ رہا تھا۔

"ہاں۔ میں بھی دیکھ چکا ہوں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ مخصوص ساخت کی ہیڈلائٹس تھیں۔ سیٹھ کرامت کی گاڑی میں دیکھ چکا تھا۔ یہ اس کی ہیڈلائٹس نہیں تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ سیٹھ کرامت تعاقب کی خبر سن کر کسمسایا تھا۔ شاید اسے کچھ امید بندھی تھی۔

میں نے رمضان کو ہدایت کی "کچھ دیر گاڑی یونہی ادھر ادھر چھوٹی موٹی سڑکوں پر گھماؤ تاکہ پوری طرح یقین ہوجائے کہ یہ گاڑی واقعی ہمارے تعاقب میں ہے۔"

سیٹھ رمضان نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے گہری سانس لی اور مسکراتے ہوئے شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ گاڑی واقعی ہمارے ہی تعاقب میں تھی۔

"ٹھیک ہے ..... اب کسی ویران سڑک کی طرف لے چلو" میں نے سیٹھ رمضان کو ہدیت کی۔

"کلفٹن کے ساحلی علاقوں میں اس وقت بالکل ویرانی ہوگی" سیٹھ رمضان گاڑی ایک نسبتاً چوڑی اور دو طرفہ سڑک کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔ کلفٹن سے ہم اس وقت بھی زیادہ دور نہیں تھے۔

چند منٹ بعد ہی ہم ساحلی علاقے کی طرف نکل آئے۔ سڑک کے دونوں طرف بیشتر پلاٹ خالی پڑے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں اپارٹمنٹس پر مشتمل کئی کئی منزلہ عمارتیں سر اٹھائے کھڑی تھیں لیکن وہ اندھیرے میں لپٹی ہوئی تھیں۔ اسٹریٹ لائٹ بھی کوئی کوئی ہی روشن تھی۔

کار بدستور ہمارے پیچھے لگی ہوئی تھی بلکہ اب تو کار والوں کو بھی اندازہ ہوچکا تھا کہ ہم تعاقب سے باخبر ہوچکے ہیں اس لئے وہ احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر قریب تر آنے کی کوشش کررہے تھے لیکن سیٹھ رمضان نے رفتار بڑھادی تھی۔ اب تو میں یہ بھی دیکھ چکا تھا کہ ہمارے تعاقب میں آنے والی کار ہلکے براؤن رنگ کی فورڈ کورٹینا تھی۔

"یہ کون ہوسکتا ہے سیٹھ صاحب؟" میں نے سیٹھ کرامت کو کہنی مار کر تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"مجھے کیا معلوم" وہ مضطرب لہجے میں بولا "شاید پولیس ہو!"

میں ہنس دیا "بہت خوب! تمہارا خیال ہے اس طرح ہم لوگ خوفزدہ ہوجائیں گے؟ شاید تم ہمیں نرا کاٹھ کا اُلو ہی سمجھ رہے ہو۔ ایک بچہ بھی جانتا ہے کہ ہماری پولیس عمدہ قسم کی پرائیویٹ گاڑیوں میں بیٹھ کر اتنی خاموشی اور مستعدی سے کسی کا تعاقب نہیں کرتی۔ پولیس ..... حتیٰ کہ خفیہ پولیس کی گاڑی بھی ایک میل دور سے پہچانی جاتی ہے۔"

"اس کا کرنا کیا ہے باس؟" شفیع شاہ نے سرسراتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔ اسے جب کوئی مختصر مہم یا مسئلہ درپیش ہوتا تھا تو اس کی آواز گویا سرگوشی میں ڈھل جاتی تھی لیکن اس میں خنجر کی سی کاٹ پیدا ہوجاتی تھی۔ عام آدمی اس آواز کو سن کر شاید اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر محسوس کرتا۔

"اس کا میں ہی کچھ کرتا ہوں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "تم سیٹھ صاحب کو ہی قابو میں رکھو۔ مجھے بھی اپنا نشانہ آزمائے کافی دن گزر چکے ہیں۔"

جس مرسیڈیز میں ہم سفر کررہے تھے وہ شفیع شاہ کے استعمال میں رہتی تھی اور ہماری خاص گاڑیوں میں سے ایک تھی۔ ہماری خاص گاڑیوں میں کئی خفیہ خانوں میں ایسی بہت سی چیزیں محفوظ رہتی تھیں جو ہنگامی صورتحال میں استعمال ہوسکتی تھیں اور حالات کا پانسہ پلٹ سکتی تھیں۔

میں نے سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر ایک خفیہ بٹن دبا کر سیٹ کے نیچے ہی بنا ہوا ایک خفیہ خانہ کھولا اور ٹٹول کر اس میں سے ایک طاقتور رائفل نکالی جو دو حصوں میں تقسیم تھی۔ رائفل کو جوڑنے اور اس پر سائیلنسر فٹ کرنے میں مجھے بمشکل چند سیکنڈ لگے۔ سیٹھ کرامت وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف پیٹھ کرتے ہوئے کھڑکی کا شیشہ نیچے کیا اور رائفل کی نال کے ساتھ سر کھڑکی سے نکالتے ہوئے نشانہ لے کر تقریباً ایک ساتھ ہی دو فائر کیے اور دوسرے ہی لمحے میں ایک انجانی مسرت محسوس کرتے ہوئے مسکرا دیا۔ نشانہ درست ہی رہا تھا۔ فائروں کی آواز تو محض ہلکی سی "ٹشک" تک ہی محدود رہی تھی جو ہوا کی شاں شاں میں مدغم ہو گئی تھی مگر ساتھ ہی دو زوردار دھماکے ہوئے تھے۔ فورڈ کے دونوں اگلے ٹائر برسٹ ہو گئے تھے۔

دوسرے ہی لمحے کار بری طرح لہرائی۔ سڑک کے درمیان کچی پٹی پر شجر کاری کی غرض سے نئے پودے لگائے گئے تھے اور ان کے گرد اینٹوں کی گول منڈیریں بھی کھڑی کی گئی تھیں۔ کار ایسی ہی ایک منڈیر سے بری طرح ٹکرائی۔ میں نے شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا اور پھر کار کی باڈی پر اینٹیں گرنے کی آواز سنی۔ کار وہیں رک چکی تھی اور الٹتے الٹتے بچی تھی۔

میں نے سر اندر کر کے رائفل گود میں رکھ لی اور کھڑکی کا شیشہ چڑھا دیا۔

"شکر ہے ونڈ اسکرین پر فائر کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔" میں نے اطمینان کی سانس لے کر کہا "اور یہ بھی شکر ہے کہ متحرک چیزوں کا نشانہ لینے کی میری صلاحیت بھی متاثر نہیں ہوئی۔"

"باس..... آپ بہرحال باس ہیں" شفیع شاہ بولا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ اتنی مسکراہٹ بھی اس کے ہونٹوں پر تبھی آتی تھی جب وہ بہت خوش ہوتا تھا۔

"بس اب ڈیفنس کی طرف ہی چلے چلو" میں نے کہا۔

سیٹھ کرامت اب بالکل اسی طرح ڈھیلا ہو کر بیٹھ گیا تھا جیسے کسی غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ تاہم مجھے اب بھی یہ سوال پریشان کر رہا تھا کہ سیٹھ کرامت کا ایسا کون سا ہمدرد ہو سکتا تھا جو اس کی خاطر انجانے خطرات میں کود پڑنے کے لئے اس حد تک تیار تھا؟ لیکن فی الحال اس سوال کا جواب حاصل کرنا میرے لیے زیادہ ضروری نہیں تھا اس لیے میں اسے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

سیٹھ رمضان ایک ایسے راستے سے واپس روانہ ہوا جس پر ہمیں دوبارہ اس مقام سے نہیں گزرنا پڑا جہاں ہم اپنے تعاقب میں آنے والی کار کو چھوڑ کر آئے تھے۔ شفیع شاہ نے ایک بار پھر

راستوں کے متعلق سیٹھ رمضان کو ہدایات دینا شروع کیں۔ ایک گلی میں پہنچ کر شفیع شاہ نے ایک ہاتھ سے اپنا اسکارف کھول کر میری طرف بڑھایا اور میں نے اس کا مقصد سمجھتے ہوئے اسکارف سیٹھ کرامت کی آنکھوں پر لپیٹ دیا۔ وہ ایک بار پھر کسمسا کر رہ گیا۔ اس کے ہاتھ آزاد تھے لیکن اس نے اسکارف آنکھوں سے ہٹانے کی قطعاً کوشش نہیں کی۔

گاڑی مزید کچھ دیر تک ادھر ادھر گلیوں میں چکراتی رہی۔ کچھ گلیوں کے چکر بلا ضرورت بھی لگائے جا رہے تھے لیکن درحقیقت اس میں بھی ایک مقصد پوشیدہ تھا۔ شفیع شاہ چاہتا تھا کہ سیٹھ کرامت آنکھیں بند ہونے کے بعد سمتیں بھی صحیح طور پر یاد نہ رکھ سکے کہ گاڑی کس کس طرف مڑی تھی۔

بالآخر گاڑی ہمارے مطلوبہ بنگلے کے سامنے جا رکی۔ یہ ایک مختصر سا ہی بنگلا تھا اور طرز تعمیر بھی سادہ سا ہی تھا۔ اس کی ایک "خوبی" یہ تھی کہ اس کے دائیں بائیں اور پیچھے کافی دور دور تک کوئی اور بنگلا نہیں تھا۔ اونچے نیچے پلاٹ خالی پڑے تھے۔ کسی میں جوہڑ کی طرح پانی کھڑا تھا اور کسی میں جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا۔

بنگلا تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور سیاہ گیٹ بند تھا لیکن رمضان نے ہلکا سا ہارن دیا تو چند لمحے بعد ہی ہمارے خصوصی تربیت یافتہ "گارڈ" نے بغلی گیٹ کھول کر باہر جھانکا اور پھر لپک کر گیٹ کھول دیا۔

گاڑی ڈرائیو وے میں چھوڑ کر ہم ایک صاف ستھرے بیڈ روم میں پہنچے۔ شفیع شاہ نے دروازہ بند کر دیا اور میں نے سیٹھ کرامت کی آنکھوں سے اسکارف ہٹا دیا۔

"بیٹھو کرامت سیٹھ.....! آرام سے بیٹھو۔" میں نے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "گھبرانے یا پریشان ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اسے اپنا ہی گھر سمجھو۔"

وہ بیڈ پر بیٹھ تو گیا لیکن اس طرح جیسے موقع ملتے ہی اٹھ بھاگے گا۔ اعصابی کشیدگی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ میں نے اس کا بریف کیس اس کے پاس ہی رکھ دیا اور خود کچھ فاصلے پر پڑی ہوئی کاؤچ پر جا بیٹھا۔ سیٹھ رمضان پہلے ہی بیٹھ چکا تھا۔

گویا صورتحال سے محظوظ ہو رہا تھا۔ یہ ہماری محبت کا کمال تھا ورنہ پہلے وہ اس قسم کے حالات میں خوف زدہ ہو جایا کرتا تھا۔

گارڈ ایک طرف مؤدب کھڑا تھا اور شفیع شاہ کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ میں نے گارڈ سے کہا۔ "سیٹھ صاحب کے لئے کھانا اور چائے وغیرہ تیار کراؤ۔ یہ دو تین روز یہیں رہیں گے۔ ہر طرح سے ان کے آرام کا خیال رکھنا۔"

یہ مخصوص اصطلاحیں تھیں اور تربیت یافتہ گارڈ ان کا مطلب اچھی طرح سمجھتا تھا۔ جب بھی ہمیں کسی شخص کو یرغمالی قیدی یا کسی اور حیثیت سے یہاں رکھنا ہوتا تھا تو اس گارڈ کی ذمے داری ہوتی تھی کہ وہ شخص نہ تو فرار ہونے پائے' اور نہ کوئی اسے چھڑا کر لے جا سکے اور نہ کوئی گزند پہنچا سکے۔ وہ تنہا ہی اپنی ذمے داری بڑی عمدگی سے نبھاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہاں ایک اور ملازم ہوتا تھا جس کا کام کھانا پکانا اور صفائی ستھرائی وغیرہ تھا۔

گارڈ سعادتمندی سے سر ہلا کر باہر جا چکا تو میں سیٹھ کرامت سے مخاطب ہوا "جتنی دیر میں تمہارے لئے کھانا وغیرہ تیار ہو اتنی دیر میں ہم وہ مختصر سا کام کر لیں جس کے لیے ہم سب کو اتنی زحمت اٹھانا پڑ رہی ہے۔"

وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"بریف کیس کھولو..." میں نے ملائمت سے کہا "اور اپنے سب سے بڑے بزنس اکاؤنٹ کی چیک بک نکالو اور پچاس لاکھ کا چیک کاٹ دو۔ شاید تمہیں یاد نہیں رہا کہ یہ رقم تم نے ابتدائی طور پر ہمارے منصوبے میں لگانے کا معاہدہ کیا تھا۔"

"میں نے کہا نا کہ میں منصوبے میں شریک ہونا نہیں چاہتا" سیٹھ کرامت گویا اپنی تمام توانائی مجتمع کر کے کمزور سی آواز میں بولا۔

"یہ فیصلہ تمہیں ہمارے نمائندے کے نیویارک روانہ ہونے سے پہلے کر لینا چاہیے تھا۔" میں نے ہموار لہجے میں کہا۔ "ہم نے تمہیں سوچنے کے لیے بہت وقت دیا تھا۔ تمہیں زبردستی اس منصوبے میں شامل ہونے کے لیے نہیں کہا تھا۔ اور تم کوئی نوعمر اور ناسمجھ لونڈیا بھی نہیں ہو جو بھولپن اور کم سنی کی نادانی کے باعث کسی غلط جگہ شادی کے لیے ہامی بھر بیٹھی ہو۔ تم نے غالباً ہمارے بارے میں کافی کرید لگائی ہے لیکن تمہیں یہ کسی نے نہیں بتایا کہ ہم کسی کے سامنے یا کوئی ہمارے سامنے خوب سوچ سمجھ لینے کے بعد کسی معاملے میں ہامی بھر لے تو پھر وہ بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے..... اور پھر تمہارے ساتھ تو ہمارا زبانی نہیں' تحریری معاہدہ ہے۔ چلو اب باتوں میں وقت ضائع نہ کرو۔ چیک بک نکالو۔"

اس نے اب بھی بریف کیس کی طرف ہاتھ نہ بڑھایا۔ شفیع شاہ اس وقت ریوالور نکالے ہوئے تھا اور اسے کھلونے کی طرح انگلی میں گھما رہا تھا۔ اسے میرا اشارہ مل چکا تھا۔ وہ بظاہر بڑی

بے نیازی سے ٹہلنے ہی کے سے انداز میں سیٹھ کرامت کے قریب پہنچا۔ سیٹھ کو قطعاً کوئی اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔

شفیع شاہ کا ہاتھ اتنی تیزی سے حرکت میں آیا کہ خود میری بھی اس پر نظر نہیں ٹھہر سکی۔ "ٹک" کی زوردار آواز کے ساتھ ریوالور کا دستہ سیٹھ کرامت کی کھوپڑی پر پڑا اور وہ بے اختیار چیخ مار کر دونوں ہاتھوں سے سر کو تھامتے ہوئے بیڈ پر چت ہو گیا۔

"یہ تمہاری کھوپڑی پر پہلی اور نہایت ہلکی سی دستک تھی" میں نے ہموار لہجے میں کہا "محض تمہارے حواس کو درست کرنے کے لئے۔ دوسری دستک پر کھوپڑی چٹخ جائے گی اور تیسری دستک پر بھیجہ باہر آ جائے گا۔ اس کے بعد ہم تمہاری بے مصرف لاش آس پاس کے کسی خالی پلاٹ میں دفن کر کے اپنے کاموں میں مصروف ہو جائیں گے۔ اکیلے دُکیلے آدمی پر تو ہم گولی بھی ضائع نہیں کرتے۔"

اس کی عقل پہلی دستک پر ہی ٹھکانے آ چکی تھی۔ وہ کراہتا ہوا اٹھا اور بریف کیس بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر رکھ کر اس کے تالے کے نمبر ملانے لگا۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

"اب جبکہ تم ہماری بات پر عمل کرنے کا ارادہ کر ہی چکے ہو تو چند منٹ کے لئے رک کر اپنے حواس درست کر لو۔" میں نے ملائمت سے کہا "تاکہ چیک پر صحیح طور پر دستخط کر سکو..... اور یہ یاد رکھنا کہ کسی بھی وجہ سے اگر تمہارا چیک ڈس آنر ہوا تو کبھی گھر جانا نصیب نہیں ہو گا اور یہاں تمہاری زندگی کا چیک بھی ڈس آنر ہو جائے گا۔ بے آبرو ہو جائے گا۔ ظاہر ہے آدمی کو موت آئے لیکن نہ کہیں جنازہ اٹھے' نہ نماز ہو' نہ کہیں مزار ہو تو یہ بے آبرو ہونا ہی ہوا۔"

میری طرف سے اجازت پا کر وہ سستانے کے لئے لیٹ گیا۔ وہ یک بیک تھکا تھکا سا نظر آنے لگا تھا۔ ایک بار اس نے سر بھی سہلایا۔ اس کے سر پر یقیناً گومڑ ابھر آیا تھا۔

"تم نے مجھے بڑا ذلیل کیا ہے" وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولا۔

"آدمی اپنی حرکتوں کی وجہ سے ذلیل ہوتا ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

وہ خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ابھی تو ہم نے تمہیں ذرا بھی ذلیل نہیں کیا۔ ابھی تک تو ہم تم سے حتی الامکان ویسا ہی سلوک کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جیسا کسی بھی معزز کاروباری پارٹنر سے کرنا چاہئے۔ تھوڑی بہت گستاخی اور سختی تو تمہارے اڑیل پن اور وعدہ خلافی کی وجہ سے کرنا پڑی ہے ورنہ تم جیسے "پارسا" تاجروں کی نسبت ہماری آنکھ میں زیادہ شرم ہے۔ ہمارا برا سلوک تو تم نے دیکھا ہی نہیں..... اور کوشش کرنا کہ نہ ہی دیکھنا پڑے۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہوگیا ہے" وہ سرہلاتے ہوئے قدرے تلخ لہجے میں بولا۔

"کاش تمہیں پہلے ہی اندازہ ہوجاتا" میں نے طویل سانس لے کر کہا "چلو.... اب چیک بک نکالو۔"

اب وہ کافی حد تک سنبھل چکا تھا۔ چیک بک نکال کر اس نے ایک چیک تیار کیا اور سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔ شفیع شاہ نے چیک اٹھا کر اس کا محائنہ کیا اور آہستگی سے بولا "ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے باس!"

"ٹھیک ہے ...... صبح اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا" میں نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ سیٹھ کرامت چمڑی اتروا لے گا مگر پچاس لاکھ کا چیک سائن نہیں کرے گا۔

سیٹھ کرامت ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "یہ بڑی رقم کا چیک ہے۔ میری ذاتی تصدیق کے بغیر کیش نہیں ہوگا۔"

"ہم اسے کیش کرانے کب جارہے ہیں" میں نے بے پروائی سے کہا "میں نے شفیع شاہ سے یہی تو کہا ہے کہ صبح اکاؤنٹ میں جمع کرا دینا۔ اس پرائیوٹ لیمٹڈ کمپنی کے اکاؤنٹ میں جو ہم نے مل کر قائم کی ہے۔ ظاہر ہے چیک کراس ہوگا۔ اس کے علاوہ اس معاہدے کی فوٹو کاپی بھی بینک میں جائے گی جس کی رو سے تمہیں لازماً اتنی رقم جمع کرانا تھی۔ چنانچہ الجھن کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... اور اگر اس کے باوجود کوئی الجھن ہوئی تو ہم الجھن سے نمٹنا جانتے ہیں۔"

شفیع شاہ نے چیک جیب میں رکھ لیا۔

"بس اتنی سی بات تھی جس کے لئے اتنا ہنگامہ تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا "کل یہ چیک جمع ہوگا اور ہم کوشش کریں گے کہ چوبیس گھنٹے میں یہ کمپنی کے اکاؤنٹ میں جمع ہوجائے۔ اس وقت تک تم یہیں رہو گے۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی بلکہ اگر تمہارا شرافت کا مظاہرہ کرنے کا ارادہ ہو اور ہمیں فرصت میسر ہوئی تو ہم تمہیں کہیں سیرو تفریح کرانے بھی لے چلیں گے۔ ہم نہیں چاہتے کہ تمہارا وقت بوریت میں گزرے۔ اب ہم چلتے ہیں' ہمارا آدمی تمہاری ضروریات کا خیال رکھے گا۔ اور وہ سامنے تپائی پر ٹی وی اور وی سی آر بھی موجود ہے چاہو تو وقت گزاری کے لئے فلمیں بھی لگا سکتے ہو۔ شب بخیر۔"

ہم اسے قدرے حیران سا چھوڑ کر باہر آگئے۔ گارڈ جس کا نام ریاض تھا' باہر دروازے کے قریب ہی کھڑا تھا اور بالکل مستعد نظر آرہا تھا۔ اس سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی' وہ اپنی ذمے داری کو خوب سمجھتا تھا۔ اعشاریہ چار پانچ کا ایک ریوالور ہمیشہ اس کی بش شرٹ کے نیچے پتلون کی بیلٹ میں اڑسا رہتا تھا اور اس کے استعمال میں وہ طاق تھا

"چلو یہ کام تو ہوا" میں نے سکون کی سانس لے کر کہا۔ ہم ڈرائیو وے میں آن کھڑے ہوئے تھے۔

"کام تو ہوگیا لیکن میں سیٹھ کرامت کی طرف سے مطمئن نہیں ہوں" سیٹھ رمضان بولا "اب ہم جبراً اسے پارٹنر بنا کر ساتھ رکھ رہے ہیں اور ظاہر ہے کاروبار کے لئے یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ اس سے بہتر ہوتا کہ ہم اس کی جگہ کوئی اور پارٹی تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد کوئی پارٹی مل ہی جاتی۔"

"میں نے ہر پہلو پر سوچا تھا۔ حالانکہ تمہیں یہی محسوس ہوا ہوگا کہ میں نے سیٹھ کرامت پر جبر کرنے کا فیصلہ فوری طور پر کرلیا ہے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ میں نے چند منٹ میں ہی ہر زاویے سے اس مسئلے پر غور کیا تھا" میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ "ایک تو ہمارے پاس دوسری پارٹی تلاش کرنے' اسے آمادہ کرنے اور کاغذات میں ترمیم کرنے نیز غیر ملکی کمپنی کو اس سے آگاہ کرنے کا وقت نہیں تھا' آجکل میں ہم سے بینک گارنٹی کی فرمائش آنے والی ہے اور سیٹھ کرامت کا نام کاغذات میں جاچکا ہے۔ تم خود ہی مجھے بتا چکے ہو کہ ان ابتدائی مراحل میں ہی اس قسم کی تبدیلی سے غیر ملکی کمپنی میں ہماری ساکھ خراب ہوسکتی تھی۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے" سیٹھ رمضان اپنے پہلے والے مؤقف پر آگیا۔

"دوسرے میں نے محسوس کیا کہ سیٹھ کرامت ان لوگوں میں سے ہے جو کسی کی شرافت سے متاثر ہو کر اس کے ساتھ معاملات اچھے نہیں رکھتے بلکہ جتنے کسی سے دہشت زدہ رہیں اتنے ہی اس کے ساتھ سیدھے رہتے ہیں" میں نے کہا بلکہ اب تو ہمیں آئندہ بھی سیٹھ کرامت کو دہشت زدہ ہی رکھنا ہوگا۔ اسے منافع ملنے لگے گا تو پھر وہ خود بخود ہی سیدھا ہوجائے گا۔ اسے صبر آجائے گا اور یہ بھی معلوم ہوجائے گا کہ ہم معاملت کے کھرے لوگ ہیں اور ہمارے ساتھ کاروبار کرنا گھاٹے کا سودا نہیں۔"

"مجھے اس کار کا خیال بھی پریشان کر رہا ہے جو ہمارے تعاقب میں آرہی تھی۔" سیٹھ رمضان بولا "معلوم نہیں وہ لوگ کون تھے۔ ظاہر ہے وہ سیٹھ کرامت کے قبیلے کے کاروباری لوگ نہیں ہوسکتے تھے۔ ان کے طرز عمل میں تم ہی لوگوں جیسی بے خوفی کی جھلک نظر آرہی تھی۔"

"تمہاری یہ عادت نہیں گئی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کہ یا تو وقت سے بہت پہلے ہی پریشان ہونا شروع کردیتے ہو یا پھر اس وقت پریشان ہوتے ہو جب موقع ہی نکل چکا ہوتا ہے اور پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ بھائی میرے! ابھی صحیح وقت پر بھی پریشان ہونیا کرو۔ جب ان لوگوں کی ہم تک رسائی ہوگی اس وقت انہیں بھی دیکھ لیں گے۔ فی الحال تو ہم انہیں راستے میں چھوڑ آئے ہیں۔ اس لئے سردست ان کا خیال بھی چھوڑ دو۔ ممکن ہے ان میں سے کوئی زخمی بھی ہوچکا ہو اور وہ اسی سے سبق حاصل کرتے ہوئے کچھ عرصے کے لئے اپنی سرگرمی ترک کردیں۔ آؤ اب چلیں.... اور کچھ اپنے کاروبار کا حساب کتاب دیکھیں۔"

"بھئی تمہیں شفیع شاہ کے ساتھ جو حساب کتاب کرنا ہے وہ جا کر بے شک کرلو۔ مجھ سے تو اب کل ہی بات کرنا۔ میں تو بہت تھک گیا ہوں" سیٹھ رمضان انگڑائی لیتے ہوئے بولا "تمہاری تو بات ہی کچھ اور ہے۔ تم تو کبھی تھکتے ہی نہیں۔ تمہارے اعصاب بھی لوہے کے بنے ہوئے ہیں اور جسم بھی۔"

"بڑی سختیاں جھیل کر ہم ایسے بنے ہیں سیٹھ صاحب!" میں نے اس کا کندھا تھپک کر دوستانہ انداز میں اس کا بازو دبایا۔

وہ کراہ اٹھا اور بازو چھڑاتے ہوئے بولا "دیکھو یار! اپن کو یہ فولادی ہاتھ مت دکھایا کرو۔ اپن ہیں آدمی دوسری طرح کے' جو کچھ کہنا ہے منہ سے کہو۔"

"ہائے سیٹھ رمضان!" میں نے آہ بھر کر کہا "تمہارے اسی بھولپن پر تو جی چاہتا ہے کہ کبھی تمہیں بازوؤں میں لے کر شفقت اور محبت سے خوب بھینچوں۔"

"وہ دن میری زندگی کا آخری دن ہوگا" سیٹھ رمضان نے قدرے ترنم سے ایک فلمی گانے کا بول گنگنانے کی کوشش کی۔ وہ عمر میں مجھ سے کافی بڑا تھا مگر کبھی کبھی واقعی مجھے ایک بھولا بھالا سا نوجوان لگتا تھا۔ بظاہر اتنا سیدھا سادا ہوتے ہوئے بھی کمبخت نے معلوم نہیں کیونکر اتنی دولت کمائی تھی اور وہ بھی ابتدا میں ہماری ہی لائن سے۔

"اچھا چلو... ہم تمہیں چھٹی دے رہے ہیں" میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کہا "تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کرکے میں اور شفیع شاہ ہوٹل چلے جائیں گے۔"

سیٹھ رمضان کا گھر ڈیفنس میں ہی تھا۔ اسے اس کے گھر ڈراپ کرکے میں اور شفیع شاہ کچھ دیر بعد ہوٹل پہنچ گئے۔ پہلے ہم نے ڈائننگ ہال میں بیٹھ کر پُر تکلف کھانا کھایا۔ پھر میں شفیع شاہ کو ساتھ لیے' اپنے کمرے میں آگیا۔ ہم نے رات گئے تک بیٹھ کر حساب کتاب کیا۔ شفیع نے تمام اہم واقعات سے مجھے آگاہ کیا۔ بعض ضروری معاملات میں مجھ سے مشورہ طلب کیا۔ اس کی رپورٹیں بے حد تسلی بخش تھیں۔ کراچی میں میرا کام بہت پھل پھول رہا تھا۔ شفیع شاہ کی کارکردگی بہت زبردست تھی۔ میں نے اسے تقریباً پارٹنر کی سی حیثیت دے رکھی تھی اور اس نے اپنے آپ کو اس پوزیشن کا اہل ثابت کردیا تھا۔ رات گئے وہ رخصت ہوگیا۔ اہم ترین کاغذات کی ایک نہایت مختصر سی فائل اس کے پاس تھی۔ ہم جب کاروباری میٹنگ کے لئے بیٹھتے تھے تو صرف اس فائل کی مدد سے سارا حساب کتاب اور تبادلہ خیال ہوجاتا تھا۔ اس فائل میں نہایت اختصار کے ساتھ ہر چیز کاغذات پر موجود ہوتی تھی۔

شفیع شاہ کے جانے کے بعد میں نہایت طمانیت اور آسودگی کی نیند سوگیا۔ کراچی میں اپنے کاروبار کی تازہ ترین پوزیشن جاننے کے بعد مجھے بے حد اطمینان ہوا تھا اسی لئے مجھے نیند اچھی آئی تھی۔ سیٹھ کرامت والے مسئلے پر میں زیادہ پریشان نہیں تھا' مجھے معلوم تھا کہ میں نے اب انگلیاں تھوڑی سی ٹیڑھی کرلی ہیں تو گھی نکل ہی آئے گا۔

دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ سیٹھ رمضان اور شفیع شاہ حسب پروگرام میرے پاس دن چڑھے آئے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد ہمارا سمندر کی سیر کو جانے کا پروگرام تھا۔ سیر سے تو ظاہر ہے ہمیں کم ہی دلچسپی تھی۔ دراصل ہمارے کاروبار کی ایک شاخ جھینگوں کی تجارت بھی تھی۔ جھینگے پکڑنے کے لئے ہمارے پاس دو ٹرالے پہلے ہی سے موجود تھے۔ شفیع شاہ نے پچھلے دنوں ایک نیا ٹرالر خریدا تھا۔ وہ مجھے اس کا معائنہ کرانا چاہتا تھا۔

اس میں بیٹھ کر ہمیں گہرے پانیوں کی طرف جانا تھا۔ اس طرح ایک تو میں ٹرالر کو بھی پرکھ لیتا اور اس بہانے کچھ سمندر کی سیر بھی ہوجاتی۔ شفیع شاہ کسی بھی نئی چیز کی خریداری کرتا تھا تو میرے انکار کے باوجود مجھے اس کا معائنہ ضرور کراتا تھا۔ ٹرالر کے معائنے کے سلسلے میں تو خیر میں نے انکار بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ چلو اس بہانے تھوڑی دیر کے لئے ایڈونچر کی دنیا میں ہی جھانک لیں گے۔ کافی عرصے سے ایڈونچر کی دنیا سے میرا رابطہ ٹوٹا ہوا تھا۔ میں تو کافی حد تک دفتری سا ہی آدمی ہو کر رہ گیا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ مکمل طور پر دفتری سانچے میں ہی ڈھل جاؤں۔

شفیع شاہ نے ٹرالر' فشریز سے کیماڑی منگوایا ہوا تھا۔ ہمیں اس پر کیماڑی سے ہی سوار ہونا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ ہمارے ٹرالر جھینگے کے شکار میں استعمال ہو رہے تھے اور اس کام میں خاطر خواہ منافع دے رہے تھے۔ لیکن رات کی تاریکیوں

میں جب کبھی ادھر اُدھر سے ہمارا کچھ سامان آتا ہوتا تھا تو وہ بھی انہی ٹرالروں پر آتا تھا۔

دوپہر کے کھانے تک ہم لوگ گپ شپ کرتے رہے۔ کھانا ہم نے ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ہی کھایا۔ شفیع شاہ نے بتایا کہ سیٹھ کرامت کا دیا ہوا چیک کمپنی کے اکاؤنٹ میں جمع کرا دیا گیا ہے اور قوی امید ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ دو دن میں کلیئر ہو جائے گا۔

"چیک کمپنی کے اکاؤنٹ میں کریڈٹ ہو جانے کے بعد ہمیں سیٹھ کرامت کو رہا کر دینا ہے" میں نے گویا شفیع شاہ کو یاد دلایا۔ اس نے صرف اثبات میں سرہلانے پر اکتفا کیا۔

ہوٹل سے نکلتے وقت دفعتاً مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے شفیع شاہ سے کہا "یار، سیٹھ کرامت کو بھی ساتھ لے لیتے ہیں۔ مجھے تو اس کے بارے میں سوچ کر اس پر ترس آرہا ہے۔ بے چارہ اداس بلبل کی طرح اس کمرے میں مقید بیٹھا ہو گا۔ بہر حال وہ ہمارا پارٹنر ہے۔ تھوڑا سا بہک گیا تو کیا ہوا۔ ہمارے طفیل وہ بھی تھوڑی سی تفریح کرلے گا ورنہ اس کی زندگی میں تفریح کا کیا دخل؟"

"مت بھولو کہ ہم نے اسے حبسِ بے جا میں رکھا ہوا ہے" رمضان نے گویا مجھے خبردار کیا "اگر اس نے راستے میں کہیں شور مچا دیا یا کسی اور طریقے سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کر کے یہ احساس دلا دیا کہ ہم جبراً اسے ساتھ رکھے ہوئے ہیں تو ہمارے لئے الجھن کھڑی ہو سکتی ہے۔ ابھی تو چیک بھی ہمارے اکاؤنٹ میں جمع نہیں ہوا۔"

میں نے مُربیانہ انداز میں رمضان کا کندھا تھپتھپایا "سیٹھ کرامت کو ایک ہی رات میں اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس کا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے ہے۔ اور اسے یقیناً اپنی زندگی بہت ہی زیادہ عزیز ہے۔"

"یہ کام تم اپنے رسک پر کرو گے" سیٹھ رمضان کندھے اچکا کر بولا "اس میں میری اور شفیع شاہ کی رائے شامل نہیں ہے۔ کیوں شفیع؟" اس نے تائید طلب انداز میں شفیع کی طرف دیکھا۔

"میری رائے ہمیشہ صرف وہی ہوتی ہے جو باس کی رائے ہوتی ہے" شفیع دھیمے لہجے میں بولا۔

"ایک تو یہ تمہاری حد سے بڑھی ہوئی وفاداری کہیں تمہیں مروا نہ دے ... اور ساتھ تمہارے باس کو بھی" سیٹھ رمضان مصنوعی خفگی سے منہ بنا کر بولا۔

"وفاداری انسان کو کبھی نہیں مرواتی ... بے وفائی مرواتی ہے۔" شفیع شاہ نے دھیمے مگر گہرے لہجے میں کہا۔

"ایک تو اس نوجوانی میں تمہارے جسم میں کوئی بوڑھی روح حلول کر گئی ہے" سیٹھ رمضان گویا صدمے کی شدت سے سر پر دوہتڑ مار کر بولا "چھوڑو اس بحث کو، آؤ چلیں۔"

ہم اس وقت پارکنگ لاٹ میں ہی کھڑے تھے۔ شفیع شاہ نے ہمیں گاڑی میں بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سنبھال لی۔ پہلے ہم ڈیفنس پہنچے۔ گارڈ مستعدی سے اپنی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ اس نے کمرے کے دروازے پر ہی ہمیں بتا دیا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔

اندر سیٹھ کرامت بیڈ پر گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے، سر کے نیچے دونوں ہاتھ رکھے کچھ اس انداز میں لیٹا ہوا تھا جیسے اسپتال کے کسی وارڈ میں کوئی صابر و شاکر قسم کا مریض لیٹا ہو۔ اس کا چہرہ کچھ اترا اترا سا تھا۔

"کہو۔ وقت خیریت سے گزرا؟ تمہیں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اب وہ نہ تو پریشان نظر آرہا تھا اور نہ ہی مشتعل۔ شاید اس نے اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔

"آؤ تمہیں تھوڑی سی آؤٹنگ کے لئے لے چلیں۔" میں نے اسے باہر چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں" اس کے لہجے میں خوف جھلک آیا۔

"ارے تمہیں کیا ہوا بھئی؟" میں نے حیرت سے کہا "کل تک تو تم اچھے بھلے سر اٹھا کر بات کر رہے تھے۔ آج خوفزدہ کیوں نظر آنے لگے؟ کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے کیا؟"

اس نے نفی میں سرہلایا۔

"تو پھر آؤ ..." میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے بستر سے اتارتے ہوئے کہا "میں تو تمہارے ساتھ دوستوں کی طرح پیش آنے کی حتی المقدور کوشش کر رہا ہوں۔ آج ہم ذرا سیر کے لئے جا رہے ہیں۔ میں نے سوچا تمہیں بھی ساتھ لے لیں۔"

وہ بستر سے اٹھ کر ہمارے ساتھ دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے شفیع شاہ سے کہا "بھئی احتیاطاً چند منٹ کے لئے ایک بار پھر سیٹھ صاحب کی آنکھوں کو ڈھانپ دو۔ ایک تجربے کے بعد اب ہمیں ان پر زیادہ بھروسہ نہیں رہا۔ کیا خبر، کل کو پھر ان کی نیت بدل جائے اور یہ کسی کو اس مکان کا محلِ وقوع سمجھانے کی کوشش کرنے لگیں۔"

شفیع شاہ نے ایک موٹی سیاہ پٹی اس کی آنکھوں پر باندھ دی۔ ... آنکھوں پر محض سیاہ پٹی کا بندھ جانا بھی نفسیاتی طور پر بے حد خوف کا باعث ہوتا ہے۔ سیٹھ کرامت میرا ہاتھ تھام کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے قدرے لرزتی آواز میں بولا۔ "دیکھو ... جہاں تک رقم کا تعلق ہے تو میں نے چیک تمہیں دے دیا ہے۔ وعدہ خلافی مجھ سے ضرور سرزد ہوئی ہے لیکن اس کے لئے میں سخت شرمندہ ہوں اور تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ میں جب بھی کوئی وعدہ کروں گا اسے ضرور پورا کروں گا، خواہ کچھ

بھی ہو جائے۔ اس صورت میں اب تمہیں میری جان کو بخش دینا چاہئے۔ مجھے مار کر تم لوگوں کو کیا مل جائے گا؟"

وہ واقعی دہشت زدہ ہو چکا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ بھی کہا جا سکتا تھا کہ وہ راہِ راست پر آچکا تھا۔

میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "ہمارا تمہیں مارنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔ ہم خونریزی کو پسند نہیں کرتے۔ اگر خون کا ایک قطرہ بہائے بغیر ہی مقصد حاصل ہو سکتا ہو تو خونریزی کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم اطمینان رکھو۔ ہم تمہیں واقعی تفریح کرانے لے جا رہے ہیں۔ کل یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک تمہیں رہائی بھی مل جائے گی۔ لیکن اب راستے میں کسی غیر ذمے داری یا حماقت کا ثبوت دے کر اپنی اس متوقع رہائی کو موت میں نہ بدل لینا۔"

"نہیں، میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا۔" وہ جلدی سے بولا۔

باہر ڈرائیوے میں آکر ہم نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور رنگین شیشے چڑھا دیئے۔ ہمارے گارڈ نے مستعدی سے سیلوٹ کیا اور گیٹ کھول دیا۔

گاڑی مین کلفٹن روڈ پر آگئی تو میں نے سیٹھ کرامت کی آنکھوں سے پٹی اتروا دی۔ اس نے طویل سانس لی اور سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اب وہ کچھ مطمئن نظر آرہا تھا۔ سڑک پر ٹریفک رواں تھا۔ موسم بے حد خوشگوار تھا اور فضا میں ایک عجیب سا سکون اور ٹھہراؤ تھا۔ میں غیر محسوس طور پر بار بار کن انکھیوں سے سیٹھ کرامت کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا لیکن اس کے تاثرات سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ چیخنے چلانے یا کسی کو اپنی طرف کسی اور طریقے سے متوجہ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ تاہم شفیع شاہ کا ہاتھ بدستور جیکٹ کی جیب میں تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اس کی انگلی ٹرائیگر پر ہو گی۔

کیماڑی پہنچ کر ہم نے کار ایک طرف کھڑی کی اور اتر کر ریلنگ کی طرف بڑھے۔ سیٹھ کرامت ہمارے درمیان تھا۔ اس جگہ ہم اس کی طرف سے زیادہ ہوشیار تھے کیوں کہ یہاں خاصی گہما گہمی تھی۔ بہت سے لوگ بیوی بچوں کے ساتھ اور بہت سے دوستوں کے ساتھ سمندر کی سیر کے لئے آئے ہوئے تھے۔

عین ممکن تھا کہ اتنی بھیڑ بھاڑ دیکھ کر سیٹھ کرامت کا ارادہ بدل جاتا اور وہ چیخنے چلانے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا فیصلہ کر لیتا۔ لیکن اس کے تاثرات مجھے اطمینان بخش ہی نظر آئے۔ البتہ اس کی پیشانی پر الجھن کی شکنیں نظر آرہی تھیں اور وہ کچھ متلاشی سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کیا تلاش کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" وہ قدرے گڑبڑا کر بولا "میں سوچ رہا تھا کہ تم لوگ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟"

میں نے اب اسے حقیقت بتا دینا بہتر سمجھا۔ مبادا وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے۔ جب ہم اسے ٹرالر میں بٹھا کر لے جانے لگیں تو وہ سمجھ لے کہ ہم اسے سمندر میں کہیں ڈبونے جا رہے ہیں۔ عین ممکن تھا کہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو کر وہ شور مچانے کی کوشش کر بیٹھتا۔

"اپنے فشنگ کے کاروبار کے سلسلے میں شفیع شاہ نے ایک نیا ٹرالر خریدا ہے۔ وہ دکھانے لے جا رہا ہے۔ ہم نے سوچا اس بہانے تھوڑی سی سیر بھی ہو جائے گی" میں نے ملائمت سے بتایا۔

"ہاں .... یہ بات تو ہے" سیٹھ کرامت نے نیم توجہی سے سر ہلایا۔

ہجوم سے بچنے کی کوشش کرتے ہوئے ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ منوڑہ تک کرائے پر موٹر بوٹس چلانے والے، گاہکوں کی تلاش میں ادھر ادھر پھر رہے تھے۔ اور سیر کے خواہش مندوں کا راستہ روک روک کر ان سے بھاؤ تاؤ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کئی ایک کشتی والوں نے کن انکھیوں سے ہمیں دیکھا لیکن ہمارا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید ہم حلیے سے ہی کرائے کی موٹر بوٹ میں بیٹھ کر منوڑہ جانے والے آدمی نہیں لگ رہے تھے۔

شفیع کو خود ہی ایک موٹر بوٹ والے سے بات کرنا پڑی کیونکہ ٹرالر اس ساحل سے کافی دور کھڑا تھا اور وہاں تک ہمیں کرائے کی بوٹ میں ہی جانا تھا۔

لکڑی کی سیڑھیوں سے اتر کر بوٹ میں بیٹھنا ہوتا تھا اور ان سیڑھیوں سے اترتے وقت عام طور پر عورتیں بہت ڈرتی تھیں۔ غالباً یہ انگریزوں کے زمانے کی سیڑھیاں تھیں جو بری طرح گھس چکی تھیں اور ان پر بے تحاشا سیاہی اور کائی جمی رہتی تھی۔

ہم نے جس بوٹ والے سے بات کی تھی وہ بوٹ کو سیڑھیوں کے قریب لے آیا اور پہلے سیٹھ کرامت کو اتار کر ہم بھی یکے بعد دیگرے بوٹ میں کود گئے۔ ہمارا ٹرالر تقریباً دو فرلانگ کے فاصلے پر ایک غیر ملکی بحری جہاز کے زیرِ سایہ لنگر انداز تھا۔

جس موٹر بوٹ میں بیٹھ کر ہم روانہ ہوئے تھے وہ کرائے پر چلنے والی دوسری کشتیوں کی طرح ہی مختصر اور نیم شکستہ سی تھی اور اسے چودہ پندرہ سال کا ایک لڑکا چلا رہا تھا جس کے بھورے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ پھٹی ہوئی قمیص سے اس کا سانولا مگر مضبوط جسم جھانک رہا تھا۔ سمندر کی مرطوب ہواؤں اور تیز دھوپ نے اس کا بدن جھلسا دیا تھا۔

اگر موٹر بوٹ چلانا اس کا پیشہ نہ ہوتا تو شاید وہ ایک گورا چٹا اور خوبصورت لڑکا نظر آتا۔ مگر پھر اس کے چہرے پر شاید وہ خود اعتمادی نہ ہوتی جو اس وقت تھی۔ عجب بے نیازی سے وہ کشتی کے اگلے حصے پر کھڑا آنکھیں سکیڑے سمندر کو تک رہا تھا جو تاحدِ

نظر پھیلا ہوا نظر آرہا تھا۔ بہت کم لوگ اس بے نیازی سے سمندر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ یہ انہی کا کام ہے جن کے روز و شب سمندر کے سینے پر گزرتے ہیں۔

لڑکے نے موٹربوٹ کا انجن ٹرالر تک پہنچنے سے کچھ دیر پہلے ہی بند کردیا اور نہایت مہارت سے چپوؤں کی مدد سے بوٹ کو لہرا دیتے ہوئے ٹرالر کے ساتھ لگا کر روک دیا۔ یہ ٹرالر واقعی ہمارے پہلے والے ٹرالر سے کہیں اچھا اور بہت بڑا تھا۔ ٹرالر کیا چھوٹا موٹا بحری جہاز ہی دکھائی دے رہا تھا۔

اس کا صرف انجن ہی باہر سے آیا تھا۔ باڈی یہیں بنی تھی لیکن بڑی توجہ، محنت اور لاگت سے تیار کی گئی تھی اس لئے یہ کسی غیر ملکی ٹرالر سے کم نہیں تھا۔ فشنگ کے ٹرالروں پر رنگ و روغن کی کوئی خاص پروا نہیں کی جاتی لیکن اس پر نہایت خوبصورت اور نہایت بیش قیمت پینٹ کیا گیا تھا۔ شفیع شاہ کو معلوم تھا کہ ہر چیز کے بارے میں میرا ایک خاص ذوق بن چکا ہے اور میں معمولی سے معمولی چیز میں بھی ایک حسن دیکھنا پسند کرتا تھا۔ یہ جمالیات پرستی مجھ میں موجود تو شاید لڑکپن ہی سے تھی لیکن اس کی تکمیل کے مواقع اب میسر آئے تھے۔

ہم ٹرالر پر پہنچ گئے تو کرائے کی موٹربوٹ واپس چلی گئی۔ ٹرالر کے انجن روم میں ایک سیاہ فام اور مضبوط جسم کا نوجوان موجود تھا جس کے بال گھنگریالے اور دانت غیر معمولی طور پر سفید چمکیلے تھے۔ وہ بنیان اور چست پتلون میں تھا اور [illegible] ہوئی دھوپ میں اس کا کسرتی جسم چمک رہا تھا۔ اس نوجوان کا نام قاسم تھا اور یہ بھی ہمارے خاص کارکنوں میں تھا۔ وہ اس ٹرالر کا "کیپٹن" تھا اور اس حیثیت سے ہمارا کوئی خاص آدمی ہی کام کرسکتا تھا جو بہت سے رازوں کا امین بننے کا اہل ہو۔

قاسم ہمارے قدموں میں بچھا جارہا تھا لیکن ہم اس سے سلام دعا کرکے جلد ہی ڈیک پر آگئے۔ اس ٹرالر پر چار بڑے بڑے کمرے تھے جن میں برف کے ذریعے جھینگوں وغیرہ کو محفوظ رکھنے کے انتظامات موجود تھے۔ ایک کیبن قیام و طعام کے لئے بھی تھا جس میں دیوار گیر بستر، باتھ روم اور دیگر ضروری چیزیں موجود تھیں۔

ٹرالر جب جھینگے وغیرہ پکڑنے کی مہم پر نکلتے تھے تو کئی کئی ہفتے سمندر میں دور افتادہ مقامات پر کھلے پانیوں میں رہتے تھے۔ شکار کے دوران ٹرالر کے دونوں طرف ہوائی جہاز کی طرح دو بازو پھیلے ہوتے ہیں جن میں بڑے بڑے جال بندھے ہوتے ہیں۔ یہ پھیلے ہوئے جال لے کر ٹرالر سمندر میں چلتے رہتے ہیں اور جال میں جھینگے، مچھلیاں اور جانے کیا کچھ الا بلا پھنستا رہتا ہے۔ ہر چند دنوں بعد یہ شکار کولڈ اسٹوریج میں منتقل کردیا جاتا تھا۔ جس وقت ٹرالر شکار پر نہیں ہوتے تھے تو ان کے دائیں بائیں پھیلے ہو[ئے] بازو سمیٹ دیئے جاتے تھے۔

چند لمحے بعد ہی ہمارا ٹرالر سمندر کا سینہ چیرتا گہرے پانی[وں کی] طرف چل دیا۔ قاسم نہایت مشاق کیپٹن تھا۔ چھ سال کی عمر [سے] اس کے روز و شب سمندر کے سینے پر ہی گزر رہے تھے۔ دیگر [بہت] سے کارکنوں کی طرح وہ بھی شفیع شاہ ہی کی دریافت تھا۔ تاہم [میں] دو ایک مرحلے پر پہلے بھی اس سے مل چکا تھا۔

"بہت عمدہ ٹرالر ہے" سیٹھ رمضان نے انجن کی آواز [اور] رفتار وغیرہ پر توجہ دینے کے بعد ستائشی انداز میں سر ہلاتے ہو[ئے] کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر پوچھا "تمہیں پسند آیا؟"

"ٹرالر دیکھنے کون کمبخت آیا ہے۔ اس کے بارے میں مجھے پہلے ہی اطمینان تھا کہ شفیع شاہ نے خریدا ہے تو ٹھیک [ہی] خریدا ہوگا" میں نے نیلے آسمان کی وسعتوں کا جائزہ لیتے ہو[ئے] کہا اور مجھے خود ہی اپنا لہجہ کھویا کھویا سا محسوس ہوا۔

"تو پھر تم کس لئے آئے ہو؟" سیٹھ رمضان نے مسکرا[تے] ہوئے پوچھا۔

"وہ جو میرے اندر ایک وحشی روح مقید ہے اسے بہلا[نے] کے لئے" میں نے جواب دیا "آسمان زمین یا سمندر کی بے کرا[ں] وسعتوں میں بھٹکنے کا مجھے ایک عرصے سے موقع نہیں ملا اور [میں] اپنے آپ کو بے چین سا محسوس کررہا تھا۔ میں وسعتوں کا آ[دمی] ہوں مگر میں نے اپنے آپ کو مقید کرلیا ہے۔"

"مقید کہاں کرلیا ہے؟" سیٹھ کرامت نے پہلی بار زبا[ن] کھولی "تم شہر کی بند بند سی عمارتوں میں رہ کر بھی ہم سے زیا[دہ] آزاد ہو۔ جو جی چاہتا ہے کر گزرتے ہو۔ آزادی اور کسے [کہتے] ہیں؟"

"تم نہیں سمجھو گے۔ یہ تمہارے سمجھنے کی باتیں نہیں[" میں] نے اس کی طرف بغور دیکھتے ہوئے ملائمت سے کہا۔ مجھے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اب وہ زیادہ دہشت زدہ نہیں تھا۔ اس [کے] چہرے پر رونق آچلی تھی۔

ہم ڈیک پر پڑی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ نکھرے ہو[ئے] آسمان کی نیلاہٹ، سورج کی تب و تاب اور زندگی بخش حرار[ت]، مرطوب ہوا اور سمندر کی اپنی ایک خوشگوار سی خنکی۔ میں [ان] سب چیزوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔

ٹرالر تیز رفتاری سے ایک سیدھ میں بڑھا جارہا تھا۔ [گویا] اس مقام پر پہنچنا ہمارا مقصد ہو جہاں سمندر نیلے افق سے [ملتا] دکھائی دے رہا تھا۔ مگر جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے وہ مقا[م] گویا ہم سے دور ہوتا جارہا تھا۔ ادھر ادھر کافی فاصلے پر اکا [دکا] ٹرالر، کوئی لانچ، موٹربوٹ یا بحری جہاز آتا دکھائی دے جاتا تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اتنی دور نکل آئے کہ اکا دکا لانچیں وغیرہ بھی نظر آنی بند ہوگئیں۔ کرائے کی لانچوں [میں] سیر کرنے والے یہاں تک آتے نہیں تھے اور فشنگ اس طرف ہوتی نہیں تھی۔

"اس بے مقصد سفر سے تو اچھا تھا کہ تم مجھے اپنے اس آرام دہ قید خانے میں ہی لیٹا رہنے دیتے" سیٹھ کرامت جماہی لے کر بولا۔

"تمہیں قدرت نے وہ حس ہی نہیں دی کہ تم ان عظیم الشان اور مبہوت کردینے والے نظاروں سے محظوظ ہوسکو" میں نے ترحم آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"اس میں محظوظ ہونے والی کون سی بات ہے؟" وہ منہ بنا کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا "بس سیدھا سادا سا سمندر ہے اور ہم احمقوں کی طرح اس ٹرالر میں بیٹھے نہ جانے کہاں چلے جارہے ہیں۔"

"شکر کرو ہم نے اس سفر کو بامقصد نہیں بنایا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ورنہ مقصد تو یہ بھی ہوسکتا تھا کہ ہم اس پرسکون مقام پر تمہیں سمندر میں پھینک دیتے۔ گہرے پانی میں مچلتی ہوئی مچھلیاں یقیناً ہماری شکرگزار ہوتیں۔"

مذاق میں بھی یہ بات سن کر اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "اب تو تمہیں ایسی بات ہی نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ اب ہمارے درمیان اصل مسئلہ بخیر و خوبی حل ہوچکا ہے۔"

میں نے اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "تم سمندر کو اس لئے بھی سیدھا سادا کہہ رہے ہو کہ تم نے ابھی اس کے رنگ نہیں دیکھے۔ تم اس کی ہیبت سے واقف نہیں ہو۔"

سیٹھ کرامت نے جواب میں کچھ کہا لیکن میری توجہ اس کی طرف سے ہٹ چکی تھی۔ میں پیچھے، بہت دور نظر آنے والے اس عنابی کھلونے کو دیکھ رہا تھا جو درحقیقت ایک خوبصورت موٹر بوٹ تھی۔ خاصی دیر پہلے بھی اس موٹربوٹ پر میری نظر پڑی تھی لیکن اس وقت چونکہ اردگرد دوسری لانچیں اور کشتیاں وغیرہ بھی موجود تھیں اس لئے میں نے اسے بھی انہی میں سے ایک سمجھا تھا اور کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اب دور دور تک اس موٹربوٹ کے علاوہ کچھ نظر نہیں آرہا تھا اور وہ عین ہماری ہی سیدھ میں چلی آرہی تھی۔

ٹرالر کی رفتار چونکہ اب بالکل کم ہوچکی تھی اس لئے موٹر بوٹ لمحہ بہ لمحہ قریب آتی جارہی تھی۔ میری چھٹی حس نے مجھے خاصی دیر پہلے بھی خبردار کیا تھا کہ کچھ نظریں خصوصی طور پر ہم پر مرکوز ہیں لیکن میں نے سرسری نظر سے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس احساس کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔ اب خیال آرہا تھا کہ میری چھٹی حس نے سگنل ٹھیک ہی دیا تھا۔

شفیع شاہ کی اس طرف پیٹھ تھی جدھر سے وہ موٹربوٹ جھاگ اڑاتی چلی آرہی تھی۔ میرا خیال ہے میرے تاثرات تو تبدیل نہیں ہوئے ہوں گے لیکن میری آنکھوں میں ضرور اس نے کوئی تبدیلی پڑھ لی تھی۔ نہایت آہستگی سے اس نے گردن گھمائی اور بوٹ پر نظر پڑتے ہی اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

دوسرے ہی لمحے وہ ڈیک سے کودا اور ایک کمرے میں گھس گیا۔ واپس باہر آنے میں اسے بمشکل تین چار سیکنڈ لگے ہوں گے۔ وہ جب دوبارہ ڈیک پر آیا تو اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔

"یہ بوٹ یقیناً ہمارے تعاقب میں ہے۔" وہ سانپ کی طرح پھنکارا۔

"وہ تو میں نے بھی دیکھ لیا ہے" میں نے آہستگی سے کہا۔ "لیکن فی الحال تم اسٹین گن چھپا دو۔ پہلے ان لوگوں کو قریب آنے دو اور اندازہ ہونے دو کہ ان کے عزائم کیا ہیں۔ کہیں یہ کوسٹ گارڈ والے تو نہیں ہیں؟"

"کوسٹ گارڈ والے اتنی چھوٹی اور فینسی قسم کی موٹربوٹ استعمال نہیں کرتے" شفیع شاہ آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا "اور پھر اس پر کسی قسم کا کوئی نشان وغیرہ بھی نہیں ہے" یہ کہتے ہوئے شفیع شاہ نے اسٹین گن موٹے سے رسے کے اس بہت بڑے لچھے تلے چھپادی جو ڈیک پر ہی پڑا تھا۔

بوٹ کچھ اور قریب آئی تو میں نے دیکھا، وہ واقعی بالکل چھوٹی لیکن جدید ساخت کی تھی۔ اس میں کیبن کوئی نہیں تھا۔ ڈیزائن کسی حد تک کھلی چھت والی کار سے مشابہ تھا۔ ونڈ اسکرین کے پیچھے ایک شخص وہیل سنبھالے کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے چرمی سیٹوں پر دو آدمی موجود تھے لیکن وہ بھی بیٹھے ہوئے نہیں تھے، کھڑے تھے۔ ہتھیار غالباً کسی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔

میں نے غیر محسوس طور پر سیٹھ رمضان اور کرامت کے چہروں کا جائزہ لیا۔ سیٹھ رمضان اگر تھوڑا بہت خوفزدہ تھا تب بھی غالباً میری اور شفیع کی موجودگی کی وجہ سے مطمئن نظر آرہا تھا تاہم مجھے یہ دیکھ کر خاصی حیرت ہوئی کہ سیٹھ کرامت کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آچلی تھی۔ موٹربوٹ میں آنے والوں کے چہرے تو ابھی صاف نظر نہیں آرہے تھے لیکن سیٹھ کرامت کو شاید اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ کون لوگ ہیں اور شاید ان کی آمد سے وہ خوش تھا، اسے کوئی امید بندھ چلی تھی۔

وہ کچھ اور قریب آئے تو پچھلی نشستوں پر کھڑے ہوئے دونوں آدمیوں میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ وہ استاد لبھو تھا جو آج کل سیٹھ واحد کا خاص آدمی تھا۔ سیٹھ واحد جو ہم جیسے لوگوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔

لاہور میں کافی عرصہ پہلے استاد لبھو میرے ہاتھوں مرتے مرتے بچا تھا اور بعد میں مجھے جب یہ پتا چلا کہ وہ سیٹھ واحد کے خاص آدمیوں میں سے تھا تو میں نے اس پر شکر ہی ادا کیا تھا کہ وہ میرے ہاتھوں سے بچ گیا تھا۔ اس وقت میں سیٹھ واحد کی ناراضگی مول لینے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

ہماری اپنی لائن کے بہت کم لوگ استاد لبھو کو جانتے تھے

لیکن میں اس کی سفاکی اور درندگی سے اچھی طرح واقف تھا۔ جب میں کچھ بھی نہیں تھا اس وقت وہ ایک امریکا پلٹ نوجوان کے ساتھ مل کر ایک چھوٹا موٹا گروہ چلاتا تھا۔ اسی کی مخبری کی بدولت میرا پہلا کاروباری پارٹنر اشرف خان موت کے منہ میں پہنچا تھا اور میری ایک جاں نثار دوست زرینہ پر بے تحاشا تشدد ہوا تھا۔

اس وقت میں ایک کمزور اور کم مایہ نوجوان تھا لیکن اس کے باوجود استاد ببو کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ مگر وہ مجھے نہیں مل سکا تھا۔ تاہم اس کے ایک قریبی ساتھی کو میں نے ضرور موت کی نیند سلا دیا تھا اور استاد ببو کے نام ایک رقعہ چھوڑا تھا کہ زندگی میں کبھی نہ کبھی اس کا ادھار ضرور چکاؤں گا۔ لیکن اس کے بعد وہ لاہور میں مجھ سے ٹکرایا تو کراچی کے سیٹھ واحد کا خاص آدمی بن چکا تھا۔ میں نے اس وقت اس کے پیچھے لگنے کا ارادہ عارضی طور پر ملتوی کردیا تھا لیکن میں یہ بھی نہیں بھولا تھا کہ مجھے اس کا ادھار چکانا ہے۔ وہ میرے ابتدائی حالات سے واقف نہیں تھا۔

اسے شاید اب یہ تو معلوم ہو کہ میں بھی اس کے سیٹھ ہی کی لائن کا آدمی ہوں لیکن اسے یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ میری کہانی کا آغاز کیا ہے اور اس کے بارے میں میرے دل پر کیا تحریر کندہ ہے۔

"شفیع شاہ! فیروزی سوٹ والے اس کالے سے آدمی کو پہچانتے ہو؟" میں نے نہایت دھیمی آواز میں پوچھا۔

"جی ہاں۔ میری معلومات کے مطابق اس کا نام استاد ببو ہے اور سیٹھ واحد کے خاص آدمیوں میں سے ہے" شفیع شاہ نے بھی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"اب ہمیں ہر قدم سوچ سمجھ کر اٹھانا ہوگا" میں نے گویا اسے خبردار کیا۔ وہ اثبات میں سرہلا کر رہ گیا۔

ہمارے ٹرالر کا انجن قاسم نے نیوٹرل کردیا تھا اور ٹرالر ویسے ہی سطح آب پر ہولے ہولے آگے بڑھ رہا تھا۔ موٹربوٹ کو ایک خوش شکل سا نوجوان چلا رہا تھا۔ اس نے انجن بند کرکے بوٹ کو لہرا دیتے ہوئے نہایت مشاقی سے ٹرالر کے پہلو سے لا جوڑا۔

استاد ببو اور اس کا ساتھی یوں اطمینان سے ٹرالر پر چڑھ آئے جیسے وہ ہمارے پرانے دوست ہوں اور ہم نے ہی انہیں اوپر آنے کی دعوت دی ہو۔ موٹربوٹ چلانے والا نوجوان بھی بوٹ کو ٹرالر کے جال والے بازو سے باندھ کر اوپر آگیا۔

استاد ببو ڈیک پر کچھ آگے آگیا۔ اس کے دونوں ساتھی کنارے پر کھڑے رہے۔ ان کا مقصد ہمارے ساتھ ساتھ انجن روم پر بھی نظر رکھنا تھا۔ قاسم ان کی نظر میں آئے بغیر انجن روم سے باہر نہیں آسکتا تھا۔

"ہیلو" استاد ببو ہم چاروں کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا کر
اس کی رنگت سیاہی مائل' ہونٹ موٹے موٹے اور بال تق
کندھوں تک لمبے تھے۔ وہ شکن آلود سوٹ میں تھا مگر ٹائی نہ
تھی۔ گریبان کھلا ہوا تھا۔ وہ کسی بن مانس کی طرح مضبوط نظر آ
تھا اور اس کی سفاکی و درندگی بھی اس کے چہرے سے ہی عیاں
تھی۔ اس کی سرخ سرخ آنکھوں میں فتح مندی کی چمک تھی اس
ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ جیب میں ریوالو
موجود ہے اور ببو کا ہاتھ اس کے دستے پر ہے۔ اس کی نظر ا
صرف مجھ پر مرکوز تھی۔

"اچھا.... تو یہ تم تھے" بالآخر وہ گہری سانس لے کر بولا
"چلو اچھا ہی ہوا اس بہانے تم سے ملاقات ہوگئی۔ ہماری لاہو
والی ملاقات کچھ ادھوری ادھوری سی رہ گئی تھی۔ خیر.... انسان
زندہ رہے تو ملاقات ہوتی ہی رہتی ہے۔"

"بے شک" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی تائید کی "اگر
زندہ رہے تو۔"

"ہاں۔ یہی تو میں کہہ رہا ہوں" وہ سرد لہجے میں بولا۔ اس
کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق تک نہ رہی اور آنکھوں میں وہ
سفاکی اتر آئی جو اس کی شناخت تھی۔

"میرے خیال میں تم ضرورت سے زیادہ زندہ رہ لئے ہو"
گویا زیر لب بولا پھر اس کی آواز قدرے بلند ہوگئی لیکن اب
سیٹھ کرامت سے مخاطب تھا "تم نے ان لوگوں کو کل ہی کیوں
نہیں بتادیا تھا کہ استاد ببو تمہارا دوست ہے۔ قریبی دوست
لوگ تمہیں اسی وقت چھوڑ دیتے۔"

"مجھے یہ امید بالکل نہیں تھی استاد! یہ لوگ بڑے زوروں
میں ہیں۔ بہت حوصلے بڑھے ہوئے ہیں ان کے" سیٹھ کرامت
نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر جواب دیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر
استاد ببو کے ذرا قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی نظر ایک بار
بدل گئی تھی اور اب اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اسکول میں کسی
کمزور بچے کو کچھ شریر بچوں نے گھیر لیا ہو لیکن اچانک ہی اس

بچے کا باپ آن پہنچا ہو اور اب وہ اس سے لڑاکا بچوں کی شکایت کررہا ہو۔

"سیٹھ کرامت میرا دوست ہے" استاد ببو نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گویا مجھے نہایت اہم اطلاع بہم پہنچائی۔ پھر وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا "اور استاد ببو جس کا دوست ہو اس شہر میں کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔"

"تمہارا انداز کچھ فلمی سا نہیں ہوگیا ببو؟" میں نے ملائمت سے کہا مگر اس ملائمت میں بھی اس کے لئے حقارت چھپی ہوئی تھی۔

ببو نے اس حقارت کو محسوس کرلیا۔ اس کی بھویں سکڑ گئیں اور پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں تاہم جب وہ بولا تو اس کا لہجہ پہلے ہی کی طرح پُرسکون تھا۔

"ہاں...." وہ سرسراتی ہوئی سی آواز میں بولا "اور ہم بالکل فلمی ہی انداز میں ان لوگوں کی لاشیں بھی گرا دیتے ہیں جو ہمارے راستے میں آنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"مثلاً.... ہم سے کیا گستاخی سرزد ہوئی عالم پناہ؟" میں نے اب واضح طور پر تمسخرانہ لہجے میں کہا۔ میں اسے اشتعال دلانا چاہتا تھا مگر وہ کم از کم بظاہر مشتعل نہیں ہوا۔ شاید وہ اشتعال میں بھی اپنی مرضی کے تحت ہی آتا تھا۔

"ہمارے دوست کو بھری محفل سے اغوا کرکے ہم سے ہی سبب پوچھ رہے ہو؟ مانا کہ کل کے لونڈے ہو مگر اب اتنے بھولے بھی نہ بنو" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا "ہم کل ہی کرامت کو چھڑا لیتے مگر تم ہمیں جل دینے میں کامیاب ہوگئے۔ صرف یہی نہیں بلکہ گاڑی الٹنے کی وجہ سے ہمارا ایک آدمی بھی زخمی ہوگیا۔ مگر ہم یہ سب جرائم تمہیں معاف کررہے ہیں۔ فی الحال ہم صرف سیٹھ کرامت کو لینے آئے ہیں۔ تم سے پھر کبھی ملاقات رہے گی۔"

"میں سمجھ نہیں سکا کہ تم ہم تک کیسے پہنچ گئے؟" میں نے سادگی سے کہا۔

"ہم کل وہیں موجود تھے جہاں سے تم نے سیٹھ کرامت کو اغوا کیا تھا لیکن تم نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ ہم ذرا محفوظ جگہ پر کھڑے تھے" ببو خوشگوار لہجے میں بولا "ہم وہیں سے تمہارے پیچھے لگ گئے تھے مگر تمہاری قسمت اچھی تھی کہ ہم نے کوئی عملی کارروائی کرنے میں تاخیر کردی اور تم نکلنے میں کامیاب ہوگئے لیکن آج صبح منہ اندھیرے سے ہماری ایک کے بجائے چار گاڑیاں ڈیفنس اور کلفٹن کے علاقے میں چکرا رہی تھیں اور میری خوش قسمتی تھی کہ آج بھی تمہاری گاڑی سب سے پہلے میری ہی نظر میں آئی۔ آج میں نے کیماڑی تک اس طرح تمہارا تعاقب کیا کہ تمہیں شبہ تک نہ ہوسکا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں۔ ہمیں واقعی شبہ نہیں ہوا تھا" میں نے اعتراف کیا
"جب استاد ببو خود ڈرائیو کررہا ہو تو کسی کو تعاقب کا شبہ
نہیں ہوتا" وہ فخریہ لہجے میں بولا "لیکن مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ
تم لوگ سمندر کی سیر کرنے چل دوگے۔ اس لئے ہمیں ذرا بوٹ
کا انتظام کرنے میں چند منٹ لگ گئے۔ شکر ہے پھر بھی ہم بروقت
پہنچ گئے۔ تم لوگ غالباً کرامت کو سمندر میں پھینکنا چاہتے تھے؟"

"نہیں۔ ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا" میں نے پُرسکون
لہجے میں کہا "ہم نے صرف ایک کاروباری وعدہ خلافی کی تلافی
کے لئے سیٹھ کرامت کو دو دن کے لئے تحویل میں لیا ہے۔ سیٹھ
کرامت نے نہایت پُرسکون طریقے سے وہ وعدہ پورا کردیا ہے
جس کے بارے میں غالباً کسی غلط فہمی کی بنا پر اس نے اپنا ارادہ
بدل لیا تھا۔ اب یہ صرف چوبیس گھنٹے اور ہماری تحویل میں رہے
گا۔ کل اطمینان اور خیروعافیت سے اپنے گھر چلا جائے گا۔"

"کل کس نے دیکھی ہے" ببو استہزائیہ لہجے میں بولا "یہ
ابھی اور اسی وقت ہمارے ساتھ جائے گا اور اگر تم نے زبردستی
اس سے کوئی بات منوائی ہے یا کسی دستاویز پر دستخط کروائے ہیں
اسے کالعدم سمجھو۔"

"کیا تم اسے سیٹھ واحد کے حکم سے لے جانے کے لئے
آئے ہو؟" میں نے محض تسلی کی خاطر پوچھا ورنہ یہ اندازہ تو مجھے
ہوچکا تھا کہ اس معاملے کا سیٹھ واحد سے کوئی تعلق نہیں ہو
"ضروری نہیں کہ میں جو قدم بھی اٹھاؤں اس کا تعلق سیٹھ
واحد سے ہی ہو" وہ غرایا "میں ایک آزاد انسان ہوں۔ میرے
کچھ نجی معاملات بھی ہوتے ہیں۔ سیٹھ کرامت ذاتی طور پر
دوست ہے" اس نے میرے خیال کی تصدیق کردی۔

"واہ سیٹھ صاحب" میں نے استہزائیہ لہجے میں سیٹھ
کرامت کو مخاطب کیا "آپ ہم سے خفگی کی وجہ تو یہ بتا
فرما رہے تھے کہ ہماری آمدنی کے کچھ ذرائع شاید مشکوک ہیں
خود آپ کی دوستیاں ببو جیسے آدمیوں سے ہیں۔ ان کے سا
مل کر آپ غالباً فلاحی کاموں میں حصہ لیتے ہوں گے؟"

سیٹھ کرامت نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ کچھ زرد
سا نظر آرہا تھا۔ ببو کے پہنچنے پر وہ جتنا خوش نظر آیا تھا اب
ہی فکرمند نظر آرہا تھا۔ شاید ہمارے سکون اور اطمینان کو دیکھ
اس کا دل ہول رہا تھا۔ غالباً اس نے آج تک استاد ببو
سامنے لوگوں کو بدحواس اور خوف زدہ ہوتے ہی دیکھا تھا۔

"تمہیں زیادہ طنزیہ گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں" ببو
غرایا۔ پھر تحکمانہ انداز میں سیٹھ کرامت سے مخاطب ہوا "
کرامت چلیں.... تم یہاں سے موٹربوٹ پر آسانی سے چھلا
لگا لوگے یا نہیں؟"

اس سے پہلے کہ سیٹھ کرامت کوئی جواب دیتا' میں نے
اٹھا کر ببو سے کہیں زیادہ تحکمانہ لہجے میں کہا "سیٹھ کرا

کوئی کھلونا نہیں ہے لبھو جسے تم اتنی آسانی سے لے جارہے ہو۔ بلکہ اگر یہ کھلونا ہوتا تب بھی تم اسے میری اجازت کے بغیر نہیں لے جاسکتے تھے۔"

"مجھے روکے گا کون؟" اس نے خوں خوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"میں" میں نے اپنے سینے پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"پھر روکو" یہ کہتے ہوئے اس نے ریوالور جیب سے نکالے بغیر ہی فائر کردیا۔ کسی اور کے لئے شاید اس کا یہ فائر غیر متوقع ہوتا کیونکہ اس کے لہجے سے ابھی اس درجہ اشتعال ظاہر نہیں ہوا تھا لیکن میری نظر صرف اس کے چہرے پر ہی نہیں تھی۔ میں اس کی جیب کے ابھار کا بھی جائزہ لیتا رہا تھا جس سے مجھے اس کی انگلیوں کی حرکت کا اندازہ ہوتا رہا تھا۔ مجھے یہ بھی اندازہ ہوچکا تھا کہ کب ریوالور کے ٹرائیگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھا۔ گولی سے بچنے کے لئے مجھے صرف چند انچ ایک طرف کو کھسکنا پڑا لیکن ایسے بظاہر چھوٹے موٹے کاموں کے لئے بڑی ہنرمندی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اندازے کی ذرا سی غلطی یا ایک ثانئے کی تاخیر انسان کو اس دنیا سے اس دنیا میں بھیجنے کے لئے کافی ہوتی ہے۔ اگر مجھے بھی ایک ثانئے کی تاخیر ہوئی ہوتی تو گولی میرے پیٹ میں اتر کر کمر سے نکل چکی ہوتی۔ گولی میرے اور شفیع شاہ کے درمیان سے گزری اور ٹرالر کی چوبی دیوار میں پیوست ہوگئی۔

اس کے ساتھ ہی لبھو کے دونوں گرگوں کے ریوالور جیبوں سے باہر آگئے تھے لیکن اس کی بھی مجھے پہلے ہی سے توقع تھی۔ میرا پاؤں اس وقت ایک ڈیک چیئر کے نیچے تھا۔ میں نے اسے اس طرح اچھالا کہ پنڈلی کی ہڈی پر چوٹ نہ آنے پائے اور کرسی بھی اچھل کر میرے ہدف سے ٹکرا سکے۔ اس مقصد کے لئے کرسی کے وزن کا اندازہ بھی میں کرچکا تھا۔

کرسی خاصی قوت کے ساتھ لبھو سے ٹکرائی۔ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید گر ہی پڑتا لیکن وہ صرف لڑکھڑا کر رہ گیا۔ کرسی کے اچھلتے ہی دونوں گرگوں کے ریوالور گرج اٹھے تھے۔ میں تو اس کے لئے تیار ہی تھا لیکن شفیع شاہ اور سیٹھ رمضان کو بھی اس سلسلے میں کسی رہنمائی کی ضرورت نہیں تھی۔

وہ دونوں سینے کے بل گرچکے تھے۔ خطرہ مجھے صرف سیٹھ کرامت کا تھا کہ وہ گھامڑ اس ہمدردی میں اپنے ہی ہمدردوں کے ہاتھوں نہ مارا جائے مگر شاید وہ اتنا گھامڑ بھی نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ یا پھر شاید جان کے خوف نے اسے رستہ سجھا دیا تھا اور وہ بھی اضطراری انداز میں سینے کے بل گرچکا تھا۔

غنیمت یہ تھا کہ ہمیں پھر بھی دو چار چھوٹی موٹی چیزوں کی آڑ میسر تھی۔ کرسیاں تھیں، تپائی تھی۔ موٹے رسے کا اونچا سا لچھا تھا، لوہے کے دو تین چھوٹے ڈرم تھے۔ جبکہ لبھو اور اس کے گرگوں کو کسی چیز کی آڑ میسر نہیں تھی۔

شفیع شاہ لڑھکتا ہوا رسے کے لچھے تک پہنچ چکا تھا۔ میں بھی مسلسل حرکت میں تھا۔ قدرت نے ابھی تک ہمیں گولیوں سے محفوظ رکھا تھا۔ لبھو کے گرگوں نے اندھا دھند فائر کئے تھے لیکن اسی دوران لبھو کا ہاتھ بھی جیب سے باہر آگیا اور جس ٹھہرے ہوئے انداز میں اس نے ریوالور ترچھا کیا اس سے مجھے یقین ہوگیا کہ وہ ایک بھی گولی ضائع نہیں کرے گا لیکن اس وقت تک میں ایک ڈرم تک ہاتھ پہنچانے میں کامیاب ہوچکا تھا۔ ڈرم چھوٹا اور ہلکا تھا۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے ایک ہاتھ سے ڈرم لبھو پر کھینچ مارا۔

ڈرم اس کے منہ پر لگا اور اس چوٹ نے ایک لمحے کے لئے اسے چکرا دیا۔ اس وقت تک شفیع شاہ رسے کے لچھے کے نیچے سے اسٹین گن نکال چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اسٹین گن کی تڑتڑ کے ساتھ دونوں ریوالور بردار نوجوان ہوا میں اچھلے اور پٹ سے ڈیک پر گر پڑے۔

لبھو کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ چکا تھا اور اب وہ نیچے موٹربوٹ پر چھلانگ لگانے کے لئے پلٹ رہا تھا جب شفیع شاہ نے اسٹین گن کا رخ اس کی طرف کیا مگر میں نے بروقت نال پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ نیچے کو کردیا ورنہ لبھو کا جسم بھی چھلنی ہوچکا ہوتا۔

میں نے گولیوں سے اسے بچایا ہی تھا کہ موت ایک اور روپ میں اس پر جھپٹی۔ دراصل قاسم انجن روم سے نکل کر کسی چیتے کی طرح اچھل کر ڈیک پر آپہنچا تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک بھاری تیغہ تھا۔

جب ٹرالر شکار پر نکلتے ہیں تو جال میں جانے کیسی کیسی مخلوق پھنس جاتی ہے۔ کبھی کبھی کوئی بڑی خطرناک مچھلی یا کوئی اور چیز بھی آپھنسی ہے جس کی وہیں تکا بوٹی کرنی ضروری ہوتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ٹرالر پر تیغے اور دوسری کئی چیزیں موجود رہتی ہیں۔ اسی مقصد کے لئے استعمال ہونے والا ایک تیغہ اس وقت قاسم کے ہاتھ میں تھا۔

عین ممکن تھا، وہ لبھو کا سر دو حصوں میں تقسیم کرچکا ہوتا کہ میں چلا اٹھا "قاسم رک جاؤ۔"

قاسم کا ہاتھ جہاں کا تہاں یوں رک گیا جیسے کسی مشین کا بٹن دبا دیا گیا ہو۔ لبھو نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ایک بار پھر ڈیک کی دیوار کی طرف لپکنے کی کوشش کی لیکن قاسم نے اس طرح اس کی ٹانگ میں ٹانگ اڑائی کہ وہ اوندھے منہ گر پڑا۔

چند سیکنڈ کے اندر ہی پانسا پلٹ چکا تھا۔ منظر ہی یکسر بدل گیا تھا۔ ہم پر ریوالور تان کر کھڑے ہوئے دو نوجوان تو اپنے ہی خون میں لتھڑے آڑے ترچھے پڑے تھے۔ بوٹ چلانے والا بھی نہتا ہونے کے باوجود مارا گیا تھا اور ان کا باس اوندھا پڑا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ کسی لومڑی کی طرح مکار ہے اور فرار کے لئے صرف موقع کی تاک میں ہے۔

میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا اور اسے کالر سے پکڑ کے اٹھایا۔ شفیع شاہ بھی اسٹین گن کا رخ اس کی طرف کیے قریب آگیا۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "لبھو پر کوئی گولی نہیں چلائے گا... کوئی حملہ نہیں کرے گا.... یہ میرا شکار ہے.... اور اسے اپنی طاقت پر بڑا زعم ہے۔ میں اسے خالی ہاتھ مقابلہ کرنے کا موقع دوں گا تاکہ اس کے دل میں کوئی ارمان نہ رہے۔"

میں نے کوٹ اتار کر ایک طرف اچھال دیا پھر ٹائی بھی گلے سے نکال پھینکی۔ لبھو آنکھیں سکیڑے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا اور رخسار کی ہڈی پر سے بھی کھال پھٹ چکی تھی۔

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔

"کچھ بھی نہیں۔ تم تو یہاں میرے بگڑے ہوئے کام سنوارنے آئے تھے" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "اور اس سے پہلے بھی تم نے میرے بڑے کام سنوارے ہیں۔ لاہور میں بھی ایک بار تم نے میرا کام سنوارنے کی کوشش کی تھی۔"

"وہ تو سیٹھ واحد کا حکم تھا" وہ کمزور سی آواز میں بولا۔

"بکواس مت کرو" میری کنپٹیاں تپ اٹھیں "تم سیٹھ واحد کے احکامات کی آڑ میں اپنی اذیت پرست فطرت کی تسکین کا سامان کرتے پھرتے ہو۔ سیٹھ واحد نے تمہیں صرف مال کی ایک کھیپ روکنے کے لئے کہا تھا اور تم مجھے ہلاک کرنے کے لئے جنگل میں لے گئے تھے۔ اس وقت بھی تمہاری قسمت اچھی تھی کہ تم بچ نکلے تھے۔ اور بعد میں میں نے یہ جاننے کے بعد کہ تم سیٹھ واحد کے آدمی ہو، تمہارے سلسلے میں کوئی جوابی کارروائی نہیں کی تھی کیونکہ میں سیٹھ واحد سے مرعوب بھی تھا اور ان کی عزت بھی کرتا تھا۔ اب بھی تم نے ذاتی مفادات کی بنا پر اپنی حدود سے بڑھنے کی کوشش کی۔ سیٹھ واحد بے چارے کو تو علم بھی نہ ہوگا کہ اس وقت تم کیا کرتے پھر رہے ہو۔ اور اب بھی شاید میں تمہیں معاف کردیتا لیکن ....." میں نے دانت پیس کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"لیکن کیا؟" لبھو کی آنکھوں میں امید کی کرن ابھری۔

"لیکن میرے سینے میں کچھ پرانے زخموں کی ٹیس ابھر آئی ہے" میں نے کہا۔

"میں تمہیں بہت زیادہ مدت سے تو نہیں جانتا" وہ بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں تو جانتا ہوں" میں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔ "تم ہی وہ خبیث انسان ہو جس کی بے مقصد مخبری کی وجہ سے میرا بہترین دوست اشرف خان ذلت کی موت مارا گیا تھا اور زرینہ پر اس قدر تشدد ہوا تھا کہ وہ اس دنیا سے، زندگی سے اور حتیٰ کہ مجھ سے بھی بیزار ہوگئی تھی۔"

"اوہ....." اس کے حلق سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔ "تو تم ہی وہ نوجوان ہو جو اشرف خان کو زخمی حالت میں پولیس کے نرغے سے نکال لے جانے میں کامیاب ہوگیا تھا اور جس کا کوئی سراغ ہمارے پاس موجود نہیں تھا؟"

"ہاں۔ میں وہی ہوں۔ میں اشرف خان کو پولیس سے تو بچا لے گیا تھا لیکن میں اسے موت سے نہیں بچا سکا تھا" میں نے جواب دیا "میں تمہاری تلاش میں واپس شہزاد کوٹ بھی گیا تھا لیکن تمہیں نہیں ڈھونڈ سکا تھا البتہ تمہارا ایک خاص کارندہ میرے ہتھے چڑھ گیا تھا اور میں اسے قتل کرکے ایک رقعہ اس کی لاش کے پاس چھوڑ کر آیا تھا۔ وہ رقعہ تمہارے نام تھا اور میں نے اس میں لکھا تھا کہ ابھی تمہارا اور میرا حساب برابر نہیں ہوا لیکن ایک نہ ایک روز میں تم سے حساب برابر کرنے ضرور آؤں گا۔ بہت اچھا ہوا کہ مجھے تمہاری تلاش میں کہیں نہیں جانا پڑا۔ تم خود ہی آگئے۔ آج ہمارا حساب برابر ہو ہی جانا چاہئے۔"

تب اچانک ہی اس نے ہاتھ جوڑ دئے اور گڑگڑانے لگا۔ "میں تم سے اپنی ہر خطا کی معافی چاہتا ہوں۔ مجھ سے جو کچھ بھی ہوا انجانے میں ہوا... میں اب تمہارا دوست..... بلکہ تمہارا غلام بن کر رہنا چاہتا ہوں۔ یقین کرو تمہیں میری ذات سے بہت فائدے پہنچیں گے۔"

وہ لومڑی کی طرح مکار تھا۔ موقع محل دیکھ کر اپنی ساری اکڑ فوں بالائے طاق رکھ کر قدموں میں لوٹنے پر تیار ہوگیا تھا۔ لیکن اگر ایسے لوگ مجھے بیوقوف بنانے میں کامیاب ہونے لگتے تو میں اس ظالم اور بے مہر دنیا میں چند دن بھی خیر و عافیت سے نہیں گزار سکتا تھا۔

میں نے اس کے منہ پر زوردار تھپڑ رسید کیا۔ اس کا بگڑا ہوا چہرہ کچھ اور بگڑ گیا اور گردن ایک طرف کو گھوم گئی۔ مگر وہ اپنی

جگہ سے ہلا نہیں۔ کسی بن مانس کی طرح جما کھڑا رہا۔ میں نے اس کے دوسرے گال پر بھی تھپڑ رسید کیا۔ میں اسے اشتعال دلانا چاہتا تھا مگر وہ بدستور کسی ستون کی طرح ساکت وہ صامت کھڑا رہا۔

"بہت گھمنڈ ہے نا تمہیں اپنی طاقت پر ....." میں نے مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا "تو پھر آؤ نا.... خارش زدہ کتے کی طرح مار کیوں کھا رہے ہو؟"

"تو تم مجھے معاف کرنے کے لئے تیار نہیں ہو؟" اس نے مجروح سے لہجے میں پوچھا گویا میرے رویئے سے اس کے حساس دل کو بڑا دھچکا لگا ہو۔

"تمہیں معاف کرنے سے کہیں بہتر ہے کہ تو وہ اپنی آستین میں دس بیس سانپ پال لے" میں نے اس کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ اس ٹھوکر سے وہ لڑکھڑایا اور پھر اچانک ہی کسی غضبناک بھینسے کی طرح اچھلا۔ اگر میں بجلی کی سی تیزی سے ایک طرف نہ ہو جاتا تو اس کا بڑا سا سر توپ کے گولے کی طرح میری ناک سے ٹکرایا ہوتا اور شاید میری ناک ہمیشہ کے لئے چپٹی ہو جاتی۔

میں نہ صرف ایک طرف ہٹا بلکہ میں نے اس کے پیٹ پر پوری قوت سے گھونسا بھی رسید کیا۔ وہ دُہرا ہوا چوبی فرش پر گرا لیکن دوسرے ہی لمحے یوں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے اس کے جسم میں ہڈیوں کی جگہ اسپرنگ لگے ہوں۔

اس نے میرے منہ پر گھونسا رسید کرنا چاہا مگر میں نے اس کا وار کلائی پر روکا اور اسے ایک لات رسید کی۔ اس بار وہ کمر کے بل گرا مگر پھر اٹھ کھڑا ہوا اور بھینسے کی طرح ہی پھر میری طرف دوڑا۔ میں اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر پٹخ دینا چاہتا تھا مگر اس بار میں اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ یک لخت ہی آکٹوپس کی طرح مجھ سے چمٹ گیا۔

اس کے بازو بن مانس کی طرح لمبے تھے اور اس نے میری کمر کے گرد شکنجہ کس لیا تھا۔ یہ شکنجہ گویا کسی مشینی عمل کے ذریعے لحہ بہ لحہ سخت ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی بھی لمحے میرے گردے اس کے شکنجے میں پس جائیں گے اور ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔

ایک لمحے کے لئے تو میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا... پھر میں نے یوگا کی مشق کو کام میں لاتے ہوئے سانس روکی۔ سانس روکنے سے اپنے ڈوبتے ذہن کو سنبھالنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ میرے حواس نے بھی ذرا سنبھالا لیا تو میں نے لبھو کی کھوپڑی پر کہنی رسید کی۔

کمبخت کا سر شاید پتھر کا بنا ہوا تھا۔ میری کہنی جھنجھنا کر رہ گئی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ لبھو کے بازوؤں کا شکنجہ کچھ ڈھیلا پڑ گیا اور میں نے کہنی ہی سے ایک اور ضرب اس کی پیشانی پر لگائی۔

اس کے بازوؤں کی گرفت مزید ڈھیلی ہو گئی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک طاقتور آدمی تھا لیکن اس کا جسم درخت کے تنے کی طرح ٹھوس اور بے لچک تھا۔ جبکہ میرے جسم میں لچک تھی جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں بالآخر اس کی گرفت سے نکل گیا اور مجھے یوں لگا جیسے موت کے جبڑے سے نکل آیا ہوں۔

پھر تو میں نے اسے گھونسوں اور لاتوں پر رکھ لیا۔ انتقام کی خونخواری مجھ پر غالب آ گئی تھی۔ میری نظر میں اشرف خان کی صورت ابھر آئی تھی جس کے کولہے میں گولی پیوست تھی اور جسے کار میں ڈال کر میں نے رات بھر سفر کیا تھا لیکن جب اسے ڈاکٹر میسر آیا اس وقت تک اس کا جسم نیلا پڑ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نظروں میں زرینہ کا چہرہ بھی ابھر آیا تھا جو تشدد سے مسخ ہو چکا تھا۔

ذہن کے افق پر ان چہروں کا ابھر آنا گویا میری رگ وپے میں شعلے بھڑکا دینے کا سبب بن گیا۔ لبھو اب اپنا دفاع بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے اسے کئی بار ہاتھوں پر اٹھایا اور چوبی فرش پر پٹخا۔ اتنی بار پٹخے جانے پر کسی عام آدمی کی تو شاید ہڈیاں چورا ہو جاتیں مگر وہ کمبخت ہر بار اٹھ کھڑا ہوتا تھا اور مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتا تھا۔ بہت کم لوگ ایسے سخت جان ہوتے ہیں۔ لیکن شاید وہ صرف تر نوالے ہی نگلنے کا عادی رہا تھا اور میں عام حالات میں کوئی تر نوالہ نہیں تھا جبکہ اس وقت تو انتقام نے مجھے شعلۂ مجسم بنا دیا تھا۔

بالآخر وہ اس طرح میرے قابو میں آ گیا کہ اس کے دونوں بازو اس کی پشت پر اور میرے ایک بازو کی گرفت میں تھے اور اس کی گردن کے گرد میرے دوسرے بازو کا شکنجہ تھا۔

"لبھو! مجھے خوشی ہے کہ قدرت نے تمہاری موت میرے ہاتھوں لکھی تھی" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا اور اس کی گردن کو ایک خاص انداز میں جھٹکا دیا۔ اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا۔

اس کی گردن توڑنا کسی سانڈ کی گردن توڑنے کے برابر ہی تھا۔ لیکن آواز محض ایک ہلکی سی "چٹ" تک ہی محدود رہی اور زندگی سے اس درندے کا ناتا ٹوٹ گیا جو چند لمحے پہلے تک اپنی طاقت کے زعم میں مبتلا میرے سامنے چٹان بنا کھڑا تھا۔ جبکہ بات بس اتنی سی تھی کہ جب قدرت کا اشارہ ہوتا ہے تو زندگی کی ڈور محض ایک ہلکی سی چٹ کی آواز کے ساتھ ٹوٹ جاتی ہے۔

میں نے لبھو کو چھوڑ دیا۔ چوبی فرش پر گرنے کے بعد اس کے بھاری بھرکم وجود نے دو تین ہلکے سے جھٹکے لئے اور ساکت ہو گیا۔ میں ہاتھ جھاڑ کر مڑا تو سامنے ہی سیٹھ رمضان دم بخود سا کھڑا تھا۔ حالانکہ وہ کافی فاصلے پر کھڑا تھا مگر مجھے مڑتے دیکھ کر گویا ہڑبڑا کر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ وہ مجھ سے کچھ خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔ شاید اس وقت میرے چہرے سے درندگی ٹپک رہی تھی۔

میں نے دوسری طرف دیکھا۔ سیٹھ کرامت اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن اس کا چہرہ زرد تھا اور اس کی ٹانگوں میں لرزش دیکھی جا سکتی تھی۔ وہ کبھی بے حس و حرکت لبھو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی خون میں لتھڑے ہوئے اس کے گرگوں کی طرف۔

وہاں صرف شفیع شاہ ہی ایسا تھا جس کا چہرہ اس وقت بھی تاثرات سے عاری تھا۔ اسٹین گن کندھے پر لٹکاتے ہوئے وہ سرسری سے لہجے میں بولا "لاشوں کا کیا کرنا ہے باس؟"

"انہیں انہی کی بوٹ میں ڈالو اور بوٹ کو ڈبو دو" میں نے کہا۔ "تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ سمندر میں لوگوں کو آئے دن حادثات پیش آتے رہتے ہیں... لوگ کشتیوں میں ڈوب جاتے ہیں... لاپتا ہو جاتے ہیں۔ کچھ منفی شہرت رکھنے والے لوگ بعض اوقات کوسٹ گارڈ والوں کی گولیوں کا نشانہ بھی بن جاتے ہیں اور کبھی کبھی ایسے کسی مقابلے کی رپورٹ مصلحتاً کہیں بھی درج نہیں ہوتی' مطلب یہ کہ سو باتیں ہو سکتی ہیں.... ہو سکتی ہیں نا؟"

"کیوں نہیں سر!" شفیع شاہ نے گہری سانس لے کر کہا۔ "انسانی زندگی حوادث و تجربات کا مجموعہ ہے۔"

اس نے آگے بڑھ کر ٹرالر سے نیچے جھانکا پھر میری طرف مڑتے ہوئے ٹھوڑی کھجا کر بولا "موٹر بوٹ فائبر گلاس کی ہے۔ اس کی ساخت بھی مخصوص قسم کی ہے۔ ایسی کشتیاں الٹنے کے بعد بھی نہیں ڈوبتیں۔"

"ہاں۔ اگر ایک دم الٹی ہو جائیں تو نہیں ڈوبتیں البتہ اگر خاص انداز میں ترچھی کر کے دباؤ ڈالا جائے تو ڈوب جاتی ہیں" میں نے کہا "لیکن تمہیں اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ لاشوں کو بوٹ میں پھینک کر بوٹ کو ٹرالر سے الگ کرو اور اس کے پیندے میں اسٹین گن کا ایک برسٹ مارو۔ اس میں سوراخ ہو گا اور بوٹ میں لاشوں کا وزن موجود ہو گا تو وہ لاشوں سمیت آہستہ آہستہ سمندر کی تہ میں پہنچ جائے گی... اور سمندر کا سینہ بہت گہرا ہے۔ بڑے بڑے بدکاروں کو چھپا لیتا ہے.... اور پھر مچھلیوں کو بھی ان کی خوراک مل جائے گی۔"

"یس سر!" اس نے پُرسکون لہجے میں کہا اور ٹرالر کیپٹن قاسم کو اشارہ کیا جو ابھی تک تیغہ اٹھائے کھڑا تھا اور شاید اس وجہ سے مغموم تھا کہ اسے اس تیغے کی دھار آزمانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

شفیع شاہ اور قاسم نے لاشیں یکے بعد دیگرے ڈنڈا ڈولی کر کے اٹھائیں اور ٹرالر کے ساتھ بندھی ہوئی موٹر بوٹ میں یوں پھینک دیں جس طرح بندرگاہ پر بے پروا مزدور سامان کی بوریاں گاڑیوں میں پھینکتے ہیں۔

پھر قاسم ٹرالر سے اترا اور وہ بندش کھول آیا جس کے ذریعے بوٹ ٹرالر سے بندھی ہوئی تھی۔ قاسم ٹرالر پر واپس چڑھ آیا تو شفیع شاہ نے بوٹ کے پیندے پر ایک برسٹ مارا۔ بوٹ کے پیندے میں خاصا بڑا سوراخ ہو گیا اور اس میں دھیرے دھیرے پانی بھرنے لگا۔

شفیع شاہ' قاسم کی طرف مڑتے ہوئے بولا "بوٹ تو ڈوب ہی جائے گی تب تک تم ڈیک کا یہ حصہ دھو ڈالو جہاں خون ہی خون پھیلا ہوا ہے۔"

قاسم نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور باتھ روم سے پانی کی بالٹیاں لا لا کر عرشہ دھونے لگا۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے ہر خون آلود حصہ دھو کر کپڑے سے صاف اور خشک کر دیا۔ اس وقت تک بوٹ ڈوب چکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ لاشیں پھول کر سطح آب پر نہیں آئیں گی۔ مچھلیاں اس کی نوبت ہی نہیں آنے دیں گی۔

قاسم نے ڈیک پر پڑی ہوئی کرسیاں اور تپائی وغیرہ بھی سیدھی کر دی۔ شفیع شاہ اسٹین گن وہیں چھپا آیا جہاں سے لایا تھا۔ ... ہم سب ایک بار پھر بیٹھ گئے۔ قاسم نے آئس بکس سے ٹھنڈے مشروبات کی بوتلیں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں اور خود انجن روم میں واپس چلا گیا۔ ٹرالر ہلکورے لینے کے بجائے ایک بار پھر درمیانی رفتار سے مشرق کی طرف چل دیا۔

ڈیک پر ایک بار پھر پہلے ہی جیسا منظر تھا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ کچھ دیر پہلے یہاں موت اور زندگی کا معرکہ بپا تھا۔ سیٹھ کرامت اب بھی گم صم تھا اور اس کے چہرے کی زردی بھی کم نہیں ہوئی تھی۔

"تم اتنے پریشان کیوں ہو؟" میں نے کولڈ ڈرنک کا گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد پوچھا۔ اس نے ابھی تک کولڈ ڈرنک کی بوتل کو بھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔

اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور یک لخت گویا پھٹ پڑا "ظاہر ہے تم لوگ اب مجھے بھی مار ڈالو گے۔ میں اس واقعے کا چشم دید گواہ ہوں... تم لوگ مجھے کہاں زندہ چھوڑو گے.... تم لوگ درندے ہو.... درندے..."

"تم ایک بار پھر ہمیں سمجھنے میں غلطی کر رہے ہو" میں نے ملائمت سے کہا "اگر ہم بلاوجہ تمہیں مار ڈالیں تو پھر یقیناً ہم پر درندگی کا الزام آ سکے گا لیکن فی الحال ہمارا کوئی ایسا ارادہ نہیں۔ البتہ اگر تم واپس جا کر کسی کو اس واقعے کی اطلاع دینے یا اس اس معاملے کا عینی شاہد بننے کا ارادہ رکھتے ہو تو پھر ضرور ہمیں تمہارا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا۔ اگر تمہیں خود ہی اپنی زندگی عزیز نہ ہو تو پھر کون تمہاری زندگی کی ضمانت دے سکتا ہے؟"

"تمہارا مطلب ہے' اگر میں اس سلسلے میں زبان بند رکھوں تو تم لوگ مجھے کچھ نہیں کہو گے؟" اس نے شک زدہ سے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے کہا نا' کہ میں بلا ضرورت خونریزی کا

قائل نہیں ہوں" میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا "اب تم بتاؤ کہ سردست تمہارا وعدہ کیا ہے؟ زبان بند رکھو گے یا..."

"میں بھول جاؤں گا کہ میں نے کچھ دیکھا تھا۔ قسم سے بالکل بھول جاؤں گا۔ میں یہ بھی بھول جاؤں گا کہ میں تمہارے ساتھ سمندر کی سیر کو نکلا تھا" وہ جلدی سے بولا۔

"اور یہ بھی یاد رکھنا کہ ہمارے ہاں وعدہ خلافی کی سزا بہت سنگین ہوتی ہے" میں نے کہا "تمہاری پہلی وعدہ خلافی کو ہم نے اس لئے معاف کردیا کہ اس کا علاج زیادہ مشکل نہیں تھا۔ لیکن تمہاری وجہ سے اگر ہمارے لئے کوئی مشکل کھڑی ہوئی تو وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔ اس وقت اگر تم ہزار پردے میں بھی ہوئے اور تمہارے گرد بیسیوں مضبوط حفاظتی حصار ہوئے تب بھی موت تمہیں آن دبوچے گی۔ اسے محض مکالمہ نہ سمجھنا۔ اس بات پر صدق دل سے یقین رکھنا۔"

"نہیں نہیں' اب مجھ کو پکا یقین ہوگیا ہے" وہ ہاتھ اٹھا کر جلدی سے بولا "میں اب تم لوگوں کو اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ میں اب تمہارے ساتھ بالکل سیدھا چلوں گا۔"

مجھے یقین تھا کہ اس بار وہ سچ کہہ رہا تھا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "مجھے یہ سوال کرنے کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں لیکن محض گپ شپ کے طور پر پوچھ رہا ہوں کہ یہ استاد لبھو سے تمہاری دوستی کس طرح نکل آئی؟"

"اب تم سے کیا چھپانا ...." سیٹھ کرامت قدرے ہچکچاہٹ کے بعد بولا "اس سے کچھ مال کا لین دین تھا۔ میری ایک چھوٹی سی مارکیٹ بھی ہے جس میں میں نے اپنے ہی آدمیوں کو دکانیں کھلوا کر دی ہوئی ہیں۔ یوں سمجھ لو کہ وہ مارکیٹ لبھو ہی کے دم سے چل رہی تھی۔"

"اگر تمہیں اس مارکیٹ کو چالو رکھنے سے دلچسپی ہے اور تم اس سلسلے میں سوچ سوچ کر پریشان ہو رہے ہو تو اس پریشانی کو ذہن سے جھٹک دو" میں نے اسے تسلی دی "میں شفیع شاہ سے کہہ دوں گا' وہ تمہاری اس مارکیٹ میں کوئی کمی نہ آنے دے گا۔"

"تمہاری بڑی مہربانی" سیٹھ کرامت کچھ مطمئن نظر آنے لگا۔ اس کے ذہن سے یقیناً کچھ بوجھ تو ہٹ گیا تھا۔ البتہ تھوڑی دیر پہلے کی خونریزی دیکھ کر اس کے اعصاب کو جو جھٹکا لگا تھا اس کے اثرات ابھی تک دور نہیں ہوئے تھے۔

چند لمحے بعد میں نے قاسم کو آواز دے کر کہا کہ ٹرالر کو واپس لے چلے۔ سیر کا وہ لطف نہیں رہا تھا اور کچھ سوالیہ نشانات بھی سامنے آن کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے اور شفیع شاہ کو مل کر ان کے جوابات تلاش کرنے تھے۔

ٹرالر ایک بہت بڑے نیم دائرے میں چکر کاٹ کر واپس ... ہوگیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہم سمندر کے کنارے اس جگہ پہنچ گئے جہاں ... وغیرہ کی آمد و رفت ... تھی۔ ... میں

ہم منوڑہ پر اتر گئے اور وہاں سے کرائے کی ایک چھوٹی سی ... میں بیٹھ کر سیر کے شائقین میں گھل مل کر واپس آ گئے۔

سیٹھ کرامت کو ہم نے اپنے اسی مکان میں چھوڑ ... ابھی اسے ایک رات اور گزارنی تھی۔ اس کے بعد ہم ... رمضان کو اس کے گھر چھوڑنے چل دئے۔

راستے میں وہ بولا "میرا خیال ہے اب تمہیں استاد لبھو ... موت کے سلسلے میں لائحہ عمل طے کرنا ہوگا۔ اس کی ہلا... معمولی بات نہیں ہے۔ وہ سیٹھ واحد کا خاص آدمی تھا۔"

"ہاں۔ ہمیں اس سلسلے میں سوچنا پڑے گا" میں نے ... لہجے میں کہا۔

"جو فیصلہ بھی کرو مجھے ضرور مطلع کردینا۔ اور میرے ذ... جو کام چاہو لگا دینا' مجھے تم ہر کام کے لئے تیار پاؤ گے۔ میں ... تو ذرا چھوٹے ہی دل کا تھا لیکن تمہارے ساتھ رہ کر مجھے دوستی کے تقاضے نبھانے آ گئے ہیں۔ اگر سیٹھ واحد سے ہ... ٹھن گئی تو تم مجھے پیچھے نہیں پاؤ گے۔"

"شکریہ رمضان!" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا "تمہا... بات سے میرا حوصلہ بڑھا ہے۔"

سیٹھ رمضان کو اس کے گھر اتار کر میں اور شفیع شاہ ا... ہوٹل میں آ گئے جہاں میں ٹھہرا ہوا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں فریج سے کولڈ ڈرنکس کی بوتلیں نکالیں اور تپائی کے پاس ستانے کے سے انداز میں بیٹھ کر دھیرے دھیرے چسکیاں لگے۔

"ایک بات تو طے ہے۔" میں نے بلا تمہید بات شروع ... کہ سمندر سے استاد لبھو اور اس کے ساتھیوں کی لاشیں یا لا... کی باقیات دستیاب ہوں یا نہ ہوں' سیٹھ واحد کو معلوم ہو جا... گا کہ انہیں ٹھکانے لگایا جا چکا ہے اور یہ بھی معلوم ہو جائے ... انہیں ٹھکانے لگانے والے کون ہیں۔"

"جی ہاں۔ اس بارے میں ہمیں قطعاً کسی خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہئے" شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا "اس کا اپنا مخ... رسی کا ایک نظام ہے جس کی کارکردگی بعض اوقات اچھے ... اداروں سے بہتر ہوتی ہے۔ اسے بہرحال معلوم ہو جائے گا کہ ... ہماری کارروائی تھی اور اس کے نزدیک یہ ایک طرح کا اعلا... جنگ ہوگا۔ اگر ہم مقابلے میں نہ اترے تو ایک ایک کر... چوہوں کی طرح مارے جائیں گے اور اگر ہم نے مقابلے کی ٹھا... لی تو خاصی خوفناک قسم کی "گینگ وار" شروع ہو جائے گی ... میں ہماری بقا تو شاید خطرے میں ہی پڑ جائے لیکن سیٹھ واحد ... گروہ کو بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچے گا۔"

"اس قسم کی بے مقصد گینگ وار میں ہرگز نہیں چاہتا" ... نے کہا "جسے مرجانا چاہئے تھا وہ تو مر ہی چکا ہے ... یہ بڑی فضول بات ہوگی کہ اب دو گروہ اس مسئلے پر لڑتے لڑتے مر جائیں ...

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے پوچھا "تمہارے خیال میں کیا سیٹھ واحد اتنا بے وقوف اور جذباتی ہو سکتا ہے کہ اپنے ایک مردہ ساتھی کے لئے ہم سے گینگ وار شروع کردے؟"

"وہ بے وقوف اور جذباتی ہرگز نہیں ہے" شفیع شاہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "اگر ایسا ہوتا تو آج وہ سیٹھ واحد نہ ہوتا محض ایک کباڑی ہی ہوتا۔ شاید آپ کو اس کے بارے میں زیادہ معلوم ہو سر! بہرحال میرے پاس اس کے بارے میں جو معلومات موجود ہیں ان کے مطابق وہ شخص بمبئی کی ایک کھولی میں پیدا ہوا تھا۔ اس کا باپ بندرگاہ پر مزدوری کرتا تھا۔ واحد کو اس نے لڑکپن ہی میں ایک بحری جہاز پر خلاصی کے طور پر بھرتی کرادیا تھا جہاں وہ دن رات وزن ڈھوتا تھا اور ملاحوں سے ٹھڈے کھاتا تھا۔"

"اور آج اس کے اپنے کئی بحری جہاز ہیں" میں نے لقمہ دیا۔ "لیکن اس نے اپنی شپنگ کمپنی کا ہیڈ کوارٹر اٹلی میں بنایا ہوا ہے۔"

"جی ہاں... آپ یقیناً مجھ سے زیادہ جانتے ہیں" شفیع شاہ بولا "میں یہی عرض کر رہا تھا کہ اگر وہ بیوقوف اور جذباتی ہوتا تو آج بھی محض ایک کباڑی ہوتا کیونکہ پاکستان آنے کے بعد کافی عرصے تک وہ بندرگاہ کے قریب ہی کباڑی کا کام کرتا رہا ہے۔"

"ہاں۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے" میں نے کہا "لیکن تم لمبے عرصے سے کراچی میں ہو۔ تمہیں اس کے قریبی حلقوں سے اس کی ذات کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوئی ہوں گی۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارے اندازے کے مطابق اس واقعے پر سیٹھ واحد کا رد عمل کیا ہوگا؟"

"سیٹھ واحد نہایت حقیقت پسند اور بے حد ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہے مگر ساتھ ہی ساتھ نہایت سفاک اور روایت پرست بھی ہے" شفیع شاہ بولا "قبائلی سے انداز میں بعض روایات پر بڑی سختی سے عمل کرتا ہے' چاہے اس سلسلے میں اس کی عقل اور شعور اسے کوئی بھی مشورہ کیوں نہ دے۔ مثلاً اگر اسے یہ محسوس ہوگیا کہ استاد لبھو کو مار کر دراصل اس کی غیرت کو للکارا گیا ہے تو اس کے جواب میں وہ یقیناً گینگ وار شروع کردے گا۔ حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم ہوگا کہ اس میں اس کے آدمیوں کی بھی جانیں ضائع ہوں گی اور لبھو کی روح کو بھی کوئی خاص "فائدہ" نہیں ہوگا۔ مگر وہ اپنی طاقت کا مظاہرہ ضرور کرے گا۔ اسی طرح بعض دوسرے معاملات میں بھی وہ قبائلی سا آدمی معلوم ہوتا ہے حالانکہ اس کا قبائلیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔"

"پھر تو میرے خیال میں سیدھا سادا راستہ ہی مناسب رہے گا" میں نے کہا

"وہ کیا؟" شفیع شاہ نے گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"یہی کہ میں خود اس کے پاس چلا جاتا ہوں" میں نے کہا۔ "میں اسے صاف صاف ساری بات بتادوں گا۔ اس کے باوجود اگر وہ مجھے قصوروار سمجھے گا تو دیکھا جائے۔ گینگ وار اگر شروع ہونی ہے تو اس کے دفتر سے ہی شروع ہو جائے۔ خاموش بیٹھ کر انتظار کرنے سے تو ہم واقعی قصوروار نظر آئیں گے۔"

"یہ اقدام کافی حد تک خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔" شفیع شاہ پُرخیال لہجے میں بولا۔

"ہماری زندگی کا کون سا لمحہ ایسا ہوتا ہے جب ہم خطرے میں نہیں ہوتے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مقصد تھا کہ یہ اقدام آپ کے حق میں زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ اس کے دفتر میں جا کر بات کریں گے۔ اس کا رد عمل کچھ بھی ہو سکتا ہے" وہ بولا۔

"میری جان میرے ساتھیوں سے زیادہ قیمتی تو نہیں" میں نے کہا "مجھے یہ ہرگز اچھا نہیں لگے گا کہ تم لوگ میرے گرد حفاظتی حصار بنائے رکھو' گولیاں کھاتے رہو اور میں خود سب سے آخر میں میدان میں نکلوں۔ اس سے کہیں زیادہ قابلِ رشک صورتحال میری نظر میں یہ ہے کہ اگر میں مارا جاؤں تو میرے ساتھی میرا انتقام لینے کے سلسلے میں جاں نثاری کی ناقابلِ فراموش مثال قائم کریں ورنہ ہوتا تو یہی ہے کہ باس کے مرنے کے بعد سب کارکن ادھر ادھر بکھر جاتے ہیں یا پھر کسی کو باس چن لیتے ہیں اور گلشن کا کاروبار حسبِ سابق چلتا رہتا ہے مگر باس کو کوئی یاد بھی نہیں کرتا۔"

"لیکن ہمارے ہاں صورتحال بہت مختلف ہے باس!" شفیع شاہ بولا "سیٹھ واحد دنیا کے نہایت خطرناک آدمیوں میں سے ایک سہی لیکن اگر اس نے آپ کو کوئی گزند پہنچائی تو وہ کم از کم اس ملک میں چین سے نہیں بیٹھ سکے گا۔ ہم اس کے ہر اس ٹھکانے کو کھنڈر بنادیں گے جو ہمارے علم میں ہوگا۔"

"تمہاری اس بات سے میرا حوصلہ بڑھا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اور یہ حقیقت تھی۔ اس دبلے پتلے نوجوان کا لہجہ بظاہر دھیما تھا مگر میں اس کے عقب میں طوفانوں کی گھن گرج سن سکتا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "اور اب میرا یہ فیصلہ مزید مستحکم ہوگیا ہے کہ مجھے ابھی اور اسی وقت جا کر سیٹھ واحد سے بات کرلینی چاہئے۔ صورت یہ ہوگی کہ تم دو تین آدمی لے کر اسی بلڈنگ میں موجود رہو گے جس میں سیٹھ واحد کا دفتر ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا کہ پورے ایک فلور پر سیٹھ واحد کے دفاتر پھیلے ہوئے ہیں۔ تم اسی فلور پر سیڑھیوں اور لفٹوں کے قریب موجود رہو گے۔ خطرے کی بو سونگھنے کی صلاحیت تم رکھتے ہی ہو۔ تمہیں اگر ذرا بھی گڑبڑ کا احساس ہو تو بلا تامل تم سیٹھ واحد کے دفتر پر حملہ آور ہو سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے پُرسکون انداز میں سر ہلایا پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ پہلو بدلتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے استاد

بسو نے سیٹھ کرامت کو جو مال سپلائی کرنے کا چکر چلایا ہوا تھا وہ اس کا سائیڈ بزنس تھا۔ سیٹھ واحد کے کاروبار سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا ہوگا۔"

"ہاں۔ میرا اندازہ بھی یہی ہے" میں نے اس کے خیال کی تائید کی "جن لوگوں کے سیدھے اور ٹیڑھے دونوں ہی قسم کے کاروبار کافی پھیل جاتے ہیں ان کے خاص خاص کارندے اپنے طور پر بھی کچھ نہ کچھ دھندے شروع کر دیتے ہیں۔ میں خود کسی زمانے میں قاسم خان کے لئے کام کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا مال بھی ادھر سے ادھر کرتا رہتا تھا۔ اسی لئے اب میں نے اپنے خاص خاص کارکنوں کو ایک طرح سے کاروبار میں اپنا کچھ فیصد حصے کا پارٹنر ہی بنایا ہوا ہے تاکہ انہیں الگ سے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہ رہے۔ وہ جتنا اس کاروبار کو پھیلائیں گے اتنے ہی زیادہ خود بھی خوشحال ہوں گے۔ اور اس کے باوجود میری طرف سے ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ اگر وہ چاہیں اور انہیں وقت بھی میسر ہو تو وہ میرے علم میں لا کر بھی جو چاہیں کر سکتے ہیں۔"

"لیکن وہ ایسا کریں گے نہیں" شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا۔ "ان کے ایسا نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ آپ کے جاں نثار ہیں۔ آپ سے بہت خوش ہیں... اور جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں آپ ہی کے لئے کرنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ بات مجھے اچھی طرح معلوم ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اسی لئے تو میں اپنے آپ کو اتنا طاقتور محسوس کرتا ہوں کہ سیٹھ واحد سے بھی ٹکر لینے کے لئے تیار ہوں۔"

"ساتھیوں پر اس اعتماد کا شکریہ" شفیع شاہ کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"سیٹھ واحد سے میری بات کراؤ۔ اگر وہ ملک میں ہی ہے تو اس وقت اپنے دفتر میں ہی ہوگا" میں نے کہا۔

شفیع شاہ نے ٹیلیفون اپنی طرف کھسکایا اور نمبر ڈائل کیا۔ سیٹھ واحد کا نمبر اسے مجھ سے پوچھنے یا کسی نوٹ بک میں دیکھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بیشتر اہم چیزیں اسے زبانی ہی یاد رہتی تھیں۔

سلسلہ ملنے پر وہ پروقار لہجے میں بولا "سیٹھ واحد صاحب سے بات کرائیے... جی؟... ان سے کہئے کہ لاہور کے محمد افضل چوہدری صاحب بات کرنا چاہتے ہیں... کام کی نوعیت صرف انہیں ہی بتائی جاسکتی ہے... آپ صرف چوہدری صاحب کا نام انہیں بتا دیجئے۔ وہی کافی ہوگا۔"

پھر وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔ اس نے مزید صرف چند سیکنڈ انتظار کیا پھر ریسیور میری طرف بڑھا دیا۔

"ہیلو" دوسری طرف سے سیٹھ واحد کی آواز سنائی دی جس میں ہلکی سی غنودگی کی جھلک تھی۔ تاہم اس کا موڈ خاصا خوشگوار معلوم ہوتا تھا کیونکہ میرے سلام کے جواب میں اس نے فوراً ہی شگفتہ لہجے میں پنجابی بولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اوئے سوہنے منڈے! کی حال اے تیرا؟"

"ٹھیک ہوں سیٹھ صاحب!" میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "مجھے خوشی ہے کہ آپ نے مجھے یاد رکھا حالانکہ آپ سے پچھلی ملاقات کو کئی برس گزر چکے ہیں۔ میں آپ کی یادداشت کی داد دیتا ہوں۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "یادداشت کے ساتھ ساتھ میری انفارمیشن سروس بھی بہت اچھی ہے۔ ویسے تو میں اس ہینڈسم نوجوان کو بھی نہیں بھولا جو پرجوش ہونے کے ساتھ ساتھ باسلیقہ بھی تھا اور اپنے باس قاسم خان کے نمائندے کے طور پر میرے پاس آیا تھا۔"

"اور یہ آپ کی نوازش تھی کہ آپ نے اس نوجوان کو مایوس نہیں لوٹایا تھا۔ اور اس کے باس کا ہاتھ تھام لیا تھا" میں نے کہا۔

"بھئی سچ پوچھو تو ہم نے تم سے متاثر ہو کر تمہارے باس کا ہاتھ تھاما تھا۔ ہماری جوہر شناس نظروں نے اس وقت ہی ہمیں بتا دیا تھا کہ یہ نوجوان ضرور آگے چل کر بہت کچھ کر کے دکھائے گا" سیٹھ واحد بدستور خوشگوار لہجے میں بولا۔

"سیٹھ صاحب! مجھے تو اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ آپ جیسے آدمی کے منہ سے اپنی تعریفیں سن سن کر میں اپنی اوقات ہی نہ بھول جاؤں" میں نے کہا۔

"نہیں۔ نہیں۔ تم اوقات بھولنے والے آدمی نہیں ہو۔ تم بہت اونچی چیز ہو" سیٹھ واحد نے ایک اور قہقہہ لگایا "تمہارا سابق باس البتہ کافی نالائق آدمی ثابت ہوا۔ تمہیں معلوم ہے آج کل وہ کہاں ہے؟"

"جی نہیں۔ میرے خیال میں اسے امریکا کی کسی جیل میں ہونا چاہئے" میں نے کہا۔

"ہے تو وہ امریکا میں ہی لیکن جیل میں نہیں ہے۔ سزا کاٹ کر رہا ہو چکا ہے" سیٹھ واحد بتانے لگا "وہاں طریقہ یہ ہے کہ منشیات کی اسمگلنگ کے سلسلے میں پکڑے جانے والے غیر ملکی جیسے ہی سزا کاٹ کر رہا ہوتے ہیں انہیں پہلی فلائٹ سے ان کے ملک بھیج دیا جاتا ہے جہاں عام طور پر ملکی پولیس بھی انہیں گرفتار کر لیتی ہے لیکن قاسم خان کے سلسلے میں ایسی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ جانتے ہو کیوں؟"

"مجھے اندازہ نہیں" میں نے کہا۔

"محض اس کی بیوی سلمیٰ کی وجہ سے۔ وہ بہت ہی کمال کی عورت ہے" سیٹھ واحد بولا۔

اس کی باتوں نے مجھے اصل بات بھلا دی جس کے لئے میں نے اسے فون کیا تھا۔ میں ماضی کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگا جہاں ان گنت کہانیاں بکھری پڑی تھیں لیکن جلد ہی میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور ماضی کے خواب خواب جزیروں سے ...ال کی دوڑتی بھاگتی دنیا میں آگیا۔

"حیرت ہے!" میں نے دھیمی آواز میں کہا "سلمیٰ اب بھی اس کے ساتھ ہے۔ میرا خیال تھا کہ وہ اسے چھوڑ چکی ہوگی، وہ تو بہت نالاں تھی اس سے۔"

"نالاں تو وہ اب بھی ہے" سیٹھ واحد ہنس کر بولا "فٹبال کی طرح اسے ٹھوکروں سے لڑھکاتی پھرتی ہے لیکن اب بھی ساتھ رکھا ہوا ہے۔ شوہر شاید اب بھی اس کی ایک سماجی ضرورت ہے اس لئے اس نے قاسم خان کو ابھی تک اپنے ساتھ باندھا ہوا ہے ورنہ وہ اپنے روز و شب تو اپنی مرضی سے ہی گزارتی ہے۔"

"ان کے حالات کیسے ہیں؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ انہوں نے گرین کارڈ بھی اصل کر لئے ہیں۔ ایک سزا یافتہ غیر ملکی... اور وہ بھی منشیات ...ی اسمگلنگ کا سزا یافتہ... اس کا وہاں گرین کارڈ حاصل کر لینا ممکن کام ہوتا ہے جسے سلمیٰ نے ممکن کر دکھایا... اور جہاں تک ...الات کا تعلق ہے تو وہ لاس اینجلس میں بیورلے ہلز کے قریب ...م اسٹارز کی طرح ایک بیش قیمت اپارٹمنٹ میں ٹھاٹ سے رہ ...ہے ہیں۔ وہاں کی زیر زمین دنیا سے ان کی لائن سیٹ ہو گئی ہے ...میں نے کہا نا کہ وہ عورت سلمیٰ بہت ہی غضب کی عورت ہے ...بھی کبھی تو میں سنجیدگی سے سوچتا ہوں کہ اسے اپنے ساتھ لوں۔ لیکن دو وجوہات کی بنا پر رہ جاتا ہوں۔"

"کیا ہیں وہ وجوہات؟" میں نے آہستگی سے پوچھا۔

"ایک تو میرا دل کہہ دیتا ہے کہ وہ عورت قابلِ اعتبار نہیں، دوسرے میرا اندازہ ہے کہ میں اس کے مطالبات پورے نہیں ...کر سکوں گا۔ میں اگر اس کی خدمات حاصل کرنے کے لئے خود ...اس کی طرف بڑھوں گا تو وہ کچھ زیادہ ہی پھیل جائے گی" سیٹھ ...واحد نے جواب دیا۔

...وہ ٹیلیفون پر ہی اتنی بے تکلفی سے یہ سب کچھ بتائے جا رہا ...تھا کہ مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا مگر وہ اس معاملے میں ...بالکل بے خوف معلوم ہوتا تھا۔ قاسم خان اور سلمیٰ کے ذکر نے ...میری رگ رگ میں ایک سنسنی سی دوڑا دی تھی اور میں ان کے ...بارے میں یونہی ایک بے نام سے تجسس کے تحت زیادہ سے زیادہ ...جاننا چاہتا تھا مگر مصلحت اور احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں فون پر ...اور وہ بھی ایک ہوٹل کے فون پر اس گفتگو کو زیادہ طول نہ دوں۔

سیٹھ واحد کہہ رہا تھا "قاسم خان نے کئی بار پاکستان آنے کا ...پروگرام بنایا مگر پھر اسی خوف سے اس نے ارادہ بدل دیا کہ یہاں ...کہیں دھر نہ لیا جائے... دوسرے وہ فی الحال تو وہاں بہت ...مزے میں ہیں اس لئے اسے کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"آپ کی معلومات کا واقعی جواب نہیں" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا کہ میری انفارمیشن سروس بہت اچھی ہے" وہ ہنس کر بولا "اب تم اپنا معاملہ ہی دیکھ لو۔ برسوں پہلے تم سے ایک ملاقات ہوئی تھی اور پھر بس لاہور میں فون پر بات ہوئی تھی جب تم نے وقت کی بساط پر ہمارا ایک مہرہ پیٹ دیا تھا۔ لیکن اس دوران ہم نے تمہارے بارے میں تھوڑی بہت ضروری معلومات رکھی ہیں اور تمہاری ترقی سے باخبر رہے ہیں۔"

"باتوں باتوں میں اصل بات رہی جا رہی ہے" میں نے کہا۔ "مجھے فوری طور پر آپ سے ملنے کے لئے تھوڑا سا وقت چاہئے۔"

"ابھی...؟ اسی وقت؟"

"جی ہاں۔"

"میں رات ہی اٹلی سے آیا ہوں اور صبح سے لے کر دوپہر کے کھانے تک لوگوں سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ آرام کا وقت ہی نہیں مل سکا۔ اب میں آرام کرنے کے لئے گھر جا رہا تھا۔ ... لیکن خیر... تمہیں تو انکار نہیں کیا جا سکتا نا۔ آجاؤ۔ لیکن کیا کوئی بہت ضروری بات ہے؟ کوئی سنگین مسئلہ ہے؟" اس کے لہجے میں سنجیدگی آگئی۔

"بس یوں سمجھ لیجئے کہ کسی کی موت کا مسئلہ ہے" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے.... آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

شفیع شاہ منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اس نے ملنے کے لئے بلا لیا ہے" میں نے شفیع کو بتایا "تم دو بہترین لڑاکوں کو طلب کر لو۔ ایسے آدمی جو پرہجوم جگہ پر اسلحے سے بھی اور خالی ہاتھ بھی لڑنا جانتے ہوں۔ ہجوم سے خود بھی نکل لینے میں ماہر ہوں اور بوقتِ ضرورت کسی اور کو بھی نکال کر لے جا سکتے ہوں۔ اس کے علاوہ سیٹھ رمضان کو بھی مطلع کر دو کہ ہمارا یہ پروگرام ہے ورنہ وہ شکوہ کرے گا کہ ہم اس سے بالا بالا ہی کارروائیاں کرنے لگے ہیں۔"

"ٹھیک ہے" اس نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں تب تک تیار ہوتا ہوں" میں نے کہا۔

میں نے وارڈ روب کھولی جس میں ہینگر پر سب... ایک نفیس سوٹ ٹنگا ہوا تھا۔ سوٹ نکال کر میں نے باہر رکھا اور خود باتھ روم میں جا گھسا۔ مجھے معلوم تھا کہ شفیع شاہ کو آدمی طلب کرنے میں چند منٹ تو لگیں گے، اس کے علاوہ سیٹھ رمضان بھی شاید آدمی بھیجنا چاہے۔ اتنی دیر میں میں شاور لے سکتا تھا۔ سمندر کی سیر اور چند منٹ کی مار دھاڑ کے بعد نہانے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تھی۔

تقریباً بیس منٹ بعد ہم کمرے سے نکلے تو میں گویا کسی

تقریب میں جانے کے لئے تیار نظر آرہا تھا۔ ہم ہوٹل سے باہر آئے تو ڈرائیوے میں ایک سیاہ کار کھڑی نظر آئی۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک عنابی کار فوارے کے نزدیک کھڑی تھی۔

"یہ سیاہ کار اپنی ہے۔ اس میں ریاض اور مرید علی ہیں" شفیع شاہ نے بتایا "اور عنابی کار میں سیٹھ رمضان کے آدمی ہیں۔ میں نے انہیں سب کچھ سمجھا دیا ہے۔"

میں نے مطمئن انداز میں سرہلایا۔ ریاض اور مرید علی کو میں جانتا تھا۔ شفیع نے ٹھیک ہی آدمیوں کا انتخاب کیا تھا۔ وہ سیکڑوں کے مجمعے میں اپنا کام کرکے نکل جانے والے آدمی تھے۔ مجھے امید تھی کہ سیٹھ رمضان نے بھی ٹھیک ہی آدمی بھیجے ہوں گے۔ میں سوچ رہا تھا کہ سیٹھ واحد نے فون پر تو مجھ سے بہت ہی شفقت اور خوشدلی سے بات کی تھی لیکن عین ممکن تھا کہ استاد لبھو اور تین دوسرے کارکنوں کی موت کا سن کر اس کی ساری شفقت اور خوشدلی ہوا ہو جاتی۔

جب میں پچھلی مرتبہ سیٹھ واحد سے ملنے گیا تھا اس وقت بھی میرے اندازے کے مطابق وہاں کم از کم چھ سات گن مین موجود تھے جن میں سے پانچ تو بظاہر بے ضرر سے دفتری کارکن نظر آرہے تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ اب شاید گن مین اس سے بھی زیادہ ہو چکے ہوں۔

بہرحال ایک بات طے تھی کہ اگر وہ غصے میں آکر وہیں کوئی کارروائی کرنے پر تل جاتا یا مجھے یرغمال بنانے کی کوشش کرتا تو یہ کارروائی اس کے لئے اتنی آسان ثابت نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے دفتر کی یقیناً اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور بعد میں وہاں سے کچھ لاشیں ضرور اٹھائی جاتیں جن میں شاید میری اور سیٹھ واحد کی لاشیں بھی شامل ہوتیں۔

میں شفیع شاہ کے ساتھ مرسڈیز میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ دونوں کاریں بھی تھوڑے تھوڑے فاصلے سے ہمارے پیچھے تھیں۔

ٹاور کے قریب ایک عالیشان عمارت کے نیچے تینوں کاریں قریب قریب رکیں اور ہم کاروں سے اتر کر بظاہر ایک دوسرے سے لاتعلقی کے ساتھ لفٹوں کی طرف بڑھ گئے۔ سیٹھ رمضان کے چار آدمی عنابی کار میں آئے تھے۔ آدمی ٹھیک ہی معلوم ہوتے تھے۔

پانچویں فلور پر پہنچ کر سب لوگ ادھر ادھر بکھر گئے۔ اس فلور پر سیٹھ واحد کے دفتر میں بہت سے لوگوں کی آمدورفت جاری تھی۔ صرف شفیع شاہ اس دروازے کے قریب رہا جس سے گزر کر ملاقاتی سیٹھ واحد کے کمرے کی طرف جا سکتے تھے۔ شفیع بظاہر ایک کتابچے کے ورق الٹ پلٹ رہا تھا جیسے کوئی ایڈریس وغیرہ تلاش کر رہا ہو۔

میں تنہا ہی آگے بڑھا اور شیشے کا بھاری بھرکم دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ یہ ایک بہت بڑا سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ ہال تھا۔ اس وقت موسم ٹھنڈا ہونے کی وجہ سے ایئر کنڈیشنرز بند تھے۔ فرش پر دبیز سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔

دیواروں کے ساتھ دونوں طرف دھندلے شیشوں کی دیواروں کے بوتھ سے بنے ہوئے تھے۔ بہت کم دفاتر میں میں نے اتنے خوبصورت بوتھ بنے ہوئے دیکھے ہیں۔ ان میں مرد عورتیں مختلف کاموں میں مصروف تھیں۔ کوئی مستعدی سے ٹائپ کر رہا تھا تو کوئی فائلوں میں غرق تھا۔ کوئی رجسٹر الٹ پلٹ رہا تھا اور کوئی کسی کیلکولیٹر یا کسی چھوٹے کمپیوٹر پر حساب کتاب میں مصروف تھا۔ پورے ہال میں دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ سیٹھ واحد کے دفتر کا سیٹ اپ کافی تبدیل ہو گیا تھا۔ پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس میں حیرانی کی کیا بات، اتنے برسوں میں تو ہر چیز میں کچھ نہ کچھ تبدیلی آجاتی ہے۔ سیٹھ واحد کے دفتر کی ترتیب و آرائش بدل گئی تھی اور اس میں وسعت آگئی تھی تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔

میں ابھی زیادہ دور تک کا جائزہ نہیں لے پایا تھا کہ ایک طرف سے آنے والی ایک مترنم آواز نے مجھے چونکا دیا "مے آئی ہیلپ یو سر؟"

"آف کورس" میں نے اس کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

ایک گوشے میں نہایت خوبصورت کاؤنٹر کے پیچھے نہایت ہی خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ رنگت اور نقوش سے اینگلو انڈین معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر مہربان مسکراہٹ تھی۔ اس کے بائیں ہاتھ پر ٹیلیفون کے انٹرکام کا بورڈ نظر آرہا تھا اور سامنے کاؤنٹر پر تین چار رنگوں کے فون، ایک رجسٹر، ایک فائل اور ایک خوبصورت ٹرے رکھی تھی۔

لڑکی بلاشبہ اتنی خوبصورت تھی کہ ایک لمحے کے لئے میں یہ بھول گیا کہ میں یہاں آیا کس لئے تھا۔ پھر میں سنبھل کر مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھا۔

"اے بیوٹی فل گرل لائیک یو کین آلویز ہیلپ ا... لائک می" میں نے کاؤنٹر پر پہنچ کر کہا اور وہ شرمیلے سے انداز میں ہنس دی۔ اس کا حلیہ ہرگز مشرقی نہیں تھا مگر جس انداز سے اس کے گال گلابی سے سرخ ہوئے اس سے وہ خود ضرور خالص مشرقی لڑکی نظر آنے لگی۔

مجھے سیٹھ واحد کی قدر ناشناسی پر افسوس بھی ہوا کہ اتنی خوبصورت لڑکی کو اس نے ریسپشنسٹ جیسا معمولی مقام دیا تھا لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ ضروری نہیں کہ وہ ریسپشنسٹ نظر آرہی ہے تو واقعی ریسپشنسٹ ہو۔

"تھینکس فار دا کمپلی مینٹس... سر!" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ میں نے اسے اپنا نام بتایا اور وہ سامنے رکھے ہوئے رائٹنگ پیڈ پر نظر ڈالتے ہوئے بولی "مسٹر زاہدی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

سیٹھ واحد کا پورا نام واحد زاہدی تھا۔ میں لڑکی کا شکریہ ادا کرکے آگے بڑھا۔ بوتھوں کے درمیان کشادہ راستے سے گزرتا ہوا میں سامنے نظر آنے والے سفید دروازے کی طرف بڑھا جس پر پیتل کے حروف سے آراستہ سیٹھ واحد کے نام کی تختی نظر آرہی تھی۔

دروازے سے ذرا پہلے دائیں بائیں جو دو کیبن تھے، بظاہر ان میں بھی دو دو آدمی میزوں پر فائلیں وغیرہ لئے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بیک وقت سر اٹھا کر گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا اور مجھے ان کے چہروں پر ایک نظر ڈالتے ہی یہ اندازہ کرنے میں ذرا سی دقت نہیں ہوئی کہ وہ بظاہر مہذب اور شائستہ نظر آنے کے باوجود دفتری آدمی نہیں تھے۔

تاہم میں نے ان کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی اور بے نیازی سے دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اسی لمحے دروازہ خود ہی کھل گیا اور پختہ عمر کا ایک دراز قد آدمی مسکراتا ہوا باہر آیا اور بے تابانہ انداز میں ہاتھ پھیلا کر میری طرف بڑھا۔ اندر گویا پہلے ہی کسی نے میری آمد کی اطلاع کر دی تھی۔

وہ شخص 'نان نہ مان میں تیرا مہمان' کے مصداق مجھ سے بغلگیر ہی ہو گیا جبکہ میں ظاہر ہے اسے پہچانتا بھی نہیں تھا لیکن مجھے چونکہ اس بیکراں خلوص کے اظہار کا مقصد معلوم تھا اس لئے میں نے کسی قسم کے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا اور اس کی گرمجوشی کا جواب اس سے زیادہ گرمجوشی سے دیا۔ گویا وہ واقعی میرا کوئی بچھڑا ہوا جگری یار تھا جسے قریہ قریہ ڈھونڈتے ڈھونڈتے میں تھک چکا تھا۔

میری اس مصنوعی گرمجوشی پر وہ کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ بہرحال اپنا فرض تو ادا کر ہی چکا تھا یعنی اس نے اخلاق کے اس مظاہرے کے دوران میرے لباس پر ہاتھ پھیر کر اچھی طرح تسلی کر لی تھی کہ میرے پاس بغلی ہولسٹر میں یا جیب میں کوئی ریوالور وغیرہ تو نہیں ہے۔ لیکن میں اتنا احمق نہیں تھا کہ ریوالور جیب میں رکھ کر سیٹھ واحد سے ملنے آتا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ البتہ میری پنڈلی سے ایک خنجر ضرور بندھا ہوا تھا اور خنجر جیسی چیز کی انہیں کوئی پروا نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ سیٹھ واحد کے کمرے میں کوئی ایسی چیز ساتھ لے بھی جاتا تو اس کے استعمال کی نوبت نہ آسکتی تھی۔ قسمت آزمائی کرنے والے کو خنجر نکالنے سے پہلے ہی ڈھیر کیا جا سکتا تھا۔ نہایت ماہرانہ انداز میں اپنا کام انجام دینے والے اس شخص نے مؤدبانہ انداز میں مجھے کمرے میں چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک کرخت صورت آدمی تھا۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اس نے دنیا کے بہت سے رنگ دیکھے ہیں، صعوبتیں سہی ہیں اور بڑے بڑے تجربوں سے گزرا ہے۔ وہ ایک ڈھیلے ڈھالے سے سوٹ میں تھا۔

"خادم کو فیروز کہتے ہیں" میرے ساتھ چلتے ہوئے اس نے اپنا تعارف بھی کرا دیا۔

"خوشی ہوئی آپ سے مل کے" میں نے اپنا نام بتائے بغیر خشک لہجے میں کہا۔

اس نے میرے لئے دروازہ کھولا۔ کمرے میں ہال کے قالین سے بھی کہیں زیادہ نرم اور دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور طویل و عریض کمرے کی آرائش اور فرنیچر قابل دید تھا۔ کمرے میں نہایت ہلکی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک گوشے میں ترچھی رکھی ہوئی ایک نہایت نفیس اور بیش قیمت میز پر ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا جس کے نیچے میز کی سطح شیشے کی طرح جھلملا رہی تھی۔ میز پر بہت کم سامان تھا جس طرح عام طور پر نہایت اونچے قسم کے دفاتر میں اعلا عہدیداروں کی میزوں پر ہوتا ہے۔

یہ سب کچھ نہایت خوبصورت اور متاثر کن تھا لیکن چنبیلی کے عطر کی تیز خوشبو اس ماحول کو بوجھل بنا رہی تھی۔ مختصر قدو قامت کا مالک سیٹھ واحد اپنی خوبصورت میز کے عقب میں ایک نہایت شاندار ریوالونگ چیئر پر نیم دراز تھا۔ اس کے بال سلیقے سے جمے ہوئے تھے لیکن شاید چنبیلی ہی کے تیل میں تر تھے اور خوب چمک رہے تھے۔

وہ اب بھی ویسا ہی تھا جیسا میں نے اسے کئی برس پہلے دیکھا تھا۔ اس کی شخصیت میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ اس وقت وہ کچھ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ دو بھاری بھرکم سے آدمی گدیلی کرسیوں پر اس کے مقابل بیٹھے تھے اور ان کے درمیان صرف ایک کرسی خالی تھی۔

سیٹھ واحد کے عین پیچھے ایک نیم گنجا شخص ستون کی طرح ایستادہ تھا۔ وہ خاکی پتلون اور چمڑے کی ڈھیلی ڈھالی جیکٹ میں تھا۔ اس کا چہرہ پھولا پھولا اور آنکھیں نیلی تھیں۔ یہ آنکھیں ہر قسم کے تاثر سے اس حد تک عاری تھیں کہ پتھر کی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے کھڑا تھا اور مجھے یقین تھا کہ جیبوں میں جدید ترین ساخت کے پستول یا ریوالور موجود ہوں گے۔

کمرے کے آدھے حصے میں نشست کا انتظام تھا اور اس کی آرائش ڈرائنگ روم کی طرز پر تھی مگر سیٹھ واحد اٹھ کر اس طرف نہیں آیا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے اس کے عین مقابل ان دو بھاری بھرکم آدمیوں کے درمیان ہی بیٹھنا تھا جو کچھ عجیب پُراسرار انداز میں خاموش بیٹھے تھے۔

سیٹھ واحد نے اٹھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس بے پناہ طاقتور آدمی کا ہاتھ نہایت مختصر مگر پتھر کی طرح سخت تھا۔

"بیٹھو بھئی سوہنے منڈے!" اس نے خالی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گرمجوشی سے کہا "بڑی مدت کے بعد ملنے کی زحمت کی ہے تم نے... ہاں بھئی اب کیوں ملو گے۔ اب تو بڑی اونچی چیز ہو گئے ہو۔"

"آپ جیسے بڑے لوگ ہم غریبوں کا اسی طرح مذاق اڑاتے

ہیں جناب!" میں نے بیٹھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے آدمیوں کے چہروں پر مسکراہٹ کا شائبہ تک نہیں تھا اور وہ گویا غیر محسوس طور پر میری حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔
"سنا ہے فائیو اسٹار ہوٹل بنانے کے چکر میں ہو" سیٹھ واحد نے میز پر کہنیاں ٹکا کر مسکراتے ہوئے کہا۔
"ہاں۔ کچھ زیادہ ہی چکر میں آگیا ہوں" میں نے کہا "ابھی ارادہ ہی کیا ہے تو عجیب عجیب چکر چلنے لگے ہیں۔"
اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "کبھی میں نے بھی اس کا ارادہ کیا تھا لیکن ہوٹل انڈسٹری کا مستقبل مجھے روشن نظر نہیں آتا۔ میں نے یہ خیال ترک کردیا اور سنگاپور میں ایک انٹرنیشنل ہوٹل کے شیئرز خرید لئے۔"
"آپ تو بڑے آدمی ہیں جناب! کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ ہم تو اپنی جمع پونجی کا بیشتر حصہ صرف اپنی بقاء کے لئے داؤ پر لگا رہے ہیں" میں نے کہا۔
"افسانوی باتیں چھوڑو برخوردار" سیٹھ واحد سر ہلاتے ہوئے مسکرایا "مجھے معلوم ہے تمہارے پاس بڑا مال ہے۔"
"چلئے آپ ایسا سمجھتے ہیں تو یہ میرے لئے فخر کا ہی مقام ہے!" میں نے کہا۔
اس دوران وہ شخص جو مجھے اندر لایا تھا' ایک دیوار کے قریب جا کھڑا ہوا تھا۔ دیوار پر بظاہر آرائش کے لئے لکڑی کا کام کیا گیا تھا مگر اس آرائش کا ایک حصہ درحقیقت ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو ایک غیر نمایاں سے سوئچ کو دبانے پر کھل گیا تھا۔ دروازے کے عقب میں ایک چھوٹی سی الماری تھی، جس میں شیشے کے جھلملاتے شیلفوں میں کچھ خوبصورت بوتلیں سجی ہوئی تھیں۔
"سر! آپ کچھ پینا پسند فرمائیں گے؟" اس شخص نے نہایت مؤدبانہ انداز میں مجھ سے پوچھا۔
"میں عام طور پر صرف ٹھنڈا پانی پیتا ہوں" میں نے جواب دیا۔
سیٹھ واحد نے قہقہہ لگایا اور اپنے آدمی سے مخاطب ہوا۔ "بھئی یہ اپنا سوہنا منڈا بڑا شریف آدمی ہے۔ تم اپنا یہ شراب خانہ بند ہی رکھو تو اچھا ہے" پھر وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ "میں بھی نہیں پیتا۔ مہمانوں کے لئے رکھتا ہوں۔"
اس شخص نے وہ خفیہ خانہ بند کردیا اور کمرے میں ایک لمحے کے لئے سکوت سا چھا گیا۔ سیٹھ واحد گویا چونکتے ہوئے بولا۔ "ہاں بھی... وہ کیا بات تھی جس کے لئے تم یوں اچانک دوڑے چلے آئے ہو؟"
"وہ بات میں تخلئے میں کرنا چاہوں گا" میں نے کہا۔
اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا اور میرے دائیں بائیں بیٹھے ہوئے دونوں آدمی [illegible]

نظر مجھ پر ڈال کر اٹھ کھڑے ہوئے اور خاموشی سے دروازے کی طرف چل دیئے۔ وہ شخص بھی انہی کے ساتھ باہر چلا گیا جو مجھے کمرے میں لایا تھا لیکن سیٹھ واحد کے عقب میں کھڑا ہوا [illegible] نما شخص بدستور اپنی جگہ استادہ رہا۔ اس کا چہرہ اب بھی [illegible] سے عاری تھا' وہ گویا کمرے میں ہونے والی کوئی بھی بات [illegible] نہیں رہا تھا۔
میں نے سوالیہ نظروں سے اس شخص کی طرف دیکھا [illegible] واحد بولا "یہ کمرے میں موجود رہے گا لیکن اس کی وجہ سے تمہیں ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں [illegible] تم گونگا اور بہرا ہی سمجھو۔"
میں نے ایک لمحے توقف کیا اور پھر دھیرے دھیرے [illegible] الامکان متاثر کن انداز میں بات شروع کی۔ تمام واقعہ [illegible] کے دوران میری کوشش درحقیقت یہی تھی کہ اس معاملے [illegible] اپنا بے قصور ہونا ثابت کرسکوں اور یہ اشارہ بھی دے [illegible] استاد لبھو اس کے ساتھ کچھ ایسا زیادہ مخلص بھی نہیں [illegible] درحقیقت اس نے خود ہی اپنی موت کو دعوت دی تھی۔
جب میں نے استاد لبھو کی ہلاکت کا ذکر کیا تو سیٹھ [illegible] آنکھوں میں بچی کھچی خوش خلقی کے آثار بھی مفقود ہوگئے [illegible] کی رنگت ایک لمحے کے لئے متغیر ہوئی لیکن وہ بظاہر تمام [illegible] اور تحمل سے میری بات سنتا رہا۔ اس کے ذہن میں اگر کوئی [illegible] برپا تھا تب بھی اس نے اس کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے کسی لفظ پر مجھے ٹوکا نہیں۔
میں خاموش ہوا تو وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگا۔ [illegible] ہی اسے گویا سانپ سونگھ گیا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے اس کی [illegible] میں نیند کا جو ہلکا سا خمار نظر آرہا تھا وہ اب غائب ہوچکا [illegible] پوری طرح چوکنا اور مستعد تھا۔ اس کا خاص الخاص [illegible] بدستور اپنی جگہ جما کھڑا تھا اور اس کی پتھریلی سی آنکھیں [illegible] تک میری ہی جانب نگراں تھیں اور وہ گویا کسی اشارے [illegible] تھا۔
میں بھی اس وقت گویا بیٹھا نہیں تھا بلکہ درحقیقت [illegible] تنے ہوئے نادیدہ رسّے پر چل رہا تھا اور اس رسّے ہی [illegible] میرے اعصاب بھی تنے ہوئے تھے۔ کسی اشارے کا [illegible] باڈی گارڈ ہی نہیں' میں بھی تھا۔
ٹہلتے ٹہلتے سیٹھ واحد اپنی سائیڈ ٹیبل کے قریب [illegible] پر رکھے ہوئے ایک خوبصورت سگار بکس سے اس نے [illegible] قیمت قسم کا سگار نکال کر طلائی لائٹر سے سلگایا اور ایک [illegible] لیا۔ وہ غالباً تمباکو نوشی کا عادی نہیں تھا' صرف اعصاب [illegible] لمحات میں چند کش لگالیتا تھا۔ میری نظر اس پر بھی تھی [illegible] کے خاص باڈی گارڈ پر بھی اور میں یہ ظاہر بھی نہیں [illegible] کہ میں بالکل چوکنا ہوں۔

پھر میری کسی نامعلوم حس نے گویا مجھے احساس دلایا کہ فضا میں پھیلی ہوئی اعصابی تناؤ کی لہریں ختم ہوگئی ہیں۔ شاید سیٹھ واحد کسی فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ وہ میری طرف مڑا تو اس کے ہونٹوں پر تھکی تھکی سی مسکراہٹ تھی۔
"استاد لبھو کو مار کر تم نے میری تنظیم کا توازن تھوڑا سا خراب کردیا ہے" وہ ملامت سے بولا "وہ بہت کام کا آدمی تھا۔"
"مجھے اس کا بخوبی اندازہ ہے" میں نے متاسفانہ سے انداز میں کہا۔
"اس میں بس تھوڑی سی جہالت باقی تھی جسے میں بھی نہیں نکال سکا... ویسے مجھے حیرت ہے کہ وہ اتنی آسانی سے کیسے مارا گیا!"
اس نے پُرخیال انداز میں ٹھوڑی پر ہاتھ پھیرا۔
"شاید وہ اپنی جہالت کے ہاتھوں ہی مارا گیا" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "بہرحال اتنی آسانی سے نہیں مارا گیا۔ اسے مارنا معمولی آدمیوں کا کام نہیں تھا" میں اشارتاً سیٹھ واحد کو یہ جتا دینا چاہتا تھا کہ ہم معمولی آدمی نہیں ہیں۔
اس نے میری اس بات کا کوئی نوٹس نہیں لیا اور واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا "اس حادثے سے مجھے ایک جھٹکا لگا ہے گو کہ اب میں کافی حد تک "جھٹکا پروف" ہوچکا ہوں۔ بہرحال..." اس نے کندھے اچکائے "اس حادثے کی اطلاع لے کر تمہارا خود یہاں چلے آنا اور بلا کم و کاست ہر بات بیان کردینا مجھے اچھا لگا اور درحقیقت تمہارے اسی اقدام سے مجھے تمہارے بے قصور ہونے کا یقین آیا ہے۔ اگر تم مجھ سے رابطہ قائم نہ کرتے اور میرے اپنے تفتیشی ذرائع سے یہ بات مجھ تک پہنچتی تو شاید بات بگڑ جاتی اور ہمارے درمیان غلط فہمیوں کا دور ہونا بہت مشکل ہوجاتا۔ میں ایک بار پھر تمہاری دور اندیشی اور معاملہ فہمی کی داد دیتا ہوں۔ پہلی بار تم اس وقت بھی مجھے دور اندیش اور معاملہ فہم معلوم ہوئے تھے جب تم قاسم خان کے نمائندے کی حیثیت سے میرے پاس آئے تھے۔"
"یہ آپ کی عنایت اور شفقت ہے" میں نے انکساری سے کہا "میں اپنے معاملات دراصل حتی الامکان سیدھے رکھنا چاہتا ہوں۔"
"ہوں۔" اس نے ہنکارا بھرتے ہوئے سگار ایش ٹرے میں رکھ دیا اور پھر گویا اسے بھول ہی گیا۔
چند لمحے بعد جب کہ میں اس سے اجازت طلب کرنے کا ارادہ کررہا تھا' وہ گویا چونکتے ہوئے بولا "ازراہِ احتیاط آئندہ کے لئے ہمیں ایک قسم کا معاہدہ کرلینا چاہئے۔ میں اپنی تنظیم کے آدمیوں کو تمہارے اور تمہاری تنظیم کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرنے کے بعد یہ ہدایت جاری کردیتا ہوں کہ میرا کوئی آدمی تمہارے کسی آدمی سے کسی بھی مسئلے پر الجھنے نہ پائے۔ اور اگر کسی وقت کسی بھی وجہ سے تصادم کی کوئی صورت پیدا ہونے لگے تو تمہارے آدمی تمہیں اور میرے آدمی مجھے مطلع کریں۔ ہم خود میز پر بیٹھ کر اس معاملے کا تصفیہ کریں گے۔"
"اول تو مجھے یقین ہے کہ آئندہ ایسی کوئی صورت پیدا ہی نہیں ہونے پائے گی" میں نے کہا "پھر بھی ازراہ احتیاط اس قسم کا معاہدہ کرتے ہوئے مجھے خوشی ہوگی اور میں اسے آپ کی خصوصی نوازش اور شفقت سمجھوں گا۔ میں اور میری تنظیم تو سختی سے 'جیو اور جینے دو' کے اصول پر کاربند ہے۔"
ہم لوگ اپنے آدمیوں کے لئے 'گروہ' کا لفظ استعمال نہیں کرتے تھے۔
"ٹھیک ہے... تو پھر آج سے یہ معاہدہ رہا" اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے گرمجوشی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ ہمارے بیشتر معاہدے اسی طرح زبانی طے پاتے تھے۔
"اس کے ساتھ ہی میں اجازت چاہوں گا" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "اس ملاقات سے میرے اعصاب پر سے بہت بڑا بوجھ ہٹ گیا ہے۔"
"لیکن میرے اعصاب پر تم بوجھ بڑھا کر جارہے ہو" سیٹھ واحد بولا۔
"استاد لبھو کی موت سے اگر واقعی آپ کے لئے کوئی ایسا خلا پیدا ہوگیا ہے جسے جلد پُر نہیں کیا جاسکتا تو کچھ عرصے کے لئے میں خود آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں" میں نے مخلصانہ لہجے میں کہا "میری یہ پیش کش آئندہ چند ماہ کے لئے یوں برقرار رہے گی کہ کسی بھی سلسلے میں آپ کو کوئی ایسا مرحلہ درپیش ہو جس کے لئے آپ سمجھتے ہوں کہ کسی خاص ہی آدمی کی ضرورت ہے تو آپ مجھے یاد فرمائیں۔ میرے پاس کئی بے مثل قسم کے آدمی موجود ہیں... اور اگر میں نے ان میں سے بھی کسی کو موزوں نہ سمجھا تو میں خود آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوجاؤں گا بشرطیکہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔"
"اس پیش کش سے تم نے میرا دل خوش کردیا" وہ واقعی کھل اٹھا "مجھے جو ایک نقصان کا سا احساس ہورہا تھا میں اسے بھول گیا ہوں۔ اپنا یہ وعدہ یاد رکھنا۔"
"کیا ہم لوگ بھی کبھی اپنے وعدے بھول سکتے ہیں" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے ایک بار پھر گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا اور میں اسے خدا حافظ کہہ کر باہر آگیا۔ دروازے سے کچھ ہی فاصلے پر ایک کیبن کے قریب ڈھیلے ڈھالے سوٹ والا دراز قد آور اور بظاہر بے حد خلیق و ملنسار آدمی کھڑا تھا جو غالباً سیٹھ واحد کا غیر رسمی پروٹوکول آفیسر تھا۔
مجھے دیکھتے ہی اس کے ہونٹوں پر مشینی سے انداز میں ملنسارانہ مسکراہٹ آگئی اور وہ گردن کو خم دیتے ہوئے بولا۔
"آیئے... میں آپ کو دروازے تک چھوڑ آؤں۔"
"اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ میں چلا جاؤں گا" میں نے [illegible]

خشک لہجے میں کہا۔ اس کے باوجود وہ مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ میں بھی اس کی پروا کئے بغیر جاتے جاتے ایک بار پھر ریپشنسٹ لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ جواباً وہ بھی مسکرائی مگر پھر یک لخت اس نے گھبرائے ہوئے سے انداز میں سر جھکالیا۔ شاید اس شخص کی وجہ سے اس کی مسکراہٹ معدوم ہوگئی تھی جو مجھے دروازے تک چھوڑنے آیا تھا۔

اس شخص سے پیچھا چھوٹنے کے بعد میں اس فلور کے ٹیرس نما حصے میں آیا۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے اپنے آدمیوں کو میں نے سگنل دیا کہ سب خیریت ہے۔ ویسے تو میرا زندہ سلامت باہر آجانا ہی خیریت کی دلیل تھا لیکن میرا اشارہ پاکر انہیں مزید اطمینان ہوگیا اور ان میں سے کوئی سیڑھیوں کے راستے اور کوئی لفٹ سے نیچے روانہ ہوگیا۔

نیچے پہنچ کر ہم ایک بار پھر کاروں میں آگے پیچھے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ ہوٹل پہنچ کر میں نے شفیع شاہ سے کہا "ان سب کو ریستوران میں بلالو۔ کھانا ہم اکٹھے ہی کھائیں گے۔"

شفیع نے جاکر انہیں میرا پیغام دیا اور وہ سب آگے پیچھے چلتے ہوئے ریستوران میں آگئے۔ اس وقت وہ سب نہایت معزز اور شریف آدمی معلوم ہورہے تھے۔ بیٹھنے کے لئے میں نے ایک الگ تھلگ سی میز منتخب کی۔ مینو دیکھ کر سب اپنی اپنی پسند کی چیزوں کا آرڈر دے چکے تو میں نے محسوس کیا کہ میری موجودگی کی وجہ سے وہ سب مؤدب سے نظر آرہے تھے۔

"بھئی آپ لوگ اس طرح زبان کو تالا لگا کر مت بیٹھیں۔ نہ تو میں کوئی سخت گیر ٹیچر ہوں اور نہ آپ کسی پرائمری کلاس کے بچے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ آزادی اور بے تکلفی سے گفتگو کریں۔"

ان کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی لیکن اب بھی وہ محض ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔ ویٹر نے ہمارے سامنے مشروبات سجادئے تھے۔

"میں اس وقت بہت خوش ہوں" میں نے مشروب کی چسکی لیتے ہوئے کہا "کیونکہ ایک بہت ہی سنگین مسئلہ نہایت ہی خوش اسلوبی سے اور پُرامن انداز میں طے پاگیا ہے اور صرف یہی نہیں، آئندہ کے لئے بھی خاصا بہتری کا سامان ہوگیا ہے۔"

شفیع شاہ نے سوالیہ سے انداز میں بھویں اچکائیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "سیٹھ واحد نے ہمیں ایک معاہدے کی پیش کش کی ہے جسے سیاسی زبان میں 'پُرامن بقائے باہمی' کا معاہدہ کہا جاتا ہے۔ آئندہ دونوں تنظیموں کا کوئی بھی آدمی کسی بھی حال میں ایک دوسرے سے نہیں الجھے گا اور اگر کوئی ناگزیر صورتِ حال پیدا ہو ہی جائے تب بھی اپنے اپنے باس کو اطلاع دے گا۔ سیٹھ واحد جیسے آدمی کا ہمیں اس قسم کی پیش کش کرنا اس امر کا ثبوت ہے کہ اس نے ہمیں ایک اہم اور طاقتور تنظیم کے طور پر تسلیم کرلیا ہے۔"

"بے شک" شفیع شاہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بھی اب خوش نظر آرہا تھا۔ کراچی میں تنظیم کو اس قدر مضبوط بنانے کا سہرا درحقیقت اسی کے سر تھا۔

"تمہیں اس سلسلے میں اپنے تمام آدمیوں کو ہدایات جاری کرنی ہوں گی" میں نے کہا۔ پھر میں نے سیٹھ رمضان کے آدمیوں کو مخاطب کیا "آپ لوگوں کو بھی چونکہ ہم اپنی ہی تنظیم میں شمار کرتے ہیں اس لئے یہ ہدایات آپ اور آپ کے دیگر تمام ساتھیوں کے لئے بھی ہوں گی۔"

"بہت بہتر" ان میں سے ایک مؤدبانہ لہجے میں بولا۔

"ویسے میں باضابطہ طور پر سیٹھ رمضان کو بھی بتادوں گا" میں نے کہا۔ ابھی الفاظ میرے ہونٹوں پر ہی تھے کہ کوئی میرے قریب آکھڑا ہوا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ سیٹھ رمضان ہی تھا۔

"یار تم نے تو شیطان کو بھی پیچھے چھوڑ دیا" میں نے کہا۔

"کس معاملے میں؟" اس نے ایک کرسی کھسکا کر اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"عمر کے معاملے میں اور کس معاملے میں" میں نے نیپکن سے ہونٹ صاف کرنے کے بعد کہا "ابھی تمہارا نام ہی لیا تھا کہ شیطان کی طرح آن موجود ہوئے۔ یقیناً شیطان سے لمبی عمر پاؤ گے۔"

"آہستہ بولو۔ شیطان نے سن لیا تو برا مان جائے گا۔" سیٹھ رمضان سنجیدگی سے بولا۔ پھر اس نے چٹکی بجا کر ویٹر کو متوجہ کیا اور اپنے لئے اسے مشروب کا آرڈر دینے کے بعد بولا "میں سیٹھ واحد کے دفتر کا ایک چکر لگا کر آیا ہوں۔ میں نے یہ دیکھ کر سکون کی سانس لی کہ ادھر خیریت ہی خیریت تھی۔ یہاں آکر میں نے دیکھا، سب کی کاریں پارکنگ لاٹ میں کھڑی ہوئی تھیں۔ مگر تم اپنے کمرے میں نہیں تھے۔ میں سمجھ گیا کہ تم کھانے پینے کے لئے یہاں آن بیٹھے ہوگے۔ کیونکہ تمہارا محبوب مشغلہ یہی ہے۔ اور میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ ابھی کھانے کا وقت نہیں ہوا مگر تم آکر میدان میں ڈٹ گئے ہو اور ساتھ ان لڑکوں کو بھی لے آئے ہو۔"

"بھئی کھانے کا وقت وہی ہے جب بھوک لگ جائے" میں نے کہا "پیٹ کو گھڑی میں وقت دیکھنا نہیں آتا۔"

"ٹھیک ہے..... تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ رہ کر اپنی عادت بگاڑ لیتا ہوں۔ میرے لئے بھی کچھ منگواؤ" سیٹھ رمضان نے گویا بڑی مجبوری کے عالم میں کہا۔

کھانے کے دوران میں نے اسے سیٹھ واحد سے ملاقات کا احوال سنایا۔ معاہدے کا ذکر سن کر وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

"سیٹھ واحد کی تنظیم ملک میں پہلے نمبر پر ہے" وہ بولا "اس نے ہمیں اتنی اہمیت دی ہے کہ اب ہم اپنے آپ کو نمبر دو سمجھ سکتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے وہ دن دور نہیں جب ہم نمبر ایک ہوں گے۔"

"دیکھو... کیا ہوتا ہے۔ میں پیشگوئیاں کرنے کا قائل نہیں" میں نے کہا۔ "وقت بڑی ظالم چیز ہے۔ دعوے کرنے والوں کے دعوے بعض اوقات اس طرح ان پر دے مارتا ہے کہ شکل بھی نہیں پہچانی جاتی۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے" سیٹھ رمضان نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔

کھانے کے بعد میں نے سب کو رخصت کردیا اور اپنے کمرے میں آکر سو گیا۔ دوسری صبح بھی میں دیر تک بستر میں پڑا رہا پھر اٹھ کر ورزش کی اور کچھ دیر بعد تیار ہوکر روم سروس کے ذریعے کمرے میں ہی ناشتا منگوا کر بیٹھا ہی تھا کہ شفیع شاہ آگیا۔

وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ میرے اصرار پر ناشتے میں شریک ہوتے ہوئے بولا "سر! سیٹھ کرامت کا چیک کمپنی کے اکاؤنٹ میں کریڈٹ ہوگیا ہے۔ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے" میں نے طمانیت سے کہا "اسے اب رہا کردو لیکن اس کے پیچھے ایک ماہر قسم کا آدمی ضرور لگائے رکھنا۔ ماہر سے میری مراد ہے کہ وہ قریب رہ کر نگرانی کرنے میں ماہر ہو۔ سیٹھ کرامت کے بارے میں ایک ایک لمحے کی رپورٹ رکھنا۔ میں ابھی اس کے بارے میں پوری طرح مطمئن نہیں ہوں۔"

"دوسری خوش خبری یہ ہے سر..... کہ رات لاس اینجلس سے ٹیلکس آیا ہے" شفیع شاہ بولا "ہم نے ہوٹل کی اجازت لینے کے لئے جس انٹرنیشنل کمپنی کے پاس اپنا نمائندہ بھیجا ہوا تھا وہ ہمیں اجازت دینے کے لئے آمادہ ہوگئے ہیں۔ اگلے ماہ ان کا نمائندہ سروے کرنے کے لئے ہمارے پاس آئے گا۔"

"بہت خوب" میں نے پُرجوش لہجے میں کہا "یہ تو واقعی بہت اہم خبر سنائی تم نے۔ اب مجھے یقین ہو چلا ہے کہ ہوٹل تعمیر کرنے کا میرا خواب ضرور شرمندۂ تعبیر ہوگا۔ حالانکہ یہ صرف ابتدائی مرحلہ ہے مگر جانے کیوں مجھے یہی سب سے زیادہ مشکل لگ رہا تھا۔"

"یونہی باقی سب مراحل بھی طے ہوتے جائیں گے سر!" شفیع شاہ یقین سے بولا۔

"تم جیسے ساتھیوں کی موجودگی میں مجھے کوئی فکر نہیں" میں نے کہا۔

چند لمحے کی خاموشی کے دوران ہم نے ناشتا ختم کیا۔ پھر میں نے گھڑی میں تاریخ دیکھتے ہوئے کہا "آج میں واپس چلا جاتا ہوں، اب یہاں میرا کوئی کام نہیں رہا۔ میرا ٹکٹ اوپن تھا، تم ٹریول ایجنٹ کو فون کرکے میرے لئے ساڑھے بارہ بجے والی فلائٹ میں ایک سیٹ کنفرم کرادو۔"

"بہت بہتر" اس نے کہا اور وہیں فون پر ٹریول ایجنٹ سے بات کرنے لگا جس کا دفتر نیچے اسی ہوٹل میں تھا۔

چند منٹ بعد شفیع شاہ نے بتایا "سیٹ مل جائے گی سر!"

"بس تو پھر میں چلنے کی تیاری کرتا ہوں" میں نے کہا "تم لاہور میرے دفتر بھی فون کردینا کہ ڈرائیور مجھے لینے ایئرپورٹ آجائے۔ فی الحال سامان اٹھاکر سیٹھ رمضان کی طرف چلتے ہیں۔ کچھ دیر اس سے گپ شپ رہے گی۔ پھر وہیں سے ایئرپورٹ چل دیں گے۔"

"ٹھیک ہے سر!" اس نے خود ہی میرا بریف کیس اور وہ چرمی کیس جس میں صرف ایک میلا سوٹ ٹنگا ہوا تھا، بند کردیا اور ادائیگی وغیرہ کرنے کے بعد کچھ دیر نیچے ٹریول ایجنٹ سے بات کرکے ہم سیٹھ رمضان کی طرف چل دئے۔

وہاں کچھ دیر گپ شپ اور کچھ دیر کام کی باتیں ہوتی رہیں۔ پھر شفیع مجھے سی آف کرنے ایئرپورٹ چل دیا۔

جہاز نے ٹھیک وقت پر ٹیک آف کیا اور جس وقت میں نے بیلٹ کھول کر نشست کے پشتے سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کیں اس وقت میں اپنے آپ کو بہت ہی ہلکا پھلکا محسوس کررہا تھا اور گویا جہاز کی مدد کے بغیر ہی ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ کراچی کے اس تازہ ترین دورے سے میں بہت مطمئن اور مسرور واپس جارہا تھا۔

میں لاہور ایئرپورٹ پر اترا تو لاؤنج سے باہر میرے ڈرائیور کے ساتھ آفاق علی بھی موجود تھا۔

"بھئی واہ! تم بھی بدولت کو ریسیو کرنے آئے ہو۔ تمہیں کیسے معلوم ہوگیا کہ ہم تشریف لارہے ہیں؟" میں نے گرم جوشی

سے اس سے ہاتھ ملا کر شگفتہ لہجے میں کہا۔

"میں اس وقت آپ کے ایکسپورٹ والے آفس میں بیٹھا تھا جب آپ کے آدمی کا فون آیا کہ آپ ساڑھے بارہ والی فلائٹ سے کراچی سے روانہ ہورہے ہیں" آفاق نے اپنے مخصوص مربیانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "میں اس وقت درحقیقت آپ کو فون کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ آپ آج ضرور پہنچ جائیں۔"

"کیوں..... خیریت؟" میں نے پوچھا۔

"کل ہماری فلم کی مہورت ہے سر! میڈم سرور جہاں کے گانے سے فلم کا آغاز ہورہا ہے۔ تمام اخباری نمائندوں کو بھی مدعو کیا ہوا ہے میں نے۔ اچھی خاصی شاندار تقریب ہوگی" اس نے بتایا۔

"اوہ..... بہت خوب" میں نے تحسین آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھا "تم تو بہت تیز دوڑ رہے ہو۔"

"جاکی اچھا ہونے سے بھی گھوڑے کی رفتار میں فرق پڑتا ہے" وہ بولا۔

"تم نے کاسٹ فائنل کرلی؟" میں نے پوچھا۔

"خاص خاص کرداروں کے لئے تو میں نے سب سے کنٹریکٹ بھی سائن کرالئے ہیں۔ ہیروئن کا معاملہ ہمارے یہاں پہلے ہی سے طے ہے" وہ بولا "صرف چھوٹے موٹے آرٹسٹوں کا معاملہ رہ گیا ہے' ان سے بعد میں بات ہوتی رہے گی۔ ان کے معاملے میں تو ردوبدل بھی ہوتا رہتا ہے۔ میں نے سوچا کہ اس دوران کام تو شروع کردیا جائے۔ مہورت میں میڈم سرور جہاں کے گانے سے ہی کرنا چاہتا تھا اور ان کے پاس کل کی تاریخ میں ہی ہمارے لئے گنجائش تھی۔ پرسوں وہ پندرہ دن کے لئے لندن جارہی ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم جو کچھ بھی کررہے ہو ٹھیک ہی کررہے ہوگے" میں نے کہا "مجھے صرف یہ بتادو کہ تمہیں کسی معاملے میں کوئی مسئلہ تو درپیش نہیں ہے؟"

"ابھی تک تو کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا" وہ مطمئن لہجے میں بولا "بلکہ مجھے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس سے بہتر حالات میں کام کرنا شاید مجھے اور کسی بھی طرح نصیب نہ ہوتا۔"

"خیر اب یہ بھی ضروری نہیں ہے" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "وقت کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب کس پر کس حد تک مہربان ہوجائے اور کب کسی کا سب کچھ چھین لے۔"

اس دوران ہم باہر آچکے تھے۔ میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا "اگر مجھے اپنا یہ فلمسازی کا پروجیکٹ کچھ چلتا نظر آیا تو تم اس میں ایک طرح سے میرے پارٹنر ہوجاؤ گے آفاق!"

"اس کی کیا ضرورت ہے سر!" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"میں اس کے بغیر بھی اسی تندہی اور لگن سے آپ کے لئے کرتا رہوں گا۔"

"وہ تو مجھے یقین ہے لیکن اب میں اپنے کاروبار کا اسٹائل بھی بنا رہا ہوں کہ نئے نئے پروجیکٹ شروع کرتا جاؤں اور جو لوگ ان منصوبوں کو منافع بخش بنائیں انہیں ان میں شریک کرتا جاؤں تاکہ ان کے مفادات ہمیشہ کے لئے ان اداروں سے وابستہ ہوجائیں۔ اداروں کو شروع کرنے اور ان میں ابتدائی سرمایہ کاری کرنے کا رسک میں لوں گا۔ آگے لوگوں کی محنت اور قدرت کی منشاء ہے کہ کون سے ادارے ترقی کرتے ہیں اور کون سے مجھے بند کرنے پڑتے ہیں" میں نے وضاحت کی۔

"آپ کی چونکہ نیت ٹھیک ہے اور قدرت بھی فی الحال آپ پر مہربان ہی نظر آتی ہے اس لئے مجھے یقین ہے کہ آپ کا قائم کیا ہوا کوئی ادارہ آپ کو بند نہیں کرنا پڑے گا" آفاق بولا "لوگوں پر یوں آنکھیں بند کرکے اعتماد کرنے کی عادت اور روپے پیسے سے اس قدر بے نیازی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی۔"

"سچی بات ہے کہ یہ دونوں عادتیں مجھ میں اس وقت ہی ہوئی ہیں جب میں ان کا متحمل ہوسکتا ہوں" میں نے کہا "میں اس پوزیشن میں ہوں کہ میری ان عادتوں کی بدولت اگر دو چار لاکھ کا نقصان ہوجائے تو میں برداشت کرلوں گا اور ایک تجربہ حاصل ہوجائے گا۔ کوئی زمانہ تھا کہ میں کسی پر روپے کی رقم کے سلسلے میں بھی بھروسا نہیں کرسکتا تھا کیونکہ

اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔"

"صاحب حیثیت ہونے کے باوجود کسی پر بھروسا کرنے کے لئے بڑا حوصلہ چاہئے صاحب!" آفاق گہری سانس لے کر بولا۔ "ورنہ میں نے زیادہ تر یہی دیکھا ہے کہ جوں جوں دولت بڑھتی جاتی ہے آدمی کا دل چھوٹا ہوتا جاتا ہے" ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "شکر ہے آپ کے معاملے میں ایسا نہیں ہوا۔"

"شاید اسی لئے میں دوسروں کی نسبت زیادہ تیز رفتاری سے ترقی کررہا ہوں۔"

"یقیناً یہی وجہ ہے" آفاق بولا۔

اس وقت ہم میاں میر والا پل عبور کرکے گلبرگ کی طرف مڑ چکے تھے۔ چند لمحے کے توقف کے بعد آفاق بولا "کل مہورت کے وقت پریس کے نمائندے اسٹوڈیو میں موجود ہوں گے۔ کچھ تصویریں وغیرہ وہیں بنیں گی۔ پھر انہیں انٹر کان لے جایا جائے گا۔ جن کے پاس کوئی سواری نہیں ہوگی ان کے لئے ہماری اسٹیشن ویگن اسٹوڈیو میں موجود ہوگی۔ انٹر کان میں آپ ایک پریس کانفرنس سے خطاب کریں گے اور اخباری نمائندوں کے سوالوں کے جواب دیں گے۔ ہماری ہیروئن ستارہ اور ہیرو وغیرہ بھی موجود ہوں گے۔ اس کے بعد پُرتکلف ڈنر ہوگا۔ امید ہے ہمیں بہت اچھی کوریج ملے گی۔ ہوسکے تو آپ پریس کانفرنس کے لئے کچھ تیاری کرلیجئے گا۔"

"تیاری کی تو کوئی خاص ضرورت نہیں۔ وقت پر ہی دیکھا جائے گا کہ کیا بولنا ہے لیکن....."

"لیکن کیا؟" اس نے مجھے ہچکچاتے دیکھ کر پوچھا۔

"دراصل میں نہیں چاہتا کہ میری ذات کو شہرت ملے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میں زیادہ لوگوں کی نظروں میں آنا نہیں چاہتا۔ میں چاہتا ہوں کہ صرف ان فلموں کو شہرت ملے جو ہم شروع کررہے ہیں اور وہ بھی صرف اس لئے کہ یہ شوبزنس کی دنیا ہے۔ اس میں ہم جو پروڈکٹ بھی دیں گے اس کی کامیابی کے لئے معیار کے ساتھ ساتھ اس کی شہرت بھی اہم کردار ادا کرے گی۔"

"لیکن سر.....! پروڈکشن کو شہرت بھی تو تبھی ملے گی جب پروڈیوسر آگے آئے گا" آفاق بولا "آپ کو شہرت سے گھبرانا نہیں چاہئے۔ شہرت کچھ فائدہ ہی دیتی ہے۔ نقصان نہیں۔"

شاید وہ درست ہی کہہ رہا تھا مگر مجھے جانے کیوں ایک انجانا سا خوف محسوس ہوتا تھا' اس بات سے کہ میں بہت زیادہ لوگوں میں پہچانا جاؤں' بہت زیادہ جگہوں پر میرے تذکرے ہوں۔ مجھے ایسا اندیشہ سا محسوس ہوتا تھا جیسے میرا کوئی راز افشاں ہوجائے گا میری کوئی حقیقت عریاں ہوجائے گی۔

"خیر..... دیکھا جائے گا" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "کل میں اپنے آفس میں مصروف رہوں گا۔ مال والے آفس میں:

پھر میں نے اضافہ کیا "یہاں 'مال' سے مراد سڑک ہے۔ ویسے تم چاہو تو دوسرا 'مال' بھی سمجھ سکتے ہو کیونکہ فی الحال وہی ایک آفس ہے جس سے میں سب سے زیادہ مال کمارہا ہوں۔ باقی سب جگہ تو فی الحال مال خرچ ہی ہورہا ہے۔ تم سہ پہر کے بعد مجھے فون کرکے بتادینا کہ میرا کس وقت اسٹوڈیو پہنچنا ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے" آفاق نے سر ہلایا۔

اس دوران ہم گھر پہنچ چکے تھے۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا۔ میں نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ آفاق کو اس کے گھر چھوڑ آئے۔ خانساماں نے کھانا لگایا اور کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کرکے میں وہ پیغامات وغیرہ دیکھنے لگا جو میری عدم موجودگی میں ملازم نے نوٹ کئے تھے۔ پھر میں نے چند ضروری فون کئے۔ دفتر بھی میں نے صرف فون ہی کرنے پر اکتفا کیا اور تازہ ترین معلومات حاصل کرنے اور چند ضروری ہدایات دینے کے بعد شام کو وقت گزارنے کے لئے میں سوئمنگ پول چلا گیا اور رات کو ہوٹل ہی میں کھانا کھا کر رات گئے گھر آکر سوگیا۔

دوسرے روز علی الصباح ہی تیار ہوکر میں ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں پہنچا۔ اس کی مکمل نگرانی' کام کاج حتیٰ کہ تنظیم کے چھوٹے موٹے معاملات نمٹانا بھی مس ٹریپ کے ذمے تھا۔ درحقیقت مس نہیں' مسز تھی اور اس کا اصل نام جولی تھا مگر تنظیم میں سب اسے مس ٹریپ ہی کے نام سے جانتے اور مخاطب کرتے تھے۔

مس ٹریپ تقریباً سیاہ فام تھی مگر اس کی موٹی موٹی آنکھوں اور ملیح رنگت میں غضب کی مقناطیسی کشش تھی۔ اس بُتِ کافر کا سراپا بھی کچھ ایسا تھا کہ بڑے بڑے پارساؤں کو پیش قدمی سوجھنے لگتی تھی مگر اس کے قریب پھٹکنے والوں کو عموماً زمین چاٹنی پڑتی تھی۔ ہماری تنظیم میں تو سب ہی اس بات سے واقف تھے اس لئے اس کے سامنے سب اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ بہت ہوا تو ہلکا پھلکا مذاق کرلیا۔ وہ بھی کسی سینئر ساتھی نے۔ ہر ایک تو اس کی بھی جرأت نہیں ہوتی تھی۔

وہ اب دو بچوں کی ماں تھی اور اس کا شوہر نہایت خوبصورت آدمی تھا مگر اس جادوگر عورت نے اسے نہ جانے بنایا ہوا تھا۔ وہ گھر پر ہی رہتا تھا اور گھر کے سارے کام کاج کرتا تھا' بچے بھی سنبھالتا تھا۔ ان لوگوں کا کوارٹر کوٹھی کے حصے میں تھا۔

ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کو ہم 'دو نمبر' کہتے تھے۔ میں جب نمبر پہنچا تو علی الصباح بھی مس ٹریپ جینز' جیکٹ اور پالش چمکیلے جوتے پہنے بالوں کا خوبصورت جوڑا بنائے بالکل تیار' ٹک کرتی مستعدی سے دروازے تک آئی اور اس نے مخصوص من موہنے انداز میں مجھے خوش آمدید کہا۔

یہ اس عورت کی خوبیوں میں سے ایک قابل ذکر خوبی

صبح منہ اندھیرے سے لے کر رات گئے تک خواہ کوئی کام ہو یا نہ ہو بالکل مستعد اور خوش لباس نظر آتی تھی۔ معلوم نہیں سوتی کس وقت تھی۔

میں ڈائننگ روم میں جا بیٹھا جہاں کبھی قاسم خان کے ایک کارندے کی حیثیت سے بیٹھا کرتا تھا۔ مس ٹریپ میری فرمائش پر میرے لئے خانساماں سے کافی بنوا لائی۔ اس نے بتایا کہ اس وقت میری تنظیم کے دو اہم آدمی حنیف خان اور شبیر شیخ کوٹھی میں مقیم تھے اور سوئے ہوئے تھے۔

باقی حالات کی رپورٹ دیتے ہوئے اس نے بتایا کہ جس روز میں کراچی گیا اسی روز رات کے پچھلے پہر سرحدی علاقے میں ہماری ایک چھوٹی کھیپ پکڑی گئی۔ ہمارے آدمیوں کو ٹرک اور مال چھوڑ کر فرار ہونا پڑا اور اس کوشش میں ہمارا ایک آدمی رینجرز کی گولیوں سے مارا گیا۔

اس خبر نے چند لمحے کے لئے مجھے اداس کر دیا۔ مجھے مال کا غم نہیں تھا بلکہ اپنے ایک کارندے کی موت کی خبر نے مجھے اداس کر دیا تھا حالانکہ وہ ایک غیر اہم اور نو آموز کارندہ تھا مگر اب اپنے کسی بھی ساتھی کی موت سے گویا میرے دل کو کچھ ہونے لگتا تھا۔ مجھے اپنے نو آموزی کے وہ دن یاد آ جاتے تھے جب میں بھی یونہی جان ہتھیلی پر لئے پھرتا تھا۔

ہر انسان اپنی جگہ ایک کائنات ہوتا ہے۔ اس میں ان گنت خوابوں کے گھر بستے ہیں۔ اس سے جانے کتنی اور بھی ہستیاں وابستہ ہوتی ہیں۔ اس کے مرنے سے پورا ایک نگر اجڑ جاتا ہے۔ ایک کہانی ختم ہو جاتی ہے۔

دشمن اور خصوصاً بد طینت دشمن کی موت پر تو میرے دل کو کچھ نہیں ہوتا تھا مگر وہ لوگ جو میرے لئے کام کرتے تھے، ان کی موت پر اب میرے دل کی جو کیفیت ہوتی تھی اس سے ایک بات ظاہر ہونے لگی تھی اور وہ کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ کہ اب میں اپنی لائن کے لئے موزوں آدمی نہیں رہا تھا۔

اس لائن میں تو کارندوں کی اہمیت شطرنج کے مہرے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ ایک پٹ گیا تو دوسرا آگے بڑھا دیا۔ لیکن میری افسردہ دلی بتاتی تھی کہ اب میں اس طرح سوچنے کے قابل نہیں رہا تھا۔

اس کے بعد میں نے بمشکل مس ٹریپ کی باقی باتوں پر دھیان دیا۔ حنیف اور شبیر کے لئے ضروری ہدایات چھوڑیں۔ مجھے مس ٹریپ نے بتایا تھا کہ وہ رات کو دو بجے آ کر سوئے تھے۔ اس لئے میں نے مس ٹریپ کو انہیں جگانے سے منع کر دیا اور وہاں سے نکل کر آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔

آفس میں اتنی مصروفیت رہی کہ ذہن پر جو بوجھ سا تھا وہ محو ہو گیا۔ پانچ بجے کے قریب آفاق کا فون آ گیا کہ تمام تیاریاں مکمل ہیں، میڈم سرور جہاں بھی ایک دوسرے اسٹوڈیو سے کسی دوسری فلم کا گانا ریکارڈ کرانے کے بعد پہنچنے والی ہیں۔ اس لئے مجھے بھی پہنچ جانا چاہئے۔

میں جب اسٹوڈیو کے ریکارڈنگ ہال میں پہنچا تو وہاں بڑی رونق تھی۔ آفاق بہت سے ہار لئے دروازے پر ہی کھڑا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر بڑی محبت سے مجھے ہار پہنا دئے۔ اس کے بعد اور بھی کئی لوگ ہار لئے آگے بڑھے اور انہوں نے مجھے اتنے ہار پہنا دئے گویا مجھے ہاروں میں دفن کرنے کی ناکام کوشش کر رہے ہوں۔

آفاق ان لوگوں سے میرا تعارف کراتا رہا۔ انڈسٹری سے ہی متعلق جانے کون کون لوگ تھے۔ مجھے صرف دو آدمیوں کے نام یاد رہ گئے۔ ایک تو ہماری فلم کا موسیقار جمال حسین تھا اور دوسرا ہماری فلم کا مصنف سلیم سید۔

سلیم سید سے پہلی بار مکمل طور پر کہانی لکھوانے کا رسک آفاق علی نے ہی لیا تھا اور یکے بعد دیگرے اس کی دو فلمیں ہٹ گئی تھیں۔ آج کل اس کے پاس کہانیاں لکھوانے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی لیکن آفاق کو وہ اب بھی سب سے زیادہ ترجیح دیتا تھا۔

مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ بولا "میرا یہاں کوئی کام تو نہیں تھا لیکن آفاق نے آپ کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ میں اشتیاق اور تجسس سے مجبور ہو کر ملنے چلا آیا۔"

"بھئی اگر آفاق نے ہماری تعریفیں کی ہیں تو پھر شاید ہم میں ایک آدھ خوبی موجود ہی ہو ورنہ تو ہماری اپنے بارے میں رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں" آفاق اور سلیم سید نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا۔

ادھر ادھر بہت سی ایکسٹرا لڑکیاں کھڑی تھیں۔ جن پر میری نظر پڑی ان میں سے کسی نے ادب، کسی نے انکساری اور کسی نے ادا سے مجھے سلام کیا۔ میں نے ان کے سلاموں کا جواب دیتے ہوئے اپنے گلے میں پڑے ہوئے سارے ہار اتار کر ایک لڑکے کو تھمائے اور آفاق وغیرہ کے ساتھ اندر پہنچا۔

ریکارڈنگ ہال کا حال کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ ہر چیز سے پرانا پن اور بوسیدگی عیاں تھی۔ ہال کا بیشتر حصہ سازندوں کے بیٹھنے کے لئے مخصوص تھا۔ شیشے کی دیوار کے پار سازندے اپنے سازوں پر مشق کرتے قطار در قطار بیٹھے نظر آ رہے تھے۔

ایک طرف وہ بوتھ بنا ہوا تھا جس میں کھڑی ہو کر گلوکارہ گانا ریکارڈ کراتی تھی۔ جس حصے میں ہم کھڑے تھے وہاں ایک طرف ریکارڈنگ کے آلات کا مانیٹرنگ بورڈ رکھا ہوا تھا اور اس کے عقب میں ایک صاحب ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے بیٹھے تھے اور مختلف سوئچوں سے چھیڑ چھاڑ کر رہے تھے۔

اسی حصے میں ایک صوفے پر میڈم سرور جہاں زرق برق ساری میں ملبوس بیٹھی تھیں۔ ان کے گلے میں ہیروں کا نیکلس، ہاتھوں میں ہیرے کے کنگن اور انگلیوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ میں نے قدرے جھک کر انہیں سلام کیا تو انہوں نے اٹھ کر میرے کندھے پر تھپکی دی اور فلم کی کامیابی کی دعا دی۔ ان کے آگے پیچھے کئی آدمی اور ادھیڑ عمر کی ایک عورت بڑے مؤدبانہ انداز میں کھڑی تھی۔

آفاق مجھے ایک طرف بنے ہوئے مستطیل سے کیبن میں لے گیا جہاں ہمارے بیٹھتے ہی کولڈ ڈرنکس آ گئیں جو چائے سے ذرا ہی کم گرم تھیں۔ کیبن میں چند لمحے کے لئے صرف میں اور آفاق ہی رہ گئے تو میں نے آفاق سے پوچھا۔ "کیا ہر فلم کی مہورت پر ہی اتنی رونق اور جوش و خروش دیکھنے میں آتا ہے؟ اتنے ہی لوگ جمع ہوتے ہیں؟"

"نہیں۔" آفاق نے بلا تامل جواب دیا "سچی بات یہ ہے کہ آپ کے بارے میں اسٹوڈیو میں ایک افسانوی سی فضا بن گئی ہے کہ آپ پانی کی طرح روپیہ بہانے کا ارادہ لے کر فلمسازی کی طرف آئے ہیں... اور وہ جو آپ نے ملک کے آدمیوں کی پٹائی کی اور انہیں اندر بھی کرا دیا اس سے یہ تاثر بھی عام ہو گیا ہے کہ آپ محض پیسے والے ہی نہیں، آپ کے ہاتھ بھی لمبے ہیں۔ اس لئے ہر کوئی آپ کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں ہے۔"

میں مسکرایا تو آفاق بولا "بڑی بڑی باتیں کرنے والے تو یہاں بہت آتے ہیں اور شروع شروع میں بعض بڑے ٹھاٹ بھی دکھاتے ہیں لیکن انڈسٹری کے لوگ ایسے بھولے نہیں۔ وہ اندازہ کر لیتے ہیں کہ کس میں کتنا وزن ہے۔"

اس دوران باہر سے کئی آوازیں سنائی دیں۔ "میڈم ستارہ آ گئیں... میڈم ستارہ آ گئیں۔"

دوسرے ہی لمحے ستارہ ریکارڈنگ روم کا دروازہ کھول کر خوشبو کے ایک جھونکے کی طرح اندر آ گئی۔ میڈم سرور جہاں سے ہاتھ ملانے اور چند لمحے بات کرنے کے بعد وہ کیبن نما حصے میں آ گئی۔ وہ نارنجی رنگ کے نہایت خوبصورت لبادے میں تھی جس کی تراش خراش جاپانی لباس کیمونو سے ملتی جلتی تھی۔ کھلے، ریشمی اور چمکیلے بال کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ پیروں میں فل بوٹ تھے اور اس کے وجود سے ایک مسحور کن خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہی مخصوص نشیلا پن تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں جادوگر آنکھیں لگتی تھیں۔

مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے وہ بولی "بڑی رونقیں ہیں بھئی، بڑے لوگ جمع کر رکھے ہیں۔"

"یہ سب اس آدمی کا کمال ہے" میں نے آفاق کی طرف اشارہ کیا جو ستارہ کی موجودگی میں قدرے نروس سا ہو چکا تھا مگر حتی الامکان پُر سکون نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دفعتاً ایک لڑکا اندر آ کر مؤدبانہ سے لہجے میں آفاق سے مخاطب ہوا۔ "سر! وہ میڈم سرور جہاں کہہ رہی ہیں کہ ان کے پاس وقت کم ہے۔ جلدی کام نمٹائیں۔"

"بالکل۔ بالکل" آفاق اٹھتے ہوئے بولا۔ پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "آئیے... پہلے دعا کر لیں۔"

ہم باہر آئے۔ آفاق نے دعا کا اعلان کیا اور لوگ نہایت سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگنے لگے۔ میں نے بھی دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور دل ہی دل میں کہا "اے رب عظیم! یہ تو بڑی مضحکہ خیز سی بات۔ کہ ہم تجھ سے اس چیز کی کامیابی کی دعا مانگ رہے ہیں جس کی تیرے احکامات میں گنجائش ہی نہیں مگر ہم کیا کریں؟ تو صرف صالح لوگوں ہی کا خدا نہیں، ہم گناہ گاروں کا خدا بھی تو ہی ہے۔ تیرے سوا ہم کس سے مدد مانگ سکتے ہیں...؟"

دعا ختم ہوئی تو میڈم سرور جہاں گانا ریکارڈ کرانے کے لئے بوتھ میں چلی گئیں۔ ایک مرتبہ فائنل ریہرسل ہوئی اور دوسری مرتبہ میں گانا ریکارڈ ہو گیا۔ پنجابی گانے کی اس دھن کو میں نے کئی مرتبہ دل ہی دل میں دہرایا اور میری کسی حس نے مجھے یقین دلایا کہ یہ گانا ہٹ ہو جائے گا۔

گانا ریکارڈ ہونے کے بعد مٹھائی تقسیم ہوئی۔ آفاق نے ایک چھوٹے ٹرک میں کئی ٹوکرے مٹھائی کے منگوائے تھے۔ دو آدمیوں کو مامور کیا گیا کہ وہ پورے اسٹوڈیو میں مٹھائی تقسیم کریں اور ہر فرد کو دیں۔

اس دوران فوٹو گرافروں نے کئی گروپ فوٹو وغیرہ بنائے۔ بالآخر آفاق گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "اب انٹر کان چلنا چاہیے،

پریس کانفرنس کا وقت ہو چکا ہے۔"

تقریباً آٹھ بجے ہم انٹر کان پہنچے۔ ستارہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ کچھ اخباری نمائندے اور فوٹو گرافر اسٹوڈیو سے ہماری ویگن میں اور کچھ اپنی سواریوں پر ہمارے ساتھ ہی پہنچے اور کچھ براہ راست وہیں آئے تھے۔

میں نے ہال میں اپنی نشست سنبھالی۔ میرے دائیں ہاتھ پر ستارہ تھی اور بائیں پر آفاق علی۔ یہ میری زندگی کی پہلی پریس کانفرنس تھی۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور پریس کے نمائندوں سے اپنے فلمسازی کے ادارے کا مختصر سا تعارف کرایا پھر مختصراً ہی ان دونوں فلموں کے بارے میں بتایا جو ہم شروع کر رہے تھے۔ اس کے بعد میں نے ان سے کہا کہ وہ جو بھی سوالات کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔

ایک نمائندے نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر ٹھوڑی کھجاتے ہوئے نہایت مُدبرانہ لہجے میں کہا "چوہدری صاحب! کچھ اپنے متعلق بھی بتائیے... کچھ اپنی ذات کا پس منظر... اور یہ کہ آپ فلم لائن کی طرف کیسے آ گئے؟"

میں نے اسے سچ اور جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ بتایا کہ میں کوئی خاندانی بزنس مین نہیں ہوں، بہت معمولی سرمائے سے میں نے کاروبار شروع کیا تھا جس میں مجھے ہر قدم پر کامیابی نصیب ہوئی۔ فلم لائن سے مجھے شروع سے دلچسپی تھی، اب حالات مناسب نظر آئے تو میں نے اس میدان میں قدم رکھ دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ بات میں کر رہا تھا لیکن توجہ سب کی ستارہ کی طرف تھی جو خاموش بیٹھی تھی۔

میں خاموش ہوا تو ایک اخبار نویس نے عینک درست کرتے ہوئے میز پر آگے جھک کر پوچھا۔ "چوہدری صاحب! فلمسازی کے ضمن میں آپ کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ آپ آرٹ کی خدمت کرنا چاہتے ہیں یا محض کاروبار؟"

"دیکھیے صاحب! میں نہ تو اس بات کے حق میں ہوں کہ آپ ایسی فلمیں بنائیں جنہیں صرف آپ اور آپ کے احباب ہی ہفتہ دس دن تک فری پاس پر دیکھیں اور اس کے بعد انہیں ہمیشہ کے لئے ڈبوں میں بند کر کے رکھ دیا جائے۔ اور نہ ہی میں اس کے حق میں ہوں کہ محض چار پیسے کمانے کے لئے عوام کی گھٹن زدہ نفسیات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے فلم میں بے مقصد قتل و غارت اور جنسیت بھری جائے۔"

پھر میں نے وہی نقطۂ نظر دُہرایا جو میں ایک بار آفاق کے سامنے بھی بیان کر چکا تھا۔ "مثلاً میں یہ نہیں کہتا کہ فلم میں قتل نہ دکھایا جائے۔ قتل و غارت گری، ڈاکا زنی اور دیگر ہر طرح کے جرائم ہمارے معاشرے میں ہوتے ہیں اور فلمیں معاشرے کی عکاس ہونی چاہئیں۔ لیکن فلم میں قتل اتنے نہ ہوں جتنے کسی ملک میں خانہ جنگی کی صورت میں ہی ممکن ہو سکتے ہوں۔ گولیاں ضرور چلیں لیکن اتنی نہیں جتنی دوسری جنگ عظیم میں چلی تھیں۔ ہر چیز میں ایک اعتدال اور ہر ممکن حد تک حقیقت پسندی کی جھلک رکھنے کی کوشش کی جائے۔ کچھ عوام کی پسند کا بھی خیال رکھا جائے اور کچھ اپنے ذوق کی ترجمانی بھی کی جائے اور جہاں تک سنسر والے اجازت دیں وہاں تک عوام کو حقائق سے روشناس کرانے کی پالیسی اپنائی جائے۔ اگر کسی فلمساز کو خدا نے اتنی توفیق دی ہے کہ وہ کسی اچھے مقصد کے لئے دو چار لاکھ کا نقصان فلم میں برداشت کر سکتا ہے تو اسے کر لینا چاہئے۔"

ایک نمائندے نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اور گویا غنودگی سے چونکتے ہوئے انگریزی میں سوال کیا "آپ کا فلمسازی کا تجربہ کتنا ہے؟"

"تقریباً پندرہ سال" میں نے جواب دیا۔

"لیکن ہماری معلومات کے مطابق تو آپ فلم انڈسٹری میں نووارد ہیں... کیا آپ کہیں اور فلمیں بناتے رہے ہیں؟" نمائندے نے حیرت سے پوچھا۔

"میرا تجربہ اصل میں یہ بیٹھا ہے" میں نے آفاق کی طرف اشارہ کیا۔ اس پر ایک اجتماعی قہقہہ پڑا۔

میں نے مسکراتے ہوئے مزید وضاحت کی "بھئی مجھے تو صرف ایک پالیسی طے کرنی ہے۔ کام تو سارا آفاق صاحب کو ہی کرنا ہے۔"

جب سکون ہوا تو ایک دبلے پتلے نوجوان نے دانشورانہ لہجے میں کہا "چوہدری صاحب! اب آپ فلمی دنیا میں آ ہی گئے ہیں تو ہم آپ سے یہ پوچھنا چاہیں گے کہ فلم انڈسٹری نے آج تک عوام کو کیا دیا؟"

"بائی دی وے آپ فلم انڈسٹری سے کیا لینا چاہتے تھے؟" میں نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔ اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "میں نے اکثر اخبارات میں فلمی مضامین اور انٹرویوز وغیرہ میں یہ سوال پڑھا ہے اور میں بڑا حیران ہوتا ہوں کہ اس سوال کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ فلم کا سب سے بڑا اور پہلا مقصد لوگوں کو تفریح فراہم کرنا ہوتا ہے اور وہ اس نے بری یا بھلی کسی نہ کسی حد تک کی ہے۔ البتہ اچھے یا برے معیار کی فلموں کا سوال اٹھایا جا سکتا ہے۔ تو اس ضمن میں بھی میں یہی عرض کروں گا کہ یہ ہر انڈسٹری اور ہر شعبے میں ہوتا ہے۔ کپڑے کی انڈسٹری کو لے لیجئے۔ کوئی کارخانہ اچھا کپڑا بناتا ہے تو کوئی کارخانہ اسی قیمت میں اتنا اچھا کپڑا نہیں بنا پاتا لیکن ان سے کوئی جا کر یہ نہیں پوچھتا کہ فلاں انڈسٹری نے ملک کو کیا دیا ہے؟ کیونکہ وہ سیدھی طرح کہہ سکتے ہیں کہ جی ہم نے کپڑا دیا۔ اس صنعت میں ملک کو خود کفیل بنایا۔ اب رہا یہ سوال کہ جی بہت اچھا کپڑا کیوں نہیں دیا؟ تو وہ آپ کو اپنے مسائل بتائیں گے کہ فلاں فلاں مشکلات اور رکاوٹیں درپیش رہیں۔ اسی طرح فلم انڈسٹری سے یہ سوال کیا جائے کہ اس نے عوام کو کیا دیا تو میرے خیال میں اس کا اولین اور سیدھا سادا جواب تو یہی ہونا چاہئے کہ جی فلم انڈسٹری نے عوام کو فلمیں دیں۔ اصل میں یہ سوال کرنا اب فیشن ہو گیا ہے اور اس انڈسٹری کی طرف زیادہ توجہ اس لئے رہتی ہے کہ یہ عوام کی دلچسپی کی چیز ہے۔ اس سے متعلق لوگ ہر وقت عوام اور پریس کی نظروں میں رہتے ہیں۔ اسی لئے فلمی لوگوں کے اسکینڈلز بھی سب سے زیادہ بنتے ہیں۔ ہیروئن کو چھینک بھی آ جائے تو اس کی خبر بنا دی جاتی ہے۔ اور انہی وجوہات کی بنا پر اس انڈسٹری کی خامیاں اور برائیاں عوام کی نظر میں سب سے زیادہ رہتی ہیں ورنہ خامیاں اور برائیاں کہاں نہیں ہیں؟ بلکہ معذرت کے ساتھ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ بعض چیزوں کے سلسلے میں اس مطعون انڈسٹری کو داد نہیں دی جاتی۔ چند دن پہلے میں نے اسٹوڈیوز کا دورہ کیا تو سامان کی خستہ حالی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ریکارڈنگ کے مائیک پچاس سال پرانے ڈیزائن کے تھے اور ان میں سے بعض کو زنگ لگا ہوا تھا۔ کیمرے اب بھی ٹرالیوں پر دھکیلے جاتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو مجھے اس لائن میں قدم رکھنے کے بعد فلم انڈسٹری پر ترس آنے لگا ہے۔"

حاضرین پر چند لمحے کے لئے سکوت چھا گیا پھر ایک نمائندہ ہنستے ہوئے بولا "جی ہاں... اب آپ فلم لائن میں آ گئے ہیں تو آپ اسی قسم کی باتیں کریں گے۔ انسان اپنے کاروبار کا دفاع تو کرتا ہے نا۔"

اس پر ہلکی سی ہنسی بلند ہوئی۔ میں نے کہا "بے شک... اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک آپ کسی بھی کاروبار، انڈسٹری یا کام کو قریب سے نہ دیکھیں تب تک اس کے مسائل کا اندازہ نہیں ہوتا۔"

اس کے بعد بھی مجھ سے بہت سے سوالات کئے گئے اور میں ان کے حتی الامکان تسلی بخش جوابات دیتا رہا جس کے بعد سوالات کا رخ ستارہ کی طرف ہو گیا۔

ایک سانولا سا نمائندہ بولا "مس ستارہ! ویسے تو آپ کے کئی انٹرویو چھپ چکے ہیں لیکن جو اخبار نویس آپ کو زیادہ بہتر طور پر نہیں جانتے ان کی معلومات کے لئے اپنے متعلق کچھ بتا دیجئے کہ آپ کس طرح فلم انڈسٹری میں آئیں؟"

ستارہ نے ایک ادا سے بالوں میں انگلیاں پھیریں، موتیوں جیسے آبدار اور ہموار دانتوں کی نمائش کی پھر قدرے شرمیلے اور مترنم لہجے میں بولی "جی... وہ... میں تو کالج میں پڑھ رہی تھی اور میرے والدین مجھے ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ لیکن میں ابھی انٹر میں ہی تھی کہ ایک مرتبہ چند سہیلیوں کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے اسٹوڈیو گئی تو وہاں آفاق صاحب سے ملاقات ہو گئی۔ پتا چلا کہ یہ تو ہمارے دور پار کے عزیز ہیں۔ انہوں نے اصرار کیا کہ میں ان کی آئندہ فلم میں ہیروئن کا رول کروں۔ میں تو گھبرا گئی۔ کیونکہ میں نے کبھی مووی کیمرے کا سامنا نہیں کیا تھا۔ پھر یہ کہ میرے گھر والے اس کی اجازت ہرگز نہ دیتے لیکن آفاق صاحب نے ان سے بات کی۔ سمجھایا بجھایا کہ فلمی دنیا اتنی بری نہیں ہے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ بالآخر وہ قائل ہو گئے اور پھر آفاق صاحب نے مجھے اداکاری بھی سکھا ہی دی۔ میں آج جو کچھ بھی ہوں اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے آفاق صاحب کو ہی میرا وسیلہ بنایا ہے۔"

وہ اتنے خوبصورت اور نپے تلے انداز میں بول رہی تھی اور ہر ہر لفظ پر آواز کا اتار چڑھاؤ اس قدر دلکش تھا کہ سب ہمہ تن گوش تھے۔ کئی ٹیپ ریکارڈرز کے مائیک اس کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ آفاق کے چہرے پر بدستور متانت طاری تھی۔ ستارہ کے بیان پر وہ ذرا بھی تو نہیں چونکا تھا۔ اسے اس سفید جھوٹ پر ذرا بھی حیرت نہیں تھی۔

اس کے بعد اخباری نمائندے ستارہ سے طرح طرح کے سوالات کرتے رہے اور وہ بڑے اعتماد سے ہر سوال کا جواب دیتی رہی۔ مسکراہٹ کی بجلی گراتی رہی۔

بالآخر آفاق نے اعلان کیا "میرا خیال ہے باتیں کافی ہو چکیں، اب ہمیں کھانے کی طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔"

ڈنر کا انتظام بینکوئٹ ہال میں تھا۔ سب لوگ اٹھ کر اس طرف چل دئے۔ ستارہ مجھ سے دو قدم آگے تھی۔ دفعتاً ارد گرد کی تمام بتیاں بجھ گئیں اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔ بیک وقت اسی قسم کی بہت سی ملی جلی آوازیں بلند ہوئیں جیسی کہ ایسے موقعوں پر ہوتی ہیں۔ مگر میرے اعصاب کوئی اور ہی آواز سن کر جھنجھنا اٹھے تھے

میں نے تاریکی میں ستارہ کی چیخ سنی تھی۔

وہاں موجود کسی بھی شخص کو یہ معلوم نہیں تھا کہ میری آنکھیں اندھیرے میں بھی دیکھنے کی عادی ہیں۔ عمرِ عزیز کی جانے کتنی راتیں تاریک ویرانوں میں بقائے حیات کی جنگ لڑتے ہوئے گزری تھیں۔

میں نے دیکھا کہ ایک ہیولے نے ستارہ کو اس کی نشست سے گھسیٹ لیا تھا اور چند قدم دور لے گیا تھا۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی حرکات و سکنات مجھے نظر آ رہی تھیں۔ میں نے اس کے ہاتھ میں خنجر کی جھلک دیکھی۔ وہ ستارہ کی گردن ایک بازو کے شکنجے میں جکڑ کر خنجر والا ہاتھ بلند کر رہا تھا۔ وہ ستارہ کی پسلیوں میں خنجر گھونپنے لگا تھا۔

اگر مجھے ایک ثانئے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو خنجر ستارہ کے پہلو میں اتر چکا ہوتا۔ میں نے کمان سے نکلے ہوئے تیر کی رفتار سے آگے بڑھ کر اس شخص کی کلائی آہنی گرفت میں لے لی تاہم خنجر کی نوک نے ستارہ کے لباس کو تو چھو ہی لیا۔

نامعلوم شخص نے فوری طور پر ستارہ کو چھوڑ دیا۔ میں نے

اس کی کلائی کو جھٹکا دیتے ہوئے اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کیا۔ وہ کمر کے بل گرا لیکن پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چھریرے جسم کا ہونے کے باوجود وہ زبردست قوتِ برداشت کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا تھا تاہم اس کی کلائی اب بھی میری گرفت میں تھی۔

میں نے اس کی پسلیوں پر گھٹنا مارا۔ وہ لڑکھڑایا لیکن اس عالم میں بھی اس نے میری کلائی پر کراٹے کی چاپ ماری۔ چاپ صحیح نہیں پڑی تاہم میری کلائی جھنجھنا اٹھی۔ میری گرفت ایک لمحے کے لئے ذرا ڈھیلی پڑی تو اس نے جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑائی اور چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ میں نے اسے دروازے کی طرف لپکتے اور راہ میں حائل چند آدمیوں کو دھکیلتے ہوئے ضرور دیکھا' اس کے بعد اس کا کچھ پتا نہ چلا۔

میں اس کے پیچھے لپکا لیکن دروازے سے باہر تاریک راہداری میں کچھ اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کدھر گیا ہو گا۔ میں مایوس ہو کر لوٹ آیا۔ ہال میں اب بھی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے اندھیرے میں ستارہ کو تلاش کیا۔ وہ ایک دیوار سے لگی کھڑی تھی اور اس خوف زدہ خرگوش کی طرح گہری گہری سانسیں لے رہی تھی جو شکاری کتوں سے جان بچانے کے لئے کسی کھوہ میں چھپ گیا ہو۔

"ستارہ! گھبراؤ نہیں۔ وہ بدمعاش بھاگ گیا ہے" میں نے اس کا کندھا تھپک کر اسے تسلی دی۔

وہ اندھیرے میں غالباً مجھے دیکھ نہیں پا رہی تھی لیکن جس انداز میں اس نے طویل سانس لی اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا خوف دور ہو گیا ہے۔ ہال میں بدستور طرح طرح کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ کوئی ہوٹل کی انتظامیہ کو برا بھلا کہہ رہا تھا' کوئی بجلی کے نظام کو لعنت وملامت کا نشانہ بنا رہا تھا اور کوئی یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اندھیرے میں کون کیا کر رہا ہے۔

میں نے ستارہ کے قریب دیوار ہی سے ٹیک لگا کر کھڑے ہوتے ہوئے کہا "مجھ سے اندازے کی ذرا سی غلطی ہو گئی ورنہ وہ نکل نہ پاتا۔"

اندازے کی غلطی مجھ سے یہ ہوئی تھی کہ میں نے یہ توقع نہیں رکھی تھی کہ وہ کراٹے سے بھی واقف ہو گا ورنہ میں اسی حساب سے اسے قابو میں کرتا۔ ہال میں موجود دوسرے لوگوں کو شاید اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ ستارہ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا۔ اسی لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ ہمارے مہمانوں اور خصوصاً اخباری نمائندوں کی یہ لاعلمی برقرار ہی رہے تو اچھا ہے۔ اس واقعے کے متعلق اخبارات میں سرخیاں لگیں گی تو ہمارے ساتھ اس وقت اور آئندہ کام کرنے والوں میں خواہ مخواہ ہراس پھیلے گا۔

ایک لمحے کے لئے مجھے یہ لالچ سا بھی محسوس ہوا کہ اس طرح ہماری فلم کو بہت زیادہ پبلسٹی حاصل ہو سکتی ہے لیکن

دوسرے ہی لمحے میں نے ایک بزنس مین کی طرح سوچا کہ پبلسٹی اس وقت مل جائے گی لیکن فلم مکمل ہونے اور ریلیز ہونے میں نہ جانے کتنا عرصہ لگ جائے۔ اس وقت تک لوگ اس واقعے کو مکمل طور پر بھول چکے ہوں گے۔ اس لیے اس بات سے فلم کا اچھا بزنس کرنے میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔

خنجر مجھے اب بھی دروازے کے قریب قالین پر پڑا نظر آ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور دروازے کے قریب قالین کے نیچے رکھ دیا۔ اب شاید یہ قالین کی صفائی کے وقت دریافت ہوتا۔

میں نے واپس ستارہ کے قریب پہنچ کر دبی آواز میں کہا "میرا مشورہ یہی ہے کہ تم کسی کو علم نہ ہونے دو کہ تم پر حملہ ہوا تھا۔ خواہ مخواہ کی تفتیش شروع ہو جائے گی۔ سو طرح کی باتیں بنیں گی۔ حاصل کچھ بھی نہیں ہو گا۔"

ستارہ غالباً اب سنبھل چکی تھی۔ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی "لیکن اس طرح حملہ کرنے والوں یا کروانے والوں کے حوصلے نہیں بڑھ جائیں گے؟ وہ آئندہ بھی اس قسم کی کوشش کریں گے۔"

"نہیں۔ بلکہ ہماری خاموشی انہیں خوفزدہ کر دے گی" میں نے وثوق سے کہا "اور تمہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم میری فلموں کی ہیروئن ہو اور میں نے خود ہی فرض کر لیا ہے کہ تمہاری حفاظت اب میری ذمے داری بن چکی ہے۔ پولیس تو شاید اس معاملے کو اتنی اہمیت نہ دے لیکن میرے لئے چونکہ یہ انا کا مسئلہ ہے اس لئے میں ان سے زیادہ تندہی اور سرگرمی سے اس کے بارے میں مناسب انتظامات کروں گا۔ تمہیں شاید اندازہ ہو ہی چکا ہو کہ اس قسم کے معاملات میں ہم کمزور لوگ نہیں ہیں۔"

"ہاں۔ وہ تو مجھے اندازہ ہے" اس کے لہجے میں اطمینان جھلک آیا "اور اگر تم میری حفاظت کی ذمے داری لے رہے ہو تو میں زیادہ مطمئن ہوں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ حرکت کون کر سکتا ہے؟ میری تو کسی سے ایسی خطرناک حد تک دشمنی بھی نہیں ہے... اور پھر یہ دیکھو کہ ایک اچھے بھلے ہوٹل میں... اتنے لوگوں کی موجودگی میں حملہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ کوئی اور بہتر موقع بھی تلاش کر سکتے تھے۔ میں تو اکثر و بیشتر گھر پر یا کہیں آتے جاتے وقت راستے میں اکیلی ہی ہوتی ہوں۔ ایسے کسی موقع پر مجھ پر حملہ کیا جاتا تو کامیابی کا امکان زیادہ ہوتا۔"

"ہاں" میں نے مبہم لہجے میں کہا "لیکن شاید یہاں حملہ کرنے میں کوئی مصلحت رہی ہو۔"

اس مصلحت کو میں کسی حد تک سمجھ رہا تھا لیکن ستارہ پر اس کا اظہار کر کے اسے مزید خوفزدہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ اس حملے کا مقصد صرف ستارہ کی جان لینا ہی نہیں بلکہ مجھے یہ احساس دلانا بھی تھا کہ حملہ کروانے والے جہاں چاہیں' جس وقت چاہیں اور جو چاہیں کروا سکتے ہیں۔ اس سے ان کی مخصوص نفسیات کا بھی اظہار ہوتا تھا۔ یہ اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنے کے انداز ہوتے ہیں اور یہ شوق کچھ خاص قسم کا پس منظر رکھنے والوں میں ہی پایا جاتا ہے۔ ورنہ عام طور پر بدقماش قسم کے لوگوں کو جب کوئی اس طرح کا کام کرنا ہوتا ہے تو وہ اس کے لئے ایسا موقع تلاش کرتے ہیں جب کم سے کم خطرات لاحق ہوں۔

اسی بنا پر مجھے کافی حد تک اندازہ تھا کہ حملہ کروانے والا کون ہو سکتا ہے لیکن میں اس سلسلے میں بہت زیادہ پُریقین بھی نہیں تھا۔ میں ابھی فلمی دنیا میں نیا نیا آیا تھا' یہاں کے نشیب و فراز کو بہت اچھی طرح نہیں سمجھتا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ ستارہ نے ہی انجانے میں کسی کو دشمن بنا رکھا ہو اور اسے خود احساس بھی نہ ہو۔

وہ تھا لائٹ آن ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ایک ادھیڑ عمر' سوٹڈ بوٹڈ لیکن نہایت ہی گھبرایا ہوا اور خجالت زدہ سا آدمی ہال میں داخل ہوا۔ اس نے متوحش سی نظروں سے ادھر ادھر دیکھا اور خاص طور سے کسی کو مخاطب کئے بغیر بولا "معاف کیجئے گا خواتین و حضرات! آپ کو خاصی دیر زحمت اٹھانی پڑی۔ کسی نے مین سوئچ آف کر دیا تھا اور کٹ آؤٹ بھی نکال کے فرش پر مار کر توڑ دیا تھا۔"

وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "کیا آپ کے ہاں مین الیکٹرک بورڈ کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں ہے؟"

"الیکٹرک سپلائی کے لئے ہمارا اپنا چھوٹا سا سب اسٹیشن ہے جو ہر وقت مقفل رہتا ہے" وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولا "اور مین الیکٹرک بورڈ نیچے تہہ خانے میں ہے۔ وہ بھی گرل میں بند ہے اور گرل میں تالا لگا رہتا ہے لیکن کسی نے نہ جانے کس طرح تالا کھول لیا تھا... اور صرف یہی نہیں' ہمارے جنریٹر کی تار بھی کاٹ دی تھی" ایک بار پھر وہ پیشہ ورانہ لجاجت سے بولا "ہوٹل کی انتظامیہ بے حد معذرت خواہ ہے۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے آہستگی سے کہا اور وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔

سب نے دوبارہ اپنی پلیٹیں سنبھال لیں اور معدے کی خدمت میں جو کسر رہ گئی تھی وہ پوری کرنے لگے۔ ویٹرز بھی مستعدی سے چیزیں لانے لے جانے لگے تھے۔ کچھ لوگوں کے ہاتھوں سے پلیٹیں گر پڑی تھیں۔ ایک آدمی نے وہ اٹھائیں اور قالین صاف کیا۔ چند لمحے بعد یہ اندازہ لگانا ممکن نہ رہا کہ یہاں کوئی گڑبڑ ہوئی تھی۔ ستارہ کے چہرے پر بھی رونق لوٹ آئی تھی تاہم وہ میرے قریب ہی رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس خیال سے مجھے خوشی ہوئی کہ میری موجودگی سے اسے تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔

بالآخر خورونوش کا سلسلہ ختم ہوا اور اخبار نویس ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ آفاق ہر ایک کو رخصت کرنے باہر راہداری تک جا رہا تھا۔ ہال میں صرف میں' ستارہ اور آفاق رہ گئے۔ ہم تینوں ایک چھوٹی میز کے گرد بیٹھ گئے اور میں نے کافی کا آرڈر دیا۔ ستارہ کے چہرے سے اب اندرونی خوف اور تناؤ کے آثار دور ہو چکے تھے اور مصنوعی اور نپی تلی مسکراہٹ سے بھی اس نے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ اپنی مخصوص فطری مسکراہٹ اور بے پروا سی حرکات و سکنات کے ساتھ وہ کم از کم مجھے پہلے سے زیادہ دلکش لگ رہی تھی۔

کافی نوشی کے دوران آفاق میری طرف دیکھتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولا "آپ نے تو کمال کر دیا۔ حقیقتاً اور عملی طور پر تو آپ ابھی فلمی دنیا میں آئے ہی نہیں لیکن تمام مسائل کا آپ کو بخوبی اندازہ ہے۔ پریس کانفرنس سے آپ کے خطاب کرنے کے انداز سے کوئی نہیں جان سکتا تھا کہ یہ شخص فلم انڈسٹری میں

نوواردہے "

"...ب زیادہ مکھن مت لگاؤ۔ میں مکھن پروف ہوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اگر مجھے مکھن لگانا ہوتا تو میں اس سے کہیں زیادہ تعریف کرتا۔ یہ تو میں انتہائی محتاط رہتے ہوئے تعریف کر رہا ہوں" پھر وہ گہری سانس لے کر بولا "مکھن لگانے والے تو ابھی آپ نے دیکھے نہیں۔ شاید آگے چل کر تجربہ ہوجائے" پھر دفعتاً وہ موضوع بدلتے ہوئے بولا "خیر ان باتوں کو چھوڑئے۔ یہ بتائیے کہ آپ نے ستارہ پر حملے کی بات کیوں چھپائی؟"

"اوہ! تو تم نے وہ سب کچھ دیکھ لیا تھا؟" میں نے گہری سانس لے کر پوچھا۔

"کسی حد تک۔ میں آپ کے سب سے زیادہ قریب تھا لیکن گھپ اندھیرے میں مجھے بھی صحیح طور پر سب کچھ نظر نہیں آیا تاہم اندازہ ہوگیا تھا کہ کیا ہو رہا ہے... اور سچی بات یہ ہے کہ میں بے حد خوفزدہ ہوگیا تھا۔ غنیمت یہ ہے کہ میں نے شور شرابا نہیں شروع کردیا تھا"

"پھر تو واقعی اندھیرے، جھگڑ اور افراتفری میں ستارہ کو کوئی نقصان پہنچ جاتا" میں نے ستارہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس تصور سے اس کی رنگت ایک لمحے کے لئے پھیکی پڑ گئی۔

"لیکن .... میں نہیں سمجھ سکا کہ آپ نے اس بات کو کیوں خفیہ رکھا؟" آفاق قدرے الجھن زدہ سے لہجے میں بولا۔ میں نے اسے وجہ سمجھانے کی کوشش کی۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی۔

وہ تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "حیرت ہے! اس خطرناک صورتِ حال میں آپ نے صرف جسمانی طور پر ہی نہیں ذہنی طور پر بھی اس قدر مستعدی کا مظاہرہ کیا...!"

"میں ذہنی یا جسمانی، کسی بھی قسم کی ایک لمحے کی سستی کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا" میں نے کہا "ایک لمحے کی غفلت مجھے میرے مقام سے میلوں پیچھے دھکیل سکتی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر تفہیمی انداز میں سرہلایا۔ میں نے الجھن آمیز لہجے میں کہا "لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے ....وہ شخص بہت خوش قسمت تھا جو میرے ہاتھوں سے بچ کر نکل گیا" میں اپنے چوڑے چوڑے اور مضبوط ہاتھوں کو جائزہ لینے لگا۔

"اگر آپ اسے پکڑنے میں کامیاب ہوجاتے تو پھر یہ حملہ راز نہ رہتا" آفاق بولا۔

"ہاں۔ لیکن اس صورتحال میں کچھ فائدہ تو ہوتا۔ کچھ سراغ تو ملتا کہ وہ کس کا آدمی تھا۔" میں نے کہا۔

"ہوسکتا ہے پولیس اس سے یہ بات معلوم کرنے میں ناکام رہتی" آفاق نے خیال ظاہر کیا۔

"تو پھر ہم خود معلوم کرلیتے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں تو یہ حملہ ملک صاحب ہی نے کرایا ہوگا" آفاق کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"کیا اس نے اسٹوڈیو والے واقعے سے کوئی سبق حاصل نہیں کیا ہوگا؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "اس کے دونوں آدمی جیل میں ہیں۔ انہیں چھ چھ ماہ کی سزا ہوچکی ہے۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے" آفاق قدرے تلخ لہجے میں بولا "اس جیسے آدمیوں کے لئے تو ان کے کارندے شطرنج کے مہرے ہوتے ہیں۔ ایک پٹ گیا تو دوسرے کو آگے بڑھا دیا۔ ملک کے بارے میں آپ اپنے اندازے کمتر نہ رکھیں۔ وہ بے حد خطرناک آدمی ہے۔ دولت اس کے پاس بے شمار ہے' اس حساب سے وسائل بھی بے شمار ہیں اور اگر ایسے آدمی کی ذہنیت مجرمانہ ہوجائے تو وہ بڑا خطرناک ثابت ہوتا ہے۔ اور ملک تو اس لئے بھی زیادہ خطرناک ہے کہ وہ بے پناہ طاقتور ہونے کے باوجود بعض اوقات موقع نامناسب دیکھ کر سانپ کی طرح بل میں گھس جاتا ہے اور جب حالات موافق ہوتے ہیں تو دوبارہ حملہ آور ہوتا ہے۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ اس وقت بھی وہ للکار کر ہی حملہ کرے۔ کسی کو زک پہنچانے کے لئے وہ کسی بھی وقت کوئی بھی حربہ اختیار کرسکتا ہے۔"

"تم تو میرے تجسس کو ہوا دے رہے ہو کہ میں ان 'ملک صاحب' سے ملاقات کا اہتمام کر ہی لوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جبکہ میں آج کل دیگر سلسلوں میں اتنا مصروف ہوں کہ اس قسم کی 'ملاقاتوں' میں الجھنا نہیں چاہتا۔"

"خیر.... آپ جب تک اسے نظرانداز کرسکتے ہیں تب تک کرتے رہیں" آفاق بولا "جب پانی سر سے اونچا ہوگا تو دیکھا جائے گا۔"

"اور پانی سر سے اونچا کب ہوگا؟ جب میری روح قفسِ عنصری سے پرواز کرجائے گی؟" ستارہ نے اتنی دیر میں پہلی بار گفتگو میں دخل دیا۔

"ضروری نہیں کہ آئندہ بھی تم پر ہی حملہ ہو" آفاق بولا۔

"اور اگر ہوا بھی تو خدا پر بھروسہ رکھنے کے علاوہ تھوڑا بہت بھروسہ تم ہم پر بھی رکھ سکتی ہو" میں نے کہا۔

"ہاں" وہ گہری سانس لے کر بولی "لگتا یہی ہے کہ اب تو تم پر بھروسہ رکھنا ہی پڑے گا۔ میں تو رہتی بھی اکیلی ہوں۔ بابا کا تو گھر میں ہونا یا نہ ہونا برابر ہی ہے۔ وہ تو نشے میں دُھت پڑے رہتے ہیں۔"

"میں تمہیں ایک باڈی گارڈ دے دوں گا جو چوبیس گھنٹے سائے کی طرح تمہارے ساتھ رہے گا" میں نے کہا۔

"چوبیس گھنٹے والی بات تو غلط ہے" وہ مسکرائی "چند گھنٹے بہرحال مجھے تنہا رہنے کے لئے بھی درکار ہوں گے" معلوم ہوتا تھا کہ اب اس کا خوف دور ہوچکا تھا اور اس کی حسِ مزاح بیدار

ہوچکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہئے۔ کل میرا شوٹنگ کا شیڈول بہت ہائٹ ہے۔ بے حد مصروفیت رہے گی۔ اگر آج مجھے آرام کے لئے زیادہ وقت مل جائے تو اچھا ہے۔"

"تم نے کوئی سیکریٹری وغیرہ نہیں رکھا؟" میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک لڑکی رکھی ہوئی ہے لیکن وہ آجکل چھٹی پر گئی ہوئی ہے۔ چار چھ روز میں آجائے گی" اس نے بتایا۔

"اب ڈیٹس وغیرہ کا حساب خود رکھتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میرا حافظہ بہت اچھا ہے۔ مجھے زبانی سب کچھ یاد رہتا ہے" وہ مسکرائی "ویسے ابھی میرے پاس اتنی زیادہ فلمیں بھی نہیں ہیں۔ اگلے ماہ میری ایک فلم سنسر میں جا رہی ہے۔ اس کی ریلیز کے بعد مجھے امید ہے کہ میرے پاس یکدم کام بہت بڑھ جائے گا"

"اس کے بعد تم ہمیں اپنے گھر کے چکر لگوانے شروع کردو گی؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں مجھ سے ایسی امید ہے؟" اس نے مسکراتے ہوئے لیکن قدرے مجروح سے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ کہا تو نہیں جاسکتا نا" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اس دنیا کا کوئی بھروسہ نہیں کہ کب کس کو کیا بنادے... اور تمہارا اپنا بھی کچھ بھروسہ نہیں۔ تم پل پل رخ بدلنے والی ہوا ہو۔"

"کبھی تھی اب نہیں رہی" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ میں نے دیکھا' اس کی آنکھوں میں دھواں سا پھیلا ہوا تھا "تم مجھے اس زمانے کے پس منظر میں مت دیکھو جب ہماری نئی نئی شناسائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اب تک بڑے انقلابات گزرے ہیں۔ بڑے تغیرات کا سامنا رہا ہے۔ ان گنت تجربات کا زہر پیا ہے میں نے۔ میرے اعمال کے پشتارے میں زیادہ نیکیاں نہیں ہیں مگر پھر بھی میرا من پہلے سے زیادہ اجلا اجلا سا ہوگیا ہے۔ میں بہت الجھے ہوئے لوگوں میں رہی ہوں لیکن خود بہت سلجھ گئی ہوں' مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ انسان خواہ کتنا ہی خودغرض، کتنا ہی چالاک اور کتنا ہی موقع پرست کیوں نہ بن جائے لیکن دنیا میں اس کا ایک آدھ دوست ضرور ہونا چاہئے۔ بالکل تنہا رہ کر مضبوط سے مضبوط انسان بھی دنیا میں زندگی نہیں گزار سکتا۔ چنانچہ میں نے تمہیں اور آفاق کو اپنے ایسے دوست شمار کرنا شروع کردیا ہے جو حاصلِ حیات ہوتے ہیں۔"

آفاق اس وقت بل پر دستخط کرنے کے لئے اکاؤنٹنٹ کے کاؤنٹر پر رک چکا تھا اور ستارہ میرے شانہ بہ شانہ چل رہی تھی۔ وہ اتنی دھیمی آواز میں بات کررہی تھی کہ میرے دوسرے ہاتھ پر اگر آفاق موجود بھی ہوتا تو شاید سن نہ پاتا۔ ہم اس وقت لابی میں سے گزر رہے تھے۔ لابی میں کئی ملکی اور کئی غیر ملکی افراد صوفوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کوئی ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ کوئی اخبار پڑھ رہا تھا اور کوئی یونہی فارغ بیٹھا جماہیاں لے رہا تھا۔

ستارہ کو دیکھ کر کئی پاکستانی مرد اور عورتیں چونکتی نظر آئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ تین چار فلموں کی ریلیز کے بعد ہی اس کا چہرہ لوگوں کے لئے ایک جانا پہچانا چہرہ بن چکا تھا۔ نو دس سال کی ایک بچی تو اسے دیکھ کر کچھ زیادہ ہی اشتیاق سے اپنی ماں سے سرگوشی میں کچھ کہنے لگی۔ ہم اس دوران لابی عبور کرکے شیشے کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔

"سنئے .... سنئے مس" دفعتاً ایک باریک سی آواز سن کر میں اور ستارہ رک گئے۔ وہی نو دس سال کی بچی ہمارے پیچھے کھڑی تھی جسے ہم ایک لمحے پہلے اپنی ماں سے سرگوشی کرتے دیکھ چکے تھے۔

"آپ مشہور فلم اسٹار مس ستارہ ہیں نا؟" بچی نے شرمیلے سے لہجے میں پوچھا۔

"مشہور تو معلوم نہیں میں ہوں یا نہیں ہوں۔ لیکن میں فلم اسٹار ستارہ ضرور ہوں" ستارہ نے جھک کر پیار سے بچی کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ہمیں آٹوگراف دے دیجئے پلیز" بچی نے آٹوگراف بک اس کی طرف بڑھائی۔

"کیا آپ آٹوگراف بک ہر وقت ساتھ رکھتی ہیں؟" ستارہ نے آٹوگراف بک اور پین اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"ہر وقت تو نہیں" بچی نے بھولپن آمیز سنجیدگی سے جواب دیا "لیکن جب میں اس ہوٹل میں آتی ہوں تو آٹوگراف بک ضرور ساتھ لاتی ہوں کیونکہ یہاں ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی مشہور شخصیت نظر آجاتی ہے۔"

"بہت خوب" ستارہ نے گویا بچی کی متانت اور ذہانت کی داد دی۔ پھر اس نے انگریزی میں آٹوگراف بک میں ایک جملہ لکھا جس کا مفہوم یہی تھا کہ ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ اس جملے کے نیچے دستخط کرکے اس نے آٹوگراف بک بچی کو واپس کردی اور وہ شکریہ ادا کرکے مسرور انداز میں دوڑتی ہوئی اپنی ماں کے پاس پہنچ گئی۔ اس دوران آفاق بھی بل کا معاملہ نمٹا کر ہمارے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہم تینوں باہر آگئے۔

ستارہ کا ڈرائیور گاڑی لے کر دروازے پر پہنچ چکا تھا۔ آج ستارہ کے اپنی گاڑی میں بیٹھنے کی نوبت ہی نہیں آرہی تھی۔ ڈرائیور گاڑی لئے گویا ہمارے پیچھے پیچھے پھر رہا تھا۔ میں نے اس وقت بھی ستارہ کا اس کی اپنی گاڑی میں جانا مناسب نہیں سمجھا۔

"تم ہمارے ساتھ ہی چلو تو اچھا ہے" میں نے کہا "میں تمہیں تمہارے گھر ڈراپ کردوں گا۔ اپنے ڈرائیور سے کہہ دو کہ گاڑی ہماری گاڑی کے پیچھے پیچھے ہی لے آئے۔"

ستارہ نے اپنے ڈرائیور کو یہی ہدایت دی اور میرے ساتھ گاڑی میں آبیٹھی۔ آفاق وہیں رکتے ہوئے بولا "اندر میرا ایک دوست مل گیا ہے۔ میں کچھ دیر اس کے ساتھ گپ شپ کرنے کے بعد گھر جاؤں گا۔ ویسے بھی آپ دونوں گلبرگ جا رہے ہیں جب کہ مجھے سمن آباد جانا ہے۔"

وہ اپنی گاڑی اسٹوڈیو ہی میں چھوڑ آیا تھا۔ ہم نے اسے خدا حافظ کہا اور روانہ ہو گئے۔ راستے میں میں نے کہا "ستارہ' تمہیں آٹوگراف بک میں انگریزی لکھتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ زمانے نے تمہیں واقعی بہت کچھ سکھا دیا ہے۔"

"اور میں تمہیں دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی ہوں" وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی "تم بھی واقعی بہت کم مدت میں بڑی زبردست چیز بن گئے ہو۔ ویسے خود پرستی سے قطع نظر میرا خیال تو یہی ہے کہ ہم میں سیکھنے کی صلاحیت تھی اس لئے زمانے نے ہمیں اتنا کچھ سکھا دیا۔ جن میں سیکھنے کی صلاحیت نہ ہو انہیں زمانہ بھی کچھ نہیں سکھا سکتا۔"

"بس یہی کچھ سوچتے سوچتے اپنے بارے میں تکبر میں مبتلا نہ ہو جانا ورنہ وہیں سے زوال شروع ہو جائے گا" میں نے مُربیانہ لہجے میں کہا۔

"میں صرف ضرورتاً کبھی کبھی متکبر نظر آتی ہوں لیکن صرف ظاہری طور پر۔ اندر سے میں بڑی انکسار پرست لڑکی ہوں" وہ سیٹ کے پشتے سے سر ٹکا کر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ وہ جب اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرتی تھی تو اس کے وجود سے امنڈتی ہوئی خوشبو کچھ اور گہری ہو جاتی تھی۔

"اتنے وثوق سے اپنے بارے میں کچھ مت کہو" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میں اور تم دونوں ہی ایسی شخصیتیں ہیں کہ خود اپنے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہم اندر سے کیسے ہیں۔"

"تم اپنے بارے میں کہو نہ کہو" وہ قدرے شوخ لہجے میں بولی "میں اپنے بارے میں تو یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میں اندر سے بڑی اچھی اور اُجلی لڑکی ہوں۔ بس ویسے ہی کبھی کبھی بُری بن جاتی ہوں۔"

اس دوران ہم گلبرگ میں داخل ہو چکے تھے۔ اس نے مجھے راستہ بتانا شروع کر دیا اور تھوڑی دیر بعد میں نے گاڑی اس کی رہائش گاہ پر جا روکی۔ یہ اوسط درجے کی ایک چھوٹی لیکن خاصی خوبصورت کوٹھی تھی۔ ہارن سن کر ایک ملازم نے آکر گیٹ کھولا اور میں نے گاڑی پورچ میں لے جا روکی۔

"خوبصورت کوٹھی ہے" میں نے گاڑی سے اتر کر ادھر ادھر کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "کب خریدی تھی؟"

"خریدی نہیں' کرائے کی ہے" وہ برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی "ویسے میرے حالات ایسے تھے کہ چاہتی تو خرید بھی سکتی تھی لیکن ابھی میں نے کچھ عرصہ اور کرائے پر ہی رہنا بہتر سمجھا۔"

میں اس کی رہنمائی میں ایک آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں پہنچا جہاں لائٹس اس طرح فٹ کی گئی تھیں کہ روشنی دیواروں سے پھوٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں خوابناک سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

"تمہارا ذوق بہت اچھا ہے" میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"بس... سب کچھ زمانے سے سیکھا ہے" وہ اپنا بیگ ایک مخملیں صوفے پر پھینکتے ہوئے بولی۔ میں بھی بیٹھ چکا تھا۔ "تمہیں ایک مزے کی بات بتاؤں... یہی کوٹھی ایک فلمساز مجھے تحفتاً پیش کرنے کے لئے تیار تھا۔"

"شرط کیا تھی؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں۔ صرف یہ کہ میں اس کی آئندہ فلموں میں کام ضرور کروں گی" ستارہ صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولی "ویسے اپنی مرضی سے خواہ میں اس کی پانچ کے بجائے دس فلموں میں کام کر لیتی اور طے شدہ معاوضے کے علاوہ کچھ نہ لیتی لیکن اس بات کو جب اس نے شرط کے طور پر رکھا تو مجھے سخت برا لگا اور میں نے فوراً انکار کر دیا۔ میں مشروط طور پر کام نہیں کر سکتی' خواہ اس میں میرا کتنا ہی فائدہ ہو۔ مجھے بڑی آزادی پسند ہے۔"

میں نے ہولے سے ہنکارا بھرا اور بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس کی غزالی آنکھیں مخمور سی نظر آ رہی تھیں اور اس وقت وہ صوفے پر ساکت تھی مگر اس کے خدوخال گویا شاعری تھے۔ بلاشبہ وہ اب بھی ایک سحرزدہ کر دینے والی لڑکی تھی کے ساتھ ساتھ اس کا باطن بھی عجیب اور حیران کن تھا۔

دفعتاً اس نے پہلو بدلا اور مجھے یوں لگا جیسے حسن کے کسی مجسمے نے ہلکورا سا لیا ہو۔ میرے ذہن میں دھواں سا رہا تھا۔ وہ گویا میرے اندر کے تغیر و تبدل سے آگاہ مگر انجان بنی' ایک زہد شکن مسکراہٹ کے ساتھ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "ایک اور فلمساز نے تو اس سے بھی بڑی قیمت کوٹھی تحفتاً دینا چاہی تھی مگر اس کا مسئلہ بھی یہی تھا' اس نے بھی ایک شرط رکھ دی تھی۔"

"کیا؟" میں نے سرگوشی نما لہجے میں پوچھا۔

"کہ وہ مہینے میں تین چار مرتبہ میرے ہاں آیا کرے" وہ عجیب سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس مسکراہٹ میں تلخی بھی تھی اور تمسخر کی جھلک بھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "اس فلمساز کی یہ بات کچھ ایسی انوکھی بھی نہیں ہے۔ ایکٹریسوں کا دولتمندوں سے یہ سلسلہ ہوتا ہے۔ میں پارسا چیز تو ہوں نہیں۔ بازارِ حسن میں بھی رہی ہوں اور

میرا ماضی کچھ ایسا قابلِ رشک نہیں رہا... تم تو جانتے ہی ہو... لیکن میں نے اس شخص کو کھڑے پیروں گھر سے نکال دیا۔ اور اگر میں اس کے مقابلے میں کمزور نہ ہوتی تو شاید میں اس کے منہ پر طمانچے بھی مارتی۔"

"اتنی برہمی" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ بات بھی کیا صرف مشروط ہونے کی وجہ سے تمہیں ناگوار گزری تھی؟"

"ہاں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ وہ شخص مجھے ذرا بھی اچھا نہیں لگا تھا۔ جو لوگ مجھے پہلی ہی نظر میں برے لگیں وہ اگر مجھے کوئی فائدہ بھی پہنچانا چاہیں تو شاید مجھے قبول نہ ہو" وہ ٹھوس لہجے میں بولی "اگر وہ شخص پہلے مجھے دوست بناتا اور رفتہ رفتہ مراسم کو اپنی مطلوبہ نہج پر لانے کی کوشش کرتا تب بھی مجھے اتنا برا نہ لگتا لیکن اس نے جس طرح دوٹوک انداز میں بات کی' اس سے وہ مجھے اور بھی زہر لگا۔ جیسے میں کوئی بہت ہی سستی قسم کی بازاری چیز ہوں۔"

"گویا بزنس میں بھی تمہاری ذاتی پسند شامل رہتی ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"بے شک۔ بلکہ اگر ذاتی پسند غالب آجائے تو میں بزنس کو پس پشت ڈال سکتی ہوں" اس کی مخمور نگاہوں کا تبسم کچھ اور بڑھ گیا۔

"شوبزنس کے لوگوں کے لئے تو یہ کوئی اچھی عادت نہیں" میں نے کہا۔

"میں تمہیں اپنی تمامتر عادتوں کے ساتھ ہی شوبزنس میں کامیاب ہو کر دکھاؤں گی۔ خواہ وہ عادتیں اچھی ہیں یا بری" وہ نہایت پُریقین لہجے میں بولی۔

"کامیاب تو تم ہو چکی ہو" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "جتنی کامیابیاں تمہیں حاصل ہو چکی ہیں اتنے کم عرصے میں اتنی کامیابیاں آج تک کسی نئی آنے والی لڑکی کو نصیب نہیں ہوئیں۔ دیکھو کتنی حیرت کی بات ہے کہ تم ابھی سے اپنی پسند کی اور اپنی مرضی کے لوگوں کی فلمیں ہی سائن کر رہی ہو ورنہ ابتدا میں کسی کو چند فلمیں مل جائیں تو وہ خوشی سے پاگل ہو جائے اور دھڑا دھڑ سائن کرنے لگے۔ انتخاب پسند بننے کا خیال بھی نہ آئے کسی کو۔"

"کافی عرصہ میں زمانے کی خواہشوں کے مطابق چلی ہوں' اب کچھ عرصہ اپنی مرضی کے مطابق جیوں گی" وہ صوفے پر ہی لیٹے ہوئے بڑے آسودہ سے لہجے میں بولی۔

دفعتاً دروازہ دھڑ سے کھلا اور ایک مجہول سا شخص لڑکھڑاتا ہوا اندر آگیا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور آنکھیں حلقوں میں دھنسی ہوئی تھیں۔ شیو بے تحاشہ بڑھی ہوئی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کے نیم وا ہونٹوں سے رال بہہ رہی تھی۔ ایک ہاتھ میں وہ وسکی کی ادھ بھری بوتل اٹھائے ہوئے تھا اور اسے دنیا میں سب سے زیادہ فکر گویا اسی بوتل کی تھی کیونکہ وہ اسے سینے سے لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آمد سے کمرے میں پھیلی ہوئی خوابناک سی خوشبو' وسکی کی بو سے مجروح ہونے لگی۔ وہ خاصا معمر آدمی تھا۔ اس کے جسم پر بہترین کپڑے کا شلوار سوٹ تھا مگر میل اور شکنوں سے اس کی حالت تباہ تھی۔ وہ دھندلی دھندلی آنکھوں سے یوں کمرے کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا جیسے اسے دیکھنے میں بہت دقت پیش آ رہی ہو۔

ستارہ یک لخت اٹھ بیٹھی اور غصیلے لہجے میں بولی "بابا! میں نے کتنی مرتبہ آپ کو منع کیا ہے کہ صرف اپنے کمرے میں رہا کریں' کسی دوسرے کمرے میں مت آیا کریں اور اگر آنا بہت ضروری ہو تو دستک دے کر' اجازت لے کر آیا کریں۔"

بوڑھے نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ستارہ کی طرف دیکھا گویا پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ بالآخر وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہو ہی گیا اور معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "مم.. معاف کرنا ستارہ بیٹی... امیں.... میں اپنے کمرے کا رستہ بھول گیا تھا" اسے ایک زوردار ہچکی آئی جس سے اس کا نحیف و نزار جسم کانپ کر رہ گیا پھر وہ واپسی کے لئے مڑ گیا۔ جاتے وقت وہ حتی الامکان محتاط انداز میں دروازہ بند کرنا نہیں بھولا تھا لیکن ستارہ نے اسے گویا ناکافی سمجھتے ہوئے اٹھ کر دروازہ مقفل بھی کر دیا۔ ایک بار پھر میرے مقابل صوفے پر بیٹھتے ہوئے وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مخمور سے انداز میں مسکرا دی مگر اب اس مسکراہٹ میں تھکن بھی شامل تھی۔

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ چند لمحے پہلے میں نے جس مجہول اور نحیف و نزار شخص کو دیکھا تھا وہ ستارہ کا باپ تھا جس کی دہشت سے میں کسی زمانے میں لرزہ براندام رہا کرتا تھا۔ جب ستارہ 'لالی' ہوا کرتی تھی اور خانہ بدوشوں والے خیمے میں رہتی تھی اور میں وقت کے دامن سے چند حسین ساعتیں چرا کر اس سے ملنے جایا کرتا تھا تو اس کے باپ کی آمد کے ڈر سے میرا دل بے تحاشہ دھڑکتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں وہ کیسا گرانڈیل اور دہشت ناک سا ہوا کرتا تھا۔ اب محض ایک قابلِ رحم ڈھانچا تھا۔ جب انسان پر منشیات غالب آجاتی ہیں تو وہ تصویرِ عبرت بن جاتا ہے' یہ بات سبھی کو معلوم ہے اور عبرت کی یہ تصویریں سبھی نے جابجا دیکھی ہوتی ہیں اس کے باوجود بہت سے انسان کسی نہ کسی طرح منشیات کے چنگل میں پھنس ہی جاتے ہیں۔ میں جب بھی کسی ایسے آدمی کو دیکھتا تھا' مجھے اس پر بے حد رحم آتا تھا۔ بعض اوقات نشے کے مارے ہوئے لوگ ایسی حرکتیں بھی کر رہے ہوتے ہیں جن پر رحم کے بجائے غصہ آنا چاہئے لیکن اگر میں کوئی ایسا منظر بھی دیکھ لیتا تب بھی میری پوری پوری کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ شخص جو پہلے ہی اپنے آپ سے بیگانہ ہے' میرے غصے کا نشانہ نہ بنے۔

کمرے میں چند لمحے بوجھل سی خاموشی طاری رہی پھر میں نے کہا "تمہارے بابا کو دیکھ کر افسوس ہوا۔"

"پہلے مجھے بھی ہوتا تھا" وہ ایک بار پھر صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے بے پروائی سے بولی "لیکن اب نہیں ہوتا۔ انسان چاہے تو اپنے آپ کو فریب دینے کے لئے کسی بھی بات کا کوئی بھی جواز گھڑ سکتا ہے۔ میں نے بھی گھڑ لیا ہے کہ بابا کم از کم اس لحاظ سے تو خوش قسمت ہے کہ وہ اس دنیا میں اپنی مرضی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ اچھا یا برا' جو بھی چاہتا ہے وہی کھاتا یا پیتا ہے۔ جیسا اس کا دل چاہتا ہے ویسا ہی لباس پہنتا ہے۔ مقصد یہ کہ انتخاب کا حق اس کے پاس ہے۔ کوئی اسے مجبور نہیں کرتا کہ فلاں کام کرے یا فلاں کام نہ کرے۔ نشے بھی اسے کسی نے نہیں لگائے' ...اس نے خود ہی اپنے آپ کو لگائے ہیں۔ وہ نوعمر یا ناسمجھ نوجوان تو قابلِ رحم ہوتے ہیں جنہیں منشیات کی تباہ کاریوں کا اندازہ نہیں ہوتا اور وہ کسی کے بہلائے پھسلائے سے یا اپنی نادانی کے سبب ان چکروں میں پھنس جاتے ہیں لیکن بابا کے ساتھ تو ایسا کوئی معاملہ نہیں تھا۔ وہ اپنے برے بھلے کو خود سمجھتا تھا۔ اس کے باوجود اگر اس نے اپنے لئے یہ راستہ منتخب کیا تو اس کا مطلب ہے کہ یہ اس کی حسرت تھی اور وہ ابھی تک اپنی حسرت پوری کرنے میں لگا ہوا ہے اور میں سوچتی ہوں کہ آج کے دور میں جو شخص اپنی حسرتیں پوری کرنے میں کامیاب ہو جائے وہ بڑا خوش قسمت ہے۔ یہ بعد کی بات ہے کہ حسرتیں اچھی ہیں یا بری۔ چنانچہ اب میں نے بابا کے بارے میں فکرمند ہونا چھوڑ دیا ہے۔"

"ہاں" میں نے بوجھل سانس لیتے ہوئے کہا "یہ تم نے ٹھیک کہا کہ خود کو مطمئن کرنے کے سو طریقے' سو حیلے ہوتے ہیں بشرطیکہ انسان کو ان سے مطمئن ہونے کا ہنر آجائے۔"

وہ خاموش رہی اور پُرخیال سے انداز میں مسکراتی رہی۔

میں اس کے ہاں سے دوسری صبح ناشتے کے بعد رخصت ہوا۔ ...وہ خود بھی شوٹنگ پر جانے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔ وہ مجھے چھوڑنے پورچ تک آئی اور کار کی کھڑکی پر جھکتے ہوئے بولی۔

"انسان جب بہت خوش ہوتا ہے تب بھی اس کا دل چاہتا ہے کہ وہ ان لمحات کو کسی کے ساتھ شیئر کرے اور جب وہ شکستہ دل و مایوس ہوتا ہے تب بھی وہ چاہتا ہے کہ کوئی اس کا دکھ بٹائے۔ جب کامیابیوں کے خمار سے وہ اپنے آپ کو نہایت ہلکا پھلکا اور بیکراں فضاؤں میں اڑتا ہوا محسوس کرتا ہے تب بھی اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کسی کے ہمدرد ہاتھ اسے سنبھالے رکھیں اور جب وہ زمانے کی دوڑ میں تھک ہار کر یا کسی انجانے صدمے سے چور ہو کر گر پڑتا ہے تب بھی اس کی خواہش ہوتی ہے کہ کوئی اسے سہارا دے' اس کے ریزہ ریزہ وجود کو سمیٹے۔ ایسے کسی بھی لمحے میں تم یہاں آسکتے ہو۔ اس گھر کے دروازے تمہیں اپنے لئے

ہر وقت کھلے ملیں گے۔"

"بالکل اسی طرح جیسے تمہارے بوسیدہ و شکستہ خیمے کا د[...] میرے لئے ہر وقت کھلا رہتا تھا' گو کہ اس میں کوئی درواز[...] نہیں تھا" میں نے کہا۔

"ہاں" وہ دھیرے سے ہنس دی "بالکل اسی زمانے کی [...] تم اب بھی میرے ہاں آسکتے ہو۔ بلکہ اس زمانے میں تو پھر بھی روک ٹوک تھی۔ اب نہیں ہوگی... اور اب مجھے اس زما[...] طرح تم سے کوئی لالچ بھی نہیں ہے۔ میں اب تمہیں پہ[...] طرح ٹھگ کر تم سے آنکھیں نہیں پھیروں گی۔ مجھے اب تم [...] کوئی غرض نہیں ہے۔ تم چاہو تو مجھے اپنی ایک بھی فلم میں [...] مت کرو' تم سے میرے تعلقِ خاطر میں کوئی فرق نہیں آ[...] کیونکہ اب میری دوستی بے غرض ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آتا کہ تم واقعی مجھ پر اتنی مہربان ہو[...] نے صاف گوئی سے کہا۔

"کم از کم اب تو تمہیں یقین آجانا چاہئے" اس۔ 'اب' پر زور دیتے ہوئے کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے "اگر تم میرے لفظوں کی سچائی کو محسوس کر سکو تو میں تمہیں [...] ہوں کہ تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ شروع ہی سے اچھے لگ[...] لیکن شروع میں میں نے اس احساس کو لالچ کی کالی چادر م[...] لیا تھا۔ تمہارے اندر تمہاری تمام تر چالاکیوں کے باوجود [...] طرح کا شرمیلا پن اور ایک طرح کا کھرا پن ہے وہ اچھا [...] مجھے... اور... اور اس کے علاوہ تم دلیر بھی ہو۔ کسی کے [...] تان کر لڑ سکتے ہو۔ یہ بات تو شاید ہر عورت کو ہی اچھی لگ[...] لیکن مجھے کچھ زیادہ ہی اچھی لگتی ہے۔ شاید اس لئے کہ م[...] آپ کو بے حد کمزور اور غیر محفوظ محسوس کرتی ہوں' اسٹوڈیوز میں منڈلانے والے کئی اونچے درجے کے [...] میرے اشارے پر بہت کچھ کر دینے میں شاید خوشی محسو[...] لیکن شاید میں بڑی سے بڑی مصیبت میں بھی ان میں [...] مدد کے لئے پکارنا پسند نہ کروں۔ لیکن تمہیں شاید بلا ضرو[...] پکارنے کو جی چاہے۔ تم اپنے اپنے سے لگتے ہو۔"

"بس .... بس۔ اب اتنا مکھن مت لگاؤ کہ میں [...] پاتال کی گہرائیوں میں جاگروں" میں نے مسکراتے ہو[...] "ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہیں اتنی خوبصورتی [...] کرنی آگئی ہے کہ سننے والا سحرزدہ سا ہو جاتا ہے اور [...] دوسری خوبی جو مجھے پسند آئی وہ یہ ہے کہ تمہاری طبیعت [...] لالچ نہیں رہا۔ بڑی درویشی سی آگئی ہے اب تمہارے [...]

"شاید پہلے میں اس لئے لالچی تھی کہ بھوکی تھ[...] دولت سے میرا پیٹ بھرنے لگا ہے اس لئے لالچ ختم ہو [...] چونکہ مزید دولت یقینی طور پر اپنی طرف آتی نظر آ رہی [...] لئے میں سوچتی ہوں کہ خواہ مخواہ پریشان ہونے اور اپنے

کھرے جذبوں کو کچلنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"لیکن میرا خیال تو یہ ہے کہ دولت سے کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ انسان ایک مرحلہ سر کر لیتا ہے تو پھر اس سے اونچے خواب دیکھنے لگتا ہے... اور پھر اس سے اونچے... اور یوں یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو دنیا میں اس وقت بے شمار دولت مند ہیں جن کے پاس دولت ان کی ضرورت سے کئی ہزار گنا زیادہ ہے' وہ سب آرام سے بیٹھ جاتے۔ مگر وہ سب مزید کمانے میں لگے ہوئے ہیں۔ اپنے کاروبار کو زیادہ سے زیادہ پھیلانے کی فکر میں لگے رہتے ہیں۔"

"ہاں" اس نے ایک گہری سانس لی "میں نے کسی ناول یا افسانے میں اس کی توجیہہ پڑھی تھی اور وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی کہ انسان کی تمام خواہشات پوری ہو جانے کے بعد ایک وقت ایسا آتا ہے جب دولت کمانا انسان کے لئے محض ایک دلچسپ مشغلہ رہ جاتا ہے۔ جس طرح شطرنج کے کھلاڑی خوب دماغ لڑا کر بساط پر مہروں کو آگے پیچھے کھسکاتے ہوئے محظوظ ہوتے ہیں اسی طرح دولت مندوں کے لئے کاروبار کی بساط پر لاکھوں کروڑوں کی رقمیں ادھر سے ادھر کرتے رہنا بھی ایک مشغلہ بن جاتا ہے۔ ایک دلچسپ مشغلہ۔ لیکن میں چونکہ ایک عورت ہوں اور خاصی مختلف قسم کی عورت' اس لئے مجھ پر کچھ دوسرے محسوسات غالب ہیں۔ لیکن شاید آگے چل کر مجھ میں بھی دولت کی ہوس عود کر آئے۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتی" اس نے کچھ عجیب معصومیت آمیز بے بسی سے سر جھٹکا اور پھر جانے کیوں ہنس دی۔ اس نے جانے کہاں کہاں کی خاک چھانی تھی۔ زمانے میں جانے کیا کچھ دیکھا تھا۔ بے مہر وقت کا جانے کس کس پہلو سے سامنا کیا تھا مگر اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں اب بھی غضب کی معصومیت تھی۔ اس کے رخساروں پر اب بھی اچھوتے پن کی شگفتگی تھی اور اس کی آنکھوں میں اب بھی شریر سی مسکراہٹ ناچتی تھی۔ بہت عجیب لڑکی تھی۔ عجب سراپا عطا کیا تھا قدرت نے اسے۔ شاید وہ ایک سدا بہار وجود لے کر دنیا میں آئی تھی۔

شب رفتہ کے سائے ایک بار پھر میرے ذہن کو دھندلانے لگے اور اس سے پہلے کہ میری کنپٹیوں میں چنگاریاں سی تیرنے لگتیں میں نے جلدی سے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا "اچھا میں چلتا ہوں۔ پھر کسی خوش قسمت لمحے میں تم سے ملاقات ہوگی۔"

سچی بات یہ تھی کہ میں اس لڑکی سے خوف سا محسوس کرنے لگا تھا کیونکہ ایک انجانی سی کشش مجھے اس کی طرف کھینچ رہی تھی۔ میں بالکل اسی طرح جذبات کی تمام تر شدتوں سے اس کی وارفتگی میں بڑھنا چاہتا تھا جس طرح کبھی نوعمری اور مفلسی کے دور میں بڑھا تھا۔ اس قسم کا جذباتی مدوجزر اب مجھے اپنے لئے پُرخطر محسوس ہوتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میری ذات کے سمندر کی تہوں میں خواہ کتنے ہی طوفان پلتے رہیں لیکن سطح بالکل پُرسکون رہے۔ کوئی صحیح طور پر نہ جان سکے کہ میں کیا چاہتا ہوں' کیا سوچتا ہوں۔ کوئی میری کمزوری نہ بن سکے' کوئی مجھے کھلونا نہ بنا سکے اور کوئی مجھے جذباتی دھچکا نہ پہنچا سکے۔

گو مجھے یقین تھا کہ ستارہ کی باتوں میں اب میرے لئے خلوص اور سچائی کی خوشبو ہے' وہ واقعی مجھ سے متاثر ہے اور جس طرح مجھ پر مہربان ہے اس طرح کسی اور پر نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود میں اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر نہیں ہونا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس سے میرے دل کا کوئی ایسا تعلق استوار ہو جائے کہ کل کلاں کو جب وہ مجھ سے دور کہیں جائے تو میں اپنے دل میں کوئی گھاؤ محسوس کروں۔ میں شاید اب کوئی گھاؤ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دل زیادہ سے زیادہ کسی کسک یا کسی میٹھی خلش کا متحمل ہو سکتا تھا۔ بات قوتِ برداشت کی بھی نہیں تھی۔ بات صرف اتنی تھی کہ اگر میں چاہت اور محرومی کے کسی صدمے سے بے حال ہو کر' دل تھام کر بیٹھ جاتا تو مجھے اپنا وجود نہایت ہی بے کار اور بے مصرف محسوس ہوتا جبکہ میں اپنی زندگی کے لئے بڑے اور اونچے مقاصد کا تعین کر چکا تھا اور ان کی تکمیل کے بعد ہی اس دنیا سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔

○☆○

میری پنجابی فلم کی شوٹنگ شروع ہوئی تو اس کے ساتھ ہی عجیب و غریب واقعات کا ایک سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔

پہلی شوٹنگ سے ایک روز قبل آفاق نے مجھے فون کیا "سر' کل سے شوٹنگ شروع ہو رہی ہے۔ اس موقع پر اگر تھوڑی دیر کے لئے آپ بھی آجائیں تو اچھا رہے گا۔"

"بھئی میرا وہاں کیا کام؟" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بطور فلمساز آپ کو فلمی دنیا اور وہاں کے معمولات سے تھوڑا بہت آشنا بھی ہونا چاہئے نا" وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

"شوٹنگ کس نوعیت کی ہے اور کہاں ہوگی؟" میں نے معمولی دلچسپی سے پوچھا۔

"ستارہ پر چند شاٹ پکچرائز کرنے کا پروگرام ہے۔ اسی حصے کے چند شاٹس ہیں جب ستارہ شکار پر جاتی ہے اور چند ڈاکوؤں سے اس کی مڈبھیڑ ہوتی ہے۔ مار دھاڑ کے منظر کا کچھ حصہ شوٹ ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔" آفاق بولا۔

"لیکن یہ منظر تو کہانی میں کافی آگے جا کر آتا ہے اور تم شوٹنگ یہاں سے شروع کر رہے ہو؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ پھر جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے خود ہی کہا "اوہ... میں سمجھ گیا۔ تمہیں جس جس سے ڈیٹس ملی ہوئی ہیں اور جس حساب سے تمہیں لوکیشنز میسر آتی جائیں گی اسی حساب سے تم شوٹنگ کا

شیڈول بناتے جاؤ گے... اداکاروں کو ایک دوسرے کی ڈیٹس کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا پڑتا ہوگا؟"

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے سر" آفاق طویل سانس لے کر بولا۔ "یہی کام مجھے سب سے مشکل لگتا ہے۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ کسی اداکار سے ملی ہوئی ایک بھی ڈیٹ ضائع نہ ہو' اس لئے میں ترتیب کی پروا کئے بغیر شوٹنگ کرتا چلا جاتا ہوں۔ ترتیب کی پروا تو شاید ہی کوئی ڈائریکٹر کرتا ہو لیکن میں تو بعض اوقات بالکل الٹا بھی چل پڑتا ہوں۔ کسی سین کے آخری شاٹس پہلے پکچرائز کرلیتا ہوں اور شروع کے شاٹس بعد میں۔"

"اس سے اداکاری کا معیار متاثر نہیں ہوتا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"یہیں تو ایک ہدایت کار کی صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے سر" آفاق ہنس کر بولا "کہ اداکاروں کو خواہ کتنی نیوٹی سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن وہ ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے لے۔ کیونکہ اس کے سامنے تو پوری فلم اپنی ساری جزیات سمیت شطرنج کی بساط کی طرح پھیلی ہوتی ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اسے کس مہرے سے کیا کام لینا ہے۔"

"شوٹنگ ہے کہاں؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"ملک صاحب کے باغ میں۔ اس قسم کی زیادہ تر آؤٹ ڈور شوٹنگز وہیں ہوتی ہیں۔ اور وہ جو آپ نے اکثر پنجابی فلموں میں ایک محراب دار سا چھوٹا سا پل دیکھا ہوگا جس پر کھڑی ہو کر عموماً ہیروئن' ہیرو کے فراق میں درد بھرے گیت گاتی ہے' وہ پل بھی وہیں ہے" آفاق نے بتایا "لیکن یہ مت سمجھئے گا کہ میں بھی لکیر کا فقیر بن کر انہی جگہوں پر شوٹنگ کروں گا۔ باغ بہت طویل و عریض ہے اور اس میں ہمارے مطلب کی نہایت ہی خوبصورت لوکیشنز موجود ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ وہاں شوٹنگ کے لئے کئی سہولتیں بھی میسر رہتی ہیں اس لئے میں نے اس جگہ کا انتخاب کیا ہے۔"

دفعتاً میں نے چونکتے ہوئے کہا "کیا بتایا تھا تم نے؟ ملک کا باغ...؟ اسی ملک کا جو انجانے میں آگ سے کھیل رہا ہے؟"

"نہیں۔ نہیں۔ یہ ایک اور ملک صاحب ہیں۔ یہ تو بڑے شریف آدمی ہیں" آفاق ہنس کر بولا۔

"اچھا" میں نے گہری سانس لی اور ایک لمحے کے توقف سے پوچھا "میں کل کس وقت اور کہاں پہنچوں؟"

"آپ باغ ہی میں پہنچ جایئے کیونکہ اسٹوڈیو سے ہمارے یونٹ کے روانہ ہونے اور پھر وہاں شوٹنگ شروع ہونے میں کافی وقت ضائع ہوگا۔ ظاہر ہے آپ اتنا وقت ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہوسکتے اس لئے آپ عین وقت پر ہی آجایئے گا" آفاق بولا۔

"ٹھیک ہے۔ مجھے باغ کی لوکیشن سمجھا دو" میں نے کہا۔ آفاق نے مجھے لوکیشن سمجھائی تو اندازہ ہوا کہ وہاں پہنچنا کچھ زیادہ

مشکل نہیں تھا۔

"میں پہنچ جاؤں گا" میں نے وعدہ کیا اور ریسیور رکھ دیا۔

ہماری فلم میں ستارہ ایک جاگیردار کی بیٹی تھی۔ ایک جنگجو اور مرد مار قسم کی لڑکی جو زیادہ تر مردانہ لباس پہنتی تھی اور جس کے زیادہ تر مشاغل خالصتاً مردانہ قسم کے تھے۔ وہ باقاعدہ شکار بھی کھیلتی تھی۔ مصنف سلیم سید نے بڑی خوبصورتی سے اس کردار کو تخلیق کیا تھا۔ تحریری طور پر اس کردار میں قدرے سنسنی خیزی کی جھلک نظر آتی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ جب ستارہ جیسی شخصیت اس کردار میں نمودار ہوگی اور آفاق جیسے ہدایت کار کی پیشہ ورانہ صلاحیتیں اس کو نکھاریں گی تو یہ بڑا غضب ڈھائے گا۔ میں چشم تصور سے اس کردار کی مقبولیت دیکھ سکتا تھا۔

ستارہ سے گزشتہ رات بھی اس کے گھر پر میری ملاقات ہوئی تھی اور ہم نے دیر تک فلموں ہی کے بارے میں باتیں کی تھیں۔ جب میں آنے لگا تو اس نے بھی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ کل اس کی جو شوٹنگ ہونے والی تھی میں اس پر ضرور پہنچوں۔ اب آفاق نے بھی اصرار کیا تھا تو میرا جانے کا ارادہ بن ہی گیا ورنہ مجھے معلوم تھا کہ شوٹنگ دیکھنا بڑی بوریت کا کام ہے۔ یہ انقلابات تھے زمانے کے۔ کہ سوچ میں ایسی تبدیلیاں آچکی تھیں ورنہ ایک وہ لڑکپن کا دور بھی تھا جب شوٹنگ دیکھنے کے لئے مرے جاتے تھے۔

دوسرے روز میں ملک کے باغ پہنچا تو دروازے پر ہی یونٹ کا ایک آدمی میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ میں تو نہیں جانتا تھا کہ یونٹ کا آدمی ہے لیکن اس نے ہاتھ ہلا کر گاڑی رکوائی اور اپنا تعارف کرانے کے بعد خادمانہ لہجے میں بولا "سر! آفاق صاحب نے مجھے یہاں کھڑا ہونے کا حکم دیا تھا کہ جب آپ تشریف لائیں تو آپ کو ساتھ لے کر لوکیشن پر پہنچوں تاکہ آپ کو ادھر اُدھر بھٹکنا نہ پڑے۔"

میں نے اسے ساتھ بٹھالیا۔ باغ میں ایک خاصی چوڑی پگڈنڈی موجود تھی جو بل کھاتی ہوئی نہ جانے کہاں تک جارہی تھی۔ اس شخص کی رہنمائی میں میں لوکیشن تک پہنچا جہاں لگ

بھگ پچیس افراد موجود تھے۔ ایک طرف دو کاریں اور ایک وین کھڑی تھی۔ آفاق علی پی کیپ پہنے' کیمرے کے پاس کھڑا کیمرہ مین سے باتیں کررہا تھا۔ حلیے کے اعتبار سے وہ اس وقت ڈائریکٹر کم اور سائٹ انجینئر زیادہ نظر آرہا تھا۔

سبزے کے اس طویل و عریض قطعے پر لوگوں کے درمیان لکڑی کی ایک بے ہنگم کرسی پر ایک ادائے بے نیازی کے ساتھ ستارہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ وہ شکاریوں والے لباس میں تھی لیکن یہ لباس صرف تراش خراش کے اعتبار سے شکاریوں والا تھا۔ رنگ اس کا سرخ تھا۔ سرخ ساٹن کا ایسا لباس پہن کر اگر کوئی شکاری حقیقتاً جنگل کی راہ لیتا اور اس کا سامنا کسی بیل سے ہوجاتا تو وہ 'آبیل مجھے مار' کی عملی تفسیر بن جاتا۔

ستارہ کے چہرے پر اس وقت ہیوی میک اپ تھا۔ یہ سب فلم کی ضرورت تھی۔ اس کے سر پر بڑی خوبصورت کیپ تھی لیکن اس کی لمبی' ریشمی زلفیں اس ٹوپی کے نیچے سمٹی ہوئی نہیں تھیں بلکہ پشت پر پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ لانگ بوٹ پہنے ہوئے تھی۔ کئی آدمی اس کے اردگرد مؤدبانہ سے انداز میں کھڑے تھے اور اس کے قریب ہی گھاس کے فرش پر ایک نوعمر لڑکا اس کا میک اپ بکس لئے بیٹھا تھا۔

ایک طرف سبزے کی باڑھ کے قریب مجھے ایک موٹی سی عورت بیٹھی نظر آئی جس نے بے تحاشہ سرخی اور غازہ تھوپا ہوا تھا۔ وہ خاصا زرق برق اور قیمتی لباس پہنے ہوئے تھی مگر بے ہنگم نظر آرہی تھی۔ اس کے ساتھ سانولی سی ایک لڑکی تھی جو ویسے تو خاصے سلیقے کا میک اپ کئے ہوئے تھی اور ویلوٹ کی پتلون پہنے ہوئے تھی مگر پھر بھی اس کے خدوخال سے کچھ گنوارپن سا جھلک رہا تھا۔ شاید وہ ماں بیٹی تھیں۔ دونوں ہی پُراشتیاق سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

میں ان کے قریب سے گزر کر اس طرف جانے لگا جدھر کیمرہ مین کھڑا تھا کہ لڑکی نے اٹھ کر بڑی ادا سے میرا راستہ روک لیا۔ اس کی ساتھی عورت بھی قریب آگئی۔ لڑکی اتنی دھیمی آواز میں بولی کہ دوسرے لوگ نہ سن سکیں "ہم آپ سے ملنے کے اشتیاق میں مرے جارہے ہیں اور آپ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے۔"

اس کے لباس سے ایک عام سے کلون کی تیز خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ سراپا دعوت تھی اور لگتا تھا کہ اسے اردگرد موجود لوگوں کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔

"کیا کام ہے؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

میرے لہجے کی سرد مہری کو محسوس کرتے ہوئے شاید اسے خاصا زوردار دھچکا لگا۔ غالباً وہ یہی سوچ کر آئی تھی کہ اس لباس میں' اس لہجے میں اور اس طرح اٹھلا کر وہ کسی مرد سے بات کرے گی تو وہ فوراً ریشہ خطمی ہوجائے گا' مرغ بسمل کی طرح وہیں لوٹنے لگے گا۔

اب غالباً ماں نے بات کو آگے بڑھانا مناسب سمجھا اور لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "ارے سیٹھ صاحب! آپ نے اسے نہیں پہچانا؟ اپنی ہی بچی ہے..." وہ اس طرح بات کررہی تھی جیسے خود میری بڑی پرانی شناسا ہے اور سفارش کے لئے کسی کو ساتھ لے کر آئی ہے۔

"آپ 'بچی' کی بات کررہی ہیں۔ میں نے تو ابھی آپ کو بھی نہیں پہچانا" میں نے خشک لہجے میں کہا "اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس تیس سالہ بچی کا تعارف کرادیں۔ لیکن ایک بات کا خیال رکھئے گا کہ میں سیٹھ صاحب کہلانا پسند نہیں کرتا۔ یہ لقب مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا۔"

اب بڑی بی بھی کچھ کھسیانی سی ہوگئیں لیکن اپنی خوشامدانہ خوش خلقی برقرار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے بولیں۔ "سیٹھ... میرا مطلب ہے سر... یہ ہنی ہے" اس نے ایک بار پھر لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ اندر ہی اندر وہ کچھ نروس سی ہوگئی تھی' ...شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کس طرح آگے بڑھائے۔ یونٹ کے افراد ہم سے کچھ فاصلے پر تھے لیکن اب ان کی نظریں بھی ہماری ہی طرف تھیں۔ سب سے زیادہ غور سے ستارہ ہماری طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ میری حالت سے لطف اندوز ہورہی تھی یا ان ماں بیٹی کی کیفیت سے۔

بڑی بی بات جاری رکھتے ہوئے بولیں "میری بیٹی ہے یہ ...شاید آپ نے اس کا نام سنا ہو۔ فلم 'جوانی دیوانی' میں اس کا بڑا اچھا کلب ڈانس تھا جی۔ اگر سنسر والے اس کا بیڑا غرق نہ کرتے تو صرف اس ایک ڈانس کی وجہ سے پورے ملک میں ہنی کے نام کا ڈنکا بج رہا ہوتا" بڑی بی کی آواز میں افسردگی سی جھلک آئی "بہرحال.... جو کچھ بچا تھا اس نے بھی خاصی دھوم مچائی تھی جی.... لیکن انڈسٹری میں میری بچی کے خلاف سازشیں شروع ہوگئیں۔ پرانی ڈانسرز اور وہ ہیروئنیں جن کا زیادہ دارومدار ڈانس پر ہی ہے انہوں نے ہنی کے پاؤں نہیں جمنے دیئے اور یہ دوبارہ کسی فلم میں کاسٹ نہیں ہوئی۔ میں آپ سے بس اسی سلسلے میں ملنا چاہتی تھی کہ آپ اسے ایک بار آزما کر تو دیکھیں ..چانس تو دے کر دیکھیں۔ روپے پیسے کی ہمیں کوئی پروا نہیں۔ بس بچی کو شوق ہے۔ میں اس سلسلے میں کئی بار آپ کے ڈائریکٹر صاحب سے ملی مگر وہ ہمیشہ ٹال دیتے ہیں۔ ویسے تو بہت اچھے ہیں یہ بے چارے آپ کے آفاق صاحب۔ لیکن اتنا میں ضرور کہوں گی کہ پروڈکشن میں ذاتی پسند ناپسند کا زیادہ خیال رکھتے ہیں۔ مارکیٹ ویلیو اور کام کو زیادہ نہیں دیکھتے۔ میں نے ان سے کئی بار کہا کہ اچھا نہیں سیٹھ... میرا مطلب ہے صاحب جی سے ہی

ملوا دیں لیکن انہوں نے یہی جواب دیا کہ صاحب کے پاس لوگوں سے ملنے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ آج تو یہ بس اتفاق سے ہی ہمیں پتا چل گیا کہ آپ بذاتِ خود شوٹنگ پر تشریف لا رہے ہیں۔ تو ہم نے سوچا' چلو آج وہیں چل کر قسمت آزمائی کر لیتے ہیں ...اور آخر آج آپ کے نیاز حاصل ہو ہی گئے۔"

میں نے اب صحیح طور پر اس لڑکی کا سرتاپا جائزہ لیا جسے اس کی ماں ہنی کہہ رہی تھی۔ وہ ایک سرو قد لڑکی تھی۔ رنگت بے شک سانولی تھی لیکن نین نقش برے نہیں تھے بلکہ اسکرین کے لئے تو خاصے موزوں تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اسکرین پر اس کا چہرہ اچھا خاصا پُرکشش معلوم ہو سکتا تھا۔ اس کے متناسب خدوخال بتاتے تھے کہ رقص کے میدان میں بھی اس نے خاصی جان ماری ہوئی تھی۔ اس بات کا خاصا امکان نظر آتا تھا کہ وہ اسکرین پر دھوم مچا سکتی تھی۔ معلوم نہیں کیوں آفاق اس سے رُکھائی برت رہا تھا۔ تاہم میں اس ضمن میں آفاق سے بدگمان ہونے کے لئے تیار نہیں تھا۔ آفاق بہرحال اپنے کام سے مخلص تھا۔ وہ اگر ذاتی پسند ناپسند کو ترجیح دیتا تھا تو اس میں بھی بہرحال کام کی بہتری اس کے پیش نظر ہوتی تھی۔ ذاتی پسند کا خیال رکھتے ہوئے وہ کام کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا۔

ہنی امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔ اپنے تمامتر سستے پن کے باوجود وہ بہرحال تھوڑی بہت عزت و ہمدردی کی مستحق تو تھی۔ اس کا انداز اور اس کا میدان عمل دوسروں کے لئے ناپسندیدہ سہی لیکن جدوجہد تو بہرحال وہ بھی کر رہی تھی۔ اس کارخانۂ جہاں میں اپنا خون تو وہ بھی جلا رہی تھی۔

اس بار میرے لہجے میں خود بخود نرمی آگئی "آفاق کے پاس آپ کا ایڈریس وغیرہ تو ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ ان کے پاس ایڈریس' فون نمبر سب کچھ ہے۔ گلبرگ میں کوٹھی ہے جی اپنی۔ آپ کبھی تشریف لائیں نا' ہنی بڑی خاطر مدارت کرنے والی بچی ہے" بڑی بی نے جوش و خروش سے کہا اور آخری الفاظ ادا کرتے وقت غیر ارادی طور پر ان کی ایک آنکھ معنی خیز انداز میں دب گئی لیکن پھر غالباً انہیں یاد آگیا کہ ابھی وہ میرے مزاج کے بارے میں کوئی اندازہ قائم نہیں کر سکی ہیں اس لئے فوراً سنبھل کر سنجیدگی سے بولیں "تو پھر ہمارے لئے کیا حکم ہے؟"

"حکم کیا... بس گزارش ہے بی بی! کہ آپ اطمینان سے گھر تشریف لے جائیں۔ میں ہنی کا نام ذہن میں رکھوں گا اور جیسے ہی کوئی ضرورت محسوس ہوئی آپ سے رابطہ قائم کروں گا" میں نے ملائمت سے کہا۔ میرے لہجے میں نہ تو طنز تھا اور نہ ہی میرا انداز ٹرخانے والا تھا۔ وہ دونوں تشکر بھرے انداز میں مسکرائیں اور خدا حافظ کہہ کر چل دیں۔ میں نے یونٹ کے افراد کے قریب پہنچ کر مڑ کر دیکھا۔ وہ ماں بیٹی ایک اچھی اور تقریباً نئی گاڑ[ی میں] بیٹھ رہی تھیں۔

میں کیمرے کے قریب پہنچا تو ستارہ نے مخمور سی آنکھو[ں] ایک ادا کے ساتھ میری طرف دیکھا اور شوخ لہجے میں بولی" کب جا رہے ہو ہنی کے گھر؟"

"جب تمہارا حکم ہو۔ کہو تو ابھی چلا جاؤں؟" می[ں نے] سادگی سے کہا۔

"ہاں۔ دل تو یہی چاہ رہا ہوگا" اس کی مترنم ہنسی ابھری۔

"بے شک۔ بلکہ دل تو یہی چاہ رہا تھا کہ ان کے سا[تھ] بیٹھ کر چلا جاؤں" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

تب وہ حقیقتاً سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "سچ سچ بتاؤ۔ کیا ... سے ملاقات طے نہیں ہوئی؟" میں یہ محسوس کر کے حیران ... کہ اس کے لہجے کی تہ میں رقابت کی خفیف سی کاٹ تھی۔ ... اس سے کوئی عہد و پیماں نہیں تھا' اس کی عنایتیں مجھ پر ... تھیں لیکن میں نے کبھی ٹوہ نہیں رکھی تھی کہ میرے علاوہ ا[س کی] نگاہِ التفات کس کس پر ہے؟ اس کے شب و روز کس حد ... پرائے ہیں۔ وہ بہت پہلے کی بات تھی جب اس کی محبت ا[ور] قربت میری کل کائنات تھی اور جب یکایک اس کی خود غرض[ی اور] ہرجائی پن کا سامنا کرنا پڑا تھا تو دل پر قیامت گزر گئی تھی ... لڑکپن کی باتیں تھیں جب سوچوں میں اچھوتے پن کی خوشبو ... اور ذرا ذرا سی بات پر رگوں میں سنسنی دوڑ جاتی ... اس وقت عشق میں شکست کے صدمے نے مجھے اندر ... پھوڑ کر رکھ دیا تھا' سنبھلنے میں بہت وقت لگا تھا۔ مگر اب تو ا... اور میری ذات پر جانے کیا کیا انقلابات گزر گئے تھے۔ ... پاس اس کے لمحوں کا کوئی حساب نہیں تھا اور نہ ہی میں اُ... زندگی کا کوئی حساب دینا چاہتا تھا۔ اور اس بات سے وہ ... واقف تھی۔ تو پھر یہ رقابت کیسی؟

میں اب کبھی اگر خود کو تنہا محسوس کرتا تھا تو اس کے ... جاتا تھا یا اس کا دل زمانے سے بیزار ہوتا تھا تو وہ مجھے فون ... تھی۔ ان ملاقاتوں کی کوئی حدود و قیود نہیں تھیں۔ ہو بھی ... سکتی تھیں۔ ہم اب جس دنیا کے باسی تھے وہاں وہ سب با[تیں] تقدس کے قصے' وہ اچھوتے پن کی کہانیاں بڑی بچکانہ ... تھیں۔ اور برسوں پہلے ہماری تو ملاقاتوں کا آغاز ہی پارسائ[ی کے] لئے کچھ ایسا قابلِ رشک نہیں تھا۔ اب تو ہماری راہیں ... جدا تھیں۔ بس دوڑتی بھاگتی زندگی کے دامن سے خوشبو[دار] چند لمحے چرانے کے لئے ہم مل بیٹھتے تھے۔ ایک ہلکا سا تعلق ... بھی تھا مگر میرا خیال ہے اس تعلقِ خاطر میں بھی رقابت ... گنجائش تو نہیں تھی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ کچھ چونک ... جیسے میں نے اس کے خیالات کو پڑھ لیا ہو۔ فوراً ہنس د...

اس بار بولی تو اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اداکارہ تھی نا۔

"میں اس لئے پوچھ رہی تھی کہ ماں بیٹی بڑی خوش خوش گئی ہیں" وہ رقابت سے عاری لہجے میں بولی "حالانکہ بات کرتے وقت تمہارا چہرہ تو خاصا پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا جبکہ کسی اور سے بنی اس طرح اٹھلا کر بات کرتی تو اس کی آنکھوں میں ہزار ہزار واٹ کے بلب روشن ہو جاتے۔"

"وہ خوش خوش اس لئے گئی تھیں کہ میں نے آخر میں ان سے ذرا احترام اور شائستگی سے بات کر لی تھی" میں نے کہا "اور جہاں تک آنکھوں میں قمقمے روشن ہونے کا سوال ہے تو اب میری آنکھوں میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر قمقمے روشن نہیں ہوتے۔"

آفاق میرے قریب ہی خاموش کھڑا تھا۔ میں نے سرسری سے لہجے میں اس سے کہا "یہ لڑکی بنی کیا فلموں میں بالکل نہیں چل سکتی؟"

ایک لمحے کے تذبذب کے بعد وہ دھیمی آواز میں بولا "چل تو سکتی ہے... بلکہ اچھا خاصا تہلکہ مچا سکتی ہے۔ اس سے کہیں کمزور اور دھیمی لڑکیوں نے ہلچل مچائی ہوئی ہے۔ یہ تو پھر بھی رقص کے میدان میں حقیقتاً دخل رکھتی ہے۔ محض اچھا کود یکھ کر نہیں آئی لیکن بات صرف اتنی ہے کہ میں اس لڑکی سے ڈرتا ہوں..."

"ڈرتا ہوں...؟" میں نے تعجب سے دہرایا۔

"جی ہاں" وہ بدستور متذبذب سے لہجے میں بولا "آپ کو یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہوگا کہ موصوفہ آج تک صرف ایک ہی فلم میں آئی ہیں اور اس میں بھی ان کا کام صرف ایک کلب ڈانس تک محدود تھا لیکن آپ نے دیکھا ہوگا کہ محترمہ کیسی شاندار گاڑی میں آئی تھیں۔ اس کے علاوہ شاید انہوں نے آپ سے اپنی کوٹھی وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہو۔ یہ حقیقت ہے کہ یہ محترمہ گلبرگ کی ایک خاصی شاندار اور آراستہ و پیراستہ کوٹھی میں رہتی ہیں۔ نوکر چاکر بھی ہیں۔ صرف ایک فلم میں معمولی سا کام اور یہ ٹھاٹ باٹ! میری سمجھ میں نہیں آتا..."

"تکلف برطرف آفاق" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر کہا "مجھے تو تمہارے منہ سے یہ باتیں نہایت بچکانہ لگ رہی ہیں۔ فلم انڈسٹری میں تم اچھے خاصے پرانے آدمی ہو۔ تمہارے لئے یہ باتیں حیرت کا باعث نہیں ہونی چاہئیں۔ تمہیں تو ان عورتوں کے سلسلے معلوم ہی ہوں گے۔ پھر حیرت کی کیا بات ہے؟"

"میں وہی بتانے لگا تھا" وہ ملائمت سے بولا "سلسلے تو ہمیں معلوم ہی ہوتے ہیں... لیکن پھر بھی میرا خیال ہے کہ تمام تر سلسلوں کے باوجود بنی جیسی عورت کے اتنے ٹھاٹ باٹ نہیں ہو سکتے۔ وہ کوئی ایسی غیر معمولی حسین بھی نہیں ہے کہ اس پر بہت زیادہ دولتمند لوگ مہربان ہو سکیں..."

میں نے ایک بار پھر آفاق کی بات کاٹی "میں نے ا بھی کمتر اور کم رو عورتوں پر بڑے بڑے سیٹھوں کو مہربان ہو"

"میں اس امکان کو بھی تسلیم کرنے لگا تھا لیکن ساتھ ساتھ میں آپ کو کچھ اور بھی بتانے لگا تھا" آفاق

"اور وہ یہ کہ ایک زمانے میں بڑے عرصے تک سی آئی ڈی کے پیچھے لگی رہی۔ اس زمانے میں دو ایک جگہوں پر بم دھماکے ہوئے تھے۔ بڑی اہم نوعیت کی عمارتوں میں۔ نقصان ہوا تھا۔ سرکاری ایجنسیوں کو شبہ تھا کہ یہ لڑکی دھماکوں میں ملوث تھی۔ اسے شاید تفتیش میں خاصا گ لیکن سنا ہے کہ صوبے کی ایک نہایت بااثر شخصیت بچا لیا تھا۔ اس کے بعد یہ کچھ عرصے تک بالکل غائب ہو کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ پھر اچانک دوبارہ نمودار ہو فلموں میں کام حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار روپے پیسے کی بھی اسے کوئی پروا نہیں بلکہ الٹا کمزور فلمسازوں کی مدد کرنے کے لئے تیار رہتی ہے۔ کچھ عرصہ نے مجھے پیش کش کی تھی کہ اگر میں اسے اپنی فلم میں رول دے دوں تو وہ معاوضہ لینے کے بجائے پچیس ہزار سکتی ہے۔ اس وقت میرے جو حالات تھے ان میں یہ میرے لئے بہت دل کش تھی لیکن میرے ضمیر نے گوارا ...یا شاید میں اس سے کسی قسم کا تعلق رکھتے ہوئے ڈر شاید میں اتنا باضمیر ہوں نہیں جتنا خود کو سمجھتا ہوں۔"

وہ ایک بار پھر عجیب سے انداز میں مسکرایا "میں حق تک اس لڑکی کی جدوجہد کا مقصد نہیں سمجھ سکا۔ اگر لڑکیاں اگر فلموں میں آنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارتی بھی ہیں کا مقصد مارکیٹ ویلیو بنانا ہی ہوتا ہے۔ وہ چاہتی ہیں کہ گلیمر انداز میں دولت مندوں کی نظر میں آجائیں کیونکہ شکل و صورت کی بھی کوئی لڑکی اگر اسکرین کے ذریعے نظر میں آئے تو اس کی شخصیت کا تاثر ہی کچھ اور ہو جا اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے۔ لیکن اس لڑکی کا مسئلہ معلوم نہیں ہوتا۔ اس کے پاؤں تو پہلے ہی بہت مضبو روپے پیسے کی اس کے پاس کوئی کمی معلوم نہیں ہوتی۔ باوجود یہ چھوٹے چھوٹے کرداروں کے لئے دھکے کھاتی ڈائریکٹرز اور پروڈیوسر اس سے کتراتے ہیں۔ یہ درست ہے یز میں سارے کے سارے کوئی شریف زادے اور نیک نہیں ہیں لیکن بہرحال جن میں کوئی بدمعاشی یا بے راہ رو بھی ہے تو وہ خاصی بے ضرر اور ذاتی نوعیت کی ہوتی ہے۔ طور پر وہ زیادہ خطرناک یا ملک و قوم کے بدخواہ نہیں ہو لئے اس لڑکی سے مجھے خوف آتا ہے۔ میں تو اس سے ز بھی اخلاق سے پیش نہیں آتا۔ اب شاید آپ میرا مطلب گئے ہوں گے۔"

"ہاں۔ میں سمجھ گیا" میں نے اس لڑکی کا نام اور شکل ذہن کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہم نے تو اس لڑکی کے باتیں کرنے میں کچھ زیادہ ہی وقت ضائع کر دیا" میں نے بھی۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اس لڑکی کے بارے میں کچھ سوچ رہا تھا "شکر ہے تمہیں وقت کا خیال تو آیا" ستارہ ب تک خاموش بیٹھی تھی گہری سانس لے کر بولی "اور صرف تمہارا ہی نہیں ہمارا بھی قیمتی ہے۔ تمہاری اور آفاق لم نہ ہوتی تو میں کب کی جا چکی ہوتی۔ آدھے گھنٹے سے بیٹھی ک شروع ہونے کا انتظار کر رہی ہوں۔ اوپر سے تم آئے ہو تو ی اس پراسرار حسینہ میں الجھ کر رہ گئے" اس کے لہجے میں قطعاً نہیں تھی۔

"حسینہ تو خیر وہ نہیں تھی" میں نے مسکراتے ہوئے اس کا پا جائزہ لیا "حسین تو آج تم لگ رہی ہو۔ سراپا شعلہ دکھائی رہی ہو۔"

"اس قسم کے جملے مجھے تقریباً ہر سیٹ پر ہی سننے کو ملتے ہیں تم کہہ رہے ہو تو واقعی میرے لئے اعزاز ہے" وہ مسکرائی میں اس کی مسکراہٹ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس مسکراہٹ نوخیز اور نہایت سادہ لوح لڑکیوں والا شرمیلا پن تھا۔ میک کی تہوں میں اس کی اصل رنگت تقریباً چھپی ہوئی تھی پھر بھی یوں لگا جیسے اس کے رخساروں پر حیا کی شفق لہرائی ہو۔ ایک ے کے لئے تو میں دم بخود رہ گیا۔ کیا اس جیسی گھاگ، جہاں اور سرد و گرم چشیدہ عورت یوں بھی مسکرا سکتی ہے؟ میرا دل رہا تھا کہ یہ اداکاری بھی نہیں تھی۔ کوئی بڑی سے بڑی کارہ بھی یہ اداکاری کر ہی نہیں سکتی تھی۔ اداکاری الگ سے ی بات ہے۔ بات شاید صرف یہ تھی کہ عورت خواہ کتنے ہی ات سے گزر لے، کتنے ہی طوفانوں کے تھپیڑے سہہ لے، ثاتِ زمانہ سے اس کی شکل کتنی ہی بدل جائے لیکن وہ جو اس اندر ایک سادہ و معصوم اور زمانے کے پیچ و خم سے ناآشنا مدفون ہوتی ہے وہ کبھی نہ کبھی ضرور اپنی جھلک دکھاتی ہے۔ شاید مخصوص حالات میں۔ اور مخصوص انسان کے سامنے۔

میں چونک کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔ ستارہ کہہ ی تھی "میں وقت کی بہت پابند ہوں اور سب لوگ میری اس ت کی بہت تعریف کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی اپنی اس عادت کی سے مجھے بہت کوفت اٹھانی پڑتی ہے۔"

"اگر شوٹنگ صرف میرے انتظار میں رکی ہوئی تھی تو میں تو ا ہوں" میں نے آفاق کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

"اب ہمیں ایک اور شخصیت کا انتظار ہے جو اس وقت ے لئے آپ سے بھی زیادہ اہم بن گئی ہے" آفاق بولا۔

"کون ہے وہ خوش نصیب جس کے انتظار میں ایسے ایسے ماہ بیٹھے ہیں؟" میں نے ستارہ کی طرف اشارہ کیا۔

"وہ ایک سائیس ہے" آفاق بولا "سائیس سمجھتے ہیں آپ؟ وہ جو گھوڑے پالتے ہیں، ان کی نگہداشت کرتے ہیں یا اصطبل کے نگران وغیرہ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ ہمیں ایک سائیس کا انتظار ہے جو صرف ایک عدد گھوڑے کا مالک ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا ایک اسسٹنٹ بول اٹھا "دینو آگیا سر" وہ ایک طرف اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ شلوار قمیص میں ملبوس ایک نیم دیہاتی سا شخص نہایت خوبصورت اور بگلے جیسے سفید گھوڑے پر سوار نہایت تیز رفتاری سے چلا آ رہا تھا۔ ایک موٹر سائیکل سوار اس کے آگے آگے تھا۔ گھوڑا کچھ سرکش سے انداز میں دوڑ رہا تھا اور بار بار ہنہنا رہا تھا۔ گھڑ سوار دینو یقیناً وہی سائیس تھا جس کا یہاں بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔

"بڑے ٹھاٹ ہیں بھئی دینو کے" میں نے خوشدلی سے کہا۔ "اس کے آگے آگے تو ایک پائلٹ بھی چلتا ہے۔ جس طرح بڑے لوگوں کی سواری کے آگے چلتا ہے۔ کیا یہ موٹر سائیکل سوار اس کا ملازم ہے؟"

"نہیں سر! وہ ہمارا ملازم ہے" آفاق مسکرایا "اسسٹنٹ پروڈکشن منیجر ہے۔ اسے میں نے بھیجا تھا کہ جا کر دینو کو بلا لائے کیونکہ دینو نے خلاف معمول آج وقت دے کر لوکیشن پر پہنچنے میں بہت تاخیر کر دی تھی ورنہ اس کا ریکارڈ ہے کہ جہاں بھی اسے طلب کیا جاتا ہے یہ بالکل صحیح وقت پر اپنے گھوڑے کو لے کر پہنچ جاتا ہے۔"

اس دوران موٹر سائیکل سوار اور دینو، دونوں ہی اس طویل و عریض سبزہ زار پر پہنچ چکے تھے جہاں ہمارا فلمی یونٹ موجود تھا۔ دینو کو گھوڑے کو روکنے اور ایک درخت سے باندھنے میں قدرے دشواری پیش آئی۔ پھر وہ آ کر گویا میرے اور آفاق کے قدموں میں تقریباً لوٹنے لگا۔

"معافی چاہتا ہوں سرکار کہ آپ کو مجھے بلانے کے لئے بندہ بھیجنا پڑا" وہ نہایت عاجزانہ لہجے میں بولا "آپ کو تو معلوم ہے، میں وعدے کا بڑا پابند ہوں لیکن آج میری گھر والی کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی۔ میں اس کے لئے دوا دارو لانے میں الجھ گیا تھا" پھر وہ گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "بجلی نے بھی تھوڑا سا ٹائم ضائع کیا۔ اسے بھی تھوڑا بہت سمجھانا اور پچکارنا پڑا۔ لگتا تھا کہ آج اس کا شوٹنگ کا موڈ ہی نہیں ہے" بجلی اس کے گھوڑے کا نام تھا اور وہ اس کا ذکر بالکل اسی طرح کر رہا تھا جیسے وہ کوئی ذی فہم انسان ہے۔

"کوئی بات نہیں" آفاق ملائمت سے بولا "اب کیسی طبیعت ہے تمہاری بیوی کی؟"

اس نے گویا نادانستگی میں دینو کی کوئی دکھتی رگ چھیڑ دی۔ وہ یکدم گلابی اردو سے خالص پنجابی پر آگیا اور قدرے بے زاری

سے بولا "صاحب جی! تہانوں تے پتا اے کہ غریباں دی زنانیاں دی ہمیشہ ای کوئی نہ کوئی چول ڈ ئی. رہندی اے۔"

"گل تے تری ٹھیک ای اے" آفاق ہنس کر بولا۔

"خیر جی... چھڈو ا ینہاں گلاں نوں... تسی شوٹنگ نبیڑو۔ میں ذرا بیہہ کے سوٹا لاناں واں" وہ ایک طرف جا بیٹھا اور سگریٹ سلگانے لگا۔ آفاق اپنے اسسٹنٹ کے ساتھ سین کی تیاری کرنے لگا۔ اسکرپٹ کے ورق الٹ پلٹ کر دیکھے جانے لگے۔ ...کیمرہ مین کیمرے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک گھوڑے کے آجانے سے گویا پورے یونٹ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ میں ستارہ کے قریب ہی ایک فولڈنگ چیئر پر بیٹھا تھا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا تھا' اس سین میں ستارہ کو خاصی گھڑ سواری کا مظاہرہ کرنا تھا۔ جبکہ گھوڑا مجھے خاصا مضطرب اور بے چین نظر آرہا تھا۔

"کیا یہ گھوڑا ہمیشہ اسی طرح بے چین' مضطرب اور سرکش سا نظر آتا ہے؟" میں نے ستارہ سے پوچھا۔

"مجھے تو معلوم نہیں" ستارہ مسکرا کر بولی "مجھے تو پہلی مرتبہ اس سے کام لینے کا اتفاق ہو رہا ہے۔ ویسے سنا ہے' انڈسٹری میں بڑا مشہور و مقبول گھوڑا ہے۔ تقریباً سبھی نامور ہیروئنیں اس پر سواری کر چکی ہیں۔"

"تمہیں گھڑ سواری آتی بھی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی خاص نہیں" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "لیکن مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے تو صرف چند ایک قریب کے شاٹس پکچرائز کرانے ہیں جو بیچ بیچ میں ایڈیٹنگ کے دوران جوڑ دیئے جائیں گے۔ زیادہ تر کام تو لانگ شاٹس میں ہوگا جو میرے ڈپلیکیٹ پر پکچرائز کئے جائیں گے۔"

"مجھے تو یہاں تمہارا کوئی ڈپلیکیٹ نظر نہیں آرہا" میں نے ادھر ادھر دیکھا۔

"وہ اس کوٹھری میں گیٹ اپ کرنے گیا ہوا ہے" ستارہ نے کافی دور واقع ایک کٹیا نما کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ...کچھ دیر پہلے میں نے چھریرے جسم کے ایک سانولے سے نوجوان کو ایک تھیلا اٹھائے اس کمرے کی طرف جاتے دیکھا تھا۔

دفعتاً اس کمرے کا دروازہ کھلا اور میں نے سانولی سی ایک لڑکی کو کمرے سے برآمد ہوتے دیکھا جو بالکل ستارہ جیسے کپڑے پہنے ہوئے تھی نہیں بلکہ' تھا' یعنی درحقیقت وہ وہی سانولا سا نوجوان تھا جو کچھ دیر پہلے تھیلا اٹھائے کمرے میں گیا تھا۔ وگ اور چند دوسری چیزوں کی مدد سے وہ کافی حد تک لڑکی نظر آنے لگا تھا۔ قریب آکر وہ ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔

بالآخر سین ستارہ کو سمجھایا گیا اور پھر کلیپ دی گئی۔ یہ صرف ایک تختی کیمرے کے سامنے لانے کا عمل ہوتا ہے جس پر فلم کا نام' سین نمبر اور شاٹس نمبر لکھا ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک شاٹ جتنی ٹیکس میں اوکے ہوتا ہے وہ نمبر بھی ترتیب وار چاک سے اس پر لکھتے چلے جاتے ہیں۔

فی الحال ستارہ کو گھوڑے پر سوار ہو کر گھاس کے صرف طویل و عریض قطعے پر ایک سرے سے دوسرے سرے تک... تھا۔ پس منظر میں کچھ درخت بھی تھے جن سے جنگل کا تاثر... تھا۔ کیمرہ وغیرہ سیٹ ہو چکا تو یہ سین بغیر ریہرسل کے شروع ہوا۔ گھوڑے پر سوار ہونا بہرحال ستارہ کو آتا تھا اور وہ بڑی ادا... سوار ہوئی۔ اس عمل کو اس نے کچھ ایسا بنا دیا کہ میرے اندازے کے مطابق سیٹ پر موجود لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں کئی گنا... گئی تھیں اور ان لوگوں میں ظاہر ہے میں بھی شامل تھا۔

گھوڑا بدستور ہنہنا رہا تھا' زمین پر بے چینی سے کھر رگڑ رہا... ...کیمرہ اسٹارٹ' کی آواز سن کر جیسے ہی ستارہ نے لگام کو ہلکا... جھٹکا دیا' گھوڑا مطلوبہ رفتار سے چلنے کے بجائے توپ سے... ہوئے گولے کی طرح دوڑ پڑا۔ کیمرہ مین نے جو فریم ذہن میں... رکھے تھے' آفاق کے ذہن میں جو زاویے تھے اور ستارہ کی نگاہ... انداز نے ابھی لوگوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز کرنے کا جو سامان... کرنا تھا' وہ سب کچھ دھرا کا دھرا رہ گیا۔

سب لوگ ہکا بکا کھڑے رہ گئے اور گھوڑا ہوا ہو گیا۔ پلک... جھپکتے میں اس نے گھاس کا وہ طویل و عریض قطعہ عبور کر لیا... تیکنیکی حساب سے اسے نہ جانے کتنے مرحلوں میں عبور کرنا تھا... ہوا کے دوش پر ستارہ کی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی۔ سب لوگ... بے وقوفوں کی طرح کھڑے تھے۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا... کیا کیا جائے۔

مجھے چونکہ گھوڑے کی حالت پہلے ہی کچھ تسلی بخش نہیں... لگ رہی تھی اس لئے میں اندر ہی اندر مضطرب تھا لیکن افسوس... کہ میں نے اپنے اضطراب اور عدم اطمینان کا اظہار بروقت... نہیں کیا تھا۔ میں آفاق وغیرہ کی وجہ سے بظاہر مطمئن رہا تھا کہ... ٹریڈ کے لوگ ہیں' انہیں اپنے معاملات کا مجھ سے زیادہ علم... کہیں میں خواہ مخواہ کے خدشات کا اظہار کر کے ان کا وقت... ضائع کروں۔

میں گھوڑے کی پہلی زقند دیکھتے ہی اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا... لیکن حقیقت یہ تھی کہ فوری طور پر میں بھی کوئی فیصلہ نہیں کر سکا... تھا کہ کیا کرنا چاہئے۔ گھوڑا سبزے کا قطعہ عبور کر کے اس... لیکن کشادہ راستے پر چھلانگ لگا چکا تھا جو باغ کے درمیان... ادھر بل کھاتا ہوا باغ کے گیٹ کی طرف جا رہا تھا۔

میری گاڑی بھی سامنے اسی راستے پر کھڑی تھی۔ میں نہایت... تیزی سے گاڑی تک پہنچا اور چشم زدن میں اسے اسٹارٹ کر کے... گھوڑے کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ گاڑی کسی غضبناک... کی سی غراہٹ کے ساتھ آگے بڑھی۔ گھوڑا ویسے ہی برق رفتار... معلوم ہوتا تھا اور اس وقت تو اس کی رفتار میں ایک ... اور وحشیانہ سی تیزی آچکی تھی۔ وہ اس وقت خاصی دور... ...ہر میری نظر سے اوجھل ہو رہا تھا۔

...راستہ ایسا نہیں تھا کہ میں زیادہ تیز رفتاری سے گاڑی چلا سکتا۔ ...میں اس وقت گھوڑے سے کافی پیچھے تھا جب میں نے اسے باغ ...گیٹ سے نکلتے دیکھا اور جب تک میری گاڑی گیٹ سے نکلی ...تک گھوڑا اور بھی آگے نکل چکا تھا۔ وہ اب پختہ سڑک پر ...رہا تھا جس کے دونوں طرف درختوں کی قطاریں تھیں۔

ستارہ اب گھوڑے پر بیٹھی نہیں تھی بلکہ ایک طرف کو اس ...لٹک گئی تھی کہ اس کے دونوں پاؤں رکابوں ہی میں پھنسے ...ہوئے تھے اور ایک ہاتھ زین کی کسی بندش میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ ...دوسرے ہاتھ سے وہ گھوڑے کی گردن کے گرد پیچھے کی طرف سے ...لپٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کبھی وہ گردن کو پکڑنے میں ...کامیاب ہو جاتی تھی اور کبھی گھوڑے کی گردن اس کے بازو کے ...گھیرے سے نکل جاتی تھی اور وہ ذرا زیادہ نیچے کو جھولنے لگتی تھی۔ ...اس کے لمبے ریشمی بال سڑک پر گھسٹنے لگے تھے۔ غنیمت یہی تھا کہ ...اس کی پوزیشن زیادہ خطرناک نہیں تھی۔ اگر وہ پکی سڑک پر ...گر پڑتی یا اس طرح گھوڑے کے ساتھ گھسٹ رہی ہوتی کہ سر یا ...جسم کا کوئی اور حصہ سڑک سے ٹکرا رہا ہوتا تو اس کے بچنے کی ...امید کم تھی۔ وہ اب چیخنا بھی بھول چکی تھی۔ بس خاموشی سے ...گھوڑے سے چمٹے رہنے کی کوششوں میں مصروف تھی۔ گویا اس ...وقت تک اس کے حواس ضرور برقرار تھے کہ وہ سمجھ سکتی تھی کہ ...اس کی سلامتی کے زیادہ امکانات کس چیز میں ہیں۔

گھوڑا دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔ غنیمت تھا کہ وہ سیدھی ...سڑک پر ہی بھاگ رہا تھا اور اس نے جنگل میں گھسنے کی کوشش ...نہیں کی تھی ورنہ میرے لئے گاڑی میں اس کا تعاقب بھی تقریباً ...ناممکن ہوتا اور ستارہ کو بہت جلد گزند پہنچنے کا امکان بھی زیادہ ...تھا۔

میں جلد ہی گاڑی گھوڑے کے قریب لے جانے میں ...کامیاب ہو گیا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر میری گاڑی ...اوپن جیپ ہوتی تو میں کھلی چھت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ...گھوڑے پر چھلانگ لگانے کی کوشش کر سکتا تھا لیکن میں اس ...وقت بند چھت کی مرسیڈیز میں تھا۔

میں گاڑی گھوڑے سے آگے نکال لے گیا اور اس وقت ...گاڑی کی رفتار اتنی تھی کہ اگر سامنے سے کوئی گاڑی آجاتی تو ...نہایت مہلک حادثہ پیش آسکتا تھا لیکن خدا کا شکر تھا کہ سڑک ...سنسان پڑی تھی اور دوسری قابل اطمینان بات یہ تھی کہ ...گھوڑے نے گاڑی کو آگے نکلتے دیکھ کر بھی رخ تبدیل نہیں کیا ...بلکہ اسی طرح ناک کی سیدھ میں سرپٹ دوڑا چلا جا رہا تھا۔ ...اس کا انداز جنونانہ ہی تھا۔ شاید اسے گرد و پیش کا کچھ ہوش ہی ...نہ تھا۔ میرے ذہن میں اب قسمت آزمائی کی ایک ہی تدبیر ...تھی۔ میں مزید تیز رفتاری سے گاڑی گھوڑے سے بہت آگے لے گیا۔ ایک مناسب جگہ دیکھ کر میں نے گاڑی کچے میں اتار کر روک دی۔ گرد و غبار کا ایک بادل اٹھا اور میں گاڑی کا انجن اسٹارٹ اور دروازہ کھلا چھوڑ کر اترا اور دوڑ کر ایک موزوں درخت تک پہنچا۔ جوتوں سمیت تنے پر چڑھنا دشوار تھا اور جوتے اتارنے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے بندر کی طرح اچھل کر ایک شاخ پکڑی اور جسم کو دہرا کرتے ہوئے مزید ایک دو شاخوں پر منتقل ہونے کے بعد بالآخر ایک موزوں شاخ پر جم کر بیٹھ گیا۔

میری توقع کے مطابق گھوڑا بدستور اسی سیدھ میں دوڑا چلا آرہا تھا اور کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ اگر وہ مزید تھوڑا سا فاصلہ اسی طرح طے کرتا تو عین اسی شاخ کے نیچے سے گزرتا جس پر میں ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

گھوڑے نے رخ نہیں بدلا۔ میں نے حواس مجتمع کئے اور مناسب ترین لمحہ آتے ہی شاخ سے چھلانگ لگا دی۔ میری کامیابی کا سب سے زیادہ انحصار مناسب ترین 'لمحے' پر ہی تھا ورنہ ممکن تھا کہ گھوڑا مجھے روندتا ہوا گزر جاتا یا میں اس کی گردن کو گرفت میں نہ لے پاتا اور اس کے جسم کے کسی اور حصے سے ٹکرا کر محض سڑک پر گر جاتا اور یہ بھی ممکن تھا کہ میں گھوڑے کو چھو بھی نہ پاتا۔ وہ بگولے کی طرح نیچے سے گزر جاتا اور میں سیدھا سڑک پر جا گرتا۔ فلموں میں ہیرو وغیرہ اس قسم کے کام بڑی آسانی سے سرانجام دیتے نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہ بڑا مشکل اور مہارت طلب کام ہے۔ اندازے کی ذرا سی غلطی سے انسان دوسرے کی جان بچانا تو درکنار' خود بھی موت کے منہ میں جا سکتا ہے۔

مجھے عرصے سے اس قسم کی کسی سرگرمی سے واسطہ نہیں رہا تھا لیکن میرا اندازہ درست ہی رہا۔ گھوڑے کی گردن کو دائیں بازو کے شکنجے میں لیتے ہوئے میں کچھ دور اس کے ساتھ گھسٹتا چلا گیا۔ جوتوں نے میرے پیروں کو زخمی ہونے سے محفوظ رکھا۔ گھوڑا بھیانک انداز میں ہنہنایا اور اس نے گردن کو جھٹکا دے کر دوڑتے ہی دوڑتے مجھے گرانے کی کوشش کی لیکن وہ گردن کو زیادہ حرکت دینے میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا۔

اس دوران میں اپنی قوت مجتمع کر چکا تھا۔ میں نے پاؤں سڑک پر جما کر گھوڑے کو روکنے کی کوشش کی۔ اگر وہ کوئی عام سا گھوڑا ہوتا یا کم از کم اس وقت اس پر دیوانگی طاری نہ ہوتی تو شاید میں اسے روکنے میں کامیاب ہو ہی جاتا۔ لیکن دیوانگی نے اسے معمول سے کچھ زیادہ طاقتور بنا دیا تھا۔ اس کے منہ سے جھاگ اڑ رہا تھا۔

اب گھوڑے کو روکنے کا ایک ہی طریقہ رہ گیا تھا۔ میں نے اسی پر عمل درآمد کی کوشش کی پوری طاقت... اپنے دائیں بازو پر مرتکز کرتے ہوئے میں نے شکنجہ مزید سخت کیا اور پھر ایک خاص انداز میں جھٹکا دیا۔ لکڑی ٹوٹنے کی سی ایک زوردار آواز

آئی اور دوسرے ہی لمحے گھوڑے کا غیر معمولی اکڑا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا' جیسے برقی رو منقطع ہو جانے پر یک لخت کسی مشینی کھلونے نے کام چھوڑ دیا ہو۔

میں نے اسے اپنی طرف ایک اور جھٹکا دیا تاکہ کہیں وہ اس پہلو پر نہ گر جائے جدھر ستارہ لٹکی ہوئی تھی۔ وہ میری طرف گرنے لگا تو میں یکدم اسے چھوڑ کر ایک طرف کو ہٹ گیا۔

وہ غیر معمولی جسامت کی کسی مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے سڑک پر گرا۔ اس کا جسم ہولے ہولے جھٹکے کھا رہا تھا اور آنکھیں ڈراؤنے انداز میں ابل آئی تھیں۔ گردن بری طرح ایک طرف کو مڑ چکی تھی بلکہ ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں تقریباً دُہری ہو چلی تھی۔ اس کے منہ سے جھاگ اب بھی بہہ رہا تھا۔

ستارہ بدستور اس کے ساتھ الجھی ہوئی تھی اور کمزور سے انداز میں اپنے ہاتھ پاؤں آزاد کرانے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس میں شاید فی الحال اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتی۔ مجموعی طور پر یہ خاصا دل خراب کرنے والا منظر تھا تاہم میں نے اطمینان کی سانس لی کہ جس بات کا اندیشہ تھا وہ ٹل گئی تھی۔

میں نے ستارہ کا پاؤں رکاب سے اور ہاتھ زین میں الجھی ہوئی لگام سے نکالا اور اسے سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھ سے ہاتھ چھڑایا اور کچے میں اتر کر لڑکھڑاتی ہوئی ایک پتھر پر جا بیٹھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ اس کی حالت ایسی ہی تھی جیسے اسے کسی بھنور میں غرقاب ہوتے ہوئے جہاز سے آخری لمحوں میں اتارا گیا ہو اور اس کے حواس اس کا ساتھ نہ دے رہے ہوں۔

اسی اثنا میں عقب میں گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا' فلم یونٹ کے افراد اپنی بڑی سی وین میں بیٹھ کر آن پہنچے تھے۔ سب سے پہلے آفاق علی وین سے اترا اور گھبرائے ہوئے انداز میں قریب آکر سراپا میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "آپ ٹھیک تو ہیں سر؟"

اس کے سوال پر میں نے خود بھی اپنا سراپا جائزہ لیا۔ میرے سوٹ کی سلائیاں کئی جگہ سے اُدھڑ چکی تھیں۔ کوٹ کی آستینیں تو تقریباً الگ ہی ہو گئی تھیں۔ جوتوں کی ایڑیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ ٹائی کا رخ بدل چکا تھا۔ شکر ہے وہ میرے لئے پھندا نہیں بنی تھی۔ شکل و صورت اور بالوں کا کیا عالم تھا' اس کا بھی میں کافی حد تک اندازہ کر سکتا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں" میں نے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں کہا' تب وہ ستارہ کے قریب پہنچا۔ ستارہ سے بھی اس نے وہی سوال کیا جو مجھ سے کر چکا تھا۔

ستارہ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب کافی حد تک سنبھل چکی تھی تاہم چہرے پر اب بھی وحشت باقی تھی۔ وہ قدرے بدحواسی سے ہنسی اور بازو اور ٹخنے سہلاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

اس دوران دوسرے بہت سے لوگ بھی وین سے اتر آئے تھے۔ سب میری اور ستارہ کی خیر و عافیت ہی کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ آفاق' ستارہ سے کہہ رہا تھا "گاڑی میں بیٹھو' تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلیں..."

"بس.... ڈاکٹر کے پاس جانے والا کوئی مسئلہ نہیں" ستارہ نے مسکرانے کی کوشش کی "میں بہت زیادہ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ کچھ پٹھوں میں کھنچاؤ آگیا ہے۔ اس کا علاج میں خود ہی گھر جا کر ڈاکٹر سے بہتر کر لوں گی۔ اور کوئی مسئلہ نہیں ہے" پھر اس نے گہری سانس لے کر جھرجھری سی لیتے ہوئے میری طرف دیکھا "اگر تم نہ آتے تو معلوم نہیں میرا کیا حشر ہوتا۔"

"شاید وہی جو اب گھوڑے کا ہوا ہے" میں نے مردہ گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ اسی لمحے میری نظر دینو پر پڑی جو گھوڑے کے قریب ہی کھڑا پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے جیسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور وحشت زدہ سے انداز میں گھوڑے کے مردہ جسم پر ہاتھ پھیرنے لگا' جیسے اس میں زندگی کی رمق تلاش کر رہا ہو۔

"سر... کیا یہ خود ہی گر کر مر گیا ہے؟" آفاق نے گھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ اسے روکنے کے لئے مجھے اس کی گردن توڑنی پڑی" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اس کی گردن... آپ نے.... میرا مطلب ہے؟" آفاق علی کبھی گھوڑے کی طرف دیکھ رہا تھا اور کبھی میری طرف۔ یہی عالم باقی سب کا بھی تھا۔ انہیں گویا یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی انسان اور خصوصاً مجھ جیسا سوٹڈ بوٹڈ اور ایک امن پسند' مہذب سا نظر آنے والا انسان کسی سرکش اور برق رفتاری سے دوڑتے ہوئے گھوڑے کی گردن توڑ سکتا ہے۔ یقین اور بے یقینی کی ملی جلی کیفیت ان کے چہروں سے عیاں تھی۔

ستارہ نے گویا میرے بیان پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہوئے کہا "آج تو افضل صاحب نے شہری ٹارزن ہونے کا ثبوت دیا ہے" پھر وہ قدرے چہکتے سے انداز میں ہنس کر آفاق سے مخاطب ہوئی "کاش! تم یہ سارا منظر پکچرائز کر سکتے۔ یہ تمہاری فلم کا سب سے شاندار اور حقیقی سین ہوتا۔ کیا خوب گردن توڑی ہے افضل صاحب نے گھوڑے کی۔ مجھے تو اب ان سے کچھ کچھ خوف بھی آنے لگا ہے۔ اگر کسی انسان کی گردن ان کے ہاتھ میں آجائے تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہو!"

وہ پھر بھی کافی مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ بہت جلد خاصے سنگین ذہنی و جسمانی دھچکے سے سنبھل گئی تھی اور اب ماحول کا رہا سہا اثر باتوں سے دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن پھر جیسے یک لخت ہی اسے کچھ یاد آگیا اور اس کے ساتھ ہی اسے غصہ بھی آگیا۔ وہ دینو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے برہمی سے بولی۔

"یہ سب اس دینو کے بچے کا کیا دھرا ہے۔ کیا اسے احساس نہیں ہو سکا تھا کہ آج گھوڑا گڑبڑ کر رہا ہے؟ یہ تو اس پر بیٹھ کر آیا تھا۔ یہ یقیناً اپنے گھوڑے کی رگ رگ سے واقف ہو گا۔ اس کی حرکات و سکنات کو اس سے زیادہ کون سمجھتا ہو گا' اس کے باوجود اس نے ہمیں ذرا بھی خبردار نہیں کیا۔ مجھے تو یہ کوئی سازش لگتی ہے اور یہ دینو اس سازش میں شریک ہے۔"

اسے غالباً ہوٹل میں اپنے اوپر ہونے والا حملہ یاد آگیا تھا۔ میں پہلے ہی خود بھی ان خطوط پر سوچ رہا تھا۔ دینو اس وقت گھوڑے کی گردن سیدھی کر کے عجیب سے انداز میں اس کے منہ پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔

میں نے یونٹ کے آدمیوں سے کہا "گھوڑے کو گھسیٹ کر کچے میں ڈال دو۔ کہیں کوئی گاڑی وغیرہ ادھر نہ آنکلے۔ ہم لوگوں نے تو پوری سڑک ہی روک لی ہے۔"

سب سڑک چھوڑ کر ایک طرف ہو چکے تو میں نے دینو کو آواز دے کر قریب بلایا۔ وہ گویا ڈرتے ڈرتے میرے قریب آیا۔ اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا مگر ہونٹوں کے گوشے پھڑپھڑا رہے تھے۔

"دینو! تم گھوڑے کو کیا کھلا کر لائے تھے؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"صبح میں نے اسے وہی کھلایا تھا جی... جو یہ ہمیشہ کھاتا تھا ....لوسن اور دودھ میں بھیگی ہوئے چنے کی دال....." دینو گلوگیر سی آواز میں بولا "البتہ جب میں بیوی کی دوا لینے گیا تھا تو اسے اپنے گھر کے قریب کھلا چھوڑ گیا تھا۔ ہمارے گھر کے قریب بہت بڑا خالی پلاٹ ہے جی.... اس پر اچھی گھاس اگی ہوئی ہے۔ کبھی کبھی میں اسے چرنے کے لئے وہاں چھوڑ دیتا ہوں۔"

"میرا خیال ہے تم سچ نہیں بول رہے" میں نے سخت لہجے میں کہا "گھر کہاں ہے تمہارا؟"

"اسٹوڈیو کے قریب ہی کچی بستی میں رہتا ہوں جی" وہ بیٹھی بیٹھی آواز میں بولا۔

"تو تم سچ نہیں بولو گے؟" میں نے اس کے قریب پہنچ کر کہا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سر جھکائے کھڑا رہا۔ میں نے اسے ایک تھپڑ رسید کیا۔ زیادہ زور سے نہیں' بس اتنا کہ وہ ارد گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہوئے لوگوں کے قدموں میں جا گرا۔

ایک آدمی نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور دوبارہ میرے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس کا ایک ہاتھ رخسار پر تھا اور وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس نے مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا' وہ کسی سازشی آدمی کی آنکھیں نہیں تھیں۔

وہ جیسے اپنی بچی کھچی توانائی مجتمع کر کے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا "صاحب جی میں ایک غریب اور دیہاتی سا آدمی ہوں۔ سازشیں کرنا اور ان میں حصہ لینا مجھ جیسے آدمی کے بس کی بات کہاں... اور پھر یہ جو موتی تھا نا جی' میرا گھوڑا... اس کے لئے تو کوئی مجھے لاکھ روپے بھی دیتا تو میں اس کی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا جی... آپ انڈسٹری میں نئے نئے آئے ہیں صاحب جی! آپ کو نہیں معلوم کہ میں بے اولاد ہوں۔ میری اولاد یہ موتی ہی تھا جی۔ ہم میاں بیوی کا اکلوتا بچہ۔ اور بچہ بھی کوئی نکما اور نالائق قسم کا نہیں۔ یہ تو ہمارا کماؤ پتر تھا جی...."

اس کی آواز آنسوؤں میں تحلیل ہونے لگی "یہ ہمارے لئے کماتا تھا جی... ہم میاں بیوی بوڑھے ہو چلے ہیں۔ یہ ہمارے بڑھاپے کا سہارا تھا جی.... اسی کے سر پر تو گھر کی دال روٹی چل رہی تھی۔ اتنا سا تھا جی یہ... جب ہم نے اسے پالا تھا" اس نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا "صاحب جی! آپ خود ہی دل پر ہاتھ رکھ کر بتائیں.... کوئی کسی لالچ میں آکر اپنے بچے کی زندگی بھی داؤ پر لگاتا ہے بھلا؟ کوئی اپنی اولاد کو اپنے ہاتھوں سے کوئی خطرناک چیز کھلا سکتا ہے کیا؟ آپ کو تو پتا بھی نہیں صاحب جی کہ موتی کے مرنے سے مجھ پر کیا گزری ہے.... اور جب میری بیوی یہ خبر سنے گی تو اس پر کیا گزرے گی۔ آپ کو کیا پتا صاحب جی... ہم تو لٹ گئے ہیں.... لٹ گئے ہیں" وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر بلک بلک کے رونے لگا۔

اس کے لہجے کی صداقت نے مجھے سُن کر دیا تھا۔ میرے اندر چھپے ہوئے مشاق منصف نے اپنے تجربے کی بنا پر فیصلہ دے دیا تھا کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ بظاہر میں اسی طرح پُرسکون کھڑا ہوا تھا لیکن اندر سے ایک لمحے کے لئے میں ہل چکا تھا۔ مجھ سے غلطی سرزد ہو چکی تھی۔ میں نے ایک بے قصور اور غریب شخص کو مارا تھا جو پہلے ہی کسی کے ظلم کا نشانہ بن چکا تھا۔ تاہم میں نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا اور لوگوں کو ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں ذرا گھوڑے کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔"

لوگوں نے میرے لئے فوراً راستہ چھوڑ دیا۔ میں نے گھوڑے کے قریب پہنچ کر گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اس کا معائنہ کیا۔ اس کی جلد ساٹن نامی کپڑے کی طرح ملائم ہو رہی تھی... وہ بلاشبہ ایک خوبصورت گھوڑا تھا لیکن اب اس پر موت کی بدصورتی غالب آچکی تھی۔ اس کا ایک پہلو بری طرح مٹی میں لتھڑ چکا تھا لیکن اس کے جسم کا جو حصہ صاف نظر آرہا تھا اس پر مجھے وہ نشان نظر آگیا جس کی موجودگی کا مجھے پہلے ہی خطرہ تھا۔

ہاتھ پھیرنے پر مجھے اس کے کولہے پر ایک ننھا سا ابھار محسوس ہوا تھا اور جب میں نے ذرا اور توجہ سے اس جگہ کا

معائنہ کیا تو مجھے ایک نہایت ننھا سا سوراخ بھی نظر آگیا۔ گھوڑے کو یقیناً کسی سوئی سے انجکشن لگایا گیا تھا۔ میں ایک گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ دینو بتا چکا تھا کہ جب وہ بیوی کی دوا لینے گیا تو گھوڑے کو گھر کے قریب کھلے سبزہ زار میں چرنے کے لئے چھوڑ گیا تھا۔ گھوڑے کو انجکشن لگانے کا کام غالباً اسی دوران انجام دیا گیا تھا۔ مویشی کو انجکشن لگانے کے لئے ویسے بھی صرف دو تین سیکنڈ درکار ہوتے ہیں۔

حیران کن بات یہ تھی کہ جس کسی نے بھی یہ قدم اٹھایا تھا اسے ہمارے مکمل پروگرام اور شیڈول کا علم تھا اور اس نے لمحہ بہ لمحہ وقت کا تعین کرتے ہوئے یہ سب کچھ کیا تھا تبھی تو وہ مطلوبہ نتائج حاصل ہونے کی توقع رکھ سکتا تھا۔ ورنہ تو وقت ذرا سا آگے پیچھے ہونے سے اس کی ساری محنت ضائع ہو سکتی تھی۔ وہ کون ہو سکتا تھا؟ اس سلسلے میں اب میرا یقین بھی کچھ متزلزل ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے آفاق کی طرف مڑتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے آج شوٹنگ کینسل ہی کردو۔ بدشگونی سی ہوگئی ہے۔ میں اب جا رہا ہوں مہتم جس طرح مناسب سمجھو شوٹنگ کا کوئی دوسرا شیڈول بنالینا۔ میں کوشش کیا کروں گا کہ ہر شوٹنگ کے آغاز پہ کم از کم چند منٹ کے لئے ضرور آجایا کروں' یہ اب ضروری معلوم ہونے لگا ہے" پھر میں نے ستارہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا "اگر تم میرے ساتھ چلنا چاہو تو چلو۔ جہاں کہو گی میں تمہیں ڈراپ کردوں گا۔"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "باغ میں میری گاڑی کھڑی ہے۔ مجھے اسی میں جانا پڑے گا۔ اور پھر ابھی اسٹوڈیوز میں میری دو سینوں پر شوٹنگ بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا اور دینو کی طرف دیکھا۔ وہ بغلوں میں ہاتھ دئے کھڑا تھا اور محزون و افسردہ نظروں سے اپنے مردہ گھوڑے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے آواز دے کر اسے قریب بلایا۔ وہ جھجکتا ہوا آیا۔ وہ غالباً پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کی آنکھیں ہر تاثر سے عاری رہیں لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں میرے لئے ناپسندیدگی کے سائے تھے۔

"دیکھو دینو" میں نے ملائمت سے کہا "تم نے جو کچھ کہا مجھے اس پر اعتبار آگیا ہے۔ موتی تمہیں جتنا عزیز تھا اس کا اندازہ کرتے ہوئے تمہیں موتی کا کوئی نعم البدل تو نہیں دے سکتا لیکن تمہارا مالی مسئلہ کسی حد تک حل کرنے کے لئے تھوڑی سی کوشش کر سکتا ہوں۔ تم کل میرے اسٹوڈیو والے دفتر میں آکر آفاق صاحب سے دس ہزار روپے لے لینا اور روزگار کی کوئی تدبیر کرلینا۔ ٹھیک ہے؟"

اس کے تاثرات بدل گئے۔ آنکھوں میں چھپی ہوئی ناپسندیدگی کی پرچھائیاں معدوم ہوگئیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اور میں نے تمہیں جو تھپڑ مارا اس کے لئے میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ میں سخت شرمندہ ہوں۔ اندازے کی غلطی انسان سے ہو ہی جاتی ہے۔ معاملہ ہی کچھ ایسا تھا۔"

"آپ مائی باپ ہیں سرکار" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "دو تھپڑ اور مار لیں۔ ہمارا جی تو اسی میں خوش ہوگیا سرکار کہ آپ کے دل میں غریبوں کا درد اور احترام تو ہے۔ آپ نے میری عزت بڑھا دی ہے جی۔ اب تو آپ پیسے نہ بھی دیں تب بھی میرا دل آپ کی طرف سے صاف ہے۔"

اس کے لہجے میں واقعی مسرت جھلکنے لگی تھی۔ کبھی کبھی ایک انسان کا ذرا سا سرنگوں ہونا' ذرا سی فراخدلی کا مظاہرہ کرنا کسی دوسرے دل شکستہ و آزردہ انسان کے لئے کتنی خوشی کا باعث بن جاتا ہے۔

"نہیں۔ تم رقم ضرور آکر لے جانا" میں نے ملائمت سے کہا پھر احتیاطاً براہِ راست آفاق کو بھی ہدایت کردی کہ وہ دوسرے دن دینو کو دس ہزار روپے ضرور دے دے۔

جاتے جاتے ایک بار پھر میں نے ستارہ کی طرف مڑتے ہوئے پوچھا "تمہیں یقین ہے کہ تم آج شوٹنگ کر سکو گی؟"

"ہاں" وہ مسکرائی "میں اس حادثے سے سنبھل چکی ہوں'۔ میں اتنی کمزور نازک مزاج عورت نہیں ہوں جو اس قسم کے حادثوں سے متاثر ہو کر بستر پر جا لیٹوں۔"

"بہت خوب' زندہ باد بہادر عورت" میں نے اسے سیلوٹ کیا اور وہ ہنس دی۔ میں سب کو خدا حافظ کہہ کر اپنی کار میں آبیٹھا جس کا انجن ابھی تک اسٹارٹ تھا اور دروازہ کھلا ہوا ہی تھا۔ واپسی پر تمام راستے میرا ذہن اسی واقعے میں الجھا رہا۔ معاملہ کچھ قابلِ توجہ ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن گھر پہنچنے تک مجھے وقتی طور پر اس مسئلے کو ذہن سے جھٹکنا پڑا۔ دوسری بہت سی باتیں' بہت سے کام اس سے زیادہ توجہ طلب تھے۔ اس سے کہیں زیادہ بڑے اور زیادہ اہم کام۔ اگر میں چھوٹے موٹے مسائل میں الجھ جاتا تو زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ جانے کا خطرہ تھا اور فی الوقت میں اس دوڑ میں سست ہونا نہیں چاہتا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے غسل کے بعد لباس تبدیل کیا اور ایک بار پھر اپنے آفس جا پہنچا۔ چار بجے میری نیروبی سے آئی ہوئی ایک پارٹی سے ملاقات طے تھی۔ یہ سستے کپڑوں کی خریدار پارٹی تھی اور اس سے مجھے بہت بڑا آرڈر ملنے کی توقع تھی۔ رات کو انہی کے ساتھ ڈنر تھا۔ چار بجنے ہی والے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ ملاقات سے پہلے میری سیکریٹری مجھے اس خط و کتابت کے بارے میں تھوڑا سا بریف کردے جو اس پارٹی کے اور ہمارے درمیان ہوتی رہی تھی۔ چنانچہ دفتر جاتے ہی میں ایسا مصروف ہوا کہ وہ واقعہ میرے ذہن سے بالکل نکل گیا۔

دوسرے دن نئے بکھیڑے تھے اور نئی مصروفیات۔ تیسرے دن ذرا سا سانس لینے کی فرصت ملی تو پھر آفاق کا فون آگیا۔ وہ کسی اور سین سے شوٹنگ شروع کر رہا تھا اور میری ہی ہدایت کے مطابق اس نے مجھے اس لئے مطلع کیا تھا کہ میں خواہ چند منٹ کے لئے ہی سہی لیکن سیٹ پر ضرور پہنچ جاؤں۔ اس بار شوٹنگ اسٹوڈیو میں ہی تھی۔ میں جا پہنچا۔

اس بار جو واقعہ پیش آیا اس سے جو کچھ بھی نقصان پہنچ سکتا تھا' اسے روکنے میں میرا کوئی کردار نہیں تھا لیکن پھر بھی میرا سیٹ پر پہنچنا اچھا رہا۔ کم از کم وہ واقعہ میں نے اپنی آنکھوں سے تو دیکھ لیا۔ یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میرے لئے اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں محفوظ کرلینا بہت ضروری تھا تاکہ جب کبھی حساب کتاب کا وقت آئے تو سارا حساب صحیح طرح چکایا جاسکے' کوئی کمی نہ رہ جائے۔

سیٹ ایک حویلی کا تھا۔ یہ حویلی ستارہ کے فلمی باپ کی تھی جو کسی بہت بڑے قبیلے کا سردار تھا۔ منظر کسی دربار یا پنچایت کا سا تھا۔ قبیلے کے کچھ لوگ اپنے سردار کے پاس شکایت لے کر آئے تھے کہ ان کی سرکش اور جنگجو قسم کی بیٹی گھوڑے یا جیپ پر سوار ہو کر جدھر نکل جاتی ہے تباہی پھیلا دیتی ہے۔ کھیتوں کو روند ڈالتی ہے اور جنگلی جانوروں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے پالتو جانوروں کا بھی شکار کر ڈالتی ہے۔ کوئی ذرا بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرے تو چابک سے اس کی پٹائی کردیتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس شکایت پر سردار وضاحت اور جواب طلبی کے لئے اپنی بیٹی یعنی ستارہ کو دربار میں بلاتا ہے۔

میں جب سیٹ پر پہنچا تو ریہرسل ہو رہی تھی۔ ستارہ ادھر ادھر ٹہل کر اپنے مکالمے یاد کر رہی تھی۔ سیٹ آخری مراحل سے گزر چکا تھا لیکن سیٹ ڈیزائنر ابھی اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ کہیں کہیں وہ اپنے آدمیوں کو ایک آدھ کیل ٹھونکنے' تھوڑا بہت رنگ پھیرنے یا کہیں کاغذ چپکانے کی ہدایت کر رہا تھا۔ جتنی بلندی پر عام طور پر کسی کمرے کی چھت ہوتی ہے اتنی بلندی پر لوہے کی پٹیوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا اور اس جال کے مختلف گوشوں میں بڑی بڑی لائٹس فٹ تھیں۔ ایک لائٹ مین اس جال پر چڑھا بیٹھا تھا۔ وہ اینگل آئرن کی پٹیوں پر بندر کی طرح پاؤں رکھتا ہوا کبھی ایک طرف جاتا اور کبھی دوسری طرف۔ وہ مختلف لائٹوں کے زاویے درست کر رہا تھا۔

کبھی وہ یک لخت نعرۂ مستانہ کے سے انداز میں آواز بلند کرتا "لائٹ" اور نیچے موجود کوئی شخص لائٹ آن کردیتا۔ اوپر والا لائٹ مین روشنی کا زاویہ چیک کرتا اور ہانک لگاتا "لائٹ آف!"

میرے پہنچنے پر سیٹ پر قدرے خاموشی چھا گئی۔ ستارہ نے ایک ادائے خاص سے دور ہی سے مجھے سلام کیا اور دلکش انداز میں مسکرائی۔ اس وقت وہ نیوی بلیو جینز میں تھی۔ پیشانی پر اس نے ہپیوں والے انداز میں ایک سرخ پٹی بھی لپیٹ رکھی تھی۔ عام بیلٹ کی جگہ اس نے باقاعدہ گولیوں والی پیٹی اور ہولسٹر لپیٹا ہوا تھا جس میں ریوالور بھی جھول رہا تھا جو غالباً نقلی تھا۔

آفاق کے کسی اسسٹنٹ نے میرے لئے ایک صوفے کی جھاڑ پونچھ کی اور دوڑ کر میرے لئے کہیں سے کولڈ ڈرنک لے آیا۔ ...ابھی میں نے کولڈ ڈرنک کی پہلی ہی چسکی لی تھی کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ سیٹ پر موجود تقریباً سبھی افراد چونک پڑے۔ ستارہ کی تو چیخ ہی نکل گئی کیونکہ دھماکے کی "وجہ" اس کے نین قریب ہی آکر گری تھی۔

دراصل اینگل آئرن کی ایک پوری پٹی ٹوٹ کر نیچے آن گری تھی جس کے دونوں سروں پر دو بڑی لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ ...لائٹس کافی وزنی معلوم ہوتی تھیں اور پھر ان کے ساتھ اینگل آئرن کا جو تقریباً ایک فٹ چوڑا جال سا بنا ہوا تھا اس کا بھی وزن تھا۔ بلبوں سے منسلک فاضل تار بھی نیچے تک لائٹوں کے ساتھ ہی کھنچ آئی تھی۔ لائٹس کے شیشے اور بلب دھماکے کے ساتھ چکنا چور ہوگئے تھے۔

یہ پٹی ستارہ سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر آکر گری تھی۔ ...ستارہ ٹہل ٹہل کر مکالمے یاد کرتے ہوئے اگر مزید ایک قدم بھی بڑھا چکی ہوتی تو شاید یہ پٹی اس کے سر پر ہی گرتی اور میرے اندازے کے مطابق اس کا وزن اتنا ضرور تھا کہ ستارہ کی موت بھی واقع ہو سکتی تھی۔ ورنہ اسے خطرناک حد تک چوٹ تو ضرور آتی۔

میں غالباً واحد شخص تھا جو دھماکا سن کر چونکا ضرور لیکن اچھلا نہیں۔ میری نظر فوراً اوپر گئی۔ لائٹ مین دم بخود اوپر بیٹھا تھا۔ جال کی ایک پٹی گرنے سے جو خلا پیدا ہوا تھا لائٹ مین کی ایک ٹانگ اس خلا میں سے نیچے جھول رہی تھی۔ اس کے چہرے پر حیرت اور خوف گویا منجمد ہو کر رہ گیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ ایکٹنگ نہیں کر رہا تھا۔

کیا ہوا' کیوں ہوا... کیسے ہوا؟ کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہونے لگیں۔ آفاق نے ستارہ کو بازوؤں سے پکڑ کر ایک طرف کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر پھیکے سے انداز میں مسکرائی اور پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی "آج پھر بال بال بچی ہوں۔"

"اطمینان رکھو" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "قدرت نے تمہاری جتنی زندگی لکھ دی ہے کوئی اس میں ایک لمحے کی بھی کمی نہیں کر سکتا۔"

میں اٹھ کر آگے بڑھا اور آہنی جال کے ٹوٹے ہوئے حصے کا معائنہ کرنے لگا۔ آفاق اس دوران لائٹ مین کو نیچے بلا چکا تھا اور اس سے پوچھ گچھ کر رہا تھا "کیوں بے... کیا کیا تم نے؟ تو یہ لائٹیں نیچے گر پڑیں؟"

"مجھے تو کچھ پتا نہیں چلا سر جی۔" لائٹ مین بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولا "میں نے تو ابھی اس پٹی پر ایک ہی پاؤں کا وزن ڈالا تھا کہ یہ پاؤں کے نیچے سے نکل گئی۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا!"

میں نے ان کے سوال جواب کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ لائٹ مین اگر مشکوک آدمی ہوتا تو عین حادثے کے وقت اس آہنی جال پر ٹنگا نہ رہتا اور اگر وہ واقعی کسی سازش میں شریک تھا تو پھر اس کا وار خالی نہیں جاسکتا تھا۔ وہ دیکھ بھال کر عین موزوں وقت پر آہنی پٹی گراتا جب ستارہ اس کی زد میں ہوتی۔

میں نیچے گری ہوئی پٹی کا جائزہ لے چکا تو اشارے سے اسٹول نما سیڑھی اپنے قریب منگوائی اور اس پر چڑھ کر اس جگہ کا جائزہ لیا جہاں سے پٹی ٹوٹ کر گری تھی جائزے کے بعد کم از کم ... یہ تصدیق ہو ہی گئی تھی کہ آہنی پٹی کا گرنا محض اتفاق نہیں تھا۔

وہ پٹی دونوں طرف ویلڈنگ کے ذریعے جال سے جڑی ہوئی تھی اور دونوں طرف صرف ایک ایک انچ حصہ ویلڈنگ شدہ تھا۔ اس حصے کو لوہا کاٹنے والی آری کے ذریعے تقریباً پورا کا پورا کاٹ دیا گیا تھا۔ بس برائے نام جڑا رہنے دیا گیا تھا۔ لائٹ مین کا پاؤں پڑتے ہی وہ پٹی مکمل طور پر علیحدہ ہو کر گر پڑی تھی۔

جس کسی نے بھی یہ طریقہ سوچا تھا وہ بہت دور کی کوڑی لایا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ آہنی پٹی اور لائٹس ستارہ ہی کے سر پر گرتیں ... بہرحال جس پر بھی گرتیں، زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ ہماری ہی فلم کمپنی کا آدمی ہوتا اور اس قسم کے حادثوں سے کمپنی کے کام اور ساکھ دونوں کو جو نقصان پہنچا کرتا ہے وہ ہمیں اٹھانا پڑتا۔

میں اسٹول نما سیڑھی سے اتر آیا۔ آفاق اب بھی سخت لہجے میں لائٹ مین سے پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ میں نے آفاق کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اس کے ساتھ مغز کھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہ کسی اور کا ہی کام معلوم ہوتا ہے۔"

میری یہ بات سن کر لائٹ مین نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ ... اسٹوڈیو منیجر اس وقت شاید کہیں قریب ہی موجود تھا اور اسے اس واقعے کی اطلاع مل گئی تھی۔ وہ کچھ گھبرایا ہوا سا فلور پر آیا۔ میں تو اسے پہچانتا نہیں تھا، آفاق نے مجھے بتایا "سر! یہ نسیم صاحب ہیں۔ اس اسٹوڈیو کے منیجر۔"

"کیا ہوا آفاق صاحب؟" اس نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

آفاق نے اسے بتایا اور جب وہ بات ختم کر چکا تو میں نے کہا "اس پٹی کو آری کے ذریعے کاٹا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس اسٹوڈیو میں شوٹنگ کرنا کچھ زیادہ محفوظ نہیں ہے۔ کسی بھی وقت کسی فلم کی کاسٹ سازش کا شکار ہو سکتی ہے اور کسی وقت بھی کوئی حادثہ پیش آسکتا ہے" میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر بے پناہ سختی اور سرد مہری در آئی تھی۔

منیجر یوں تو خاصا درشت مزاج اور چیتا بُرزہ معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی تو کچھ گڑبڑا سا گیا اور معذرت خواہانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولا۔

"میں حیران ہوں کہ ایسا کیونکر ہوا ... اسٹوڈیو میں آج تک ایسا حادثہ نہیں ہوا ... لوہے کا یہ جال اتنا بوسیدہ بھی نہیں ہے" اس نے اوپر دیکھا "اور اگر اسے آری سے کاٹا گیا ہے تب بھی اس کے بارے میں کوئی اندازہ ظاہر کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ کس کا کام ہو سکتا ہے۔ اسٹوڈیو میں سیکڑوں ملازم ہیں اور سب ہی آزادانہ ادھر ادھر آتے جاتے رہتے ہیں....." وہ الجھن زدہ سے انداز میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہونے کے بعد بولا "لیکن آخر کسی کو اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت پڑی تھی؟ ایسی کیا دشمنی تھی کسی کو آپ لوگوں سے؟" انداز خود کلامی کا سا تھا۔ اس نے کسی کو خاص طور پر مخاطب نہیں کیا تھا۔

"ہمیں بھی یہی جاننے کا اشتیاق ہے .. اور ہم اپنے طور پر جاننے کی کوشش بھی کریں گے" میں نے خشک لہجے میں کہا۔

"اگر آپ پسند کریں تو اس واقعے کی پولیس میں رپورٹ درج کرادی جائے" منیجر بولا۔

"فی الحال ہم اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے" میں نے بدستور خشک لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے ... میں لائٹ مین سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ اچھی طرح پورے آہنی جال کے تمام جوڑوں اور نٹ بولٹوں وغیرہ کا جائزہ لے لے۔ اس کے بعد اگر آپ مناسب سمجھیں تو شوٹنگ جاری رکھیں۔ آپ کو جتنا بھی ایکسٹرا ٹائم درکار ہو، آپ لگائیں ... ہم اس کا کرایہ چارج نہیں کریں گے" منیجر نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری اور لائٹ مین کو ہدایات دینے کے بعد رخصت ہو گیا۔

"شوٹنگ جاری رکھنی ہے؟" میں نے آفاق سے پوچھا۔

"ہاں۔ آج تو ہم یہ سین کر کے ہی چھوڑیں گے۔ البتہ ستارہ سے پوچھنا پڑے گا" وہ ستارہ کی طرف مڑتے ہوئے بولا "کیوں میڈم! آپ کی ہمت جواب تو نہیں دے گئی؟" وہ مسکرایا۔

"میڈم اتنی کم ہمت نہیں ہیں ... یہ بات تمہیں اچھی طرح معلوم ہے" ستارہ سنجیدگی سے بولی "البتہ جو ڈائیلاگ میں نے اتنی مشکل سے یاد کئے تھے وہ ایک دم دماغ سے نکل گئے ہیں ... اب تھوڑا وقت اور لگے گا ... اور اب میں ٹہل ٹہل کر نہیں آرام سے ایک کونے میں بیٹھ کر یاد کروں گی" وہ اسکرپٹ سنبھال کر یوں ایک کرسی پر بیٹھ گئی گویا اسکول کی کوئی طالبہ سبق یاد کر رہی ہو۔

دو لائٹ مین اوپر چڑھ کر آہنی پٹیوں کا معائنہ کر رہے تھے۔ کافی دیر بعد جا کر بالآخر شوٹنگ شروع ہونے کی نوبت آہی گئی جو میرے لئے بڑا بور کام تھا۔ بار بار ری ٹیکس ہوتی تھیں۔ ایک

ایک منظر کے لئے کیمرہ کبھی اسٹارٹ ہوتا تھا' کبھی بند۔ کبھی لائٹوں کے زاویئے تبدیل ہوتے تھے اور کبھی کیمرے کی جگہ۔ کبھی ستارہ منظر میں کوئی چھوٹی موٹی غلطی کرجاتی تھی اور کبھی کوئی دوسرا اداکار۔ کچھ دیر بعد میں بور ہوگیا۔ ویسے بھی اب مجھے اطمینان ہوگیا تھا کہ شوٹنگ بغیر کسی گڑبڑ کے جاری رہ سکے گی۔ چنانچہ میں نے آفاق' ستارہ اور دیگر لوگوں کو خدا حافظ کہا اور وہاں سے رخصت ہوگیا۔ فلور سے باہر آتے وقت میں سوچ رہا تھا کہ یہی وہ شوٹنگز تھیں جنہیں دیکھنے کی حسرت میں لڑکپن میں ہم گویا مرے جاتے تھے۔

اگلے ایک ماہ میں میں بے حد مصروف رہا۔ میرا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس بہت تیزی سے پھیل رہا تھا۔ ٹیکسٹائل کے دو 'بیمار' کارخانے بھی میں نے پچھلے دنوں خریدے تھے جن کے مالکان ہر جتن کرکے تھک گئے تھے مگر وہ چل کر نہیں دیتے تھے۔ لیبر نے ان کا ناک میں دم کیا ہوا تھا۔ میں نے یہ کارخانے خریدنے سے پہلے ان کے حالات کا بہت گہرائی سے مشاہدہ کیا تھا' ...اپنے ساتھیوں سے مشورے کئے تھے۔ بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ بعض جگہ سیٹھ لوگ مزدوروں کا استحصال کرتے ہیں اور ہر طریقے سے انہیں ان کے حقوق سے محروم رکھتے ہیں لیکن بعض جگہ ورکر بھی زیادتی کررہے ہیں اور مالکان کو کمزور پاکر انہیں تنگ کرتے رہتے ہیں اور درحقیقت مزدور لیڈروں کے بہکاوے میں آکر اپنا ہی نقصان کرتے رہتے ہیں' اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارتے رہتے ہیں۔

ان دونوں کارخانوں میں میجر شیئرز دو بھائیوں کے تھے اور میں نے دیکھ لیا تھا کہ ان کارخانوں کے معاملات کو تھوڑی سی سختی اور طاقت سے چلانے کی ضرورت ہے اور کوئی خاص خرابی نہیں ہے چنانچہ یہ دونوں یونٹ میں نے خرید لئے تھے اور کچھ ہی عرصے میں سب ٹھیک ٹھاک ہوگیا تھا۔ ان کارخانوں کی وجہ سے بھی میری مصروفیت میں اضافہ رہا تھا۔ ادھر کراچی میں بھی سلسلے بہت پھیل گئے تھے۔ وہاں ہوٹل کا کام بھی بہت پروگریس میں تھا' ...سیٹھ کرامت ہمارے ساتھ بہت سیٹ چل رہا تھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ہم شریفوں کے ساتھ حد سے زیادہ شریف ہیں اور ہم سے بدمعاشی کرکے کوئی بچ کے نہیں جاسکتا تھا۔ اس نے محسوس کرلیا تھا کہ ہمارے ساتھ شرافت سے چلنے میں فائدہ ہی فائدہ تھا۔

وہاں ہوٹل کی تعمیر کے سلسلے میں ابتدائی مراحل بڑی تیزی سے طے ہورہے تھے۔ اوپر سے سیٹھ رمضان نے شپ بریکنگ کے کام میں میرا کچھ سرمایہ پھنسا دیا تھا۔ میری طرف سے قائم ہونے والی کمپنی نے یونان سے جو پہلا ہی ناکارہ جہاز خریدا اس کی بریکنگ کے دوران ہی دو جہاز اور آگئے اور ان میں زبردست منافع ہوا۔ لاہور اور کراچی دونوں جگہ میرے گروپ آف کمپنیز کے چھوٹے بڑے سبھی یونٹ شاندار منافع دے رہے تھے اور سب سے اچھی بات یہ تھی کہ میرا تمام کاروبار بغیر قرضوں کے چل رہا تھا۔ ورنہ کاروبار کی دنیا میں ہوتا یہ ہے کہ بعض بہت بڑے اور مستحکم نظر آنے والے کاروباری ادارے اندر سے بالکل کھوکھلے ہوتے ہیں اور ان کی کوئی سیل ویلیو نہیں ہوتی' یعنی اگر انہیں فروخت کیا جائے تو ان پر قرضے اور سود ہی اتنا نکل آتا ہے کہ فروخت کرنے والے کے ہاتھ کچھ بھی نہیں آتا۔ لیکن میرا گروپ آف کمپنیز بہت سے دوسرے گروپس کے مقابلے میں چھوٹا ہونے کے باوجود مستحکم اور ٹھوس تھا۔ ضرورت پڑنے پر مجھے بینکوں اور دوسرے مالیاتی اداروں سے بہت بڑے قرضے بھی مل سکتے تھے۔ کاروبار کی دنیا میں بہت کم لوگ ایسے تھے جو اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھاتے تھے بلکہ بہت بڑے بڑے سیٹھ جن کا اپنا ریزرو سرمایہ کروڑوں میں تھا' اپنے کاروبار جان بوجھ کر قرضوں پر چلا رہے تھے۔ اس میں ان کی اپنی بہت سی گفتنی اور ناگفتنی مصلحتیں تھیں جن کے ذکر سے بات خواہ مخواہ طویل ہوجائے گی۔

قصہ مختصر یہ کہ میری خواہش کے مطابق کاروبار اتنا پھل پھول گیا تھا کہ میں نے زیر زمین دھندے تقریباً مکمل طور پر ہی سمیٹ دیئے تھے حالانکہ کبھی کبھی دل میں لالچ آتا تھا کہ میں نے بہت بڑی آمدنی کا دروازہ خود پر بند کرلیا تھا جبکہ اب میرے لئے وہ کام نسبتاً بہت آسان ہوگیا تھا کیونکہ اب وسائل زیادہ تھے' رابطے زیادہ تھے' اثر رسوخ زیادہ تھا اور کئی طرح کی آڑ میسر تھی' ...مال کی آمد اور ترسیل میں اب بڑی آسانیاں ہوسکتی تھیں۔ بلیک منی کو وہائٹ منی میں تبدیل کرنے کے کئی ذرائع میسر تھے۔ غرضیکہ پہلے کے مقابلے میں بہت آسانیاں تھیں لیکن پھر بھی اب دل نہیں مانتا تھا۔ میں سوچتا تھا کہ جب خدا جائز ذرائع سے اتنا دے رہا ہے تو خواہ مخواہ اپنے ضمیر کے سامنے سرنگوں رہنے کی کیا ضرورت ہے۔

حالانکہ میں بہت سے ایسے بڑے بڑے سیٹھوں کو بھی جانتا تھا جن کی دولت کا کوئی شمار نہیں تھا۔ اس کے باوجود ان کی ہوس دن بہ دن بڑھتی ہی جارہی تھی۔ وہ کالے دھندوں میں ملوث تھے بلکہ موقع ملنے پر وہ منشیات جیسی مکروہ اور مہلک چیزوں کی زیر زمین تجارت اور اسمگلنگ میں بھی ذرا نہیں ہچکچاتے تھے اور بہت سے بااختیار لوگ ان کے شریک کار تھے' ان سے حصے وصول کرتے تھے۔

منشیات کے دھندے میں تو خیر میں نے کبھی ہاتھ ڈالا ہی نہیں تھا لیکن اب باقی سلسلے بھی آہستہ آہستہ ختم کردیئے تھے۔ تاہم میرے بیشتر ساتھی اب بھی وہی پرانے لوگ تھے۔ میں نے انہیں بڑے بڑے اہم عہدوں پر رکھا تھا۔ بعض مقامات پر تو وہ بالکل خود مختار تھے۔ روپے پیسے کے معاملات میں وہ جو چاہتے کرسکتے تھے لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ میں نے جب

بھی انہیں چیک کیا' ایماندار اور وفادار ہی پایا۔ ضمیر نام کی چیز ان کے اندر بھی زندہ تھی اور مواقع میسر ہونے کے باوجود انہوں نے بھی ناجائز دھندوں سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ کسی نے لالچ میں مبتلا ہوکر اپنے طور پر بھی کوئی دھندہ جاری رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کا کہنا بھی یہی تھا کہ جب انہیں ویسے ہی تمام عیش و آرام میسر تھا تو خاردار راستوں پر چلنے کی کیا ضرورت تھی۔

میرے ساتھ ان کی جاں نثاری اب اور بھی پختہ ہوگئی تھی اور زندگی کے بارے میں ہمارا ایک مشترکہ سالائحہ عمل بن گیا تھا کہ حتی الامکان ایمانداری سے چلو' کسی کے لئے تکلیف کا باعث نہ بنو لیکن کوئی اگر ہمارے لئے تکلیف کا باعث بنے' بدمعاشی دکھائے' کوئی ناجائز ہتھکنڈہ استعمال کرے تو اسے ہرگز مت بخشو بلکہ اگر کہیں اور بھی' کسی اور کے ساتھ زیادتی ہورہی ہو' کسی کمزور کے ساتھ ظلم ہورہا ہو تو اس کی مدد کرنے کی کوشش کرو۔

اپنا یہ نصب العین بنانے کے بعد ہم بہت مطمئن تھے۔ بوقتِ ضرورت ہم اب بھی ایک سنڈیکیٹ کی طرح' ایک گروہ ہی کی طرح اپنا کام کرتے تھے۔ کوئی مسئلہ آن پڑتا تھا تو فوراً ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک میرے آدمیوں کے درمیان رابطہ قائم ہوجاتا تھا۔ ٹیلیفون' ٹیلکس' وائرلیس' چھوٹے ٹرانسیٹر غرضیکہ رابطے کے لئے ہمیں ہر چیز میسر تھی۔ ضرورت کے مطابق ہتھیار بھی میسر تھے لیکن اب ان کے استعمال کی نوبت کم ہی آتی تھی۔ میرے آدمیوں میں ہر طرح کی صلاحیتیں رکھنے والے شامل تھے اور ہر ایک اپنی جگہ بے مثل تھا۔

خیر... یہ سب باتیں تو ضمنی طور پر درمیان میں آگئیں۔ میں بتا رہا تھا کہ وہ مہینہ بہت ہی مصروف گزرا۔ مجھے سونے کے لئے بھی بہت کم وقت ملتا تھا۔ اس دوران امریکا کا بھی ایک چکر لگانا پڑا۔ بیورلے ہلز میں اس کمپنی کا دفتر تھا جس کے نام پر ہم ہوٹل بنانا چاہ رہے تھے۔ میں گیا تو پھر اجازت نامہ لے کر ہی آیا گوکہ یہ اجازت نامہ مشروط ہی ہوتا ہے۔ ہوٹل کی تعمیر کے بعد کمپنی کا وفد آکر معائنہ کرتا ہے کہ ہوٹل کا معیار کیا ہے۔ پھر اس کی سہولیات اور معیار کے مطابق ہی اسے فائیو اسٹار یا فور اسٹار کا گریڈ دیا جاتا ہے۔ بہرحال اصل مرحلہ تو طے ہو ہی گیا تھا۔ باقی چیزوں کا انحصار تو خود ہم پر تھا۔

ہوٹل کے لئے سائٹ پہلے ہی موجود تھی۔ زمین کا بیعانہ ہم دے چکے تھے۔ اجازت ملنے کے بعد ہم نے سودا فائنل کردیا اور تعمیر کے انتظامات شروع کردیئے گئے۔ مختلف کمپنیوں سے مختلف کاموں کے سلسلے میں ٹینڈر طلب کرنے کا سلسلہ جاری تھا اور ہر روز کی رپورٹ رات کو مجھے فون پر ملتی تھی۔

ان حالات میں ظاہر ہے' فلم کی طرف سے میرا دھیان بالکل ہٹ گیا تھا حالانکہ اس دوران ہماری کئی شوٹنگز بخیروعافیت ہوچکی تھیں۔ آفاق بہت خوش تھا۔ وہ شوٹنگ بخیروعافیت ہوجانے کی اطلاع فون پر دیتا تب مجھے یاد آتا کہ ہماری کوئی فلم کمپنی بھی ہے۔ اسٹوڈیو میں ہماری شوٹنگ کے دوران لائٹ گرجانے کی خبر اخباروں میں آئی تھی جس کی سرخیاں کچھ اس قسم کی لگی تھیں کہ مشہور فلم اسٹار ستارہ خطرناک حادثے سے بال بال بچ گئیں۔ ہماری کمپنی کا نام بھی آیا تھا اور میں یہ محسوس کرکے قدرے حیران بھی ہوا تھا کہ اخباروں کے فلمی ایڈیشنوں میں اس چھوٹے سے واقعے کو گویا خاص طور پر اچھالا گیا تھا اور بڑے لمبے چوڑے تبصرے اور قیاس آرائیاں بھی کی گئی تھیں جن میں ضمنی طور پر یہ ذکر بھی کیا گیا تھا کہ اس سے پہلے بھی اسی فلم کی ایک اور شوٹنگ کے دوران فلم اسٹار ستارہ ہی ایک جان لیوا حادثے کا شکار ہوتے ہوتے رہ گئی تھیں جب گھوڑا پاگل ہوکر انہیں پیٹھ پر لادے نہ جانے کس طرف بھاگ کھڑا ہوا تھا۔

وہ واقعہ مبہم انداز میں تحریر کیا گیا تھا لیکن اس میں فلم اور کمپنی کے نام کا بار بار ذکر کیا گیا تھا۔ گویا تبصرے وغیرہ لکھنے والے یہ ذہن نشین کرانا چاہتے ہوں کہ اس فلم یا شاید اس کمپنی کے ساتھ کوئی نہ کوئی چکر یا کوئی نہ کوئی نحوست ہے۔ حالانکہ جس وقت وہ گھوڑے والا واقعہ پیش آیا تھا اس وقت کسی اخبار میں اس کا ذکر نہیں آیا تھا اور میرا خیال یہی تھا کہ وہ واقعہ کسی اخبار نویس کے علم میں نہیں آسکا۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ ان واقعات کے پیچھے جو ہاتھ کارفرما تھا وہ اس کے تشہیری پہلو کی طرف بھی خصوصی توجہ دے رہا تھا۔

میری مصروفیات نے مجھے اس پہلو پر زیادہ سوچ بچار کرنے کی مہلت نہیں دی تھی۔ میں تو اس دوران ستارہ کے گھر بھی نہیں جاسکا تھا۔ غم دوراں نے غم جاناں بھلا دیا تھا۔ دو تین مرتبہ اس کا فون بھی آیا لیکن میں دونوں تینوں مرتبہ دفتر میں ہی نہیں تھا اور اس کا پیغام ملنے کے بعد جب میں نے اس کے ہاں فون کیا تو وہ گھر پر نہیں تھی۔

ایک دن جبکہ میں کراچی کا ایک روزہ دورہ کرنے کے بعد واپس آکر سہ پہر کے وقت دفتر پہنچا ہی تھا' میری سیکریٹری نے اطلاع دی کہ آفاق اور ستارہ مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ کوئی خاص ہی بات تھی جو وہ دونوں اکٹھے میرے دفتر آئے تھے۔ میں نے فوراً انہیں بلا بھیجا اور جب وہ میرے کمرے میں پہنچے تو اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔

آفاق حلیئے کے اعتبار سے تو کچھ تھکا تھکا لگ رہا تھا یعنی اس کا شیو بڑھا ہوا' بال بکھرے ہوئے اور کپڑے شکن آلود تھے۔ لیکن حرکات و سکنات سے وہ بڑا پرجوش اور مستعد لگ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ آج کل وہ بہت محنت کررہا تھا اور اپنے کام سے

بڑا مطمئن اور مسرور تھا۔

ستارہ کسی نہایت ہی نفیس کپڑے کی بہت ہی خوبصورت میکسی میں تھی اور ہمیشہ کی طرح حسین اور پُرکشش نظر آرہی تھی۔ اس کی آمد سے گویا ماحول جگمگا اٹھتا تھا اور فضا کسی نہ کسی مسحور کن کلون کی مہک سے خوابناک سی ہوجاتی تھی۔ کمبخت کو ملبوسات، میک اپ اور خوشبوؤں کے استعمال کا سلیقہ آگیا تھا۔ اس کے نین نقش، حسن کے کسی بلند و بالا معیار پر پورے نہیں اترتے تھے لیکن مجموعی طور پر وہ پچاسوں حسین عورتوں سے بہتر نظر آتی تھی۔

میں ایک لمحے کے لئے اسے دیکھتا رہ گیا پھر میں نے سحرزدہ سے لہجے میں کہا "آج تمہیں میرے دفتر نہیں آنا چاہئے تھا ... آج تو یہ حسنِ بلاخیز میرے حق میں بہت خطرناک ثابت ہوسکتا ہے "میں نے اس کے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں" وہ منہ بنا کر بولی اور ائیرکنڈیشنر کے سامنے صوفے پر ڈھیر ہوگئی۔ آفاق بھی بیٹھ گیا۔

میں میز کے عقب سے نکل کر ان کے مقابل بیٹھ گیا اور ایک بار پھر ستائشی انداز میں اس کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے کہا۔ "منہ کی تعریف تو منہ' دیکھ کر ہی کی جاتی ہے نا۔"

وہ تھکے تھکے سے انداز میں آہستگی سے چہرے پر دونوں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی "مجھے یہ تو اندازہ ہوگیا تھا کہ تم بڑے آدمی بن گئے ہو لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اتنے بڑے آدمی بن گئے ہو" اس نے لفظ 'اتنے' پر خوب زور دیا "تم سے تو ملنا ہی مشکل ہوگیا۔ ایک دنیا ہم سے ملنے کو ترستی پھرتی ہے اور ہم تم سے ملنے کی آرزو لئے پھر رہے ہیں۔"

"انہیں میں اپنی زندگی کے انتہائی بدنصیب لمحے شمار کروں گا جب تم نے مجھ سے ملنا چاہا لیکن میں بدبخت نہ جانے کہاں دھکے کھاتا پھر رہا تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایسی مصنوعی باتیں مت کیا کرو" ستارہ نے ملامت سے گویا مجھے مشورہ دیا "تمہاری زندگی میں اب جذبات و احساسات کا گزر کم ہی رہ گیا ہے۔ تم تو بس روپیہ کمانے کی مشین بنے ہوئے ہو۔"

"روپیہ کمانے میں میں بے شک لگا ہوا ہوں لیکن مشین بہرحال نہیں بنا ہوں" میں نے تصحیح کی "میرے محسوسات' میری انسانی صفات' حتیٰ کہ میرا ضمیر بھی بدستور زندہ ہے" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "اور میری یہ بھاگ دوڑ' یہ افراتفری بھی کچھ عرصے کی ہے۔ میرے کچھ مقاصد ہیں' وہ پورے ہوجائیں گے تو میں دولت کا تعاقب کرنا چھوڑ دوں گا۔"

"سب یونہی کہتے ہیں" ستارہ منہ بنا کر بولی "لیکن دولت کا تعاقب انسان کبھی ترک نہیں کرتا۔ دولت کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ یہ ایک نشہ ہے جو انسان کی رگ و پے میں سرایت کرجاتا ہے۔ میں نے دنیا کے کسی بڑے سے بڑے سرمایہ دار کے بارے میں بھی نہیں سنا کہ اس نے زندگی کے کسی بھی مرحلے پر دولت کمانے کی جدوجہد ترک کردی ہو۔"

"میں یہ نہیں کہہ رہا کہ میں بہت قناعت پسند ہوجاؤں گا اس لئے دولت کا تعاقب چھوڑ دوں گا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ میں ایک ایسا انتظام سیٹ کردوں گا جس میں مجھے آج کل کی طرح بہت زیادہ بھاگ دوڑ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ ایک خاص حد تک دولت خود ہی سمٹ کر میری طرف آتی رہے گی۔ مجھے صرف اتنی قربانی دینی پڑے گی کہ اس خاص حد پر قناعت کرلوں۔ اور میرا خیال ہے یہ میں کر ہی لوں گا۔ اتنا حوصلہ اور قوتِ ارادی مجھ میں ہے۔ میں زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی ہوس پر قابو پالوں گا کیوں کہ اس وقت مجھے اور بہت سے ضروری کام کرنے ہوں گے جنہیں میں نے فی الحال ادھورا چھوڑا ہوا ہے۔"

ستارہ صوفے پر نیم دراز' ادھ کھلی سی آنکھوں سے... ایک لمحے میری طرف دیکھتی رہی جیسے میرے مستقبل میں جھانکنے کی کوشش کررہی ہو پھر وہ جیسے تھکن سے پیچھا چھڑا کر سر جھٹکتے ہوئے اور سنبھل کر سیدھی بیٹھتے ہوئے بولی "ہم یہاں دولت کے فلسفے اور تمہارے مستقبل کے منصوبوں پر تبادلۂ خیال کرنے نہیں آئے۔ ایک تو تم باتونی بہت ہو۔ ہمیشہ ادھر ادھر کی باتوں میں الجھا لیتے ہو۔ میں نے کبھی کسی اچھے بزنس مین کو اتنا باتونی نہیں دیکھا۔"

"میں نے بزنس مین ہونے کا دعویٰ کب کیا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں صرف مین ہوں۔ بزنس تو خود بخود میرے ہاتھوں میں سمٹ آیا ہے۔ خیر... تم بتاؤ' کیا بتانے والی تھیں۔ میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ تم دونوں نے بہ نفسِ نفیس اکٹھے یہاں آنے کی زحمت کی ہے تو کوئی خاص بات ضرور ہوگی"

ستارہ' آفاق کی طرف دیکھتے ہوئے شریر لہجے میں بولی "بھئی... اب تم بولو۔ تمہاری باری ہے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ دونوں کے ہوتے ہوئے مجھے بھی موقع میسر آیا" آفاق نے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھاتے ہوئے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اس کے انداز پر ہم دونوں ہی کو ہنسی ... آفاق خود بھی مسکرادیا لیکن دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "آج ستارہ پھر ایک خوفناک حادثے سے دوچار ہوتے ہوتے بچی ہے۔"

"اوہ..." میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

آفاق نئی سگریٹ سلگا کر کش لینے کے بعد بولا "آج شوٹنگ میں سین کچھ اس قسم کا تھا کہ چند نقاب پوش ستارہ کو اغوا کرنے کے ارادے سے اس کی خوابگاہ میں داخل ہوتے ہیں لیکن ستارہ کی آنکھ کھل جاتی ہے اور وہ تکیے کے نیچے سے

خنجر نکال کر ان پر حملہ آور ہوتی ہے۔ خنجر وہی مخصوص ساخت کا تھا جو عموماً شوٹنگوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کی نوک جب کسی بھی چیز سے ٹکراتی ہے تو پورا پھل دستے میں چلا جاتا ہے۔ شوٹنگ میں عام طور پر ہوتا یہی ہے کہ بظاہر اس خنجر کو کسی کے جسم میں گھونپا جاتا ہے لیکن درحقیقت' پھل' دستے میں چلا جاتا ہے اور جس شخص پر وار کیا جاتا ہے اس کے لباس تلے رنگ سے بھرا ہوا غبارہ چھپا ہوتا ہے جسے عین اسی وقت پھوڑنے کا انتظام موجود ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کا لباس خون میں تر ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔"

آفاق نے ایک اور طویل کش لینے کے بعد سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اس وقت ریہرسل چل رہی تھی اور سین میں استعمال ہونے والی مصنوعی بندوقیں اور وہ خنجر ایک طرف میز پر رکھا تھا۔ ریہرسل کے دوران ہم ذرا سستانے لگے۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ میں اتفاق سے اسی میز کے قریب کھڑا چائے پی رہا تھا۔ چائے ختم کرکے 'کپ رکھ کر میں نے یونہی غیر ارادی طور پر خنجر اٹھالیا اور باتیں کرتے کرتے بے دھیانی میں ایک انگلی سے اس کی نوک پر دباؤ ڈالا تو اس کا پھل دستے میں جانے کے بجائے میری انگلی میں اترتے اترتے رہ گیا۔" اس نے بایاں ہاتھ اٹھا کر انگلی مجھے دکھائی جس پر چھوٹا سا زخم نظر آرہا تھا۔

آفاق بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے گھبرا کر خنجر کو میز پر مار کر دیکھا۔ اس کی نوک تقریباً آدھ انچ تک لکڑی میں دھنس گئی۔ وہ خنجر بالکل اصلی تھا۔ نہ جانے کس وقت کس نے نقلی خنجر ہٹا کر اس کی جگہ بالکل ویسا ہی اصلی خنجر رکھ دیا تھا۔ ستارہ نے بھی مجھے خنجر چیک کرتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس تصور سے ہم دونوں ہی کی حالت غیر ہوگئی کہ اگر ستارہ نے بے دھڑک وہ خنجر استعمال کرلیا ہوتا تو کیا ہوتا؟ ستارہ تو اس کی طرف سے بالکل مطمئن تھی کیوں کہ وہ اس سے پہلے بھی ایک شوٹنگ میں اسے استعمال کرچکی تھی۔"

"خنجر آیا کہاں سے تھا؟" میں نے پوچھا۔

"اسٹوڈیو کے پراپرٹی روم سے" آفاق بولا "میرا ایک اسسٹنٹ ہی لے کر آیا تھا۔ پراپرٹی انچارج نے احتیاطاً خنجر چیک کرنے کے بعد اسے دیا تھا اور اسسٹنٹ نے تسلیم کیا ہے کہ وہ جب دوسری چیزوں کے ساتھ وہ خنجر لے کر آیا تھا تو اس کا پھل اندر دھنس رہا تھا۔ اس نے ساری چیزیں شوٹنگ سے بہت دیر پہلے لاکر سیٹ پر رکھ دی تھیں۔ اس دوران وہاں بہت سے لوگ آئے اور گئے' جیسا کہ عام طور پر سیٹوں پر ہوتا ہی ہے۔ کچھ کو ہم نے دیکھا تھا اور کچھ پر توجہ نہیں بھی دی تھی۔ گزشتہ دو تین شوٹنگز بخیر و عافیت ہوجانے کے بعد ہم تھوڑے سے بے پروا ہوگئے تھے کہ شاید اب کوئی خطرہ نہیں رہا۔"

"وہ اسسٹنٹ کیسا آدمی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نوجوان ہے۔ اپنا ہی بچہ ہے۔ دیکھا بھالا اور پرکھا ہوا لڑکا ہے۔ تقریباً بچپن سے میرے ساتھ ہے۔ کسی لالچ میں آکر کسی خطرناک کام میں ہاتھ ڈالنے والا نہیں ہے۔ میں اس کی فطرت سمجھتا ہوں۔ اس انکشاف کے بعد تو اس بے چارے کی حالت ہی خراب ہوگئی تھی۔ الٹا میں نے اسے تسلی دی۔"

ستارہ بولی "کسی اور کی فلم ہوتی تو اب تک میں چھوڑ کر ایک طرف ہوچکی ہوتی۔ معلوم نہیں میری کونسی نیکی کام آتی رہی ہے جو اب تک میں بچتی رہی ہوں ورنہ میرا خانہ خراب ہونے میں تو کوئی کسر نہیں رہی تھی۔"

"وہ شخص ایک تیر سے کئی شکار کررہا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب تک اس نے جو کوششیں کی ہیں ان میں تمہاری جان بھی جاسکتی تھی۔ تمہارا مستقبل بھی تباہ ہوسکتا تھا۔ فلم بھی مکمل ہونے سے رہ سکتی تھی اور ہماری کمپنی کی ریپوٹیشن ایسی ہوسکتی تھی کہ آئندہ شاید کوئی ہیروئن ہماری فلم سائن ہی نہ کرتی' اسی لئے ان معاملات کو اخبارات میں اچھالنے کی کوشش بھی کی گئی تھی لیکن اس میں اس شخص یا اشخاص کو زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ شاید وہ زیادہ اخبار نویسوں کو خرید نہیں سکے یا انہیں ان خبروں کو ہینڈل کرنا نہیں آیا۔"

"میری جان کو خطرہ لاحق ہے اور تم یہاں بیٹھے مسکرا مسکرا کر اس مسئلے کا تجزیہ کئے جارہے ہو" ستارہ رو دینے والی آواز میں بولی لیکن یہ لہجہ مصنوعی تھا۔ وہ بے چاری مجھے مسئلے کی سنگینی کا احساس دلانے کی پوری پوری کوشش کررہی تھی۔

"خدا نے جتنی تمہاری زندگی لکھ دی ہے وہ تو ہر حال میں پوری ہوگی۔ اس سے پہلے کوئی تمہیں نہیں مار سکتا" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی بعید نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری بے پروائی دیکھ کر زندگی مختصر کردے کہ بھئی ان لوگوں کو تو زندگی کی کوئی قدر ہی نہیں ہے' انہیں زندہ رکھنے سے کیا فائدہ" ستارہ ترکی بہ ترکی بولی "اس لئے بہتر ہے کہ ہم اپنے تحفظ کی کوئی تدبیر کرلیں۔ میں آج تم سے حتمی طور پر یہی معلوم کرنے آئی ہوں کہ تم اس سلسلے میں کچھ کروگے یا نہیں؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا" میں نے سنجیدگی سے کہا "مجھے اب تک مصروفیات نے صحیح طور پر اس مسئلے کی طرف توجہ دینے کی مہلت نہیں دی تھی لیکن ان واقعات کے پیچھے جس کا بھی ہاتھ ہے وہ میری خاموشی سے مجھے کوئی کمزور آدمی سمجھنے لگا ہوگا۔ اب اس کا کچھ بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔"

"سچی بات یہ ہے کہ اگر چوتھی مرتبہ کوئی حادثہ پیش آیا یا آتے آتے رہ گیا تو میں فلم چھوڑنے پر مجبور ہوجاؤں گی" ستارہ نے بظاہر سنجیدگی سے کہا لیکن مجھے معلوم تھا کہ یہ سنجیدگی بھی

مصنوعی ہے۔

"بس۔ اتنا ہی حوصلہ تھا ساتھ دینے کا؟" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"تین بار جان پر کھیل گئے یہ کیا کم ہے" اس نے بدستور سنجیدگی سے کہا "تمہیں زندگی میں کوئی ایسا بھی ملا ہے جس نے ایک بار بھی تمہارے لئے جان کو خطرے میں ڈالا ہو؟ افسانوی باتیں کرنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن عملی طور پر جان سے گزر جانے کے لئے جس حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے وہ کم ہی کسی میں ہوتا ہے... اور پھر مجھے تو کوئی افسانوی سا دعوا بھی نہیں ہے۔ میں تو حقائق کی دنیا میں رہنے والی ایک عام سی لڑکی ہوں۔ میں زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ جس طرح تمہارے کچھ ارادے ہیں' پروگرام ہیں' اسی طرح میرے بھی کچھ خواب ہیں۔"

وہ کم بخت بات کرنے پر آتی تھی تو دل کے بخئے ادھیڑ کر رکھ دیتی تھی۔ انسان کی سب کمزوریاں اسے معلوم تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ دنیا میں بہت کامیاب' بہت کامران اور آسودہ حال نظر آنے والوں کے دامانِ تمنا بھی اکثر تہی ہوتے ہیں۔ میں جو اتنے رنگا رنگ' متنوع اور ہیجان خیز تجربات کا خزانہ سینے میں چھپائے پھر رہا تھا' واقعی یہ دعوا تو نہیں کر سکتا تھا کہ کسی کی خاطر ہم نے جان کو روگ لگایا تھا یا کوئی ہماری خاطر جان سے گزر گیا تھا۔ شاید تمام جذبوں کی شدتیں وقتی اور لمحاتی ہوتی ہیں۔ ہر ایک کی کوئی نہ کوئی مدت ہوتی ہے۔ کسی کی کم' کسی کی زیادہ۔ لیکن تمام شدتیں بالآخر گزر جاتی ہیں اور انسان انہیں بھول کر وہی عام' ہموار' سپاٹ اور بے کیف سے شب و روز گزارنے لگتا ہے۔ یہ بھی تو ایک قسم کی تہی دامنی اور مفلسی ہی ہے کہ آپ کے پاس فخر کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں۔

لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ جو دعوا کر رہی تھی کہ وہ حقائق کی دنیا میں رہنے والی ایک عام سی لڑکی ہے۔ تو درحقیقت وہ بھی اپنے آپ کو بہلا رہی تھی۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں نا کہ وہ بہت حقیقت پسند ہیں... درحقیقت سب سے زیادہ خواب وہی دیکھتے ہیں۔ وہ نہ تو حقیقت پسند تھی اور نہ ہی عام سی عورت۔ وہ بہت خاص عورت تھی لیکن بظاہر نامیانہ پن کے جنگل میں بھٹک رہی تھی۔ اگر وہ حقیقت پسند ہوتی تو اس دن ہی فلم کا کنٹریکٹ منسوخ کر دیتی جس دن پہلا حادثہ پیش آیا تھا۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ کسی سازش کا نتیجہ تھا۔

میرے ذہن کے کسی اندھیرے گوشے میں اداسی کی سرد سی لہر میرے محسوسات کو چھونے لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ اداسی ہر رگِ جاں میں زہر بن کر پھیلتی' میں نے ہنستے ہوئے کہا "تم ہمیں چھوڑ کر تو بھاگ جاؤ گی لیکن اگر یہ نادیدہ اور نامعلوم دشمن درحقیقت تمہارے ہی پیچھے لگا ہوا ہے تو پھر یہ کہیں بھی تمہارا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

یکدم وہ جیسے سچ مچ فکر مند ہو گئی۔ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی "میرا دشمن کون ہو سکتا ہے۔ اور کیوں...؟"

"یہ تو بالکل بے کار سوال ہے" میں نے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا "اس ملک میں بے شمار لوگ تمہارے چاہنے والے اور تمہاری دوستی کے خواہاں ہوں گے۔ ایسی شخصیتوں کے دشمن بھی خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ خودرو پودوں کی طرح۔"

ایک لمحے کے لئے وہ بالکل خاموش ہو گئی' جیسے چوکڑی بھول گئی ہو لیکن پھر ہنستے ہوئے گویا خود کو تسلی دینے کی خاطر بولی "نہیں۔ نہیں۔ میرا بھلا کون دشمن ہو سکتا ہے۔"

"خیر..." میں نے گہری سانس لے کر صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "اب بہت جلد سب کچھ سامنے آ جائے گا' تم سب کچھ مجھ پر چھوڑ دو اور اطمینان سے کافی پیو۔"

وہ کچھ مطمئن نظر آنے لگی۔ کافی کی چند چسکیاں لینے کے بعد میں نے آفاق سے پوچھا "فلم کی کیا پوزیشن ہے؟"

وہ سگریٹ کا گہرا کش لے کر مسکرایا۔ فلم اس کا پسندیدہ موضوع تھا۔ سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے بولا "ابتدا میں تو میں خوفزدہ ہو گیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی آسیب ہمارے پیچھے لگ گیا ہے جو کبھی صحیح طرح شوٹنگ شروع نہیں ہونے دے گا لیکن ایک بار جب کام شروع ہو گیا تو پھر گویا فلم کو پر لگ گئے۔ اگر رفتار یہی رہی تو مجھے یقین ہے کہ چھ ماہ میں ہم اپنی پہلی فلم مکمل کر لیں گے جب کہ یہ بڑی کاسٹ کی فلم ہے۔"

"ہماری یہ دونوں فلمیں تو فارمولا فلمیں ہیں" میں نے کہا "ان سے کمپنی مالی طور پر کچھ مضبوط ہو جائے گی۔ میں چاہتا ہوں اس کے بعد تم بڑی ہی کاسٹ کی ایک نہایت خوبصورت سوشل فلم کی تیاری کرو۔ بہت اچھی کہانی ہو۔ یادگار پرفارمنس ہو سب اداکاروں کی۔ اور پکچرائزیشن میں کوئی نیا پن ہو۔ اس فلم کو بڑے پیار سے' بڑے دھیمے پن سے بے شک زیادہ وقت میں مکمل کرنا۔ لاگت کی پرواہ مت کرنا... اور مجھے اس بات کی بھی زیادہ فکر نہیں ہو گی کہ وہ فلم منافع دیتی ہے یا نہیں۔ لیکن بس یادگار فلم ہو۔ کوئی اس کی برائی نہ کر سکے۔ اسے ایک بری' عام یا فارمولا فلم نہ کہہ سکے لیکن وہ خالصتاً کوئی آرٹ فلم بھی نہ ہو جسے بس چند عام لوگ اور چند ہزار خواص ہی بیٹھ کر دیکھیں اور واہ واہ کرتے رہیں۔ وہ فلم بہت معیاری ہونے کے باوجود نہایت عام آدمی کے لئے بھی ہو۔ ولایت پلٹ لوگوں کے ساتھ ایک تانگے والا یا ریڑھی والا بھی اسے دلچسپی سے دیکھ سکے۔ میرا خیال ہے ایسا فلم بنانا کافی مشکل کام ہے۔"

"کوئی مشکل نہیں" آفاق بلا تامل بولا "اگر ڈائریکٹر میں ذرا سی بھی اہلیت ہو' لاگت کی اسے کوئی پرواہ نہ ہو' منافع کا بھی اسے کوئی لالچ نہ ہو اور فلم کی تکمیل کے لئے کوئی جلد بازی بھی نہ ہو تو پھر ایسی فلم بنانا قطعی مشکل نہیں۔ ہمارے ٹریڈ میں ایسی فلمیں

بنانے کے اہل لوگ بھی کئی موجود ہیں اور کئی خواہشمند بھی ہیں لیکن جن مجبوریوں سے آپ مجھے آزاد کر رہے ہیں ان میں سے کوئی نہ کوئی ان کے ساتھ لگی ہوتی ہے۔ وہ ان سب چیزوں کو نظر انداز کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ آپ متحمل ہو سکتے ہیں اس لئے میں آپ کے لئے ایک نہیں کئی ایسی فلمیں بنا سکتا ہوں کہ آپ سینما ہال میں بیٹھ کر دیکھیں گے تو آپ کی طبیعت خوش ہو جائے گی۔ لیکن اس میں شرط یہی ہو گی کہ اس فلم کو آپ مکمل ہونے کے بعد ہی سینما ہال میں دیکھیں۔ اس کی تیاری کے دوران اس کا ذرا سا بھی حصہ نہ دیکھیں اور نہ ہی شوٹنگ' رش پرنٹ یا اسٹلز وغیرہ دیکھیں۔"

"مجھے تمہاری شرط منظور ہے بلکہ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ اس طرح میرا وقت بچے گا۔ لیکن اگر فلم میری توقعات کے مطابق نہ ہوئی تو میں تم پر جرمانہ کروں گا" میں نے کہا۔

"میں بخوشی ادا کروں گا" آفاق مسکرایا "لیکن مجھے امید ہے کہ اس کی نوبت نہیں آئے گی کیونکہ میں آپ کا مطلب سمجھ گیا ہوں اس لئے میں آپ کی خواہشات کے عین مطابق فلم بناؤں گا۔"

"لو بھئی... یہاں تو مستقبل کی منصوبہ بندیاں شروع ہو گئیں' ... ہم تو چلیں" ستارہ ایک قیامت خیز انگڑائی لے کر اٹھتے ہوئے بولی۔ آفاق بھی اٹھ کھڑا ہوا لیکن پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ اپنا بریف کیس کھول کر وہ ایک بڑا سا' خوبصورت لفافہ نکالتے ہوئے بولا "یہ دعوت نامہ شاید کل پرسوں تک آپ کو ڈاک کے ذریعے بھی مل جائے لیکن ایک میں نے بھی آپ کے لئے لے لیا تھا کہ احتیاطاً آپ کو خود ہی دے دوں گا۔"

"کس قسم کا دعوت نامہ ہے؟" میں نے لفافہ کھولے بغیر پوچھا۔

"پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کا سالانہ ڈنر ہے انٹرکان میں" آفاق بولا "فلم انڈسٹری کے تقریباً سبھی سرکردہ لوگ موجود ہوں گے۔ تاریخ پانچ دن بعد کی ہے۔ آپ کوشش کریں تو وقت نکال سکتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں' چند ایک خاص خاص لوگوں سے تو آپ کا تعارف ہی ہو جائے۔"

"تم کہہ رہے ہو تو میں آ جاؤں گا" میں نے کہا "لیکن یہ کارڈ تم میری سیکریٹری کو دیتے جاؤ تاکہ وہ اپنی اپائنٹمنٹ بک میں نوٹ کر لے۔ کہیں میرے ذہن سے نکل نہ جائے۔ وہ مجھے صحیح وقت پر بتا دے گی۔"

آفاق نے کارڈ اٹھا لیا۔ ستارہ نے ایک مخمور مسکراہٹ کے ساتھ خدا حافظ کہا اور وہ دونوں رخصت ہو گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے دفتری فائلیں ایک طرف کھسکا دیں اور دیر تک بے حس و حرکت اور خاموش بیٹھا رہا۔ میں اپنی سوچوں کو صرف ایک مسئلے پر مرتکز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بالآخر میں نے اپنے ڈائرکٹ لائن والے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا اور ایک نمبر ملایا۔

"سردار علی شاہ!" رابطہ قائم ہونے پر میں نے دھیمی آواز میں کہا "میں تمہیں کچھ واقعات مختصراً سنا رہا ہوں۔ غور سے سننا" میں نے اسے گزشتہ شوٹنگز میں ستارہ کے ساتھ پیش آنے والے تینوں واقعات سنائے جن میں ستارہ ہلاکت و تباہی سے بال بال بچی تھی۔

"یہ باتیں تم نے ذہن نشین کر لی ہیں نا؟" میں نے واقعات سنانے کے بعد پوچھا۔

"یس سر...! آپ سمجھیں کہ آپ نے ایک ایک لفظ کسی کمپیوٹر کی میموری والے خانے میں بھر دیا ہے" دوسری طرف سے مؤدبانہ لہجے میں کہا گیا۔

"اسٹوڈیو میں میرے دفتر کے تقریباً مقابل' پہلی منزل پر' ملک کے نام سے مشہور کسی شخص کا دفتر ہے... پورا نام مجھے معلوم نہیں... دفتر' ملک فلمز' کے نام سے ہے... اس شخص کی شکل بھی میں نے نہیں دیکھی لیکن مجھے شبہ ہے... بلکہ کافی حد تک یقین ہے کہ ان تمام واقعات کے پیچھے اسی شخص کا ہاتھ ہے" میں نے بدستور دھیمے لہجے میں کہا "تمہیں صرف تصدیق کرنی ہے کہ کیا واقعی یہی شخص ان تمام سازشوں کا ذمے دار ہے؟ کہیں میں غلط تو نہیں سمجھ رہا اور کسی دوسرے نامعلوم شخص کی حرکتیں اس کے کھاتے میں تو نہیں ڈال رہا۔ فی الحال صرف اسی مقصد کے لئے یہ تحقیق ضروری ہے۔"

"ٹھیک ہے سر...! یہ کام ہو جائے گا" سردار شاہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کسی کو احساس نہ ہونے پائے کہ کسی قسم کی چھان بین ہو رہی ہے" میں نے ہدایت کی۔

"سر! اس سلسلے میں تو آپ کو فکر مند ہونے کی ضرورت ہی نہیں" سردار شاہ نے گویا مجھے تسلی دی "میں ذہین ترین آدمیوں کو اس کام پر لگاؤں گا۔"

"مجھے جلد از جلد رپورٹ چاہئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور کوشش کر گزرے" میں نے کہا۔

"تاخیر نہیں ہو گی سر!" سردار شاہ وثوق سے بولا "جب انسان کے پاس خرچ کرنے کے لئے روپیہ' استعمال کرنے کے لئے اعلا ذہن کے کارکن اور بوقتِ ضرورت سختی کرنے کے لئے طاقت بھی موجود ہو تو پھر کون سا کام رک سکتا ہے؟ کونسی سی معلومات ہیں جو ہم حاصل نہیں کر سکتے؟ اس سے پہلے بھی ہمیں جس قسم کی معلومات کی ضرورت پڑی ہے ہم نے وہ حاصل کر ہی لی ہیں سر!" اس کے لہجے میں داد کی طلب تھی۔

"ہاں... اس میں تو کوئی شک نہیں اسی لئے تو میں اس قسم کے معاملات میں تم پر زیادہ انحصار کرتا ہوں اور ایسی مہمات کا

انچارج تمہیں ہی بناتا ہوں" میں نے گویا اسے ہلکی سی شاباشی دی "اس معاملے میں زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت اس لئے ہے کہ شاید یہ شخص کچھ زیادہ خطرناک ہو۔ جس انداز سے اس نے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ چالاک بھی ہے اور کافی حد تک بے خوف بھی۔ ہمارا کوئی آدمی اس کی نظر میں نہیں آنا چاہئے۔"

"ایسا ہی ہوگا سر!" سردار شاہ سعادت مندی سے بولا۔

"کتنے دن میں مجھے رپورٹ ملے گی؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے چار دن میں کام مکمل ہوجائے گا سر!" سردار شاہ نے ایک لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا "اگر مزید مہلت کی ضرورت پڑی تو میں آپ کو مطلع کردوں گا۔"

"ٹھیک ہے' خدا حافظ" میں نے ریسیور رکھ دیا اور ایک بار پھر فائلیں اپنے سامنے کھسکالیں۔

اس سے اگلے روز مجھے کراچی جانا پڑا۔ ایک دن بعد واپس آیا تو باہر کی دو خریدار پارٹیوں سے طویل ملاقاتیں رہیں۔

چوتھے دن شام کو جبکہ میں دفتر سے اٹھ کر قالین کے ایکسپورٹروں کی ایک میٹنگ میں جانے کا ارادہ کررہا تھا' فون کی گھنٹی بجی' دوسری طرف سردار شاہ تھا۔

"مکمل رپورٹ حاضر ہے سر!" وہ ہموار لہجے میں بولا "اس فلم ساز کا نام اسلم ملک ہے۔ ستارہ کو ہلاک کرنے کی دو مرتبہ اور اسے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ایک مرتبہ جو کوشش کی گئی تھی اس کے پیچھے اسی کا ہاتھ تھا۔ دینو کے گھوڑے کو خطرناک دوا کا انجکشن لگانے کے لئے سلیم نامی ایک بدمعاش کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس کام کا اسے ایک ہزار روپیہ ادا کیا گیا تھا۔ جس وقت دینو کا گھوڑا اس کے گھر کے قریب واقع سبزہ زار میں چر رہا تھا اس وقت گھوڑے کو انجکشن لگایا گیا تھا۔ ایک اور بدمعاش سڑک کے قریب کھڑا تھا کہ اگر کوئی آتا دکھائی دے تو وہ سلیم کو خبردار کردے۔ انجکشن سنت نگر کے ایک شخص عبدالخالق سے حاصل کیا گیا تھا جو حیوانات کا ڈاکٹر ہے اور اپنی گلی میں ڈنگر ڈاکٹر کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ایک ضرورت مند سا آدمی ہے' اس کی آمدنی بے حد قلیل ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے سانس لینے کو رکا۔ اس کے انداز سے یہی ظاہر ہورہا تھا جیسے وہ لکھی ہوئی رپورٹ پڑھ رہا ہے لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ زبانی ہی اس طرح بول رہا تھا۔ اس قسم کی چیزیں ہم کبھی تحریری شکل میں لانے کی زحمت ہی نہیں کرتے تھے۔

قدرے توقف کے بعد وہ بولا "اور وہ جو شوٹنگ کے دوران بھاری لائٹس اور آہنی پٹی گرنے کا واقعہ پیش آیا تھا اس کے پیچھے بھی اسلم ملک کا ہاتھ تھا۔ اس کے لئے ایک لائٹ مین کو استعمال کیا گیا تھا لیکن وہ لائٹ مین ان میں سے نہیں تھا جو آپ کی شوٹنگ کے وقت کام کررہے تھے۔ اس لائٹ مین کو خاصا معاوضہ دیا گیا' دس ہزار روپے۔ کیونکہ اس میں رسک زیادہ تھا۔ نقلی خنجر کی جگہ اصلی خنجر رکھنے کے معاملے میں ایک بڑھئی کو استعمال کیا گیا جو سیٹ پر لکڑی کی چیزیں تیار کرنے آیا تھا... وہ خنجر اپنے اوزاروں کے تھیلے میں رکھ کر لایا تھا۔ اس کا اسٹوڈیو سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ سیٹ ڈیزائنر نے اچانک ہی ضرورت پڑجانے پر اس کی خدمات حاصل کی تھیں اور ملک کے کسی آدمی نے پیسوں ہی کا لالچ دے کر اسے اپنے مقصد کے لئے استعمال کرلیا" وہ خاموش ہوگیا۔

"بہت خوب" میں نے آہستگی سے کہا "رپورٹ بہت تسلی بخش ہے اور یہ معلومات بہت کم وقت میں حاصل کی گئی ہیں۔ میں اپنے آدمیوں کی کارکردگی سے خوش ہوا ہوں۔"

"شکریہ سر!" سردار شاہ مسرور لہجے میں بولا۔

"زیادہ دقت تو پیش نہیں آئی اس کام میں؟" میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"آپ ہی نے تو ہمیں ٹریننگ دی ہے سر... کہ مقصد کے حصول میں اگر دشواری پیش آئے بھی تو اسے دشواری نہیں سمجھنا چاہئے' درحقیقت وہ صلاحیتوں کا امتحان ہوتا ہے" سردار شاہ بولا "اس کام میں تو ویسے بھی کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی... بس روپیہ خرچ ہوا اور ایک جگہ ہمارے آدمی کو خفیہ پولیس کے عہدے دار کا روپ دھارنا پڑا لیکن وہ بھی میک اپ میں تھا سر!" ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "اس سلسلے میں آگے کیا کرنا ہے سر؟"

"میں دو ایک دن میں بتاؤں گا" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

دوسرے دن آفاق نے دوپہر کے قریب فون کرکے مجھے یاد دلایا "سر' آج آپ کو پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنر میں آنا ہے۔"

"مجھے کیتھرین نے یاد دلایا ہے اور میرا آنے کا ارادہ برقرار ہے" میں نے جواب دیا۔

"میں نے سوچا' احتیاطاً میں بھی یاد دلادوں" وہ بولا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرکے سلسلہ منقطع کردیا۔

شام کو میں مقررہ وقت سے خاصی تاخیر کے ساتھ انٹرکان پہنچا تو ہال میں خاصی رونق نظر آئی۔ میں سمجھا تھا کہ وہ کوئی خشک سی تقریب ہوگی مگر شرکاء میں صرف پروڈیوسرز ہی نہیں تھے' کئی معروف ہیروئنیں اور کچھ نامعلوم لیکن ہیروئنوں ہی کی طرح چمکتی دمکتی خواتین بھی موجود تھیں۔ بعض موٹے' بے ہنگم اور بدوضع سیٹھوں کے ساتھ ساتھ حسن وتناسب اور دلکشی و نزاکت کا خوبصورت توازن نظر آرہا تھا۔

آفاق نے کئی پروڈیوسروں' ہیروئنوں اور دیگر لوگوں سے میرا تعارف کرایا اور مجھے یوں لگا جیسے وہ سب خاصے اشتیاق کے ساتھ مجھ سے ملنے کے منتظر تھے۔ ستارہ بھی موجود تھی۔ لوگوں سے ملنے ملانے اور رسمی باتوں کے تبادلے کے بعد میں اور ستارہ ایک طرف جا بیٹھے۔ تقریریں وغیرہ شروع ہوچکی تھیں۔ پہلے مہمان خصوصی کو جو وزارت ثقافت کے ایک اعلیٰ افسر تھے' سپاس نامہ پیش کیا گیا جس میں برسوں پرانے مطالبات دہرائے گئے تھے کہ فلمی صنعت کے لئے یہ کیا جائے' وہ کیا جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ مہمان خصوصی اس کے جواب میں بڑی حوصلہ افزا تقریر کریں گے' تھوڑی سی تنقید کریں گے' کچھ حوصلہ بڑھائیں گے' کچھ وعدے کریں گے جنہیں وہ کل دفتر جاتے ہی بھول جائیں گے۔ حتیٰ کے ایسوسی ایشن کے اگلے سالانہ ڈنر کا دن آجائے گا جس میں کوئی اور مہمان خصوصی آئے گا جس میں ایک بار پھر اسی قسم کی کئی تقریریں اور جوابی تقریریں ہوں گی اور پرنالہ وہیں بہتا رہے گا۔

سپاس نامے کے بعد ایسوسی ایشن کے عہدے داروں نے تقریریں شروع کردیں۔ ہم یوں کریں گے' ہم وہ کریں گے' ہم یہ کرنا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کچھ اسی قسم کی باتیں ہورہی تھیں۔ میں نیم بیزاری سے کبھی تقریریں سننے لگتا تھا اور کبھی ان کی طرف سے دھیان ہٹاکر اپنے بعض معاملات کے بارے میں غور کرنے لگتا تھا۔ اکا دکا مہمان اب بھی آرہے تھے اور جہاں جگہ مل رہی تھی بیٹھتے جارہے تھے۔

اسی دوران گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سے سوٹ میں ایک خاصا دراز قد اور بھاری بھرکم آدمی ہال میں داخل ہوا۔ ستارہ نے مجھے کہنی مار کر اس کی طرف متوجہ کیا لیکن اس وقت تک وہ اگلی قطار میں نظر آنے والی ایک خالی کرسی کا رخ کرچکا تھا اس لیے میں اس کی صورت نہ دیکھ سکا۔

میں نے سوالیہ نظروں سے ستارہ کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتے ہوئے سرگوشی میں بولی "میں نے اپنی زندگی کی کہانیاں تمہیں سناتے ہوئے یہ بھی بتایا تھا کہ جب میری پہلی فلم ریلیز اور کامیاب ہوئی تو ایک خاصے بڑے فلمساز نے مجھے پیشکش کی تھی کہ اگر میں اس سے اس کی مرضی کے مطابق رسم و راہ رکھوں تو وہ مجھے بہت اچھی کوٹھی اور کار خرید کردے گا اور ایک معقول رقم ماہانہ بھی دیا کرے گا۔"

"ہاں.... مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم نے ایسی کوئی بات کی تھی" میں نے سرگوشی میں کہا "تم نے غالباً اسے بڑے سخت انداز میں نفی میں جواب دیا تھا۔"

"ہاں... لیکن کم از کم بظاہر تو اس نے برا نہیں منایا تھا کیونکہ ہماری دنیا میں اس قسم کے اقرار اور انکار چلتے ہی رہتے ہیں" ستارہ سرگوشی میں بولی "یہ جو ابھی سیاہ سوٹ میں ایک شخص اندر آیا تھا یہی تھا وہ فلمساز۔"

"اوہ...." میں نے آہستگی سے کہا اور غیر محسوس طور پر اس شخص کی صورت دیکھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ اس کا رخ مستقل اسٹیج کی طرف تھا اور ہم اس سے کئی قطاریں پیچھے تھے۔

"آج کل کیسے مراسم ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رسمی سے۔ جیسے ہر ایک سے ہوتے ہیں" ستارہ نے جواب دیا "کبھی سامنا ہوجاتا ہے تو ہنس کر ملتا ہے حالانکہ میں اس کی دو فلموں سے انکار بھی کرچکی ہوں۔ اس نے بہت زور دیا تھا۔ کہتا تھا' یہ دونوں فلمیں لکھوائی ہی آپ کے لئے ہیں۔"

"فلموں سے کیوں انکار کیا تھا؟ اس وقت تو تمہیں فلموں کی ضرورت رہی ہوگی" میں نے کہا۔

"پہلے تو یہ شخص مجھے صرف ناپسند تھا کیونکہ اس کے مزاج میں بڑی فرعونیت تھی' جیسے وہ دنیا کی ہر چیز کو خرید لینے یا تسخیر کرلینے کی طاقت رکھتا ہے" ستارہ پہلو بدلتے ہوئے بولی "لیکن پھر مجھے اس سے کچھ خوف بھی محسوس ہونے لگا تھا حالانکہ میں زندگی کے کسی بھی معاملے میں آسانی سے ڈرنے والی عورت نہیں ہوں۔ یہ شخص مجھے ان لوگوں میں سے محسوس ہوتا ہے جن سے کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نا رکھنے کو دل نہیں مانتا۔"

"دلچسپ شخصیت معلوم ہوتی ہے۔ ڈنر کے دوران اس سے میرا تعارف کرانا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

خدا خدا کرکے تقریریں اور جوابی تقریریں ختم ہوئیں اور ڈنر کے لئے مہمان دوسرے ہال کی طرف چل دئے۔

ڈنر کے دوران عورتوں اور مردوں کی ٹولیاں پلیٹیں سنبھالے ادھر ادھر بکھر گئیں۔ خوش گپیاں ہورہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی طرف سے کوئی مترنم قہقہہ سنائی دے جاتا۔ آفاق اپنی برادری میں خاصا مقبول آدمی معلوم ہوتا تھا' جدھر جاتا لوگ اسے گھیر لیتے۔ میں اور ستارہ اپنی قابیں سنبھالے ایک طرف کھڑے تھے۔ بہت سے لوگ بار بار کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

اسی دوران ستارہ ادھر ادھر دیکھے بغیر بولی "مڑ کر مت دیکھنا.... وہ شخصیت ہماری طرف ہی آرہی ہے جس سے تعارف کرانے کی تم نے فرمائش کی تھی۔"

"اوہ...." میں نے صرف اتنا کہا اور بظاہر اپنی پلیٹ کی طرف متوجہ رہا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ کوئی ہمارے دائیں طرف آن کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اور ستارہ نے بیک وقت چونکنے کی اداکاری کی اور گردن گھما کر دیکھا۔ سیاہ سوٹ میں ایک کیم شحیم' سرخ و سفید' ادھیڑ عمر شخص ایک ہاتھ میں پلیٹ اٹھائے ہمارے قریب کھڑا تھا۔

"ارے... ملک صاحب.... آپ' کیا حال چال ہیں؟ کیسے مزاج ہیں؟" ستارہ نے مصنوعی جوش و خروش سے کہا۔

"اپنے حال چال تو ہمیشہ ٹھیک ہی ہوتے ہیں ستارہ بیگم" وہ شخص بھاری اور کو نجدار سی آواز میں بولا "آپ اپنی سنائیں۔"

میں ہال کی مدھم روشنی میں ایک ٹک اس شخص کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن سنسنا رہا تھا اور میں دم بخود سا کھڑا سوچ رہا تھا کہ میری آنکھیں مجھے دھوکا تو نہیں دے رہی ہیں؟ میں اپنے آپ کو یہی سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے ستارہ نے گویا تصدیق کر دی کہ میں جو کچھ سمجھ رہا تھا وہ غلط نہیں تھا۔

ستارہ کہہ رہی تھی "ان سے ملو افق! یہ ملک اسلم صاحب ہیں .... بہت بڑے فلمساز۔ بنیادی طور پر زمیں دار ہیں مگر کافی عرصے سے فلم انڈسٹری کو بھی بڑا وقت دے رہے ہیں۔ بہت سی کامیاب فلمیں بنائی ہیں انہوں نے" ستارہ نے دو تین فلموں کے نام بھی لئے لیکن وہ میں نے نہیں سنے۔

پھر ستارہ نے اس سے میرا تعارف کرایا "اور ملک صاحب! یہ ہیں محمد افضل چوہدری... بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ کچھ عرصے سے تھوڑا بہت ان کا بھی فلم انڈسٹری سے تعلق استوار ہو گیا ہے۔"

"ارے صاحب! یہ چاہے ہمیں نہ جانتے ہوں لیکن ہم تو غائبانہ طور پر انہیں بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔ بڑے چرچے ہیں ان کے فلم انڈسٹری میں۔ ہر ہیروئن دل ہی دل میں ان سے ملنے کی آرزو لئے پھر رہی ہے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے ہیں یہ انڈسٹری میں" وہ اپنے لہجے کو خوشگوار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا لیکن میں اس لہجے میں چھپے ہوئے حسد اور طنز کو محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس نے چمچہ پلیٹ میں رکھ کر مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو اس نے گویا اپنی طاقت کا احساس دلانے کی کوشش کی۔ اس کا ہاتھ بھی اس کے تن و توش کی مناسبت سے خاصا لمبا چوڑا اور آہنی سا تھا۔ میں نے بھی نہایت آہستگی سے اسے احساس دلایا کہ وہ کسی کمزور آدمی سے مصافحہ نہیں کر رہا۔

ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے آمنے سامنے کھڑے تھے۔ وہ قد میں مجھ سے ذرا نکلتا ہوا ہی تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اس خوبصورت اطلاع کا بہت بہت شکریہ ملک صاحب کہ ہر ہیروئن مجھ سے ملنے کا ارمان... دل میں لئے پھر رہی ہے۔ اگر یہ اطلاع مجھے کچھ پہلے مل جاتی تو میں خود جا کر ان معزز خواتین سے مل لیتا...."

اس نے ایک گونجدار سا قہقہہ لگا کر میری بات کاٹ دی اور بدستور زہریلے سے لہجے میں بولا "لیکن اب تو آپ کو واقعی اس کی ضرورت نہیں رہی۔ انڈسٹری کی حسین ترین عورت آپ پر مہربان ہے" اس نے آنکھوں سے ستارہ کی طرف اشارہ کیا۔ "جن پر ان کی نظرِ عنایت ہو ان کی نظر کسی اور طرف اٹھ ہی نہیں سکتی۔"

میں نے اس کے نظریئے کی تردید کی تکلفاً بھی ضرورت نہیں سمجھی اور بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "بے شک۔ لیکن آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہو کہ ستارہ سے میرا تعارف فلم انڈسٹری میں نہیں ہوا۔ اتفاق سے ہم دونوں ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے تھے۔ اور جہاں تک میرے فلم انڈسٹری میں آنے کا تعلق ہے تو حقیقت یہ ہے کہ میں فلم انڈسٹری میں آیا ہی نہیں ہوں۔ میرے پاس اب بذاتِ خود تو کسی نئے بزنس پر عملی توجہ دینے کے لئے وقت ہی نہیں ہے۔ فلم انڈسٹری میں تو میں نے صرف اپنا ایک نمائندہ چھوڑا ہے لیکن بہرحال... خوشی کی بات یہ ہے کہ اس بہانے آپ جیسے لوگوں سے ملاقات ہونے لگی ہے۔"

وہ ایک بار پھر زور سے ہنسا۔ اسی دوران اسے غالباً کوئی شناسا عورت نظر آ گئی جو دور کھڑی منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ ہم سے معذرت کر کے اس کی طرف بڑھ گیا اور ستارہ نے گویا سکون کی سانس لی۔ میں کئی لمحے تک ملک اسلم ہی کی طرف دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ عورت سمیت مہمانوں کے ہجوم میں میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔

"کیا ہوا...؟ ملک صاحب نے تم پر جادو کر دیا کیا؟ ایک ٹک اسی طرف دیکھے جا رہے ہو جدھر وہ گئے ہیں" بالآخر ستارہ بولی۔

میں جب بولا تو اپنی آواز مجھے خشک جھاڑیوں میں سانپ کی سرسراہٹ سے مشابہ محسوس ہوئی "ستارہ! تمہیں معلوم ہے یہ ملک اسلم ہی وہ شخص ہے جس نے اس گھوڑے کو انجکشن لگوایا تھا جس پر سوار ہو کر تم موت کے منہ میں جاتے جاتے بچی تھیں۔ اسی نے اس بات کا اہتمام کرایا تھا کہ شوٹنگ کے دوران تم پر بھاری لائٹس اور پٹی گر پڑے اور اسی نے مصنوعی خنجر کی جگہ اصلی خنجر رکھ کر تمہیں قتل کے الزام میں پھنسوانے کا بندوبست کیا تھا۔ ان سب سازشوں کے پیچھے اسی شخص کا ہاتھ کام کر رہا تھا۔"

"نہیں...." ستارہ کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے بچی۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں "لیکن یہ تو مجھ سے ہمیشہ بڑی خوش خلقی سے ملتا رہا ہے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ سب لوگوں کے دلوں میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ان کے چہروں سے عیاں ہو جاتا ہے؟" میں نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا۔

"لیکن پھر بھی.... میرا مطلب ہے.... بھلا اسے اتنے لمبے چکروں میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ بدستور حیرت زدہ تھی اور مجھے اس کی حیرت پر حیرت ہو رہی تھی۔

"تم نے اس کی پیش کش ٹھکرائی تھی... بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ تم نے اسے ہی ٹھکرایا تھا۔ تمہارا خیال ہے کہ تمہارا جانی دشمن بننے کے لئے یہ وجہ کافی نہیں تھی؟" میں نے پلیٹ قریبی میز پر رکھ کر نیپکن سے ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ ہماری دنیا میں اس قسم کے انکار اور اقرار تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ ایک عورت سودے بازی پر تیار نہیں ہوتی تو دولت مند لوگ 'تو نہیں اور سہی' گنگناتے ہوئے دوسری کی طرف چل دیتے ہیں۔ اور یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ دولت مندوں کو ایک سے ایک بڑھ کر حسین عورت مل بھی جاتی ہے" ستارہ دھیمے لہجے میں بولی "میرا یہ تسلیم کرنے کو دل نہیں چاہ رہا کہ اتنی سی بات کے لئے کوئی اتنی لمبی سازشوں اور چکروں میں پڑ سکتا ہے۔ اس میں رسک بھی تو اچھا خاصا تھا۔ اب میں ایک خاصی نامور ہیروئن ہوں۔ اگر میں حادثاتی طور پر مر جاتی تو تفتیش اچھی خاصی باریک بینی سے ہوتی اور عین ممکن تھا کہ پولیس کوئی سراغ پا کر بالآخر اس تک جا پہنچتی۔"

میں نے قدرے ترحم آمیز سے انداز میں ستارہ کی طرف دیکھا اور ملائمت سے کہا "تو تم بہت چالاک اور ہوشیار ہو لیکن کبھی کبھی بچوں کی طرح معصوم لگتی ہو۔ تم شاید ان معاملات کو نہیں سمجھ سکتیں۔ اس نے کچھ سوچ کر، کوئی بندوبست کر کے ہی ہر قدم اٹھایا ہو گا۔ دوسرے تم بے شک ہر قبیل کے مردوں کی نفسیات کے بارے میں بہت کچھ جانتی ہو گی لیکن ضروری نہیں کہ تم ملک اسلم کو بھی سمجھنے کا دعوا کر سکو۔ شاید وہ اپنی بات کے جواب میں انکار سننے کا عادی ہی نہ ہو۔ شاید انکار سننا اس کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہو۔ وہ ایک بڑا زمیندار ہے اور ایسے لوگوں کا مسئلہ یہی ہے کہ اگر ان کی فطرت میں بھلائی اور نیک طبعی کا پلڑا بھاری ہو جائے تو یہ اپنے حلقۂ اثر اور اپنے ارد گرد کے لوگوں کے لئے فرشتۂ رحمت اور ان کی ذات دوسروں کے لئے پناہ گاہ بن جاتی ہے لیکن اگر ان کی فطرت میں منفی خاصیتوں کا پلڑا بھاری ہو جائے تو پھر یہ قہر و تشدد اور سازشیت کے ایسے پیکر میں ڈھل جاتے ہیں کہ ان کے کرتوت دیکھ کر انسان یقین نہیں کر پاتا کہ یہ اسی دنیا کے لوگ ہیں۔ تم جن باتوں پر حیران ہو رہی ہو وہ تو بالکل معمولی سی باتیں ہیں۔ اس کے نوشتۂ اعمال میں تو جانے کیا کچھ درج ہو گا۔"

ستارہ کے ہونٹ نیم وا تھے۔ وہ بس حیرت سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ شاید میرے چہرے سے کچھ عیاں ہو رہا تھا۔ میں نے کوشش کی کہ میں اپنے آپ کو بالکل نارمل ظاہر کروں جو کہ میری عادت بھی تھی۔ شاید غیر ارادی طور پر میری آنکھوں میں نفرت کے اس الاؤ کی جھلک نظر آ گئی تھی جسے میں نے سینے کی مضبوط چار دیواری میں مقید کیا ہوا تھا۔ شاید یہی جھلک دیکھ کر ستارہ زیادہ خوف زدہ ہو گئی تھی۔

میں مسکرایا تو اس کے چہرے پر قدرے طمانیت نظر آنے لگی۔ میں نے ملائمت سے کہا "ملک اسلم کو خار تم پر ہی نہیں مجھ پر بھی ہے۔ اسٹوڈیو میں ہمارا جو دفتر ہے وہ اسے اپنے لئے یا شاید اپنے کسی چہیتے کے لئے لینے کا خواہش مند تھا۔ اس لئے وہ گویا ایک تیر سے کئی شکار کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہم خوش قسمت ہیں کہ اب تک اس زہریلے سانپ سے بچتے رہے ہیں لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ہم کب تک بچ سکیں گے۔"

"تم میرے ساتھ ہو اور جب تک میرے دوست ہو تب تک مجھے کوئی فکر نہیں" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔

کافی وغیرہ کا انتظام ایک الگ میز پر تھا لیکن میں نے ایک ویٹر سے کہا تو وہ ہمارے لئے کافی بنا کر وہیں لے آیا جہاں ہم کھڑے تھے۔ کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے ستارہ نے ایک بار پھر ملک اسلم کی کوئی بات شروع کی لیکن میں نے ملائمت سے کہا۔ "چلو اب دفع کرو ملک اسلم کو.... یہ اتنی خوبصورت شام ہے۔ یہاں تم موجود ہو۔ اتنے بہت سے دوسرے حسین اور ہنرمند لوگ موجود ہیں۔ ابھی ہم نے بہت اچھا کھانا کھایا ہے۔ اب تو ہماری آنکھوں میں ستارے اور ہماری رگ و پے میں خمار ہونا چاہئے۔ ایسے موقعوں پر اتنی بدصورت باتیں کرنا بڑی ناشکری ہے۔ کفرانِ نعمت ہے۔"

وہ ہنس دی۔ وہی مترنم سی ہنسی جس کے لئے جلترنگ کی تشبیہ بھی کچھ ناموزوں سی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے چہرے سے تناؤ دور ہو گیا تھا اور ایک بار پھر وہی ملاحت، وہی دلکشی اور وہی ٹھہراؤ آ گیا تھا جس کا میں کبھی کبھی اسیر ہونے لگتا تھا۔ میں جب اس کے گھر سے واپس آتا تھا تو بمشکل اپنے آپ کو اس کے سحر سے آزاد کرپاتا تھا۔

ابھی وہ کسی خوبصورت بات کی تمہید ہی باندھنے لگی تھی کہ آفاق کئی آدمیوں کو ساتھ لئے میری طرف آ گیا۔ ان سے میرا تعارف کراتے ہوئے وہ بولا "یہ سب ہماری انڈسٹری کے اہم ستون ہیں اور انہیں آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا" پھر وہ فرداً فرداً ان سب کا نام اور کام بتانے لگا۔ میں حتی الامکان خوش خلقی سے ان سب سے ملا اور دیر تک ادھر ادھر کی کچھ رسمی اور کچھ غیر رسمی سی باتیں ہوتی رہیں۔

بالآخر لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے تو میں اور ستارہ بھی نیچے آئے اور ہوٹل سے باہر نکل گئے۔ ستارہ کا ڈرائیور اسے لینے کے لئے موجود تھا۔ ہوٹل کے برآمدے میں رک کر ستارہ نے نیم وا سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ اب اس کی آنکھوں میں ستارے تھے۔

"اگر تم چاہو تو میری طرف چلو" وہ دھیمی آواز میں بولی۔ "میں آج فارغ ہوں۔"

"لیکن آج میں بہت مصروف ہوں" میں نے جواب دیا۔ "تمہاری یہ حسین دعوت مجھ پر ادھار رہی' ایک احسان کی طرح۔"

اس نے قدرے مایوسی سے گردن کو خفیف سا جھٹکا دیا اور ڈرائیور کی طرف چل دی جو کچھ فاصلے پر گاڑی لئے کھڑا تھا۔ میں پارکنگ لاٹ کی طرف چل دیا۔ آفاق کو ہم اوپر ہی خدا حافظ کہہ

آئے تھے۔ وہ ابھی تک وہیں لوگوں سے باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

میں نے پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالی اور نہایت سست رفتاری سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میں نے ستارہ سے غلط کہا تھا کہ میں بہت مصروف ہوں۔ درحقیقت مجھے کوئی مصروفیت نہیں تھی۔ لیکن میری رگ وپے میں ایک آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس عالم میں کوئی میرے قریب آئے۔ مجھے تنہائی کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔

میں رات گئے گھر پہنچا تو تنہائی کی بے کراں جھیل میری منتظر تھی۔ میں اسی تنہائی کی طلب میں گھر آیا تھا۔ اس طویل و عریض کوٹھی میں صرف چار پانچ نوکر رہتے تھے جن کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس وقت ویسے بھی سب غالباً سرونٹ کوارٹرز میں جا چکے تھے۔ صرف چوکیدار گیٹ کے عقب میں اپنے چھوٹے سے کیبن میں موجود تھا۔ اس نے گیٹ کھولا اور میں گاڑی پورچ میں چھوڑ کر اوپر کی منزل پر واقع اپنے خاص کمرے میں جا پہنچا۔

زندگی میں بہت کم چیزیں مجھے پریشان کرتی تھیں اور میرے سکون میں خلل ڈالتی تھیں۔ میرے حالات نے مجھے اپنے اعصاب اور جسم دونوں کو فولادی بنا لینے میں بڑی مدد دی تھی۔ میں نے اس چیز کی بھی بڑی مشق کی تھی کہ مجھ پر کبھی افسردگی کا غلبہ نہ ہو۔ لیکن شاذ و نادر اگر مجھ پر شکستگی، بے سکونی، افسردگی یا معمول سے ہٹ کر کسی اور کیفیت کا حملہ ہوتا تو میں اس خاص کمرے میں آجاتا تھا۔

یہ کمرا خاص طور پر میری فرمائش پر ڈیزائن کیا گیا تھا۔ اس کی آرائش اور ساخت اس قسم کی تھی کہ اس میں پہنچ کر دنیا سے کٹ جانے کا احساس ہوتا تھا۔ یہ ساؤنڈ پروف بھی تھا۔ سامنے کے رخ پر اس کی دیوار میں ایک بڑا سا تاریک شیشہ لگا ہوا تھا۔ اگر مجھے باہر کی دنیا کو دیکھنا مقصود ہوتا تو میں اس شیشے کے بلائنڈز ہٹا دیتا تھا۔ وگرنہ بس مقید ہو کر بیٹھ رہتا تھا۔

اس کمرے میں داخل ہو کر میں نے دروازہ مقفل کر لیا۔ میں کوئی عادی پینے والا نہیں تھا لیکن اس کمرے میں ایک بار بھی موجود تھا۔ میں نے نہایت مدھم لائٹ جلائی، اپنے لئے ایک ڈرنک تیار کی اور صوفے میں دھنس گیا۔

چند ہی لمحوں میں گویا دنیا سے واقعی میرا رابطہ ٹوٹ گیا۔ میں کسی اور ہی دنیا میں ہلکورے لے رہا تھا۔ یہ شاید میرا ماضی تھا، ...ایک سمندر جس کے تلاطم میں میرا ناتواں وجود کبھی بکھر رہا تھا کبھی سمٹ رہا تھا۔ یا شاید یہ ایک جھلستا صحرا تھا جس میں میں آبلہ پا ادھر سے ادھر گم کردہ راہ، بے منزل و بے نشاں گرتا پڑتا پھر رہا تھا۔ اس صحرا میں میرے سر پر ایک ہی سائبان تھا جو مجھ سے چھین لیا گیا تھا۔

وہ سائبان میرے باپ کی شخصیت تھی۔ میرا معصوم باپ، ایک سیدھا سادا سا دیہاتی انسان، مگر بے پناہ محبت کرنے والا، جس نے مجھے باپ کی شفقت ہی نہیں، ماں کی ممتا بھی دی تھی۔ لڑکپن میں ایک وہی تو میری پناہ گاہ تھی۔ کیسا محفوظ و مامون محسوس کرتا تھا میں اپنے آپ کو اس کے سائے میں۔ اور پھر اس معصوم سے انسان کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیا گیا تھا۔ کسی نے اس کے قتل کی صحیح طرح سے تفتیش کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔ کیونکہ وہ ایک مفلس اور نادار دیہاتی تھا۔ بے سہارا، بے وسیلہ اور اس معاشرے کے مذبح خانے میں بالکل بے وقعت وبے وقار اور بے مقام۔

اپنے جلتے ہوئے چہرے پر نمی محسوس کر کے میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو احساس ہوا کہ میں رو رہا تھا۔ مجھے اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں کا لمس بہت اچھا محسوس ہوا۔ محبت کرنے والے باپ کی یاد میں بہائے جانے والے آنسو ہیرے موتیوں سے زیادہ قیمتی تھے۔

آج مجھے ابا کی ہر بات یاد آرہی تھی۔

جب میرا میٹرک کا رزلٹ آیا تھا تو وہ کیسے اشتیاق سے پگڑی سنبھالے اخبار کی تلاش میں مجھ سے بھی آگے آگے گاؤں کی گلیوں میں دوڑے دوڑے پھر رہے تھے اور جب انہوں نے سنا تھا کہ میں نے تھرڈ ڈویژن میں میٹرک پاس کر لیا ہے تو ان کے چہرے پر کیسی آسودگی آگئی تھی۔ جیسے میں نے کسی بہت بڑے امتحان میں ٹاپ کر لیا ہو۔ کیسے تشکر سے انہوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا "اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے آج ہمیں عزت اور کامیابی عطا فرمائی۔ خدایا، تیرا بڑا شکر ہے کہ ہمارے خاندان میں بھی کوئی لڑکا تعلیم حاصل کر رہا ہے۔"

انہوں نے کئی مرتبہ میری پیشانی چومی تھی اور ان کی آنکھوں سے تشکر کے آنسو چھلک پڑے تھے جو ان کی خشخشی داڑھی میں جذب ہو رہے تھے۔ پھر انہوں نے صدری کی جیب ٹٹول کر اپنی کل پونجی دو روپے آٹھ آنے نکال کر مجھے دیتے ہوئے کہا تھا "جاؤ بیٹا، کمو حلوائی کے ہاں سے کچھ لڈو لے کر اپنے دوستوں کا منہ میٹھا کرا دینا" ان پیسوں سے کسی کا منہ میٹھا کرانے کے بجائے میں نے اور میرے لنگوٹیے دوست راجو نے فلم دیکھی تھی۔

پھر مجھے وہ زمانہ یاد آیا جب مجھے انٹر کا امتحان دینا تھا اور ابا نہ جانے کیا چیز بیچ کر میرے لئے امتحان کی فیس اور دیگر واجبات کا بندوبست کر کے آئے تھے۔ میں نے کہا تھا "ابا! آخر آپ مجھے مزید تعلیم کیوں دلانا چاہتے ہیں؟ یہیں رہ کر یا پھر شہر جا کر میں چھوٹی موٹی نوکری تو اب بھی کر سکتا ہوں اور ہم پر کوئی اتنا زیادہ بوجھ بھی نہیں ہے کہ ہمیں زیادہ کمائی کی ضرورت ہو۔"

ابا نے پگڑی اتار کر کھچڑی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا تھا "بیٹا، بات صرف کمائی کی نہیں ہوتی۔ انسان کے کچھ

خواب بھی ہوتے ہیں۔ میری تمنا ہے کہ تم روپیہ بھی ضرور کماؤ لیکن ساتھ ہی کوئی بڑے اور مشہور آدمی بھی بنو۔ لوگ تمہاری عزت کریں، تمہیں جانیں، تمہیں پہچانیں۔ روپیہ تو بہت سے لوگوں کے پاس ہوتا ہے لیکن وہ سب مشہور تو نہیں ہوتے نا" پھر جیسے ان کی نظریں اپنے خوابوں کی بھول بھلیوں میں بھٹکنے لگی تھیں "میرا جی چاہتا ہے کہ شہر میں تمہارا کوئی بڑا سا بنگلا ہو، تمہاری بیوی کوئی پڑھی لکھی، میم قسم کی عورت ہو۔ فصل آنے پر میں تم لوگوں کے لئے کبھی پیاز، لہسن کی بوری یا گنوں کا گٹھر لے کر آیا کروں اور بنگلے کے باغیچے میں کھیلتے ہوئے میرے گول مٹول پوتے پوتیاں شور مچایا کریں، دادا جی آگئے... دادا جی آگئے، پھر وہ دوڑ کر میری ٹانگوں سے چمٹ جایا کریں۔"

میں نے دھیمی آواز میں کہا تھا "ابا جی! اگر میں بڑا اور امیر آدمی بن گیا اور شہر میں میرا بنگلا ہوا تو کیا آپ میرے ساتھ نہیں رہیں گے؟"

ابا نے سر کھجاتے ہوئے کہا تھا "نہیں بیٹا، میں تو بالکل سیدھا سادا دیہاتی قسم کا آدمی ہوں۔ میں بھلا بنگلے میں رہتا کہاں اچھا لگوں گا۔ میں تو یہیں گاؤں میں رہا کروں گا۔ بس مہینے دو مہینے بعد ملنے آجایا کروں گا۔ تم بس اتنی مہربانی کرنا کہ اپنے دوستوں کو یہ بتانا مت شروع کر دینا کہ یہ بڈھا ہمارا نوکر ہے۔ جیسا کہ کئی دولت مند اور پڑھے لکھے بیٹے اپنے دیہاتی اور ان پڑھ والدین کے بارے میں کہنے لگتے ہیں۔ تم مجھے ابا جی ہی کہا کرنا۔ اکیلے میں بھی اور سب کے سامنے بھی تاکہ میں جی بھر کے اس خوشی کو محسوس کر سکوں کہ میں ایک لائق، مشہور اور دولت مند بیٹے کا باپ ہوں۔"

اس وقت میرا جی چاہا تھا کہ اٹھ کر ان کے سینے سے چمٹ جاؤں اور کسی ننھے بچے کی طرح زور زور سے رونے لگوں۔ لیکن ایک عجیب سی جھجک مانع رہی تھی۔ شاید وہی آنسو آج برسوں بعد بہہ رہے تھے۔

آج میں اس طویل و عریض بنگلے کے اس بالائی کمرے میں تنہا بیٹھا تھا اور غیر ارادی طور پر رو رہا تھا۔ یہاں میری کوئی میم قسم کی بیوی یا گول مٹول بچے نہیں تھے جو دوڑ کر دادا کی ٹانگوں سے چمٹ جاتے۔ لیکن خود ابا بھی تو اس دنیا میں نہیں تھے جو گنوں کا گٹھر لے کر اس بنگلے میں آتے۔

ایک حویلی کے طویل و عریض صحن میں چارپائی پر رکھی ہوئی ان کی لاش میری آنکھوں میں ابھر آئی۔ کلہاڑیوں سے ان کے دست و بازو تقریباً پورے کٹ چکے تھے اور پھر بندوق کی گولیوں سے ان کی آدھی کھوپڑی اڑ گئی تھی۔ میرے خیال میں وہ لوگ ان کے قاتل نہیں تھے جنہوں نے انہیں ہلاک کیا تھا۔ ان کا اصل قاتل وہ زمیں دار تھا جس نے انہیں اپنا مزارع ہونے کی وجہ سے ایک زر خرید غلام اور قربانی کا ایک بے وقعت بکرا سمجھ کر اپنے دشمنوں کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے کے لئے بھیج دیا تھا۔

...ایک میرے ابا ہی نہیں، ان جیسے نہ جانے کتنے سادہ، معصوم اور بن مول بکے ہوئے انسان ان بڑے زمیں داروں کی آپس کی لڑائیوں میں گاجر مولی کی طرح کٹ جاتے تھے اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا تھا کہ ایک انسان کے مرنے سے کتنے انسانوں پر جانے کیا کیا قیامتیں ٹوٹ پڑتی ہیں اور جانے کتنی کہانیاں ادھوری رہ جاتی ہیں۔

اور آج اپنے باپ کے قاتل سے میری ملاقات ہو گئی تھی!

آج میں جس ملک اسلم سے مل کر آیا تھا یہ وہی تو تھا جس نے مجھ سے میری عزیز ترین ہستی چھین لی تھی اور اس کی نظر میں اس ہستی کی اہمیت درخت سے ٹوٹ جانے والی شاخ جتنی بھی نہیں تھی۔ یہ وہی ملک اسلم تھا جس کی حویلی کی بلند و بالا دیوار تلے کھڑے ہو کر سترہ اٹھارہ برس کے ایک مفلوک الحال، بے بس اور نادار لڑکے نے قسم کھائی تھی "ملک! اگر زندگی نے وفا کی تو میں تجھے کتے کی موت ماروں گا۔ میں ایک روز ضرور تیرے لئے فرشتہ اجل بن کر واپس آؤں گا۔"

یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ مجھے اس کے اصل گھر کی چار دیواری تک نہیں جانا پڑا تھا۔ وہ خود ہی اس زندگی کی تماشاگاہ میں مجھ سے آٹکرایا تھا۔

میں نے ستارہ کو تو صرف یہ بتایا تھا کہ اس شخص نے اسے مروانے اور مجھے کاروباری اور جذباتی نقصان پہنچانے کی سازش کی تھی۔ میں نے اسے قطعی نہیں بتایا تھا کہ اس شخص کے ذمے میرا کتنا پرانا اور کیسا ناقابل معافی قرض نکل آیا تھا۔ میں نے ملک اسلم سے مصافحہ کرتے ہی اسے پہچان لیا تھا اور اس وقت اپنے تاثرات کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ پر قیامت سی بیت گئی تھی۔ لیکن اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ وہ بھلا پہچان بھی کیسے سکتا تھا؟ ایک بے وقعت مزارع کے روتے بلکتے لڑکے کی تصویر بھلا اس کے حافظے میں کہاں محفوظ رہ سکتی تھی؟ ایسی نہ جانے کتنی زندہ تصویریں آئے دن اس کی نظروں سے گزرتی تھیں۔ اگر میری وہ تصویر اس کے ذہن میں محفوظ رہی بھی ہوتی تب بھی مجھے آج وہ نہ پہچان پاتا۔ کیونکہ گزرے ہوئے گنتی کے کچھ برسوں میں انقلابات و تغیرات کا ایک سمندر تھا جو میں پھلانگ کر آیا تھا۔ ایک طویل صحرا تھا جو میں نے عبور کیا تھا۔ ...وہ لڑکا جسے گاؤں والے بھیا کہہ کر پکارتے تھے اور آج کا محمد افضل چوہدری عرف انی۔ ان میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ملک اسلم اس انقلاب کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے گلاس خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا اور اٹھ کر دیوار میں نصب شیشے کے پاس آن کھڑا ہوا اور اس کے بلائنڈز ہٹا دیئے۔ اس شیشے کے عقب میں اگر بلائنڈز نہ ہوتے تب بھی باہر سے کچھ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اندر سے البتہ باہر کا منظر

جا سکتا تھا۔ اس وقت گلی کوچوں میں ہو کا عالم تھا۔ عظیم الشان بنگلے اور کوٹھیاں تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں مدھم سے قمقمے ٹمٹما رہے تھے۔

بہت دیر تک میں اندھیرے میں ٹمٹماتے ہوئے ان قمقموں کو دیکھتا رہا۔ نہ جانے کب میں نے رائٹنگ ٹیبل پر سے ایک آرائشی شمع دان غیر ارادی طور پر اٹھا لیا تھا۔ یہ پیتل کا ایک چمکیلا اور وزنی شمع دان تھا اور بارہ سنگھے کے سینگوں سے مشابہ تھا۔ میں بے خیالی میں اسے ہاتھوں میں الٹ پلٹ رہا تھا اور ملک اسلم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کب شمع دان پر میری گرفت سخت ہوتی گئی۔

چند لمحے بعد میں نے ہاتھوں میں معمولی سا درد محسوس کرتے ہوئے قدرے چونک کر دیکھا۔ شمع دان میرے ہاتھ میں یوں تڑ مڑ کر رہ گیا تھا جیسے وہ محض کوئی کاغذ کی سی چیز تھی۔ اس بھاری بھرکم شمع دان کو اس حالت تک پہنچانے کے لئے شاید کسی آہنی شکنجے کی ضرورت پڑتی لیکن میرے ہاتھوں میں جانے کب اور کس طرح اس کا یہ حال ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی تو مجھے خود بھی اپنے آپ پر حیرت ہوتی تھی کہ کیا میں واقعی اتنا طاقتور ہوں؟ یا پھر کسی موقع پر میری خواہشِ انتقام اور کسی موقع پر کوئی اور جذبہ میری رگ و پے میں ایسی ناقابلِ یقین قوت بھر دیتا تھا؟

میں نے مڑا تڑا شمع دان رائٹنگ ٹیبل پر آہستگی سے رکھ دیا اور گہری سانس لے کر چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ میرے آنسو خشک ہو چکے تھے اور سینے میں دہکتے الاؤ کی اذیت کچھ ہو گئی تھی۔ چند لمحے بعد میں اس کمرے سے نکل کر نیچے اپنے بیڈ روم میں آ گیا لیکن اس رات میں سو نہیں سکا۔ نیند مجھے صبح کے قریب آئی جب میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔

دن چڑھے میں سو کر اٹھا' تیار ہو کر میں نے ناشتا کیا اور آفس جانے سے پہلے فون پر ایک نمبر ڈائل کیا۔ رابطہ قائم ہونے پر میں نے دھیمے لہجے میں کہا "شبیر! ایک شخص کا نام' پتا اور حلیہ ذہن نشین کر لو۔" میں نے اسے ملک اسلم کا نام' دفتر کا پتا اور حلیہ بتایا اور اس کے بعد کہا "میں چاہتا ہوں کہ اس شخص کی... کم از کم ایک ہفتے مکمل نگرانی کی جائے۔ اس کے تمام معمولات کا بے حد احتیاط اور باریک بینی سے جائزہ لیا جائے اور اس کے بعد یہ فیصلہ کیا جائے کہ شام ڈھلنے کے بعد اسے اغوا کرنے کے لئے کونسا وقت مناسب ترین رہے گا۔ وقت ایسا ہونا چاہئے جب اس کے اغوا کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو سکے۔"

"آپ حکم کریں سر" دوسری طرف سے شبیر شیخ کی آواز سنائی دی جو کسی بھیڑیئے کی غراہٹ سے مشابہ تھی "آپ جس وقت چاہیں' اسے اغوا کیا جا سکتا ہے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہو گی۔ اگر اس کے ارد گرد لوگ بھی موجود ہوں گے تو وہ صرف

یہی بتا سکیں گے کہ وہ کوئی ضروری ٹیلیفون کال سننے یا کسی کا پیغام موصول ہونے کے بعد چند لمحے کے لئے معذرت کر کے باہر گئے تھے اور پھر لوٹ کر نہیں آئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس معاملے میں غیر معمولی احتیاط کی ضرورت ہے" میں نے ملائمت سے کہا "یہ کوئی چھوٹا موٹا آدمی نہیں ہے۔"

"گستاخی معاف سر! چھوٹے موٹے آدمی تو ہم بھی نہیں اٹھاتے" وہ دھیرے سے بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے" میں نے ایک بار پھر اس کی تائید کی۔ "لیکن میں اس معاملے سے محظوظ ہونا چاہتا ہوں اس لئے میں یہ پسند نہیں کروں گا کہ کسی بھی معمولی سی بے احتیاطی یا خوش فہمی کے باعث میرے اس چھوٹے سے تفریحی ڈرامے میں کوئی بدمزگی یا کرکرا پن پیدا ہو جائے۔ اس لئے میں سردار شاہ کے ذمے یہ کام نہیں لگا رہا کیونکہ میرے لئے یہ بہت ہی زیادہ اہم نوعیت کا ہے۔"

"آپ مطمئن رہیں سر! سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا۔ ایک ہفتے بعد میں آپ کو رپورٹ دوں گا" شبیر نے کہا اور پھر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

وہ ہفتہ میں نے معمول کی مصروفیات میں گزارا۔ عام طور پر اپنے آدمیوں کو کسی کام کے لئے کہہ کر اس وقت تک کے لئے بھول جاتا تھا جب تک اس کا موقع نہیں آ جاتا تھا لیکن جو کام میں نے شبیر شیخ کے سپرد کیا تھا اسے میں ذہن سے نہ جھٹک سکا۔ میری تمام تر مصروفیات کے دوران وہ میرے تحت الشعور کے کسی نہ کسی گوشے میں رینگتا رہا۔ اس دوران میرا اپنے اسٹوڈیو والے دفتر میں بالکل جانا نہیں ہوا۔

ٹھیک ایک ہفتے بعد سہ پہر کے وقت دفتر میں میرے ڈائریکٹ نمبر والے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف شبیر شیخ تھا' وہ پورے ایک ہفتے بعد فون کر رہا تھا مگر اس نے بات کچھ اس طرح شروع کی جیسے ہم چند لمحے پہلے تک مصروفِ گفتگو تھے اور درمیان میں ذرا دیر کے لئے سلسلہ منقطع ہو گیا تھا "سر! اس کے معمولات کچھ بندھے نہیں ہیں" وہ بولا "اس کی روزانہ مصروفیات تو تقریباً ایک جیسی ہیں لیکن ان کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ وہ اسٹوڈیو والے دفتر جاتا ضرور ہے لیکن کبھی صبح چلا جاتا ہے۔ کبھی دوپہر میں اور کبھی شام میں۔ کبھی کبھی وہ اپنی فلموں کی شوٹنگ دیکھنے بھی چلا جاتا ہے۔ شہر سے باہر اس کی ایک چھوٹی سی فلور مل ہے۔ کبھی کبھی اس کا معائنہ بھی کرنے جاتا ہے۔ اس کی زیادہ تر مصروفیات عیاشانہ ہوتی ہیں۔ دفتر میں بھی چھوٹی موٹی ایکٹریس اور دوسری لڑکیاں آتی رہتی ہیں۔ وہ خود بھی بعض کے گھر جاتا رہتا ہے۔ سنیچر کو وہ اپنے ایک دولت مند دوست کی کوٹھی پر رات کے وقت گیا تھا' رات گئے تک وہ وہیں رہا۔ وہاں کئی کاریں پہلے سے موجود تھیں اور رات میں مزید اکا دکا کاریں آتی رہیں اور جاتی رہیں۔ اندر کی سرگرمیوں کی صحیح رپورٹ تو ہمارے آدمی نہیں دے سکے لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ وہاں عیاشی کا کوئی پروگرام چل رہا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اس کوٹھی میں ہر سنیچر کی رات کو یہ اجتماع ہوتا ہے۔ ملک اسلم وہاں سے رات کے پچھلے پہر نکلا تھا اور نشے میں معلوم ہوتا تھا لیکن اس نے اپنی کار صحیح طرح ڈرائیو کی۔ وہ اپنی کار میں اکیلا ہی گھر واپس آیا۔ ہمارے ایک آدمی نے صبح تک اس کوٹھی کی نگرانی کی۔ صبح پو پھٹنے تک وہاں سے پکی عمروں کے مزید کچھ مرد اور ایک خاص قماش کی بڑی طرحدار قسم کی چند عورتیں بھی کاروں میں رخصت ہوتی دیکھی گئیں۔ سر! ایسا لگتا ہے کہ یہ پکی عمروں کے کچھ دولت مندوں کا ٹولہ ہے جن کی زندگی کا مقصد بس عیاشی کے سوا کچھ نہیں۔ دولت سب کے پاس خاصی ہے اور بیٹھے بٹھائے آ رہی ہے۔ سب بس کچھ اسی قسم کی سرگرمیوں میں لگے رہتے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو اگلے سنیچر کو بھی چیک کر لیا جائے کہ وہ لوگ اس کوٹھی پر جمع ہوتے ہیں یا نہیں۔ ملک اسلم جب وہاں سے واپس آ رہا ہو تو وہی وقت اسے اغوا کرنے کے لئے موزوں ترین ہے۔ اس دوران اگر وہ غائب ہو گیا تو ہزاروں قیاس آرائیاں کی جا سکیں گی۔ بات الجھ کر رہ جائے گی۔ کوئی واضح نتیجہ نہیں نکلے گا۔"

"ٹھیک ہے" میں نے آہستگی سے کہا "بلکہ اگلے سنیچر کو اسے صرف چیک مت کرو... اگر وہ واقعی وہاں جاتا ہے تو واپسی میں اسے غائب کر دو۔ یہ کام تمہیں خود ہی کرنا ہو گا۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدمی ساتھ رکھنا۔ جب تم اسے لے کر روانہ ہو جاؤ تو ایک آدمی کی ڈیوٹی لگانا کہ وہ کہیں سے مجھے فون پر اطلاع کر دے کہ کام ہو گیا ہے۔ میں رات بھر اس فون کا منتظر رہوں گا۔"

"ملک کو لے کر جانا کہاں ہے سر؟" شبیر نے ہموار لہجے میں کہا۔

"میں وہی بتانے لگا تھا" میں نے کہا "جہانگیر کے مقبرے کی طرف سے جو سڑک ٹکسال کی طرف جا رہی ہے اس کے دونوں اطراف میں ویرانہ ہے۔ مقبرے کے عقب سے سڑک پر پہنچنے کے بعد جو پہلا سنگِ میل آتا ہے اس طرف بہت گھنے درختوں کا جھنڈ ہے۔ اس جھنڈ کو عبور کر کے اگر ہم بائیں ہاتھ ہی مزید آگے بڑھیں تو بہت بڑے میدانی سے علاقے میں پہنچ جائیں گے۔ ... تمہیں ملک اسلم کو لے کر وہاں پہنچنا ہے۔ گاڑی تم درختوں کے جھنڈ میں چھپاؤ گے۔ ملک کی گاڑی تم وہیں چھوڑ دو گے جہاں سے اسے قابو میں کرو گے۔ راستے ایسے اختیار کرنا جہاں گشتی پولیس وغیرہ سے سامنا ہونے کا کوئی امکان نہ ہو۔"

"یس سر.... آپ کا یہ چھوٹا سا ایڈونچر آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا" شبیر نے جواب دیا۔

"ضرورت محسوس کرو تو تم ٹرانسمیٹر بھی استعمال کر سکتے ہو" میں نے کہا "میں ٹرانسمیٹر پر بھی سگنل کا منتظر رہوں گا۔"

"ٹھیک ہے سر۔ ویسے شاید اس کی ضرورت پیش نہ آئے' یہ کوئی ایسی خطرناک مہم نہیں ہے" شبیر نے کہا "لیکن بہرحال... مجھے آپ کی ہدایت یاد ہے سر... کہ چھوٹے سے چھوٹے کام کو بھی نہایت اہم سمجھ کر سرانجام دینا چاہیے۔"

"بالکل" میں نے طمانیت سے کہا "بہترین نتائج اسی طرح حاصل ہوتے ہیں۔ خدا حافظ۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

امید مجھے بھی یہی تھی کہ ٹرانسمیٹر کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی گی۔ ہمارے پاس خاصے وسیع دائرہ عمل والے ٹرانسمیٹر موجود تھے لیکن ایک عرصے سے ان کے استعمال کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ان کا زیادہ تر استعمال انہی دنوں میں ہوا تھا جب ہمارے زیرِ زمین کاروبار عروج پر تھے۔ اب تو وہ دھندے ختم ہو چکے تھے جن میں ہنگامی ضرورتیں رہتی تھیں۔ میں اس وقت ایک عجیب سی مسرت محسوس کر رہا تھا۔ جب شیر کسی شکار کی گھات میں بیٹھا ہوتا ہے اور شکار بے خبری کے عالم میں اس کے سامنے سے گزر رہا ہوتا ہے اس وقت شاید شیر کی بھی یہی کیفیت

ہوتی ہوگی۔

وہ ہفتہ بھی معمول کی مصروفیات میں گزر گیا اور کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا۔ سنیچر کی رات کو میں جم خانہ سے واپس آکر اطمینان سے سوگیا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ ٹیبل لیمپ جلا کر سب سے پہلے میں نے گھڑی میں وقت دیکھا۔ تقریباً دو بج رہے تھے۔ یہ یقیناً میری مطلوبہ ٹیلیفون کال تھی۔ میری غنودگی ایکدم کافور ہوگئی۔

"یس ...؟" میں نے ریسیور اٹھا کر بشاشت سے کہا۔ دوسری طرف سے کوڈورڈ سنائی دیا۔ میں نے جوابی کوڈورڈ بولا تو گہری سانس لے کر دوسری طرف سے کہا گیا "سر! ارشاد بول رہا ہوں ... شبیر نے پارسل اٹھالیا ہے اور بتائے ہوئے ایڈریس کی طرف روانہ ہوگیا ہے۔ ٹونی اس کے ساتھ ہے۔ میں وہیں ان سے الگ ہوگیا تھا جہاں سے پارسل اٹھایا گیا تھا۔ شبیر نے مجھے ہدایت کی تھی کہ آپ کو اطلاع کردوں۔"

مجھے کچھ ہنسی بھی آئی۔ ارشاد بالکل اسی انداز میں بول رہا تھا جس طرح ہم اپنے دوسرے کاروبار کے زمانے میں بولتے تھے ... بے حد محتاط اور مؤدب۔

"ٹھیک ہے۔ تمہارا کام ختم" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

بیڈ سے نکل کر میں نے نہایت پھرتی سے لباس تبدیل کیا۔ نائٹ گاؤن وغیرہ کی جگہ سوٹ پہنا، ٹائی لگائی تاکہ راستے میں اگر کوئی دیکھے بھی تو اسے دور سے ہی اندازہ ہوجائے کہ ایک معزز آدمی کسی ہنگامی ضرورت کے تحت رات گئے کہیں جارہا ہے۔ چند منٹ بعد میری مرسیڈیز رات کی تاریکی اور سناٹے کا سینہ چیرتی سڑکوں پر فراٹے بھر رہی تھی۔ اس رات اکثر سڑکوں پر اسٹریٹ لائٹس تک روشن نہیں تھیں۔

میں جب مطلوبہ سڑک پر پہنچا تو چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور پھیکی پھیکی سی چاندنی نے ماحول کو کچھ منور تو کردیا تھا مگر یاسیت اور سناٹے میں گویا کچھ اور اضافہ کردیا تھا۔ اس ویرانے میں کبھی کبھار صرف جھینگروں کی آواز سنائی دے جاتی تھی یا پھر دور کہیں کوئی گیدڑ فریادی سے انداز میں چلا اٹھتا تھا، اس کے بعد پھر وہی گہرا سکوت۔

سنگ میل نظر آنے کے بعد میں نے کار کچے میں موڑلی۔ تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد سامنے جھاڑ جھنکاڑ کا سلسلہ پھیلا دکھائی دیا۔ اس سے آگے درختوں کے جھنڈ تھے۔ جھاڑ جھنکاڑ کے ایک حصے سے مجھے ٹارچ جلتی بجھتی دکھائی دی اور میں نے کار کا رخ اسی طرف کرلیا۔ ادھر مجھے جھاڑ جھنکاڑ کے درمیان اس حد تک خلا نظر آگیا کہ گاڑی جھاڑیوں وغیرہ سے الجھتی ہوئی اندر جاسکتی تھی اور تھوڑا ہی آگے جانے کے بعد انہی جھاڑیوں میں اس طرح چھپ جاتی کہ اگر کچے میدانی علاقے میں کوئی آ بھی نکلتا تو گاڑی کا نام و نشان بھی اسے نظر نہ آتا۔ ویسے اس ویرانے میں دن میں بھی کوئی نہیں آتا تھا، پھر رات میں کیا آتا۔

جھاڑیوں میں گھستے ہی مجھے ٹونی نظر آگیا جو ایک ہاتھ میں ریوالور اور ایک ہاتھ میں ٹارچ لیے کھڑا تھا۔ وہ سیاہ جیکٹ اور سیاہ پینٹ میں تھا اور جھاڑیوں ہی میں تقریباً پھنسا کھڑا تھا۔ گاڑی کا دروازہ کھول کر میرے برابر بیٹھ گیا اور ہاتھ کے اشارے سے بتانے لگا۔ "گاڑی ادھر لے چلیے۔" جھاڑیوں کو روندتی ان سے الجھتی ہوئی گاڑی کافی آگے تک آگئی تو اس نے رکنے کا اشارہ کیا۔

آگے دوسری گاڑی کھڑی تھی۔ یہ ایک سیاہ فورڈ تھی۔ شبیر کی پسندیدہ گاڑی۔ میں اور ٹونی اتر کر اس گاڑی تک پہنچے تو اس کے اندر کی لائٹ آن ہوگئی۔ اگلی سیٹ پر مجھے ملک اسلم بیٹھا نظر آیا۔ اس کے عقب میں شبیر بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں پچھلی سیٹ پر نیم دراز، چیونگم چبا رہا تھا لیکن اس کا ہاتھ ایک رائفل پر تھا جس کی نال ملک اسلم کی کنپٹی کو چھو رہی تھی۔

ملک اسلم کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور آنکھیں بری طرح پھیلی ہوئی تھیں۔ ممکن ہے جس وقت شبیر اور ٹونی نے اسے اس کی گاڑی سے اتارا ہو اس وقت وہ نشے میں رہا ہو لیکن اب اس کا نشہ نہ جانے کب کا ہرن ہوچکا تھا بلکہ اس وقت تو وہ خود ایک حواس باختہ ہرن نظر آرہا تھا۔

ملگجی روشنی میں مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ اس نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور اس کے منہ سے سرگوشی نما آواز نکلی۔ "افضل چوہدری ... تم ... !تو تم نے اغوا کرایا ہے مجھے؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا "شبیر! اسے لے آؤ۔ ہمیں جنگل عبور کرکے آگے کھلے میدان میں جانا ہے۔"

شبیر نے رائفل کی نال سے ملک کو ٹھوکا دیا اور خود ہی ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے لیے دروازہ کھولا۔ ملک اسلم خاموشی سے نیچے اتر آیا ...... شبیر چیتے کی سی پھرتی سے کار سے اترا اور ریوالور کی نال سے اس نے ملک کو درختوں کی طرف دھکیلا۔

ملک لڑکھڑایا تو میں نے شبیر کو اشارہ کیا "سختی نہیں۔ اس کے ذمے صرف میرا قرض واجب الادا ہے۔ کوئی اور تکلیف نہ پہنچاؤ" میں نے ملک کو آگے چلنے کا اشارہ کیا اور اس کے تقریباً ساتھ چلنے لگا۔ شبیر اس کی کمر سے رائفل کی نال لگائے اس کے پیچھے تھا۔ ٹونی سب سے پیچھے تھا اور ٹارچ سے ہمیں راستہ دکھا رہا تھا۔ جنگل میں جہاں کہیں چاندنی پہنچ رہی تھی وہاں ٹارچ کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"بات وہ نہیں ہے جو تم سمجھ رہے ہو" میں نے ملائمت سے کہا "تمہارے ذمے تو بہت پرانا اور ناقابل معافی قرض نکل آیا ہے۔"

"پرانا ...؟" اس نے سرسراتی ہوئی آواز میں دہرایا۔ "میں تو تمہیں زیادہ عرصے سے نہیں جانتا۔"

"ہر فرعون صفت شخص ان لوگوں کی شکلیں بھول جاتا ہے جنہیں وہ برباد کرتا ہے" میں نے ہموار لہجے میں کہا "تمہارا کوئی قصور نہیں۔ پیروں تلے کچلی جانے والی چیونٹیوں کی شکلیں کون پہچان سکتا ہے اور کون یاد رکھ سکتا ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ ہم درختوں کے درمیان چلتے جارہے تھے۔ ٹارچ کی روشنی میں درختوں کے سائے ہم سے آگے آگے بھوتوں اور ہیولوں کی طرح بڑھتے نظر آرہے تھے۔

"آخر تم لوگ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے ہو؟" کسی قدر طویل خاموشی کے بعد وہ بولا۔ اب اس کی آواز واضح طور پر کانپ رہی تھی۔

"تم اتنا خوف زدہ کیوں ہورہے ہو ملک اسلم؟" میں نے بہت ملائمت سے پوچھا۔ "تم نے زندگی میں بیسیوں آدمیوں کو اغوا اور قتل کرایا ہے۔ کیا تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ جس وقت تمہارے آدمی انہیں اغوا کرکے قتل کرنے یا کوئی اور بھیانک سزا دینے کے لیے کہیں لے جارہے ہوتے ہیں تو ان کے محسوسات کیا ہوتے ہیں؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں جان بوجھ کر ذرا آہستہ چل رہا تھا تاکہ ہم زیادہ دیر میں جنگل عبور کریں تاکہ ملک اسلم کے اعصاب کو زیادہ بوجھ اور تناؤ برداشت کرنا پڑے۔ اعصاب کی یہ توڑ پھوڑ آدمی کو پہلے ہی نیم جان کردیتی ہے۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ ایک بار پھر ہمت کرکے بولا۔ "مجھے مار کر تمہیں کیا ملے گا؟"

"کس نے کہا کہ ہم تمہیں مارنے کے لیے یہاں لائے ہیں؟" میں نے حیرت کا اظہار کیا۔

"مجھے بچگانہ تسلیاں دینے کی کوشش مت کرو" وہ بے بسی سے بولا "ظاہر ہے تم مجھے یہاں ضیافت کے لیے تو نہیں لے کر آئے۔ شہر سے دور اس ویرانے میں ... رات کے اس پہر!"

"میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوگی" میں نے کہا۔

لیکن اس نے گویا میرے لفظوں پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ گڑگڑانے کے لہجے میں بولا۔ "دیکھو ... میں اپنی زندگی کے لئے بڑی سے بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں ... دس لاکھ ... بیس لاکھ ... پچاس لاکھ ... جتنی رقم تم کہو ... اگر وہ میرے بس میں ہوئی ... خواہ وہ ادا کرنے کے بعد میں قلاش ہی کیوں نہ ہوجاؤں ... میں اتنی رقم تمہیں دینے کو تیار ہوں ... اپنی تمام دولت ... جائداد ... ہر چیز۔"

"تو گویا تمہیں معلوم ہوگیا کہ سب سے قیمتی چیز جان ہے" میں ہنس دیا "لیکن مصیبت یہ ہے کہ انسان کو جان کی قدر و قیمت کا صرف اسی وقت پتا چلتا ہے جب اس کی اپنی جان پر بنتی ہے۔ آج تم اپنی دولت جائداد ہر چیز دینے کو تیار ہو حالانکہ زیادہ تر لوگوں کی جانیں تم نے اسی دولت و جائداد کی خاطر لی ہیں۔ اور جب آدمی چند جانیں لینے میں آسانی سے کامیاب ہوجاتا ہے تو پھر انسانی جانوں سے کھیلنا اس کا مشغلہ بن جاتا ہے۔ آج کی مکروہ سوسائٹی میں سب سے پہلے یہی رجحان رکھنے والوں کی سرکوبی بہت زیادہ ضروری ہے۔ جس طرح شیر کے منہ انسان کا خون لگ جاتا ہے تو وہ آدم خور ہوجاتا ہے اسی طرح انسان کے منہ بھی انسان کا خون بہت جلد لگ جاتا ہے۔"

"دیکھو ... تم جذباتی باتیں چھوڑو۔ مجھے چھوڑ کر تم یک لخت بے حساب دولت حاصل کرسکتے ہو۔ مجھ سے جو بھی قسم چاہو لے لو۔ کہ میں تمہارے متعلق کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہوں گا۔ میں یہ شہر چھوڑ کر ... بلکہ اگر کہو گے تو ملک چھوڑ کر کہیں دور چلا جاؤں گا۔" اس نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ جوں جوں ہم جنگل میں زیادہ فاصلہ طے کرتے جارہے تھے اس کے اعصاب جواب دیتے جارہے تھے۔ وہ میری بات تو گویا سن ہی نہیں رہا تھا، بس مجھے قائل کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔

"ہاں کہ اس دنیا میں ہر چیز بکتی ہے۔" میں نے بدستور ملائمت سے کہا "لیکن تم کم از کم ایک بیٹے سے اس کا باپ خریدنے کی کوشش تو مت کرو۔ ویسے اب تم نے ریٹ کافی بڑھادیا ہے انسانی جان کا۔ برسوں پہلے تم نے ایک انسانی جان کی قیمت دس ہزار روپے لگائی تھی۔ آج ایک انسانی جان کے عوض اپنی ساری دولت و جائداد دینے پر تیار ہو۔ یہ انقلاب کیونکر آیا؟ ... شاید اس لیے کہ وہ جان تمہارے ایک حقیر مزارع کی تھی اور آج مسئلہ تمہاری اپنی جان کا ہے۔"

تب اس نے چونک کر میری طرف دیکھا لیکن ملگجی روشنی میں وہ اب بھی مجھے نہ پہچان سکا۔

"سامنے دیکھ کر چلو ... کسی ٹوٹی ہوئی شاخ وغیرہ میں الجھ کر گر نہ جانا۔" میں نے اسے ہدایت کی اور وہ میرے چہرے سے نظریں ہٹا کر ایک بار پھر سیدھا چلنے لگا۔

"دیکھو ... تم ساری بات مجھے بتادو ... مجھ سے اگر ماضی میں کوئی غلطی ہوئی ہے تو میں اس کی تلافی کی پوری پوری کوشش کروں گا لیکن تم مجھے بتاؤ تو سہی" وہ تقریباً گڑگڑانے لگا تھا۔

"میں نے کہا ناکہ 'میں تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کروں گا'" میں نے اسے اطمینان دلانے کی کوشش کی۔

اب ہم جنگل سے نکل آئے تھے اور سامنے کھلا میدان نظر آرہا تھا۔

چاندنی پھیلی ہوئی تھی اور ناہموار میدان میں بلا کا سکوت تھا۔

ملک اسلم ایک سرخ و سپید آدمی تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھا تو وہ ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔

"آؤ ذرا آگے چلیں" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا اور شبیر نے رائفل کی نال سے اسے آگے دھکیل دیا۔

میدان کے وسط میں پہنچ کر میں نے رکتے ہوئے کہا "یہ بڑی پُرسکون جگہ ہے، دخل در معقولات کا کوئی خطرہ نہیں۔ یہاں انصاف کے ان ٹھیکیداروں کی آمد کا بھی کوئی خطرہ نہیں جو درحقیقت معاشرے میں سب سے زیادہ بے انصافی پھیلانے کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ چنانچہ میں نے اس جگہ کو میدانِ عدل کا نام دے رکھا ہے۔ ہمارے تمہارے اس معاشرے میں حالات اکثر کچھ ایسے ہوجاتے ہیں کہ مظلوم کی داد رسی نہیں ہوتی اور ظالم اپنے تمامتر مظالم کے باوجود بچ نکلتا ہے اور بڑے ٹھاٹ باٹ اور عزت و آبرو سے اس سوسائٹی میں زندگی گزارتا رہتا ہے۔ نہ صرف زندگی گزارتا ہے بلکہ اپنی فطرت کے مطابق پردہ یا... علی الاعلان ظلم کا بازار بھی گرم رکھتا ہے۔ وہ قانون کی کمزوریوں اور اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔ قدرت نے اسے جو حیثیت بخشی ہوتی ہے وہ اس کا بے حد ناجائز استعمال کرتا ہے۔ خصوصاً کمزوروں کی تو وہ زندگی اجیرن کئے رکھتا ہے جبکہ اپنے ہم پلّہ یا اپنے سے زیادہ طاقتور لوگوں سے وہ کترا کر گزرتا ہے یا ان سے بنا کر رکھتا ہے۔ یا بس پھر ان سے زبانی کلامی دشمنی ظاہر کرتا رہتا ہے، عملاً کبھی ان سے نہیں ٹکراتا۔ یہ ایک عام رویّہ ہے جو آج کی سوسائٹی میں چل رہا ہے۔"

اسلم دم بخود میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "شاید تم حیران ہورہے ہو کہ میں نے کیا تقریر شروع کردی۔ میں کوئی مبلغ یا مقرر نہیں ہوں۔ حتیٰ کہ مجھے تو کوئی اچھا آدمی ہونے کا بھی دعویٰ نہیں ہے۔ البتہ میں اتنا ضرور کہوں گا کہ میں ایک نہایت انصاف پسند آدمی ہوں لیکن میرا انصاف ذرا پرانے زمانوں کے اصولوں اور قواعد کے مطابق ہے جب انسان فطرت سے قریب تر زندگی بسر کرتا تھا۔ آج کے دور کے قانون کی موٹی موٹی کتابوں اور طول طویل ضابطوں میں قانونی نکتے تو بے شمار سمٹ آئے ہیں، قانون پر بلاشبہ بہت کام ہوا ہے لیکن انصاف کہیں گم ہوگیا ہے، کھو گیا ہے۔ بے چارہ اتنی بہت سی بھول بھلیوں میں راستہ بھول گیا ہے۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور بدستور ملائمت سے کہا "اس لئے مجبوراً مجھے اسی پرانے، سیدھے سادے اور نہایت مؤثر نظریۂ انصاف کا قائل ہونا پڑا ہے۔ یعنی آنکھ کے بدلے آنکھ۔ کان کے بدلے کان، اور جان کے بدلے جان۔ میں جب کمزور اور بے بس تھا تو معاشرے کے

کئی طبقوں اور کئی افراد نے مجھ پر بہت سے ظلم کئے، بہت زیادتیاں کیں جن میں سے سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ مجھے معصوم اور محبت کرنے والے باپ کے سائے سے محروم کر...

"لیکن مجھے نہیں یاد کہ میں نے کبھی تمہارے باپ کو..." اسلم ہکلایا۔

"یہی تو مزید ظلم کی بات ہے" میں نے اس کی بات کاٹ... "کہ تمہیں یاد بھی نہیں، تم نے ہمارے ساتھ کیا کیا تھا... ہم بہت ہی حقیر لوگ تھے۔ چیونٹیوں سے بھی زیادہ حقیر... آج میرے پاس اتنی طاقت ہے، میرے اتنے وسائل ہیں ک... نے تمہیں بھرے پُرے شہر کی ایک سڑک سے اٹھوالیا؟ اب میرے آدمی صرف میرے اشارے کے منتظر ہیں... چاہوں تو یہ ابھی تمہیں گولی ماردیں اور ہم تمہاری لاش ویرانے میں چھوڑ کر چلے جائیں۔ چیل، کوّے اور گدھ تمہ...

لاش کو نوچ کر کھا جائیں گے۔ شاید کئی دن بعد مسخ شدہ حالت میں تمہاری لاش دریافت ہوسکے بلکہ عین ممکن ہے، صرف ڈھانچا ہی دریافت ہو۔ اور تم اس کے مستحق بھی ہو۔ تمہارے ساتھ اگر ایسا کیا جائے تو یہ کوئی زیادتی نہیں ہوگی لیکن میں پھر بھی ایسا نہیں کروں گا۔ میں تمہارے ساتھ بہت رعایت کررہا ہوں۔ تمہارے لئے اپنی بہت انرجی اور بہت وقت ضائع کررہا ہوں تاکہ تمہیں یہ شکوہ نہ رہ جائے کہ تمہارے ساتھ کوئی زیادتی ہوئی یا تمہیں اپنے دفاع کا موقع نہیں دیا گیا۔"

میں نے ٹائی ڈھیلی کرکے گلے سے نکالی اور پھر کوٹ بھی اتار کر دونوں چیزیں ٹونی کی طرف اچھال دیں۔ ٹونی نے احتیاط سے انہیں بازو پر لٹکالیا۔

"تم بھی ٹائی اور کوٹ سے نجات حاصل کرلو" میں نے کہا۔

ملک اسلم نے ایک نظر اپنے سراپا پر ڈالی اور تھوک نگل کر بولا "تم چاہتے کیا ہو؟"

"کمال ہے! تم ابھی تک نہیں سمجھے؟" میں نے حیرت سے کہا "بھئی، تمہیں مجھ سے مقابلہ کرنا ہے۔ بالکل خالی ہاتھ۔ دیکھ لو، میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے" میں نے اسے اپنی پتلون کی جیبیں تھپتھپا کر دکھائیں "اور میرے آدمی اس مقابلے میں قطعی مداخلت نہیں کریں گے، خواہ تم مجھ پر غالب ہی کیوں نہ آجاؤ۔ اگر تم نے مجھے شکست دے دی تو تمہیں اختیار ہوگا کہ چاہو تو مجھے ہلاک کردو اور چاہو تو معاف کردو۔ اگر تم نے مجھے ہلاک کردیا تب بھی میرے آدمی اپنے طور پر یا قانونی طور پر تمہارے خلاف کوئی کارروائی نہیں کریں گے۔ یہ میرا وعدہ ہے، اس لئے تم بالکل بے خوف ہوکر مقابلہ کرنا۔ میرے خیال میں اس سے زیادہ فیئر گیم کوئی نہیں ہوسکتا۔"

وہ متوحش سی نظروں سے کبھی میری طرف دیکھتا تھا اور کبھی ٹونی اور شبیر کی طرف۔

"غالباً تمہیں میری بات کا یقین نہیں آرہا کیونکہ تمہاری زندگی میں فیئر گیم کا شاید کبھی کوئی تصور نہیں رہا" میں نے کہا۔ "لیکن میں تمہیں اپنے مرحوم باپ کی قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہی ہوگا۔ میرے وعدے پر حرف بہ حرف عمل ہوگا۔ کوٹ اور ٹائی اتار دو۔"

ہچکچاہٹ آمیز سے انداز اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ ٹونی نے اس کا کوٹ اور ٹائی بھی سنبھال لی۔ لیکن ملک اسلم کے دل نے شاید صرف ایک لمحے کے لئے سنبھالا لیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ خوفزدہ سے انداز میں بول اٹھا "یہ کیا بچوں والی باتیں ہیں... میں نہیں لڑسکتا۔"

"نہیں مجبور نہ کرو کہ ہم بزدلوں کی طرح ایک نہتے آدمی کو گولی مار کر ویرانے میں پھینک جائیں" میں نے کہا "اور جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ بچوں والی نہیں، نہایت سمجھداری اور معقولیت کی بات ہے۔ اس سے زیادہ فراخدلانہ پیشکش شاید دنیا میں تمہیں کوئی نہ کرسکے۔"

"مدت ہوگئی... میں خود کبھی کسی سے نہیں لڑا" اسلم بولا۔

"یہ تو بہت بری بات ہے" میں نے کہا "لڑا میں بھی عرصے سے کسی سے نہیں ہوں لیکن ہم تم جیسے آدمیوں کو لڑنے کے قابل تو رہنا چاہئے نا۔ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں کہ تم صرف کارندوں پر حکمرانی کرتے رہو۔ ہمیشہ احکامات ہی جاری کرتے رہو کہ فلاں کو اٹھالیا جائے، فلاں کو قتل کردیا جائے اور فلاں کا حلیہ بگاڑ دیا جائے۔ جو آدمی اس قسم کے احکامات دینے کا عادی ہو اسے خود بھی کسی قابل ہونا چاہئے۔ آدمی میرے پاس بھی بہت ہیں اور میں ان سے بڑے بڑے کام لیتا ہوں۔ بڑے جاں نثار ہیں میرے... اور وہ میرے ایک اشارے پر شہر بھر میں تباہی پھیلا سکتے ہیں۔ تمہیں یہاں تک بھی میرے یہ دو ساتھی لائے ہیں لیکن ایسا میں نے صرف وقت اور غیر ضروری جھگڑوں سے بچنے کے لئے کیا ہے تاہم ضرورت پڑنے پر ... کام میں خود بھی کرسکتا ہوں جو میرے ساتھی کرتے ہیں۔ اسی لئے میں اپنے آپ کو اس چیز کا مستحق بھی سمجھتا ہوں کہ ان کو ... کروں۔ یہ سرداری میں نے خود اپنی صلاحیتوں سے رفتہ رفتہ حاصل کی ہے۔ یہ مجھے ورثے میں نہیں ملی۔ تم اتنے آدمیوں پر حکم چلاتے ہو، اتنی زندگیوں سے کھلونوں کی طرح کھیلتے رہتے ہو۔ تمہارے اپنے بازوؤں میں.... بھی دم ہونا چاہئے۔ آؤ، میدان میں آؤ" میں نے اسے آگے آنے کا اشارہ کیا۔

پھر میں نے ٹونی سے پوچھا "اس کی تلاشی اچھی طرح لی تھی نا؟ اس کے پاس ہتھیار تو نہیں ہے؟"

"اس کے پاس صرف یہ ریوالور تھا۔ کوٹ کی اندرونی جیب میں" ٹونی نے مجھے اپنی پتلون کی جیب سے تین دو کا ایک ریوالور نکال کر دکھایا۔ ملک اسلم بدستور اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔

"اب میدان میں آ بھی جاؤ یار! تم تو شرمیلی دلہن کی طرح وہیں گڑے کھڑے ہو" میں نے کہا "یہ بات طے ہے کہ تمہارے لئے مجھ سے مقابلے کے سوا اب کوئی چارہ نہیں ہے۔ کھلا میدان ہے اور میں تمہارے سامنے ہوں۔ مجھے مار کر ہی اب تم اپنی دنیا میں واپس جاسکتے ہو۔ مجھے شکست دے دو، میرے آدمی خود تمہیں عزت و احترام سے چھوڑ آئیں گے۔"

وہ ایک کیم شحیم آدمی تھا۔ ڈیل ڈول میں مجھ سے کچھ نکلتا ہوا۔ جبکہ میں بھی عام سے قد کاٹھ کا مالک نہیں ہوں۔ اس نے میرا سرتاپا جائزہ لیا گویا نظروں ہی نظروں میں مجھے تول رہا ہو۔ پھر شاید اس کی کچھ ہمت بندھی اور وہ آگے بڑھ آیا۔

چند لمحے تک ہم ایک دوسرے کے سامنے دائرے میں گھومتے رہے۔ شبیر اور ٹونی خاصے فاصلے پر ایک ٹیلہ نما ابھار پر جا بیٹھے تھے اور سپاٹ نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

ملک اسلم نے مجھ پر حملہ کرنے میں پہل کی۔ وہ نہایت پھرتی سے مجھ پر جھپٹا تھا اور اس کے انداز سے ظاہر ہوا کہ لڑنے کے معاملے میں وہ اتنا بھی اناڑی نہیں تھا جتنا ظاہر کر رہا تھا۔ میں نے جھکائی دیتے ہوئے اس کی کنپٹی پر ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ زمین چاٹنے لگا مگر اپنے تمامتر بھاری تن و توش کے باوجود انتہائی پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا پورا موقع دیا اور فوری طور پر اس پر حملہ نہیں کیا۔

اس بار اس نے اپنی دانست میں خاصی چالاکی کا مظاہرہ کیا یعنی ظاہر تو یہ کیا کہ وہ میری گردن پکڑنے کی کوشش کرے گا لیکن درحقیقت اس نے یکدم جھک کر مجھے گرانے کے لئے ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی لیکن اس قسم کے داؤ پیچ میرے لئے بچکانہ تھے۔ میں نے اس کے منہ پر ٹھوکر رسید کی اور وہ الٹ کر لڑکھڑاتا ہوا پیچھے جا گرا۔ میں نے اس بار بھی اسے اٹھنے اور سنبھلنے کا موقع دیا۔

اس نے سر جھٹکا اور منہ صاف کیا۔ اس کے ہونٹ پھٹ گئے تھے اور شاید سامنے کے کچھ دانت بھی ٹوٹ گئے تھے جس کی وجہ سے وہ کچھ چکرا سا گیا تھا۔ یہ تو اسے شروع سے ہی اندازہ تھا کہ میں کوئی تر نوالا نہیں ہوں اسی لئے اتنی بے فکری سے لڑنے کا چیلنج دے رہا ہوں۔ تاہم اب دو ضربیں کھا کر شاید اسے میری طاقت کا کچھ صحیح طور پر اندازہ ہونے لگا تھا۔

اس بار اس نے غالباً بہتر طور پر اپنی توانائیاں مجتمع کیں اور یک لخت بپھرے ہوئے سانڈ کی طرح مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن شاید وہ خود بھی یہ سمجھنے سے قاصر رہا ہو کہ میں نے کس طرح اسے ہوا میں اچھالا اور وہ دھپ سے زمین پر چت آگرا۔ خاصی مٹی ہوا میں اڑی۔ جس طرح وہ گرا تھا، اگر زمین [illegible] نہ ہوتی تو شاید اس کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔

کئی لمحے تک وہ زمین پر ہی پڑا پلکیں جھپکاتا رہا۔ اس دوران میں نے اسے چھوا تک نہیں اور اس کے قریب کھڑے ہو کر اس کے اٹھنے کا انتظار کرتا رہا۔ میں اب اس صورتِ حال سے محظوظ ہونے لگا تھا۔ شاید بلی بھی چوہے سے کھیلتے وقت ایسی ہی لذت محسوس کرتی ہوگی لیکن پھر میں نے سوچا کہ وہ چوہا تو نہیں تھا۔ اگر اسے تھوڑی سی ڈھیل ملتی، ذرا سا موقع ملتا تو وہ مجھ جیسے نہ جانے کتنے آدمیوں کو پیس ڈالتا، فنا کر دیتا۔

اس بار وہ اٹھا تو اس کے چہرے پر موت کا خوف نمودار ہو چکا تھا لیکن چند لمحے میرے مقابل نیم دائرے میں گھومنے کے بعد جب وہ مجھ پر حملہ آور ہوا تو انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے عقل و خرد کو بالائے طاق رکھ دیا ہو اور سوچ لیا ہو کہ مرنا تو ہے ہی اس لئے اب بالکل بے فکر ہو کر وحشیانہ انداز میں ایک آخری کوشش کر کے دیکھ لی جائے۔

اس کا یہ حملہ بہت شدید تھا اگر میں ذرا بھی غافل ہوتا تو میرے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس نے کسی غضبناک درندے کی طرح مجھے دبوچنے کی کوشش کی تھی۔ میری کمر اس کی گرفت میں آگئی اور اس نے خالصتاً دیسی انداز میں دھوبی پٹڑا مار کر مجھے گرانے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کے چہرے پر پوری طاقت سے کہنی رسید کی۔ اس کے حلق سے کربناک چیخ نکلی کیونکہ اس کی ناک یوں پچک گئی تھی گویا کسی نے اس پر وزنی ہتھوڑا دے مارا ہو۔ ایک ہی لمحے میں اس کا چہرہ اور قمیص خون میں تر ہونے لگی۔ خون یکدم ہی گویا ابل پڑا تھا۔

وہ تکلیف کو بھلا کر اندھوں کے سے انداز میں گھوما اور اچانک ہی اس کا گھونسا میرے جبڑے پر پڑ گیا۔ اب تک میری کوشش یہی رہی تھی کہ میں اس سے ایک ہاتھ بھی نہ کھانے پاؤں اور یہ بھی گویا ایک طرح کا ریکارڈ ہی رہے۔ میری اپنی یادوں کے خزانے کے لئے۔ مگر اس نے یہ ریکارڈ قائم نہیں ہونے دیا تھا۔

اس کے گھونسے سے ایک لمحے کے لئے میرا دماغ جھنجھنا کر رہ گیا لیکن اس گھونسے نے گویا میرے غیظ و غضب کے اس سیلاب کو بے قابو کر دیا جس پر میں اب تک بند باندھے ہوئے تھا اور حسبِ ضرورت توانائی استعمال کر رہا تھا۔ میں نے اس کے دونوں کندھوں پر بیک وقت دونوں ہاتھوں سے کراٹے کا وار کیا۔ اس کے حلق سے ایک بار پھر چیخ بلند ہوئی اور دونوں بازو بے جان ہو کر جھول گئے۔

اس نے لات چلانے کی کوشش کی لیکن میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے جوڈو کا ایک داؤ 'چاپ سوئی' آزمایا۔ پھر اس کی کنپٹی پر گھوم کر کک رسید کی۔ وہ گر پڑا تو میں نے اسے متعدد ٹھوکریں رسید کیں جو اس کی کئی پسلیاں توڑنے کے لئے کافی تھیں۔ وہ بالکل ڈرم کی طرح ادھر ادھر لڑھک رہا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کرنے کی کوشش کی مگر وہ مدہوش شرابی کی طرح گرنے لگا تو میں نے اس کی گردن بازو کے شکنجے میں جکڑ لی۔ دوسرے ہی لمحے چٹ کی زوردار آواز آئی اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح زمین پر گر پڑا۔

میں چند لمحے وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ وہ ساکت ہی رہا۔ شبیر پتھر پر سے اٹھ کر آگے آیا۔ اس نے اسلم کی نبض دیکھی، دل کی دھڑکن محسوس کرنے کی کوشش کی اور اٹھتے ہوئے کسی فرض شناس ڈاکٹر کی سی متانت اور بردباری سے بولا "مر چکا ہے سر۔"

"بس اتنی سی جان ہوتی ہے انسان کے بدن میں" میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا "مگر وہ نہ جانے کتنے انسانوں کی جان عذاب میں کئے رکھتا ہے۔"

میں نے اپنے سراپا کا جائزہ لیا۔ میرے صرف جوتے گرد میں اٹ گئے تھے۔ لباس جوں کا توں تھا۔ قمیص البتہ پتلون سے باہر آگئی تھی۔ میں نے اپنا حلیہ درست کیا۔ کوٹ پہنا، ٹائی لگائی

اور ایک بار پھر وہی معزز اور آرام طلب سا آدمی نظر آنے لگا جسے اگر کوئی بظاہر دیکھتا تو یہی سوچتا کہ اس شخص کو تو آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر فائلوں پر دستخط کرنے کے علاوہ کچھ نہیں آتا ہوگا۔

"اس کا کیا کرنا ہے سر؟" شبیر نے لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا فیصلہ میں تم پر چھوڑ رہا ہوں" میں نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا "تم چاہو تو اسے یونہی چھوڑ سکتے ہو۔ کچھ پرندوں اور کیڑے مکوڑوں وغیرہ کا بھی اس پر کچھ حق بنتا ہے۔ وہ دو چار دن آرام سے پیٹ بھر لیں..... اور اگر تمہارا دل چاہے تو اسے دفن کر دو لیکن میں اب چلوں گا، مجھے نیند آرہی ہے۔"

شبیر نے ایک نظر نوٹنی کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کچھ سوچا، بالآخر جھجکتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے سر..... اسے دفن کر دیتے ہیں، کیا یاد کرے گا بے چارہ۔"

"تمہاری مرضی۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں" میں نے کہا اور الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا کر واپس چل دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ شبیر کی گاڑی میں ایک کدال موجود ہوگی جو فولڈ ہونے کے بعد گاڑی کے جیک کا کام دیتی تھی اور اس حالت میں اسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بطور کدال بھی استعمال ہوتی ہوگی۔

وہ دونوں میرے پیچھے پیچھے اپنی گاڑی تک واپس آئے۔ میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ انہیں میں نے ڈکی سے کدال نکال کر واپس میدان کی طرف جاتے دیکھا۔ واپسی پر میں اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ برسوں سے ذہن کے ایک گوشے میں گویا کسی مکڑی نے جالا سا بُن رکھا تھا۔ آج وہ جالا ہٹ گیا تھا۔ ذہن کچھ صاف سا ہو گیا تھا کچھ دیر کے لئے غیر ارادی طور پر میں ہلکے سُروں میں سیٹی بھی بجانے لگا۔ راوی چوک پر ایک جگہ مجھے تین پولیس والے بھی بندوقیں لئے کھڑے نظر آئے لیکن انہوں نے مجھے روکا نہیں۔ گھر آکر لباس تبدیل کر کے میں آرام سے سو گیا۔

اس کے ایک ہفتے بعد میں اپنے مال والے آفس میں بیٹھا تھا کہ سیکریٹری نے انٹرکام پر اطلاع دی "سر! ایک پولیس انسپکٹر آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"پولیس انسپکٹر.....؟" میں نے قدرے حیرت سے دُہرایا، اگرچہ مجھے حیرت ہرگز نہیں تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ٹھیک ہے... بھیج دو۔"

چند لمحے بعد جو باوردی انسپکٹر دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا وہ میرے اندازے سے کہیں کم عمر تھا۔ وہ ایک چاق و چوبند اور اسمارٹ نوجوان تھا۔ اس کی وردی نہایت صاف ستھری، سلیقے سے استری شدہ اور اس کے چھریرے جسم پر بالکل فٹ تھی۔ نیلی ٹوپی کے نیچے اس کی سرخ و سپید رنگت بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس کی بغل میں ایک فائل دبی ہوئی تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے اس سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ مضبوط تھا۔ مجموعی طور پر وہ ایک خاصا مختلف قسم کا آفیسر نظر آرہا تھا۔

"انسپکٹر نعیم احمد" اس نے اپنا تعارف کرایا۔

"تشریف رکھئے" میں نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے آراستہ و پیراستہ آفس پر ایک نظر ڈالی اور بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر مرعوبیت نہیں تھی اور یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی، کم از کم میں اسے اپنے حق میں اچھا نہیں سمجھتا تھا۔

"کیا پینا پسند کریں گے آپ، چائے یا کافی؟" میں نے پوچھا۔

"شکریہ۔ میں اس وقت کچھ نہیں پیوں گا، تفتیش کی غرض سے میں جس کے ہاں جاتا ہوں اس کے ہاں کچھ کھاتا پیتا نہیں" اس نے ملائمت سے جواب دیا۔

"حیرت ہے" میں نے حقیقتاً حیرت سے کہا "یہ میں کیا سُن رہا ہوں کانوں پر اعتبار نہیں آرہا۔"

"کیوں سر! اس میں یقین نہ آنے والی کیا بات ہے؟" اس نے ملائمت سے پوچھا۔

"انسپکٹر..... ! میں نے گاؤں میں پرورش پائی ہے اور بچپن سے میں نے یہ دیکھا ہے کہ اگر گاؤں میں کہیں قتل بھی ہو جاتا تو تفتیش کے لئے آنے والے تھانے دار صاحب اور ان کے ماتحتوں کے لئے مرغیاں پکتی تھیں، پراٹھے تیار ہوتے تھے۔ لاش چادر سے ڈھکی ایک طرف پڑی رہتی تھی، دوسری طرف، ستر

خوان سجے ہوتے تھے۔ مقتول کے ورثا کو دو ہی کام ہوتے تھے۔ یعنی نت نئے کھانے تیار کرنا اور جب ان سے فرصت ملے تو آہ و زاری کرنا، رونا پیٹنا۔ تفتیش کئی کئی دن جاری رہتی تھی اور پولیس پارٹی روزانہ باقاعدگی سے آتی رہتی تھی۔ بالآخر جب کچھ مشتبہ افراد کی فہرست تیار ہو جاتی تھی تو پھر پولیس پارٹی کی آمد و رفت ان کے ہاں شروع ہو جاتی تھی اور مقتول کے ورثا آنسو پونچھ کر نتائج کا انتظار کرنے لگتے تھے۔ کم و بیش یہی سب کچھ میں مختلف جگہوں پر، مختلف انداز میں، مختلف لوازمات کے ساتھ دیکھتا آیا ہوں۔ ماحول، صورت حال اور حیثیتوں کے مطابق تھوڑی بہت تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں" میں بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا دیا۔

اس کے چہرے کی سرخی معمولی سی گہری ہو گئی۔ تاہم وہ گویا تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دیتے ہوئے بولا "آپ تھوڑا سے مبالغے سے کام لے رہے ہیں تاہم میں پھر بھی آپ کی بات کو مکمل طور پر درست تسلیم کرتا ہوں۔ ... لیکن یہ تو آپ بھی تسلیم کریں گے کہ ہر طبقے میں ہر طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ میں اس عزم کے ساتھ اس ڈیپارٹمنٹ میں آیا ہوں کہ جو چیزیں یہاں کی روایت بن چکی ہیں انہیں کچھ بدلنے کی کوشش کروں۔"

پھر وہ ٹوپی درست کرتے ہوئے ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ "شاید اسے آپ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کے مترادف سمجھیں لیکن میں یہ باتیں محض تعارف کے طور پر بتا دینا بہتر سمجھتا ہوں کہ میرا تعلق چھوٹے موٹے زمیندار گھرانے سے ہے۔ کئی سال گزر چکے ہیں میری سروس کو لیکن ابھی تک خدا کا کرم شامل حال رہا ہے کہ میں نے رشوت کا ایک پیسہ بھی نہیں کھایا اور اس وجہ سے جو بھی دشواریاں مجھ پر پڑیں انہیں بھی میں آسانی سے ... گیا۔ ... اور خدا کا ایک کرم یہ بھی ہے کہ اپنی ایمانداری کی وجہ سے محکمے والوں کی نظر میں گندی مچھلی ہونے کے باوجود اس نوجوانی میں ہی اے ایس آئی بھرتی ہونے کے بعد انسپکٹر کے عہدے تک ترقی پا چکا ہوں۔"

"بہت خوب" میں نے ستائشی انداز میں سر ہلایا۔

"برسبیل تذکرہ ایک اور بات کی وضاحت کرتا چلوں" وہ بولا "میں آپ کو سر، کہہ کر اس لئے مخاطب نہیں کر رہا کہ آپ ایک دولت مند انسان ہیں، شہر میں آپ کا بڑا نام ہے، بڑی عزت ہے اور میں آپ سے مرعوب ہو گیا ہوں یا مجھے آپ کی خوشنودی عزیز ہو گئی ہے۔ ایسا کوئی خیال دل میں مت لائیے گا۔ ان میں سے کوئی بات درست نہیں ہے۔ ہر شریف آدمی کا یہ قانونی حق ہے کہ اس وقت تک اس کی عزت کی جائے جب تک وہ مجرم ثابت نہ ہو جائے۔ اس لئے دوران تفتیش یہ واسطہ چاہے مزدور سے پڑے یا مل اونر سے، میں اس کے سماجی مرتبے پر غور کئے بغیر اسے سر ہی کہتا ہوں۔"

"انسپکٹر..... کیا نام بتایا تھا تم نے اپنا؟" میں نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"انسپکٹر نعیم احمد۔" وہ جلدی سے بولا۔

"انسپکٹر نعیم!" میں نے ریوالونگ چیئر پر پہلو بدلتے ہوئے کہا "تم مجھے خواب و خیال کے آدمی لگ رہے ہو۔ مجھے یقین سا ہو رہا ہے کہ ابھی کوئی کھٹکا ہو گا اور میری آنکھ کھل جائے گی۔ تم میری نظروں کے سامنے سے غائب ہو چکے ہو گے، خواب ٹوٹ چکا ہو گا۔ تم جیسے کردار صرف انگریزی کہانیوں میں پائے جاتے ہیں اور وہ بھی ہر انگریزی کہانی میں نہیں، جرم و سزا کی کسی کسی کہانی میں۔ تم اس خطہ زمین کی طرف کیونکر آ نکلے؟"

"بس کبھی کبھی قدرت کو یوں بھی منظور ہوتا ہے" وہ مسکرایا اور دھیرے دھیرے اپنی چھڑی دوسرے ہاتھ پر مارنے لگا۔ "بہرحال آپ یقین رکھئے، میں خواب و خیال کی دنیا کا آدمی نہیں ہوں۔ ٹھوس حقائق کی اسی دنیا سے تعلق ہے میرا اور میں خود بھی ایک ٹھوس حقیقت ہوں۔ اس لکڑی کی طرح" اس نے اپنی چھڑی قدرے بلند کر کے مجھے دکھائی۔ میں چھڑی کی طرف دیکھنے کے بجائے چند لمحے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ بالآخر اس نے نظر چرالی لیکن اگر وہ اتنی دیر بھی میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہا تھا تو یہ اس کی جرات مندی کی دلیل تھی۔

"فرمائیے .... کیسے تشریف لانے کی زحمت کی؟" میں نے انتہائی دھیمے لہجے میں انتہائی ملائمت سے پوچھا۔

اس نے دن اور تاریخ بتاتے ہوئے کہا "ایک ممتاز فلساز، صنعتکار اور بڑے زمیندار مسٹر اسلم ملک تیرہ اور چودہ ستمبر کی درمیانی رات سے غائب ہیں۔ ان کا ایک دفتر آپ کے ایک دفتر کے مقابل فلم اسٹوڈیو میں واقع ہے..."

"اسلم ملک...." میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پرخیال لہجے میں دہرایا۔ "مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ اس نام کے کسی شخص سے کسی تقریب میں ملاقات ہوئی تھی لیکن یہ یاد نہیں رہا کہ وہ کون تھا اور اس کی شکل صورت بھی ذہن میں نہیں رہی.. میں معذرت خواہانہ سے انداز میں مسکرا دیا۔ "روزانہ بہت سے لوگوں سے ملنا پڑتا ہے۔ صرف خاص خاص لوگوں کے نام اور شکلیں ہی ذہن میں رہ جاتی ہیں یا پھر ان لوگوں کی جن سے ہمیں کوئی خاص کام ہو یا جن سے ہمارا کوئی خاص تعلق ہو۔ اور میرا خیال ہے اسلم ملک ان لوگوں کی فہرست میں شامل نہیں ورنہ مجھے اس کے بارے میں ضرور کچھ یاد ہوتا۔ اور جہاں تک میرے اسٹوڈیو والے دفتر کا تعلق ہے تو شاید یہ جاننے سے آپ کی معلومات میں کچھ اضافہ ہو سکے کہ اس سے مجھے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔ وہ بس میرے گروپ آف کمپنیز کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے اس لئے میں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہاں آس پاس کس کس کا دفتر ہے۔"

پھر میں نے نہایت سادگی سے کہا "ویسے بائی دا وے۔"

آپ اسلم ملک کی گمشدگی کی اطلاع مجھے کیوں دینے آئے ہیں؟"

انسپکٹر نعیم احمد گہری نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ پھر اس نے گویا میری آنکھوں میں جھانک کر کچھ پڑھنے کی کوشش کی۔ وہ تقریباً میرا ہی ہم عمر تھا لیکن مجھ جیسے لوگوں کی آنکھیں پڑھنے کے معاملے میں ابھی بچہ تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس ابتدائی مرحلے پر ہی اس کا اعتماد متزلزل ہو چلا تھا۔

تاہم وہ خاصے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "اسلم ملک کے بیٹے قیصر ملک نے رپورٹ درج کراتے ہوئے شبہ ظاہر کیا ہے کہ ان کی گمشدگی میں آپ کا ہاتھ ہے۔"

میں نے بزرگانہ تحمل سے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "انسپکٹر! کل کو اگر کسی شخص نے آکر آپ کے سامنے اس شبے کا اظہار کر دیا کہ امریکا کو ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرانے پر دراصل میں نے ہی اکسایا تھا اور اس نے یہ کارروائی پرل ہاربر پر بمباری کے جواب میں نہیں کی تھی، تو کیا آپ اس سلسلے میں بھی تفتیش کرنے میرے پاس تشریف لے آئیں گے؟"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہا اور اس دوران اس کے چہرے پر سرخی آگئی لیکن پھر اس نے غالباً میری بات کا میرے ہی انداز میں جواب دینے کا فیصلہ کیا اور سادگی سے بولا "نہیں جناب! میں تو ایک چھوٹا سا آفیسر ہوں۔ میں زیادہ بڑے معاملات میں ہاتھ نہیں ڈالتا۔ ملکوں کے مسائل سربراہان مملکت جانیں۔ میں تو صرف یہ دیکھتا ہوں کہ میرے تھانے کے حلقے میں سے اگر کوئی میرے پاس شکایت لے کر آیا ہے تو اس میں کہاں تک صداقت ہے۔ میری زندگی کا واحد مقصد صرف قصور وار کو سزا دلوانا اور بے گناہ کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کرنا ہے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ معاشرے میں ایسا ہی ہو رہا ہے انسپکٹر؟" میں نے ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

وہ ایک لمحے کے لئے گڑبڑایا پھر قدرے بے چینی سے پہلو بدل کر بولا "معاشرے کی میں بات نہیں کرتا۔ اپنی ذات کی حد تک اور جہاں تک میرا اختیار چلتا ہے، میں کوشش کر رہا ہوں۔"

"مجھے خوشی ہے" میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے مُربیانہ لہجے میں کہا "اور شاید تمہیں یہ سن کر خوشی ہو کہ میری زندگی کے بھی صرف تین ہی خاص مقاصد ہیں اور ان میں سے ایک وہی ہے جو تم نے بیان کیا ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ سن کر مجھے واقعی خوشی ہوئی ہے۔" وہ قدرے عدم دلچسپی سے بولا؟ "لیکن فی الحال میں صرف اس کیس کے بارے میں بات کرنا چاہوں گا۔ میں مسٹر اسلم ملک کی گمشدگی کی تفتیش کر رہا ہوں...."

"ہاں۔ میں خود اس موضوع پر آنے لگا تھا۔" میں نے ایک پینسل انگلیوں میں گھماتے ہوئے کہا "تو یہ اسلم ملک کا بیٹا... کیا نام بتایا تم نے اس کا....؟ ہاں، قیصر ملک... اس نے مجھ پر جو شبہ ظاہر کیا ہے اس کی کوئی بنیاد تو ہوگی؟ بغیر کسی بنیاد کے اور محض کسی معزز اور شریف شہری کو تنگ کرنے کے ارادے سے اس پر شبے کا اظہار کرنا یا بہتان لگانا تو خود کئی پہلوؤں سے قانون کی زد میں آتا ہے... اور میرا خیال ہے مجھے اس سلسلے میں اپنے قانونی مشیروں سے مشورہ کرنا پڑے گا.... بہر حال... فی الوقت میں صرف یہی جاننا چاہوں گا کہ کیا اسلم ملک سے میرا کوئی جائداد وغیرہ کا جھگڑا چل رہا تھا... ہمارے درمیان کبھی بحث و تکرار یا کشیدگی کا کوئی موقع آیا تھا؟ کبھی ہم میں سے کسی ایک نے دوسرے کو دھمکیاں دی تھیں؟ کیا کبھی ہمارے کاروباری مفادات ٹکرائے تھے؟ یا ہمارے درمیان شدید کاروباری مخاصمت پائی جاتی تھی جس کی بنا پر ایک دوسرے کو اغوا کرنے کی نوبت آسکتی؟ کوئی بنیاد تو یقیناً رہی ہوگی؟"

میں پُر اشتیاق انداز میں ذرا آگے کو جھک آیا جیسے انسپکٹر یقیناً مجھے کوئی ٹھوس وجہ بتائے گا۔ وہ ایک لمحے کے لئے پھر گڑبڑایا لیکن بظاہر اب بھی پُرسکون رہا اور دھیمے لہجے میں بولا۔

"ریکارڈ پر ایسی کوئی چیز نہیں..." غیر ارادی سے انداز میں اس نے گود میں رکھی ہوئی فائل ایک لمحے کے لئے کھول کر پھر بند کردی۔ "لیکن قیصر ملک کا خیال ہے کہ اس کے والد اور آپ کے درمیان کوئی مخاصمت پیدا ہوئی تھی اور یہ خیال اس کے ذہن میں اپنے باپ کے قریبی ساتھیوں سے تبادلہ خیال کے بعد پیدا ہوا ہے۔ اس کا اپنا تو باپ سے رابطہ کم ہی رہا ہے۔ وہ زیادہ تر ملک سے باہر رہا ہے یا پھر کچھ عرصہ اس نے زمینوں پر گزارا ہے۔ عام طور پر اسے باپ کے معاملات کا زیادہ علم نہیں ہوتا تھا..."

"اس کے باوجود اسے اپنے باپ کے اور میرے درمیان مخاصمت کا علم ہوگیا۔ یہ قیصر ملک اور اس کے باپ کے ساتھی خاصی وجدانی اور الہامی سی صلاحیتوں کے مالک معلوم ہوتے ہیں..." میں نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا۔

"تفتیش کا آغاز بہر حال ایسی ہی باتوں سے ہوتا ہے" انسپکٹر نعیم گہری سنجیدگی سے بولا "اور بعض اوقات ایسی ہی باتوں کے سہارے رفتہ رفتہ ہم مجرم تک جا پہنچتے ہیں۔ میں آپ پر براہ راست کوئی الزام عائد کرنے نہیں، صرف تفتیش کرنے آیا ہوں"

"ہاں... یہ تو خاصی معقول بات ہے۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "تفتیش میں تو کوئی حرج نہیں۔ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" میں نے انتہائی سرد اور رسمی لہجے میں کہا "میرے بدلے ہوئے لہجے کے باعث اس کے چہرے پر غیر محسوس سا تناؤ آگیا۔

"میں صرف آپ کا بیان چاہتا ہوں۔" وہ محتاط لہجے میں بولا

"میں اب تک جو باتیں کرتا رہا، وہ میرا بیان ہی تھا۔ آپ اسے تحریری شکل دے لیجئے، میں دستخط کر دوں گا۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر گویا مجھے کوئی خیال آیا اور میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "آپ نے تاریخ کیا بتائی تھی ... اسلم ملک کس رات غائب ہوا ہے؟"

"تیرہ اور چودہ ستمبر کی درمیانی رات کو۔ وہ اپنے دوست عزت علی کے ہاں کھانے پر گئے تھے۔" انسپکٹر نے پُر امید لہجے میں کہا "وہاں سے وہ رات گئے گھر روانہ ہوئے تھے لیکن گھر نہیں پہنچے۔"

میں نے ذہن پر زور دینے کی اداکاری کی، پھر انٹر کام کا ریسیور اٹھا کر ایک بٹن دبایا "کیتھرین..." میں نے اس حد تک بلند آواز میں کہا کہ انسپکٹر بہ آسانی سن سکے۔

"تیرہ ستمبر کو تو میں اسپین سے آئے ہوئے کچھ تاجروں اور خریداروں کے گروپ سے ملاقات کے لئے کراچی گیا تھا نا؟ پندرہ ستمبر کی شام واپس آیا تھا اور فوراً ہی اسلام آباد چلا گیا تھا، وہاں سے سولہ ستمبر کو واپس آیا تھا۔ یہی تاریخیں تھیں نا؟... ذرا اپنی ڈائری دیکھ کر بتاؤ..."

میں نے انٹر کام کا وہ بٹن دبادیا جس سے کیتھرین کی آواز انسپکٹر بھی سن سکتا تھا۔ صرف ایک لمحے کے توقف کے بعد کیتھرین کی آواز انٹر کام کے اسپیکر پر ابھری "یس سر! آپ کو بالکل ٹھیک یاد ہے، یہی تاریخیں تھیں، یہی شیڈول تھا۔"

"اور میں چونکہ اس وقت کمپنی کے کام پر تھا اس لئے جہاز کے ٹکٹوں کی کاؤنٹر فائل اور ہوٹلوں کے بل وغیرہ بھی اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ کی فائلوں میں محفوظ ہوں گے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"یقیناً سر" کیتھرین نے انگریزی میں مستعدی سے کہا "کیا آپ دیکھنا پسند کریں گے؟ آپ کے کمرے میں بھجواؤں؟"

"میں تو نہیں، البتہ ہمارے مہمان انسپکٹر نعیم شاید دیکھنا پسند کریں، بھجوا دیجئے" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

مطمئن انداز میں ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگا کر میں نے انسپکٹر نعیم کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بظاہر سپاٹ تھا لیکن وہ پُرخیال نظروں سے ایک دیوار گیر فینسی لائٹ کو دیکھ رہا تھا۔

چند لمحے بعد دستک دے کر اور اجازت پاکر چھ فٹ لمبا اور گھنی مونچھوں والا ایک باڈی بلڈر ٹائپ، باوردی چپراسی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دو کھلی فائلیں تھیں۔ نہایت خاموشی سے اس نے فائلیں انسپکٹر کے سامنے رکھ دیں۔ ان میں جہاز کے ٹکٹ اور ہوٹلوں کے بل وغیرہ لگے ہوئے تھے۔

انسپکٹر نے بغور ان کا معائنہ کیا، تاریخیں وغیرہ دیکھیں، اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کیا اور فائلیں میز پر ایک طرف کو کھسکا دیں۔ چپراسی میرا اشارہ پاکر خاموشی سے فائلیں لے گیا اور انسپکٹر نعیم بھی جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بالکل خاموش تھا اور اس کا چہرہ بھی حد سے زیادہ سپاٹ تھا۔ اس کی یہ کیفیت مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ جن لوگوں کے چہروں پر مجھے ان کے محسوسات کا سراغ نہیں ملتا تھا وہ مجھے قدرے تشویش میں مبتلا کردیتے تھے۔

انسپکٹر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "افضل چوہدری صاحب! فی الحال میں جا رہا ہوں اور شاید دوبارہ نہ آؤں لیکن ایک بات بتا دینا میں بہتر سمجھتا ہوں، اگر مجھے کسی کے بارے میں مکمل یقین ہوجائے کہ وہ مجرم ہے لیکن میرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہ ہو جسے عدالتیں تسلیم کر سکیں، تو میں کبھی کبھی خفیہ طور پر اپنی حدود سے بھی تجاوز کر جاتا ہوں اور ہر ممکن کوشش کرتا ہوں کہ مجرم کو اس کے کئے کی سزا ضرور ملے۔"

"تقریباً یہی حال میرا ہے" میں نے بلا تامل کہا "مجھے لگتا ہے ہمارے خیالات بہت ملتے ہیں۔"

اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں خاصا چھوٹا اور کمزور لگ رہا تھا لیکن درحقیقت یہ ایک مضبوط ہاتھ تھا کیونکہ یہ قانون کا ہاتھ تھا، ایک ایماندار آفیسر کا ہاتھ تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے انسپکٹر نعیم سے مل کر خوشی ہوئی تھی۔

میں نے اس کے لئے احتراماً اٹھتے ہوئے کہا "اگر میں آپ کے آتے ہی آپ سے مصافحہ کرتے وقت کہتا کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی تو وہ ایک قطعی رسمی اور جھوٹی بات ہوتی۔ میں آپ کے رخصت ہوتے وقت کہہ رہا ہوں کہ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بہت مدت بعد ایک آئیڈیل پولیس آفیسر سے ملاقات ہوئی ہے اور ایک عرصے تک شاید اس حسین اتفاق کی خوشی محسوس ہوتی رہے۔"

"شکریہ" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ صرف اتنا کہا اور رخصت ہوگیا۔ اس کے جاتے ہی میں نے اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا اور فائلیں دیکھنے لگا۔

جہاز کے ٹکٹوں اور ہوٹلوں کے بلوں والی احتیاط اچھی رہی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ تیرہ اور چودہ ستمبر کی درمیانی رات کو میں نے نہیں، ہمارے ایک آدمی نے میرے نام سے کراچی اور پھر اسلام آباد کا سفر کیا تھا۔ قد کاٹھ اور صورت شکل میں معمولی حد تک مشابہت تو اس میں موجود تھی، تھوڑی سی مزید مشابہت چھوٹی موٹی چیزوں کے ذریعے پیدا کردی گئی تھی۔ وہ غیر ملکیوں اور اجنبیوں سے ملا تھا۔ ان سے شناخت کی تصدیق کرانے کی نوبت مشکل سے ہی آسکتی تھی اور اگر کبھی آبھی جاتی تو ان کے لئے کسی چیز کی تردید کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ اول تو میں اس حد تک نوبت آنے کی اجازت ہی نہیں دے سکتا تھا۔ نعیم تو بے چارہ ایک نوآموز اور پُرجوش انسپکٹر تھا، میرے پاس بڑی بڑی گھاگ چیزوں سے نمٹنے کے لئے ترپ کا ایک نہیں، کئی کئی پتے موجود تھے۔

مجھے کام کرتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ کیتھرین نے اطلاع دی کہ سیٹھ عالم شیر مجھ سے ملنے آئے ہیں۔ سیٹھ عالم شیر میرے اس زمانے کے پرانے شناسا تھے جب میرے زیر زمین دھندے جاری تھے۔ وہ اسی لائن کے آدمی تھے اور ابھی تک ان کا اسمگلنگ کا دھندا زوروں پر تھا لیکن وہ تھے بہت عجیب و غریب قسم کی شخصیت۔

عمر ان کی پچاس سے اوپر تھی۔ باریش تھے، نمازی پرہیزگار آدمی تھے، ماتھے پر محراب تھی اور انہیں دیکھنے والا اگر یہ سوچ

بھی بیٹھتا کہ وہ اسمگلر ہو سکتے ہیں تو شاید سوچنے والا اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کرتا کہ اس کے دل میں یہ بے ہودہ خیال کیونکر آیا لیکن وہ بہرحال اسمگلر تھے اور بڑے دھڑلے کے اسمگلر تھے۔ اس معاملے میں ان کے نظریات بڑے کمال کے تھے۔

اس وقت بھی وہ میرے کمرے میں داخل ہوئے تو ٹخنوں سے اونچی کھدر کی شلوار اور قمیص میں تھے لیکن یہ کھدر ریشم سے زیادہ مہنگی تھی۔ ان کے وجود سے فرانس کی ایک نہایت اعلا اور بیش قیمت پرفیوم کی مہک پھوٹ رہی تھی۔ ان کے سرخ و سپید چہرے پر چوڑی چکلی اور گھنی داڑھی خوب سجی تھی۔ ان کے بال بھی لمبے لمبے تھے اور ان پر ایک نفیس قسم کی گول سفید ٹوپی ٹکی رہتی تھی۔ کشادہ پیشانی پر سجدوں کا نشان دور سے چمکتا تھا۔ مجموعی طور پر ان کی شخصیت بڑی پُرکشش اور سحرانگیز تھی۔

وہ مجھ سے ہاتھ ملانے کا تکلف کئے بغیر کمرے کے اس گوشے میں چلے گئے جہاں صوفے وغیرہ پڑے تھے اور مہمانوں کو غیررسمی انداز میں بٹھایا جا سکتا تھا۔ اپنے خوب صورت اور سبک غیرملکی جوتے اتار کر وہ بڑے اطمینان سے ایک صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولے "برخوردار رانی! تم تو عید کا چاند ہو گئے ہو... مانا کہ تم اب بہت بڑے آدمی بن گئے ہو لیکن تمہیں ہم بزرگوں سے تو میل ملاقات کا سلسلہ نہیں توڑنا چاہئے۔"

"سلسلہ ٹوٹا کہاں ہے صاحب! آپ کی نوازش ہے کہ آپ اکثر اس سلسلے کو جوڑتے رہتے ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میری مصروفیت کا تو واقعی کچھ نہ پوچھیں۔"

انہوں نے واسکٹ کی جیب سے ہوانا کا ایک موٹا سا سگار نکال کر بیش قیمت طلائی لائٹر سے سلگایا اور ایک طویل کش لے کر بولے "میں ایک بہت ضروری کام سے تمہارے پاس آیا ہوں لیکن پہلے کافی منگواؤ۔"

کافی آ چکی تو وہ چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے کے بعد بولے۔ "رانی! مجھے دراصل ٹرانسپورٹ کا مسئلہ درپیش ہے..."

"آپ کو ٹرانسپورٹ کا کیا مسئلہ درپیش ہو سکتا ہے؟" میں حیرت سے بول اٹھا "کئی گاڑیاں ہیں آپ کے پاس... ابھی پچھلے دنوں بھی میں نے آپ کو ایک نئی فورڈ ... میں دیکھا تھا..."

"پوری بات تو سن لیا کرو بے وقوف" انہوں نے مُربیانہ شفقت سے مجھے ڈانٹا "میں ذاتی ٹرانسپورٹ کی بات نہیں کر رہا، مجھے مال کی ٹرانسپورٹیشن کا مسئلہ درپیش ہے۔ مڈل ایسٹ میں ایک ساحل پر میری گھڑیوں کی بہت بڑی کھیپ لاوارث پڑی ہوئی ہے۔ جو لانچ والا میرا مال لایا کرتا تھا اسے کوسٹ گارڈ والوں نے پکڑ لیا ہے اور اس کی باقی لانچیں بڑی شرافت سے سیدھے اور قانونی کاروبار میں لگ گئی ہیں۔ کسی کے مال کا ایک کارٹن بھی نہیں اٹھا رہی ہیں۔ کوئی دوسری پارٹی بھی نہیں مل رہی۔ تمہارے ٹرالر آج کل کس علاقے میں پھر رہے ہیں؟"

"صرف پاکستانی علاقے میں، اور وہ صرف فشنگ کر رہے ہیں" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"دو چار راتوں کے لئے ایک ٹرالر ہمارے کام کے لئے مخصوص کر دو۔ اور یہ مت سمجھنا کہ ہم یونہی دوستی میں کام نکال رہے ہیں۔ معاوضہ جو دوسروں سے طے ہے وہ تمہارے آدمیوں کو بھی ملے گا۔ اور اس کے باوجود ہم احسان مند بھی ہوں گے۔ ویسے یہ ٹرانسپورٹ کا مسئلہ اب اکثر ہی سر اٹھانے لگا ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں کہ ذرا دو چار خاص خاص کاموں سے فرصت ملے تو ایک دو ٹرالر لے کر ڈال ہی دوں۔" انہوں نے سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی اور گہری سانس لے کر بولے "خیر... یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ یہ بتاؤ کہ ٹرالر کب مل سکتا ہے؟"

"میں معذرت خواہ ہوں سیٹھ صاحب" میں نے ملائمت سے کہا "میں نے یہ لائن ہی چھوڑ دی ہے۔ اسمگلنگ سے اب کسی بھی سطح پر میرا کوئی واسطہ نہیں رہا۔ چنانچہ جب اپنے ٹرالر میں خود اس کام کے لئے استعمال نہیں کر رہا تو کسی اور کو اس مقصد کے لئے کیونکر دے سکتا ہوں؟ اس کے لئے تو آپ مجھے معاف ہی فرمائیں۔"

"چھوڑو یار..." وہ گویا میری بات پر یقین نہ کرتے ہوئے بولے "اس قسم کی باتیں تو سبھی کرتے رہتے ہیں کہ جناب ہم لائن چھوڑ رہے ہیں، چھوڑ چکے ہیں یا چھوڑ دیں گے لیکن حقیقت یہ ہے کہ چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی۔"

"یہ آپ اپنے بارے میں کہہ سکتے ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے ملائمت سے کہا "اپنا تو یہ معاملہ ہے کہ جب جس چیز کو منہ لگا لیا اور جب جی چاہا چھوڑ دیا۔ آخر اپنی لائن کے آدمی ہیں آپ، آپ سے تو کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ اگر میں کچھ کر رہا ہوتا تو آپ کو ضرور خبر ہوتی۔ ایک عرصے سے آپ کو میرے مال کے ادھر ادھر آنے جانے یا فروخت ہونے کی کوئی خبر ملی ہے؟"

"نہیں" انہوں نے تسلیم کیا "لیکن یہ کوئی انوکھی یا قابل غور بات نہیں۔ ایسے دور تو ہم سب پر آتے رہتے ہیں جب خاصے لمبے لمبے عرصے کے لئے لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ کوئی ایسی وجہ ہو جاتی ہے لیکن حالات مناسب ہونے پر انگڑائی لے کر اپنے حواس پر سے سستی جھٹک کر ایک بار پھر میدانِ عمل میں آ جاتے ہیں۔ بعض اوقات تو سال سال بھر ہاتھ دھر کر بیٹھنا پڑتا ہے اور بعض اوقات دو چار مہینوں میں برسوں کی کسریں نکل جاتی ہیں۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے لیکن میں نے عرض کیا نا کہ یہ معاملہ نہیں ہے۔ مجھے اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ میرے پاس چاروں طرف سے دولت آ رہی ہے" میں نے انہیں بات کا یقین دلانے کی کوشش کی۔

"کیسی بے وقوفی کی باتیں کر رہے ہو برخوردار" وہ پیار سے بولے "دولت تو خواہ ایک ہزار راستوں سے آ رہی ہو، بھلا کوئی راستہ بند کرنے کو جی چاہتا ہے؟"

"مجھے دوسروں کا نہیں معلوم لیکن میں نے بہرحال وہ راستہ بند کردیا ہے۔ اس راستے سے آنے والی دولت کے بارے میں میرا دل اور ضمیر کچھ زیادہ اطمینان یا خوشی محسوس نہیں کررہا تھا۔" ...میں نے جواب دیا "بلکہ آپ کو بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ اب یہ لائن چھوڑ دیں۔ دولت کی آپ کے پاس کمی نہیں۔ کچھ بلیک منی آپ نے وہائٹ بھی کرلی ہے اور باقی کو بھی تھوڑی سی قربانی دے کر وہائٹ میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اس کے بعد آپ کے سامنے سیکڑوں راستے کھلے ہوں گے۔ جہاں جہاں آپ کا دل چاہے کاروبار پھیلا لیجئے گا۔"

"کیا خوب کھڑے پیروں مروانے والا مشورہ دے رہے ہو" وہ گویا جوش میں آکر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولے "ہر بزنس مین سر پر ہاتھ رکھے رو رہا ہے۔ ذاتی سرمایہ کاری کرکے کوئی کاروبار کرنے کو تیار نہیں' بڑی بڑی کمپنیوں کا بیشتر کام بینکوں کے قرضوں اور پبلک کے شیئرز پر چل رہا ہے۔ سب نے اپنا سرمایہ محفوظ کیا ہوا ہے یا دھڑا دھڑ باہر منتقل کررہے ہیں اور تم مجھے مشورہ دے رہے ہو کہ میں مکمل طور پر روشنی میں آکر اپنی گردن کے لئے پھندا تیار کرنے کا آرڈر دے دوں؟"

پھر وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولے "اسمگلنگ کے بارے میں تم جیسے بیوقوفوں کا دل اور ضمیر اس لئے بے اطمینانی کا شکار رہتا ہے کہ تم نے دلی طور پر یہ تسلیم کر رکھا ہوتا ہے کہ یہ کوئی ناجائز دھندا ہے جبکہ میں نے اس قسم کی کوئی بیمار سوچ نہیں پالی۔ میرا یقین ہے کہ جو کچھ ہم کرتے ہیں یہ کوئی ناجائز دھندا نہیں بالکل صحیح اور جائز کاروبار ہے۔ بھئی' پرانے زمانے میں تو بڑی تجارت یہی تھی کہ قافلوں کے قافلے سامانِ تجارت لے کر ایک شہر سے دوسرے شہر' ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے تھے۔ اس وقت کون سا امپورٹ ایکسپورٹ لائسنس لینا پڑتا تھا؟ کون سی ایل سی کھولنا پڑتی تھی؟ کون سے دوسرے کھڑاگ ہوتے تھے؟ یہ سب انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں اور میں انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کو نہیں مانتا۔ تمہیں معلوم ہے میں اچھا بھلا مذہبی آدمی ہوں۔ اگر میں اپنے نظریات کے بارے میں مطمئن نہ ہوتا تو ضرور اس لائن کو چھوڑ چکا ہوتا۔"

"لیکن مملکت کے قوانین کو ماننا تو مذہبی نکتۂ نظر سے بھی ضروری ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں" وہ بلا تامل بولے "صرف ان قوانین کو مانا جاسکتا ہے جن کا کوئی معقول انسانی یا اخلاقی جواز موجود ہو۔ اب مثال یوں سمجھ لو کہ میں ٹریفک کے سگنل پر گاڑی روکتا ہوں۔ اور یوں انسان کے بنائے ہوئے قانون کی پابندی کرتا ہوں کیونکہ یہ سبھی انسانوں کے فائدے کے لئے بنایا گیا ہے تاکہ ٹکر نہ ہو' کسی کو گزند نہ پہنچے۔ لیکن دوسرے ملکوں سے مال لانے کے سلسلے میں میں اس لئے قوانین کی پابندی نہیں کرسکتا کہ یہ انتہائی غیر معقول ہیں۔ ان کے ذریعے بے تحاشہ اور ناروا قسم کے ٹیکسوں کا بوجھ تو مجھے اور خریدار کو برداشت کرنا پڑتا ہے لیکن فائدہ صرف ایک مخصوص مشینری کو پہنچتا ہے۔ سارا نظام گویا ان کی عیاشیوں کے لئے تخلیق کیا جاتا ہے کہ ان کی لمبی لمبی ائیرکنڈیشنڈ گاڑیوں کے فلیٹ درآمد ہوتے رہیں' ان کے لئے بڑے بڑے آراستہ پیراستہ بنگلے تعمیر ہوتے رہیں اور وہ چھینک آجانے پر بھی بغرضِ علاج' لندن اور پیرس جاتے رہیں اور واپسی پر ان کی بیگمات سامانِ تعیش کی ٹرالیاں بھر کر لاتی رہیں۔ ان تمام ٹیکسوں کا بوجھ آخر میں جاکر درحقیقت جس پر پڑتا ہے' وہ ہے عام آدمی۔ اور اس بے چارے عام آدمی کی حالت یہ ہے کہ کہیں اس کے بچے کو اسکول میں داخلہ میسر نہیں اور کہیں داخلہ میسر ہے تو اس کے بچے کے سر پر اسکول کی چھت گر رہی ہے۔ کہیں اسے اسپتال سے دوا کے نام پر لال پانی بھی دستیاب نہیں اور کہیں وہ پینے کے پانی کو ترس رہا ہے۔ زندگی کی بنیادی سہولتیں جو اس کا حق تھیں' اس کے لئے وہ بھی خواب ہیں' بہت بڑی عیاشی ہیں۔ دوسری غیر منصفانہ بات یہ ہے کہ بااختیار طبقے کو تو اختیارات حاصل ہیں کہ بڑے سے بڑے سیٹھ یا کسی عزت دار آدمی نے ان کے من مانے ٹیکس ادا نہیں کئے تو اسے اندر کردیں' اس کی قرقی کے اشتہارات اخباروں میں چھپوادیں لیکن ایک عام آدمی کو یہ اختیار حاصل نہیں بلکہ اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ کسے پکڑ کر پوچھے کہ جناب یہ سڑک مدتوں سے کیوں ٹوٹی ہوئی ہے؟ یہ ومنی بس کی کھڑکیوں تک میں لوگ کیوں لٹکے ہوئے ہیں؟ یہ گلی کوچوں میں خاک کیوں اُڑ رہی ہے؟ لوگ ذرا ذرا سے کاموں کے لئے دفتر دفتر دھکے کیوں کھاتے پھر رہے ہیں؟ علاج کے لئے کیوں سسک رہے ہیں؟ ان کے بچے اسکول جانے کے بجائے گھٹیا ریستورانوں میں اپنے قد سے بھی بڑے دیگچے کیوں مانجھ رہے ہیں اور مالکوں کی غلیظ گالیاں کیوں سُن رہے ہیں؟ ٹھڈے کیوں کھا رہے ہیں؟ جناب! ان کا جرم کیا ہے؟ آپ کے پاس کوئی ایسا نظام نہیں ہے کہ جس میں آپ کسی سے یہ سوالات کرسکیں یا کسی کو اس کا ذمے دار ٹھہرا سکیں۔ مشینری کا ہر پُرزہ اس کی ذمے داری دوسرے پُرزے پر ڈالے گا۔ برسوں سے اس مقدمے کی لاوارث فائل یونہی ادھر سے ادھر پھر رہی ہے۔ ٹھوکروں میں رُل رہی ہے۔ کسی پلیٹ فارم سے بہت شور مچتا ہے تو جواباً کسی افسرِ اعلیٰ کی طرف سے اعداد و شمار کا ایک پلندہ' ایک گورکھ دھندا جاری کردیا جاتا ہے' جسے کوئی صحیح طرح سمجھ نہیں سکتا' چیلنج نہیں کرسکتا اور پھر تان اس بات پر آکر ٹوٹتی ہے کہ ہمارا ملک ایک غریب اور پسماندہ ملک ہے۔ جب بھی لوگوں کو کچھ دینے کی باری آتی ہے تو ملک غریب اور پسماندہ قرار پاتا ہے لیکن نہ تو ہمارا ٹیکسوں کا نظام غریبانہ اور پسماندہ ہے اور نہ ہی ہماری مشینری کا رہن سہن اور طور طریقے غریبانہ اور پسماندہ ملکوں والے ہیں۔ جب کہ ہم تعلق اس مذہب سے رکھتے ہیں جس میں ایک بدو بھی خلیفہ کا دامن پکڑ کر سرِ مجلس پوچھ لیتا تھا کہ

تم نے یہ ریشمی جُبّہ پہنا ہوا ہے تو اس کے لئے پیسے کہاں سے حاصل کئے؟ تقریروں میں حوالے ہم آج بھی اسی دور کے دیتے ہیں جبکہ عملی طور پر حالت یہ ہے کہ سڑک پر اگر دو سپاہی کسی کو پکڑ کر ڈنڈے مارتے ہوئے گھسیٹ کر لے جارہے ہوں تو ایک عام آدمی آگے بڑھ کر نہیں پوچھ سکتا کہ بھئی اسے کہاں لے جارہے ہو' اس کا جرم کیا ہے؟ جبکہ طاقتور کے آگے قانون کی بے بسی کا یہ عالم ہے کہ ایک آدمی اگر رات کو فلم دیکھ کر دیر سے گھر جارہا ہو تو راستے میں چار جگہ اسے پولیس روکے گی' کچھ جھڑکیاں کھاکر' کچھ بے عزت ہوکر اور کچھ نہ کچھ گنواکر وہ گھر پہنچے گا جبکہ کسی روز گاڑی میں لوگ کسی کو اغوا کرکے' قتل کرکے لاش پچھلی سیٹ پر ڈالے شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سفر کرجائیں تو انہیں کہیں رکنا نہیں پڑے گا۔ شاید اس لئے کہ ان کی گاڑی کی کھڑکیوں سے گنوں کی جھلک نظر آرہی ہوگی ...تو جناب! میں ایسے غیر منصفانہ نظام کے غیر منصفانہ قوانین کو اپنے اوپر لاگو کرنا نہیں چاہتا۔ میرا اپنا ایک ضابطۂ اخلاق ہے۔ میں منشیات کی اسمگلنگ نہیں کرتا' میرے آدمیوں نے کبھی کسی کو بلاوجہ قتل نہیں کیا' میں کوشش کرتا ہوں کہ میری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے' وغیرہ وغیرہ۔"

وہ خاموش ہوگئے۔ اس دوران ان کا سگار بجھ گیا تھا۔ وہ اسے دوبارہ سلگانے لگے۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "حاجی صاحب! آپ کی تقریر دلپذیر سن کر اور آپ کے افکار و نظریات سے آگہی حاصل کرکے بڑی خوشی ہوئی۔ گوکہ آج سے پہلے بھی وقتاً فوقتاً آپ اپنے خیالات فدوی کے گوش گزار کرتے رہے ہیں لیکن آپ کا اندازِ بیاں کچھ ایسا دلچسپ ہے کہ بات پرانی محسوس نہیں ہوتی۔"

وہ سگار کا کش لے کر مجروح سے لہجے میں بولے "تم مذاق سمجھ رہے ہو؟ قسم سے میں اپنے نظریات میں بالکل مخلص ہوں۔ میں خلوصِ دل سے جو کچھ محسوس کرتا ہوں اس کے مطابق عمل کرتا ہوں اور مجھے اپنے طرزِ عمل پر کوئی احساسِ جرم شرمندگی یا پچھتاوا نہیں ہے۔ اگر بہت ہی زیادہ خطرات لاحق نہ ہوتے تو میں علی الاعلان تسلیم کرلیتا کہ ہاں میں اسمگلر ہوں لیکن ملک و قوم کے بہت سے ٹھیکیداروں سے بہتر ہوں۔"

"خیر... انسان کو خود اپنے بارے میں دعوے نہیں کرنے چاہئیں" میں نے دھیمی آواز میں کہا "اس ضمن میں میری گزارش بس یہی ہے کہ... میرے اب اپنی برادری سے راستے الگ ہوچکے ہیں... اور آپ کی معلومات کے لئے بتاتا چلوں کہ میں نے جس طرح دھیرے دھیرے باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت یہ نئی زندگی اختیار کی ہے تو اس میں مجھے کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی۔ چھوٹے موٹے مسائل اور جوڑ توڑ سبھی کاموں میں ہوتے ہیں۔ وہ مجھے اس میں بھی کرنے پڑے لیکن بہرحال اس میں خطرات کم ہیں۔ مجھے یہ نئی زندگی راس آگئی ہے۔"

"یوں کہو کہ عافیت کی خاطر بھیڑیا' بھیڑ کی کھال پہن کر بیٹھ گیا ہے اور شکار کرنے کے بجائے آرام سے نرم نرم گھاس چر رہا ہے" انہوں نے گویا مجھے چڑایا لیکن میں فی الحال چڑنے پر تیار نہیں تھا۔

"جو بھی سمجھ لیجئے" میں نے اطمینان سے کہا۔

پھر گویا انہیں اصل بات یاد آگئی۔ سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولے "یہ سارے مکالمے اور تقریریں خواہ مخواہ بیچ میں آگئیں۔ میں تو تم سے چھوٹی سی بات کرنے آیا تھا۔ تم ٹرا دے سکتے ہو یا نہیں؟" ان کا لہجہ قطعی دوٹوک سا ہوگیا تھا۔

"مجھے اس سلسلے میں جو کچھ عرض کرنا تھا' کرچکا ہوں" میں نے شائستگی سے کہا۔ "میں عام طور پر اپنے پہلے ہی جواب پر قائم رہا کرتا ہوں"

وہ یکدم ہی' جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے' گویا صوفے میں لگے ہوئے کسی طاقتور اسپرنگ نے انہیں اچھال دیا ہو۔ ان کی آنکھیں کچھ بدل سی گئیں۔ خشک اور کھردرے لہجے میں بولے۔ "مانا کہ تم بڑے آدمی بن گئے ہو انی! لیکن جس برادری سے انسان کا اصل تعلق ہو اس سے یوں بے رخی اختیار کرنا اچھا نہیں ہوتا۔ ...اور تمہیں تو شاید معلوم ہی ہوگا کہ ہماری برادری تو اس معاملے میں خصوصی طور پر کچھ زیادہ ہی حساس ہے۔ ساتھ چھوڑ جانے والوں اور وقت پر کام نہ آنے والوں کو ہمارے ہاں کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا"

ان کے لہجے میں دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ بلکہ چھپی ہوئی بھی نہیں تھی' اچھی خاصی عیاں تھی۔ یکبارگی مجھے اپنے کانوں کی لویں تپتی ہوئی محسوس ہوئیں جو کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ میں نے اپنے لہجے کو ہموار رکھنے کی سخت کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "حاجی عالم شیر صاحب! میں آپ کو بزرگ سمجھتا ہوں اور ماضی کی شناسائی کے حوالے سے آپ کا احترام کرتا ہوں۔ آپ کوشش کریں کہ میرے دل میں آپ کا یہ احترام برقرار رہے"

میرے لہجے کی سرد مہری کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے کچھ اور ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا اور سگار کا ایک طویل کش لیا۔ وہ فیڈرل کاسترو والے انداز میں کچھ تن کر کھڑے تھے۔ سگار ان کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا اور اس سے دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر ہوا میں بلند ہورہی تھی۔ میں اپنی جگہ کرسی کے پشتے سے ٹیک لگائے ساکت بیٹھا پلک جھپکائے بغیر ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے نظر چرائی اور کچھ عجیب پُراسرار سے انداز میں ایک ثانیے کے لیے مسکراکر دروازے کی طرف مڑ گئے۔

وہ چلے گئے لیکن میرے ذہن میں پھانس سی چھوڑ گئے۔ ایک بار پھر میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ انسان واقعی خدا کی عجیب ترین مخلوق ہے۔ انسان رنگ بدلنے پر آتا ہے تو گرگٹ کو شرمندہ کردیتا ہے۔ حاجی عالم شیر صاحب کے بارے میں میں نے

بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اتنی سی بات پر یکدم ان کی نظر بدل جائے گی۔ بات صرف اتنی سی ہی تو تھی کہ میں نے انہیں اس کام کے لیے ٹرالر کی سہولت مہیا نہیں کی تھی جواب مجھے پسند نہیں رہا تھا۔ میرا نظریۂ حیات اب بدل چکا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس دنیا میں بیشتر لوگ اس بات کے قائل نہیں تھے کہ دوسروں کو ان کی مرضی سے زندگی گزارنے دی جائے۔ یہاں ہر کوئی بقدرِ حیثیت اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ دوسرے اس کی مرضی سے زندگی بسر کریں۔ اور جس کا جس حد تک بس چل رہا تھا اس حد تک تو وہ اپنے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی کو بھی خود بسر کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حاجی عالم شیر صاحب کے انداز نے مجھے خوفزدہ تو ہرگز نہیں کیا تھا البتہ خفیف سا رنج ضرور پہنچایا تھا۔ جہاں تک کوئی نقصان پہنچانے کا تعلق تھا تو نقصان انسان کو چیونٹی بھی پہنچا سکتی ہے' خواہ بعد میں انسان اسے چٹکی میں مسل ہی دے۔ اس لئے میں اس خوش فہمی میں تو نہیں تھا کہ حاجی صاحب مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے لیکن اب کسی قسم کے نقصان کی باتیں مجھے خوف زدہ نہیں کرتی تھیں۔ میری زندگی میں خوف کا عمل دخل بہت کم رہ گیا تھا۔ تاہم اس قسم کی ملاقاتیں ذہن کی پُرسکون جھیل میں دو چار لمحوں کے لیے لہریں سی ضرور پیدا کر دیتی تھیں۔

حاجی صاحب کے جانے کے بعد ان کے ناگوار تاثر کو ذہن سے جھٹکنے میں مجھے چند لمحے ضرور لگے۔ اس کے بعد میں نے چند ٹرنک کالز کیں اور ایک بار پھر فائلوں کی طرف متوجہ ہوا لیکن شاید آج میرے مقدر میں ناگوار ملاقاتیں ہی لکھی تھیں۔

ابھی مجھے ضروری کاغذات دیکھتے ہوئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ انٹرکام کا بزر بج اٹھا۔ دوسری طرف کیتھرین تھی۔

"سر!" وہ پُرسکون لہجے میں بولی تاہم میں نے اس کے لہجے میں چھپا ہوا خفیف سا اضطراب محسوس کر لیا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی "ایک اجنبی نوجوان دفتر میں موجود ہے۔ اس نے ریسیپشن پر رکنے کی زحمت بھی نہیں کی تھی... کچھ مشکوک لگ رہا ہے اور کچھ غصے میں بھی معلوم ہوتا ہے۔ رشید اور جعفر نے اس کا راستہ روکا تو بدمعاشی دکھانے لگا' فرنیچر کو ٹھوکریں ماریں اور ریوالور نکال لیا۔ رشید اور جعفر نے اسے قابو میں کر لیا ہے۔ وہ پوچھ رہے ہیں اس کا کیا کرنا ہے۔ وہ بدتمیزی سے آپ کا نام لے رہا ہے.... کہہ رہا ہے آپ سے ہر حال میں ملے گا۔ اور سر...." وہ بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔ "وہ گندی گالیاں بھی دے رہا ہے..."

اس کی ہچکچاہٹ پر مجھے ہلکی سی ہنسی آ گئی گو کہ یہ ہچکچاہٹ بجا تھی۔ کیتھرین کو معلوم تھا کہ اس دفتر میں آ کر گالیاں دینے کی جرأت کرنے والا بہت بدنصیب بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ اتنا بدنصیب کہ زندگی بھی اس کا ساتھ چھوڑ کر رخصت ہو سکتی تھی۔

"وہ اکیلا نہیں آیا ہو گا۔ باہر یقیناً کوئی گاڑی بھی موجود ہو گی جس میں شاید اس کا کوئی ساتھی وغیرہ بھی موجود ہو۔ شہزاد سے کہو کہ کھڑکی سے جائزہ لے اور انہیں نشانے پر لے لے۔" میں نے ہدایت کی۔

"شہزاد پہلے ہی ایسا کر چکا ہے سر" کیتھرین نے بتایا "اس نے کھڑکی میں پوزیشن لے لی ہے۔ باہر سڑک کے دوسری طرف ایک درخت کے نیچے ایک جیپ کھڑی ہے۔ یہ نوجوان یقیناً اسی جیپ میں آیا ہے۔ اس میں دو بدمعاش قسم کے آدمی موجود ہیں۔ جو ہماری بلڈنگ ہی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ بظاہر تو ان کے پاس کچھ نظر نہیں آ رہا لیکن اندازہ ہے کہ جیپ میں گنیں وغیرہ بھی موجود ہیں۔ وہ منتظر انداز میں بیٹھے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ شہزاد کو پیغام بھجوا دو کہ اگر وہ لوگ گنیں وغیرہ لیکر بلڈنگ کی طرف بڑھیں تو ان کی کھوپڑیاں اڑا دے۔" میں نے بلا تامل ہدایت کی۔ "رشید اور جعفر سے کہو کہ اس نوجوان کو میرے کمرے میں پہنچا دیں۔ میں اس سے بات کرنا چاہوں گا۔"

"یس سر" کیتھرین نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

رشید' جعفر اور شہزاد بظاہر دفتر میں چپراسی تھے لیکن درحقیقت یہ تینوں تربیت یافتہ کمانڈو تھے۔ دفتر میں مختلف الماریاں اور شیلف وغیرہ فائلوں اور دفتری سامان سے بھرے پڑے تھے لیکن ان میں دو چار خانے ایسے بھی تھے جن کے خفیہ حصے کھولنے پر دور مار رائفلیں بھی نکل آتی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر یہ دفتر ایک چھوٹا سا قلعہ بھی ثابت ہو سکتا تھا۔ میری زندگی میں کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ہر چیز کے لیے تیار رہا جائے۔ اپنے ساتھ ہر آدمی بھی چھانٹ کر میں نے اسی نظر سے رکھا تھا کہ وقت پڑنے پر وہ فوراً جون بدل کر میرے شانہ بہ شانہ چل سکے۔

چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور رشید اور جعفر ایک نوجوان کے دونوں بازو اس طرح قابو میں کیے ہوئے اندر داخل ہوئے کہ اگر وہ ذرا بھی مزاحمت کی کوشش کرتا تو اس کے کندھوں کے جوڑ اتر سکتے تھے اور غالباً اسی لیے وہ نوجوان ان کے ساتھ گھسٹتا بھی آ رہا تھا ورنہ وہ لڑنے بھڑنے کا خاصی اچھی طرح اہل معلوم ہوتا تھا۔

وہ ایک لمبا تڑنگا اور کسرتی جسم کا مالک سرخ و سپید نوجوان تھا۔ نفیس قسم کی شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا جو اب جگہ جگہ سے شکن آلود ہو چکی تھی۔ گریبان کے بٹن ٹوٹ چکے تھے اور سینے کے گھنے بال نظر آ رہے تھے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور ہیجان خیزی کے باعث سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی.. مجھ سے بھی کچھ کم عمر ہی تھا اور اسے دیکھ کر ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی دھڑکن تیز ہوتی ہوئی محسوس ہوئی تھی کیونکہ وہ بالکل ملک اسلم زماں کی تصویر معلوم ہو رہا تھا۔

میں نے ملک اسلم زماں کو اس عمر میں تو نہیں دیکھا تھا لیکن یقیناً نوجوانی کے عالم میں وہ بالکل ایسا ہی رہا ہو گا۔ اس کے بارے میں کم از کم مجھے کسی سے یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی کہ وہ کون تھا۔ وہ یقیناً ملک اسلم کا بیٹا قیصر ملک تھا۔

رشید اور جعفر نے یوں سنجیدگی' خموشی اور لاتعلقی سے اسے کمرے کے وسط میں دھکیلا جیسے مزدور کہیں سے بوری اٹھا کر لائے ہوں اور گودام میں ڈال کر دوسرا پھیرا لگانے جا رہے ہوں۔ الٹے قدموں کمرے سے نکل کر انہوں نے دروازہ آہستگی سے بند کر دیا گویا ان کی کوشش ہو کہ دفتر کے پُرسکون ماحول میں ذرا بھی خلل نہ پڑے۔

"خوش آمدید قیصر ملک۔" میں نے ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"تم.. تم..... سُور کے....." اس نے ہانپتے ہوئے ڈرامائی انداز میں انگلی سے میری طرف اشارہ کر کے گالی سے بات شروع کرنا چاہی۔

"شٹ اپ۔" میں نے یک لخت غیر ارادی طور پر اتنی بدلی ہوئی آواز میں کہا کہ اس کی زبان کو بریک لگ گئی۔

"اگر اب تم نے اس طرح میرے لیے کوئی گالی استعمال کرنا چاہی تو میں تمہاری زبان گدی سے کھینچ کر اسی سڑک پر پھرتے ہوئے کسی آوارہ کتے کو کھلا دوں گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

چند لمحے ہم ایک ٹک ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا اور محسوس میں بھی کچھ ایسا ہی کر رہا تھا جیسے میری آنکھیں کسی انجانی تپش سے سلگ رہی ہیں۔ یکبارگی اس کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور وہ شاید دل ہی دل میں کوئی فیصلہ کر کے یکدم میری میز کی طرف لپکا۔

"خبردار....." میں نے اپنا ہاتھ میز کے نیچے سے نکال کر میز پر رکھ لیا۔ اس ہاتھ میں خوفناک سی ساخت کا ایک ریوالور موجود تھا جس پر سائیلنسر بھی لگا ہوا تھا۔ میرا لہجہ اور اس ریوالور کی شکل اسے اپنی جگہ پر روک دینے کیلئے کافی تھی۔

"میں نہتے آدمیوں کو ریوالور دکھانا پسند نہیں کرتا...." میں نے ریوالور کی نال اس کے پیٹ کی سیدھ میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اور مجھے خدا نے اتنی طاقت دی ہے کہ خالی ہاتھ بھی تم جیسوں کی گردن توڑ کر سانڈ جیسی وزنی لاشیں کھڑکی کے راستے باہر پھینک سکتا ہوں لیکن سرِ دست میں اس کمرے میں دھینگا مشتی پسند نہیں کروں گا۔ یہاں کا فرنیچر بہت قیمتی ہے اور میری نظر میں اس کی قدر و قیمت تم جیسے نطفۂ ناتحقیق قسم کے لوگوں سے زیادہ ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش کھڑا رہا۔ اس کی مٹھیاں بار بار کھل رہی تھیں اور بند ہو رہی تھیں تاہم وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے چہرے سے بے بسی کا اظہار نہ ہونے پائے۔ چند لمحے کے لئے کمرے میں صرف اس کی سانسوں کی آواز سنائی دیتی رہی جو کسی درندے کی خرخراہٹ سے مشابہ تھی۔

"آخر تمہیں تکلیف کیا ہے؟ کیوں تم بلبلاتے ہوئے یہاں آن گھسے ہو؟" بالآخر میں نے قدرے ملائمت سے پوچھا۔

"بھولے مت بنو" وہ بھی گویا اپنے بے ثمر غصے اور ہیجان پر قابو پاتے ہوئے بولا "تم نے یا تو میرے ابا جی کو اغوا کر لیا ہے یا شاید... شاید انہیں قتل کرا دیا ہے..." اس کی آواز ایک لمحے کے لئے لڑکھڑا گئی لیکن فوراً ہی اس نے اس پر قابو پا لیا اور گہری سانس لے کر اپنے آپ کو باحوصلہ ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "قتل و غارت ہمارے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے..."

"یقیناً' یقیناً" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا "مجھے پتا چلا ہے کہ موصوف بہت بڑے زمیندار ہیں... یا شاید تھے۔ معلوم نہیں ان کے لئے کون سا صیغہ استعمال کرنا مناسب رہے گا۔ بہرحال نوجوان بیٹے کا انداز ظاہر کر رہا ہے کہ باپ کے لئے بھی قتل و غارت گری اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کٹوا دینا محبوب مشغلہ رہا ہو گا۔ پُرامن لوگوں پر بندوقیں لے کر چڑھ دوڑنا بھی شاید انہیں پسند رہا ہو۔ محض زبان ہلا کر اپنے کارندوں کے ذریعے کچھ بھی کرا لینا ان کی عادت رہی ہوگی۔ زمیندار تو ملک میں بہت سے موجود ہیں اور ان میں ایک سے بڑھ کر ایک طاقتور اور صاحبِ حیثیت ہے لیکن کچھ لوگ اپنی طاقت' حیثیت اور وسائل کو اچھے کاموں میں استعمال کرتے ہیں لیکن تم ایسے باپ کے بیٹے معلوم نہیں ہوتے۔"

"زیادہ تقریر کرنے کی ضرورت نہیں" وہ غرایا "اور اتنا معصوم اور انجان بننے کی بھی ضرورت نہیں جیسے تم ابا جی کو جانتے ہی نہیں۔ اگر تم ان سے اتنے ناواقف ہوتے تو میری شکل دیکھتے ہی مجھے یوں نہ پہچانتے۔"

"وہ تو ایک اندازہ تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آج دوپہر ایک انسپکٹر آیا تھا۔ وہ تمہاری اس تگ و دو کے بارے میں بتا رہا تھا جو تم اپنے والد کی گمشدگی کے سلسلے میں میرے خلاف کر رہے ہو۔ چنانچہ اب جب مجھے تمہاری آمد اور آمد کے انداز کے بارے میں اطلاع ملی تو میرے لئے یہ اندازہ کرنا کوئی مشکل نہیں رہا کہ تم کون ہو سکتے ہو۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے گویا بصد مشکل تحمل اور رسانیت سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں سمجھ نہیں سکا کہ اپنے والد کی گمشدگی کے سلسلے میں تمہاری نظرِ کرم مجھ پر ہی کیوں پڑی ہے؟ تم جیسے لوگوں کے ڈسے ہوئے بیسیوں انسان ادھر ادھر بکھرے ہوتے ہیں۔ جبکہ میری تمہارے والد سے کوئی ملاقات... کوئی دوستی یا دشمنی... کوئی لین دین... کوئی بھی تو تعلق واسطہ نہیں رہا... ہاں شاید ایک مرتبہ کسی ڈنر میں چند سیکنڈ کی ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ کسی نے ہمارا تعارف کرایا تھا لیکن میں ان کی صورت تک بھول چکا تھا۔ اب تمہیں دیکھ کر یاد آیا ہے کہ شاید ان کی شکل صورت تم جیسی ہی تھی۔ بہرحال۔ تم مجھے یہ جاننے کا موقع تو دو کہ آخر انہیں اغوا کرنے یا قتل کرنے کی مجھے کیا ضرورت پیش آ سکتی تھی؟ کوئی بڑا قدم انسان کسی وجہ

سے ہی اٹھاتا ہے نا؟ کوئی تو بنیاد ہونی چاہئے۔"

"وجوہات بظاہر مبہم سی ہیں۔ شاید کوئی بات مجھ سے چھپی ہوئی ہے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ کام تمہارے سوا کسی کا نہیں ہو سکتا۔" شاید مجھے دیکھ کر اب وہ بھی جذباتیت سے بالاتر ہو کر بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "اور مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم پولیس کے قابو میں نہیں آسکتے۔ اور آج تمہارے آفس آنے کے بعد یہ بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کس قسم کی چیز ہو۔ بے فکر رہو۔ ہم تم سے تمہارے ہی انداز میں نمٹیں گے۔ چھوڑیں گے نہیں ہم تمہیں۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ میں نے غلطی کی ہے جو سوچے سمجھے بغیر زمینداروں والے روایتی انداز میں یوں تم سے آٹکرانے کی کوشش کی ہے۔ تم یہ مت سمجھنا کہ ہمیں دوسرے طریقے نہیں آتے۔"

"نہیں، میں تمہیں اتنا کریڈٹ ضرور دوں گا کہ تمہاری یہ پہلی کوشش بھی زمینداروں کی روایات سے مختلف تھی" میں نے ریوالور کو ہلکی جنبش دے کر مسکراتے ہوئے کہا "زمیندار بھلا خود کہاں زحمت کرتے ہیں۔ سستے داموں خریدے ہوئے ان کے کارندے ہی اکثر کیڑے مکوڑوں کی طرح مرتے ہیں۔ تم نے بڑی ہمت دکھائی جو بہ نفس نفیس زحمت کی۔ میں تمہاری اس جوانمردی کی قدر کرتا ہوں اور اسی جوانمردی کے صدقے میں تم یہاں سے زندہ سلامت واپس جاؤ گے۔ بشرطیکہ تم نے کوئی حماقت نہ کی"

وہ ایک لمحے کھڑا گویا اندر ہی اندر بل کھاتا رہا — پھر مضطربانہ انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ "اگر تم ایسے ہی جوانمردوں کی قدر کرنے والے ہو تو کم از کم یہ تسلیم تو کر لو کہ میرے اباجی کی گمشدگی میں تمہارا ہی ہاتھ ہے۔ ان کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا ہے اس کے ذمے دار تم ہی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میں تمہارے اس اعتراف کا ذکر کسی پولیس والے سے، کسی بھی سرکاری آدمی سے نہیں کروں گا۔ یہ مسئلہ میں اب قانون پر نہیں چھوڑ رہا۔ یہ اب صرف تمہارے اور میرے درمیان ہے۔ یہ جنگ صرف میری اور تمہاری ہے اور اس میں اب ہر حربہ استعمال ہوگا۔ تم صرف اعتراف کر لو۔"

میں ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ بے چارہ بڑی مشکل میں تھا۔ ابھی اس کے دل میں شک کی پھانس تھی۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ اس کی مشکل دور کر دوں۔

وہ بدستور مضطربانہ لہجے میں بولا۔ "اگر تم نے اباجی کو قتل کرا دیا ہے تو صرف اتنا بتا دو کہ ان کی لاش کہاں ہے؟ اگر اس کی کچھ باقیات ہی مل سکتی ہیں تو وہی ہمیں حاصل کر لینے دو۔ ہم کم از کم باعزت طریقے سے ان کی تدفین تو کر سکیں گے۔ دل میں گھاؤ تو پڑ ہی گیا ہے لیکن اس طرح کچھ تو تسکین مل سکے گی۔ اگر ان کے متعلق کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا تو یہ گھاؤ زیادہ اذیت دے گا۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں کسی سے ذکر نہیں کروں گا کہ لاش مجھے تمہارے توسط سے ملی ہے۔ تم جو قسم کہو میں کھا سکتا ہوں" اس کے لہجے میں التجا کی جھلک آچلی تھی۔

ایک لمحے کے لئے تو میرا دل چاہا کہ اسے بتا ہی دوں کہ اس کا باپ شہر سے دور ایک ویرانے میں دفن ہے اور اب تک شاید اس کی لاش کو خطرناک کیڑے مکوڑے کھا چکے ہوں گے جو وہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ لیکن پھر میں نے اس خواہش کو دل میں ہی دبا لیا۔

"بہت محبت تھی، تمہیں اپنے باپ سے؟" میں نے کرسی ذرا گھمائی لیکن اس پر سے نظر نہیں ہٹائی۔

"ہر بیٹے، بیٹی کو ہوتی ہے" وہ سر جھٹک کر بولا۔ "مجھے اس لئے زیادہ ہے کہ اباجی کو بھی مجھ سے بہت زیادہ محبت تھی، اور پھر یہ کہ... اباجی نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ دولت، طاقت، اعتبار اور وہ سب کچھ جس کی اس دنیا میں ضرورت پڑ سکتی ہے"۔

"لیکن تم نے دیکھا کہ ہر طاقت کہیں نہ کہیں پہنچ کر بے بس ہو جاتی ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جیسے اس وقت تم میرے سامنے بے بس کھڑے ہو اور اپنے باپ کے بارے میں جاننے کے لئے تڑپ رہے ہو"۔

"اس ایک لمحے کی برتری پر زیادہ کھال سے باہر ہونے کی ضرورت نہیں" وہ حقارت سے منہ بنا کر بولا۔ "اس وقت کو زیادہ دور نہ سمجھنا جب تم میری ٹھوکروں کی زد پر ہو گے۔ میرے جوتے چاٹ رہے ہو گے۔"

میں مسکرا دیا۔ اس نوجوان میں طوفان مقید تھے۔ اس کی طرف سے بے پروا رہنا میرے لئے خطرناک، ثابت ہو سکتا تھا۔ پھر ایک لمحے کے لئے میرے اندر، میرے دل کے کھنڈر میں وہی یخ بستہ سا سناٹا پھیل گیا جو یک لخت مجھے اداس کر دیتا تھا، جیسے بجلی کا شاک بعض اوقات کسی کو یکدم شل کر دیتا ہے۔

وہ ایک طاقتور باپ کا بیٹا تھا۔ بچپن سے انہوں نے لوگوں پر حکم چلایا تھا۔ گھر میں، گھر سے باہر اکثر جگہوں پر اپنی دولت اور طاقت کی حکمرانی دیکھی ہو گی۔ کتنا اعتماد تھا اسے اپنے ورثے پر، کتنا تکبر تھا اس کے لہجے میں۔ وہ اپنی بے بسی کو تسلیم کرنے یا شاید اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔

پھر مجھے چودہ پندرہ سال کا وہ لڑکا یاد آیا جس کے سامنے اس کے باپ کی لاش پڑی تھی، قاتل بھی اس کے سامنے تھا مگر وہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور جب اس نے آگے بڑھ کر قاتل کے گریبان پر ہاتھ ڈالنا چاہا تھا تو تھانے دار نے اس کے ہاتھ پر بید رسید کیا تھا۔ وہ لڑکا میں تھا۔

میں۔ جسے غربت، کمزوری اور بے بسی ورثے میں ملی تھی لیکن بہر حال مجھے بھی اپنے معصوم اور سادہ لوح باپ سے محبت تھی اور شاید اس سے زیادہ تھی جتنی قیصر ملک کو اس کے خیال میں اپنے باپ سے تھی۔ کیونکہ باپ کے سوا صحیح معنوں میں دنیا میں میرا کوئی تھا ہی نہیں۔

نہایت آہستگی سے میں اپنی جگہ سے اٹھا۔ ریوالور میں نے دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کیا اور گویا دبیز قالین پر نہیں بلکہ کسی پتلی سی دیوار پر چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ میرا بازو یک لخت یوں حرکت میں آیا جیسے کوئی طاقتور اسپرنگ ٹوٹا ہو۔ میرا گھونسا اس کی ٹھوڑی پر پڑا۔ کافی مضبوط اور بھاری بھر کم ہونے کے باوجود قیصر ملک ہوا میں کچھ اچھلا اور ایک دیوار سے ٹکرا کر قالین پر ڈھیر ہو گیا۔

چند لمحے کے لئے وہ سر جھٹکتا اور یوں آنکھیں جھپکتا رہ گیا جیسے اس کی بینائی ضائع ہو گئی ہو۔ لیکن بالآخر سنبھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ٹھوڑی کی کھال پھٹ گئی تھی۔ رستے ہوئے خون کو ہاتھ سے صاف کر کے وہ طنزیہ سے انداز میں مسکرایا اور جب وہ بولا تو اس کی آواز سانپ کی ہلکی سی پھنکار سے مشابہ محسوس ہوئی۔

"تم اپنے جرائم کی فہرست طویل اور اپنی زندگی مختصر کئے جا رہے ہو" یہ کہتے ہوئے اس کے ہونٹ کچھ اس طرح کھنچ گئے تھے جیسے اس نے ہنسنے کی کوشش کی ہو مگر حلق سے کوئی آواز برآمد نہ ہو سکی ہو۔

"یہ میری طرف سے اعلانِ جنگ ہے" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "اب تم جاؤ اور جو بھی تمہارا دل چاہے اور جو کچھ بھی تمہارے بس میں ہو وہ کرو"۔

اس نے صرف دھمکی آمیز سے انداز میں سر ہلایا، منہ سے کچھ نہیں کہا اور واپسی کے لئے مڑ گیا۔ اس کے دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی دروازہ کھل گیا، جیسے باہر سے کوئی نادیدہ آنکھ اسے دیکھ رہی ہو۔ دروازے پر رشید اور جعفر دائیں بائیں کھڑے تھے۔ وہ بظاہر لاتعلق سے نظر آرہے تھے لیکن پلک جھپکائے بغیر قیصر ملک کی حرکات و سکنات پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ قیصر ملک ان کی طرف دیکھے بغیر ناک کی سیدھ میں نکلتا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں اپنی کرسی پر آبیٹھا اور دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ کیا کرنا چاہئے۔ ابھی میں اسے "اپنا مجرم" بھی قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ابھی اس نے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ وہ چین سے بیٹھنے والا نہیں تھا۔ اس کی تصدیق دو دن بعد ہوئی۔

○☆○

میں گاڑی عموماً خود چلاتا ہوں۔ جب سے قیصر ملک میرے دفتر ہو کر گیا تھا تب سے میں اپنے گردوپیش کے بارے میں بہت محتاط رہنے لگا تھا۔ تاہم ابھی تک کوئی ایسا موقع نہیں آیا تھا جب مجھے شبہ ہوا ہو کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے۔

اس روز میں ایک ڈنر سے فارغ ہو کر ہوٹل سے نکلا تھا۔ ڈنر تو بہت دیر پہلے ختم ہو چکا تھا اور سبھی مہمان جا چکے تھے لیکن ہال سے نکلتے وقت مجھے چند کاروباری شناسا مل گئے تھے جو چند ضروری باتیں کرنے کے لیے مجھے اپنے ساتھ لاؤنج میں لے گئے۔ وہاں ایک بار پھر کافی کا دور چلا اور باتیں ہوتی رہیں۔

جب یہ نشست برخاست ہوئی تب بھی وہ لوگ ہوٹل سے نہیں نکلے۔ اٹھ کر کسی دوسرے ہال میں چلے گئے۔ میں ان سے اجازت لے کر باہر آگیا۔ رات خاصی بیت چکی تھی اور سردی کی وجہ سے ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ پارکنگ لاٹ کے علاوہ ایک دو گاڑیاں ڈرائیو وے میں بھی کھڑی تھیں اور وہ اوس میں دھندلائی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ باہر اس وقت دربان یا پارکنگ لاٹ کا اٹینڈنٹ بھی موجود نہیں تھا۔ غالباً کسی بہانے ادھر ادھر کہیں کھسکے ہوئے تھے۔

میں نے اندر کے پُرحرارت ماحول سے یکدم باہر آنے پر جو ٹھنڈ محسوس کی وہ مجھے بڑی خوشگوار لگی۔ گہری گہری سانسیں لیتا میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، ٹہلنے کے سے انداز میں پارکنگ لاٹ کی طرف چلا۔ دفعتاً... برآمدے کے آخری ستون کے عقب سے ایک ہیولا سا نکل کر میرے سامنے آگیا۔

میرے اعصاب یکدم تن گئے۔ اٹھتا ہوا قدم رک گیا اور اس ایک ثانیے میں میں نے اپنے آپ کو ہر طرح کے حملے کے لیے تیار پایا لیکن مجھ پر کوئی حملہ نہیں ہوا۔ وہ شخص حملہ کرنے کا تو کیا، ہاتھ ہلانے کا بھی اہل معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ برآمدے کی روشنی وہاں تک بہت کم پہنچ رہی تھی جہاں اس شخص سے میرا سامنا ہوا تھا لیکن یہ روشنی کم از کم میرے لیے کافی تھی۔ میں نے ایک نظر میں اس کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ کوئی مفلوک الحال اور نشے باز بھکاری معلوم ہوتا تھا۔

اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں حلقوں میں اتری ہوئی تھیں اور نیم وا ہونٹوں کے عقب سے پیلے دانت جھانک رہے تھے۔ رال بہہ بہہ کر جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں جذب ہو رہی تھی۔ جسم پر ایک لمبا سا بوسیدہ اوورکوٹ تھا جس کے بٹن کھلے تھے اور نیچے جو کچھ بھی تھا وہ تقریباً دھجیوں ہی کی شکل میں تھا۔

میرے اعصاب کو جو جھٹکا لگا تھا اس کا اثر بھی اسی تیزی سے معدوم ہو گیا لیکن جانے کیوں پھر بھی میں نے اپنے آپ کو مکمل مطمئن محسوس نہیں کیا۔ عجیب سے انداز میں اس نے ہاتھ پھیلایا اور کھرکھراتی آواز میں بولا۔ "بابو! ذرا ماچس تو دے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے دوسرے ہاتھ میں دبی ہوئی مڑی تڑی سی سگریٹ موٹے موٹے ہونٹوں کے درمیان پھنسالی۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ اسے اس وقت بھیک نہیں چاہئے تھی۔ میں اس بات پر خفیف سی حیرت محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا کہ وہ ہوٹل کی چار دیواری میں داخل کیسے ہوا تھا؟ فقیروں کو یا اس حلئے کے دیگر لوگوں کو عالیشان ہوٹلوں کی حدود میں کون گھسنے دیتا ہے۔ لیکن شاید وہ نظر بچا کر گھس آیا تھا۔

مزید حیرت مجھے اس کا ہاتھ دیکھ کر ہوئی تھی۔ میرے سامنے پھیلا ہوا وہ ہاتھ نحیف یا استخوانی نہیں، ایک چوڑا چکلا اور

مضبوط ہاتھ تھا۔ اس ہاتھ کی اس کے حلیئے سے کچھ زیادہ مطابقت نہیں تھی۔

”میں سگریٹ نہیں پیتا“ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ میں گوکہ عادی سگریٹ نوش نہیں تھا لیکن میری جیب میں ایک خوب صورت سگریٹ لائٹر ضرور موجود رہتا تھا جو صرف لائٹر ہی نہیں تھا، اس کے اور بھی کئی استعمال تھے لیکن میں نے اس لائٹر سے اس شخص کی سگریٹ سلگانا ضروری نہ سمجھا۔

وہ میرے راستے سے ہٹ گیا اور میں نے اس کے قریب سے گزرنے کے لئے قدم بڑھایا۔ اسی لمحے میرے پہلو میں برق سی چمکی۔ اگر میں اس شخص کی طرف سے مکمل طور پر مطمئن ہوتا تو یقیناً وہ خنجر میرے پہلو میں اتر گیا ہوتا لیکن میری چھٹی حس نے مجھے اس شخص کو بھکاری تسلیم کرنے سے باز رکھا تھا۔

یہی ایک بے اطمینانی کام آگئی۔ میں لٹو کی طرح ایڑی پر گھوم گیا اور خنجر میرے قریب سے نکل گیا۔ وہ شخص مجھ سے ٹکرایا۔ ہم دونوں ہی لڑکھڑا گئے لیکن اس نے سنبھلنے میں مجھ سے بھی زیادہ پھرتی دکھائی۔ خنجر بدستور اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا بازو ایک بار پھر بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا۔

اس بار اگر میں اتنی ہی تیزی سے اپنا سر پیچھے ہٹانے میں کامیاب نہ ہوتا تو شاید خنجر کی نوک میری ایک کنپٹی میں پیوست ہوتی اور دوسری کنپٹی سے نکل آتی۔ خنجر اتنی تیزی سے میری آنکھوں کے سامنے سے گزرا تھا کہ مجھے محض ایک روشن لکیر کی طرح دکھائی دیا تھا۔

وہ بھکاری جو ایک لمحے پہلے تک مجھے مجہول نشے باز نظر آرہا تھا، اسے یوں بجلی کی طرح حرکت کرتے دیکھ کر میں یقیناً محظوظ ہوتا بشرطیکہ میں خود اس کی نوکِ خنجر کا ہدف نہ ہوتا۔ وہ وار خالی جانے کی وجہ سے اپنی جھونک میں تھوڑا سا ترچھا ہو گیا تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں پر گرانے کا وار کیا۔ اس کا اوور کوٹ بے حد دبیز تھا اور پھر ہاتھ بھی قدرے اُچٹتا ہوا پڑا تھا۔ اسے غالباً مہلک چوٹ تو نہیں آئی تھی اور نہ ہی شاید کوئی پسلی ٹوٹی تھی تاہم وہ پشت کے بل خاصی دور جا گرا۔

تاہم اس کی کوششوں میں ایک ثانئے کا بھی تعطل نہیں آیا۔ اس کے دو وار خالی گئے تھے لیکن سڑک جیسی پختہ روش پر بھی گر کر وہ تیسرا وار کرنے سے باز نہیں آیا۔ وہیں پڑے پڑے اس نے خنجر ہوا میں ذرا سا اچھالا اور ہوا ہی میں اسے نوک کی طرف سے چٹکی سے پکڑ لیا اور اسی لمحے اگر میں جھک نہ گیا ہوتا تو یقیناً خنجر میرے حلقوم میں پیوست ہو چکا ہوتا۔ کیونکہ جھکنے کے بعد وہ سنسناتا ہوا میرے بالوں کو چھوتا ہوا، پیچھے اندھیرے میں کہیں گم ہو گیا تھا۔

اس شخص کو قابو میں کرنا تو درکنار، اس کے حملوں سے بچنا ہی بہت بڑی بات تھی۔ کم بخت کی رگ و پے میں بجلی بھری ہوئی تھی اور جیسا متضاد وہ بہروپ بھر کر آیا تھا اس نے گویا اسے زیادہ خطرناک بنا دیا تھا۔ زندگی میں کئی خنجر پھینکنے والوں سے مجھے واسطہ پڑا تھا اور خود ستائشی سے قطع نظر میں اپنے آپ کو بھی اچھا خاصا ماہرِ خنجر زن سمجھتا تھا لیکن اس شخص نے بجا طور پر مجھے حیران کر دیا تھا۔ ایسا ماہر، اتنا پھرتیلا اور ایسا بے خطا وار کرنے والا میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ اگر وہ کسی اور طرح کے حالات میں مجھے ملا ہوتا تو شاید میں اسے اپنے ساتھیوں میں شامل کرنے کی کوشش کرتا۔ سرِدست تو وہ میرے لئے فرشتہ اجل بنا ہوا تھا۔

خنجر ہاتھ سے نکل جانے کے بعد شاید وہ اتنا پُر اعتماد نہیں رہا تھا۔ مشینی انداز میں وہ اچھل کر اٹھا اور ہوٹل کی بغلی دیوار کی طرف لپکا۔ میں نے لمبی چھلانگ لگائی اور اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کے اوور کوٹ کا پچھلا حصہ میرے ہاتھ میں آگیا۔ اسے ایک جھٹکا لگا لیکن اس نے فوراً ہی پلٹ کر ہاتھ گھمایا! اس کا گھونسا میری گردن پر پڑا اور مجھے یوں لگا کہ وہ کوئی انسانی ہاتھ نہیں، ایک وزنی ہتھوڑا تھا جس نے میری کھوپڑی ہلا دی تھی لیکن میں نے اس کا اوور کوٹ نہیں چھوڑا۔

اس نے اوور کوٹ اتار پھینکنے کی کوشش کی لیکن اسی دوران میں نے اس کی گردن پکڑ لی۔ ایک بار اگر وہ صحیح طرح میری گرفت میں آجاتا تو پھر کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ اس کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ نہ تو میں اسے صحیح طور پر گرفت میں لے پاؤں اور نہ ہی اس پر کوئی بھرپور وار کر سکوں۔

گردن چھڑانے کے لئے اس نے میرے پیٹ میں پنجہ گھونپنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی یہ ٹیکنک چلنے نہیں دی۔ اس کی گردن پر گرفت برقرار رکھتے ہوئے میں نے اس کی کھوپڑی پر یوں گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی جس طرح دیہاتی لوگ عموماً خربوزہ پھوڑتے ہیں لیکن وہ بھی بری طرح تڑپ کر اپنے آپ کو اس وار سے بچا گیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ میرے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

پاؤں میں اس نے نجانے کیا پہنا ہوا تھا۔ مجھے یہی محسوس ہوا گویا وہ لوہے کا کوئی ٹھوس جوتا تھا۔ اس کی گردن پر ایک لمحے کے لئے میری گرفت ڈھیلی ہوئی اور وہ گردن چھڑا کر دیوار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ بندر کی طرح اچھل کر دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف کود گیا۔

میں نے سوٹ میں ہونے کے باوجود دیوار پر چڑھنے میں تاخیر نہیں کی اور اس کے تعاقب میں دوسری طرف کود گیا۔ میں نے اسے آرٹس کونسل میں داخل ہوتے دیکھا۔ آرٹس کونسل کی نئی عمارت زیرِ تعمیر تھی۔ ہر طرف اینٹوں اور ملبے کے ڈھیر تھے اور ملگجے اندھیرے میں کوئی چیز متحرک نظر نہیں آرہی تھی۔ یہاں سے نکل جانے کے کئی راستے تھے اور یقیناً اس نے مجھے ڈاج دینے کے لئے ہی سڑک عبور کر کے یہاں آن گھسنے کی زحمت کی تھی۔

آرٹس کونسل کی پرانی عمارت قریب ہی تھی اور وہاں بڑی رونق اور چہل پہل نظر آرہی تھی۔ لان پر بھی قناتیں لگی ہوئی تھیں۔ شاید کوئی ڈراما ختم ہوا تھا یا انٹرول ہوا تھا۔ چند لمحے ملگجے اندھیرے میں ادھر ادھر کا جائزہ لینے کے بعد میں پرانی عمارت کی طرف چل دیا۔ یہاں بھی روشنی کم ہی تھی۔ قریب پہنچ کر ہی لوگوں کی شکلیں دیکھی جا سکتی تھیں۔

یہاں بہت سے لوگ ادھر ادھر آجا رہے تھے۔ کچھ لوگ ایک چھوٹے سے کیبن کے قریب کھڑے کولڈ ڈرنکس پی رہے تھے اور سگریٹوں کے کش لگا رہے تھے۔ برآمدے کی سیڑھیوں پر دو تین لڑکیاں اور دو تین مرد کھڑے تھے۔ مرد ان سے باتیں کرنے کی کوشش کر رہے تھے جب کہ لڑکیاں مضطربانہ سے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔ وہ سب ہی گہرا میک اپ کئے ہوئی تھیں۔

ان میں سے ایک لڑکی میری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلا کر بولی ”واہ شیخ صاحب! اچھی گاڑی بھیجی آپ نے۔ اس سے تو اچھا تھا میں رکشہ، ٹیکسی میں چلی جاتی۔“

اس کے ساتھ کھڑی ہوئی دوسری لڑکیوں اور مردوں نے بھی مڑ کر میری طرف دیکھا۔ میری آنکھیں کیوں کہ کم روشنی میں بھی بہتر طور پر دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھیں اس لئے میں نے قدرے فاصلے سے بھی اس کی صورت اچھی طرح دیکھ لی تھی۔ وہ فربہی مائل ایک قبول صورت لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر قابلِ ذکر چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ بڑی بڑی آنکھیں جن میں اک طائرِ زیرِ دام کی سی دہشت تھی۔ ان حیران حیران سی آنکھوں نے مجھے پہچاننے میں غلطی کی تھی۔

میں سیڑھیوں کے قریب پہنچا تو اس کے تاثرات بدل گئے۔ وہ کچھ شرمندہ سی نظر آنے لگی لیکن اس کے ساتھ کھڑی ہوئی لڑکی بڑی شریر معلوم ہوتی تھی۔ اس کی شکل و صورت کوئی خاص نہیں تھی لیکن اس کی شریر سی مسکراہٹ میں بڑی جان تھی۔ وہ بڑی بڑی آنکھوں والی لڑکی کو ٹہوکا دے کر بولی ”گولی مارو شیخ صاحب کو۔ یہ شیخ صاحب سے بہتر چیز معلوم ہوتی ہے۔“

میں نے ایک لمحے کے لئے ان کے سامنے رک کر گردن کو خفیف سا خم دیتے ہوئے شریر لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا ”اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں آپ کی سفارش سے ضرور استفادہ کرنے کی کوشش کرتا لیکن افسوس کہ میں اس وقت کسی اور چکر میں ہوں۔“

میں نے محسوس کیا کہ لڑکیوں کے ساتھ کھڑے ہوئے مرد میری طرف ناپسندیدگی کی نظروں سے دیکھ رہے تھے لیکن میں ان کی طرف توجہ دیئے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔

قناتوں کے قریب ایک دو بھکاری موجود تھے مگر وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ ہر گوشے کا جائزہ لینے اور ہر چہرے پر نظر ڈالنے کے بعد میں آرٹس کونسل کے بغلی دروازے سے نکلا اور درمیانی سڑک عبور کر کے واپس ہوٹل میں آگیا۔

اب میں اس چیتے کی طرح چوکنا تھا جس پر اندھیرے میں فائر ہو چکا ہو اور گولی اس کے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی ہو۔ میرے ساتھ کم و بیش یہی ہوا تھا۔ اب مین کے ڈرائیو وے میں کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ اونچے طرّے والا دربان اندرونی دروازے پر واپس آچکا تھا اور آنے جانے والوں کے لئے مؤدبانہ انداز میں دروازہ کھول رہا تھا۔ اس کا حلیہ مغل سپاہیوں والا تھا ...حتیٰ کے کمر سے تلوار بھی بندھی ہوئی تھی۔ پہلے میں نے اس سے کچھ پوچھنے کا ارادہ کیا مگر پھر فوراً ہی ملتوی کر دیا۔ اب ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں نے خود جا کر پارکنگ لاٹ سے گاڑی نکالی اور قدرے بدمزگی کے عالم میں مال پر لے آیا۔ حالات کچھ عجیب سے ہو چلے تھے اور میری بے نیازی کا یہ عالم تھا کہ میرے پاس اس وقت ریوالور تک نہیں تھا۔

میں نے گلبرگ کی جانب جانے کے لئے مال روڈ پر گاڑی موڑی ہی تھی کہ کچھ فاصلے پر درختوں کے قریب ایک لمبی سی سیاہ گاڑی اس طرح ترچھی کھڑی نظر آئی کہ سڑک کا بیشتر حصہ بلاک ہو کر رہ گیا تھا اور اس کے سامنے سے گزر کے جانا بھی خطرے سے خالی معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ جب میں آرٹس کونسل سے نکل کر ہوٹل میں واپس گیا تھا اس وقت یہ گاڑی یقیناً یہاں موجود نہیں تھی۔ چند ہی لمحوں میں کہیں سے آئی تھی۔

میں نے گاڑی جب اس گاڑی کے سامنے سے گزاری تو میں اس بات کے لئے بالکل تیار تھا کہ میری گاڑی پر فائرنگ ہو گی لیکن اس وقت میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب مجھے نہایت امن پسندانہ انداز میں نکل جانے دیا گیا۔ میں دیکھ نہیں سکا کہ اس گاڑی میں کتنے لوگ موجود تھے کیونکہ گاڑی کے شیشے تاریک تھے اور وہ ویسے بھی تقریباً اندھیرے ہی میں کھڑی تھی۔ اس کی تمام بتیاں بجھی ہوئی تھیں لیکن انجن بیدار تھا۔

میری گاڑی کے آگے بڑھتے ہی اس گاڑی کے ٹائر چرچرائے اور وہ نیم دائرے میں گھوم کر ایک عفریت کی طرح میرے تعاقب میں آنے لگی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ خرکھیل شروع ہو گیا تھا۔ میں ان کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔ پہلے مجھ پر بھکاری کے بہروپ میں جس شخص نے حملہ کیا تھا اس کے انداز سے تو صاف ظاہر تھا کہ اس کا مقصد ہر حال میں مجھے ہلاک کرنا تھا۔ لیکن ان گاڑی والوں نے میرا تعاقب کرنا شروع کر دیا تھا۔ کیا ان کا مقصد مجھے زندہ ہی قابو میں کرنا تھا؟ تھوڑی ہی دیر میں پروگرام بدل لینے میں کیا مصلحت تھی؟ یا پھر کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ بھکاری کا تعلق میرے کسی اور دشمن سے تھا اور یہ گاڑی والے کوئی اور لوگ تھے؟

ان سوالوں کا سرِدست میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

میں پُرسکون انداز میں ڈرائیو کرتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ میری گاڑی میں ٹیلیفون موجود تھا جو تقریباً پچیس میل کے دائرے میں کارآمد تھا۔ اس پر میں ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی سے رابطہ قائم کرسکتا تھا جو میرے لئے ہیڈ کوارٹر کا کام دیتی تھی۔ وہاں ٹونی اور شبیر شیخ عموماً موجود رہتے تھے۔ مس ٹرپ تو چوبیس گھنٹے وہیں ہوتی تھی اور اسے باقی تمام لوگوں کے بارے میں معلوم ہوتا تھا کہ کون کس وقت کہاں ہوگا۔

اگر میں اس گاڑی کو چند منٹ اپنے تعاقب میں لگائے رکھتا اور اس دوران فون پر مس ٹرپ سے رابطہ قائم کرکے اسے چند ضروری ہدایات دے دیتا تو موت کے فرشتے اس گاڑی کے تعاقب میں آسکتے تھے لیکن یہ مجھے کچھ اچھا محسوس نہیں ہوا کہ ایک عرصے کے بعد اچانک اگر میں کسی خطرے سے دوچار ہوگیا ہوں تو فوراً مدد کے لئے اپنے ساتھیوں کو طلب کرنا شروع کردوں۔ ... میں اپنے آپ کو ساتھیوں پر انحصار کرنے کا زیادہ عادی نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ میری صلاحیتوں کو زنگ بھی لگ سکتا تھا۔

گورنر ہاؤس کے قریب پہنچ کر میں نے گاڑی کی رفتار اچانک بڑھائی۔ سیاہ گاڑی کی رفتار بھی اتنی ہی بڑھ گئی اور درمیانی فاصلہ اتنا ہی رہا۔ میں ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھاتا ہی چلا گیا۔ سنسان سڑک پر گاڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح جارہی تھی۔ میں نے انہیں اپنی مشاقی کا ایک چھوٹا سا نمونہ دکھانے کا فیصلہ کیا تھا۔

سڑک دو طرفہ تھی۔ سیمنٹ کی درمیانی رکاوٹ اور گرین بیلٹ کے درمیان جیسے ہی جگہ نظر آئی، میں نے ایک خاص ٹیکنک سے دو پہیوں پر گاڑی اچانک موڑی۔ اس ٹیکنک پر عمل کرنے کے لئے صرف مشاق ڈرائیو رہی کی نہیں، ایک نہایت شاندار، طاقتور اور مضبوط گاڑی کی بھی ضرورت تھی۔

میرا تعاقب کرنے والے شاید سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ میں اس رفتار سے جاتے جاتے اچانک مڑنے کا فیصلہ بھی کرسکتا ہوں۔ یہ ایک انتہائی خطرناک یوٹرن تھا اور اس کا تجربہ میں پہلے بھی کئی مرتبہ کرچکا تھا۔ تعاقب کرنے والے بھی عموماً اضطراری طور پر اسی طرف مڑنے کی کوشش کرتے تھے اور حادثے کا شکار ہوجاتے تھے۔ اس وقت جو لوگ میرا تعاقب کررہے تھے ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔

اس کار کے بریک بہت بری طرح چرچرائے اور ٹرن لینے کی کوشش میں اس کے پچھلے پہیے دور تک سڑک پر گھسٹتے چلے گئے اور پھر وہ سڑک کی درمیانی رکاوٹ سے ٹکرا کر الٹ گئی۔ میں نے نہ صرف ٹرن لیا تھا بلکہ عقب نما آئینوں میں یہ سب کچھ دیکھا بھی تھا۔ غیر ارادی طور پر میرے حلق سے ایک گھٹا گھٹا سا قہقہہ برآمد ہوا۔ کسی کو تباہ ہوتے دیکھ کر خوش ہونا میری فطرت نہیں تھی لیکن دشمنوں کو تباہ ہوتے دیکھ کر میں ضرور محظوظ ہوتا تھا۔

اپر مال سے واپس لوئر مال کی طرف جاتے ہوئے میں نے تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد اس واقعے کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں اسے کوئی اہمیت دوں لیکن میری یہ بے نیازی زیادہ دیر برقرار نہیں رہ سکی۔

میں رفتار غیر ارادی طور پر کچھ کم کرچکا تھا اور اب عقب نما آئینے میں ایک کار کی ہیڈلائٹس نظر آنے لگی تھیں جو خاصی تیزی سے قریب آتی جارہی تھیں۔ یوں تو وہ ایئرپورٹ کی طرف سے آنے والی کوئی بھی عام سی کار ہوسکتی تھی لیکن وہ جو میری چھٹی حس سے بھی دو قدم آگے کوئی نامعلوم حس تھی، وہ مجھے بتارہی تھی کہ گاڑی میرے تعاقب میں آرہی ہے۔ تاہم میں یہ دیکھنے سے قاصر رہا تھا کہ وہ کب اور کہاں سے میرے تعاقب میں چلی تھی۔

میں نے یکدم پھر رفتار بڑھائی لیکن دونوں گاڑیوں کا درمیانی فاصلہ برقرار رہا۔ مجھے احساس بھی نہ ہوسکا کہ کب میں چیرنگ کراس سے آگے نکل گیا، اس دوران گاڑی میرے کچھ اور قریب آگئی تھی۔ اب تو میں اس کی ساخت کا بھی اندازہ کرسکتا تھا۔ وہ نئے ماڈل کی فورڈ کیپری تھی۔

دفعتاً میری گاڑی کے پچھلے شیشے پر چھناکا سا ہوا۔ میں نے مڑ کر صرف ایک نظر شیشے کی طرف دیکھا۔ شیشے پر نچلی طرف ایک سوراخ نمودار ہوچکا تھا اور پورے شیشے پر مکڑی کا جال سا نمودار

ہوچکا تھا۔ فائر یقیناً سائلنسر لگی ہوئی کسی گن سے کیا گیا تھا۔ میں نے دھماکا نہیں سنا تھا۔ شیشے کے درمیان اگر ٹرانسپیرنٹ پلاسٹک کی حفاظتی تہ نہ ہوتی تو شاید پورا شیشہ ہی کرچیوں میں تبدیل ہوچکا ہوتا۔ گولی شاید ترچھی آئی تھی اور سیٹ کی پشت میں کہیں اتر گئی تھی۔

یکبارگی میں نے جھرجھری سی لی، کچھ سنبھل کر بیٹھا اور رفتار مزید بڑھا دی۔ اب سڑک کے کنارے کی کوئی چیز مجھے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ عقب سے گولیوں کی بارش شروع ہوچکی تھی۔ اب تو ایک گن بغیر سائلنسر والی بھی استعمال ہورہی تھی۔ ان کی دیدہ دلیری قابلِ داد تھی۔ شہر کی سب سے بڑی سڑک پر وہ یوں دھڑلے سے ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے تھے۔ یہاں عموماً رات کے اس پہر بھی کبھار پولیس کی کوئی گاڑی گشت کرتی نظر آجاتی تھی لیکن آج دور دور تک ایسی کسی گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔

فائرنگ کرنے والوں کی بیشتر گولیاں ضائع جارہی تھیں تاہم میرا اندازہ تھا کہ گاڑی کا پچھلا حصہ خاصا تباہ ہوچکا تھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ وہ گاڑی کے ٹائروں کو نشانہ بنانے کی کوشش کررہے ہیں لیکن انہیں کامیابی نہیں ہورہی تھی تاہم ٹائروں کی طرف سے مجھے کوئی زیادہ پریشانی بھی نہیں تھی۔ ٹائر بلٹ پروف تھے اور اب مجھے افسوس ہورہا تھا کہ میں نے گاڑی کی ونڈ اسکرین وغیرہ بھی بلٹ پروف کیوں نہیں لگوائی تھی۔ جرمنی میں موجود میرے ایک کاروباری دوست نے بارہا مجھ سے کہا تھا کہ وہ گاڑیاں جو خاص طور پر میرے استعمال میں رہتی ہوں، اگر میں ان کے ماڈل نمبر وغیرہ اسے لکھوا دوں تو وہ میرے لئے بلٹ پروف شیشے تیار کرا کے بھیج دے گا جو ابھی کمرشل پیمانے پر تیار ہونے اور فروخت ہونے شروع نہیں ہوئے تھے۔ لیکن میں نے اس پیشکش پر کبھی توجہ نہیں دی تھی کیونکہ میرے خیال میں یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔

مال کے سرے پر پہنچ کر میں نے بلا سوچے سمجھے گاڑی بھاٹی کی طرف موڑ لی۔ آگے جس قسم کے راستے آنے والے تھے ان پر جانے کا مجھے فائدہ بھی ہوسکتا تھا اور نقصان بھی۔ میرے تعاقب میں آنے والوں نے اب فائرنگ بند کردی تھی لیکن ان کا انداز بتارہا تھا کہ وہ قبر تک میرا پیچھا کرنے کا تہیہ کئے ہوئے ہیں اور اس قسم کے معاملات میں اس گاڑی کا ڈرائیور بھی بلا کا ماہر معلوم ہوتا تھا۔ ہر موڑ پر گاڑیوں کے ٹائر بری طرح چرچرا رہے تھے۔ بالکل فلمی انداز کی چیزنگ ہورہی تھی۔

ٹکسالی پہنچ کر میں نے صرف ایک ثانیے کے لئے سوچا اور گاڑی بازارِ حسن کی طرف موڑ لی۔ یہ بات یقینی تھی کہ انہیں ڈاج دیئے بغیر میں ان سے چھٹکارا نہیں پاسکتا تھا اور کھلی سڑکوں پر انہیں ڈاج نہیں دیا جاسکتا تھا۔

بازارِ حسن کے دن سوتے ہیں اور راتیں جاگتی ہیں لیکن اس وقت وہاں کی رات بھی تھک چکی تھی۔ کسی کسی کوٹھے سے ہارمونیم کی آواز کسی ضدی بچے کی روں روں کی طرح سنائی دے رہی تھی۔ مین بازار میں ویرانی قدم جمانے لگی تھی۔ ہار بیچنے والے بھی تھک ہار کر ادھر ادھر تھڑوں پر بیٹھ چکے تھے۔

اکا دکا تماش بین یا راہ گیر ادھر ادھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے لیکن جس انداز میں میری گاڑی شاہی بازار میں داخل ہوئی اس سے وہ لوگ بھی بڑبڑا کر راستہ چھوڑ کر دیواروں سے چپک گئے۔ شاہی بازار کوئی زیادہ چوڑی چکلی شاہراہ نہیں اور پھر عموماً یہ سڑک نیم شکستہ اور ناہموار بھی رہتی ہے لیکن میں اس پر بھی تیز رفتاری کے تمام سابقہ ریکارڈ توڑنے کی کوشش کررہا تھا۔

یہاں کی گلیاں تو بہت ہی تنگ اور نیم تاریک تھیں۔ گاڑی لے کر گھسنے کے لئے تو بالکل ہی ناموزوں تھیں اور پھر مجھے ان سے کچھ زیادہ واقفیت بھی نہیں تھی لیکن عجلت کے فیصلے کے تحت میں ایک گلی میں گھس گیا۔ یہاں کا فرش اینٹوں کا تھا۔ عین وسط میں گندے پانی کی نالی تھی اور دونوں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ پانی کے کئی کئی ٹیڑھے میڑھے پائپ بچھے ہوئے تھے۔

میری مرسیڈیز جتنی بڑی تھی اتنی بڑی گاڑی لے کر کوئی دیوانہ ہی ان گلیوں میں گھس سکتا تھا۔ دونوں طرف پانی کے پائپ ٹائروں تلے کھڑکھڑا رہے تھے اور گاڑی کے دونوں طرف کے دروازے دیواروں کو تقریباً چھو رہے تھے۔ اس گلی میں زلفِ یار کی طرح پیچ و خم تھے لیکن میں کسی نہ کسی طرح گاڑی کو لہراتا ہوا بہت دور تک لے گیا لیکن ایک موڑ آخرکار ایسا آیا جہاں میری مشاقی بھی جواب دے گئی۔

وہ موڑ تو میں نے عمدگی سے کاٹ لیا لیکن تین چار فٹ اونچے اس ٹوٹے ہوئے پول سے نہ بچ سکا جو گلی کے تقریباً وسط میں نہ جانے کیوں گاڑ دیا گیا تھا۔ گاڑنے والوں کو شاید عرفان ہوگیا تھا کہ ایک روز کوئی شامت کا مارا ان گلیوں میں داخل ہوگا اسے آگے نہ جانے دیا جائے۔

ٹکر خاصی زوردار ہوئی تھی۔ ہیڈلائٹ ٹوٹنے کا چھناکہ سنائی دیا۔ میں نے گاڑی وہاں سے نکالنے کے سلسلے میں کوئی تدبیر لڑانے یا کسی اور چکر میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً دروازہ کھول کر باہر چھلانگ لگادی۔ مجھے معلوم تھا کہ تعاقب کرنے والی گاڑی وہاں سے زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

میں ناک کی سیدھ میں دوڑتا چلا گیا۔ گھپ اندھیرے میں ڈوبے ہوئے سالخوردہ مکانات اپنے سینوں میں نہ جانے کتنے انجانے بھید چھپائے خاموش کھڑے تھے مگر وہ بدبخت کتا خاموش نہ رہ سکا جو شاید غمِ جاناں سے تنگ آکر سایۂ دیوار میں لیٹا ہوا تھا۔

میرا پاؤں اس کی دُم پر پڑ گیا تھا۔ سوتے وقت جو کتا اپنی دُم کو سمیٹ کر نہ سوئے وہ عموماً اسی انجام سے دوچار ہوتا ہے۔ میرے پاؤں تلے آکر اس کی دُم چاہے سیدھی نہ ہوئی ہو لیکن آئندہ کے لئے قابلِ استعمال شاید ہی رہ گئی ہو اور کتا چوں کہ اپنی

دُم کو دوسروں کے سامنے ہلانے کے لئے استعمال کرتا ہے اس لئے وہ اس کا سب سے قیمتی اثاثہ ہوتی ہے۔ چنانچہ اگر وہ کتا بہت بری طرح چلّا کر بہت اونچا اچھل پڑا تھا تو اس کی یہ حرکت بے جا نہیں تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ انتقاماً میری ٹانگ دبوچتا' میں نے اسے ایک ٹھوکر رسید کر کے دوبارہ ہوا میں اچھالا اور اپنی اس زیادتی پر دل ہی دل میں اس سے معذرت کرتے ہوئے زیادہ تیزی سے آگے کی طرف دوڑ پڑا۔ گلی کے مزید کچھ پیچ و خم طے کرنے کے بعد جب میں تقریباً ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کر چکا تو اچانک ہی میں نے اپنے آپ کو کھلی جگہ میں پایا۔

یہاں چاروں طرف وہی پرانی طرز کے اونچے اونچے سالخوردہ مکانات تھے اور درمیان کی جگہ خالی تھی۔ یہ جگہ کسی بہت بڑے کنویں سے مشابہہ نظر آرہی تھی۔ عین وسط میں کارپوریشن کا نل لگا ہوا تھا جس کی ٹونٹی کسمپرسی کے سے عالم میں آدھی کھلی ہوئی تھی اور پانی شرر شرر کی سی پُرشور آوازیں اس وقت بھی بہہ رہا تھا۔

یہاں پہنچ کر گویا اس گلی کا اختتام ہو گیا تھا جس سے میں آیا تھا اور آگے مزید کوئی گلی نہیں تھی۔ بس ایک دوسرے سے جڑے ہوئے مکان ہی مکان تھے۔ بند کواڑوں والے مکان۔ کسی کسی کھڑکی میں روشنی نظر آرہی تھی اور ایسی کھڑکیاں گویا شک زدہ سی آنکھوں کی طرح مجھے گھور رہی تھیں۔

میرے پاس ضائع کرنے کے لئے تو کیا' استعمال کرنے کے لئے بھی وقت نہیں تھا۔ سناٹے سے چھیڑ چھاڑ کرتی چند مبہم سی آوازوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ میرے خون کے پیاسوں کی گاڑی میری گاڑی کے عقب میں رک چکی ہے۔ میں دو قدم آگے بڑھا لیکن تذبذب کے عالم میں رک گیا۔ اسی لمحے خاصے فاصلے پر گلی میں کہیں دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ انہوں نے مجھے سامنے پایا تو چیتھڑے اڑا دیں گے۔ اب ان کا غالباً مجھے اغوا کرنے کی زحمت کرنے اور کسی قسم کی پوچھ گچھ کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا اور گولی بہرحال انسان سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ مجھے کہیں نہ کہیں جائے پناہ تلاش کرنی تھی۔

یہاں کے بیشتر مکانات اونچے اونچے بندڑبوں کی طرح تھے۔ سامنے صرف ایک مکان ایسا نظر آرہا تھا جس کی الگ ایک بیرونی دیوار تھی اور وہ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ اس سے ذرا ہی پیچھے اصل عمارت تھی اور اس میں سامنے ہی ایک روشن کھڑکی نیم وا نظر آرہی تھی۔ مکان زیادہ بڑا معلوم نہیں ہوتا تھا اور یہ بھی غالباً کسی طوائف ہی کی رہائش گاہ تھی۔ شاہی بازار میں بیشتر طوائفوں کی رہائش اور ناچ گانے کے ٹھکانے الگ الگ تھے۔ دیگر کاروباری لوگوں کی طرح وہ بھی نجی زندگی میں ایک حدِ فاصل برقرار رکھنے کی قائل معلوم ہوتی تھیں۔

دوڑتے قدموں کی آوازیں قریب آرہی تھیں۔ میں پنجوں کے بل دوڑتا ہوا اس مکان تک پہنچا' بازو بلند کر کے دیوار پر ہاتھ جمائے اور دوسرے ہی لمحے بندر کی طرح اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا ... اس دوران قدموں کی آوازیں کچھ اور قریب آچکی تھیں۔ میں بلی کی طرح بے آواز طریقے سے پنجوں کے بل اندر کود گیا۔

مکان کا بیرونی حصہ ایک مختصر اور تنگ سی بالکونی سے مشابہ تھا جہاں ایک کونے میں کچھ کاٹھ کباڑ سا پڑا تھا۔ دوسری طرف دروازہ تھا۔ اس جگہ چھپنا محفوظ نہیں تھا۔ کھڑکی زیادہ بلندی پر نہیں تھی۔ میں نے آہستگی سے کھڑکی کا پٹ کھول کر' پنجوں کے بل کھڑے ہو کر اندر جھانکا۔ غنیمت تھا کہ اس کھڑکی میں سلاخیں وغیرہ نہیں تھیں لیکن یہ دیکھ کر مجھے خفیف سی حیرت ہوئی کہ کمرا بالکل خالی تھا حتیٰ کہ اس میں فرنیچر کے نام پر بھی ایک کرسی تک موجود نہیں تھی۔ فرش پر گرد کی ہلکی سی تہہ بھی موجود تھی۔ کمرے میں دیوار گیر الماریاں موجود تھیں مگر ان کے پٹ کھلے تھے اور وہ بالکل خالی تھیں۔ لگتا تھا کہ مکین نہایت بے پروائی سے مکان خالی کر کے چھوڑ گئے ہیں۔

گو کہ باہر نل سے پانی گرنے کی شرر شرر جاری تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں قدموں کی آوازیں پہلے سے زیادہ واضح طور پر سن رہا تھا۔ اب وہ کھلے حصے میں پہنچنے ہی والے تھے۔ ایک بار پھر میں نے کھڑکی میں لٹک کر بندروں والا انداز اپنایا اور اندر جا پہنچا۔ یہ بھی شاہی بازار کے بیشتر مکانوں کی طرح پرانی طرز کا ایسا مکان تھا جس کا فرش بہت اونچا تھا' اسی لئے کمرے کی کھڑکی بھی بلندی پر تھی۔

بے آواز طریقے سے اندر کودنے کے بعد میں نے قدرے سکون کی گہری سانس لی اور کھڑکی کو نہایت احتیاط سے بند کر کے بولٹ چڑھا دیا۔ اسی لمحے میں نے اس بات پر توجہ دی کہ اگر مکان خالی تھا تو اس میں لائٹ کیونکر آن تھی؟ اس کمرے کے ساتھ ہی غالباً دوسرا کمرا تھا جس کا دروازہ ایک گوشے میں نظر آرہا تھا۔ وہ دروازہ نیم وا تھا۔

میں اپنی دانست میں قطعی بے آواز قدموں سے اس دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ میں دروازے کو چھوتا' ایک خوابناک سی آواز گویا ہوا کی لہروں کے دوش پر تیرتی ہوئی موسیقی کی مدھم لے کی طرح میری سماعت سے ٹکرائی۔

"آجاؤ ... اندر آجاؤ ... یہ دروازہ آج بھی تمہارے انتظار میں اسی طرح کھلا ہے جس طرح تم چھ برس پہلے اسے کھلا چھوڑ گئے تھے۔"

آواز نسوانی تھی۔

روحوں اور بھوت پریت پر مجھے ذرا بھی یقین نہیں تھا لیکن یہ آواز سنتے ہی سب سے پہلا خیال میرے ذہن میں کسی بھٹکی ہوئی روح ہی کا آیا۔ کیونکہ آواز ایک ایسی سرگوشی سے مشابہ تھی جیسی عام طور پر فلموں میں روحوں کی موجودگی ظاہر کرنے کے لئے صوتی اثرات کی مدد سے سنائی جاتی ہے۔

ایک لمحے کے لئے میں تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ میرا اٹھا ہوا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔ دوسرے کمرے میں نہ جانے کون بے چاری میری منتظر تھی جس کے خیال میں میں چھ برس پہلے یہاں سے رخصت ہوا تھا۔ ایک ثانئے کے لئے میرے دل میں لوٹ جانے کا خیال بھی آیا لیکن اس وقت تک باہر سکوت چھا چکا تھا اور یہ سکوت ہنگاموں سے زیادہ خطرناک محسوس ہو رہا تھا۔ وہ یقیناً شکاری کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ جس دشمن کے قدموں کی آہٹ معدوم ہو جاتی تھی اس سے میں زیادہ ہوشیار ہو جاتا تھا۔ میرے لئے آگے جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

نہایت غیر محسوس انداز میں ایک گہری سانس لے کر میں نے نیم وا دروازے کو تھوڑا دھکیل کر یوں قدم اندر رکھا جیسے کوئی نوآموز بازیگر پہلی بار ہجوم کے سامنے تار پر چلنے کا مظاہرہ کرنے کے سلسلے میں پہلا قدم اٹھا رہا ہو۔ تاہم میں کسی قدر ترچھا اور چوکھٹ کے قریب ہی رہا تھا۔ کچھ اس انداز میں کہ اگر مجھ پر فائر کیا جائے تو بچنے کا امکان زیادہ رہے۔

لیکن سامنے مجھے کوئی بندوق یا خنجر نظر نہیں آیا۔ سامنے سب سے پہلے مجھے صرف دو آنکھیں نظر آئیں۔ لیکن یہ آنکھیں کسی قاتل کی آنکھیں نہیں تھیں۔ گو اس وقت وہ آنکھیں نہیں' اداسی اور آنسوؤں کا سمندر تھیں۔

وہ ایک خوبصورت لڑکی کی خوبصورت آنکھیں تھیں۔ وہ سامنے ہی ایک معمولی سی مسہری پر عروسی لباس میں بیٹھی تھی۔ سر سے پاؤں تک سجی بنی' جھلمل کرتے زیور پہنے' سرخ بھڑکیلا اور چمکیلا جوڑا زیب تن کئے' گہرا میک اپ کئے' گوٹے کناری والا دوپٹہ سر پر ڈالے۔ وہ ایک مکمل دلہن تھی۔

بس صرف ایک چیز کی وجہ سے وہ روایتی دلہن سے مختلف نظر آرہی تھی۔ اور وہ چیز تھی اس کی آنکھیں۔ ان آنکھوں میں آنسو تھے جنہوں نے اس کا کاجل پھیلا دیا تھا۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں خشک ہو چکی تھیں۔ مگر آنسو بھی کوئی غیر متوقع چیز نہیں تھے۔ سہاگ رات کو بہت سی دلہنوں کی آنکھوں میں آنسو ہوتے ہیں۔ مختلف چیز دراصل وہ وحشت' وہ ویرانی تھی جو اس کی آنکھوں میں جاگزیں تھی۔ ان عمارتوں کی سی ویرانی جو کسی کے انتظار میں کھنڈر ہو گئی ہوں۔ مجھے یاد نہیں آتا تھا کہ یہ تشنگی' یہ حزن میں نے کس کی آنکھوں میں دیکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر یہ ویرانی' یہ تشنگی اور یہ حزن کچھ اور بڑھ گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ یوں مجھے دیکھنے لگی تھی جیسے درحقیقت مجھے نہ دیکھ رہی ہو بلکہ میں کوئی شفاف شیشہ ہوں اور وہ میرے پار کسی اور کو دیکھ رہی ہو یا دیکھنا چاہ رہی ہو۔ شاید اس کے انتظار کا تسلسل صرف ایک ثانئے کے لئے ٹوٹا تھا اور اب دوبارہ وہی انتظار شروع ہو گیا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کی صورت مجھے کچھ شناسا سی لگ رہی تھی لیکن فوری طور پر مجھے یاد نہ آیا کہ اس سے پہلے میں نے اسے کہاں دیکھا ہے۔

میں نے مڑ کر اپنے عقب میں دروازہ بند کیا اور اس کے دونوں بولٹ چڑھا دیئے۔ لڑکی کے انداز سے اب بھی کسی قسم کی تشویش ظاہر نہ ہوئی' وہ اسی طرح گاؤ تکئے سے ٹیک لگائے بیٹھی رہی۔ البتہ دروازہ بند ہونے پر اس کی آنکھوں میں مدھم لو کے ساتھ جلتی ہوئی انتظار کی شمع یکدم بجھ گئی۔

اب اس نے گویا مجھے میری ذات کے حوالے سے دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک مضمحل سی مسکراہٹ آگئی۔ قدرے تھکے تھکے سے انداز میں اس نے پہلو بدلا۔

"آیئے چوہدری صاحب! زہے نصیب ...! کسی طرح بھی سہی' آپ ہمارے دروازے پر آئے تو سہی" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس کے ہونٹ شوخ لپ اسٹک سے رنگے ہوئے تھے مگر ان ہونٹوں سے برآمد ہونے والی یہ آواز گویا کوئی نوحہ دُہرا رہی تھی۔ بہرحال اس نے مجھے چوہدری صاحب کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مجھے پہچانتی تھی۔

اسی لمحے میرے ذہن میں ہلکا سا چھناکا ہوا اور میں نے اسے پہچان لیا۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔ جب ملک کے باغ میں میری فلم کی شوٹنگ ہو رہی تھی تو وہ اپنی نائیکہ ٹائپ ماں کے ساتھ وہاں آئی تھی اور اس کی ماں نے مجھے راستے میں روک کر کہا تھا کہ 'بے بی کو بھی اپنی فلم میں چانس دیجئے۔' مجھے اس وقت وہ عورت بھی اور اس کی تیس سالہ 'بے بی' بھی کافی چیپ نظر آئی تھی۔ اور مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے انہیں کوئی ہمت افزا جواب نہیں دیا تھا۔

رہی سہی کسر آفاق نے پوری کر دی تھی۔ جب میں نے اس سے مشورہ کیا تھا کہ اس لڑکی کو چانس دیا جا سکتا ہے یا نہیں ... تو اس نے اسے کچھ پُراسرار اور کچھ خطرناک سی چیز قرار دے دیا تھا اور میں نے اس کا خیال ذہن سے بالکل ہی جھٹک دیا تھا۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ پُراسرار ضرور تھی۔ اس وقت بھی میں اسے ایک پُراسرار روپ میں دیکھ رہا تھا۔

"غالباً کوئی آپ کے تعاقب میں ہے ... اور وہ یقیناً کوئی بہت خطرناک دشمن ہو گا جس سے گھبرا کر آپ جیسا آدمی بھاگ رہا ہے" وہ مسہری سے اتر کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔ اس کی آواز اب بھی سرگوشی سے مشابہ تھی۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے بلکہ کسی حد تک بے ہنگم عروسی لباس کے باوجود اس کی جسمانی ساخت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ وہ دراز قد اور بے حد مضبوط جسم کی مالک نظر آتی تھی۔ میں اس لمحے یہ بھول چکا تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں آرہا ہے۔

"تم وہی ہو نا ..." میں نے غیر ارادی طور پر اس کے چہرے کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

اس نے میری بات کاٹ دی "ہاں۔ میں وہی ہوں جو اپنی ماں کے ساتھ آپ سے ایک چھوٹے سے رول کی بھیک مانگنے آئی تھی۔ شکر ہے کہ آپ کو یاد آگیا ورنہ آپ جیسے بڑے لوگوں کو ہم جیسی بھک منگی سی لڑکیوں کے چہرے کہاں یاد رہتے ہیں۔"

"بڑا زہر ہے تمہارے لہجے میں" جانے کیوں میں مسکرا دیا۔

"آپ ہی جیسے لوگوں کا دیا ہوا ہے" اس نے دھیمے مگر پہلے ہی جیسے زہریلے لہجے میں کہا۔

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ تمہارا نام۔" میں ایک بار پھر اٹک گیا۔

"آپ کو میرا نام یاد نہیں آئے گا" وہ ایک بار پھر مضمحل انداز میں مسکرائی "میرا فلمی نام ہنی ہے۔ اصل نام بتانے کی میرا خیال ہے ابھی ضرورت نہیں۔"

"لیکن تمہاری ماں نے تو کہا تھا کہ تم لوگوں کی گلبرگ میں کوٹھی ہے۔" مجھے یاد آتا جا رہا تھا کہ ملک کے باغ میں شوٹنگ کے موقع پر وہ ملاقات کس طرح ہوئی تھی اور اس مختصر سے وقت میں کیا کیا باتیں ہوئی تھیں۔ اس وقت ہنی یقیناً اس دن سے بہت مختلف لگ رہی تھی۔

"ہاں۔ امی نے جھوٹ نہیں کہا تھا" وہ افسردہ سے لہجے میں بولی "لیکن یہ ہمارا پرانا گھر ہے۔ ہم یہیں کی پیداوار ہیں۔ میرا خیال ہے تفصیل بتانے کی تو ضرورت نہیں اور نہ ہی آپ کو تفصیلات سے کوئی دلچسپی ہوگی۔ آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ ہم کوئی زیادہ معزز لوگ نہیں ہیں۔ پیسہ آیا تو گلبرگ چلے گئے تھے۔ ... اور گو کہ مجھ جیسی لڑکیوں کو یہاں سے گلبرگ یا کسی اور اچھے علاقے میں پہنچ کر بہت خوشی ہوتی ہے لیکن مجھے نہیں ہوئی مجھے یوں لگتا ہے جیسے میرا سب کچھ یہیں رہ گیا ہے۔ مجھے جب بھی موقع ملتا ہے یہاں آتی ہوں اور ہر سال آج کی تاریخ میں تو ضرور آتی ہوں۔ میں نے ہی امی کو آج تک یہ مکان بیچنے نہیں دیا۔"

"لیکن کیوں آتی ہو ہر سال تم یہاں آج کی تاریخ پر...؟ اور یہ سب کیا ہے؟" میں نے اس کے عروسی لباس کی طرف اشارہ کیا۔

"چھ سال پہلے اسی تاریخ کو اسی لباس میں کوئی مجھے یہاں بیٹھی چھوڑ کر صرف یہ کہہ کر رخصت ہوا تھا کہ میں ابھی آتا ہوں ... اور اس کے بعد وہ آج تک لوٹ کر نہیں آیا" اس کی آواز جیسے خاموش سسکیوں میں ڈھل گئی "ہم نے زمانے سے بہت لڑ کر ... بلکہ یوں سمجھو کہ جان کی بازی لگا کر ایک دوسرے کو پایا تھا۔ چند منٹ بعد ہمارا نکاح ہونے والا تھا... مگر وہ اسی دروازے سے باہر گیا اور اس کے بعد اس کا کوئی پتا نہیں چلا کہ اس کو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔ تب سے ہر سال اسی تاریخ کو میں اسی طرح دلہن بن کر یہاں بیٹھتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ نہیں آئے گا لیکن میں نے یہ ایک رسم بنالی ہے... رسمیں انسان ہی بناتے ہیں نا؟" وہ تھکے تھکے لیکن تائید طلب سے انداز میں میری طرف دیکھ کر مسکرائی "امید ہو تب تو سب ہی انتظار کرلیتے ہیں۔ میں ناامیدی کے باوجود انتظار کر رہی ہوں۔ کیا خیال ہے میں ایک اچھی رسم کی بنیاد نہیں رکھ رہی؟"

"یقیناً" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان گلی کوچوں میں بھی اس طرح وفا کا بھرم رکھنے والے پائے جاتے ہوں گے۔"

"یہ تو بخت بخت کی بات ہے" وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "بعض ناقدروں اور بدمعاشوں کو بازارِ حسن میں طوائفوں سے وفا ملتی ہے اور بعض شریفوں اور مسکینوں کو اپنی پردے دار بیویوں سے بھی وفا نہیں ملتی۔ یہ سب تماشے اس دنیا میں ہوتے ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا گوٹا کناری والا دوپٹہ اتارا اور اسے حفاظت سے تہ کرکے مسہری پر رکھنے لگی۔ دوبارہ وہ میری طرف مڑی تو گویا اسے کچھ یاد آگیا۔

"تم تو اپنے دشمنوں کو گویا بھول ہی گئے۔ یقیناً ایک سے زیادہ آدمی تمہارے تعاقب میں ہیں۔ کیا سوچا ہے تم نے؟" اس نے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔

"تم نے مجھے سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی" میں نے گہری سانس لے کر کہا "تمہیں دیکھ کر، تم سے مل کر مجھے حیرت کا کچھ ایسا جھٹکا لگا کہ میں سب کچھ بھول گیا حالانکہ میں بہت کم حیران ہوتا ہوں۔"

"ابھی تم نے زندگی میں دیکھا ہی کیا ہوگا" وہ مربیانہ لہجے میں بولی۔

میں اس کے خیال سے متفق نہیں تھا لیکن میں نے مبہم لہجے میں کہا "شاید۔"

"مسئلہ کیا ہے؟" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تلے لہجے میں بولی۔ اس کے بال خوبصورت تھے۔

"معلوم نہیں کتنی تعداد میں، خاصے خطرناک قسم کے لوگ میرے تعاقب میں ہیں۔ ان کے پاس خاصے خطرناک ہتھیار بھی ہیں اور ارادہ ان کا غالباً یہی ہے کہ مجھے دیکھتے ہی گولیوں سے میرے پرخچے اڑادیں۔ اور میں بالکل تنہا ہوں" میں نے نہایت دھیمے لہجے میں اختصار سے اسے صورتحال بتادی۔

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا "کاش میرے پاس ایک ریوالور ہی ہوتا۔ اور مصیبت یہ ہے کہ میری گاڑی بھی ان پیچیدہ گلیوں میں پھنس گئی ہے۔"

"ہوں" اس نے ہنکارہ بھرا اور پُرخیال انداز میں اپنے رخسار پر انگلی پھیری۔ اس وقت وہ بلاشبہ پُروقار اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ شوٹنگ کے موقع پر جب میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا تو نہ جانے کیوں وہ مجھے چیپ لگی تھی۔ اس وقت اس کا میک اپ اس کا لباس اور اس کی حرکات و سکنات میری نظر میں کچھ جچی نہیں، تمہیں جبکہ ... وہ انداز اپنا ... ہوں گے کہ فلم انڈسٹر ... کر ... رہی کہ دیکھ کر ... رفتہ ... ختلی ہوجاتے ہیں۔ اس میں شاید ہنی کا اپنا زیادہ قصور نہیں تھا۔ اصل میں وہ کسی اور ہی طرح کی عورت معلوم ہوتی تھی۔

بالآخر جیسے وہ کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "کیا خیال ہے، اب تک تمہارے دشمن تمہاری تلاش میں ناکام ہوکر واپس نہیں چلے گئے ہوں گے؟"

"نہیں۔ میرا خیال ہے آج وہ واپس جانے کے موڈ میں نہیں ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ان کا انداز کچھ ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ مجھے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔ میرا خیال ہے، وہ اس حصے کو نہایت خاموشی سے کھنگال رہے ہیں اور کسی بھی لمحے اس مکان تک پہنچنے والے ہیں۔"

تب ہنی جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئی۔ مڑ کر اس نے مسہری پر رکھا ہوا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا۔ ایک لمحے کے لئے اس کا ہاتھ ہینڈ بیگ میں گیا اور جب وہ ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک جھلملاتا ہوا سانیکوں جرمن لیوگر دبا ہوا تھا۔ یہ اعشاریہ چار پانچ کا ریوالور تھا مگر نہایت ہی جدید اور خوبصورت ساخت کا جس میں اس کا حجم بے حد کم کردیا گیا تھا مگر تھا وہ بہرحال بڑے کلیبر کا ریوالور۔ اس کے ساتھ ہی ہنی کے ہاتھ میں کسی گاڑی کی چابیاں بھی نظر آرہی تھیں۔

دونوں چیزیں میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولی "جن دو چیزوں کی تم کمی محسوس کررہے ہو وہ میں تمہیں مہیا کررہی ہوں۔ آگے تمہارا مقدر۔ میری گاڑی مکان کے سامنے والے دروازے پر کھڑی ہوئی ہے۔ ادھر گلی بھی کافی چوڑی ہے... سفید رنگ کی ٹویوٹا تمہیں دروازے کے قریب ہی کھڑے نظر آجائے گی۔ اب تم نکل لو۔"

"تم کیسے واپس جاؤ گی؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ مجھے اس کا آپ سے تم پر آجانا اچھا محسوس ہوا تھا۔

"تم میری فکر مت کرو۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"اور اگر میرے جانے کے بعد وہ لوگ یہاں آن گھسے؟" میں ابھی تک متذبذب تھا۔

"تم اس کی بھی فکر مت کرو۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔ مجھے اس کے بارے میں آفاق کی رائے یاد آنے لگی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کچھ پُراسرار اور خطرناک لڑکی ہے۔ آفاق کی بات مجھے کافی حد تک درست تو معلوم ہورہی تھی لیکن میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اس کے پُراسرار اور خطرناک ہونے کی نوعیت کیا تھی؟

میں نے ریوالور اور چابیاں اس کے ہاتھ سے لے لیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اب بھی ایک بے عنوان سے اداسی باقی تھی۔ ان آنکھوں کو دیکھ کر برسات کی چاندنی مگر سونی راتوں کا خیال آتا تھا۔

اسی لمحے دھم دھم کی ہلکی سی آوازیں سنائی دیں، جیسے دو تین وزنی بلیاں عقبی بالکونی نما برآمدے میں کودی ہوں۔ مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ بلیاں نہیں، بلے تھے جو بھیڑیوں سے زیادہ خطرناک تھے۔

"جاؤ۔" ہنی نے گویا لب ہلائے بغیر سرگوشی کی۔

میں کوئی ایسی حکمتِ عملی سوچنے کی کوشش کررہا تھا کہ جس کے تحت میں صرف اس ریوالور کی مدد سے ان سے نمٹ سکوں مگر اب کوئی حکمتِ عملی اختیار کرنے کے سلسلے میں تاخیر ہوچکی تھی۔ یہ بھی طے تھا کہ ہنی کے پاس ریوالور کی فاضل گولیاں نہیں تھیں ... ورنہ وہ ضرور مجھے دے دیتی۔ بس ریوالور لوڈڈ تھا جیسے کہ عموماً کچھ خاص قسم کی لڑکیاں اپنے پرس میں رکھتی ہیں۔ اکثر ان کے پاس فاضل گولیاں نہیں ہوتیں۔

"لیکن تم..." میں ایک بار پھر ہنی کے بارے میں تشویش کا شکار ہوگیا۔ اس سے مدد لے کر اور اسے یوں غیر یقینی حالات کے شکنجے میں چھوڑ کر چلے جانا مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی ایسا نہیں کیا تھا، کبھی اس طرح کی مدد نہیں لی تھی۔

"جذباتیت کی زنجیر مت پہنو" وہ یکایک سرد لہجے میں بولی اور اسی لمحے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ خطرات سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتی تھی اور اس کے لئے بھی چند لمحوں کی مہلت کافی تھی۔

دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بدستور سرگوشی کے سے انداز میں بولی "اس دروازے سے نکل کر ناک کی سیدھ میں دوڑتے چلے جاؤ۔ تم سامنے والے دروازے تک پہنچ جاؤ گے۔ بڑے بولٹ کو ذرا زنگ لگا ہوا ہے۔ احتیاط سے کھولنا، آواز پیدا نہ ہو۔"

"میں تمہاری یہ عنایت بھولوں گا نہیں۔" میں نے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا اور جانے کیوں اپنے آپ کو ہوا کے جھونکے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے دروازے سے نکل گیا۔ کمرے کے آگے برآمدہ تھا۔ دائیں بائیں بھی کمروں کے بند دروازے نظر آرہے تھے۔ سامنے مختصر سا صحن تھا اور بڑا سا دروازہ قدرے نشیب میں تھا۔

جس وقت ... میں بیرونی دروازے پر پہنچا، وہ عقبی دروازہ دھڑدھڑائے جانے کی آواز سنائی دینے لگی تھی جس سے گزر کر میں اس مکان میں داخل ہوا تھا۔ ہوا یا کوئی آواز سنائی نہ دی اور دوسرے ہی لمحے آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ دروازہ توڑے جانے کی کوشش شروع ہوگئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں یقین ہوچکا تھا کہ میں اس مکان میں داخل ہوا ہوں ورنہ انہوں نے پاس پڑوس میں بھی کہیں اس قسم کی کوئی کوشش ضرور کی ہوتی اور اس کی تھوڑی بہت آواز مجھ تک پہنچ گئی ہوتی۔ لیکن یہ محض ایک امکان تھا۔

میں نے حتی الامکان آہستگی سے اونچے اور مضبوط چوبی دروازے کا موٹا سا بولٹ کھولا اور ذرا سی درز پیدا کرکے باہر

جھانکا۔ گلی میں گھپ اندھیرا تھا۔ دروازے کے قریب ہی سفید ٹویوٹا کھڑی تھی۔ رکوع کی سی حالت میں گاڑی تک پہنچ کر میں نے گاڑی کا دروازہ کھولا اور اسٹیئرنگ سنبھالتے ہی اگنیشن میں چابی لگائی۔ گاڑی اچھی تھی۔ تقریباً بے آواز طریقے سے اسٹارٹ ہوئی لیکن اسی لمحے گلی کے ایک مکان کی دیوار پر ایک انسانی سایہ نمودار ہوتا دکھائی دیا اور جب تک گاڑی حرکت میں آئی تب تک وہ سایہ اچھی خاصی اونچی اس دیوار سے نہایت مشاقانہ انداز میں سڑک پر کود چکا تھا۔

اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ رائفل کا رخ صحیح کرپاتا' میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ وھیل سنبھالتے ہوئے دوسرا ہاتھ کھڑکی سے نکال کر ریوالور کی گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا اور اس کی رائفل اندھیرے میں نہ جانے کہاں جاگری۔ ایک ثانئے کے لئے مجھے خیال آیا کہ رک کر وہ گن تلاش کرکے اٹھالوں۔ میرے پاس ایک ڈھنگ کا ہتھیار ہی ہوجائے گا لیکن ایک تو یہ کوشش خطرے سے خالی نہیں تھی اور دوسرے گاڑی گویا مست ہاتھی کی طرح لہراتی ہوئی خاصی آگے پہنچ چکی تھی۔

میں نے بہتر سمجھا کہ نکلتا ہی چلا جاؤں۔ ہنی کے ریوالور کی نال میں نے غیرارادی طور پر چوم لی۔ اس ریوالور نے اپنے کام کا آغاز نہایت عمدگی سے کیا تھا۔

ہنگامہ میرے عقب میں رہ گیا تھا۔ ایک لمحے بعد ہی میں نے اپنے آپ کو شاہی بازار کے مین روڈ پر پایا۔ گاڑی میں نے دائیں طرف موڑی اور مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں اسی سمت جارہا ہوں جدھر سے آیا تھا اور جیسے ہی میں اس گلی کے قریب سے گزرا جس سے میں بھول بھلیوں میں داخل ہوا تھا' یک لخت ہی اندھیرے میں کھڑی ہوئی ایک کار کی ہیڈ لائٹس کسی عفریت کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں اور پھر میں نے انجن کی غضیلی غراہٹ سنی۔ میں نے اس طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ مجھے ویسے ہی کچھ اندازہ سا ہوا کہ یہ وہی سیاہ گاڑی تھی جو یہاں تک میرے تعاقب میں آئی تھی لیکن میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ کتنے آدمی تھے اور کس طرح اتنی تیزی سے کبھی آگے پہنچ رہے تھے اور کبھی واپس اس جگہ پہنچ جاتے تھے جہاں سے میں نکلنے کی کوشش کرتا تھا۔

آگے نکلتے نکلتے میں نے ایک اور گاڑی کو بھی اچانک عقاب کی طرح اپنے تعاقب میں جھپٹتے دیکھا۔ اسی لمحے آگے دور کہیں پولیس والوں کی وسل سنائی دینے لگی۔ پولیس والوں میں یہ بڑی اچھی بات ہے کہ وہ دور سے ہی لوگوں کو خبردار کردیتے ہیں کہ ہم آرہے ہیں' جسے بھاگنا ہے بھاگ لے۔

شاہی بازار کا مین روڈ بھی کچھ زیادہ کشادہ نہیں تھا۔ میں اکا دکا راہ گیروں کو بچاتا' گاڑی کو لہراتا اس رفتار سے گزرا کہ وہ راہ گیر دہشت زدہ سے ہوکر ادھر ادھر ہٹتے نظر آئے۔ راستے میں مجھے کہیں پولیس والے یا ان کی گاڑی نظر نہیں آئی۔ شاید وہ مین روڈ پر نہیں' ادھر ادھر کہیں گلیوں میں تھے اور معلوم نہیں اس گڑبڑ کی وجہ سے سرگرم تھے جو میری اور میرا تعاقب کرنے والوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھی یا پھر کسی اور چکر میں تھے۔

سرکلر روڈ پر پہنچ کر میں نے سگنل کی پروا نہ کرتے ہوئے چوراہے پر گاڑی دو پہیوں پر گھمائی اور اس طرف روانہ ہوگیا جدھر کچھ آگے جاکر یہی سڑک راوی روڈ کہلاتی تھی۔ رات کے اس پہر اس سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا البتہ اب ٹرکوں کی آزادانہ آمدورفت کا وقت ہوچکا تھا اور طرح طرح کے ٹرک کھڑکھڑاتے' دندناتے دوطرفہ سڑک پر رواں دواں تھے۔

اس سڑک پر پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میرے تعاقب میں اب دو گاڑیاں تھیں۔ یہ چیز بھی میرے لئے ناقابل فہم تھی کہ جوں جوں تعاقب کا سلسلہ طویل ہورہا تھا' ان کی تعداد میں کیونکر اضافہ ہوتا جارہا تھا؟

وہ ٹرک جو اسی سمت جارہے تھے جدھر میں جارہا تھا' میں نے ان کے درمیان گاڑی کو نہایت خطرناک انداز میں لہراتے ہوئے اپنا تعاقب کرنے والوں کو یہ تاثر دینا چاہا کہ میں انہیں ڈاج دینے کی کوشش کررہا ہوں تاکہ وہ مجھے ایک ثانئے کے لئے بھی نظر سے اوجھل نہ ہونے دیں اور اس مقصد کے لئے ضروری تھا کہ وہ بھی میری ہی طرح ٹرکوں کے درمیان سے گاڑی کو زگ زیگ کرتے ہوئے نکالتے۔ اس دوران میں کوئی کوشش کرسکتا تھا جس سے ان کی کم ازکم ایک گاڑی تو کسی ٹرک سے ٹکرا جاتی یا الٹ جاتی۔ لیکن وہ اس چکر میں نہیں آئے۔ وہ ٹرک تقریباً سیدھی قطار میں سفر کررہے تھے۔ تعاقب کرنے والی ایک گاڑی اس قطار کے ایک طرف ہوگئی اور دوسری گاڑی دوسری طرف۔ اب میں ٹرکوں کے درمیان انہیں غچہ دیتے ہوئے یوٹرن لینے کی کوشش نہیں کرسکتا تھا۔ فی الحال وہ مجھ پر فائرنگ نہیں کررہے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں تھا کہ جس انداز سے اس وقت تعاقب جاری تھا اس میں وہ فائرنگ کرکے مجھے کوئی حقیقی نقصان پہنچا سکیں گے۔ اس لئے انہوں نے بہتر یہی سمجھا کہ ایمونیشن ضائع نہ کیا جائے اور لوگوں کو بھی اپنی طرف متوجہ نہ کیا جائے۔

چند ہی لمحوں میں میں نے اپنے آپ کو راوی چوک کے قریب پایا۔ اس چوک سے مختلف سمتوں میں مختلف شہروں کے لئے سڑکیں نکلتی ہیں۔ اس وقت ان شہروں کو جانے والی اکادکا بسیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھیں۔ ان کی آرائشی بتیاں جل بجھ رہی تھیں۔ پریشر ہارن اور میوزیکل ہارن بجائے جارہے تھے اور کنڈیکٹر مختلف شہروں کے نام لے لے کر آوازیں لگارہے تھے حالانکہ وہاں دور دور تک کوئی مسافر نظر نہیں آرہا تھا۔ مسافر جتنے بھی دستیاب تھے وہ ان بسوں میں پہلے ہی بیٹھ چکے تھے۔

میں نے شہر سے نکل لینا ہی بہتر سمجھا۔ ایک ثانئے کے لئے مجھے خیال بھی آیا کہ اس جگہ چونکہ قدرے رونق تھی اس لئے

یہاں ان سے الجھنے یا انہیں کسی طرح چکر دینے کا خطرہ مول لیا جاسکتا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ یہاں بھی اندھا دھند فائرنگ شروع کردیتے۔ اس طرح کچھ بے گناہ لوگوں کی جان بھی جاسکتی تھی۔

اس چوک میں بھی سگنل ابھی تک کام کررہے تھے لیکن میں نے ان کی پروا نہ کرتے ہوئے دو پہیوں پر گاڑی شاہدرہ کی سمت گھمائی۔ پہیوں اور بریکوں کی چرچراہٹ کے ساتھ ہی چوک میں برپا شور یک لخت تھم گیا۔ بسوں کے ہارن خاموش ہوگئے اور کنڈیکٹر بھی جانے کیوں آوازیں لگانا بھول گئے۔ میرے عقب میں ان دونوں گاڑیوں کے پہیوں اور بریکوں کی چرچراہٹ سنائی دی اور وہ بھی بالکل میرے ہی انداز میں چوک سے مڑیں۔ میں عقب نما آئینوں میں دیکھ رہا تھا کہ اب وہ گاڑیاں مجھ سے زیادہ پیچھے نہیں رہی تھیں۔

میں نے ایکسیلیٹر پر دباؤ کچھ اور بڑھا دیا اور ٹول ٹیکس کی محرابوں تک پہنچتے پہنچتے انہیں ذرا زیادہ پیچھے چھوڑ دیا۔ ٹول ٹیکس وصول کرنے والے لڑکے کا ہاتھ ہوا میں اٹھا کا اٹھا ہی رہ گیا اور میری گاڑی زن سے اس کے بازو سے مس ہوتی ہوئی گزر گئی۔

کچھ دیر بعد میں جی ٹی روڈ پر مڑگیا۔ دونوں گاڑیاں بدستور میرے تعاقب میں لگی ہوئی تھیں۔ تاہم ہنی کی گاڑی اس اعتبار سے بہت اچھی تھی کہ میری مرضی کے مطابق میرا ساتھ دے رہی تھی۔ ہمارے درمیان فاصلہ بڑھتا جارہا تھا۔ جی ٹی روڈ پر اس وقت ٹریفک برائے نام تھا۔

پھر شاید تعاقب کرنے والوں نے یہ اندیشہ محسوس کرتے ہوئے کہ میں ان کی دسترس سے نکل جاؤں گا' عقب سے اچانک پھر فائرنگ شروع کردی۔ گنوں کا رخ زمین کی طرف تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ ٹائروں کو نشانہ بنانا چاہتے ہیں۔ میں نے گاڑی کو لہرانا شروع کردیا۔ اس رفتار پر گاڑی کو لہرانا نہایت خطرناک تھا لیکن اس وقت میرے آس پاس خطرات کے سوا تھا ہی کیا؟ ایک خطرے سے بچتا تو بہرحال دوسرے خطرے کا سامنا تھا۔

گاڑی کے عقبی حصے سے گولیاں ٹکرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ عقبی بتیاں وغیرہ یقیناً چکنا چور ہوچکی تھیں اور ڈکی وغیرہ میں بھی شاید سوراخ ہوچکے تھے۔ آوازوں سے یہی اندازہ ہورہا تھا۔ غنیمت تھا کہ ٹائر ابھی تک گولیوں کی زد سے بچے ہوئے تھے۔ یہ تو تھے بھی عام سی گاڑی کے عام سے ٹائر۔

بالآخر وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ سڑک پر نیم دائرے کا سا ایک موڑ آیا اور یہ موڑ کاٹتے وقت بالآخر ایک یا شاید دونوں ہی پچھلے ٹائر گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ اس رفتار سے موڑ کاٹتے ہوئے ٹائروں کا فلیٹ ہوجانا موت کے منہ میں چلے جانے ہی کا دوسرا نام تھا لیکن مجھے قدرت نے اتنی مہلت دے دی کہ گاڑی قلابازیاں کھانے سے پہلے بری طرح لہرائی اور اسی دوران مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کس طرف پہلی قلابازی کھائے گی۔ اسی لمحے میں دوسری طرف کا دروازہ کھول کریوں باہر کودا جیسے کسی طاقتور اسپرنگ نے مجھے اچھال دیا ہو اور یہ میری مزید خوش قسمتی تھی کہ میں سڑک سے نیچے کچے میں گرا اور نشیب میں لڑھکتا چلا گیا۔

گاڑی اسی رفتار سے چند گز آگے جاکر لڑھک گئی اور خاصی دور تک لڑھکتی چلی گئی۔ بری بات یہ ہوئی کہ نشیب میں لڑھکتے وقت ریوالور میرے ہاتھ سے گرگیا۔ اور اچھی بات یہ تھی کہ ان لوگوں کو غالباً اس وقت اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ میں لڑھکتی ہوئی گاڑی سے نشیب میں چھلانگ لگانے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔

دونوں گاڑیاں آگے گزرتی چلی گئیں۔ پھر ان کے ٹائروں کے چرچرانے اور دروازے کھلنے' بند ہونے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ غالباً میری الٹی ہوئی گاڑی کا جائزہ لے رہے تھے۔ اس دوران میں نے اٹھ کر ناک کی سیدھ میں دوڑنا شروع کردیا تھا۔ میں لحہ بہ لحہ سڑک سے دور ہوتا جارہا تھا۔

ملگجے اندھیرے میں کچھ دور قد آدم گھاس پُراسرار ہیولوں کی طرح لہراتی نظر آرہی تھی۔ دور دور تک جھاڑ جھنکاڑ ہی پھیلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میری آنکھیں ملگجے اندھیرے میں جہاں تک دیکھ پارہی تھیں اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ آگے زرعی زمینیں ہیں البتہ شروع کی کچھ زمین کسی وجہ سے خالی پڑی تھی اور شاید چراگاہ کا کام دیتی تھی۔

گھاس کے قریب پہنچ کر میں نے مڑکر دیکھا۔ ان لوگوں کو اس وقت تک معلوم ہوچکا تھا کہ میں کار سے نکل چکا ہوں کیونکہ مجھے سڑک پر کئی انسانی ہیولے نظر آئے اور وہ سب یقیناً نشیب ہی کی طرف متوجہ تھے۔ ان میں سے تین کے پاس ٹارچیں بھی تھیں جن کی روشنی ادھر ادھر چکرا رہی تھی لیکن میں بہت تیز دوڑنے کے باعث اس روشنی کی رسائی سے کافی آگے نکل آیا تھا۔

ان کی غالباً سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ طویل و عریض کھلی جگہ میں کس طرف مجھے تلاش کریں۔ پھر انہوں نے غالباً چند ہی سیکنڈ میں حکمت عملی تیار کرلی۔ ٹارچیں بجھ گئیں اور میں نے ان ہیولوں کو سڑک سے اتر کر اندھیرے میں مدغم ہوتے دیکھا۔ میں نے زیادہ تیزی سے گھاس کی طرف دوڑ لگادی اور چند سیکنڈ بعد میں کسی بدکے ہوئے مویشی کی طرح گھاس کے سمندر میں اتر گیا۔

اپنے اس فیصلے پر ایک لمحے کے لئے مجھے پچھتاوا بھی محسوس ہوا کیونکہ گھاس کچھ اس قسم کی تھی کہ اگر کسی خاص زاویے سے جسم کا کوئی کھلا حصہ ان لمبی پتیوں سے ٹکرا جاتا تھا تو وہ قدرے کھردری دھاروالی کسی تلوار کی طرح کاٹنے لگتی تھی۔ تاہم گھاس میں پناہ لینے کے سوا چارہ بھی کوئی نہیں تھا۔ کھلے میدان میں بیوقوفوں کی طرح دوڑتے رہنا تو کچھ زیادہ ہی فراخدلی سے موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔

قد آدم گھاس کو چیرتے ہوئے اور ذرا جھک کر دوڑتے ہوئے میں نے خاصا فاصلہ طے کرلیا۔ گھنی گھاس میں کچھ ہلچل تو مجھ جیسے خاصے جسیم آدمی کے دوڑنے سے مچی ہوئی تھی اور کچھ

شاید یہاں چھوٹے موٹے جانور بھی پناہ گزیں تھے جو میرے یوں در آنے سے گھبرا گئے۔ کچھ ہلچل ان کی وجہ سے بھی مچی ہوئی تھی۔ ...اگر اس وقت وہ لوگ گھاس کے قریب پہنچ چکے ہوتے تو اس ہلچل کی وجہ سے میرا سراغ پانا ان کے لئے بہت آسان ہوتا۔

خاصا فاصلہ طے کرنے کے بعد بالآخر میں رک گیا اور غیر محسوس انداز میں سانس لیتے ہوئے ادھر ادھر کی آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے رکنے کے چند لمحے بعد گھاس میں ادھر ادھر بھاگتے ہوئے چھوٹے موٹے جانور بھی گویا سکون میں آ گئے اور چاروں طرف سکوت چھا گیا۔ میں کسی بھی ایسی آواز پر کان لگائے ہوئے تھا جس سے ان لوگوں کی نقل و حرکت کا اندازہ ہو سکتا مگر مجھے کسی طرف سے کوئی ایسی آواز سنائی نہ دی۔

یہ عجیب اعصاب شکن سکوت تھا۔ کبھی کبھار کہیں دور سے موسیقار شبِ غم یعنی جھینگر کا راگ سنائی دے جاتا تھا۔ میں اپنے آپ کو خوش کن خیالات اور شگفتہ تشبیہات میں الجھانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ برسوں بعد ایسا موقع آیا تھا جب میں صحیح معنوں میں اپنے آپ کو اعصابی تناؤ میں مبتلا محسوس کر رہا تھا۔

کئی منٹ یونہی گزر گئے۔ چھٹی حس تو خطرے کا احساس دلا ہی رہی تھی لیکن وہ جو میری ایک نامعلوم سی حس تھی، وہ مجھے بتا رہی تھی کہ خطرہ میرے گرد بھنور کی طرح چکر کاٹ رہا ہے لیکن حیرت مجھے اس پر تھی کہ میں ذرا سی آہٹ بھی سننے سے قاصر تھا حالانکہ میری سماعت بھی غیر معمولی تھی لیکن شاید بات یہ تھی کہ جن لوگوں سے مجھے واسطہ پڑا تھا وہ بھی اس قسم کے معاملات میں غیر معمولی ہی صلاحیت رکھتے تھے۔

دفعتاً تابڑ توڑ دھماکوں سے فضا مرتعش ہو کر رہ گئی اور اس کے ساتھ ہی گھاس میں کوئی مشین سی چلنے لگی۔ وہ دراصل گولیاں تھیں جو بوچھاڑ کی سی صورت میں گھاس کو کاٹتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے میری سانس سینے میں اٹک گئی۔ وہ لوگ کافی بڑے رقبے میں پھیل گئے تھے اور گولیوں کی آوازوں سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ نیم دائرے میں رہتے ہوئے فائرنگ اسکواڈ کی طرح گولیاں چلا رہے تھے۔ گویا ان کا ہدف ان کی نظروں کے سامنے ہو۔

غنیمت یہ تھا کہ میں اب بھی ان کا ہدف نہیں بن سکا تھا۔ یہ اتفاق تھا یا شاید امدادِ غیبی کہ میں رخ بدلتی ہوئی ان گولیوں کی زد پر نہیں تھا۔ میں چوپائے کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں پر جھک گیا اور دھیرے دھیرے گولیوں کی بوچھاڑ سے کچھ اور دور کھسکنے لگا۔ جھاڑیوں میں چھپا ہوا وہ خرگوش جسے کئی شکاریوں نے گھیر رکھا ہو شاید اسی طرح جان بچانے کی فکر میں ہوتا ہو جس طرح اس وقت میں تھا۔ مجھے اپنا آپ بے حد قابلِ رحم محسوس ہوا۔ بڑی شان سے بیٹھے بٹھائے حالات کے ایک تھپیڑے نے مجھے کہاں سے کہاں دھکیل دیا تھا۔

اچانک گھاس کے درمیان ملگجی سی روشنی نظر آنے لگی۔ ان لوگوں نے ٹارچیں روشن کر لی تھیں۔ مجھے ایک بار پھر اپنی جگہ ساکت ہونا پڑا۔ گولیوں کی تڑاتڑ کے درمیان پرندوں کی چیخ و پکار بھی جاری تھی۔ دور کہیں فریادی سے انداز میں دو چار گیدڑ بھی بولنے لگے تھے۔ سرِدست تو میں بھی ایک گیدڑ ہی بن کر رہ گیا تھا جس کی شامت آئی تھی تو اس نے احتیاطی تدابیر اور حفاظتی انتظامات کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

میں بظاہر ایک محفوظ اور پُر سکون زندگی گزار رہا تھا لیکن درحقیقت میرے اردگرد قدم قدم پر غیر متوقع اور نادیدہ خطرات پھیلے ہوئے تھے۔ اگر میں احتیاط اور حفاظتی انتظامات کا خیال رکھتا تو یہ کوئی شرم کی بات نہیں تھی لیکن جانے کیوں میں اتنا زیادہ بے پروا یا پھر ضرورت سے زیادہ خود اعتماد ہو گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اب خود کو اتنی زیادہ لعنت و ملامت کرتے رہنے سے بھی کچھ حاصل نہیں، اپنی غلطیوں سے نمٹنا اور غیر متوقع حالات کا سامنا بھی مردانگی ہی ہے۔

دفعتاً گولیوں کی تڑتڑاہٹ تھم گئی۔ شاید انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ بے تحاشا ایمونیشن ضائع کر رہے ہیں یا پھر شاید انہیں اطمینان ہو گیا تھا کہ انہوں نے گولیوں سے پوری گھاس کو کھنگال لیا ہے۔ ٹارچیں بجھ گئیں اور چند لمحے بعد پھر وہی پہلا سا سکوت چھا گیا۔ مجھے بار بار دل ہی دل میں ان لوگوں کو داد دینا پڑ رہی تھی۔ وہ لوگ چوہے بلی کے کھیل میں خوب ماہر تھے۔ کبھی یکدم ہی ہنگامہ برپا کر دیتے تھے اور کبھی گویا دم سادھ کر بیٹھ جاتے تھے۔ کبھی ان کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہر قیمت پر مجھے گولیوں سے چھلنی کر دینا چاہتے ہیں اور کبھی یوں لگتا تھا کہ وہ مجھے

زندہ پکڑنا چاہتے ہیں۔ اعصاب شکن جنگ کی حکمتِ عملی یہی تھی کہ مخالف کو صحیح طور پر اندازہ ہی نہ ہونے پائے کہ آپ درحقیقت چاہتے کیا ہیں اور کس لمحے کیا قدم اٹھائیں گے۔ لیکن شاید ان لوگوں کو اندازہ نہیں تھا کہ اس وقت ان کا واسطہ بھی ایک ایسے شخص سے ہی ہے جس کی زندگی کے کئی قیمتی برس انہی حکمتِ عملیوں کے ساتھ اسی قسم کی محاذ آرائیوں میں گزرے تھے۔ جس کے اعصاب برسوں کی تربیت اور خداداد صلاحیتوں کی بدولت فولاد ہو گئے تھے۔ صورتِ حال خواہ کچھ بھی تھی لیکن میں خوفزدہ بہرحال نہیں تھا۔

میں نے نہایت آہستگی سے ایک طویل سانس لے کر بہت سی سرد ہوا کو بھی جسم دل میں چند لمحے کے لئے مقید کیا اور قطعی پُر سکون ہو کر ایک بار پھر ہموار انداز میں سانس لیتے ہوئے دھیرے دھیرے ایک طرف کو کھسکنا شروع کیا۔ میرے ہاتھ اب بھی کھردرے اور مضبوط تھے۔ کٹیلی گھاس اور زمین کی تمام ناہمواریوں کو برداشت کر رہے تھے۔

چند گز کا فاصلہ طے کرنے کے بعد یک لخت مجھے رکنا پڑا۔ کہیں دور سے گھاس میں سرسراہٹ کی خفیف سی آواز سنائی دی تھی اور یہ ان آوازوں سے بہت مختلف تھی جو گھاس میں چھوٹے موٹے جانوروں کے حرکت کرنے سے پیدا ہو سکتی تھیں۔ یقیناً کوئی انسان گھاس میں داخل ہو چکا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ دور بھی نہیں تھا۔ پھر ایسی ہی سرسراہٹ ایک اور سمت سے سنائی دی۔

شاید وہ سب ہی مختلف سمتوں سے گھاس میں داخل ہو چکے تھے۔ میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ ٹائی جو ڈھیلی ہو کر میرے گلے میں جھول رہی تھی، اسے اتار کر میں نے گھاس میں ہی پھینک دیا۔ میرا کوٹ بھی نقل و حرکت میں کچھ دشواری پیدا کر رہا تھا لیکن ساتھ ہی وہ کچھ چیزوں سے تھوڑا بہت تحفظ بھی دے رہا تھا۔ اس لئے میں نے اسے اتار کر نہیں پھینکا۔ کندھوں پر سے اس کی آستینیں خاصی اُدھڑ چکی تھیں جس کی وجہ سے بازو ہلانے جلانے میں خاصی آسانی ہو سکتی تھی۔

میری مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور خفیف سے خفیف آواز پر کان لگے ہوئے تھے۔ سرسراہٹ کی آوازیں کبھی سنائی دے جاتی تھیں اور کبھی معدوم ہو جاتی تھیں۔ وہ لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اب ان میں سے کوئی بھی ٹارچ روشن نہیں کر رہا تھا۔

میں ساکت بیٹھا رہا۔ سرسراہٹ کی آواز قریب آتی جا رہی تھی۔ ان میں سے کوئی ایک میری ہی سیدھ میں آ رہا تھا۔ میرے حق میں بہتر یہی تھا کہ میں کسی سے الجھنے کے بجائے وہاں سے نکل لینے ہی کی کوششیں جاری رکھتا لیکن مجھے کسی ہتھیار کی ضرورت شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ میں خطرہ مول لے کر کسی سے کوئی گن چھیننا چاہتا تھا۔

سرسراہٹ کی آواز بالکل قریب آ گئی تو میں نے سانس روک لی۔ پھر میرے سامنے گھاس چیر کر ایک نہایت دھندلا ہیولا نمودار ہوا۔ اس کے ہاتھ میں غالباً اسٹین گن تھی۔ اگر مجھے ایک ثانیے کی بھی تاخیر ہوئی ہوتی تو شاید اسے میری موجودگی کا احساس ہو جاتا لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔

میں نے چیتے کے سے انداز میں اچھل کر اس کی گردن دبوچ لی تاکہ وہ کوئی آواز نہ نکال سکے لیکن اس دوران اضطراری طور پر اس سے اسٹین گن کا ٹریگر دب چکا تھا۔ گولیوں کی تڑتڑ عین میرے کان کے قریب گونجی۔ گن کا رخ اس وقت آسمان کی طرف ہو چکا تھا۔ زندگی کے آخری لمحوں میں بھی اس شخص کو یہ عقلمندانہ احساس ضرور رہا کہ اس کے ہاتھوں میں موجود گن میرے لئے بہت اہم ہے کیونکہ میں نہتا ہوں۔ وہ اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ گن مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتی۔ گولیاں آسمان کی طرف گئی تھیں لیکن وہ شخص گن دور کہیں اندھیرے میں پھینکنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس دوران چاروں طرف بلا کا سکوت چھا گیا۔ اس سکوت میں "کڑک" کی صرف ایک ہلکی سی آواز ابھری اور یہ اس شخص کی گردن ٹوٹنے کی آواز تھی جو میری گرفت میں آ گیا تھا۔ بازو کے شکنجے میں یا دونوں ہاتھوں کی گرفت میں گردن پھنسا کر ایک مخصوص ٹرک اور کچھ طاقت کے استعمال سے اسے ایک پل میں توڑ دینا میرے لئے بہت آسان تھا۔

میں نے دم توڑتے ہوئے اس شخص کو گھاس میں پھینکا اور سر جھکا کر ایک طرف کو دوڑ پڑا۔ گن کو تلاش کرنے کا اب وقت نہیں رہا تھا کیونکہ ایک لمحے کے سکوت کے بعد کئی اطراف سے بے تحاشا فائرنگ شروع ہو گئی تھی اور ٹارچوں کی روشنی بھی ادھر ادھر چکرانے لگی تھی۔ میں گولیوں اور روشنی کی زد سے بچتا ہوا جدھر بھی راستہ مل رہا تھا ادھر دوڑ رہا تھا۔ بہرحال اپنی طرف سے تمامتر احتیاط کے باوجود کچھ بعید نہیں تھا کہ میں دوڑتا ہوا سیدھا کسی سے جا ٹکراتا جو گن لئے گھاس میں میرا منتظر کھڑا ہوتا۔

ایسا تو نہیں ہوا لیکن جو کچھ ہوا وہ اس سے بھی کچھ برا ہی تھا۔ ...ہوا یہ کہ دہشت زدہ درندے کی طرح سر جھکا کر گھاس کو چیرتے ہوئے میں نے کچھ دور تک بھاگنے کے بعد اچانک ہی اپنے آپ کو کھلے میدان میں پایا۔ کچھ آگے پانی کا ایک چھوٹا سا نالہ تھا۔ میں اپنی جھونک میں اسے بھی پھلانگ گیا۔

کھلے میں آ کر میں نے اپنے آپ کو قطعی غیر محفوظ محسوس کیا، ...تاہم اب رکنا یا سمت تبدیل کرنا بھی مجھے مناسب نظر نہ آیا۔ میں دیوانہ وار دوڑتا ہی چلا گیا۔ فائرنگ بدستور جاری تھی بلکہ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی ایک شخص تو کہیں قریب سے ہی فائرنگ کر رہا ہے لیکن وہ مجھے دیکھ نہیں پایا ہے۔ ملگجے اندھیرے میں کچھ دور مجھے درختوں کا ایک جھنڈ نظر آ رہا تھا اور میرا ارادہ تھا کہ درختوں کی اوٹ میں ذرا رک کر صورتحال کو سمجھنے اور کوئی فیصلہ کرنے کی کوشش کروں گا لیکن جونہی میں جھنڈ کے قریب پہنچا، میری نظروں کے سامنے ہوا میں ایک جال سا لہرایا۔ فوری

طور پر مجھے یہ خیال آیا کہ شاید یہ میرا وہم ہے اور کافی دیر سے میں جس صورتحال کا شکار ہوں اس کی وجہ سے میری نظر عارضی طور پر دھندلا سی رہی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے جب میں الجھ کر گر پڑا، میرے پاؤں زمین پر نہ رہے اور میں خود بخود ہی گویا سمٹ کر رہ گیا تب مجھے احساس ہوا کہ وہ جال حقیقی تھا اور مجھ پر ہی پھینکا گیا تھا اور میں نہایت ہی آسانی سے کسی بے ضرر جانور کی طرح اس میں پھنس کر رہ گیا تھا۔

تھوڑا سا لڑھکنے کے بعد میں سنبھلا تو کچھ فاصلے پر دائیں بائیں دو آدمی ہیولوں کی طرح کھڑے نظر آئے۔ وہ غالباً قریبی درختوں سے کودے تھے اور ان کے ہاتھوں میں جال کی بندشیں تھیں جنہیں انہوں نے مخالف سمتوں میں کھینچ کر جال کا منہ بند کیا تھا۔ یہ جال بھی عجیب سی ساخت کا تھا۔ تتلی پکڑنے والے جال سے ہی مشابہ معلوم ہوتا تھا لیکن اس کا منہ بند کرنے والی بندشیں دو مخالف سمتوں میں تھیں جنہیں کھینچنے سے نہ صرف جال کا منہ بند ہو گیا تھا بلکہ جال سکڑ کر بھی رہ گیا تھا اور میں بھی اس میں سمٹ کر رہ گیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہئے ایک بڑا سا گولا بننے میں کچھ ہی کسر رہ گئی تھی۔

خاصی مضحکہ خیز سی صورتحال تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یقین نہ آیا کہ میں یوں مضحکہ خیز سے انداز میں بھی کسی کے قابو میں آسکتا ہوں اور جب میں یہ یقین کرنے پر مجبور ہو گیا تو مجھ پر چند لمحے کے لئے جنون سا طاری ہو گیا۔ میں نے جال کا منہ کھولنے یا اسے توڑنے کے لئے مجنونانہ سے انداز میں ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ جال ٹوٹنا یا اس کی بندشیں کھلنا تو درکنار میں اس میں صحیح طور پر سیدھا کھڑا ہونے کے قابل بھی نہ ہو سکا۔

دونوں آدمی عمدگی سے جال کو سنبھالے ہوئے تھے۔ میری مجنونانہ اچھل کود سے انہیں جو جھٹکے لگے تھے انہیں بھی وہ برداشت کر گئے تھے اور جال کی بندشیں ان کے ہاتھوں سے نہیں چھوٹی تھیں۔ پھر ان میں سے ایک نے حلق سے نہایت بلند اور کریہہ آواز نکالی۔ ابھی تک دور کہیں جو اکا دکا فائر ہو رہے تھے وہ تھم گئے اور چند ہی لمحوں بعد دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں قریب آنے لگیں۔ پھر میں نے ارد گرد سے ہیولے نمودار ہوتے دیکھے۔ پھر چند ٹارچیں دوبارہ روشن ہو گئیں اور وہ سب دوڑتے ہوئے ادھر آنے لگے جدھر میں ان کے لئے تماشہ راحت اور خود اپنے لئے درس عبرت بنا ہوا تھا۔

وہ سب میرے ارد گرد جمع ہو چکے تو میں ان کی تعداد دیکھ کر حیران رہ گیا۔ صرف ایک شخص کو قابو میں کرنے یا شاید ہلاک کرنے کی غرض سے پوری فوج کی فوج جمع تھی۔ یہ لوگ صرف دو گاڑیوں میں تو نہیں ہو سکتے تھے۔ معلوم نہیں کب اور کس طرح یہ لوگ یہاں پہنچے تھے۔ شاید یہ بھی زبردست منظم گروہی انداز میں کام کر رہے تھے۔ شاید ان کے پاس ٹرانسمیٹر وغیرہ موجود تھے یا رابطے کا کوئی اور ذریعہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ یقیناً ایک باقاعدہ حکمت عملی بنا کر چلے تھے۔ شاید انہوں نے میرے معمولات کا بھی کسی نہ کسی طرح جائزہ لیا تھا اس لئے ایکشن میں آنے کا نہایت مناسب وقت منتخب کیا تھا۔

کچھ حیرت مجھے ان کے حلئے دیکھ کر بھی ہوئی تھی۔ اب ٹارچوں وغیرہ کی وجہ سے ماحول خاصا منور ہو چکا تھا۔ گو کہ ٹارچوں کا رخ میری ہی طرف تھا اور میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں پھر بھی میں خاصی حد تک گرد و پیش کا جائزہ لے سکتا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان کے حلیوں میں بڑا فرق تھا۔ ان میں سے کوئی جینز جیکٹ میں تھا تو کوئی ایسی شلوار قمیص میں جس پر پورا تھان کپڑے کا لگ جاتا ہے۔ کوئی پستہ قد تھا تو کوئی بے تحاشہ جسیم۔ کسی کے چہرے پر زمانہ غار کے سے انسانوں والی وحشت تھی تو کسی کے چہرے پر مہذب شہریوں والی ملائمت۔ کوئی محض ایڈونچر کا شوقین شکاری معلوم ہوتا تھا تو کوئی فلمی قسم کا ڈاکو جو سیاہ شلوار قمیص میں تھا، سر پر پگڑی تھی اور منہ پر باقاعدہ ڈھاٹا بھی بندھا ہوا تھا۔ کمر سے گولیوں کی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس طرح ایک ایک نمونے کے دو دو تین تین آدمی موجود تھے۔ مشترک ان میں صرف ایک ہی بات تھی اور وہ یہ کہ ان سب کے پاس جدید ساخت کی گنیں تھیں۔ اگر کسی کے پاس ریوالور بھی تھا تو وہ بھی جدید ترین ساخت کا تھا۔ حتیٰ کہ ایک شخص کے پاس ہلکی مشین گن بھی موجود تھی۔ لگتا تھا کہ وہ لوگ کوئی چھوٹا موٹا شہر فتح کرنے کے ارادے سے نکلے ہیں۔ میں گہری سانس لے کر

رہ گیا۔

وہ سب دلچسپی آمیز سی نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے لیکن ان کے چہرے تاثرات سے عاری تھے، بس کچھ جوش و خروش اور کچھ بھگدڑ کی تھکن باقی تھی جو اب فتح کی طمانیت میں بدلتی جا رہی تھی۔ مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ وہ فوج مجھ پر.... ایک تنہا اور غیر مسلح شخص پر قابو پا کر قدرے شرمندہ نظر آنے کے بجائے مطمئن نظر آ رہی تھی۔

چمڑے کی جیکٹ اور شکاریوں والی خاکی پینٹ میں ملبوس ایک دراز قد نوجوان جو اس بھان متی کے کنبے کا سربراہ معلوم ہوتا تھا، اپنے مشین پسٹل کو انگلی پر گھماتے ہوئے آگے آیا۔ میرے قریب پہنچ کر فلمی انداز میں ایک جھٹکے سے رکا۔ نخوت سے مجھ پر ایک نظر ڈالی۔ اس کے بائیں رخسار پر ایک تازہ زخم تھا جس سے خون رس رہا تھا۔ نخوت بھرے انداز میں ہی اس نے الٹے ہاتھ سے اس زخم کو پونچھا اور پھر اچانک ہی نہ جانے کیا سوچ کر پوری قوت سے مجھے ایک ٹھوکر رسید کی۔

وہ شکاریوں والے فل بوٹ پہنے ہوئے تھا۔ ٹھوکر مارنے میں اس نے قوت بھی بڑی صرف کی تھی۔ ٹھوکر میری ران پر پڑی تھی اور ایک لمحے کے لئے مجھے یوں لگا تھا جیسے اس جگہ سے گوشت پھٹ گیا ہے۔ تکلیف تو بہت ہوئی لیکن میں برداشت کر گیا۔ میں نے آنکھ تک نہیں جھپکی۔ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا لیکن افسوس کہ اس وقت میں اکڑوں سی حالت میں بیٹھا ہوا تھا۔ بڑی شدت سے دل چاہ رہا تھا کہ اس وقت میں اسی کی طرح سر اٹھا کر اس کے سامنے کھڑا ہو سکتا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ میرا ایک بھرپور گھونسا بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا لیکن بدقسمتی سے وقت اس کے ساتھ تھا۔ میں نے غیر ارادی طور پر اٹھنے کی کوشش کی لیکن میں بدستور جال میں بری طرح جکڑا ہوا تھا اس لئے کامیاب نہ ہو سکا۔

"نطفۂ ناتحقیق" میں نے بلند اور ٹھہری آواز میں کہا "تیری ماں نے تجھے انہی لوگوں کو ٹھوکریں مارنا سکھایا ہے جو بندشوں میں جکڑے ہوئے ہوں؟"

اس کے انداز و اطوار فلمی تھے لیکن وہ فلمی ولن کی طرح جوش میں نہیں آیا۔ بالکل اسی طرح نپے تلے انداز میں اس نے مجھے ایک اور ٹھوکر رسید کی اور بڑے مطمئن لہجے میں بولا "ہاں... میری ماں نے تو کیا میرے باپ نے بھی مجھے یہی سکھایا ہے کہ دشمن کو زیادہ سے زیادہ بے بس کر کے مارو۔"

بے بسی، غصے اور جھنجلاہٹ سے میرے جسم میں خون کی گردش اتنی تیز ہو چکی تھی کہ اس مرتبہ میں ٹھوکر کی تکلیف بھی محسوس نہ کر سکا۔ میری کنپٹیاں سنسنا رہی تھیں اور اپنی آنکھوں سے خود مجھے شعلے سے پھوٹتے محسوس ہو رہے تھے۔ تاہم میں نے حتی الامکان ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا "کیا دشمنی ہے مجھ سے تیری؟"

"ہم دوستوں کے دشمنوں کو اپنا بھی دشمن سمجھتے ہیں۔" اس نے فخریہ سے لہجے میں جواب دیا۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کن دوستوں کا ذکر کر رہا ہے کہ اس نے مشین پسٹل کا دستہ میرے سر پر رسید کرنے کے لئے نہایت خونخوارانہ انداز میں اسے ہوا میں بلند کیا۔ انداز بتا رہا تھا کہ اگر وہ ضرب میرے سر پر پڑ گئی ہوتی تو میری کھوپڑی خطرناک حد تک چٹخ ضرور گئی ہوتی لیکن اس سے پہلے ہی ڈاکوؤں کے سے حلئے والے ایک دراز قد اور جسیم شخص نے آگے بڑھ کر اس کی کلائی مضبوطی سے گرفت میں لے لی۔

"انہوں نے بولا تھا کہ اگر ... زندہ ہاتھ آجائے تو پھر اس کو ہر حال میں زندہ ہی لایا جائے۔" ڈاکو نما شخص نے کھردری آواز میں کہا۔ جھاڑ جھنکار داڑھی والا وہ ڈاکو جس نے اس وقت اپنے چہرے سے ڈھاٹا ہٹا لیا تھا مجھے بڑا خوش شکل اور بھلا آدمی معلوم ہوا۔ اس نے مجھے ایک خطرناک ضرب سے بچا لیا تھا۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ 'انہوں' سے اس کی کیا مراد تھی۔ اور اس وقت میں غور کرنے کی پوزیشن میں بھی نہیں تھا۔

فلمی ولن نما شخص کڑی نظروں سے ڈاکو نما کی طرف دیکھتے ہوئے غرایا "میں تم سے بہتر جانتا ہوں کہ آرڈرز کیا ہیں۔ میں اسے بے ہوش کر رہا ہوں۔ اسے ہوش و حواس میں ساتھ لے جانے کا خطرہ میں مول نہیں لے سکتا خواہ یہ جال میں ہی کیوں نہ ہو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ یہ ہے کیا چیز۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کسی کو اشارہ کیا اور وہ قیامت جو ایک لمحے کے لئے ٹل گئی تھی، بالآخر سر پہ ٹوٹ ہی پڑی۔ عقب میں کھڑے ہوئے کسی بدبخت نے گن کا بٹ میرے سر پر دے مارا تھا۔ ٹارچوں کی روشنی ایک ثانئے کے لئے میری آنکھوں کے سامنے کچھ زیادہ ہی پھیل گئی مگر دوسرے ہی لمحے گھپ اندھیرا چھا گیا۔ میں نے اپنے حواس کو بیدار رکھنے کی بہت کوشش کی مگر ذہن اندھیروں میں ڈوبتا چلا گیا۔

دوبارہ جب میری حسیات نے انگڑائی سی لی تو سب سے پہلا احساس یہ ہوا کہ کوئی مجھے دھیرے دھیرے جھولے دے رہا ہے لیکن یہ جھولے کچھ تکلیف دہ سے تھے۔ ہر جھکولے کے ساتھ گویا کوئی سر کے پچھلے حصے پر بھاری ہتھوڑے سے ہولے ہولے دستک دے رہا تھا۔ میں نے دھیرے دھیرے آنکھیں بھی کھول لیں لیکن چاروں طرف گھٹا ٹوپ اندھیرے کی دلدل بدستور موجود رہی۔

ایک ثانئے کے لئے یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح ذہن میں لپکا کہ کہیں ضرب اتنی شدید تو نہیں تھی کہ میں بینائی کھو بیٹھا ہوں؟ مگر پھر دھیرے دھیرے چیزوں کے سرمئی خدوخال واضح ہونا شروع ہوئے۔ کچھ سماعت نے بھی صحیح طور پر کام شروع کیا اور کھڑکھڑاہٹ اور گڑگڑاہٹ کی آوازوں کی نوعیت سمجھ میں آنے لگی۔

کئی منٹ بعد میری سمجھ میں آسکا کہ میں درحقیقت اسی جال میں مقید ہوں اور اسے اب پہلے سے بدتر انداز میں کس دیا گیا ہے اور شاید گرہیں وغیرہ بھی لگادی گئی ہیں۔ اس وقت میں ایک ٹرک کے پچھلے حصے میں تھا۔ ٹرک بالکل خالی تھا۔ اس کا واحد "لوڈ" اس وقت میں تھا۔ یہ ٹرک شاید مویشیوں کی باربرداری کے لئے استعمال ہوتا تھا کیونکہ اس میں چاروں طرف ناقابل برداشت سی بدبو رچی ہوئی تھی جسے برداشت کرنے پر میں مجبور تھا۔

مجھے بھی ایک مویشی ہی کی طرح ایک کونے میں ڈال دیا گیا تھا بلکہ میں مویشی سے کچھ بدتر حالت میں ہی تھا کیونکہ مویشی کو جال میں جکڑنے کی زحمت نہیں کی جاتی۔ انہیں تو بس پاس پاس کھڑا کر کے ٹرک کے دروازے پر رسیوں سے جال سا تان دیا جاتا ہے۔ اس ٹرک کا پچھلا حصہ اوپر تک تختوں سے بند کر دیا گیا تھا تاہم اوپر کی طرف نہ تو ترپال لگی ہوئی تھی اور نہ ہی کسی اور قسم کی چھت موجود تھی۔ اوپر تاریک آسمان نظر آرہا تھا جس کا نظر آنا نہ آنا برابر ہی تھا۔

کئی منٹ تک تو میں ساکت ہی بیٹھا رہا۔ ٹرک خاصی تیز رفتاری سے کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں تھا اور سڑک کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی اس لئے ہچکولوں، جھٹکوں، اور کھڑکھڑاہٹ کا سلسلہ جاری تھا۔ میرے سر کے پچھلے حصے میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ تاہم رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ میری توانائی واپس آرہی ہے اور خوابیدہ اعصاب بیدار ہو رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تکلیف کا احساس کچھ کم ہونے لگا۔

جال میں میرے لئے کچھ زیادہ ہلنے جلنے کی گنجائش تو نہیں تھی لیکن پھر بھی میں نے کسمسا کر اپنے آپ کو قدرے آرام دہ پوزیشن میں لانے کی کوشش کی اور سوچنے لگا کہ کیا اس مصیبت سے چھٹکارے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ دفعتاً مجھے ایک چیز یاد آئی اور اگر اس وقت گنجائش ہوتی تو میں ضرور خوشی سے اچھل پڑتا۔ اچھلنے کے بجائے ایک بار پھر میں صرف کسمسا کر رہ گیا۔

مجھے یاد آیا کہ میرے پاس چھوٹی چابیوں کا ایک چھوٹا سا گچھا موجود رہتا ہے۔ اور اسی گچھے میں چابیوں کے ساتھ ایک ننھا سا نیل کٹر بھی موجود رہتا تھا جو بظاہر کسی ملک کا چمکتا دمکتا سکہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نیل کٹر کی مدد سے نائیلون کے جال کی ایک ایک رسی کاٹ کر کچھ دیر میں اتنی جگہ بنائی جا سکتی تھی کہ مجھ جیسی جسامت کا آدمی اس سے نکل سکے۔

میں گٹھڑی سی بنا ہوا تھا۔ بمشکل ہاتھ کو اندرونی جیب تک لے گیا لیکن اندرونی جیب میں چابی کا گچھا تو کیا، کچھ بھی موجود نہ تھا بلکہ میری سبھی جیبیں خالی تھیں۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میری تمام چھوٹی موٹی چیزیں بھاگ دوڑ کے دوران کہیں گر گئی تھیں یا میری بے ہوشی کے دوران نکال لی گئی تھیں۔

ایک گہری سانس لے کر میں نے فیصلہ کیا کہ آخر مجھے قدرت ہی کے عطا کردہ ہتھیار استعمال کرنا پڑیں گے۔ اس میں زحمت ذرا زیادہ تھی اس لئے میں پہلے انہیں استعمال کرنے سے کتراتا رہا تھا۔ کسی چیز کو کترنے کے لئے دانت اللہ تعالیٰ نے صرف چوہے کو ہی نہیں دیئے ہوتے، انسان کے دانتوں میں بھی چار دانت ایسے ہوتے ہیں جنہیں وہ چوہے کی طرح استعمال کر سکتا ہے لیکن اس کے لئے کچھ مشق اور تھوڑی سی ڈینٹسٹ کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مجھے تو خیر ڈینٹسٹ کی مدد کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ مشق میں نے خاصی کی تھی اور ایک بار اس قسم کے کام میں ان دانتوں کو استعمال بھی کر چکا تھا۔ اس وقت میرے ہاتھ ایک موٹی سی رسی سے بندھے ہوئے تھے اور مجھے ایک تہ خانے میں قید کر دیا گیا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ میرے ہاتھ پشت پر نہیں باندھے گئے تھے۔

آج غنیمت یہ تھا کہ میرے ہاتھ سرے سے بندھے ہوئے ہی نہیں تھے اور اس کا نفسیاتی اثر یہ تھا کہ میں اپنے آپ کو زیادہ مایوس محسوس نہیں کر رہا تھا۔ میں نے ایک جگہ سے جال کی رسی کو دانتوں میں دبا کر کترنا شروع کیا اور چند ہی سیکنڈ میں اسے کاٹنے میں کامیاب ہو گیا جسے طاقت سے توڑنا بے حد مشکل تھا۔

پھر میں جال کے ایک ایک چوکور خانے کو کترتا چلا گیا۔ اس کام کے دوران میرے ہونٹ اور مسوڑھے زخمی سے ہو گئے اور چار دانت گویا گھس سے گئے لیکن نتائج بڑے تسلی بخش تھے۔ جلد ہی جال میں سوراخ اتنا بڑا ہونے والا تھا کہ میں اس سے نکل سکتا تھا اور اس جال سے چھٹکارا پا سکتا تھا۔ میں حتی الامکان پُرسکون رہنے کی کوشش کر رہا تھا، اس کے باوجود اعصاب پر سا ہیجان طاری ہو چلا تھا۔ جال سے چھٹکارا پانے کی امید نظر آنے لگی تھی تو دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

ٹرک اس دوران شاید کسی اور بدتر سڑک پر مڑ گیا تھا کیونکہ جھٹکے اور ہچکولے پہلے سے زیادہ محسوس ہونے لگے تھے۔ ٹرک کی کھڑکھڑاہٹ کے سوا اب تک کوئی دوسری آواز سنائی نہیں دی تھی۔ بڑی یکسوئی سے سفر جاری تھا۔

بالآخر وہ خوشگوار لمحہ آن پہنچا جب میں نے اپنے آپ کو سکیڑ سمیٹ کر جال سے نکال لیا۔ اس لعنتی چیز کو سمیٹ کر میں نے ایک کونے میں پھینکا اور نہایت محتاط انداز میں بیٹھے ہی بیٹھے ٹرک کے عقبی حصے تک پہنچا۔ گو کہ ٹرک کے پورے ہی پچھلے حصے میں اندھیرا تھا اور اگر ڈرائیور والے کیبن سے کسی سوراخ کے ذریعے کوئی ادھر دیکھ بھی رہا ہوتا تو اس کے لئے میری نقل و حرکت دیکھنا مشکل ہی ہوتا لیکن میں پھر بھی احتیاط برت رہا تھا۔

ٹرک کے عقب میں جو تختے لگے ہوئے تھے ان کی ایک درمیانی درز سے آنکھ لگا کر باہر دیکھتے ہی میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میرا اندیشہ درست ہی تھا۔ میں پہلے ہی سوچ رہا تھا کہ ٹرک کے پیچھے پیچھے کوئی گاڑی ضرور آرہی ہوگی جس نے ٹرک کو کور کیا ہوا ہوگا تبھی انہوں نے مجھے ٹرک میں پھینکنے کے بعد سے زیادہ حفاظتی انتظامات نہیں کئے تھے۔ اب طویل سانس لے کر میں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ ٹرک کے عقب میں ایک نہیں دو گاڑیاں آرہی تھیں۔ اگلی گاڑی تو ٹرک سے بمشکل پچیس تیس گز کے فاصلے پر تھی۔ دوسری گاڑی اس سے مزید اتنا ہی پیچھے تھی۔

کاروں کی روشنی میں مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی چھوٹی سی سڑک تھی جس کے دونوں طرف چھدرے چھدرے درخت نظر آرہے تھے۔ اگر میں ٹرک کے پیچھے سے اترنے کی کوشش کرتا تو ہیڈ لائٹس کی زد میں آتے ہی یقیناً کوئی گولی میرا مقدر ہوتی۔

اب ایک ہی طریقہ تھا کہ میں ٹرک کی سائڈ کی دیوار پر چڑھ کر باہر چھلانگ لگانے کی کوشش کرتا لیکن اس صورت میں بھی کار والوں کی نظر میں آنے کے امکانات خاصے قوی تھے البتہ اگر میں عین اس وقت چھلانگ لگاتا جب ٹرک کوئی موڑ کاٹ رہا ہوتا اور اس سے پہلے کہ پیچھے آنے والی کار بھی اس موڑ تک پہنچتی، میں درختوں کے درمیان خاصا دور نکل کر اندھیرے میں پناہ لینے میں کامیاب ہو جاتا تبھی میرے بچ نکلنے کا کوئی امکان تھا۔

لیکن کوئی ضروری نہیں تھا کہ اس سڑک پر کوئی موڑ آتا، عین ممکن تھا کہ یہ میلوں تک اسی طرح سیدھی چلتی رہتی اور کوئی موڑ آنے سے پہلے ہی کوئی واقعہ رونما ہو جاتا۔ بہرحال میں دیوار سے لگ کر کھسکتا ہوا واپس اگلے حصے کی طرف آیا۔ ٹرک کی دیوار میرے قد سے خاصی بلند تھی تاہم میں نے اس پر لٹک کر ذرا باہر جھانکا۔ کار کی روشنی اس طرف کبھی تھوڑی بہت پہنچتی تھی اور کبھی نہیں لیکن چھلانگ لگانے کی صورت میں خطرہ بہرحال موجود تھا۔

عین اسی لمحے شاید قسمت نے مجھ پر مہربانی فرمانے کا فیصلہ کیا اور میں نے محسوس کیا کہ ٹرک موڑ کاٹ رہا ہے۔ میں نے سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں کیا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ دوبارہ مجھے ایسا موقع کب ملتا۔ ٹرک غالباً کسی کچے راستے پر مڑ رہا تھا کیونکہ اردگرد یکایک کچھ زیادہ مٹی اڑتی محسوس ہونے لگی تھی۔

میں نے جسم کو بندروں کی طرح سکیڑا، اچک کر ٹرک کی چوبی دیوار پر چڑھا اور دوسری طرف لٹک گیا۔ اس دوران ٹرک موڑ کاٹ چکا تھا اور کار پیچھے رہ گئی تھی۔ جس وقت میں ٹرک کی چوبی دیوار پر چڑھا، ٹرک اس بری طرح ڈگمگا رہا تھا کہ شاید میں درخت سے جدا ہونے والے پکے ہوئے پھل کی طرح کہیں جا گرتا لیکن آرام دہ زندگی کا دور شروع ہونے کے بعد میں نے مشقیں اور تربیت ترک نہیں کی تھی۔ یہ مشقیں اور تربیت زندگی کے ہر موڑ پر کام آتی تھی۔

ٹرک کے گھومتے ہی میں نے چھلانگ لگا دی۔ وہ کوئی پگڈنڈی نما راستہ تھا۔ پاؤں زمین پر لگتے ہی میں دوڑ پڑا۔ پگڈنڈی کے اس طرف بے ترتیب سے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ میں تیزی سے ان کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔ کچھ دور پہنچ کر میں ایک تناور درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ عین اسی لمحے پہلی کار موڑ پر نمودار ہوئی اور ہچکولے کھاتی ہوئی کچے راستے پر اتر آئی۔ وہ میرے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ اس کے شیشے تاریک تھے۔ میں دیکھ نہیں سکا کہ اس میں کتنے آدمی تھے۔

چند لمحے بعد اسی طرح دوسری کار بھی میرے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ یہ اندازہ مجھے ہو گیا تھا کہ ٹرک کے آگے بھی کوئی نہ کوئی گاڑی ضرور تھی بلکہ شاید ایک سے زیادہ ہی رہی ہوں لیکن انہیں میں دیکھ نہیں سکا تھا۔

مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں اتنی آسانی سے ٹرک سے فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔ اس احساس نے میری دھڑکنیں کچھ تیز کر دی تھیں۔ میں نے چند گہری گہری سانسیں لے کر اپنے آپ کو پُرسکون رکھتے ہوئے سوچنے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر میرے فرار سے لاعلم نہیں رہ سکیں گے۔ میرے لئے اہم سوال یہ تھا کہ کس سمت میں بھاگنا میرے لئے مفید رہے گا؟

بہتر تو یہی نظر آتا تھا کہ میں اسی سمت میں سڑک کی طرف بھاگ لوں جدھر سے ٹرک آیا تھا۔ سڑک پر رہتے ہوئے یہ امید کی جا سکتی تھی کہ شاید مجھے لفٹ لینے کے لئے کوئی سواری مل جائے لیکن اندیشہ یہ تھا کہ میری عدم موجودگی کا احساس ہوتے ہی وہ لوگ بھی اسی راستے کی طرف پلٹیں گے جدھر سے وہ آئے تھے۔ پھر وہ تعداد میں اتنے زیادہ تھے، ان کے پاس گاڑیاں تھیں، وہ بہت کم وقت میں بڑا علاقہ کھنگال سکتے تھے۔

پھر میں نے کسی خاص استدلال کے بغیر اس طرف منہ پھیرا جدھر میں پیٹھ کیے کھڑا تھا، اور بگٹٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ درختوں سے بچ کر دوڑتے ہوئے میں نے سو قدم کا فاصلہ طے کیا تو آگے ایک پشتہ سا آگیا۔ میں اسے بھی پھلانگ گیا۔ اس سے آگے کوئی درخت نہیں تھا۔ زمین نرم اور بھربھری تھی۔ زرعی زمین معلوم ہوتی تھی، شاید یہاں تازہ تازہ گوڈی کی گئی تھی اور اب پانی کا انتظار تھا کیونکہ پانی سپلائی کرنے والا نالا خشک پڑا تھا۔

مٹی اتنی نرم تھی کہ میرے جوتوں میں گھسنے لگی تاہم میں دوڑتا رہا۔ اسی دوران مجھے احساس ہوا کہ تاریکی اب پہلے جیسی گہری نہیں رہی۔ صبح کاذب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ میں نے اپنی رفتار کچھ اور تیز کرنے کی کوشش کی۔ زرعی زمین جلد ہی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد ٹھوس اور بنجر زمین کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس ناہموار میدانی سے علاقے میں کچھ دور دوڑنے کے بعد میں پھر ایک پشتے پر جا پہنچا جو خاصا اونچا تھا۔ اس پر چڑھا تو پتا چلا کہ وہ نہر کا پشتہ تھا۔

نہر زیادہ چوڑی نہیں تھی اور ملگجے اندھیرے میں سبک خرامی سے بہتا ہوا پانی سرمئی سیال معلوم ہو رہا تھا۔ پانی کی ہلکی ہلکی سرسراہٹ سرگوشیوں سے مشابہ محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو دائیں ہاتھ پر کچھ ہی دور مجھے چھوٹی سی پلیا نظر آئی جس سے نہر کو پار کیا جا سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں [illegible] طرف نہ بڑھ سکا۔

درحقیقت پانی کی سرگوشیوں نے مجھے بے خود سا کردیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے پانی یہ سرگوشیاں مجھ سے کررہا ہے۔ یہ سرگوشیاں میرے لئے شناسا تھیں۔ پھر مجھے یوں لگا جیسے وہ زمین' وہ علاقہ' گردوپیش کی ہر چیز میری شناسا ہے۔ اس وقت روشنی نہیں تھی کہ میں گردوپیش کا جائزہ لے سکتا لیکن ہر جگہ کی اپنی گویا ایک خوشبو ہوتی ہے۔ یہاں کی بھی اپنی ایک خوشبو تھی جو میرے لئے شناسا تھی۔ مجھے ایک عجیب بھولی بسری اور گم گشتہ اپنائیت کا احساس دلا رہی تھی' معلوم نہیں کیوں میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا تھا۔

میں نے اس کی وجہ سمجھنے کی بہت کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہوسکا۔ بالآخر میں پلیا کی طرف چل دیا۔ پلیا پرانی اور سالخوردہ تھی لیکن جب میں اس کے قریب پہنچا تو اس کے گرد گویا ایک سنہرا ہالہ روشن ہوگیا۔ یہ یادوں کا ہالہ تھا۔

بچپن اور لڑکپن کی یادوں نے یک لخت میرے ذہن پر یلغار کردی۔ یہ تو وہی علاقہ تھا جہاں میرا بچپن گزرا تھا۔ اس پلیا کے آس پاس میں نے اور میرے دوست ریاض عرف راجو نے بے شمار فلموں کی شوٹنگز کی تھیں۔ گنے ہاتھ میں پکڑ کر شمشیرزنی کی تھی۔ جب فرصت میسر ہوتی تھی' جب شوٹنگ کرتے کرتے تھک جاتے تھے' جب دل کسی انجانے دکھ سے بوجھل ہوتا تھا تو میں اسی پلیا پر آبیٹھتا تھا۔ اس وقت یہ علاقہ اور قریبی قصبہ ہی میری کل کائنات تھا۔

وقت نے مجھے کہاں لاکھڑا کیا تھا... اور کیسے عجیب حالات اور غیر متوقع انداز میں۔ میں تھکنے والا انسان نہیں تھا لیکن اچانک ہی میں تھک سا گیا۔ آہستگی سے میں اس پلیا پر بیٹھ گیا۔ میرے اعصاب میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ میرا دل چاہا کہ اجالا ہونے تک یہیں بیٹھا رہوں' اجالے میں گردوپیش کے ہر ذرّے کا چہرہ قریب سے دیکھوں' ہر شجر اور ہر برگ و ثمر سے پوچھوں' تم نے مجھے پہچانا؟

جہاں انسان کا بچپن بیتے' اچھا بیتے چاہے برا بیتے' وہ جگہ شاید مرتے دم تک دلکش ہی محسوس ہوتی رہتی ہے۔ کسی کو جبراً ایسی جگہ سے دور' کہیں انجانی سرزمین کی طرف دھکیل دیا جائے تو یہ اس کی روح پر ظلم کے مترادف ہے' اس کی جڑیں گویا زمین میں نہیں رہتیں' زمین سے اس کا ناتا ٹوٹ جاتا ہے۔ زندگی بھر' بلکہ شاید نسل درنسل وہ بے زمین سا ہی پھرتا رہتا ہے۔ اس کی شناخت ختم ہوجاتی ہے۔ نئی سرزمین کے لوگ اس کے وجود کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔

میں اس اعتبار سے پھر بھی خوش قسمت تھا کہ جہاں میرا بچپن بیتا تھا وہ علاقہ کسی دوسرے ملک کی سرحدوں میں شامل نہیں تھا۔ میرے اپنے ہی وطن میں تھا' میری رسائی میں تھا' کوئی لمبا سفر بھی نہیں تھا' میں جب چاہتا یہاں آسکتا تھا اور سچی بات یہ تھی کہ بارہا میں نے سوچا بھی... لیکن زندگی نے گویا کبھی مہلت ہی

نہیں دی۔ آج دشمن ہی گھیر کر یہاں تک لائے تھے۔

چند لمحے بعد میں بادل ناخواستہ وہاں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ زیادہ دیر وہاں بیٹھے رہنا ٹھیک نہیں تھا۔ یہاں سے تو میں اندھیرے میں بھی اپنے قصبے تک جاسکتا تھا اور قصبے میں کہیں نہ کہیں مجھے پناہ مل سکتی تھی۔ مجھے اس وقت پناہ کی تلاش تھی۔ سب سے زیادہ اس وقت جو چیز مجھے پریشان کررہی تھی وہ پیاس تھی۔ بڑی شدید پیاس لگی ہوئی تھی مگر نہر سے پانی پینے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ صاف اور ٹھنڈے پانی کی طلب تھی اور طلب شاید ابھی اس مرحلے سے نہیں گزری تھی کہ جو کچھ بھی سامنے آتا میں پی جاتا۔

قصبے میں کسی نہ کسی کا گھر تو مل ہی سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میرے دونوں چچا اس آبائی گھر میں ہی رہ رہے ہوں جو صرف ڈیڑھ کمرے پر مشتمل تھا اور جسے وہ ہر وقت فروخت کرکے بٹے بخرے کرنے پر تلے رہتے تھے۔ عین ممکن تھا کہ میرا دوست ریاض عرف راجو بھی ابھی اسی قصبے میں ہو اور اپنے باپ کی پرچون کی دکان چلا رہا ہو۔

ایک عجیب سے احساس نے میری رگ و پے میں نئی توانائی بھردی۔ میں تیز تیز قدموں سے قصبے کی طرف بڑھنے لگا۔ دفعتاً ایک طرف کافی فاصلے پر مجھے روشنی کی ایک چوڑی سی پٹی سی نظر آئی۔ میں ایک لمحے کے لئے ٹھٹکا پھر اسی طرف بڑھنے لگا۔

کافی آگے جاکر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک جھونپڑی تھی۔ اس کی کھڑکی کا پٹ غالباً نیم وا تھا جس سے روشنی باہر آرہی تھی۔ اس ویرانے میں درختوں کے ایک جھنڈ کے پاس موجود یہ جھونپڑی کچھ عجیب اور افسانوی سی لگ رہی تھی۔ جیسا کہ عموماً پرانے قصے کہانیوں میں ہوتا ہے کہ شہزادہ ویرانے میں بھٹکتا ہوا جارہا تھا کہ سامنے اسے ایک جھونپڑی نظر آئی...

فرق صرف یہ تھا کہ میں کوئی شہزادہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی

شہزادی کی تلاش میں نکلا ہوا تھا۔ میں محتاط انداز میں اس جھونپڑی تک پہنچا۔ وہ کچی اینٹوں' لکڑی کی بلیوں اور گھاس پھونس وغیرہ کی مدد سے بنی ہوئی خاصی بڑی جھونپڑی تھی اور اس ویرانے میں انسانی بودوباش کی واحد علامت تھی۔

جھونپڑی کا ٹیڑھا میڑھا چوبی دروازہ بند تھا۔ میں چند لمحے متذبذب سے انداز میں اس کے سامنے کھڑا رہا۔ ویرانے میں سکوت اتنا گہرا تھا کہ میں جھونپڑی کے اندر کسی کے سانسوں کی سرسراہٹ سن سکتا تھا۔ یعنی یہ تصدیق تو ہوگئی تھی کہ جھونپڑی میں کوئی ذی روح موجود تھا۔

میں دبے قدموں کچی دیوار میں بنے ہوئے اس کھڑکی نما شگاف تک پہنچا جس میں سلاخوں کی جگہ ٹیڑھی میڑھی لکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ اسی کھڑکی کا سالخوردہ سا پٹ آدھا کھلا ہوا تھا اور بیمار سی روشنی باہر آرہی تھی۔

میں نے اس کھڑکی سے اندر جھانکا اور ایک ہی لمحے میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہر چیز کا جائزہ لے ڈالا۔ ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا' چند برتن اور صراحی وغیرہ پڑی تھی۔ اس سے کچھ دور دو تین پرانے ٹرنک اوپر نیچے رکھے تھے۔ سب میں گڑھے پڑے ہوئے تھے اور ایک ٹرنک میں سے تو بدرنگ سے کپڑے باہر کو لٹکے ہوئے تھے۔ گھریلو ضروریات کی دوسری چھوٹی موٹی اور معمولی سی چیزیں ادھر ادھر لڑھک رہی تھیں۔ فرش کچا اور ناہموار تھا۔

پرلی دیوار کے ساتھ ایک جھلنگا سی چارپائی پر ایک پرانا اور بدرنگ سا لحاف ٹانگوں پر ڈالے ایک عورت لیٹی ہوئی تھی اور ایک ٹک چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کی چارپائی سے ذرا ہی دور دیوار میں گڑی ہوئی ایک کیل پر لالٹین لٹکی ہوئی تھی۔

وہ عورت جاگ رہی تھی اور شاید اس کی ساری رات ہی جاگتے ہوئے گزری تھی۔ وہ عورت نہیں' محض ایک کھنڈر معلوم ہوتی تھی۔ ایک ایسا کھنڈر جس سے عمارت کی خوبصورتی کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ تیکھی اور ستواں ناک اس کے چہرے پر گویا لبِ مزار بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے چہرے پر شاید صرف آنکھیں ہی برباد ہونے سے کسی حد تک بچ گئی تھیں۔ تاہم ویرانیاں ان موٹی موٹی حسین آنکھوں میں بھی نہ جانے کب سے جاگزیں تھیں۔ یہ آنکھیں اس وقت نہ جانے کون سی گم گشتہ رفاقتوں کا نوحہ پڑھ رہی تھیں۔ اس کی رنگت آبنوسی تھی' شاید کبھی سانولی رہی ہو اور اس سانولے پن میں زمانے بھر کی ملاحت سمٹ آئی ہو۔ مگر اب سب کچھ بیت چکا تھا۔ شاید وہ ایک کہانی تھی جو ختم ہوچکی تھی۔

لیٹے لیٹے اسے یک دم کھانسی آئی مگر ایسے جیسے اس میں کھانسنے کی بھی سکت نہیں تھی۔ اس کے پھیپھڑے تھک چکے تھے۔ کھانسی کی آواز بہت کمزور تھی لیکن تکلیف یقیناً زیادہ تھی کیونکہ اس نے دونوں ہاتھوں سے سینہ تھام رکھا تھا۔ اس پر بھی اس کی خود اذیتی کا عالم یہ تھا کہ جونہی کھانسی تھمی' اس نے اپنا میلا سا تکیہ استخوانی ہاتھ سے ذرا اوپر کو اٹھایا' وہاں سے سستی سی سگریٹ کی ایک پچکی ہوئی ڈبیا اور ماچس نکالی اور ایک مڑی تڑی سی سگریٹ نکال کر لیٹے ہی لیٹے قدرے ترچھی ہوکر کانپتے ہاتھوں سے سلگائی اور دوبارہ سر تکیے پر ٹکا کر گہرا سا کش لے کر یوں آنکھیں بند کرلیں جیسے بے پناہ سکون ملا ہو' کثیف دھواں اس کے چہرے پر چکرا رہا تھا۔

یہ دھواں چھٹا تو جیسے میرے ذہن پر چھائی ہوئی دھند بھی ایک لمحے کے لئے صاف ہوگئی اور یادوں کے افق پر ایک چہرہ چاند کی طرح جھلملا اٹھا۔ میں نے اس عورت کو پہچان لیا۔

وہ تاجاں تھی!

مگر اتنی خوب صورت کہانی کا انجام اتنا دردناک بھی ہوسکتا ہے' یہ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ اس بات کو کوئی زیادہ برس تو نہیں بیتے تھے جب میں جوانی کی حدود کے آس پاس بھٹکتا ہوا ایک نوخیز لڑکا تھا اور وہ مجھ سے عمر میں خاصی بڑی' بھرپور جوان' دراز قد اور پنجاب کی ایک روایتی لڑکی جس کی شخصیت ہیر کے تصور کے بہت قریب تھی۔ بچپن کے اپنے کچھ رومانی تصورات' کچھ عجیب آئیڈیلز ہوتے ہیں۔ میں اس کی طرف اس وقت سے رشک کی نظر سے دیکھنے لگا تھا جب مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ گھر سے بہانہ کرکے ایک قریبی گاؤں میں اپنے محبوب سے ملنے جاتی ہے۔ وہ میری نظر میں جرأتوں کی علمبردار تھی۔ پھر وہ اپنے محبوب کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور پورے گاؤں میں مطعون وملعون قرار پائی تھی۔

پھر میں نے کئی برس بعد اسے اس وقت دیکھا تھا جب میں پیر مشعل شاہ کے ہاں جعلی مؤکل کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ وہ اپنی اندھی محبتوں کا نہ جانے کیا کیا تاوان ادا کرکے لوٹ آئی تھی۔ ...اس وقت بھی وہ مجھے برباد ہی نظر آئی تھی مگر اتنی نہیں' بعض لوگوں کو تو ماہ و سال بالکل ہی کچل کر گزر جاتے ہیں' ریزہ ریزہ کردیتے ہیں۔

کئی لمحے تک میں وہیں مبہوت سا کھڑا اسے دیکھتا رہا اور وہ میلے کچیلے تکیے پر سر ٹکائے دھیرے دھیرے اس گھٹیا سگریٹ کے کش لیتی رہی۔ چند کش لینے کے بعد اسے پھر کھانسی اٹھی لیکن اس نے سگریٹ پھینکی نہیں۔

میں کھڑکی سے ہٹ کر دروازے کی طرف بڑھا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ میں نے ہولے سے دستک دی۔ مجھے یوں لگا جیسے اندر لیٹی ہوئی تاجاں نے سانس بھی روک لی ہو' پھر اس کی کمزور سی آواز ذات کے کھنڈر میں گونجنے والے نوحے کی طرح ابھری "کون ہے؟"

یہ وہی آواز تھی جس کی نغمگی' جس کا رسیلا پن کبھی میرے نوخیز دل کو اتھل پتھل کردیا کرتا تھا اور میں بڑے رشک سے سوچا

کرتا تھا کہ نہ جانے وہ کون خوش نصیب ہوگا جس کے کانوں میں یہ مُدھر سرگوشیاں رس گھولتی ہوں گی۔ وقت اور حالات نے اس آواز کا رس' اس کی نغگی بھی چھین لی تھی۔ عجب کھر کھراتی ہوئی سی آواز تھی۔

"دروازہ کھولو تاجاں" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

اندر ایک لمحے کے لئے پھر سکوت چھاگیا۔ پھر کپڑوں کی سرسراہٹ اور سلیپر گھسیٹنے کی آواز سنائی دی اور بالآخر کنڈی کھلنے کی آواز آئی۔ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ دھیرے سے کھلا۔ تاجاں لالٹین اونچی کئے میرے سامنے کھڑی تھی۔ اس کے مرجھائے ہوئے استخوانی چہرے پر حیرت تھی کیونکہ وہ مجھے پہچان نہیں پائی تھی جبکہ میری زبان سے وہ اپنا نام سن چکی تھی۔

اس کے بازو میں شاید زیادہ دیر اونچا رہنے کی سکت نہیں تھی۔ لالٹین نیچی کرتے ہوئے وہ مرتعش سی آواز میں بولی "کون ہو تم؟" اس کے بے کیف سے ہونٹ بات کرتے وقت خزاں رسیدہ پتوں کی طرح کانپتے نظر آتے تھے۔

"پہلے مجھے اندر آجانے دو" میں نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

اس نے بلا تامل مجھے راستہ دے دیا۔ شاید اس کے پاس اب ایسا کچھ رہا ہی نہیں تھا جس کے چھن جانے کا اسے خوف ہوتا اور جس کی وجہ سے وہ اجنبیوں سے ڈرتی' شاید جان بھی اس کے لئے کوئی متاع گراں مایہ نہیں رہی تھی۔ اس کا لباس میلا اور بوسیدہ تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک قابلِ رحم معلوم ہوتی تھی' اسے قریب سے دیکھ کر میرے دل کو دھچکا سا لگا تھا۔

وہ کچھ پیچھے ہٹ گئی۔ دروازہ میں نے اپنے عقب میں بند کردیا اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم نے واقعی مجھے نہیں پہچانا؟؟"

اس نے لالٹین کیل پر ٹانگ دی اور دھیرے سے نفی میں گردن ہلائی۔ تب میں نے اسے یاد دلایا کہ خوب صورت زمانوں میں جب وہ نہر کے پار کسی سے ملنے جاتی تھی تو وہیں آس پاس جھاڑ جھنکاڑوں میں یا نہر کی پلیا پر جو دو لڑکے فلموں کی شوٹنگ کیا کرتے تھے' ان میں سے ایک میں تھا' افضل چوہدری' جسے اس زمانے میں گاؤں کی روایات کے عین مطابق نام بگاڑنے کے بعد پھجا کہا جاتا تھا۔ کئی بار تاجاں نے درخت پر چھپ کر ہماری شوٹنگ دیکھی تھیں۔ اس زمانے میں وہ بلی کی سی پھرتی سے درخت پر چڑھ جاتی تھی۔ اور اب شاید اس کے لئے ہموار زمین پر بھی چند قدم چلنا محال تھا۔ جبکہ وقت اتنا زیادہ بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ اس حال کو پہنچ جاتی' معلوم نہیں اسے کیا چیز گھن کی طرح چاٹ گئی تھی۔

میرے یاد دلانے پر اسے فوراً یاد آگیا کہ میں کون تھا۔ پہلے تو حیرت اور بے یقینی سے اس کی اجڑی اجڑی سی آنکھیں پھیل گئیں مگر اس بہانے ان میں زندگی کی رمق نظر آنے لگی' پھر اس کے ڈھانچا نما جسم پر لرزہ سا طاری ہوگیا۔ سگریٹ اس کی انگلیوں سے نکل کر فرش پر گر گئی اور اسے شاید پتا بھی نہیں چلا۔

بے اختیار اس نے آگے بڑھ کر مضطربانہ سے انداز میں میرا بازو تھام لیا اور کسی انجانے اشتیاق سے لرزتی آواز میں بولی۔

"تم... تم واقعی افضل ہو...؟ کتنے خوب صورت... کتنے گبھرو جوان نکلے ہو تم... بچپن میں تو یونہی بونگے سے ہوا کرتے تھے۔ اس وقت تو تم یقیناً کسی مصیبت سے گزر کر آرہے ہو... تمہارا حال خراب ہے مگر پھر بھی اچھے لگ رہے ہو... ماشاءاللہ... لگتا ہے بڑی چیز بن گئے ہو... اور تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ تاجاں کا گھر ہے؟"

"میں وہاں سے تمہیں دیکھ رہا تھا" میں نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"اور صرف یوں دیکھ کر تم نے مجھے پہچان لیا۔ کیا واقعی؟" اس کی آواز بے یقینی سے کانپ رہی تھی "میں تو تمہیں اتنی اچھی طرح دیکھ کر... ذہن پر اتنا زور دے کر بھی نہیں پہچان سکی تھی۔"

"یہ اصل میں نظر نظر کی بات ہے... کہ کب' کس نے کس کو کتنی گہری نظر سے دیکھا تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "انسان کی زندگی میں جن کی اہمیت نہیں ہوتی' جنہیں وہ سرسری

نظر سے دیکھتا ہے وہ اسے یاد نہیں رہتے۔ لیکن چھوڑو ان باتوں کو... یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے آپ کو اس حد تک برباد کیونکر کرلیا؟ کیا گزری تم پر؟"

وہ تھکے تھکے سے انداز میں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ اس کے پژمردہ ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ جیسے اسے وقت' حالات اور دنیا' کسی سے بھی کوئی شکوہ' کوئی گلہ نہ ہو۔ تکیے کے نیچے سے پچکا ہوا پیکٹ نکال کر اس نے پھر ایک سگریٹ سلگائی اور طویل کش لے کر کھانسی کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"میری کہانی میں کوئی نیا پن نہیں ہے' کوئی خاص بات نہیں ہے' اس دنیا میں ہزاروں لاکھوں لوگ آئے دن میری ہی طرح برباد ہوتے رہتے ہیں' صفحۂ ہستی سے مٹتے رہتے ہیں۔"

"پھر بھی کچھ تو بتاؤ" میں نے اصرار کیا "وہاں تک تو مجھے معلوم ہے کہ گھر سے فرار ہونے کے بعد تم ایک طویل عرصے تک... نہ جانے کہاں کہاں دھکے کھانے کے بعد واپس آگئی تھیں۔"

"اس کے بعد کا قصہ کچھ زیادہ طویل نہیں ہے" اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں کچھ اور دھندلا گئیں "بابا دن رات مجھ پر لعنت بھیجتا تھا' گلی کوچے میں نکلتی تھی تو لوگ انگلیاں اٹھاتے تھے' ...مجھے بڑا افسوس ہوتا تھا کہ کیوں واپس آگئی۔ اس سے تو اچھا تھا' کہیں ادھر ادھر دھکے ہی کھاتی رہتی۔ میں تو بڑے مان سے آئی تھی کہ جہاں انسان جنم لے وہ جگہ' وہ گاؤں' وہ شہر تو ماں کی طرح ہوتا ہے' ضرور اپنی گود میں پناہ دیتا ہے مگر یہاں تو ہر چیز مجھ پر نامہرباں ہوچکی تھی۔ پھر ایک روز بابا مرگیا اور گھر میں گویا بک بک جھک جھک ختم ہوگئی۔ زندگی کے آخری دنوں میں بابا مجھے بہت برا لگنے لگا تھا لیکن جب وہ مرگیا تو اس کی کمی بہت شدت سے محسوس ہونے لگی۔ بابا جن کا مزارع رہا تھا' مکان بھی انہی کا تھا' انہوں نے چہلم کے بعد ہی مکان لے لیا اور دوسرے مزارع کو دے دیا۔ ...میں بالکل جیسے سرِراہ کھڑی رہ گئی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کروں' کہاں جاؤں اور کہاں سے روٹی کھاؤں۔ اور قصبے میں شاید کسی کو بھی اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ میں نے زیادہ بڑے شہر دیکھے تو نہیں لیکن سنا ہے کہ بڑے شہروں کی زندگی بڑی مشینی ہوتی ہے' بے حسی کا راج ہوتا ہے۔ کسی کو کسی کا پتا نہیں ہوتا' پڑوسی کو پڑوسی کے دکھ سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ لیکن میں سمجھتی ہوں کہ خود غرضی' بے حسی یا مشینی زندگی اب صرف بڑے شہروں کی خصوصیت نہیں رہی' یہ تو محض بڑے شہروں پر ایک الزام ہے۔ بے حسی' خود غرضی اور مشینی طرزِ عمل تو اب چھوٹی سے چھوٹی بستیوں میں بھی زہر کی طرح پھیلتا جارہا ہے۔ اصل میں بستیاں یا شہر تو نہیں بدل رہے' تبدیل تو ہم انسان ہورہے ہیں۔ الزام ہم لوگ وقت' زمانے اور شہروں کو دیتے رہتے ہیں۔ میں تمہیں بتا نہیں سکتی کہ اس وقت میں کیا محسوس کررہی تھی۔ میری جیب میں اتنے پیسے بھی نہیں تھے کہ میں بس میں بیٹھ کر کسی اور شہر میں چلی جاتی۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک درویش قسم کے ضعیف آدمی نے یہاں یہ جھونپڑی بنوائی تھی۔ کچھ عرصے وہ اس میں رہا تھا لیکن چند دن سے نہ جانے کہاں گیا ہوا تھا۔ اس پر ایک معمولی سا تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے کمال ڈھٹائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ تالا توڑا اور آکر اس میں رہنا شروع کردیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ جب فقیر بابا آئے گا تو دیکھی جائے گی۔ میں اس سے بات کرلوں گی۔ شاید وہ مجھے اپنے ساتھ ہی رکھ لے۔ یہاں تھوڑا سا راشن پانی بھی موجود تھا۔ چند دن تو آرام سے گزر ہی گئے۔ بابا لوٹ کر ہی نہیں آیا۔ میں کوئی شریف زادی تو ویسے بھی نہیں رہی تھی۔ مجھ جیسی عورت کے لئے اگر سب راستے بند ہوجائیں تب بھی ایک راستہ بہرحال کھلا رہتا ہے۔ ...میں نے وہ راستہ اپنا لیا۔ بہت گاہک آنے لگے اور میں حیران رہ گئی کہ شہر ہو یا گاؤں ہر جگہ کتنی بھوک ہے مگر یہ سلسلہ زیادہ لمبے عرصے نہیں چلا' مجھے بڑی بری سی بیماری لگ گئی۔ لوگوں نے آنا چھوڑ دیا۔ کبھی کبھار پرانے مہربانوں میں سے کوئی ترس کھاکر تھوڑے بہت پیسے دے جاتا تھا۔ کبھی تکلیف بڑھ جاتی ہے تو حکیم صاحب کے پاس جاکر چند دن کی دوا لے آتی ہوں۔ وہ بھی ترس کھاکر مفت دوا دے دیتے ہیں۔ چند دن آرام سے گزر جاتے ہیں۔ بس یونہی زندگی کی سانسیں پوری کررہی ہوں۔ شروع شروع میں تو لوگوں نے جینا دوبھر کردیا تھا۔ مجھے یہاں سے نکال پھینکنے کی بڑی کوششیں ہوئیں لیکن میں ڈٹی رہی۔ بڑے مکالمے بازی' بحث و مباحثے اور دلیل بازیاں ہوئیں لیکن برائی کے پاؤں ایک مرتبہ جم جائیں تو اسے اکھاڑنا مشکل ہوتا ہے۔ اپنی بقا کی خاطر میں بھی ایک برائی بن گئی تھی۔ اب تو سب گویا مجھے بھول سے گئے ہیں۔ کسی روز یونہی یہاں پڑی موت کی آغوش میں جاسوؤں گی۔"

اس نے سب کچھ بڑے سرسری سے لہجے میں کہا تھا لیکن میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ میں نے اپنے لہجے کو ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "نہیں' تم اتنی کسمپرسی کی موت نہیں مروگی۔ میں تمہیں شہر لے جاؤں گا۔ بہت اچھے ڈاکٹروں سے تمہارا علاج کراؤں گا۔ تمہیں بہت اچھے گھر میں رکھوں گا' تم بالکل ٹھیک ہوجاؤگی۔"

اس نے بے اعتباری سے میری طرف دیکھا "تم کیوں کروگے میرے لئے ایسا؟ اس دنیا میں کوئی بغیر غرض کے کسی کے لئے زیادہ زحمت نہیں اٹھاتا... اور میں اب کسی کی بھی کوئی غرض پوری کرنے کے قابل نہیں رہی۔ لوگ تو میرے سائے سے بھی بھاگتے ہیں' تم کیوں اتنی تکلیف اٹھاؤگے میرے لئے؟"

"صرف اس لئے کہ تم میرے بچپن کی یادوں کا ایک حصہ ہو... اور مجھے اپنے بچپن کی یادیں بہت عزیز ہیں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

معلوم نہیں کیوں یہ الفاظ سن کر اس کی کھنڈر آنکھوں میں آنسوؤں کی شبنم پھیل گئی مگر اس نے جلدی سے آنکھیں پونچھ لیں اور مصنوعانہ اشتیاق کے ساتھ مسکراتے ہوئے بولی "یقین نہیں آرہا کہ کسی کو مجھ سے اتنی ہمدردی ہو سکتی ہے... میں تو بہت بری عورت ہوں... اور پھر میں نے زندگی میں کبھی تمہارے لئے کچھ نہیں کیا" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "تم بہت بڑے آدمی بن گئے ہو نا؟ بہت دولت ہوگی تمہارے پاس؟"

"کچھ ایسی زیادہ نہیں' اور پھر دولت زیادہ ہونے سے آدمی بڑا تو نہیں بن جاتا" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"ہاں۔ لیکن خوشی تو ہوتی ہے" اس نے سر ہلایا۔ پھر جیسے یکدم اسے یاد آیا کہ اس نے سب سے ضروری بات تو پوچھی ہی نہیں۔ قدرے بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی "لیکن اس وقت تم کس مشکل میں گرفتار ہو؟ تمہارا حال اتنا خراب کیوں ہو رہا ہے؟ کیا مصیبت آن پڑی ہے تم پر؟"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا 'مصیبت' خود ہی دروازے پر آن کھڑی ہوئی۔

میں شاید باتوں میں کچھ زیادہ ہی محو ہو گیا تھا جو میری چھٹی حس بھی مجھے خطرے سے خبردار نہیں کر سکی تھی۔ میں نے دروازے کی زنجیر بھی نہیں چڑھائی تھی اور خود کو کچھ زیادہ ہی محفوظ مقام پر محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ دروازہ اتنی زوردار آواز کے ساتھ کھلا کہ ایک ثانیے کے لئے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ زمیں بوس ہو گیا ہے۔

دروازے پر ایک وحشت زدہ سا دراز قد نوجوان کھڑا تھا۔ جس کے بال جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ گھنی داڑھی بھی منتشر سی تھی اور اس میں تنکے پھنسے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں مشین پسٹل تھا جس کا رخ میری طرف تھا۔ یہ نوجوان انہی لوگوں میں سے ایک تھا جو مجھے پکڑنے میں ایک بار کامیاب ہو چکے تھے لیکن میں ان کے جال سے نکل بھاگا تھا۔

"آؤ... آؤ.. باہر آجاؤ میری جان!" وہ دانت قدرے بھینچ کر گھٹے گھٹے مگر زہریلے لہجے میں بولا "زیادہ چالاکی دکھانے کی کوشش مت کرنا ورنہ تڑپنے کی مہلت بھی نہیں ملے گی۔"

میں نے مسکرا کر تاجاں کی طرف دیکھا اور مجبوری کے اظہار میں کندھے اچکا دئے۔ وہ بے چاری پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی میری طرف اور کبھی اس نوجوان کے ہاتھوں میں دبے ہوئے مشینی پسٹل کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں آہستگی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ اسی رفتار سے نوجوان نے پیچھے کھسکنا شروع کر دیا۔ وہ پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ تاجاں کی طرف اس نے ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی۔

میں دروازے سے باہر آیا تو وہ مجھ سے چھ سات قدم کے فاصلے پر جا چکا تھا۔ باہر اب بھی دھندلا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ تاہم مجھے اتنا اندازہ ہو گیا کہ جھونپڑی تک وہ اکیلا ہی پہنچا تھا۔ باقی لوگ شاید ادھر ادھر میری تلاش میں بکھرے ہوئے تھے۔

وہ غالباً فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ تنہا مجھے پسٹل کی زد پر رکھے ہوئے اگلا قدم کیا اٹھائے۔ ویسے بھی اس پر وحشت سی سوار تھی... شاید میرے تعاقب' سفر اور رات بھر کی ہنگامہ آرائی نے اس کے اعصاب جھنجھوڑ دئے تھے۔ نہ جانے یہ اس کی ضرورت تھی یا حماقت کہ اس نے اپنے باقی ساتھیوں کو اپنی کامیابی سے مطلع کرنے کے لئے ہوائی فائر کرنے کی غرض سے پسٹل کا رخ ذرا سا بدلا۔ میرے لئے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔

عین اس وقت جب کہ اس نے ہوائی فائر کیا' میں اس کے دوسرے ممکنہ فائر سے بچتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے اس پر جھپٹ چکا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پر کراٹے کا وار کیا۔ معلوم نہیں اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹی یا نہیں بہرحال مشین پسٹل اس کے ہاتھ سے دور جا گرا اور اس کا بازو بے جان سے انداز میں اتنی تیزی سے گھوما کہ اس کے ساتھ ہی وہ خود بھی تھوڑا سا گھوم گیا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر ایک بھرپور گھونسا رسید کیا' وہ اوندھے منہ دور جا گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔

اس دوران کہیں قریب ہی کوئی ٹامی گن تڑتڑانے لگی۔

میں ایک بار پھر اندھا دھند بھاگا۔ ایک ثانیے کے لئے مجھے تاجاں کا بھی خیال آیا لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ میں دوڑتا چلا گیا۔ فائر اب بھی کئی سمتوں سے ہو رہے تھے۔ وہ لوگ غالباً صرف مجھے خوف زدہ کرنے کے لئے نفسیاتی حربے کے طور پر فائرنگ کر رہے تھے۔ ان کا کوئی ہدف نہیں تھا اور اس بات کا مجھے کافی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ وہ مجھے ہلاک کرنا نہیں چاہتے تھے۔

مجھے اب سمت کا اندازہ نہیں رہا تھا۔ بس میں کسی طرح فائرنگ کرنے والوں سے دور نکل جانا چاہتا تھا لیکن آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں سے بھی ایک دو آدمی ضرور اسی سمت میں بڑھ رہے تھے جدھر میں جا رہا تھا۔

کافی دور نکل آنے کے بعد مجھے سامنے ایک بہت بڑے حویلی نما مکان کا ہیولا نظر آیا۔ میں اس کے قریب جا پہنچا کہ شاید وہاں کوئی جائے پناہ میسر آسکے۔ لیکن جب میں اس حویلی کے قریب پہنچا تو ملگجے اندھیرے میں بھی وہ مجھے کچھ جانی پہچانی سی نظر آئی اور دوسرے ہی لمحے میرے اعصاب کو جھٹکا سا لگا۔

یہ تو ملک اسلم زماں کی حویلی تھی۔ اس حویلی کی اسی بلند و بالا دیوار تلے کھڑے ہو کر میں نے برسوں پہلے عہد کیا تھا کہ میں ملک اسلم زماں سے اپنے باپ کے قتل کا بدلہ ضرور لوں گا۔ اس وقت میں ایک کمزور' حقیر اور بے حیثیت لڑکا تھا۔ بے شک میں نے اپنا عہد پورا کر لیا تھا۔ ملک اسلم زماں سے میں نے انتقام لے لیا تھا لیکن اس صورت حال کو نہ جانے کیا نام دیا جا سکتا تھا کہ آج میں اسی اسلم ملک کے بیٹے قیصر ملک کے آدمیوں سے بچنے کے لئے دوڑتا ہوا اسی حویلی کے سایۂ دیوار میں آن پہنچا تھا۔ وہ لوگ مجھے قابو میں کرنے کے بعد یقیناً یہیں لا رہے تھے لیکن میں قصبے کے قریب پہنچ کر ان کے چنگل سے نکل بھاگا تھا۔ مگر قسمت گویا مجھے کھینچ کر دوبارہ یہیں لا رہی تھی۔

ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ انتقام کوئی ایسی خاص اچھی چیز بھی نہیں ہے۔ شاید سلسلہ در سلسلہ چلتا ہے۔ میں نے ملک اسلم زماں کو انجام کو پہنچایا تھا۔ اس کا بیٹا اب مجھ سے انتقام لینے کے لئے اپنے تمام تر وسائل استعمال کر رہا تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ سلسلہ اب کہاں ختم ہوگا۔

میں حویلی کی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوا کہ میں تاریکی کا ہی ایک حصہ بن کر رہ گیا ـــــ کھلی جگہ میں تھا پھر بھی مجھ جیسی بصری صلاحیت رکھنے والا کوئی انسان تھوڑے بہت فاصلے سے میرا ہیولا دیکھ سکتا تھا۔

اب مجھ پر بھی تھکن غلبہ پانے لگی تھی۔ پیاس سے میرا برا حال تھا۔ دوڑ بھاگ سے ایک بار پھر سر میں اس جگہ دھمک سی ہونے لگی تھی جہاں ضرب لگی تھی۔ فائرنگ اب تھم چکی تھی۔

میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے اب کیا کرنا چاہئے۔ صرف دوڑتے رہنا مسئلے کا حل نہیں تھا۔ سچی بات یہ تھی کہ میرے حواس میں اب وہ تیزی و طراری نہیں رہی تھی جو ایک تازہ دم انسان کے حواس میں ہو سکتی ہے۔ اس عالم میں بھی گو کہ میں دو چار آدمیوں سے تو نمٹ ہی سکتا تھا لیکن اس وقت میرے تعاقب میں غول کا غول تھا اور وہ بھی جدید ہتھیاروں کے ساتھ۔

میں نے اپنی حالت کچھ درست کرنے کے لئے دو چار گہری گہری سانسیں لیں۔ دفعتاً مجھے یاد آیا کہ اس حویلی کے گرد مسلح محافظ گشت کیا کرتے تھے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اسی لمحے کوئی محافظ حویلی کے کونے سے نمودار ہوتا دکھائی دے جاتا۔ میں نے فوراً کونے کی طرف کھسکنا شروع کر دیا تاہم کمر دیوار سے ہی لگائے رکھی۔

کونے پر پہنچ کر میں نے نہایت محتاط انداز میں دوسری طرف جھانکا اور اسی لمحے اپنی سانسیں سینے میں ہی روک لیں محافظ والی بات مجھے بروقت ہی یاد آئی تھی۔ دوسری طرف سے واقعی ایک محافظ ٹہلنے کے سے انداز میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا۔ وہ بڑی بے پروائی سے سگریٹ کے کش لیتا ہوا آ رہا تھا اور اس کی توجہ اس کونے کی طرف نہیں تھی جدھر سے میں جھانک رہا تھا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی سیاہ یا شاید کسی اور گہرے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس کے کندھے پر کوئی گن لٹکی ہوئی تھی۔

میں نے سر پیچھے ہٹا لیا اور بے چینی سے اس کا انتظار کرنے لگا۔ جیسے ہی وہ دیوار کی اوٹ سے برآمد ہوا' میں نے پوری قوت مجتمع کرتے ہوئے اس کے نرخرے پر چاپ رسید کی۔ وہ اوغ کی ہلکی سی آواز کے ساتھ اچھل کر الٹا گرنے لگا' مگر آدمی جاندار تھا' سنبھل گیا۔ لیکن اس وقت تک میں جھپٹ کر اس کی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں لے چکا تھا۔ وہ کوئی آواز نہ نکال پایا اور دوسرے ہی لمحے اس کی گردن چٹ سے ٹوٹ کر رہ گئی۔

اس کی گن زمین پر میرے سامنے پڑی تھی۔ وہ بہت شاندار اسٹین گن معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اس کے بے جان جسم کو دیوار کی طرف دھکیلا اور گن اٹھانے کے لئے جھکا۔ مگر میں شاید اس مختصر سی کارروائی میں الجھ کر گرد و پیش کی خبر نہیں رکھ سکا تھا' حواس میں وہ مخصوص مستعدی نہیں رہی تھی اس لئے بروقت خبردار نہیں ہو سکا۔ یا پھر شاید کوئی ہتھیار حاصل کرنا آج میری قسمت میں ہی نہیں لکھا تھا۔

اسٹین گن کی طرف جھکتے ہی مجھ پر گویا آسمان ٹوٹ پڑا۔

اس بار کسی چیز سے وار نہیں کیا گیا تھا بلکہ تین چار یا شاید اس سے بھی زیادہ آدمی مجھ پر پل پڑے تھے۔ ایک نے یکدم ایک موٹے اور کھردرے کپڑے کا تھیلا یا شاید بوری میرے چہرے پر ڈال دی جو میرے کندھوں سے بھی کچھ نیچے تک چلی گئی تھی۔ باقیوں نے ناقابلِ یقین پھرتی سے مجھے رسیوں میں جکڑ دیا تھا۔ ایک لمحے کے اندر اندر میں اندھیرے اور بے بسی کی دنیا میں منتقل ہو گیا تھا۔ میرے بازو میرے پہلو سے چپک کر رہ گئے تھے۔ ٹانگیں ایک دوسرے سے جڑ گئی تھیں۔ کندھوں سے لے کر ٹخنوں تک انہوں نے اس پھرتی سے رسّی لپیٹی تھی جیسے کسی مشین نے تکلے پر سوت لپیٹا ہو۔ وہ لوگ بلاشبہ اپنے کاموں میں ماہر تھے۔ ... مجھ جیسے آہوئے وحشی کو قابو میں کرنا عام سے لوگوں کے بس کی بات نہیں تھی۔

انہوں نے بے جان شہتیر کی طرح مجھے اٹھا لیا اور نہ جانے کس طرف لے چلے۔ بہرحال سفر زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ کچھ دور چلنے اور کئی بار ادھر اُدھر مڑنے کے بعد آخرکار انہوں نے مجھے میرے پیروں پر کھڑا کر دیا۔ مجھے وہاں کئی آدمیوں کی موجودگی کا احساس ہوا۔ بڑبڑاہٹ کے سے انداز میں کچھ لوگوں کی باتیں کرنے کی آواز بھی سنائی دی۔ جوں ہی میرے پاؤں زمین پر ٹکے' ایک بلند آہنگ قہقہہ بھی سنائی دیا۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ یہ قہقہہ بلاشبہ قیصر ملک نے لگایا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مجھے اسی کی حویلی میں پہنچایا گیا تھا۔

"بھئی واہ...!" میں نے قیصر ملک کی آواز سنی۔ لگتا تھا کہ وہ اس صورتِ حال سے بہت ہی محظوظ ہو رہا تھا۔ نہایت ہی مسرور لہجے میں وہ نہ جانے کس سے مخاطب ہوا۔ "تم لوگوں کی کارکردگی کا واقعی جواب نہیں۔ وہ نعرہ تو تمہارا ہونا چاہئے' باکمال لوگ۔ جواب سروس؛ جن لوگوں کے پاس نہ کوئی کمال ہے نہ کوئی سروس' انہوں نے اس قسم کے سلوگن اپنائے ہوئے ہیں۔"

اس کے جواب میں ایک کھردری اور سفاکانہ سی آواز سنائی دی "بھائی صاحب! ہم جس مال کا وعدہ کرتا ہے اس کی ڈلیوری ضرور دیتا ہے۔ بہترین دام' بہترین کام۔"

"اس کا دیدار تو کراؤ۔ میں اس حالت میں اس کی شکل دیکھنا چاہتا ہوں۔" قیصر ملک کی آواز سنائی دی۔ کسی نے میرے سر پر چڑھے ہوئے تھیلے سے زور آزمائی شروع کر دی مگر اس کا کچھ حصہ رسیّوں میں ہی لپٹ گیا تھا اس لئے وہ اتر نہ سکا۔

"اسے کھول دو۔ یہ ہمارے ٹھکانے پر آ گیا ہے' اب کہیں نہیں جا سکتا۔ بس اس کے پاؤں بندھے رہنے دینا۔ دولتیاں مارنے والے گدھوں کی ٹانگیں باندھ کر ہی رکھی جاتی ہیں۔" قیصر ملک صورتِ حال سے زیادہ سے زیادہ محظوظ ہونے اور طنز کے زیادہ سے زیادہ تیر برسانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ظاہر ہے اس وقت وہ اس پوزیشن میں تھا۔ کون اس کی زبان روک سکتا تھا؟

میرے جسم سے تقریباً ساری رسّی کھول دی گئی تب میرا دورانِ خون بحال ہوا ورنہ یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے شکنجے میں جکڑ دیا گیا ہے۔ ہاتھ آزاد ہو جانے کے بعد بھی میں ساکت کھڑا رہا۔ میں نے اپنے چہرے پر چڑھا ہوا وہ گندا سا تھیلا اتارنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے ٹخنوں پر رسّی کا حلقہ رہنے دیا گیا تھا اور وہاں مضبوط گرہیں لگا دی گئی تھیں۔ باقی رسّی بھی پاس ہی لچھے کی شکل میں پڑی تھی۔ پھر یکدم کسی نے وہ بوری نما تھیلا میرے سر سے کھینچ لیا۔

قیصر ملک مجھ سے کافی فاصلے پر لیکن عین میری سیدھ میں بیٹھا تھا۔ تاریخ کے بہت پرانے ادوار کے بارے میں ہم صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں کہ فلاں زمانے کے بادشاہوں کے طور طریقے کیا تھے اور ان کے اٹھنے بیٹھنے کا انداز کیا تھا۔ فلموں کے ہدایت کار بھی چشم تصور ہی کی مدد سے یا کبھی کبھار محققین کے تعاون سے فلموں میں پرانے زمانے کے بادشاہوں کی نشست و برخاست دکھاتے ہیں۔ میری چشم تصور بھی مجھے بتا رہی تھی کہ سکندرِ اعظم شاید اسی انداز میں اپنے تخت پر براجمان ہوتا ہو گا جس طرح اس وقت قیصر ملک میرے سامنے بیٹھا تھا۔

وہ اس وقت ایک اونچی اور خاصی بڑی مخملی کرسی پر براجمان تھا جس کے پائے موٹے اور رنگین تھے۔ قیصر اس پر کچھ زیادہ ہی پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ جسم جتنا پھیلا ہوا تھا' آنکھیں اتنی ہی سکڑی ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر بڑی طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

میں نے کوشش کی کہ میرے چہرے سے کسی بھی تاثر کا اظہار نہ ہونے پائے۔ بے پروائی کے اظہار کے لئے میں اپنے کپڑے جھاڑنے لگا حالانکہ اب وہ جھاڑنے کے نہیں بلکہ پھاڑنے کے قابل رہ گئے تھے۔ زیادہ توجہ سے ادھر اُدھر دیکھے بغیر بھی میں اردگرد کا جائزہ لے چکا تھا۔ میں ایک طویل و عریض برآمدے میں کھڑا تھا۔ یہ غالباً ملک کی پرانی طرز کی حویلی کا ہی عقبی حصہ تھا۔ سامنے لان کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ اس سے آگے روشنی نہیں جا رہی تھی لیکن ادھر غالباً عقبی دیوار تھی۔

آس پاس بہت سے آدمی موجود تھے اور تقریباً سبھی مسلح تھے۔

ان میں سے دس بارہ تو وہی مختلف حلیوں کے لوگ تھے جنہیں میں اپنی فرار کی جدوجہد کے دوران دیکھ چکا تھا۔ یہ لوگ حویلی کے ماحول سے متعلق نہیں لگتے تھے۔ کہیں اور ہی کی مخلوق لگتے تھے۔ ان کے حلیے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے لیکن پھر بھی ان میں کوئی نادیدہ سی قدر مشترک تھی جو ظاہر کرتی تھی کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھی ہیں۔ وہ تمام اسلحہ ان کے پاس اب بھی موجود تھا جس کی جھلک میں پہلے بھی اس ویرانے میں دیکھ چکا تھا جہاں انہوں نے مجھے جال کے ذریعے قابو میں کر لیا تھا۔ وہ اب بھی اسی انداز میں اپنی اپنی گنیں وغیرہ سنبھالے کھڑے تھے جیسے ایک فرد کا نہیں' ایک شہر کا محاصرہ کئے کھڑے ہوں۔ ان سب کے چہرے اب بھی ہر تاثر سے عاری تھے لیکن تقریباً پوری رات کی بھاگ دوڑ کے باعث تھکن اور درماندگی ان کے چہروں سے ضرور عیاں تھی۔ حالانکہ حالات یہی بتاتے تھے کہ ان کی راتیں اسی انداز میں گزرتی ہوں گی۔ انہیں تو اس کا عادی ہونا چاہئے تھا۔

چمڑے کی جیکٹ اور شکاریوں والی خاکی پینٹ میں ملبوس وہ دراز قد نوجوان جو بھان متی کے اس کنبے کا سربراہ معلوم ہوتا تھا' ایک طرف کھڑا پہلے ہی کی طرح فلمی انداز میں اپنے مشین پسٹل کو انگلیوں پر گھما رہا تھا۔

"اوہو۔ کپڑے جھاڑے جا رہے ہیں" قیصر ملک طنزیہ لہجے میں بولا "گویا یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہیں اس صورتِ حال کی کوئی پروا نہیں۔ خیر... یہ بے نیازی تو ابھی دھری رہ جائے گی۔ ذرا نظر تو اٹھاؤ' یہ شرمیلی نازنینوں ماہ جبینوں کی طرح آنکھیں کیوں جھکائی ہوئی ہیں۔ ادھر ہماری طرف تو دیکھو۔ ہم اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں۔"

میں نے گہری سانس لے کر سر اٹھاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "تمہیں اگر کوئی گیا گزرا کہے تو میں اس سے لڑ پڑوں گا۔ لاکھوں میں نہیں تو کم از کم ہزاروں میں ایک تو ضرور ہو۔ یہ بتاؤ کہ اب تمہاری فرمائش کیا ہے؟ تمہارا مطلب ہے کہ میں اپنے آپ کو خوفزدہ ظاہر کروں؟ اچھا... یہ لو... خوفزدہ ہو جاتا ہوں۔" میں نے گھٹنوں کو ذرا سا خم دے کر ٹانگیں یوں ہلائیں جیسے میں تھر تھر کانپ رہا ہوں۔

"بس... اب تو خوش ہو نا؟ تھر تھر کانپ لیا میں" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

قیصر ملک کے چہرے سے طنزیہ مسکراہٹ یکدم غائب ہو گئی

اور ہونٹ سفاکانہ انداز میں کھنچ کر رہ گئے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا، مشین پسٹل والا نوجوان اس سے مخاطب ہوا "ملک صاحب! ویسے یہ بندہ ہے جی دار۔ زبان بھی خوب چلتی ہے اور ہاتھ پاؤں بھی۔ ہم نے آج تک پچاسوں مشکل مشکل کام کئے ہیں لیکن اس اکیلے بدبخت کو قابو میں کرتے ہوئے ہمارا بڑا نقصان ہوا۔ بڑی محنت کرنی پڑی۔ دو آدمی بھی کام آگئے۔ اس سے تو اچھا تھا کہ آپ ہم سے کوئی آدم خور شیر پکڑ کرلانے کا کنٹریکٹ کرلیتے۔"

'اچھا.... تو یہ کنٹریکٹ تھا' میں نے دل ہی دل میں سوچا' ملک کافی ترقی کرتا جارہا تھا۔ اب قتل' اغوا وغیرہ جیسے معاملات کے لئے کنٹریکٹرز کی باقاعدہ مضبوط تنظیمیں بننے لگی تھیں۔

"بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا تم لوگوں کی عادت ہوتی ہے تاکہ معاوضے میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرایا جاسکے" قیصر ملک قدرے بدمزگی سے بولا "بعض مصلحتوں کی وجہ سے میں یہ کام اپنے آدمیوں سے کرانا نہیں چاہتا تھا ورنہ یہ ان کے لئے کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا۔"

مشین پسٹل والا نوجوان طنزیہ سے انداز میں مسکرادیا لیکن بولا کچھ نہیں۔ البتہ اس کے پاس کھڑا ہوا ایک ادھیڑ عمر شخص جو حلئے سے فلمی قسم کا ڈاکو معلوم ہوتا تھا' اپنی جھاڑ جھنکاڑ داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے مضطرب لہجے میں نوجوان سے مخاطب ہوا "باس! رقم وصول کرو اور بوریا بستر گول کرو۔ کام ختم ہونے کے بعد زیادہ دیر رکنا اپنے اصول کے خلاف ہے۔"

مشین پسٹل والا نوجوان گویا اپنے ساتھی کی تائید کرتے ہوئے قیصر ملک سے مخاطب ہوا۔ "سنا تم نے.... کوڑل بادشاہ کیا کہہ رہا ہے؟ باقی رقم ہمارے حوالے کردو۔ ہم جائیں۔ اب تم جانو اور تمہارا کام۔"

"رقم تیار ہے" قیصر ملک نے قدرے ناگواری سے ہی جواب دیا۔ اس نے ان لوگوں سے کام ضرور لیا تھا لیکن شاید کسی نامعلوم وجہ کی بنا پر وہ ان سے زیادہ خوش نہیں تھا یا شاید اسے اب معاہدے کی باقی رقم دینا ناگوار گزر رہا تھا۔

وہاں موجود آدمیوں میں سے چند آدمی قیصر ملک کے معلوم ہوتے تھے۔ قیصر ملک نے ان میں سے ایک کو اشارہ کیا "خمیس خان کو رقم لادو۔"

جس شخص کو یہ حکم دیا گیا تھا وہ وہاں موجود لوگوں میں سب سے بڑی عمر کا تھا۔ اس کی موٹی موٹی اور اوپر کو اٹھی ہوئی بارعب مونچھوں میں بہت کم بال سیاہ تھے۔ ناک پر موٹے فریم کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ سر پر کلف لگی ہوئی اونچے طرّے والی پگڑی تھی۔ وہ اچکن اور شلوار میں تھا۔ وہ بجائے خود کوئی چھوٹا موٹا زمیندار نظر آتا تھا۔ غالباً وہ کوئی منیجر ٹائپ چیز تھا۔ اس کے ماتھے پر موٹی موٹی شکنیں تھیں۔ اس کی شکل دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ اس ساری صورتِ حال سے ذرا بھی خوش نہیں تھا۔ تاہم قیصر ملک کا حکم پاکر اس نے مؤدبانہ انداز میں سر ہلایا اور اس پُرہجوم سی جگہ میں لوگوں سے بچتا ہوا دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا کافی پیچھے چلا گیا جہاں دیوار میں ایک بھاری بھرکم اور آہنی سا دروازہ نظر آرہا تھا۔ تاب تھما کر اس نے دروازہ کھولا اور اس کے عقب میں غائب ہوگیا۔

چند لمحوں کے لئے ماحول پر گہرا سکوت طاری ہوگیا جیسے کوئی فلم چلتے چلتے رک گئی ہو اور پردے پر ایک ہی منظر ساکت ہوگیا ہو... قیصر ملک پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھے جارہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ خمار کے ڈورے تھے یا بے خوابی کے۔ اس کے ہونٹوں پر نہایت خفیف لیکن فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ دیکھ میری طرف رہا تھا لیکن اس کا ذہن شاید کہیں دور پہنچا ہوا تھا۔ آخر کار میں نے ہی سکوت توڑا کیونکہ مجھے یہ سکوت بہت ہی گراں گزرنے لگا تھا۔

"تم نے یہ اتنا زیادہ تردد کس لئے کیا برادرِ عزیز؟" میں نے نہایت میٹھے لہجے میں پوچھا۔

"ہم نے سوچا تمہارے اعزاز میں کوئی تقریب ہونی چاہئے... اتنے بڑے آدمی ہو تم۔ شہر میں اتنے چرچے ہیں تمہارے۔ تم جس محکمے میں فون کردو وہاں ہلچل سی مچ جاتی ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہم جیسے بڑے زمیندار ہی ملک کے طاقتور اور بااثر ترین لوگ ہیں لیکن اب ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ ہمیں تم جیسے 'پہنچے ہوئے بزرگوں' کی آشیرواد بھی حاصل کرتے رہنا چاہیے۔ بس صرف اسی لئے زحمت دی ہے حضور کو۔" کمبخت کا لہجہ حد سے زیادہ زہریلا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے اپنی کنپٹیوں میں سرسراہٹ محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ ان حالات میں ایک تو ویسے ہی کھوپڑی کو ٹھنڈا رکھنا ضروری تھا۔ ہر جنگ صرف اسلحے اور نفری کی جنگ نہیں' اعصاب کی جنگ بھی ہوتی ہے اور بعض اوقات وہ لوگ کمزور پوزیشن میں ہونے کے باوجود فائدہ اٹھا جاتے ہیں جو ہیجان خیزی اور اضطراب کا شکار نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ میں نے یہ سوچ کر بھی اپنے آپ کو تسلی دے لی کہ وہ دراصل اسی لئے اتنا پھنکار رہا تھا کہ اس کی دُم پر میرا پاؤں تھا۔ زندگی تو جب تک کی خدا نے لکھ دی تھی اس سے کم یا زیادہ نہیں ہوسکتی تھی لیکن سردست تو مجھے اس بات سے محظوظ ہونے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔

اس دوران پگڑی والا معمر شخص ایک خاصا موٹا سا بریف کیس اٹھائے لوٹ آیا۔ بریف کیس میں یقیناً کوئی چھوٹی موٹی رقم نہیں تھی۔ اس نے بریف کیس مشین پسٹل والے نوجوان کو تھما دیا۔ نوجوان نے ایک ہاتھ سے بریف کیس تھامتے ہوئے صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں میں وہی مخصوص چمک آگئی جو دولت سے پیار کرنے والوں کی آنکھوں میں دولت

دیکھ کر آتی ہے۔ تاہم وہ تھا صحیح پیشہ ور۔ اس کی نظر مجھ پر سے نہیں ہٹی اور مشین پسٹل بھی گو کہ بار بار اس کی انگلی پر گھومتا رہا لیکن انداز ایسا ہی تھا کہ کسی بھی لمحے وہ اس کی گردش روک کر مجھ پر فائر کرسکتا تھا۔ اس کا انداز قدرے فلمی سہی اور وہ کچھ شیخی خورا بھی نظر آتا تھا لیکن گن کے استعمال میں وہ بلاشبہ ماہر نظر آتا تھا۔ اس معاملے میں میں اس کی طرف سے کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھا۔

"رقم گننا چاہو تو ادھر آرام سے بیٹھ کر گن لو۔" قیصر ملک نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔

"کوئی انتہائی احمق انسان ہی ہمیں وعدے سے کم رقم دینے کی حماقت کرسکتا ہے اور تمہیں ہم احمق انسانوں میں ہرگز شمار نہیں کرتے" خمیس خان مسکرایا پھر اس نے تنقیدی سی نظر سے گردوپیش کا جائزہ لیا اور سنجیدگی سے بولا "اب ہم جائیں؟ ہماری ضرورت تو نہیں؟"

"نہیں۔ تم اب جاسکتے ہو۔ میں نے کہا نا کہ ضرورت تو تمہاری پہلے بھی اتنی شدید نہیں تھی لیکن کچھ مصلحتیں تھیں۔" قیصر ملک نے ایک بار پھر جتایا۔ وہ یقیناً بڑی شدت سے چاہتا تھا کہ ایسے معاملات میں اسے ضرورت مند نہیں بلکہ 'خود کفیل' سمجھا جائے۔

"خیر..." خمیس خان ایک بار پھر طنزیہ سے انداز میں مسکرایا "آئندہ بھی کبھی مصلحتیں تنگ کریں تو ہم کو یاد رکھنا۔ ہمارے وسائل تو تم نے دیکھ ہی لئے۔ شہر ہو یا گاؤں' جنگل ہوں یا پہاڑ' ہماری رسائی سب جگہ اور بڑی ٹھیک ٹھاک ہے۔"

قیصر ملک کچھ نہ بولا۔ خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سن لیا شہری پرندے؟ شہر میں تمہاری بڑی اونچی اڑانیں ہیں لیکن تمہارے علاقے ہی میں تمہارے پر کترنے کے کیسے کیسے دعویدار پڑے ہیں۔"

"دنیا اسی کا نام ہے" میں نے نہایت مسکینی سے تسلیم کیا۔ "ہر جگہ سیر کا سوا سیر تو موجود ہی ہوتا ہے۔ بہرحال اس واقعے سے میں نے کافی سبق حاصل کیا ہے۔"

"لیکن یہ سبق صرف اسی صورت میں تمہارے کام آئے گا کہ تم اپنے لئے زندگی کا راستہ منتخب کرو۔" قیصر ملک نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' خمیس خان نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ تقریباً دس بارہ آدمی اسی دروازے کی طرف چل دیئے جدھر کچھ دیر پہلے قیصر ملک کا منیجر گیا تھا۔ منیجر بھی ان کے ساتھ ساتھ جارہا تھا۔ وہ سب لوگ ایک ایک کرکے دروازے کے عقب میں غائب ہوگئے۔ ہال نما وہ طویل و عریض برآمدہ جیسے خالی خالی سا ہوگیا لیکن چھ آدمی اب بھی میرے ارد گرد موجود تھے۔ ان میں سے کسی کے پاس رائفل تھی' کسی کے پاس اسٹین گن۔ یہ یقیناً قیصر ملک کے اپنے آدمی تھی۔

"یہ دیکھ کر معلومات میں بڑا اضافہ ہوا کہ ہمارے ملک میں بھی اب معاوضے پر قتل و غارت اور اغوا کرنے والی تنظیمیں بننے لگی ہیں" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"یہ کوئی آج نہیں بننے لگیں" قیصر ملک نے طنزیہ سے لہجے میں گویا میری معلومات میں مزید اضافہ کیا "چھوٹی موٹی ٹولیاں یا انفرادی طور پر کام کرنے والے ہر دور میں موجود رہے ہیں۔ اب وہ ذرا زیادہ مضبوط اور منظم ہوگئے ہیں۔ زمانے کی رفتار کے ساتھ ان میں بھی جدّت طرازیاں آگئی ہیں۔ انہیں عقل آگئی ہے اور اب ان میں ہر قبیل کے لوگ شامل ہیں۔ حتیٰ کہ انتہا پسند قسم کے طالب علم بھی' جنہیں خاطر خواہ طور پر اپنے جوش و خروش کے اخراج کے راستے نہیں ملتے یا پھر وہ جنہیں ان کی ناپسندیدہ سرگرمیوں کی وجہ سے تعلیمی اداروں سے نکال دیا جاتا ہے۔ وہ بھی انتہا پسندی کا راستہ اختیار کرلیتے ہیں۔ ایسے گروہوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے لیکن ان کے رابطے صرف خاص خاص لوگوں سے ہی ہوتے ہیں۔ ہم جیسے لوگوں سے" اس کے لہجے میں فخر جھلک آیا "بعض سیاسی جماعتیں بھی انہیں اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ کبھی یہ خود بھاری تاوان وصول کرنے کے لئے کسی بھی شخصیت کو اغوا کرلیتے ہیں اور کبھی بھاری معاوضہ لے کر آرڈر پر بھی اس قسم کے کام کردیتے ہیں"

قیصر ملک یہ سب کچھ بڑے خوشگوار انداز میں مجھے بتا رہا تھا جیسے کچھ دیر کے لئے وہ بھول گیا ہو کہ ہم کن حالات میں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے گمان گزرا کہ کوئی نوجوان معلم مجھے حالاتِ حاضرہ پر لیکچر دے رہا ہے۔

جن گروہوں کی وہ بات کررہا تھا ان کے بارے میں میں نے اڑتی اڑتی سی باتیں سنی تھیں لیکن کبھی انہیں اہمیت نہیں دی تھی اور نہ ہی یہ اندازہ ہوا تھا کہ وہ اس قدر منظم اور بے خوف ہوتے ہوں گے۔ آج ان سے واسطہ بھی پڑگیا تھا اور ان کی دسترس کا بھی اندازہ ہوگیا تھا تاہم اب بھی اس قسم کے لوگ ہمارے لئے کوئی زیادہ بڑا مسئلہ نہیں تھے۔ میں تو صرف بے پروائی اور ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کے باعث مارا گیا تھا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ قیصر ملک اتنے اطمینان سے مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا رہا تھا؟ یقیناً اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال موجود تھا کہ مجھے اب یہاں سے واپس تو جانا نہیں ہے جو میں ان معلومات سے کوئی استفادہ کرلوں گا یا کسی اور تک یہ باتیں پہنچا سکوں گا۔

میں نے غیر محسوس طور پر اردگرد کا جائزہ لیا۔ قیصر ملک کے آدمی مستعدی سے مجھے ہتھیاروں کی زد پر لئے کھڑے تھے۔ اس دوران قیصر ملک کا وہ منیجر ٹائپ آدمی بھی لوٹ آیا۔ وہاں موجود لوگوں میں میرے علاوہ غالباً وہ واحد آدمی تھا جس کے پاس کوئی

ہتھیار نہیں تھا۔ قیصر ملک کے پاس بھی کم از کم ایک ریوالور ضرور موجود تھا جس کا دستہ اس کی واسکٹ سے جھانک رہا تھا۔

"کیا مجھے دن چڑھے تک اسی طرح اپنے دربار میں کھڑے رکھنا ہے؟" میں نے بیزاری سے کہا "اگر مجھے ہلاک ہی کرنا ہے تو کر چکو۔ جس شخص کو تم ہلاک کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو اور وہ تمہارے قابو میں بھی ہے اس کے لئے اتنا وقت ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"کس نے کہا کہ میں تمہاری جان لینا چاہتا ہوں؟" اس نے معصومیت سے آنکھیں پھیلائیں "مجھے کیا فائدہ ہوگا تمہاری جان لے کر؟"

"تو پھر کیا واقعی تم نے میرے اعزاز میں جشن برپا کرنے کے لئے بے ہزار وقت مجھے اغوا۔ کرایا ہے؟" میں نے مسکراتے ہو پوچھا۔

"نہیں۔ وہ تو میں مذاق کر رہا تھا" وہ سنجیدگی سے بولا "تم سے کام صرف وہی ہے جو میں ایک مرتبہ تمہیں پہلے بھی بتا چکا ہوں۔ اباجی زندہ ہیں یا ...... یا مُردہ تم مجھے ان کا پتا دے دو.... اور بس۔ اس کے بعد تم جا سکتے ہو۔"

مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ کیا وہ مجھے اتنا ہی معصوم سمجھ رہا تھا کہ میں اس کی بات پہ یقین کر لیتا کہ اپنے زندہ یا مُردہ باپ کا پتا پانے کے بعد وہ واقعی مجھے جانے دے گا۔

"اس کے جواب میں تمہیں شہر میں ہی دے چکا ہوں" میں نے سنجیدگی سے کہا "تمہارا کیا خیال تھا کہ اس طرح اغوا کر کے یہاں لائے جانے کے بعد میرے جواب میں کوئی تبدیلی آجائے گی؟"

"ہاں۔" اس نے بلا تامل کہا "ہمارے علاقے میں آنے کے بعد۔ اور خاص طور پر ہمارے قابو میں آنے کے بعد لوگ عموماً اپنے بیانات پر نظرِ ثانی کر لیتے ہیں۔ ہمارے پاس اب اتنا وقت بھی نہیں کہ تمہیں غور و خوض کے لئے مہلت دے سکیں۔ میرا صبر و ضبط اور تابِ انتظار پہلے ہی جواب دے چکی ہے۔ تمہیں ابھی اور اسی وقت فیصلہ کرنا ہوگا۔ اگر تم اباجی کو ہلاک کروا چکے ہو تب بھی میں تمہیں معاف کر دوں گا۔ صرف ان کی لاش کا بتا دو کہ وہ کہاں ہے۔"

"اب تو مجھے حسرت سی محسوس ہونے لگی ہے کہ کاش یہ بات واقعی مجھے معلوم ہوتی۔ اگر تم مجھے خدمت کا موقع دو تو میں باہر کی کسی سراغرساں کمپنی کی خدمات حاصل کر کے تمہارے باپ کی لاش تلاش کروا دیتا ہوں۔"

"میرے پاس اب کوئی فضول بات سننے کا بھی وقت نہیں ہے۔ اگر تم مجھے اباجی کے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گے تو پھر مجبوراً مجھے تمہاری ہلاکت کی زحمت کرنی پڑے گی لیکن یہ مرحلہ اتنا آسان نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے اور بہت سے مرحلے آئیں گے جن کے دوران تم موت مانگو گے مگر وہ تمہیں نہیں ملے گی۔

یہاں ایک مقام پر تہ خانے میں ہمارا ذاتی قید خانہ ہے۔ اس کی پتھریلی کوٹھریاں درمیانے سائز کے صندوقوں سے بس ذرا ہی بڑی ہیں۔ ان میں عام جسامت کا آدمی نہ تو سیدھا کھڑا ہو سکتا ہے نہ سیدھا لیٹ سکتا ہے۔ ان کے فرش اور دیواروں میں سیلن اس قدر ہوتی ہے کہ رات کو شبنم کی طرح قطرے پھوٹتے ہیں۔ مختلف قسم کے حشرات الارض حتیٰ کہ کنکھجورے بھی خاصی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ہماری جیلوں کے چکر وارڈ بہت مشہور ہیں اور بڑے بڑے پھنے خاں مجرم چکر وارڈ کے نام سے کانپتے ہیں لیکن چکر وارڈ کے قیدی کو اگر ہمارے قید خانے میں لایا جائے تو وہ چکر وارڈ کو یاد کر کے اس سے محرومی پر آہیں بھرے گا۔"

میں خاموش کھڑا قیصر ملک کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ اسی ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس قید خانے میں تمہارے ساتھ جو کچھ ہوگا وہ مطلق العنان رومن بادشاہوں کے زمانے کی کوئی بھیانک، لرزہ خیز اور ناقابلِ یقین کہانی معلوم ہوگی۔ تم جاندار اور مضبوط قوتِ ارادی کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ ان مراحل سے گزر کر بھی اگر تم نے زبان نہ کھولی تو پھر ہمارے پاس ایک آدمی ہے جو استرے سے زندہ آدمی کی صحیح سالم کھال اس صفائی سے اتارتا ہے کہ چہرے کے ایک نقش تک میں فرق نہیں آتا۔ اس کے بعد ہم اس پر ایک خاص کیمیکل کا اسپرے کرتے ہیں اور اسے کھولتے ہوئے تیل کے ایک بہت بڑے کڑھاؤ میں ڈال دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے بعض دُکانوں پر مچھلی تلی جاتی ہے۔ کئی گھنٹے تیل میں پک کر وہ انسان سیاہ کوئلے کا سا پُتلا بن جاتا ہے لیکن اس عالم میں بھی تھوڑی سی کوشش سے اس کی شکل پہچانی جا سکتی ہے۔ جس کیمیکل کا ہم اس پر اسپرے کرتے ہیں وہ اسے زیادہ چُرمُر ہونے نہیں دیتا۔ کوئلے جیسے اس سیاہ پُتلے کو ہم تہ خانے میں ایک الماری میں محفوظ کر لیتے ہیں۔ وہ کبھی خراب نہیں ہوتا۔ یہ دشمنی کی ایک یادگار ہوتی ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا اور سفاکانہ انداز میں مسکرایا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا اس کے تصور سے یقیناً بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ میں ساکت کھڑا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "دریائے ایمزن کے کنارے آباد بعض افریقی قبائل کے بارے میں تم نے پڑھا ہوگا اور شاید کچھ فلموں میں دیکھا بھی ہو کہ وہ دشمن کی کھوپڑی کو سکیڑ لیتے ہیں اور ایسی کئی کھوپڑیاں جمع ہو جائیں تو ان کا ہار بنا کر گلے میں ڈالے رکھتے ہیں۔ وہ بھی دراصل کھوپڑی نہیں ہوتی' یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا۔ درحقیقت گردن تک انسان کے چہرے اور سر کی کھال بالوں سمیت نہایت حفاظت سے اتار لی جاتی ہے اور اسے کسی محلول میں پکایا جاتا ہے تو وہ سکڑ جاتی ہے تاہم اس کے نقوش اسی طرح محفوظ رہتے ہیں۔ وہ گویا مقتول کے چہرے کا ایک چھوٹا سا خول ہوتا ہے' دشمنی کی ایک یادگار ہوتی ہے۔ اسی روایت سے متاثر ہو کر اباجی نے بھی دشمنی کی یادگاریں محفوظ کرنے کا طریقہ سوچا تھا لیکن یہ طریقہ بہت ہی خاص الخاص دشمنوں کے لئے تھا۔ عام سے اور گاجر مولی کی طرح کاٹ کر پھینک دیئے جانے والے دشمن تو بہت ہوتے ہیں نا۔ ان کا تو حساب کتاب نہیں رکھا جاتا۔ ہمارے تہ خانے میں صرف چار سیاہ پُتلے موجود ہیں۔ پانچواں تمہارا ہوگا بشرطیکہ تم نے زبان نہ کھولی۔"

میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ محض مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے یہ سب کچھ "ہانک" نہیں رہا تھا۔ تکبر کی حد تک خود اعتمادی میں مبتلا ہو کر وہ سچ بول رہا تھا اور اپنی دانست میں مجھے خوفزدہ کر رہا تھا جبکہ میرے لہو میں خوف سے نہیں بلکہ ایک خاموش غیظ و غضب کی وجہ سے چنگاریاں سی تیرنے لگی تھیں۔

جب بھی میں کسی بدفطرت اور شقی القلب انسان کی اپنی ہی زبانی اس کے "کارنامے" سنتا تھا تو میری یہی کیفیت ہوتی تھی۔ اس تصور سے میری کنپٹیوں میں آگ سی دہکنے لگتی تھی کہ اس طرح کے لوگ اپنے قابو میں آئے ہوئے انسانوں کو کس طرح سسکا سسکا کر مارتے تھے۔ انسان کی جان آسانی سے نہیں نکلتی اور اس انسان کی اذیت اور ذہنی حالت کا صحیح اندازہ کوئی بھی نہیں کر سکتا جسے دنیا والوں کی نظروں سے دور کسی عقوبت خانے میں اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جا رہا ہو اور وہ چیخ بھی نہ سکتا ہو اور اگر چیخ سکتا ہو تو کوئی اس کی اذیت بھری چیخیں سن کر مدد کے لئے نہ آ سکتا ہو۔

خدا کی اس بیکراں سلطنت میں ان گنت بے رحم لوگوں نے اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں بنا رکھی تھیں۔ جس کا جہاں تک زور اور اختیار چلتا تھا وہ وہاں تک ظلم و تشدد کرنے میں لگا ہوا تھا۔ ۔کہیں کوئی صرف اپنے آپ کو راہِ راست کا مسافر سمجھ کر اپنے سیاسی مخالفین پر بالواسطہ یا بلاواسطہ ظلم و تشدد کے پہاڑ توڑ رہا تھا' ۔کہیں کوئی مذہبی جنون میں مبتلا ہو کر اپنے سوا باقی سب کو لائقِ گردن زدنی قرار دے کر بنی نوع انسان کے لئے قہر کا پیامبر بنا ہوا تھا۔

کہیں کوئی کج فطرت زمیندار تھا' کہیں کوئی وڈیرا جس نے اپنی زمینوں کی حدود کو اپنی سلطنت سمجھا ہوا تھا' جہاں اس کی ذات میں چھپا ہوا درندہ مختلف طریقوں سے اپنی حیوانیت کا اظہار کرتا رہتا تھا۔ کہیں کوئی تھانے دار تھا جس کے نزدیک اس کا تھانہ ہی اس کی سلطنت تھا۔ اس سلطنت میں زیرِ تفتیش کوئی قیدی تشدد سہتے سہتے مر بھی جاتا تھا تو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اگر مقتول بہت خوش قسمت ہوتا تھا تو اخبار کے کسی کونے کھدرے میں چند سطروں کی مبہم سی خبر آجاتی تھی۔ پھر اسی تھانے میں اس کی گول مول رپٹ درج ہوتی تھی اور وہی لوگ اس کی "تفتیش" پر مامور ہوتے تھے جن کی "تفتیش" کی وجہ سے وہ بدنصیب سسکتے سسکتے مرا تھا۔ چنانچہ وہی 'قاتل وہی منصف' والا ڈراما دُہرائے جانے کے بعد آخرکار ایک دن فائل داخل دفتر ہو جاتی تھی اور تھانے دار صاحب کسی اور تھانے میں جا کر' کسی اور سلطنت کے فرمانروا ہو کر اپنے شوقِ تفتیش کی تکمیل کرنے لگتے تھے۔

اس طرح ہر گلی' ہر محلے' ہر گاؤں' ہر شہر میں ان گنت سلطنتیں بکھری ہوئی تھیں۔ حتیٰ کہ ایک موٹر مکینک کا گیرج بھی اس کی چھوٹی سی سلطنت تھی جہاں وہ چھوٹے چھوٹے معصوم شاگردوں کے ٹخنوں پر لوہے کا رنچ مار کر یا انہیں موٹی موٹی گالیاں دے کر اپنے اندر چھپے ہوئے بدفطرت حیوان کے لئے لاشعوری طور پر تسکین کا سامان کرتا تھا۔ ان سب سلطنتوں میں' ان سب فرمانرواؤں کے ہاتھوں صرف عام آدمی' غریب آدمی یا کمزور آدمی کی زندگی اجیرن تھی۔ ہر جگہ صرف عام آدمی اندیشوں میں گھرا ہوا تھا۔ عام آدمی ہونا گویا ایک جرم ہو کر رہ گیا تھا۔ ہر جگہ صرف طاقتور یا اہلِ اختیار دندناتا پھر رہا تھا۔ دنیا کی یہ شکل کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔ میں دنیا کو خوبصورت دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن افسوس یہی تھا کہ میں اپنی جگہ خاصا طاقتور ہوتے ہوئے بھی دنیا کے کسی ایک چھوٹے سے گوشے کی حالت بھی شاید نہیں بدل سکتا تھا۔ اور اس وقت تو ویسے ہی میں خود نہایت بے بسی کے عالم میں ایک چھوٹے سے فرعون کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔

لیکن اس عالم میں بھی مجھے اپنے انجام کی کچھ زیادہ پروا نہیں تھی۔ میرا تصور اب بھی ان نامعلوم' ان دیکھے اور انجانے لوگوں کے انجام میں بھٹک رہا تھا جو قیصر ملک اور اس کے باپ کے احکامات پر نہ جانے کیا کیا اذیتیں اٹھا کر اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ ان میں سے کچھ کا شاید کوئی قصور' کوئی جرم بھی رہا ہو لیکن انصاف اور سزا کے نظام کا کوئی پیمانہ' کوئی اصول' کوئی قابلِ فہم طریقہ' کوئی سند تو ہونی چاہئے۔

میں نے ایک ٹک قیصر ملک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "جو کچھ تم بتا رہے ہو اس کی روشنی میں تو اگر تمہارا باپ کسی کے ہاتھوں کسی برے انجام سے دوچار ہو چکا ہے تو یہ بہت ہی اچھا ہوا ہے۔ اب تک تو باپ کے بارے میں تمہاری تشویش اور پریشانی دیکھ کر مجھے کچھ کچھ تاسف ہو رہا تھا لیکن اب میں بہت خوش ہوں ...میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں بھی کسی ایسے ہی انجام سے دوچار کرے۔"

قیصر ملک نے خوش دلی سے بلند آہنگ قہقہہ لگایا "ابھی سے دل جلی بوڑھیوں کی طرح کوسنے دینے پر اتر آئے۔ ابھی تو تماشا شروع ہی نہیں ہوا۔"

"میں نے اپنے ناپسندیدہ ترین آدمیوں کی فہرست میں تمہارا

نام لکھ لیا ہے۔ زندگی نے مہلت دی تو میں تمہیں بتاؤں گا کہ میرے ناپسندیدہ ترین آدمیوں کا انجام کیا ہوتا ہے" میں نے اس کی بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔

"زندگی یقیناً تمہیں مہلت دے سکتی ہے" وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے اور اپنے لہجے میں اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "اور ہمیں ایک دوسرے کے انجام کے بارے میں بھی اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ آخر تم ابا جی کے بارے میں کچھ بتا کیوں نہیں دیتے؟؟"

اس بار میں نے جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

اس نے ایک لمحے خاموشی سے انتظار کیا پھر غالباً قطعی طور پر مایوس ہو کر وہ یکدم طیش میں آگیا۔ گرگٹ کی طرح یک لخت اس کی رنگت بدل گئی۔ چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا اور اس نے ہاتھ کو جھٹکا دیتے ہوئے پھٹی پھٹی سی آواز میں اپنے آدمیوں کو مخاطب کیا "بہت ہو چکی رعایت۔ اس کے ہاتھ بھی باندھ دو اور رائفلوں کے بٹ مار مار کر اسے گلے ہوئے خربوزے کی طرح پلپلا کر دو۔"

اس کے آدمی بھی ایسے معاملات میں کافی منجھے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک دم جوش میں آکر میری طرف نہیں بڑھا بلکہ دو آدمی نہایت محتاط انداز میں میری طرف بڑھے۔ باقی چار آدمیوں نے مختلف زاویوں سے مجھے نشانے پر لئے رکھا۔

اس کے باوجود میرا خیال تھا کہ وہ دونوں آدمی جب میرے ہاتھ باندھنے کے لئے میرے قریب پہنچیں گے تو میں کوئی آخری داؤ کھیلنے کی کوشش کروں گا کیونکہ فی الحال یہی غنیمت تھا کہ کم از کم میرے ہاتھ تو آزاد تھے۔ ہاتھ دوبارہ بندھ جانے کے بعد تو میرے بچاؤ کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ موت کی آہٹ تو سنائی دے ہی رہی تھی۔ بہتر یہی تھا کہ موت کو دردناک بنانے کے بجائے کچھ کر گزرنے کی کوشش کی جاتی۔

میں نے کوشش کی کہ چہرے سے پوری طرح مایوس و دل گرفتہ نظر آؤں لیکن درحقیقت میں پوری مستعدی سے منتظر تھا کہ وہ دونوں میرے بالکل قریب پہنچ جائیں۔ ان کے ہاتھ خالی تھے۔ انہوں نے اپنی گنیں مینجر کو تھما دی تھیں۔

وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر تھے کہ ایک زبردست دھماکا ہوا۔ حویلی میں جیسے کوئی بم پھٹ پڑا تھا۔ بلکہ یہ تشبیہ کی تو بات ہی نہیں تھی۔ حقیقتاً بم ہی پھٹا تھا۔ دھماکا اتنا شدید تھا کہ میری طرف بڑھنے والوں میں سے ایک اوندھے منہ گر پڑا۔ میرے دائیں ہاتھ پر کھڑے ہوئے ایک شخص کے ہاتھ سے رائفل چھوٹ کر گر پڑی۔ خود قیصر ملک بوکھلا کر کرسی سے تقریباً گر پڑا۔ جس دیوار کے قریب ہم کھڑے تھے اس میں دراڑ نمودار ہوتی نظر آئی۔ اس کے عقب میں، حویلی کی اصل عمارت میں ہی دھماکا ہوا تھا۔ دور فضا میں یکدم بارود اور مٹی کی بو پھیل گئی۔ چھتوں اور دیواروں کے زمیں بوس ہونے کی گڑگڑاہٹ سنائی دی تھی اور

اسی کے ساتھ گھٹی گھٹی سی انسانی چیخیں بھی سنائی دی تھیں۔

یہ سب کچھ گویا ایک ثانئے میں ہو گیا تھا اور اسی ایک ثانئے میں مَیں گویا سب کے ردِعمل کا جائزہ لینے میں ہی محو ہو کر رہ گیا تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ یہ تو قدرت نے مجھے موقع فراہم کیا تھا۔ سب لوگ حواس باختہ ہو چکے تھے، صرف ایک رائفل بردار کی رائفل میری طرف اٹھی رہ گئی تھی اور اس کی بھی غالباً سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔

وہ مجھ سے دو قدم کے فاصلے پر تھا۔ اسکول کے زمانے میں آپ نے شاید اس ریس میں حصہ لیا ہو جس میں دونوں ٹانگیں باندھ دی جاتی ہیں۔ بالکل اسی انداز میں مَیں نے جست لگا کر رائفل والے کے منہ پر پوری قوت سے گھونسا رسید کیا۔ وہ اس وقت تک بھی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ مجھ پر گولی چلائے یا نہیں، جس کا نتیجہ اسے بھگتنا پڑا۔ گھونسا کھا کر وہ ہوا میں اچھلا، رائفل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی اور وہ چاروں خانے چت لان پر جا کر گرا۔

اسی لمحے قیصر ملک شاید حواس میں آیا اور پھٹی پھٹی آواز میں چلایا "جانے نہ پائے۔۔۔" پھر اسے زور کی کھانسی آگئی۔ اس نے ریوالور نکال کر مجھ پر فائر بھی کیا لیکن شاید بدحواسی میں وہ اتنا آسان نشانہ بھی نہیں لے سکا۔ اس کے ساتھ ہی کڑاکا سا ہوا اور برآمدے کی بتیاں بھی بجھ گئیں۔ شاید تاریں بھی دھماکے سے ٹوٹ کر شارٹ ہو گئی تھیں۔

اس اندھیرے میں قیصر ملک دیوانوں کی طرح چیخنے لگا۔ وہ گندی گندی گالیاں دے رہا تھا۔ معلوم نہیں مجھے یا اپنے آدمیوں کو۔ فوری طور پر تو یہی محسوس ہوا تھا کہ گھپ اندھیرا چھا گیا ہے لیکن درحقیقت طویل و عریض لان پر تاروں کی نہایت مدھم روشنی موجود تھی اور میں کینگرو کی طرح اچھلتا ہوا عقبی دیوار کی طرف دوڑا چلا جا رہا تھا۔

شاید وہ لوگ اپنی تمام تر بدحواسی اور افراتفری کے باوجود مجھے پکڑ لیتے یا گولی کا نشانہ بنا دیتے لیکن اسی لمحے ایک اور ویسا ہی زوردار دھماکا ہوا۔ دونوں دھماکوں کے درمیان تین چار سیکنڈ کا ہی وقفہ رہا ہو گا۔ یہ دھماکا غالباً اس دیوار اور اس سے ملحقہ چیزوں کو بھی لے بیٹھا تھا۔ میں نے عقب میں ملبہ گرنے کی آواز سنی، اس کے ساتھ ہی کئی چیخیں بھی سنائی دیں۔ شاید وہ بلند و بالا چوبی دروازہ بھی ٹوٹ کر گر گیا تھا جس سے میں نے چند لمحے پہلے لوگوں کو آتے جاتے دیکھا تھا۔ فضا میں مٹی اور بارود کی بو پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی۔ مجھے بھی کھانسی آنے لگی مگر میں نے اسے دبا لیا اور سانس بھی روک لی۔

میں دیوار تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ ایک لمحے پہلے جہاں میں اور دوسرے کئی آدمی کھڑے تھے وہاں اب ملبے کا خاصا اونچا ڈھیر نظر آرہا تھا تاہم برآمدے کا کچھ حصہ اب بھی سلامت تھا اور اس کے عقب میں حویلی کی اصل عمارت کا بھی زیادہ تر حصہ محفوظ ہی تھا لیکن درمیان سے بوسیدہ میں ایک پوری پٹی سی منہدم ہو گئی تھی۔ کچھ ہیولے گرتے پڑتے ادھر ادھر بھاگتے دکھائی دئیے لیکن میری طرف کوئی نہیں آرہا تھا اس لئے میں نے حتی الامکان پھرتی سے رسی کی گرہ کھولی اور رسی کا وہ بڑا سا الجھا ہوا لچھا ایک طرف پھینکا جو ابھی تک میرے ساتھ گھسٹتا آرہا تھا۔

پاؤں آزاد ہوتے ہی میرے جسم میں بجلی سی بھر گئی۔ ساری تھکن اور درماندگی دور ہو گئی۔ دیوار پر ہاتھ جما کر میں نے جسم کو سکیڑتے ہوئے چیتے کی طرح زقند لگائی اور دوسرے ہی لمحے میں دیوار پھلانگ چکا تھا۔ بچپن میں اس حویلی کے گرد میں نے بہت چکر لگائے تھے۔ اس زمانے کی یادیں ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں نے اندازاً اس سمت کا انتخاب کیا جدھر میں گاؤں کے مکانوں وغیرہ کے قریب سے گزرے بغیر اس کی حدود سے نکل سکتا تھا۔

ملگجے اندھیرے میں کسی سرکش گھوڑے کی سی تیز رفتاری سے میں دوڑتا چلا گیا۔ اسی تیزی سے میرا دل بھی دھڑک رہا تھا۔ ...کئی بار میں نے مڑ کر دیکھا لیکن کوئی میرے تعاقب میں نہیں تھا۔ ...گویا میں واقعی موت کی گرفت سے نکلنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ تاہم صحیح طور پر محفوظ میں اپنے آپ کو تبھی محسوس کر سکتا تھا جب میں قیصر ملک کے علاقے سے نکل جاتا۔

جلد ہی میں درختوں کے اس جھنڈ تک پہنچ گیا جو میری سمتوں کی نشانیوں میں سے ایک تھا۔ یہ ایک طرح کا نہایت مختصر سا جنگل تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اب تک قیصر ملک یا اس کے باپ نے یہ مختصر سا جنگل کٹوا کر اس کی جگہ کچھ اور نہ بنا دیا ہو لیکن یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ جنگل اسی طرح موجود تھا۔

اب مجھے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ تاجاں کی جھونپڑی کس طرف ہو گی۔ جاتے جاتے میں یہ بھی دیکھتا ہوا جا سکتا تھا کہ وہ خیریت سے تھی یا نہیں اور میرے پکڑے جانے کے بعد اس پر کیا گزری تھی۔

جنگل میں داخل ہونے کے بعد میں تاروں کی برائے نام روشنی سے بھی محروم ہو گیا تاہم میری آنکھیں اب بھی کسی نہ کسی حد تک میرا ساتھ دے رہی تھیں اور دو قدم آگے بڑھتے ہی میں نے دیکھا کہ مجھ سے چند قدم آگے تاریکی میں ایک زیادہ تاریک انسانی ہیولا گرتا پڑتا درختوں کے درمیان دوڑا چلا جا رہا ہے۔ شاید وہ کسی اور سمت سے جنگل میں داخل ہوا تھا۔

مزید دو قدم آگے بڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ہیولا نسوانی تھا۔ ...اسے شاید علم نہیں تھا کہ میں اس کے پیچھے آرہا ہوں۔ بلکہ شاید اسے گرد و پیش کا قطعاً ہی کوئی ہوش نہیں تھا۔ وہ دوڑتے دوڑتے بے حال ہو چکی تھی۔ میں اس سے خاصا پیچھے ہونے کے باوجود دھونکنی کی طرح چلتی ہوئی اس کی سانس کی آواز سن رہا تھا۔

میں اس وقت اس سے صرف ایک قدم کے فاصلے پر تھا جب وہ غالباً بالکل ہی بے دم ہو کر لڑکھڑا کر گر پڑی۔ اس وقت تک میں نے اسے پہچان لیا تھا اور مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ ... پھر وہ کراہی اور اس کی کراہ سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ میں اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کر رہا تھا۔

وہ بلاشبہ تاجاں تھی!

لیکن وہ ناتواں، بیمار اور لبِ گور عورت یہاں قیصر ملک کی حویلی کے قرب و جوار میں کیا کر رہی تھی اور جتنا تیز میں نے اسے دوڑتے ہوئے دیکھا تھا اتنا تیز دوڑنے کی اس میں توانائی کہاں سے آگئی تھی؟

اسی لمحے شاید اسے میری موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے ہلکی سی ایک چیخ کے ساتھ ہڑبڑا کر اٹھنے کی کوشش کی۔

"گھبراؤ مت تاجاں! یہ میں ہوں" میں نے جلدی سے کہا۔

"اوہ۔۔۔ افضل۔۔۔" وہ ٹوٹتے لہجے میں صرف اتنا کہہ سکی اور بے جان سے انداز میں ناہموار زمین پر دوبارہ چت ہو گئی۔ میں نے گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس کا استخوانی سا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا اور اڑتے ہوئے پرندے کے پھڑپھڑاتے ہوئے پروں کی طرح اس کے دل کی دھڑکن اس کے ہر مسامِ جاں سے سنائی دے رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے گویا بمشکل تمام اپنی سانسوں کو قابو میں لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "افضل! تم بالکل ٹھیک ہو نا۔۔۔ بالکل ٹھیک۔۔۔؟"

"ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں تاجاں!" میں نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ اس کے کھردرے، خشک اور الجھے ہوئے بالوں میں تنکے پھنسے ہوئے تھے۔

"تم زخمی تو نہیں ہوئے نا۔۔۔ کوئی چوٹ تو نہیں آئی تمہیں؟"

...اسے جیسے اطمینان نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے لہجے میں، اس کے

اصرار میں اس قدر اپنائیت تھی' اس قدر تشویش تھی اور ایک بے عنوان سا تعلق خاطر تھا کہ میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔

"نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ذرا سی بھی چوٹ نہیں آئی مجھے" میں نے حلق میں پھیلتی ہوئی نمی کو نگلتے ہوئے کہا۔

"خدایا تیرا شکر ہے۔۔ میری محنت کام آئی" اس نے گہری سانس لی اور یکدم جیسے اسے قرار سا آگیا۔

"تمہاری محنت۔۔۔؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔ "تو کیا حویلی پر گرنیڈ تم نے پھینکے تھے؟"

"ہاں۔" اس نے طمانیت بھرے لہجے میں کہا۔

ایک لمحے کے لئے مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔ تاجاں جھوٹ بولنے والی عورت بھی نہیں تھی لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ایک راندۂ درگاہ' مفلوک الحال اور عرصے سے بیمار عورت کے پاس گرنیڈ کہاں سے آئے؟ اور ایسی عورت کے پاس گرنیڈز کا کیا کام؟

اس سے پہلے کہ یہ سوال میری زبان پر آتا' تاجاں ہانپتے ہوئے بولی "خدا کے لئے اب تم تو بھاگ جاؤ۔ مجھ میں تو اب ایک قدم بھی چلنے کی طاقت نہیں رہی"

"تمہارا کیا خیال ہے کہ میں تمہیں یوں جنگل میں بے یارومددگار پڑا چھوڑ جاؤں گا؟" میں نے حیرت سے کہا "میں تمہیں اپنی کمر پر لاد کر لے چلوں گا"

"کہاں تک؟" اس نے گویا بے یقینی سے پوچھا۔

"کسی بھی محفوظ جگہ تک" میں نے جواب دیا۔

"میرے لئے تو میری جھونپڑی ہی محفوظ ترین جگہ ہے۔ اس جھونپڑی اور اپنے رہن سہن کی وجہ سے میں کئی ناگہانی مصیبتوں سے محفوظ رہی ہوں۔" وہ کمزور سی آواز میں بولی "تم مجھے بس وہیں تک پہنچا دو اور خود کسی بھی طرف نکل جاؤ۔ تمہارا اس علاقے میں زیادہ دیر رکنا بہت خطرناک ہے"

وہ اٹھ بیٹھی۔ میں نے اسے کمر پر لادا اور ایک بار پھر دوڑ پڑا۔ ...وہ محض ایک مشتِ استخواں ہی تو رہ گئی تھی۔ میرے لئے اس کا وزن ہی کیا تھا! لیکن ابھی میں کچھ ہی دور پہنچا تھا کہ وہ کراہتے ہوئے بولی "خدا کے لئے آہستہ دوڑو۔۔۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ میری ہڈی ہڈی الگ ہو جائے گی۔ تم نے دیکھا نہیں۔۔۔ میں بس ایک کمزور سا ڈھانچا ہی تو ہوں۔"

"اچھا اب میں رفتار کم کرتا ہوں اور ایک خاص ترکیب سے دوڑتا ہوں۔ اس طرح تمہیں ذرا بھی جھٹکا نہیں لگے گا" میں نے کہا "میں بھول گیا تھا کہ میں جس تاجاں کو کمر پر لاد کر بھاگ رہا ہوں وہ بارہ سال پہلے والی تاجاں نہیں ہے۔"

"مجھے کبھی غلطی سے اس تاجاں کی یاد بھی مت دلانا۔ میرے دل سے لہو سا ابلنے لگتا ہے" وہ ٹوٹتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ...اس لہجے کی تہ میں درد کا سمندر تھا۔

میں یکدم خاموش ہو گیا۔ اجڑے ہوئے لوگوں کو ماضی کی خوبصورتی زیادہ دکھ دیتی ہے۔ میں نے ایک خاص ٹیکنیک سے دوڑنا شروع کر دیا۔ یہ ٹیکنیک میں نے ایک ریٹائرڈ جاپانی فوجی سے سیکھی تھی۔ یہ زخمی سپاہیوں کو کمر پر لاد کر دوڑنے کی ٹیکنیک تھی۔ اس میں زخمیوں کو تکلیف کم ہوتی تھی اور خون بھی کم سے کم بہتا تھا۔ مجھے روزمرّہ زندگی میں جو بھی جہاندیدہ آدمی ملتا تھا' میں اس سے کچھ نہ کچھ سیکھنے کی کوشش ضرور کرتا تھا۔

"تمہیں راستہ معلوم ہے؟" چند لمحے بعد تاجاں نے پوچھا۔ اب اس کا لہجہ قدرے پُرسکون تھا۔

"ہاں۔ اب تو اندازہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

مختصر یہ جنگل سے نکلنے کے بعد میں ناک کی سیدھ میں ہی چلتا رہا اور آخرکار تاجاں کی جھونپڑی تک جا پہنچا۔ جھونپڑی میں ٹمٹماتی ہوئی لالٹین اب بھی روشن تھی اور دروازہ اسی طرح چوپٹ کھلا تھا جس طرح اس وقت تھا جب اغوا کرنے والوں میں سے ایک نوجوان نے ریوالور کے بل پر مجھے یہاں سے نکالا تھا۔

جھونپڑی میں داخل ہو کر میں نے تاجاں کو اس کی چارپائی کے قریب کمر سے اتارا۔ وہ اترتے ہی صرف ایک لمحے کے لئے اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی پھر دھم سے چارپائی پر گر گئی اور گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

"تمہیں مجھ کو یوں پیٹھ پر لاد کر لاتے ہوئے ذرا بھی کراہت محسوس نہیں ہوئی؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ کئی بار اس کے لہجے میں مجھے یہی بے یقینی رچی ہوئی محسوس ہوئی تھی۔ شاید دنیا پر سے اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی اسے مشکل سے یقین آتا تھا۔

"کراہیت کیوں محسوس ہوتی؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"مجھے چھوت کی بیماری ہے نا" اس نے گویا کسی جرم کا اعتراف کیا۔

"اگر تم بیمار ہو تو یہ کوئی تمہارا جرم تو نہیں ہے" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "اور پھر میرے ذہن نے تو ابھی تک تمہاری اس حالت کو قبول ہی نہیں کیا۔ میں جب بھی تم پر نظر ڈالتا ہوں تو میری چشمِ تصور مجھے وہی بارہ سال پہلے والی تاجاں دکھاتی ہے۔ لمبی تڑنگی' حسین جتنی۔ دور سے دل کھینچ لینے والی۔"

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ مجھے ماضی کی تاجاں مت یاد دلانا" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی "یہ میرے سوال کا صحیح جواب نہیں ہے۔"

"تمہارے سوال کا صحیح جواب یہ ہے کہ انسان کی زندگی میں اکثر و بیشتر ایسے لمحے آتے ہی رہتے ہیں جب وہ حفظانِ صحت کے اصولوں سے بالاتر ہو کر کوئی عمل کرتا ہے۔ جو لوگ دل سے اچھے لگتے ہوں ان کے سامنے طبی نصیحتیں دھری رہ جاتی ہیں۔ تم

نے میرے لئے زندگی داؤ پر لگائی۔ میں تم سے گھن کھاتا؟ مجھے تمہارا سوال بالکل اچھا نہیں لگا۔"

"میری زندگی کا کیا ہے۔ یہ بے وقعت اور بے مصرف زندگی ہے۔ کچھ بیکار سی سانسوں کا مجموعہ جو موت کے انتظار میں خرچ ہو رہی ہیں۔ یہ زندگی کوڑے کے ڈھیر پر پڑے ہوئے روٹی کے باسی ٹکڑے کی طرح ہے جسے کتا سونگھ کر چھوڑ دیتا ہے" اس کے الفاظ زہریلے تھے مگر اس کے لہجے میں زہر نہیں تھا۔ تھکے ٹوٹے انسانوں کے لہجے میں زہر نہیں ہوتا۔ "ایک عرصے سے لوگ میرے قریب آتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں"

"ایک وقت آئے گا کہ لوگ پھر تمہارے قریب آنے کو ترسیں گے" میں نے وثوق سے کہا۔

"بس اب تم جاؤ" اچانک وہ جھرجھری سی لے کر بولی "تم انسان کو باتوں میں بہت بری طرح الجھا لیتے ہو۔ خوبصورت خواب دیکھنے لگتے ہیں لوگ۔ لیکن یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں۔ جلد از جلد یہاں سے دور نکل جاؤ۔"

"جانا تو مجھے ہے ہی لیکن میں سوالوں کی خلش ساتھ لے کر نہیں جانا چاہتا۔ جہاں اتنی دیر ہوئی ہے وہاں تھوڑی سی دیر اور سہی" میں نے بے پروائی سے کہا "یہ بتاؤ تمہارے پاس گرنیڈ کہاں سے آئے تھے؟"

وہ جیسے کچھ یاد کر کے عجیب سے انداز میں ہنسی "ایک بار ایک گھبرایا ہوا سا گاہک آیا تھا میرے پاس۔۔" اس نے تکیے کے نیچے سے سستی سی سگریٹ کا پیکٹ نکال کر سگریٹ سلگائی اور کثیف دھواں اگلتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا "بہت پریشان تھا وہ۔ ...کہنے لگا' میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے' مجھے ایک رات کے لئے چھپا لو' بہت پیسے دوں گا۔ مجھے تو عرصے سے کسی بات کی پروا ہی نہیں رہی۔ پیسوں کی ضرورت لب گور انسان کو بھی رہتی ہے' ۔ پیسوں کے بغیر تو انسان کو کفن دفن بھی نصیب نہیں ہوتا نا۔۔۔ میں نے اسے ٹھہرا لیا۔ رات کو اس نے اپنے بیگ سے دو اناس سے نکالے اور کہنے لگا' انہیں کہیں چھپا دو۔ میرے پاس بھلا چھپانے کے لئے کونسی تجوریاں رکھی تھیں۔ میں نے انہیں چیتل کی اس دیگچی میں ڈال دیا۔۔۔" اس نے کارنس پر رکھی ہوئی بڑی سی دیگچی کی طرف اشارہ کیا۔

پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی "پتا نہیں کون تھا اور کیا چکر تھا اس کے ساتھ۔ لیکن تھا سچا آدمی' کم از کم میرے ساتھ اس نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ آتے ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ پھر میں نے پوچھا یہ اناس سے کیا ہیں' تو اس نے صاف بتا دیا کہ بم ہیں۔ میں نے یونہی پوچھا کہ کیسے چلتے ہیں' تو اس نے وہ بھی سمجھا دیا کہ کیسے پن نکالتے ہیں اور کیسے پھینکتے ہیں۔ پھر میں انہیں دیگچی میں رکھ کر بھول گئی۔ وہ بھی کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ پولیس بھی اس کے تعاقب میں کم از کم میرے پاس تو نہیں آئی۔ اس کے بعد کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ کوئی گاہک فرمائش کرتا۔ اری تاجاں! تیرے پاس کھانے کو کچھ نہیں ہے؟ بڑی بھوک لگی ہے۔ تو میں کہتی' ذرا ٹھہر۔ میں تجھے بم پکا کر کھلاتی ہوں۔ وہ مذاق سمجھتا اور بات مذاق میں ہی آئی گئی ہو جاتی اور اب ایک عرصے سے تو میں انہیں بالکل ہی بھول گئی تھی۔"

وہ خاموش ہو کر سانس درست کرنے لگی پھر مسکراتے ہوئے بولی "وہ جو کہتے ہیں نا کہ رکھی ہوئی چیز کبھی نہ کبھی کام ضرور آتی ہے۔۔۔ تو آج مجھے اس بات پر پورا یقین آگیا۔ یہاں سے جب اس نوجوان نے پستول دکھا کر تمہیں باہر نکالا اور تم اسے بے ہوش کر کے بھاگ گئے تو میں بڑی خوش تھی کہ تم نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہو لیکن پھر کچھ دیر بعد ایک آدمی اپنے اس ساتھی کو ڈھونڈنے آیا جسے تم بے ہوش کر کے ڈال گئے تھے۔ میں اس وقت چھپ گئی تھی۔ وہ آدمی پانی کے چھینٹے وغیرہ دے کر اپنے ساتھی کو ہوش میں لایا اور بڑے مسرور لہجے میں اسے بتانے لگا کہ شکار گھیرے میں آرہا ہے اور خود ہی حویلی کی طرف جا رہا ہے۔ ...وہ دونوں بھاگم بھاگ روانہ ہو گئے۔ میں کچھ دیر جھونپڑی کے پیچھے چھپی سوچتی رہی کہ مجھے کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔ مجھے اپنی بے بسی اور کمزوری پر رونا آرہا تھا۔ میں کسی قابل بھی تو نہیں تھی لیکن میرے اندر کوئی جذبہ تھا جو مجھے چین سے نہیں بیٹھنے دے رہا تھا۔ پھر مجھے وہ دستی بم یاد آئے۔ میں نے سوچا کوشش کر دیکھتی ہوں' شاید میری کوشش کسی کام آ ہی جائے۔ میں دونوں بم اٹھا کر اندھیرے میں گرتی پڑتی' ہانپتی کانپتی ان کے پیچھے پیچھے ہی حویلی پہنچ گئی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ سب کچھ قیصر ملک کے حکم پر ہی ہو رہا ہو گا۔ وہ اور اس کا باپ ہی ایسی کارروائیاں کراتے رہتے ہیں۔۔۔ میں جب حویلی کے سامنے پہنچی تو بہت سے آدمی تمہیں رسیوں سے باندھ کر کندھوں پر لاد کر اندر لے جا رہے تھے۔ بہت دیر تک تو میں درختوں کے پیچھے چھپی دہشت زدہ سی کھڑی رہی۔ وہ منظر بہت ہی خوفزدہ سا کر دینے والا تھا۔۔۔ رات کے اندھیرے میں اتنے بہت سے مسلح آدمی ایک شخص کو رسیوں سے باندھ کر اس کے منہ پر بوری چڑھا کر لے جا رہے ہوں۔۔۔ یہ منظر مجھ جیسی کمزور عورت کو دہشت زدہ کرنے کے لئے کافی تھا۔ سب لوگ اندر چلے گئے۔ بڑا سا دروازہ بند ہو گیا اور بے حد مہیب سا سکوت چھا گیا۔۔۔ باہر بس دو کاریں اور ایک ٹرک کھڑا تھا۔ ان میں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں سوچ رہی تھی کہ اگر میں بم پھینکوں گی تو نہ جانے اس سے کتنی تباہی پھیلے اور پھر تم بھی تو اندر ہی تھے۔ ظاہر ہے بم یہ تو نہیں دیکھ سکتا تھا کہ کس کو نقصان پہنچانا ہے اور کس کو محفوظ رکھنا ہے۔ میں نے دعا کی کہ اگر بم واقعی پھٹ جائے تو کچھ اس طرح تباہی پھیلے کہ تمہیں نکل بھاگنے کا موقع مل جائے۔"

"تمہاری دعا قبول ہو گئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ ایک نئے سرے سے اللہ تعالیٰ سے امید سی بندھ گئی ہے کہ وہ گناہ گاروں کی بھی سنتا ہے۔" اس نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر کے طویل سانس لی "بس میں نے یونہی آنکھیں بند کر کے پن نکال کے... بم پھینک تو دیا تھا لیکن مجھے یقین نہیں تھا کہ وہ واقعی پھٹے گا اور جب وہ پھٹ گیا اور میں نے حویلی کے درودیوار منہدم ہوتے دیکھے تو ایک لمحے کے لئے تو پہلے سے بھی زیادہ وحشت زدہ ہو گئی۔ دھماکے سے میں گر پڑی تھی۔ پھر میں نے سوچا' جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔ تمہارے حق میں اچھا ہو یا برا' میں نے اس کی پروا کئے بغیر دوسرا بھی پھینک دیا... اور اس بار تو مجھے اتنا زور لگانا پڑا کہ مجھے لگا جیسے میرا بازو ہی کندھے سے الگ ہو کر دور جا پڑا ہے لیکن بس کسی نہ کسی طرح میں نے فوراً ہی واپسی کے لئے دوڑنا شروع کر دیا۔ معلوم نہیں کونسا جذبہ' کونسی طاقت تھی جس نے مجھ سے اتنا مشکل کام کرا دیا۔"

"یہ طاقت شاید ایک بے نام تعلقِ خاطر کی تھی" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

وہ نہ جانے کس تصور سے خوفزدہ ہو کر جھرجھری سی لے کر بولی "بس اب تم جاؤ۔ بہت باتیں ہو چکیں۔ سب کچھ معلوم ہو گیا تمہیں۔ گاؤں میں تو ہلچل مچ چکی ہو گی۔ معلوم نہیں کون کون مرا ہو گا دھماکے میں۔"

"یہ تو میں بھی نہیں دیکھ سکا۔" میں نے کہا "اور ہاں' میرا تمہیں چھوڑ کر جانے کو دل نہیں چاہ رہا۔ کہیں تم پر کوئی بات نہ آ جائے' تم کسی کے غیظ و غضب کا نشانہ نہ بن جاؤ۔"

"میں اتنی کمزور' اتنی مسکین' اور اتنی بے ضرر نظر آتی ہوں کہ میری طرف کوئی زیادہ دھیان نہیں دیتا۔ ہاتھی مجھ جیسی چیونٹی کو کچلنا پسند نہیں کرتے۔ اسی لئے کبھی کبھی اپنی یہ بے وقعتی مجھے فائدہ مند محسوس ہونے لگتی ہے۔ تم بالکل بے فکر ہو کر جاؤ۔ صرف اپنی جان کی فکر کرو" اس کا لہجہ ان بے غرض اور جاں نثار دوستوں کا سا تھا جو صرف خوش نصیبوں کو ہی میسر آتے ہیں۔

"میں جلد از جلد یا تو خود تمہیں لینے آؤں گا یا میرا کوئی آدمی آئے گا۔ تم بلا جھجک اور بلا تاخیر اس کے ساتھ چلی آنا۔" میں نے دروازے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے بلایا تو میں ضرور آؤں گی۔" اس کی دھندلی آنکھوں میں مشکوک سی مسرت کی کرن لہرائی جیسے اسے یقین نہ ہو کہ میں واقعی اسے بلاؤں گا۔

جھونپڑی سے نکل کر میں نے نہر کی پلیا کی طرف دوڑ لگا دی۔ اس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو چلا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت گاؤں کے لوگ یا تو قیصر ملک کی حویلی کی طرف جا رہے ہوں گے یا پھر کھیتوں کی طرف۔ غنیمت یہ تھا کہ دونوں کے راستے اس طرف سے نہیں تھے۔

نہر پار کر کے کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد میں چھوٹی سڑک پر پہنچ سکتا تھا لیکن ایک چیز مجھے پریشان کر رہی تھی کہ اس سڑک پر بسوں کی آمدورفت بہت کم تھی۔ گھنٹے دو گھنٹے بعد کوئی بس آتی تھی اور اتنی دیر بس کے انتظار میں کھڑے ہونا میرے لئے خطرے سے خالی نہیں تھا۔ یہ سڑک تقریباً تین میل آگے جا کر بڑی سڑک سے ملتی تھی جس پر سیالکوٹ اور لاہور وغیرہ جانے والی بسوں اور ویگنوں کی کافی آمدورفت رہتی تھی۔ اگر میں وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تو پھر مجھے سواری کے لئے انتظار قطعاً نہ کرنا پڑتا۔ لیکن سچی بات یہ تھی کہ مجھ میں اب تین میل مزید دوڑنے کی ہمت نہیں رہی تھی اور سست رفتاری سے چلنا بھی خطرے کو دعوت دینے والی بات تھی۔

اسی اُدھیڑبُن میں بہر حال میں چھوٹی سڑک پر پہنچ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور صبح کی تازہ اور فرحت بخش ہوا میں سانس درست کرنے لگا۔ اب تک اعصاب پر اتنا بوجھ پڑ چکا تھا اور اس تیزی و تندی سے ہر چیز کا مقابلہ کرنا پڑا تھا کہ اب ذرا آرام سے فرحت بخش ہوا میں کھڑا ہوا تو گویا یکدم سارا تناؤ اور ہیجان خیزی رخصت ہو گئی اور ذہن پر غنودگی کا سا حملہ ہونے لگا۔ بھوک بھی بڑے زور کی لگ رہی تھی۔ سست کر دینے والے کئی عناصر ایک ساتھ جمع ہو گئے تھے۔

میں نے سر جھٹک کر اپنے آپ کو مستعد اور چوکنا رکھنے کی کوشش کی اور اسی لمحے میری نظر دور سے آتے ہوئے ایک سائیکل سوار پر پڑی۔ صبح صادق کے سرمئی اجالے میں وہ دھیرے دھیرے' سست سے انداز میں پیڈل مارتا آ رہا تھا۔ میرا سست پڑتا ہوا ذہن دوبارہ کچھ مستعد ہو گیا۔ پیدل چلنے سے تو سائیکل پھر بھی غنیمت تھی۔

سائیکل سوار میرے گاؤں کی طرف نہیں مڑا بلکہ سیدھا ہی آتا رہا۔ شاید وہ بڑی سڑک کی طرف ہی جا رہا تھا۔ اب میں صاف طور پر اسے دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک عام سا' ڈھیلا ڈھالا اور مفلوک الحال دیہاتی تھا۔ گھٹنوں سے ذرا نیچے دھوتی' لمبا سا ڈھیلا ڈھالا کرتا' سر پر مختصر سی پگڑی اور کندھے پر رومال۔ انجانے تفکرات میں گم' پیڈل کی حرکت کے ساتھ ادھر اُدھر کو ہلتا ہوا وہ میرے خاصا قریب آن پہنچا تب اچانک ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ یوں بوکھلا کر سائیکل سے گرتے گرتے بچا جیسے اس نے کسی مگرمچھ کو خشکی پر رینگتے دیکھ لیا ہو۔

میں نے اسے رکنے کے لئے ہاتھ دیا تو وہ بریک لگائے بغیر ہی سائیکل سے اتر پڑا اور کچھ دور تک سائیکل کے ساتھ ہی دوڑتا ہوا آیا۔ اگر میں ایک طرف نہ ہٹ جاتا تو وہ یقیناً سائیکل میری ٹانگوں میں گھسیڑ دیتا۔ سائیکل کو قریب سے دیکھ کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ زنگ آلود سی اس سائیکل کے انجر پنجر ڈھیلے سے معلوم ہوتے تھے لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ زندگی میں ایک بار پہلے بھی ایسی ہی ایک کھٹارا سائیکل بہت اہم موقع پر میرے کام آ چکی ہے۔

"کہاں جا رہے ہو بھائی؟" میں نے اس کو سہارا دے کر سنبھالتے ہوئے ملائمت سے پوچھا۔

"وہ... شکر گڑھ موڑ تک..." اس نے سنبھل کر اپنی حالت پر قدرے جھینپتے ہوئے کہا۔

"اگر تم مجھے بھی ساتھ بٹھا کر وہاں تک لے چلو تو تمہاری بہت ہی مہربانی ہو گی" میں نے درخواست کی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ وہ بے چارہ خاصا ناتواں سا آدمی تھا۔ وہ تو اکیلا ہی رینگنے کی سی رفتار سے آ رہا تھا۔ مجھے بٹھا کر تو شاید پیڈل کو حرکت دینا بھی اس کے بس میں نہ رہے' اس لئے میں نے جلدی سے کہا "بلکہ اخلاق کا تقاضا تو یہ ہے کہ تم آرام سے آگے بیٹھو' میں چلاتا ہوں۔"

"جیسے تمہاری مرضی بھائی صاحب۔" اس نے کچھ اس انداز سے کہا گویا میں نے بہت اصرار کیا ہو اور وہ میرے اصرار کے سامنے مجبور ہو گیا ہو۔ شاید وہ خود بھی تھکا ہوا تھا۔ اس کی سائیکل پر پیچھے دودھ کا ایک درمیانے سائز کا ڈرم لٹکا ہوا تھا اور کیریئر پر گنوں کا خاصا بڑا گٹھڑ لدا ہوا تھا۔

میں نے سائیکل سنبھالی تو وہ اچک کر آگے بیٹھ گیا اور غیر ارادی طور پر اس نے سکون کی سانس لی۔ دل ہی دل میں وہ یقیناً خوش تھا کہ اسے سائیکل چلانے سے نجات مل گئی تھی۔

لیکن جب کچھ دور تک آرام سے چلانے کے بعد میں نے اپنی مرضی کے مطابق سائیکل رفتار بڑھانا شروع کی تو اس کے اوسان اڑنا شروع ہوئے۔ میری کوشش تھی کہ میری بچی کھچی تمام توانائی میری ٹانگوں میں سمٹ آئے۔ ذرا سی دیر میں وہ کھٹارا سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی تو اس کا مالک بے چارہ بری طرح بوکھلا گیا۔

سائیکل بھی شاید اپنی تیاری کے دن سے لے کر آج تک اس رفتار سے نہیں چلی تھی اور اب اس عالمِ ضعیفی میں جبکہ اس کے تمام اعضاء اور اجزائے ترکیبی کھڑکھڑانے لگے تھے' اسے اس رفتار سے چلنے کی بالکل ہی عادت نہیں رہی ہو گی چنانچہ اس کا ہر پرزہ پوری طاقت سے آہ و زاری کر رہا تھا۔ وہ کہنے کو ایک سائیکل تھی مگر شور تقریباً ایک ٹرین جتنا مچا رہی تھی۔

پیچھے کیریئر پر دودھ کا ڈرم بری طرح کھڑکھڑا رہا تھا۔ گنوں کا گٹھڑ ادھر اُدھر لہرا رہا تھا۔ سائیکل کا مالک الگ اپنی جگہ ہر جھٹکے پر ڈنڈے پر اچھل رہا تھا اور کراہ رہا تھا۔ ایک بار دودھ کے ڈرم کی کھڑکھڑاہٹ بڑھی تو وہ چلایا "بھائی! یہ ڈرم گر جائے گا۔"

"پروا مت کرو۔ تم دوسرا ڈرم لے لینا" میں نے چلا کر اسے تسلی دی "بلکہ ایسے چار ڈرم لے لینا۔"

اسی لمحے ڈرم' کیریئر کے ہُک میں سے نکلا اور لڑھکتا ہوا کہیں غائب ہو گیا۔ میں یہ دیکھنے کے لئے رکنے کو ہرگز تیار نہیں تھا کہ وہ کدھر گیا ہے۔ سائیکل والا بے معنی سے انداز میں 'ہا... ہو' کر کے رہ گیا۔

مزید تھوڑی دور جانے کے بعد گنوں کے گٹھے نے ہم کو الوداع کہا اور اتحاد و اتفاق کی تمام روایتوں کو توڑتے ہوئے ایک ایک گنا الگ الگ ہو کر سڑک پر بکھر گیا۔ میں نے مڑ کر صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور سائیکل کی رفتار میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔

دیہاتی درد بھرے انداز میں چلایا "بھائی! میرے گنے...!"

"چھوڑو یار گنوں کو۔" میں نے بہ آوازِ بلند کہا "تم گنڈیریوں کی پوری ریڑھی خرید لینا... بلکہ چاہو تو چینی کی بوری خرید لینا"

اسی لمحے ہوا کی تیزی کی وجہ سے اس کی مختصر اور ڈھیلی ڈھالی پگڑی اڑ گئی اور وہ یکدم اسے پکڑنے کی کوشش میں گرتے گرتے بچا۔ میں نے اس کے دائیں بائیں اپنے بازوؤں کا حلقہ کچھ تنگ کرتے ہوئے کہا "آرام سے بیٹھو یار! اگر تم ڈنڈے سے پھسل پڑے تو مجھے بھی مرواؤ گے"

"اگر تم... اتنی تیز چلاؤ گے... تو ہم ویسے بھی... ضرور مارے جائیں گے" وہ خوفزدہ لہجے میں بولا "خدا کے لئے آہستہ چلاؤ... مجھے چوٹ لگ رہی ہے"

"آدمی کے دل پر چوٹ نہیں لگنی چاہئے۔ باقی سب چوٹوں کا علاج ہو جاتا ہے" میں نے گویا اسے تسلی دی اور سائیکل کی وہی رفتار برقرار رکھی۔ میں سائیکل سے موٹر سائیکل کا کام لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں تو... تمہیں سائیکل پر... بٹھا کر پچھتا رہا ہوں" وہ شخص کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"لیکن جب میں تمہاری سائیکل سے اتروں گا تو تمہارے سارے پچھتاوے دور ہو جائیں گے" میں نے ایک بار پھر اس کا دل بڑھانے کی کوشش کی۔

آخر کار وہ مقام نظر آ گیا جہاں یہ چھوٹی سڑک بڑی سڑک سے مل رہی تھی لیکن اس سہ راہے پر بھی اس وقت رونق نظر نہیں آ رہی تھی۔ صبح کے آثار کچھ اور واضح ہو چکے تھے۔ میں نے سہ راہے سے کچھ پہلے ہی سائیکل بصد کوشش روک لی۔ بصد کوشش اس لئے کہ اس میں دیگر کئی چیزوں کی طرح بریک بھی گئے گزرے ہی تھے اور جس رفتار پر میں نے انہیں استعمال کیا اس کے بعد تو وہ شاید آئندہ استعمال کے قابل ہی نہیں رہے ہوں گے۔

سائیکل سے اترنے کے بعد میں نے دیکھا کہ وہ شخص رو دینے کے قریب تھا۔ اس میں یقیناً اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اپنے نقصان پر وہ میرا گریبان ہی پکڑ لیتا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کی اور میری صحت میں زمین آسمان کا فرق تھا اور

دوسری وجہ یہ تھی کہ میرا گریبان پہلے ہی پھٹ چکا تھا۔ قمیص کے دو تین بالائی بٹن بھی غائب تھے۔ کوٹ کی آستینیں کندھوں پر سے تقریباً علیحدہ ہی ہو چکی تھیں۔ ہر چیز مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔

سائیکل والا حسرت بھری نظر سے پیچھے اسی طرف دیکھ رہا تھا جدھر سے ہم آئے تھے۔ میرے جانے کے بعد وہ غالباً اس راہ پر واپس جانے کا ارادہ رکھتا تھا تاکہ اگر اس کا بکھرا ہوا اثاثہ یا اس کی کچھ باقیات دستیاب ہو سکیں تو سمیٹ کر لا سکے۔

میرا پہلے ہی ارادہ تھا کہ اس کے نقصان کی تلافی کی ضرور کوشش کروں گا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن جیب کسی اُجڑے ہوئے مکان کی طرح سائیں سائیں کر رہی تھی۔ اس میں تو پھوٹی کوڑی تک نہیں تھی۔ میرا پرس نہ جانے کب اور کہاں گر چکا تھا۔ ظاہر ہے اسے گرنا ہی تھا۔ جن مراحل سے میں گزر چکا تھا ان میں تو یہی غنیمت تھا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ علیحدہ ہو کر کہیں نہیں گرا تھا۔

ایک لمحے کے لئے تو میں ہاتھ جیب سے نکال ہی نہ سکا، شرمندہ سا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا جبکہ سائیکل والا برا سا منہ بنائے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں یہ شکر ادا کرتے ہوئے جیب سے ہاتھ نکال لیا کہ میں اپنے پرس میں رقم کے علاوہ کوئی اہم چیز نہیں رکھتا تھا۔ سائیکل والے نے میرا ہاتھ جیب سے خالی باہر آتے دیکھا تو اس کے چہرے پر قدرے مایوسی جھلک آئی۔

دفعتاً میری نظر اپنی کلائی کی گھڑی اور ہیرے کی انگوٹھی پر پڑی۔ گھڑی کو دیکھ کر تو مجھے بجا طور پر حیرت ہوئی۔ معلوم نہیں کس طرح وہ میری کلائی سے لپٹی رہ گئی تھی۔ یہ ایک چھوٹا سا معجزہ ہی تھا۔ اس کی چین سونے کی تھی۔ انگوٹھی میں چھوٹا سا ہیرا لگا ہوا تھا اس لئے وہ بھی خاصی بیش قیمت تھی۔

میں نے انگوٹھی نکال کر سائیکل والے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لو یار! اسے بیچ کر اپنا نقصان پورا کر لینا۔ خالص سونے کی ہے اور اس میں ہیرا لگا ہوا ہے۔"

اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں انگوٹھی لے لی اور پھر بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ پہلے تو شاید اسے یہ یقین نہیں آیا تھا کہ میں ہیرے کی انگوٹھی کا مالک ہو سکتا ہوں تاہم میرا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد غالباً اس نے میرے حق میں فیصلہ دے دیا لیکن اب شاید اسے اس بارے میں شک پیدا ہو گیا تھا کہ میں انگوٹھی واقعی اسے دے رہا ہوں۔

"کیا واقعی یہ میں لے لوں؟" اس نے تصدیق چاہی۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لرزش آ گئی تھی اور وہ انگوٹھی کو الٹ پلٹ کر دیکھے جا رہا تھا۔

"ہاں یار! واقعی تم لے لو۔ تم نے مجھ پر احسان کیا اور میں نے الٹا تمہارا نقصان کیا۔ میرے پاس نقد تو کوئی روپیہ پیسہ ہے نہیں۔ اس لئے یہ ایک حقیری چیز تمہاری خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ تمہارا نقصان پورا ہو سکے اور میں بھی اپنی نظروں میں سُرخرو ہو سکوں" میں نے خوشدلی سے کہا۔ ساتھ ہی میں بڑی سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن ابھی کسی بس کی آمد کے آثار نہیں تھے۔

اس شخص کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے خوشی کی چمک ابھری لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی جگہ مایوسی کے اندھیرے نے لے لی۔ وہ انگوٹھی واپس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "یہ اگر واقعی اصلی ہے تو میں نہیں لے سکتا۔ میں اگر اسے بیچنے گیا تو پولیس مجھے پکڑ لے گی کہ میرے پاس اتنی قیمتی چیز کہاں سے آئی؟"

وہ بھی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نکتے کی طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ غریب آدمی تو بے چارہ کسی سے غیر متوقع انعام بھی نہیں لے سکتا۔ میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم رکھ تو لو۔ جب کبھی حالات مناسب نظر آئیں یا بغیر کسی خطرے کے اسے فروخت کرنے کا موقع میسر آئے تو کر دینا۔ اب اور کیا کیا جا سکتا ہے؟" میری سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا کہ اس کا حل یا متبادل کیا ہو سکتا ہے۔

اس شخص نے قدرے تذبذب کے سے عالم میں انگوٹھی جیب میں رکھ لی۔ اسی اثنا میں مجھے سڑک پر بس آتی دکھائی دی۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کرائے کے لئے بھی تو پیسے درکار ہوں گے۔ اب میں کنڈکٹر سے تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ بھائی میں ذرا گاؤں کو

بر کو آیا تھا اور یہاں میری جیب کٹ گئی۔ اور نہ ہی میں اسے اپنی اصلی داستانِ غم سنا سکتا تھا۔

میں نے بے اختیار اس دیہاتی سے کہا "یار! کچھ پیسے ہوں گے تمہارے پاس؟"

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ شاید اسے مجھ سے اس بے تکلفی کی توقع نہیں تھی۔ خصوصاً جو کچھ اس کے ساتھ ہو چکا تھا اس کے بعد تو پیسوں کی فرمائش کرنا اس کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھا لیکن پھر شاید اس نے انگوٹھی کے حوالے سے یہ سوچا کہ میں نے اس کے نقصان کی تلافی کی کوشش تو کی تھی۔ تب اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک روپے کا مڑا تڑا اور میلا سا نوٹ اور ایک چونی نکالی۔

قدرے شرمندہ سے لہجے میں وہ بولا "میرے پاس تو یہی رقم ہے جناب!"

اس رقم سے یقیناً مجھے کوئی خاص فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ لاہور کا کرایہ اتنا کم تو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے اس کو نہ لینا ہی بہتر سمجھا اور ایک بار پھر دوستانہ انداز میں اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "بہت شکریہ میرے یار! اس سے کام نہیں چلے گا۔ اسے تم ہی رکھو۔ تمہارے تو کسی نہ کسی کام آ ہی جائیں گے یہ پیسے۔ رب راکھا"

میں سڑک کی طرف دوڑ پڑا۔ صبح کا اجالا چونکہ ابھی صحیح طور پر نہیں پھیلا تھا اس لئے بس کی ہیڈ لائٹس روشن تھیں۔ اسٹاپ پر چونکہ اور کوئی نہیں تھا اس لئے میں نے سڑک کے تقریباً درمیان میں ہی پہنچ کر ہاتھ ہلانا شروع کر دیا کہ کہیں ڈرائیور مجھے نظرانداز کرتے ہوئے نہ گزر جائے۔

بس کھڑکھڑاتی ہوئی ایک طرف کو ہو کر رک گئی۔ حالانکہ وہ لمبے روٹ پر چلنے والی بسوں میں سے ایک تھی لیکن اس کا حلیہ بھی کچھ مجھ سے ملتا جلتا ہی تھا۔ عجیب خستہ حالی سی طاری تھی اس پر۔ میں بے تابی سے بس میں سوار ہو گیا اور وہ جھرجھری سے لے کر آگے روانہ ہو گئی۔

بس کے اندر دیئے کی طرح ٹمٹماتی ہوئی سی ایک بتی روشن تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی کہ اس میں مسافر چند ایک ہی تھے اور وہ بھی اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے اور ایک دوسرے پر لڑھک رہے تھے۔ ایک آدھ مسافر کے علاوہ کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ میں نے پوری طرح سکڑتے سمٹتے ہوئے یہی کوشش کی کہ ان کی نظروں میں بھی زیادہ مشکوک نہ ٹھہروں اور وہ میرے جگہ جگہ سے ادھڑے ہوئے لباس کو نہ دیکھ پائیں۔

میں نے سب سے پچھلی سیٹ پر نیم تاریکی میں، کونے میں بیٹھ کر سکون کی سانس لی۔ کنڈکٹر، ڈرائیور کے پاس بیٹھا بہت دھیمی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ وہ سگریٹوں کے کش لگا رہے تھے اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑ رہے تھے۔ کنڈکٹر ترچھا بیٹھا تھا۔ کبھی کبھی وہ معنی خیز انداز میں مسکرا کر اپنی مونچھوں پر تاؤ دینے لگتا۔

پھر اس نے غالباً بادل نخواستہ گفتگو کا سلسلہ کچھ دیر کے لئے منقطع کیا اور 'فرائضِ منصبی' کی ادائیگی کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پیسوں کے تھیلے میں ہاتھ ڈالے وہ میرے قریب آیا اور پیشہ ورانہ مخصوص لہجے میں بولا۔ "ٹکٹ بھائی صاحب!"

میں نے اسے اپنی طرف جھکنے کا اشارہ کیا۔ مجھ سے اگلی کئی سیٹوں پر کوئی نہیں تھا اس کے باوجود میں نے اس سے سرگوشی میں بات کرنا ہی بہتر سمجھا۔ بس پورے زور و شور سے کھڑکھڑاتی ہوئی اب خاصی تیز رفتاری سے منزل کی طرف رواں تھی۔

کنڈکٹر قدرے ہچکچاہٹ اور کچھ حیرت کے ساتھ میری طرف جھکا تو میں نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا "برادرِ عزیز! پیسہ دھیلا میرے پاس کوئی نہیں ہے اور میرا لاہور پہنچنا ضروری ہے۔ میں کسی چکر میں پھنس گیا تھا۔ میرا سب کچھ گر گیا ہے۔ یہ گھڑی میرے پاس رہ گئی ہے۔ یہ تم رکھ لو۔ اس کی چین سونے کی ہے اور کافی قیمتی گھڑی ہے۔ آٹھ دس روپے کرائے کے بدلے میں یہ بری تو نہیں۔ اونے پونے بھی بیچو گے تو آٹھ دس ہزار میں بک جائے گی۔ کیا خیال ہے؟"

ایک لمحے کے لئے تو وہ بالکل خاموش اور اسی طرح جھکا کا جھکا رہ گیا۔ الفاظ کا مطلب گویا بہت آہستگی سے اس پر واضح ہوا۔ اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور ایک طویل سانس لی۔ اصل افسوس اسے گویا کرایہ نہ ملنے کا نہیں بلکہ کوئی اہم بات ادھوری چھوڑ کر اٹھ کے آنے کا تھا۔ اس کی نظریں کہہ رہی تھیں، 'اگر مجھے معلوم ہوتا تو میں یہ چند قدم کا فاصلہ طے کرنے کی زحمت ہی نہ کرتا۔'

میں نے گھڑی اتار کر اس کی طرف بڑھا دی تھی اور یہ اطمینان کر لیا تھا کہ کوئی مڑ کر ہماری طرف نہیں دیکھ رہا۔ کنڈکٹر نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر نرمی سے میرا ہاتھ گھڑی سمیت پیچھے کرتے ہوئے بولا "کوئی بات نہیں بھائی صاحب! کرایہ نہیں ہے تو کیا ہوا۔ اور دس بیس کی ضرورت ہے تو ہم سے لے لو۔ اتنی قیمتی چیز ہم کو کیوں دے رہے ہو؟ ہم کنڈکٹر ہے کوئی ڈاکو تو نہیں" اس کی آواز کھردری لیکن اس کے لہجے میں خلافِ توقع ملائمت تھی۔ اس کا رویہ بھی میری توقع کے برعکس تھا ورنہ جو کچھ میں نے اس مخلوق کے بارے میں سنا تھا اور بچپن یا لڑکپن کے جو تجربات تھے ان سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ کرائے میں دو چار آنے کم ہونے پر بھی یہ لوگ مسافر کی اچھی خاصی بے عزتی کر دیتے تھے۔ لیکن بات پھر وہی آ جاتی ہے کہ ہر لائن میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔

وہ ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں چلتا ہوا واپس ڈرائیور کے پاس جا بیٹھا اور وہ دونوں ایک بار پھر سر جوڑ کر باتوں میں مصروف

ہو گئے تاہم کنڈکٹر کبھی کبھار مڑ کر میری طرف دیکھ لیتا تھا لیکن یہ مجھے یقین تھا کہ اس نے ڈرائیور کو میرے بارے میں نہیں بتایا تھا... میں دل ہی دل میں اس شخص کا بے حد شکر گزار تھا۔ بات بظاہر کچھ بھی نہیں تھی لیکن درحقیقت اس شخص نے میرا بہت بڑا مسئلہ حل کیا تھا۔ حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات صرف پانچ دس روپے کی وجہ سے انسان کتنی مشکل میں پھنس جاتا ہے' اس کا صحیح معنوں میں اندازہ مجھے آج ہوا تھا۔ میں اس پوزیشن میں بھی نہیں تھا کہ کنڈکٹر یا ڈرائیور کو مارپیٹ کر یا کسی اور طریقے سے مجبور کر سکتا کہ وہ مجھے بس میں سفر کرنے دیتے۔ اور اس سڑک سے بس کے علاوہ کوئی اور سواری میسر آنی مشکل تھی۔

سفر بخیر و عافیت ہی گزر گیا۔ دن چڑھنے تک تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ بس گویا سڑک کے کنارے نظر آنے والے ہر درخت اور ہر جھاڑی کے پاس رکتی ہوئی جا رہی تھی کیونکہ ہر درخت اور جھاڑی کے پاس کوئی نہ کوئی مسافر گٹھڑی' پوٹلی یا ٹرنک اٹھائے کھڑا ہوتا تھا۔ یہ لوگوں کے اپنے ہی مقرر کردہ بس اسٹاپ تھے۔ دس بجے تک تو یہ عالم ہو گیا کہ بس تو مجھے کہیں نظر ہی نہیں آ رہی تھی' دائیں بائیں اوپر نیچے بس مسافر ہی مسافر تھے۔ میں کھڑکی کے پاس بیٹھا تھا لیکن کھڑکی سے باہر دیکھنے سے قاصر تھا۔

میں اس وقت اپنے آپ کو دوسرے بہت سے تربوزوں کے انبار تلے دبا ہوا ایک تربوز محسوس کر رہا تھا۔ موسم حالانکہ سردیوں ہی کا تھا لیکن بس کے اندر موسم تبدیل ہو چکا تھا۔ یہاں تو اچھی خاصی گرمیاں آ گئی تھیں۔ اندر گو کہ تل دھرنے کی جگہ نہیں رہی تھی لیکن بس ڈگمگاتی' ڈولتی اب بھی جگہ جگہ رکتی جا رہی تھی اور ہر جگہ کنڈکٹر یہی آواز لگا رہا تھا۔ اندر تے آؤ پاء جی...... بڑی جگہ اے..... دل اچ جگہ ہونی چاہدی اے....."

میں اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اب بھی مزید مسافروں کو اندر ٹھونسے جا رہا تھا اور اپنے اس کمال کے لئے وہ بلاشبہ کسی نہ کسی ایوارڈ کا مستحق تھا ورنہ میں تو یہی سوچ کر پریشان تھا کہ جو مسافر اب تک اندر ٹھونسے جا چکے ہیں انہیں کیسے باہر نکالا جائے گا' چہ جائیکہ اس میں مزید مسافر ٹھونستا۔

بس کے اندر کی گھٹن اور مختلف لوگوں کے پسینے کی ہمک سے میرا دل خراب ہونے لگا۔ اوپر سے میں بہت تنگ سی جگہ میں پھنسا بیٹھا تھا۔ دو سیٹوں کے درمیان جگہ اتنی کم تھی کہ مجھ جیسے لمبے تڑنگے آدمی کے لئے تو اس جگہ میں اپنی ٹانگیں "فٹ" کرنا ہی ایک مسئلہ تھا۔ مزید یہ کہ آڑے ترچھے کھڑے ہوئے لوگ ہر طرف سے مجھ پر جھکے ہوئے تھے۔ ایک بار تو میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس سے تو بہتر تھا میں پیدل لاہور کی طرف سفر شروع کر دیتا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے خیال آیا کہ شاید میری آرام دہ زندگی اور ایک عرصے سے میرے ارد گرد پھیلی ہوئی آسائشوں نے مجھ پر اثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ ورنہ ایک عام انسان کی زندگی تو یہی ہے۔ ہمارے ہاں کم از کم ستر فیصد لوگ تو انہی تمام مسائل اور انہی تمام معمولات کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ اور میں چاہتا تھا کہ میں ان تمام چیزوں سے مانوس رہوں۔ خواہ میں کتنا ہی مزید دولتمند ہو جاؤں لیکن ایک عام آدمی کی زندگی گزارنا میرے لئے کبھی بھی مسئلہ نہ بنے۔ اب بھی روزمرہ کی مختلف ورزشوں اور مختلف فنونِ حرب کی مشق کی بدولت میرا جسم تو تمام مشقتیں' صعوبتیں اور سختیاں برداشت کرنے کا عادی تھا لیکن مزاج میں شاید کہیں تھوڑی بہت نزاکت آ گئی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اب اس طرف سے بھی خبردار رہوں گا اور مزاج میں اس نزاکت کو جڑ نہیں پکڑنے دوں گا۔

اس عزم کے ساتھ ہی میری طبیعت سے ناگواری ختم ہو گئی اور میں نے اپنے آپ کو اس ماحول کا ایک حصہ محسوس کرنا شروع کر دیا۔ اسی لمحے ایک اور مسئلے نے ستانا شروع کر دیا۔ بھوک پیاس بڑی شدت سے محسوس ہونے لگی۔ میں اچھا خاصا خوش خوراک آدمی تھا اور خاصا طویل وقت میں نے کڑی مشقت اور دوڑ بھاگ میں گزار دیا تھا۔ اس دوران ایک کھیل بھی اڑ کر منہ میں نہیں گئی تھی اور ایک بوند پانی بھی نہیں پیا تھا۔ اب حالات کا تناؤ کچھ کم ہوا تھا تو معدے وغیرہ نے بھی بڑی شدت سے اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا تھا بلکہ اب تو گویا معدے میں ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔

راستے میں زیادہ تر اسٹاپ قصبے دیہات کے تھے۔ بس جہاں بھی رکتی باہر سے نوجوانوں اور بچوں کی بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دیتیں۔ میں بمشکل انسانی بازوؤں' گردنوں اور پگڑیوں کے درمیان کوئی جھری سی پا کر کھڑکی سے باہر دیکھتا۔ مختلف عمروں کے لڑکے مختلف چیزیں فروخت کرنے کی کوشش میں دیوانہ وار بس کے گرد چکر لگاتے نظر آتے۔ کوئی تھال میں پکوڑے سجائے ہوئے تھا اور کوئی کینو' مالٹے اٹھائے ہوئے تھا۔ کسی نے گنڈیریوں کی تھیلیاں انگلیوں میں پھنسائی ہوئی تھیں تو کسی نے دال موٹھ اور مونگ پھلی کی۔ کوئی قلفیوں کا تھرماس اٹھائے ہی بھاگا پھر رہا تھا اور نمونے کے طور پر دو قلفیاں ہوا میں لہرا رہا تھا۔

پکوڑوں پر خواہ کتنی ہی دھول جمی ہوئی تھی اور دال موٹھ خواہ کتنی ہی باسی تھی' مونگ پھلیاں خواہ کتنی ہی ناقص تھیں اور قلفیوں پر چاہے کتنی ہی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں مگر اس وقت یہ چیزیں مجھے بہت اچھی لگ رہی تھیں۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی بھی طرح کھڑکی سے بازو نکال کر کچھ نہ کچھ چیزیں تو جھپٹ ہی لوں کیونکہ میں خرید تو سکتا نہیں تھا' جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی... مگر اس خواہش کی تمام تر شدت کے باوجود میں مضبوطی سے منہ بند کئے اور اپنے آپ کو سکیڑے سمیٹے اسی طرح بے حس و حرکت

بیٹھا رہا۔ وضعداری بھی آخر کوئی چیز ہے۔

خدا خدا کر کے مجھے آوازوں سے یہ اندازہ ہونے لگا کہ ہم لاہور کے قریب پہنچ رہے ہیں۔ اس دوران بس میں سے ہجوم بھی چھٹنے لگا تھا اور مسافر اس حالت میں واپس آنے لگے تھے کہ اپنے آپ کو تربوز کے بجائے انسان محسوس کر سکتے۔ ٹول ٹیکس کی کراسنگ سے گزرنے کے بعد تو بس میں بہت ہی کم مسافر رہ گئے۔

بیشتر بسیں واپسی میں بھی کچھ دیر کے لئے راوی چوک پر رکتی تھیں۔ یہ بس بھی رک گئی۔ اِکا دُکا مسافروں کو یہاں بھی اترنا تھا... ان کے اترتے ہی سیاہ جینز اور چمڑے کی جیکٹ میں ایک اسمارٹ سا نوجوان پی کیپ پیشانی پر قدرے جھکائے بس میں چڑھا اور پائیدان پر کھڑے ہی کھڑے متلاشی سی نظروں سے تمام مسافروں کا جائزہ لینے لگا۔

آخرکار اس کی نظر مجھ پر آن رکی اور میں گہری سانس لے کر رہ گیا' وہ شبیر شیخ تھا۔ مجھے بس میں موجود پا کر اسے یقیناً بہت خوشی ہوئی تھی اور اس نے سکون کی گہری سانس بھی لی ہوگی لیکن اس کے تاثرات میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کے چہرے پر کوئی تاثر ہی نہیں ابھرا۔ اس کا پتھریلا چہرہ بدستور سپاٹ رہا۔

میرے قریب آ کر وہ بڑے اطمینان سے نہایت دھیمی آواز میں بولا "آئیے سر!"

انداز ایسا ہی تھا جیسے میں طے شدہ پروگرام کے تحت ائرپورٹ یا ریلوے اسٹیشن پر اترا تھا' شبیر شیخ کو بذریعہ خط یا ٹیلیگرام میری آمد کی اطلاع تھی اور وہ مجھے لینے آیا ہوا تھا۔ میں گہری سانس لے کر قدرے مشکل سے اٹھ کھڑا ہوا۔ مشکل سے اس لئے کہ ایک لمحے کے لئے مجھے یہی محسوس ہوا کہ میں جس پوزیشن میں بیٹھا تھا' اسی حالت میں میرے ہاتھ پیروں کے جوڑ 'جام' ہو گئے ہیں۔

نہایت خاموشی سے ہم دونوں آگے پیچھے بس سے اتر آئے'... کسی نے ہماری طرف توجہ نہیں دی۔ حتیٰ کہ اس بس کے کنڈیکٹر نے بھی۔ وہ اس وقت بس سے اتر کر ایک دوسرے کنڈیکٹر کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔

بس سے اتر کر شبیر شیخ کی رہنمائی میں چند قدم چلنے کے بعد میں نے اس سے کہا۔ "شبیر! جس بس سے میں اترا ہوں اس کے کنڈیکٹر کو کچھ دے آؤ۔ اس سے کہنا جن صاحب کو تم نے بلا ٹکٹ سفر کرنے دیا تھا یہ ان کی طرف سے ہیں' شکریئے کے ساتھ۔"

میں چاہتا تھا اس کا یہ جذبہ آئندہ بھی برقرار رہے اور اگر وقت کسی شریف پر نامہربان ہو اور سفر کرنا اس کی مجبوری ہو تو کنڈیکٹر شاید کچھ سوچ کر اس کے ساتھ بھی مہربانی ہی کا سلوک کرے۔

"اوکے سر!" شبیر شیخ نے بلا تامل اور بلا تجسس کہا۔ جیب سے پرس نکال کر اس نے سو سو کے پانچ کرارے نوٹ گنے اور واپس بس کی طرف بڑھ گیا۔ میں ایک بس کی آڑ میں ہو گیا تاکہ کنڈیکٹر مجھے نہ دیکھے۔

چند لمحے بعد شبیر شیخ لوٹ آیا اور سرسری سے لہجے میں بولا۔ "وہ لے نہیں رہا تھا۔ کہہ رہا تھا' میں نے کسی صلے کے لالچ میں احسان نہیں کیا' میں پہچان گیا تھا کہ وہ کوئی شریف اور بڑا آدمی ہے' آخر ہم بھی روز ہزاروں آدمیوں کی شکل دیکھتے ہیں' آدمی آدمی کو پہچانتے ہیں لیکن میں نے ایسا کسی بدلے کے لالچ میں نہیں کیا تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔ بڑی باتیں کر رہا تھا لیکن میں بہرحال پیسے اسے دے آیا۔"

"گڈ" میں نے ایک بے عنوان سا اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر شبیر شیخ کے ساتھ چل دیا۔ چند قدم دور سڑک کے کنارے ایک درخت کی چھاؤں میں شبیر کی گاڑی کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں اس خوبصورت' چمچماتی گاڑی کا دروازہ میرے لئے کھولا اور میں اپنے جسم پر جھولتے ہوئے چیتھڑوں اور خاک میں لتھڑے ہوئے سراپا کے ساتھ اس میں بیٹھ گیا۔

گاڑی سڑک پر آ گئی تو میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا "یہ کیا قصہ ہے بھئی؟ تم یہاں کیسے موجود ہو؟"

"ہم سب لوگ آپ کی تلاش کے سلسلے میں حرکت میں آ چکے تھے سر!" اس نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا "یہ ایک اتفاق تھا کہ ٹونی نے شاہی بازار کی ایک گلی میں آپ کی کار پھنسی کھڑی دیکھ لی۔ آپ کو غالباً کار وہاں چھوڑے زیادہ دیر نہیں گزری تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ وہاں کچھ دیر پہلے کچھ ہنگامہ ہوا ہے۔ پولیس ابھی نہیں پہنچی تھی۔ ٹونی کو یہ اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ آپ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔ وہ فوری طور پر آپ کی گاڑی وہاں سے نکال لایا۔ اس کے بعد ہم نے آپ کی تلاش شروع کی۔ آپ کی سیکریٹری کیتھرین کو ہم نے رات گئے اس کے گھر فون کر کے جگایا۔ اس سے پتا چلا کہ گزشتہ روز کا آپ کا آخری پروگرام ایک ڈنر میں شرکت کرنا تھا۔ فوراً ہی یہ بھی تصدیق ہو گئی کہ آپ نے ڈنر میں تو شرکت کی تھی اور رات گئے ہوٹل سے نکلے تھے' اس کے بعد سے آپ کا کوئی پتا نہیں تھا۔ میں نے فوراً تمام کارکنوں کو الرٹ کر دیا۔ ہم شہر سے باہر جانے والے تمام راستوں اور ریلوے اسٹیشن پر پھیل گئے۔ حنیف خان اور سردار علی نے تو فوراً دو دو آدمی ساتھ لے کر فوری طور پر اپنے آپ کو خفیہ پولیس کے آدمی قرار دے دیا اور جی ٹی روڈ اور لاہور شیخوپورہ روڈ پر عام کاروں میں بھی جھانک کر دیکھنا شروع کر دیا لیکن آپ کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ہمیں امید بھی کم ہی تھی۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ آپ شہر میں ہی ہیں یا پھر ہمارے حرکت میں آنے سے پہلے ہی شہر سے باہر لے جائے جا چکے ہیں۔"

"میں دوسرے امکان کا شکار ہوا تھا۔" میں نے گویا اس کی تسلی کے لئے بتایا۔

"بہرحال صبح کے قریب میں نے ازراہِ احتیاط۔ یا شاید اپنی کسی نامعلوم حِس کے کہنے پر بیرونِ شہر سے آنے والی بسوں کو بھی چیک کرنا شروع کردیا اور اب نہایت غیر متوقع طور پر آپ اس کھٹارا بس کے ایک کونے میں بیٹھے ہوئے مل گئے۔"

"میں خود بھی اس وقت خاصی کھٹارا حالت میں ہوں۔" میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ میں اس کے برابر والی سیٹ پر ہی بیٹھا تھا تاکہ باتیں کرنے میں آسانی رہے۔

اس نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا بلکہ پُرخیال سے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے میں ٹرانسیٹر استعمال کرہی لوں' میں حنیف خان کو اطلاع کردیتا ہوں کہ باس بخیروعافیت واپس آگئے ہیں۔ وہ تمام پوائنٹس پر سے آدمیوں کو ہٹالے گا۔"

ہماری کاروں میں عام ریڈیو اور ٹیپ ریکارڈر ہی کی صورت میں ٹرانسیٹر فٹ تھے۔ ان کے مائیک بھی الگ نہیں تھے۔ محض ایک سوئچ کے استعمال سے یہ مختلف فریکوئنسیز پر کام کرسکتے تھے لیکن ہمیں ان کے استعمال کی ضرورت شاذونادر ہی پیش آتی تھی۔

گاڑی ایئرکنڈیشنڈ تھی اور شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ شبیر شیخ چلتی گاڑی میں ہی ٹرانسیٹر پر حنیف خان کے لئے پیغام نشر کرنے لگا۔ پیغام جلد ہی ریسیو کرلیا گیا۔ شبیر نے اسے میرے مل جانے کی خبر سنائی۔ میں نے ٹرانسیٹر پر ہی حنیف خان کا فاتحانہ سا نعرہ سنا۔ حنیف خان کم ازکم میرے معاملے میں خاصا جوشیلا آدمی تھا۔۔۔ وہ ایسے موقعوں پر اپنے جذبات کا تھوڑا بہت اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ جبکہ شبیر شیخ بھی اندر ہی اندر بہت جذباتی آدمی تھا لیکن بظاہر وہ جھیل کی طرح پُرسکون رہتا تھا۔ شبیر نے اس کے جوشیلے نعرے کے جواب میں کچھ کہے بغیر ٹرانسیٹر کا سوئچ آف کردیا۔

مجھے اپنے آدمیوں کی مستعدی پر فخر محسوس ہورہا تھا۔ میرے گروپ آف کمپنیز میں کام کرنے والے تمام کارکنوں کی تعداد یوں تو کئی ہزار کو پہنچتی تھی لیکن ظاہر ہے' وہ سب سیدھے سادھے عام کارکن تھے۔ اپنا دفتری یا ٹیکنیکل کام سرانجام دیتے تھے اور تنخواہ لیتے تھے لیکن میرے پرانے اور خاص آدمیوں کی تعداد صرف چالیس کے قریب تھی جو کوئی غلط سلط دھندا نہیں کرتے تھے لیکن اب بھی میرے لئے ایک گروہ کی سی صورت میں کام کررہے تھے۔ وہ سب میرے جائز کاروبار میں کسی نہ کسی عہدے پر فائز تھے لیکن سب اپنی جگہوں پر ان گنت صلاحیتوں کے مالک تھے' وقت پڑنے پر ان میں سے ہر ایک نہ جانے کیا کچھ بن سکتا تھا۔

شہر میں جب بھی امنِ عامہ سے متعلق کوئی مسئلہ کھڑا ہوتا تھا تو میں کسی نہ کسی بڑے افسر کا یہ بیان پڑھتا تھا کہ شہر میں آبادی کے لحاظ سے پولیس کی تعداد کم ہے۔ میرے صرف چالیس آدمی ضرورت پڑنے پر پورے شہر کو کھنگال سکتے تھے جبکہ انہیں پولیس جیسے اختیارات بھی حاصل نہیں تھے۔ سوال دراصل صرف یہ تھا کہ آپ جو کچھ بھی کرنے جارہے ہیں اس کام سے کس حد تک مخلص ہیں؟ اور آپ کا کردار کیا ہے؟ اگر اخلاص اور کردار نہ ہو تو تعداد کتنی ہی بڑھاتے جایئے' کوئی فائدہ نہیں ہوگا' کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا' کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا بلکہ مسائل بڑھتے ہی جائیں گے۔ مقصد کبھی حاصل نہیں ہوپائے گا۔۔۔ لیکن یہ بات میں کسی کام کے آدمی کو نہیں سمجھا سکتا تھا۔ اور پھر سمجھنا چاہتا بھی کون تھا؟ یا شاید سمجھتے سب تھے لیکن سب کی اپنی اپنی مجبوریاں تھیں یا اپنی اپنی مصلحتیں۔

میں نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے کہا "میری یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ ٹونی شاہی بازار میں کیا کرنے گیا تھا؟"

شبیر بلا تامل بولا "سر! وہاں ایک رقاصہ ہے ثمینہ۔۔۔ اس سے اس کا زوردار عشق چل رہا ہے۔"

ٹونی ایک وجیہہ نوجوان تھا لیکن میری معلومات کے مطابق وہ "عورت پروف" تھا۔ کسی سے متاثر ہوتا بھی تھا تو صرف اپنا مطلب نکالنے کی حد تک۔ عشق محبت جیسے الفاظ اس کی ڈکشنری میں نہیں تھے لیکن اب یکایک موصوف کے عشق فرمانے کی اطلاع بھی ملی تھی تو ایک رقاصہ سے' طوائف سے۔ مجھے معمولی سی حیرت ہوئی۔

"ٹونی کو ایسی عورتوں کے چکر میں نہیں پھنسنا چاہئے۔ یہ آدمی کو بے وقوف بنانے اور لوٹنے کی کوشش کرتی ہیں اور اگر آدمی ان کے ساتھ سنجیدہ ہوجائے تو اسے آخر میں عموماً خطرناک جذباتی دھچکا برداشت کرنا پڑتا ہے" میں نے مُربیانہ لہجے میں کہا۔

"ٹونی بے وقوف بننے والی چیز نہیں ہے سر!" شبیر اپنے مخصوص مطمئن لہجے میں بولا "وہ آج کل کی لڑکیوں میں سے کسی کے ساتھ اسی لئے تو سنجیدہ نہیں ہوپاتا کہ ان میں اسے خلوص نظر نہیں آتا۔ وہ عموماً اپنی اپنی غرض کا پیمانہ لئے پھررہی ہوتی ہیں۔۔۔ اسی سے انسان کو ناپتی ہیں اور جو اس پر پورا اترتا ہے اس پر مہربان ہوجاتی ہیں۔ اس میں اندر سے امنڈنے والے کسی جذبے یا کسی بے ساختگی کو دخل نہیں ہوتا۔"

"اوہو۔ تم تو اچھے خاصے فلسفی ہوگئے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سر! یہ میں اپنے نہیں' ٹونی کے خیالات بیان کررہا ہوں" شبیر مؤدبانہ لہجے میں بولا "اس رقاصہ ثمینہ میں یقیناً اسے کچھ خلوص کی جھلک نظر آئی ہے جو وہ اسے اتنی اہمیت دینے لگا ہے ورنہ وہ اس صنف کو اتنی اہمیت کہاں دیتا ہے؟ ثمینہ کی نائیکہ ٹائپ ماں نے دو ایک مرتبہ اس سے تحائف منگانے کی کوشش کی تھی لیکن لڑکی نے خود ہی اکیلے میں ٹونی کو منع کردیا کہ اس کے لئے کسی قسم کی کوئی چیز لانے کی ضرورت نہیں' اسے کچھ نہیں چاہئے اور ان کے ہاں کسی چیز کی کمی بھی نہیں ہے۔ بہت دولتمند لڑکی ہے سر! مجھے لگتا ہے سچ مچ ٹونی پر مرمٹی ہے۔"

"بھئی میں اپنے ساتھیوں کی نجی زندگی میں مداخلت تو نہیں کرتا لیکن جو مشورہ بہتر سمجھتا ہوں وہ دے دیتا ہوں" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اسی لئے تو ہم آپ کے جاں نثار ہیں سر۔ کہ آپ نے ہمیں آزادی دی ہے' عزت اور محبت دی ہے۔ خوشحالی دی ہے۔۔ ورنہ شاید ہم سب بہت معمولی لوگ ہوتے" پہلی بار اس کے لہجے میں ہلکی سی جذباتیت کی جھلک محسوس ہوئی۔

"یہ سب خدا کی مہربانیاں ہیں۔ میں کسی کو کیا دے سکتا ہوں۔ میں تو بڑا گناہ گار سا آدمی ہوں" میں نے حقیقتاً بے حد عاجزی و انکساری سے کہا۔

"اللہ تعالیٰ بھی کسی کو وسیلہ بنادیتا ہے نا جی۔" شبیر نے ریڈ سگنل پر گاڑی روکتے ہوئے کہا۔ "ہمارے لئے اللہ نے آپ کو ہی وسیلہ بنادیا۔"

میں خاموش رہا' ایک لمحے کے لئے گاڑی میں بے حد خاموشی چھاگئی۔ انجن اور ایئرکنڈیشنر کی خفیف سی سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ شبیر گویا موضوع بدلنے کی غرض سے بولا "آپ کی تلاش کے سلسلے میں میں سیٹھ عالم شیر کے پاس بھی گیا تھا۔ وہ مشکوک حالات میں آپ کے غائب ہونے کا سن کر کچھ عجیب' معنی خیز سے انداز میں مسکرایا تھا۔ ہم اسے دوستوں' ہمدردوں اور سابق ہم مشرب لوگوں میں شمار کرتے ہیں۔۔۔ مگر سر! مجھے اس کی مسکراہٹ کچھ اچھی نہیں لگی۔ مجھے اس میں کسی گڑبڑ گھٹالے کی جھلک محسوس ہوئی۔ معلوم نہیں مجھے کیوں شبہ ہوا کہ وہ آپ کی گمشدگی کے راز سے واقف تھا یا اگر یہ میری غلط فہمی تھی تو وہ یہ خبر سن کر خوش تو ضرور ہوا تھا۔ دل ہی دل میں۔ مگر بظاہر تشویش زدہ ہوکر سوالات کرنے لگا۔ سر! اس میں کوئی تبدیلی ضرور آئی ہے۔"

میرے ذہن کے کسی گوشے میں مدھم سی گھنٹی بجی۔ سیٹھ عالم شیر بھی اس روز مجھ سے خفا ہوکر گئے تھے جس روز قیصر ملک مجھے دھمکیاں دینے آیا تھا اور ذلیل و خوار ہوکر گیا تھا۔ سیٹھ عالم شیر نے اس بات پر پوری طرح یقین نہیں کیا تھا کہ میں ان کی لائن چھوڑ چکا ہوں۔ میں نے ان کا کام کرنے سے انکار کردیا تھا تو ان کے تاثرات' ان کی آنکھیں یک لخت بدل گئی تھیں' تاہم میں نے اس وقت یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ عملی طور پر میرے خلاف کوئی قدم اٹھاسکتے ہیں۔

وہ نمازی پرہیزگار آدمی تھے۔ دھندا ان کا خواہ کچھ بھی تھا اور نظریات چاہے جو بھی تھے لیکن میں نے ان میں ہمیشہ اچھی عادتیں ہی دیکھی تھیں۔ ویسے بھی میں خوش گمان آدمی تھا۔ ہر آدمی کے بارے میں اس وقت تک اچھے خیالات رکھنے کی کوشش کرتا تھا جب تک وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ بہرحال اس دنیائے حرص و ہوس میں مَیں نے لوگوں کو جس طرح بدلتے ہوئے دیکھا تھا اس کے تجربات بھی میرے پاس کچھ کم نہیں تھے۔ ایک شخص کے اگر آپ سے کچھ مفادات' کچھ توقعات وابستہ ہوتی ہیں اور آپ کسی مجبوری کے تحت یکدم ان مفادات' ان توقعات کی زنجیر توڑ دیتے ہیں تو پھر اس شخص کی اصل شکل نظر آتی ہے۔ اس وقت پتا چلتا ہے کہ وہ اندر سے کیسا آدمی ہے۔ فطرتاً وہ جیسا بھی ہوگا ویسا ہی ردِعمل ظاہر کرے گا۔

کوئی بعید نہیں تھا کہ میرا انکار سن کر سیٹھ عالم شیر نے بھی اپنا خوش نما خول اتارلیا ہو لیکن گزشتہ رات کے واقعات میں اس کا کردار کہیں فٹ ہوتا نظر نہیں آرہا تھا۔ مجھے اغوا کرنے والے تو سیدھے قیصر ملک کی حویلی پر ہی لے گئے تھے اور ان کی باتوں سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی خدمات صرف قیصر ملک نے ہی حاصل کی تھیں' سیٹھ عالم شیر کا تو کہیں اشارتاً نام تک نہیں آیا تھا۔ تو پھر اس کا ان واقعات سے کس طرح کا اور کس حد تک تعلق ہوسکتا تھا؟ بظاہر تو کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا لیکن میں شبیر شیخ کے محسوسات کو بھی نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ بہت سے معاملات میں اس کی حسیات بھی میری ہی طرح غیر معمولی طور پر تیز تھیں۔ بہرحال سرِدست میں نے اس معاملے کو ذہن سے جھٹک دیا۔

شبیر بولا "سر! مجھے ابھی یہ تو نہیں معلوم کہ گزشتہ رات آپ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا لیکن میں نے جو بات کی ہے کیا آپ کو اس کا کوئی امکان نظر آتا ہے؟"

"فی الحال میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ تم تو سیٹھ عالم شیر سے مل آئے ہو۔ ایک بار میں بھی مل لوں تو پھر کوئی رائے قائم کروں گا" میں نے بے پروائی سے کہا "سرِدست تو میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں کہ کیا ہوا تھا' کیوں ہوا تھا" جس حد تک گاڑی میں گنجائش تھی میں نے ٹانگیں پھیلالیں اور سیٹ کے پشتے سے سر ٹکاکر آنکھیں بند کرلیں۔

شبیر قدرے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "گستاخی معاف سر! آپ ضرورت سے کچھ زیادہ بے پروا ہوگئے ہیں۔ میرا مطلب ہے ہر جگہ تنہا پھرتے رہنا اور کسی بھی قسم کا کوئی ہتھیار وغیرہ پاس نہ رکھنا۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے سر!"

"وہ۔۔۔ دراصل میرا خیال تھا کہ میرا کوئی قابلِ ذکر دشمن نہیں ہے" میں نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا "اور پھر اب میں نے لائن بدل لی ہے تو میرا خیال تھا کہ اب مجھے کم خطرات لاحق ہوا کریں گے۔ میں ایک عام اور شریف آدمی کے سے انداز و اطوار اپنانے کی کوشش کررہا تھا۔"

"آپ بے شک شریف آدمی بن کر رہیں سر! بلکہ ہمارے

خیال میں تو آپ پہلے بھی بہت شریف ہی آدمی تھے۔ آپ نے صرف اپنا کاروباری سیٹ اپ ہی تھوڑا سا تبدیل کیا ہے اور آپ کی وجہ سے ہمیں بھی مزید سدھرنے کا موقع مل گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم لوگ احتیاطی تدابیر ترک کردیں۔ احتیاطی تدابیر کی ضرورت تو شریف آدمی کو بھی ہوتی ہے بلکہ آج کے دور میں تو شریف آدمی کو زیادہ ہوتی ہے۔"

"میں اب خیال رکھوں گا" میں نے وعدہ کیا۔

"ہم بھی خیال رکھیں گے۔ اس کا برا مت منایئے گا اور ہمیں منع بھی مت کیجئے گا سر!" وہ دھیمے لہجے میں بولا "زمانہ بہت ترقی کرگیا ہے۔ لوگ ہمیں ہمارے رجعت پسندانہ سے خیالات اور نظریات کے ساتھ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہنے دیں گے۔"

میں کوئی جواب نہ دے سکا کیونکہ کار خفیف سے دھچکے کے ساتھ رک گئی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ گاڑی میری کوٹھی کے سامنے رک چکی تھی اور چوکیدار گیٹ کھول رہا تھا۔ ہماری گاڑی ڈرائیو وے میں داخل ہونے لگی تھی کہ ہمارے عقب میں ایک اور گاڑی نمودار ہوئی۔ وہ بھی ہمارے پیچھے ہی ڈرائیو وے میں داخل ہوئی۔ یہ جولی عرف مس ٹریپ کی چھوٹی سی خوب صورت کنورٹیبل فوکس ویگن تھی۔

میں اور شبیر گاڑی سے اترے۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ اسی لمحے مس ٹریپ بھی اپنی گاڑی سے اتر رہی تھی۔ وہ سفید ٹی شرٹ اور نیوی بلو جینز میں تھی۔ تراشیدہ، ریشمی اور گھرے سیاہ بال کندھوں پر جھول رہے تھے۔ گلے میں سادھوؤں جیسے موٹے موٹے منکوں والی مالا تھی۔ وہ گویا ایک ہی زقند بھر کر مجھ تک پہنچی۔

اس کا سانولا سلونا چہرہ گویا شدتِ جذبات سے تمتمارہا تھا اور موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں جیسے آنسو چھلکنے کو بے تاب تھے۔ اس نے والہانہ انداز میں میرے دونوں ہاتھ تھام لئے۔ اس کے ہونٹوں میں خفیف سی لرزش اور ہاتھوں میں محبت کی گرمی و گداز اور اس کے ساتھ ہی نہایت طاقتور انسانوں والی مضبوطی بھی تھی۔

"سر! مجھے چند منٹ پہلے ہی ٹرانسیٹر پر اطلاع ملی ہے کہ آپ واپس آگئے ہیں۔ میں آندھی طوفان کی طرح ہیڈ کوارٹر سے یہاں پہنچی ہوں۔ صرف یہ دیکھنے کے لئے کہ آپ خیریت سے تو ہیں نا" وہ مرتعش سے لہجے میں بولی۔ وہ ایسی عورت تھی جس کے لہجے میں ارتعاش شاذ و نادر ہی آتا تھا۔

میں نے ایک نظر اپنے خراش زدہ اور مٹی میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں جولی اور تمہارا بے حد شکرگزار ہوں کہ تم نے میرے لئے اس قدر تشویش محسوس کی۔"

مجھ سے پہلے وہ قاسم خان کی ملازم تھی اور اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اس کے احکامات کی تعمیل اور اس کے مفادات کی حفاظت میں مخلص تھی۔ لیکن یہ بس پیشہ ورانہ خلوص تھا۔ اور ایک محدود پیمانے پر تھا لیکن جب سے جولی اور دوسرے لوگ میرے ساتھی بنے تھے تب سے ان کا خلوص صرف کاروباری حدود میں مقید نہیں رہا تھا۔ یہ خلوص بے کراں ہوگیا تھا۔ مجھ سے ان کی وابستگی میں ایک بے عنوان سی محبت بھی شامل ہوگئی تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ مجھے اپنے گھر میں کبھی افرادِ خانہ کی کمی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ ان سب لوگوں کی محبتیں ہمہ وقت میرے گرد ایک ہالہ سا بنائے رکھتی تھیں۔

جولی نے میرے ہاتھ چھوڑ دیئے اور ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی "بس اب میں چلتی ہوں۔ آپ آرام کیجئے۔ تفصیلی بات آپ سے تب ہی ہوگی جب آپ مجھے یاد فرمائیں گے۔"

"یہ کیسا آنا ہوا بھئی؟" میں نے حیرت سے کہا "تم میری فکر نہ کرو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اور جہاں تک آرام کا سوال ہے تو بس اب گھر پہنچنے کے بعد تو آرام ہی آرام ہے۔ تم کچھ دیر تو بیٹھو!"

"نہیں سر!" وہ انگلی ہلاتے ہوئے بولی "ہیڈ کوارٹر میں میرا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے نا۔ میں کسی اور کو ہدایت بھی دے کر نہیں آئی۔ آپ کی خیر و عافیت جاننے کے لئے ٹرانسیٹر پر دھڑا دھڑ سگنل موصول ہو رہے ہوں گے۔ ان کا کوئی نوٹس ہی نہیں لے گا۔ کسی کو پتا ہی نہیں چلے گا۔ ٹیلیفون تو چلو مراتب علی اٹینڈ کرلے گا لیکن آپ کے بارے میں وہ بھی کسی کو کچھ نہیں بتا سکے گا۔"

"اچھا۔ جیسے تم مناسب سمجھو" میں نے کندھے اچکائے اور کوٹ کی آستینیں تقریباً علیحدہ ہونے کی وجہ سے کندھے کچھ زیادہ ہی اچک گئے "آئی تو تھیں تم آندھی طوفان کی طرح۔ لیکن اب واپس بادِ بہاری کی طرح جانا" وہ میری اس نصیحت پر زندگی سے بھرپور انداز میں ہنس دی۔

شبیر بولا "میں بھی جولی کے پیچھے پیچھے ہیڈ کوارٹر جاتا ہوں۔ اپنے آدمیوں کو کچھ ضروری ہدایت دینی ہوں گی۔ وہیں سے دے دوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں جلد ہی تم سے رابطہ قائم کروں گا" میں نے کہا اور انہیں خدا حافظ کہہ کر برآمدے کی طرف بڑھ گیا وہ دونوں اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوگئے۔

○☆○

دو دن میں گویا حالات معمول پر آگئے۔ میں آفس جانے لگا۔ اس دوران اخبار میں دو خبریں بھی آگئیں جن کی مجھے توقع تھی۔ ایک تو شاہی بازار کی ایک گلی میں ایک لاش پائے جانے کی خبر تھی۔ لاش کی شناخت نہیں ہوسکی تھی تاہم پولیس نے اندازہ قائم کیا تھا کہ وہ کوئی جرائم پیشہ شخص تھا اور کسی غلط فہمی یا کسی جھگڑے کے باعث اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھوں قتل ہوگیا تھا۔ خبر سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس سلسلے میں رسمی سی پوچھ گچھ کی گئی تھی۔ یہ یقیناً وہی شخص تھا جو میری گولی کا نشانہ بنا تھا۔ پولیس کا یہ اندازہ تو درست ہی تھا کہ وہ جرائم پیشہ تھا لیکن یہ جان کر مجھے مایوسی ہوئی تھی کہ پولیس اس کے بارے میں کوئی معلومات حاصل نہیں کرسکی تھی۔

جس گروہ سے وہ وابستہ تھا وہ ایک طرح سے کرائے کے بدمعاشوں ہی کا گروہ تھا۔ اور براہِ راست مجھ سے ان کی کوئی دشمنی نہیں تھی پھر بھی میں ان کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا تاکہ اگر کبھی فرصت میسر آئے اور حالات اجازت دیں تو انہیں بھی تھوڑا سا کھنگالا جائے اور بتایا جائے کہ وہ محض معاوضے کی خاطر ہر شخص پر آنکھیں بند کرکے ہاتھ نہ ڈالا کریں تو بہتر ہے۔ بہرحال قیصر ملک تو میرے سامنے موجود تھا۔ جس نے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ ضرورت پڑنے پر کسی نہ کسی طرح اس گروہ کا سرا تو ہاتھ آہی سکتا تھا۔

دوسری خبر گاؤں کی تھی اور خاصی نمایاں سرخی کے ساتھ چھپی تھی۔ خبر میں بتایا گیا تھا کہ علاقے کے ممتاز زمیندار قیصر ملک کی حویلی پر ڈاکوؤں نے دستی بموں سے حملہ کردیا۔ وہ کچھ لوٹ کرلے جانے میں تو کامیاب نہیں ہوسکے تاہم حویلی کا خاصا حصہ منہدم ہوگیا اور جانی نقصان بھی ہوا۔ قیصر ملک کی رشتے کی کوئی خالہ مہمان آئی ہوئی تھیں۔ وہ ایئر کنڈیشنڈ کمرا چھوڑ کر صحن میں سوئی ہوئی تھیں۔ ان کے تو پرخچے اڑ گئے۔ دو محافظ اور ایک نوکر بھی لقمۂ اجل بنے۔

دھماکے سے قیصر ملک کو کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن اس کے فوراً بعد ہی وہ صورتِ حال کا جائزہ لینے کے لئے دوڑا تو تاریکی میں منہدم شدہ ایک ستون سے نکلا ہوا شکستہ سریا اس کی پنڈلی میں گھس گیا۔ یوں گویا اب اسے بھی کچھ دن بستر میں لیٹ کر گزارنے تھے۔ دوسرے دو تین آدمی بھی معمولی زخمی ہوئے تھے۔

خبر پڑھ کر میں مسکرا دیا۔ قیصر ملک نے واقعے کو یہ رنگ دے کر گویا اپنے اس دعوے کی لاج رکھی تھی کہ جنگ اب صرف میرے اور اس کے درمیان تھی۔ لیکن اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اب وہ پولیس کو یہ تو بتا نہیں سکتا تھا کہ وہ مجھے اغوا کروا کے اپنے ذاتی قید خانے میں ڈلوانے، پکوڑے کی طرح تلوانے اور نہ جانے میرا کیا کچھ بنوا دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا، جب کسی نامعلوم شخص نے حویلی پر دو طاقتور گرینیڈ پھینک مارے۔

اخبار میں ایک اسپتال کے بیڈ پر لیٹے ہوئے زخمی قیصر ملک کی تصویر بھی چھپی تھی۔ اس چھوٹی سی تصویر کو بغور دیکھ کر میں نے مسکراتے ہوئے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور دل ہی دل میں کہا 'اب میں تمہاری طرف سے ہوشیار ہوگیا ہوں قیصر ملک! اب تم شہر آؤ گے تو تمہارا شایانِ شان استقبال ہوگا پیارے!'

قیصر ملک کے بارے میں خبر صرف ایک اردو اخبار میں قدرے تفصیل سے چھپی ہوئی تھی۔ باقی اردو اخبارات میں نہایت اختصار سے چھپی تھی اور انگریزی اخبار میں تو بالکل ہی غیر نمایاں طور پر چند سطروں میں ایک کونے میں اندرونی صفحے پر چھپی تھی جہاں چھوٹے موٹے شہروں کی خبریں چھپتی تھیں۔

اخبارات ایک طرف ڈالنے کے بعد مجھے یاد آیا کہ دو ایک ضروری کام کرنے تھے۔ میں اس وقت آفس میں تھا۔ اپنے ڈائریکٹ فون پر میں نے حنیف خان سے رابطہ قائم کیا۔ وہ آج کل سرکلر روڈ پر واقع میرے ایک دفتر کا مینجر تھا جہاں سے اعلیٰ قسم کے بیش قیمت قالین ایکسپورٹ ہوتے تھے۔ لیکن اس نے بھی میرے کئی دوسرے خاص کارکنوں کی طرح بزنس اس طرح سیٹ کیا ہوا تھا کہ اسٹاف کی مدد سے وہ خودکار انداز میں چلتا رہے اور خود اسے اگر میرے کاموں سے کئی دن بھی غائب رہنا پڑے تو اس سے کاروباری معاملات میں کوئی فرق نہ پڑے۔

"یس سر! کیا حکم ہے؟" اس نے اپنے مخصوص مستعد لہجے میں کہا۔

میں نے اسے اپنے گاؤں کا حدود اربعہ اور پھر تاجاں کی جھونپڑی کا محل وقوع بتانے کے بعد کہا "اس جھونپڑی میں تاجاں نام کی ایک بیمار اور شکستہ حال عورت موجود ہوگی۔ اس سے کہنا تمہیں شہر بلایا گیا ہے۔ میرا نام لینا۔ اسے ساتھ لے آنا لیکن کوشش کرنا کہ تم کسی کی نظر میں نہ آؤ اور نہ ہی کوئی تاجاں کو تمہارے ساتھ رخصت ہوتے دیکھے۔ خطرے والی کوئی بات

نہیں ہے، لیکن گاؤں کے لوگ یونہی بس چھوٹی چھوٹی باتوں پر متجسس ہو جاتے ہیں نا۔ اور طرح طرح کے افسانے گھڑنے شروع کر دیتے ہیں۔ ہم کو افسانے نہیں چاہئیں۔"

"میں سمجھ گیا سر! آپ فکر نہ کریں۔ افسانہ تو کیا کوئی سرگوشی بھی جنم نہیں لے گی۔" اس نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"شہر میں ہماری جو پراپرٹی ہے اس میں کوئی فلیٹ وغیرہ خالی پڑا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صحیح ریکارڈ تو ٹونی کے پاس ہے سر!" وہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولا "لیکن مجھے یاد پڑتا ہے کہ گلبرگ میں ہماری ایک عمارت میں ایک فلیٹ خالی تو ہے۔ اس میں صرف ہمارے کارگو ریکارڈ کے کچھ رجسٹر اور پرانی فائلیں وغیرہ پڑی ہیں۔ وہ وہاں سے ہٹائی جا سکتی ہیں۔ وہ بہت اچھا فلیٹ ہے سر! آج کل وہ کسی مصرف میں نہیں آ رہا۔"

"بس تو پھر اسی کو بالکل ٹھیک ٹھاک کرالو۔ یہ عورت تاجاں اس میں رہے گی۔ اس کے پاس ایک معقول اور تھوڑی بہت پڑھی لکھی کوئی خادمہ ہونی چاہئے جو ہر وقت اس کا خیال رکھے اور اس کا ہر کام کرے۔ پرائیوٹ طور پر ایک ڈاکٹر کا بھی بندوبست ہونا چاہئے جو دن میں جتنی مرتبہ بھی ضروری سمجھے اس عورت کا معائنہ کرنے آئے اور پوری توجہ سے اس کا علاج کرے اور اس عورت کی چھوٹی سے چھوٹی ضرورت کا خیال رکھا جانا چاہئے۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اسے ایک نئی زندگی کی طرف لانا ہے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟"

"میں سمجھ رہا ہوں سر! سب کچھ آپ کی مرضی کے مطابق ہو گا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"تھینک یو۔" میں اپنے آدمیوں کی مستعدی اور فرض شناسی کے لئے ان کا شکریہ ادا کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتا تھا۔

ان انتظامات کی ہدایات دے کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس تصور سے مجھے ایک عجیب ناقابلِ بیان سی خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ تاجاں زندگی میں پہلی بار ایک صاف ستھرے اور آسودہ دور میں داخل ہو گی تو اس کے محسوسات کیا ہوں گے؟ وہ راندۂ درگاہ اور دنیا کی نظر میں بہت بری عورت کیسی معصوم خوشی محسوس کرے گی!

ایک لمحے کے لئے میں اسی عجیب سے تصور سے سحرزدہ سا بیٹھا رہا پھر چونک کر حال کی دنیا میں واپس آیا اور انٹرکام پر میں نے کیتھرین کو ہدایت کی کہ وہ اسٹوڈیو والے آفس سے رابطہ قائم کر کے آفاق سے میری بات کرائے۔

آفاق کو کچھ نہیں معلوم تھا کہ میں اس دوران ایک رات کے لئے غائب بھی ہو گیا تھا اور اس رات مجھ پر کیا گزری تھی۔ اس لئے اس سے حسبِ معمول خیروعافیت کے رسمی سے جملوں کے ساتھ گفتگو شروع ہوئی۔

اس کے بعد میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔ "وہ جو ایک مرتبہ ملک کے باغ والی لوکیشن پر ہنی نام کی لڑکی اپنی ماں کے ساتھ آئی تھی، اس کا ایڈریس یا فون نمبر وغیرہ محفوظ ہے تمہارے پاس؟"

"شاید ہو۔ نام پتوں والی نوٹ بک دیکھنا پڑے گی۔ مجھے یاد تو پڑتا ہے کہ جب وہ پہلی بار آئی تھیں تو ان کے بے حد اصرار پر میں نے ان کا ایڈریس وغیرہ نوٹ کیا تھا۔" آفاق بولا۔ پھر اس کے لہجے میں ہلکی سی شگفتگی آ گئی "سر! کیا آپ نے اسے کسی فلم میں سائن کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"نہیں۔ یہ مسئلہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو مجھے اس سے کوئی اور کام ہے" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "تم اس کا نمبر وغیرہ تلاش کر کے مجھے فون کرلو۔ میں منتظر ہوں" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ دو منٹ بعد ہی آفاق کا فون آ گیا۔ اس نے ایک ایڈریس اور فون نمبر مجھے نوٹ کرایا اور میں نے اسے مزید باتیں کرنے کا موقع دیئے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔

پہلے میں نے سوچا کہ فون کر کے معلوم کرلوں کہ ہنی گھر پر ہے بھی یا نہیں۔ لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ اچانک ہی اس کے گھر پہنچ کر اسے سرپرائز دینے کی کوشش کرنی چاہئے۔

میں جب مطلوبہ ایڈریس پر پہنچا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ ایک اچھی خاصی طویل و عریض کوٹھی تھی۔ میں نے ہارن دیا تو چوکیدار نے بغلی گیٹ کھولا۔ اس نے بڑا گیٹ نہیں کھولا کہ میں گاڑی اندر لے جاتا۔ وہ خود ہی باہر آ کر کھڑکی پر جھکتے ہوئے مؤدبانہ لہجے میں بولا "جی صاحب! کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

"ہنی بی بی موجود ہوں تو ان کو یہ میرا کارڈ دے دو۔" میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اسے تھما دیا۔ وہ واپس اندر چلا گیا اور جاتے وقت بغلی گیٹ کا بولٹ اندر سے چڑھا کر گیا۔ خاصا محتاط آدمی معلوم ہوتا تھا یا پھر اسے ہدایات اسی قسم کی تھیں۔

چند ہی لمحے بعد گیٹ کے عقب میں چوکیدار کے بھاری جوتوں کی دھمک سنائی دی۔ شاید وہ دوڑا دوڑا آ رہا تھا۔ اس نے بوکھلائے ہوئے انداز میں گیٹ کھولا اور کورنش بجا لانے کے سے انداز میں جھکتے ہوئے بولا "آیئے۔۔۔ آیئے صاب! تشریف لایئے۔"

میں نے دیکھا پورچ میں دو تقریباً نئی گاڑیاں پہلے ہی کھڑی تھیں۔ میں نے ان کے عقب میں گاڑی لے جا کر روکی اور دیکھا کہ ہنی بھی تقریباً دوڑتی ہوئی راہداری سے نکلی اور برآمدے میں آ کر رک گئی۔ اسے بخیروعافیت دیکھ کر مجھے عجیب سی خوشی محسوس ہوئی۔

اس کے گھٹاؤں جیسے لمبے، سیاہ ریشمی بال اس کے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ میک اپ سے بے نیاز اس کی کھلی کھلی رنگت،

بھرے بھرے نیم وا ہونٹ اور نیند کا خمار لئے موٹی موٹی سیاہ آنکھیں بہت دلکش دکھائی دے رہی تھیں۔ حیرت کی بات تھی کہ دوپہر کا وقت تھا مگر وہ شب خوابی کے لبادے میں تھی۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ یہ کچھ ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ اس کے چہرے پر بے یقینی کے ساتھ ساتھ ایک معصوم سی مسرت کا پرتو تھا۔ وہ اس وقت کسی کم سن اور نوخیز لڑکی ہی کی طرح معصوم دکھائی دے رہی تھی۔

اسی لمحے اس کی نائیکہ ٹائپ ماں بھی سلیپر گھسیٹتی، تھل تھل کرتی، راہداری سے برآمد ہوتی دکھائی دی۔ وہ ہنی کے پاس... آ کھڑی ہوئی اور ہانپنے لگی۔ ہنی کی وجہ سے اس بے چاری کو بھی چند قدم دوڑنے کی زحمت کرنا پڑی تھی۔

میں گاڑی سے اتر کر برآمدے کی دو تین سیڑھیاں چڑھ کر ان تک پہنچا اور غیر ارادی طور پر میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ ہنی کی طرف بڑھا دیا۔ اپنے اس انداز پر خود مجھے ہنسی بھی آتے آتے رہ گئی۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ائیرپورٹ پر جہاز سے اترنے والی اہم شخصیات اپنے استقبال کے لئے کھڑے ہوئے لوگوں سے ہاتھ ملاتی ہیں۔

ہنی نے خوابناک سے انداز میں دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ تھام لیا پھر اس کی آواز جیسے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ کو بالکل صحیح سلامت دیکھ کر مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ میں بہت پریشان تھی... دو راتیں میں نے جاگ کر گزاری ہیں... دل پر بوجھ اس لئے زیادہ تھا کہ میں کسی کو بتا بھی نہیں سکتی تھی کہ بات کیا ہے..... بات خود مجھے بھی صحیح طور پر معلوم نہیں تھی۔"

اس کے لہجے میں خلوص تھا، حقیقی تشویش تھی لیکن اس کی ماں خلوص سے خالی اور پیشہ ورانہ سے لہجے میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولی "ہاں جی۔ اس کا تو کھانا پینا چھوٹ گیا تھا لیکن اس نے مجھے بھی نہیں بتایا کہ بات کیا تھی۔"

"اور اس وقت مجھے اپنی خوش نصیبی پر یقین نہیں آ رہا" ہنی بدستور میرا ہاتھ تھامے مسکرائی۔ "آنکھیں دیکھ رہی ہیں مگر ذہن تسلیم نہیں کر رہا ہے کہ آپ جیسا بڑا آدمی بہ نفسِ نفیس اس غریب خانے تک آیا ہے۔"

"ایک تو ہمارے معاشرے میں انکساری کا بہت غلط استعمال ہوتا ہے" میں نے ہنستے ہوئے کہا اور کوٹھی پر چاروں طرف نظر دوڑائی "اگر غریب خانہ اسی کو کہتے ہیں تو میری دعا ہے کہ میرے ملک کا ہر غریب ایسے ہی 'خانے' میں رہنے لگے۔"

"آپ کے آنے سے پہلے واقعی یہ غریب خانہ تھا لیکن اب اس کے مقدر جاگ گئے ہیں۔ اب ہم اس پر فخر کر سکتے ہیں۔ اب یہ محاورتاً بھی غریب خانہ نہیں رہا" وہ بدستور خوابناک سے لہجے میں بولی اور خوابناک ہی سے انداز میں مسکرائی "لیکن آپ نے اتنی زحمت کیوں کی؟ آپ نے کسی سے فون کرا دیا ہوتا۔ ہم خود آ جاتے۔ سر کے بل آ جاتے۔"

"میں نہیں چاہتا تھا کہ اتنا خوبصورت سر چلنے میں استعمال ہو" میں نے آنکھوں سے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا "اب یہ بتاؤ کہ یہیں کھڑی کھڑی شرمندہ کرتی رہو گی یا اندر آنے کو بھی کہو گی؟"

بہت آہستگی سے، اور گویا بادل نخواستہ اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا "کیا اس گھر میں اندر جانے کے لئے آپ کو مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت ہے؟" یہ کہتے ہوئے وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ اس کی ماں جلدی سے آگے چلتی ہوئے بولی "یہ آپ کا اپنا گھر ہے جی۔ دن ہو یا رات..... جس وقت، جس لمحے آپ کا دل چاہے تشریف لایئے۔ چوکیدار آئندہ آپ کو دیکھتے ہی گیٹ کھول دیا کرے گا۔ آج تو پہلی بار اس نے آپ کو دیکھا تھا نا۔"

ہم کوریڈور میں داخل ہوئے۔ دائیں ہاتھ پر پہلا ہی ہال نما کمرا ڈرائنگ روم تھا جو شاہانہ انداز میں آراستہ و پیراستہ تھا۔ ہنی میرے پاس ڈرائنگ روم میں آ بیٹھی جبکہ اس کی ماں اندر کہیں چلی گئی۔ مجھے بعد میں اندازہ ہوا کہ غالباً وہ خانساماں کو چائے اور دیگر لوازمات کے سلسلے میں ہدایات دینے گئی تھی۔

"مجھے تمہارے بارے میں تشویش تھی" میں نے ایک بار پھر اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "کیا میرے نکل جانے کے بعد وہ لوگ اندر آئے تھے؟ انہوں نے تم سے کوئی بدسلوکی تو نہیں کی؟"

"میں نے خود ہی ان کے لئے دروازہ کھول دیا تھا" ہنی نے بڑے اطمینان سے بتایا "ظاہر ہے انہوں نے پہلا سوال آپ ہی کے بارے میں کیا۔ میں نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا کہ ہاں ایک نامعلوم شخص اچانک ہمارے ہاں گھس آیا تھا، وہ سنگھار میز پر پڑی ہوئی میری کار کی چابیاں بھی لے گیا اور جب میں نے اسے روکنے کی کوشش کی تو اس نے میرے منہ پر تھپڑ مارا۔ اپنی بات میں صداقت کا رنگ پیدا کرنے کے لئے میں نے خود ہی اپنے گال پر زور سے تھپڑ مار کر انگلیوں کے نشان ثبت کر لئے تھے۔ شاید اب بھی ہوں" اس نے انگلی سے اپنے رخسار کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ ظلم کے وہ نشان مٹ چکے ہیں" میں نے اس کے آتشیں رخسار کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ویسے تمہیں خود پر اتنا بھی ظلم کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"وہ سخت ہیجان زدہ تھے۔ ایک ثانئے کے لئے بھی ان کا ذہن ادھر اُدھر بھٹک جاتا تو وہ نہ جانے کیا کر گزرتے۔ کوئی کچی بات فوراً انہیں شک میں مبتلا کر سکتی تھی۔ اور اگر میں انہیں یہ بتانے کی کوشش کرتی کہ یہاں کوئی نہیں آیا تھا تو یہ میرے حق میں بہت برا ہوتا" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "میری بات

سنتے ہی وہ آپ کے تعاقب میں دوڑ پڑے۔"

"یہ میری خوش قسمتی تھی کہ اس بازار میں مجھے تم مل گئیں"۔ میں نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگا کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا "وہ ایک عجیب رات تھی۔"

اس رات وہ جس طرح مجھے اس مکان میں بیٹھی ہوئی ملی تھی، شاید اس کے تصور سے اس کے چہرے پر کرب کی ایک ہلکی سی پرچھائیں آکر گزر گئی۔ شاید اس تصور کو ذہن سے جھٹکنے ہی کی خاطر وہ بولی "اگر کوئی مضائقہ نہ ہو تو میرا تجسس دور کردیں کہ اس رات آپ پر کیا گزری اور معاملہ کیا تھا؟"

"فی الحال اس تجسس کو برقرار رہنے دو" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "زندگی میں تھوڑا بہت تجسس بھی تو ہونا چاہئے نا۔"

"میری زندگی میں تجسس تو تسلی بخش طور پر موجود ہے لیکن اگر آپ کہتے ہیں تو تھوڑا بہت اور سہی"۔ اس نے فوری طور پر گویا اس معاملے کو ذہن سے جھٹک دیا اور بے پروائی سے سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر مسکرا کر رہ گئی لیکن اس بار اس کی مسکراہٹ میں نہ جانے کیوں افسردگی کی آمیزش تھی۔

دفعتاً اسے جیسے آداب میزبانی یاد آگئے۔ تپائی پر رکھے ہوئے خوبصورت منقش سگریٹ باکس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی "آپ کوئی سگریٹ وغیرہ پینا پسند کریں گے؟ لیکن لگتا یہی ہے کہ آپ تمباکو نوشی نہیں کرتے؟" اس نے ساتھ ہی اندازہ ظاہر کردیا۔

"تمہارا اندازہ درست ہی ہے۔ لیکن میں اتنا پارسا بھی نہیں ہوں۔ حفظانِ صحت کی چھوٹی موٹی خلاف ورزیاں کرتا رہتا ہوں۔ تاہم اس وقت دل نہیں چاہ رہا" میں نے ٹائی کی ناٹ ذرا ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔

"کوئی ڈرنک وغیرہ...؟" اس نے سرسری سے لہجے میں پوچھا اور میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی موٹی موٹی سیاہ آنکھوں میں جیسے ان گنت بھید چھپے رہتے تھے میں نے محسوس کیا کہ ان آنکھوں کو قریب سے دیکھنے پر ذہن کے کسی گوشے میں بے عنوان سا اضطراب جاگ اٹھتا تھا۔

"نہیں۔ اس وقت اس کا بھی موڈ نہیں" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

عین اسی وقت اس کی ماں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے ایک ملازم ٹرالی دھکیلتا ہوا لا رہا تھا جس پر چائے کے برتن اور اس کے لوازمات کی نہ جانے کتنی پلیٹیں سجی ہوئی تھیں۔

بڑی بی ایک صوفے میں دھنس کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولیں "بس جی... آپ تو اس طرح اچانک بغیر اطلاع کے تشریف لائے کہ ہمارے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کی کیا خاطر تواضع کریں!" پھر وہ گویا خود ہی فوراً [illegible] بولی "خیر... فی الحال تو آپ چائے اور ان ہلکی پھلکی چیزوں سے شغل فرمائیں کھانا تیار ہورہا ہے۔ ان کے علاوہ جو بھی آپ کا موڈ ہو بلا تکلف حکم فرمائیں۔ یہ آپ کے خدمت گاروں کا گھر ہے۔"

"آپ کی اس قدر محبت و عنایت مجھے مسلسل شرمندہ کئے جارہی ہے۔ نوازشات کا بوجھ مجھ پر اس قدر نہ ڈالیں کہ میں اٹھا بھی نہ سکوں" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا "فی الحال میں صرف ایک پیالی چائے پیوں گا... اور کھانے کے تکلف کی تو قطعاً ہی کوئی ضرورت نہیں۔ میں زیادہ دیر نہیں ٹھہروں گا۔ آپ مجھے یہ احساس بھی دلانے کی کوشش کررہی ہیں جیسے میں بہت بڑا آدمی ہوں، اس سے بھی مجھے شرمندگی ہورہی ہے۔ میں تو بہت معمولی سا آدمی ہوں۔"

"یہ تو ہم ہی زیادہ بہتر جانتے ہیں جناب!" وہ جہاندیدہ عورت مجھے میٹھے لفظوں سے مارنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "جنہیں آپ سے محض ایک منٹ کی ملاقات کا وقت لینے کے لئے نہ جانے کتنے چکر لگانے پڑے مگر ملاقات ممکن نہ ہوسکی۔ آخر کار ہمیں ایک طرح سے آپ کے راستے میں ہی دھرنا مار کر بیٹھنا پڑا۔"

"اس کے لئے میں شرمندہ ہوں" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "لیکن آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب آدمی کے کاروبار اس قسم کے ہوں جیسے میرے ہیں تو سیکڑوں لوگ ملاقات کے خواہشمند رہتے ہیں لیکن ہر ایک کے متعلق تو اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون کیا ہے۔ اب مثلاً آپ ہی کی مثال لے لیجئے۔ ملک کے باغ میں شوٹنگ کے موقع پر جب آپ سے گویا سرِراہ ملاقات ہوئی تو آپ دونوں ہی کی شخصیت کا میں نے کوئی اچھا تاثر نہیں لیا تھا۔ اس وقت مجھے بالکل اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ آپ لوگ اس قدر سلجھے ہوئے، ملنسار اور محبت کرنے والے ہیں۔"

"آپ کا قصور نہیں ہے جی" ہنی کی ماں میرے لئے چائے بناتے ہوئے بولی "یہ بات تو مجھے خود بھی معلوم ہے کہ میرا امپریشن کچھ اچھا نہیں پڑتا۔ میں کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہتی جی۔ مجھے پھڑیں مارنے کی بھی عادت نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ تعلیم کی طرف سے میرا ہاتھ تنگ ہے۔ لیکن میں نے اپنی اس بیٹی کو بڑے شوق اور لگن سے پڑھایا ہے جی۔ ایم اے پاس کیا ہوا ہے اس نے۔ اب آپ سے کوئی بات چھپی ہوئی تو ہے نہیں۔ جہاں سے ہم آئے ہیں... جس ماحول سے ہمارا تعلق رہا ہے، تعلیم کا رواج تو وہاں بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ مگر میں نے ہنی کو پڑھایا۔ اسے خود بھی بڑا شوق تھا تعلیم حاصل کرنے کا۔ چینی کتنی لیں گے آپ؟"

باتیں کرتے کرتے یکدم پٹڑی بدل کر اس نے جو یہ سوال کیا تو میں چونک سا گیا۔ وہ جرمن سلور کا شکر دان اور چمچہ ہاتھوں میں تھامے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ڈیڑھ چمچ۔" میں نے جواب دیا۔

"اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جی کہ آپ کو شوگر نہیں ہے ورنہ آج کل تو ہر پیسے والے کو شوگر ضرور لاحق ہے۔ پیسہ کیا آتا ہے جی بس، شوگر بھی ضرور ساتھ لاتا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے پیسے اور شوگر کا چولی دامن کا ساتھ ہے" شکر حل کرکے چائے مجھے دیتے ہوئے وہ بمشکل ایک لمحے کو سانس لینے کو رکی اور میرے کپ تھامتے ہی سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ ہنی کو پڑھنے کا خود بھی بہت شوق تھا... اور یہ اسی کا حوصلہ تھا کہ اس نے باقاعدہ ریگولر اسٹوڈنٹ کی حیثیت سے ایم اے کرلیا حالانکہ کالج اور یونیورسٹی میں طعنے سن سن کر اس کا کلیجہ چھلنی ہوگیا۔ بات چھپی نہیں رہتی نا جی...! کالج یونیورسٹی میں سب جگہ پتا چل ہی جاتا تھا کہ اس کا تعلق اس بازار سے ہے۔ کچھ لڑکے لڑکیاں تو اعلیٰ ظرف اور سمجھدار ہوتے ہیں جی۔ وہ تو اس بات پر اس کو عزت کی نظر سے دیکھتے تھے کہ یہ ایسے خاندانی پس منظر کے باوجود تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہے لیکن زیادہ تر چھچھورے اور کم ظرف ہی ہوتے تھے۔ لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہی آوازیں کستے تھے، مذاق اڑاتے تھے، ذلیل کرتے تھے۔ ان حالات میں میری بچی نے تعلیم حاصل کی ہے جی۔ بڑے حوصلے والی لڑکی ہے" موٹی سی اس عورت نے قربان جانے والی نظروں سے ہنی کی طرف دیکھا۔ اس لمحے اس کے بھدے سے چہرے پر ممتا کی جو روشنی تھی اس کی وجہ سے وہ مجھے بہت بھلی دکھائی دی۔

اس لمحے ہنی بول اٹھی "امی! آپ یہ کیا قصے لے کر بیٹھ گئیں" یکدم ہی اس کے لہجے میں بے پناہ تھکن سی در آئی تھی۔

"چوہدری صاحب آج پہلی مرتبہ ہمارے گھر آئے ہیں بیٹی!" اس کی ماں سمجھانے کے سے انداز میں بولی "معلوم نہیں دوبارہ آنا گوارہ بھی کریں یا نہیں۔ بڑے لوگ ہیں۔ میں چاہتی ہوں کہ اس ملاقات میں اچھی طرح تعارف تو ہوجائے۔ اس کے بعد یہ تشریف لائیں یا نہ لائیں یہ ان کی مرضی ہے لیکن شاید یہ ہم کو تھوڑا بہت یاد ہی رکھ لیں۔"

وہ ایک بار پھر میری طرف متوجہ ہوگئی "میں یہ کہہ رہی تھی جی کہ مجھے اپنے بارے میں تو کوئی دعویٰ نہیں کہ میں بڑی باذوق خاتون ہوں۔ میں تو جی بس یونہی پینڈو سی عورت ہوں لیکن اپنی بیٹی کے بارے میں میرا دعوا ہے کہ اس کا ذوق بڑا اچھا ہے لیکن فلمی اسٹوڈیوز میں ذوق کو کون پوچھتا ہے؟ وہاں کے لوگوں کو تو لڑکیوں کے چہروں پر رنگ برنگے میک اپ اور جسموں پر بھڑکیلے کپڑے اچھے لگتے ہیں جو ہر نشیب و فراز کا بھی ٹھیک ٹھیک پتا دے سکیں۔ اس لئے ہنی وہاں ویسی ہی بن کر جاتی تھی..."

میں پوچھنا چاہتا تھا کہ ہنی کو آخر ایسی مصیبت ہی کیا پڑی تھی جو وہ چھوٹے موٹے کرداروں کے لئے یوں دھکے کھاتی پھرتی تھی؟ لیکن پھر اس سوال کے دسیوں جواب خود ہی میرے ذہن میں آگئے۔ یہ بڑی لمبی بحث تھی۔ اور پھر یہ اکیلی ہنی ہی کا مسئلہ نہیں تھا۔ تقریباً ایسے ہی پس منظر کے ساتھ بہت سی ایسی لڑکیاں اسی طرح فلمی دنیا میں ہاتھ پاؤں مارنے آتی تھیں۔

بہرحال وہ ان سب سے کچھ مختلف ضرور تھی۔ جوں جوں اس کی ماں باتیں کررہی تھی، وہ دونوں ماں بیٹی مجھے کسی دلچسپ کہانی کے کردار معلوم ہونے لگی تھیں۔ ایسی دلچسپ کہانی کے کردار جس میں کہیں نہ کہیں تھوڑا بہت کوئی پُراسراریت کا پہلو بھی نہاں تھا۔ لیکن وہ کیا تھا؟ یہ میں ابھی نہیں جان پایا تھا۔ اس بازار والے مکان میں مَیں نے ہنی کا جو روپ دیکھا تھا وہ بھی حیران کن تھا اور آج جو کچھ بھی میں اس کے متعلق سن رہا تھا وہ بھی میرے لئے کچھ نہ کچھ حیرت کا باعث ضرور تھا۔

اس کی ماں کہہ رہی تھی "میں آپ سے جب پہلی مرتبہ ملی تو فوراً ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ آپ کوئی روایتی اور عام قسم کے سیٹھ نہیں ہیں۔ اور میں آپ سے بہت غلط انداز میں ملی ہوں۔ ہمارا امپریشن آپ پر غلط پڑا ہے۔ اور تب سے ہی میری خواہش تھی کہ آپ سے ایک مرتبہ اور ملاقات ضرور ہو تاکہ ہم کچھ بہتر نظر آنے کی کوشش کرسکیں۔"

"اب اس کی ضرورت نہیں رہی" میں نے کہا "ہنی نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اور جس طرح یہ وہاں مجھے ملی تھی اس سے میری نظر میں اس کا امیج بالکل بدل گیا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ اس احسان کے جواب میں ہنی کے لئے کچھ کرسکوں۔"

"وہ کوئی احسان نہیں تھا" ہنی جلدی سے بولی "وہ آڑے وقت میں آپ کے کام آنے کی ایک چھوٹی سی کوشش تھی اور وہ میں نے قطعی سوچ سمجھ کر یا منصوبے کے تحت نہیں کی تھی کہ اس کے بدلے میں آپ سے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں گی۔ اب تو مجھے آپ سے قطعاً کچھ نہیں چاہئے۔ بس آپ کا اتنا ہی کرم کافی ہوگا کہ کبھی کبھار وقت میسر آئے تو ملتے رہئے گا۔ آپ مجھے اچھے لگتے ہیں اور اچھے لوگوں سے میل ملاقات کی خواہش رکھنا میرا کمپلیکس ہے مگر میں اس کمپلیکس پر شرمندہ نہیں ہوں۔"

"اچھا خیر... فی الحال تو میں اس موضوع پر کوئی بحث نہیں کروں گا" ہنی کی ماں اس دوران مجھے کچھ نہ کچھ کھلانے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کی تمامتر کوششوں کو ناکام بنانے کے بعد میں نے گویا اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "ہنی! دراصل میں تمہیں یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ تمہاری کار تو اس رات کی ہنگامہ بازی میں تباہ ہوگئی۔ میں تم سے مستعار لی ہوئی اس چیز کی حفاظت نہیں کرسکا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ وہ تباہ ہوچکی ہے" ہنی اطمینان سے بولی۔ اس کے چہرے پر تاسف یا پچھتاوے کی کوئی علامت نہیں تھی

جس سے اندازہ ہوا کہ اسے ایک اہم اور مہنگی چیز کے ضائع ہونے کا افسوس ہوا ہے حالانکہ میرا تجربہ تھا اور سنا بھی یہی تھا کہ اس قسم کی عورتیں اپنا مالی نقصان برداشت نہیں کرتیں' وہ تو خود دوسروں سے اس قسم کی مہنگی چیزیں تحفتاً حاصل کرنے کی فکر میں رہتی ہیں۔ ظاہر ہے ایسی کسی چیز کا ضائع ہو جانا ان کے لئے شدید صدمے کا باعث ہوتا ہے۔ میری حیثیت دیکھتے ہوئے ہنی کو اس بات کا یقین بھی تھا کہ میں اس کی تلافی کروں گا تب بھی کم از کم سروست ہی کوئی تاسف ظاہر نہ کرنے کے لئے بھی خاصے حوصلے کی ضرورت تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ تباہ ہو چکی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بائی وے سے گزرتے وقت کسی پولیس پارٹی نے اسے دیکھ لیا تھا اور نمبر پلیٹ دیکھ کر لاہور پولیس کو مطلع کر دیا تھا۔ اس کی رجسٹریشن میرے ہی نام تھی۔ حالانکہ گھر میں جو دوسری دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ ان کی رجسٹریشن میرے نام پر نہیں ہے۔ چنانچہ اس طرح پولیس نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے کہہ دیا کہ ہماری وہ گاڑی تین چار روز سے شاہی بازار والے مکان پر ہی کھڑی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ وہاں کیسے پہنچی جہاں پولیس نے اسے دیکھا تھا۔ ممکن ہے کوئی چرا کے لے گیا ہو۔ مجھے چونکہ علم ہی نہیں تھا کہ وہ چوری ہو چکی ہے اس لئے میں رپورٹ بھی درج نہیں کرا سکی۔ اس علاقے میں رات کو چونکہ کوئی پراسرار سی گڑبڑ ہو بھی چکی تھی۔ اس لئے پولیس کو میرے بیان پر یقین کرنا ہی پڑا۔"

"گڈ۔" میں نے طمانیت سے کہا "تمہیں بات کو سنبھالنا آتا ہے" پھر میں نے اٹھنے کے لئے پر تولتے ہوئے کہا "تم ذرا آدھے گھنٹے کے لئے میرے ساتھ چل سکتی ہو؟"

ہنی کے جواب دینے سے پہلے ہی اس کی ماں بول اٹھی۔ "اسے آپ کے ساتھ جانے سے کیا انکار ہو سکتا ہے جی! یہ تو اسے اپنی خوش قسمتی سمجھے گی۔ لیکن آپ کھانا کھائے بغیر نہیں جا سکتے۔"

بمشکل تمام میں ہنی کی ماں کو اس بات پر آمادہ کر سکا کہ میں پھر کسی وقت ان کے ہاں کھانا کھاؤں گا -- فی الحال وہ مجھے جانے دیں کیونکہ دو بجے ایک ہوٹل میں میری ایک کاروباری ملاقات طے ہے۔

ہنی اٹھ کر اپنے سراپا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "چلنے کو تو میں اسی حلئے میں بھی آپ کے ساتھ چل سکتی ہوں لیکن شاید آپ کو شرم آئے اس لئے میں اپنا حلیہ تھوڑا سا درست کر آتی ہوں" وہ مسکرائی اور نسیم سحری کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکل گئی۔ وہ چلتی تھی تو اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں رقاصاؤں والی مخصوص لچک تھی۔

اس کے جانے کے بعد اس کی ماں مجھ سے ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی اور یہ محسوس کرتے ہوئے مجھے خفیف سی حیرت ہوئی کہ اس نے میرے کاروبار' میری دولتمندی کے متعلق کریدنے کی قطعاً کوشش نہیں کی جبکہ اس قسم کی عورتوں کی زیادہ دلچسپی انہی باتوں میں ہوتی ہے۔ نہ ہی اس نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ میں ہنی کو اپنے ساتھ کہاں لے جا رہا ہوں اور نہ ہی اس نے یہ اندازہ لگانے کے لئے گھما پھرا کر کوئی سوال کیا کہ میں ہنی کو کسی فلم میں کاسٹ کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں یا نہیں۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کی وجہ سے اس مرتبہ وہ عورت مجھے بے حد مختلف اور بہت بہتر معلوم ہوئی۔ باقی دلوں کے بھید تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم کتنے ہی مردم شناس بن جائیں لیکن پھر بھی ہر انسان کی تہہ کو پہنچ جانے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔

ہنی چند ہی منٹ میں تیار ہو کر آ گئی۔ اس نے نہایت جدید تراش خراش کا اور جاپانی کیمونو کی طرز کا لباس پہنا تھا۔ بال نہایت نفاست سے برش کر کے اس نے سیدھے سادے انداز میں جوڑا بنا لیا تھا اور بہت ہلکا لیکن مشاقانہ میک اپ کیا تھا۔ اب اس کی شخصیت میں ذرا بھی سستے پن کی جھلک نہیں تھی۔ وہ اچھے طبقے کی' سلجھی ہوئی اور باذوق لڑکی معلوم ہو رہی تھی۔ اس لڑکی سے بہت مختلف جسے میں نے شوٹنگ کے موقع پر دیکھا تھا۔

ہم تینوں باہر آئے۔ ہنی کی ماں کا نام اب مجھے معلوم ہو چکا تھا۔ وہ خورشید جہاں کہلاتی تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ اس نام کی شاید انڈیا میں کوئی مشہور ایکٹریس بھی گزری تھی۔ خورشید جہاں نے برآمدے میں ہی رک کر ہمیں خدا حافظ کہا۔ آج تو وہ گویا مجھے خاصی حد تک حیران کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس قسم کی عورتیں اس وقت تک اپنی بیٹیوں کو کسی مرد کے ساتھ ایک لمحے کے لئے بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتیں جب تک کسی قسم کی کوئی سودے بازی نہ مکمل ہو جائے۔ لیکن اس نے تو گویا اس پہلی قدرے باقاعدہ ملاقات میں ہی آنکھیں بند کر کے مجھ پر بھروسا کر لیا تھا۔

ہنی میری گاڑی میں میرے برابر آ بیٹھی اور گویا خوشبو کا ایک جھونکا میرے پہلو میں سمٹ آیا۔ خورشید جہاں نے ہاتھ ہلا کر ہمیں خدا حافظ کہا اور میں گاڑی ریورس کر کے باہر لے آیا۔ پھر میری بے آواز انجن والی گاڑی گلبرگ کی سڑکوں پر پھسلنے لگی۔ کبھی کبھی میں گردن موڑ کر ایک نظر ہنی کی طرف دیکھ لیتا اور وہ بے معنی سے انداز میں مسکرا دیتی۔ اس نے اب بھی نہیں پوچھا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔

آخر کار کچھ دیر کے سفر کے بعد میں نے کاروں کے ایک بہت بڑے شوروم کے قریب گاڑی لے جا روکی۔ اندر جانے کے لئے تو راستہ ہی نہیں تھا۔ شوروم کی گاڑیاں فٹ پاتھ تک پھیلی ہوئی تھیں۔

ہنی گویا چونک کر بولی "یہاں آپ کس لئے آئے ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں تم یہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں میں سے کوئی بھی پسند کرلو۔ وہ تمہارے گھر پہنچ جائے گی۔ بلکہ اگر تمہیں کوئی اور گاڑی پسند ہو لیکن وہ اس وقت یہاں موجود نہ ہو' اس کا نام اور ماڈل وغیرہ شوروم والوں کو لکھوا دو۔ چند دن کے اندر اندر تمہیں وہی گاڑی مل جائے گی۔ قیمت کا قطعاً کوئی خیال نہ کرنا" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

وہ چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ حقیقتاً اسے میری بات سے خوشی نہیں ہوئی۔ آخر کار وہ مجروح سے لہجے میں بولی "میں نے اگر آڑے وقت میں آپ کو وہ حقیری سی گاڑی دی تھی اور وہ تباہ ہوگئی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس کا بدلہ ضرور اتارنے کی کوشش کریں۔ ... میرے لئے تو بس یہی خوشی کافی ہے کہ آپ اس خطرناک صورت حال سے بخیریت نکل آئے۔ آپ سمجھ رہے ہوں گے کہ آپ کی پیش کش سے مجھے خوشی ہوئی ہوگی لیکن میں آپ کو سچ بتا رہی ہوں' مجھے قطعاً خوشی نہیں ہوئی۔ میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا تھا۔ لیکن اگر آپ اسے احسان ہی سمجھتے ہیں تو اسے برقرار رہنے دیجئے۔"

"اگر تم کوئی گاڑی پسند کرلوگی تو احسان اس کے بعد بھی برقرار رہے گا۔ مجھے تمہارے خلوص میں کوئی شبہ نہیں لیکن میرا نظریہ یہی ہے کہ میری وجہ سے اگر کسی کا کوئی نقصان ہو تو اس کی تلافی ضرور ہونی چاہئے" میں نے ملائمت سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ کوئی نقصان نہیں تھا" وہ تیزی سے بولی "ایک گاڑی کے ہونے یا نہ ہونے سے میرے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ویسے بھی وہ ہمارے لئے فالتو ہی تھی۔ آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ گھر پر دو گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں اور امی عموماً ایک ہی گاڑی استعمال کرتے ہیں۔ رشتے کے ایک ماموں ہمارے ہاں رہتے ہیں۔ دوسری گاڑی کبھی کبھار ان کے استعمال میں رہتی ہے۔ ہمیں تیسری گاڑی نہ ہونے سے.... ایک لمحے کے لئے بھی کوئی کمی محسوس نہیں ہوئی.. اور اگر ضرورت پڑی بھی تو میں خود خرید لوں گی۔ آپ سے مجھے گاڑی نہیں چاہئے" اس کے لہجے میں شدت کا انکار تھا اور اس میں تصنع نہیں تھا۔

"تمہارا انکار اب میرے دل کو مجروح کرنے لگا ہے" میں نے سنجیدگی سے کہا "تم اس گاڑی کے بدلے نہ سہی... بس میری جانب سے ایک نشانی' ایک تحفہ سمجھ کر کوئی گاڑی قبول کرلو۔ ہماری اس شناسائی' اس دوستی کے نقطۂ آغاز پر ایک نیک شگون کے طور پر کچھ تو ہونا چاہئے۔"

ایک لمحے کے لئے اس نے بغور میری طرف دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی آنکھوں میں نمی چھلک آنے کو بے تاب ہو۔ پھر اس کے ہونٹ کپکپائے "کیا میں واقعی اپنے آپ کو آپ کے دوستوں میں شناساؤں میں شمار کرنا شروع کردوں؟ کیا میں اپنے آپ کو اس اعزاز کے قابل سمجھنے لگوں؟"

"پرائمری اسکول کے زمانے میں تم نے وہ محاورہ نہیں پڑھا تھا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اے فرینڈ ان نیڈ از اے فرینڈ ان ڈیڈ۔ دوست وہی ہے جو ضرورت کے وقت کام آئے۔ تم ضرورت کے وقت میرے کام آئی ہو' اب اپنے آپ کو میری دوست شمار کرنے کے سلسلے میں اجازت طلب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" مجھے اس بات پر بھی قدرے حیرت تھی کہ ہنی اور اس کی ماں دونوں ہی میرے سامنے اس قدر انکساری کا اظہار کیوں کرتی تھیں؟ یہ تو ٹھیک تھا کہ میں معاشرے میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہوچکا تھا لیکن اب ایسا بھی نہیں تھا کہ ہنی جیسی لڑکیوں کے لئے میری ایک ستائشی جنبش ابرو بھی ایک اعزاز ہوتی۔ اس کی ماں جیسی گھاگ عورتیں اگر ایسا محسوس بھی کرتی ہیں تو اس کا برملا اظہار نہیں کرتیں۔

وہ اب بھی سحرزدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

"اس میں اتنی بے یقینی کی کیا بات ہے؟" آخر کار میں نے پوچھا۔

"مجھے دراصل اپنی حقیقت کا احساس ہے" وہ نظریں جھکا کر ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے بولی "آپ کے طبقے کے لوگ ہم جیسی لڑکیوں کو داشتہ بنانے کی بات تو کرسکتے ہیں لیکن دوست بنانے کی بات میں نے پہلی بار سنی ہے اور وہ بھی ایک ایسے شخص کے منہ سے جو مجھے عام دولت مندوں سے بہت مختلف اور بہت بلند نظر محسوس ہوا تھا۔ مجھے اس اعزاز کی توقع نہیں تھی... اور جہاں تک ضرورت کے وقت کام آنے کی بات ہے تو اس کا درحقیقت ابھی تو کوئی موقع ہی نہیں آیا لیکن اگر واقعی کبھی صحیح معنوں میں ایسا کوئی مرحلہ آیا تو شاید میں جان سے گزر جانے میں بھی قطعاً تاخیر نہ کروں.... لیکن یہ باتیں محض لفظوں میں شاید کچھ اچھی نہیں لگتیں" وہ جیسے خود ہی اپنے الفاظ پر کچھ نادم سی ہوگئی۔

اس کی باتوں نے میری رگ وپے میں عجیب سا ارتعاش پیدا کردیا۔ میرا دل جو بہت کم ہی کسی بات سے متاثر ہوتا تھا' نہ جانے کیوں اس کی دھڑکنیں کچھ بے ترتیب سی ہونے لگی تھیں۔ ...اس کے لہجے میں یقیناً اس کا خلوص شامل تھا اور خلوص بڑی جادو اثر چیز ہے۔ ایک پل میں آپ کے روئیں روئیں میں سرایت کر جاتا ہے۔ یہ جو دن رات بڑے بڑے لوگ آپ کے سامنے لمبی چوڑی تقریریں کرتے رہتے ہیں' یہ ان کے نہ جانے کتنے لمبے چوڑے پیشہ ور اسٹاف نے انہیں لکھ کر دی ہوتی ہیں' اسی لئے یہ تقریریں آپ پر اثر نہیں کرتیں' آپ کو اچھی نہیں لگتیں کہ ان میں کسی کا بھی خلوص شامل نہیں ہوتا۔ نہ لکھ کر

دینے والوں کا' اور نہ ہی بولنے والوں کا۔ خلوصِ نیت شامل ہو تو دو لفظ ہی دل کی کایا پلٹ دیتے ہیں۔

"میں تمہارے خوب صورت جذبات کے لئے تمہارا بہت شکرگزار ہوں ہنی" میں نے بہت دھیمی آواز میں کہا "آؤ... میری طرف سے خلوص کی نشانی کے طور پر کوئی گاڑی پسند کرلو۔ اب انکار نہ کرنا۔"

"اگر آپ مُصر ہیں تو کوئی چھوٹی سی... کم قیمت کی گاڑی دلا دیجئے۔ نشانی اور تحفہ تو معمولی سا بھی ہو تو انمول ہوتا ہے" اس کے لہجے میں اب بھی گریز تھا۔

"لیکن تحفہ لینے والے اور دینے والے' دونوں ہی کے شایانِ شان بھی تو ہونا چاہئے" میں نے کہا "چلو خیر... یہ بحث چھوڑو' اب میں خود ہی کوئی گاڑی منتخب کروں گا اور تمہیں اس پر کوئی اعتراض کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔"

میں فیصلہ کن انداز میں اس کا ہاتھ تھپتھپا کر گاڑی سے اتر آیا۔ ہم ایک ساتھ شوروم کے آفس میں داخل ہوئے۔ چھوٹے سے دفتر میں کئی آدمی بیٹھے تھے۔ سودے بازیاں اور بحث ومباحثہ جاری تھا۔ ہمارے وہاں پہنچتے ہی جانے کیوں خاموشی سی چھا گئی۔ شوروم کا مالک امجد بھی دفتر میں موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور گرم جوشی سے مصافحہ کرنے لگا۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔ ہم نے اپنی کمپنیوں اور ذاتی ضروریات کے لئے زیادہ تر گاڑیاں اسی کے شوروم کے توسط سے خریدی تھیں۔ اسی دوران دو ایک آدمی گویا بات ختم کرکے اٹھ کھڑے ہوئے اور کمرے سے باہر چلے گئے تاہم دو آدمی وہیں موجود رہے۔ میں نے ان کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

ہم بیٹھ چکے تو امجد انٹرکام کا ریسیور اٹھاتے ہوئے بولا "کیا پینا پسند فرمائیں گے؟"

"کچھ بھی نہیں..." میں نے بمشکل اسے کچھ منگانے سے باز رکھا اور اصل موضوع پر آگیا۔ اس وقت تک میں فیصلہ کرچکا تھا کہ مجھے ہنی کے لئے کون سی گاڑی لینی ہے۔ میں نے اس کا نام اور ماڈل بتاتے ہوئے امجد سے پوچھا "اس وقت اس کی کیا قیمت ہوگی؟"

امجد کے کچھ بولنے سے پہلے ہی ہنی احتجاجی سے لہجے میں بول اٹھی "وہ تو بہت مہنگی ہوگی۔ اس کی کیا ضرورت ہے...."

وہ بے چاری اپنی دانست میں خلوص سے مجبور ہوکر بولی تھی۔ ...وہ میری زیادہ رقم خرچ کرانا نہیں چاہتی تھی لیکن مجھے اس وقت اس کا بولنا غیرضروری محسوس ہوا۔ میں نے تنبیہی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور دھیمے لہجے میں کہا "یہ طے ہوچکا تھا کہ اب اس معاملے میں تم نہیں بولوگی۔"

"اوہ... سوری... میں بھول گئی تھی" وہ حقیقتاً شرمساری سے بولی اور یوں خاموش ہوگئی گویا اب اس کا ایک مدت تک ہونٹ ہلانے کا کوئی ارادہ نہیں۔

امجد نے مجھے گاڑی کی قیمت بتائی۔ میں نے بریف کیس سے چیک بک نکال کر چیک لکھ کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ہنی کے گھر کا پتا مجھے زبانی یاد ہوچکا تھا۔ ایک چٹ پر وہ ایڈریس لکھتے ہوئے میں نے امجد سے کہا "گاڑی کی ابتدائی رجسٹریشن وغیرہ اس نام سے کروا کر اس ایڈریس پر بھیج دینا۔"

"پرسوں پہنچ جائے گی سر" امجد نے چٹ لے کر حفاظت سے دراز میں رکھتے ہوئے کہا۔

"میں شیڈ سے نکلوا کر بھیجواؤں گا۔ یہاں تو ایک ہی پیس موجود ہے۔ کلر کے بارے میں کیا حکم ہے سر؟"

"میٹیلک بلیک۔" میں نے ہنی سے پوچھے بغیر گویا مکمل اپنی مرضی چلاتے ہوئے کہا۔

امجد نے ایک لمحے کے لئے پنسل سے سر کھجاتے ہوئے گویا ذہن پر زور دیا پھر مطمئن انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے سر! اس کلر کا بھی ایک پیس موجود ہے۔"

میں اٹھنے کے ارادے سے بریف کیس بند کر رہا تھا کہ میرے برابر والی کرسی پر بیٹھے ہوئے شخص نے کھنکار کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "سر! گستاخی معاف... اگر آپ جلدی میں نہیں ہیں تو ایک آدھ منٹ کے لئے ہمیں بھی ہمکلامی کا شرف عنایت فرمائیں۔"

میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ پتلا دبلا ایک سانولا سا نوجوان تھا۔ جس کی پتلی پتلی مونچھیں بے وقوفانہ سے انداز میں نیچے کو لٹکی ہوئی تھیں لیکن اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں قدرے شاطرانہ چمک تھی۔ وہ سفید مگر کچھ شکن آلود سی قمیص پر عنابی سویٹر پہنے ہوئے تھا۔ ساتھ پرانے فیشن کی سیاہ ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ گویا منکسرالمزاجی کے اظہار کے لئے مسکرا دیا۔ اس کے دانتوں پر پان خوری اور چائے وسگریٹ نوشی کی وجہ سے مختلف رنگوں کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ سفیدی ذرا کم ہی تھی۔

میں نے نہایت آہستگی سے ہاتھ بڑھا کر اس کا استخوانی سا ہاتھ تھام لیا اور رسمی سا مصافحہ کرنے کے بعد کہا "میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

"پہچانیں گے کیسے چوہدری صاحب! جبکہ یہ ہماری پہلی ملاقات ہے" اس نے شاید خود اعتمادی کے اظہار کے لئے یا پھر شاید اپنی بات میں مزاح کا کوئی پہلو محسوس کرتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

میں بدستور ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ بات کرتے وقت نروس ہے لیکن اپنی گھبراہٹ کو چھپانے کی حتی الامکان کوشش کر رہا ہے۔ جلدی سے سگریٹ کا کش لگا کر وہ بولا "..... ہم جیسے غریب غرباء اور گمنام سے لوگوں کو تعارف

کے بغیر کون پہچانتا ہے جناب! یہ تو آپ جیسے بڑے لوگ ہوتے ہیں جنہیں لوگ غائبانہ طور پر بھی جانتے ہیں اور کبھی کبھی دور سے دیکھ کر سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں' وہ دیکھو سیٹھ محمد افضل چوہدری صاحب جارہے ہیں۔"

میں نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے برابر بیٹھی ہوئی ہنی شاید کچھ مضطرب تھی۔

نوجوان کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا "سر! خاکسار کو رحمت علی رشک کہتے ہیں اور میں ہفت روزہ "فلم نگر" کا نمائندۂ خصوصی ہوں۔ خاصی بڑی اشاعت کا ہفت روزہ ہے۔ خاص طور پر فلمی دنیا میں اور فلم کے شائقین میں بڑی دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے۔ شاید کبھی آپ کی نظر سے گزرا ہو۔ ہمارا کاروباری نمائندہ بڑی باقاعدگی سے آپ کے اسٹوڈیو والے آفس میں اس کی دو کاپیاں پہنچاتا ہے۔"

"میں معذرت خواہ ہوں... اور شاید یہ میری بد نصیبی ہے کہ آپ کا ہفت روزہ آج تک میری نظر سے نہیں گزرا" میں نے ملائمت سے کہا "میں اسٹوڈیو والے آفس میں کم ہی جاتا ہوں اور جب جاتا ہوں تو بہت سے دوسرے کام ہوتے ہیں۔"

"میرا بھی یہی اندازہ ہے سر" وہ جلدی سے بولا "اسی لئے میں بذاتِ خود کئی بار آپ کے دوسرے آفس بھی حاضر ہوا لیکن آپ سے شرفِ ملاقات حاصل نہ ہو سکا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ آپ... اب کسی نہ کسی انداز میں فلمی دنیا میں داخل ہو ہی چکے ہیں تو ہم بھی اپنے ہفت روزے کو آپ سے متعارف کرا سکیں..." پھر اس نے کھنکار کر دوبارہ گلا صاف کیا گویا گفتگو کے اہم حصے کی طرف آنے لگا ہو "آپ کی پروڈکشنز بھی زور و شور سے جاری ہیں۔ تو ہم چاہ رہے تھے کہ آپ کی فلموں کے اشتہارات کا بھی کچھ سلسلہ بن جائے۔ ہمارے ہفت روزے کے لئے اشتہارات دے کر آپ بہت فائدے میں رہیں گے سر! ہم آپ کی فلموں پر اچھے قسم کے تبصرے بھی ساتھ ساتھ شائع کرتے رہیں گے۔"

"آپ کی اس مخلصانہ پیشکش کے لئے میں آپ کا شکرگزار ہوں برادرم رحمت علی رشک صاحب!" میں نے ملائمت سے کہا۔ "لیکن اس معاملے میں براہِ راست مجھ سے معاملات کا کوئی فائدہ نہیں۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ خاص معلومات نہیں۔ میں نے آفاق صاحب کو اس شعبے کا مختارِ کل بنایا ہوا ہے۔ وہ اس ضمن میں جو مناسب سمجھتے ہیں' کرتے ہیں۔ میرے پاس ان معاملات کے لئے وقت نہیں ہے۔ آپ انہی سے رابطہ رکھئے۔ وہ اگر آپ کی تجویز کو فائدہ مند سمجھیں گے تو ضرور آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔"

"ان سے تو ہم ملتے ہی رہتے ہیں سر" اس کا لہجہ یک لخت کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہو گیا "پہلے تو وہ ہم سے کچھ تھوڑے بہت اخلاق سے مل لیتے تھے' جب سے انہیں آپ کی سرپرستی حاصل ہوئی ہے تب سے تو وہ ہمیں گھاس ہی نہیں ڈالتے اور نہ ہی ہمارا اخبار ان کی نظر میں جچتا ہے۔"

"میں ان سے آپ کی سفارش کروں گا۔ لیکن مسئلہ یہی ہے برادرم کہ میرے کاروبار میں بیسیوں شعبے ہیں اور کسی نہ کسی شخص کو میں نے وہ شعبہ سونپا ہوا ہے۔ وہی اس کے سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ میں بزنس کا اصل مالک ہونے کے باوجود اکثر ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا۔ وہ اپنے فیصلوں میں خود مختار ہوتے ہیں۔ بہرحال... آپ ایک بار پھر آفاق سے مل لیجئے گا۔ میرا حوالہ دیجئے گا۔ شاید وہ از سرِنو آپ کی بات پر غور کرے۔"

"بہتر ہے۔ آپ کہتے ہیں تو میں آج ہی ان سے مل لوں گا" وہ ایک مڑے تڑے سے پیکٹ سے نئی سگریٹ نکالتے ہوئے بولا۔ ...اس کے لہجے میں اب پہلا سا جوش و خروش نہیں رہا تھا۔ شاید آفاق نے کبھی اس کی ہمت افزائی یا اس کے ساتھ تعاون نہیں کیا تھا اور اگر آفاق نے اسے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا تھا تو یقیناً وہ اس قابل رہا ہی نہیں ہو گا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور میرے ساتھ ہی تیزی سے ہنی بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ امجد سے رسمی' الوداعی جملوں کے تبادلے کے بعد ہم باہر آ گئے اور ہنی نے گویا سکون کی سانس لی۔

"شکر ہے اس نے مجھے پہچانا نہیں" وہ مطمئن لہجے میں بولی "یا شاید آپ کی موجودگی کی وجہ سے اس نے مجھے مخاطب نہیں کیا ورنہ بہت بور کرتا۔"

"تم مل چکی ہو اس سے؟" میں نے پوچھا۔

"جن دنوں میری پہلی فلم ریلیز ہوئی تھی جس میں میرا صرف ایک بے ہنگم سا رقص شامل تھا' ان دنوں اخباروں' رسالوں میں میرے خاصے انٹرویو چھپے تھے۔ یہ بھی انہی دنوں انٹرویو لینے گھر آیا تھا اور انٹرویو چھاپنے کے بعد بھی آتا ہی رہا' کمبل ہو جاتا تھا' بہت بور کرتا تھا۔ آخر کار میں نے بہانے کر کے اس سے کترانا شروع کر دیا۔ کافی پرانی بات ہو گئی۔ میں نے تو اسے پہچانا ہی نہیں تھا۔ جب اس نے بولنا شروع کیا تب میں نے اسے پہچانا۔ ...اتنے عرصے میں اس میں ذرا سی بھی تبدیلی نہیں آئی۔"

"وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں ہر شخص میں نہیں آتیں" میں نے کہا اور پھر موضوع بدل دیا "میں نے جو گاڑی تمہارے لئے پسند کی ہے' تمہاری دیکھی ہوئی ہے نا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تمہیں پسند ہے نا؟" میں نے پوچھا۔

"اگر بات دوستی اور تحفے ہی کی آ گئی ہے تو آپ اگر گدھا گاڑی بھی لے دیتے تو وہ بھی مجھے رولز رائس سے زیادہ عزیز ہوتی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے اسے اس کے گھر پر اتارا تو وہ متوقع سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "آپ اندر نہیں آئیں گے' کچھ دیر ٹھہریں گے نہیں؟"

"اس وقت نہیں... پھر کبھی سہی" میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا اور گاڑی ریورس کر کے باہر نکالی۔ گیٹ بند ہونے تک وہ مجھے برآمدے ہی میں کھڑی اور ایک ٹک باہر کی طرف دیکھتی نظر آئی۔

میں گلیوں سے نکل کر مین بلیوارڈ پر آیا تو نہ جانے کیونکر مجھے احساس ہوا کہ سفید رنگ کی ایک گاڑی خاصا مناسب فاصلہ رکھ کر میرے پیچھے آ رہی ہے۔ اس سے پہلے بھی یونہی دو ایک مرتبہ سرسری سے انداز میں نظر پڑنے پر ذہن کے کسی گوشے میں خفیف سا احساس ابھرا تھا کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے لیکن اس وقت میرے عقب میں کئی گاڑیاں تھیں اس لئے میں واضح طور پر کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تھا اور پھر سفید رنگ تو بہت عام ہے۔

لیکن اس وقت میرے پیچھے وہ اکیلی ہی گاڑی تھی اور فاصلہ گو کہ خاصا تھا لیکن میری نامعلوم حس مجھے بتا رہی تھی کہ وہ میرے ہی تعاقب میں ہے۔ میں نے رفتار کم کی تو اس کی رفتار بھی کم ہو گئی اور یوں فاصلہ برقرار رہا۔ میں عقب نما آئینے میں اس کے ڈرائیور کی صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ پہلے فوارے سے موڑ مڑنے کے بعد میں نے گاڑی دو تین سیکنڈ کے لئے روک ہی لی اور جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ سفید گاڑی بھی موڑ تک پہنچ چکی ہو گی تو میں نے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی۔ اب وہ گاڑی میرے عقب میں موڑ پر نمودار ہوئی تو ہمارے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں تھا۔

عقب نما آئینے میں عکس بے شک بہت چھوٹا نظر آتا تھا لیکن پچھلی گاڑی کے ڈرائیور کو بہرحال اب میں پہچان سکتا تھا اور اسے پہچان کر میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ٹونی تھا۔ گاڑی بھی اپنی ہی تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ شبیر شیخ نے میری نگرانی اور حفاظت کے سلسلے میں اس کی ڈیوٹی لگا دی تھی یا پھر اس نے خود اپنے طور پر ہی یہ فریضہ سنبھال لیا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں کوئی ہدایت نہیں دی تھی اور نہ ہی ایسی کوئی خواہش ظاہر کی تھی۔ یہ ان لوگوں کی اپنی ہی مستعدی یا پھر مجھ سے محبت کی علامت تھی۔

میں نے اس سلسلے میں ٹونی کو کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا اور ایکسیلریٹر دبا دیا۔ میری گاڑی کسی طیارے کے ٹیک آف کرنے کے سے انداز میں تیزی سے آگے بڑھ گئی۔ میرے ساتھیوں کو یقیناً اب بھی مجھ سے بے پروائی کا ہی اندیشہ تھا لیکن میں اب اتنا بے پروا بھی نہیں رہا تھا۔ میری ذاتی انٹیلیجنس سروس کی اطلاعات کے مطابق قیصر ملک ابھی تک شہر واپس نہیں آیا تھا تاہم اس کا اسٹوڈیو والا آفس باقاعدگی سے کھل رہا تھا اور اس کے باپ کے زمانے سے فلموں کے جو شیڈول چل رہے تھے انہی کے مطابق شوٹنگ ہو رہی تھی۔ بہرحال شہر میں قیصر ملک کے موجود نہ ہونے کے باوجود میں نے احتیاطی تدابیر شروع کر دی تھیں۔

میری گاڑی میں ڈیش بورڈ کے نیچے ایک خصوصی خانے میں ایک بہترین قسم کا مشین پسٹل موجود رہتا تھا۔ جس کی مار بہت دور تک تھی۔ میرے کوٹ کی اندر کی جیب میں ایک چپٹا پستول اور دوسری جیب میں مختصر سا سائلنسر موجود رہتا تھا۔ پنڈلی کے ساتھ ایک مخصوص ساخت کی نیام میں نہایت پتلا دودھاری خنجر بندھا رہتا تھا۔ اس کے علاوہ میری جیب میں نائیلون کی ایک نہایت باریک ڈوری موجود رہتی تھی جس کے دونوں سروں پر بھاری دھات کے دو موٹے موٹے چھلے بندھے ہوئے تھے۔ میرے لئے یہ بڑے کام کی چیز تھی اور اس سے میں بڑے خطرناک قسم کے کرتب دکھا سکتا تھا۔ ان تین چار چیزوں کی موجودگی میں مَیں اپنے آپ کو کسی بہت بڑے اور پیشہ ور بدمعاشوں پر مشتمل گروہ کے مقابلے کے لئے بھی تیار پاتا تھا۔

اس کے بعد میرے چند دن بے حد مصروفیت میں گزرے۔ اس دوران مجھے کراچی بھی جانا پڑا جہاں میرے ہوٹل کی تعمیر کے سلسلے میں مختلف کاموں کے لئے شہرت یافتہ کمپنیوں سے ٹینڈر طلب کئے جا چکے تھے اور مجھے کچھ خصوصی مسائل کے سلسلے میں ان میں سے چند کمپنیوں کے نمائندوں سے انٹرویو کرنا تھے۔ کراچی کے اس ہنگامی دورے سے واپس آ کر مجھے دو دن کے لئے

اسلام آباد جانا پڑا۔

ان کاموں سے ذرا فرصت پاکر میں اس دن معمولات بحال ہونے پر آفس پہنچا۔ چند ایک ضروری ٹیلیفون کالز سے فارغ ہونے کے بعد میں گزشتہ روز کی ڈاک دیکھنے لگا۔ میری ذاتی ڈاک میں ایک رنگ برنگا سا تہ شدہ اخبار بھی موجود تھا۔ پہلے تو میں اسے کھول کر دیکھے بغیر ہی ایک طرف رکھنے لگا تھا لیکن پھر اس کے نام پر نظر پڑ گئی "فلم نگر" مجھے یاد آیا کہ اس ہفت روزے کے حوالے سے ایک صاحب چند دن پہلے مجھے اتفاقاً کاروں کے شوروم میں ملے تھے۔

میں نے یونہی نیم توجہی سے اخبار کھولا تو ایک صفحے پر پن کے ذریعے ایک چھوٹی سی چٹ منسلک نظر آئی۔ شاید میری توجہ مبذول کرانے کے لئے اس صفحے پر خصوصی طور پر فلیگ لگایا گیا تھا۔ ۔۔میں نے وہ صفحہ کھول کر نظر دوڑائی تو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ اس صفحے پر فلیگ کیوں لگایا گیا تھا۔

اس صفحے پر تین کالمی اور خاصی جلی سرخی کے ساتھ میرے بارے میں خبر چھپی ہوئی تھی اور اس کی طرف بھی توجہ دلانے کے لئے سرخ قلم سے حاشیہ لگایا گیا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ رحمت علی رشک نے بذات خود اخبار مجھے بھیجنے کے لئے خصوصی اہتمام کیا تھا۔ سرخی تھی:

'ملک کے ممتاز صنعت کار اور تاجر محمد افضل چوہدری نے فلمی دنیا کی تیسرے درجے کی ناکام رقاصہ ہنی کو نئی بیش قیمت کار لے دی!'

نیچے خوب نمک مرچ لگا کر اس واقعے کو بیان کیا گیا تھا کہ پچھلے دنوں کس طرح سیٹھ محمد افضل چوہدری صاحب ناکام اور بدنام رقاصہ ہنی کے ساتھ کاروں کے ایک بڑے شوروم میں آئے اور انہوں نے ناز و ادا دکھاتی ہوئی ہنی کو بڑے پیار سے ایک بیش قیمت کار خرید کر دی۔ شوروم میں ہونے والے میرے اور ہنی کے محض دو تین مکالموں کو بنیاد بنا کر خبر کو طول دینے کی حتی الامکان کوشش کی گئی تھی۔ تاثر کچھ ایسا ہی ملتا تھا جیسے میں کوئی بڑا عیاش سا آدمی ہوں۔

انتہائی کھردرے الفاظ کے ذریعے ہنی کی کھنچائی کرنے کی بھی پوری کوشش کی گئی تھی۔ قطعی غیر ضروری طور پر خبر میں یہ حوالہ بھی ٹھونسنے کی کوشش کی گئی تھی... واضح رہے کہ رقاصہ ہنی کا شاہی بازار سے پرانا خاندانی تعلق رہا ہے اور اس نے خود بھی خاصا عرصہ وہاں گزارا ہے۔

خبر پڑھ کر ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی کنپٹیوں میں ہلکی سی تپش محسوس ہوئی لیکن فوراً ہی میں پُرسکون ہو گیا تاہم ایک خفیف سی حیرت برقرار رہی کہ میں تو حتی الامکان معقولیت سے رحمت علی رشک سے ملا تھا لیکن اس نے یہ تکلیف دہ سا انداز کیوں اختیار کیا تھا؟ کیا اس کے خیال میں یہ مجھ پر دباؤ ڈالنے کا طریقہ تھا؟ اور مجھے قریب سے جانے بغیر کیا اس بے وقوف کو امید تھی کہ میں اس قسم کے دباؤ میں آجاؤں گا؟ یا پھر بس اسے محض سنسنی خیز خبروں سے اپنے اخبار کا پیٹ بھرنا ہوتا تھا؟ خواہ وہ خبریں کہیں سے بھی ملیں، کسی بھی ذریعے سے ملیں، خواہ کتنی ہی غیر مصدقہ ہوں اور خواہ ان میں کتنا ہی مرچ مسالہ لگانا پڑے؟

مجھے یہ غور و خوض قطعی بیکار محسوس ہوا۔ میں نے اخبار پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور باقی ڈاک دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد میں اس بات کو بالکل بھول گیا۔

لیکن لوگ شاید نہیں چاہتے تھے کہ میں اس بات کو بھولوں۔ ...تقریباً ایک گھنٹے بعد آفاق کا فون آیا "سر! آپ کو ڈاک میں ہفت روزہ 'فلم نگر' تو نہیں ملا؟" اس نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"ملا ہے" میں نے سرسری سے ہی لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے یہی توقع تھی" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "اس شخص کا طریقۂ واردات یہی ہے۔"

"میں تو اس سے خاصے دوستانہ انداز میں ملا تھا اور میں نے اسے ایک بار پھر تم سے ملنے کی ہدایت کی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے تم نے اس بار بھی اسے گھاس نہیں ڈالی جس کی خار اس نے مجھ پر نکالی ہے" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"گھاس تو ہم اسے ڈالتے رہتے ہیں سر! لیکن شاید اتنی نہیں ڈالتے جتنی وہ چاہتا ہے" آفاق بولا "میں اسے خاصے عرصے سے جانتا ہوں سر! اس کے اخبار کی قطعاً کوئی قابل ذکر اشاعت نہیں ہے۔ معمولی سا اخبار ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ بذریعہ ڈاک فلمی دنیا کی ہر قابل ذکر شخصیت کو جاتا ہے چنانچہ جب کسی ایک شخصیت کے متعلق اس میں کوئی خبر چھپتی ہے تو ملاقات ہونے پر دوسرے بہت سے لوگ اس کا تذکرہ کرتے ہیں، استفسار کرتے ہیں۔ اس سے مذکورہ شخص گھبرا جاتا ہے کہ معلوم نہیں وہ دنیا میں کتنا بدنام ہو گیا ہے۔ آپ پریشان تو نہیں ہوئے خبر پڑھ کر؟"

میں ہنس دیا "اگر میں اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے پریشان ہونے لگوں تو پھر میں کر چکا بزنس۔ وہ اخبار پرزوں کی صورت میں میری ردی کی ٹوکری میں پڑا ہے۔"

"بہت خوب" وہ مطمئن لہجے میں بولا "میں آپ کو بتانا یہ چاہ رہا تھا کہ اس اخبار میں اپنی فلموں کے اشتہار دے کر ہمیں کوئی خاص فائدہ تو ہوتا نہیں اور ابھی ہماری فلمیں ریلیز کے مرحلے سے بھی بہت دور ہیں اس کے باوجود ہم محض اس اخبار کی سرپرستی اور بلا امتیاز ہر چھوٹے بڑے اخبار اور رسالے سے تعلقات بہتر رکھنے کی پالیسی کے تحت اسے بھی تھوڑے بہت اشتہارات ریلیز کرتے رہے ہیں لیکن رحمت علی رشک کچھ زیادہ ہی لمبے فوائد چاہتا ہے۔ اس کے مطالبات کچھ زیادہ ہی بڑھتے جا رہے تھے اور ان کا تعلق اب اخبار کے بجائے اس کی اپنی ذات سے ہوتا جا رہا تھا اس لئے میں نے اسے نظرانداز کرنا شروع کر دیا تھا۔"

"ٹھیک ہے۔ جو تم مناسب سمجھو وہ کرو" میں نے قدرے عدم دلچسپی سے کہا۔

"آپ اگر مناسب سمجھیں تو اس کا دماغ درست کرنے کا کچھ بندوبست کیا جائے؟ آپ کا تو ایک اشارہ ہی کافی ہوگا" آفاق پُرتجسس سے لہجے میں بولا۔

"ارے نہیں بھئی..." مجھے ہنسی آگئی "ہمارے معمولات میں ان چھوٹے موٹے کاموں کی گنجائش نہیں۔ اس مسکین سے آدمی کا کیا بندوبست کرنا۔ اسے اپنا کام کئے جانے دو۔ ہم اپنا کام کرتے رہیں گے۔ البتہ ایک کام ضرور کرنا۔ اب تک جو تھوڑے بہت اشتہارات اس کے اخبار کے لئے ریلیز ہوتے رہے ہیں یا آئندہ جو کچھ بھی دینے کا ارادہ تھا وہ سب بند کر دو۔ آئندہ کے لئے اس اخبار کو اپنی تشہیری مہم کی فہرست سے قطعی طور پر خارج کر دو۔ میری کوشش اور خواہش تو یہی ہوتی ہے کہ ہمارے اداروں سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فیض پہنچے، کسی کو بھی کوئی شکوہ نہ ہو۔ لیکن اس شخص سے اگر اب بھی ہم نے مہربانی کا سلوک جاری رکھا یا نوازشات میں اضافہ کیا تو اسے یقین ہو جائے گا کہ ہم بلیک میل ہو گئے ہیں۔ اسے یہ تاثر کسی قیمت پر نہیں ملنا چاہئے۔"

"اوکے سر!" آفاق مستعدی سے بولا "میں تو خود یہی چاہتا تھا، آپ سے اس کی تصدیق ہو گئی تو اور بھی اچھا ہو گیا" یہ گویا اس کے دل کی بات تھی۔

سلسلہ منقطع کر کے میں نے باہر کی پارٹیوں کے مزید صرف دو ہی خط پڑھے تھے کہ انٹرکام کا بزر ایک بار پھر بول اٹھا۔ کیتھرین نے بتایا کہ ہنی نام کی کوئی خاتون مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔

"ملاؤ" میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر کہا۔ میں نے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا تو ہنی کی مترنم آواز سنائی دی "کیسے ہیں آپ؟"

"بالکل ٹھیک۔ تم سناؤ..... لیکن پہلے میں معذرت کر لوں کہ زبردست مصروفیت کی وجہ سے میں تم سے ملنا تو درکنار، فون بھی نہیں کر سکا" میں نے حقیقتاً معذرت خواہی کے جذبے کے ساتھ کہا "تم سے گزشتہ ملاقات کے بعد قاعدے قرینے سے میں آج ہی آفس آیا ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں فون کرتی رہی ہوں اور مجھے آپ کی مصروفیات کا پتا چلتا رہا ہے" اس کے لہجے میں نہ جانے کیوں ہلکی سی افسردگی کی جھلک تھی "ویسے مجھے اتنی جلد آپ کی آمد یا فون کی توقع بھی نہیں تھی۔"

"اچھا یہ بتاؤ گاڑی پہنچ گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ مل گئی تھی اور میں نے شوق ہی شوق میں اسے ڈھائی تین سو میل چلا بھی ڈالا ہے.... آپ کو شاید اس گاڑی کی رسید نہیں ملی؟"

"رسید.....؟" میں نے حیرت سے پوچھا "کیسی رسید؟"

"ہفت روزہ 'فلم نگر' میں اس کی رسید چھپ گئی ہے نا" اس کے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی "مگر آپ تو بڑے آدمی ہیں۔ یہ چھوٹے موٹے اخبار آپ کی نظر سے کہاں گزرتے ہوں گے۔ ویسے پڑھتی تو میں بھی نہیں ہوں لیکن یہ شمارہ خاص طور پر مجھے ڈاک میں بھیجا گیا ہے۔ میں رحمت علی رشک کو شوروم میں دیکھ کر ہی کھٹک گئی تھی کہ اب ضرور کوئی گل کھلے گا۔"

"اوہ.....تو تمہارا اشارہ اس خبر کی طرف ہے" میں نے گہری سانس لی "تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ وہ میں پڑھ چکا ہوں۔ اخبار مجھے بھی ارسال کیا گیا تھا۔ لیکن تم اس بات پر اتنی پریشان کیوں ہو؟"

"کیا مجھے پریشان نہیں ہونا چاہئے؟" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "اس قسم کی غلط سلط اور الٹی سیدھی خبروں کی وجہ سے میرا امیج پہلے ہی بہت خراب ہو چکا ہے۔ میں اپنے آپ کو پارسا تو ظاہر کرنا نہیں چاہتی لیکن اس ایک خبر سے ہی آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بات کا پس منظر کیا ہوتا ہے اور وہ لوگوں کے سامنے کس انداز میں آتی ہے۔ دکھ مجھے اسی بات کا ہوتا ہے کہ جب لوگوں کو حقیقت معلوم نہیں ہوتی...تو وہ محض سرسری نظر سے دیکھ کر، اندازے قائم کر کے افسانے کیوں لکھنے بیٹھ جاتے ہیں؟"

"دنیا کا کام یہی ہے۔ کچھ لوگ افسانے لکھتے ہیں، کچھ افسانے بولتے ہیں۔ اور میرا مشورہ یہ ہے کہ دنیا کو اپنا کام کرنے دو۔ تم اپنا کام کرتی رہو۔ اگر تم ان باتوں میں الجھو گی تو ان کا مقصد پورا ہو گا۔ وہ تمہیں الجھانا ہی تو چاہتے ہیں۔ فضا میں جتنی زیادہ گرما گرمی پیدا ہوگی انہیں اتنی ہی خوشی ہوگی۔ تمہاری طرف جتنی خاموشی، جتنا سکوت رہے گا انہیں اتنی ہی مایوسی ہوگی۔ ...اور یہی بہترین ردعمل ہے" میں نے نہایت ٹھہرے نکھرے لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"آپ جیسے لوگوں کا کچھ نہیں بگڑتا اس لئے آپ ایسی باتیں کر سکتے ہیں۔ مجھے سمجھا سکتے ہیں" وہ گویا رو دینے کو تھی "لیکن میں آپ کو بتاتی ہوں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے میرے لئے کتنا فرق پڑتا ہے۔ فلمی دنیا کے دروازے مجھ پر اس قسم کی قیاس آرائیوں نے بھی بند کئے ہیں۔ پہلے تو ایک عرصے تک لوگوں کے پیٹ میں یہ درد اٹھتا رہا کہ بظاہر میرا کوئی ذریعۂ آمدنی نہیں تو میں اتنے ٹھاٹ باٹ سے کیسے رہتی ہوں۔ اس ضمن میں بھی حقیقت گو کہ کسی کو معلوم نہیں تھی مگر مختلف قیاس آرائیاں کی جاتی رہیں۔ لیکن خیر... اس بات سے مجھے اتنا نقصان نہیں پہنچا کیوں

کہ فلمی دنیا کے لوگوں کو اس بات پر زیادہ تشویش نہیں ہوتی کہ ایک لڑکی کا اگر بظاہر کوئی خاص ذریعۂ آمدنی نہیں ہے تو وہ ٹھاٹ باٹ سے کیوں رہتی ہے۔ ان کے گرد ایسی بہت سی لڑکیاں موجود رہتی ہیں' فلم انڈسٹری میں آتی جاتی رہتی ہیں۔ کوئی ان کے بارے میں زیادہ باریکیوں میں نہیں جاتا۔ سب کو تقریباً سبھی کچھ پتا ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ نقصان مجھے اس بات سے پہنچا کہ میرا امیج ایک خطرناک لڑکی کا بنا دیا گیا۔"

"خطرناک لڑکی؟" میں نے یونہی ذرا سی حیرت ظاہر کی حالانکہ یہی بات مجھے آفاق بھی بتا چکا تھا۔

"ہاں...." وہ جیسے سسکی سی لے کر بولی "بات یہ تھی کہ ایک بہت بڑا سرکاری افسر کچھ ملک دشمن سرگرمیوں میں ملوث تھا۔ غداری کا مُرتکب ہو رہا تھا۔ لیکن مجھے صحیح طور پر نہیں معلوم کہ وہ کس حد تک قصوروار تھا۔ میرا جرم صرف اتنا تھا کہ میں اس بات سے بالکل بے خبر تھی اور اس شخص کا ہمارے ہاں آنا جانا تھا۔ جب قانون کا ہاتھ اس شخص تک پہنچا تو وہ تو اپنی خفیہ دولت' نہ جانے کون کون سے وسائل اور پرانی شناسائیاں استعمال کرتے ہوئے صاف بچ نکلا۔ ملک سے فرار ہو گیا۔ تحقیقاتی ایجنسیوں نے ان تمام لوگوں کو دھر لیا جن سے اس کا چاہے کسی بھی سلسلے میں مختصر سا بھی رابطہ رہا تھا۔ کبھی اگر اس نے دو آدمیوں کی موجودگی میں سرِراہ کسی سے مصافحہ بھی کیا تھا تو اسے بھی دھر لیا گیا۔ ان دُکانداروں تک کو طلب کر لیا گیا جن سے وہ سگریٹ پان' شیو کا سامان یا کچھ اور خرید تا تھا اور ایک آدھ منٹ کے لئے ان کے پاس کھڑے ہو کر ہنس بول لیتا تھا۔"

"ہاں۔ یہ تو ہوتا ہے ہمارے ہاں" میں نے تاسف سے کہا۔

"بات اگر صرف پوچھ گچھ اور تفتیش کی ہو تب بھی ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو تو معلوم ہی ہو گا کہ ہمارے ہاں ان لوگوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے" وہ دکھ سے بولی۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"میں بھی ایک ناروا دور سے گزری۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں تو کسی کو جا کر سنا بھی نہیں سکتی کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ تحقیقاتی افسروں میں سے کس نے میرے ساتھ کیا کیا اور کس نے کیا کہا۔ میں وہ سب لرزہ خیز داستانیں سینے ہی میں مقید رکھنے پر مجبور ہوں۔ اخبار والے اسی زمانے میں بھی میرے بارے میں محض مبہم اطلاعات یا مختلف اداروں کی فراہم کردہ معلومات کے سہارے اور کچھ اپنی قیاس آرائیوں کی مدد سے خبریں چھاپتے رہے۔ کچھ میرا چہرہ بھی فوٹو جینک ہے۔ اخبار میں تصویر اچھی آتی ہے اس لئے اگر قارئین تک پہنچانے کے لئے کوئی بات نہیں ہوتی تھی تب بھی لفاظی پر مشتمل کوئی نہ کوئی خبر بنا کر ساتھ تصویر ضرور لگا دی جاتی تھی۔ درحقیقت کسی بھی لکھنے والے کی مجھ تک رسائی ہونے ہی نہیں دی گئی تھی کہ کوئی مجھ سے بھی پوچھ سکتا کہ آخر مجھ پر کیا گزری اور اگر کوئی آ بھی جاتا تو میں یقیناً اسے کچھ بتا بھی نہ پاتی اور اگر بعد میں بتاتی بھی تو چھاپ کون سکتا تھا؟ کوئی بھی نہیں۔ سب کو اسی معاشرے میں رہنا ہے۔ نوکری بھی کرنی ہے' روٹی بھی کمانی ہے۔ بچوں کا پیٹ بھی پالنا ہے اور زندہ بھی رہنا ہے۔"

اس کی باتوں نے ایک لمحے کے لئے مجھے سُن سا کر دیا۔ پہلی ملاقات میں سطحی اور سستی سی نظر آنے والی وہ لڑکی اپنے سینے میں جانے کیا کیا بھید' کیا کیا تلخیاں' کیسے کیسے انگارے چھپائے بیٹھی تھی۔

"پھر تمہارا چھٹکارا کیوں کر ہوا؟" میں نے سرگوشی نما لہجے میں پوچھا۔

"اس دنیا میں کچھ اچھے لوگ بھی باقی ہیں اور خصوصاً ہمارا معاشرہ تو شاید انہی کی وجہ سے قائم ہے ورنہ ہمارا یہ سماجی ڈھانچا شاید بہت پہلے زمیں بوس ہو چکا ہوتا۔ ایسے ہی ایک آدمی نے مجھے اس عذاب سے نجات دلائی۔ وہ شخص اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ میں مرتے دم تک اس کی شکر گزار رہوں گی حالانکہ وہ بھی اسی مشینری کا ایک پُرزہ تھا" اس کے لہجے میں دلی تشکر جھلک آیا۔

"لگتا ہے تمہاری زندگی نہایت دلخراش واقعات سے بھری پڑی ہے" میں نے کہا۔

"بے شک۔ اگر کوئی میری سوانح عمری لکھے تو نہایت سنسنی خیز اور بھیانک قسم کی انکشافاتی کتاب مرتب ہو سکتی ہے لیکن وہ یہاں چھپ نہیں سکتی۔ ویسے میں اکیلی نہیں ہوں۔ مجھ جیسی بہت سی لڑکیوں کے پاس ایسی بہت سی داستانیں ہوتی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میرے پاس کم عمری میں ہی زیادہ مواد جمع ہو گیا ہے اور وہ بھی مختلف النوع" اس نے یقیناً اپنے آنسوؤں کو پی جانے اور اپنے لہجے میں خوش دلی لانے کی کوشش کی تھی۔

"تم جیسے لوگوں میں مجھے بہت کشش محسوس ہوتی ہے" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کمال ہے!" اس نے اب قدرے شگفتہ لہجے میں کہا "دنیا کے مروّجہ اصولوں کے مطابق تو آپ کو ہم جیسے لوگوں سے نفرت کرنی چاہئے۔ گھن کھانی چاہئے۔"

"بیکار باتیں مت کرو۔ میں روایتی اور فرسودہ آدمی نہیں ہوں" میں نے کہا۔

جانے کیوں وہ دھیرے سے ہنس دی۔

میں نے سنجیدگی سے کہا "تمہاری شخصیت۔ ز کی طرح تہ در تہ ہے۔"

"اور اندر کچھ بھی نہیں ہے" اس نے کھوکھلا سا قہقہہ لگایا۔ "اور اگر کاٹتے جاؤ تو آنکھوں میں پانی ہی پانی" وہ شاید اب اپنی تلخی کو بھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں ایک لمحے کے لئے خاموش رہا تب وہ جیسے چونکتے ہوئے بولی "بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میں نے آپ سے یہ پوچھنے کے لئے فون کیا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"ارے.... آپ اتنی جلدی بھول گئے!" وہ حیرت سے بولی۔ "اسی خبر کے سلسلے میں"

"کرنا کیا ہے؟" اس بار میں نے حیرت کا اظہار کیا "ارے بھئی اس اخبار کو تہ کر کے ایک طرف رکھو بلکہ بہتر ہو گا کہ میری طرح اس کے پُرزے کر کے ردی کی ٹوکری میں ڈالو اور جو کام پہلے کر رہی تھیں' آرام سے دوبارہ اسی میں مصروف ہو جاؤ۔ اس کو بھول جاؤ۔ ذہن سے جھٹک دو۔"

"اچھا...." وہ جیسے میرے لہجے سے تقویت پاتے ہوئے بولی۔ "آپ کہتے ہیں تو ایسا ہی کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ پھر کسی دن ملاقات ہو گی۔ خدا حافظ" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور کافی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے گمان تک نہیں گزرا تھا کہ کبھی یہ لڑکی مجھے اس درجہ دلچسپ اور قابلِ توجہ محسوس ہونے لگے گی۔ کبھی کبھی انسان کے اندازے کیسے غلط نکلتے ہیں۔

اپنے خیالات سے چونک کر میں نے مزید تھوڑا سا ہی کام نمٹایا تھا کہ ایک بار پھر انٹر کام پر کیتھرین نے اطلاع دی کہ میرے لئے فون ہے۔ اس بار فون پر ستارہ تھی۔

خلافِ معمول اس کے لہجے میں کچھ تیکھا پن تھا جسے میں ابتدا میں محسوس نہ کر سکا۔

"کچھ زیادہ ہی مصروف ہو گئے ہو تم" وہ بولی "پچھلے دنوں مجھے خاصی فرصت میسر تھی میرا خیال تھا تم فون کرو گے۔ ملیں گے۔ باتیں ہوں گی۔ شاموں کی صورت کچھ سنور جائے گی' تنہائیوں کے تیور کچھ بدل جائیں گے...."

"اوہو۔ آج تو شاعری کر رہی ہو" میں نے اس کی بات کاٹی۔

"لیکن تمہیں شاید کافی دنوں سے میری شاعرانہ رفاقت کی کمی محسوس نہیں ہوئی۔ مصروف جو بہت تھے۔"

"مصروف تو میں بہت عرصے سے چلا آ رہا ہوں" میں نے ملائمت سے کہا۔

"لیکن اب مصروفیات کی نوعیت کچھ بدلتی جا رہی ہے نا۔ اب کچھ نئی مصروفیتیں بھی پیدا ہوتی جا رہی ہیں نا۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً تیسرے درجے کی ناکام اور بھولی بسری اداکاراؤں.... بلکہ رقاصاؤں کو عمدہ قسم کی کاریں دلوانا" اس نے بظاہر نہایت سرسری سے لہجے میں کہا۔

اس لمحے میرا دل چاہا کہ ریسیور اپنی پیشانی پر مار لوں۔ لیکن میں بمشکل اس خواہش پر ضبط کرتے ہوئے ایک طویل اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

"لگتا ہے آج پورے شہر نے وہ خبر پڑھ ڈالی ہے اور سب لوگوں کو اس پر تبصرہ کرنے کے سوا کوئی کام نہیں رہا" میں نے حتی الامکان نرمی سے کہا۔

"اوہو.... معلوم ہوتا ہے اس بات کا عام ہو جانا بہت ناگوار گزر رہا ہے" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ایک بار پھر اس کے لہجے میں رقابت کی جھلک محسوس کر کے میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ہمارے ایک دوسرے سے کوئی عہد وپیماں نہیں تھے اور وہ کوئی تخیل پرست عورت بھی نہیں تھی کہ خیالوں ہی خیالوں میں کچھ اچھوتے سے محل تعمیر کر لیتی اور انہیں آندھیوں کی زد پر دیکھ کر متوحش ہو جاتی۔ وہ تو نو عمری سے ہی بہت پریکٹیکل تھی۔ مغربی لڑکیوں سے بھی زیادہ پریکٹیکل۔ تو پھر اس رقابت کے کیا معنی تھے:

بہرحال وہ مجھے اچھی بھی بہت لگتی تھی۔ میں اس کے... ردِعمل پر ناگواری ظاہر کر کے اس کا دل دکھانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا "تم اب صفِ اول کی ہیروئن ہو۔ کیا ابھی تک تمہیں تجربہ نہیں ہوا کہ چھوٹے موٹے اخباروں میں چھپی ہوئی خبروں کی تہ میں چھپی ہوئی حقیقت کتنی مختلف ہوتی ہے۔ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے اخباروں میں جو کچھ چھپا ہو' حقیقت بھی لفظ بہ لفظ اسی طرح ہو۔ خبروں کی صداقت اور درستگی کا خیال تو وہی اخبارات رکھتے ہیں جن کا معاشرے میں کچھ مقام ہوتا ہے' کچھ روایات ہوتی ہیں اور کوئی ساکھ ہوتی ہے۔ ہر اخبار تو اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے اتنا دردِ سری مول نہیں لیتا۔"

"بہرحال بالکل ہی بے بنیاد بات تو نہیں چھپتی نا" اس کے لہجے کا تیکھا پن کچھ کم ہوا "دھواں تو وہیں سے اٹھتا ہے جہاں آگ لگی ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ میں ضرور تسلیم کرتا ہوں" میں نے بلا تامل کہا۔ "اس بات کا مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ہنی کو گاڑی دلائی ہے لیکن جو تاثر خبر میں دینے کی کوشش کی گئی ہے' میری کہانی اس سے بالکل مختلف ہے۔"

"اور وہ کہانی مجھے سنائی نہیں جا سکتی ہو گی؟" اس کے لہجے کی تہ میں تجسس اور اشتیاق کروٹیں لے رہا تھا۔

"اس میں فی الحال تمہارے لئے نہ تو کوئی دلچسپی ہو گی اور نہ ہی فی الحال ان طویل باتوں کو دہرانے کا کوئی فائدہ ہے" میں نے بدستور ملائمت سے کہا۔

"اچھا۔" وہ طویل سانس لے کر بولی "جیسے تمہاری مرضی۔ ویسے میری باتوں کا برا مت منانا۔ کبھی کبھی مجھے خود بھی احساس ہوتا ہے کہ اس قسم کی جلی کٹی باتیں کرنے کا مجھے کوئی حق نہیں پہنچتا۔ لیکن مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ بس.....دل کے ہاتھوں مجبور سی ہو جاتی ہوں۔ حالانکہ یہ میری فطرت کے بھی خلاف ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میں ہرجائی پن کی حد تک

حقیقت پسند ہوں۔"

"ہاں۔ انسان اپنے اوپر کتنے ہی پتھریلے خول چڑھا لے لیکن اندر کہیں نہ کہیں نرم و نازک جذبوں کی کونپلیں سر اٹھاتی رہتی ہیں" میں نے کہا۔

دوسری طرف ایک لمحے کے لئے بالکل خاموشی چھا گئی جیسے میرے لفظوں نے اس کے لئے سوچوں کی بھول بھلیوں کے دروازے کھول دئے ہوں۔ پھر وہ بہت ہی دھیمی اور کپکپاتی سی آواز میں بولی "انی! اب تو میں یہ بھی سوچنے لگی ہوں کہ تم جب کسی سے شادی کرو گے تو میرا کیا حال ہوگا؟ کہیں حسد کے مارے مجھے کچھ ہو تو نہیں جائے گا؟"

"ہوتا ہواتا کچھ بھی نہیں۔ یہ سب انسان کے خود ساختہ جذباتی ڈراوے ہیں۔ اب ہم لوگ جس اسٹیج پر ہیں وہاں تقریباً ہر چیز کو ہی ہنس کر سہنے کا ہم میں حوصلہ پیدا ہو چکا ہے۔ وہ عمر گزر گئی جب کسی کی بے وفائی راتوں کو جگاتی تھی، خون کے آنسو رلاتی تھی" میں نے ہنس کر کہا۔

"ابھی ہم کوئی بوڑھے تو نہیں ہو گئے۔ ابھی تو ہمارا شمار نوجوانوں ہی میں ہے" اس کو یکدم گویا عمر کے اندیشے نے آن گھیرا۔

"ہاں۔ ہیں تو نوجوان ہی" میں نے کہا "لیکن ہم نے زندگی میں سب کچھ دیکھ لیا ہے نا۔ سوچ میں پختگی آگئی ہے۔"

"سوچ میں پختگی آنے سے آدمی کوئی جذباتی صدموں سے محفوظ تو نہیں ہو جاتا" وہ حسب معمول عقل کی باتیں کر رہی تھی۔

...وہ عام فلمی عورتوں کی طرح سطحی عورت نہیں تھی۔

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن اس سے کم از کم انسان میں صدموں کو آسانی سے سہنے اور خود پر ہنسنے کا سلیقہ آجاتا ہے" میں نے کہا۔

دفعتاً اسے جیسے ایک اور خیال آیا۔ چونکنے کے سے انداز میں بولی "انی! ویسے تم شادی تو کسی بہت حسین، ذہین، خاندانی، تعلیم یافتہ اور پاکیزہ بی بی، قسم کی لڑکی سے کرو گے نا؟"

"یہ تم سے کس نے کہہ دیا؟" میں نے حیرت سے کہا "فی الحال تو میں اس سلسلے میں پُر یقین ہی نہیں ہوں کہ میں شادی کروں گا بھی یا نہیں۔ اور یہ بتانا تو تقریباً ناممکن ہی ہے کہ اگر کروں گا تو کیسی لڑکی سے کروں گا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ میرا کچھ پتا نہیں۔ میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کے بارے میں کوئی پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی۔"

"ہاں.... یہ تو ہے...." وہ قدرے مبہم لہجے میں بولی پھر جیسے اس نے سارے الجھے الجھے خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا "اچھا.... خیر.... کبھی وقت ملے تو آنا۔ تمہارا انتظار سا رہتا ہے۔"

اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس کے لہجے میں کوئی بات تھی جس نے ایک لمحے کے لئے مجھے خالی الذہن سا بنا دیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں کیا سوچ رہا ہوں، کیا محسوس کر رہا ہوں۔

ستارہ کا میرے ساتھ جو رویّہ تھا وہ کبھی کبھی مجھے جذباتی کشمکش میں مبتلا کر دیتا تھا جب کہ میں کسی بھی قسم کی جذباتیت میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا۔

میرا دل کام سے اُچاٹ سا ہو گیا تھا لیکن بہت سے خطوط کی فائل دیکھنا بہت ضروری تھا اس لئے میں نے بمشکل اپنے آپ کو دوبارہ کام کی طرف متوجہ کیا۔ ابھی میں نے باہر کی پارٹیوں کے چند ہی خطوط پڑھے تھے کہ کیتھرین نے ایک بار پھر ٹیلی فون کال کی اطلاع دی۔ آفاق دوبارہ کسی اہم سلسلے میں مجھ سے بات کرنا چاہتا تھا۔

لائن ملی تو آفاق بولا "دوبارہ آپ کو زحمت دینے کی معافی چاہتا ہوں سر! بات کچھ زیادہ اہم نہیں لیکن میں نے مناسب سمجھا کہ آپ کی رائے ضرور معلوم کر لوں۔ ہماری پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے صدر ہیں نا، سعید اللہ سعید صاحب.... پچھلی مرتبہ ایسوسی ایشن کے سالانہ ڈنر میں میں نے آپ سے ان کا تعارف کرایا تھا۔"

"ہاں۔ مجھے یاد تو پڑتا ہے۔ بھاری بھرکم سے سرخ و سفید سے آدمی تھے نا؟" میں نے اپنی یادداشت کو کھنگالا۔

"جی ہاں۔ وہی" آفاق قدرے پُرجوش لہجے میں بولا "بہت اچھے اور بہت کام کے آدمی ہیں سر۔ آپ سے مل کر وہ خوش بھی بہت ہوئے تھے وہ خود بہت بڑے آدمی ہیں جی۔ بہت دولت مند بھی ہیں۔"

"کیا اتنی دولت انہوں نے فلم سازی میں ہی کمائی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں سر! ان کے اور بھی کئی بزنس ہیں۔ کئی سینما ہاؤس ہیں۔ فیکٹریاں ہیں۔ بڑی زبردست چیز ہیں.... اور پھر ایسوسی ایشن کے صدر بھی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ آپ کے ان کے ساتھ اچھے مراسم ہونے چاہئیں۔ وہ خود بھی آپ سے راہ و رسم بڑھانے کے بڑے خواہش مند ہیں۔ چند دن بعد ان کے ہاں ایک بہت بڑی تقریب منعقد ہو رہی ہے۔ ان کے لئے کئی خوشیاں یکجا ہو گئی ہیں۔ حال ہی میں ان کی فلم "رُت مستانی" نے پلاٹینم جوبلی کی ہے۔ ادھر ان کے ہاں شادی کے تقریباً دس سال بعد پہلی اولاد ہوئی ہے۔ پھر یہ کہ اس سال وہ دوسری مرتبہ ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے ہیں۔ ان کے لئے یہ سب خوشیاں بے انتہا اہم ہیں اور ان کا خیال ہے اب تو انہیں ایک زوردار تقریب ضرور منعقد کرنی چاہئے۔ اور ان کے ہاں منعقد ہونے والی تقریبات اپنی مثال آپ ہوتی ہیں۔ میری درخوست ہے کہ آپ اس تقریب میں ضرور شرکت کریں۔ انہوں نے مجھ سے درخوست کی تھی کہ میں آپ سے کہوں۔ ویسے کل وہ خود بھی آپ کو فون کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ ایک تو آپ اس تقریب سے محظوظ ہوں گے دوسرے سعید صاحب کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ تیسرے یہ کہ بہت سی اہم اور "کارآمد" شخصیتوں سے آپ کی ملاقات رہے گی۔"

"بھئی! تم اتنا زور دے رہے ہو تو میں آہی جاؤں گا" میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد کہا "گو کہ مصروفیات تو ابھی کئی دنوں تک زیادہ ہی رہیں گی لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ زندگی میں تفریحات کی کچھ زیادہ ہی کمی واقع ہوتی جا رہی ہے۔ اس طرف بھی کچھ نہ کچھ توجہ دیتے رہنا چاہئے، کہیں اعصاب بے چارے ناراض ہی نہ ہو جائیں کہ یہ کیا ایک ہی قسم کی مشقت لئے جا رہے ہیں۔"

"جی ہاں" وہ دھیرے سے ہنستے ہوئے بولا "ایک یہ خیال بھی میرے پیشِ نظر تھا.... تو پھر میں یقین رکھوں کہ سعید صاحب آپ کو فون کریں گے تو آپ کا جواب اثبات میں ہوگا؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا "میرا خیال ہے میں حامی بھر ہی لوں گا۔"

○☆○

سعید صاحب کا گھر گارڈن ٹاؤن میں تھا اور میری توقع سے کہیں زیادہ شاندار تھا۔ کوٹھی کیا ایک چھوٹا موٹا قلعہ تھا۔ اس کی چار دیواری کنکریٹ کی معلوم ہوتی تھی اور خاصی بلند تھی لیکن اس کے اندر کی طرف اس سے بھی بلند گویا ایک اور چار دیواری تھی اور یہ چار دیواری سفیدے کے درختوں پر مشتمل تھی۔ ان درختوں کی گنجان قطار چار دیواری کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور اس نے اصل عمارت کو تقریباً چھپا ہی رکھا تھا لیکن اس سے بے پناہ پرائیویسی کا احساس ہوتا تھا۔ معلوم یہی ہوتا تھا کہ اندر برپا ہونے والے جشن اور ہنگامے کا باہر کسی کو ذرا سا بھی اندازہ نہیں ہو سکتا۔

میں یہ سوچ کر دانستہ طور پر خاصی تاخیر سے آیا تھا کہ لوگ کبھی تقریبات میں صحیح وقت پر نہیں پہنچتے اور بروقت پہنچ جانے والے شرمندہ شرمندہ سے بیٹھے رہتے ہیں۔ لیکن یہاں شاید حقیقتاً مجھے تاخیر ہو چکی تھی۔ گیٹ بند ہو چکا تھا اور دیوار کے ساتھ ملگجے اندھیرے میں قطار میں کھڑی گاڑیاں جھلملا رہی تھیں۔

میری گاڑی بند گیٹ کے سامنے رکی تو فوراً ہی گیٹ کھل گیا اور ایک لمبا تڑنگا، بارعب اور باوردی مسلح چوکیدار باہر آیا اور میری طرف جھکتے ہوئے خلافِ توقع بڑے شائستہ لہجے میں بولا۔ "سر! آپ افضل چوہدری صاحب ہیں نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ مستعدی سے بولا "آپ گاڑی اندر ہی لے آئیے" اس نے گیٹ کھول دیا۔

ڈرائیو وے بہت لمبا چوڑا تھا اور وہاں بھی بہت سی لمبی چوڑی، جھلمل کرتی بیش قیمت گاڑیاں کھڑی تھیں۔ یہ شاید خاص خاص مہمانوں کی گاڑیاں تھیں۔ میں نے اپنی گاڑی ایک کیڈلک کے عقب میں پارک کی اور روش پر قدم رکھا ہی تھا کہ ایک بٹلر نمودار ہوا اور مؤدبانہ انداز میں جھکتے ہوئے بولا "تشریف لائیے سر!"

کوٹھی واقعی قلعے سے مشابہ تھی اور چاروں طرف سفیدے کے درختوں نے پردہ سا تان رکھا تھا۔ سامنے کی طرف بھی بہت کشادہ لان تھا جس کے درمیان سے مرمریں ٹائیلوں کی روش لہراتی ہوئی گزر رہی تھی۔ رنگا رنگ پھولوں کی کیاریاں بڑے سلیقے سے بنی ہوئی تھیں اور فضا میں ایک بوجھل مگر مسحور کن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

بٹلر کی رہنمائی میں میں عقبی لان پر پہنچا۔ یہ سامنے والے لان سے کہیں کشادہ اور خوب صورت تھا اور اس کے وسط میں ایک چھوٹا لیکن نہایت خوب صورت اور تمام لوازمات سے آراستہ سوئمنگ پول بھی موجود تھا۔ پارٹی کا اہتمام یہیں کیا گیا تھا۔ تمام مہمان یہاں موجود تھے۔ فانسل لائٹس لگائی گئی تھیں تاہم پھر بھی روشنی میں دھیما پن تھا اور ماحول کی رومانویت برقرار تھی۔

چاروں طرف حسن و آرائش اور خوشبوؤں کا ایک سیلاب تھا۔ صورتوں کے ستارے جھلملا رہے تھے۔ کافی عرصے سے میں نے کوئی فلم نہیں دیکھی تھی تاہم بہت سے فلمی چہروں کو میں نے پہچان ہی لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ لان پر میرے قدم رکھتے ہی تقریباً سبھی کی نظریں ایک لمحے کے لئے میری طرف گھوم گئی تھیں۔

ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں ایک بھاری بھرکم مگر قدرے پستہ قد

شخص میری طرف لپکا۔ اس کی رنگت سرخ و سپید تھی۔ ناک پر موٹے سے سیاہ فریم کا چشمہ ٹکا ہوا تھا اور بھورے، بے ترتیب بال کندھوں تک آئے ہوئے تھے۔ میں نے پہچان لیا۔ وہ میزبان سعید احمد سعید صاحب تھے۔ ان کے ہونٹوں پر دلکش دوستانہ مسکراہٹ تھی۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار آدمی معلوم ہوتے تھے۔ آفاق ان کے ساتھ تھا۔

"میں تو آپ کی آمد سے مایوس ہو چکا تھا" وہ مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولے۔ ان کے وجود سے اٹھتی ہوئی خوشبو فرانسیسی معلوم ہوتی تھی لیکن وہ کچھ زنانہ سی خوشبو محسوس ہو رہی تھی۔

معانقے سے فارغ ہو کر وہ پُرجوش مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔ "بہرحال دیر آید درست آید۔ آپ ٹھیک ہی آئے۔ صحیح معنوں میں رونق ہی اب ہوئی ہے۔ میں بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ تشریف لائے۔ بڑا اشتیاق تھا کہ کہیں خوشگوار ماحول میں آپ سے گپ شپ ہو۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے کہ مجھے اس قابل سمجھا" میں نے حقیقتاً ممنونیت سے کہا کیوں کہ اس شخص کے لہجے میں مجھے خلوص کی خوشبو محسوس ہوئی تھی۔

آفاق بولا "سعید صاحب آپ سے صرف ایک مرتبہ ملے ہیں اور تھوڑا بہت آپ کے متعلق غائبانہ طور پر جانتے ہیں لیکن صرف اسی بنیاد پر یہ آپ کو بہت پسند کرنے لگے ہیں۔"

"محبت ہے ان کی" میں نے مزید ممنونیت سے کہا۔

"برادرِ عزیز!" سعید صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے "ہم تو ان لوگوں کے قدردان ہیں جن کی معاشرے میں کوئی حیثیت ہو اور جو اس کے ساتھ ساتھ زندہ دل بھی ہوں۔ آپ میں ہمیں صرف یہ دونوں ہی نہیں، اور بھی بہت سی خوبیاں محسوس ہوئی ہیں۔"

سعید صاحب کو یقیناً مردم شناسی کا دعویٰ رہا ہوگا تبھی ایک مختصر سی ملاقات میں انہوں نے میرے بارے میں اتنے اندازے لگا لئے تھے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑ کر آگے لے جاتے ہوئے بولے۔ "آیئے میں آپ کو شہر کے خوب صورت، معروف اور پُرکشش لوگوں سے ملواؤں۔"

انہوں نے کئی ہیروئنوں، ہیروؤں، پروڈیوسروں، صنعتکاروں سے میرا تعارف کرایا۔ حتیٰ کہ تین چار وزیر بھی وہاں موجود تھے۔ ... بیشتر ایکٹرسیں اپنے خوب صورت اور جدید تراش خراش کے ملبوسات، طرح طرح کے ہیئر اسٹائلز میں اچھی لگ رہی تھیں۔ بیشتر نے میک اپ بھی اچھا ہی کیا ہوا تھا یا شاید بیوٹی پارلرز سے کرایا ہوا تھا۔

اس بات پر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ بیشتر مہمان مردوں اور عورتوں نے مجھ سے تعارف کے دوران یہی کہا ۔ ۔ ۔

"اچھا.... آپ ہیں افضل صاحب! بھئی آپ سے ملنے کا تو بڑا اشتیاق تھا۔"

مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ لوگ مجھے غائبانہ طور پر جاننے لگے تھے۔ میں تو اپنے آپ کو حتیٰ الامکان گمنام ہی رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

باوردی بیرے ڈرنکس لئے مہمانوں کے درمیان ادھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ مردوں عورتوں کی ٹولیاں ادھر اُدھر مصروفِ گفتگو تھیں۔ سعید صاحب بیسیوں مہمانوں سے میرا تعارف کرانے اور میرے ہاتھ میں اپنی پسند کی ڈرنک تھمانے کے بعد نہ جانے کہاں الجھ چکے تھے۔ آفاق بھی کچھ دیر تک تو میرے ساتھ رہا تھا پھر ایک فلمی مصنف سے زندہ جاوید کہانیوں کے موضوع پر اس کی بحث شروع ہو گئی تھی اور میں ان دونوں کو یہ "گمبھیر" مسئلہ حل کرنے کے لئے لفظوں کے میدان میں برسرپیکار چھوڑ کر ایک طرف کو ہو گیا تھا۔

میری نظریں دراصل ہنی کو تلاش کر رہی تھیں۔ ایک دن پہلے ہی ہنی سے فون پر میری بات ہوئی تھی تو اس نے یہ بتا کر مجھے حیران کر دیا تھا کہ سعید صاحب کی پارٹی میں وہ بھی مدعو ہے۔ آفاق نے مجھے یہی تاثر دیا تھا کہ سعید صاحب کی پارٹیوں میں ہر شعبۂ زندگی کے خاص الخاص لوگوں کو ہی مدعو کیا جاتا تھا جب کہ فلمی کیریئر کے لحاظ سے ظاہر ہے ہنی خاص الخاص لوگوں میں ہرگز شمار نہیں ہو سکتی تھی اور آفاق نے تو مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ لوگ اس سے راہ و رسم رکھتے ہوئے اور اسے قریب بلاتے ہوئے جھجکتے تھے، کتراتے تھے۔

لیکن ظاہر ہے ہنی سے میں اس بات پر حیرت کا اظہار نہیں کر سکتا تھا اس لئے میں یہ سوچ کر چپ رہ گیا کہ انسان کے نجی مراسم تو نہ جانے کہاں کہاں ہو سکتے ہیں۔ خصوصاً ہنی جیسی لڑکیوں کے۔ اور ضروری نہیں کہ آفاق کے اندازے اور محسوسات اس کے بارے میں درست ہی ہوں۔ وہ ویسے بھی بہت زیادہ محتاط بلکہ قدرے وہمی سا آدمی تھا۔ فلم لائن میں اس جیسے محتاط اور اصول پرست آدمی ملنے کی توقع مجھے کم ہی تھی۔

میں نے جب ہنی کو بتایا تھا کہ میں بھی سعید صاحب کی پارٹی میں مدعو ہوں تو وہ گہری سانس لے کر بولی: "میں یہی پوچھنے والی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آپ تو ضرور مدعو ہوں گے..... تو پھر آپ سے وہیں ملاقات ہوگی۔ اگر آپ کو وہاں بڑے بڑے لوگوں بڑی

بڑی ایکٹرسوں یا بڑے بڑے معزز گھرانے کی خواتین کے جمگھٹے سے فرصت ملے تو ذرا اس حقیری سی لڑکی سے بھی چند منٹ بات کر لیجئے گا۔ مجھے آپ سے ایک بہت ضروری کام ہے۔"

"تم نے تو گویا مجھے خوابوں کا شہزادہ، گلفام یا پرنس چارمنگ ثابت کرنے کا تہیہ کیا ہوا ہے" میں نے ہنستے ہوئے کہا "میں ابھی سماجی حلقوں میں اتنا بھی مقبول نہیں ہوا کہ جدھر بھی جاؤں تمام قابلِ ذکر لوگ میرے گرد ہی پروانوں کی طرح جمع ہو جائیں۔ میں تو بہت گمنام سا اور اپنی دنیا میں مگن آدمی ہوں۔"

"آپ کو نہیں معلوم کہ آپ کے یوں ریزرو رہنے سے آپ کی شہرت کے افسانے اور زیادہ پھیل چکے ہیں" وہ بولی۔

"ممکن ہے" میں نے بے یقینی سے کہا "بہرحال مجھے تو قطعاً احساس نہیں کہ مجھے چار لوگ جانتے ہوں گے خیر.... اس بحث کو چھوڑو.... تم کیا کہہ رہی تھیں کہ تمہیں مجھ سے کوئی ضروری کام ہے؟"

"ہاں۔ لیکن کام کل ہی بتاؤں گی۔ کل تک صورت حال کچھ اور واضح ہو جائے گی" وہ مبہم سے لہجے میں بولی۔ "ویسے وہاں ماحول تو بہت حسین ہوگا۔ آپ برا تو نہیں منائیں گے اگر میں کوئی بکھیڑا لے کر بیٹھ جاؤں؟"

"یہ تو وہیں دیکھیں گے۔ ابھی تو نہیں بتا سکتا کہ میں برا مناؤں گا یا نہیں" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

"خیر.... آپ برا منائیں یا اچھا منائیں، ہم نے تو مسئلہ آپ کے سامنے رکھ دینا ہے۔ آپ سے امید ہے کہ اس سلسلے میں ضرور کچھ نہ کچھ کریں گے" وہ پُرامید لہجے میں بولی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے قدرے الجھن محسوس کی کہ آخر ایسا کیا مسئلہ ہو سکتا ہے؟ پھر میں نے یہ سوچ کر اس الجھن کو ذہن سے جھٹک دیا کہ کل تک کی تو بات ہے، کل خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا تو خواہ مخواہ ذہن کو تھکانے کی کیا ضرورت ہے۔

اور اب یہاں میری نظریں ہنی کو تلاش کر رہی تھیں لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ لان پر ایک طرف چھوٹا سا اسٹیج بھی بنایا گیا تھا۔ آفاق نے مجھے بتایا تھا کہ ڈنر کے بعد رقص، موسیقی اور مزاحیہ خاکوں پر مشتمل ورائٹی پروگرام بھی پیش کیا جانا تھا۔ اس کے بعد دلچسپی کے مزید دو ایک پروگرام تھے۔

آخر کار میں آفاق سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا "ہنی نظر نہیں آ رہی۔ تمہیں اس کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟"

وہ اس وقت اپنی بے نتیجہ بحث سے فارغ ہونے کے بعد ایک پڑھی لکھی اور ناک میں انگریزی بولنے والی دبلی پتلی سی لڑکی کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہمارے ہاں ہالی وڈ کے معیار کی فلمیں کیوں نہیں بن سکتیں؟ اس کی ناک پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔

میرا سوال سن کر اس نے پہلے تو عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا گویا بہ زبان خموشی کہہ رہا ہو "دال میں کچھ کالا ضرور ہے.... باتیں یونہی تو نہیں بنتیں" لیکن پھر گویا وہ اپنی سوچ پر قابو پاتے ہوئے بولا "کیا ہنی یہاں مدعو ہے؟"

"میری معلومات کے مطابق تو وہ مدعو ہے" میں نے کہا۔

"میں اپنی دانست میں ایک ایک مہمان کی صورت دیکھ چکا ہوں۔ ہنی مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ سعید صاحب نے اس کا کوئی ذکر بھی نہیں کیا۔"

"ظاہر ہے اب وہ ایک ایک مہمان کا ذکر تو نہیں کر سکتے تھے...." میں نے ملائمت سے کہا "خیر.... تم گفتگو جاری رکھو" قطع کلامی کے لئے میں پہلے ہی معذرت کر چکا تھا۔ میں آگے بڑھ گیا جہاں ایک نہایت خوب صورت خاتون گلاس ہاتھ میں تھامے بڑی دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ مجھے ان کی صورت کچھ شناسا سی لگ رہی تھی۔ پھر مجھے یاد آ گیا کہ وہ وزارت تجارت کے ایک بہت بڑے افسر کی بیگم تھیں۔ میں صرف ایک مرتبہ ان کے گھر گیا تھا۔ میاں بیوی سے بہت خوشگوار ماحول میں کھانے کی میز پر گپ شپ رہی تھی۔ خاتون کا حافظہ یقیناً بہت اچھا تھا جو انہوں نے ایک طویل عرصہ پہلے کی ملاقات کے حوالے سے مجھے ابھی تک یاد رکھا تھا۔

ان کے قریب پہنچ کر ابھی رسمی جملوں کا تبادلہ ہی ہوا تھا کہ قہقہوں کا ترنم اور باتوں کی بھنبھناہٹ جیسے تھم سی گئی۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ شاید اس کی وجہ جان سکوں۔

وجہ مجھے فوراً ہی نظر آگئی۔ تمام مہمان اپنی باتیں بھول کر اس کی طرف متوجہ ہوچکے تھے۔ بٹلر کی رہنمائی میں وہ شاہانہ تمکنت کے ساتھ مرمریں روش پر قدم اٹھاتی چلی آرہی تھی۔ اس کے جسم پر کسی عجیب سے، جھلمل جھلمل کرتے کپڑے کا خوب صورت لبادہ تھا۔ پیروں میں فل بوٹ اور کلائیوں پر مدھم سی چمک والے سچے موتیوں کی مالائیں لپٹی ہوئی تھیں اس کا ہیئر اسٹائل قلوپطرہ والا تھا اور وہ قلوپطرہ ہی لگ رہی تھی۔

وہ ستارہ تھی۔ میں نے نہ تو فلم کی اسکرین پر اور نہ ہی حقیقی زندگی میں کبھی اسے اتنا خوب صورت محسوس کیا تھا۔

ایک لمحہ پہلے تک میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ ستارہ جیسی سلونی سی لڑکی کی آمد سے ایسے ایسے حسین چہروں کے چراغ ٹمٹمانے لگیں گے۔ میں چشم آوارہ کا مالک نہیں ہوں پھر بھی ایک لمحے پہلے تک میری نظر بے اختیار ادھر اُدھر بھٹک رہی تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس جلوہ بلاخیز سے نظر کو سیراب کروں۔ مگر اب ستارہ کو دیکھا تو اس کے چہرے سے نظر ہٹانا دشوار محسوس ہوا۔

ستارہ کو اپنی حرکات و سکنات، اپنی جنبش ابرو اور اپنے تیر نظر کے برمحل استعمال میں ملکہ حاصل ہوچکا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں شو بزنس کی عورت بن چکی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب ساری محفل اس کی طرف دیکھ رہی ہو تو اسے کسی کی طرف نہیں دیکھنا چاہئے۔

چنانچہ وہ کسی کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن صرف ظاہری حد تک۔ ورنہ مجھے معلوم تھا کہ حقیقت میں وہ سب کی طرف دیکھ رہی ہے۔ اسے معلوم تھا کہ میزبان کہاں کھڑا ہے۔ وہ سیدھی سعید صاحب کی طرف بڑھی۔ اس کے ہر قدم کے ساتھ یقیناً مردوں کے دل اتھل پتھل ہو رہے تھے۔

میرے لئے اس عمارت کی بھول بھلیاں کچھ زیادہ پُراسرار یا ایسی ان دیکھی بھی نہیں تھیں لیکن ایک لمحے کے لئے میری رگ و پے میں بھی وہ سنسنی دوڑ گئی جو شاید ان سیاحوں کے جسم میں دوڑتی ہوگی جو کسی نادریافت شدہ جزیرے کے قریب جا پہنچتے ہیں۔

ستارہ اور سعید صاحب نے ہاتھ ملایا۔ بہت قریب ہو کر۔ بے تکلف دوستوں کی طرح۔ لیکن ستارہ کی تمامتر گرمجوشی،

مسکراہٹ اور تمامتر دوستانہ انداز کے باوجود اس کے طرز عمل سے جانے کیوں وہی تصنع ظاہر تھا جسے عام لوگ محسوس نہیں کرسکتے اور جو شوبزنس کی عورتوں کی فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔

سعید صاحب سے ملنے کے بعد وہ سیدھی میری طرف آئی اور یوں میرے بازو میں بازو ڈال کر کھڑی ہوگئی جیسے اس تقریب میں ہم اکٹھے ہی آئے تھے اور مجھ سے ہی اس کا قریبی رشتہ تھا۔ ہمارے درمیان کسی رسمی جملے کا تبادلہ نہیں ہوا، کچھ نہیں پوچھا گیا، کچھ نہیں بتایا گیا۔ بس اس نے میرا بازو تھام کے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ اس کے عنابی ہونٹوں کے عقب میں موتیوں جیسے دانت جھلملائے۔ میں بھی مسکرا دیا۔ اور بس۔

میں نے محسوس کیا کہ اس کے انداز میں ایک عجیب تفاخر آمیز سا احساسِ ملکیت بھی شامل تھا جیسے وہ وہاں موجود سب لوگوں پر نہایت لطیف پیرائے میں یہ جتا دینا چاہتی ہو کہ مجھ سے اس کے خصوصی مراسم ہیں بلکہ میں تقریباً اسی کا ہوں۔ میں خاموش تھا لیکن مجھے ہنی کی فکر ضرور تھی۔

اگر وہ آن پہنچی تو ستارہ کو یوں اپنائیت سے میرے ساتھ نتھی دیکھ کر کیا محسوس کرے گی؟ یہ سوال مسلسل میرے ذہن میں چبھ رہا تھا لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ ہنی سے ابھی کوئی ایسا تعلقِ خاطر تو استوار نہیں ہوا تھا کہ وہ رقابت محسوس کرنے لگتی۔ ویسے بھی وہ پختہ ذہن کی لڑکی تھی۔ اس سے کوئی عہد و پیماں نہیں ہوا تھا۔ امید تو یہی تھی کہ وہ اس انداز میں نہیں سوچے گی۔

امید تو خیر کچھ دن پہلے تک مجھے ستارہ سے بھی یہ نہیں تھی کہ وہ لاشعوری طور پر میرے بارے میں ایک خفیف سے احساسِ ملکیت کا شکار ہوجائے گی۔ ہمارے مراسم کی نوعیت خواہ کچھ بھی تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ ہمارے راستے کم از کم فی الحال تو الگ الگ ہی ہیں اور مستقبل قریب میں بھی ان کے ایک ہونے کے کوئی آثار نہیں۔ بہرحال وہ اچھی لڑکی تھی۔ میرے دل میں اس کے لئے اپنائیت تھی۔ اس کا ہاتھ جھٹکنے کا میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

ستارہ کا جھلملاتا لبادہ کندھوں تک پہنچنے سے پہلے ختم ہوچکا تھا اور صرف دو سیاہ ریشمی ڈوریوں کے سہارے کندھوں سے لٹکا ہوا تھا۔ جب کوئی مڑ کر اس کی طرف دیکھتا تھا تو میں فیصلہ نہیں کر پاتا تھا کہ وہ ستارہ کا چہرہ تک رہا ہے یا ان ڈوریوں کی گرہیں دیکھ رہا ہے۔ اور بیشتر مرد اپنی بیویوں یا ساتھی عورتوں کی موجودگی کے باوجود مڑ مڑ کر اس کی طرف دیکھنے سے باز نہیں آرہے تھے۔

ستارہ کے ساتھ ساتھ وہ میرا بھی جائزہ ضرور لیتے تھے۔ شاید یہ دیکھتے تھے کہ یہ چلتی پھرتی قیامت کس کے گلے کا ہار ہے۔ ستارہ اس وقت خوشبوؤں اور حرارتِ حیات کا منبع تھی۔ اس کے سراپا کی کشش تو اپنی جگہ تھی لیکن عمر کے اعتبار سے بھی وہ ایک عجیب ہی موڑ پر تھی۔ نوخیزی و دوشیزگی کی وادیوں کو وہ بلاشبہ بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی لیکن پختہ کاری یا زوال کی منزلیں بھی ابھی اس سے بہت دور معلوم ہوتی تھیں۔ اس کی ہر ادا، اس کے ہر جلوے، اس کی ہر جنبش پُرشباب تھا۔ وہ اس وقت ایک ایسا گلاب تھی جس کی ہر پتی اپنی جگہ خوشبوؤں کا ایک الگ جہان تھی۔ وہاں اس سے کہیں بڑھ کر حسین عورتیں موجود تھیں لیکن نہ جانے کیوں اور کیسے اس کے آتے ہی سارے آفتاب ماند پڑ گئے تھے۔

باوردی بیرے مختلف مشروبات کی کشتیاں اٹھائے مہمانوں کے درمیان چکرا رہے تھے۔ میں نے ایک بیرے کو روک کر بے رنگ و بے بو سیال کا ایک گلاس طشتری سے اٹھایا اور احتیاطاً بیرے سے تصدیق کرلی۔ "یہ سادہ پانی ہی ہے نا"؟

اس نے اثبات میں سرہلایا لیکن ساتھ ہی حیرت سے میری طرف دیکھا گویا بہ زبانِ خموشی کہہ رہا ہو۔ "کیا اس محفل میں تم جیسے بدذوق بھی موجود ہیں؟"

جبکہ میرا مسئلہ یہ تھا کہ پہلے ہی گلا خشک ہو رہا تھا، رگ و پے میں چنگاریاں سی تیر رہی تھیں۔ میں تو حلق تر کرنا چاہتا تھا، رگ و پے میں تیرتی ہوئی چنگاریوں کو سرد کرنا چاہتا تھا۔ آتش سیال حلق میں انڈیلنا نہیں چاہتا تھا۔ ستارہ نے آتشیں مشروب کا جام اٹھایا۔ معلوم نہیں اس آتش بہ جاں کو اپنی رگ و پے میں مزید آگ دوڑانے کی کیا ضرورت تھی۔

ہم نے خاموشی اور آہستگی سے اپنے اپنے گلاس خالی کر کے ایک بیرے کی طشتری میں رکھ دیئے۔ شاید دونوں ہی کو اپنے اپنے مشروب سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا تھا۔ میرا حلق بدستور خشک تھا اور ستارہ کی جھلملاتی آنکھوں میں بدستور پیاس تھی۔ اس نے ہلکے عنابی سیال سے لبریز ایک اور چھوٹا سا فینسی گلاس اٹھالیا۔ میں نے سادہ پانی کا دوسرا گلاس اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

یوں تو وہاں قہقہوں کا ترنم اور باتوں کی بھنبھناہٹ خاصی تیزی تھی لیکن میرے اور ستارہ کے درمیان ابھی تک سکوت کی جو دیوار حائل تھی وہ اب گراں محسوس ہونے لگی تھی۔

میں نے یونہی گفتگو برائے گفتگو شروع کرنے کی غرض سے کہا "اچھی پارٹی ہے۔"

وہ دلآویزی سے مسکرائی۔ "سعید صاحب کی پارٹیاں ہمیشہ خوبصورت ہوتی ہیں۔"

میں نے اس کی نظروں کے تعاقب میں ادھر اُدھر دیکھا۔ وہاں بہت زیادہ لوگ موجود نہیں تھے لیکن جو بھی تھے وہ یقیناً شہر کے اہم ترین اور خوبصورت ترین لوگوں میں سے تھے۔

ستارہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "جن اخبار نویسوں سے سعید صاحب کی ذاتی دوستی ہے اب تو انہیں بھی سعید صاحب نے اپنی غیر رسمی پارٹیوں میں مدعو کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

"وہ کیوں؟" میں نے مہمانوں کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ جتنے مہمان مجھے نظر آرہے تھے ان میں سے نہ تو کسی کے پاس کیمرہ تھا اور نہ ہی شکل و صورت یا حرکات و سکنات سے کسی پر اخبار نویس ہونے کا شبہ ہو رہا تھا۔

"جن چیزوں کی سعید صاحب پبلسٹی کرانا چاہتے ہیں ان کی تو مفت پبلسٹی ہوتی نہیں۔ اس کے لئے انہیں اشتہارات دینے پڑتے ہیں۔ ان پارٹیوں کی وہ بالکل پبلسٹی نہیں چاہتے لیکن ان میں کوئی فوٹوگرافر یا رپورٹر آجائے تو اگلے دن بڑی بڑی رنگین تصویروں کے ساتھ گز بھر لمبی رپورٹ آجاتی ہے۔ اور کبھی کبھی آف دی ریکارڈ باتیں بھی۔ اس لئے سعید صاحب نے انداز کچھ بدل دیا ہے۔" ستارہ نے وضاحت کی اور اپنا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔

چھوٹا سا گھونٹ بھر کر وہ دوبارہ بولی تو اس کی آواز میں خمار کا نہایت ہلکا سا رنگ تھا۔ "کیا تمہاری مصروفیات ابھی تک کم نہیں ہوئیں؟"

"نہیں" میں نے اختصار سے جواب دیا۔

"کب کم ہوں گی؟" اس نے سرگوشی کی۔

"کہہ نہیں سکتا۔ تمہیں معلوم ہے میری مصروفیات اتنی مختلف النوع ہیں کہ ان کے بارے میں کوئی پیشگوئی نہیں کی جاسکتی" میں نے بھی دھیمے لہجے میں کہا۔

"اور نہ ہی تمہارے بارے میں کوئی پیشگوئی کی جاسکتی ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"شاید یہ بھی صحیح ہے۔" میں نے مبہم لہجے میں کہا۔

"لیکن میں تمہارے بغیر خود کو بہت تنہا تنہا محسوس کرنے لگی ہوں۔ ایک دنیا میری نوازشات کو ترستی ہے اور میں تمہاری نوازشات کو۔ اور عجیب بات یہ ہے کہ میں شو بزنس کی تمام مصلحتوں اور روایتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی اس کمزوری کا اظہار بھی کر رہی ہوں۔" وہ مجھ سے جڑی کھڑی تھی لیکن اس کی آواز گویا دور سے آرہی تھی۔

"عنایت اور محبت ہے تمہاری۔ میں تمہاری دوستی کا قدردان ہوں۔" میں نے خلوص سے کہا۔

"لیکن تم کچھ رسمی سے نہیں ہوگئے؟ نپے تلے اور منتخب الفاظ بولنے والے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"میں تو اپنے آپ میں کوئی تبدیلی محسوس نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"بہرحال...." اس نے قدرے بے پروائی کے اظہار کے لئے گردن کو نہایت خفیف سا جھٹکا دیا۔ اس کے کانوں میں جھولتے ہوئے ہیرے کے آویزے جھلملا کر رہ گئے۔ "پہلے تم چار چھ دن میں ملنے کے لئے آجایا کرتے تھے تو زندگی بڑی دلچسپ سی محسوس ہوتی تھی۔ اب کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کر رہی ہوں، کیوں کر رہی ہوں، کس کے لئے کر رہی ہوں؟ اب شاید میں ویسی عورت بھی نہیں رہی جس کی دلچسپیوں کے محور و مرکز آئے دن حسبِ سہولت اور حسبِ ضرورت بدل جاتے ہیں۔"

میں خاموش رہا حالانکہ میں کچھ نہ کچھ کہنا ضرور چاہتا تھا۔ دوستی، تسلی اور اخلاص کی کوئی بات۔ مگر جانے کیوں مجھے مناسب لفظوں کے انتخاب میں دشواری پیش آرہی تھی اور اسی لمحے ایک بار پھر مجھے ہنی کا بھی خیال آگیا تھا۔ جانے وہ کیوں نہیں آئی تھی... ایک لمحے کے لئے شاید میں ستارہ سے کہیں دور پہنچ گیا تھا۔

"تمہیں کسی کا انتظار ہے؟" اس نے ہولے سے میرا بازو ہلایا تو میں چونکا۔

"نہیں۔ مجھے کسی کا انتظار نہیں" میں نے غیر ارادی طور پر کہا حالانکہ میں اسے سچ سچ بتا دینا چاہتا تھا کہ مجھے ہنی کا انتظار ہے۔ اس کا مشاہدہ غضب کا تھا۔ اس نے میری آنکھوں میں انتظار پڑھ لیا تھا۔

اس نے میرے جواب کا پوسٹ مارٹم نہیں کیا۔ میرے لفظوں کی سچائی کو چیلنج نہیں کیا۔ شاید اس لئے بھی کہ اسے اس کی مہلت بھی نہیں ملی۔ بہت سے مرد اور عورتیں ہمارے پاس آن کھڑی ہوئی تھیں۔ ستارہ مجھ سے زیادہ لوگوں کو جانتی تھی۔ وہ ان سے میرا تعارف کرانے لگی۔ وہ سبھی مشہور گھرانوں کے افراد تھے یا پھر خود مشہور تھے۔ کوئی کسی سرمایہ دار خاندان سے تھا۔ کوئی ڈائریکٹر، کوئی پروڈیوسر اور کوئی ہیرو یا ہیروئین اور حیرت کی بات یہ تھی کہ تقریباً سبھی مجھے غائبانہ طور پر جانتے تھے۔

بیشتر کے ہاتھوں میں ڈرنکس تھیں۔ شوخ جملوں کے تبادلے ہونے لگے۔ پُرتکلف سے قہقہے ابھرنے لگے لیکن پھر دھیرے دھیرے جیسا کہ اس قسم کی پارٹیوں میں ہوتا ہے، سبھی ادھر اُدھر بکھرنے لگے۔ کوئی کسی اور کے ساتھ کسی گوشے کی طرف بڑھ گیا کسی کو کسی نے آواز دے لی اور کوئی محض منیرازم کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسی طرف کو کھسک گیا۔

ایک بار پھر ہم دونوں ہی وہاں کھڑے رہ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ لوگوں کی موجودگی میں ستارہ نے کچھ اور احتیاط سے میرا بازو تھام لیا تھا، جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اس چھوٹے سے ہجوم میں سے کوئی اس کی متاعِ عزیز کو اُچک کر لے جائے گا۔

اس لمحے نہ جانے کیوں مجھے وہ زمانہ یاد آگیا جب ستارہ خانہ بدوش، نوخیز لڑکی تھی اور اپنی دانست میں اس نے مجھے بیوقوف بنانے اور میری کل پونجی رفتہ رفتہ ٹھگنے کے بعد نہایت سفاکی سے مجھے حکم سنایا تھا کہ آئندہ میں اس کے خیمے میں نہ آیا کروں۔ مجھ سے اس کی کوئی شناسائی نہیں رہی۔ اس وقت اس کا گرانڈیل باپ بھی اپنی پہلی جنگِ عظیم کے زمانے کی بندوق اٹھائے پاس ہی کھڑا تھا۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ نوخیزی اور کم سنی کے زمانے میں

جبکہ انسان کا دل ویسے ہی بڑا ملائم اور محبتوں کا متلاشی ہوتا ہے اور جبکہ ستارہ نے زیادہ دنیا بھی نہیں دیکھی تھی، اس وقت وہ اتنی سفاک اور پل بھر میں بدل جانے والی تھی، اسے خود پر اتنا قابو تھا۔ اور اب جبکہ وہ میرے خیال میں گرگِ باراں دیدہ بن چکی تھی، اس کے دل میں کیسے نازک جذبے کونپلوں کی طرح سر اٹھانے لگے تھے۔ جبکہ میرے خیال میں اس وقت اس جیسی عورت کی نظر میں زندگی دو اور دو چار، کے سوا کچھ نہیں رہنی چاہئے تھی لیکن انسان بھی بس عجیب ہی گورکھ دھندا ہے۔ متضاد صفات کا مجموعہ۔

میں نے اس بھولے بسرے دور کی دھندلی یادوں کو ذہن سے جھٹکا اور ستارہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "اداس کرنے والی اور احساسِ تنہائی کو بڑھانے والی باتیں چھوڑو۔ اور یہ بتاؤ آج کل مصروف کتنی ہو؟ کتنی فلمیں ہیں تمہارے پاس؟"

"مصروف تو بہت ہوں لیکن تمام تر مصروفیتوں میں سے تمہارے انتظار کی گنجائش نکال ہی لیتی ہوں۔" وہ سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی۔ اس نے دوسرا گلاس خالی کر دیا تھا اور اس کی آنکھوں میں معمول سے زیادہ نمی کی تہہ سی جھلملا رہی تھی۔

پھر وہ جیسے دل ہی دل میں گنتی کرتے ہوئے بولی۔ "تمہاری دو فلموں کے علاوہ اس وقت میرے پاس تیرہ چودہ فلمیں ہیں۔"

"بہت خوب" میں نے کہا "پھر تو واقعی اچھی خاصی مصروفیت ہوگی۔"

"ہاں۔ ان ہیروئنوں سے زیادہ مصروفیت ہے جن کے پاس اس وقت پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ فلمیں ہیں۔ کیونکہ ایک تو میری ساری فلمیں سیٹ پر ہیں۔ سب کی شوٹنگز زور و شور سے چل رہی ہیں اور میں ایسی ہی فلموں کو ترجیح دیتی ہوں جن کے مقررہ شیڈول میں مکمل ہو جانے کی امید دکھائی دے رہی ہو۔ میرے زیادہ مصروف رہنے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ میں اپنے کیریئر کو بہت سنجیدگی سے لے رہی ہوں۔ بہت محنت کر رہی ہوں... ہر سیٹ پر وقت پر پہنچتی ہوں بلکہ اس وجہ سے میرا بہت وقت ضائع ہوتا ہے کیونکہ میرے سوا کوئی بھی وقت پر نہیں پہنچتا۔"

"لیکن یہ عادت تمہیں بہت فائدہ پہنچائے گی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"پہنچائے گی نہیں بلکہ پہنچا رہی ہے۔" اس نے تسلیم کیا۔ "فی الحال تو میرا کچھ وقت کا زیاں ہو رہا ہے لیکن میری ایک ساکھ بن چکی ہے۔ اس چھوٹی سی بات سے ہدایت کاروں کے رویے میں میرے لئے بڑا احترام پیدا ہو گیا ہے۔"

"اگر آدمی واقعی کچھ اصول لے کر چلے تو پھر وہ بہت زیادہ فلمیں نہیں کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس فلمیں کم ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں بہت بڑی ہیروئن نہ ہونے کے باوجود ابتدا ہی سے انتخاب پسند رہی ہوں۔" وہ بڑی طمانیت سے مسکرائی۔ "میں آنکھیں بند کر کے فلمیں سائن نہیں کرتی۔ فلمیں میرے پاس آتی تو بہت ہیں لیکن موضوع جاننے کے بعد میں بیشتر کو انکار کر دیتی ہوں اور میری شانِ بے نیازی پر سرمایہ کاروں اور ہدایت کاروں کو بڑی حیرت ہوتی ہے۔"

"کیا تم صرف لوگوں کو حیران کرنے کے لئے فلم انڈسٹری میں آئی ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ میں روپیہ کمانے بھی آئی ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں بہت بڑی اداکارہ کے طور پر بھی معروف ہونا چاہتی ہوں۔ تم تو کامیاب اداکارہ اور بڑی اداکارہ کے درمیان فرق کو سمجھتے ہو نا؟"

"بہت اچھی طرح۔" میں نے جواب دیا۔

"اور مجھے یقین ہے کہ میری یہ تیرہ چودہ فلمیں مجھے ایک بڑی اداکارہ کے طور پر تسلیم کروالیں گی۔" اس کے لہجے میں اعتماد اور طمانیت تھی۔

"میری اور تمہارے بہت سے دوسرے چاہنے والوں کی دعائیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔" میں نے کہا۔

"مجھے صرف تمہاری دعاؤں کی زیادہ فکر ہے۔ خیال رکھنا، تمہاری دعائیں میری زندگی کے سفر میں مجھ سے پیچھے نہ رہ جائیں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، اسے جیسے کچھ یاد آگیا... اور وہ شاید کوئی پُرلطف بات تھی۔ وہ بے اختیار ہنستے ہوئے بولی۔ "میں بڑی انتخاب پسند بنتی ہوں لیکن پچھلے دنوں میں نے ایک عجیب و غریب فلم سائن کرلی، جسے شاید کوئی بھی سنجیدہ اداکارہ نہ کرتی۔"

"کون سی فلم؟ کیا موضوع ہے اس کا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"آؤ۔ ادھر چل کر بیٹھتے ہیں..... پھر میں تمہیں اس فلم کے متعلق بتاتی ہوں۔" ستارہ نے سرو کے ایک درخت کی طرف اشارہ کیا۔ اس گوشے میں روشنی اور بھی کم تھی اور درخت کے قریب پتھر کی ایک چھوٹی سی بینچ موجود تھی۔

ستارہ نے قریب سے گزرتے بیرے کی ٹرے سے ایک اور گلاس اٹھایا۔ میں نے ایک بار پھر سادہ پانی کا گلاس منتخب کیا اور ہم سرو کے درخت کے قریب جا بیٹھے۔ فضا میں خنکی تھی اور ماحول بے حد خوب صورت تھا۔ آسمان پر چاند بھی موجود تھا اور خوبصورت ماحول کے ماتھے کا جھومر بنا ہوا تھا۔

ستارہ نے جھرجھری سی لے کر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "سب کچھ کتنا رومینٹک لگ رہا ہے سوائے تمہارے، تم آج

تک میری سمجھ میں نہیں آسکے۔ کبھی تو تم اتنے رومینٹک اور افسانوی لگتے ہو کہ اس دنیا سے تمہارا کوئی ناتا ہی نظر نہیں آتا۔ خوابوں کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اور کبھی اتنے پتھریلے کہ چھونے کی ہمت نہیں پڑتی۔"

"تم ابھی مجھ کو سمجھنے میں وقت ضائع مت کرو۔ ابھی تو زندگی پڑی ہے' رفتہ رفتہ میں خود بخود تمہاری سمجھ میں آجاؤں گا"... میں نے گویا اسے تسلی دی۔

"یہ تمہارا خیال ہے نا کہ زندگی بہت طویل ہے؟ یقین کرو یہ تو ایک خواب کی طرح بیت جائے گی۔ بستر مرگ پر ہم بڑی حیرت سے سوچیں گے۔ بس... یہ تھی زندگی! تم یہی دیکھ لو کہ اب تک جتنے برس بیت گئے ہیں کیا وہ خواب معلوم نہیں ہوتے؟ ساری باتیں' ساری یادیں خواب ہو چکی ہیں۔"

"یہ ہمارے حق میں بہتر ہی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ اس کی باتوں نے ایک ثانئے کے لئے میرے اعصاب میں خوف کی لہر سی دوڑا دی تھی۔

اس نے ایک گھونٹ بھرا اور میں نے اسے اس موضوع سے ہٹانے کے لئے کہا۔ "تم مجھے اس فلم کے بارے میں بتا رہی تھیں۔"

"ہاں..." وہ ایک بار پھر مترنم انداز میں ہنسی اور میرے دل کے آنگن میں گویا نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔

گلاس بینچ پر رکھ کر اس نے اپنے خوبصورت بیگ سے امپورٹیڈ سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور ایک سگریٹ نکال کر اپنے خوبصورت ہونٹوں میں دبائی۔ میں نے طلائی لائٹر نکال کر اس کی سگریٹ کو شعلہ دکھایا۔ زرد روشنی میں ایک لمحے کے لئے چمک اٹھنے والا اس کا بنا سنورا چہرہ مجھے کسی مصری شہزادی سے مشابہ نظر آیا۔

"تم واقعی عجیب آدمی ہو۔" وہ ایک طویل کش لے کر دھواں میرے چہرے پر چھوڑتے ہوئے بولی۔ "سگریٹ نہیں پیتے مگر لائٹر رکھتے ہو۔"

میں نے اسے نہیں بتایا کہ وہ محض لائٹر نہیں ہے۔ مجھے خاموش پا کر وہ بولی۔ "میں تمہیں اس فلم کے متعلق بتا رہی تھی جو میں نے مذاق مذاق میں سائن کر بیٹھی ہوں۔ اس کا نام "جنگل گرل" ہے"

"اوہ... مجھے یاد آیا۔ اس کے متعلق تو میں اخباروں میں پڑھ چکا ہوں۔ اس کی تو شاید شوٹنگ شروع ہو چکی ہے؟" میں نے کہا "مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کی ہیروئن تم ہو۔"

"ہاں ہیروئن میں ہوں اور شوٹنگ خوب زور و شور سے جاری ہے۔ ڈائریکٹر کا اعلان ہے کہ وہ اسے تین مہینے میں ختم کر کے چھوڑے گا۔ راحیل صاحب ہیں اس کے ڈائریکٹر۔ وہ بھی اس پارٹی میں موجود ہیں۔" اس نے بتایا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "ہالی ووڈ اور یورپ کی فلم ٹریڈ میں جو رجحانات چلتے ہیں وہ چار پانچ سال بعد انڈیا میں پہنچتے ہیں اور وہاں سے ایک آدھ سال بعد ہمارے ہاں پہنچ جاتے ہیں... ٹارزن ٹائپ کے کرداروں والی فلمیں کسی زمانے میں صرف بچوں کے لئے بنتی تھیں مگر تھوڑے سے رد و بدل کے بعد پچھلے دنوں ہالی ووڈ اور یورپ میں دوبارہ ان کا سیلاب آیا تھا اور اس بار ان میں بچوں سے زیادہ بڑوں نے دلچسپی لی تھی کیونکہ ان میں کسی نہ کسی قبائلی سردار کی شعلہ جوالا اور فتنہ خیز قسم کی بیٹی ضرور موجود ہوتی تھی جو عموماً ٹارزن کی محبوبہ ہوتی تھی اور وہ چیتے کی نہیں بلکہ چیتے کے بچے کی کھال پہن کر ناظرین کے دلوں پر بجلیاں گراتی پھرتی تھی۔"

"اور ٹارزن کے دوش بدوش کشتوں کے پشتے لگاتی تھی۔" میں نے لقمہ دیا۔

"بالکل" وہ ہنسی "دنیا بھر میں اس قسم کی فلموں کا رجحان ختم ہونے کے بعد اب ہمارے ہاں قدم رکھ رہا ہے۔ راحیل صاحب اس کی ابتدا کر رہے ہیں۔ وہ ہنگامی انداز میں فلم بنا رہے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ تین ماہ میں اسے مکمل کر کے چھوڑیں گے۔"

"تو تم اس میں جنگل گرل ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ میں بھی بچپن میں انتقال کر جانے والے کسی چیتے کی کھال پہن کر ادھر اُدھر درختوں پر جھولتی پھروں گی اور جس حد تک سنسر بورڈ اجازت دے گا اس حد تک فلم بینوں کے دلوں پر جلووں کی بجلیاں گراؤں گی۔" وہ مخمور سے انداز میں مسکرائی۔

"یہ تو واقعی تمہاری فلموں کی قطار میں ایک مختلف قسم کی فلم ہوگی۔" میں نے کہا

"راحیل صاحب ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جنگل گرل کے تصور پر میرے علاوہ کوئی لڑکی پوری نہیں اترتی۔ ان کے خیال میں اس رول کے لئے لڑکی نہ تو بعض فلموں کی ہیروئنوں کی طرح بھاری بھرکم ہونی چاہئے اور نہ ہی پستہ قد یا نازک اندام بلکہ ان سب کے بیچ بیچ کی کوئی چیز ہونی چاہئے۔ اس کے خد و خال' چہرے مہرے اور جسمانی ساخت سے بیک وقت نزاکت اور مضبوطی کا اظہار ہونا چاہئے اور اس کی حرکات و سکنات میں چیتے کی سی لچک اور پھرتی نظر آنی چاہئے...... اور نہ جانے کیونکر انہیں یہ سب خصوصیات صرف مجھ میں مجتمع نظر آرہی تھیں۔"

"خیر۔ ان کے انتخاب سے تو اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔" میں نے ایک نظر اسے سرتاپا دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن مجھے یہ جان کر حیرت ہو رہی ہے کہ ہمارے ہدایت کار ہیروئن وغیرہ کے انتخاب میں اس قدر تردد بھی کرنے لگے ہیں' اتنی باریک بینی سے

کام لینے لگے ہیں ورنہ تمہیں تو معلوم ہی ہے کہ ہمارے ہاں ہیروئن کا انتخاب کس طرح ہوتا ہے۔"

"ہاں... مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"ہیروئن کا یا تو نام بک رہا ہو یا پھر وہ فنانسر یا ڈسٹری بیوٹر کو ذاتی طور پر بہت پسند ہو' وہ ایک دوسرے سے بہت خوش ہوں"... میں نے کہا۔ "ورنہ کردار کی موزونیت پر تو کم ہی غور ہوتا ہے۔ خصوصاً راحیل صاحب کے بارے میں تو یہ جان کر اور بھی حیرت ہو رہی ہے کیونکہ میں نے سنا ہے کہ وہ یونہی.... بہت کم پڑھے لکھے آدمی ہیں۔"

"ہاں... وہ تقریباً ان پڑھ ہی ہیں لیکن بہت سے پڑھے لکھوں سے بہتر ہیں۔ وہ اپنی ٹریڈ میں' اپنے کام میں یکتا ہیں۔ کمال آدمی ہیں۔ میں ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئی ہوں۔" وہ لفظوں پر زور دیتے ہوئے بولی۔

"کیا واقعی....؟" میں نے اس کی جھلملاتی آنکھوں میں جھانکا۔

"جو تم سمجھ رہے ہو وہ بات نہیں ہے۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔ "میں صرف پیشہ ورانہ سطح کی بات کر رہی ہوں۔ جو حالات اور وسائل ہمارے ہاں میسر ہیں ان میں وہ شخص جس طرح کام کرتا ہے اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ وہ ترقی یافتہ ملکوں کے ڈائریکٹرز کی طرح چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے تردد کرتا ہے۔ ہر تعلق' وابستگی اور ذاتی پسند و ناپسند سے بالاتر ہو کر کاسٹ کا انتخاب کرتا ہے اور چھوٹے سے چھوٹے کردار میں موزوں ترین اداکار کو لانے کی کوشش کرتا ہے' خواہ اس کے لئے کتنی ہی دشواری اٹھانی پڑے۔"

"بہت خوب" میں نے کہا۔

"لیکن ہماری انڈسٹری کا امیج ایسا بن چکا ہے کہ اچھے آدمیوں کی اچھی باتوں کو بھی نہ تو نوٹ کیا جاتا ہے اور نہ کوئی انہیں سراہتا ہے۔" وہ سگریٹ کا ہلکا سا کش لے کر بولی۔ راحیل صاحب کی خوبیوں پر بھی شاذ و نادر ہی کسی کی نظر جاتی ہے۔ یہ انہی کا کام تھا کہ انہوں نے مجھے اس فلم کے لئے سائن کر لیا۔ خود سوچو کہ میں درختوں کی شاخیں پکڑ کر ادھر سے اُدھر جھولتی ہوئی کیسی لگوں گی؟ لیکن راحیل صاحب کا کہنا ہے کہ وہ اس کردار کو بھی یادگار بنا دیں گے۔ ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے کچھ کچھ یقین ہونے لگا ہے کہ شاید وہ واقعی ایسا کر دیں گے۔"

فلم کے معاملات میں وہ بہت منجھ گئی تھی۔ میں نے پانی کا ایک گھونٹ بھرا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ...ہونوں کا لگ کر میری رگ و پے کی تپش کچھ کم ہو گئی تھی۔

آخر کار میں نے کہا۔ "...یہ فلم سائن کرنے پر تمہارا رویہ معذرت خواہانہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس میں کیا ہرج ہے؟ زندگی میں تجربے تو ہوتے رہنے چاہئیں۔"

"ہاں۔ میں نے یہی محسوس کیا جیسے میں کسی ...میں حصہ لے رہی ہوں۔ شاید میں زندگی کی یکسانیت سے بھی ...بیزار تھی۔ میری جو فلمیں میرا امیج ایک بہت سنجیدہ اور جذباتی اداکارہ کا بنائیں گی' جنگل گرل ان سے پہلے ریلیز ہو جائے گی۔ شاید میں واقعی فلم بینوں کو حیران کرنے میں کامیاب ہو جاؤں کہ میں کتنی مختلف نظر آسکتی ہوں۔ پیسے بھی مجھے اے کلاس ہیروئن والے ہی مل رہے ہیں۔ بس شاید اس قسم کی کئی وجوہات ہو گئی تھیں بہرحال..... میں بہت خوش ہوں۔ بہت لطف آرہا ہے اس فلم میں کام کرتے ہوئے۔ زیادہ تر شوٹنگ آؤٹ ڈور ہوتی ہے۔"

"خوشی بہت اہم چیز ہے۔ جہاں سے ملے' حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔" میں نے کہا۔

"لیکن میری اصلی خوشی کہیں دور..... بہت دور ہے.... اور مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا ہے اور کہاں ہے۔" اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے تقریباً بند ہو گئیں اور لہجہ خوابیدہ سا ہو گیا۔

پھر اس نے جیسے چونک کر اپنے قریب رکھا ہوا گلاس اٹھا کر آخری جرعہ حلق میں انڈیلا اور خالی گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "تم بہت بڑے آدمی ہو لیکن چونکہ میرے دوست ہو..... اس لئے یہ بات حفظِ مراتب کے خلاف نہیں ہوگی اگر میں تم سے کہوں کہ پلیز مجھے ایک ڈرنک اور لا دو۔"

"تمہارے لئے کچھ لانے سے میری شان میں ہرگز کوئی فرق نہیں آئے گا۔" میں نے خالی گلاس اس کے ہاتھ سے لے کر دوسری طرف رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نہیں چاہتا تم اور پیو۔ آج تم پینے کی طرف اتنی مائل کیوں نظر آرہی ہو؟ اس سے پہلے تو میں نے کبھی تمہیں اس طرح پیتے نہیں دیکھا۔ ابھی تمہیں یہاں آئے زیادہ دیر نہیں گزری اور یہ تمہارا تیسرا گلاس تھا۔"

"معلوم نہیں کیوں آج دل چاہ رہا ہے..... " وہ پالش میں چھپے ہوئے اپنے مخروطی ناخنوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "بہت سی پینے اور بے خود ہو جانے کو دل چاہ رہا ہے۔ اس وقت میں وہیں ہلکورے لے رہی ہوں جہاں میں چاہتی تھی۔ لیکن میں اس سے کچھ آگے جانا چاہتی ہوں۔ میں جب یہاں آئی تو بہت اداس تھی۔"

"حالانکہ بظاہر تمہارا چہرہ خوشی سے دمک رہا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ایکٹنگ اسی کو کہتے ہیں۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولی۔

"اداسی کی کوئی وجہ؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ اداسی بس ایک خود رو پودے کی طرح اندر

کہیں سے خود بخود پھوٹی تھی اور زہر کی طرح رگ و پے میں پھیل گئی تھی۔" وہ قدرے مضمحل انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہوتا ہے' کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن اس کا علاج یہ نہیں۔"

"یہ بہت پرانی نصیحت ہے۔" وہ مربیانہ انداز میں مسکرائی۔

"یہ شراب بھی تو بہت پرانا ہے جس کا نام شراب ہے۔" میں نے کہا۔

"اور انسان کے درد اس سے بھی زیادہ پرانے ہیں۔" وہ سلگتی سگریٹ کا ٹوٹا ایک طرف اچھالتے ہوئے بولی۔

"چھوڑو ان باتوں کو' آؤ لوگوں سے ملتے ہیں اور اپنے آپ کو بھلاتے ہیں۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

ہم واپس بکھرے بکھرے ہجوم تک پہنچے تو مجھے یوں لگا جیسے کئی لوگ کن انکھیوں سے ہماری طرف دیکھ رہے ہیں کہ ہم سب سے الگ تھلگ کیوں جا بیٹھے تھے۔ ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں ایک پستہ قد آدمی اس پُرسکون ماحول میں بھی نہ جانے کیوں آندھی طوفان کی طرح ایک طرف کو جاتا نظر آیا۔ وہ ہمارے قریب سے گزرا تو ستارہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ جھٹکے سے یکدم یوں رک گیا جیسے کسی روبوٹ کی برقی رو منقطع ہو گئی ہو۔

پھر وہ ایڑیوں کے بل ہماری طرف گھوما۔ وہ گول مٹول سے چہرے والا ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اگر اس کی بھویں موٹی اور آپس میں تقریباً جڑی ہوئی نہ ہوتیں تو اسے خوش شکلوں میں ہی شمار کیا جا سکتا تھا۔ اس قسم کی بھویں شخصیت کا کوئی اچھا تاثر نہیں دیتیں لیکن وہ پھر بھی اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ خوش خلق' ملنسار اور بے پناہ مستعد۔ اس کے روئیں روئیں میں گویا توانائی موجزن تھی اور وہ جیسے ہر لمحے کچھ نہ کچھ کر گزرنے کے لئے بے چین تھا۔

"یہ راحیل بٹ صاحب ہیں۔ جنگل گرل کے ڈائریکٹر۔" ستارہ نے بتایا۔

اس شخص نے ایک جھٹکے سے مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس کا مختصر سا ہاتھ نرمی سے تھامتے ہوئے کہا۔ "آپ سے غائبانہ تعارف تو تھا' آج ملاقات بھی ہو گئی۔"

"اور اس سے پہلے کہ ستارہ آپ کا تعارف کرائے' میں بتا سکتا ہوں کہ آپ افضل چوہدری صاحب ہیں۔" اس نے مختصر سا قہقہہ لگایا۔ "افضل چوہدری کے علاوہ کوئی ہماری ہیروئن جنگل گرل کو اغوا کر کے وہاں نہیں لے جا سکتا۔" اس نے سرو کے اس درخت کی طرف اشارہ کیا جس کے قریب ہم چند لمحے پہلے بیٹھے تھے۔

اس کی بات میں معنویت تھی لیکن فی الحال میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور ملائمت سے کہا۔ "ہیروئن کے رول کے

لئے میں آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دیتا ہوں۔ میں نے آپ کی کوئی شوٹنگ نہیں دیکھی لیکن میرا اندازہ ہے کہ اسکرین پر ستارہ سے بہتر جنگل گرل کوئی نظر نہیں آ سکتی۔"

"میں منہ دیکھے کی بات نہیں کر رہا جی اور نہ ہی میں کوئی بہت بڑا نامی گرامی ڈائریکٹر ہوں۔ میں تو سیدھا سادا ان پڑھ سا آدمی ہوں۔ کوئی دعویٰ نہیں کرتا لیکن وقت ثابت کر دے گا کہ ستارہ کے روپ میں ہماری انڈسٹری کو ایک سپر ستارہ مل گیا ہے۔ آنے والے دس سال اس کے ہیں۔ یہ ہر رول میں جچے گی... کم از کم میں تو اسے جمعدارنی سے لے کر مہارانی تک ہر رول میں لینے کے لئے تیار ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ ہر رول میں دھوم مچائے گی۔"

"میں آپ سے متفق ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"لیکن میں نے یہ بات کبھی ستارہ کے منہ پر نہیں کہی۔ کیونکہ انڈسٹری میں سامنے بیٹھ کر اس قسم کی باتیں کرنے کا رواج عام ہے اور ان پر بہت کم اعتبار کیا جاتا ہے۔"

ستارہ نے کسی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا' کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ میرا بازو تھامے خاموش کھڑی مسکراتی رہی۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں بن سلگی سگریٹ تھی اور وہ غیر ارادی طور پر آہستگی سے اسے انگلیوں میں گھمائے جا رہی تھی۔

اچانک راحیل بٹ کو جیسے کچھ یاد آیا۔ وہ چونکتے ہوئے بولا۔ "میں اس وقت اپنی بیوی کی تلاش میں جا رہا تھا جب آپ نے میری بریکیں دبا دیں۔"

"آپ کی بیوی کھو گئی ہے کیا؟" ستارہ نے ہولے سے ہنس کر پوچھا۔

"وہ دراصل ہم لوگوں میں بری عادتیں پیدا ہو جاتی ہیں نا۔ ہم لوگ تفریح کو بھی خالص نہیں رہنے دیتے۔ میں اچھا بھلا انجوائے کر رہا تھا' یعنی یہ میری خوش قسمتی تھی کہ بیوی کی موجودگی کے باوجود انجوائے کر رہا تھا۔ اتنے میں مجھے اپنے ایک فنانسر سیٹھ صاحب نظر آ گئے۔ بہت دنوں سے ان کی اور میری ملاقات ٹلتی آ رہی تھی۔ میں فارغ ہوتا تھا تو وہ مصروف یا ملک سے باہر ہوتے تھے۔ وہ فارغ ہوتے تھے تو میرا شیڈول ٹائٹ چل رہا ہوتا تھا۔ آج نظر آئے تو میں نے فوراً بیوی سے کہا۔ بھلی مانس! تو یہاں ایک طرف کو کھڑی ہو۔ میں چار پیسے کا بزنس کر لوں۔ میں ٹہل ٹہل کر سیٹھ صاحب سے باتیں کرتا رہا اور جب فارغ ہوا تو بھول گیا کہ بیوی کو کہاں کھڑا کیا تھا۔"

"آپ تھوڑی دیر اور ستارہ سے باتیں کرتے رہئے آپ کی بیگم خود ہی آپ کو تلاش کر لیں گی۔" میں نے مشورہ دیا۔

راحیل بٹ نے خوشدلی سے قہقہہ لگایا۔ ایک طویل عرصے سے فلم جیسے بزنس میں رہنے کے باوجود اس کے چہرے پر معصومیت تھی۔

"مشورہ اچھا ہے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا لیکن پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "ہم فلم انڈسٹری والوں کی بیویوں کا بڑا حوصلہ ہوتا ہے جی۔ معلوم نہیں ہمیں کیا کچھ کرتے دیکھتی ہیں لیکن پھر بھی بظاہر آنکھیں بند کر کے ہمارا انتظار کرتی ہیں' خاص طور پر فلمی ہیرو کی بیوی ہونے کے لئے تو بڑا جگرا چاہئے جی۔"

وہ دوستانہ انداز میں میرا ہاتھ دبا کر آگے بڑھنے ہی لگا تھا کہ پھر رک گیا کیونکہ اسی لمحے گہرے رنگ کے سوٹ میں ایک نہایت دراز قد شخص ہمارے قریب آن رکا تھا۔ وہ سرخ و سفید وجیہہ جوان تھا۔ اس کے ہونٹوں کے قدرتی گلابی پن کو پان کی لالی نے گہرا کیا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خمار کے گلابی ڈورے تھے اور وہ یقیناً ہوش و بے خودی کے درمیان درمیان کہیں کسی نازک موڑ پر ہی تھا تاہم بظاہر خود کو اچھی طرح سنبھالے ہوئے تھا۔

تھری پیس سوٹ میں جسمانی ساخت کا زیادہ صحیح اندازہ نہیں ہوتا' اس کے باوجود اسے سرتاپا دیکھ کر کم از کم میرے لئے یہ جاننا مشکل نہیں تھا کہ وہ کوئی ٹھیک ٹھاک باڈی بلڈر تھا۔ اس کے چہرے کے عضلات کھنچے ہوئے تھے اور لباس کے نیچے یقیناً طاقتور مچھلیاں مچل رہی تھیں۔ کندھے چوڑے تھے۔

اس نے کوئی بات نہیں کی' کوئی تمہید نہیں باندھی' کسی قسم کی رسمیات کی ضرورت محسوس نہیں کی اور یکدم ہی اس طرح جھٹکے سے ستارہ کی کلائی پکڑ لی کہ اس کی انگلیوں سے سگریٹ نکل کر گھاس پر گر پڑی۔

اسے گویا اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ ستارہ نے دوسرے ہاتھ سے میرا بازو تھاما ہوا ہے اور وہ میرے ساتھ کھڑی ہے۔ اس نے ستارہ کو اپنی طرف تقریباً کھینچتے ہوئے مخمور سے لہجے میں کہا "ارے' مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ میری ہیروئن یہاں کھڑی ہوئی ہے۔ بھئی اصولاً تو تمہیں میرے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔"

مجھے اس کا انداز بہت ہی برا لگا۔ میں نے اپنے آپ کو آگے بڑھ کر اس کے منہ پر گھونسا رسید کرنے سے بمشکل باز رکھا۔ ستارہ کے چہرے پر بھی تناؤ اور برہمی کے آثار نمودار ہو گئے۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے اردگرد سکوت چھا گیا ہو حالانکہ میرا خیال ہے لوگ بدستور اپنی اپنی باتوں میں ہی مشغول ہوں گے۔

میں محفل کو خراب کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے ایک قدم آگے بڑھا کر اس کی کلائی پکڑ لی اور پھر میرے ہاتھ کا شکنجہ اس قدر سخت ہو گیا کہ اس کے ہاتھ سے ستارہ کی کلائی خود بخود چھوٹ گئی۔ میں نے آہستگی سے اس کا بازو پیچھے کیا اور ایک لفظ کہے بغیر ایک قدم پیچھے ہٹ کر یوں اپنی جگہ کھڑا ہو گیا گویا کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو۔

اسے بہتر طور پر دیکھنے پر مجھے احساس ہوا کہ اسے نوجوان نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اچھا خاصا پختہ العمر آدمی تھا لیکن اپنی بہتر نگہداشت وغیرہ کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے خاصا کم کا نظر آتا تھا۔ جس انداز سے میں نے اس کی کلائی کو چند لمحے کے لئے شکنجے میں جکڑا تھا' اس کی جگہ اگر کوئی عام آدمی ہوتا تو وہ یقیناً کلائی تھام کر کراہتا ہوا زمین پر بیٹھ جاتا لیکن وہ بہرحال باڈی بلڈر تھا۔

وہ شعلہ بار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ بہت کم لوگ سر اونچا کئے بغیر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتے ہیں کیونکہ میرا قد سوا چھ فٹ ہے لیکن وہ سیدھا میری آنکھوں میں دیکھ سکتا تھا کیونکہ وہ قد میں مجھ سے ایک آدھ انچ ہی کم تھا۔

اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ترچھے ہی کئے تھے کہ راحیل بٹ نے ایک عقلمند ثالث کی طرح آگے بڑھ کر ہاتھ بلند کر کے گویا اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "ارشد! تمہارا شاید ان سے تعارف نہیں۔ یہ شہر کے بہت بڑے آدمی ہیں افضل چوہدری صاحب' چوہدری گروپ آف کمپنیز کے مالک' فلمساز بھی ہیں۔"

پھر وہ اسی طرح عجلت کے سے عالم میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اور یہ ارشد موتی ہیں۔ شہر کے مشہور باڈی بلڈرز میں سے ایک رہے ہیں۔ چار پانچ سال پہلے مسٹر لاہور بھی رہے ہیں۔ مسٹر پاکستان کے لئے بھی مقابلوں میں حصہ لے چکے ہیں۔ معمولی پوائنٹس سے رہ گئے تھے۔ کافی عرصے سے اداکاری کے میدان میں قدم رکھ چکے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے ایک فلم بنی تھی 'جنگل کا

شہزادہ' اچھا بزنس کیا تھا اس نے۔ ارشد موتی اس کے ہیرو تھے۔ ...آج کل یہ ہماری فلم میں کام کررہے ہیں۔ جنگل گرل میں ستارہ کے مقابل ہیرو ہیں۔"

ارشد موتی کو غالباً اس سے غرض نہیں تھی کہ اسے میرے بارے میں کیا بتایا گیا ہے۔ اسے صرف اس بات سے دلچسپی تھی کہ اس کا تعارف متاثر کن انداز میں کرایا گیا ہے یا نہیں۔ راحیل نے جس طرح اس کا تعارف کرایا' اس سے اس کے چہرے کا تناؤ کافی حد تک کم ہوگیا لیکن خوشگوار موڈ میں بھی شاید اسے منہ قدرے ٹیڑھا کرکے بولنے کی عادت تھی۔

اپنے اسی مخصوص انداز میں وہ قدرے استہزائیہ لہجے میں بولا۔ "بٹ صاحب! اتنا لمبا تعارف کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ بس اتنا ہی کہہ دیں کہ اگر یہ بڑے آدمی ہیں تو چھوٹے آدمی ہم بھی نہیں ہیں۔"

"ہاں' وہ تو تمہارے انداز و اطوار سے ہی معلوم ہوگیا ہے۔" ...میں نے پلک جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

وہ شاید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر میری نظروں کی تاب نہ لاکر اس نے منہ پھیر لیا اور سر کو عجیب سے انداز میں جھٹکا دے کر آگے بڑھ گیا۔

راحیل بٹ نے یوں طویل سانس لی جیسے کوئی مصیبت ٹل گئی ہو۔ ستارہ کا اعصابی تناؤ بھی جیسے دور ہوگیا۔ وہ قدرے حقارت آمیز لہجے میں بولی۔ "اس کے ساتھ کام کرتے ہوئے مجھے یہ اندازہ تو ہوگیا تھا کہ یہ چھچھورا آدمی ہے مگر سیٹ پر یا شوٹنگ کے دوران اس نے کم از کم میرے سامنے چھچھورے پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ یہ آج اس کو کیا ہوگیا تھا بٹ صاحب؟"

راحیل بٹ ندامت آمیز انداز میں کنپٹی پر انگلی مارتے ہوئے بولا "کمبخت کے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔"

"دماغ ہے اس کے پاس؟" ستارہ نے معصومیت سے پوچھا۔

"بس میں مروتاً فرض کرلیتا ہوں کہ شاید ہو دو چار رتی دماغ اس کے پاس۔" راحیل نے مختصر اور مضطرب سا قہقہہ لگایا۔

ستارہ سنجیدگی سے بولی "میں نے تو شوٹنگ کے دوران کبھی اپنے کسی عمل سے اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی۔ اس کے باوجود یہ یکایک اسے کیا سوجھی تھی جو فری ہونے لگا تھا؟"

"میں نے کہا نا کہ اس کے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔" راحیل ہاتھ ملتے ہوئے بولا "ویسے بھی اس قسم کی پارٹیاں' ایسا ماحول اس کے لئے ابھی نئی چیزیں ہی ہیں۔" اس نے ہمدردانہ سے انداز میں سرہلایا "انسان کبھی غلط فہمی اور کبھی خوش فہمی میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ خصوصاً جبکہ وہ کم ظرف ہو۔ معمولی ماحول سے آیا ہو۔ ایسے انسانوں کو معاف کردینا چاہئے۔" وہ بظاہر ستارہ سے مخاطب تھا لیکن یہ بات گویا اس نے مجھے سنانے کے لئے کہی تھی۔

ستارہ نئی سگریٹ سلگا کر ایک کش لیتے ہوئے بولی "میں تو معاف نہیں کروں گی بٹ صاحب! یہ درست ہے کہ میں نے آپ کی فلم سائن کرلی ہے اور آپ کی شخصیت' عادات و اطوار اور کام کرنے کا انداز مجھے بہت اچھا لگا ہے لیکن میں ارشد موتی کو اس بات کی اجازت نہیں دوں گی کہ وہ مجھے کوئی ایکسٹرا گرل سمجھ کر فری ہونے کی کوشش کرے۔ آئندہ اگر اس نے کبھی شوٹنگ یا کسی پارٹی کے دوران یوں اچانک ہی مجھ سے کھینچا تانی کی کوشش کی تو میں کوئی چیز اس کے منہ پر مار کر دانت باہر نکال دوں گی۔ اور اس سلسلے کا باقی کام چوہدری صاحب مکمل کرادیں گے۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔

"میں نے کہا نا کہ ایسے لوگوں کو معاف کردینا چاہئے۔" راحیل بٹ نے ایک بار پھر مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملے۔ "انہیں کچھ نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بس اپنے تڑپتے پھڑکتے پٹھوں کے زعم میں ہوتے ہیں۔ خیر اس موضوع پر ہم پھر بات کریں گے۔ بشرطیکہ ضرورت پڑی۔ اب اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں اپنی بیوی کو تلاش کرلوں؟ اس عمر میں میں اپنی بیوی کو کھونے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔"

"آپ ضرور انہیں تلاش کیجئے۔ پلیز" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ راحیل بٹ آگے بڑھ گیا اور لوگوں کی ٹولیوں کے درمیان ہماری نظر سے اوجھل ہوگیا۔

ستارہ کا ذہن اب بھی ارشد موتی میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ "آج تو اس گدھے نے مجھے حیران کردیا۔"

"اس کا جغرافیہ کیا ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"بٹ صاحب نے کچھ بتا تو دیا ہے۔ مجھے بھی کچھ زیادہ نہیں معلوم۔" وہ ٹہلنے کے سے انداز میں ایک طرف بڑھتے ہوئے بولی "...بعض باڈی بلڈر اور پہلوان' کسرت گاہوں اور اکھاڑوں کو چھوڑ کر' ان کے تقدس کو بھول کر عشرت کدوں کی طرف مائل ہوجاتے ہیں۔ بدمعاشی میں پاؤں رکھنے لگتے ہیں۔ ان کے پاس جسمانی طاقت بھی ہوتی ہے اور آٹھ دس انہی جیسے پلے پلائے چیلے چانٹے بھی ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ اس لئے انہیں عیش و عشرت اور بدمعاشی' دونوں کا چسکا پڑجاتا ہے۔ ان کی دھاک بھی جلدی بیٹھ جاتی ہے۔ بہت سے دولت مند لوگ انہیں اپنے غیر رسمی باڈی گارڈز کے طور پر استعمال کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس لئے وہ کچھ اور بھی زعم میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ ارشد موتی بھی ایسے ہی لوگوں میں سے ایک ہے۔ اکھاڑے اور تن سازی کے کلبوں سے اس کا حقیقی ناتا یقیناً کئی برس پہلے ٹوٹ چکا ہے۔"

"فلم انڈسٹری میں اسے کون لے آیا؟" میں نے سادہ پانی

گلاس کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"صحیح طور پر تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ سنا ہے ایک بہت اچھے ...ساز ہوتے تھے یونس صاحب۔ انہوں نے کئی ہلکی پھلکی رومانی ...گھریلو فلمیں بنائیں لیکن ایسی فلموں کا بزنس کچھ نرم پڑنے لگا ...لوگ غالباً وہی گنے چنے چہرے دیکھ دیکھ کر تنگ آنے لگے تو ...ن صاحب نے یکدم ہی کروٹ بدلی اور ایک نیا تجربہ کیا۔ اس ...ارشد موتی نوجوان تھا۔ یونس صاحب نے اسے باڈی ...کلب سے اٹھا کر اسٹوڈیو میں پہنچادیا۔ وہ بھی ہیرو بننے کے ...میں خوشی خوشی چلا آیا اور پھر لوٹ کر نہ جاسکا۔"

ستارہ نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر سگریٹ کا کش لیا ...ہموار لہجے میں بات جاری رکھی۔ "یونس صاحب کا تجربہ نیا ...وہ بانکے سجیلے اور مٹک مٹک کر چلنے والے ہیرو کی جگہ ایک ...ح' تند خو' جسمانی طور پر خوبصورت اور مضبوط ہیرو کو اسکرین ...ئے تھے جس کے رگ پٹھوں کی نمائش کا بھی خاطر خواہ انتظام ...یونکہ وہ صرف چیتے کی کھال کا ایک ٹکڑا پہنتا تھا اور ڈرائنگ ...وغیرہ میں ڈائیلاگ بولنے کے بجائے پہاڑوں اور جنگلوں ...شیروں' چیتوں اور ہاتھیوں کے ساتھ دوڑا پھرتا تھا۔ چڑیا گھر ...ان جانوروں پر بھی خاصی محنت کی گئی تھی۔"

"مجھے کچھ کچھ یاد تو پڑتا ہے کہ اس قسم کی بھی کوئی فلم بنی ...کیا وہ تجربہ بھی کامیاب رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"خاصا کامیاب رہا تھا۔" ستارہ نے بتایا "اور فلم انڈسٹری ...حالانکہ روایت ہے کہ ایک طرح کی فلم ہٹ ہوجائے تو پھر ...قسم کی فلموں کی لائن لگ جاتی ہے لیکن حیرت انگیز طور پر ...جنگلی شہزادے والے سبجیکٹ پر نہ جانے کیوں دوبارہ کسی نے ...نہیں ڈالا۔ شاید اس لئے کہ اس طرح کی فلم بظاہر آسان ...آتی ہے لیکن درحقیقت اس میں محنت زیادہ ہوتی ہے۔ اس کا ...احسن آؤٹ ڈور شوٹنگز میں ہوتا ہے۔ سدھے ہوئے جانور ...ہمارے ہاں زیادہ تعداد میں دستیاب نہیں ہوتے۔ یعنی خاصا ...ت کا کام ہے۔ اس میں سب سے کم محنت کہانی پر ہوتی ہے ...نکہ کہانی خاصی حد تک بچگانہ ہی ہوتی ہے۔ ساری خوبصورتی ...لرز بلے اور ڈائرکشن کی ہوتی ہے۔"

سگریٹ کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے وہ ایک لمحے کے توقف ...بولی۔ "بہرحال لوگ اس تجربے کو بھول بھال گئے۔ ارشد ...تی کو فلم انڈسٹری کا ایسا چسکا لگا کہ وہ مسلسل اسٹوڈیوز میں ہی ...آتا رہا مگر دوبارہ اس کو کسی نے ہیرو کے طور پر کاسٹ نہیں کیا۔ ...ئی فلموں میں البتہ اسے ولن یا گینگ لیڈر ٹائپ کے کرداروں ...پیشکش ہوئی مگر اس وقت تک اس کی امید برقرار تھی اس ...ئے وہ انکار کرتا رہا لیکن آخر کار اس نے ان سے بھی چھوٹے ...لار قبول کرنے شروع کردئے۔ لیکن اسی دوران وہ حقیقی ...رگی میں خاصا مضبوط گینگ لیڈر بن گیا۔ اب بھی بہت سے بڑے فلم ساز اور دوسرے سیٹھ کسی نہ کسی مشکل مرحلے پر' کسی نہ کسی کٹھن کام کے سلسلے میں یا اپنے کسی مخالف کا دماغ درست کرانے کے لئے خفیہ طور پر اس کی خدمات حاصل کرتے رہتے ہیں لیکن فلموں میں پھر بھی اسے بڑا رول نہیں دیتے۔ اور ان حالات میں راحیل بٹ صاحب کی نظر کرم اس پر پڑگئی۔ انہوں نے ایک بار پھر وہی ٹارزن والا سبجیکٹ پکڑا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اب پھر اس تجربے کو دہرانے کا وقت آگیا ہے۔"

"بہت خوب" میں نے آہستگی سے کہا۔

"تاہم راحیل صاحب مکھی پر مکھی مارنے والے آدمی نہیں ہیں۔ انہوں نے جو کہانی منتخب کی ہے اس میں کچھ آگے چل کر نئے موڑ آتے ہیں۔ مثلاً ہیرو ٹارزن اور ریمبو کا مکسچر بن جاتا ہے۔ اسی طرح ہیروئنیں بھی دو ہیں۔ میں تو ٹارزن نما اس ہیرو کی جنگلی محبوبہ ہوں لیکن ثانوی ہیروئن ایک کروڑ پتی بزنس مین کی بیٹی ہوگی۔ ہیرو صاحب درختوں کی شاخوں پر جھولتے جھالتے آخر کار شہر کی چمکتی دمکتی سڑکوں پر بھی پہنچیں گے لیکن لمبے چوڑے چکروں کے بعد آخر کار وہ اپنی جنگلاتی محبت کی طرف لوٹ آتا ہے۔ ...اس میں عوامی دلچسپی کے سارے مسالے ہوں گے۔"

"کاروباری نقطۂ نظر سے تو سبجیکٹ اچھا ہے لیکن کیا بٹ صاحب کو ارشد موتی کے علاوہ کوئی دوسرا ہیرو نہیں ملا تھا؟" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"ہاں واقعی نہیں ملا تھا" ستارہ نے جواب دیا "انہوں نے بہت سے باڈی بلڈرز کا اسکرین ٹیسٹ لیا تھا۔ کوئی فوٹو جینک نہیں تھا' کسی کی آواز اچھی نہیں تھی اور کیمرے کا سامنا کرنے کے معاملے میں تو بیشتر ناکام تھے۔ اس لئے بٹ صاحب کو مجبوراً ارشد موتی کی طرف ہی رجوع کرنا پڑا۔ اس کے کریڈٹ پر کم از کم ... ایک کامیاب فلم تو موجود تھی۔ فوٹو جینک بھی ہے۔ کیمرے کے سامنے کام کرنا اچھی طرح جانتا ہے۔ آواز بھی پرکشش ہے حالانکہ عمر کے اعتبار سے وہ مصنف کے تصوراتی ہیرو سے کچھ زیادہ عمر کا ہے لیکن میک اپ سے اس خامی کو چھپالیا جائے گا۔"

پھر وہ ایک لمحے کے توقف سے بولی۔ "آدمی بے شک گھٹیا ہے لیکن کم از کم میرے اور بٹ صاحب کے ساتھ اس نے کبھی گھٹیا پن کا مظاہرہ نہیں کیا۔"

"ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے اور پھر آدمی کا دماغ الٹتے کیا دیر لگتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی دوران اسٹیج پر لگے ہوئے مائیک کے ذریعے اعلان کیا گیا کہ اندر ہال میں مہمانوں کے لئے رقص کا انتظام ہے' جو بھی جوڑے رقص سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ اندر جاکر اپنا شوق پورا کرسکتے ہیں۔ اور یہ کہ کھانے کے بعد ورائٹی پروگرام شروع ہونے سے پہلے سوئمنگ وغیرہ کے چند دلچسپ مقابلے ہوں گے۔ اس کے بعد اعلان کرنے والے نے غالباً ذرا مزاح پیدا

کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہدایات دینا شروع کیں "جو لوگ ان مقابلوں میں حصہ لینے میں دلچسپی اور آمادگی ظاہر کر چکے ہیں ان سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ کھانا ذرا ہاتھ روک کر کھائیں تاکہ تیراکی اور غوطہ خوری وغیرہ کے قابل رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہمیں ان کو اٹھا اٹھا کر سوئمنگ پول میں پھینکنا پڑے۔ کھانے سے پہلے ان کو اس لئے زحمت نہیں دی جا رہی کہ کہیں بھوک کے مارے وہ ہاتھ پاؤں ہی نہ ہلا سکیں اور سیدھے سوئمنگ پول کی تہ میں جا بیٹھیں۔"

اس پر کئی مہمانوں نے قہقہہ لگایا۔ میں اور ستارہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا دیئے۔ ستارہ نے گویا وضاحت کی۔ "بیشتر مہمانوں کی چونکہ میزبان سعید صاحب سے بے تکلفی ہے اس لئے اس قسم کے اعلانات کا برا نہیں منایا جاتا۔ ان کی پارٹیوں میں لوگ کھل کر انجوائے کرتے ہیں۔ سوئمنگ، غوطہ خوری اور اس سلسلے کے دوسرے کرتب دکھانے کا جو مقابلہ ہو گا اس میں کئی خواتین بھی حصہ لیں گی۔ ان مقابلوں میں جیتنے والوں کو حیران کن قسم کے تحائف دیئے جائیں گے۔"

"خاصے زندہ دل آدمی ہیں سعید صاحب!" میں نے ستارہ کا ہاتھ تھام کر دیگر بہت سے مہمانوں کے پیچھے چلتے ہوئے کہا۔ میری نظریں ابھی تک غیر محسوس طور پر ہنی کو تلاش کر رہی تھیں گو کہ اب میں اس کی آمد سے مایوس ہو چلا تھا۔

اندر جس ہال کو رقص کے لئے استعمال کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا وہ واقعی کسی بڑے ہوٹل کے ہال روم سے کم نہیں تھا۔ اس طویل و عریض ہال کا ماربل کا پالش شدہ فرش آئینے کی طرح جھلملا رہا تھا اور اس میں لوگوں کے دھندلے دھندلے عکس تک دیکھے جا سکتے تھے۔ یہاں تیز روشنیوں کا سیلاب تھا اور ان روشنیوں میں جہاں حسن کے جلووں کی جگمگاہٹ کئی گنا بڑھ گئی تھی وہاں بہت سے ایسے چہروں کی کھاپتگی بھی عیاں ہو گئی تھی جو ملگجی روشنی میں بہتر لگ رہے تھے۔ ملبوسات کے رنگ کچھ اور گہرے ہو گئے تھے، زرتار ملبوسات کی جگمگاہٹ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ہیروں کی جیولری آنکھوں کو خیرہ کرنے لگی تھی۔ آرکسٹرا غالباً بغلی کمرے میں تھا لیکن دھیمی دھیمی موسیقی کی لہریں گویا ہر شخص کو اپنے ہی پہلو سے پھوٹتی محسوس ہو رہی تھیں۔

کئی کمرے اسی ہال سے ملحق تھے اور ان کے دروازے ہال ہی میں کھلتے تھے۔ اس وقت بھی دروازے کھلے تھے۔ کسی کمرے میں قالین پر صرف خوبصورت گاؤ تکیے اور اونچے کشن رکھے نظر آ رہے تھے۔ غالباً رقص کے دوران مہمانوں کے ستانے کے لئے ایک کمرے میں میزوں پر پینے پلانے کا سامان بھی سجا نظر آ رہا تھا جہاں غالباً اپنی مدد آپ کے تحت ڈرنکس تیار کی جا سکتی تھیں۔ یہاں کوئی بیرا نہیں تھا۔

سازندے غالباً ابھی اپنے ساز درست کر رہے تھے اور انہیں آزمائشی سے انداز میں بجا رہے تھے۔ اسی دوران ایک خاصا خوبصورت جوڑا ہمارے قریب آ کر رکا۔ مرد قدرے فربہی مائل دراز قد اور پینتیس سے اوپر کا تھا۔ عورت تیس سے اوپر کی نہایت گوری اور خوبصورت تھی مگر اس کے حسن میں عجیب سا پھیکا پن تھا۔ اس کا چہرہ دیکھ کر برف پوش چوٹیوں کا خیال آتا تھا۔ اس کی آنکھیں شربتی تھیں اور وہ ڈھیر ساری جیولری پہنے ہوئے تھی۔ وہ بھی قدرے فربہی مائل تھی اور کسی جھیل کی طرح پرسکون تھی۔

مرد کی رنگت حالانکہ زیادہ صاف نہیں تھی مگر اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور ان آنکھوں سے بے پناہ چالاکی عیاں تھی مگر اس نے بڑی کامیابی سے اپنی شخصیت پر لاابالی پن کا لبادہ چڑھایا ہوا تھا اور بظاہر بڑے ڈھیلے ڈھالے انداز میں چلنے پھرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ تاہم اس وقت وہ یا تو مضطرب تھا یا پھر اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی کیونکہ اس نے مجھ سے مصافحہ کیا تو مجھے اس کے ہاتھ میں غیر معمولی حرارت اور نہایت ہی خفیف سی لرزش محسوس ہوئی۔

عورت نے نہایت نپے تلے انداز میں مسکراتے ہوئے ستارہ سے ہاتھ ملایا اور اسی دوران ستارہ نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ "یہ نصیر نواز ہیں۔ فلمی دنیا کے مشہور اور مصروف ترین مصنف۔ سلیقے کی کہانیاں لکھتے ہیں لیکن میری طرح تجربے کے طور پر انہوں نے جنگل گرل لکھنے کی بھی ہامی بھر لی تھی۔"

وہ شخص پھیکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "ایک کامیاب مصنف کو ہر طرح کی کہانیاں لکھنی چاہئیں جی، خصوصاً جب معاوضہ بہترین مل رہا ہو۔"

میں نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔ اس کی تردید یا تائید نہیں کی۔ ستارہ نے اس کی ساتھی عورت کی طرف اشارہ کر(کے کہا)

"اور یہ ان کی دوست ہیں طاہرہ خانم۔"

میرا اندازہ غلط رہا تھا۔ وہ نصیر نواز کی دوست تھی، میں اسے اس کی بیوی سمجھا تھا۔ نصیر نواز سے بھی میں غائبانہ طور پر واقف تھا۔ ملاقات آج ہوئی تھی۔ فلمی کہانیوں کے ضمن میں اس نام کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ میں نے اس کی دو تین فلمیں دیکھی بھی تھیں اور میرا خیال تھا کہ اس کی کہانی اتنی اچھی نہیں ہوتی جتنا اچھا اسکرین پلے ہوتا ہے۔ کہانی کو پیش کرنے کا انداز اس کی کامیابی کی بنیاد تھا۔ وہ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھرپور ڈرامائی منظر نامے کے ساتھ پیش کرنے میں ماہر تھا۔

ستارہ نے اس سے میرا تعارف کرانے کی غرض سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور یہ ہیں...."

نصیر نواز اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "محمد افضل چوہدری۔ انہیں کون نہیں جانتا۔ مجھے خوشی ہے کہ آج ان سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا۔"

مجھے اب واقعی حیرت ہونے لگی تھی کہ اتنے بہت سے اور خاصے معروف و کامیاب لوگ مجھے غائبانہ طور پر کیسے جانتے تھے! میری تو تصویریں بھی آئے دن اخباروں میں نہیں چھپتی تھیں۔ فلمی دنیا میں شاید دولت بہت بڑا تعارف تھی۔ دولت مندوں کو لوگ بغیر ملاقات کے بھی جاننے لگتے تھے۔ میں صرف چند مرتبہ سٹوڈیوز گیا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ پچاسوں آدمی مجھے جاننے لگے تھے۔

"آپ لوگوں سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے رسم نبھائی۔

"خوش نصیبی ہے ہماری" نصیر نواز گردن کو خفیف سا خم دے کر مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کی مسکراہٹ روح سے خالی تھی مگر پھر بھی خاصی دلکش تھی۔ اس کی عمر اگر کچھ کم ہوتی اور شخصیت تھوڑی سی بے ڈول ہونا شروع نہ ہو چکی ہوتی تو وہ خود بھی گزارے لائق ہیرو کے طور پر فلموں میں چل سکتا تھا۔ بلکہ مجھے نہ جانے کیوں شبہ ہو رہا تھا کہ شاید ابتدا میں وہ ہیرو بننے ہی کی آرزو لے کر فلم انڈسٹری میں آیا ہو مگر اس طرف دال نہ گلی ہو اور پھر حالات نے، اس کی کوششوں یا پھر صلاحیتوں نے اسے مصنف بنا دیا ہو اور اس میدان میں اسے کامیابی نصیب ہو گئی ہو۔ فلمی دنیا میں یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نہ جانے کتنوں کے ساتھ یہ ہو چکا تھا کہ وہ بننے کچھ اور آئے تھے مگر بن گئے کچھ اور۔

اس کی ساتھی عورت طاہرہ خانم ٹھہری ٹھہری نظروں سے ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہی تھی لیکن اس کے بارے میں یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی ہے۔ وہ جھیل کی طرح پُرسکون ہی نہیں بلکہ سمندر کی طرح گہری بھی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنی ساتھی کے برعکس نصیر نواز ہمارے سامنے پُرسکون نہیں کھڑا تھا۔ وہ اندر ہی اندر تناؤ اور اضطراب کا شکار تھا۔ میں نے گویا اس کی سہولت کی خاطر اسے اجازت دیتے ہوئے کہا "پلیز انجوائے یور سیلف"

وہ گویا ایسے ہی الفاظ کا منتظر تھا۔ فوراً اپنی ساتھی کا ہاتھ پکڑ کے آگے بڑھ گیا۔ طاہرہ خانم گویا بادل نخواستہ اس کے ساتھ آگے بڑھی۔ وہ شاید کچھ دیر اور ہمارے قریب رکنا چاہتی تھی، کوئی بات کرنا چاہتی تھی لیکن شاید فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ کیا بات کرے۔

"یہ کیا کیس ہے بھئی؟" میں نے مسکراتے ہوئے ستارہ سے پوچھا۔ "اچھی بھلی عمر ہے دونوں کی اور ابھی تک غیر شادی شدہ ہی گھوم رہے ہیں؟"

"طاہرہ خانم کی تو دو شادیاں ہو چکی ہیں۔ دونوں شوہر اچھی خاصی عمر کے تھے۔ دونوں ہی شادی کے تھوڑے تھوڑے عرصے بعد انتقال کر گئے اور طاہرہ کے لئے دونوں ہی بہت دولت چھوڑ گئے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ طاہرہ نسبتاً ایک جوان آدمی پر مہربان ہوئی ہے۔ یا شاید اس میں نصیر نواز کا کمال پوشیدہ ہے۔"

"تو گویا طاہرہ خانم کا فلم انڈسٹری سے کوئی تعلق نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، ہرگز نہیں" ستارہ نے جواب دیا "وہ خالصتاً ایک غیر فلمی عورت ہے۔ اس کے پاس شوہروں کی چھوڑی ہوئی کچھ زمینیں ہیں۔ کاروبار ہیں۔ کافی مصروف عورت ہے۔ لیکن اب شاید اس کا فلمی دنیا سے عملی تعلق بھی ہو جائے۔ سنا ہے آج کل نصیر نواز اپنی ایک ذاتی فلم کی کہانی پر کام کر رہا ہے۔ وہ فلم غالباً طاہرہ خانم ہی کے سرمائے سے بنے گی۔"

اس دوران رقص کے لئے موسیقی شروع ہو چکی تھی۔ ہم بھی دوسرے جوڑوں کے ساتھ موسیقی کے زیر و بم پر ہلکورے لینے لگے۔ آرکسٹرا نے اس قسم کی پارٹیوں کی عمومی روایت کے مطابق جاز سے موسیقی کا آغاز کیا تھا۔ ابتدا عام طور پر یونہی دھیمے اور قدیم رومانوی سے انداز میں ہوتی ہے لیکن دھیرے دھیرے ماحول حرارت پذیر ہوتا ہے تو دھنیں بدلتی جاتی ہیں۔ تیز تیز ہوتی جاتی ہیں اور جدید ترین دور میں تو اچھا بھلا سنجیدہ طبقہ بھی آخر کار بریک ڈانس تک پر طبع آزمائی کی کوشش کرتا ہے۔

رقص کے دوران بھی جانے کیوں میرے ذہن میں نصیر نواز ہی پھنسا رہا۔ میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں کہا "جانے کیوں میرا دل نہیں مانتا کہ نصیر نواز ابھی تک غیر شادی شدہ ہو گا"

"میں نے کب کہا کہ مجھے اس بات کا یقین ہے؟" ستارہ میری بانہوں میں مسکرائی "لیکن ظاہری حالات اور اعلانات کے مطابق تو وہ غیر شادی شدہ ہی ہے اور ظاہر ہے ہمیں وہی تسلیم کرنا چاہئے جو بظاہر دکھائی دے رہا ہو اور جو کچھ متعلقہ شخص نے خود ڈکلیئر کر رکھا ہو۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بالکل ٹھیک۔ ہمیں کوئی حق نہیں کسی کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن میں تو یونہی غیبت سیشن چالو رکھنے کے لئے تمہاری ذاتی رائے جاننا چاہ رہا تھا۔"

"میری ذاتی رائے؟" اس نے چھت میں آویزاں فانوس کی طرف دیکھتے ہوئے پُرخیال لہجے میں کہا "مجھے یقین نہیں مگر میرا دل کہتا ہے کہ جس گاؤں یا چھوٹے موٹے شہر سے وہ آیا ہو گا وہاں ضرور اس کی کوئی گھریلو سی بیوی موجود ہو گی۔ فلمی دنیا میں عموماً یہی ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ چھوٹے چھوٹے شہروں یا دیہات سے اس ونڈر لینڈ کا رخ کرتے ہیں۔ قسمت اگر ان پر مہربان ہوتی ہے تو وہ عزت، دولت، شہرت سب کچھ حاصل کر لیتے ہیں اور وہ بے چاری ارینجڈ میرج کی شکار، سیدھی سادی، وفا شعار عورتیں ان کا انتظار کرتی رہ جاتی ہیں۔"

"میرا خیال ہے اکثریت کی نہیں، بہت کم لوگوں کی یہ کہانی ہوتی ہو گی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"کم لوگوں ہی کی سہی لیکن یہ بہرحال کوئی اچھی کہانی نہیں

ہے۔ میں یہ نہیں کہتی کہ مرد کو وفا کا پیکر بن کر رہنا چاہئے۔ ٹھیک ہے' خواہشوں کی غلامی اپنی جگہ ہے لیکن وعدہ بہرحال نبھانا چاہئے۔ شادی میرے خیال میں ایک مقدس وعدہ ہے۔ اسے نبھانا مردانگی ہے۔ یا پھر یہ ہے کہ جو لوگ بہت ہی بلند عزائم رکھتے ہوں' بہت آگے جانا چاہتے ہوں' انہیں شادی کرنی ہی نہیں چاہئے۔" وہ جاز کی دُھن ہی کی طرح ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بول رہی تھی۔

"اسی لئے تو میں نہیں کرتا ہوں" میں نے جلدی سے کہا۔

اس نے مصنوعی حیرت سے اپنی خوبصورت آنکھیں پھیلائیں "تم آخر اور کتنا آگے تک جانا چاہتے ہو؟"

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" میں نے راست گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا "ویسے اس زاوئے سے قطع نظر ابھی تو میری عمر میں بھی گنجائش موجود ہے۔ کیا خیال ہے؟"

"ہاں گنجائش تو موجود ہے۔" اس نے گویا تنقیدی نظر سے میرا جائزہ لیا "تمہاری اصل عمر بھی کچھ زیادہ نہیں جبکہ تمہیں یہ فائدہ بھی حاصل ہے کہ تم اپنی اصل عمر سے بھی کم کے نظر آتے ہو۔"

"تعریف کا شکریہ" میں نے کہا "اور تم بھی سدا بہار عورت ہو' غربت یا نامساعد حالات کی خزاؤں نے تمہاری شخصیت کو ذرا بھی متاثر نہیں کیا۔"

"میرا خیال ہے اس وقت ہم من تراحاجی بگویم تو مرا ملا بگو والے فارمولے پر عمل کر رہے ہیں۔ تمہیں فارسی کے اس محاورے کا مطلب آتا ہے نا؟" اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بالکل آتا ہے' بچپن میں ہی پڑھ لیا تھا اس کا مطلب لیکن میرا خیال ہے کہ ہم خوش فہم نہیں ہیں بلکہ بہت مار کھائی ہے زمانے کی ہم نے۔"

"خیر کچھ بھی سہی" وہ بے پروائی سے سر جھٹک کر بولی۔ "یہی غنیمت ہے کہ ہم دوسروں کی باتیں چھوڑ کر اپنی طرف متوجہ تو ہوئے۔ کیا ہماری ذات اس قابل نہیں کہ کچھ دیر ہم اس کے بارے میں بھی بات کر سکیں؟"

"ایک دوسرے کے بارے میں تو ہم سب کچھ جانتے ہی ہیں۔ ... حالات سے بھی واقف ہیں اور جذبات و احساسات سے بھی۔ تجسس تو دوسروں کے بارے میں ہوتا ہے نا۔" میں نے کہا۔ "ویسے تمہیں صدق دل سے ایک بات بتاؤں۔ مجھے فلمی دنیا بہت دلچسپ لگی ہے۔ اگر میں شاید پہلے یہاں قدم رکھنے میں کامیاب ہو چکا ہوتا تو شاید میں اس میں کھو جاتا' گم ہو جاتا۔ یہیں کھپ جاتا' یہیں کا ہو رہتا۔ لیکن اب میرے مفادات دوسرے شعبوں سے زیادہ وابستہ ہو گئے ہیں۔ ان میں میرے لئے زیادہ دولت ہے اور سردست میرے پاس اتنا فالتو وقت نہیں ہے کہ محض شغل کے طور پر فلم انڈسٹری میں روز و شب گزار سکوں۔ ویسے میرا دل

ت چاہتا ہے کیونکہ جن شعبوں میں اس وقت میں الجھا ہوا ہوں ن میں لوگ دلچسپ نہیں ہیں۔ بہت خشک شخصیتیں ہیں۔ ہنستے رف اس وقت ہیں جب ڈرنک ہوتے ہیں۔ جس وقت بہ قائمی دش و حواس ہوتے ہیں اس وقت تو انہیں کوئی لطیفہ سناؤ تو لطیفہ تم ہونے کے بعد بڑی سنجیدگی سے پوچھتے ہیں۔ اچھا اس کے بعد لیا ہوا؟ ایسے لوگوں کے ساتھ رہ کر انسان مشین سی بن جاتا ہے۔ اندرونی طور پر میں اس قسم کے لوگوں میں خوش رہنے والا آدمی میں ہوں لیکن بس فی الحال میں اپنے چند بڑے پروجیکٹس مکمل کرنے کے لئے ان لوگوں کے درمیان گزربسر کر رہا ہوں۔"

"اگر بات صرف دولت کی ہے تو بے تحاشہ دولت کمانے کے امکانات تو فلم انڈسٹری میں بھی کچھ کم نہیں۔ کتنے بہت سے تو شعبے ہیں' آپ اپنے کام کو جتنا چاہیں پھیلا سکتے ہیں۔ فلمسازی ہے' ڈسٹری بیوشن ہے حتیٰ کہ ابھی تو اس شہر میں مزید کئی اسٹوڈیوز بنانے کی گنجائش بھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک بہت بڑا کام ہے اور جسے انسان چاہے پھیلا سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اس کے پاس پیسے کی کمی نہ ہو۔" ستارہ نے کہا۔

"شاید میں کبھی اس حد تک اس طرف توجہ دوں۔ فی الحال تو میں دوسرے کاموں میں الجھا ہوا ہوں اور اس شعبے میں سردست میں نے صرف تجربے کے طور پر آفاق کو آگے بڑھا رکھا ہے۔ میں دیکھوں گا کہ وہ کام کو کس حد تک پھیلا سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ ہدایت کار بہت اچھا ہے۔ ایماندار بھی ہے لیکن اس میں وہ سب صلاحیتیں نہیں ہیں جو ایک کامیاب بزنس مین میں ہونی چاہئیں۔" اس کی نظر بہت گہری تھی۔ وہ شخصیت اور حالات کا تجزیہ کرنا بہت اچھی طرح جانتی تھی۔ معلوم نہیں کیسے سیکھ گئی تھی وہ یہ سب کچھ؟ یا شاید اس میں پیدائشی طور پر اس قسم کی صلاحیتیں موجود تھیں لیکن فلم انڈسٹری میں آکر انہیں اظہار کا راستہ ملا تھا۔

آفاق کے بارے جو رائے اس نے ظاہر کی تھی کم و بیش وہی رائے میری اپنی بھی تھی۔ اس موقع پر میں خود اپنے بارے میں بھی سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ آخر میں خود کہاں سے یہ سب کچھ سیکھ گیا تھا؟ لوگوں کا اور حالات کا تجزیہ کرنا' کامیابیوں کے امکانات کا جائزہ لینا اور سارے کاروباری گر وغیرہ؟ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ سب کچھ مجھے وقت نے سکھایا تھا یا حالات نے؟ یا پھر یہ صرف تقدیر کی مہربانیاں تھیں۔

میں نے ستارہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "تمہارا خود اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا تم فلم انڈسٹری میں میرے کاروبار کو پھیلانے کے لئے کام نہیں کر سکتیں؟ میرا خیال ہے تم میں کم از کم فلم سے متعلقہ کاروباروں کو چلانے کی صلاحیتیں ضرور پیدا ہو چکی ہیں۔"

"شاید ہو چکی ہوں لیکن میں نے کبھی اپنے آپ کو آزمایا نہیں۔" وہ غیر یقینی لہجے میں بولی "لیکن فی الحال تو بطور اداکارہ ہی میری مصروفیات اتنی ہیں کہ میں کسی اور کام میں دلچسپی لینے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ اس لئے مجھے تو ان معاملات میں مت گھسیٹو۔"

"اوہ" میں مزید کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ مجھے اس کے جواب سے ہلکی سی مایوسی ہوئی تھی۔ ایک لمحے کے لئے گویا کچھ سوچ کر وہ بولی۔ "ویسے بھی وہ انگریزی کا مقولہ ہے نا... ڈونٹ ڈو بزنس ود اے فرینڈ۔ یو دل لوز بوتھ۔ تو میں اس کی قائل ہوں۔ واقعی دوست کے ساتھ کاروبار نہیں کرنا چاہئے۔ دونوں ہاتھ سے جاتے ہیں۔ دوست بھی اور کاروبار بھی۔"

میں ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"مجھے واقعی حیرت ہوتی ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "وقت نے تمہیں کیا کچھ سکھا دیا ہے۔"

وہ کچھ نہ بولی' بس عجیب سے انداز میں قہقہہ لگا کر رہ گئی۔ دھیمی موسیقی کی لہروں پر ہم ہلکورے لیتے رہے۔ آخر کار جاز کی دُھن ختم ہو گئی اور کوئی وقفہ دئے بغیر ہی آرکسٹرا یکدم جاز سے راک اینڈ رول پر آ گیا۔ لوگوں کو اپنے قدم اس دُھن سے ملانے میں چند سیکنڈ لگے۔ اس کے ساتھ ہی گویا ماحول کی حرارت بڑھ گئی۔ گرد و پیش گویا پُرہنگام سا ہو گیا۔

ستارہ میں بھی یکدم تیزی آ گئی تھی۔ چند لمحے پہلے تک اس کا وجود گویا دھیمی ہوا میں ہلکورے لیتا ہوا ریشم تھا مگر اب وہ برقی کھلونے کی طرح تھرک رہی تھی مگر جب وہ بولی تو اس کی آواز مرتعش نہیں تھی۔ "کیا بات ہے' تم خاموش کیوں ہو گئے؟"

"میں پہلے بھی شاید باتوں سے اپنے آپ کو بہلا رہا تھا۔ لفظوں کی مدد سے اپنی توجہ بٹا رہا تھا۔" میں نے موسیقی اور قہقہوں کے شور میں کہا۔

"کیوں بہلا رہے تھے؟ کیوں توجہ بٹا رہے تھے؟" اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"میں فولادی اعصاب کا مالک ہوں۔ یہ محض خود پرستی نہیں' بہت سے تجربات کی بنا پر یہ بات کہہ رہا ہوں لیکن اس کے ساتھ ساتھ میری حسیات بہرحال بہت تیز ہیں۔ میری کھوپڑی پر جیسے کوئی غیر مرئی انٹینا فٹ ہے جو ماحول میں پھیلے ہوئے نہایت خفیف سے سگنل ریسیو کرتا رہتا ہے۔ اکثر اوقات جبکہ ماحول بظاہر پُرسکون ہوتا ہے تو میرے اس غیر مرئی انٹینا پر موصول ہونے والی لہریں مجھے مضطرب کرتی ہیں۔"

"اوہ... خدا کے لئے کوئی بری بات نہ کرنا" وہ طویل سا سانس لے کر بولی "میں اس وقت بہت اچھا محسوس کر رہی ہوں۔ میرے سامنے تم ہو' تیز... موسیقی ہے' تیز روشنیاں ہیں اور کل میری کوئی شوٹنگ نہیں ہے۔ میں بہت خوش ہوں' مجھے انجوائے کرنے دو۔"

"میں نے کب کہا کہ میں کسی بری بات کے احساس سے مضطرب ہوں؟"

"یہ جو چھٹی' ساتویں' آٹھویں یا اسی قسم کی دوسری نامعلوم حسیات ہوتی ہیں نا' اور یہ جو نامعلوم سگنل ریسیو کرنے والے غیر مرئی انٹینا ہوتے ہیں' یہ سب بری خبریں ہی لاتے ہیں۔" اس نے بڑے دانشمندانہ لہجے میں کہا۔ "خیر تم کہو بات کیا ہے؟"

"ماحول میں ایک عجیب' بے عنوان سے تناؤ کا احساس ہو رہا ہے اور یہ احساس بھی کچھ واضح نہیں ہے۔ بس جیسے ذہن کے کسی تاریک حصے میں کوئی چیونٹی رینگ رہی ہے۔" میں نے اسے اپنا مطلب' سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "لوگ یہاں ہنس رہے ہیں' قہقہے لگا رہے ہیں۔ بہ آواز بلند باتیں کررہے ہیں۔ بہت مسرور ہیں لیکن لگ رہا ہے جیسے کسی چیز کو بھلانے' کسی تشویش کو چھپانے کی کوششوں میں مصروف ہیں اور شاید اسی لئے ضرورت سے کچھ زیادہ اونچی آوازوں میں باتیں کررہے ہیں۔ ضرورت سے کچھ زیادہ گرمجوش بھی نظر آنے کی کوشش کررہے ہیں۔ مجھ اور تم سمیت ہر شخص پر گویا کوئی نامعلوم سا دباؤ ہے۔ ہوا میں یہ جو بے عنوان سا تناؤ ہے نا' وہ گویا چھوت کی بیماری کے جراثیموں کی طرح ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلا ہوا ہے۔ جراثیم جو نظر نہیں آتے مگر اپنا اثر دکھاتے رہتے ہیں۔ جب تک سب لوگ لان پر تھے تو وہاں شاید کم روشنی کی وجہ سے یہ احساس بھی تقریباً معدوم تھا لیکن یہاں کی تیز روشنیوں نے جیسے ایک باریک سی تہ اتار دی ہے لیکن اصل چیز' اصل سبب اب بھی کہیں بہت دور' ان گت تہوں کے اندر ہے۔"

"شاید تمہارا خیال درست ہو۔" ستارہ نے گہری سانس لی۔ ..."دراصل یہاں مختلف طبقوں کے مالک اور مختلف حالات کے پروردہ بہت سے لوگ موجود ہیں اور ہر ایک کے ساتھ اس کے ماضی' حال اور مستقبل کی الجھنیں لگی ہوئی ہیں۔ الجھنیں تو دنیا میں سبھی کو لاحق ہوتی ہیں لیکن جب لوگ بڑے بن جاتے ہیں' ان کے کام اور نام اونچے ہو جاتے ہیں تو ان کی الجھنیں بھی بڑی ہو جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے جتنے بھی لوگ یہاں موجود ہیں ان سب کے اعصاب پر کسی نہ کسی چیز کا تناؤ ہے اور اسی تناؤ کے اثرات ہوا میں تیر رہے ہیں جنہیں تم جیسے لوگ جن کی کھوپڑی پر بقول تمہارے' انٹینا فٹ ہوتا ہے' محسوس کرلیتے ہو۔"

"وضاحت تو تمہاری قابل قبول ہے۔ تم تو اچھی خاصی عالم و فاضل سی ہوتی جارہی ہو۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"میں ان لوگوں کو اور فلمی دنیا کے ماحول کو تھوڑا سا جان گئی ہوں نا' اس لئے کچھ باتوں کی توجیہہ کرسکتی ہوں۔" وہ ایک لمحے کے لئے مجھ سے ہاتھ چھڑا کر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "یہاں اس وقت کسی کو یہ سوال ڈس رہا ہوگا کہ اس لمحے جب وہ خود کسی اور عورت کے ساتھ محوِ رقص ہے' اس کی بیوی نہ جانے کہاں ہوگی؟ آیا اس شہر میں بھی ہوگی یا نہیں؟ کسی کی اس کی بیوی سے علیحدگی ہوچکی ہے اور عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے کہ بچے کس کی تحویل میں رہیں گے۔ کسی کا لاکھوں کا بزنس چل رہا ہوگا مگر پھر بھی اسے مالی پریشانیاں لاحق ہوں گی۔ کسی کی فلم مکمل حالت میں اسٹوڈیو میں پڑی ہوگی مگر عین آخری دنوں میں وہ دیوالیہ ہوچکا ہوگا اور اس کے پاس اتنی رقم بھی نہیں ہوگی کہ اسٹوڈیو کے بقایا جات ادا کرکے فلم اٹھا سکے۔ کوئی سوچ رہا ہوگا کہ سنسر بورڈ کے کس رکن پر کس طرح ڈورے ڈالے جاسکتے ہیں۔ کسی کو اس کی داشتہ بلیک میل کررہی ہوگی۔ غرضیکہ ہر ایک کی اپنی پریشانیاں ہوں گی' اپنا مسئلہ ہوگا۔"

"اور تمہارا مسئلہ کیا ہے؟" میں نے قطعی غیر ارادی طور پر پوچھ لیا۔

"میرا مسئلہ؟" اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھتے ہوئے یوں لمبی لمبی پلکیں جھپکائیں کہ میرا دل اتھل پتھل ہو کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ سرگوشی نما لہجے میں بولی۔

"میرا مسئلہ صرف تم ہو۔ اور یہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوسکتا۔"

اس سے پہلے کہ میں اس بات کی وضاحت چاہتا' وہ سر جھٹک کر بولی۔ "چھوڑو ان سب باتوں کو' کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ اس تقریب کا خوبصورت ترین جوڑا اتنی بیکار گفتگو کررہا ہوگا۔"

"تو تمہیں اس بات کا احساس ہے کہ ہم اس تقریب کا خوبصورت ترین جوڑا ہیں؟" میں نے کہا۔

"اس قسم کی باتوں کو محسوس کرتے رہنا چاہئے۔ دل خوش رہتا ہے۔" وہ دل آویزی سے مسکرائی۔ "تم بھی اسی قسم کی کوئی بات کرو نا۔ رومینٹک اور خوش کن سی۔"

"میرا خیال ہے مجھے بھی اپنے گھر پر اس قسم کی ایک تقریب کا اہتمام کرکے مقابلۂ حسن منعقد کروانا چاہئے تاکہ تمہیں بجا طور پر کم از کم مس لاہور تو منتخب کر ہی لیا جائے اور تاج پہنا دیا جائے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ارشد موتی تو یقیناً اس مقابلۂ حسن کے ججوں میں شامل ہونا چاہے گا۔" ستارہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جج صرف انسانوں میں سے لئے جائیں گے۔" میں نے کہا۔ "ویسے تمہیں اس تذکرے پر وہ کیوں یاد آگیا؟"

"اس کی شکل نظر آگئی ہے' اس لئے یاد آگیا۔" ستارہ بولی۔ "وہ اس وقت تمہارے عقب میں ایک خاصی خوبصورت اور کم عمر لڑکی کے ساتھ رقص کررہا ہے۔"

میں نے رقص ہی کے انداز میں قدرے ترچھا ہو کر دیکھا۔ وہ واقعی مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کی تیز حرکات و سکنات کے ساتھ اس کے چست سوٹ میں جسم کے پٹھے مچلتے محسوس ہو رہے تھے۔ تراشیدہ بالوں والی ایک کم عمر' نہایت گوری اور نازک اندام سی لڑکی اس کے مقابل تھی جو اس کے بازوؤں کے حلقے میں ایسی ہی لگ رہی تھی جیسے کوئی بن مانس کسی چینی گڑیا سے کھیلنے کی کوشش کررہا ہو۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ بن مانس کی طرح بدصورت نہیں بلکہ خاصا وجیہہ انسان تھا۔ وہ شاید میرے دیکھنے سے پہلے ہی شعلہ بار نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"اسے تکلیف کیا ہے؟" میں نے ستارہ سے کہا لیکن میری نظر ارشد موتی پر ہی رہی اور میں مسکراتا رہا۔ چڑانے والے انداز میں۔ تاؤ دلانے والے انداز میں۔

ستارہ میرے کان کے قریب بولی۔ "میرا خیال ہے کہ وہ مجھ پر عاشق ہوگیا ہے۔ اس بات کا احساس مجھے آج پہلی بار اس پارٹی میں ہی ہوا ہے۔ اس قسم کے لوگ ہر چیز کو قابلِ حصول سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی چیز قابلِ حصول نظر نہ آئے تو اسے طاقت یا سازش کے ذریعے اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس وقت شاید قدرے بے بسی کے احساس نے اسے زیادہ پیچ و تاب کھانے پر مجبور کیا ہوا ہے۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہے جیسے تم نے اس کی کسی چیز پر قبضہ کرلیا ہے۔"

"کیا اس کا یہ خیال صحیح ہے؟" میں نے ستارہ کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر پوچھا۔

"آدھا صحیح ہے" ستارہ کی مخمور آنکھیں مسکرائیں مگر بظاہر وہ سنجیدہ رہی "یعنی یہ تو صحیح ہے کہ تم نے قبضہ کر رکھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ چیز اس کی ہے۔"

"کمبخت بڑا ہی غیر مہذب اور بد اطوار آدمی ہے۔" میں نے ایک بار پھر ارشد موتی کی طرف ایک نظر دیکھ کر کہا۔ میں اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ ہم اسی کے بارے میں باتیں کررہے ہیں "دیکھو نا' اب یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ آدمی اچھی بھلی خوبصورت' کم عمر اور پڑھی لکھی نظر آنے والی لڑکی کے ساتھ رقص کررہا ہو لیکن دیکھتا رہے ایک دوسری عورت کی طرف۔ اس شخص کو تو چڑیا گھر میں ہونا چاہئے تھا۔"

"وہ اس بات پر زیادہ کھول رہا ہوگا کہ تم اس سے خوف زدہ یا مرعوب نہیں ہوئے۔ اس کا خیال یا شاید تجربہ یہی ہے کہ سیٹھ ٹائپ کے لوگ ذاتی طور پر بڑے بودے ہوتے ہیں۔ ان کا سارا انحصار اپنے پالے ہوئے آدمیوں پر ہوتا ہے اور جس نے آدمی نہ پالے ہوئے ہوں وہ تو بالکل ہی پیروں سے اکھڑا ہوا ہوتا ہے۔"

"اسے کم از کم میرے قد کاٹھ کا ہی کچھ خیال کرلینا چاہئے تھا" میں نے اس شخص کے سے لہجے میں کہا جو معاشرے میں صحیح مقام نہ ملنے کا شکوہ کررہا ہو۔

"ہاں یہ اس کی بے وقوفی ہے۔ شاید نشے میں اسے لوگوں کے قد کاٹھ صحیح نظر نہ آرہے ہوں۔ اپنے سامنے سب اسے بونے لگ رہے ہوں۔" ستارہ نے خیال ظاہر کیا۔

ارشد موتی اب بھی مڑ مڑ کر خونخوار نظروں سے میری طرف

دیکھ رہا تھا۔ اس کی ساتھی لڑکی نے رقص کے دوران تمام سر تیز میوزک کے باوجود دو تین مرتبہ اس کے کندھے پر سر ٹکانے کی کوشش کی تھی لیکن یہ کوشش بے سود بلکہ کچھ احمقانہ سی تھی کیونکہ ارشد موتی کا کندھا' لڑکی کے سر سے بھی ذرا بلندی پر ہی واقع تھا۔ دوسرے ارشد موتی کی توجہ بھی صحیح طور پر اس کی طرف نہیں تھی۔

میں نے ستارہ سے کہا "ارشد موتی کی ساتھی لڑکی بڑی صابر و شاکر ہے۔ زیادہ تر آنکھیں بند کیے ہی رقص کئے جارہی ہے اس سے شکوہ بھی نہیں کررہی کہ آخر وہ اس کی طرف توجہ کیوں نہیں دے رہا۔"

"اس بے چارے کو بھی صحیح طور پر پتا نہیں ہے کہ اس کے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔" ستارہ ہولے سے ہنس کر بولی وہ لڑکی ایرانی ہے۔ نہ جانے کون کون سے ملک گھومتی ہوئی کافی دنوں سے یہاں آئی ہوئی ہے۔ کسی فلم کی شوٹنگ کے دوران فلمی لوگوں سے آ ٹکرائی تھی اور کافی دوستیاں وغیرہ ہوگئی تھیں۔ حتی کہ جنگل گرل میں سائن بھی ہوچکی ہے لیکن چونکہ اس کا یہاں قیام مزید طویل نہیں ہوسکتا اس لئے اس کا کام مختصر رکھا گیا ہے ... کہانی کے ابتدائی حصے میں ہی اسے شیر کھا جاتا ہے۔"

"واہ!" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "وہ کیسا باذوق اور قدرشناس شیر ہوگا جو اس حسینہ کو کھائے گا۔ بالکل انسانوں کی طرح۔"

"کھائے گا نہیں بلکہ کھا چکا ہے' فلم کا وہ حصہ شوٹ ہوچکا ہے۔ شیر چڑیا گھر کا تھا۔ بے چارے کی پسلیاں نکلی ہوئی تھیں اس کی پسلیاں کیمرے سے چھپانا ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ آخر کا ایک صاحب نے تسلی دی کہ کوئی بات نہیں' جنگل کے شیر کی صحت بھی کمزور ہوسکتی ہے۔ تماشائی سوچ لیں گے کہ بے چارہ بیمار شیمار رہا ہوگا۔" ستارہ نے کہا۔

میں ہنس دیا پھر میں نے سادگی سے کہا۔ "اگر اس حسینہ کو کھانے کے بعد بھی شیر کو کمزور دکھایا گیا تو یہ بڑی زیادتی کی بات ہوگی۔"

"اس بے چارے کو تو اس لڑکی پر منہ مارنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ سدھا ہوا شیر تھا۔ ٹرینر اس کے ہمراہ تھے۔ بس لڑکی پر چھلانگ لگاتے ہوئے دکھایا گیا۔ پھر کچھ کیمرہ ٹرکس ڈالی گئیں۔ آخر میں میک اپ کے کمالات کے ذریعے لڑکی کی ادھڑی ہوئی لاش دکھا کر شیر کو قریب ہی خون آلود پنجے چاٹتے ہوئے دکھا دیا گیا۔ پھر شیر کے دو چار کلوز اپ ڈال دیئے گئے۔ زوردار دہاڑوں کی ریکارڈنگ کے ساتھ۔"

"چلو اتنا ہی کافی ہے۔ تھوڑا بہت تردد تو کرنے لگے ہیں ہماری فلموں والے۔" میں نے کہا۔

"تردد تو خیر وہ بہت کرتے ہیں۔" ستارہ نے معترفانہ لہجے میں

کہا۔ "جتنے وسائل اور جیسا ماحول یا حالات انہیں میسر ہیں' ان میں وہ غیر معمولی محنت کرتے ہیں۔ کوئی اکیڈمی' کوئی ٹریننگ کا ادارہ نہیں۔ جو کچھ سیکھتے ہیں' خود ہی سیکھتے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر یا ایک دوسرے سے سیکھتے ہیں۔ زنگ آلود ساز و سامان کے ساتھ کام کرتے ہیں۔ سرکاری اداروں کو بس ٹیکس کھسوٹنے اور تیار شدہ فلم کی جائز یا ناجائز کٹریبوشن کرنے کے سوا اس انڈسٹری سے کوئی واسطہ نہیں جو خود رو پودے کی طرح پھلتی پھولتی یا سکڑتی سمٹتی رہتی ہے۔ لیکن بس اسے براکمنافیشن سا ہو گیا ہے۔"

"اوہ! تم نے تو تقریر کر ڈالی۔ میں تو پہلے ہی ان باتوں کا قائل ہوں۔ مجھے کیا بتا رہی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا

"بس۔ ایسے ہی کبھی کبھی خیال آجاتا ہے ان باتوں کا۔ دراصل انسان جب کسی کام میں عملی طور پر ہاتھ ڈالتا ہے تب اس کے نشیب و فراز کا پتا چلتا ہے۔ دور بیٹھ کر تنقید کرنا بہت آسان کام ہے۔" ستارہ گہری سانس لے کر بولی۔

"میں تمہارے اس خیال سے بھی متفق ہوں۔" میں نے کہا۔

رقص کی تیسری دُھن بج رہی تھی۔ تیسرا دور چل رہا تھا۔ ارشد موتی کی ہم رقص بدل چکی تھی لیکن وہ اب بھی مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک مشہور ہیروئن اس کی ہم رقص تھی۔ میں نے ستارہ کو چھیڑنے کے لئے کہا۔ "اتنی مشہور ہیروئن کے ساتھ رقص کر رہا ہے لیکن اب بھی مڑ مڑ کر تمہاری طرف دیکھ رہا ہے۔"

وہ بڑی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "اس سے تم ہماری قدر و منزلت کا اندازہ کر سکتے ہو۔"

"ویسے مجھے اب اس کی نظریں ناگوار گزرنے لگی ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ایک جھٹکا دے کر اس کی گردن مستقل طور پر دوسری طرف موڑ دوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"اس کی گردن موڑنا اور کسی سانڈ کی گردن موڑنا تقریباً ایک برابر ہو گا۔" ستارہ ہنس کر بولی۔

"تم اسے سانڈ سے تشبیہ نہ دو۔ کسی سانڈ نے سن لیا تو برا منا جائے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اس بار ستارہ کھل کر ہنسی۔ گردن پیچھے کو جھکا کر نہایت بے ساختگی کے ساتھ میں نے جان بوجھ کر ایک بار پھر ارشد موتی کو دیکھا لیکن اگر میں اس کی طرف نہ بھی دیکھتا تب بھی اسے اندازہ تھا کہ ہم اس کے بارے میں ہی باتیں کر کے ہنس رہے ہیں۔

دفعتاً ستارہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "بھئی تم اسے احساس مت دلاؤ کہ ہم اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔ مجھے تو اس سے خوف آنے لگا ہے۔"

"میرے ہوتے ہوئے بھی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم کونسا چوبیس گھنٹے میرے پاس ہوتے ہو۔" موقع پاتے ہی اس نے اپنا شکوۂ محرومی یا شاید لاشعوری خواہش بیان کر دی۔

"تم میرا تصور ذہن میں رکھا کرو۔ اس قسم کے اُچکوں سے نمٹنے کے لئے تو میرا تصور ہی کافی ہو گا۔" میں نے مشورہ دیا۔

"گمبھیر مسئلوں سے جان چھڑانی تو تمہیں خوب آتی ہے۔" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"اور تمہیں مسئلوں کو گمبھیر بنانا خوب آتا ہے۔" میں نے اسے چھیڑا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی' ایک چھناکے کے ساتھ موسیقی نے دم توڑ دیا اور لوگوں کے رگ و پے میں دوڑتی ہوئی برقی رو جیسے یکدم منقطع ہو گئی۔ سب ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں کھڑے رہ گئے۔ فربہ اندام لوگ تو باقاعدہ ہانپ رہے تھے۔ تاہم خواتین کے چہروں پر تازگی تھی۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ عورتیں اس محفل اور یہاں کے ہلے گلے سے زیادہ لطف اندوز ہو رہی تھیں۔ ان کے چہرے ہیجان آمیز مسرت سے تمتما رہے تھے یا شاید اس میں میک اپ کی بھی کچھ رنگ آمیزی شامل تھی۔

اچانک سعید صاحب کی آواز ابھری۔ "خواتین و حضرات! میرے خیال میں آج کے لئے اتنی ہی ورزش کافی ہے۔ کھانا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ آئیے کھانے کا حق ادا کریں اور بہادروں کی طرح اس پر ٹوٹ پڑیں۔"

سب نے ہم آہنگ ہو کر نعرہ لگایا اور باہر کو لپکے۔ میں اور ستارہ دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ بیشتر لوگ نکل چکے تب ہم پُرسکون انداز میں دروازے کی طرف بڑھے۔ دروازے کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا' ارشد موتی ہماری طرف پشت کئے ستون کی طرح راستے میں تنا کھڑا تھا۔ دوسرے لوگ ایک ایک کر کے اس سے کتراتے ہوئے قدرے دقت کے ساتھ دروازے سے گزر رہے تھے۔ مجھے اپنے قد کاٹھ کی وجہ سے شاید اس طرح گزرنے میں تھوڑی سی زیادہ دقت پیش آتی۔

میں نے اس کے کندھے پر انگلی مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ اسے یقیناً معلوم تھا کہ اس کی پشت پر کون ہے۔ اس نے گھوم کر دیکھنے کے بجائے بڑی بے نیازی سے گردن معمولی سے ترچھی کی اور ٹیڑھی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"تم راستے سے ہٹ کیوں نہیں جاتے؟" میں نے ملائمت سے کہا۔ اس کی ہم رقص ہیروئن اسے چھوڑ کر جا چکی تھی۔

"میرا خیال ہے یہ دروازہ میرے گزرنے کے لئے چھوٹا ہے" وہ خالصتاً فلمی ولن والی نخوت کے ساتھ بولا۔

"تم آئے بھی تو اسی دروازے سے تھے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"اس وقت شاید میں نے دروازے سے سمجھوتہ کر لیا تھا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"ادھر دیکھو' میری طرف۔" میں نے اس کے کندھے پر

ہاتھ رکھ کر غیر محسوس طور پر دباؤ ڈالا۔ وہ بڑے اسٹائل سے ایڑیوں کے بل میری طرف گھوم گیا اور ناک سیکڑ کر بولا۔ "تم بھی تھوڑا سا ادھر اُدھر ہو کر گزر کیوں نہیں جاتے؟ دوسرے لوگ بھی تو گزر رہے ہیں۔"

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور پلک جھپکائے بغیر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سرسراتی سی آواز میں پوچھا۔ "تو دروازہ تمہارے لئے چھوٹا ہے؟"

اس لمحے ستارہ کی گرفت میرے بازو پر سخت ہو گئی۔

"میں بات کو دُہرایا نہیں کرتا۔" وہ مجھ سے نظر چراتے ہوئے بدستور بے پروائی سے بولا۔

میں نے خاصی قوت مجتمع کر کے بجلی کی سی تیزی سے اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا۔ اتنی تیزی کی اسے یقیناً توقع نہیں رہی تھی۔ وہ اپنے دفاع میں کچھ بھی نہ کر سکا اور اچھل کر اسی دروازے سے ہوتا ہوا باہر برآمدے میں جا گرا جسے اس نے اپنے لئے چھوٹا قرار دیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے تو شاید اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا اس لئے وہ وہیں ساکت پڑا رہ گیا۔ میں ستارہ کے بازو میں بازو ڈالے یوں بے پروائی سے آگے بڑھا جیسے میں نے اپنے راستے میں پڑا ہوا کیلے کا چھلکا جوتے کی نوک سے ایک طرف ہٹایا ہو۔

دوسرے ہی لمحے ارشد موتی کے حواس بحال ہوئے تو وہ چیتے کی سی پھرتی سے اچھل کر کھڑا ہوا لیکن اس وقت تک دوسرے بہت سے مہمان لپک کر بیچ میں آچکے تھے بلکہ ان میں میزبان سعید صاحب بھی شامل تھے۔ کئی آدمیوں نے ارشد موتی کو گھیر لیا بلکہ یوں کہئے کہ قابو میں کر لیا اور ڈانٹنے کے سے انداز میں سمجھانے لگے "موتی! یہ کیا جاہلوں والی حرکت ہے۔ تم کیوں چوہدری صاحب سے پنگا لینے کی کوشش کر رہے ہو؟ تمہیں تو ایسے لوگوں سے سلام دعا رکھنی چاہئے۔ اور کم سے کم موقع محل تو دیکھا کرو۔ یہاں نہ تو کسی فلم کا سیٹ لگا ہوا ہے اور نہ یہ کوئی ایسی جگہ ہے جہاں تم جگا ٹیکس وصول کرنے کے لئے آئے ہو۔"

کوئی کہہ رہا تھا "یار! ہم یہاں زندگی کو انجوائے کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں۔ لڑائی جھگڑے ویسے بھی کیا زندگی میں کم ہیں؟ کیوں مزہ غارت کر رہے ہو۔"

اسی دوران سعید صاحب لپک کر میرے قریب آئے۔ میں برآمدے میں پہنچ چکا تھا۔ وہ میرا بازو تھامتے ہوئے بولے "آپ اس کے منہ نہ لگیں چوہدری صاحب! میں اس بدمزگی کے لئے معذرت خواہ ہوں۔" پھر ان کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ "ایسے نچلے درجے کے آدمیوں کو دعوت دے کر دراصل انسان بدمزگی کو ہی دعوت دیتا ہے۔ پتا نہیں کس کی سفارش پر میں نے اسے بلا لیا تھا۔ بہرحال آپ اب زحمت نہ کریں۔ میں اسے سمجھا دوں گا۔ دراصل وہ اتنی حماقت اس لئے کر بیٹھا کہ وہ [cut off] نی کو جانتا نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں سعید صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے ملائمت سے کہا "آپ نہ بھی زحمت کریں تب بھی میں خود ہی اسے سمجھا دوں گا۔ مجھے معلوم ہے اس قسم کے لوگ کون سی زبان سمجھتے ہیں۔"

"اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی ہے کہ آپ کو وہ زبان بھی آتی ہے۔" سعید صاحب آہستگی سے بولے۔

"دنیا میں سر اٹھا کر زندہ رہنے کے لئے بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے ورنہ ہرا ایرا غیرا آپ کو پاؤں تلے کچل کر آگے بڑھ جائے۔"

ہم بظاہر یوں باتیں کرتے ہوئے لان کی طرف بڑھ رہے تھے جیسے موسم پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے ٹہل رہے ہوں۔ ستارہ کے ہاتھ کی گرفت میرے بازو پر اب بھی سخت تھی لیکن وہ دیکھ اس سمت میں رہی تھی جدھر لوگ ارشد موتی کو کھینچ کھانچ کر لے گئے تھے۔

"خیر چوہدری صاحب! آپ اسے معاف کر دیجئے گا۔" سعید صاحب نے نہ جانے اپنی نرم دلی کے تحت یا کسی اور وجہ سے ارشد موتی کی سفارش کی۔ شاید ان کی اپنی بھی کوئی مصلحت ارشد موتی سے وابستہ رہی ہو لیکن بہرحال وہ مردم شناس آدمی تھے۔ مجھے زیادہ جانے بغیر بھی انہیں اندازہ تھا کہ ارشد موتی جیسے لوگ میرے لئے کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

"اس کا دارومدار اس کے اپنے طرزِ عمل پر ہے سعید صاحب" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "یہاں کا حساب کتاب [cut off] یہیں ختم ہے۔ آئندہ اس نے اپنے آپ کو پھنے خان سمجھتے ہوئے کچھ کرنے کی کوشش کی تو میں نہیں کہہ سکتا کہ میرا ردِعمل کیا ہو [cut off]"

سعید صاحب مزید کچھ نہیں بولے۔ وہ پُرخیال سے انداز میں مسکراتے رہے۔ خوش مزاج آدمی تھے۔ کسی فکر میں بھی غلطاں ہوتے تھے تب بھی مسکراتے رہتے تھے۔ پھر وہ ہمیں کھانے کی ایک میز تک پہنچا کر خود معذرت کر کے ایک طرف چلے گئے۔ میں اور ستارہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

اب ستارہ نے بھی گویا اس واقعے کو ذہن سے جھٹک دیا [cut off]

...کھانا بہت اچھا تھا۔ بہت زبردست اہتمام کیا تھا سعید صاحب نے۔ میں اور ستارہ اپنی پلیٹیں لے کر ایک طرف کو ہو گئے اور کھانے سے لطف اندوز ہونے لگے۔

اسی دوران ہدایت کار راحیل اور اس کی بیوی ٹہلتے ہوئے اپنی پلیٹیں سنبھالے ہمارے قریب آگئے۔ وہ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے بالکل اُلٹ معلوم ہوتے تھے۔ راحیل پستہ قد اور سانولا تھا۔ اس کی بیوی دراز قد اور بے حد گوری۔ راحیل ایک بے پناہ متحرک آدمی تھا۔ اس کی رگ و پے میں گویا بجلیاں بھری ہوئی تھیں لیکن اس کی بیوی اتنی ہی سکوت پسند معلوم ہوتی تھی۔ اسے اپنی جگہ سے جنبش بھی کرنا ہوتی تھی تو گویا خوب سو [cut off]

سمجھ کر کرتی تھی۔ جدھر بھی دیکھتی تھی ادھر اس کی نظر دیر تک ٹکی رہتی تھی۔ غرضیکہ اس کی حرکات و سکنات اور شخصیت میں بڑا ٹھہراؤ تھا۔

قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ وہ میاں بیوی ایک دوسرے سے خواہ کتنے ہی مختلف نظر آتے تھے لیکن انہیں دیکھ کر پھر بھی جانے کیوں فوری طور پر احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک خوش و خرم جوڑا ہے۔ ایک دوسرے کے ساتھ ان کی زندگی خوب گزر رہی ہے۔

اپنی بیوی سے ہمارا تعارف کرانے کے بعد وہ کھانے اور گفتگو کا عمل بیک وقت جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "کام تو آپ نے بہت اچھا کیا۔ یہ وہ گھونسا تھا جو میں بہت دنوں سے ارشد موتی کے منہ پر رسید کرنا چاہتا تھا لیکن نہیں کر سکتا تھا کیونکہ مجھے اپنا یہ مختصر سا وجود خاصا عزیز ہے۔ آپ کے اس اقدام پر میں کچھ خوش بھی ہوں اور کچھ متفکر بھی۔ مجھے کچھ نقصان کا اندیشہ محسوس ہونے لگا ہے۔ کہیں ارشد موتی' ستارہ کے ساتھ کام کرنے سے انکار نہ کردے۔ بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ فلم کی تین ریلیں شوٹ ہو چکی ہیں۔"

"اس کو ایسی ناشکری کرنی تو نہیں چاہئے" میں نے ہموار لہجے میں کہا "ستارہ کے مقابلے میں وہ بہرحال ایک ٹٹ پونجیا ایکٹر ہے۔ کسی بھی وجہ سے اگر وہ ستارہ کے ساتھ کام کرنے سے انکار کرتا ہے تو اس میں توہین ستارہ کی ہے اور میں اسے اس کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

"لیکن ..... بالفرض اگر ایسا ہو گیا تو میں کیا کروں گا؟" راحیل گویا اپنی تشویش کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"کرنا کیا ہے" میں نے بے پروائی سے کہا "فوری طور پر اسے کٹ کر کے دوسرا ہیرو تلاش کر کے وہ تین ریلیں ری شوٹ کر لیجئے گا۔ تین ریلیں ری شوٹ کرنے کا تمام خرچ میں دے دوں گا۔ اس کے علاوہ نئے ہیرو کی تلاش پر جو خرچ آئے گا وہ بھی میرے ذمے ہو گا۔ اس سلسلے میں اگر بھرپور قسم کی پبلسٹی کی جائے کہ آپ کو کس قسم کے ہیرو کی ضرورت ہے' اور بھاگ دوڑ پر بھی خرچ کیا جائے تو ضرور اس سے بھی اچھا ہیرو میسر آ سکتا ہے۔ .. اتنا بڑا ملک ہے ہمارا۔ ایک سے ایک بڑھ کر ہیرو پڑا ہے ہمارے ہاں۔ مسئلہ صرف اس تک پہنچنے کا ہے۔ اکثر اوقات وہ بے چارہ خود ہم تک نہیں پہنچ سکتا۔ تلاش آپ نے یقیناً پہلے بھی کی ہو گی مگر بھرپور وسائل کے ساتھ نہیں کی ہو گی۔"

"جی ہاں۔ یہ تو درست۔" راحیل نے تسلیم کیا "اشتہار تو ہم نے کوئی دیا ہی نہیں تھا۔ یونہی زبانی ایک دوسرے سے کہا تھا۔ .. چند ہیلتھ کلبوں' کسرت گاہوں' اور اکھاڑوں وغیرہ سے رابطہ قائم کیا تھا۔ ہمارا فنانسر زیادہ رقم بھی خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا' دوسرے اسے یہ اعتراض بھی تھا کہ اگر ہم نے پبلسٹی کی تو امیدواروں کی لائن لگ جائے گی اور انتخاب وغیرہ کے مرحلوں میں ہمارا بہت وقت ضائع ہو گا۔ فلم ابتدا ہی سے اوور بجٹ ہونی شروع ہو جائے گی۔"

"چلئے میں کسی غرض اور دلچسپی کے بغیر اس ضمن میں ہونے والا تمام خرچ اور تین ریلوں کی ری شوٹنگ کے اخراجات تو اٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ اس صورت میں میرا خیال ہے کہ آپ کے فنانسر کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا کیونکہ اس کی حیثیت تو متاثر نہیں ہو گی۔" میں نے کہا

"بہت بہت شکریہ۔ آپ کی اس پیشکش نے مجھے حیران بھی کر دیا ہے اور میرا حوصلہ بھی بڑھا دیا ہے۔" راحیل قدرے مضطربانہ سے لہجے میں بولا۔ "میں نے دولت والوں کو کبھی بغیر کسی خاص وجہ کے ایسی فراخدلانہ پیشکش کرتے نہیں دیکھا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ خواہش کے باوجود شاید میں اس پیشکش سے استفادہ نہ کر سکوں۔ کیونکہ اس فلم کے سلسلے میں وقت کی کچھ زیادہ ہی اہمیت ہے۔ آپ نے سنا ہی ہو گا کہ میں نے اسے تین ماہ میں مکمل کرنے کا اعلان کر رکھا ہے۔ اگر میں اپنے دعوے پر عمل درآمد میں کامیاب ہو گیا تو یہ پاکستان کی پہلی فلم ہو گی جو تین ماہ میں مکمل ہو گی اور وہ بھی پچاس فیصد سے زیادہ آؤٹ ڈور شوٹنگ کے ساتھ۔"

"ہاں۔ یہ تو ستارہ نے مجھے بتایا تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ دعویٰ کرنے میں گو کہ میرا ایک ریکارڈ قائم کرنے کا شوق بھی شامل ہے لیکن اس سے زیادہ درحقیقت ایک مجبوری کا دخل ہے جس کا پس منظر میں پھر کبھی آپ کو بتاؤں گا۔" اس کے لہجے میں اضطراب برقرار تھا اور وہ کھانے میں شاید ذرا بھی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ یونہی پلیٹ اور چمچے سے کھیل رہا تھا۔

"کوئی بہت بڑی مجبوری ہے کیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی بے چین آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں۔ مجھ جیسے ایک ہدایت کار کے لئے تو بہت بڑی مجبوری ہے۔" وہ طویل سانس لے کر بولا "آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ اچھے بھلے کامیاب ہدایت کار' جنہوں نے کبھی ذاتی فلم نہ بنائی ہو' خوشحال تو ضرور ہو سکتے ہیں لیکن بہت زیادہ دولتمند لوگ نہیں ہوتے۔ ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہمارا نام ہی ہوتا ہے۔ ہم کسی زیادہ بڑے مالی نقصان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

"ہاں' مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا

"بس میں ایسی ہی ایک مجبوری میں پھنسا ہوا ہوں۔ میرے لئے وقت بہت قیمتی ہے۔ میں اس فلم کا ایک فٹ بھی ری شوٹ کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آپ ستارہ سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس کی شوٹنگ کس طرح ہو رہی ہے۔" اس نے تائید طلب انداز میں ستارہ کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" ستارہ نظر اٹھاتے ہوئے مسکرائی۔ "میں اتوار کی چھٹی کرتی تھی لیکن بٹ صاحب نے کچھ اس طرح مجھے رام کیا

کہ میں اپنی اتوار کی چھٹی بھی ان کی نذر کررہی ہوں حالانکہ فلم مجھے اتنی بیوقوفانہ لگ رہی ہے کہ شوٹنگ کے دوران اکثر مجھے ہنسی آتی رہتی ہے۔"

"بیوقوفانہ چیزوں کو پبلک آج کل زیادہ پسند کرتی ہے۔" راحیل بٹ نے سنجیدگی سے کہا' پھر میری طرف دیکھ کر گویا اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ "تو اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وقت کی میرے لئے کیا اہمیت ہے۔"

"خیر میری دعا تو یہی ہے کہ آپ کے لئے کوئی مسئلہ سر ہی نہ اٹھائے۔" میں نے خلوص سے کہا۔ "بہرحال اگر کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس میں روپیہ کچھ کام آسکتا ہو تو میں حاضر ہوں۔ اور اگر ارشد موتی کچھ زیادہ ہی پھیلے' آپ کو مسئلے کا کوئی حل نظر نہ آئے تب بھی مجھے مطلع کر دیجئے گا۔ میرا خیال ہے' میں اس کے انکار کو اقرار میں تبدیل کرانے کے سلسلے میں بھی کچھ نہ کچھ ضرور کرسکوں گا۔"

راحیل بٹ پہلی مرتبہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ "ہاں۔ مجھے اس کا بھی یقین ہے' مجھے بہت خوشی ہے کہ آپ سے میری شناسائی ہوگئی۔"

اس کی بیوی بھی ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ راحیل اس کا بازو تھامتے ہوئے بولا۔ "آؤ بیگم! ادھر میزوں پر بڑی عمدہ قسم کی چیزیں ہمارا انتظار کررہی ہیں۔ ذرا انہیں بھی ٹٹولیں۔ چوہدری صاحب سے گفتگو کے بعد میری بھوک کچھ کھل گئی ہے۔ ورنہ میں تو بس یونہی کھانے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ہی کررہا تھا۔"

اس کی بیوی رخصت ہوتے وقت میری اور ستارہ کی طرف ایک نظر دیکھ کر بہت ہی دھیمے انداز میں مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ کچھ ایسی ہی تھی جیسے برف پوش چوٹیوں کے عقب سے سورج کی پہلی کرن نمودار ہوئی ہو مگر جلد ہی معدوم ہوگئی ہو۔

وہ میاں بیوی جاچکے تو ستارہ گہری سانس لے کر بولی "فلم کا بزنس انسان کو بڑے اعصابی تناؤ میں مبتلا رکھتا ہے۔ اس کی الجھنیں کہیں بھی متعلقہ لوگوں کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔"

"اعصابی تناؤ ہر بزنس میں ہے۔" میں نے کہا "لیکن یہ آپ کے اعصاب پر منحصر ہے کہ آپ کتنا تناؤ برداشت کرسکتے ہیں اور یہ آپ کے حوصلے کی بات ہے کہ آپ کتنے مطمئن نظر آسکتے ہیں"

"ہاں یہ تو ہے۔" ستارہ نے تسلیم کیا "دراصل سب تمہاری طرح فولادی اعصاب کے مالک تو نہیں ہوسکتے۔"

"ہاں۔ اس قسم کی خصوصیات بعض مخصوص حالات میں جِلا ضرور پاتی ہیں لیکن بنیادی طور پر یہ عطیۂ خداوندی ہی ہوتی ہیں اور مجھ پر اللہ ہر معاملے میں بہت ہی مہربان ہے' بہت زیادہ میں الفاظ میں اس کی مہربانیوں کا احاطہ نہیں کرسکتا۔"

ستارہ ایک لمحے کے لئے گہری نظر سے میری طرف دیکھتی رہی پھر پلیٹ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

کچھ دیر بعد آخر کار سبھی کھانے سے فارغ ہوگئے۔ ایک بار پھر سعید صاحب کی آواز ابھری۔ "خواتین و حضرات! توجہ فرمایئے۔ جن صاحبان نے تیراکی کے مقابلوں میں حصہ لینے اور پانی میں کرتب دکھانے کا وعدہ کیا تھا وہ لباس تبدیل کرکے' سوئمنگ کاسٹیوم میں سوئمنگ پول پر پہنچ جائیں۔ اور جن لوگوں نے پہلے سے اپنے نام نہیں دیئے' اگر مقابلے دیکھنے کے دوران انہیں جوش چڑھ جائے اور وہ سوچیں کہ اس سے بہتر کرتب تو ہم دکھا سکتے ہیں' وہ بھی ان مقابلوں میں حصہ لے سکتے ہیں۔ بشرطیکہ ان کے پاس سوئمنگ کاسٹیوم موجود ہو۔ یا پھر وہ کسی اور شریفانہ لباس کے ساتھ سوئمنگ پول میں اترنا چاہتے ہوں۔ مقابلے میں حصہ لینے والوں کو دس منٹ دیئے جاتے ہیں۔"

مہمانوں نے تالیاں بجائیں۔ تالیوں کا شور مدھم پڑا تو سعید صاحب ایک بار پھر بہ آوازِ بلند بولے "ایک ضروری بات اور بتاتا چلوں۔ جن صاحبان نے ڈٹ کر کھایا ہو ان سے میں گزارش کروں گا کہ وہ مقابلوں میں حصہ نہ ہی لیں تو بہتر ہے۔ ہم نہیں چاہتے کہ وہ سوئمنگ پول کی تہ میں پہنچ کر لیٹ جائیں اور واپس سطحِ آب پر آنا بھول جائیں۔"

مہمانوں نے قہقہے لگائے اور ایک بار پھر تالیاں بجائیں۔ پھر کچھ لوگوں کو میں نے مہمانوں کی ٹولیوں سے نکل کر بغلی راستے کی طرف جاتے دیکھا' شاید وہ اپنی گاڑیوں سے اپنے سوئمنگ سوٹ لینے جارہے تھے۔

سعید صاحب ایک بار پھر اعلان کرنے کے سے انداز میں بولے "اب تک آپ لوگوں کو کھڑے رکھ کر آپ کی ٹانگوں کی مضبوطی کا امتحان لیا جاچکا ہے اور آپ اس میں کامیاب ہوچکے ہیں۔ جب تک ہمارے تیراک لباس تبدیل کرکے آتے ہیں تب تک آپ کرسیوں پر تشریف رکھ کر ذرا سستا سکتے ہیں۔ اپنی مظلوم ٹانگوں کو تھوڑا سا سکھ دے سکتے ہیں۔ اس دوران خوبصورت آڈیو اور خوبصورت وڈیو والی ایک گلوکارہ یعنی جس کی آواز بھی حسین ہے اور چہرہ بھی' آپ کو ایک پیارا سا نغمہ سنائے گی تاکہ آپ لوگ ایک بار پھر سوئمنگ پول کے کنارے کھڑے ہونے کے لئے تازہ دم ہوسکیں۔ صرف ایک نغمہ' اصل ورائٹی پروگرام آخر میں ہوگا۔"

سب لوگ لان کے اس حصے پر آگئے جہاں کرسیاں لگی ہوئی تھیں اور سامنے اسٹیج بنا ہوا تھا۔ میں اور ستارہ سب سے پیچھے بیٹھے' ستارہ نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ایک طویل اور آسودہ سی سانس لی' وہ یقیناً تھک سی گئی تھی۔

آرکسٹرا نے دھیمی دھیمی موسیقی بکھیرنا شروع کردی تھی۔ پھر میں نے گلوکارہ کو ایک تاریک گوشے سے نکل کر اسٹیج کی

سیڑھیوں کی طرف بڑھتے دیکھا۔ وہ سر سے پاؤں تک جھلملا رہی تھی۔ وہ اس طرح کہ اس کے بال سنہری ڈائی کیئے ہوئے تھے اور اسٹیج کی رنگ برنگی روشنیوں میں چمک رہے تھے۔ اس کا ڈھیلا ڈھالا اور کندھوں پر جھولتا ہوا لبادہ گویا ستاروں سے بنا ہوا تھا۔ وہ بھی جھلمل جھلمل کررہا تھا۔ پیروں میں سنہرے سینڈل تھے۔ اس کے رخساروں پر بھی افشاں چمک رہی تھی۔ اس کی چال میں بڑی مستعدی تھی۔ گردن ایک نامعلوم احساسِ تفاخر سے ذرا اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔

اس کی عمر زیادہ نہیں تھی۔ انداز مغرب کی اوپیرا سنگرز کا سا تھا۔ خاصی ماڈرن لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ صورت بھی اچھی خاصی دلکش تھی' کم از کم اتنے فاصلے سے' رنگ برنگی روشنیوں میں اور بڑی محنت سے کیئے گئے میک اپ کے باعث تو دلکش ہی لگ رہی تھی۔ ویسے مجھے امید تھی کہ قریب سے دیکھنے پر بھی میری رائے زیادہ تبدیل نہیں ہوگی۔

اس کے اسٹیج پر پہنچتے ہی موسیقی تیز ہوگئی۔ جس انداز سے اس نے جھک کر مائیک اسٹیج سے اٹھایا اس سے یقیناً بہت سے دلوں کی دھڑکن بھی تیز ہوگئی ہوگی۔ پھر ایک لہرا سا لے کر' بالوں کو جھٹکا دے کر' ایک ہاتھ ہوا میں بلند کرکے اس نے جس طرح تان لگائی اس سے مہمانوں کی سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ بھی ختم ہوگئی۔ سب ہمہ تن گوش اور ہمہ تن چشم ہوگئے' لڑکی کا گانے کا انداز بھی مغربی تھا۔ اردو شاعری کو پاپ دُھن پر گارہی تھی لیکن سُر وغیرہ سے اتنی بے خبر بھی نہیں تھی جتنا کہ عام طور پر اس قسم کے سنگر ہوا کرتے ہیں۔

بلاشبہ اس نے سماں باندھ دیا۔ جب اسٹیج کی بتیاں گل ہوئیں اور وہ نظروں سے اوجھل ہوئی تو میں نے دوسرے مہمانوں کے ساتھ چند لمحوں کے لئے تالیاں بجاتے ہوئے ستارہ سے کہا "اچھا خاصا گارہی تھی۔ بے چاری کے نام تک کا اعلان نہیں کیا گیا۔ کون تھی یہ؟"

"فرحین اس کا نام ہے اور اسے اپنا نام مشہور کرانے کا زیادہ شوق نہیں ہے ورنہ اب تک ملک میں تہلکہ مچا چکی ہوتی" ستارہ نے بتایا۔

"اگر مشہور ہونے کا شوق نہیں ہے تو گاتی کیوں ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کا شوق بس یہیں تک محدود ہے کہ چیدہ چیدہ لوگوں کی محفل میں گا کر انہیں دم بخود کردیا جائے۔ وہ اپنے جلوے' اپنا فن ہرایرے غیرے تک پہنچانا نہیں چاہتی۔ یہ اس کے اپنے الفاظ اور اپنے نظریات ہیں۔ ویسے بھی اب وہ پاکستان میں رہتی نہیں ہے اس لئے سوچتی ہوگی کہ یہاں شہرت حاصل کرنے کا کیا فائدہ۔ امریکا میں سیٹل ہے۔ کبھی کبھار تھوڑے دنوں کے لئے یہاں آتی ہے۔ کافی عرصے پہلے یہاں رہتی تھی اور اس وقت اس نے ٹی وی پر دو چار مرتبہ گایا تھا لیکن ٹی وی والوں کے لئے وہ نیم کلاسیکل گایا کرتی تھی اور وہ بھی دو زانو بیٹھ کر' ساری کا پلو سر پر رکھ کر۔ اچھے کھاتے پیتے گھر کی ہے۔ اس کی والدہ بھی شاید آج کی تقریب میں آئی ہوئی ہوں گی۔"

ستارہ نے یہ سب کچھ بتا کر ایک لمحے توقف کیا پھر شریر سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "اب میں تمہیں اس کے بارے میں سب سے اہم بات بھی بتادوں؟"

"ضرور" میں نے خواہ مخواہ اشتیاق ظاہر کیا۔

"وہ شادی شدہ ہے۔ اس کا شوہر امریکا ہی میں رہتا ہے" ستارہ نے ڈرامائی لہجے میں کہا اور میرے چہرے پر گویا کوئی ردِ عمل تلاش کرنے لگی۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا "تم سمجھ رہی ہو کہ میں یکایک اس میں دلچسپی لینے لگا ہوں اور اس کے شادی شدہ ہونے کی اطلاع میرے لئے صدمے کا باعث ہوگی؟"

"ہاں۔ مجھے کچھ کچھ شبہ ہوا تھا" اس نے اعتراف کیا۔

"تمہیں اب تک اندازہ نہیں ہوا کہ میں یکایک دلچسپی لینے والوں میں سے نہیں ہوں۔ میرے ہاں لمحاتی اور وقتی دلچسپی کا تصور ہی نہیں ہے۔ میرے ہاں تو اچھا خاصا گہرا تعلقِ خاطر ہوتا ہے جس کا بیج دل کی زمین سے پھوٹتا ہے اور دھیرے دھیرے تناور درخت بنتا ہے۔ وہ بھی اگر موسم سازگار رہیں تب" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں... مجھے اندازہ ہے... لیکن مرد کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا نا..." وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی۔

"اگر تم کسی اور طرف میری نظر اٹھتے ہوئے دیکھتی ہو تو کیا واقعی حسد محسوس کرنے لگتی ہو؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"ہاں" ایک بار پھر اس نے گویا کسی جرم کا اقرار کیا "مجھے معلوم ہے کہ میرے اس اعتراف کے بعد تم میری طرف سے کھٹک جاؤ گے لیکن میں سچ بولنے پر مجبور ہوں۔ مجھے معلوم ہے تمہیں نہ تو ایسے دوستوں کی ضرورت ہے جو تمہارے پیروں کی زنجیر بننے کی کوشش کریں اور نہ ہی تم ایسے دوستوں کو پسند کرتے ہو۔ تم آزادی پسند انسان ہو۔ لحہ بہ لحہ اوپر کی طرف جانا چاہتے ہو۔ پیچھے مڑ کر یا نیچے جھک کر دیکھنا تمہیں پسند نہیں۔"

میں نے اس کے تجزیئے کی تردید یا تصدیق نہیں کی۔ اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے صرف اتنا کہا "تم میری دوست ہو اور دوست رہوگی۔"

اچانک سعید صاحب کی خوشگوار آواز ایک بار پھر ابھری۔ "لیجئے خواتین و حضرات! سوئمنگ پول میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کے خواہشمند تیار ہوکر آگئے ہیں۔ اب آپ لوگ بھی ذرا ادھر کو ہی کھسک آیئے۔"

سوئمنگ پول قریب ہی تھا۔ سب لوگ اس کے اردگرد جمع

ہو گئے۔ سعید صاحب کا مکان یقیناً کسی بہت ہی اچھے آرکیٹیکٹ نے ڈیزائن کیا تھا۔ ہر جگہ اس نے مشرقی اور مغربی طرزِ تعمیر کو یکجا کر کے ایک نئی راہ نکالی تھی' ایک نیا تاثر تخلیق کیا تھا۔ مثلاً سوئمنگ پول کے ڈائیونگ بورڈ' اس کے کنارے ماربل کے فرش پر پڑے ہوئے اٹریڈز یا رنگ برنگی چھتریوں کو دیکھ کر جہاں مغربیت' جدیدیت یا تصنع کا تاثر ملتا تھا' وہیں ایک طرف فطری حسن کا تاثر بھی موجود تھا' پول کے ایک طرف کچھ فاصلہ چھوڑ کر چھوٹے بڑے سرمئی اور نسواری' ناہموار پتھروں کو بظاہر بے ترتیب سے انداز میں رکھ کر کسی نیم شکستہ چٹان کا تاثر دیا گیا تھا۔ [illegible] کے عقب میں درختوں کے جھنڈ کو بھی قدرے بے ترتیب سے انداز میں پروان چڑھایا گیا تھا۔ پتھروں کے آس پاس رنگ برنگے پھولوں سے لدے، گنجان پودے تھے۔

ان پتھروں پر سے شفاف پانی یوں پھسلتا ہوا سوئمنگ پول میں آکر گرتا تھا جیسے کوئی چھوٹا سا آبشار گر رہا ہو۔ گویا سوئمنگ پول میں [illegible] ہوا [illegible] تھا' اسے حسبِ خواہش گردش میں لایا جا سکتا تھا۔ اس سمت نظر ڈالنے پر کسی خوبصورت پہاڑی مقام کے کسی گوشے کا گماں گزرتا تھا۔

میں نے دیکھا' کچھ لوگ سوئمنگ کاسٹیوم میں پول کے کنارے پر کھڑے تھے۔ ان میں کوئی سوکھا سڑا تھا اور کوئی تھل تھل کرتا۔ کوئی درمیانے جسم کا تھا مگر اس کی توند ابھری ہوئی تھی۔ ... صرف ایک آدھ ہی ایسے متناسب جسم کا مالک تھا جسے دیکھ کر یقین آسکتا تھا کہ تیراکی اس کا مشغلہ رہی ہوگی۔

پول پر زیادہ تیز روشنیوں کا انتظام نہیں تھا اور اس وقت تو شاید جان بوجھ کر روشنی اور بھی کم رکھی گئی تھی۔ اس کے اندر کا آسمانی پینٹ اس وقت گہرے رنگ کا دکھائی دے رہا تھا اور پول کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ خصوصاً اس کے زیادہ گہرے حصے کی طرف روشنی اور بھی کم پہنچ رہی تھی۔ تاہم چاندنی کا امتزاج موجود تھا اور ہلکی نقرئی روشنی میں اس طرف پانی پگھلی ہوئی چاندی کی طرف جھلملا رہا تھا۔

سوئمنگ پول کا جائزہ لیتے وقت جب میری نظر دوبارہ ڈائیونگ بورڈ پر پڑی تو میں نے سوئمنگ کاسٹیوم میں ارشد موتی کو اس کے قریب کھڑے دیکھا۔ مقابلوں میں حصہ لینے والوں میں وہ چونکہ اس وقت سب سے نمایاں تھا اس لئے احساسِ تفاخر سے کچھ اور اکڑا ہوا تھا۔ مدھم روشنی میں بھی اس کے کسرتی جسم کے نشیب و فراز نمایاں تھے۔

سعید صاحب اسٹاپ واچ لئے اس کے قریب کھڑے تھے۔ سعید صاحب ان مقابلوں کے اکلوتے جج تھے۔ ایک صاحب ان کی مدد کے لئے کاپی پنسل لئے قریب کھڑے تھے۔ ارشد موتی نے قدرے جھک کر سعید صاحب سے کچھ بات کی اور ڈائیونگ بورڈ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

سعید صاحب نے اعلان کیا "ارشد موتی سب سے پہلے پانی میں چت لیٹ کر جسم کو حرکت دیئے بغیر تیرنے کا مظاہرہ کرے گا۔ اس کے بعد وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک پانی کی تہ میں رہ کر دکھائے گا۔ اس کے بعد کوئی بھی صاحب اس کے قائم کئے ہوئے ریکارڈ کو توڑنے کے لئے آگے آسکتے ہیں۔ اگر کوئی بھی ان دو مظاہروں کے سلسلے میں آگے نہ آیا یا اس ریکارڈ کو نہ توڑ سکا تو ان دونوں کرتبوں کا انعام ارشد موتی کو دے دیا جائے گا جو ایک ڈبے میں بند ہے۔ مقابلوں کے اختتام پر سب انعام یافتگان اپنے اپنے ڈبے اسٹیج پر مہمانوں کے سامنے کھول کر دکھائیں گے۔ اس مقابلے کے بعد ایک ہاتھ سے' زیادہ سے زیادہ تیز رفتاری سے تیرنے کا مقابلہ ہوگا۔ ارشد موتی کا کہنا ہے کہ وہ تمام مقابلوں میں حصہ لے گا اور اگر اس نے تمام مقابلوں کے انعامات جیت لئے تو پھر چاندی کا ایک بڑا سا تاج بھی اس کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ جو آج کی تقریب کی خوبصورت ترین خاتون اسے اپنے ہاتھ سے پہنائیں گی... اور یہ فیصلہ بھی ارشد موتی خود ہی کرے گا کہ تقریب کی خوبصورت ترین خاتون کون ہیں۔ ٹھیک...؟"

سب مہمانوں نے تالیاں بجا کر سعید صاحب کی تائید کی۔

اس وقت تک ارشد موتی ڈائیونگ بورڈ تک پہنچ چکا تھا اور ایک مخصوص انداز میں ساکت کھڑا تھا۔ وہ باڈی بلڈر تھا اور لاشعوری طور پر باڈی بلڈروں والے انداز میں پوز دے رہا تھا۔ ڈائیونگ بورڈ پر وہ مکمل طور پر چاندنی کے حلقے میں تھا اور کسی یونانی دیوتا

کے مجسمے کی طرح خوبصورت نظر آرہا تھا لیکن اس کے جسم کی مچھلیاں یونانی دیوتاؤں سے کچھ زیادہ نمایاں انداز میں ابھری ہوئی تھیں۔ مگر ساتھ ہی ایک خفیف سی بدنمائی یہ تھی کہ اس کا پیٹ باڈی بلڈروں والے مخصوص انداز میں کھنچا ہوا نہیں رہ گیا تھا بلکہ کسی حد تک "توند" کہلانے کی طرف مائل نظر آرہا تھا حالانکہ اس وقت وہ یقیناً سانس کھینچ کر کھڑا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ اب کسرت کی طرف اس کا ویسا رجحان نہیں رہا ہوگا جیسا نوجوانی میں رہا ہوگا۔ بے احتیاطی سے کھانے اور پینے کے مشاغل بھی زندگی میں خاصے در آئے تھے اس لئے بے چارے پیٹ پر کچھ اثرات تو مرتب ہونے ہی تھے لیکن پھر بھی اس کا جسم قابلِ تعریف تھا کہ پرانی مشقوں کے نتیجے میں اب تک اپنی شکل برقرار رکھے ہوئے تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ کئی خواتین تو مبہوت سی ہو کر سر اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

جس قسم کے لوگ مقابلوں میں حصہ لینے کے لئے کھڑے ہوئے تھے' ان کے بارے میں یقین سے تو نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کس میں کیا ہنر پوشیدہ ہو' پھر بھی مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ ارشد موتی سارے مقابلوں میں جیت جائے گا۔ اس نے یقیناً ان مشغلوں کو بھی بڑا وقت دیا تھا۔ تمام مقابلے جیتنے کے بعد اسے اختیار ہوتا کہ وہ کسی بھی خاتون کو تقریب کی خوبصورت ترین خاتون قرار دے کر اس سے تاج پہنتا۔ اور میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ستارہ کو خوب صورت ترین خاتون قرار دے دے گا۔ میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیا ستارہ اسے تاج پہنانے سے انکار کردے گی؟ اور اگر اس نے اتنے مہمانوں کی موجودگی اور سعید صاحب کی مروّت میں' طے شدہ باتوں کا احترام کرتے ہوئے تاج پہنانے کا ارادہ کر بھی لیا تو کیا میں اسے منع کردوں؟ میرے اس اقدام کو تنگ نظری یا نچلے درجے کا احساسِ رقابت تو نہیں سمجھا جائے گا؟ ویسے اتنا مجھے یقین تھا کہ اگر میں نے ستارہ کو منع کردیا تو وہ ارشد کو تاج پہنانے نہیں جائے گی۔

میں ان سوچوں کے تانے بانے کو سلجھانے کی کوشش بھی کر رہا تھا اور بغور ارشد موتی کو بھی دیکھ رہا تھا۔ اس نے ڈرامائی انداز میں دھیرے دھیرے بازو ہوا میں بلند کئے۔

"ون۔ ٹو۔ تھری" سعید صاحب نے آواز لگائی اور ارشد نے نہایت خوبصورتی سے پانی میں چھلانگ لگادی۔ صرف ایک لمحے کے لئے پانی میں غائب ہو کر وہ سطح پر ابھرا اور جسم کو اکڑا کر چت تیرنے لگا۔ یہ کوئی خاص کرتب نہیں تھا۔ میں بھی دکھا سکتا تھا۔

کافی دیر تک وہ اسی طرح دھیرے دھیرے تیرتا رہا پھر عام انداز میں تیرنے لگا۔ اس کا ٹائم نوٹ کرلیا گیا۔ چند لمحے سانس درست کرنے کے بعد اس نے غوطہ لگایا اور اس کے ساتھ ہی میں نے بھی سانس روک لی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ کیا ارشد مجھ سے زیادہ دیر تک زیر آب رہ سکتا ہے؟

سب لوگ پُر تجسس انداز میں متحرک پانی کو دیکھ رہے تھے۔ ارشد موتی غالباً زیادہ گہرائی کی طرف چلا گیا تھا کیونکہ کہیں اس کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ ایک لمحے کو لئے تو گویا سبھی مہمانوں نے سانسیں روک لی تھیں کیونکہ اتنا سکوت چھا گیا تھا کہ اسٹاپ واچ کی ٹک ٹک بھی صاف سنائی دے رہی تھی۔ لیکن یہ تجسس' یہ اشتیاق تو صرف ایک لمحے ہی رہا۔ سب کو معلوم تھا کہ اب ارشد موتی پانی سے برآمد ہونے میں کچھ نہ کچھ دیر لگائے گا اس لئے وہ ایک بار پھر اپنی خوش گپیوں میں مشغول ہوگئے۔ لیکن یہ بھنبھناہٹ بھی چند سیکنڈ سے زیادہ نہ رہ سکی۔

پانی میں یکدم ہلچل سی ہوئی اور ارشد موتی کا سر ابھرتا دکھائی دیا۔ سر پانی سے نکالتے ہی اس نے خوفزدہ انداز میں چیخ ماری۔ شاید وہ چلا کر کچھ کہنا چاہتا تھا مگر غیر ارادی طور پر اس کے الفاظ چیخ میں ڈھل گئے تھے۔

پھر وہ کسی دہشت زدہ کیکڑے کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا کنارے پر پہنچا۔ باہر آنے کے لئے اس نے کسی سیڑھی یا ریلنگ کا سہارا لینے کی بھی زحمت نہیں کی بلکہ ماربل کے پختہ کنارے پر ہاتھ ٹکا کر بندروں کی طرح اچک کر باہر آگیا۔ اس کا کسرتی جسم خوف سے کانپ رہا تھا اور خوف ہی کے باعث اس کا چہرہ بگڑا بگڑا سا لگ رہا تھا۔ چہرے سے پانی پونچھتے ہوئے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر دیکھ رہا تھا۔

چند لمحے پہلے وہ ڈائیونگ بورڈ پر کھڑا کسی یونانی دیوتا کی طرح خوبصورت لگ رہا تھا مگر اب اس بوکھلاہٹ نے اس کی شخصیت کا سارا حسن غارت کردیا تھا۔ وہ بالکل ایک خوفزدہ چوہا لگ رہا تھا لیکن ذرا پلا ہوا۔

سعید صاحب لپک کر اس کے قریب پہنچے۔ شاید وہ اسٹاپ واچ بھی بند کرنی بھول گئے تھے۔ ارشد موتی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے شاید انہیں ہی تلاش کر رہا تھا۔ ان پر نظر پڑتے ہی بولا "سعید صاحب! پول کی تہ میں... وہاں... ایک لاش پڑی ہوئی ہے..." وہ کانپتے ہاتھ سے اس طرف اشارہ کر رہا تھا جس طرف پانی گہرا تھا۔

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ بات مجھے بڑی عجیب لگی تھی کہ ارشد موتی اچھی خاصی اونچے درجے کی بدمعاشی میں پاؤں دھرتا تھا لیکن ایک لاش کی موجودگی کے انکشاف نے اسے بری طرح بوکھلا دیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے ماحول پر گہرا سکوت چھا گیا۔ آخر کار سعید صاحب نے تھوک نگل کر کہا "لاش... کیسی لاش...؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ لاش ہے؟" انہوں نے یوں مڑ کر پانی پر نظر دوڑائی جیسے ابھی کوئی سطح آب پر نمودار ہوگا اور ہاتھ ہلا کر کہے گا "ارے بھئی... وہ لاش نہیں تھی... وہ تو میں تھا..."

لیکن ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی اور انہیں دوبارہ ارشد

موتی کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ ارشد اب اپنی بوکھلاہٹ اور کپکپاہٹ پر کسی حد تک قابو پاچکا تھا۔ شاید اسے احساس ہوگیا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بدحواس ہوگیا ہے اور اتنے لوگوں کے سامنے بالکل ہی کارٹون بن گیا ہے جب کہ اس سے پہلے وہ اپنی شخصیت سے مردِ آہن قسم کی چیز کا تاثر دینے کی کوشش کرتا رہا ہے۔

اب وہ قدرے سنبھلے ہوئے لہجے میں بولا "میرا پاؤں اس سے ٹکرایا تھا... میں سمجھا کوئی چیز پانی میں گری ہوئی ہے... میں نے ٹٹول کر دیکھا... وہ یقیناً لاش ہے... کسی لڑکی کی لاش..."

"لڑکی کی...؟" کئی مہمانوں نے بیک آواز دُہرایا۔ کئی مہمان ذرا پیچھے کو ہٹ گئے گویا وہ سوئمنگ پول سے دور ہی رہنا چاہتے ہوں۔ مجھے یقین تھا کہ ان میں سے کچھ تو شاید وہاں سے کھسکنے کے بارے میں بھی سوچنے لگے تھے مگر شاید مروتاً یا پھر مصلحتاً انہیں نکلنا پڑ رہا تھا۔

ستارہ نے تشویش زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ہمت بندھانے والے انداز میں اس کا کندھا تھپتھپایا اور ایک بار پھر ان لوگوں کے ردِّعمل کا مشاہدہ کرنے لگا۔ میرے خیال میں سب سے زیادہ پریشان تو سعید صاحب کو ہونا چاہیے تھا کیونکہ وہ میزبان تھے۔ لاش ان کے گھر میں، ان کے سوئمنگ پول میں موجود تھی لیکن وہ پھر بھی کافی حد تک پُرسکون تھے۔ ارشد موتی سے گھبراہٹ زدہ انداز میں یہ خبر سن کر وہ پہلے پریشان اور پھر متوحش نظر آئے تھے لیکن اب انہوں نے کافی حد تک اپنے آپ پر قابو پالیا تھا۔

یہ سن کر کہ لاش لڑکی کی تھی، نہ جانے کیوں میرے ذہن میں فوری طور پر ہنی کا خیال آیا۔ اس نے اس پارٹی میں آنے کا وعدہ کیا تھا مگر نہیں آئی تھی۔ کہیں...؟ میں جھرجھری سی لے کر رہ گیا۔ ...اور میں نے فوری طور پر اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔

سعید صاحب، ارشد موتی کا بازو تھامتے ہوئے بولے "تم لاش کو باہر ہی لے آتے۔ پولیس کو بلانے سے پہلے ہمیں کم از کم یہی معلوم ہوجاتا کہ لاش ہے کس کی؟"

"نہیں... نہیں..." ارشد موتی کے لہجے میں اب بھی گھبراہٹ تھی "میرا خیال ہے ہمیں پولیس کے آنے سے پہلے کسی چیز کو چھیڑنا نہیں چاہیے، کوئی شہادت، کوئی سراغ ضائع ہوسکتا ہے۔"

"لگتا ہے تم جاسوسی کہانیاں پڑھنے لگے ہو" سعید صاحب منہ بنا کر بولے "تم شہادت اور سراغ کی بات کررہے ہو... بھائی! ...یہاں اگر پولیس کا موڈ نہ ہو تو اسے پوری لاش بھی نظر نہیں آتی۔ ...ہم تو خیر پھر بھی یہاں چار ایسے لوگ جمع ہیں جن کی دو چار آدمیوں سے دعا سلام ہوگی۔ ہمارے بلانے پر تو پولیس آبھی جائے گی ورنہ عین ممکن تھا کہ اگر ہم فون کرتے تو آگے سے جواب ملتا کہ ہم خود لاش لے کر، بلکہ اگر ہوسکے تو قاتل کو بھی ساتھ لے کر تھانے پہنچ جائیں تو شاید کچھ کارروائی ہوسکے۔ اس لئے میری جان! تم سراغ وغیرہ کی فکر چھوڑدو۔ کوئی سراغ ضائع نہیں ہوگا۔ پولیس سے ہم خود بات کرلیں گے۔ تم لاش کو پانی سے نکال لاؤ۔"

"جب میرا پاؤں اس سے ٹکرایا تھا تو میں نے پاؤں سے اس کو کھسکانے کی کوشش کی تھی... یہ اندازہ کرنے کے لئے کہ وہ کیا چیز ہے... مگر اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی تھی ... میرا خیال ہے اس کے ساتھ کچھ بندھا ہوا بھی ہے... اسے اوپر لانا مشکل ہی ہے..." ارشد موتی اٹک اٹک کر بولا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ لاش کو باہر لانا نہیں چاہتا۔

میں نے اجازت طلب سی نظروں سے ستارہ کی طرف دیکھا اور اس سے پہلے کہ وہ مجھے روکنے کی کوشش کرتی، میں نے اس سے بازو چھڑا کر سعید صاحب کے قریب پہنچتے ہوئے کہا "میں لاش کو باہر لے آتا ہوں۔"

پھر میں نے بنیان اور انڈرویئر میں سوئمنگ پول میں چھلانگ لگائی اور جلد ہی اس جگہ جا پہنچا جہاں میرے خیال میں لاش ہونی چاہیے تھی۔ جلد ہی میرا پاؤں لاش سے ٹکرایا۔ میں نے جھک کر اسے چھو کر دیکھا۔ وہ یقیناً لاش ہی تھی۔ اس میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔ وہ ڈوری غالباً نائیلون کی تھی جس سے اس کے بازو اس کے جسم کے ساتھ بندھے ہوئے تھے۔ اسی ڈوری کے سرے سے ایک بڑا سا پتھر بندھا ہوا تھا اور درمیان میں بالکل ذرا سی ڈوری فاضل تھی اس لئے پتھر، لاش سے تقریباً جُڑا ہوا ہی تھا۔

میں نے ایک بازو پر لاش کو اٹھایا اور دوسرے بازو پر پتھر کو۔ پانی میں بے جان جسم کو اٹھا کر تیرنا خاصا مشکل کام ہے۔ تاہم میں اوپر آگیا۔ سعید صاحب نے لاش اور پتھر کو کنارے پر نکالنے میں میری مدد کی۔ پھر میں بھی باہر آگیا۔

کئی مہمان کچھ ہمت کرکے لاش کے قریب آگئے تھے۔ میں نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لے کر اس بات پر قدرے اطمینان محسوس کیا کہ وہ ہنی نہیں تھی۔ لیکن وہ جو کوئی بھی تھی اس کے لئے دل میں دکھ اور تاسف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ لاش کو پانی میں یقیناً بہت زیادہ دیر نہیں گزری تھی کیونکہ اس کی حالت بگڑنا شروع نہیں ہوئی تھی۔

لڑکی نوجوان ہی تھی۔ بمشکل تیئس چوبیس سال عمر ہوگی اس کی۔ وہ اتنی مختصر الوجود اور نازک اندام تھی کہ بالکل گڑیا لگتی تھی۔ اس کے تراشیدہ بھورے بالوں کی لٹیں اس کے سفید رخساروں پر چپکی ہوئی تھیں۔ اس کے نقوش میں بڑی نزاکت تھی۔ چینی لڑکیوں کی طرح چھوٹی سی ناک، پتلے پتلے مختصر سے ہونٹ اور نازک سی ٹھوڑی۔ اس کا لباس بے حد معمولی تھا۔

جوتی صرف ایک پاؤں میں تھی اور وہ بھی بے حد سستی اور معمولی سی معلوم ہوتی تھی۔

زندگی سے محروم ہونے کے بعد تو اس کی شخصیت سے دلکشی، حرارت اور گداز رخصت ہو ہی چکا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ کافی عرصے سے وہ زندہ حالت میں بھی اجڑی اجڑی سی ہی نظر آتی ہوگی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور ان حلقوں کی سیاہی اس وقت بھی کم نہیں ہوئی تھی جب آنکھیں ان حلقوں سے باہر کو ابل آئی تھیں۔

اس طرح ابھری ہوئی آنکھوں کی وجہ سے ہی وہ اس وقت ایک پیاری اور گڑیا سی لڑکی کے بجائے، کوئی ڈراؤنی مخلوق لگ رہی تھی۔ اس کی گردن پر سیاہی مائل سرخ دائرہ موجود تھا۔ شاید اس کی گردن میں اسی نائیلون کی ڈوری کا پھندا ڈال کر اس کا گلا گھونٹا گیا تھا جس سے بعد میں اس کے جسم کے ساتھ پتھر باندھ دیا گیا تھا۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر سب سے آگے کھڑے ہوئے لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیا۔ سب ہی کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔ سعید صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بہ آوازِ بلند کہا "معاف کیجئے گا خواتین و حضرات! پارٹی [illegible] ت ہوگیا... اب رات اس مسئلے سے نمٹنے میں ضائع ہوگی... بہرحال... زندگی اسی کا نام ہے... حادثے تو پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ ایک ناگوار حادثے کا سا[illegible] ا ہی پڑ گیا ہے تو صبر و سکون سے کیجئے... مجھے دل ہی دل میں برا بھلا مت کہئے گا... میرا اس میں کوئی قصور نہیں۔"

مجھے ان کا یہ اعلان غیر ضروری سا محسوس ہوا لیکن شاید انہیں اعلانات کرنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔ مہمانوں میں کچھ بھنبھناہٹ سی ہوئی پھر ادھیڑ عمر کے ایک صاحب بہ آوازِ بلند بولے "بھئی... اپنے سعید میاں! یہاں موجود بیشتر مہمان اس معاملے میں ملوث ہونا نہیں چاہتے۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ ہم سب اپنے اپنے گھر چلے جائیں۔ آپ خود ہی پولیس سے نمٹتے رہیے گا۔"

سعید صاحب نے قدرے بے بسی سے میری طرف دیکھا۔ ماحول کی تمام تر ٹھنڈک کے باوجود ایک لمحے کے لئے مجھے اپنے کانوں کے قریب تپش سی محسوس ہوئی۔ غیر ارادی طور پر میں نے قدرے سرد مہری سے کہا "کوئی اپنے گھر نہیں جائے گا۔ معلوم نہیں اس گڑیا سی لڑکی کا کوئی قصور یا گناہ تھا یا نہیں... لیکن اسے یوں قتل کردیا جانا بہرحال انصاف نہیں کہلا سکتا... یہ جو کوئی بھی ہے، بہرحال زندگی جیسی نعمت سے محروم ہوئی ہے۔ کیا اس کی خاطر ہم تھوڑا سا وقت ضائع نہیں کرسکتے؟ بڑے افسوس کی بات ہے۔"

سعید صاحب نے گویا غیر ارادی طور پر میری تائید میں سر ہلایا۔ ادھیڑ عمر مہمان جو غالباً کوئی صنعت کار تھا، اپنی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے قدرے آگے آکر بولا "چوہدری صاحب! ... آپ شاید ہماری پولیس کو نہیں جانتے... بہت پریشان کرتے ہیں وہ لوگ... اور بہت وقت ضائع کرتے ہیں۔"

"پولیس کو مجھ سے زیادہ شاید ہی کوئی جانتا ہو" میں نے ملائمت سے کہا "آپ لوگ مطمئن رہیں۔ مجھے حیرت ہے کہ آپ لوگوں کو خود اپنی پوزیشن کا احساس نہیں۔ ہم سب کوئی ایرے غیرے نہیں ہیں۔ شہر کے معزز ترین لوگ ہیں ہم۔ کوئی پولیس آفیسر ہم سے بدتمیزی سے پیش نہیں آسکتا۔ خصوصاً جب کہ ہم بے گناہ ہوں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ کوئی ایسی پریشانی والی بات نہیں" سعید صاحب نے بھی گویا سب کو تسلی دی "ڈی آئی جی صاحب تک سے بھی آپ کے اس خادم کی جان پہچان ہے اور علاقے کے ڈی ایس پی صاحب سے تو اچھی بھلی گپ شپ ہے۔ آپ لوگ ذرا بھی فکر نہیں کریں۔ بس رسمی سی کارروائی ہوگی۔ ضابطے کی پوچھ گچھ۔ پولیس بالکل اسی طرح تفتیش کرے گی جس طرح اسے کرنی چاہئے۔ اس طرح نہیں کرے گی جس طرح کرتی ہے۔"

"ڈی آئی جی صاحب کو فون کریں تو انہیں میرا بھی سلام کہہ دیجئے گا" میں نے آہستگی سے سعید صاحب سے کہا۔ انہوں نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلانے لگے۔

اعتراض کرنے والے مہمان جو اس وقت غالباً باقی مہمانوں کے نمائندے بن چکے تھے گویا بادل نخواستہ بولے "اچھا... اگر آپ لوگ اصرار کرتے ہیں تو ہم رک جاتے ہیں۔"

"پو[illegible] کے آنے سے پہلے [illegible] طور پر بھی تھوڑی بہت تفتیش کرنے کی کوشش کرنی چاہئے" میں نے مہمانوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "کسی کو اس واقعے کے بارے میں کچھ معلوم ہے...؟ کوئی ایسی بات جو پہلے معمولی اور غیر اہم لگی ہو مگر اب یہ لاش سامنے آنے کے بعد یاد آرہا ہو کہ اس بات کا اس قتل سے کوئی تعلق ہوسکتا ہے؟ اپنے ذہنوں پر زور دیجئے۔ شاید ایسی کوئی بات یاد آجائے۔"

میں نے متوقع نظروں سے باری باری سب کی طرف دیکھا لیکن سب ہی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کوئی اسے پہچانتا ہے؟" میں نے پوچھا "براہِ کرم غور سے اس کی صورت دیکھئے۔"

سامنے کھڑے ہوئے مہمانوں نے تو فوری طور پر نفی میں سر ہلا دیا۔ جو مہمان پیچھے کھڑے تھے میں نے ان سے بھی درخواست کی کہ وہ آگے آکر اچھی طرح لاش کا جائزہ لیں۔ بالآخر... نفیس سوٹ میں، درمیانے سے قد کا ایک نوجوان جو اس وقت بھی ہاتھ میں ڈرنک اٹھائے ہوئے تھا، لاش کا بغور جائزہ لے کر قدرے چونکتے ہوئے بولا "ارے... یہ تو وہ ایکسٹرا گرل

معلوم ہوتی ہے... اس کا نام مجھے یاد نہیں آرہا... شکل اس لئے یاد رہ گئی کہ ایک بار ایک ایکسٹرا سپلائر اسے میرے پاس لے کر آیا تھا کہ میں اسے ہیروئن کا چانس دے دوں۔ میں ان دنوں اپنی فلم 'لہریں' کے لئے نئے چہرے تلاش کرنے کا ارادہ کررہا تھا۔"

"لیکن ظاہر ہے آپ نے اسے چانس نہیں دیا ہوگا۔ اگر یہ ہیروئن آئی ہوتی تو ہم لوگوں نے اسے ضرور پہچان لیا ہوتا" سعید صاحب سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"نہیں۔ میں نے اسے اور ایکسٹرا سپلائر، دونوں کو بھگا دیا تھا۔ لڑکی میں اسپارک بالکل نہیں تھا۔ فلم میں ایسی لڑکیاں بالکل نہیں چلتیں۔ ٹی وی پلے کے لئے... وہ بھی کسی چھوٹے موٹے رول میں ٹھیک رہتی۔ ویسے بھی میری ذاتی رائے یہ ہے کہ جو لڑکی زیادہ عرصے تک ایکسٹرا رہ چکی ہو اسے ہیروئن نہیں لیا جاسکتا۔ ایسی لڑکی کی کامیابی کی ہمارے ہاں صرف ایک ہی مثال موجود ہے۔"

"ہاں... یہ تو ہے" سعید صاحب نے اثبات میں سر ہلایا پھر قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور سوٹ والے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "ان سے ملئے چوہدری صاحب! یہ مشہور فلم ساز اور ہدایت کار دلدار قریشی ہیں۔"

میرے لئے یہ نام شناسا تھا۔ میں نے اس شخص سے مصافحہ کیا۔ صورتِ حال خاصی عجیب لگ رہی تھی۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر ایک لاش پڑی ہوئی تھی۔ بائیں ہاتھ پر اتنے سارے مہمان تھے جن میں خواتین بھی شامل تھیں۔ سامنے دلدار اور سعید صاحب عمدہ سوٹوں میں کھڑے تھے اور میں بھیگے ہوئے بنیان اور انڈرویئر میں کھڑا دلدار سے ہاتھ ملا رہا تھا۔

سعید صاحب ایک لمحے کے لئے گویا لاش کو بھول گئے اور دلدار سے مخاطب ہوئے "'لہریں' میں تو پھر آپ نے نئے چہرے نہیں لئے تھے نا؟"

"نہیں۔ مجھے رسک ہی محسوس ہوا تھا۔ میں نے نئے چہرے لینے کا ارادہ ہی بدل دیا تھا" دلدار قریشی ایک نظر لاش کی طرف دیکھ کر متانت سے بولا "ہم نے اپنی وہی پرانی سپر اسٹار ساحرہ بیگم کو لے کر کام چلا لیا تھا۔ ان کا قد چھوٹا ہے نا اور عمر بھی کم ہی لگتی ہے۔ ہم نے ان کی دو چٹیاں وغیرہ کرکے کام چلا لیا تھا۔ کچھ میک اپ سے اچھے ایفیکٹس لے لئے تھے..."

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ دونوں صاحبان فلموں کے نشیب و فراز پر تبادلۂ خیال شروع نہ کردیں اس لئے میں نے گفتگو میں مداخلت کرتے ہوئے دلدار کو مخاطب کیا "تو آپ کو صرف یہ یاد ہے کہ یہ کوئی ایکسٹرا گرل ہے۔ نام وغیرہ یاد نہیں آرہا...؟"

"نہیں۔ وہ... دراصل ایکسٹرا گرلز کے نام اور شکلیں وغیرہ تو زیادہ تر اسسٹنٹ ٹائپ کے لوگ ہی یاد رکھتے ہیں" دلدار نے معذرت خواہانہ سے انداز میں کہا لیکن اس معذرت میں بھی ہلکی سی نخوت پنہاں تھی۔ "البتہ اس ایکسٹرا سپلائر کا نام مجھے معلوم ہے جس نے اس کی سفارش کی تھی۔ ضرورت پڑنے پر وہ میں بتا سکتا ہوں۔"

میں نے ایک بار پھر لاش کا جائزہ لیا۔ حلقوں سے ابھری ہوئی اس کی آنکھیں خوابوں سے خالی اور دہشت سے پُر تھیں۔ لاش کے ساتھ بندھا ہوا پتھر نسواری اور کھردرا مگر کہیں کہیں سے معمولی سا کائی زدہ تھا۔ یہ یقیناً انہی پتھروں میں سے ایک تھا جو پہاڑی منظر کا تاثر دینے کے لئے سوئمنگ پول سے کچھ دور سجائے گئے تھے اور جن پر سے پانی پھسلتا ہوا سوئمنگ پول میں آتا تھا۔

میں نے سعید صاحب سے کہا "پتھر تو آپ نے پہچان ہی لیا ہوگا۔ اس ڈوری کے متعلق کیا خیال ہے؟"

"عین ممکن ہے کہ یہ ڈوری بھی وہیں کہیں سے اٹھائی گئی ہو" سعید صاحب نے پتھروں کے عقب میں پھیلے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی طرف اشارہ کیا "مجھے یاد پڑتا ہے کہ مالی بعض پودوں کو سیدھا رکھنے کی غرض سے اس قسم کی ڈوریوں سے باندھتے ہیں۔"

"تب تو زیادہ امکان یہی نظر آتا ہے کہ اس لڑکی کو یہیں کہیں آس پاس ہی قتل کیا گیا ہے۔ کہیں اور سے اس کی لاش لا کر سوئمنگ پول میں نہیں پھینکی گئی" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ممکن ہے..." سعید صاحب نے بے یقینی سے کہا "ویسے ہمارے باغ کی دیوار بھی زیادہ اونچی نہیں۔ ہم نے اس پر خاردار تاریں تو لگوائی ہیں لیکن پھر بھی کوئی پھلانگ کر اندر آسکتا ہے۔ اس لئے رات کو ہم ادھر اپنے کتے چھوڑ دیتے ہیں۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ قاتل کہیں ادھر اُدھر سے پھلانگ کر آیا ہوگا۔ ویسے بھی ہمیں قاتل کے بارے میں غور کرنے سے پہلے مقتولہ کے بارے میں غور کرنا چاہئے کہ یہ یہاں کیسے آئی تھی..." میں نے کہا اور اسی لمحے میری نظر لڑکی کے بائیں ہاتھ پر پڑی۔ اس کا ہاتھ سختی سے مٹھی کی شکل میں بند تھا۔ انگلیوں کے درمیان کوئی سفید سفید سی چیز چپکی ہوئی نظر آرہی تھی۔

میں نے لاش کے قریب بیٹھ کر جائزہ لیا۔ لڑکی کی مٹھی میں یقیناً کوئی کاغذ کا ٹکڑا دبا ہوا تھا۔ اس کا ایک ذرا سا کونا انگلیوں کے درمیان سے نکلا ہوا تھا جو بھیگ کر اور تقریباً گل کر انگلیوں سے چپک گیا تھا لیکن لڑکی کی مٹھی اتنی سختی سے بند تھی کہ میرا اندازہ تھا، اندر پانی مشکل سے ہی پہنچا ہوگا۔

میں نے تقریباً غیر ارادی سے انداز میں لڑکی کی مٹھی کھولنے کی کوشش شروع کردی۔ کوئی صاحب مضطربانہ انداز میں بول اٹھے "چوہدری صاحب! آپ کہیں کوئی سراغ ضائع نہ کردیں... کہیں پولیس والے ناراض نہ ہوں۔"

میں نے ان صاحب کی طرف دیکھے بغیر کہا "میرا خیال ہے میں تو پولیس کے آنے سے پہلے اس کے حصے کا کچھ کام کرکے رکھ

رہا ہوں ... یا ممکن ہے ہم اپنے کسی دوست کو غیر ضروری شرمندگی سے بچالیں۔"

لاش شاید پانی میں رہنے کی وجہ سے زیادہ بری طرح نہیں اکڑی تھی۔ تھوڑی سی طاقت صرف کرکے میں نے مٹھی اس حد تک کھول لی کہ مڑے تڑے کاغذ کو بحفاظت نکال سکوں۔ یہ کسی ڈائری سے پھاڑا گیا تقریباً آدھا ورق تھا۔ کچھ تو پانی مٹھی میں زیادہ نہیں پہنچا تھا اور کچھ کاغذ بھی عمدہ تھا، مکمل طور پر گلا نہیں تھا۔ میں نے حفاظت سے اسے کھولا۔ اس پر غالباً نہایت عجلت میں بال پوائنٹ سے چند الفاظ گھسیٹے گئے تھے۔ اگر یہ فاؤنٹین پین کی تحریر ہوتی تو شاید اب تک پڑھنے کے قابل نہ رہی ہوتی۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا کیونکہ مختصر سادہ پیغام میرے ہی نام تھا۔

افضل صاحب!

مجھے افسوس ہے کہ میں پارٹی میں نہیں آسکوں گی۔ میں اپنے اردگرد بہت خطرہ محسوس کررہی ہوں۔ لیکن خیر... آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس لڑکی کو شاید آپ کی اخلاقی مدد کی ضرورت پڑے۔ ضرور کردیجئے گا۔

فقط

ہنی

میں چند لمحے کے لئے ساکت کھڑا رہا۔ کاغذ اچھی حالت میں ہوتا تو یقیناً سعید صاحب اسے میرے ہاتھ سے جھپٹ لیتے۔ آخرکار ... میں نے خود ہی مضمون پڑھ کر انہیں سنادیا۔ دیکھ تو سب پہلے بھی میری ہی طرف رہے تھے لیکن اب کچھ اور زیادہ توجہ سے دیکھنے لگے۔

"... تو اسے کسی اخلاقی مدد کی ضرورت تھی ...!" سعید صاحب لاش کی طرف دیکھ کر گہری سانس لے کر بولے۔

"اور کوئی ایسا شخص بھی تھا جو نہیں چاہتا تھا کہ اسے کوئی اخلاقی مدد میسر آسکے" میں نے بھی ایک نظر لاش کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس لمحے مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ وہ نجانے کیا امید لے کر یہاں پہنچی تھی۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ ہنی نے اس کے ہاتھ معذرت کا پیغام بھیجا تھا اور ساتھ ہی کسی نامعلوم خطرے کی بھی نشان دہی کی تھی۔ .. لیکن ہنی کو تحریر میں پیغام بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا وہ سعید صاحب کے ہاں فون نہیں کرسکتی تھی؟ پارٹی کے دوران فون کرکے وہ مجھ سے بھی بات کرسکتی تھی۔ کیا یہ لڑکی بھی اسی خطرے کی لپیٹ میں آگئی تھی جس کی طرف ہنی نے اشارہ کیا تھا یا یہ اس کی ذاتی زندگی کے کسی اتار چڑھاؤ کا شاخسانہ تھا؟

سوال سے سوال نکل رہا تھا۔ میں نے سر جھٹک کر سعید صاحب کی طرف دیکھا اور مڑا تڑا کاغذ مردہ لڑکی کے ہاتھ میں ہی پھنساتے ہوئے کہا "بہتر ہے کہ ہم ہر چیز پولیس کے لئے ہی چھوڑدیں"

"لیکن میں اپنی یہ حیرانی ضرور دور کرنی چاہتا ہوں کہ یہ کس راستے سے ہمارے ہاں آئی تھی۔ یہ کسی بھی طرح مدعو مہمان تو لگ نہیں رہی۔ چوکیدار نے اسے اندر کیسے آنے دیا ہوگا؟"

سعید صاحب خودکلامی کے سے انداز میں بولے۔ پھر انہوں نے ایک نوکر کو آواز دے کر حکم دیا کہ وہ گیٹ سے چوکیدار کو بلالائے۔

چوکیدار اپنی رائفل سنبھالے آیا۔ وہ جوان العمر اور بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ سعید صاحب نے اسے سیدھا لاش کے پاس بلالیا۔ لاش دیکھ کر اسے حیرت کا جھٹکا لگا اور اس کی مونچھیں ایک لمحے کے لئے پھڑپھڑا کر رہ گئیں۔

"یہ لڑکی سامنے والے گیٹ سے اندر آئی تھی؟" سعید صاحب نے پوچھا۔

"ہاں صاب ...!" چوکیدار غالباً سعید صاحب کا مطلب سمجھ گیا اور خود ہی تفصیل بتانے لگا "یہ رکشے میں آئی تھی صاب! ہم سمجھ گیا تھا کہ یہ کوئی بڑا لوگ نہیں اے۔ مگر صاب! اس کے پاس کارڈ موجود تھا۔ ام سمجھا ٹھیک اے... صاب نے کسی وجہ سے بلالیا ہوگا... یہ سب سے پہلے آگیا تھا... ام سمجھا اس کو بوت شوق اے پارٹی میں آنے کا..."

"ایک تو تم ساری باتیں خود بخود ہی سمجھ لیتے ہو" سعید صاحب قدرے چڑ کر بولے۔

"ام نے اس کو بولا صاب کہ ابھی کوئی مہمان نہیں آئی اے... مگر یہ بولا کہ ام جاکر بیٹھے گا اور انتظار کرے گا۔ اس نے پوچھا کہ مہمان کے بیٹھنے کا انتظام کدر اے۔ ام نے اس کو بتادیا کہ پیچھے باغ میں... یہ سرونٹ کوارٹر والی سائیڈ سے باغ کی طرف چلاگیا.. بس اس کا بعد ام اس کو بھول گیا۔"

"کیا اس وقت کیٹرنگ سروس والے... میرا مطلب ہے کھانا لگانے والے آچکے تھے؟" سعید صاحب نے پوچھا۔

"نیئں صاب! ان کو تو ام نے رات نو بجے کا ٹائم دیا تا تا... تاکہ کھانا بالکل تازہ تازہ آوے..." چوکیدار نے جواب دیا۔

کھانے کا انتظام ویسے بھی سائیڈ والے لان پر تھا۔ مہمانوں کے لئے انتظام پیچھے والے لان میں نہانے کے تالاب کے پاس تھا۔

تاہم سعید صاحب نے تمام نوکروں اور کیٹرنگ سروس کے ویٹروں کو بلاکر لاش دکھائی اور ان سے پوچھا کہ کیا انہوں نے سوئمنگ پول کے آس پاس یا اسٹیج کے سامنے لگی ہوئی کرسیوں میں سے کسی پر اس لڑکی کو بیٹھے دیکھا تھا؟ لیکن سب کا جواب نفی میں تھا۔

"مجھے یاد نہیں پڑ رہا کہ کون مہمان سب سے پہلے آیا تھا... میں اس وقت گیٹ کے آس پاس تھا بھی نہیں..." سعید صاحب پیشانی مسلتے ہوئے بولے۔ ان کی بیگم جو ایک خوبصورت اور باوقار خاتون تھیں، کچھ دور کھڑی تھیں۔ وہ ان سے کچھ کہنے کے

ارادے سے آگے بڑھیں لیکن اس سے پہلے ہی مہمانوں میں سے ایک شخص نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں بولا۔ "میرا خیال ہے سب سے پہلے میں اور میری دوست طاہرہ خانم پہنچے تھے لیکن ہمیں لان پر نہیں، ڈرائنگ روم میں بٹھایا گیا۔ پھر جب وہاں کئی مہمان جمع ہوگئے تو ہم یہاں عقبی لان پر آئے تھے۔ اس وقت اندھیرا گہرا ہوچکا تھا اور میرا خیال ہے، ہم جتنے بھی لوگ یہاں آئے تھے ان میں سے کسی کو یہاں کوئی لڑکی بیٹھی دکھائی نہیں دی تھی۔"

"جی ہاں... یہ درست ہے..." بیک وقت کئی آوازیں سنائی دیں۔ یہ غالباً وہ مہمان تھے جو اس شخص اور اس کی دوست طاہرہ خانم کے ساتھ لان پر آئے تھے۔ یہ شخص نصیر نواز تھا، 'جنگل' کا رائٹر۔ دراز قد اور خاصی حد تک وجیہہ مگر تیزی سے بے ڈھنگے پن کی طرف گامزن۔

سعید صاحب کی بیگم قدرے قریب آکر کھڑی ہوگئی تھیں مگر بدستور خاموش تھیں۔ شاید وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھیں وہ نصیر نواز اور دوسرے مہمانوں نے خود کہہ دیا تھا۔ مسز سعید کی موٹی موٹی آنکھوں سے تشویش جھانک رہی تھی۔

میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "سعید صاحب! آپ پولیس کو فون کریں۔ تب تک میں اور یہ دوسرے صاحبان جن کو تیراکی وغیرہ کے مقابلوں میں حصہ لینا تھا، اپنے حلیے درست کر آئیں۔ کم از کم میں تو یوں کھڑا اپنے آپ کو جوکر محسوس کررہا ہوں... اور اب سردی بھی لگنے لگی ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" سوئمنگ کاسٹیوم میں کھڑے ہوئے آدمیوں نے میری تائید کی۔ ہم نے پول کے کنارے پڑی ہوئی خوبصورت آرام کرسیوں پر سے اپنے اپنے سوٹ اٹھائے اور اندر کی طرف چل دیئے تاکہ اپنے حلیے درست کرکے آسکیں۔

اچانک سعید صاحب آواز دے کر مجھے روکتے ہوئے بولے۔ "... یہ دعوت نامے والی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دعوت ناموں کے لئے میں نے خود اپنے سیکرٹری کو نام لکھوائے تھے... اور مجھے یاد نہیں کہ میں نے کسی ایکسٹرا گرل کے لئے دعوت نامہ بھیجنے کو کہا ہو۔"

"اس کا جواب پہلے ہی میرے ذہن میں آچکا ہے۔" میں نے ذرا دیر کے لئے رکتے ہوئے کہا۔ "وہ دعوت نامہ یقیناً ہنی کا ہوگا۔ چوکیدار نے مہمانوں سے جو دعوت نامے لے کر جمع کیے ہوں گے آپ جاکر ان میں دیکھ لیجئے گا۔ ان میں ضرور ہنی کے نام کا دعوت نامہ موجود ہوگا۔ وہ چونکہ خود نہیں آرہی تھی اس لئے اس نے لڑکی کو اپنا دعوت نامہ دے کر بھیج دیا ہوگا کہ اسے اندر آنے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔"

سعید صاحب نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ انہیں میری بات پر یقین آگیا تھا اس لئے انہوں نے تصدیق کی بھی ضرورت نہیں سمجھی اور میرے ساتھ ہی اندر کی طرف چل دیئے لیکن پھر رک کر انہوں نے مڑ کر بہ آوازِ بلند مہمانوں کو مخاطب کیا۔

"بھئی .... جس کا جہاں جی چاہے بیٹھ جائے ... اور خواتین و حضرات! بالکل ریلیکس رہیں... پارٹی تباہ ہوگئی... کوئی بات نہیں ... جلد ہی اس کی تلافی کرلیں گے۔"

مہمان اِدھر اُدھر بکھرنے لگے۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت ان میں سے کوئی بھی خوش نہیں تھا۔ لیکن میں نے اب ان کی پروا چھوڑ دی تھی۔ میرا ذہن بہت سے سوالات میں الجھا ہوا تھا۔

میں جب ایک باتھ روم خالی پاکر اور اپنا حلیہ درست کرکے نکلا تو راہداری کے اختتام پر ہال کی طرف سے مجھے سعید صاحب کی آواز سنائی دی۔ وہ ابھی فون پر ہی باتیں کررہے تھے۔ میں ہال ہی میں جا پہنچا۔ وہ ہال بھی ایک طرح کا ڈرائنگ روم سا ہی تھا۔ ... دیوار کے قریب صوفے پر سعید صاحب بیٹھے تھے۔ فون ان کے سامنے تپائی پر رکھا تھا۔ آس پاس صوفوں اور دوسری نشستوں پر کئی مہمان موجود تھے۔ سعید صاحب کی بیگم ان کے قریب ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔

سعید صاحب نے مزید کئی منٹ فون پر بات کی پھر ریسیور رکھ کر خاصی دیر کے بعد پہلی مرتبہ مطمئن انداز میں مسکرائے۔ "لو بھئی... اب ہمارے لئے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ اب پولیس جانے اور اس کا کام۔"

میں نے ان کے مقابل قالین پر پڑے ہوئے ایک موٹے سے کشن پر بیٹھ کر فون اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ "ذرا ہنی کو بھی فون کرکے اس کی خیر وعافیت معلوم کرنی چاہئے۔ اور اگر وہ مل جائے تو اسے اس افسوسناک واقعے کی اطلاع دے دینی چاہئے۔"

اسی دوران میں نے اپنے قریب کپڑوں کی سرسراہٹ اور ایک مخصوص شناسا سا خوشبو محسوس کی۔ سر ذرا گھما کر دیکھا تو ستارہ دوسرا کشن کھسکا کر میرے قریب بیٹھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں افسردہ سا خمار تھا۔ مغموم سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ لڑکی تمہارے لئے پریشانیوں کا باعث بنے گی..." وہ شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی مگر اس نے ان لفظوں کو ہونٹوں کے پیچھے ہی مقید رکھا، اگر وہ کچھ اور بولتی تو شاید اس کا انداز بیویوں والا لگتا۔

میں نے ملائمت سے کہا "ستارہ! مجھے اس لڑکی سے کوئی مطلب نہیں ہے .... لیکن اتفاق بس کچھ ایسا ہوا ہے کہ مجھ پر اس کا ایک احسان چڑھ گیا ہے .... اور انسان جن کا احسان مند ہو ان کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے نا۔"

ستارہ خاموش رہی۔ سعید صاحب نے اس موقع پر شاید کچھ کہنا چاہا لیکن پھر ایک نظر بیوی کی طرف دیکھ کر ارادہ ملتوی کردیا۔ میں نے ہنی کا نمبر ڈائل کیا لیکن دوسری طرف مکمل سکوت طاری

رہا۔ کسی بھی قسم کی کوئی ٹون سنائی نہ دی۔ میں نے ایک بار پھر نمبر ڈائل کیا کہ شاید پہلی بار صحیح نہ ملا ہو لیکن دوسری طرف بدستور سکوت رہا۔

"ایسا لگتا ہے کہ لائن کٹی ہوئی ہے۔" میں نے ریسیور رکھ کر خاص طور پر کسی کو مخاطب کئے بغیر کہا۔ دور ایک کونے میں مصنف نصیر نواز اور اس کی دوست طاہرہ خانم سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اب ہمیں پولیس کا انتظار کرنے کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

لاشیں میرے لئے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی تھیں لیکن جانے کیوں باہر کھلے آسمان تلے سوئمنگ پول کے کنارے پڑی ہوئی اس مختصرالوجود سی لڑکی کا تصور میرے ذہن سے چپکا ہوا تھا۔ ...اس میں ضرور کوئی بات تھی جو میرے محسوسات کو مضطرب سا کر رہی تھی۔ شاید وہ اس کی خاموش بے کسی کی پکار تھی۔ شاید اس کے بے جان سراپا میں کہیں اس کی مظلومیت بول رہی تھی۔ نہ جانے اسے کس معاملے میں میری اخلاقی مدد کی ضرورت تھی؟ شاید ہی مجھے یہ بات بتا سکتی تھی مگر اس کی طرف بھی مکمل سکوت تھا۔ بہرحال میرا ارادہ تھا کہ یہاں سے فارغ ہو کر گھر جاتے وقت میں ہنی کے گھر کا چکر بھی ضرور لگاتا جاؤں گا۔ شاید اس سے ملاقات ہو ہی جائے۔ یا شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔

پولیس نے آنے میں دیر نہیں لگائی۔ صرف ایک اے ایس آئی اور دو کانسٹیبل آئے تھے اور وہ پہلے ہی اپنے کسی افسر سے ہدایات سن کر آئے تھے۔ ان کا رویّہ کچھ دوستانہ اور کچھ مؤدبانہ تھا۔

سب سے پہلے انہوں نے جا کر جائے واردات کا معائنہ کیا۔ لاش کا جائزہ لیتے ہوئے اے ایس آئی بولا۔ "پولیس کے آنے تک جائے واردات پر کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہئے لیکن آپ لوگوں نے تو پوری واردات کو ہی سوئمنگ پول سے نکال کر باہر رکھا ہوا ہے۔" اس کے کھردرے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ لاشیں اور تشدد کے مظاہرے دیکھنا ان کا روز کا معمول تھا۔

سعید صاحب نے متانت سے کہا "ہم نے لاش اس لئے باہر نکالی تھی برادر کہ ہمیں صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ یہ لاش ہی ہے۔ ہم نے سوچا تھا کہ شاید اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی ہو۔ شاید فوری طور پر طبی امداد میسر آنے سے یہ بچ سکے۔ لیکن باہر نکالنے پر اندازہ ہوا کہ اسے مرے ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے۔"

"معقول بات ہے" اے ایس آئی نے تائید میں سر ہلایا۔ اس کی مشاق نظروں نے چند لمحے میں لاش اور سوئمنگ پول کا جائزہ لے لیا تھا۔ وہ اٹھ کر ہماری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "لاش نکالی کس نے تھی؟"

"انہوں نے۔" سعید صاحب نے میری طرف اشارہ کیا اور میرا تعارف کرایا۔ میرا نام سن کر اے ایس آئی نے گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ کیا۔

"لیکن لاش کی موجودگی کا پتا پہلے ان کو چلا تھا۔" میں نے ارشد موتی کی طرف اشارہ کیا۔

پھر ہم نے وہ سب کچھ اے ایس آئی کو بتایا جو ہم اب تک معلوم کر سکے تھے۔ اے ایس آئی سب کچھ اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا رہا اور آخرکار ڈائری بند کرتے ہوئے بولا "آپ لوگوں نے تو اچھی خاصی تفتیش کر ڈالی ہے۔ یہی تو فائدہ ہوتا ہے پڑھے لکھے ہونے کا۔ لیکن اصل نکتے ابھی آپ لوگوں کو معلوم نہیں۔"

پھر اس نے لاش کو ہلا جلا کر دیکھا۔ ایک لفافہ منگوا کر وہ پرچی اس میں محفوظ کر لی جو لاش کی مٹھی سے برآمد ہوئی تھی۔ پھر اس نے لاش کی تلاشی لینے کی کوشش کی لیکن اس کے لباس میں کوئی جیب وغیرہ نہیں تھی۔

"شاید اس کے پاس کوئی پرس وغیرہ موجود رہا ہو۔ جسے قاتل نے غائب کر دیا ہو۔ یا شاید وہ سوئمنگ پول کی تہ میں پڑا ہو" اے ایس آئی خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ شاید وہ بہ آوازِ بلند سوچ رہا تھا۔

"اگر آپ ضرورت محسوس کریں گے تو کوئی شخص سوئمنگ پول میں اتر کر اچھی طرح تہ کھنگال آئے گا۔" سعید صاحب نے اسے تسلی دی۔ "اور اگر آپ ضروری سمجھیں گے تو سوئمنگ پول خالی کروا دیا جائے گا تاکہ آپ فرش کا معائنہ کر سکیں۔"

"اس کا فیصلہ میں اپنے انسپکٹر صاحب سے مشورے کے بعد کروں گا۔" اے ایس آئی نے سادگی سے کہا "فی الحال میں صرف ابتدائی تفتیش کے لئے آیا ہوں۔ اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ لڑکی کو ہلاک کہاں کیا گیا ہو گا۔"

عقبی لان کی طرف کی ساری بتیاں روشن کر دی گئیں پھر بھی مصنوعی آبشار کے عقب میں پھیلے ہوئے جھنڈ تک پہنچنے کے لئے روشنی ناکافی تھی۔ بہرحال دیگر لائٹس بھی ساتھ لے کر پولیس والوں نے چپے چپے کا جائزہ لینا شروع کیا لیکن کہیں کسی قسم کا کوئی سراغ نظر نہ آیا۔

آخرکار میں نے کہا "اے ایس آئی صاحب! میرا خیال ہے کہ زیادہ دور تک ادھر اُدھر دیکھنے کے بجائے ہمیں پہلے اسی حصے کی طرف دیکھنا چاہئے جہاں سے غالباً پتھر اٹھایا گیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے کہ اگر کوئی سراغ ہو گا تو ادھر ہی پتھروں کے پیچھے، درختوں کے جھنڈ میں یا اس کے آس پاس ہو گا۔" اے ایس آئی اطمینان سے بولا "لیکن ضابطے کی کارروائی کے لئے مجھے سارے لان کا جائزہ تو لینا ہی ہے۔ اس لئے پہلے میں فالتو کام نمٹا رہا ہوں۔" وہ اتنا بے وقوف نہیں تھا جتنا میں سمجھ رہا تھا البتہ ان لوگوں کا کام کرنے کا اپنا ہی ایک انداز تھا۔

سب سے آخر میں اس نے اس حصے کا رخ کیا جدھر میں جانا چاہ رہا تھا۔ آخرکار ہمیں سوئمنگ پول سے کچھ ہی فاصلے پر ایسے

نشانات مل گئے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ لاش کے ساتھ پتھر باندھنے کے بعد وہاں اسے پتھر سمیت گھسیٹا گیا تھا لیکن لڑکی کا ایک سینڈل ہمیں درختوں کے جھنڈ میں پڑا ہوا ملا۔ میرا خیال تھا کہ لڑکی کو بلاک وہیں کیا گیا تھا۔ وہ اتنی ہلکی پھلکی تھی کہ اوسط جسامت کا بھی کوئی شخص اسے آسانی سے اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔ قاتل بھی اس کی لاش کو مصنوعی آبشار تک تو غالباً اٹھا کر ہی لایا تھا لیکن یہاں رک کر لاش کے ساتھ ایک پتھر باندھنے کے بعد اس نے اسے پتھر سمیت گھسیٹ کر سوئمنگ پول میں دھکیل دیا تھا۔ تقریباً یہی نتائج اے ایس آئی نے بھی اخذ کئے تھے تاہم وہ قیاس کا گھوڑا کچھ اور آگے تک دوڑاتے ہوئے بولا "ممکن ہے وہ جب یہاں آکر دوسرے مہمانوں کے انتظار میں اکیلی بیٹھی ہو تو بور ہو کر ادھر اُدھر ٹہلنے لگی ہو۔ درختوں کے جھنڈ تک چلی گئی ہو اور وہاں کسی نوکر کی اس پر نیت خراب ہو گئی ہو۔ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہونے پر اس نے جھنجلاہٹ اور وحشت میں نائیلون کی ڈوری سے اس کا گلا گھونٹ دیا ہو۔" اس نے یوں سعید صاحب کی طرف دیکھا گویا اس موضوع پر ان کی رائے جاننا چاہتا ہو۔

سعید صاحب قدرے تھکے تھکے لہجے میں بولے۔ "اتفاق سے میرے ہاں چوکیدار کے سوا سبھی نوکر بوڑھے ہیں۔ خاصے معمر اور قابلِ اعتبار۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان میں سے کسی پر اس قسم کی وحشت اور جنون طاری ہو سکتا ہے۔ اور جہاں تک چوکیدار کا تعلق ہے' تو اس کے بارے میں مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ بے چارہ آج دوپہر سے ایک لمحے کے لئے بھی گیٹ سے نہیں ہٹا۔ ویسے بھی میرے خیال میں میڈیکل رپورٹ آنے سے پہلے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس پر مجرمانہ حملے کی کوشش کی گئی تھی یا نہیں۔"

"میں بھی صرف اندازے ظاہر کر رہا ہوں جی۔ میں کوئی بات یقین سے تو نہیں کہہ رہا ہوں۔ چالان عدالت میں پیش کرنے تک ہم کوئی بات یقین سے نہیں کہتے۔ کم از کم پبلک کے سامنے نہیں کہتے۔" اے ایس آئی نے مونچھ کو بل دیتے ہوئے بڑی سنجیدگی سے کہا۔ پھر وہ اشارے سے گویا لان کے کچھ حصے کی حد بندی کرتے ہوئے بولا۔ "خیر جناب' جب تک ہماری طرف سے نہ کہا جائے اس وقت تک اتنے حصے میں گھر کا کوئی فرد یا نوکر قدم نہ رکھے۔"

پھر ہم سب واپس اندر ہال میں آگئے۔ اے ایس آئی نے ایک بار پھر ڈائری اور بال پوائنٹ سنبھال لیا لیکن کچھ لکھنے سے پہلے وہ اعلان کرنے کے سے انداز میں بولا۔ "دیکھیں صاحبان! آپ سب شہر کے بڑے معزز' پڑھے لکھے' جانے پہچانے اور اثر و رسوخ والے لوگ ہیں۔ ہمیں بالکل توقع نہیں ہے کہ آپ میں سے کوئی بھی کسی قسم کی غلط بیانی کرسکتا ہے۔ ہم کو یہاں آنے سے پہلے اوپر سے ہدایت ملی تھی کہ ہم یہاں اپنے خاص طور طریقوں کا مظاہرہ بالکل نہ کریں اس لئے آپ نے دیکھا ہی ہوگا کہ میں نے نہ تو کسی پر شبہ ظاہر کیا ہے' نہ کسی کو حراست میں لے رہا ہوں لیکن ظاہر ہے ہم کو اس کیس کا کچھ نہ کچھ تو کرنا ہے' ... قتل کے کیس کو ہم آسانی سے داخل دفتر تو نہیں کر سکتے۔ اس لئے میری آپ صاحبان سے دوستانہ گزارش ہے کہ اگر کسی کو کوئی معمولی سی بھی بات معلوم ہے یا کوئی اس سلسلے میں کچھ کہنا چاہتا ہے' کچھ تسلیم کرنا چاہتا ہے' وہ اس وقت کرلے۔ میرا وعدہ ہے ہم اس کے ساتھ بہت نرمی سے پیش آئیں گے لیکن بعد میں اگر ہم نے اپنے طور پر' اپنی کوششوں سے کچھ معلوم کیا تو پھر ہم رعایت نہیں کریں گے' پھر سفارش اور اثر رسوخ بھی کام نہیں آئے گا۔" اس کی عقابی نظریں فرداً فرداً ہر ایک کے چہرے کا جائزہ لینے لگیں۔ اس نے بڑے پُراعتماد اور دوٹوک لہجے میں بات کی تھی پھر بھی جانے کیوں مجھے اس کے لہجے میں کھوکھلے پن کی جھلک محسوس ہوئی۔ مسلسل مشق سے اس کے لہجے میں گھن گرج تو آگئی تھی لیکن مجھے اس کے عقب سے عمل کی جھنکار سنائی نہیں دے رہی تھی۔

سب خاموش رہے۔ کوئی ایک لفظ بھی نہ بولا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ جیسے آپ صاحبان کی مرضی۔" اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور اپنی جیب سے پیکٹ نکال کر ایک سگریٹ سلگائی حالانکہ اس کے سامنے تپائی پر خوبصورت سگریٹ باکس اور سگار باکس سجا ہوا تھا۔ سنہرا بیضوی لائٹر بھی رکھا تھا۔ اس کی یہ ادا مجھے اچھی لگی۔ اس وقت تک اس کے لئے کافی اور دیگر لوازمات آچکے تھے مگر اس نے ان کی طرف بھی توجہ نہ دی۔

وہ ایک بار پھر ٹٹولنے والی نظروں سے سب کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "کسی کو اس بارے میں بھی بالکل کوئی اندازہ نہیں کہ وہ یہاں کیوں آئی تھی؟"

ڈائریکٹر راحیل بٹ سر کھجاتے ہوئے بولا "جب یہاں کوئی اسے جانتا ہی نہیں تھا تو کسی کو اس کے مقصد کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے؟ میں پندرہ سال سے فلم انڈسٹری میں ہوں اور اسٹوڈیوز کی دیواروں کی ایک ایک اینٹ کو پہچانتا ہوں مگر میں بھی اسے نہیں پہچان سکا تھا۔ اس سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ہمارے لئے وہ کس قدر غیر اہم تھی۔ دلدار قریشی صاحب نے یاد دلایا تب مجھے بھی یاد آیا تھا کہ شاید دو ایک مرتبہ میں نے اسے کہیں ایکسٹرا گرلز کے درمیان دیکھا تھا۔"

"چوہدری صاحب! آپ کو بھی کچھ اندازہ نہیں؟" اے ایس آئی نے میری طرف مڑتے ہوئے پوچھا "آپ کی تو اسے اخلاقی مدد کی ضرورت تھی۔"

"مجھ سے اس کی ملاقات کی نوبت آتی تبھی کچھ کہا جا سکتا تھا" میں نے ملائمت سے کہا۔

"ٹھیک" اے ایس آئی نے گہری سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ مسماۃ ہنی صاحبہ ہی اس کے بارے میں کچھ بتا سکتی ہیں جنہوں نے اس کو آپ کے پاس بھیجا تھا لیکن ان کے بارے میں بھی آپ بتا رہے ہیں کہ ان کا ٹیلی فون ہی شاید ڈیڈ پڑا ہے۔ ویسے میں ان کو تھوڑا سا جانتا ہوں۔ ان کا گھر بھی معلوم ہے۔ میں یہاں سے نمٹنے کے بعد ان کے گھر ہوتا ہوا جاؤں گا۔"

"آپ اپنی کارروائی نمٹا لیں' پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا۔" میں نے کہا۔

تب اس نے ضابطے کی باقی کارروائی نمٹانا شروع کردی۔ اس نے فرداً فرداً سب کے نام پتے' حیثیتیں' فون نمبر اور ہر ایک کا پارٹی میں پہنچنے کا وقت وغیرہ نوٹ کیا۔ اس کام میں خاصی دیر لگ گئی اور اس دوران اس نے مضطربانہ انداز میں کئی سگریٹیں پھونک ڈالیں تاہم اس کا قلم خاصی تیز رفتاری سے نوٹ بک کے صفحات پر پھسلتا رہا۔

آخر کار وہ تمام اندراجات سے فارغ ہو کر نوٹ بک بند کرتے ہوئے بولا۔ "آپ تمام خواتین و حضرات سے گزارش ہے کہ ہمارے انسپکٹر خالد حیات صاحب سے اجازت لئے بغیر شہر سے باہر نہ جائیں اور دورانِ تفتیش اگر کسی صاحب سے فون پر تھوڑی بہت پوچھ گچھ کی جائے یا تھانے آنے کی زحمت دی جائے تو پورا پورا تعاون کریں۔"

"آپ فکر نہ کریں' ایسا ہی ہوگا۔" سعید صاحب نے اسے تسلی دی۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ ہی سب مہمان یوں گہری سانسیں لے کر اٹھے جیسے کسی مصیبت سے جان چھوٹی ہو۔ سب نے سعید صاحب سے ہاتھ ملا ملا کر تیزی سے رخصت ہونا شروع کردیا اور سعید صاحب ہر ایک سے معذرت کرنے لگے۔

آخر کار ہال میں میزبانوں اور پولیس والوں کے علاوہ صرف میں اور ستارہ رہ گئے۔ اے ایس آئی نے اپنے ماتحتوں کو ہدایات دیں کہ لاش کو گاڑی میں رکھ کر کون سے اسپتال لے جانا ہے۔ پھر وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا "میں آپ کے ساتھ آپ کی گاڑی میں مسماۃ ہنی کے گھر چلوں گا۔"

بسر و چشم" میں نے کہا۔

ستارہ میرا بازو چھوتے ہوئے بولی۔ "میں بھی اب چلتی ہوں"

"تم میرے ساتھ نہیں چل رہیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں تھکن اتر آئی تھی۔

"ضرور چلتی لیکن میں بہت تھک گئی ہوں۔ اور اس واقعے نے دل بھی خراب کردیا ہے۔ تم بعد میں مجھے بتانا کہ بات کہاں پہنچی۔" اس کے لہجے میں بھی تھکن تھی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی اور ہم اس کے ساتھ ہی باہر آگئے۔ اس کی گاڑی اور ڈرائیور موجود تھا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد میں نے اے ایس آئی کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھایا اور ہم ہنی کے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔

راستے میں اے ایس آئی واردات اور تفتیش سب کچھ بھول کر حیرت سے میری مرسیڈیز کی ہر چیز دیکھتا رہا اور اس کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا۔ آخر کار وہ سیٹ پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا۔ "یہ تو اندر سے بالکل جہاز لگتی ہے جی!" اس کے لہجے میں نہایت ہی خفیف سی حسرت تھی۔ اس نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کرلیں پھر اس کی سحر زدہ سی آواز جیسے کہیں دور سے آئی۔ "اتنی بڑی بڑی کوٹھیاں' اتنے نوکر چاکر' اتنے بڑے بڑے باغ باغیچے' اتنے بڑے سوئمنگ پول کہ بندہ ڈوب جائے تو پتا نہ چلے۔ ایسی ایسی جہاز جیسی گاڑیاں! میں کہتا ہوں جی آخر لوگوں کے پاس اتنی دولت کہاں سے آجاتی ہے؟"

سوال شاید اس نے اپنے آپ سے کیا تھا مگر میں نے اس کی تسلی کے لئے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ سب اللہ کی دین ہے اے ایس آئی صاحب!"

"ہاں یہ سب اللہ کی دین ہے۔" وہ عجیب سے انداز میں بڑبڑایا پھر یکدم سر جھٹک کر آنکھیں کھول کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ ادھر اُدھر بھٹکتی ہوئی اس کی سوچیں ایک بار پھر جیسے فرائض کی دنیا کی طرف لوٹ آئیں۔ یا پھر شاید بہت عرصے تک ایک پیشے سے وابستہ رہنے کے بعد عادت سی بن جاتی ہے کہ دنیا بھر کی باتیں سوچنے کے بعد آخر کار ذہن اپنے پیشے کی طرف لوٹ آتا ہے۔

وہ ذرا میری طرف کو جھکتے ہوئے بولا "دیکھیں جی! ویسے تو آپ بھی اس پارٹی میں شریک تھے۔ وہاں سب آپ کے دوست ہی ہوں گے ..."

"نہیں۔ کوئی ایسے خاص نہیں تھے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"چلیں' یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ اس صورت میں آپ ذرا غیر جذباتی ہو کر میری بات سن سکتے ہیں۔ یہ آپس کی بات ہے۔ میں آپ کو ان سب لوگوں کے خلاف استعمال کرنے کی کوشش نہیں کررہا۔ بس یونہی آپ کو ایک ہمدرد انسان سمجھ کر بات کررہا ہوں۔ وہ مقتولہ لڑکی مجھے کچھ مظلوم سی لگی ہے۔

آخری لمحوں میں اس کا چہرہ کچھ بگڑ کر رہ گیا تھا اور اس پر صرف موت کا خوف غالب تھا۔ پھر بھی مجھے اس خوف کی تہ میں کوئی عجیب سی بات چھپی ہوئی نظر آتی ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی مہمان نے نشے میں دُھت ہو کر اسے ہلاک کر ڈالا ہو؟ باقی لوگ اس کی پردہ پوشی کر رہے ہوں؟ پیے ہوئے تو وہاں کئی لوگ تھے نا!"

میں دھیرے سے ہنس دیا۔ ایک لمحہ وہ مجھے بے حد ذہین و فطین لگتا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے کچھ کوڑھ مغز اور موٹے دماغ کا معلوم ہونے لگتا تھا۔

میں نے نہایت کم رفتار سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "میں آپ کو یقین دلاتا ہوں اے ایس آئی صاحب! کہ ایسا ہرگز نہیں ہوا ورنہ قاتل کا ہاتھ پکڑ کر آپ کے ہاتھ میں دینے والا سب سے پہلا شخص میں ہوتا۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ پیے ہوئے وہاں بے شک تقریباً سبھی تھے لیکن آپ نے کسی کو بہکا ہوا یا بدمست دیکھا؟ پی پلا کر اتنا بدمست تو ان میں سے شاید کوئی کبھی نہ ہوا ہو کہ کسی کو قتل کر سکے۔ ... یہ کہانی کچھ اور ہی لگتی ہے۔ مجھے یقین ہے وہاں موجود لوگوں میں سے شکی ایک شخص کے سوا کوئی اس لڑکی کو جانتا تک نہیں تھا، اور وہی ایک شخص قاتل ہے۔"

"یہی نتیجہ میں نے بھی اخذ کیا ہے چوہدری صاحب!" وہ مونچھ کو بل دیتے ہوئے مسکرایا۔ "لیکن میرا طریقہ کار ہے کہ ہر اینگل پر تبادلۂ خیال ضرور کر لیتا ہوں۔ چاہے وہ اینگل کتنا ہی بے وقوفانہ کیوں نہ لگتا ہو۔ دراصل ہمارا کام اتنا آسان نہیں ہے۔ یونہی بات سے بات نکلتی ہے۔ اور پھر بعض اوقات واقعات سچ مچ اتنے بے وقوفانہ انداز میں رونما ہوتے ہیں کہ ہم تو جاسوسوں والی باریکیوں میں ہی الجھے رہتے ہیں اور جب حقیقت سامنے آتی ہے تو عقل دنگ رہ جاتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔

"اب دیکھیں نا جی۔ ایک شخص قتل کر کے بھیڑ میں گم ہو گیا ہے۔ اس کو تلاش کرنا آسان تو نہیں ہے۔ جبکہ عالم یہ ہے کہ ابھی ہم جائے واردات کا معائنہ کرنے کے لئے روانہ ہونے لگتے ہیں تو افسروں کے فون آنے شروع ہو جاتے ہیں۔"

مجھے محسوس ہوا کہ اب وہ روایتی انداز میں پولیس والوں کی دشواریوں کا رونا روئے گا۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "حالات کچھ ایسے ہیں اور کچھ آپ پولیس والوں کا سیٹ اپ ایسا ہے کہ جو شخص واردات میں ملوث نہیں ہوتا وہ زیادہ ڈرتا ہے۔ یہاں تو لوگوں کو غیر ضروری پریشانی سے محفوظ رہنے کے لئے فون کرنے پڑے تھے۔"

"بس جی' پولیس والا کوئی چاہے صحیح ہے یا غلط لیکن امیج سب کا ایک جیسا ہے اسی لئے کبھی کبھی تنگ آ کر صحیح پولیس والے بھی دوسرون جیسے ہو جاتے ہیں کہ کیا فائدہ اتنی تکلیفیں انھانے کا' نیک نامی تو پھر بھی حصے میں آئی نہیں ہے۔ اب دیکھیں نا' ہمیں کوئی شوق تو نہیں ہے کہ قاتل آزاد پھرتا رہے۔ اب مثال کے طور پر آپ اسی واردات کو لے لیں۔ قاتل مجھے رشوت کے طور پر کوئی تھیلیاں تو نہیں دے گیا ہے کہ میں جان بوجھ کر اس کو کھلا چھوڑے رکھوں گا۔ لیکن اب ہمیں کوئی الہام تو نہیں ہوا نا کہ اتنے سارے آدمیوں میں سے ایک دم قاتل پر انگلی رکھ دیں۔ لوگوں کے تعاون کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی کو کوئی بات معلوم ہوتی ہے تو وہ ہم کو بتاتا نہیں ہے۔"

"وہ بات پھر کیس کی کارروائی میں شامل ہو جاتی ہے نا۔ اور کس بے چارے میں اتنی ہمت ہوتی ہے کہ دو جملوں کی گواہی دینے کے لئے برسوں عدالت کے چکر کاٹتا رہے اور مخالف پارٹی کے غیظ و غضب کا سامنا بھی کرے۔ اسی لئے تو ہمارے ہاں گمنام ٹیلی فون کالوں کا رواج زیادہ ہے۔ جب کسی کا ضمیر اسے زیادہ ہی مجبور کرتا ہے اور اس کے پاس کوئی کام کی اطلاع ہوتی ہے تو وہ پولیس کو گمنام فون کر دیتا ہے۔ اب یہ پولیس کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ اس اطلاع کو قانون کے کام میں لائے یا اپنے کام میں لائے اور اسے کیش کر لے۔ بہرحال یہ بڑی لمبی بحث ہے۔ نہ جانے کب سے چل رہی ہے اور نہ جانے کب تک چلتی رہے۔" میں نے گویا بات ختم کر دی۔

وہ بے چینی سے پہلو بدل کر رہ گیا۔ میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا' کوئی گاڑی مسلسل میرے تعاقب میں تھی لیکن یہ یقیناً میرے اپنے آدمیوں کی گاڑی تھی۔ وہ میری حفاظت کے سلسلے میں بدستور مستعد تھے۔

اچانک میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اے ایس آئی صاحب! میں کم از کم اس معاملے میں آپ سے غیر معمولی تعاون کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میرے کچھ وسائل ہیں جنہیں میں آپ کی مدد کے لئے استعمال کر سکتا ہوں۔ لیکن بہت سی باتیں ہوتی ہیں جو آپ صرف اپنی وردی اور اختیارات ہی کی وجہ سے معلوم کر سکتے ہیں۔ تو ہم ایسا کرتے ہیں کہ ایک شریفانہ معاہدہ کر لیتے ہیں۔ جو بات آپ معلوم کر سکیں گے وہ آپ مجھ کو بتا دیجئے گا۔ جو میں معلوم کر سکوں گا وہ میں آپ کو بتا دوں گا۔ مقصد ہم دونوں کا یہی ہو گا کہ قاتل کو سزا ملے اور قرار واقعی سزا ملے۔ اور اس کا تمام تر کریڈٹ آپ لے لیجئے گا۔ میں بہت مصروف آدمی ہوں لیکن میں خود اس معاملے میں دلچسپی لوں گا۔ کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر تھوڑی سی بھاگ دوڑ کروں گا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے۔ مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ میرا دل کہتا ہے کہ آپ اس معاملے میں میری مدد کر سکتے ہیں۔" اے ایس آئی نے بلا تامل کہا۔ "میرا نام وغیرہ تو آپ کو معلوم ہو ہی چکا ہے۔ آپ کسی وقت بھی متعلقہ تھانے میں فون کر کے مجھ سے تازہ ترین صورتحال معلوم کر سکتے ہیں۔"

"طے ہو گیا۔" میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے سینے پر شریف سیال کے نام کا بیج آویزاں تھا۔ میں نے یہ نام ذہن نشین کر لیا۔ میں اپنا کارڈ اسے پہلے ہی دے چکا تھا۔

اگلی گلی کا موڑ مڑ کر میں نے گاڑی ہنی کی کوٹھی کے سامنے لے جا روکی۔ کوٹھی مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ویسے تو خیر یہ شرفا کے سونے کا وقت تھا بلکہ میرے خیال میں اس وقت تو شاید وہ لوگ بھی آرام کرنے لگتے ہوں جنہیں کچھ زیادہ شریف نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن ہنی کی کوٹھی جس انداز میں تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی وہ گڑبڑ کا احساس دلانے کے لئے کافی تھا۔ ایسے گھروں میں سب لوگ سو جائیں تب بھی دو ایک جگنوں کی بتیاں جلتی رہتی ہیں۔ اور پھر گیٹ پر چوکیدار بھی موجود نہیں تھا۔

میں نے بتیاں بجھا دیں اور انجن بند کر دیا۔ انجن کی خفیف سی سرسراہٹ بھی مفقود ہو گئی تو ساؤنڈ پروف گاڑی میں بالکل ہی سکوت چھا گیا۔ میں اور اے ایس آئی شریف سیال محتاط انداز میں گاڑی سے اترے اور ہم دونوں نے ہی بے آواز طریقے سے دروازے بند کئے۔ گاڑی سے باہر بھی سناٹا اور سکوت ہی تھا۔ صرف کبھی کبھار جھینگر کا ترانہ سنائی دے جاتا تھا۔ باقی گھروں سے مدھم مدھم سی روشنیاں جھانک رہی تھیں لیکن پھر بھی چاروں طرف اندھیرا ہی غالب تھا۔ ہنی کے گھر کے عین سامنے چھوٹا سا پارک تھا۔ میں نے دو آوارہ کتوں کو اس پارک کے ایک سرے سے داخل ہو کر کاہلی بھرے انداز میں دوسرے سرے کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ کمبخت بھی ہمیں دیکھ کر نہیں بھونکے۔ علاقہ کچھ زیادہ ہی سکوت کا مارا ہوا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر گیٹ کو ذرا سا دھکیلا۔ وہ ہلکی سی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔ پورچ اور لان پر بھی اندھیرا تھا۔ شریف سیال نے اپنا سرکاری ریوالور ہولسٹر سے نکال لیا۔ میں نے بھی ریوالور نکال لینا ہی بہتر سمجھا۔ ہم چوکنا رہتے ہوئے آگے بڑھے۔ ... یہ محض احتیاط تھی ورنہ میری نامعلوم حس نے تو مجھے بتا دیا تھا کہ وہاں کوئی ہماری گھات میں نہیں۔

ڈرائنگ روم کا دروازہ بھی ہمیں کھلا ہی ملا۔ میں نے ٹٹول کر سوئچ بورڈ تلاش کر کے لائٹ آن کر دی۔ شریف سیال نے ریوالور چاروں طرف گھماتے ہوئے کونے کھدروں کا جائزہ لیا مگر وہاں سکوت کے سوا کوئی چیز ہماری منتظر نہیں تھی۔ ڈرائنگ روم میں کسی قسم کی بے ترتیبی نہیں تھی' تمام سامان اور آرائش و زیبائش جوں کی توں تھی۔

ہم یکے بعد دیگرے دوسرے کمروں میں پہنچے۔ سب کے دروازے کھلے تھے اور بتیاں روشن ہونے پر کہیں بھی کسی قسم کی بے ترتیبی نظر نہیں آئی۔ سارا مکان یوں کھلا پڑا تھا جیسے مکین انتہائی بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوئی بھی دروازہ مقفل کئے بغیر اٹھ کر کہیں چلے گئے ہوں۔ نہ جانے کب سے گھر یونہی کھلا پڑا تھا اور یہ اتفاق ہی تھا کہ اس دوران کسی چور اُچکے کو اس سنہری موقع سے استفادہ کرنے کی توفیق نہیں ہوئی تھی ورنہ قیمتی اشیاء تو رہیں ایک طرف' وہ اس بھرے پُرے گھر کے ساز و سامان پر ہی ہاتھ صاف کر کے بڑا عرصہ عیش و آرام سے گزار سکتا تھا۔

"عجیب بات ہے!" شریف سیال بڑبڑایا۔

ہم لاؤنج میں پہنچے تو میری نظر ڈائننگ ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ پر گئی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگا کر دیکھا۔ ٹیلی فون ڈیڈ تھا۔ اچانک کچن کے بند دروازے کے عقب سے اوع... اوع کی آوازیں سنائی دیں۔ ان مدھم آوازوں کو سن کر شریف سیال یکدم دوبارہ چوکنا ہو گیا۔ ریوالور اس نے یوں تان لیا جیسے معمولی سی حرکت نظر آتے ہی گولی چلا دے گا لیکن اس کے برعکس میں نے گہری سانس لے کر ریوالور بغلی ہولسٹر میں رکھ لیا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ آواز جن انسانوں کی ہے وہ کس پوزیشن میں ہوں گے۔

شریف سیال نے ٹھوکر مار کر کچن کا دروازہ کھولا اور اچھل کر ایک طرف کو ہو گیا جیسے کسی متوقع حملے سے بچ رہا ہو ــــ لیکن اندر کی صورتحال میری توقع کے مطابق تھی۔

چوکیدار کے علاوہ ہنی کے گھر میں دو میاں بیوی ملازم تھے۔ میں جب ہنی کے ہاں آیا تھا تو میں نے یہ تین ہی ملازم دیکھے تھے اور وہ تینوں اس وقت کچن کے ٹائیلوں والے فرش پر آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ کچن میں صفائی وغیرہ کے کام آنے والے کپڑے ان کے منہ میں ٹھنسے ہوئے تھے۔ تینوں کے ہاتھ پاؤں ڈوریوں سے بندھے ہوئے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ انہیں ایک دوسرے سے دور رکھنے کے لئے کسی کے ہاتھ سنک کے پائپ سے' کسی کے الماری کے کنڈے میں اور کسی کے اوون کے پائے کے ساتھ بھی باندھ دئے گئے تھے۔

شریف سیال ایک لمبی سانس لے کر رہ گیا۔ اب اس نے بھی ریوالور ہولسٹر میں رکھ لیا۔ ہم دونوں نے کچن کی چھریاں تلاش کر کے ان کی بندشیں کاٹیں کیونکہ ان کی گرہیں کھولنا خاصا وقت طلب مسئلہ نظر آ رہا تھا۔

ان کا دورانِ خون اور حواس بحال ہوئے تو ہم نے انہیں لاؤنج میں لا کر بٹھایا۔ پوچھ گچھ کا کام میں نے شریف سیال پر چھوڑ دیا۔ اس کے تابڑ توڑ سوالات کے جواب میں تینوں نوکروں کی زبانی جو باتیں ہمارے علم میں آئیں ان کا خلاصہ کچھ یوں تھا کہ سرِ شام ایک نازک اندام سی لڑکی جو کافی پریشان معلوم ہوتی تھی' ہنی سے ملنے آئی تھی۔ دو ایک مرتبہ وہ اس سے پہلے بھی گھر آئی تھی لیکن کوئی اس کا نام نہیں جانتا تھا۔ چوکیدار کی زبانی وہ اپنی آمد کی اطلاع صرف یہ کہہ کر بھجواتی تھی کہ بے بی آئی ہے۔ بے بی غالباً اس کی عُرفیت تھی۔

آج ہنی اس کے ساتھ دیر تک ڈرائنگ روم میں بیٹھی باتیں

کرتی رہی۔ چائے اور لوازمات وغیرہ کا دور بھی چلا۔ پھر ہنی اسے لاؤنج میں لے آئی۔ وہاں اس نے اپنی ڈائری سے ایک ورق پھاڑ کر اسے کچھ لکھ کر بھی دیا اور وہ چلی گئی۔ چوکیدار نے اسے پیدل ہی مین روڈ کی طرف جاتے دیکھا۔ حلئے وغیرہ کی مدد سے اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ یہ بے بی اس لڑکی کے سوا کوئی نہیں تھی جس کی لاش سعید صاحب کے ہاں سوئمنگ پول سے ملی تھی۔

بے بی کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد ہنی نے چوکیدار کو بلایا تھا۔ وہ ٹیلی فون کا ریسیور ہاتھ میں لئے بیٹھی تھی اور بہت پریشان معلوم ہوتی تھی۔ اس نے چوکیدار کو ہدایت کی کہ وہ پچھلی گلی میں جا کر ٹیلی فون کی تار والا پول چیک کرے۔ اسے شبہ ہے کہ کسی نے فون کا تار کاٹ دیا ہے۔

چوکیدار چونکہ جلدی میں یونہی اٹھ کر چلا آیا تھا اس لئے اس نے سوچا کہ پہلے گیٹ کو مقفل کر آئے پھر عقبی دروازے سے پچھلی گلی میں جائے گا۔ مگر جب وہ پورچ میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ گیٹ کھل چکا تھا اور لمبی سی ایک سیاہ گاڑی پورچ میں داخل ہو رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا' منہ پر ڈھاٹا باندھے ایک شخص بجلی کی سی تیزی سے گاڑی سے اترا اور اس نے اپنی رائفل کا بٹ چوکیدار کی کنپٹی پر رسید کیا' وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

اس کے بعد کی باتیں ان میاں بیوی نے بتائیں جو گھر کے دیگر کام کاج کرتے تھے۔ عورت اس وقت کچن میں تھی۔ مرد ڈائننگ ٹیبل صاف کر رہا تھا جب وہ لوگ دندناتے ہوئے لاؤنج میں آئے۔ وہ تعداد میں تین تھے۔ تینوں کے چہرے چھپے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں رائفلیں تھیں۔ نوکر اور نوکرانی کو تو بے ہوش کرنے کی بھی ضرورت پیش نہیں آئی۔ انہوں نے ان دونوں کو تو یونہی باندھ کر' منہ میں کپڑا ٹھونس کر کچن میں ڈال دیا۔ ایک شخص ہنی اور اس کی ماں پر رائفل تانے کھڑا رہا۔ پھر انہوں نے چوکیدار کو بھی کچن میں لا پھینکا اور کچن کا دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے بس ہنی کی ایک گھٹی گھٹی سی چیخ سنی پھر سناٹا چھا گیا۔

یہ واقعہ اس وقت کا تھا جب شام کا سرمئی اندھیرا پھیل چکا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ سر شام اس علاقے کے ایک گھر میں گھس کر تین مسلح افراد دو عورتوں کو اغوا کر کے لے گئے تھے اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی! یا شاید کسی کو خبر ہوئی بھی ہو تو وہ بے خبر بن گیا ہو۔

شریف سیال نے بہت سے سوالات کے ذریعے ہر ممکن کوشش کی کہ اغوا کرنے والوں کے بارے میں کوئی سراغ مل سکے مگر اسے ناکامی ہوئی۔

آخر کار وہ گہری سانس لے کر میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "لیں جی! اس کو کہتے ہیں نماز بخشوانے جانا اور روزے گلے

پڑ جانا۔ ہم یہاں اس لئے آئے تھے کہ سعید صاحب کے ہاں قتل ہونے والی لڑکی کے بارے میں کوئی سراغ ملے گا لیکن یہاں ایک اور ہی ایف آئی آر تیار رکھی ہوئی ہے۔"

میں خاموش رہا تو وہ افسردگی سے سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"اب آپ ایسا کریں جی کہ مجھے اور ان تینوں نوکر صاحبان کو اپنی گاڑی میں تھانے تک چھوڑ دیں۔ میں ان کے باضابطہ بیانات قلمبند کروں گا۔ ایف آئی آر درج کروں گا۔"

تینوں ملازموں کے چہروں پر خوف کی پرچھائیاں نظر آنے لگیں۔ میں نے شریف سیال سے پوچھا۔ "ان کے ساتھ وہ خاص الخاص تفتیش تو نہیں ہو گی جس کے سلسلے میں ہماری پولیس مشہور ہے؟"

"نہیں" شریف سیال گہری سانس لے کر بولا۔ "اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ مجھے ان کے بیانات پر یقین ہے۔" میں نے چوکیدار کا سر ٹٹول کر نہیں دیکھا مگر مجھے اس کی کنپٹی پر بڑا سا گومڑ نظر آ رہا ہے۔ میری نظر ایک پولیس والے کی نظر ہے۔"

"بے شک" میں نے تائید کی حالانکہ وہ گومڑ اس سے پہلے شاید میں دیکھ چکا تھا۔ اس کی بات سن کر نوکروں کے چہروں پر قدرے اطمینان جھلک آیا۔

شریف سیال بولا "باقی پاس پڑوس والوں سے میں کل ہی معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ اس وقت تو شریف شرفا لوگوں کی نیند خراب کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ ویسے بھی مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہونے کی امید نہیں ہے ورنہ کسی کے آرام وغیرہ کی تو میں اتنی پروا نہ کرتا۔"

"ٹھیک ہے تو پھر آیئے چلیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

میں اس وقت بظاہر پرسکون تھا لیکن درحقیقت بہت پریشان تھا۔ یہ زہریلا سوال مجھے مسلسل ڈس رہا تھا کہ وہ مخلص سی لڑکی اس وقت نہ جانے کس حال میں ہو گی؟ میں اپنے تمام تر وسائل کے باوجود اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ میرے آدمی میری حفاظت کے لئے تو سائے کی طرح میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ کاش میں نے انہیں ہنی کی نگرانی کی ہدایت بھی کر دی ہوتی۔ لیکن اس طرف میرا ذہن ہی نہیں گیا تھا۔ مجھے اندیشہ ہی محسوس نہیں ہوا تھا کہ ہنی کو اس قسم کا بھی کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔

یہ بھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سعید صاحب کے ہاں اس ایکسٹرا گرل کا قتل اور ہنی کا اغوا کسی ایک ہی سلسلے کی کڑی تھی یا یہ دو الگ الگ واقعات تھے جو محض اتفاقاً تقریباً ایک ساتھ پیش آئے تھے۔

چوکیدار نے بتایا تھا کہ جس وقت اس نے پورچ میں گاڑی آتے دیکھی تو سب سے پہلی کوشش یہی کی تھی کہ گاڑی کا نمبر دیکھ سکے لیکن گاڑی پر سرے سے کوئی نمبر پلیٹ ہی موجود نہیں

تھی۔ کم از کم آگے کی طرف تو نہیں تھی۔ گویا اس سلسلے میں کوئی سراغ ہمارے سامنے نہیں تھا اور یہ میرے لئے بڑی تکلیف کی بات تھی۔ شریف سیال کا اس صورتِ حال سے کوئی جذباتی تعلق نہیں تھا۔ یہ اس کے پیشہ ورانہ معمولات کا ایک حصہ تھا۔ اس لئے اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سوائے اس کے کہ وہ پہلے کی نسبت ذرا زیادہ تھکا ہوا دکھائی دینے لگا تھا۔

اغوا کرنے والے ہنی سے نہ جانے کیا سلوک کر رہے ہوں گے؟ اگر ہم کوئی سراغ نہ پا سکے تو کیا وہ اسی عذاب میں گرفتار' ہماری نظروں سے اوجھل رہے گی؟ اس تصور سے میں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

میں نے ان چاروں کو تھانے کے سامنے اتارا اور غیر ارادی طور پر نہایت تیز رفتاری سے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ویران سڑکوں پر گویا ان گنت سوال رقم تھے اور مجھے ڈسنے کے لئے چاروں طرف سے لپک رہے تھے۔ میں جلد از جلد کہیں منہ چھپا لینا چاہتا تھا۔

لیکن گھر پہنچا تو بستر نے بھی صحیح معنوں میں مجھے پناہ نہ دی۔ شب خوابی کے لباس میں' انتہائی آرام دہ بستر پر' انتہائی پرسکون کمرے میں بھی میں بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا اور بار بار چھت کو گھورتا رہا' جیسے اس کی بے داغ سطح پر میرے سوالوں کے جواب ابھر آئیں گے۔ کبھی کبھی میں چاہتا تو بے حسی کا لبادہ اوڑھ کر کیسی بھی قسم کے حالات میں سو جاتا تھا لیکن آج یہ خصوصیت بھی میرے کام نہیں آ رہی تھی' یہ صلاحیت جیسے مجھ میں باقی ہی نہیں رہی تھی۔ یہ شاید اس لڑکی ہنی کے خلوص کا کمال تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ اس رات میں سویا یا نہیں۔ بہرحال صبح اٹھ کر میں معمول کے مطابق آفس پہنچا اور بے دلی سے چند ضروری کام نمٹائے۔ دس بجے کے قریب میں نے اے ایس آئی شریف سیال کو فون کیا۔

"بے بی کے قتل کے سلسلے میں آپ کے پاس ایک سراغ تھا نا۔" میں نے کہا۔ "اس ایکسٹرا سپلائر کا نام جس سے بے بی کی رہائش وغیرہ کے بارے میں معلوم ہو سکتا تھا۔ دلدار قریشی صاحب نے بتایا تھا نا کہ اس کا نام عبدالواحد تھا۔ آپ نے اس سے رابطہ قائم کیا؟ بے بی کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟"

جواباً فون پر پہلے ایک ایسی آواز سنائی دی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ شریف سیال نے ایک طویل جماہی لی تھی۔ پھر وہ گویا خوش مزاجی سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "آپ بھی کمال کرتے ہیں چوہدری صاحب! کل میں نے ایک طرح سے ڈبل ڈیوٹی دی۔ فجر کے وقت سے ذرا پہلے تو آپ نے مجھے

دستک

انوار صدیقی

تھانے پر ڈراپ کیا تھا۔ مزید کارروائی کرتے کرتے فجر کی اذان ہو گئی تھی۔ اس کے بعد میں نے گھر جا کر مشکل سے دو گھنٹے کی نیند لی اور وردی بدلے بغیر ہی چند منٹ پہلے ہی آ کر دفتر میں قدم رکھا ہے کہ آپ کا ٹیلی فون آ گیا۔ چوہدری صاحب! ہمارے حال پر رحم کھائیں۔ کام کا ایسا ڈھیر لگا پڑا ہے کہ ہفتے ہفتے بھر صحیح طرح بیوی سے بات کرنے کا بھی موقع نہیں ملتا۔ نفری اتنی کم ہے۔ اور لگتا ایسا ہے جیسے شہر کا ہر آدمی واردات کرنے پر تلا ہوا ہے۔ شاید سب لوگ بڑی جلدی میں ہیں کہ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے اس لئے جلد از جلد ایک آدھ ہاتھ مار لو۔ اب آپ دیکھیں نہ چوہدری صاحب! تفتیش تو نمبروار ہی ہو گی نا۔ بہرحال۔ آپ فکر نہ کریں جی۔ میں کرتا ہوں کچھ نہ کچھ۔ اور جیسے ہی کوئی کام کی بات معلوم ہو گی میں آپ کو فون کر دوں گا۔ آپ کو کیا معلوم جی کہ شریف سیال کی جان کتنے بکھیڑوں میں پھنسی ہوئی ہے۔"

پھر شاید وہ ادھر ادھر دیکھ کر ایک لمحے کے توقف کے بعد رازدارانہ سے لہجے میں بولا۔ "اس تھانے میں صرف ہم دو تین ہی آدمی ہیں جو جان لڑا کر کام کرتے ہیں ورنہ باقیوں کو کوئی پروا نہیں۔ ہم نہ ہوتے تو شاید اس سے بھی برا حال ہوتا۔ یہ تھانہ شاید داخلِ دفتر کیسوں کی فائلوں کے انبار میں دب چکا ہوتا۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا میری بات؟"

"ہاں میں سمجھ رہا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی تقریر کو مزید طول دیتا' میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں خود ہی دیکھتا ہوں کہ میں کیا کر سکتا ہوں اس سلسلے میں۔"

"ہاں جی' آپ بالکل کریں' بے فکر ہو کر کریں۔ میری طرف سے آپ کو پوری اجازت ہے۔ آپ پولیس سے تعاون کریں' پولیس آپ سے تعاون کرے گی۔" اس نے فراخدلی سے کہا۔

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ فون پر اس کی دوسری جماہی کی آواز سن کر میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد میں نے اپنے اسٹوڈیو والے آفس فون کیا۔ آفاق دفتر پہنچ چکا تھا۔ میں نے کہا۔ "تمہیں یاد ہو گا' کل رات والے واقعے کے بعد فلمساز اور ہدایت کار دلدار قریشی نے ایک ایکسٹرا سپلائر کا ذکر کیا تھا جس نے ایک بار ان سے مقتولہ بے بی

بھی ایکسٹرا سپلائرز سے تھا مگر عبدالواحد ذرا اپنی فطری نرمی کے باعث اس سے کچھ ہمدردی رکھتا تھا۔ لیکن اب اسے تشویش

کی سفارش کی تھی؟"

"جی ہاں۔ عبدالواحد کا ذکر کر رہے تھے نا وہ؟ میں جانتا ہوں اسے۔ یہاں اسٹوڈیو کے قریب ہی ملتان روڈ پر رہتا ہے۔ ہے تو وہ ایکسٹرا سپلائر مگر طبعاً شریف آدمی ہے۔ پریشانیوں میں پھنسے ہوئے لوگوں کی مدد کرنے کی کوشش کرتا ہے۔"

"تم فوری طور پر اس سے رابطہ قائم کرو۔ اس کے ہاں ٹیلی فون ہو تو فون کر لو۔ اگر فون نہیں ہے تو خود چلے جاؤ یا کسی آدمی کو بھیجو۔ اس سے معلوم کرنا ہے کہ بے بی کہاں رہتی تھی۔ اس کا مکمل ایڈریس۔ اس کے علاوہ خود عبدالواحد کا بھی ایڈریس چاہئے مجھے۔" میں نے کہا۔

"میں تھوڑی دیر میں فون کرتا ہوں آپ کو۔" آفاق نے کہا۔ "آپ اس معاملے میں ذاتی طور پر دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"ہاں" میں نے اسے ہنی کے اغوا کے بارے میں بتایا اور کہا۔ "میں اپنی صرف یہ الجھن دور کرنا چاہتا ہوں کہ ان دونوں واقعات کے درمیان کوئی تعلق تو نہیں؟ اور کیا ایک واقعے کی مدد سے دوسرے کے بارے میں کچھ سراغ مل سکتا ہے یا نہیں؟ میں تمہارے فون کا انتظار کر رہا ہوں۔" میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد میری دو اوورسیز کالز آ گئیں اور میں خاصی دیر تک فون پر ہی مصروف رہا۔ اس وقت میں انٹرکام پر اپنے ایکسپورٹ منیجر کو چند ضروری ہدایات دے کر ایک فائل کی طرف متوجہ ہی ہوا تھا جب آفاق کا فون آیا۔

"بے بی رائل پارک کی ایک بلڈنگ میں رہتی تھی سر!" آفاق نے بتایا۔ پھر بلڈنگ کا نام اور نمبر وغیرہ نوٹ کرانے کے بعد وہ بولا۔ "ویسے بے بی کا اصل نام نشاط تھا۔ عبدالواحد اس کے قتل کا سن کر بہت پریشان ہے۔"

"کیا اس کا اس لڑکی سے کوئی جذباتی تعلق نظر آتا ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں، نہیں سر!" آفاق بولا۔ "عبدالواحد تو ادھیڑ عمر آدمی ہے....."

"تو کیا ایک ادھیڑ عمر آدمی کا ایک نوجوان لڑکی سے جذباتی تعلق نہیں ہو سکتا؟" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"وہ سر.... عبدالواحد کو چونکہ میں خاصے عرصے سے جانتا ہوں اس لئے کہہ رہا ہوں۔ بڑے بڑے بچے ہیں اس کے۔ جذباتیت کے جراثیم کافی حد تک ختم ہو چکے ہیں اس میں۔ ویسے بھی سر! یہ جو ایکسٹرا سپلائر اور ایکسٹرا گرلز ہوتی ہیں، یہ سب اپنی اپنی جگہ پروفیشنل، بڑے غیر جذباتی سے لوگ ہوتے ہیں۔"

"تو پھر اسے پریشانی کس بات کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسی بات کی کہ کہیں پولیس اسے اس معاملے میں زیادہ گھسیٹنے کی کوشش نہ کرے۔ حالانکہ بے بی کا کاروباری تعلق تو یہ ہے کہ اسے تو بے بی کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں، سوائے اس کے کہ اس کا اصل نام نشاط تھا اور وہ رائل پارک کی ایک بلڈنگ میں کرائے کے کمرے میں رہتی تھی۔"

"میرا خیال ہے اسے تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم اسے تسلی دے دو۔" میں نے کہا۔ "میں نہیں سمجھتا کہ اس لڑکی کی موت کو.... میرا مطلب ہے اس کے قتل کو پولیس یا کوئی اور زیادہ اہمیت دے گا۔ وہ ایک غریب اور غالباً پریشان حال لڑکی تھی۔"

"لیکن مجھے لگتا ہے کہ آپ اس کی موت کو کافی اہمیت دے رہے ہیں۔" آفاق ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔

"شاید" میں نے مبہم لہجے میں کہا کیونکہ یہ بات ابھی خود مجھ پر بھی واضح نہیں تھی۔ پھر میں نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ دفتر کے باقی کاموں کے سلسلے میں ایکسپورٹ منیجر، جنرل منیجر اور کیشئرن کو ہدایات دے کر میں اٹھ کھڑا ہوا۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں رائل پارک پہنچا۔ یہاں کی بیشتر عمارتیں قیام پاکستان سے پہلے کی تھیں۔ ان میں سے بیشتر میں فلمی دفاتر قائم تھے لیکن بعض میں رہائش بھی تھی۔ ہر طبقے اور ہر مزاج کے لوگ آباد تھے۔ گلیاں زیادہ کشادہ نہیں تھیں۔ جس گلی میں میری مطلوبہ عمارت واقع تھی، وہ تو خاصی تنگ تھی۔ اگر میں گاڑی وہیں کھڑی کر دیتا تو راستہ تقریباً مکمل طور پر ہی بند ہو جاتا۔ اس لئے میں آگے نکال لے گیا اور نسبتاً ایک کشادہ جگہ پر کھڑی کر کے واپس آیا۔ ٹونی کی گاڑی جو میری حفاظت کی غرض سے میری نگرانی پر مامور ہو چکی تھی، گلی کے کونے پر موجود تھی۔

تین سیڑھیاں چڑھ کر میں عمارت کے پرانے اور موٹے موٹے تختوں والے چوبی دروازے سے اندر پہنچا۔ یہ قدیم طرز کی تین منزلہ عمارت تھی۔ نیچے نیم دائرے میں ایک دوسرے سے جڑے ہوئے کئی کمرے تھے۔ تقریباً اسی انداز میں اوپر کی منزلوں پر کمرے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے سامنے آہنی جنگلے والی لمبی سی مشترکہ بالکونی بھی تھی۔ بائیں ہاتھ پر سیڑھیاں تھیں اور پوری عمارت میں ناگوار سی بو پھیلی ہوئی تھی۔

تنگ سی سیڑھیاں چڑھ کر میں پہلی منزل پر پہنچا تو ایک کمرے کے دروازے پر بیٹھی ہوئی موٹی سی ادھیڑ عمر عورت نے سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا اور اچانک اٹھ کر چیختی ہوئی مجھ پر جھپٹی۔ "آخر تم آ ہی گئے۔ آؤ، آؤ" اس کی کرخت آواز سے میرا ذہن جھنجھنا اٹھا۔

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگرانی ابھی جاری ہے باقی واقعات تیسرے حصے میں پڑھیں۔

سرکش

3

محمود احمد مودی

سرکش/3

ایک ثانیے کے لئے تو میں گھبرا سا گیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اسی دوران غیر ارادی طور پر میرا ایک ہاتھ جیب میں پڑے ہوئے ریوالور کی طرف چلا گیا اور دوسرے ہاتھ سے میں نے اس عورت کو مزید آگے بڑھنے اور اپنے آپ پر جھپٹنے سے باز رکھا۔

وہ مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر ہی رک گئی اور میں نے ریوالور نکالنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ وہ اتنی خوفناک نہیں تھی جتنی چیخنے اور اچانک اٹھ کر جھپٹنے کی وجہ سے نظر آئی تھی۔ اس کی انگلیوں میں ایک سگریٹ سلگ رہی تھی جس سے اٹھتے ہوئے دھوئیں کی بو معمول سے کچھ زیادہ ناگوار تھی۔

جوانی میں وہ یقیناً ایک حسین عورت رہی ہو گی۔ مگر اب محض ایک کھنڈر تھی۔ اس کے کھچڑی بال منتشر تھے۔ لباس کا اسے کچھ ہوش نہیں تھا۔ نہ جانے کتنے دن سے وہ اس کے تن پر تھا۔ اس

کے ہونٹ کچھ سوچ ہوئے سے لگ رہے تھے اور ان پر بیاروں والی نیلاہٹ سی تھی۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ چہرے پر جھائیاں پڑی ہوئی تھیں۔ آنکھیں جو یقیناً کبھی بے حد خوبصورت رہی ہوں گی، وحشت سے پُر تھیں۔

مجھ پر جھپٹتے وقت تو وہ چلائی تھی۔ "آخر تم آ ہی گئے.... آؤ.... آؤ" لیکن جب میں نے ہاتھ سے اسے دو ڈھائی فٹ کے فاصلے پر روک دیا تو اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یوں میری طرف دیکھا جیسے از سرنو پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ پھر اس کے تاثرات یکدم بدل گئے۔ وحشت زدہ چہرے پر یک لخت شکست خوردگی پھیل گئی۔ ہونٹ لرزنے لگے اور سرخ سرخ وحشی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اس کا سر دھیرے دھیرے نفی میں ہلا اور پھر وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔ "نہیں.... نہیں.... تم تو وہ نہیں ہو...."

اس کی آواز معدوم ہو گئی لیکن ہونٹ دھیرے دھیرے لرزتے رہے۔ ... پھر وہ شکست خوردہ سے انداز میں خود ہی پیچھے ہٹی اور اسی کمرے کی دہلیز پر جا بیٹھی جہاں سے اٹھ کر آئی تھی۔ آنسوؤں کی دو لکیریں اس کے رخساروں پر نمودار ہو چکی تھیں اور وہ قدرے مجنونانہ سے انداز میں اس مڑی تڑی سی سگریٹ کے کش لینے لگی جیسے اسے آن کی آن میں ختم کر دینا چاہتی ہو۔ فضا میں چرس کی ناگوار بُو پھیل گئی۔

اپنے عقب میں کسی کے گہری سانس لینے کی آواز سن کر میں نے مڑ کر دیکھا۔ دبلا پتلا سا ایک سانولا نوجوان نہ جانے کس وقت میرے عقب میں سیڑھیاں چڑھ آیا تھا۔ اسے غالباً آگے جانا تھا لیکن میں اس کی راہ میں حائل تھا۔ تاہم وہ قطعی عجلت میں نہیں تھا۔ میری اس سے نظر ملی تو وہ قدرے افسردگی سے مسکراتے ہوئے ملائم لہجے میں بولا۔ "آپ پریشان نہیں ہوئے؟" اس وقت تک میرے تاثرات یقیناً معمول پر آ چکے تھے۔

"ہوا.... لیکن زیادہ نہیں...." میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اگر یہ عورت پاگل ہے تو اسے پاگل خانے کیوں نہیں پہنچایا گیا؟"

"جن پاگلوں سے لوگوں کو ہمدردی ہوتی ہے انہیں عموماً پاگل خانے نہیں پہنچایا جاتا۔" نوجوان بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔ وہ بے حد نرم خو نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ اس میں نوجوانوں والی تندی و طراری نہیں تھی۔ وہ معمولی سی قمیص پتلون اور سویٹر میں تھا اور اس کی روح پر کسی بے عنوان سی اداسی کی تہہ جمی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی ہلکی سی افسردگی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "اور پھر یہ کوئی ایسی خطرناک پاگل بھی نہیں ہے۔ یہ کسی کو نہیں ستاتی۔ اپنے آپ کو مختلف قسم کے نشوں میں غرق کئے اپنے کمرے میں پڑی رہتی ہے۔ اس کا پاگل پن بس اتنا ہے کہ آپ جیسے کسی خوش پوش اور خوبرو آدمی کو آتے دیکھتی ہے تو بے اختیار اٹھ کر چلاتی ہوئی بھاگتی ہے۔ تم آ گئے.... تم آ گئے....! لیکن یہ اس کی صحیح الدماغی کی دلیل ہے کہ چند لمحے بعد خود ہی پیچھے ہٹ کر بیٹھ جاتی ہے۔ یعنی ا[سے] احساس ہو جاتا ہے کہ آنے والا وہ نہیں ہے جس کا اسے انتظا[ر ہے۔"]

"اوہ...." میں نے متاسفانہ سے انداز میں گہری سانس [لے] کر عورت کی طرف دیکھا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ سے ٹیک [لگائے] بیٹھی تھی۔ اب وہ ہماری طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کی وا آنکھیں بظاہر بالکونی کے جنگلے کو دیکھ رہی تھیں لیکن [اس کی] نظریں یقیناً اس سے بھی کہیں دور مرکوز تھیں۔ ان دیواروں [کے] پار۔ یا پھر شاید وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

"آپ اسی عمارت میں رہتے ہیں؟" میں نے نوجوان [سے] پوچھا۔

"جی ہاں۔ میں پیدا ہی اس عمارت میں ہوا تھا۔" اس [کی] مسکراہٹ میں افسردگی کی آمیزش کچھ بڑھ گئی۔ "اور شاید [اسی] عمارت میں مروں گا۔" لیکن دوسرے ہی لمحے وہ گویا اپنی افسرد[گی] چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ ہم میں سے بھی [کوئی] نہیں جانتا کہ اس عورت کو کس کا انتظار ہے۔" ان دو لفظوں 'اس عورت' پر اس نے کچھ زور دیا تھا۔ قدرے چبھتے ہو[ئے] انداز میں یہ الفاظ ادا کئے تھے۔

پھر وہ خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "میں اس کے لئے 'اس عورت' کے الفاظ آپ کی طرف سے استعمال کر رہا ہوں ورنہ ہم کم از کم اسے پہچانتے ضرور ہیں اور اس کی آج بھی ع[زت] کرتے ہیں۔ مگر مجھے معلوم ہے آپ نے اسے نہیں پہچانا ہو[گا۔] آپ کی نظر میں یہ ایک عام سی پاگل عورت ہو گی۔ بہت کم لو[گ] اب اسے پہچانتے ہیں۔"

"کون ہے یہ خاتون؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"اپنے وقت کی ملکۂ جذبات شکیلہ بیگم۔" نوجوان نے ٹھہ[رے] ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔ "کبھی لوگ پردۂ سیمیں پر اس [کی] اداکاری دیکھ کر رو پڑتے تھے۔ آج اس کی حقیقی زندگی دیکھ کر [لوگوں] کی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ شاید یہ دنیا میں صرف رونے رلا[نے] کے لئے ہی آئی تھی۔"

میں اپنی جگہ سن سا ہو کر رہ گیا۔ میں نے گہری نظروں [سے] اس عورت کی طرف دیکھا۔ اس کھنڈر میں واقعی مجھے ایک [جانی] پہچانی سی عمارت کے مسخ شدہ خدوخال نظر آئے۔ اپنے بچپن [یا] لڑکپن میں میں نے اس کی بہت سی فلمیں دیکھی تھیں جو میر[ے] بچپن یا لڑکپن سے بھی پہلے کی بنی ہوتی تھیں اور بڑے بڑے شہ[روں] میں چلنے اور گھس پٹ جانے کے بعد ہمارے قصبے یا قریبی [شہر] سیالکوٹ میں آ کر لگتی تھیں۔

میں نے ایک فلم میں اسے جوان کردار میں بھی دیکھا تھا۔ [بے] پناہ خوبصورت عورت تھی وہ۔ لیکن جوان کرداروں میں بہت [کم] آئی تھی۔ جوانی میں ہی مستقل طور پر اس کے بالوں پر سفیدہ [مل دیا] گیا تھا۔ وہ ملکۂ جذبات کہلانے لگی تھی۔ بہت سے ایوارڈ لئے [تھے۔] بہت نام کمایا تھا۔ لیکن مجھے یاد نہیں تھا کہ کب اس کی [شہرت] کا سورج غروب ہونا شروع ہوا تھا اور کب وہ مکمل گمنامی کے [اند]ھیرے میں چھپ گئی تھی۔ عملی زندگی میں آنے کے بعد ویسے بھی [فلم]وں میں میری دلچسپی کم ہو گئی تھی۔

"یہ اس حال کو کیونکر پہنچ گئی؟" میں نے دکھ سے پوچھا۔

"یہ تو شاید اسے خود بھی معلوم نہ ہو۔ ہمیں بھی معلوم نہیں [ہے۔] اسے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔" نوجوان دھیمے لہجے [میں] بولا۔ "دو سال پہلے تک یہ لبرٹی مارکیٹ کے ایک فلیٹ میں [ر]ہتی تھی.... اور اس سے پہلے ایک اچھی بھلی کوٹھی میں رہتی تھی۔ [س]نا ہے کوئی بانکا سجیلا نوجوان تھا جس کو اس سے محبت کا دعویٰ تھا۔ [و]ہ اس کا سب کچھ بیچ باچ کر ملک سے باہر چلا گیا۔ کچھ عرصہ اور [ملک] میں رہتا تو شاید وہ اسے بھی بیچ جاتا...." نوجوان اپنے [مخ]صوص افسردہ سے انداز میں مسکرایا اور ایک لمحے کے توقف سے [بو]لا۔ "فلمی عورتیں بہت چالاک سمجھی جاتی ہیں لیکن عجیب بات [ی]ہ ہے کہ کچھ لوگ چالاکیوں میں انہیں بھی مات دے جاتے ہیں۔"

مجھے اس نوجوان میں ذرا کشش محسوس ہوئی۔ وہ بالکل ہی [ع]ام سا نوجوان نہیں تھا۔ اس میں یقیناً کچھ صلاحیتیں موجود تھیں جو [ش]اید مناسب حالات میسر نہ آنے کی وجہ سے پنپ نہیں سکی تھیں۔ [اور] اگر یہ اندازہ غلط تھا تب بھی اس میں کم از کم انسانی اخلاص اور [اس] کے سینے میں ایک دردمند دل ضرور موجود تھا۔

"تم کرتے کیا ہو نوجوان؟" میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"وہی جو اس ملک کے بیشتر نوجوان کرتے ہیں۔" اس کا لہجہ [ج]ارحانہ نہیں تھا پھر بھی اس میں ایک کاٹ تھی۔

میں سمجھ تو گیا تھا پھر بھی میں نے یونہی تصدیق کی خاطر کہا۔ [”]میں سمجھا نہیں۔"

"بی اے کا بے وقعت سرٹیفکیٹ ہاتھ میں لئے [جو]تیاں چٹخاتا پھرتا ہوں۔" اس نے اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں جواب دیا پھر ہاتھ میں پکڑا ہوا ایک خالی لفافہ ذرا بلند کر کے مجھے دکھاتے ہوئے بولا۔ "گھر والوں کے پکانے کے لئے دال دلیے کا کچھ سامان لینے گیا تھا۔ یہ انہیں دے کر میں اپنے سرٹیفکیٹس اور متعلقہ بیسیوں کاغذات کی موٹی سی فائل اٹھاؤں گا اور حسب معمول دفتروں کے چکر لگانے اور ان افسروں کے سامنے پیش ہونے کے لئے نکل جاؤں گا جو اپنے ائرکنڈیشنڈ دفتروں میں بیٹھے 'انٹرویو انٹرویو' کھیل رہے ہوں گے۔ اس وقت تو میں آپ کو کافی حد تک انسانی حلئے میں نظر آ رہا ہوں لیکن واپسی پر آپ مجھے دیکھنے کے لئے یہاں موجود نہیں ہوں گے۔ اس وقت تک بسوں اور ویگنوں میں مرغا بن کر نہ جانے کہاں کہاں تک کا سفر کر کے اور نہ جانے کہاں کہاں تک پیدل چلنے اور دھول مٹی پھانکنے کے بعد حالت بہت بدل چکی ہو گی لیکن پھر بھی ان سب چیزوں سے زیادہ تکلیف دہ اور تھکا دینے والی چیز وہ ناکامی کی شرمندگی ہو گی جسے چہرے پر لئے مجھے اپنی ماں اور بہن بھائیوں کا سامنا کرنا ہو گا۔" اس کے لہجے میں اب بھی احتجاج یا تندی نہیں تھی لیکن اس پُرسکون جھیل کی تہہ میں یقیناً زہر گھلا ہو تھا۔

"تم رہتے کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس نے دوسری منزل کی بالکونی کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا۔ "وہاں ایک کمرے میں ہم پانچ افراد رہتے ہیں۔" جس کمرے کی طرف وہ اشارہ کر رہا تھا اس کا سفید دروازہ بند نظر آ رہا تھا۔

میں نے اپنا کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "نوجوان! تم آج کل میں فون پر وقت طے کر کے مجھ سے ملو۔ شاید میں تمہارے لئے کچھ کر سکوں۔ ایسے نوجوان مجھے کارآمد محسوس ہوتے ہیں جن کے سینے میں راکھ کی تہہ میں کوئی نہ کوئی چنگاری سی سلگ رہی ہو۔ نام کیا ہے تمہارا؟"

"محسن علی۔" وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پہلی بار قدرے واضح انداز میں مسکرایا۔ "لیکن میں کبھی کسی پر کوئی احسان کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔ بلکہ کسی محسن کی تلاش میں ہی رہا ہوں مگر وہ بھی مجھے نہیں ملا۔"

"ممکن ہے اب تمہاری اس تلاش میں کامیابی کا وقت آ گیا ہو۔" میں نے کہا۔

"شاید۔" وہ بے یقینی سے مسکرایا۔ میرا کارڈ بھی اس نے قدرے بے یقینی ہی کے سے عالم میں دو انگلیوں میں دبایا ہوا تھا۔ شاید اس کم عمری میں ہی اسے اتنی مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا کہ اب اسے لوگوں کی باتوں کا زیادہ اعتبار نہیں رہا تھا۔ خصوصاً یوں سرِراہ مل جانے والے لوگوں کی باتوں کا۔

"تمہارے توسط سے شاید میں اس کے لئے بھی کچھ کرنا چاہوں۔" میں نے شکیلہ بیگم کی طرف اشارہ کیا جو اپنی سگریٹ ندیدے انداز میں تقریباً فلٹر تک ختم کر کے اٹھ کر کمرے میں جا رہی تھی۔ اس کی چال میں لڑکھڑاہٹ تھی اور اسے اپنے گرد و پیش سے اب گویا قطعاً کوئی واسطہ نہیں رہا تھا۔

نوجوان نے ایک بار پھر گویا نظروں ہی نظروں میں مجھے تولنے کی کوشش کی۔ میں نے شکیلہ بیگم کے کمرے کے بوسیدہ سے دروازے کو دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "میرے لڑکپن میں یہ میری پسندیدہ ترین فنکاراؤں میں شامل تھی۔ میں سوچا کرتا تھا کاش میں کبھی اس کی ایک جھلک دیکھنے میں کامیاب ہو سکوں.... فلمی دنیا واقعی عبرت کی جگہ ہے۔"

"ساری دنیا ہی عبرت کی جگہ ہے جناب" محسن علی جلدی سے بولا۔ "فلمی دنیا کے عبرت آموز تماشے نظروں کے سامنے کچھ زیادہ ہی آتے ہیں اس لئے وہ زیادہ زبان زد عام رہتے ہیں۔ ورنہ عبرت کا سامان کس جگہ نہیں ہے؟ دیکھنے والی نظر چاہئے...."

وہ درست کہہ رہا تھا مگر پھر وہ گویا خود ہی اس بحث کو بیکار سمجھتے

ہوئے موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ "کوئی رفاہی ادارہ شکیلہ بیگم کی مدد کرنا موزوں نہیں سمجھتا۔ حتیٰ کہ پبلسٹی کے نقطہ نظر سے بھی نہیں... شاید اس لئے کہ معاشرے کے مروّجہ معیار اور پیمانے کے مطابق اس کا شمار اچھی عورتوں میں نہیں کیا جا سکتا۔ آپ کیونکر اس کی مدد کا ارادہ کر رہے ہیں؟"

"اچھے لوگوں کے لئے تو اس دنیا میں کوئی بھی کسی بھی وقت کوئی بھی کام کر سکتا ہے۔ میں بھی حسب توفیق کرتا رہتا ہوں۔ لیکن معاشرے کی نظر میں برے آدمیوں کے لئے کچھ کرنے کے لئے ذرا زیادہ حوصلہ اور ذرا زیادہ کشادہ دلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے بھی یہ پابندی رکھ دی ہوتی کہ وہ صرف اچھے' پارسا اور نیک لوگوں ہی کو رزق دے گا تو دنیا کتنی ویران سی ہو جاتی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور پھر میں تو عموماً ان بروں کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں جو کبھی اچھے تھے یا کبھی جن کے اچھے ہونے کی امید کی جا سکتی ہے۔"

"بے شک۔" وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔ پھر وہ جیسے کسی خیال سے چونکا اور سر کو خفیف سا جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ "یہ بتایئے آپ یہاں کس سے ملنے کے لئے آئے ہیں؟ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟"

"مجھے کسی سے ملنا نہیں ہے۔ صرف ایک کمرے کے سازوسامان پر ایک نظر ڈالنی ہے۔ تیسری منزل پر ہے وہ کمرا۔ میرا خیال ہے میں رہنمائی کئے بغیر بھی آسانی سے وہاں تک پہنچ جاؤں گا۔"

وہ سمجھ گیا کہ میں اسے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا۔ مودبانہ انداز میں سلام کر کے بولا۔ "تو پھر مجھے اجازت۔ میں آپ کو فون ضرور کروں گا۔ میرا نام یاد رکھیئے گا۔ محسن علی۔"

"مطمئن رہو۔ اس نام کو میں نے اپنے ذہن کے اس خانے میں ڈالا ہے جہاں یاد رکھی جانے والی چیزیں موجود ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی اور آگے بڑھ کر دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

محسن علی کو جیسے کچھ یاد آگیا۔ تیزی سے میرے پیچھے آتے ہوئے بولا۔ "سر! میں ایک بات اور بتا دوں.... شاید اس کا ابھی بتا دینا ہی اچھا ہو.... میرا مسئلہ یہ بھی ہے کہ میں اپنے بارے میں کوئی بات چھپا نہیں سکتا.... سر! ہمارا خاندانی پس منظر کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔"

"میرے دفتر میں کوئی تم سے تمہارے خاندانی پس منظر کے بارے میں نہیں پوچھے گا۔" میں نے ایک لمحے کے لئے رک کر بے پروائی سے کہا۔ اس نے ایک آسودہ سی طویل سانس لی اور میں مڑ کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ میں کئی سیڑھیاں چڑھ چکا تب اس نے آہستگی سے میرے عقب میں سیڑھیوں پر قدم رکھا۔ میں اس وقت تیسری منزل پر پہنچ چکا تھا جب میں نے اسے نیچے والی بالکونی میں اپنے کمرے کی طرف جاتے دیکھا۔ میں کچھ آگے بڑھا اور تیسری منزل کی بالکونی میں داخل ہو گیا۔ غنیمت تھا کہ عمارت کی تمام بوسیدگی کے باوجود ہر کمرے کی پیشانی پر نمبر موجود تھا۔

میرے مطلوبہ نمبر والے کمرے کا دروازہ نیم وا تھا۔ میں نے اندر جھانکنے کی کوشش نہیں کی اور ایک انگلی سے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے؟ اندر آجاؤ...." ایک بیٹھی بیٹھی اور قدرے لرزاں سی آواز سنائی دی۔ آواز نسوانی تھی۔ اس کے ساتھ مدھم سی ایک ایسی آواز بھی سنائی دی جیسے کوئی بچہ نیند میں رویا ہو اور پھر کروٹ بدل کر خاموش ہو گیا ہو۔

میں نے ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں دروازہ کھول کر اندر قدم رکھا۔ وہ بڑے دروازوں اور بڑی کھڑکیوں والا ایک طویل و عریض کمرا تھا جیسے پرانی طرز کی کئی منزلہ عمارتوں میں عام طور پر ہوتے ہیں۔ فرش ٹائیلوں کا تھا۔ کمرے کے دوسری طرف بھی باہر کو نکلی ہوئی ایک چھوٹی سی بالکونی موجود تھی۔ کمرے میں دیوار الماریاں بھی موجود تھیں۔ ایک کونے میں مٹی کے تیل کا چولہا اور دیگر مختصر سامان موجود تھا' جیسا کچن میں ہوتا ہے۔ وہ گوشہ یقیناً کچن ہی کا کام دیتا تھا۔

کمرے میں دائیں بائیں دونوں دیواروں کے ساتھ پرانی ساخت ہی کی دو مسہریاں لگی ہوئی تھیں۔ ایک خالی تھی اور ایک پر سانولی سی ایک عورت گندمی سی رنگت کے ایک چھ سات سالہ بچے کو لئے لیٹی تھی۔ بچے کا چہرہ تمتمایا ہوا تھا اور وہ آنکھیں بند کئے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے شبہ سا ہوا کہ وہ نیند میں نہیں بلکہ غشی کی سی کیفیت میں تھا۔

خود عورت بھی کوئی اچھی حالت میں معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ ایک مڑے تڑے سے تکیے کے سہارے نیم دراز تھی اور نا ہموار سے انداز میں سانس لے رہی تھی مگر اس کا ایک بازو بچے کے سر کے نیچے اور دوسرا ہاتھ اس کے سینے پر تھا۔ مسہری کے قریب ایک پرانی سی تپائی پر دواؤں کی بہت سی شیشیاں وغیرہ الٹی سیدھی پڑی تھیں۔

عورت کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں اور آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ اس کی آنکھوں میں بھیانک ویرانی تھی۔ جاننا مشکل نہیں تھا کہ اس کے پہلو میں لیٹا ہوا بچہ اس کا بیٹا تھا اور دونوں ماں بیٹا ہی بیمار تھے۔ شاید یہاں بھی کوئی کہانی میری منتظر تھی... غربت و افلاس کی ان گنت کہانیوں میں سے ایک اور کہانی۔ افلاس کی بھی اپنی ایک بو ہوتی ہے جو اس کمرے کے ہر گوشے میں رچی ہوئی تھی۔

اس عورت میں غالباً اتنی سکت نہیں تھی کہ میری دستک پر دروازے تک آتی لیکن اب مجھے سامنے دیکھ کر اس نے سیدھی ہو کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

"لیٹی رہو..... لیٹی رہو۔" میں نے نیچی آواز میں جلدی سے کہا۔ "میں تمہیں بے آرام کرنے نہیں آیا۔"

میرے منع کرنے کے باوجود اس نے نہایت آہستگی سے بچے کے سر کے نیچے سے بازو نکالا اور سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ ماں بیٹے کے کپڑے اور بستر کی چادر وغیرہ سبھی کچھ میلا میلا سا تھا۔

نہایت دھیمی آواز میں وہ بولی۔ "بے آرام تو انہیں کیا جاتا ہے جن کی زندگی میں کوئی آرام ہو۔" بظاہر وہ ان پڑھ سی عورت لگتی تھی لیکن اس کا لہجہ بے حد شائستہ تھا۔

"غالباً آپ دونوں ماں بیٹا بیمار ہیں؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔ پہلے صرف میرا بچہ بیمار تھا۔ اس کی تیمارداری کرتے اور اس کی فکر میں گھلتے چند دن سے میں بھی بیمار ہو گئی ہوں۔" ... وہ سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز میں بولی۔

"بچے کو بیماری کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ڈاکٹروں کو پتا نہیں چل پاتا تو میں ان پڑھ سی عورت کیا بتا سکتی ہوں جی۔" اس کے لہجے میں تلخی تھی "جن چھوٹے موٹے ڈاکٹروں کے پاس جانے کے ہم متحمل ہو سکتے تھے' ان کے پاس جاتے رہے ہیں۔ اب دو تین دن سے تو ان کے پاس بھی جانے کی طاقت نہیں رہی۔ ہمت نہیں پڑتی کہ کسی ڈاکٹر سے جا کر کہا جائے کہ وہ بغیر فیس کے ہمیں دیکھ لے۔ مفت دوا دے دے۔"

"اوہ۔" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ "اس بچے کا باپ.... میرا مطلب ہے آپ کے شوہر کیا کرتے ہیں؟" میں غیر ارادی طور پر سوال کئے جا رہا تھا۔ جس مقصد کے لئے میں یہاں آیا تھا وہ سردست جیسے پس منظر میں چلا گیا تھا۔

"بچے کا باپ....؟" اس نے استہزائیہ سے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی لیکن اس کی ہنسی مجھے ایک کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی۔ ...ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "آپ میرے لئے اجنبی ہیں۔ مجھے نہیں معلوم آپ کس سلسلے میں یہاں آئے ہیں لیکن بہرحال آپ ایک شریف اور معزز آدمی معلوم ہوتے ہیں اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ آپ مجھے برا بھلا نہیں کہیں گے' کوئی فتویٰ صادر نہیں کریں گے۔ اس لئے بتا دیتی ہوں...." لیکن پھر وہ یکدم خاموش ہو گئی اور اجڑی اجڑی آنکھوں سے ہوا میں نہ جانے کس چیز کو گھورنے لگی۔

ایک لمحے انتظار کے بعد میں نے ملائمت سے پوچھا۔ "آپ کیا بتانے لگی تھیں؟"

"ایک سچی بات۔" وہ سرسراتی آواز میں بولی۔ "لیکن پھر ڈر گئی۔"

"مجھ سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

تب وہ پہلے سے بھی زیادہ مدھم لہجے میں بولی۔ "سچی بات یہ ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم اس بچے کا باپ کون تھا.... اور اگر معلوم بھی ہوتا تو کوئی فرق نہ پڑتا... وہ بہرحال مجھے یا اس بچے کو ڈاکٹروں کے پاس لے جانے یا ہماری دیکھ بھال کرنے کا پابند نہ ہوتا... چند لمحوں کی سودے بازی کے ثمر کو کوئی عمر بھر کے لئے گلے میں لٹکائے تو نہیں پھرتا۔"

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ کبھی فرش کی طرف دیکھنے لگتی اور کبھی اپنے بچے کی طرف۔ میں سوچ رہا تھا۔ بڑی باحوصلہ ہوتی ہیں یہ مائیں جو ان بچوں کو بھی دیگر ماؤں ہی کی طرح سینے سے چمٹا کر اپنا خون پلا کر پالتی ہیں جو ان کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ کہلاتے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ معاشرے میں قدم قدم پر مطعون ہو سکتی ہیں۔

"تم کون ہو؟" مجھے اب اس کو اجنبیت آمیز لہجے میں پکارنا اچھا نہیں لگا۔

"ایکسٹرا گرل ہوں.... بلکہ تھی' ہی سمجھئے... خاصا طویل عرصہ ہو گیا ہے اب تو اسٹوڈیو گئے ہوئے بھی۔ لگتا ہے کچھ زیادہ ہی ایکسٹرا ہو گئی ہوں۔ کسی کو بھی میری ضرورت نہیں پڑتی۔" اتنا کچھ بول کر گویا اس کے دل کا بوجھ کچھ کم ہوا اور وہ ذرا چونک کر قدرے بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔ "آپ مجھے نہیں جانتے اس لئے زیادہ امکان تو یہی ہے کہ آپ مجھ سے ملنے نہیں آئے ہوں گے۔ اخلاقاً مجھے آپ سے پوچھنا چاہئے تھا کہ آپ کون ہیں اور کس سے ملنا چاہتے ہیں لیکن میں آپ کو اپنے دکھڑے سنانے بیٹھ گئی۔"

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"... اس دنیا میں دکھڑے سنانے والوں کی تعداد تیزی سے بڑھتی جارہی ہے اور دکھڑے سننے والے معدوم ہوتے جارہے ہیں۔ کسی کے پاس بھی کسی کے دکھڑے سننے کا وقت نہیں ہے۔ میں اپنے بارے میں بھی بتادوں گا اور اپنی آمد کا مقصد بھی بیان کردوں گا۔ لیکن اس سے پہلے تم ایسا کرو....."

میں نے اپنا پرس نکال کر دیکھا۔ اس میں تقریباً دو ہزار روپے تھے۔ نیچے گاڑی میں بریف کیس موجود تھا اور اس میں میری چیک بک اور کچھ نقد رقم بھی موجود تھی لیکن فی الحال میں نے وہ دو ہزار روپے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سردست تو یہ رکھو اور آج ہی خود کو اور اپنے بچے کو کسی اچھے ڈاکٹر کو دکھاؤ۔ ایک دو دن میں' میں تمہارے لئے مزید کچھ رقم بھجواؤں گا۔ اتنی رقم کہ تم اچھی طرح اپنا اور بچے کا مکمل علاج کراسکو اور اس کے بعد اپنے پیروں پر کھڑی ہوسکو۔ تم یقیناً باہمت عورت ہو۔ ایک بار سہارا لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں تو جلد ہی سنبھل جاؤ گی اور دوبارہ زندگی کے راستے پر چل پڑو گی۔ بس میں اتنا ہی تمہارے کام آسکوں گا۔ کبھی کبھی بہادر لوگ بھی زندگی کی جنگ میں گر پڑتے ہیں۔ انہیں صرف اتنے ہی سہارے کی ضرورت ہوتی ہے کہ سنبھالا لے سکیں۔ اس کے بعد وہ خود ہی سب کچھ کرلیتے ہیں۔"

اس نے میری بات توجہ سے سنی لیکن اس کا ہاتھ نوٹوں کی طرف نہیں بڑھا بلکہ اس نے ہاتھوں کی انگلیاں مضبوطی سے ایک دوسرے میں پھنسالیں اور مجروح سے لہجے میں بولی۔ "نہیں جی... بہت بہت شکریہ..... میں نے کبھی کسی اجنبی سے ایسی رقم قبول نہیں کی جو ترس کھا کر دی جارہی ہو۔ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ مجھ پر ترس یا رحم کھایا جائے۔ اسی خواہش نے تو مجھے زیادہ قابل رحم بنا دیا ہے۔"

"تم میری توہین کررہی ہو۔ میرے جذبے کی توہین کررہی ہو"... میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "میں یہ رقم تم پر ترس کھا کر نہیں دے رہا... اور مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم نے اپنے متعلق جو بھی تھوڑا بہت بتایا ہے وہ میری ہمدردیاں حاصل کرنے یا میرے جذبۂ ترحم کو بیدار کرنے کے لئے نہیں بتایا۔ وہ سب کچھ بالکل غیرارادی تھا... اور میں اگر تمہارے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں تو اسے بھیک مت سمجھو۔ یہ ایک مخلص انسان کا دوسرے انسان کے لئے حقیر سا تحفہ ہے۔ جب تم سنبھل جاؤ' زندگی کے منہ زور گھوڑے کی لگام دوبارہ تمہارے ہاتھ میں آجائے تو تم بھی میرے لئے کوئی خلوص بھرا تحفہ بھیج دینا۔ خواہ وہ بازار سے خریدا ہوا ایک گلدستہ ہی ہو۔ میں سمجھوں گا خلوص کا قرض خلوص سے ادا ہوگیا۔"

میں نے ایک بار پھر نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔ اس بار اس نے کانپتے ہاتھ سے نوٹ تھام لئے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے۔ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ملکہ..." اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئی استہزائیہ سے لہجے میں کہا۔ "والدین بھی بعض اوقات اولاد کے نام ایسے رکھ دیتے ہیں کہ آگے چل کر ستم ظریفانہ محسوس ہوتے ہیں۔ بے چاری ملکہ بیمار بچے کے ساتھ اس افلاس زدہ پرانی عمارت میں پڑی سسک رہی ہے۔ مالک مکان نے عمارت میں رہنے والے سب لوگوں کو بے دخلی کے نوٹس دے رکھے ہیں کیونکہ وہ بھاری پگڑیاں لے کر یہ کمرے قلمی دفاتر کے لئے دینا چاہتا ہے۔ بے چاری ملکہ.....!"

"یہ کوئی ایسی انوکھی بات نہیں۔ بعض کہانیوں میں کسی ملکہ یا شہزادی پر ایسا وقت بھی آجاتا ہے۔"

وہ نوٹ تکیے کے نیچے رکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن سر....! مجھ جیسی عورتیں.... بچے اور مرد تو اس معاشرے میں بلکہ ساری دنیا میں قدم قدم پر بکھرے ہوئے ہیں۔ ان میں سے ان گنت تو ہم سے بھی کہیں برے حال میں ہوں گے۔ آپ کس کس کی مدد کریں گے' کس کس کو اپنے خلوص کا نذرانہ پیش کریں گے؟"

"میرا ایک خواب ہے ملکہ..." میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "کہ دنیا میں حد سے زیادہ پریشان حال' مظلوم' اذیتوں اور ذلتوں کے مارے لوگ نہ ہوں۔ یہ دنیا سبھی کو رہنے کے قابل نظر آئے۔ لوگ زندگی کو محض سزا سمجھ کر نہ کاٹیں۔ لیکن ظاہر ہے میں اکیلا اس خواب کی تعبیر نہیں ڈھونڈ سکتا۔ اگر کسی طریقے سے میری حیثیت کے دو چار سو آدمی بھی یکجا ہوسکتے اور ہم خیال ہوکر ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چل سکتے تو شاید ہم دنیا کے نہیں تو کم از کم اپنے ملک کے کسی چھوٹے موٹے گوشے میں تو کوئی چھوٹا موٹا انقلاب لے ہی آتے۔ لیکن فی الحال چونکہ یہ بھی ممکن نہیں۔ اس لئے بس سرراہ چلتے چلتے جو کچھ میں آسانی سے کرسکتا ہوں کرتا چلا جاتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ دنیا کے دکھوں میں اس سے کوئی کمی نہیں آسکتی لیکن چند لمحوں کے لئے میرے ضمیر کو اپنے حبس زدہ خول سے نکل کر فرحت بخش ہوا میں چند سانسیں لینے کا موقع مل جاتا ہے۔ اگر لوگ انسان کی فلاح کی طرف سے اتنے ہی مایوس ہوجائیں تو بڑی مشکل ہوجائے۔ تمام فلاحی ادارے بند ہوجائیں اور تمام نیک طینت لوگ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر قیامت کے انتظار میں بیٹھ جائیں۔ دنیا اور بھی زیادہ بدصورت ہوجائے۔"

ملکہ ایک میلی سی چادر اپنے گھٹنوں پر ڈالتے ہوئے بولی۔ "آپ نے اپنے نظریات اور خیالات کے بارے میں تو مجھے اتنا کچھ بتادیا۔ اب کچھ اپنے بارے میں بھی بتادیجئے۔"

"بتادوں گا۔ لیکن وہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ زیادہ اہم وہ کام ہے جس کے لئے میں یہاں آیا ہوں۔ مجھے بھی چونکہ کبھی کبھی ہی اپنے دل کی باتیں کرنے کا موقع میسر آتا ہے اس لئے میں کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول بھال جاتا ہوں۔"

"میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے ابھی تک آپ کو بیٹھنے کے لئے نہیں کہا۔ مجھے یہاں آپ کے شایان شان کوئی کرسی نظر نہیں آرہی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آپ کو کہاں بٹھاؤں۔" اس کے لہجے میں واقعی انتہائی معذرت اور انتہائی احساس محرومی تھا۔

"میں کوئی ایسا شان و شوکت والا آدمی نہیں۔" میں نے قریب ہی موجود ایک پرانی اور نیم شکستہ سی کرسی کھینچتے ہوئے کہا۔

میں اس پر بیٹھ چکا تو وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کے کس کام آسکتی ہوں؟"

"نشاط عرف بے بی نامی ایک ایکسٹرا گرل غالباً اس کمرے میں تمہارے ساتھ رہتی تھی؟" میں نے کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"رہتی تھی نہیں.... رہتی ہے۔" اس نے گویا تصحیح کی۔ "کل سے وہ کہیں غائب ہے۔ لیکن ہم جیسی لڑکیوں کا چونکہ ایک دو راتوں کے لئے اپنے ٹھکانوں سے غائب ہوجانا کوئی انوکھی بات نہیں اس لئے مجھے اس کے بارے میں کوئی تشویش نہیں۔"

"اب تمہیں تشویش ہوتی بھی تو کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟" اس کی آنکھیں کچھ پھیلیں۔

"اسے گزشتہ رات قتل کردیا گیا ہے۔" میں نے اسے بتادینا بہتر سمجھا۔

"نہیں...." اس کے حلق سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی اور وہ گویا مسہری سے گرتے گرتے بچی۔ اس کے اس طرح بڑبڑانے سے بچہ ایک بار پھر نیند یا غشی میں کسمسایا اور کراہنے کے سے انداز میں ایک لمحے کے لئے رویا۔ اس کی آواز افسردہ کردینے والی تھی۔ ملکہ اس پر یوں جھک گئی جیسے کوئی مرغی اپنے چوزے کو پروں تلے چھپانے کی کوشش کررہی ہو۔ وہ اس کی پیشانی سہلانے اور اسے چومنے لگی مگر اس دوران اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکتے رہے۔

بچہ ذرا ٹکا تو وہ گھٹنوں میں منہ چھپا کر بیٹھ گئی اور نہایت خاموشی سے رونے لگی۔ چند لمحے بعد اس نے خود ہی سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر اور آنکھیں سرخ تھیں۔ بخار کی تپش نے اس کے جسم کو دہکایا ہوا ہی تھا' اب آنسوؤں کی آگ نے یقیناً اس کے دل کو بھی آتش کدہ بنادیا تھا۔

اس نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ شاید اس میں بولنے کی سکت ہی کم رہ گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں سوال ہی سوال تھے۔ میں نے اسے مختصراً بتادیا کہ واقعہ کس طرح پیش آیا تھا۔

وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن پولیس تو میرے پاس نہیں آئی۔ ابھی تک مجھے اس قیامت کی اطلاع ہی نہیں ہوئی۔"

"پولیس بھی پہنچے گی لیکن ذرا آرام سے پہنچے گی۔ زیادہ امکان ہے کہ وہ محض ضابطے کی کارروائی کرے گی۔" میں نے کہا۔ "میں اپنے احساس کے ہاتھوں مجبور ہوکر پولیس سے زیادہ مستعد ہوں اور اس معاملے میں زیادہ دلچسپی لے رہا ہوں۔ میں اس لڑکی سے زندگی میں کبھی نہیں ملا۔ میں نے اسے صرف مردہ حالت میں دیکھا.... اور یہ کوئی پہلی لاش نہیں تھی جو میں نے زندگی میں دیکھی.... لیکن میرے دل کو نہ جانے کیا ہوگیا.... وہ بہت کم عمر' معصوم اور پھول کی طرح نازک معلوم ہوتی تھی۔"

"پھول سے بھی زیادہ نازک اس کا دل تھا۔" ملکہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی۔ "لیکن اپنے ارادوں کے معاملے میں وہ فولاد کی طرح مضبوط تھی۔ اس نے اپنے ارادوں کی شکست کو تسلیم کرنا یا کسی معاملے میں ہار ماننا نہیں سیکھا تھا۔ اور ایسی شاخیں جو جھکنا نہیں جانتیں' عموماً ٹوٹ ہی جایا کرتی ہیں.... وہ ہیروئن بننے کا عزم لے کر انڈسٹری میں آئی تھی۔ اور اس خواہش کے لئے اس نے اپنا سب کچھ لٹادیا۔ بارہا جھکی' بارہا بکی۔ لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے وہ تیار نہیں تھی کہ وہ ہیروئن نہیں بن سکتی۔ ہونے کو تو اس دنیا میں خیر کیا نہیں ہوسکتا.... لیکن مجھے یہ کام اس لئے بھی مشکل نظر آتا تھا کہ جس نو آموز اور نادان لڑکی کو انڈسٹری کے گرگے ابتدا میں ہی کھلونا بنانے میں کامیاب ہوجائیں اس کے ہیروئن بننے کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ باقی سوال تو بعد میں اٹھتے ہیں...." وہ خاموش ہوگئی۔

"میں اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننے کے لئے ہی یہاں آیا تھا۔" میں نے کہا۔ "کبھی انسان بلاوجہ ہی کوئی کام اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ میں نے بھی اس کے قاتل کی گردن تک ہاتھ پہنچانے کا تہیہ کرلیا ہے۔ وہ مدد کی طلب میں میرے پاس آئی تھی۔ میں اس کی زندگی میں اس کی کوئی مدد نہیں کرسکا۔ اگر اس کا قاتل ہی میری وجہ سے کیفرکردار کو پہنچ جائے تو شاید اس کی روح کو کچھ تسکین ملے۔"

"عجیب بات یہ ہے...." وہ مضطربانہ سے انداز میں بولی۔ "کہ صبح ہی صبح ایک اور شخص بھی آیا تھا... اس نے کہا کہ نشاط اپنے ایک 'دوست' کے گھر ہے اور اسے اپنی ایک ڈائری کی ضرورت پڑ گئی ہے جو الماری میں ہے۔ اس نے وہ منگوائی ہے۔ نشاط کا سامان بہت مختصر سا ہے اور وہ سارا کا سارا ہی میری نظر میں رہا ہے۔ میں نے اس کے پاس کبھی کوئی ڈائری نہیں دیکھی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ شخص ہر حال میں نشاط کے سامان کا جائزہ لے کر رہے گا۔ میری طبیعت بھی اس وقت کچھ زیادہ خراب تھی۔ میں نے اس سے الجھنے کی کوشش نہیں کی۔ نشاط کا کل سامان بس اس الماری میں ہے...." اس نے ایک دیوارگیر الماری کی طرف اشارہ کیا۔ الماری اس وقت بند تھی۔

ملکہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اس شخص نے الماری میں ذرا
کھول کر ہر چیز کا جائزہ لیا۔ ہر چیز کو کھنگال کر دیکھا سوٹ کیس مجھے ذرا
نشاط کا چھوٹا سا سوٹ کیس پڑا ہے۔ اسے بھی یقیناً نشاط کے ساتھ ساتھ
پلٹ کر دیکھا لیکن اسے کوئی ... ان اس کی خوبصورتی اور عمدگی برقرار تھی۔
زور دے کر کئی مرتبہ مجھ

نہیں رکھا؟ آخر کار وہ سارے ہی کمرے کا نظروں ہی نظروں میں جائزہ لے کر یہ کہہ کر رخصت ہو گیا کہ شاید نشاط نے ڈائری کے بارے میں صحیح طرح نہیں سمجھایا۔ میں اس کے بارے میں مطمئن نہیں تھی لیکن میں اس سے الجھنے یا کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔"

"وہ شخص تمہارے لئے قطعی اجنبی تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔"

"کس قسم کا حلیہ تھا اس کا؟"

"جینز جیکٹ میں تھا۔ درمیانے قد اور مضبوط جسم کا تھا۔ سانولی رنگت اور موٹی موٹی مونچھیں تھیں۔ کچھ بدمعاش سا معلوم ہوتا تھا۔" ملکہ نے بتایا۔

"ممکن ہے ڈائری کا صرف بہانہ رہا ہو۔ وہ یہاں کچھ اور تلاش کرنے آیا ہو اور وہ چیز تلاش کر کے بھی لے گیا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں" ملکہ نے نفی میں سرہلایا۔ "مجھے اس کے بارے میں اور کسی بھی بات کا یقین نہیں لیکن اس بات کا یقین ہے کہ وہ یہاں سے لے کر کچھ نہیں گیا کیونکہ جتنی دیر وہ کمرے میں رہا میری نظر اس پر رہی۔ میں اپنی جگہ لیٹے لیٹے اسے دیکھتی رہی۔ اس نے بھی اپنی حرکات و سکنات مجھ سے چھپانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی۔ ...اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اسے میری کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اگر اس کی مطلوبہ چیز اسے نظر آجاتی تو وہ ہر حال میں اسے لے جاتا۔ ...اس کے موڈ کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا.... میں کچھ خوفزدہ بھی تھی.... وہ اگر کچھ لے جانے کی کوشش کرتا تو میں یقیناً اسے منع نہ کرتی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اطمینان محسوس کیا تھا۔"

"خیر.... تم مجھے نشاط کے بارے میں بتاؤ.... اس کی شخصیت ...عادت... اس کے ملنے جلنے والے.... کوئی ایسی بات جو تمہارے خیال میں اس کے قتل کا سبب بن سکتی ہو؟"

اس کی پیشانی پر سوچ کی شکنیں ابھر آئیں۔ "وہ ساتھ رہتی تھی تو محسوس ہوتا تھا کہ میں اس کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں...." وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔ "لیکن اب یاد کرنے کی کوشش کر رہی ہوں تو محسوس ہو رہا ہے کہ میں اس کے بارے میں کوئی خاص بات.... کوئی کام کی بات شاید نہیں جانتی...."

اس نے قدرے بے بسی سے میری طرف دیکھا تاہم بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اس سے میری ملاقات چار پانچ ماہ پہلے اسٹوڈیو میں ہوئی تھی۔ وہ غالباً اسٹوڈیو میں میرا اب تک کا آخری ...تھا۔ اس کے بعد سے میں کچھ ایسی الجھی ہوں کہ آج تک نے کانپتے ہاتھ سے ...سکی۔ وہ نشاط سے میری پہلی ملاقات تھی اور پہلی جھلملا رہے تھے۔ میں نے دیکھے سب... اچھی لگی.... ہمارے درمیان اتنی دوستی "ملکہ...." اس نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے ...نے کی دعوت دے دی کیونکہ وہ کسی عورت کے گھر میں بنے

ہوئے چھوٹے سے نجی قسم کے ہوسٹل میں رہتی تھی جہاں چند ملازمت پیشہ عورتیں رہتی تھیں۔ اس نے خود کو بھی وہاں ملازمت پیشہ ہی بتایا ہوا تھا لیکن اس کا کہنا تھا کہ اب وہ وہاں کے اخراجات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ وہ بہت پریشان تھی۔ مجھے معلوم ہے' بے یارومددگار عورتوں کے لئے رہائش کا مسئلہ کتنا سنگین ہوتا ہے۔ میرے کمرے میں جگہ تھی۔ میں نے اسے آنے کے لئے کہہ دیا اور وہ دوسرے دن ہی آگئی۔ میرے ساتھ رہنا اسے ہر لحاظ سے سستا پڑتا لیکن اس نے خود ہی اسے بھی اپنے لئے مہنگا بنائے رکھا۔"

"میں سمجھا نہیں۔" میں نے کہا۔

"مطلب یہ کہ بے چاری میرے اور میرے بچے کے مسائل سے لاتعلق نہیں رہتی تھی حالانکہ اگر وہ لاتعلق رہتی تب بھی مجھے اس سے کوئی شکوہ نہ ہوتا کیونکہ اس کے اپنے مسائل ہی کچھ کم نہیں تھے۔ لیکن وہ تو ہماری ذرا ذرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتی۔ ہماری ہر مالی پریشانی پر ہم سے زیادہ پریشان ہو جاتی۔ جو کماتی زیادہ تر ہم پر ہی خرچ کر دیتی۔ وہ ان نایاب لوگوں میں سے تھی جو خود بھوکے رہ کر اپنے منہ کا نوالا دوسرے کو کھلا دیتے ہیں۔ وہ مجھے بہنوں سے زیادہ عزیز معلوم ہونے لگی تھی۔"

"اس کے باوجود تم اس کے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتیں" ...میں نے ملائمت سے کہا۔

"ہاں.... وہ ساتھ رہتی تھی تو کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں جانتی۔ شاید مہلت بھی نہیں ملی اگر وہ مزید کچھ عرصہ ساتھ رہ جاتی تو شاید کچھ اور جاننے کا موقع ...ہر وقت تو وہ سرگرداں سی رہتی تھی۔ صبح نکلتی تھی تو تھکی ہار رات گئے آتی تھی۔ جو تھوڑا بہت وقت میسر ہوتا تھا اس میں اس کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ میری باتیں سنتی رہے' مجھ سے کچھ نہ کچھ معلوم کرتی رہے۔ اور کچھ نہیں تو انڈسٹری میں گزارنے کے گر ہی معلوم کرنے لگتی تھی۔ میرا چونکہ ہر چیز پر اعتبار اٹھ چکا ہے اور صرف مقدر پر اعتبار رہ گیا ہے اس لئے اسے کوئی کام کی بات بتانے سے قاصر رہتی تھی۔ میں بس یہی کہ کر بات ختم کر دیتی تھی کہ اگر تقدیر میں کچھ ہو تو وہ بڑے انہونے طریقوں سے پورا ہو جاتا ہے۔ سارے گر' ساری کوششیں دھری رہ جاتی ہیں۔ میری باتیں سن کر شاید اسے کچھ مایوسی ہوتی تھی۔"

"بہرحال تم نے کبھی نہ کبھی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش تو کی ہو گی۔ وہ کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی.... اس کا خاندانی پس منظر کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ دو ایک مرتبہ میں نے سرسری انداز میں کچھ جاننے کی کوشش کی ہو گی لیکن کبھی زور دے کر پوچھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ بہت مضطرب' بہت بے چین معلوم ہوتی تھی۔ اس کا انداز ایسا ہی معلوم ہوتا تھا جیسے کہہ رہی ہو کہ بس مجھے کچھ بن جانے دو پھر میں اپنے متعلق سب کچھ تمہیں تو کیا پورے زمانے کو ہی

...گی۔ ویسے بھی وہ مجھے اتنی بے ضرر' اتنی معصوم معلوم ہوتی تھی کہ میں اسے کریدنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتی تھی۔"

"اس کے ملنے جلنے والوں کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہیں؟ ...کسی سے کوئی خاص میل ملاقات رہی ہو اس کی؟" میں نے پوچھا۔

"جب سے اس نے یہاں رہنا شروع کیا تھا تب سے مجھے اس کے ساتھ اسٹوڈیو جانے کا اتفاق ہی نہیں ہوا۔ ویسے بھی اسٹوڈیو والے مراسم کے بارے میں کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ہم جیسے لوگوں کو تو وہاں ہر ایک سے ہی ہنس کر بات کرنی پڑتی ہے۔ بہرحال وہ کبھی کسی کو یہاں لے کر نہیں آئی اور نہ ہی کبھی کوئی اسے پوچھتا ہوا یہاں تک آیا۔ ایکسٹرا سپلائر عبدالواحد سے اس کی ذرا زیادہ جان پہچان معلوم ہوتی تھی۔ تاہم ان کے درمیان رشتہ صرف احترام اور ہمدردی کا معلوم ہوتا تھا۔ عبدالواحد بہت اچھا آدمی ہے۔ میں اسے برسوں سے جانتی ہوں۔ وہی اسے زیادہ سے زیادہ کام دلوانے کی کوشش کرتا تھا۔ بغیر کسی غرض اور لالچ کے۔ عبدالواحد تو خیر سبھی کے ساتھ حتی الامکان ہمدردی سے پیش آنے کی کوشش کرتا ہے۔ جو لڑکیاں زیادہ ضرورت مند ہوتی ہیں بعض اوقات ان کے پیسوں میں سے کمیشن بھی نہیں کاٹتا بلکہ اگر کوئی زیادہ ہی مشکل میں گرفتار ہو اور عبدالواحد کے پاس گنجائش ہو تو پلے سے بھی دے دیتا ہے۔ وہ طوطا چشم نہیں ہے اس لئے اس کے مالی حالات بھی بہت زیادہ اچھے نہیں ہیں۔"

"نشاط کے بارے میں کوئی خاص بات؟" میں نے ایک بار پھر کچھ جاننے کی کوشش کی۔

"خاص بات...." وہ ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "مجھے بس یہی بات کچھ خاص معلوم ہوتی تھی کہ وہ ہمارے ماحول کی پروردہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس میں جو بگاڑ' جو تھوڑی بہت چالاکی' جو تھوڑی بہت بکنے یا جھکنے کی عادت پیدا ہوئی تھی وہ بالکل نئی ہی معلوم ہوتی تھی۔ اور اس میں کوئی گھٹیا پن نہیں تھا... ایکسٹرا گرل کے طور پر وہ مجھے بہت عجیب' بہت مختلف معلوم ہوتی تھی۔ اسے دیکھ کر بار بار احساس ہوتا تھا کہ اسے کم از کم فلمی دنیا میں نہیں ہونا چاہئے تھا' اور خواہ وہ کہیں بھی ہوتی۔" اس نے سسکی کے سے انداز میں ایک گہری سانس لی اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ ...."میری عمر اچھی خاصی ہے... میں نے زمانے میں بہت عرصہ ٹھوکریں کھا کر بہت کچھ سیکھا ہے لیکن اس مختصر سے عرصے میں میں نے اس لڑکی سے بھی بہت اچھی اچھی باتیں سیکھیں۔"

"گزشتہ دنوں میں اس میں کوئی تبدیلی محسوس کی ہو؟" میں نے جاننا چاہا۔

"معلوم یہی ہوتا تھا کہ اس کم عمری میں اس نے دل پر بہت بوجھ سہنا سیکھ لیا تھا۔" وہ افسردہ لہجے میں بولی۔ "لیکن پچھلے چند دنوں سے اس کے رویئے میں تبدیلی بہرحال میں محسوس کر رہی تھی۔ ...دو ایک مرتبہ میں نے پوچھا بھی لیکن اس نے حسب عادت ہنس کر ٹال دیا۔ البتہ ایک بار اس نے مذاق ہی کے سے انداز میں اتنا ضرور کہا کہ اگر مجھے کوئی خاص مسئلہ درپیش بھی ہو تو آپ کو بتانے سے کیا فائدہ؟ آپ تو خود اتنی کمزور پوزیشن میں ہیں کہ اپنے ہی مسائل حل نہیں کر سکتیں' آپ سے کچھ کہنا آپ کے بوجھ میں اضافہ ہی کرنے والی بات ہے۔ دکھڑا اس کے سامنے رونا چاہئے جو اس کا کچھ نہ کچھ مداوا کر سکتا ہو' ہر ایک کے سامنے اپنے دکھوں کی پوٹلی کھول کر بیٹھنے سے کیا حاصل؟ بس اس قسم کی باتیں کر کے اس نے مجھے لاجواب کر دیا تھا۔"

"میں ذرا اس کے سامان کا جائزہ لے سکتا ہوں؟" میں نے اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" وہ الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ اس کا کل سامان بس اس الماری میں ہے۔ باقی ضرورت کی تمام چیزیں وہ میری ہی استعمال کرتی تھی جو اس کمرے میں پہلے سے موجود تھیں۔"

میں نے اٹھ کر الماری کھولی اور کھولتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی ہر چیز کو پہلے ہی کھنگالا جا چکا ہے۔ اس کے آدھے حصے میں کچھ سستے قسم کے ملبوسات لٹکے ہوئے تھے اور کچھ بے ترتیبی سے نیچے ڈھیر تھے۔ دوسرے حصے میں کئی شیلف تھے۔ ان میں بھی زیادہ تر معمولی قسم کے ملبوسات اور نسوانی ضروریات کی دوسری چیزیں تھیں۔ ایک شیلف میں بہت سی تصویریں بے ترتیبی سے رکھی ہوئی تھیں۔ یہ مختلف سائز کی رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ تصویریں تھیں۔

میں نے سرسری نظر سے ہر تصویر کا جائزہ لیا۔ وہ سب کی سب تصویریں نشاط کی تھیں اور ہر تصویر میں وہ تنہا ہی تھی۔ تصویریں اسی قسم کی تھیں جس طرح کی عموماً ایکٹنگ کے شوقین لڑکے لڑکیوں کی ہوتی ہیں۔ کہیں ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکائے خیالوں میں گم۔ کہیں ہاتھ اٹھا کر مصنوعی قہقہہ لگاتے ہوئے۔ کہیں بڑے ناز و ادا سے مڑ کر دیکھتے ہوئے۔ کوئی تصویر بھی ایسی نہیں تھی جس سے نشاط کے بارے میں میری معلومات میں کوئی اضافہ ہوتا۔

میں نے نشاط کو صرف مردہ حالت میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابلی ہوئی تھیں اور کربناک موت نے اس کی صورت مسخ کر دی تھی لیکن پھر بھی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ زندگی میں وہ خوش شکل اور گوری چٹی رہی تھی لیکن اس کی تصویریں بتاتی تھیں کہ اس کا چہرہ زیادہ فوٹو جینک نہیں تھا۔ تصویروں کی نسبت وہ عام زندگی میں کہیں بہتر معلوم ہوتی ہو گی۔

الماری میں چھوٹا موٹا دوسرا کاٹھ کباڑ تھا۔ کوئی بھی ایسی چیز نہیں تھی جس سے نشاط کی شخصیت کے بارے میں کوئی قابل ذکر معلومات حاصل ہوتیں۔ البتہ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس مجھے ذرا غیر معمولی لگا۔ اس سوٹ کیس نے بھی یقیناً نشاط کے ساتھ ساتھ خاصے دھکے کھائے تھے لیکن اس کی خوبصورتی اور عمدگی برقرار تھی۔

...یہ ایک بیش قیمت غیر ملکی سوٹ کیس تھا۔ کوئی غریب لڑکی ایسا سوٹ کیس خریدنے کی متحمل مشکل سے ہی ہو سکتی تھی۔ میں نے سوچا، ممکن ہے وہ نشاط کو کسی نے تحفتاً دیا ہو۔

میں نے ہر چیز اسی طرح چھوڑ کر قدرے مایوسی کے عالم میں الماری بند کر دی۔ ملکہ نے جس نامعلوم شخص کی آمد کا ذکر کیا تھا وہ بھی شاید میری ہی طرح مایوس ہو کر یا پھر شاید مطمئن ہو کر گیا تھا۔ نشاط کا قتل غیر اہم معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ شخص یقیناً کسی ایسی چیز کی تلاش میں آیا تھا جس سے حقائق کا کوئی سرا ہاتھ آسکتا تھا۔

میں نے ملکہ کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "یہاں آکر مجھے نشاط کے افسوس ناک قتل کے سلسلے میں کوئی خاص سراغ تو نہیں ملا لیکن کم از کم اس کی شخصیت کے کچھ نکتے ضرور واضح ہوئے ہیں۔ شاید ان سے ہی کچھ مدد ملے۔"

"ممکن ہے قدرت نے آپ کو نشاط کے ساتھ ساتھ درحقیقت میری مدد کے لئے یہاں بھیجا ہو۔" ملکہ نے دھیمے لہجے میں یہ کہتے ہوئے غالباً مجھے خدا حافظ کہنے کے لئے مسہری سے اترنا چاہا لیکن میں نے اشارے سے اسے روک دیا۔ "تم سکون سے بچے کے پاس بیٹھی رہو۔ تکلفات کی ضرورت نہیں۔ صرف اس وقت الصنا جب تم محسوس کرو کہ بچے کو لے کر ڈاکٹر کے پاس لے جا سکتی ہو۔ خدا حافظ۔"

میں تیزی سے کمرے سے نکل آیا۔ اس وقت تک بھی اس کی آنکھوں میں آنسو خشک نہیں ہوئے تھے۔ عمارت سے باہر آکر میں نے چند گہری گہری سانسیں لیں۔ ہر عمارت اپنے سینے میں نہ جانے کتنی کہانیاں چھپائے ہوتی ہے۔ میں اپنے ذہن میں بہت سے الجھے سوال لئے کار میں بیٹھ کر ہنی کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہنی کی تلاش کے سلسلے میں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میرے سامنے کوئی سراغ نہیں تھا اور اس کے بارے میں مجھے تشویش بے پناہ تھی۔ وہ مخلص لڑکی نہ جانے کس حال میں تھی، کہاں تھی!

ہنی کے تینوں ملازم گھر پر موجود تھے۔ چوکیدار گیٹ پر اپنی ڈیوٹی سنبھال چکا تھا اور باقی دونوں میاں بیوی چھوٹے موٹے گھریلو کاموں میں مصروف تھے۔ تینوں اداس تھے اور اپنی مالکن کے بارے میں فکر مند تھے۔ کسی حد تک خوفزدہ بھی تھے لیکن بہرحال ان کا گھر چھوڑ کر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ ان سے ملنے اور کچھ دیر اس مکان میں گزارنے کے بعد بھی کوئی نئی بات میرے سامنے نہیں آئی۔

میں قدرے مایوسی کے عالم میں ایک بار پھر گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہو گیا۔ میں نے اب اسٹوڈیو کا ایک چکر لگانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ...مین بلیوارڈ پر پہنچتے ہی مجھے احساس ہوا کہ ایک گاڑی میرے تعاقب میں ہے۔ ایک سفید گاڑی تو پہلے ہی میرے تعاقب میں تھی۔ ...وہ میرے اپنے آدمی تھے جو اپنے طور پر میری حفاظت کے لئے میرے تعاقب میں رہنے لگے تھے۔ وہ دوسری گاڑی ان کے پیچھے تھی۔

وہ پرانے ماڈل کی ایک سرخ شیورلیٹ کنورٹیبل تھی۔ اس قسم کی گاڑیاں اب شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتی تھیں۔ اس کی کینوس کی چھت اس وقت کھلی تھی اور اس میں جس شخص کی جھلک مجھے نظر آئی تھی وہ بھی خاصا عدیم المثال ہی معلوم ہوتا تھا۔ خاصے قدیم زمانے کے بوڑھے انگریزوں کی طرح اس کے کانوں کے آس پاس بھورے گھنگریالے بالوں کی جھالر تھی اور باقی چندیا بالکل صاف اور چمکیلی تھی۔ اگر ڈارون کی تھیوری کو درست مان لیا جائے کہ بندر ہمارے آباؤ اجداد تھے تو اس میں اپنے آباؤ اجداد کی بہت زیادہ مشابہت موجود تھی۔ جس انداز میں وہ اس بڑی سی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ میں دھنسا ہوا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ خاصا مختصر الوجود آدمی ہے۔

جب بھی مجھے عقب نما آئینے میں اس کی جھلک نظر آئی، وہ اپنے گرد و پیش بلکہ تمام دنیا سے بے خبر سا نظر آیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خواب کے سے عالم میں گاڑی چلا رہا ہے لیکن جوں ہی میں ذرا رفتار بڑھاتا اور میرے ساتھ سفید گاڑی کی رفتار بڑھتی تو فوراً ہی اس سرخ شیورلیٹ کی رفتار میں بھی اضافہ ہو جاتا۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ سرخ شیورلیٹ میرے یا ہماری سفید گاڑی کے تعاقب میں ہے تو مجھے تشویش کے بجائے ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوا۔ وہ یقیناً کہیں ہنی کے گھر کے آس پاس سے ہی ہمارے پیچھے لگی تھی کیونکہ جب میں رائل پارک گیا تھا اور واپس آیا تھا تو ہماری اپنی سفید گاڑی کے علاوہ کوئی گاڑی میرے تعاقب میں نہیں تھی۔ آج کل میں خود بھی کافی حد تک محتاط رہنے لگا تھا اور کہیں آتے جاتے وقت اپنے گرد و پیش پر نظر رکھتا تھا۔

ممکن ہے وہ بندر نما شخص ہنی کے گھر کی نگرانی کر رہا ہو اور مجھے وہاں آتے اور پھر رخصت ہوتے دیکھ کر میرے پیچھے لگا ہو۔ اگر یہ قیاس درست ہوتا تو اس سے یقیناً ہنی کے اغوا کے سلسلے میں کوئی سراغ ہاتھ آسکتا تھا۔ اس معاملے میں یہ امید کی پہلی کرن نظر آئی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس شخص کو احساس ہو کہ میں تعاقب سے باخبر ہو گیا ہوں۔ اس لئے میں نے بے مقصد ادھر ادھر بھٹکنے کی کوشش نہیں کی اور اسٹوڈیو کی طرف سفر جاری رکھا۔

نہر کے کنارے پہنچ کر میں نے کار کی رفتار درمیانی رکھتے ہوئے خفیہ خانے سے ٹرانسمیٹر نکالا اور غیر محسوس انداز میں سفید گاڑی میں موجود ٹونی سے رابطہ قائم کیا۔

"تمہیں اندازہ ہو گیا ہے کہ سرخ شیورلیٹ ہمارے تعاقب میں ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یس سر! مجھے گلبرگ میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔" ٹونی کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

"لیکن تم اسے احساس مت ہونے دو کہ تم میرے تعاقب میں ہو۔" میں نے ہدایت کی۔ "کیمپس والے موڑ پر تم سیدھے کیمپس کی طرف نکلتے چلے جانا۔ میں علامہ اقبال ٹاؤن کی طرف

جاؤں گا لیکن چند لمحے بعد تم اس طرح واپس آجانا کہ سرخ گاڑی کے پیچھے رہ سکو۔ اس بندر کو نکلنے نہیں دینا ہے۔ یہ بہت اہم سراغ ثابت ہو سکتا ہے۔"

"او کے سر!" ٹونی نے مستعدی سے کہا۔

اس ہدایت پر عمل ہوا اور چند لمحے بعد سفید کار درمیان سے ہٹ چکی تھی۔ اس کے چند لمحے بعد وہ شیورلیٹ کے پیچھے نظر آنے لگی لیکن اب درمیانی فاصلہ کافی تھا۔ بندر نما شخص حسب سابق، بظاہر دنیا مافیہا سے بے خبر، نیم خوابیدہ سے انداز میں میرے تعاقب میں گاڑی لئے آرہا تھا۔

ملتان روڈ پر مڑتے وقت مجھے ایک لمحے کے لئے گاڑی روکنی پڑی اور اس دوران میرے عقب میں شیورلیٹ کا فاصلہ کچھ اور کم ہو گیا اور مجھے عقب نما آئینے میں اس شخص کی ایک اور جھلک بہتر طور پر دیکھنے کا موقع مل گیا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں اور اس کی نظر صرف سڑک پر تھی۔

وہ سفید قمیص اور دھاری دار کوٹ کے ساتھ سرخ بو لگائے ہوئے تھا۔ اس کی شخصیت کا تاثر بڑا عجیب تھا۔ وہ بیک وقت جوکر بھی معلوم ہوتا تھا اور نہایت سنجیدہ و متین بھی۔

میں نے اسٹوڈیو کی طرف سفر جاری رکھا لیکن اسٹوڈیو پہنچ کر میں رکا نہیں بلکہ اس سے آگے نکلتا چلا گیا۔ اسٹوڈیو اور اس کے آس پاس کے علاقے میں بڑی گہما گہمی تھی۔ یہاں ذرا سی بھی گڑبڑ کی صورت میں فوراً سیکڑوں لوگ ہماری طرف متوجہ ہو سکتے تھے۔

ان دنوں ملتان روڈ پر اسٹوڈیوز سے آگے کوئی خاص آبادی نہیں تھی۔ تقریباً دو میل آگے نکلنے کے بعد ویرانی شروع ہو گئی۔ کبھی کبھی مخالف سمت سے کوئی بس آتی دکھائی دیتی اور ہمارے قریب سے گزر جاتی۔ پھر گویا بسوں کی آمد و رفت میں بھی تعطل واقع ہو گیا۔ حد نظر تک پھیلی ہوئی تیز چمکیلی دھوپ میں بس تین کاریں آگے پیچھے یوں فراٹے بھرتی جا رہی تھیں جیسے انہیں کہیں پہنچنے کی ت جلدی ہو۔

وہ شخص بڑی دل جمعی سے میرے پیچھے چلا آرہا تھا۔ اسے کوئی تشویش نہیں تھی اور اس بات کی بھی گویا کوئی پروا نہیں تھی کہ یک گاڑی اس کے عقب میں بھی چلی آرہی تھی۔ اس کا کام تو بس یے آنکھیں بند کر کے میرے پیچھے آتے رہنا تھا۔ اس کے علاوہ ے دنیا کی کسی چیز سے شاید کوئی غرض نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کہیں وہ کوئی سنکی یا خبطی تو نہیں جو اپنی ن رو بہک جانے کی وجہ سے نہ جانے کیا سوچ کر میرے پیچھے لگ یا ہو۔ لیکن یہ خیال میرے دل کو نہیں لگا۔ سنکی اور خبطی لوگ ن مستقل مزاجی سے شاید ہی کسی کا تعاقب کرتے ہوں۔ عجیب ت یہ تھی کہ دور و نزدیک کوئی ایسا شخص بھی نظر نہیں آرہا تھا کہ اس کا مددگار سمجھا جا سکتا۔ اس کے باوجود بالکل مطمئن اور پروا تھا۔

تھے۔ بائیں طرف قدرے نشیب میں سڑک جتنی ہی چوڑی کچی پٹی تھی اور اس کے بعد باغ کی نیچی سی کچی دیوار تھی جس کے عقب سے سنگتروں سے لدے ہوئے درخت جھانک رہے تھے۔

میں نے یکدم ہی اس الجھن کا حل تلاش کرنے کا فیصلہ کیا کہ آخر وہ بندر نما شخص چاہتا کیا تھا۔ میں نے گاڑی کو ترچھا کرتے ہوئے یک لخت بریک لگائے۔ میری دیو ہیکل مرسیڈیز کے ٹائروں نے سڑک پر بری طرح رگڑ کھائی مگر دوسرے ہی لمحے گاڑی گویا سڑک سے چپک کر رہ گئی۔

سرخ شیورلیٹ زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ اگر بندر نما انسان اناڑی ڈرائیور ہوتا تو اس کی گاڑی میری گاڑی سے ٹکرا بھی سکتی تھی لیکن اس کے بارے میں میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ وہ اناڑی ڈرائیور ہرگز نہیں تھا۔ اس نے گاڑی کو زبردست لہریا دیتے ہوئے کچے میں اتار کر نکل جانے کی کوشش کی لیکن میں اسے چھوڑنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس سے کہیں زیادہ تیزی سے میری گاڑی ریورس ہو کر اس کے راستے میں حائل ہو گئی اور سرخ شیورلیٹ یوں باغ کی دیوار کے ساتھ جا کر رکی کہ ایک لمحے کے لئے گرد و غبار کے طوفان میں چھپ کر رہ گئی۔

ٹونی نے بھی گاڑی نہایت مشاقی سے شیورلیٹ کے عقب میں ترچھی کر کے لا روکی تھی۔ سب سے پہلے میں گاڑی سے اترا۔ میں نے کوئی ہتھیار نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن مختصر بالوجود شخص بڑا بے جگر معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے دھول کے بادل میں گاڑی کا دروازہ کھولے بغیر اچھل کر کھلی چھت کی گاڑی سے کودتے دیکھا۔ اس کے مختصر سے بازو کے سرے پر مجھے لمبی نال والے پستول کی جھلک نظر آئی۔

میں فوراً اپنی گاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ بغیر کسی دھماکے کے گولی میرے سر پر سے سنسناتی ہوئی گزر گئی۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جو کوئی بھی تھا بہرحال اس قسم کے حالات سے اچھا خاصا مانوس معلوم ہوتا تھا لیکن شاید ہمارے بارے میں اس کے اندازے کچھ غلط رہے ہوں۔ اسے دوسرا فائر کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ ٹونی کے پاس بھی سائلنسر والا ریوالور تھا۔ اس کے خاموش ریوالور نے کچھ اس طرح گولی اگلی کہ منحنی شخص کے ہاتھ سے صرف پستول نکل کر کہیں دور جا گرا۔ مجھے امید تھی کہ اس کے ہاتھ پر خراش بھی نہیں آئی ہوگی۔

لیکن وہ شخص ہتھیار کی عدم موجودگی میں بھی، محاورتاً، ہتھیار ڈالنے کا قائل معلوم نہیں ہوتا تھا اور فیصلہ شاید ہم سے بھی کہیں تیزی سے کرتا تھا اور پھر صرف اس کا ذہن ہی نہیں جسم بھی بجلی کی سی تیزی سے حرکت کرتا تھا۔ پستول ہاتھ سے جاتے ہی میں نے اسے کسی راکٹ کی طرح ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔ وہ باغ کی دیوار پھلانگ کر اندر جا رہا تھا۔

میں اس کی چھلانگ کی بلندی دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ

کہیں زیادہ اونچائی تک ہوا میں بلند ہوا لیکن اسی لمحے ٹونی کے ریوالور کی گولی اسے چاٹ گئی۔ میں ٹونی کو روک بھی نہ سکا۔ مجھے ٹونی کو یہ بتانے کی مہلت ہی نہ ملی کہ میں اس شخص کو زندہ سلامت پکڑنا چاہتا ہوں۔ ٹونی سے بھی فائر شاید اضطراری حالت میں ہوا تھا۔ اسے غالباً یہی احساس ہوا تھا کہ وہ شخص ہاتھ سے نکلا جا رہا ہے۔

دیوار سے کچھ بلندی پر ہوا میں ہی میں نے اس شخص کے مختصر وجود کو ڈھیلا پڑتے دیکھا' جیسے کسی غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ مجھے اس وقت یہ اندازہ تو نہیں ہو سکا کہ گولی اسے کہاں لگی ہے لیکن یہ اندازہ بہرحال ہو گیا کہ وہ اس کے لئے مہلک ثابت ہو چکی ہے۔ دوسرے ہی لمحے میں نے دیوار کے عقب میں باغ کے اندر دھپ سے اس کے گرنے کی آواز سنی۔

میں نے کار کی اوٹ سے نکل کر ٹونی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کار کے قریب ایک گھٹنے کے بل کھڑا تھا۔ ریوالور ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ شبیر ریوالور لئے گاڑی کے دوسری طرف کھڑا تھا۔ میں نے انہیں اشارہ کیا۔ دونوں نے ریوالور جیبوں میں رکھ لئے اور ہم نے ایک ساتھ دیوار پھلانگی۔

اندر قطار در قطار درختوں کے درمیان کچی زمین پر وہ چت پڑا تھا۔ مردہ حالت میں اس کے چہرے میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا سوائے اس کے کہ نیم وا آنکھیں اب مکمل بند ہو گئی تھیں۔ اس کے دھاری دار کوٹ کا بٹن کھلا تھا اور پسلیوں کے قریب سے اس کی سفید قمیص خون سے سرخ ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس کی نبض دیکھی اور ٹونی نے ناک کے سامنے ہاتھ رکھ کر دیکھا۔ نبض ختم ہو چکی تھی۔ زندگی میں وہ جتنا پھرتیلا تھا' مرنے میں بھی اس نے اتنی ہی پھرتی دکھائی تھی۔

میں نے اور ٹونی نے پھرتی سے اس کی جیبوں کی تلاشی لی۔ اس کے کوٹ کی جیبوں سے صرف ایک پرس اور ایک کھٹکے دار چاقو برآمد ہوا۔ پرس میں صرف رقم تھی۔ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت میں مدد ملتی۔ میں نے دونوں چیزیں واپس اس کی جیب میں ڈال دیں۔

باغ میں قریب ہی کہیں سے دو آدمیوں کے تیز تیز بولنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جو لحہ بہ لحہ قریب آتی جا رہی تھیں۔ شاید وہ باغ کے رکھوالے تھے جو کسی بات پر بحث کرتے ہوئے ادھر ہی آ رہے تھے۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں تھی کہ ہمیں کسی لاش کے سرہانے بیٹھا ہوا دیکھا جاتا۔ اور لاش بھی ایک ایسے شخص کی جسے لاش میں تبدیل کرنے کے ذمے دار ہم ہی تھے۔

میں نے ٹونی اور شبیر کی طرف اشارہ کیا اور ہم اٹھ کر دیوار کی طرف لپکے لیکن اسی لمحے میری نظر ایک قدرے چمکیلی سی چیز پر پڑی۔ یہ دھات کے روپے سے بھی کچھ بڑا پیتل کا ایک بٹن تھا جس لیکن درختوں کے درمیان سے تھوڑی سی دھوپ اس پر پڑ رہی تھی جس کی وجہ سے وہ خود ہی میری نظر میں آ گیا تھا۔

بٹن کچھ غیر معمولی سا تھا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھا لیا۔ اس کی موٹائی بھی دھات کے روپے سے کچھ زیادہ ہی تھی اور اس کے پیچھے کپ نما حصے میں تازہ ٹوٹے ہوئے دھاگے بھی اٹکے ہوئے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ جس وقت میں نے اس نامعلوم شخص کو باغ کی دیوار سے اوپر ہوا میں بلند ہوتے دیکھا تھا تو اس کے کوٹ کے بٹن بند معلوم ہوتے تھے لیکن جب ہم نے اسے مردہ حالت میں چت پڑے دیکھا تو اس کے کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے۔ شاید گرتے وقت اس کا کوٹ کسی درخت کی شاخ میں اٹکا تھا جس کی وجہ سے یہ بٹن ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے فوراً ہی پلٹ کر لاش کے کوٹ کا اگلا حصہ الٹ کر دیکھ لیا اور میرے خیال کی تصدیق ہو گئی۔ اس کے کوٹ میں یہی ایک بٹن تھا جو ٹوٹ کر گر چکا تھا۔ اس تصدیق کے چکر میں ان دو نامعلوم آدمیوں کی آوازیں کچھ اور قریب آ گئی تھیں۔ تاہم درختوں کی قطاروں کے درمیان وہ کہیں نظر نہیں آئے تھے۔ ہم تینوں دیوار پھلانگ کر تیزی سے ٹونی کی گاڑی کے قریب جا پہنچے۔

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم نے صورت حال کو سمجھنے میں تھوڑی سی غلطی کی۔ میں اس شخص کو زندہ سلامت پکڑنا چاہتا تھا۔"

"مجھے آپ کے کہنے سے پہلے ہی اپنی غلطی کا اندازہ ہو چکا ہے سر!" ٹونی کے لہجے میں شرمندگی تھی۔ "میں نے اس کی ٹانگ کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی حیرت انگیز پھرتی کی وجہ سے میرا اندازہ کچھ غلط ہو گیا۔"

"تم کچھ دیر کے لئے میری نگرانی ملتوی کر کے ابھی واپسی میں ہی رجسٹریشن آفس ہوتے آؤ۔" میں نے سرخ شیورلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "نمبر تو تمہیں یاد ہو ہی گیا ہو گا؟"

"اتنی دیر نظر کے سامنے رہا ہے سر! وہ تو ابتدائی چند سیکنڈ میں ہی ازبر ہو گیا تھا۔" ٹونی مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کے بعد ہم اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر تیزی سے واپس روانہ ہو گئے۔ اس وقت باغ میں دیوار کے عقب میں کوئی ایسی آواز نہیں ابھری تھی جس سے اندازہ ہوتا کہ لاش دریافت کر لی گئی ہے۔ عین ممکن تھا کہ لاش بہت دیر تک دریافت نہ ہو پاتی۔

چند لمحے بعد میں نے ٹونی کو آگے نکل جانے دیا اور خود رفتار بالکل کم کر لی۔ مجھے امید تو کم ہی تھی کہ گاڑی کے نمبر کی مدد سے اس مختصر الوجود شخص کے بارے میں کوئی سراغ میسر آ سکے گا لیکن چیک کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ بٹن میں نے رکھ لیا تھا۔ جانے کیوں وہ مجھے کچھ غیر معمولی لگا تھا اور میں چشم تصور سے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس مجہول سے شخص کے ڈھیلے ڈھالے کوٹ

اس وقت میں اسٹوڈیو سے دو تین فرلانگ کے فاصلے پر ہی تھا جب ٹریفک جام ہونے کی وجہ سے مجھے کچھ دیر کے لئے سڑک کے کنارے گاڑی روکنی پڑی۔ سڑک کے درمیان کوئی رکاوٹی پٹی نہیں تھی اور ٹریفک دو طرفہ تھا۔ یہاں سے کچھ آگے تک ہر قسم کی گاڑیوں کی بہت آمدورفت رہتی تھی اور بدنظمی کی وجہ سے کبھی کبھار ٹریفک جام ہو جاتا تھا۔

میرے بائیں ہاتھ پر نشیب میں خاصا طویل و عریض گڑھا تھا جس میں گندا پانی کھڑا تھا۔ اسی گڑھے سے متصل ایک جزیرہ نما' جگہ تھی جس پر بہت بڑا نیم پختہ چھپر ڈال کر کسی نے عوامی قسم کا ریستوران کھول رکھا تھا جس کی بے ہنگم کرسیاں میزیں سڑک کے کنارے تک آئی ہوئی تھیں۔

میرے آگے ملتان سے آنے والی ایک بس کھڑی تھی جس کا ڈرائیور مسلسل پریشر ہارن بجا رہا تھا مگر کوئی اس کی بھیانک آواز پر کان نہیں دھر رہا تھا۔ اس سے آگے ایک آدھ کار' ایک دو تانگے' ایک ٹھیلا' مالٹوں سے لدی ہوئی ایک بہت بڑی گھوڑا گاڑی' چند سائیکل سوار اور چند اسکوٹر سوار غرض کہ ہر طرح کی سواریاں موجود تھیں۔

سب سے آگے ایک اومنی بس تھی جس میں کوئی نہایت اطمینان سے چڑھ رہا تھا اور کوئی اتر رہا تھا جبکہ کنڈکٹر زنانہ حصے کے قریب کھڑا چند برقع پوش عورتوں سے جھگڑا کر رہا تھا۔ انہیں گردوپیش کی گویا کوئی پروا نہیں تھی۔ صحیح طور پر کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ٹریفک پھنسا ہوا کہاں ہے۔

میرا ذہن اس وقت کئی معاملات میں الجھا ہوا تھا اس لئے میں صبروسکون سے ٹریفک رواں ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ اسی دوران میری نظر دو آدمیوں پر پڑی جو چھپر والے ریستوران سے نکلے تھے۔ ان میں سے ایک کا حلیہ ایسا تھا کہ اس کا اس قسم کے ریستوران میں جانا کچھ عجیب سا ہی لگ رہا تھا۔ وہ بیش قیمت سوٹ میں تھا اور اس کے سر سے پاؤں تک آسودگی کی چمک نظر آ رہی تھی۔

وہ قدرے ترچھا ہوا تو فاصلہ کافی ہونے کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ معروف فلمی مصنف نصیر نواز تھا۔ اس کے ساتھ چھپر سے باہر آنے والا شخص ہر لحاظ سے اس سے بہت مختلف تھا۔ وہ معمر اور مفلوک الحال تھا۔ نہایت معمولی سی شکن آلود شلوار قمیص' پیروں میں کینوس کے گرد آلود جوتے' سر پر پرانی سی جناح کیپ اور آنکھوں پر موٹے موٹے عدسوں کی عینک۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔

ان کے درمیان کسی مسئلے پر بحث و تکرار گویا آخری مرحلے میں تھی۔ معمر شخص بے بسی آمیز انداز میں بار بار دونوں ہاتھ پھیلا پھیلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ نصیر نواز کے انداز سے ظاہر تھا جیسے وہ اس دانت پیس رہا ہو لیکن گردوپیش کا خیال کرتے ہوئے خود پر ضبط کر رہا ہو۔ وہ کچھ مضطرب بھی معلوم ہوتا تھا۔ بار بار غیر محسوس انداز سے ادھر ادھر بھی دیکھ رہا تھا۔

اپنی وجاہت اور خوش پوشی کی وجہ سے وہ دور سے ہی نمایاں نظر آ رہا تھا لیکن شاید وہ اکثر مضطرب بھی رہتا تھا۔ گزشتہ روز سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں بھی میں نے جب اسے اس کی دوست اور ایک دولت مند خاتون طاہرہ خانم کے ساتھ دیکھا تھا تب بھی وہ مجھے کچھ مضطرب ہی معلوم ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تخلیق کار قسم کے لوگوں پر اس وقت قدرے اضطراب اور ہیجان طاری ہوتا ہے جب وہ کچھ تخلیق کر رہے ہوں لیکن وہ شاید ہر وقت ہی تخلیقی موڈ میں رہتا تھا۔

چند لمحے بعد بالآخر ان کے درمیان بحث شاید ختم ہو گئی۔ اس وقت تک سب سے آگے والی اومنی بس نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔ معمر اور قدرے مفلوک الحال شخص گرتا پڑتا اس کی طرف لپکا اور جلدی سے بس میں چڑھ گیا۔ نصیر نواز ایک لمحے وہیں کھڑا رہا پھر اس نے شاید قدرے سکون محسوس کرتے ہوئے سر اٹھا کر گہری سانس لی اور کچے ہی میں آگے بڑھ گیا۔ چھپر سے ذرا آگے نشیب میں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ جگہ ایسی تھی کہ وہ پھنسے ہوئے ٹریفک سے آگے گاڑی سڑک پر لا کر اطمینان سے روانہ ہو سکتا تھا۔

اس نے ایسا ہی کیا اور چند لمحے بعد میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس کی گاڑی نئے ماڈل کی فورڈ کیپری تھی۔ خاصی مہنگی گاڑیوں میں سے ایک۔ مانا کہ نصیر نواز ایک کامیاب فلمی مصنف تھا لیکن میرا خیال تھا کہ محض کہانی نویسی کے بل بوتے پر اس کے یہ ٹھاٹ باٹ نہیں ہو سکتے تھے۔ شاید اس کی دولت مند دوست کی عنایات بھی شامل حال تھیں۔ آخر وہ اس کی فلم بھی تو فائنانس کر رہی تھی۔ اس کے علاوہ بھی نہ جانے کہاں کہاں اس کا فائنانس کام میں آ رہا تھا۔

میں اسٹوڈیو پہنچا تو چھوٹے سے کمپاؤنڈ میں نصیر نواز کی گاڑی بھی کھڑی نظر آئی۔ میں گاڑی پارک کر کے اپنے آفس میں چلا گیا۔ اس آفس میں اب مہینوں بعد ہی میرا چکر لگتا تھا لیکن ایک کمرا میرے لئے مخصوص تھا۔ میں اس میں جانے کے بجائے آفاق کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ فون پر کوئی نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور مؤدبانہ انداز میں اٹھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "سر! میں آپ سے ہی رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

اس کے مقابل شلوار قمیص میں ایک ادھیڑ عمر فربہی مائل سا شخص بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بھی مؤدبانہ انداز میں سلام کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر موٹی موٹی مونچھوں کی موجودگی کے باوجود بچپنے کا سا بھولپن تھا۔

آفاق اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "سر! یہ عبدالواحد ایکسٹرا سپلائر ہے۔ میں نے اس خیال سے اسے بلوایا تھا کہ شاید آپ براہ راست اس سے بات کرنا پسند کریں۔ میں انہیں ہیڈ آفس کا نمبر ہی ملا رہا تھا۔"

تعارف ہونے پر عبدالواحد نے دوبارہ مجھے سلام کیا اور کچھ زیادہ ہی انکساری سے جھکتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ اکثر و بیشتر زبان خلق 'نقارہ خدا ہی ثابت ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں اب تک جس شخص نے بھی بات کی تھی' اسے ایک اچھا آدمی ہی قرار دیا تھا اور وہ چہرے مہرے سے حقیقتاً اچھا آدمی ہی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی آفاق کے مقابل بیٹھ گیا۔ آفاق کے سامنے فلم کا اسکرپٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ اس نے ایک طرف کھسکا دیا اور یوں میز پر قدرے جھک گیا جیسے کوئی اہم کانفرنس شروع ہونے والی ہو۔

"اوہ ۔۔ تم تو بہت سنجیدہ ہو گئے آفاق!" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ "میں یہاں کوئی میٹنگ طلب کرنے ہرگز نہیں آیا۔ میں تو ایک کام سے اس علاقے میں آیا ہوا تھا۔ سوچا ذرا دفتر میں بھی جھانکتا چلوں۔ ہو سکے تو اچھی سی کافی پلواؤ۔"

آفاق نے انٹر کام پر ریسپشنسٹ لڑکی کو کافی بھجوانے کی ہدایت کی۔ وہ ریسیور رکھ چکا تو میں نے عبدالواحد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ویسے مجھے امید نہیں ہے کہ مقتولہ نشاط کے بارے میں کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی ہے۔ میرا خیال ہے اس کے بارے میں تو آپ بھی کوئی خاص بات نہیں بتا سکتے۔"

"ہاں جناب! یہ تو آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ "جب وہ زندہ تھی اور اس سے واسطہ رہتا تھا تو کبھی اسے کریدنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی۔ بالکل کھلی کتاب لگتی تھی وہ ۔۔ ہر وقت ہنستی مسکراتی ہوئی ۔ اور اپنی چھوٹی چھوٹی باتیں بھی سب کو بتا دینے والی ۔۔۔ لیکن اب احساس ہو رہا ہے کہ صحیح معنوں میں ہم تو اس کے بارے میں کوئی خاص بات نہیں جانتے تھے ۔۔"

نشاط کے بارے میں کم و بیش یہی بات اس کی روم میٹ ملکہ نے کہی تھی۔ عبدالواحد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "درحقیقت اسی وجہ سے میں زیادہ پریشان ہوں۔ کون اس بات پر یقین کرے گا کہ جن لوگوں سے چوبیس گھنٹے نشاط کا واسطہ پڑتا تھا وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔" اس کے لہجے سے واقعی پریشانی جھلک رہی تھی۔

"میں اس بات پر یقین کر چکا ہوں عبدالواحد!" میں نے ملائمت سے کہا۔ "ہمارے معاشرے میں جہاں اور بہت سے بڑے مسائل پیدا ہو گئے ہیں وہاں ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے ہاں لوگ ایک دوسرے کا اعتبار کھوتے جا رہے ہیں۔ کوئی کسی کا یقین ہی نہیں کرتا۔ ہر کوئی دوسرے کو جھوٹا سمجھتا ہے اور ہر ایک کو دوسرے کی بات میں ہیرا پھیری نظر آتی ہے"

"اللہ آپ کی عمر دراز کرے جی ۔۔۔ آپ نے میرے دل کی کہہ دی۔" عبدالواحد جلدی سے بولا۔ "ایسے میں ان لوگوں [illegible] سچ بول کر زندگی گزارنا

چاہتے ہیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "ہمارے پیشے کو یا ہم کو کچھ زیادہ اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا سر جی! ایکسٹرا گرلز کو کوئی عزت دینے کے لئے تیار نہیں ہوتا لیکن جناب! دکھ سکھ ہمارے بھی دوسرے لوگوں جیسے ہی ہیں۔ ہمارے بھی مسائل ہیں۔ ہمارے بھی جذبات ہیں۔ ہمارے ہاں بھی اچھی قدریں' اچھے جذبے' چھوٹی چھوٹی کمینگیاں' بڑی بڑی ضرورتیں' سب کچھ دوسروں ہی کی طرح ہے۔ ہم بھی بچوں کے لئے دو وقت کی روٹی کمانے کے چکر میں صبح شام سرگرداں رہتے ہیں ۔۔۔۔"

اس نے بے چینی سے آرام دہ کرسی پر پہلو بدلا۔ "اب اگر میں کسی سے کہتا ہوں کہ نشاط بہت اچھی لڑکی تھی تو کوئی یقین نہیں کرتا۔ کم از کم دل میں یقین نہیں کرتا۔ میں یہ نہیں کہتا جی کہ وہ پارسا تھی' بہت بھولی تھی' اس نے دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں تھا' اسے تو کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود بھی کوئی اچھا ہو سکتا ہے نا؟ دلدل میں پھنسے ہوئے لوگ بھی تو اچھے ہو سکتے ہیں نا! یہ میرا نظریہ ہے۔ آپ چاہے اس سے متفق ہوں۔"

وہ اب پہلے کی طرح اٹک اٹک کر نہیں بول رہا تھا۔ جذبات سے اس کے لفظوں میں روانی آ گئی تھی اسی طرح اگر میں یہ کہوں کہ مجھے نشاط سے بغیر کسی غرض کے ہمدردی تھی تو کوئی یقین نہیں کرے گا۔ لوگ سمجھتے ہیں جی کہ ہمارے ماحول میں تو اچھے جذبے پنپ ہی نہیں سکتے۔ میں اب اس عمر میں اس سے کیا غرض رکھتا جی۔ بڑے بڑے بچے ہیں۔ بیس سال ہو گئے ہیں انڈسٹری میں دھکے کھاتے ہوئے۔ بہت کچھ دیکھ لیا ہے جی ۔۔۔۔ بہت کچھ برت لیا ہے۔ اب دل بجھ سا گیا ہے۔ بس وہ لڑکی اچھی لگتی تھی۔ اس کے لئے دل میں شفقت سی تھی۔ اس کی مدد کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن سچی بات ہے' ہم جیسے لوگ کسی کی کیا مدد کر سکتے ہیں؟"

"مختصر یہ کہ اس کے بارے میں آپ جانتے کچھ نہیں تھے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"جی ہاں۔ اب یہی سوچ کر تو حیرت ہوتی ہے" اس نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ "حالانکہ ہمارا زیادہ تر واسطہ لڑکیوں سے بس کی حد تک ہی رہتا ہے لیکن پھر بھی ہم زیادہ تر لڑکیوں کے پورے شجرۂ نسب سے واقف ہوتے ہیں۔ کون کہاں سے آئی ہے' کس کی ماں کون ہے ۔۔۔ کون بال بچے دار ہے اور کون چھڑی چھانٹ سب ہمیں زبانی یاد ہوتا ہے لیکن نشاط کے بارے میں بس معلوم ہے کہ وہ پہلے کسی ہوسٹل ٹائپ مکان میں رہتی تھی پھر کے پاس چلی گئی تھی۔ وہ یہیں اسٹوڈیو میں مجھ سے ٹکرائی تھی ایک دو ملاقاتوں کے بعد ہی یوں محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں اسے جانتا ہوں۔ اس نے پہلی ملاقات میں ہی صاف بتا کہ وہ آئی تو ہیروئن بننے کے لئے تھی لیکن اس نے بہت د لئے ہیں اور اب وہ ایکسٹرا کے طور پر بھی کام کرنے کے

ہے۔"

"اس کے کسی سے کسی خاص تعلق کا اندازہ نہیں ہوا کبھی آپ کو؟" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"جی نہیں۔ میں نے خود اس پہلو پر بہت سوچا لیکن میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا سر جی!" وہ قدرے بے بسی سے سہلاتے ہوئے بولا۔ "وہ ہر ایک سے ہی ہنس کر ملتی تھی لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ کسی سے اس کا تعلق خاص تھا یا نہیں۔ ویسے ۔۔۔ ایک بات میں نے چند دن پہلے محسوس کی تھی لیکن ۔۔۔ شاید وہ میرا وہم ہی ہو ۔۔۔"

وہ تذبذب کے سے عالم میں خاموش ہو گیا۔ پھر میرے کچھ کہنے سے پہلے خود ہی بولا۔ "مجھے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے وہ بار بار مجھے کچھ بتانے یا شاید مجھ سے کچھ پوچھنے کا ارادہ باندھتی ہو اور پھر توڑ دیتی ہو۔ میں ان دنوں اپنے کچھ چکروں میں پریشان تھا۔ اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکا اور شاید اسی لئے وہ بھی کہتے کہتے رہ گئی کہ میں تو پہلے ہی اپنے چکروں میں پھنسا ہوا ہوں۔ یہ خیال شاید اب زندگی بھر کانٹے کی طرح ذہن میں کھٹکتا رہے کہ اگر میں نے اسے کریدا ہوتا' ذرا اصرار کیا ہوتا تو شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جاتی۔"

کافی آ چکی تھی۔ کافی پینے کے دوران بالکل ہی خاموشی چھائی رہی۔ ہم تینوں ہی گویا اپنی اپنی جگہ خیالوں میں الجھے ہوئے تھے۔ دفعتاً انٹر کام کا بزر بجا۔ آفاق نے ریسیور اٹھا کر بات سنی پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "سر نصیر نواز آیا ہے۔ کیا اسے یہیں بلوا لوں؟"

"ہاں۔ بلوا لو" میں نے بلا تامل کہا۔

اس نے ریسپشنسٹ کو ہدایت کی اور ریسیور رکھ کر نیچی آواز میں بولا "اس سے پہلے تو یہ کبھی یہاں نہیں آیا۔ آج کیسے آ گیا۔"

"ہر کام کا کوئی نہ کوئی پہلا دن ہوتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور نصیر نواز بہ آواز بلند سلام کرتے ہوئے اندر آ گیا۔ میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا اور وہ عبدالواحد ہی کی طرح جھک کر مجھ سے ملا حالانکہ وہ مجھے جھکنے والا آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔

"آپ سے ملنے کا کافی دنوں سے اشتیاق تھا ۔۔۔" وہ گرمجوشی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "گزشتہ رات آپ سے تعارف ہوا بھی تو سعید صاحب کے ہاں پارٹی کی ہڑبونگ کے دوران ہوا ۔۔۔ اور پھر وہ اس لڑکی والا ناگوار واقعہ پیش آ گیا ۔۔۔ کیا نام تھا اس کا ۔۔۔" اس نے گویا اپنی یادداشت کا دروازہ کھٹکھٹانے کے لئے کنپٹی پر انگلی ماری۔

"نشاط؟" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"ہاں ۔۔۔ نشاط ۔۔۔ سوئمنگ پول سے اس بے چاری کی لاش برآمد ہونے کے بعد تو پارٹی تباہ ہی ہو کر رہ گئی۔ آپ سے مزید بات چیت کا شرف ہی حاصل نہیں ہو سکا۔ اب پتا چلا کہ آپ اسٹوڈیو میں آئے ہوئے ہیں تو میں نے سوچا' چل کر نیاز حاصل کروں۔ اسٹوڈیو میں آپ کی آمد بھی ایک خبر ہوتی ہے۔" اس نے مصافحے کے بعد اب تک میرا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔

"بس ۔۔ محبت ہے آپ کی ۔۔۔ اور دوسرے لوگوں کی۔" میں نے مسکراتے ہوئے ملائمت سے کہا۔ "تشریف رکھیے نا۔"

وہ دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ بیٹھا کیا بلکہ ڈھیر ہو گیا۔ پھر وہ بغیر کسی بات کے ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ "مجھ جیسے لوگوں کو تو آپ جیسے لوگوں سے ویسے بھی ملتے رہنا چاہئے۔ کیا پتا کب آپ لوگوں کی نظر کرم ہو اور کب آپ ہمیں خدمت کا موقع دیں۔"

"نظر کرم ۔۔ اور خدمت کا موقع ۔۔۔" آفاق استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر بولا۔ "اب کی بات تو میں نہیں کر سکتا لیکن کچھ عرصہ پہلے تک کم از کم مجھ جیسے آدمیوں کے لئے تو تمہارے پاس وقت نہیں ہوتا تھا۔ یاد ہے میں نے پچھلے سال تمہارے گھر کے کتنے چکر لگائے تھے۔ حالانکہ سبجیکٹ بھی میرے پاس تھا۔ صرف اسکرین پلے اور ڈائیلاگز ہی کی بات تھی اور میں مکمل طور پر ہر چیز کے کریڈٹ پر تمہارا نام دینے کو تیار تھا۔ بس میرے پاس پیسے ذرا کم تھے۔ تمہارے پاس بات کرنے کا وقت نہیں ہوتا تھا۔" آفاق نے اپنے لہجے میں زیادہ طنز جھلکنے نہیں دیا تھا۔ وہ کافی حد تک ملائمت کے ساتھ ہی گویا کسی شخص کو محض کوئی بھولی بسری بات یاد دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

نصیر نواز ذرا بھی شرمندہ یا پریشان ہوئے بغیر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "بات کرنے کا وقت تو میرے پاس اب بھی نہیں ہے میری جان! لیکن تم دراصل بات کو سمجھتے نہیں ہو اسی لئے ہر تھوڑے عرصے بعد تم پر زوال آ جاتا ہے۔ بھئی اس وقت میں ہر وہ چیز لکھ رہا تھا جس کے لئے مجھے پیسے مل رہے تھے۔ کوڑا کرکٹ لکھ رہا تھا میں ۔۔۔ ہر ایک سے پیسے پکڑے ہوئے تھے میں نے۔ لوگ میرے پیچھے لگے ہوئے تھے۔ چل سو چل کا زمانہ تھا۔ ہر راجے گامے کے لئے "اسٹوری" لکھ رہا تھا میں۔ میرے پاس واقعی وقت نہیں تھا۔ میں تم جیسے شریف آدمی کو پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ورنہ ایسی کیا بات تھی میری جان! چار پیسے کم یا زیادہ۔ اس سے کیا فرق پڑ جاتا؟ اب میں کم کام کرتا ہوں' ستھرا کرتا ہوں۔ اسکرپٹ پر ٹائم لگاتا ہوں اور لمبے پیسے لیتا ہوں۔ اب میں چالو کام نہیں کرتا۔ خاص خاص پارٹیوں کے لئے کرتا ہوں اور خاص خاص پارٹیاں ہی اصل میں میرا کام افورڈ کر سکتی ہیں۔ اللہ کا بڑا کرم ہے' اب میں آسودہ ہوں۔ اب میں آنکھیں بند کر کے کنٹریکٹ سائن نہیں کرتا۔ اب تو صرف چوہدری صاحب جیسے لوگوں کے لئے کام کرنے کا موڈ بنتا ہے۔" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ وہ جب خاموش ہوتا تھا تو بڑا کم گو اور متین آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے اب پہلی مرتبہ اسے صحیح معنوں میں بولتے سنا تو اندازہ ہوا کہ وہ زبردست لفاظ اور چرب زبان تھا۔

آفاق نے اس موضوع کو آگے نہیں بڑھایا۔ بحث نہیں

چھیڑی بلکہ اس کے لئے کافی منگوائی۔ نصیر نواز نے عبدالواحد ایکسٹرا سپلائر کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس سے ہاتھ بھی نہیں ملایا تھا بلکہ وہ گویا اسے نظر ہی نہیں آیا تھا۔

کافی آئی تو پیالی اٹھانے سے پہلے نصیر نواز نے اپنا دھوپ کا بیش قیمت اور نفیس چشمہ اتار دیا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی تھی اور ان کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ شاید کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ سوتا بہت کم تھا۔

کچھ دیر فلموں کی، کہانیوں کی اور ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ تر نصیر نواز ہی بول رہا تھا۔ باتوں باتوں میں وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس لڑکی کی موت میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے گزشتہ رات آپ کے تاثرات سے ہی اندازہ ہوگیا تھا۔" وہ کافی کی پیالی رکھ کر اپنے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے بولا۔ لہجے میں بے پروائی سی تھی۔

"یہ تو بڑی افسوسناک اطلاع دی آپ نے۔ کہ مجھے اب اپنے تاثرات پر قابو نہیں رہا" میں نے بدستور خوشگوار لہجے میں کہا۔

"قابو تو یقیناً ہوگا لیکن جناب' تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔" اس نے ایک بار پھر بے وجہ سا قہقہہ لگایا۔ "اور پھر ہم تو رہتے ہی تاثرات کی دنیا میں ہیں۔ اسکرین پر تاثرات بیچتے ہیں۔ تاثرات کی کمائی کھاتے ہیں۔"

"مصنوعی تاثرات کی۔" میں نے گویا تصحیح کی۔

"جی ہاں۔ مصنوعی تاثرات کا کاروبار کرتے کرتے اصلی تاثرات کو پرکھنے کا بھی سلیقہ آجاتا ہے۔" وہ ایک بار پھر ہنسا۔ وہ گویا کسی لڑکی کی موت کا نہیں بلکہ اس سے میرے حسین معاشقے کا تذکرہ کررہا تھا۔

"تو آپ نے اندازہ لگالیا کہ میں اس لڑکی کی موت میں دلچسپی لے رہا ہوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"پچھلی رات تو محض شبہ ہوا تھا کہ آپ دلچسپی لیں گے لیکن اب انہیں یہاں دیکھ کر یقین ہوگیا ہے۔" اس نے پائپ سے عبدالواحد کی طرف اشارہ کیا۔

"تو آپ انہیں جانتے ہیں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ بہت پرانے ایکسٹرا سپلائر ہیں یہ اسٹوڈیو کے۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک خوبصورت لائٹر سے پائپ کو شعلہ دکھایا۔

اس لمحے عبدالواحد بھی بول اٹھا۔ "شکر ہے نصیر نواز صاحب! آپ نے اس خادم کو بھی پہچان لیا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا' میں آپ کو نظر ہی نہیں آیا۔"

"بھئی میں نے تو کمرے میں داخل ہوتے ہی سب کو سلام کیا تھا۔ ان میں آپ بھی شامل تھے۔" نصیر نواز نے ملائمت سے کہا۔ عبدالواحد چپ ہوگیا۔

ایک طویل کش لے کر نصیر نواز میری طرف دیکھتے ہو۔ مسکرایا۔ "بہرحال میرا اندازہ درست رہا نا۔ آپ اس لڑکی نا۔ کی موت میں دلچسپی لے رہے ہیں؟"

"نائیلہ نہیں' نشاط" میں نے تصیح کی "اور میں اس کی مو۔ میں نہیں اس کے قتل میں دلچسپی لے رہا ہوں۔ نصیر نواز صاحب اس کے چہرے پر دراصل فریاد رقم تھی۔ اور فریادی چہرے میر۔ لاشعور میں بیٹھ جاتے ہیں۔"

"لیکن چوہدری صاحب! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں.... ا۔ کاروبار پھیلے ہوئے ہیں آپ کے.... کتنی مصروفیت رہتی ہوگی آ۔ کو.... آپ یہ ایسے چھوٹے موٹے معاملات میں پولیس والوں طرح تفتیش کے لئے وقت کیسے نکال لیتے ہیں؟" اس کے لہجے۔ حیرت بھی تھی' ستائش بھی' تجسس بھی اور بے یقینی بھی۔ لیکن اندازہ کرنا مشکل تھا کہ ان میں سے کون سا جذبہ حقیقی تھا۔

"میرے کاروبار مشینی انداز میں چل رہے ہیں" میں۔ کہا۔ "میں چاہوں تو میرے پاس وقت ہی وقت ہے اور نہ چاہوں چوبیس گھنٹے بھی مصروف رہ سکتا ہوں۔"

"خیر جی.... آپ کا جذبہ لائق تحسین ہے۔" اس۔ امریکیوں والے انداز میں کندھے اچکائے۔ پھر گویا موضوع بد۔ ہوئے بولا۔ "کل آپ نے وہ بھی بڑا کمال کیا... ہمارے ۔ صاحب کو ایک ہی گھونسے میں زمین چٹا دی۔ بے چارے کا رعب تھا اسٹوڈیوز میں۔ سچ مچ کا ٹارزن سمجھا جاتا تھا اسے۔"

"بہت بے وقوف سا آدمی ہے۔" میں نے بے پروائی۔ کہا۔

"بے وقوف نہیں ہے جناب! اس بے چارے کے انداز غلط نکلے آپ کے بارے میں۔" نصیر نواز کے لہجے میں ایک بار ستائش جھلک آئی۔ وہ مجھ سے متاثر ضرور تھا لیکن اس کے اظ میں خلوص نہیں تھا۔ وہ درحقیقت بڑی ہوشیاری سے یہ اند کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ مجھ پر خوشامد کا زہر اثر انداز ہوتا یا نہیں۔ میں نے اپنا رویہ مبہم ہی رکھا۔ میں اسے کوئی بھی اندازہ لگانے کا زیادہ موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔

کافی ختم کرکے میں نے گھڑی دیکھی اور اٹھنے کا ارادہ کر۔ لیکن اسی لمحے آفاق کو انٹرکام پر ریپشنسٹ نے اطلاع دی کہ فون ہے۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف تھا۔

"سر! اس سرخ شیورلیٹ کی نمبر پلیٹ جعلی تھی۔" اس اطلاع دی۔ "غالباً وہ گاڑی چوری کی تھی۔"

"مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا' .... مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ انتظار کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں ہوتا ہے۔" میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میرے آدمیوں کارکردگی تسلی بخش تھی۔ کم سے کم وقت میں وہ مطلوبہ معلو حاصل کرلیتے تھے۔

نصیر نواز کافی ختم کرکے اٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے اب اجازت جیئے۔" پھر وہ آفاق کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت شیریں لہجے میں ا۔ "آفاق! میری جان! تم جب بھی میری ضرورت محسوس کرو' رف ایک فون کرکے مجھے بلوا سکتے ہو۔" بڑے اسٹائل سے اس نے دھوپ کا چشمہ اٹھا کر ناک پر جمایا اور رخصت ہوگیا۔

اس کے جانے کے بعد چند لمحے خاموشی رہی پھر میں نے آفاق سے پوچھا۔ "تمہارے خیال میں نصیر کیسا آدمی ہے؟"

"میرا اس سے واسطہ کم رہا ہے۔ میں اسے زیادہ سمجھ نہیں کا۔" آفاق ٹھہرے لہجے میں بولا "تاہم میرا خیال ہے کہ یہ ن لوگوں میں سے ہے جو دنیا میں لامحدود ترقی کرنا چاہتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ آگے جانا چاہتے ہیں اور اس مقصد کے لئے وہ کوئی بھی رم اٹھانے سے گریز نہیں کرتے۔ ان کی کوئی اخلاقیات یا اصول ہیں ہوتے۔ بس اپنا کام نکالنا ان کے لئے ہر چیز سے مقدم ہوتا ہے۔ ہمارا اسلیم سید بھی اسی کے درجے کا مصنف ہے بلکہ اس کی بعض کہانیاں اس سے بھی بہتر رہی ہیں اور اس نے اکثر و بیشتر فلموں کو ایک نیا ٹرینڈ دینے کی کوشش کی ہے لیکن وہ اس کے مقابلے میں کہیں زیادہ شریف' سلجھا ہوا اور قناعت پسند آدمی ہے اس لئے وہ اس جتنا دولت مند آدمی نہیں ہے۔ وہ اپنے اسٹائل سے مصنف لگتا ہے۔ نصیر نواز نہ جانے کیوں مجھے رائٹر نہیں لگتا۔ کوئی تیز طرار اور شاطر قسم کا بزنس مین لگتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہاری رائے اس کے بارے میں اچھی نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن اگر کبھی وہ مجھے آپ کے کسی بھی پروجیکٹ کے لئے کارآمد نظر آیا تو میں اس کے پاس ضرور چلا جاؤں گا کیونکہ یہاں میں آپ کے مفادات کی نگرانی کے لئے بیٹھا ہوں۔ ذاتی پسند اور ناپسند کو مقدم سمجھنے کے لئے نہیں" آفاق بلا تامل بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں آفاق ڈیئر!" میں نے ملائمت سے کہا۔ "میرے مفادات کے سلسلے میں تم اپنے آپ کو اتنا پابند ہرگز مت سمجھو۔ تمہیں اپنی پسند اور ناپسند کو بھی معقول حد تک اہمیت دینے کی آزادی ہے۔ آخر تم ایک معقول آدمی ہو۔ ظاہر ہے تمہاری ذاتی پسند اور ناپسند اتنی نامعقول تو نہیں ہوگی۔"

"شکریہ سر! یہ آپ کی مردم شناسی بھی ہے اور کشادہ دلی بھی۔" آفاق کے لہجے میں حقیقی ممنونیت تھی۔

عبدالواحد اٹھتے ہوئے بولا۔ "سر جی! مجھے اب اجازت.... آپ سے مل کر طبیعت بڑی خوش ہوئی ہے سر جی! بہت مدت بعد ایک ایسے آدمی سے ملاقات ہوئی ہے جس کا دل سونا ہے سونا۔"

"بھئی آج تو شاید میرے لئے اپنی تعریفیں ہی تعریفیں سننے کا دن ہے۔" میں نے حقیقتاً تھوڑی سی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ عبدالواحد نہایت انکساری سے ایک بار پھر جھک کر ملا اور رخصت ہوگیا۔ آفاق نے بتایا کہ کچھ دیر بعد اسٹوڈیو ہی کے ایک فلور پر ہماری فلم کی شوٹنگ شروع ہونے والی ہے' میں چاہوں تو دیکھنے کے لئے رک سکتا ہوں لیکن میں نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی اور آفس سے نکل کھڑا ہوا۔

ہال پر پہنچ کر میں نے پہلے انٹرکان میں کھانا کھایا پھر اپنے آفس میں آن بیٹھا۔ چند ایک دفتری کام نمٹانے کے بعد ذرا فرصت ہوئی تو میں نے وہ بٹن جیب سے نکالا جو ٹونی کے ہاتھوں مارے جانے والے اجنبی کے کوٹ سے ٹوٹ کر گرا تھا۔

ابھی میں ٹیبل لیمپ کی روشنی میں اس کا جائزہ لینے ہی لگا تھا کہ کمرے میں مکھی کی بھنبھناہٹ سے مشابہ نہایت ہلکی سی آواز گونجنے لگی۔ میں نے ادھر ادھر محض تصدیق کی خاطر دیکھا ورنہ مجھے احساس ہوچکا تھا کہ آواز میرے ہاتھ میں موجود بٹن ہی سے ابھری ہے۔ کمرے میں کوئی مکھی موجود نہیں تھی۔

میں نے بٹن کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پچھلے حصے پر مجھے مسور کے دانے کے برابر ایک ننھا سا ابھار نظر آیا۔ میں نے احتیاط کے ساتھ ناخن سے اسے ذرا دبایا تو وقفے وقفے سے ابھرنے والی معمولی سی بھنبھناہٹ ختم ہوگئی اور اس کی جگہ تیز سرگوشی سے مشابہ ایک آواز ابھری۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ کسی کو مخاطب کیا جارہا تھا لیکن زبان میری سمجھ سے بالاتر تھی۔

میں نے بٹن میز پر رکھ دیا اور تذبذب و خاموشی کے عالم میں اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کے عین وسط میں سرخ رنگ کا جو ایک گول دھبا تھا وہ درحقیقت نہایت ہی باریک قسم کی جالی تھی جس کے سوراخ انسانی جلد کے مساموں سے شاید ہی کچھ بڑے رہے ہوں۔

آواز زیادہ دیر جاری نہیں رہی۔ جلد ہی خاموشی چھا گئی۔ میں نے بٹن کو الٹ کر ایک بار پھر اس ننھے سے ابھار کو ناخن سے دبایا۔ وہ دوبارہ ذرا سا ابھر کر اپنی اصلی حالت پر واپس آگیا۔ میں نے ایک بار پھر بٹن کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ آخر کار مجھے اس کے کناروں پر وہ خفیف سی لکیر نظر آگئی جو کسی جوڑ کی نشاندہی کرتی تھی۔

میں نے میز پر سے اپنی چابیوں کا پرس اٹھایا۔ اس میں چابیوں کے ساتھ چھوٹی موٹی کئی کام کی چیزیں آویزاں تھیں۔ میں نے بلیڈ کی طرح تیز لیکن نہایت مضبوط ایک ننھے سے چاقو کے ذریعے تھوڑی سی کوشش کی اور آخر کار وہ بٹن ڈبیا کی طرح کھل گیا۔ اس کے اندر بال سے زیادہ باریک تاروں اور خوردبینی پرزوں کا جال پھیلا ہوا تھا۔ مائیکرو بیٹری بھی موجود تھی۔ میں نے اس کا بہت اچھی طرح جائزہ لیا۔ میری چھٹی حس نے ابتدا ہی میں مجھے احساس دلا دیا تھا کہ وہ محض کوٹ کا بٹن نہیں ہے۔ وہ بہت عمدہ قسم کا ٹرانسیٹر تھا۔ ٹرانسیٹر ہمارے پاس بھی تھے لیکن اتنا نفیس اور اتنے کم حجم کا ٹرانسیٹر ہم آج تک بھی حاصل نہیں کرسکے تھے حالانکہ رسائی ہماری بھی بہت دور دور تک تھی۔ حجم کم ہونے کے باوجود اس کا دائرۂ کار خاصا وسیع معلوم ہوتا تھا۔

میں ریوالونگ چیئر پر تقریباً نیم دراز ہوگیا اور میز پر رکھے

ہوئے اس ٹرانسیٹر کو یوں دیکھتا رہا جیسے ابھی اس میں سے کوئی مہذب و شائستہ آواز ابھرے گی اور میری تمام الجھنیں چند لمحے میں دور کردے گی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس ننھی سی ڈبیا نے میرے ذہن میں ان گنت سوالوں کا دروازہ کھول دیا تھا جبکہ الجھنوں کا ایک پینڈورا بکس پہلے ہی کھلا پڑا تھا۔

اس قسم کے ٹرانسیٹر بہت منظم قسم کے لوگوں کے پاس ہی ہو سکتے تھے۔ وہ لوگ کون تھے اور کس چکر میں میرے پیچھے لگ چکے تھے یا آئندہ زیادہ زور و شور سے لگنے والے تھے؟ یہ کونسی زبان تھی جو میں نے چند لمحے پہلے ٹرانسیٹر پر سنی تھی؟ وہ شخص کون تھا جس نے میرا تعاقب کیا تھا اور ٹونی کے ہاتھوں مارا گیا تھا؟

ایک تو یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہو گیا تھا کہ میں اس شخص کے بارے میں یہ بھی اندازہ نہیں لگا سکا تھا کہ وہ ملکی تھا یا غیر ملکی؟ وہ پاکستانی بھی ہو سکتا تھا اور غیر ملکی بھی۔ کسی مخصوص قوم سے بھی ہو سکتا تھا اور دوغلی نسل کا بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے اس کی مضحکہ خیز سی شخصیت کے ساتھ اس پرانی کار میں دیکھ کر زیادہ اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب اس ٹرانسیٹر کو دیکھنے اور اس پر ایک اجنبی زبان میں چند الفاظ سننے کے بعد مجھے نہایت سنجیدگی سے اس کے بارے میں سوچنا پڑ رہا تھا بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ مجھے تشویش لاحق ہو چلی تھی۔

کسی سوال کا تو مجھے کوئی جواب نہ ملا البتہ انٹرکام کے بزر نے مجھے چونکا دیا۔ دوسری طرف کیتھرین تھی۔ وہ خط و کتابت کی کچھ فائلیں ایک نظر دکھانے کے لئے میرے پاس بھیجنا چاہتی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اگر سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل رہا تو تھوڑا سا دفتری کام ہی کر لیا جائے۔

دفتری کام میں الجھا تو پھر شام ہی ڈھل گئی۔ گھر جا کر لباس تبدیل کر کے، فریش ہو کر میں ایک بار پھر باہر نکلا۔ مجھے ایک پارٹی میں جانا تھا لیکن اس میں ابھی دیر تھی۔ میں نے سوچا، راستے میں تاجاں کو دیکھتا چلوں کہ میرے آدمیوں نے اس کی رہائش اور علاج معالجے کا کیا بندوبست کیا ہے اور اتنے عرصے میں اس کی حالت میں کتنی بہتری ہوئی ہے۔

اس صاف ستھری بلڈنگ کی دوسری منزل پر پہنچ کر میں نے مطلوبہ فلیٹ کی بیل بجائی۔ راہداری میں سناٹا تھا۔ یہ بلڈنگ زیادہ بڑی نہیں تھی۔ بس چند کشادہ اور آرام دہ فلیٹوں پر مشتمل تھی جن میں سفید پوش اور قدرے آسودہ حال لوگ آباد تھے۔

دروازہ ادھیڑ عمر کی ایک سنجیدہ صورت عورت نے کھولا۔ وہ صاف ستھری سوتی ساری میں تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ چونک کر مودبانہ انداز میں ایک طرف کو ہٹ گئی۔ معلوم نہیں کس طرح وہ مجھے پہچانتی تھی۔

"آپ.....؟" میں نے اندر قدم رکھتے ہوئے کہا۔

"ہمارا نام مہرالنساء ہے صاحب!" وہ میرا ان کہا سوال سمجھتے ہوئے بولی "ہمیں تاجاں بیگم کی خدمت کے لئے رکھا گیا ہے۔ ہمارے علاوہ روزانہ ایک نرس بھی دو گھنٹے کے لئے یہاں آتی ہے اور تیسرے چوتھے دن ڈاکٹر صاحب بھی تاجاں بیگم کو دیکھنے آتے ہیں۔"

"بہت خوب" میں نے طمانیت کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ "تاجاں ہے کہاں؟"

"اپنے بیڈ روم میں ہیں صاحب!" مہرالنساء نامی اس آیا نے مستعدی سے آگے بڑھ کر میری رہنمائی کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ایک کمرے کے دروازے پر ہولے سے دستک دی اور دروازہ کھول کر اندر جھانکتے ہوئے بڑے مسرور سے لہجے میں بولی "تاجاں بیگم! دیکھئے تو کون آپ سے ملنے آئے ہیں؟"

وہ ایک نہایت صاف ستھرا کمرا تھا۔ آرائش میں سادگی تھی مگر وہاں ضرورت کی ہر معیاری چیز موجود تھی۔ صاف ستھرے، بے داغ بستر پر تاجاں نہایت آرام دہ، ڈھیلے ڈھالے لباس میں بستر پر گھٹنوں کے بل بیٹھی تھی اور فلمی رسالے اس کے سامنے کھلے پڑے تھے۔ وہ اس تاجاں سے بہت مختلف تھی جسے میں نے کچھ عرصہ پہلے گاؤں کی اس جھونپڑی میں غلیظ بستر پر بیماری کی حالت میں سسکتے ہانپتے دیکھا تھا۔

اس کے بال جو اس وقت گھاس پھونس کی طرح الجھے ہوئے تھے۔ اب صاف ستھرے، برش کئے ہوئے اور ریشم کی طرح چمکیلے نظر آ رہے تھے اور بڑی خوبصورتی سے اس کی کمر، کندھوں اور رخساروں پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے گندمی رخسار جو اس وقت دھنس چکے تھے اور جن پر موت کی زردی نے قدم جما لئے تھے، اب ان پر زندگی کی چمک لوٹ آئی تھی۔ اس کی آنکھیں جو مایوسی اور مصائب کے دھوئیں سے دھندلا چکی تھیں اب ان میں امید اور بے عنوان جذبوں کے ستارے جھلملانے لگے تھے۔ اس کی جوانی کسی نہ کسی حد تک لوٹنے لگی تھی۔ بہت کم عرصے میں اس کی حالت میں خاصی بہتری آگئی تھی۔ اس پر یقیناً بہت توجہ دی گئی تھی۔ بہت محنت سے اسے موت کی دہلیز سے واپس لایا گیا تھا۔

اسے اتنی بہتر حالت میں دیکھ کر میرا دل ایک عجیب، بے نام سی خوشی سے بھر گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ وہ بھی یکدم بے اختیار سی ہو کر بستر سے اٹھتے ہوئے بولی۔ "افضل! میرے چندا... میرے دوست... میرے محسن!"

الفاظ اس کے منہ سے صحیح طرح نہیں نکل رہے تھے۔ شاید اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ مجھے کس القاب سے پکارے مجھ سے کون سا رشتہ استوار کرے۔ وہ عمر میں مجھ سے صرف چند سال بڑی تھی اور درحقیقت ہمارے درمیان کوئی رشتہ بھی نہیں تھا۔ وہ بس میرے گاؤں کی تھی اور میری یادوں کا ایک حصہ تھی اور جب وہ خود لب گور تھی تو میری جان بچانے کا سبب بن گئی تھی۔ یوں اس کے اور میرے درمیان کوئی رشتہ نہ ہوتے ہوئے بھی ان گنت رشتے تھے۔

وہ کسی غیر مرئی دھارے میں بہتی ہوئی میرے قریب آئی تو میں نے کندھوں سے اسے تھام لیا۔ اس کے وجود سے کلون کی بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ وہ خوابناک سے انداز میں مسکرائی تو اس کے دانت موتیوں کی طرح چمک اٹھے۔ یہ دانت کچھ عرصے پہلے تک گھٹیا سگریٹوں کے دھوئیں سے پیلے ہو چکے تھے۔ اب ان کی وہ سفیدی اور چمک لوٹ آئی تھی جو میں اس زمانے میں دور دور سے دیکھا کرتا تھا جب اس پر شباب کی آمد آمد تھی۔ میں اس وقت بچہ ہی ہوا کرتا تھا۔

وہ اب بھی کمزور تھی۔ ابھی اسے بہت دیکھ بھال، بہت علاج معالجے کی ضرورت تھی لیکن پھر بھی بہرحال زمین آسمان کا فرق تھا۔ میں اس مصور کی طرح اسے دیکھے جا رہا تھا جس سے کسی خاص کوشش کے بغیر کوئی شاہکار تخلیق ہو گیا ہو۔

"افضل...!" دفعتاً وہ رندھی ہوئی سی آواز میں بولی "تو نے مجھے احسانوں کے ایک اونچے پہاڑ تلے دبا دیا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں کیسے تیرے احسانوں کا بدلہ اتاروں گی۔ میں... میں نالی کا کیڑا بن چکی تھی۔ تو نے مجھے اٹھا کر اس جنت میں لا بٹھایا ہے۔" اس نے اپنے گرد و پیش کی طرف اشارہ کیا۔ "میں مٹی کوڑے میں رُلنے والی غریب دیہاتن! میں نے تو یہ چیزیں کبھی خواب میں بھی دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ تو نے میرے لئے اتنا کچھ کیا ہے۔ میں تیرے لئے کیا کروں گی؟ میں تو کسی قابل بھی نہیں ہوں۔ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ کوئی گن۔ کوئی خوبی بھی نہیں ہے۔ میں تو بیکار روڑے پتھر کی طرح ہوں۔"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں" میں گلے میں پھیل جانے والی نمکینی سی نگلتے ہوئے کہا۔ "اگر تو نے آئندہ احسانوں کا ذکر کیا یا ان کے بدلے اتارنے کی بات کی تو میں تجھے اس کھڑکی سے باہر پھینک دوں گا۔ سچ مچ کے روڑے اور پتھروں کی طرح۔" میں نے بیڈ روم کی کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس پر ریشمی پردہ پھیلا ہوا تھا۔

خادمہ نے ایک بار پھر کمرے میں جھانکا اور کھنکار کر مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ "صاحب! میں آپ کے لئے کیا تیار کروں... چائے کافی۔ ٹھنڈا یا......"

"کچھ نہیں، قطعاً کچھ نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں فی الحال صرف چند منٹ کے لئے آیا ہوں۔ کھڑے کھڑے بات کرنے کے لئے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ تاجاں بیگم کے لئے انتظامات ٹھیک ہیں یا نہیں۔"

"یہ تو آپ انہی سے پوچھ لیجئے گا صاحب!" خادمہ نے تاجاں کی طرف اشارہ کیا۔

"اب پوچھنے کی ضرورت نہیں رہی۔" میں نے کہا اور خادمہ واپس چلی گئی۔

تاجاں آنکھیں بند کر کے مٹھیاں بھینچتے ہوئے گہری سانس لے کر بولی "قسم سے، مجھے صبح شام یہی وہم ہوتا رہتا ہے کہ میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ ابھی آنکھ کھولوں گی اور سپنا ٹوٹ جائے گا۔"

"خدا نے چاہا تو یہ سپنا میری زندگی میں تو نہیں ٹوٹے گا۔" میں نے کہا۔

وہ یکدم آنکھیں کھولتے ہوئے بولی۔ "اللہ کرے میری زندگی بھی تجھے لگ جائے۔ میرا دل کہتا ہے کہ تو صرف میرے لئے ہی یہ سب کچھ نہیں کر رہا بلکہ اور بھی نہ جانے کتنے لوگوں کے لئے کیا کچھ کرتا ہو گا۔ ان سب کی دعائیں تیری زندگی کی حفاظت کریں گی۔ بہت لمبی عمر پائے گا تو... اور ہر دن تیرے لئے عروج ہی عروج لے کر آئے گا۔"

میں نے بستر پر پھیلے ہوئے رسالوں کی طرف اشارہ کر کے موضوع بدلنے کی غرض سے کہا "تاجاں! خیر سے اب تو پڑھنے بھی لگی ہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تو تو ان پڑھ ہوا کرتی تھی۔"

"پڑھ کہاں رہی ہوں.... میں تو بس تصویریں دیکھ رہی تھی ٹی وی اور فلم ایکٹروں کی۔" اس نے سادگی سے کہا "اب جسم میں تھوڑی سی جان آگئی ہے نا... اور کوئی کام ہے نہیں کرنے کے لئے۔ اس لئے ذرا بے چینی سی ہونے لگتی ہے۔ کبھی بالکنی میں بیٹھ کر آتی جاتی گاڑیاں دیکھتی ہوں۔ لوگوں کو دیکھتی ہوں۔ کبھی ٹی وی دیکھتی ہوں اور کبھی رسالے پر ولنے لگتی ہوں۔ کوئی کام تو نہیں ہے۔ میرے ہاتھ تو جیسے الٰہ دین کا چراغ لگ گیا ہے۔ ہر کام خود بخود ہو جاتا ہے۔ ہر چیز تیار ملتی ہے۔ جو مانگتی ہوں، حاضر کر دیا جاتا ہے۔"

پھر جیسے اسے یکدم کوئی خیال آیا۔ تاک سیکڑ کر بولی "ویسے میں اتنی زیادہ ان پڑھ بھی نہیں ہوں۔ تھوڑی بہت اردو تو پڑھ لیتی ہوں ذرا کوشش کر کے۔ گاؤں میں تیسری چوتھی جماعت تک تو اسکول گئی ہوں میں۔ بعد میں ابا نے کپاس چننے پر لگا دیا تھا۔"

میں مسکراتا رہا اور محویت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "افضل! تو مجھے کسی کام پر کیوں نہیں لگا دیتا؟ کوئی بھی ایسا کام جس میں میرا دھیان بٹا رہے۔ میں مصروف رہوں۔ ایسا کوئی کام جو میں کر سکوں۔ اب تو مجھ میں جان آگئی ہے۔ ساری زندگی کام کاج کرتے گزری ہے نا۔ بیکار بیٹھنا مشکل لگتا ہے۔"

"ابھی تو کافی عرصہ تجھے اسی طرح بیکار بیٹھنے کی سزا کاٹنی ہے۔" میں نے کہا "پھر جو تیرا جی چاہے کر لیا کرنا۔ ایک عمر پڑی ہے کام کرنے کو۔ اب میں چلتا ہوں۔"

"میں تجھے رکنے کو کہتی۔" وہ میرے ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "لیکن مجھے پتا چل گیا ہے کہ تو بہت بڑا آدمی ہے۔ بہت کام ہوتے ہوں گے تجھے۔ بڑی مصروفیت ہوتی ہو گی۔ آج بھی پتا نہیں میری خاطر کس طرح وقت نکال کر آیا ہو گا۔"

"نہیں، اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ میں اتنا بڑا یا اتنا مصروف آدمی بھی نہیں" اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا اور اس ہاتھ میں زندگی کی حرارت اور گداز لوٹنے لگا تھا۔

"میں بہت جلد دوبارہ تجھے دیکھنے آؤں گا۔" میں نے بیرونی دروازے پر رکتے ہوئے کہا۔ "اس وقت تجھے اور بہتر ہونا چاہئے' تیری صحت اور اچھی ہونی چاہئے۔"

"دنیا بھر کی دوائیاں' پھل فروٹ' طاقت کی چیزیں تو کھا رہی ہوں میں۔ ڈاکٹر نے سگریٹ بھی چھڑا دی ہے میری۔ اب میں نے اچھا نہیں ہونا تو اور کیا ہونا ہے۔" وہ اپنے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔

میں اسے دروازے پر کھڑی چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ وہ اس وقت تک وہیں کھڑی رہی جب تک میں اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔

وہاں سے میں ہلٹن میں پہنچا۔ پارٹی ہلٹن میں تھی۔ وہاں میرا دن اچھا گزرا۔ رات گئے واپسی ہوئی اور میں فوراً ہی شب خوابی کا لباس پہن کر بستر پر ڈھیر ہو گیا لیکن اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ نیند سے میری آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ میں نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا۔

"تو تم نے اسے قتل کر دیا مسٹر چوہدری!" دوسری طرف سے بغیر کسی تمہید کے انگریزی میں کہا گیا۔ آواز بہت بھاری اور گونجیلی تھی۔ مجھے اس میں خمار کی جھلک بھی محسوس ہوئی۔ بولنے والے کی زبان انگریزی معلوم نہیں ہوتی تھی اور وہ پاکستانی بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔

میری نیند یک لخت کافور ہو گئی اور میں بالکل چوکنا ہو گیا لیکن میں نے اپنی آواز حتی الامکان نیند کے خمار سے بوجھل بناتے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا۔ "سوری! رانگ نمبر۔ یہاں کوئی قاتل یا کوئی مقتول' کوئی مسٹر چوہدری نہیں رہتے۔"

"شٹ اپ۔" گونجیلی آواز نے مجھے ڈانٹا۔ "یہ ایک قتل ہم تمہیں معاف کر رہے ہیں۔ شرط صرف یہی ہے کہ تم ہنی کی تلاش میں دلچسپی لینا بالکل چھوڑ دو۔ بھول جاؤ اسے۔ آئندہ تمہیں اس کے گھر کے آس پاس یا کہیں بھی اس کے بارے میں پوچھ گچھ کرتے ہوئے نظر نہیں آنا چاہئے۔ سمجھ گئے؟"

"ہنی سے اگر آپ کی مراد شہد ہے تو میں حلفیہ بیان دے سکتا ہوں کہ میں نے ایک عرصے سے اس میں دلچسپی نہیں لی۔" میں نے بدستور سادگی سے کہا۔ "اب اگر آپ اجازت دیں تو میں فون بند کر کے تھوڑی دیر سو لوں؟"

"زیادہ شوخ بننے یا زیادہ اونچا اڑنے کی ضرورت نہیں۔" گونجیلی آواز میں ناگواری در آئی۔ "یہ پہلی اور آخری وارننگ ہے۔ اگر عمل کرنے کا ارادہ نہیں ہے تو خود کو آج سے ہی مردہ سمجھنا شروع کر دو۔"

"بہت بہتر۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ "آپ کی تعریف؟"

"ریڈ ڈاٹ" دوسری طرف سے مبہم جواب ملا۔

"تو مسٹر ریڈ ڈاٹ! میں نے آپ کے حسب ہدایت اپنے آپ کو مردہ فرض کر لیا ہے اور آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ مردوں کو فون پر بات کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اس لئے۔۔۔"

"ریڈ ڈاٹ میرا نام نہیں ہے۔" وہ غرایا۔

"تو پھر۔۔۔؟" میں نے سادگی سے پوچھا لیکن دوسری طرف کوئی جواب نہیں ملا بلکہ ہلکی سے کلک کے ساتھ رابطہ منقطع ہو گیا۔ کئی لمحے تک میں ریسیور کو گھورتا رہا۔ آخر کار مجھے یقین ہو گیا کہ اب اس سے ٹون کے علاوہ کوئی آواز نہیں ابھرے گی۔ میں نے آہستگی سے اسے واپس کریڈل پر رکھ دیا۔ بظاہر معمولی سے انداز میں شروع ہونے والے واقعات گنجلک ہوتے جا رہے تھے۔

ہنی کے اغوا کے سلسلے میں سکوت کچھ ٹوٹا تو تھا لیکن بات اور الجھ گئی تھی۔ اس شخص نے یہ تو بتا دیا تھا کہ ریڈ ڈاٹ اس کا نام یا عرفیت نہیں تھی لیکن اگر یہ کسی تنظیم کا نام تھا تو اس کی نوعیت کس قسم کی تھی اور ہنی کو اغوا کرنے میں ان کی کیا غرض پوشیدہ تھی... ان باتوں کا کچھ اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا اور کیا مجھے اس سلسلے میں دلچسپی لینے سے باز رکھنا ان کی نظر میں اتنا ضروری تھا؟

آخر کار میں نے ان سوالوں پر غور کرنے کی نسبت سو جانا بہتر سمجھا چنانچہ سب کچھ ذہن سے جھٹک کر میں سو گیا۔

سوتے میں اگر اچانک آنکھ کھل جائے تو انسان کو فوری طور پر تو قطعاً اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ کتنی دیر سویا ہے۔ سوتے سوتے یکا یک ہی میری آنکھ کھلی تھی۔ جیسے اچانک کسی مشین کا سوئچ آن ہو جائے۔ وہ حس درندوں میں موجود ہوتی ہے جو نیند میں بھی انہیں خطرے سے خبردار کر دیتی ہے اور کوئی کتنا ہی دبے قدموں ان کے قریب پہنچے وہ عموماً ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے ہیں۔ وہ حس کسی نہ کسی حد تک مجھ میں بھی موجود تھی۔ اس حس نے گویا مجھے سوتے میں اطلاع دی تھی کہ کمرے میں میرے علاوہ بھی کوئی موجود ہے۔ میرے حواس یک لخت بیدار ہو گئے تھے لیکن تب بھی کسی نہ کسی حد تک تاخیر ہو چکی تھی۔ نہایت ہلکی سی ٹک کی آواز کے ساتھ کمرے میں تیز روشنی پھیل گئی اور نائٹ بلب کی مدھم اور رنگین روشنی گویا معدوم ہو گئی۔

سب سے پہلے میری نظر سوئچ بورڈ ہی کے قریب کھڑے ہوئے شخص پر پڑی۔ وہ سیاہ پتلون اور چمڑے کی جیکٹ پہنے ہوئے تھا۔ قمیص گہرے سرخ رنگ کی تھی۔ وہ دراز قد اور نوجوان تھا مگر عام سی جسامت کا مالک تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اس کی کمر سے کینوس کا ایک چھوٹا سا تھیلا بندھا ہوا تھا۔ جس وقت میری نظر اس سے ملی اس کا ایک ہاتھ سوئچ بورڈ پر اور دوسرا ایک ریوالور کے دستے پر تھا جس کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک گورا چٹا' خوبصورت نوجوان تھا مگر اس کی آنکھوں میں کمینگی اور گھٹیا پن کی جھلک تھی۔

طویل و عریض بیڈ روم کے دو کونوں میں دوسرے دو آدمی بھی موجود تھے جو بڑی مستعدی سے گویا پوزیشن سنبھالے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں خود کار رائفلیں تھیں۔ وہ گہرے رنگ کی شلوار قمیصوں میں تھے۔ دونوں ہی بھاری بھرکم اور مضبوط تھے اور دونوں ہی چھٹے ہوئے بدمعاش معلوم ہوتے تھے۔ ان کی شکلیں اور حلئے ملتے جلتے سے تھے۔ نمایاں فرق یہ تھا کہ ان میں سے ایک کی موٹی موٹی مونچھیں تھیں جبکہ دوسرا کلین شیو تھا۔ موسم ٹھنڈا ہونے کے باوجود انہوں نے کوئی گرم کپڑا پہنا ہوا نہیں تھا۔ وہ دونوں قہر آلود نظروں سے مجھے یوں گھور رہے تھے جیسے ان سے میری بہت پرانی دشمنی چلی آ رہی ہو۔

ساؤنڈ پروف کمرے کا دروازہ پہلے ہی کی طرح بند تھا۔ کہیں کسی قسم کی توڑ پھوڑ کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے حالانکہ میں ہمیشہ کی طرح کمرا مقفل کر کے سویا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ تالا کھول کر یا کسی اور پُرامن طریقے سے اسے ناکارہ بنا کر اندر آئے تھے۔ میں نے بظاہر ایک سرسری سی نظر ہی ڈالی تھی لیکن تمام چیزوں کا مکمل جائزہ لے لیا تھا۔ میری حس نے حقیقتاً مجھے خاصی تاخیر سے خبردار کیا تھا۔ ان کے اندر آنے اور یوں پوزیشن سنبھال کر کھڑے ہونے میں کچھ دیر تو لگی ہی ہو گی۔ شاید مجھ پر نیند کا غلبہ زیادہ تھا جو میں جلدی خبردار نہیں ہو سکا تھا۔

رائفل والے دونوں بھاری بھرکم آدمی پیشہ ور لڑاکے اور جرم پیشہ معلوم ہوتے تھے۔ سوئچ بورڈ کے قریب کھڑا ہوا نوجوان لڑائی جھگڑے میں زیادہ ماہر معلوم نہیں ہوتا تھا تاہم ریوالور کے دستے پر اس کی گرفت مشاقانہ تھی۔ شاید ریڈ ڈاٹ والوں کو یقین ہو گیا تھا کہ میں ہنی کی تلاش سے باز نہیں آؤں گا اور انہوں نے فوراً ہی اپنی طاقت اور رسائی کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔

یہ بھی گویا ایک ستم ظریفی ہی تھی کہ ادھر اُدھر آتے جاتے وقت تو ٹونی اور شبیر یا کوئی نہ کوئی دوسرے دو آدمی میری حفاظت کے لئے سائے کی طرح ساتھ لگے رہتے تھے لیکن میرے گھر کے جہاں مجھے ساری رات گزارنی ہوتی تھی۔ حفاظتی انتظامات اتنے تسلی بخش نہیں تھے۔ ویسے عام حالات میں میں کبھی اپنے گھر کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں فکر مند نہیں ہوا تھا۔ گھر میں چار بلڈ ہاؤنڈ کتے تھے جو سہ طرفہ لان پر رات کو خاموشی سے ٹہلتے رہتے تھے۔ دن اور رات کے لئے الگ الگ چوکیدار تھے۔ دونوں ہی اپنی اپنی ڈیوٹی کے دوران گیٹ کا بھی خیال رکھتے تھے اور چار دیواری کے اندر اندر کوٹھی کی اصلی عمارت کے گرد چکر بھی لگاتے تھے۔ وہ دونوں بظاہر عام سے چوکیدار ہی معلوم ہوتے تھے لیکن درحقیقت وہ گوریلا فوجیوں سے کم نہیں تھے۔ مزید چند چھوٹی چھوٹی احتیاطی تدابیر بھی میں نے اختیار کر رکھی تھیں اور میرے خیال میں اتنا ہی بندوبست کافی تھا۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کی میں نے کبھی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

میرا سر اس وقت خاصے اونچے تکیے پر تھا۔ میں نے کمبل ہٹاتے ہوئے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی لیکن موٹی موٹی مونچھوں والا آٹومیٹک رائفل کو حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "بس بس' لیٹے ہی رہو سیٹھ جی' ہم نے تو پوری پوری کوشش کی تھی کہ تمہاری آنکھ نہ کھلنے پائے تاکہ تمہاری موت تمہارے لئے کم سے کم تکلیف دہ ہو۔" اس کا لہجہ استہزائیہ بھی تھا اور اس میں برسوں کی نفرت بھی رچی ہوئی تھی۔ شاید یہ نفرت سب ہی دولت والوں کے خلاف تھی اس لئے اس کے اندازِ تخاطب میں مجھے زیادہ زہر رچا ہوا محسوس ہوا تھا۔ اس نے کافی حد تک مجھے اس فلمی ہیرو کی طرح سیٹھ جی کہا تھا جو فلم کے آخری سین میں اس سیٹھ سے حساب کتاب برابر کرنے آیا ہو جس نے پوری فلم میں نہایت ہی گھٹیا قسم کے ولن کا رول ادا کیا ہو۔

میں نے نرمی سے کہا "اگر تمہیں میرے آرام کا اتنا ہی خیال تھا تو تمہیں لائٹ آن نہیں کرنی چاہئے تھی تاکہ میری آنکھ نہ کھلتی۔"

"مجبوری تھی" وہ سفاکی سے زیر مونچھ مسکرایا "ہمیں شکل بھی اچھی طرح دیکھنی تھی۔ ہم غلط آدمی پر گولیاں ضائع کرنا بالکل پسند نہیں کرتے۔ ریپوٹیشن خراب ہوتی ہے۔"

"تم لوگوں کو اندر آنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوئی؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "میرے کتوں کو کیا ہوا؟ وہ ذرا بھی نہیں بھونکے؟"

"کتوں کا کیا ہے سیٹھ جی!" مونچھوں والے نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "کتوں کو خاموش کرانے کے بہت سے نسخے ہیں ہمارے پاس۔"

"کیا تم نے ان کو مار دیا؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ مجھے اپنی کنپٹیوں میں غیظ و غضب کے آتش فشاں کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ وہ کمیاب نسل کے انتہائی جاں نثار قسم کے کتے تھے۔

"ممکن ہے وہ بچ جائیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مر جائیں۔" مونچھوں والے نے مبہم جواب دیا۔

"کیا تم نے ان کو زہر دیا ہے؟ مگر وہ تو گھر والوں کے علاوہ کسی کے ہاتھ سے کوئی چیز نہیں کھاتے' راستے میں پڑی ہوئی بھی کوئی چیز نہیں کھاتے۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہا نا کہ ہمارے پاس بہت سے نسخے ہیں۔ اور پھر کتے آخر کتے ہی ہوتے ہیں۔ غلطیاں تو انسان سے بھی ہوتی ہیں وہ تو پھر جانور ہیں۔" مونچھوں والا بولا۔

"اور چوکیدار؟"

"وہ بھی آرام سے سو رہا ہے۔"

میرا بیڈ روم بالائی منزل پر تھا۔ میں نے مونچھوں والے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "اور تمہیں راستے میں تمام تالے کھولنے میں بھی کوئی دقت پیش نہیں آئی؟"

"اس قسم کے کاموں کے لئے یہ جو ہمارا یار ساتھ تھا۔" مونچھوں والے نے گورے چٹے نوجوان کی طرف اشارہ کیا جو ریوالور تھامے سوئچ بورڈ کے قریب کھڑا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ

وہ حقیقتاً نہایت اعلیٰ درجے کا قفل شکن اور نقب زن لگتا تھا۔ شاید یہ اس پیشے ہی کی کمینگی تھی جو اس کی آنکھوں میں رچ بس گئی تھی۔

مونچھوں والا گویا اسے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے بولا "اس جیسا فنکار پورے ملک میں شاید ہی کوئی دوسرا ہو۔ تالے تو اس کی شکل دیکھ کر خود بخود کھل جاتے ہیں۔ دیسی ہوں ولایتی ہوں چینی ہوں جاپانی ہوں۔ چاہے کسی بھی قسم کے تالے ہوں۔"

کلین شیو شخص کے چہرے پر پہلی مرتبہ خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ اپنے ساتھی سے ملتے جلتے لہجے میں بولا۔ "سیٹھ! تم تو ہمیں اپنے کمرے میں دیکھ کر کچھ زیادہ ہی حیران پریشان ہوگئے ہو۔ تمہارے گھر میں تو کچھ بھی انتظام نہیں تھا۔ ہم تینوں اگر اکٹھے ہو جائیں تو ان جگہوں پر بھی پہنچ جاتے ہیں جہاں چیونٹیاں بھی اپنی شناخت کرائے بغیر داخل نہیں ہو سکتیں۔"

مونچھوں والے نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کے قہقہے کی آواز کسی دور افتادہ مقام سے سنائی دینے والی بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے مشابہ تھی۔ وہ غالباً اپنے شکار کی زندگی کے آخری لمحات سے بہت لطف اندوز ہوتا تھا۔ رائفل کے ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھنے لگا تھا۔

میں نے آنکھیں یوں بند کرلیں گویا مجھ میں موت کا سامنا کرنے کی تاب نہیں ہے لیکن درحقیقت میں دو چار سیکنڈ کی اس مہلت میں اپنی آنکھوں کو روشنی سے یکدم اندھیرے میں دیکھنے کے قابل بنا رہا تھا۔ اندھیرے میں یوں تو میری نظر قابل رشک حد تک کام کرتی تھی لیکن تیز روشنی سے یکدم اندھیرے میں فوری حرکت کرنے کے لئے تھوڑی سی پیش بندی ضروری تھی۔ خصوصاً جبکہ ذرا سا بھی غلط اندازہ جسم چھلنی کرانے کا باعث بن سکتا تھا۔

میرا پاؤں گفتگو کے دوران غیر محسوس طور پر کھسکتا ہوا پائنتی کی چوبی پٹی تک پہنچ چکا تھا اور وہاں ننھا سا ایک پش بٹن موجود تھا جو بظاہر چوبی پٹی ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے پاؤں کے انگوٹھے کا دباؤ بڑھایا اور کمرا گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ نائٹ بلب تک بجھ گیا۔ یہ ان چھوٹی چھوٹی احتیاطی تدابیر میں سے ایک تھی جو میں نے اپنے گھر میں قدم قدم پر اختیار کر رکھی تھیں۔

اندھیرا ہوتے ہی میں بیڈ سے قالین پر گر چکا تھا۔ کمرے میں درندوں کی غراہٹیں اور پھر رائفلوں کی تڑتڑاہٹ گونجی۔ غیر ارادی طور پر ان کی گنوں کا رخ بیڈ کی طرف ہی رہا تھا اور میں نے اسی نفسیاتی پہلو پر تکیہ کیا تھا۔ وہ یقیناً بری طرح نروس ہوگئے تھے کمرے میں گھپ اندھیرا ہو جانا ان کے شیڈول میں شامل نہیں تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ان میں سے تارچ وغیرہ صرف قفل شکن نوجوان کے پاس ہوگی اور وہ غالباً اسے کینوس کے اس تھیلے میں رکھ چکا تھا جو اس کی کمر سے بندھا ہوا تھا۔ اسی تھیلے میں شاید اس کے ضروری اوزار تھے۔ فاصلے کے اعتبار سے بھی وہ مجھ سے نزدیک ترین تھا۔ اس لئے میں بیڈ سے لڑھکتے ہی ایک لمحے میں اس تک پہنچ چکا تھا۔ میں اندھیرے میں سب کچھ کم از کم اس حد تک ضرور دیکھ رہا تھا جتنا شاید وہ نائٹ بلب کی روشنی میں دیکھ پاتے۔

قفل شکن نوجوان سب سے زیادہ نروس ہوا تھا۔ تارچ نکا[لنا] تو درکنار وہ ہاتھ میں موجود ریوالور کو بھی فوری طور پر استعمال نہیں کرپایا تھا۔ وہ اندھیرے میں اسے گھمانے ہی لگا تھا کہ میں نے اسے جالیا۔ ایک بازو سے اس کی گردن دبوچتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی موڑ کر میں نے ریوالور اس کے [ہاتھ] سے قالین [پر] گرنے دیا اور پھر اس نوجوان کو ہی اٹھا کر میں نے مونچھوں وا[لے] پر دے مارا جس نے اندھا دھند فائرنگ سے کمرے کا فرنیچر وغیرہ کافی حد تک تباہ کر دیا تھا۔

ان دونوں کے گرنے کی دھمک کے ساتھ ان کی خوفزدہ غراہٹیں سی ابھریں اور ایک گن کم از کم وقتی طور پر خاموش ہوگئی۔ اسی دوران میں کلین شیو شخص کی کلائی قابو میں کرکے اس کا سر دیوار سے ٹکرا چکا تھا۔ اسے بھی میں نے جوڈو کی ٹیکنیک استعمال کرتے ہوئے ان دونوں پر اچھال دیا جو کمرے کے دوسرے کونے میں ڈھیر تھے اور اٹھ ہی رہے تھے۔ مونچھوں والے کے ہاتھ سے گن ایک لمحے کے لئے چھوٹ چکی تھی مگر وہ فوراً ہی اسے دوبارہ تلاش کر چکا تھا لیکن اس کا اسے کوئی فائدہ نہیں ہوا کیونکہ اسی لمحے کلین شیو شخص پہاڑ کی طرح ان دونوں پر جاگرا اور وہ تینوں ایک دوسرے میں الجھ کر رہ گئے۔

میں نے انہیں اس لئے یکجا کیا تھا کہ اس طرح ان پر قابو پانا میرے لئے زیادہ آسان تھا۔ کلین شیو شخص کی گن میرے ہاتھ میں آچکی تھی لیکن میں انہیں قتل کرنا نہیں چاہتا تھا ورنہ ایک لمحے میں تینوں کا قصہ پاک ہو سکتا تھا۔ تاہم میں انہیں محض گن کے اشارے سے بھی حکم دینا نہیں چاہتا تھا انہیں تھوڑی سی سزا دینا بھی میرے خیال میں ضروری تھا۔

میں نے گن کو نال کی طرف سے پکڑ کر ان کی ٹھکائی شروع کردی۔ وہ تینوں ایک دوسرے پر ڈھیر تھے اور میں انہیں اٹھنے کی مہلت نہیں دے رہا تھا۔ رائفل کا بٹ ان کے جسموں کے مختلف حصوں پر برس رہا تھا لیکن میری کوشش یہی تھی کہ ان میں سے کسی کی بھی کھوپڑی یا کوئی دوسری ہڈی فریکچر نہ ہونے پائے یعنی میں ہاتھ ہلکا ہی رکھ رہا تھا۔

بھاری بھرکم بدمعاشوں کے حلق سے تو غراہٹ آمیز گھٹی گھٹی سی چیخیں ہی برآمد ہو رہی تھیں لیکن قفل شکن نوجوان نے خاصے زور و شور سے چیخنا شروع کردیا تھا۔ چند لمحے چیخ و پکار کے بعد وہ تو باقاعدہ رونے لگا اور رحم کی فریاد کرنے لگا۔ معافیاں مانگنے لگا۔ اس وقت تک دونوں بدمعاشوں نے بھی اٹھنے اور کسی طرح صورتحال کا مقابلہ کرنے کی جدوجہد ترک کردی تھی کیونکہ ان تینوں میں سے کسی کو بھی اپنا دفاع کرنے یا وار سے بچنے کی مہلت ہی نہیں مل [رہی] تھی۔ انہوں نے محسوس کرلیا تھا کہ سزا ان کا مقدر ہو چکی ہے [او]ر وہ انہیں برداشت کرنی پڑے گی۔

آخر کار میں نے محسوس کیا کہ اب ان میں آسانی سے اٹھنے [کی س]کت نہیں رہی یا اب وہ کم از کم مجھ پر حملہ کرنے کی جرأت [نہی]ں کریں گے تب میں نے ہاتھ روک لیا۔ میں نے رائفل پھینک [دی] اور قفل شکن نوجوان کا ریوالور اٹھالیا۔ دونوں رائفلیں میں [ن]ے پاؤں سے بیڈ کے نیچے کھسکا دیں اور صرف ریوالور ایک ہاتھ [می]ں رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے بیڈ کی چوبی پٹی میں چھپا ہوا پش [بٹ]ن دبا دیا۔ کمرا دوبارہ منور ہوگیا۔

میں فائرنگ سے ہونے والی تباہی پر ایک نظر ڈالے بغیر نہ رہ [سک]ا لیکن تباہی میری توقع سے کم ہی ہوئی تھی۔ انہیں زیادہ گولیاں [چل]انے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ پھر بھی میٹرس ادھڑ کر رہ گئی تھی [او]ر بیڈ کے ساتھ والی دیوار کا کھڑکی سے نیچے کا پلستر ادھڑ کر رہ گیا تھا [او]ر خاصے بڑے حصے میں گڑھے ہی گڑھے پڑ کر رہ گئے تھے۔

لیکن ان تینوں کی حالت دیکھ کر میری کوفت کچھ کم ہوگئی۔ ان کے چہروں سے وہ رعونت وہ اذیت پسندی اور وہ خشونت غائب ہو چکی تھی۔ اس کی جگہ ان کے چہروں پر اب خوف اور تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ قفل شکن نوجوان تو باقاعدہ سسکیاں لے رہا تھا۔ [ا]س کا چہرہ خون اور آنسوؤں سے تر تھا۔ ان کی آنکھوں میں کافی حد تک بے یقینی بھی تھی۔ شاید ان کی اب بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر اس طرح آناً فاناً کس طرح پانسا پلٹ سکتا ہے؟ حقیقتاً پانسا [ت]و چند ہی سیکنڈ میں پلٹ چکا تھا' زیادہ دیر تو ان کی پٹائی میں ہی لگی تھی۔

میں نے بیڈ کے ایک قدرے محفوظ کنارے پر بیٹھتے ہوئے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں کہا "کس نے بھیجا تھا تمہیں؟"

تینوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ نوجوان کی سسکیاں کمرے میں ابھرتی رہیں۔ مجھے اٹھ کر ایک بار پھر ان کے قریب جانا پڑا۔ سب سے آگے مونچھوں والا ڈھیر تھا۔ میں نے اسے مونچھوں ہی سے پکڑ کر اٹھایا۔ وہ بری طرح چیختے ہوئے تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کے پیٹ میں گھٹنا رسید کیا۔ اس نے 'اوغ' کی آواز کے ساتھ جھکنا چاہا لیکن اس کی مونچھیں میری مٹھی میں تھیں۔ وہ جھک نہیں سکا۔ اس کے دونوں ہاتھ آزاد بھی تھے اور بظاہر سلامت بھی نظر آرہے تھے لیکن اس نے انہیں کام میں لانے یا مزاحمت کرنے کی کوشش نہیں کی حالانکہ میں اس کے لئے بھی تیار تھا۔

مجھے یہ اندازہ تو ہوگیا کہ وقتی طور پر ان کی قوت اور جرأت سلب ہو کر رہ گئی تھی لیکن زبان کھولنے کے لئے وہ ابھی تیار نہیں تھے۔ قوتِ برداشت ان میں یقیناً کافی تھی۔ مار پیٹ سہنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے کس بل تو ڈھیلے ہو چکے تھے لیکن ان کے [...]ٹر جیسے مضبوط جسموں میں بہرحال ایک ڈھیٹ روح موجود تھی [...]رمیں ان پر اپنا وقت صرف کرنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے اسے اس کے دونوں ساتھیوں پر دھکیل دیا اور اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ وہ ڈکرا کر رہ گیا۔ میں نے ریوالور سے اس کے دل کا نشانہ لیتے ہوئے پوچھا "تم ریڈ ڈاٹ کے آدمی ہو؟"

اس نے خوفزدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور کراہنے کے سے انداز میں پوچھا "وہ کیا چیز ہوتی ہے جی؟"

مجھے اس کے انداز میں بے ساختگی سی محسوس ہوئی۔ شاید وہ اداکاری نہیں کر رہا تھا لیکن سردست میں اتنا پُریقین نہیں تھا۔ میں واپس بیڈ کے کونے پر آبیٹھا۔ ریوالور ایک ہاتھ میں رکھتے ہوئے میں نے دوسرے ہاتھ سے دیوار گیر انٹر کام کا ریسیور ہک سے اتارا اور اسی ہاتھ کی انگلی سے ایک نمبر کا بٹن دبایا۔ نظر میری ان تینوں پر ہی رہی۔ وہ خواہ کتنے ہی نڈھال تھے لیکن ان کی طرف سے بے پروا نہیں ہوا جا سکتا تھا۔

دوسری بار بزر بجنے پر دوسری طرف میرے سرونٹ کوارٹر میں ریسیور اٹھایا گیا اور رشید کی قدرے غنودگی زدہ سی آواز سنائی دی۔ رشید ایک دیانتدار اور محنتی نوجوان تھا' میرے گھر کے تمام معاملات کی نگرانی اور ہر چیز کا انتظام اس کے ذمے تھا۔

"رشید!" میں نے ہموار لہجے میں کہا لیکن وہ علی الصباح چار بجے کے قریب میری آواز سن کر یکدم گویا مستعد ہوگیا۔ اس کی آواز سے غنودگی اور نیند کا خمار غائب ہوگیا۔

"یس سر!" وہ مستعدی سے بولا۔

رات کو جاگنا اور گھر کی حفاظت کرنا اس کی یا دوسرے گھریلو نوکروں کی ذمے داری نہیں تھی اس لئے میں نے اسے فی الحال یہ بتانا بھی ضروری نہیں سمجھا کہ ان کے سوتے ہوئے گھر میں کیا کچھ ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ انہیں رات کے اس پہر زحمت دوں لیکن مجبوری تھی۔ سردی میں وہ اپنے اپنے کمروں کے دروازے کھڑکیاں بند کئے بستروں میں دبکے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہوں گے۔

میں نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا۔ "رشید! تمہیں خود بھی زحمت کرنی پڑے گی اور نیک محمد اور بلے وغیرہ کو بھی اٹھانا پڑے گا۔" یہ ڈرائیور اور مالی وغیرہ تھے۔

"خیریت سر؟ کیا میں اوپر آؤں؟" وہ گویا اور زیادہ مستعد ہوگیا۔

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم بس لان پر چاروں کتوں کو اور چوکیدار کو دیکھو۔ اگر ان کی حالت ذرا بھی تشویشناک ہو تو کتوں کو ڈاکٹر فاروق کے پاس لے جاؤ۔" وہ جانوروں کا ڈاکٹر تھا۔ اس کا کلینک اس کے گھر کے قریب ہی تھا۔ "اسے گھر جا کر جگا لینا۔ میرا نام لینا' وہ فوراً کتوں کا معائنہ کرلے گا۔ چوکیدار کو کسی پرائیویٹ ڈاکٹر کے پاس یا اسپتال میں جہاں بھی لے جانا ضروری محسوس ہو وہاں لے جاؤ۔ تم اور بلا ایک گاڑی میں کتوں کو لے جاؤ۔ نیک محمد اور پرویز دوسری گاڑی میں چوکیدار کو لے جائیں۔ ٹھیک ہے؟"

"آپ فکر ہی نہ کریں سر!" اس نے غیر ضروری سوالات میں وقت ضائع نہیں کیا اور خود ہی سلسلہ منقطع کردیا۔

وہ تینوں اب اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ان کی آنکھوں میں تکلیف اور خوف کی پرچھائیاں کچھ مدھم پڑرہی تھیں اور ان کی جگہ ذہنی کشمکش کا عکس جھلکنے لگا تھا۔ شاید وہ اس فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کررہے تھے کہ انہیں کچھ نہ کچھ کرنا چاہئے۔

میں نے اب ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا۔ "اب بھی وقت ہے، تم چاہو تو بتادو کہ تمہیں کس نے بھیجا ہے۔ اگر تم سچ سچ بتادو گے تو میرا وعدہ ہے کہ تمہیں جانے دوں گا۔"

وہ بس شکست خوردہ درندوں کی طرح میری طرف ایک ٹک دیکھتے رہے، کچھ بھی نہیں بولے۔ انکار نہ اقرار۔ شاید انہیں میرے وعدے کا بھی اعتبار نہیں آیا تھا۔

میرا ریوالور والا ہاتھ اس سائیڈ ٹیبل پر ٹکا ہوا تھا جس پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ غنیمت تھا کہ ٹیلی فون سیٹ گولیوں کی زد میں آنے سے بچ گیا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کندھے اور کان کے درمیان پھنسایا اور پھر اسی ہاتھ سے نمبر ڈائل کرنے لگا۔ اس لمحے میں نے ان کی آنکھوں میں قدرے طمانیت کی لہر ابھرتے دیکھی۔ آنکھیں گھر کی بھیدی ہوتی ہیں، لنکا ڈھاتی ہیں۔ بشرطیکہ کسی کو آنکھیں پڑھنے کا فن آتا ہو۔

"تم لوگ شاید اس لئے اطمینان محسوس کررہے ہو کہ میں پولیس کو بلا رہا ہوں اور یہ تمہارے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی۔ پولیس کے چکروں سے تو تم نمٹ ہی لو گے۔" میں نے نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔ دوسری طرف بیل بجنے لگی تھی۔

وہ اب بھی خاموش رہے۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "لیکن تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں پولیس کو نہیں بلا رہا ہوں۔"

اس دوران دوسری طرف ریسیور اٹھایا جاچکا تھا۔ ریسیور جولی نے ہی اٹھایا تھا۔ اس کی آواز میں نیند کے خمار کی ہلکی سی جھلک تھی۔ میں عام طور پر اسے اس کے اصلی نام سے ہی مخاطب کرتا تھا لیکن اس وقت میں نے ان تینوں بدمعاشوں کے سامنے اسے اس کی عرفیت سے ہی مخاطب کرنا بہتر سمجھا "مس ٹریپ! تمہیں زحمت تو ہوگی لیکن فوری طور پر یہاں آکر تین پارسل اپنے ساتھ لے جاؤ۔ حنیف خان کو بھی ساتھ لے آنا۔ وہ پارسل لوڈ کرانے میں تمہارا ہاتھ بٹادے گا۔"

"او کے سر! میں دس منٹ میں پہنچ رہی ہوں۔" جولی نے مستعدی سے کہا۔ اس کی آواز سے غنودگی یک لخت کافور ہوگئی تھی۔

میں نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ تینوں اب بھی ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر کار مونچھوں والا کراہنے کے سے انداز میں بولا "سیٹھ صاحب! آپ ہمیں معاف کردیں۔" اس کی ساری اکڑفوں رخصت ہوچکی تھی لیکن اس کا معافی طلب کرنا ا[...] مکاری کا مظہر تھا۔ دلی طور پر نہ تو اس نے شکست تسلیم کی تھی او[ر نہ] ہی وہ اپنے عمل پر شرمندہ تھا۔ انہیں اگر دوبارہ موقع ملتا تو وہ ا[یک] بار پھر مجھ پر حملہ کرکے قسمت آزمائی کرنے سے ہرگز باز نہ رہتے۔

"تم تو بہت ہی بودے بدمعاش نکلے یار!" میں نے ریوالو[ر کو] دھیرے دھیرے حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "ذرا سی مار پڑی تو معا[فی] مانگنے لگے۔"

"ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہوگیا ہے صاحب!" کلین [شیو] بدمعاش نے اپنے ساتھی کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے یہ غلطی کی ہی کی[وں] تھی؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور سر جھکا لئے۔ [...] ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرے لئے جولی کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں نے سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اب تم سے کچھ بھی نہیں پوچھوں گا۔"

جولی دس منٹ میں تو نہیں البتہ پندرہ منٹ میں پہنچ گئی۔ [وہ] مردانہ سلیپنگ سوٹ میں تھی۔ اس کے تراشیدہ، چمکیلے اور ر[...] بال کندھوں پر لہرارہے تھے اور سانولے چہرے پر کولڈ کریم کی مع[...] سی چمک نظر آرہی تھی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں گ[لابی] ڈورے تیر رہے تھے۔ اس کی آنکھیں ویسے ہی بڑا غضب ڈھ[اتی] تھیں۔ گلابی ڈوروں کی موجودگی میں تو یہ آنکھیں قاتل آنکھ[یں] دکھائی دیتی تھیں۔ جولی کی سانولی سلونی شخصیت میں بڑی کشش [تھی] لیکن آنکھیں تو اس کی شخصیت کا نمایاں ترین حصہ تھیں۔

حنیف خان اس کے ساتھ تھا۔ وہ باریش آدمی تھا۔ ر[...] سفید گول ٹوپی رکھتا تھا۔ عام طور پر بڑی نفیس قسم کی شلوار ق[میض] میں رہتا تھا۔ اس کے چہرے پر نہایت گہری بلکہ اداسی آمیز سنجیدگی طاری رہتی تھی۔ پہلی نظر میں تو وہ کوئی بہت ہی سنجیدہ متین قسم کا استاد یا سوشل ورکر نظر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی [...] بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مارشل آرٹ میں ماہر اور ہر قسم ہتھیاروں کے استعمال میں یکتا ہوگا۔ وہ بہت کم گو اور قدرے [...] نظر آتا تھا لیکن جب وہ ایکشن میں ہوتا تھا تو اس کے جسم [میں] بجلیاں بھری ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ تاہم اپنی تمام تر صلاحیتوں [کے] باوجود وہ ٹونی یا شبیر شاہ کے مقابلے کا آدمی نہیں تھا اور نہ ہی میر[...] کراچی والے پروجیکٹس کے انچارج شفیع شاہ کی برابری کرسک[تا تھا] لیکن بہرحال وہ بھی میری تنظیم کے اہم آدمیوں میں شمار ہوتا تھا [...] زیادہ تر ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر ہی رہتا تھا جو ایک طرح سے لا[ہور] میں میرا خفیہ ہیڈ کوارٹر تھی۔ وہ جولی کے ساتھ ضروری معاملات سنبھالتا تھا۔

جولی نے بظاہر بے پروائی سے تینوں بدمعاشوں کا جائزہ لیا [اور] سرسری سے لہجے میں بولی۔ "لگتا ہے گھر میں خاصی گڑبڑ ہوئی۔ آپ پر حملہ ہوا تھا؟" میں نے صرف اثبات میں سرہلانے پر ا[کتفا کیا۔]

[...]میری نظر ان تینوں پر تھی۔ وہ میرے حکم کے بغیر ہی اٹھ [کھڑ]ے ہوئے تھے۔

[...] قفل شکن نوجوان تو اب بھی کراہ رہا تھا لیکن دونوں بدمعاش [سنب]ھل چکے تھے۔ وہ بہرحال سخت جان تھے۔ انہوں نے پہلے جولی کو [...]ہی آمیز نظروں سے دیکھا تھا لیکن پھر شاید جسم میں اٹھتی ہوئی [درد] کی لہروں نے انہیں احساس دلایا کہ صورتحال کچھ ایسی [خوش]بصورت بھی نہیں کہ وہ اس سانولی سلونی عورت کو دیکھ کر محظوظ [ہو س]کیں جس کے خدوخال ڈھیلے ڈھالے مردانہ سلیپنگ سوٹ [میں] بھی دل کی دھڑکنیں تیز کرنے کا باعث بن رہے تھے اور جو دو [بچو]ں کی ماں ہونے کے باوجود کالج گرل دکھائی دیتی تھی۔

حنیف خان کو تو انہوں نے شاید درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا [تھا۔] وہ انہیں غالباً بالکل بے ضرر نظر آیا تھا۔ جولی کو بلائے جانے کا [غال]باً مقصد ہی ان کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

"یہ ہیں تینوں پارسل؟" جولی نے ان کی طرف اشارہ کرتے [ہو]ئے گویا مجھ سے رسمی تصدیق چاہی۔ میں نے ایک بار پھر اثبات [میں] سرہلانے پر اکتفا کیا۔

جولی نہایت دوستانہ لہجے میں ان سے مخاطب ہوئی۔ "تم لوگ [دیو]ار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوجاؤ... اور ہاتھ پشت پر کرلو۔ مجھے [تم]ہارے ہاتھ پاؤں باندھنے ہیں۔"

اس کا انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو ذرا ماچس [دی]نا۔ مجھے سگریٹ سلگانی ہے۔

وہ ان کے قریب بھی جا پہنچی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نظر [نہ]یں آرہا تھا اور وہ بہرحال ایک عورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں [نا]ئیلون کی ڈوری کا لچھا تھا جو اس نے حنیف خان سے لیا [تھ]ا۔ حنیف خان کے پاس ان کے ہونٹوں پر چپکانے کے لئے ٹیپ [...]فیو بھی موجود تھی۔

انہیں یقین ہوگیا کہ اگر وہ اسی طرح ساکت کھڑے رہے تو [ا]ن کے ہاتھ پاؤں بندھ ہی جائیں گے۔ انہوں نے اپنی تمام تر شکستہ [ح]الی کے باوجود غالباً جان پر کھیل کر ایک آخری کوشش کرنے کا [ف]یصلہ کیا۔ یہ فیصلہ غالباً صرف مونچھوں والے کا تھا لیکن ان کے [د]رمیان گویا ایک طرح کا ذہنی رابطہ چل رہا تھا اور اسے [...] [د]ونوں ساتھیوں کی تائید حاصل تھی۔

طریقہ بھی اس نے اپنی دانست میں صورتحال کے مطابق مؤثر اختیار کیا تھا لیکن اس بدنصیب کو شاید ذرا بھی اندازہ نہیں [تھا] کہ اس کا واسطہ کن لوگوں سے ہے۔ کسی نے ان بے چاروں [کو] مکمل معلومات کے بغیر آگے دھکیل دیا تھا اور کسی کو ہمارے بارے میں معلومات ہو بھی کس طرح سکتی تھیں؟

جولی جونہی ان کے قریب پہنچی، مونچھوں والے نے اپنی تمام تر جسمانی ٹوٹ پھوٹ کے باوجود حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اپنے سامنے ڈھال بنانے کی کوشش کی... تاکہ مجھے فائر کرنے سے باز رکھا جاسکے لیکن اس بے چارے کی یہ حسرت دل میں ہی رہ گئی۔

جولی کے بازو تو اس کے ہاتھوں میں کیا آنے تھے، اس کے اپنے دونوں بازو نہ جانے کیونکر ہوا میں بلند ہوئے اور دوسرے ہی لمحے جولی نے بجلی کی سی تیزی سے گھوم کر الٹی کک، چاپ سوئی اس کی ٹھوڑی پر رسید کی۔ اس کا کلین شیو ساتھی جو اس کی آڑ لینے کی کوشش کررہا تھا، اس کے نیچے دب گیا۔

اس دوران قفل شکن نوجوان اس توقع پر کہ مونچھوں والے کی کوشش کامیاب ہوگی، خود بھی بڑی ہمت کرچکا تھا۔ یعنی اس نے حنیف خان کو آسان شکار سمجھتے ہوئے اس پر چھلانگ لگادی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ بڑے عجیب انداز میں قلابازی کھا کر واپس اپنی جگہ پر آگرا۔ حنیف خان نے اس دوران اپنے صرف ایک بازو کو خاص انداز میں حرکت دی تھی اور اس کی اداسی آمیز سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

وہ تینوں دم بخود سے اپنی اپنی جگہ پڑے چند لمحے تک آنکھیں پٹ پٹاتے رہے۔ شاید ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ ان کے ساتھ ہوا کیا ہے؟ تاہم اس حد تک وہ ضرور سمجھدار ثابت ہوئے کہ انہوں نے اپنی صلاحیتوں کو مزید آزمانے کی کوشش نہیں کی اور ایک ہی کوشش سے سبق پکڑ لیا ورنہ جولی اور حنیف خان کے ہاتھوں ان کی مزید درگت بنتی اور ان میں جو تھوڑا بہت دم خم رہ گیا تھا۔ وہ بھی نکل جاتا۔

جولی نے مونچھوں والے کو گریبان سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے اٹھایا۔ اس نے تب بھی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے جولی کی طرف دیکھے جارہا تھا، شاید اس سے پہلے اسے زندگی میں کبھی اس قسم کی عورت سے پالا نہیں پڑا تھا اور نہ ہی اسے ایسی توقع رہی تھی۔ جولی نے اسے زیادہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کا موقع نہیں دیا اور دوسرے جھٹکے سے اسے پہیوں والے ڈرم کی طرح گھما کر اس کا منہ دیوار کی طرف کردیا۔ جولی صرف داؤ پیچ میں ہی ماہر نہیں تھی، وہ حیرت انگیز طور پر طاقتور بھی تھی۔

حنیف خان اس کی مدد کے لئے اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس نے کلین شیو بدمعاش کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ تقریباً دے ہی مارا۔ چند سیکنڈ میں ان کے ہاتھ پشت پر باندھے جاچکے تھے۔ انہیں یوں قابو میں دیکھ کر قفل شکن نوجوان نے تو خود ہی سعادت مندی سے ہاتھ بندھوالئے۔ ان کے صرف ہاتھ ہی نہیں پاؤں بھی باندھ دیئے گئے اور انہیں قالین پر اوندھا لٹا کر ان کے ہونٹوں پر مضبوطی سے ٹیپ بھی چپکا دی گئی۔ آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی گئیں۔

"پارسل تیار ہیں سر!" جولی نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے مستعدی سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ انہیں لے جاؤ۔" میں نے ریوالور سائیڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔ "میں آج سکون سے سونا چاہتا تھا۔ کمبخوں نے میری نیند خراب کردی۔"

"سر! ان کا بنانا کیا ہے؟ جام، جیلی، مار ملیڈیا ٹماٹو کیچپ؟"

جولی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"اصل میں ان سے صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ انہیں کس نے مجھ پر حملہ کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ اگر یہ نہ بتائیں تو پھران کا جو دل چاہے بنادینا اور جو کچھ بھی بنے اسے راوی میں بہا دینا۔" میں نے نیم بے زاری سے کہا۔

حنیف خان نے انہیں باری باری نیچے اپنی اسٹیشن ویگن میں پہنچانے کے لئے سب سے پہلے مونچھوں والے کو کندھے پر اٹھایا۔ جولی نے اس کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا "واہ بچو! کیا عیش ہیں تمہارے بھی۔ ہوش میں ہونے کے باوجود کندھے پر سوار ہو کر جارہے ہو۔"

آخر وہ سب رخصت ہو چکے تو میں بالائی منزل پر ہی دوسرے بیڈ روم میں آکر لیٹ گیا۔ یہ میرا خاص کمرا تھا۔ میرا گوشۂ تنہائی۔ جب میں بہت اداس ہوتا تھا تو اس کمرے میں آکر پناہ لیتا تھا اور اس وقت تک یہیں رہتا تھا جب تک میری اداسی اور ڈپریشن دور نہیں ہو جاتا تھا۔ بعض لوگ اداسی اور ڈپریشن دور کرنے کے لئے پُرہجوم اور ایسی جگہوں کا رخ کرتے ہیں جہاں رنگا رنگ دلچسپیاں موجود ہوں لیکن میری اداسی اور ڈپریشن تنہائی میں ہی دور ہوتا تھا تاہم اس قسم کا دورہ مجھ پر شاذ و نادر ہی پڑتا تھا اور آج تو میں یہاں محض سونے کی غرض سے آیا تھا۔

چند لمحے تک گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر کے میں نے اپنا خفیف سا اعصابی ارتعاش دور کیا اور پھر سب کچھ ذہن سے جھٹک کر سو گیا۔

دوسرے روز دن چڑھے تک میں سوتا ہی رہا۔ آخر کار دس بجے کے قریب اٹھا اور کاہلی آمیز انداز میں تیار ہونے لگا۔ تیار ہو کر میں نیچے ڈائننگ روم میں پہنچا تو خانساماں نے میرے پوچھنے سے پہلے ہی بتایا "کتوں کو بچالیا گیا ہے صاحب! جلدی خبر ہو گئی ورنہ ان کا بچنا مشکل تھا۔ ابھی وہ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں ہی ہیں۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ایک دو دن میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے۔ چوکیدار بھی ہوش میں آگیا ہے۔ ڈاکٹر کابا صاحب کے کلینک میں داخل ہے۔ اس کے سر پر شاید گن کے دستے سے یا کسی اور بھاری اور ٹھوس چیز سے ضرب لگائی گئی تھی۔ خاصی زوردار چوٹ تھی لیکن اب خطرے والی کوئی بات نہیں۔"

"خدا کا شکر ہے۔" میں نے زیر لب کہا۔ "کتوں کو غالباً زہر دیا گیا تھا؟"

"جی ہاں۔ لان پر باہر سے زہر آلود گوشت کے ٹکڑے پھینکے گئے تھے اور ان پر ایک ایسی دوا ہی لگائی گئی تھی جس کی بُو کی وجہ سے کوئی بھی کتا ان ٹکڑوں پر منہ مارے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔" پھر خانساماں میرے لئے ناشتے کے برتن سجاتے ہوئے بولا۔ "بہرحال رشید نے سب کچھ سنبھال لیا صاحب! ہر چیز کنٹرول میں ہے۔"

"بہت خوب" میں نے طمانیت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

بھرپور ناشتا کرنے کے بعد میں اخبارات کی طرف متوجہ سیاسی لغویات اور جرائم کی دیگر خبروں کے ساتھ اندر کے صفحہ تقریباً سبھی اخبارات میں غیر نمایاں انداز میں نشاط عرف بے قتل کی مختصر سی خبر موجود تھی۔ دو اخباروں میں اس کی تصویر بھی موجود تھی۔ تصویر مردہ حالت میں ہی لی گئی تھی جو اس کا پہچانا جانا بھی مشکل تھا۔ شاید خبر ریلز کرنے تک بھی نے جاکر اس کمرے کو چیک نہیں کیا تھا جہاں نشاط رہتی تھی اس کی زندگی کے دوران کی کوئی تصویر اخبارات میں دیتا تاکہ اس کے اگر کوئی ورثا موجود تھے تو انہیں پہچاننے میں رہتی کیونکہ خبر میں یہ اپیل بھی موجود تھی کہ اگر اس کے موجود ہوں تو پولیس سے رابطہ قائم کریں ورنہ دو دن بعد لاوارث قرار دے کر دفن کر دی جائے گی۔

خبر میں ایک سطر ایسی بھی تھی جسے پڑھنے کے بعد میں نہیں کرسکا کہ مجھ پر اس کا ردِعمل کیا ہوا تھا۔ معلوم نہیں صدمہ پہنچا تھا، حیرت ہوئی تھی یا بس دل خراب سا ہوا تھا کچھ عجیب سی کیفیت ہوئی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا کافی دیر تک میں ساکت بیٹھا رہا۔

اس سطر میں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ پوسٹ مارٹم رپورٹ مطابق مقتولہ نشاط امید سے تھی۔ گو اس کے ماں بننے کا بہت دور تھا لیکن بہرحال یہ ایک حقیقت تھی جو روایتی اند چند لفظوں میں بیان کر دی گئی تھی۔

میں نے اس نوخیز اور معصوم صورت لڑکی کی زندگی بھرپور، رنگارنگ تصویریں بھی دیکھی تھیں اور بگڑے ہو چہرے کے ساتھ مردہ حالت میں بھی دیکھا تھا۔ ایک بار پھر چہرہ میری آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔ میں نے وقتی طور ذرا بٹانے کے لئے دوبارہ اخبارات کی ورق گردانی شروع کر

کسی اخبار میں کہیں کسی ایسی لاش کی دستیابی کا ذکر جسے میں اس عجیب سے شخص کی لاش سمجھ سکتا جو ٹونی کے باغ میں مارا گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس کی لاش شاید اب پولیس کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہوگی لیکن ابھی اس کی خبر رپورٹروں تک پہنچنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔ کل کے اخبارات اس سلسلے میں کوئی خبر نظر آنے کی توقع رکھی جاسکتی تھی۔

اس کا خیال آیا تو میں ایک بار پھر اپنے کوٹ کی جیب ٹرانسیٹر نکال لایا جو کوٹ کے بٹن میں فٹ تھا۔ ڈائننگ ٹیبل دوبارہ اسے کھول کر بیٹھ گیا لیکن ظاہر ہے اس کے اندر کوئی موجود نہیں تھا۔ کل دوپہر صرف ایک بار اس پر سگنل ہونے کے بعد سے ٹرانسیٹر خاموش ہی رہا تھا حالانکہ ظاہر لوگوں کے پاس اس ساخت کے اور بھی ٹرانسیٹر رہے ہو لیکن شاید ہر ایک کی فریکوئنسی مختلف تھی یا پھر ان میں فر تبدیل کرنے کی گنجائش موجود تھی اور انہوں نے اب فر تبدیل کرلی تھی۔ فریکوئنسی تبدیل کرنے کا نظام مجھے اس

آرہا تھا لیکن ٹرانسیٹر کا تفصیلی آپریشن کرنے کے لئے نہایت بین قسم کے اوزاروں کی ضرورت تھی جو فی الحال میرے موجود نہیں تھے۔

میں نے ٹرانسیٹر بند کردیا۔ اس پر وسط میں چھوٹا سا جو سرخ نشان موجود تھا غالباً یہی ریڈ ڈاٹ تنظیم کا شناختی نشان تھا۔ سیٹر کو میں نے دوبارہ جیب میں رکھ لیا اور فون اپنی طرف کھسکالیا۔ ناط والی خبر اب بھی میرے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی۔

میں نے گلبرگ تھانے کا نمبر ملایا اور اے ایس آئی شریف کو فون پر بلوایا۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے کہا۔ ال صاحب! آپ نے مجھے کل صبح نشاط کے امید سے ہونے بات نہیں بتائی تھی۔"

"بتاتا کیسے جناب! اس وقت تک تو خود مجھے بھی معلوم نہیں یہ بات۔" وہ اپنے مخصوص جھٹکے دار لہجے میں بولا۔ "پوسٹ مارٹم رپورٹ آتو چکی تھی لیکن وہ انسپکٹر صاحب کی میز پر پڑی تھی۔ انہوں نے پڑھی تھی نہ میں نے۔ آپ سے بات ہونے کے کچھ بعد میں نے پڑھی تھی میرے لئے یہ کوئی حیران کن بات نہیں۔ خیال ہے کہ اس قسم کی لڑکیوں کے بارے میں ایسی ہی باتیں سامنے آسکتی ہیں۔ ان کے بارے میں یہ تو معلوم ہونے سے رہا کہ یہ بڑی پارسا و پاک باز خاتون تھیں، پابند صوم و صلوٰۃ تھیں۔"

"خیر چھوڑیں" میں نے کہا "یہ بتائیں تفتیش کچھ آگے بڑھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ اپنی تمامتر مصروفیات کے باوجود میں نے وقت نکال کر اس لڑکی کی روم میٹ ملکہ بی بی سے اور اس ایکسٹرا سپلائر۔ نام ہے اس کا۔ ہاں عبدالواحد سے بیان لے لیا ہے۔ دونوں ہی لگتے ہیں۔ اور میرا خیال ہے انہوں نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک ہی کہا ہے۔ بہرحال میں نے احتیاطاً دونوں پر تھوڑا سا رعب شوب ڈال دیا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ آپ مجھ سے پہلے ہی ان دونوں سے مل چکے ہیں۔ آپ بہت تیز جارہے ہیں صاحب! لیکن خیر، ہماری بھی تفتیش اپنے حساب سے آگے بڑھ رہی ہے۔ مقتولہ کا سامان وغیرہ میں نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ دنیا کے دو چار اور لوگوں کے نام پتے میں نے نوٹ کئے ہیں جن سے پوچھ گچھ کرنی ہے۔ آپ فکر نہ کریں جناب! کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔ شریف سیال جس کام کو ہاتھ میں لیتا ہے اس کا کچھ نہ کچھ کر کے چھوڑتا ہے۔ اس کیس کے اصل تفتیشی افسر انسپکٹر صاحب تھے لیکن انہوں نے خود ہی یہ کیس میرے سپرد کردیا ہے۔ آج صبح اس سلسلے میں ایک صاحب کا فون بھی آیا تھا۔ وہ پوچھ رہے تھے کہ اس کیس کی تفتیش کون کررہا ہے۔ انسپکٹر صاحب نے میرا نام ہی لیا اور فون مجھے پکڑا کر خود ضلع کچہری چلے گئے۔" اچانک وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے اسے احساس ہو گیا ہو کہ روانی میں اس کے منہ سے کوئی غیر ضروری بات نکل گئی ہے۔

میرے کان کھڑے ہوئے۔ تاہم میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا "فون کس نے کیا تھا؟"

وہ صرف ایک لمحے خاموش رہا پھر ذرا نیچی آواز میں بولا۔ "ابھی بتاتا ہوں۔"

پھر اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر کسی کو مخاطب کیا "اللہ وتے! تو یہاں کھڑا کیا کررہا ہے؟ چل جاکے ہیڈ محرر صاحب کے پاس بیٹھ کر گامے قصائی والے کیس کی رپورٹ تیار کرا کر فائل مکمل کر۔ آج مجسٹریٹ صاحب کو پیش کرنی ہے۔"

غالباً تخلیہ میسر آجانے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا "میں نے سوچا آپ کو بتا ہی دوں۔ آپ بہت اچھے آدمی ہیں۔ اور ویسے بھی ہمارے درمیان باہمی تعاون کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ فون تقریباً آدھ گھنٹا پہلے ہی آیا تھا۔ بولنے والے نے اپنا نام نہیں بتایا لیکن آواز سے وہ بہت غمزدہ لگ رہا تھا۔ شاید بہت دیر رو تا بھی رہا ہو۔ مجھ سے جب اس کا رابطہ قائم ہوا تو اس نے پہلے اچھی طرح تصدیق کی کہ قتل کی تفتیش میں ہی کررہا ہوں۔ پھر وہ التجا کے سے انداز میں کہنے لگا۔ بھائی صاحب! میری آپ سے صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ باقی ہر کام کو بھول کر اس کیس کی تفتیش پوری سرگرمی اور تندہی سے کریں اور ہر حال میں قاتل کو کیفرِ کردار تک پہنچائیں۔ میں آپ کی محنت کے اعتراف میں ایک بڑی رقم انعام کے طور پر آپ کے لئے بھجواؤں گا۔ یہ میری طرف سے آپ کے لئے ایک حقیر سا تحفہ ہوگا اور یہ بات صرف میرے اور آپ کے درمیان رہے گی۔ لگتا ہے اس آدمی نے اخبار پڑھتے ہی فون کیا تھا۔"

"آپ نے پوچھا نہیں کہ وہ کتنی رقم انعام میں بھجوائے گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"پوچھا تھا جناب! بس یونہی غیر سنجیدگی سے ہی پوچھا تھا۔ اس نے کہا کہ کم از کم دو لاکھ۔ اور اگر میں قاتل کو عبرت ناک سزا دلوانے میں کامیاب رہا تو اس کے بعد مزید انعام بھی بھجوایا جاسکتا ہے۔ یہ سن کر دل میں گدگدی تو ہوئی جناب! لیکن ظاہر ہے اس قسم کی باتوں پر اعتبار تو نہیں کیا جاسکتا نا۔ اگر میں اس آدمی کی بات کو سچ بھی سمجھ لوں تو سمجھیں کہ قاتل کے پکڑے جانے کے بعد اس کا کام تو نکل ہی گیا نا۔؟ اور کام نکل جانے کے بعد کون کس کو پوچھتا ہے۔ اس قسم کی باتیں مذاق ہی ہوسکتی ہیں جی۔ ویسے بھی میں لالچ میں پڑنا نہیں چاہتا۔ مجھے تو بہرحال اپنی ڈیوٹی سرانجام دینی ہی ہے۔ اپنا فرض ادا کرنا ہی ہے۔ قاتل کو تلاش کرنا میرا تو فرض ہی ہے جناب!"

"ظاہر ہے آپ نے یہ جاننے کی کوشش تو کی ہوگی کہ وہ کون تھا؟" میں نے کریدا۔

"کیوں نہیں جناب۔ میں نے اس سے بہت پوچھا کہ وہ کون ہے، مقتولہ سے اس کا کیا رشتہ ہے، اور وہ آکر مقتولہ کی لاش کیوں نہیں لے جاتا؟ لیکن وہ اسی بات پر اڑا رہا کہ مقتولہ سے اس کا کوئی رشتہ نہیں اس لئے وہ لاش وغیرہ لینے نہیں آسکتا، وہ تو بس انسانی

ہمدردی کی بنا پر مجھے وہ پیشکش کر رہا ہے۔ اسی لئے تو جناب مجھے یہ بات زیادہ کھوکھلی لگی اور میں نے اس پر اعتبار نہیں کیا۔ ویسے باتوں باتوں میں میں نے اس شخص کو آپ کے بارے میں بھی بتادیا تھا۔"

"میرے بارے میں کیا بتادیا تھا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"یہی کہ ایک بہت بڑے سیٹھ صاحب جو ہمارے بڑے کرم فرما ہیں وہ بھی اس معاملے میں ذاتی دلچسپی لے رہے ہیں۔ وہ بھی چاہتے ہیں کہ قاتل کو عبرت ناک سزا ملے اور وہ بھی محض انسانی ہمدردی کی بنیاد پر یہ سب کچھ چاہ رہے ہیں۔" شریف سیال نے بتایا۔

"پھر اس کا ردِ عمل کیا رہا؟"

"یہ بات اس نے بڑی دلچسپی سے سنی اور مجھ سے آپ کا فون نمبر بھی لے لیا۔ شاید وہ آپ کو بھی انعام کی پیشکش کرے۔" وہ دھیرے سے ہنسا پھر فوراً ہی کھنکار کر گلا صاف کرنے لگا۔

"یہ تو بڑی دلچسپ بات بتائی آپ نے سیال صاحب! لیکن افسوس کہ اس سے بھی نہ تو قاتل کی تلاش میں کوئی مدد مل سکتی ہے اور نہ نشاط کی اصلیت پر کوئی روشنی پڑ سکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں جناب! یہ بات تو ہے" اس نے تسلیم کیا "لیکن آپ دیکھ لیں کہ میں آپ سے کوئی بات چھپا نہیں رہا۔ پرسنل اور کانفیڈنشل، دونوں طرح کی باتیں آپ کو بتاتا جارہا ہوں۔ یعنی میرا آپ سے تعاون جاری ہے۔"

"میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں سیال صاحب! پولیس ڈیپارٹمنٹ میں بہت سے چھوٹے بڑے ایسے افسران میرے کرم فرما ہیں جو دل کے بڑے اچھے اور نہایت انسان دوست ہیں۔ میں ان کا بڑا قدردان ہوں۔ انسانی بھلائی کے کاموں اور ظالموں اور بدمعاشوں کو سبق آموز انجام تک پہنچانے میں وہ قانون سے ہٹ کر بھی خاموشی سے میری مدد کرتے ہیں۔ ان میں اب آپ کا نام بھی شامل ہوگیا ہے۔"

"مہربانی ہے جناب آپ کی۔" وہ خوش دلی سے بولا "لوگ کہتے ہیں پولیس والوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی اچھی۔ لیکن ہم نے تو جناب اچھے آدمیوں کو ہمیشہ دوست رکھنے کی کوشش کی ہے۔"

"ایک تکلیف اور کیجئے گا سیال صاحب!" میں نے کہا "اگر پرسوں تک بھی نشاط کا کوئی وارث لاش لینے نہ آیا تو آپ کوشش کیجئے گا کہ اس کی تکفین و تدفین بہت اچھے اور موزوں طریقے سے ہوجائے۔ کوئی کمی نہ رہے۔ ہر کام باعزت طریقے سے ہو۔ اخراجات کے لئے میں رقم اپنے آدمی کے ہاتھ بھجوادوں گا۔ میرا مطلب ہے کہ اگر وہ لاوارث بھی تھی تو اس کی لاش لاوارثوں کی طرح دفن نہیں ہونی چاہئے۔"

"ٹھیک ہے جناب! جیسے آپ کہتے ہیں ویسے ہوجائے گا۔" شریف سیال نے مستعدی سے کہا اور میں نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔ پھر میں نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

گاڑی میں بیٹھ کر پہلے میں ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں پہنچا۔ بالکل سکون تھا۔ وہ ہمیشہ ہی ایک ایسا پُرسکوت گھر معلوم ہوتا جہاں گنجائش سے کہیں کم افراد رہتے ہوں اور وہ بھی بے حد خاموشی پسند ہوں۔ حالانکہ یہاں بڑے بڑے اہم اور ہنگامہ خیز قسم کے کام بھی نمٹائے جاتے تھے اور تھوڑا بہت دفتری قسم کا کام بھی ہوتا۔

جولی لان پر بیٹھی اپنے ناخن تراشنے اور انہیں سنوارنے میں مصروف تھی گویا اسے دنیا میں اور کوئی مصروفیت ہی نہ ہو۔ وہ ٹراؤزر اور ڈھیلی ڈھالی شرٹ میں تھی۔ آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ مجھے دیکھ کر وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مسکراتے ہوئے کھڑی ہوئی۔

"وہ تینوں مہمان خانے میں ہی ہیں؟" میں نے ہیلو ہیلو کے بعد پوچھا۔

"یس سر! آپ دیکھیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا "کچھ زیادہ محنت تو نہیں کرنا پڑی ان پر؟"

"نہیں سر! کوئی ایسی خاص محنت نہیں کرنی پڑی۔" جولی نے بے پروائی سے کہا "ویسے وہ عام بدمعاشوں سے خاصے اونچے درجے کے بدمعاش ہیں۔ بڑا منظم قسم کا ایک باقاعدہ گروہ ہے ان کا۔ اسلحہ بھی ان کے پاس کافی ہے۔ بلکہ مشین گنیں تک ہیں۔ ہر طرح کی وارداتوں پر کمربستہ رہتے ہیں۔ خود اپنے طور پر بھی اور آرڈر پر بھی کام کرتے ہیں....."

اس دوران اندر سے حنیف خان بھی ہمارے ساتھ ہو لیا اور ہم عقبی ہال کی طرف جارہے تھے۔ جولی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں نے ساری معلومات حاصل کرلی ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو ان کے گروہ کا صفایا کردیا جائے؟"

"فی الحال تو صرف انہیں سبق سکھانا اور اصل بات معلوم کرنا ہی میرا مقصد تھا۔ اگر انہوں نے سبق نہ سیکھا اور آئندہ ٹکرانے کی کوشش کی تو پھر دیکھا جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے کہ بلا کسی وجہ کے خونریزی ہماری پالیسی نہیں ہے اور نہ ہی مجھے پسند ہے۔"

"یس سر!" جولی مسکرائی "میں نے تو احتیاطاً پوچھا تھا۔"

اس دوران ہم سیڑھیاں اترنے لگے تھے۔ ہم تہ خانے کی طرف جارہے تھے۔ حنیف خان خاموشی سے آگے چل رہا تھا۔

"ان کے گروہ کا نام ریڈ ڈاٹ ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر!" جولی نے نفی میں سر ہلایا "کوئی نام وغیرہ نہیں ہے ان کے گروہ کا۔ بس یونہی دس آدمیوں کا گروہ ہے۔ دھڑلے سے بدمعاشی کرتے ہیں۔ جوئے کے اڈے وغیرہ بھی ہیں ان کے۔ لیکن کوئی ایسی پڑھی لکھی قسم کی چیزیں نہیں کہ گروہ کا انگریزی میں نام وغیرہ رکھنے کا سوچنے لگیں۔"

میں نے ابھی تک اصل بات نہیں پوچھی تھی۔ وہ میں تہ خانے میں پہنچ کر ہی پوچھنا چاہتا تھا۔ سیڑھیاں بظاہر ایک سٹور روم کی معلوم ہوتی تھیں جو بائیں ہاتھ پر تھا۔ دائیں طرف

...۔ اس کے قریب ہی سوئچ بورڈ موجود تھا۔ حنیف خان نے ...ٹرانک کنٹرول کے تین سوئچ ایک خاص ترتیب سے کئی مرتبہ ...ئے اور دیوار ایک طرف ہٹ گئی۔

سامنے ٹھوس اسٹیل کا ایک ساؤنڈ پروف دروازہ موجود تھا۔ ...ں کے کنٹرول کے سوئچ الگ تھے۔ حنیف خان نے انہیں بھی ...ب خاص ترتیب سے دبایا۔ وہ بظاہر نظر بھی نہیں آتے تھے۔ ...ٹیل ہی کی ایک پٹی کے نیچے چھپے ہوئے تھے اور پٹی کو ہٹانے کی ...ب الگ ترکیب تھی۔

سیاہ اسٹیل کا دروازہ بے آواز طریقے سے کھل گیا اور ہم ...یل و عریض تہ خانے میں جا پہنچے۔ یہ تہ خانہ کئی حصوں پر مشتمل ...۔ اس میں قیدیوں کو رکھنے کے لئے مختلف ساخت کی کوٹھریاں ...ں تھیں اور ٹارچر سیل بھی۔ یہاں تک پہنچنے کی نوبت صرف انہی ...وں کی آتی تھی جو انسانیت اور معاشرے کے لئے ناسور سے کم ...یں ہوتے تھے یا پھر جو ہمارا جینا دوبھر کرنے کی کوشش کرتے تھے ...ر کسی طرح بھی باز نہیں آتے تھے۔ یہاں بھی ان کو سیدھا کرنے ...ے مختلف مراحل ہوتے تھے۔ ہماری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ...خری مرحلے تک کوئی نہ جائے۔

وہ تینوں کنکریٹ کے ایک چبوترے پر لیٹے ہوئے تھے۔ ان ...ے جسموں پر قمیصیں نہیں تھیں۔ جسموں پر بظاہر نشانات بھی ...سولی سے تھے لیکن ان کی حالت مردوں سے بدتر تھی۔ وہ بغیر کسی ...رشوں کے چت لیٹے ہوئے تھے۔ کلین شیو بدمعاش کے جسم کو تو ...قفے وقفے سے یوں جھٹکے لگ رہے تھے جیسے اس پر نزع کا عالم ...ری ہو۔ مونچھوں والے کی آنکھیں نیم وا تھیں اور باچھوں سے ...ف بہ رہا تھا۔ قفل شکن، آنکھیں بند کئے لیٹا تھا اور ہچکیاں سی ...لے رہا تھا۔

تہ خانے میں بدرو بھی موجود تھا اور خاموشی سے بعض چیزوں ...د ان کی صحیح جگہوں پر رکھ رہا تھا اور دیوار گیر الماریوں کے تالے ...ییرہ چیک کر رہا تھا۔ بدرو بھی ہمارے خاص آدمیوں میں سے ایک ...ا۔ وہ بہت زیادہ ذہین یا پھرتیلا نہیں تھا مگر پھر بھی بہت کام کا آدمی ...ا۔ ہمیں ادب سے سلام کرکے وہ دوبارہ اپنے کام میں مصروف ...گیا۔

وہ تقریباً ساڑھے چھ فٹ کا ایک سیاہ فام آدمی تھا لیکن اس ...ے موٹے موٹے ہونٹ قدرتی طور پر خون کی طرح سرخ معلوم ...ہوتے تھے۔ اس کا جسم سانڈ سے زیادہ مضبوط تھا۔ علی الصباح جسم ...ایک خاص تیل کی مالش کرکے وہ جب باغیچے میں درختوں کے ...درمیان کسرت کرتا تھا تو اس کے جسم میں مچھلیاں اسی طرح تڑپتی ...یں جس طرح سچ مچ کی مچھلیاں پانی میں مچلتی ہیں۔ وہ ہاتھوں سے ...ے کی موٹی موٹی سلاخیں موڑ دیتا تھا اور ٹھوس دیواروں پر ...ٹکریں مارنے سے بھی اس کے تربوز نما سر کا کچھ نہیں بگڑتا تھا۔ ...موسم خواہ کچھ بھی ہوتا وہ ہمیشہ نیکر بنیان اور کینوس کے جوتوں میں ...نظر آتا تھا۔ وہ اس تہ خانے کا انچارج تھا اور حنیف خان کا ماتحت تھا۔

جولی نے مونچھوں والے بدمعاش کے بال پکڑ کر اسے بٹھایا مگر وہ ادھر ادھر کو جھولنے لگا۔ جولی کے اشارے پر بدرو نے اس کے منہ پر ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے اور کچھ پانی اسے پلایا بھی۔ تب وہ ذرا بیٹھنے کے قابل ہوا لیکن اس کی گردن اب بھی گویا ڈھلکی جارہی تھی۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" جولی نے اس کے بالوں کو ہلکا سا جھٹکا دے کر پوچھا۔

"محمد طارق" اس نے سرگوشی نما آواز میں لیکن بغیر کسی حیل حجت کے فوراً جواب دیا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اسے فوری جواب دینے کے لئے سدھایا گیا ہے۔

"تمہیں کس نے بھیجا تھا اور کیوں بھیجا تھا؟" جولی نے مزید پوچھا۔

"قیصر ملک نے .... سیٹھ صاحب کو قتل کرنے کے لئے۔" اس نے چڑھی چڑھی سی آنکھوں سے میری طرف اشارہ کیا۔

"کتنی رقم دی تھی؟" جولی گویا کسی بچے سے اس کا سبق سن رہی تھی۔

"پانچ لاکھ جی... کام مشکل تھا۔ ہم نے ساری رقم ایڈوانس لی تھی۔" اس کی آواز سرگوشی سے ہی مشابہ رہی۔

"تم نے بہت کم رقم پر ہامی بھرلی تھی چغد!" جولی نے اس کے ہاتھ چھوڑ دیئے۔ وہ ہاتھ چبوترے پر ٹکائے اس طرح بیٹھا رہا کہ اس کی ٹھوڑی سینے کو تقریباً چھونے لگی۔

میں ایک طویل سانس لے کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی تھی اور جب میں بولا تو یہ مایوسی غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں جھلک آئی۔ "کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ یہ تو اسی الو کے پٹھے قیصر ملک کا چکر تھا۔ اس بدبخت کا دماغ ابھی ٹھکانے پر نہیں آیا۔ وہی گھٹیا حربے... وہی کرائے کے قاتل۔"

مجھے اپنی کنپٹیوں میں تپش سی محسوس ہورہی تھی۔ جولی گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اپنی بے زاری کو کنٹرول کرنے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے ملک بھر کے جرائم پیشہ گروہوں سے اس لعنتی کی شناسائی ہے اور وہ میرے قتل کے لئے یکے بعد دیگرے سب کی خدمات حاصل کرکے رہے گا۔ اس کی زندگی کا گویا مقصد صرف یہی رہ گیا ہے۔"

"بالکل یہی بات ہے سر!" جولی سنجیدگی سے بولی۔ وہ تقریباً تمام حالات سے آگاہ تھی۔ "یہ اس کے لئے زندگی موت اور انا کا مسئلہ بن گیا ہے۔ اس کا چین سے بیٹھنا بہت مشکل ہوگا۔ اس قسم کے لوگ حالات سے کوئی سبق نہیں سیکھتے۔ اپنی ضد پر اڑے رہتے ہیں۔"

اسی دوران محمد طارق نامی اس بدمعاش میں شاید زندگی کی کچھ لہر ابھری یا وہ بصد کوشش اپنی بچی کھچی توانائی مجتمع کرکے چبوترے

سے کھسکا اور ایک دم لڑھک کر میرے قدموں میں آگرا۔ سسکیوں اور ہچکیوں کے امتزاج کے درمیان وہ اسی عجیب سی سرگوشی نما آواز میں بول رہا تھا۔ "صاحب ... بڑے صاحب! خدا کے لئے مجھے معاف کردیں۔ قیصر ملک نے ہمیں بتایا تو تھا کہ آپ بہت خطرناک آدمی ہیں۔ کام بہت مشکل ہے' لیکن ہم اس کی بات کو صحیح طرح سے سمجھے نہیں تھے۔ ہمارا خیال تھا کہ آپ..... بہرحال ہوں گے تو دوسرے بڑے سیٹھوں ہی کی طرح زیادہ سے زیادہ بس یہی ہوگا کہ آپ نے کچھ بدمعاش پال رکھے ہوں گے۔ ہمیں اندازہ نہیں تھا صاحب کہ آپ تو چیز ہی کچھ اور ہیں۔ خدا کے لئے ہمیں معاف کردیں۔"

"آہ وزاری کرنے اور پاؤں پکڑنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے نرمی سے کہا اور اسے بازو سے پکڑ کر واپس چبوترے پر بٹھادیا۔ "تمہیں اتنی تکلیف ہی نہ اٹھانا پڑتی اگر تم مجھے میرے گھر پر ہی بتادیتے کہ تمہیں قیصر ملک نے بھیجا ہے۔ میں تمہیں اسی وقت چھوڑ دیتا۔ مجھے تم جیسے کرائے کے قاتلوں سے بھلا کیا لینا تھا۔ اصلی مجرم تو وہ ہوتے ہیں جو ان کو بھیجتے ہیں۔ سزا کرائے کے قاتلوں کو بھی ملنی چاہئے لیکن اس کی پرورش کرنے والوں کو زیادہ کڑی سزا ملنی چاہئے۔ اب بھی جیسے ہی میں نے تمہارے منہ سے سنا کہ تمہیں قیصر ملک نے بھیجا تھا تو میں نے اسی لمحے تمہیں چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔"

اس کے شکستہ وجود میں گویا زندگی کی لہر عود آئی۔ اس کی سوجی سوجی آنکھیں جن کے گرد نیلے حلقے پڑ چکے تھے' قدرے ٹھیک نظر آنے لگیں اور اس نے امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی سے زیادہ بلند آواز میں بے یقینی سے پوچھا۔ "صاحب! کیا آپ واقعی ہمیں چھوڑ دیں گے؟ بالکل معاف کردیں گے؟"

"ہاں۔ اب سے کچھ دیر بعد تم آزاد ہوجاؤ گے اور مجھے اس بات کی بالکل پروا نہیں ہوگی کہ تم باہر جاکر کیا کرتے ہو۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن قیصر ملک کو ایک پیغام ضرور دے دینا کہ زندہ رہنے کا اس کے پاس اب صرف ایک راستہ ہے کہ آئندہ وہ خود یا کرائے کے قاتلوں کے ذریعے میری جانب ایک انچ بھی پیش قدمی نہ کرے۔ یہ آخری موقع تھا کہ میں اسے معاف کررہا ہوں لیکن آئندہ ایسی کوئی بھی کوشش اس کی زندگی کی آخری کوشش ہوگی۔ تم اچھی طرح سن رہے ہونا؟ سمجھ رہے ہو نا؟" میں نے قدرے جھکتے ہوئے کہا۔

اس نے اثبات میں سرہلانے کی کوشش کی لیکن کراہ کر گردن تھام لی۔

"تمہیں یہ پیغام اسی طرح لفظ بہ لفظ.... اسی مفہوم کے ساتھ قیصر ملک کو دینا ہے۔ بس یہی تمہاری رہائی کی واحد شرط ہے۔" میں نے ٹھوس لہجے میں کہا اور ایک لمحے کے لئے غیرارادی طور پر میرے دانت بھنچ گئے لیکن پھر میں نے فوراً ہی جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

"میں .... میں اسے ضرور آپ کا پیغام دوں گا۔ بلکہ ا[پنی] طرف سے بھی سمجھاؤں گا۔" رہائی کی امید نظر آتے ہی محمد خا[ن] کی حالت عجیب سی ہوگئی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس کی ٹانگیں بری طرح کانپ گئیں اور وہ دوبارہ دھپ [سے] چبوترے پر بیٹھ گیا۔ کلین شیو بدمعاش اور قفل شکن نوجوان بھی یہ خوشخبری سن کر آنکھیں کھول دی تھیں اور کانپتے بازو[ؤں] کے سہارے اٹھنے کی کوشش کررہے تھے۔

میں نے محمد طارق سے کہا "قیصر ملک تو زخمی تھا۔ اسپتال داخل تھا۔ کیا وہ صحت یاب ہوگیا؟"

"جی ہاں" محمد طارق نے نحیف آواز میں جواب دیا "و[ہ] ابھی چھڑی کے سہارے لنگڑا کر چلتا ہے۔ مگر صاحب..... سچی با[ت] یہ ہے اس پر جنون طاری ہے آپ کو قتل کروانے کا.... اس کا [بس] نہیں چل رہا کہ وہ کیا کرے..... اور معلوم نہیں وہ کیا کر گزرے اسے سو فیصد یقین ہوجائے کہ کوئی آپ کو قتل کرسکتا ہے تو شا[ید] اس مقصد کے لئے اپنی ساری دولت بھی دے دے..... صاحب! میں اس کا جنون اتارنے کی کوشش کروں گا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور حنیف خان سے کہا "ا[ن]ہی کی گاڑی میں محفوظ طریقے سے کہیں بھجوا دینا۔"

"بہت بہتر" حنیف خان نے دھیمے لہجے میں کہا اور ا[ن] آنکھوں پر پٹیاں باندھنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ میں اور جولی وا[پس] چل دئے۔

لان پر پہنچ کر میں نے جولی کو خدا حافظ کہا اور گاڑی [میں] بیٹھا۔ وہ دوبارہ لان چیئر پر بیٹھ کر سامنے تپائی پر رکھی ہوئی نیل [پالش] ریموور اور نیل کٹر وغیرہ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

میں آفس پہنچا تو کیتھرین نے بتایا کہ محسن علی نامی ا[یک] نوجوان مجھ سے ملاقات کے انتظار میں بہت دیر سے بیٹھا ہوا [ہے]۔ صبح اس نے فون کرکے اپائنٹمنٹ لینے کی کوشش کی تھی لیکن پھ[ر خود] ہی چلا آیا۔ وہ ویٹنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ چند منٹ بعد اسے میرے آفس میں بھیج [دینا]" میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا اور اندر جا بیٹھا۔

چند لمحے بعد محسن علی کو میرے پاس بھیجا گیا۔ وہ یقیناً [بڑی] امیدوں کے ساتھ تیار ہوکر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ معمولی مگر [صاف] ستھرے کپڑوں کو اس نے یقیناً بڑی محنت سے استری کیا تھا۔ [بالوں] میں تیل بھی لگایا ہوا تھا اور انہیں شاید چند منٹ پہلے بھی [سنوارا] گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں امید اور ناامیدی کی کشمکش [کے] سائے تھے اور وہ بار بار خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہا تھا۔

"سر! وہ آپ نے نوکری کے لئے ...؟" اس نے گویا [یاد] دلانے کی کوشش کی۔

"مجھے یاد ہے۔" میں نے اسے اطمینان سے بیٹھے رہنے کا [اشارہ] کرتے ہوئے کہا۔ چند ضروری خطوط پر سرسری نظر ڈالنے [کے بعد] میں نے فائل ایک طرف کھسکائی اور انٹرکام پر اپنے ایکسپو[رٹ منیجر]

سے رابطہ قائم کیا۔

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ چند دن پہلے آپ ذکر کررہے تھے کہ ہمیں کارگو سپروائزر کی آسامی کے لئے ایک ایماندار نوجوان کی ضرورت ہے؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔" منیجر بولا "کارگو میں تمامتر احتیاطوں کے باوجود ہیرا پھیری کا اندیشہ رہتا ہے۔ کوئی بھروسے کا نوجوان چاہئے۔ اسی لئے میں ابھی تک اخبار میں اشتہار دیتے ہوئے ہچکچا رہا تھا کہ کوئی جاننے والا مل جائے تو بہتر ہے۔"

"میں ایک نوجوان کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ فی الحال اسے آزمائشی بنیادوں پر رکھ لیجئے گا۔ بعد میں مستقل کرلیجئے گا۔" میں نے کہا۔

انٹرکام کا ریسیور رکھ کر میں نے محسن علی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "ملازمت بھی تمہیں ایسی دی جارہی ہے جس میں اوّلین شرط صرف دیانتداری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ میں تمہیں دو ایک کام اور ایسے سونپ رہا ہوں جن میں دیانتداری کی اشد ضرورت ہوگی۔ میرے کسی بھی کاروبار' کسی بھی پراجیکٹ سے وابستہ ہونے والے وہ لوگ بہت ترقی کرتے ہیں جو بنیادی طور پر ایماندار اور میرے ساتھ مخلص ہوتے ہیں۔"

"سر! آپ مجھے ضرور آزمائیے۔ قبل از وقت میں کوئی دعویٰ کرنا نہیں چاہتا۔" وہ دبے دبے جوش کے ساتھ بولا۔

"دعوے کرنے والے لوگ مجھے متاثر بھی نہیں کرتے۔" میں نے کہا "نوکری میں تمہیں جو کچھ کرنا ہوگا وہ تو تمہیں ایکسپورٹ منیجر صاحب سمجھا دیں گے۔ میں تمہارے ذمے جو دو کام لگا رہا ہوں وہ یہ ہیں کہ تمہیں اپنی ہی بلڈنگ کی دو خواتین کی مدد نہایت رازداری اور نہایت خلوص سے کرنی ہے۔ ایک تو تمہیں شکیلہ بیگم کو کسی ایسے پرائیویٹ اسپتال میں داخل کرانا ہے جہاں اس کی نشوں کی عادت چھڑائی جاسکے اور ضروری علاج کیا جاسکے۔ صحت یابی کے بعد بھی اسے جس حد تک مدد کی ضرورت ہوگی وہ تم فراہم کروگے۔ وہ اپنے زمانے کی بہت اچھی اداکارہ تھی۔ اور اس سے قطع نظر میں نے سنا ہے کہ وہ بہت نیک دل عورت تھی۔ اپنے خرچ پر اس نے کئی غریب لڑکیوں کی شادی کرائی اور کئی بیواؤں کی وہ مستقل مدد کرتی تھی۔ معلوم نہیں آسمان اس پر کیوں اتنا نامہرباں ہوا کہ آج وہ اس حال میں ہے۔ ممکن ہے اسے کسی کی محبت نے برباد کیا ہو یا پھر اس کی اپنی ہی ذات کے کسی خلل نے۔ بہرحال ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں۔ ہماری غرض صرف اتنی ہونی چاہئے کہ وہ دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہوجائے اور معاشرے کی ایک کارآمد رکن بن جائے۔ کیا تم نوکری کے علاوہ اپنے فاضل وقت میں یہ کام کرلوگے!"

"کیوں نہیں سر!" وہ بلا تامل بولا۔ "یہ کوئی ایسا مشکل کام تو نہیں۔ مجھے تو خود بہت شوق رہا ہے دوسروں کے کام آنے کا.... کسی کے لئے کچھ کرنے کا.... جذبۂ خدمت بہت تھا مجھ میں..... لیکن افسوس کہ قدرت نے مجھے اس قابل ہی نہیں بنایا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے میں تو خود دوسروں کی مدد کا محتاج رہا۔" اس کے لہجے میں تاسف ضرور تھا مگر احساسِ محرومی کی جھلک نہیں تھی۔

"اس تاسف کو دل سے نکال دو۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ قدرت کو نہ جانے کیا منظور ہے۔" میں نے کہا "دوسری عورت جس کا میں ذکر کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ تمہاری بلڈنگ کی تیسری منزل پر رہنے والی ایکسٹرا گرل ملکہ ہے۔ جانتے ہو اسے؟"

"جی ہاں۔ اچھی طرح۔ آج کل اس بے چاری کا بچہ بہت بیمار ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں وہی۔" میں نے طمانیت سے کہا "میں نے ان کے لئے تھوڑا بہت انتظام تو کیا تھا۔ لیکن لگتا ہے ان دونوں ہی ماں بیٹے کو اچھے اور خاصے طویل علاج کی ضرورت ہے۔ میں چاہتا ہوں تم اس وقت تک ان کے علاج معالجے اور دیگر ضروریات کا خیال رکھو جب تک ملکہ اور اس کا بچہ مکمل طور پر تندرست نہیں ہوجاتے اور ملکہ دوبارہ کوئی کام کاج کرنے کے قابل نہیں ہوجاتی۔ شکیلہ بیگم اور ملکہ جب دوبارہ حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہوجائیں تو پھر ان کی مدد جاری رکھنے کی ضرورت نہیں۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے محسن علی! کہ معاشرے میں جو زیادہ تر محتاج' کچلے مسلے ہوئے اور ناکارہ لوگ نظر آتے ہیں وہ دراصل وہ لوگ ہیں جو زندگی کی اس قیامت خیز دوڑ میں کبھی ٹھوکر کھا کر گر پڑے تھے اور اس کے بعد کسی نے انہیں سہارا دے کر نہیں اٹھایا۔ انہیں دوبارہ ان کے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں بنایا۔ وہ زمانے کے قدموں تلے روندے جاتے رہے اور آخرکار اس قابل ہی نہیں رہے کہ کسی بھی طرح دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوسکیں۔ اس دوران اگر ان میں سے کسی خوش نصیب کی مدد بھی کی گئی تو وہ بس اس طرح تھی جیسے بھوک اور پیاس سے مرتے ہوئے کسی انسان کے حلق میں محض ذرا اوپر سے پانی کے دو چار قطرے ٹپکا دیئے جائیں اور روٹی کا ایک آدھ نوالہ منہ میں ڈال دیا جائے۔ اس مدد کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔ لیکن جذبہ بہرحال اس کے پیچھے بھی نیک ہو تو اس کو بھی سراہنا ہی چاہئے۔ بہرحال میری نظر میں زیادہ بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک بار کسی کو سہارا دینے کے لئے اس کا ہاتھ تھاما جائے تو اسے دوبارہ زمانے کی بے رحم دوڑ میں حصہ لینے کے قابل بنانے کی کوشش کی جائے۔ اسے ہمیشہ مدد کا محتاج نہ رکھا جائے۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہونا؟"

وہ مبہوت سا میری طرف دیکھ رہا تھا۔ یکدم گویا چونک کر بولا۔ "بہت اچھی طرح سر!"

"امدادی کاموں کے سلسلے میں تم جس وقت بھی چاہو براہِ راست انٹرکام پر یا فون پر مجھ سے بات کرسکتے ہو۔ میں اسی وقت کیشیئر سے کہہ دیا کروں گا اور وہ تمہیں مطلوبہ رقم دے دیا کرے گا۔ ان کاموں کے لئے میرا ایک الگ چھوٹا سا متوازی نظام کام کررہا ہے۔ دفتری کاموں کے سلسلے میں آئندہ تمہارا رابطہ زیادہ تر

دوسرے لوگوں سے رہے گا۔ امید ہے تنخواہ اور دیگر مراعات تمہارے لئے قابل قبول ہوں گی۔"

"سر! میری قبولیت کی آپ کیا پوچھتے ہیں" وہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے ذرا مسکرایا۔ "میں تو کچھ دنوں سے چپڑاسی کے طور پر بھی کام کرنے کے لئے تیار تھا۔ ایک دو جگہ اس اسامی کے لئے انٹرویو دینے بھی جا پہنچا مگر انہوں نے معذرت کرلی کہ یہ بی اے کی ڈگری کی توہین ہوگی۔ عجیب ستم ظریفی تھی۔ ایک طرف تو وہ مجھے ڈگری کے مطابق بھی کوئی نوکری نہیں دے سکتے تھے اور دوسری طرف اگر میں اپنی تعلیمی سطح سے نیچے آکر کوئی کام کرنا چاہتا تھا تو وہ بھی نہیں کرنے دیتے تھے۔ آئندہ کے لئے میرا ارادہ یہ تھا کہ اگر چپڑاسی کی اسامی کے لئے درخواست دوں تو اس میں اپنی تعلیم صرف میٹرک بتاؤں گا۔"

"بہرحال.... "میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ مت بھولنا کہ فی الحال تمہیں آزمائشی بنیاد پر رکھا جارہا ہے۔"

"مجھے جب تک بھی یہاں رہنا نصیب ہوا میں اپنے آپ کو آزمائشی بنیادوں پر ہی ملازم سمجھوں گا سر!" وہ اٹھتے ہوئے بولا اور اجازت پاکر رخصت ہوگیا۔ میں اسے آزمانے سے پہلے ہی اس کی طرف سے مطمئن تھا۔ میں لوگوں کی آنکھوں میں ایمانداری' وفا اور خلوص کے جو گمشدہ خزانے تلاش کیا کرتا تھا۔ محسن علی کی آنکھوں میں مجھے ان کی جھلک نظر آئی تھی۔ خزانے عموماً خرابوں ہی میں ملتے ہیں۔ خوبصورتیاں عموماً کھنڈروں ہی میں مدفون ہوتی ہیں۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنی ترجیحات پر غور کیا۔ سرفہرست مجھے ہنی کے اغوا کا معاملہ اہم نظر آیا۔ شریف سیال نچلی سطح کا پولیس آفیسر تھا اور اس کی جان بہت جھنجٹوں میں پھنسی ہوئی تھی۔ تفتیش تو گو کہ ہرحال میں اسی تھانے کو کرنی تھی لیکن میں آخرکار اسی نتیجے پر پہنچا کہ اگر ذرا اوپر سے تھوڑا سا دباؤ ڈلوادیا جائے تو بہتر رہے گا۔ مجھے اپنے طور پر تو کوشش کرنی ہی تھی لیکن پولیس بہرحال اپنی جگہ ایک محکمہ تھی۔ اس کے اپنے انداز' طور طریقے اور وسائل تھے۔ اگر وہ بھی اس سلسلے میں تھوڑے سے سرگرم رہتے تو کوئی حرج نہیں تھا۔

ایس پی جہاں زیب میرا دوست تھا۔ میں نے فون پر اس سے رابطہ قائم کرکے تفصیلی بات کی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ فوری طور پر متعلقہ لوگوں کو تیزی سے حرکت میں آنے کی ہدایات جاری کردے گا۔ اس سے خاصی طویل گفتگو رہی۔ گپ شپ بھی ہوئی۔ آخرکار میں نے اس کا شکریہ ادا کرکے سلسلہ منقطع کیا اور دوسرے کاموں کی طرف متوجہ ہوا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر جہاں زیب کے کہنے سے بھی تفتیش کی رفتار کچھ تسلی بخش نظر نہ آئی تو پھر ڈی آئی جی صاحب سے بھی کہلوادوں گا۔

دفتر کے کاموں میں الجھ کر مجھے مزید دو گھنٹے گزر گئے۔ اس دوران ضروری ٹیلی فون کالز بھی آتی رہیں۔ دفتر کے سب لوگ کھانے کا وقفہ کرنے کے بعد واپس بھی آگئے لیکن میں کھانے کے لئے بھی نہیں اٹھا۔ آخرکار گھڑی دیکھنے کے بعد میں کچھ دیر کے لئے اٹھنے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ کیتھرین نے بتایا ایک صاحب مجھ سے بات کرنے کے لئے بہت اصرار کررہے ہیں مگر اپنا نام نہیں بتارہے۔ ان کا کہنا تھا کہ نام وہ صرف مجھے ہی بتائیں گے۔ اس انداز سے فون کرنے والوں کو کیتھرین ٹال دیتی تھی۔ انہیں بھی ایک مرتبہ ٹال چکی تھی لیکن انہوں نے فوراً ہی دوبارہ فون کیا تھا اور بہت منت سماجت کررہے تھے۔

"ٹھیک ہے' بات کراؤ۔" میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد کہا اور فون کا ریسیور اٹھایا۔ دوسری طرف سے جس ٹھہری ٹھہری سی آواز نے سلام کیا وہ میرے لئے اجنبی تھی۔ پھر اس نے جس انداز سے میری خیروعافیت دریافت کی اس سے یوں لگا جیسے وہ میرا کوئی غائبانہ جاننے والا ہو۔ بہرحال اس لہجے میں سادگی اور شرافت کی جھلک تھی۔

"چوہدری صاحب! میں آپ سے ملنے کی حسرت لے کر کچھ دیر پہلے ہی گوجرانوالہ سے یہاں پہنچا ہوں۔ میں آپ جیسا بڑا آدمی تو نہیں' لیکن بہرحال ایک کاروباری آدمی ہوں۔" پھر اس نے ایک شناسا سا برانڈ نام بتاتے ہوئے کہا "اس نام کے پنکھوں کا کارخانہ میرا۔ میرے بیٹوں کے بھی الگ الگ چھوٹے موٹے کارخانے ہیں ...اللہ کا کرم ہے۔ اچھے آسودہ حال لوگوں میں شمار ہوتا ہے۔ لیکن مجھے آپ سے کاروباری نہیں' اخلاقی مدد درکار ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے آپ کا قیمتی وقت خراب کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں لیکن میں بس ایک موہوم سی امید کے سہارے چلا آیا ہوں۔ شریف سیال نے آپ کے متعلق جو کچھ کہا اور یہاں کے کاروباری حلقوں سے میں نے جو تھوڑی بہت معلومات حاصل کیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ جتنے بڑے آدمی ہیں اتنے ہی بڑے دل کے بھی مالک ہیں ....اور دل بھی ایسا جس میں دوسروں کے لئے دردمندی پائی جاتی ہے۔ کیا میں امید رکھوں کہ آپ میری مدد کے لئے وقت نکالیں گے؟ میں ہلٹن میں ٹھہرا ہوا ہوں.... اگر آپ مجھے یہاں ملاقات کا اعزاز بخشنا چاہیں تو یہاں تشریف لے آئیں یا مجھے اجازت دیں میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں؟"

میں نے خاموشی اور توجہ سے اس کی بات سنی تھی۔ بظاہر اس کا لہجہ ٹھہرا ٹھہرا تھا لیکن پھر بھی اس کے لفظوں میں جیسے جذبات کا ایک بہاؤ سا تھا۔ وہ بہت بے تاب بھی معلوم ہوتا تھا اور کسی صدمے سے نڈھال بھی۔ مگر وہ گویا بہت جرأت اور ہمت سے کام لیتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔

"لیکن آپ کو کس سلسلے میں میری مدد کی ضرورت آن پڑی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"نشاط کے قتل کے سلسلے میں" اس نے نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا۔ ان لفظوں کے عقب میں گویا سسکیاں مچل رہی تھیں۔

"اچھا.... تو آپ ہی نے غالباً آج صبح شریف سیال کو بھی فون کیا تھا؟" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"جی ہاں" اس نے بلا تامل کہا "اسے میں نے گوجرانوالہ سے فون کیا تھا۔ اس نے جب آپ کے بارے میں بتایا تو مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی۔ میں فوراً گاڑی نکال کر گوجرانوالہ سے چل پڑا۔ پہلے میرے ذہن میں شک بھی تھا کہ آخر آپ نشاط کے قتل میں دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟ لیکن پھر میں نے معلومات کیں اور آپ کے بارے میں اطمینان ہوگیا کہ آپ کی دلچسپی بے لوث اور انسانی ہمدردی پر مبنی ہے اور کسی نے نشاط کو آپ کے پاس مدد مانگنے کے لئے ہی بھیجا تھا مگر اس سے پہلے ہی... "اس کی آواز ایک لمحے کے لئے گلوگیر ہوگئی مگر پھر اس نے گویا خود کو سنبھالا۔ "مجھے معلوم ہوا کہ وہ آپ کے لئے بالکل اجنبی تھی مگر آپ کو اس کی دردناک موت کا دکھ ہوا۔ اس دکھ کے ناتے کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

"مگر آپ کی اس معاملے میں دلچسپی کی بنیاد کیا ہے؟ کیا صرف انسانی ہمدردی؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"یہ میں آپ کو فون پر نہیں بتاسکتا۔ میں آپ سے ملاقات کے لئے بے تاب ہوں۔"

میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "میں ہی آپ کے پاس آجاتا ہوں۔ لیکن آدھے گھنٹے بعد۔ آپ مجھے اپنا نام اور کمرا نمبر بتادیجئے۔"

"اس عزت افزائی کے لئے میں تازندگی آپ کا شکرگزار رہوں گا۔" اس کے لہجے میں حقیقی ممنونیت تھی۔ "میرا نام وحید ہے۔" پھر اس نے اپنا کمرا نمبر بھی بتادیا۔ میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

آدھے گھنٹے بعد جب میں ہلٹن ہی میں کھانا وغیرہ کھاکر ڈائننگ ہال سے اوپر مطلوبہ کمرے تک پہنچا تو وحید صاحب مجھے کمرے کے دروازے پر ہی کھڑے ملے۔ شاید وہ خاصی دیر پہلے ہی باہر آکر کھڑے ہوگئے تھے اور بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔

وہ گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سے سوٹ میں تھے۔ قدرے فربہ اندام آدمی تھے اور بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکے تھے۔ جوانی میں وہ خاصے وجیہہ رہے ہوں گے۔ عام حالات میں ان کے چہرے پر سخت گیری بھی جھلکتی ہوگی لیکن اس وقت وہ شکستہ دل اور مضمحل نظر آرہے تھے۔ میں ان کے قریب پہنچا تو انہوں نے اندازے سے مجھے پہچان لیا اور خود ہی آگے بڑھ کر گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے بولے۔ "چوہدری صاحب! آپ نے یہاں تشریف لاکر مجھے بڑی عزت بھی دی ہے اور میرے دل کو بڑا حوصلہ بھی بخشا ہے۔"

انہوں نے میرے لئے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر پہنچ کر بولے۔ "میں کس منہ سے آپ کا شکریہ ادا کروں"

میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "رسمی باتوں کو چھوڑیئے وحید صاحب! کام کی بات کیجئے۔ نشاط آپ کی بیٹی تھی؟"

ان کی آنکھیں بلوری تھیں۔ نشاط کی آنکھوں کا رنگ بھی ایسا ہی تھا لیکن میں نے انہیں ڈراؤنے انداز میں حلقوں سے نکلے ہوئے دیکھا تھا۔ وحید صاحب کی آنکھوں میں نمی چھلک آئی۔ ایک لمحے وہ بالکل خاموش رہے۔ کمرے میں بوجھل سا سکوت چھاگیا

"آپ ٹھیک سمجھے۔" آخرکار وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولے اور ٹشو پیپر سے آنکھیں خشک کرنے لگے۔ "وہ میری سب سے چھوٹی اولاد تھی۔ اکلوتی بیٹی۔ ضدی' خودسر اور لاڈلی۔ دھن کی پکی۔"

ہم دونوں ابھی کھڑے ہی تھے۔ میرا بیٹھنے کو دل بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ انہوں نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے میری طرف دیکھا پھر ان کی آواز گویا بہت دور سے آنے لگی۔ "ہم کاروباری لوگ ہیں۔ ہمارے گھرانے میں تعلیم زیادہ نہیں ہے۔ لڑکے واجبی سی تعلیم حاصل کرکے کاروبار میں لگ جاتے ہیں لیکن رخشندہ کو تعلیم دلانے کا ہمارا ارادہ تھا۔ نشاط کا اصل نام رخشندہ تھا۔ مجھے بہت بعد میں پتا چلا تھا کہ لاہور آکر اس نے اپنا نام نشاط رکھ لیا تھا۔ کیونکہ وہ ہمارے حوالے سے پہچانی جانا نہیں چاہتی تھی۔"

انہوں نے مجھے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔ آخرکار وہ خود تھکے تھکے انداز میں ایک صوفے پر ڈھیر ہوگئے اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولے "وہ اس وقت صرف انٹر کی طالبہ تھی جب اس پر فلمی ہیروئن بننے کا جنون سوار ہوا۔ ہمارے گھرانے اور ہمارے خاندان میں کئی نسلوں سے دولت ہونے کے باوجود ہم لوگ زیادہ آزاد خیال نہیں ہیں۔ روایتوں کی شدت پابندی ہے ہمارے ہاں۔ کسی حد تک قدامت پسند بھی کہہ سکتے ہیں آپ ہمیں۔ لیکن رخشندہ کے معاملے میں ہم نے کبھی زیادہ قدامت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ہم دیکھتے تھے کہ وہ فلمی رسالے شوق سے پڑھتی ہے۔ اداکاروں کو خط لکھتی ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم تھا کہ وہ کالج کے ڈراموں وغیرہ میں پیش پیش ہوتی ہے۔ آئینے کے سامنے ایکٹنگ کرتی ہے۔ ایک بار اس کا بھائی لندن سے ویڈیو کیمرہ لایا تو اس نے باقاعدہ خود اسکرپٹ لکھ کر تنہا اداکاری کرکے ایک لڑکی کی مدد سے اپنی بیس پچیس منٹ کی ایک فلم بھی تیار کی۔ جس پر ہم سب نے اس کا خوب مذاق اڑایا اور اس نے وہ کہیں چھپاکر رکھ دی یا شاید ضائع کردی۔ ان سب چیزوں کو ہم نے کبھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ بچکانہ شوق ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی ختم ہوجائیں گے۔ بے شمار لڑکے لڑکیوں کو ہوتے ہیں یہ شوق۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ٹھنڈے پڑجاتے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئے۔ ان کا سر جھک گیا اور لہجہ خود کلامی کا سا ہوگیا۔ "انٹر کے بعد ہم اسے پڑھنے کے لئے گوجرانوالہ کے بجائے لاہور بھیجنا چاہتے تھے۔ اس موقعے پر اس نے اعلان کردیا کہ پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ لاہور میں فلموں میں بھی کام حاصل کرنے کی کوشش کرے گی۔ اس کا انداز فیصلہ کن تھا اور اس کے لہجے میں غیر متزلزل عزم کی جھلک تھی۔ ہم نے محسوس کیا کہ اب سختی اختیار کرنے کا وقت آگیا ہے۔ اب ہمیں اس کے سر سے یہ بھوت اتارنا پڑے گا۔ چنانچہ ہم نے سختی

اختیار کی۔ اسے لاہور بھیجنا تو درکنار، ہم نے اسے گوجرانوالہ کے کالج سے بھی اٹھالیا۔ ہم نے سوچ لیا تھا کہ اگر اسے مزید پڑھانا ہی ہوا تو پرائیویٹ پڑھائیں گے۔ اس پر دوسری پابندیاں بھی لگائیں۔ کافی سختی کی ... شاید ہمارا طرز عمل غلط تھا۔ شاید ہم سچویشن کو صحیح طور پر ہینڈل نہیں کرسکے۔ اس مسئلے کو زیادہ وقت نہیں دے سکے۔ ہم سب مصروف بھی بہت رہتے تھے۔ کسی کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ بیوی میری تقریباً دس سال پہلے اللہ کو پیاری ہوچکی ہے......"

ایک نیا ٹشو پیپر لے کر انہوں نے ایک بار پھر آنکھیں خشک کیں "ہم نے دن بہ دن سختیاں بڑھائیں اور اس کے دل میں دن بہ دن بغاوت طاقتور ہوتی گئی۔ ہم نے اس کے لئے ہر راہ مسدود کردی لیکن اس نے آخری راہ اختیار کرلی اور ایک رات گھر سے فرار ہوگئی۔"

انہوں نے ایک سسکی سی لی اور ان کی آواز پہلے سے بھی مدھم ہوگئی۔ "بہت عزت دار لوگوں میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ ہم نے اس کے فرار کی خبر کو گھر سے باہر نہیں پہنچنے دیا۔ یہی مشہور کردیا کہ ہم نے اسے پڑھنے کے لئے لندن بھیج دیا ہے۔ ہم نے اسے تلاش کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ ہمیں صدمہ بھی بہت تھا اور غصہ بھی۔ بلکہ کافی عرصہ تو ہم پر نفرت غالب رہی۔ وہ گھر سے معمولی سی رقم کے علاوہ کچھ بھی لے کر نہیں گئی تھی۔ اپنی سونے کی چوڑیاں وغیرہ تک اتار کر رکھ گئی تھی۔ حتیٰ کہ اپنی شناخت بھی گھر پر ہی چھوڑ گئی تھی۔ وہ کوئی ایسا کاغذ کا پرزہ تک ساتھ لے کر نہیں گئی تھی جس سے ہمارے ساتھ اس کے تعلق کا کوئی حوالہ بنتا۔ ... ایک بہت طویل جذباتی خط چھوڑ گئی تھی کہ اگر اس کے شوق کی وجہ سے ہماری ناموس کو خطرہ لاحق ہے تو وہ ہماری خوشنودی کی خاطر اپنے آپ کو ہم سے لاتعلق کررہی ہے اسے کسی شناخت، کسی سہارے کی ضرورت نہیں..... اور ایک روز وہ اتنا نام کمائے گی کہ ہم خود اس سے تعلق جوڑنے کے لئے دوڑے آئیں گے اور اس سے ناتا ظاہر کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ۔ بس اسی قسم کی بہت سی بچگانہ اور جذباتی باتیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے سلسلہ کلام جوڑا۔ "ایک طویل عرصے بعد اس کے بارے میں جو پہلی خبر ہماری نظر سے گزری وہ اس کے قتل کی خبر تھی..... اور ہم نے اس کے متعلق جو کچھ بھی معلومات حاصل کیں وہ آج ہی کی ہیں۔ اب بھی ہم نے سب سے پہلے تو اسی بات پر شکر ادا کیا کہ کسی نے اس کو ہماری بیٹی کی حیثیت سے نہیں پہچانا۔ بہت خود غرض، بہت سنگدل ہیں ہم... لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے اس کی یاد میں بہت سی راتیں کروٹیں بدلتے گزاری ہیں۔ ہم نے اپنے جذبوں پر غم و غصے کا آتشیں خول پہن لیا تھا لیکن اس رشتے کی کونپل تو ہر حال میں ہری رہتی ہے نا۔

بھائی بھی چپ چپ رہتے تھے .... اور اب جو کچھ بھی ا متعلق معلوم ہوسکا ہے۔ اس نے ہمیں اپنی اپنی زندگی نفرت دلادی ہے۔ ہم وہاں عالیشان کوٹھیوں میں ایئر کنڈیشن میں سوتے رہے اور وہ میری پھول سی بچی..... ضد اور انا کی نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکروں میں رُلتی رہی۔ کن کن ہاتھ کھلونا بنتی رہی۔ صرف معاشرے میں ناک اونچی رکھنے کے کتنے کٹھور ہوجاتے ہیں..... اور اب بھی ہیں۔ اب بھی ہم اخلاقی جرأت نہیں کہ آگے بڑھ کر اس کی موت کے بعد اپنا کہیں اور عزت آبرو سے اس کا جنازہ اٹھوانے کی کوش ... وہ اسپتال کے مردہ خانے میں لاوارث لاش کی حیثیت ہے۔ معلوم نہیں اسے ڈھنگ سے کفن بھی نصیب ہوگا یا

"اس کی آپ فکر نہ کریں۔ نہایت اچھے طریقے تدفین کا میں نے بندوبست کردیا ہے۔" میں نے ان کے تپتے صحرا پر اوس کا ایک قطرہ ٹپکانے کی کوشش کی۔

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا چوہدری صا" وہ بھیگی بھیگی آنکھوں سے ایک نظر میری طرف دیکھ کر بو "اس کے بھائی گم صم ہیں۔ وہ اپنے آپ سے بھی خفا ہیں اور بھی .... اور اب میں سوچتا ہوں..... واقعی بات تو کوئی ایسی بھی نہیں تھی کہ جس سے ہم اتنے سنگدل ہوتے چلے گئے نے اس بچی کو ذلت آمیز موت کے راستے پر بھیج دیا.... اگر قائل کرنے میں یا اس کی مناسب رہنمائی کرنے میں ناکام ر تو ہم تھوڑا سا جھک بھی سکتے تھے..... میں تو اس کے شوق کی کے لئے خود اس کے لئے فلم بنا کر مارکیٹ میں پھینک سکتا تھا دس لاکھ روپے کی کیا بات تھی۔ لیکن اب یہ سب پچھتاوے ہیں..... ندامتیں ہیں..... جو اس زخم کو نہیں بھ ... اب ہمیں تھوڑی بہت تسکین شاید صرف اس طرح مل کہ ہم اس کے قاتل کو تلاش کریں اور اپنے ہاتھوں عبرت ناک انجام تک پہنچائیں۔ لیکن ہم بہت ہی بے کار لو ... اس معاملے میں بھی ہم بے دست و پا ہیں۔ سمجھ میں نہیں کیا کریں۔ ویسے تو میں نے پولیس والوں کو بھی تحریک د کوشش کی ہے لیکن اول تو مجھے ان کی کامیابی کی امید کم اگر اتفاق سے قاتل ان کے ہاتھ آبھی گیا تب بھی ضروری وہ قرار واقعی سزا پاسکے۔ عین ممکن ہے وہ قانونی موشگافیو فائدہ اٹھاتے ہوئے بری ہوجائے یا تھوڑی بہت سزا ہوجائے۔ میں چاہتا ہوں کہ پولیس کو اپنی جگہ معروف عمل کسی اور طریقے سے بھی قاتل کو تلاش کرنے کی کوشش کی اس لئے میں ذرا سی امید پاکر آپ کے پاس دوڑا آیا ہوں۔ چوہدری صاحب! کیا آپ میری مدد کریں گے؟"

وہ آنکھوں میں ان گنت التجائیں لئے میری طرف دیکھ اور میں خاموش تھا!

میری مسلسل خاموشی کے باعث آخر کار سیٹھ وحید کی ں میں مایوسی کے سائے اتر آئے لہٰذا وہ ٹوٹتے لہجے میں ۔ "مجھے معلوم ہے میری یہ فرمائش، میرا یہ اصرار بے جا جب ہم جیسے چھوٹے موٹے صنعتکاروں کی مصروفیات کا یہ ہے کہ ہم اپنی اولاد کے لئے ان کی زندگی میں، خاطر خواہ وقت نکال پاتے تو آپ جیسا بڑا آدمی کسی کی مری ہوئی بچی کے لئے وقت کس طرح نکال سکتا ہے۔ مجھے آپ سے کوئی شکوہ نہیں۔"

میں افسردگی سے مسکرادیا۔ مزید ایک لمحے کے توقف کے بعد نے دھیمے لہجے میں کہا "وقت بے شک بہت قیمتی ہے لیکن وم کے لہو سے زیادہ قیمتی نہیں۔ اگر میں اس معاملے میں کچھ نے کا ارادہ نہ رکھتا تو آپ سے ملنے کی زحمت بھی نہ کرتا۔ میں تو اصل یہ سوچ رہا تھا کہ اگر میں نے آپ سے کوئی وعدہ کرلیا تو یں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔"

"آپ صرف ہامی بھر لیجئے۔ میرے سینے میں بھڑکتے آتش ں میں کچھ ٹھنڈک سی اتر آئے گی۔" وحید صاحب بولے "اور ھے یہ بھی یقین ہے کہ نیک مقاصد میں اوپر والے کی تائید بھی امل ہوتی ہے۔"

"میں بھی اسی یقین کے سہارے آپ سے وعدہ کررہا ہوں کہ یک ہفتے کے اندر اندر قاتل کو آپ کے قدموں میں لا پھینکوں گا۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ افضل صاحب!" وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے گلوگیر آواز میں بولے "میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔"

"آپ بار بار احسان کا ذکر کرکے مجھے شرمندہ کئے جارہے ہیں۔" میں نے حقیقتاً شرمندگی سے کہا "میں اس قسم کا جو بھی کوئی چھوٹا موٹا کام کرتا ہوں، اپنے دل کی تسکین کے لئے کرتا ہوں۔ ایک عجیب بے عنوان سی تشنگی ہے، ایک غیر واضح سی بے اطمینانی ہے جو ایک مدت سے میری ہم سفر چلی آرہی ہے۔ صرف اسے بھلانے کے لئے میں کسی کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ اس کا مجھے کوئی اجر ملے گا یا نہیں۔ میں تو بس اپنی غرض کے لئے کرتا ہوں۔ آپ کو احسان مند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

وہ آنسوؤں سے دھندلائی آنکھوں سے ایک لمحے میری طرف دیکھتے رہے۔ ان کے ہونٹ دھیرے سے کانپے مگر وہ کچھ بولنے سے قاصر رہے۔ آخر کار وہ گویا بڑی مشکل سے بول پائے "آپ بہت عجیب آدمی ہیں افضل صاحب....! اور جہاں تک بے اطمینانی اور تشنگی کا تعلق ہے تو وہ آج کے دور کے ہر چھوٹے بڑے آدمی کا مقدر ہوچکی ہے۔ کیوں کہ ہر کوئی اپنی اپنی جگہ اس مادی دور کے چکروں میں پھنسا ہوا ہے۔ انگریزی میں "جسے ریٹ ریس" کہتے ہیں نا۔ ہر شخص چوہوں کی اس دوڑ میں شریک ہے۔ اور بس دوڑ رہا ہے۔ کسی کو نہیں معلوم اس کی منزل کیا ہے۔ اسی طرح دوڑتے دوڑتے ایک روز انسان ختم ہوجاتا ہے۔"

"میں اب چلتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ میرے فلسفے سے بور ہوگئے۔" وہ افسردگی سے مسکرائے "رخشندہ کی موت نے یکایک ہی مجھے فلسفی سا بنادیا ہے ورنہ میں تو ایک سیدھا سادا کھردرا سا بزنس مین تھا۔"

"اندر سے میں بھی خاصا فلسفی ہوں۔" میں نے ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "لیکن میں زیادہ تر تنہائی میں اپنے فلسفے اپنے آپ سے ہی ڈسکس کرکے زیادہ اطمینان محسوس کرتا ہوں۔" میں دروازے کی طرف چل دیا۔ سیٹھ وحید اپنا وزٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولے "اس پر میرے ٹیلی فون نمبرز اور گھر، دفتر، فیکٹری کے ایڈریس موجود ہیں۔ میں آپ کی طرف سے کسی اطلاع کا منتظر رہوں گا۔" وہ مجھے لفٹ تک چھوڑنے آئے۔

نیچے پہنچ کر میں جیسے ہی لفٹ سے نکلا، ٹونی سامنے کھڑا نظر آیا۔ ٹونی اور شبیر شیخ آج کل ایک سفید گاڑی میں ہمہ وقت میرے تعاقب میں رہتے تھے۔ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو میری حفاظت کے لئے مامور کرلیا تھا۔ میں گاڑی سے اتر کر کہیں جاتا تھا تو ان میں سے ایک میرے پیچھے رہتا تھا، دوسرا اپنی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے میری گاڑی پر نظر رکھتا تھا۔

"سر!" وہ بلا تمہید سرسری لہجے میں بولا "ایک گوری چٹی، اسمارٹ اور بہت خوب صورت لڑکی آپ کی گاڑی میں گھسی ہے۔"

"لگتا ہے بہت غور سے جائزہ لیا ہے تم نے اس کا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"آنکھیں پوری طرح کھلی رکھنا تو ضروری ہے نا سر!" اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ وہ نہایت تیکھے نقوش کا مالک اور گورا چٹا نوجوان تھا۔ جب وہ ایکشن میں ہوتا تھا تو اس کے پتلے پتلے ہونٹوں سے سفاکی جھلکتی تھی لیکن عام حالات میں وہ بہت نرم خو اور مہذب نظر آتا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آپ شاید گاڑی کو لاک کرنا بھول گئے تھے۔"

"قفس کو کبھی کبھی اسی طرح چھوڑ دینا چاہئے۔ کوئی نہ کوئی آوارہ پنچھی آن ہی پھنستا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس پنچھی کو کتنی دیر ہوگئی گاڑی میں داخل ہوئے؟"

"تقریباً بیس منٹ ہوگئے ہیں۔" ٹونی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ اندر ہی ہے اور غالباً پچھلی سیٹ کے نیچے چھپی ہوئی ہے۔ وہ سلیٹی رنگ کی ایک پرانی سی ڈیا نیٹ میں آپ کے آفس سے ہی آپ کے تعاقب میں روانہ ہوئی تھی۔"

"اگر وہ بیس منٹ سے پچھلی سیٹ کے نیچے چھپی بیٹھی ہے تب

تو کافی تکلیف دہ پوزیشن میں ہوگی۔ حسینوں کو اتنی تکلیف دینا کوئی مناسب بات نہیں۔ میرا خیال ہے مجھے چل کر فوراً گاڑی میں بیٹھنا چاہئے۔" میں نے لابی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"سر....! آپ رسک لیں گے؟ معلوم نہیں اس کا ارادہ کیا ہو؟" ٹونی ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"دیکھ لیتے ہیں۔ ایسی تشویش کی کیا بات ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "تم اپنی گاڑی میں تعاقب جاری رکھو اور جب تک میری طرف سے کوئی سگنل نہ ملے یا خطرہ بڑھتا ہوا محسوس نہ ہو تب تک مداخلت نہ کرنا۔"

"اوکے سر!" وہ اثبات میں سر ہلا کر دوسری طرف چلا گیا تاکہ ہمیں ایک ساتھ لابی میں داخل ہوتے اور پھر ہوٹل سے نکلتے نہ دیکھا جا سکے۔

میں نے پارکنگ لاٹ میں آ کر بظاہر بے خیالی کے سے عالم میں گاڑی کا دروازہ کھولا اور ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ اگر ٹونی نے مجھے خبردار نہ کیا ہوتا تب بھی یقیناً مجھے احساس ہو جاتا کہ گاڑی میں کوئی لڑکی موجود ہے۔ گو اس نے شاید اپنے طور پر احتیاط کر رکھی تھی کہ کوئی کلون وغیرہ نہیں لگایا ہوا تھا مگر ہر عورت کے وجود کی اپنی بھی ایک خوشبو ہوتی ہے۔ اس لڑکی کے وجود کی بھی بہرحال ایک خوشبو تھی جو کم از کم مجھے ضرور خبردار کر دیتی۔

بظاہر بے پروائی سے سیٹی بجاتے ہوئے میں گاڑی مال پر لایا۔ آرٹس کونسل کے سامنے پہنچ کر میں واپس جانے کے لئے گاڑی سڑک کی دوسری سائیڈ پر موڑنے لگا تھا کہ عقب نما آئینے میں، میں نے اپنی سیٹ کے عقب سے ایک سر نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کے بال اخروٹ کے رنگ کے تھے۔ ٹونی نے اس کے بارے میں مبالغے سے کام نہیں لیا تھا۔ خوب صورت وہ بلاشبہ تھی مگر اس کی خوب صورتی محض آنکھوں کو بھلی لگنے والی تھی۔ دل کو گرمانے والی نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے پلاسٹر آف پیرس کے مجسمے بہت حسین ہو سکتے ہیں مگر انہیں دیکھ کر رگ و پے میں چنگاریاں نہیں تیر سکتیں۔

اس کے سپید مرمریں ہاتھ میں چھوٹا سا پستول دبا ہوا تھا جو اس نے اپنی دانست میں میری بے خبری میں میری کنپٹی پر رکھ دیا اور سرگوشی کے سے انداز میں بولی "گاڑی موڑنا مت۔ سیدھے چلتے رہو۔"

حکم اس نے انگریزی میں دیا تھا تاہم لہجے سے وہ ایشیائی ہی معلوم ہوتی تھی۔ پہلے میں نے سوچا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر ذرا سا اچھل کر خوفزدگی کا اظہار کروں مگر پھر میں نے ہلکی سی آواز میں محض "اوہ" کہنے پر اکتفا کیا۔ اس کا چہرہ مجھے شناسا سا محسوس ہو رہا تھا۔ گاڑی صحیح سائیڈ پر لے آنے کے بعد میں نے ایک بار پھر عقب نما آئینے میں اس کی صورت پر نظر ڈالی۔ عقب نما آئینہ ہر چیز کو بہت چھوٹی کر کے دکھاتا ہے تاہم میں نے خاصی آسانی سے اسے پہچان لیا۔

مجھے یاد آیا کہ میں نے اسے سعید احمد سعید صاحب کی پارٹی میں دیکھا تھا۔ وہ جنگل گرل کے ہیرو اور نازن نما مفہم موتی کے ساتھ ڈانس کر رہی تھی اور ستارہ نے مجھے بتایا تھا کہ ایرانی تھی اور فلمی دنیا کے بہت سے لوگوں سے اس کی دوستی تھی۔ شغل ہی شغل میں اسے جنگل گرل میں چھوٹا سا کوئی رول بھی دے دیا گیا تھا جو شوٹ بھی ہو چکا تھا۔ فلم میں کام کرنے تک تو ٹھیک تھا لیکن ایک سیاح قسم کی لڑکی کا کم از کم یہ کام نہیں ہونا چاہئے تھا کہ پستول کے زور پر کسی کو کہیں لے جانے کی کوشش کرتی پھرے۔ لگتا تھا کہ اس کی جڑیں بھی شاید کہیں جرائم میں تھیں۔ یا وہ انہیں گہرائی میں لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کوشش میں اس کی جڑ کٹ سکتی تھی۔

ایک لمحے کے سکوت کے بعد میں نے ملائمت سے کہا "تمہارا ایران واپس جانے کا ارادہ نہیں ہے جو تم نے اس قسم کے دھندے شروع کر دیئے ہیں؟"

"اوہ... تو تم نے مجھے پہچان لیا۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "یادداشت بہت اچھی ہے۔ بھیڑ بھاڑ میں دیکھے ہوئے چہرے یاد رکھتے ہو۔"

"ہر چہرہ نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "صرف وہ چہرہ یاد رہتا ہے جو یاد رکھے جانے کے قابل ہو۔"

"سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں دیکھا تھا تم نے مجھے؟" نہ جانے کیوں اس نے تصدیق چاہی۔

"ہاں" میں نے بلا تامل کہا "وہی پارٹی جہاں تم جیسی ایک خوب صورت اور نوجوان لڑکی کی لاش سوئمنگ پول سے نکلی تھی اور تمام مہمانوں کا لطف و سرور غارت ہو گیا تھا۔"

"تمہیں کس نے میرے متعلق بتایا تھا؟" وہ گویا لڑکی کی لاش والی بات ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

"ایک مہربان نے۔" میں نے جواب دیا "تمہیں کس نے بھیجا ہے؟"

"ایک مہربان نے۔" اس نے گویا ترکی بہ ترکی جواب دینے کی کوشش کی۔

"ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے۔" میں نے اردو میں مصرعہ پڑھ کر ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا مطلب؟"

"انگریزی میں اس کا صحیح مفہوم سمجھانا میرے لئے ذرا مشکل ہے۔ لیکن اتنا بتا دوں کہ لوگوں کی مہربانیاں کبھی کبھی جان بھی لے لیتی ہیں۔" میں نے نہایت سنجیدہ اور مربیانہ لہجے میں کہا "تم کم سن اور حسین ہو۔ ممکن ہے ایک حسین مستقبل تمہارا منتظر ہو۔ واقعی تمہیں ایران واپس نہیں جانا ہے جو ان چکروں میں پڑ

گئی ہو؟" میں نے انگلی سے پستول کی طرف اشارہ کیا۔

"ایران میں میرے لئے اب کیا رکھا ہے۔ مجھے تو مدت ہو گئی وہاں سے نکلے ہوئے۔ ماں باپ گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ گھر نذرِ آتش ہو گیا۔ بھائی کو پھانسی لگ گئی۔ بہن کو کوئی اٹھا کر لے گیا۔ میں تو نہ جانے کس طرح جان بچا کر ملک در ملک بھٹکتی ہوئی یہاں تک پہنچی ہوں اور ابھی نہ جانے کہاں کہاں جانا پڑے۔ کوئی گھر، کوئی سنہرا مستقبل میرا منتظر نہیں ہے۔ اور اگر ہو بھی تو مجھے اب اس کی پروا نہیں رہی۔ میں اب دنیا کی ہر چیز سے بے پروا ایک من موجی لڑکی ہوں۔ جو میرے دل میں آئے کرتی ہوں۔ تمہیں میری فکر میں دبلا ہونے یا زیادہ حاجی صاحب بننے کی ضرورت نہیں۔" اس کا دل برف کی قاش معلوم ہوتا تھا۔ بعض لوگ بہت زیادہ صدمات سے گزرنے کے بعد ایسے ہی ہو جاتے ہیں۔

"اوہ!" میں نے متاسفانہ سے انداز میں طویل سانس لی "کیا زمانہ آگیا ہے۔ ہمدردوں اور غمزاروں کی اس طرح طبیعت صاف کر کے انہیں ایک طرف بٹھا دیا جاتا ہے۔ خیر۔ تمہاری مرضی!" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکا دیئے اور عقب نما آئینے میں ایک بار پھر اس پر نظر ڈالی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا رکھا تھا اور اس کی بھوری آنکھوں میں نہ جانے کن خون آشام لمحوں کی پرچھائیاں تھیں۔ ایک لمحے کے لئے وہ مجھے بہت سفاک اور بہت زہریلی دکھائی دی۔

میں کار بہت سست رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے رفتار تیزی کرنے کی فرمائش نہیں کی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "مجھے حکم ملا تھا کہ تمہیں بہلا پھسلا کر، تم پر ڈورے ڈال کر، ناز و ادا دکھا کر ساتھ لے آؤں لیکن نہ جانے کیوں میرے دل نے کہا کہ شاید یہ جادو تم پر نہ چل سکیں۔ میں نے سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں تمہیں ستارہ کے ساتھ دیکھا تھا مگر میں تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکی۔ میرا دل تمہارے بارے میں بیک وقت متضاد رائے دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تم بہت عاشق مزاج اور دل پھینک لگتے تھے اور دوسرے ہی لمحے دل کہتا تھا کہ تم عورت کے معاملے میں بہت بے حس اور بے نیاز ہو۔ اس الجھن کی وجہ سے میں نے بہتر سمجھا کہ پستول ہی استعمال کیا جائے۔"

"اپنے بارے میں تو میں خود بھی الجھن میں رہتا ہوں۔ تم محض ایک بار دور سے دیکھ کر کیا اندازہ لگا سکتی ہو۔" میں نے کہا اور کھڑکی پر لگے ہوئے عقب نما آئینے پر ایک نظر ڈالی۔ ٹونی اور شبیر سفید کار میں بدستور پیچھے آ رہے تھے۔ لڑکی تعاقب وغیرہ کی طرف سے بالکل بے نیاز معلوم ہوتی تھی۔ وہ یا تو ان معاملات میں زیادہ منجھی ہوئی نہیں تھی یا پھر اس نے میرے بارے میں بالکل ہی غلط اندازے لگائے ہوئے تھے۔ میں اس کے بارے میں الجھن میں تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ اسے جس نے بھیجا تھا وہ بھی میرے بارے میں کچھ زیادہ معلومات نہیں رکھتا تھا۔ لیکن وہ کون ہو سکتا تھا اور مجھے اغوا کرانے کا اس کا مقصد کیا تھا؟ کیا اس کا رخشندہ عرف بے بی نشاط کے قتل سے کوئی تعلق ہو سکتا تھا؟

ایک لمحے کے لئے مجھے اس نازک اندام سی لڑکی پر ترس بھی آیا جو میری کنپٹی پر پستول رکھے بیٹھی تھی اور اس خوش فہمی میں مگن تھی کہ وہ مجھے اغوا کر کے لے جا رہی ہے۔ اسے شاید ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اگر میں چاہتا تو اس کا پستول مجھے اس کی خوب صورت سی گردن مروڑنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ اس بے چاری کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس قسم کی صورتِ حال کے لئے میری گاڑی میں کئی طرح کے میکینیزم بھی موجود تھے۔ میں چاہتا تو پاؤں کے قریب ہی موجود ایک غیر نمایاں سا بٹن دباتا اور میری سیٹ کے عقب سے تقریباً چار انچ لمبا 'بغیر دستے کا' پتلا سا ایک زہر آلود خنجر تقریباً گولی کی سی رفتار سے برآمد ہوتا اور اس کے سینے میں پیوست ہو جاتا۔ وہ بالکل اسی سیدھ میں بیٹھی تھی جہاں ڈارٹ گن کے اصول پر کام کرنے والی وہ گن پوشیدہ تھی جو خوب صورت ساخت کا مہلک خنجر پھینکتی تھی۔ اور بھی دو تین چیزیں تھیں جن کی زد میں آ کر وہ ہلاک ہو سکتی تھی، بے دست و پا ہو سکتی تھی۔ اور اگر میں خود بھی ہاتھ پاؤں ہلانے کی زحمت کرنا چاہتا تو وہ میرے لئے.... کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں تھی۔ لیکن میں بخوشی اس کے ساتھ جا رہا تھا۔ کیوں کہ آج کل میرے چاروں طرف الجھے ہوئے معاملات کا ایک عجیب سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ ان میں سے کسی معاملے کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ لڑکی ان میں سے یقیناً کسی نہ کسی معاملے کا سراغ تھی۔ میں اس کے سہارے کسی بڑی مچھلی تک پہنچنا چاہتا تھا۔

مزید کچھ دیر کے سفر کے بعد اس نے مجھے گارڈن ٹاؤن کے ایک دور افتادہ حصے میں ایک ویران، اجاڑ اور نامکمل سی کوٹھی کے سامنے رکنے کا حکم دیا۔ اس کے آس پاس کافی پلاٹ خالی پڑے تھے اور بعض کو تو جھاڑیوں یا بے ہنگم گھاس پھوس نے ڈھانپ رکھا تھا۔

"میں نے تمہارا نام تو پوچھا ہی نہیں۔" میں نے اترنے سے پہلے کہا "ہو سکتا ہے میرا آخری وقت قریب ہو۔ مرنے سے پہلے مجھے کم از کم تمہارا نام تو معلوم ہو ہی جانا چاہئے۔"

"مہ پارہ مشہدی" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ وہ بالکل پرسکون اور بے خوف نظر آ رہی تھی۔ پستول ایک لمحے کے لئے کنپٹی سے ہٹا کر اس نے مجھے گاڑی سے دو قدم دور جانے کا حکم دیا پھر خود بھی پھرتی سے اتر آئی۔ وہ پستول لئے میری پیچھے رہی اور مجھے آگے بڑھنے کے سلسلے میں ہدایات دیتی رہی۔

کوٹھی میں دروازے نہیں لگے ہوئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی وجہ سے اس کی تعمیر کا کام بہت عرصہ پہلے روک دیا گیا تھا اور کوئی اس کی دیکھ بھال کرنے والا بھی نہیں رہا تھا۔ برآمدے سے

گزر کر ہم اس کمرے میں پہنچے جسے غالباً ڈرائنگ روم ہونا چاہئے تھا۔ فرش پر گرد و غبار کی تہ تھی مگر اس میں بہت سے جوتوں کے نشانات بھی گڈمڈ نظر آرہے تھے۔ کونے کھدروں میں جالے لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں جانوروں کی پھیلائی ہوئی غلاظت بھی نظر آرہی تھی۔

ڈرائنگ روم سے گزر کر ہم ایک کشادہ ہال میں پہنچے۔ یہاں کچھ صفائی نظر آرہی تھی۔ ہال کے ایک سرے سے نامکمل سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔ سیڑھیوں کے قریب ایک نیم شکستہ چارپائی پر ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص میں ملبوس غیر معمولی طور پر بھاری بھرکم ایک شخص نیم دراز تھا۔ اس کا سر منڈا ہوا تھا اور تیل کی مالش کی وجہ سے خوب چمک رہا تھا۔ گردن سانڈ کی طرح موٹی تھی اور اس پر بل پڑے ہوئے تھے۔ وہ سگریٹ کے گہرے گہرے کش لے رہا تھا اور کثیف دھواں بڑی ہی ادا سے فضا میں بکھیر رہا تھا۔ ہوا میں پھیلی ہوئی بُو بتارہی تھی کہ سگریٹ میں چرس بھری ہوئی تھی۔ اس کی چارپائی کے سہارے سیون ایم جی کی ایک گن کھڑی ہوئی تھی۔ چارپائی پر سرہانے کی طرف ایک فاضل میگزین بھی رکھا ہوا تھا۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ پکی عمر کا تھا اور اندازہ بتا تا تھا کہ ماضی قریب میں وہ پیشہ ور پہلوان تھا۔ بلکہ کوئی بعید نہیں تھا اب بھی پیشہ ور پہلوان ہی ہو۔ رخساروں پر چڑھے ہوئے گوشت کی وجہ سے اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں اور ان میں لہو کی سی سرخی تھی۔ موٹے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ بڑی ترنگ میں معلوم ہوتا تھا۔

اس نے گن اٹھانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور استقبالیہ انداز میں ہاتھ پھیلا کر سیڑھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نیم استہزائیہ سے لہجے میں بولا "آؤ... آؤ... میرے شہزادے۔ آؤ... تشریف لاؤ... تمہارے بغیر یہ گھر بالکل سونا پڑا ہوا ہے۔"

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ گہری نظر سے صرف اس کا سرتاپا جائزہ لینے پر اکتفا کیا۔ مہ پارہ نے مجھے سیڑھیوں کے راستے نیچے چلنے کا حکم دیا۔ وہ خود جب اس پہلوان کے قریب سے گزرنے لگی تو میں نے اس کی زوردار سسکاری کی سی آواز سنی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک جگہ سے اپنا جسم سہلا رہی تھی اور اس کا چہرہ غصے سے سرخ تھا۔

"بینڈے! میں نے تمہیں کتنی مرتبہ منع کیا ہے کہ میرے ساتھ بے ہودگی مت کیا کرو۔" وہ برہمی سے چلاتے ہوئے انگریزی میں بولی۔

"ساڈے نال پنجابی یا اردو وچ گل کیا کرو بادشاہو!" بینڈا اپنا پھولا پھولا سا گال کھجاتے ہوئے قربان جانے والے انداز میں مسکرا کر بولا "انگریزی شنگریزی سانوں نئیں آندی۔" پھر وہ لہجہ بدل کر قدرے سنجیدگی سے اردو میں بولا "ویسے شہزادی! صرف ہم سے ہی کیوں ناراض رہتی ہو؟ ہمارے میں کیا کانٹے لگے ہوئے ہیں؟"

غالباً مہ پارہ کی سمجھ میں اس کی کوئی بات نہیں آئی تھی۔ پستول ہوا میں لہراتے ہوئے بولی "کسی دن تمہاری اس تربوز جیسی کھوپڑی میں میرے ہی پستول کی گولیوں سے روشن دان بنیں گے۔"

میں خاموش تھا اور اس صورتِ حال سے کسی حد تک محظوظ بھی ہو رہا تھا۔

"بھینسے کا بچہ!" مہ پارہ پاؤں پٹختے ہوئے بڑبڑائی پھر اس نے پستول میری کمر میں چبھوتے ہوئے مجھے آگے دھکیلنے کی کوشش کی اور بینڈے کے حصے کا باقی غصہ مجھ پر اتارتے ہوئے چلائی "آگے چلو۔ تم یہاں کیوں جم کر کھڑے ہو گئے خبیث!"

اس کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکا تو ان شعلوں میں گویا پانی سا پڑ گیا اور اس نے فوراً نظر چرالی۔ پھر پہلے سے بہت مختلف اور مرتعش سے لہجے میں بولی "چلو... چلو... نیچے چلو۔"

میں گہری سانس لے کر مڑا اور نپے تلے انداز میں سیڑھیاں اترنے لگا۔ سیڑھیوں کے اختتام پر بھاری بھرکم آہنی گیٹ لگا ہوا تھا۔ اس اجاڑ اور نامکمل مکان میں یہ واحد دروازہ تھا جو فی الحال مجھے نظر آیا تھا۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔

"دستک دو" مہ پارہ نے بدستور میرے پیچھے رہتے ہوئے حکم دیا۔ میں نے نہایت سعادت مندی سے آہنی بولٹ سے گیٹ کو کھٹکھٹایا۔ گیٹ ہلکی سی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ تھوڑا سا کھلا اور بینڈے ہی جیسی ایک شخصیت نے باہر جھانکا لیکن یہ شخصیت سیاہ پوش تھی۔ اس نے سر پر بھی مختصر سی سیاہ پگڑی لپیٹی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بھاری بھرکم ریوالور تھا۔

باہر کی صورتِ حال دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس کی مونچھیں نہیں تھیں مگر نہ جانے کیوں اس نے اپنی خیالی مونچھوں پر تاؤ دیا اور گیٹ تقریباً پورا کھول دیا۔

اندر پہنچ کر میں تہ خانے کی وسعت اور کشادگی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جتنے رقبے پر کسی نے کوٹھی تعمیر کرانا شروع کی تھی اتنے ہی رقبے پر پوری ایک منزل زیرِ زمین بھی بنوانا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اس کا مقصد کیا تھا اور اب کون لوگ اس پر قابض تھے۔ یہ لوگ بہرحال اصلی مالک تو معلوم نہیں ہوتے تھے۔ تہ خانے میں بھی بغیر دروازوں کے کئی کمرے نظر آرہے تھے۔ یہاں کافی ستھرائی تھی مگر کچھ عجیب سیلن آمیز سی بُو پھیلی ہوئی تھی جو کئی قسم کی ہلکی سی بدبوؤں کا آمیزہ معلوم ہوتی تھی۔

ہال میں موٹے موٹے شہتیر نما پایوں والی دو بڑی بڑی چارپائیاں پڑی تھیں۔ ان پر تین چار موٹے موٹے آدمی آلتی پالتی

[مار] بیٹھے تھے۔ کوئی بوتل اور گلاس تھامے ہوئے تھا۔ کوئی چرس [بھرے] سگریٹ کے کش لگا رہا تھا اور ایک ایسا ہی تھل تھل کرتا ہوا [ایک] کونے میں بیٹھا بھنگ گھوٹ رہا تھا۔ اس کے جسم پر صرف میلی [بنی]یان اور مختصر سی دھوتی تھی۔ چارپائیوں پر تین رائفلیں بھی [آڑ]ی ترچھی پڑی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ کچھ کارٹن بھی اوپر [تلے] رکھے تھے۔ معلوم نہیں خالی تھے یا بھرے ہوئے۔ اچھا بھلا کسی [...]سین کا سا منظر تھا۔

[ایک] چارپائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھا ہوا ایک پہلوان مجھے دیکھتے ہی [چہک] کر بولا "تھا جس کا انتظار وہ شاہکار آگیا۔ آؤ آؤ چوہدری [صاح]ب! جی آیاں نوں۔" اس نے سگریٹ کا ایک طویل کش لے [کر کث]یف دھویں کا مرغولا ہوا میں چھوڑا۔ "سنا ہے بہت بڑے [آدمی] ہیں آپ... کروڑپتی' بلکہ شاید ارب پتی ہیں۔ خیر... کوئی [بات] نہیں۔ ہمارے اس غریبانہ ڈیرے پر بڑے بڑے کروڑپتی [حاض]ری دیتے ہیں۔ کچھ اپنی مرادیں پاتے ہیں اور کچھ کے کس بل [نک]ل جاتے ہیں جس کے بعد وہ ہمیشہ کے لئے سیدھے ہو جاتے [ہیں]۔ کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جو کچھ عرصے کے لئے یہیں مہمان [رہت]ے ہیں لیکن ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا جاتا ہے۔ ایک [آدھ] مہمان یہاں ایسا بھی آیا ہے جس کی ہڈیاں باہر کے کسی خالی [پلاٹ] میں دفن ہیں۔ افسوس' مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں معلوم کہ [آپ] کا شمار کون سے مہمانوں میں ہوتا ہے۔"

اس کی گفتگو میرے لئے خاصی بے ربط اور تقریباً ناقابل فہم [تھی]۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی [ایک پہلوان را]ئفل اٹھا چکا تھا اور کھلونے کی طرح اسے تھامے ہوئے تھا۔ [اس] کا رخ میری طرف ہی تھا۔ دوسرا پہلوان اپنی رائفل اٹھا کر اور [اپنا] گلاس چھوڑ کر ایک کونے میں جا کھڑا ہوا تھا۔ اس نے یوں [مجھے] نشانہ لے رکھا تھا جیسے کہیں سے کوئی اشارہ ملتے ہی مجھے چھلنی [کر دے] گا۔ تیسرے پہلوان کا ایک ہاتھ رائفل پر تھا مگر اس نے [رائف]ل اٹھائی نہیں تھی۔ وہ چارپائی سے ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا اور [انہیں] دھیرے دھیرے ہلاتے ہوئے کچھ گنگنا رہا تھا۔ وہ سب سے [زیادہ] ترنگ میں معلوم ہوتا تھا۔

چوتھا پہلوان جو کونے میں بیٹھا بھنگ گھوٹ رہا تھا' ایک نظر [میری] طرف دیکھنے کے بعد بدستور جوش و خروش سے اپنے کام میں [مصرو]ف رہا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا گویا اس کے نزدیک دنیا کا اہم [ترین] کام بھنگ گھوٹنا ہی ہو۔ بظاہر میری نظر صرف اس پہلوان پر [تھی] جس نے میری آمد پر ایک طرح کی استقبالیہ تقریر جھاڑی تھی [لیکن د]رحقیقت میری نظر اس ہال کی ہر چیز اور وہاں موجود ہر شخص [پر تھی]۔ میں صرف مہ پارہ کو نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ وہ میرے عین [پیچھے] میں تھی اور اب بھی میری کمر سے پستول لگائے کھڑی تھی۔ [پھر] میں نے اسے بے زاری آمیز لہجے میں کہتے سنا "مسٹر شکرا! [اس] کو بلاؤ۔ میں کیا یہاں اس طرح شام تک کھڑی رہوں گی؟"

شکرا غالباً اسی کا نام یا عرفیت تھی جس نے مجھے مخاطب کیا تھا۔ وہ مخمور سے انداز میں اس کی طرف دیکھ کر باچھیں پھیلاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا "اب تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں حسین چڑیا! اب یہ آدمی ہماری ذمے داری ہے۔ تم اپنے نازک ہاتھوں کو مزید تکلیف مت دو اور اپنا پستول پرس میں رکھ کر جدھر تمہارا جی چاہے بیٹھ جاؤ... بلکہ ضرورت محسوس کرو تو لیٹ جاؤ۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

لڑکی نے گہری سانس لی۔ میں اس کی صورت نہیں دیکھ رہا تھا مگر میرا اندازہ تھا کہ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے۔ وہ ان پہلوانوں سے خوش معلوم نہیں ہوتی تھی مگر نہ جانے کس مخصوص کی خاطر یا کس مفاد کے لئے ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ اس نے شکرا کی ہدایت پر عمل کیا اور پستول میری کمر سے ہٹالیا۔ پھر میں نے اسے اپنے قریب سے گزر کر اس چارپائی کی طرف بڑھتے دیکھا جس پر ایک پہلوان ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

اب میں نے پہلی بار صحیح طور پر مہ پارہ مشہدی کا سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ سرخ رنگ کے چست ٹراؤزر اور نیلی سفاری شرٹ میں تھی۔ کمر سے چوڑی بیلٹ بندھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے کمر کی نزاکت اور دیگر اعضا کی سرکشی کچھ اور نمایاں ہو گئی تھی۔ چال کچھ اور غضب ڈھا رہی تھی۔ ان پہلوانوں کے درمیان اس کا عالم کچھ ایسا ہی تھا جیسے بندروں کے درمیان ایک رسیلی لالی پاپ پھینک دی گئی ہو۔ معلوم نہیں کون سی طاقت انہیں اس لالی پاپ پر چھینا جھپٹی سے باز رکھے ہوئے تھی۔ شاید وہ طاقت نامعلوم باس کی تھی۔ لیکن کچھ بعید نہیں تھا کہ کسی وقت چھینا جھپٹی ہوتی ہی ہو۔

مہ پارہ چارپائی پر اس پہلوان سے حتی الامکان دور ہٹ کر بیٹھ گئی جو ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس پہلوان نے بھی باچھیں پھیلا کر اس کی طرف کھسکتے ہوئے اس کی کمر میں بازو حمائل کرنے کی کوشش کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی مہ پارہ پر رال ٹپکانے کے معاملے میں پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا۔ مہ پارہ نے اسے پرے دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس کا پہلوان کو دھکیلنا ایسا ہی تھا جیسے کوئی ہرنی کسی ہاتھی کو دھکیلنے کی کوشش کرے۔ اس نے برہمی کے عالم میں چیخ کر کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ پہلوان تیزی سے دور کھسک گیا۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مہ پارہ کے چیخنے کے اندیشے سے خوف زدہ ہو گیا بلکہ اس کی وجہ غالباً وہ نقاب پوش تھا جو اندر ہی کے کسی کمرے سے ہال میں داخل ہوا تھا۔

وہ سیاہ چرمی جیکٹ اور سیاہ پتلون میں تھا۔ شرٹ بھی سیاہ تھی اور چہرہ بھی گردن تک سیاہ نقاب میں ہی چھپا ہوا تھا۔ صرف آنکھوں کی جگہ دو سوراخ نظر آرہے تھے۔ وہ دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔

وہ ہال میں داخل ہوتے ہی بھنگ گھوٹنے والے پہلوان پر برس پڑا "تم نے ابھی تک رسہ نہیں لٹکایا۔" اس نے پہلوان کے شجرۂ

نسب میں چند شرمناک سی ترامیم کیں پھر بولا "بھنگ گھوٹنے کے علاوہ بھی کبھی کچھ کرلیا کر سالے!"

"رسہ لٹکانے میں کون سی دیر لگتی ہے باس! ابھی لٹکا دیتا ہوں۔ میں تو یہی سوچ رہا تھا کہ دنبہ آجائے تو لٹکانے کا انتظام بھی ہو جائے گا۔" پہلوان بڑی بے پروائی سے بھنگ گھوٹنے کا سوٹا رکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔ اس نے بڑی دلچسپی آمیز نظروں سے میرا سرتاپا جائزہ لیا پھر گویا دل ہی دل میں محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا دیا اور ہال کی ایک دیوار کی طرف بڑھ گیا جس کے قریب موٹے سے رسے کا ایک بڑا سا لچھا پڑا تھا۔

اس نے رسہ اٹھایا اور ہال کے وسط میں آگیا۔ تب میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ چھت کے وسط میں ایک بڑا سا کنڈا لگا ہوا تھا۔ پہلوان نے بڑی مہارت سے رسہ اوپر پھینکا اور وہ کنڈے میں لٹک گیا۔ اس نے بڑی مہارت سے ہی اس کے دونوں سرے پکڑ کر موٹی سی ڈھیلی گرہ لگائی پھر ایک سرے کو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا۔ دوسرا سرا اس طرح اوپر جانے لگا کہ عین کنڈے پر جاکر گرہ لگ گئی۔ وہ اس کام میں بہت مشاق معلوم ہوتا تھا۔ معلوم نہیں آج تک کتنے لوگوں کو اس طرح رسے سے لٹکا کر ان پر کس کس انداز سے تشدد کیا گیا تھا۔ میں خاموشی سے کھڑا یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔

میں نقاب پوش کی آواز پر بھی غور کر رہا تھا اور اس کی جسمانی ساخت پر بھی۔ لباس میں انسان کا جسم چھپ جاتا ہے اور ہر لباس میں اس کا بصری تاثر مختلف ہو جاتا ہے مگر پھر بھی اگر کوئی باریک بینی کی صلاحیت رکھتا ہو تو اسے ہر انسان کی جسمانی ساخت اسے پہچاننے میں مدد دے سکتی ہے۔ دستِ قدرت کا یہ کمال بھی بے پناہ حیران کن ہے کہ اس نے ان گنت انسانوں کو تخلیق کیا ہے مگر ان کی جسمانی ساخت، ان کی آواز، رنگ روپ، خدوخال میں کوئی نہ کوئی فرق ضرور رکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک پیدا ہونے والے اربوں کھربوں انسانوں میں شاید ہی کوئی دو انسان ایسے پیدا ہوئے ہوں جنہیں مکمل طور پر یکساں کہا جاسکے۔ جن میں کوئی معمولی سا بھی فرق نہ ہو۔ میں قدرت کی اس صناعی پر غور کرتا تھا اور بہت جلد بڑے عجیب عجیب بھید پالیتا تھا۔

نقاب پوش اپنی آواز بدل کر بولنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس میں بڑی حد تک کامیاب تھا لیکن میں نے اس کے اتار چڑھاؤ پر ذرا سا غور کیا تو یاد آگیا کہ یہ آواز اصل میں کیسی تھی اور کس کی تھی۔ غیر محسوس طور پر میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس شخص کو پہچان کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی تھی۔ میرا سارا تجسس ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

وہ غراہٹ آمیز لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا "تمہیں اس رسے کے ذریعے چھت سے الٹا لٹکا کر اس وقت تک تمہارے جسم پر لاٹھیاں برسائی جائیں گی جب تک تم ملغوبے میں تبدیل نہیں ہو جاتے۔ آخر میں ملغوبہ بھی نہیں رہے گا، صرف چند ٹوٹی پھوٹی ہڈیاں رسے سے لٹکی رہ جائیں گی۔ تمہارا وجود صرف فرش پر ہوئی غلاظت کی سی صورت میں باقی رہ جائے گا۔ پھر یہ غلاظ... صاف کردی جائے گی۔ صفحۂ ہستی سے نام و نشان مٹ ... تمہارا۔ بس اتنی سی کہانی ہوگی تمہاری۔ بہت گھمنڈ ہے ... خود پر؟"

"میں بھلا گھمنڈ کس بات پر کرسکتا ہوں؟" میں نے م... ہوئے ملائمت سے کہا "میں تو خالقِ کائنات کا ایک بہت ع... بندہ ہوں۔ گھمنڈ تو تمہارے لہجے میں بول رہا ہے۔ اور شا... بھی۔ کیا بگاڑا ہے میں نے تمہارا؟ کیوں اتنا تاؤ کھائے ہو... پر؟"

اس نے گویا میرے سوال کا جواب دینے کی ضرورت ... اور اس پہلوان کی طرف دیکھا جو مستعدی سے رائفل ... کونے میں کھڑا تھا۔ اس نے چٹکی بجا کر پہلوان کو حکم دیا "... سے رسے میں نہیں لٹکے گا۔ اس کی ٹانگ میں گولی مار دو تا ک... قسم کی اچھل کود نہ کرسکے۔"

نقاب پوش کے پاس غالباً اس وقت کوئی ہتھیار نہیں ... زیادہ امکان یہی تھا کہ یہ فریضہ وہ خود انجام دیتا۔ پہلوان کی ... کی نالی ذرا نیچے کو ہوئی اور ٹریگر پر انگلی کا دباؤ بڑھا۔ میں اپ... ہی ٹانگوں کو گولی کی زد سے بچانے کے لئے تیار تھا لیکن ... کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تہ خانے میں فائر کی آو... اور رائفل پہلوان کے ہاتھوں سے چھوٹ کر دیوار سے ٹکر... گر پڑی۔ ہلکی سی چیخ کے ساتھ پہلوان اپنا ایک ہاتھ چہ... سامنے لا کر دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ سے خون ٹپکنے لگا تھا۔

سبھی نے بیک وقت آہنی دروازے کی طرف دیکھا... آنے کے بعد کسی نے اس کا اندر کا بولٹ چڑھانے کی زحم... کی تھی۔ اس وقت گیٹ صرف اتنا کھلا ہوا تھا کہ ایک گ... سی نالی اندر جھانک رہی تھی۔ دوسرے پہلوان نے تی... رائفل سیدھی کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہاتھ... رائفل دور جاگری۔ اس کے بھی صرف ہاتھ میں ہی سورا... متحرک چیزوں پر ہی درست نشانہ لگانے میں ٹونی کا جوا... تھا۔

تیسرے پہلوان کی جو چارپائی پر ٹانگیں لٹکائے ... ٹانگیں بالکل ساکت ہو چکی تھیں۔ اس کا جو ہاتھ رائفل... وہیں کا وہیں رہ گیا۔ اس نے نہ تو رائفل اٹھانے کی کوش... نہ ہی اس پر سے ہاتھ ہٹایا۔ بھنگ گھوٹنے والا پہلوان ہال... میں رسہ تھامے کھڑا تھا اور حیرت سے پلکیں جھپکا رہا تھا... توند تیزی سے پھول پچک رہی تھی۔

ٹونی نے ٹھوکر مار کر گیٹ کھولا۔ شبیر شیخ اس کے ... تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ مہ پارہ مشہدی چارپ... کبھی میری طرف اور کبھی ان دونوں کی طرف دیکھ رہی تھ...

"بینڈے۔" دفعتاً نقاب پوش نے مرتعش سی آواز میں پکارا ... ر کوئی جواب نہ پاکر قدرے غضب ناک سے لہجے میں ٹونی کو ... طب کیا "کیا تم نے بینڈے کو مار ڈالا ہے؟"

"اگر بینڈا اسی مخلوق کا نام ہے جو اوپر سیڑھیوں کے قریب ... ہو رہی تھی تو وہ زندہ ہے۔" ٹونی نے ملائمت سے جواب دیا۔ ... لبتہ اس کی تربوز نما کھوپڑی شاید چٹخ گئی ہو۔ وہ اپنی چارپائی پر پڑا ... ی نیند لے رہا ہے۔ ایک آدھ دن میں ہوش میں آجائے گا۔"

"تم لوگ یہاں سے زندہ نہیں جاسکو گے۔" نقاب پوش گویا ... سی امید کے سہارے بولا۔ شاید یہاں اس کے کچھ اور ساتھیوں ... ی آمد متوقع تھی۔

"تم میرے بارے میں مسلسل غلط اندازے لگائے جارہے ہو رشد موتی!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا۔ میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا مگر میں نے محسوس کیا کہ وہ جھرجھری سی لے کر رہ گیا تھا۔

"تو تم نے مجھے پہچان لیا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا، پھر اس نے اپنے چہرے سے تھیلا نما نقاب کھینچ کر اتار دیا۔ اس کے پُرکشش چہرے پر پسینے کے قطرے تھے اور خوب صورت بال بکھرے ہوئے تھے۔

"گدھا شیر کی کھال پہن کر آجائے تب بھی پہچانا جاتا ہے۔" میں نے ہموار لہجے میں کہا "تم فلمی دنیا کے کوئی بہت زیادہ پرانے آدمی نہیں ہو مگر معلوم نہیں کیوں فلمی انداز و اطوار تمہاری فطرت میں رچ بس گئے ہیں۔ یہ اس طرح کے ڈیرے بنا کر بیٹھنا، ان ڈھیلے پہلوانوں کے سرپر بدمعاشی چلانا، مجھے کوئی عام سا سیٹھ سمجھتے ہوئے اس طرح اغوا کرانا۔۔۔ اور میرا ملغوبہ اور نہ جانے کیا کیا بنوانے کی باتیں کرنا۔ مجھے تو شبہ سا ہونے لگا ہے کہ تمہاری کھوپڑی کا کوئی اہم پرزہ گرا ہوا ہے۔"

وہ خاموش کھڑا مجھے گھورتا رہا۔ میں نے نرمی سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا تم میرے چکر میں کیوں پڑگئے ہو۔ تمہاری میری کوئی دشمنی نہیں۔ اور تم جیسے روایتی، فرسودہ ذہن کے مالک اور ڈیرے دار بدمعاشوں سے دشمنی رکھنا میں اپنے شایانِ شان بھی نہیں سمجھتا۔ میرا خیال ہے تمہارا کچی شراب کا دھندا بھی ہوگا۔ جوئے میں سے پتی بھی لیتے ہو گے۔ کہیں کہیں سے جگا ٹیکس بھی جمع کراتے ہو گے۔ کسی کے آرڈر پر شریف شرفا کو اغوا بھی کراتے ہو گے۔ معاوضے پر کبھی کبھار قتل بھی کراتے ہو گے۔ ادھر کا مال ادھر بھی کرتے ہو گے۔ اس قبیل کے تھرڈ کلاس بدمعاشوں سے الجھنا میں پسند نہیں کرتا۔"

"میں تمہاری یہی اکڑ تو نکالنا چاہتا ہوں۔ تم اپنے آپ کو معلوم نہیں کیا سمجھتے ہو۔" ارشد موتی کی جرأت گویا عود کر آئی۔

"یہ اپنے آپ کو کچھ سمجھنے کی نہیں بلکہ اپنے اپنے حلقے، اپنے اپنے طبقے اور اپنی اپنی لائن کی بات ہے۔" میں نے مربیانہ لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی "تم اپنے اس قسم کے تہ خانوں اور دوسرے اڈوں پر اپنے دھندوں میں مصروف رہتے۔ پولیس کو بھتہ جاتا رہتا اور گلشن کا کاروبار چلتا رہتا لیکن میرے ساتھ پنگا لے کر معلوم نہیں تم اپنے لئے کیوں مصیبت مول لینا چاہتے ہو۔"

"تم نے سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں بیسیوں معزز مردوں اور عورتوں کے سامنے مجھے گھونسا مارا تھا۔ میرا پاؤں پھسل گیا تھا اس لئے میں دور جاگرا تھا۔ ورنہ میں کوئی ایسا گیا گزرا آدمی نہیں ہوں۔ آج تک کسی نے مجھ پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔ میں تمہاری اس حرکت کو بھول نہیں سکتا، معاف نہیں کرسکتا۔"

مجھے اس کی "پاؤں پھسلنے" والی بات پر ہنسی آگئی۔ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا "وہاں بھی تم نے خود ہی پنگا لیا تھا۔ میں تو تمہیں جانتا بھی نہیں تھا اور نہ ہی جاننا چاہتا تھا۔"

"لیکن میں تمہیں ضرور جان کر رہوں گا۔" وہ بے خوفی سے بولا "میں نے تمہارے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے بڑی بھاگ دوڑ کی ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں تمہارے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جان سکا۔ ایسا لگتا ہے جیسے کوئی بھی تمہارے بارے میں زیادہ نہیں جانتا لیکن نہ جانے کیوں لوگ تم سے ڈرتے ہیں۔ تمہیں پُراسرار سا سمجھتے ہیں۔ میں تمہیں بے نقاب کرکے چھوڑوں گا۔"

"میں نے کوئی نقاب نہیں چڑھائی ہوئی ہے جو تم مجھے بے نقاب کرنے کا شوق پورا کرسکو۔" میں نے اس کے اندازِ گفتگو سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "نقاب وغیرہ تم جیسے فلم زدہ لوگ چڑھاتے ہیں اور اس شوق میں کبھی کبھی کمال تک اترواتے ہیں۔ میں تو اس شہر کا ایک عام سا، تھوڑا معزز سا، تھوڑا شریف سا آدمی ہوں۔ بس اتنا ضرور ہے کہ تم جیسے اچکے مجھ سے الجھنے سے پرہیز کریں تو فائدے میں رہتے ہیں۔ سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں تو گھونسا کھا کر تمہارا پاؤں پھسل گیا تھا۔ چلو۔ میں تمہیں یہاں پورا پورا موقع دینے کو تیار ہوں۔ تم اپنے ساتھیوں کو ایک طرف ہٹا دو۔ میرے ساتھی بھی صورتِ حال میں مداخلت نہیں کریں گے۔ آؤ ہم دو دو ہاتھ کرلیتے ہیں۔ طاقت کی آزمائش کا وہی صدیوں پرانا طریقہ۔ تم اسی وقت اسی جگہ اپنے ارمان نکال لو۔" میں نے مسکراتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اشارہ کرکے اسے اپنے اوپر حملہ کرنے کی دعوت دی مگر اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے مجھے گھورتا رہا۔

"شاید تمہاری کھوپڑی میں یکدم ہی تھوڑی بہت عقل سرایت کرگئی ہے۔" میں نے بدستور چڑانے والے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "اچھا ہی ہوا تم جوش میں نہیں آئے۔ میں تمہارا چھوبگاڑنا نہیں چاہتا کیوں کہ تم "جنگل کرل" کے ہیرو ہو اور اس فلم کا شیڈول پہلے ہی بہت مختصر ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ واقعی کم سے کم مدت میں مکمل ہو جائے۔ تمہارا چھوا اگر میرے ہاتھوں بگڑا تو

تم بڑے سے بڑے میک اپ مین کی خدمات سے فائدہ اٹھانے کے بعد بھی کیمرے کے سامنے آنا پسند نہیں کرو گے۔"

"تمہیں "جنگل گرل" کے مکمل ہونے یا نہ ہونے سے کیا دلچسپی ہے؟" ارشد موتی آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا "تم تو اس کے فائنانسر نہیں ہو۔"

"انسانی ہمدردی بھی کوئی چیز ہے پیارے فلمی ٹارزن!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "اس کا ڈائریکٹر راحیل بٹ مجھے شریف آدمی لگا ہے۔ اگر فلم جلدی مکمل نہ ہوئی تو اس کا نقصان ہو جائے گا۔ اس کی ہیروئن ستارہ میری دوست ہے۔ فلم کی تکمیل میں تاخیر ہوئی تو وہ بھی خواہ مخواہ اپ سیٹ ہوگی۔ وہ کم فلمیں سائن کرتی ہے اور اپنی فلموں کے بارے میں بڑی حساس ہے۔ وہ دوسری ہیروئنوں سے بڑی مختلف ہے۔"

ہماری گفتگو کچھ طول کھینچ گئی تھی۔ اس دوران تیسرا پہلوان جو چارپائی پر بیٹھا تھا اور جس کا ایک ہاتھ رائفل پر ہی تھا' غالباً اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ سب کا دھیان اس کی طرف سے ہٹا ہوا ہے۔ اس نے نہایت پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رائفل اٹھانے اور ٹریگر دبانے کی کوشش کی مگر اس کی بھی یہ حسرت پوری نہیں ہو سکی۔ رائفل اس کے ہاتھ سے بھی نکل گئی اور اس کے بھی دائیں ہاتھ میں عین اسی جگہ سوراخ ہو گیا جہاں پہلے دو پہلوانوں کے ہوا تھا۔ ٹونی آج شاید ہاتھوں میں سوراخ کرنے کا کوئی ریکارڈ قائم کرنے پر تلا ہوا تھا۔

اس بار گولی مہ پارہ مشہدی کے عین قریب سے گزری تھی اور وہ دہشت زدہ سی ہو کر چارپائی پر نیم دراز ہو گئی تھی۔ اس کے قریب بیٹھے ہوئے پہلوان نے اپنا زخمی ہاتھ دوسرے ہاتھ میں دبا کر بری طرح کراہنا شروع کر دیا تھا۔ ارشد موتی ایک بار پھر اپنا نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ہوئے تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے اپنے ساتھی پر زیادہ غصہ آ رہا تھا یا ٹونی پر؟

"میرا خیال ہے آج کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ اب ہم چلتے ہیں۔" میں نے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میں نے جان بوجھ کر کچھ اسی انداز سے یہ الفاظ ادا کئے تھے جیسے ہم کسی ٹی پارٹی میں آئے ہوئے تھے' جہاں بہت اچھا وقت گزرا تھا اور اب میں میزبانوں سے اجازت طلب کر رہا تھا۔

میں بے پروائی سے مڑا اور سیڑھیوں کے دروازے کی طرف چل دیا۔ ارشد موتی کی طرف سے مجھے ایک آخری کوشش کی توقع تھی لیکن میرا اندازہ اس وقت غلط ثابت ہو گیا جب ارشد موتی کے بجائے اس پہلوان نے اچانک مجھ پر چھلانگ لگائی جس کے ہاتھ پر سب سے پہلے گولی لگی تھی۔ ہاتھ زخمی اور جسم کسی پلے ہوئے سانڈ کی طرح بھاری بھرکم ہونے کے باوجود اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے درحقیقت مجھے ڈھال بنانے کی کوشش کی تھی اور اس حد تک وہ اپنی کوشش میں کامیاب رہا کہ ٹونی یا شبیر شیخ نے فوری طور پر گولی نہیں چلائی۔

اسی ثانیے ارشد موتی بھی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کر ہوئے میری آڑ میں ہو چکا تھا۔ پہلوان نے مجھے عقب سے باز کے شکنجے میں لینے کی کوشش کی اور ارشد موتی نے جھک کر تانگیں پکڑنے کی کوشش کی۔ اس دوران ٹونی اور شبیر کی سیو ایم کی گنیں گرجیں۔ شاید موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پہلوان نے رائفل اٹھانے کی کوشش کی تھی۔

میں نے ارشد موتی کے منہ پر الٹی کک رسید کی اور پہلو اپنی کمر پر لاد کر سامنے فرش پر دے مارا۔ فرش چوں کہ میڈ گارڈن اسکوائر کے رنگ کا نہیں تھا جس پر ٹھوس ربڑ کی مو بچھی ہوتی ہے اس لئے پہلوان کسی ریسلنگ چیمپئن کی طرح طور پر نہیں اٹھ سکا۔ ایک لمحے کے لئے تو وہ گویا کھردرے ٹھوس فرش سے چپک کر ہی رہ گیا۔

اس دوران ارشد موتی سنبھل کر دوبارہ مجھ پر جھپٹ ر اس کے ہاتھ میں لمبا سا خنجر تھا۔ ٹونی یا شبیر نے اب بھی غال لئے فائر نہیں کیا کہ میرے بھی گولی کی زد میں آنے کا اندیشہ تھ باقی لوگوں کو یقیناً انہوں نے کور کیا ہوا تھا کیوں کہ کسی اور نے حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ارشد موتی نے غالباً عجلت اور بدحواسی میں نہایت ا طریقے سے خنجر میری پسلیوں میں گھونپنے کی کوشش کی۔ م جھکائی دیتے ہوئے اس کی گردن پر ہلکا سا ہاتھ رسید کیا۔ و ساتھی پہلوان پر جا پڑا جو اس دوران اٹھنے کی کوشش کر رہا بے چارہ دوبارہ ڈھیر ہو گیا اور ارشد موتی کا خنجر اس کی پسلیو پیوست ہوتے ہوتے رہ گیا۔

میں نے ان دونوں کو دو چار تسلی بخش قسم کی ٹھوکریں کیں جنہوں نے ان دونوں ہی کو اٹھنے سے باز رکھا لیکن ہی ارشد موتی سانپ کی طرح پھنکار کر پلٹا اور پوری طر کھڑے ہونے سے پہلے ہی اس نے اندھا دھند خنجر ہوا میں میں نے اس کے وار سے بچتے ہوئے یکدم اس کی کلائی کر لے لی۔

دوسرے بازو کا شکنجہ میں نے اس کی گردن کے گر اس کی کلائی پر میں نے بتدریج دباؤ بڑھانا شروع کیا اور خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر گر پڑا۔ وہ کسمسا رہا تھ رہا تھا اور میری گرفت سے نکلنے کے لئے پوری طاقت صر تھا۔ وہ بلاشبہ ایک طاقتور آدمی تھا لیکن میری گرفت سے کے بس کی بات نہیں تھی۔

میں اسے کھینچ کر فرش پر پڑے ہوئے پہلوان سے ذر گیا تھا تاکہ کہیں وہ میری ٹانگ نہ کھینچ لے۔ پہلوان جرأت اور ہمت کا ثبوت دیتے ہوئے ایک بار پھر اٹھنے کی لیکن اب چوں کہ اس پر فائر کرنے کی صورت میں م

ہونے کا اندیشہ نہیں رہا تھا اس لئے ٹونی نے اس پر محض وارننگ کے طور پر ایک گولی چلا دی جو اس کی ناک کو چھوتی ہوئی گزری۔ وہ یکدم اپنی جگہ پر دوبارہ چت ہو گیا اور مضحکہ خیز سے انداز میں آنکھیں پٹ پٹانے لگا۔

میری گرفت میں ارشد موتی کے چہرے کی رگیں بری طرح پھول چکی تھیں اور اسے سانس لینے میں سخت دشواری پیش آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ اس بڑے سے چقندر سے مشابہ نظر آنے لگا تھا جو کسی نامعلوم وجہ کے تحت پھٹنے کے قریب تھا۔ اس کا جو بازو آزاد تھا اس سے اس نے میرے بازو کا شکنجہ ڈھیلا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ طاقت بھی صرف کی تھی' ناخنوں سے میرا بازو ادھیڑنے کی بھی سعی کی تھی اور الٹے رخ سے میرے پیٹ میں کہنی سے ضربیں لگانے کی بھی کوشش کی تھی لیکن اس کی یہ کوششیں اسی طرح بے سود رہی تھیں جیسے کوئی ننھا بچہ کسی بڑے کی گرفت میں آنے کے بعد اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے مچلتا ہے' ہاتھ پاؤں مارتا ہے مگر ناکام رہتا ہے۔

چند لمحے بعد ہی اس کی طاقت جواب دینے لگی اور وہ بے دم سا ہونے لگا۔ میں نے اس کی گردن پر دباؤ ذرا سا اور بڑھاتے ہوئے کہا "اسی حالت میں کھڑے کھڑے تمہارا انتقال بھی ہو سکتا ہے۔ اور اگر تمہیں عالم بالا پر جانے کی جلدی ہو تو اسی لمحے ایک جھٹکے سے تمہاری گردن ٹوٹ سکتی ہے۔ میرا خیال ہے تم اس کے مستحق بھی ہو لیکن میں ایک بار پھر تمہیں یقین دلا رہا ہوں کہ صرف وہ معمولی سی فلم "جنگل گرل" تمہارے زندہ رہنے کا بہانہ بن گئی ہے۔ اگر اس فلم میں تمہارا کام مکمل ہو چکا ہوتا تو شاید آج تمہاری زندگی کی فلم کی بھی آخری ریل چل جاتی۔ ایک بار پھر تمہیں محض اس لئے چھوڑ رہا ہوں کہ تم "جنگل گرل" میں اپنا کام مکمل کرا سکو۔ ورنہ آدمی تم بہت کمینے ہو اور زندہ رہنے کے مستحق نہیں ہو۔ میں اچھا بھلا تمہیں چھوڑ کر جا رہا تھا مگر تمہیں اپنی طاقت کے مظاہرے کا جو شوق چڑھا ہوا ہے وہ کسی طرح کم ہونے میں نہیں آ رہا۔ اگر میں یا میرے ساتھی بھی غیر ضروری خونریزی کے شوقین ہوتے تو اس وقت یہاں تم سب کی لاشیں پڑی ہوتیں۔"

میں نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کے کس بل نکل چکے ہیں اور وہ زیادہ ہاتھ پاؤں چلانے کے قابل نہیں رہا تو میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ دھب سے فرش پر گر پڑا اور منہ پھاڑ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ ہال میں گہرا سکوت طاری تھا۔ اس کی سانسوں کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

تینوں زخمی پہلوان عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ چوتھا پہلوان بدستور ہال کے وسط میں رسہ تھامے ساکت و صامت کھڑا تھا۔ وہ ایک مضحکہ خیز بت نظر آتا بشرطیکہ اس کی توند پھول پچک نہ رہی ہوتی۔ اس نے اب تک کی چھوٹی موٹی سی کشمکش میں ہاتھ تک ہلانے کی زحمت نہیں کی تھی۔ معلوم نہیں یہ کس قسم کے پہلوان تھے جو پہلوانی کی اعلیٰ و ارفع روایات کو ترک کر کے بھنگ' افیم اور چرس کے رسیا بنے ہوئے تھے۔ میں نے ایسے تو کئی پہلوانوں کو دیکھا تھا جو اس قسم کی چیزوں کے دھندے چلواتے تھے۔ اپنے ڈیرے پر طرح طرح کے کاروبار کراتے تھے۔ معاوضے پر مختلف خدمات انجام دیتے تھے لیکن وہ عموماً خود منشیات کے رسیا نہیں ہوتے تھے مگر یہ لوگ تو گویا بالکل ہی گئے گزرے تھے۔

مہ پارہ مشہدی کو دیکھ کر بھی مجھے خفیف سی حیرت ہوئی۔ وہ نہ جانے کب چارپائی سے اتر کر اکڑوں بیٹھ چکی تھی۔ چہرہ زرد تھا۔ غالباً اس کا ارادہ یہی تھا کہ زیادہ زور و شور سے گولیاں چلنے لگیں تو چارپائی کے نیچے گھس جائے گی۔ اس کا چرمی بیگ چارپائی پر پڑا تھا مگر اس نے اس میں سے پستول نکالنے کی قطعاً کوشش نہیں کی تھی۔

میں نے ارشد موتی کو ہلکی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا۔ "ایک آدھ دن میں تم شوٹنگ میں حصہ لینے کے قابل ہو جاؤ گے۔ اس دوران تمہیں سب سے ضروری کام یہ کرنا ہے کہ یہاں سے یہ اڈہ ختم کرنا ہے۔ کل سے یہاں نہ تو تمہارا کوئی آدمی موجود ہونا چاہئے اور نہ ہی تمہارا کوئی دھندا چلنا چاہئے۔ پرسوں میرے آدمی آ کر چیک کریں گے۔ اگر یہاں تم لوگوں کی موجودگی کے کوئی آثار ہوئے تو اس جگہ کو بم سے اڑا دیا جائے گا۔ جس کسی کی یہ پراپرٹی ہوگی اس کا نقصان میں خود پورا کر دوں گا۔"

میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ ٹونی اور شبیر شیخ نے اس وقت تک اپنی جگہ نہیں چھوڑی جب تک میں ان کے درمیان سے گزر کر اوپر نہیں آ گیا۔ جینڈا اپنی چارپائی پر اوندھا پڑا تھا۔ اس کا ایک بازو چارپائی سے نیچے لٹکا ہوا تھا۔ اس کی کنگ سائز کھوپڑی پر کان کے قریب خاصا نمایاں ابھار نظر آ رہا تھا اور کھال تھوڑی سی پھٹی ہوئی تھی۔ اس کی رائفل بدستور چارپائی کے سہارے کھڑی ہوئی تھی۔ ٹونی نے اسے بھی وہاں سے ہٹانے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

میری مرسڈیز اس نامکمل کوٹھی کے قریب ہی کھڑی تھی جبکہ ٹونی اور شبیر شیخ اپنی سفید فورڈ کیپری وہاں سے کافی دور درختوں کے ایک چھوٹے سے جھنڈ کے عقب میں چھوڑ آئے تھے۔ وہ مکان سے نکل آئے تو میں نے انہیں انہی کی گاڑی کی طرف جانے کا اشارہ کیا اور خود اپنی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اچانک ٹونی تیزی سے چیتے کی طرح پلٹا اور ایک بار پھر اس نے گن سیدھی کر لی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ مہ پارہ مشہدی مکان سے نکل رہی تھی مگر وہ پہلے ہی دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھی اور اس کا بیگ بھی اس کے پاس نہیں تھا۔

"سر!" اس نے دور سے ہی چلا کر مجھے مخاطب کیا "میں کچھ بھی نہیں کروں گی۔ مجھ میں تو اتنی جرأت ہی نہیں ہے۔ میں تو بس آپ سے ایک منٹ بات کرنا چاہتی ہوں۔ بہت ضروری بات۔"

میں نے ٹونی اور شبیر کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی گاڑی کی طرف چلے جائیں۔ وہ لڑکی کوئی ایسا بڑا مسئلہ نہیں تھی۔ وہ پیٹھ موڑ کر آرام سے آپس میں باتیں کرتے ہوئے چل دیئے اور مہ پارہ حشمدی میرے قریب آگئی۔ میں گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

وہ گلابی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولی "سر! میری ایک درخواست تھی۔۔۔ آپ مجھے اپنے گینگ میں شامل کرلیں۔ میں آپ کے بہت کام آسکتی ہوں۔"

"مثلاً؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مثلاً بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات پیدا کرنا۔ اہم سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں کو مٹھی میں کرنا۔ اس کے علاوہ میں کیریئر کے فرائض بھی انجام دے سکتی ہوں۔ باہر سے کوئی مال لے کر آسکتی ہوں یا یہاں سے لے کر جاسکتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں فائٹر کے طور پر بھی اتنی نکمی نہیں ہوں جتنی آج آپ کو نظر آئی ہوں۔ آج تو مجھے نہ جانے کیا ہوگیا تھا ورنہ تو میں خاصی کام کی چیز ہوں۔ اور بھی جو خدمت آپ کہیں گے میں بجالاؤں گی۔ آپ کچھ عرصے کے لئے مجھے آزما کر تو دیکھیں۔"

وہ بڑے جوش و خروش سے مجھے قائل کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ مجھے ہنسی آگئی۔ وہ مزید پرجوش لہجے میں بولی "سر! آپ یہ مت سمجھیں کہ میں کوئی چکر چلانے کی کوشش کررہی ہوں یا ارشد موتی نے مجھے سکھا پڑھا کر بھیجا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے سر۔ موتی تو ابھی تک وہیں پڑا ہے۔ اٹھنے کے قابل بھی نہیں ہوسکا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک منٹ آپ کی گرفت میں رہ کر اس کا یہ حال ہوجائے گا۔ سر! میں نے اپنے طور پر ہی آپ سے یہ درخواست کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ آپ مجھے ایک بار ضرور آزمائیں۔ مجھے بہت تجربہ ہے ہر قسم کے کاموں کا۔"

میں ایک بار پھر ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اس کے انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "تمہیں کیوں کر خیال آیا کہ تم میرے کام آسکتی ہو؟"

"سر! ظاہر ہے آپ زیرِ زمین دنیا کے کوئی بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت مضبوط گینگ ہوگا آپ کا۔ تبھی تو آپ نے موتی اور اس کے آدمیوں کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی اور انہیں محض انگلیوں کے اشاروں سے بے بس کرکے رکھ دیا۔ ظاہر ہے آپ جیسے لوگوں کے ہاں مجھ جیسی لڑکیوں کی گنجائش تو نکلتی ہی رہتی ہے نا۔ بلکہ گنجائش نہ ہو تب بھی پیدا کرلی جاتی ہے۔"

"دیکھو بے بی!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "ممکن ہے تمہاری باتیں اپنی جگہ درست ہوں لیکن تمہارے، میرے بارے میں اندازے درست نہیں ہیں۔ میرا کسی زیرِ زمین دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ میرا کوئی گینگ نہیں۔ میں تو اس شہر کا ایک عام معمولی اور شریف سا آدمی ہوں۔"

"عام، معمولی اور شریف آدمیوں کے پیچھے اس طرح ماہر اور مسلح قسم کے محافظ ہر جگہ آتے ہیں کیا؟" اس نے ٹونی اور شبیر کی طرف اشارہ کیا جو ابھی اپنی گاڑی تک نہیں پہنچے تھے۔

"وہ پیشہ ور محافظ نہیں، میرے جاں نثار دوست ہیں۔ از کو دنیا میں صرف دوست بنانے چاہئیں۔ جو کام دوست کرسکتے وہ گروہوں کے پیشہ ور کارکن نہیں کرسکتے۔" میں نے ملائمت کہا "مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں۔ تم ابھی وفا اور وابستگ کڑی آزمائشوں سے گزر کر کندن نہیں بنی ہو۔ میں نے تم جیسی پھرتی لڑکیوں کو اہم لوگوں کے پاس بھیج کر کبھی اپنے کام نکلوا کوشش نہیں کی۔ اول تو میرے کام کہیں اٹکے ہوئے ہی ن ہوتے اور اگر ہوں بھی تو اپنے کام نکلوانے کے میرے اپنے طریقے ہیں۔ بہرحال یوں لگی لپٹی رکھے بغیر اظہارِ مدعا کا تم انداز مجھے پسند آیا۔"

"سر! آپ مجھے ادھر اُدھر کی باتوں میں مت ٹالیں۔" دلربائی سے مسکرائی "مجھے ان لوگوں کے ساتھ کام کرنے میں تکلیف تو نہیں ہے۔" وہ پیچھے کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہو بولی "معاوضہ بھی بہت اچھا مل رہا ہے۔ معاملہ ارشد موتی کی تک تو ٹھیک ہے لیکن میں ان پہلوانوں سے بڑی تنگ ہوں۔ مو ٹولا بیدرہ بیس پہلوانوں پر مشتمل ہے اور یہ سب کے سب ٹھ ہیں۔ مگر ہیں چرسی بھنگی۔ اپنا حلیہ تک ٹھیک نہیں رکھتے۔ ان سے بعض کے جسموں سے تو بکروں جیسی بو آتی ہے۔"

"تم انہیں اتنے قریب آنے کا موقع مت دیا کرو تاکہ اس محسوس کرنے کی نوبت آئے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کب موقع دیتی ہوں۔" وہ مسکرا کر بولی "لیکن ان کا چلے تو ان میں سے ہر ایک میری ہڈیاں تک چبا جائے۔ ارشد کے احکامات کی بھی وہ کوئی خاص پروا نہیں کرتے۔ ان کے ہاں ڈسپلن نہیں ہے۔"

"حیرت کی بات ہے! تم اچکّوں میں ڈسپلن ڈھونڈ رہی ہو" میں نے حقیقتاً حیرت سے کہا۔

"برے سے برے کام کو بھی سرانجام دینے کا کوئی طریق کچھ اصول ہونے چاہئیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

میری نظر نامکمل کوٹھی کی طرف بھی تھی لیکن ابھی تک سے کوئی برآمد نہیں ہوا تھا۔ کسی نے مہ پارہ کی تلاش میں بھی آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مہ پارہ مجھے کوٹھی کی طرف متوجہ بولی "یہ کوٹھی بھی ارشد موتی کی اپنی ہے۔ میرا خیال ہے تم اسے یہ ٹھکانا چھوڑنے کا حکم دے دیا ہے۔ وہ بہت پریشان ہوگا۔ وہ تو عنقریب اسے مکمل کرانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔"

"اچھا ہوا تم نے بتادیا۔ اسے تو میرا شکر گزار ہونا چا میں نے اسے اتنی سزا نہیں دی جتنی سزا کا وہ مستحق ہے۔ اچ اب میں چلتا ہوں۔" میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے ٹونی اور شبیر درختوں کے عقب میں غائب ہوچکے تھے۔ غالباً و ں بیٹھ چکے تھے۔

مہ پارہ دم بخود سی وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کی خوب صورت ں میں نمی سی تیرنے لگی تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ ۔۔۔! میری دلی خواہش تھی کہ میں آپ کے ساتھ چلتی۔"

خوبیبی!" میں نے آہستگی سے اس کا گال تھپتھپایا "ہم ذرا ی طرح کے لوگ ہیں۔" میں نے گاڑی اسٹارٹ کی اور آہستگی گے بڑھائی۔ کچھ آگے نکل آنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ ھں میں ہاتھ دیئے وہیں کھڑی تھی۔ اس کے بھورے بال ہوا ڑ رہے تھے اور اس کے چہرے پر زمانے بھر کی اداسی تھی۔ میں یا تھا کہ میرا حتمی انکار سن کر وہ غصے میں کسی پتھر وغیرہ کو ٹھوکر ی، حقارت سے زمین پر تھوکے گی اور پاؤں پٹختی ہوئی واپس چلی جائے گی مگر وہ وہیں بت بنی کھڑی تھی۔ عجیب سی لڑکی تھی۔ نے مجھے تھوڑا سا حیران کردیا تھا۔ تاہم میں رکا نہیں۔

ایک موڑ کاٹنے کے بعد میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ اور شبیر کی گاڑی کافی فاصلہ رکھتے ہوئے میرے پیچھے آرہی تقریباً ایک میل کے بعد گارڈن ٹاؤن کا آباد علاقہ شروع جہاں دو رویہ خوب صورت اور طویل و عریض بنگلوں کی ں تھیں۔ تاہم سڑکوں پر ویرانی تھی۔

گلبرگ کا علاقہ شروع ہونے سے کافی پہلے میں نے سڑک کے طرف کچے میں ایک شخص کو مضمحل سے انداز میں چلتے دیکھا۔ راور قدرے مفلوک الحال سا آدمی تھا۔ غالباً اسی طرح سڑک نارے کنارے کافی دور سے کچے میں ہی چلا آرہا تھا۔ کیوں کہ کے نیم شکستہ جوتوں سے بھی ذرا اوپر تک دھول جمی ہوئی تھی۔ بار مڑ کر پیچھے دیکھتا ہوا جا رہا تھا۔ شاید اسے بس یا ویگن کی تھی مگر کسی پبلک ٹرانسپورٹ کا دور دور تک نام و نشان نہیں گرمیوں کے موسم کے ابھی دور دور تک آثار نہیں تھے مگر وہ دھوپ میں نہ جانے کتنی دور سے پیدل چلا آرہا تھا کہ اس کے پر پسینہ دور سے چمکتا نظر آرہا تھا۔ وہ دبلا پتلا، سانولا اور دراز چہرے پر پریشانی اور مایوسی رقم تھی۔ یہ چہرہ مجھے کچھ شناسا ں ہوا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں نے اس چہرے کو یاد رکھنے کے لئے اس تصویر اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں کہیں ڈالی تھی۔ میں نے رفتار بالکل کم کرلی اور ذہن پر ذرا زور دیا۔ کمپیوٹر کے کسی نہاں ے سے کھٹ سے وہ تصویر برآمد ہوگئی۔ مجھے یاد آگیا۔ میں نے شخص کو فلمی مصنف نصیر نواز کے ساتھ ملتان روڈ کے ایک ریستوران سے نکلتے دیکھا تھا اور دونوں کے درمیان کسی دعا پر گرما گرم بحث ہورہی تھی۔ پھر یہ شخص ایک بس میں نکل ور نصیر نواز اپنی خوب صورت گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگیا اور نصیر نواز ایک ایسا شخص تھا جو پہلی ملاقات سے ہی میرے میں کھٹک رہا تھا۔

میں نے گاڑی اس شخص کے قریب لے جا روکی۔ وہ بری طرح ٹھٹک کر رہ گیا۔ گاڑی کے شیشے رنگین تھے اور وہ آنکھیں سکیڑے اندر دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتی تھیں۔ ان آنکھوں میں گو کہ یاسیت تھی مگر اس یاسیت کی تہ میں ذہانتوں کے برباد خزانے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ آنکھیں ایسی ہی تھیں جیسے اس کی ذات کے کھنڈر میں دو قمقمے کبھی جل اٹھتے ہوں اور کبھی بجھ جاتے ہوں۔

میں نے پسنجر سیٹ کا دروازہ کھول کر قدرے جھکتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا "آپ کو کہاں جانا ہے؟ آیئے میں آپ کو چھوڑ دوں گا۔"

اس نے میرے چہرے پر شناسائی کی کوئی رمق تلاش کرنے کی کوشش کی اور اس میں ناکام ہونے کے بعد قدرے خوف زدہ سا نظر آنے لگا۔ وہ خاصا اعصاب زدہ اور کمزور سا آدمی نظر آتا تھا۔ پیشانی اور گردن کی نسیں ابھری ہوئی تھیں۔ نفی میں سر ہلاتے ہوئے وہ تھوک نگل کر بولا "نہیں۔۔۔ نہیں شکریہ۔ میں چلا جاؤں گا۔ ابھی بس آجائے گی۔"

"ارے حضور! بیٹھ جایئے۔ ان علاقوں میں بس خوش نصیبوں ہی کو ملتی ہے۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "آپ اتنا خوف زدہ کیوں نظر آنے لگے ہیں؟ قبلہ! نہ تو میں ڈاکو لیٹرا یا چور اچکا ہوں اور نہ ہی آپ کوئی ایسے سرمایہ دار نظر آرہے ہیں کہ راستے میں میرے ہاتھوں آپ کے لٹ جانے کا اندیشہ ہو۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کوئی جنونی قاتل بھی نہیں ہوں اور نہ ہی آپ کوئی البیلی حسینہ ہیں کہ میں آپ کو اغوا کرکے قتل کردوں گا۔"

"نہیں۔۔۔ نہیں جناب! یہ بات نہیں۔" وہ قدرے کھسیانا نظر آنے لگا۔ پھر اس نے ایک نظر اپنے سراپا پر اور ایک گاڑی پر ڈالی اور بہت دھیمے لہجے میں بولا "میرا حلیہ اس قابل نہیں ہے کہ میں اتنی شاندار گاڑی میں سفر کروں۔ آپ دیکھ رہے ہیں، میرے جوتے مٹی میں لتھڑے ہوئے ہیں۔ آپ کی گاڑی کے خوب صورت کارپٹ پر نشان نہ پڑجائیں۔ میں پسینے میں شرابور ہوں۔ آپ کی گاڑی کی مخملیں سیٹ پر نشان نہ پڑجائیں اور اس کے اندر کے خنک اور معطر ماحول میں میرے پسینے کی بو بدمزگی نہ پیدا کردے۔" اس نے اپنے لہجے میں تہذیب و شائستگی کی ملائمت برقرار رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی لیکن اس ملائمت کی تہ میں کسی زہر کی کڑواہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ میں اندازہ نہیں کرسکا کہ یہ تلخی، یہ زہریلا پن میرے لئے تھا، کسی اور کے لئے یا پھر سارے دولت مندوں کے لئے۔

"بعض لوگ ان چھوٹی موٹی چیزوں پر پڑنے والے داغوں کی پروا نہیں کرتے لیکن وہ روح پر پڑے ہوئے داغوں کا جائزہ لینے کی کوشش ضرور کرتے ہیں۔" میں نے اب بھی خوشگوار لہجے میں کہا۔

"اب بحث چھوڑیئے اور آجایئے۔ اتنا اصرار اگر میں تنہا جاتی ہوئی کسی حسینہ سے کرتا تو وہ بھی گاڑی میں آن بیٹھتی۔"

اس کے خشک لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ مدھم سی آواز میں بولا "جی ہاں ..... بلکہ جس قبیل کی حسیناؤں کی طرف آپ کا اشارہ ہے وہ تو اصرار کی نوبت بھی نہیں آنے دیتیں۔ گاڑی رکتے ہی بیٹھ جاتی ہیں۔ خصوصاً جبکہ گاڑی روکنے والا آپ جیسا خوبرو ہو اور تنہا بھی۔" وہ پاؤں سڑک پر جھاڑنے کی کوشش کرنے کے بعد گاڑی میں آبیٹھا۔

"تعریف کا بھی شکریہ اور لفٹ قبول کرنے کا بھی۔" میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس نے پشتے سے ٹیک لگا کر ایک طویل سانس لی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "آپ زندگی میں پہلے آدمی ملے ہیں جو میرے حصے کا بھی شکریہ ادا کر رہے ہیں۔"

"زندگی باقی رہنی چاہئے۔ لوگ تو ہر طرح کے ہی مل جاتے ہیں۔ اچھے بھی' برے بھی۔ مہرباں بھی نامہرباں بھی۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ کچھ لوگ جلدی مل جاتے ہیں اور کچھ لوگ تاخیر سے۔" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"درست کہا آپ نے۔ لیکن شاید کچھ لوگ بہت جلدی مل جاتے ہیں اور کچھ بہت ہی زیادہ تاخیر سے۔" وہ مسکرایا۔ اب وہ کچھ پُرسکون نظر آرہا تھا۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر ذہن پر زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے آپ کو نصیر نواز کے ساتھ کہیں دیکھا ہے۔ غالباً دوست ہے وہ آپ کا؟"

میں نے محسوس کیا کہ گاڑی میں بیٹھ کر اس کے اعصاب کو جو تھوڑا بہت سکون ملا تھا وہ یک لخت رخصت ہوگیا اور اس کے جسم میں ایک عجیب سا تناؤ آگیا۔

"کون نصیر نواز؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ انجان بننے کی یہ کوشش خاصی اچھی تھی لیکن میرے سامنے بے اثر تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے ایک ثانئے کے لئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس نے فوراً نظر چرالی۔

میں نے نظر دوبارہ سڑک پر مرکوز کرتے ہوئے کہا "نصیر نواز کے ساتھ نظر آنا کوئی جرم تو نہیں جسے چھپانے کی کوشش کی جائے۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہا۔ وہ پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے اندر جو نامعلوم سی کشمکش جاری ہے اس کی جھلک چہرے پر نہ آنے پائے۔ غالباً اس نے لفٹ قبول کرنے پر پچھتانا بھی شروع کردیا تھا۔ شاید اس کا بس چلتا تو چلتی گاڑی سے چھلانگ لگا دیتا مگر اس میں اس کی بھی جرأت نہیں تھی۔ وہ ان شریف آدمیوں میں سے معلوم ہوتا تھا جن کی شرافت اور بزدلی کے درمیان بہت ہی باریک سی لکیر حائل ہوتی ہے۔

"آپ نصیر نواز سے اپنی شناسائی کے معاملے میں بہت یا پھر شاید بہت خوف زدہ معلوم ہوتے ہیں۔" میں نے ملائم کہا "کیا اس میں کوئی بھید ہے؟ کوئی راز ہے؟"

"مجھے جان لینا چاہئے تھا کہ آپ نے مجھے خواہ مخواہ نہیں دی..... اس دنیا میں کوئی چھوٹا سا بھی احسان بے مقصد کرتا۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔

"آپ کوئی بات کریں یا نہ کریں' میں آپ کی منزل کو ضرور چھوڑ کر آؤں گا۔" میں نے گہری سانس لیتے ہوئے "نصیر نواز کے ساتھ آپ کو دیکھنے کی بات تو مجھے یونہی یاد آ میرا آپ کو کریدنے کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے اور نہ ہی سے زبردستی کچھ معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں ایک غیر متعلق ہوں۔ میں تو یونہی دوستی اور قدرے بے تکلفی کا ماحول پیدا کے لئے یہ تذکرہ چھیڑ بیٹھا تھا۔ بلکہ آپ کے انکار نے متجسس کردیا ہے۔ آپ مجھے کچھ پریشان حال معلوم ہوتے ہیں آپ مجھے دوست سمجھ کر کچھ کھل کر بات کریں تو شاید میں کچھ کام آسکوں۔"

میرے الفاظ سے اس کا کچھ حوصلہ تو بندھا لیکن شاید جلدی کسی پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ معلوم کس کا ڈسا ہوا تھا۔ مسکراتے ہوئے بولا "کچھ پتا نہیں چلتا کون کس کا دوست ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ جسے آپ سمجھیں وہ کسی دشمن جاں کا دوست ہو۔"

"ہاں یہ تو عین ممکن ہے۔" میں نے تسلیم کیا "لیکن ایک اچھے اور سچے آدمی ہیں تو آپ مجھے اپنے اچھے دوستوں میں شمار کرسکتے ہیں۔"

وہ پشتے سے ٹیک لگائے چند لمحے گہری گہری سانسیں میں بہت ہی سست رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس نے بارے میں مجھے کچھ نہیں بتایا تھا کہ کس طرف چلنا ہے میں نے کچھ پوچھا تھا۔

"مجھ سے پہلے آپ بتایئے کہ آپ نصیر نواز کو ہیں؟" آخر کار وہ بولا۔ وہ اب زبان کھولنے پر کچھ آمادہ

"میں اسے کچھ زیادہ نہیں جانتا۔" میں نے آہستہ "بس اتفاقاً ہی فلم انڈسٹری سے میرا کچھ غائبانہ سا تعلق ہوگیا ہے اور اتفاقاً ہی اس شخص نصیر نواز سے میری آشنائی ہوگئی ہے۔ اور نہ جانے کیوں میں اس کے بارے کچھ جاننے کے لئے متجسس ہوگیا ہوں۔"

"کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہے جناب! انسان یو بارے میں متجسس نہیں ہوجاتے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے دل مجھ پر اعتبار کرنے کو بھی چاہ رہا تھا لیکن ساتھ ہی ہوا سا بھی تھا یا پھر شاید وہ حد سے زیادہ محتاط تھا۔

"بات یہ ہے عزیز محترم!" میں نے گہری سانس

ہ عرصے سے مجھے احساس ہونا شروع ہوا ہے کہ قدرت نے ں مجھے روپے پیسے سے نوازا ہے وہاں کچھ غیر معمولی ذہن اور سانی صلاحیتوں سے بھی نوازا ہے جن سے ابتدا میں' میں خود بھی بے خبر رہا ہوں۔ جسمانی طاقت کے معاملے میں قدرت کی مہربانی مجھ پر یہ ہے کہ بظاہر جو لوگ مجھ سے بھی کہیں زیادہ جسیم اور طاقت ور نظر آتے ہیں ان کے لئے بھی مجھے مغلوب کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ ں کے برعکس اگر میں انہیں گرفت میں لے لوں تو چند ہی لمحے میں ن کی حالت نچڑے ہوئے آم کی سی ہوجاتی ہے یا وہ میرا ایک آدھ لونا کھا کر ہی ڈھیر ہوجاتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے بے میرے اندر کوئی جن مقید ہے۔ ذہنی صلاحیت کے معاملے میں عالم ہے کہ میں ایک بار جس شخص سے ملتا ہوں چند ہی لمحوں میں ں کے باطن کی ایک تصویر سی میرے سامنے آجاتی ہے۔ یہ تصویر لوکہ زیادہ واضح نہیں ہوتی' دھندلی سی ہوتی ہے لیکن پھر بھی مجھے ندازہ ہوجاتا ہے کہ یہ شخص بنیادی طور پر کیا ہے۔ خواہ اس نے پنی شخصیت پر کیسا ہی لبادہ کتنی ہی عمدگی سے چڑھا رکھا ہو۔ آپ میری باتوں کو محض لن ترانی سمجھ کر تو نہیں سن رہے؟" میں نے سکراتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

وہ گویا کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولا "آپ میری آنکھوں یں جھانک کر دیکھ سکتے ہیں کہ ان میں بے اعتباری کے سائے نہیں ہیں۔"

مجھے اس کی آنکھوں میں بھی جھانکنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا وہ درست کہہ رہا تھا۔ میں نے محض رسماً ہی اس سے پوچھا تھا۔ اگر مجھے احساس ہوتا کہ وہ میری باتوں پر یقین نہیں کر رہا تو میں اس موضوع پر بات جاری ہی نہ رکھتا۔ میں کسی سے بھی اپنی ذات کے بارے میں باتیں کرنا زیادہ پسند نہیں کرتا تھا۔ قدرت جن جن خزانوں سے مجھے نواز رہی تھی انہیں میں اپنی ذات کے خول میں ہی چھپا کر رکھنا چاہتا تھا لیکن اس شخص کی زبان کھلوانا مجھے بہت مشکل نظر آرہا تھا۔ اس سے اس کے دل کی بات اگلوانے کے لئے اس کے سامنے خود بھی تھوڑا بہت کھلنا ضروری تھا۔

میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "میں جو نصیر نواز سے متعارف ہوا تو میرے دل نے کہا کہ یہ شخص ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی شخصیت کی عمارت کے کونے کھدروں میں ضرور کچھ مکروہ سے بھید چھپے ہوئے ہیں اور یہ نہ جانے کن کن چکروں میں الجھا ہوا ہے۔ ایسے لوگ مجھے اچھے نہیں لگتے جو اندر سے زہریلے سے ہوں۔ بس صرف اسی لئے میں اس کے بارے میں متجسس ہوں اور مزید کچھ جاننا چاہتا ہوں تاکہ میرے ذہن میں اس کے باطن کی جو دھندلی سی تصویر ابھری ہے وہ کچھ اور روشن' کچھ اور واضح ہوجائے۔"

وہ جھرجھری سے لے کر بولا "بہت جی خوش ہوا آپ کی باتیں سن کر۔ دراصل کوئی بات کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میں اپنے دوست سے بات کر رہا ہوں یا نصیر نواز کے دوست سے۔ اچھا یہ بتایئے میرے بارے میں آپ کا دل کیا کہتا ہے؟"

"آپ بنیادی طور پر حد سے زیادہ شریف اور حد سے زیادہ بزدل ہیں اور طویل عرصے سے کسی کشمکش' کسی مصیبت میں گرفتار ہیں۔ چوں کہ میں آپ کو نصیر نواز کے ساتھ دیکھ چکا ہوں اور آپ کے درمیان کچھ بحث و تمحیص سی بھی ہورہی تھی اس لئے مجھے کافی امکان نظر آیا کہ شاید آپ کی مصیبت کا تعلق نصیر نواز کے ساتھ بھی ہو۔ ویسے میرا وجدان یہی کہتا ہے کہ آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن پر زندگی ہمیشہ ہی نامہربان رہتی ہے۔ جو ہمیشہ طرح طرح کے مصائب میں گرفتار رہتے ہیں اور حالات کی چکی میں کسی نہ کسی زاوئیے سے پستے ہی رہتے ہیں۔ تاہم میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ایسا ان کی اپنی کمزوریوں اور حماقتوں کی وجہ سے ہوتا ہے یا ان کی تقدیر ہی کچھ ایسی ہوتی ہے۔ میں ابھی اپنے آپ کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ ان معاملات میں کوئی فتویٰ صادر کرسکوں۔"

"آپ کا وجدانی تجزیہ بالکل درست ہے۔ اور اگر آپ مجھ سے میرے بارے میں رائے لیں تو میں یہی کہوں گا کہ اپنے بیشتر مصائب کا ذمے دار میں خود ہوں۔ قدرت نے مجھے بہت سی صلاحیتوں سے نوازا تھا لیکن نہ جانے کب اور کیوں کر میں محض حماقتوں' کمزوریوں اور بزدلی کا ایک الجھا ہوا سا جال بن کر رہ گیا۔ بالکل ناکارہ سا آدمی بن گیا۔ ردی کے پلندے کی طرح..." اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہاں سے موڑ لیجئے گا۔ انٹرکان کی بلند و بالا اور شاندار عمارت کے عقب میں ایک کچی بستی چھپی ہوئی ہے۔ وہیں میں رہتا ہوں۔ آپ مجھے باہر ہی اتار دیجئے گا۔ گلیوں میں تو یہ گاڑی نہیں جاسکے گی۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے گاڑی موڑتے ہوئے کہا "میں تو

آپ کے ساتھ جاسکوں گا۔ کیا آپ مجھے اپنے گھر لے جانا پسند کریں گے؟"

"آپ بہت تنگ ہوں گے جناب!" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "وہاں گندی نالیاں ہیں۔ کچے پکے گھر ہیں۔ گلیوں میں کھیلتے ہوئے گندے سندے بچے ہیں۔ ویسے ہمیں خوش خبری سنادی گئی ہے کہ جلد ہی وہ بستی پکی ہونے والی ہے۔ پھر اس کی حالت بڑی حد تک سدھر جائے گی۔ لیکن اس قابل شاید وہ پھر بھی نہ ہوسکے کہ آپ وہاں تشریف لاسکیں۔"

"میں تو خیر اتنا طویل انتظار بھی نہیں کرسکتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور مجھے آج تک کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جس کے بارے میں مجھے یہ خیال آیا ہو کہ وہاں میں تشریف نہیں لے جاسکتا۔ آپ بالکل مطمئن رہیں۔ میں نے زندگی کو ہر رنگ ہر پہلو سے دیکھا ہوا ہے۔ اور ابھی تو اصل موضوع پر آپ سے بات ہی نہیں ہوئی۔ وہ باتیں آپ کے گھر پر ہی بیٹھ کر ہوں گی۔ گھر پر بات کرنے کا اپنا ایک لطف ہے۔ گھر چاہے کیسا بھی ہو، بہرحال گھر ہے۔"

اٹرکان کے عقب میں پہنچ کر کئی گلیوں کی بھول بھلیوں میں گھومنے کے بعد آخر کار اس نے ایک ایسی جگہ گاڑی رکوائی جہاں سے آگے پیدل ہی جایا جاسکتا تھا۔ میں نے اتر کر دیکھا، گلی کے موڑ پر ٹونی اور شبیر کی گاڑی بھی پہنچ چکی تھی تاہم وہ اترے نہیں تھے۔ میں نے غیر محسوس طور پر انہیں اشارہ دے دیا کہ انہیں میرے پیچھے آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ گاڑی میں ہی بیٹھے رہے۔

میں اس شخص کے ساتھ چل دیا۔ وہ خاموش اور فکر مند سا نظر آرہا تھا۔ پھر اس نے بغور میرے چہرے کی طرف دیکھا۔ شاید وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ میں گردوپیش کو دیکھ کر ناک بھوں چڑھا رہا ہوں یا نہیں۔ میں اطمینان سے چلا جارہا تھا۔ مجھے ایسی جگہوں پر جانے میں حقیقتاً کبھی کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ میرا بچپن اور لڑکپن جن گلی کوچوں میں گزرا تھا وہاں ان سے ذرا زیادہ کشادگی اور سبزہ ضرور تھا کیوں کہ وہ گاؤں کی گلیاں تھیں لیکن ماحول یہاں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھا۔

"میں نے ابھی تک آپ کا نام ہی نہیں پوچھا۔" میں نے کہا۔

"سجاد نسیم۔" اس نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جواب دیا "اور۔۔۔۔ کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں؟"

میں نے اسے اپنا نام بتایا۔ اس نے مزید کچھ جاننے کی کوشش نہیں کی۔ مزید چند قدم چلنے کے بعد وہ رک گیا۔ اس کا مکان دیگر مکانوں کی نسبت پھر بھی کچھ بہتر تھا۔ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے اس نے یوں دروازے پر دستک دی گویا اپنے نہیں، کسی اور کے گھر آیا ہو۔

دروازہ کیا کھلا گویا تاریک بادلوں کے عقب سے چاند طلوع ہوگیا۔ اتنا حسین چہرہ کم از کم یہاں دیکھنے کی مجھے توقع نہیں تھی۔ مگر یہ چاند چہرہ اداس تھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ناامیدی دھندلاہٹیں پھیلی ہوئی تھیں، سرمئی شاموں نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ اس چہرے کی چاندنی کچھ زرد زرد سی تھی۔ اداس چاندنی تھی۔ اور ویران راتوں کی چاندنی!

اس کے بال سیدھے سادے انداز میں بنے ہوئے تھے ان میں چاندی کے تار جھلملا رہے تھے۔ لباس نہایت معمولی سادہ تھا مگر خدوخال کا حسن اس میں بھی نمایاں تھا۔ شاید وہ شعلہ رہی ہو مگر اب اس پر بے بسی تہیں جما رہی تھی۔ اگر وہ [illegible] تھی تو اب اس پر راکھ کی تہ جمنے لگی تھی۔

سجاد کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے [illegible] پھر دوپٹہ درست کرتے ہوئے ایک طرف کو ہٹ گئی۔

"یہ۔۔۔۔ میری بیٹی سارہ ہے۔" سجاد نسیم کے لہجے میں نہ [illegible] کیوں ارتعاش سا آگیا۔ جیسے وہ کسی جرم کا اعتراف کررہا ہو۔ [illegible] کے چہرے پر صرف آنکھیں سجاد کی تھیں۔ موٹی موٹی آنکھیں۔ اور کسی بھی نقش میں سجاد کی کوئی مشابہت نہیں ویسے بھی سجاد سانولا تھا اور لڑکی حد سے زیادہ گوری۔ ممکن ہے [illegible] کی ماں ایسی رہی ہو اور وہ ماں پر ہی گئی ہو اور یہ بھی کچھ بعید [illegible] تھا کہ خود سجاد رنگ روپ کے معاملے میں نوجوانی میں بہتر [illegible] بعض لوگ جوانی میں بہت کھلے کھلے ہوتے ہیں مگر مصائب کی دھوپ میں ناصریاں گلی کوچوں میں دھکے کھاتے کھاتے ان [illegible] خدوخال پر ایسے رنگ چڑھ جاتے ہیں کہ اصل صورت پہچانی [illegible] جاتی۔

لڑکی نے مرمریں ہاتھ اٹھا کر مجھے سلام کیا اور جلدی سے چلی گئی۔ سجاد نے اسے میرے بارے میں کچھ بتانے کی ضرو[رت] نہیں سمجھی۔ ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں کھڑے تھے جو [illegible] کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس میں چند کرسیاں اور تپائی تھی۔ اسی میں ایک دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ سارہ دروازے سے اندر گئی تھی۔

"تشریف رکھئے" سجاد نے ایک بہتر کرسی کی طرف اشار[ہ کیا] پھر ہاتھ ملتے ہوئے بولا "میری بیوی کئی برس سے بیمار ہے۔ عرصے سے وہ بستر پر ہے۔ میرا معمول ہے کہ باہر سے آتا ہو[ں تو] سب سے پہلے اسے دیکھنے جاتا ہوں۔ اگر آپ برا محسوس نہ کر[یں تو] میں پہلے ایک نظر اسے دیکھ آؤں۔ پھر آپ کے پاس بیٹھتا ہوں"

"ضرور۔ ضرور" میں نے کرسی پر بیٹھ کر اطمینان سے [illegible] پسارتے ہوئے کہا۔

وہ ممنونیت بھرے انداز میں سرہلا کر اندر چلا گیا اور [کمرے] میں سکوت چھا گیا۔ باہر گلی میں کہیں دور لڑتے جھگڑتے بچوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن مکان کے اندر سے [کوئی] آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید مکان خاصا کشادہ [تھا] سجاد سرگوشیوں میں اپنی بیوی اور بیٹی سے بات کررہا تھا۔

[چ]ند لمحے بعد وہ لوٹ آیا۔ اب قدرے مطمئن نظر آرہا تھا۔ [میرے] مقابل بیٹھتے ہوئے بولا "خدا کا شکر ہے، میری بیوی اس وقت [ت]کلیف میں نہیں ہے۔"

"انہیں کیا بیماری ہے؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"غربت بجائے خود سب سے بڑی بیماری ہے۔" وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولا "سو بیماریوں کی جڑ ہے۔ جس طرح [غربت] کی وجہ سے معمولی سے زخم میں بھی انفیکشن ہوجاتی ہے اور [ناس]ور بن جاتا ہے اسی طرح غربت کی وجہ سے کبھی معمولی سے [معمولی] بیماریاں طول کھینچ کر کچھ سے کچھ ہوجاتی ہیں۔ خیر۔۔۔۔" اس [نے] سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا "آپ ان باتوں کو چھوڑئے۔ یہ بتائیے میں [آپ] کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟"

"میں آپ سے صرف نصیر نواز کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا [ہوں]۔ اور اس سے آپ کے تعلق کے بارے میں بھی۔" میں نے [نرم] لہجے میں کہا۔

اس نے ٹوپی اتار کر گود میں رکھ لی اور سفید بالوں میں انگلیاں [پھیر]تے ہوئے چھت کو گھورنے لگا۔ چند لمحے بعد وہ بولا "نصیر نواز [ایک] آسیب ہے جو کئی سال پہلے مجھ پر مسلط ہوگیا تھا۔ یا پھر شاید [میں نے] خود ہی اسے اپنے آپ پر مسلط کرلیا تھا۔ ہم کس طرح [ملے] ہوئے اور کس طرح ہمارے مراسم بڑھے، یہ ایک طویل [کہانی] ہے۔ میں اس کی تفصیل میں جا کر آپ کو بور نہیں کروں گا۔ [ب]س یہ سمجھ لیجئے کہ اس کی فلمی دنیا میں شناسائی تھی اور اسے [ل]وگوں سے معاملت کرنے کا ہنر آتا تھا۔ شاید آپ کو اندازہ ہو [کہ] فلمی لوگوں سے معاملت کرنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے [ایک] ہے۔ وہ کچھ بھی نہیں جانتا تھا، فلمی دنیا سے متعلق کوئی بھی [کام] اسے نہیں آتا تھا مگر نہ جانے کس طرح فلم والوں سے اس کی [شناسائ]یاں تھیں اور وہ ان سے معاملہ کرنا جانتا تھا۔۔۔۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اسے فلمی کہانی وغیرہ بھی لکھنی نہیں [آتی] تھی؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" اس نے نفی میں سرہلایا "وہ پڑھا لکھا ضرور ہے مگر [کہ]انی کے فن سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس نے فلمی دنیا میں [ج]و پہلی کہانی اپنے نام سے دی تھی اور جو سپرہٹ ہوئی تھی، وہ [اص]ل میری لکھی ہوئی تھی۔"

"اوہ!" میں گہری سانس لئے بغیر نہ رہ سکا۔

"تقسیم ہند سے قبل بمبئی میں، میں نے فلمی دنیا میں چند ایک [اسکر]پٹس کی زبان و بیان وغیرہ درست کرنے کا کام کیا تھا۔" وہ [دھیم]ے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس زمانے میں [اسکر]پٹ پر بہت محنت کی جاتی تھی۔ بہت سے لوگ اس پر باری [باری] کام کرتے تھے۔ اس کی نوک پلک سنوارتے تھے اور اسکرین [پلے] کو بہتر بنانے کے سلسلے میں اپنی اپنی رائے دیتے تھے لیکن وہ [س]ب اہل ہنر ہوتے تھے۔ یعنی اگر گانوں کو بہتر بنانے کے سلسلے میں مشورہ لیا جاتا تھا تو کسی شاعر سے ہی لیا جاتا تھا۔ زبان و بیان بہتر بنانے کا کام کسی ثقہ ادیب کو ہی سونپا جاتا تھا۔ آج کل کی یہاں کی فلمی دنیا میں بھی اسکرپٹ میں بڑی اکھاڑ پچھاڑ ہوتی ہے مگر وہ غیر متعلق لوگ کرتے ہیں۔ محض اس لئے کہ فلم میں ان کی اہمیت ہوتی ہے مثلاً ہیرو کو کوئی مکالمہ پسند نہیں تو وہ اسے تبدیل کروا دیتا ہے۔ ہیروئن کو کوئی چوئیشن پسند نہیں تو وہ اسے تبدیل کروا دیتی ہے۔ ڈسٹری بیوٹر کو کوئی کردار پسند نہیں تو وہ اسے نکلوا کر وہاں اس لڑکی کو شامل کروا دیتا ہے جو اسے ذاتی طور پر پسند ہوتی ہے یا جو اس کے عشرت کدے کے دو چار چکر لگا چکی ہوتی ہے۔ اس طرح اسکرپٹ کا حلیہ بگڑتا ہے سنورتا نہیں۔ اس کے باوجود بہرحال فلمیں ہٹ ہوتی ہیں کیوں کہ بنیادی کہانی کی کچھ نہ کچھ جان ان میں ہوتی ہے۔ اور کچھ اب فلم بینوں کے ذوق بھی بدل چکے ہیں، رجحانات تبدیل ہوچکے ہیں۔"

روانی سے بات کرتے کرتے وہ یکدم کچھ چونکا اور گویا سنبھل کر بولا "اوہ۔ معاف کیجئے گا۔ میں تو غیر ضروری تفصیلات میں چلا گیا۔ یہ باتیں تو آپ کو معلوم ہی ہوں گی۔ میں آپ کو بتا رہا تھا کہ بمبئی کی فلمی دنیا میں، میں نے معمولی سی تنخواہ پر کچھ اسکرپٹس پر کام کیا تھا۔ وہیں میں نے اپنی ذاتی دلچسپی کی بنا پر اسکرپٹ کی ٹیکنک کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور بہت کچھ سیکھا تھا۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ اٹھانے کی نوبت نہ آسکی اور ملک تقسیم ہوگیا۔ میں یہاں چلا آیا۔ جب ہجرت کے زخم کچھ مندمل ہوئے تو میں نے کئی ماہ کی محنت سے ایک اسکرپٹ لکھا۔ میں ان دنوں گھر کا چولہا جلتا رکھنے کے لئے ایک آڑھتی کے پاس منشی گیری کررہا تھا۔ وہ اسکرپٹ لے کر میں نے فلمی دنیا میں کافی دھکے کھائے۔ کہیں تو میری خستہ حالی دیکھ کر اسٹوڈیو کے چوکیدار نے مجھے گیٹ سے ہی بھگا دیا اور کہیں فلم ساز یا ڈائریکٹر نے میری فائل کا ایک ورق الٹے بغیر مجھے اپنے دفتر کے دروازے سے ہی چلتا کردیا۔ یا بہت مہربانی کی تو ایک پیالی چائے پلادی اور معذرت کرکے اپنے سیٹ پر چلا گیا۔ آخر کار بددل ہوکر میں نے اس اسکرپٹ کو اسی گھر کے ایک کونے میں پھینکا اور یکسوئی سے اپنے ہی کھاتوں میں ہی دل لگالیا۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر اس نے میری طرف دیکھا اور مجھے ہمہ تن گوش پاکر سلسلۂ کلام جوڑا "پھر نصیر نواز سے میری ملاقات ہوگئی۔ شاید اس نے کہیں مجھے اسٹوڈیوز میں دھکے کھاتے دیکھ لیا تھا۔ بہرحال ۔۔۔ ملاقات بظاہر اتفاقی ہوئی تھی۔ چند ملاقاتوں کے بعد باتوں باتوں میں اس اسکرپٹ کا ذکر نکلا۔ نصیر نواز نے وہ اسکرپٹ مجھ سے لے لیا اور غائب ہوگیا۔ پندرہ دن بعد وہ دوبارہ ملا تو اس نے ایک ہزار روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیئے اور نوید سنادی کہ اس اسکرپٹ پر فلم بنے گی لیکن مصنف کے طور پر نام اس کا آئے گا کیوں کہ بقول اس کے 'پروڈیوسر میرا نام سن کر شاید

اسکرپٹ کو ہاتھ بھی نہ لگاتا۔ سچی بات ہے اس وقت مجھے نام آنے یا نہ آنے کے مسئلے سے ذرا بھی دلچسپی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ میں تو ایک ہزار روپے دیکھ کر ہی سب کچھ بھول گیا تھا۔ میرے حالات کچھ ایسے تھے اور ضروریات نے مجھے ایسا مجبور کر رکھا تھا کہ ایک ہزار روپے مجھے کسی خزانے سے کم نہیں لگے تھے۔ نصیر نواز نے فرمائش کی کہ میں فلم ریلیز ہونے سے پہلے ہی زبردست محنت سے ویسے ہی تین چار زوردار اسکرپٹ اور لکھ دوں۔ میرے لئے تو گویا یہ ایک بہت بڑا وسیلہ پیدا ہوگیا تھا۔ میں نے بڑے دل و جان سے تین چار اسکرپٹ اور لکھ ڈالے۔ اسکرپٹ لیتے ہی نصیر نواز ہزار روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔ مجھے تو اپنی منشی گیری کی نوکری بھی غیر اہم لگنے لگی کیوں کہ وہاں سے مجھے چھ سو روپے ماہوار ملتا تھا۔"

اپنے خالی ہاتھوں کو پھیلا کر دیکھتے ہوئے وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا "پھر وہ پہلی فلم ریلیز ہوگئی جس کی کہانی میری لکھی ہوئی تھی۔ فلم سپرہٹ گئی۔ فلمی دنیا کا چلن تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ جو فلم ہٹ ہو جائے اس سے تعلق رکھنے والی پوری ٹیم کی قسمت راتوں رات پلٹ جاتی ہے۔ نصیر نواز بھی ایک سپرہٹ مصنف کے طور پر سامنے آگیا اور راتوں رات اس کے دروازے پر ڈائریکٹرز' پروڈیوسرز کی لائن لگ گئی۔ ذیر، وقت کے لئے اس نے پہلے ہی مجھ سے تین چار کہانیاں لے کر رکھ لی تھیں۔ اس نے سب سے زیادہ بولی لگانے والوں کو کہانیاں تھمادیں۔ اور اس کے بعد تو بس سلسلہ چل نکلا۔ کہانیاں میں لکھ کر دیتا رہا' وہ انہیں بیچتا رہا۔ پھر اس نے اور کاموں میں بھی ہاتھ ڈال دیا۔ ڈسٹری بیوشن..... پروڈکشن..... اور نہ جانے کیا کچھ۔ سنا ہے آج کل ایک کروڑ پتی خاتون بھی اس کی مٹھی میں ہے۔ اسے وہ پروڈیوسر اور فائنانسر کے طور پر انڈسٹری میں لایا ہے۔ معلوم نہیں اس بے چاری کا انجام کیا ہوگا۔" وہ ایک آہ سی بھر کر خاموش ہوگیا۔

"اتفاق سے میں اس عورت سے بھی مل چکا ہوں۔" میں نے کہا "وہ ہماری ہمدردیوں کی کچھ زیادہ مستحق معلوم نہیں ہوتی۔ زبردست عیاش اور سفاک عورت معلوم ہوتی ہے۔"

"نصیر نواز سے زیادہ عیاش اور سفاک شاید وہ نہ ہو۔" سجاد نے خیال ظاہر کیا "اس جیسا سنگدل اور بے حمیت شخص میں نے زندگی میں نہیں دیکھا۔"

"سجاد صاحب! میں بہت کم باتوں پر حیران ہوتا ہوں لیکن یہ سب کچھ سنا کر آپ نے واقعی مجھے حیران کردیا ہے۔ یقین نہیں آرہا..... کیا واقعی اس نے آج تک ایک بھی کہانی نہیں لکھی اور اتنا کامیاب' اتنا معروف مصنف بنا ہوا ہے؟"

"آپ جو قسم کہیں میں وہ کھانے کے لئے تیار ہوں۔ دنیا میں اپنی بیٹی مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ میں اس کی قسم کھانے کے لئے تیار ہوں۔"

"نہیں' نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" میں شرمندگی سے کہا "میں تو صرف اپنی حیرت کا اظہار کررہا"

"کبھی کبھی مجھے خود بھی حیرت ہوتی ہے۔" سجاد بولا عرصے سے فلمی دنیا کی جڑوں میں اترا ہوا ہے۔ اتنی کہانیاں اس کے ہاتھ سے گزری ہیں۔ فلموں کی کام ناکامیوں پر اس کی گہری نظر ہوتی ہے۔ وہ اگر چاہتا تو ا بھی طبع آزمائی کرنا سیکھ سکتا تھا۔ اتنا عرصہ فلم انڈسٹری سیٹ لگانے والے مزدور اور لائٹ مین تک مختلف شعبہ مارنے لگتے ہیں لیکن اس نے آج تک ایک صفحہ کوشش نہیں کی۔"

"شاید وہ حد سے زیادہ آسانی پسند ہے۔ اسے جب بنی بنائی چیز آسانی سے دستیاب ہے تو پھر دماغ کھ ضرورت ہے۔"

"جی ہاں۔ میں نے خود ہی اپنے آپ کو مکمل طور پر بنائے رکھا۔" سجاد افسردگی سے بولا "مجھے یہ بھی معلوم ایک اسکرپٹ کا چالیس سے پچاس ہزار کے درمیان لیکن میں پھر بھی خاموشی سے ایک ہزار لیتا رہا۔ کیوں کہ آگئی تھی کہ میں اس سے خوف زدہ بھی رہنے لگا تھا۔ وہ خطرناک آدمی ہے۔ اس کے دل میں رحم یا ملامت کو نہیں۔ آپ اسی سے اندازہ کرلیں کہ اگر اس میں اح کوئی چیز ہوتی تو وہ اتنا ضرور سوچتا کہ جس چیز سے وہ بلا پچاس ہزار کمارہا ہے اس کا ایک ہزار معاوضہ تو بہت وہ اس میں تھوڑا بہت ہی اضافہ کردیتا مگر اس نے کبھی ا پر بات بھی کرنا پسند نہیں کی بلکہ جب میں نے اپنی ضرو مجبور ہو کر تھوڑی بہت چوں چاں شروع کی تو اس نے میں کہہ دیا کہ زندگی کے معاملات میں اس کے نظریات ہیں۔ اور ان میں سے ایک نظریہ یہ ہے کہ اگر سونے دینے والی مرغی بھی زیادہ کڑ کڑ کرنے لگے تو اسے ذبح گندے نالے میں پھینک دو' اگر تم مقدر کے تیز ہو۔ دوسری مرغی مل جائے گی۔ یہ تھا اس کا جواب۔"

"بہت خوب" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"آسودہ حال تو میں کبھی بھی نہیں رہا۔" سجاد جوڑتے ہوئے بولا "لیکن بیوی کی بیماری نے مجھے کچھ ز دست' قلاش اور مجبور کردیا۔ اوپر سے بیٹی کا بوجھ بھی تھا۔ غریب آدمی کی بیٹی تو خوب صورت ہو تب بھی اسے سے ہی میسر آتا ہے۔"

بیٹی کی شاید عمر لمبی تھی کہ جونہی اس کا ذکر آیا ٹرے اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے صرف میری طرف دیکھا پھر اس کی نظریں پہلے ہی کی طرح بوجھ سے جھک گئیں۔ دوپٹہ اس نے کس کر بالوں اور چ

ا تھا۔ شاید اس کا مقصد بالوں کی چاندی کو چھپانا بھی تھا۔ چائے رکھ کر وہ خاموشی سے واپس چلی گئی۔ چائے کے ساتھ بھی تھے۔ مجھے بے حد شرمندگی ہوئی۔ نہ جانے بچاری سارہ س طرح اور کس کے ہاتھ منگوائے ہوں گے۔

"آپ کو یہ تکلف نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ بات میں محض نہیں کہہ رہا۔ مجھے حقیقتاً شرمندگی ہورہی ہے۔" میں نے

"مجھے معلوم ہے' یہ آپ کے شایان شان نہیں ہیں۔ شاید ں دیکھ کر آپ کو ابکائی آرہی ہو لیکن اگر آپ انہیں چکھ لیں تو میرا دل بڑا ہوجائے گا۔ سارہ کو بھی یقیناً خوشی ہوگی۔ انسان کو بان کر ضرور خوشی ہوتی ہے کہ کسی بڑے آدمی نے اسے اور اس چیزوں کو حقیر نہیں سمجھا۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"اگر میرے ان بسکٹوں کو کھانے سے آپ کو کوئی خوشی مل ہے تو میں یہ سارے کے سارے ہڑپ کرسکتا ہوں۔" میں نے راتے ہوئے کہا اور بسکٹوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کردیا۔ ں غریبوں کو دیکھ کر دل کی حالت واقعی عجیب سی ہوجاتی ہے۔ وہ خواہ فاقے سے ہوں مگر کسی کی تواضع کے لئے پڑوسی سے ادھار ۔ کر مٹھائی منگوالیں گے۔ یہ جذبے اب دنیا سے رخصت تے جارہے ہیں مگر جہاں نظر آتے ہیں دل کو پانی کردیتے ہیں۔

میں نے چمکتا ہوا کپ اٹھا کر چائے کی چسکی لی اور مجھے حقیقتاً لطف آیا۔ اس چائے میں خلوص کی حرارت اور وضع داری کی ماس تھی۔ سجاد نسیم اپنا کپ تھامے افسردگی سے چھت کی طرف یکھتے ہوئے بولا "سارہ کی عمر پینتیس سال ہے اور کبھی کبھی رات کو چیخ مار کر سوتے سے اٹھ بیٹھتی ہے۔ اس کے ناخن ہتھیلیوں میں ڑجاتے ہیں۔ بہت دیر تک وہ ہوش و حواس میں نہیں آتی اور ں کا جسم تختہ بنا رہتا ہے۔ ہوش و حواس بحال ہونے کے بعد بھی یک دو دن تک وہ گم صم سی رہتی ہے۔ اگر میں جاہل یا حد سے یادہ سادہ لوح آدمی ہوتا تو یہی سمجھتا کہ لڑکی پر کوئی سایہ وغیرہ ہے۔ تعویذ گنڈے والے پیروں فقیروں اور عاملوں کے پاس جاتا لیکن ہی بھی بہت بڑا عذاب ہے۔ میں بھی عذاب آگہی میں گرفتار ہے۔ مجھے اصل مرض معلوم ہے علاج میری دسترس سے باہر ہے۔ میں اپنی معصوم بیٹی کا مجرم ہوں۔ وہ بیٹی جو خاموشی سے تیس برس کی عمر کو پہنچ گئی مگر جس نے کبھی گھر کی چھت پر چڑھ کر ڈیر کے پار نہیں جھانکا۔ جس نے کبھی چوری چھپے دروازے کی ری سے گلی میں نظر نہیں ڈالی۔ میں اس کا مجرم ہوں کہ اسے اس ر نہیں بھیج سکا جہاں اسے ہونا چاہئے تھا۔ شہنائی کی گونج میں ے رخصت نہیں کرسکا۔ مگر وہ اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتی ہے ر سوچتی ہے کہ وہ مجھ پر بوجھ بنی ہوئی ہے۔ اسی احساس سے اس ں پلکیں جھکی جھکی رہتی ہیں۔"

"لڑکی کی کہیں بات ہی نہیں چلی یا روپے پیسے کی وجہ سے....؟"

"میں اپنی کہانی کے اسی اہم موڑ کے بارے میں آپ کو بتانے لگا تھا۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا "تقریباً دو سال پہلے ایک جگہ خدا خدا کرکے سارہ کی بات پکی ہوئی تھی۔ میں ایک باپ کی نظر سے دیکھتا تھا تو لڑکا مجھے کسی اعتبار سے بھی سارہ کے لائق نظر نہ آتا تھا لیکن سارہ کی بڑھتی ہوئی عمر نے مجھے وہ رشتہ قبول کرنے پر مجبور کردیا مگر یہ بھی شاید قسمت کی ستم ظریفی تھی کہ منگنی کے کچھ دن بعد لڑکے کو قطعی غیر متوقع طور پر دبئی جانے کا موقع مل گیا۔ دو سال کے کنٹریکٹ پر وہاں ملازمت کرکے وہ کچھ رقم کما لایا اور گھر کے حالات ذرا بدل گئے۔ آج کل بھی وہ دوبارہ باہر جانے کے لئے بھاگ دوڑ میں لگا ہوا ہے اور آثار بتاتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوجائے گا۔ بجائے اس کے کہ حالات کی اس تبدیلی پر وہ قدرت کے شکر گزار ہوتے اور جلد از جلد لڑکے کی شادی کے فریضے سے سبکدوش ہونے کی کوشش کرتے' الٹا ان کی تو نظریں ہی بدل گئیں۔ لڑکے کے والدین صاف طور پر جتانے لگے کہ ان کے لڑکے کو رشتوں کی کیا کمی ہے' کئی اچھے گھروں کے رشتے موجود ہیں۔ فلاں گھرانہ جہیز میں یہ کچھ دینے کو تیار ہے اور فلاں نے وہ کچھ دینے کی بات کی ہے۔ کچھ عرصے اس قسم کی باتوں کے بعد آخر کار انہوں نے کھل کر دل کی بات کردی کہ انہیں فلاں فلاں چیزوں پر مشتمل جہیز چاہئے۔ باقاعدہ فہرست بنا کر دے دی انہوں نے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا کہ اگر ہم ان کے مطالبات پورے نہ کرسکیں تو رشتہ ختم سمجھا جائے۔"

"اوہ..... گھٹیا قسم کی خود غرضی اور ہوس کی وہی پرانی کہانی!" میں نے تاسف سے کہا۔

"جی ہاں' وہی پرانی کہانی جو ہر روز نہ جانے کتنے والدین کے دلوں پر نئے زخم لگاتی ہے۔" وہ افسردگی سے بولا "بہرحال..... ان کے اس مطالبے کے بعد پہلی بار میں نے نصیر نواز سے اپنے لین دین سے بڑھ کر کچھ مانگنے کے لئے ہاتھ پھیلایا۔ میں نے پھر بھی اسے یہ احساس دلانے کی کوشش نہیں کی کہ میرا اس پر کچھ حق بنتا ہے۔ یا میری وجہ سے اس نے جو لاکھوں روپیہ' عزت اور شہرت کمائی ہے' میں اسی میں سے معمولی سا حصہ مانگ رہا ہوں۔ بلکہ میں نے تو اس سے قرض یا بھیک کی طرح رقم مانگی تھی۔"

"کتنی رقم؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"لڑکے والوں کے مطالبات پورے کرنے کے لئے مجھے کم از کم ایک لاکھ روپیہ درکار تھا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا "اور ایک لاکھ کا سن کر نصیر نواز کی آنکھیں یوں پھیل گئیں جیسے میں نے اس سے ہفت اقلیم کی دولت مانگ لی ہو۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ میں کوئی نشہ وغیرہ کرکے آگیا ہوں اور میرے ہوش و حواس ٹھکانے پر نہیں ہیں۔ جب اسے یقین ہوگیا کہ میں نشے میں نہیں ہوں تو اس نے سمجھا کہ شاید میں اسے بلیک میل کرنے کی کوشش کا آغاز کررہا ہوں۔ یہ سمجھ کر وہ آپے سے باہر ہوگیا اور اس نے مجھے سنگین نتائج

بھگتنے کی دھمکیاں دیں۔ مجھے معلوم ہے وہ اس قسم کی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت رکھتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ ایک اٹھارہ سال کے لڑکے کو اس نے محض اس لئے قتل کرا دیا تھا کہ نوجوانی کے جوش میں اس نے نصیر کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تھی۔ ایک اور شخص پر اس نے رقابت کے کسی چکر میں پیشہ ور قاتلوں سے حملہ کرایا۔ وہ جان بچانے میں تو کسی طرح کامیاب ہو گیا لیکن عمر بھر کے لئے معذور ہو گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ شخص یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس پر حملہ نصیر نواز نے کرایا ہے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔"

"اوہ... خاصی خطرناک چیز معلوم ہوتا ہے یہ شخص!" میں نے اس موقع پر قدرے حیرت کا اظہار کرنا مناسب سمجھا۔

"کم از کم مجھ جیسے مسکین آدمی کا اس سے دہشت زدہ رہنا بجا ہے۔ میری حیثیت ہی کیا ہے؟ ایک غلیظ بستی میں رہنے والا حقیر سا کیڑا جسے ذرا سا بھی طاقتور کوئی شخص کچل کر گزر سکتا ہے۔ جس کے بعد میری بیوی اور بیٹی جو پہلے ہی ایک کربناک زندگی گزار رہی ہیں' بالکل ہی بے آسرا ہو جائیں گی۔ اس لئے میں نے نصیر نواز کے سامنے اکڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ منت سماجت کے انداز میں ہی اپنا مسئلہ اسے سمجھایا مگر اس نے میری ضرورت پوری کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ دو ٹوک انداز میں کہہ دیا کہ وہ اتنی بڑی رقم ہرگز مجھے نہیں دے سکتا۔ جس نے میری دن رات کی محنت سے لاکھوں کما کر جیب میں ڈالے تھے اس کے لئے ایک لاکھ مجھے دینا بعید از تصور تھا۔ جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اس نے ایک ایسی بات کہی کہ ایک باحمیت باپ کی حیثیت سے مجھے اس کو وہیں قتل کر دینا چاہئے تھا مگر میں بزدل... نالی کا کیڑا یہ بھی نہ کر سکا۔ صرف تلملا کر رہ گیا۔ اور آج تک اپنے آپ کو کوس رہا ہوں۔"

"اس نے کیا کہا؟" میں نے آہستگی سے پوچھا "اس سوال سے میرا مقصد آپ کے زخموں پر نمک چھڑکنا نہیں ہے بلکہ میں نصیر نواز کی تصویر اپنے ذہن میں بالکل واضح کر لینا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک لمحے اپنے ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلیاں مروڑتا رہا پھر سرگوشی سے ذرا ہی بلند آواز میں بولا "وہ مجھے سمجھانے لگا' بڑے میاں! یہ کیا شرافت' عزت اور تقدس کے فرسودہ چکروں میں پڑے ہوئے ہو۔ اگر بیٹی کی شادی کرنا تمہارے خیال میں بہت ہی ضروری ہے اور اس کے لئے ایک لاکھ روپیہ حاصل کرنا بھی ضروری ہے تو میں ایک آسان سی ترکیب بتا رہا ہوں۔ میرا ایک بہت بڑا سیٹھ جاننے والا ہے۔ ایک ہفتے کے لئے بیٹی کو اس کے پاس بھیج دو۔ میں نے اسے دیکھا ہوا ہے۔ خوب صورت لڑکی ہے۔ سیٹھ ایسی لڑکیوں کا قدردان ہے۔ رنڈوا ہے۔ اپنے عالیشان بنگلے میں تنہا رہتا ہے۔ سارہ بہت عیش و عشرت سے آٹھ دس دن اس کے گھر مہمان رہے گی اور خاموشی سے ایک لاکھ روپیہ لے کر واپس آجائے گی۔ کسی کو کانوں کان بھی پتا نہیں چلے گا۔ فوراً ہی دھوم دھام سے اس کی شادی کر دینا۔ کیا ز... گا۔ اس نے یہ سب کچھ کہا اور میں نے سن لیا..." ... رندھ سی گئی۔

غیر ارادی طور پر میرا سر جھک گیا۔ وہ ایک لمحے ... بعد پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا "میں نے کئی ایسی کہا... ہیں جن میں لڑکیوں کے باپ یا پھر فلم کے ہیرو ایس... چھوٹی چھوٹی باتوں پر ولن کو قتل کر دیتے ہیں۔ گنڈاسے ... ٹکڑے کر دیتے ہیں۔ لاٹھیوں سے اس کا کچومر نکال ... گولیوں سے اس کا جسم چھلنی کر دیتے ہیں لیکن میں ... طمانچہ بھی رسید نہ کر سکا۔ آپ نے دیکھا' فلمی یا کتابی ... حقیقی زندگی میں کتنا فرق ہوتا ہے؟ غم و غصے کا سانپ ... کنڈلی مارے بیٹھا ہے اور اندر ہی اندر بس گھول رہا ہے ... نس میں زہر پھیل چکا ہے مگر شاید ابھی اس میں اتنی قوت ... کہ یہ کسی اور کو مار سکے۔ فی الحال تو یہ صرف مجھے ... دھیرے ہلاک کر رہا ہے۔"

سارہ کی معصوم اور افسردہ صورت میری نگاہوں ... گئی۔ اگر یہ بات اسے معلوم ہو جاتی تو اسے نہ جانے ... صدمہ پہنچتا' کتنی تذلیل کا احساس ہوتا۔ میں نے ... پوچھا "آپ نے غصے میں یا کسی جذباتی کیفیت میں اپنی ... ان باتوں کا تذکرہ نہیں کیا؟"

"توبہ کیجئے صاحب!" وہ طویل سانس لے کر بولا ... ایسی ذلت کی کہانی اسے کیوں کر سنا سکتا تھا۔ بلکہ آپ کو حیرت ہو گی کہ میری بیوی اور بیٹی کو تو یہ بھی علم نہیں کہ ... کو فلمی کہانیاں لکھ کر دیتا ہوں یا اس سے میرا کوئی معاملہ ... یہی سمجھتی ہیں کہ میں معمولی معاوضے پر مختلف اداروں ... اسکرپٹس کی تصحیح کا کام کرتا ہوں۔ برسوں گزر گئے مگر ... کامیابی سے اس معاملے کو راز رکھا ہوا ہے۔"

"میرے خیال میں یہ آپ نے اچھا ہی کیا ہے ... قدرے طمانیت سے کہا۔

"میری بیوی کی تو حالت ہی ایسی نہیں کہ اسے کو... کوئی اشتعال انگیز بات سنائی جا سکے۔ بیٹی کو بھی میں آ... خوش خبری تو سنا نہیں سکا' اس لئے کوئی بری خبر بھی ا... حوصلہ نہیں پڑتا۔ میں باہر کی باتیں باہر ہی رکھتا ہوں ... انہیں بتائے بغیر ایک پرانے شناسا سے ملنے کا ارادہ ... ٹاؤن گیا تھا۔ کبھی وہ بھی میری ہی طرح مفلس تھے او... خاصی گہری شناسائی تھی۔ پھر رفتہ رفتہ قسمت ان پر ... گئی۔ ان کا چھوٹا سا کاروبار پھیلتا چلا گیا اور اسی رفتار ... سے دور ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ گارڈن ٹاؤن کی ایک بہ... کوٹھی میں پہنچ گئے۔ بہت مدت سے ان سے ملاقات ... تھی۔ ایک آدھ مرتبہ سر راہ ملے بھی تو انہوں نے بڑی

پہچانا۔ پھر بھی میں ایک موہوم سی امید کے سہارے ان کے پاس چلا گیا تھا کہ..... شاید وہ بھولے بسرے، پرانے تعلق کے حوالے سے میری کچھ مدد کردیں۔ لیکن وہ ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ ان کی بیگم بھی پرانے وقتوں سے مجھے جانتی ہیں۔ وہ گھر پر تھیں۔ انہوں نے اتنی زحمت ضرور کی گیٹ تک آگئیں لیکن انہوں نے مجھے اندر بلانا گوارا نہیں کیا۔ گیٹ پر سے ہی یہ بتا کر رخصت کردیا کہ صاحب ملک سے باہر گئے ہیں۔ وہیں سے الٹے قدموں واپس آرہا تھا جب آپ نے مجھے لفٹ دی۔"

"دنیا اسی کا نام ہے سجاد صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور چائے کا کپ خالی کرکے تپائی پر رکھ دیا "اچھا یہ بتایئے' جہاں آپ اپنی بچی کی شادی کرنا چاہ رہے ہیں' کیا آپ کو امید ہے کہ وہ وہاں خوش رہے گی؟"

"مستقبل کے بارے میں یقین سے تو کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خصوصاً انسان تو ایسی ناقابلِ اعتبار مخلوق ہے کہ اس کے بارے میں تو کہا ہی نہیں جاسکتا۔ کوئی نہیں بتا سکتا کہ کب کس کا رویہ کیا ہوجائے۔ بہرحال مجھے کافی حد تک یقین ہے کہ اگر ان لوگوں کے مطالبات پورے ہوجائیں تو وہ لڑکی کی قدر کریں گے۔ سارہ خود بھی بڑی صابر لڑکی ہے۔ وہ ان کے قریب رہے گی تو انہیں اس کی خوبیوں کا پتا چلے گا۔ دوسری بات یہ ہے جناب... کہ سارہ کے سامنے کوئی چوائس نہیں ہے۔ لڑکی نوخیز ہو' اس کے سامنے رشتوں کی بہتات ہو تب تو سو باتیں سوچی جاسکتی ہیں۔ ایک سماجی ضرورت ہے' وہ پوری تو کرنی ہے۔ اور شادی تو کہیں بھی کی جائے' بہرحال ایک جوا ہے۔ آپ خوشیاں جیت بھی سکتے ہیں اور ہار بھی سکتے ہیں۔ رسک تو لینا ہی پڑتا ہے۔"

"درست کہا آپ نے۔" میں نے کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

"اگر آپ شادی شدہ ہیں تو میری بات کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔" وہ بولا۔

"میں شادی شدہ نہیں ہوں پھر بھی آپ کی بات کو بہرحال بہتر طور پر سمجھ سکتا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور کوٹ کی جیب سے چیک بک اور قلم نکال کر ایک چیک لکھنے لگا۔

سجاد سمجھا کہ بیٹھے بٹھائے مجھے کوئی دفتری کام یاد آگیا ہے اور میں اسی سلسلے میں چیک لکھنے لگا ہوں لیکن جب میں نے چیک کاٹ کر اس کی طرف بڑھایا تو اس کے چہرے پر حیرت کے آثار نمودار ہوئے "یہ کیا...؟"

"یہ سوا لاکھ کا چیک ہے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "میرا خیال ہے لڑکے والوں کے مطالبات کے علاوہ شادی کے دیگر اخراجات بھی پورے ہوجائیں گے۔ آپ اطمینان سے شادی کی تیاری کریں اور باقی تمام باتوں کو بھول جائیں۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ نصیر نواز سے اگر ملاقات ہو تو تھوڑا سا کھنچاؤ ضرور رکھیں لیکن ہماری اس ملاقات کا یا اس چیک وغیرہ کا کوئی ذکر نہ کریں۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا' پھر چیک لے کر ا... اسے دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر وہ خشک... پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "سر! آپ مجھ سے مذاق تو نہیں کررہے؟"

"میں احساسات کو مجروح کرنے والے مذاق ہرگز پسند... کرتا۔" میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ اس کی طرف بڑھاتے... کہا۔ "چند دن بعد آپ مجھ سے رابطہ قائم کیجئے گا۔ ہم وقت... کرکے چند ضروری باتیں کریں گے۔"

"سر...! مجھے یقین نہیں آرہا۔" وہ متوحش سے لہجے میں...

"قدرت بڑے عجیب عجیب انداز میں انسان سے کام لیتی... اور بڑے ناقابلِ یقین انداز میں بعض لوگوں کے مسائل حل... ہے۔ آپ اس سلسلے میں اب ذہن نہ کھپائیں اور ایک مسئلے... میری بھی تھوڑی سی مدد کریں۔ یہ بھی خدمتِ خلق ہی کے سلسلے... ایک کڑی ہے۔"

میں نے جیب سے رخشندہ عرف بے بی نشاط کی ایک ت... نکالی اور سجاد کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "آپ کی نصیر نواز... بہت ملاقاتیں رہی ہیں۔ آپ نے کبھی اس لڑکی کو تو اس کے... نہیں دیکھا؟"

اس نے تصویر میرے ہاتھ سے لے کر ایک نظر دیکھی... چونک کر بولا "یہ لڑکی کہاں ہے؟ اس کی تو مجھے تلاش ہے... صرف ایک بار مجھے ملی اور حیران کرگئی۔ کیا آپ اس کے متعلق... جانتے ہیں؟ کچھ اتا پتا معلوم ہے اس کا؟ افسوس! مجھے تو اس... بھی نہیں معلوم۔"

مجھے اس کا اشتیاق دیکھ کر قدرے حیرانی ہوئی۔ میں... تاسف سے کہا "جی ہاں۔ اتا پتا تو معلوم ہے لیکن افسوس کہ ا... کوئی اس سے ملنے نہیں جاسکتا اور نہ ہی اب یہ کسی سے ملنے آ... ہے۔"

"کیا مطلب؟" وہ گویا اس مفہوم کو قبول کرنا نہیں چاہتا ت... میں نے اس تک پہنچانا چاہا تھا۔

"کیا آپ نے اخبار میں اس کے قتل کی خبر نہیں پڑھی؟"... نے پوچھا۔

"میں اخبار باقاعدگی سے نہیں پڑھتا۔ کبھی کبھار کسی چا... خانے وغیرہ میں سامنے رکھا ہوا نظر آجائے تو پڑھ لیتا ہوں۔"... روانی میں بولا۔ پھر یکدم جیسے اسے جھٹکا سا لگا۔ اصل لفظ کی ط... اس کا ذہن ذرا تاخیر سے گیا تھا "آپ نے کیا کہا؟ قتل..." اس... حلق سے سرسراتی سی آواز نکلی۔

"جی ہاں۔ اسے چند دن قبل بڑے پُراسرار سے انداز... قتل کردیا گیا ہے۔ یوں تو ہر قاتل ہی سفاک ہوتا ہے لیکن اس... کے قتل میں کچھ زیادہ ہی سخت القلبی کا مظاہرہ کیا گیا۔" میں... بوجھل لہجے میں کہا "بہرحال... اگر آپ اس کا نام نہیں... سنتے تھے تب تو شاید اخبار میں اس کے قتل کی خبر دیکھ کر بھی اس... بارے میں جان نہ پائے۔ کیوں کہ خبر کے ساتھ اس کی لاش کی... بی سی تصویر چھپی تھی جو اس کے زندہ سراپا سے بہت مختلف... ."

"اوہ... تو بے چاری ماری ہی گئی۔" وہ بڑبڑایا۔ اس کے... ے کی درماندگی یک لخت بڑھ گئی۔ بوڑھا تو وہ تھا ہی لیکن اب... ر کور نظر آنے لگا۔ چند لمحے پہلے اسے اپنا مسئلہ حل ہوجانے پر جو... شی حاصل ہوئی تھی شاید وہ اسے بھی بھول گیا۔ سر جھکائے گم صم... بیٹھا رہا۔ کسی گہری سوچ میں تھا۔

آخرکار میں نے کہا "آپ کو اس کے بارے میں جو کچھ بھی... علوم ہے بلاکم و کاست مجھے بتا دیجئے۔ اس لڑکی سے اپنی ہمدردی... بت کرنے کا اب یہی ایک طریقہ ہے۔"

"کیسی معصوم' پُرعزم اور باحوصلہ نظر آتی تھی یہ مجھے... یہ... ی کسی کے دل کا ٹکڑا ہوگی..... میری سارہ کی طرح!" وہ خود کلامی... ے سے انداز میں بولا۔ وہ ایک ٹک اس تصویر کی طرف ہی دیکھے... رہا تھا جو میں نے اسے دی تھی۔ پھر وہ ایک طویل سانس لے کر... سر اٹھاتے ہوئے بولا "بہت عجیب انداز میں اس سے ملاقات ہوئی... تھی۔ غالباً یہ بارہ تیرہ دن پہلے کی بات ہے' میں ایک اشد ضرورت کے تحت نصیر نواز سے ملنے اس کے گھر چلا گیا۔ اس نے مجھے اپنے گھر آنے سے منع کر رکھا تھا۔ میرے ہاں بھی وہ دو تین مرتبہ ہی آیا ہے۔ زیادہ تر میں اس سے فون پر ملاقات طے کرتا تھا اور ہم کسی بھی ایسی دور افتادہ جگہ پر ملتے تھے جہاں دونوں ہی کے کسی شناسا کے ملنے کا امکان نہ ہو۔ حالاں کہ میں تو مکمل طور پر اس کی مٹھی میں ہی تھا۔ اس کے حکم کے خلاف کچھ کرتا ہی نہیں تھا۔ اس کے باوجود وہ بہت محتاط رہتا تھا۔ میرے ساتھ کسی بھی ایسے مقام پر دیکھے جانا پسند نہیں کرتا تھا جہاں اس کے کسی شناسا کے نظر آنے کا امکان ہو لیکن اس روز ضرورت کچھ ایسی تھی کہ میں اس سے پیشگی رابطہ قائم کئے بغیر اس کی کوٹھی پر پہنچ گیا۔ میں جس وقت گیٹ پر پہنچا' رات کی تاریکی پھیل چکی تھی۔ نصیر کے ہاں کوئی چوکیدار وغیرہ نہیں ہے۔ وہ تنہا ہی رہتا ہے۔ ایک خانساماں اور چھوٹے موٹے کاموں کے لئے ایک نوکر رکھا ہوا ہے۔ گیٹ بند تھا لیکن آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ اندر سے نصیر کسی کو چھوڑنے گیٹ تک آرہا تھا۔ ساتھ ہی وہ اس کو سخت برہمی کے عالم میں ڈانٹ بھی رہا تھا۔ مجھے ابھی تک اس کے الفاظ یاد ہیں۔ وہ کہہ رہا تھا "تمہیں مجھ کو بتائے بغیر یہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ میں نے جب ملاقات کا طریقہ مقرر کر رکھا ہے تو تمہیں اس کی خلاف ورزی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آئندہ اس طرح اطلاع دیئے بغیر ہرگز مت آنا۔ اپنے مسئلے کے سلسلے میں اتنا ہڑبڑانے اور بوکھلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا لیکن خدا کے لئے تم یہ بچکانہ طور طریقے چھوڑ دو۔" وہ جسے بھی ڈانٹ رہا تھا اس کی آواز مجھے سنائی نہیں دی۔ میں بہت دلبرداشتہ ہوا کہ یہاں تو پہلے ہی کسی کو جھاڑ پڑ رہی ہے۔ میرے ساتھ تو شاید اس سے بھی بدتر سلوک ہوگا۔ میں ابھی فیصلہ نہ کرپایا تھا کہ مجھے نصیر سے ملنا چاہئے یا واپس چلے جانا چاہئے کہ اچانک گیٹ کھل گیا اور چادر لپیٹے ایک لڑکی نے باہر قدم رکھا۔ وہ یہی لڑکی تھی۔ نصیر نواز کے خوف اور کچھ اپنی عادت کے باعث میں نے اس کی طرف زیادہ غور سے نہیں دیکھا۔ تاہم ایک نظر دیکھ کر ہی اتنا اندازہ ضرور ہوگیا کہ وہ بہت خوب صورت اور معصوم سی تھی۔ اس وقت بہت غصے میں نظر آتی تھی۔ اس کے چہرے پر صرف ایک لمحے کے لئے کھلے گیٹ سے روشنی پڑی تھی اور مجھے وہ لال بھبھوکا نظر آیا تھا۔ بہرحال یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ میں گو کہ نصیر کے گھر دو ایک مرتبہ ہی گیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہاں لڑکیوں اور عورتوں کی آمدورفت رہتی ہے۔ ایک کامیاب فلمی مصنف کے ہاں ان کی آمدورفت کوئی ایسی تعجب خیز بھی نہیں تھی۔ اسی لمحے نصیر نواز کی نظر مجھ پر پڑی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ ارے...! تمہیں بھی آج ہی مرنا تھا' لڑکی نے صرف ایک ثانیے میں سرتاپا میرا جائزہ لیا اور ایک لفظ بولے بغیر وہاں سے رخصت ہوگئی۔" سجاد خاموش ہوگیا۔

"بس یہی ملاقات تھی؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا کیوں کہ سجاد نے لڑکی کے بارے میں تبصرہ کچھ زیادہ کیا تھا۔

"نہیں..... میں بتا رہا ہوں... بلاشبہ وہ میرے لئے ایک عجیب ملاقات تھی۔" وہ گویا اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے بولا "نصیر نواز طوعاً و کرہاً مجھے اندر لے گیا۔ اس وقت کی میری ضرورت معمولی تھی وہ تو اس نے پوری کردی لیکن یہ بڑا مسئلہ اپنی جگہ برقرار چلا آرہا تھا۔ اس رات بھی اس سے میری کسی حد تک تلخ کلامی ہوئی۔ میں نے اسے جتا دیا کہ میں گمنام اور پس پردہ رہ کر اس کے لئے لکھتے لکھتے تنگ آچکا ہوں۔ تھک چکا ہوں کیوں کہ اس نے مجھے کوئی اچھا صلہ نہیں دیا۔ چناں چہ میں اب اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کرنے کے بارے میں سوچوں گا۔ وہ میری دھمکی سے قطعاً مرعوب نہیں ہوا۔ اس نے کہہ دیا کہ اسے اس کی کوئی پروا نہیں ہے۔ اس نے متبادل بندوبست کرلیا ہے' میرا جو جی چاہے کرتا پھروں' اور اگر میں نے اسے نقصان پہنچانے کا ارادہ بھی کیا تو وہ مجھے 'ٹکس اپ' کردے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔ کچھ دیر بعد میں اس کے گھر سے رخصت ہوا تو پہلے سے زیادہ دلبرداشتہ اور اندر ہی اندر خوفزدہ بھی تھا۔ گلبرگ کی گلیوں میں نیم تاریکی تھی۔ میں رکشے کی تلاش میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ عقب سے کسی کی نسوانی آواز سنائی دی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو یہی لڑکی تھی۔ وہ تیز تیز قدموں سے چلتی میرے برابر آگئی۔ چادر اب اس کے گلے میں مفلر کی طرح لپٹی ہوئی تھی اور ذرا دور سے وہ لڑکی کے بجائے کوئی نوخیز سا لڑکا نظر آرہی

تھی۔

وہ بلا تمہید بولی "آپ بہت پریشان نظر آتے ہیں۔ نصیر نواز سے آپ کا کیا چکر ہے؟"

میں خوفزدہ سا ہو گیا۔ میں نے کہا "کوئی چکر نہیں ہے۔ میں تو کام سے اس کے پاس آیا تھا۔"

وہ گویا مجھے سمجھاتے ہوئے بولی "آپ ڈریں نہیں، مجھے اپنے دوستوں میں ہی شمار کریں۔ میری ذات سے آپ کو کوئی فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے، نقصان نہیں۔ میں نے آپ کی اور نصیر نواز کی کچھ باتیں سنی ہیں، کچھ نہیں سن سکی۔ تاہم اتنا ضرور اندازہ ہو گیا ہے کہ آپ اسے کہانیاں لکھ کر دیتے رہے ہیں۔ یہ ایک بہت بڑا اسکینڈل ہے۔ اگر یہ منظرِ عام پر آجائے تو وہ تباہ ہو سکتا ہے اور میں اسے تباہ کرنے کے درپے ہوں۔"

میں سدا کا بزدل اس کمسن سی لڑکی کے لہجے سے خوفزدہ ہو گیا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ چل رہی تھی اور میں بے یقینی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے شک زدہ لہجے میں پوچھا "تم نے ہماری باتیں کہاں سے سن لیں؟ نصیر جب مجھے اپنے ساتھ اندر لے کر گیا تو اس نے گیٹ اندر سے بند کر لیا تھا اور تم بھی وہاں سے رخصت ہو گئی تھیں؟"

وہ بے پروائی سے بولی "میں آج کل اس کی ٹوہ میں ہوں اس لئے کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی۔ میں چند لمحے بعد لوٹ کر آگئی تھی اور عقبی دیوار پھلانگ کر اندر پہنچ گئی تھی۔ گھر بہت اچھی طرح میرا دیکھا ہوا ہے۔ میں نے ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے لگ کر آپ کی باتیں سنی تھیں۔"

نصیر کے مکان کی دیوار خاصی اونچی تھی لیکن اس لڑکی کے انداز و اطوار بتاتے تھے کہ اس سے کچھ بھی بعید نہیں تھا۔ وہ دیواریں بھی پھلانگ سکتی تھی اور شاید اونچے اونچے درختوں پر بھی چڑھ سکتی تھی۔ پھر وہ گویا میرے خیالات کی تصدیق کرتے ہوئے بولی۔ "میں بہت ضدی لڑکی ہوں۔ جس کام کا تہیہ کر لیتی ہوں وہ کر کے چھوڑتی ہوں اور اب میں نے نصیر نواز کو تباہ کرنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ اگر آپ میرا ساتھ دیں تو میرا خیال ہے میں اسے ضرور اس کے کرتوتوں کی سزا دے سکتی ہوں۔"

ضدی وہ یقیناً تھی۔ اس کا لہجہ گواہی دے رہا تھا۔ جتنی زیادہ وہ بات کر رہی تھی اتنا ہی زیادہ میں اس سے خوفزدہ ہوتا جا رہا تھا۔

میں نے پوچھا "تم نصیر نواز کو تباہ کرنے کے درپے کیوں ہو؟"

وہ بولی "یہ میں ابھی نہیں بتاؤں گی کیوں کہ آپ بھی مجھے کچھ نہیں بتا رہے۔ بہرحال مناسب وقت پر سب کچھ بتا دوں گی۔"

میں نے سنبھل کر کہا "لڑکی! تم ابھی کم عمر نادان اور ناتجربہ کار ہو۔ اپنی فکر کرو اور نصیر نواز کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ مجھے نہیں معلوم کہ تم کون ہو اور کیا کچھ کر سکتی ہو لیکن مجھے یہ ضرور معلوم ہے کہ نصیر نواز کون ہے اور کیا کچھ کر سکتا ہے۔ اگر کچھ گوا

چکی ہو تو اس پر صبر کرو اور آئندہ کے لئے اپنی حفاظت کرو۔"

اپنی دانست میں میں نے اسے درست ہی مشورہ دیا تھا۔ سخت خوفزدہ تھا۔ اس کے ساتھ چلتے ہوئے مجھے سخت ... ہو رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ کسی معاملے میں ملوث نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اسی دوران مجھے ایک رکشا نظر آگیا اور میں لپک ... میں سوار ہو کر اسے وہیں چھوڑ کر روانہ ہو گیا۔ بعد میں مجھے ... تک اس کا خیال آتا رہا۔ کبھی میں سوچتا کہ شاید اس طرح ... انداز میں یکدم بھاگ کر میں نے غلطی کی ہے۔ مجھے اس سے کم ... بات تو کرنی چاہئے تھی۔ اس کے عزائم کے بارے میں ... معاملے کے بارے میں کچھ تفصیل جاننے کی کوشش کرنی ... تھی۔ خواہ میں اس کا ساتھ نہ دیتا، اس کی بات نہ مانتا لیکن کم ... کچھ جان تو لیتا۔ مجھے اس پر رشک بھی آیا۔ وہ کمسن 'نادان' ... کچھ بھی تھی لیکن مجھ جیسے جہاندیدہ سے لاکھ درجے بہتر تھی کہ ... اس میں ردِعمل ظاہر کرنے کا حوصلہ تو تھا۔ اس کے بعد وہ مجھے ... ملی۔ میں نے نصیر سے اشارتاً بھی اس کا ذکر نہیں کیا کہ کہیں ... نہ ہو جائے اور اس لڑکی کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ لیکن اب آپ کی باتوں سے تو کچھ ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے کہ اسے ... زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا تھا وہ پہنچ چکا ہے۔ میری احتیاط ... کار ہی گئی۔" سجاد نسیم ایک سسکی سی لے کر خاموش ہو گیا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "میں نے جب آپ ... میں بٹھایا تو نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ مجھے آپ سے ... لڑکی کے بارے میں ضرور کچھ نہ کچھ معلوم ہو گا حالاں کہ بظاہر ... سے اس کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا تھا لیکن میری الہامی سی ... نے میری درست سمت میں ہی رہنمائی کی تھی۔ ارادے مثبت ... اور نیت میں خلوص شامل ہو تو گتھیاں خود بخود ہی سلجھتی چلی ... ہیں۔ یہ گتھی بھی تقریباً سلجھ ہی گئی ہے۔ اب مجھے صرف چند ... چھوٹی چھوٹی جزئیات پر کام کرنا ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔" میں ... کے ہاتھ سے تصویر لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ مجھے چھوڑنے گاڑی تک آیا اور ایک بار پھر لے چو... الفاظ میں میرا شکریہ ادا کرنے لگا لیکن میں نے اسے اس موضو... بات کرنے سے روک دیا اور اس علاقے کے پیچ و خم کا نقشہ ذ... نشین کرنے کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔

گھر آکر میں نے شاور لیا اور لباس تبدیل کیا۔ اس دورا... خنک رات نے اپنا سیاہ دامن پھیلا لیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ آ... رات کا کھانا مجھے ستارہ کے ساتھ اسی کے گھر کھانا تھا۔ پروگرام کہ پہلے سے طے تھا پھر بھی میں نے بہتر سمجھا کہ فون کر کے تصد... کر لوں کہ آیا ستارہ گھر پر موجود بھی ہے یا نہیں۔ ان فلمی ستاروں کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا۔ دعویٰ تو ستارہ کا یہی تھا کہ میرے معا... میں وہ بے نیازی برتنے کا سوچ بھی نہیں سکتی لیکن بہرحال وہ مر... نام کی ستارہ نہیں، سچ مچ کا فلمی ستارہ تھی اور اسٹارز کی مصروفیا...

کبھی کبھی ایسی صورت اختیار کر جاتی ہیں کہ وہ بڑے بڑے اہم وعدے بھی وفا نہیں کر پاتے۔

میں نے فون پر اس کا نمبر ڈائل کیا تو دوسری طرف دیر تک گھنٹی بجتی رہی مگر کسی نے ریسیور نہ اٹھایا۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ آخر میرا اندیشہ درست ہی نکلا تھا۔ ستارہ چوں کہ تنہا رہتی تھی اس لئے وہ نوکروں پر کچھ زیادہ بھروسا نہیں کرتی تھی۔ ایک چوکیدار اس نے مجبوراً رکھا ہوا تھا۔ باقی تمام کاموں کے لئے دو ادھیڑ عمر عورتیں تھیں۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دونوں عورتوں میں سے بھی کسی نے فون نہیں اٹھایا تھا۔ شاید وہ ٹیلی فون سے دور کہیں اپنے کام کاج میں مصروف تھیں۔ میں مایوس ہو کر ریسیور رکھنے ہی لگا تھا کہ اچانک دوسری طرف سے ریسیور اٹھا لیا گیا۔

"ہیلو۔ ستارہ! کہاں تھیں بھئی؟ میں تو اب ریسیور رکھنے ہی والا تھا۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ دوسری طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ صرف کسی کے سانس لینے کی ہلکی سی آواز سنائی دی پھر وہ بھی معدوم ہو گئی۔ یوں لگا جیسے ریسیور اٹھانے والے نے سانس روک لی ہو۔ پھر نہایت آہستگی سے ریسیور رکھ دیا گیا۔

میں چند لمحے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے ریسیور کو دیکھتا رہا۔ میری کھوپڑی کے کسی نیم تاریک گوشے میں الارم بجنا شروع ہو چکا تھا۔ میں نے کسی کو مطلع کرنے کے چکر میں بھی چند لمحے ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا اور گاڑی نکال کر آندھی اور طوفان کی طرح ستارہ کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو گیا۔ یہ دیکھ کر بہرحال میں نے اطمینان کی سانس لی تھی کہ ٹونی اور شبیر کی گاڑی اب بھی میرے پیچھے تھی۔ یہ دونوں کبھی نہ تھکنے والے جناتی قسم کے نوجوان تھے۔ بارہ گھنٹے کے لئے یہ میری نگرانی کے فرائض انجام دیتے تھے اور اس دوران سائے کی طرح پیچھے لگے رہتے تھے۔ اس کے بعد بارہ گھنٹے کے لئے یہ ذمے داری حنیف خان اور سردار علی سنبھال لیتے تھے۔ اگر میں اس دوران اطمینان سے گھر میں سو رہا ہوتا تھا تب بھی ان کی گاڑی گھر کے قریب موجود رہتی تھی۔ جب سے میرے گھر میں مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوا تھا تب سے میرے ساتھیوں نے از خود ہی یہ انتظامات کر لئے تھے اور میری ایک نہیں سنی تھی حالاں کہ میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا تھا۔

ٹونی اور شبیر نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے کیوں کہ ان کی کار بھی تیزی سے حرکت میں آئی تھی اور چند ہی منٹ بعد مجھے ریڈیو کا سگنل سنائی دیا۔ میں نے کار کا خفیہ خانہ کھولا اور ایک ہاتھ سے مختصر سا ٹو وے مائیک نکالا۔

بٹن دبانے پر ٹونی کی آواز سنائی دی "سر۔؟" اس نے اور کچھ بھی نہیں کہا۔ سوال اس کے لہجے میں تھا۔

"ٹونی! ستارہ کی کوٹھی پر کوئی گڑبڑ ہے۔" میں نے ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز رکھتے ہوئے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں کہا "اندر میں ہی جاؤں گا۔ تم دونوں باہر ہی ایسے زاویوں پر کھڑے ہونا کہ کوٹھی کی کسی بھی سمت سے کوئی نکل کر بھاگے تو تمہاری نظر میں آجائے اور بچ کر نہ جانے پائے۔ کوشش کی جائے کہ وہ زندہ ہاتھ آجائے ورنہ گولی مار دی جائے۔"

"ٹھیک ہے سر!" ٹونی نے ہموار لہجے میں جواب دیا۔

ستارہ کی گلی میں پہنچ کر میں نے گاڑی ستارہ کے گھر سے کچھ دور ہی چھوڑ دی اور عقبی گلی سے پیدل ہی آگے بڑھا۔ عقبی گلی میں تاریکی تھی۔ ستارہ کے گھر میں پچھلی طرف بھی لان تھا اور عشق پیچاں کی بیلیں دیواروں سے باہر کو لٹکی ہوئی تھیں۔ دیوار خاصی بلند تھی لیکن میرے لئے اسے پھلانگنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

دیوار پر ہاتھ جما کر میں نے نہایت آہستگی سے جسم کو اوپر اٹھایا اور پہلے صرف سر دیوار کی اوٹ سے نکال کر اندر جھانکا۔ میرا خیال تھا کہ شاید کسی طرف سے کوئی گولی سنسناتی ہوئی آئے گی مگر وہاں بدستور سکوت رہا۔ کوٹھی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی اور یہ کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ یکبارگی تو اس احساس سے میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا کہ کہیں مجھے تاخیر تو نہیں ہو گئی؟ گہری تاریکی اور سکوت میں نہ جانے کون سا بھید میرا منتظر تھا۔

نہایت آہستگی سے کچھ اور اونچا ہو کر آخر کار میں نے دیوار پھلانگ لی اور بے آواز طریقے سے اندر لان پر کود گیا۔ مشین پسٹل اب میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور میری آنکھیں تاریکی میں دیکھنے کے قابل ہو چکی تھیں مگر دیکھنے کے لئے وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ بس وہی چیزیں تھیں جو کسی کشادہ اور خوب صورت لان میں نظر آسکتی ہیں۔ کہیں کوئی باڑھ، کہیں پھولوں بھرے پودے، دیوار کے ساتھ عشق پیچاں کی بیلیں اور پام کے درختوں کی صرف ایک جوڑی۔

اچانک میرے کان کے عین قریب ایک پٹاخا سا پھٹا، کوئی ٹھنڈی سی چیز میری ناک کو چھوتی ہوئی گزری اور پھر شاید وہی چیز کچھ دور گھاس پر جا گری۔ محسوس کچھ یہی ہوا گویا وہ کسی سیال کی مختصر سی دھار تھی۔ دوسرے ہی لمحے گھاس پر شعلہ بھڑک اٹھا۔ میں پیٹ کے بل لیٹ چکا تھا لیکن میں نے اندھا دھند فائر نہیں کیا تھا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ یہ حرکت کس طرف سے ہوئی تھی، پٹاخا کس طرح میرے قریب پھٹا تھا اور یہ سیال چیز کس طرح ایسی تیز رفتاری سے پھینکی گئی تھی اور کیوں کر گھاس پر گرتے ہی بھڑک اٹھی تھی۔ کسی بھی چیز کا اندازہ کئے بغیر فائر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں پیٹ کے بل گرنے کے بعد بھی ایک جگہ ٹکا نہیں تھا بلکہ دھیرے دھیرے ایک طرف کو کھسک رہا تھا۔ میری نظریں لان کے چپے چپے کا جائزہ لے رہی تھیں مگر کہیں خفیف سی حرکت کے بھی آثار نہیں تھے۔ بھڑکتا ہوا شعلہ بمشکل ایک بالشت اونچا تھا اور تقریباً تین انچ کے قطر میں پھیلا ہوا تھا تاہم تیزی سے سمٹتا جا رہا تھا

اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ معدوم ہوگیا۔ فضا میں گھاس جلنے کی معمولی سی بُو باقی رہ گئی۔

میں کھسکتے کھسکتے ایک باڑھ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ یہ باڑھ کچن کے عقبی دروازے کے سامنے تھی۔ ایک بار پھر کوئی چیز سنسناتی ہوئی میرے سامنے سے گزری۔ عین میرے چہرے کی سیدھ میں کچھ فاصلے پر پٹاخا سا پھٹا اور گھاس پر شعلہ بھڑک اٹھا۔ یہ چیز جو کچھ بھی تھی' باقاعدہ فائر کی جارہی تھی۔ تاہم اس بار مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ چیز کس طرف سے آئی تھی۔ کوئی پاپلر کے درخت پر چھپا ہوا تھا اور یہ میرے لئے مزید حیرت کی بات تھی کیوں کہ پاپلر کے درخت کی شاخیں ایسی نہیں ہوتیں کہ کوئی انسان ان پر پناہ لے سکے اور نہ ہی وہ اتنا گھنا ہوتا ہے کہ صحیح طور پر کسی کو چھپا سکے۔

میں نے سائیلنسر لگے مشین پسٹل سے فائر کیا۔ درخت میں پھڑپھڑاہٹ سی ہوئی۔ پھر تاریکی میں عجیب سی ہنسی ابھری۔ کافی حد تک یہ غیر انسانی ہی ہنسی تھی۔ اس میں بندر کی خوخیاہٹ سی شامل تھی مگر کچھ تاثر ایسا بھی تھا گویا کوئی نیم جنونی اور اذیت پرست انسان کسی کو تکلیف میں دیکھ کر محظوظ ہورہا ہو۔ اس تاریکی اور سکوت میں اس ہنسی نے مجھ جیسے فولادی اعصاب کے مالک کو بھی ایک بار جھرجھری سی لینے پر مجبور کردیا تھا۔

میں نے باڑھ کی طرف مزید تھوڑا سا کھسک کر درخت کی شاخوں پر فائر کیا۔ اس بار بہت سے پتوں کے ٹکڑے جھڑے اور ساتھ ہی کسی نے درخت سے چار دیواری پر چھلانگ لگائی۔ ملگجے اندھیرے میں اس کا صرف ہیولا نظر آیا اور وہ بے حد عجیب معلوم ہوا۔ شاید وہ عجیب سی جسمانی ساخت کا کوئی مجہول اور پستہ قد انسان تھا۔ وہ غالباً بلندی پر درخت کے تنے سے ہی پچھلی طرف لپٹا ہوا تھا۔ اس کے چھلانگ لگانے کا انداز بندروں کا سا ہی تھا اور پھرتی بندروں سے بھی کہیں زیادہ تھی۔ میں نے ہوا میں اس کا ہیولا نمودار ہوتے ہی فائر کیا تھا مگر وہ نہ صرف اس سے بچ گیا تھا بلکہ دیوار پر پہنچتے ہی میرے پستول سے بلا تاخیر نکلی ہوئی ایک اور گولی سے بھی بچ کر باہر کود گیا۔ ایک بار پھر وہ مکروہ سی ہنسی ابھری لیکن فوراً ہی معدوم ہوگئی۔

میں فوری طور پر اس کے تعاقب میں لان عبور کرکے اور دیوار پھاند کر نہیں جاسکتا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ابھی کسی تاریک گوشے میں اس کے کتنے ساتھی چھپے ہوئے ہوں۔ اس کے علاوہ اس کی پھرتی کا لمحاتی مظاہرہ دیکھنے کے بعد مجھے اندیشہ یہی تھا کہ میرے باہر پہنچنے تک وہ نہ جانے کہاں پہنچ چکا ہوگا۔ بس ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید ٹونی یا شبیر میں سے کوئی اسے پکڑنے میں کامیاب ہوگیا ہو۔ ان کے پاس گنیں بغیر سائیلنسر کی تھیں۔ ان گنوں پر سائیلنسر فٹ کرنے سے گن کے جام ہونے کا اندیشہ رہتا تھا۔ تاہم ان کی ساخت ہی ایسی تھی کہ فائر کی آواز بہت کم ہوتی تھی مگر میں نے فائر کی ہلکی سی آواز بھی نہیں سنی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ پستہ قد شخص یا تو صحیح سلامت نکل گیا تھا یا پھر ٹونی اور شبیر میں سے کسی نے اسے قابو کرلیا تھا۔

میں چاروں ہاتھ پیروں کے بل چلتا ہوا کچن کے دروازے تک پہنچا۔ دروازہ کھلا ہی تھا۔ میں نے آہستگی سے اسے اندر دھکیلنا شروع کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ ہی باہر گھاس کے قطعے پر روشنی کا ایک مستطیل پھیلنے لگا۔ کچن کے اندر روشنی تھی جو دروازہ کھلنے کے ساتھ ساتھ باہر آرہی تھی مگر یہ روشنی بہت کم تھی۔

دروازہ کافی کھل چکا تب بھی اندر سے کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔ آخر کار میں نے سر نیچا رکھتے ہوئے اندر جھانکا۔ کُکنگ رینج کا ایک چولہا روشن تھا اور گیس کا شعلہ دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔ اس کی وجہ سے کشادہ کچن میں تھوڑی سی روشنی تھی ورنہ وہاں لائٹ تو آف ہی تھی۔

ستارہ کی موٹی سی سانولی ملازمہ آڑی ترچھی فرش پر پڑی تھی۔ چولہا جلانے کا لائٹر اس کے ہاتھ میں ہی دبا ہوا تھا۔ باہر سے ہی اسے دیکھ کر مجھے کم از کم اتنا اندازہ ضرور ہوگیا کہ وہ زندہ تھی۔ اس کے بھاری بھرکم سراپا کا کہیں سے پھولتا پچکتا رہا تھا کہ سانسوں کی آمدورفت جاری تھی۔ شاید اس وقت اس نے چولہا روشن کیا ہی تھا کہ جب اسے بے ہوش کردیا گیا۔

کچن میں اور کوئی نہیں تھا۔ اندر پہنچ کر سرسری طور پر دیکھنے سے ہی مجھے ملازمہ کی کھوپڑی پر بڑا سا گومڑ نظر آگیا۔ کچن سے ہی غالباً اسٹیل کا ایک ڈونگا اٹھا کر اس کے سر پر رسید کیا گیا تھا۔ چینی کے دو تین برتن بھی قریب ہی ٹوٹے پڑے تھے' روشنی کے لئے لگا ہوا گلوب بھی بلب سمیت ٹوٹا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کچن میں کسی نے تھوڑی سی اچھل کود مچائی تھی۔

میں ملازمہ کو وہیں چھوڑ کر اسی طرح محتاط انداز میں لاؤنج میں پہنچا۔ وہاں بھی تاریکی اور سکوت نے میرا استقبال کیا۔ لگتا یہی تھا کہ جن لوگوں نے بھی یہاں آکر کارروائی کی تھی ان میں سے اب کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ لاؤنج سے گزر کر میں ستارہ کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ وہ مجھے دروازے کے قریب ہی پڑی مل گئی۔ وہ بھی بے ہوش تھی۔ اس کی کنپٹی پر وار کیا گیا تھا۔ ضرب زیادہ خطرناک نہیں تھی۔

میں نے اطمینان کی سانس لی اور اسے اٹھا کر بیڈ پر ڈالا۔ اس وقت تک وہ خود بھی کسمسانے لگی تھی۔ میں نے لائٹ جلائی اور فریج سے پانی لاکر اس کے منہ پر چھینٹے مارے۔ ہلکی سی کراہ کے ساتھ وہ جلد ہی ہوش میں آگئی۔

میری صورت دیکھتے ہی اس نے مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا اور اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "خدا کا شکر ہے تم آگئے ابی!... پھر اس نے خوف زدہ سی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھا اور تھوک نگل کر بولی "وہ کہاں ہے؟ کیا وہ چلا گیا؟"

"کون؟" میں نے اس کا سر سہلاتے ہوئے تحمل سے پوچھا۔

"وہ بندر.... وہ جسیم قسم کا چمپینزی... اف خدایا! کیسا بھیانک اور مکروہ صورت تھا۔" اس نے جھرجھری سی لی اور مجھے اپنے کچھ اور زیادہ قریب کرلیا۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ تو وہ ہیولا اسی لئے مجھے کچھ غیر انسانی محسوس ہوا تھا کہ درحقیقت وہ انسان تھا ہی نہیں۔

ستارہ کمزور سی آواز میں بولی "میں نے زندگی میں خاصے جانور دیکھے ہیں اور خاصا طویل عرصہ جنگلوں میں بھی گزارا ہے۔ شہری زندگی اختیار کرنے کے بعد بھی بہت سے جانوروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے اور اب جب سے "جنگل گرل" سائن کی ہے تب سے بھی بہت سے جانوروں سے واسطہ پڑرہا ہے۔ بعض جانور چمپینزی سے بھی زیادہ بدشکل ہوتے ہیں لیکن کسی کی آنکھوں میں اور صورت پر آج تک میں نے خباثت اور شیطانیت کی یہ انتہا نہیں دیکھی جو اس منحوس میں دیکھی۔ میرا خیال ہے وہ گھر میں داخل تو پچھلی طرف سے ہوا تھا لیکن دونوں ملازماؤں کے علاوہ شاید گیٹ پر جاکر چوکیدار کو بھی کسی طرح بے ہوش کر آیا تھا۔ کیوں کہ میں ان تینوں کو پکارتی رہی مگر کسی کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا۔ یہاں اس کمرے کے دروازے پر پہنچ کر وہ عجیب و غریب انداز میں اچھلنے کودنے لگا۔ وہ انسانوں کی طرح قہقہے لگانے کی کوشش کررہا تھا اور اس کی آواز سن کر رونگٹے کھڑے ہورہے تھے۔ اس کے ایک ہاتھ میں عجیب سی گن تھی اور دوسرے ہاتھ .... اب میں تمہیں کیا بتاؤں... بہت شرمناک حرکتیں کررہا تھا وہ۔" ایک بے باک عورت ہونے کے باوجود ستارہ نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا۔

میں نے اس کی کنپٹی کی چوٹ سہلاتے ہوئے کہا "وہ بس یکدم.... اچانک تمہارے سامنے آگیا تھا؟"

"مجھے گھر میں کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ پھر کچن کی طرف سے چھناکا سنائی دیا۔ میں سمجھی شاید ملازمہ نے کوئی برتن توڑ دیا ہے۔ میں تمہارے انتظار میں تیار ہوکر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی تھی۔ ابھی میں یہ دیکھنے کے لئے اٹھی ہی تھی کہ کیا چکر ہے' اچانک وہ چھلانگ مار کر دروازے پر آگیا۔" ایک لمحے کے لئے وہ پھر خاموش ہوگئی۔ اس کے دلکش چہرے پر سرخی گہری ہوگئی "مجھے تو اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ وہ مجھ پر وہی حملہ نہ کردے جسے اخباری زبان میں مجرمانہ حملہ کہا جاتا ہے۔ مگر پھر اچانک ہی اس نے حیرت انگیز پھرتی سے اچھل کر اپنی اس عجیب سی گن کا دستہ میری کنپٹی پر رسید کردیا۔ میں چکرا کر گر پڑی۔ آخری منظر بس میں نے یہی دیکھا کہ وہ فاتحانہ انداز میں اچھلتا ہوا کمرے سے رخصت ہورہا تھا۔ اس کے جسم میں گویا بجلیاں بھری ہوئی تھیں۔"

"تم اب کیسا محسوس کررہی ہو؟" میں نے ستارہ کو آرام سے لٹاتے ہوئے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہوں۔ بس اس جگہ خاصا درد ہے۔" اس نے کنپٹی پر ذرا سا دباؤ ڈال کر دیکھا اور کراہ کر رہ گئی "میرا خیال ہے اس اچانک افتاد نے مجھے خوف زدہ زیادہ کردیا تھا۔ ویسے یہ کس کی حرکت ہوسکتی ہے؟ وہ چمپینزی خود تو ظاہر ہے نہیں آیا ہوگا...؟ وہ گن بھی عجیب تھی۔ اس نے اس سے لاؤنج میں فائر کیا تو ایک پٹاخا سا پھٹا اور لاؤنج کے فرش پر شعلہ بھڑک اٹھا۔ شکر ہے اس نے کمرے میں فائر نہیں کیا ورنہ قالین آگ پکڑ سکتا تھا اور یوں سارے گھر میں آگ لگ سکتی تھی۔ آخر.... آخر اس کا مقصد کیا تھا؟"

"اس قسم کے بیسیوں سوالات تو اس وقت میرے ذہن میں بھی چکرا رہے ہیں لیکن کسی کا جواب میرے پاس بھی نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "فی الحال تم آرام سے لیٹو۔ میں ذرا بے چاری ملازماؤں اور چوکیدار کی بھی خبر لے لوں۔"

میں نے پوری کوٹھی کی بتیاں روشن کیں۔ دوسری ملازمہ مجھے لان پر ہی پڑی مل گئی۔ وہ شاید الگنی سے سوکھے ہوئے کپڑے اتارنے آئی تھی۔ چوکیدار گیٹ کے قریب ہی اندر کی طرف روش پر پڑا تھا۔ ہوش میں آنے پر اس نے بتایا کہ وہ آرام سے اپنی کرسی پر بیٹھا پگڑی اتار کر بالوں میں کنگھی کررہا تھا کہ دھم سے کوئی وزنی چیز اس کے سر پر آکر لگی۔ ساتھ ہی کسی جانور کی خوخیاہٹ سی سنائی دی اور وہ کرسی سے لڑھک کر بے ہوش ہوگیا۔ وہ وزنی سی چیز ایک گملا تھا جو قریب ہی روش پر گر کر ٹوٹ چکا تھا۔ چوکیدار کو یہی افسوس ہوئے جارہا تھا کہ اس نے پگڑی کیوں اتاری۔ سر پر دبیز پگڑی ہوتی تو وہ اچھی خاصی چوٹ سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ وہ بزرگوں کی اس حکمت بھری نصیحت کو یاد کرکرکے سر دُھن رہا تھا کہ ننگے سر نہیں رہنا چاہئے۔ شیطان ضرور کچھ نہ کچھ مار دیتا ہے۔

میں نے اس سے پوچھا "خان صاحب! جب آپ پگڑی باندھتے ہیں تو پھر آپ کو بال سنوارنے اور ان میں کنگھی پٹی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ بال کون سا کسی کو نظر آنے تھے؟"

خان صاحب اپنی چوٹ سہلا کر قدرے شرما کر بولے "پگڑی اپنی جگہ اے صاب! بالوں میں کنگی اپنی جگہ اے.... کنگی منگی کرکے ذرا دل پشوری ہوجاتا اے.... اور کوئی امارے بالوں کو نئیں دیکتا.... مگر ام خود تو شیشے میں دیکتا اے نا.... اور ام سمجتا اے کہ نورجان ام کو دیکتی اے۔"

"یہ نورجان کون ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ امارا گھر والی ہے اور بنوں میں اے۔ جب بیگم صاب اجازت دے گا تو ام نورجان کو بھی ادر بلالے گا۔" خان صاحب کے گالوں پر سرخی دوڑ گئی۔ میں نے ان لوگوں کی تھوڑی بہت دوا دارو کرنے کے بعد انہیں ان کی جگہوں پر بھیج دیا۔ غنیمت تھا کہ کسی کو زیادہ چوٹ نہیں آئی تھی۔ کوئی فریکچر وغیرہ نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کسی کو زخم آیا تھا۔

حالات معمول پر آچکے تو ستارہ بولی "میں سمجھتی ہوں کہ یہ

اس خبیث چمپینزی کی کچھ مہربانی ہی تھی جو اس نے ہاتھ ہلکا ہی رکھا ورنہ وہ مجھے ایسی ضرب لگانے کا بھی پوری طرح اہل نظر آرہا تھا جو انسانی کھوپڑی کو پاش پاش کردے۔ اور میرا خیال ہے اگر وہ کسی کو بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیتا تو ہڈیاں چکنا چور کرسکتا تھا۔ بظاہر بھی وہ پستہ قد کے کسی نہایت گٹھے ہوئے مضبوط جسم والے آدمی کے برابر تھا اور اس کے جثے سے کہیں زیادہ حیوانی طاقت اس میں مقید نظر آتی تھی۔"

"تم کسی انسان سے آج تک اتنی متاثر نہیں ہوئیں جتنی اس چمپینزی سے متاثر نظر آرہی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں اصل میں پوری طرح سمجھ نہیں پارہی ہوں... وہ ایک غیر معمولی چمپینزی تھا۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔

"مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔ لیکن کاش وہ میرے ہاتھ آجاتا۔" میں نے تأسف زدہ لہجے میں کہا۔

"وہ ہاتھ آنے والی چیز نہیں لگتا۔" ستارہ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھتے ہوئے بولی۔

"میں ذرا اس کے بارے میں تھوڑی سی معلومات اور کر آؤں۔ دو منٹ میں آتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

باہر آکر میں نے دیکھا ٹونی اور شبیر کوٹھی کے دو مختلف کونوں پر تاریک اندھیرے میں مستعد کھڑے تھے۔ گنیں انہوں نے اپنے جسموں کی آڑ میں کی ہوئی تھیں۔

"تمہیں وہ چمپینزی فرار ہوتا نظر آیا تھا؟" میں نے ٹونی سے پوچھا۔

"جی ہاں" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تم نے اسے پکڑنے یا شوٹ کرنے کی قطعاً کوشش نہیں کی؟" میں نے محض ایک موہوم امید کے سہارے پوچھا۔ حالاں کہ مجھے معلوم تھا' جواب مایوس کن ہی ہوگا۔

"چمپینزی کو؟" ٹونی نے حیرت سے پوچھا۔ "ہم تو سمجھے تھے' کسی کا پالتو چمپینزی ہوگا اور شرارتاً گھر سے نکل بھاگا ہوگا۔"

"پالتو تو وہ یقیناً تھا۔ مگر... خیر... چھوڑو۔" میں نے سر جھٹکا اور واپس اندر جانے کے لئے مڑتے ہوئے کہا "تم چاہو تو اب ڈیوٹی تبدیل کرسکتے ہو۔ میں آج رات یہیں رہوں گا۔"

"بہت بہتر۔" ٹونی گاڑی کی طرف بڑھ گیا تاکہ ریڈیو پر پیغام دے کر دوسرے دو ساتھیوں کو بلوا سکے۔

میں واپس ستارہ کے بیڈ روم میں آگیا۔ میری نظر سائیڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ پر پڑی اور میں نے ستارہ کو بتایا کہ آنے سے قبل میں نے اسے فون کیا تھا تو کسی نے ریسیور اٹھا کر صرف ایک گہری سانس لے کر واپس رکھ دیا تھا۔

"یقیناً وہی چمپینزی ہوگا۔" ستارہ فوراً بولی "اسے بالکل انسانوں کی طرح تمام باتوں کی سوجھ بوجھ تھی۔ شکر ہے اس کے ہاتھ میں سچ مچ کی گن نہیں تھی۔"

"اگر ہوتی تب بھی شاید وہ کسی کو ہلاک نہ کرتا۔ اگر کسی کو زیادہ نقصان پہنچانا مطلوب ہوتا تو وہ اپنی اس قلم گن سے بھی ... سکتا تھا۔ اسے شاید صرف ہڑبونگ مچانے اور خوف زدہ کرنے کے لئے ہی بھیجا گیا تھا۔" میں نے کہا۔ ستارہ نے غالباً کوئی سوال کرنے کے لئے لب کھولے ہی تھے کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ستارہ نے ریسیور اٹھایا لیکن پھر ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولی "تمہارے لئے فون ہے۔ کیا تم کسی کو بتا کر آئے تھے کہ تم اس نمبر پر ملوگے؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ قدرے ناگواری سے بولی "جو کوئی بھی ہے وہ کمینہ بات بھی بڑی بدتمیزی سے کررہا ہے۔ کہہ رہا ہے ذرا اپنے یار سے بات کراؤ۔ سور کا بچہ کہیں کا۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا "فارسی میں یار' دوست کو ہی کہتے ہیں اور دوست تو میں بہرحال ہوں تمہارا۔"

میں نے ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "کس حرامی کو ضرورت آن پڑی ستارہ کے یار سے بات کرنے کی؟"

"یاروں کے یار کو" دوسری طرف سے ترکی بہ ترکی جواب ملا۔ آواز میرے لئے شناسا تھی لیکن لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ پچھلی بار میں نے اس شخص کو فون پر ہی انگریزی میں بات کرتے سنا تھا لیکن انگریزی اس کی اصل زبان معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اور اب بامحاورہ اردو میں بات کررہا تھا لیکن اردو بھی اس کی مادری زبان معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کا تعلق "ریڈ ڈاٹ" سے تھا۔ یہ واضح نہیں ہوسکا تھا کہ وہ تنظیم کا سربراہ تھا۔ کوئی عام کارکن یا چھوٹا موٹا عہدیدار۔ اور نہ ہی ریڈ ڈاٹ کے سربراہ کا کچھ پتا چلا تھا۔

"خاموش کیوں ہوگئے؟" اس بھاری اور گونجیلی سی آواز نے پوچھا۔

"یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ جھینگر جیسی آواز اس سے پہلے کہاں سنی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"جس روز اس آواز نے تمہاری موت کے احکامات جاری کردئیے اس روز اس جھینگر کی تلاش میں مارے مارے پھرو گے تاکہ رحم کی بھیک مانگ سکو۔" وہ غرایا۔

"تو اتنی دیر کس بات کی ہے؟ جاری کرچکو نا احکامات۔ معاملہ کسی ایک طرف تو ہوجائے۔ میری اب یہ فلمی لن ترانیاں سننے کی عمر نہیں رہی۔ میں کوئی ہائی اسکول کا لڑکا تو ہوں نہیں۔" میں نے بے زاری سے کہا "ویسے میرے عقیدے کے مطابق زندگی اور موت کے احکامات بہت بلندیوں سے جاری ہوتے ہیں۔ تم جیسے جھینگروں کے حکم پر اگر کسی کو موت آسکتی تو اس زمین پر صرف موت ہی موت کا راج ہوتا۔ زندگی تو کہیں نظر ہی نہ آتی۔"

"تمہاری یہی چکار' یہی دلیری اور بے خوفی تو ہمیں پسند ہے۔" اس بار وہ تاؤ کھائے بغیر بولا "کبھی کبھی تو ہم سنجیدگی

...ے تھے ہیں کہ تمہیں ہم لوگوں کے ساتھ ہونا چاہئے تھا۔ خیر۔
...ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ ہمارا بلیک برڈ پسند آیا؟"

"بلیک برڈ۔۔۔؟" میں سمجھ تو گیا تھا کہ بلیک برڈ سے ان کی مراد ... ہو سکتی ہے لیکن یونہی تصدیق کے لئے ذرا انجان بن رہا تھا۔

"ہمارا چمپینزی۔" وہ مسرور سے لہجے میں بولا "ایک ماہر ...نیات کی کئی سال کی محنت کا شاہکار ہے وہ۔ وقتاً فوقتاً تمہیں ...نے کرتب دکھانے آتا رہے گا۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا "مجھے پہلے ہی شبہ سا ...دس ہو رہا تھا کہ یہ بے تکی حرکت تم لوگوں کی نہ ہو۔ اگر تمہارا ... تجریدی آرٹ کا شاہکار ایک آدھ منٹ اور یہاں ٹھہر گیا ہوتا تو ...ں کا صرف فریم ہی تم تک پہنچتا۔ پینٹنگ غائب ہوچکی ہوتی۔"

"خوش فہمی ہے تمہاری۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کا قہقہہ ...ی گونجیلا سا تھا' جیسے کوئی تہ خانے میں ہنس رہا ہو "وہ تو گولی کی زد ...بھی نہیں آتا۔ بڑے کام کی چیز ہے۔"

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ تم لوگوں کا جو آدمی ہمارے ہاتھوں مارا ...گیا تھا اس کی صورت شکل اور شخصیت بھی بندر سے بہت ملتی جلتی ...تھی۔ تم لوگوں کی تنظیم کہیں بندروں پر ہی تو مشتمل نہیں ہے؟"

"اس اعتبار سے بھی ہم تمہارے آباؤ اجداد ہوئے۔" وہ آج ...بہت خوشگوار موڈ میں معلوم ہوتا تھا۔

"ہم لوگ ڈاروِن کی تھیوری کو نہیں مانتے۔ ہمارا نظریۂ ...حیات دوسرا ہے۔" میں نے کہا "تم چاہو تو خوشی سے اسے اپنا جدِ امجد قرار دیتے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

"دو چار ملاقاتوں کے بعد تم بھی اسے اپنا جدِ امجد مان لو گے۔" وہ بولا۔

"یہ تو ملاقات کے بعد ہی پتا چلے گا۔" میں نے بے زاری سے کہا "لیکن یہ تو بتاؤ کہ آخر ان حرکتوں سے تمہارا مقصد کیا ہے؟"

"تمہیں صرف یہ بتانا کہ تم اور تمہاری عزیز ترین ہستیاں کس حد تک ہماری دسترس میں رہتی ہیں اور ہمیں تمہارے معمولات کا کس حد تک علم رہتا ہے۔" اس کے لہجے میں حقیقتاً فخر جھلک آیا۔

"چلو مان لیا کہ تم مجھ پر یہ سب کچھ جتانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے بعد...؟" میں نے ملائمت سے کہا "کیا فائدہ ہوگا تمہیں اس سے؟"

"تمہیں اوقات پر رکھنے میں مدد ملے گی۔ ورنہ ہمیں معلوم ہے تم ضرور ہمارے کچھ کاموں میں ٹانگ اڑاؤ گے۔" وہ بولا۔

"میری ٹانگیں اتنی فارغ نہیں ہیں کہ میں انہیں غیر متعلقہ کاموں میں اڑاتا پھروں۔ میں ایک مصروف آدمی ہوں اس لئے ظاہر ہے میری ٹانگیں بھی مصروف ہی رہتی ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"بات تمہارے موڈ کی ہے نا۔ تم جب چاہو کسی بھی غیر متعلقہ کام کو متعلقہ سمجھ لیتے ہو۔ خصوصاً دوستوں کے بارے میں بہت جذباتی ہوجاتے ہو۔ اب مثلاً آج اگر تمہاری اس فلمی حسینہ ستارہ کو ہی کچھ ہوجاتا تو اسے تم اپنا مسئلہ سمجھ لیتے۔ حالاں کہ تم نے کوئی ستارہ کی سلامتی کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا۔"

"لے رکھا ہے نا" میں نے پہلے سے بھی زیادہ سنجیدگی سے کہا۔ "اس کے بارے میں کوئی خیال بھی دل میں مت لانا۔ ورنہ تمہارا اور تمہاری تنظیم کا انجام عبرت ناک ہوگا۔ ظاہر ہے تم لوگ ساری عمر تو مجھ سے چھپے نہیں رہ سکوگے۔"

"اس خیال کو تو دل سے نکال دو کہ تمہارے ہاتھ تنظیم تک پہنچ سکتے ہیں۔ یا اگر ہاتھ پہنچ بھی جائیں تو تم تنظیم کا کچھ بگاڑ سکتے ہو۔" وہ قہقہہ لگا کر بولا "ابھی کے سلسلے میں تم نے اب تک کیا کرلیا؟ لے دے کر ایک وہ بے چارہ اے ایس آئی شریف سیال ہے' اسے یاد دہانی کے فون کرتے رہتے ہو۔ ایک معمولی اے ایس آئی بے چارہ ہمارے معاملات میں کیا کرے گا۔ اسے تو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا۔"

"تو پھر آئی جی صاحب سے کہہ دوں؟" میں نے کہا "اگر تم محض عہدے کی وجہ سے اے ایس آئی کو حقیر سمجھ رہے ہو تو کوئی بات نہیں۔ آئی جی صاحب سے بھی تھوڑی بہت دوستی ہے۔"

"وہ تو ہمیں بھی معلوم ہے لیکن اتنا معصوم بننے کی کوشش نہ کرو۔ تم میرا مطلب بخوبی سمجھ رہے ہو۔ یعنی یہ کہ ہم لوگوں کے معاملات میں پولیس بے چاری کچھ کر ہی نہیں سکتی۔ ان کی ذہنیت ان کا طریقۂ کار سب کچھ سو ڈیڑھ سو سال پرانا ہے۔"

"چلو پھر میں کسی ماڈرن ایجنسی کی خدمات حاصل کرلیتا ہوں۔ مثلاً اسکاٹ لینڈ یارڈ۔ سی آئی اے... کے جی بی وغیرہ۔ میں کوشش کروں گا تو امید ہے ان میں بھی کہیں نہ کہیں تعلق واسطہ' یاری دوستی نکل ہی آئے گی۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"فی الحال تو تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے نا۔ لیکن جلد ہی تم سنجیدگی سے ان خطوط پر سوچنے پر مجبور ہوجاؤ گے اور افسوس کہ یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہوگی۔" وہ گویا میری حالت پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔

"دیکھو یار...! میں بہت سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اگر تمہاری تنظیم اتنی ہی طاقتور ہے' اتنے وسائل ہیں تم لوگوں کے پاس۔ تو پھر ٹیلی فون پر اس قسم کی مکالمے بازی میں وقت ضائع کرتے رہنے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر مجھے مروا سکتے ہو تو مروا ڈالو۔ علی الاعلان مقابلہ مقصود ہے تو چیلنج دے کر سامنے آجاؤ۔ غرضیکہ جو بھی کرنا ہے خدا کے لئے کر گزرو۔ میں یہ چوہے بلی کا کھیل کھیلنے والا آدمی نہیں ہوں۔ میری کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ کل ہونا ہے وہ آج ہی ہوجائے۔ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارنا مجھے پسند نہیں۔ کب تک تم لوگ یونہی فون پر دھمکیاں دیتے رہو گے؟ بڑی بڑی باتیں کرتے رہو گے؟" میرے لہجے میں تندی آگئی۔

"دھیرج میری جان!" وہ نہایت ملائمت اور رسان سے بولا "ابھی تو تم دیکھنا کیا کچھ ہوگا۔ تمہارے ارمان بھی پورے ہوں گے۔ اتنی جلدی کس بات کی ہے۔ یہاں جو کچھ ہوگا اس سے تم جیسے لوگ بھی پناہ مانگنے لگیں گے۔ لیکن تمہارے ساتھ ہمارا رویہ ابھی تک دوستانہ اس لئے ہے کہ تم جیسے لوگوں کے ہم قدردان ہیں۔ کیا معلوم کب تم ہماری مشینری کا پرزہ بننے پر آمادہ ہو جاؤ۔ ہم جوہری ہیں۔ ہیرے کو بہت دور سے دیکھ لیتے ہیں۔ تم پر ہماری مہربانیاں بے سبب نہیں ہیں۔"

"ایک مہربانی مجھ پر اور کرو۔" میں نے التجائیہ سے لہجے میں کہا "کبھی آکر اپنی منحوس صورت دکھا جاؤ۔ یقیناً بندر سے مشابہ ہوگی۔ میں صرف اپنے اندازے کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔"

"چہکتے رہو پیارے!" وہ بدستور خوشگوار لہجے میں بولا "فی الحال تمہیں ہماری طرف سے چہکنے کا لائسنس ملا ہوا ہے۔"

"لائسنس کی تجدید کی فیس بتادو۔ میں باقاعدگی سے جمع کراتا رہوں گا تاکہ لائسنس منسوخ نہ ہونے پائے۔" میں نے کہا۔

"فیس صرف یہی ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔" وہ ملائمت سے بولا۔

"بہن کی بازیابی کو بھی میں اپنا ہی کام سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"تمہاری یہی سوچ تو غلط ہے۔ اسے بھول جاؤ۔ شہر میں اور بھی، اس سے کہیں زیادہ حسین لڑکیاں موجود ہیں جو تمہارے التفات کی منتظر بھی رہتی ہیں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

"بات حسن کی نہیں تعلق خاطر کی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"کم از کم ستارہ کے پاس بیٹھ کر تو ایسی باتیں مت کرو۔ بے چاری کا دل ٹوٹ جائے گا۔" اس کے لہجے میں پھر شوخی جھلک آئی۔

"اچھا صرف یہ بتادو، تم لوگ اس کے ساتھ کوئی برا سلوک تو نہیں کر رہے؟ اسے کوئی ذہنی یا جسمانی اذیت تو نہیں پہنچا رہے؟"

"نہیں۔ اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے کہ ان اقدامات کی ضرورت پڑے۔ اب تو مطمئن ہو؟"

مجھے اس کے لہجے میں صداقت کی جھلک محسوس ہوئی اور دل کو قدرے اطمینان ہوا ورنہ میں اس لڑکی کی طرف سے بہت فکر مند تھا۔

میں ایک لمحے خاموش رہا تو وہ بولا "میں نے تم سے جو باتیں کی ہیں وہ محض گپ شپ یا وقت گزاری نہیں تھی۔ ان میں غور و خوض کے بہت سے پہلو ہیں اور میرا مشورہ ہے کہ غور و خوض ضرور کرنا۔ اور ہاں... کراچی میں تمہارا جو فائیو اسٹار ہوٹل تقریباً مکمل ہو چکا ہے، بہت خوب صورت ہے۔ یونہی باتوں باتوں میں یاد آگیا تو سوچا کہ مبارکباد دے دوں۔ ویسے خیال رکھنا، کوئی ایسی حرکت نہ کرنا کہ عین افتتاح کے دن ہوٹل زمین بوس ہو جائے۔

اتنی حسین عمارت ملبے کا ڈھیر بن جائے اور کوئی بعید نہیں تقریبِ افتتاح پر آئے ہوئے سیکڑوں مہمان بھی اسی ملبے میں ہو جائیں۔ کیسی کیسی حسین، اہم اور معروف شخصیات شامل گی مہمانوں میں۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے، جو لوگ کاروبار کی دنیا کوئی مقام رکھتے ہیں وہ دشمنیوں کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً ہم جیسے لوگوں سے۔"

میرے جسم میں ایک خفیف سی سرد لہر دوڑ گئی۔ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ لوگ میرے بارے میں بہت کچھ جانتے اگر وہ لوگ کراچی میں میرے کاروبار وغیرہ کے بارے میں بہت جانتے تھے تو کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ میرے ساتھیوں کی حیثیتوں سے بھی واقف رہے ہوں۔ گو کہ ہم لوگ ایک عرصے تمام زیرِ زمین دھندے ترک کر چکے تھے اور ہمارے تمام کار اب کسی نہ کسی طرح جائز کاروباروں کی مد میں آچکے تھے۔ قانونی طور پر کسی قسم کا کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔

میرے تمام ساتھی منظرِ عام پر ہی رہتے تھے لیکن اس باوجود اپنی اپنی جگہ ان کی ایک خفیہ حیثیت بھی تھی۔ جن معاملات میں ہمیں جلد شنوائی یا انصاف ملنے کی توقع نہیں تھی، انہیں ہم خود ہی نمٹاتے تھے۔ کبھی کبھار کسی فرعون صفت سزا دینا بھی مقصود ہوتا تھا۔ کسی سے کوئی حساب بھی چکانا ہوتا ظاہر ہے یہ سب کام خفیہ انداز میں انجام دیئے جاتے تھے۔ ان بارے میں کسی کا آگاہ ہو جانا ہمارے لئے الجھن کا باعث ہو تھا۔ خصوصاً ایسے لوگوں کا آگاہ ہونا تو بہت برا تھا جو خود ہما نظروں سے اوجھل تھے۔ ہوٹل کے بارے میں اس شخص کی میرے لئے کچھ نہ کچھ تشویش کا باعث تھی۔ اس ہوٹل پر میرا کروڑ روپیہ لگ چکا تھا۔ روپے سے قطع نظر یہ نکتہ زیادہ توجہ طلب تھا کہ اگر عین افتتاح کے دن شہر کی، بلکہ ملک بھر کی کچھ چیدہ شخصیتیں کسی حادثے کا شکار ہو جاتیں اور میں خود کسی طرح حادثے سے بچ جاتا تو کراچی یا لاہور میں منہ دکھانے کے قابل رہتا۔

تاہم میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "اس قسم کے خیالات میں نہ لانا۔ ورنہ یہ سرزمین تمہارے لئے جہنم بن جائے گی۔ آتش فشاں جب تک پھٹتا نہیں بہت بے ضرر نظر آتا ہے۔ میرے بے ضرر نظر آنے سے دھوکا مت کھاؤ۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بڑے مطمئن و مسرور لہجے میں "خالی گیدڑ بھبکیوں سے کیا ہوتا ہے۔ تم بھی یہیں ہو، ہم بھی یہیں ہیں۔ وقت بتا دے گا کس کی کیا حیثیت ہے۔ خدا حافظ۔" اس اچانک ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں چند لمحے ریسیور کو گھورتا رہا، کار اسے کریڈل پر رکھ دیا۔

اسی لمحے ستارہ کمرے میں داخل ہوئی۔ میری اس گفتگو دوران ستارہ ہال میں چلی گئی تھی۔ دراصل اس شخص سے گفتگو شروع ہوتے ہی میں نے ستارہ کو ایک چٹ لکھ کر دی تھی۔ اس پر اس نے ایک فون نمبر کے ساتھ لکھا تھا "اس نمبر پر ٹیلی فون ایکسچینج میں حفیظ نامی ایک شخص موجود ہوگا۔ اسے اپنا فون نمبر بتا کر کہو کہ کوئی شخص اس نمبر پر بات کر رہا ہے۔ فوری طور پر معلوم کیا جائے کہ وہ کس نمبر سے بات کر رہا ہے۔ یہ پیغام اسے میری طرف سے دینا۔ وہ فوراً جواب دے گا۔"

ستارہ کے ہاں دوسرا فون موجود تھا جو ہال میں رکھا تھا۔ ستارہ میری ہدایت پر عمل کرنے کے لئے اس فون پر چلی گئی تھی۔ میں نے اس دوران اسی لئے اس نامعلوم شخص سے فون پر اپنی گفتگو کو حتی الامکان طول دیا تھا۔ چٹ لکھتے وقت بھی میں نے اس سے بات جاری رکھی تھی۔

ستارہ میرے قریب آکر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں وہی چٹ تھی جو میں نے دی تھی۔ چہرے پر مایوسی تھی۔

"کیا حفیظ نہیں ملا؟" میں نے پوچھا۔

"حفیظ تو مل گیا تھا لیکن بات کرنے والے کا کوئی سراغ نہیں ملا۔" ستارہ بولی "حفیظ نے بہت اچھی طرح چیک کیا اور وہ خود بھی یہ جان کر حیرت زدہ بلکہ کسی حد تک دہشت زدہ ہو گیا کہ وہ کال ایکسچینج کے تھرو نہیں آرہی تھی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو ستارہ؟ یہ کیسے ممکن ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

"یہ میں نہیں کہہ رہی، یہ تمہارا حفیظ کہہ رہا تھا اور یہ کیسے ممکن ہے، یہ خود اس کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اب یا تو تمہارا حفیظ جھوٹ بول رہا تھا، ہمیں ٹرخا رہا تھا۔ یا پھر حقیقتاً کوئی چکر تھا۔"

"حفیظ میرے معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔ بھروسے کا آدمی ہے۔" میں نے کہا۔ امید کی جو موہوم سی کرن میرے ذہن میں ابھری تھی وہ بھی معدوم ہو گئی۔ وہ آج سے کئی سال پہلے کا زمانہ تھا۔ جاپان الیکٹرانکس کی دنیا میں اس وقت بھی بہت آگے تھا مگر پھر بھی ترقی کی رفتار ویسی انقلابی نہیں تھی جیسی آج ہے۔ آج تو روزانہ ایک نئی دھماکا خیز ایجاد مارکیٹ میں آتی ہے اور کم سے کم وقت میں ہمارے ملک تک بھی اس کے اثرات پہنچ جاتے ہیں لیکن اس وقت یہ عالم نہیں تھا۔ ترقی کی رفتار اتنی تیز نہیں تھی۔ میرے لئے بھی یہ بات خاصی حیرت کا باعث تھی کہ ایکسچینج کے توسط کے بغیر باقاعدہ گھنٹی بجنے کے بعد ایک ٹیلی فون سیٹ پر کال ریسیو ہوئی تھی۔

میں نے ابھی تک ریڈ ڈاٹ کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن اب مجھے کچھ کچھ یقین ہونے لگا تھا کہ یہ کوئی خاصی مضبوط تنظیم تھی اور اس کے مقاصد بھی یقیناً چھوٹے موٹے نہیں تھے۔ میں سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور ہو چلا تھا کہ جلد از جلد مجھے کراچی اور لاہور میں پھیلے ہوئے اپنے تمام ساتھیوں کو بلا کر ایک خفیہ اور تفصیلی میٹنگ کرنی چاہئے اور اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل طے کر کے انہیں ضروری ہدایات دینی چاہئیں۔ اس معاملے میں اب ہوشیار ہو جانا ہی بہتر تھا۔

"میں پہلی بار تمہیں کچھ فکر مند سا دیکھ رہی ہوں۔ کیا یہ بہت خطرناک لوگ ہیں؟" ستارہ نے سادگی سے پوچھا۔

"نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اصل میں میرے معاملے میں کئی سمتوں سے کئی مختلف طرح کے لوگ مصروفِ عمل ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ ذرا کچھ عرصے کے لئے کاروبار سے توجہ کم کر کے ان سب کا ہی بندوبست کر دوں تاکہ سکون سے زندگی سے کچھ انجوائے کر سکوں۔ ہر جگہ ہی کوئی نہ کوئی، کسی نہ کسی قسم کی بخ اڑانے آجاتا ہے۔ مثلاً آج ہی کی بات لے لو۔ دن بھر کسی نہ کسی قسم کا دردِ سری لاحق رہا۔ سوچا تھا شام کو بالکل ہلکا پھلکا ذہن لے کر تمہارے پاس آجاؤں گا اور اس آستانِ محبت سے گدگداتی یادوں کے کچھ خوش رنگ پھول دامن میں سمیٹ کر لے جاؤں گا مگر افسوس! یہاں بھی رنگ میں بھنگ...."

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

"رنگ میں تو جتنی بھنگ پڑنی تھی پڑ چکی۔" ستارہ مسکراتے ہوئے بولی "باغباں تو تم پر اب بھی مہرباں ہے، گدگداتی یادوں کے خوش رنگ پھول چن کر لے جانے سے تمہیں کس نے روکا ہے؟"

"مجھے باغباں کی طبیعت کے بارے میں تشویش ہے۔ کیا باغباں اب واقعی بالکل ٹھیک ہے؟" میں نے اس کا سرتاپا جائزہ لیا۔ اس نے اپنے آپ کو سنوارنے کے لئے رنگ و بو کے امتزاج سے جو حشر آرائی کی تھی اس کے نقوش کچھ زیادہ نہیں بگڑے تھے۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تمہیں معلوم ہی ہے، میں کسی نہ کسی حد تک تو سخت جان ہوں۔" وہ دل آویزی سے مسکرائی۔ تکلیف دہ لمحے اس کی آنکھوں سے اپنی ناگواریاں لے کر رخصت ہو چکے تھے اور اب ان آنکھوں میں جذبوں کے جگنو جھلملا رہے تھے۔

"باغباں کو چاہئے کہ پہلے اس بھوکے کو کھانا کھلانے کا بندوبست کرے۔ بھوکے پیٹ تو پھول کلیوں کی باتیں بھی اچھی نہیں لگتیں۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کراہ کر کہا۔

"کبھی کبھی تو تم بہت ہی غیر رومانی آدمی بن جاتے ہو۔ جذبات پر بریانی قورمہ انڈیل دیتے ہو۔" ستارہ آہ بھر کر بولی پھر اس نے ملازمہ کو بلا کر کھانا لگانے کی ہدایت کی۔

دوسری صبح میں اس کے ہاں سے رخصت ہونے لگا تو وہ عجیب سے لہجے میں بولی "انی! ایک فرمائش کروں پوری کرو گے؟"

"کوئی ہیرا نظر آگیا ہے جو تمہاری قوتِ خرید سے باہر ہے؟" میں نے موزے پہنتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے روپیہ پیسہ، ہیرے جواہر اور اس قسم کی دوسری چیزیں اب میری کمزوریاں نہیں رہیں۔"

"تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔" میں نے کہا "اب اصل بات بتاؤ۔"

"آج دوپہر ہم لوگ" جنگل گرل "کی شوٹنگ کے سلسلے میں رائے ونڈ روڈ کے راستے ایک جنگل میں جائیں گے۔ بہت خوب صورت لوکیشن ڈھونڈی ہے راحیل بٹ نے۔ بہت ہی پیاری جگہ ہے۔ دو مرتبہ پہلے بھی وہاں شوٹنگ ہو چکی ہے اور دونوں مرتبہ وہاں مجھے تم بہت یاد آئے۔ بڑا ہی خوب صورت جنگل ہے۔ ہرے بھرے درخت ہیں۔ عجیب و غریب رنگا رنگ پھولوں سے لدے ہوئے جنگلی پودے ہیں۔ کچھ فاصلے سے ایک نہر گزر رہی ہے جس کے دونوں کناروں پر کچھ حصے میں بڑا خوب صورت گھاس کا فرش ہے۔ وہاں اتنا سکون' اتنی خاموشی اور اتنی خوب صورتی ہے کہ کئی بار میں نے سوچا' اگر تم میرے ساتھ ہوتے تو میں ہمیشہ کے لئے وہیں رہ پڑتی۔"

"نا بابا....!" میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا "مانا کہ ہم تمہارے چاہنے والوں میں ہیں مگر اب میں تمہاری خاطر بن باس نہیں لے سکتا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں تم سے کب ایسی فرمائش کر رہی ہوں۔ پوری بات تو سن لو۔" وہ بدستور مخمور سے لہجے میں بولی۔ "تمہیں یاد ہے جب میں سجاد اینڈ کمپنی میں مزدوری کرتی تھی اور تم وہاں سپروائزر تھے۔"

"تمہیں ابھی تک اس کمپنی کا نام بھی یاد ہے!" میں نے حیرت سے کہا "وہ ہمارا تقریباً لڑکپن کا ہی دور تھا۔ خاصے کم عمر تھے ہم دونوں۔"

"لیکن تھے پکّے بدمعاش۔ مجھے تو اس زمانے کی ہر بات یاد ہے۔" اس کے رخساروں پر سرخی گہری ہو گئی۔

"تم زیادہ تیز تھیں۔ میں تو یونہی بدھو سا تھا۔" میں نے اس دور کی یادوں سے دل میں گدگدی سی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"اب میں اپنے آپ کو تمہارے سامنے بدھو محسوس کرتی ہوں۔" اس اعتراف میں بھی فخر کی جھلک نمایاں تھی۔

"یہ وقت وقت کی.... یا پھر شاید بخت بخت کی بات ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ جہاں کمپنی سڑک اور پُل بنا رہی تھی وہاں کچھ دور سائٹ سے ہٹ کر ایسا ہی منظر تھا جیسی لوکیشن پر آج میں شوٹنگ کے لئے جا رہی ہوں۔ تمہیں یاد ہے میں تمہارے لئے کھانے پینے کی کوئی نہ کوئی چیز بنا کر لاتی تھی اور یہی ظاہر کرتی تھی کہ میں بابا سے چھپ کر آئی ہوں...."

"ہاں۔ تم اس وقت بھی ایک کامیاب اداکارہ تھیں۔" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"لیکن اب جبکہ میں اداکاری کا پیشہ اختیار کر چکی ہوں تو میں درحقیقت اداکارہ نہیں رہی۔" وہ فوراً بولی "اور میں نے اس دور کی خود غرضیوں کی بڑی حد تک تلافی بھی کر دی ہے۔ اب میں تمہارے لئے سلگتی ہوں اور تم اپنی راہوں پر سرپٹ جا رہے ہو۔ خیر... میں بیتے دنوں کی بات کر رہی تھی۔ ہم کنارے گھاس پر بیٹھ کر وہ روکھی سوکھی چیزیں کھا کر کتنے خو[ش] کرتے تھے۔"

"کبھی کبھی کپڑوں سمیت نہر میں کود کر پیراکی کا شوق بھ[ی] کرتے تھے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"بعد میں کپڑے سکھانے کے لئے گھاس پر دوڑے تھے۔" وہ جھینپی جھینپی سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"بالکل اُلّو لگتے ہوں گے۔" میں نے چشم تصور میں ا[پنے آپ] کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں چاہتی ہوں ہم ایک بار پھر اُلّو لگیں۔" جانے کیو[ں] ہی اس کے لہجے میں افسردگی سی در آئی "یہ جو خوب صور[ت] میں نے دیکھی ہے' وہاں میں تھوڑی دیر تنہا جا کر بیٹھی تو میر[ے] میں درد سا ہونے لگا۔ ایک عجیب سی ٹیس بار بار اٹھ رہی تھی کسی کو بتائے بغیر وہاں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ یونٹ والے کافی د[یر] مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پریشان ہوتے رہے اور میں بس گرد و پیش [سے] بے نیاز بیٹھی رہی۔ بہت شدت سے دل چاہا کہ تم میرے [ساتھ] ہوتے۔ ہم وہاں بیٹھ کر کچھ کھاتے پیتے' ایک دوسرے کے [پیچھے] بھاگتے' بچوں جیسی حرکتیں کرتے۔"

"اور کپڑوں سمیت سوئمنگ بھی۔" میں نے لقمہ دیا۔

"وہ تو اب ہم سوئمنگ کاسٹیوم میں بھی کر سکتے ہیں۔ کون منع کر سکتا ہے۔" وہ افسردگی سے مسکرائی "اصل با[ت] احساس کی ہے۔ کیا وہ معصوم سنسنی.... دلوں میں وہ مدوجزر د[وبارہ] محسوس کیا جا سکتا ہے؟ کیا ان گمشدہ لمحوں کا لمس ایک با[ر] مستعار مل سکتا ہے؟ کتنا اچھا لگے گا۔ گو یہ سب کچھ بھی عارضی' بالکل لمحاتی ہو گا مگر تھکی ہوئی روح کو کتنی تازگی ملے گی۔"

وہ ایسی باتیں کرتی تھی تو میرے دل پر چڑھے ہوئے پتھ[ر کے] خول میں بھی دھمک سی ہونے لگتی تھی۔ میں نے جلدی سے [کہا] "بھئی جیسے تم کہتی ہو کر لیں گے۔ اس میں اتنی لفاظی اتنی تمہید [کی کیا] ضرورت ہے۔ لیکن اس کی صورت کیا ہو گی؟"

"تھینک یو" اس نے میری ٹائی کی ناٹ درست کرتے ہ[وئے] مدھم لہجے میں کہا۔ پھر ایک لمحے خاموش رہ کر بولی "میں تو یونٹ [کے] ساتھ جاؤں گی۔ ایک صورت تو یہ ہو سکتی ہے کہ تم بھی ساتھ چلے چلو۔ تم اپنی گاڑی لے لینا یا میں اپنی لے لوں گی اور ہم ا[پنی] ہی گاڑی میں یونٹ کی گاڑیوں کے پیچھے پیچھے چلے چلیں گے۔"

"اور دوسرے دن اخباروں میں اسکینڈل چھپ جائے گا [کہ] اب تو میڈم ستارہ اپنے عاشقوں کو شوٹنگ پر بھی ساتھ لانے [لگی] ہیں۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔

وہ گویا سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی "لیکن شوٹنگ ختم ہو[نے] کا انتظار کرنا تمہارے لئے بڑی بوریت کا باعث ہو گا۔ [...] بھی شوٹنگ دیکھنے کے لئے مرے جاتے تھے۔" میں نے [...] لے کر کہا "اب عالم یہ ہے کہ پندرہ منٹ کی شوٹنگ دیکھ [...] پھاڑ کر جنگلوں کو نکل جانے کو جی چاہتا ہے۔"

[...] چنانچہ دوسرا طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم شوٹنگ ختم ہونے پر [...] تقریباً تین بجے شوٹنگ ختم کرنے کا ٹارگٹ ہے۔ میرا اندازہ [...] چار بجے تک تو ہو ہی جائے گی۔ وہ بھی اس لئے کہ ہمارے [...] سب وقت کے بہت پابند ہیں۔ ورنہ تو شوٹنگ اپنے [...] گھنٹوں لیٹ ہوتی ہے۔" وہ بولی "یونٹ والے شوٹنگ [...] کے واپس آ جائیں گے۔ ہم دونوں وہیں رک جائیں گے اور [...] سی پکنک منا کر واپس آئیں گے۔ میں لوکیشن تمہیں سمجھا [...] تم آسانی سے وہاں پہنچ جاؤ گے۔"

"اس صورت میں زیادہ بڑا اسکینڈل چھپے گا کہ یونٹ تو شوٹنگ [...] کر کے واپس آ گیا مگر ہیروئن اپنے عاشق زار کے ساتھ جنگل [...] اور رنگ رلیاں وغیرہ وغیرہ مناتی رہی۔ مشہور لوگوں کے [...] تو انسان تفریح کے چند لمحے بھی نہیں گزار سکتا۔" میں نے [...] کہا۔

"تم اسکینڈل سے ڈرتے ہو؟" اس نے مسکراتے ہوئے میری [آنکھوں] میں جھانکا "حالاں کہ ڈرنا تو مجھے چاہئے۔"

"تم اب کہاں کسی چیز سے ڈرتی ہو۔ میں تو بے چارہ ایک [...] سادا' معصوم سا نوجوان ہوں۔" میں نے منہ لٹکاتے ہوئے [...]

وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی "بس' بس۔ اب فیڈر یا چوسنی [...] لئے ضد نہ شروع کر دینا۔ تم مطمئن رہو' کوئی اسکینڈل نہیں [...] گا۔ دراصل اسٹوڈیو کے جو چھوٹے موٹے کارکن یونہی اپنی [...] بنانے کے شوق میں دوڑے دوڑے اخبار نویسوں کے پاس [...] ہیں یا کسی غرض کے تحت ان کے آلۂ کار بنے ہوتے ہیں اور [...] چھوٹی سے چھوٹی بات بڑھا چڑھا کر انہیں بتاتے ہیں' وہ میرے [...] میں ایسا نہیں کرتے۔ کیوں کہ میں ان سے حقارت کا سلوک [نہیں] کرتی۔ ایک انسان کی حیثیت سے انہیں برابر سمجھتی ہوں' [...] دیتی ہوں۔ آڑے وقت میں ان کے کام آتی ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے اسکینڈل تو ہوتے ہوں گے مگر تم نے [...] اخبار والوں سے چھپائے رکھنے کا بندوبست کیا ہوا ہے؟" [میں] نے اس کی طرف جھکتے ہوئے دلچسپی سے کہا۔

"میرا اسکینڈل تو بس تمہارے ساتھ ہی بن سکتا ہے اور کسی [...] تو ابھی دھیان ہی نہیں گیا۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا [...] یکدم ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے میرے کوٹ کا کالر مٹھی میں جکڑ کر [ایک] جھٹکا دیتے ہوئے بولی "سچ سچ بتاؤ' کیا میرے ساتھ اسکینڈل [بننے] سے تم اتنا ہی ڈرتے ہو؟ اس معمولی ایکسٹرا ہنی کے ساتھ [تمہ]ارا اسکینڈل بنا تھا تب تو تمہیں غصہ نہیں آیا تھا۔" لگتا تھا وہ [...] یاد آنے سے وہ یکدم سچ مچ ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔

"ارے.... میں تو مذاق کر رہا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا "اس شہر میں تو مجھ جیسے نہ جانے کتنے پڑے ہوں گے جو تمہارے ساتھ "بدنام" ہونے کے لئے اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار ہوں گے۔"

اس کا موڈ دوبارہ مخمور سا ہو گیا تو میں نے کہا "لیکن یہ پروگرام آج شوٹنگ والے دن ہی رکھنا کیا ضروری ہے؟ اتنی بھیڑ بھاڑ کے ساتھ جانے کے بجائے کیا ہم کسی اور دن اکیلے وہاں نہیں جا سکتے؟"

"کل کس نے دیکھی ہے۔ ایک تو زندگی کا کچھ اعتبار نہیں۔ دوسرے تمہارا کوئی بھروسا نہیں کہ تمہاری مصروفیات کا کیا عالم ہو۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ کسی چیز کے لئے دل آج مچل رہا ہو اور اس کے میسر آنے کی امید ایک ماہ بعد ہو' اس کا کیا فائدہ؟ تمہیں معلوم ہے' خواہشوں کے معاملے میں' میں ایک عجیب عورت ہوں۔"

"میرا خیال ہے تم ہر معاملے میں ہی ایک عجیب عورت ہو۔ اسی لئے مجھ جیسا سیلانی تمہارا اسیر ہے۔" میں نے کہا "تمہاری رگ و پے میں کبھی ختم نہ ہونے والی رومانیت رچی ہوئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ شب رفتہ کے ساتھ ساتھ تمہاری شمع رومانویت کی لو بھی مدھم پڑ چکی ہو گی۔ میرا خیال ہے تم ان عورتوں میں سے ہو جن میں رومانویت کی حس کبھی ختم نہیں ہوتی۔"

"عورت میں اگر رومانویت کی حس ختم ہو جائے تو میرے خیال میں وہ عورت کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔" ستارہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں فلسفے میں تم سے نہیں جیت سکتا۔" میں نے ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا "پروگرام کچھ یوں رکھتے ہیں کہ میں چار بجے ہی لوکیشن پر پہنچ جاؤں گا۔ اس دوران کچھ ضروری دفتری کام بھی انجام دے لوں گا۔ گھر جا کر لباس بھی تبدیل کر لوں گا اور تیراکی کا لباس بھی ساتھ لے لوں گا۔ لگتا ہے تم نہر کے گندے مندے اور گدلے پانی میں غوطے کھلوا کر ہی چھوڑو گی۔"

"اب اپنی اوقات مت بھولو۔" وہ شوخی سے مسکرائی "سوئمنگ پول تو جمعہ جمعہ آٹھ دن سے نصیب ہوئے ہیں ورنہ تو ایسی ہی گدلی نہروں میں ڈبکیاں کھا کر پھولے نہیں سماتے تھے۔ بلکہ نہر تو خاصی معززانہ چیز ہے' تمہیں تو کہیں برساتی جوہڑ بھی نظر آ جاتا تھا تو فو[راً ا]یک آدھ غوطہ لگانے پر تل جاتے تھے۔"

"ایک تو غربت کے زمانے کے شناساؤں میں یہ بڑی بری عادت ہوتی ہے۔ ایک منٹ میں سارا پول کھول کر رکھ دیتے ہیں۔" میں نے آہ بھر کے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا "اچھا میں چلتا ہوں۔ ارے ہاں... ذرا مجھے لوکیشن اچھی طرح سمجھا دو۔"

اس نے کاغذ قلم لے کر لوکیشن مجھے سمجھائی۔ مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ میرا وہاں پہنچنا زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔

ستارہ کے ہاں سے میں سیدھا دفتر ہی چلا گیا۔ وہاں دوپہر کے کھانے تک مصروف رہنے کے بعد میں نے باہر سے آئے ہوئے ایک وفد کے ساتھ انٹرکان میں کھانا کھایا اور پھر انہیں اپنے منیجر کے ساتھ ائرپورٹ رخصت کرکے خود گھر آگیا۔ کچھ دیر بعد میں تیار ہو کر گھر سے نکلا تو ٹونی اور فیمبرکی کار ایک بار پھر سائے کی طرح میرے پیچھے تھی۔

جنرل اسپتال سے آگے نکل آنے کے بعد میں نے ریڈیو پر ٹونی سے رابطہ قائم کیا اور بلا تمہید ایک شعر سنا دیا۔

بہتر ہے دل کے ساتھ رہے پاسبانِ عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ٹونی غالباً کچھ حیران سا ہوگیا۔ اٹک اٹک کر بولا "سر...! آپ آج شعروں میں بات کر رہے ہیں؟"

"ہاں ٹونی ڈیئر!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہی تو تمہیں معلوم نہیں کہ اندر سے میرا مزاج بڑا شاعرانہ ہے۔ سفاک بننے پر تو بعض لوگ مجھے مجبور کردیتے ہیں۔ اچھا سنو... دس بارہ میل بعد کاہنا نام کا جو گاؤں آئے گا نا... اس سے تقریباً ایک میل آگے میں کچے راستے پر مڑ جاؤں گا۔ بس وہاں سے تم واپس آجانا۔ سمجھے۔ آج میں ایک چھوٹی سی پکنک منانے جارہا ہوں اور یہ خالصتاً ایک نجی سرگرمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہاں بھی تمہاری آنکھیں میری نگراں رہیں۔"

"ایز یو وش سر!" ٹونی بولا "ویسے بہتر یہی ہے کہ گھر سے باہر آپ کسی بھی وقت ہماری نظر سے اوجھل نہ ہوا کریں۔"

"مطمئن رہو ٹونی! اگر خدا کو میری زندگی منظور ہے تو کوئی بھی مجھے نہیں مار سکتا۔ اور اگر اوپر والے کے ہی کھاتوں میں میری زندگی کے دن ختم ہوجائیں گے تو کوئی میری زندگی کا ایک پل بھی نہیں بڑھا سکتا۔" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر درویشانہ ہوگیا۔

"وہ تو درست ہے سر!" ٹونی اپنے مخصوص دھیمے لہجے میں بولا۔ "لیکن احتیاط کی تلقین بھی تو خدا نے کی ہے۔"

"اسی لئے تو تم لوگوں کو اس حد تک زحمت اٹھانے کی اجازت دے رکھی ہے۔ ورنہ میں تو اتنی نگرانی کا قائل نہیں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر! اگر آپ اجازت دیں تو ہم لوگ ہائی وے پر رک جائیں گے۔ اگر ضرورت پڑی تو آپ ریڈیو پر رابطہ قائم کرکے اور لوکیشن بتا کر ہمیں طلب کرلیجئے گا۔"

"چلو یہ ٹھیک ہے۔" میں نے اس کی تجویز سے ا
یہ اس کی محبت اور خلوص تھا کہ میری حفاظت کے
میری خواہش سے زیادہ مستعد رہنا چاہتا تھا۔

مذکورہ موڑ پر پہنچ کر انہوں نے ایک سایہ دار جگہ
گاڑی روک لی اور میری گاڑی کچے راستے پر دھول اڑا
گئی۔

لوکیشن تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہ
مین روڈ سے تقریباً چھ میل دور تھی۔ واقعی بہت خوب
تھی۔ کہنے کو جنگل تھا لیکن بہت سے باغات سے کہیں
صورت۔ یہاں جھاڑ جھنکاڑ بھی تھے اور پھولوں سے لد
بھی۔ اونچے نیچے درخت بھی تھے اور سانپوں کی طرح ز
ہوئی بیلیں بھی۔ بعض درخت تو اتنے بلند تھے کہ مجھ جیسے
بھی زندگی میں اتنے اونچے درخت نہیں دیکھے تھے۔
درختوں کے درمیان ایک صاف اور کشادہ قطعے پر یونٹ
ڈالے ہوئے تھے۔ مجھے ان کی موجودگی کے آثار دور
آگئے تھے۔

ڈائریکٹر راحیل بٹ سمیت یونٹ کے سبھی افراد ا
وہاں پا کر حیران رہ گئے۔ انہیں میری آمد کی اطلاع نہیں
ایک ہلچل سی مچ گئی "چوہدری صاحب آئے ہیں۔
صاحب آئے ہیں..." کوئی میرے لئے فولڈنگ چیئر جھا
لا رہا تھا۔ کوئی آئس بکس سے ٹھنڈی بوتل پکڑے سے
لئے چلا آرہا تھا۔ جبکہ میں ان سب کا شکریہ ادا کرکے
تکلفات سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ارشد موتی بھی وہاں موجود تھا اور اتنے لوگوں میں
شخص تھا جو خاموشی سے ایک طرف کھڑا تھا۔ اس۔
مصافحہ بھی نہیں کیا تاہم اس کی آنکھوں میں اب پہلا
نفرت، نحوست یا خونخواری نہیں تھی بلکہ مجھے دیکھ کر اس
پر ہلکے سے خوف کے آثار نمودار ہو چکے تھے۔ اس کا مط
میری طرف سے دوسری مرتبہ ذرا معقول ڈوز مل جانے
کافی حد تک سدھر چکا تھا۔ شاید اسے یہ دھڑکا لگ گیا ت
آمد خالی از علت نہیں ہے۔ وہ چیتے کی مصنوعی کھال کے
سے لباس میں تھا۔ گہرا میک اپ کئے ہوئے تھا۔ اس
بھی کہیں کہیں میک اپ کا ہلکا ٹچ دے کر رگ پٹھے نمایاں
کوشش کی گئی تھی۔

وہاں سے کچھ دور بلند درختوں میں ایک دوسرے
فاصلے پر اونچی اور مضبوط شاخوں میں کچھ رسیاں بھی لٹکا
لیکن ان پر مٹیالا کپڑا وغیرہ لپیٹ کر انہیں ان جڑوں کی شک
کامیاب کوشش کی گئی تھی جو برگد کے پرانے درختوں
رہتی ہیں گو کہ درخت برگد کے نہیں تھے۔ ایک بہت اد
چھلانگ میں مدد دینے کے لئے ارشد موتی کے لئے ایک

لمبی شاخوں میں مچان بھی لگائی گئی تھی۔ راحیل بٹ نے بتایا کہ ارشد موتی ان رسیوں کی مدد سے ادھر اُدھر جھول کر اپنے بیشتر کرتب شوٹ کروا چکا تھا۔ تاہم ابھی اس کے چند شاٹس باقی تھے۔ ستارہ کا کام ختم ہو چکا تھا۔

"بھئی میں تو یہاں ستارہ کا مہمان ہوں۔" میں نے ان لوگوں کی حیرانی کسی حد تک رفع کرنے کے لئے بتایا "اس نے اس علاقے کی اتنی تعریف کی کہ مجھے ضرور یہاں گھومنا پھرنا چاہئے' کچھ وقت گزارنا چاہئے۔ ہم جیسے زندگی کی مصروفیتوں کے مارے ہوئے لوگوں کو یہاں بڑا سکون مل سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں تو اس کی تعریفوں سے متاثر ہو کر چلا آیا۔ ویسے بھی ستارہ جیسی خاتون کسی کو دعوت دے تو انکار کر کے کفرانِ نعمت کا مرتکب نہیں ہونا چاہئے۔"

"ہاں یہ آپ نے لاکھ روپے کی بات کی۔" راحیل بٹ نے اثبات میں سرہلایا۔

"ویسے ستارہ نے آپ سے غلط تعریف نہیں کی۔ ہم لوگ جتنی مرتبہ بھی یہاں آئے ہم نے کام بھی بہت خوب صورتی سے مکمل کیا اور انجوائے بھی بہت کیا۔ اعصاب کو بہت سکون ملا۔ خصوصاً نہر کے کنارے جا کر تو طبیعت میں بڑی فرحت آتی ہے...... میں تو اس سارے ٹکڑے کو ہر زاویے سے اپنی فلموں میں استعمال کر چکا ہوں۔ ورنہ ابھی مزید دو چار مرتبہ آؤٹ ڈور شوٹنگ یہاں کی رکھتا۔"

"بٹ صاحب! ہم ابھی نہر کی طرف ہی جا رہے ہیں۔ جب آپ لوگ روانہ ہونے لگیں تو ہمیں بلوا لیجئے گا۔" ستارہ نے میرا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے کہا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ایک خوب صورت ٹفن کیریئر تھا۔ یونٹ کے لوگوں نے ہمارے یوں جانے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنے اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ ہم ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دو بے فکرے بچوں کی طرح گھومتے گھامتے درختوں کے درمیان سے گزرتے ایک طرف کو چل دیئے۔

ہم ان لوگوں سے کافی دور نکل آئے لیکن نہر ابھی نظر نہیں آئی تھی۔ یونٹ کے لوگوں کے زور زور سے بولنے کی آوازیں معدوم ہو چکی تھیں۔

"تم نے آج میرے بلاوے پر یہاں آ کر میرا مان رکھ لیا ہے۔" ستارہ والہانہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"یہ تو بہت خوب صورت جگہ ہے سرکار! آپ تو اگر صحرائے گوبی میں بھی بلائیں گی تو آپ کے اس خادم کو آنا پڑے گا۔" میں نے بازو اس کی گردن کے گرد حمائل کرتے ہوئے کہا۔ اس کا گداز ہاتھ میرے ہاتھ پر تھا اور یوں ایک، دوسرے کے سہارے دھیرے دھیرے قدم بڑھانا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ واقعی میرا دل چاہنے لگا کہ یہ سفر کچھ طویل ہو جائے۔

مگر ان خوب صورت اور پُرسکون لمحوں میں اچانک قریب ہی کہیں کوئی آٹومیٹک گن گرج اٹھی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی عین قریب سے گزریں۔ ستارہ خود بخود ہی دہشت کے گھٹنوں کے بل زمین پر گر پڑی۔ میں نے خود بھی رکوع کی سی میں جاتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے الٹے قدموں کی کوشش کی تاکہ درختوں کی اوٹ میں ہو سکیں۔ لائن آف مجھے فوری طور پر اندازہ ہو گیا تھا۔

لیکن یکدم لگنے والے اعصابی جھٹکے نے ستارہ کو نکارہ سا بنا دیا تھا۔ وہ فوری طور پر اپنی جگہ سے حرکت کر قابل نہیں رہی تھی۔ ایک تناور درخت نے ہمیں گولیوں برسٹ سے محفوظ رکھا تھا۔

میں نے ستارہ کے اوسان خطا دیکھ کر اسے ایک بازو اور دوسرے ہاتھ سے کوٹ کی جیب سے اپنا مشین پسٹل ہوئے رکوع کی سی حالت میں ہی دوڑ پڑا۔ فائرنگ کا رخ بدلا کوئی ہمارے تعاقب میں تھا۔ ستارہ کے تحفظ کی فکر نے فوری مجھے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ پوزیشن لے کر مقابلہ کر کوشش کرتا یا اندازہ کرتا کہ حملہ آور کہاں چھپا ہوا ہے۔

میں درختوں کے درمیان زگ زیگ کرتا دوڑتا چلا گیا مجھے اپنے سامنے لٹکی ہوئی ایک رسی نظر آئی جس کا دوسرا کہیں شاخوں میں گم تھا۔ میں نے اچھل کر اسے تھاما اور ایک پر ستارہ کو سنبھالے پورے جسم کی قوت دوسرے بازو میں کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک لمبی زقند بھری۔ یہ ایک کام تھا۔ فلم کا کوئی شاٹ نہیں تھا جسے کیمرہ ٹرک کی مدد سے کچھ بنا کر دکھایا جا سکتا۔

میں نے اپنے اندازے سے بھی لمبی زقند بھری اور رسائی ختم ہونے پر جہاں میں نے چھلانگ لگائی وہاں عین سا۔ کچھ فاصلے پر کیمرہ موجود تھا جو آن تھا اور ہلکی سی گھرر گھرر کی کے ساتھ چل رہا تھا لیکن اس کے عقب میں کوئی کیمرہ مین تھا۔ فائرنگ کی آواز سن کر یونٹ کے لوگ ادھر ادھر بھاگ تھے۔ کوئی سینے کے بل زمین پر لیٹ گیا تھا۔ کوئی درخت کے جا گرا تھا۔ حتیٰ کہ ارشد موتی بھی وہاں نہیں تھا۔ فلمی ٹارزن کسی درخت کی آڑ میں پناہ لے چکا تھا اور اس کی جگہ کیمرہ شاید میری چھلانگ کا منظر فلمبند کر لیا تھا۔ اگر یہ منظر کسی سینما میں چلتا تو یقیناً تماشائی بہت حیران ہوتے کہ یہ کیسا ٹارزن تھا کے ایک بازو پر ہیروئن تو موجود تھی مگر جو تھری پیس سوٹ میں فائرنگ ابھی جاری تھی اس لئے میں یہاں بھی رک نہیں تھا۔ میں نے ستارہ کو بازو پر اٹھائے رکھا اور مزید آگے دوڑ گیا۔

اچانک مجھے درختوں کے جھنڈ سے ذرا آگے، ٹیلے پر گاڑی کھڑی نظر آ گئی۔ میرے دل کو قدرے اطمینان ہوا۔

کسی چھوٹے موٹے کارخانۂ عجائب سے کم نہیں تھی۔
فائرنگ کی آوازیں قدرے مدھم پڑ گئی تھیں۔ فائرنگ کرنے یقیناً کافی پیچھے رہ گئے تھے اور شاید میں ان کی نظر سے اوجھل تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ وقفے وقفے سے فائرنگ کئے جا رہے شاید مجھے خوفزدہ کرنے اور بھگائے رکھنے کے لئے۔

میں تیزی سے گھوم کر گاڑی کی دوسری طرف پہنچا۔ ستارہ کو نے بازو سے اتار دیا اور میرا اشارہ پا کر وہ گاڑی کی اوٹ میں کے بل لیٹ گئی۔ اب وہ خوفزدہ نظر نہیں آ رہی تھی بلکہ اس تو میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب وہ میری طرف دیکھتے ئے شریر سے انداز میں مسکرا دی۔ گویا یہ فائرنگ بھی اس کے م ایڈونچر کا ایک حصہ رہی ہو۔

"بہت خوش ہو رہی ہو۔" میں نے سرگوشی میں کہا "قدرت بچا لیا ورنہ ابھی پرخچے اڑ گئے ہوتے۔"

"میں نے تو اب سوچ لیا ہے کہ تمہارے ساتھ رہنا ہے تو نہ ایک روز پرخچے ہی اڑنے ہیں۔ اس لئے اب پریشان نے اور گھبرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔" اس نے سرگوشی میں ہی ب دیا۔

"اچھا بکواس مت کرو اور یہ سنبھالو۔" میں نے گھٹنوں کے جھکتے ہوئے کوٹ کی اندرونی جیب سے مشین پسٹل نکال کر اس طرف بڑھاتے ہوئے کہا "پستول چلانا تو آتا ہو گا تمہیں؟"

"تھوڑا بہت سیکھا ہے۔" وہ پستول سنبھالتے ہوئے بولی۔ اسی پُرخطر زندگی گزاری ہے میں نے۔ اور اپنی حفاظت خود نے کا شوق بھی ہے' اس لئے اس قسم کی چیزوں کا استعمال سیکھنے کوشش کرتی رہتی ہوں۔ لیکن نشانے کے بارے میں کچھ نہیں ہ سکتی۔" وہ گویا معذرت خواہ تھی۔

"نشانے کے بارے میں تمہیں کون کم بخت کچھ کہہ رہا ہے۔ کون سا یہاں ٹارگٹ شوٹنگ کے مقابلے میں ٹرافی جیتنے آئے ئے ہیں۔" میں نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ پچھلی سیٹ کے نیچے ایک خفیہ بٹن دبا کر میں نے ایک لمبوترا سا خانہ مولات اسٹیل کی سیاہ پلیٹ سے ڈھکے ہوئے اس خانے کی موجودگی کسی کو احساس نہیں ہو سکتا تھا۔

دوسرے ہی لمحے سیاہ رنگ کی سیون ایم ایم کی ایک خاص قسم آٹومیٹک رائفل میرے ہاتھ میں تھی۔ ستارہ کے چہرے پر شوخی کے آثار قدرے کم ہو گئے اور آنکھوں میں ہلکا سا خوف جھلک آیا۔

رائفل دیکھنے میں بہت خوب صورت تھی لیکن ہتھیاروں کی خوب صورتی عجیب ہوتی ہے۔ اس کی تہہ میں موت کی خوف ناکی اور بد صورتی پنہاں ہوتی ہے۔

گن سنبھال کر میں دوسری طرف بڑھا تو عقب سے ستارہ میری جیب کا کونا کھینچ کر خوفزدہ سی سرگوشی میں بولی "تم کیا کرنے جا رہے ہو؟"

"وہی جو دوسرے کر رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"پھر تم میں اور دوسروں میں کیا فرق رہے گا؟"

"یہ میں بعد میں سوچوں گا۔"

"بعد میں سوچنے والے نقصان میں رہتے ہیں۔"

"یہ فلسفہ جھاڑنے کا وقت ہے کیا؟" میں نے نرمی سے اس سے قمیص چھڑاتے ہوئے کہا "تم صرف اتنا کرنا کہ جب میں تمہاری نظروں سے اوجھل ہو جاؤں تو دو چار ہوائی فائر کر دینا تاکہ ان لوگوں کو گمان گزرے کہ میں یہاں ہوں۔ انہیں صرف چند لمحے کے لئے غلط فہمی میں رکھنا تمہارا کام ہے۔ اس دوران میں ان سے نمٹ لوں گا۔"

"یہ امکان بھی تو ہے کہ ان چند لمحوں میں وہ یہاں آ کر میرا تیا پانچا کر دیں؟" اس کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو چکی تھی۔

"مت بھولو کہ چند لمحے پہلے ہی تم نے نڈر اور بے خوف رہنے کا عزم ظاہر کیا ہے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ وہ خاموش ہو گئی اور مشین پسٹل کو ہاتھ میں تولنے لگی۔

میں نے چلتے چلتے اسے بتانا بہتر سمجھا "یہ عام پستول یا ریوالور سے ذرا مختلف ہے۔ فائر کرو گی تو مسلسل جھٹکے لگیں گے۔ گرفت مضبوط رکھنا۔"

اس نے اثبات میں سرہلایا اور میں درختوں کے جھنڈ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ فائرنگ بند ہو چکی تھی لیکن آخری فائر جہاں سے ہوئے تھے اس جگہ کا مجھے اندازہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ حملہ آور ابھی اس جگہ کے آس پاس ہوں گے۔

درختوں کے درمیان میں نے حتی الامکان تیز رفتاری سے فاصلہ طے کیا اور وہاں جا پہنچا جہاں سے میری دانست میں آخری فائر کئے گئے تھے۔ وہاں مجھے ہلکی مشین گن کا ایک خالی میگزین بھی پڑا دکھائی دیا۔ گھاس بھی بری طرح مسلی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہاں چند لمحے پہلے تک انسانوں کی زبردست نقل و حرکت رہی ہو۔

میں کھلے میں نہیں آ رہا تھا بلکہ درختوں کی اوٹ میں رہتے ہوئے ہی چھلاوے کی طرح انتہائی تیزی سے اِدھر اُدھر حرکت کرتے ہوئے صورتِ حال کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔

فضا سے بارود کی بُو معدوم ہو چکی تھی۔ بُو سونگھنے کی مجھ میں درندوں کی سی جو صلاحیت موجود تھی' آخر کار اس نے میری مدد کی اور مجھے بتا دیا کہ انسان کس طرف تھے۔ انسانوں کی بُو لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی تھی۔ میں تیزی سے اس سمت میں بڑھا۔

آخر کار وہ مجھے نظر آ گئے۔ تعداد میں وہ صرف دو تھے اور نہایت اطمینان سے نیچی آواز میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ ان کی آواز مجھ تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ صرف حرکات و سکنات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ باتیں کر رہے تھے۔

وہاں درخت چھدرے تھے اور وہ دونوں مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ غالباً وہ نہر کی طرف جا رہے تھے۔ اطمینان کا یہ عالم تھا کہ دونوں میں سے کوئی بھی سر اٹھا کر ارد گرد دیکھنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ جس طرح انہوں نے مجھے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتے دیکھا تھا' اس کے بعد انہیں غالباً ذرا بھی توقع نہیں تھی کہ میں ان کے تعاقب میں واپس بھی آ سکتا ہوں۔

چند لمحے پہلے ستارہ میری ہدایت کے مطابق چند فائر کر چکی تھی لیکن انہوں نے شاید انہیں بھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ وہ تو گویا کوئی کام نہایت عمدگی سے مکمل کرنے کے بعد پورے اطمینانِ قلب کے ساتھ واپس جا رہے تھے۔

شکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح کچھ دُور ان کا تعاقب کرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ ان کا کوئی اور ساتھی آس پاس موجود نہیں تھا۔ انہیں کسی کا انتظار بھی نہیں تھا۔

وہ دونوں ہی پستہ قد تھے مگر ایک خوب چوڑا چکلا اور گٹھے ہوئے جسم کا مالک تھا۔ جبکہ دوسرا منحنی' مجہول اور مختصر الوجود دکھائی دیتا تھا۔ چوڑے چکلے شخص نے ہلکی مشین گن لٹھ کی طرح کندھے پر اٹھائی ہوئی تھی۔ مجہول آدمی کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں تھا لیکن میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں تھا کہ وہ واقعی نہتا تھا۔

وہ ڈھیلے ڈھالے سیاہ کوٹ اور خاکی پینٹ میں تھا۔ سر پر گہرے رنگ کی پی کیپ تھی۔ اس حلئے میں اسے عقب سے دیکھتے ہوئے کوئی اندازہ قائم کرنا مشکل تھا لیکن نہ جانے کیوں اس پر نظر پڑتے ہی مجھے احساس ہوا تھا کہ وہ سراپا میرا شناسا سا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس شخص کو میں پہلے بھی کہیں اچھی طرح دیکھ چکا تھا لیکن یقین سے تبھی کچھ کہا جا سکتا تھا جب میں اس کے مزید قریب جاتا یا سامنے سے اسے دیکھتا۔

اس کی پی کیپ کے نیچے لمبے بالوں کی لٹیں جھول رہی تھیں۔ یہ لٹیں اور ڈھیلے ڈھالے کپڑوں میں چھپے ہوئے خد و خال کچھ جانے پہچانے سے لگ رہے تھے۔ لیکن یہ وہ شخص نہیں ہو سکتا تھا جس کا خیال میرے ذہن میں آ رہا تھا۔ وہ شخص اب اس دنیا میں نہیں تھا۔ میں اسے مرتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔

ہم جنگل میں اس جگہ پہنچ چکے تھے کہ اگر دائیں طرف مڑتے تو نہر کے کنارے کھلے میں جا پہنچتے اور اگر بائیں طرف مڑتے تو درختوں کا سلسلہ گھنا ہو جاتا۔

میری توقع کے مطابق وہ دائیں طرف ہی مڑے۔ میں بد[ستور] ایک خاموش درندے کی طرح اس جگہ تک ان کا تعاقب کر[تا رہا] جہاں سے نہر نظر آنے لگتی تھی۔ یہاں سے سو ڈیڑھ سو قدم فاصلے پر نہر پر ایک چھوٹا سا پُل موجود تھا اور اس پُل کے قریب کے دوسری طرف کُھلی چھت کی ایک سرخ شیورلیٹ امپالا کھ[ڑی] ہوئی تھی۔ یہ گاڑی بھی میری دیکھی بھالی تھی۔ میری حیرت بڑھنے لگی۔ یہ تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ سرخ امپالا اور لٹوں والا شخص مجھے زندگی میں دوبارہ بھی نظر آئیں گے۔ یہ م[عاملہ] میری سمجھ سے باہر تھا!

بہرحال اتنا میں ضرور سمجھ چکا تھا کہ وہ واقعی واپس جا ر[ہے] تھے۔ نہر کے دوسری طرف سے کچے راستے سے ہائی وے تک جا سکتا تھا۔ وہ یقیناً آئے بھی اسی طرف سے تھے۔ پُل اور گا[ڑی] ابھی بہت دور تھی لیکن میرے خیال میں اب انہیں روک لینا بہتر تھا۔

میں نے ان کے قدموں سے ذرا ہی آگے زمین پر ایک بر[سٹ] مارا۔ گولیاں دھول اڑاتی ہوئی زمین میں پیوست ہو گئیں۔ وہ دو[نوں] اپنی جگہ بت بن گئے۔ ماہر اور مشاق لوگ تھے' انہیں معلوم تھ[ا کہ] کس صورتِ حال میں کیا کرنا چاہئے۔ مشین گن والے نے [مشین] گن سیدھی کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے معلوم تھا کہ ا[یسی] کوشش کا انجام اس کی موت کی صورت میں سامنے آ سکتا تھا۔

"گن ذرا دور پھینک دو چندا۔۔۔!" میں نے بہ آواز بلن[د کہا] "اور میری طرف گھوم جاؤ۔ میں ذرا زلفوں والی سرکار کے در[شن] کرنا چاہتا ہوں۔"

چوڑے چکلے آدمی کے ہاتھ میں گو کہ سب مشین گن تھی م[گر وہ] بھی اتنی ہلکی نہیں تھی۔ اس نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہو[ئے] گن پھینک تو دی مگر وہ زیادہ دور جا کر نہیں گری۔ وہ دونوں آ[ہستگی] سے میری طرف گھومے۔ میری زیادہ توجہ صرف لمبے بالوں وا[لے] کی طرف تھی۔ اور اسے دیکھ کر واقعی میرا سر گھوم گیا۔ ایک [لمحے] کے لئے مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔

میرا شبہ درست ہی تھا۔ وہ وہی بندر نما شخص تھا جسے چند [روز] پہلے ملتان روڈ کے ایک باغ میں ٹونی نے میرے سامنے گولی مار[ی] تھی۔ وہ سب کچھ غیر ارادی طور پر اضطراری انداز میں ہوا تھا۔ [وہ] میرا تعاقب کر رہا تھا اور جب ہم نے اسے روکنے کی کوشش [کی تو] اس نے ریوالور نکال لیا تھا۔ ٹونی نے اس پر اس مہارت سے [فائر] کیا کہ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا' اسے کوئی گزند نہیں [پہنچی] مگر دوسرے ہی لمحے اس نے باغ کی دیوار پھلانگ کر فرار ہو[نے کی] کوشش کی اور ٹونی نے اس پر دوسرا فائر کر دیا۔

ہم نے اسے باغ میں چت پڑے دیکھا تھا۔ اس کی قمیص [خون میں تر] تھی اور نبض ساکت تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ میں نے [اس] کے دل کی دھڑکنیں بھی سننے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے اس [کا د]ل ساکت ہی محسوس ہوا تھا۔ وہ سارا منظر میری آنکھوں میں [گھ]وم رہا تھا لیکن وہ بدبخت زندہ سلامت میری آنکھوں کے سامنے کھڑا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے برسوں سے اسے خراش تک بھی [نہ] آئی ہو۔ اگر ہمیں اس کی موت کا محض دھوکا ہوا تھا اور وہ صرف [ز]خمی ہی ہوا تھا تب بھی اتنی جلدی وہ دوبارہ چلنے پھرنے کے قابل [نہ]یں ہو سکتا تھا۔ اور وہ تو صرف چل پھر ہی نہیں رہا تھا بلکہ مار دھاڑ [م]یں بھرپور حصہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں اس طرح نیم وا تھیں [او]ر چہرے پر کچھ ایسی بے نیازی و بے پروائی تھی جیسی دیکھنے والوں کو جتا رہا ہو کہ اسے تو کسی بھی صورتِ حال کی ذرہ برابر پروا نہیں۔

میری پوری کوشش ہوتی ہے کہ کسی بھی موقع پر حیرت کا اظہار نہ کروں لیکن اس وقت میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا "تم زندہ ہو۔۔۔!"

"بے شک۔ اور امید ہے کہ ابھی غیر معینہ مدت تک زندہ رہوں گا۔" اس نے نہایت پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ اس کی آواز بھی کچھ ایسی ہی تھی جیسے کسی بندر نے کئی برس کی محنت کے بعد آخر کار خاصی کامیابی سے انسانوں کی طرح بولنا سیکھ لیا ہو۔

"لیکن میں نے خود تمہیں مردہ دیکھا تھا۔۔۔ تمہاری قمیص خون میں تر تھی اور نبض ساکت تھی۔" میں نے کہا تاہم میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرے تاثرات سے حیرت کا اظہار نہ ہو۔

"اس قسم کے تو بہت سے شعبدے میری جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا "کچھ دیر کے لئے دل کی دھڑکن روک لینا بھی میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں۔ میں میڈیکل سائنس کے لئے چلتا پھرتا چیلنج ہوں۔"

"میڈیکل سائنس کے لئے تو تم بے شک چیلنج بنے رہو' مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں لیکن تم میرے لئے بھی چیلنج بن گئے ہو۔ یہ میرے لئے بڑی تکلیف کی بات ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اب میں کیا کروں۔۔۔ میں تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ کر بھی نہیں مر سکتا۔ میری عمر ڈیڑھ سو سال ہے۔ میری چار بیویاں یکے بعد دیگرے میرے مرنے کے انتظار میں خود راہیٔ ملکِ عدم ہو چکی ہیں۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی جھلک آئی جیسے وہ خود بھی اپنی درازیٔ عمر سے پریشان ہو۔

میں نے اس کے چہرے پر تمسخر یا استہزا کی علامات تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہاں ہلکی سی غیر سنجیدگی کی بھی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ بالکل سنجیدہ تھا۔ مگر یہ کوئی قابلِ اعتبار نشانی نہیں تھی۔ بعض لوگ انتہائی سنجیدگی سے مذاق کرتے ہیں۔

میں نے بھی اسی سنجیدگی سے کہا "تمہیں یقیناً کسی سنیاسی بابا قسم کی شخصیت نے آبِ حیات قسم کی کوئی چیز پلا دی ہوگی۔"

"تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو۔" اس کے لہجے میں افسردگی ذرا گہری ہو گئی "مگر میں مذاق نہیں کر رہا۔ جو کچھ کہہ رہا ہوں اس کے لئے کوئی سی بھی قسم کھانے کے لئے تیار ہوں۔ مدتوں پہلے کی بات ہے۔ میں افریقہ کے جنگلوں میں بھٹک رہا تھا۔ راستہ بھول گیا تھا۔ بالکل ویسی ہی پچویشن تھی جیسی کہانیوں اور فلموں میں ہوتی ہے۔ میں اتنا بھوکا پیاسا تھا کہ اپنے سگے بھائی کا گوشت کھانے کے لئے تیار تھا۔ جنگلوں سے بھی کہیں دور نکل آیا تھا۔ لق و دق صحرا میں گھسٹ رہا تھا۔ وہاں مجھے ایک پودا نظر آیا۔ تاحدِ نظر پھیلے ہوئے صحرا میں وہ صرف ایک ہی پودا سر اٹھائے کھڑا تھا اور اس پر چھوٹے اناس جیسا بس ایک ہی پھل لگا ہوا تھا۔ میں نے بغیر سوچے سمجھے اسے توڑا اور ہڑپ کر گیا۔ اسے کھاتے ہی میرے جسم میں گویا آگ لگ گئی اور میں بے ہوش ہو گیا۔ میں سمجھا کہ کوئی زہریلا پھل کھا گیا ہوں اور مر رہا ہوں۔ بے ہوش ہونے سے پہلے یہ احساس بھی بڑا فرحت انگیز تھا کہ اب ساری تکلیفوں سے نجات ملنے والی ہے۔ لیکن جب مجھے ہوش آیا تو میں بالکل تازہ دم اور بھلا چنگا تھا۔ میں پھر بھی نہیں سمجھ سکا کہ یہ اسی پھل کا کمال تھا۔ اس وقت میری عمر چوتیس سال تھی۔ تب سے لے کر آج تک بھلا چنگا ہوں۔ ڈیڑھ سو سال عمر ہو چکی ہے لیکن کبھی بیمار بھی نہیں ہوا۔ چند سال پہلے میں نے پانچویں شادی کی ہے۔ چوالیس بچے ہیں میرے۔ دوبارہ کبھی اس مقام تک رسائی نہیں ہو سکی جہاں وہ پودا نظر آیا تھا اور نہ ہی ویسا پودا یا پھل دوبارہ کہیں نظر آیا۔ وہ یقیناً ثمرِ حیات قسم کی کوئی چیز تھا۔ فرق صرف یہ پڑا ہے کہ میرا خون سیاہ ہو گیا ہے۔"

"اصل میں دل کالا ہو گیا ہوگا۔" میں نے لقمہ دیا۔

وہ گویا اس صورتِ حال میں بھی اپنی کہانی سنانے کے لئے بہت بے قرار تھا کہ میں ایک آٹومیٹک رائفل کا رخ اس کی طرف کئے کھڑا تھا۔ وہ میرے الفاظ پر قطعاً توجہ دئے بغیر بولا "بلڈ ٹسٹ سے پتا چلا ہے کہ میرے خون میں آئرن اتنا ہو گیا ہے کہ اگر کسی اور کے جسم میں ہوتا۔۔۔"

"تو وہ فاؤنڈری کھول لیتا۔" میں نے لقمہ دیا۔

"نہیں۔ وہ فوراً مر جاتا۔" اس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔ اس کی سنجیدگی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کے علاوہ میرے خون میں ایک اور مادہ بھی پایا گیا تھا جسے لیبارٹری والے کوئی نام نہیں دے سکے۔ اس کے بعد میں گول ہو گیا کہ کہیں لیبارٹری والے زیادہ آگے نہ بڑھ جائیں۔ لمبے چکر شروع نہ ہو جائیں اور مجھے منظرِ عام پر نہ آنا پڑے۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "ذلت کی زندگی انسان جتنا بھی چھپ کر گزارے اتنا ہی اچھا ہے۔"

"کیا تم کبھی کسی کی بات سنجیدگی سے نہیں سنتے؟" اس نے گویا بڑے تأسف سے پوچھا۔

"کیا میں تمہیں غیر سنجیدہ نظر آ رہا ہوں؟" میں نے معصومیت

سے پوچھا۔ وہ منہ بنا کر کندھے اچکا کر رہ گیا۔ اس کے چہرے پر دلی تکلیف کے آثار تھے۔

میں نے گہری سانس لے کر گویا مذاکرات کا یہ دور ختم کرتے ہوئے کہا "بہت ہو چکی اے بندر نما انسان ـــــ یا انسان نما بندر! تمہیں اتنا اندازہ تو ہو گیا ہو گا کہ میں کوئی داستان ہوشربا سننے کے لئے یہ رائفل لے کر تمہارے تعاقب میں نہیں آیا تھا۔ لیکن پھر بھی چونکہ میں مروت کا مارا انسان ہوں اس لئے میں نے اتنی دیر تمہاری لن ترانی سن لی۔ اب خاموشی سے اس طرف چل پڑو۔" میں نے انہیں اُدھر چلنے کا اشارہ کیا جدھر سے میں خود آیا تھا اور جدھر میری گاڑی کھڑی تھی۔

میں اب تک بظاہر صرف بندر نما انسان ہی کی طرف متوجہ رہا تھا۔ اس سے شاید اس کا ساتھی غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا۔ مگر یہ غلط فہمی اس کے حق میں مہلک ثابت ہوئی۔ میں نے اسے خبردار کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی۔ مجھے اس پر دل ہی دل میں بہت خار آ رہی تھی۔ مجھ پر اور ستارہ پر اندھا دھند فائرنگ اسی نے کی تھی۔ مصلحت کا تقاضا تو یہی تھا کہ میں اسے زندہ پکڑ کر لے جانے کی کوشش کرتا تاکہ زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل ہو سکتیں لیکن اس وقت میں نے مصلحت کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ ویسے بھی مجھے بندر نما انسان اس سے زیادہ اہم نظر آ رہا تھا۔ وہ تو محض ایک ماہر و مشتاق اور پیشہ ور قاتل معلوم ہوتا تھا۔ سفاک' خون کا پیاسا اور زبان بند رکھنے والا۔ محض ایک جیتی جاگتی مشین۔

میں نے دیکھ لیا تھا کہ جب سے میں بندر نما انسان کی طرف متوجہ تھا' اس کا ساتھی کسی چیونٹی سے بھی کم رفتار کے ساتھ الٹے قدموں اپنی سب مشین گن کی طرف کھسک رہا تھا جو اس نے میرے حکم پر پھینک دی تھی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس پر ترس بھی آیا۔ وہ یقیناً اس وقت اپنے آپ کو بہت چالاک محسوس کر رہا تھا۔

میں نے اسے گن تک پہنچنے کا موقع دیا لیکن اسے چھونا اسے نصیب نہ ہو سکا۔ جونہی وہ جھکا' میری رائفل نے اس کا جسم چھلنی کر دیا۔ ایک لمحے کے لئے وہ گولا سا بن کر لڑھکتا ہوا دور جا گرا' پھر چاروں خانے چت ہو گیا۔ اس کی کھلی آنکھیں اور کھلا منہ بتا دے رہا تھا کہ زندگی کے آخری لمحے میں اس نے شدید حیرت محسوس کی تھی جو اس کے چہرے پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید اس نے زندگی بھر صرف دوسروں کے جسموں میں گولیاں اتاری تھیں۔ وہ خود ان کی اذیت سے نا آشنا تھا۔ زندگی کے آخری لمحے میں شاید اس پر اسی حیرت نے حملہ کیا تھا کہ یہ کیسے انگارے ہیں جو اچانک اس کے جسم میں اتر گئے ہیں۔

بندر نما انسان بلاشبہ ایک عجیب مخلوق تھا۔ اس نے کمال بے نیازی سے گردن ذرا سی موڑ کر یوں اپنے ساتھی کی طرف دیکھا جیسے کسی شریر بچے کی گیند لڑھکتی ہوئی اس کے پیچھے جا گری ہو۔ رائفل کے اچانک گرج اٹھنے پر وہ اُچھلنا تو درکنار اپنی جگہ سے ہلا نہیں تھا۔

اپنے مخصوص لہجے میں وہ بولا "اس کی کیا ضرورت تھی اسے خبردار کر کے گن اٹھانے سے روک بھی سکتے تھے۔"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہا ہو "جناب! اس بچے کو [illegible] لگانے کی کیا ضرورت تھی' آپ اسے صرف ڈانٹ کر بھی کا[م چلا] سکتے تھے۔"

"یہ میں نے خبرداری کیا ہے۔ اسے نہیں' تمہیں۔" میں [نے] خشک لہجے میں کہا "اب تم اس طرف چل دو۔" میں نے ایک [بار] پھر رائفل سے اشارہ کیا۔

اسی لمحے وہ اس طرح اچھلا جیسے اس کے جسم میں ہزار[وں] اسپرنگ فٹ ہوں۔ پچھلی بار جب اس سے سامنا ہوا تھا تب [بھی] میں نے اسے اسی طرح اُچھلتے دیکھا تھا۔ اسی انداز میں اُچھل [کر وہ] ایک باغ کی کافی اونچی دیوار پھلانگ کر اندر کود گیا تھا۔

فضا میں ہی وہ لٹو کی طرح گھوما' پھر دوسرے ہی لمحے وہ مجھ [سے] کافی فاصلے پر زمین پر تھا اور گولی کی سی رفتار سے نہر کی طرف [جا رہا] تھا۔ اس کا دوڑنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اسے نشانہ بنانا [خاصا] مشکل تھا تاہم میرے لئے ناممکن بھی نہیں تھا۔ لیکن اسے [بھی] اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ زندہ ہی قابو کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے اس کے دائیں بائیں فائر کئے مگر وہ رکا نہیں۔ [وہ] مختصر الوجود تھا' اتنا ہی بے خوف تھا۔ میں اس بندر نما شخص پر تو عاشق ہو چکا تھا۔ بہت عرصے بعد مجھے انسان کے جامے میں [ایک] عجوبہ نظر آیا تھا۔ میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے زندہ [گرفت] میں کرنے کے لئے اس کا تعاقب کرنا ضروری تھا اور یہ بلاشبہ ا[یک] بہت ہی مشکل کام تھا۔ اسے ہلاک کرنے سے بھی زیادہ مشکل کام۔ وہ حقیقتاً ایک چھلاوا تھا۔ اور اسے خود بھی اس کا ا[چھی] طرح اندازہ تھا۔ لیکن میں نے سوچا کہ اسے بتا ہی دیا جا[ئے کہ] مابدولت بھی چھلاووں کے جدِ امجد ہیں۔

میں نے گن پھینک دی۔ کیونکہ گن سمیت بھاگنے سے ر[فتار] میں بڑا فرق پڑتا تھا۔ وہ بگولے کی طرح دوڑا جا رہا تھا لیکن میں [نے] جلد ہی اسے جا لیا۔ اور یہ ایک کارنامے سے کم نہیں تھا۔ [یہ] ممکن تھا کہ دو چار سیکنڈ بعد میں جھپٹ کر اس چھلاوے کو پکڑ [لیتا] لیکن اُسی لمحے میری آنکھوں نے ایک اور حیرت انگیز نظارہ دیکھا۔ وہ بندر نما انسان ایک ہی زقند میں نہر کو پھلانگ گیا۔ لانگ جمپ [کا] کوئی چیمپئن بھی ایک زقند میں اس نہر کو نہیں پھلانگ سکتا تھا۔

میں اگر ایک ثانئے کے لئے بھی جھجک جاتا یا سوچ میں پڑ [جاتا] تو شاید میرے لئے بھی نہر کو پھلانگنا ممکن نہ رہتا۔ میں بھی آج عجوبۂ روزگار شخص کو سرپرائز دینے پر تلا ہوا تھا۔ اسی رفتار دوڑتے ہوئے میں بھی نہر پھلانگ گیا۔ وہ نہر کے دوسرے کنار[ے] پہنچ کر رک گیا تھا۔ شاید اسے قطعاً توقع نہیں تھی کہ کوئی اس کے تعاقب میں نہر کو بھی پھلانگ سکتا ہے۔

غالباً فاتحانہ انداز میں میری طرف دیکھنے کے لئے وہ گھوما اور اسی لمحے اس نے مجھے اپنے سر پر پایا۔ میں نے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلتے دیکھیں لیکن اسے زیادہ دیر حیران ہونے کا موقع نہیں مل سکا۔ میں اسے لیتے ہوئے زمین پر گرا اور ہم دور تک لڑھکتے چلے گئے۔ میں اس کے تعاقب میں جتنا دوڑ چکا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ اب اس کی خاطر میں اپنی جان کو مزید زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔

میرا خیال تھا کہ میں اس شخص تک پہنچ گیا ہوں تو اب آسانی سے اس کو قابو میں کر لوں گا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کی صرف پھرتی ہی غیر معمولی ہو گی' طاقت اس میں کوئی خاص نہیں ہو گی اور ایک بار کسی طاقتور آدمی کی گرفت میں آنے کے بعد وہ جلد ہی بے بس ہو جاتا ہو گا۔

وہ مختصر الوجود تھا۔ میں نے ایک گٹھڑی کی طرح اسے بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کی لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے بجلی کی سی تیزی سے ایک چیز کو حرکت میں آتے دیکھا۔ وہ اس کا استخوانی بازو تھا۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اس استخوانی بازو کے ایک سرے پر ایک آہنی گھونسا بھی پایا جاتا ہے۔ یقین مجھے اس وقت آیا جب وہ گھونسا ایک ہتھوڑے کی طرح میری ٹھوڑی پر پڑا۔

میری آنکھوں کے سامنے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میرے سب دانت ایک دوسرے میں پیوست ہو گئے ہیں۔ جبڑا شاید دہرا ہو کر حلق میں پھنس گیا ہے اور ٹھوڑی ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی ہے۔ میرے نیچے دبا ہوا وہ پہلے ہی پارے کی طرح مچل رہا تھا۔ اس گھونسے کے بعد تو میری گرفت سے تقریباً نکل ہی گیا۔

یہ محض ایک اتفاق ہی تھا یا دوسرے لفظوں میں میری خوش قسمتی کہ اس کی ٹانگ میرے ہاتھ میں آ گئی ورنہ اس بار وہ نکل جاتا تو یقیناً گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کی ٹانگ ہاتھ میں آتے ہی میں نے زور سے کھینچی۔ وہ دھپ سے گرا لیکن گرتے ہی اس نے دوسرے پاؤں سے میرے سر پر ٹھوکر ماری۔ میری کھوپڑی دوبارہ جھنجھنا اٹھی۔

معلوم نہیں اس خبیث نے اس منحنی سے جسم میں اتنی طاقت کیونکر چھپائی ہوئی تھی۔ یہ اسرار اپنی جگہ تھا لیکن سردست اس سے میرا عشق ہوا ہو گیا۔ وہ جو میرے ذہن کے کسی تاریک خانے میں ایک خوف ناک جھنجلاہٹ خوابیدہ رہتی تھی' یکدم جاگ اٹھی۔ میرے دل میں اس کے لئے بے وجہ جو ایک نرم سا گوشہ تھا' وہ یک لخت ہی اجڑ گیا۔ میرے سارے جسم کا لہو گویا آتشیں لاوے میں ڈھل گیا اور صرف کنپٹیوں میں مرتکز ہو گیا۔

میں نے زور سے سر جھٹکا۔ دھندلاتے ہوئے منظر میری نظروں میں صاف ہو گئے۔ اس وقت تک وہ چھلاوا اٹھ چکا تھا اور گو کہ اس کی ایک ٹانگ اب بھی میری گرفت میں تھی لیکن وہ دوسری ٹانگ سے مجھے دوسری ٹھوکر رسید کرنے لگا تھا۔ اور یہ ٹھوکر شاید میری آہنی کھوپڑی کو بھی چٹکا دیتی۔

بروقت میرا دوسرا ہاتھ حرکت میں آیا اور اس کی دوسری ٹانگ بھی کچھ اس طرح میری گرفت میں آ گئی جیسے کسی گول کیپر نے گولی کی رفتار سے آتی ہوئی بال کو بروقت ہاتھ سے روک لیا ہو اور فیصلہ کن گول بچا لیا ہو۔ دونوں ٹانگیں میری گرفت میں آ جانے کے باعث وہ دھپ سے پیٹھ کے بل زمین پر گرا اور میں اسی لمحے بالکل مشینی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اب وہ کسی بڑی سی مچھلی کی طرح میرے ہاتھوں میں اُلٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کا وزن محسوس کرتے ہوئے مجھے ایک بار پھر حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کم بخت ہڈیوں کا مجموعہ تھا مگر یہ ہڈیاں شاید خالص اور ٹھوس فولاد کی بنی ہوئی تھیں۔ جتنی طاقت صرف کر کے میں نے اس منحنی انسان کو اٹھایا تھا اتنی طاقت سے تو ایک صحت مند ریچھ کو جھولا جھلایا جا سکتا تھا۔

صرف یہی نہیں' اس کی فولادی ہڈیوں میں لچک ربڑ جیسی تھی۔ میرے ہاتھوں میں لٹکے لٹکے وہ سانپ کی طرح دہرا ہو کر اپنا سر اوپر لایا اور اپنے دونوں استخوانی ہاتھ بڑھا کر اس نے میری گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ اگر وہ میری گردن دبوچنے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید میری زندگی کی کہانی اس ویرانے میں ہی نہایت احمقانہ انداز میں ختم ہو جاتی۔

اس کی صلاحیتوں کے بارے میں میری عاشقی تو ٹھنڈی ہو ہی چکی تھی۔ اور اب مجھے اس بات کی پروا نہیں رہی تھی کہ وہ زندہ رہتا ہے یا مرتا ہے' صحیح سالم میرے ہاتھ لگتا ہے یا محض اس کی باقیات ہی ہاتھ آتی ہیں۔ پہلے تو دل یہی چاہا کہ اسے اسی طرح زمین پر دے ماروں جس طرح دھوبی گھاٹ پر دھوبی کپڑوں کو پتھر کی سل پر پٹختے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں غیر ارادی طور پر میں ایسا کرنے سے باز رہا۔

میں نے اسے محض کپڑوں کی طرح جھٹکنے پر اکتفا کیا۔ یہ ایک خاص ٹیکنک تھی۔ اگر میرے ہاتھ میں سانپ ہوتا اور میں اسے دم سے پکڑ کر اس انداز سے جھٹکا دیتا تو اس کے جسم کی اکلوتی ہڈی درمیان سے ٹوٹ جاتی۔ لیکن اس فتنے کے جسم میں شاید ریڑھ کی ہڈی کی جگہ بھی کوئی انتہائی لچکدار اسپرنگ فٹ تھا۔

اس جھٹکے کی بدولت میری گردن تو اس کی گرفت میں جانے سے بچ گئی لیکن اس کی کوئی ہڈی ٹوٹنے کا کڑاکا مجھے سنائی نہیں دیا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ ایک لمحے کے لئے وہ کچھ ڈھیلا سا پڑ گیا اور یوں میرے ہاتھوں میں جھول گیا جیسے اس کے حواس مختل ہو گئے ہوں۔ میں نے اس کی کمر میں ایک زوردار ٹھوکر رسید کی اور اسے

کافی اونچا ہوا میں اچھال دیا۔

وہ چاروں خانے چت زمین پر آکر گرا۔ زمین وہاں کچی ضرور تھی مگر اتنی بھی نہیں تھی کہ اس کے لئے گدے کا کام دیتی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ پہلے تو میں سمجھا کہ اس نے اس جہانِ فانی کو الوداع کہہ دیا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں کھول دیں اور تھکے تھکے انداز میں انہیں پٹ پٹانے لگا۔

میں نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ زندہ ضرور تھا لیکن اب اس کے کس بل نکل چکے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ چُستی پکڑتا میں نے ایک اور ٹھوکر رسید کرکے اسے اوندھا کیا اور اپنے گلے سے ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھولتی ہوئی ٹائی اتار کر تیزی سے اس کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے اس دوران مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی بغل میں ہولسٹر موجود تھا۔

میں نے ہاتھ ڈال کر ریوالور نکال لیا۔ اس کی مختصر شخصیت کے برعکس وہ اعشاریہ چار پانچ کا ایک بھاری بھرکم ریوالور تھا جو دوسری جنگِ عظیم کے دوران سفید فام فوجیوں کا پسندیدہ ترین ریوالور تھا۔ سرکاری ایجنسیوں میں اس کے استعمال کا بہت رواج تھا۔ پرانا ماڈل ہونے کے باوجود وہ نئی ساخت کے بہت سے ریوالوروں سے زیادہ مہلک اور دور مار تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ اس ساری بھاگ دوڑ کے دوران اس شخص نے ریوالور استعمال کرنا تو درکنار، اسے نکالنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ میں تو اسے نہتا ہی سمجھا تھا۔ اور میں اس غلط فہمی میں مارا بھی جا سکتا تھا۔ ریوالور میں نے اپنی جیب میں ڈال لیا اور اسے گریبان سے پکڑ کر اس کے پیروں پر کھڑا کیا۔

وہ ایک بار ذرا سا لڑکھڑایا مگر پھر جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار اب بھی نہیں تھے۔ بس کچھ نڈھال نظر آرہا تھا۔ ایسی ڈھیٹ اور سخت جان مخلوق سے مجھے شاید اس سے پہلے واسطہ نہیں پڑا تھا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ اس کے رخسار کی ابھری ہوئی ہڈی کے قریب ایک چھوٹا سا زخم آچکا تھا اور کھال تھوڑی سی پھٹ گئی تھی۔ خون کی ایک پتلی سی لکیر اس کی ٹھوڑی کی طرف پھسلتی آرہی تھی۔ مگر نہیں۔۔۔ وہ خون تو نہیں تھا۔ بلکہ بالکل تارکول تھا۔ یا پھر کسی بہت ہی کھٹارا گاڑی سے رستا ہوا ایک عرصے سے زیرِ استعمال موبل آئل۔ تو کیا واقعی اس کا خون سیاہ تھا؟ اس نے مجھے جو کہانی سنائی تھی وہ کہیں سچ ہی تو نہیں تھی؟ ان سوالوں کے جواب اگر اثبات میں تھے تو مجھے ان کو تسلیم کرنے میں اب بھی تامل تھا۔

پچھلی جھڑپ کے موقعے پر جب میں نے اپنی دانست میں اسے مردہ دیکھا تھا تو اس کی قمیص سرخ سیال میں لتھڑی ہوئی تھی۔ تو کیا واقعی وہ اس کا خون نہیں تھا؟ اس نے کوئی شعبدہ دکھایا تھا؟ میں اس کی نبض دیکھنے اور دھڑکن سننے میں ناکام رہنے کے باوجود دھوکا کھا گیا تھا!

منحنی شخص نے بالکل میری ہی طرح سر جھٹکا گویا آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھندلاہٹ دور کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے تھکے تھکے سے لہجے میں بولا "تم دنیا میں پہلے آدمی ہو جس نے مجھے قابو میں کیا ہے۔"

"اور تم دنیا میں پہلے آدمی ہو جسے قابو میں کرنے کے لئے اتنی محنت کرنا پڑی۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا "ویسے واوے۔۔۔ تم نے اپنا یہ آثارِ قدیمہ قسم کا ریوالور استعمال کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"حقیقت تو یہ ہے کہ تم نے مجھے اس کے استعمال کی مہلت ہی نہیں دی۔" وہ مغموم سے لہجے میں بولا "ایک آدھ لمحے کی مہلت میسر آجاتی تب بھی شاید میں اسے استعمال نہ کرتا۔ میں امن پسند آدمی ہوں۔ ہتھیار شاذ و نادر ہی استعمال کرتا ہوں۔ اس کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ میں خود کسی ایٹمی ہتھیار سے کم نہیں ہوں۔ لیکن تمہارے بارے میں میں اندازوں کی غلطی کی وجہ سے مارا گیا۔ قد کاٹھ میں تو بہت سے لوگ تم جیسے ہوتے ہیں لیکن ان میں وہ بات نہیں ہوتی جو تم میں ہے۔"

"میرا خیال ہے یہ موقع مکھن لگانے کے لئے کچھ زیادہ مناسب نہیں ہے۔"

"میں مذاق نہیں کر رہا۔ اور نہ ہی میں بلا ضرورت جھوٹ بولتا ہوں۔ میرا امریکا کے میڈیسن اسکوائر گارڈن میں لڑنے والے بعض مشہورِ عالم ریسلرز سے بھی واسطہ پڑا ہے۔ ان میں سے بھی کبھی کوئی میرے لئے مسئلہ ثابت نہیں ہوا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی باتوں پر یقین کروں یا محض ہنس دوں۔ میں نے متذبذب لہجے میں کہا "مجھے اعتراف ہے کہ میں نے بھی تمہیں بہت انڈر اسٹیمیٹ کیا۔"

"تمہارا قصور نہیں ہے۔ میں شخصیت سے مار کھاتا ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"تم ابھی کہہ رہے تھے کہ تم بہت امن پسند آدمی ہو۔ لیکن، تھوڑی دیر پہلے جو تم لوگ سب مشین گن سے مجھ پر اور میرے دوست پر فائرنگ کر رہے تھے، وہ کیا ثواب حاصل کرنے کے لئے کر رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو نہیں کر رہا تھا نا۔" وہ معصومیت سے بولا "وہ تو اپنا بچہ نائی کر رہا تھا۔ میں تو یونہی ذرا اس کا خیال رکھنے کے لئے ساتھ آیا ہوا تھا۔ کیا کریں، اب نوکری بھی کرنی ہے نا۔"

"نائی۔۔۔؟ یعنی شریر؟ اس کا اصل نام کیا تھا؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"یہ اس کا اصل نام ہی ہے۔ کم از کم مجھے اس کے علاوہ اس کا کوئی نام معلوم نہیں۔" وہ پُر سکون لہجے میں بولا۔

"اور نوکری تم کس کی کرتے ہو؟"

"ریڈ ڈاٹ کی"

"وہ کیا ہے؟"

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"اچھا۔۔۔ ذرا پُل کی طرف چلو۔ ہمیں واپس چلنا ہے۔ اب ہم دونوں ہی اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ دوبارہ نہر پھلانگ سکیں۔"

"تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں خوف کا شائبہ تک نہیں تھا۔

"بھائی گیٹ۔" میں نے جواب دیا "وہاں میں تمہیں ٹھنڈے میٹھے رس گلے کھلاؤں گا۔"

"مگر مجھے تو رس گلے بالکل پسند نہیں ہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"جو رس گلے میں کھلانا چاہتا ہوں وہ تمہیں بہت پسند آئیں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے کندھے اچکائے اور آگے آگے چل دیا۔ میں نے اس کا ریوالور جیب سے نکال کر ہاتھ میں تھام لیا تھا۔ اب اگر وہ بھاگنے کی کوشش کرتا تو اسے گولی مارنے میں مجھے ایک لمحے کا بھی تامل نہ ہوتا۔

پُل پار کرکے ہم واپس اسی جگہ آئے جہاں اس کے ساتھی کی لاش پڑی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے وقت وہ جذبات سے عاری لہجے میں بولا "اگر تم اجازت دو اور میرے ہاتھ کھول دو تو میں اسے بھی اٹھا کر ساتھ لے چلوں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

میں نے اسے چلتے رہنے کا اشارہ کیا اور ملائمت سے کہا "تم وعدہ نہ کرو تب بھی مجھے تمہارا اعتبار ہے۔ تم اتنے ایماندار اور سچے آدمی ہو کہ اگر پرانا زمانہ ہوتا تو یقیناً تم کسی عدالت کے قاضی ہوتے۔ جہاں تک اس لاش کا تعلق ہے تو میں اسے اٹھا کر لے جانے کی اجازت تم کو نہیں دے سکتا کیونکہ مجھے اپنے گھر میں کچرا جمع کرنے کا بالکل شوق نہیں ہے۔ ویسے بھی اس قسم کی لاشیں جنگل میں ہی پڑی زیادہ جچتی ہیں۔ اور پھر یہ بھی تو سوچو کہ کیڑے مکوڑوں اور چیل کووں وغیرہ کے بھی آخر ہم پر کچھ حقوق ہیں۔ ہمیں اس بات کا خیال رکھنا چاہئے کہ کبھی کبھار انہیں بھی اچھی وافر مقدار میں پروٹینز ملتے رہیں۔"

اس نے مڑ کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر سیدھا ہو کر خاموشی سے چلنے لگا۔ ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں میری گاڑی کھڑی تھی۔ شوٹنگ کی لوکیشن سے یہ جگہ کچھ فاصلے پر تھی۔ فلمی یونٹ کے لوگ لوکیشن پر واپس پہنچ چکے تھے لیکن ایک ٹولی کی شکل میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ شاید میرے اور ستارہ کے بارے میں ہی اندازے لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہم کہاں ہیں۔ حالاں کہ ستارہ ان سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی لیکن کسی کو اِدھر اُدھر جا کر دیکھنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

میں ان کی نظروں سے بچنے کے لئے تھوڑا سا چکر کاٹ کر گاڑی تک پہنچا۔ ستارہ بڑے اطمینان سے پچھلی سیٹ پر سر زرا نیچا کیے بیٹھی تھی۔ دروازہ تھوڑا سا کھلا تھا اور مشین پسٹل ڈھیلے ڈھالے انداز میں اس کے ہاتھ میں لٹکا ہوا تھا۔ وہ گویا انتظار کرتے کرتے بور ہو چکی تھی۔

"کہاں رہ گئے تھے تم؟" وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔

"شکر کرو میں وہاں نہیں رہ گیا جہاں سے واپسی کبھی ممکن ہی نہیں ہوتی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اتنی دیر غائب رہے اور پکڑ کر صرف یہ نمونہ لائے ہو؟ تمہیں کوئی ڈھنگ کا آدمی بھی نہیں ملا؟" اس نے شکوہ کیا۔

"یہ بھی آدمی ہی ہے۔ بس بقول خود اپنے۔۔۔ ذرا شخصیت سے مار کھاتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

بندر نما انسان براہِ راست ستارہ سے مخاطب ہوا "ہلکہ میں بے شمار انسانوں سے بہتر ہوں، کبھی آزما کر دیکھنا۔"

ستارہ گاڑی سے اتر آئی۔ مشین پسٹل گاڑی کے ڈیش بورڈ پر ہی چھوڑ کر اس نے دانت پیستے ہوئے بازو بلند کیے۔ وہ بندر نما انسان کے منہ پر گھونسا رسید کرنا چاہتی تھی لیکن میں نے اس کا گھونسا ہاتھ پر روکتے ہوئے کہا "اسے مت مارنا۔ عورت کے ہاتھوں مار کھا کر اس کے جذبات مجروح نہ ہو جائیں۔"

وہ مجھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی "کھودا پہاڑ نکلا چوہا۔ وہ بھی بندر سے ملتا جلتا۔ یہ تم کیا پکڑ لائے ہو؟ اتنے زوروں کی فائرنگ ہو رہی تھی۔ میں تو سمجھی تھی، تم نہ جانے کیسی خوف ناک چیزوں کو قابو میں کرکے لاؤ گے۔"

"اسے چوہا کہہ کر تم اس کا ہی نہیں، میرا بھی دل توڑ رہی ہو۔ یہ بہت سی خوفناک چیزوں پر بھاری ہے۔ تم نے انگریزی کا وہ محاورہ تو پڑھا ہی ہوگا جس کا ترجمہ کچھ یوں ہے کہ اچھی چیزیں ہمیشہ چھوٹے پیکٹوں میں آتی ہیں۔ یہ شخص اس محاورے کی عملی تفسیر ہے۔ میں اسے دوست بنانا چاہتا ہوں مگر یہ دشمنوں کی نوکری کیے جا رہا ہے۔" میں نے آہ بھری۔

پھر میں نے براہِ راست اسے مخاطب کیا "بزرگوارم! میں نے ابھی تک تمہارا نام نہیں پوچھا۔"

"کیا کرو گے نام پوچھ کر؟ تمہیں کون سا مجھ کو اسکول میں داخل کرانا ہے۔" وہ میری طرف دیکھے بغیر بولا۔ وہ اب دلچسپی آمیز نظروں سے ستارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"اسکول میں نہ سہی۔ لیکن ہو سکتا ہے مجھے تم کو اسپتال میں داخل کرانا پڑے۔" میں نے کہا۔

"انسان کے دل میں کیسی کیسی حسرتیں ہوتی ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تمہاری تسکینِ قلب کے لئے بتا رہا ہوں۔۔۔ میرا نام این این ہے۔"

"میں نے مخفف نہیں، پورا نام پوچھا ہے۔"

"یہ مختلف نہیں ہے۔ میں این این نہیں کہہ رہا ہوں۔ اے نن کہہ رہا ہوں۔" اس نے ہجے کرکے بتایا۔

"عجیب نام ہے!" میں نے اسے گھورا۔

"بعض اوقات عجیب آدمیوں کے نام بھی عجیب ہوتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ وہ ستارہ کو مسلسل گھورے جارہا تھا اور میں محسوس کررہا تھا کہ ستارہ کے چہرے پر سرخی بڑھتی جارہی تھی۔ میرے لئے اچھا ہی تھا کہ وہ میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ میں نے اچانک ہی اس کے سر پر ریوالور کا دستہ زور سے رسید کیا۔ یہ ضرب کسی اور کے سر پر پڑی ہوتی تو شاید اسے اسٹریچر پر ڈال کر اسپتال لے جانا پڑتا۔ لیکن وہ صرف لڑکھڑا کر رہ گیا۔

سر جھٹکتے ہوئے اس نے خشمگیں سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے راہ چلتے کسی بزرگ کو کسی نوجوان نے کندھا مار دیا ہو۔

"اس کی کیا ضرورت تھی؟" اس نے خفگی سے پوچھا۔

"میں تمہیں بے ہوش کرنا چاہتا ہوں اے نن ڈیئر! اور میرے پاس کلوروفارم نہیں ہے۔" میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا۔

"میں جب سعادت مندی سے تمہارے ہر حکم کی تعمیل کررہا ہوں تو پھر یہ بے ہوش کرنے کے کھڑاگ کی کیا ضرورت ہے؟ اگر تم پر میری غیر معمولی مضبوطی کا راز فاش ہو ہی گیا ہے تو تم میرے جسم میں اتنی توڑ پھوڑ پر کیوں تل گئے ہو؟" اس نے شکوہ کیا۔

"اچھا تو پھر خاموشی سے ٹانگیں بھی بندھوالو اور ہونٹوں پر ٹیپ لگوالو۔" میں نے کہا۔ اس نے کندھے اچکادئے۔ یہ گویا رضامندی کا اظہار تھا۔ میں نے اپنی بیش قیمت رائفل گاڑی کے خفیہ خانے میں فٹ کی اور گاڑی سے ہی نائیلون کی ڈوری اور چپکنے والی ٹیپ نکال کر اے نن کی ٹانگیں باندھیں اور منہ بند کیا۔ اس نے یہ کام واقعی نہایت سعادت مندی سے کرالیا۔ اس کی یہ سعادت مندی مجھے کچھ عجیب سی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے اسے گاڑی کے عقبی حصے میں سیٹوں کے درمیان پھنسا کر لٹا دیا۔

"یہاں سے اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ تمہارا آخری علاج یعنی گولی استعمال کرنے میں اب میں دریغ نہیں کروں گا۔" میں نے کہا اور گاڑی کے چاروں دروازے لاک کردئے۔

ستارہ باہر ہی کھڑی تھی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔ "آؤ میں تمہیں لوکیشن پر واپس چھوڑ آؤں۔ اگر تمہارے ڈائریکٹر راحیل بٹ صاحب کے اعصاب نے ساتھ دیا تو شاید وہ باقی شوٹنگ مکمل کرلیں۔ تم انہی لوگوں کے ساتھ واپس آجانا۔ میں تو اب فوری طور پر اس تحفے کو لے کر روانہ ہورہا ہوں۔" میں نے گاڑی کی طرف اشارہ کیا "میرے لئے یہ بندر نما انسان بہت اہم ثابت ہوسکتا ہے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا تم کن چکروں میں ہو۔" وہ سر جھٹک کر میرے ساتھ چلتے ہوئے بولی۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اس کے رخسار گویا دہک اٹھے "تم نے ذرا دیکھا۔ اس منحوس کی آنکھوں میں کیسی بدمعاشی تھی؟ مجھ جیسی عورت بھی ایک بار تو شرم سے پانی پانی ہوجاتی ہے۔ یہ شخص اور وہ چمپینزی جو ایک رات میرے گھر میں گھس آیا تھا' یہ دونوں مجھے ایک ہی نسل کے لگتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ یہ اس کی ذرا ترقی یافتہ شکل لگتی ہے۔"

"نہیں خیر۔۔۔ نسل تو ایک نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر کہا "کم از کم ہم لوگوں کے نظریات کے مطابق تو نہیں ہے۔ اگر ڈارون کے نظریۂ حیات کو تسلیم کرلیں پھر تو ہمیں بھی ان دونوں کو اپنے آباؤ اجداد میں شمار کرنا پڑے گا۔ تاہم اتنا ضرور معلوم ہے کہ ان دونوں کا تعلق کسی ایک ہی گروہ یا تنظیم سے ہے۔"

"اب گروہوں اور تنظیموں میں اس قسم کی چیزیں بھی جانے لگیں؟" ستارہ کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

"کار آمد ہونے کی بات ہے۔ یہ دونوں ان کے لئے نہ جانے کتنے انسانوں سے زیادہ کار آمد ہوں گے۔ تمہیں ابھی ان کی صلاحیتوں اور افادیت کا اندازہ نہیں ہے' اس لئے تم ان کا ذکر حقارت سے کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

"کچھ کچھ اندازہ ہو چلا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی اور ساتھ ہی اس کے چہرے پر ایک بار پھر ہلکی سی سرخی آگئی۔ میں ہنس دیا۔

اس دوران ہم لوکیشن پر پہنچ گئے۔ یونٹ کے افراد شوٹنگ پیک اپ کرنے کی تیاریاں کررہے تھے۔ ڈائریکٹر راحیل بٹ دونوں کو دیکھتے ہی ہاتھ پر ہاتھ مار کر بولا "یہ لو۔۔۔ جن کی فکر میں ہمارا آدھا خون سوکھ گیا وہ ہنستے چلے آرہے ہیں۔"

سب نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمارا سرتاپا جائزہ لیا۔ جیسے ہمیں زندہ سلامت دیکھ کر انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آرہا ہو۔ پھر راحیل بٹ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر بولا "اللہ جی! میں کس مونہہ نال تہاڈا شکر ادا کراں۔۔۔ ساڈی ہیروئن تے چوہدری صاحب۔۔۔ دو ہویں ٹھیک ٹھاک نیں۔"

"چوہدری صاحب! ایہہ کی تڑ تڑ شروع ہوگئی سی؟" کیمرا مین نے آگے آتے ہوئے پوچھا۔

"بھئی جب آدمی کے کاروبار پھیلتے ہیں تو اس قسم کے جھگڑے رگڑے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔" میں نے مسکرا کر بات گول کرتے ہوئے کہا "بہرحال میں آپ کی ہیروئن کو کسی قسم کی توڑ پھوڑ کے بغیر واپس آپ کے حوالے کررہا ہوں۔ آپ چاہیں تو اپنی باقی شوٹنگ مکمل کرلیں۔"

"شوٹنگ کہاں سے ہوگی چوہدری صاحب!" راحیل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ہیرو ہی چلا گیا۔"

"کیا۔۔۔؟" میں نے حیرت سے کہا "ارشد موتی چلا گیا؟"

"جی ہاں۔" راحیل بٹ مسکراتے ہوئے بولا "کہہ رہا تھا وہ اپ سیٹ ہوگیا ہے۔ ٹھیک پرفارمنس نہیں دے سکے گا۔ ڈرا

گھبراہٹ میں اسی طرف بھاگ اٹھا تھا جدھر سے فائرنگ ہورہی تھی۔ وہ بال بال بچا۔ گولیاں اس کے عین قریب سے گزری ہیں۔ بچ تو گیا لیکن بے چارے کی حالت غیر تھی۔ اچھا ہی ہوا' چلا گیا ہماری فلمی دنیا کا ٹارزن۔"

"ویسے مابدولت کا بھی ٹارزن اسٹائل کا ایک شاٹ آپ کے کیمرے میں محفوظ ہوگیا ہے۔ اسے ضائع کردیجئے گا۔" میں نے کہا۔

"کیا واقعی؟" راحیل بٹ کی آنکھوں میں شرارت کی چمک بھر آئی "وہ تو دیکھنے کی چیز ہوگی۔ ہم تو اسے ڈیولپ کروا کر دیکھنے کے بعد ہی فیصلہ کریں گے کہ ضائع کرنا ہے یا کچھ اور کرنا ہے۔"

"وہ میرا شاٹ ہے۔ اس کے جملہ حقوق میرے نام محفوظ ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے ستارہ کی طرف توجہ ہوتے ہوئے پوچھا "تم اپنے یونٹ کے ساتھ آؤ گی یا میرے ساتھ چلنا پسند کروگی؟"

"میں یونٹ کے ساتھ ہی آجاؤں گی۔" وہ ایک لمحے سوچ کر بولی "ویسے میرے پاس اپنی گاڑی بھی ہے۔"

"جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے ان سب کو خدا حافظ کہا اور واپسی کے لئے مڑنے لگا تو راحیل بٹ بہ آواز بلند بولا "چوہدری صاحب! دعا کیجئے گا' یہ فلم تین مہینے میں مکمل ہوجائے ورنہ میں کنگال ہوجاؤں گا۔ فنانسر سے میری شرط لگی ہوئی ہے۔ اگر تین ماہ میں فلم مکمل نہ ہوئی تو اس کا سارا پیسہ بھی واپس اور جتنی فلم بن چکی ہوگی وہ بھی مفت میں اس کی ملکیت ہوجائے گی۔ یہ باقاعدہ معاہدہ ہے۔"

میں نے جاتے جاتے مڑ کر اسی طرح بہ آواز بلند کہا "آپ بے فکر ہوکر کام کریں بٹ صاحب! ہم یاروں کے یار ہیں۔ آپ کا فنانسر آپ کو لوٹ کر بھاگ گیا تب بھی ہم آپ کو کنگال نہیں ہونے دیں گے۔ آپ کا ہر نقصان ہم بھریں گے۔ جنگل گرل' ضرور مکمل ہوگی اور ضرور ریلیز ہوگی۔"

یونٹ کے تمام لوگ زور و شور سے تالیاں بجانے لگے اور میں تیز تیز قدموں سے اپنی گاڑی کی طرف واپس چل دیا۔ چند منٹ بعد جب میں اس مقام پر پہنچا جہاں میری گاڑی کھڑی تھی تو ایک لمحے کے لئے میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ میں گاڑی کے چاروں دروازے لاک کرکے گیا تھا لیکن اس وقت گاڑی کا پچھلا دروازہ کھلا نظر آرہا تھا۔

گاڑی میں جھانکے بغیر دور سے ہی مجھے احساس ہوگیا کہ اے نن گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ ایک انجانے خطرے کے احساس سے میرے اعصاب تن گئے۔ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود اے نن گاڑی کا دروازہ تو اندر کی طرف سے کھول سکتا تھا لیکن جس حالت میں' میں نے اسے چھوڑا تھا اس حالت میں وہ فرار نہیں ہوسکتا تھا۔ شہتیر کی طرح لڑھکتا ہوا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

وہ دور دور تک کہیں نظر نہیں آرہا تھا اور اس کے اس طرح فرار ہونے کا مطلب یہی تھا کہ کسی نے اس کی مدد کی تھی۔ اور وہ مددگار شاید آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ میری کوئی حس مجھے اس کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی۔

میں دوڑ کر ایک بار پھر گاڑی کی اوٹ میں ہوگیا اور اس دوران میرے اس خیال کی تصدیق ہوگئی کہ اے نن گاڑی میں موجود نہیں تھا۔ ستارہ سے واپس لیا ہوا مشین پسٹل میرے ہاتھ میں آچکا تھا اور میری نظریں درختوں کے گنجلک سلسلے میں بھٹک رہی تھیں۔

دفعتاً فضا میں ایسی ہنسی ابھری جیسے کوئی میری حالت دیکھ کر محظوظ ہورہا ہو۔ مگر یہ غیر انسانی ہنسی تھی۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ مجھے نظر نہیں آیا تھا مگر اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ میں نے پہچان لیا تھا کہ یہ ہنسی کس کی تھی۔ یہ وہی منحوس چمپینزی بلیک برڈ تھا جس سے مجھے ستارہ کے گھر واسطہ پڑچکا تھا۔ اکثر خبیثوں کی طرح اس کی بھی عمر لمبی معلوم ہوتی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے ہی اس کا ذکر ہورہا تھا اور وہ آن موجود ہوا تھا۔ بلکہ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اس وقت بھی آس پاس ہی کہیں موجود رہا ہو اور کسی پناہ گاہ سے ہماری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا ہو جس وقت ستارہ اس کا ذکر کررہی تھی۔

وہ ایک بہت اونچے اور گھنے درخت کی بالائی شاخوں پر پتوں کے درمیان چھپا ہوا تھا اور کسی جھری سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھ پر شاید ہلکی سی جھلاہٹ طاری تھی۔ میں نے اندازاً اس جگہ پر کئی فائر کرڈالے۔ بہت سے پتے ٹوٹ کر ہوا میں لہراتے ہوئے اِدھر اُدھر بکھر گئے لیکن شاخوں کے درمیان ہونے والی کھڑکھڑاہٹ سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ گولیوں سے بچ چکا تھا۔ شاخوں ہی شاخوں کے درمیان کسی اور درخت پر پہنچ چکا تھا۔

گولیاں ضائع کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے مشین پسٹل جیب میں رکھ لیا اور تن بہ تقدیر ہوکر گاڑی کی اوٹ سے نکل آیا۔ تب وہ بھی پتوں کی پناہ گاہ سے نکل آیا۔ ایک بار پھر وہی خوخیاہٹ نما ہنسی ابھری اور میں نے دیکھا' وہ کافی دور ایک درخت کی اونچی شاخ پر ایک ہی بازو کے سہارے جھول رہا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں ذرا مختلف ساخت کی ایک گن تھی۔ وہ یقیناً اس کی وہی فلیئر گن تھی جو میں اس رات تاریکی کی وجہ سے صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا جب ستارہ کی کوٹھی پر اس سے سامنا ہوا تھا۔

لیکن آج بلیک برڈ کی شخصیت میں ایک بہت بڑی تبدیلی نظر آرہی تھی۔ اور وہ یہ کہ شاید انسدادِ فحاشی کے کسی پروگرام سے متاثر ہوکر اس نے خاکی رنگ کی ایک ڈانگری پہنی ہوئی تھی۔ آج وہ اپنے فطری لباس میں باہر نہیں آیا تھا۔ اس کے جسم پر صرف ڈانگری ہی نہیں تھی بلکہ کاؤبوائز والے اسٹائل میں باقاعدہ ہولسٹر میں گولیوں کی بیلٹ کے ساتھ ایک ریوالور بھی جھول رہا تھا۔ سینے پر

ایک بچ بھی ہوتا تو شاید وہ بندروں کا شریف معلوم ہوتا۔

مجھے یقین ہو گیا کہ اے نن کو فرار ہونے میں اسی نے مدد دی تھی۔ میرا غصہ ایک بار پھر عود کر آیا اور گو کہ اس نے اپنی فلیئر گن سے مجھ پر فائر نہیں کیا تھا لیکن میں نے انتہائی پھرتی سے جیب سے مشین پسٹل نکال کر اس پر فائر کئے۔ میں نے اسے چھلاوے کی طرح ہوا میں قلابازیاں کھاتے اور پتوں کے درمیان دوبارہ غائب ہوتے دیکھا۔

لائن آف فائر کا اندازہ کرتے ہوئے گولیوں سے بچنے کی ٹیکنک مجھے بھی آتی تھی اور میں نے بڑی محنت سے سیکھی تھی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ شاید وہ بھی اس ٹیکنک کا مظاہرہ کرے گا اس لئے میں نے اس کا توڑ کرتے ہوئے فائر کئے تھے۔ لیکن اس حیوان کی ٹیکنک مجھ انسان سے بہتر تھی۔ اس نے انسانی نفسیات کو دھوکا دے دیا تھا۔ میرے خیال میں اسے گولیوں سے بچتے ہوئے جتنے فاصلے تک چھلانگ لگانی تھی میں نے وہیں فائر کیا تھا۔ انسان عموماً اس سمت میں چھلانگ لگاتا ہے جدھر اس کا چہرہ ہوتا ہے۔ لیکن اس نے اس نفسیاتی اصول کو بالائے طاق رکھ دیا تھا اور الٹی جست لگائی تھی۔

شاید چمپینزی ہونے کی وجہ سے بھی اس کی صلاحیتیں اور نفسیات مختلف تھی یا پھر اسے تربیت میری نسبت بہتر ملی تھی۔ اس کا اسٹائل مجھے بہت پسند آیا تھا۔ یہ مزید کار آمد ٹیکنک تھی۔ میں نے اسی لمحے سوچ لیا تھا کہ میں اس کی بھی مشق کروں گا۔ انسان چاہے تو بندروں سے بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔

میں دل ہی دل میں چمپینزی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے تیزی سے دوبارہ گاڑی کی اوٹ میں ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی جواباً فلیئر گن یا ریوالور سے فائر کرے گا۔ یا کوئی اور ردِ عمل تو یقیناً ظاہر کرے گا۔ مگر وہ کم بخت آج میرے سارے اندازے غلط ثابت کرنے اور میرے پورے علم نفسیات کو چکر دینے پر تُلا ہوا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں کیا اور ایک لمحے بعد مجھے بہت دور سے پتوں کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ سنائی دی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بدمعاش یقیناً درختوں ہی درختوں پر جنگل کے گھنے حصوں کی طرف نکلتا چلا گیا تھا۔ وہ غالباً مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلانے اور یہ جتانے آیا تھا کہ اے نن کو اس نے فرار کرایا ہے۔ شاید وہ مجھے یہ احساس بھی دلانا چاہتا تھا کہ میں انہیں قابو میں نہیں کر سکتا۔

میرے خیال میں اب اس کی تلاش میں اپنے آپ کو تھکانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اب اس طرف جانے کی کوشش نہیں کرے گا جدھر قلمی یونٹ کے افراد موجود تھے۔ اس کے انداز سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کہیں اور روانہ ہو گیا تھا۔ میں بھی گاڑی میں بیٹھا اور واپس شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

راستے میں جہاں میں نے ٹونی اور شبیر کو چھوڑا تھا وہ وہیں درختوں کے جھنڈ کے عقب میں سڑک سے کچھ دور کچے میں موجود تھے۔ وہ دوبارہ میرے پیچھے آنے لگے۔ بڑے ہی مستقل مزاج نوجوان تھے۔

کچھ دور آنے کے بعد میں نے ریڈیو پر ٹونی سے رابطہ اور دورانِ سفری اسے نصیر نواز کا ایڈریس بتاتے ہوئے کہا دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگاؤ کہ آج رات یا کل کسی وقت ایسا کریں کہ یہ شخص مجھے گھر پر اکیلا ملے۔ مجھے اس سے اکیلے مذاکرات کرنے ہیں۔ جب بھی میٹنگ کے لئے ماحول تیار ہو مجھے فون کر دو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے سر!" ٹونی حسبِ عادت دھیمے لہجے میں بولا مذاکرات زیادہ ضروری نہ ہوں تو ہمیں بریف کر دیں۔ ہم کر لیں گے۔" وہ میرا مطلب بخوبی سمجھتے تھے۔

"نہیں میں نے کسی سے وعدہ کیا تھا کہ میں خود مذاکرات کروں گا۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر کے ریڈیو کا مائیک خفیہ میں واپس رکھ دیا۔

گھر پہنچ کر میں نے غسل اور کھانے کے بعد باہر جانے تیار ہونا شروع کیا تو مجھے ایک اور کام یاد آ گیا۔ میں نے گوجرانوالہ کا ایک نمبر ڈائل کیا اور رابطہ قائم ہونے پر سیٹھ وحید سے بات کرنا تھی۔"

چند لمحے کے انتظار کے بعد مجھے ایک جانی پہچانی اور آواز سنائی دی اور میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "سیٹھ صاحب افضل چوہدری بول رہا ہوں۔"

"اوہو۔۔۔" اس نے ایک طویل سانس لی اور وفور

کی آواز کانپ گئی "چوہدری صاحب! مجھے یقین نہیں آرہا نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ مجھے لگ رہا ہے میرے کان مجھے رہے ہیں۔ چوہدری صاحب! کیا یہ واقعی آپ ہیں؟"

جی ہاں۔۔ یہ سو فیصد میں ہی ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا صاحب! میں نے آپ سے جس کام کا وعدہ کیا تھا' میرا خیال تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ اگر آپ اپنی آنکھوں سے آخری کھنا چاہتے ہیں تو آج ہی لاہور پہنچ جایئے اور مجھے اپنے فون مطلع کر دیجئے۔"

بہت بہتر چوہدری صاحب!" اس نے سعادت مندی سے لیکن پھر گویا کچھ سوچ کر ہچکچاتے ہوئے بولا "اگر آپ نے نص کو تلاش کر لیا ہے تو اسے ہمارے حوالے کر دیجئے۔۔۔۔ میرے اور میرے بیٹے نوید کے جذبات کی بھی کچھ تسکین کسمپرسی اور ذلت کے عالم میں بہن کا قتل ہونا نوید کے لئے بڑا دھچکا ثابت ہوا ہے۔ اس کے ذہن پر بہت برا اثر پڑا ہے۔ گم صم رہنے لگا ہے۔ وہ بڑا جذباتی اور جوشیلا نوجوان ہے۔ ور جذباتیت میں ہم نے پہلے بچی کو ہاتھ سے کھو دیا۔ اب بچہ غلط قدم اٹھا لے۔ وہ بھی اپنے آپ کو مجرم محسوس کرتا ہے۔ خواہشات کو کچلنے میں اس وقت وہ بھی میرے شانہ بہ شانہ ب پچھتاوے کا زہر اسے مجھ سے زیادہ کھا رہا ہے۔ اگر اس کا ذمے دار ہمارے ہاتھوں میں آجائے تو شاید ہم اپنا پچھتاوا کر سکیں۔"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا "نہیں سیٹھ صاحب! جذباتیت ام بگاڑ دیتی ہے۔۔۔ اور پھر آپ لوگ ان معاملات میں کافی ناکتے ہیں۔ جو کچھ میں آپ کو دکھاؤں گا آپ کی جذباتیت کی ن کے لئے وہی کافی ہو گا۔"

"جیسے آپ کی مرضی چوہدری صاحب!" اس نے فوراً ہی اپنی ش واپس لے لی "ہمارے لئے تو یہی بہت بڑا احسان ہے کہ جیسے بڑے آدمی نے بہ نفس نفیس ہمارے لئے اتنی زحمت کی۔ آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔" اس کی آواز گلوگیر نے لگی تھی اس لئے میں نے جلدی سے خدا حافظ کہہ کر منقطع کر دیا۔

مجھے ایک رنگا رنگ تقریب میں جانا تھا۔ وہاں جا کر میں نے ناگوار باتیں بھلانے کی کوشش کی اور اس میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ وہاں ایک سے ایک بڑھ کر حسین چہرے تھے جن میں بیشتر میرے گرد منڈلاتے رہے اور یوں بری عزت افزائی ہوتی لہ۔ سیاحتوں کے قصے تھے' لہو کو گرمانے والی باتیں تھی' عمدہ بات تھے' اچھا کھانا تھا۔ سب کچھ میرے ذوق کے مطابق تھا۔ دیر کے لئے میں نے ساری الجھی الجھی باتیں بھلا کر خود کو اس ل میں اُڑا دیا۔ اس دوران دو تین سیٹھوں نے حسب عادت مجھ لوہے کے بھاؤ' چھالیہ کے جہازوں' اسکریپ' کاٹن اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں ان سے دور ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میری نظر میں یہ سب فضولیات تھیں۔

بعض سیٹھوں پر مجھے حیرت ہوتی تھی کہ اگر وہ تقریبات کو انجوائے نہیں کر سکتے تھے تو ان میں آتے کیوں تھے۔ لیکن اس سوال کا جواب بھی مجھے معلوم تھا۔ وہ بے چارے یہاں بھی صرف کاروبار کو وسعت دینے آتے تھے۔ بہت سے کام کے لوگوں کو ایک ہی جگہ پر جمع دیکھ کر ان کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگتی تھیں اور باچھیں کھل جاتی تھیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ ملک الموت سے بھی منڈی کے بھاؤ ضرور ڈسکس کریں گے۔

اس پارٹی میں فلمی دنیا کا کوئی آدمی نہیں تھا۔ فلمی دنیا کی پارٹیوں کا اپنا ایک الگ ہی مزہ تھا۔ بہر حال میں پارٹی سے واپس آیا تو خاصی ترنگ میں تھا۔ میری عدم موجودگی میں ٹیلی فون کا جواب دینے والی مشین پر دو ایسے ریکارڈ شدہ پیغامات موجود تھے جن کا مجھے انتظار تھا۔

ایک پیغام تو سیٹھ وحید کا تھا۔ وہ گوجرانوالہ سے لاہور آچکا تھا اور حسبِ معمول ہلٹن میں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے اپنا فون نمبر اور کمرا نمبر وغیرہ ریکارڈ کرا دیا تھا۔ دوسرا پیغام کوڈ ورڈز میں ایک کارکن کا تھا۔ ٹونی نے اس کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ وہ نصیر نواز سے میری ملاقات کے لئے سازگار' ماحول تیار کرے۔ اس کارکن نے اطلاع دی تھی کہ میٹنگ کے لئے صبح آٹھ بجے کا وقت مناسب رہے گا۔ نصیر نواز رات کو دیر سے گھر آتا تھا اور صبح دیر تک سوتا تھا۔ اس بات کا بندوبست کر لیا گیا تھا کہ صبح اس کے ملازم بھی دیر تک سوتے رہیں۔ کوئی ہماری گفتگو میں مداخلت کرنے یا ہماری ملاقات کا چشم دید گواہ بننے نہ آئے۔ میرے آدمی کام جلدی کرتے تھے اور تسلی بخش کرتے تھے۔ میں مطمئن ہو کر لمبی تان کر سو گیا۔

رات کو تقریباً روزانہ میں بھی دیر سے ہی سوتا تھا لیکن صبح جلدی اٹھ جاتا تھا۔ میری ایک دیہاتی والی سحر خیزی کی عادت نہیں گئی تھی۔ علی الصباح میں نے ہلٹن فون کر کے سیٹھ وحید کو جگایا اور اسے اطلاع دی کہ فلاں وقت میرا ایک آدمی اسے لینے آئے گا۔ وہ اسے جہاں بھی لے چلے' سیٹھ کو بے چون و چرا چلے آنا چاہئے۔ اس نے بتایا کہ اس کا بیٹا نوید بھی اس کے ساتھ ہے۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر بے پروائی سے کہا "آپ اسے بھی ساتھ لا سکتے ہیں۔"

اس کے بعد میں نے ٹونی اور شبیر کو کچھ ضروری ہدایات دیں اور خود معمول کے مطابق تیار ہونے لگا۔ تیار ہو کر میں نے ناشتا کیا اور بریف کیس اٹھا کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ گاڑی میں بیٹھتے وقت میں نے گھڑی دیکھی۔ پونے آٹھ بج رہے تھے۔ نصیر نواز کے گھر پہنچنے کے لئے پندرہ منٹ کافی تھے۔

گاڑی میں نے نصیر نواز کے گھر سے کافی دور ایک چھوٹی سی مارکیٹ کے قریب چھوڑ دی اور ٹہلتا ہوا آگے روانہ ہوا۔ اس کی گلی میں ویرانی سی تھی۔ اِکا دکا گاڑیاں گزر رہی تھیں۔ اس علاقے کے بیشتر مکینوں کے نزدیک آٹھ بجے کا وقت تقریباً منہ اندھیرے ہی کا وقت تھا۔

چلتے چلتے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد میں یکدم ہی نصیر نواز کے گھر میں داخل ہو گیا۔ گیٹ بظاہر بند تھا لیکن اندر سے بولٹ چڑھا ہوا نہیں تھا۔ میں نے اندر پہنچ کر بولٹ چڑھا دیا۔ نصیر نواز کی کوٹھی شاندار تھی اور اس کے ڈرائیو وے میں دو بیش قیمت کاریں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک کامیاب فلمی مصنف خاصا خوش حال ہوتا ہے مگر اتنا بھی نہیں جتنا نصیر نواز نظر آتا تھا۔ اور جتنا وہ نظر آتا تھا، مجھے یقین تھا کہ اس سے بھی زیادہ دولت مند تھا۔ وہ صرف فلمی مصنف کے طور پر ہی نہیں، اور بھی نہ جانے کن کن حیثیتوں میں کتنا کامیاب تھا۔

گھر کا لان شاندار تھا۔ در و دیوار سے امارت ٹپک رہی تھی۔ میں ایک ایک کمرے میں جھانکتا آگے بڑھتا گیا۔ اس گھر میں زیادہ رونق نوکروں ہی کے دم سے رہتی ہوگی جن میں سے کوئی بھی اس وقت مجھے روکنے ٹوکنے کے لئے موجود نہیں تھا۔

آخر کار مجھے نصیر نواز کا بیڈ روم مل گیا۔ اس کا دروازہ بھی غیر مقفل تھا۔ میرے آدمی کسی سے ملنے کے لئے جب میرا راستہ صاف کرتے تھے تو پھر راستے میں کوئی چھوٹی سی رکاوٹ بھی نہیں رہنے دیتے تھے۔

نصیر نواز اپنے شاندار بیڈ پر آڑا ترچھا بے خبر پڑا سو رہا تھا۔ ہلکے ہلکے خراٹے بھی لے رہا تھا۔ میں بریف کیس اٹھائے یوں اس کے قریب جا کھڑا ہوا جیسے کوئی ڈاکٹر اپنے مریض کا معائنہ کرنے آیا ہو۔ بریف کیس سائڈ ٹیبل پر رکھتے ہوئے میں نے اس کا کندھا ہلا کر اسے جگایا۔

تھوڑی سی کوشش کے بعد آخر کار وہ آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں اور چہرہ بتا رہا تھا کہ پچھلی رات پینے پلانے کا شغل رہا تھا جس کا اثر ابھی تک باقی تھا لیکن پھر مجھے پہچان کر اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں اور وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"چوہدری صاحب! آپ یہاں ... اور اس وقت؟ میں کہیں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟" اس نے ایک بار پھر آنکھیں ملیں۔

"نہیں، یہ خواب نہیں ہو سکتا۔" میں نے گویا اسے یقین دلایا۔ "کیوں کہ میں مردوں کے خوابوں میں آنا ہرگز پسند نہیں کرتا۔"

"آپ کی آمد کی کوئی اطلاع ... میرا مطلب ہے آپ کو کسی نے ..." اس نے جملے ادھورے چھوڑ دیئے۔

"غالباً تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ میں سیدھا تمہارے کمرے میں کیونکر پہنچ گیا؟ کیا مجھے کسی ملازم وغیرہ نے نہیں روکا؟ تو بات یہ

ہے مسٹر نصیر نواز ... کہ میں جب کسی سے اپنے طور پر [illegible] کر لیتا ہوں تو عام طور پر ملازموں وغیرہ کے تکلفات [illegible] نکال دیتا ہوں۔" میں نے ڈریسنگ ٹیبل کا اسٹول کھینچ کر [illegible] کہا۔

وہ قدرے سنبھل کر بولا "پھر بھی آپ نے کیوں [illegible] آپ فون کر دیتے ... آفاق سے کہہ دیتے ... میں خود حا[ضر] کیا کوئی نئی فلم شروع کر رہے ہیں؟ میرے لائق کوئی [illegible] آئی ہے؟"

"میں جس فلم کے سلسلے میں آیا ہوں، وہ تم ابھی [illegible] تقریباً پوری لکھ چکے ہو نصیر!" میں نے ملائمت سے کہا [illegible] اس کا آخری سین لکھوانے آیا ہوں۔"

میں نے نشاط کی ایک تصویر اس کے سامنے [illegible] زندگی سے بھرپور، ہنستی مسکراتی ایک خوب صورت [illegible] پہچانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں خوف کی پرچھائیاں [illegible] لیکن وہ کہانی کار نہ سہی، اداکار بہت اچھا تھا۔ بڑی کام[یابی سے اُن] پرچھائیوں کو معصومیت کے پردوں تلے چھپا گیا۔ اس [illegible] شکنیں ابھر آئیں گویا ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس لڑکی کو کہیں دیکھا تو نہیں؟

بغور میری طرف دیکھتے ہوئے وہ سادگی سے بولا [illegible] دیکھی ہوئی سی تو لگ رہی ہے لیکن یاد نہیں آرہا کہاں [illegible] کہیں یہ وہی لڑکی تو نہیں جو سعید صاحب کے ہاں پارٹی [میں] سوئمنگ پول میں مردہ پائی گئی تھی؟ اس کی شکل تو بہت [illegible] تھی ... لیکن پھر بھی ... اس تصویر میں اس کی کچھ کچھ [illegible] ہے۔"

"بہت خوب" میں نے ہلکی سی تالی بجا کر اسے داد [illegible] بڑا غنیمت ہے کہ تمہیں اس تصویر میں مقتولہ نشاط مر[حومہ کی] جھلک تو دکھائی دے گئی۔ ورنہ تم چاہتے تو اس جھلک [illegible] ہو سکتے تھے۔ بے شک نشاط کی صورت اس وقت کافی بگڑ [چکی تھی] جب اس کی لاش سوئمنگ پول کی تہ سے نکالی گئی۔ [illegible] پرورش پانے والی ایک نازک اندام مگر ضدی لڑکی جو [illegible] ان گنت تباہیوں کی بھینٹ چڑھ چکی ہو، جس کے ساتھ [illegible] دھوکا ہوا ہو ... محبت اور شادی کے وعدوں کے نام پر جو [illegible] صرف عیش و نشاط کی راتیں بسر کی گئی ہوں، جس کے [illegible] بچے کو بچے کا باپ اپنا تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہو، [illegible] گرفتگی کے لمحات میں نائیلون کی ڈوری سے جس کا گلا [گھونٹ کر] ہلاک کر دیا گیا ہو، جس کی لاش کم از کم دو ڈھائی گھنٹے سو[ئمنگ پول] کی تہ میں رہی ہو۔ اس کی شکل تو بگڑنی ہی تھی نصیر نواز!"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے [illegible] رکھتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے کہ وہ ایک نادان لڑکی تھی [illegible]

حماقت کرتی چلی آئی تھی لیکن اس کی نادانیوں کی اسے اتنی بڑی سزا نہیں ملنی چاہئے تھی۔ اسے کم از کم زندہ رہنے کا حق تو حاصل رہنا چاہئے تھا۔ تمہیں اس حسین تصویر کو اتنی بے دردی سے مسخ نہیں کرنا چاہئے تھا نصیرا!"

" میری سمجھ میں نہیں آرہا آپ کس قسم کی باتیں کر رہے ہیں!"نصیر نواز غیر محسوس طور پر تھوک نگل کر بولا۔

" یہ بہت گھسا پٹا مکالمہ ہے۔ عام طور پر ایسے موقعوں پر یہی بولا جاتا ہے۔ لیکن تم اتنے بڑے فلمی مصنف مشہور ہو' کم از کم تمہیں تو اس موقع کے لئے کچھ اور سوچ کر رکھنا چاہئے تھا۔ خود نہیں سوچ سکتے تھے تو سجاد نسیم سے ہی لکھوا لیتے۔"

اسے حیرت کا جو دھچکا لگا اسے بھی وہ بڑی صفائی سے چھپا گیا۔ بدستور معصوم بنا رہا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا " چوہدری صاحب! آپ یقیناً آج صبح ہی صبح مجھے حیران کرنے کی مہم پر نکلے ہیں۔ آپ کی باتیں واقعی میری سمجھ میں نہیں آرہیں۔ آج یکم اپریل بھی نہیں ہے۔ ورنہ میں یہی سمجھتا کہ آپ نے اپریل فول بنانے کے لئے میرا انتخاب کیا ہے۔"

" میرے لئے نہ اپریل فول کی رسم اتنی اہم ہے اور نہ تمہاری شخصیت' جس کے لئے میں اپنا اتنا وقت خراب کرنے آتا۔" میں نے حقارت سے کہا "میں نے تو ایک شریف باپ اور ایک معصوم روح سے کیا ہوا وعدہ پورا کرنے کے لئے اتنی زحمت اٹھائی ہے۔"

" چوہدری صاحب! میں آپ کو انتہائی سنجیدہ اور کافی حد تک غیر فلمی سا آدمی سمجھا تھا..." وہ ذرا سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

" تم بالکل ٹھیک سمجھے تھے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے لقمہ دیا۔

" لیکن آج آپ کی باتوں سے ظاہر ہو رہا ہے کہ آپ ڈرامائی سچویشن پیدا کرنے میں بھی اچھے خاصے ماہر ہیں۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا " آپ نے مجھے واقعی خاصا حیران پریشان کر دیا ہے۔ میں اس وقت ویسے بھی کافی پیا کرتا ہوں.... لیکن آپ کی باتوں کے بعد تو کافی کی ضرورت زیادہ شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ آپ بھی یقیناً کافی پینا پسند کریں گے۔ میرا شیف بہت عمدہ کافی بناتا ہے۔" اس کے بیڈ کے سرہانے کال بیل کا بٹن موجود تھا۔ میرے جواب کا انتظار کئے بغیر اس نے بٹن دبایا اور دباتا ہی چلا گیا۔ کافی فاصلے پر غالباً کچن میں گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی۔ وہ امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھتا رہا لیکن گھنٹی کے جواب میں کوئی نہ آیا۔ اب وہ اپنی آنکھوں میں تشویش کی پرچھائیوں کو چھپانے میں کچھ ناکام ہو رہا تھا۔

وہ اٹھنے کے لئے آگے کھسکتے ہوئے بولا " یہ ملازم پتا نہیں کہاں مر گئے۔ ٹھہرئے میں خود دیکھتا ہوں۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑلی۔ یہ ایسی گرفت تھی جو ایک بیل کو بھی اس کی جگہ بیٹھے رہنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ وہ تو محض ایک عیش کوش انسان تھا۔

" چوہدری صاحب! کیا آپ واقعی سنجیدہ ہیں؟" اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

" بہت زیادہ سنجیدہ ہوں۔" میں نے جواب دیا " میں کبھار ہی زیادہ سنجیدہ ہوتا ہوں اور جو لوگ کبھی کبھار سنجیدہ ہوتے ہیں' ان کی سنجیدگی کسی نہ کسی کو بہت بھاری پڑتی ہے۔"

" آپ بالکل صاف صاف اور سلیس انداز میں بات کیجئے کہ آپ کس لئے آئے ہیں اور مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" وہ گویا طور پر کچھ تیار ہوتے ہوئے بولا۔

" میں کیا اب تک فارسی میں گفتگو کر رہا تھا؟" میں نے ملائمت سے کہا " میری گفتگو تمہارے لئے بالکل صاف اور واضح تھی۔ مجھے معلوم ہے کہ تم سب کچھ بہت اچھی طرح سمجھ رہے ہو لیکن جانتے بوجھتے بھی انجان بنے رہنے کا اگر تمہاری نظر میں کوئی فائدہ ہے تو بنے رہو۔ میں تو جو کچھ کرنے آیا ہوں وہ کر کے ہی جاؤں گا۔ تمہاری فرد جرم میں تمہیں سنا چکا ہوں۔ تم جتنے خوش شکل انسان ہو' اندر سے اتنے ہی گھناؤنے ہو۔ ایک غریب آدمی سے ہزار ہزار روپے پر فلمی کہانیاں لے کر تم چالیس پچاس ہزار روپے میں بیچتے رہے اور سپرہٹ مصنف بنے رہے۔ اس غریب آدمی نے اپنی بوڑھی ہوتی ہوئی بیٹی کی شادی کے لئے تم سے تھوڑی سی مدد طلب کی تو تم نے اسے کسی سیٹھ کے عشرت کدے کی زینت بنانے کا مشورہ دیا...."

اب حقیقتاً اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے نمودار ہونے لگے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "پھر تم نے گھر سے بھاگی ہوئی اس نادان لڑکی نشاط کو محبت کے جھانسے دیئے۔ اسے ہیروئن بنوانے کا وعدہ کیا۔ اس سے شادی کا وعدہ کیا اور اسے پھسلا کر اپنی راتیں رنگین کرتے رہے۔ وہ تمہارے کہانیوں والے راز سے بھی آگاہ ہو گئی۔ وہ تم سے فیصلہ کن جواب لینے پر بضد تھی کیونکہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی تھی۔ اس نے شاید تمہیں کہانیوں والا راز بھی فاش کرنے کی دھمکی دی ہو۔ چنانچہ تم نے انتہائی سفاکی سے اسے ٹھکانے لگا دیا۔ یہ تو تمہارے وہ جرائم ہیں جو میرے علم میں آسکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تمہارے جرائم کی فہرست اس سے کہیں زیادہ لمبی ہوگی۔"

" فلمی دنیا میں اس قسم کے معاملے چلتے رہتے ہیں۔ چوہدری صاحب! آپ کیوں اتنے سیریس ہو رہے ہیں؟ آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟"

" گویا تم تسلیم کر رہے ہو کہ ایسا ہوا ہے"؟ میں نے پوچھا۔

" تسلیم تو میں کچھ بھی نہیں کر رہا۔ میں تو آپ کو سمجھا رہا ہوں کہ آدمی کو تمام پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑا کر خواہ مخواہ اپنا خون نہیں جلانا چاہئے۔" وہ اب سنبھل چکا تھا اور پر اعتماد نظر آرہا تھا۔ غالباً اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کچھ ہونا ہے' ذرا جرات سے اس کا مقابلہ کیا جائے۔ لیکن اسے صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ ہونا کیا ہے۔

" میں یہاں خون جلانے نہیں خون کا حساب لینے آیا ہوں۔" میں نے کہا۔ " ویسے نشاط واقعی تھی بہت بے وقوف۔ اگر وہ تمہیں بتا دیتی کہ وہ کتنے دولت مند باپ کی بیٹی ہے تو تم اس کے ساتھ کبھی وہ سلوک نہ کرتے جو تم نے کیا۔ شاید تم اس کے ساتھ شادی کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے لگتے۔ بشرطیکہ طاہرہ خانم کا پلہ بھاری نہ ہوتا۔ آج کل تمہاری نظر طاہرہ خانم کی دولت پر ہے۔ لیکن تم اس سے جتنا استفادہ کر چکے ہو اتنا ہی کافی ہے۔ زندگی اب تمہیں مزید مہلت نہیں دے گی۔"

اس کی آنکھوں میں ایک تلاطم سا آکر گزر گیا۔ شاید اسے یہ سن کر حیرت ہوئی تھی کہ نشاط ایک دولت مند آدمی کی بیٹی تھی۔ شاید یہ بات بھی اس کے لئے حیرت کا باعث تھی کہ میں اس کے بارے میں اتنا کچھ جانتا تھا۔

" آخر آپ کرنا کیا چاہتے ہیں"؟ اس کی آنکھوں میں اب خوف کی پرچھائیاں واضح ہو چکی تھیں۔

میں نے ایک خوفناک سیاہ ریوالور نکال کر اس میں سائلنسر فٹ کرتے ہوئے کہا۔ " میری ذاتی عدالت انصاف نے تمہیں موت کی سزا سنائی ہے۔"

ریوالور دیکھ کر اس کی آنکھیں ذرا پھیلیں مگر دوسرے ہی لمحے وہ کچھ سنبھل گیا۔ اس نے اپنا خوف چھپانے کی کوشش کی اور تھوک نگل کر بولا۔ " چوہدری صاحب! بے شک آپ دولت مند آدمی ہیں۔ ممکن ہے آپ کے ہاتھ بھی لمبے ہوں۔ لیکن آپ کو اتنا احساس تو ضرور ہونا چاہئے کہ میں کوئی گھسیارا نتھو خیرا نہیں ہوں۔ میں انڈسٹری کا ایک اہم آدمی ہوں۔ میرا ایک نام ہے۔ مجھے قتل کر کے آپ کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جائیں گی۔ آپ بچ نہیں سکیں گے۔"

میں مسکرا دیا۔ ریوالور سیدھا کرتے ہوئے میں نے کہا۔ "دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے۔ تمہیں اس قسم کی باتیں کرنے کا حق حاصل ہے کیونکہ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ تم میرے لئے کسی گھسیارے یا نتھو خیرے سے بھی کم اہم ہو۔"

اس نے یہ حربہ بھی ناکام ہوتے دیکھا تو اپنی دانست میں انتہائی پھرتی سے کام لیتے ہوئے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا اور چھوٹا سا ایک پستول نکالیا۔ میں چاہتا تو پستول اس کے ہاتھ میں آنے تک اس کا جسم گولیوں سے چھلنی کر سکتا تھا لیکن میں نے اسے یہ ارمان نکالنے کا موقع دیا..... اس کا خیال تھا کہ شاید میں اس کی طرف سے غافل ہو گیا ہوں یا پھر میں اس جتنی پھرتی کا مظاہرہ نہیں کر سکا۔

پستول ہاتھ میں آتے ہی اس نے بدحواسی میں اندھا دھند ٹریگر دبانا شروع کر دیا۔ اگر پستول میں واقعی میگزین موجود ہوتا تب بھی آدمی سے زیادہ گولیاں تو ضائع ہی ہوتیں لیکن افسوس کے میگزین پستول میں نہیں تھا۔ میگزین میری جیب میں تھا۔ اسے جگانے سے پہلے میں نے احتیاطاً تکیے کے نیچے ہاتھ مار کر دیکھ لیا تھا۔ میرے اندیشے کے عین مطابق وہاں پستول موجود تھا۔ میں نے پستول غائب کرنے کے بجائے صرف اس کا میگزین نکال لینا ہی کافی سمجھا تھا۔

وہ کئی بار ٹریگر دبا چکا تب اسے احساس ہوا کہ اس میں سے گولیاں نہیں' صرف کلک کلک کی آوازیں برآمد ہو رہی ہیں۔ اس کی حالت عجیب ہو گئی۔ وہ کبھی پستول کی طرف دیکھتا اور کبھی میری طرف۔ اس کے تاثرات دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔

اس نے وحشت زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں اس کا ارادہ پڑھ لیا اور یک لخت ریوالور سیدھا کرتے ہوئے' بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اٹھ کر بھاگنے کی کوشش مت کرنا۔ زندگی مزید چند منٹ کم ہو جائے گی۔ ویسے بھی انسان موت سے کہاں بھاگ سکتا ہے؟ مجھے ابھی تم سے چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری موت کے ٹل جانے کی کوئی صورت نکل ہی آئے۔"

اس نے اٹھ کر بھاگنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ چہرے پر امید کی ایک لہری بھی آگئی۔ اس بار اس نے تھوک نگلا تو باقاعدہ (غڑچ) کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ وہ مرتعش آواز میں بولا۔ "چوہدری صاحب! آپ دولت مند آدمی ہیں... روپیہ پیسہ آپ کا مسئلہ تو نہیں ہے... لیکن پھر بھی...... روپے پیسے کی اہمیت تو کسی کے لئے بھی ختم نہیں ہوتی.... اگر اس طرح معاملہ رفع دفع ہو سکتا ہے تو میں اس کے لئے تیار ہوں.... میرا مطلب ہے کوئی جرمانہ...... تاوان وغیرہ...... میں خاصی بڑی رقم آپ کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں...." اس نے پر امید نظروں سے میری طرف دیکھا۔

" مثلاً کتنی بڑی؟" میں نے اپنے لہجے سے دلچسپی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

" پانچ لاکھ۔" اس نے بلا تامل کہا۔

" دولت عجیب چیز ہے اور انسان عجیب تر۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ " سجاد نسیم ایک غریب آدمی ہے۔ اس کی بیٹی گھر بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہے۔ اس شخص کی وجہ سے تم نے لاکھوں روپے' عزت اور شہرت کمائی ہے۔ اس نے تم سے ایک لاکھ روپیہ مانگا تھا تو تم نے نہیں دیا۔ مجھے تم یکدم پانچ لاکھ روپے دینے کے لئے تیار ہو گئے ہو حالانکہ میں ضرورت مند نہیں ہوں۔ میں پہلے ہی بقول تمہارے دولت مند ہوں۔ اور میں نے زندگی میں کبھی تمہیں کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچایا۔ ہے نا عجیب بات؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

" فلسفہ چھوڑیں چوہدری صاحب! کام کی بات کریں۔" وہ منمنانہ لہجے میں بولا۔ " پانچ لاکھ کم ہیں تو میں سات لاکھ دے سکتا

ہوں۔" اس نے یک دم دو لاکھ بڑھا دیئے حالانکہ اس زمانے میں پانچ لاکھ بھی بہت بڑی رقم تھی۔

"میں تمہیں اس سے کہیں سستا چھوڑ سکتا ہوں" میں نے کہا "میرا پہلا مطالبہ صرف سچ کا ہے۔ سب سے پہلے تم مجھے سچ سچ بتا دو کہ تم نے سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں نشاط کو مارا کیسے تھا؟"

اس نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر غالباً اسی نتیجے پر پہنچا کہ بات تو اب کھل ہی چکی ہے' مجھے سب کچھ معلوم ہے اور وہ خود بھی بہ زبان خموشی اپنا جرم تسلیم کرچکا ہے اس لئے یہ ایک نکتہ بیان کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

وہ سر جھکا کر قدرے شرمندگی ظاہر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "میں اسے ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ سب کچھ بالکل غیر ارادی طور پر اور اچانک ہوگیا۔ میں سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں اتفاق سے سب سے پہلے پہنچ گیا تھا۔ سعید صاحب نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور تواضع کے لئے میرے سامنے کچھ چیزیں رکھوا کر خود ادھر ادھر کہیں مصروف ہوگئے۔ سعید صاحب کے ڈرائنگ روم سے گیٹ ایک کھڑکی کے راستے نظر آتا ہے۔ اچانک میں نے بے بی کو...... میرا مطلب ہے نشاط کو اندر آتے دیکھا اور میں اچھل پڑا۔ مجھے معلوم تھا وہ بہت خاص خاص لوگوں کی پارٹی تھی۔ نشاط وہاں مدعو نہیں ہوسکتی تھی مگر اس کے ہاتھ میں آدھا پھٹا ہوا کارڈ نظر آرہا تھا۔ آدھا چوکیدار نے باہر ہی رکھ لیا تھا۔ یقین تھا کہ وہ کسی اور کے کارڈ پر آئی ہوگی۔ اس پارٹی کا کارڈ از کم کسی ایکسٹرا گرل کو جاری نہیں کیا جاسکتا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اتنا تردد کرکے آئی ہے تو کسی خاص وجہ سے آئی ہے اور اس مقصد کا تعلق میرے سوا کسی سے نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ اندر آکر ڈرائنگ روم کی دیوار کے قریب کھڑی ہو کر نظروں سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ سعید صاحب کا گھر میرا اچھی طرح دیکھا ہوا ہے۔ میں جلدی سے ڈرائنگ روم سے نکل کر کسی کی نظر میں آئے بغیر بغلی راستے سے اسے باغ میں لے آیا۔ سعید صاحب کا باغ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کتنا بڑا ہے۔

سوئمنگ پول کے قریب جہاں مصنوعی آبشار سا بنا ہوا ہے وہاں کھڑے ہو کر میں اسے ڈانٹنے لگا کہ وہ وہاں کیوں آئی تھی۔ بہت ضدی لڑکی تھی۔ اس وقت مجھ سے بھی زیادہ غصے میں تھی۔ اسے میرے کہانیوں والے چکر کا بھی پتا چل چکا تھا۔ ہونے والے بچے کے تصور سے بھی پریشان تھی۔ اسے معلوم ہوچکا تھا کہ رات پارٹی میں سوسائٹی اور فلمی صنعت کے بہت بڑے بڑے لوگ جمع ہو رہے تھے۔ وہ پکا ارادہ کرکے آئی تھی کہ ان سب کے سامنے وہ ہر بات کھول کر رکھ دے گی۔ وہ میرے جھوٹے وعدوں سے تنگ آچکی تھی کہ اس وقت میں اس کی ہر بات ماننے کے لئے

یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھی۔

...اس پر اس وقت کوئی نہیں تھا اور اس دور افتادہ گوشے سے ...ان پر ...اری بحث و تمحیص کی آوازیں نہیں سن سکا تھا۔ اسے اندازہ ...تھا کہ وہ کیسے خطرناک موڑ پر کھڑی تھی۔ ناچار میں نے ...ن کی ایک ڈوری اٹھائی اور اس کا کام تمام کردیا۔ میرے ...میں اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ پودوں کو باندھنے کے ...ہاں نائیلون کی اور بھی کئی ڈوریاں پڑی تھیں۔ میں نے ...آبشار سے ایک بھاری پتھر اٹھایا اور اس کی لاش کے ساتھ ...ر سوئمنگ پول میں پھینک دیا۔ میرا خیال تھا کہ لاش بعد میں ...ہوگی اور سعید صاحب خود ہی بھگتتے پھریں گے۔ مجھے نہیں ...تھا کہ پارٹی میں سعید صاحب ترنگ میں آکر تیراکی کے ...کا بھی اعلان کردیں گے ... اور ...... اور مجھے یہ بھی نہیں ...تھا کہ نشاط کی مٹھی میں کوئی کاغذ دبا رہ گیا ہے جس پر ...کے نام مدد کی درخواست تحریر ہے۔" وہ شرمندہ سے انداز میں ...ہوگیا۔

"اصل میں تمہیں بہت سی باتیں معلوم نہیں تھیں۔" میں ...

"تمہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ قدرت کی نہیں آنکھ بھی ...سب دیکھ رہی ہوتی ہے۔"

"اب تلافی کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟" اس نے رحم طلب ...سے میری طرف دیکھا۔

"دیکھو..." میرا لہجہ دوستانہ ہوگیا۔ ریوالور بھی میں نے ...۔ میرا تمہیں ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں جب ...آیا تو تم بے خبر سو رہے تھے۔ اگر تمہیں ہلاک کرنا ہی میرا ...ہوتا تو اسی وقت خاموشی سے گولی مار کر واپس جا سکتا تھا۔ ...ل دکھا کر کسی کو ہلاک کرنے کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں ...

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ دلیل اس کے دل کو لگی تھی۔ ...بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن میرا مقصد محض تمہارا ...سا خون خشک کرنا بھی نہیں تھا۔ میں اصل میں تمہاری ...چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ آئندہ تمہارے ہاتھوں کوئی ...نشاط جیسے انجام کو پہنچے۔ تمہیں ہلاک کرنے سے تو نشاط کو ...یا اس کے باپ کو کھوئی ہوئی عزت واپس نہیں مل جائے گی۔ ...مجھے ایک گارنٹی لکھ کر دے دو تو میں تمہیں کم از کم اس وقت ...معاف کرنے کے لئے تیار ہوں جب تک تم دوبارہ کوئی ایسی ...غلطی نہ کرو۔"

"میں آپ کو ہر طرح کا وعدہ لکھ کر دینے کے لئے تیار ہوں" ...سے بولا۔

"ٹھیک۔ گارنٹی میرے اپنے انداز کی ہوگی" میں نے کہا۔ "تم ...وضاحت سے لکھو گے کہ سجاد نسیم سے کس طرح کہانیاں لیتے ...کس طرح تم نے نشاط کو دھوکے دیئے اور اسے ہلاک کیا۔ پھر تم لکھو گے کہ ضمیر کی خلش اب تمہیں ایک پل کے لئے بھی چین سے نہیں رہنے دیتی اس لئے تم خودکشی کررہے ہو۔ میرا وعدہ ہے کہ یہ تحریر میرے پاس محفوظ رہے گی۔ اس کی صرف دو شرائط ہوں گی۔ ایک تو تم سجاد نسیم کو آئندہ ہر کہانی سے ملنے والے معاوضے میں سے آدھا دیا کرو گے اور مصنف کے طور پر اپنے ساتھ اس کا نام بھی دیا کرو گے۔ کہانی بے شک پوری وہی لکھتا رہے گا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تم کسی لڑکی کے ساتھ نشاط والا چکر نہیں چلاؤ گے۔ اگر کوئی تمہیں پسند آہی جاتی ہے تو سیدھی طرح اس سے شادی کرو' گھر بساؤ اور شریف آدمی کی طرح زندگی گزارو۔ عیاشی ہی کرنی ہے تو اس کے لئے آوارہ' نیم آوارہ عورتیں بہت ہیں۔ کسی معصوم لڑکی کو جھوٹے وعدوں کے سہارے مت لوٹنا۔ جس دن بھی تمہارا اس قسم کا کوئی اسکینڈل میرے علم میں آیا' اس دن تمہاری وہ تحریر میرے کام آئے گی اور میں سچ مچ تمہیں "خودکشی" کرا دوں گا۔"

"مجھے منظور ہے۔" وہ کچھ سوچ کر بولا۔

"بس تو پھر شروع ہو جاؤ۔" میں نے ریوالور سے اشارہ کیا۔

اس نے سائیڈ ٹیبل سے رائٹنگ پیڈ اور قلم نکالا اور تکیے سے ٹیک لگا کر لکھنے لگا۔ چند سطریں لکھ کر اس نے کاغذ پھاڑ دیا اور بے بسی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "مجھ سے لکھا نہیں جارہا۔ سمجھ میں نہیں آرہا کیسے لکھوں۔ کوئی ربط ہی نہیں بن رہا۔"

"شرم کرو۔" میں نے ملامت سے کہا "تم فلم انڈسٹری کے سب سے بڑے مصنف ہو' تمہاری تحریر کی بڑی دھوم ہے۔"

اس کے چہرے پر ہلکی سی خجالت کے آثار نمودار ہوئے لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ اداکاری کررہا تھا۔ وہ کسی بات پر شرمندہ ہونا نہیں جانتا تھا۔ اس دنیا میں بعض لوگ اپنی حد سے زیادہ ڈھٹائی' بے ضمیری اور بے حمیتی کی وجہ سے بھی بہت زیادہ کامیاب ہوجاتے ہیں لیکن عموماً ان کا انجام اچھا نہیں ہوتا۔

میں نے اس کا پھاڑ کر پھینکا ہوا کاغذ بھی اٹھا لیا تھا اور اس کے ٹکڑوں پر احتیاطاً نظر دوڑالی تھی کہ اس نے میری ہدایت کے خلاف تو کوئی بات نہیں لکھ ڈالی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس سے چند بے ربط الفاظ کے سوا کچھ لکھا ہی نہیں گیا تھا۔ میں نے کہا "لکھو...... میں لکھواتا ہوں۔"

میں نے لکھوانا شروع کیا اور وہ سعادت مندی سے لکھتا چلا گیا۔ خط مکمل کرکے وہ حیرت سے کبھی خط کی طرف اور کبھی میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ نے تو اچھا بھلا رائٹروں جیسا خط لکھوا دیا۔"

"کیا کریں' جب تم جیسے لوگ رائٹر ہوتے ہوئے چار جملے ڈھنگ سے نہ لکھ سکیں تو پھر مجھ جیسے بدذوق اور کم پڑھے لکھے لوگوں کو اس قسم کی خدمات انجام دینی پڑتی ہیں۔" میں نے کہا اور ہاتھ بڑھا کر خط اس سے لے لیا۔ اس پر اس کے دستخط موجود تھے۔ مجھے

امید نہیں تھی کہ اتنا عیار آدمی اتنی آسانی سے میرے چکر میں آجائے گا۔

میں نے خط حفاظت سے تہ کرکے جیب میں رکھ لیا۔ اس دوران میں نے ریوالور بھی گود میں رکھ لیا تھا لیکن اس نے کوئی چالاکی دکھانے یا مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی۔ آدمی بہرحال عقل مند تھا۔ اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ اس قسم کی کسی کوشش سے بنی بنائی بات بگڑ سکتی ہے۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ اس کی بات تو بگڑ ہی چکی تھی۔

میں نے حلق سے ایک مخصوص آواز نکالی۔ دوسرے ہی لمحے شبیر اور ٹونی بے آواز طریقے سے دروازہ کھول کر دو پُراسرار سایوں کی طرح اندر آگئے۔ ٹونی کے ہاتھ میں پرانی رسی کا ایک لچھا تھا۔ اس نے کمرے میں آتے ہی بولٹ چڑھا دیا اور رسی کا پھندا تیار کرنے لگا۔ شبیر نے بیڈ پر چڑھ کر نصیر نواز کے دونوں ہاتھ پشت پر لے جاکر اسے اس طرح قابو میں کرلیا کہ وہ اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کرسکتا تھا۔

یہ سب کچھ گویا چشم زدن میں ہوگیا۔ نصیر کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہو رہا ہے اور جب اس کی سمجھ میں آیا تب تک وہ بے بس ہوچکا تھا۔ ٹونی نے اس وقت تک پھندا تیار کرکے پنکھے کے کنڈے میں لٹکا دیا تھا اور ڈریسنگ ٹیبل کا اسٹول بیڈ کے قریب عین پھندے کے نیچے رکھ رہا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے چوہدری صاحب؟" نصیر نواز چیخا۔

"اپنا چیخنے کا شوق بھی پورا کرلو میری جان!" میں نے ملائمت سے کہا "میں دیکھ چکا ہوں کہ کمرا ائرکنڈیشنڈ اور ساؤنڈ پروف ہے۔ شاید تم نے احتیاطاً اسے ساؤنڈ پروف بنوایا ہوگا۔ شاید یہاں تمہارے جال میں پھنسنے والی وہ ایسی لڑکیاں بھی آئی ہوں گی جنہوں نے تمہاری خواہشات کی بھینٹ چڑھتے وقت تھوڑی بہت چوں چاں کی ہوگی مگر ان کی آواز اس کمرے سے باہر نہیں جاسکی ہوگی۔ تمہاری آواز بھی نہیں جاسکے گی۔ چلی بھی جاتی تو ہم جیسے لوگوں کے لئے کوئی خاص فرق نہ پڑتا۔"

وہ خاصے تن و توش کا آدمی تھا لیکن شبیر نے اسے بچوں کی طرح اچھال کر بیڈ پر کھڑا کیا پھر اسٹول پر لا ٹکایا۔ ٹونی نے اس وقت اسٹول پکڑا ہوا تھا۔ نصیر نواز کا چہرہ دہشت سے پیلا پڑ چکا تھا۔ میں نے یک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے نشاط کے گلے میں نائیلون کی ڈوری کا پھندا ڈال کر اسے ہلاک کیا تھا۔ تمہیں اس سے ملتی جلتی موت کو سامنے دیکھ کر خوف زدہ نہیں ہونا چاہئے۔"

"لیکن میں نے تو آپ کی ہر شرط مان لی تھی چوہدری صاحب! آپ نے وعدہ کیا تھا۔" وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔

"تم جیسے لوگوں کے منہ سے لفظ وعدہ اچھا نہیں لگتا۔ اس لئے تمہارے سامنے آکر میں بھی بھول گیا ہوں کہ اس کے معنی کیا ہوتے ہیں۔ اچھا خدا حافظ۔"

ٹونی نے پھندا اس کے گلے میں ڈال دیا اور اسٹول پیروں تلے سے نکال دیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ہی لمحوں میں آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ جب تک ڈھیلا نہیں پڑ گیا، شبیر نے عقب سے اس کے ہاتھ نہیں اس نے ہاتھ چھوڑ دیئے تو نصیر کے جسم کو دو چار ... پھر وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں رسی میں جھولنے لگا۔ ... کسی حد تک مسخ سی ہوکر رہ گئی تھی۔ میں نے اس کا ... ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا جس میں اس نے اپنے دو جرائم ... کرتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ ضمیر کی اذیت سے تنگ آکر ... ہے۔

میں نے ٹونی کو اشارہ کیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہمارا ... وحید اور اس کے بیٹے کو اپنی گاڑی میں ساتھ لئے وہاں ... ہی دور ایک مارکیٹ کے سامنے موجود تھا۔ میرے اشارہ ... یہ تھا کہ اسے ریڈیو پر پیغام دے دیا جائے تاکہ وہ سیٹھ ... کو یہاں آجائے۔ ہمارا وہ آدمی پیغام ہی کا منتظر تھا۔ ٹونی ... کے ریڈیو کے ذریعے پیغام دے کر چند لمحوں میں ہی واپس ...

اس کے تھوڑی دیر بعد ہی دروازے پر دستک ہوئی ... خود آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور سیٹھ وحید اپنے بیٹے کا ... اندر آگیا۔ سامنے ہی چھت کے کنڈے میں رسی سے ... کرو ہی نہیں، اس کا جذباتی اور جوشیلا بیٹا بھی خوفزدہ سا ...

"وحید صاحب! یہ ہے رخشندہ کا قاتل۔" میں ... طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور مجھے خود بھی عجیب ... ہوا۔ میرا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں کسی پارٹی میں ... شخصیت سے سیٹھ وحید کا تعارف کرا رہا ہوں۔ ان کی ... اصل نام رخشندہ تھا۔ نشاط اس نے اپنا فلمی نام ... اسٹوڈیوز میں مشہور وہ بے بی کے نام سے ہوگئی تھی ... لڑکی کے نام تو تین تھے مگر فانی دنیا میں وہ تین میں ... تھی ...

"آپ نے اسے تلاش بھی کرلیا اور اس کے انجا... دیا؟" سیٹھ وحید کی آنکھوں میں حیرت تھی۔ وہ کبھی لاش ... دیکھتا اور کبھی میری طرف۔ لاش کی گردن کچھ لمبی ہوگئی ...

"ایسی باتیں نہیں کرتے وحید صاحب!" میں ... ہوئے کہا "انسان خود اپنے اعمال کے ہاتھوں انجام تک ... اس بے چارے نے تو ضمیر کی خلش سے مجبور ہو ... ہے۔" میں نے نصیر نواز کا نامہ خودکشی اٹھا کر سیٹھ و... بڑھا دیا۔

اس نے بڑی توجہ سے خط پڑھا۔ اس کا بیٹا بھی ... گردن آگے کئے خط پر ہی جھکا رہا۔ کمرے میں گہرا ... اور لاش بدستور کمرے کے وسط میں جھول رہی تھی ...

سیٹھ وحید نے خط پڑھ کر واپس ڈریسنگ ٹیبل ... لمحے ہم سب نیم دائرے میں لاش کے گرد کھڑے رہے اور اس کے مسخ شدہ سے چہرے کو دیکھتے رہے۔ پھر میں نے سب کو باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیو وے میں پہنچ کر سیٹھ وحید یکدم رک کر میرا ہاتھ تھام کر والہانہ انداز میں چومتے ہوئے بولا "میں آپ کو مان گیا چوہدری صاحب! آپ ہر لحاظ سے بہت بڑے آدمی ہیں۔ میرا آپ پر جان قربان کرنے کو جی چاہتا ہے۔ آپ مجھے کبھی خدمت کا موقع ضرور دیجئے گا۔"

"ضرور، ضرور۔ میں آپ کے جذبات کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں۔" میں نے مربیانہ انداز میں اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

"میں اے ایس آئی شریف سیال کو معقول انعام دوں گا جس نے درحقیقت آپ سے تعارف کرایا۔" وہ بولا۔

"جیسے آپ کی مرضی۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "ویسے وہ بے چارہ واقعی انعام کا مستحق ہے۔ میرا بھی یونہی بلاوجہ اسے کچھ نوازنے کو دل چاہتا ہے۔ میں اس کے انداز و اطوار دیکھ کر اس کی باتیں سن کر بہت محظوظ ہوتا ہوں۔ پولیس میں ہے مگر شریف آدمی ہے۔"

"پولیس میں شرفا کی بھی بہت بڑی تعداد موجود ہے۔ مجھے تو اکثر شریف آفیسرز سے ہی پالا پڑا ہے۔" وہ بولا۔

"میں آپ کو خوش قسمت ہی کہوں گا۔ گوکہ اس سلسلے میں تجربہ میرا بھی کچھ ایسا برا نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر ہم وہاں سے رخصت ہولئے۔ سب گویا اپنا اپنا ضروری کام انجام دے کر مطمئن و مسرور واپس جارہے تھے۔

واپسی میں میں نے اپنی گاڑی انٹرکان کے عقب میں واقع کچی بستی کی طرف موڑلی۔ گاڑی ایک جگہ چھوڑ کر کچھ فاصلہ پیدل طے کرکے میں ایک گھر کے دروازے پر پہنچا۔ وہ سجاد نسیم کا گھر تھا جس کے کام سے نصیر نواز کا نام برسوں چمکا تھا۔ میری دستک کے جواب میں دروازہ تھوڑا سا کھلا اور انہی دو اداس آنکھوں نے باہر جھانکا جن میں بلا کی کشش تھی۔ ان آنکھوں میں اب ستارے جھلملا اٹھے تھے مگر اداسی کا رنگ پھر بھی اپنی جگہ برقرار تھا۔ یہ اداسی ان آنکھوں کا ایک حصہ تھی۔ اور یہی ان آنکھوں کا حسن بھی تھی۔ بعض آنکھوں میں اداسی اسی طرح بھلی لگتی ہے جس طرح اونچی چھتوں والی پرانی، عظیم اور پرشکوہ عمارتوں کے طاقوں میں رکھے ہوئے دھیمے دھیمے جھلملاتے ہوئے چراغ۔

مجھے دیکھ کر اس کی پلکوں کی جھالریں گر گئیں اور گھر کا دروازہ کھل گیا۔ رخساروں پر شفق اتر آئی۔ اس نے ایک طرف ہٹ کر مجھے راستہ دیا۔ ان کی بیٹھک میں جانے کے لئے صحن میں ہی داخل ہوکر الٹے ہاتھ مڑنا پڑتا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اشارے سے مجھے سلام کیا۔ ہونٹ لرزے مگر آواز برآمد نہ ہوئی۔ وہ شاید سلام کے علاوہ بھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر کہہ نہ سکی۔ شاید شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی۔ شاید اسے معلوم ہوگیا تھا کہ اس کی شادی کے لئے میں نے اس کے باپ کو سوا لاکھ روپیہ دیا تھا۔ اچھا ہی ہوا اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ میں اس کے منہ سے شکریے کا کوئی لفظ سننا بھی نہیں چاہتا تھا۔

وہ واقعی ایک حد درجہ شریف اور شرمیلی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کے رخساروں پر شفق اتر آئی تھی۔ اندر قدم رکھنے سے پہلے میں نے پوچھ لینا بہتر سمجھا "سجاد نسیم صاحب گھر پر موجود ہیں؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور پھنسی پھنسی سی آواز میں بمشکل بول پائی "آپ بیٹھئے۔۔۔ میں ابھی انہیں بھیجتی ہوں۔" اس نے بیٹھک کی طرف اشارہ کیا۔

صحن سے گزرتے وقت میں نے دیکھا، وہاں چارپائیوں پر رنگ برنگے اور زرق برق جوڑے پھیلے ہوئے تھے۔ وہ شاید اس وقت جوڑوں پر کچھ ٹانک رہی تھی جب میں نے دستک دی۔ بے چاری اکیلی خود ہی اپنا جہیز تیار کر رہی تھی۔ وہ ایک اچھی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ اسے ایک خوشگوار ازدواجی زندگی دیکھنا نصیب ہو۔

میں بیٹھک میں جاکر بیٹھا ہی تھا کہ سجاد نسیم گویا ہانپتا کانپتا سا وہاں پہنچا اور مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے تقریباً دُہرا ہوگیا۔ انتہائی ممنونیت سے وہ بولا "آپ خود کیوں زحمت کرتے ہیں چوہدری صاحب! کسی ملازم کو بھیج کر مجھے بلوالیا کریں۔ میں حاضر ہوجایا کروں گا۔۔۔ فون میرے ہاں ہے نہیں، ورنہ آپ فون کرکے مجھے طلب فرماسکتے تھے۔ اب آپ خود تشریف لائے ہیں۔ کتنی بڑی زحمت کی ہے آپ نے!" وہ یوں ہاتھ ملنے لگا گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ میری مدارت کے لئے کیا کرے۔

"ان باتوں کو چھوڑیئے سجاد صاحب!" میں نے ملائمت سے کہا "میں آپ کو ایک ضروری اطلاع دینے آیا تھا۔ نصیر نواز نے خودکشی کرلی ہے۔۔۔"

میں اپنی بات جلد سے جلد کہہ کر وہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن سجاد تو اتنا ہی سن کر سناٹے میں آگیا۔ اس کے چہرے پر دہشت زدگی کے سے آثار نمایاں ہوگئے اور وہ یوں دھم سے ایک کرسی پر ڈھیر ہوگیا جیسے اس کی ٹانگوں کی جان نکل گئی ہو۔ اس لئے مجھے مزید کچھ کہنے کے لئے توقف کرنا پڑا۔

"اخبار میں تو نہیں آئی یہ خبر۔ خاصی بڑی اور اہم شخصیت تھا وہ۔۔۔" آخرکار سجاد کے حلق سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی۔

"اخبار میں تو کل یا پرسوں آئے گی یہ خبر" میں نے کہا "میں تو آپ کو اس سے پہلے خبردار کرنے آیا ہوں کہ اب آپ فلم انڈسٹری میں اس کی جگہ لینے کے لئے تیار رہیں۔"

"کیا مطلب؟" وہ کچھ اور چونکا۔

"مطلب یہ کہ پولیس کو اس کی لاش کے قریب اس کا آخری خط بھی ملے گا جس میں اس کا یہ اعتراف بھی شامل ہو گا کہ وہ کس طرح آپ سے کہانیاں لے کر آپ کا استحصال کرتا رہا۔"

سجاد قیم نے ایک بار پھر خوف زدہ لہجے میں میری بات کاٹ دی "کہیں پولیس مجھ پر تو اس کی موت کے سلسلے میں کوئی شبہ نہیں کرے گی؟"

"ایسا بھلا کیوں ہونے لگا؟" میں نے تیزی سے کہا "اس کی اپنی تحریر میں اس کے دستخط کے ساتھ اعتراف نامہ موجود ہو گا کہ وہ خودکشی کر رہا ہے۔ آپ پر بھلا کوئی کیوں شبہ کرنے لگا؟ آپ تو بہت ہی ڈرپوک نکلے ہیں سجاد صاحب!"

"غریب اور کچلا ہوا آدمی عام طور پر ڈرپوک ہی ہوتا ہے چوہدری صاحب!" وہ بے چارگی سے بولا۔

"اپنے اندیشوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیجئے۔ آپ کا خوف بالکل بے جا ہے۔ اگر کوئی بات ہو بھی تو بھلا میں کس لئے بیٹھا ہوں؟"

"اوہ۔۔۔ معاف کیجئے گا۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا کہ اب مجھے آپ جیسی شخصیت کی سرپرستی حاصل ہے۔" اس نے طمانیت کی گہری سانس لی۔ اس کے چہرے سے یک لخت ہی خوف غائب ہو گیا۔ عجیب ہی آدمی تھا وہ بھی۔

میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا "میں اصل میں آپ کو یہ بتانے آیا تھا کہ جونہی یہ خبر سامنے آئے گی کافی ہلچل مچے گی اور جونہی ہلچل ذرا کم ہو گی فلم انڈسٹری آپ کی تلاش میں دوڑے گی۔ یعنی نصیر نواز کے پس پردہ رہنے والی اصل شخصیت کو تلاش کیا جائے گا۔ ایک تو اس کام کی کوالٹی کی وجہ سے بھی جو آپ اب تک انڈسٹری کو دے چکے ہیں۔ دوسرے اس لئے بھی کہ انڈسٹری میں یک لخت ہی فلمی مصنفوں کے شعبے میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گا جسے فوری طور پر کوئی بھی دوسرا مصنف پر نہیں کر سکے گا۔ یہ کمی آپ کو خود ہی پوری کرنی ہو گی۔ آپ کی اپنی کمی۔ اس کے لئے تیار رہیے گا۔ نصیر نواز نے جن نئی فلموں کے لئے کنٹریکٹ کئے ہوں گے لیکن جن کے لئے آپ نے ابھی اسے کہانی نہیں دی ہو گی۔۔۔ یا جن کہانیوں کے صرف آئیڈیاز سنائے گئے ہوں گے ان سب پر اب تیزی سے کام شروع کر دیجئے۔ مایوسی اور دل گرفتگی کے دور سے نکل آیئے۔ آپ کا جتنا نقصان ہونا تھا ہو چکا۔ اب ایک ہنگامہ خیز مستقبل آپ کا منتظر ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اب آپ ہی نصیر نواز ہوں گے۔"

"کیا واقعی؟" اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں ان گنت بھولے بسرے خواب جاگ اٹھے "مجھے یقین نہیں آ رہا۔ کیا واقعی میں فلمی دنیا کا اسٹار رائٹر ہو جاؤں گا؟"

"بے شک۔ اب آپ کو یقین کر ہی لینا چاہئے۔" میں نے کہا "مجھے اصل میں اسی لئے تو آپ کے پاس احتیاطاً پہلے ہی آنا پڑا کہ لوگ آپ کو تلاش کرتے ہوئے آپ کے پاس پہنچیں اور آپ بوکھلاہٹ میں نہ جانے کیا کہہ دیں۔ عین ممکن ہے کہ آپ انکار ہی کر دیں کہ نہیں صاحب میں تو نصیر نواز کو کہانیاں لکھ کر نہیں دیتا تھا۔"

"ہاں۔ مجھ سے یہ بھی بعید نہیں تھا۔" اس نے تسلیم کیا۔

"یوں آپ اپنی دلدل سے نکلنے کا ایک اور موقع ضائع کر دیتے۔ اور ایسے سنہری مواقع انسان کو بار بار نہیں ملتے۔" میں نے کہا "اب آپ ایسا کیجئے گا کہ نصیر نواز کی خودکشی کا معاملہ منظر عام پر آتے ہی اسٹوڈیو میں میرے فلم بزنس کے انچارج آفاق احمد سے مل لیجئے گا۔ وہ آپ کے لئے باقاعدہ کسی پریس کانفرنس وغیرہ کا اہتمام کر کے مناسب وقت پر آپ کو پریس کے تمام لوگوں اور پروڈیوسروں، ڈائریکٹروں وغیرہ سے متعارف کرا دے گا اور اس اسکینڈل کا پس منظر بھی جس حد تک مناسب سمجھے گا بتا دے گا۔ اب میں چلتا ہوں۔" میں گھڑی دیکھتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے حضور!" وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا "آپ ہمیں شرف میزبانی بخشے بغیر کیسے جا سکتے ہیں۔۔۔ سارہ چائے وغیرہ تیار کر رہی ہو گی۔ آپ کے شایان شان تو نہیں ہو گی لیکن جس طرح آپ نے پہلے ہمارا مان رکھا تھا اسی طرح پھر عزت افزائی فرما کر ہی جایئے۔" اس کے لہجے میں ہزار التجائیں سمٹ آئیں۔

مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے خوش دلی سے کہا۔ "ایک تو آپ اتنے انکسار سے بھرپور اور تکلف سے بوجھل الفاظ استعمال کرتے ہیں کہ انسان شرمندہ ہو جاتا ہے۔ لیکن تمام تر شرمندگی کے باوجود اس وقت میں رکوں گا نہیں۔ میں آپ کی چائے سے ضرور لطف اندوز ہوتا لیکن میں نے آفس میں کچھ لوگوں کو ملنے کے لئے وقت دیا ہوا ہے۔ ویسے خواہ میں آفس کے لئے کتنا ہی لیٹ ہو جاؤں، کتنے ہی دنوں کے لئے غائب ہو جاؤں لیکن کسی کو وقت دے کر میں ایک منٹ لیٹ ہونا بھی پسند نہیں کرتا۔"

میں اس کے مزید اصرار پر معذرت کرتے ہوئے آخر کار وہاں سے نکل ہی آیا۔ آفس پہنچ کر میں نے دیکھا کہ ہماری آفس بلڈنگ کے نچلے ہال میں ہمارا ایک سپروائزر اور چند کارکن کسی چیز کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے ہیں۔ ذرا قریب جا کر اندازہ ہوا وہ تقریباً چھ فٹ لمبا اور دو ڈھائی فٹ چوڑا پارسل سا تھا۔ اس پر سفید کینوس چڑھا ہوا تھا۔ بڑی عمدگی سے پیک کیا گیا تھا۔

مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ ہماری آفس بلڈنگ میں اتنا بڑا پارسل کہاں سے آ گیا تھا۔ مال وصول کرنے یا ارسال کرنے کے لئے شہر کے دوسرے مقامات پر ہمارے گودام اور ہال وغیرہ موجود تھے جو اس قسم کے کاموں کے لئے مخصوص تھے۔ آفس بلڈنگ میں ایسا کوئی کام نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے یہاں کبھی اس قسم کے پارسل یا کارٹن وغیرہ نظر نہیں آتے تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ سب لوگ مودبانہ انداز میں سلام کر کے اِدھر

وقت کا حساب لینے پر آگیا تو آپ کو لینے کے دینے پڑجائیں گے۔"

"آپ ایک سرکاری آفیسر کو دھمکیاں دے رہے ہیں۔ اس پر بھی آپ کے خلاف مقدمہ درج ہو سکتا ہے۔" وہ بولا۔

"اس قسم کی بچکانہ باتوں کے جواب دینے کے لئے میرے گروپ آف کمپنیز کو وکیلوں کی ایک بہت بڑی سینڈیکیٹ کی خدمات حاصل ہیں جس میں بڑے نامی گرامی وکیل اور ریٹائرڈ جج وغیرہ شامل ہیں۔" میں نے کہا "اس لئے اس بات کو تو ایک طرف اٹھا رکھیں۔ آپ سے میں جو اصل بات کرنا چاہتا تھا وہ یہ ہے انسپکٹر صاحب ۔۔۔! " میں نے ایک گہری سانس لی "کہ آپ سے میری پچھلی ملاقات بھی کچھ زیادہ خوشگوار حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود میں نے آپ کے بارے میں بہت اچھا تاثر لیا تھا۔ میں آپ جیسے دیانتدار اور جرات مند پولیس آفیسوں کا قدردان ہوں۔ لیکن دیانتداری کو دیانتداروں ہی کے خلاف ہتھیار مت بنائیں نعیم صاحب! اگر آپ ایک دیانتدار آدمی ہیں تو میں بھی اصول پرست آدمی ہوں۔"

وہ خاموش تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میری عمر آپ سے زیادہ نہیں ہے انسپکٹر! لیکن تجربات شاید زیادہ ہوں۔ ہماری سوسائٹی بڑی عجیب ہے۔ اس میں آپ کو بہت سے لوگ ملیں گے جو بہت اچھے ہوں گے لیکن آپ کو کسی وجہ سے وہ شکوک و شبہات کی دھند میں لپٹے دکھائی دیں گے۔ کچھ لوگ ہوں گے جو بہت برے ہوں گے لیکن وہ آپ کو کسی بہت اونچے سنگھاسن پر بیٹھے ملیں گے۔ لوگ ان کے ہاتھ چوم رہے ہوں گے، پاؤں چاٹ رہے ہوں گے۔ لیکن اگر آپ ان کا اصل روپ جان لیں تو آپ کو قے آجائے گی اور آپ کا دل چاہے گا کہ ان کی تکا بوٹی کرکے چیل کووں کو کھلا دیں۔ اور یہ آپ کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ لیکن کم از کم ان دونوں قسموں کے انسانوں میں امتیاز کرنا تو سیکھیں۔"

وہ بدستور خاموش تھا۔ میں تیزی سے بولتا چلا گیا "میری بڑی خواہش ہے کہ آپ جیسے آفیسوں کی نوکری لمبی ہو۔ لیکن اگر آپ غلط نمبر کی عینک لگا کر چلیں گے تو قدم قدم پر ٹھوکر کھائیں گے اور آخر کار آپ کا سفر مختصر ہو جائے گا۔ کسی موڑ پر تھک کر بیٹھنا پڑے گا۔ میں اس ملک کے چند بزنس میگنیٹس میں سے ایک ہوں۔ اور اس وقت میرے آفس میں جاپان کی ایک بہت بڑی کمپنی کے نمائندے بیٹھے ہیں۔ میں نے اس بات کا بہت سخت برا منایا ہے کہ ایک پولیس انسپکٹر محض ایک گمنام اطلاع پر بغیر کسی سرچ وارنٹ کے، بغیر یونیفارم کے، اس وقت میرے ہیڈ آفس کی تلاشی لینے کے ارادے سے چلا آیا۔ میں آپ کو صرف قانون کے احترام کے نام پر معاف کر رہا ہوں۔ اور وہ بھی صرف اس لئے کہ آپ ایک کرپٹ آفیسر نہیں ہیں۔ لیکن صرف آپ کے اپنے فائدے کے لئے کہہ رہا ہوں کہ پلیز آئندہ ایسی کوئی حماقت مت کیجئے گا۔"

میں اس بات کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ اس نے نہایت تحمل سے میری تقریر سنی تھی۔ وہ اب بھی خاموش تھا۔ اس نے ریسیور بھی نہیں رکھا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے کہا "آپ سادہ لباس میں تھے۔ اگر مجھے بھی اپنی طرح ایک آدمی سمجھ کر دوستانہ انداز میں آئے ہوتے تو میں محض دل کی تسلی کے لئے آپ کو پوری بلڈنگ کا معائنہ کرا دیتا لیکن اس انداز میں نہیں کہ کسی کو شبہ ہوتا، آپ تلاشی لے رہے ہیں۔ اب میں مروت کے اس مظاہرے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ آپ جا سکتے ہیں۔ خدا حافظ۔"

"سنئے ۔۔۔ سنئے۔" وہ جلدی سے بولا۔ اب اس کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ اس میں افسرانہ تحکم نہیں تھا "میری ملازمت زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ناتجربہ کاری کی وجہ سے مجھ سے کبھی کبھار غلطیاں ہو جاتی ہیں لیکن ان میں میری بدنیتی کا دخل نہیں ہوتا۔ اگر میری آمد ناگوار گزری ہے تو اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں لیکن فرض کر لیجئے، میں دوستانہ انداز میں آیا ہوں اور محض تسلی دینا چاہتا ہوں۔ دل کی تسلی کے لئے مجھے اس عمارت پر نظر ڈال لینے دیجئے۔"

وہ نوجوان تھا لیکن ضرورت پڑنے پر جذباتیت اور جوش سے گریز کرنے کا ہنر اسے خوب آتا تھا۔ وہ ہر حال میں اپنا کام پورا کرکے جانا چاہتا تھا۔ اس نے اب جو انداز اختیار کیا تھا وہ میرے لئے قابل قبول تھا۔ میں نے ایک لمحے سوچا پھر محض
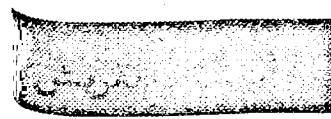
دل رکھنے کے لئے اس کی فرمائش پوری کرنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ نوجوان اور دیانتدار تھا۔ معاشرے کے بارے میں یقیناً کچھ اچھے خواب دیکھتا تھا۔ ان خوابوں کی تعبیر تلاش کرنے کے لئے گو کہ ابھی اسے مناسب راستہ نہیں مل رہا تھا لیکن پھر بھی ۔۔۔ ایسے نوجوانوں کی دل شکنی کرنا مجھے زیادہ پسند نہیں تھا۔

"اگر یہ ایک دوستانہ درخواست ہے تو میں اسے مان لیتا ہوں۔" میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا "محض اس لئے کہ تمہیں احساس ہو جائے، تم اپنے ذہن میں میری جو تصویر تیار کر رہے ہو وہ صحیح نہیں ہے۔ تم میرے دفاتر پر ایک نظر ڈال سکتے ہو لیکن کسی کو قطعاً یہ احساس نہ ہونے پائے کہ تلاشی لے رہے ہو۔ خصوصاً میرے کمرے میں آتے وقت تمہارا رویہ ایسا ہونا چاہئے جیسے کوئی بے حد قریبی دوست ادھر سے گزرتے وقت بس یونہی دعا سلام کرنے آگیا ہے۔"

"آپ مطمئن رہئے۔ آپ کو قطعاً کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ یہ ایک درمیانی راستہ ہے۔ آپ کے ذہن میں بھی کوئی کشیدگی نہیں رہے گی اور میرا ضمیر بھی مطمئن ہو جائے گا۔" وہ اس حل سے بھی مطمئن معلوم ہوتا تھا۔

میں نے ریسیور رکھ دیا اور واپس آکر بات چیت میں مصروف ہو گیا۔ انسپکٹر نعیم کافی دیر بعد میرے کمرے میں آیا۔ اس نے حرف بہ حرف میری ہدایات پر عمل کیا۔ کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکا کہ اس کی آمد کا مقصد کیا تھا۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ کھڑے پیروں واپس چلا گیا۔

خورشید جہاں کی لاش کے بارے میں میری ساتویں حس نے مجھے بروقت ہی خبردار کیا تھا اور اسے دفتر سے روانہ کر دینے کا میرا فیصلہ درست ہی ثابت ہوا تھا۔ گو کہ پارسل کی شکل میں اس کی موجودگی بھی میرے لئے کوئی ایسی خاص الجھن پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں نے اسے روانہ کرنے میں محض اس لئے عجلت کی تھی کہ ایک کاروباری آدمی کے دفتر میں کسی بھی لاش کا پایا جانا اس کے حق میں اچھا نہیں ہوتا۔

کچھ دیر بعد جاپانی پارٹی رخصت ہو گئی۔ ان سے دوسرے روز ہوٹل میں لنچ پر ملاقات کے لئے وقت مقرر ہوا تھا۔ اس ملاقات میں مزید تفصیلات طے ہونا تھیں۔ انہیں رخصت کرکے میں دوبارہ آفس میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ میرے ڈائریکٹ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ یہ ٹیلی فون کیتھرین نہیں ملاتی تھی۔ اس کا اندراج ڈائریکٹری میں بھی نہیں تھا۔ اس کا نمبر چند خاص خاص لوگوں ہی کے پاس تھا۔

میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک شناسا آواز سنائی دی۔ وہی پراسرار اور گونجیلی سی آواز، جس کے بارے میں میں فیصلہ کرنے سے قاصر رہا تھا کہ کسی غیر ملکی کی ہے یا اپنے ہی کسی ہم وطن کی۔ بہرحال اردو وہ بالکل صحیح تلفظ کے ساتھ بولتا تھا۔ نام کی جگہ صرف ریڈ ڈاٹ کے الفاظ استعمال کرتا تھا۔

اس نے مجھ سے تصدیق کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ میں کون بول رہا ہوں۔ بلکہ میرے ریسیور اٹھاتے ہی کہا "ہمارا بھیجا ہوا تحفہ پسند نہیں آیا جو فوراً ہی غائب کر دیا؟"

"مجھے تمہارے ہی فون کا انتظار تھا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "مجھے معلوم تھا کہ کوئی بھی ٹٹ پونجیا حرکت کرنے کے بعد تم شیخی خوروں والے انداز میں فون ضرور کیا کرتے ہو۔"

"کیا کریں، ہم جیسے گھٹیا لوگ جب تک تم جیسے کسی اعلیٰ حضرت سے بات نہ کر لیں، چین سا نہیں آتا۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولا "کہاں بھیج دیا پارسل؟"

"جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں نے اسے غائب کر دیا ہے تو پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کہاں بھیجا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہم نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اسے کہاں بھیجا جائے گا۔ ہم صرف یہ دیکھ رہے تھے کہ انسپکٹر نعیم اسے دریافت کر پاتا ہے یا نہیں۔ اور اسے ہم نے تمہاری بلڈنگ سے خالی جاتے دیکھا۔"

مجھے اس کی بات کا پوری طرح یقین نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے کسی آدمی نے ٹونی اور شبیر وغیرہ کا تعاقب کرنے کی کوشش کی ہو لیکن جب میں ٹونی کو ہدایت کرتا تھا کہ کوئی اس کا تعاقب نہ کرنے پائے تو اس کا تعاقب کرنا موت کا تعاقب کرنے کے مترادف ہی ہوتا تھا۔

"کیا انسپکٹر نعیم تمہارا آدمی ہے؟" میں نے اچانک ہی پوچھا۔

"کاش وہ ہمارا آدمی ہو سکتا۔" وہ آہ بھر کر بولا "کم بخت بالکل بھی بکاؤ نہیں ہے۔ اب ہم کوشش کر رہے ہیں کہ اسے اس کی ایمانداری سمیت ہی تمہاری دم میں پٹاخے کی طرح باندھ دیں تاکہ تم بلبلاتے پھرو، بھاگتے پھرو۔"

"اتنے چھوٹے موٹے پٹاخوں سے میں دوڑتا پھروں گا؟" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا "مجھے دوڑانا ہی ہے تو میری دم میں کوئی بم وغیرہ باندھو۔"

"وہ بھی باندھ دیں گے۔ وقت تو آنے دو۔" اس نے بڑی شفقت سے کہا "ابھی تو تم سے تعارف کے ابتدائی مراحل چل رہے ہیں۔"

"یار ۔۔۔ دیکھو ۔۔۔ میری بات سنو۔" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "تم بہت باتیں کر چکے۔ میں بھی بہت مرعوب ہو چکا۔ کافی سسپنس بھی پیدا ہو چکا۔ اب بتا ہی دو، آخر تم کون ہو؟ یہ ریڈ ڈاٹ کیا ہے؟ تمہارے مقاصد کیا ہیں؟ میرے ساتھ یہ بے مقصد سی چھیڑ چھاڑ جاری رکھنے سے تمہیں کیا حاصل ہو رہا ہے؟ خدا کے لئے کسی سوال کا جواب تو دے دو۔ اب تو مجھ پر جھنجلاہٹ طاری ہونے لگی ہے۔"

"یہی تو ہم چاہتے ہیں۔" وہ بڑے مسرور انداز میں ہنس کر بولا "تم جیسے آدمیوں کو جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنا آسان کام نہیں۔ اور تم جیسے لوگوں کی جھنجلاہٹ ہم جیسے غریبوں مسکینوں کے لئے بڑا قیمتی سرمایہ ہوتی ہے۔"

اس نے ایک بار پھر الجھا ہوا جواب دے کر مجھے ٹالنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے کہا "اچھا تھوڑی سی سہولت کے لئے اتنا ہی بتادو کہ تمہارا نام کیا ہے؟ ریڈ ڈاٹ تو تمہارا نام نہیں ہے نا؟"

"میرا نام ایڈم ہے جسے اردو میں آدم بولا جاتا ہے۔ تم مجھے صرف ایڈی کہہ سکتے ہو۔" اس نے کم از کم میرے ایک سوال کا جواب تو بلا تامل دے دیا۔

"غیر ملکی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں ان لوگوں میں سے ہوں جن کا کوئی ملک نہیں ہوتا۔ اور سب ملک جن کے اپنے ہوتے ہیں۔" وہ روانی سے بولا۔

"اوہ مائی گاڈ ___!" میں کراہ اٹھا "تم نے پھر میرے منہ پر سفہ دے مارا۔ اچھا خیر ___ اصل بات تو بتادو۔ تم نے اس بے چاری بے ضرر سی عورت خورشیدہ جہاں کو کیوں مار ڈالا؟"

"تنگ بہت کر رہی تھی۔ ناقابلِ برداشت ہوگئی تھی۔ ویسے وہ کچھ ایسی بے ضرر بھی نہیں تھی جتنی تم سمجھ رہے ہو۔ خاصی پہنچی ہوئی چیز تھی۔ اسے ہلاک کرنا اس لئے بھی ضروری ہوگیا تھا کہ نائی کی لاش کے جواب میں تمہیں کوئی لاش بھجوانی تو ضروری تھی۔"

"نائی ___؟ تمہارا مطلب ہے وہ گوریلا جس نے جنگل میں مجھ پر اور ستارہ پر فائرنگ کی تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں وہی۔ خاصا کام کا آدمی تھا ہمارے لئے۔ شکر کرو ہم نے اس کے جواب میں تمہیں خاصی ناکارہ سی عورت کی لاش بھجوائی ہے۔ صرف اس لئے کہ تمہارے دل میں ان ماں بیٹی کے لئے بڑا درد پایا جاتا ہے۔ ہم نے سوچا' دیکھیں تم اپنی دوستوں کے لئے کیا کرتے ہو۔" وہ گویا اندازہ کرنا چاہتا تھا کہ مجھے کتنی ذہنی تکلیف ہوئی تھی۔ اور پھر اس احساس سے لطف اندوز ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔

"کیا بنی سے بھی تمہارا اسی قسم کا سلوک کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو نہیں۔ سردست تو وہ بڑے مزے سے روز و شب گزار رہی ہے۔ صرف کبھی کبھی تھوڑی سی اداس ہوجاتی ہے۔ شاید تمہاری یاد میں۔ اس کے علاوہ اسے کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن اس کا دارومدار تمہارے طرزِ عمل پر ہے کہ اسے آئندہ بھی کوئی تکلیف ہوگی یا نہیں۔ اگر نائی کی طرح ___"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم بار بار اس جھاڑ جھنکاڑ اور وحشت ناک قسم کی شخصیت کو نائی کہتے ہو تو مجھے بڑا عجیب محسوس ہوتا ہے۔ کم از کم اب تو تم اسے اس کے اصل نام سے یاد کر سکتے ہو۔ یہ بچگانہ سا نام اس کی شخصیت کے ساتھ کچھ میل نہیں کھاتا۔"

"ناموں میں کیا رکھا ہے۔ نام تو اکثر ہی لوگوں کی شخصیتوں کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتے۔ اب تم اپنے نام کو ہی دیکھ لو۔ تم افضل چوہدری۔ نام سن کر ذہن میں گاؤں کے کسی چھوٹے موٹے زمیندار کا تصور آتا ہے۔ گمان گزرتا ہے کہ شام کو ادھی سی پگڑی باندھ کر اپنی بیٹھک میں بڑی سی چارپائی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتا ہوگا پنڈ والوں کے مسائل سنتا ہوگا' سہلاتے ہوئے اور گو نجدار انداز میں کھانستے ہوئے انہیں تسلیاں دیتا ہوگا اور کسی مزارعے کی ٹانگیں دبواتا ہوگا۔ لیکن تم اس تصور سے کتنے مختلف ہو۔ پہلی بار تم سے ملنے والے کو اچھا خاصا جھٹکا لگتا ہوگا۔"

"ہوسکتا ہے۔ لیکن کم از کم میں نے کسی کو جھٹکا لگتے نہیں دیکھا۔"

"تمہاری کیا بات ہے۔ تمہاری شخصیت میں بے نیازی اور بے پروائی خطرناک حد تک پائی جاتی ہے۔ خیر' میں یہ کہہ رہا تھا اگر آئندہ تمہاری طرف سے ہمارے پاس نائی کی طرح کوئی اور لاش آئی۔ اور ہمارے پاس جواب میں تمہیں بھجوانے کے لئے کسی بیکار سی لاش کا بندوبست نہ ہوسکا تو پھر شاید مجبوراً بنی کو ہی لاش میں تبدیل کرنا پڑے۔ حالانکہ اسے لاش میں تبدیل کرتے وقت ہمیں بہت افسوس ہوگا۔ وہ بہت کام کی چیز ہے۔ بڑے ہنر ہیں اس کے پاس۔ بڑے گن ہیں اس میں۔ اور پھر درحقیقت وہ اس سے زیادہ خوب صورت ہے جتنی باہر سے نظر آتی ہے۔"

"بس ___ اتنی بہت سی بکواس کرنے کے لئے ہی فون کیا تھا؟" میں نے بے زاری سے پوچھا۔

"تم ان باتوں کو بکواس کہتے ہو۔ تمہیں دراصل اندازہ نہیں ہے کہ جب میں تمہیں فون کرتا ہوں تو ہمارے درمیان اہم گفتگو ہوتی ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اس میں کم از کم یہ احساس تو ہوتا ہوگا کہ ہم تمہارے بارے میں کتنے ___ ہیں۔"

"باخبر' بے خبر کا تو مجھے کچھ نہیں معلوم۔ لیکن اتنا ضرور۔ تم میرا وقت بہت ضائع کرتے ہو۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

"شکر کرو کہ ابھی صرف وقت ہی ضائع کرتے ہیں۔ ابھی وقت نہیں آیا کہ تمہیں ضائع کرنے کے بارے میں سوچنے لگیں۔"

"اگر تم مجھے ضائع کرنا نہیں چاہتے تو پھر یہ فائرنگ وغیرہ کس سلسلے میں کراتے ہو؟ ساتھ ہی یہ بھی کہتے ہو کہ اگر میں نے لاش بھجوائی تو جواباً تم بنی کی لاش بھجوادو گے۔ تو کیا تمہارا مطلب یہ ہے کہ آئندہ تمہارا کوئی آدمی مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرے تو میں اسی طرح سعادت مندی سے سر جھکا کر بیٹھ جایا کروں جس طرح لوگ حجام کے سامنے بیٹھتے ہیں؟ بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ ایک ہی وقت میں تم کتنی متضاد قسم کی باتیں کرتے ہو۔"

"آجائے گا ___ آجائے گا ___ رفتہ رفتہ سب سمجھ میں آجائے گا۔" وہ مربیانہ انداز میں بولا۔ پھر اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد بھی کافی دیر تک میں سوچتا رہا۔ اس شخص کے بارے میں' ان حالات کے بارے میں' اس تانے بانے کے بارے میں جو میرے گرد بنا جارہا تھا۔ لیکن ان میں سے کسی کا بھی سر پیر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں کافی دیر انہی خیالات میں الجھا رہا۔

اچانک میرے قریب ہی رکھے ہوئے انٹرکام کے بزر نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے ریسیور اٹھایا۔ نیچے ریسپشن سے ٹونی بول رہا تھا۔ وہ اپنا کام کرکے واپس آگیا تھا۔

"سر! ہم نے عقبی گیٹ سے پارسل لان میں پہنچادیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"بس ٹھیک ہے۔ وہاں کوئی نہ کوئی اسے دریافت کرہی لے گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ گہری سانس لے کر میں چند فائلوں کی طرف متوجہ ہوگیا جو دیر سے میری میز پر رکھی ہوئی تھیں۔

اس کے دو دن بعد کا ذکر ہے' میں گھر سے آفس آنے کی تیاری کر رہا تھا کہ اے ایس آئی شریف سیال ہانپتا کانپتا آن پہنچا۔ وہ ایک بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا لیکن کچھ یوں ایک طرف کو جھکا جارہا تھا جیسے وہ بریف کیس نہیں' سازوسامان سے بھرا ہوا بہت بڑا صندوق ہو۔

چوکیدار نے انٹرکام پر مجھ سے اجازت لے کر اسے اندر بھیجا تھا اور میں نے ڈائننگ روم کی کھڑکی سے اسے ڈرائیووے میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ میں نے اسے ڈائننگ روم میں ہی بلوالیا۔ وہ کچھ بوکھلایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ٹوپی الٹی پہنی ہوئی تھی۔

میں نے اسے ڈائننگ ٹیبل پر ہی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اسی سرے پر بیٹھ گیا جو اس کے زیادہ قریب تھا لیکن پھر میز کی لمبائی نگاہوں سے ناپتے ہوئے بولا "اوہو' میں تو آپ سے کچھ زیادہ ہی دور ہوگیا۔ مجھے کچھ راز کی باتیں کرنی ہیں۔ مجھے تو آپ کے قریب بیٹھنا چاہئے۔"

اس نے بریف کیس بغل میں دبایا اور میرے برابر والی کرسی پر آکر گہری سانس لیتے ہوئے بولا "ایک تو یہ آپ امیر لوگ کھانے کی میزیں بھی اتنی بڑی بڑی بنوا لیتے ہیں کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچنے کے لئے اچھا بھلا سفر طے کرنا پڑتا ہے۔"

"کم از کم ٹوپی تو سیدھی کرلو۔ پولیس والے کے سر پر الٹی ٹوپی اچھی نہیں لگتی۔" میں نے اس کے سر کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا کروں چوہدری صاحب ___!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر ٹوپی سیدھی کرتے ہوئے بولا "ایک کام سیدھا کرتا ہوں تو دوسرا الٹا ہوجاتا ہے۔ دوسرا سیدھا کرتا ہوں تو تیسرا الٹا ہوجاتا ہے۔"

"کیا ہوگیا؟ اتنے بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ___ جی ___ اللہ نے بڑا کرم کیا تھا۔ ایک کیس تو بیٹھے بٹھائے حل ہوگیا تھا۔" وہ ٹوپی اتار کر سر کھجاتے ہوئے بولا "وہی نشاط عرف بے بی والا۔ چوہدری صاحب! آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ بڑے معزز آدمی نے اس کو قتل کیا تھا۔ بڑا مشہور آدمی تھا جی۔ نصیر نواز نام تھا اس کا۔ فلمی اسٹوریاں وغیرہ لکھتا تھا ___"

"اچھا ___؟" میں نے آنکھیں تھوڑی سی پھیلائیں۔ اس موقعے پر تھوڑی سی حیرت ظاہر کرنا مجھے اپنا اخلاقی فریضہ محسوس ہوا تھا۔

"ویسے جی ___ آپس کی بات ہے۔ یہ فلموں میں بھی بڑی کمائی ہے۔ کیا شاندار بنگلا تھا اس نصیر نواز کا۔" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ پھر اس نے چاروں طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے کہا "لیکن خیر' آپ کے بنگلے جیسا شاندار نہیں تھا۔ کافی عرصے سے میری تقرری اُدھر گلبرگ میں ہی ہے۔ بڑے بڑے صاحب لوگوں کی کوٹھیاں دیکھی ہیں۔ لیکن آپ کی کوٹھی جیسی کوٹھی نہیں دیکھی' لگتا ہے آدمی کسی ماڈرن بادشاہ کے محل میں آگیا ہے۔"

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا "چوہدری صاحب! یہ کوٹھی اور بنگلے میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم یار!" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "کوٹھی شاید زیادہ طویل و عریض مکان کو کہتے ہیں ___ یا ہوسکتا ہے کوٹھی' بنگلا ایک ہی چیز کو کہتے ہوں۔ میں نے کبھی اس پر غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ وہ تم نصیر نواز کے بارے میں کچھ بتارہے تھے۔"

"ارے ہاں ___" اس نے جلدی سے ٹوپی ایک بار پھر الٹی سر پر رکھ لی "میں یہ بتارہا تھا کہ اللہ نے بڑا کرم کیا۔ نصیر نواز کو اللہ نے توفیق دی۔ اس کی غیرت جاگی ___ نہیں ___ شاید اس موقعے پر یہ کہنا چاہئے کہ اس کا ضمیر جاگا اور اس نے خودکشی کرلی۔ مجھے زیادہ مغز ماری نہیں کرنی پڑی۔ اس کے نوکروں نے ہمیں اطلاع دی۔ میں موقع پر پہنچا۔ اس کا رقعہ قبضے میں لیا۔ لاش مردہ خانے بھجوائی اور کیس داخلِ دفتر کیا۔ جان چھوٹی۔ لیکن صاحب! پولیس والے کی جان کہاں چھوٹ سکتی ہے ___!" وہ مغموم انداز میں سر جھکا کر ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگیا۔ وہ واقعی سیدھا آدمی تھا۔ جس کام میں اسے محنت نہیں کرنا پڑتی تھی اس کا کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ اس کی جگہ کوئی اور پولیس والا ہوتا تو شاید نصیر نواز کی خودکشی کے ساتھ بھی کوئی اس قسم کی کہانی بنا دیتا کہ اس نے مجرم کے گرد تفتیش کا دائرہ روز بہ روز تنگ کردیا۔ مجرم کو احساس ہوگیا کہ اس کی شخصیت بے نقاب ہو کر رہے گی۔ اس کے سامنے کوئی جائے فرار نہیں رہی تھی' اس لئے آخرکار اس نے خودکشی کرلی ___ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن شریف سیال کے ذہن میں ایسا کوئی خیال

نہیں آیا تھا۔

میں منتظر نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ آخر کار وہ سر اٹھا کر بولا "لیکن میرے لئے دوسرا ملبہ تیار ہے جی۔ پہلے ہی میں کام کے ڈھیر تلے دبا رہتا ہوں۔ اوپر سے افسر لوگ سارے بیکار قسم کے کام میرے اوپر لاد دیتے ہیں۔ وہ جو کچھ دن پہلے میں اور آپ اس فلمی ایکٹرس قسم کی چیز کے گھر گئے تھے ـــــ وہی جس کا نام ہنی تھا۔ آپ کو یاد ہے؟"

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔" میں نے کہا۔ اس دوران خانساماں نے شریف سیال کے سامنے ناشتا لا سجایا تھا۔

"ناشتا تو میں کالو ماچھی کے ہوٹل سے کر کے آیا تھا۔ لیکن خیر ـــــ اب اتنی اچھی اچھی چیزیں دیکھ کر انکار کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔" وہ آستینیں چڑھاتے ہوئے بولا۔

"وہ ـــ تم ہنی کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہنی کے بارے میں کہاں جی ـــ میں تو آپ کو اس کی ماں کے بارے میں بتانے لگا تھا۔" وہ سر جھٹک کر بولا "ہم جب ان کے ہاں پہنچے تو وہ دونوں ماں بیٹی اغوا ہو چکی تھیں نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا۔ "آج میں اس کی ماں کو دفن کرا کے آ رہا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" مجھے ایک بار پھر حیرت زدہ ہونے کی اداکاری کرنی پڑی۔

"پتا نہیں کہاں سے اس کی لاش ٹپک پڑی۔ ایک نوکرانی کو اس کی لاش پیچھے والے لان پر رکھی ہوئی ملی تھی۔ باقاعدہ تابوت میں تھی۔ کسی کو کچھ نہیں معلوم، کہاں سے آئی وہ لاش ـــ کب آئی وہ لاش ـــــ کیوں آئی وہ لاش۔" وہ عمرگی سے ناشتے کا صفایا کرتے ہوئے بولا "افسران کو اس قسم کے کاموں کے لئے میں ہی سب سے اچھا آدمی نظر آتا ہوں۔ ویسے بھی اس کیس کا تفتیشی افسر شروع سے میں ہی ہوں۔ حالاں کہ میرا عہدہ چھوٹا ہے۔ یہ قتل وغیرہ کے کیس میرے کھاتے میں آنے تو نہیں چاہئیں لیکن افسران بھی دیکھ لیتے ہیں کہ کس معاملے میں جان ناری زیادہ ہے، بس اُدھر شریف سیال کو لگا دیتے ہیں۔ اب مجھے معلوم کرنا ہے کہ مساۃ خورشید جہاں کو کس نے مارا اور لاش اس کے گھر کیوں بھجوائی۔"

"پوسٹ مارٹم ہوا تھا لاش کا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جی۔ لاش اگر ہمارے ہاتھ آ جائے پھر کارروائی تو پوری ہوتی ہی ہے۔" وہ فرنچ ٹوسٹ چباتے ہوئے اور ساتھ ہی کافی کا بڑا سا گھونٹ بھر کر تیزی سے نگلنے کے بعد بولا "اپنے میڈیکل افسر کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا۔ اس نے لکھا ہے کہ نشانیاں تو ہارٹ فیل والی ہیں ـــــ اور ہارٹ فیل ہونے کی وجہ کوئی بڑا صدمہ بھی ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس کے دماغ پر فالج گرا ہو۔ اب بتائیں بھلا، یہ بھی کوئی رپورٹ ہے؟ اس قسم کے ڈاکٹروں کی قابلیت دیکھ

کر تو میں سوچتا ہوں کہ میں بھی تھوڑی بہت محنت کر لیتا اور ڈاکٹر بن جاتا تو زیادہ اچھا تھا۔"

"ڈاکٹر یا سرجن نے ٹھیک ہی لکھا ہے۔ بعض کیسوں میں علامت اسی طرح الجھی ہوتی ہیں۔ سر حال ـــ اس عورت پر تشدد کی تو کوئی علامات نہیں پائی گئی؟"

"نہیں۔ ایسا تو کوئی ذکر نہیں ہے رپورٹ میں۔" وہ منہ چلاتے ہوئے بولا "رپورٹ میں دفتر میں ہی فائل میں لگا آیا ہوں ورنہ آپ کو دکھاتا۔"

ناشتا ختم کر کے اس نے ڈکار لی اور ڈکار کے ساتھ ہی وہ یکدم اچھا خاصا اچھل پڑا "واہ چوہدری صاحب! میں بھی بالکل ہی پروفیسر ہوتا جا رہا ہوں۔ یادداشت کا یہ حال ہو گیا ہے کہ جس مسئلے پر آپ سے سب سے پہلے بات کرنی تھی اسے بغل میں ہی دبائے بیٹھا ہوں۔"

وہ اپنا بریف کیس ناشتا کرتے وقت بھی اپنے پہلو میں رکھے بیٹھا تھا۔ اب اس نے اسے میز پر رکھ دیا اور اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ ہے جی اصل مسئلہ جس کے بارے میں میں آپ سے مشورہ کرنے آیا ہوں۔ شکر ہے آپ جیسا بڑا آدمی مجھ جیسے چھوٹے افسر کا دوست بن گیا ہے۔ ورنہ میری تو سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ مشورے کے لئے کس کے پاس جاؤں۔"

"اس میں کیا ہے؟" میں نے بریف کیس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "کوئی بم وغیرہ ہے؟"

"بم ہوتا تو شاید اتنی پریشانی نہ ہوتی چوہدری صاحب!" وہ ایک اور ڈکار لے کر بولا "اس میں بم سے زیادہ خطرناک چیز ہے۔ دنیا کے سارے فساد کی جڑ۔ وہ چیز جس سے بم بھی خریدے جا سکتے ہیں اور بم چلانے والے بھی۔"

"شریف سیال! تم تو اچھے خاصے فلسفی ہوتے جا رہے ہو۔" میں نے مصنوعی تشویش سے کہا "مجھے ڈر ہے، تمہیں پولیس کی نوکری سے نکال نہ دیا جائے۔ تمہارا مطلب ہے اس بریف کیس میں رقم ہے؟"

"ہاں جی۔ پورے دو لاکھ روپے ہیں۔ میں نے تقریباً دو ہزار مرتبہ گنے ہیں۔" اس نے بریف کیس کھول کر میرے سامنے کر دیا۔ اس میں سو سو کے نوٹوں کی گڈیاں سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ ان دنوں ہزار اور پانچ سو کے نوٹ جاری نہیں ہوئے تھے۔ اس لئے سو کا نوٹ اتنا بے وقعت نہیں لگتا تھا اور دو لاکھ روپے خاصی بڑی رقم معلوم ہوتی تھی۔

"کیا پریشانی ہے ـــ اور اس رقم کی کیا کہانی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"واہ چوہدری صاحب! آپ نے تو ردیف قافیے میں بات کر دی۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "کہانی اس کی یہ ہے کہ کل میں تھانے سے نکل کر رکشے کی تلاش میں ٹہلتا ہوا مین مارکیٹ کی طرف جا رہا تھا کہ سائیکل پر ایک کم عمر سا لڑکا آیا اور یہ بریف کیس مجھے دے کر بولا کہ گاڑی میں کوئی دو توی سامنے والے موڑ پر موجود تھے، انہوں نے دیا ہے۔ میں نے اس طرف دیکھا جدھر لڑکے نے اشارہ کیا تھا۔ اُدھر ایک کار تو واقعی موجود تھی لیکن میرے دیکھنے تک وہ تیزی سے ایف سی کالج کی طرف روانہ ہو چکی تھی۔ فاصلہ کافی تھا، میں نہ تو یہ دیکھ سکا کہ کار میں کتنے لوگ تھے یا ان کی شکلیں کیسی تھیں اور نہ ہی کار کا نمبر دیکھ سکا۔ سائیکل والا لڑکا ایک طرف چلا گیا۔ کار دوسری طرف چلی گئی۔ میں بیچ میں ہونقوں کی طرح کھڑا رہ گیا۔"

وہ ابھی تک ہونق ہی معلوم ہو رہا تھا لیکن یہ بات میں نے اس سے نہیں کہی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "بریف کیس کو تالا نہیں لگا ہوا تھا۔ میں نے تھوڑا سا کھول کر دیکھا تو نوٹ بھرے ہوئے نظر آئے۔ قسم سے میرا تو دل بیٹھ گیا چوہدری صاحب! میں نے اپنے آپ سے کہا، لے بھئی شریف سیال! تیرے شاندار کیریئر کا تو خاتمہ ہو گیا۔ آج تو ذلیل کر کے محکمے سے [illegible] جائے گا اور ڈی ایس پی بننے کی حسرت تیرے دل میں ہی رہ جائے گی۔ میں نے تو وہیں کھڑے کھڑے اپنی نوکری کو خدا حافظ کہہ دیا تھا۔"

"کیوں بھئی! اتنی پریشانی کی کیا بات تھی؟" میں نے اس کے انداز سے محظوظ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے جی ـــ سڑک پر کھڑے توی کو کوئی راہ چلتا آدمی یونہی تو بریف کیس میں نوٹ بھر کر نہیں پکڑا جاتا۔" وہ مریانہ لہجے میں بولا "پہلا خیال تو یہی آیا کہ کسی نے مجھے رشوت خوری کے کیس میں پھنسانے کا پکا بندوبست کیا ہے اور بس اب کسی بھی لمحے ایف آئی اے، سی آئی اے، ڈی آئی اے، پی آئی اے اور پتا نہیں کون کون سی آئی اے اور جائی اے قسم کی ایجنسیاں میری گردن ناپنے کے لئے چلی آ رہی ہوں گی۔ اینٹی کرپشن والے تو شاید فوٹوگرافروں کو ساتھ ہی لے کر آئے ہوں گے کہ بریف کیس سمیت میری تصویریں کھینچی جا سکیں۔ قریب ہی ایک گٹر کا منہ کھلا نظر آ رہا تھا۔ میں نے سوچا بریف کیس اس میں پھینک دوں۔ لیکن یہ کم بخت نوٹوں میں بڑی عجیب سی کشش ہوتی ہے۔ خواہ ان کی وجہ سے ہی توی کی جان پر بنی ہو مگر پھر بھی انہیں پھینکنے کو جی نہیں چاہتا۔ چنانچہ میں بھی خوفزدہ خرگوش کی طرح بھاگتا چلا گیا۔ بریف کیس بغل میں ہی دبائے رکھا۔ کل سے اس کو چھپاتا پھر رہا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کیا کروں کیا نہ کروں۔"

میں سمجھ گیا تھا کہ بریف کیس اسے سیٹھ وحید نے بھجوایا تھا لیکن سیٹھ وحید چونکہ اندھیرے میں ہی رہ کر شریف سیال کو نوازنا چاہتا تھا اس لئے میرا اس ضمن میں زبان کھولنا مناسب نہیں تھا۔ شریف سیال نے ایسا کوئی کارنامہ بھی انجام نہیں دیا تھا لیکن سیٹھ وحید بس جتنا فیاض معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ اس کی دلی تمنا پوری ہو گئی تھی۔ اس کی بیٹی کا قاتل کیفرِ کردار کو پہنچ گیا تھا، اس

لئے وہ اس باب میں کسی نہ کسی کو ضرور نوازنا چاہتا تھا۔ مجھ سے تو روپے پیسے کی بات کرنے کا اس میں حوصلہ نہیں پڑ سکتا تھا۔ میں یقیناً اس قسم کی بات کا برا منا جاتا۔ چنانچہ اس نے شریف سیال کو منتخب کرلیا تھا جو اسے مجھ تک پہنچانے کا ذریعہ بنا تھا۔ ممکن ہے قدرت نے ہی یہ شریف سیال جیسے سیدھے آدمی کو نوازنے کا بہانہ بنایا ہو۔ اس غیبی ہاتھ کے کام بڑے عجیب ہوتے ہیں۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا "زندگی میں پہلی بار ایسا پولیس والا دیکھا ہے جو اس لئے پریشان ہے کہ اسے رقم دے دی گئی ہے۔ ورنہ پولیس والوں کو تو عموماً اسی بات پر پریشان دیکھا ہے کہ انہیں رقم کیوں نہیں دی گئی۔"

"چوہدری صاحب! اب آپ سے کیا پردہ۔ بات اوقات کی بھی ہے نا۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولا "بچپن سے جوانی تک میں نے غریبی ہی غریبی دیکھی ہے۔ پولیس کی نوکری میں آنے کے بعد بھی آج تک میں نے کسی کیس میں ہزار پانچ سو سے زیادہ کا معاملہ نہیں کیا۔ یہ ایک دم دو لاکھ روپے دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا یہ کہاں سے ٹپک پڑے۔"

"بھئی، ہوسکتا ہے کسی نے تمہاری کسی بات سے خوش ہو کر تمہیں انعام سے نوازا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن اس طرح گمنام اور پُراسرار طریقے سے؟" اس نے بے یقینی سے سر ہلایا "چوہدری صاحب! آج کل تو کوئی کسی کو دس روپے بھی دیتا ہے تو دس مرتبہ جتا کر دیتا ہے۔ اور پھر میں نے تو ان دنوں کسی کا کوئی خاص کام بھی نہیں کیا۔ کسی کا کوئی مسئلہ حل نہیں کیا۔ سارے شکار تھانے کا دوسرا عملہ ہی مارے جا رہا ہے۔"

"ہوسکتا ہے تم سے لاعلمی میں کوئی ایسا چھوٹا موٹا کام سرزد ہوگیا ہو جو کسی کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہو۔"

"اگر کسی کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کے مفاد کا کام مجھ سے لاعلمی میں سرزد ہوا ہے تو بھلا وہ اتنی بڑی رقم ضائع کرنے کی ضرورت کیوں محسوس کرتا؟ جب مطلب ہی نکل گیا تو ایسی کونسی مجبوری رہ گئی؟ مطلب نکل جانے کے بعد تو آج کل بھائی بھائی کو نہیں پوچھتا۔ اولاد ماں باپ کو نہیں پوچھتی۔ آپ دیکھتے نہیں ہیں کہ بڑے بھائی نے چھوٹے بھائی کو یا ماں باپ نے بیٹے کو خون پسینہ ایک کرکے پالا پوسا لیکن شادی ہوتے ہی وہ انہیں لات مار کر اس وقت الگ جاکر رہنے لگا جب انہیں سہارے کی ضرورت پڑی۔ مطلب نکل گیا نا اس لئے۔"

شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اور شاید اس کے پیچھے اس کا اپنا کوئی کمپلیکس بھی بول رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر کسی نے مجھے نوازنا ہی تھا تو وہ مجھ سے مل کر مجھے ساری بات بتا کر بھی تو رقم دے سکتا تھا۔ اس صورت میں مجھے اطمینان تو ہو جاتا۔ رقم مجھے ہضم تو ہو جاتی۔"

"ہوسکتا ہے وہ شخص دولت مند ہو طبیعت فیاضانہ پائی ہو۔ اور کسی مصلحت کی وجہ سے وہ خود سامنے آنے سے بچنا چاہتا ہو۔" میں نے کہا۔

"چوہدری صاحب! آپ تو 'ہوسکتا ہے' کی آڑ میں ہی میرے سارے مسئلے حل کئے جارہے ہیں۔ آپ کی باتوں سے میرے دل کو حوصلہ تو بہت مل رہا ہے لیکن پھر بھی مجھے ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے مجھے پھانسنے کے لئے یہ چارہ پھینکا گیا ہے۔ کوئی ڈرامہ رچایا جارہا ہے۔ میں خود بھی اپنے آپ کو لعنت ملامت کر رہا ہوں کہ ایک پولیس والے کو اتنا ڈرپوک بھی نہیں ہونا چاہئے۔ اس کی اوقات اتنی چھوٹی بھی نہیں ہونی چاہئے۔ لیکن خود میرے سمجھانے کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو رہا، اس لئے آپ سے مشورہ کرنے چلا آیا ہوں۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"بھئی، میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے یہ روپیہ تو اب تمہاری ملکیت ہو گیا ہے۔ تمہاری کچھ نہ کچھ ضروریات تو ہوں گی۔ وہ پوری کرلو اس رقم سے۔" میں نے کہا۔

"ضروریات کا کیا ہے چوہدری صاحب!" وہ طویل سانس لے کر بولا "انسان کی ضروریات پوری کرنے کے لئے تو قارون کا خزانہ بھی ناکافی ہے۔ کچھ پتا ہی نہیں چلتا کہ ضروریات کہاں ختم ہوتی ہیں اور خواہشات کہاں سے شروع ہوتی ہیں۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ شاید وہ اتنا سادہ لوح نہیں تھا جتنا میں سمجھتا تھا۔ وہ گہری بات بھی کرسکتا تھا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "بھئی، اگر تمہارے پاس ذاتی مکان نہیں ہے تو کوئی اچھا سا مکان دیکھ کر خرید لو۔ اگر رقم کم پڑے گی تو میں دے دوں گا۔ بچوں کے حق میں یہی سب سے اچھا کام ہے۔"

"لگتا ہے قدرت مجھ پر بہت ہی زیادہ مہربان ہو رہی ہے۔" اس کی آنکھیں کچھ چمک گئیں "یہ رقم تو چھپر پھاڑ کر آئی ہی تھی، اب آپ اور بھی دینے کو تیار ہیں۔ اور آپ جو یہ مکان کی بات کررہے ہیں۔ یہ تو اس فدوی کی زندگی کی سب سے بڑی حسرت ہے۔ لیکن مسئلہ پھر وہی آن پڑتا ہے جی۔ اگر میں نے اس قسم کا کوئی کام کیا تو اینٹی کرپشن والے تو میرے پیچھے لگ جائیں گے۔ آپ کو معلوم ہے، اینٹی کرپشن میں ایک شعبہ ہوتا ہے جس کا کام سرکاری ملازموں کے رہن سہن کا سروے کرنا ہوتا ہے۔ اس کے کارندے یونہی دوستانہ سے انداز میں کسی سے ملنے آجاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں پتا چلاتے ہیں مکان ذاتی ہے یا کرائے کا۔ اگر کرائے کا ہے تو کرایہ کتنا ہے۔ دوستانہ انداز میں سگریٹ مانگ لیتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ آدمی کون سا برانڈ پیتا ہے۔ فرنیچر دیکھتے ہیں کس قسم کا ہے۔ گھر کی سجاوٹ وغیرہ کیسی ہے۔ کھانا پینا کیسا چل رہا ہے۔ بظاہر یہ ایک دوستانہ سی اور اتفاقیہ سی ملاقات ہوتی ہے لیکن اس میں وہ سب کچھ نوٹ کرکے لے جاتے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ اس کا رہن سہن اس کی تنخواہ کے مطابق ہے یا نہیں۔ وہ اس کی رپورٹ کرتے ہیں۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آگئی۔ کئی لمحے تک میں ہنستا رہا۔ شریف سیال حیرت سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں خاموش ہوا تو وہ تشویش زدہ سے لہجے میں بولا "چوہدری صاحب! اس میں ہنسنے کی کیا بات تھی؟"

"تمہاری باتیں سن کر کبھی کبھی یقین نہیں آتا کہ تم پولیس میں ہو۔" میں نے کہا "بھئی، محکموں کا کیا ہے۔ محکمے تو ہمارے ملک میں دنیا کے ہر ملک سے زیادہ ہیں۔ کیا کسی محکمے نے آج تک وہ مسئلہ حل کیا ہے جس کے لئے وہ قائم کیا گیا تھا؟ اس نے تو اس مسئلے کو دگنا، چار گنا، دس گنا کیا ہے۔ حسبِ توفیق بڑھایا ہے۔ محکمے ہمارے ہاں مسائل کا پولٹری فارم ہیں۔ وہاں ان مسائل کی افزائشِ نسل ہوتی ہے۔ تم نے دیکھا نہیں، اس وقت ہر چیز کی پرائس زیادہ کنٹرول میں تھی جب پرائس کنٹرول کمیٹی نہیں بنی تھی۔ اس وقت کرپشن کم تھی جب اینٹی کرپشن کا محکمہ نہیں تھا۔ اس وقت بجلی کی کمی کا شور سننے میں نہیں آتا تھا جب واپڈا نہیں تھا۔ اس وقت جرائم کم تھے جب پولیس کم تھی۔"

"دراصل ۔۔۔۔ چوہدری صاحب! پہلے آبادیاں بھی تو کم تھیں، شہر اتنے پھیلے نہیں تھے۔ لوگوں کا معیارِ زندگی اتنا بلند نہیں تھا۔ ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ مسائل بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ پھیلتے چلے جاتے ہیں۔" اس نے دلیل دی۔

"تو میرے بھائی! محکمے اسی لئے تو قائم کئے جاتے ہیں کہ وہ آبادی کے پھیلاؤ، زمانے کی ترقی وغیرہ کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ ساتھ اپنے حصے کے مسائل کو حل کرنے کے لئے اقدامات کرتے رہیں۔ منصوبہ بندی کرتے رہیں اور جو اقدامات بھی ضروری سمجھیں وہ کرتے رہیں۔" میں نے کہا۔

"اس کے لئے وسائل کہاں ہوتے ہیں جی!" اس نے ایک بار پھر محکموں کا دفاع کیا "ہر محکمہ بنا کر یتیم خانے کی طرح چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہ اگر کوئی منصوبہ بناتا ہے تو اس کے لئے فنڈز نہیں ہوتے۔ وہ اگر کوئی تجاویز پیش کرتا ہے تو اوپر بیٹھا ہوا کوئی رنجیت سنگھ قسم کا بیوروکریٹ انہیں مسترد کردیتا ہے۔ اس لئے محکمے بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آرام سے لوٹ مار میں لگ جاتے ہیں۔"

"یہ سب تاویلیں ہیں۔ بے کار باتیں ہیں۔" میں نے کہا۔ "کیوں کہ ہم سب نے مل کر لوتی دے دیا ہے کہ ہمارا ملک ایک غریب ملک ہے اس لئے ہر کام کے سلسلے میں ہمارے پاس بہترین عذر موجود ہوتا ہے کہ جی فنڈز نہیں ہیں۔ ہمارے پاس افسران کے لئے عالیشان بنگلے تعمیر کرنے، کاروں کے فلیٹ خریدنے اور سرکاری مشینری کی عیاشیوں پر خرچ کرنے کے لئے فنڈز ہوتے ہیں، تیل اور گیس کی تلاش کرنے کے لئے فنڈز نہیں ہوتے۔ جرائم کو کنٹرول کرنے کے لئے فنڈز نہیں ہوتے۔ پیاس سے مرتے ہوئے انسانوں کو بچانے کے لئے فنڈز نہیں ہوتے۔ اگر لوگوں کا خون چوس کر یا کچھ نئے ٹیکس لگا کر کسی منصوبے کے لئے فنڈز فراہم بھی کئے جاتے ہیں تو اس کا حشر کیا ہوتا ہے؟ دس کروڑ کا منصوبہ ہوتا ہے تو نو کروڑ غتربود ہو جاتے ہیں۔ ایک کروڑ اس پر لگتا ہے جس سے منصوبے کا ہاتھ وہیں پھنسا رہ جاتا ہے۔ صرف اس کی دم باہر آتی ہے جو ہمارے کسی کام کی نہیں ہوتی۔ فنڈز کی کمی کا رونا رو کر اپنی نااہلی کو چھپانا ہماری روایت بن چکی ہے۔ اصل بات یہ ہے بھائی کہ کوئی کام کرنا نہیں چاہتا، کوئی قربانی دینا نہیں چاہتا، کوئی یہ نہیں چاہتا کہ اس کی عیاشیوں میں فرق پڑے۔ دوسری بڑی وجہ ہمارے ہاں کا عدم استحکام ہے۔ آئے دن نت نئے انداز سے اقتدار کی رسا کشی، نت نئی حکومتیں، نت نئے قانون۔ اس مریضِ محبت کی ہر نس کا بے دردی سے آپریشن ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود جو سرجن آتا ہے وہ نئے سرے سے اس کی چیر پھاڑ شروع کر دیتا ہے۔ پرانے آپریشن کو ٹانکے لگنے کی نوبت نہیں آتی کہ نیا آپریشن شروع ہو جاتا ہے۔ لہٰذا مریض کا یہ حشر تو ہونا ہی تھا جو ہو رہا ہے۔"

"واہ چوہدری صاحب ۔۔۔۔ واہ!" وہ بہ آوازِ بلند بولا "آپ تو اچھی خاصی تقریر کر لیتے ہیں۔ آپ میں تو سیاسی لیڈر بننے کے جراثیم خاصی تعداد میں پائے جاتے ہیں۔"

"یہ ایک اور غلط فہمی ہے جو ہمارے ہاں لوگوں میں پائی جاتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کہ قومی مسائل پر کسی نے ذرا دردمندی سے بات کی تو فوراً اسے سیاسی لیڈر سے تشبیہ دے دی۔ حالاں کہ قومی درد جن کے دل میں سب سے کم پایا جاتا ہے وہ ہمارے لیڈر ہیں۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ لیڈر کے کم از کم دو چہرے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اخباروں میں نظر آتا ہے اور ایک وہ جو اس کے صرف چند انتہائی قابلِ اعتماد رفقا کو نظر آتا ہے۔ ہمارے سادہ لوح لوگ صرف اخباری چہرے کی وجہ سے لیڈروں کو پوجتے ہیں۔ اگر وہ ان کے حقیقی چہرے دیکھ لیں تو خوابوں میں بھی چیخیں ماریں۔ لیکن دیکھو بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ مجھے تمہاری سادہ لوحی پر ہنسی آگئی تھی اور گفتگو کا رخ مڑ گیا رلانے والی باتوں کی طرف۔"

"بے کار ہیں جی یہ باتیں۔" وہ سر ہلا کر ناصحانہ انداز میں بولا "ہمارے معاشرے میں روزانہ کروڑوں آدمی کمروں میں بند بیٹھے اسی قسم کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"یہی سوچ کر تو میں خاموش رہتا ہوں۔ یہ تو آج تم نے نادانستگی میں دُکھتی رگ چھیڑ دی۔ میں اصل بات کیا کر رہا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"آپ مجھے تسلیاں دے رہے تھے کہ محکموں وغیرہ سے کیا ہوتا ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"ہاں۔ تم بتا رہے تھے کہ سرکاری ملازموں کا سروے وغیرہ کرنے آتے ہیں لوگ۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں اس شہر میں بہت سے ایسے پولیس افسروں کو

جانتا ہوں جن کے لاکھوں کے کاروبار ہیں لاکھوں کی کوٹھیاں ہیں۔ ابھی پرسوں ہی میں نے اسلام آباد میں منسٹری آف انڈسٹریز میں ایک شناسا پولیس آفیسر کو دیکھا۔ وہ ٹیکنا کل لمڑنگانے کے لئے این او سی لینے آیا ہوا تھا۔ درخواست بے شک اس کے ایک رشتے دار کے نام سے دی گئی تھی لیکن مجھے معلوم ہے کہ رشتے دار کا اس کارخانے سے کتنا تعلق ہوگا۔ بنیادی سرمائے کا ذریعہ کیا ظاہر کیا گیا ہے اور اصل میں سرمایہ کہاں سے آیا ہے' یہ باتیں مجھ سے بھی پہلے منسٹری کو معلوم ہوں گی لیکن اسے بہرحال این او سی مل جائے گی۔ سبھی اپنا کام کر رہے ہیں تم اپنا کام کئے جاؤ میرے دوست!"

"ٹھیک ہے جی۔" وہ قدرے طمانیت سے سرہلاتے ہوئے بولا "آپ جیسے بڑے آدمی نے اتنی تسلیاں دی ہیں تو میرا بھی دل بڑا ہوگیا ہے۔ میں کوئی مکان شکان خرید لیتا ہوں گھروالی کے نام سے۔ اب مجھے بھی یقین آگیا ہے کہ یہ رقم آپ جیسے کسی مہان نے میری کسی چھوٹی موٹی بات سے خوش ہو کر انعام کے طور پر بھیجی ہے۔ آپ نے میرا اتنا بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ شکر ہے مجھ گدھے نے ڈر کے مارے یہ بریف کیس کہیں پھینک نہیں دیا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ قدرے جھجکاہٹ کے ساتھ بولا "وہ جو آپ نے فرمایا تھا کہ مکان کی خریداری کے سلسلے میں اگر رقم کچھ کم پڑی تو آپ بھی عنایت کردیں گے۔ تو مطلب یہ ہے کہ میں ذرا ڈھنگ کا مکان دیکھ لوں؟"

"بالکل دیکھ لو۔ میں تمہیں ذرا ڈھنگ کے مکان میں ہی رہتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں اچھے آدمیوں کا سچا قدردان ہوں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

رخصت ہوتے وقت اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور میرا ہاتھ تھام کر جھکتے ہوئے نہایت عقیدت مندانہ انداز میں چوم لیا اور دھیمی آواز میں بولا "آپ بہت ہی کمال آدمی ہیں چوہدری صاحب! میں سمجھتا تھا آپ جیسے آدمی دنیا میں ختم ہو چکے ہیں۔"

"دنیا میں کسی بھی قسم کے آدمی ختم نہیں ہوئے۔ صرف تعداد گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ دوسرے اس اتفاق کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کب کس کو کس قسم کا آدمی ٹکرا جائے۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

اس کے رخصت ہونے کے بعد وہ ہلکی سی افسردگی مجھ پر حملہ آور ہوگئی جسے اب تک میں ذہن کے کسی تاریک گوشے میں دھکیلے بیٹھا تھا۔ یہ افسردگی خورشید جہاں کی موت کے باعث تھی۔ شریف سیال نے بتایا تھا کہ اس کے جسم پر تشدد کی کوئی علامت نہیں تھی اور نہ ہی اسے گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ نہ جانے خبیثوں نے اسے کیسے ہلاک کیا تھا اور اس سے انہیں کیا حاصل ہوا تھا۔ ان کی سبھی حرکتیں بے سروپا تھیں لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آج کے دور میں کس کے پاس بے سروپا حرکتیں کرنے کے لئے وقت اور انرجی موجود تھی۔ میری یہ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ریڈوا کے سلسلے میں مجھے کیا کرنا چاہئے۔ جو را کوئی سراغ ہاتھ آنے لگتا تو فوراً ہی وہ مچھلی کی طرح ہاتھ سے پھسل جاتا تھا۔

بہرصورت میں نے اس افسردگی کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور تیار ہو کر آفس پہنچ گیا۔ ابھی میں نے اسٹینو گرافر کو چند ضروری خطوط کے لئے اہم پوائنٹس نوٹ کرائے تھے کہ اطلاع ملی کراچی سے سیٹھ کرامت مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے اسے فوراً بلوایا اور اس کے استقبال کے لئے اٹھ کر اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ آخر وہ ہوٹل کے پروجیکٹ میں میرا پارٹنر تھا۔

وہ اندر آیا تو مجھ سے مصافحہ کرتے وقت یوں جھکا جا رہا تھا مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا' کہیں میرے پیروں میں نہ آ پڑے۔ میں نے پہلی بار اسے تھری پیس سوٹ میں دیکھا تھا۔ وہ خاصا معقول آدمی لگ رہا تھا۔ چہرے پر کمینہ پن بھی کچھ کم تھا لیکن نہ جانے کیوں منہ کچھ سوکھا سوکھا لگ رہا تھا اور مسکراہٹ بھی مصنوعی سی تھی۔

رسمیات ختم ہو چکیں اور کافی وغیرہ کا دور چل چکا تو میں نے پوچھا "سناؤ سیٹھ' کیسے آنا ہوا؟"

کافی دیر سے آفس کی نشست گاہ میں ہم دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا' اس کے باوجود اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر گویا اطمینان کیا کہ ہمیں تخلیہ میسر ہے یا نہیں۔ پھر وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب! مجھے لاہور میں اور کوئی کام نہیں۔ میں صرف آپ سے ملنے آیا ہوں۔ لیکن اب آپ کے سامنے بیٹھا ہوں تو وہ بات کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی۔ جس کے لئے آیا ہوں۔"

"جو بات کرنی ہے کھل کر کرو سیٹھ کرامت! یہ احمقوں والا انداز اختیار کرکے اپنا اور میرا وقت ضائع نہ کرو۔ اس قسم کے اندازِ گفتگو سے مجھے الجھن ہوتی ہے۔ آدمی کو جو بھی کہنا ہو سیدھی طرح کر دینا چاہئے۔" میں نے کہا۔

"آپ ناراض ہو جائیں گے اور میں آپ کی ناراضگی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میری آپ سے روح فنا ہوتی ہے۔" اس کے چہرے پر حقیقتاً زردی تھی۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' میں نے تمہارے ساتھ کوئی بُرا سلوک تو کبھی نہیں کیا کہ تمہاری مجھ سے روح فنا ہونے لگے۔" میں نے ملائمت سے کہا "البتہ ایک بار ہمیں صرف ایک دوسرے کو سمجھنے کے سلسلے میں ہلکی سی غلط فہمی ضرور ہوئی تھی۔ بات ایک ہی تھی اور میں اصول پرست آدمی ہوں۔ میں نے صرف اس غلط فہمی کو دور کیا تھا۔ اور شکر ہے وہ آسانی سے دور ہو گئی تھی۔ اس کے بعد سے تم بھی سیدھے چل رہے ہو۔ اور امید ہے ہم سے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوئی ہوگی۔"

"اسی لئے تو بات کرتے ہوئے زیادہ مشکل پیش آرہی۔"

مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے۔" وہ تھوک نگل کر بولا "آپ بھی سوچیں گے کیسا آدمی ہے ـــ بچوں کی طرح کبھی کوئی فرمائش لے کر آجاتا ہے، کبھی کوئی ارادہ کرلیتا ہے۔ لیکن میں آپ کو اپنا سمجھ کر آپ کی منت کرنے آیا ہوں۔ وعدہ کریں کہ آپ ناراض نہیں ہوں گے۔"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا "چلو وعدہ رہا میں ناراض نہیں ہوں گا۔"

وہ شیشے کی تپائی پر کچھ آگے کو جھک آیا۔ اس کی انگلیوں میں ابھی ہلکی لرزش تھی۔ پھنسی پھنسی آواز میں وہ بولا "چودھری صاحب! میں جو پچاس لاکھ روپیہ دے چکا ہوں وہ بے شک آپ رکھ لیں ـــ لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ ہوٹل میں میری پارٹنرشپ ختم کردیں ـــ"

اس سے آگے وہ کچھ نہ بول سکا۔ آواز گویا حلق میں ہی اٹک گئی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور وہ یوں وحشت زدہ سے انداز میں صوفے کے پشتے سے لگا جارہا تھا جیسے میں نظروں ہی نظروں میں اسے قتل کردوں گا۔ پھر وہ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "دیکھیں چودھری صاحب! ناراض نہ ہوں۔ اگر آپ ـــ"

میں نے ایک طویل سانس لے کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں ناراض نہیں ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ نیا خیال تمہیں کیوں آگیا؟ کسی طرف سے دباؤ پڑا ہے کیا؟"

"نہیں ـــ نہیں چودھری صاحب!" وہ تیزی سے بولا "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دباؤ بھلا کس کی طرف سے پڑنا تھا۔ آپ کے خلاف کون مجھ پر دباؤ ڈال سکتا ہے؟ ایسی کوئی بات ہوتی تب تو میرے لئے آسانی ہوجاتی۔ میں آپ کو بتادیتا کہ فلاں مجھ پر دباؤ ڈال رہا ہے۔ آپ خود ہی اس سے نمٹ لیتے۔"

"ہوسکتا ہے دباؤ ڈالنے والا ہم سے زیادہ طاقتور ہو۔" میں نے کہا۔

"میری نظر میں تو آپ ہی سب سے طاقتور ہیں جی۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"مکھن لگانے کی چیپ اور روایتی قسم کی کوششیں نہ کرو۔ بالکل سچی بات کرو۔ بعض اوقات صرف سچی بات کی وجہ سے میں اپنے دشمنوں کو بھی معاف کردیا کرتا ہوں۔ تم تو پھر بھی کم از کم فی الحال دوستوں میں شامل ہو۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"میں زندگی بھر آپ کے دوستوں میں ہی شمار ہونا چاہتا ہوں۔ چاہے آپ مجھے اپنے قدموں میں ہی جگہ دیں۔" وہ بدستور پھنسی پھنسی اور مرتعش آواز میں بولا "اسی لئے تو کہہ رہا ہوں کہ رقم بھی بے شک آپ رکھ لیں۔ بس میری پارٹنرشپ ختم کردیں۔ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ بلکہ میں آپ کا شکرگزار ہوں گا۔ آپ کو دعائیں دوں گا۔"

"کچھ وجہ تو بتاؤ۔" میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر ملائمت سے کہا کیونکہ اس کی طرف میرے دیکھنے سے اس کی جان نکلی جارہی تھی۔

"وجہ کوئی ایسی خاص نہیں ہے چودھری صاحب!" وہ ہمت کرکے بولا "بس ـــ ویسے ہی میرے دل میں خوف ہے ـــ جب سے پارٹنرشپ ہوئی ہے میرا دل ڈوبا ڈوبا سا رہتا ہے۔ آپ بڑے آدمی ہیں اور خطرناک بھی ہیں ـــ مجھے لگتا ہے میں آپ کے ساتھ نہیں چل سکوں گا ـــ یہ خوف بھی لگا رہتا ہے کہ کسی رگڑے میں نہ آجاؤں ـــ میں اپنے خوف کی وضاحت نہیں کرسکتا۔ بس اس خیال سے آیا ہوں کہ شاید آپ میری بات سمجھ سکیں اور مجھے معاف کرسکیں۔" اس نے ایک بار پھر ہاتھ جوڑ دیئے۔

"باربار ہاتھ مت جوڑو۔ مجھے گڑگڑاتے ہوئے لوگ اچھے نہیں لگتے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "تو میں بڑا آدمی ہوں۔ اور خطرناک بھی۔ اس لئے تم میرے ساتھ نہیں چل سکتے۔ اس سے پہلے کیا تمہارا تعلق واسطہ صرف حاجیوں اور نہایت نیک و پارسا لوگوں سے رہا ہے؟ کیا استاد لمبو بھی انہی میں سے ایک تھا جس کی تمہیں پشت پناہی حاصل تھی؟"

"نہیں ـــ سر! میں نے کب یہ دعویٰ کیا ہے۔" اس نے خواہ چیخنے کی کوشش کی لیکن حلق سے صرف ایسی آواز نکلی جیسے کسی پرندے کا گلا گھونٹا جارہا ہو۔ "استاد لمبو سے دوستی کی وجہ ہی تو میں اب تک پچھتا رہا ہوں۔ ایف آئی اے اور کرائمز برانچ میرے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ بڑی مشکل سے ان کا منہ بند رکھتا ہوں۔ اسی لئے میں اب محتاط ہوکر اٹھانا چاہتا ہوں۔ اپنے ہاتھ بالکل صاف رکھنا چاہتا ہوں۔"

"اور ہمارے ساتھ رہ کر تمہارے ہاتھ گندے ہوجائیں گے؟" میں نے اسے گھورا۔

"نہیں ـــ نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا صاحب!" وہ یکدم کچھ اور بوکھلا کر بولا "سر! تو دراصل کاروبار سمیٹ رہا ہوں۔ میں اب ہاتھ پاؤں مزید پھیلانا نہیں چاہتا ـــ سر! آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں ـــ میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔"

میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخرکار میں نے ایک سانس لے کر صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "عجیب آدمی ہو سیٹھ کرامت! میرا خیال تھا کہ انسانوں کو سمجھنے میں مجھے کافی حد تک ملکہ آچکا ہے لیکن تمہیں میں نہیں سمجھ سکا۔ تمہیں قائل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا کہ میرا کاروبار صاف ستھرا اور مستحکم ہے۔ نہ ہی میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ کاروبار کی دنیا میں میری کیا ساکھ ہے۔ تم یہ سب کچھ دیکھ ہی چکے ہو۔ اب تمہارے ساتھ شامل ہوئے تھے۔ میں تمہیں یہ یقین دلانا بھی نہیں چاہتا کہ آج تک کسی ایجنسی کو ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہیں ہوئی۔"

"مجھے یقین ہے سر! مجھے یقین ہے چودھری صاحب!" وہ جلدی سے بولا۔

"ان سب باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ لیکن تمہارا ریکارڈ درست رکھنے کے لئے میں تمہیں ایک بات ضرور بتانا چاہتا ہوں کہ تمہارے روپے کی مجھے اس وقت بھی ضرورت نہیں تھی جب میں نے ہوٹل کا پروجیکٹ شروع کیا تھا۔ اور اب بھی ضرورت نہیں ہے جب میرا ہوٹل مکمل ہونے والا ہے۔ مجھے اپنے دوست سیٹھ رمضان کے روپے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہ بات اسے بھی معلوم ہے۔ میرے پاس پروجیکٹ شروع کرتے وقت بھی اتنا روپیہ تھا کہ سول پروپرائٹر کے طور پر ہوٹل بنوا سکتا تھا۔ اور اب تو یہ میرے لئے بالکل معمولی بات ہے۔ لیکن صرف کاروباری مصلحتوں کی وجہ سے میں نے پارٹنرشپ میں یہ پروجیکٹ شروع کیا تھا۔ میں ان مصلحتوں کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ تم کاروباری آدمی ہو ان باتوں کو سمجھتے ہوگے۔ لیکن تمہاری حالت دیکھ کر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ان کاروباری مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ دوں گا۔ مجھے اب سول پروپرائٹر بھی بننا پڑا تو بن جاؤں گا۔ تمہارے شیئرز میں خرید لوں گا۔ تمہاری رقم تمہیں واپس مل جائے گی۔"

اس کے چہرے پر ذرا رونق آگئی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میرا تیسرا پارٹنر سیٹھ رمضان حالاں کہ میرا جگری یار ہے اور ہوٹل میں روپیہ لگا کر بہت خوش ہے۔ اس نے تو آج تک پلٹ کر دیکھا بھی نہیں کہ ہوٹل کس مرحلے میں ہے۔ حالاں کہ وہ بھی کراچی میں ہی رہتا ہے اور ہوٹل کے سامنے سے اس کا سیکڑوں مرتبہ گزر ہوا ہے لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ اس نے کبھی آکر جھانکا تک نہیں کہ کنسٹرکشن کیسی ہورہی ہے۔ کام کی رفتار کیا جارہی ہے۔ عجب قلندر سا آدمی ہے اور مجھ پر معلوم نہیں کیوں آنکھیں بند کرکے بھروسا کرتا رہتا ہے۔ اپنی ساری دولت میرے حوالے کرنے کے لئے تیار رہتا ہے اور اس کی طرف سے مجھے مستقبلِ بعید میں بھی کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں سوچ رہا ہوں کہ اس کی پارٹنرشپ بھی ختم کردوں گا۔ اس کے شیئرز بھی خرید لوں گا۔ حالاں کہ وہ یہی سمجھے گا کہ میں یہ حرکت کرکے اس پر بدگمانی کا مظاہرہ کررہا ہوں۔ اور اس بات پر وہ بہت واویلا کرے گا۔ جذباتی ہوجائے گا۔ خودکشی کی دھمکیاں دے گا۔ لیکن میں اسے منالوں گا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ پارٹنرشپ والا سلسلہ ٹھیک ہی نہیں ہے۔ بینکوں میں بچت کے لئے اگر کبھی بہت ہی زیادہ ضرورت پڑے تو آدمی بس کاغذی قسم کی پارٹنرشپ کرلے۔ یہ سچ مچ کی پارٹنرشپ تو محض دردِ سر ہے۔ میں اس سے جان ہی چھڑا لوں تو بہتر ہے۔"

"چودھری صاحب! آپ تو ناراض ہوگئے۔ میرا مقصد آپ کو ناراض کرنا نہیں تھا۔ اسی لئے تو میں کہہ رہا تھا کہ رقم بے شک آپ رکھ لیں۔ بس میری پارٹنرشپ ختم کردیں۔" وہ تیزی سے بولا۔ "رقم آپ کی نذر ہے۔"

"سیٹھ کرامت! میں نذرانے نہیں لیتا۔ تمہارا خیال ہے کہ مفت میں پچاس لاکھ روپیہ ہاتھ آنے پر میری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہے گا؟" میں نے سرد لہجے میں کہا "کوئی زمانہ تھا کہ روپیہ میری مجبوری تھا، اب نہیں رہا۔ مجھے روپیوں کی نہیں، آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور تم ان آدمیوں میں سے نہیں ہو جن کی مجھے ضرورت ہوتی ہے۔ جب مجھے تمہاری ہی ضرورت نہیں تو تمہارے روپے کا میں کیا کروں گا۔ میں نہ تو ناخوش آدمی کو ساتھ رکھنا چاہتا ہوں اور نہ ہی اس کے روپے کو۔"

اس نے کچھ بولنے کے لئے منہ کھولا لیکن میں نے اسے اس کا موقع دیئے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں ابھی اپنے ڈائریکٹر فائنانس اور اکاؤنٹس منیجر کو تم سے ملوا دیتا ہوں۔ انہیں بتادو کہ تم رقم کس اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرانا چاہتے ہو۔ وہ آج ہی ٹرانسفر کرادیں گے۔"

وہ ندامت آمیز سے انداز میں ایک لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ "لیکن میں شیئر سرٹیفکیٹس تو ساتھ نہیں لایا ہوں۔ وہ تو میں آج واپس نہیں کرسکتا۔"

"کوئی بات نہیں، رقم اس کے باوجود آج تمہارے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر ہوجائے گی۔ شیئر سرٹیفکیٹس تم کراچی واپس جاکر جب چاہو بھجوا دینا۔ مجھے معلوم ہے تم ہماری کوئی چیز دبا نہیں سکتے۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"میری یہ جرأت کہاں چودھری صاحب!" وہ کھسیائے ہوئے سے انداز میں بولا "وہ تو ایک بار غلطی ہوگئی سو ہوگئی۔ مجھے آج ہی واپس جانا ہے۔ کل بائی ایئر میں شیئرز ارسال کردوں گا۔"

اس کے بعد کی کارروائی چند منٹ میں ہی طے پاگئی۔ وہ جب رخصت ہوا تو اس کی آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوگیا ہے۔ لیکن رخصت ہوتے وقت اس کے پاؤں زمین پر گڑے جارہے تھے۔ آخرکار وہ کہے بغیر نہ رہ سکا "میں نے آپ کو سمجھنے میں غلطی پر غلطی کی۔ آپ کی پارٹنرشپ کے اعزاز سے محروم ہوکر اس سے بھی بڑی غلطی کی۔ اب میں آپ کا ساتھی، آپ کا دوست ـــ بلکہ آپ کا غلام بننا چاہتا ہوں۔ لیکن مجھے معلوم ہے آپ مجھے قبول نہیں کریں گے۔"

"تمہارا خیال بالکل درست ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

اس نے ایک نہایت سستے برانڈ کی تلخ سی سگریٹ نکال کر سلگائی تو اس کا ہاتھ بری طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے تپائی سے سگریٹ باکس اٹھا کر اس کی طرف بڑھایا جس میں بیش قیمت

سگریٹیں بھری ہوئی تھیں "ان میں سے پی کر دیکھو۔" میں نے کہا۔

"شکریہ ۔۔۔ شکریہ ۔۔۔" وہ مضطرب لہجے میں بولا "میں کسی زمانے میں ردی کا بیوپاری تھا۔ اس زمانے سے یہی برانڈ پی رہا ہوں۔ اب میں کوئی سی بھی سگریٹ افورڈ کر سکتا ہوں لیکن یہ برانڈ چھوڑ ہی نہیں سکا۔"

"میں یہی جواب سننا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا' تم یہی جواب دو گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے تمہیں اچھی سگریٹ اس لئے آفر نہیں کی تھی کہ تم افورڈ نہیں کر سکتے۔ مجھے تمہاری حیثیت معلوم ہے اور تمہاری حیثیت کے کئی لوگوں سے میں نے کسی نہ کسی چیز کے بارے میں اسی قسم کا جواب سنا ہے۔ اور مجھے حیرت ہوئی ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ تم ماضی کا ذکر کرنے اور اپنی پرانی حیثیت کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے لیکن میرا مشورہ یہی ہے کہ جہاں تم نے رہائش تبدیل کی ہے' پہناوا تبدیل کیا ہے' اٹھنے بیٹھنے کے ٹھکانے تبدیل کئے ہیں' دوست تبدیل کئے ہیں' سواری تبدیل کی ہے' غرضیکہ ہر چیز تبدیل کی ہے۔ وہاں سگریٹ کا برانڈ بھی تبدیل کر لو۔ اب اگر تم اپنے سوٹ میں ایک پیوند لگا کر آجاؤ اور کہو کہ یہ میرے غربت کے زمانے کی یادگار ہے' تو کتنا برا لگے گا۔ اس لئے بہتر تو یہی ہے کہ یہ سگریٹ کا پیوند بھی ہٹا دو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ذہن کے کسی کونے میں ابھی تک گرد جمی ہوئی ہے۔ اور ذہن کے کسی ایسے ہی کونے کی وجہ سے تم میرے ساتھ نہیں چل سکے۔ خدا حافظ" میں اسے اپنے کمرے کے دروازے پر چھوڑ کر واپس آگیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے اپنا ذہن کچھ ہلکا محسوس کیا۔ لیکن آج کا دن شاید کراچی سے ناخوشگوار خبریں آنے کے لئے مخصوص ہو گیا تھا۔ اس وقت میں دوپہر کا کھانا کھانے کے لئے اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا جب میرے ڈائرکٹ فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی نہ جانے کیوں میرے دل نے کہہ دیا کہ فون کراچی سے ہے۔

میرے دل کا کہا درست ہی نکلا۔ دوسری طرف کراچی سے شفیع شاہ تھا۔ نہایت مختصر رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد وہ بولا۔ "سر! تھوڑی سی بری خبر ہے۔"

"سنا دو۔ میں آج ہر بری خبر سننے کے لئے تیار ہوں" میں نے پُر سکون لہجے میں کہا۔

"ہمارا سب سے بڑا ٹرالر "وکٹری" ڈوب گیا ہے۔ اس پر ہمارے جو آدمی فشنگ کے لئے گئے ہوئے تھے ان میں سے ایک آدمی ارشد بھی ہلاک ہوا ہے اور بعد میں اس کی لاش ڈوب گئی" اس نے رک رک کر بتایا۔

"کس طرح ہوا یہ سب کچھ؟" میں نے اپنے آپکو خبر کے دھچکے سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وکٹری" میرے تین سو ٹرالروں کے فلیٹ میں سب سے بڑا اور خوبصورت ٹرالر تھا۔ اس کا صرف انجن ہی نہیں بلکہ وہ پورا کا پورا امپورٹیڈ تھا۔ میں نے منگوایا تھا۔ اس کے ذریعے جدید ترین پیمانے پر فشنگ کی جا[تی] تھی۔ ٹرالر کیا تھا' چھوٹا موٹا بحری جہاز تھا۔ وہ گویا میرے ٹرالروں کے دستے کا سردار تھا۔

شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا "وہ اٹھائیس دن کے فشنگ کے بعد واپس آرہا تھا ......"

"پھر تو مچھلیوں سے بھی لدا ہوا ہوگا؟" میں نے اس کی کانپتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں۔ کئی لاکھ کا مال تھا اس پر" شفیع شاہ نے جوا[ب دیا]

"ایک لانچ سے بغیر کسی وجہ کے اس پر کئی گرنیڈ پھینکے گئے بری طرح ٹوٹ پھوٹ گیا۔ انجن میں آگ لگ گئی۔ ہمارے آ[دمیوں] نے پانی میں کود کر جان بچائی لیکن ارشد بھنی ٹرالر کو بچا[نے کی] کوشش میں ....." اس کی آواز ایک لمحے کے لئے مرتعش ہو گ[ئی]

"معلوم نہیں ہو سکا لانچ کس کی تھی؟" میں نے اپ[نا لہجہ] پُر سکون رکھا۔

"سب کچھ معلوم ہو گیا ہے سر! ہمارے آدمیوں نے کر[ِ] دیا۔ ٹریننگ کا حق ادا کر دیا" شفیع شاہ کی آواز سے ارتعاش ہو گیا "انہوں نے پانی میں غوطہ لگا کر یہی ظاہر کیا کہ وہ ڈوب [رہے] ہیں لیکن نیچے ہی نیچے وہ لانچ کے قریب پہنچ کر اس طرح ا[وپر] چڑھے کہ حملہ آوروں کو احساس ہی نہیں ہو سکا۔ وہ تعدا[د میں] صرف دو تھے۔ ہمارے آدمیوں نے انہیں قابو میں کر لیا اور
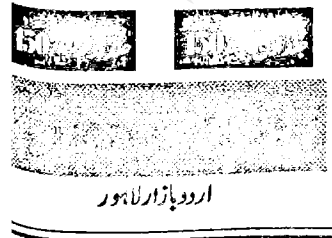
[گ]ذانی لے گئے۔ لانچ کو ہم نے قبضے میں کر لیا ہے۔ وہ گذانی سے [کچ]ھ دور ایک ویران مقام پر کھڑی ہے۔ ہمارے آدمی ان دونوں [آدم]یوں کو قابو میں کر کے اپنے ٹھکانے پر لے آئے تھے۔ ہم نے ان [س]ے "تفتیش" کی۔ پہلے تو انہوں نے زبان نہیں کھولی۔ کافی سخت [ج]ان تھے۔ لیکن آج صبح پھوٹ پڑے۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سیٹھ عالم [شی]ر کے آدمی ہیں اور اسی نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ ہمارے ٹرالر [ک]و توپوں سمیت ڈبو دیں۔"

"سیٹھ عالم شیر ۔۔۔" میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بہت دھیمے لہجے میں کہا "شفیع شاہ! ہمیں تو پتا ہی نہیں چلا اور لوگ اتنی ترقی کر گئے کہ وہ "ہم" پر حملے کرنے لگے۔"

"لیس سر" وہ آہستگی سے بولا۔ سیٹھ عالم شیر کو اچھی طرح جانتا تھا۔ گو کہ عالم شیر لاہور میں رہتا تھا لیکن اس کے "کاروبار" کا زیادہ دارومدار کراچی پر تھا۔ وہ اب بھی اسی لائن کا آدمی تھا جسے ہم ایک عرصہ ہوا ترک کر چکے تھے۔ باریش آدمی تھا۔ دو مرتبہ حج کر چکا تھا۔ پنج وقتہ نمازی تھا۔ اسمگلنگ کو قطعی جائز "کاروبار" کہتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ پرانے زمانے میں۔ بلکہ عین اسلام کے دورِ عروج میں قافلے ہر طرح کا سازوسامان لے کر جس ملک میں چاہتے' لے جاتے رہتے تھے۔ اور جن چیزوں میں بھی فائدہ دیکھتے تھے ان کی خرید و فروخت کرتے رہتے تھے۔ یہ سب سے معزز تجارت تھی۔ یہ کسٹم' کوسٹ گارڈ' ٹیکس' ڈیوٹیاں' امپورٹ لائسنس' پابندیاں' کالے سفید قوانین' یہ سب تو بعد کی پیداوار تھیں۔ غیر مسلم' بدکرداری اور سود خور قوموں کی اختراعات تھیں جنہیں سب نے آنکھیں بند کر کے اپنا لیا تھا۔ وہ انہیں نہیں مانتا تھا۔ لیکن چوں کہ فی الحال اس میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ حکومتوں سے ٹکر لے سکے اس لئے وہ بقول خود' چھپا چھپا کر یہ کاروبار کرنے پر مجبور تھا' لیکن اس کا ارادہ تھا کہ جب اس کے پاس خاطر خواہ وسائل ہو جائیں گے تو وہ ان بین الاقوامی قوانین کے خلاف تحریک چلائے گا کیوں کہ انہی کی وجہ سے دنیا کا معاشی نظام درہم برہم تھا' انہی کی وجہ سے دنیا میں کرپشن کم ہونے کے بجائے بڑھ گئی تھی اور انہی کی وجہ سے امیر' امیر تر اور غریب' غریب تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ وہ بڑی دلیلوں اور اعداد و شمار کے ساتھ بات کرتا تھا اور اس کا دعویٰ تھا کہ اگر پرانے زمانوں کی طرح پوری دنیا میں مال کی نقل و حرکت اور تجارت سے پابندیاں ہٹالی جائیں تو رفتہ رفتہ دنیا کی معیشت خود بخود متوازن ہو جائے گی۔ کسی ملک میں حد سے زیادہ دولت اور کسی ملک میں حد سے زیادہ غربت نہیں رہے گی۔

مجھے اس کے نظریات سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ بلکہ اس کی ذات سے' اس کے کسی بھی کام سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ اس کے اور ہمارے راستے قطعی جدا تھے۔ اس کے باوجود اس نے ہمیں اتنا بڑا نقصان کیوں پہنچایا تھا؟

میں نے اس سوال پر غور کیا تو مجھے فوراً یاد آگیا کہ اس نے ایک بار اپنا اسمگلنگ کا مال منگوانے کے لئے مجھ سے ٹرالر مستعار لینا چاہا تھا لیکن میں نے اس قسم کے کام کے لئے ٹرالر دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے ٹرالر باقاعدہ لائسنس کے تحت صاف ستھرے انداز میں فشنگ کا جائز کاروبار کر رہے تھے۔ پرانے دھندے میرے لئے قصۂ پارینہ ہو چکے تھے۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرے پاس جائز طریقوں سے اس سے زیادہ دولت آرہی تھی۔ لیکن یہ بات سیٹھ عالم شیر کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ ٹرالر نہ دینے پر وہ مجھ سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔ لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جرأت کرے گا اور اتنا کینہ پرور ثابت ہوگا۔

میں جو کچھ سن رہا تھا' میرا اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے تصدیق چاہی "شفیع شاہ! تم نے اچھی طرح یقین کر لیا ہے کہ وہ سچ بول رہے ہیں؟ کہیں جان بچانے کے لئے وہ خواہ مخواہ کسی پر ملبہ تو نہیں ڈال رہے؟"

"نہیں سر! میں نے اندازہ کر لیا ہے۔ ان کے بیان میں کچھ نشانیاں ہیں۔ کچھ حوالے ہیں۔ وہ ٹھیک ہی کہہ رہے ہیں۔ یہ عالم شیر ہی کی حرکت ہے" شفیع شاہ نے وثوق سے جواب دیا۔

"بہت ہی عجیب حرکت ہے" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "مجھے تو اب شبہ ہونے لگا ہے کہ عالم شیر کی کھوپڑی کا کوئی اہم پرزہ گرا ہوا ہے۔"

"سر! ان دونوں آدمیوں کا کیا کرنا ہے؟" شفیع نے پوچھا "میں نے سوچا کہ اس معاملے کا اصل تعلق لاہور سے نکل آیا ہے اس لئے آپ کے حکم کے بغیر کوئی قدم نہ اٹھاؤں۔"

"ان میں سے جو لانچ چلا رہا تھا اسے ابھی قبضے میں ہی رکھو۔" میں نے ایک سادہ کاغذ کو انگلیوں میں مسلتے ہوئے کہا۔ "دوسرا' جس نے گرنیڈ پھینکے ہوں گے اسے وہیں پہنچا دو جہاں ارشد بھنی گیا ہے۔ مچھلیاں ابھی اور بھوکی ہوں گی۔ مزید ہدایات کا انتظار کرو۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے سر!" اس نے مستعدی سے کہا۔

"خدا حافظ" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

کچھ دیر میں بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ سوچتا رہا۔ میری بھوک ختم ہو گئی تھی۔ میری انگلیوں میں کاغذ کی گولی سی بن گئی تھی۔ آخر کار میں نے اسے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور انٹرکام کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

انٹرکام پر میں نے کیتھرین سے کہا "نیچے ریسپشن پر یا باہر گاڑی میں ٹونی اور شبیر شیخ ہوں گے۔ انہیں ذرا میرے پاس بھیج دو۔"

"لیس سر!" کیتھرن نے جواب دیا۔

ایک منٹ سے بھی پہلے وہ دونوں میرے کمرے میں تھے۔ ٹونی ہمیشہ کی طرح ایک فیشن ایبل' لا ابالی اور غنودگی زدہ سا نوجوان نظر آرہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اندر سے وہ چیتے کی طرح مستعد رہتا تھا۔ میں نے انہیں اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"حاجی عالم شیر کو جانتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں سر!" ٹونی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "میری عمر بے شک کم ہے لیکن میں اسے اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ پڑوسی ملک سے گوٹا کناری کی بوریاں خود کمر پر لاد کر گھوڑوں اور اونٹوں پر لادا کرتا تھا۔ پھر انہیں سرحد پار لایا کرتا تھا لیکن دین کا وہ اس وقت بھی اچھا نہیں تھا۔ اپنے تقاضہ داروں کو ہر بار نئی کھیپ آنے کے وعدے پر ٹرخاتا رہتا تھا۔"

"ہاں.... اچھا یاد دلایا تم نے ٹونی!" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "میں تو یہ باتیں بھول ہی گیا تھا۔ میں غیر اہم باتیں اپنے ذہن کے کمپیوٹر سے نکال پھینکتا ہوں۔ ڈی پروگرام کردیتا ہوں۔ لیکن کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ غیر اہم باتیں بھی یاد رکھنی چاہئیں۔ خیر.... تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ وہ عالم شیر بہت بڑا آدمی ہوگیا ہے۔ اس کے آدمیوں نے ہمارا ماہی گیری کا جائز اور قانونی کاروبار کرنے والا بہترین ٹرالر گرنیڈز پھینک کر ڈبو دیا ہے۔ ارشد بھٹی اس حملے میں کام آیا ہے۔"

"اوہ..." ٹونی کے ہونٹ سیٹی بجانے کے سے انداز میں سکڑ گئے اور چمکیلی شربتی سی آنکھوں میں سفاکی کی ایک لہر آکر گزر گئی۔ شبیر شیخ نے بھی بے چینی سے کرسی پر پہلو بدلا۔

"بہرحال ہمارے آدمیوں نے ان کارندوں کو پکڑلیا ہے۔" میں نے گویا انہیں تسلی دی "یہ بتاؤ کہ تمہیں عالم شیر کے حفاظتی انتظامات کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔"

"جی ہاں۔ تین آدمی اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔" ٹونی بلا تامل بولا "ایک کے پاس لائسنس یافتہ گن ہوتی ہے۔ وہ باضابطہ گارڈ ہے' گارڈ ہی کی طرح عالم شیر کے ساتھ رہتا ہے۔ دوسرے دو عام لباسوں میں ہوتے ہیں۔ ان کے لباسوں میں ہی اسلحہ چھپا ہوتا ہے۔ ان کا اسلحہ بلا لائسنس ہوتا ہے۔ وہ دونوں پیشہ ور بدمعاش اور قاتل ہیں۔ باضابطہ گارڈ کے طور پر ساتھ رہنے والا ایک ریٹائرڈ کمانڈو ہے۔"

"بہت خوب ٹونی! مجھے خوشی ہے کہ تم آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہو۔" میں نے ستائشی لہجے میں کہا۔

"سر! زندگی کی دوڑ بہت سخت ہے۔ یہ دنیا عالم شیروں سے بھری پڑی ہے۔ ذرا آنکھیں اور کان بند کرو.... یہ لوگ کچلتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔" ٹونی اپنے مخصوص دھیمے سے لہجے میں بولا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "کرنا کیا ہے سر؟"

"عالم شیر کو آج رات دو نمبر پر ہونا چاہئے۔ مجھے ا
مذاکرات کرنے ہیں۔" میں نے سرسری سے لہجے میں
سے میری مراد ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی ہوتی تھی اور میر
معلوم تھا کہ جب کسی کو وہاں بلوایا جاتا تھا تو اسے کس
تھا۔

"پہنچ جائے گا سر! آپ بالکل مطمئن رہیں۔" ٹو
سے بولا۔

"تم چاہو تو میری حفاظت کی ذمے داری کم از کم
کے لئے تو چھوڑ ہی سکتے ہو۔" میں نے کہا "بلکہ بہتر تو یہ
خواہ مخواہ کی مشقت چھوڑ ہی دو۔ میں اب خود اپنے
خاصا مستعد اور ہوشیار رہنے لگا ہوں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے سر!" وہ سر جھکاتے ہوئے بولا "
اپنی حفاظت آپ خود ہی کرسکتے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ
دل سے مجبور ہو کر' محض ایک اضافی احتیاطی تدبیر کے
ہیں۔ آپ اس کی بالکل فکر نہ کریں کہ کس وقت
داری انجام دے رہا ہوگا۔ میں نے اس کا سب انتظام
اتنے بہت سے ساتھی ہیں ہمارے۔ ہم چاہیں تو آپ
ہجوم کردیں کہ آپ تک کسی کی نظر بھی نہ پہنچ سکے۔
کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ دوسرے ہمیں یہ اطمینان
خود کسی فولادی دیوار سے کم نہیں۔ یہ چار آنکھیں
تسلی کے لئے آپ کی نگرانی کرتی ہیں۔ آپ اس معا
چھوڑے رکھئے۔ میری آپ سے بس یہ ایک ہی تو

"اور میں ہمیشہ تمہاری ضد کے سامنے مجبور ہوجاتا ہوں۔"
نے گہری سانس لے کر کہا "اس بے فائدہ کام کی اجازت دیئے
ہوں۔"

"اس کا کوئی فائدہ بھی کبھی نہ کبھی سامنے آہی جائے گا سر!"
مسکراتے ہوئے بولا "اب ہم جائیں؟"

"ہاں" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "عالم شیر والے کام میں
جلد بازی یا جذباتیت کا مظاہرہ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔
آج ہاتھ نہ پڑے تو یہ کام کل یا پرسوں بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس
لئے آج کی شام ڈیڈ لائن نہیں ہے۔ بس کام کچا نہیں ہونا
ہے۔" یہ میں نے محض احتیاطاً کہا تھا ورنہ مجھے معلوم تھا کہ ٹونی
سپرد کوئی کام کرنے کا مطلب یہی تھا کہ کام کچا نہیں ہوگا۔

وہ دونوں جاچکے تو میرے ذہن سے دھند سی چھٹ گئی اور میں
نا کھانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ کھانے پر انٹرکان میں آفاق
منتظر تھا۔ اس سے میری ملاقات طے تھی اور میں چند منٹ
تھا۔ میں نے اس سے معذرت کی تو وہ شرمندہ سا ہوگیا۔
دری صاحب! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ مجھ جیسے اپنے چھوٹے
رندے کارندوں سے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں پر معذرت کرتے ہیں تو
سے بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔ آپ کو ذرا بھی خطرہ محسوس نہیں
کہ ان باتوں سے آپ کی حاکمانہ شان میں فرق آسکتا ہے؟"

"میں اپنے کام حاکمانہ شان کے ذریعے نہیں بلکہ اپنے
ساتھیوں کی جاں نثاری کے ذریعے چلانا چاہتا ہوں۔ اور جاں نثاری
ان میں تبھی آئے گی جب انہیں مجھ سے محبت ہوگی۔ میں یہ ہرگز
نہیں چاہتا کہ میرے آدمی مجھ سے ڈریں' مرعوب ہوں' میرے
سامنے سراپا تعظیم بنے رہیں۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھ
سے محبت کریں۔ مجھے ان کے وہ جذبات زیادہ اہم معلوم ہوتے ہیں
جو پیٹھ پیچھے میرے بارے میں رکھتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔
"ان باتوں کو چھوڑو۔ جن معاملات پر بات کرنے کے لئے یہ
ملاقات طے پائی تھی وہ شروع کرو' کھانے کے ساتھ ساتھ وہ نمٹ
جائیں تو بہتر ہے۔"

مجھے آج کل اسٹوڈیو جانے کا وقت نہیں مل رہا تھا اس لئے
میں نے اپنے فلم بزنس کے ضروری معاملات پر بات کرنے کے لئے
آفاق کی کئی مرتبہ کی یاد دہانیوں کے بعد اسے کھانے پر ہی بلالیا تھا۔
اس نے چند فائلیں بریف کیس سے نکال کر میز پر رکھ لیں۔
باتیں کوئی خاص نہیں تھیں۔ بس جب تک وہ اپنی کارگزاری
کے گوش گزار نہیں کردیتا تھا' اسے اطمینان نہیں ہوتا تھا۔
دو فلمیں ابھی آدھی بھی نہیں ہوئی تھیں لیکن اس نے دو نئی
بھی شروع کردی تھیں۔ ان میں ہیروئن ستارہ نہیں تھی۔ اس
نے ایک نئی ہیروئن کو سائن کیا تھا جس کی آج کل انڈسٹری میں
دھوم مچی ہوئی تھی۔ سبھی ڈائریکٹرز' پروڈیوسرز اس کی طرف لپک رہے
تھے۔

وہ چھوٹے قد اور معمولی شکل و صورت کی لڑکی تھی مگر ایک دھماکے کے ساتھ انڈسٹری میں وارد ہوئی تھی۔ ہوا اس کے ساتھ بھی وہی تھا جو انڈسٹری میں اکثر ہوتا ہے۔ یعنی پہلی فلم سپرہٹ ہوگئی تھی۔ اس کے بعد فلموں کی لائن لگ گئی تھی۔ ورنہ میں نے سنا تھا' اس سے پہلے وہ خود کہا کرتی تھی کہ اسے شاید کوئی ایکسٹرا کے طور پر بھی کاسٹ نہ کرے۔ میں نے اس کی وہ پہلی فلم نہیں دیکھی تھی جس نے اسے راتوں رات سپر اسٹار بنایا تھا۔ آفاق بتا رہا تھا کہ اس کے حق میں سب سے اچھی بات یہ رہی تھی کہ وہ اس کردار میں نگینے کی طرح فٹ ہوگئی تھی۔ یہ فلم' باہر کی ایک فلم کا اردو ایڈیشن تھی۔ اس میں ہیروئن کا کم عمر نظر آنا ضروری تھا۔ اور ہماری کوئی ہیروئن کمسن نظر نہیں آتی تھی۔ نئی لڑکی کمسن نظر آتی تھی۔ فلم کلک کرگئی تھی۔

میں اس کے حق میں نہیں تھا کہ اکیلا آفاق دو فلمیں کرتے کرتے دو اور شروع کردے۔ لیکن میں نے اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اس لائن کا آدمی تھا اور میں نے اسے اس شعبے کا مختارِ کل بنادیا تھا۔ برے بھلے کا اب وہی ذمے دار تھا اس لئے میں کچھ نہیں بولا۔ اس کے اکاؤنٹ میں رقم ختم ہوچکی تھی۔ میں نے اسے دس لاکھ کا چیک کاٹ دیا۔

میں نے نئی فلموں کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا' کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ خود ہی گویا وضاحت کرتے ہوئے بولا "آپ شاید حیران ہوں گے کہ دو فلمیں ابھی آدھی بھی نہیں ہوئیں اور میں نے دو نئی شروع کردیں۔"

"نہیں' میں بالکل حیران نہیں ہوں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "تم ٹریڈ کے آدمی ہو۔ کچھ سوچ سمجھ کر ہی ایسا کیا ہوگا۔"

"ویسے تو ہر کاروبار میں یہی ہوتا ہے کہ ہوا کا رخ پہچان کر جس نے بروقت صحیح سمت میں صحیح قدم اٹھالیا وہ کما گیا۔ لیکن فلم انڈسٹری میں تو یہ اصول کچھ زیادہ ہی لاگو ہوتا ہے۔ اس وقت جو بھی اس لڑکی کو صحیح کہانی کے ساتھ سائن کرکے جلد از جلد فلمیں مارکیٹ میں پھینک دے گا وہ کما جائے گا۔ بساط تو آپ نے مجھے بچھادی ہے' اب میں کوشش کررہا ہوں کہ مہرے ٹھیک ٹھیک چلتا رہوں۔"

"کمائی کی مجھے اتنی زیادہ فکر نہیں ہے۔" میں نے کہا "میں چاہتا ہوں کہ ہمارا ادارہ ایک بہت بڑا' مستحکم اور باعزت ادارہ شمار ہو۔ سپر اسٹارز بھی ہمارے لئے کام کرنے میں فخر محسوس کریں۔"

"سال ڈیڑھ سال میں آپ سی اے فلمز کو اسی مقام پر پائیں گے۔ اور میرا خیال ہے اتنا بڑا مقام حاصل کرنے کے لئے یہ عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہے۔" وہ بولا۔

"میں تم سے متفق ہوں۔" میں نے کہا "سی اے فلمز میں 'سی'

سے مُراد چوہدری اور اے سے مراد آفاق تھی۔ یہ ادارہ میرے بھولے بسرے خوابوں کی تسکین کا ایک ذریعہ تھا۔ لیکن اب یہ مجھے اتنا اہم نہیں لگتا تھا۔ یہ میں نے یونہی محض شغل کے طور پر اور کچھ آفاق کو اکوموڈیٹ کرنے کے لئے قائم کرلیا تھا۔ اگر یہ بھی خوب پھل پھول جاتا تو یہ میری خوش قسمتی کا ایک اور ثبوت ہوتا۔ جب قسمت آدمی پر مہربان ہو تو زیادہ ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر بھی کام سیدھے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

کھانے سے فارغ ہوکر میں نے آفاق کو خدا حافظ کہا اور ہم اپنی اپنی گاڑی میں الگ الگ سمتوں میں روانہ ہوگئے۔ میرا دفتر واپس جانے کا ارادہ تھا۔ لیکن ابھی میں دفتر سے کچھ دور ہی تھا کہ کار کے خفیہ ریڈیو پر سگنل موصول ہوا۔ میں نے خفیہ خانے سے ریڈیو کا ننھا سا مائک نکال کر کالر کے نیچے لگالیا اور ڈرائیو تک جاری رکھتے ہوئے بات کرنے لگا۔

دوسری طرف ٹونی تھا۔ اس نے اپنے مخصوص غنودگی زدہ سے لہجے میں اطلاع دی "پارسل دو نمبر پر پہنچ گیا ہے سر!"

"کیا؟" حیرت کا اظہار نہ کرنا میری عادت تھی لیکن اس وقت غیر ارادی طور پر لہجے میں کچھ حیرت جھلک ہی آئی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ٹونی اور شبیر نے اتنی جلدی عالم شیر کو اٹھالیا تھا اور دو نمبر پر پہنچا دیا تھا۔ عالم شیر ان بے ضرر لوگوں میں سے نہیں تھا کہ جنہیں گھرے کی مچھلی کی طرح جب جی چاہا ہاتھ ڈال کر اٹھالیا۔ اس قبیل کے آدمی کو اٹھانے کے لئے باقاعدہ منصوبہ بندی کرنا پڑتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ ٹونی اور شبیر ابھی تو اسے تلاش ہی کررہے ہوں گے۔

"ٹونی! تم مذاق تو نہیں کررہے؟" میں نے کار کی رفتار بالکل کم کرتے ہوئے پوچھا۔

"سر! مانا کہ ہمیں آپ سے مذاق کرنے کی بھی آزادی حاصل ہے لیکن ان معاملات میں مذاق کیسا۔" ٹونی بولا "یہ محض اتفاق ہی ہے کہ جونہی ہم نے اسے تلاش کیا وہی موقع مناسب ترین نظر آیا۔ ہم نے سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں کیا۔ ہاتھ سیدھا پڑگیا' کوئی خون خرابہ نہیں ہوا۔ بس ذرا گارڈز کی کھوپڑیاں تھوڑی سی چٹخانی پڑیں۔ بڑی خاموشی اور صفائی سے کام ہوگیا۔ میں نے سوچا' آپ کو فوراً ہی اطلاع دے دوں۔"

"بہت اچھا کیا تم نے... ویل ڈن... مجھے تم پر فخر ہے ٹونی!"

"تھینک یو سر! سو کائنڈ آف یو۔" وہ یقیناً اپنی کارکردگی کی داد پاکر خوش تھا۔

میں نے سلسلہ منقطع کردیا اور گاڑی واپس موڑلی۔ میں جب ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر پہنچا تو عالم شیر تہ خانے میں موجود تھا۔ ابھی اس کی آنکھوں سے پٹی بھی نہیں کھولی گئی تھی۔ مس ٹرپ اس کے پاس کھڑی تھی۔ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ میں وہاں پہنچنے والا ہوں' وہ میری ہی منتظر تھی۔

عالم شیر ایک لحیم شحیم' قد آور اور باریش آدمی تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ نہایت نفیس اور بیش قیمت کپڑے کی شلوار قمیص میں دیکھا تھا۔ شلوار قمیص اور واسکٹ کے سوا وہ کبھی کچھ نہیں پہنتا تھا۔ پیروں میں نہایت شاندار اور چم چم کرتی پشاوری چپل ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی حلیے میں تھا۔ بس ذرا لباس شکن آلود تھا۔ چپلوں پر تھوڑی سی گرد لگی ہوئی تھی اور بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ لکڑی کی ایک غیر آرام دہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ پُرسکون نظر آنے کی پوری پوری کوشش کررہا تھا۔ تاہم اس کا ایک پاؤں دھیرے دھیرے فرش پر حرکت کررہا تھا جو اس کے اندرونی اضطراب کا مظہر تھا۔

"واہ... مس ٹرپ! مہمان کے ساتھ اتنا برا سلوک!" میں نے متاسفانہ انداز میں کہا "فوراً کھولو ان کے ہاتھ... اور آنکھوں سے پٹی بھی ہٹاؤ۔"

عالم شیر کی چوڑی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ شاید اس نے آواز تو پہچان لی تھی لیکن پھر بھی کسی الجھن میں تھا۔ مس ٹرپ نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ آنکھوں سے پٹی ہٹتے ہی اس کی نظر سب سے پہلے مجھ پر پڑی اور وہ اچھل پڑا۔ عام حالات میں بھی اس کے چہرے سے خون چھلکتا محسوس ہوتا تھا لیکن اب تو یکدم ہی اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہوگیا۔

"وہ... تو یہ تم تھے!" وہ غرایا "کل کے لونڈوں کے حوصلے کتنے بلند ہوگئے' کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر۔"

"اور تم جیسے استادوں کے کردار کتنے پست ہوگئے... افسوس ہوتا ہے مجھے یہ دیکھ کر۔" میں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

اچانک اس کی نظر مس ٹرپ پر پڑی اور وہ گویا اپنا غصہ بھول گیا۔ مس ٹرپ اس وقت نیلی جینز اور سفید شرٹ میں تھی۔ ویسے تو وہ ہر حلیے میں ہی غضب کی عورت تھی لیکن بعض حلیوں میں تو وہ اپنے سانولے سلونے وجود کے ساتھ قیامت ڈھاتی تھی۔ عالم شیر نے سر سے پاؤں تک ایک ایک انچ کے حساب سے بھوکی نظروں سے اسے یوں گھورا جیسے کوئی ترسا ہوا شرابی ایک گھونٹ کرکے جام حلق سے اتار رہا ہو اور اس اندیشے میں مبتلا ہو کہ اس ایک جام کے سوا اسے کچھ نہیں ملے گا۔ مس ٹرپ جیسی عورت بھی ایک لمحے کے لئے کسمسا کر رہ گئی۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو فوراً نظر جما کر کسی کی طرف دیکھ لیتی ہیں تو وہ پانی پانی ہو جاتا ہے۔

"کچھ شرم کرو عالم شیر!" میں نے تنبیہہ کے سے انداز میں کہا۔ "حاجی نمازی اور باریش آدمی ہو لیکن اس وقت تمہارے تاثرات دیکھ کر مجھ جیسے گناہ گار کو شرم آرہی ہے۔"

"وہ چیزیں اپنی جگہ ہیں اور یہ چیز اپنی جگہ' مرد کو مرد تو رہنا ہی چاہئے نا۔" وہ مس ٹرپ پر سے نظر ہٹائے بغیر اپنے موٹے سرخ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

"یہ اچھا فلسفہ گھڑ رکھا ہے۔ اس کی آڑ میں تم نے ہر گناہ اپنے لئے جائز کررکھا ہے۔ چھوڑا تو کچھ بھی نہیں ہے تم نے' اللہ کو بھی دھوکا دے رہے ہو اور اس کے بندوں کو بھی۔" میں نے کہا۔

"فضول لیکچر مت دو۔" وہ گویا کان پر سے کوئی نادیدہ مکھی اڑاتے ہوئے بولا "اپنے معاملات کو میں خود بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ سانولی قیامت ہے کون؟ اتنا عرصہ تم سے میل ملاقات رہی' آنا جانا رہا لیکن اس کے تو کبھی درشن ہی نہیں ہوئے تھے۔ کون لگتی ہے تمہاری؟"

اب معاملہ گویا مس ٹرپ کی برداشت سے باہر ہوگیا' بجلی کے کوندے کی طرح اس کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ عالم شیر کے چہرے پر بڑے زور کا گھونسہ پڑا کہ ایک لمحے کے لئے مجھے اندیشہ محسوس ہوا' اس کے چہرے کی کوئی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔ وہ ہوا میں کم از کم ایک فٹ اچھلا اور یوں چاروں خانے چت گرا جیسے کسی مشین نے درخت کا بھاری بھرکم تنا اچھال کر کچھ دور پھینک دیا ہو۔

وہ چت پڑا' آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے چھت کو تک رہا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہوگیا ہے۔ اس جیسے تن و توش کے آدمی کا یوں اچھل کر دور جاگرنا خود اس کے لئے بھی ناقابلِ فہم تھا۔ اس کے رخسار پر گوشت پھٹ چکا تھا اور خون بہہ بہہ کر اس کی گھنی داڑھی میں جذب ہورہا تھا۔ بہرحال آدمی بہت جاندار تھا' سر جھٹکتے ہوئے جلد ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

اس بار اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے گویا ایک نئے زاویئے نگاہ سے مس ٹرپ کا جائزہ لیا۔ وہ گویا اس کے ہاتھ سے لگی ہوئی ضرب سے بھی لذت کشید کررہا تھا۔

"کھل ہوگئی!" وہ اب ایک ٹک اسے گھورتے ہوئے بڑبڑایا۔ "تمہاری نامہربانیاں کسی کو ہلاک کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اور مہربانیاں کسی کو نہ جانے کیا سے کیا بنا دیتی ہوں گی۔ خلوت میں۔"

اس بار اس نے شاید کسی حد تک اندازہ کرلیا تھا کہ مس ٹرپ کس زاویئے سے حملہ کرے گی اور کیا داؤ آزمائے گی۔ اس نے نہ صرف بچنے بلکہ مس ٹرپ کو قابو میں کرنے کی بھی کوشش کی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک طاقتور اور مضبوط آدمی تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اگر مس ٹرپ اس کی گرفت میں آجائے تو وہ لکڑی کی طرح اسے درمیان سے توڑ کر رکھ دے گا لیکن ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ یہ بھی محض عالم شیر کی خوش خیالی تھی کہ وہ مس ٹرپ کے داؤ پیچ کو سمجھ سکتا ہے۔ اس کے داؤ پیچ کو سمجھنے میں تو مجھے ایک عرصہ لگ گیا تھا۔ اور اس کی خاطر مجھے مختصر عرصے کے لئے اس کی شاگردی بھی کرنا پڑی تھی۔

وہ بلاشبہ ایک نئے اسٹائل کی موجد تھی جس کا کوئی نام نہیں تھا۔ اس نے مارشل آرٹس اور مشرقی داؤ پیچ کو ایک دوسرے میں کمال مہارت سے مدغم کردیا تھا اور اس کے لئے اس بے مثال عورت نے کسی کی شاگردی نہیں کی تھی۔ یہ خالصتاً اس کی اپنی محنت اور ذہانت تھی۔ وہ اگر چاہتی تو اس گوشۂ گمنامی سے نکل کر بڑا نام بڑی دولت کما سکتی تھی لیکن وہ عجیب بے نیاز عورت تھی۔ اپنی اس محدود دنیا میں مگن تھی۔ اور جب سے وہ میرے ساتھ وابستہ ہوئی تھی تب سے تو بہت ہی مطمئن رہتی تھی۔ اب تو گویا دنیا کی ہر چیز سے بے نیاز رہتی تھی۔

عالم شیر کسی بن مانس کی طرح مس ٹرپ پر جھپٹا تھا لیکن وہ نہ صرف اپنی جھونک میں آگے گرا بلکہ اس کی پیٹھ پر ایک ایسی لات بھی پڑی جس نے اسے ایک بہت بڑے گولے کی طرح لڑھکا دیا۔ وہ طویل و عریض تہ خانے کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ ٹھنڈا پڑجائے گا لیکن اس کا ردِعمل میری توقع کے بالکل برعکس تھا۔ وہ تو گویا غصے سے پاگل ہوگیا' سچ مچ اپنے بال نوچنے لگا۔

اس کے منہ سے گندی گالیوں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا۔ اس کی شخصیت کو دیکھتے ہوئے میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس قسم کی گالیاں دیتا ہوگا۔ آج اس کی فطرت کا اصل رخ میرے سامنے آیا تھا۔

وہ اب باقاعدہ بن مانس ہی کی طرح دونوں بازو پھیلا کر غصے سے شوں شوں کرتا مس ٹرپ کی طرف بڑھا۔ اپنی دانست میں وہ مس ٹرپ کو ٹریپ کررہا تھا۔ اسے گھیر کر تہ خانے کے ایک کونے میں لے جارہا تھا۔ میرے اور میرے آدمیوں کے لئے اس قسم کے لوگوں سے نمٹنا زیادہ آسان ہوجاتا تھا جو غیظ و غضب سے اندھے ہوجاتے تھے اور جنہیں اپنی طاقت کا بہت زعم ہوتا تھا۔

میں اطمینان سے ایک کونے میں کھڑا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میرے خیال میں عالم شیر کو اس قسم کی کچھ خوراک مل جاتا ہی مناسب تھا۔ اس کے بعد مجھ سے مذاکرات کرنے کے لئے آدمی زیادہ مناسب حالت میں آجاتا تھا۔

مس ٹرپ بظاہر بالکل پُرسکون تھی لیکن اسے اس شخص پر یقیناً بہت غصہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں شیرنی کی سی چمک تھی اور اس کی نظر ایک ثانئے کے لئے بھی عالم شیر پر سے نہیں ہٹی تھی۔ عالم شیر نے اس بار دھوکے سے مس ٹرپ کو لات رسید کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھی جیسا پاؤں دیوار سے ٹکرایا اور ساتھ ہی مس ٹرپ نے ایسی بے رحمی سے اس کی گردن پر چاپ رسید کی کہ مجھے اندیشہ محسوس ہوا' اس کی سانڈ جیسی گردن ٹوٹ نہ گئی ہو۔

وہ لہرایا اور کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہونے لگا۔ اس لمحے مس ٹرپ نے ایک اور کمال دکھایا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے ڈھائی تین من وزنی اس وحشت زدہ بن مانس نما انسان کو بالکل اس طرح اٹھالیا جیسے ویٹ لفٹر اٹھاتے ہیں۔ دوسرے ہی لمحے وہ اسے فرش پر پٹخ چکی ہوتی' اگر میں بروقت نہ چیختا "جولی اسٹاپ۔"

غنیمت رہا کہ مجھے یہ دو الفاظ ادا کرنے کی مہلت مل گئی۔ اگر عالم شیر فرش پر پٹخا جاچکا ہوتا تو نہ جانے اس کا کیا حشر ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ کھوپڑی کئی جگہ سے چٹخ جاتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ باقی ٹوٹ پھوٹ تو شاید قابل مرمت ہوتی لیکن ان دو چیزوں کی ٹوٹ پھوٹ کا علاج ذرا مشکل تھا اور میں نے اسے مذاکرات کے لئے اٹھوایا تھا' علاج معالجے کے لئے نہیں۔

جولی عرف مس ٹرپ نے بہ مشکل اپنی روانی کو کنٹرول کیا اور پٹخنے کے بجائے ذرا آہستگی سے عالم شیر کو فرش پر ڈال دیا لیکن یہ بھی کچھ دیر کے لئے اس کے حواس مختل کرنے کو کافی تھا۔ وہ وہیں پڑا رہا' اٹھ نہیں سکا۔

مس ٹرپ نے قدرے ندامت سے میری طرف دیکھا "آئی ایم سوری سر! مجھ سے کافی سنگین غلطی ہوئی۔ میں تو سمجھی تھی ہم لوگ اپنے اس قسم کے معاملات میں جذباتی ہونا بھول چکے ہیں لیکن لگتا ہے ابھی کچھ جراثیم باقی ہیں۔"

"کوئی بات نہیں' انہیں باقی ہی رہنے دو۔" میں نے ملائمت سے کہا "میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم لوگ انسانوں کے بجائے روبوٹ بن جاؤ۔ مجھے روبوٹس کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ اپنا لباس درست کرنے لگی۔ میں نے عالم شیر کو گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور لکڑی کی بھاری بھرکم کرسی پر پٹخ دیا۔ اس کے کس بل نکل چکے تھے۔ وہ اب بالکل پُرسکون تھا بلکہ تھکا تھکا سا نظر آنے لگا تھا۔ وہ اپنی لمبی سی قمیص کے دامن سے اپنا چہرہ پونچھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں ہیرو بننے کی یہ کوشش مہنگی پڑے گی۔"

"تمہارا روئے سخن کسی اور طرف ہونا چاہئے۔" میں نے تصحیح کی "تمہیں مس ٹرپ سے کہنا چاہئے کہ تمہیں ہیروئن بننے کی کوشش مہنگی پڑے گی۔ میں نے تو تمہیں ایک ہاتھ بھی رسید نہیں کیا۔ میں ذاتی طور پر اس انداز میں مذاکرات کی ابتدا پسند نہیں کرتا لیکن تم جیسے لوگ مجھے یا میرے ساتھیوں کو مجبور کر دیتے ہیں۔"

"مذاکرات؟" وہ قدرے چونکا "کیسے مذاکرات؟"

"اوہ۔۔۔ اب مجھے ایجنڈا بھی پڑھ کر سنانا پڑے گا۔" میں نے قدرے بے زاری سے کہا "خیر۔۔۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ بقول تمہارے کسی بد اطوار قسم کے کیڑے نے کاٹا اور تم نے اپنے آدمیوں کو میرا سب سے عمدہ ٹرالر ڈبو دینے کا حکم دیا۔ کوشش تو ان کی یہی رہی ہوگی کہ ٹرالر تمام آدمیوں سمیت ڈوب جائے لیکن میرے آدمی اتفاق سے محض مچھیرے نہیں تھے۔ ایک آدمی ضرور ٹرالر کو بچانے کی کوشش میں ڈوب گیا لیکن دوسرے نہ صرف بچ گئے بلکہ انہوں نے تمہاری لانچ اور تمہارے آدمیوں کو بھی قابو میں کرلیا۔ لیکن وہ ایک معمولی قسم کی لانچ ہے۔ ٹرالر کا نعم البدل نہیں ہوسکتی۔ اب تمہیں انتہائی شرافت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹرالر اور مال کی قیمت کے علاوہ مرنے والے ساتھی کے لئے تھوڑے سے زرِ تلافی کی ادائیگی کرنی ہے تاکہ یہ ناگواری یہیں ختم ہوجائے' معاملہ زیادہ آگے نہ بڑھے۔"

"بہت خوب!" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا لیکن میں دیکھ چکا تھا کہ ایک لمحے کے لئے اس کے چہرے پر تغیر سا آگیا تھا۔ "اور یہ ساری رقم ملا جلا کر کتنی ہوگی؟"

"بارہ لاکھ روپے ٹرالر اور مال کے' دس لاکھ روپے مقتول کی بیوہ اور بچوں کو دینے کے لئے۔" میں نے بلا تامل حساب بتا دیا۔ "انسانی جان کا کوئی مول نہیں ہوتا۔۔۔ اور جاں نثار ساتھی کے خلوص اور جاں نثاری کی تو کوئی قیمت ہی نہیں لگائی جاسکتی لیکن بے چاری بیوہ اور اس کے بچوں کے زندگی بھر کے کم از کم مسائل حل کرنے کے لئے میں دس لاکھ میں مزید کچھ رقم ڈال کر ان کے لئے کوئی سلسلہ سیٹ کردوں گا۔ ان کی زندگی آرام سے گزر جائے گی۔ یعنی تمہیں کل بائیس لاکھ روپے کی ادائیگی کرنی ہے۔"

"ماشاء اللہ!" وہ زہریلے لہجے میں بولا "تمہارا تجونسا حاتم طائی سے ملتا ہے۔ تم ٹرالر پر کام کرنے والے ایک آدمی کے مرنے پر دس لاکھ میں مزید کچھ رقم ڈال کر اس کے گھر بھجواؤ گے۔"

"ہاں۔ رقم خاصی کم ہے لیکن فی الحال اتنی ہی گنجائش نکل جاسکتی ہے۔ میں تمہیں زیادہ تکلیف نہیں دینا چاہتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "میرے بعض ساتھی تو ایسے ہیں جن کے بارے میں سوچتا ہوں کہ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہوجائے تو میں ان کے لواحقین کو مالی طور پر بھی کس طرح تلافی بہم پہنچانے کی کوشش کروں گا؟ جذباتی تلافی کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"اچھا۔ ٹھیک ہے۔ ہم پھر کبھی بیٹھ کر یہ حاتم طائی انداز کی باتیں کریں گے۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے اس سلوک کو بھول سکوں۔" وہ بیچ بیچ کپڑے جھاڑ کر اٹھنے لگا۔ مس ٹرپ نے کچھ اس طرح اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دباؤ ڈالا کہ وہ دوبارہ بیٹھ گیا۔ تاہم اب وہ مس ٹرپ کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہا تھا۔

"دیکھو۔۔۔ اے! برخوردار" وہ گویا تحمل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "اگر تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو کر میرے ساتھ یہ سلوک کر بیٹھے ہو تو میں تمہیں معاف کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن اب تم مجھے جانے دو۔"

"معاف تو میں بھی تمہیں کرہی دوں گا۔" میں نے گویا بادل ناخواستہ کہا "لیکن اس معاملے کا کم از کم مالی پہلو سے تو تصفیہ ہو جائے۔"

"کون سا معاملہ؟ تم کیا باتیں کررہے ہو؟ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آرہا۔" وہ بے پناہ حیرت کی کامیاب اداکاری کرتے ہوئے بولا۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں جو وہ ٹرالر وغیرہ کی بات کررہا تھا تو دراصل کسی ایڈونچر اسٹوری سے اقتباس سنا رہا تھا؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"میں تو یہ بھی نہیں سمجھ سکتا۔" وہ منہ بنا کر بولا "معلوم تو یہی ہورہا تھا کہ تم مجھے کوئی کہانی سنا رہے ہو لیکن مجھے اس کا کوئی سرا نہیں نظر آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا چیز میرے سر تھوپنے کی کوشش کررہے ہو! کیسے آدمی۔۔۔ کیسا ٹرالر۔۔۔؟ مجھے کچھ نہیں معلوم' کراچی میں تمہارے کتنے ٹرالر کیا کرتے پھر رہے ہیں۔۔۔"

"وہ صرف فشنگ کرتے پھر رہے ہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔" وہ ہاتھ جھٹک کر بولا۔ "میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے کسی ٹرالر کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا۔ مجھے بالکل نہیں معلوم آج کل کراچی میں کیا ہورہا ہے۔ وہاں میری تمام سرگرمیاں بالکل بند پڑی ہیں۔ میرے آدمی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔"

"شاید اسی لئے تم نے سوچا ہو کہ فرصت کے ان لمحات سے فائدہ اٹھایا جائے اور اپنے جذبۂ کینہ پروری کی تسکین کرلی جائے۔ یا پھر شاید تم نے سوچا ہو کہ مجھ جیسے برخورداروں کو اس قسم کا ڈوز دیتے رہنا چاہئے تاکہ وہ سرکشی اختیار نہ کرپائیں۔" میں نے کہا۔

"خدا! مجھے تمہاری کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی۔" وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا "آخر تم اپنی ہی کیوں ہانکے جارہے ہو؟ میری بات کو کیوں کوئی اہمیت نہیں دے رہے؟"

میرے لہجے میں غیر ارادی طور پر سرد مہری آگئی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "عالم شیر! جب تم جیسے گرگِ باراں دیدہ' دودھ پیتا بچہ بننے کی کوشش کرتے ہیں تو مجھے بہت برا لگتا ہے۔ تم اپنا اور میرا قیمتی وقت ضائع کررہے ہو۔ اپنی جان ہلکان کررہے ہو اور صورت حال کو مشکل سے مشکل ترینا رہے ہو۔ اپنے لئے مزید الجھنیں مول لے رہے ہو۔ مسئلے کو مختصر کرو۔ بائیس لاکھ کی ادائیگی کا بندوبست کرو اور اپنے گھر جاؤ۔"

"بہت خوب!" وہ ایک بار پھر طنزیہ سے لہجے میں بولا "بائیس لاکھ روپے کی فرمائش تو تم اس طرح کررہے ہو جیسے بائیس ٹکے ہیں جو میں تمہارے سامنے پھینکوں اور گھر چلا جاؤں۔ بغیر کسی معقول وجہ کے تو میں بائیس ٹکے بھی اس طرح نہیں پھینکتا۔ مانا کہ تم نے بے اندازہ دولت کمائی ہے لیکن پھر بھی روپے پیسے کو اتنا حقیر سمجھنا مت شروع کرو ورنہ جلد کنگال ہو جاؤ گے۔"

"تم میری فکر میں دبلا ہونا چھوڑو۔" میں نے رکھائی سے کہا۔ "میں کنگال رہوں یا ارب پتی' ہر حال میں زندگی گزار لوں گا۔ تم اصل بات کا جواب دو۔ تمہیں بائیس لاکھ کی ادائیگی کرنی ہے۔ جتنی جلد کردو گے اتنی جلدی گھر جاسکو گے۔"

"بھئی یہ تو اچھی زبردستی ہے۔ مان نہ مان میں تیرا مہمان۔ یہ تو تم نے بہت اچھا دھندا شروع کردیا۔ اغوا برائے تاوان۔ کہیں یہ بھی تمہارا سائیڈ بزنس تو نہیں ہے؟ راہ چلتے آدمی کو اٹھوالیا اور بیس تیس لاکھ کا مطالبہ اس کے سر پر داغ دیا۔" وہ سر جھٹک کر بولا۔

"اگر تمہاری پہلے ہی اتنی پٹائی نہ ہوچکی ہوتی تو اس بات پر میں تمہارے منہ پر کم از کم ایک تھپڑ ضرور رسید کرتا۔ لیکن اس وقت مجھے اندیشہ ہے کہ تم میرا تھپڑ برداشت نہیں کرسکو گے۔ مر مرا جاؤ گے اور میں ہرگز نہیں چاہتا کہ تم بائیس لاکھ کی ادائیگی کرنے سے پہلے مرجاؤ۔ میرے بارلیش چاند! یہ اغوا برائے تاوان نہیں' بہ زورِ بازو اپنے نقصان کی تلافی کرانے کا ایک طریقہ ہے۔ اب بار بار یہ کہنے کا کوئی فائدہ نہیں کہ تم اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتے۔ تم نے حماقت کی ہے۔ جرمانہ تمہارے سر پڑچکا ہے۔ رقم دیئے بغیر اب تمہاری جان نہیں چھوٹ سکتی۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"کیا کرو گے تم؟" اس نے مجھے گھورا۔

"تم عالم شیر ہو۔ یعنی عالم کے شیر۔ میں تمہیں عالم کا سگ بنادوں گا۔ تمہارے گلے میں زنجیر ڈال کر اس ستون سے باندھ دوں گا۔ پھر تم ساری زندگی یہیں بندھے رہو گے اور یہ زندگی بہت مختصر ہوگی۔ صرف چند دن کی۔ اس لئے کہ تمہیں کھانے پینے کو کچھ نہیں ملے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت تمہیں چھڑا کر نہیں لے جاسکے گی کیونکہ کوئی تمہارا سراغ ہی نہیں پاسکے گا۔ ادائیگی کئے بغیر اب یہاں سے تمہارا ڈھانچا ہی باہر جاسکے گا۔ اور دولت و جائیداد ڈھانچوں کے کسی کام نہیں آتی۔ بہت دولت کمائی ہے تم نے بھی' بائیس لاکھ روپے کے لئے کیوں زندگی داؤ پر لگا رہے ہو؟"

اب شاید اسے یقین سا آنے لگا کہ وہ واقعی بری طرح پھنس گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں اور چہرے پر اداکاری کی جو دھول اُڑ رہی تھی' دھیرے دھیرے بیٹھنے لگی۔ اب تک وہ بڑی کامیابی سے انجان بنا ہوا تھا مگر اب اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اس سارے واقعے سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ مگر آدمی ضدی اور خسیس تھا۔ مزید ایک کوشش سے باز نہ رہ سکا۔

مُربیانہ انداز میں گویا مجھے سمجھاتے ہوئے بولا "تمہیں ضرور کسی نے بھڑکایا ہے یا پھر واقعہ اس طرح پیش آیا ہے کہ تمہیں میرے بارے میں غلط فہمی ہو گئی ہے۔"

"مجھ تک کوئی رپورٹ صرف اس وقت ہی پہنچتی ہے جب اس میں سے افواہوں اور غلط فہمیوں کی ساری ملاوٹ چھان پھٹک کر نکال لی جاتی ہے۔ وہ سو فیصد خالص حقیقت رہ جاتی ہے کیونکہ مجھے فیصلہ کن قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ اور میرے ساتھیوں کو معلوم ہے کہ میں کچا قدم اٹھانا بالکل پسند نہیں کرتا۔" میں اب بھی اسے تحمل سے سمجھا رہا تھا۔

"اگر میں تمہاری دھونس دھاندلی سے مجبور ہو کر تمہارے الزام کو درست تسلیم کر لوں تب بھی بائیس لاکھ بہت بڑی رقم ہے۔ اس میں کمی ہونی چاہئے۔ بائیس لاکھ تو میں نے پچھلے پورے سال میں بھی نہیں کمایا۔ یہ سال بھی مندا ہی جاتا دکھائی دے رہا ہے۔"

"سودے بازی بالکل نہیں ہو گی۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں تمہارے ہاتھ اسکریپ فروخت نہیں کر رہا ہوں جس کے ریٹ اوپر نیچے کر لئے جائیں۔ تم نے میرا ایک نقصان کیا ہے جس کی تمہیں تلافی کرنی ہے۔ اور بس۔ تم سے پرانے مراسم تھے اس لئے تمہاری اتنی بکواس سن لی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس کے ساتھ میں اتنا وقت ضائع نہ کرتا۔"

"اچھا۔ تو بائیس لاکھ لے کر تم مجھے چھوڑ دو گے؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"بالکل۔ میری تم سے کوئی دشمنی تھوڑی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم واقعی بہت اونچی چیز ہو گئے ہو۔" اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اتنے بے خوف ہو گئے ہو۔ عام طور پر تو زیادہ روپیہ پیسہ آدمی کو بزدل بنا دیتا ہے۔ تمہیں اس کا بھی خوف نہیں کہ میں باہر جا کر کوئی جوابی کارروائی شروع کر سکتا ہوں۔"

"مثلاً ۔۔۔؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مثلاً۔" وہ نظر چراتے ہوئے بولا "میں حکومت کو مخبری کر سکتا ہوں کہ تم درحقیقت کیا ہو ۔۔۔ تمہارا اصل کاروبار کیا ہے۔ میں مختلف ایجنسیوں کو تمہارے پیچھے لگا سکتا ہوں۔"

مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ وہ پیشانی پر شکنیں لئے میری طرف دیکھتا رہا۔ شاید اسے حیرت ہو رہی تھی کہ میں اس کی دھمکی سے خوف زدہ نہیں ہوا تھا۔ شاید اس کے خیال میں یہ ا[illegible] اقدام تھا۔

میری ہنسی تھمی تو میں نے کہا "عالم شیر! تم واقعی ا[illegible] آدمی ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہیں انتہائی احمق یا انتہائی شاطر۔ ایک لمحے میں تم بے پناہ شاطر معلوم ہو[illegible] اور دوسرے ہی لمحے انتہائی احمق۔ میرے بارے میں [illegible] اطلاعات بہت ہی پرانی ہیں۔ یا پھر تمہارا ذہن بس کسی ا[illegible] دور میں ہی اٹکا ہوا ہے۔"

"کیا مطلب؟" اس نے الجھن زدہ لہجے میں پوچھا۔

"میں نے پہلے بھی باتوں باتوں میں کئی بار اشارتاً تمہیں [illegible] لیکن شاید تمہاری ازلی کوڑھ مغزی کی وجہ سے بات تمہا[illegible] میں نہیں آئی۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "میرے سا[illegible] ایسی کوئی کمزوری وابستہ نہیں جس کا سہارا لے کر تم اس [illegible] دھمکیوں سے مجھے بلیک میل کر سکو۔ میرے تمام کاروبار [illegible] قانونی ہیں۔ تمام متعلقہ محکموں میں رجسٹرڈ ہیں۔ میں تمام اقسام کے ٹیکس باقاعدگی سے ادا کرتا ہوں۔ میرے تمام ا[illegible] آڈٹ ہوتے ہیں۔ میرا تمام سرمایہ ڈاکومینٹیشن کے تحت گر[illegible] ہے۔ میرے بارے میں کسی محکمے میں کوئی ایسی فائل کھلی ہو[illegible] ہے جس کے خوف سے مجھے راتوں کو نیند نہ آتی ہو۔ اور نہ [illegible] کوئی فائل کھل سکتی ہے۔"

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے تیزی سے پلکیں جھپکا رہا تھا [illegible] کے چہرے پر ورم سا آنے لگا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے [illegible] کہا "وہ میرا نادانی کا ایک مختصر سا دور تھا جو تمہارے ذہن [illegible] ہے۔ تمہیں یہ بھی یاد نہیں ۔۔۔ یا شاید معلوم نہیں کہ میں نے جلد اس دورِ گمراہی سے پیچھا چھڑا لیا تھا۔ میں نے اپنی اصل[illegible] اپنے جائز کاروباروں سے تعمیر کی ہے۔ میں کسی قسم کے خوف[illegible] سائے میں زندگی نہیں گزار رہا ہوں۔ تمام ایجنسیوں [illegible] سربراہوں' تمام محکموں کے سیکریٹریوں اور اکثر اہم وزیروں[illegible] ان کے دفاتر میں' ہوٹلوں میں اور تقریبات میں ملاقاتیں رہتی [illegible] وہ مجھے بھی جانتے ہیں اور میرے کاروباروں کو بھی۔ سب سے [illegible] اچھے مراسم ہیں۔ کبھی کسی نے اشارتاً بھی مجھے کوئی دھمکی [illegible] دی۔ میں بہت حساب کتاب سے چل رہا ہوں عالم شیر! مجھے [illegible] تھا کہ ہر طرح کے لوگوں سے واسطہ پڑے گا۔ میں قدم قدم پر [illegible] میلنگ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔"

"اور تم گینگ وار سے بھی نہیں ڈرتے؟" عالم شیر نے جھ[illegible] لہجے میں پوچھا۔ "جو کچھ تم میرے ساتھ کر رہے ہو اس کے [illegible] ہمارے درمیان ایک خوف ناک گینگ وار بھی چھڑ سکتی ہے۔"

"گینگ تمہارا ہو گا۔ میرا کوئی گینگ نہیں ہے۔" میں نے [illegible] تصحیح کی "بہت سے شریف اور معزز لوگ میرے ساتھی ہیں۔ میر[illegible] لئے کام کرتے ہیں۔ بس جب کہیں سیدھی انگلیوں سے گھی نہ [illegible]

[illegible] انگلیاں ذرا ٹیڑھی کر لیتے ہیں۔ ہمارا نظریۂ حیات یہ ہے کہ [illegible] کے ساتھ زیادتی مت کرو اور اپنے ساتھ کوئی زیادتی ہونے [illegible] دو۔ بس اتنی سی بات ہے۔ اگر تمہیں ایسا کوئی سلسلہ شروع [illegible] نے کا شوق ہے جسے تم گینگ وار کا نام دے رہے ہو تو وہ بھی [illegible] تمہارا یہ ارمان بھی نکل جائے گا۔ لاشیں اٹھاتے اٹھاتے [illegible] جاؤ گے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا تمہیں کیسے سمجھاؤں!" وہ بے بسی [illegible] کے عالم میں سر ہلاتے ہوئے بولا "تم نے اپنے لئے بہت [illegible] راستے منتخب کر لئے ہیں۔ ان فلمی طور طریقوں کے ساتھ [illegible] زندگی میں گزارا نہیں ہوتا برخوردار! اب بھی وقت ہے' تم اپنی [illegible] احمقانہ تکرار چھوڑو اور مجھے رہا کر دو۔"

"تمہیں یہ طور طریقے فلمی نظر آ رہے ہیں؟" میں نے [illegible] اری سے کہا "فلمی طور طریقے اتنے ٹھنڈے میٹھے نہیں ہوتے۔ [illegible] میں زیادہ ایکشن ہوتا ہے۔ میں چاہتا تو تمہیں فلمی طور طریقوں [illegible] مزہ بھی چکھا دیتا۔ میرے آدمی تمہارے گھر پر بھی چڑھائی کر سکتے [illegible] گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا سکتے تھے۔ تمہارے گارڈز کو ہلاک [illegible] سکتے تھے۔ تمہارے گھر میں موجود تمام نقدی اور زیورات وغیرہ [illegible] کرا سکتے تھے۔ شاید مجھے میرے مطالبے سے زیادہ ہی مل جاتا۔ [illegible] سمگلروں کے گھر میں کافی نقدی اور زیورات وغیرہ پائے جاتے [illegible] لیکن میں ایسے گھٹیا طور طریقے اختیار کرنا پسند نہیں کرتا۔ [illegible] تو ایک معزز اور امن پسند آدمی ہوں۔ اکثر معاملات میز پر بیٹھ [illegible] کر طے کرنا پسند کرتا ہوں۔ بس بعض آدمیوں کو میز تک لانے کے [illegible] لئے تھوڑا سا شارٹ کٹ مارنا پڑتا ہے۔ تم سے بھی نہایت آرام و [illegible] سکون سے تمام معاملہ طے پا سکتا تھا۔ یہ جو تھوڑی سی تمہاری توڑ [illegible] پھوڑ ہوئی ہے یہ تمہاری اپنی بد نظری اور بد کلامی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اور مذاکرات میں تاخیر بھی تمہاری ہی وجہ سے ہو رہی ہے۔ تم [illegible] اچھے تو نہایت باعزت طور پر میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتے' مختصر [illegible] گفتگو کرتے' ادائیگی کا طریقہ طے کرتے اور ادائیگی ہوتے ہی اپنے [illegible] گھر چلے جاتے۔ کتنا آسان تھا یہ سب کچھ۔ تم نے اسے مشکل بنایا ہے۔" میں نے انگلی سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

وہ چند لمحے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ شاید [illegible] اسے اب بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہی میرا نظریۂ حیات ہے' ہمارے طور طریقے یہی ہیں۔ بہر حال اسے غالباً یہ یقین آ گیا تھا کہ ادائیگی اسے کرنی ہی پڑے گی۔ اور یہ اس کے لئے بلاشبہ بہت بڑا صدمہ تھا۔ شاید اسے اپنے جسم پر لگنے والی اچھی بھلی خطرناک ضربات سے اتنی تکلیف نہیں پہنچی تھی جتنی اس موضوع کی طرف آتے ہوئے پہنچ رہی تھی۔ اس کے کندھے یکدم بالکل ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھک گئے۔

"میں رقم کا بندوبست کیسے کروں؟" اس نے شکست خوردہ لہجے میں پوچھا۔

مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ مس ٹرپ نے آواز دی۔ تہ خانے میں ایک طرف چند چھوٹے چھوٹے کمرے بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کمرے کا دروازہ کھلا اور بدرو اس طرح باہر آیا جیسے کوئی ہاتھی اپنے آپ کو سیکڑتا سمیٹتا ہوا کسی ڈربے سے برآمد ہوا ہو۔

بدرو کسی ہاتھی سے کم نہیں تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہاتھی کو دیکھ کر کوئی اتنا خوف زدہ نہیں ہو سکتا تھا جتنا بدرو کو دیکھ کر ہو جاتا تھا۔ وہ بلاشبہ فلموں میں کسی کیمرا ٹرک کے بغیر ہی جن بھوت کا کردار نہایت آسانی سے ادا کر سکتا تھا اور ڈائریکٹر کو بے پناہ داد دلوا سکتا تھا۔

وہ افریقیوں کی طرح سیاہ فام تھا لیکن موٹے موٹے ہونٹ یوں سرخ رہتے تھے گویا ان پر لپ اسٹک لگی ہو اور ان ہونٹوں کے عقب سے جھانکنے والے بڑے بڑے دانت نہایت سفید اور آبدار تھے۔ یہ دانت اس کی سیاہ رنگت کے ساتھ جو قدرتی کنٹراسٹ پیش کرتے تھے' وہ کوئی بڑا میک اپ مین بھی بڑی مشکل سے پیدا کر سکتا تھا۔

اس کا قد تقریباً سات فٹ تھا۔ بازو اور ٹانگیں شہتیروں سے مشابہ تھیں۔ عام طور پر اس جسامت کے آدمی چلتے ہیں تو تھل تھل کرتے ہیں لیکن بدرو کا جسم فولاد کی طرح گٹھا ہوا تھا۔ اس کی چندھیا روشنی میں جھلملاتی تھی۔ اس کی آنکھیں بہت چھوٹی چھوٹی تھیں اور دائیں رخسار پر آنکھ سے لے کر ٹھوڑی تک زخم کا گہرا نشان تھا جس نے آدھے چہرے کو گویا دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ وہ چلتا تھا تو زمین میں ہلکی سی دھمک محسوس ہوتی تھی۔ اسے اچانک دیکھ لینے والا تو اپنی چیخ کو مشکل سے ہی روک پاتا تھا۔

عالم شیر جیسا نڈر اور جہاندیدہ آدمی بھی اسے دیکھ کر سہم کر رہ گیا کیونکہ بدرو مسکراتا ہوا سیدھا اس کی طرف آ رہا تھا۔ اور بدرو کی مسکراہٹ تو بہت ہی غضب ڈھاتی تھی۔ موسم خواہ کچھ بھی ہوتا' بدرو سال کے بارہ مہینے اسی قسم کی ڈھیلی ڈھالی نیکر پہنتا تھا جیسی پرانے زمانے میں سپاہی پہنتے تھے لیکن اس نیکر پر عام آدمی کے سوٹ سے زیادہ کپڑا لگتا تھا' تب یہ بدرو کے لئے ڈھیلی ڈھالی اور بقول اس کے آرام دہ رہتی تھی۔ اگر کوئی ہاتھی تھوڑی سی بے

آرامی برداشت کرنا پسند کرتا تو وہ بھی اسے زیب تن کر سکتا تھا۔

بدرو اپنے بیلچہ نما ہاتھ پر ایک ٹیلی فون سیٹ اٹھائے ہوئے تھا جس کی تار پیچھے گھسٹتی آرہی تھی۔ وہ ایک جھٹکے سے عالم شیر کے سامنے رکا تو عالم شیر کرسی سمیت الٹتے الٹتے بچا۔ بدرو نے کچھ بولے بغیر بدستور مسکراتے ہوئے ٹیلی فون عالم شیر کی گود میں رکھ دیا۔

"تم نے اچھے وقت پر تم نے معقولیت سے کام لینے کا فیصلہ کرلیا۔" میں نے عالم شیر سے کہا "ورنہ تمہاری ضد سے تنگ آکر اب میں تمہیں اس کے حوالے کرنے کا سوچ رہا تھا۔" میں نے بدرو کی طرف اشارہ کیا اور عالم شیر تھوک نگل کر رہ گیا۔ غالباً اسے خود بھی اپنے فیصلے پر خوشی ہوئی تھی۔ بدرو فوراً ہی کمرے میں واپس چلا گیا، تب عالم شیر کی جان میں جان آئی۔

"مجھے کیا کرنا ہے؟" اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

"فون کرو۔" میں نے اس کی گود میں رکھے ہوئے ٹیلی فون سیٹ کی طرف اشارہ کیا "کسی بھی ایسے آدمی کو جو تمہاری ہدایت پر بائیس لاکھ روپے کیش کا انتظام کر سکتا ہو۔ اس سے کہو رقم کل شام تک اپنے پاس تیار رکھے۔ کل اسے بتایا جائے گا کہ رقم کب اور کہاں کوئی اس سے وصول کرنے آئے گا۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے ہدایت کی "کوئی فالتو بات مت کرنا۔ سمجھدار آدمی ہو۔ فی الحال یہ صرف روپے پیسے کا معاملہ ہے۔ اسے زندگی اور موت کی بازی مت بنانا۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ پیشانی سہلاتے ہوئے چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ مجھے اس کی طرف سے تشویش نہیں تھی۔ مس زیب اس کے سر پر کھڑی تھی۔ اس کی نظر اس کی انگلیوں پر اور کان یقیناً اس کی آواز پر تھے۔

عالم شیر نے نہایت شرافت سے فون کیا۔ بات اب اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کا مطلوبہ آدمی پہلے نمبر پر نہیں ملا تھا۔ اس نے ایک اور جگہ فون کیا تو وہ مل گیا۔ اس نے اپنی خیریت کی اطلاع دی، رقم کا انتظام کرنے کے لئے کہا اور کوئی غیر ضروری بات کئے بغیر خود ہی سلسلہ منقطع کر دیا۔

"اب تم ہمارے مہمان ہو۔ اب تمہارے ساتھ باعزت سلوک ہوگا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور مس زیب کو ایک طرف لے جا کر اس کے بارے میں ہدایات دیں اور کہا "رقم وصول کرنے کا معاملہ اب میں ٹونی کے سپرد کردوں گا۔ وہ خود ہی سارے انتظامات کرلے گا۔" اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور میں تہ خانے سے نکل آیا۔

دوسرے روز دوپہر کے قریب ہی ٹونی ایک بریف کیس اٹھائے میرے آفس میں پہنچا۔ نہایت سرسری سے لہجے میں اس نے مجھے اطلاع دی "رقم وصول ہوگئی ہے سر!"

"گڈ" میں نے چند کاغذات پر دستخط کرتے ہوئے کہا "کوئی دشواری تو پیش نہیں آئی؟"

"بالکل نہیں سر!" ٹونی نے جواب دیا "میں نے رقم والے کو پہلے ایک جگہ پہنچنے کی ہدایت کی۔ پھر فون پر اسے [illegible] جگہ پہنچنے کا حکم دیا۔ پھر تیسری جگہ کھلے میدان میں بلایا۔ [illegible] دوران میں نے اس پر نظر رکھی۔ اس کے ساتھ کوئی سادہ لباس [illegible] یا کوئی مشکوک آدمی نہیں تھا۔ نہایت پُرسکون انداز میں میں [illegible] اس سے رقم وصول کرلی۔ اس نے ہدایات پر حرف بہ حرف [illegible] تھا۔ وہ عالم شیر کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کے تمام کاروبار [illegible] شریک ہے۔"

"کچھ پوچھا تو نہیں اس نے؟" میں نے دریافت کیا۔

"وہ کافی خوف زدہ نظر آرہا تھا سر!" ٹونی نے جواب دیا دیتے وقت اس نے صرف اتنا پوچھا کہ حاجی صاحب کو کب چھوڑ دیا جائے گا۔"

"تم نے کیا جواب دیا؟"

"یہی کہ رقم چیک ہونے کے صرف ایک یا دو گھنٹے بعد [illegible] چھوڑ دیا جائے گا۔ رقم میں نے چیک کرلی ہے۔ پوری ہے۔ [illegible] بھی اصلی ہیں۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے فائل سے نظر ہٹائے بغیر کہا "یہ جنرل منیجر کو دے دو اور بتادو کہ یہ کراچی ٹرانسفر ہوگی۔ تم دو نمبر [illegible] جاؤ اور حاجی صاحب کو صحیح طریقے سے کسی مناسب جگہ پر پہنچا [illegible] آدمی سخت کینہ پرور ہے۔ اس کی طرف سے آئندہ بھی ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی۔"

"میں کچھ عرصے کے لئے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں [illegible] اس پر نظر رکھے گا۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"خیر۔۔۔ اب اتنے بھی تردد کی ضرورت نہیں۔ اللہ مالک ہے۔" میں نے درویشانہ لہجے میں کہا "اگر اس نے آئندہ کو بدمعاشی کی تو اسے زیادہ سخت سزا دیں گے۔"

ٹونی رخصت ہوگیا تو میں نے شفیع شاہ کو کراچی فون کیا [illegible] ہدایت کی "عالم شیر کے آدمیوں اور لانچ کو چھوڑ دو۔ ارشد [illegible] کے گھر دس لاکھ روپے پہنچا دو اور آئندہ بھی اس کی بیوہ اور بچوں [illegible] خبر رکھنا۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ جرمانہ وصول ہو [illegible] ہے۔ تم چاہو تو نئے ٹرالر کا آرڈر بھی دے سکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے سر!" شفیع شاہ نے جواب دیا "آپ سے دو تین بہت ضروری باتیں کرنا تھیں۔ باتیں بہت اہم اور تفصیل طلب ہیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ لاہور کا ایک چکر ہی لگالوں۔ لیکن کا[م] اتنے پھیلے ہوئے ہیں کہ ایک لمحے کی بھی فرصت نہیں مل رہی۔"

"مختصراً فون پر ہی کرلو وہ باتیں۔" میں نے کہا "تفصیلات بعد میں بیٹھ کر طے کرلیں گے۔"

"سر! ایک تو ہوٹل کے بارے میں پوچھنا ہے۔ ہوٹل کے سب کام مکمل ہوچکے ہیں۔ اسٹاف تک رکھ لیا گیا ہے۔ اگلے [ہفتے] اس کی تشہیری مہم شروع ہو رہی ہے۔ اس کی اوپننگ کا [پروگ]رام طے کرنا تھا۔" شفیع شاہ بولا "جس ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے [پاس] ہماری پبلسٹی کمپین ہے، افتتاح کی تقریب کے انتظامات کا ٹھیکا [بھی] میں اسی کو دے رہا ہوں۔ اس سلسلے میں اگر آپ کی کچھ خاص [ہدای]ات ہوں۔۔۔"

"بھئی مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹتے [ہوئ]ے کہا "ایسے کام تم مجھ سے بہتر طور پر آرگنائز کرلیتے ہو۔ جس [طر]ح دل چاہے کرتے رہو۔ بس اوپننگ کی تاریخ طے کرکے مجھے [اطل]اع دے دینا۔ میں اس کے مطابق اپنا شیڈول بنالوں گا۔ بس [میں] تو صرف اتنا چاہتا ہوں کہ اوپننگ ہو تو شہر میں دھوم مچ [جائ]ے۔ ہر شعبۂ زندگی کے مشہور ترین لوگ اس روز ڈنر میں موجود [ہو]نے چاہئیں۔ ملک کے سب سے اونچے طبقے کے سب سے اونچے [افر]اد کو اپنی طرف کھینچنے کے لئے تمہیں جو بھی طریقہ اختیار کرنا [پڑ]ے کرو۔ جس کی بھی خدمات حاصل کرنی پڑیں کرو۔ روپیہ پانی کی [طر]ح بہاؤ، کسی بات کی پروا مت کرو۔"

"روپیہ تو پانی کی طرح بہہ ہی رہا ہے سر!" شفیع شاہ بولا "ہوٹل [کی] دھوم تو شہر میں اس کے افتتاح سے پہلے ہی مچ چکی ہے۔ افتتاح [کی] تقریب کو بھی میں آپ کے خیالات کے عین مطابق بنانے کی [ک]وشش کروں گا۔ اس پر کام تو شروع ہوچکا ہے۔ ہر بڑے شہر میں، ہر شعبۂ زندگی کی اہم ترین شخصیات سے رابطہ قائم کیا جارہا ہے۔ ایڈورٹائزنگ ایجنسی نے اس سلسلے میں مختلف کاموں کے لئے [تھ]وڑے تھوڑے آدمیوں کی کئی کمیٹیاں بنادی ہیں۔ فائنل رپورٹ [تی]ار ہوتے ہی میں آپ کے پاس بھیج دوں گا۔ جب آپ اس کی [م]نظوری دے دیں گے تو صرف تاریخ طے کرنے کا کام رہ جائے گا۔ اس میں بہت اعلیٰ درجے کے ایک ورائٹی پروگرام کی تیاریاں بھی ہو رہی ہیں جو ہم اپنے ہوٹل کے آڈیٹوریم میں پیش کریں گے۔ افتتاح کی تقریب پوری رات چلے گی۔ اگر پروگرام زیادہ پھیلا تو ہم ان تقریبات کو دو یا تین راتوں تک لے جائیں گے۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے تائید کی "یہ سب کچھ تمہیں ہی کرنا ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ بڑے پروجیکٹس میں عموماً مالکان بے چارے تو پس منظر میں ہی رہتے ہیں۔ ان کا کام تو روپیہ فراہم کرنا ہوتا ہے۔ بے شمار لوگ کام کرتے رہتے ہیں۔ تم بھی جتنے لوگوں کی چاہو خدمات حاصل کرو۔ بس ان کو کمان کرنا تمہارا کام ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تم وہاں موجود ہو تو مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ دوسرا کیا مسئلہ ہے؟"

"کل سیٹھ واحد نے مجھے اپنی کوٹھی پر ایک پرائیویٹ ڈنر پر بلایا تھا۔ بہت طویل گفتگو رہی اس سے۔" شفیع شاہ بولا "وہ کہہ رہا تھا، تم لوگوں کے پاس اتنی مین پاور ہے، اتنا روپیہ ہے۔ پھر یہ تم نے بڑے اور صاف ستھرے کاروباروں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے اور گندے گندے کاروبار کیوں شروع کر رکھے ہیں۔۔۔"

"کون سے کاروباروں کو چھوٹا اور گندا کہہ رہا تھا وہ؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا اشارہ ٹرالروں کے ذریعے ماہی گیری کے کاروبار کی طرف تھا۔" شفیع شاہ نے جواب دیا۔

"گدھا ہے وہ۔" میں نے کہا "اسے تو ہر شریفانہ کاروبار چھوٹا اور گندا نظر آتا ہے۔ یہی ٹرالر اگر آس پاس کے ملکوں سے دھڑا دھڑ مال اسمگل کر رہے ہوتے تو وہ ان میں بڑی دلچسپی لیتا۔ اس نے اسی قسم کے کسی کام کی پیشکش تو نہیں کی؟"

"نہیں سر!" شفیع شاہ بولا "وہ بچ بچ بڑے کاروباروں کی بات کر رہا تھا۔ اس نے مجھے حامد مصطفیٰ سے ملوایا۔ وہ بہت ہی خاص ڈنر تھا۔ اس میں صرف چار آدمی ہی مدعو تھے۔ مہمانِ خصوصی حامد مصطفیٰ ہی تھا۔ آپ اسے جانتے ہیں نا سر؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"کیوں نہیں۔ گو کہ وہ یہاں یعنی اپنے ملک میں کم ہی جانا پہچانا جاتا ہے لیکن میں بہرحال اسے جانتا ہوں۔ لندن میں ایک بار اس سے ملاقات بھی ہوئی تھی۔ بہت بڑی شپنگ کمپنی ہے اس کی۔ غالباً چار سو بحری جہاز ہیں اس کے پاس۔ لیکن پاکستانی ہونے کے باوجود اس نے اپنی کمپنی اٹلی میں قائم کی تھی اور وہیں اس کا ہیڈ کوارٹر بنا رکھا ہے۔ وہ یہاں کے نظام، بیوروکریسی اور اس قسم کی دوسری

چیزوں سے بہت بے زار تھا۔ اس نے یہاں پاؤں جمانے کی کوشش ہی نہیں کی۔ آغاز ہی باہر سے کیا تھا۔"

"بالکل ٹھیک ہے سر! یہ وہی آدمی ہے۔" شفیع شاہ بولا "اس کے پاس چار سو نہیں پانچ سو بحری جہاز ہیں۔ ایک ائرلائن میں بھی اس کے شیئر ہیں۔ رئیل اسٹیٹ کی اس کی ایک بین الاقوامی ایجنسی ہے جو دنیا کے مہنگے ترین مقامات پر جائیداد کی خرید و فروخت کا کام کرتی ہے۔ معزول اور برسرِ اقتدار' ہر طرح کے بادشاہ' شیوخ اور دنیا کے امیر ترین افراد اس ایجنسی کے توسط سے محلات' حویلیاں اور وِلاز خریدتے ہیں لیکن انہیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس ایجنسی کے پیچھے اصل شخصیت کون ہے۔ اس کاروبار میں دنیا کا ایک بہت مشہور بینکر اس کا پارٹنر ہے۔ اور بھی بہت سے کاروبار ہیں ان کے۔"

"بہت خوب! یہ مجھے معلوم نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"یہ باتیں بہت کم لوگوں کو معلوم ہیں سر!" شفیع شاہ بولا "اس نے گویا کمال مہربانی سے ہمیں اپنے دوستوں میں شمار کرتے ہوئے اور بھی کئی باتیں بڑے خوشگوار موڈ میں مجھے بتائیں۔ دنیا کی کئی بڑی مشہور اداکارائیں جائیداد کے کام میں اس کی مدد کرتی ہیں اور اس سے کمیشن لیتی ہیں۔ وہ تھوڑے عرصے کے لئے کوئی جائیداد خرید لیتی ہیں۔ بعد میں چھوڑ دیتی ہیں لیکن اس کی ویلیو بڑھ جاتی ہے۔ بات بن جاتی ہے۔ مثلاً یہ وہ کیسل ہے جس میں الزبتھ ٹیلر رہتی تھی۔ یا یہ وہ حویلی ہے جسے ایوا گارڈنر نے اپنا بڑھاپا گزارنے کے لئے خریدا تھا۔ ایجنسی اس کے علاوہ بھی کئی طرح کے تشہیری حربے استعمال کرتی ہے جس سے جائیداد کی قیمت میں لاکھوں ڈالر کا اضافہ ہو جاتا ہے۔"

"کون کہتا ہے کہ پاکستانی لوگ بین الاقوامی سطح پر کاروبار کرنا نہیں جانتے۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "انہیں اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملے تو یہ دنیا کے کان کتر دیں۔ خیر یہ بتاؤ کہ وہ ہم پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا ہے؟"

"میرا اپنا اندازہ ہے سر۔" شفیع شاہ محتاط سے انداز میں بولا۔ "کہ پاکستانی دنیا میں کہیں بھی چلا جائے' کتنا ہی بڑا آدمی بن جائے' اسے اپنے ملک سے اور یہاں کے نظام سے خواہ کتنی ہی شکایتیں ہوں لیکن اس کا دل یہاں ضرور اٹکا رہتا ہے۔ حامد مصطفیٰ کو بھی اب یہاں حالات ذرا سازگار نظر آرہے ہیں تو وہ یہاں بھی پاؤں پھیلانا چاہتا ہے۔ وہ کسی ایسی پارٹی کو ساتھ ملانا چاہتا ہے جس کے پاس صرف روپیہ اور ساکھ ہی نہیں بلکہ بہت سی جرأت بھی ہو۔ جو ہر سیدھے یا ٹیڑھے طریقے سے اپنا کام کرالینا جانتے ہوں' جن کا کوئی کام اٹکتا نہ ہو' جنہیں کوئی تنگ کرنے کی جرأت نہ کرتا ہو۔"

"شفیع! ہماری شہرت کیا بیرونِ ملک بھی پہنچنے لگی ہے؟" میں نے حیرت سے کہا "ٹھیک ہے کہ ہم بڑی پارٹیوں میں شمار ہوتے ہیں لیکن اتنی بڑی پارٹی بھی نہیں ہیں۔ اس ملک میں بڑی بڑی چیزیں پڑی ہیں۔"

"میں نے جو اندازے قائم کئے ہیں سر۔" شفیع بولا "ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہماری سفارش سیٹھ واحد نے کی۔ وہ آپ کی اصول پسندی اور دوسرے طور طریقوں وغیرہ سے متاثر ہے۔ وہی آپ کو زیادہ بہتر طور پر جانتا بھی ہے۔ وہ اس سے بہت زیادہ حیران بھی ہے کہ آپ نے کم سے کم عرصے میں زیادہ سے زیادہ ترقی کرنے کا ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔"

"شفیع ڈیئر! میں اس میں اپنا کوئی خاص کمال محسوس نہیں کرتا۔ مجھے تو بس ایسا لگتا ہے کہ یہ سب کچھ خود بخود ہوتا چلا گیا ہے۔ اب تم بھی دیکھ لو کہ حامد مصطفیٰ کو ہم نے اپروچ نہیں کیا' اس نے ہمیں اپروچ کیا ہے۔ بڑا آدمی چل کر چھوٹے آدمیوں کے پاس آرہا ہے۔" میں نے کہا "بس اسی طرح میرے اکثر کام خود بخود ہوتے چلے گئے ہیں۔ میں نے ان کے لئے دن رات ایک نہیں کیا۔ میں نے اگر شدید محنت کی ہے تو وہ صرف اپنی زندگی کے ابتدائی دور میں کی ہے۔"

"یہ آپ کی انکساری ہے سر!" شفیع بولا "ہم تو آج بھی دن رات کے کسی بھی لمحے میں آپ کی ضرورت محسوس کرتے ہیں تو آپ کو مستعد و بیدار پاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ ہر وقت' ہر جگہ ہماری پشت پناہی کے لئے موجود ہوتے ہیں۔ کبھی آرام نہیں کرتے اور گویا کبھی سوتے بھی نہیں۔ آپ کے اس طرزِ عمل کی وجہ سے ہمیں کبھی لاہور اور کراچی کے درمیان فاصلے کا احساس نہیں ہوا۔"

"یہ تو تمہاری محبت ہے کہ تم لوگ ایسا محسوس کرتے ہو۔ میری آنکھیں اور میرا دماغ تو دراصل تم لوگ ہو جو ہر وقت بیدار رہتا ہے۔" میں نے خلوصِ دل سے کہا "ورنہ میں تو آرام بھی کرتا ہوں۔ زندگی کی ہر تفریح' ہر آسائش سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میں نے کاروبار اور اس کے تفکرات کو کبھی اپنے سر پر سوار نہیں ہونے دیا۔ میں کاروباری مسائل سے نمٹتا ضرور ہوں لیکن ان کی فکر میں ہلکان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ میں پچھلے کئی سال سے رسمی چیک اپ کے لئے بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں گیا۔ خیر' ان باتوں کو چھوڑو' یہ بتاؤ کہ حامد مصطفیٰ نے کھل کر کوئی بات کی؟"

"اصل باتیں تو وہ آپ سے ہی کرے گا سر!" شفیع بولا۔ "میرے ذریعے تو اس نے صرف تمہید باندھی ہے۔ صبح وہ روم واپس جا رہا ہے۔ کچھ عرصے بعد زیادہ وقت کے لئے آئے گا۔ میرا خیال ہے تب وہ آپ سے ملاقات طے کرے گا۔ میں کوشش کروں گا کہ اسے ہوٹل کے افتتاح پر بھی مدعو کروں اور وہ واقعی آسکے۔ شاید تبھی باتیں ہو جائیں۔ ویسے وہ بہت ہنگامہ خیز دن ہوگا۔ شاید اس قسم کے مذاکرات کے لیے وقت نہ نکل سکے۔"

"مجھے اگر کوئی کام کرنا ہوتا ہے تو میں اس کے لئے ضرور وقت نکال لیتا ہوں۔ کوئی کام کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو تو بات دوسری ہے۔" میں نے کہا "یہ بتاؤ تمہیں وہ کیسا آدمی لگا؟"

"آدمی معقول ہے سر!" شفیع شاہ نے رائے دی۔ میں اس مختصر اور جامع رائے کا مطلب سمجھتا تھا۔ یعنی وہ حامد مصطفیٰ کے ساتھ کسی قسم کا اشتراک کرنے کے حق میں تھا۔

"اگر تمہاری رائے اس کے بارے میں اچھی ہے تو پھر اس کے ساتھ مل کر کام کرنے کے بارے میں ضرور کچھ سوچیں گے۔" میں نے کہا "ویسے سیٹھ واحد خود اس کے ساتھ کسی قسم کی پارٹنر شپ کیوں نہیں کر رہا؟ سیٹھ واحد ہم سے چھوٹی پارٹی تو نہیں ہے۔"

"میں ایک بار پھر اپنے اندازوں ہی کی بات کروں گا۔۔۔" شفیع ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"تم بلا جھجک اپنے اندازے سے بات کرو۔ مجھے معلوم ہے' ان کے معاملات میں تمہارے اندازے ہی درحقیقت بہترین ثابت ہوتے ہیں۔ وہ اندازے نہیں' ننانوے فیصد حقائق ہی ہوتے ہیں۔ تم محض ازراہِ انکساری انہیں اندازے کہتے ہو۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اور یہ حقیقت تھی۔ کراچی میں میرے کاروباروں کو سنبھالنے کے سلسلے میں شفیع شاہ درست ترین آدمی ثابت ہوا تھا۔

"میرا خیال ہے سیٹھ واحد کی تو حامد مصطفیٰ کے ساتھ ملنے کی بڑی خواہش تھی لیکن حامد مصطفیٰ ہی اس سلسلے میں کنّی کترا گیا۔ اور میرے اندازے کے مطابق اس کی واحد وجہ یہی ہے کہ سیٹھ واحد کی یہاں ساکھ کچھ اچھی نہیں ہے۔ حامد مصطفیٰ ایسے کسی آدمی سے پسِ پردہ تو تعارف کا طلب گار ہو سکتا ہے لیکن اس سے کوئی باضابطہ قسم کی پارٹنر شپ کرنا مصلحت کے خلاف سمجھتا ہے۔ حالانکہ ویسے میرے اندازے کے مطابق سیٹھ واحد کرنسی وغیرہ کے معاملے میں حامد مصطفیٰ کی مدد کرتا رہتا ہے۔ دنیا کے بڑے سے بڑے بزنس مین کو بھی اس زمانے کی تمام تر سہولتوں کے باوجود کسی وقت بھی' دنیا کے کسی بھی حصے میں کرنسی کا کوئی مسئلہ پیش آسکتا ہے اور سیٹھ واحد یہاں بیٹھے بیٹھے چٹکی بجاتے میں اس کا مسئلہ حل کر سکتا ہے۔ کرنسی اس کی خصوصی فیلڈ ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔" میں نے کہا "خود میری بھی اس نے ایک مرتبہ مدد کی تھی۔ اور بغیر کسی منافع یا لالچ کے کی تھی۔ ہانگ کانگ میں اس نے ایک پارٹی کو دو ملین ڈالر فراہم کئے تھے لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ میری مدد کر رہا ہے۔ وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ ایک وزیر کی مدد کر رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہم پر براہِ راست مہربان نہیں۔ میرے ساتھ اس کا سلوک شروع سے اچھا رہا ہے۔ بلکہ جب ہم اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے تب مجھ سے اس کے معاملے میں دو ایک سنگین غلطیاں بھی ہوئیں لیکن اس نے بڑی فراخدلی سے ہمیں معاف کر دیا۔"

"مجھے یاد ہیں وہ سب باتیں سر!" شفیع شاہ بولا "اس وقت ہم لوگ بہت کم عمر اور اناڑی تھے۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ہم پر مہربان ہے۔ مہربان نہ ہوتا تو حامد مصطفیٰ سے ہمارا معاملہ کرانے میں یوں پیش پیش نہ رہتا۔"

"اور کون سے مسائل تھے جن کے بارے میں تم بات کرنا چاہ رہے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"بس ۔۔۔ اور کوئی خاص بات نہیں ہے۔ باقی مسائل کے بارے میں' میں خود ہی فیصلہ کرلوں گا۔ میں نے آپ کا کافی وقت لے لیا ہے۔" شفیع بولا "شاید مجھے جلد کراچی سے لاہور کے درمیان شٹل کاک بننا پڑے۔ لگتا ہے' بہت سے کاموں کے سلسلے میں بہت آنا جانا رہے گا۔"

"میں بھی تم سے ملاقات کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔" میں نے کہا "بزنس کے علاوہ بھی کچھ معاملات میں مشورے کرنے ہیں۔ اگر تم جلد نہ آسکے تو شاید مجھے ہی کراچی کا چکر لگانا پڑے۔"

"کوئی خاص مسئلہ ہے تو ابھی حکم دے دیجئے سر!" وہ فوراً بولا۔

"نہیں۔ وہ فون پر کرنے والی باتیں نہیں ہیں۔ فون پر جتنی باتیں کرلی ہیں وہی کافی ہیں۔ خدا حافظ۔"

"خدا حافظ سر!" اس نے کہا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

اسی شام مجھے ملتان روڈ پر آٹھ دس میل آگے ایک جگہ زمین دیکھنے جانا تھا۔ میری کمپنی کے مالی مشیروں نے کمپنی کو چند ہزار ایکڑ یہ زمین خریدنے کا مشورہ دیا تھا۔ وہ کسی زوال پذیر زمیندار کی زمین تھی۔ کسی زمانے میں زرعی تھی۔ اب بنجر ہو چکی تھی اور بہت سستی مل رہی تھی۔

فی الحال اس کا کوئی استعمال نظر نہیں آرہا تھا لیکن مشیروں کا کہنا تھا کہ کچھ ہی عرصے میں اس کے بہت سے استعمال نکل آئیں گے۔ اس پر کوئی ہاؤسنگ اسکیم بھی بن سکے گی' کوئی انڈسٹری بھی لگائی جا سکے گی یا فارمنگ کی جا سکے گی۔ اس دوران آہستہ آہستہ اس کے نقائص دور کرنے اور اس کو ڈیولپ کرنے کا کام بھی مکمل ہو جائے گا۔

کمپنی تمام معاملات طے کر چکی تھی۔ آج مجھے صرف ایک نظر زمین کو دیکھنے اور ایک طرح سے سودے کی حتمی منظوری دینے کے لئے جانا تھا۔ زمیندار کا نام افضال شاہ تھا اور اس سے میری ملاقات زمین پر ہی طے پائی تھی۔ نقشہ وغیرہ میں نے دیکھ لیا تھا' نشانیاں سمجھ لی تھیں۔ میرا ارادہ تھا کہ تنہا ہی جا کر ایک نظر دیکھ آؤں گا۔ زیادہ دیر کا کام نہیں تھا۔ رات کو مجھے چیمبر آف کامرس کے ایک ڈنر میں شرکت کرنی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ وہاں سے واپسی پر سیدھا ہوٹل ہی چلا جاؤں گا۔

آفس سے اٹھ کر میں اس کام کے لئے روانہ ہو گیا۔ ٹونی اور شبیر شیخ شاید ابھی عالم شیر کو محفوظ طریقے سے واپس پہنچانے کے

مشن سے فارغ نہیں ہوئے تھے لیکن میری نگرانی کے کام سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ وہ سردار اور حنیف کی ڈیوٹی لگا گئے تھے۔ سفید گاڑی بدستور میرے تعاقب میں تھی۔ میں طوفانی رفتار سے روانہ ہوا۔ میرے پاس وقت زیادہ نہیں تھا اور مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ زمیندار جو میری اطلاعات کے مطابق خاصا شریف آدمی تھا' سڑک کے کنارے اپنی جیپ میں میرا انتظار کر رہا ہو گا۔

اسٹوڈیوز کا سلسلہ بھی بہت پیچھے چھوڑنے کے بعد ویران ہائی وے پر کئی میل کا فاصلہ میری طاقتور اور بھاری بھرکم مرسیڈیز نے گویا لمحوں میں طے کر لیا۔ مطلوبہ لوکیشن پر پہنچنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ اندازاً اس جگہ کے قریب پہنچنے پر میں نے رفتار کم کی۔ دور ہی سے میں نے سڑک کے کنارے نشیب میں ایک کھلی جیپ کھڑی دیکھ لی تھی جس کے قریب تین دیہاتی قسم کے بندوق بردار کھڑے آنکھیں سکیڑے منتظر نگاہوں سے سڑک کی طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے گاڑی' جیپ کے قریب لے جا روکی۔ اسٹیئرنگ وہیل پر تقریباً چالیس کی عمر کا ایک گورا چٹا اور ہینڈسم شخص موجود تھا۔ اس نے جیپ سے اتر کر نہایت گرمجوشی سے مجھ سے مصافحہ بلکہ معانقہ بھی کیا۔

"آپ یقیناً افضل چوہدری ہیں۔" اس نے شستہ انگریزی میں کہا "اس وقت' اس جگہ آکر رکنے والے کو افضل چوہدری ہی ہونا چاہئے' مجھے افضال شاہ کہتے ہیں۔" اس کا لہجہ آکسفورڈ کے پڑھے ہوئے پاکستانیوں والا تھا۔ اب میں اس لہجے کو نہ صرف پہچاننے لگا تھا بلکہ اسے اپنانے پر بھی قادر تھا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ لیکن زیادہ خوشی اس وقت ہو گی جب زمین کا سودا طے پا جائے گا۔" میں نے اسی لہجے میں جواب دیا حالانکہ مجھے آکسفورڈ تو کیا اپنے ملک کی بھی کسی یونیورسٹی میں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

"چوہدری صاحب! سودا تو آپ کی کمپنی کے ذمے دار لوگوں سے تقریباً طے ہی ہو چکا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ کو بھی اس میں اعتراض کی کوئی گنجائش نظر نہیں آئے گی۔" وہ اعتماد سے بولا۔ پھر اس نے سڑک پر ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "آپ کے ساتھ کوئی نہیں ہے کیا؟"

حنیف اور سردار گاڑی آگے لے جا کر یقیناً کسی چیز کی آڑ میں چھپ چکے تھے۔ میرے آدمی کبھی کسی کو یہ محسوس ہونے کا موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ میرے ساتھ ہیں یا میری نگرانی کر رہے ہیں۔

"یا میرے ساتھ کسی کو ہونا چاہئے تھا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ دراصل آپ پہلی بار یہ زمین دیکھنے کے لئے آ رہے تھے۔ اور پھر اتنے بڑے بزنس مین ہیں آپ تو۔ مجھے امید نہیں تھی کہ کالج کے لڑکوں کی طرح بے فکری سے سیٹی بجاتے ہوئے آپ اکیلے ہی آجائیں گے۔" وہ معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا۔

"اب کام صرف میرا ہی رہ گیا ہے اس لئے میں اکیلا آگیا۔" میں نے ایک نظر اس کے بندوق برداروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی پرانی سی بندوقیں سنبھالے سپاٹ چہرے لئے کھڑے تھے۔

پھر میں نے چاروں طرف دیکھا اور کہا "آپ بس مجھے ایک نظر زمین دکھا دیجئے۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے چوہدری صاحب! آپ بیٹھ کر سکون کی سانس تو لیں۔ زمین بھی دکھا دیں گے۔" وہ میرا کندھا تھپک کر بولا۔ پھر وہ چاروں طرف ہاتھ گھماتے ہوئے گویا بڑے تذکرہ بولا "کسی زمانے میں یہ ساری زمینیں ہی ہماری ہوا کرتی تھیں۔"

اردگرد جو زمین نظر آ رہی تھی اس میں سے بیشتر بنجری تھی حالانکہ اس میں معمولی سا تھور تھا جسے کلر کہا جاتا تھا۔ اس کے علاج کی کوئی نہ کوئی تدبیر کی جا سکتی تھی۔ پھر وہ سر جھٹک کر بولا "آپ میری جیپ کے پیچھے پیچھے آجائیے۔ ڈیرے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ پھر زمین دیکھنے نکلیں گے۔"

میں نے گھڑی دیکھی' ابھی ڈنر میں خاصا وقت باقی تھا۔ میں گاڑی میں جا بیٹھا۔ اس کے آدمی اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھ گئے اور جیپ ایک پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ میں نے گاڑی اس کے پیچھے لگا دی۔ دھول اڑاتی جیپ کے پیچھے دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد مجھے اس ویرانے میں ایک طرف چند کچے پکے گھر نظر آئے' دو چار مویشی بھی درختوں کے نیچے بندھے ہوئے تھے۔ چند بچے ادھر اُدھر کھیل رہے تھے۔ وہ ہماری گاڑیوں کے پیچھے لگنے کے بجائے افضال شاہ کو دیکھ کر گھروں میں گھس گئے۔

افضال شاہ نے جیپ ایک بہت بڑے پختہ کمرے کے سامنے لے جا روکی جو سب سے الگ تھلگ چند ٹنڈ منڈ درختوں کے درمیان کھڑا تھا۔ دروازہ کھلا ہی تھا اور وہاں بھی ایک بندوق بردار موجود تھا۔ ہم گاڑیوں سے اتر کر اندر پہنچے۔ کمرا اچھا بھلا آراستہ پیراستہ تھا۔ قالین اور صوفے تک موجود تھے۔ حالت بتا رہی تھی کہ ویسے تو مدتوں سے یہ کمرا استعمال نہیں ہوا تھا لیکن آج خاص طور پر اس کی جھاڑ پونچھ کی گئی تھی۔ چھت میں لکڑی کے تختوں اور بھاری کپڑوں سے بنے ہوئے دو پنکھے بھی لٹکے ہوئے تھے جنہیں رسّی کھینچ کر ہلایا جاتا تھا۔ یہ پنکھے میں نے ایک طویل عرصے کے بعد دیکھے تھے۔ شاید کسی زمانے میں اس ڈیرے پر خوب رونقیں رہی ہوں۔

آج نئے سرے سے کچھ رونقیں بیدار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ کھلے میدان میں عارضی چولہے وغیرہ بنا کر دو تین آدمی مرغیاں روسٹ کر رہے تھے۔ اور بھی نہ جانے کیا کچھ پکا رہے تھے۔ پانی کا ایک بڑا سا لوہے کا کولر بھی ایک طرف کھڑا ہوا تھا۔ فضا میں بہت ... انداز کی اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ میرے ... کا ساتی ذرا کسمسایا لیکن میں نے اسے دو چار تھپکیاں دے ...

... ہم صوفوں پر بیٹھ چکے تو میں نے باہر کی طرف اشارہ کرتے ... پوچھا "یہ سارا اہتمام کس کے لئے ہو رہا ہے؟"

"آپ ہی کے لئے ہو رہا تھا۔" افضال شاہ مسکراتے ہوئے ... "میں نے کہا نا' کہ مجھے اندازہ نہیں تھا' آپ اکیلے آئیں ... مجھے واضح طور پر کچھ بتایا نہیں گیا تھا۔"

"دراصل واضح طور پر میں نے ہی کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ ...رت چاہتا ہوں۔ میں کچھ دوسرے معاملات میں غیر متوقع طور پر ...یا تھا۔" میں نے کہا۔

"بہرحال مجھے امید ہے کہ آپ اس ذرا مختلف قسم کے ڈنر ...لطف اندوز ہوں گے۔" وہ بولا "پکنک کے انداز میں کھانے کا کچھ ...ہی لطف ہوتا ہے۔ اگر آپ پسند کریں تو کھانے سے پہلے پینے ...نے کا بھی انتظام ہے۔ وسکی' وائن' بیئر سب کچھ موجود ہے۔ کچھ ...کریں گے آپ؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا "یہ شوق میں نے ...ں پالے۔ اور کھانے کے چکر میں پڑنے کا میرے پاس وقت نہیں ...ہے۔ گو کہ خوشبوئیں سونگھ کر میرا شدت سے دل چاہ رہا ہے کہ ...ٹ ٹائی اتار کر' آستینیں چڑھا کر ان سب چیزوں پر ٹوٹ پڑوں ...ن وعدے کی مجبوری آن پڑی ہے۔ وعدہ کہیں اور کھانا کھانے کا ...ہے یا پھر یہ کہنا چاہئے کہ اوپر والے نے مہر کہیں اور کے رزق پر لگا ...دی ہے۔"

اس کے چہرے پر مایوسی کی ایک لہر آکر گزر گئی' جیسے اسے ...پنے انتظامات ضائع جانے کا قدرے افسوس ہوا ہو۔ وہ بغور میری ...طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ میرے اندازوں سے بہت مختلف ...دی ہیں چوہدری صاحب! آپ کی عمر بھی میرے اندازے سے ...کہیں کم ہے۔ اور میں چونکہ ایک طویل عرصے سے ملک سے باہر ...رہا ہوں اس لئے یہاں کے بڑے لوگوں کے بارے میں میری ...معلومات اپ ٹو ڈیٹ نہیں ہیں۔"

"اگر آپ کو مجھ سے مل کر مایوسی ہوئی ہے تو میں معذرت خواہ ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ مجھے خوشی ہوئی ہے۔" اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"تو پھر اسی خوشی میں زمین ایک نظر مجھے دکھا دیجئے۔" میں نے کہا۔

"سانس تو لیجئے' ابھی چلتے ہیں۔" وہ بولا۔ اس دوران اس کے ...نوکر صاف ستھرے برتنوں میں بڑی تمیز اور سلیقے سے کولڈ ڈرنکس لے آئے۔ یہ انہوں نے اچھا کام کیا تھا۔ موسم خاصا سرد ہونے کے باوجود میں کولڈ ڈرنک کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ کولڈ ڈرنک ختم کر کے ہم اٹھ کھڑے ہوئے اور باہر آگئے۔

"آپ میرے ساتھ جیپ میں بیٹھنا پسند کریں گے یا میں آپ کے ساتھ گاڑی میں آجاؤں؟" افضال شاہ نے پوچھا۔

"آپ ہی میرے ساتھ گاڑی میں آجائیں۔" میں نے کہا۔

اس نے جیپ کی چابی اپنے آدمیوں کو دے دی اور میرے ساتھ گاڑی میں آبیٹھا۔ میں نے اس کی ہدایت کے مطابق اونچے نیچے راستوں پر گاڑی چلانا شروع کر دی۔ اس کے آدمی جیپ میں پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔

وہ کچے پکے گھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ایک مدت ہوئی ہماری زمینیں اُجڑ چکی ہیں لیکن ہم نے اپنے کچھ مزارعوں کو ابھی تک فارغ نہیں کیا۔ یہ اسی طرح یہاں رہتے آ رہے ہیں۔ اپنے اپنے کام کرتے ہیں لیکن ہماری طرف سے بھی انہیں مالی امداد ملتی ہے۔ بس یہ ایک طرح سے زمینوں کے محافظ ہیں۔ بہت اچھے' بہت جاں نثار لوگ ہیں۔ اگر آپ نے یہ زمین خرید لی تو خواہ اس کا کوئی بھی مصرف نکالیں لیکن کوشش کیجئے گا کہ ان لوگوں کو بھی اس میں ایڈجسٹ کر سکیں۔ یہ آپ کا مجھ پر ذاتی احسان ہو گا۔ ہمارے بے شمار مزارعوں میں سے بس یہ تھوڑے سے لوگ رہ گئے ہیں جنہیں نہ تو میں اُجڑتے دیکھنا چاہتا ہوں اور نہ ہی یہ خود اس زمین سے ناتا توڑ کر کہیں جانا چاہتے ہیں۔"

"آپ کو ان کے محسوسات کا تو اتنا خیال ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن آپ خود کیوں اس زمین سے ناتا توڑ کر جا رہے ہیں؟"

ایک لمحے کے لئے وہ چپ ہو گیا۔ اس کا ذہن جیسے کہیں دور بھٹکنے لگا۔ پھر بہت دھیمے لہجے میں وہ بولا "اس ملک میں رہنا میرے بس کی بات نہیں رہی۔ میں اس سوسائٹی میں مس فٹ ہوں۔" وہ اشاروں سے مجھے زمین بھی دکھاتا جا رہا تھا کہ فلاں جگہ سے شروع ہوتی ہے۔ فلاں مقام تک جا رہی ہے۔ وہاں سے یوں خم کھا رہی ہے

لوریوں لوھر تک جاری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ہی وہ میری باتوں کا جواب بھی دیئے جا رہا تھا۔

"کمال ہے!" میں نے قدرے حیرت سے کہا "کسی جاگیردار کے منہ سے پہلی بار سن رہا ہوں کہ اس ملک میں رہنا اس کے بس کی بات نہیں رہی اور وہ اس سوسائٹی میں مس فٹ ہے۔ فیوڈل لارڈز تو یہاں کا حاکم طبقہ ہیں۔"

"درست ہے۔" وہ طنزیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "لیکن ہر طبقے میں کچھ نہ کچھ مجھ جیسی غلط سلط مثالیں بھی موجود ہوتی ہیں۔ میں والدین کا اکلوتا بیٹا تھا اور ہمارے خاندان میں اعلیٰ تعلیم کی کچھ زیادہ روایت نہیں تھی۔ اس کے باوجود باپ نے بچپن ہی میں مجھے باہر بھیج دیا۔ میری عمر کا بیشتر حصہ لندن، پیرس اور سوئٹزر لینڈ میں گزرا ہے۔ میری بیوی بھی سوئس ہے۔ میں اب اپنی زمینوں کے سلسلے کی یہ آخری کڑی بھی بیچ کر سوئٹزر لینڈ میں ہی سیٹل ہو رہا ہوں۔"

"تو آپ کا خیال ہے کہ آپ ساری زندگی باہر رہنے کی وجہ سے اس سوسائٹی میں مس فٹ ہو گئے ہیں؟" میں نے اسے کریدا۔

"شاید یہی بات ہو، شاید میری اپنی ذات میں کچھ خامیاں ہوں۔ میں صحیح طور پر کچھ سمجھ نہیں پایا۔ بہرحال ایک بات میں نے اچھی طرح سمجھ لی ہے کہ یہاں کے نظام کے ساتھ چلنا، یہاں کے محکموں کے ساتھ چلنا اور یہاں کے دوسرے زمینداروں سے نمٹنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ شاید میں ایک کمزور آدمی ہوں اور زمینداری مضبوط لوگوں کا کام ہے۔ یا پھر شاید میں ایک شریف آدمی ہوں۔۔۔" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

گاڑی دھول اڑاتی اونچے نیچے راستوں پر آگے بڑھ رہی تھی۔ میں نے شیشے چڑھا رکھے تھے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تو گویا وطن کی مٹی میں آپ کے لئے کوئی کشش نہیں رہی؟"

"چوہدری صاحب! معاف کیجئے گا، اپنے وطن میں مٹی کچھ زیادہ ہی ہے اور وہ لوگوں کے پھانکنے کے لئے چھوڑ دی گئی ہے۔" وہ گویا صاف گوئی سے کام لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے بولا "اس مٹی سے گل و گلزار کھلانے والا کوئی کام ہمارے ہاں نہیں ہو رہا ہے۔ جتنی کثرت سے ہمارے ہاں وطن کی محبت کے ترانے لکھے جاتے ہیں اور جس طرح دن رات ریڈیو ٹی وی سے الاپے جاتے ہیں، اتنی ہی ہمارے دل وطن کی محبت سے خالی ہیں۔ خصوصاً سرکاری مشینری کے بس لفظوں کی جگالی ہو رہی ہے۔ ویسے بھی یہ توانی ہوئی بات ہے کہ جہاں باتیں زیادہ ہوتی ہیں وہاں عملی طور پر کم ہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ تو بڑا آسان طریقہ ہے۔ ڈھول تاشے بجائے، لہک لہک کر سال میں ڈیڑھ دو سو نغمے گائے اور سب اپنے فرائض سے سبکدوش ہو گئے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گیا، جیسے منتظر ہو کہ میں کچھ کہوں گا لیکن میں خاموش رہا تو وہ بولا "وطن کو وطن بنانا پڑتا ہے جو کہوں کا کام ہے چوہدری صاحب! بڑا خون جلانا پڑتا ہے۔ بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں، بڑا ایثار کرنا پڑتا ہے۔ اپنے بڑا مارنا پڑتا ہے۔ بڑے جرأت مندانہ قدم اٹھانے پڑتے ہیں۔ صدیوں کشٹ اٹھانا پڑتے ہیں تب کہیں جا کر وطن کوئی پاتا ہے، قوم کہیں منہ دکھانے کے قابل ہوتی ہے۔ ہمارے مسئلہ یہ ہے کہ حقوق تو سب نے اپنے لئے رکھ لئے ہیں۔ فرائض دوسروں کے لئے چھوڑ دیئے ہیں۔ نیچے سے اوپر تک مجھ سمیت جرم میں سب شریک ہیں۔"

اس کے لہجے میں ہلکا سا ارتعاش آ گیا "میں اس ملک کو اور دیکھنا چاہتا تھا چوہدری صاحب! لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ کسی اور ہی سمت میں جا رہا ہے۔ کئی بار میں یہاں سیٹل ہونے ارادے سے آیا لیکن ہر بار مایوس ہو کر واپس جانا پڑا۔ بیوی کے سامنے الگ شرمندگی ہوئی۔ ایک عمر باہر گزار کر جب میں واپس آتا ہوں تو لگتا ہے، میں کسی اور ہی سیارے میں پہنچ گیا ہوں۔ جہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ مجھے کہیں اور ہی ٹھکانا کرنے میں عافیت نظر آتی ہے۔"

"لیکن اگر آپ جیسے لوگ، جو اس ملک کو کچھ اور دیکھنا چاہتے ہیں۔۔۔۔ یونہی ایک ایک کر کے اس ملک سے رخصت ہوتے رہے تو پھر اس کی حالت بدلے گا کون؟" میں نے ملائمت سے پوچھا "اس کے علاوہ ایک بات اور سوچیں۔ آپ کے پاس کروڑوں کی جائیداد تھی، آپ کی بیوی سوئس ہے۔ آپ تو جا کر سوئٹزر لینڈ میں سیٹل ہو جائیں گے۔ لیکن اس ملک میں اور بھی لاکھوں ایسے لوگ موجود ہیں جو آپ ہی جتنے باشعور ہوں گے، آپ ہی کی طرح سوچتے ہوں گے لیکن وہ غریب ہیں۔ مایوسی انہیں بھی گھیرتی ہے لیکن وہ کہیں اور جا کر سیٹل نہیں ہو سکتے۔ ان کا کیا قصور ہے؟ وہ بھی آپ کے ہم وطن ہیں۔ آپ انہیں کیوں پیچھے چھوڑے جا رہے ہیں؟ ہم خیال اور ہم وطن ہونے کے ناتے آپ کو ان سے بھی ہمدردی ہونی چاہئے؟"

"آپ درست کہہ رہے ہیں چوہدری صاحب! لیکن اکیلا چنا بھاڑ پھوڑے گا۔ میرے تو یہاں پاؤں جمنے نہیں پائے۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے۔۔۔۔ اور اب تو تمام انتظامات بھی ہو چکے ہیں۔ صرف یہ چند ہزار ایکڑ زمین کا سودا ہونا رہ گیا ہے۔ مجھے جانے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آ رہا۔" وہ شاید اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں اس کے حالات کیا رہے تھے۔ وطن میں اسے کیسے لوگوں سے پالا پڑا تھا، کیا اتفاقات پیش آئے تھے۔ تاہم میں نے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

"میں آپ کو قائل کرنے کی یا آپ کا نقطۂ نظر بدلنے کی کوشش نہیں کر رہا" میں نے کہا "اپنے حالات کو ہر انسان خود بہتر طور پر سمجھتا ہے۔ میں تو آپ کو صرف یہ بتانے کی کوشش کر

رہا ہوں کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر چلے جانا مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ ہمیں رہ کر مقدور بھر کوششیں کرتے رہنا ہے۔ اسی شجر سے پیوستہ رہ کر امید بہار رکھنی ہے۔"

"ہر ایک کو اپنے اپنے حالات اور اپنے اپنے مزاج کے مطابق فیصلے کا حق حاصل ہے۔" وہ امریکیوں والے انداز میں کندھے اچکا کر بولا۔

جلد ہی اس کی زمین کے گرد ہمارا چکر پورا ہو گیا اور ہم واپس ڈیرے کے قریب آ رکے۔ گاڑی سے اتر کر ہم ایک درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ افضال شاہ طویل سانس لے کر بولا۔ "تو یہ ہے زمین! آپ کی کمپنی کے لوگ اس کا ہر طرح سے جائزہ لے چکے ہیں۔ اس کی تمام خوبیوں اور خامیوں سے میں نے انہیں آگاہ کیا ہے حالانکہ ہمارے ہاں اپنی چیز کی خامیاں بتانے کا رواج نہیں ہے۔ حتیٰ کہ میں نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ زمین کے نیچے پانی کی سطح تھوڑی سی بلند ہو چکی ہے جس کی وجہ سے یہ بعض فصلوں کے لئے موزوں نہیں رہی اور بعض فصلوں کے لئے بہت کم قابل ہو گئی ہے۔ اور یہ مسئلہ ابھی زیادہ سنگین حد تک نہیں پہنچا ہے۔ بڑی آسانی سے اس کے کئی علاج ہو سکتے ہیں اور آپ اس زمین کو دوسرے مقاصد کے لئے بھی قابل استعمال بنا سکتے ہیں۔ کچھ پوچھنا چاہیں تو پوچھ لیجئے۔ اس یقین کے ساتھ کہ میں آپ سے کچھ چھپاؤں گا نہیں۔"

"مجھے کچھ نہیں پوچھنا۔ مجھے معلوم ہے میرے آدمیوں نے کوئی ایسی بات چھوڑی نہیں ہوگی جو پوچھنا ضروری ہو۔ دو تین روز میں ڈیل ہو جائے گی۔" میں نے جواب دیا۔ زمین تا حدِ نظر پھیلی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اور یہ سوچتے ہوئے ایک لاشعوری سی مسرت کا احساس ہو رہا تھا کہ دو تین روز بعد یہ زمین میری ہو گی۔ ایک عجیب سی فتح مندی اس احساس میں شامل تھی۔ شاید اسی احساس سے لذت اندوز ہونے کے لئے انسان دن رات تگ و دو میں لگا رہتا ہے۔ بزنس کو پھیلاتا رہتا ہے۔ صنعتکار ایک کے بعد دوسری صنعت خریدتا چلا جاتا ہے۔ حکمراں ایک ملک کے بعد دوسرے کو فتح کرنے کی منصوبہ بندیاں کرنے لگتے ہیں۔

میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "اب اجازت دیجئے شاہ صاحب! ہو سکے تو جانے سے پہلے ایک بار مجھ سے ضرور ملئے گا۔ کھانے پر ملاقات اور گپ شپ رہے تو بہت اچھا ہوگا۔ آپ جیسے لوگوں سے مل کر خوشی ہوتی ہے جن کے پاس صرف سر ہی نہیں ہوتا، سر کے اندر بھی کچھ ہوتا ہے۔"

"خواہ دیوانگی کے جراثیم ہی سہی" وہ مسکرایا۔

"ہاں۔ خواہ دیوانگی کے ہی سہی۔" میں نے سر ہلایا "بعض دیوانے فرزانوں سے بہتر ہوتے ہیں۔"

"قدر افزائی کا بہت شکریہ۔ میں ضرور حاضر ہونے کی کوشش کروں گا چوہدری صاحب۔" پھر وہ جیب سے ایک وزٹنگ کارڈ نکالتے ہوئے بولا "اگر آپ کا کبھی سوئٹزر لینڈ کی طرف چکر لگے تو مجھے ضرور میزبانی کا موقع دیجئے گا۔ اس کارڈ پر میرا وہاں کا ایڈریس موجود ہے۔"

"آپ کا وہاں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ میں بس اسٹاکس خریدتا اور بیچتا رہتا ہوں۔ اب بھی یہی کروں گا۔ زندگی بڑی مختصر ہے۔ میں تمام نعمتوں سے لطف اندوز ہونا چاہتا ہوں۔ دنیا کے جھمیلوں سے آزاد رہ کر اس کی خوبصورتیوں سے محظوظ ہونا چاہتا ہوں۔ کچھ نہ کرنے کے باوجود میرے اثاثوں میں اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے۔ میری آئندہ نسلیں بہت کچھ لٹا بھی دیں گی تب بھی انہیں پریشانی نہیں ہوگی۔"

میں نے اسے خدا حافظ کہا اور واپس روانہ ہو گیا۔ تاریکی اچھی خاصی گہری ہو چکی تھی۔ میں نے ابھی دو میل کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں سڑک کے عین بیچوں بیچ ایک بڑا سا "گڈا" جاتے دکھائی دیا۔

یہ ایک مخصوص قسم کی بیل گاڑی ٹائپ کی چیز ہوتی ہے مگر اس میں بیلوں کی جگہ سانڈ جوتے جاتے ہیں اور یہ حجم میں بیل گاڑی سے کہیں بڑی ہوتی ہے۔ گاڑی کیا اچھا بھلا بحری جہاز دکھائی دیتی ہے جو غلطی سے سڑک پر آ کر رینگنے لگا ہو۔ گاڑی پر لکڑیوں کا ایک بڑا سا ڈھانچہ چاروں طرف پھیلا کر اس پر ٹاٹ لپیٹ کر زیادہ سے زیادہ گنجائش پیدا کی جاتی ہے۔

گڈے آج بھی پنجاب کے اکثر علاقوں میں دکھائی دیتے ہیں۔ زیادہ تر یہ کپاس اور کٹی ہوئی خشک گھاس کی نقل و حمل کے لئے استعمال ہوتے ہیں جسے توڑی یا پرالی کہا جاتا ہے۔ جب ملک میں ٹرکوں کی کمی تھی تو یہ گویا ٹرکوں کا متبادل تھے۔ بعض گڈوں میں تو ٹرک سے زیادہ مال آ جاتا تھا۔

یہ عام طور پر کسی شہر یا دیہات سے مال لاد کر لمبے سفر پر چل پڑتے تھے۔ کئی کئی دن سفر کرتے تھے۔ زیادہ تر رات کو سفر کرتے تھے۔ دن میں سانڈ اور گڈے کو چلانے والے لوگ کہیں درختوں کے نیچے آرام کرتے تھے۔ قطار کی صورت میں یہ گڈے سڑک کے ایک طرف "کچے میں" دھیرے دھیرے اپنی منزلوں کی طرف گامزن

رہتے تھے' ٹریفک کو ڈسٹرب نہیں کرتے تھے۔

گڈے والا اکثر گڈے پر لیٹا سوتا رہتا۔ سانڈ سر جھکائے جگالی کرتے خود ہی ناک کی سیدھ میں چلتے رہتے تھے۔ راستے عموماً ان کے لئے مانوس ہوتے تھے کیونکہ ہر گڈے والے کا کوئی نہ کوئی لگا بندھا روٹ ہوتا تھا جس پر وہ ایک طرف سے کچھ لاد کر جاتا تھا' دوسری طرف سے ہفتے دو ہفتے بعد کچھ اور لاد کر واپس آجاتا تھا۔ گڈے کے نیچے لالٹین لٹکی جھولتی رہتی تھی اور سانڈوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی دھیمی دھیمی ٹن ٹن ویرانوں میں ایک عجیب سی رومان انگیز موسیقی بکھیرتی رہتی تھی۔ ہائی ویز پر سفر کرنے والوں کے لئے یہ ایک مانوس سا نظارہ تھا جو دھیرے دھیرے معدوم ہوتا جارہا تھا۔ تیز رفتار گاڑیاں ان گڈوں کی جگہ لیتی جارہی تھیں۔

میں بھی کسی حد تک روایت پرست اور ماضی میں زندہ رہنے والا آدمی تھا۔ مجھے اس قسم کی چیزیں بھلی لگتی تھیں لیکن اس وقت نہ جانے کیوں وہ گڈا مجھے بھلا نہیں لگا۔ یہ بات کچھ عجیب سی تھی کہ گڈے پر کچھ لدا ہوا نہیں تھا اور وہ اکیلا ہی تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اسے جان بوجھ کر سڑک کے بیچوں بیچ چلایا جارہا تھا اور گڈے والے کو پیچھے آنے والی گاڑیوں کی کوئی پروا نہیں تھی۔

میری گاڑی اس کے قریب پہنچ گئی اور اس کا نچلا حصہ روشنی میں نہا گیا۔ پھر بھی ایسے آثار پیدا نہیں ہوئے کہ گڈے والا میرے لئے راستہ چھوڑ دے گا۔ وہ مجھے ہی کچے میں اتارنا چاہتا تھا۔ کہنے کو تو وہ ہائی وے تھا مگر سڑک تو محض چند گز ہی چوڑی تھی اور وہ بھی کناروں پر سے ٹوٹی پھوٹی تھی۔

اچانک مجھے گڈے کے پچھلی طرف دیوار کی طرح پھیلے ہوئے ٹاٹ کے پردے کے عقب میں کسی ہلچل کا احساس ہوا۔ میری چھٹی حس نے مجھے احساس دلایا کہ اس پردے کے عقب سے کوئی آنکھ میری گاڑی کا جائزہ لے رہی تھی۔ گاڑی اگر اندھیرے میں جارہی ہو اور اس کی ہیڈ لائٹس روشن ہوں تو وہ سامنے والی چیز کو تو روشنی میں نہلا دیتی ہے لیکن خود اندھیرے ہی میں رہتی ہے تاہم میری گاڑی کی نمبر پلیٹ تو دیکھی ہی جاسکتی تھی۔ اس پر ہیڈ لائٹس کی روشنی بھی پڑ رہی تھی اور نمبر پلیٹ کی اپنی لائٹ بھی موجود تھی۔

میری چھٹی حس نے تو مجھے صرف کسی گڑبڑ کا احساس دلایا تھا لیکن میری وہ حس جسے میں ساتویں حس کہتا تھا' زیادہ کار آمد ثابت ہوئی۔ اس نے مجھے ایک سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں فیصلہ کرنے پر مجبور کردیا اور میں نے گاڑی پوری قوت سے کچے میں موڑ دی۔

اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو شاید اس ویرانے میں میری زندگی کی کہانی ختم ہوجاتی۔ سب مشین گن کا برسٹ عین میرے سامنے سے آیا تھا اور اس کے ساتھ ہی گڈے کے پیچھے کی طرف کا ٹاٹ کا پردہ چھلنی ہوگیا تھا۔ اسی پردے کے عقب میں گڈے پر یقیناً کئی آدمی موجود تھے۔ یہ محض میرا اندازہ تھا۔ میں ان کی جھلک نہیں دیکھ سکا۔

میری گاڑی شاید کچے میں اتر کر الٹ گئی ہوتی کیونکہ کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیوں اچھا خاصا چوڑا نالا سا تھا۔ اس میں پانی نہیں تھا۔ نالے کے بعد بھی زمین ہموار تھی۔ مٹی کے تودے' جھاڑیاں' نشیب و فراز' کیچڑ سبھی لیکن گاڑی بہرحال الٹنے سے بچ گئی اور تلاطم میں پھنسی کی طرح ہچکولے کھاتی آگے بڑھتی چلی گئی۔

سب مشین گن کا برسٹ ونڈ اسکرین پر پڑا ہوتا۔ ونڈ بھی دیگر تمام شیشوں کی طرح بلٹ پروف تھی لیکن پھر پُریقین نہیں تھا کہ اتنے قریب سے اور عین سامنے سے سب گن کا برسٹ سہ سکتی تھی۔ میں نے اپنے اوسان بحال ر گاڑی کی ہیڈ لائٹس آف کردیں۔ یہ اپنے آپ کو تن بہ چھوڑنے والی بات تھی کیونکہ گاڑی کسی درخت سے بھی ٹکرا تھی۔ کسی بڑے تودے میں بھی جاکر دھنس سکتی تھی اور کسی گڑھے میں بھی گر سکتی تھی۔ وہ علاقہ کچھ ایسا ہی تھا۔ تار چھاؤں بھی اس وقت کوئی خاص مدد نہیں کررہی تھی۔ چلتی میں ہر طرف اندھیرا ہی محسوس ہورہا تھا۔ گاڑی سے اتر قدرے سکون کی سانس لے کر شاید منظر کچھ بہتر نظر آتا۔

میرے عقب میں بے مقصد انداز میں وقفے وقفے سے مارے جارہے تھے لیکن آواز ہر بار سمت کے تھوڑے بہت کے ساتھ آرہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ لوگ گڈے اتر آئے تھے اور دیوانے کتوں کی طرح بہت تیزی سے میری میں ادھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ اندھیرے میں گاڑی کی رفتار خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔

میری گاڑی پٹرول اور ڈیزل دونوں سے چلتی تھی۔ اس پٹرول پر تھی۔ اگر وہ لوگ بہت زیادہ ماہر و مشاق ہوتے تو ویر میں چلتی ہوئی تیز ہوا کے باوجود پٹرول کی بُو اور انجن کی ہلکی سرسراہٹ کا سراغ پکڑ کر بالکل صحیح سمت میں آسکتے تھے۔

اگر میری گاڑی کسی حادثے کا شکار نہ ہوتی تو میں ادھر لمبا سا چکر کاٹ کر کافی آگے دوبارہ بھی سڑک پر پہنچ کر فرار ہو تھا مگر اندھیرے میں رسک اتنا ہی تھا جتنا حملہ آوروں کا سامنا کر میں۔ اور پھر کچھ دل نے گوارا نہیں کیا۔ یہ کوئی اچھی بات تھی کہ کسی نے عین سامنے سے مجھ پر حملہ کیا تھا اور میں دُم دبا بھاگ جاتا۔

میں نے گاڑی ایک جگہ روک دی لیکن انجن بند کیا۔ دروازہ کھلا چھوڑ کر میں باہر رینگ آیا۔ میں نے گاڑی خفیہ خانے سے رائفل بھی نہیں نکالی۔ وہ لوگ زیادہ دور تھے۔ میں صرف اپنا نفری مشین پسٹل ہی سنبھال کر رکوع کی سی حال میں دوڑتا چلا گیا۔

اس طرح گھات لگا کر ہونے والے حملوں کے سلسلے تجربات نے مجھے سکھایا تھا کہ جیت اس کی ہوتی ہے جو انسا

دشمن کی توقعات کے خلاف عمل کرتا ہے۔ اضطراری اور دشمن سے فوری طور پر کچھ دور نکل آنا درست تھا لیکن مجھے چند لمحے کی مہلت مل چکی تھی' میں اس کی توقع کے خلاف چل رہا تھا۔

حملہ آور جب یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کسی پر اچانک حملہ کر کے بدحواس کردیا ہے اور اس کا پلہ بھاری ہے تو وہ یہی توقع رکھتا ہے کہ اس کا بھاگ نکلنے والا شکار مزید آگے ہی بھاگا جارہا ہے۔ وہ یہ لمحہ حملہ آور سے زیادہ دور ہونے کی فکر میں ہوگا۔ لیکن میں دوبارہ حملہ آوروں ہی کی طرف جارہا تھا۔ واپس اسی سمت بڑھ رہا تھا جدھر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دی تھیں۔ ایک لمحے پہلے سب مشین گن کی تڑتڑ کے علاوہ تھری ناٹ تھری رائفل کی گرج بھی سنائی دی تھی۔ لیکن جونہی میں نے اس سمت بڑھنا شروع کیا' تمام آوازیں یکلخت خاموش ہوگئی تھیں۔ گویا کسی غیبی طاقت نے انہیں بتا دیا ہو کہ میں ان کی طرف آرہا ہوں اور انہوں نے میرے لئے گھات لگالی ہو۔

یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ مجھے کچھ ہوشیار ہونا تھا۔ میں بدستور رکوع کی سی حالت میں رہتے ہوئے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے لگا۔ کہیں کوئی جھاڑی' تودا یا ٹنڈ منڈ درخت نظر آتا تو ایک لمحے کو میں اس کی آڑ لے لیتا اور ہر بار نئے سرے سے گردوپیش کا جائزہ لیتا۔

ہر طرف ایک ایسا سکوت طاری تھا جس کی تہ میں موت چھپی ہوئی تھی۔ اب میں کافی بہتر طور پر اور خاصا دور تک دیکھ سکتا تھا مگر کوئی چیز متحرک نظر نہیں آرہی تھی۔ ایک بار پھر میرا وہی احساس ابھر آیا کہ انسان بنیادی طور پر درندہ ہے۔ جب کسی کے لئے گھات لگاتا ہے تو بالکل درندہ معلوم ہوتا ہے۔ دوسرے کے خون کا پیاسا' دوسرے کی زندگی کا دشمن۔

باربرداری کا گڈا ایک بہت ہی بے ضرر سی چیز تھی۔ بچپن میں میں نے بہت ہی گڈے دیکھے تھے۔ ان پر چڑھ کر کھیل کود بھی کی تھی۔ ان کی آڑ میں لکن میٹی بھی کھیلی تھی لیکن آسودہ حالی کے دور میں بھی میں نے بارہا انہیں سڑکوں پر دیکھا تھا اور بڑی بے نیازی سے گاڑی ان کے قریب سے نکالتا لے گیا تھا۔ کبھی میں نے ان کے بارے میں کچھ سوچا تک نہیں تھا۔

لیکن آج ایسے ہی بظاہر بے ضرر نظر آنے والے ایک گڈے سے موت مجھ پر جھپٹی تھی۔ عجیب چیز پر انہوں نے میرے لئے گھات لگائی تھی۔ اگر آج بھی میں بے نیازی سے ہی اس کے عقب میں گاڑی رکھتا اور راستہ ملنے کا منتظر رہتا تو نہ جانے کیا ہوتا! اس وقت درندہ درندوں کے وار سے محض اتفاقاً یا پھر خوش قسمتی اور مشیتِ ایزدی سے بچ نکلا تھا مگر اب درندے پھر ایک دوسرے کی گھات میں تھے۔

میں تیزی سے کچھ اور آگے بڑھا۔ غنیمت تھا کہ دوسرے ہی لمحے مجھے چوپائے کی طرح چاروں ہاتھ پیروں کے بل گر کر چھپنے کے لئے مٹی کا ایک بڑا سا تودا میسر آگیا۔ کیونکہ اسی لمحے مجھے کافی فاصلے پر نشیب سے ایک ہیولا سا نمودار ہوتا دکھائی دیا تھا۔ فرشتۂ اجل کی طرح وہ گن لئے یوں گڑھے کے کنارے پر ابھرا جیسے زمین نے ہی اسے اپنے شکم سے اگلا ہو۔ ایک کے بعد دوسرا' تیسرا اور پھر چوتھا ہیولا بھی باہر آگیا۔ سب کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔

فاصلہ کافی تھا اور وہ مجھے محض ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے پھر بھی ان کے بارے میں بہت سی باتوں کا اندازہ ہورہا تھا۔ وہ چاروں ڈھیلے ڈھالے سیاہ لباسوں میں تھے۔ غالباً شلوار قمیص تھیں۔ کمر کے مقام پر وہ سب دبلے دبلے نظر آرہے تھے۔ یقیناً ان کی کمروں پر کچھ لپٹا ہوا تھا۔ غالباً گولیوں کی پیٹیاں تھیں۔ انہوں نے یقیناً ڈھاٹے بھی باندھے ہوئے تھے۔ یہ انداز ڈاکوؤں والا تھا مگر ان کا ڈاکو ہونا کچھ بعید از قیاس نظر آتا تھا۔

ڈاکو گڈے میں سوار ہوکر سست رفتاری سے عین سڑک کے بیچوں بیچ سفر نہیں کرسکتے تھے۔ دوسرے اگر میں انہیں ایک معقول شکاری دکھائی دیتا تو وہ یکدم مجھ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے بجائے مجھے روک کر لوٹنے کی کوشش کرتے۔ اگر انہیں صرف ایک اچھی گاڑی ہی کی ضرورت تھی' مالک خواہ ان کی طرف سے جہنم میں ہی جاتا تب بھی وہ اس طرح گاڑی پر برسٹ نہ مارتے۔ گاڑی کو کوئی ایسا نقصان پہنچ سکتا تھا یا اس کا ٹائر برسٹ ہوسکتا تھا جس کی وجہ سے وہ فوری طور پر کہیں لے جانے کے قابل نہ رہتی۔ اس طرح تو ڈاکوؤں کا مقصد ہی فوت ہوجاتا۔ چکر کچھ اور ہی تھا۔

وہ چاروں اسی سمت میں بڑھ رہے تھے جدھر میں گاڑی چھوڑ کر آیا تھا۔ گویا اس قسم کی آنکھ مچولی میں وہ ماہر تو تھے مگر ساتھ ہی ان کے انداز میں ایک چھوٹا سا اناڑی پن بھی نظر آرہا تھا کہ سب "باجماعت" میری تلاش میں بڑھ رہے تھے۔ انہوں نے بکھر کر اور زیادہ دور تک پھیل کر مجھے ایک طرح سے گھیرے میں لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کے اپنے حساب سے اس میں بھی کوئی مصلحت رہی ہوگی۔ تاہم وہ ایک دوسرے سے کچھ دور دور تھے اور چاروں کے چہرے مختلف سمتوں میں تھے۔ یعنی وہ چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔

مشین پسٹل کی رینج کافی تھی۔ اس کے باوجود میں نے چند لمحے انتظار کرنا مناسب سمجھا کہ وہ ذرا "محفوظ" فاصلے تک آجائیں لیکن اس انتظار کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ وہ درحقیقت میری طرف نہیں بڑھ رہے تھے بلکہ میرے سامنے سے گزرتے جارہے تھے۔ مجھے ان چاروں کو تقریباً ایک ساتھ ہی نشانہ بنانا تھا ورنہ میرے لئے الجھن پیدا ہوسکتی تھی۔ خواہ مخواہ زیادہ بھاگ دوڑ کرنا پڑتی۔ اور میں اس وقت زیادہ لمبی آنکھ مچولی کے موڈ میں نہیں تھا۔ شکار جب عین نشانے پر آیا ہوا تھا تو خواہ مخواہ اس موقع کو گنوا کر اپنے آپ کو تھکانے کی کیا ضرورت تھی۔

جب میرے اور ان کے درمیان فاصلہ گھٹنے کے بجائے بڑھتا دکھائی دینے لگا تو میں نے سینے کے بل لیٹے لیٹے مشین پسٹل ذرا بلند کیا۔ وہ چاروں' شکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح ذرا سی بھی آواز پیدا کئے بغیر حتی الامکان تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے اور بالکل صحیح سمت میں جا رہے تھے۔ صرف انہیں یہ توقع نہیں تھی کہ میں وہاں سے واپس آگیا تھا۔

میں ٹریگر پر دباؤ بڑھانے ہی والا تھا کہ یکدم 'ٹک ٹک' کی کئی تیز سی آوازیں ابھریں اور ان میں سے تین آدمی اچھل کر ادھر اُدھر جا گرے۔ ان میں سے کسی کی کرب ناک چیخ سے ماحول کا سکوت بھی چند لمحے کے لئے مرتعش ہوگیا۔ نامعلوم سمت سے گولیاں آئی تھیں جو یقیناً سائیلنسر لگی رائفلوں سے چلائی گئی تھیں۔ سائیلنسر بھی خاص قسم کے تھے جو مسلسل فائرنگ سے بھی جام نہیں ہوتے تھے۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ گولیاں چلانے والے یقیناً حنیف اور سردار تھے جو میرے پیچھے خاصا فاصلہ چھوڑ کر گاڑی میں آرہے تھے۔ انہوں نے دوربین سے صورت حال دیکھ لی ہوگی۔ بڑی عمدگی سے اور بڑے صحیح موقع پر آکر انہوں نے معاملے میں دخل دیا تھا۔ ان کی حکمتِ عملی کی خوب صورتی یہ تھی کہ نہ تو وہ مجھے ابھی تک کہیں نظر آئے تھے اور نہ ہی اندازہ ہوا تھا کہ وہ کس سمت میں موجود ہیں۔

چوتھے سیاہ پوش کی خوش قسمتی تھی کہ وہ گولیوں کی بوچھاڑ سے بچ گیا تھا اور اس نے حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے زمین پر قلابازی کھائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ غائب ہوگیا تھا۔ زمین اونچی نیچی تھی' کئی جگہ خاصے اونچے ابھار موجود تھے لیکن کوئی ابھار ذرا بھی متحرک نہیں تھا۔ وہ بدبخت سیاہ پوش گویا زمین سے چپک کر زمین میں ہی سما گیا تھا۔

میں پسٹل سیدھا کئے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا لیکن کوئی اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ کس طرف کو نکل گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حنیف اور سردار جہاں بھی تھے' ان کی نظریں بھی اسی طرح پریشان ہوں گی۔ کچھ فاصلے پر جھاڑیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ان کی آڑ میں چلا گیا ہو۔ حنیف اور سردار نے بھی یقیناً یہی سوچا تھا کیونکہ دوسرے ہی لمحے جھاڑیوں پر بہت سی گولیاں برسیں۔ کچھ شاخیں بھی ٹوٹ کر ہوا میں اڑتی نظر آئیں اور کچھ چھوٹے موٹے جنگلی جانوروں کی چوں چاں بھی سنائی دی جو شاید انہی جھاڑیوں میں چھپے ہوئے تھے۔ مگر کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دی اور نہ ہی جواباً کوئی فائر ہوا۔ میری حسیات یہی کہہ رہی تھیں کہ وہ جھاڑیوں کے عقب میں نہیں تھا۔ لیکن حسیات یہ رہنمائی نہیں کرپا رہی تھیں کہ وہ کدھر چلا گیا تھا۔

میں نے چاروں ہاتھ پیروں پر ہی دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس طرف نیم دائرے میں بڑھنا شروع کیا جہاں چوتھا سیاہ پوش زمین پر لڑھک کر غائب ہوا تھا۔ باقی تینوں سیاہ پوش جہاں گرے تھے وہیں ساکت تھے۔ ماحول پر ایک بار شکن سکوت چھا گیا تھا۔

مجھے آگے بڑھنے میں بہت زیادہ احتیاط کرنا پڑ رہی تھی۔ ڈر یہ تھا کہ میرا ہیولا دیکھ کر حنیف اور سردار مجھ پر ہی فائر نہ کر دیں۔ اندھیرے میں ان کی نظر بھی عمدگی سے کام کرتی تھی مگر جتنی تیز بہرحال نہیں تھی۔ ادھر درمیان سے اس چوتھے کے غائب ہونے سے بڑی گڑبڑ ہوگئی تھی۔

میں نے سوچا' حنیف اور سردار کو سگنل دے دینا چاہئے تاکہ وہ میری موجودگی سے تو باخبر رہیں اور گولی چلاتے ہوئے احتیاط برتیں۔ میں نے حلق سے چکور کی آواز نکالی۔ آسمان پر دور دور تک چاند کا نام و نشان تک نہیں تھا لیکن ایسی تشویش کی بات نہیں تھی۔ چکور ہر وقت چاند کے ساتھ نہیں لگا رہتا' کبھی کبھی وہ کسی درخت وغیرہ پر آرام کرتا ہے اور اپنے آس پاس فائرنگ کی آوازیں سن کر صدائے احتجاج بلند کرسکتا ہے۔

حنیف اور سردار میں سے بھی کسی نے جواباً ایسی ہی آواز نکالی۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئے تھے اور اب ہم تینوں کو محتاط رہتے ہوئے چوتھے نقاب پوش کو تلاش کرنا تھا۔ میں زمین کے نشیب و فراز کی آڑ لیتے ہوئے اور حتی الامکان نیچا رہتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

اچانک میں سینے کے بل زمین سے چپک گیا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ آس پاس کوئی موجود ہے اور وہ حنیف یا سردار نہیں ہے۔ میرے نتھنے خود بخود پھڑک اٹھے تھے۔ وہ شخص کہیں موجود تھا۔ میں بالکل ساکت ہوگیا' زمین کا ایک حصہ بن گیا۔ سانس بھی میں نے روک لی۔

چند لمحے اسی طرح گزرے۔ ان چند لمحوں کے دوران دھڑکن بھی ساکت ہوگئی تھی۔ پھر میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ کم گہرے گڑھے سے نہایت موٹے اژدہے کی طرح رینگ کر باہر آیا۔ اس کے جسم میں بالکل اژدہے ہی کی طرح بل بھی پڑ رہا تھا۔ وہ سیاہ پوش ہی تھا۔ وہ میری طرف نہیں آرہا تھا بلکہ اس طرف بڑھ رہا تھا جدھر میرا رخ تھا۔ اس کے پاؤں میں جوتے تھے۔ وہ بہت عمدگی سے اچھی خاصی رفتار سے مٹی میں رینگ رہا تھا۔ اسے یقیناً اندازہ ہوگیا تھا کہ خاموش رائفلوں سے گولیاں کس سمت سے آئی تھیں۔ وہ سردار اور حنیف کی تلاش میں جا رہا تھا۔ اس کی سب مشین گن شاید کہیں گر چکی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف ریوالور تھا۔ شاید اسی لئے وہ گولیاں ضائع نہیں کر رہا تھا۔ کسی حکمتِ عملی کے تحت اپنے گمشدہ دشمن کو تلاش کرکے ریوالور کو صحیح طور پر استعمال کرنا چاہتا تھا۔

ایک جگہ رک کر اس نے سر ذرا اونچا کرکے ارد گرد دیکھا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ ڈھاٹا اس کے چہرے پر ابھی تک بندھا ہوا تھا۔ اس وقت وہ بالکل میرے نشانے پر تھا' اسے نہیں معلوم تھا کہ موت اس کے تعاقب میں تھی۔ میں چاہتا تو اس کی کھوپڑی میں گولیاں اتار سکتا تھا لیکن میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ شاید اس طرح کچھ مفید معلومات ہوسکتیں۔

"ریوالور پھینک دو ورنہ گولی ــــ" میں نے اسے للکارا لیکن اس نے مجھے جملہ پورا کرنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ کسی اژدہے کی طرح ہی تڑپ کر پلٹا اور اس نے یکدم تین گولیاں جھونک دیں۔ کمبخت کا اندازہ بالکل صحیح تھا۔ اس نے عین اس جگہ فائر کیا تھا جہاں سے اس نے میری آواز سنی تھی۔

اتنی پھرتی کے ساتھ گھومتے ہوئے عین اس مقام پر فائر کرنا اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ وہ ایک ماہر لڑاکا تھا۔ شاید بات صرف اتنی تھی کہ قسمت اس کے ساتھ نہیں تھی۔ میں محض احتیاطاً اسے للکارتے ہی پوزیشن تبدیل کرچکا تھا۔ گولیاں میرے قریب ہی زمین میں دھنسیں اور ان سے اڑنے والی دھول میں نے اپنے نتھنوں میں گھستی محسوس کی۔

اس کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ہتھیار ڈالنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ چوتھا فائر کرتا' مجھے گولی چلانا پڑی۔ دو گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہوگئیں۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ سانڈ کی طرح ڈکراتا ہوا دُہرا ہوگیا۔

میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا تو وہ نزع کے سے عالم میں جھٹکے لے رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ پسلیوں کے نیچے تھا۔ میں نے ٹھوکر مار کر اس کا ریوالور کچھ اور دور پھینکا پھر جھک کر اس کے چہرے سے ڈھاٹا کھینچا۔ وہاں تقریباً اندھیرا ہی تھا لیکن میں اسے پہچان سکتا تھا۔ اور اسے پہچان کر مجھے بلاشبہ حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ قیصر ملک تھا!

مجھے یہ تو معلوم تھا کہ قیصر ملک میرے خون کا پیاسا تھا اور مجھے مروانے کے لئے ہر حربہ اختیار کرچکا تھا لیکن یہ بس اوپر والے کا کرم ہی تھا کہ ہر بار میں بچ نکلا تھا۔ مجھے قتل کرانے کے لئے اس نے اونچے سے اونچے درجے کے بدمعاشوں کی خدمات حاصل کی تھیں۔ راہ چلتے' سڑک پر' گھر پر' سوتے میں' جاگتے میں حتیٰ کہ دفتر میں بھی اس نے مجھ پر بڑے منظم انداز میں بڑی منصوبہ بندی کے ساتھ حملے کرائے تھے۔ مجھے ٹھکانے لگانے کے لئے ایک خاصے خطرناک' دہشت گرد گروہ کی خدمات بھی حاصل کی تھیں اور اس وقت تو اپنے مقصد میں تقریباً کامیاب ہی ہوگیا تھا لیکن قدرت کی کتابوں میں ابھی میری زندگی کا کھاتہ بند نہیں ہوا تھا اس لئے میں اس رات بھی نکل آیا تھا۔

ایک بڑے اور عیاش زمیندار کے خبطی مزاج بیٹے کی حیثیت سے اس کی یہ کوششیں میرے لئے غیر متوقع نہیں تھیں لیکن مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ خود کالے کپڑے پہن کر' ڈھاٹا منہ پر باندھ کر' تین آدمی ساتھ لے کر مجھے ٹھکانے لگانے کے لئے اس انداز میں نکل کھڑا ہوگا۔

وہ ہچکیاں سی لے رہا تھا اور ہر ہچکی کے ساتھ اس کے منہ سے بلبل کرکے خون آرہا تھا۔ شاید ایک یا دونوں ہی گولیاں اس کے پھیپھڑوں میں اتر گئی تھیں۔ اس کی آنکھیں بار بار اذیت ناک انداز میں کھل اور بند ہو رہی تھیں۔ وہ کڑیل جوان تھا۔ اس نے میرے ساتھ خواہ کچھ بھی کیا تھا پھر بھی میرا اسے ہلاک کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔

آخری بار اس سے میرا تصادم ہوا تھا تو میں نے اسے تلقین کی تھی کہ وہ اس سلسلے کو روک لے اور اگر آئندہ اس نے مجھ پر کوئی قاتلانہ حملہ کرایا تو وہ اس کی زندگی کی آخری کوشش ہوگی۔ اس کے باوجود کم از کم اس وقت تک میرا اسے ہلاک کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں اس کی احمقانہ خبطی مزاجی کو معاف کئے جا رہا تھا۔ ہر بار میں اس سے نرمی برت جاتا تھا۔ اس بار بھی وہ غیر ارادی طور پر ہی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ وہ قیصر ملک ہے تو شاید ایک بار پھر مجھے اس کی جوانی پر ترس آجاتا۔ میں اس کے ہاتھوں سے خود کو بچانے اور اسے زندہ چھوڑنے کی کوئی تدبیر کر ہی لیتا لیکن وہ احمق تو ایک عرصے سے گویا موت کو گھسیٹ گھسیٹ کر اپنے سر پر مسلط ہونے کی دعوت دے رہا تھا۔

موت اس کی رگوں میں پنجے گاڑ چکی تھی اور ارد گرد اندھیرا بھی پھیلا ہوا تھا' اس کے باوجود اس نے بھی مجھے پہچان لیا تھا۔ میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا "گدھے کہیں کے! میرا تمہیں مارنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ تم نے خود ہی اپنی قیمتی زندگی بے مقصد ضائع کی ہے۔" پھر میں نے چکور کی ایک آواز میں حنیف اور سردار کو سگنل دیا کہ سب ٹھیک ہوچکا ہے اور اب وہ سامنے آسکتے ہیں۔ جیب سے ایک ننھی اور چپٹی سی ٹارچ نکال کر میں نے اس کے چہرے پر روشنی ڈالی' وہ یقیناً چند لمحے کا مہمان تھا۔

اذیت کے ان لمحات میں بھی اس نے عجیب سے انداز میں مسکرانے کی کوشش کی اور لہو کے چھینٹے منہ سے اڑاتے ہوئے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا "تم بہت لکی آدمی ہو افضل چوہدری ـــ! اب ـــ اب تو بتا دو تم نے میرے باپ کو کس طرح ہلاک کیا تھا ـــ کہاں غائب کیا تھا ـــ بتا دو پلیز ـــ کہیں اس کی قبر ہے یا نہیں ـــ"

"اب جان کر کیا کرو گے احمق!" میں نے طویل سانس لے کر کہا "اب کون سا تم اس کی قبر پر فاتحہ پڑھنے جاسکو گے۔"

"پھر بھی ـــ پھر بھی" وہ بڑی مشکل سے سرگوشی کے سے انداز میں بولا مگر اسے جملہ مکمل کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ اس کا منہ بھی کھلا رہ گیا اور آنکھیں بھی۔ اس دوران حنیف اور سردار بھی دوڑتے ہوئے قریب آگئے۔ رائفلیں ان کے ہاتھوں میں تھیں۔ حنیف کے پاس ایک بڑی سی ٹارچ بھی تھی۔ اس نے ٹارچ روشن کی اور قیصر ملک تیز روشنی میں نہا گیا۔ وہ واقعی مر چکا تھا۔

ذرا سی دیر میں اس کے جسم سے بہت خون بہہ گیا تھا اور مٹی میں جذب ہو گیا تھا۔

"یہ تو قیصر ملک ہے... لیکن اس حلئے میں؟" حنیف حیرت سے بولا۔ قیصر ملک واقعی ڈاکو لگ رہا تھا اور وہ بھی فلمی قسم کا۔ اس کی کمر سے سب مشین گن کی گولیوں کی بیلٹ بھی بندھی ہوئی تھی۔

میں نے اس کی کالی پگڑی سے دوبارہ اس کے چہرے پر ڈھاٹا باندھ دیا اور کپڑے اچھی طرح جھاڑ کر سیدھا ہوتے ہوئے کہا "آؤ چلیں۔"

حنیف اور سردار بھی یوں اطمینان سے سرہلا کر میرے ساتھ چل دئے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ راستے میں ہم ان تین سیاہ پوشوں کے قریب بھی رُکے جو پہلے ہی مرچکے تھے اور ایک دوسرے سے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہی آڑے ترچھے پڑے ہوئے تھے۔ ہم نے ان کے چہرے بھی کھول کر دیکھے لیکن وہ تینوں ہمارے لئے اجنبی تھے۔ شاید کرائے کے بدمعاش یا پھر سچ مچ کے ڈاکو تھے۔ انہیں کئی کئی گولیاں لگی تھیں۔ مرنے کے بعد ان کے چہروں پر کرختگی اور خشونت نمایاں تھی۔ ان کے خدوخال بتاتے تھے کہ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ جنگلوں بیابانوں میں ہی گزرا تھا۔ ہم نے ان کے چہروں پر بھی دوبارہ ڈھاٹے باندھ دئے اور اس طرف چل دئے جدھر میری گاڑی کھڑی تھی۔

حنیف اور سردار اپنی گاڑی سڑک سے کچھ ہی دور چھوڑ کر آئے تھے۔ سیاہ پوش میرے تعاقب میں تھے لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ حنیف اور سردار کی شکل میں موت ان کے تعاقب میں تھی۔ میری گاڑی میں بیٹھ کر ہم تینوں کچے ہی کچے میں اس طرف روانہ ہوئے جدھر حنیف اور سردار نے گاڑی چھوڑی تھی۔

"فائرنگ کی آوازیں سن کر سڑک سے گزرنے والی اِکادُکا بسیں یا گاڑیاں رک نہ گئی ہوں؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"سر! ان ویرانوں میں فائرنگ کی آوازیں سن کر تو سڑک سے گزرتی گاڑیوں اور بسوں والے اپنی رفتار بڑھا دیتے ہیں۔" سردار بولا۔ اس کا خیال درست تھا' میں اس حقیقت کو بھول گیا تھا۔

ہم دوسری گاڑی تک پہنچنے سے پہلے گڈّے تک پہنچ گئے جو سڑک سے اتر آیا تھا اور نشیب میں کھڑا تھا۔ دونوں سانڈ بڑے اطمینان سے کھڑے جُگالی کر رہے تھے۔ ان کی گردنوں پر جہاں جُوا رکھا جاتا تھا وہاں بھاری وزن کی مسلسل رگڑ سے گوشت پھول پھول کر تھیلیوں کی طرح لٹک گیا تھا۔ زخم بھی پڑے ہوئے تھے۔ ان گڈوں میں جوتے جانے والے سانڈوں کی گردنوں کا یہی حال مستقل رہتا تھا مگر اسی طرح گردنوں پر جُوا رکھے وہ ستر اسی بلکہ سو سو من وزنی گڈا کھینچتے رہتے تھے۔ گاڑی کی روشنی سانڈوں پڑی تو انہوں نے ایک عجیب درویشانہ بے نیازی سے سر اٹھا کر ایک نظر گاڑی کی طرف دیکھا اور اُداسی آمیز سے انداز میں کانوں کو حرکت دے کر دوبارہ سر جھکا لیا اور جُگالی کا سلسلہ وہیں سے شروع کردیا

جہاں سے ٹوٹا تھا۔

میرا اشارہ پاکر سردار نے گاڑی سے اتر کر گڈّے پر جا کر ایک نظر اس کا جائزہ لیا اور واپس آکر بولا "گڈّا بالکل خالی ہے اس پر دو میلے گدوں اور ایک لحاف کے سوا کچھ نہیں ہے۔"

میں نے اطمینان سے سرہلایا اور حنیف کی رہنمائی میں آگے بڑھا دی۔ ان کی گاڑی وہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ ابھی انجن اسٹارٹ تھا اور دروازہ کھلا تھا۔ وہ اپنی گاڑی میں ہو کر رائفلیں چھپا چکے تو میں نے تیزی سے گاڑی موڑی اور مناسب سی جگہ آنے کے بعد سڑک پر چڑھا دی۔

گھڑی ابھی تک میری کلائی پر موجود تھی اور میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ میری کوئی اور چیز بھی اس ساری گڑبڑ کے دوران نہیں گری تھی۔ اس ساری کارروائی میں صرف اٹھائیس منٹ صرف ہوئے تھے۔ چار زندگیاں ختم ہو گئی تھیں اور میری زندگی کا ایک اہم باب ختم ہو گیا تھا۔ قیصر ملک کا باپ ملک اسلم میرے باپ کے قتل کا ذمے دار تھا اور میرے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ قیصر ملک اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا اور غیر شادی شدہ تھا۔ گویا ملک اسلم کا خاندان ختم ہو چکا تھا۔ اب وہاں کوئی مجھ سے انتقام لینے کی خواہش میں جھلسنے والا باقی نہیں رہا تھا۔ میں آج جب گھر سے نکلا تھا تو مجھے گمان تک نہیں تھا کہ راہ چلتے یوں اچانک یہ باب ختم ہو جائے گا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ قیصر ملک کو کس طرح معلوم تھا' میں افضال شاہ سے مل کر اس وقت اس راستے سے واپس آرہا ہوں گا۔ تبھی تو وہ گھات لگائے راستے میں موجود تھا۔ یہ محض ایک اتفاق تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اسے کس نے میرے پروگرام سے مطلع کیا تھا؟ میرے ساتھیوں اور کارکنوں میں تو کسی غدار کی موجودگی بعید از امکان تھی۔ اس پہلو پر تو میرا ذہن سوچنے کے لئے آمادہ ہی نہیں تھا۔ تو پھر...؟

اس سوال کو میں نے اپنے ذہن میں معلق چھوڑ دیا۔ بعض سوالوں کے جواب وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی سامنے آجاتے ہیں۔ میں طوفانی رفتار سے گھر پہنچا' غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور چیمبر آف کامرس کے ڈنر میں ہوٹل جا پہنچا۔ میں نے اس واقعے کو ذہن سے جھٹک دیا تھا۔

دو دن بعد افضال شاہ زمین کی قیمت کی ادائیگی کے سلسلے میں دفتر آیا تو مجھ سے بھی اس کی ملاقات ہوئی' وہ کچھ بجھا بجھا سا نظر آ رہا تھا۔ باتوں کے دوران بولا "میں شاید آج رقم ٹرانسفر کرانے کے سلسلے میں نہ آتا لیکن کمپنی والوں کا اصرار تھا کہ انہوں نے ساری کارروائی مکمل کر لی ہے۔ پھر میں آپ کے دفتر کے سامنے سے گزر بھی رہا تھا۔ سوچا چلو دستخط کرتا ہی چلوں۔ آپ جیسے آدمی کے ساتھ یہ ڈیل مکمل ہونے پر مجھے بہت خوشی ہوتی لیکن ایک افسوس ناک واقعے نے ساری خوشی کرکری کر دی۔"

"کیا ہوا؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

ہمارا ایک پرانا جاننے والا زمیندار تھا' قیصر ملک۔ نوجوان ہمارے باپ کی اس کے باپ سے شناسائی رہی تھی۔" وہ مغموم لہجے میں بولا۔ میرے کان کھڑے ہوئے۔

بات جاری رکھتے ہوئے بولا "شاید آپ اسے جانتے بھی ہوں۔ میں نے سنا ہے' آپ کا فلم بزنس سے بھی تھوڑا بہت تعلق ہے۔ اس کا بھی باپ کے زمانے سے فلمی دنیا سے تعلق چلا آرہا ہے۔ بہت سی فلمیں پروڈیوس کی تھیں انہوں نے۔ جن میں کامیاب بھی رہی تھیں۔"

ہاں۔ کچھ یاد تو پڑتا ہے۔ نام تو کچھ مانوس سا ہے۔" میں نے زور دینے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "اصل میں فلم بزنس پر توجہ دینے کا مجھے کچھ زیادہ وقت نہیں ملتا۔ میرا ایک آدمی اشفاق احمد۔ وہ سارے معاملات ہینڈل کرتا ہے' وہی سب کو دیکھتا ہے۔ بہر حال آپ کیا بتانے جا رہے تھے؟"

"آپ نے شاید اخبار میں چھوٹی سی خبر پڑھی ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "پولیس کو ویرانے میں تین بدنام ڈاکوؤں کے ساتھ اس کی لاش ملی ہے۔ تینوں ڈاکو قتل اور ڈکیتیوں کی کئی وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھے۔ زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ قیصر ملک بھی ڈاکوؤں والے حلئے میں تھا۔ پولیس کو کافی حد تک یقین ہو چکا ہے کہ وہ نہ صرف ڈاکوؤں کی سرپرستی کرتا تھا بلکہ کسی موقع پر خود بھی وارداتوں میں حصہ لیتا تھا اور وہ چاروں مخالف گروہ کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔"

"اچھا!" میں نے آنکھیں تھوڑی سی پھیلا کر ذرا حیرت کا اظہار کیا "اس قسم کی افواہیں تو خیر اکثر سننے میں آتی ہیں کہ بعض زمیندار' ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے ہیں لیکن یہ کبھی نہیں سنا کہ زمیندار خود بھی انہی کے سے حلئے میں ان کے ساتھ واردات میں حصہ لینے چل پڑا ہو۔ جب اشاروں پر مدگی سے ناچنے والی کٹھ پتلیاں موجود ہوں تو اتنی زحمت کرنے اور اتنا خطرہ مول لینے کی کوئی تُک نظر نہیں آتی۔"

"جی ہاں۔ یہی میں نے بھی پولیس کو سمجھانے کی کوشش کی تھی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "لیکن پولیس تو پولیس ہے نا' اس نے جو رائے قائم کرلی سو کرلی۔ میں نے زیادہ زور اس لئے نہیں دیا کہ کہیں وہ مجھے ہی شاملِ تفتیش نہ کرلیں۔ ان کے تیور کچھ ایسے ہی ہو چلے تھے۔"

"اوہ!" میں نے متاسفانہ انداز میں سرہلایا "یہ تو آپ نے خاصی بری خبر سنائی۔ میں نے اخبار میں نہیں پڑھی۔ مجھے اخبارات زیادہ تفصیل سے پڑھنے کا موقع نہیں ملتا۔ خاصا گہرا دوست تھا آپ کا؟"

"نہیں۔ اسے گہرا دوست تو نہیں کہا جا سکتا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا "عمر میں وہ مجھ سے کافی چھوٹا تھا لیکن بہر حال پرانی شناسائی تھی۔ ملاقاتیں کم ہی رہیں۔ کبھی کبھار وہ لندن آتا تو خاصی لمبی ملاقاتیں رہتی تھیں لیکن پھر میں پیرس چلا گیا تھا تو ملاقاتوں کا سلسلہ کافی عرصہ منقطع رہا تھا۔ ذرا عیاش سا نوجوان تھا لیکن میرے خیال میں اتنا برا نہیں تھا جتنی بری اس کی تصویر اب سامنے آئی ہے۔"

میں ہمدردانہ انداز میں سرہلاتا رہا۔ وہ بولا "جس روز آپ کو میرے پاس آنا تھا اس روز بھی اس بدنصیب سے میری ٹیلی فون پر بات ہوئی تھی۔ میں نے اس سے آپ کا ذکر بھی کیا تھا کہ آپ سے میری زمین کا سودا فائنل ہو رہا ہے اور آج آپ زمین دیکھنے آئیں گے بلکہ اس نے پوچھا بھی تھا کہ میں کس وقت تک اس چکر سے فارغ ہو جاؤں گا۔ وہ مجھے اپنے ہاں بلانا چاہتا تھا۔"

میرا خیال درست تھا کہ بعض سوالوں کا جواب وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی مل جاتا ہے۔ اب مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میرا پروگرام قیصر ملک کے علم میں کس طرح تھا۔ اس کے سازشی ذہن نے نہ جانے کیوں اس انداز میں ایک بار پھر میری جان لینے کی تدبیر کی تھی اور خود جان گنوا بیٹھا تھا۔ مجھے اس کی جواں مرگی کا افسوس تھا۔ لیکن ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا تھا کہ یہ باب بند ہو گیا تھا۔ میرے پاؤں سے گویا پھانس سی نکل گئی تھی۔ کبھی کبھار یہ پھانس خواہ مخواہ ہی زیادہ تکلیف دینے لگتی تھی۔

ادائیگی کی کارروائی مکمل ہو چکی تو افضال شاہ چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی کیتھرین نے انٹر کام پر بتایا کہ سیٹھ عالم شیر مجھ سے بات کرنا چاہتا ہے۔

"اسے بتادو کہ اس وقت میں مصروف ہوں' پھر کسی وقت بات کرے۔" میں نے ریسیور رکھ دیا اور فائلیں دیکھنے لگا۔ ان میں زیادہ تر باہر سے آئی ہوئی ڈاک تھی۔ آدھے گھنٹے کے بعد کیسترین خود دستک دے کر کمرے میں آئی اور ہچکچاتے ہوئے بولی "سر! وہ عالم شیر نے بڑا ناک میں دم کر رکھا ہے۔ پہلے آرام سے بات کر رہا تھا' پھر رعب ڈالنے لگا' اب منت سماجت کر رہا ہے۔ وہ صرف چند سیکنڈ بات کرنا چاہتا ہے۔"

"اسے ڈانٹ پلائی ہوتی۔" میں نے کہا۔

"ڈانٹ تو بہت پلائی ہے سر!" وہ انگلیوں میں پنسل گھماتے ہوئے بولی "اس کے بعد ہی تو منت سماجت کرنے لگا ہے۔"

"اچھا ملاؤ۔" میں نے بے زاری سے کہا۔ وہ واپس اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں نے ریسیور اٹھالیا۔

لائن ملتے ہی دوسری طرف سے عالم شیر بلا تمہید چیخا "تم نے اچھا نہیں کیا چوہدری!"

"کیا بدتمیزی ہے۔" میں نے اسے ڈانٹا "اگر اتنے زور سے ہی چیخنا تھا تو فون استعمال کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ویسے ہی اپنے آفس کی کھڑکی سے سر نکال کر گلا پھاڑتے تو آواز مجھ تک پہنچ جاتی۔"

"باتیں کرنی بہت آگئی ہیں تمہیں۔" اس کا والیوم کم نہیں ہوا "لیکن میں تمہیں بتا رہا ہوں تم نے اچھا نہیں کیا۔ میں تمہیں پچھتانے پر مجبور کردوں گا۔"

"کیا اچھا نہیں کیا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"یہ جو تم نے مجھے اغوا کروا کے بائیس لاکھ روپیہ تاوان وصول کیا ہے' یہ میں تمہیں ہضم نہیں ہونے دوں گا۔" غصے کی شدت سے اس کی آواز پھٹی جارہی تھی۔

"یہ کیا بکواس ہے؟" میں نے برہمی سے کہا "میں اس قسم کا بے ہودہ مذاق پسند نہیں کرتا۔"

"مذاق؟ تمہارے خیال میں' میں مذاق کر رہا ہوں؟ جس کی تم نے اتنی بے عزتی کی۔۔۔ جس سے بائیس لاکھ روپیہ چھینا اسے مذاق سوجھے گا؟" اس کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اس وقت اس کی باچھوں سے کف بہہ رہا تھا۔

"شیر عالم!" میں نے بدستور ملائمت سے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں کسی قسم کا دورہ پڑا ہے۔ تمہیں شاید کسی نے نہیں بتایا کہ اس حالت میں شہر کے معزز لوگوں کو فون کرکے ادھر ادھر کی بکواس کرنے اور اول فول بکنے کے بجائے کسی اچھے ڈاکٹر سے رجوع کیا کرتے ہیں؟"

"ڈاکٹر سے تو میں رجوع کرچکا ہوں' اپنے زخموں اور چوٹوں کا علاج کروا رہا ہوں۔ لیکن تمہیں عنقریب گورکن سے رجوع کرنا پڑے گا۔ تھوک کے حساب سے لاشیں اٹھیں گی تمہارے ساتھیوں کی۔ اور تم خود بھی محافظوں کے گھیرے میں کب تک بچ

گے؟ کسی نہ کسی روز کوئی گولی تم تک پہنچنے کے لئے محافظو حلقے میں بھی راستہ تلاش کرلے گی۔" چیختے چیختے اب خود ہی آواز کچھ کم ہوگئی تھی۔

"اب مجھے پورا یقین ہوگیا ہے کہ تمہارا ذہنی توازن ہوچکا ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "میں پاگل خانے وا فون کرتا ہوں۔ پتا نہیں تم کن کی لاشوں اور کن محافظوں کی کر رہے ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم زیادہ خطرناک پاگل نہ بن میں تمہیں ابھی پاگل خانے بھجوانے کا بندوبست کرتا ہوں۔"

"اب تم مجھے کہیں بلوانے اور کہیں بھجوانے کا بندو نہیں کرسکو گے بچے!" وہ زہریلے لہجے میں بولا "اب تو سا بندوبست میں ہی کروں گا۔ خیریت چاہتے ہو تو میرا بائیس لاکھ واپس کردو۔"

"میری سمجھ میں نہیں آرہا وہ کون سی بائیس لاکھ کی ر جس کے صدمے سے تم ذہنی توازن کھو بیٹھے ہو۔ میرا تو تم سے قسم کا کوئی لین دین بھی نہیں ہے۔" میں نے بے زاری سے کہا

"سب سمجھ میں آجائے گا بچے! سب سمجھ میں آجائے' وہ گویا پھپکارتے ہوئے بولا "تم نے ابھی صرف اپنا ہاتھ دکھایا ابھی تم نے عالم شیر کا ہاتھ نہیں دیکھا۔"

"حاجی صاحب!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "معلوم ہے تم ادھر اپنے فون کے ساتھ ریکارڈنگ سسٹم منسلک کر میری گفتگو ریکارڈ کر رہے ہو لیکن تمہاری اطلاع کے لئے عرض کہ ادھر میرے فون سے بھی گفتگو ریکارڈ ہوتی ہے۔ اور تم نے ا تک جو بھی بکواس کی ہے وہ ساری کی ساری دھمکی اور ہرا پھیلانے کی کوشش ہے۔ اگر یہ کیسٹ میں آئی جی صاحب بھجوادوں تو فوری طور پر تمہارے خلاف سخت قانونی کاروا ہوسکتی ہے۔ تمہارے وارنٹ بھی نکل سکتے ہیں۔"

"یہ ریکارڈنگ شکارڈنگ۔۔۔ یہ کیسٹ۔۔۔ یہ وارنٹ۔۔۔ قانونی کارروائیاں' یہ سب تمہارے مشغلے ہیں برخوردار!" پھنکارا۔ "ہمارے طور طریقے تو بالکل سیدھے سادے اور ٹو پوائنٹ ہوتے ہیں۔ اب تمہیں واسطہ پڑے گا تو سب کچھ سمجھ آجائے گا۔ اب تم یہ نہیں کہہ سکو گے کہ کسی نے تمہیں للکار بغیر مارا تھا۔ اب ہماری تمہاری کھلی جنگ ہے' جو بندوبست چا کرلینا۔"

"ایک بندوبست تو میں فوری طور پر کر رہا ہوں۔" میں کہا۔

"کیا؟" اس نے غالباً غیرارادی طور پر پوچھا۔

"یہی کہ میں فون بند کر رہا ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیو کریڈل پر پٹخ دیا۔ اس وقت دوسری طرف اس کی حالت یقیناً دیکھ ہوگی۔ ایسے ہی موقعوں پر باتصویر ٹیلی فون کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ میں نے شیر عالم کی گفتگو کو کوئی جھکیوں سے زیا

نہیں دی تھی تاہم کچھ دیر بعد میں نے محض احتیاطاً اپنے ... کو معمول سے ذرا زیادہ ہوشیار رہنے کا سگنل دے دیا۔

دوسرے روز سے میری کاروباری مصروفیات بہت بڑھ گئیں۔ دس بارہ روز کے لئے لندن بھی جانا پڑا۔ وہاں بھی مصروفیات زیادہ رہیں۔ کئی پارٹیوں سے ملاقاتیں' لنچ اور ڈنر طے تھے۔ بے مسائل طے کرنا تھے۔ اور ان پارٹیوں میں ایک کروڑپتی انگریز جوڈی فوسٹر بھی شامل تھی جو پہلی بار مجھ سے ملی تھی۔ اس سے ... اس نے صرف کمپنی کی طرف سے آنے والے خطوں پر میرے ... دیکھے تھے' مجھے نہیں دیکھا تھا۔

... میرے بارے میں اس کے ذہن میں یہی تاثر تھا کہ سوٹی سی ... والا کوئی امیر بڈھا ہوگا جو پنجابی لہجے میں انگریزی بولتا ہوگا۔ یہ ... نے مجھے بعد میں بتایا۔

میں نے تو خیر اس کے بارے میں کبھی کچھ سوچا ہی نہیں تھا بلکہ ... تو صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ ہماری پارٹیوں میں شامل ... مجھے تو بس لندن روانہ ہوتے وقت میرے ایکسپورٹ منیجر نے ... فائل تھما دی تھی جس میں کچھ لوگوں کے ناموں کی فہرست ... تھی کہ مجھے ان سے ملنا ہے۔ کچھ کاغذات پر اہم نکات اور ... قات کی تاریخیں وغیرہ درج تھی۔ ان سب سے ملاقاتیں پہلے ہی ... ہوچکی تھیں۔

جوڈی فوسٹر ایک نوخیز اداکارہ کا نام بھی تھا لیکن ایک بہت ... کمپنی کی مالکن کا یہ نام پڑھ کر میرے ذہن میں بھی کچھ ایسا ہی ... آیا تھا کہ وہ کوئی بڑی خرانٹ اور قدرے سنکی قسم کی بڑھیا ... عام طور پر کسی بہت بڑی کمپنی کی مالک بننے کی نوبت آتے ... تے عورت عمر کی اسی منزل کو پہنچ چکی ہوتی ہے تب ہی اسے ... روبار کو چلانے کا سلیقہ آتا ہے۔

لیکن ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بزنس لنچ پر اس سے ملاقات ... تو ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ وہ سنہرے بالوں ... ایک دراز قد عورت تھی جس کی عمر شاید تیس کے قریب رہی ... لیکن وہ بمشکل بائیس چوبیس کی لڑکی نظر آتی تھی۔ وہ بے پناہ ... حسین تھی لیکن روسی لڑکیوں کی طرح اس کے حسن میں وہی پھیکا ... اور وہی ٹھنڈک تھی جو شفاف برف پوش چوٹیوں میں ہوتی ہے۔

ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر اچھی طرح حیران ہوچکے تو دونوں ... کو بے اختیار ہنسی آگئی۔ ہم اپنا اپنا کاروباری رکھ رکھاؤ اور سرد ... بالکل بھول گئے۔ حتیٰ کہ اس نے اپنی اونچے طبقے کے انگریزوں ... والی وضع داری بھی بالائے طاق رکھ دی۔ چند منٹ بعد ہی ہم دو ... بے تکلف نوجوان دوست نظر آنے لگے۔ مجھے تو کاروبار پھر بھی کچھ ... یاد رہا لیکن اس نے تو گویا ہر چیز بالکل ہی بھلا دی۔

ہم نے ایک دوسرے کو صاف گوئی سے وہ رائے بھی بتادی جو ہم نے ایک دوسرے کے بارے میں قائم کر رکھی تھی۔ ہنسی مذاق کی باتوں کے دوران میں بار بار کوئی کاروباری نکتہ اٹھاتا تو وہ بے زاری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہتی "اوہ۔۔۔ مسٹر شوڈری (چوہدری) اٹ از آل رائٹ۔۔۔ یو رائٹ اپنی تھنک' آئی ول سائن اٹ۔"

اس سے میری ایکسپورٹ کمپنی کا کئی ملین پاؤنڈ سالانہ کا لین دین تھا' وہ ہماری وی آئی پی لسٹ میں تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس سے ملتے وقت مجھے خواہ مخواہ مصنوعی خوش اخلاقی سے مسکرانا اور اس کی ہر بات کی تائید میں سر ہلانا پڑے گا جو میرے لئے ایک مشکل کام تھا لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ ہوگیا تھا' اس کے التفات کو سنبھالنا میرے لئے مشکل ہو رہا تھا۔

دوسرے روز وہ بغیر کسی اپائنٹمنٹ کے میرے ہوٹل کے سوئٹ میں آگئی۔ کاروبار کی تو اب کوئی بات ہی نہیں ہوتی تھی' اب تو اسے صرف یہ جاننے کی فکر رہتی تھی کہ میں کب فارغ ہوؤں گا' کب ہم ڈانس کے لئے جاسکتے ہیں' کب ہم تھیٹر جاسکتے ہیں اور کب مضافات میں لمبی ڈرائیو کے لئے نکل سکتے ہیں۔

میں نے اسے اشاروں کنایوں میں بتانے کی کوشش کی کہ میں ان کاموں کے لئے لندن نہیں آیا تھا۔ سوئٹ کے اندر تک کی دوستی تو ٹھیک تھی لیکن اب میں اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دنیا جہان کی خاک چھانتا نہیں پھر سکتا تھا۔ ادھر اس کے اندر کی تنہائی اور روح کی افسردگی' وغیرہ ختم ہی ہونے میں نہیں آرہی تھی۔

اس نے مجھے یہ بھی بتادیا کہ اسے ساری دولت و جائیداد اور جمی جمائی کمپنی اس کے آنجہانی شوہر سے ترکے میں ملی تھی۔ جوڈی کی وہ پہلی اور اس کے شوہر کی تیسری شادی تھی۔ جوڈی کی عمر اس وقت چوبیس سال اور اس کے شوہر کی بیاسی سال تھی۔ شادی کے صرف دو سال بعد اس کا انتقال ہوگیا تھا۔

یہ سب کچھ سن کر میرے ذہن میں نوجوانی کی پڑھی ہوئی جرم و سزا کی وہ ساری کہانیاں تازہ ہوگئی تھیں جن میں نوجوان بیویاں عمر رسیدہ دولت مند شوہروں کے قتل کی سازش کرتی تھیں۔

اس نے گویا میرے خیالات پڑھ لئے اور مجھے جھنجوڑ کر میرے بال بکھیرتے ہوئے بے تحاشہ ہنستے ہوئے بولی "مجھے کوئی زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ مجھے صرف دو سال دلجمعی سے انتظار کرنا پڑا تھا۔ وہ انجائنا کا مریض تھا۔ بلڈ پریشر تقریباً ہر وقت ہائی رہتا تھا۔ شراب پی پی کر اس کے گردے ناکارہ ہوچکے تھے۔ مٹھی بھر سلیپنگ پلز کھائے بغیر اسے نیند نہیں آتی تھی۔ اعصاب ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر مجھے تو حیرت تھی کہ میرا انتظار اتنا طویل کیوں ثابت ہوا۔"

مجھے ان لوگوں کے حوصلے پر بڑا رشک آتا تھا جو بلڈ پریشر اور امراض قلب وغیرہ میں مبتلا ہوتے تھے۔ جن کے گردے اور پھیپھڑے وغیرہ تقریباً ناکارہ ہوتے تھے مگر جو اسی نوے سال کی عمر میں پچیس تیس سال کی لڑکی سے شادی کرلیتے تھے۔ انتہائی بلند

حوصلے کے بغیر اس قسم کے کارنامے انجام نہیں دیئے جاسکتے۔

لندن سے میں واپس آنے لگا تو یہ جان کر میرے ہوش اڑ گئے کہ جوڈی فوسٹر میرے ساتھ پاکستان آنے کے لئے تلی بیٹھی تھی۔ اس کا حسن' اس کی نوازشات اور اس کی شخصیت کی کشش اپنی جگہ تھی اور لندن کی حد تک ساتھ عمدگی سے نبھ گیا تھا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ میں اسے پاکستان لے جانے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ادھر اُدھر کے بہانے بنا کر بڑی مشکل سے میں نے اسے اپنے ساتھ چلنے سے باز رکھا۔

میں واپس پہنچا تب بھی بے شمار مصروفیات میری منتظر تھیں۔ انہی مصروفیات کے دوران آفاق مجھ سے ملنے آیا۔ وہ خاصا خوش اور پُرجوش نظر آرہا تھا۔ آفس میں داخل ہوتے ہی بولا "آپ ملک سے باہر تھے۔ آپ کی عدم موجودگی میں فلم انڈسٹری میں تو پے در پے کئی انقلابات آگئے۔ قیصر ملک مارا گیا اور پولیس اس کے ڈاکو ہونے کے بارے میں تفتیش کررہی ہے۔ نصیر نواز نے خودکشی کرلی اور نسیم سجاد نے راتوں رات اس کی جگہ لے لی۔ آپ کے حوالے سے وہ میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اس کے لئے پریس کانفرنس کا اہتمام کردیا تھا۔ اچھا خاصا اسکینڈل تھا۔ اخباروں کے فلمی ایڈیشنوں میں تو بڑی بڑی سرخیاں لگی تھیں۔ آپ کو تو کچھ پتا نہیں ہوگا' آپ تو شاید اس وقت روانہ ہوچکے تھے۔"

"نہیں۔ نصر نواز کی خودکشی اور قیصر ملک کی ہلاکت کی خبر میں نے جب اخبارات میں پڑھی تو میں یہیں تھا۔ تفصیلات کا بہرحال علم نہیں ہوسکا اور تفصیلات سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہیں۔ میرے لئے یہ کوئی اہم واقعات نہیں ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ اس طرح کے لوگوں کا انجام ایک نہ ایک روز ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا "تم یہ سناؤ کہ اپنا فلمی کاروبار کیسا جارہا ہے؟"

اس کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑگیا تاہم مسرور لہجے میں ہی بولا "بہت اچھا جارہا ہے۔ لگتا ہے ہمارا ستارہ بہت صحیح راستے پر چل پڑا ہے۔ تمام رکاوٹیں گویا خود بخود دور ہوتی جارہی ہیں۔ معروف سے معروف اسٹارز سے بھی ڈیٹس دھڑا دھڑ ملتی جارہی ہیں۔ ہر شخص تعاون پر تلا بیٹھا ہے۔ ڈسٹری بیوٹرز رقمیں لئے چلے آرہے ہیں۔ سلیم سید کہتا ہے کہ وہ اپنے بہترین اسکرپٹ صرف ہمارے لئے مخصوص رکھے گا۔ ادھر نسیم سجاد کو سارے پروڈیوسروں نے گھیر لیا ہے۔ اسے زبردستی رقمیں بھی تھمادی ہیں' اس کے لئے سب کچھ کررہے ہیں تاکہ وہ ان کے لئے کہانیاں لکھنی شروع کردے۔ لیکن وہ تو بس جیسے آپ کا مُرید ہے' آپ ہی کے نام کی گردان کرتا رہتا ہے۔ کہتا ہے چوہدری صاحب کے حکم کے بغیر کسی کے لئے کچھ نہیں لکھوں گا۔ وہ اس وقت بھی آپ سے ملنے کی خواہش لئے میرے ساتھ آیا ہوا ہے۔ کیتھرین نے اسے باہر بٹھا رکھا ہے۔ میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ پہلے میں تنہائی میں چوہدری صاحب سے مل لوں' شاید انہیں علیحدگی میں مجھ سے کوئی بات کرنی ہو۔ کوئی ہدایت دینی ہو۔"

"ارے بھئی ایسی کوئی بات نہیں۔ ہدایت کار تم ہو' ہدا... بس اب تم ہی دیتے رہا کرو۔" میں نے انٹرکام کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ابھی بلوا لیتے ہیں اسے بھی اندر۔ مجھے یہ اچھا لگا ہے۔ شریف آدمی ہے۔"

"جی ہاں۔ لگتا تو مجھے بھی ایسا ہی ہے۔" آفاق نے تائید...

میں نے کیتھرین سے کہہ کر نسیم سجاد کو اندر بلوایا اور اس... استقبال کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کچھ اس انداز سے اندر آ... آنکھیں نم تھیں اور وہ میرے پیروں میں گرا جارہا تھا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کسی کی حد سے زیادہ انکساری اور ممونیت مجھے شر... کردیتی تھی۔

اس کے انداز نے بھی مجھے کھسیانا سا کردیا۔ میں نے اسے... سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا "یہ آپ کیا کررہے ہیں صاحب؟ خدا کے لئے اپنے پیروں پر ذرا تن کر کھڑے ہونا سیکھئے۔"

وہ گلوگیر سی آواز میں بولا "بس اب آپ کی نظرِ کرم میسر ہے چوہدری صاحب! اب میں سب کچھ سیکھ جاؤں گا۔ میں مٹی... آپ نے مجھے سونا بنادیا ہے۔"

میں نے بدستور شرمندگی سے کہا "بنانے والی ذات تو صر... اوپر والے کی ہے نسیم صاحب! ہم تو کسی کو بھی کچھ بنانے کی قدر... نہیں رکھتے۔ ہم انسان تو زیادہ تر ایک دوسرے کا کچھ بگاڑتے ہیں' بناتے ذرا کم ہی ہیں۔"

"مجھے لگتا ہے' آپ کی یہ انکساری اور اوپر والے پر آپ کا زبردست اعتقاد ہی آپ کو دن دُگنی اور رات چوگنی ترقی دے... ہے۔" وہ میرا اشارہ پاکر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"میں تو اس بارے میں کوئی رائے دینے سے بھی قاصر ہوں... میں بہت گناہ گار انسان ہوں' اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربان ہے تو... صرف اس کی صفت ہے ورنہ مجھ میں ایسی کوئی خوبی نہیں کہ وہ... پر مہربان ہو۔" میں نے حقیقتاً اپنے دل میں عاجزی کا ایک عجیب... سوز محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"سبحان اللہ!" وہ گویا جھوم کر بولا۔ آفاق خاموش اور د... بخود بیٹھا تھا' وہ جیسے کہیں کھو سا گیا تھا۔

"تم کیا سوچ رہے ہو آفاق؟" میں نے پوچھا۔

وہ جیسے چونکتے ہوئے بولا "سر! میں سوچ رہا تھا کہ دنیا آپ... جیسے دولت والوں کو اور ہم جیسے فلم والوں کو بہت برا سمجھتی ہے... یہی سمجھتی ہے کہ ہم تو گناہوں کی دلدل میں گردن تک غرق رہتے ہیں اور شاید کبھی بھول کر بھی خدا کو یاد نہیں کرتے۔ ہم شاید دنیا... میں فرعون کے پیروکار ہیں لیکن کوئی اندازہ نہیں کرسکتا کہ ہمارے... دلوں میں کتنا گداز اور کتنا خوفِ خدا ہے۔ ہمارے ارادے کمزور... ہیں' ہم گناہ گار ہیں۔ ہر قدم پر ہم سے کوئی نہ کوئی گناہ سرزد ہو... ہے لیکن ہمیں کم از کم اس کا احساس تو ہے۔ اس دنیا میں بے شما...

...تو ایسے ہیں جو گناہوں اور خباثتوں کو بھی نیکیوں کی طرح فخر... ...سر انجام دیتے ہیں اور دنیا میں معزز و سربلند بنے بیٹھے ہیں۔"

"یہ تم سے مزید ایک گناہ سرزد ہورہا ہے آفاق؟" میں نے ...تے ہوئے کہا "دوسروں سے اپنا موازنہ کرنا اور اپنے آپ کو ...نا اس قسم کی سوچ خود پرستی کی طرف لے جاتی ہے۔ دنیا میں ہر ...کے لوگ موجود ہیں۔ انہیں اپنا کام کئے جانے دو' ہم اپنا کام ...پائیں گے۔"

پھر میں نے نسیم سجاد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "آپ ...یے نسیم صاحب! کیسی گزر رہی ہے؟"

"بس کیا بتاؤں چوہدری صاحب!" وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ...معلوم ہوتا ہے کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔ ہر لمحے دھڑکا سا لگا ...ہے کہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ کل تک فلم انڈسٹری میں کوئی مجھے ...نہیں تھا۔ آج سب میرے گھر حاضری دے رہے ہیں۔ کل ...میں کسی سے ملنے کی کوشش کرتا تو شاید وہ دو منٹ کے لئے مجھے ...دفتر میں بھی نہ بلاتا' آج ایک فلم ساز نے مجھے اپنے بنگلے میں ...بیڈ روم کا بڑا پیارا اور سجا سجایا پورشن دے دیا ہے۔ ایک ...ڈیوسر نے اپنی پرانی گاڑی میرے حوالے کردی ہے۔ ایک نے ...پنے خرچ پر ڈرائیور میرے ہمراہ کردیا ہے۔ اور یہ سب اس ...صورت میں ہے کہ میں نے کسی کے لئے کام کی ہامی نہیں بھری۔ ...میں نے تو سب سے کہہ دیا کہ بھئی میں تو چوہدری صاحب کا ادنیٰ ...غلام ہوں۔ میرا قلم تو بس انہی کے لئے وقف رہے گا جنہوں نے ...غربت اور گمنامی میں عزت دی' میرا ہاتھ تھاما اور ہر طرح سے ...میری مدد کی جبکہ انہیں مجھ سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میری خدمات کی ...ضرورت نہیں تھی۔ انہیں آج بھی میری خدمات کی ضرورت ...نہیں ہے۔ میری خدمات کے بغیر بھی ان کا سفر بلند سے بلند تر مقام ...کی طرف جاری رہے گا۔ لیکن خود مجھے ممونیت کے اظہار کا اس ...کے سوا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا کہ میں جس قابل بھی ہوں' اپنی ...خدمات ان کے لئے وقف کردوں۔ لیکن میری اس تقریر سے بھی ...کوئی مایوس نہیں ہوا۔ سب کی نوازشات کا سلسلہ جاری ہے۔ ...میری سمجھ میں نہیں آتا' انہیں کیسے روکوں۔ ویسے خوشی بھی ہورہی ...ہے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ خوشی کے مارے پاؤں زمین پر نہیں ...رہے۔"

"نسیم صاحب! آپ جو کچھ کررہے ہیں بالکل غلط کررہے ...ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں نے اگر آپ کے لئے کچھ ...کیا ہے تو وہ اس لئے نہیں کیا کہ میں آپ کو احسان کی زنجیر سے ...باندھ کر رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اپنے فیصلوں میں بالکل آزاد رہئے ...اور ہر وہ معقول کام کیجئے جس سے آپ کی بھلائی کی کوئی صورت ...نکلتی ہو۔ آپ کسی کے لئے بھی خواہ کتنا ہی کام کریں' کسی کو کتنی ہی ...ترجیح دیں' اس سے ہمارے آپ کے تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑے ...گا۔ آپ نے اپنی عمر کے سنہرے سال پہلے ہی احمقانہ قسم کی غلامی میں گزار دیئے۔ بلکہ گنوا دیئے۔ میں نہیں چاہتا کہ باقی عمر آپ غیر ضروری ممونیت میں ضائع کردیں۔ جس کے لئے دل چاہے کام کیجئے اور اپنی پوری توانائی سے کام کیجئے۔ زیادہ سے زیادہ کام کیجئے' جتنے کنٹریکٹ پورے کرسکتے ہیں اتنے ضرور سائن کیجئے۔ آپ کے حصے کا جتنا بھی عروج کا دور رہ گیا ہے اس سے ضرور استفادہ کیجئے۔ یہی میری خواہش ہے اور یہی میرا مشورہ۔"

"ہمیں تو آپ کے حکم پر چلنا ہے چوہدری صاحب!" وہ دو ٹوک لہجے میں بولا "آپ اجازت دے رہے ہیں تو دوسروں کے لئے بھی کام شروع کردیں گے۔ آپ منع کریں گے تو وہیں ہاتھ روک لیں گے۔"

"نہیں' میں آپ کو منع نہیں کروں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ مجھے نسیم سجاد کو دیکھ کر واقعی خوشی ہورہی تھی۔ وہ عمدہ قسم کی سیاہ شیروانی اور سفید پاجامے میں تھا۔ خوشحالی کی چھاؤں میں قدم رکھے اسے چند ہی دن ہوئے تھے لیکن پہلے سے بہت مختلف آدمی دکھائی دینے لگا تھا۔ صاف ستھرا اور نکھرا نکھرا سا۔ چہرے پر عجیب سی چمک آگئی تھی۔ خدوخال سے خود اعتمادی جھلکنے لگی تھی۔ یہ تغیر مجھے بارہا دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا اور ہر بار میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

غربت میں آدمی زنگ لگے برتن کی طرح ہوتا ہے' گھر کے کونے میں پڑا رہتا ہے۔ نظروں کو بھلا نہیں لگتا۔ گرہن لگا چاند ہوتا ہے جسے دیکھنے کے لئے لوگ گردنیں اونچی نہیں کرتے' نظر چُراتے ہیں۔ خوشحالی اس زنگ آلود برتن پر پالش کردیتی ہے۔ اس میں چمک دمک آجاتی ہے۔ چاند کا گرہن دور ہوجاتا ہے۔ خوشحالی اور عروج زیادہ ہی آجائے تو آدمی عید کے چاند کی طرح ہوجاتا ہے۔ لوگ چھتوں پر چڑھ چڑھ کر دیکھتے ہیں اور بڑے اہتمام سے دیکھتے ہیں۔

آفاق مجھ سے مخاطب ہوا "بہرحال نسیم صاحب دو فلمیں تو ہمارے لئے بھی لکھ رہے ہیں' دونوں ایکشن فلمیں ہوں گی۔"

"نسیم صاحب سے ایکشن فلمیں لکھواؤ گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بھئی یہ دھیمے اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی ہیں۔ ان سے تو سوشل' میوزیکل اور رومینٹک قسم کی فلمیں لکھواؤ۔"

"یہی تو آپ کو معلوم نہیں ہے چوہدری صاحب" آفاق جلدی سے بولا "دھیمے اور مرنجاں مرنج قسم کے آدمی ایکشن فلمیں بہت اچھی لکھ سکتے ہیں۔ نسیم صاحب تو کئی کامیاب ایکشن فلمیں لکھ چکے ہیں لیکن وہ بھی اسی دور میں ریلیز ہوئی ہیں جب ان کی جگہ نصیر نواز کا نام چل رہا تھا۔ ویسے بھی شاید آپ ہماری انڈسٹری کے سب سے بڑے ایکشن رائٹر سے نہیں ملے ہیں جن کا ہیرو سب سے اونچا بولتا ہے۔ ہمیشہ ناقابلِ شکست رہا ہے اور جس نے لاٹھی اور گنڈاسے سے کشتوں کے پشتے لگادیئے ہیں؟"

"نہیں میرا خیال ہے مجھے ان سے ملاقات کا اتفاق نہیں ہوا۔" میں نے ذہن پر تھوڑا سا زور دیتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی بڑے دھیمے' مرنجاں مرنج اور دھان پان سے آدمی ہیں۔" آفاق نے بتایا۔ پھر وہ فلسفیانہ سے لہجے میں بولا "لکھنے والے اپنے ادھورے خواب لکھتے ہیں چوہدری صاحب! وہی کچھ زیادہ لکھتے ہیں اور اچھا لکھتے ہیں جس کی ان کی اپنی زندگی میں کمی ہوتی ہے۔ فلموں میں تو خیر بھیڑ چال کا مسئلہ بھی آجاتا ہے۔ پروڈیوسر کے حکم اور پبلک کی ڈیمانڈ کے مطابق بھی لکھنا پڑتا ہے لیکن افسانوں اور کہانیوں کی دنیا میں تو آپ کو میرے نظریے کے بہت سے ثبوت ملیں گے۔ اگر آپ نے بہت پڑھا ہو اور آپ کو لکھنے والوں سے ملاقات کا موقع بھی ملا ہو تو شاید آپ کو معلوم ہو کہ لکھنے والوں کی زندگی میں جس چیز کی کمی ہوتی ہے اسی کے متعلق وہ خوب لکھ لکھ کر اپنے دل کو غیر شعوری طور پر تسکین پہنچاتے ہیں۔ لیکن بہرحال یہ کوئی معیوب بات نہیں' کسی قسم کا احساسِ محرومیت ہی انسان کو فنکار بناتا ہے۔ بدصورت قلم کار کی تحریر میں بڑا حسن ہوتا ہے اور محبت سے محروم مصنف کی تحریروں میں محبت ہی محبت بکھری ہوتی ہے۔ جن کی تحریروں میں انسانی قدروں کا بڑا پرچار ہوتا ہے اور معاشرے کی بڑی دُہائی دی جاتی ہے' وہ عملی زندگی میں انسانی قدروں کے کچھ ایسے زیادہ امین نہیں ہوتے۔ جن کا ہیرو بڑا شوخ' چنچل اور سوشل ہوتا ہے' وہ خود عام طور پر بڑے شرمیلے اور گوشہ نشین ہوتے ہیں۔ میں اس خیال سے کچھ زیادہ متفق نہیں ہوں کہ تحریر میں لکھنے والے کی شخصیت کا عکس نظر آتا ہے۔ میرے خیال میں اس بیان میں تصحیح کرکے کچھ یوں کہنا چاہئے کہ اکثر تحریروں میں ان کے لکھنے والوں کی تشنہ تکمیل تمناؤں کا عکس نظر آتا ہے۔"

"بھئی میں یہ دعویٰ تو نہیں کرسکتا کہ میں نے بہت پڑھا ہے۔" میں نے آہستگی سے کہا "لیکن مجھے یاد ہے' نوجوانی میں' میں دنیائے ادب کے ایک بہت بڑے مزاح نگار کی کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ لگے بندھے ان کے کردار تھے جن کا تعلق آسودہ حال گھرانوں سے تھا۔ ان کا ہیرو ہمیشہ دراز قد' کھلنڈرا' خوبرو اور رومینٹک ہوتا تھا۔ بہت لطف آتا تھا ان کی کہانیاں پڑھ کر۔ کچھ عرصہ پہلے اسلام آباد میں ایک پارٹی میں اتفاقاً ان سے ملاقات ہوئی تو مجھے لگا کہ نوجوانی میں وہ بالکل ویسے ہی رہے ہوں گے جیسا ان کا ہیرو ہوتا تھا۔"

"ایسی مثالیں بھی ہوتی ہیں لیکن بہت کم ہوتی ہیں۔ اِکا دُکا لکھنے والوں کی شخصیت ان کی تحریروں سے مشابہ نظر آتی ہے۔" آفاق احمد بولا "ویسے میں سمجھ گیا ہوں۔ آپ کس مزاح نگار کا ذکر کررہے ہیں۔ میں انہیں تھوڑا بہت جانتا ہوں' ان کے افسانوں اور شخصیت میں صرف یہی مماثلت ہے کہ ان کا ہیرو دراز قد' کھلنڈرا اور خوبرو ہوتا ہے اور وہ خود بھی اسمارٹ ہیں۔ لیکن اور بہت سے تضادات موجود ہیں۔ مثلاً ان کی کہانیاں پڑھ کر ہنسی آتی ہے۔ دل میں پھلجھڑیاں سی چھوٹنے لگتی ہیں لیکن وہ خود نہایت بے حد سنجیدہ رہتے ہیں۔ اور جہاں تک ان کے افسانوں میں بکھرے ہوئے رومینس کا تعلق ہے تو مجھے یقین ہے کہ انہوں نے زندگی میں ایک ہی لڑکی سے رومینس کیا ہوگا جو آج کل ان کی بیوی اور ان کے جوان بچوں کی والدہ ہوں گی۔"

سجاد نسیم بولا "چوہدری صاحب! گستاخی معاف' میں بھی کسی حد تک آفاق صاحب کے خیالات سے متفق ہوں۔ اصل میں تخلیق کار لوگ اپنے پیاسے خوابوں کے بیوپاری ہوتے ہیں لیکن پیاسے خواب صرف ہمارے ہی نہیں ہوتے۔ وہ اس ملک کے نوے فیصد لوگوں کے خواب ہوتے ہیں۔ لوگ مافوق الفطرت کی کہانیوں پر بڑی ناک بھوں چڑھاتے ہیں لیکن آپ نے کبھی سوچا کہ لوگوں کی ایک بہت بڑی اکثریت انہیں ذوق و شوق سے کیوں پڑھتی ہے؟ ہمارے ہاں بیشتر محفلوں میں لاٹھی اور گنڈاسے سے کشتوں کے پشتے لگانے والے فلمی ہیرو کا بڑا مذاق اڑایا جاتا ہے لیکن آپ نے کبھی سوچا کہ ایک بڑی اکثریت اس کی فلمیں ذوق و شوق سے کیوں دیکھتی ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "یہ ہیرو دراصل کچلے ہوئے اور محروم لوگوں کے ہیروز ہیں۔ اور ہماری سوسائٹی میں کچلے ہوئے اور محروم لوگوں کی اکثریت ہے۔ کم لوگوں کی اکثریت ہے۔ ان کے ان گنت خواب ہیں مگر وہ ایک بھی تعبیر نہیں پاسکتے۔ ان کے ساتھ قدم قدم پر زیادتیاں ہوتی ہیں مگر وہ ایک کا بھی بدلہ نہیں لے سکتے چنانچہ وہ اپنے ہیرو کو سارے کارنامے انجام دیتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ لاشعوری تسکین محسوس کرتے ہیں' ہیرو کی شخصیت میں انہیں اپنی تمناؤں کا عکس نظر آتا ہے۔"

"بالکل ــــ یہی بات ہے۔ آپ بالکل ٹھیک سمجھے۔" سجاد جوش میں بولا۔ "اور یہ صرف ہماری ہی سوسائٹی کی کہانی نہیں۔ تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ یہ تقریباً ہر سوسائٹی کی کہانی ہے۔ امریکا میں بھی کشتوں کے پشتے لگادینے والے ہیرو بہت مقبول ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہ یہ کام لاٹھی اور گنڈاسے کے بجائے ہولناک قسم کی گنوں اور دوسرے آتشیں ہتھیاروں سے انجام دیتے ہیں۔ بلکہ وہاں تو اگر ڈائریکٹرز کا بس چلے تو وہ ہیرو کے کندھے پر ایک عدد توپ رکھ دے۔"

"ویسے بھی دراصل کہانی یا فلم کے ہیرو کا تصور ہی کچھ ایسا ہے کہ لوگ اسے مار کھاتے دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔" میں نے کہا "وہ لاشعوری طور پر محسوس کرتے ہیں کہ وہ ہیرو ہی کیا جو مار کھاگیا۔ لفظ ہیرو ذہن میں آتے ہی ایک ایسے قوی کا تصور آتا ہے جو ہر مسئلہ حل کرسکتا ہے' ہر مشکل پر قابو پاسکتا ہے' اینٹ کا جواب پتھر سے دے سکتا ہے اور ہیروئن جس کے آگے پیچھے پھرتی ہے۔"

لیکن سمجھدار لوگ ان باتوں میں یقین نہیں رکھتے۔ انہیں پتا ہوتا ہے حقیقت کہاں ختم ہوتی ہے اور فسانہ کہاں سے شروع ہوتا ہے۔" آفاق بولا۔

"لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ان کے سر پر کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔" سجاد نسیم بولا۔

"بہرحال ہمارے ادارے سے ہر قسم کی فلمیں بنی چاہئیں۔" آفاق سے کہا۔ "میں چاہتا ہوں کہ آپ خواہ کسی بھی طبقے کی فلم بنائیں' وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک شاندار فلم ہو۔ بجٹ کی پروا نہ کریں۔ ویسے تو خیر محض زیادہ روپیہ خرچ کردینا فلم کی کامیابی کی ضمانت نہیں ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ زیادہ روپے کے ساتھ ساتھ اگر ذہانت' محنت اور بے پناہ لگن بھی شامل ہو تو زیادہ آمدنی بھی ہوگی۔ وہ فلم کمانے کا سودا نہیں ہوگی۔"

"میں ہی سارے فلمز کو انہی خطوط پر چلا رہا ہوں چوہدری صاحب" آفاق بولا۔ "اور اگر حالات اسی طرح موافق اور سازگار رہے جس طرح اس وقت ہیں تو اس سال کے آخر تک ہم یکے بعد دیگرے چار فلمیں ریلیز کردیں گے۔ چاروں ایک دوسرے سے بے حد مختلف۔ یہ خاصی اچھی کارکردگی ہوگی۔ ایک سال میں' ایک ہی ادارے سے ایک ہی ڈائریکٹر کی ڈائریکشن میں یکے بعد دیگرے بڑی بجٹ کی چار فلموں کا ریلیز ہوجانا بہت اچھا آغاز ہے۔ جبکہ اس وقت ہماری مزید چار فلمیں سیٹ پر ہوں گی۔"

"یہ تو اب تمہارا شعبہ ہے بھئی۔ تم اچھا کرو یا برا۔ میں تو اس سے بے فکر ہوں۔" میں نے کہا۔ "فلسفے اور نظریات پر تو ہم باتیں کرچکے۔ اب اگر کام کے سلسلے میں کوئی مسئلہ درپیش ہے جو میرے ذریعے سے حل ہوسکتا ہے تو وہ مجھے بتادو۔"

ایسا کوئی مسئلہ نہیں تھا اس لئے تھوڑی دیر بعد وہ رخصت ہوگئے۔ اس کے بعد خالصتاً کاروباری لوگوں سے انتہائی خشک قسم کی باتیں اور ملاقاتیں شروع ہوگئیں۔

کچھ اسی قسم کی ملی جلی سی مصروفیات میں تقریباً ایک ماہ گزر گیا اور احساس تک نہیں ہوسکا۔ مصروف لوگوں کے لیے وقت واقعی اسی طرح گزرتا ہے۔ پھر ایک روز ستارہ کا فون آیا۔ اس سے بھی آج کل صرف فون پر ہی گفتگو ہوتی تھی۔ ملاقات کی نوبت نہیں آرہی تھی۔ مجھے تھوڑی بہت فرصت میسر آتی تھی تو وہ مصروف ہوتی تھی۔ وہ بلانے کے لئے فون کرتی تھی تو اتفاق کچھ ایسا ہوتا تھا کہ میں کہیں اور جارہا ہوتا تھا۔

اپنے مخصوص گلے شکوں کے بعد وہ بولی۔ "تمہیں تو شاید یہ بھی معلوم نہیں ہوگا کہ کراچی میں تمہارا ہوٹل مکمل ہوگیا ہے اور آنے والی کیم کو اس کا افتتاح ہے؟"

"نہیں۔ مجھے واقعی معلوم نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"حیرت خوب! لوگوں کو دعوت نامے موصول ہونا شروع ہوگئے ہیں اور مالک کو معلوم ہی نہیں۔" وہ بے یقینی سے بولی۔

"تمہیں معلوم ہے میں جھوٹ نہیں بولتا۔ کم از کم تمہارے سامنے نہیں بولتا۔ اور اس قسم کے معاملات میں نہیں بولتا۔" میں نے کہا۔ "مجھے واقعی معلوم نہیں۔ بس اخبارات میں اشتہارات دیکھ رہا ہوں جن میں عنقریب شاندار افتتاح کی خوشخبری سنائی جارہی ہے۔"

"بہرحال یہاں تو تمام سپر اسٹارز کو دعوت نامے مل چکے ہیں۔ آنے جانے کا فرسٹ کلاس کا ہوائی جہاز کا ٹکٹ' وی آئی پی یا لگژری سوئٹ میں جب تک دل چاہے تب تک قیام اور خاصے بیش قیمت تحائف کی پیشکش کی گئی ہے۔ بہت روپیہ خرچ کررہے ہو۔" وہ بولی۔

"مجھے نہیں معلوم۔ شفیع شاہ کررہا ہے۔ اور وہ کررہا ہے تو پھر ٹھیک ہی کررہا ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔ "روپیہ کمانے کے لیے پہلے روپیہ خرچ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"تمہاری بے نیازی دیکھ کر بڑا رشک آتا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ویسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ لوگ ان پیش کشوں کی وجہ سے نہیں جارہے۔ بلکہ اس وجہ سے جارہے ہیں کہ دعوت نامے تمہاری اور آفاق کی طرف سے ہیں۔ اور تم دونوں کے نام اب انڈسٹری میں ایسے ہوگئے ہیں کہ ان کی طرف سے ملنے والی دعوت کو تو کوئی رد کر ہی نہیں سکتا۔"

"چلو یہ تو اچھی خبر سنائی تم نے۔ اس کا مطلب ہے افتتاح کے موقعے پر گلیمر والا خانہ خالی نہیں رہے گا۔" میں نے کہا۔

"خانہ تو تمہارا صرف ایک ہی خالی رہے گا۔" وہ بولی۔

"کونسا؟ اوپر والا؟ یعنی کھوپڑی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ خانۂ دل۔" وہ بولی۔

"بددعائیں تو مت دو۔ خانۂ دل میں تو ایسے ایسے حسین آباد ہیں کہ اگر دیکھ لوگی تو جل کر کباب ہوجاؤگی۔ اور کباب بھی ایسا جس نے لپ اسٹک لگا رکھی ہوگی۔"

"جن کے دلوں میں زیادہ حسین آباد ہوتے ہیں' آخر میں انہی کے دل سب سے زیادہ ویران رہ جاتے ہیں۔" وہ بولی۔

"بکواس چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم کب کراچی جارہی ہو؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں تو تمہارے ساتھ جانا چاہتی تھی۔" وہ بولی۔

"تم میرے چکر میں مت رہنا۔ میرا کچھ پتا نہیں ہے۔ میں تو شاید ائرپورٹ سے سیدھا عین افتتاح کے وقت پر ہی ہوٹل پہنچوں۔ اسی لئے تو شفیع شاہ مجھے ہر روز کے پروگرام سے آگاہ نہیں کررہا۔ میں نے ہی اسے منع کررکھا ہے کہ اس تردد کی ضرورت نہیں۔ بس مجھے تو افتتاح سے صرف ایک آدھ دن پہلے اطلاع دے دی جائے۔ میں تو اسی طرح بھگدڑ میں جاؤں گا۔ جبکہ تم فلم اسٹارز کے سو نخرے ہوتے ہیں۔ تم اپنے فلمی لوگوں کی پلٹن میں سے ہی کسی کے ساتھ پروگرام بنا لینا۔ وہیں کراچی میں ہی ملاقات

ہوگی۔"

"ہاں بھئی۔۔۔۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "تمہارے پاس فلم انڈسٹی کی صف اول کی ہیروئن کے ساتھ سفر کرنے کا وقت کہاں ہے۔ ہم تو اب تمہارے لیے کمتری چیز ہوگئے ہیں"۔

"بات کمتری اور برتری کی نہیں ہے اُلو کی دُم"! میں نے اسے ڈانٹا۔ "بات موقع محل کی ہے۔ میرا یہ پورا مہینہ بہت زیادہ مصروفیت کا ہے۔"

"خیر۔۔۔۔ ٹھیک ہے۔ تو پھر میں کسی ہینڈسم سے ہیرو کے ساتھ جانے کا پروگرام بناتی ہوں۔ اسی کے سوئٹ میں ٹھہر جاؤں گی۔" اپنی دانست میں وہ مجھے چڑانے کے لئے بولی۔ "تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں ہوگا؟"

"ہرگز نہیں۔ مجھے تو بہت خوشی ہوگی۔" میں نے بلا تامل جواب دیا۔

وہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "لیکن انڈسٹری میں ہینڈسم ہیرو ہے ہی کون؟ جو مجھے سب سے زیادہ پسند تھا اور ہینڈسم لگتا تھا' وہ اب پچاس کی عمر کو پہنچ رہا ہے۔ ایک فلم میں اسے میرے ابا جان کے رول میں کاسٹ کیا گیا ہے۔ دوسرا جو مجھے تھوڑا سا پسند ہے اس کی بیوی اتنی خونخوار ہے کہ اگر میں اس کے شوہر کے ساتھ چلی گئی تو وہ اپنے شوہر کو جان سے مار دے گی۔ تیسرا بھی مجھے تھوڑا سا پسند تھا لیکن اس کی تو پہلے ہی تین بیویاں ہیں یہی کل ڈھائی تین ہیرو ہیں انڈسٹری میں۔ کیسی تنگ دستی کا عالم ہے۔ انسان کسی کو سفر میں ساتھ بھی نہیں لے جاسکتا۔ اور یہ تو ابھی چار قدم کے سفر کی بات ہوری ہے۔ زندگی کے سفر کی نہیں۔"

"چہ۔۔۔ چہ۔۔۔ چہ۔۔۔ مجھے بھی ترس آرہا ہے تم پر۔" میں نے کہا۔ "بالکل ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے کشکول لے کر لکشمی چوک میں کھڑی ہو اور صدا لگا رہی ہو۔ ایک ہینڈسم سے ہیرو کا سوال ہے بابا' کیسی کیسی غضب کی لڑکیوں کو کیا دن دیکھنا پڑتے ہیں۔"

"بس۔ بس۔ زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں"۔ وہ جلدی سے بولی۔ "تمہیں کیا معلوم یہاں کیسے کیسے لوگ صرف ایک نگاہِ التفات کے انتظار میں عمر گنوا رہے ہیں۔ یہ تو میں ایسے ہی ذرا تمہیں بانس پر چڑھانے کے لیے بکواس کر رہی تھی۔"

"بکواس نہیں' اس وقت تم اس محاورے کی تفسیر پیش کر رہی ہو' تربوز کھٹے ہیں۔ یہ محاورہ بالکل ایسے ہی موقعوں کے لئے تخلیق ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"اپنے اس انجام پر تو محاورہ بھی زار و قطار رو رہا ہوگا۔" وہ بولی۔

"دراصل مجھے انگور جیسی چھوٹی چیز سے اپنے آپ کو تشبیہ دینا اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔ "خیر۔ تو طے پایا کہ تم سے کراچی میں ہی ملاقات ہوگی۔"

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" وہ جل کر بولی۔

"ملاقات کے لیے بھاڑ کوئی مناسب جگہ تو نہیں ہے۔ نے کہا۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز سے اندازہ اس نے ریسیور پٹخ دیا تھا لیکن مجھے معلوم تھا یہ مصنوعی غص میں مسکرا دیا۔ ستارہ جیسے دوست واقعی خوش نصیبوں کے آتے تھے۔

کچھ دن بعد شفیع شاہ کا فون آیا۔ اس نے تمام حالات بارے میں رپورٹ دی۔ تمام کاروباری معاملات ٹھیک ٹھاک ہوٹل کے سلسلے میں بھی انتظامات ٹھیک ٹھاک جا رہے تھے۔

"آپ کا کیا پروگرام ہے؟" اس نے پوچھا۔

"میں عین افتتاح کے دن ہی پہنچوں گا۔ فون کردوں گا۔" نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے سر! گاڑی آپ کو لینے کے لیے موجود ہوگی۔ خود شاید ائرپورٹ حاضر نہ ہوسکوں۔" وہ بولا۔

"اس کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے تمہارے لیے کیسا مصروفیت کا دن ہوگا" میں نے ملائمت سے کہا۔

○☆○

یکم کی شام جب میں کراچی ائرپورٹ پر اترا تو موسم بے خوشگوار تھا۔ میں لاہور سے چلا تھا تو وہاں خنکی تھی لیکن کراچی خوشگوار ہوا کے تیز جھونکوں میں ذرا بھی خنکی نہیں تھی۔ ائرپور پر سلیم نامی ایک آفس منیجر مجھے ریسیو کرنے کے لیے موجود تھا پارکنگ لاٹ میں نیلی مرسیڈیز کے قریب دو مسلح گارڈز بھی موجود تھے۔ شاید شفیع شاہ نے محض احتیاطاً بھیج دئیے تھے۔

کئی سال پہلے میں پہلی بار اس ائرپورٹ پر اترا تھا تو اسی رنگ کی ایک مرسیڈیز مجھے لینے آئی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ مرسیڈیز میری ملکیت نہیں تھی لیکن اس میں آنے والے لوگ مجھے اپنے سے لگے تھے۔ اس وقت دن کا اجالا پھیلا ہوا تھا اور میرے سادہ و معصوم سے دل میں بھی اچھوتی محبت کی کرنیں سی پھیل رہی تھیں۔ آج شام کا سرمئی اندھیرا گہرا ہو رہا تھا اور زندگی کی تمام ہنگامہ خیزیوں' مسرتوں اور کامیابیوں کے باوجود دل کے کسی گوشے میں یاس آمیز سی تاریکی پر پھیلائے بیٹھی تھی جو بھری محفلوں میں مجھے تنہا کر دیتی تھی۔

اس سے پہلے کہ یادیں میرے رگ و پے میں اداسی کا زہر پھیلاتیں' میں نے انہیں ذہن سے جھٹک دیا۔ سوچنے کے لیے اور بہت سی باتیں تھیں۔ ہوٹل کے افتتاح کے علاوہ بھی بہت سی کاروباری مصروفیات میری منتظر تھیں۔ شفیع شاہ نے بلاشبہ کراچی میں کاروبار کو بہت پھیلا دیا تھا۔ بیشتر معاملات میں وہ بے حد باصلاحیت نوجوان تھا لیکن پھر بھی مجھے اس سے کاروبار کے میدان میں اتنی اچھی کارکردگی کی امید نہیں تھی۔ میں اگر خود بھی کراچی میں رہتا تو شاید اتنے کم وقت میں اتنی عمدگی سے کاروبار کو پھیلا

۔ونکہ میں سر جھکا کر ایک ہی دُھن میں لگ جانے والا آدمی تھا۔ میں محفلیں بھی جماتا تھا' گپ شپ بھی کرتا تھا' تھوڑی ۔ماجی تقریبات میں بھی جاتا تھا۔ مہ رخوں سے رسم و راہ بھی تھی۔ اور اگر کسی کام سے دل اُچاٹ ہو جاتا تھا تو میں اسے ۔بھی دیتا تھا۔ لیکن شفیع شاہ میں یہ خصوصیات بہت ہی کم ۔۔ وہ تو کسی کام کو پکڑتا تھا تو اسے جن کی طرح چمٹ جاتا تھا۔

گاڑی نے بہت تیز رفتاری سے فاصلہ طے کیا اور آخرکار بلند بالا عمارت کے سامنے جا رُکی جو رنگ برنگی روشنیوں سے ۔ا رہی تھی۔ ایک چوڑی چکلی مصروف شاہراہ کے کنارے وہ نئی عمارت گویا نخوت سے سر اٹھائے کھڑی تھی اور اس کے سر پر ۔ین لینڈ ہوٹلز' کا ایک بہت بڑا نیون سائن تاج کی طرح جھلملا رہا

ہوٹل کی یہ خوبصورت اور پُرشکوہ عمارت گویا راتوں رات ہی ۔ن کے سینے سے سر ابھار کر میرے سامنے آگئی تھی۔ کم از کم مجھے محسوس ہو رہا تھا۔ درحقیقت میں اسی احساس سے لذت اندوز ۔نے کے لیے عین اس کے افتتاح کے موقع پر آنا چاہتا تھا۔ میں ۔ی تعمیر کے دوران کبھی اسے دیکھنے نہیں آیا تھا۔ میں نے اپنے ۔پر بڑا جبر اور ضبط رکھتے ہوئے اسے دیکھنے سے خود کو باز رکھا تھا۔ ۔اسے بالکل اسی طرح مکمل حالت میں سجا سجایا دیکھنا چاہتا تھا۔ ۔بھی میرے خوبصورت خوابوں میں سے ایک خواب تھا۔ میں ۔ے تشنۂ تکمیل حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

یہ میرا ہوٹل تھا۔ اس احساس کی لذت ہی عجیب تھی۔ اس ۔تکمیل کچھ اسی طرح ہوئی تھی جیسے کسی مصور نے بے خبری اور ۔شعوری کے عالم میں کوئی شاہکار تخلیق کر ڈالا ہو اور صحیح طور پر ۔دار ہونے کے بعد جب وہ تصویر اس کے ہاتھوں میں تھمائی گئی ہو ۔اسے یقین نہ آرہا ہو کہ وہ شاہکار اسی سے سرزد ہوا ہے۔

ڈرائیوے اور پارکنگ لاٹ میں چم چم کرتی بیش قیمت گاڑیاں ۔کھڑی نظر آرہی تھیں۔ سبزہ زار پر بہت سے لوگ جمع تھے۔ کچھ ۔ل مرکزی دروازے کے آس پاس بھی کھڑے تھے جو گہرے رنگ ۔کے شیشے کی ایک اونچی سی دیوار سی مشابہ تھا۔ دروازے کے سامنے ۔سرخ رنگ کا ایک خوبصورت فیتہ تنا ہوا تھا۔ یہ محض رسم نبھانے ۔کے لیے تھا۔ ورنہ مجھے معلوم تھا کہ عملی طور پر تو ہوٹل کا افتتاح ۔ہوچکا تھا۔ دوسرے شہروں سے آئے ہوئے اہم مہمانوں کو حسبِ ۔تراتب کمروں میں ٹھہرایا جا چکا تھا۔ ہوٹل کے تمام کچن مصروف تھے۔ تمام اسٹاف مصروف تھا۔ عمارت کا ہر طرح کا مشینی نظام کام کر رہا تھا۔ آمد و رفت دوسرے دروازوں سے جاری تھی۔ صرف ۔روایت پوری کرنے کے لیے مرکزی دروازے پر فیتہ کٹنا باقی تھا ۔جس کے لیے مرکزی وزیرِ صنعت و تجارت کو آنا تھا۔ دروازے ۔سے لے کر سڑک تک سرخ قالین بچھا ہوا تھا۔ اخباری فوٹوگرافر ۔اِدھر اُدھر منڈلا رہے تھے۔

گاڑی سے اتر کر چند لمحے تک میں سر اٹھائے مبہوت سا اس عمارت کو دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ میری آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے دھندلانے لگیں۔ بہت سے لوگ مجھے ریسیو کرنے کے لیے آگے آچکے تھے۔ ان میں سب سے آگے شفیع شاہ تھا۔ جدید تراش خراش کے سوٹ میں وہ نہایت اسمارٹ اور ہینڈسم لگ رہا تھا۔

"سر! پسند آیا آپ کو اپنا ہوٹل؟" اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے پوچھا۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور اس کی کمر تھپکتے ہوئے کہا۔ "بہت پسند آیا۔ لیکن یہ میرا نہیں تم لوگوں کا ہوٹل ہے۔ میرے دوستوں' ساتھیوں اور جاں نثاروں کا۔"

شفیع شاہ کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لان پر لے گیا اور مہمانوں سے ملوانے لگا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ان میں ہر شعبۂ زندگی کے اعلیٰ ترین طبقے کے لوگ موجود تھے۔ شوبزنس کے لوگ تھے' سیاست داں تھے' سفارت کار تھے' بزنس میگنیٹس تھے۔ ہر طرح کے لوگ تھے۔ دلکش چہروں کی بھی ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ رنگین پیرہن تھے۔ مترنم قہقہے تھے۔ خوشبوؤں کا ایک سیلاب تھا۔

مہمانوں میں سے بہت سے ذاتی طور پر میرے شناسا تھے۔ بہت سے مجھے غائبانہ طور پر جانتے تھے اور بہت سوں کو میں غائبانہ طور پر جانتا تھا۔ بہت سے لوگوں کو میں جاننے کا خواہشمند رہا تھا اور بہت سے مجھے جاننے کے مشتاق رہے تھے۔ مجھ سے ملنے کے بعد ان سب کا ردِعمل مشترک تھا۔ سب کو میری نوجوانی پر حیرت تھی۔ ان سب کے ذہنوں میں نہ جانے کیوں میری شخصیت کا تصور یہی تھا کہ میں اگر عمر رسید نہیں تو کم از کم ادھیڑ عمر تو ضرور ہوں گا۔ کیونکہ سب کو معلوم تھا' میں کوئی خاندانی دولت مند نہیں تھا۔ اور اگر آدمی کو ورثے میں دولت نہ ملے تو پھر ڈھیروں دولت کماتے کماتے کافی عمر گزر ہی جاتی ہے۔

آخرکار وقتِ مقررہ سے ایک گھنٹا تاخیر کے ساتھ وزیرِ صنعت و تجارت بھی آہی گئے۔ اصل عمارت کے اردگرد کی کھلی جگہ ساری کی ساری مہمانوں سے بھر گئی تھی۔ ان میں ستارہ بھی تھی۔ وہ ابھرتی ہوئی ایک ہیروئن کے ساتھ آئی تھی۔ دونوں میں اس مخصوص نفاست و نزاکت کی کمی تھی جو اونچے درجے کی پڑھی لکھی لڑکیوں میں دور سے نظر آتی ہے۔ اس کے باوجود دونوں قیامت ڈھا رہی تھیں۔ ان کی شخصیت کی اپنی ایک الگ طرح کی کشش تھی۔ اس سے میری ملاقات مختصر اور رسمی سی رہی۔ ہم دونوں ہی کو بہت سے لوگوں سے ملنا پڑ رہا تھا۔ بار بار مجھے بھی پتہ نہ کچھ لوگ گھیر لیتے تھے اور اسے بھی۔ فوٹوگرافرز تو فلمی لوگوں کی طرف زیادہ ہی متوجہ تھے۔

ایک مولانا نے نہایت خوش [illegible] تلاوت کی اور وزیر

صاحب نے مختصر سی رسمی تقریر کے بعد فیتہ کاٹ دیا۔ ہوٹل کے دروازے مہمانوں کے لئے کھول دئے گئے۔ بیشتر مہمان طویل و عریض لابی میں پہنچ چکے تو یک دم لائٹس آف ہو گئیں۔ کئی خواتین کی تو چیخیں ہی نکل گئیں۔ لیکن ایک لمحے بعد سب کو احساس ہوا کہ بجلی کے نظام نے عین موقعے پر قیامت نہیں ڈھائی تھی بلکہ انہیں تھوڑا سا سرپرائز دینے کے لئے یہ حرکت کی گئی تھی۔

فوراً ہی لابی میں دھیمی دھیمی موسیقی بکھرنے لگی تھی جو نہایت آہستگی سے لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتی جارہی تھی۔ پھر کاؤنٹرز کے سامنے گھپ اندھیرے میں نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا سا اسٹیج دھیرے دھیرے نمودار ہوا۔ اس پر رنگا رنگ اسپاٹ لائٹس کچھ اس طرح تیزی سے حرکت کررہی تھیں کہ رقص کا سا انداز بن گیا تھا۔ یہ صرف روشنیوں کا رقص تھا۔

لیکن پھر جیسے ہر روشنی ایک خوبصورت لڑکی کا روپ دھارنے لگی۔ اندھیرے کی کوکھ سے نہ جانے کس طرف سے ایک ایک لڑکی نمودار ہو کر ہر رنگ کی روشنی کے دائرے میں آگئی تھی اور روشنی اسی کے ساتھ ساتھ حرکت کرنے لگی تھی۔ وہ دس بارہ لڑکیاں تھیں اور نہایت ہی انوکھے اور اچھوتے انداز میں رقص کررہی تھیں۔ وہ روایتی اور فرسودہ قسم کا رقص نہیں تھا۔ ان کے لباس بھی ایک دوسرے سے مختلف اور انوکھے قسم کے تھے۔ وہ رقص نہیں کررہی تھیں گویا موسیقی کے دھیمے سُروں کے ساتھ دھیرے دھیرے ہوا میں ہلکورے لے رہی تھیں۔ اور ان کے ہونٹ خوابناک انداز میں ہل رہے تھے' آنکھیں نیم وا تھیں۔

روشنیوں سے بہت ہی خوبصورت تاثر دیا جارہا تھا۔ کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے لڑکیاں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی ہیں اور کبھی ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ تعداد میں دُگنی ہو گئی ہیں۔

رقص اور موسیقی جوبن پر آئی تو لوگوں کو اندازہ ہوا کہ وہ ایک غیر روایتی قسم کا ویلکم ڈانس تھا۔ لڑکیوں کے ہاتھوں میں رنگا رنگ قسم کے پھولوں کے ہار تھے۔ جو اُن کے کھلے بالوں کے ساتھ لہرا رہے تھے۔ لوگ دم بخود کھڑے تھے۔ جو لوگ لابی میں داخل نہیں ہوسکے تھے وہ شیشے کی دیواروں کے پار سے اسی طرح مبہوت سے ہو کر یہ ویلکم ڈانس دیکھ رہے تھے۔ اب میں نے رقص کرنے والی بیشتر لڑکیوں کو پہچان لیا تھا۔ وہ ملک کی ٹاپ کی ماڈلز تھیں۔

اپنی سوسائٹی کے اس رواج کو دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا احساس ہوتا تھا کہ ٹی وی پر' سماجی تقریبات میں ہمارے ہاں پہلے تلاوت کی جاتی تھی اور اس کے بعد رقص و موسیقی یا اسی قسم کے دوسرے سلسلے شروع ہو جاتے تھے۔ یعنی ہم ان چیزوں کا آغاز بھی اللہ ہی کے نام سے کرتے تھے جنہیں اللہ نے ممنوعات قرار دے رکھا تھا۔ بہرحال یہ ایک رواج تھا اور میں بھی رواج کے اس سیلاب میں ایک تنکا تھا۔

رقص خاصا طویل تھا لیکن میرا خیـ [illegible] سی طرح دو سوبوں

کو بھی وقت گزرنے کا پتا نہیں چلا تھا۔ آخر کار موسیقی مدھم پڑنے لگی۔ اسپاٹ لائٹس دھیمی پڑتے پڑتے غائب ہونے لگیں ا
کے ساتھ ساتھ لڑکیاں بھی ایک ایک کرکے غائب ہونے لگ
حتیٰ کہ اندھیرا پھیلا تو اسٹیج بھی دھیرے دھیرے ایک طرف کو
ہوا غائب ہو گیا۔

یک دم چاروں طرف بجلی کی طرح تیز روشنیاں پھیل
اور لوگوں کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ اب سامنے کچھ بھی نہیں
صرف مختلف قسم کے کاؤنٹرز تھے۔ تب لوگوں کو تالیاں بجا
خیال آیا اور وہ دیر تک تالیاں بجاتے ہی چلے گئے۔ میں بھی شاہو کے انتظامات کی داد دئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کے بعد منتظمین کی ٹولیاں مہمانوں کو مختلف حصے دکھا
لگیں۔ پورے ہوٹل میں گہما گہمی ہو گئی۔ کچھ لوگ سوئمنگ
دیکھ رہے تھے تو کچھ بینکوئٹ ہال کا جائزہ لے رہے تھے۔
آڈیٹوریم دیکھ رہے تھے تو کچھ مختلف حصوں پر مختلف ہال د
جارہے تھے۔ کچھ لوگ ہوٹل کی فرنشنگ اور آرائش وغیرہ
تنقیدی نظروں سے جائزہ لے رہے تھے۔ انہیں ہوٹل میں مہ
جانے والی سہولیات وغیرہ کے بارے میں بتایا جارہا تھا۔

مہمان چونکہ بہت زیادہ تھے اس لئے ہوٹل میں ہر ہال
علاوہ سوئمنگ پول پر بھی کھانے کا انتظام تھا۔ کھانے کے
آڈیٹوریم میں ایک ورائٹی پروگرام بھی تھا جو ساری رات چ
اس میں خاص خاص مہمانوں کو تحائف بھی دئے جانے تھے
اسٹیج پر پیش کئے جانے والے بعض آئٹمز میں انہیں بھی شریک
جانا تھا۔ اس موقعے پر مہمانوں میں تقسیم کرنے کے لئے ا
انتہائی خوبصورت اور ضخیم سوونیئر بھی چھپایا گیا تھا جس میں ہو
کے بارے میں ہر تفصیل اور مختلف حصوں کی خوبصورت تصو
بھی شامل تھیں۔ شفیع شاہو نے بے شمار کمپنیوں اور اداروں
دفاتر میں یہ سوونیئر بذریعہ ڈاک بھجوانے کا بھی بندوبست کیا
اس کی زبانی تمام تفصیلات سن کر مجھے اطمینان ہو رہا تھا کہ وہ
انداز میں مطلوبہ طبقے میں ہوٹل کا تعارف کرانے میں
کامیاب ہو چکا تھا۔

اسی دوران میں نے ایک دُبلے پتلے اور خوب صورت نوجو
کو دیکھا' وہ عمدہ سوٹ میں تھا۔ بو لگائے ہوئے تھا۔ اس کے
کے کالر پر ہوٹل کی انتظامیہ کا مخصوص بیج لگا ہوا تھا۔ کبھی
کہیں اس کی جھلک نظر آتی اور کبھی وہ کہیں اور دکھائی دیتا۔
شستہ انگریزی میں مہمانوں کو ہوٹل کے بارے میں کچھ بتاتے
کبھی ان کی رہنمائی کرتا۔ کبھی جا کر شیف کو ہدایات دیتے
کبھی ویٹرز کو احکامات دیتا۔

مجھے ابھی تک پوری طرح اس کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔
جس حد تک بھی ادھر اُدھر سے جھلک نظر آرہی تھی اس سے
مجھے شناسا لگ رہا تھا۔ پھر جب ڈنر شروع ہوا تو ایک مرحلے پ

ا سامنا ہو گیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے بالکل سامنے
ر ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔
راشد تھا۔ میں نے جب آخری بار اسے دیکھا تھا تو اس کی
یک رہی تھیں اور میں بھی کچھ ایسا پختہ کار نہیں تھا۔ وہ مجھ
سا چھوٹا تھا۔ لیکن بہرحال اب ایک وجیہہ نوجوان تھا۔ وہ
میں ہی بے حد سنجیدہ لڑکا تھا لیکن اب تو اس کے چہرے پر
ہت ہی گہری ہو گئی تھی۔ جیسے اسے اپنی عمر سے کچھ زیادہ
ا بوجھ اٹھانا پڑ گیا ہو۔
ری نظر اس کے چہرے سے ہٹ کر اس کے کالر پر لگے
ج پر گئی اور میں نے نہایت آہستگی سے پوچھا "راشد تم
یا کررہے ہو؟"
"میں ۔۔۔۔" وہ جیسے چونک کر خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔
یہاں پرسنل منیجر ہوں افضل بھائی!" پھر ایک لمحے کے توقف
بولا "آپ یقیناً یہاں مدعو ہوں گے۔ میرے لائق کوئی
ت ہو تو حکم فرمائیے۔ سرِدست میں یہاں مہمانوں ہی کی
ت پر مامور ہوں۔"
"مسٹر راشد ۔۔۔۔!" اچانک کوئی میرے قریب سے ہی نیم
ہ اور خشک لہجے میں بولا "یہ مہمان نہیں ہیں۔ یہ ہماری
پ آف کمپنیز کے چیف ڈائریکٹر ۔۔۔۔ ہمارے تمام کاروباروں
ور اس ہوٹل کے مالک ۔۔۔۔ ہمارے باس افضل چودھری
میں نے مڑ کر دیکھا' وہ شفیع شاہو تھا جو راشد کو میرے بارے
تا رہا تھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اسے خبردار کررہا ہو کہ ان
ضور میں کوئی گستاخی نہ کر دینا۔ انجانے میں کوئی غلطی نہ
نا۔
پھر وہ میری طرف دیکھ کر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔
"آپ اس نوجوان کی کم عمری پر نہ جائیے گا۔ بہت محنتی اور
احیت نوجوان ہے۔ میں نے اس کا تعلیمی اور خاندانی پس منظر
کرا رکھا ہے۔ اس عہدے کے اڑتالیس امیدواروں میں
اس کا انتخاب کیا ہے۔ میں نے خود اپنے پورے دو دن صرف
کے ذاتی طور پر امیدواروں کے انٹرویو کئے تھے۔" وہ گویا مجھے
ینان دلانے کی کوشش کررہا تھا کہ میں اس کے انتخاب کی طرف
کسی بدگمانی کا شکار نہ ہوؤں۔
"تم نے بہت اچھا کیا جو ان کا انتخاب کرلیا شفیع" میں نے
ع کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "تمہارا انتخاب ہر معاملے میں بے
ل ہوتا ہے۔ اب تم دوسرے مہمانوں کی طرف توجہ دو اور مجھے
نے ہوٹل کے پرسنل منیجر سے کچھ پرسنل سی باتیں کرنے دو۔"
شفیع شاہو کے چہرے پر طمانیت کی مسکراہٹ آگئی اور وہ آگے
ہو گیا۔ میں اور راشد ایک ٹک ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔
نوں ہی کی آنکھوں میں ان گنت سوال تھے۔ میری آنکھوں میں
اید بھولے بسرے روز و شب کی یادوں کا دھواں بھی تھا اور ناتمام
حسرتوں کی راکھ بھی۔

بالآخر اسی نے سکوت توڑا۔ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "زندگی کے اس موڑ پر بھی آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی افضل بھائی! آپ واقعی لوگوں کو حیران کردینے کی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں۔ آپ نے حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ بہت دل خوش ہوا ہے سب کچھ جان کر۔ مجھے یہاں نوکری شروع کئے دو ماہ ہوچکے ہیں۔ بعض فائلوں میں مجھے ٹائپ شدہ' خالص دفتری خطوط پڑھنے کا اتفاق ہوا جو لاہور سے 'ہیڈ آفس' سے آتے تھے۔ ان میں سے بعض پر' ایم اے چوہدری' کے دستخط ہوتے تھے۔ لیکن میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایم اے چوہدری ۔۔۔ محمد افضل چوہدری آپ ہوں گے۔"

"چلو ۔۔۔ یہ تو ہوا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "مگر یہ تو بتاؤ کہ تم یہاں نوکری کرنے کیسے چلے آئے؟ تم اچھے بھلے دولت

مند اور صنعت کار باپ کے بیٹے ہو۔۔۔ تم تو خود بہت سوں کو پرسل نیجر رکھ سکتے تھے۔ تمہیں نوکری کی کیا ضرورت آن پڑی؟ گھر سے ناراض ہو کر نکلے ہوئے ہو کیا آجکل؟"

"جی نہیں۔" وہ افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ہم کسی سے کیا ناراض ہوں گے۔ ہم سے تو ایک مدت ہوئی تقدیر ہی ناراض ہو چکی ہے۔ جتنے انقلابات آپ کی طرف آئے ہیں اتنے ہی ہماری طرف بھی آئے ہیں۔ فرق صرف نوعیت کا ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"آپ نیچے سے اوپر آئے۔ ہم اوپر سے نیچے چلے گئے۔ دنیا اسی کا نام ہے۔"

"لیکن پھر بھی کیسے۔۔۔۔؟ کیا ہوا؟ کچھ بتاؤ تو سہی۔" میں شاذو نادر ہی بے تابی کا اظہار کرتا تھا لیکن اس وقت میں اپنے لہجے کی بے تابی پر قابو نہ رکھ سکا۔

"یہ لمبی باتوں کا موقع نہیں۔" وہ اردگرد مہمانوں کے ہجوم پر ایک بے چین سی نظر ڈالتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کا ملازم ہوں اور آج خاص طور پر میری بڑی ذمے داریاں ہیں۔"

"بھاڑ میں گئی نوکری۔۔۔۔ اور تمہاری یہ فرض شناسی۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔"

"ٹھیک ہے سر! میں آپ کو جواب دہ ہوں۔ آپ کی ہر بات کا جواب دینا میرے فرائض میں شامل ہے۔ آپ میرے ہر باس کے باس ہیں۔ بگ باس۔ اس لئے۔۔۔۔"

"یہ تم طنز کر رہے ہو یا حالات نے واقعی اتنا فرماں بردار بنا دیا ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"آپ پر طنز کرنے کی تو مجھ میں پہلے بھی کبھی جرأت نہیں تھی۔ آپ میرے محسن ہیں۔ اور اب تو میں طنز وغیرہ کرنے کے بارے میں بھی سوچ نہیں سکتا۔ اب تو صورتِ حال بہت ہی مختلف ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

اس کی نگاہیں چھت میں آویزاں فانوسوں میں الجھ گئیں۔ ایک لمحے وہ بالکل خاموش رہا' جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ لفظوں کی ڈور کا سرا کہاں تلاش کرے۔ آخر کار وہ نظر جھکاتے ہوئے بولا "آپ کو شاید یہ اندازہ تو ہمارے گھر میں قیام کے دوران ہی ہو گیا ہو گا کہ ڈیڈی جو کچھ بھی بنے تھے ممی کے پیسے سے ہی بنے تھے۔ ڈیڈی خود خاندانی طور پر خوشحال آدمی نہیں تھے۔ ممی ہی اس خاندان میں ورثے کی دولت لے کر آئی تھیں۔ میں اب مقدر پر یقین رکھنے لگا ہوں۔ ہر فرد کا یقیناً کوئی مقدر ضرور ہوتا ہے۔ امی یقیناً خوش بخت تھیں۔ جب تک زندہ رہیں' ڈیڈی کو کوئی بڑا نقصان نہیں پہنچا۔۔۔۔"

"تو کیا اب وہ اس دنیا میں نہیں ہیں؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"جی نہیں" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر بولا "آپ جن دنوں ہمارے گھر آئے تھے' آپ نے دیکھا' ان دنوں بھی وہ مستقل بیمار رہتی تھیں۔ راحیلہ کی شادی کے بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا تھا۔"

ایک تو یہ اطلاع افسوس ناک تھی۔ دوسرے یہ نام' راحیلہ' سن کر دل پر جیسے برچھی سی لگی تھی۔ راشد سے سامنا ہونے کے بعد سے وہی چہرہ بار بار ذہن کی لوح پر ابھر رہا تھا جسے میں نے بہ مشکل ذہن کے تاریک نہاں خانوں میں دھکیل رکھا تھا۔ نوجوانی کی ناکامیاں بڑی دل خراش ہوتی ہیں' خصوصاً محبت کی ناکامیاں۔ میں اپنے خوابیدہ زخموں کو کھرچنا نہیں چاہتا تھا لیکن اب یہ نام سامنے ہی آگیا تھا۔ اب اور نہ جانے کیا کچھ سامنے آنا تھا۔

میں زبان سے اظہارِ افسوس نہ کر سکا۔ تاسف شاید میرے چہرے پر لکھا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راشد سلسلہ' کلام جوڑتے ہوئے بولا "ممی دنیا سے گئیں تو گویا اپنا مقدر بھی ساتھ لے گئیں۔ ویسے تو پوری ٹیکسٹائل انڈسٹری ہی بحران کا شکار تھی' لیکن ڈیڈی کو تو کچھ زیادہ ہی مشکلات نے آن گھیرا۔ انہوں نے گھبرا کر یکے بعد دیگرے کئی بڑے کاروباروں میں ہاتھ ڈالا لیکن ہر ایک میں اس بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کہ تقریباً ساری پراپرٹی گروی رکھی گئی۔۔۔۔"

مجھے شاید مہمان زیادہ ہونے کے باعث ہال میں گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ اس لئے میں نے راشد کی بات کاٹتے ہوئے کہا "آؤ باہر چلتے ہیں۔"

وہ میرے ساتھ چل تو پڑا لیکن نہایت سنجیدگی سے بولا "سر! میں آپ کے حکم کی تعمیل میں آپ کے ساتھ ہوں۔ اس سے میری ملازمت پر حرف نہیں آنا چاہئے۔ یہ ملازمت مجھے بڑی محنت سے ملی ہے۔ میں اسے کھونا نہیں چاہتا۔ اچھی ملازمتیں آج کل آسانی سے نہیں ملتیں۔"

"یہ جو تم نے ملازمت ملازمت کی رٹ لگا رکھی ہے۔۔۔۔ مجھے اپنے ہوٹل کی ریپوٹیشن کا خیال نہ ہوتا تو گھونسا مار کر تمہارے دانت باہر نکال دیتا۔ ویسے میں اس خیال سے بھی اپنے ہاتھ روکے ہوئے ہوں کہ مجھے پوری بات سننی ہے۔ میرا گھونسا کھانے کے بعد تم جیسا دھان پان اور نفیس نوجوان کئی دن تک بات کرنے کے قابل نہیں رہے گا" میں نے کہا۔ وہ ہنس دیا۔ شاید کئی دن بعد ہنسا تھا مگر فوراً ہی سنجیدہ ہو گیا' جیسے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

ہم باہر سوئمنگ پول کے کنارے آن کھڑے ہوئے۔ سوئمنگ پول کے کنارے بھی مہمانوں کے لئے کھانے کا انتظام تھا اور وہاں بھی بھیڑ بھاڑ تھی۔ لیکن وہاں گھٹن نہیں تھی اور ایک نسبتاً پرسکون گوشہ بھی میسر آگیا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد راشد بولا "ڈیڈی ایک چھوٹے موٹے کے مریض بن کر رہ گئے تھے۔ نہ جانے کون کون سی بیماریاں انہیں لاحق ہو گئی تھیں۔ ہر وقت ان پر جھنجلاہٹ سوار رہتی تھی۔ نفع نقصان کو انہوں نے اپنی روح پر مسلط کر لیا تھا۔ زیادہ نفرت انہیں اس بات سے تھی کہ کبھی کبھار کوئی لے سے یہ تاثر دیتا تھا کہ ان کی مرحومہ بیوی بڑی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید لوگ انہیں احساس دلانے کی رہے ہیں کہ وہ جو کچھ بھی تھے' بیوی کے مقدروں کی وجہ اور خود ان میں ذاتی طور پر کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ کر دینے والا کمپلیکس تھا۔"

سان کی سوچیں بھی عجیب گورکھ دھندا ہوتی ہیں" میں نے ے کہا۔

ند ہوٹل کی جگمگاتی عمارت پر ایک نظر ڈال کر بولا "میں امراض کی کوئی فہرست بناؤں تو اس میں' کاروبار' کا نام وں گا۔ کاروباری لوگوں کے لئے کاروبار بھی بڑا مہلک ہے۔ سیاست اور اقتدار کی طرح یہ بھی شیر کی سواری کے ہے۔ جب تک آپ اس پر سوار رہتے ہیں اور یہ سیدھا ہے تب تک ہی آپ ٹھیک رہتے ہیں۔ جونہی یہ آپ کے باہر ہوتا ہے' فوراً آپ کے سینے پر سوار ہو جاتا ہے۔ آپ دماغ کو ماؤف کر دیتا ہے۔ حواس کو چیر پھاڑ ڈالتا ہے اور کو چبا جاتا ہے۔ نفع و نقصان کو زندگی موت کا مسئلہ بنا لینے ہرے خیال میں بڑے گھاٹے میں رہتے ہیں۔ وہ بہت کچھ ہوئے بھی زندگی کی کسی نعمت سے لطف اندوز نہیں "

نوجوانی اور ناتجربے کاری کے دور میں بھی بڑے پتے کی رہا تھا۔ مجھے اس نظریئے کا قائل ہونا پڑا کہ تجربہ اور عقل و عمر کی محتاج نہیں ہوتی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ نے اپنا سب کچھ بیچ باچ کر' ادھر ادھر سے ایک ایک پائی کے اپنی دانست میں ایک آخری داؤ کے طور پر اسی سڑک پر آپ کا یہ ہوٹل تعمیر ہوا ہے۔۔۔۔ یہاں سے ڈیڑھ دو میل لے پر ایک بیس منزلہ کمرشل بلڈنگ تعمیر کرنی شروع کی۔ اس ٹ پرایا تھا' سرمایہ ڈیڈی کا تھا۔ انہوں نے کوئی بکنگ نہیں ینک کہیں سے لون نہیں ملا۔ حالانکہ وہ ایک بے پناہ منافع وجیکٹ نظر آرہا تھا لیکن ان کی ساکھ خراب ہو چکی تھی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ انہوں نے بکنگ کے ذریعے یا لون کی میں کوئی مدد نہیں لی ورنہ شاید الجھنیں اور بڑھ جاتیں۔ نے اپنے وسائل سے ہی تعمیر شروع کی۔ انہیں یقین تھا کہ ر بلڈنگ مکمل ہو گئی تو سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔ وہ سے نکل آئیں گے۔۔۔۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"لیکن ایسا بھی نہیں ہو سکا؟" میں نے طویل سانس لے کر

"ظاہر ہے۔ ورنہ میں یہاں اس حیثیت میں کیوں نہیں آتا؟" کرایا "بلڈنگ کی تیرھویں منزل کی چھت ڈالی جارہی تھی کہ پوری بلڈنگ گر گئی۔ ریت کے گھروندے کی طرح بیٹھ گئی۔ ایک انجینئر کی ذرا سی غلطی سے ایک ہارے ہوئے سالارِ جنگ کا آخری جہاز بھی ڈوب گیا۔ دسیوں مزدور مر گئے۔ بیسیوں زخمی اور معذور ہو گئے۔ ڈیڈی کے۔۔۔۔ اور کمپنی کے نہ جانے کتنے لوگوں کے وارنٹ نکل آئے۔ ڈیڈی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا۔۔۔۔ اور یوں سود و زیاں کی ایک کہانی ختم ہو گئی۔"

"اوہ۔۔۔۔ یعنی زاہد انکل بھی۔۔۔۔!" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ زاہد انکل کی شبیہہ میری آنکھوں میں گھوم گئی۔ کیسے ہینڈسم آدمی تھے!

راشد خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ اردگرد خاصا شور شرابا تھا لیکن میرے اندر ایک لمحے کے لئے گہرا سناٹا چھا گیا۔ راشد بہت دھیمی آواز میں بولا "وہ تو اچھا ہوا' میں نے ڈیڈی کے زوال کے آخری دنوں میں یونہی' نہ جانے کیوں۔۔۔۔ شاید کسی لاشعوری احتیاط کے تحت امریکا جا کر ہوٹل مینجمنٹ کا ایک کورس کر لیا تھا جو یہ نوکری حاصل کرنے کے سلسلے میں میرے کام آگیا۔ ورنہ ڈیڈی کے جاننے والے صنعت کاروں کے ہاں تو شاید مجھے کلرکی بھی نہ ملتی۔ وہ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ امیرزادوں سے نوکری نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے کاروبار میں تو انتھک محنت کر سکتے ہیں لیکن دوسرے کی نوکری میں محنت نہیں کر سکتے۔" وہ خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرا دیا "آپ بھی اسی نظریئے کے قائل ہو کر مجھے نوکری سے مت نکال دیجئے گا۔"

"بکواس مت کرو" میں نے دھیمی آواز میں اسے ڈانٹا۔ ایک سوال دیر سے میری زبان پر مچل رہا تھا۔ جب وہ ہونٹوں تک آیا تو میری دھڑکنیں قدرے تیز ہو گئیں۔ "راحیلہ آج کل کہاں ہے؟ کیسی ہے؟"

"اس کی زندگی پر تو تباہی کے سائے ڈیڈی کے زوال سے پہلے ہی پڑنا شروع ہو گئے تھے" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا "دولت کی ہوس عجیب چیز ہے۔ یہ ہوس آج تک میری سمجھ میں نہیں آئی کہ یہ کیوں کر انسان کو ایسا دیوانہ بنا دیتی ہے۔ راحیلہ کے شوہر جمیل کا خاندان' آپ کو معلوم ہی ہو گا' لکھ پتیوں کا خاندان تھا۔ لیکن شادی کے کچھ عرصے بعد ہی راحیلہ کو اور ہمیں احساس ہوا کہ انہوں نے مزید دولت کے لالچ میں ہم سے رشتہ جوڑا تھا۔ شادی پر بھی ہم سے جو ہو سکا تھا' کیا تھا لیکن اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد جمیل کی بڑی بڑی فرمائشیں شروع ہو گئی تھیں۔ اس وقت تک تو ڈیڈی کا باقاعدہ زوال بھی شروع نہیں ہوا تھا اس لئے انہوں نے اس کی کئی فرمائشیں پوری بھی کیں لیکن اس کے بعد ایک تو وہ خود الجھنوں میں پھنسے رہنے لگے' دوسرے خود راحیلہ کو یہ سلسلہ بہت برا محسوس ہونے لگا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی محبت' اس کی شخصیت اور اس کے خلوص کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ سارا سلسلہ

بس لین دین کا ـــــ بلکہ یوں کہئے کہ صرف لین ہی لین کا تھا۔
اسے راحیلہ نے صریحًا اپنی توہین محسوس کیا۔ اس نے ڈیڈی کو سختی سے منع کردیا کہ وہ جمیل کی کوئی خواہش پوری نہ کریں۔ اس کے بعد ہی ہم پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ کتنا بڑا بدمعاش تھا۔ اس نے محض ہم لوگوں کو پھانسنے کی حد تک اپنے اوپر تہذیب و شائستگی کا خول چڑھایا ہوا تھا۔ راحیلہ سے اس کا رویّہ تو شادی کے چند دن بعد ہی بدل گیا تھا۔ اس کا اصل روپ سامنے آنے لگا تھا جو بے حد مکروہ تھا۔
لیکن جب اس کی بڑی بڑی فرمائشیں پوری کرنے کا سلسلہ بند ہوا تب تو اس نے راحیلہ کو باقاعدہ اذیتیں دینا شروع کردیں۔ شرابی، عیاش اور بد اطوار تو وہ پہلے ہی تھا، اس کے بعد تو اس نے بہت ہی نچلے طبقے کے جاہلوں کی طرح راحیلہ کو مارنا پیٹنا بھی شروع کردیا۔ وہ جسم پر اذیت رسانی اور زخموں کے نشانات لے کر واپس آتی۔ شوہر کے ہاں اس کے دن کم گزرتے اور میکے میں زیادہ۔ معلوم نہیں جمیل ذہنی طور پر بیمار تھا یا کیا بات تھی ـــــ میں آپ کو اس کی اذیت پرستی کی ایک مثال بتادوں ـــــ"
وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگیا۔ گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ وہ مثال بیان کرنا مناسب رہے گا یا نہیں۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخرکار وہ بولا "وہ جب شیو بناتا تھا تو واش بیسن میں شیو کا جو جھاگ اور بالوں والا پانی جمع ہوتا تھا، راحیلہ کو وہ پینے پر مجبور کرتا تھا۔ وہ نہیں مانتی تھی تو اس کی گردن پکڑ کر زبردستی اس کا منہ اس پانی میں ڈبوتا تھا۔ بلیڈوں سے چرکے لگاتا تھا۔ آخری دنوں میں تو کچھ ایسا ہونے لگا تھا جیسے راحیلہ دوسری جنگِ عظیم کے زمانے کی اتحادی فوجی ہے اور نازی کیمپ میں پہنچی ہوئی ہے۔ ظاہر ہے اس کا انجام طلاق ہی ہوسکتا تھا۔ صرف ڈیڑھ سال میں یہ کہانی بھی ختم ہوگئی۔ شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد وہ طلاق لے کر گھر آبیٹھی۔"
اس نے ایک طویل سانس لی اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "ہم دونوں بہن بھائی آج کل ساتھ ہی تو رہتے ہیں۔ کلفٹن پر دو بیڈ روم کے ایک چھوٹے سے فلیٹ میں ہم رہ رہے ہیں، جو کرائے کا ہے۔ راحیلہ مجھ سے بھی پہلے سے جاب کررہی ہے۔ وہ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں آرٹسٹ ہے۔ آپ کا یہ ہوٹل بھی اسی ایجنسی کا کلائنٹ ہے۔ لیکن شاید آپ کو یہ بات معلوم نہ ہو۔ اسی لئے تو راحیلہ کی زبانی مجھے پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ ہوٹل کے لئے فلاں فلاں اسامیوں کا اشتہار اخبارات میں آنے والا ہے اور میں نے پہلے ہی اپنے آپ کو انٹرویو کے لئے تیار کرنا شروع کردیا تھا۔ اب ہم دونوں ملازمت کررہے ہیں۔ پرانے وقتوں کو یاد کرکے آہیں نہیں بھرتے۔ روتے پیٹتے نہیں۔ کسی کو 'پدرم سلطان بود' کے قصے نہیں سناتے۔ زمانے کو اور فلک کج رفتار کو برا بھلا نہیں کہتے۔ اس لئے سکون اور خاموشی کا احساس ہوتا ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہی گزر بسر ہورہی ہے۔ آدمی مطمئن نہ رہنا چاہے تو کسی بھی حال مطمئن نہیں رہ سکتا۔ لیکن ہم دونوں بہن بھائیوں نے ہر مطمئن رہنا سیکھ لیا ہے۔"
ایک طویل لمحے تک ہم دونوں خاموش رہے۔ آخرکار نے دھڑکتے دل سے کہا۔ "راشد! مجھے اپنا ایڈریس دے دو راحیلہ سے ملنا چاہتا ہوں۔"
"کیا ابھی ـــــ اسی وقت؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں ــــ اسی وقت۔" میں نے جواب دیا۔
"لیکن ـــــ یہاں آپ کی ایک اہم تقریب جاری ہے" وہ گرد و پیش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔
"میری نظر میں اب یہ کوئی خاص اہم نہیں رہی۔" میں نے کہا۔
"جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے جیب سے اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر مجھے دیا جس پر اس کے فلیٹ کا پتا بھی درج تھا۔ ساتھ ہی بولا "میں نہیں کہہ سکتا کہ راحیلہ سے آپ کی ملاقات خوشگوار رہے گی یا نہیں۔ بہرحال اگر اس کا رویّہ آپ کے ساتھ مناسب نہ ہوا تو اس کی میں پیشگی معذرت چاہتا ہوں۔ وہ سرپھری لڑکی ہے۔ میں اس کے معاملات میں بھی دخل نہیں دے سکتا اور آپ کے معاملات میں بھی۔ ہم سب اپنے اپنے معاملات میں خودمختار ہیں۔ میں دوسروں کے حصے کی معذرت ضرور کرلیتا ہوں لیکن دوسروں کی زندگی میں دخل نہیں دیتا۔ کم از کم اس وقت تک نہیں دیتا جب تک میری زندگی اس سے متاثر نہ ہونے لگے۔"
میں نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموشی سے وہاں سے اٹھ آیا۔ میں نے شفیع شاہ سے اس مرسڈیز کی چابیاں لیں جو اس نے میرے لئے ائرپورٹ بھیجی تھی۔ وہ پوچھتا ہی رہ گیا کہ میں کہاں جارہا ہوں لیکن میں نے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے کوئی آدمی بھی اپنے ساتھ نہیں لیا اور کلفٹن روانہ ہوگیا۔
اس چھوٹی سی عمارت میں واقع اس چوتھی منزل کے فلیٹ تک پہنچنا ذرا دشوار ثابت ہوا لیکن جب دل میں طلب کا شعلہ بھڑک رہا ہو تو سودائی منزل تک پہنچ ہی جاتے ہیں۔ میں بھی اس کے در تک پہنچ ہی گیا جس نے کئی برس پہلے کاسۂ دل کو ٹھوکر ماری تھی اور تمنّاؤں کی ناتمام مسرتوں کا ہر پھول اسی کے قدموں کی دُھول ہوگیا تھا۔
میں نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ اندر کہیں گھنٹی یوں گنگنائی جیسے برسوں کے سکوت کے بعد کسی نے آرزوؤں کے کھنڈر میں قدم رکھا ہو اور کسی منتظر روح کی نقرئی پائل کھنک اٹھی ہو!
میری دھڑکنیں شاذ و نادر ہی تیز ہوتی تھیں لیکن اس وقت سینے میں دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ بڑے بڑے بدمعاشوں ...

...ی ارتعاش پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اس نرم و نازک لڑکی کا ...نے کے تصور سے رگ و پے میں ایک عجیب سا ہیجان برپا ...مسامِ جاں سے شرارے سے پھوٹ رہے تھے۔ اپنے آپ پر ...نا دشوار ہورہا تھا۔
...یک بار تو شدت سے دل چاہا کہ واپس بھاگ جاؤں۔ آخر ...ں کس لئے آیا تھا؟ مجھ سے تو کبھی بھی اس سنگدل کا کوئی ...اں نہیں رہا تھا۔ مجھے تو اس نے کبھی اچھا نہیں سمجھا تھا۔ ...یہاتی اور سادہ دل شخص کی محبت تو کبھی بھی اس کے لئے ...قر نہیں رہی تھی۔ اس نے تو نہ صرف میرا دل توڑا تھا بلکہ ...بت کا مذاق بھی اڑایا تھا۔ وہ محبت جو منافقت اور ریاکاری ...ی تھی۔
...ا میں ایک بار پھر اپنی محبت کو ذلت سے دوچار ہوتے دیکھنے ...؟ میرے دل پر تو کسی کی چھوٹی سی بات، کسی کا چھوٹا سا عمل ...طرح ہرا رہتا تھا۔ کیا محبت میں انسان کی یہ صفت برقرار ...ہتی؟ کیا محبت انسان کی خودداری اور انا کو کھا جاتی ہے؟
...یرا دل کہہ رہا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ میری ...ی، میری انا کے بت ابھی تک صحیح سلامت تھے۔ مجھے ایک ...بے عنوان سی مقناطیسیت یہاں کھینچ کر لائی تھی۔ میں جیسے ...ز خود نہیں، کسی کی پکار پر آیا تھا۔ جیسے کسی دستِ غیبی نے ...ت پر راشد سے میری ملاقات کرائی تھی، اس کا ایڈریس مجھے ...ا اور یہاں بھجوایا تھا۔
...ر اپنے اس خیال پر مجھے خود ہی ہنسی آگئی۔ یہ یقینا میری خوش ...تھی۔ یہ کمبخت محبت بڑی ہی خوش گمان ہوتی ہے۔ اپنی ہر ...کے لئے جواز گھڑ لیتی ہے، اپنے ہر فیصلے کا ایک خوشنما پیں ...لیتی ہے۔ بھلا یہاں کس کے دل میں میرے لئے ایسی چاہ تھی ...یسیت میں ڈھل جاتی؟ یہاں کون بیٹھا تھا جس کی روح مجھے ...؟ جو یہاں رہتی تھی اس ہرجائی نے تو برسوں پہلے ہمیں اس ...نہیں سمجھا تھا۔
...میں نے بھی اس کی یاد کو ذہن کے کسی تاریک گوشے میں ...کی اپنی سی سعی کی تھی اور میرا خیال تھا کہ میں اپنی اس ...ں میں کامیاب رہا ہوں۔ لیکن آج راشد سے ملاقات ہوتے ...ر راحیلہ کا ذکر آتے ہی جیسے سارے خوابیدہ زخم بیدار ہوگئے ...ہر دھندلایا ہوا نقش پھر سے روشن ہوگیا تھا۔ اسی میٹھی خلش، ...بھولی بسری کسک کو ایک بار پھر محسوس کرنے کے لئے دل بے ...ہوگیا تھا۔
...اندر چند لمحے کے لئے سکوت رہا اور یہ چند لمحے مجھے اپنی زندگی ...بڑا محسوس ہوئے۔ مجھے ایسا لگا کہ میں وہیں کھڑے کھڑے پتھر ...اس کا کوئی آنے والا نہیں آئے گا۔ آرزوؤں کی محل سرا کا

دروازہ میرے سامنے یونہی بند رہے گا۔ وہ پلائی وُڈ کا ایک عام، سادہ اور کمزور سا دروازہ تھا۔ جیسے عموماً فلیٹوں میں ہوتے ہیں۔ میں کندھے کی ایک ضرب سے اسے توڑ سکتا تھا لیکن بے التفاتی کی اس غیر مرئی دیوار کو نہیں ڈھا سکتا تھا جو شاید اس کے عقب میں بھی میری منتظر تھی۔
راحیلہ آج کل ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں آرٹسٹ تھی۔ اپنے آرٹسٹ ہونے کا ثبوت اس نے دروازے پر ہی چسپاں کیا ہوا تھا۔ کارڈ بورڈ پر بنا ہوا ایک بڑا سا رنگین کارٹون دروازے پر چسپاں تھا۔ ایک بچہ تالاب میں گرا ہوا تھا۔ اس کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ وہ مدد کے لئے دونوں ہاتھ پھیلا رہا تھا۔ ایک بچی پھولوں کی ٹوکری لئے، پھولدار ٹوپی پہنے کنارے پر کھڑی تھی اور اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ کارٹون پر آرٹسٹ کا نام نہیں تھا مگر مجھے یقین تھا کہ وہ راحیلہ ہی کا بنایا ہوا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے یہی لگا کہ حسرتوں کے تالاب میں گرا ہوا وہ بچہ میں تھا اور کنارے پر کھڑی ہوئی وہ شریر اور سنگدل بچی راحیلہ تھی۔
سکوت سے گھبرا کر میں نے دوبارہ بیل دی۔ تب چند لمحے بعد دروازے کے عقب سے وہی جانی پہچانی کھنکتی آواز سنائی دی۔ "کون؟" فقط ایک لفظ تھا لیکن اس میں جانی پہچانی بیسیوں نشانیاں پنہاں تھیں۔ وہی ہلکی سی سرکشی، وہی دھیما سا تحکم، جھجک نہ سکنے

والی شاخوں کا سادہ سی کرارا پن۔

میں نے دیکھا دروازے میں بیجک آئی نہیں تھی۔ وہ اندر سے مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ رات کا وقت تھا۔ وہ فلیٹ میں تنہا تھی۔ گو کراچی ان دنوں شہرِ آشوب نہیں تھا' گلی کوچوں میں درندوں کا راج نہیں تھا۔ پھر بھی میرا خیال تھا کہ رات کے اس سناٹے میں "اس آباد "بیابان" میں کسی خاموش اجنبی کی دستک پر کوئی تنہا لڑکی دروازہ نہیں کھول سکتی تھی۔

ادھر میں بولنا چاہتا تھا مگر زبان جیسے پتھر کی ہو گئی تھی۔ شاید لاشعوری طور پر مجھے ڈر تھا کہ میری آواز سن کر وہ دروازہ کھولنے کا ارادہ ہی ترک نہ کر دے۔

"کون ہے؟" اس نے دوبارہ قدرے تیزی سے پوچھا "بولتے کیوں نہیں؟" لہجے میں وہی تندی' وہی برہمی' وہی تحکم' جو اس کے پھول جیسے سراپا کے ساتھ مجھے بہت بھلا لگتا تھا۔ وہ دیکھنے میں جتنی نازک اندام' نفیس اور روئی کا گالا سی نظر آتی تھی' خصوصیات میں اس کے کافی برعکس تھی۔ اس کی شخصیت کے اسی تضاد میں میرے لئے ایک انوکھی کشش تھی مگر پچھلے چند برسوں میں اس میں نہ جانے کیا کیا تبدیلیاں آگئی ہوں؟ میں نے سوچا' خصوصاً جبکہ یہ برس خوشگوار نہیں گزرے تھے'

"یہ میں ہوں......" غیر ارادی طور پر میرے حلق سے عجیب بیٹھی بیٹھی سی آواز نکلی جو خود میرے لئے بھی ناقابل شناخت تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس نے آواز پہچانی ہوگی مگر شاید یہ لہجے کی مسکینی کا اثر تھا کہ اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا۔

ایک مدت بعد وہ چاند چہرہ' ستارہ آنکھیں سامنے تھیں۔ میں مبہوت سا ہو گیا۔ وہ سفید' ریشمی' سلیپنگ سوٹ میں تھی' اس کے بھورے بال جن میں ہلکا سا سنہرا پن بھی تھا' اس وقت بے ترتیب تھے مگر اس بے ترتیبی میں بھی ایک حسن تھا۔ اس کی رنگت آج بھی چاندنی کی طرح تھی۔ وقت کی ناگواریاں اسے دھندلا نہیں سکی تھیں' بلکہ وہ سر سے پاؤں تک ویسی ہی تھی جیسی میری یادوں کے صنم خانے میں اس کی تصویر آویزاں تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ پہلے نوخیز تھی' کچی کچی دکھائی دیتی تھی' اب میچیور ہو چکی تھی۔ نخلِ جاں نے بہار بھی دیکھ لی تھی' خزاں بھی۔ وجود کا ثمر پک چکا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس کی شفاف بلوری آنکھوں میں گلابی ڈورے تھے اور یہ ڈورے نیند کے یقیناً نہیں تھے کیوں کہ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں کوئی موٹا کاغذ سا تھا۔ میرے لئے اس کا ردِ عمل قدرے غیر متوقع سا تھا۔

میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی اسے حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ ایک قدم پیچھے ہٹ گئی۔ لڑکھڑا سی گئی۔ اس کے ہاتھ میں موجود موٹا سا کاغذ یا کارڈ مڑ تڑ کر اس کی مٹھی میں دب گیا۔

"وہ...... تو......" بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور اس نے

دوسرے ہاتھ سے جلدی سے اپنی آنکھیں پونچھنے کی کوشش نہیں چاہتی تھی کہ میں اس کے آنسو دیکھوں۔ شاید وہ اس اپنی زندگی کے تشنہ و ناگوار باب کا کوئی ورق پلٹ رہی تھی جب نے کال بیل کا بٹن دبایا۔ شاید اس کے ہاتھ میں جمیل کی تھی۔ مجھے اس کی صرف سفید سائڈ نظر آئی تھی۔ بعض لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں۔ وہ اپنے چاہنے والوں کو ہر راحت د مگر تنہائیوں میں چھپ چھپ کر انہی کی تصویریں دیکھ کر ہیں' اشکوں کے موتی پروتے ہیں۔

ایک لمحے کے لئے وہ مبہوت سی ہو گئی پھر سرسراتی سی میں بولی "مجھے یقین نہیں آرہا......"

"کہ کوئی اتنا ڈھیٹ بھی ہو سکتا ہے" میں نے جملہ مکمل کر

"نہیں...... نہیں...... یہ بات نہیں ہے" وہ ملامت بولی۔ جس سرد مہری' سفاکی اور درشتی کی میں توقع لے کر آیا اس کے لہجے میں نہیں تھی۔ شاید حیرت نے ان جذبوں کو دبا پردبا دیا تھا۔ میرا دل کچھ سنبھلنے لگا۔

"تم...... تم یہاں ایک دم کیسے پہنچ گئے؟ تمہاری یقیناً سے ملاقات ہوئی ہوگی" اس کی آواز اب بھی سرگوشی نہیں تھی۔ شاید کچھ آنسو ابھی اس کے حلق میں اٹکے ہوئے

"ہاں" میں نے اثبات میں سرہلایا "راشد سے ملاقات تھی" پھر میں نے ایک طویل سانس لے کر اپنا حوصلہ مجتمع کر اندر آنے کے لئے بھی نہیں کہو گی؟ بڑے لوگ تو دروازے پر ہوئے دشمن کو بھی ایک بار تو خوش خلقی سے اندر آنے کی دے دیتے ہیں۔ ہمارے درمیان دوستی نہ سہی...... لیکن کچھ دشمنی بھی تو نہیں۔"

اس نے ایک طرف ہٹ کر میرے لئے راستہ چھوڑ دیا اس کے قریب سے گزر کر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے

دیوانہ بنا دینے والی پُراسرار خوشبو آج بھی برقرار تھی۔

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی "بڑے لوگ کا صیغہ استعمال تم نے طنز گوئی کا آغاز کر دیا ہے۔ راشد نے یقیناً تمہیں اپنے کی داستان سنا دی ہوگی۔ تم سے تو وہ کوئی بات چھپا ہی نہیں تمہیں موقع مناسب دکھائی دیا ہوگا۔ آگئے ہو گے مذاق ۔"

"ٹریجڈی یہی ہے کہ تم نے مجھے ہمیشہ انڈر ایسٹی میٹ کیا !" میں نے تأسف سے کہا "میرے خیال میں تو تمہاری فیملی کوئی ایسا واقعہ نہیں ہوا ہے جس کا مذاق اڑایا جا سکے۔ مالی کا اوپر نیچے ہو جانا میری نظر میں کوئی ایسا اہم واقعہ نہیں ہے' اتی نفع نقصان البتہ قابلِ ذکر چیز ہے۔"

وہ خاموشی سے وہیں کھڑی میری طرف دیکھتی رہی۔ میری آواز اس تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ میں نے کہا "راشد نے مجھے سے آگاہ کر دیا تو کوئی برا نہیں کیا۔ بات عروج و زوال کی ہوتی۔ دوست ملتے ہیں تو ایک دوسرے کا حال تو پوچھتے ہی ہیں' ہمارے ہاں تو تکیۂ کلام بن گئی ہے "اور سناؤ کیا حال چال ہیں؟" تعلق' کوئی واسطہ ہوتا ہے تبھی انسان دوسرے کا احوال جاننا ہے اور جسے تم عروج و زوال کہہ رہی ہو' یہ عروج و زوال زندگی کے نشیب و فراز ہیں۔ آتے رہتے ہیں۔ ان کے لئے رہنا چاہئے۔"

ہم ایک تنگ سی راہداری میں کھڑے تھے۔ میں نے ایک بعد شناسا آنکھوں کی ان شفاف جھیلوں میں جھانکتے ہوئے کر کہا "کیا مجھے اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں ہے؟"

اس کا ذہن گویا اب بھی کہیں اور تھا۔ قدرے چونکتے ہوئے "دراصل مجھے حیرت کا جو جھٹکا لگا ہے اس سے میں ابھی تک ل نہیں پائی...... اس کے علاوہ تمہارے وجود سے دولت کی بو آرہی ہے...... تمہارے ہاتھ میں مرسڈیز کی چابیاں ہیں۔ یقیناً نے مزید ترقی کر لی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا' تمہیں کہاں اس مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ یہ جگہ تمہارے شایانِ شان ہے" اب اس کی بھیگی آنکھوں میں دھیرے دھیرے راہٹ طلوع ہو رہی تھی۔ بارش کے بعد بادلوں کے عقب سے کیں پھوٹ رہی تھیں۔

"طنز کے تیر تو اصل میں تم چلا رہی ہو۔ الزام مجھ پر دھر رہی ہو" میں نے کہا۔ وہ مجھے چھوٹے سے ایک صاف ستھرے تنگ روم میں لے آئی۔ اس کے رہن سہن کو غریبانہ یا عُسرت تو بہرحال نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن جو وقت وہ دیکھ چکی تھی اس کے مقابلے میں یہ غربت ہی تھی۔ شروع شروع میں شاید اسے یہاں اپنا گھٹتا محسوس ہوا ہو۔

اس کا اشارہ پا کر میں نے ایک صوفے پر بیٹھ کر ادھر اُدھر تے ہوئے کہا "یہ جگہ تو میری اوقات سے بہت اونچی ہے۔ میرا تو

اب بھی کبھی کبھار کسی تھڑے پر بیٹھ کر بچپن کے کسی دوست کے ساتھ آلو چھولے کھانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن کمبخت بچپن کا کوئی دوست کبھی کہیں نظر ہی نہیں آیا۔ حالاں کہ میں نے سنا ہے' انسان کے پاس چار پیسے آجائیں تو ادھر اُدھر سے' کونے کھدروں سے بچپن کے دوست...... بلکہ معمولی شناسا بھی امل پڑتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام' تعاون کی کوئی نہ کوئی درخواست لے کر آجاتے ہیں اور اگر کسی وجہ سے ان کی غرض پوری نہ ہو سکے تو تڑپ تڑپ کر لوگوں سے کہتے ہیں' ذرا دیکھو تو سہی' کیسے دماغ آسمان پر پہنچ گئے ہیں۔ کل تک پاؤں میں ڈھنگ کی جوتی نہیں تھی۔ ہمیں سات سات سلام کرتا تھا۔ آج سیدھے منہ بات نہیں کی۔ ذرا سا کام نہیں ہو سکا ہمارا! مجھے تو کوئی یہ کہنے بھی نہیں آیا۔ کوئی طعنہ دینے بھی نہیں آیا۔ پتا نہیں کہاں مر گئے کمینے۔"

اس کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے مسکراہٹ روشن تر ہو رہی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اعصاب کا تناؤ کم ہو رہا تھا۔ میں یہی چاہتا تھا۔ وہ کچھ ایزی نظر آتی تو میرے اعصاب سے بھی بوجھ کم ہوتا۔

"تم نے اپنے گاؤں جا کر انہیں تلاش کیا ہوتا" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"گیا تھا ایک مرتبہ گاؤں بھی" میں نے کہا "کُل دو تین ہی دوست تھے۔ وہ بھی غائب ہو چکے تھے۔ وہ گلی ہی اُجڑ چکی تھی جس میں ہم رہتے تھے۔ شہر کی کشش سب کو نگل گئی تھی۔ سب مختلف شہروں کو کوچ کر گئے تھے۔ کسی کو پتا نہیں تھا کون کہاں گیا۔"

"دکھائی تو یہی دیتا ہے کہ ابھی اک عمر باقی پڑی ہے" وہ اچٹتی سی نظر سے میری طرف دیکھ کر بولی "زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔"

"جیسے تم مل گئی ہو؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ انگوٹھے کے ناخن سے دوسرے ناخن کی پالش کھرچتے ہوئے بولی "راشد تمہیں کہاں ملا تھا؟" اس نے سوال سے سوال کا رخ پھیر دیا تھا۔

"ہوٹل میں" میں نے جواب دیا۔

"ہاں...... آج اس ہوٹل کا افتتاح تھا جس میں اسے پرسنل مینیجر کے طور پر نوکری ملی ہے" وہ دھیمے لہجے میں بولی "نئی نئی نوکری ہے۔ بڑی مشکل سے ملی ہے۔ بہت محنت کر رہا ہے وہ۔ تم بھی شاید اسی افتتاحی تقریب میں آئے ہو گے۔ میں نے راشد سے کہا تھا کہ ایک کارڈ مجھے بھی لا دو۔ اس نے صاف منع کر دیا۔ کہنے لگا' کارڈ بہت ہی خاص الخاص لوگوں کو دیئے جا رہے ہیں جن کی آمد پبلسٹی کے نقطۂ نظر سے مفید ہو' خواہ ان پر پلے سے بہت کچھ خرچ کرنا پڑے۔ غیر اہم لوگوں کو' اور خصوصاً ملازمین کے اہل و عیال اور رشتے داروں کے لئے تو کارڈ بالکل جاری نہیں کئے جا رہے۔"

وہ میری طرف دیکھ کر مبہم سے انداز میں مسکرائی اور طویل

سانس لے کر بولی "چناں چہ ہم گھر بیٹھے ہیں۔ ہم غیر اہم بھی ہیں اور ہوٹل کے ملازم کے رشتے دار بھی۔"

"اوہ۔۔۔۔" میں نے حقیقی تاسف سے کہا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اس تقریب میں جانے کی خواہش مند ہو تو کوئی ایسا بندوبست کرتا کہ افتتاح ہی تمہارے ہاتھوں سے ہوتا۔"

"میرے ہاتھوں سے؟" وہ خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسی۔ گو کہ ہنسی میں تلخی کی آمیزش تھی لیکن ایک عرصے بعد اس کی ہنسی سننا سماعت کے لئے ایک بڑا ہی دلکش تجربہ تھا۔ اجنبیت کے دبیز پردوں کے عقب سے دھیرے دھیرے اس کی اصل شخصیت طلوع ہو رہی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "ہمارے ہاتھوں سے تو اب کوئی یتیم خانے کا افتتاح کرانا بھی پسند نہیں کرے گا۔ یہ تو فائیو اسٹار ہوٹل کا معاملہ ہے۔ ویسے جس انداز سے تم بات کر رہے ہو اس سے لگتا ہے کہ کافی اثر و رسوخ ہے تمہارا اس ہوٹل کے مالک پر؟"

"ہاں۔۔۔۔ بس کچھ تھوڑی بہت شناسائی ہے۔ بہرحال بات مان لیتے ہیں بے چارے" میں نے مبہم سے لہجے میں کہا "خصوصاً جذباتی رشتوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔"

"حیرت ہے!" وہ جمیل سی آنکھوں کو مصنوعی حیرت سے پھیلاتے ہوئے بولی "دولت مندوں کے ہاں جذبات کا احترام کہاں سے آگیا؟"

"سب دولت مند تم جیسے یا جمیل جیسے تو نہیں ہوتے نا۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

اس کی چاندنی جیسی رنگت میں شفق کی سرخی جھلک آئی۔

"تمہیں ایسی باتیں کرنے کا۔۔۔۔ دل کا غبار نکالنے کا حق حاصل ہے۔ میں تمہیں اس سے نہیں روکوں گی لیکن خدارا میرا اور جمیل کا موازنہ مت کرو۔ وہ میرا انتخاب نہیں، میرے لڑکپن کی ایک بھول تھی۔ نوعمر لوگ جب زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کرتے ہیں تو عموماً کیچڑ میں ہاتھ مار لیتے ہیں۔ میرے دامن میں بہت سے پچھتاوے ہیں لیکن میں ان کا اعتراف نہیں کروں گی۔ اب یہ خود غرضی اور مصلحت کوشی محسوس ہوگی۔ اب تو یہ سوچنا بھی اچھا محسوس نہیں ہوتا کہ زندگی کا ایک تجربہ ناکام ہو گیا، اپنا انتخاب غلط ثابت ہو گیا تو اس کی طرف لوٹ آئے جس کا کبھی مذاق اڑایا تھا۔ جس کا کبھی دل توڑا تھا۔"

اس کا سر بہت جھک گیا۔ اس کے ریشمی بالوں نے اس کا چہرہ تقریباً ڈھانپ لیا۔ اس کی آواز جیسے بہت دور سے آنے لگی "میں۔۔۔۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔۔۔۔ لیکن میں اس کا باقاعدہ اعتراف نہیں کر سکتی۔ میں تم سے معذرت نہیں چاہوں گی۔۔۔۔"

"وہی تمہاری ازلی ضدی طبیعت۔۔۔۔!" میں گہری سانس لیتے ہوئے مسکرایا۔

"نہیں۔۔۔۔ میں نے کہا نا کہ اب یہ اچھا محسوس نہیں ہوا" سر اٹھائے بغیر بولی "تم خواہ زبان سے نہ کہو۔۔۔۔ شعوری طور محسوس نہ کرو۔۔۔۔ لیکن لاشعوری طور پر ضرور محسوس کرو گے لڑکی اب ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔ بلندیوں کی طرف پرواز کرنے شوق میں دھڑام سے نیچے آگری ہے۔۔۔۔ اور میں اب بہت ہو گیا ہوں اس لئے اس نے اب مجھے ترجیح دینے کا فیصلہ کر لیا اب میں اس کی نظر میں اچھا ہو گیا ہوں۔ بولو تم سوچ گے یا نہ" بالوں کی چلمن سے آنکھوں کے ستارے جھلملائے۔

"تم کیوں خواہ مخواہ فیصلے دیتی ہو کہ کون کیا سوچے گا نہیں؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"انسان کو اندازہ تو ہوتا ہے نا۔"

"انسان کے اکثر اندازے غلط ہوتے ہیں۔ جذبات اور کی ڈوریاں کہیں اور سے ہلتی ہیں" میں نے کہا "مثلاً اس وقت اندازہ غلط تھا جب میں سمجھ رہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کر۔۔۔۔ تمہارا اندازہ اس وقت غلط تھا جب تم نے سوچا تھا کہ تمہارے عشق میں دیوانہ ہے اور تمہارے لئے زندگی کا بہتر ثابت ہوگا۔ اندازوں کی تو بات ہی مت کرو۔ محض اندازہ زندگی کے بڑے فیصلے نہیں کرنے چاہئیں۔"

"شاید تم درست کہہ رہے ہو" وہ اٹک اٹک کر بولی "اس وقت بھی میرا اندازہ غلط تھا جب میں سمجھ رہی تھی کہ تمہیں دھوکا دے رہی ہوں۔ تم سے شغل یا دل لگی کر رہی ہوں۔ میں اس وقت تمہیں نہیں، شاید اپنے آپ کو دھوکا دے رہی تھی۔ دل کو شاید اس وقت بھی تمہاری طلب تھی۔ تم چاہ تھی۔۔۔۔ لیکن میں اسے مس گائیڈ کر رہی تھی۔ اسے غلط دکھا رہی تھی۔"

یہ سب کچھ سننا بہت بھلا لگ رہا تھا۔ رگ و پے میں شبنمی سی ٹھنڈک پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر اس چہرے سے بالوں کی چلمن ہٹا دی۔ میں اس چہرے پر پیچ کو پا

سچ وہاں آنسوؤں کی صورت میں موجود تھا۔ میں یہ دیکھ کر بغیر نہ رہ سکا کہ وہ ایک بار پھر رو رہی تھی۔ آنسوؤں کی کے رخساروں پر سے پھسلتی ہوئی ریشمی بش شرٹ میں رہی تھی۔

نے اس کے آنسو پونچھ دیئے مگر وہ تو اک سیل رواں تھا جو نے آیا تھا۔ وہ میرے بازوؤں میں سمٹ کر بلک بلک کر رونے وؤں کے اس سیلاب کو روکنا میرے بس کی بات نہیں نے اسے بہنے دیا۔ خود میرے دل کے تپتے صحرا میں نمی سی آخر کار وہ تھکی ہوئی فاختہ کی طرح ہانپنے لگی۔ جھوٹ لے اس طرح نہیں رو سکتے تھے۔

یں حیران ہوں۔" میں نے اس کی بھیگی آنکھوں کی طرف تے ہوئے بنتی بنتی سی آواز میں کہا "اگر یہ حقیقت ہے تو پہلے کی وہ سنگدلی کیا تھی؟"

میں نے کہا تو ہے۔۔۔۔ وہ ایک خود فریبی تھی۔۔۔۔ شاید میرے اور غیر حقیقت پسند ذہن کا ایک ایڈونچر تھا۔ بہت ہم پسند پائی تھی تا میں نے عشق کو بھی ایک مہم بنا لیا تھا اور راستہ منتخب کیا تھا۔" پھر وہ یکدم جھٹکے سے اپنے آپ کو علیحدہ ہوئے بولی "لیکن تم بتاؤ۔۔۔۔ تم کس لئے آئے ہو؟ میری کا تماشا دیکھنے؟ میری تنہائیوں کا مذاق اڑانے؟"

"میں تمہارا مذاق کیسے اڑا سکتا ہوں؟ کیا میں برباد نہیں ہوا؟ آج بھی ایک برباد کھنڈر ہے۔ پہلی شکست کا صدمہ بہت تھا۔ بھلائے نہیں بھولا۔ اور یہ دل پھر کبھی آباد نہیں ہو سکا" اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم سو اسی طرح کہتے ہو" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے

"مو اور عورت کی یہ ازلی بحث مت چھیڑو۔ عورت یہ کہتی اور مو یہ کہتا ہے۔۔۔۔ ہر عورت اور ہر مو کی کہانی الگ کہانیاں ایک جیسی نظر آنے کے باوجود الگ الگ محسوسات الگ الگ ہیں" میں نے تیزی سے کہا۔ اس کے ہاتھ کی مٹھی ابھی تک بند تھی جس میں اس نے تصویر چھپانے کوشش کی تھی۔

میں نے مٹھی کھولنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اب اگر بالآخر یہ سچ بول ہی دیا ہے تو کم از کم اب تو اس منحوس کی تصویر پھینک دو۔"

"کس منحوس کی؟" اس نے مٹھی زیادہ سختی سے بھینچتے ہوئے کہا۔

"جمیل ہی کی ہوگی۔ تنہائی میں بیٹھ کر انسان اپنی ناکامیوں اور نا آسودگیوں کی تصویریں ہی دیکھتا ہے اور روتا ہے" میں ری بھی طاقت صرف کئے بغیر اس کی مٹھی کھولنے کی کوشش رہا تھا۔

"بات تم نے بالکل ٹھیک کی ہے" وہ مٹھی کھولتے ہوئے بولی۔ "لیکن تصویر جمیل کی نہیں ہے۔"

وہ مڑی تڑی تصویر اس کی ہتھیلی پر تھی۔ میں نے جلدی سے اسے اٹھا کر سیدھا کیا، اس کی شکنیں نکالیں اور دوسرے ہی لمحے جیسے میرا دل دھڑکنا بھول گیا۔ وہ میری اپنی تصویر تھی۔ راحیلہ اس میں میرے ساتھ تھی۔ یہ اس وقت کی تصویر تھی جب میں پہلی اور آخری بار ان کے گھر آیا تھا اور ہم پکنک منانے ساحل سمندر پر گئے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ وہ ہم دونوں کی اکٹھے ایک ہی تصویر تھی اور راحیلہ کی امریکی دوست نے کھینچی تھی۔ اس وقت ساحل سمندر پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ تصویر بھی دھندلائی ہوئی سی تھی۔ ایک عجیب سی معصومیت تھی اس تصویر میں۔ چند برسوں میں ہماری شخصیتوں میں ظاہری طور پر کچھ ایسا زیادہ فرق نہیں پڑا تھا لیکن روح پر تجربات کچھ ایسی تیز رفتاری سے گزرے تھے کہ تصویر بھی پرانی محسوس ہو رہی تھی۔ تقریباً بچپن کی سی لگ رہی تھی۔ یادوں کے سارے گرد آلود موتی ادھر ادھر بکھرنے لگے۔

"تم نے۔۔۔۔ تم نے اس تصویر کو اب تک سنبھال کر رکھا ہوا تھا؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔ اپنی آواز میں خود بھی بڑی مشکل سے سن پایا۔

"ہاں۔۔۔۔ اور آج جب میں تنہائی میں اسے نکال کر بیٹھی تو پہلی بار اس شدت سے مجھے رونا آیا۔ شاید یہ پچھتاوے اور ندامت کے آنسو تھے۔ پچھتاوا اس بات کا تھا کہ میں تو تمہیں تلاش کرنے، تم سے معذرت کرنے بھی نہیں جا سکتی تھی لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ قبولیت کی گھڑی ہے۔ اسی دوران بیل بجی۔۔۔۔ اور میں نے دروازہ کھولا تو تمہیں سامنے کھڑا پایا۔ اسی لئے تو میں اتنی زیادہ حیران ہو گئی تھی۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بالکل یقین نہیں آ رہا تھا۔ خواب لگ رہا تھا یہ سب کچھ۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں قدرت کی اتنی بڑی نوازش کی مستحق بھی ہو سکتی ہوں۔"

"اب تو تمہیں جذبوں کی صداقت کو مان لینا چاہئے" میں نے کہا۔

"مانتی تو میں پہلے بھی تھی لیکن اب کچھ اور ہی طرح کا یقین ہوا ہے۔"

ایک لمحے گہری خاموشی رہی۔ وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھے ساکت بیٹھی تھی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا "کیسا سکوت ہے یہاں۔ راشد نے مجھے بتایا ہے کہ جمیل سے تمہاری رفاقت ڈیڑھ سال رہی۔۔۔۔ مجھے یہاں کسی بچے کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا۔"

"وہ رفاقت نہیں، میری حماقت اور جمیل کی خباثت تھی" اس کی نم آنکھوں میں ایک بار پھر چنگاریاں سی تیر گئیں "وہ شادی شاید اس کا پہلے سے سوچا سمجھا منصوبہ تھا۔ اس لئے وہ ہر معاملے

میں طے شدہ سی حدود میں چل رہا تھا۔ بقول اس کے 'وہ اتنی جلدی زیادہ الجھنوں میں پھنسنا نہیں چاہتا تھا۔ احتیاط اسی کی طرف سے تھی۔ مجھے ماں بننے میں کوئی عذر نہیں تھا۔ وہی باپ بننا نہیں چاہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اولاد ازدواجی زندگی کی زنجیر ہوتی ہے۔ ... میاں بیوی رشتہ توڑنا بھی چاہیں تو بعض اوقات صرف اولاد ہی کی وجہ سے بادل ناخواستہ بھی اس بندھن میں بندھے رہتے ہیں۔ وہ ایسی کوئی جذباتی کمزوری پالنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے شروع سے ہی معلوم تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ جو کچھ ہوا وہ محض اتفاقیہ یا غیر ارادی نہیں تھا۔"

میں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "تم نے اس کے اتنے ظلم و ستم کس طرح سہہ لئے؟ تم تو جوڈو کراٹے بھی جانتی تھیں؟"

"بیوی بننے کے بعد جوڈو کراٹے دھرا رہ جاتا ہے۔ اگر براہِ راست صرف مرد اور عورت کا مسئلہ ہو تب بھی کوئی بات نہیں۔ شاید عورت نمٹ لے۔ لیکن عورت بہت سے رشتوں کے جال میں پھنس جاتی ہے' بندھ جاتی ہے' بے دست و پا ہو جاتی ہے۔" ... وہ اپنے ہاتھ پھیلا کر گلابی ہتھیلیوں کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "جوڈو ازدواجی بندھن کو توڑنے میں تو مددگار ہو سکتی ہے' جوڑنے میں نہیں۔ پھر بھی جتنی میں نے مزاحمت کی' اتنی شاید کوئی اور لڑکی نہ کر سکتی۔ یہ بات نہیں ہے کہ شادی کے نبھ جانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ نبھ بھی سکتی تھی' اگر میں بالکل بھیڑ بکری بن کر سب کچھ سہتی چلی جاتی۔ ہر مطالبہ پورا کرتی چلی جاتی اور اپنے والدین کو بھی مرتے دم تک بلیک میل ہونے دیتی تب شاید نبھ جاتی۔ لیکن میں نے ذلت کی آخری حدوں تک سمجھوتا نہیں کیا اور اچھا ہی کیا۔ کچھ تو عزت رہ گئی۔ ورنہ ڈیڈی کے مفلس ہونے کے بعد بھی بہرحال یہ بندھن ٹوٹ ہی جانا تھا۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ قدرے شرمیلے سے انداز میں بولی "لیکن جب بندھن کا ٹوٹنا سو فیصد یقینی ہو گیا تھا تب تو ایک بار میں نے اس کے والدین اور بھائی بہنوں کے سامنے اس کی ٹھیک ٹھاک پٹائی کی تھی۔ اٹھا اٹھا کر پٹخا تھا۔ دو دانت توڑ دیئے تھے۔ ایک ہنگامہ ہو گیا تھا۔ ان کے گھر میں تو صفِ ماتم بچھ گئی تھی۔ جمیل کے ابا نے میرے خلاف قاتلانہ حملے کی رپٹ درج کرا دی تھی۔ تھانہ کچہری بھی ہوئی تھی۔ اخباروں میں خبریں بھی آگئی تھیں۔ بیوی نے عبرت ناک انداز میں شوہر کی پٹائی کر دی اور اسے اسپتال پہنچا دیا۔ اس پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ بیانات کا ایک سلسلہ چل پڑا تھا۔ چھوٹی سی ایک سیاسی پارٹی جسے مذہبی ہونے کا دعویٰ ہے' اس کے سربراہ نے تو فتویٰ دے دیا تھا کہ ایسی نابکار بیوی کو پھانسی دے دینی چاہئے۔"

"اوہ۔" میں نے قدرے حیرت سے کہا "افسوس... مجھے یاد نہیں کہ میں نے اس قسم کی کوئی بحث اخباروں میں پڑھی ہو۔ شاید لاہور کے اخباروں نے لفٹ نہیں کی تھی یہ خبر... بھی ہو تو شاید غیر نمایاں انداز میں لفٹ کی ہو۔ اس کا... کافی شہرت پائی ہو گی تم نے؟" میں نے مسکراتے ہوئے... صبیح چہرے کی طرف دیکھا جس پر اب بھی نوخیزی کی معصو... تھی۔

"ہاں۔ لیکن کافی منفی قسم کی شہرت تھی" وہ بھی... ہوئے بولی "نوکری ملنی بھی مشکل ہو گئی تھی بعد میں مجھے... اسی لئے بعد میں کبھی کوئی رشتہ بھی نہیں آیا۔"

"مجھے جو یہاں آنا تھا۔ قدرت جو کرتی ہے' بہتری کر..." میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر یک لخت گہری سنجیدگی... بلکہ عجیب... سا چھا گیا۔ خوبصورت آنکھیں وحشت سے پھیل گئیں۔ ... سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے مرتعش سے لہجے میں بو... کے لئے تم مجھ سے شادی کی درخواست نہ کرنا۔ پلیز...!"

اس کے تاثرات میرے لئے حیرت کا باعث تھے۔ ... ملائمت سے کہا "مجھے ایسی جلدی نہیں ہے۔"

"نہیں۔ آج بھی نہیں۔ کل بھی نہیں۔ کبھی نہیں۔ تم کبھی بھی شادی کے لئے نہ کہنا" وہ بدستور وحشت زدہ نظ... تھی۔

"تم تو کچھ اس طرح خوف زدہ ہو گئی ہو جیسے مجھ سے... کسی ریچھ' بن مانس یا لکڑ بھگے سے شادی کا تصور تمہارے ذ... آگیا ہے" میں نے ہلکی سی خفگی سے کہا۔ "ایک طرف ایسی لا... محبتوں کی باتیں ہوں' دوسری طرف شادی کے نام سے ایسا... اور وحشت ہو تو انسان کو خفگی تو ہوتی ہی ہے۔"

"نہیں... نہیں... تم غلط سمجھ رہے ہو" وہ بے ا... میرا ہاتھ پکڑ کر اپنی بھیگی بھیگی آنکھوں سے لگاتے ہوئے بولی... ویسے بھی تمہارے قدموں میں بیٹھ کر زندگی گزار سکتی ہوں... اس طرح ندامت کے داغ دُھل سکیں لیکن بس تم مجھ سے ش... خیال دل میں نہ لانا۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" میں نے حیرت سے کہا "کیا تمہیں... کمپلیکس ہو گیا ہے؟ ایک شادی کی ناکامی کے بعد شادی سے... بیٹھ گیا ہے دل میں؟"

"نہیں... یہ بات بھی نہیں ہے..." وہ میری ا... سے کھیلتے ہوئے الجھن زدہ لہجے میں بولی "بس... تم سے شا... میں تصور نہیں کر سکتی۔ شاید یہ ندامت کی انتہا ہے۔ میں... آپ کو تمہارے قابل محسوس نہیں کرتی۔ میں اب وہ راحیلہ... ہوں جس پر تم فدا تھے۔ خود غرضی سی لگتی ہے کہ آج جب ک... ایک ٹھکرائی گئی... مسترد شدہ سی چیز ہوں... اور تم عروج کی... جا رہے ہو تو میں تمہارے پلے بندھ جاؤں۔ محض اس... تمہارے دل میں لڑکپن کے اس عشق کی چنگاری آج بھی ا...

"چنگاری نہیں' وہ شعلہ ہے جسے میں نہ جانے کس طرح ... بیٹھا تھا" میں نے تصحیح کی "ایک تو میں تم جیسے پیچیدہ سوچوں ... انسانوں سے بڑا تنگ ہوتا ہوں جو کبھی کوئی فلسفہ گھڑ کر بیٹھ ... ہیں اور کبھی کوئی۔ ان کی زندگی کا بس ایک ہی مقصد ہوتا ... کہ خوشیاں آکر ان کے دروازے پر دستک دیں تو وہ دھکے دے ... کر انہیں واپس کر دیں۔ تم لوگ زندگی کو سیدھے سادے ... انداز میں کیوں نہیں لیتے؟ بھئی جو ہوا سو ہوا۔ اب اسے بھولنے کی ... کوشش کرو اور زندگی کا جو نیا موڑ سامنے منتظر ہے اس سے از سرِ نو ... آغاز کرو" میں نے اسے ڈانٹ سی پلائی۔

"یہ اتنا آسان نہیں ہوتا" وہ بھیگی بھیگی آنکھیں پھیلاتے ... بولی "اور یہ تم جمع کے صیغے میں بات کر رہے ہو... تو کیا اور ... لوگ ہیں تم جیسے؟ اور بھی ہیں تمہارا دل جلانے والے؟"

"ہاں۔ ہیں تو سہی" میں نے جواب دیا "لیکن مقام شکر ہے کہ ... سے عشق کا رشتہ نہیں ہے" پھر میں نے ایک طویل جماہی لیتے ... کہا "کیا تمہارے ہاں اتنی دور سے آئے ہوئے دن بھر کے ... ہارے مہمان کو کچھ کھلانے پلانے کا رواج نہیں ہے؟"

"آئی ایم سوری" وہ یکدم اٹھتے ہوئے بولی "تمہارا آنا میرے ... اتنا حیرت انگیز واقعہ ہے کہ میں سب کچھ بھول گئی تھی۔"

وہ کچن میں چلی گئی۔ مجھے بھی آواز دے کر اس نے وہیں بلا لیا ... بولی "تمہیں وہاں اکیلے چھوڑ کر آنا مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ میں ... پینے کے لئے کچھ بناتی ہوں۔ تم کھڑے باتیں بناتے رہو۔"

چھوٹا سا کچن ڈربے سے مشابہ تھا لیکن صاف ستھرا اور چمکتا تھا۔ اس میں کام کرتی ہوئی وہ مجھے اور بھی زیادہ اچھی لگ رہی ... وہ میرے لئے کافی اور سینڈوچ تیار کر رہی تھی۔ میں دل ہی ... میں حالات کے اس دلچسپ پہلو سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ... صبح سے لاہور میں دفتری اور دیگر کاموں میں مصروف رہا تھا اور ... کو وہیں سے سیدھا ہوٹل کے افتتاح میں پہنچا تھا۔ آج اتفاق ... مجھے دوپہر کا کھانا کھانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ کراچی آکر ... ہوٹل میں بھی میرے کچھ کھانے پینے کی نوبت نہیں آئی ... میں تو رونق' گہما گہمی اور عمدہ انتظامات دیکھ کر پانی کا گلاس ... بھی بھول گیا تھا۔ ہزاروں افراد وہاں بہترین ڈنر کے لوازمات ... لطف اندوز ہو رہے تھے اور میں خود اس چھوٹے سے فلیٹ کے ... سے کچن میں کافی کی ایک پیالی اور ایک سینڈوچ کا منتظر تھا۔

راحیلہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر ایپرن پر ہاتھ پونچھتے ہوئے ... "آج کل کیا کر رہے ہو؟ وہی پرانا دھندا... یا کوئی کاروبار وغیرہ ... کیا ہے؟"

"اس دھندے کا تو تمہیں خواہ مخواہ ہی شبہ ہو گیا تھا مجھ پر" ... نے جلدی سے تھوک نگل کر کہا "اس زمانے میں لاعلمی میں ایسے کچھ لوگوں سے میرے مراسم ضرور ہو گئے تھے لیکن میں خود کبھی اس دھندے میں نہیں پڑا۔"

"تو پھر کیا کر رہے ہو؟"

"کئی چھوٹے موٹے کاروبار ہیں۔ قسمت نے کچھ ہاتھ پکڑ لیا ہے" میں نے جواب دیا۔

"خیر... ان باتوں سے مجھے اب کوئی دلچسپی بھی نہیں رہی۔ میں اب خواہ مخواہ جج بننے کی کوشش نہیں کرتی۔ تھوڑی بہت ہیرا پھیریاں اور چالاکیاں تو ہر کاروبار میں چلتی ہیں۔ آدمی کو تھوڑا بہت چالاک تو ضرور ہونا چاہئے ورنہ وہ زندگی کی دوڑ میں تھوڑا بہت آگے تو بڑھ سکتا ہے' بہت زیادہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔ خالص سونے سے تو زیور بھی نہیں بنتا۔ اسے زیور کے قابل بنانے کے لئے اس میں بھی تھوڑی بہت ملاوٹ کرنی پڑتی ہے" وہ بے پروائی سے بولی۔

"یہ بات نہیں ہے" میں نے ملائمت سے کہا "یہ دنیاوی ترقی کے چکر کچھ عجیب ہی ہیں۔ خود میری سمجھ میں آج تک نہیں آئے۔ بس تقدیر جس کا ہاتھ تھام لے' وہ خواہ بالکل سیدھا ہو' تھوڑا بہت چالاک ہو یا عمرو عیار ہو' باصلاحیت ہو' خواہ چغد ہو۔ بس وہ کچھ نہ کچھ بن جاتا ہے۔ میرا تو اب تقدیر پر ایمان ہو گیا ہے۔"

"یعنی صلاحیت تمہاری نظر میں کوئی چیز نہیں؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"صلاحیت ضمنی چیز ہے۔ اس کا کردار ثانوی ہے۔ تقدیر ساتھ نہ دے تو صلاحیتیں وغیرہ سب دھری رہ جاتی ہیں" میں نے کہا۔

وہ مبہم سے انداز میں کندھے اچکا کر رہ گئی گویا اس موضوع پر بحث سے بچنا چاہتی ہو۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ "بہرحال... اب تم اپنی حرکات و سکنات اور خود اعتمادی سے خاندانی دولت مند لگتے ہو۔ ایک خاص نفاست آگئی ہے تمہاری شخصیت میں۔ وجیہہ بھی پہلے سے زیادہ لگنے لگے ہو۔ لڑکیاں تو بہت منڈلاتی ہوں گی ارد گرد؟" اس نے شریر سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شخصیت کا پرانا رنگ دھیرے دھیرے مزید نمایاں ہو رہا تھا۔

"ایسی کچھ زیادہ تو نہیں منڈلاتیں" میں نے جواب دیا "اپنا تو وہ عالم ہے کہ... وہ جو شاعر نے کہا ہے نا۔ ع

کسی کو کچھ بھی یہاں حسبِ آرزو نہ ملا
کسی کو ہم نہ ملے اور ہم کو تو نہ ملا

اپنے ساتھ تو بس یہی معاملہ چل رہا ہے۔"

"اوہو... دردناک قسم کے شعر پڑھنے بھی آگئے ہیں اب تو" وہ ہولے سے ہنسی۔

"آگئے ہیں...؟ کیا مطلب؟ پہلے زیادہ آتے تھے۔ اب بھولتا جا رہا ہوں۔ کوئی کوئی شعر ہی یاد رہ گیا ہے لیکن جب زیادہ آتے تھے اس وقت تمہیں سنانے کا موقع ہی نہیں ملا" میں نے اس کے

قریب آکر اس کے وجود اور کافی کی خوشبو ایک ساتھ سونگھتے ہوئے کہا۔

"اب بھی مت سنانا" وہ یکدم سنجیدگی سے بولی "میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ میرا دل بہت نازک ہو گیا ہے۔"

"دل کو نازک ہی رہنا چاہئے" میں نے کہا "ورنہ بہتر ہے انسان دل کی جگہ سنگِ مرمر کا کوئی اچھا سا کتبہ فٹ کرا لے۔"

کافی اور سینڈوچز لے کر ہم واپس ڈرائنگ روم میں ہی کھڑکی کے قریب آبیٹھے۔ راحیلہ نے کمرے میں مدھم روشنی رہنے دی اور پردے ہٹا دیئے۔ اس کھڑکی سے سڑک نظر آتی تھی جس پر دونوں طرف کہیں کہیں درخت لہرا رہے تھے۔ گرین بیلٹ پر اوس چمک رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی گاڑی ویران سڑک سے گزر جاتی۔ بلندی پر اس چھوٹے سے کمرے میں، ملگجے اندھیرے میں ایک ہمدم دیرینہ کے ساتھ بیٹھ کر ہلکی سی خنکی میں باتیں کرتے ہوئے اس سڑک کا نظارہ کرنا دل کو بہت ہی خوشی دے رہا تھا۔ روح جیسے آج ہلکی پھلکی سی ہو گئی تھی۔ زندگی میں جیسے اصل دلکشی ہی آج پیدا ہوئی تھی۔

ہم دیر تک نو عمر و نوخیز، محبت کرنے والوں کی طرح باتیں کرتے رہے اور وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چلا۔ وہی باتیں جو برسوں پہلے تشنہ سی رہ گئی تھیں۔ آج ہم مل بیٹھے تھے تو جیسے درمیان سے برسوں کی خلیج غائب ہو گئی تھی اور سلسلہ وہیں سے مل گیا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا۔ محبت عجیب چیز ہے اور انسان عجیب تر۔

ہم اس وقت چونکے جب کال بیل بجی۔ اس وقت شاید سپیدۂ سحر نمودار ہونے کو ہی تھا۔ راشد لوٹ آیا تھا۔ وہ تھکا ہوا بھی تھا لیکن پُرجوش بھی نظر آ رہا تھا۔ مجھے ڈرائنگ روم میں چند لمحے پہلے آئے ہوئے مہمان کی طرح تازہ دم بیٹھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔

"آپ ابھی تک جاگ رہے ہیں؟" وہ حیرت سے بولا۔ پھر راحیلہ سے مخاطب ہوا "تم انہیں میرے بیڈ روم میں ہی سُلا دیتیں ..... میرا کوئی سلیپنگ سوٹ ہی دے دیتیں۔"

"تمہارا سلیپنگ سوٹ؟" راحیلہ نے اسے گھورا "تم جیسے نازک اندام اور مختصر الوجود نوجوان کا سلیپنگ سوٹ انہیں دے کر میں ان کا دم گھٹنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتی تھی۔"

راشد میری طرف دیکھ کر بڑی شرمندگی سے بولا "معاف کیجئے گا افضل بھائی! یہ جگہ ..... اور ہمارے حالات ..... آپ کے شایانِ شان نہیں ہیں۔ آپ کو کافی بے آرامی اٹھانی پڑی۔"

"فار گاڈ سیک راشد .....!" میں نے جلدی سے کہا "یہ حالات ..... اور شایانِ شان قسم کی اصطلاحیں میرے سامنے مت استعمال کیا کرو۔ مجھے اگر سونا ہوتا تو میں یہیں کہیں صوفے پر ..... قالین پر ..... تپائی پر ..... کہیں بھی سو جاتا۔ لیکن میں تو تم لوگوں سے تجدیدِ مراسم کی خوشی میں رت جگا منا رہا تھا۔"

"یعنی آپ کو اپنے ہوٹل کے افتتاح سے زیادہ ہم سے مل بیٹھنے کی خوشی ہے؟" راشد نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا۔

اس سے پہلے کہ میں اسے کوئی جواب دیتا، راحیلہ نے کراس کی طرف دیکھا "کیا کہا؟ ان کا ہوٹل؟"

"ہاں" راشد نے سرہلایا "کیا انہوں نے تمہیں نہیں [illegible] جس ہوٹل میں، میں ملازم ہوا ہوں وہ انہی کا ہے؟"

"نہیں۔ انہوں نے تو مجھے نہیں بتایا" راحیلہ نے مجھے [illegible]

"ارے بھئی ..... افضل بھائی تو بہت بڑے آدمی ہو گئے [illegible]" راشد تھکے تھکے انداز میں صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا "[illegible] معلوم ہی نہیں تھا کہ میں درحقیقت کس کا ملازم ہونے جا رہا [illegible] اور اب ان کے بارے میں مزید معلومات کر کے آیا ہوں۔ [illegible] کاروبار تو لاہور اور کراچی دونوں جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ فیکٹر[illegible] ٹرانسپورٹ ..... امپورٹ ایکسپورٹ ..... فلم میکنگ ..... اسٹیٹ ..... کنسٹرکشن ..... فنڈنگ ..... اب فائیو اسٹار [illegible] بھی ..... اور نہ جانے کیا کچھ، کہاں کہاں پھیلا ہوا ہے۔ یہ [illegible] وہ چیزیں ہیں جو ایک صاحب عجلت میں ایک طرف کو جا[illegible] مجھے بتا سکے ہیں۔ انہوں نے خود تمہیں کچھ نہیں بتایا؟"

"نہیں۔ کہہ رہے تھے میں بھی ذرا افتتاح میں مدعو [illegible] نے پوچھا، آج کل آپ کیا کر رہے ہیں۔ تو شرماتے ہوئے [بولے] بس ایسے ہی دو چار چھوٹے موٹے کاروبار ہیں" راحیلہ نے نقل اتارتے ہوئے مجھے گھورا۔

"آخر انکساری بھی کوئی چیز ہے" میں نے ٹھنڈی سان[س بھر] کر کہا پھر سادگی سے پوچھا "ویسے بائی دا وے ..... آپ لوگ[وں کے] ہاں کیا بڑا آدمی صرف اسی کو سمجھا جاتا ہے جس کے بڑے کاروبار ہوں؟"

"طنز فرمانے کی ضرورت نہیں ہے" راحیلہ مسکراتے [ہوئے] بولی "تمہیں معلوم ہے ہمارا یہ کمپلیکس نہیں ہے۔ بے شک تم جیسا عروج نہیں دیکھا لیکن زندگی کی ہر آسائش تو [دیکھی] ہے۔ اور نہ بھی دیکھی ہوتی تب بھی شاید ہم میں مرعو[بیت کا] کمپلیکس نہ ہوتا کیوں کہ ہر انسان کی اپنی اپنی سائیکالو[جی ہوتی] ہے۔ ہماری سائیکالوجی ایسی نہیں ہے۔ میں تو صرف مکمل جاننے کے لئے پوچھ رہی تھی۔ تم خود بھی کہہ چکے ہو، بات زوال کی نہیں ہوتی، ایک دوسرے کا حال جاننے کی ہوتی ہے۔"

"اف ..... اتنی لمبی تقریر کی کیا ضرورت تھی" میں [نے ہاتھ] تھامتے ہوئے کہا "میں طنز کب کر رہا تھا۔ یونہی ذرا تم لوگوں [کو چھیڑ] رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے تم دونوں میں کوئی کمپلیکس نہیں پایا جا[تا۔"]

"خیر ..... اب تم جان چھڑانے کے لئے ایسا بھی م[ت کہو"] راحیلہ فوراً بولی "ہر انسان میں کمپلیکس تو کوئی نہ کوئی ضر[ور ہوتا] ہے۔ لیکن اب ہم تم سے بحث نہیں کریں گے۔ اب تم را[شد کے] بگ باس ہو گئے ہو بلکہ ہماری چھوٹی سی ایڈورٹائزنگ کمپ[نی کے] سب سے بڑے کلائنٹ بھی تم ہی ہو۔ ہم تمہیں ناراض کر[نے کا رسک]

[ب]ھی نہیں لے سکتے۔ اور بگ باس کا کوئی پتا نہیں ہوتا کہ وہ [ک]س بات پر ناراض ہو جائے۔"

"ہاں ..... یہ تو ٹھیک ہے" میں نے مصنوعی سنجیدگی سے سرہلاتے [ہوئ]ے کہا "میرے خیال میں ناراض ہونے کے لئے یہی موقع سب [سے] زیادہ مناسب ہے۔ میں ابھی اور اسی وقت ناراض ہو جاتا [ہوں] ۔ راشد کو نوکری سے برخاست کر دیتا ہوں۔"

کمرے میں ایک لمحے کے لئے سکوت چھا گیا۔ دونوں بہن [بھائی]وں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ میں نے مناسب وقفے [کے]بعد کہا "تاکہ یہ کوئی ڈھنگ کا کام کر سکے۔"

وہ دونوں مسکرا دیئے۔ میں نے براہِ راست راشد کو مخاطب کیا۔ "[کر]اچی میں میرا کنسٹرکشن کا کاروبار زیادہ اچھا نہیں جا رہا۔ شفیع [پ]ر کام کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ وہ بہت سے شعبوں کی نگرانی کر رہا [ہے]۔ کنسٹرکشن کا شعبہ محض اوپری نگرانی کے لئے بھی بہت وقت [مانگت]ا ہے۔ کنسٹرکشن کمپنی چل تو رہی ہے لیکن اس طرح نہیں چل [رہی] جس طرح میں چاہتا ہوں۔ اس کے لئے سپریم اتھارٹی کے طور [پر] کام کرنے والے ایک ایسے شخص کی مجھے بہت دنوں سے [ضر]ورت ہے، جس پر میں آنکھیں بند کر کے اعتماد کر سکوں۔"

"ہو گی تو وہ بھی نوکری" راشد ہنس کر بولا۔

"ہاں۔ تمہاری حیثیت ملازم ڈائریکٹر کی ہو گی لیکن تم تقریباً [خو]د مختار ہو گے۔ صرف مجھے جواب دہ ہو گے۔ اور میں لاہور میں [ہ]وں گا۔"

"لیکن مجھے تو کنسٹرکشن کا کوئی تجربہ نہیں ہے" وہ بولا۔

"جس مقام پر میں تمہیں متعین کرنا چاہتا ہوں اس کے لئے تجربے کی ضرورت نہیں۔ کام کرنے والی تو ساری مشینری موجود ہے، تمہیں صرف اس مشینری کی دیکھ بھال کرنی ہو گی۔ اسے چالو رکھنا ہو گا۔ تمہاری زیادہ بڑی ذمے داریاں صرف دو ہوں گی۔ باقی سب باتیں ضمنی ہوں گی۔ ایک تو تمہیں صرف یہ دیکھنا ہو گا کہ کہیں کوئی گھپلا نہ ہونے پائے۔ دوسرے کہیں کام رکنے نہ پائے۔ اصل میں تم صرف مالک کے نمائندے ہو گے۔"

"مجھے کنسٹرکشن سے خوف بھی آنے لگا ہے" راشد کمزور سے لہجے میں بولا "ڈیڈی آخری داؤ کے طور پر جس بلڈنگ کو اپنا ایمپائر سمجھ کر تعمیر کر رہے تھے، وہی ان کی قبر بن گئی۔ تب سے میرے ذہن میں خوف بیٹھ گیا ہے۔"

"خیر ..... اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے" میں نے جلدی سے کہا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان کے والد مرحوم کا ذکر آنے پر ماحول بوجھل نہ ہو جائے۔ میں نے راحیلہ کو مخاطب کیا "تمہیں ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہو گیا؟"

"دو سال" اس نے جواب دیا۔

"اتنا اعتماد تو آ ہی گیا ہو گا کہ اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی چلا سکو؟"

"ہاں ..... اعتماد تو نوکری شروع کرنے سے پہلے بھی تھا" وہ قدرے مضطرب سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"بس تو پھر تم اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھول لو۔ ابتدائی طور پر اسے چلانے کے لئے ہمارے اپنے کاروباروں کی پبلسٹی کا کام ہی کافی ہو گا۔ شروع میں یہ گویا ایک ہوم ایجنسی ہی ہو گی لیکن تم اسے جتنی بھی وسعت دے سکو، دے دینا۔ یہ تمہاری اپنی ہمت اور صلاحیت پر منحصر ہو گا۔ مالی مسئلہ تمہیں کوئی نہ ہو گا۔"

راحیلہ نے ایک بار پھر بھائی کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے کہا "انی! ہمیں ہماری اوقات پر ہی رہنے دو۔ ہم بہت سکون میں ہیں۔ ہمیں بڑی بڑی چھلانگیں لگانے کا بالکل شوق نہیں ہے۔"

"تمہیں اس میں اعتراض کیا ہے؟ تکلف کیا ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"بس ..... کچھ اچھا نہیں لگتا ....." وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "کچھ ایسا محسوس ہو گا جیسے ہم پرانی شناسائیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔"

"کیا اس "جرم" پر تمہارے خلاف تفتیش ہو گی کہ تم شناسائیوں سے فائدہ اٹھا رہے ہو؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"بات اپنے احساس کی ہوتی ہے" راحیلہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

"تمہاری تسلی کے لئے بتا دوں کہ اس میں شناسائیوں سے فائدہ اٹھانے والی کوئی بات نہیں ہو گی۔ میں اس ایجنسی میں سلیپنگ پارٹنر ہوں گا۔ محنت تمہاری ہو گی، رقم میری۔ نفع نقصان نصفا نصف۔ کوشش کرنا کہ وہ نقصان میں نہ جائے تاکہ تمہارے حضرتِ ضمیر مطمئن رہ سکیں۔ ہم مہربانیوں اور نوازشات کی بات نہیں کر رہے۔ دو کاروباری افراد کی طرح ایک کاروباری منصوبے کی بات کر رہے ہیں، جس میں مَیں منافع کی امید پر سرمایہ کاری کر رہا ہوں۔ یہ ایک نیا پروجیکٹ ہے اور مخدوش بزنس ہے۔ تمہیں اس میں جان توڑ محنت کرنا پڑے گی۔ کوئی احسان نہیں ہو گا تم پر۔"

"اب ہم بار بار انکار کرتے رہیں گے تو تم کہو گے کہ نخرے دکھا رہے ہیں۔ لیکن فی الحال ہمیں انکار کے سوا کچھ سوجھ بھی نہیں رہا۔ بہتر یہی ہے کہ ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔ یقین کرو ہم اپنے موجودہ حالات سے بہت مطمئن ہیں۔ ہمیں کوئی حسرت یا پریشانی نہیں ہے۔ لیکن اگر تم بضد ہو تب بھی ہمیں کچھ عرصہ سوچنے سمجھنے کا موقع ضرور دو۔ ابھی تو ہم اس اچانک ملاقات سے ہی بوکھلائے ہوئے ہیں" راحیلہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"یہ جواب مناسب ہے" میں نے طمانیت سے سرہلایا "اچھی طرح سوچو، سمجھو۔ اگر کچھ بقراط سقراط قسم کے دوست میسر ہوں تو ان سے بھی مشورہ کر لو۔ ویسے مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرا ساتھی

بننے کے لئے بھی تمہیں اتنی سوچوں میں الجھنا پڑے گا۔"
"ہم سہمے ہوئے لوگ ہیں۔ سہمے ہوئے بھی اور قناعت پسند بھی" راشد بولا۔
"چلو خیر۔۔۔ میں نے جو تجویزیں پیش کی ہیں ان پر عمل درآمد کا فیصلہ اگلی ملاقات کے لئے اٹھا رکھتے ہیں" میں نے کہا "جلد ہی میں خود دوبارہ کراچی آؤں گا یا تم دونوں کو لاہور بلاؤں گا' پھر ہم تفصیلات طے کریں گے۔ یہ بات بہرحال طے ہے کہ تمہارا جواب انکار میں نہیں ہونا چاہئے۔"
راشد بولا "آپ نے افتتاح کے بارے میں تو کچھ پوچھا ہی نہیں۔"
"تم لوگوں سے تجدید مراسم کی جس محل سرا کا افتتاح ہوا ہے اس کے بعد میں ہوٹل کے افتتاح کو بھول گیا ہوں" میں نے کہا۔ "بتانا ہے تو خود ہی بتادو کہ کیسا رہا؟"
"بہت شاندار" راشد جوش و خروش سے بولا "اس انداز میں آج تک کسی ہوٹل کا افتتاح نہیں ہوا۔ شفیع شاہ نے روپیہ پانی کی طرح بہایا ہے۔ اور اس کا ریٹرن ضرور ملے گا۔"
پھر ایک لمحے کے توقف سے بولا "لیکن آپ کی بہت کمی محسوس ہو رہی تھی۔ خصوصاً ورائٹی پروگرام کے ساتھ ساتھ جو تعارفی سے سلسلے چل رہے تھے ان میں آپ کا کئی بار ذکر آیا۔ بہت سے لوگ جو آپ سے غائبانہ واقف تھے وہ آپ سے ملنے کے مشتاق رہے اور جو آپ کو جانتے تھے وہ آپ کو تلاش کرتے رہے۔ کیوں کہ وہاں یہ خبر تو پھیل چکی تھی کہ آپ آئے ہوئے ہیں۔ ہر کوئی پریشان تھا کہ آپ اس موقعے پر کہاں غائب ہو گئے۔ خصوصاً فلم اسٹار ستارہ آپ کو بہت پوچھ رہی تھی اور تلاش کر رہی تھی۔"
راحیلہ نے فوراً ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ راشد اپنی دُھن میں سادگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا "بلکہ ایک ستارہ ہی کیا تینوں چاروں ہیروئنیں جو آئی ہوئی ہیں' سبھی آپ کے بارے میں بڑی گرم جوشی سے پوچھ رہی تھیں۔"
راحیلہ نے معنی خیز انداز میں آہستگی سے یوں سرہلایا کہ راشد دیکھ نہیں پایا۔ میں نے صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں جلدی سے کہا "ستارہ کے سوا میری تو کسی سے شناسائی نہیں۔ ستارہ سے بھی اس لئے ہو گئی ہے کہ وہ کئی ایسی فلموں کی ہیروئن ہے جنہیں میں فائنانس کر رہا ہوں۔ ورنہ میں تو اسٹوڈیو آتا جاتا بھی نہیں۔ بس اب غائبانہ طور پر لوگ ذرا جاننے لگے ہیں اور تم جیسے کچھ دوستوں کی مہربانیاں ہیں کہ اچھے انداز میں جاننے لگے ہیں۔"
راشد سادگی آمیز شریر لہجے میں بولا "لیکن آپ خاص طور پر خواتین میں کافی پاپولر معلوم ہوتے ہیں۔"
میں نے طویل سانس لے کر کہا "بھائی! اگر تم فلمی خواتین میں پاپولر ہونے کی بات کر رہے ہو تو وہاں ہر وہ شخص پاپولر ہوتا ہے

جس کے پاس پیسہ ہو۔ اگر وہاں کسی کی دولت مندی کے قصے ہو جائیں تو وہ کسی سے ملنے سے پہلے ہی پاپولر ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ صفات کو جانچنے کا پیمانہ عموماً یہ ہوتا ہے کہ اس نے ہیروئن کو کوٹھی لے کر دی ہے' کس چھوٹی موٹی مگر خوش اداکارہ کو بیش قیمت گاڑی لے کر دی ہے۔ کس کی خدمت ڈائمنڈ کا کوئی سیٹ وغیرہ پیش کیا ہے۔"
"ایک بے چاری فلم انڈسٹری کا کیا ذکر ہے۔" را[حیلہ] سر جھٹک کر بولی "آج کل تو پوری دنیا کا تقریباً یہی چلن ہے ذرا مراسم کی نوعیت کا فرق آجاتا ہے ورنہ پیمانے تو یہی ہیں۔"
"یہ بھی تم نے ٹھیک ہی کہا" میں نے سرہلایا پھر گھڑی د[یکھ کر] اٹھتے ہوئے کہا "اب میں چلتا ہوں۔ شفیع شاہ حیران ہو گا کہ کہاں غائب ہو گیا ہوں۔"
"اب آپ کہاں جائیں گے؟" راشد نے پوچھا۔
"میں سوچ رہا ہوں' اب جا کر ذرا اپنے ہوٹل میں بھی د[و]... دیکھ لوں۔ آرام بھی ہو جائے گا اور ہوٹل کے معیار و سروس کا بھی اندازہ ہو جائے گا۔" میں نے جواب دیا۔
راشد مسکراتے ہوئے بولا "وہاں کوئی کمرا خالی ہے۔ ایمرجنسی کے لئے بھی جو چار پانچ کمرے رکھے جاتے ہ[یں] بھی مجبوراً کسی نہ کسی کو دینے پڑے ہیں۔ آج ہی سے آمد[ورفت] شروع ہو گئی ہے۔ اسی فیصد تو دوسرے شہروں سے آئے ہو[ئے] اعزازی مہمان ہیں۔ بیس فیصد کمرے کرائے پر بھی گئے ہیں۔ کو وہاں جگہ ملنی مشکل ہے۔ اگر آپ واقعی آرام کرنا چاہتے ہ[یں تو] آپ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ یہیں ٹھہرے رہیں۔"
میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ راحیلہ کو بھی وہی خیال آ[یا جو] ایک لمحہ پہلے مجھے آچکا تھا۔ ہنس کر بولی "انسان عبرت پکڑنا چا[ہے تو] اس قسم کے واقعات سے کافی تسلی بخش طور پر پکڑ سکتا ہے۔ ہو[ٹل] کے مالک کو نہ تو ہوٹل میں کھانا نصیب ہوا اور نہ ہی رہنا۔"
"اسی لئے تو میں اپنی املاک کو کبھی اپنی املاک نہ[یں] سمجھتا۔ ہر وقت دونوں ہاتھ جھاڑ کر ایک مفلس کی طرح از[سر نو] زندگی کے میدان میں کودنے کو تیار رہتا ہوں۔" میں نے کہا۔
"لیکن تم نے پہلے ہی زبردست عبرت پکڑی ہوئی ہے جیسوں کو دیکھ کر" راحیلہ بولی۔
"تم بات پھر اپنی طرف لے آئیں۔ میں اب واقعی چلتا ہو[ں]" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ انہوں نے مجھے رو[کنے] کی بہت کوشش کی لیکن مجھے اب واقعی شفیع سے ملنے' ہوٹل [کا] جائزہ لینے اور بہت سے کاروباری معاملات پر تبادلۂ خیال کرنے [کے] لئے جانا تھا اس لئے میں نے اجازت لے ہی لی۔
دوسرے روز شام کو کراچی سے میری واپسی ممکن ہو سکی [۔] اس دوران مجھے ایک لمحے کی فرصت نہیں ملی۔ ائرپورٹ پر [شفیع] شاہ کے علاوہ راحیلہ' راشد اور سیٹھ رمضان بھی مجھے چھوڑ[نے آ]

[آ]ئے تھے۔ فلمی لوگوں کا قافلہ مجھ سے پہلے ہی واپس روانہ ہو چکا [تھا] اور ستارہ انہی کے ساتھ چلی گئی تھی۔
شفیع شاہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ راشد اور راحیلہ سے میرا پرانا [تعلق] خاطر نکل آیا ہے۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ راشد بھی ویسے [ہی نا]یاب لوگوں میں سے ایک تھا جن کی ہمیں تلاش رہتی [تھی۔] جن پر ہم آنکھیں بند کر کے بھروسہ کر سکتے تھے اور جو ہمارے [جاں] نثار ثابت ہو سکتے تھے۔ میں نے شفیع کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ راشد [ہماری] ایمپائر کا ایک ستون ثابت ہو سکتا تھا اور میں کنسٹرکشن کا [شعب]ہ اس کے سپرد کرنے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ میں نے شفیع شاہ کو [ہدای]ت کر دی تھی کہ اس سلسلے میں ابھی سے اسے ضروری رہنمائی [فرا]ہم کرنے کا سلسلہ شروع کر دیا جائے۔ شفیع شاہ نے ہمیشہ کی طرح [سع]ادت مندی سے سرہلا دیا تھا۔ کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔
میں گھر پہنچا تو خاصا تھکا ہوا تھا۔ نہا کر میں سونے کا ارادہ کر ہی [رہا] تھا کہ انٹرکام پر طارق خان اجازت لے کر اندر آگیا۔ طارق [خان] ایک لمبا تڑنگا' ادھیڑ عمر' سرخ و سفید توی تھا۔ وہ زیادہ تر [گی]ٹ پر یا گیٹ ہاؤس میں بیٹھتا تھا۔ ملنے سے ایک عام' سیدھا سادا [...]ان پڑھ سا روایتی چوکیدار نظر آتا تھا' جیسے عام طور پر کوٹھیوں [کے] گیٹ پر بیٹھے نظر آتے ہیں مگر درحقیقت وہ ایسا عام سا آدمی [نہیں] تھا۔
وہ ایک سابق کمانڈو تھا۔ گیٹ پر بھی وہ گیٹ کی آڑ میں ایک [انتہ]ائی جدید دہائٹ ورتھ رائفل رکھ کر بیٹھتا تھا جو انتہائی قریب [سے] لے کر تقریباً پندرہ سو گز کے فاصلے تک یکساں خطرناک [تھی۔] اس کے علاوہ گیٹ ہاؤس میں اس کے پاس ہلکی مشین گن [...] بھی رکھی رہتی تھی۔ انٹرکام پر اس کا کوٹھی کے دوسرے [کمر]وں سے اور ٹرانسمٹر پر باقی تمام ساتھیوں سے رابطہ رہتا تھا۔ [ضر]ورت کے وقت وہ قریب ترین لوگوں کو فوری طور پر طلب کر سکتا [تھا۔]
اسی طرح کا دوسرا آدمی ظاہر علی تھا۔ وہ دونوں جُڑواں بھائی [لگ]تے تھے لیکن درحقیقت وہ صرف گہرے دوست تھے۔ ظاہر علی بھی [گی]ٹ پر ڈیوٹی دیتا تھا۔ ایک دن میں رہتا تھا اور دوسرا رات [میں۔] ان دونوں کا بندوبست میں نے اس دن کے بعد سے کیا تھا [جب] بدمعاشوں کے ایک بڑے خطرناک گروہ کا سردار اپنے [ساتھ]یوں کے ہمراہ میرے کتوں کو زہر آلود گوشت کھلانے اور [چوک]یدار کو ہلاک کرنے کے بعد گھر میں داخل ہونے میں کامیاب [ہو گ]یا تھا۔ قیصر ملک نے بہت بھاری معاوضہ دے کر اس کی خدمات [حاص]ل کی تھیں۔ اتفاق سے اس کا نام محمد طارق تھا۔ اور اس کے [بعد] مجھے طارق خان نامی یہ کام کا آدمی مل گیا تھا۔ ظاہر علی کو وہی [تلاش] کر کے لایا تھا۔
طارق خان کو میں نے اسٹڈی میں بلا لیا۔ وہ ایک چھوٹا سا [پیک]ٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "سر! یہ آپ کی غیر موجودگی

میں ایک شخص آپ کے لئے دے گیا تھا۔ سیکیورٹی چیک اپ میں نے کر لیا ہے۔ اس میں کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔ صرف ایک ویڈیو کیسٹ ہے۔"
"کون تھا وہ؟" میں نے پیکٹ لیتے ہوئے پوچھا۔
"اے نن یا مین ۔۔۔۔ کچھ اس قسم کا نام بتایا تھا" طارق خان نے جواب دیا۔
"اوہ۔۔۔۔" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس بندر نما' مختصر الوجود اور پُراسرار انسان کی صورت میرے ذہن میں ابھر آئی۔
"اس کی تصویر ریکارڈ میں آگئی ہے۔ گو کہ وہ گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی یہ پیکٹ دے کر آگے بڑھ گیا تھا" طارق خان بولا اور اس نے جیب سے ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھا دی۔
کوٹھی کے گیٹ میں دونوں طرف دو کیمرے فٹ تھے جن کے لینس گیٹ کے آرائشی دائروں میں نظر نہیں آتے تھے۔ وہ بے آواز مووی کیمرے تھے۔ گیٹ ہی میں لگے ہوئے ایک ننھے سے پش بٹن کو چھوتے ہی کام شروع کر دیتے تھے۔ کوئی بھی شخص جو طارق خان کے لئے اجنبی ہوتا' کسی سلسلے میں استفسار کرتا ہوا گیٹ تک آتا یا کوٹھی کے آس پاس منڈلاتا نظر آتا' کوئی چیز دینے آتا یا مجھ سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتا' مووی کیمرے میں کسی نہ کسی زاویے سے اس کی تصویر اور کچھ نہ کچھ نقل و حرکت محفوظ ہو جاتی تھی۔ طارق خان اسی کے ذریعے تیار کیا گیا ایک پرنٹ میری طرف بڑھا رہا تھا۔ مجھے تصویر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے لئے نام ہی کافی تھا۔
تاہم میں نے طارق خان سے تصویر لے لی۔ وہ اے نن ہی تھا۔ ایک کیڈلک کی کھڑکی سے سر نکال کر وہ پیکٹ طارق خان کی طرف بڑھا رہا تھا اور اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے یوں استہزائیہ سے انداز میں مسکرا رہا تھا جیسے اسے علم ہو کہ کیمرا اس کا عکس محفوظ کر رہا ہے اور یہ اس کے لئے ایک بچکانہ سی حرکت ہو۔
"کوئی پیغام تو نہیں دیا اس نے؟" میں نے پوچھا۔
"نہیں سر!" طارق خان بولا "بس یہ پیکٹ دیا اور کہا کہ اپنے صاحب کو دے دینا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میرے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا۔"
میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "طارق خان! تم نے اس شخص کی تصویر غور سے دیکھ لی ہے نا؟"
"یس سر!"
"اس کی شکل ذہن میں رکھنا۔ آئندہ یہ تمہیں یہاں کہیں آس پاس بھی نظر آئے تو اسے قابو میں کر کے گھر میں لانا ہے۔ خواہ اس مقصد کے لئے ٹانگ وانگ میں گولی ہی مارنی پڑے۔ لیکن یہ خیال رہے کہ اسے جان سے نہیں مارنا ہے۔ زندہ پکڑنا ہے اور یہ بھی خیال رہے کہ یہ جتنا حقیر' کمزور اور مختصر الوجود نظر آتا ہے

حقیقت میں ویسا ہرگز نہیں ہے۔ بہت ہی پُراسرار سی چیز ہے اور حیرت انگیز طور پر طاقتور اور پھرتیلا ہے۔ اس کے بارے میں قطعاً کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ رہنا اور اسے بالکل اسی طرح قابو میں کرنے کی کوشش کرنا جس طرح شیر' چیتے یا کسی اور خطرناک درندے کو قابو میں کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ سمجھ گئے نا؟"

"بالکل سمجھ گیا سر!" طارق خان نے جواب دیا اور میرا اشارہ پاکر مستعدی سے خالصتاً فوجی انداز میں سیلوٹ کرکے رخصت ہوگیا۔

میں گو کہ بہت تھکا ہوا تھا۔ دو رات سے سو نہیں سکا تھا اور اب تیسری رات بھی جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود محض تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں وہ کیسٹ وی سی آر میں لگا کر بیٹھ گیا۔

وہ کیسٹ کیا تھی' لرزہ خیزی کا ایک ایسا عجیب ذریعہ تھی جس کے تاثر کو الفاظ میں صحیح طور پر بیان کرنا ممکن نہیں۔ وہ ایک انسان پر تشدد کی بڑی صاف اور تفصیلی فلمبندی تھی جس میں اس کی اذیت ناک آوازیں بھی تمام تر جزئیات کے ساتھ ریکارڈ کی گئی تھیں۔

تشدد کے بہت سے مظاہرے میں نے بھی دیکھے تھے۔ شاید آپ نے بھی دیکھے ہوں۔ تھانوں' زیرِ زمین عقوبت خانوں اور دنیا بھر کی خفیہ پولیس کے مراکز میں انسانوں پر ہونے والے تشدد اور اذیت رسانی کے قصے بھی منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں لیکن اس قسم کے واقعات گول مول انداز میں پڑھ لینا اور بات ہے' نہایت اہتمام سے تیار کی گئی ایک فلم دیکھنا اور بات۔

فلم میں ماہرانہ فلمبندی کی تمام تیکنیک استعمال کی گئی تھی۔ تمام زاویے کوَر کئے گئے تھے۔ لائٹ اور ساؤنڈ کے تمام تاثرات سے پورا پورا کام لیا گیا تھا۔ جس طرح اس شخص کے جسم کے ایک ایک ریشے کو مرحلہ وار اذیت دی جارہی تھی' وہ منظر گویا میں حقیقت میں دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ جیسے میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔

وہ ایک جوان رعنا تھا جس کے بدن سے ایک ایک بال نوچا گیا۔ اس کے ناخن کھینچے گئے۔ اسے بجلی کے جھٹکے دئے گئے۔ اس کا جسم دہکتے تاروں سے چھیدا گیا۔ اس کی ہڈیوں کے جوڑ توڑے گئے۔ اس کے اعضا کو ہتھوڑیوں سے آہستہ آہستہ کچل کر گودے میں تبدیل کیا گیا۔ اس کے بچے کھچے بدن میں میخیں گاڑی گئیں۔ آنکھوں میں سلائیاں گھونپی گئیں۔ پھر تشدد کے کچھ ایسے شرمناک طریقے اختیار کئے گئے کہ اگر کسی معجزے کے تحت اس کے سارے زخم بھر جاتے اور وہ زندہ بچ جاتا تب بھی شاید وہ دنیا کو منہ دکھانا اور باقی زندگی گزارنا پسند نہ کرتا۔ پھر اس کے چہرے پر بلیڈ سے چرکے لگا کر ان میں مرچیں بھر دی گئیں۔ آخر کار وہ سسک سسک کر مرگیا اور اس کے ساتھ ہی فلم ختم ہوگئی۔ ان دنوں کیسٹ ایک گھنٹے کی

ہوتی تھی۔ فلم ایڈیٹنگ کے ساتھ تیار کی گئی تھی۔ اس نوجوان نے یقیناً کئی گھنٹے اس عذاب میں گزارے تھے۔ تب اس کی جان کو زندگی سے چھٹکارا ملا تھا۔

اس قسم کی اذیت کے تو چند لمحے گزارنے کا تصور ہی روح ... ہوتا ہے۔ اس نوجوان پر وہ چند گھنٹے کس طرح گزرے ہوں ... اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ شاید ہر پل اس نے موت ... دعا کی ہوگی لیکن موت اسے صدیوں کے فاصلے پر کھڑی نظر ... ہوگی۔ موت اس وقت اس کے لئے ایک حسین نعمت ہوگی ... سے ہم زندگی بھر بھاگتے رہتے ہیں' جس سے بچنے کی تدبیریں کر... رہتے ہیں۔

میں اپنے آپ کو بہت مضبوط اعصاب کا مالک سمجھتا تھا۔ ... خود میرے اشارے پر کئی درندہ صفت اور سفاک انسانوں کو سید... کرنے کے لئے ان کی پٹائی کی گئی تھی لیکن تشدد اور اذیت رس... کے اس انداز اور ان ہتھکنڈوں کی میں نے اپنے کسی آدمی کو ... اجازت نہیں دی تھی حالانکہ جو لوگ اس ضمن میں پکڑ کر میر... ہاں لائے گئے تھے وہ تو اپنے اعمال کے پیشِ نظر اس سلوک ... مستحق بھی قرار پاسکتے تھے۔ پھر بھی میں نے اپنے کسی آدمی کو ان ... ساتھ اس قسم کے سلوک کی ابتدا بھی کرنے کی اجازت نہیں ... تھی اور اس کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ ہمیشہ اس حد ... جائے بغیر ہی کام چل گیا تھا۔

درندہ اپنے شکار کو اذیت نہیں دیتا۔ فطرت نے اسے جو ... طریقہ سکھایا ہے' اسی سیدھے سادے انداز میں وہ اسے ہلاک ... ہے اور اگر وہ اس کی خوراک ہے تو اسے کھالیتا ہے۔ وہ اذ... رسانی کے نت نئے' زیادہ سے زیادہ کرب انگیز طریقے نہیں س... اور انہیں اپنے ہم جنسوں پر نہیں آزماتا۔ انہیں بے بس کر... ان طریقوں سے لذت اندوز نہیں ہوتا۔ یہ صفات صرف انسا... میں ہی پائی جاتی ہیں۔ اس کے باوجود درندہ خواہ مخواہ بدنام ... ہمیں جہاں کہیں بھی ظلم و تشدد اور بربریت و سفاکی کی مثال ... ہوتی ہے ہم عموماً درندگی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔

میں نے اپنے آدمیوں کو اس لئے بھی کبھی اس طرف ... ہونے کا موقع نہیں دیا تھا کہ اکثر انسانوں میں اذیت رسانی کی ... مبہم سی پیاس چھپی ہوتی ہے۔ اگر انہیں اکثر و بیشتر کسی کو اذ... دینے کے مواقع میسر آنے لگیں تو ان میں یہ پیاس باقاعدہ طو... جاگ اٹھتی ہے۔ ان کی طلب اور ضرورت بن جاتی ہے۔ ... عمل میں انہیں تسکین ملتی ہے۔ اگر انہیں اس کا موقع نہ ملے ... جھنجلائے ہوئے اور بے چین رہتے ہیں۔ شکار کی تلاش میں ر... ہیں۔ ایک غیر انسانی قسم کی خونخواری ان کی فطرت کا حصہ بن ... ہے۔

فلم ختم ہوئی تب بھی میں دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ ... ہتھیلیاں پسینے میں تر تھیں اور کنپٹیاں سنسنا رہی تھیں۔ اذ...

...انی کی وہ ہولناک کارروائی پانچ گیم تحیم آدمیوں نے انجام دی ... جن کے چہروں پر اُلٹے تھیلوں کی طرح کے سیاہ نقاب چڑھے ...ئے تھے۔ صرف آنکھوں کی جگہ سوراخ تھے۔ ان کے چہروں کی ...ی بھی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں ...یں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ وہ انسانی صفات سے عاری' شقی ...ب قسم کے جلاد تھے اور ان کے لئے یہ ساری کارروائی ایک ...ین کا حصہ تھی۔ نوجوان کو بے بس کرکے جس سکون اور ...اک سے انہوں نے سب کچھ کیا تھا' اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ... کے لئے یہ کوئی نیا کام نہیں تھا۔ انہیں اس کا طویل تجربہ تھا۔ ... جگہ یہ سارا عمل کیا گیا تھا وہ کوئی طویل و عریض ہال معلوم ہوتا ... جس کی چھت بہت نیچی تھی۔ وہ ایک زبردست قسم کا عقوبت ... معلوم ہوتا تھا۔ وہاں اذیت رسانی کے نہ جانے کتنے آلات ...زلوازمات موجود تھے۔ فلم میں بہت سی ایسی چیزوں کی جھلک بھی ...ائی دی تھی جن کی اس نوجوان پر آزمائے جانے کی نوبت ہی ... آسکی تھی۔ صرف یہی نہیں' وہاں شاید فلمبندی کے بھی ...مل انتظامات موجود تھے۔

لیکن میری ہتھیلیوں سے پسینہ پھوٹنے یا کنپٹیاں سنسانے کی ... محض یہی سوچیں نہیں تھیں۔ میں تو اس لئے بھی دم بخود رہ گیا ...کہ وہ نوجوان ایک جانی پہچانی سیاسی شخصیت تھا۔ مجھے سیاست ... کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں سیاستدانوں کے بیانات وغیرہ بھی ...ی خاص توجہ سے نہیں پڑھتا تھا۔ میرا ان لوگوں پر سے اعتبار ...و چکا تھا لیکن اس نوجوان کو میں نے اس لئے پہچان لیا تھا کہ چند ... پہلے کچھ دن کے لئے اخبارات اس کے تذکرے سے بھر گئے ...ے۔

ایک روز منہ اندھیرے اس کی مسخ شدہ لاش شہر کی ایک ...ران نواحی سڑک پر پائی گئی تھی اور اس کے بعد ملک کے کئی ...وٹے بڑے شہروں میں ہنگامے شروع ہوگئے تھے' جن پر بڑی ...شکل سے قابو پایا جاسکا تھا۔ وہ دولت مند والدین کا بیٹا تھا۔ ایک ...ات اپنے شاندار مکان میں اپنے بیڈ روم میں سونے گیا اور صبح ...ئب پایا گیا۔ اس کے دو دن بعد ہی سڑک پر اس کی مسخ شدہ لاش ...۔

اس کا نام شاہد شوکت تھا۔ وہ ایک ابھرتا ہوا نوجوان ...یاستداں تھا۔ تعلیمی اداروں میں ہر سیاسی جماعت کی ذیلی تنظیم ...ور موجود ہوتی ہے۔ کالج کے زمانے میں شاہد شوکت بھی ایسی ہی ...ی تنظیم کا سرگرم لیڈر تھا۔ بعد میں اس کے اپنے سیاسی بزرگوں ...ے کچھ اختلافات ہوگئے اور اس نے اپنی ایک الگ سیاسی پارٹی ...نالی۔

یہ کئی سال پہلے کی بات تھی۔ تب سے وہ تندہی سے اپنے کام ...ں لگا ہوا تھا اور اس نے اپنی نوخیز سیاسی پارٹی کو کافی منظم اور ...عال بنالیا تھا۔ نوجوان تیزی سے اس کے گرد جمع ہو رہے تھے۔

اس کی شخصیت میں وہ کشش اور تمام خوبیاں موجود تھیں جو ہمارے ہاں عموماً کسی کو کامیاب سیاستداں بناتی ہیں۔ لیکن وہ نہ تو اپوزیشن میں شمار ہوتا تھا اور نہ ہی صحیح معنوں میں اسے حکومت کا حامی کہا جاسکتا تھا۔ شاید وہ اپنی کوئی الگ ہی لائن بنا رہا تھا۔

اس طرح بظاہر ناوابستگی کی سیاست کرنے والے کا ہماری سیاست میں کیا مستقبل تھا' اس کا تو مجھے اندازہ نہیں تھا۔ تاہم ایک امکان یہ نظر آتا تھا کہ شاید پہلے وہ اپنا وزن بنا رہا تھا تاکہ پھر جس پلڑے میں بھی گرے وہاں اس کی نمایاں حیثیت اور اہمیت ہو۔ شاید وہ مرحلہ زیادہ دور نہیں تھا جب اسے قتل کردیا گیا۔

اس کا قتل ایک معما بن کر رہ گیا تھا۔ تأسف اور گہرے رنج کا اظہار سبھی نے کیا تھا۔ کوئی اس کے قتل کا الزام کسی پر رکھ رہا تھا اور کوئی کسی پر۔ کسی کا خیال تھا کہ اسے حکومتی پارٹی نے قتل کرایا تھا کیونکہ مستقبل میں وہ سیاسی میدان میں اس کے لئے بڑا خطرہ بننے والا تھا جبکہ وزیروں کے بیانات آئے تھے کہ مقتول کا تو ذہنی جھکاؤ حکومتی پارٹی ہی کی طرف تھا لیکن وہ اس کے اظہار کے لئے مناسب وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر اسے حکومتی پارٹی نے قتل نہیں کرایا تھا تب بھی ذمے داری اسی پر آتی تھی۔ یہ اس حکومت کی نااہلی تھی کہ ایک ایسے ابھرتے ہوئے باصلاحیت نوجوان کو اس پُراسرار اور بہیمانہ انداز میں قتل کردیا گیا تھا۔ بعض لوگوں کا شک اس پارٹی پر جارہا تھا جس سے وہ ماضی میں علیحدہ ہوا تھا۔ حکومتی حلقوں کا رویہ سخت معذرت خواہانہ تھا۔ شاہد شوکت کے قتل کی تحقیقات کے لئے ایک خصوصی ٹریبونل بھی تشکیل دیا گیا تھا۔ چند گرفتاریاں بھی عمل میں آئی تھیں لیکن نتیجہ کچھ نہیں نکلا تھا۔

پھر وہی ہوا تھا جو ہمارے ہاں اکثر ہوتا ہے۔ بڑے بڑے واقعات پر رفتہ رفتہ وقت کی دُھول جم جاتی ہے۔ اس پر بھی جم گئی۔ لوگ اسے بھی جلد ہی بھول گئے۔ ہنگامے ٹھنڈے ہوگئے۔ زندگی اسی طرح رواں دواں رہی۔ گلشن کا کاروبار چلتا رہا۔ ہمارے ہاں اکثر کہا جاتا ہے کہ فلاں کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پُر نہیں ہوسکے گا۔ معلوم نہیں خلا واقعی پیدا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ اور اگر پیدا ہوتا ہے تو وہ یقیناً کسی نہ کسی طرح پُر ہوجاتا ہے جبھی تو رفتہ رفتہ سب کچھ معمول پر آجاتا ہے۔ دنیا شاید ایک سمندر ہے۔ جب اس میں ہلچل مچتی ہے تو لگتا ہے سب کچھ اس میں بہہ جائے گا لیکن رفتہ رفتہ یہ عفریت پُرسکون ہوجاتا ہے۔ سہمے ہوئے سفینے کونے کھدروں سے نکل کر اپنی منزلوں کی طرف رواں ہوجاتے ہیں۔

چند ماہ میں ہی لوگ اس واقعے کو تقریباً بھول گئے تھے لیکن اب یہ کیسٹ مجھے بھجوادی گئی تھی۔ وہ بھی اے ٹی کے ہاتھ' جو پہلے ہی میرے لئے ایک معما بنا ہوا تھا۔ میرے لئے پریشان کن سوال یہ تھا کہ یہ کیسٹ مجھے کیوں بھیجی گئی تھی؟ میرا تو سیاست سے

کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاہد شوکت سے میری دور کی بھی شناسائی نہیں تھی۔ مجھے اس کی سیاست' اس کے نظریات سے بھی کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے نہ تو اس سے کوئی ہمدردی رہی تھی اور نہ ہی پرخاش۔ البتہ یہ کیسٹ دیکھنے کے بعد مجھے انسانی بنیادوں پر اس سے ضرور ہمدردی محسوس ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ جو کچھ بھی کیا گیا وہ کسی بھی اعتبار سے قابلِ معافی نہیں تھا۔ خواہ اس کا جواز کچھ بھی رہا ہو۔ اسے سیدھے سادے انداز میں گولی ماردی گئی ہوتی تو شاید یہ میری نظر میں ایسا غیر معمولی واقعہ نہ ہوتا۔ ہر درجے کے انسانوں کی جانیں اس دنیا میں آئے دن کسی نہ کسی رقابت کی بھینٹ چڑھتی ہی رہتی ہیں۔

میں نے اس سلسلے میں جتنا بھی سوچا' الجھن بڑھتی ہی گئی۔ تھکا ہوا ذہن مزید تھکتا چلا گیا۔ آخر کار میں نے سوالوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور سونے کے لئے بیڈ روم میں چلا گیا۔ ریڈ ذات کی طرف سے اس قسم کی کوئی حرکت ہوتی تھی تو عموماً اس کے فوراً بعد میرا ردِ عمل جاننے کے لئے ایڈم عرف ایڈی کا فون آجاتا تھا اور وہ مجھے کریدنے کے لئے مکالمے بازی شروع کردیتا تھا۔ لیکن آج اس کا بھی فون نہیں آیا۔

عین اس وقت جب نیند کی دیوی نے میری طرف ایک آدھ قدم ہی بڑھایا تھا' فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ایڈم عرف ایڈی کی عمر شاید بہت لمبی تھی۔ شیطان کی عمر لمبی ہی ہوتی ہے۔ اور ایڈم کسی شیطان سے کم نہیں تھا۔ مگر میں نے ریسیور اٹھایا تو رگ و پے میں ایک اور ہی طرح کی سنسنی پھیل گئی۔ دوسری طرف راحیلہ تھی۔

"میں بہت دیر سے سوچ رہی تھی ۔۔۔" اس کے لہجے میں شرمیلا پن بھی تھا اور ہچکچاہٹ بھی "کہ اب تم لاہور پہنچ گئے ہوگے ۔۔۔ اب تم نے شاور لیا ہوگا ۔۔۔ اب کھانا کھایا ہوگا ۔۔۔ اب سونے کے لئے لیٹ گئے ہوگے۔ ہر لمحے دل چاہتا رہا کہ تمہیں فون کروں لیکن ایک عجیب سی ہچکچاہٹ مانع رہی کہ کہیں تم جاتے ہی سو نہ گئے ہو۔ تم تھکے ہوئے ہوگے۔ کہیں میں تمہارے لئے مزید بے آرامی کا سبب نہ بنوں۔"

"اوہو ۔۔۔ مجھے تو اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ تم اتنی باتکلف قسم کی چیز بن گئی ہو" میں نے خوش دلی سے چہکنے کی کوشش کی "تم تو کہا کرتی تھیں کہ محبت میں ایک دوسرے کو قبر سے بھی کھینچ کر نکال لینا چاہئے۔"

"میں تو نہ جانے کیا کچھ کہا کرتی تھی۔ بکواس کرتی تھی میں" وہ ہولے سے ہنسی "ویسے تمہاری بے آرامی کے علاوہ اپنی اوقات کا بھی خیال تھا نا۔ ایک ملازمت پیشہ لڑکی کو ڈائرکٹ ڈائلنگ پر ٹرنک کال کرتے ہوئے ذرا سوچنا پڑتا ہے نا۔ خصوصاً جب کہ یہ بھی اندیشہ ہو کہ لائن ملنے کے بعد فون بند کرنے کو دل نہیں چاہے گا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی خیال آجاتا ہے کہ جب بل آئے گا تو آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگیں گے۔"

"چہ ۔۔۔ چہ ۔۔۔" میں نے مصنوعی تاسف کا اظہار کیا "محبت اور مہنگائی کی جنگ میں ہمیشہ مہنگائی جیت جاتی ہے۔ اسی لئے میں نے تمہیں پارٹنرشپ میں اپنی ایجنسی کھولنے کا مشورہ دیا۔ حالات کچھ تو بہتر ہوجائیں گے۔ محبت میں انسان کو دن میں کم از کم دو چار ٹرنک کالز افورڈ کرنے کے قابل تو ہونا چاہئے۔"

"اور جو دو چار ٹرنک کالز افورڈ نہ کرسکے اسے محبت کرنے کا حق نہیں؟"

"حق تو اسے بھی حاصل ہے لیکن اسے چاہئے کہ للچائی ہوئی نظروں سے بار بار ٹیلیفون کی طرف نہ دیکھے بلکہ صرف ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں بھرنے پر اکتفا کرے۔ غم ناک قسم کے افسانے پڑھے۔ دردناک قسم کے اشعار جمع کرے۔ سلائی کڑھائی کرے۔ تکئے پر بڑے بڑے پھول کاڑھے جن کے درمیان "ڈونٹ فرگیٹ می" لکھا ہو" میں نے مشورہ دیا۔

"اچھا اب زیادہ مت چہکو اور سو جاؤ۔ تمہاری آواز میں تھکن بول رہی ہے۔ میں نے خواہ مخواہ ہی تمہیں ڈسٹرب کیا" وہ بولی۔

"اگر دن میں دو تین مرتبہ اسی طرح باقاعدگی سے ڈسٹرب کرتی رہا کرو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی" میں نے درخواست کی۔

"گھر کا سارا ساز و سامان بک جائے گا فون کا بل ادا کرنے میں۔"

"کوئی بات نہیں۔ اس کے بعد میرے ہوٹل کے کسی وی آئی پی سوئٹ میں منتقل ہوجانا۔ وہاں ہر چیز نئی ملے گی اور مفت ملے گی۔ ٹیلیفون بھی خواہ دن بھر کرتی رہنا۔"

"جی نہیں۔ اپنے پاس ہی رکھو اپنا ہوٹل۔ ہم اپنے کرائے کے فلیٹ میں ہی اچھے ہیں" وہ فوراً ہی بولی "اچھا خدا حافظ۔"

"ارے سنو تو سہی ۔۔۔" میں نے تیزی سے کہا "تھوڑی دیر اور باتیں کرو۔ میرا دل بہت اداس ہے۔"

"اسی لئے اتنا چہک رہے ہو؟"

"بعض لوگ اداسی کو دبانے کے لئے بہت زیادہ بولتے ہیں"

"بعض لوگ بہت زیادہ بولنے کی وجہ سے اداس ہوجاتے ہیں" اس نے کہا۔

"یعنی یہ بات طے ہے کہ بیشتر لوگ بہت زیادہ ہی بولتے ہیں۔ کسی بھی بہانے۔"

"ہاں۔ اور میرا مشورہ ہے کہ تم بھی زیادہ بولا کرو۔ کم از کم میرے ساتھ۔"

"جی نہیں۔ میرے پاس کھوپڑی فالتو نہیں ہے۔ میں فون بند کررہی ہوں۔ تم بھی واقعی اب سو جاؤ۔"

"بولنے کے لئے کھوپڑی کی ضرورت کہاں پڑتی ہے؟ بس زبان ہلاتے رہنا چاہئے۔" میں نے مشورہ دیا۔

"ہر ایک کو اپنے طور طریقے مت بتایا کرو" وہ حزنیہ سی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "اچھا خدا حافظ۔ اگر تمہیں توفیق ہو تو کبھی کبھار

خود بھی فون کرلیا کرو" اس نے میری مزید کوئی بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔ میں نے فوراً ہی اس کا نمبر ڈائل کرنے کا ارادہ کیا مگر پھر ملتوی کر دیا اور دوبارہ سونے کی کوشش کرنے لگا۔

میرے دل میں واقعی اداسی اور خوشی کی گنگا جمنا گلے مل رہی تھیں۔ خوشی راحیلہ کے مل جانے کی تھی۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی کے کسی موڑ پر وہ یوں اچانک دوبارہ سامنے آجائے گی اور اس بار اس کے دل کی کائنات ہی بدلی ہوئی ہوگی۔ کئی بار میرے دل کے کسی اندھیرے گوشے سے شک کے سانپ نے سر ابھارا کہ کہیں اس بار بھی وہ کسی نئے زاویے سے کوئی کھیل تو نہیں کررہی؟ جذبات سے کھیلنے کا کوئی نیا ہنر تو نہیں آزمارہی؟ لیکن دل سے ہی اس کا جواب نفی میں ملا۔ شاید حقیقت یہی تھی یا پھر محبت بے چاری ہمیشہ ہی خوش گمان رہتی ہے۔

اداسی میرے دل میں کیسٹ دیکھنے کی وجہ سے جاگزیں تھی۔ اس کے بارے میں الجھن ذہن میں اٹک گئی تھی۔ کیا میں اسے پولیس کے سپرد کردوں اور بتادوں کہ وہ کس شخص کے ہاتھ میرے گھر تک پہنچی تھی؟ اس ٹریبونل کا بھی کچھ پتا نہیں تھا جو اس سلسلے میں قائم کیا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ ابھی تک قائم تھا یا ختم کردیا گیا تھا۔ کیا میں اس کے بارے میں معلومات کروں؟

لیکن محض کیسٹ کسی کے حوالے کرنے کا کیا فائدہ تھا؟ اپنی ایجنسیوں کی کارکردگی کا مجھے اچھی طرح اندازہ تھا۔ یہ ایک حساس معاملہ تھا۔ کیسٹ کی بات منظرِ عام پر آجاتی تو ان پر نئے سرے سے طوفان اٹھ سکتا تھا اور ان سے اگر کچھ نہ ہوپاتا تو ان کے شکوک و شبہات کے سائے میری طرف بھی پھیل سکتے تھے۔ میری اس بات پر بھلا کون یقین کرتا کہ مجھے خود اندازہ نہیں تھا' وہ کیسٹ مجھے کیوں بھیجی گئی تھی؟ ہوسکتا تھا کوئی ایجنسی کوئی نہ کوئی تعلق' کوئی نہ کوئی وجہ دریافت کرنے کی تگ و دو میں لگ جاتی۔ ایسے معاملات میں تو بعض اوقات اونچے پیمانے کی شناسائی اور اثر و رسوخ بھی دھرا رہ جاتا ہے' جن میں عوامی سطح پر کوئی ابال اٹھ جانے کا اندیشہ ہو۔ پریس بھی کبھی کبھی ایسے معاملات کو سلجھانے کے بجائے سنسنی خیزی میں الجھا دیتا ہے۔

آخر کار میں نے خاموش رہنے اور انتظار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد مجھے قرار سا آگیا اور میں اطمینان سے سو گیا۔

دوسرے روز میں دفتر میں شام ڈھلے تک مصروف رہا۔ جب اٹھنے کا ارادہ کررہا تھا تب ستارہ کا فون آگیا۔ میری آواز سننے کے بعد نہایت سنجیدگی سے بولی "وہ جو ایک بہت بڑے سیٹھ صاحب ہیں نا ۔۔۔ محمد افضل چوہدری صاحب ۔۔۔ مجھے ان سے بات کرنا ہے۔ سنا ہے آج کل وہ بہت مصروف ہیں۔ کسی سے سیدھے منہ بات کرنے کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہیں ہے۔ اگر آپ چند سیکنڈز کے لئے ان سے بات کرادیں تو آپ کا بہت بڑا احسان ہوگا۔ یہ بندی زندگی بھر آپ کی کنیز رہے گی۔ کیا آپ اس گناہ گار پر یہ احسان فرما سکتے ہیں؟"

کمبخت واقعی اچھی اداکارہ ہوگئی تھی۔ لہجے کو برتنے کا بڑا سلیقہ آگیا تھا۔ ایسا زبردست طنز سمولیا تھا لہجے میں کہ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید شرم سے پانی پانی ہوجاتا۔

میں نے آواز بدل کر کہا "اے گناہ گار فریادی! تم نے اب ٹیلیفون پر زنجیرِ عدل ہلا ہی دی ہے تو ہم تمہاری فریاد ضرور ظلِ الٰہی تک پہنچا دیں گے۔ تمہیں ازراہِ نوازش بہت جلد ملاقات کا موقع عطا کیا جائے گا۔ ایسا کرو کہ ڈیڑھ سو سال بعد آجاؤ۔"

"کہاں؟ ظلِ الٰہی کے مزار پر؟" اس نے سکون سے پوچھا۔

"کیا بکتی ہو گناہ گار فریادی!" میں نے بدستور بارُعب لہجے میں کہا "ظلِ الٰہی ہزاروں سال سے زندہ ہیں۔ اور ہر دور میں زندہ رہیں گے۔ آزما کر دیکھ لینا۔"

"دُور فِٹے منہ" یکدم وہ اپنے اصل لہجے میں بولی "اب اپنی اصلی آواز میں بھی بول لو۔ کان ترس گئے ہیں سننے کو۔ تم تو واقعی بہت بڑے آدمی ہوتے جارہے ہو۔ فلم کے سپر اسٹارز سے بھی بڑھتی جارہی ہے تمہاری مصروفیت۔ ہم وہاں تمہاری خاطر تمہارے ہوٹل کے افتتاح میں گئے اور تم اس طرح ملے جیسے سرِراہ کسی ڈاکٹر کو اپنا مریض مل گیا ہو۔ اور مریض بھی ایسا جس نے پچھلی چھ ملاقاتوں کی فیس ادا نہ کی ہو۔ اور پہلی رات تو تم سلام دعا کے بعد ہی غائب ہوگئے تھے۔ میں نے سوچا تھا اس کے بارے میں تو تم سے لاہور چل کر ہی پوچھوں گی۔ کہاں غائب ہوگئے تھے؟ کس سے ملنے چلے گئے تھے؟"

"ہم جیسے بے چارے کس سے ملنے جاسکتے ہیں؟ کسی انکم ٹیکس والے سے' کسی ایکسائز والے سے' کسی وکیل سے' کسی بور قسم کے سیٹھ سے۔ اور بھلا ہمیں کون بلا سکتا ہے؟" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہم کوئی فلمی ہیرو تھوڑا ہی ہیں کہ ایک گرل فرینڈ کو ہوٹل کی لابی میں کھڑی چھوڑ کر دوسری سے ملنے سوئمنگ پول پر چلے جائیں۔ تیسری گھر پر انتظار کررہی ہو اور چوتھی مری یا ایبٹ آباد میں راہ دیکھ رہی ہو۔"

"بس۔ بس' رہنے دو۔ مجھے اندازہ ہوتا جارہا ہے کہ تم فلمی ہیرو سے زیادہ بدمعاش ہو اور تمہاری زیادہ مقامات پر راہ دیکھی جاتی ہے۔ کم از کم میرے سامنے تو بھولے اور معصوم بننے کی کوشش مت کیا کرو" وہ خاصی سنجیدگی سے بولی۔

"اچھا ۔۔۔ میں تمہارے سارے گلے شکوے دور کرنے کے لئے فوری طور پر تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر بیٹھ کر اداس اداس سی باتیں کریں گے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اکٹھے بیٹھ کر اداسی کی باتیں کرنے سے اداسی کم ہوجاتی ہے" میں نے کہا۔

"میں کیا صرف اداسیاں شیئر کرنے کے لئے رہ گئی ہوں؟" وہ گویا برا مناتے ہوئے بولی "میرا مصرف کیا بس یہی رہ گیا ہے کہ

جب دنیا بھر کے مسائل نے ذہن کو بوجھل اور دل کو اداس کیا تو میرے کندھے پر سر رکھ کر اداسیوں کی لوڈ شیڈنگ کرنے آگئے؟ مجھے نہیں چاہئے ایسی دوستی اور ایسی ملاقاتیں۔ اپنے پاس ہی رکھو اپنی اداسیاں۔"

"کس قدر سنگدل ہو گئی ہو تم۔" میں نے آہ بھر کر کہا "لگتا ہے فلک کج رفتار سخت نامہربان ہوتا جا رہا ہے جو تم جیسے دوست بھی آنکھیں پھیرتے جا رہے ہیں۔"

فلک کج رفتار کا تو مجھے پتا نہیں۔ مجھے اس سے تبادلۂ خیال کا موقع نہیں ملا لیکن میں ضرور تم سے آنکھیں' ناک' منہ' سب کچھ پھیر لوں گی" وہ بولی۔

"اس سے پہلے ملزم کو صفائی پیش کرنے کا موقع ملنا چاہئے۔ یہ میری پُر زور اپیل ہے۔ اس وقت تم کہاں سے بول رہی ہو اور کیا کر رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس وقت تو اسٹوڈیو سے بول رہی ہوں۔ اپنے ڈریسنگ روم سے۔ لائٹ چلی گئی ہے۔ شوٹنگ رُکی ہوئی ہے۔ میں اس وقت فقیرنی کے گیٹ اپ میں ہوں۔ پھٹے پرانے کپڑوں میں بیٹھی ہوں۔ کپڑے کچھ زیادہ ہی پھٹے ہوئے ہیں کیوں کہ ان میں میرا ایک ڈانس پکچرائز ہونا ہے۔"

"فقیرنی ڈانس کرے گی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ بڑا ٹھیک ٹھاک قسم کا ڈانس کرے گی۔ تمہیں شاید معلوم ہی ہو کہ ہماری اور پڑوسی ملک کی اکثر فلموں میں یہ سچویشن ضرور ہوتی ہے کہ ولن' ہیرو کو کسی مقام پر قید کر لیتا ہے۔ تب ہیروئن بھیس بدل کر اپنے ساتھیوں کے ہمراہ جاتی ہے۔ ولن کے اڈے پر وہ سب مل کر ڈانس کرتے ہیں۔ گانے کی صورت میں وہ بار بار ولن اور اس کے ساتھیوں کو بتاتے رہتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور کس طرح اس کی ایسی تیسی کرنے آئے ہیں مگر ولن باچھیں پھیلا پھیلا کر جھومتا رہتا ہے۔ اسے اس وقت تک کچھ پتا نہیں چلتا جب تک ہیروئن اور اس کے ساتھی ہیرو کو رہا کرا کے نہیں لے جاتے۔ اس کے بعد ولن منہ سے جھاگ اڑاتا ہے اور ان کے تعاقب میں جاتا ہے۔" ستارہ نے قدرے تفصیل سے بتایا۔

"اوہ مائی گاڈ!" میں نے سہمے سے لہجے میں کہا "کیا یہ ہماری کسی فلم کی سچویشن ہے؟"

"نہیں' نہیں۔ تمہیں اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارے ادارے کی کسی فلم کی سچویشن نہیں ہے" وہ ہنس کر بولی۔ اس کا موڈ خوشگوار ہو چکا تھا "آفاق کم از کم اب اس قسم کی فلموں کے دور سے نکل آیا ہے۔"

"ویسے مجھے اتنا فکرمند ہونے کی بھی ضرورت نہیں" میں نے اطمینان سے سانس لیتے ہوئے کہا "میرا کون سا ان فلموں پر کسی بھی حیثیت سے نام آئے گا۔ میں تو ہمیشہ پس پردہ ہی رہوں گا۔"

"ہاں۔۔۔۔ پس پردہ گلوکار تو ہوتے تھے ہمارے ہاں۔ اب تم جیسے پس پردہ خرکار بھی آنے لگے" وہ مجھے چڑانے کی فکر میں تھی۔

"آج جو دل چاہے کہہ لو۔ آج تمہیں آزادی ہے" میں نے کہا پھر ایک لمحے کے توقف سے کہا "ہاں۔۔۔ تو کب فارغ ہو رہی گھر کب پہنچ رہی ہو؟"

"آج صبح اٹھ کر پتا نہیں کس کا منہ دیکھا تھا۔ آج ہر شوٹنگ میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوئے جا رہی ہے۔ دیر پر دیر ہوئے جا رہی ہے۔ حالاں کہ میں رات کی شوٹنگ بالکل نہیں کرتی۔ اس کے باوجود آج کم از کم دس بجے گھر پہنچوں گی" وہ بولی۔

"میں تمہیں تازہ دم ہونے کے لئے صرف آدھا گھنٹا دوں گا ساڑھے دس بجے میں آن دھمکوں گا" میں نے ڈرانے کے انداز میں کہا۔

"دن تو اچھا نہیں گزرا۔ اب تم چاہتے ہو رات بھی اچھی نہ گزرے" اس نے رو دینے والے لہجے میں کہا۔

"یہ تو میرے آنے پر ہی پتا چلے گا" میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں نے دس بجے تک دوسرے چند کام نمٹائے اور ساڑھے دس بجے ستارہ کے ہاں جا پہنچا۔ میں نے یہ تصدیق کرنے کی زحمت نہیں کی تھی کہ وہ گھر پہنچ چکی ہے یا نہیں۔ حالاں کہ مجھے معلوم تھا کہ شوٹنگوں کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا۔ یہ تو ستارہ کا حوصلہ تھا کہ کام نمٹانے کے لئے رات کی شوٹنگیں نہیں کرتی تھی۔ صاف انکار کر دیتی تھی۔ گو کہ اس وجہ سے اسے فلمیں چھوڑنا پڑتی تھیں مگر وہ اپنا رات کا آرام اور تفریحات نہیں چھوڑتی تھی۔ اس کا کہنا تھا' اگر میں نے راتوں کو بھی کام کر کے مزید کچھ دولت کما بھی لی تو وہ بڑھاپے میں مجھے میری جوانی کی راتیں اور ان راتوں کی کھوئی ہوئی نیند واپس نہیں دلا سکے گی۔

میں اس کے ہاں پہنچا تو وہ ایک خوبصورت گاؤن اور ہلکی سی چپلیں پہنے' نم آلود بال کندھوں پر بکھرائے لان میں بیٹھی تھی۔ بالکل تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ صبح کے اخبار اب رات کو بیٹھی دیکھ رہی تھی۔

وہ بالکل اسی طرح ملی جس طرح برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست ملتے ہیں۔ اس عورت میں یہ بڑی خوبی تھی۔ کم از کم میرے لئے اس کا غصہ مصنوعی ہوتا تھا۔ فون پر خواہ کچھ بھی کہہ لیتی' پیغام خواہ کیسے بھی بھجوا دیتی تھی لیکن جونہی میں اس کے سامنے پہنچتا تھا وہ جیسے سب کچھ بھول جاتی تھی۔ اس کی دوستی میں گرمجوشی تھی وہ مجھے آج تک کہیں نصیب نہیں ہوئی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اپنے ماضی کے برعکس وہ اب جتنی بے غرض نظر آتی تھی اتنا بے غرض بھی میں نے کسی کو نہیں پایا۔ اس کی دنیا کا ہر دروازہ ہر وقت میرے لئے کھلا تھا اور وہ مجھ سے کسی صلے کی طلب گار نہیں تھی۔ اس نے کبھی مجھ سے مجھے

تھا۔ کبھی موہوم سے انداز میں بھی اس خیال کا اظہار نہیں کیا کہ وہ مجھ سے شادی کی امید رکھتی ہے۔ کبھی اس نے یہ جاننا چاہا تھا کہ وہ جو اپنے آپ کو میرے لئے بندۂ بے دام بنائے ہے تو میرے ساتھ اس کا مستقبل کیا ہے۔

وہ تو جیسے اس طرح کی سوچوں میں الجھنا قطعی غیر ضروری سمجھتی تھی۔ اندھی رفاقت پر یقین رکھتی تھی۔ کبھی کبھی میں سوچتا وہ مجھے کسی بندھن میں باندھے بغیر میری زندگی کا اہم حصہ بن چکی تھی۔ شاید میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ کہیں یہی تو اس کی حکمت عملی نہیں تھی؟ جو عورت خود کو کسی مرد کی ذات میں گم کر دیتی ہے اور اس کے عوض کچھ بھی نہ چاہتی وہ گویا مرد کو خرید لیتی ہے۔

اب راحیلہ کے مل جانے کے بعد میں سوچ رہا تھا کہ کیا ستارہ سے میرا بے عنوان تعلق جاری رہ سکے گا؟ کیا مجھے اس کو جاری رکھنا چاہئے؟ ان دونوں ہی سوالوں کے جواب میں میرے دل میں سناٹا چھا گیا۔ ایک بات بہرحال طے تھی کہ اس سے ترک تعلق میرے لئے بہت بڑی آزمائش بن سکتا تھا۔ جو بات ستارہ میں تھی وہ راحیلہ میں نہیں تھی اور جو بات راحیلہ میں تھی وہ ستارہ میں نہیں تھی۔

میں نے اس وقت تک کھانا نہیں کھایا تھا اس لئے کمرے میں جاتے ہی کہا "چلو کہیں باہر چلتے ہیں۔ آج چائنیز کھانا کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔"

"ذرا سکون کی سانس تو لو۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے" وہ ایک کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "ویسے میں نے گھر پر بھی بہت اچھا کھانا پکوایا ہے۔ مجھے ایک بہت اچھا کک مل گیا ہے۔ انگلش' پاکستانی' کانٹی نینٹل اور چائنیز سب طرح کے کھانے بہت اچھے پکا لیتا ہے۔ گریڈ اٹھارہ کے افسر سے زیادہ تنخواہ پر رکھا ہے۔ آج اس کی کارکردگی آزما کر دیکھو۔"

"آج گھر پر کھانے کا موڈ نہیں ہے۔ نہ اپنے گھر' نہ تمہارے گھر۔ یہاں سے کچھ ہی دور کافی معیاری قسم کا ایک نیا چائنیز ریسٹورنٹ کھلا ہے۔ بڑا خوبصورت رومینٹک ماحول ہوتا ہے۔ میزوں پر دھیمی روشنی کی چینی لالٹینیں روشن ہوتی ہیں۔ اور چوں کہ نیا کھلا ہے اس لئے وہاں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں ہوتی۔ مجھے بھی ایک چینی وفد باقاعدہ فرمائش کر کے وہاں لے گیا تھا۔ ہم اس ملک میں' اس علاقے میں رہتے ہیں اور ہمیں یہاں رہنے والے اس ریسٹوران کا علم نہیں تھا۔ چین سے آئے ہوئے لوگوں کو علم تھا۔ آؤ چلیں" میں نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"خدا کے لئے انی! کچھ تو خیال کرو" وہ ہاتھ چھڑاتے ہوئے بولی "میں کیا اسی طرح باتھ گاؤن میں ریسٹورنٹ چل دوں گی؟ اخباروں میں خبریں آ جائیں گی۔ معروف فلمی اداکارہ ستارہ نائٹ گاؤن میں شہر کی ایک ممتاز کاروباری شخصیت کے ساتھ ریستوران پہنچ گئیں۔ خبر میں کہیں نہ کہیں یہ بھی دیا جائے گا کہ موصوفہ غالباً نشے میں تھیں۔"

میں نے ایک کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایک تو تم جیسی عورتیں بھی اسکینڈلوں سے یوں ڈرتی رہتی ہیں جیسے کسی باپردہ' پرہیزگار خاتون کو کسی نیک اور متقی شخص سے اپنی منگنی ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو۔"

"اوہ اچھا۔۔۔۔ تو تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جن کی نظر میں فلمی عورتوں کی گویا کوئی عزت ہی نہیں ہوتی" وہ ایک دم تن کر کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ شاید وہ آستینیں چڑھانے کا ارادہ بھی رکھتی تھی۔

میں نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "جاؤ بابا! تم تیار ہو کر آؤ۔ میری نظر میں تمہاری جتنی عزت ہے اتنی خود اپنی بھی نہیں ہے۔"

اس کی مسکراہٹ واپس آ گئی اور وہ اندر جانے کے لئے مڑ گئی۔ تب میں نے بہ آواز بلند کہا "لیکن میرے چائے ختم کرنے تک تیار ہو کر آ جانا۔ یہ سمجھ کر مت تیار ہونا کہ تم شوٹنگ پر جا رہی ہو۔"

وہ حیرت انگیز طور پر پانچ منٹ میں تیار ہو کر آ گئی۔ موسم خاصا سرد تھا لیکن اس نے نہایت ہلکا پھلکا لباس پہنا تھا البتہ ایک کشمیری شال کندھوں پر ڈال لی تھی۔ ان چند منٹوں میں اس نے برائے نام میک اپ بھی کر لیا تھا اور اس معمولی میک اپ میں وہ فلمی میک اپ سے زیادہ پُرکشش لگ رہی تھی۔

چند منٹ بعد ہم ریستوران جا پہنچے۔ کونے میں مجھے اپنی پسندیدہ میز بھی خالی مل گئی جس کے پاس کینوس کا ایک خوبصورت پارٹیشن بھی کھڑا تھا۔ اس پر رنگا رنگ چینی تصویریں بنی ہوئی تھیں جن کے عقب میں مدھم روشنیاں جھلملاتی تھیں تو وہ بہت بھلی لگتی تھیں۔

ہال میں روشنی بہت کم تھی اس کے باوجود ہمارے داخل ہوتے ہی کئی گردنیں یکے بعد دیگرے ہماری طرف گھوم گئیں۔ ظاہر ہے مجھے کم اور ستارہ کو زیادہ دیکھا جا رہا تھا۔ فلم اسٹار ستارہ کو پہچان لیا گیا تھا۔ ہمیں اس کونے میں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ آٹوگراف لینے کے کئی شوقین جمع ہو گئے۔ ان میں زیادہ تر ٹین ایجرز اور بچے ہی تھے۔ جن کے پاس اس وقت آٹوگراف بک نہیں تھیں وہ کوئی نوٹ' اپنے ابا جان کا وزیٹنگ کارڈ' ٹشو پیپر یا کوئی اور کاغذ بھی پھاڑ کر لئے چلے آ رہے تھے۔

سولہ سترہ سال کی ایک گول مٹول سی لڑکی نے ستارہ سے آٹوگراف لینے کے بعد میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "آپ بھی شاید فلمی ہیرو ہیں لیکن ابھی آپ کی کوئی فلم ریلیز نہیں ہوئی؟"

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا "نہیں چندا! میں فلموں میں کام نہیں کرتا۔ میری کوئی فلم کبھی ریلیز نہیں ہوگی۔"

بچی انگریزی میں بولی "ڈونٹ بی سو شیور۔ یو ہیو اے ہینڈسم فیس۔۔۔ اینڈ آفٹر آل یو آر اے فرینڈ آف میڈم ستارہ۔"

بچی ذہین ہی نہیں' بالغ نظر بھی معلوم ہوتی تھی۔ شاید ہر دور کے بچے' بڑوں سے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ میں اکثر ہی سنتا آیا تھا کہ آج کل کے بچے بڑے تیز ہو گئے ہیں۔ میں نے بچی کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا "میں اس لئے پُریقین ہوں کہ مجھے فلموں میں کام کرنے کا بالکل بھی شوق نہیں ہے۔"

اس کی ذہین آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ میرے جواب سے مطمئن نہیں تھی لیکن بہرحال امریکیوں کے سے انداز میں کندھے اچکا کر واپس چلی گئی۔ چند منٹ بعد مجھے اپنے اس خیال میں ترمیم کرنا پڑی کہ ہر دور کے بچے' بڑوں سے زیادہ تیز ہوتے ہیں۔ اس میں یہ اضافہ ضروری تھا کہ احمق بھی ہر دور میں پائے جاتے ہیں۔

ہمیں ابھی سکون میسر آئے ذرا ہی دیر ہوئی تھی اور ہم سوپ سے لطف اندوز ہونے لگے تھے کہ بیس بائیس سال کا ایک ہونق سا نوجوان اپنی گول گول سی آنکھیں گھماتا ہوا یوں پارٹیشن کے عقب سے نمودار ہوا جیسے کوئی ریڈ انڈین درختوں میں چھپا انتظار کر رہا تھا کہ اس کا شکار ذرا تنہا ہو تو وہ اس پر حملہ کرے۔ شاید وہ ہمارے گرد بھیڑ چھٹنے کا انتظار کر رہا تھا۔

وہ خاصا خوش شکل تھا لیکن چہرے پر حماقت برس رہی تھی۔ کپڑے ریڈی میڈ اور اچھی کمپنی کے تھے لیکن اس کے اصل سائز سے کم از کم ڈیڑھ گنا بڑے تھے اور شاید ایک تو وہ بیٹھتے سے مسلسل اس کے منحنی جسم پر جھول رہے تھے۔ ناک پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک تھی۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی ہیجان سے تمتما رہا تھا اور وہ بار بار تھوک نگل رہا تھا جس کی وجہ سے اس کی مرغے جیسی گردن میں نرخرے کی ہڈی مسلسل اوپر نیچے حرکت کرتی دکھائی دے رہی تھی۔

اس نے ایک نوٹ بک اور پین ستارہ کے سامنے رکھ دیا اور چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی سی آواز میں یکدم ہی بولا۔ "آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں۔۔۔ میں راتوں کو آپ کو خوابوں میں دیکھتا ہوں۔۔۔ آپ میری بہن بن جائیں۔"

ہم دونوں اس کی طرف دیکھتے رہ گئے۔ مجھے ہنسی بھی آتے آتے رہ گئی اور ایک خفیف سے ترحم کا بھی احساس ہوا۔ میں نے ملائمت سے کہا "برادر عزیز! دونوں میں سے ایک چیز چھوڑ دو۔ یا تو انہیں راتوں کو خواب میں دیکھنا چھوڑ دو یا بہن بنانے کا خیال چھوڑ دو۔"

معلوم نہیں اس کی سمجھ میں میری بات آئی یا نہیں لیکن وہ سر کو نہایت سعادت مندی سے سہلاتے ہوئے بولا "جی بہت اچھا۔ میں اپنی سی کوشش کروں گا۔"

پہلے تو میں سمجھا شاید وہ میرے مشورے کے جواب میں ہلکا سا طنز کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن پھر اس کے چہرے پر برستی ہوئی حماقت دیکھ کر مجھے اپنا خیال مسترد کرنا پڑا۔ وہ طنز کرنا تو در کنار شاید طنز کو سمجھنے کی صلاحیت سے بھی محروم تھا۔

ستارہ نے شاید جان چھڑانے کے لئے جلدی سے اس کی نو[ٹ] بک میں آٹوگراف دے دیئے لیکن وہ محض آٹوگراف پر مطمئن [نہیں] ہوا۔ تقریباً گڑگڑاتے ہوئے بولا "کوئی شعر بھی لکھ دیجئے۔"

ستارہ زیر لب کچھ بڑبڑائی تاہم اس نے یہ شعر لکھ دیا۔

ان کے پیچھے نہ چلو ان کی تمنا نہ کرو
سائے پھر سائے ہیں کچھ دیر میں ڈھل جائیں گے

شعر پڑھ کر نوجوان تڑپ اور پھڑک اٹھا۔ ہم چاہ رہے تھے وہ جلدی واپس چلا جائے لیکن وہ ابھی ہماری جان چھوڑنے کے [موڈ] میں نہیں تھا۔ اسے تڑپنے اور پھڑکنے سے فرصت ملی تو میری طرف متوجہ ہو گیا۔ ناک پر عینک درست کرتے ہوئے وہ ایک دم اچھل پڑا "ارے۔۔۔ میں نے تو اب آپ کو پہچانا۔ آپ تو افضل چوہدری صاحب ہیں۔ آپ تو بہت بڑے تاجر اور صنعتکار ہیں۔۔۔ میری خوش قسمتی ہے کہ یہاں ایک ہی جگہ پر دو اتنی بڑی بڑی شخصیات سے ملاقات ہو گئی۔"

"مجھے کیسے جانتے ہو تم؟" میں نے اسے گھورا۔

وہ اپنے استخوانی ہاتھ ملتے ہوئے گڑبڑا کر بولا "آپ میرے۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کے بارے میں میرے ابا نے مجھے [بتایا] تھا۔ ہمارا بھی ایک چھوٹا موٹا کارخانہ ہے۔ پلاسٹک کے پائپ اور ربڑ کے چپل بنانے کا۔۔۔ کارخانے تو اصل میں چار ہیں لیکن چار حصے ہوئے ہیں۔ پچھلے دنوں صنعت کاروں کی ایک میٹنگ اور ڈنر تھا۔ اس میں آپ بھی آئے ہوئے تھے۔ بہت بھیڑ تھی وہاں۔ ابا نے دور سے اشارہ کر کے آپ کے بارے میں بتایا تھا۔ تعریفیں کر رہے تھے آپ کی۔ وہ بھی آپ سے ملنا چاہ رہے تھے سوچ رہے تھے تعارف وغیرہ ہو جائے لیکن کسی نے ہمیں آپ کے نزدیک ہی نہیں آنے دیا۔"

"کیا انہیں کوئی کام تھا مجھ سے؟" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ انہیں تو کوئی کام نہیں تھا۔ بس ویسے ہی۔" اس نے دانت نکالے' پھر قدرے شرمیلے لہجے میں بولا "لیکن مجھے آپ سے کام ہے۔ بہت ضروری مشورہ کرنا ہے۔ کیسی خوش قسمتی کی بات ہے کہ آپ سے یہاں ملاقات ہو گئی۔"

"ہاں۔ میری شامت نے دعوت دی تھی جو میں یہاں چلا آیا۔ آئندہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ پھر ستارہ کی طرف دیکھتے ہوئے اضافہ کیا "بلکہ ان جیسی خاتون کے ساتھ تو بالکل ہی کہیں باہر نہیں نکلوں گا۔"

ستارہ ہونٹ دانتوں میں دبائے مسکراہٹ ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ اب میری حالت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ نوجوان نے گویا میری بات سنی ہی نہیں۔ وہ ایک کرسی

[...]ے کی فکر میں تھا۔ میں نے اسے کرسی کی طرف ہاتھ بڑھاتے [دیکھ]ا تو جلدی سے اس کے پشتے پر اس طرح بازو رکھ دیا کہ اسے [کھی]نچنا اس کے بس کی بات نہ رہی۔ دوسری کرسی پر ستارہ نے اپنا [ہینڈ]بیگ رکھ دیا۔

نوجوان نے اس پر بھی ہمت نہیں ہاری۔ کھڑے کھڑے ہی [...] ٹیڑھا میڑھا سا ہوتے ہوئے بولا "مجھے اپنے ابا کے بارے میں [مشو]رہ کرنا تھا۔۔۔"

"کیا وہ تمہارے ابا بن کر پچھتا رہے ہیں؟" میں نے ملائمت [سے] پوچھا۔ حقیقت یہ تھی کہ مجھے اس نوجوان پر اب غصہ آنے لگا [تھا] لیکن مسئلہ یہ ہے کہ پبلک مقامات پر انسان اس قسم کے چغدوں [کی] پٹائی بھی نہیں لگا سکتا۔ خصوصاً جب کہ وہ ایک مشہور اداکارہ کے [س]اتھ ہو۔ اس نے ستارہ سے میری ملاقات کا لطف غارت کر دیا [تھ]ا۔

"نہیں۔ چوہدری صاحب! یہ بات نہیں ہے" وہ خوف زدہ سی [نظر]وں سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا "بات دراصل یہ ہے کہ [میر]ے ابا جی جب میری طرح نوجوان تھے تو ربر کی چیزیں بنانے والی [ا]یک چھوٹی سی فیکٹری میں کام کرتے تھے۔ امی بتاتی ہیں کہ وہ شروع [س]ے ہی بہت کنجوس تھے۔ پائی پائی جوڑ کر کسی طرح چھوٹا موٹا کام [شر]وع کر کے رفتہ رفتہ کارخانے دار بن گئے لیکن خوشحالی آنے کے [بعد] بھی ہمیشہ ہمارے گھر میں پیسے پیسے پر لڑائی ہوتی رہی ہے۔ اب تو [ال]لہ کے فضل سے ہمارا شمار ٹھیک ٹھاک لوگوں میں ہے لیکن اب [ا]ن کی کنجوسی پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ ہم صرف دو بھائی ہیں۔ دوسرا [مجھ س]ے بھی چھوٹا ہے۔ ہم نے ان اسکولوں میں پڑھا ہے جن میں بچے ٹاٹ پر بیٹھتے ہیں۔ اب بھی ابا سے دس روپے مانگ لیں تو [ا]ونے سے پٹائی ہوتی ہے۔ بات بات پر وہ چیخنے لگتے ہیں' اوئے کھوتے دے پُترو! میں نے دن رات خون پسینہ ایک کر کے اس لئے [یہ رو]پیہ نہیں کمایا کہ تم لٹاتے پھرو۔ بڑے عذاب میں ہے زندگی ہماری۔۔۔" اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں باقاعدہ آنسو آ گئے۔ وہ چشمہ اتار کر آستین سے آنکھیں پونچھنے لگا۔

ایک لمحے کے لئے تو مجھے شک گزرا کہ وہ کسی قسم کا ڈراما تو نہیں کر رہا؟ کہیں وہ کسی خاص مقصد کے تحت تو ہمارے سر پر سوار نہیں ہو رہا؟ لیکن اس کی صورت دیکھتے ہوئے ایک بار پھر مجھے اپنا خیال مسترد کرنا پڑا۔ وہ کسی بھی مکاری اور منصوبہ سازی کا اہل ہی نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اپنے باپ کے بارے میں جو کچھ بتا رہا تھا وہ کوئی بعید از امکان باتیں نہیں تھیں۔ ایسے کردار کہیں نہ کہیں دیکھنے میں آتے ہیں۔ حد سے زیادہ کنجوسی بھی ایک نفسیاتی بیماری ہے اور تقریباً لاعلاج ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے کنبے پر اس کے عجیب عجیب اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس لڑکے کے ذہنی طور پر کچھ پسماندہ سا نظر آنے کی وجہ بھی اس کے باپ کا وہی رویہ رہا ہو جو وہ بچپن سے دیکھتا چلا آ رہا تھا' سہتا چلا آ رہا تھا اور باپ کو شاید یہ دیکھنے کی فرصت ہی نہ ملی ہو کہ اس کا بیٹا کس ذہنی حالت کے ساتھ پرورش پا رہا ہے۔ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کی لہر ابھر آئی۔ ستارہ کے چہرے سے بھی تمسخر کے آثار غائب ہو گئے۔ ساتھ ہی ہمارا سوپ پینے کا لطف بھی غارت ہو گیا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" میں نے اب طنز کی ملاوٹ کے بغیر حقیقتاً ملائمت سے پوچھا۔

"وسیم احمد" وہ ناک پونچھتے ہوئے بولا۔

"وسیم میاں! جب تمہارا باپ اتنا کنجوس ہے اور پیسوں کے لئے تمہارے گھر میں اتنی جوتم پیزار ہوتی ہے تو تم اس ریستوران میں کیسے نظر آ رہے ہو؟ یہ کوئی عام چائنیز ریستوران بھی نہیں ہے۔ یہ تو ان کی نسبت بہت مہنگا ہے۔ جب کہ تمہارا باپ تو تمہیں کسی عام چائنیز میں بھی دیکھ لے تو شاید وہیں سے جوتے مارتا ہوا لے جائے کہ تم نے پیسے ضرور چرائے ہوں گے" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کی بات بالکل صحیح ہے" وہ گویا میرے اندازے پر خوش ہوتے ہوئے بولا "ہم تو زیادہ سے زیادہ کسی تھڑے پر بیٹھ کر چائے پانی کا شوق پورا کر سکتے ہیں۔ لیکن دراصل امی ہماری مدد کرتی ہیں۔ انہیں ابا سے روپے اینٹھنے کے طریقے آ گئے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح کچھ مال کھینچ ہی لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ ابا جو نقد رقم گھر میں چھپا کر رکھتے ہیں' امی اس میں سے بھی کسی نہ کسی طرح کچھ پار کر لیتی ہیں اور ہم دونوں بھائیوں کو دیتی رہتی ہیں۔ انہیں معلوم ہے کہ دوسرے خوشحال گھرانوں کے بچوں کی طرح ہمارا بھی اچھی جگہوں پر جانے' اٹھنے بیٹھنے اور اچھی چیزیں استعمال کرنے کو جی چاہتا ہے۔ انہی کی مہربانی سے ہمارے پاس اکثر تھوڑی بہت رقم موجود رہتی ہے" اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص کی بڑی سی جیب سے چند نوٹ نکال کر مجھے دکھائے۔ ستارہ مسکرا دی۔

پھر وہ اپنا وزن ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر منتقل کرتے ہوئے بولا "امی ہی کی وجہ سے میرے پاس ایک پرانی سی فوکسی موجود ہے ورنہ ابا تو کہتے ہیں کسی کباڑی سے موٹر سائیکل کا ڈھانچا خرید لو اور بلال گنج سے پرزے خرید کر اس میں لگا لو۔ ساتھ ہی وہ اپنا زمانہ یاد دلاتے ہیں جب ان کے پاس سائیکل بھی نہیں تھی۔ انہوں نے مجھے اپنے ہی کارخانے میں نائٹ سپروائزر کے طور پر ملازم رکھا ہوا ہے۔ آٹھ سو روپے تنخواہ دیتے ہیں جس سے میں کالج کی فیس دیتا ہوں اور پیٹرول کا خرچ پورا کرتا ہوں۔ دن میں کالج جاتا ہوں۔ شام کو سوتا ہوں۔ رات کو ڈیوٹی دیتا ہوں۔ ابا کہتے ہیں میں اس طرح محنت کروں گا' تنخواہ پر کام کروں گا تو مجھے لڑکپن سے ہی پیسہ کمانے کا سلیقہ آئے گا اور پیسے سے محبت پیدا ہو گی۔ محنت کی عادت بھی پڑے گی۔"

"بہت روشن خیالات ہیں ان کے" میں نے کہا "لیکن اس سلسلے میں' میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ تمہارا اور تمہارے باپ کا آپس

کا مسئلہ ہے۔"

"آپ انہیں اپنے طور پر کچھ سمجھائیں۔ میرا نام مت لیجئے گا ۔۔۔ کہ میں آپ سے ملا تھا ۔۔۔ یا میں نے اباجی کی شکایتیں کی تھیں۔ بس کسی بہانے سے ان کے کان میں یہ بات ڈالیں کہ وہ کنجوسی چھوڑ دیں اور اولاد کے ساتھ اچھا سلوک کیا کریں۔"

"وہ یہ تو پوچھیں گے کہ مجھے یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں۔"

"آپ کوئی بہانہ بنا دیجئے گا نا ۔۔۔ آپ جیسے بڑے لوگ تو بہت عقل مند ہوتے ہیں" وہ گول گول آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ میں تو بالکل بھی عقل مند نہیں ہوں" میں نے نفی میں سر ہلایا "پھر بالفرض میں نے کوئی بہانہ بنا بھی لیا تو وہ کہیں گے، مان نہ مان میں تیرا مہمان، بھئی تم کون ہو ہمارے گھریلو معاملات میں دخل دینے والے؟ تم کیوں اپنے عظیم ابا کے ہاتھوں اپنی طرح میری بھی بے عزتی کرانا چاہتے ہو؟"

"نہیں جی ۔۔۔ وہ آپ کی بے عزتی کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے" وہ بڑے وثوق سے بولا "بڑے لوگوں کی تو وہ بڑی عزت کرتے ہیں۔ بہت ڈرتے ہیں ان سے۔ اس روز ڈنر میں ان کی آپ کے قریب جانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ دور دور سے ہی کہے جا رہے تھے، بہت بڑے آدمی ہیں ۔۔۔ بہت بڑے آدمی ہیں۔ وہ تو فون پر بھی آپ کا نام سنتے ہی اٹھ کر کھڑے ہو جائیں گے۔"

"اچھا ۔۔۔ میں ان سے بات کروں گا۔ تم اپنا کارڈ مجھے دے جاؤ" میں نے بادل ناخواستہ کہا۔

"کارڈ کہاں ہے جی میرے پاس۔ اباجی ایسی فضول خرچیاں کہاں برداشت کر سکتے ہیں۔ میں آپ کو کاغذ پر اباجی کا فون نمبر لکھ دیتا ہوں" اس نے کانپتے ہاتھوں سے اپنی ڈائری سے ایک ورق پھاڑ کر اس پر فون نمبر لکھ کر میرے سامنے رکھ دیا۔ اس کا دل رکھنے کے لئے میں نے اسے تہ کر کے ایش ٹرے کے نیچے اس کا ایک کونا دبا دیا۔

وہ گویا طمانیت کی گہری سانس لے کر بولا "چلیں کچھ امید تو پیدا ہوئی۔ واقعی بڑے لوگ دل کے بھی بڑے ہوتے ہیں۔ میں اپنا یہ مسئلہ لے کر کئی لوگوں کے پاس گیا جو ابا سے زیادہ بڑے کارخانے دار اور زیادہ دولت مند لوگ ہیں۔ جن سے ابا مرعوب ہو سکتے تھے۔ مگر کسی نے میری بات ہی نہیں سنی۔ ہر ایک نے مجھے ہنس کر ٹال دیا۔ آپ پہلے آدمی ہیں جس نے توجہ سے میری بات سنی ہے۔"

پھر وہ طمانیت کی اس سے بھی لمبی سانس لے کر بولا "یہ تو تھا میرا پرانا اور لمبا مسئلہ۔ اب آپ کو اپنا نیا اور ذرا چھوٹا مسئلہ بتاتا ہوں ۔۔۔"

"اف میرے خدا ۔۔۔! ابھی دوسرا مسئلہ بھی باقی ہے۔" بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور بات گویا اب میری برداشت سے باہر ہو گئی۔ میں نے غیر ارادی سے انداز میں اس کی سوکھی سی کلائی پکڑ

لی۔ اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ گول گول سی آ[نکھیں] پھیل کر بالکل ہی گول ہو گئیں۔ چہرے پر اذیت کے کچھ ایسے [آثار] ابھر آئے جیسے اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹنے کے قریب ہو اور کو[ئی] نہیں تھا کہ ٹوٹ ہی جاتی۔ میں نے دبے دبے غصے کے تحت اس [کی] کلائی کچھ زیادہ ہی زور سے پکڑ لی تھی۔

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال [کر] اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ رکھ لو۔ پھر کسی وقت اپا[ئنٹمنٹ] لے کر میرے پاس آنا۔ میں اطمینان سے تمہارا دوسرا، تیسرا، [چوتھا] حتیٰ کہ آخری مسئلہ بھی سنوں گا اور تمہاری کچھ مدد کرنے کی کوشش کروں گا۔"

"بہت بہتر جی" وہ کارڈ لے کر کلائی سہلاتے ہوئے بولا "[اگر] آپ سن لیتے تو بڑی مہربانی ہوتی۔ مختصر سی بات ہے ۔۔۔"

میں نے ایک بار پھر اس کی کلائی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ و[ہ] کر پیچھے ہٹ گیا اور جلدی سے بولا "ٹھیک ہے ۔۔۔ ٹھیک ہے۔ پھر کسی وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔"

"اگر کارخانے میں تمہاری رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے تو تم[ہیں] اس وقت کس نے کھلا چھوڑ دیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ ۔۔۔ آج میرا ڈے آف ۔۔۔ میرا مطلب ہے م[یرا] نائٹ آف ہے۔ آج میں عیاشی پر نکلا ہوا ہوں" اس نے مسکرا[نے] کی کوشش کی۔

"دوسروں کی تفریح کا بیڑا غرق کرنا بھی شاید تمہاری عیاشی [میں] شامل ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"جی نہیں ۔۔۔ جی نہیں۔ آپ شاید برا منا گئے" وہ گڑبڑا گیا [اور] جلدی سے الٹے قدموں کھسکتے ہوئے بولا "میں پھر کبھی آپ [سے] وقت لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا" اس کے ا[لٹے] قدموں چلنے کی کوشش میں پارٹیشن گرتے گرتے بچا۔ اس نے ا[سے] سنبھالا تو خود گرتے گرتے بچا۔ آخر کار وہ اپنی میز کی طرف چلا [گیا] اور ہماری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے ستارہ کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے بے آواز طریقے [سے] ہنس رہی تھی۔ ہنسی اس کی آنکھوں سے بھی چھلکی پڑ رہی تھی۔

"تمہیں ہنسی آ رہی ہے؟" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا۔

"میری تو زندگی ہی عجیب و غریب کرداروں میں گزر رہی ہے" [وہ] چہرے سے ہاتھ ہٹاتے ہوئے بولی "اب بھی کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی عجیب کردار ٹکراتا ہی رہتا ہے۔ اب میں نے ان سے محظوظ ہو[نا] سیکھ لیا ہے۔ ویسے اس بے چارے پر تو مجھے ترس آ رہا تھا۔ بعض لوگ کچھ تو قدرتی طور پر ہی قابل رحم ہوتے ہیں اور کچھ انہیں ماحول، حالات یا ماں باپ کا نفسیاتی رویہ مزید قابلِ رحم بنا [دیتا] ہے۔"

"ترس تو مجھے بھی آ رہا تھا" میں نے تسلیم کیا "لیکن بتاؤ ا[ب] ہم جیسے غیر متعلق انسان اس قسم کے بے سروپا مسائل میں، ایسے

[کیا] مدد کر سکتے ہیں۔"

[وہ] طویل سانس لے کر سر جھکا کر رہ گئی۔ سوپ ٹھنڈا ہو [رہا تھا۔] ہم نے دوسرا منگایا۔ پھر اپنی باتوں میں مگن ہو کر ہم نے [کھانے سے] لطف اندوز ہونے کی کوشش کی۔ ستارہ بہت کم کھاتی [تھی۔ وہ] اپنے فگر کی بہت فکر رہنے لگی تھی۔ وہ انڈسٹری میں چند سال بعد ہی دوسری کئی ہیروئنوں کی طرح بھاری بھرکم [نہیں ہونا] چاہتی تھی۔ اسی لئے ابھی سے محتاط ہو کر چل رہی [تھی۔ میں] حیران تھا کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود اسے سب باتوں کا [شعور] کیسے آ گیا تھا۔

[میں] چوں کہ زیادہ یا کم کھانے سے کچھ بگڑتا یا سنورتا نہیں تھا [اس لئے] میں بے فکر ہو کر کھاتا تھا۔ خصوصاً چائنیز کھانے چوں کہ [مجھے پسند] ہوتے تھے اس لئے ان پر تو میں کچھ زیادہ ہی ہاتھ صاف [کرتا تھا]۔ تاہم مجھے عادی بسیار خور نہیں کہا جا سکتا تھا۔ کبھی ایسا [بھی ہوت]ا تھا کہ میں پورے پورے دن کچھ نہیں کھاتا تھا۔ کھانے [کے بعد] چینی قہوے کا دور چلا۔ کچھ دیر پہلے لوگوں کی بھیڑ بھاڑ اور وسیم کی آمد سے جو بدمزگی پیدا ہو گئی تھی وہ رفتہ رفتہ دور

[ہو گئی۔]

[ہ]م جب ریستوران سے نکلے تو کوئی ترنگ والی چیز پئے بغیر ہی ترنگ میں تھے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہم باہر آئے تو [م]ن وسیم دروازے پر موجود تھا۔ شاید ہمارے ہی انتظار میں [سر]دی میں سکڑ رہا تھا۔ وہ ستارہ کی طرف دیکھ کر گڑگڑانے کے [اند]از میں بولا "تو پھر آپ میری محسن بن گئی ہیں نا؟"

"بالکل ۔۔۔ بالکل" ستارہ شال لپیٹتے ہوئے جلدی سے بولی۔

"آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیجئے۔ میں آپ کو فون پر اپنے [حالا]ت سے آگاہ کروں گا" وہ طویل و عریض پارکنگ لاٹ میں [ہمار]ے ساتھ چلتے ہوئے منمنایا۔

"میں ابھی ذرا غریب ہیروئن ہوں۔ ابھی میرے ہاں فون نہیں [ہے]" ستارہ نے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے اپنا ایڈریس ہی بتا دیجئے۔ میں آپ کو پابندی سے [خط] لکھا کروں گا۔"

ستارہ نے اسے ایک اسٹوڈیو کا نام بتاتے ہوئے کہا "اس کی [معر]فت تم مجھے خط لکھ سکتے ہو۔ مجھے فوراً مل جائے گا۔ مکان تو [ک]رائے کا ہے۔ کیا بھروسہ کل بدل لوں۔"

"بہت بہتر" وسیم خوش ہو گیا اور میری طرف دیکھ کر سٹپٹا کر [ج]لدی سے دوسری طرف کو بڑھ گیا۔ ادھر شاید اندھیرے میں کہیں اس کی کار کھڑی تھی۔ میں نے ستارہ کو گاڑی میں بٹھاتے ہی اتنی تیزی سے وہاں سے گاڑی نکالی کہ باؤنڈری کے گیٹ پر کھڑا ہوا چوکیدار بھی اچھل کر ایک طرف کو ہٹ گیا۔ وہ مجھے شاید نشے میں [م]دہوش کوئی نودولتیا سمجھا ہو گا۔

ستارہ بے اختیار ہنستے ہوئے بولی "تم تو اس طرح ڈر کر بھاگ رہے ہو جیسے تمہارے پیچھے کوئی بھوت لگ گیا ہو۔"

"اگر میرے پیچھے بھوت لگا ہوتا تب میں اس طرح نہ بھاگتا" میں نے اس کی غلط فہمی دور کی "وسیم کے روپ میں ہمارے پیچھے بھوت سے بڑی کوئی چیز لگ گئی ہے۔"

وہ ہنستے ہنستے مجھ پر تقریباً ڈھیر ہو گئی اور میں وسیم کو بالکل بھول گیا۔ ستارہ کے گھر پہنچ کر تو میں ستارہ کے سوا دنیا کی ہر چیز کو بھول گیا۔

دو گھنٹے بعد جب میں اس کے ہاں سے نکلا تو رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ اپنے رگ و پے میں اس کے وجود کا نشہ اور اپنے ہر مسامِ جاں میں اس کے سانسوں کی مہک لئے میں اپنے آپ میں مگن چلا جا رہا تھا کہ ایک کشادہ مگر ویران گلی میں مڑتے ہی مجھے اچانک گاڑی روکنی پڑی۔

گلی میں روشنی کم ہی تھی لیکن اگلے موڑ پر دو سائے ایک دوسرے سے الجھتے مجھے آسانی سے نظر آ رہے تھے۔ ایک گیم تھیم مرد تھا اور ایک دوسری سرو قد لڑکی جس کے خدوخال اتنی کم روشنی میں اتنی دور سے بھی بے حد دلکش دکھائی دے رہے تھے۔ ایک گاڑی بھی قریب ہی کھڑی تھی جس کے دونوں اگلے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

میں نے مرد کو لڑکی سے کوئی چوکور سی سیاہ چیز چھینتے دیکھا۔ شاید وہ کوئی بریف کیس تھا۔ لڑکی اسے واپس لینے کے لئے اس سے الجھ رہی تھی۔ مرد نے بے دردی سے اسے گھونسے، تھپڑ اور لاتیں مارنی شروع کر دیں۔ لڑکی خاصی مشاق اور مہارت سے ان سے بچ رہی تھی اور ساتھ ہی وہ بریف کیس مرد سے واپس لینے کی کوشش بھی جاری رکھے ہوئے تھی لیکن اس کوشش کے دوران کچھ گھونسے تھپڑ اور لاتیں اسے پڑ ہی گئیں۔

وہ دہری ہو گئی اور پھر زمین پر گر گئی۔ اس وقت تک میں گاڑی سے اتر کر ان کے پاس پہنچ چکا تھا۔ مرد دوڑ کر گاڑی میں بیٹھنے ہی لگا تھا۔

"خبردار ۔۔۔ ٹھہرو ۔۔۔ ورنہ گولی مار دوں گا" میں نے پستول نکالتے ہوئے للکارا لیکن میں دیکھ نہیں سکا کہ اس کے ہاتھ میں اب ریوالور تھا۔ گاڑی کی طرف لپکتے وقت وہ جیب سے ریوالور نکال چکا تھا اور اس نے فائر کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت میں غیر ارادی طور پر ایک لمحے کے لئے جھک گیا تھا۔ گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ تب میں نے بھی یہ جاننا ضروری نہ سمجھا کہ وہ کون تھا اور معاملہ کیا تھا۔ میں نے بھی عین اس کے سینے پر گولی چلا دی لیکن اس نے حیرت انگیز طور پر گولی کے رخ کا اندازہ کرتے ہوئے بروقت وہ بریف کیس نما چیز اپنے سینے پر رکھ لی۔ اسے ڈھال بنا لیا۔

وہ واقعی بڑی عمدہ ڈھال ثابت ہوئی۔ شاید وہ ٹھوس دھات کی بہت موٹی چادر کا کوئی ڈبا تھا یا شاید دھات کا کوئی ٹھوس ٹکڑا ہی

تھا۔ گولی کے دھات سے ٹکرانے کی واضح آواز میں نے سنی' چنگاریاں اڑیں اور گولی نہ جانے کس سمت کو پھسل گئی۔

اس وقت تک میں گاڑی کے عین قریب پہنچ چکا تھا۔ وہ شخص گاڑی میں بیٹھ رہا تھا۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھینچنے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اسے اب ہلاک یا زخمی کرنے کا ارادہ بدل دیا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ وہ زندہ و صحیح سلامت میرے ہاتھ آجائے لیکن عین اسی لمحے اس نے پوری قوت سے گاڑی کا دروازہ بند کیا۔ میرا ہاتھ دروازے میں آگیا۔

تکلیف سے میری چیخ نکل گئی جو درحقیقت ہلکی سی چیخ تھی جسے میں نے دبا لیا تھا۔ میں نے ہاتھ کھینچا تو دروازہ فوراً ہی بند ہوگیا۔ گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہی تھا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ گاڑی کو جھٹکا لگا تو سڑک کے ٹوٹے ہوئے پتھروں پر میرا پاؤں پھسل گیا۔ اسی وقت گاڑی میرے جسم سے رگڑ کھاتی آگے بڑھ چکی تھی۔ میں گرا تو وہی ہاتھ جو گاڑی کے دروازے میں آیا تھا' گاڑی کے پچھلے چرچراتے ٹائر تلے بھی آگیا۔ پہیہ اس پر سے گزر گیا۔ آج بے چارے اس ہاتھ کی شامت ہی آگئی تھی۔

میں نے آخری کوشش کے طور پر بغیر کسی اندازے کے تین فائر کئے۔ گاڑی کا شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی مگر وہ رکی نہیں' تیزی سے آگے بڑھتی چلی گئی اور موڑ عبور کرگئی۔ موڑ پر اس کے ٹائروں کی رگڑ سے ہوا میں ربڑ جلنے کی بو محسوس ہوئی۔

اسی لمحے ایک سفید کار کو میں نے اسی رفتار سے' اسی انداز میں اس کے پیچھے غائب ہوتے دیکھا اور اطمینان کی سانس لی۔ ٹونی آج اکیلا ہی گاڑی میں میرے پیچھے تھا۔ شبیر شیخ کو میں نے ہی دو تین ضروری کاموں کے سلسلے میں بھیجا ہوا تھا۔ ٹونی اس وقت اس شخص کے تعاقب میں روانہ ہو چکا تھا جو گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ مجھے خود آج اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی۔ میں آج اپنی روایتی پھرتی اور چابک دستی کا مظاہرہ نہیں کرسکا تھا ورنہ وہ شخص نکل کر نہیں جا سکتا تھا۔ شاید یہ سب کچھ اتنی اچانک اور اتنے غیر متوقع طور پر میرے سامنے آگیا تھا کہ میری قوتِ فیصلہ صحیح طور پر درست میں کام نہیں کرسکی تھی۔ یا پھر شاید اس وقت میرے اعصاب اور حواس مکمل طور پر بیدار نہیں تھے۔ ان پر کوئی خفیف سا سرور طاری تھا۔

میرے ہاتھ میں اٹھنے والی درد کی لہریں پورے بازو میں' بلکہ کندھے تک پھیل رہی تھیں۔ سارا سُرور ہوا ہوگیا تھا۔ اور حواس نہ صرف بیدار ہو چکے تھے بلکہ زور و شور سے فریاد کر رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور ہاتھ کو ہلا کر' مٹھی بند کرکے اور کھول کے دیکھا۔ کوئی ہڈی ٹوٹی نہیں تھی۔ خاصی ڈھیٹ ہڈیاں تھیں۔

پسٹل جیب میں رکھ کر میں لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تو یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ وہ اٹھ کر تیز تیز قدموں سے ایک طرف کو چل دی تھی۔ یعنی جس کے لئے ہم نے جان کر[illegible] ڈالا تھا اس نے شکریہ ادا کرنا تو درکنار' مڑ کر یہ دیکھنے کی[illegible] نہیں کی تھی کہ دخل در معقولات کرنے والا احمق زند[illegible] مرگیا۔

میں اس کے پیچھے لپکا تو اس نے باقاعدہ دوڑنا شرو[illegible] اسی طرف کو جا رہی تھی جدھر میں نے اپنی گاڑی[illegible] تھی۔ ایک چھلانگ لگا کر میں نے اس کا بازو پکڑ لیا اور[illegible] طرف گھمایا۔ میرا ابھی سے کچھ کہنے کا ارادہ تھا لیکن ا[illegible] دیکھ کر الفاظ میرے منہ میں رہ گئے۔

اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ پیشانی پر[illegible] ہلکا سا نیل نمودار ہو چکا تھا۔ غالباً گھونسے کی ضرب سے ہڈی پر ابھار سا پیدا ہونے لگا تھا۔ کچھ شاید دوسری چوٹوں[illegible] تھا کہ وہ ہچکیاں سی لے رہی تھی۔ مجھے اس پر ترس آ[illegible] ڈانٹنے کے بجائے میں نے ملائمت سے پوچھا "کون تھا[illegible] تمہارا کیا چھین کر بھاگا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ سسکیاں لینے کے سے انداز م[illegible] اس کی اپنی چیز تھی ۔۔۔ مجھے دینے کے بعد واپس مانگ[illegible] ۔۔۔ میں واپس دینا نہیں چاہتی تھی۔۔۔"

وہ بلاشبہ ایک نہایت خوب صورت لڑکی تھی۔ سمٹ[illegible] میکسی اور بچوں جیسے ہلکے پھلکے رنگ برنگے جوتے پ[illegible] تھی۔ اس کے خدوخال نہایت ہی پُرکشش تھے۔ لگتا تھا[illegible] ہی خاص قسم کی ورزشیں کرتی تھی۔ اس کی آنکھوں م[illegible] گلابی ڈورے تھے لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ آنکھیں[illegible] نظر میں مجھے شناسا محسوس ہوئی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ ا[illegible] میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا لیکن ان آنکھوں کی[illegible] مانوسیت نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"کیا چیز تھی وہ؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانک[illegible] پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں ۔۔۔ کوئی خاص چیز نہیں تھی" وہ نظ[illegible] ہوئے اور اپنا بازو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "[illegible] بڑی مہربانی ۔۔۔ کہ تم میری مدد کو آئے ۔۔۔ لیکن اب تم جا[illegible] خاص بات نہیں تھی۔ ہمارا آپس کا معاملہ تھا۔ وہ کوئی اج[illegible] تھا' میرا جاننے والا تھا۔"

"میں نے پوچھا ہے وہ کیا چیز تھی؟" میں نے سخت لہج[illegible] اور اس کے بازو پر گرفت سخت کردی۔ وہ کراہ اٹھی۔

"کچھ زیورات تھے" وہ جلدی سے بولی "میں کہہ رہی[illegible] چلے جاؤ۔ بس اب بات ختم ہوگئی ہے۔"

بقول اس کے 'بات ختم ہوگئی تھی لیکن وہ خوف زدہ[illegible] سے ادھر اُدھر دیکھے جا رہی تھی۔ اس میں کوئی شک[illegible] زیورات کے لئے عورت سر دھڑ کی بازی لگا سکتی ہے لیکن م[illegible]

[illegible]ا دل نہیں مان رہا تھا کہ اس ڈبے میں زیورات تھے[illegible] کچھ دیر پہلے کشمکش ہو رہی تھی۔ زیورات عموماً اس قسم[illegible] اور آہنی ڈبوں میں نہیں رکھے جاتے۔

[illegible] بحث کا موقع نہیں تھا۔ میں نے گاڑی کی طرف اشارہ[illegible] کہا "آؤ میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دوں۔"

[illegible] نہیں۔ میں چلی جاؤں گی۔ میرا گھر یہاں سے زیادہ[illegible] [illegible]" وہ پہلے سے زیادہ خوف زدہ لہجے میں جلدی سے بولی۔ [illegible] پلیز۔ چلے جاؤ۔۔۔"

[illegible] زدہ بھی تھی۔ اس کے باوجود تنہا گھر جانا چاہتی تھی۔ یہ [illegible] بھی ہو سکتی تھی۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ لڑکی [illegible] سی صورتِ حال میں پھنسی ہوتی ہے۔ کوئی مددگار بن[illegible] ہے لیکن بعد میں وہی بلیک میل کرنا شروع کر دیتا [illegible] انداز سے لڑکی کا خوف بجا بھی ہو سکتا تھا لیکن یکدم مجھے [illegible] کہ بات یہ نہیں تھی۔ لڑکی اپنے لئے نہیں' شاید میرے [illegible] زدہ تھی۔

[illegible] نائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یقین[illegible] کوئی خاص بات نہیں تھی ۔۔۔ ایک نجی سا جھگڑا [illegible] ٹھیک ہو جائے گا ۔۔۔ پلیز تم جاؤ۔"

[illegible] بھینچے پر تلی ہوئی تھی۔ دفعتاً میں نے اس کی آنکھیں [illegible] دیکھیں۔ میں تیزی سے گھوما لیکن مجھے تاخیر ہو چکی [illegible] عقب میں ایک تاریک کوٹھی کے سامنے جھاڑ جھنکاڑ [illegible] پھیلی ہوئی باڑھ تھی۔ یہ باڑھ دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ [illegible] دو تین کوٹھیوں کے سامنے مختصر سا بیرونی لان کسی زمانے [illegible] کا' جسے باڑھ کی چار دیواری میں محفوظ کیا گیا ہوگا لیکن نہ [illegible] سے سب کچھ بے پروائی سے چھوڑ دیا گیا تھا۔ تینوں ہی [illegible] کے سامنے جھاڑ جھنکاڑ سا پھیل گیا تھا۔

[illegible] باڑھ کے عقب سے گویا کسی چیتے نے مجھ پر چھلانگ لگائی [illegible] تھا تو انسان ہی لیکن گولی کی رفتار سے آیا تھا۔ میں صرف [illegible] ہائیں سی ہی دیکھ سکا۔ میں شاید اسے جھکائی دے جاتا [illegible] کے ہاتھ میں کوئی لمبی سی چیز تھی۔ اس کی زد سے میں نہ بچ[illegible] کنپٹی پر ہتھوڑا سا پڑا۔ وہ یقیناً وزنی چیز تھی اور بڑی قوت [illegible] گئی تھی۔

[illegible] آخری آواز جو میں نے سنی وہ شاید کسی قسم کے سائرن کی [illegible] کیا محسوس ہوا کہ شاید وہ میری زندگی کی آخری آواز [illegible] میرا خیال یہی تھا کہ میری کھوپڑی کے پرخچے اڑ چکے [illegible] گرے ہی لمحے میں ہر چیز سے بے نیاز ہوگیا۔

[illegible] آنکھ کچھ اس طرح کھلی جیسے میرے پپوٹے کسی بھاری [illegible] کے بنے ہوئے تھے۔ پہلا احساس یہی ہوا کہ شاید میں اپنی [illegible] تھا۔ جگہ کچھ زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ میرا جسم کچھ پھنسا پھنسا

پھر مفلوج حواس میں دھیرے دھیرے کہیں درد کا احساس بیدار ہوا لیکن یہ بھی صحیح طور پر پتا نہیں چل رہا تھا کہ درد تھا کہاں؟ پھر احساس ہوا کہ قبر خاصی گدیلی سی تھی اور میرا سر بھی کسی گرم و گداز تکیے پر تھا۔ میں نے گرد و پیش کو محسوس کرنے کے لئے ہاتھ ادھر اُدھر گھمایا۔ ارد گرد بیشتر چیزیں نرم و ملائم ہی تھیں۔

محسوسات نہایت آہستگی سے کچھ اس طرح بیدار ہو رہے تھے جیسے کسی انتہائی زنگ آلود مشینری کو تیل دے کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ پھر کسی کی گرم سانس میری پیشانی سے ٹکرائی۔ خوبصورت بالوں کے حلقے میں گھرا ہوا ایک چہرہ مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ ان شناسا آنکھوں میں بے پناہ تشویش تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ قبر نہیں ہو سکتی تھی۔ قبر میں ایسی گداز چیزیں نہیں پائی جا سکتی تھیں۔ اور اس لڑکی کو منکر نکیر بھی قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ وہ تو وہی تھی جس کی وجہ سے مجھ پر آج کی رات بھاری گزری تھی۔

اپنے سر میں ابھرتی ہوئی دھمک اور ارد گرد پھیلے ہوئے ملگجے اندھیرے سے میں کچھ مانوس ہوا تو اندازہ ہوا کہ میں اپنی ہی کار کی عقبی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا اور میرا سر اس لڑکی کی گود میں تھا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" لڑکی کی آواز مجھے دور سے آتی محسوس ہوئی۔

"ہاں" میں نے جواب دیا اور سر کو دائیں بائیں جھٹک کر اپنی دانست میں سر کا بوجھل پن کم کرنے کی کوشش کی لیکن یہ بڑی غلطی ثابت ہوئی۔ میں نے گویا درد کے ہیڈ کوارٹر کو چھیڑ دیا تھا۔ ٹیسیں سر سے پورے جسم میں بکھر گئیں۔ میں نے سانس روک کر یوگا کی تدبیر سے انہیں کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ پھر لڑکی کی مدد سے اٹھ کر بیٹھ گیا تو۔۔۔ میں نے اپنے آپ کو بہتر محسوس کیا۔ سر ٹٹول کر دیکھا تو کنپٹی سے ذرا اوپر ایک گومڑ محسوس ہوا۔ کچھ خون بھی نکلا تھا۔ بالوں میں چپچپاہٹ تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا۔ وہ سر کی چوٹ زیادہ بری ثابت ہوتی ہے جس میں خون نہ نکلے۔

میں نے کار کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ ہم وہاں نہیں تھے جہاں میں بے ہوش ہوا تھا۔ گاڑی وہاں سے کم از کم ایک میل دور ایک سروس روڈ پر درختوں کے عقب میں کھڑی تھی۔

"ہم یہاں کیسے پہنچ گئے؟" میں نے پوچھا۔

"میں لائی ہوں" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔ اس کے چہرے سے ابھی تک خوف کے سائے چھٹے نہیں تھے اور یہ سائے اس کے معصوم چہرے پر اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

"کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"کس طرح ۔۔۔؟" اس نے یوں میرے الفاظ دُہرائے گویا میرا سوال اس کے نزدیک نہایت غیر ضروری بلکہ شاید احمقانہ رہا ہو "میں نے تمہیں کھینچ کھانچ کر بڑی مشکل سے گاڑی میں ڈالا اور ڈرائیو کرکے یہاں لے آئی۔ یہ جگہ مجھے کچھ محفوظ نظر آئی تو یہاں رک کر تمہیں ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگی۔ کافی دیر سے

کوشش کررہی تھی۔"

اگر اس لڑکی نے مجھے بے ہوشی کی حالت میں کھینچ کھانچ کر گاڑی میں ڈال لیا تھا تو یقیناً اس نرم و نازک سراپا میں بہت سی طاقتیں چھپی ہوئی تھیں۔

"لیکن جس شخص نے مجھے بے ہوش کیا اس نے تمہیں اتنی آسانی سے کیسے آنے دیا؟" میں نے پوچھا۔ فی الحال میں نے صرف سوالات کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔ اس کے جوابات پر شک و شبے کا اظہار کرنے کا میرا ابھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔

"اس شخص کو فوراً ہی وہاں سے بھاگنا پڑا تھا کیوں کہ پولیس کی گاڑی کا سائرن بھی سنائی دینے لگا تھا اور چوکیداروں یا پھر شاید پیدل گشت کرنے والے پولیس والوں کی سیٹیاں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے بھی وہاں سے اسی لئے جلد از جلد نکل جانا بہتر سمجھا کہ میں پولیس کے چکروں میں نہیں پڑنا چاہتی تھی لیکن تمہیں بھی وہاں بے ہوش پڑا چھوڑ کر آنے کو میرا دل نہیں مانا۔ حالاں کہ پولیس آکر تمہیں اٹھاتی تو شاید اسپتال لے جاتی جو تمہارے حق میں بہتر ہوتا۔"

"نہیں" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جہاں میری آنکھ کھلی وہ جگہ زیادہ بہتر تھی۔"

اس کی آنکھوں میں حیا کی لہر ابھری لیکن چہرے پر کوئی خاص تغیر نہ آیا۔ میں نے پوچھا "وہ شخص کون تھا؟"

"مجھے کیا معلوم" وہ تیزی سے بولی۔

"کیا وہ اس شخص کا دوست تھا جو تمہیں مار رہا تھا؟"

"میں کیا کہہ سکتی ہوں" وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔

"ویسے بھلا اس کی مجھ سے کیا دشمنی تھی جو وہ یکدم اندھیرے سے نکل کر میری کھوپڑی توڑنے پر تل گیا" میں نے کہا۔

"اس سلسلے میں بھی میں بھلا کیا کہہ سکتی ہوں" وہ بے چارگی سے بولی۔

"اچھا..... وہ کس قسم کا آدمی تھا؟ اس سلسلے میں بھی تم کچھ کہہ سکتی ہو یا نہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکی" وہ بولی "وہاں روشنی کوئی خاص نہیں تھی ـــــ اور پھر وہ بے پناہ پھرتیلا تھا ـــــ چھلاوے کی طرح آیا اور تمہیں بے ہوش کرکے چھلاوے ہی کی طرح غائب ہوگیا۔"

وہ کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس کا ہاتھ آہستہ آہستہ دروازے کے ہینڈل کی طرف کھسک رہا تھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی بلکہ اپنے مضروب ہاتھ کو دیکھنے لگا۔ وہ کافی سوج چکا تھا۔

"کیا ہوا تمہارے ہاتھ کو؟" وہ دفعتاً تشویش سے بولی۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے لہجے میں میرے لئے ہمدردی اور اپنائیت تھی لیکن وہ مجھے کچھ بتانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ انسان اگر کسی کے لئے اپنائیت محسوس کرتا ہے، اس سے انکسار، ہمدردی یا اس کی ہمدردی کا طلب گار ہوتا ہے تو اسے اپنے مصائب کے بارے میں بتانے سے اتنا سخت پرہیز بھی نہیں کرنا...

"یہ ہاتھ پہلے تمہارے اس مہربان کی گاڑی کے دروازے... آیا پھر پہیئے کے نیچے آگیا" میں نے بتایا۔

"اوہ..... میرے خدا ـــــ!" اس نے وحشت زدہ... میں کہا اور فوراً میرے متورم ہاتھ کو دونوں ہاتھوں... لیا۔ اس کے ہاتھوں کا لمس واضح تکلیف تھا۔ وہ ہاتھ... ہوئے بولی "کوئی ہڈی نہ ٹوٹ گئی ہو۔"

"نہیں۔ ہڈیاں سلامت ہیں" میں نے کہا۔

"ایکسرے کے بغیر تم اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتے ہو؟"

"درد سب سے بڑا ایکسرے ہے" میں نے مسکراتے...

"ہڈی ٹوٹنے کا تو درد ہی کچھ اور طرح کا ہوتا ہے۔"

"تم یا تو بہت خوش قسمت ہو یا بہت سخت جان" وہ بولی...

"دونوں ہی باتیں درست ہیں" میں نے جواب دیا۔ ... اپنے آپ کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔

"اس شخص نے تمہارے سر پر را کفل سے وار کیا تھا... طرف سے لاٹھی کی طرح پکڑ کر، گھما کر پوری قوت سے... تھا" وہ بولی "میں تو سمجھ رہی تھی تمہاری کھوپڑی کے ٹکڑے... ہوں گے لیکن شاید وار اُچٹتا ہوا پڑا یا پھر تمہاری کھوپڑی... طرح ہے۔"

"دونوں ہی باتیں درست ہیں" میں نے ایک بار پھر کہا... اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی... ہی معدوم ہوگئی۔ وہ تیزی سے دروازہ کھول کر اترتے ہو...

"میں اب چلتی ہوں۔"

بلی کی طرح بے آواز قدموں سے وہ درختوں کے سا... چلی جارہی تھی۔ میں اتر کر اس کے پیچھے لپکا تو سر میں سخت... ہوئی۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا گہرا ہونے لگا مگر میں نے پروا نہیں کی۔ اس نے دوڑنے کی کوشش کی مگر میں نے ہاتھ جلدی سے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"کہاں جارہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"گھر" اس نے جواب دیا۔

"تمہیں پیدل چلنے کا اتنا شوق کیوں ہے؟ میں تمہیں... میں چھوڑ دیتا ہوں" میں نے کہا۔

"مجھے نہیں جانا ہے تمہاری گاڑی میں، تمہارے سا..." گویا پھٹ پڑی "تم میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے۔ جو ہونا... چکا۔ اب تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔"

"مجھ سے اگر اتنا ہی گریز کرنا تھا تو تم نے مجھے میرے... چھوڑ دیا ہوتا، مجھے بے ہوش چھوڑ کر چلی گئی ہوتیں" میں نے...

"ہاں۔ مجھ سے بس یہی بڑی غلطی ہوئی کہ میں نے ا...

...ح لہجے میں بولی۔

"... غلطی کے لئے میں تہہ دل سے تمہارا شکر گزار ... غلطی کر ہی چکی ہو تو اسے ذرا اور نباہ لو۔ آؤ میں تمہیں ... ہوں" میں نے اسے پیچھے کھینچا۔ گرفت ایسی تھی کہ وہ بازو ... بھاگ نہیں سکتی تھی۔

... پُرتشویش لہجے میں بولی "میں اتنی مصیبت سے تمہیں وہاں ... لئے اٹھا کر نہیں لائی تھی کہ مجھے تم سے بہت ہمدردی ... میں تو بس یہ چاہتی تھی کہ تم پولیس کی تحویل میں نہ جاؤ اور ... وں کو میرے بارے میں کچھ نہ بتاؤ۔"

"کیوں ڈرتی ہو تم پولیس سے؟ کوئی جرم کیا ہے تم نے؟"

"رات کے پچھلے پہر مشکوک سے حالات میں مارکٹائی اور ... کے دوران ایک جوان لڑکی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے تو کیا ... کے لئے کوئی جرم کرنا ضروری رہ جاتا ہے؟ بغیر کسی جرم کے ... کی مٹی پلید ہو سکتی ہے" وہ تلخی سے بولی۔

"میں تو اب بھی پولیس کو کچھ بتانے نہیں جارہا۔ تمہیں کم از کم ... اس سلسلے میں مجھ سے کوئی خوف محسوس کرنے کی ضرورت ... آؤ چلیں" میں نے کہا۔ وہ گویا بادل ناخواستہ میرے ساتھ ... گی۔

گاڑی میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیونگ سیٹ اسی کے سپرد کی اور "یہاں تک چلا کر لے آئی ہو تو اپنے گھر تک بھی تم ہی لے ..."

اس نے خاموشی سے اسٹیرنگ وہیل سنبھال لیا اور گاڑی روڈ پر لے آئی۔ اسی دوران ڈیش بورڈ پر ایک ننھا سا بلب جلنے لگا اور مکھی کی بھنبھناہٹ سے مشابہ آواز وقفے وقفے سے ... نے لگی۔ یہ ریڈیو کا سگنل تھا۔ سالا ٹونی مجھ سے ریڈیو پر رابطہ ... کرنا چاہتا تھا۔ وہ جس کار کے تعاقب میں روانہ ہوا تھا شاید ... کے بارے میں کوئی اطلاع دینا چاہتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا ... لڑکی ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے میں ریڈیو کی موجودگی سے آگاہ ... اس لئے میں نے وہ خانہ نہیں کھولا۔ چند سیکنڈ بعد سگنل بند ... لیا۔ اگر وہ ٹونی تھا تو یقیناً تشویش میں مبتلا ہوا ہوگا، میں نے ... لیکن سردست میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

"یہ کیسا سگنل تھا؟" لڑکی نے پوچھا۔

"پیٹرول ختم ہو رہا ہے" میں نے جواب دیا۔

"لیکن فیول کا ڈائل تو یہ ہے" اس نے ایک ڈائل کی ... طرف اشارہ کیا۔

"یہ اس کے علاوہ ایک فاضل انڈیکیٹر ہے" میں نے جواب ... "اس ڈائل سے بھی کچھ پہلے یہ خبردار کرتا ہے۔"

"تمہاری گاڑی بہت پیچیدہ قسم کی ہے۔ اس میں بہت سی ... چیزیں ایسی ہیں جو میری سمجھ میں نہیں آئیں" وہ بولی "میں جب تمہیں گاڑی ... میں ڈال کر ڈرائیونگ سیٹ پر آکر بیٹھی تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ہوائی جہاز کے کاک پٹ میں بیٹھ گئی ہوں۔ اس وقت تو میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے کہ معلوم نہیں میں اس گاڑی کو ڈرائیو بھی کرسکوں گی یا نہیں لیکن شکر ہے ڈرائیونگ آسان ہی ثابت ہوئی۔"

"یہ ماڈل شہر میں صرف تین چار لوگوں کے پاس موجود ہے" میں نے کہا "شوقین لوگوں کے رکھنے کی چیز ہے۔ میں نے براہ راست مرسیڈیز کمپنی سے منگوائی تھی۔ میں تو چاہ رہا تھا کہ اس میں دروازے بھی چھ ہوتے لیکن کمپنی نے انکار کردیا۔ انہوں نے لکھا کہ چھ دروازوں والی گاڑی وہ صرف سربراہانِ مملکت کے لئے تیار کرتے ہیں۔ مجھے صبر کرنا پڑا۔"

"تم بہت دولت مند ہو؟" وہ ترچھی نظر سے میری طرف دیکھ کر بولی۔

"کوئی ایسا خاص نہیں" میں نے حسبِ عادت انکساری سے کام لیا "ویسے اچھی چیزیں رکھنے کے لئے صرف دولت ہی کی نہیں، شوق کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس شہر میں مجھ سے کہیں زیادہ دولت والے بہت سے لوگ موجود ہیں لیکن ان میں سے دو چار ایسے بھی ہیں جن کے ملازموں کے پاس ان سے بہتر گاڑیاں ہیں۔"

دفعتاً سامنے ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس آنکھیں خیرہ کردینے والے انداز میں چمکیں۔ وہ ون وے سڑک تھی لیکن سامنے سے ایک گاڑی ون وے توڑتی ہوئی مست ہاتھی کی طرح جھومتی چلی آرہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس ہاتھی کی رفتار جمبو جیٹ سے کچھ ہی کم تھی۔

وہ ہماری گاڑی پر چڑھتی چلی آئی۔ لڑکی بوکھلا گئی لیکن شاید ہماری قسمت اچھی تھی کہ وہ بروقت گاڑی کو لہرا کر گرین بیلٹ میں دو درختوں کے درمیان اتارنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس گرین بیلٹ کے گرد منڈیر نہیں تھی، اس میں پانی کھڑا تھا جو ایک چھپاکے کے ساتھ فوارے کی سی صورت میں ادھر ادھر اچھلا اور گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔ لڑکی ایک طویل سانس لے کر رہ گئی۔ اسٹیرنگ وہیل پر اس کے ہاتھ ہولے ہولے کانپ رہے تھے۔ دونوں گاڑیوں کے درمیان آمنے سامنے کا خوفناک تصادم ہونے میں بال برابر کسر رہ گئی تھی۔

دوسری گاڑی چشم زدن میں دور جا چکی تھی۔ اس کے پھٹے ہوئے سائلنسر کی گڑگڑاہٹ بھی معدوم ہو چکی تھی۔ لڑکی وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ وہی تھا نا؟"

"وہی کون؟" میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"وہی جو مجھ سے لڑ رہا تھا ـــــ جس نے تمہیں مارا تھا" وہ بولی۔

"کمال ہے! اس سے تو تمہارے اپنے بیان کے مطابق تمہارا کوئی بھی تعلق تھا اور تم اس کی گاڑی بھی نہیں پہچانتیں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "وہ سیاہ رنگ کی بیوک میں فرار ہوا تھا اور یہ عنابی رنگ کی فورڈ کورٹینا تھی۔ میں نے ڈرائیور

کی جھلک بھی دیکھی ہے۔ یہ کوئی نوجوان تھا۔ شاید نشے میں دھت تھا۔"

"اوہ۔۔۔" اس نے طویل سانس لے کر محض اتنا کہا۔ شاید یہ طمانیت کی سانس تھی۔ گاڑی ریورس کر کے وہ دوبارہ مین روڈ پر لائی اور اگلے چوراہے سے گارڈن ٹاؤن کی طرف مڑ گئی۔

تین چار میل کے سفر کے بعد اس نے ایک بنگلے کے سامنے گاڑی روکی جو تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیٹ پر تالا جھول رہا تھا۔ وہ گاڑی سے اتر کر ایک چابی تالے میں لگانے لگی۔ میں بھی جلدی سے اتر کر اس کے پاس جا پہنچا۔ اس لمحے مجھے احساس ہوا کہ بنگلے کی ایک کھڑکی میں روشنی تھی لیکن جونہی لڑکی نے تالے میں چابی گھمائی' وہ بھی بجھ گئی تھی۔ باہر تالا لگا ہوا تھا لیکن کیا اندر کوئی موجود تھا؟ اور اس نے لائٹ کیوں آف کر دی تھی؟ کہیں وہی شخص اس سے پہلے یہاں آ کر تو نہیں بیٹھ گیا تھا؟ میں بظاہر بے پرواہی رہا لیکن اب میں پوری طرح ہوشیار تھا۔

"تم نے مجھے گھر چھوڑ دیا ہے۔ اب تم چلے کیوں نہیں جاتے؟" وہ تالا کھولنے کے بعد میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ وہ اپنی آنکھوں میں رُکھائی اور اجنبیت سمونے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔

"بداخلاقی کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔" میں نے اپنا لہجہ رنجیدہ بناتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نے مجھے ان حالات میں میرے گھر پہنچایا ہوتا تو میں تمہیں کم از کم چھ ماہ اپنے ہاں قیام کی دعوت دیتا۔ اور تم چائے یا کافی کی ایک پیالی کو بھی نہیں پوچھ رہیں۔ میرا سر گھوم رہا ہے۔ شاید میں صحیح طور پر اپنے گھر تک ڈرائیو تک بھی نہ کر سکوں۔"

وہ کچھ نہ بولی۔ اس کا چہرہ بدستور چڑایا ہوا سا رہا لیکن اس نے گیٹ کھول دیا اور پورچ میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔ "گاڑی اندر کھڑی کر دو۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ اس وقت تک وہ پورچ کی لائٹ آن کر چکی تھی اور اندر کا دروازہ کھول چکی تھی۔ گھر میں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے لیکن ہر طرف صفائی ستھرائی تھی۔ لان صاف ستھرا اور سرسبز تھا۔ وہاں تپائی اور لان چیئرز بھی پڑی تھیں۔ کہیں ایک خشک پتہ بھی پڑا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے اس کے پیچھے پیچھے اندر گھستے ہوئے کہا۔ "دو مرتبہ تم نے مجھ سے پیچھا چھڑا کر گھر کی طرف روانہ ہونے کی کوشش کی تھی۔ پیدل ہی چل پڑی تھیں اور دونوں مرتبہ تم نے یہی کہا تھا کہ تمہارا گھر زیادہ دور نہیں ہے۔ میں تمہارے حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ پیدل چلتے وقت تین چار میل کا فاصلہ تمہارے لئے کوئی وقعت نہیں رکھتا۔"

"میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں پیدل ہی جاؤں گی۔ مجھے آگے کوئی سواری مل جاتی۔" وہ خفگی سے بولی۔

"رات کے پچھلے پہر سنسان سڑکوں پر تنہا پھرنے والی لڑکی کو سواریاں عموماً پرستان لے جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔ ہم اب ایک آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں کھڑے تھے۔

میں بات اس سے کر رہا تھا لیکن میرے کان کسی بھی حرکت یا آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔ وہ میری طرف مڑتے ہوئے برہمی سے بولی۔ "مجھے اپنی نہیں' تمہاری فکر تھی۔ میں تمہارا بھلا چاہ رہی تھی لیکن لگتا ہے' تمہیں کسی کی ہمدردی کی کوئی ضرورت نہیں۔ بڑا زعم ہے تمہیں اپنے بارے میں۔"

"تمہاری ہمدردی کا شکریہ ادا کرنے ہی تو میں تمہارے ساتھ آیا ہوں۔۔۔ تمہیں کیا معلوم کہ میں اپنے محسنوں کا کیسا قدردان ہوں۔" میں نے اس کے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ "احسان کرنا بہت اچھی عادت ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سچ بولنا بھی بہت اچھی عادت ہے۔"

وہ میرے عین مقابل خاموش کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ میں اپنے سر کو ہولے ہولے ہلاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ "میں نے ابھی تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔"

"حُسنہ ہے میرا نام۔" اس نے تیزی سے کہا۔

"حسینہ ہوتا تو زیادہ اچھا تھا۔ وہ نقطے بڑھ جانے سے یہ نام تمہارے حسن کے ہم وزن ہو جاتا۔" میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن خیر۔۔۔ ناموں میں کیا رکھا ہے۔ بعض اوقات تو نام شخصیت کے بالکل ہی اُلٹ ہوتے ہیں۔ تم سے مل کر خوشی ہوئی۔"

اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ساکن کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ پھر میرے بائیں ہاتھ کو دیکھنے لگی جو اچھا خاصا سوج چکا تھا۔ وہ سب کمروں کی بتیاں روشن کر چکی تھی۔ میں نے مصافحے کا ارادہ ملتوی کر کے دوسرے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا بنگلا ہے۔۔۔ اور بڑی عمدگی سے فرنش کیا گیا ہے۔"

بظاہر آرائش دیکھنے کے بہانے میں نے ہر کمرے میں جھانکا۔ وہ میرے پیچھے تھی۔ میں نے کچن اور باتھ روم بھی دیکھ لیے۔ کہیں کوئی نہیں تھا۔ پھر بھی اتنے بڑے گھر کے کسی کونے کھدرے میں اکیلے دُکیلے آدمی کا چھپنا یا موقع مناسب دیکھ کر نکل بھاگنا زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

"تسلی ہو گئی؟ یہاں کوئی نہیں ہے۔" وہ جلے کٹے سے انداز میں بولی۔

"ویسے ہی مجھے وہم سا ہوا تھا کہ جب ہم یہاں پہنچے تو ایک کھڑکی میں روشنی تھی۔" میں نے سچ بتا دیا۔ "میں تو تمہاری ہی بہتری کے لئے چیک کر رہا تھا۔"

"میں بھی تمہاری ہی بہتری کے لئے کہہ رہی ہوں' تم مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلے کیوں نہیں جاتے؟" اس کے لہجے میں

پھر بے چارگی آ گئی۔ "میں دوبارہ تمہاری کھوپڑی ٹوٹتے یا تم پر چلتے نہیں دیکھنا چاہتی۔"

"یہی معاملہ اِدھر بھی ہے۔" میں نے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ میں بھی ہرگز نہیں چاہتا کہ پھر تم سے کچھ چھیننے آ جائے اور بے دردی سے تم پر تھپڑ اور گھونسے چلائے۔ میں نرم دل آدمی ہوں۔ اتنے حسین چہرے پر تھپڑ پڑتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"یوں کہو کہ عیاش آدمی ہو۔ اچھی صورت دیکھتے ہی اسے پانے کی فکر میں لگ جاتے ہو۔" اس کے لہجے میں نرمی تھی۔

"نہیں۔ ابھی اتنی قابلیت مجھ میں پیدا نہیں ہوئی۔ عیاش کی تعریف پر میں پورا نہیں اترتا۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"تم جتنے معزز آدمی نظر آتے ہو' تمہاری حرکتیں اتنی معززانہ نہیں۔"

"میرے خیال میں معزز بننے کے لئے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ آدمی تربوز کی طرح منہ پھلا کر ریوالونگ چیئر پر بیٹھ جائے اور چلتے وقت یہ دیکھتا رہے کہ سوٹ میں کہیں شکن تو نہیں۔ انسان کو ہنستے بولتے اور ہاتھ پاؤں ہلاتے جلاتے رہنا چاہئے۔"

"تو دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے کا کچھ زیادہ ہی شوق ہے۔" میں نے کہا۔

"خواہ ٹانگ ٹوٹ ہی جائے؟"

"ابھی تک تو نہیں ٹوٹی۔ اگر ٹوٹ گئی تو شاید باز آ جاؤں۔" میں نے جواب دیا پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں بالکل اکیلی رہتی ہو؟"

"ہاں' بالکل اکیلی۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"سارے کام کاج بھی خود کرتی ہو؟ اتنے بڑے گھر کو صاف بھی خود ہی رکھتی ہو؟ اتنی سلیقہ شعاری بلکہ جان ماری تم نے کہاں سے سیکھی؟"

"یہاں پارٹ ٹائم کام کرنے والے آتے ہیں۔ اپنا اپنا کام کر کے چلے جاتے ہیں۔ میں کسی کو گھر میں رکھنا نہیں چاہتی۔" اس نے جواب دیا۔

"ایک پارٹ ٹائم شوہر بھی رکھ لو۔ کیا حرج ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

"کیا تم امیدوار ہو گئے ہو؟" اس نے مجھے گھورا۔

"درخواست تو میں بھی آج کل ہاتھ میں لئے گھوم رہا ہوں لیکن میں اتنا جلد باز نہیں ہوں۔ میل ملاقات جاری رہی تو شاید کبھی آ جائے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

وہ گویا زچ ہو کر میری زبان بند کرانے کے لئے بولی "تم یہاں بیٹھو۔ میں تمہارے سر پر بینڈیج کر دیتی ہوں اور ہاتھ پر بھی دوا لگا دیتی ہوں۔"

اس کی اس پیشکش سے فائدہ اٹھا لینے میں کوئی حرج نہیں تھا' اس لئے میں آرام سے صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ باتھ روم میں گئی اور دواؤں کی الماری سے چند چیزیں نکال کر واپس آ گئی۔ بڑی عمدگی و مہارت سے اس نے بالوں سے خون صاف کر کے' دوا لگا کے پٹی کی۔ پھر دھیرے دھیرے ہاتھ پر دوا کی مالش کرنے لگی۔ چوٹوں کو ذرا سا بھی چھونے سے بڑا درد ہوتا تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں مسیحائی کی لذت بھی تھی۔ میں صوفے پر تھا' وہ آلتی پالتی مارے قالین پر بیٹھی تھی۔ ابتدائی طبی امداد کے لوازمات اس کے قریب ایک چھوٹی سی ٹرے میں رکھے تھے۔

اس کی آنکھیں جو بدستور میرے لئے الجھن کا باعث بنی ہوئی تھیں' میں نے ایک بار پھر انہی میں جھانک کر اپنی الجھن کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے انداز میں بڑی مشاقی و مہارت ہے۔ کیا تم کبھی نرس بھی رہی ہو؟"

"رہی ہو۔۔۔ میں اب بھی نرس ہی ہوں۔ میں تو حیران ہوں کہ تم نے ابھی تک یہ پوچھا ہی نہیں تھا کہ تم کیا کرتی ہو" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولی۔

"ہمارے ہاں خواتین سے یہ پوچھنا کچھ زیادہ اچھا نہیں لگتا کہ تم کیا کر رہی ہو۔" میں نے جواب دیا' پھر اردگرد کا از سرِ نو جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ماشاءاللہ! یہ پیشہ کافی ترقی کر گیا ہے۔ اگر اس شہر کی لڑکیوں نے تمہارا رہن سہن دیکھ لیا تو سب کی سب نرس بننے پر تل جائیں گی۔"

"میرا یہ رہن سہن میری تنخواہ کی بدولت نہیں ہے۔ میں اتنی احمق نہیں ہوں جو ایسا دعویٰ کروں گی۔ میرا خاندان کافی خوشحال تھا۔ والدین کے انتقال کے بعد بہت کچھ میرے حصے میں آیا تھا۔ میں ان کی اکلوتی اولاد تھی۔"

"تو پھر تمہیں نرس بننے کی کیا سوجھی؟ دنیا میں کوئی اور کام نہیں رہ گیا تھا تمہارے لئے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"کیوں۔۔۔ کیا یہ اچھا کام نہیں ہے؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"بہت اچھا ہے مگر جب ورثے میں اتنا کچھ ملا ہو تو اس پیشے کی طرف دھیان کہاں جاتا ہے۔"

"نظریات بھی کوئی چیز ہوتے ہیں۔" وہ تیزی سے بولی۔ "مجھے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا۔ مارکس کم رہ گئے' نہیں بن سکی۔ میں نے سوچا نرس بننے میں بھی کیا حرج ہے۔ مقصد تو تڑپتے سسکتے لوگوں کی خدمت کرنا تھا۔ ڈاکٹر بھی میں پیسے کے لئے تو بننا نہیں چاہ رہی تھی۔"

"شادی کرنے سے پہلے سب کا بیان یہی ہوتا ہے۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

بہت سی دوا میرے ہاتھ میں جذب ہو چکی تھی۔ کافی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے لئے کافی بناتی ہوں۔"

وہ کچن میں جا چکی تو میں نے اٹھ کر فون پر ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی کا نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف جولی موجود تھی۔ میں نے نیچی آواز میں اور کوڈ ورڈز میں اسے ہدایت دی۔

"ٹونی جہاں کہیں بھی ہو اسے ریڈیو یا فون پر میرے بارے میں اطلاع دے دو کہ میں خیریت سے ہوں۔ وہ پریشان نہ ہو اور جس گاڑی کا وہ تعاقب کر رہا تھا اس کے بارے میں رپورٹ یا تو میرے فون پر ریکارڈ کرا دے یا میں موقع ملتے ہی اس سے خود بات کرلوں گا۔ فی الحال میں اس سے بات کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔"

میرے آخری الفاظ ادا کرنے تک وہ دروازے میں آن کھڑی ہوئی تھی اور غصیلی نظروں سے مجھے گھور رہی تھی۔ لیکن میرے الفاظ کچھ اور تھے۔ وہ ان سے کوئی مفہوم اخذ نہیں کر سکتی تھی۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔

"کسی کو یہاں بلایا ہے؟ پولیس کو اطلاع دی ہے؟ تمہاری اطلاع کے لئے بتا دوں کہ پولیس میرے معاملات میں مداخلت نہیں کرتی۔" وہ تیزی سے بولی۔

"ظاہر ہے' پولیس کو شرفا کے معاملات میں مداخلت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔ "تمہیں یہ گمان کیونکر گزرا کہ میں کسی کو بلا رہا ہوں یا پولیس کو اطلاع دے رہا ہوں؟"

"تو پھر میرے جاتے ہی گھٹی گھٹی آواز میں ٹیلی فون پر ٹرانے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟" وہ بدستور مجھے گھور رہی تھی۔

"کاروباری آدمی ہوں۔ وقت بے وقت منڈی کے بھاؤ معلوم کرتا رہتا ہوں۔" میں نے حتی الامکان سادگی سے کہا۔

"رات کے اس پہر تو صرف ایک ہی منڈی کھلی ہوتی ہے۔ اور اس کے بھاؤ معلوم کرنا خاصا معیوب کام سمجھا جاتا ہے۔" وہ بلا تامل بولی۔

"اچھا۔۔۔! کہاں ہے وہ منڈی؟ کیا تمہیں اس کے بارے میں خاصی معلومات ہیں؟ کچھ مجھے بھی بتاؤ۔ کبھی کبھی معیوب سی حرکتیں کرنے کو بڑا دل چاہتا ہے۔" میں نے اشتیاق سے کہا۔

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے مجھے گھورتی رہی۔ پھر قدرے بے چارگی آمیز سے لہجے میں بولی "تم سچ سچ بتا کیوں نہیں دیتے۔۔۔ کسے فون کر رہے تھے؟ مجھے الجھن رہے گی' ذہن میں خلش رہے گی۔"

"میں نے تمہاری اتنی باتوں پر یقین کیا۔ تم میری ایک بات پر بھی یقین کرنے کے لئے تیار نہیں ہو۔ یہ تو بڑی زیادتی ہے۔۔۔۔ بہرحال تمہارے اطمینان کے لئے بتا رہا ہوں۔ ایک دوست کو میرے بارے میں تشویش ہوگی۔ اسے اپنی خیریت کی اطلاع دے رہا تھا۔"

معلوم نہیں وہ میرے جواب سے مطمئن ہوئی یا نہیں۔ بہرحال کچن میں واپس چلی گئی۔ اس کے کچن میں جدید ترین سازو سامان موجود تھا۔ فوراً ہی کافی بنا کر لے آئی۔ اب میں نے دیکھا' وہ اپنے چہرے کی چوٹوں پر بھی دوا کی مالش کر چکی تھی۔ کافی نوشی کے ۔۔۔ خاموشی رہی۔ بیشتر وقت ہم پُر خیال انداز میں ایک دوسرے ۔۔۔ رہے' جیسے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو تول رہے ہو ۔۔۔ پھر شاید ہم ایک دوسرے کی دروغ گوئی کو تول رہے تھے۔

جونہی میں نے کافی کا مگ خالی کر کے ٹرے میں واپس ر ۔۔۔ بول اٹھی۔ "تم اب چلے کیوں نہیں جاتے؟"

"اگر تم دو منٹ پہلے کہہ دیتیں تو میں کافی کا مگ ہاتھ م ۔۔۔ ہی رخصت ہو جاتا۔ خواہ مخواہ ہی تم نے دو منٹ مزید مجھے ہوا ۔۔۔ کیا۔" میں نے کہا۔ "اب تو جانے کو دل ہی نہیں چاہ رہا ۔۔۔ بہت اچھی تھی۔ اسے پینے کے بعد میرے خیالات میں بڑی ۔۔۔ آگئی ہے۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر رو دینے والے لہجے میں بولی "دیکو ۔۔۔ سنجیدگی سے کہہ رہی ہوں۔ خدا کے لئے اس وقت چلے جاؤ ۔۔۔ بہت پریشان ہوں۔ مجھے اس وقت آرام کی ضرورت ہے۔ ۔۔۔ اگر میرے سر پر سوار ہونے کا اتنا ہی شوق ہے تو پھر کسی ۔۔۔ آجانا۔ گھر تو تم نے دیکھ ہی لیا ہے۔"

"پھر کبھی آنے کا ارادہ رکھنے والوں کو عموماً بہت زیادہ ۔۔۔ ہو جایا کرتی ہے۔ بعض اوقات تو ان کا دوبارہ آنا بے کار ہی ۔۔۔ ہے۔" میں نے اطمینان سے کچھ اور پھیل کر بیٹھتے ہوئے ۔۔۔ "زیادہ اہم تو آج ہی کی رات ہے۔ دراصل مجھے شبہ ہے کہ وہ لوٹ کر ضرور آئے گا۔ پھر وہ نہ جانے تم سے کیا سلوک کرے۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اس کے آنے کے تصور ۔۔۔ خوفزدہ ہوں؟" وہ غصیلے انداز میں بولی۔ "ہو سکتا ہے مجھے ا ۔۔۔ آمد کا انتظار ہو۔"

"یہی تو میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ کس کو کس کا انتظار ہے۔ کون کس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔" میں نے کہا "مجھے ا ۔۔۔ ہے کہ تم نے اسے گھر کی چابی بھی دی ہوئی ہوگی تاکہ وہ جس و ۔۔۔ چاہے کال بیل بجانے کی زحمت کے بغیر اندر آسکے؟"

"ہاں' دی ہوئی ہے۔ تم سے مطلب؟" وہ تقریباً چلا اٹھی۔

"گڈ! حسین لڑکیوں کو ایسا ہی ملنسار ہونا چاہئے۔" میں ۔۔۔ سہلاتے ہوئے کہا۔ لیکن سرہلانے سے درو دیوار بھی آنکھوں ۔۔۔ سامنے تھوڑا تھوڑا ہلنے لگے۔ میں نے فوراً ہی سر کو مزید ہلنے ۔۔۔ روک لیا۔ اسی میں عافیت تھی۔ بینڈیج کرتے وقت حُسنہ نے ۔۔۔ کھانے کے لئے دو گولیاں بھی دی تھیں۔ اب میری حالت خا ۔۔۔ بہتر تھی لیکن ابھی چوٹ کے اثرات تو بہرحال باقی تھے اور ۔۔۔ خیال تھا کہ دو تین دن تک اس سے بھی زیادہ تکلیف برداشت کرنی پڑے گی۔

"یس" تھی تو میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "۔۔۔ تمہارے گھر کی چابی سے یا اس شخص سے کوئی خاص غرض ۔۔۔ ہے۔ لیکن مجھ میں ایک بڑی خرابی ہے۔ اگر کوئی اپنی گاڑی سے ۔۔۔

۔۔۔ کچل کر' مجھ پر گولی چلا کر اور میرے سامنے کسی سے کچھ چھین کر ۔۔۔ جائے تو عام طور پر مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ اسے تلاش ۔۔۔ میرے لئے اتنا ہی ضروری ہو جاتا ہے جتنا خرگوش کے لئے ۔۔۔ کھانا۔۔۔ معاف کرنا' اس وقت کوئی مناسب تشبیہ نہیں سوجھ ۔۔۔"

وہ ایک ٹک مجھے گھور رہی تھی۔ اس وقت اسے میرا خوش دلی ۔۔۔ بات کرنا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے ۔۔۔ نے پوچھا۔ "وہ تھا کون؟"

"عبدالرشید۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا سبزی منڈی کا کوئی آڑھتی تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں' بکرا منڈی میں بکرے بیچتا تھا۔" وہ جل کر بولی۔ وہ ۔۔۔ ے ہی انداز میں بات گول کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"بکرے نہیں' بکریاں بیچتا ہوگا۔ دو ٹانگوں والی خوش شکل ۔۔۔ یاں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ اس کی آنکھیں بتاتی تھیں کہ وہ ۔۔۔ ن اور جھنجلاہٹ کا شکار تھی لیکن اس کی رنگت حقیر نہیں ۔۔۔ ی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے حتی الامکان سنجیدگی سے ۔۔۔ ا۔ "میں دراصل یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ اس سے تمہارے تعلق کی ۔۔۔ یت کیا ہے جو تم اس کی اتنی بدسلوکی بھی صبر و سکون سے ۔۔۔ راشت کرنے کے لئے تیار ہو؟"

وہ بھی بظاہر سنجیدگی سے ہی بولی "وہ میرا منگیتر ہے۔"

"او میرے خدا۔۔۔!" میں صوفے سے گرتے گرتے بچا۔ یقیناً ۔۔۔ ری آنکھیں بھی پھیل گئی تھیں۔

"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" وہ خفگی سے ۔۔۔ لی۔

"اس سے میری ملاقات بے شک خوشگوار حالات میں نہیں ۔۔۔ وئی تھی۔ وہاں روشنی بھی کم تھی۔ میں اسے صحیح طور پر نہیں دیکھ ۔۔۔ کا لیکن پھر بھی مجھے اتنا اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ اس کی عمر پچاس ۔۔۔ ے کم نہیں تھی۔"

"تب بھی حیرت کی بات کیا ہے اس میں؟" وہ بولی "کیا اس ۔۔۔ معاشرے میں بڑی عمر کے مردوں کی شادیاں نوجوان لڑکیوں سے ۔۔۔ نہیں ہوتیں؟ کیا یہ کوئی انوکھی بات ہے؟"

"نہیں۔ انوکھی بات تو نہیں" میں نے تسلیم کیا "مگر نہ جانے کیوں دل کو نہیں لگ رہی۔ لیکن خیر۔۔۔ کیا اس کا نام عبدالرشید ہی ہے؟"

"نہیں۔ وہ میں جل کر کہہ رہی تھی۔ اس کا نام احمد شجاع ہے۔ جوانی میں ملکی سطح پر وہ اچھا خاصا نامور باکسر تھا۔ اس عمر میں بھی تندرست' طاقتور اور چاق و چوبند ہے" اس نے جواب دیا۔

"تبھی تو میری گرفت میں آنے سے بچ گیا۔ اس کے تندرست' طاقتور اور چاق و چوبند ہونے میں تو مجھے کوئی شک نہیں۔ اور وہ ایسا نہ ہوتا تب بھی اس سے تمہاری شادی پر مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا" میں نے ملائمت سے کہا "میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ اس سے دوبارہ جلد از جلد کہاں اور کس طرح ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"میرے ہاتھ کی ورم اور سر پر بندھی ہوئی پٹی اپنا حساب مانگ رہی ہے۔"

"دیکھو۔۔۔" وہ تھکے تھکے انداز میں گہری سانس لے کر بولی۔ "ہو سکتا ہے تم حساب لینے کی فکر کرو تو نقصان میں رہو۔ یہ کوئی فلمی سچویشن نہیں ہے اور نہ ہی وہ ولن یا تم ہیرو ہو کہ کہیں تمہارے ساتھ کچھ ہو گیا تو تم لاٹھی لہراتے ہوئے انتقام لینے کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول جاؤ۔ انسان کو سرِراہ جاتے جاتے بھی تو چوٹ لگ جاتی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہم اس سے بھی زیادہ خطرناک حادثے سے بچے ہیں۔ وہ شرابی اگر ہماری گاڑی سے گاڑی ٹکرا ہی دیتا تو تم کیا کرتے؟"

"اگر میں زندہ بچ جاتا اور وہ بھی کسی نہ کسی حالت میں زندہ پایا جاتا تو میں اسے ضرور سبق سکھاتا کیوں کہ یہ محض اتفاقیہ حادثہ نہ ہوتا۔ اس کی شراب نوشی کی وجہ سے یہ حادثہ پیش آتا۔ میری ذاتی عدالت اسے ضرور سزا دیتی" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری ذاتی عدالت۔۔۔؟" اس نے قدرے چونک کر کہا۔

"میرا مطلب ہے' میں اپنی ذات کی حد تک اسے قابلِ معافی نہ سمجھتا" میں نے جلدی سے کہا۔

"تم تو واقعی بڑا دردِ سر ہو" وہ کنپٹیاں مسلتے ہوئے بولی "احمد شجاع کا تو تم نے پیچھا پکڑ لیا ہے لیکن جس نے تمہیں زیادہ شدید چوٹ لگائی' تمہاری کھوپڑی پر رائفل کے بٹ سے وار کیا' اسے تم بھول گئے ہو۔ اس کے بارے میں کیا کرو گے؟"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اسے بھول گیا ہوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میرا دل کہتا ہے کہ جب مجھے احمد شجاع مل جائے گا تو اس دوسرے شخص کا سراغ بھی خود بخود ہی مل جائے گا۔"

"تو کیا اب تم زندگی بھر یہاں بیٹھے احمد شجاع کا انتظار کرتے رہو گے؟"

"تو کیا تمہارے خیال میں وہ اب میری زندگی میں یہاں نہیں آئے گا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں۔۔۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ میں تو یہ پوچھ رہی تھی' تم کب تک اس کا انتظار کرو گے؟" وہ جلدی سے بولی۔

"صرف سپیدۂ سحر نمودار ہونے تک" میں نے جواب دیا "دن کی روشنی میں تمہیں تنہا چھوڑتے ہوئے میرے دل کو اتنا افسوس نہیں ہوگا" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "تمہارا کب اس سے شادی کا پروگرام تھا؟"

"جلدی۔ بس دو تین مسائل کا تصفیہ ہونا باقی ہے" وہ بولی۔

"ان مسائل میں کہیں اس کی پہلی بیوی اور جوان بچے وغیرہ تو شامل نہیں ہیں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

وہ مجھے گھور کر رہ گئی' پھر کاٹ کھانے والے انداز میں بولی۔ "تمہیں اس سے مطلب؟"

"ایسے ہی ۔۔۔ ذرا جنرل نالج کے لئے پوچھ رہا تھا" میں نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"میں ذرا یہ برتن دھولوں" وہ ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔ میں بھی اس کے پیچھے پیچھے کچن کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ شاید برتنوں کو گندے ہوئے چھوڑنا اس کی عادت نہیں تھی. یا پھر اپنے اضطراب کو چھپانے کے لئے اس وقت وہ کوئی مصروفیت ڈھونڈ رہی تھی لیکن جس محبت اور انہماک سے وہ برتن دھو رہی تھی اس سے اس کی فطرت کے کسی اور ہی پہلو کا پتا چلتا تھا۔

"لگتا ہے گھر بسانے کی بہت آرزو تھی تمہیں" میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

"تم پر یہ انکشاف کیسے ہوگیا؟" وہ جارحانہ لہجے میں بولی۔ حالاں کہ میں دیکھ چکا تھا' میری بات سن کر اس کے ہاتھ ایک ثانئے کے لئے لرز کر رہ گئے تھے' جیسے کسی نے دل کی گہرائیوں میں مدفون درد کے تار چھیڑ دئے ہوں۔

"ویسے ہی ۔۔۔ تمہارا برتن دھونے کا انداز دیکھ کر احساس ہوا۔"

"بہت تجربہ ہے اس چھوٹی سے عمر میں۔ کتنی شادیاں کی ہیں اب تک؟" اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ پہلی بار اس کے لہجے میں تناؤ کچھ کم محسوس ہوا۔ اس نے مجھے یوں چھوٹی عمر کا قرار دیا تھا جیسے خود کوئی بزرگ خاتون ہو حالاں کہ وہ زیادہ سے زیادہ میری ہی ہم عمر ہو سکتی تھی۔

"ابھی ایک ہی کرنے کی ہمت نہیں پڑ رہی' اور تم اس طرح پوچھ رہی ہو جیسے یہ بھی درخت سے نارنگیاں توڑنے کے مترادف ہے۔ کہ اب تک کتنی توڑ چکے ہو۔"

"بعض لوگوں کے لئے یہ اس سے بھی آسان کام ہوتا ہے" وہ برتنوں کو سکھا کر ایک کیبنٹ میں رکھتے ہوئے بولی۔

"مثلاً احمد شجاع ۔۔۔؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تم ہر بات پر اس کو کیوں بیچ میں کھینچ لاتے ہو؟" وہ بھڑک گئی۔

"آج وہ میرے ذہن پر سوار ہوگیا ہے۔ میں اپنی بدذوقی پر معذرت خواہ ہوں کہ ذہن پر سوار ہوا بھی تو کون ۔۔۔"

اس پر وہ کچھ نہیں بولی۔ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "بیوک میں تھا۔ کھاتا پیتا آدمی ہوگا؟"

"ملے گا تو خود ہی پوچھ لینا۔ میں اب تمہارے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گی۔ میں پہلے ہی پریشان ہوں۔ اوپر سے تم میرا دماغ چاٹ گئے ہو" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

دفعتاً فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ اسی ٹیلیفون سیٹ کی طرف لپکی جو ڈرائنگ روم میں رکھا ہوا تھا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا بے تابانہ تھا جیسے اسے بہت دیر سے فون کال کا انتظار رہا ہو۔ ریسیور اٹھا کر اس نے صرف "ہیلو" کہا اور دیر تک خاموش کھڑی رہی۔ میں نے اس کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے اس میں ناکامی ہوئی۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سپاٹ تھا۔ تقریباً ایک منٹ بعد اس نے ریسیور رکھ دیا۔

"کیا وہ خیریت سے گھر پہنچ گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اس نے واقعی عہد کر لیا تھا کہ اب میرے کسی سوال کا جواب نہیں دے گی۔ وہ ایک بار پھر کمرے سے نکل آئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کچن کی طرف جائے گی لیکن وہ دائیں طرف مڑ کر یکدم بیڈ روم میں گھس گئی اور دروازہ اس نے مقفل کر لیا۔

میں نے بہ آوازِ بلند کہا "میں نے تو ابھی تک کوئی ایسی حرکت نہیں کی جو تمہیں یوں اندر گھس کر دروازہ بند کرنے کی ضرورت پیش آگئی۔"

"اب تو سپیدۂ سحر بھی نمودار ہوگیا ہے۔ خدا کے لئے اب تو چلے جاؤ" اس کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی "اس میں تمہاری بھلائی بھی ہے۔ میری بات مان لو۔ کبھی کبھی کسی اجنبی کا مشورہ بھی مان لیا کرتے ہیں۔"

میں نے ہال کے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ واقعی سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ میں چند لمحے وہیں تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا۔ آخر کار میں فیصلے پر پہنچ گیا۔ اب بہت ہو چکی تھی۔ مجھے چلے ہی جانا چاہئے تھا۔ حُسنہ کے لہجے میں کوئی بات تھی جس نے مجھے شرمندہ سا کر دیا تھا۔ ویسے بھی اب میں اس کی صورت اور ٹھکانا اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ مجھے کافی حد تک یقین تھا کہ وہ کہیں نہیں جا سکے گی۔

میں نے اسے خدا حافظ بھی نہیں کہا اور خاموشی سے باہر آگیا۔ خنک ہوا میرے چہرے سے ٹکرائی تو نئی فرحت محسوس ہوئی۔ پرندوں کی چہکار بھی بہت بھلی لگ رہی تھی۔ پورچ میں اس کی فوکس کھڑی تھی۔ گاڑی چھوٹی لیکن بیش قیمت تھی۔ میں نے اس کا نمبر ذہن نشین کر لیا اور اس کے عقب سے اپنی گاڑی نکال لی۔ وہ گیٹ بند کرنے بھی نہیں آئی۔ میں نے بھی کھلا ہی رہنے دیا۔

مین روڈ پر پہنچ کر میں ابھی تھوڑی ہی دور گیا تھا اور گاڑی کی رفتار بھی معمولی ہی تھی کہ کوئی سڑک کے مین بیچ میں آگیا اور زور زور سے دونوں ہاتھ ہلانے لگا' جیسے سخت مصیبت میں ہو۔ وہاں دو طرفہ سڑک کے درمیان گرین بیلٹ تیار کی جا رہی تھی۔ نئے لگائے گئے پودوں کے گرد اینٹوں کی چھوٹی چھوٹی' جالی دار حفاظتی دیواریاں کھڑی کی گئی تھیں۔ ایسی ہی ایک چار دیواری کے ...ب سے نکل کر وہ سامنے آیا تھا۔ صبح کا اجالا ابھی واضح نہیں تھا اس لئے میں نے ہیڈ لائٹس روشن رکھی تھیں۔ ان کی ...نی میں' میں نے اسے فوراً ہی پہچان لیا اور بے اختیار گہری ...س لے کر گاڑی روک لی۔ میں اس سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا تو ...بعید نہیں تھا کہ وہ کمبخت گاڑی کے نیچے ہی آجاتا۔ وہ اتنا ہی ...یا ہوا نظر آ رہا تھا۔

وہ وسیم احمد تھا۔

"تم یہاں کیسے پہنچ گئے احمق!" میں نے گاڑی ایک طرف ...نے کے بعد کھڑکی سے سر نکال کر پوچھا۔

"میں تو چائنیز ریستوران سے ہی آپ کے تعاقب میں ہوں ...یکن میری گاڑی شور بہت کرتی ہے اس لئے میں نے فاصلہ ...ور رکھا تھا ۔۔۔" اس نے مسکین سی صورت بنا کر جواب دیا۔

میں ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کیا وہ واقعی ...ی احمق تھا جتنا نظر آتا تھا؟ یا میں کچھ بے پروا ہوتا جا رہا تھا؟ وہ ...ں رات سے میرے تعاقب میں تھا اور مجھے علم نہیں تھا۔ میں ...یکھا' دوسری طرف کی سڑک کے کنارے ایک دیوار کے قریب ...رنگ کی ایک فوکسی کھڑی تھی۔ یقیناً وہ اسی کی تھی۔

میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا "کیا ضرورت آن پڑی تھی ...ے تعاقب کی؟"

"پہلے تو میں میڈم ستارہ کا گھر دیکھنا چاہتا تھا" وہ قدرے ...لے سے لہجے میں بولا "پھر اس امید پر باہر موجود رہا کہ شاید آپ ...نکلیں تو آپ کا موڈ خوشگوار ہو اور آپ مجھ پر ترس کھا لیں ...یرے مسئلے کا کوئی حل تجویز کر دیں۔ لیکن جب آپ میڈم ...کے ہاں سے نکلے تو مجھے آپ سے بات کرنے کا موقع ہی نہیں ...ملا یا یوں کہہ لیں کہ ہمت ہی نہیں پڑی۔ میں پھر آپ کے پیچھے ...لگا۔ اتفاق سے جدھر آپ جا رہے تھے اُدھر سے ہی مجھے بھی ...گھر جانا تھا ۔۔۔ لیکن آپ کے ساتھ تو راستے میں عجیب ہی چکر ...۔ میں تو ڈر گیا۔ دور ہی سے چھپ کر دیکھتا رہا۔ جب اس بندر ...انسان نے آپ کو بندوق کا بٹ مار کر بے ہوش کیا ۔۔۔"

"بندر نما انسان نے؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ...نی چاہی۔

"جی ہاں۔ وہ چھوٹے سے قد کا تھا۔ لمبے لمبے بال تھے۔ حالاں ...ں وہاں سے کافی دور چھپا ہوا تھا اور وہاں روشنی بھی کم تھی ...جب سے میں نے یہ عینک لگائی ہے' میری نظر بہت شاندار ...ے سے کام کرنے لگی ہے" اس نے عینک کے موٹے موٹے ...شیشوں کے عقب میں گول گول آنکھیں گھمائیں "میں نے اس کی ...لیاں سی دیکھیں ان سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ بالکل بندر جیسا ...ستی پھرتیلا تھا۔ بندر سے بھی زیادہ۔"

"تمہیں یقین ہے ناکہ اسی نے میرے سر پر بٹ مارا تھا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔ میں اندھیرے میں ایک دیوار سے چپکا کھڑا تھا اور سب کچھ دیکھ رہا تھا" وہ وثوق سے بولا۔

حُسنہ میرے عین قریب تھی مگر اس کا کہنا تھا کہ وہ اس شخص کی جھلک دیکھ کر اس کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتی تھی۔ وہ اس کی صورت نہیں دیکھ سکی تھی۔ جب کہ اس احمق لڑکے نے دور سے اسے دیکھ کر اس کے بارے میں کام کی بات بتا دی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ حُسنہ اس بندر نما شخص کے بارے میں یقیناً کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی' جو اے ٹن کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حُسنہ کا اے ٹن سے کوئی تعلق تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔ اب وہ احمق مجھے اتنا برا نہیں لگ رہا تھا۔

"شاید پولیس کے آنے کے آثار پیدا ہوگئے تھے۔ اس بندر نما شخص اور لڑکی نے مل کر جلدی سے آپ کو آپ کی گاڑی میں ڈالا ۔۔۔"

"تم نے اچھی طرح دیکھا تھا کہ اس شخص نے اس کام میں لڑکی کا ہاتھ بٹایا تھا؟" میں نے ایک بار پھر اس کی بات کاٹی۔

"جی ہاں۔ اور اس کے فوراً بعد وہ تو چھلاوے کی طرح معلوم نہیں کہاں غائب ہوگیا اور لڑکی آپ کی گاڑی ڈرائیو کر کے آپ کو لے کر چل دی" وسیم نے بتایا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا کہ مجھے ... بے ہوشی کی حالت میں حُسنہ تنہا گھسیٹ کر گاڑی میں نہیں ڈال سکتی تھی جبکہ میرے سوٹ یا جسم پر گھسیٹے جانے کے نشانات بھی نہیں تھے۔

وسیم بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میری روح فنا ہو رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں بے ہوش ہو جاؤں گا لیکن میں نے سوچا' لڑکی آپ کو پتا نہیں کہاں لے جا رہی ہے اس لئے میں آپ کے پیچھے لگا رہا۔ وہ ایک محفوظ جگہ پر رک گئی۔ کافی دیر بعد عقبی شیشے سے آپ کی بھی پرچھائیں دکھائی دی اور میں سمجھ گیا کہ آپ ہوش میں آگئے ہیں۔ تب میرے دل کو کچھ اطمینان ہوگیا۔ اس کے بعد میں آپ کے تعاقب میں یہاں تک آیا اور تب سے یہاں چھپا آپ کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔"

"میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں" میں نے گاڑی سے اتر کر یہ سوچتے ہوئے اس کی پیٹھ تھپکی کہ کبھی کبھی کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے "اب مجھے تمہارے بارے میں رائے بدلنی پڑے گی۔ میرا خیال ہے' تم اتنے احمق نہیں ہو جتنا میں تمہیں سمجھا تھا۔"

"کون کہتا ہے جی میں احمق ہوں؟" اس نے قدرے خفگی سے کہا "ابھی آپ کو میری فنکارانہ صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے۔ یہ سب کچھ میں اس لئے کر رہا تھا کہ مجھے جاسوسی کا بڑا شوق ہے۔ میں تو ایک جاسوسی ناول بھی لکھ رہا ہوں۔ گیارہ سو صفحے لکھ چکا ہوں:

"گیارہ سو صفحے؟" میں نے حیرت سے کہا "اسے چھاپے گا کون؟"

"یہ تو میں بعد میں سوچوں گا۔ پہلے اسے مکمل تو کرلوں" وہ بے پروائی سے بولا "میں تو بننا بھی پرائیویٹ سراغ رساں ہی چاہتا تھا لیکن ابا نے مجھے نائٹ سپروائزر بنا دیا۔ ایک مرتبہ میں نے ان سے کہا کہ میں پرائیویٹ سراغ رساں بننا چاہتا ہوں۔ انہوں نے اپنے ہی کارخانے کی بنی ہوئی چپل اٹھا کر مجھے رسید کی اور کہنے لگے 'مار مار کر کھال ادھیڑ دوں گا' ساری سراغ رسانی اور جاسوسی نکال دوں گا۔ مجھے ہروقت یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر میرے جاسوسی ناول کا مسودہ ان کے ہاتھ لگ گیا تو کہیں پھاڑ نہ دیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ" میں نے ملائمت سے کہا "ابھی جب میں اس بنگلے کے اندر تھا تو تم نے کسی کو باہر آتے یا آس پاس منڈلاتے تو نہیں دیکھا؟"

"نہیں" اس نے نفی میں سرہلایا' پھر شکوہ آمیز سے لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ نے واپس آنے میں بہت دیر لگادی سر! میں تو اب بالکل ہی مارا گیا۔ میں تو آپ سے مسئلے کا حل پوچھنے کی فکر میں تھا لیکن فی الحال تو ایک اور مسئلہ کھڑا ہوگیا ہے۔ اور وہ یہ کہ میں گھر جا کر ابا کو کیا جواب دوں گا؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے جاننا چاہا۔

"کہ میں تمام رات کہاں غائب رہا۔ وہ تو میری چمڑی اُدھیڑ دیں گے" وہ خوف زدہ سے لہجے میں بولا۔

"بتا دینا کہ تم بڑی مصیبت میں پھنس گئے تھے اور یہی بڑا غنیمت ہے کہ تم گھر واپس پہنچ گئے" میں نے کہا۔

"وہ اس قسم کی باتیں سنتے کہاں ہیں۔ یہی تو سب سے بڑی مصیبت ہے' بلکہ وہ خود سب سے بڑی مصیبت ہیں" وہ منہ بنا کر بولا۔

"خیر۔ اب تم اتنے بڑے ہوگئے ہو۔ تمہیں مصیبتوں کا سامنا کرنے کی اہلیت اپنے اندر پیدا کرنی چاہئے۔ فی الحال تو تم گھر جاؤ" میں نے اس کا کندھا تھپکا۔

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "اور وہ میرا مسئلہ......؟ میرا مستقبل' میری نوکری داؤ پر لگی ہوئی ہے۔"

"میں کہہ چکا ہوں نا' کہ اس کے بارے میں اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ ایسے اہم اور سنگین مسائل کے بارے میں سرِراہ کھڑے ہو کر کیا بات ہوسکتی ہے" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اچھا" وہ ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے قدرے مایوسی سے بولا۔ اس کا منہ لٹک گیا تھا۔ اس کے لئے ہیجان خیزی اور ایڈونچر کی مختصر سی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ اب اسے واپس گھر کی طرف جانا تھا جہاں بوریت تھی' اولاد کے مزاج سے ناآشنا اور سخت دل باپ تھا اور تشنۂ تعبیر خواب تھے۔

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ گاڑی کی طرف جاتے جاتے پلٹ آیا۔ اپنے مخصوص احمقانہ انداز میں باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا "ویسے لونڈیا یہ بھی خوبصورت تھی جو آپ کو اٹھا کر لے ا[...] تھی۔ کافی دیر رہے آپ اس کے بنگلے میں۔ کیا کہہ رہی تھی؟"

"کہہ رہی تھی وسیم بھائی سے میرا سلام کہئے گا۔" میں[...] جواب دیا۔

اس کی ناک سکڑ گئی اور باچھیں مزید پھیل گئیں۔ مجھول[...] جسم کو ہلکے ہلکے جھٹکے لگنے لگے۔ حلق سے عجیب سی آواز بر[آمد] ہوئی۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی گاڑی پیٹرول ختم ہونے [کی] وجہ سے جھٹکے لے لے کر رکنے لگی ہو۔ دراصل وہ شرمیلے [...] انداز میں ہنس رہا تھا۔

"مذاق مت کریں چوہدری صاحب! سچی سچی بتائیں" وہ ا[...] کر بولا۔

"دیکھو...... میری تمہیں نصیحت ہے کہ اس لڑکی کو بہن بنا[نے] کے چکر میں مت پڑنا اور نہ ہی اس کی سراغ رسی کی کوش[ش] کرنا۔ یہ خطرناک معاملات ہیں۔ کہیں اپنی جان کو خطرے میں [نہ] ڈال لینا۔ سمجھ گئے نا؟"

"سمجھ گیا" اس نے اپنی پھیلی ہوئی باچھیں سکیڑ لیں۔ پھر دونوں اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔ اگلے چوراہے پر دونوں الگ الگ سمتوں میں مڑ گئے۔ کچھ دور جانے کے بعد میں گاڑی کی رفتار کم کرتے کرتے آخر کار اسے ایک جگہ روک لیا۔ میرے ذہن میں کھچڑی سی پک رہی تھی۔

مجھے اس لڑکی کو ایک بار پھر کریدنے کی کوشش کرنی چا[ہئے] تھی۔ مشکوک تو وہ میری نظر میں پہلے ہی تھی۔ اس کی کسی بات [پر] میں نے یقین نہیں کیا تھا لیکن وسیم کے بیان کے بعد تو اسے نن[...] بھی اس کا کوئی تعلق محسوس ہونے لگا تھا اور یوں وہ خطرناک حد تک مشکوک ہوگئی تھی۔ چند لمحے سوچنے کے بعد میں نے گا[ڑی] واپس موڑلی۔

جب میں دوبارہ اس بنگلے پر پہنچا تو اس پر بڑا سا وہی تالا جھ[ول] رہا تھا اور صبح کی ملگجی روشنی میں درودیوار گہرے سکوت میں ڈو[بے] ہوئے تھے۔ میں نے گاڑی سے اتر کر ایک لمحے سوچا' ادھر اُ[دھر] دیکھا پھر چار دیواری پر چڑھ کر اندر چھلانگ لگادی۔ میں نے نہا[یت] احتیاط سے پنجوں کے بل چھلانگ لگائی تھی۔ اس کے باوجود سر[...] ایسی دھمک ہوئی کہ ایک بار تو میرا دل چاہا کہ دونوں ہاتھوں سے تھام کر وہیں بیٹھ جاؤں لیکن میں نے صرف ایک لمحے کے لئے بر[آمدے] کے ستون کا سہارا لینے پر اکتفا کیا۔

پورچ میں حسنہ یا جو بھی اس کا اصل نام تھا۔ کی گا[ڑی] بھی اب موجود نہیں تھی۔ اندرونی دروازہ بھی مقفل تھا۔ میں [نے] عمارت کے چاروں طرف چکر لگایا۔ تمام کھڑکیاں دروازے مضب[وطی] سے بند تھے۔ ویسے بھی میری حسیات بتا رہی تھیں کہ وہ اب [...] موجود نہیں تھی۔ شاید میرے جاتے ہی نکل چکی تھی۔ سمت [...]

[...] اس نے۔ میں نے کوئی تالا کھولنے کی کوشش نہیں کی [...] چھلانگ کر واپس باہر آگیا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ حسنہ اب [...] اس گھر میں نہیں ملے گی۔ عین ممکن تھا کہ یہ اس کا گھر ہی [نہ ہو] لیکن جس انداز میں وہ گھر میں چل پھر رہی تھی اور چیزیں [...] کر استعمال کر رہی تھی اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کم از کم [...]ے خوب اچھی طرح مانوس ضرور تھی۔

[...] گھر واپس آگیا اور اپنے بیڈ روم میں پہنچتے ہی میں نے ٹیلی[فون سے م]نسلک ریکارڈنگ مشین کا سوئچ آن کیا۔ ٹونی کا ریکارڈ شدہ [پیغام موجو]د تھا۔

[...] میں نے اس سیاہ بیوک کا تعاقب کیا۔ وہ شخص یا تو حد [...]بدحواس تھا یا پھر نشے میں تھا۔ بہت خطرناک ڈرائیونگ [...]۔ وہ شیرپاؤ برج کی طرف مڑا تو میں اس کے بالکل قریب [...] لیکن شاید آپ کو معلوم ہو برج پر ایک جگہ حفاظتی جنگلا [...] ہوا ہے۔ چند دن پہلے ایک ٹرک کی اس جنگلے سے بڑی [ٹک]ر ہوئی تھی تاہم ٹرک نیچے گرنے سے بچ گیا تھا۔ جنگلے کی [مرمت] نہیں ہو سکی۔ وہیں شاید سڑک پر کچھ آئل بھی پھیلا [...] ایک تو وہ شخص بہت خراب ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ مجھے [...]کر نکلنے کی کوشش میں ہر حربہ آزما رہا تھا۔ دوسرے اس [...] پر آئل کی چمک بھی نہیں دیکھی۔ وہاں شاید اس نے [...]ر گاڑی عقب سے میری گاڑی سے ٹکرانی چاہی تھی لیکن [...]ی لیے اس کی گاڑی بری طرح پھسلتی ہوئی' ٹوٹے جنگلے کو [...]ا ہوئی نیچے ریلوے لائن پر جا گری۔ گاڑی نے کئی [قلابازیاں] بھی کھائی تھیں۔ فوراً ہی اس میں آگ لگ گئی۔ ریلوے [...] آس پاس ہی غیر قانونی جھگیوں پر مشتمل جو بستی ہے وہاں [کے] لوگ آن پہنچے۔ آگ بھی بجھالی گئی لیکن وہ شخص مرچکا [...] بھی کافی خراب حالت میں ملی۔ اسے سرکاری اسپتال میں [...] گیا ہے۔ دن چڑھے تک آپ کو مزید معلومات فراہم [کروں] گا۔"

[اس] کے علاوہ ANSWE RING اور ریکارڈنگ مشین میں [کوئی پیغام] موجود نہیں تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر سوئچ آف کر [...] ڈھیر ہو گیا۔

[...] بمشکل ایک گھنٹا سو پایا تھا جب میرے مخصوص ٹیلیفون کی [گھنٹی نے] مجھے جگا دیا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے میں نے ریسیور [...]

[دوسر]ی طرف ٹونی تھا۔ میرا احوال جاننے کے بعد وہ بولا "سر! [...]س کا نام احمد شجاع تھا اور وہ ریٹائرڈ ڈی آئی جی تھا۔ کچھ [...]ے اس نے خود ریٹائرمنٹ لے لی تھی حالاں کہ اس کی [...]ے چار پانچ سال باقی تھے۔ حادثاتی موت تھی۔ لاش اس [...]کے حوالے کردی گئی ہے۔"

[ری]ٹائرڈ ڈی آئی جی......؟" میں نے قدرے حیرت سے سوچا

اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "تمہارے پیغام میں اور تمہاری تازہ رپورٹ میں بھی ایک چیز کا کوئی ذکر نہیں ہے جس کے بارے میں' میں کافی متجسس ہوں۔ تمہیں معلوم ہے احمد شجاع کے پاس سیاہ رنگ کا لوہے یا کسی اور دھات کا ایک باکس سا موجود تھا؟"

"نہیں سر! میں نہیں دیکھ سکا تھا" ٹونی نے جواب دیا "میں جب موڑ کاٹ کر اس گلی میں داخل ہوا اس وقت وہ گاڑی میں بیٹھ کر فرار ہو رہا تھا اور آپ گر چکے تھے۔ تاہم میں نے دیکھ لیا تھا کہ آپ زیادہ زخمی نہیں ہیں۔ اس لئے میں نے آپ کے پاس رکنے کے بجائے اس کا تعاقب کرنے کو ترجیح دی۔"

"وہ تو خیر تم نے اچھا کیا" میں نے نیند سے بوجھل آواز میں کہا۔

"لیکن حادثے کے بعد تم نے اس قسم کی کوئی چیز اس گاڑی سے برآمد ہوتے تو نہیں دیکھی؟"

"نہیں سر!" ٹونی نے جواب دیا "حادثے کے فوراً بعد لوگوں نے آگ بجھانے اور گاڑی ٹھنڈی ہونے کے بعد گاڑی کی تلاشی لی تھی کیوں کہ ایک تو انہیں ایسی کوئی چیز نہیں مل رہی تھی جس سے اس شخص کی شناخت میں مدد مل سکتی۔ دوسرے وہ نہیں چاہتے تھے کہ بے چارے کی کوئی قیمتی چیز تباہ شدہ گاڑی میں رہ جائے اور بعد میں کوئی پار کرلے۔ وہ اس کی ہر چیز لاش کے ساتھ ہی اسپتال پہنچانا چاہتے تھے تاکہ جب اس کے لواحقین لاش لینے آئیں تو چیزیں بھی وصول کرلیں۔ چھوٹی موٹی چیزیں تباہ شدہ سی حالت میں گاڑی سے برآمد ہوئیں لیکن اس قسم کا کوئی باکس یا بریف کیس وغیرہ نہیں نکلا تھا۔ میں نے خود تلاشی لینے والوں پر نظر رکھی تھی۔"

"اور وہ شخص تعاقب کے دوران بھی تمہاری نظر سے قطعاً اوجھل نہیں ہوا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"صرف ایک موڑ پر چند سیکنڈ کے لئے اس کی گاڑی میری نظر سے اوجھل رہی تھی۔ وہ پہلے موڑ عبور کرگیا تھا لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اس نے راستے میں کہیں کوئی چیز پھینکی ہوگی" ٹونی بولا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ جو چیز اس نے جان پر کھیل کر اپنے قبضے میں رکھی تھی' اسے وہ کیسے پھینک سکتا تھا۔

لیکن سوال یہ تھا کہ وہ باکس پھر کہاں گیا؟

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "مجھے ذرا اس کا ایڈریس لکھواؤ۔ میں خود جا کر دیکھوں گا۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے۔"

ٹونی نے ایڈریس مجھے لکھوا دیا۔ وہ کینٹ کے علاقے کا ایڈریس تھا۔ میں نے اس خیال سے ایڈریس لے لیا تھا کہ شاید بعد میں کار کے ملبے سے وہ دھات کا باکس برآمد ہو گیا ہو اور احمد شجاع کے گھر پہنچا دیا گیا ہو' شاید اس کے گھر کے کسی فرد سے مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے۔

دل میں یہی امید لے کر میں سوئم والے دن احمد شجاع کے ہاں جا پہنچا۔ میرے خیال میں یہ ایک ایسا موقع تھا جب متوفی سے اپنی تعلق داری کے بارے میں کوئی بھی دعویٰ کیا جا سکتا تھا اور اس کے اہلِ خانہ کے زیادہ سے زیادہ قریب جانے کی کوشش کی جا سکتی تھی۔

احمد شجاع کے گھر پہنچ کر مجھے خاصی حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ گھر کیا تھا' ایک اچھا بھلا قلعہ تھا۔ کینٹ جیسے مہنگے علاقے میں اتنا طویل و عریض اور عالیشان مکان ہونا کوئی معنی رکھتا تھا۔ گلی میں دونوں طرف قیمتی کاروں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈی آئی جی بڑی چیز ہوتا ہے۔ سرکار کی طرف سے جائز ذرائع سے بھی اسے بہت کچھ ملتا ہے لیکن

کوٹھی کی شان و شوکت میری آنکھ میں کچھ کھٹکی تھی۔ در و دیوار دیکھ کر ہی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کس آراستہ و پیراستہ ہوگی۔ دیواروں سے کئی کئی ائر کنڈیشنر ہے تھے۔ طویل و عریض پورچ میں پانچ بیش قیمت کاریں جیپ کھڑی تھی۔ یہ کاریں اور جیپ اس کیڈلک کے علاوہ حادثے میں تباہ ہو چکی تھی۔ باہر کھڑی کاریں تو مہمانوں کی پورچ میں کھڑی ہوئی کاریں یقیناً اہلِ خانہ ہی کی تھیں۔ پر شامیانے لگے ہوئے تھے۔ بوفے ٹیبلز سجی ہوئی یوں باوردی بیرے مستعدی سے اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ تے جا رہے تھے۔ دو تین نوجوانوں سے اظہار افسوس رہے تھے اور کھا پی کر رخصت ہوتے جا رہے تھے۔ فضا کھانوں اور ان کے لوازمات کی خوشبو میں پھیلی ہوئی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک مشہور کیٹرنگ سروس کی گاڑی ور کھانے پینے کی چیزیں پہنچا کر چلی جاتی تھی۔

ان بھی بس اظہارِ افسوس کرنے تک سنجیدہ اور بوجھل سی ے نظر آتے لیکن جونہی کھانے کی میز پر پہنچتے ہنسی مذاق جاتا تھا۔ سوئم کیا تھا' اچھا بھلا شادی کا سا سماں دکھائی تھا۔ عجیب زمانہ آگیا تھا۔ شادی اور مرگ میں کوئی خاص ظر نہیں آتا تھا۔

تینوں نوجوان یقیناً احمد شجاع کے بیٹے تھے جن سے لوگ رہے تھے۔ ان کی عمروں میں تھوڑا تھوڑا ہی فرق تھا۔ بڑی شباہت تھی اور ان تینوں کی شخصیتوں میں احمد شجاع ی جھلک تھی۔ احمد شجاع کو میں نے ملگجے اندھیرے میں چند لئے دیکھا تھا اور وہ چند لمحے بھی زندگی اور موت کی کشمکش رت تھے لیکن اس کا سراپا میری نگاہوں میں محفوظ ہو گیا مدت بعد کوئی شخص مجھے اس طرح زک پہنچا کر بھاگنے یاب ہوا تھا۔ اگر وہ مر نہ گیا ہوتا تو میرے دل میں خواہ مخواہ لے میں خلش سی بیٹھ جاتی۔

ں فوری طور پر ان نوجوانوں کے پاس تعزیت کرنے نہیں ایک طرف کو بیٹھ کر ایک بیرے سے کوک لے کر دھیرے چسکیاں لینے لگا۔ میں یونہی ذرا گرد و پیش کا جائزہ لے رہا یہ ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا کیونکہ اسی دوران مجھے وہاں ں آئی شریف سیال نظر آگیا۔

ں سرسری نظر سے دیکھ کر تو شاید اسے پہچان ہی نہ پاتا۔ وہ اس میں تھا جبکہ میں نے اسے جتنی بار بھی دیکھا تھا' وردی دیکھا تھا۔ سادہ لباس میں تو وہ بہت ہی مختلف نظر آرہا تھا۔ والے عام طور پر سادہ لباس میں بھی پہچانے جاتے ہیں کہ وہ والے ہیں۔ لیکن شریف سیال پر تو کوئی شبہ تک نہیں تھا کہ وہ پولیس والا ہے۔ اسے گاما حلوائی ننھا نانبائی یا شیدا لانڈری کچھ بھی سمجھا جا سکتا تھا' پولیس والا نہیں سمجھا جا سکتا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ دونوں بازو پھیلا کر میری طرف بڑھا اور چہکا۔

"اوئے بلے بلے ...... ایتھے تے اپنے چوہدری صاحب وی آئے ہوئے نیں......"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ زیادہ لوگ میری طرف متوجہ ہوں۔ میں حتی الامکان غیر نمایاں نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک طرف کو دبکا بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود کئی افراد نے بار بار مڑ کر میری طرف دیکھا۔ شریف سیال تو اپنی جھنکے دار چہکار سے چھوٹا موٹا مجمع لگا سکتا تھا۔

میرا اشارہ پا کر وہ میرے برابر والی کرسی پر آبیٹھا۔ میں نے طویل سانس لے کر نیچی آواز میں کہا۔ "تو تم بھی احمد شجاع صاحب کو جانتے تھے۔" میں نے اپنے لہجے کو سوالیہ بنانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"میرے تو وہ ڈیپارٹمنٹ کے آدمی تھے چوہدری صاحب!" وہ قدرے فخریہ سے لہجے میں بولا "تھے تو وہ بہت بڑے افسر لیکن مجھے ڈائریکٹ جانتے تھے۔ میں اس وقت ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ بڑے دل والے آدمی تھے۔ غرور اور افسرانہ اکڑ بالکل نہیں تھی ان میں۔ کئی بار انہوں نے چھوٹی موٹی باتوں پر انعام سے نوازا۔ محکمے کی طرف سے نہیں' بلکہ اپنی جیب خاص سے۔" اس کے چہرے پر عجیب سی چمک تھی۔ بے شک اس کے لہجے میں عقیدت اور ممنونیت تھی لیکن اس کی تہ میں کوئی اور تاثر بھی چھپا ہوا تھا جسے میں کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "آپ کے کب واقف بنے تھے؟"

شریف سیال ایسا آدمی تھا جس سے کم از کم مجھے جھوٹ بولنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی اور میں اسے بلا تکلف کرید بھی سکتا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا "میری ان سے کوئی خاص شناسائی نہیں تھی۔ میں پہلی بار ان کے گھر آیا ہوں۔ کیا مرحوم خاندانی طور پر خاصے کھاتے پیتے آدمی تھے؟ رہن سہن بڑا ٹھاٹ وارد کھائی دے رہا ہے۔"

وہ عجیب سے انداز میں بے آواز طریقے سے ہنسا اور ادھر اُدھر دیکھ کر گردن میری طرف جھکاتے ہوئے نیچی آواز میں بولا۔ "کسی کے سوئم پر اس قسم کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں' اچھا نہیں لگتا۔ لیکن آپ میرے زیادہ مربی و محسن ہیں' اب آپ سے کیا چھپانا۔ آپ تو ان کا یہ ایک ہی گھر دیکھ کر شاید اندر ہی اندر کچھ حیران و پریشان سے ہو رہے ہیں۔ ان کی جائیداد کا تو کچھ پتا ہی نہیں ہے' کہاں کہاں کس کس طرح کی کوٹھیاں اور بنگلے بکھرے ہوئے ہیں......" وہ ایک بار پھر گویا سائیلنسر لگا کر ہنسنے لگا۔

ہنسی تھمی تو وہ سرگوشی میں بولا۔ "شجاع صاحب بڑے دھڑلے

کے آدمی تھے۔ بہادری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ یعنی رشوت کھانے کے معاملے میں کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔ بے خوف و خطر کھاتے تھے اور بے حساب کھاتے تھے۔ ظاہر ہے ان کا عہدہ بھی کچھ ایسا تھا۔ سیکڑوں اور ہزاروں کی باتیں تو ان سے ہو نہیں سکتی تھیں۔ لمبے ہی معاملات ان کے پاس جاکر پھنستے تھے۔ لاکھوں کے چکر ہوتے تھے۔ چھوٹے موٹے نذرانوں والے معاملے تو نیچے ہی نیچے طے ہوجاتے ہیں نا۔ لوگ حسبِ مراتب اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ شجاع صاحب مہینے میں دو تین شکار کرلیتے تھے۔ باقی دن آرام سے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر ڈکاریں لیتے گزر جاتے تھے۔"

"کیا نوکری کے دوران بھی موصوف اسی شان و شوکت سے رہتے تھے؟" میں نے ایک بار پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ شان و شوکت تو ریٹائرمنٹ کے بعد آئی تھی۔ بہرحال دورِ ملازمت میں بھی کچھ کم نہیں تھی۔ لڑکوں کو تو اسی زمانے میں کام سے لگا دیا تھا۔ کارخانے لگوا دیئے تھے ہر ایک کو الگ الگ۔"

"اور کوئی انہیں نہیں پوچھتا تھا کہ یہ کیا سلسلہ ہے؟ کہاں سے آرہی ہے اتنی دولت؟" میں نے پوچھا' حالانکہ اس سوال کے تمام ممکنہ جوابات مجھے معلوم تھے۔

"پوچھنے والوں کے گھر بھی بڑے بڑے نذرانے' تحفے تحائف جاتے رہتے ہیں جی۔ ایک بار جب میں کسی گمنام شخص کی طرف سے تحفے میں آئے ہوئے دو لاکھ روپے کا بریف کیس لے کر سخت گھبرایا ہوا آپ کے پاس پہنچا تھا تو آپ ہی نے تو مجھے بتایا تھا اور تسلیاں دی تھیں کہ لوگ کیا کچھ کررہے ہیں لیکن کوئی انہیں کچھ نہیں کہہ رہا۔ مجھے لگتا ہے آپ کو ساری باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن آپ یونہی سیدھے اور معصوم بن کر سب کچھ پوچھتے رہتے ہیں۔" وہ بغور میری طرف دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے مسکرایا۔

"ہاں۔ مجھے معلوم تو بہت کچھ ہوتا ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "پھر بھی...... پوچھتے رہنے سے کوئی نہ کوئی نئی بات معلوم ہوتی ہی رہتی ہے۔ کوئی نہ کوئی مختلف نکتہ سامنے آتا ہی رہتا ہے۔ تم بتاتے رہو۔ بتانے میں کیا حرج ہے۔"

جی ہاں۔ آپ تو اپنے ہی آدمی ہیں' آپ سے تو ساری گپ شپ لگتی رہتی ہے" وہ مطمئن لہجے میں بولا۔ "آپ کو تو معلوم ہی ہے' یہ جو کھانے پینے کا سلسلہ ہے یہ بھی اوپر سے نیچے تک ایک مربوط نظام ہے۔ میں تو ایک ڈرپوک آدمی ہوں' اس نظام میں پوری طرح داخل نہیں ہوسکا۔ لیکن ایک مرتبہ آدمی اس میں گھس جائے تو اس بڑی سی مشین کا ایک پرزہ بن جاتا ہے۔ آرام سے اپنا کام بھی کرتا رہتا ہے۔ اور اس کی مدد سے دوسروں کا کام چلتا رہتا ہے۔"

اندر سے قرآن خوانی کی آواز آرہی تھی۔ مدھم سی یہ اجتماعی آواز کبھی بالکل معدوم ہوجاتی تھی۔ مرحوم کو ایصال ثواب کے لئے قرآن ختم کئے جارہے تھے۔ پورچ کی طرف سے خواتین رفت جاری تھی۔ وہ اندر کہیں جارہی تھیں۔ مردوں میں جنہیں قرآن خوانی میں شرکت کرنا تھی' وہ ڈرائنگ روم جاتے تھے۔

شریف سیال ایک نظر پورچ کی طرف دیکھ کر مدھم بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "شجاع صاحب تو بڑے ا انہیں تو ویسے بھی چھوٹے موٹے آدمی تو پوچھ ہی نہیں سکتے بڑے لوگوں سے ان کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ بہت بڑ لوگوں کو ان سے..... بڑے بڑے کام پڑتے رہتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی چوہدری صاحب۔!" اس۔ ٹھنڈی سانس لی "کہ شجاع صاحب سے ویسے بھی کوئی کچھ نہیں سکتا تھا۔ قانونی طور پر ان کے سارے کام پکے تھے۔ پر ایسے افسروں کی دو چار ایکڑ بھی خاندانی زمین ہوتی ہے تو زمیندار مشہور ہوتے ہیں۔ اور اگر نہیں بھی ہوتی تو وہ دیتے ہیں۔ خواہ انہوں نے جاکر ان زمینوں کی شکل بھی نہ لیکن حیرت انگیز طور پر وہ انہیں بڑی آمدنی دیتی رہتی ہے۔ سارے ٹھاٹ باٹ زمینداری کے مرہونِ منت نظر آ شجاع صاحب کا بھی یہی سلسلہ تھا۔ پہلے زمینداری کی آڑ رہی۔ پھر اس کی "آمدنی" اور کچھ قرضے وغیرہ ملا کر کار لئے۔ آپ کو پتا ہی ہے ایک بار آدمی کی لائن سیدھی ہوجا چل سو چل۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"لوگ بڑی تعریف کرتے ہیں کہ شجاع صاحب نے کی' اپنے وسائل کو بڑے صحیح طریقے سے استعمال کر واقفان حال جانتے ہیں کہ سارا پیسے کا کھیل ہے۔ اور سے آیا تھا' یہ بھی جانتے ہیں۔ لیکن چوہدری صاحب! روپیہ ہی ہوتا ہے۔ اس کی کوئی قسم' کوئی ذات کوئی ک ہوتی۔ روپے کو سلام ہوتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں' ان کے بعد بھی کیسے کیسے لوگ ان کے روپے کو سلام کرنے آ ہیں۔" اس نے آنکھوں سے گرد و پیش کی طرف اشارہ کیا۔

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا اور سر جھٹک کر وہ اپنے گا سے تھپتھپاتے ہوئے بولا "توبہ۔ توبہ! کتنے کمینے ہوگئے لوگ۔ کسی کے سوئم پر کیسی باتیں کررہے ہیں۔ ورنہ ٹے منہ

"کیا کریں' اتفاق سے موقع ہی اب میسر آیا ہے" "اس سے پہلے بھلا ہم احمد شجاع کے بارے میں کب اور کرسکتے تھے؟"

"ہاں۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ اب ہمیں مرحوم کی تھوڑی سی تعریف بھی کرلینی چاہئے کوئی شک نہیں کہ مرحوم تھے بہت اچھے آدمی۔ ان کی خا ہمیں کیا مطلب؟ ہمیں تو ان خامیوں سے کوئی نقصان

میں تو ان کے سامنے ایک بہت ہی ادنیٰ آدمی تھا لیکن مجھے نے ہمیشہ کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ انعام و سے نوازتے رہے۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ ہم ایک ہی کے تھے۔ میں جب چھوٹا تھا تب سے انہیں جانتا تھا۔ باپ دادا ان کے باپ دادا کو جانتے تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ ع میں ان کی کوئی زمین وغیرہ نہیں تھی۔ اور وہ کوئی ایسے ال آدمی نہیں تھے۔ ان کا خاندان ہمارے خاندان سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ شاید وہ یہی چاہتے ہوں کہ میں کسی سے ان خاندانی پس منظر کا ذکر نہ کروں۔"

وہ سیدھا آدمی تھا لیکن سمجھتا بہرحال سب کچھ تھا۔ میں نے دور کھڑے ہوئے تین ہم شکل سے نوجوانوں کی طرف اشارہ تے ہوئے تصدیق چاہی۔ "یہ تینوں شجاع صاحب کے بیٹے ہیں

"جی ہاں۔ آپ ان سے نہیں ملے؟" شریف سیال بولا۔ ے لڑکے ہیں۔ لڑکپن میں ہی صنعتکار بن گئے ہیں۔ سرکاری سے بعض لوگوں کی تو سات نسلیں سنور جاتی ہیں۔ اسی لئے تو ے ہاں سرکاری نوکریوں کے لئے اتنی کھینچا تانی' بلکہ قتل و خون تے ہیں۔ ہمارا تو سیاسی نظام بھی سرکاری نوکریوں کے گرد گھوم ہے۔ ہر پارٹی اپنے جاں نثاروں سے وعدے کرتی ہے کہ وہ ار میں آتے ہی انہیں نوکریوں سے نوازے گی۔ اور یہ بات گویا خانے طے شدہ ہوتی ہے کہ نوکری سے مراد صرف نوکری ۔ بلکہ "سرکاری نوکری" ہوگی۔ اور وہ بھی کچھ اس قسم کی ی جس میں تنخواہ اگر ہزار روپے ماہوار ہوگی تو اوپر کی آمدنی ہزار روپے روزانہ۔ اسی لئے تو سر دھڑ کی بازی لگی رہتی ہے۔ تو حیران ہوں کہ اگر ہماری ہوس کا یہی عالم رہا تو ہمارا انجام کیا ا؟"

"اگر ہم شتر مرغ بن کر ریت میں منہ نہ چھپائیں تو انجام کا ازہ تو کرسکتے ہیں۔" میں نے کہا "خیر۔ یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ زرا مرحوم کے لڑکوں سے تو مل لوں' میں نے تو ابھی تک تعزیت نہیں کی۔"

"آپ پسند کریں تو میں ان سے آپ کا تعارف کرا دیتا ہوں۔ ردار ہیں اپنے' بڑی عزت کرتے ہیں۔" شریف سیال اٹھتے ے بولا۔

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کے کندھے پر رکھ کر اسے بٹھاتے ہوئے کہا "میں خود ہی مل لوں گا۔"

ان تینوں نوجوانوں کے پاس پہنچ کر میں نے اپنا تعارف کرایا شجاع صاحب کی ناگہانی موت پر افسوس کا اظہار کرنے لگا۔ ایسے شخص کی موت پر اظہارِ افسوس مجھے عجیب لگ رہا تھا انے بغیر کسی دشمنی کے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگر پنی کوشش میں کامیاب ہوگیا ہوتا تو آج اس کی جگہ میرا سوئم ہورہا ہوتا۔ تینوں نوجوان کچھ مغموم اور کچھ تشکر بھرے انداز میں سر ہلاتے رہے۔ حتیٰ کہ کچھ دیر میں نے مرحوم کی اعلیٰ صفات پر بھی تبادلۂ خیال کیا۔ وہ اعلیٰ صفات جن کا مجھے ذرا بھی علم نہیں تھا۔

جب خاصی دیر اس طرح کی باتیں ہوچکیں تو چند لمحوں کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "شجاع صاحب سے میری شناسائی زیادہ پرانی نہیں' اس لئے آپ لوگوں سے بھی ملاقات کا موقع نہیں آسکا تھا۔ لیکن کاروباری طور پر ہمارا تعلق بہت مضبوط ہورہا تھا اور مستقبل قریب میں اس کے مزید مضبوط ہونے کے امکانات تھے۔ ان کی بے وقت موت نے جہاں وہ سلسلہ خطرے میں ڈال دیا' وہیں ایک الجھن بھی کھڑی کردی۔ لیکن چلئے چھوڑیئے۔ اس موقع پر اس قسم کی باتیں کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

بڑا لڑکا جس کا نام سرور تھا' قدرے چونکتے ہوئے بولا۔ "نہیں' نہیں۔ آپ تکلف نہ کریں۔ اطمینان سے باتیں کریں۔ ویسے تو ڈیڈی کے سارے کاروباری معاملات ہمارے ہی ہاتھوں میں تھے۔ وہ تو صحیح معنوں میں ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے تھے۔ ہم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ آپ گھومیں پھریں عیش کریں۔ زندگی بھر آپ نے محنت کی ہے۔ اب ہر ذمے داری ہم پر ڈال دیں۔ لیکن انہوں نے کبھی آپ سے کسی کاروباری تعلق کا ذکر نہیں کیا۔ تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ اتنے بڑے آدمی ہیں۔ آپ سے تعلق ہمارے لئے فخر کا باعث ہوگا۔ ڈیڈی سے اگر آپ کی کوئی بات ہوئی تھی تو ہم اسے نباہیں گے۔ ہم نے ہمیشہ ان کے تمام کاموں' تمام ذمے داریوں کو اون کیا ہے۔ اگر ان کی طرف کوئی لین دین تھا تو ہم اسے بھی پورا کریں گے۔ آپ بلا تکلف بات کریں۔ موقع کی فکر نہ کریں۔ جو باتیں کل ہونی ہیں وہ اگر آج ہوجائیں تو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

سرور بڑا شیریں زبان نوجوان تھا۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہم ذرا ایک خاص قسم کے پروجیکٹ پر کام کررہے تھے۔ ابھی تو اس کی کوئی شکل ہی نہیں بنی تھی اس لئے کسی سے اس کے بارے میں بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔" میں نے اپنے لہجے کو معنی خیز بنانے کی کوشش کی۔

سرور نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "معاملہ لین دین کا نہیں' صرف ایک چھوٹی سی امانت کا ہے۔"

اس کے چہرے پر قدرے طمانیت ابھر آئی۔ شاید اس لئے کہ میں کسی رقم وغیرہ کا دعوے دار ثابت نہیں ہوا تھا۔ میں نے نظر اس کے چہرے پر جمائے رکھی اور کہا۔ "وہ لوہے کا ایک سیاہ رنگ کا باکس تھا' چھوٹی سی ایک تجوری سے مشابہ۔ لیکن وہ چاروں طرف سے بند تھا۔ اس کا کوئی حصہ کھلنے والا دکھائی نہیں دیتا تھا۔" میں نے اچھی طرح وضاحت سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کس قسم کا باکس تھا۔ ہاتھوں کے اشاروں کی مدد سے میں نے اس

کا سائز بھی واضح کرنے کی کوشش کی۔

اس کی ساخت کے بارے میں سمجھانے کے بعد میں نے کہا۔ "حادثے سے کچھ دیر پہلے جو باکس شجاع صاحب کے پاس تھا، وہ میری امانت تھا۔ شاید پولیس یا اسپتال والوں نے وہ آپ کو دیا ہو۔ یا آپ کو اس کے بارے میں کچھ علم ہو۔ وہ مجھے واپس چاہئے تھا۔"

تینوں بھائیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر سرور ہی بولا۔ "اس قسم کا تو کوئی باکس ہمیں کسی ذریعے سے نہیں ملا۔ اور نہ ہی ہمیں اس کے بارے میں کچھ علم ہے۔ کیا تھا اس باکس میں؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔" میں نے دیانتداری سے کہا۔ "میرے پاس بھی درحقیقت وہ کسی اور کی امانت تھا۔ شجاع صاحب کے انتقال کے بعد اسے واپس پہنچانا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔ یوں سمجھ لیں کہ وہ باکس جس شخص کا تھا اسے ہمارے پروجیکٹ میں ہمارا تیسرا پارٹنر بننا تھا۔ وہ باکس کسی اور شخص کے لئے بالکل بے کار ہے۔ یہ مجھے اس کے اصل مالک نے بتایا ہے۔ اب شجاع صاحب کے بغیر پروگرام پر عملدرآمد نہیں ہو سکے گا، سارا منصوبہ منسوخ کر دیا گیا ہے۔"

سرور بے بسی آمیز سے لہجے میں بولا۔ "لیکن ہم اب اس سلسلے میں تو آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے، ہمیں تو اس باکس کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم۔ تباہ شدہ کار کو بھی ہم نے خود جا کر دیکھا تھا۔ اس میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ ڈیڈی نے اشارتاً بھی کبھی اس قسم کی کسی چیز کا ہم سے کوئی ذکر نہیں کیا۔ اگر ہمیں کچھ معلوم ہوتا تو میں ضرور اس کے بارے میں عرض کر دیتا۔" اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ سچ ہی بول رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "خیر۔ چلئے کوئی بات نہیں۔ لیکن اسے ذہن میں ضرور رکھئے گا۔ اگر اس سلسلے میں کوئی بات سامنے آئے تو مجھے ضرور مطلع کیجئے گا۔ خواہ وہ آپ کو کتنی ہی غیر اہم محسوس ہو" میں نے اپنا وزیٹنگ کارڈ سرور کو دے دیا۔

کارڈ کا جائزہ لیتے ہوئے وہ ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں بولا۔ "آپ کو کیسے یقین ہے کہ حادثے سے کچھ دیر پہلے وہ باکس ڈیڈی کے پاس تھا؟ آپ نے باکس ڈیڈی کو دیا تھا یا آپ خود ان کے ساتھ تھے؟"

"نہ تو میں ان کے ساتھ تھا اور نہ ہی باکس میں نے ان کے حوالے کیا تھا۔" میں نے کچھ سوچ کر کہا۔ "بلکہ مجھے یہ بات ایک لڑکی نے بتائی ہے۔ جس سے وہ شادی کرنے والے تھے۔"

تینوں کو بیک وقت خاصا زوردار جھٹکا لگا اور تینوں نے ایک ساتھ ہی دزدیدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا، گویا اس خیال سے سہم گئے ہوں کہ یہ بات کسی نے سن نہ لی ہو۔

سرور تھوک نگل کر بولا۔ "آیئے اُدھر چل کر بات کرتے ہیں" وہ مجھے شامیانے سے باہر لان کے ایک گوشے میں لے جہاں لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ باقی دونوں بھائی شامیانے میں ہی رہ گئے۔

ایک بار پھر وہ محتاط سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ کر بولا "مجھے ڈر تھا کہ کوئی عزیز رشتے دار اس قسم کی بات نہ سن لے ممی کے کان میں نہ ڈال دے۔ اس عمر میں اس قسم کی بات سن ظاہر ہے ممی کی سائیکالوجی پر کچھ اچھے اثرات مرتب نہیں گے۔"

مجھے یقین تھا کہ اچھے اثرات تو خود اس کی اپنی سائیکالوجی بھی مرتب نہیں ہوئے تھے تاہم میں نے اس سلسلے میں کچھ کہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "کون ہے وہ لڑکی؟"

"حسنہ اس کا نام ہے۔ ویسے مجھے شبہ ہے کہ یہ اس کا نام نہیں ہے" میں نے اطمینان سے کہا "میں اس کے بارے زیادہ نہیں جانتا تاہم مجھے اس کا ایڈریس معلوم ہے۔" میں اسے گارڈن ٹاؤن کی اس کوٹھی کا نام بتایا جس میں حسنہ مجھے گئی تھی۔

وہ قدرے چونک کر بولا "یہ کوٹھی تو ہماری ہی ہے۔ ڈیڈی کہتا تھا کہ انہوں نے کسی کو کرائے پر دے رکھی ہے۔"

"اس جملے میں شاید "کرائے" کا لفظ فاضل ہو۔ حسنہ کو رکھی ہو گی۔" میں نے سادگی سے کہا۔ میں تو یہ بھی کہنا چاہتا کرایہ شاید وہ کسی اور شکل میں وصول کرتے ہوں گے۔ لیکن نے اپنے آپ کو یہ جملہ کہنے سے باز رکھا۔

وہ ایک لمحے الجھن آمیز انداز میں ہاتھ مسلنے کے بعد "دیکھیں چوہدری صاحب! اب آپ سے کیا چھپانا۔ ڈیڈی نے بھرپور زندگی گزاری۔ جوانی میں تو وہ عورتوں کے معاملے ...... منہ زور تھے ہی۔ لیکن جوں جوں بڑھاپا آ رہا تھا انگیز طور پر وہ اور بھی وہ ہوتے جا رہے تھے۔ کیا کہنا چاہئے" وہ گویا کوئی موزوں لفظ تلاش نہیں کر پا رہا تھا۔ آخر باپ کا تھا۔

"عیاش۔" میں نے سنجیدگی سے اس کے جملے میں خالی کر دی۔ اس نے یوں مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھ اسے مجھ جیسے شریف آدمی سے اپنے باپ کے بارے میں موقع پر ایسے لفظ کے استعمال کی توقع نہیں تھی۔

تاہم اس لفظ کو اس نے گویا ذہنی طور پر قبول کر لیا اور میں سر ہلاتے ہوئے قدرے خجالت سے بولا۔ "ہاں۔ بس لیجئے۔ اس عمر میں بھی ایک سے ایک خوبصورت اور نوخیز لڑکی کے مراسم رہتے تھے۔ لیکن یہ سب حرکتیں وہ ممی سے چھپ کرتے تھے۔ یہ بات نہیں تھی کہ وہ ممی سے ڈرتے تھے یا زن قسم کی چیز تھے۔ ڈرتے تو شاید وہ کسی سے بھی نہیں تھے۔ بس ہی انہوں نے ممی کا وہ مان اور احترام ہمیشہ قائم رکھا جو ایک

کے سامنے انہوں نے کبھی ڈھٹائی کا مظاہرہ کرنے یا دل توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا مطلب ہے وہ شادی کے کبھی نہیں پڑے۔ اس معاملے میں وہ بڑے ٹھیک آدمی اپنے طور طریقوں کا اثر انہوں نے اپنے گھر پر کبھی پڑنے دیا۔ ان کی گھریلو زندگی میں کبھی کوئی خلل نہیں آیا۔"

"عیش و عشرت کے بھی کچھ اصول ہونے چاہئیں۔" میں نے ت سے سرہلایا۔

"وہ ہر معاملے میں بڑے بااصول آدمی تھے چوہدری ب!" سرور نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ وہ واقعی فرزندی کا حق کر رہا تھا۔ باپ اس کے لئے دولت و جائیداد چھوڑ کر مرا تھا تو ے مرحوم کی ہر ادا میں اصول پسندی نظر آ رہی تھی۔

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "میں گارڈن ٹاؤن والی کوٹھی میں جا کر دیکھوں گا کہ وہ لڑکی کون ہے اور ڈیڈی سے اس کیا معاملہ تھا۔ باکس کے بارے میں اگر کوئی بھی بات معلوم سکی تو میں ضرور آپ کو اطلاع دوں گا۔"

"بہت شکریہ۔ میں اب چلتا ہوں۔" میں نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ مجھے یقین تھا کہ حسنہ اب اسے کوٹھی میں نہیں ملے گی۔

"آپ نے کھانا وغیرہ کھایا؟" سرور کو دفعتاً آداب میزبانی کا خیال آیا۔

"نہیں۔ بس بہت شکریہ۔ یہ سوئم وغیرہ کے اتنے پُرتکلف اور پُراہتمام کھانے میرے حلق سے نیچے نہیں اترتے۔" میں نے کہا۔ اور جواب کا انتظار کئے بغیر تیزی سے جانے کے لئے مڑ گیا۔

واپسی میں میں شریف سیال سے ملنے کے لئے ذرا رک گیا۔ وہ اس وقت بوفے ٹیبل پر تھا اور ایک چرغے پر ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ ہاتھ گندے کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ چھری کانٹے کا تکلف کرنے والا آدمی نہیں تھا۔

"چوہدری صاحب!" وہ مجھے جاتے دیکھ کر چونک کر بولا۔ "میں آپ کو یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ میں نے آپ کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اس رقم سے مکان خرید لیا تھا جو کسی نامعلوم مہربان نے مجھے بھجوائی تھی۔ تھوڑا سا قرضہ بھی پکڑ لیا تھا۔ بڑا اچھا مکان مل گیا تھا۔ بیوی بچے بڑے خوش ہیں۔ آپ کو دن رات دعائیں دیتے ہیں۔ میں بھی آپ کو بہت دعائیں دیتا ہوں۔"

"لیکن میں نے تو تمہارے لئے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں نے تو صرف مشورہ دیا تھا۔" میں نے حقیقتاً ذرا حیرت سے کہا۔

"چوہدری صاحب! مشورہ بھی اگر کسی بڑے آدمی کا ہو، سمجھدار آدمی کا ہو۔ اور اس میں اس کا خلوص بھی شامل ہو تو اس مشورے سے بڑھ کر قیمتی چیز کیا ہو سکتی ہے۔" وہ حقیقی ممنونیت سے بولا "ویسے بھی میں تو محسوس کرتا ہوں کہ جب سے میری آپ سے شناسائی ہوئی ہے میرے حالات کچھ بدلتے جا رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ سے صرف شناسائی رکھنا بھی مجھ جیسے غربا کے لئے بخت آور ثابت ہوتا ہے۔"

"اب اتنا بھی شرمندہ مت کرو شریف!" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "خالی خولی مشوروں کے بدلے دعائیں کیا لینا۔ ایسا کرو، کل شام گھر پر ہی رہنا۔ میرے دفتر سے کوئی آدمی آکر تمہارے مکان کا جائزہ لے جائے گا اور اسے معقول طریقے سے فرنش کرا دے گا۔ اب مکان ہو گیا ہے تو اس کی سجاوٹ بھی تمہاری خوشی کے مطابق ہو جانی چاہئے۔ تم صرف اتنی زحمت کرنا کہ میرے آفس فون کر کے میری سیکریٹری کو اپنا ایڈریس لکھوا دینا۔ میں ابھی آفس ہی جا رہا ہوں۔ اسے اس سلسلے میں ہدایات دے دوں گا۔"

یہ کہہ کر میں گیٹ کی طرف چل دیا۔ وہ چرغا چھوڑ کر میرے پیچھے لپکا اور مرتعش لہجے میں بولا۔ "چوہدری صاحب! ایمان نال، اللہ دی قسمے اس مہربانی کی ضرورت نہیں۔ میرے لئے تو یہی بڑا اعزاز ہے کہ آپ جیسا بڑا آدمی میرا مہربان، میرا شناسا اور دوست ہے۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں چاہئے۔ آپ کی دعاؤں سے مکان ہو گیا ہے تو مرضی کا فرنیچر بھی ہو جائے گا۔ مجھے نہ تو جلدی ہے اور نہ ہی لالچ۔"

"اسی لئے تو میں یہ انتظام کر رہا ہوں۔ میں ان لوگوں کا بڑا قدردان ہوں جنہیں نہ تو اپنی خواہشات کی تکمیل کی عجلت ہوتی ہے اور نہ ہی لالچ۔" میں نے رکے بغیر کہا۔

وہ میرے ساتھ ڈگ بھرتا آ رہا تھا۔ چرغے کی بوٹی اس کے منہ میں ہی پھنسی رہ گئی تھی۔ گھٹی گھٹی آواز میں اس نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکتے ہوئے کہا۔ "بکواس بند کرو اور جا کر کھانا کھاؤ۔ بالکل اسی طرح کرنا جس طرح میں نے کہا ہے ورنہ یاد رکھنا کہ میں اپنی بات نہ ماننے والے دوستوں کو بھی "پھینٹی" لگا دیا کرتا ہوں"

میں اسے وہیں دم بخود کھڑا چھوڑ کر باہر آ گیا اور گاڑی میں بیٹھ کر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔ نہ جانے کیوں اس باکس کی پُراسراریت میں میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا جو میں یہاں بھی چلا آیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا ممکن ہے وہ باکس اتنا اہم نہ ہو جتنا میں سمجھ رہا تھا۔ بے شک احمد شجاع نے اس کے لئے جان کی بازی لگا دی تھی لیکن عین ممکن تھا کہ وہ صرف اس کی اپنی ذات کی حد تک ہی بہت اہم رہا ہو۔ لیکن مجھے اس باکس سے ریڈ ڈاٹ کا بھی کوئی تعلق نظر آ رہا تھا۔ اور اگر احمد شجاع اس کے لئے سردھڑ کی بازی لگا رہا تھا تو یہ بھی عین ممکن تھا کہ ریڈ ڈاٹ سے اس کا بھی کوئی تعلق رہا ہو اور ریڈ ڈاٹ جیسی ایک انتہائی مشکوک قسم کی تنظیم سے ایک ریٹائرڈ ڈی آئی جی کا کیا تعلق ہو سکتا تھا، یہ ایک خاصی قابلِ غور بات تھی۔

پھر مجھے یہ بھی خیال آیا کہ میں اس معاملے میں خواہ مخواہ ہی

پُراسرار ست تلاش نہیں کررہا؟ ابھی تک تو مجھے صحیح طور پر یہی معلوم نہیں تھا کہ ریڈ ڈاٹ کیا چیز تھی؟ یہ واقعی کوئی تنظیم تھی یا دو چار پڑھے لکھے بدمعاشوں نے یونہی ذرا تاثر بنانے کے لئے اپنی ٹولی کا ایک نام رکھ لیا تھا؟

انہی سوچوں میں الجھا ہوا میں آفس پہنچا تو عمارت کے صدر دروازے پر ایک اور الجھن میری منتظر تھی۔ اور اس الجھن کا نام وسیم احمد تھا۔ وہ دروازے کے قریب ہی ایک ستون کا سہارا لئے کھڑا تھا اور عینک کے عقب میں اپنی گول گول سی آنکھیں گھما رہا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اگر وہ مجھے دیکھ نہ چکا ہوتا تو شاید میں الٹے قدموں لوٹ جاتا اور عمارت کے گرد گھوم کر پچھلے دروازے سے اندر چلا جاتا۔ مگر قدرت کو یوں میری گلوخلاصی منظور نہ تھی۔ وہ مجھے دیکھ کر میری طرف لپکا چلا آرہا تھا۔

"سر جی۔ چوہدری صاحب۔!" اس کے انداز میں اتنی لجاجت تھی کہ اگر میں اس کا ہاتھ نہ تھام لیتا تو شاید وہ میرے پیروں میں ہی گر پڑتا۔ اس نے دیر تک مجھ سے مصافحہ کیا اور دیر تک باچھیں پھیلائیں۔ پھر بولا۔ "میں دو دن سے آپ کے دفتر کے چکر لگا رہا ہوں۔ ریسپشن والے مجھے آپ سے ملنے ہی نہیں دیتے۔ کبھی کہہ دیتے ہیں کہ آپ مصروف ہیں۔ کبھی کہہ دیتے ہیں کہ آپ آفس میں نہیں ہیں۔ فون کرتا ہوں تب بھی یہی جواب ملتا ہے۔ گھر فون کرتا ہوں تو وہاں بھی آپ موجود نہیں ہوتے۔"

ریسپشن والے عام طور پر مجھے ہر شخص کی آمد کی اطلاع ضرور دیتے تھے۔ اس سے ملنے نہ ملنے کا فیصلہ میں ہی کرتا تھا۔ لیکن پچھلے دو دنوں میں واقعی میں بہت مصروف رہا تھا اور شاید ریسپشن والوں نے وسیم کی شکل دیکھ کر بھی فیصلہ کرلیا ہو کہ وہ میرا وقت ضائع کرنے کے سوا کچھ نہیں کرے گا۔

میں نے اسے اندر لے جانے کا قطعاً کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا اور وہیں کھڑے کھڑے قدرے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔ "کس لئے ملنا چاہتے تھے؟ کوئی خاص کام تھا مجھ سے؟"

"وہی مشورہ کرنا تھا نا آپ سے۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بے چارگی آمیز سے انداز میں بولا

ایک لمحے کے لئے مجھے اس پر ترس بھی آگیا۔ مشورے کا اتنا سچا طالب میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ میں نے ذرا ملائمت سے کہا۔ "ہاں۔ بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟"

وہ تھوک نگل کر بدستور ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ "میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ابا نے مجھے اپنے کارخانے میں نائٹ سپروائزر کے طور پر ملازم رکھا ہوا ہے۔"

"ہاں۔ مجھے یاد ہے" میں نے تیزی سے کہا "بلا تمہید اپنا اصل مسئلہ بتاؤ"

"ابا نے اپنے چھوٹے بھائی یعنی میرے چچا کو بھی ملازم رکھا ہوا ہے۔" اس نے گویا ہمت سے کام لیتے ہوئے تیزی سے بول[illegible] کی کوشش کی۔ "سارا کیش وغیرہ انہی کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ انتہائی چالاک اور چرب زبان آدمی ہیں۔ ابا ان پر بہت زیادہ اعتبا[illegible] کرتے ہیں۔ ان کی ہر بات مانتے ہیں لیکن اپنی اولاد پر بھروسا نہی[illegible] کرتے اور نہ ہی اولاد کی بات مانتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔

"اچھا تو پھر؟" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

"بعض ہول سیلر مال خریدنے کے لئے کارخانے میں ہی آجاتے ہیں اور نقد ادائیگی کرتے ہیں۔" وہ ہانپنے کے سے انداز میں بولا۔ "اصولاً چھوٹے چچا کو ہر شام تک کی وصول شدہ رقم دوسرے روز صبح ہی بینک میں جمع کرا دینی چاہئے لیکن وہ ہفتہ ہفتہ کیش بینک میں جمع نہیں کراتے۔ رقم ان کی میز کی درازوں میں بھری رہتی ہی ہے۔"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟" میں اپنے لہجے کی بیزاری کو چھپانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ "ممکن ہے تمہارے ابا نے انہیں یہی ہدایت کر رکھی ہو۔"

"نہیں۔ ایسا نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا "وہ ابا کو بھی چکر دیئے رکھتے ہیں۔ اکاؤنٹینٹ، کیشئر، منیجر سب کچھ وہی ہیں۔ انہیں سب کو چکر دینے کے طریقے آتے ہیں۔ ابا تو ویسے بھی آنکھیں بند کرکے ان پر اعتبار کرتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ وہ کیش میں مستقل طور پر گھپلا کرتے ہیں۔ یہ مجھے معلوم ہے۔ لیکن ابا ان کے بارے میں ایک لفظ سننے کو تیار نہیں۔ جونہی ان کے سامنے چھوٹے چچا کا نام میری زبان پر آتا ہے وہ زبان بند کرا دیتے ہیں۔ مجھے بے نقط سناتے ہیں۔ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ میں خود تو نالائق ہوں، کچھ کر نہیں سکتا۔ چھوٹے چچا نے اگر اتنا کام سنبھالا ہوا ہے تو میں ان کے خلاف سازشوں کی فکر میں لگا رہتا ہوں۔ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں ابا۔"

"یار! کیا واقعی وہ تمہارے سگے ابا ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں چوہدری صاحب!" اس کی آواز یکدم بھرا گئی۔ "لیکن باتیں سن کر کوئی یقین نہیں کرتا۔ اس طرح کی باتیں تو سوتیلے باپ بھی نہیں کرتے۔"

"تو پھر تم کیوں فکر میں دبلے ہو رہے ہو؟" میں نے قدرے بےزاری سے کہا "ایسے باپ کا مال جارہا ہے تو جانے دو"

اس کی صرف آواز ہی نہیں بھرائی، آنکھوں سے آنسو بھی چھلکنے لگے تھے۔ وہ ذرا غصیلے لہجے میں فوراً بولا "مال کی فکر کس کمبخت کو ہے۔ میری طرف سے تو چاہے ابا کا سارا مال لڑھک جائے۔ ہم کون سا اس مال سے عیش کر رہے ہیں۔ مجھے اس کی فکر نہیں۔ فکر تو مجھے اس بات کی ہے کہ چھوٹے چچا مستقل مال کما رہے ہیں لیکن غبن کے چکر میں مجھے پھنسانا چاہتے ہیں۔ غبن کے

[illegible] بھی نہیں۔ بلکہ یوں سمجھیں مجھ پر چوری کا الزام لگانا [illegible] مجھے چوری کے چکر میں پھنسا کر وہ اپنے راستے کا یہ [illegible] کانٹا بھی ہٹانے میں کامیاب ہوجائیں گے۔ اگر ان کی یہ [illegible] امیاب ہوگئی تو شاید رفتہ رفتہ وہ مجھے ابا کی نظر میں اتنا برا بنا [illegible] ہم چھوٹی موٹی سہولتوں اور وراثت وغیرہ سے بھی محروم [illegible]"

[illegible] سارا کیش سے کوئی تعلق ہے جو وہ تمہیں چوری کے الزام [illegible] انے کی کوشش کرے؟" میں نے دریافت کیا۔

[illegible] میں رات کو جاکر اسی کمرے میں بیٹھتا ہوں جہاں وہ اپنی میز [illegible] زوں میں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہوئی چھوڑ کر چلے جاتے ہیں [illegible] وہاں سے کافی دور لگی ہوئی ہیں۔ رات کو میں تین چار چکر [illegible] ے لگاتا ہوں لیکن زیادہ تر دفتر میں ہی بیٹھتا ہوں۔ میرا زیادہ [illegible] ری قسم کا ہی ہے۔ چھوٹے چچا کی حرکات و سکنات سے مجھے [illegible] وگیا ہے کہ وہ مجھے چوری کے چکر میں پھانسنے کی تیاریاں [illegible] ہے ہیں۔"

[illegible] بس۔ اتنے سے مسئلے کے لئے تم میرے پیچھے لگ گئے ہو؟" [illegible] نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تمہیں کیونکر یقین ہوگیا ہے کہ [illegible] مارا مسئلہ حل کرسکتا ہوں؟"

[illegible] میرا دل کہتا ہے کہ آپ انسانوں کے کام آتے ہیں۔ اتنا بڑا [illegible] ہونے کے باوجود اپنی مصروفیات میں سے لوگوں کے لئے وقت [illegible] ہیں۔" وہ بڑے وثوق سے بولا۔ "اور جسے آپ "اتنا سا [illegible]" کہہ رہے ہیں، مجھ غریب کے لئے وہ زندگی اور موت کا مسئلہ [illegible] مجھے یقین ہے کہ آپ ضرور میری مدد کریں گے اور تو کوئی [illegible] بات سنتا ہی نہیں۔"

"ہاں میرے بھائی! میں ہی سن کر پھنس گیا ہوں۔" میں نے [illegible] ری سانس لے کر کہا۔

وہ شرمیلی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "مجھے معلوم ہے آپ مذاق [illegible] ایسی باتیں کرتے ہیں ورنہ حقیقت میں تو آپ کو مجھ سے دلی [illegible] ردی ہے۔"

"شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔" میں نے ایک اور ٹھنڈی [illegible] نس لے کر کہا "چاہتا تو میں یہی ہوں کہ تمہیں اٹھا کر کسی ایسی [illegible] پھینک دوں جہاں سے مجھے دوبارہ تمہاری صورت دکھائی نہ [illegible] ے۔ لیکن تمہاری صورت دیکھتا ہوں تو ترس آجاتا ہے۔"

"آپ مجھ پر رحم کھائیں گے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا صلہ [illegible] ے گا چوہدری صاحب!" وہ عینک اتار کر بچ بچ زار و قطار رونے [illegible] ا۔

"ارے۔ ارے۔ یہ کیا کر رہے ہو! رونے کی ضرورت [illegible] یں۔" میں نے گڑبڑا کر کہا۔ "میں تو تمہارے مسئلے کا حل بتانے [illegible] ا تھا۔ تم نے رونا شروع کردیا۔"

اس کے آنسو تقریباً اسی طرح رک گئے جس طرح ٹونٹی بند کرنے سے پانی کی دھار رک جاتی ہے۔ عینک اس نے دوبارہ لگالی اور پوری طرح میری طرف متوجہ ہوگیا۔ عام حالات میں بھی اس کی آنکھیں پھیلی پھیلی سی رہتی تھیں لیکن اس وقت تو کچھ اس طرح پھیل گئی تھیں جیسے وہ کانوں سے نہیں بلکہ آنکھوں سے میری بات سنے گا۔

"تمہیں تھوڑی سی ہمت سے کام لینا پڑے گا" میں نے کہا۔ "تمہارے لئے بہترین راستہ یہی ہے کہ چھوٹے چچا کی سازش کو انہی پر الٹ دو۔ ان کے کچھ کرنے سے پہلے تم ہی کچھ کر گزرو۔ تم جب ڈیوٹی پر پہنچتے ہو تو کیا کمرے میں کوئی ہوتا ہے؟"

"نہیں۔" اس نے پُر امید انداز میں نفی میں سر ہلایا۔ "کمرے کا تالا میں ہی جاکر کھولتا ہوں۔ چوکیدار گیٹ پر ہوتا ہے۔ اور ورکر مشینوں پر ہوتے ہیں۔"

"تم جاتے ہی ان درازوں کا تالا توڑ دو جن میں رقم ہوتی ہے اور رقم کی گڈیاں اس طرح میز پر سجا دو جیسے کوئی چور ان کو لے جانے کی تیاری کررہا تھا۔ یہ کام اس دن کرنا جس دن تمہیں یقین ہو کہ ہفتے بھر کا کیش درازوں ہی میں جمع ہے۔ اس بات کا تو تمہیں اندازہ رہتا ہے نا؟"

"بہت اچھی طرح۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں دن میں بھی اکثر و بیشتر دفتر جاتا رہتا ہوں۔ اسی لئے تو چھوٹے چچا کی نظروں میں زیادہ کھٹکنے لگا ہوں۔ میں سب کچھ دیکھتا رہتا ہوں۔ ابا دوسرے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ وہ اس آفس میں کبھی آکر نہیں جھانکتے۔"

"میں تمہارے چھوٹے چچا کا فراڈ سمجھ گیا ہوں۔" میں نے کہا۔ "چھوٹے کارخانوں کے حسابات زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے۔ درازیں توڑنے سے پہلے تم اس ہفتے کی کیش سیل کا رجسٹر دیکھ لینا۔ اس میں مجموعی طور پر کم رقم کا اندراج ہوگا جبکہ درازوں میں زیادہ رقم موجود ہوگی۔ بینک میں جمع کراتے وقت چھوٹے چچا فاضل رقم اپنے پاس رکھ لیتے ہوں گے۔ تم رقم جوں کی توں میز پر رکھ دینا اور گھبرائے ہوئے انداز میں اپنے ابا کو فون کرنا کہ جب تم کمرے میں داخل ہوئے تو کوئی شخص درازوں سے رقم نکال نکال کر میز پر جمع کررہا تھا۔ تم نے اسے للکارا تو وہ کھڑکی سے کود کر بھاگ گیا۔ تھوڑی بہت ایکٹنگ تو تم کرلیتے ہو نا؟"

"ایکٹنگ تو میں اچھی خاصی کرلیتا ہوں سر!" وہ تھوک نگل کر بولا۔ اور ایک لمحے کے لئے مجھے گمان سا گزرا کہ کہیں اس کا حد سے زیادہ بے وقوف نظر آنا بھی ایکٹنگ ہی تو نہیں تھی؟ "بس تو پھر یہ ڈراما کر گزرنا۔" میں کہا "اس سے کم از کم دو فائدے تو ہوں گے۔ رقم چونکہ ہر حال میں گنی ضرور جائے گی اور حساب کیا جائے گا کہ چور کچھ لے تو نہیں گیا۔ اس سے ایک تو یہ انکشاف ہوجائے گا کہ چھوٹے چچا ہفتہ ہفتہ بھر کیش بینک میں جمع نہیں کراتے۔ دوسرے وصولی کے رجسٹر کی رقم اور کیش میں فرق ہوگا۔ چھوٹے

چچا کی پوزیشن لازماً مشکوک ہو جائے گی۔ بس اتنی سی بات ہے۔ ذرا ہمت کرو گے تو الٹی چال چھوٹے چچا پر پڑ جائے گی۔ لیکن پہلے اچھی طرح سوچ لینا کہ یہ کام تمہارے بس کا ہے یا نہیں۔"

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک آگئی تھی اور یہ حماقت کی چمک سے مختلف تھی۔ وہ ذرا تامل کے بعد اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے میں یہ کام کر ہی لوں گا۔ کم از کم چھوٹے چچا کو سبق سکھانے کے لئے تو کر ہی گزروں گا۔"

"بس تو اب جاؤ۔ فی الحال تمہارے لئے میرے پاس یہی مشورہ ہے۔ معذرت چاہتا ہوں کہ تمہیں اپنے ساتھ دفتر میں نہیں لے جا رہا۔ مجھے کچھ ضروری کام کرنے ہیں جن کے لئے مجھے تنہائی اور یکسوئی کی ضرورت ہے۔ پھر کبھی موقع مناسب ہوا تو چند منٹ بیٹھیں گے۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں۔" وہ بُرا منائے بغیر بولا۔ بُرا منانے کی تو شاید اس میں حس ہی نہیں تھی۔ "مجھ پر تو آپ کا یہی احسان کافی ہے کہ یہاں کھڑے کھڑے آپ نے مجھ سے اتنی باتیں کرلیں۔" مصافحہ کرتے ہوئے وہ ایک بار پھر تقریباً دُہرا ہو گیا۔ اس بار میں نے اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کر دیا اور خدا حافظ کہہ کر عمارت میں داخل ہو گیا۔

اپنے آفس میں جا کر بیٹھے ہوئے مجھے چند منٹ ہی ہوئے تھے کہ کیتھرین نے بتایا 'کسی مسٹر ایڈم کا فون ہے۔ میں نے ملانے کے لئے کہا۔ دوسرے ہی لمحے وہی مانوس اور کچھ منحوس سی آواز سنائی دی۔ "احمد شجاع کے ہاں سے ہو آئے؟"

میں اندازہ نہیں کر سکا کہ یہ سوال تھا یا بیان۔ یا پھر محض یہ جتانا مقصود تھا کہ وہ ہر وقت میری نقل و حرکت سے واقف رہتے تھے۔

"ہاں۔ ہو آیا۔" میں نے ملائمت سے جواب دیا۔

"اس کے بارے میں چھان بین کرنے گئے تھے کہ وہ کس قسم کا آدمی تھا؟" ایڈم عرف ایڈی نے اپنے مخصوص پُراسرار سے لہجے میں اردو میں ہی پوچھا۔

"جب تمہیں یہ معلوم ہے کہ میں وہاں گیا تھا تو پھر یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ کس لئے گیا تھا۔" میں نے رکھائی سے کہا۔

"نہیں۔ ہمارا آدمی تمہارے اتنا زیادہ قریب نہیں ہو سکا۔" وہ بولا "بہرحال یہ بات زیادہ اہم نہیں ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ وہ باکس ہمیں چاہئے۔"

"کون سا باکس؟" میں نے حقیقتاً حیرت سے کہا۔ اس نے گویا تحمل سے کام لیتے ہوئے اس سیاہ باکس کی ساخت کی وضاحت کی جو ابھی تک میرے لئے معمّا بنا ہوا تھا۔

"مگر وہ تو فرار ہوتے وقت احمد شجاع ہی کے ہاتھوں میں تھا۔ میں تو اسے بریف کیس سمجھا تھا۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "مجھے تو اس کے بعد شاید تمہارے ہی کسی منحوس آدمی نے حسب معمول گیدڑوں کی طرح پیچھے سے حملہ کر کے بے ہوش کر دیا تھا۔ ر پاس وہ باکس کہاں سے آسکتا تھا۔"

"احمد شجاع کے فرار ہوتے ہی ایک سفید گاڑی تیزی اس کے تعاقب میں روانہ ہوئی تھی۔ اس میں وہی نوجوان تمہارے سیکیورٹی گارڈ کے فرائض انجام دیتا ہے' ہر وقت سا طرح تمہارے پیچھے لگا رہتا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے' کیا ہم نہیں پہچانتے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ میرے بارے میں واقعی سبھی کچھ جانتے تھے۔ ایڈی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہم ر یہ نہیں جان سکے کہ جب تمہارا آدمی احمد شجاع کے تعاقب روانہ ہوا اور جب اسے حادثہ پیش آیا' اس کے درمیان کیا' اور اسی درمیانی وقفے میں وہ باکس کہیں غائب ہو گیا۔ اس کے ے اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ شدہ کار سے برآمد نہیں ہوا۔ ظاہر ہے اس کا مطلب یہی ہے راستے میں تمہارا آدمی اسے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہ تم تک پہنچ چکا ہے۔ اب وہ کوئی ایسی چیز تو تھی نہیں کہ شجاع اسے چبا کر نگل جاتا۔ اسے تو کوئی وہیل مچھلی بھی نگل کر ے نہیں رہ سکتی۔"

"مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہیل مچھلی اسے نگل سکھ سے رہ سکتی ہے یا معدے کے السر اور درد قولنج میں مبتلا ہو ہے" میں نے خشک لہجے میں کہا "میں نے تمہیں بتا دیا ہے کہ نہ باکس مجھ تک یا میرے کسی آدمی تک پہنچا ہے اور نہ ہی مجھے ا کے بارے میں کچھ معلوم ہے۔ مجھے اس قسم کے کسی باکس د ے کوئی دلچسپی بھی نہیں تھی لیکن اب تمہاری تشویش دیکھ دلچسپی پیدا ہو چلی ہے۔ اب شاید میں بھی اسے تلاش کرنے کوشش کروں۔"

"تم بہت اونچی چیز ہو۔ ہم تمہاری باتوں میں آنے والے نہ ہیں" ایڈی گہری سنجیدگی سے بولا۔ وہ زیادہ تر بات کرتے وقت "ہم" کا صیغہ استعمال کرتا تھا۔ شاید وہ بات کرتے وقت غیر شعور طور پر اپنے تمام ساتھیوں کی ترجمانی کر رہا ہوتا تھا۔ پھر اس کے ۔ کی سنجیدگی میں سفاکی کی آمیزش بھی ہو گئی اور وہ ایک ایک لف پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں آخری بار کہہ رہا ہوں' باکس ہمیں واپس کر دو۔ وہ تمہارے کام کی چیز تو ہے نہیں۔"

میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں بھی آخری بار کہہ رہا ہو کہ تم اب باکس کے بارے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔ م وضاحتیں کرنا پسند نہیں کرتا اور نہ ہی یہ بات میرے لئے قابل برداشت ہے کہ کوئی میرے کہے پر یقین نہ کرے اور مجھے جھ سمجھے۔"

اس کے لہجے میں دوبارہ نرمی آگئی اور وہ سمجھانے کے ۔ انداز میں بولا "اگر کسی نے غلط طریقے سے اس باکس کو کھولنے

ں کی تو وہ دھماکے سے پھٹ کر تباہ ہو جائے گا اور کھولنے ے بھی پرخچے اڑ جائیں گے۔"

"پھر تو تمہیں اس کی کوئی فکر ہونی ہی نہیں چاہئے۔" میں نے اس میں کوئی قیمتی چیز نہیں ہے۔ اگر کوئی راز محفوظ ہے تو کو کھولنے کی کوشش کرنے والا یقیناً مارا جائے گا اور باکس ے راز سمیت تباہ ہو جائے گا کیونکہ "پرچا ترکیب استعمال" تو کے ساتھ ہے نہیں۔ لہٰذا تمہیں اس کے بارے میں تشویش یں ہونا چاہئے۔"

"ہم اس کی طرف سے بے نیاز ہونے کا خطرہ مول نہیں لے وہ بولا۔

"یہ سوچ کر کہ کہیں کوئی اسے صحیح طریقے سے نہ کھول لے؟" نے پوچھا۔

"جو چاہو سمجھ لو۔" وہ مبہم لہجے میں بولا۔ "لیکن باکس ں واپس کر دو۔"

"خدا کی پناہ!" میں نے جھنجلائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "تم یا میری ہر بات پر یقین نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے؟ تمہارے میں اگر وہ میرے پاس ہے تو جب اور جس طرح چاہو مجھ سے ں کر لو۔ تمہاری معلومات تو ویسے ہی لامحدود ہیں۔ تمہیں م ہی ہو گا کہ میں نے باکس کہاں رکھا ہوا ہے۔ مجھے بھی بتا دو۔ ود اٹھا کر تمہاری خدمت میں پیش کر دوں گا۔ اس سے زیادہ انہ پیشکش کیا ہو سکتی ہے۔"

"مسئلہ یہ ہے کہ تم ہمارے 'پسندیدہ' بلکہ مطلوبہ آدمیوں کی ت میں شامل ہو۔ ورنہ یہ 'جب چاہو اور جس طرح چاہو' والی ن استعمال کرنے کی تو نوبت ہی نہیں آتی۔" وہ طویل سانس لے لا "اگر ہم تم پر مہربان نہ ہوتے تو نہ جانے اب تک تمہارا کیا ہو چکا ہوتا۔"

"اپنی سی کوششیں تو کر چکے ہو۔ اگر میرا خدا مجھ پر مہربان نہ تو شاید ان میں سے کوئی کامیاب ہو چکی ہوتی۔" میں نے کہا۔ ا کا متکبرانہ انداز مجھے بہت برا لگتا تھا۔ اگر وہ شخص میری رسائی ہوتا تو مجھے امید تھی کہ میں اس کا تکبر نکال دیتا۔ وہ اپنا لہجہ کسی ذہنیت زدہ بادشاہ کا سا بنانے کی کوشش کرتا تھا۔

"ارے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "تو تم سمجھتے ہو کہ وہ شیں تمہیں ٹھکانے لگانے کے سلسلے میں تھیں؟" وہ میرے خیال سے گویا بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ "یہ بچکانہ خیال ذہن سے ادو چندرا! تمہیں ٹھکانے لگا دینا ہمارے لئے ایسا ہی ہے جیسے ر پر بیٹھی ہوئی کسی مکھی کو اڑا دینا۔ تم پر جو حملے ہوئے وہ تو ری اہلیت اور قابلیت کے چھوٹے موٹے امتحان تھے۔ انہی بعد تو تم ہمیں زیادہ عزیز ہو گئے ہو۔ اس سے پہلے ہم فیصلہ نہیں پارہے تھے کہ تمہیں اہمیت دیں یا نہیں۔"

"بڑی نوازش ہے تمہاری کہ تم نے مجھے سایۂ عاطفت میں لیا۔ ہوا ہے" میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ "میرا وقت خاصا قیمتی ہوتا ہے اور تم ہر بار فون پر بڑی بوڑھیوں کی طرح ادھر اُدھر کے قصے چھیڑ کر بیٹھ جاتے ہو۔ میرا خیال ہے اب بات ختم ہو چکی ہے۔ خدا حافظ۔"

"بات تو اب شروع ہوگی پیارے!" وہ یک دم بدلے بدلے لہجے میں بولا۔ "اگر تم نے باکس واپس نہ کیا تو ایک ایسی کہانی شروع ہوگی جس کا انجام کم از کم تمہارے لئے بڑا المناک ہوگا۔"

"بعض اوقات میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہاری باتوں کا کیا جواب دوں۔" میں نے بیزاری سے کہا۔

"ہم عام طور پر صرف وہ جوابات سننے کے عادی ہیں جو ہمارے حق میں جاتے ہوں" وہ بولا۔ "تم نے وہ کیسٹ دیکھی؟"

"ہاں۔ تم لوگوں کی خباثت کا وہ ثبوت میں نے بغور دیکھا تھا۔ تنہا اور مجبور و بے بس انسانوں کے ساتھ جو لوگ یہ سب کچھ کرتے ہیں' انہیں ایک نہ ایک روز اس کا حساب دینا پڑتا ہے۔" میں نے نفرت سے کہا۔

"تم نے یہ نہیں پوچھا کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟"

"اکثر خبیث اپنی خباثتوں کے کوئی نہ کوئی جواز گھڑ لیتے ہیں۔"

وہ گویا میری بات سنے بغیر بولا۔ "وہ بھی ہم سے اکثر اسی لہجے میں بات کرتا تھا جس طرح تم کرتے ہو۔ وہ بھی ہماری بات نہیں مانتا تھا۔ اور جب ماننے پر تیار ہوا اس وقت بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ اس وقت ہم اپنے پسندیدہ اور مطلوبہ آدمیوں کی فہرست سے اس کا نام کاٹ چکے تھے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔"

"میرا نام اپنے پسندیدہ اور مطلوبہ آدمیوں کی فہرست سے کب کاٹ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بہت جلدی ہے تمہیں کسی لرزہ خیز انجام سے دوچار ہونے کی؟" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "اصل میں تم اس لئے مجھ سے ایسے لہجے میں بات کرتے رہتے ہو کہ ابھی تمہارے فرشتوں کو بھی اندازہ نہیں ہے کہ تم کس سے مخاطب ہو۔ تمہیں ذرا بھی علم نہیں ہے کہ میں جن کی نمائندگی کرتا ہوں وہ کون ہیں۔"

"تو پھر تم بتا دو نا تاکہ میں تھر تھر کانپنے لگوں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"بتا دیں گے' بتا دیں گے۔" وہ مربیانہ انداز میں بولا۔ "ابھی بھی کیا جلدی ہے۔ تمہارا نام اپنے پسندیدہ اور مطلوبہ آدمیوں کی فہرست سے کاٹنے کے مراحل بھی ابھی دور ہیں۔ لیکن تم کوشش بھی کرو اور دعا بھی کہ ان مراحل تک نہ پہنچو کیونکہ تم بہت قیمتی انسان ہو۔"

"اور تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ہم تمہیں بن مول خریدنا چاہتے ہیں۔ اسی لئے تم پر اتنی

توجہ دی جارہی ہے۔ ہم چاہتے ہیں تم ہمارے کام آؤ..... اس طرح تم اور بھی قیمتی آدمی بن جاؤ گے۔ بہت عروج ملے گا تمہیں۔"

"میرے لئے اتنا ہی عروج کافی ہے جتنا مجھے مل چکا ہے۔ میں قناعت پسند آدمی ہوں۔ اگر مجھے مزید عروج کی خواہش بھی ہوگی تب بھی میں اس کے لئے کسی کی مدد نہیں چاہوں گا۔ خصوصاً تم جیسے لوگوں کی۔"

"خیر۔ یہ سب کچھ تو وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔ لیکن اس وقت تک بھی تم قناعت پسندی کی باتیں مت کرو۔ آج کے دور میں قناعت پسند تقریباً نایاب ہوگئے ہیں۔ اب تو درویش اور سادھو بھی قناعت پسند نہیں رہے۔ ہاں اگر تم فیشن کے طور پر اپنے آپ کو قناعت پسند کہہ رہے ہو تو کوئی حرج نہیں۔ کروڑ پتیوں میں اپنے آپ کو درویش، مزدور اور قناعت پسند وغیرہ کہنے کا فیشن ہے۔ جس سال کروڑوں کا منافع ہوتا ہے اس سال بھی اگر کوئی پوچھ لے کہ کاروبار کیسا جارہا ہے؟ تو یہی جواب دیتے ہیں کہ بس دال روٹی چل رہی ہے۔ اس فیشن کے مطابق تمہاری قناعت پسندی پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"تمہیں اعتراض ہو بھی تو میری صحت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ویسے تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم کون ہو، ریڈ ڈاٹ کیا ہے۔ اور مجھ سے تم کیا چاہتے ہو؟" میں نے اس امید پر کہا کہ شاید اس بار وہ کھل ہی جائے۔

"یہ باتیں اتنی آسانی سے بتائی جانے والی تو نہیں ہیں۔ اور ابھی یہ سب کچھ جاننا تمہارے لئے اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔ رفتہ رفتہ سب کچھ جان ہی جاؤ گے" وہ بے پروائی سے بولا۔

"لیکن مجھ پر ہی تمہاری نظرِ انتخاب کیوں ہے؟ اس شہر میں، اس ملک میں مجھ سے کہیں بڑے بڑے سرمایہ دار پڑے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تم سے کس نے کہا کہ ہمیں کسی سرمایہ دار کی ضرورت ہے؟" وہ گویا میری ناسمجھی پر قدرے حیران ہوتے ہوئے بولا۔ "سرمایہ تو تم ہم سے جتنا چاہو لے لو۔ سیٹھوں سے ہمیں دلچسپی ضرور ہے لیکن ویسی نہیں جیسی تم سے ہے۔ تم صرف سرمایہ دار ہی نہیں اور بھی بہت کچھ ہو۔ تمہارے اندر بے شمار صلاحتیں ایسی ہیں جن کا ابھی شاید تمہیں خود بھی علم نہ ہو۔ ہمارے لئے تم سرمایہ دار نہیں بلکہ خود ایک سرمایہ ہو۔ ہم نے تمہیں اپنے ریزرو بینک میں ڈلا ہوا ہے۔ سیٹھوں کا کیا ہے۔ سیٹھ تو ہمارے لئے گاجر مولی کی طرح ہیں۔ جس کو چاہتے ہیں اٹھا کر جیب میں ڈال لیتے ہیں۔"

عزت افزائی کا بہت شکریہ۔ اور خدا حافظ۔" میں نے کہا۔

"باکس واپس کرنے کے بارے میں ضرور غور کرنا۔" اس نے ایک بار پھر تاکید کی۔ اس بار میں نے کوئی جواب ہی نہیں دیا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

اس شام میں گھر پہنچا تو ایک اور حیرت میری منتظر تھی۔ میں ڈرائیو وے میں گاڑی سے اترا تو کوٹھی کے سیکیورٹی انچارج طارق خان نے سر کھجاتے ہوئے قدرے ندامت آمیز انداز میں مجھے بتایا "سر! آپ کے بیڈ روم سمیت چند کمروں میں آپ کو کچھ بد نظمی نظر آئے گی۔ یہ مت سمجھئے گا کہ یہ میری سستی کی وجہ سے ہے۔ میں نے اس شخص کو گھر میں داخل ہوتے دیکھ لیا تھا۔ لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اسے کس چیز کی تلاش تھی۔۔۔۔"

"وہ گھر میں داخل کس طرف سے ہوا تھا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"عقبی لان کی دیوار پھاند کر۔" طارق خان نے جواب دیا۔ "اور اس کا خیال غالباً یہی تھا کہ اسے کسی نے دیکھا نہیں ہے لیکن میں نے اسے دیکھ لیا تھا۔"

طارق خان کی ڈیوٹی زیادہ تر دن میں ہوتی تھی اور وہ گیسٹ ہاؤس میں ہی رہتا تھا لیکن کبھی کبھار کسی آسیب کی طرح نہایت غیر محسوس انداز میں اصل عمارت کا چکر لگا لیتا تھا، یعنی کسی کو کم ہی نظر آتا تھا۔ گھر میں گھومنے پھرنے کا اس کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ کہیں بھی، کسی کے سامنے اچانک نمودار ہو سکتا تھا۔

کوٹھی کی چار دیواری کافی اونچی تھی اور اس کے اوپر باریک، متوازی تاریں بچھی ہوئی تھیں جو دیوار کے اوپر چڑھنے کے بعد بھی غور سے دیکھنے پر ہی نظر آسکتی تھیں۔ رات کے بارہ بجے کے بعد صبح کی سپیدی نمودار ہونے تک ان برہنہ تاروں میں کرنٹ دوڑتا تھا۔ جو تاریں دیوار پر باڑھ کی طرح لگائی جاتی ہیں، میری

وئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ دیواریں پھاند کر گھروں میں نے والے انہیں دور سے ہی دیکھ کر ان کا کوئی بندوبست کر ا ان میں کتنے ہی دولٹ کرنٹ دوڑ رہا ہو۔ لیکن طارق فص کا ذکر کر رہا تھا وہ دن میں کسی وقت دیوار پر چڑھا ہماری چار دیواری کی تاروں میں کرنٹ نہیں ہوتا تھا۔ ں کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔

لئے کا آدمی تھا وہ؟ کوئی نقاب وغیرہ چڑھائی ہوئی تھی اس نے اپنے لہجے کی بے تابی چھپانے کی کوشش کرتے

ں سر! نقاب وغیرہ کہاں۔ وہ تو وہی بندر نما شخص تھا جو ، کر گیا تھا۔ جس کے بارے میں آپ نے حکم دے رکھا ، پکڑنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے اسی لئے اسے ے... دیکھ کر نہ تو تاروں میں کرنٹ آن کیا اور نہ ہی اس ۔ میں چاہتا تھا، وہ زندہ ہی ہاتھ آجائے۔ زخمی بھی نہ ہو اس کے انداز سے میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی چیز کی تلاش ۔ میں نے اسے گھیرنے کے لئے دو تین کمروں کی تلاشی دیا۔"

ری سانس لے کر رہ گیا۔ اس مردود اے تن نے مجھے کھ دیا تھا۔ وہ واقعی میرے لئے دردِ سر بنتا جارہا تھا۔

، خان بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "پھر وہ اوپر آپ میں چلا گیا۔ میرا اسے وہیں گھیرنے کا ارادہ تھا کیونکہ ھاگنے کا دروازے کے سوا کوئی راستہ نہیں۔ کھڑکی کی بلندی کم از کم بیس فٹ ہے۔ اس سے چھلانگ لگانے ری ہو سکتا ہے۔ اس لئے میں نے اسے شمار نہیں کیا

لہ اسی سے کود کر بھاگ گیا ہوگا؟" میں نے اس کی بات ے کہا۔ طارق خان نے ندامت آمیز انداز میں اثبات

ں وقت بیڈ کے نیچے سے نکل رہا تھا جب میں نے کمرے ہو کر اپنے عقب میں دروازہ بند کرلیا۔" اس نے دھیمی !! میں نے گن دکھاتے ہوئے اسے سیدھا کھڑا ہونے اس وقت تک وہ غالباً کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے چکا نے تو ایک لمحے بھی توقف نہیں کیا، کوئی بات نہیں ۔ میں تو اس کی شکل بھی صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا۔ اس ابازی کھائی اور بالکل اس طرح کھڑکی سے باہر نکل گیا ندناتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا ہو۔ کسی انسان سے ست لگانے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ میرا خیال تھا ہ میں وہ یہ کرتب تو دکھا گیا ہے لیکن اب ٹانگ وانگ ی گلی میں پڑا ہوگا۔ میں نے دوڑ کر کھڑکی سے جھانک کر سلے کی طرح گلی کے موڑ پر غائب ہو رہا تھا۔"

"شکر کرو اس سے فائرنگ کے تبادلے یا ہاتھا پائی کی نوبت نہیں آئی۔" میں نے کہا۔ "ورنہ شاید کمانڈو ہونے کے باوجود تمہیں مزید پچھتانا پڑتا۔ محض اندازوں کی غلطی کی وجہ سے۔ بلکہ غلطی اصل میں میری ہی ہے کہ میں نے تمہیں اس کو قابو میں کرنے کا حکم تو دے دیا لیکن صحیح طور پر اس کے بارے میں خبردار نہیں کیا، جس کی وجہ سے تم نقصان بھی اٹھا سکتے تھے۔ اُسے سب سے بڑا فائدہ یہ حاصل ہے کہ اس کا مختصر سا وجود اور مضحکہ خیز شکل دیکھ کر ہر کوئی غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس کے بارے میں انتہائی غلط اندازے لگاتا ہے۔"

"یس سر! یہ تو مجھے تجربہ ہوگیا۔" طارق نے تسلیم کیا۔

"آئندہ اگر کبھی اسے دیکھو اور قابو کرنے کا ارادہ کرو تو یہ سوچ کر کرنا کہ تمہارا مقابلہ کسی آسمانی بلا سے ہے جو محض آنکھوں کو دھوکا دینے کے لئے مختصر اور مضحکہ خیز سا بہروپ دھارے ہوئے ہے۔ اس چھوٹے سے وجود میں شاید کوئی شیطان مقید ہے۔ اس سے تم کسی بھی حرکت کی، کسی بھی بات کی توقع رکھ سکتے ہو۔ یہ سوچ کر ہاتھ ڈالو گے تو شاید کچھ کامیابی ہو سکے۔"

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا سر!" وہ مستعدی سے بولا۔ "آئندہ اگر وہ نظر آگیا تو آپ ضرور کوئی اچھی خبر سنیں گے۔"

اندر جاکر میں نے کمروں کا جائزہ لیا۔ سازو سامان الٹ پلٹ پڑا ہوا تھا۔ تاہم تلاشی کا انداز بتاتا تھا کہ ڈھونڈنے والے کو کسی بہت چھوٹی چیز کی تلاش نہیں تھی، اس لئے بہت زیادہ اکھاڑ پچھاڑ نہیں مچائی گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ اسی سیاہ باکس کی تلاش کا شاخسانہ تھا۔ بلاشبہ وہ اس کی تلاش کے سلسلے میں بہت مستعدی دکھا رہے تھے۔ لیکن یہ سوچنا ان کی بے وقوفی تھی کہ اگر باکس واقعی میرے پاس تھا اور میں اسے چھپانا چاہ رہا تھا تو وہ اسے اس طرح تلاش کر سکتے تھے۔

میں نے گھر کے منتظم کو کمروں کی حالت درست کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے میرے معائنے کے لئے چیزوں کو جوں کا توں چھوڑ دیا تھا۔ میں خود لاؤنج میں بیٹھ کر ٹونی کو فون کرنے لگا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس وقت وہ گھر واپس پہنچ چکا ہوگا۔

"ٹونی!" میں نے سلسلہ ملنے پر کہا "میں تمہیں ایک انتہائی ضروری کام بتا رہا ہوں۔ دنیا کا ہر کام چھوڑ کر تمہیں صرف اسی کی فکر کرنی ہے۔ اپنے علاوہ تم نے جن لوگوں کو اس کام پر لگایا ہوا ہے، انہیں بھی ہٹالو۔ میری نگرانی اور حفاظت کی فکر بالکل چھوڑ دو۔ اللہ نے میری زندگی جتنی لکھی ہوگی اتنا میں ضرور جیوں گا۔ اور اگر اوپر سے بلاوا آگیا تو محافظوں کی بہت بڑی فوج بھی مل کر مجھے نہیں بچا سکے گی۔ اس لئے خدارا تم یہ ہر وقت میرے پیچھے دو آدمی لگائے رکھنے کی ضد چھوڑ دو۔"

وہ دھیرے سے ہنس کر بولا۔ "سر! آپ منتیں کیوں کر رہے ہیں۔ آپ باس ہیں، حکم دیجئے۔ جس طرح آپ حکم دیں گے اس

طرح ہو جائے گا۔"

"نہیں۔ جو کام میرے ساتھی، میرے دوست میری محبت میں کرتے ہیں ان کے بارے میں مجھے ان کی منت کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں ہوتی۔"

"سر! ہمیں تو اب یوں لگتا ہے جیسے ہم ہر کام ہی آپ کی محبت میں کرتے ہیں۔" ٹونی بولا۔

"بس تو پھر سمجھ لو کہ میں ہر کام کے سلسلے میں تمہاری منت کر سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم سے بہتر کون جانتا ہے کہ ہمارے ہاں باس اور ماتحت کا روایتی چکر نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہمارا ڈسپلن مثالی ہے۔"

"بے اصولی دنیا میں کتنی ہی عام سہی، اس کے باوجود ہماری بقا اصولوں میں ہی ہے سر۔ بے اصول لوگ بہت جلد فنا ہو جاتے ہیں۔" ٹونی انتہائی سنجیدگی سے بولا۔ "سر! آپ حکم کیجئے، وہ ضروری کام کیا ہے؟"

"تم نے اس بندر نما شخص کو تو دیکھا ہی ہے جسے ہم نے اپنی دانست میں مار دیا تھا لیکن وہ زندہ ہی تھا۔ اس کے بعد کئی بار میرے سامنے آ چکا ہے۔ وہ اپنا نام اے نن بتاتا ہے۔ اسے ہر حال میں پکڑنا ہے۔ زندہ یا کم از کم نیم زندہ۔ جان سے نہیں مارنا ہے ورنہ اس کے "فوت" ہونے کے ساتھ ساتھ اسے پکڑنے کا مقصد بھی فوت ہو جائے گا۔"

"آپ مطمئن رہیں سر! آپ چاہیں گے تو اسے اس طرح پکڑا جائے گا کہ اس کے جسم پر ایک خراش تک نہیں ہوگی۔" ٹونی بڑے اعتماد سے بولا۔

"اس کام کو اتنا آسان بھی مت سمجھو۔" میں نے اس کی معصوم خود اعتمادی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "تم خود بھی خیال رکھنا اور تمام ساتھیوں کو بھی ہدایت کر دینا کہ جب بھی اس پر ہاتھ ڈالا جائے، یہ سمجھ کر ڈالا جائے کہ وہ کسی بلا یا کسی چھلاوے کو قابو میں کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس کی ظاہری حالت دیکھ کر ہمارا کوئی بھی آدمی قطعاً خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی کوشش نہ کرے۔"

"ٹھیک ہے سر!" ٹونی فوراً بولا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں یہ ہدایات ذاتی تجربات کی بنا پر دے رہا تھا۔

"تم نے تو اسے اچھی طرح دیکھ ہی رکھا ہے۔" میں نے مزید کہا۔ "لیکن باقی ساتھیوں میں تقسیم کرنے کے لئے طارق خان سے اس کی تصویر کے پرنٹ لے لینا۔ اس کے پاس تصویر موجود ہے، وہ مزید پرنٹ نکلوا دے گا۔ سب ساتھیوں کو اس کام پر لگا دو۔ اسے بالکل اسی طرح سرگرمی سے تلاش کرنا ہے جس طرح والدین اپنے گمشدہ بچے کو تلاش کرتے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت، کسی بھی جگہ اچانک ہی نظر آ سکتا ہے۔ سب کا ٹرانسیٹر پر ایک دوسرے سے رابطہ رہنا چاہئے۔ اگر کسی کو مدد کی ضرورت پڑے تو قریب ترین ساتھی فوراً اس کی مدد کو پہنچنے کی کوشش کرے۔ ایک بار پھر [illegible] دوں کہ وہ مجھے مردہ نہیں چاہئے۔ ہمیں اس سے بہت [illegible] معلومات حاصل کرنی ہیں۔ خاموش حالت میں وہ ہمارے کم [illegible] نہیں۔"

"میں سمجھ گیا سر! آپ مطمئن رہئے۔" ٹونی اعتماد سے [illegible] میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں حقیقتاً مطمئن ہو گیا تھا۔ مجھے [illegible] تھا کہ صبح سے ہماری مختصر مگر نہایت مستعد و فعال مشینری [illegible] میں آ جائے گی تو جلد یا بدیر کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور برآمد ہوگا۔

ملازمین کمرے درست کر چکے تھے اور میں اس وقت [illegible] باہر جانے کے لئے تیار ہو رہا تھا جب ایک ملازم نے مجھے [illegible] وزیٹنگ کارڈ لا کر دیا۔ میری کسی سے ملاقات طے نہیں [illegible] نے کارڈ لے کر دیکھا۔ وہ نہایت خوبصورت، نفیس اور [illegible] کارڈ تھا اور اس پر نہایت خوبصورتی سے ہی صرف ایک [illegible] ہوا تھا۔ طاہرہ خانم!

نام کے سوا اس پر کچھ نہیں تھا۔ نہ تو حیثیت کی کوئی [illegible] اور نہ ہی کوئی فون نمبر یا ایڈریس وغیرہ۔ مجھے غیر ممالک [illegible] ایسی شخصیات کے وزیٹنگ کارڈ دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا [illegible] وزیٹنگ کارڈ پر نام کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔ مگر وہ ان [illegible] نہایت اہم اور معروف شخصیات میں شمار ہوتی تھیں۔ [illegible] میں نہ آیا کہ طاہرہ خانم کس شمار قطار میں تھی جو اس [illegible] کارڈ کے سلسلے میں یہ انداز اپنایا تھا۔

مجھے یاد پڑتا تھا کہ اس عورت کو میں نے صرف [illegible] پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے صدر کے ہاں اس پارٹی میں [illegible] جس میں بے بی نشاط کی لاش سوئمنگ پول سے [illegible] تھی۔ اس قتل کا سرا نام نہاد فلمی مصنف نصیر نواز سے [illegible] اور میں نے اسے اس کے کئے کی سزا دے دی تھی۔ طا[illegible] میں نے نصیر نواز کے ساتھ ہی دیکھا تھا۔ وہ اس کی [illegible] بانہیں ڈالے مستقل اسی کے ساتھ تھی۔

کسی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ بہت دولتمند عورت تھی [illegible] بہت بڑی فائنانسر کے طور پر فلم انڈسٹری میں داخل ہو[illegible] کر رہی تھی۔ بتانے والے کے انداز سے مجھے یہی تاثر [illegible] نصیر نواز ہی کی دریافت تھی اور وہی اسے فلم انڈسٹر[illegible] تھا۔ طاہرہ خانم سے اسی پارٹی میں میرا محض رسمی سا [illegible] تھا۔ اب نصیر نواز کی "خودکشی" کے بعد وہ مجھ سے [illegible] تھی؟

میں نے ہال میں آ کر تاریک شیشے والی ایک کھڑ[illegible] دیکھا۔ وہ چم چم کرتی ایک خوبصورت لنکن کے پاس ڈر[illegible] کھڑی تھی اور تنقیدی نظر سے کوٹھی کا جائزہ لے رہی [illegible] خان نے نظروں ہی نظروں میں اس کا اور گاڑی کا جا[illegible] تبھی اسے ڈرائیو وے میں اتنا آگے آنے کا موقع [illegible]

[illegible]ران میں شامل خواتین کو خصوصاً یہ احساس ہرگز نہیں [illegible]جاتا تھا کہ میرے گھر میں سیکیورٹی کا کوئی نظام کام کرتا [illegible]ال ایسی نوبت بھی نہیں آئی تھی کہ میں اس نظام کو [illegible]ر زیادہ تفصیلی بناتا۔ یہ محض ہلکی پھلکی احتیاط تھی۔ اور [illegible]ے والا پُراسرار اور ناقابلِ فہم سا سلسلہ سامنے نہ آتا تو [illegible]اس کی بھی ضرورت محسوس نہ کرتا۔ میں حفاظتی انتظامات [illegible]یقین نہیں رکھتا تھا۔

[illegible]نے گہری نظر سے طاہرہ خانم کا جائزہ لیا۔ وہ بلا شبہ ایک [illegible]ل عورت تھی۔ دراز قد، خوبصورت اور خوش لباس۔ [illegible]کی شخصیت کا وہی تاثر اب بھی برقرار تھا جو میں نے پہلی [illegible]ر محسوس کیا تھا۔ یعنی اس کے چہرے مہرے اور شخصیت [illegible] عجیب سی سرد مہری کا اظہار ہوتا تھا۔ اس کے تاثر میں [illegible]کی رنگت کی وجہ سے بھی اضافہ ہوتا تھا۔ اس کی رنگت [illegible]زیادہ ہی گوری تھی۔ پہاڑوں پر جمی ہوئی برف کی طرح سفید [illegible]تھی۔ شاید اسی لئے وہ خود بھی ایک برف پوش چٹان سی [illegible]تی تھی۔ اس میں اپنی ایک الگ ہی طرح کی کشش تھی جو [illegible]کو اس کی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کرتی تھی۔ لیکن اس [illegible]ے اس کی پُراسرار سی شخصیت کے دروازے بند معلوم [illegible]تھے۔ کم از کم فی الحال!

[illegible]ں نے ملازم کو ہدایت کی کہ اسے ڈرائنگ روم میں [illegible]۔ اور خود تیار ہونے چلا گیا۔ میرا صرف ٹائی لگانا اور جوتے [illegible]باقی تھا، اس کے باوجود میں خلافِ معمول عورتوں کی طرح [illegible]نفاست اور سست روی سے تیار ہوا۔ درحقیقت میرا ذہن [illegible]اس عورت میں ہی الجھا ہوا تھا۔ اس کی آمد کا کیا مقصد تھا؟ مجھے اس سے کس طرح پیش آنا چاہئے تھا اور کس [illegible]میں گفتگو کرنی چاہئے تھی؟ پھر میں نے دل ہی دل میں اپنے [illegible]سمجھایا کہ ان سب باتوں کا فیصلہ تو اس کا رویّہ دیکھنے کے بعد [illegible]ئے تھا۔

[illegible]میں ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو وہ ایک ملکہ کی سی تمکنت [illegible]صوفے میں دھنسی بیٹھی تھی اور گرد و پیش کے جائزے سے [illegible]ہی ہوئی تھی۔ وہ ہر چیز کا گہرا مشاہدہ کرنے کی عادی معلوم ہوتی [illegible]وہ جس چیز کو بھی دیکھتی تھی، نہایت ٹھہرے ٹھہرے انداز میں، [illegible]ٹی سے۔ گویا اس کی تصویر تمام تر جزئیات کے ساتھ ذہن کے [illegible]نہاں خانے میں ڈالتی جاتی تھی۔

مجھے دیکھ کر وہ دلکش مگر ذرا نپے تلے سے انداز میں مسکرائی [illegible]چہرے کے برف زار پر اس کی آنکھوں میں بہت گہرائیوں میں [illegible]محسوسات کی ننھی سی چنگاری جھلملائی لیکن دوسرے ہی لمحے [illegible]دم ہو گئی۔ شاید اس نے مجھے بھی سر سے پاؤں تک تمام تر [illegible]یات کے ساتھ ذہن کے مخصوص نہاں خانوں میں محفوظ کرنا [illegible]کر لیا تھا۔ میں شاید اس کے لئے جیومیٹری کی کوئی تصویر تھا، سائنس کا کوئی ڈایا گرام تھا جسے اس کے ذہن کی کمپیوٹرائزڈ فوٹو لائبریری اپنے اندر محفوظ کر رہی تھی۔

میں نے پہلی بار جب اسے نصیر نواز کے ساتھ دیکھا تھا تو مجھے اس میں ہلکی سی "دیہاتیت" کی جھلک محسوس ہوئی تھی لیکن اس وقت وہ اپنے میک اپ، لباس اور رکھ رکھاؤ سے مکمل طور پر اس طبقے کی نمائندہ عورت دکھائی دے رہی تھی جن کی زندگی کا بیشتر حصہ فرانس، امریکا اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ میں بسر ہوتا ہے۔ شاید میں ہی پہلی ملاقات پر صحیح طور پر اس کا جائزہ نہیں لے سکا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ اس وقت میرے ساتھ شعلہ بردوش ستارہ تھی جو ۔۔۔ بہت خاص موڈ میں تھی۔ وہ مجھے کسی اور طرف متوجہ ہونے کی مہلت ہی نہیں دے رہی تھی۔

"معاف کیجئے گا طاہرہ خانم!" میں نے انتہائی شائستگی سے کہا۔ "خواتین کو..... اور خصوصاً خوبصورت خواتین کو انتظار کرانا انتہائی بدذوقی کی دلیل ہے لیکن مجھے مجبوراً چند منٹ آپ کو انتظار کی زحمت دینا پڑی۔ دراصل میں اس حالت میں نہیں تھا کہ آپ کی آمد کی خوشخبری سن کر فوراً آپ کے سامنے آ سکتا، ورنہ شاید میں خود باہر آ کر آپ کو ریسیو کرتا۔"

اس کے چہرے کا برف زار دھیرے دھیرے تھوڑا سا پگھلا اور مسکراہٹ کی کرن جھلملائی۔ اسی دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے نہایت مترنم آواز میں بولی۔ "ہو سکتا ہے میرا شمار ان لوگوں میں ہو جو آپ کو کسی بھی حالت میں دیکھ کر خوش ہوتے ہوں۔"

اس کے الفاظ سے زیادہ معانی اس کے لہجے میں پوشیدہ تھے۔ میں نے بے ساختہ کہا۔ "نزع کی حالت میں دیکھ کر بھی؟"

"بدشگونی کی باتیں مت کیجئے۔" وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "یہ ہماری پہلی ملاقات ہے۔"

"اوہ! آئی ایم سوری۔ ایسے ہی ذرا زبان پھسل گئی تھی۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "لیکن کیا واقعی مجھے عالمِ نزع میں دیکھنا آپ کے لئے خوشی کی بات نہیں ہوگی؟"

"میں نے تو ابھی آپ کو زندگی کے عالم میں صحیح طور پر نہیں دیکھا، آپ نزع کی باتیں کرنے لگے۔ میری معلومات اور میرے قیافے کے مطابق تو آپ اتنے قنوطیت پسند نہیں ہیں۔ آپ تو بدترین حالات میں بھی شگفتہ انداز میں سوچنے والے اور بے خوف انداز میں بولنے والے ہیں۔" وہ اسی مترنم، دل نشیں اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ میرے بارے میں معلومات بھی رکھتی تھی اور قیافے بھی لگائے بیٹھی تھی۔ جو تقریباً درست ہی تھے۔ لیکن یہ کیونکر ممکن ہوا تھا؟ یہ میں سمجھ نہیں سکا۔

سرِدست میں نے اسے کریدنے کے بجائے شکرگزارانہ سے لہجے میں کہا۔ "آپ میرے بارے میں حسنِ ظن لے کر آئی

ہیں۔ میں بے حد ممنون ہوں۔ آپ کیا پینا پسند کریں گی؟"

"شیمپین منگا لیجئے۔ طبیعت بڑی بے کیف ہو رہی ہے۔" وہ بلا تامل بولی۔ مجھے اندر ہی اندر اس فرمائش پر خفیف سا جھٹکا لگا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ میں اب جس طبقے میں شامل تھا وہاں کسی عورت کے منہ سے اس قسم کی فرمائش حیرت کا باعث نہیں بنی چاہئے تھی۔ لیکن پھر بھی بہرحال یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ طبقہ خواہ کچھ بھی ہو' پہلی ملاقات کے اپنے کچھ تقاضے' کچھ تکلفات ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تمام تقاضوں کو فضول سمجھ کر' تمام تکلفات کو بالائے طاق رکھ کر آئی تھی۔

ملازم شیمپین اور لوازمات کی ٹرے سجا کر لے آیا تو میں نے کہا۔ "ہیلپ یور سیلف پلیز۔ آپ کو خود ہی زحمت کرنا پڑے گی۔"

اس نے دو ڈرنکس تیار کیں۔ میں خاموشی سے دیکھتا رہا۔ جب اس نے ایک گلاس میری طرف بڑھایا تب میں نے کہا۔ "شکریہ۔ میں پیتا نہیں ہوں"

اسے گویا حیرت کا خاصا زوردار جھٹکا لگا۔ حیرت کے اظہار کے طور پر اس نے تیزی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے طویل و عریض ڈرائنگ روم کی ایک دیوار کی طرف دیکھا۔ اس دیوار پر لکڑی کا خوبصورت آرائشی کام تھا' جس کے عقب میں بار موجود تھا۔ ملازم نے طاہرہ خانم کے سامنے وہیں سے سب کچھ نکالا تھا۔

وہ اس طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "لیکن اس اہتمام میں تو ذاتی دلچسپی اور ذوق کی جھلک نظر آ رہی ہے۔ ویسے تو اب ہمارے طبقے میں بار زیادہ تر گھروں کے لوازمات میں شامل ہو گیا ہے۔ لیکن یہ خوبصورتی اور وسعت میں نے کہیں نہیں دیکھی۔"

"ذاتی دلچسپی تو میں عموماً ہر کام میں شامل کر لیتا ہوں۔" میں نے کہا "میں اس نظریئے کا قائل ہوں کہ انسان برائی کو بھی اپنائے تو سلیقے سے اپنائے۔"

"تو آپ اسے برائی سمجھتے ہیں۔" اس نے شیمپین کا خوبصورت فرانسیسی ہائی بال بلند کرتے ہوئے کہا جس سے وہ ایک گھونٹ بھر چکی تھی۔

"ہاں۔ برائی تو برائی ہے۔" میں نے بلا تامل کہا۔

"اوہ...." وہ متاسفانہ انداز میں خوبصورت ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی۔ "یہاں میرا اندازہ غلط ہو گیا۔ میں آپ کو اتنا پارسا سمجھ کر آپ کے پاس نہیں آئی تھی۔"

"میں نے کب کہا کہ میں پارسا ہوں؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "مجھے پارسائی کا دعویٰ ہرگز نہیں۔ لیکن میں رند خرابات بھی نہیں۔"

"تو پھر آپ کیا ہیں؟" اس نے ایک اور گھونٹ بھر کر گلاس کو ایک ادائے خاص کے ساتھ انگلیوں میں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میں خود بھی فیصلہ نہیں کر سکا۔" میں نے دیانتداری سے کہا۔ "شاید میں کوئی بہت اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن اچھا آدمی بننے کے لئے کوشاں ضرور رہتا ہوں۔ کوئی نہ کوئی غلط کام کبھی کبھار مجھ سے سرزد ضرور ہو جاتا ہے لیکن اس پر میں نے خوشی یا محسوس نہیں کیا۔ ہمیشہ پچھتاوا ہی محسوس کیا ہے۔ میرے خ یہ اس بات کی پکی دلیل ہے کہ میرا خمیر خراب نہیں ہے۔ ہر برائی کو صرف چکھا ہے اور چکھ کر چھوڑ دیا ہے۔ یہ میری خو قسمتی ہے کہ میں کسی بھی نشے' کسی بھی برائی کا مستقل اس ہو سکا۔"

"بہت..... خوب..... بہت خوب" اس نے کر نادیدہ حاضرین کو تالیاں بجانے کا اشارہ کیا پھر خالی ہوتے گلاس کو میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "فرض کر لیجئے یہ ما اور میں ٹی وی پر آپ کا انٹرویو لے رہی ہوں۔ ہاں تو صاحب! یہ بتایئے آپ کی زندگی کا مقصد کیا ہے؟"

میں نے اپنی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آنے دیا اور بات رکھتے ہوئے کہا "میں اس سلسلے میں بھی آج تک کسی نتیجے پہنچ سکا۔ کبھی کبھی مجھے اپنی زندگی کی کہانی بے مقصد ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں کے ننانوے فیصد طرح میری زندگی بھی مقصد سے محروم ہی رہے گی۔ دوسرے لوگوں کی طرح میرا معاملہ بھی یہی رہے گا کہ ہوئے' ادھر اُدھر بھٹکے' کاروبار کیا' روپیہ کمایا' کچھ برائیوں میں الجھے اور بالآخر مر گئے۔ یہ کوئی زندگی نہیں۔ ایسا ہوا تو مجھے اس پر افسوس ہو گا۔ لیکن کبھی کبھی کوئی مجھے اطمینان دلاتی ہے کہ ایسا نہیں ہو گا۔ میرا دل کہتا ہے مقدر میں کوئی بڑا کام لکھا ہے۔ قدرت مجھ سے کوئی بہت لینا چاہتی ہے۔ اسی لئے وہ اتنی تیزی سے مجھے اوپر لا رہی میں تو بہت ہی حقیر اور بے وسیلہ سا انسان تھا۔ دو وقت کی لالے پڑے رہتے تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس طرح کے گھر میں' اس طرح کے ڈرائنگ روم آپ جیسی کسی حسین خاتون سے اس بے تکلفی سے ہوں گا۔"

"صرف ایک خاتون سے ہی نہیں' بلکہ اونچے طبقے کی کتنی خواتین سے۔" طاہرہ خانم نے تصحیح کی۔

"آپ میرے بارے میں حسن ظن ضرور رکھیں مگر مت رکھیں۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"یہ حسن ظن کی نہیں حسن زن کی باتیں ہیں۔" وہ گلاس خالی کر کے اس نے واپس میز پر رکھتے ہوئے کہا "مائیک ہٹا لیا ہے' انٹرویو ختم۔ اب آف دی ریکارڈ باتیں ہیں۔"

ہم دونوں ہی ہنس دیئے۔ اس نے وہ گلاس اٹھا لیا لئے تیار کیا تھا۔ وہ چہرے سے جتنی سرد مہر اور خشک مزاج تھی' ویسی نہیں تھی۔ ایک لمحے کے سکوت کے بعد میں۔

"آف دی ریکارڈ کون سی باتیں؟"

وہ ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر بولی۔ "آپ نے پوچھا نہیں کہ میں ی خاص شناسائی کے' بغیر کسی دعوت کے' بغیر کسی اطلاع کے کے ہاں کیوں چلی آئی؟"

"آپ چلی آئیں یہی کافی ہے۔ آپ کی نوازش ہے۔ اب کو سوالوں کے خار زار میں گھسیٹتے پھرنا تو بڑی بے وقوفی اور ی کی بات ہوگی۔" میں پہلے اسے اچھی طرح خوش کرنے پر تلا تھا کہ شاید اس طرح اس کی اصلیت کو سمجھنے میں کچھ مدد مل

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ایک نالائقی تو مجھ سے ہی سرزد ہو چکی ہے کہ جب سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں سے تعارف ہوا تھا تو میں نے آپ کو دعوت نہیں دی کہ کبھی ے ہاں تشریف لا کر اس غریب خانے کو رونق بخشیں۔ شاید میں احتیاطاً ایسا نہیں کیا تھا کیونکہ آپ نصیر نواز کے ساتھ تھیں۔ نے سوچا وہ' حسد اور رقابت میں مبتلا نہ ہو جائے"

"ہاں۔ یہ عین ممکن تھا۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "شاید میں بھی اس وقت زیادہ توجہ سے آپ کی طرف اس لئے نہیں دیکھا کہ ستارہ آپ کے شانہ بہ شانہ تھی۔" اس نے حساب برابر دیا۔

میں نے لہجہ قدرے مغموم بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ نا ہے نصیر نواز نے خودکشی کر لی تھی اور کوئی اعتراف نامہ قسم کی بھی چھوڑی تھی جس میں نہ جانے کن کن گھپلوں کا ذکر تھا؟"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ دوسرا پیگ بھی ن سے اتار چکی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خمار کا شائبہ تک ں تھا' البتہ اس کی برف جیسی سفید رنگت میں زندگی کا ہلکا سا ار جھلکنے لگا تھا۔ ایک ثانیے کے لئے مجھے یوں لگا جیسے اس کی ریں میری روح کی گہرائی تک میں اتر جائیں گی۔ میں نے پوری وشش کی کہ میرے باطن کے دروازے بند ہو جائیں۔ کہیں کوئی روزن بھی باقی نہ رہے۔ میں چہرے پر حتی الامکان معصومیت طاری ئے بیٹھا رہا۔

"ہاں۔ خودکشی تو اس نے کر لی تھی۔" وہ بدستور میری نکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "لیکن نہ انے کیوں اس کی خودکشی میرے لئے ایک معمّا بن گئی ہے۔"

"اور آپ کو معمّے حل کرنے کا شوق ہو گا۔" میں نے بظاہر سادگی سے کہا۔

بات شوق کی نہیں' افسوس کی ہے۔" وہ پہلو بدلتے ہوئے لی۔ "آپ کو یقیناً بہت اچھی طرح اندازہ ہے کہ وہ میرا کس قسم کا ست تھا۔ مجھے نیک پروین نظر آنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے۔ میں جو کچھ کرتی ہوں اسے چھپانے کی کوئی خاص کوشش نہیں کرتی اور جو کچھ کہنا چاہتی ہوں اسے بھی دل میں دبائے رکھنے کی عادی نہیں ہوں۔ مثلاً میں آپ کو یہ بتا دینے میں بھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتی کہ آپ مجھے پہلی ہی ملاقات میں بہت اچھے لگے تھے۔ اسی کے نتیجے میں آپ آج مجھے یہاں دیکھ رہے ہیں۔"

"بہت شکریہ۔ یہ صرف آپ کا حسنِ نظر ہے ورنہ مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اوہ.... خدا کے لئے یہ روایتی قسم کی غیر ضروری انکساری کا اظہار کرنے کی کوشش نہ کریں۔ ہم سیدھی اور سچی باتیں کریں تو دوستی میں زیادہ لطف رہے گا۔" وہ نہایت شستہ انگریزی میں بولی۔ یہ بھی خوب تھا کہ وہ اپنی طرف سے ہی دوستی کا پروگرام طے کر کے آئی تھی۔

"میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا کہوں؟" میں نے پسندیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "پہلی بار کسی حسین عورت نے پہلی ہی ملاقات پر اس صاف گوئی سے ایک مرد کی تعریف کی ہے' پسندیدگی کا اظہار کیا ہے۔ عام طور پر صرف عورت ہی یہ اپنا حق سمجھتی ہے کہ اس کی تعریف کی جائے' اس سے عشق جتایا جائے"

"آپ مردوں نے ہی اسے ایسا بنایا ہے۔ اس کی زبان بند کر دی ہے۔ وہ بے چاری صرف جھوٹی سچی تعریفیں سن سن کر ہی خوش ہوتی رہتی ہے۔ خوشی سے پھولی نہیں سماتی۔ اس چکر میں وہ اپنے جذبات کو بھول ہی جاتی ہے۔ انہیں لفظوں کی شکل .... دینا اب اس کی سرشت میں ہی شامل نہیں رہا۔ لیکن میں مرد کے بنائے ہوئے اس خول میں مقید نہیں رہی۔ میں اپنے جذبات کے اظہار میں اپنے آپ کو لاشعوری گھٹن میں مبتلا نہیں رکھتی۔ مجھے اگر ایک مرد اچھا لگتا ہے تو میں بھی اس سے کہہ سکتی ہوں کہ وہ مجھے اچھا لگ رہا ہے۔ اور کیوں اچھا لگ رہا ہے میں بھی اس سے اظہارِ عشق میں پہل کر سکتی ہوں۔"

"بے شک۔ بے شک۔" میں نے سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلایا۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اس طرح نسوانیت کا شاعرانہ تصور مجروح ہوتا ہے۔" وہ خود ہی بولی۔ "وہ جو ایک شرمائی' لجائی' سکڑی سمٹی بیٹھی ہوئی لڑکی کا تصور ہے' جو بات بات پر لال گلال ہو جاتی ہے' اس تصورکو دھچکا لگتا ہے۔ کہتے ہیں مرد کے حوصلے بلند رکھنے کے لئے یہ تصور ضروری ہے' ورنہ کہیں وہ نہ سکڑنا سمٹنا شروع کر دے۔ لیکن میرے خیال میں یہ سب بیکار باتیں ہیں۔ زمانے اور وقت نے جہاں دوسرے تصورات کی جڑ مار دی ہے' وہاں اس تصور کو بھی سنبھال کر بیٹھے رہنے کا کیا فائدہ؟ میں تو کہتی ہوں عورت کا اظہارِ عشق' اس کی جرأت مندی مرد کو زیادہ جارح بنا سکتی ہے' مہمیز دے سکتی ہے۔ اس کے بہت سے نامعلوم جذبے بھی بیدار ہو سکتے ہیں۔ کیا گھوڑا سڑک صاف دیکھ کر زیادہ تیز نہیں دوڑتا؟ گھنٹوں کا سفر منٹوں میں طے ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کے پاس ضائع کرنے کے لئے اتنا بہت سا وقت کہاں ہے۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کیا "جی ہاں۔ شاید آپ درست ہی

کہہ رہی ہیں۔ دراصل میرے تجربات کچھ اتنے زیادہ نہیں ہیں۔"
مجھے احساس ہوگیا تھا کہ وہ اتنی سطحی عورت نہیں تھی جتنی میں اسے سمجھا تھا۔ میں اس سے بحث میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ پہلے ہی مجھے کافی الجھائے دے رہی تھی۔ ابھی تک اس کی شخصیت کا سرا میرے ہاتھ نہیں آیا تھا۔ ابھی تک اس کی آمد کا مقصد حقیقتاً واضح نہیں ہوا تھا۔

"آپ اب بچنے کی کوشش مت کیجئے۔" وہ دوسرا پیگ خالی کر کے رکھتے ہوئے بولی۔ اس کے پتلے پتلے اور قدرے سفاک سے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی عمر زیادہ نہیں مگر یہ مت کہئے کہ آپ کے تجربات زیادہ نہیں۔"

میں نے بظاہر سہمے سہمے سے انداز میں چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا "کیا تجربات میرے چہرے پر لکھے نظر آنے لگے ہیں؟"

وہ میرے انداز پر بے ساختہ دھیرے سے ہنس دی۔ "نہیں۔ اتنا گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ تجربات چہرے پر دکھائی تو نہیں دے رہے۔ اگر دکھائی دیں تب بھی انہیں پڑھنے کے لئے خاص ہی نظروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ کے چہرے پر تو بڑی معصومیت ہے۔ ابھی آپ برسوں تک ان گنت تجربات اس معصومیت کی تہ میں چھپا سکتے ہیں۔"

"تو پھر آپ نے کیونکر کہہ دیا کہ میرے تجربات زیادہ ہیں؟"

"یہ بھی میرا قیافہ ہے۔"

"آپ کے قیافے بھی آپ کی طرح حسین ہونے چاہئیں۔"

وہ مربیانہ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "آپ کو گفتگو کا سلیقہ کس نے سکھایا؟"

"وقت نے۔" میں نے بلا تامل جواب دیا۔ "میں نے بطور خاص کسی سے بھی کچھ سیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ وقت جیسے خود بخود ہی سب کچھ سکھاتا چلا گیا۔"

ہلکا سا ہنکارا بھر کر وہ بولی۔ "بہت مہربان ہے وقت آپ پر۔"
ایک لمحے خاموشی رہی پھر وہ جیسے کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولی۔
"بات ہو رہی تھی نصیر نواز کی۔ مجھے اس کی موت کا خاصا افسوس ہوا تھا، خصوصاً اس لئے کہ وہ خودکشی کرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اس کے پاس سے ملنے والے خط میں جو باتیں لکھی ہوئی تھیں وہ اسے خودکشی پر مجبور نہیں کر سکتی تھیں۔ بدنامی، بے عزتی، رسوائی، کسی جرم کی سزا کا خوف۔ یہ تو اس کے لئے نہایت معمولی باتیں تھیں۔ وہ زندگی سے چمٹا رہنے والا آدمی تھا۔ ان لوگوں میں سے تھا جو اپنی زندگی کے لئے ہزاروں زندگیاں برباد کر سکتے ہیں۔ اپنے فائدے کے لئے ساری دنیا کو نقصان میں دیکھنا گوارا کر سکتے ہیں۔ ایسے آدمی خودکشی نہیں کیا کرتے۔ وہ صرف ایک صورت میں خودکشی کرتے ہیں۔ یعنی اس وقت جب انہیں پکا یقین ہو جائے کہ اگر انہوں نے خودکشی نہ کی تو وہ کسی اور کے ہاتھوں

زیادہ تکلیف دہ اور زیادہ ذلت آمیز طریقے سے مریں گے۔"

"یہ آپ اس کی تعریف کر رہی ہیں یا برائی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"تعریف نہ برائی۔ میں تو اس کی شخصیت کا صحیح تجزیہ کر رہی ہوں۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"اس کے باوجود وہ آپ کا گہرا دوست تھا؟" میں نے ملا... سے کہا۔

"ہاں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"آدمی اپنے دوستوں سے پہچانا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے اس محاورے سے اتفاق نہیں۔" وہ بولی۔ "انسان حال میں وہی رہتا ہے جو وہ ہوتا ہے۔ آج کے مشکل زمانے کامیابی سے زندگی گزارنا ایک ہنر ہو گیا ہے۔ ایک ہنرمند کی طرح کے اوزار اپنے ساتھ رکھنا پڑتے ہیں۔ انسان کے دو... دراصل اس کے اوزار ہوتے ہیں۔"

"بہت خوب!" میں نے صرف اتنا ہی کہا۔ میں اس انو... فلسفے سے محظوظ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا لیکن میں نے اپنے آ... ہنسنے سے باز رکھا۔

"نصیر نواز زندگی کے کئی مرحلوں میں میری ضرورت تھا۔" ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "اور پھر وہ ہینڈسم بھی تھا۔ ہینڈسم میری کمزوری ہیں لیکن ہر ہینڈسم مرد نہیں۔ مائنڈ اٹ۔"

"اوہ......" میں ہونٹ سکیڑ کر رہ گیا۔ وہ خفیف سی مسکراہٹ ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بات کرتے وقت وہ پلکیں کم جھپکاتی تھی۔

"چوہدری صاحب! آپ کو کچھ اندازہ ہے کہ نصیر نواز آدمی بھلا کیونکر خودکشی کر سکتا تھا؟" وہ یک دم ذرا آگے کو ہوئے بولی۔

"اگر میں اسے ذرا بھی قریب سے جانتا تو شاید اس سلسلے کوئی رائے ظاہر کرنے کی کوشش کرتا۔" میں نے قدرے ... سے کہا۔ "میں آپ کے اس باصلاحیت دوست کی شناسائی بالکل ہی محروم تھا۔ میں بھلا کیا اندازے لگا سکتا ہوں۔ مجھے تو کی موت کی خبر بھی اخبارات کے ذریعے ہی ملی تھی۔"

"میں نے اس کے کردار کا جو خاکہ کھینچا ہے اس کی مد میں آپ کچھ تو رائے زنی کر سکتے ہیں کہ کیا ایسا آدمی خودکشی کر تھا؟" اس کے لہجے میں ہلکا سا اصرار تھا۔

'یہ کمبخت مجھے کیوں کرید رہی ہے؟ کیا اسے کسی قسم کا ... ہے' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ منطقی طور پر ایسا ممکن تو ... تھا۔

میں نے بیزاری سے کہا۔ "خانم! اس شہر میں طبعی اور غیر ... ملا کر پچیس تیس اموات روزانہ ہوتی ہیں۔ بعض کے بارے ہم جان پاتے ہیں اور بعض کے بارے میں نہیں۔ بعض کے با...

...نے کی ہمیں کوئی خواہش بھی محسوس نہیں ہوتی۔ نصیر نواز ...ے نزدیک انہی لوگوں میں سے ایک تھا۔ وہ میرے لئے ...بی تھا۔ مجھے اس کی موت کا تاسف ضرور ہوا تھا لیکن میں ...پوری تفتیش کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ آپ کے ذہن میں ...ضمن میں کوئی سوال، کوئی خلش یا تشنگی ہے تو آپ پولیس ...کو تھوڑا سا ہلا کیں جلائیں، شاید کوئی کام کی بات معلوم ...ے۔"

...س کے چہرے پر مسکراہٹ اب پوری طرح طلوع ہوئی اور وہ ...بدلے بدلے سے لہجے میں بولی۔ "اوہو...... آپ تو شاید ...ہو گئے چوہدری صاحب! مجھ میں دراصل یہی خرابی ہے کہ ...مجھے اچھا لگتا ہے اس سے پہلی ملاقات پر ہی میں فرض کر ...لوں کہ اس سے میری برسوں کی دوستی ہے۔ اس سے اپنی ...اور اپنی الجھنیں اس طرح زور و شور سے ڈسکس کرنے لگتی ...جیسے وہ بھی ان پر میری ہی طرح تڑپ اٹھے گا اور ہر گتھی کو ...نے کے لئے بے چین ہو جائے گا۔ میں بھول گئی تھی کہ نصیر ...صرف میرا دوست تھا، آپ کا نہیں۔ آپ بور نہ ہوں، میں ...اس کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گی۔"

اس نے بڑی ہوشیاری سے موضوع کا تاثر بدل دیا تھا۔ اب ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ درحقیقت مجھے کرید ...رہی تھی۔ تاہم میں نے اپنا لہجہ خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔ "یہ ...دونوں کے حق میں اچھا ہوگا۔ پہلی ملاقات پر ایسے ناگوار اور دل ...دکھانے والے موضوع زیر بحث نہیں آنے چاہئیں۔"

"بالکل درست کہا آپ نے۔" اس کے لہجے میں اب ایک ...قسم کی مٹھاس سی مٹھاس تھی "ویسے بھی مجھے اندازہ تھا کہ ...نہ ایک روز نصیر نواز کسی افسوسناک انجام سے ہی دوچار ...ہو۔ اس میں ایک بڑی خرابی یہ بھی تھی کہ اپنی ہر طرح کی ...خواہشات کی تکمیل کے سلسلے میں وہ نتائج کی بالکل پروا نہیں کرتا ...جو کرنا ہوتا تھا، بس کر گزرتا تھا۔ یہ نہیں سوچتا تھا کہ کوئی بظاہر ...معمولی نظر آنے والی چیز گلے بھی پڑ سکتی ہے۔"

میں نے شیمپئن کی بوتل اور سوڈے کے سائفن وغیرہ کی طرف ...اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور لیجئے نا۔ آپ رک کیوں گئیں؟"

"بس۔" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "طبیعت کی بے کیفی دور ...کرنے کے لئے اتنی ہی کافی تھی۔" پھر وہ کھنکتی سی آواز میں، دھیمی ...ہنسی کے ساتھ بولی "آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ خود پیتے نہیں، ...دوسروں سے فرمائش کرتے ہیں کہ اور پئیں۔ شاید آپ دوسروں کو ...پیتے دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔"

"میرے ہاں ہر ذوق کے لوگ آتے ہیں۔ کاروبار کے سلسلے ...میں غیر ملکی پارٹیاں بھی آتی رہتی ہیں۔ ہوٹلوں کے علاوہ کبھی کبھی ...ان کا یہاں بھی قیام و طعام یا کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہو جاتی ہے۔ ...میں ان سب پر اپنے نظریات و افکار تو نہیں ٹھونس سکتا۔ اور

ابھی میں خود کو اس قابل بھی نہیں سمجھتا کہ ایسی کوئی بات کر سکوں۔ اس لئے میں واعظ و نصیحت نہیں کرتا۔ اگر کبھی میرے اعمال اس قابل ہو گئے تو پھر شاید یہ جرأت کروں۔ فی الحال تو میں واقعی لوگوں کو کھاتے پیتے دیکھ کر خوش ہوتا ہوں، محظوظ ہوتا ہوں"

"اچھا چلئے ان باتوں کو چھوڑئے۔ میرا خیال ہے اس مختصری ملاقات میں ہم ایک دوسرے کو بہت بہتر طور پر جان گئے ہیں۔" وہ یکدم جیسے سارے مسائل کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بولی۔ "اب ذرا کچھ تفریح کی باتیں کرتے ہیں۔ انٹرکان میں آج رات ایک زبردست ڈانسر کا شو ہے۔ ہفتے میں تین دن شو ہوتا ہے۔ مرد ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ ٹکٹ بلیک میں بکتے ہیں۔"

"ایسی کیا خاص بات ہے اس میں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

وہ ایک آنکھ کو خفیف سا دباتے ہوئے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "تم مرد ہو۔ یہ تو تمہیں بہتر طور پر معلوم ہونا چاہئے۔ سنا ہے یورپ اور بیروت وغیرہ کے بڑے کامیاب دورے کر کے آئی ہے۔"

"اس قسم کے ڈانس شوز میں کبھی کبھار اتفاقاً ہی جانا ہوا ہے۔ بطور خاص، ارادہ کر کے میں کبھی نہیں گیا۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس میں تو چلنا پڑے گا۔ میرے پاس دو عدد وی آئی پی ٹکٹ ہیں۔ مجھے امید ہے آپ بور نہیں ہوں گے۔" اس کے لہجے میں اصرار تھا۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مرد تو عورتوں کو اس قسم کی دعوتیں دیتے رہتے ہیں لیکن کسی عورت کے منہ سے مرد کے لئے اس طرح کی دعوت مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ اس قسم کے ڈانس شوز میں میں نے ... مردوں کے ساتھ ان کی بیویوں یا دوست عورتوں کو دیکھا تھا انہیں کافی بدمزہ ہی پایا تھا۔ کیونکہ ان کے ساتھی مردوں کی تمام تر توجہ ڈانسر کی ہوشربا حرکات پر ہوتی تھی۔ بعض کے منہ سے تو صرف رال بہنے کی کسر ہوتی تھی۔ ظاہر ہے ساتھی عورتوں کے لئے یہ کوئی قابلِ رشک صورت حال نہیں ہوتی تھی۔ لیکن طاہرہ خانم یقیناً ایک مختلف عورت تھی۔ یا پھر دوستی میں گرمجوشی لانے کے لئے اس کا طریق کار مختلف تھا۔

مجھے ایک لمحے کے لئے خاموش دیکھ کر وہ بولی۔ "ویسے بھی میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ شاید کہیں باہر ہی جانے کے لئے تیار ہو کر آئے تھے۔"

"جی ہاں۔ اسی لئے تو میں ڈانس شو کے بارے میں معذرت چاہوں گا۔ میری ایک اور ہوٹل میں باہر کی پارٹی سے کاروباری ملاقات طے ہے۔" میں نے حقیقتاً معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

وہ قدرے مایوسی سے بولی۔ "چوہدری صاحب! میرے قیافے عام طور پر غلط ثابت نہیں ہوتے۔ لیکن آپ کے بارے میں تو میرا علمِ قیافہ کچھ کچھ غلط ثابت ہوتا جا رہا ہے۔ میرا خیال تھا کہ آپ اُن

لوگوں میں سے نہیں ہیں جو کاروبار کو سر پر سوار کر لیتے ہیں۔ دن رات کاروبار کے سوا انہیں کسی بات کا ہوش نہیں ہوتا۔ زندگی کی آسائشوں اور طرب و نشاط سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ اور بالآخر وہ دوسروں کے لئے بینکوں میں اثاثوں کی صورت میں ڈھیروں دولت چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔"

اس میں شک نہیں تھا کہ میرے بارے میں اس عورت کے تمام اندازے درست تھے لیکن میں جان بوجھ کر انہیں غلط ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس نے یہ تمام اندازے مجھے محض ایک پارٹی میں دیکھنے کے بعد قائم کئے تھے۔ اگر اس سے ملاقاتیں شروع ہو جاتیں تو اس کے اندازوں کا جانے کیا عالم ہوتا!

وہ مجھے خاموش دیکھ کر گویا قائل کرنے کے لئے بولی۔ "انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے کماتا ہے۔ اگر وہ اس دولت سے کوئی لطف ہی نہ اٹھا سکے تو کیا فائدہ؟"

میں نے اسے نہیں بتایا کہ یہ باتیں تو میں خود لوگوں سے کرتا رہتا تھا۔ اس کے بجائے میں نے کہا۔ "لطف' آسائشوں اور لذتوں کے بھی اپنے اپنے معیار ہوتے ہیں۔"

وہ میرے الفاظ پر توجہ دئے بغیر بولی۔ "میں خود بھی ایک کاروباری عورت ہوں۔ اور عورت کو تو پیسے کا لالچ زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن میں نے کاروبار کو کاروبار کی جگہ رکھا ہوا ہے۔ چار بجے کے بعد میں ایک لمحہ آفس میں نہیں بیٹھتی اور نہ ہی اس کے بعد کوئی کاروباری مصروفیت رکھتی ہوں۔ میں بھی اگر دوسروں کی طرح چوبیس گھنٹے کاروبار کی فکر میں پھنسی رہوں تو اسے مزید وسعت دے سکتی ہوں لیکن میرا دل نہیں مانتا۔ اس چکر میں اگر پھنس جاؤ تو پھر اس کی کوئی انتہا نہیں۔ جبکہ میں تو اپنے کاروبار کے موجودہ پھیلاؤ سے ہی تنگ ہوں۔ مجھ سے یہی نہیں سنبھلتا۔"

"کیا کاروبار ہے آپ کا؟ یہ میری نالائقی ہے کہ شہر کی بیشتر بے ہنگم قسم کی کاروباری شخصیات اور ان کے کاروبار سے تو واقف ہوں لیکن اس خشک اور بے کیف میدان میں ایسے حسین چہرے کی موجودگی سے بے خبر رہا۔"

وہ دلفریب انداز میں مسکرائی لیکن اس مسکراہٹ میں خفیف سی شرارت بھی پنہاں تھی' جیسے دل ہی دل میں کہہ رہی ہو..."میں خوب سمجھ رہی ہوں تمہیں۔ بڑی شے ہو تم بھی۔ ایک طرف بے نیازی بھی جتا رہے ہو' دوسری طرف تعریف کا کوئی موقع بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے'

بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ قدرے بے نیازی سے بولی۔ "چھوٹی موٹی کچھ انڈسٹریز ہیں۔ ڈسٹری بیوشن کا کچھ کام ہے۔ دو سینما ہیں۔ لیکن ہمارا شمار زیادہ بڑے لوگوں میں نہیں ہے۔ دوسرے میں چیمبر آف کامرس کی سرگرمیوں میں بھی بالکل حصہ نہیں لیتی۔ شاید اسی لئے آپ ہمارے وجود سے بے خبر رہے

ہوں۔"

میں نے جب مزید کریدا تو وہ اسی بے نیازی سے اچھے مشہور برانڈ کے ایک گھی' صابن اور پینٹ کا نام بتاتے ہوئے "ان تینوں چیزوں کے کارخانے ہیں۔ ان کے علاوہ شیخوپورہ پچھلے سال گارمنٹس اور ہوزری کے دو بڑے یونٹس ہیں۔ اسی سال ان کی پروڈکشن شروع ہوئی ہے۔ ٹینریز اور کی بھی ایک ایک فیکٹری تھی۔ وہ دونوں میں نے بیچ دی ہیں۔ حالت اچھی نہیں تھی۔ یونینوں نے انہیں ڈوبنے کے قریب تھا۔"

"بہت خوب!" میں نے سرہلایا۔

"یہ "بہت خوب" آپ کس بات پر کہہ رہے ہیں؟ اس پر کہ یونینوں نے فیکٹریوں کو ڈوبنے کے قریب پہنچا دیا تھا؟" مسکراہٹ میں ہلکی سی شرارت برقرار رہی۔

"نہیں۔ اس بات پر کہ آپ ڈوبتے کاروبار کو بچانے کاروبار شروع کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔" میں نے کہا "سنا آپ فلم انڈسٹری میں بھی قدم رکھ رہی ہیں۔"

"وہ تو بس ایسے ہی۔" وہ بے معنی سے انداز میں "دراصل وہ میں نصیر نواز کی خوشنودی کے لئے تھی۔ کاروباری مقصد بھی اپنی جگہ تھا لیکن نصیر نواز کی خوش عزیز تھی۔ آخر وہ دوست تھا۔"

میں نے اب تک دولت مند مردوں کو اپنی "خاص" دوستوں کے لئے اس طرح کی سرمایہ کاریاں کرتے دیکھا تھا۔ عورت تھی جس کے منہ سے میں ایک مرد کی خوشنودی سرمایہ کاری کی بات سن رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اب آپ سے کیا دراصل پچھلے کچھ برسوں میں میرے کچھ ملازموں اور انکم وغیرہ کے کچھ وکیلوں نے اپنی دانست میں میری ہمدردی

کے لئے ایسے طریقے اختیار کئے کہ میرے پاس کافی بلیک ویسے تو بلیک منی خیر زیادہ تر بڑے کاروباری لوگوں کے ہی ہے۔ لیکن میری کچھ ایسی ہے کہ سنبھالنا مشکل ہو رہا اور وکیلوں نے کام پکا نہیں کیا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں کہ کیا کروں۔ میں بلیک میل ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اسی نصیر نواز سے دوستی بہت گہری ہو گئی اور اس نے فلمیں کر کے بلیک منی کو وہائٹ کرنے کا بہت اچھا فارمولا پیش میں نے ہامی بھرلی۔ لیکن اب اس کی موت کی وجہ سے کچھ بیچ میں رہ گیا۔"

"اوہ... یہ تو بہت برا ہوا!" میں نے رسمی سے لہجے میں کہا۔ وہ بظاہر سرسری سے لہجے میں بولی۔ "آپ نے بھی تو آفاق کو شن شروع کرا کے دی ہے۔ ابتدا میں آپ کا کتنی بلیک منی نے کا ارادہ ہے؟"

"ذرا سی بھی نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں نے منی کا ایک روپیہ بھی فلم انڈسٹری میں نہیں لگایا۔ اور نہ ہی کا ارادہ ہے۔ میرے پاس بلیک منی ہے ہی نہیں۔"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر نو عمر لڑکیوں کے سے انداز میں ہنسنے لگی۔ میں نے کوئی ناقابلِ یقین بات کہہ دی ہو۔ میری سنجیدگی میں فرق نہ آیا۔ اس کی ہنسی تھمی تو وہ بولی۔ "یہ تو یقین کرنے والی ہی نہیں۔ ہمارے ٹیکسوں کے نظام میں اگر کوئی کاروباری سو فیصد صحیح چلے تو وہ آپ کی طرح بزنس ایمپائر بنانا تو دور کی گزارا بھی نہیں کر سکتا۔ عین ممکن ہے وہ دیوالیہ ہی جائے۔"

"نہیں۔ ایسی بھی بات نہیں ہے۔" میں نے متانت سے کہا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے شروع سے ہی کچھ ماہرین معاشیات کے لوگوں کا تعاون حاصل ہو گیا۔ ہم نے بہت سے راستے نکال لئے جن پر چل کر دیانتداری سے بھی بہت تیز رفتار ترقی کی جا سکتی ہے۔"

"ایسے نایاب لوگوں سے تو ہمیں بھی ملوایئے گا۔ ہماری بھی کچھ مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ لہجہ معمولی سا استہزائیہ تھا۔

میں نے بُرا منائے بغیر کہا "ضرور۔ ضرور۔ ویسے اب تو میں بھی ان سب لوگوں سے اتنا کچھ سیکھ چکا ہوں اور اتنے تجربات سے گزر چکا ہوں کہ اگر میرے پاس معاشیات کی کوئی بڑی ڈگری ہوتی اور میں کاروبار میں اتنا نہ پھنس چکا ہوتا تو شاید بہت بڑا تھنکر ہوتا۔ لوگوں کے سرمائے کو اس بری طرح الٹ پلٹ کرتا کہ دنیا بھر میں نہ جانے کتنی ایمپائرز کھڑی کر لیتا۔ میرے موجودہ کاروبار تو اس کے سامنے اونٹ کے منہ میں زیرے کے مصداق دکھائی دیتے۔"

یہ حقیقت تھی۔ میں اب کچھ ایسا ہی محسوس کرتا تھا۔ وہ میرے لہجے کی سنجیدگی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس کے چہرے سے خفیف سے تمسخر کے آثار غائب ہو گئے اور وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی "اگر کبھی کوئی بڑا پروگرام بنے تو مجھے یاد رکھئے گا۔ اپنی حیثیت کے مطابق میں بھی آپ کے ساتھ چلنے میں خوشی محسوس کروں گی۔ لیکن آپ کی فلم پروڈکشن والی بات پر میری حیرت اب بھی برقرار ہے۔ میرا خیال تھا کہ فلم انڈسٹری میں تو شاذو نادر ہی کوئی وہائٹ منی لے کر جاتا ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ ہر کاروباری میدان کی طرح اس میدان میں بھی ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ میں فلم انڈسٹری کو زیادہ قریب سے تو نہیں دیکھ پایا لیکن جتنا دیکھ پایا ہوں اس سے کافی باتوں کا اندازہ ہو گیا ہے۔ ہر طرح کا آدمی آتا ہے۔ ہر طرح کا پیسہ لے کر آتا ہے۔ کچھ لوگ صاف ستھرا پیسہ لے کر آتے ہیں اور صرف کمانے کی دُھن لے کر آتے ہیں۔ دوسرے تمام کاروباروں کی طرح اسے بھی ایک کاروبار سمجھتے ہیں۔ کچھ بلیک منی بھی لے کر آتے ہیں۔ کچھ شوق کے تحت آتے ہیں۔ کچھ ٹھرک پوری کرنے آتے ہیں۔ اس ٹریڈ کے رنگ ڈھنگ تھوڑے سے مختلف ضرور ہیں لیکن بنیادی باتیں تو وہی ہیں جو کسی بھی کاروباری میدان میں ہوتی ہیں۔"

"چلئے ایسا کیجئے۔" وہ پُر خیال انداز میں بولی۔ "کہ نصیر نواز کی غیر متوقع موت سے میرے جو پروگرام ادھورے رہ گئے ہیں انہیں جاری رکھنے میں آپ ہی میری کچھ مدد کیجئے۔ آفاق کے ذریعے سے میرا بھی کچھ روپیہ فلم انڈسٹری میں لگوا دیجئے۔ یوں تو بہت سے لوگ بہت سے منصوبے لے کر میرے پیچھے لگے رہتے ہیں لیکن میں چاہتی ہوں' جو بھی کام ہو کسی صحیح آدمی کے ہاتھوں سے ہو۔ پیسے کی مجھے کچھ زیادہ پروا نہیں۔ لیکن میں بالکل ہی ریت کے گھروندے بھی بنانا نہیں چاہتی۔"

وہ کچھ کچھ مجھ سے ملتے جلتے نظریات کا اظہار کر رہی تھی۔ آفاق کے ساتھ کام کا آغاز کرتے وقت میں نے بھی کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ طاہرہ خانم کی سرمایہ کاری کی پیشکش سن کر میں دل ہی دل میں وقت اور حالات کی بوالعجبی پر کچھ حیران بھی ہوا اور کچھ محظوظ بھی۔ میں بزنس کی دنیا میں آگے آگیا تھا تو ہر طرف سے سرمایہ چلا آرہا تھا۔ جب مجھے ضرورت نہیں تھی تو بینک' شرفا' اسمگلر' بلیک مارکیٹئے' غرضیکہ سبھی مجھے روپیہ دینے کو تیار تھے۔ آدمی جب غریب ہوتا ہے تو کوئی اسے دس روپے بھی اُدھار نہیں دیتا۔ اپنے پلّے ڈھیروں روپیہ ہو تو بینک تک بھی مزید روپیہ دینے کو تیار رہتے ہیں۔ اور وہ بھی دوسروں کا روپیہ۔ پھر اگر اثر رسوخ ہو تو معاف بھی کر دیتے ہیں' بھول بھی جاتے ہیں۔ دنیا واقعی بڑی عجیب جگہ ہے!

میں نے ملائمت سے کہا "اپنی فلم کمپنی میں تیسرے پارٹنر کو شامل کرنے کے بارے میں تو فی الحال میں معذرت چاہوں گا۔ البتہ میں آفاق سے بات کر کے آپ کو بتاؤں گا۔ شاید وہ آپ کو نئی کمپنی

قائم کرنے میں پوری مدد دینے پر تیار ہو جائے۔ پیسے کی ضرورت تو ہر جگہ رہتی ہے۔ فلم انڈسٹری میں بھی پیسے والوں کا بے چینی سے انتظار رہتا ہے۔"

"ہماری دلچسپی تو آپ میں ہے۔" وہ بلا جھجک بولی "ہم تو اس چیز سے تعلق جوڑنے کے تمنائی تھے جس سے آپ کا کوئی تعلق ہو۔ لیکن آپ انکار پر انکار کئے جا رہے ہیں۔ شاید ابھی آپ کھلنا نہیں چاہتے۔ یا پھر شاید اس لئے ہماری قدر کم ہو گئی ہے کہ ہم خود چل کر آپ کے دروازے پر آ گئے ہیں۔"

"بخدا ایسی کوئی بات نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا "آپ کا چل کر آنا میرے لئے باعث عزت افزائی ہے۔ آپ نے اس گھر کو عزت بخشی ہے۔ باقی یہ انسانوں کے معاملات میں انکار اور اقرار تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ کسی بھی معاملے میں میرا انکار پتھر پر لکیر ہرگز نہیں ہے۔ کل حالات بھی بدل سکتے ہیں' میری رائے بھی تبدیل ہو سکتی ہے' انکار اقرار میں بھی بدل سکتا ہے۔ آپ انڈسٹری اور کاروبار چلا رہی ہیں۔ آپ کو تو ان باتوں کا تجربہ ہونا چاہئے۔"

"تجربہ ہی تو نہیں ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میرا مطلب ہے انکار سننے کا تجربہ نہیں ہے۔ کچھ خوش قسمتی رہی ہے میری۔ جدھر بھی نظر اٹھائی' آمادگی دیکھنے کو ملی۔ جس طرف بھی دستِ سوال دراز کیا' خالی واپس نہیں آیا۔ آج پہلی بار عزتِ نفس۔ یا یوں کہئے کہ نسوانی انا مجروح ہوتی محسوس ہوئی ہے۔"

"اوہ پلیز! ایسا ہرگز نہ سمجھئے۔ میری خواہش آپ کو دل گرفتہ کرنے کی ہرگز نہیں ہے۔ میں آپ جیسی نفیس عورت کو اپنے دوستوں میں ہی دیکھنا پسند کروں گا لیکن مجھے سنبھلنے کا موقع تو دیجئے۔ آپ کی ایک دم نوازشات نے مجھے بوکھلا دیا ہے۔"

میرے الفاظ سے گویا اس کی کچھ دلجوئی ہوئی۔ بجھے ہوئے چہرے پر پھر مسرت کی ہلکی سی چمک ابھری اور وہ ایک بار پھر پہلے کی طرح مسکراتے ہوئے بولی "آپ بہت ڈپلومیٹک گفتگو کرتے ہیں۔ بہت محتاط آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ مجھ سے بالکل الٹ طبیعت ہے آپ کی۔"

"بعض اوقات متضاد طبیعتوں کے لوگ زیادہ اچھے دوست ثابت ہوتے ہیں۔ اور یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ میں آپ سے بالکل ہی متضاد شخصیت کا مالک ہوں۔ عین ممکن ہے ہمارے درمیان بہت سی عادات مشترک پائی جائیں۔ بعض باتوں کا دھیرے دھیرے پتا چلتا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ مخمور سے انداز میں مسکرائی۔ میں اٹھ کر اس کے قریب جا بیٹھا اور بظاہر غیر ارادی سے انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ سرد مہری محض اس کا نقاب تھی ورنہ وہ تو سرتاپا حرارت و گداز تھی۔ مجھے قریب پا کر وہ یکدم اس نو دمیدہ پھول کی طرح کھل گئی جس نے سورج کی پہلی کرن دیکھ لی ہو۔ شاید اس کی منشا یہی تھی۔ ساری تمہید اسی لئے تھی۔ نصیر نواز کی خودکشی کی چھان بین'

شبہات کا اظہار' کاروبار کے منصوبے' روپے پیسے کی باتیں' کچھ وہ جیسے بھول گئی۔

اور یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔

چند لمحے بعد وہ بوجھل لہجے میں بولی "تو پھر چل رہے ہیں م ساتھ ڈانس شو میں؟"

"بار بار انکار کروا کے مجھے شرمندہ نہ کریں۔" میں نے م دیکھتے ہوئے کہا "آج کے بزنس ڈنر کا انتظام میں نے ہی کیا۔ اب اگر میں خود ہی غائب رہوں گا تو اچھا محسوس نہیں ہو گا۔ ڈا شو تو ابھی چلتا ہی رہے گا۔ آپ پرنسس تہمینہ کے شو کی بات کر ہیں نا؟ میں نے ایک انگریزی اخبار میں اس کا اشتہار دیکھا تھا۔ غالباً ابھی ایک ماہ چلے گا۔ پھر کسی دن سہی۔"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اچھا...... جیسے آپ مرضی۔"

"میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "اب یہ "آپ جناب" کچھ عجیب نہیں لگ رہا؟"

"بہت زیادہ میں تو تمہاری وجہ سے یہ اندازِ تخاطب ا رکھے ہوئے تھی۔ ورنہ جو لوگ میرے دل میں کھب جاتے ہیں کے ساتھ "آپ جناب" کرتے ہوئے مجھے دلی تکلیف ہوتی ہے وہ فوراً بولی۔

"ویسے یہ میرا آپ کے دل میں کھب جانے کا حادثہ اچانک ہی نہیں ہو گیا؟ میں نے تو نہیں سوچا تھا کہ قسمت کبھی طرح بھی مجھ پر مہربان ہو سکتی ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا

"میرے ساتھ تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ جو صورت اچھی لگنی ہے وہ پہلی نظر میں ہی اچھی لگ جاتی ہے۔ ورنہ خواہ زندگی صاحب سلامت رہے لیکن ہم سے کوئی ناتا استوار نہیں ہو پاتا۔" وہ میرے قریب سمٹتے ہوئے بولی "اور میرا خیال ہے زیا لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے لیکن انہیں اعتراف میں لگ جاتی ہیں۔ میں لمبے چکروں میں نہیں پڑتی۔ کہ تم مجھے اچھے تو پہلے میں ذرا میٹھی میٹھی نظروں سے کبھی کبھار تمہاری طر دیکھوں۔ تم پیش قدمی کرو تو ذرا نخرے دکھاؤں۔ مہینوں دو دو باتیں ملاقاتیں چلتی رہیں' پھر دوستیوں اور قربتوں کے مر آئیں۔ مجھ سے اتنا انتظار نہیں ہوتا۔ میں بڑی بے تاب اور صبری عورت ہوں۔ اور میں نے اپنے اوپر کوئی خول نہیں چ رکھا۔ جو کچھ بھی ہوں' تمہارے سامنے ہوں۔ چاہے مجھے ا سمجھو یا بری۔"

"تم بہت اچھی ہو۔ اور حوصلے والی بھی۔" میں نے دھیم میں کہا۔

"اب میں چلتی ہوں۔" وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی "تم نے اچھی کہہ دیا' بس اب میں مطمئن ہوں۔ میرے اندر گلزار گئے ہیں۔ باقی باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ اب میں تمہاری جان

ہوں تاکہ تم بزنس ڈنر میں شرکت کر سکو۔"

وہ ایک سرو قد عورت تھی جس کے سراپا میں زلفِ دراز سے کر پائے نازک تک کچھ عجیب سے بھید چھپے ہوئے تھے۔ وہ ں تھی تو خوبصورت لگتی تھی' کھڑی ہوتی تھی تو خوبصورت تر۔

میں نے شاید یونہی اس کے پیکر سے توجہ ہٹانے کے لئے ہا "طاہرہ! تم نے اپنی دولت خود کمائی ہے یا کوئی خاندانی ورثے رہ کا سلسلہ ہے؟"

"کچھ تو خاندانی طور پر بھی میں ٹھیک ٹھاک ہی تھی۔ اس کے بعد شوہروں نے مجھے نہایت حسین قسم کی بیوگی سے دوچار کیا۔ یعنی مر گئے لیکن میرے لئے بہت کچھ چھوڑ گئے۔ انہوں نے مجھ سے ت نہیں کی تھی لیکن باقی ہر طرح سے میرا بہت خیال رکھا تھا۔ ں کے ساتھ مجھے دنیا گھومنے اور بہت کچھ سیکھنے کا بھی موقع ملا ۔ اس لئے ان کے بعد میں نے اس دولت اور بزنس میں اضافہ یا۔ محض عورت اور وہ بھی تنہا عورت ہونے کے باوجود اسے برباد ں کیا۔ لیکن ساتھ ساتھ میں نے خود کو بھی برباد نہیں کیا۔ ہروں کے زمانے میں میں نے بڑی گھٹن کی زندگی گزاری۔ یکے ر دیگرے دونوں ہی مجھے ایک جیسے ملے۔ لیکن اس کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ زندگی کو انجوائے کروں گی۔ سو وہ میں کر رہی ں۔ میں عمر میں تم سے بڑی ہوں لیکن میرا دل شاید تم سے زیادہ ران ہے۔"

"بے شک۔ بے شک۔" میں نے یہ بات تسلیم کرنے میں ہی انیت سمجھی۔ وہ دروازے کی طرف چل دی تھی۔ میں اس کی لداری کے لئے اسے رخصت کرنے باہر اس کی گاڑی تک آیا۔ میرے طویل و عریض لان پر پھیلی ہوئی دنیا بھر کے رنگا رنگ پھولوں کی کیاریوں کی وجہ سے فضا میں بھینی بھینی خوشبو کی آمیزش تھی۔

وہ چاروں طرف دیکھ کر' آسمان کی طرف منہ کر کے ایک بہت طویل سانس لے کر بولی۔ "کبھی کبھی میرا دل چاہتا ہے' ساری خوشبوئیں' ساری روشنیاں' ساری لذتیں اور ساری خوشیاں اپنے رگ و پے میں اتار لوں۔ میں واقعی ایک بے صبری اور بے قناعت عورت ہوں۔"

میں خاموش رہا۔ میں اس کے الفاظ اور اس کی شخصیت میں الجھا ہوا تھا۔ وہ جو کچھ بھی تھی لیکن ایک عجیب اور مختلف عورت ضرور تھی۔ جھرجھری سی لے کر وہ اپنے محسوسات کی دنیا سے باہر آتے ہوئے بولی۔ "اب کسی دن تم میرے گھر آؤ۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ شاعرانہ زبان میں تمہارے لئے بام و در سجاؤں۔ لیکن مجھے معلوم ہی نہیں ہے کہ بام و در کیسے سجائے جاتے ہیں۔ ہاں البتہ میں یہ ضرور کروں گی کہ میرا کک تمہارے لئے دنیا کے بہترین کھانے پکائے گا۔ میں تمہارے لئے دنیا کی بہترین موسیقی کی کیسٹس جمع کروں گی۔ دنیا کی بہترین ڈرنکس اور وائن کا انتظام کروں گی۔"

لیکن یہ کہتے ہوئے اسے گویا کچھ یاد آیا اور وہ قدرے مایوسی سے بولی۔ "مگر اس اہتمام کی کیا ضرورت ہے؟ تم تو پیتے ہی نہیں۔"

"میرا کچھ بھروسا بھی نہیں ہے۔" میں نے قدرے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں ناقابلِ اعتبار سا آدمی ہوں۔ کوئی بعید نہیں کہ تم جیسا پلانے والا میسر آئے تو پینے بیٹھ ہی جاؤں۔"

"جو لوگ خود اپنی زبان سے اپنے آپ کو ناقابلِ اعتبار کہتے ہیں وہ عموماً زیادہ قابلِ اعتبار ہوتے ہیں۔ اور جن کی زبانیں اپنے قابلِ اعتبار ہونے اور اپنی پارسائی کا ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتیں وہ عموماً بالکل ناقابلِ اعتبار اور اندر سے غلیظ ہوتے ہیں۔" وہ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

میں گاڑی پر جھکا تو کھڑکی کے فریم کے قریب مجھے ایک خاصا گہرا ڈینٹ نظر آیا۔ وہاں سے پینٹ بھی اکھڑ گیا تھا۔ خوبصورت اور چم چم کرتی گاڑی پر یہ گڑھا اور داغ کوڑھ کے نشان کی طرح چمک رہا تھا۔ حالانکہ یہ کوئی خاص بات نہیں تھی مگر حسن پرستی میری فطرت کا ایک حصہ تھی۔ میں طاہرہ خانم کی توجہ اس طرف دلائے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ کہاں مار دی تھی گاڑی؟ ٹھیک نہیں کرایا اس ڈینٹ کو؟" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ خوبصورت چیزوں میں عیب میری آنکھ میں کھٹکتا تھا۔ خصوصاً ایسا عیب جسے دور کرنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا تھا۔

اس نے دروازے سے سر نکال کر جھک کر اس ڈینٹ کو دیکھا اور بولی "ارے ہاں۔ گاڑی کو ڈینٹر پینٹر کے ہاں بھجوانا یاد ہی نہیں رہتا۔ دراصل یہ میری پسندیدہ ترین گاڑی ہے۔ ہر وقت میرے استعمال میں رہتی ہے۔ ایسا موقع ہی نہیں ملتا کہ اسے ایک دو دن کے لئے چھوڑ دوں۔ اور تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے گاڑی کہیں ماری نہیں تھی۔ میں بڑی زبردست ڈرائیور ہوں اور میری خوش قسمتی ہے کہ دوسروں کی غلطیوں سے بھی زیادہ تر محفوظ ہی رہتی ہوں۔ یہ ڈینٹ تو بس عجیب ہی انداز میں پڑ گیا۔ بس یوں سمجھو کہ کسی بھاگتے چور کا نقشِ قدم ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے کسی خاص دلچسپی کے بغیر یونہی سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"کسی نہ کسی پارٹی' کسی نہ کسی تقریب کی وجہ سے میں اکثر ہی رات کو دیر سے گھر پہنچتی ہوں" وہ بتانے لگی۔ "یہ تین دن پہلے کا واقعہ ہے۔ اس رات بھی میں بہت دیر سے گھر پہنچی تھی۔ میں گیٹ کے سامنے چند سیکنڈ کے لئے رکی تھی۔ ابھی چوکیدار نے گیٹ نہیں کھولا تھا۔ اچانک ایک سیاہ کیڈلک اتنی تیزی سے میرے قریب سے گزری کہ میں سمجھی' شاید اس کا ڈرائیور "گراں پری" ریس میں حصہ لینے کی مشق کر رہا ہے۔ معاملہ یہیں تک ہوتا تب بھی کوئی بات نہیں تھی لیکن اس منحوس نے آندھی طوفان کی طرح جاتے جاتے کھڑکی سے ہاتھ نکال کر دھات کا کوئی سیاہ باکس

سا میری طرف اچھال دیا۔"

میں یکدم چونکا۔ میرے ڈھیلے پڑے ہوئے اعصاب گویا ایک جھٹکے سے بیدار ہو گئے۔ طاہرہ خانم میرے اس تغیّر سے بے خبر' بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "وہ دھماکے سے آکر میری گاڑی کی اس کھڑکی سے ٹکرایا۔ اچھا خاصا وزنی معلوم ہوتا تھا' جس نے لنکن جیسی گاڑی میں اچھا خاصا ڈینٹ ڈال دیا۔ شکر ہے اس وقت کھڑکی کا شیشہ چڑھا ہوا نہیں تھا ورنہ شاید یہ بھی ٹوٹ جاتا۔ اس گاڑی کی کھڑکی چونکہ خاصی بڑی ہے' اس لئے اس شخص نے شاید وہ باکس کھڑکی کے راستے اندر ہی پھینکنے کی کوشش کی تھی لیکن طوفانی رفتار کی وجہ سے اندازہ غلط ہو گیا اور باکس نیچے کہیں جا گرا۔"

میری سانس تقریباً رک گئی تھی اور میں بمشکل اپنے آپ کو کسی سوال سے باز رکھے ہوئے تھا۔ میں طاہرہ خانم کی بات بھی سن رہا تھا اور ساتھ ہی میرا ذہن تیزی سے حالات کا تجزیہ کرنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔ طاہرہ خانم کی میرے ہاں آمد قطعی غیر متوقع تھی اور وہ اپنے دامن میں میرے لئے غیر متوقع سی ہی نوازشات بھی سمیٹ کر لائی تھی۔ اور اب اس نے مجھے اسی سیاہ باکس کی کہانی بھی سنانی شروع کر دی تھی۔ کہیں یہ سب کچھ کسی سوچے سمجھے منصوبے کا حصہ تو نہیں تھا؟ کہیں اس کے سرے کہیں اور جا کر تو نہیں ملتے تھے؟ کہیں طاہرہ خانم کی اصل شخصیت کچھ اور تو نہیں تھی؟ لیکن اس رخ سے معاملہ بیان کرنے سے اس کیا فائدہ حاصل ہو سکتا تھا؟ میں ان سب پہلوؤں پر غور کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

دوسری طرف یہ سب محض اتفاق بھی ہو سکتا تھا۔ قسمت کبھی کبھی عجیب ہی انداز میں مجھ پر مہربان ہوتی تھی اور بالکل غیر متوقع طور پر کسی چیز کا سراغ ہاتھ آجاتا تھا۔

طاہرہ خانم کہہ رہی تھی۔ "میں نے کیڈلک والے کو بہ آواز بلند دو تین گالیاں دیں اور گاڑی سے اتر کر دیکھنے کا ارادہ ہی کر رہی تھی کہ اس نے کیا پھینکا تھا' اچانک سڑک کے موڑ سے ایک دوسری گاڑی نمودار ہوئی۔ وہ سفید رنگ کی کوئی نامعلوم سی گاڑی تھی۔ سیاہ کیڈلک اس وقت تک کافی آگے نکل چکی تھی لیکن سفید گاڑی کی رفتار بھی کچھ کم نہیں تھی اور وہ یقیناً کیڈلک ہی کے تعاقب میں تھی۔ میں نے گاڑی سے اترنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ سفید گاڑی بھی میرے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ اس وقت تک چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ میں ڈرنے والی عورت نہیں ہوں لیکن اس وقت ذرا خوفزدہ سی ہو گئی تھی۔ معلوم نہیں کیا چکر تھا۔ میں فوراً گاڑی اندر لے گئی۔ گاڑی ڈرائیو وے میں کھڑی کرنے کے بعد میں چوکیدار کے ساتھ دوبارہ باہر آئی اور درحقیقت تب ہی میں نے دیکھا کہ میری طرف اچھالی جانے والی وہ چیز سیاہ رنگ کا ایک عجیب سا باکس تھا۔"

وہ غالباً باکس کی ساخت بیان کرنے لگی تھی لیکن اس سے پہلے میں نے اس کی نشانیاں بیان کرتے ہوئے پوچھا۔ "ایسا ہی تھا وہ؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے قدرے حیرت سے بولی۔ "ایسا ہی تھا۔ لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"وہ میرا ہی باکس ہے۔" میں نے ذہن میں کوئی خاص بندی کئے بغیر کہا۔ "اس میں میری کچھ نہایت بیش قیمت چیز چند اہم دستاویزات ہیں۔ بہت خطرناک قسم کے کچھ جرائ لوگوں نے اسے چرا لیا ہے۔ میں تو اس کی طرف سے مای ہو چکا تھا۔ لیکن بیٹھے بٹھائے یک دم ہی تمہاری طرف سے یہ خبری سننے کو مل گئی۔ تم نے اسے سنبھال کر تو رکھا ہے؟ بے سے کہیں اِدھر اُدھر تو نہیں پھینک دیا؟" میں کوشش کے با اپنے لہجے کی بے تابی کو مکمل طور پر نہیں چھپا سکا۔

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں "میں نے کب کہا کہ وہ میں نے اٹھا لیا تھا؟ میں تو بتانے لگی وہ وہیں پڑا تھا جہاں چند لمحے پہلے میری گاڑی کھڑی تھی۔ وہ میں ہی کچھ عجیب سا لگ رہا تھا' جیسے کسی بڑی مشین کا کوئی حص مجھے اس سے خوف محسوس ہوا کہ کہیں کوئی خطرناک چیز نہ ہو جانے کیوں مجھے وہم سا ہو رہا تھا کہ اگر اس کے ساتھ غلط طریقے سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کی گئی تو کہیں دھماکے سے پھٹ جائے۔"

مجھے دل ہی دل میں اس عورت کو داد دینا پڑی۔ ا حسیات اس کی صحیح رہنمائی کرتی تھیں۔ میں نے بے تابی پوچھا۔ "اگر تم نے اسے اٹھایا نہیں۔ تو پھر کیا کیا؟"

"میں نے ڈرتے ڈرتے اسے پاؤں سے تھوڑا سا کھسکا کر د خاصا وزنی تھا۔" طاہرہ بولی "پھر میں نے چوکیدار کو حکم دیا کہ ا اسی طرح احتیاط کے ساتھ پاؤں سے آہستہ آہستہ کھسکاتے ہو کچھ دور ایک بنگلے کی دیوار کے ساتھ لگا دے۔ وہ بنگلا کافی عر سے خالی پڑا ہے۔" وہ سانس لینے کو رکی۔

"پھر؟" میں اب اپنی بیتابی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بس۔ چوکیدار کے ذریعے اسے اپنے گھر سے ذرا دور پہنچ میں اندر آکر سو گئی۔ چوکیدار کو بھی میں نے سختی سے منع کر دیا تھ اسے اپنی جگہ سے اٹھانے یا چھونے کی کوشش نہ کرے۔ پھر اس چیز کو بھول گئی۔ صبح میں ذرا دیر سے آفس جانے کے لئے تب وہ مجھے دوبارہ یاد آیا اور میں نے جاتے جاتے اس خالی بنگلے دیوار کی طرف دیکھا۔ باکس وہاں نہیں تھا۔"

"وہاں نہیں تھا؟" میں نے مردہ سے لہجے میں پوچھا۔ "کو لے گیا تھا اسے؟"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"شاید چوکیدار کو معلوم ہو۔" میں نے ایک موہوم سی ا کے سہارے کہا۔

"شاید معلوم ہو۔ میں نے تو اس سے پوچھا نہیں تھا۔" ا

بے نیازی برقرار رہی "رات گزر گئی اور دن چڑھ آیا تو مجھے وہ غیر اہم سا لگنے لگا تھا۔ ویسے بھی میں اس قسم کی باتوں میں سر نہیں کھپاتی جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہو۔"

"چلو' چوکیدار سے چل کر پوچھتے ہیں۔" میں نے جلدی سے ور اس کے برابر بیٹھنے کے لئے گاڑی کے دوسرے دروازے رف بڑھا۔

وہ گاڑی سے اتر آئی اور حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے "تم میرے ساتھ چلو گے؟ میرے گھر؟"

"ہاں۔ کیوں' اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟" میں نے

"تمہیں تو بہت ضروری بزنس ڈنر میں جانا تھا۔ تم تو ڈانس شو بھی جانے کے لئے تیار نہیں تھے۔" اس نے ہلکے سے طنزیہ میں مجھے یاد دلایا۔

میں نے اس کے طنز کا بُرا منائے بغیر کہا۔ "یہ کام بزنس ڈنر زیادہ ضروری ہے۔"

"وہ آہ بھر کر دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئی۔ میں اس کے برابر جا ۔ وہ ونڈ اسکرین سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "واہ ! تیری اس دنیا میں ہر کوئی غرض کا بندہ ہے۔ اپنا کام پڑتا ہے تو بھر میں کیسے پروگرام بدل جاتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اسے یہ باتیں کرنے کا حق تھا۔ ویسے بھی ا ذہن باکس میں الجھا ہوا تھا۔ ریڈ ذاٹ والے جسے زندگی اور ت کا مسئلہ بنا رہے تھے وہ چیز راستے میں لاوارث پڑی رہ گئی تھی ں کے لئے اس کی اہمیت تھی ان میں سے کسی کی بھی نظر اس پر ں پڑی تھی۔

"طاہرہ خانم!" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "تمہیں حق حاصل ہے کہ اس عاجز و مسکین پر طنز کے جتنے تیر چاہو سالو لیکن مجھے جلد از جلد وہاں لے چلو جہاں تم نے باکس چھوڑا ۔"

"عاجز و مسکین!" وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر اپنے صوص کھنکتے انداز میں ہنسی "مزاحیہ لگتے ہیں تمہاری شخصیت کے ساتھ یہ الفاظ۔"

"میری شخصیت میں کون سا سُرخاب کا پر لگا ہوا ہے۔ میں تو یک عام سا گناہ گار۔۔۔ انسان ہوں۔ ویسے بھی یہ عام سی بات ہے کہ جب کوئی الجھن میں ہوتا ہے تو اسے دیکھ کر دوسروں کو ہنسی آتی ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

وہ قدرے سنجیدگی سے بولی۔ "کیا واقعی وہ باکس تمہارے لئے بہت اہم ہے؟"

"ہاں۔ بہت زیادہ۔" میں نے جواب دیا حالانکہ مجھے ابھی قطعاً معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے لئے کیوں اہم تھا۔ شاید اس لئے کہ ریڈ ذاٹ اس میں بہت دلچسپی لے رہی تھی اور میں ریڈ ذاٹ کا کوئی سرپیر تلاش کرنے پر تُلا ہوا تھا۔

"میں تو تفریح کی تلاش میں تمہارے پاس آئی تھی لیکن مجھے لگ رہا ہے' جیسے کوئی جاسوسی کہانی شروع ہو گئی ہے۔"

"جاسوسی کہانی میں کیا کم تفریح ہوتی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ میں اب اپنے اندرونی ہیجان پر قابو پا چکا تھا اور پُرسکون نظر آنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔

"تمہارے ساتھ رہنے کا موقع ملا تو شاید اس قسم کے چکروں سے بھی لذت اندوز ہونے کا ہنر سیکھ لوں۔" وہ بولی۔

وہ حقیقتاً بڑی خوب صورت اور مہارت سے ڈرائیونگ کر رہی تھی۔ جہازی قسم کی گاڑی اس کے مرمریں ہاتھوں میں کھلونا معلوم ہو رہی تھی۔

مجھے یاد آیا کہ ریڈ ذاٹ کی طرف سے فون پر مجھ سے باتیں کرنے والا ایڈم عرف ایڈی جب بھی رابطہ قائم کرتا تھا' یہی تاثر دیتا تھا کہ وہ لوگ میری تمام نقل و حرکت سے واقف رہتے تھے۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا تھا کہ ان کا کوئی نہ کوئی آدمی ہر وقت میرا تعاقب کرتا تھا لیکن میں نے جب بھی ایسے کسی شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی تو مجھے کم از کم اپنے تعاقب میں کوئی نظر نہیں آیا تھا۔ صرف ایک آدھ بار اے نن نے میرا تعاقب کیا تھا۔ لیکن وہ بات پرانی ہو چکی تھی۔ اب تو کافی دنوں سے وہ بالکل ہی غائب تھا۔ مجھے تو اس کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔

اب بھی احتیاطاً میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ میرے اپنے آدمی تو میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے میری نگرانی کا سلسلہ منقطع کر چکے تھے۔ لیکن مجھے شبہ ہوا کہ کوئی اور گاڑی میرا تعاقب کر رہی تھی۔ گہرے رنگ کی وہ ٹویوٹا کافی دور تھی۔ سڑک پر اور بھی گاڑیاں رواں تھیں لیکن اس پر نہ جانے کیوں مجھے تعاقب کا شبہ ہوا۔ اس میں اے نن ہرگز نہیں تھا۔ گاڑی میں صرف ڈرائیو کرنے والا ہی تھا اور وہ کوئی معزز قسم کا بزنس مین معلوم ہوتا تھا۔ غالباً سوٹ میں تھا' کوٹ ٹائی کی جھلک نظر آئی تھی۔ وہ ہونٹوں میں سگریٹ دبائے بظاہر اپنے خیالوں میں مگن ڈرائیو کرتا آرہا تھا۔ میں مڑ کر گاڑی کے عقبی شیشے سے اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے انداز و اطوار میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ سوائے اس کے کہ گرد و پیش سے اس کی لاتعلقی مصنوعی سی لگ رہی تھی۔

میں نے طاہرہ خانم سے کہا۔ "تم اپنی ڈرائیونگ کی بڑی تعریف کر رہی تھیں۔ تمہاری اہلیت کا امتحان لینے کی ضرورت پیش آگئی ہے۔"

پھر میں نے عقب نما آئینے میں اسے وہ گاڑی دکھائی اور کہا۔ "مجھے شبہ ہے کہ یہ گاڑی ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔ پہلے تو ذرا دو چار سڑکوں پر اسے لمبے لمبے دو چار بے مقصد قسم کے چکر دے کر تصدیق کرو کہ یہ واقعی ہمارے ہی پیچھے ہے۔ اس کے بعد اس سے پیچھا چھڑانا ہے۔ کر لو گی یہ کام؟"

"گل ای کوئی نئیں بادشاؤ۔" وہ چٹکی بجا کر بولی۔ یکایک ہی اس میں نو عمر لڑکیوں والا وہ چلبلاپن نظر آنے لگا تھا جس کی مجھے کم از کم اس کی طرف سے ہرگز توقع نہیں تھی۔

اس نے گاڑی کی رفتار یکدم بڑھائی اور اسے لہراتے ہوئے دوسری گاڑیوں کے درمیان سے نکالتے ہوئے بولی۔ "میں وقت بے وقت ہر طرح کی سڑکوں پر تنہا گاڑی دوڑائے پھرتی ہوں۔ کبھی کبھار نو دولتیوں کے شہدے سے لڑکے کار یا اسپورٹس موٹر سائیکل وغیرہ پر میرے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ انہیں چکر دینے اور زچ کرنے میں مجھے بڑا مزہ آتا ہے۔ حالانکہ ان میں سے بھی بیشتر ڈرائیونگ یا رائیڈنگ میں بڑے بدمعاش ہوتے ہیں لیکن میں انہیں بھی جب چاہتی ہوں غچہ دے دیتی ہوں۔ ڈاج دینے میں بڑی ماہر ہوں۔ تم فکر نہ کرو۔"

"حسن کے ایسے نوخیز قدر دانوں کو تمہیں ڈاج نہیں دینا چاہئے۔ ان کی قدردانی سے تو استفادہ کرنا چاہئے۔" میں نے کہا۔

وہ مصنوعی خفگی سے ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولی۔ "میں تفریح پسند اور عیش کوش ضرور ہوں لیکن کھلونا نہیں ہوں۔ میرا معیارِ نظر اب اتنا گرا ہوا بھی نہیں ہے کہ ہر راہ چلتے سے، ہر لوفر لفنگے سے، ہر انجانے سے، ہر باچھیں کھلاتے ہوئے چغد سے پینگیں بڑھانے لگوں۔ میں ایک ٹیسٹ فل عورت ہوں۔ میرا کوئی ذوق ہے۔"

"نصیر نواز تو مجھے کوئی اچھا آدمی معلوم نہیں ہوا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ کم از کم ہینڈسم تو تھا۔ اور سوسائٹی میں اس کا کوئی مقام تھا۔ وہ کوئی راہ چلتا، گمنام اور باپ کی دولت پہ اکڑنے والا لفنگا سا نوجوان تو نہیں تھا۔ اس چکر میں البتہ میں نہیں پڑتی تھی کہ اسے اعلیٰ انسانی اقدار کے پیمانے سے ناپوں۔" وہ باتیں بھی کرتی جارہی تھی اور اس گاڑی پر نظر بھی رکھے ہوئے تھی۔

بڑی ہوشیاری سے اس نے اِدھر اُدھر کی سڑکوں پر چند میل کا چکر کاٹا اور یہ بات طے ہوگئی کہ گہرے رنگ کی ٹویوٹا ہمارے تعاقب میں تھی۔ وہ شخص غالباً سمجھ گیا تھا کہ ہم تعاقب کی تصدیق کررہے ہیں اور اب جبکہ یہ بات ظاہر ہوہی گئی تھی تو اس نے احتیاط چھوڑ دی تھی اور فاصلہ بھی کم کرلیا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں اسے گھیرنے کی کوشش کرتا۔ آج کل مجھے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کسی سراغ کی شدت سے تلاش تھی اور شاید وہ ایک سراغ ثابت ہوسکتا تھا۔ لیکن اس وقت میرا ذہن صرف سیاہ باکس میں الجھا ہوا تھا۔ فی الحال اس کے سوا مجھے کوئی چیز اہم نہیں لگ رہی تھی۔

"یہ لُدھڑ کا بچہ ہے تو ہمارے ہی تعاقب میں۔" طاہرہ خانم بولی۔ "کون ہے یہ؟"

"کاش مجھے معلوم ہوتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کیا کرنا ہے اس کا؟" طاہرہ نے بالکل اس انداز میں جیسے کسی خانساماں کے سامنے آلو وغیرہ رکھے ہوں اور وہ پوچھ رہی ہو۔ "کیا کرنا ہے ان کا؟ چپس بنانے ہیں یا بھرتا؟"

"فی الحال تو اس سے صرف پیچھا چھڑالو۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ اس بات سے آگاہ ہو کہ ہم کہاں جارہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

چند لمحے بعد بالکل فلمی قسم کی کار چیزنگ شروع ہوگئی۔ اس شخص کو ڈھکا چھپا نہیں بلکہ علی الاعلان قسم کا ڈاج دینے کی کوشش ہوئی تھی۔ شہر کے راستوں سے بھی وہ خوب واقف تھی اور اس "علم" سے حاضر دماغی کے ساتھ فائدہ اٹھانے میں بھی اس کا جواب نہیں تھا۔ تعاقب کرنے والا شاید ایک عورت سے اس قسم کی ڈرائیونگ کی توقع نہیں کررہا تھا۔ شروع میں شاید وہ کچھ گھبرا گیا تھا لیکن اس نے بہرحال ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔

طاہرہ بالآخر گاڑی فیروز پور روڈ کی طرف نکال لے گئی۔ وہاں اس نے ون وے کا نہایت خوبصورتی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس طرح ٹویوٹا والے کو ڈاج دیا کہ وہ سر پیٹتا رہ گیا ہوگا۔ اچھرہ کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں میں ذرا سا چکرانے کے بعد طاہرہ جلد ہی واپس فیروز پور روڈ پر نکل آئی۔ یہ ایک نفسیاتی حربہ تھا۔ تعاقب کرنے والا یہ توقع نہیں کرسکتا تھا کہ ہم چند منٹ بعد وہیں واپس آجائیں گے جہاں سے ہم نے اسے غچہ دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ اچھرہ کی گلیوں میں ہماری تلاش میں بھٹک رہا ہوگا۔ جبکہ طاہرہ جمال کے راستے آندھی طوفان کی طرح واپس گلبرگ کی طرف روانہ ہوگئی تھی۔

نہر کراس کرنے کے بعد جب اسے اطمینان ہوگیا کہ تعاقب کرنے والے کا کہیں دور دور تک پتا نہیں تو وہ تحسین طلب نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئی بولی۔ "کیسا ہے؟"

"بہت اچھا ہے۔" میں نے ہولے سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "اطمینان رکھو، اگر کبھی ڈاج دینے کے سلسلے میں کوئی ایوارڈ جاری ہوا تو وہ یقیناً تمہیں ہی ملے گا۔"

"تمہاری تھپکی ہی میرے لئے ایوارڈ ہے۔" وہ مسرور لہجے میں بولی۔ "فیروز پور روڈ تو ذرا غنیمت قسم کی سڑک ہے، اگر میں اسے کسی اور نکمے اور ناکارہ قسم کے ہائی وے کی طرف لے جاتی تو نہ جانے کہیں اسے کچے میں لوٹنیاں بھی کھلا سکتی تھی۔ اس کے بعد شاید وہ گاڑی سے زندہ سلامت برآمد نہ ہوتا۔"

"خیر۔ اب اتنے تردّد کی بھی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا "میرا مشورہ ہے کہ تم جو فلمیں فنانس کروگی ان میں کار چیزنگ کے مناظر خود ہی پکچرائز کرا دیا کرنا۔ تمہیں تو کیمرا ٹرک کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

وہ دھیرے سے ہنسی اور بولی۔ "فلمی کار چیزنگ تو بہت ہی بُری لگتی ہے مجھے۔ ہنسی آتی ہے دیکھ کر۔ ٹکڑے جوڑ جوڑ کر ناظرین کو بے وقوف بناتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے دنیا کا سب سے بڑا اور سب سے زیادہ فرحت بخش کاروبار کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"کیا؟ کار چیزنگ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں۔ لوگوں کو بے وقوف بنانا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی۔ اتنے قریب سے اس کی یہ بے ساختہ اور جلترنگ سی ہنسی سن کر دل میں گدگدی سی ہوتی تھی۔ جلد ہی اس نے گاڑی اپر مال سے ملحق علاقے کی ایک کشادہ سڑک پر لے جا روکی۔

"لو جی، یہ آگیا۔ گھر پیارا گھر۔ میرا گھر، میری جنت وغیرہ وغیرہ۔" وہ انجن بند کرکے دونوں ہاتھوں سے اپنے کھلے بال سمیٹتے ہوئے بولی۔ سامنے ایک خاصا اونچا آہنی گیٹ نظر آرہا تھا۔ بظاہر گیٹ پر لوہے کی لکیروں سے بے معنی سے پیٹرن بنے دکھائی دے رہے تھے لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اصل عمر خیام کی وہی خیالی اور علامتی تصویر تھی جو کہیں کہیں دیکھنے میں آتی ہے۔ وہی ایک شاعرِ مدہوش و پریشاں خیال۔ وہی جام۔ وہی اس میں سے نمودار ہوتی ہوئی ایک سرمست و پُر شباب نازنین۔ وہی ایک ساز۔ وہی فضا میں بکھرتے ہوئے سُروں کی علامتیں۔ تصویر بہت پرانی تھی۔ عام ہوچکی تھی۔ کیلنڈر والوں نے اسے چیپ کردیا تھا۔ مگر پھر بھی نہ جانے کیوں ایک خاص موڈ میں آدمی کو متاثر کرتی تھی، بہت سی دوسری پرانی چیزوں کی طرح۔

"طاہرہ خانم! تم واقعی ایک خاص نہج کی باذوق عورت ہو۔" میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ "صرف نصیر نواز کی سابق دوست ہونے کی وجہ سے مجھے تمہاری خوش ذوقی پر شک ہونے لگتا ہے۔"

"تم تو کہتے ہو کہ تم نصیر نواز کو جانتے نہیں تھے، پھر اس کے بارے میں اتنے بدگمان کیوں ہو؟" اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا۔

"میں بھی تمہاری طرح انسان کے بارے میں قیافے اور محسوسات کی بنیاد پر کوئی نہ کوئی رائے رکھنے کا عادی ہوں۔ اور نصیر نواز کے بارے میں وہ رائے کچھ اچھی نہیں۔ اور پھر اس نے اپنی خودکشی کے سلسلے میں جو خط چھوڑا تھا اس سے بھی تو اس کا کتنا گھناؤنا کردار سامنے آتا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور گاڑی سے اتر آئی۔ اس کی کوٹھی کی دیوار سے اتنی بیلیں اور اتنے بہت سے گھنے درخت جھانک رہے تھے کہ اصل عمارت ان کے عقب میں ہی چھپ کر رہ گئی تھی۔ چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا، سیاہ فام نوجوان تھا۔ کندھے پر بڑی شاندار قسم کی جاپانا رائفل لٹکائے ہوئے تھا لیکن شکل سے کچھ بے وقوف ہی دکھائی دے رہا تھا۔

طاہرہ نے اسے گیٹ پر ہی کھڑے رہنے کا اشارہ کیا اور مجھے اپنے ساتھ ایک دیوار کے قریب لے جاتے ہوئے بولی۔ "میں نے یہاں تک کھسکایا تھا اس باکس کو۔ اور آخری بار میں نے گھپے اندھیرے میں اسے یہیں پڑے دیکھا تھا۔"

"تمہارے چوکیدار کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"عبدالرشید راجپوت۔ اسے پورے نام سے مخاطب کرو تو بہت خوش ہوتا ہے۔" طاہرہ نے جواب دیا۔

میں نے واپس آکر چوکیدار کو دوستانہ لہجے میں مخاطب کیا۔ "عبدالرشید راجپوت! تمہیں معلوم ہے وہ کالا باکس جو اُس رات تم نے بھی دیکھا تھا اور جسے بیگم صاحب نے پاؤں سے کھسکا کر ادھر دیوار کے ساتھ چھوڑا تھا، کہاں گیا؟"

"ہاں جی۔ معلوم ہے۔ اسے ٹین ڈبّے والا لے گیا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ میری دھڑکن جو ایک لمحے کے لئے تیز ہوئی تھی دوبارہ سست پڑ گئی۔

"ٹین ڈبّے والا...... وہ کون ہے؟" میں نے ایک لمحے کے لئے خود کو چغد محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"ٹین ڈبّے والا تو بس ٹین ڈبّے والا ہی ہوتا ہے نا صاحب جی!" عبدالرشید عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اسے گویا معلوماتِ عامہ میں میری کمزوری دیکھ کر خاصا صدمہ پہنچا تھا۔ پھر وہ ذہن پر زور دے کر وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہی لوگ جی، وہ جو ٹھیلوں پر کاٹھ کباڑ لادے آواز لگاتے پھرتے ہیں۔ ردی اخبار، خالی بوتلیں، ٹین ڈبّے وغیرہ لے لیتے ہیں۔"

"اوہ، اچھا وہ۔" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ شاید یہ اتفاق ہی تھا کہ میں نے اپنے علاقے میں آج تک کوئی ٹین ڈبّے والا نہیں دیکھا تھا۔ بلکہ اس قسم کے علاقوں میں مجھے کوئی سے بھی ٹھیلے اور خوانچے والے شاذ و نادر ہی دکھائی دیئے تھے۔ میں سمجھتا تھا، شاید وہ اس لئے ان علاقوں میں نہیں آتے کہ ان کی صدا یہاں صدا بہ صحرا ہی ثابت ہوتی ہوگی۔ اتنے بڑے بڑے گھروں میں، تقریباً ساؤنڈ پروف کمروں میں ان کی آوازیں کہاں پہنچتی ہوں گی۔

عبدالرشید بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ادھر کوٹھی بنگلوں میں جو نوکر چاکر ہیں وہ ان ٹھیلے والوں کو کاٹھ کباڑ بیچتے رہتے ہیں جی۔ انہیں چار پیسے مل جاتے ہیں۔"

اب میری سمجھ میں آیا کہ ٹھیلے والے تو آتے تھے لیکن ان سے خرید و فروخت اب نوکروں کے شعبے میں چلی گئی تھی اس لئے مجھ جیسوں کو ان کے وجود کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میں تو ان لوگوں کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔

"تم تو اس ٹھیلے والے کو جانتے ہوگے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں بھلا کیسے جاننے لگا صاحب جی! میں نے تو آج تک اس کے ہاتھ کوئی چیز نہیں بیچی۔" یہ کام گویا اس کے مقام و منصب کے خلاف تھا اور یہ پوچھ کر میں نے گویا اسے ڈی گریڈ کردیا تھا جس کا

اس نے یقیناً دل ہی دل میں برا منایا تھا لیکن میں چونکہ اس کی بیگم صاحب کے ہمراہ تھا اس لئے وہ از راہِ مروت بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہاں سے چار پانچ ٹھیلے والے گزرتے ہیں۔ وہ بھی انہی میں سے ایک ہے لیکن وہ بھی کبھی کبھار آتا ہے۔ شاید اس نے علاقوں کی باری باندھ رکھی ہے۔ وہ جب آتا ہے تو صبح ہی صبح سب سے پہلے آتا ہے۔ میں اس وقت دودھ والے کے لئے گیٹ کھول رہا تھا' اس لئے اتفاق سے میں نے اسے وہ ڈبا اٹھا کر ٹھیلے پر رکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ میں نے سوچا بھی کہ کم سے کم اسے خبردار ہی کروں کہ اسے احتیاط سے ایک طرف رکھے۔ کہیں کوئی خطرناک چیز نہ ہو' بیگم صاحب نے بھی مجھ سے یہی کہا تھا۔ لیکن پھر میں نے سوچا' مجھے کیا پڑی ہے۔ ویسے بھی ڈبا رات بھر وہیں پڑا رہا تھا۔ کچھ نہیں ہوا تھا۔"

میرے چہرے پر یقیناً خاصی مایوسی پھیل گئی تھی۔ تبھی طاہرہ خانم نے چوکیدار کو اپنی جگہ واپس جانے کا اشارہ کیا اور تسلی آمیز انداز میں میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولی۔ "اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔ اب جہاں اتنا سراغ مل گیا ہے وہاں آگے بھی سراغ ملتا چلا جائے گا۔ کہانیوں میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ میں دوسرے نوکروں' نوکرانیوں سے پوچھ گچھ کروں گی۔ ڈبے والے کا ضرور کچھ پتا چل جائے گا۔ جونہی وہ دوبارہ اس گلی میں آیا' اسے پکڑ کر یہاں بٹھا لیا جائے گا اور تمہیں فوری اطلاع دی جائے گی۔ میں اس سلسلے میں تمہاری پوری مدد کروں گی۔ تمہاری تشویش دیکھ کر مجھے یقین آگیا ہے کہ وہ واقعی تمہارے لئے کوئی اہم چیز ہے۔ لیکن فی الحال اس کی فکر ذہن سے اتار دو' اسے بھول جاؤ۔ میرے گھر آئے ہو' مجھے یاد رکھو۔ آؤ میرے ساتھ۔" وہ میرا ہاتھ تھام کر اندر چل دی۔ اس کے لہجے اور لفظوں میں خلوص تھا۔ مجھے یقین سا ہونے لگا کہ اب وہ باکس واقعی مل جائے گا۔ میرے دل کو قرار سا آگیا۔

چند لمحے بعد میں اس کے خوبصورت اور آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ اس کے ڈرائنگ روم کو یقیناً کسی بہت اچھے انٹیریئر ڈیکوریٹر نے پلان کیا تھا۔ دیواروں میں شیشے کے بڑے بڑے کیس اس طرح نصب تھے کہ دیواروں ہی کا حصہ معلوم ہوتے تھے۔ ان میں مصنوعی سبزہ' پودے اور پھول لہلہا رہے تھے اور انہی کے اندر خفیہ روشنیوں کا کچھ ایسا انتظام تھا کہ رات کے وقت بھی دن کا سماں تھا اور کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ایک شاہانہ ڈرائنگ روم کے لوازمات کسی سبزہ زار میں رکھ دیئے گئے ہیں۔ طاہرہ خانم کو یقیناً ہریالی اور پھولوں سے پیار تھا۔ اس کی کوٹھی کی اصل عمارت کے گرد بھی ایک خوبصورت اور گھنا باغ موجود تھا جس نے عمارت کو اپنے دامن میں تقریباً چھپا رکھا تھا۔ کمروں اور راہداریوں میں بھی کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی طرح اس نے پھولوں اور سبزے کو جگہ دے رکھی تھی۔

میں بیٹھ چکا تو وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولی۔ "شوق تھا مجھے تمہاری آمد پر ڈھیروں اہتمام کرنے کا۔ لیکن تمہارا یہاں آمد یوں اچانک لکھی ہوئی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا مدارت کروں۔"

"تم میری صرف یہ مدارت کرو کہ میرے لئے ٹھنڈے ... کا ایک جگ بھر کر منگواؤ۔ اس کے بعد تقریباً جگ ہی جتنا بڑا ... گرم گرم بلیک کافی کا منگوا لو۔"

"اتنی ٹھنڈی چیز کے بعد یکدم اتنی گرم چیز؟" وہ مسکرائی۔

"کبھی کبھی میں توازن اسی طرح برقرار رکھتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کے بعد کیا پروگرام ہے؟" اس نے بٹلر کو طلب کر کے دونوں چیزوں کا حکم دینے کے بعد پوچھا۔

"اس کے بعد وہی ڈانس شو دیکھنے چلیں گے جس کے ... تمہارے پاس ہیں" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اور تمہارا وہ بزنس ڈنر۔؟" اس نے ایک بار پھر یاد دلایا۔

"بھاڑ میں گیا بزنس ڈنر۔" میں نے کہا۔

"جب میں کہہ رہی تھی اس وقت تم بزنس ڈنر کو بھاڑ میں بھیجنے کے لئے قطعاً "تیار نہیں تھے۔" وہ مسکرائی۔

"میں نے کہا نا کہ میرا کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

"عجیب آدمی ہو تم بھی۔"

"میں تمہاری رائے سے سو فیصد متفق ہوں۔"

"ویسے کھانا گھر میں بھی تیار ہے۔" وہ بولی۔

"وہیں ڈنر بھی کر لیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ وہ ... خوش نظر آنے لگی۔

کچھ دیر بعد جب ہم گھر سے روانہ ہونے لگے تو میں نے ... "کل صبح سے میرا ایک آدمی تمہارے گیٹ کے پاس موجود ... اور جونہی وہ ٹین ڈبے والا نظر آئے گا یا کسی اور ذریعے سے سیاہ باکس کے بارے میں کوئی سراغ ملے گا' وہی اس سلسلے ضروری کارروائی کرے گا۔"

"وہ کیا گیٹ کے پاس کھڑا رہے گا؟" طاہرہ نے حیرت ... پوچھا

"نہیں۔ گاڑی میں ہوگا۔ میرا مطلب ہے صرف ایک نہیں ہوگا۔ ڈیوٹی بدلتی رہے گی۔ چوبیس گھنٹے کوئی نہ کوئی موجود ... گا۔ میں نے اس لئے بتا دیا ہے کہ اپنے گھر کے قریب مستقلاً ... موجود دیکھ کر تم پریشان نہ ہو جاؤ۔"

"میرے گھر میں ایک الگ انیکسی موجود ہے جسے میں ... ہاؤس کے طور پر استعمال کرتی ہوں۔ تمہارا کوئی بھی آدمی ... آ کر ٹھہر سکتا ہے۔ لیکن اس کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے تم ... کہہ دیا ہے کہ تمہیں ضرور اس سلسلے میں اطلاع مل جائے گی۔ ... نے یقین دلایا۔

"میں نے سوچا شاید چوکیدار صحیح طور پر دھیان نہ رکھ سکے اور وہ ٹین ڈبے والا نکل جائے۔" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"میں چوکیدار کے علاوہ ایک نوکر کی ڈیوٹی بھی لگا دوں گی۔ اس کے علاوہ میں خود کل صبح اپنے ملازموں کے علاوہ پاس پڑوس کے بھی دو چار ملازموں کو بلوا کر "تفتیش" کروں گی۔ ہو سکتا ہے، ٹین ڈبے والے کی آمد کا انتظار بھی نہ کرنا پڑے۔ اس کا کوئی ٹھکانا وغیرہ ہی معلوم ہو جائے۔ تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔ اس ڈبے کے لئے تمہاری پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی۔ دل چاہ رہا ہے....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا دل چاہ رہا ہے؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"دل چاہ رہا ہے وہ ڈبا ابھی کہیں سے مل جائے اور میں اسے تمہارے سر پر دے ماروں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"اگر وہ مل جائے تو میں تمہاری اس حرکت کا بھی برا نہیں مناؤں گا۔"

"یقیناً۔ کیونکہ تم برا منانے کے قابل ہی نہیں رہو گے۔ تمہاری کھوپڑی ٹوٹ چکی ہو گی۔" وہ اطمینان سے بولی۔

ہم جب ہوٹل پہنچے تو شو کا ٹائم شروع ہوئے آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ مگر شو ابھی تک شروع نہیں ہوا تھا۔ مشتاقان دید کے صبر کا پوری طرح امتحان لیا جا رہا تھا۔ شو کے لئے ہوٹل کا ہال روم مخصوص کر دیا گیا تھا اور اس میں ایک خصوصی اسٹیج اور میزیں لگا دی گئی تھیں۔ ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ کسی تیسرے درجے کے تھیٹر کی طرح دیواروں کے ساتھ بھی لوگ کھڑے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ تین چار پولیس والے بھی موجود تھے۔ ٹکٹ بہت منگا تھا اس کے باوجود اتنا رش دیکھ کر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس ہوٹل میں کسی بھی تقریب یا شو وغیرہ کے سلسلے میں مَیں نے کبھی ایسا ہجوم نہیں دیکھا تھا۔ تاہم طاہرہ خانم کے لئے سب سے اگلی وی آئی پی قطار میں ایک میز خالی تھی جس کے ساتھ صرف دو نشستیں تھیں۔

غنیمت یہ رہا کہ ہمارے بیٹھتے ہی شو کی تمہید شروع ہو گئی۔ یعنی ہال کی بتیاں بجھ گئیں اور اسٹیج کے تاریک پردے پر رنگ برنگی روشنیاں چکرانے لگیں۔ ہیجان خیز قسم کی مغربی موسیقی سے فضا مرتعش ہو گئی۔ دھیرے دھیرے پردہ ہٹا اور روشنیاں اسٹیج پر چکرانے لگیں۔ پھر یکدم یہ روشنیاں بھی غائب ہو گئیں اور موسیقی بھی ایک جھٹکے سے دم توڑ گئی۔ ہال میں سکوت چھا گیا۔ صرف لوگوں کی گہری سانسوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بالکل ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی بڑے سے غار میں بہت سے ریچھ اجتماعی شب خوابی کا پروگرام بنا کر سو رہے ہوں۔

پھر اچانک ہی ایک چھناکا سا ہوا، اسٹیج پر بجلیاں سی چمکیں اور وہ قیامت یکدم سامنے کودی جس کے انتظار میں سب دل تھام کر بیٹھے تھے۔ ڈانسر کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ چھت کی طرف سے اسٹیج پر کودی ہو۔ اس کا سراپا اور رقص کا انداز دیکھ کر مجھے ہال

میں مردوں کی تعداد پر تو حیرت نہ رہی لیکن وہاں کئی عورتیں موجود تھیں، صرف طاہرہ خانم ہی نہیں تھی۔ ان کی موجودگی پر میری حیرت ضرور برقرار رہی۔ شاید وہ یہ "تحقیق" کرنے آئی تھیں کہ مرد کس بات پر لٹو ہوتے ہیں۔

پھر جب ڈانسر پرنسس تہمینہ نے موسیقی تیز ہونے کے ساتھ یہ ثابت کرنا شروع کیا کہ اس کے رگ و پے میں بجلیاں بھری ہوئی تھیں تو ہال میں اچھا خاصا شور ہونے لگا حالانکہ وہاں شہر کے معززین کی تھی لیکن مجھے اس روز معلوم ہوا کہ معززین کا بھی سیٹیاں بجا کر اور بڑھکیں مار کر اپنے جذبات کا اظہار کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ان دنوں اس قسم کے ڈانس شو وغیرہ پر خاص پابندی نہیں تھی۔ اونچے ہوٹلوں، ڈراموں، حتیٰ کہ تھیلوں میں بھی ڈانس کا کوئی نہ کوئی موقع نکلتا رہتا تھا۔ بڑے شہروں میں تو نائٹ کلب تک کھلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود لوگ تہمینہ کا ڈانس کچھ اس طرح دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار موقع ملا ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ زبردست رقاصہ تھی۔ لوگوں کو اتھل پتھل کرنے کا فن اسے خوب آتا تھا۔ لیکن ابھی تک میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا۔ اسپاٹ لائٹ ابھی تک اس کے چہرے پر نہیں پڑی تھی۔ لوگوں کو چہرے سے شاید کچھ زیادہ غرض بھی نہیں تھی۔ پھر رقص میں کچھ اور روانی آئی تو ایک اسپاٹ لائٹ تہمینہ کے چہرے پر پڑی اور میں اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔

طاہرہ خانم میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔ "دیکھا۔ میں نہ کہتی تھی کہ تمہارے دل پر بھی ضرور بجلیاں گرائے گی۔ مگر اب ایسا بھی کیا کہ انسان اپنی سیٹ سے ہی اٹھ جائے۔ پلیز اب بیٹھ جاؤ اور جذبات کا اظہار بیٹھے بیٹھے ہی کرتے رہو۔ ڈانسر کی جگہ بننے کی کوشش نہ کرو۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے نیچی آواز میں کہا۔ "میں جذبات زدہ ہو کر نہیں اٹھا ہوں۔ دراصل مجھے تو اس لڑکی کی تلاش تھی۔ یہ کسی اور نام سے مجھے چرکہ دے چکی ہے۔"

"کوئی بات نہیں جان خانم!" وہ پچکارنے کے سے انداز میں بولی۔ "ان عورتوں کا کام ہی چرکہ دینا ہوتا ہے۔ ہر گھڑی، ہر پل نہ جانے کن کن مردوں کو چرکے دیتی ہوئی کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہیں۔ نہ جانے کتنے ملکوں میں کتنی جائیدادیں بنا لیتی ہیں۔ بینکوں میں ان کے اکاؤنٹ ہوتے ہیں۔ تم بھی اب اس بات کو بھول جاؤ اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

میں بیٹھ تو گیا کیونکہ میرے پیچھے والی میزوں سے شور اٹھنے لگا تھا۔ شرفا کا نظارہ خراب ہو رہا تھا۔ طاہرہ خانم دھیرے دھیرے میرا ہاتھ سہلا رہی تھی جیسے کسی روتے ہوئے بچے کو چپ کرانے کی کوشش کر رہی ہو۔

"تم سمجھ نہیں رہی ہو۔ بات دراصل یہ ہے....." میں

کہ چند دن پہلے وہ لڑکی عجیب پُراسرار حالات میں مجھے ملی تھی۔ اس نے اپنا نام حسنہ بتایا تھا۔ وہ مجھے اپنے گھر بھی لے گئی تھی۔ پھر اسی رات اس گھر سے غائب بھی ہو گئی تھی۔ میں اس کے چکر میں اسی کی وجہ سے پڑا تھا۔ اسی رات ریٹائرڈ ڈی ایس پی احمد شجاع فرار ہوتے ہوئے حادثے کا شکار ہو کر مر گیا تھا۔ الجھے ہوئے معاملات تھے اور ان کے سرے نہ جانے کہاں کہاں مل رہے تھے۔ معاملات کا سب سے زیادہ تعلق ریڈ ڈاٹ سے معلوم ہوتا تھا۔

پرنسس تہمینہ کے ڈانس شو کا اشتہار میں نے کل ہی اخبار میں دیکھا تھا۔ اس میں لہو کو گرمانے والی اس کی تصویر بھی شامل تھی لیکن کچھ اس قسم کی تصویر تھی جس میں چہرے کو ایکسپوز کرنے پر کم ہی توجہ دی جاتی ہے۔ میں نے بھی چہرے کی طرف توجہ کم ہی دی تھی۔ کچھ ہیئر اسٹائل اور میک اپ وغیرہ کا بھی عمل دخل تھا۔ میں اسے حسنہ کی حیثیت سے نہیں پہچان سکا تھا۔ پہچاننا تو دور میرا اس پر شبہ بھی نہیں گیا تھا۔ ویسے بھی پرنسس تہمینہ کا ڈانسر کے طور پر کئی ملکوں میں جانا پہچانا تھا۔ میں اس رات سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اپنا نام حسنہ بتانے والی لڑکی پرنسس تہمینہ ہے۔ اس نے بھی یقیناً دل ہی دل میں شکر ادا کیا ہو گا کہ میں آسانی سے بے وقوف بن گیا۔

جب میں اس رات کے واقعات کو یاد کر رہا تھا تو مجھے ایک اور بات عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق تہمینہ اصلاً ترکی کی باشندہ تھی۔ لیکن اس رات جب وہ حسنہ کے روپ میں مجھ سے ملی تھی تو مجھے اس پر غیر ملکی ہونے کا شبہ تک نہیں ہوا تھا۔ شکل صورت کی حد تک تو ایک پاکستانی اور ترک لڑکی میں کوئی حدِ فاصل مقرر کرنا بڑا مشکل تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کا تو لہجہ بھی خالصتاً پاکستانی تھا۔ اس میں کسی غیر ملکی لہجے کی جھلک تک نہیں تھی۔ جبکہ اخبار میں ڈانس شو کا جو اشتہار چھپا تھا اس میں بتایا گیا تھا کہ پرنسس تہمینہ کا یہ پاکستان کا پہلا دورہ تھا۔

یہ سب الجھنیں تو اپنی جگہ تھیں لیکن فی الحال طاہرہ خانم میرے لئے بڑی الجھن بننے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ میری بات کاٹتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "میں سب سمجھ رہی ہوں۔ اس قماش کی عورتیں پارٹیوں میں، تقریبات میں، جہاں بھی شہر کے چیدہ چیدہ مردوں کو دیکھ لیتی ہیں، فوراً دوستی گانٹھ لیتی ہیں۔ لیکن یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ کسی اور نام سے چرکہ دے چکی ہے، یہ بات البتہ میری سمجھ میں نہیں آئی۔ شوبزنس کی عورتوں کا نام ہی تو ان کا اصل سرمایہ ہوتا ہے۔ اور بھلا ان کے پاس ہوتا ہی کیا ہے؟ ان کے نام و نمائش اور شہرت کی چکا چوند سے ہی تو متاثر ہو کر لوگ ان کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ لیکن اگر کسی کو کچھ عرصہ ان کے ساتھ رہنے کا موقع میسر آ جائے تو سارا شوق اتر جاتا ہے....."

لیکن تھا وہ ابھی شوبزنس کی عورتوں کی زندگی کے بارے میں مزید سبق آموز حقائق سے مجھے آگاہ کرتی لیکن، میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "تم بات کو بالکل غلط رخ سے لے رہی ہو۔ معاملہ یہ نہیں ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ جس رات مجھے وہ بلیک باکس..."

طاہرہ خانم نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا "اف میرے خدا..... پھر وہی بلیک باکس!" پھر وہ چھت کی طرف دیکھ کر کراہنے کے سے انداز میں بولی۔ "وے میریا سوہنیا ربا! توں ای ایس بندے تے رحم فرما۔"

اس التجا کے بعد اس نے ترحم آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا اور گویا بڑی مشکل سے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولی۔ "ایک حسین عورت اتنا زبردست ڈانس پیش کر رہی ہے اور ایک حسین عورت تمہارے پہلو میں بیٹھی ہے۔ لوگ اکیلے بھی بیٹھے ہیں تو دنیا کو بھولے بیٹھے ہیں۔ اور ایک تم ہو کہ جسے اس منحوس بلیک باکس کے سوا کچھ سوجھ ہی نہیں رہا ہے۔ اگر خدانخواستہ کوئی طیارہ کریش ہو جائے اور جائے حادثہ سے اس کا بلیک باکس غائب ہو جائے تو ائرلائن والے شاید اسے... بھی اس جوش و خروش اور دیوانگی سے تلاش نہ کریں جو تم نے اپنے سر پر سوار رکھی ہے۔"

پھر وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ "دیکھو، وہ بلیک باکس کتنا بھی قیمتی سہی، اس میں کتنی ہی قیمتی دستاویزات اور ہیرے موتی سہی۔ لیکن وہ سب چیزیں زندگی سے زیادہ قیمتی تو نہیں۔ تم اس پر شکر ادا کیوں نہیں کرتے کہ تم اس وقت صحت اور تندرستی کے ساتھ زندہ ہو اور اَن گنت نعمتیں، آسائشیں، دولت اور عیش و نشاط کا سامان تمہارے قبضے میں ہے۔ وہ سب چیزیں تمہارے پاس موجود ہیں جن کا اس ملک میں بسنے والے نہ جانے کتنے لوگوں نے کبھی خواب تک نہیں دیکھا۔ تم صرف انہی سے انجوائے کیوں نہیں کرتے؟ فی الحال اس ذلیل منحوس بلیک باکس کو بھول کیوں نہیں جاتے؟"

میں نے سختی سے ہونٹ بھینچ لئے۔ عام حالات میں میرے بھی بالکل یہی خیالات ہوتے تھے جن کا وہ اظہار کر رہی تھی۔ یعنی وہ میرا ہی فلسفہ میرے منہ پہ مار رہی تھی۔ میری اپنی حماقتوں کی وجہ سے یہ نوبت آئی تھی۔ میں اپنے اعصاب اور اپنی زبان پر اس طرح کنٹرول نہیں رکھ پا رہا تھا جس طرح ہمیشہ رکھا کرتا تھا۔ ایک لمحہ پہلے میں ایک حماقت اور کرنے لگا تھا۔ یعنی طاہرہ خانم کو بلیک باکس والا اصل واقعہ سنانے لگا تھا جس سے یہ ظاہر ہو جاتا کہ وہ درحقیقت میری ملکیت نہیں تھا۔ میں تو محض اس کی پُراسراریت اور ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے اس میں دلچسپی لے رہا تھا۔ جبکہ آج شام ہی میں طاہرہ خانم سے کہہ چکا تھا کہ وہ میری ملکیت تھا اور اس میں میری کچھ قیمتی چیزیں تھیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ طاہرہ خانم نے جھنجلاہٹ میں میری بات کاٹ دی ورنہ میری تضاد بیانی سامنے آ جاتی۔ ایسی حماقت مجھ سے شاذ و نادر ہی سرزد ہوتی تھی۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے ملائمت سے کہا۔ "آئی ایم سوری۔ واقعی میں نے بلیک باکس کو اپنے سر پر کچھ زیادہ ہی سوار کرلیا ہے۔ لیکن خیر۔ اب میں اس کا ذکر نہیں کروں گا۔ بس سمجھ لو میں نے لعنت بھیج دی اس پر۔"

میں پرنسس تہمینہ کی طرف متوجہ ہوگیا جو اَب ڈانس کا پیٹرن بالکل بدل کر جمناسٹک کے سے کچھ کرتب دکھا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی موسیقی کا انداز بھی بدل گیا تھا۔

"ذرا دیکھو تو۔" طاہرہ ہولے سے میرا ہاتھ دبا کر بولی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عورت کے جسم میں ہڈی تو کہیں ہے ہی نہیں۔"

"ہاں۔ واقعی۔" میں نے خلوصِ دل سے اس کی تائید کی اور محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ میں نادانستہ طور پر اب تک اس کی طرف سے جتنی بے توجہی برت چکا تھا' اب اس کی تلافی کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے چہرے پر سرشاری اور آنکھوں میں نشیلا پن سا آگیا۔

پرنسس تہمینہ کے جمناسٹک کے کرتب دیکھ کر لوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ لیکن یہ مرحلہ جلد ہی ختم ہوگیا۔ موسیقی نے ایک بار پھر کروٹ لی اور اس نے دوبارہ رقص شروع کردیا۔ رقص میں اس نے یکے بعد دیگرے سات پیٹرن بدلے' یعنی اس کے رقص میں کم از کم سات ملکوں کے روایتی رقص اور ثقافت کی جھلک تھی۔ اس نے مسلسل تقریباً ایک گھنٹے رقص کیا۔ اتنی دیر لگاتار ایسا "جان توڑ" قسم کا رقص کرنا اور بیچ میں جمناسٹک کے کرتب بھی دکھانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ رنگ برنگی روشنیوں میں اس کے جسم پر پسینہ چمک رہا تھا۔ لیکن اس کی پھرتی و مہارت اور جسم کے لوچ میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کی وہ شگفتگی بھی برقرار تھی جو وہ اوّلین لمحے میں اپنے ساتھ لے کر اسٹیج پر اتری تھی۔

بالآخر موسیقی نے دم توڑ دیا اور وہ حاضرین کے سامنے تشکر کے اظہار کے لئے جھک گئی۔ اسپاٹ لائٹس صرف اس کے وجود پر مرتکز تھیں۔ باقی اسٹیج تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ لوگ تالیاں بجا بجا کر اپنے ہاتھ توڑے ڈال رہے تھے۔ میں نے بھی سوچا کہ تالیاں بجانے میں کنجوسی سے کام نہیں لینا چاہئے۔ میں بھی خاصے جوش و خروش سے تالیاں بجانے لگا۔ میرا خیال تھا' اس سے طاہرہ بھی خوش ہوگی کہ میرا ذہن تفریح کی طرف مائل تو ہوچکا تھا۔

لیکن دنیا کسی حال میں بھی خوش نہیں رہتی۔ میں نے زیادہ تالیاں بجائیں تب بھی طاہرہ خانم نے میرا ہاتھ روک دیا اور مصنوعی خفگی سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "کچھ تالیاں آئندہ کے لئے بھی بچا رکھو۔ یہ اس ہوٹل کی تاریخ کی آخری ڈانسر نہیں ہے۔ امید ہے یہاں آئندہ بھی ڈانسرز آتی رہیں گی۔"

"تمہاری مرضی۔" میں نے معصومیت سے کہا۔ "میں تو تمہاری خوشی کے لئے بجا رہا تھا۔ تمہیں بڑا شکوہ تھا کہ میں اس عظیم فنکارہ کے فن کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہا۔"

"تم بہت بدمعاش ہو تم۔" وہ سہلاتے ہوئے بولی۔ اس دھیرے دھیرے اسٹیج کا پردہ گر گیا اور ہال کی بتیاں روشن ہو گئیں۔ میں اٹھ کر اسٹیج کے بائیں ونگ کی طرف بڑھا۔ مجھے معلوم ادھر سے آرائشی پردوں کے عقب سے ایک راستہ اسٹیج کے جاتا تھا۔ اس ہال میں چونکہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد کوئی غیر معمولی شو ہوتا رہتا تھا' اس لئے اسٹیج کے عقب میں کی ایک قطار کو مستقل طور پر ڈریسنگ روم' میک اَپ روم میں تبدیل کردیا گیا تھا۔ شو ختم ہونے کے بعد آرٹسٹ وہیں جاتے تھے۔

میں ایک قدم بھی بڑھا نہیں پایا تھا کہ طاہرہ خانم نے ایک پھر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور اس بار اس کی گرفت میں گداز اور گرم کم' سختی زیادہ تھی۔

"تم کہاں چل دیئے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے حسنہ۔ میرا مطلب ہے پرنسس تہمینہ سے بہت بات کرنی ہے۔ پانچ منٹ میں واپس آرہا ہوں۔" میں نے تیز کہا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اور بھی بہت سے لوگ اسٹیج کے عقب کی طرف جارہے تھے۔

وہ خفگی سے بولی۔ "میں تمہیں اس لئے یہاں نہیں لا کہ تم مجھے چھوڑ کر پرنسس تہمینہ سے "ضروری باتیں" کرتے یہ تو مل بیٹھنے اور موڈ خوشگوار بنانے کا ایک بہانہ تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔ لیکن تم مجھ پر اعتبار کرو۔ میں اس ہونے کے ارادے سے ہرگز نہیں جارہا۔ یہ محض ایک اتفا کہ اس کا تعلق ایک پُراسرار معاملے سے نکل آیا ہے۔ مشکوک عورت ہے۔ میرا اس سے بات کرنا ضروری ہے۔" ملائمت سے کہا۔

"اس قسم کی عورتوں کا اکثر ہی پُراسرار معاملات سے کوئی تعلق بن جاتا ہے۔ لیکن تمہیں ایسے کسی معاملے سے بات کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ تم پولیس والے آئی ڈی والے؟" طاہرہ مجھے دوبارہ نشست پر بٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ کوئی اور عورت ہوتی تو شاید ایک ہاتھ رسید کردیتا۔ لیکن وہ کمبخت ایک تو حسین اوپر سے ستم یہ کہ دل کی بہت اچھی تھی۔ کسی قسم کی بغیر اور تمہید باندھے بغیر اس نے پہلی ملاقات میں ہی اور جتا بھی دیا تھا کہ وہ مجھ سے دوستی چاہتی تھی اور درمیان دیوار نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ مزید یہ کہ وہ رقابت میں ہوسکتی تھی۔ دوستی کے پہلے ہی دن!

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولی۔ "ویسے بھی تم اس سے کے لئے غلط وقت کا انتخاب کررہے ہو۔ اس وقت اپنی پرفارمنس کی وجہ سے وہ تھکی ہوئی ہے۔ اوپر سے شہر

رنگین مزاج باچھیں پھیلائے ہوئے اس کے پاس پہنچ جاتے لیس والے بھی جاکر اسی وقت اسے گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جنرل منیجر' پبلک ریلیشنز منیجر' پرنسس تہمینہ کا اپنا منیجر' ہوٹل رے دو چار لوگ' سیکیورٹی والے' اس وقت سب وہیں وتے ہیں۔ شہر کے اچھے بھلے معززین سے اور بڑے بڑے وں سے بھی اس وقت وہاں کوئی خاص اچھا سلوک نہیں وتا۔"

"اچھا سلوک کراتا تو خیر میں جانتا ہوں" میں نے کہا۔ "اس کے مالکان سے لے کر ویٹر تک مجھے جانتے بھی ہیں اور مانتے۔ میرا اسی وقت اس لڑکی کو پکڑنا ضروری ہے ورنہ یہ پھر ہوجائے گی۔ کیونکہ ایک بار پہلے بھی مجھے اپنا گھر دکھا کر اس غائب ہوچکی ہے کہ مجھے بعد میں اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔"

"گھر؟ اس کا یہاں کوئی گھر نہیں۔ یہ اسی ہوٹل کے وی آئی پی نمبر تین سو سترہ میں ٹھہری ہوئی ہے۔" طاہرہ خانم اطمینان لی۔ "اور یہ کہیں غائب نہیں ہوسکتی۔ اس ہوٹل کے ساتھ پورے ایک ماہ کی پرفارمنس کا معاہدہ ہے اور ابھی تو اسے پیش کرتے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا۔"

"لیکن یہ مجھے گارڈن ٹاؤن کی ایک کوٹھی میں ملی تھی۔ اس ما تھا کہ وہ اس کا گھر ہے۔ اس کے پاس وہاں کی تمام چابیاں۔" میں نے کہا۔

طاہرہ خانم نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اُف! کیا تم واقعی ہی بھولے ہو؟ بھئی اس قبیل کی عورتوں کے لئے شہر کے بہت روٴسا اپنے دل کے دروازے بھی کھلے رکھتے ہیں اور اپنی خالی یوں کے بھی۔ کسی مہربان نے دے دی ہوگی اپنی کوٹھی۔ پھر اس نے مناسب سمجھا ہوگا' وہاں سے غائب ہوگئی ہوگی۔ لیکن کا اصل ٹھکانا یہیں وی آئی پی سوئٹ نمبر تین سو سترہ میں ہے۔ ب چاہو اس نمبر پر اس سے رابطہ قائم کرسکتے ہو۔ میں تمہیں ینان دلاتی ہوں' یہ فی الحال کہیں نہیں بھاگے گی۔ لیکن کم از کم ب تک میں تمہارے ساتھ ہوں' تم بھاگ بھاگ کر اس کی طرف نے کی کوشش مت کرو۔"

"تمہیں اس کے بارے میں اتنی معلومات کیوں کر ہیں؟" میں پوچھا۔

"میں جب کسی چیز میں تھوڑی بہت دلچسپی لیتی ہوں تو اس کے رے میں معلومات رکھنے کی کوشش ضرور کرتی ہوں۔ یہ میری ہابی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ "میں نے پہلے ہی دن اس عورت کی فارمنس دیکھی تھی اور اس نے مجھے عورت ہوتے ہوئے بھی اثر کیا تھا۔ اس میں کوئی بات ہے ضرور۔ یہ محض جسمانی نمائش انحصار نہیں کررہی' اس کے پاس فن بھی ہے اور اس کی نصیت میں کوئی پُراسراری کشش بھی ہے۔ یہ زبردست ڈانسر ہے۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے بھی شبہ سا ہوتا ہے کہ حقیقت یہ ڈانسر نہیں ہے۔"

میں نے اپنے جوش و خروش کو دباتے ہوئے بیٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ یہ طاہرہ خانم بھی بڑے کمال کی چیز تھی۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ملک میں تفتیشی رپورٹنگ INVESTIGATIVE REPORTING کا رواج نہیں ہے لیکن تمہیں کسی اچھے سے اخبار میں اسی قسم کی رپورٹر ہونا چاہئے تھا۔"

وہ سنجیدگی سے بولی۔ "تفتیشی رپورٹنگ کی طرف میرا رجحان ہے یا نہیں' اس سلسلے میں تو میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ لیکن کسی زمانے میں مجھے عورتوں کے لئے ایک بڑا ماڈرن قسم کا رسالہ نکالنے کا بہت شوق تھا۔ جس کام کی سنک چڑھ جائے وہ میں کر گزرتی ہوں۔ زبردست انتظامات اور کافی بڑی انوسٹمنٹ کے ساتھ نکال ڈالا انگریزی میں پہلا ایک رسالہ۔"

"کیا نام تھا؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"اسپارک۔" طاہرہ نے جواب دیا۔

"کبھی سنا نہیں یہ نام اور نہ ہی کبھی رسالہ نظر سے گزرا۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"یہی تو ٹریجڈی رہی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ہم خود ہی میگزین چھاپتے تھے اور خود ہی پڑھتے تھے۔ حتیٰ کہ جن بے شمار کمینوں میں ہم مفت بانٹتے تھے وہ بھی نہیں پڑھتے تھے۔ رسالے سے زیادہ رسالہ نکالنے والیوں میں لوگ زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔"

"پھر تو تمہیں خوش ہونا چاہئے تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں تو خیر خوش ہی تھی کیونکہ میں ہر حال میں خوش رہتی ہوں۔ لیکن میرا مطلب ہے لوگوں کی تمام تر مہربانیوں کے باوجود رسالے کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ ہم اسے جاری نہیں رکھ سکے۔ میں نے اس میں بہت ہی خوبصورت اور چلبلی قسم کی لڑکیاں رکھی تھیں۔ میرا خیال تھا جس رسالے کے پیچھے اتنے بہت سے خوبصورت چہرے ہوں اسے تو چل ہی جانا چاہئے۔"

"پھر بھی نہیں چلا؟" میں نے حقیقتاً حیرانی سے پوچھا۔

"ہمیں تو یہی لگتا تھا کہ خوب چل رہا ہے۔ آراستہ و پیراستہ عالیشان قسم کے دفتر میں ہر وقت گہما گہمی رہتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ میرے اسٹاف سے زیادہ مصروف لوگ دنیا میں پائے ہی نہیں جاتے۔ لڑکیاں واقعی بہت مصروف تھیں۔ کوئی بوائے فرینڈز کی تعداد بڑھانے میں مصروف تھی۔ کوئی گھر بسانے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ کوئی مال بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھی۔ کوئی اپنے بگڑے ہوئے کام سنوارنے میں مصروف تھی۔ کوئی رسالے کے خرچ پر نت نئے تجربات کرنے میں مصروف تھی۔ رسالے کو اشتہارات بھی خوب ملتے تھے۔ اس کے باوجود خسارہ لاکھوں میں جارہا تھا اور میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ جیب میں بھی کچھ نہیں آرہا تھا۔ سال ڈیڑھ سال میں لاکھوں کا نقصان اٹھانے کے بعد میرا شوق پورا ہوگیا۔ میں نے محسوس کیا کہ انگریزی جرنلزم کی

یہ نام نہاد قسم کی ماہرین مجھے بیچ کر کھا جائیں گی۔ چنانچہ میں نے رسالہ بند کردیا۔ مجھے خود بھی حیرت ہوئی کہ اتنی بڑی انڈسٹریز میں چلا سکتی ہوں' اتنا سا رسالہ نہیں چلا سکی۔"

"جس کا کام اسی کو ساجھے۔" میں نے کہا "انڈسٹری تمہاری لائن بن گئی ہے۔ ضروری نہیں کہ اب تم ہر لائن میں ٹانگ اڑا سکو۔ میرا خیال ہے رسالے نکالنے والے اگر کاروبار یا انڈسٹری کی طرف آنے کی کوشش کریں تو شاید وہ بھی اسی طرح ناکام رہیں۔"

"ممکن ہے۔" وہ بولی۔ "اسی لئے تو اگر اب میں کوئی نیا کام شروع کرنے کا سوچتی ہوں اور مجھے اس کا تجربہ نہیں ہوتا تو میں خود اس کی کرتا دھرتا نہیں بنتی۔"

اس دوران ہال تقریباً خالی ہوچکا تھا۔ چند میزوں پر لوگ رہ گئے تھے۔ کھانے پینے کی چیزیں وہاں بھی سرو کی جارہی تھیں لیکن طاہرہ بولی۔ "چلو ریستوران میں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔"

ریستوران میں زیادہ بھیڑ بھاڑ نہیں تھی۔ بیشتر لوگوں نے کھانے سے فارغ ہو کر ڈانس شو کا رخ کیا تھا۔ کھانے پینے کا اپنا ایک خمار ہوتا ہے اور اس خمار کو دوبالا کرنے کے لئے لوگ اس قسم کے "پوسٹ ڈنر آئٹم" سے محظوظ ہوتے ہیں۔ ایک پُرسکون گوشے میں میز سنبھالنے کے بعد ہم نے اپنی اپنی پسند کی چیزوں کا آرڈر دیا۔

کھانے کے دوران طاہرہ ٹٹولنے والی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اب تو پرنس تہمینہ ذہن سے اتر گئی یا اب بھی سوار ہے؟"

"اتر گئی۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ "اب تو ذہن پر صرف تم سوار ہو۔"

"رات ڈھل رہی ہے نا۔" وہ خوابناک سے لہجے میں بولی۔ "چاند سورج کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ انسان کے اندر کا موسم بھی بدلتا رہتا ہے۔ کبھی فرصت میں تم سے پوچھوں گی کہ اس عورت نے تمہیں کیونکر مخچہ دیا' کس سلسلے میں دھوکا دیا؟ فی الحال تو میں صرف اپنی اور تمہاری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں یہاں صرف اس لئے لائی تھی کہ تم اسے محض تفریح کا ایک ذریعہ سمجھ کر دیکھو گے۔ مجھے گمان تک نہیں تھا کہ اس سے تمہارا کوئی چکر نکل آئے گا۔"

"چکر کوئی نہیں ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں نے اب اس معاملے کو ذہن سے جھٹک دیا ہے۔ تم بھی جھٹک دو۔ یہ محض اتفاق تھا کہ تم آئیں تو تمہارے ساتھ کچھ الجھے ہوئے معاملات کے سراغ بھی چلے آئے۔ لیکن میں نے اب کسی بھی معاملے میں سر کھپانے کا ارادہ ترک کردیا ہے۔ تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں بھی اب صرف اپنے اور تمہارے بارے میں سوچنے کی کوشش کروں گا۔"

میں اس کی دلجوئی کے لئے یہ باتیں کررہا تھا ورنہ پرنس تہمینہ کو فی الحال میں اپنے ذہن سے جھٹکنا نہیں چاہتا تھا۔ طاہرہ کی مزید

دلجوئی کے لئے مجھے اس کے ساتھ دوبارہ اس کے گھر بھی جانا پڑ وہاں سے صبح ہی واپسی ہوسکی۔ نیند کی کمی سے میری آنکھیں بو تھیں لیکن میرا سونے کے بجائے تیار ہو کر آفس جانے کا ارا تھا۔ آج کئی ضروری ملاقاتیں طے تھیں۔ تاہم اس سے پہلے ا اور کام بھی ضروری تھا۔

میں نے اپنے ایک خاص کارکن منیر کو فون کیا اور کہا۔ " کان کے سوئٹ نمبر تین سو سترہ میں پرنس تہمینہ کے نام سے ا ڈانسر مقیم ہے جو اسی ہوٹل میں روزانہ ڈانس شو پیش کررہی ہے

"یس سر۔ مجھے معلوم ہے۔" منیر نے کہا۔

"مسعود کو بھی ساتھ لے لو۔ اس لڑکی کی چوبیس گھنٹے نگر ہونی چاہئے۔ مسعود کے علاوہ بھی کسی کی ضرورت ہو تو اسے طلب کرو۔ جس طرح بھی تم چاہو نگرانی کے انتظامات کرلو۔ سروس کے ویٹروں اور کمروں میں چھوٹے موٹے کام کرنے ا میڈز کو بھی ساتھ ملانا ضروری ہو تو کسی بھی حربے سے ملالیا جا۔ یہ لڑکی کہیں غائب نہ ہونے پائے۔ سمجھ گئے نا؟"

"یس سر۔ ایسا ہی ہوگا۔ غائب نہیں ہوسکے گی۔" منی وثوق سے کہا۔ اس کا وعدہ یا دعویٰ پتھر پر لکیر ہوتا تھا۔ اسے مسعود کو اس قسم کے کاموں میں خصوصی مہارت تھی۔ کسی جگہ مقیم یا کہیں بھی سرگرم عمل آدمی' خواہ اس کے معمولات بھی ہوتے' اس کی چوبیس گھنٹے نگرانی میں منیر اور مسعود کا جو نہیں تھا۔ یہ کام بظاہر بہت آسان نظر آتا تھا لیکن درحقیقت ہی ذہانت طلب اور اعصاب شکن کام تھا۔ خصوصاً جبکہ وا بہت ہی شاطر قسم کے لوگوں سے ہو۔ منیر اور مسعود اس کا اسپیشلسٹ تھے۔ اس ضمن میں جو بھی انتظامات کرنے ضر ہوتے تھے وہ خود ہی کرلیتے تھے۔

تیار ہونے اور ناشتا کرنے کے بعد میں آفس جانے کے نکلنے ہی لگا تھا کہ طاہرہ خانم کا فون آگیا۔ نیند کی کمی کے اثرات کی آواز سے بھی ظاہر ہونے چاہیے تھے۔ مگر ایسا نہیں تھا۔ کے لہجے میں تو رات سے بھی زیادہ شگفتگی اور کھنک تھی۔ چھیڑنے کے سے انداز میں بولی۔ "کی حال اے سوہنیو؟ "میں تو ٹھیک ہوں۔ تم اپنی سناؤ۔" میں نے ایک بار

ے میں شب رفتہ کا خمار محسوس کرتے ہوئے کہا۔

ہارے لئے ایک اچھی خبر ہے۔" وہ بولی۔

یا آج رات پھر ملاقات رہے گی؟" میں نے پوچھا۔

ہ تو رہے گی ہی۔ لیکن دوسری خبر شاید تمہیں اس سے زیادہ ن محسوس ہو۔" وہ بولی۔ "وہ ٹین ڈبے والا ہاتھ آگیا ہے۔ ہند راجپوت نے اسے پکڑ کر اپنے کمرے میں بٹھایا ہوا ہے۔ ہ پہلے تو بری طرح ڈر گیا تھا لیکن میری ہدایت پر اس کے ت اچھا سلوک کیا گیا۔ بلکہ یوں سمجھو کہ اسے وی آئی پی ی دیا جارہا ہے۔ اب بتاؤ مزید "تفتیش" کا بندوبست بھی میں یا تم خود ہی اس معاملے کو سنبھالو گے؟"

تم کچھ بھی مت کرو۔ تم نے جتنا کردیا اتنا ہی کافی ہے۔ پندرہ ٹ تک میرا ایک آدمی پہنچے گا۔ اس سے آگے جو کچھ بھی روری ہوگا' وہی کرے گا۔ بس تم ٹین ڈبے والے کو اس الے کردینا۔ اس کے بعد تمہارا کام ختم۔" میں نے کہا۔

ھر کی چند باتیں اور ہوئیں پھر میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ س کے بعد میں نے سردار شیخ سے رابطہ قائم کیا اور اسے کس والا معاملہ سمجھانے کے بعد کہا۔ "اب وہ ٹین ڈبے والا خانم کی کوٹھی پر موجود ہے۔ تمہیں اس سے معلومات کرکے بڑھنا ہے اور ہر حال میں اس بلیک باکس کو تلاش کرکے یہ ت دو نمبر میں پہنچانا ہے۔ یہ اطمینان کرلینا کہ اس دوران کوئی ے پیچھے نہ لگا ہو۔ باکس حاصل کرنے کے بعد تمہیں بہت حتاط رہنے کی ضرورت ہوگی۔ وہ باکس کوئی تم سے چھینے نہ ۔"

"اوکے سر!" سردار شیخ نے جواب دیا۔ "آئی ایم آن مائی ۔" میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ اس دوران ملازم نے خاص ، اخبارات لاکر میرے سامنے رکھ دیئے۔ آج میں ابھی تک رات بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔ ذہن دوسری باتوں میں الجھا ہوا میں نے سوچا' جانے سے پہلے سرسری نظر ڈال ہی لی جائے۔ انگریزی اخبار میں کبھی کوئی کام کی بزنس انکوائری نظر آجاتی ہے دیکھنے میں میرا ایگزیکٹو اسٹاف بھی کبھی کبھار سستی کرجاتا

میں اس وقت نیم توجہی سے ایک انگریزی اخبار کے صفحات رہا تھا جب تفریحات کے صفحے پر میری نظر ایک نمایاں تصویر پر ۔ وہ صرف چہرے کا کلوز اپ تھا۔ تصویر باکس میں چھپی ہوئی ۔ اب یہ چہرہ میرے لئے خوب جانا پہچانا تھا کیونکہ گزشتہ رات پر میں نے اسے اسی طرح گہرے میک اپ میں ہر زاویئے سے لیا تھا۔ وہ پرنس تہمینہ کا چہرہ تھا۔ تصویر کے نیچے چند سطری رت تھی۔ اخبار نے لکھا تھا:

تفریحات کے ضمن میں پرنس تہمینہ شہر میں ایک اچھا اضافہ لیکن پریس کے لئے اس کی آمد کچھ زیادہ خوشگوار نہیں ہے

کیونکہ شوبزنس کی بیشتر شخصیتوں کے برعکس یہ خاتون نہ تو اخباری نمائندوں سے ملنا پسند کرتی ہیں اور نہ ہی انٹرویو دیتا۔ حتیٰ کہ تصویر کھنچوانا بھی گوارا نہیں کرتیں۔ ابھی تک ان کی واحد تصویر وہی ہے جو اشتہار میں چھپتی ہے اور وہ کوئی ایسی قابل تعریف تصویر نہیں۔ شاید خاتون کا خیال ہو کہ وہ جو کچھ اسٹیج پر پیش کرتی ہیں وہی ان کی شہرت دور دور تک پھیلانے کے لئے کافی ہے۔ بہرحال ہمارے فوٹوگرافر گزشتہ رات اچانک ہی اس وقت نہایت عمدگی

سے ان کا کلوز اپ اپنے کیمرے میں محفوظ کرنے میں کامیاب ہوگئے جب وہ ڈریسنگ روم سے نکل ہی تھیں۔ موصوفہ کی تمام تر برہمی کے باوجود ہم یہ تصویر اپنے قارئین تک پہنچانے میں کامیاب ہوہی گئے۔"

عبارت کا انداز تھوڑا سا چبھتا ہوا بھی تھا۔ اس کے باوجود تصویر کچھ اس طرح شائع کی گئی تھی جیسے یہ ایک کارنامہ تھا۔ اور اگر یہ کارنامہ انجام نہ دیا جاتا تو صحافت کی تاریخ میں بہت بڑا خلا رہ جاتا۔

کئی لمحے تک میں ایک ٹک اس چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ حیران حیران آنکھیں بھی گویا میری ہی جانب نگراں تھیں۔ اور میں ایک بار پھر الجھن میں تھا۔ جب یہ لڑکی حسنہ کے نام سے مجھے ملی تھی تب بھی انہی آنکھوں نے مجھے الجھن میں ڈالے رکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ آنکھیں میرے لئے شناسا کیوں تھیں؟

اب چونکہ یہ آنکھیں تصویر کی صورت میں میرے سامنے ساکت تھیں اس لئے میں زیادہ بہتر طور پر ان کے بارے میں غور کرسکتا تھا۔ ایک اجنبی چہرے پر یہ شناسا آنکھیں کہاں سے آگئی تھیں؟

پھر یک لخت میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ بعض باتیں یونہی اچانک بالکل غیر متوقع طور پر یاد آتی ہیں، جیسے گہری تاریکی میں بجلی کا کوندا لپکا ہو اور کوئی منظر یکدم روشن ہوگیا ہو۔

مجھے یاد آگیا تھا کہ یہ آنکھیں کس کی تھیں۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہ محض مشابہت کا معاملہ بھی نہیں تھا۔ اب مجھے معلوم ہوگیا تھا کہ جب یہ لڑکی حسنہ کے نام سے میرے سامنے تھی تو وہ کون سی خلش تھی جو میرے اعصاب میں سرسراہٹ سی دوڑائے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ حسنہ کی آنکھیں مجھے شناسا لگ رہی تھیں بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی پوری شخصیت ہی میرے لئے شناسا تھی۔

درحقیقت وہ نہ تو حسنہ تھی اور نہ ہی پرنسس تمینہ۔ اب مجھے سو فیصد یقین ہوگیا تھا کہ وہ اصل میں ہنی تھی۔ لیکن اس کی صورت کو کیا ہوا تھا؟ یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا.....!

کئی لمحے تک میں اس تصویر کو تکتا رہا۔ اس لڑکی کے کتنے روپ تھے؟ یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ ایک مختصر سے عرصے میں اس کی شخصیت کئی زاویوں سے میرے سامنے آئی تھی۔ ہر بار مجھے اس میں ایک عجیب سی پُراسراریت کا احساس ہوا تھا لیکن اب تو معاملہ بہت ہی حیران کن ہوگیا تھا۔ اب تو اس کی صورت ہی بدل گئی تھی۔ اسے غائب ہوئے تقریباً تین ماہ ہوچکے تھے اور اس دوران مجھ سے ٹیلیفون پر رابطہ رکھنے والے ایڈم عرف ایڈی کی باتوں سے یہی ظاہر ہوا تھا کہ وہ ریڈ ڈاٹ کے قبضے میں تھی لیکن اب آزاد

کے باوجود اور مجھ سے سامنا ہونے کے باوجود وہ مجھ سے کیوں بنی رہی تھی؟ صرف اجنبی ہی نہیں بنی رہی تھی بلکہ اس یہ چکر دینے کی بھی پوری پوری کوشش کی تھی۔ کیا اسے یہ حساس نہیں تھا کہ اس کے اغوا نے مجھے کتنا پریشان کیا تھا اور ں کے لئے کتنا فکرمند رہا تھا؟

فی الحال چونکہ ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں مل رہا تھا اس میں نے انہیں ذہن کے کسی اندھیرے گوشے میں دھکیلنے کی ش کی اور آفس روانہ ہوگیا۔

آفس کی اپنی ایک الگ ہی دنیا تھی۔ وہاں پہنچ کر میں بہت معروف ہوجاتا تھا۔ فائلیں، فون کالز، معذرتیں، شکریے، ے، کاغذات کا انبار، دستخط ہی دستخط، مالی انتظامات۔ اور ایسی جانے کتنی چیزیں ہوتی تھیں جو سر کھجانے کی بھی مہلت نہیں تھیں۔ پھر بعض اوقات غیر کاروباری، معاملات کی رپورٹیں وہیں آتی رہتی تھیں۔ انہیں بھی سننا ہوتا تھا اور ان کے ے میں فیصلے بھی کرنا ہوتے تھے۔ اس روز بھی شام تک میں بے معروف رہا۔ پھر وہ غیر کاروباری فون کال آئی جس کا مجھے وری سے انداز میں انتظار تھا۔ وہ سردار شیخ کا فون تھا جسے میں ین ڈبے والے کے ساتھ بلیک باکس کی تلاش کی مہم پر بھیجا

"یہ ایک عجیب و غریب مہم تھی سر!" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ ۔ اس ہنسی میں ہلکی سی تھکن اور خود استہزائی کی جھلک تھی۔ ین ڈبے والے کا کہنا تھا کہ اس نے حسبِ معمول شام تک ٹھ کباڑ جمع کیا اور لے جاکر کباڑیے کے ہاں ڈھیر کردیا جہاں ہر ز کی چھانٹی ہوتی ہے۔ شیشہ، کاغذ، لوہا پلاسٹک وغیرہ، سب کی الگ ب ڈھیریاں لگائی جاتی ہیں اور پھر ہر چیز کے ریٹ کے حساب سے یلے والوں کو پیسے ملتے ہیں..."

"اور یہ کباڑیا کہاں ہوتا ہے؟" میں نے بات کاٹتے ہوئے ما۔

"اس کا ٹھکانا طاہرہ خانم کی کوٹھی سے بہت زیادہ دور نہیں ہے۔ میاں میر کے علاقے میں اس نے ایک بہت بڑے اور قیمتی الی پلاٹ پر ناجائز قبضہ کرکے، بڑے بڑے چھپر ڈال کر اپنا گودام ا بنایا ہوا ہے۔ پلاٹ کے چار دعوے دار ہیں، چاروں مقدمے زی میں برسوں سے مصروف ہیں اور اس دوران کباڑیا اطمینان سے وہاں اپنے کاروبار میں مصروف ہے۔ ٹھیلے والے اسے ٹھیکیدار جی کہتے ہیں اور وہ خاصا آسودہ حال آدمی ہے۔ اس کے پنے ٹرک چلتے ہیں۔"

"بہت خوب!" میں سردار شیخ کو داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس شخص میں یہ بڑی خوبی تھی۔ اسے جب خصوصی ہدایات کے ساتھ کسی معاملے میں لگایا جاتا تھا تو وہ بڑی گہرائی میں جاکر ہر پہلو سے بڑی تفصیلی معلومات جمع کرکے لاتا تھا، خواہ بظاہر ان کی کوئی اہمیت نظر نہ آتی۔ اس کا کہنا تھا کہ معلوم نہیں کب کون سا نکتہ اہم اور کارآمد ثابت ہوجائے۔

سردار شیخ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "شام سے ٹھیکیدار کے ہاں گہماگہمی شروع ہوجاتی ہے۔ ٹھیلوں پر اور بوریوں وغیرہ میں کچرا اور کاٹھ کباڑ جمع کرنے والے وہاں پہنچنا شروع ہوجاتے ہیں۔ سو الغرض چیزوں کی چھانٹی ہوتی ہے اور ان لوگوں کو پیسے دے کر فارغ کردیا جاتا ہے۔ ٹھیلے والے نے اس باکس کو دھات کی چیزوں میں ہی ڈالا تھا لیکن وہ چونکہ کچھ صاف ستھری سی چیز معلوم ہورہی تھی اس لئے اس نے بعد میں اسے الگ رکھ لیا تھا کہ اسپیشل آئٹم، کے طور پر ٹھیکیدار سے اس کی خصوصی قیمت وصول کرنے کی کوشش کرے گا۔

پہلے ٹھیلے والے نے اس باکس کو خود بھی ٹھونک بجاکر دیکھا تھا۔ اس میں ہینڈل تو موجود تھا لیکن وہ تقریباً ٹھوس دھات کا ایک ٹکڑا محسوس ہورہا تھا۔ اس میں کہیں کوئی جوڑ نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی پتا چلتا تھا کہ وہ کہیں سے کھلتا ہے یا نہیں۔ تھک ہار کر اس نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ کوئی ایسی کارآمد چیز نہیں ہے جسے اپنے پاس رکھا جائے۔ چنانچہ شام کو اس نے دیگر کاٹھ کباڑ کے ساتھ ٹھیکیدار کے آدمی کے سپرد ہی کردیا تھا۔ اس کی بڑی منت سماجت کے بعد ٹھیکیدار کے آدمی نے الگ سے اس کی قیمت لگادی تھی۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں وہ قیمت کیا تھی؟"

"نہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔" میں نے اعتراف کیا۔

"دو روپے۔" سردار شیخ نے بتایا۔ "دو روپے میں وہ باکس کاٹھ کباڑ میں چلا گیا۔"

"اوہ خدایا!" میرے پہلو میں ٹیس سی اٹھی۔ جس چیز کے لئے کشت و خون ہونے کے آثار پیدا ہورہے تھے، جان کی بازیاں لگتی دکھائی دے رہی تھیں، وہ دو روپے میں کباڑی کے ہاتھ بک گئی تھی۔ کیا ستم ظریفی تھی!

سردار شیخ نے کہانی سنانے کے انداز میں بات جاری رکھی۔ میں اس کہانی کا کلائمکس جاننے کے لئے بے چین تھا لیکن اپنی بے تابی پر قابو رکھتے ہوئے مرحلہ وار ہر بات سن رہا تھا۔ سردار شیخ کہہ رہا تھا "ٹھیکیدار یعنی کباڑیے کے ہاں شام کے وقت دو تین آدمی "مال" کی وصولی کرتے ہیں۔ وہ خود ایک لمبی چوڑی چارپائی پر بیٹھا حقہ گڑگڑاتا رہتا ہے۔ اسے تو باکس کے سلسلے میں کچھ نہیں معلوم۔ ٹھیلے والے نے اس دن اپنا "مال" جس شخص کے سپرد کیا تھا اسے یاد ہے کہ اس قسم کی کوئی باکس نما چیز اس روز آئی تو تھی لیکن اسے صحیح طور پر یہ یاد نہیں کہ اس کا کیا بنا تھا۔ کباڑخانے میں ہاتھ سے کام کرنے والی دو تین پریس مشین قسم کی چیزیں ہیں۔ ان سے کاٹھ کباڑ کو پچکا کر اس کا حجم کم کیا جاتا ہے اور مختلف نوعیت کی چیزیں ٹرکوں میں لاد کر مختلف کارخانوں کو روانہ کردی جاتی ہیں۔ اس روز اتفاق سے لوہے کے سامان کا ٹرک جارہا

تھا۔ نوّے فیصد امکان یہی تھا کہ وہ باکس اسی ٹرک میں لوہے کے کارخانے کو چلا گیا۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان پُرسکون رکھتے ہوئے پوچھا۔

"ظاہر ہے سر' میں صرف یہ سن کر تو نہیں آسکتا تھا کہ وہ باکس آگے کہیں چلا گیا۔" سردار طویل سانس لے کر بولا۔ "میں اس کارخانے میں گیا جہاں لوہے کا ٹرک گیا تھا۔ بیچ میں ایک آڑھتی کا کردار بھی آتا ہے جو پہلے مختلف کباڑیوں کے ہاں سے آنے والے مال کو یکجا کرتا ہے پھر کارخانے والوں سے اکٹھا لین دین اور حساب کتاب کرتا ہے۔"

"کارخانہ کہاں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ شیخوپورہ روڈ پر واقع ایک اسٹیل ری رولنگ مل ہے۔" سردار نے جواب دیا "اس کا احاطہ بہت بڑا ہے جہاں لوہے کا کاٹھ کباڑ ڈھیر کیا جاتا ہے۔ پھر اسے صاف کرنے کے لئے مختلف مراحل میں بھٹیوں میں بھیجا جاتا ہے۔ وہاں نہ جانے کس کس علاقے سے اور کب کب کا آیا ہوا کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ یوں سمجھئے کہ کاٹھ کباڑ کے پہاڑ کھڑے تھے۔ ظاہر ہے وہاں کس کو یاد رہ سکتا تھا کہ کسی انبار میں لوہے کی بکس نما کوئی چیز بھی آئی تھی یا نہیں۔"

"ہاں۔ یہ تو درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"اس کے باوجود میں نے کسی نہ کسی طرح انتظامات کیے کہ کاٹھ کباڑ کے ان تمام پہاڑوں کو کھنگالا جائے۔" سردار نے بتایا۔

"اوہ۔" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ سردار' شیخ' ٹونی اور حنیف وغیرہ اس طرح تقریباً ناممکن کاموں کو ممکن بنانے میں خصوصی مہارت رکھتے تھے۔

سردار بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن سر! کہیں دھمکی' کہیں لالچ اور کہیں چکر دینے کے باوجود اس ساری جدوجہد کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اس باکس نما چیز کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ کم از کم وہ ان انباروں میں کہیں نہیں تھا جو کارخانے کے احاطے میں موجود تھے۔ پچھلے تین چار دنوں میں کئی انبار پگھلائے بھی جا چکے تھے اور صاف کرنے کے بعد سلاخوں وغیرہ میں ڈھالے جا چکے تھے۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ ان میں شامل ہو کر ایسے ہی کسی انجام کو پہنچ چکا ہے۔"

"نہیں' یہ ممکن نہیں ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اگر ایسا ہوا ہوتا تو بھٹی دھماکے سے اڑ جاتی۔ اور اگر کارخانے میں اس قسم کا کوئی حادثہ پیش آیا ہوتا تو تمہارے علم میں ضرور آجاتا۔"

مجھے یاد تھا ایڈم عرف ایڈی نے باکس کے بارے میں فون پر مجھ سے بحث کرتے وقت خبردار کیا تھا کہ اگر باکس کو ذرا بھی غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش کی گئی تو وہ دھماکے سے پھٹ جائے گا۔ اگر باکس میں کسی قسم کے میکنزم سے منسلک ڈائنامیٹ موجود تھا تو بھٹی میں جا کر اسے زیادہ تباہ کن انداز میں پھٹ جانا چاہئے تھا۔

"کارخانے والوں نے اس قسم کے کسی حادثے کا تذکر[ہ نہیں]
کیا۔" سردار بولا "وہاں تو سکون و اطمینان سے معمول کے م[طابق]
کام ہو رہا تھا۔"

"وہ باکس بظاہر لوہے کا ایک ٹکڑا ہی نظر آتا تھا جس میں
صرف اسے اٹھانے کی غرض سے چھوٹا سا ہینڈل لگا ہوا تھا۔ ت[اہم]
ذرا توجہ سے دیکھنے پر خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ ممکن ہے کار[خانے]
کے احاطے میں سے کوئی مزدور وغیرہ اسے اٹھا کر لے گیا ہو۔"
نے کہا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں سوچ رہا تھا کہ شاید ایڈ[ی نے]
محض مجھے خوفزدہ کرنے کے لئے گپ ہی چھوڑی ہو تاکہ میں با[کس]
کھولنے کی کوششوں سے باز رہوں۔ عین ممکن تھا کہ اس میں
ڈائنامیٹ وغیرہ نہ رہا ہو اور وہ واقعی بھٹی میں جا کر کسی اور شکل [میں]
ڈھل چکا ہو۔

سردار بولا "یس سر! یہ عین ممکن ہے۔ کارخانے میں
اجرت پر کام کرنے والوں اور مستقل ملازموں کو ملا کر تقریباً
بیس آدمی کام کرتے ہیں۔ اگر آپ حکم دیں تو ہم باری بار[ی]
سب کو چیک کر لیتے ہیں۔ ان کے گھروں پر پہنچ کر پوچھ گچھ کر[تے]
ہیں اور ذرا چھان بین بھی کر لیتے ہیں تاکہ کوئی جھوٹ بول کر
ٹالنے کی کوشش نہ کرے۔"

مجھے معلوم تھا' سردار کسی کام کو بے نتیجہ چھوڑنا پسند [نہیں]
کرتا تھا خواہ اس میں کتنی ہی محنت کی ضرورت ہوتی۔ لیکن میں [نے]
فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "چلو چھوڑو سردار! اتنے لمبے چکروں [میں]
مت پڑو۔ فی الحال اتنی جدوجہد ہی کافی ہے۔ میری اس میں [دلچسپی]
یکایک ہی کم ہو گئی ہے۔ لعنت بھیجو اس پر۔"

"جیسے آپ کا حکم سر۔ ویسے آپ کہیں تو ایک کوشش
کر کے دیکھی جا سکتی ہے۔ تمام ملازموں کو چیک کرنے کا کام
چار دن میں مکمل ہو جائے گا۔ ہم تین چار آدمی لگ جائیں۔
ذرا اطمینان ہو جائے گا۔"

"بس رہنے ہی دو' مجھے ویسے ہی اطمینان سا ہو گیا ہے۔"
نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے طاہرہ خانم کے مشور[ے پر]
عمل کر ہی لیا تھا اور بلیک باکس پر لعنت بھیج دی تھی۔

کچھ دیر بعد میں نے ٹرانسیٹر پر منیر سے رابطہ قائم کیا جسے
نے پرنس تہمینہ کی نگرانی کی ذمے داری سونپی تھی۔ ٹرانسیٹ[ر پر]
اس کی طرف سے جواب ملنے میں چند منٹ لگ گئے۔ شاید
وقت وہ کسی مناسب جگہ پر نہیں تھا جب اسے ٹرانسیٹر پر سگنل [ملا]

"کیا خبر ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"نگرانی جاری ہے سر!" منیر نے جواب دیا "وہ آج سارا [دن]
اپنے سوئٹ میں ہی موجود رہی ہے۔ چند منٹ کے لئے بھی [باہر نہیں]
نکلی۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ ہمارے علاوہ بھی کوئی اس کی نگ[رانی]
کر رہا ہے۔ بظاہر وہ ایک بے ضرر سا سفید فام ہے۔ عمر رسید[ہ]

[س]ا معلوم ہوتا ہے۔ بظاہر اپنے آپ میں مگن رہتا ہے لیکن
[مجھے شک] ہے کہ وہ پرنس تہمینہ کی نگرانی پر مامور ہے۔"

"[ع]ین ممکن ہے۔" میں نے تصدیق کی "اس کے علاوہ تو کوئی
[نظر] نہیں آیا؟"

"جی نہیں۔ نگرانی کرنے والا تو کوئی نہیں لگا۔ لیکن ہوٹل کے
[عملے] میں بھی مجھے نچلے درجے کے دو ایک ملازمین پر شبہ ہے کہ
[و]ہ کسی کے لئے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ پرنس
[...] کا مینیجر بھی کچھ ٹھیک آدمی نہیں لگتا۔ وہ صرف مینیجر نہیں
[معلو]م ہوتا۔"

منیر کا مشاہدہ قابل داد تھا۔ ابھی اسے نگرانی پر مامور ہوئے
[چند ہ]ی گھنٹے گزرے تھے لیکن اس نے بہت سی باتیں معلوم کر لی
[تھیں] اور بہت سی باتیں محسوس کر لی تھیں۔

"ٹھیک ہے۔ نگرانی جاری رکھو لیکن غیر معمولی طور پر محتاط
[رہنا]۔ اور اگر ڈیوٹی بدلنے کی ضرورت پیش آئے تو اپنی جگہ احمد اور
[...]ب کو مامور کرنا۔" میں نے ہدایت کی۔

"کم از کم اڑتالیس گھنٹے تک تو میں اور مسعود نگرانی جاری رکھ
[سکتے] ہیں سر!" منیر نے جواب دیا "اس میں کسی خاص بھاگ دوڑ
[کے] آثار نظر نہیں آ رہے اس لئے شاید ہم اس سے زیادہ وقت کے
[لئے] بھی مسلسل نگرانی جاری رکھ سکیں۔ بہرحال اگر ضرورت پڑی
[تو می]ں انتظام کر لوں گا اور آپ کو اطلاع دے دوں گا۔"

میں نے خدا حافظ کہہ کر ریسیور رکھا ہی تھا کہ کیتھرین نے
[اط]لاع دی' طاہرہ خانم مجھ سے بات کرنا چاہتی ہے۔ میں نے لائن
[ملا]نے کے لئے کہا۔ طاہرہ خانم میری آواز سنتے ہی بولی۔ "کیا آج
[دف]تر میں ہی رات گزارنے کا ارادہ ہے؟ خدا خیر کرے' سیکرٹری بھی
[وہ]یں موجود ہے۔"

"بدمعاشی والی گفتگو نہیں چلے گی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"کیوں؟ تمہیں ڈر ہے وہ سن لے گی اور برا منا جائے گی؟"

"میرے دفتر میں ایسی سیکرٹری نہیں پائی جاتی جو میری اجازت
کے بغیر کسی سے میری گفتگو کے بارے میں اس حد تک تجسس میں
[مب]تلا ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"میں نے گھر فون کیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ تم گھر پہنچ چکے
ہو گے۔"

"بس..... کبھی کبھار دیر ہو جاتی ہے۔"

"اس باکس کا کیا رہا؟ ہاتھ آیا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہ انگریزی کا ایک محاورہ ہے نہ' جس کا مطلب کچھ
[ی]وں ہے۔ گھاس کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنا۔ وہی گھاس جسے
پنجابی میں پرالی کہتے ہیں۔ تو اس باکس کی مثال بھی اب کچھ ایسی ہی
ہو گئی ہے۔ اسے تلاش کرنا سوکھی گھاس کے انبار میں سوئی تلاش
کرنے سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔ میں نے تمہاری نصیحت پر عمل
کرتے ہوئے اس پر لعنت بھیج دی ہے۔"

"شکر ہے" اس نے سکون کی سانس لی "ورنہ میرا تو خیال تھا کہ اب تمہاری باقی زندگی اسی کا وظیفہ پڑھتے گزر جائے گی۔ اچھا یہ بتاؤ آج میری طرف آ رہے ہو یا نہیں؟"

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا" میں نے تذبذب کے عالم میں کہا "مجھے ایک کام ہے۔ اگر وہ نہ ہوا تو میں تمہاری طرف آ سکتا ہوں۔"

"مجھ سے دوٹوک بات کرو ڈیئر انی! اس طرح انتظار کی سولی پر لٹکا کر میری شام برباد مت کرو۔ اور مجھے اسپیروھیل بھی مت بتاؤ کہ فلاں وھیل ٹھیک نہ چلا تو اس کی جگہ تمہیں لگالوں گا ورنہ اسی سے کام چل جائے گا۔ میں اس انداز کی دوستی کی قائل نہیں۔"

"دراصل میرا دل تو تمہاری ہی طرف اٹکا ہوا ہے لیکن ذہن کہیں اور پھنسا ہوا ہے۔" میں نے سچ بیانی سے کہا۔ میں آج رات پرنس تہمینہ والے سلسلے میں کچھ کرنا چاہتا تھا۔ میرا ذہن ادھر پھنسا ہوا تھا۔

"یہی تو میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہی ہوں کہ ہم اس طرز زندگی کے قائل نہیں ہیں۔ دل کہیں اٹکا ہوا ہے' ذہن کہیں اٹکا ہوا ہے اور جسم کہیں اور اٹکا ہوا ہے۔ جب اٹکاؤ تو سب کچھ ایک ہی جگہ اٹکاؤ اور جب رخصت کی طلب ہو تو اپنا سارا ہی بستر بوریا سمیٹ کر وہاں سے کوچ کر لو۔ قدموں کے نشان تک مت چھوڑو۔"

"یہ بھلا کیسے ممکن ہے۔ تم تو بہت ہی سنگدلی کی باتیں کر رہی ہو۔" میں نے کہا۔

"تم عمر میں مجھ سے چند سال چھوٹے ہو۔ شاید چند سال میں تمہارا سوچنے کا انداز بھی میرے جیسا ہو جائے۔ بشرطیکہ تمہیں بھی وہی تجربات حاصل ہو سکیں جو مجھے ہوئے ہیں۔" وہ بولی۔ میں نے وہ پہلی عورت دیکھی تھی جو کم عمر بننے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ حالانکہ وہ چاہتی تو اپنی عمر چھپا سکتی تھی۔ اس کا سراپا ایسا ہی تھا۔ میں نے ایسی عورتیں بھی دیکھی تھیں جن کے بارے میں بجا طور پر کہا جا سکتا تھا کہ پیٹ میں آنت نہ منہ میں دانت۔ مگر میں نے بات بات پر انہیں یہ بھی کہتے سنا تھا "ابھی ہماری عمر ہی کیا ہے۔" بہت کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں عمر کی سیڑھی پر دوسروں سے ذرا اوپر کھڑے ہونا برا نہیں لگتا بلکہ وہ دوسروں کے چھوٹے پن' معصومیت اور ناتجربے کاری سے محظوظ ہوتے ہیں۔

"مجھے ایسے تجربات نہیں چاہئیں جو انسان کو کٹھور بنا دیں۔" میں نے کہا۔

"سنگدلی اور حقیقت پسندی کے درمیان بہت باریک سی لکیر ہے۔ اور میں حقیقت پسند ہوں' سنگدل نہیں" وہ بولی "جو چیز میرے قبضے میں ہو' میرے ہاتھ میں ہو' میں اس کی ملکیت کے احساس سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ جو ہاتھ سے چلی جائے اس کے لئے تھوڑی دیر افسوس ضرور کرتی ہوں' زیادہ پیاری چیز ہو تو اس

کے لئے رو بھی لیتی ہوں۔ لیکن ہمیشہ ہی جیٹھی رونی نہیں رہتی۔ اور نہ ہی یہ امید رکھتی ہوں کہ کسی معجزے کے تحت وہ چیز یا وہ رفاقت گم گشتہ مجھے دوبارہ مل جائے گی۔"

"تم بہت عجیب عورت ہو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اگر تم ذات کی گہرائی میں جا کر دیکھو گے تو تمہیں ہر عورت ہی کچھ نہ کچھ عجیب ضرور لگے گی۔ ایسی باتیں کبھی ختم نہیں ہوں گی۔ یہ بتاؤ تم آ رہے ہو یا نہیں؟" وہ ہموار لہجے میں بولی۔

"مشکل ہے۔" مجھے معذرت کا کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔

"کوئی بات نہیں۔ کل سہی" وہ گویا اس بات کو ذرا بھی محسوس کئے بغیر بولی "لیکن بس اتنا بتا دو کہ آج کہیں تم اسی بے ہودہ عورت پرنس تہمینہ کے پاس تو نہیں جا رہے ہو؟"

ایک لمحے میں وہ عورت سیدھی اور شفاف نظر آتی تھی اور ایک لمحے میں پیچیدہ تضادات کا مجموعہ۔ ایک شام کی ملاقات میں وہ سارے مراحل طے کر گئی تھی۔ حقیقت پسند اور بے نیاز بھی بنتی تھی۔ اس کے باوجود اندر ہی اندر رقابت کا بھی شکار تھی۔ ایسی عورت کے نزدیک رقابت ایک بالکل بے معنی چیز ہونی چاہئے تھی۔ بظاہر تو وہ بے پروائی سے ہی پوچھ رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ اندر کوئی بات ضرور تھی۔

"دیکھو' مجھے اس کے پاس جانے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔" میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی "وہ ایک بہت ہی عجیب اور پُراسرار معاملہ ہے۔ میں اسے سمجھنے کے لئے کوشاں ہوں۔"

"لیکن مجھے سمجھانے کی کوشش نہیں کر رہے کہ آخر پُراسرار معاملات سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ میں پہلے بھی پوچھ چکی ہوں' تم پولیس والے ہو' سی آئی ڈی والے ہو' ایف آئی اے والے ہو' جاسوس ہو' کیا ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں تو ایک بندۂ ناچیز ہوں۔" میں نے اس کے لہجے سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔

"خیر۔ اب اتنے ناچیز بھی نہیں ہو۔ چیز تو بہت بڑی ہو۔ لیکن میرا مطلب ہے تم بزنس مین ہو' بزنس مین کی طرح زندگی گزارو۔ ابھی تمہاری شادی بھی نہیں ہوئی۔ اس لئے دن چاہے کتنے ہی جھنجٹوں میں گزارو لیکن شامیں تو اپنی رکھو۔ دفع کرو ان پُراسرار چکروں کو۔ انہیں پُراسرار لوگوں کے لئے ہی رہنے دو۔"

"بعض اوقات انسان نہ چاہتے ہوئے بھی ایسے معاملات میں الجھ جاتا ہے۔" مجھے خود بھی اپنا لہجہ کمزور سا لگا۔

"میں تو اب پچھتا رہی ہوں کہ تمہیں اس ڈانس شو میں کیوں لے کر گئی۔ اور بھی بہت سی جگہیں تھیں جانے کے لئے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"خیر۔۔۔ اس کے لئے تو میں تمہارا شکر گزار ہوں۔" میں نے کہا۔ "ورنہ وہ شاید عین میری ناک کے نیچے پرنس تہمینہ کے نام

سے مہینہ بھر دھوم مچا کر چلی جاتی۔ دوبارہ غائب ہو جاتی او[ر] بھی نہیں چلتا۔ کیونکہ میں نے اس شو کا اشتہار زیادہ توجہ [سے] دیکھا تھا اور دو ایک بار اشتہار دینے کے بعد انہیں مزید د[...] ضرورت ہی نہیں پڑی۔"

"چلو خیر۔۔۔ کل تم سے ملاقات رہے گی۔ ویسے اگر تم رات کے کسی پہر فارغ ہو جاؤ تو میں گھر پر ہی ملوں گی۔ خدا[...] اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد بھی میں چند لمحے ساکت بیٹھا رہا[...] خانم سے بات کرنے کے بعد چند لمحے تک تو اعصاب جھ[...] رہتے تھے۔ میں اٹھنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ گھنٹی ایک با[ر] اٹھی۔ کیتھرین بھی بے چاری میری ہی وجہ سے آفس میں ا[...] بیٹھی ہوئی تھی ورنہ تقریباً پورا اسٹاف جا چکا تھا۔ اس نے اب ستارہ کا فون تھا۔

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ بھی ایسی ہس[...] تھی جس سے میں کوئی بہانہ کر سکتا۔ کیتھرین سے کہہ سکتا[...] ٹرخا دے۔ میں نے بات کرانے کے لئے کہا اور ستارہ کی طر[ف] آغاز میں ہی طنز کا تیر۔۔۔ بلکہ بھالا آیا۔

"سنا ہے وزارتِ خزانہ اور وزارتِ صنعت و تجار[ت کے] قلمدان تمہارے سپرد کر دئیے گئے ہیں۔" وہ بولی "اور م[...] قلمدان قطار در قطار رکھے ہوئے ہیں۔ کہ تمہیں ذرا فرص[ت ہو تو] تمہارے سپرد کئے جائیں۔ کیا یہ درست ہے؟"

"چلاؤ۔۔۔ چلاؤ۔۔۔ تم بھی طنز کے تیر چلاؤ۔ طنز کے تی[ر] ہمیں دوست ہلاک نہیں کریں گے تو اور کون کرے گا۔" [...] کراہ کر کہا۔

"میں طنز تو نہیں کر رہی" وہ بڑی معصومیت سے بولی [...] ضرورت کس کمبخت کو ہے؟ تمہاری مصروفیات سے ظا[ہر] ہے کہ اس ملک کا سارا مالیاتی اور تجارتی نظام تمہارے ہی [دم] سے چل رہا ہے۔ اگر تم نے توجہ ذرا کم کر لی تو تجارت بیوہ [ہو جائے] گی اور کاروبار کی ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ جائے گی۔"

"کاروبار کا تو مجھے نہیں معلوم" میں نے کہا "لیکن اگر [اسی] طرح طنز کے گولے برساتی رہیں تو میری ریڑھ کی ہڈی ضر[ور ٹوٹ] جائے گی۔ بھئی میں کچھ عجیب سے چکر میں پھنس گیا تھا' ا[س لئے] فون نہیں کر سکا۔"

"چکر کا نام کیا تھا؟ شادی شدہ تھا' بیوہ یا غیر شادی [شدہ؟"] اس نے فوراً پوچھا۔

"مذکر بھلا بیوہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میں نے اعتراض اٹھا[یا۔]

"تمہارے چکر عام طور پر مونث ہوتے ہیں۔" وہ بولی۔

"عورت کو ہر چیز کی تہ میں عورت ہی نظر آتی ہے۔ جا[نے یہ] بیماری مردوں کو ہونی چاہئے۔ بہر حال۔۔۔ میں جھوٹ نہ[یں بول] رہا۔ تمہاری قسم کھانے کو تیار ہوں۔ واقعی مصروفیت بہ[ت تھی۔]

[...]بہت ہی عجیب قسم کی مصروفیت۔ میرا تو خود تمہاری طرف [آنے کو بہ]ت دل چاہ رہا تھا۔"

"[...]ث" وہ فوراً بولی۔ "اکثر میں ہی ڈھیٹ بن کر تمہیں فون [کرتی ہو]ں۔ سراپا دعوت نامہ بن کر تمہیں اپنے ہاں بلاتی [ہوں۔ بڑ]ے فلمی سپر اسٹارز کی مصروفیت کی مثالیں دیتے ہیں لیکن [...]ہیں کہ تمہاری آمد کی امید نہ ہوتے ہوئے بھی تمہارا [انتظار کر]نے کے لئے وقت نکال لیتے ہیں۔ ہمارے بعد تمہیں ایسے [چاہنے وا]لے نہیں ملیں گے۔"

"[تمہ]ارے بعد چاہنے والوں کو تلاش ہی کون کمبخت کرے [گا۔" میں] نے خلوص سے کہا۔

"[یہ] سب منہ دیکھے کی باتیں ہیں۔" اس کے لہجے میں واقعی [اف]سردگی در آئی تھی۔

"[اس] وقت تو خیر میں تمہارا منہ دیکھے بغیر یہ بات کر رہا ہوں۔ [تمہیں م]علوم ہی ہے ٹیلیفون پر منہ تو نظر نہیں آتے نا۔ یہاں منہ [سے مرا]د چہرے ہیں۔" میں نے اسے شگفتگی کی طرف لانے کی [کوشش] کی۔

"[میں]یں نے محاورہ استعمال کیا تھا۔" وہ بولی۔

"[تم ا]تنی ڈپریس کیوں ہو رہی ہو کہ محاورے بولنے پر اتر آئی [ہو؟" میں] نے اب بھی ہلکے پھلکے انداز میں پوچھا۔

"[...]جب کئی دن تک تم سے ملاقات نہیں ہوتی تو میں ایسی ہی [ہو جاتی] ہوں۔ باوجود تمام تر مصروفیت کے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"[...]یں بس آج کل میں تمہاری طرف آنے والا ہوں۔" میں [نے اس]ے یقین دلایا۔ "اور تو سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

"[...]ہاں۔ ٹھیک ہی ہے۔" وہ کچھ عدم دلچسپی سے بولی۔ پھر جیسے [اس]ے یاد آیا "بس ایک خرچا بڑھ گیا ہے۔"

"[...]کیا خرچا بڑھ گیا ہے؟ کوئی بکری یا بلی پال لی ہے کیا؟"

"[...]بکری یا بلی نہیں البتہ بکرے یا بلّے پالے ہیں۔ میرا خیال ہے [...]بلّے ہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ دو خونخوار قسم کے بلّے۔ میرا [مطلب] ہے میں نے اپنی حفاظت کے لئے دو مسلح گارڈ رکھ لئے [ہیں۔]" وہ بولی۔

"تو پھر انہیں بکرے ہی کہو' قربانی کے بکرے۔" میں نے [کہا۔ "ل]یکن تمہیں ان کی کیا ضرورت آن پڑی؟"

"معلوم نہیں کیوں مجھے کچھ وہم سا رہتا ہے کہ جیسے ہر وقت [میری] نگرانی ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں میری کون سی حس مجھے [یہ احسا]س دلاتی رہتی ہے کہ کوئی نادیدہ یا نامعلوم آنکھ مجھے دیکھ رہی [ہے۔] کئی بار کہیں آتے جاتے یہ احساس بھی ہوا کہ میرا تعاقب [ہو رہا] ہے۔ میں یقین سے تو نہیں کہہ سکتی لیکن ان باتوں کا وہم سا [...]رہنے لگا ہے۔ میں نے سوچا احتیاط ہی بہتر ہے۔" وہ نہایت [سادگ]ی سے یہ بات بتا رہی تھی۔

"ارے۔۔۔ تو تم نے مجھ سے ذکر کیا ہوتا۔ میں تمہیں آدمی دیتا۔ کرائے کے آدمی۔ میرا مطلب ہے لگی بندھی تنخواہ پر کام کرنے والے یہ روایتی سے محافظ کوئی خاص کارآمد نہیں ہوتے۔"

"ارے چھوڑو" وہ شکوہ آمیز سے لہجے میں بولی "تم نے تو تسلیاں دیتے دیتے ہی وقت گزارتے رہنا تھا۔ اس دوران خواہ یہ بندی ہی گزر جاتی۔"

"میری نیت جھوٹی تسلیاں دینے کی نہیں ہوتی" میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ "کیا تم میری عادت کو سمجھ نہیں سکیں؟ میں شروع میں ان باتوں کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ بلکہ اپنے معاملے میں تو آخر تک بھی میں ان معاملات کو اہمیت نہیں دیتا۔ اب جبکہ میرے گرد نامعلوم دشمن کا جال تنگ ہو رہا ہے' میں نے اپنے ساتھیوں کو اپنی نگرانی سے بالکل منع کر دیا ہے۔ لیکن تمہارے لئے تو بہر حال جو تم کہتیں وہ کیا جا سکتا تھا۔ اب میں تمہاری طرف سے اتنا بھی بے پروا نہیں ہوں۔ خیر۔۔۔ اب بھی میں اپنے ایک آدمی کی ڈیوٹی لگا دیتا ہوں۔ وہ دور سے تمہاری نگرانی کرتا رہے گا اور اگر کوئی تمہارا تعاقب کرتا ہے یا ٹوہ میں رہتا ہے تو وہ اس کی بھی چھان بین کر لے گا۔"

"ارے نہیں" وہ یکدم بدلے ہوئے شگفتہ لہجے میں بولی "اب اتنا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو ویسے ہی تمہیں چھیڑ رہی تھی۔ کرید رہی تھی کہ تمہیں میری کچھ پروا بھی ہے یا نہیں۔ تمہارے لہجے کی تشویش ہی میرے لئے کافی ہے۔ ان معاملات سے ڈرتی میں بھی نہیں' گارڈ تو میں نے یونہی بس احتیاطاً رکھ لئے ہیں۔ بھئی کوئی میری نگرانی کرتا ہے تو کرتا رہے۔ تعاقب کرتا ہے تو کرتا رہے۔ بھاڑ میں جائے۔ جب کوئی کچھ کرے گا تو دیکھا جائے گا۔ جو مقدر میں ہوگا بھگت لیں گے۔ ویسے آدمی میں نے روایتی سے نہیں رکھے۔ اچھے آدمی ہیں۔ اسلحے کے استعمال میں ماہر ہیں اور جوڈو کراٹے وغیرہ بھی جانتے ہیں۔ بھروسے کے بھی ہیں۔ کبھی کبھی میں انہیں فلموں میں اسٹنٹ مین کے طور پر تھوڑا بہت کام دلوا دیتی ہوں۔ اچھے اسٹنٹ مین ہیں۔ انہیں فلموں میں اس طرح کام کرنے کا شوق بھی ہے اور انڈسٹری میں آجکل اس قسم کے آدمیوں کی ذرا کمی بھی ہے۔ تنخواہ کے علاوہ انہیں آمدنی بھی ہو جاتی ہے۔ بے چارے خوش ہو جاتے ہیں۔ سرکاری کمانڈو رہ چکے ہیں۔"

"چلو تم کہہ رہی ہو تو ٹھیک ہی ہوگا۔ لیکن میرا ایک آدمی بہر حال دُہری حفاظت کے لئے تمہارے پیچھے رہا کرے گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"ارے نہیں۔۔۔ بس اب اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے کہا نا کہ حقیقت میں تو میں بھی تمہاری ہی طرح ملنگوں اور درویشوں کے سے انداز میں سوچتی ہوں۔ کم از کم زندگی اور موت کے بارے میں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"تو پھر گارڈ کس لئے رکھ لئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یونہی شوق میں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "آدمی ذرا وی آئی پی سا لگنے لگتا ہے۔ اور اگر پہلے ہی سے وی۔ آئی پی ہو تو ڈبل وی آئی پی ہو جاتا ہے۔ فلم اسٹار کو تو ویسے بھی ضرورت رہتی ہے۔ دیکھا نہیں، کبھی کبھی مداح اور پرستار کیسی بدتمیزی پر اتر آتے ہیں۔ کبھی کسی جگہ اچانک کس طرح ہجوم ہو جاتا ہے۔ اظہارِ عقیدت کے طریقے بھی تو ہمارے ہاں کچھ عجیب ہیں۔ لوگوں کا بس نہیں چلتا کہ اپنے پسندیدہ فنکاروں کی بوٹیاں نوچ ڈالیں، اس کی گاڑی توڑ ڈالیں اور اس سے ایسا سلوک کریں کہ وہ کبھی پبلک مقامات پر آنے کی جرأت نہ کرے۔"

"شاید آتے آتے کبھی سلیقہ آ ہی جائے۔ پیوستہ رہ شجر سے امید بہار رکھ" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر مشورہ دیا۔

"ہاں۔ بہار آنی ضرور چاہئے، پھول کھلنے ضرور چاہئیں۔ خواہ ہماری قبر پر ہی کھلیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "فی الحال تمہارا کیا پروگرام ہے؟ کہاں جا رہے ہو؟"

"ایک میٹنگ میں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم سے جب بھی پوچھو تم کسی میٹنگ میں جا رہے ہوتے ہو یا میٹنگ سے آ رہے ہوتے ہو۔ تم تو بزنس مین کے بجائے کوئی سرکاری افسر معلوم ہونے لگے ہو۔ خیر۔ میں تمہارے فون کی منتظر رہوں گی۔" اس نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں ریسیور رکھ کر اٹھنے کے لئے اپنا بریف کیس وغیرہ ہی سنبھال رہا تھا کہ ایک بار پھر فون کی گھنٹی بج اٹھی اور شریر سی ہنسی کے ساتھ کیتھرین نے بتایا "اب کراچی سے راحیلہ کی کال ہے۔"

"اوہ مائی گاڈ!" میں دھم سے دوبارہ کرسی پر گر پڑا۔ آج تو عجیب ہی اتفاق ہو گیا تھا۔ میں حیران تھا کہ کیا تینوں عورتوں کے فون آج ہی۔۔۔ اور اوپر تلے ہی آنے تھے؟ تینوں میں سے کوئی شخصیت ایسی نہیں تھی جس کے لئے میں کیتھرین سے یہ کہنے کا تصور کر سکتا کہ اسے ٹرخا دیا جائے۔ راحیلہ کے فون کی اطلاع سن کر تو میرا دل عجیب ہی انداز میں دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اسے روز فون کیا کروں گا لیکن پچھلے دس روز میں ایک مرتبہ بھی یہ وعدہ وفا نہیں ہو سکا تھا۔

کسی باضمیر چور کی طرح شرمندہ سے لہجے میں، میں نے کیتھرین سے کہا "ملاؤ۔"

کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ راحیلہ کی آواز ابھری جو رگ و پے میں نشہ سا دوڑا دیتی تھی۔ وہ بلا تمہید بولی "سچ ہے جب کوئی چیز حاصل ہو جائے تو اس کی وہ قدر نہیں رہتی۔ بعض لوگ اچھا نہیں کرتے کہ اپنے عشق کا اعتراف کر لیتے ہیں۔ میں انہی بدنصیبوں میں سے ایک ہوں۔"

"حاصل حصول کی منزلیں تو بہت دور ہیں راحیلہ ڈیئر! ابھی تو تم سے جی بھر کے باتیں کرنے کا بھی شوق پورا نہیں ہوا اور تم نے بے قدری کے شکوے شروع کر دئے۔" میں نے حقیقتاً کراہ کر

کہا۔

وہ بات کاٹتے ہوئے بولی "ہاں۔ واقعی۔۔۔ تمہارا عالم تو دیکھا نہیں جا رہا۔ صبح تمہارے فون کی گھنٹی سے ہی ہے اور رات کو بھی تم سے ہی باتیں کرتے کرتے سوتی ہوں میں نے ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ آج پر طنز کے اتنے گولے برسے تھے کہ دماغ کی چولیں ہل گئی تھیں۔ آج کی شام بڑی بدنصیب تھی۔

"راحیلہ! اگر میں چند دن تمہیں فون نہیں کر سکا تو مطلب یہ ہے کہ میں تمہیں بھول گیا یا میرے دل میں تمہاری کم ہو گئی؟" میں نے دردناک لہجے میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔ بلکہ اگر تم مزید چھ ماہ فون نہیں کرو زیادہ متاثر ہو جاؤں گی۔ میں سمجھوں گی میری جدائی میں حال ہو گیا ہے کہ آنکھیں دھندلا گئی ہیں، ٹیلی فون دکھائی نقاہت کے مارے نمبر ڈائل نہیں ہوتا، شدتِ غم سے حافظہ دے گیا ہے۔ میرا نمبر تک یاد نہیں رہا۔ نمبر تم نے کہیں نوٹ نہیں کیا تھا اور نہ ہی تمہیں کہیں سے مل سکتا تھا کیونکہ ارض پر تو رہتی نہیں۔ دوسرے سیارے پر رہتی ہوں۔ بھلا کس طرح ہو سکتا تھا؟"

میں بالکل خاموش رہا۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد "کیا قوتِ گویائی بھی جواب دے گئی ہے؟"

"جس بے چارے کے ساتھ اتنی بری ہو رہی ہو، وہ بو[لنے کے] قابل رہے گا؟" میں نے مردہ سے لہجے میں کہا۔

"پھر بھی کچھ تو بولو۔ کوئی جھوٹ ہی بولو۔"

"میں اچھا بچہ ہوں، جھوٹ نہیں بولتا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ طنزیہ انداز میں ہنسی "بہت خوب! اس سے بڑا جھوٹ کیا ہو سکتا ہے۔"

"دیکھو تم نے جی بھر کے مجھے شرمندہ کر لیا۔" میں نے غمناک لہجے میں کہا "مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ تم جو سزا دو، مجھے قبول ہے۔ میں اگر محض تمہارا شکوہ دور کرنے کے لئے روایتی اور رسمی انداز میں تمہیں فون کرنا چاہتا تو یقیناً گزشتہ دنوں میں کئی بار کر سکتا تھا۔ لیکن میرے نزدیک تو تمہیں فون کرنا ایک خصوصی کام تھا۔ میں تو نہایت فرصت میں، نہایت اطمینان کے ساتھ تم سے نہایت لمبی لمبی باتیں کرنا چاہتا تھا۔ بس یہی میری غلطی تھی۔ مگر اتنی فرصت میسر نہ آ سکی، ایسا خصوصی موقع نہ مل سکا اور فون نہ کیا جا سکا۔ اب بتاؤ اس کی تلافی کس طرح کروں؟ پرسوں تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں؟ گلے شکوے کچھ کم ہو سکیں گے؟"

"اب اتنے بڑے جھوٹ بھی مت بولو کہ دم ہی نکل جائے مارے خوشی کے۔" وہ مضطرب سی ہنسی کے ساتھ بولی۔

"یہ تو پرسوں ہی پتا چلے گا جب یہ بندۂ ناچیز ہونقوں کی طرح منہ اٹھا کر تمہارے درِ دولت پر دستک دے رہا ہو گا۔"

"درِ غربت کہو۔" اس نے تصحیح کی "اب میں تمہیں اتنی زیادہ بھی تکلیف نہیں دینا چاہتی۔ اب تم صحیح معنوں میں بزنس مین ہو۔ جتنا وقت میرے پاس آنے اور جانے میں ضائع کرو گے اتنی دیر میں تو دو چار لاکھ روپے کما لو گے۔"

"اف فوہ۔۔۔!" میں نے ایک ثانئے کے لئے دانت بھینچنے کے بعد کہا "اب تو بے اختیار سر پیٹنے کو دل چاہ رہا ہے۔ میرا بزنس مین ہونا تو میرے لئے طعنہ بن گیا ہے۔ لیکن کم از کم تم مجھے روپے پیسے کے لالچ کا طعنہ مت دینا۔ ورنہ ابھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اسی سوٹ میں کراچی پہنچ جاؤں گا۔ بلکہ نہیں۔۔۔ یہ سوٹ بھی مہنگا ہے، امارت کی نشانی ہے۔ اسے بھی یہیں چھوڑ دوں گا اور لنڈا بازار پہنچ کر کسی مرے ہوئے انگریز کی نیکر بش شرٹ خرید کر پہن لوں گا۔ کسی ٹرین کے تھرڈ کلاس ڈبے میں بیٹھ کر آ جاؤں گا۔ پھر گزارا کر لو گی میرے ساتھ؟ زندگی بھر؟"

وہ بے اختیار ہنس دی۔ اس کی مترنم اور کھنکتی ہنسی دل کے تپتے صحرا پر بارش سی کر دیتی تھی۔ غصہ تو اسے پہلے بھی کم تھا۔ اصل میں تو غصے کی اداکاری ہی زیادہ کر رہی تھی لیکن اب اس کی ہنسی نے بتا دیا کہ جو تھوڑا بہت غصہ تھا وہ بھی میرے خلوص کے ریلے میں بہہ گیا تھا۔

"تم بہت بدمعاش ہو۔ میرا کافی دیر تک تم سے خفا رہنے کا ارادہ تھا لیکن تم نے بہت جلد مجھے ہنسنے پر مجبور کر دیا۔" وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی۔

"یہ اعزاز صرف تمہیں حاصل ہے کہ تمہارے غصے پر مجھے غصہ نہیں آتا، پیار آتا ہے۔ ورنہ غصے کے جواب میں مجھے خود زیادہ غصہ آنے لگتا ہے۔ کوئی صرف غرائے تو میرا اس پر دہاڑنے کو جی چاہتا ہے۔ کوئی آنکھیں دکھائے تو میرا گھونسا دکھانے کو جی چاہتا ہے۔"

"بندی آئندہ احتیاط کرے گی عالم پناہ!" وہ اپنی آواز میں لرزش پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "اور یہ کنیز چونکہ زیادہ طویل فون کال کرنے کی متحمل نہیں ہو سکتی اس لئے اب فون بند کر رہی ہے۔"

"کیا فون کرنے کا مقصد صرف لعن طعن کرنا ہی تھا؟ اتنی دیر میں تم نے روح کو معطر کرنے والا ایک لفظ بھی نہیں بولا۔ دل کو خوشی دینے والی ایک بھی بات نہیں کی۔"

"فون تو تمہیں صرف یہ یاد دلانے کے لئے کیا تھا کہ کراچی میں صرف تمہارے بزنس پارٹنر اور بزنس کو چلانے والے کارندے ہی نہیں رہتے، کچھ اور لوگ بھی رہتے ہیں، جو بے شک تمہارے لئے کچھ کماتے نہیں مگر جن کے دل تمہارے لئے دھڑکتے ہیں اور جو ہر لمحے تمہیں یاد کرتے ہیں۔"

"اے بندی خاص اور کنیز عام! جا کر ان لوگوں سے کہہ دو کہ ہم جلد ہی ان سے ملنے آ رہے ہیں" میں نے شاہانہ لہجے میں کہا۔

"اور اگر ان کے دل واقعی ہمارے لئے دھڑکتے ہیں اور وہ واقعی ہر لمحے ہمیں یاد کرتے ہیں تو پھر انہیں ہم سے رسمی قسم کے گلے شکوے ہرگز نہیں کرنے چاہئیں۔ جذبے ٹیلی فون کالز کے محتاج نہیں ہوتے۔ جذبوں کو تو اپنا جواب خود بخود ہی مل جاتا ہے۔"

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتی، میں نے سلسلہ منقطع کر دیا اور ریسیور رکھ کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ آج یکے بعد دیگرے تینوں عورتوں کے فون آئے تھے تو مجھے احساس ہوا تھا کہ کہیں میں کچھ زیادہ ہی تو نہیں الجھ گیا تھا۔ دل میرا یہی کہتا تھا کہ عشق مجھے صرف راحیلہ سے تھا۔ لیکن اگر میں ستارہ سے قطع تعلق کرنے کے بارے میں سوچتا تھا تب بھی میرا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ اور اگر کبھی میں یہ سوچتا تھا کہ اس سے میرے تعلق کا انجام کیا تھا؟ تب بھی کوئی جواب نہیں ملتا تھا۔ ایک اچھی یا بری بات یہ تھی کہ خود ستارہ نے آج تک نہیں پوچھا تھا کہ اس کے اور میرے تعلق کا انجام کیا تھا۔ ایک کشتی تھی جو بس خواہشات اور محسوسات کے دھارے پر بہتی چلی جا رہی تھی۔ کہاں جا رہی تھی؟ یہ نہ تو اسے معلوم تھا اور نہ ہی مجھے۔

یہ بے منزل سفر تو اپنی جگہ تھا ہی لیکن اب اس طاہرہ خانم نے آ کر ایک ہی رات کی ملاقات میں مجھے کسی انجانے بندھن میں جکڑ لیا تھا۔ وہ بھی یکدم ہی مجھے اچھی لگنے لگی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ بے پناہ حسین تھی۔ لیکن بہرحال نوجوانی میں ہی دو مرتبہ بیوہ ہو چکی تھی۔ اس کے بعد بھی اس کی عمر نہ جانے کس کس وحشت کی سیاحی میں گزری تھی۔ عمر میں مجھ سے کئی سال بڑی بھی تھی۔ ستارہ گو کہ میری ہم عمر ہی تھی لیکن گھاٹ گھاٹ کا پانی وہ بھی پئے ہوئے تھی۔

راحیلہ، جس سے میری دانست میں مجھے عشق تھا، گو کہ بہت ہی نفیس، بہت ہی اونچی چیز تھی۔ وہ میرا آئیڈیل تھی، ایسا آئیڈیل

جسے لڑکپن کے زمانے میں، میں صرف ایک حسین بت کی طرح ذہن میں تراش سکتا تھا، کبھی پانے کا تصور نہیں کر سکتا تھا۔ میرے بیکراں عشق کو اپنی بانہوں میں سمیٹنے سے پہلے اس نے میرے دل پر گہرا گھاؤ بھی لگایا تھا۔ کسی اور کی بن کر اس کا گھر بسانے کی کوشش بھی کر دیکھی تھی۔ اس کے باوجود گم گشتہ التفات کے مرجھائے پھول لئے اچانک ہی زندگی کے ایک موڑ پر سامنے آ گئی تھی تو مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ میرے دل میں تو اس کے لئے وہی شعلہ فروزاں تھا جس سے آغازِ عشق میں دل منور تھا۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ میں تو ہنی کے لئے بھی بے چین تھا۔ اسے میں نے گویا پانے سے پہلے ہی کھو دیا تھا۔ جب وہ میری ذرا سی نظرِ التفات کے لئے بے چین تھی، دیدہ و دل میری راہوں میں بچھائے رکھتی تھی تو میرا ذہن نہ جانے کہاں الجھا ہوا تھا۔ مجھے اس کی طرف پیش قدمی کی مہلت نہیں ملی تھی لیکن جب وہ پُراسرار حالات میں یکدم غائب ہوئی تھی تو مجھے بھی اچانک احساس ہوا تھا کہ میرے دل میں اس کے لئے کوئی بات ضرور تھی۔ میں اسے تلاش کرنے کے لئے بے چین ہو گیا تھا۔ بارہا میں نے دیر تک اس کے بارے میں سوچا تھا۔ اس کے بارے میں فکرمند ہوا تھا کہ نہ جانے اس پر کیا گزر رہی ہو گی۔ مجھے اس کی خاموش عقیدت، اس کی نگاہوں کی پیاس، اس کا ایثار بے تحاشہ یاد آتا رہا تھا۔

اب میں وہ سب کچھ یاد کرتا تھا تو احساس ہوتا تھا کہ وہ جذبات کی تمام تر شدتوں سے میری طرف بڑھنا چاہتی تھی لیکن اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ شاید وہ یہی سمجھتی تھی کہ میں اس کی بے غرض چاہت کی پذیرائی نہیں کروں گا۔ اسے وہ مقام نہیں دے سکوں گا جس کی وہ خواہش مند تھی۔ اور یوں اس کا شیشۂ دل ٹوٹ جائے گا۔ اس نے اپنے پندار کو مجروح کرنے کے بجائے اپنی ذات کے خول میں سکڑے سمٹے رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔

اب جب سے میں نے اسے پرنسس تمینہ کے روپ میں پہچانا تھا، تب سے اس پر گزرے ہوئے حالات کو جاننے کا تجسس تو بے قابو ہوا ہی تھا لیکن اسے یہ بتانے کی خواہش بھی بڑی شدت سے ابھر آئی تھی کہ اسے کھونے کے بعد میں نے اس کے بارے میں کیا محسوس کیا۔ کس طرح اس کی طلب میرے دل میں جاگی۔

آج پہلی مرتبہ بیک وقت ان سب عورتوں کے بارے میں سوچنے بیٹھا تھا تو یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا کہ آخر میری ذات میں یہ کیا تماشا برپا تھا؟ یہ کون سی پیاس تھی جو مجھے ساحل ساحل بھٹکا رہی تھی؟ اس میں شک نہیں تھا کہ اپنے اپنے ناقابلِ رشک ماضی کے باوجود یہ عورتیں معمولی عورتیں نہیں تھیں۔ اپنی اپنی جگہ پر ہر ایک بہت مختلف اور بہت غیر معمولی تھی۔ اس کے باوجود اگر میں تھوڑا سا خود پرست ہو کر سوچتا تو ان کا اور میرا ساتھ کچھ جچتا نہیں تھا۔ گو کہ ان میں سے ہر ایک ایسی تھی جس کی اک ذرا سی نظرِ التفات کے لئے نہ جانے کیسے کیسے لوگ متاعِ حیات ہتھیلی پر لئے پھرتے تھے۔ پھر بھی کم از کم مجھے ان پر مرمٹنے سے پہلے کے لئے سوچنا چاہئے تھا۔ جو میں نے نہیں سوچا تھا۔

جبکہ اس سے پہلے زندگی کے سفر میں نہ جانے کتنی پوتر نگاہوں کو، نہ جانے کیسے کیسے اچھوتے پیکروں کو، نہ جانے پاکیزہ ہیولوں کو نظرانداز کرتا ہوا بڑھتا چلا آیا تھا۔ ان میں بھی زندگی کا ساتھی ہو سکتا تھا، کوئی بھی میرے بڑھے ہوئے بصد شوق تھام سکتا تھا، کوئی بھی لازوال محبتوں کا دعوے دار تھا، کوئی بھی ایسا مہرباں جس کے ماضی سے کوئی لغزش وابستہ تھی۔ کوئی بھی ایسا نازک خیال جس کے وجود کی چاندی کسی لمس کی حرارت سے پگھلی نہیں تھی۔ مگر میں نے کبھی ان کی خاص توجہ سے نہیں دیکھا تھا۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میں اپنے آپ کو جتنی مضبوط شخصیت کا مالک سمجھتا تھا، اندر سے درحقیقت اتنا ہی کمزور تھا؟ میرے جذبے آوارہ تھے، میری سوچیں بے لگام تھیں، میری خواہشیں سمندر تھیں اور ضبط کے بند کچے؟ شاید ایسا نہیں تھا بلکہ صرف اتنی تھی کہ میری ذہنی سطح عمر سے آگے چلی گئی تھی۔ سوچوں کا سفر شاید بہت تیز تھا۔ کچی باتیں، کچی عمریں، کچے پیکر نظر میں جچتے ہی نہیں تھے۔ شاید سوچ کی اسی تیز رفتاری نے دنیاوی کامیابیاں بھی جلد از جلد حاصل کرنے میں بڑی مدد دی۔

خیالوں کے یہ پنچھی کونجوں کی ڈار کی طرح ذہن کے افق سے اڑتے چلے گئے۔ اچانک میں نے چونک کر جھرجھری سی لی۔ حقیقتاً خوفزدہ سی نظروں سے فون کی طرف دیکھا اور دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا۔ برخوردار انی! اس سے پہلے کہ فون کی گھنٹی ایک بار پھر بج اٹھے، تم اپنا یہ روحانی تجزیہ یا تحلیل نفسی وغیرہ بند کرو۔ اور جو کرنے کا کام ہے وہ کرو۔ زندگی کو کٹی پتنگ کی طرح چھوڑ دو، خواہ سنبھال سنبھال کر رکھو، اسے تو جس طرح گزرنا ہے اسی طرح گزرے گی۔ زیادہ بقراط مت بنو اور نہ ہی اپنے آپ کو اونچے سنگھاسن پر بٹھا کر اپنا جائزہ لو۔ جیسی گزر رہی ہے گزرنے دو۔ دیکھا جائے گا۔ ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا۔ تم میں کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے جو اپنے بارے میں ایسے تشویش زدہ ہو کر سوچنے لگے ہو؟ اس سے پہلے تو تم پر اس طرح کا دورہ نہیں پڑا تھا۔

میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اپنے ڈائریکٹ لائن والے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنے چند ساتھیوں کو ضروری ہدایات دیں۔ انہیں ایک متوقع سچویشن کے بارے میں سمجھایا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

میں اپنے آفس کے بیرونی حصے میں آیا تو کیتھرین احتراماً اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی میز کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے رک کر کہا "کیتھی! معاف کرنا، آج میری وجہ سے تمہیں بھی بہت دیر تک بیٹھنا پڑا۔"

کیتھرین کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی "سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ باس بھی کہیں معذرت کیا کرتے ہیں؟ دفتر میں جو بھی دیر تک کام کرتا ہے اسے اتنا اوور ٹائم ملتا ہے جتنا کسی اور دفتر' کسی اور کارخانے میں نہیں ملتا سر!"

"وہ صرف تمہارے وقت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ لیکن جس خلوص سے میرے ساتھی میرے لئے کام کرتے ہیں اس خلوص کا میں کوئی معاوضہ نہیں دے سکتا۔" میں اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ میری یہ گفتگو اور یہ تھپکی کاروباری ڈپلومیسی نہیں تھی۔ میں واقعی دل سے اپنے کارکنوں کے خلوص کا معترف تھا۔ میری ترقی میں ان کی انتھک محنت کا بڑا دخل تھا۔ اسی لئے میں نے اپنے کاروباری نظام میں ایسی بہت سی قسمیں رکھی تھیں کہ میرے ساتھ دھیرے دھیرے یہ لوگ بھی کچھ نہ کچھ ترقی کرتے چلے جائیں۔ ان کے بھی حالات کچھ نہ کچھ بدلتے چلے جائیں۔ شاید یہی وجہ تھی...... یا پھر یہ بھی محض میری خوش قسمتی کی ایک اور مثال تھی کہ جو کارکن میرے لئے صرف دفتری اور کاروباری خدمات انجام دیتے تھے وہ بھی میرے جاں نثار تھے۔

ٹونی' سردار شیخ' حنیف' شبیر شیخ' شفیع شاہ اور ان جیسے دوسرے پچاسوں جوان تو مشن کے سے انداز میں میرے ساتھ تھے۔ کاروبار بھی سنبھالتے تھے اور دوسرا کوئی حکم بجالانے کے لئے بھی مستعد رہتے تھے۔ لیکن بہت سے ایسے بھی تھے جنہیں گمان تک نہیں تھا کہ میری کچھ غیر کاروباری مصروفیات بھی ہو سکتی ہیں۔ عام سیٹھوں کے برعکس میں بہت سے خطرناک معاملات میں بھی ہاتھ ڈال سکتا ہوں یا اپنے آپ کو بہت خطرناک سمجھنے والے طاقتور لوگوں سے الجھ بھی سکتا ہوں۔ وہ لوگ مکمل طور پر مجھے صرف اور صرف کاروباری شخصیت سمجھتے تھے لیکن وہ بھی وقت پڑنے پر مجھ پر جان نچھاور کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ بعض موقعوں پر میں نے ان کے خلوص اور جاں نثاری کے ایسے مظاہرے دیکھے تھے کہ میری آنکھوں میں نمی سی آگئی تھی۔

انسان کی شخصیت کا یہ تضاد کبھی کبھی مجھے بہت حیران کرتا تھا۔ عقوبت خانوں میں جو لوگ دوسروں کو سسکا سسکا کر مارتے ہیں یا ان کی زندگی کو موت سے بدتر بنا دیتے ہیں وہ بھی انسان ہی ہوتے ہیں۔ اور یہی انسان جب کسی عقیدت و محبت کا اظہار کرنے پر آتا ہے تو اس کے پاؤں چاٹنے میں بھی فخر محسوس کرتا ہے' اس کے اشارے پر جان دینے کے لئے تیار رہتا ہے اور اس کی بڑی سے بڑی خباثت' حیوانیت اور بڑے سے بڑے عیب کو بھی نہ صرف نظر انداز کر دیتا ہے بلکہ اس کی بدترین حرکتوں میں بھی اچھے معانی تلاش کر لیتا ہے۔ بلاشبہ حضرتِ انسان بے شمار تضادات کا مجموعہ ہے۔ یا پھر شاید "اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔"

اپنے افکار پریشاں سے الجھتا ہوا میں گاڑی میں بیٹھ کر انٹرکان کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے ہیڈ آفس کی عمارت سے انٹرکان کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ تاہم میں نے اسے نہایت سست رفتاری سے طے کیا۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو جو ہدایات دی تھیں میں انہیں ان پر عمل درآمد کے لئے مہلت دینا چاہتا تھا۔

انٹرکان کی پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر میں گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ بظاہر میں نے سرسری سے انداز میں اردگرد کا جائزہ لیا۔ گاڑیاں تو بہت سی موجود تھیں لیکن کوئی شخص موجود نہیں تھا۔ حتیٰ کہ گاڑیوں کی نگرانی کرنے والا بھی نہیں تھا۔ میں نے ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے سے ریڈیو کا مائیک نکالا اور صفدر سے رابطہ قائم کیا۔ صفدر میرے اس ساتھی کا نام تھا جسے میں نے کچھ دیر پہلے طلب کیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی سلیمان تھا۔ لازمی نہیں تھا کہ مجھے ان دونوں کی ضرورت پڑ ہی جاتی۔ میں نے صرف احتیاطاً انہیں دو مختلف مقامات پر تعینات کرنے کے لئے بلایا تھا۔ اگر چھوٹا سا کام کرنا ضروری ہو جاتا جو میرے ذہن میں تھا تو صفدر اور سلیمان بہت کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔

"یس سر!" صفدر نے سگنل ملنے اور کوڈ ورڈ سننے کے بعد کہا "میں اور سلیمان اپنی پوزیشن پر پہنچ چکے ہیں۔ آپ کا سگنل ملتے ہی ہم حرکت میں آجائیں گے۔"

سلیمان جو اس وقت دوسرے پوائنٹ پر موجود تھا' وہ ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا تو وہ بولا "یس سر! انٹرکان کا پچھلا چھوٹا گیٹ میری نظر میں ہے۔ ادھر گلی چھوٹی اور اندھیرا بھی ہے۔ پارسل اگر ادھر سے لے جانا پڑا تو زیادہ آسان رہے گا۔"

"دیکھیں گے جیسی بھی سچویشن ہوئی۔" میں نے مبہم لہجے میں کہا "یہ کچھ ایسا معاملہ ہے کہ اس میں قبل از وقت کوئی ہدایت نہیں دی جاسکتی۔ عین ممکن ہے کہ یہ کام کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ کوئی دوسرا راستہ نکل آئے۔ خدا حافظ۔" میں نے ریڈیو آف کیا' خفیہ خانہ بند کیا اور گاڑی سے اتر آیا۔ موسم خنک اور خوشگوار تھا۔ تاریکی گہری ہو چکی تھی لیکن انٹرکان کی عمارت اپنی روایت کے مطابق جگمگا رہی تھی۔

پارکنگ لاٹ اور اصل عمارت کے طویل و عریض ڈرائیو وے کے درمیان ایک اونچی دیوار حائل تھی جس کے تقریباً وسط میں دروازہ موجود تھا۔ اس سے گزر کر میں ڈرائیو وے میں آیا تو مین دروازے کے سامنے گاڑیوں کی آمدورفت اور خوب چہل پہل نظر آئی۔ یہ صورتِ حال گویا میری خواہش کے عین مطابق تھی۔ میں یہی چاہتا تھا کہ جب میں ہوٹل پہنچوں تو وہاں خوب گہما گہمی ہو۔

ہوٹل میں مختلف شعبوں میں کام کرنے والے اسٹاف میں بیشتر لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ آنے جانے والوں میں بھی اکثر شناسا صورت آشنا نکل آتے تھے۔ لیکن زیادہ گہما گہمی کی صورت میں بہت مشکل تھا کہ میری طرف کسی کی توجہ جاتی اور کوئی میری آمد یاد رکھتا۔ آج کل ڈانس شو کی وجہ سے ویسے ہی بہت سے ا

آمدورفت بھی شروع ہو چکی تھی جو اکثر و بیشتر اس ہوٹل والوں میں شامل نہیں تھے۔ ان میں سے بعض ایسے تھے ہوٹلوں میں نشست و برخاست کے درحقیقت متحمل نہیں ے لیکن اس قسم کی کسی کشش کی وجہ سے آنے لگے ں ایسے تھے جن کے پاس روپیہ کافی تھا لیکن وہ اچھی اٹھنے بیٹھنے کا ذوق نہیں رکھتے تھے۔ مگر پرنس تھینہ کا نہیں بھی یہاں کھینچ لاتا تھا۔

وں کی بھیڑ بھاڑ میں شامل ہو کر میں لفٹ تک پہنچا اور تھوڑ گیا۔ ساری بھیڑ بھاڑ اور رونق گراؤنڈ فلور تک ہی محدود ر کی منزلوں پر وہی سناٹا تھا جو ہمیشہ رہا کرتا تھا۔ ہوٹل میں تم کمرے خالی رہتے تھے لیکن راہداریوں میں عموماً ایسا ہی تا تھا جیسے تمام کمرے خالی ہیں اور مدتوں سے بند ہیں۔ کسی یڈ کے علاوہ شاذ و نادر ہی کوئی آتا جاتا یا کمرے سے برآمد ہوتا دیتا تھا۔

لیکن اس راہداری میں اتنی زیادہ ویرانی نہیں تھی جس وی آئی پی سوئٹ نمبر تین سو سترہ واقع تھا۔ میں جونہی اس تیزی سے مڑا' ایک تقریباً اپنے ہی جتنے دراز قد آدمی سے تے ٹکراتے رہ گیا۔

رکتے ہی مجھے معلوم ہوا کہ آدمی دراصل ایک نہیں دو دونوں کی شکلیں گو کہ ملتی نہیں تھی لیکن پھر بھی ان پر جڑواں ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں کا قد جسامت اور رنگت تقریباً ایک جیسی تھی اور وہ ایک جیسی بلیو وردی میں تھے۔

ان کے سروں پر پولیس والوں سے ملتی جلتی ٹوپیاں تھیں اور دں کی جیب پر عقاب کی تصویر والا ایک مونوگرام سا کڑھا ہوا دونوں کی بیلٹ میں بڑے بڑے ہولسٹروں میں کوئی خاص ہی قسم ریوالور جھول رہے تھے ورنہ ریوالوروں کے ہولسٹر عام طور پر تنے بڑے نہیں ہوتے تھے۔

سرسری نظر میں تو وہ انگلش فلموں میں نظر آنے والے پولیس ہی معلوم ہو رہے تھے لیکن ان کی یونیفارم اور مونوگرام کو ذرا سے دیکھتے ہی مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ کون تھے۔ ان دنوں سیاسی شت گردی' سیاسی بدمعاشیاں' ڈاکے اور اغوا برائے تاوان کے لسلے کچھ ایسے عروج پر نہیں تھے۔ اس لئے پرائیویٹ سیکیورٹی گارڈز کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔ اسی لئے ظاہر ہے کہ پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسیاں بھی نہیں تھیں۔

مجھے معلوم تھا کہ لاہور میں صرف ایک ہی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی تھی جو بہت محدود پیمانے پر کام کر رہی تھی۔ کوئی ریٹائرڈ کرنل اکرم صاحب تھے۔ عمر کا کافی حصہ انہوں نے دوسرے ملکوں میں گزارا تھا۔ کچھ عرصے پہلے انہوں نے ایک غیر ملکی پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسی کے اشتراک اور الحاق سے یہاں ایجنسی کھولی تھی۔

اس ایجنسی میں گنتی کے چند گارڈز موجود تھے اور انہیں بھی مصروفیت ذرا کم ہی میسر آتی تھی۔ اس میں شک نہیں تھا کہ ایجنسی کی خدمات کا معیار بہت اچھا تھا لیکن پھر بھی اچھے بھلے دولت مند لوگ بھی مستقلاً تو اس سے استفادہ کرنے کے بارے میں سوچتے تک نہیں تھے کیونکہ اس کے اخراجات بہت زیادہ تھے۔ اور بیشتر سرمایہ داروں کو ابھی جان اور مال کے لالے نہیں پڑے تھے۔ بہت تھوڑے لوگ' زیادہ ہی مجبوری کے عالم میں کبھی کبھار ہی عارضی طور پر اس ایجنسی کے گارڈز کی خدمات حاصل کرتے تھے۔ میرے خیال میں کرنل صاحب کو ایجنسی سے کوئی خاص آمدنی نہیں ہو رہی تھی لیکن وہ خاندانی دولت مند تو تھے۔ ایجنسی کو اسی معیار سے چلائے جا رہے تھے۔ شاندار دفتر تھا' گاڑیاں تھیں' اسلحہ تھا اور باصلاحیت لوگ مستقل ملازم تھے۔ شاید ایجنسی اس امید پر چل رہی تھی کہ کبھی نہ کبھی تو حالات زیادہ خراب ہوں گے اور پیسے والے لوگ پرائیویٹ ایجنسیوں کی طرف بھاگیں گے۔

وہ دونوں جوان بظاہر اسی ایجنسی "شیلٹر" کے گارڈز معلوم ہوتے تھے۔ لفظ بظاہر' میں نے اس لئے استعمال کیا ہے کہ ان کے پاس ایجنسی کے لوازمات یعنی یونیفارم اور مونوگرام وغیرہ تو موجود تھے لیکن انہیں ذرا توجہ سے دیکھنے پر میری چھٹی یا شاید کسی اور نامعلوم حس نے نہ جانے کیوں مجھے بالکل خفیف اور مدھم سے انداز میں خبردار کیا تھا کہ ان کا تعلق "شیلٹر" سے نہیں تھا۔ حالانکہ میں نے شیلٹر کے گارڈز کی شکلیں فرداً فرداً دیکھی ...... نہیں تھیں اور نہ ہی میں ایجنسی کے مالک ریٹائرڈ کرنل اکرم صاحب کو جانتا تھا۔ ایجنسی کا دفتر بھی میں نے صرف باہر سے ہی دیکھا ہوا تھا یا پھر ایجنسی کی دو ایک گاڑیاں کبھی سڑک پر ادھر اُدھر آتی جاتی دیکھی تھیں۔ اس سے زیادہ مجھے اس کے بارے میں کوئی معلومات نہیں تھیں۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں نے انہیں دیکھتے ہی نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ وہ شیلٹر کے تو نہیں تھے۔

وہ دونوں سفید فام تو نہیں تھے لیکن سرخ و سپید اور لمبے تڑنگے تھے۔ صرف چہرہ دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کس ملک کے باشندے ہیں۔ وہ دونوں سوئٹ نمبر تین سو سترہ ہی کے سامنے تعینات تھے۔ اس راہداری میں مڑنے سے پہلے ہی وہ آگے بڑھ کر میرے راستے میں حائل ہو گئے تھے گویا انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسری راہداری سے کوئی شخص ان کی طرف آرہا تھا۔ حالانکہ راہداریوں میں دبیز قالین بچھا ہوا تھا اور میرے قدموں کی ذرا سی بھی آہٹ نہیں ابھری تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ بطور گارڈز وہ برے نہیں تھے۔

ان میں سے ایک نے بالکل درست تلفظ کے ساتھ صاف اور شستہ اردو میں مجھے مخاطب کیا "آپ کس سے ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں؟" اس کے لہجے میں کوئی عیب نہیں تھا۔ اس کے باوجود

نہ جانے کیوں میرا یہ شبہ دور نہ ہوسکا کہ شاید وہ پاکستانی نہیں تھے۔ایک مجھ سے بات کرنے کے لئے ذرا آگے آگیا تھا۔دوسرا ایک قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا تھا اور بالکل خاموش تھا۔چہرے دونوں ہی کے سپاٹ تھے۔دونوں کے ہاتھ ویسٹرن فلموں کے ہیرو کی طرح ہولسٹروں پر تھے۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو مجھ سے مخاطب تھا۔اس کی بھوری آنکھیں دیواروں کی طرح تھیں جن کے پار اس کی شخصیت میں جھانکنا بڑا مشکل تھا۔میں اس طرح ایک ٹک کسی کی طرف دیکھتا تھا تو عام طور پر وہ نظر چرا لیتا تھا لیکن اس نے ایسا بھی نہیں کیا۔میں مسکرا دیا۔تب بھی اس کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔وہ انسان تھا مگر چہرہ سپاٹ رکھنے کے معاملے میں کسی بت سے زیادہ مستقل مزاج تھا۔

میں اس کی اصلیت کے بارے میں کسی شبہے کا اظہار کرنا چاہتا تھا لیکن پھر میں نے اس سے مطلب کی بات کے علاوہ کوئی بات کرنے کا ارادہ ملتوی کر... کے نپے تلے لہجے میں صرف اتنا کہا "مجھے پرنسس تہمینہ سے ملنا ہے۔"

"میڈم اس وقت آرام کررہی ہیں سر۔" اس نے اپنے چہرے سے بھی زیادہ سپاٹ لہجے میں کہا "اٹھنے کے بعد وہ شو کی تیاری کریں گی۔یہ ان کا کسی سے بھی ملنے کا وقت نہیں ہے۔صرف شو کے بعد وہ تھوڑی بہت دیر کے لئے لوگوں سے ملتی ہیں۔"

دل تو چاہا اس سے کہوں "ایسی تیسی تمہاری میڈم کی اور ساتھ تمہاری بھی۔' دل تو یہ بھی چاہا کہ اتنا کہتے ہی بیک وقت دونوں کی کھوپڑی پر کرانٹے کا وہ ہاتھ رسید کروں کہ کھوپڑیاں چٹخ جائیں اور اسپتال جاکر ہی ہوش آئے لیکن میں نے صرف سردسی مسکراہٹ پر اکتفا کیا اور اپنا وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ اپنی میڈم کو دے دو۔وہ یقیناً مجھ سے ملنا پسند کریں گی۔"

وہ جو بھی جواب دینے جارہا تھا' یقیناً نفی میں ہی تھا لیکن اسی دوران پیچھے سوئٹ کا دروازہ کھلا اور ایک گھریلو ملازم ٹائپ شخصیت یوں باہر آئی جیسے کسی نے اسے باہر دھکا دیا ہو۔وہ تقریباً چالیس کی عمر کا ایک منحنی اور شاطر صورت سا آدمی تھا۔دوسرے ہی لمحے وہ ذرا سنبھل کر یوں آگے بڑھا جیسے بند دروازے کے پیچھے سے وہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا حالانکہ یہ ممکن نہیں تھا۔میں دیکھ چکا تھا کہ میرے آنے سے پہلے دروازہ پوری طرح بند تھا اور جب وہ شخص باہر آیا اس وقت دروازے کی ناب گھومی تھی۔دروازے میں لگی ہوئی میجک آئی سے بھی صرف سامنے کھڑا ہوا ایک ہی آدمی نظر آتا تھا جبکہ اس وقت ہم تینوں اس دروازے کے سامنے بھی نہیں کھڑے تھے۔دروازے سے خاصا ہٹ کر کھڑے تھے۔

عجیب پُراسرار سے انداز میں وہ باہر آیا تھا۔اس سے بھی زیادہ پُراسرار انداز میں اس نے نہایت خاموشی سے میرے ہا... سے وزیٹنگ کارڈ اچک لیا اور کسی کے چہرے پر ایک نظر ڈالے ... ایک لفظ بولے بغیر واپس سوئٹ میں چلا گیا۔دونوں گارڈز نے ای... دوسرے کی طرف دیکھ کر امریکیوں کے سے انداز میں کندھے اچکائے اور پیچھے ہٹ کر دروازے کے دونوں طرف دیوار سے لگ کر کھڑے ہوگئے۔میرے آنے سے پہلے وہ غالباً اسی جگہ کھڑے تھے۔

چند لمحے بعد سوئٹ کا دروازہ دوبارہ کھلا۔اس بار تھری پیس سوٹ میں ایک میانہ قد مگر بھاری بھرکم اور مضبوط جسم کا آدمی ... باچھیں پھیلاتا ہوا برآمد ہوا جیسے اسے اپنے کسی برسوں ... بچھڑے ہوئے دوست کی آمد کی اطلاع ملی ہو۔حالانکہ اس ... صورت میرے لئے اتنی ہی اجنبی تھی جتنی افریقہ سے درآمد شدہ کسی بن مانس کی۔تاہم اس کی شکل بن مانس سے مشابہ ہرگز نہیں تھی۔اچھا خاصا خوش شکل اور ادھیڑ عمر آدمی تھا۔

وہ گرمجوشی سے مسکراتا ہوا میری طرف بڑھا لیکن نہ جا... کیوں یہ گرمجوشی اس کے چہرے سے کچھ میل نہیں کھا رہی تھی۔شاید اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ اس کے نقوش بہت ... تیکھے اور پتھریلے سے تھے۔کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کا چ... پتھر کی کسی سل کو تراش کر بنایا گیا ہو اور مجسمہ ساز نے نقوش ... زیادہ ہی باریکی سے تراشے ہوں۔

ایک جھٹکے سے اس نے مصافحے کے لئے میرا ہاتھ تھا... لیا۔اس کا ہاتھ بھی پتھر ہی سے تراشیدہ معلوم ہوتا تھا۔نہ جا...

...ایک ثانیے کے لئے میرا دل چاہا کہ اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ کی ...میں پیس کر رکھ دوں لیکن بلاوجہ ایسا کرنا ظاہر ہے کوئی ...حرکت نہیں تھی۔اس کے چہرے پر تو دوستی اور خوش خلقی ...پڑ رہی تھی۔

...اس نے ہینڈ پمپ کی طرح میرا ہاتھ ہلاتے ہوئے گرمجوشی سے ...کہا جو میری سمجھ میں نہیں آیا۔تاہم مجھے اتنا ضرور معلوم ہوگیا ...زبان ترکی تھی۔میں نے بے بسی سے مسکراتے ہوئے وہی ...عالم مصرع دُہرا دیا۔

...یار من ترکی و من ترکی نمی دانم

وہ کم از کم اس مصرعے کی حد تک تو فارسی سمجھتا ہی ...نہایت خوش دلی سے ہنسا اور انگریزی میں بولا "معاف کیجئے گا ...چوہدری! میں اپنی اس کمزوری پر آج تک قابو نہیں پاسکا کہ ...گرمجوشی میں اپنی مادری زبان بولنے لگتا ہوں۔"

...میں اس سے کچھ زیادہ متفق نہیں تھا۔وہ ترک ہو بھی سکتا تھا ...عین ممکن تھا کہ وہ مجھے محض اپنے ترک ہونے کا یقین دلانے ...کوشش کررہا ہو۔وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مجھے کمال نے ...کہتے ہیں۔میں پرنسس تہمینہ کا منیجر ہوں۔آیئے تشریف لایئے۔" ...نے سوئٹ کے دروازے کی طرف اشارہ کیا "میں آپ کو خوش ...دید کہتا ہوں۔"

"میں پرنسس تہمینہ سے ملنے آیا ہوں۔" میں نے قدم بڑھائے ...کہا۔میں گویا یہ کہتے کہتے رہ گیا تھا "مجھے تم سے ملنے کا کوئی شوق ...ہے۔" لیکن میں نے اپنے لہجے میں رُکھائی نہیں آنے دی تھی ...جو تاثر میں دینا چاہتا تھا وہ اس نے لے لیا مگر ذرا بھی برا منائے ...بولا "میں آپ کو پرنسس سے ہی ملانے لے جارہا ہوں۔میں اس ...فہمی میں مبتلا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ آپ جیسے بڑے ...مجھ سے ملنے آئیں گے۔"

میں نے گارڈز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مگر یہ تو کہہ ...رہے تھے کہ پرنسس آرام کررہی ہیں اور اس وقت کسی سے نہیں ...سکتیں۔"

"اوہو مسٹر چوہدری! آپ اتنے بڑے بزنس مین ہیں۔آپ کو ...اندازہ ہونا چاہئے بلکہ آپ کو تو خود بھی یہ طریقے استعمال کرنا ...تے ہوں گے۔آپ کو تو معلوم ہی ہوگا کہ یہ احکامات کن لوگوں ...لئے ہوتے ہیں اور کن لوگوں کے لئے نہیں۔کس وقت ان پر ...درآمد ضروری ہوتا ہے اور کس وقت انہیں واپس لے لیا جاتا ...ہے۔آیئے تشریف لایئے۔پرنسس بے تابی سے آپ کا انتظار ...رہی ہوں گی۔"

اس راہداری میں صرف دو ہی وی آئی پی سوئٹ تھے اور ان ...نوں کے دروازے بھی ایک دوسرے کے عین مقابل نہیں تھے۔ ...سوئٹ کو زیادہ سے زیادہ پرائیویسی فراہم کرنے کا پورا پورا خیال ...رکھا گیا تھا۔میں کمال نے ...ن کی رہنمائی میں اندر پہنچا تو اس نے دروازہ میرے عقب میں مقفل کردیا اور اپنی دانست میں میری نظر بچا کر چابی جیب میں ڈال لی۔میں نے اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ میں نے اس کی یہ حرکت دیکھ لی تھی۔اس قسم کی حرکتوں پر مجھے تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔اس قسم کی ملاقاتوں پر جاتے وقت ایسی حرکتیں میرے لئے متوقع ہوتی تھیں۔کچھ کا انتظام کرکے آتا تھا اور کچھ کا توڑ کرنے کے لئے میں خود بھی تیار رہتا تھا۔

آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم سے گزر کر ہم سیدھے بیڈ روم میں جا پہنچے۔پرنسس تہمینہ سامنے ہی ایک آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔کمال نے حسن نے کہا تھا کہ وہ بے تابی سے میرا انتظار کررہی ہوگی لیکن پرنسس جس انداز میں بیٹھی تھی اسے اور خواہ کچھ بھی کہہ لیا جاتا' کم از کم بے تابانہ انداز نہیں کہا جاسکتا تھا۔

وہ بالکل بت بنی بیٹھی تھی۔ایک ایسا بت جس کی آنکھیں کسی انجانے خوف سے پھیلی ہوئی تھیں۔اس کے دونوں بازو آرام کرسی کے ہتھوں پر یوں جمے ہوئے تھے گویا وہ بمشکل اپنے آپ کو اٹھ بھاگنے سے باز رکھ رہی ہو۔اس کے سڈول جسم پر ایک نہایت نفیس مگر نہایت ناکافی لبادہ تھا۔لبادہ کیا تھا' بس لبادے کا خلاصہ ہی تھا۔وہ پورے میک اپ میں تھی۔گلے میں ہوئیوں جیسے' موٹے موٹے منکوں والی ایک مالا تھی جو اس کے گلے میں کچھ یوں بج رہی تھی کہ شاید ہیروں کا ہار بھی اس کے سامنے ہیچ معلوم ہوتا۔اگر اس کے چہرے پر اتنا خوف نہ ہوتا اور وہ جسم کو کچھ ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھی ہوتی تو شاید ڈانسر کے بجائے پرنسس ہی معلوم ہوتی۔

وہ گھریلو ملازم نما شخص جو میرا وزیٹنگ کارڈ لے کر اندر آیا تھا' ایک کونے میں قدیم زمانے کے غلاموں کی طرح ہاتھ باندھے' نظریں جھکائے کھڑا تھا۔وہ گویا مراقبے میں تھا۔کچھ دیکھ رہا تھا نہ سن رہا تھا۔

میں نے سوئٹ میں داخل ہوتے وقت اور بیڈ روم تک پہنچنے کے دوران غیر محسوس طور پر اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر اطمینان کرلیا تھا کہ وہاں کمال نے حسن' پرنسس اور اس ملازم نما شخص کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔البتہ وارڈ روب کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا لیکن اس میں کسی کے ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ماڈرن ہوٹلوں کی الماریاں ایسی نہیں ہوتی تھیں کہ ان میں کوئی آسانی سے چھپ سکتا۔اور پھر وارڈ روب کا دروازہ پوری طرح بند تھا۔ایسی ائرٹائٹ الماری میں چند منٹ چھپنے کے لئے بھی بڑا حوصلہ درکار تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی پرنسس تہمینہ نے اپنے تاثرات پر قابو پانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ایک کامیاب اداکارہ کی طرح اس کے تاثرات یکسر ہی تبدیل ہوگئے۔وہ حتی الامکان پُرسکون اور پُراعتماد نظر آنے لگی۔

"ہیلو مسٹر چوہدری! خوش آمدید۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔اس کا

اٹھتا گویا ایک خوب صورت سانچے میں ڈھلی ہوئی سمندری موج کا اٹھنا تھا۔ اس کے اعضا میں لہروں کا سا لوچ تھا۔ میں حیران تھا کہ جب میں نے اسے ہنی کی حیثیت سے دیکھا تھا تب مجھے اس میں اتنی خوب صورتیاں کیوں نظر نہیں آئی تھیں؟

شاید اب وہ کچھ پالش ہو کر سامنے آئی تھی۔ شاید پہلے مجھے اس کی طرف اتنی گہری نظروں سے دیکھنے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اور شاید اس وقت اس کا حدود اربعہ اتنی تفصیل سے سامنے بھی نہیں آیا تھا۔ اس کی مرحوم ماں نے ذکر تو کیا تھا کہ اس کے ایک ڈانس نے فلم میں بڑی دھوم مچائی تھی مگر میں وہ فلم بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ یقیناً اس میں وہ کچھ اسی انداز میں سامنے آئی ہوگی، جس انداز میں آج کل اس کا ڈانس شو چل رہا تھا۔

اس نے بڑی تمکنت سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ایک لمحے پہلے اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے خوف کے باوجود اس کا ہاتھ سرد نہیں تھا۔ کمال نے سن کے ہاتھ کے پتھریلے لمس کے بعد اس ہاتھ کی حرارت اور گداز ایک خوش گوار تجربہ تھا۔

وہ کھنکتی سی آواز میں انگریزی میں بولی "میں شکر گزار ہوں کہ آپ مجھ سے ملنے کے لئے تشریف لائے مسٹر چوہدری! مجھے آپ سے مل کر حقیقتاً بہت خوشی ہوئی ہے۔" الفاظ میں بڑی روانی تھی، لہجے میں حتی الامکان خلوص سمونے کی کوشش کی گئی تھی لیکن پھر بھی اس میں ایک پیشہ ورانہ سا رنگ آگیا تھا۔ نہ جانے اس جملے کی۔ اور اس جیسے دوسرے کتنے جملوں کی کتنی مشق کی گئی تھی۔

"مجھے بھی آخر کار تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہنی... عرف حسنہ... عرف پرنسس تمینہ!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

اس کی آنکھوں میں ایک ثانیے کے لئے وہی پہلا سا خوف عود کر آیا۔ رنگت ذرا متغیر ہوئی مگر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اس اپنائیت کے لئے بھی میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے پہلی ہی ملاقات میں مجھے ہنی کہہ کر مخاطب کیا۔ میرے لئے یہ بات ناگواری کے بجائے خوشی کا باعث بنی ہے۔"

"اور حسنہ کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"حسنہ...؟" اس کی محرابی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔ "میں سمجھی نہیں۔ آپ اگر مجھے اس نام سے مخاطب کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے یہ میرے نام کا حصہ نہیں۔ لیکن آپ جس نام سے بھی پکاریں، میرے لئے وہی اچھا ہے۔"

"تغافل تم پر ختم ہے ہنی! تمہارے منہ سے یہ اپنائیت بھرے الفاظ سن کر بڑے بڑے لوگ پھڑک اٹھتے ہوں گے۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں اس وقت یہاں دل فریب جملوں سے خوش ہونے نہیں، حقیقت جاننے آیا ہوں۔"

"کیسی حقیقت مسٹر چوہدری؟ کس کی حقیقت؟" اس نے نہایت معصومیت سے انگریزی میں ہی پوچھا۔

"سوہنیو! ہن اے نخرے بازیاں چھڈ دی دیو۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ مجھے معلوم تھا ہنی عرف حسنہ پنجابی بھی اچھی طرح بولتی سمجھتی تھی۔

لیکن اس وقت وہ اپنی اداکاری جاری رکھنے پر تلی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی آنکھیں معصومیت سے پٹ پٹاتے ہوئے بولی "میں نے یہ زبان یہاں سنی تو ہے لیکن میں ابھی اسے سمجھنے نہیں لگی۔ ویسے میں زبانیں سیکھنے کے معاملے میں بڑی تیز ہوں۔ جس ملک، جس علاقے میں بھی جاتی ہوں، چند ہی روز میں گزارے لائق اس کی زبان سیکھ لیتی ہوں۔ یہ غالباً یہاں کی علاقائی زبان میں کچھ کہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو ہفتے بعد میں آپ کو ایسے چھوٹے موٹے جملوں کا جواب دینے کے قابل ہو جاؤں گی۔"

"جان!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "اگر میں نے تمہارے سر پر دستِ شفقت رکھ دیا تو تم چند ہی سیکنڈ میں نہ جانے کن کن زبانوں میں کیسی کیسی باتوں کا جواب دینے کے قابل ہو جاؤ گی۔"

کمال نے سن ہم دونوں کے درمیان ریفری کی طرح کھڑا تھا اور گویا انتظار کر رہا تھا کہ دونوں حریفوں میں اصل معرکہ شروع ہو تو پوائنٹ گننے شروع کرے۔ وہ گہری سنجیدگی سے بولا "میرا خیال ہے ہمیں کم از کم بیٹھ تو جانا چاہئے۔ سنگین سے سنگین گفتگو بھی بیٹھ کر ہو سکتی ہے۔" اس کے لہجے میں اب پہلے جیسی خوش خلقی یا انکساری نہیں تھی۔

ہم تینوں شیشے کی ایک سینٹر ٹیبل کے گرد کھڑے تھے۔ بیٹھنے میں پہل پرنسس تمینہ نے ہی کی۔ پھر میں اور کمال نے سن بھی بیٹھ گئے۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی اہم کانفرنس شروع ہونے والی ہو اور شرکا نے اپنی نشستیں سنبھال لی ہوں۔

میں نے قدرے بے زاری سے پرنسس تمینہ کو مخاطب کیا "میں زیادہ لمبی باتوں میں پڑنا نہیں چاہتا ہنی! تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ تمہاری گمشدگی سے میں کتنا پریشان تھا، کوئی ذرا سا سراغ بھی میرے سامنے ہوتا تو میں نہ جانے کیا کچھ کر گزرتا۔ لیکن سراغ کے بجائے اب تم خود ہی مجسم سامنے آگئی ہو تو مجھے پہچاننے سے بھی منکر ہو۔ کیا اس طرح صلہ دیتے ہیں کسی کی ہمدردی کا؟"

وہ یوں خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی جیسے میری گفتگو کا ایک لفظ بھی اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ کمال نے سن کی پُراسرار خاموشی بھی برقرار رہی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے محسوس ہوا شاید وہ دونوں منتظر تھے کہ مجھے جتنا بولنا ہے میں بول چکوں تاکہ انہیں اندازہ ہو جائے کہ میں کیا جانتا ہوں، کتنا جانتا ہوں۔

وہ ایک لمحے کے لئے پیشانی مسل کر الجھن زدہ لہجے میں بولی "کیا آپ واقعی سنجیدگی سے یہ ساری گفتگو کر رہے ہیں؟ قسم سے

...ساری باتوں کے سر پیر کا پتا نہیں چل رہا۔"

...ہنی!" میں نے ملائمت سے کہا "کیا تم ابھی تک اپنے آپ ...یقین دلانے پر تلی ہوئی ہو کہ میں نے تمہیں نہیں پہچانا؟ یہ ...ہے کہ اس رات جب تم نے مجھے حسنہ کے نام سے نچا دیا تو ...ی تمہیں نہیں پہچان سکا تھا۔ لیکن تمہیں اتنا تو یاد ہوگا کہ ...ت تم فر فر اردو بول رہی تھیں۔ پھر میں نے آج کے اخبار ...ارا ایک کلوز اپ دیکھا اور صرف آنکھوں کی وجہ سے پہچان لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تمہاری صورت یکسر ...ی ہے۔ لیکن تمہاری آنکھیں وہی ہیں۔ میں ان آنکھوں کو ...میں کبھی دھوکا نہیں کھا سکتا۔ اب تو یہ آنکھیں اپنے پیشہ ...قاضوں یا کچھ اور مصلحتوں کی وجہ سے پل پل رنگ بدلتی ہیں ...س وقت ان بڑی بڑی آنکھوں میں صرف ایک بے عنوانی سی بسیرا کئے رہتی تھی۔ اور اسی لئے یہ آنکھیں مجھے بہت پسند ...میرے دل پر نقش تھیں۔ اسی لئے میں نے انہیں پہچان بھی ...اسی لئے میں ان کے بارے میں اتنا پُریقین بھی ہوں۔"

پرنسس تمینہ کے ہونٹ ایک لمحے کے لئے تھرتھرائے مگر اس ...نہیں سختی سے بھینچ لیا۔ کمال نے سن کھنکار کر گلا صاف کرتے ...بولا "جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں، آپ کو پرنسس تمینہ پر اپنی ...دوست کا گمان گزر رہا ہے مسٹر چوہدری! جبکہ آپ یہ بھی تسلیم ...ہے ہیں کہ میڈم کی شکل آپ کی اس دوست سے بہت مختلف ...آخر آپ میڈم سے اپنی بات منوانے پر کیوں تلے ہوئے ...آپ کو میڈم کے چہرے پر صرف آنکھیں شناسا لگ رہی ہیں تو ...ان کو اپنی دوست قرار دینے پر بضد ہیں۔ اس دنیا میں تو بعض ...ت دو آدمی مکمل طور پر ایک دوسرے کے ہم شکل بھی نکل ...ہیں لیکن بہرحال وہ دو مختلف انسان ہوتے ہیں۔"

میں نے کمال نے سن کو گھورتے ہوئے کہا "چلو... یہ ہنی نہ ...کم از کم حسنہ ہونے کا تو اقرار کرلے۔ منگل کی رات دو بجے یہ ...اسی شکل صورت، اسی سراپا کے ساتھ ایک نیم تاریک گلی میں ...آئی تھی۔" میں نے مختصراً وہ واقعہ دُہرایا اور زہریلے لہجے میں "اب تم کہو گے کہ وہ بھی کوئی اور عورت تھی۔"

"یہ ایک عجیب اتفاق ہو سکتا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے بولا "آپ ...عجیب کہانی لے کر ہمارے پاس آئے ہیں مسٹر چوہدری! لیکن ...ال... زندگی اتفاقات کا ہی مجموعہ ہے۔ آپ ان ساری باتوں ...بھول کیوں نہیں جاتے؟ بھول جانے میں آپ کا کیا نقصان ہے؟ ...ہنی آپ کا کچھ لے کر بھاگی ہے اور نہ ہی حسنہ نے آپ کو کوئی ...مان پہنچایا ہے۔"

"مسٹر کمال نے سن... یا جو کچھ بھی تمہارا نام ہے..." میں ...اسے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں کہا "اگر میں تمہارے منہ پر ...ونسا مار کر تمہارے کچھ دانت پیٹ میں پہنچا دوں تو یہ بھی محض ...ب اتفاق ہوگا۔"

اس کا پتھرایا ہوا سا چہرہ بدستور سپاٹ رہا اور اسی سپاٹ لہجے میں وہ بولا "نہیں مسٹر چوہدری! یہ اتفاق نہیں، غلطی ہوگی، ایک سنگین غلطی۔"

"تب بھی مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ میری زندگی میں اس قسم کی سنگین غلطیوں کا انبار لگا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ وہ کچھ نہ بولا، ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ لیکن اس کی آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں ایک ڈانسر کے منیجر کی آنکھیں نہیں تھیں۔

میں نے ان آنکھوں کی سفاکی کا اندازہ لگاتے ہوئے کہا "مسٹر کمال نے سن! تمہارا کہنا ہے کہ میں صرف آنکھیں شناسا ہونے کی وجہ سے پرنسس تمینہ پر ہنی ہونے کا شبہ کر رہا ہوں؟ بات صرف آنکھوں کی نہیں ہے، وجہ ان کی بھی ہے۔ میرا وجدان کہہ رہا ہے کہ یہ آنکھیں ہنی کے سوا کسی کی بھی نہیں ہو سکتیں۔ اور اب... جبکہ میں اس عورت کے روبرو بیٹھا ہوں تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ ہنی کے سوا کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ مجھے اس گہرے میک اَپ اور کلون کی خوشبوؤں تلے سے ہنی کے وجود کی خوشبو آرہی ہے۔ انسان اَن گنت خوشبوئیں استعمال کرتا ہے مگر اس کے اپنے وجود کی بھی ایک الگ بدبو یا خوشبو ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں کوئی مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔ اس معاملے میں میری قوتِ شامہ کسی بلڈ ہاؤنڈ سے بھی تیز ہے۔"

"لیکن مسٹر چوہدری...!" کمال نے سن بدستور پُرسکون لہجے میں بولا "پرنسس تمینہ ایک عالمی شہرت یافتہ شخصیت ہیں۔ ان کے پاس ٹرکش پاسپورٹ موجود ہے۔ آٹھ سال سے اسٹیج کی دنیا میں اس نام کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ دنیا کے تقریباً چالیس ممالک میں میڈم اپنے فن کا مظاہرہ کر چکی ہیں۔ وہاں کے اخباروں رسالوں میں ان کے فن کے مظاہروں کی ایک تاریخ محفوظ ہے۔ یہ شخصیت کوئی راتوں رات تو اٹھ کر سامنے نہیں آگئی جو آپ ایسا بے سروپا قسم کا دعویٰ کر رہے ہیں۔"

"ہاں... کام تو یقیناً پکا کیا گیا ہوگا۔" میں نے تسلیم کیا "یہی گتھی سلجھانے کے لئے تو میں آیا ہوں۔ عین ممکن ہے اصلی پرنسس تمینہ کو غائب کر دیا گیا ہو اور اس کی جگہ اس عورت کو سامنے لایا گیا ہو۔ کاغذات یا پاسپورٹ اور دیگر سب چیزیں پرنسس تمینہ کی... میرا مطلب ہے اصل پرنسس تمینہ ہی کی چل رہی ہوں۔ میرے خیال میں تم جن لوگوں کی نمائندگی کر رہے ہو، ان کے لئے تو یہ... اور اس قسم کے ہزاروں دوسرے کام بائیں ہاتھ کا کھیل ہیں۔"

"اور آپ کے خیال میں، میں کن لوگوں کی نمائندگی کرتا ہوں مسٹر چوہدری؟" وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولا۔ اس کی آنکھیں سانپ کی معلوم ہوتی تھیں کہ وہ گول نہیں تھی۔ مگر وہ انہیں جھپکتا ہی نہیں تھا۔ شاید اس

www.paksociety.com

وقت جھپکتا تھا جب میری نظر اس کی طرف نہیں ہوتی تھی۔

"کاش مجھے ان کے بارے میں صحیح طور پر کچھ معلوم ہوتا!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "صرف ایک نام اب تک سامنے آیا ہے۔ شاید وہ بھی فرضی ہو۔ لیکن مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ وہ معمولی لوگ نہیں ہیں اور معمولی چکروں میں نہیں ہیں۔ کوئی بہت ہی بڑا سیٹ اَپ ہے اور بہت ہی بڑے مقاصد ہیں۔ لیکن تم انہیں میری طرف سے بھی پیغام دے دینا۔ اگر تمہاری بہت اونچی سطح تک رسائی ہے تو ان سے کہہ دینا کہ وہ مجھے انڈرا یسٹی میٹ نہ کریں' مجھ سے پنگا نہ لیں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ مجھے اذیت پہنچانے کے لئے نئے نئے طریقے اختیار نہ کریں اور مجھے بلیک میل کرنے کے لئے میرے دوستوں اور ہمدردوں کو مشق ستم نہ بنائیں۔"

"یہ پنگا کیا ہوتا ہے مسٹر چوہدری؟" کمال نے سن نے نہایت سنجیدگی سے دریافت کیا۔ میں نے اپنی گفتگو میں اس لفظ کا انگریزی میں ترجمہ نہیں کیا تھا۔ جو بات اصل میں تھی وہ ترجمے میں آ ہی نہیں سکتی تھی۔

"پنگا..... بس پنگا ہی ہوتا ہے۔ جب انسان لے چکتا ہے تب ہی اس کی سمجھ میں آتا ہے کہ اس نے دراصل پنگا لیا ہے۔ عام طور پر اس کے بارے میں پہلے سے خبردار کرنے سے انسان خبردار نہیں ہوتا۔" میں نے وضاحت کی۔

"آپ فکشن مائنڈڈ آدمی معلوم ہوتے ہیں چوہدری!" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "اتنے بڑے آدمی بننے کے بعد آپ کو بہت پریکٹیکل ہونا چاہئے تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ذہن افسانہ طرازیوں میں الجھا رہتا ہے۔ زندگی کسی جاسوسی ناول' جرم و سزا کی کہانی یا اسپائی فلم سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ آپ بہت سیدھی سادی چیزوں میں پیچیدگیاں ڈھونڈنے کے عادی معلوم ہوتے ہیں۔"

"مسٹر کمال نے سن! مجھے زندگی کے بارے میں سبق پڑھانے کی کوشش مت کرو۔ میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں زندگی کیا ہوتی ہے اور کیا نہیں۔ میں نے زندگی کا ہر رنگ' ہر ڈھنگ اور ہر روپ دیکھا ہے' اس لئے مجھے یقین ہو چکا ہے کہ زندگی درحقیقت جاسوسی ناولوں' جرم و سزا کی کہانیوں اور اسپائی فلموں سے زیادہ پُراسرار' پیچیدہ اور سنسنی خیز ہے لیکن ہر ایک کی زندگی نہیں۔ زندگی اپنی پُراسراریت' اپنی پیچیدگیوں اور اپنی سنسنی خیزیوں کے اظہار کے لئے کسی کسی کو منتخب کرتی ہے۔"

وہ بدستور ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی "میں جب نوعمر تھا' غریب تھا تب فکشن مائنڈڈ تھا۔ خیالوں خوابوں کی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ مستعار لے کر فلمی رسالے' جاسوسی ناول' اسپائی کہانیاں' غرضیکہ جو مل جاتا تھا پڑھتا تھا اور میرا ذہن نہ جانے کن کن بھول بھلیوں میں بھٹکتا رہتا تھا

لیکن اُس وقت عملی زندگی میں مجھے کوئی پُراسرار' کوئی سنسنی خیز' کوئی انوکھا واقعہ پیش نہیں آتا تھا۔ میری زندگی اتنی ہی سپاٹ تھی جتنی جوہڑ میں پڑے ہوئے کسی مینڈک کی۔ ذرا چھلانگ لگائی تو ایک قدم آگے ہو گئے' پھر ذرا پھدکے تو دو قدم پیچھے ہو گئے۔ اور سوچا کر بس یہی کل کائنات ہے۔ عجیب و غریب اور الجھے ہوئے واقعات تو مجھے اس وقت سے پیش آنے شروع ہوئے ہیں جب سے میں دولت مند ہوا ہوں۔ معاشرے میں مجھے کوئی مقام حاصل ہوا ہے۔"

اس سے پہلے کہ کمال نے سن مزید کچھ کہتا' میں نے پرنس تہمینہ کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا پھیلی پھیلی سی آنکھوں سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے کمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تہمینہ کو مخاطب کیا "ہنی! تمہیں اس سے..... یا کسی سے بھی ڈرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ تم پر جو بھی گزری ہے' بلا جھجک اور بلا کم و کاست مجھے بتا دو۔ یہاں نہیں بتا سکتیں تو گھر چل کر بتانا' میں تمہیں لینے ہی آیا ہوں۔"

میرا خیال تھا کہ ہنی عرف پرنس تہمینہ' کمال کی طرف التجائیہ نظروں سے دیکھے گی۔ وہ اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی دھمکی دے گا اور وہ دل کی بات کہتے کہتے رہ جائے گی۔ لیکن وہ اس کے بجائے دھیمی سی آواز میں بولی "میں کمال کی بات کی تائید کروں گی۔ آپ کو یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے۔ آپ کو بیک وقت مجھ پر دو مختلف شخصیتوں کا گمان گزر رہا ہے جبکہ میں اصل میں تیسری شخصیت ہوں۔ یعنی پرنس تہمینہ۔ اس کے سوا میرا کوئی اور نام یا کوئی اور شخصیت نہیں ہے۔ اور نہ کبھی رہی ہے۔ میں آپ کے تصورات کو دھچکا پہنچانے کے سلسلے میں معذرت خواہ ہوں لیکن میں مجبور ہوں۔ میں بھلا آپ کی انہونی سی باتوں کو کیونکر تسلیم کر لوں۔ بات ہی ایسی ہے کہ میں محض آپ کا دل رکھنے کو بھی اسے تسلیم نہیں کر سکتی۔"

گویا جس پر تکیہ تھا وہ پتے بھی ہوا دے رہا تھا۔ میں نے یکد

ائی اختیار کرتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے' جیسے تم دونوں کی مرضی۔ میں نے تو سوچا تھا کہ ہنی اگر میری کوششوں سے اپنے گھر پہنچ جائے اور سکون و عافیت سے آئندہ زندگی گزار سکے تو اس کے عوض میں بلیک باکس ان لوگوں کے حوالے کر دوں گا جنہیں اس کی تلاش ہے۔ میرے لئے ہنی زیادہ اہم تھی' وہ بلیک باکس نہیں۔ میری نظر میں یہ سوَدا برا نہیں تھا۔ لیکن تم دونوں تو حقیقت کو حقیقت تسلیم کرنے کے لئے ہی تیار نہیں ہو۔ میں چلتا ہوں۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"ٹھہرو مسٹر چوہدری!" کمال نے سن تیزی سے بولا۔ پہلے تو اس کی آنکھیں ہی عجیب لگ رہی تھیں کہ سانپ کی طرح وہ پلکیں جھپکتا نہیں تھا' اب مجھے اس کی آواز بھی سانپ کی پھنکار کے مشابہ محسوس ہوئی۔

میں نے چڑانے کے سے انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھے بغیر بولا "اب بلیک باکس کا ذکر آ گیا ہے تو تم اتنی آسانی سے نہیں جا سکتے۔"

"کون روکے گا مجھے؟" میں نے اس کی طرف تھوڑا سا جھکتے ہوئے پوچھا "تم..... یا تمہارے وہ جعلی گارڈ جو شیٹر کی وردی پہنے کھڑے ہیں؟"

سنجیدہ گفتگو شروع ہونے کے بعد وہ خوش خلقی سے باچھیں کھلانے کی اداکاری بالکل بند کر چکا تھا۔ اب پہلی بار اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ابھری لیکن یہ مسکراہٹ بس ایسی تھی جیسے کسی مجسمے نے کسی ہلکے پھلکے جادو کے زیرِ اثر اپنے ہونٹوں کو مبہم سی حرکت دینے کی کوشش کی ہو۔

"میں تمہارے بارے میں بہت کچھ سن چکا ہوں مسٹر چوہدری! اب کچھ یقین سا آنے لگا ہے کہ وہ درست ہی ہو گا۔ تمہاری حسیات بہت تیز ہیں۔ بالکل درندوں کی طرح' جو بہت سی ایسی باتیں بھی محسوس کر لیتے ہیں جن کا بظاہر کوئی جواز نہیں ہوتا۔ تم نے یقیناً شیٹر کے سارے گارڈز کی شکلیں تو نہیں دیکھ رکھی ہوں گی لیکن تم نے محسوس کر لیا۔"

ایک ثانئے کی خاموشی کے بعد وہ ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے بولا "لیکن اس صورت میں تمہیں ان سے زیادہ خطرہ محسوس کرنا چاہئے کہ وہ شیٹر کے گارڈز نہیں ہیں۔ پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسیوں کے گارڈز بھی بھلا کوئی گارڈز ہوتے ہیں۔ ان میں اور تمہارے ملک کی پولیس میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ یہ سب وہ پتلے ہیں جو پرندوں کو ڈرانے کے لئے کھیتوں میں کھڑے کر دیئے جاتے ہیں۔ ان سے صرف پرندے ہی ڈرتے ہیں' درندے نہیں۔ لیکن وہ جو باہر کھڑے ہیں ان سے درندوں کو بھی ڈرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وہ عجیب ہی چیز ہیں۔ محسوسات نام کی کوئی چیز ان میں نہیں ہے۔ بس آنکھیں بند کر کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں درندوں سے بھی بدتر ہیں۔"

میں نے قدرے بیزاری سے کہا "بس۔ زیادہ قصیدہ خوانی کی ضرورت نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت کھڑے نہیں' لیٹے ہوئے ہوں گے۔ تمہارا کہنا شاید درست ہو کہ وہ آنکھیں بند کر کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں لیکن اس وقت ان کی آنکھیں محاورتاً نہیں' حقیقتاً بند ہوں گی۔"

"کیا مطلب؟" اس کی پیشانی کی شکنوں میں ایک اور شکن کا اضافہ ہو گیا۔

"اس سوئٹ کے سامنے والا بھی وی آئی پی سوئٹ ہے نا؟" میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ اس نے الجھن آمیز انداز میں اثبات میں سر ہلایا۔

"اور تم اپنے گارڈز کی جتنی تعریفیں کر رہے تھے اس سے مجھے وہ بھی وی آئی پی محسوس ہونے لگے تھے۔ چنانچہ انہیں وی آئی پی سوئٹ میں پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ اس وقت لگژری بیڈ پر اوندھے لیٹے آرام کر رہے ہوں گے۔ ان کے ساتھ تھوڑی سی ناشائستگی صرف یہ ہوئی ہو گی کہ ان کے ہاتھ پشت پر باندھ دیئے گئے ہوں گے۔ اور عین ممکن ہے پاؤں بھی بندھے ہوئے ہوں۔ اس کے لئے میں پیشگی معذرت خواہ ہوں۔"

"یہ کیا بکواس ہے!" وہ برہمی سے بولا اور اس کے پتھرائے ہوئے نقوش میں یک لخت بھونچال سا آ گیا۔

"یہ بکواس نہیں' چند چھوٹی موٹی تبدیلیاں ہیں جو باہر رونما ہو چکی ہوں گی لیکن تم یہاں ہونے کی وجہ سے انہیں دیکھ نہیں پا رہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اور تم کیا انہیں دیکھ رہے ہو؟" اس نے طنزیہ سے لہجے میں پوچھا۔

"تقریباً یہی سمجھ لو۔" میں نے جواب دیا "میں جب وقت کا تعین کر کے اپنے آدمیوں کو کوئی کام بتا کر آتا ہوں تو آنکھیں بند رکھتے ہوئے بھی مجھے یقین ہوتا ہے کہ وہ کام اسی طرح ہو رہا ہو گا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"مگر سامنے والے سوئٹ میں تو کوئی غیر ملکی ڈپلومیٹ ٹھہرا ہوا ہے۔" کمال اپنی برہمی پر قابو پاتے ہوئے بولا۔

"وہ آج شام جا چکا ہے۔ انہوں نے معلوم کر لیا تھا۔ وہ کچا کام نہیں کرتے۔"

"میں ابھی دیکھ لیتا ہوں۔" وہ اٹھنے لگا۔

میں نے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ایک معزز آدمی کی بات پر یقین کرنا چاہئے۔ ویسے بھی شاید کسی کو اس وقت تمہارا اس کمرے سے باہر جانا پسند نہ ہو۔" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازہ ذرا سا کھل چکا تھا اور اس سے ایک ریوالور کی چپٹی' خوف ناک سی نال جھانک رہی تھی۔

ریوالور جس کے ہاتھ میں تھا وہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ احمد ہوگا۔ احمد بلاشبہ کمال کا آدمی تھا۔ مقفل دروازے کو بے آواز طریقے سے کھولنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔ کمال نے سن جیسے شاطر و ہوشیار آدمی کو بھی پتا نہیں چلا تھا کہ کب سوئٹ کا بیرونی دروازہ اور پھر بیڈ روم کا دروازہ کھلا تھا۔ باہر اس کے دونوں مسلح گارڈز کو کب قابو میں کیا گیا اور کب سامنے والے سوئٹ میں منتقل کیا گیا' اس کا تو اسے ذرا بھی اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کام میں احمد کے ساتھ آفتاب شریک تھا۔

اس وقت مجموعی طور پر انٹر کان میں میرے چھ آدمی ڈیوٹی پر تھے۔ احمد کے ریوالور کی نال تو بیڈ روم میں جھانک رہی تھی۔ آفتاب باہر دروازے پر تعینات تھا۔ منیر اور مسعود پہلے ہی نیچے کمپاؤنڈ میں موجود رہتے ہوئے سوئٹ کی نگرانی کررہے تھے۔ صفدر اور سلیمان ہوٹل سے باہر جانے کے راستوں پر تعینات تھے۔ میں ہنی کو ساتھ لے جانے کا پورا بندوبست کرکے آیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ آسان کام نہیں ہوگا۔

کمال نے سن اٹھ چکا تھا لیکن ایک لمحے تک دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد وہ گہری سانس لے کر بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر دوبارہ پہلا سا ٹھہراؤ آگیا۔ اس نے گویا دل ہی دل میں اعتراف کرلیا تھا کہ جو کچھ ہورہا تھا اس کو روکنے کے لئے اب کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور اس احساس کے ساتھ گویا اسے قرار سا آگیا تھا۔

"یہ سب کیا ہے مسٹر چوہدری؟" اس نے دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہموار لہجے میں پوچھا۔

"یہ سب میرے ریموٹ کنٹرول نظام کا ایک حصہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"اور اس وقت اس نظام کی کارکردگی مجھے دکھانے کا مقصد؟" اس نے ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ میں ہنی کو ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہوں۔" میں نے دوستانہ لہجے میں جواب دیا "مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں ہے کہ کوئی میرے دوستوں کو اغوا کرے اور انہیں کھلونوں کی طرح استعمال کرتا پھرے۔"

وہ بڑی تحمل مزاجی سے بولا "یہ عورت جسے آپ ہنی سمجھنے پر بری طرح بضد ہیں' پہلے اس سے تو پوچھ لیجئے۔ کیا یہ آپ کے ساتھ جانے کے لئے تیار ہے؟" اس کے لہجے میں بڑا زہر تھا لیکن شکر میں لپٹی ہوئی گولی کی طرح۔

میں نے ہنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میرے ساتھ چلو۔ اس سے اچھا موقع تمہیں پھر نہیں ملے گا۔ میں تمہاری خاطر بڑا رسک لے رہا ہوں۔"

وہ گویا سر پیٹتے پیٹتے رہ گئی اور بے زاری سے بولی "مسٹر چوہدری! آپ کو کیا ہوگیا ہے؟ میں آپ کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں ہنی نہیں ہوں۔ اس لئے میں آپ کے ساتھ نہیں جاسکتی۔ اگر یہ ہنی سمجھ کر آپ کو کوئی خوشی مل رہی ہے تو بے شک سمجھتے رہیۓ لیکن مجھے ساتھ لے جانے کی ضد مت کیجئے۔ میں جہاں ہوں بہت خوش ہوں۔ آخر آپ کیوں خون خرابہ کرانے پر تلے ہوئے ہیں؟"

یہ میرے لئے شرمسار کردینے والی صورتِ حال تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مجھے افسوس ہورہا تھا کہ اتنا تردد میں نے کس لئے کیا تھا؟ لیکن یہ ایسا اٹھا ہوا قدم تھا جس کا واپس ہونا بڑا مشکل تھا۔ واپسی میں بھی بہرحال خطرات پنہاں تھے۔

"اگر کسی نے کوئی حماقت نہ کی تو کوئی خون خرابہ نہیں ہوگا۔" میں نے ہنی کو یقین دلایا "اگر میرے ساتھ چلنے میں تمہاری کوئی مجبوری آڑے آرہی ہے تو مجھے بتاؤ۔ میں اس کا بھی حل نکال لوں گا۔"

"میری سب سے بڑی مجبوری تو یہی ہے کہ میں ہنی نہیں ہوں۔" وہ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی "دوسری مجبوری یہ ہے کہ اس ہوٹل میں میرا ایک ماہ کا کنٹریکٹ چل رہا ہے جس کو پورا ہونے میں ابھی تیئس دن باقی ہیں۔ اگر کنٹریکٹ میری طرف سے ٹوٹا تو مجھے لاکھوں روپے ہرجانہ ادا کرنا پڑے گا۔"

"جس مسئلے کا تعلق روپے پیسے سے ہو اس کی تو بالکل ہی فکر مت کرو۔ ہرجانہ جتنا بھی ہوا' بھر دیا جائے گا۔ اور کچھ؟" میں نے ان شناسا آنکھوں میں جھانکا جو اجنبی نظر آنے کی پوری پوری کوشش کررہی تھیں۔

میری اس پیشکش سے وہ گویا زچ ہوگئی۔ اس نے مزید کچھ کہنے کے بجائے سر جھکا لیا' ساتھ ہی اس کے کندھے بھی بے جان سے انداز میں جھک گئے۔

کمال نے سن ہولے سے کھنکارنے کے بعد مجھ سے مخاطب ہو "تم نے ابھی بلیک باکس کی بات کی تھی..."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اور اس میں دلچسپی ظاہر کرکے تم نے ثابت کردیا تھا کہ تم ریڈ ڈاٹ کے آدمی ہو۔"

"اس بات کو جانے دو کہ میں کس کا آدمی ہوں اور کس کا نہیں۔ ضروری نہیں کہ بلیک باکس سے دلچسپی صرف ریڈ ڈاٹ ہی کو ہو۔ ویسے بائی دا وے... یہ ریڈ ڈاٹ ہے کیا؟ کسی آدمی کا فرضی نام ہے؟"

"اب اتنے معصوم نہ بنو۔" میں نے بے زاری سے کہا "مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ ہنی کو ریڈ ڈاٹ نے اغوا کرایا تھا اور یہ انہی کے قبضے میں تھی۔ اور یہ بات خود ایڈم عرف ایڈی فون پر مجھ سے کہہ چکا ہے۔ وہ مجھے یہی نصیحتیں کیا کرتا تھا کہ میں اس کی تلاش کے سلسلے میں پریشان ہونا چھوڑ دوں۔"

"اور یہ ایڈم عرف ایڈی کون ہے؟" اس نے پوچھا۔ میرے بتا دینے کے باوجود وہ معصوم بننے پر تلا ہوا تھا۔

...م عرف ایڈی تمہارا روحانی باپ ہے جسے تم نے فراموش ...بھی ممکن ہے وہ تمہارا حقیقی باپ ہی ہو۔ میں یقین سے ...سکتا۔" میں نے اسے تاؤ دلانے کے لئے کہا۔ تاؤ ...مجھے خود آرہا تھا۔

...ن وہ ذرا بھی غصے میں آئے بغیر متاسفانہ سے انداز میں سر ...ے بولا "جب آدمی اس طرح جھنجلا کر جواب دے تو اس ...یہی ہوتا ہے کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔"

...ظاہر ہے' اگر مجھے کچھ معلوم ہوتا تو بات کچھ آگے نہ بڑھ ...۔ میں اتنے عرصے تک ہنی کے معاملے میں بے دست و پا ...بیٹھا رہتا۔" میں نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرلیا "لیکن ...ریڈ ڈاٹ کے بارے میں اتنا بے خبر بننے کا شوق کیوں چرایا ...

...ہوسکتا ہے مجھے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم ہو اور ...ے کہ کچھ معلوم نہ ہو۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم ...ٹ کو چھوڑو اور کام کی بات کرو۔ اگر تم بلیک باکس میرے ...کردو تو اس عورت کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہو جسے تم ہنی ...ے ہو۔ اب یہ ہنی نکلے یا کچھ اور یہ تمہارا مقدر ہے۔"

"دیکھ لیا تم نے؟" میں نے ہنی کو مخاطب کیا "یہ ہے ان لوگوں ...زدیک تمہاری اوقات۔ یہ تمہاری مرضی معلوم کئے بغیر بلیک ...کے عوض تمہیں میرے سپرد کرنے کے لئے تیار ہیں۔"

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور خاموشی سے سر ...۔ شاید اس نے اب خاموش ہی رہنے کا تہیہ کرلیا تھا۔

کمال نے سن بولا "تم پرنس کو چھوڑو' مجھ سے بات کرو۔ ...اگر باہر کہیں ہے تو اپنے آدمیوں سے منگوالو۔ ابھی... اسی ...ے میں ہم دونوں کا مسئلہ حل ہوجائے گا۔ بلیک باکس میز پر رکھ ...ر پرنس کا ہاتھ تھام کر اسے ساتھ لے جاؤ۔"

"بے چاری پرنس!" میں نے ترحم آمیز لہجے میں کہا "جس کا ...س کی تقدیر کا فیصلہ کررہا ہے! میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ ...یں ایسی بھی کوئی پرنس موجود ہے۔" میں ہنی کی طرف دیکھ رہا ...ہ شاید اس کے دل میں خوف کی دھند میں لپٹے ہوئے کسی ...ے کو سرکشی پر آمادہ کرسکوں مگر وہ میری طرف دیکھ ہی نہیں رہی ...

کمال نے سن اب اپنے لہجے کی بے تابی نہ چھپا سکا۔ تیزی ...ے بولا "مسٹر چوہدری! کام کی بات کرو۔ وقت ضائع مت کرو۔ میں ...وچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تمہارے پاس اتنا فالتو وقت ہوتا ہے۔"

"فالتو وقت تو میرے پاس واقعی نہیں ہوتا۔ دراصل وقت کو ...ستعمال کرنے کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ میرے انداز ...ماری سمجھ میں نہیں آئیں گے۔ کام کی بات کے بارے میں ...زارش یہ ہے میرے بھائی... کہ میں بلیک باکس تمہارے حوالے ...ہی نہیں سکتا۔ اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ وہ میرے پاس ہے ہی نہیں۔"

"تو تم جھوٹ بول رہے تھے؟" اس کے پتھرائے ہوئے چہرے پر ایک بار پھر زلزلے کے سے آثار نمودار ہوئے۔

"یہی سمجھ لو۔ میں بلف کررہا تھا' جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ بلف کرنا میرا مشغلہ ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا "دوسری بات یہ کہ تم تو اس وقت شرائط عائد کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہو۔ ہنی عرف پرنس تہمینہ کو تو میں ہر حال میں ساتھ لے ہی جاؤں گا۔ شاید اپنے یا میرے گھر پہنچنے کے بعد اسے یاد آجائے کہ یہ واقعی ہنی ہے۔"

"اتنی احمقانہ اور حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی اچھی نہیں ہوتی۔" وہ زہریلے لہجے میں بولا۔ پھر اس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالنے کے بعد کہا "میں بھی تمہیں اپنے ریموٹ کنٹرول نظام کا ایک معمولی سا نمونہ دکھاتا ہوں۔" وہ اس میز کی طرف بڑھا جس پر ٹی وی وغیرہ رکھا ہوا تھا۔

"کوئی احمقانہ حرکت نہ کرنا مسٹر نے سن!" میں نے خبردار کیا۔ "گن کی جو نال دروازے سے جھانک رہی ہے یہ محض دکھاوے کے لئے نہیں ہے۔ یہ آتش و آہن بھی اگلتی ہے۔ تمہاری ذرا سی غلط حرکت تمہارے لئے موت کا پیغام ثابت ہوسکتی ہے۔ دروازے کی طرف پشت نہ کرنا۔ اور نہ ہی میری طرف۔"

اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا۔ اسے احساس نہیں ہوسکا تھا کہ کب میرے ہاتھ میں مشین پسٹل آچکا تھا۔ اس کی نظر میں میرے اس پسٹل کے لئے بھی اور دروازے سے جھانکتی ہوئی نال کے لئے بھی بے پناہ حقارت ابھر آئی۔

"دو بڑے آدمیوں کو بات چیت کرتے وقت اس قسم کے کھلونوں سے ایک دوسرے کو مرعوب کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہئے۔" وہ مربیانہ لہجے میں بولا "یہ چھوٹے لوگوں کے کام آنے والی چیزیں ہیں۔ کیا تم ان پر بہت زیادہ بھروسا کرتے ہو مسٹر چوہدری؟"

"بھروسا تو میں صرف اوپر والے پر کرتا ہوں۔" میں نے درویشانہ انداز میں انگلی اٹھا کر چھت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا "ہوسکتا ہے ان کھلونوں کی موجودگی میں بھی تم اس ہوٹل سے باہر نہ جاسکو۔"

"اگر میں ہوٹل سے باہر نہ جاسکا تو ہوٹل ملبے کا ڈھیر بن جائے گا ڈیئر کمال نے سن!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"دیکھا جائے گا۔" وہ بے پروائی سے کندھے اچکا کر بولا۔ "لیکن تمہارے لئے میرا مشورہ یہی ہے کہ زیادہ بڑی بڑی باتیں مت کیا کرو۔"

محتاط انداز میں وہ اس طرح ٹی وی کی طرف بڑھا کہ اس کے ہاتھوں کی حرکات و سکنات دیکھی جاسکیں۔ اس نے ٹی وی ٹرالی

کھولی۔ اس میں وی سی آر رکھا ہوا تھا۔ کمروں میں رکھے ہوئے ٹی وی' ہوٹل کے ایک مرکزی وی سی آر سے منسلک تھے لیکن وی آئی پی سوئٹ میں ایک الگ وی سی آر کی موجودگی کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ وہ سوئٹ میں قیام کرنے والے کا اپنا بھی ہو سکتا تھا اور یہ بھی ممکن تھا کہ ہوٹل والوں نے فراہم کیا ہو۔

مگر ذرا توجہ سے دیکھنے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ وی سی آر سے کچھ مختلف تھا۔ وہ سائز میں وی سی آر جتنا ہی تھا لیکن اس کا سوئچ پینل بہت مختلف تھا اور اس پر مانیٹر کے طور پر کام دینے والی ایک چھوٹی اسکرین بھی موجود تھی۔ سوئچوں اور سرخ سبز لائٹوں کی تعداد بھی زیادہ تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کلوز سرکٹ ٹی وی کے نظام کو چلانے والی ایک مختصر کثیر المقاصد مشین تھی اور اس دور کے لحاظ سے جدید ترین تھی۔

اس نے مشین کا ایک بٹن دبایا اور ٹی وی آن کیا۔ اس کی اسکرین روشن ہو گئی لیکن اس پر کوئی منظر نہیں ابھرا۔ مانیٹر کی چھوٹی اسکرین بھی سادہ ہی تھی۔ کمال نے سن ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "ہم نے اس سوئٹ کا انتخاب صرف اس لئے نہیں کیا تھا کہ یہ اہم شخصیات کے لئے مخصوص ہے۔ بلکہ ہمیں اس کا محل وقوع بھی پسند تھا۔ دو طرف سے یہ اوپن ہے۔ تمہارے آدمیوں کو بھی یہ آسانی محسوس ہوئی کہ وہ نیچے کمپاؤنڈ میں دو مختلف مقامات پر کھڑے ہو کر اس پر نظر رکھ سکتے تھے۔ لیکن اسی طرح ہمارے لئے بھی ان پر نظر رکھنا آسان تھا۔ انہی دونوں سمتوں میں اس سوئٹ کی کھڑکیوں میں دو کیمرے نصب ہیں جن کا تمہارے آدمیوں کو علم نہیں۔"

مجھے حیرت کا تھوڑا سا تکلیف دہ جھٹکا لگا۔ پرنس تمینہ کے سوئٹ کی نگرانی منیر اور مسعود کر رہے تھے۔ میرا خیال تھا کہ ان کے بارے میں کسی کو شبہ تک نہیں ہو گا کہ وہ کسی کی نگرانی کر رہے ہیں۔

کمال نے سن گویا میرے خیالات پڑھتے ہوئے بولا۔ "ویسے تمہارے آدمیوں کی کارکردگی ہے بہت عمدہ۔ ان پر کوئی کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکتا۔ لیکن انہیں... بلکہ تمہیں بھی ابھی تک اندازہ نہیں ہے کہ تمہارا واسطہ کن لوگوں سے ہے۔"

اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور مشین پر ایک بٹن اور دبایا۔ اسکرین تاریک ہو گئی۔ کمال ایک اور بٹن کو بار بار دباتے ہوئے بولا۔ "تمہارے دونوں آدمی اس وقت اندھیرے میں ہیں۔ لیکن ہمارے کیمرے انفرا ریڈ ہیں۔ انہیں یہیں سے' اسی مشین کے ذریعے حرکت بھی دی جا سکتی ہے۔ کیمرا ابھی تمہارے آدمیوں کو تلاش کر لے گا۔"

اسکرین پر تاریکی ہلکی ہو چکی تھی اور متحرک نظر آ رہی تھی۔ اچانک ایک ہیولا نمودار ہوا اور کیمرا وہیں ٹھہر گیا۔ ایک لمحے بعد وہ ہیولا اور اس کے آس پاس کا منظر کافی واضح ہو گیا۔ تقریباً اتنا ہی

واضح' جتنا ہمارے ہاں فلموں میں رات کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ وہ منیر تھا جو اپنی چھوٹی سی گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ وہ سگریٹ پیتا نہیں تھا لیکن شاید بے کیف نگرانی اور طویل انتظار کی کوفت سے اکتا کر اس وقت شغل کے طور پر پی رہا تھا۔

کمال تنے سن نے ایک اور بٹن دبایا۔ منظر بدل گیا۔ اب کنکشن دوسرے کیمرے سے ہو گیا تھا۔ یہ کمپاؤنڈ ہی کا ایک اور گوشہ تھا۔ یہاں پتھر کی بینچ بھی پڑی تھی اور تھوڑی سی روشنی بھی تھی جس کی وجہ سے منظر روزِ روشن کی طرح صاف نظر آ رہا تھا۔ مسعود پتھر کی بینچ پر پشتے سے ٹیک لگائے' ٹانگ پر ٹانگ رکھے بے فکرے نوجوانوں کی طرح غالباً سیٹی بجا رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کی حرکات سے تو یہی ظاہر ہو رہا تھا۔

کمال نے سن تعریفی انداز میں بولا۔ "یہ دونوں نوجوان جتنی دیر کمپاؤنڈ میں رہتے ہیں' اس سوئٹ کی کھڑکیوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن مجھے معلوم ... ہے کہ ان کی نظر سے کچھ بھی اوجھل نہیں۔ یہ جگہ بھی بدلتے رہتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ کس وقت سیڑھیوں کا چکر لگانا چاہیے۔ کتنی دیر میں لفٹوں کا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ کتنی کتنی دیر بعد باری باری راہداریوں میں نظر ڈال لینی چاہیے۔ احتیاطاً انہوں نے سیکنڈ فلور پر ایک کمرا بھی لے لیا ہے تاکہ ہوٹل میں ان کی موجودگی اور ادھر

یا وہ آمد و رفت مشکوک نظر نہ آئے۔ انہیں ہمارے فلور پر ... مل سکتا تھا لیکن انہوں نے جان بوجھ کر نہیں لیا تاکہ ہم ... سامنا ہونے کا امکان کم رہے۔" وہ بالکل اس طرح اعتماد سے ... بیان کر رہا تھا جیسے منیر اور مسعود کی حرکات و سکنات سے ... ان کی سوچوں سے بھی واقف ہو۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا ... نے بلاوجہ منیر اور مسعود کا وقت اور توانائی ضائع کی تھی۔

کمال نے سن بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس میں شک ... کہ میری اور پرنس تمینہ کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ اور وہ اس ... سے نکلنا چاہتا تو ان دونوں کی نظر میں آئے بغیر نہیں نکل سکتا ... لیکن ہمارا مسئلہ یہ تھا کہ ہمیں تو اس ہوٹل سے فی الحال نکلنا ... نہیں تھا۔ اور اگر ہم نکلنا چاہتے تو تمہاری یہاں کھڑی کی ہوئی ... ایک بٹالین بھی ہمیں نہیں روک سکتی تھی۔ ہمیں خواہ یہاں ... گراؤنڈ فلور تک چھتوں میں سوراخ کر کے اور پھر زمین میں ... بنا کر بھی جانا پڑتا تو ہم چلے جاتے۔ لیکن ہمیں اس کی ... ضرورت نہیں تھی۔ اور ہمیں چونک۔ تمہاری آمد کی توقع بھی تھی ... لئے ہم اس کے لئے بھی تیار تھے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ... کہ تمہاری آمد کا انداز کیا ہو گا۔ صرف اسی لئے باہر کھڑے ... ہمارے دو آدمیوں کو ذرا تکلیف اٹھانی پڑی۔ لیکن اس سے ... فرق نہیں پڑتا۔"

کندھے اچکا کر اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور خفیف سی ... راہٹ کے ساتھ بولا۔ "تم نے اپنے ریموٹ کنٹرول نظام کا ذکر ... تھا۔ اتفاق سے کچھ اسی قسم کا نظام ہمارا بھی ہے۔ اب ذرا ... اپنے آدمیوں کا حشر بھی دیکھ لینا۔ وقت تو ہو گیا ہے..."

اسکرین پر اب بھی مسعود بینچ پر بیٹھا سیٹی بجاتا دکھائی دے رہا ... ۔ اچانک بینچ کے نیچے سے گہرے رنگ کے کسی چست قسم کے ... میں ایک شخص سانپ کی طرح بل کھا کر نکلا۔ اس نے مسعود ... کے عقب میں سر ابھارا تھا۔ اپنے سائے سے بھی خبردار رہنے والا ... مسعود اس کی موجودگی سے آگاہ نہیں ہو سکا تھا۔

اس شخص کا چہرہ اسکرین پر نظر نہیں آ رہا تھا۔ کیمرے کا زاویہ ... کچھ ایسا تھا لیکن میں نے اسے پائپ یا ڈنڈے جیسی کوئی چیز جو ... زیادہ لمبی نہیں تھی' مسعود کے سر پر رسید کرتے ہوئے دیکھا۔ ... مسعود کے سر پر کئے جانے والے اس وار کی چوٹ مجھے اپنے دل پر ... محسوس ہوئی لیکن اب کچھ بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مسعود کی گردن ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک طرف کو جھک ... گئی مگر اس سے پہلے کہ وہ بینچ پر ڈھیر ہو جاتا' اسی شخص نے عقب ... سے اس کے گلے میں بازو ڈال کر بے رحمی سے اسے کھینچ لیا اور ... دوسرے ہی لمحے وہ دونوں کیمرے کی آنکھ سے اوجھل ہو گئے۔

کمال نے سن نے پہلے والا بٹن دبایا۔ کیمرا منیر کی کار پر آیا ... لیکن اب منیر وہاں نہیں تھا۔ احاطے کے فرش پر ایک سگریٹ پڑی ... اب بھی سلگ رہی تھی اور ٹی وی کی اسکرین پر چنگاری کی طرح ... دکھائی دے رہی تھی۔

کمال نے سن طمانیت بھرے انداز میں گہری سانس لے کر بولا۔ "یہ تو پہلے ہی روانہ ہو چکا ہے۔"

میرا اندازہ تھا کہ منیر پر وار کرنے کے لئے آدمی اس کی کار کے نیچے سے برآمد ہوا ہو گا۔ میں نے ایک ٹک کمال کی طرف دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "ان دونوں کو کہاں لے جایا جا رہا ہے؟"

"کسی انجانے سفر پر۔ منزل مجھے معلوم نہیں۔" وہ بے نیازی سے دونوں ہاتھ پھیلا کر بولا۔

میں نے بہ آواز بلند صرف ایک کوڈورڈ بولا۔ یہ احمد اور آفتاب کے لئے تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ فوری طور پر اپنے ان ساتھیوں کی خبر لیں جن کا حشر ہمیں ٹی وی پر دکھایا گیا تھا' یہاں کی صورتِ حال کو میں خود ہی سنبھال لوں گا۔

چشم زدن میں ریوالور کی نال دروازے سے غائب ہو گئی اور دروازہ کھٹ سے بند ہو گیا۔ وہ لوگ بھی مشینی انداز میں حرکت میں آنے والے تھے' اس کی تو مجھے توقع تھی لیکن میری ساری توجہ کمال نے سن پر رہی اور یہی میری غلطی تھی۔ میں نے کونے میں کھڑے ہوئے اس مجہول اور ڈھانچا نما شخص کو نظر انداز کر دیا تھا جو حلیے سے گھریلو ملازم اور جسمانی طور پر نہایت نحیف و نزار نظر آ رہا تھا۔

کمال نے سن نے تو اپنی جگہ سے جنبش بھی نہیں کی لیکن وہ ڈھانچا یکدم ہی اس طرح ہوا میں اچھلا جیسے اس کے پیروں تلے نہایت طاقتور اسپرنگ فٹ تھے جنہوں نے اسے مشینی گدے کی طرح ہوا میں اچھال دیا تھا۔

صرف یہی نہیں بلکہ وہ گویا اڑنے پر بھی قادر تھا۔ عقاب کی طرح اڑتا ہوا ہی وہ یکدم مجھ پر آ کر گرتا لیکن عین آخری لمحے میں مجھے اس حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کا موقع مل گیا تھا جو اس کے حرکت میں آنے سے مجھے لگا تھا۔ میں نے نہایت تیزی سے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے مشین پسٹل کا دستہ اس کی کھوپڑی پر رسید کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کی کھوپڑی کے بجائے کندھے پر لگا۔

اس ضرب سے بھی میرے اندازے کے مطابق اس کے کندھے کی ہڈی کم از کم چیخ تو جانی چاہئے تھی لیکن اس بدبخت پر تو جیسے اس کا بال برابر بھی اثر نہیں ہوا۔ وہ چھپکلی کی طرح دھپ سے اوندھے منہ دبیز قالین پر گرا مگر اسی ثانئے اس طرح اچھل کر سیدھا اٹھ کھڑا ہوا جیسے اسپرنگوں والے کسی بہت موٹے گدے پر گرا تھا۔

دوسرے ہی لمحے اس نے جس انداز میں ٹانگ گھمائی اور ساتھ ہی مجھے چاپ رسید کرنے کی کوشش کی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تو جیوجسٹو کا ماہر تھا۔ جس انداز میں اس کا استخوانی بازو ہوا میں گھوما تھا وہ کسی عام آدمی کی گردن توڑ دینے کے لئے کافی

تھا۔ میرا بھی اس سے بچ جانا خوش قسمتی ہی تھی۔ میری ہڈیوں کی تمامتر مضبوطی کے باوجود شاید کوئی ہڈی تو چٹخ ہی جاتی اور نہ جانے کتنی دیر کے لئے میں دنیاومافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔

یہ محض میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے بروقت اس کے بارے میں خبردار ہونے اور اس کی خطرناکی کا اندازہ لگانے کی مہلت مل گئی ورنہ اس کا ظاہری سراپا یقیناً لوگوں کو دھوکا دیتا ہو گا اور وہ کسی کے کچھ سمجھنے سے پہلے ہی اسے ڈھیر کر دیتا ہو گا۔

اب جبکہ وہ بھی سمجھ چکا تھا کہ میں کوئی آسان شکار نہیں ہوں تو یکدم محتاط ہو گیا تھا۔ ادھر کمال نے سن سے نہ جانے کہاں سے ایک خوفناک صورت سا ریوالور نکال لیا تھا جس پر نہایت عمدہ قسم کا ایک سائیلنسر فٹ تھا مگر اس سے ریوالور کی خوفناکی میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

صورت حال اب عجیب ہو گئی تھی۔ میرے ہاتھ میں مشین پسٹل اور کمال کے ہاتھ میں سائیلنسر والا ریوالور تھا۔ ہم دونوں کے درمیان وہ ڈھانچا نما شخص تھا جس کا مردار سا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا مگر اس کی آنکھوں میں خون کی پیاس تھی۔

چند لمحے کے لئے تو ہم تینوں ساکت رہے۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا تھا کہ کس کی ذرا سی حرکت، کس کا ذرا سا غلط اٹھا ہوا قدم کس کے لئے موت کا پیغام لا سکتا تھا۔ واگن کے تنے ہوئے تاروں کی طرح گویا ہم ایک دوسرے کی زندگی کے تار تھامے ہوئے تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ذرا سے غلط دباؤ سے کس کی زندگی کا تار ٹوٹ جائے۔ حتیٰ کہ وہ دونوں تو ساتھی ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے لئے فرشتۂ اجل ثابت ہو سکتے تھے۔ کسی ایک کی غلطی ان میں سے کسی کو بھی مروا سکتی تھی۔ گوکہ ہدف ان دونوں کا میں ہی تھا۔

پرنس تمینہ ایک دیوار سے جا لگی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ کمرا بے شک کشادہ تھا لیکن بہرحال ہوٹل کا کمرا تھا۔ کوئی طویل و عریض میدان جنگ تو تھا نہیں۔ محض جگہ کی تنگی کے باعث بھی موت کسی کا لہو چاٹتی ہوئی گزر سکتی تھی۔ اس کا اندازہ چاروں ہی کو تھا۔

پھر ہم تینوں نے بہتر زاویے پر آنے کے لئے بیک وقت چیونٹی کی رفتار سے اپنی جگہ سے کھسکنا شروع کیا۔ کوئی ایک دوسرے سے ذرا سی بھی زیادہ عجلت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ ان دونوں کا مرکزِ نگاہ میں تھا اور مجھے بیک وقت ان دونوں پر نظر رکھنا پڑ رہی تھی۔ میں نہایت آہستگی سے دوسری دیوار سے جا لگا۔ موجودہ صورتِ حال میں یہی حکمتِ عملی بہتر تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مار دھاڑ شروع ہو تو ڈھانچا نما شخص درمیان سے نکل جائے یا کسی طرح میری پشت پر پہنچ جائے۔ کمال کی اور میری انگلی کا دباؤ اپنی اپنی گن کے ٹریگر پر خطرناک حد تک بڑھ چکا تھا۔ کسی کی گن سے کسی بھی لمحے گولی برآمد ہو سکتی تھی۔

صورتِ حال کا تناؤ شاید پرنس تمینہ کی برداشت سے باہر ہو گیا۔ وہ چلا اٹھی۔ "کمال! پلیز... رو کو... یہ سب کچھ روکو۔ میں چوہدری صاحب کو منا لوں گی۔ ان کی منت کر لوں گی۔ یہ یہاں سے چلے جائیں گے۔ تم دونوں میں سے کسی کا بھی مرنا ٹھیک نہیں ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے بھی میری طرف سے نظر ہٹانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پرنس کی طرف دیکھے بغیر بھینچے بھینچے دانتوں کے درمیان سے بولا۔ "تم خاموش رہو۔ تمہارے دل میں کیا مسٹر چوہدری کی ہمدردی جاگ اٹھی ہے؟ کیا تم اسے مرتے دیکھنا نہیں چاہتیں؟"

"نہیں۔ میں دراصل تمہیں مرتے نہیں دیکھنا چاہتی۔" وہ تیزی سے بولی۔ اس کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔

کمال کے دانت بدستور بھینچے رہے اور اسی عالم میں وہ عجیب سے انداز میں ہنسا۔ اس کی ہنسی دیوانگی کی طرف مائل کسی درندے کی آواز محسوس ہوئی اور وہ بدستور چیونٹی کی رفتار سے کھسکتے ہوئے بولا۔ "میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔ لیکن میری خواہش تھی کہ چوہدری بھی نہ مرتا۔ لیکن اس نے بغیر کسی خاص مقصد کے، نہایت احمقانہ انداز میں اپنے آپ کو غلط چویشنز میں پھنسا لیا ہے۔"

کشیدگی کے انتہائی حد تک تنے ہوئے تار کو توڑنے میں ڈھانچا نما شخص نے فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ وہ کٹے ہوئے تنے کی طرح مگر اس سے کہیں زیادہ تیزی سے نیچے گرا۔ اپنی دانست میں اس نے بڑی ہوشیاری دکھائی تھی۔ اس نے اپنی لمبی ٹانگیں بڑھا کر مجھے اڑنگی لگا کر اوندھے منہ گرانے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اپنی جگہ سے ہٹتے ہوئے اس کے ٹخنے پر ٹھوکر رسید کی جو ٹخنہ توڑ ڈالنے کے لئے کافی تھی۔

اسی لمحے کمال نے سن فائر کر چکا تھا مگر میرے اس جگہ سے ہٹ جانے کے باعث صرف دیوار کا تھوڑا سا پلستر اکھڑ کر رہ گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں آگے بڑھ کر ڈھانچے کی پسلیوں میں بھی ٹھوکر رسید کر چکا تھا۔ اگر مجھے دوسری ٹھوکر رسید کرنے میں ایک ثانئے کی بھی تاخیر ہوئی ہوتی تو وہ اچھل کر دوبارہ کھڑا ہو چکا ہوتا۔

وزن تو اس کا کم ہی تھا، میری پوری قوت سے رسید کی گئی ٹھوکر نے اسے تقریباً ایک فٹ اوپر اچھال دیا۔ اس کے ساتھ ہی شاید میں کمال پر بھی فائر کر چکا ہوتا لیکن اسی لمحے ایک اور ایسی حرکت ہوئی جو میرے لئے قطعی غیر متوقع تھی۔ پرنس تمینہ پر سے میری نظر ایک ثانئے کے لئے ہٹ چکی تھی اور اس کی طرف سے مجھے اندیشہ بھی نہیں تھا کہ وہ اس خطرناک کشمکش میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کرے گی۔

لیکن شاید وہ کمبخت ہنی نہیں تھی، پرنس تمینہ ہی تھی۔ سب کام ایک ساتھ ہی ہو رہے تھے۔ اسی لمحے وہ بھی نہ جانے کہاں

...پنا سا پستول نکال چکی تھی جو میں نے بعد میں دیکھا۔ مجھے ...پتا چلا کہ محض پٹاخا چلنے جیسا ایک ہلکا سا دھماکا ہوا اور ...پسٹل میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

...ں تمینہ کے نشانے کی خوبی یہ تھی کہ میرے ہاتھ پر ...نہیں آئی تھی اور اس کی چلائی ہوئی گولی کی بدولت ...ے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ ورنہ شاید اس لمحے کمال کی ...ورج غروب ہو چکا ہوتا۔ شاید اس نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ...انی سے مرنے والا نہیں تھا لیکن یہ عین ممکن تھا کہ اس ...کی سخت جانی نہیں بلکہ ایسے اتفاقات ہی رہے ہوں۔

...تو فائر نہیں کر سکا تھا لیکن کمال نے فائر کر دیا تھا۔ میں اس ...یں بھی کامیاب ہو گیا لیکن گولی میرے کوٹ کی آستین کو ...ئی گزری۔ تاہم اس دوران فائدہ یہ ہوا کہ میں کمال کے ...نے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اندھا دھند فائرنگ کا خطرہ کوئی ...نہیں لے سکتا تھا، اس لئے مجھے بے خوفی سے ہاتھ پاؤں ...موقع مل گیا۔

...نے اس کے بازو پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کیا۔ مجھے یہی ...ں نے لوہے کے کسی چھوٹے موٹے پول پر ہاتھ رسید کر دیا ...گولی اور چل گئی لیکن ریوالور بہرحال اس کے ہاتھ سے ...میں اس پر مزید کوئی وار نہ کر پایا کیونکہ اسی لمحے عقب سے ...نچے نے مجھے آن دبوچا تھا جس کی چند پسلیاں اور ٹخنہ ...ندازے کے مطابق ٹوٹ تانا چاہئے تھے۔

...ں ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گیا۔ ہم تینوں ...ں پر جا کر گرے۔ اس دوران شاید اس بدبخت ڈھانچے نے ...پر کوئی داؤ بھی آزمایا تھا کیونکہ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں ...شدید لہر محسوس ہوئی تھی۔ وہ تپائی بڑی مضبوط تھی۔ بیک ...تینوں کے گرنے سے بھی نہیں ٹوٹی تھی۔

...ھانچا اس وقت نیچے تھا لیکن وہ کینچوے کی طرح کلبلا کر نکل ...ی لمحے کمال نیچے آ گیا اور میں اوپر۔ ڈھانچا "واہو" کی ...چیخ کے ساتھ ہوا میں اچھلا۔ میں نے اس کا استخوانی ہاتھ ...طرح نیچے آتے دیکھا۔ اس کا یہ جیوجستو کا وار میرے لئے ...تلوار کے وار سے کم نہ ہوتا۔ میں کمال سمیت نیچے لڑھک ...ر اس وار سے بال بال ہی بچا۔ وہ تپائی جو ہم تینوں کے بیک ...رنے سے نہیں ٹوٹی تھی، اس استخوانی ہاتھ کی ضرب سے ...سے ٹوٹ گئی۔ اگر اس کی جگہ میری گردن ہوتی تو...

...صورتِ حال کی سنگینی اور نزاکت حد سے بڑھی تو میرے جسم ...لخت ایک اضافی سی حیوانی قوت جاگ اٹھی۔ سارا منظر ...آنکھوں کے سامنے دھندلا گیا۔ صرف کمال اور ڈھانچے کے ...رہ گئے۔ مجھے ان چہروں کو منظر سے ہٹانا تھا۔ اس کے سوا گویا ...میں کوئی خیال، کوئی اندیشہ، کوئی احتیاط باقی نہ رہی۔ مجھ پر ...ی سوار ہو گئی۔

ڈھانچے نے وار خالی جاتا دیکھ کر فوراً ہی لات ہوا میں بلند کر کے ہتھوڑے کی طرح میری پیشانی پر رسید کرنا چاہی لیکن میں ایک طرف ہٹ گیا۔ لات کمال نے سن کی پیشانی پر پڑی۔ بالکل اسی طرح جیسے فرش پر پڑے ہوئے خربوزے کو کسی نے ہاکی مار کر پچکانے کی کوشش کی ہو۔ کمال کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور وہ وہیں ساکت ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ ڈھانچے نے میرا کام آسان کر دیا تھا۔

ایک وار خالی جاتا دیکھ کر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر دوسرا وار کرنا مارشل آرٹس کا بنیادی اصول ہے۔ ڈھانچا اس اصول پر کچھ زیادہ ہی عمل پیرا تھا۔ ابھی میں ایک وار سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ وہ دوسرا وار کرتا تھا لیکن مجھ میں اب جو درندگی پیدا ہوئی تھی اس کی وجہ سے اب یہ مقابلہ ٹیکنیک کا نہیں، طاقت کا ہو کر رہ گیا تھا۔

وہ ایک بار پر عقاب کی طرح مجھ پر آیا۔ وہ میری پیشانی پر چاپ مارنا چاہتا تھا لیکن میں نے اس کا وار روکتے ہوئے اسے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ لیا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ میری گرفت میں آ گیا تھا۔ اب اس کی حیثیت میرے لئے ایک کینچوے سے زیادہ نہیں تھی۔

میں نے اسے بھینچنا شروع کیا تو وہ بلبلا اٹھا۔ مارشل آرٹس میں دشمن کی گرفت سے نکلنے کے لئے جتنے داؤ پیچ سکھائے جاتے ہیں وہ سب اس نے مجھ پر آزمانے کی کوشش کی لیکن اب اس کی ایک نہ چلی۔ چوہا چوہے دان میں آ چکا تھا۔ اب اس کی کوئی تدبیر اس کے کام نہیں آ سکتی تھی۔

ہر لڑنے بھڑنے والے کی زندگی میں کوئی نہ کوئی ایسا موقع ضرور آتا ہے جب وہ محسوس کرتا ہے کہ فتح حاصل کرنے کے لئے صرف مارشل آرٹس یا کسی بھی قسم کی صرف ٹیکنیک کافی نہیں ہوتی۔ جب اس کے ساتھ طاقت... بلکہ بے پناہ طاقت کا امتزاج ہو تو بات ہی کچھ اور ہوتی ہے۔

میرے اندر ایک عجیب سا اُبال اٹھ رہا تھا جو لمحہ بہ لمحہ شدید ہو رہا تھا۔ میری رگ و پے میں کوئی طوفان سا اٹھ رہا تھا جو بگولے کی طرح بلند ہوتا ہوا گویا کھوپڑی میں آ کر مرتکز ہو رہا تھا۔ میں ڈھانچے کو بھینچتا چلا گیا۔ وہ بلاشبہ فولاد کی طرح سخت تھا مگر کچھ شکنجے ایسے ہوتے ہیں جن میں فولاد کو بھی کچھ نہ کچھ سمٹنا پڑتا ہے۔

اس کی حالت غیر ہو گئی۔ دھنسی ہوئی آنکھیں اُبل آئیں۔ پچکے ہوئے گال پھول گئے۔ چھپکلی کے پیٹ کی طرح زرد چہرہ ارغوانی ہو گیا۔ اس نے بہت ہاتھ پاؤں مارے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ جیوجستو بھی اس کے کسی کام نہ آئی۔

آخر کار کچھ دیر بعد وہ فولادی ڈھانچا نرم پڑ گیا، جیسے کسی روبوٹ کے نٹ بولٹ ڈھیلے ہو گئے ہوں۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک گئی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مر ہی جائے۔ میں نے اسے بازوؤں کے شکنجے سے آزاد کر دیا۔ وہ مردہ سانپ کی طرح قالین پر جا

گرا۔ ذھلو اور کمال نے سن اب پاس پاس ہی آرام فرما رہے تھے۔ کمال چت پڑا تھا جبکہ ڈھانچا اوندھے منہ گرا تھا۔

ان سے نمٹ کر میں نے پرنسس تہمینہ کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور اپنا چپٹا سا پستول ہاتھ میں دبائے دیوار سے لگی دم بخود سی کھڑی تھی۔ اس نے اس دوران نہ تو مجھ پر گولی چلائی تھی اور نہ ہی کوئی حکم دیا تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میرے وجود کی گہرائیوں سے غیظ و غضب کا جو طوفان امنڈا تھا اس کی شدتوں میں میں پرنسس تہمینہ کو تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ وہ چاہتی تو اس دوران آسانی سے مجھے گولی مار سکتی تھی یا کسی اور طرح گزند پہنچا سکتی تھی۔ لیکن وہ اپنی جگہ ساکت رہی تھی۔ یہ صورتِ حال شاید اس کے لئے بہت زیادہ حیران کن تھی۔

کمال اور ڈھانچے کے بے ہوش ہوتے ہی جیسے میرے غیظ و غضب کا طوفان سرد ہو گیا تھا۔ آنکھوں کے سامنے سے سرخ دھند چھٹنے لگی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ میں اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ ناپ چکا تھا۔ نظروں ہی نظروں میں مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ میرے ہاتھ کی رسائی سے زیادہ دور نہیں تھا۔ اگر وہ میکسیکن فلموں کے ہیرو کی طرح فائر کرنے کے معاملے میں حد سے زیادہ پھرتیلی ہوتی تب بھی میں اپنے آپ کو گولی سے بچاتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پستول چھین سکتا تھا۔

میں نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا ہی تھا کہ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے کمال اور ڈھانچے پر باری باری جھک کر بغور انہیں دیکھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اطمینان کر رہی تھی کہ دونوں واقعی بے ہوش ہیں۔

پھر میں یہ دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ رائٹنگ ٹیبل کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے کھڑے کھڑے ہی جھک کر پستول نہایت آہستگی سے میز پر رکھا اور قلم اٹھا کر ہوٹل کے رائٹنگ پیڈ پر تیزی سے کچھ لکھنے لگی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اسے گویا اس بات کی کوئی پروا نہیں رہی تھی کہ میں اسے کوئی نقصان بھی پہنچا سکتا ہوں جبکہ چند سیکنڈ پہلے اس نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔

میں نے خاموشی سے انتظار کرنا ہی بہتر سمجھا۔ کمال نے سن کی سانسوں کے زیر و بم میں کچھ تبدیلی آ رہی تھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ وہ زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہے گا۔ پرنسس تہمینہ نے تیزی سے کچھ لکھنے کے بعد رائٹنگ پیڈ سے ورق یوں احتیاط سے پھاڑا کہ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔ خاموشی سے وہ ورق اس نے میری طرف بڑھا دیا۔ اس پر لکھا تھا۔

"میں خواہ کچھ بھی کہوں، تم ایک لفظ بھی نہ بولنا۔ یہاں ہونے والی تمام گفتگو ریکارڈ ہوتی ہے۔ فوری طور پر یہاں سے چلے جاؤ۔ تمہاری جان کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ کل رات میرے شو کے بعد ہوٹل کے تہ خانے میں لانڈری روم کے قریب مجھ سے ملو۔ اگر میں کل نہ آ سکی تو پھر پرسوں اسی وقت، اسی جگہ میرا انتظار کرنا۔ کسی کو ساتھ

مت لانا۔ یہ اطمینان بھی کرتے ہوئے آنا کہ کسی نے تمہارا تعاقب نہ کیا ہو۔ اس سوئٹ کی نگرانی ختم کرا دو۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

نیچے اس نے اپنا کوئی نام نہیں لکھا تھا لیکن تحریر کا انداز دوستانہ تھا۔ اس میں میرے لئے ہمدردی کا رنگ پایا جاتا تھا۔ فی الحال یہ تحقیق نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ رنگ سچا تھا یا جھوٹا۔ تحریر میں بھی میرے لئے شناسائی کی جھلک تھی لیکن چونکہ وہ پیغام بہت ہی جلدی میں، نہایت گھسیٹ کر لکھا گیا تھا اس لئے میں تحریر کی شناخت کرنے کے معاملے میں فی الحال زیادہ پُر یقین نہیں تھا۔ بہرحال میں نے ان ہدایات پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے دل نے مجھے یہی مشورہ دیا تھا۔

پرنسس تہمینہ پستول بلند کرتے ہوئے غصیلے لہجے میں بولی۔ "اے... اے مسٹر چوہدری! میں کہتی ہوں، تم مٹھو کو چھوڑ دو... دیکھو اگر یہ مر گیا تو میں تمہیں بھی زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ اسے فوراً چھوڑ دو ورنہ میں گولی چلا رہی ہوں..." پھر اس نے پاؤں فرش پر مار کر دھپ کی سی آواز پیدا کی جیسے کوئی گرا ہو۔

اس نے گویا اطمینان کی سانس لی اور قدرے کم کشیدہ

"زندگی چاہتے ہو تو فوراً یہاں سے چلے جاؤ ورنہ تلاش والوں کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔"

سمجھ گیا کہ مٹھو اس ڈھانچے کا نام تھا جسے میں نے چند لمحے اپنے شکنجے سے آزاد کیا تھا لیکن پرنسس تہمینہ یہ ظاہر کر رہی وہ کارروائی اب ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے خاموش رہنے کی کی تھی لیکن میں نے سوچا کہ تھوڑا بہت بول کر میری طرف اس ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھر دیئے جانے میں کوئی میں تھا۔

میں نے غرانے کے سے انداز میں کہا۔ "فی الحال تو میں ہوں۔ لیکن تم جو کوئی بھی ہو، اپنے سرپرستوں کو بتا دینا کہ اگر ساتھیوں کو کوئی نقصان پہنچا تو میں قبر تک ان کا پیچھا کروں

یہ کہہ کر میں تیزی سے گھوما اور بیڈ روم و ڈرائنگ روم کے خاصی زوردار آوازوں کے ساتھ بند کرتا ہوا باہر آ گیا۔ اور بڑی راہداری میں مکمل سناٹا تھا۔ اندر ایک ہنگامہ بپا ہو چکا لیکن باہر وہی سکوت تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ احمد اور آفتاب اس منیر اور مسعود کے اغوا کو ناکام بنانے کے لئے ان کے تعاقب ہوں گے۔

میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ گھر واپس جاتے وقت میں ابھی رستے ہی میں تھا کہ کار کے ریڈیو پر سگنل موصول ہوا۔ دوسری آفتاب تھا۔ اس نے بتایا۔ "سر! ہم نے منیر اور مسعود کو چھڑا لیا ہے۔ انہیں لے جانے والے تین آدمی تھے۔ ایک ڈرائیور اور دو شاید وہی تھے جنہوں نے منیر اور مسعود کو بے ہوش کیا۔ وہ تینوں مارے گئے ہیں۔"

"اوہ...!" میں نے تاسف سے کہا۔ یہ تاسف ان کے مارے جانے پر نہیں تھا بلکہ اس بات پر تھا کہ کوئی کارآمد سراغ ہاتھ آنے کا ایک اور موقع ضائع ہو گیا تھا۔ میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "تم نے ان کا تعاقب کر کے یہ دیکھنے کی کوشش کی ہوتی کہ وہ منیر اور مسعود کو کہاں لے جانا چاہ رہے تھے۔ یا پھر منیر اور مسعود کو اس طرح چھڑانے کی کوشش کی ہوتی کہ انہیں اٹھا کر لے جانے والوں میں سے کوئی زندہ ہاتھ آ جاتا۔ شاید اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہو سکتی۔"

"یہ دونوں ہی باتیں ممکن نہیں تھیں سر!" آفتاب بولا۔ "ان تینوں کو ہلاک کئے بغیر منیر اور مسعود کو جلد از جلد ان کی گرفت سے چھڑانا ممکن نہیں تھا۔ انہیں چھڑانے میں ہم جتنی تاخیر کرتے اتنا ہی ان کی زندگی کے لئے خطرہ بڑھتا جاتا۔ ایک ایک لمحے کی تاخیر منیر اور مسعود کو موت کی طرف لے جا رہی تھی۔"

"وہ کیوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"سر! وہ منیر اور مسعود کو کسی عام گاڑی میں نہیں لے جا رہے تھے۔" آفتاب نے بتایا۔ "ہوٹل کے عقب کی طرف، جہاں سپلائی کی گاڑیاں وغیرہ آتی ہیں، آئس کریم سپلائی کرنے والا ایک بڑی مشہور کمپنی کا ٹرک کھڑا تھا۔ وہ اس ٹرک کو لے بھاگے تھے۔ ڈرائیور کی جگہ انہوں نے اپنا آدمی بٹھا دیا تھا اور منیر اور مسعود کو بے ہوشی کی حالت میں فریزر میں ڈال دیا تھا۔ وہ اندھادھند ٹرک کو کینٹ کی طرف بھگائے لئے جا رہے تھے۔ میرا اندازہ یہی ہے کہ ان کی کوئی خاص منزل نہیں تھی۔ وہ بس یہی چاہ رہے تھے کہ منیر اور مسعود فریز ہو کر مر جائیں تو ان کی لاشوں کو کسی ویران مقام پر پھینک دیا جائے۔"

میرے اعصاب میں ایک لمحے کے لئے تناؤ آ گیا۔ آفتاب بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس صورتِ حال میں ہم معاملے کو طول دینے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے سر! اب بھی منیر اور مسعود ہمیں برف کی طرح یخ اور اکڑے ہوئے ملے ہیں۔ بدبختوں نے انہیں بالکل مذبح خانے سے آنے والے گوشت کی طرح آئس کریم کی شیلفوں کے درمیان ٹھونسا ہوا تھا۔"

"انہیں فوری طور پر دو نمبر لے جاؤ۔" میں نے حکم دیا۔

"ہم وہیں لے جا رہے ہیں سر!" آفتاب نے جواب دیا۔ ماڈل ٹاؤن والی طویل و عریض کوٹھی میں محدود سی جگہ میں، محدود پیمانے پر آج کل وہ تمام طبی سہولتیں میسر تھیں جو کسی چھوٹے موٹے مگر جدید اور اعلیٰ اسپتال میں میسر آ سکتی تھیں۔ کچھ عرصہ قبل ہی میں نے ضرورت محسوس کرتے ہوئے یہ انتظامات کئے تھے۔ ہر وقت وہاں ایک ڈاکٹر اور ایک نرس بھی موجود رہتی تھی۔ وہ بھی اپنے ہی لوگ تھے۔ اس سے بڑی سہولت ہو گئی تھی۔

آفتاب بولا۔ "صفدر اور سلیمان کو ہم نے ہوٹل کے انہی دروازوں پر موجود رہنے کی ہدایت کی تھی جہاں وہ تعینات تھے۔"

"میں نے انہیں وہاں سے رخصت کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہوٹل کی... یا اس سوئٹ کی نگرانی کرنا اب کوئی خاص ضروری نہیں رہا۔"

احمد کی آواز ریڈیو پر ابھری۔ "سر! اگر آپ حکم دیں تو کمال نے سن کو اٹھا لیتے ہیں۔ وہ تھوڑا بہت اہم آدمی معلوم ہوتا ہے۔"

"اگر ایسا کرنا ضروری ہوا تب بھی چند دن بعد کریں گے۔" میں نے جواب دیا۔ "میرا خیال ہے وہ فی الحال غائب نہیں ہوگا۔ وہ جہاں ہے اسے وہیں رہنے دو۔ میں آج کے واقعے کے سلسلے میں اس کا ردِ عمل دیکھنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد تم یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ اسے ہدایات کہاں سے ملتی ہیں۔ ویسے مجھے وہ اہم آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ میرا اپنا اندازہ تو یہی ہے کہ ابھی تک کوئی اہم آدمی ہمارے سامنے آیا ہی نہیں۔ ہم تو ابھی یونہی آس پاس کے جھاڑ جھنکاڑ سے الجھ رہے ہیں۔ اصل درخت، اس کی شاخوں... بلکہ پتوں تک بھی نہیں پہنچے، جڑ تو بہت دور کی بات ہے۔ یہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی بہت ہی بڑا، بہت ہی لمبا چوڑا چکر معلوم ہوتا ہے۔"

"میں بھی یہی محسوس کررہا ہوں سر!" احمد بولا "ابھی تک ہم اس کے بارے میں صرف محسوسات کی بنیاد پر ہی بات کرسکتے ہیں۔ ٹونی نے اس معاملے میں ہمیں جس حد تک بریف کیا ہے اس سے کوئی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اگر یہ واقعی کوئی تنظیم ہے تو ابھی تک اس کے سرپیر کا پتا نہیں چل رہا۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر مشفقانہ لہجے میں کہا "بچے! ابھی تو تمہارا باس اندھیرے میں ہے ' تمہاری سمجھ میں کیا آئے گا۔ بہرحال.... کچھ سوالوں کے جواب صرف وقت کے پاس ہوتے ہیں۔ میں بھی انتظار کررہا ہوں اور میرا دل کہہ رہا ہے کہ آنے والے چند دنوں میں کوئی نہ کوئی بات .... کوئی خاص بات ضرور سامنے آئے گی۔"

احمد بولا "سر! وہ جن دو جعلی گارڈز کو ہم نے بے ہوش کرکے پرنسس تہمینہ کے سامنے والے سوئٹ میں ڈالا ہے ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ انہیں اٹھوالیا جائے؟ دو نمبر میں منتقل کرالیا جائے؟ شاید ان سے کچھ معلوم ہوسکے۔"

"احمد ڈیئر! وہ اپنی جگہ خطرناک ضرور معلوم ہوتے ہیں لیکن ان کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ وہ بھی مجھے معمولی حیثیت ہی کے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ سب جھاڑ جھنکاڑ ہی ہے۔ اس سے الجھنے میں توانائیاں ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "وہ جو تین آدمی تم لوگوں کے ہاتھوں ہلاک ہوئے ہیں ان کے بارے میں تم نے کیا رائے قائم کی تھی؟"

"پیشہ ور دہشت گرد معلوم ہوتے تھے سر!" احمد نے جواب دیا "گوکہ انہیں ہمارے سامنے دہشت گردی دکھانے کا موقع نہیں ملا لیکن ان کے انداز و اطوار بتارہے تھے کہ وہ بڑی تباہی پھیلانے کے اہل تھے۔ ان کے جسموں پر گہرے رنگ کے ڈھیلے ڈھالے سفاری سوٹ تھے اور پیٹ ' ٹانگوں اور پسلیوں کے ساتھ کئی خطرناک قسم کی گنیں اور خنجر وغیرہ بندھے ہوئے تھے لیکن کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے ان کی شناخت میں مدد ملتی۔"

"مجھے یہی امید تھی۔" میں نے کہا "وہ جعلی گارڈز بھی اسی قبیل کی چیز معلوم ہوتے تھے۔ اہم وہ بھی دکھائی نہیں دیتے۔ یہ جسم اور ہتھیار استعمال کرنے والے لوگ ہیں۔ جو ہدایات ملتی ہوں گی ' آنکھیں بند کرکے ان پر عمل کرگزرتے ہوں گے۔ قتل و غارت مچانے اور تباہی پھیلانے میں یقیناً ماہر ہوں گے لیکن زیادہ اہم ' دماغ استعمال کرنے والے لوگ ہوتے ہیں ' جن کا حکم چلتا ہے ' جن کی ہدایات پر عمل ہوتا ہے۔ ایسا کوئی آدمی سامنے آئے گا تو کچھ بات بنے گی۔"

میں گھر پہنچ چکا تھا۔ گاڑی ڈرائیووے میں روکتے ہوئے میں نے ریڈیو پر پوچھا "منیر اور مسعود کی کیفیت اس وقت کیسی ہے؟"

جواب آفتاب نے دیا "تشویش کی کوئی بات نہیں ہے سر! ان کے جسموں کی حرارت بحال ہورہی ہے۔ ہم دو نمبر پہنچنے ہی والے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم انہیں وہاں پہنچادو۔ میں صبح ان کی حالت کے بارے میں جولی سے رپورٹ لوں گا۔" میں نے خدا حافظ کہہ کر ریڈیو کا سوئچ آف کردیا اور خفیہ خانہ بند کردیا۔

اندر پہنچ کر میں نے شاور لیا اور کھانا کھاکر سب کچھ ذہن سے جھٹک کر سو گیا۔ گوکہ آج کی رات کا آغاز اچھا نہیں ہوا تھا لیکن خواب بہت اچھے آنے لگے۔ میں اس وقت یقیناً بہت گہری نیند میں تھا جب فون کی گھنٹی سے میری آنکھ کھلی۔ کئی سیکنڈ تک تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ میرے بیڈ کے قریب جو چیز وقفے وقفے سے بج رہی تھی وہ فون کی گھنٹی تھی۔

گھر پر آنے والی ٹیلی فون کالز گیسٹ ہاؤس میں ہی ریسیو کی جاتی تھیں۔ طارق خان یا طاہر علی میں سے جو بھی ڈیوٹی پر ہوتا تھا وہ فون ریسیو کرتا تھا اور اگر ضروری سمجھتا تھا تو مجھ سے ملا دیتا تھا لیکن اس وقت گھنٹی میرے پرائیویٹ فون کی بج رہی تھی جو ڈائرکٹ تھا۔ اس کا نمبر خاص خاص لوگوں ہی کے پاس تھا۔

اس وقت رات کے تین بجنے والے تھے۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ رات کے اس پہر کس کو مجھے فون کرنے کی ضرورت پیش آگئی تھی؟ شاید ستارہ یا پھر کراچی سے راحیلہ تھی۔

اگر اس قسم کا کوئی 'آوازِ دوست' سنائی دینے والا معاملہ ہوتا تو شاید اتنی گہری نیند سے بیدار ہونا مجھے ناگوار نہ گزرتا۔ گوکہ اتنی گہری نیند مجھے کبھی کبھار ہی آتی تھی اور معمول سے کچھ زیادہ تازہ دم کردیتی تھی۔ لیکن جب میں نے ریسیور اٹھاکر کان سے لگایا تو نیند ٹوٹنے کا صدمہ دوچند ہوگیا۔ طبیعت جھک ہوگئی۔ بڑی شدت سے دل چاہا کہ ٹیلی فون کے نظام میں یہ سہولت بھی شامل ہونی چاہئے تھی کہ اگر انسان فون کرنے والے کے سر پر ریسیور کھینچ کر مارنا چاہے تو مار سکے۔

دوسری طرف وہی ہونق وسیم احمد تھا جسے میں تقریباً بھول چکا تھا۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر سے محسوس کیا کہ اس کی آواز کانپ رہی تھی ' وہ سخت گھبراہٹ زدہ انداز میں پوچھ رہا تھا "سر... سر! آپ افضل چوہدری ہی بول رہے ہیں نا؟"

"نہیں۔ میں ان کی روح بول رہی ہوں جو قفسِ عنصری اور جسدِ خاکی وغیرہ سے پرواز کرچکی ہے۔" میں نے جل کر جواب دیا۔

"سر! میں اس وقت آپ کو پریشان کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن سر...! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" وہ بدستور مرتعش لہجے میں بولا۔

"نہیں ' نہیں۔ میں نے کب کہا کہ یہ مذاق کا وقت ہے۔ یہ ا قبروں میں لیٹے ہوئے مُردوں کو نہایت سنجیدگی سے جگانے کا وقت ہے۔ معلوم نہیں مجھ سے یہ حماقت کس طرح ہوگئی کہ میں نے تمہیں اپنا وہ وزٹنگ کارڈ دے دیا جس پر میرا پرائیویٹ فون نمبر بھی موجود تھا۔"

ر! میں اس وقت بڑی مصیبت میں ہوں۔ میری کچھ مدد ہ گڑگڑایا۔

اپ کوئی ایسا وقت بھی گزرتا ہے جب تم مصیبت میں نہیں میں نے پوچھا۔

ر! اس وقت مجھے بہت ہی بڑی مصیبت کا سامنا ہے ... یہ سولی بات نہیں ہے۔ ورنہ میں آپ کو تکلیف نہ ے دل نے کہا کہ آپ کے سوا کوئی میری مدد نہیں ۔ سر! خدا کے لئے فون بند مت کیجئے گا۔ میری زندگی برباد ی۔"

تمہاری زندگی پہلے کون سی آباد ہے۔" میں نے ٹھنڈی لے کر قدرے نرم لہجے میں کہا۔ حقیقت یہ تھی کہ جب میں مسکین سی صورت دیکھتا تھا یا اس کا چہرہ میرے تصور میں ا تو مجھے اس پر ترس آنے لگتا تھا ' اوپر سے اس کا لہجہ مجھے لر رکھ دیتا تھا۔ اتنی عاجزی اور مسکینی ہوتی تھی اس کے لہجے ہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے شرمندگی سی ہونے لگتی

یکدم ہی جیسے پھٹ پڑا۔ بھوں بھوں کرکے رونے لگا ' فون پر ہچکیاں سنائی دینے لگیں۔ مجھے ایک بار پھر اس پر ترس مجھے پھر وہی خیال آیا کہ اگر کچھ لوگ ایسے ہونق ' کم عقل وط الحواس ہوتے ہیں تو اس میں ان کا اپنا تو کوئی قصور نہیں ر انہیں خود تو شاید احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ہونق ' کم مخبوط الحواس ہیں۔ سمجھتا تو ہر شخص یہی ہے کہ اس میں دنیا خوبیاں یکجا ہیں۔ انہی خوش فہمیوں کے سہارے تو زندگی ذرا سے بسر ہوجاتی ہے ورنہ درحقیقت زندگی بڑی کٹھن ہے۔

لیکن وسیم احمد کم از کم اس حد تک تو غنیمت تھا کہ اسے اپنی ریوں کا کچھ نہ کچھ احساس تھا۔ ہر معاملے میں وہ خود ہی بقراط بنتا تھا۔ وہ جب بھی اپنے آپ کو مصیبت میں محسوس کرتا تھا تو کے لئے کسی نہ کسی کی طرف بھاگتا تھا لیکن اب یہ اس کی ی تھی کہ بیشتر لوگ اسے دھتکار دیتے تھے۔ حتیٰ کہ خود اس کے باپ کے دل میں اس کے لئے ہمدردی نہیں تھی ' اس کی ۔ توجہ دینے کا وقت نہیں تھا۔

مسئلہ کیا ہے؟" میں نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ زیادہ نرم نہیں نے دیا۔

"سر! اس وقت میرے سامنے ایک لاش پڑی ہے۔" وہ اں روکتے ہوئے بولا۔

"لاش؟" میں نے قدرے چونک کر کہا "یہ تم کہاں سے وں کے چکر میں پڑ گئے۔ کس کی لاش ہے؟"

"چھوٹے چچا کی۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ چھوٹے چچا اچانک لاش میں کیونکر تبدیل ہوگئے؟ انہوں تو تمہاری زندگی اجیرن کررکھی تھی۔ تم کہاں سے بول رہے ہو؟ مجھے پوری بات بتاؤ اور شروع سے بتاؤ۔"

"میں کارخانے ہی سے بول رہا ہوں... اپنے آفس سے۔" وہ گویا کچھ سنبھلتے ہوئے بولا "آپ کو معلوم ہی ہے کہ میری رات کی ڈیوٹی ہوتی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ چھوٹے چچا مجھے چوری وغیرہ کے چکر میں پھانسنے کی تیاری کررہے ہیں اور آپ نے مجھے مشورہ دیا تھا کہ میں ان کی چال کو انہی پر الٹ دوں..."

مجھے یاد تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ چھوٹے چچا ہفتہ بھر کیش بینک میں جمع کرانے کے بجائے میز کی درازوں میں ہی بھرے رکھتے تھے۔ اسی کمرے میں رات کو آکر وسیم احمد بیٹھتا تھا اور اپنے ہی باپ کے کارخانے میں نائٹ سپروائزر کے طور پر ایک ملازم کے فرائض انجام دیتا تھا۔ میں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ جس رات میز کی درازوں میں ہفتے بھر کا کیش جمع ہو ' اس رات وہ کسی طرح درازیں کھول کر ساری گڈیاں اس طرح میز پر سجادے جیسے کوئی چور انہیں لے جانے کی تیاری کررہا تھا لیکن اوپر سے وسیم احمد کے آجانے کی وجہ سے وہ بھاگ گیا۔ وہ اپنے باپ کو فون کرکے اس واقعے کی اطلاع دے دے۔

اس طرح ایک تو اسے تھوڑا سا کریڈٹ مل جائے گا کہ بروقت اس کی آمد کی وجہ سے اور اس کے للکارنے کی وجہ سے بہت بڑی رقم چوری ہونے سے بچ گئی۔ دوسرے جب رقم گنی جائے گی تو چھوٹے چچا کے گھپلے بھی سامنے آجائیں گے۔ اول تو اس کی پوزیشن مشکوک بنانے کے لئے یہی گھپلا کافی ہوگا کہ وہ ہفتے بھر کا کیش درازوں ہی میں رکھتا تھا۔

وسیم احمد کہہ رہا تھا "آج رات میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے درازوں سے سارا کیش نکال کر میز پر سجادیا تھا۔ میز کی دراز میں ایک بھرا ہوا ریوالور بھی موجود تھا۔ معلوم نہیں ابا کو اس کا بھی پتا ہوگا یا نہیں۔ بہرحال میں نے ریوالور بھی نکال کر میز پر رکھ لیا تھا۔ میری کارروائی ابھی جاری تھی کہ اچانک دھاڑ سے دروازہ کھلا اور چھوٹے چچا اندر آگئے۔"

"یہ رات کے تین بجے چھوٹے چچا کارخانے میں کہاں سے پہنچ گئے؟" میں نے حیرت سے کہا "تم نے تو بتایا تھا کہ ان کی ڈیوٹی دن میں ہوتی ہے۔"

"سر! یہ تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکا... اس وقت اگر سچ مچ کوئی چور یا ڈاکو آجاتا تو شاید مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی لیکن ان کی آمد کا تو مجھے وہم و گمان بھی نہیں تھا۔"

"چوکیدار اس وقت کہاں ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"چوکیدار تو یہاں سے کافی فاصلے پر گیٹ پر ڈیوٹی دے رہا ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت میں نے اسے ایک قریبی ریستوران میں بھیجا ہوا تھا۔ یہاں چونکہ آس پاس کئی کارخانے ہیں اور تین تین شفٹوں میں کام چلتا ہے اس لئے وہ ریستوران دن رات کھلا رہتا ہے ' کھانے پینے کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ اسی لئے ہم نے کارخانے

میں اس طرح کا کوئی انتظام نہیں رکھا۔ مجھے اس وقت کچھ بھوک سی لگ رہی تھی۔ میں نے چوکیدار کو بھیج دیا کہ میرے لئے ناشتا لے آئے۔ ویسے بھی میں نے سوچا کہ میری کارروائی کے دوران وہ ڈیوٹی پر نہ ہی رہے تو اچھا ہے۔ کبھی کبھی چکر لگاتا ہوا گیٹ سے یہاں تک آجاتا ہے۔ چھوٹے چچا بھی یقیناً اس کی غیر موجودگی میں ہی اندر آئے ہوں گے۔" اس نے بتایا۔

"اچھا۔۔ خیر۔۔۔۔ ان کے آنے کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا سر۔۔۔۔!" اس کی آواز ایک بار پھر بھرّانے لگی۔ "انہوں نے مجھے دیکھا' پھر میز پر بچی ہوئی نوٹوں کی گڈیوں کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے ہی نہ جانے کیا سوچ کر آئے تھے لیکن یہ منظر دیکھ کر تو ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ کونے میں ایک موٹا سا ڈنڈا دیوار سے لگا ہوا تھا۔ پتا نہیں کس نے اور کیوں یہاں رکھا تھا۔ چھوٹے چچا وہ اٹھا کر اتنی غضبناک حالت میں میری طرف بڑھے کہ بالکل غیر ارادی طور پر میں نے میز سے ریوالور اٹھا کر ان پر فائر کردیا۔۔۔" اس کی آواز ایک بار پھر کانپ گئی۔

مجھے فون پر بھی اس کے تھوک نگلنے کی 'ٹرچ' صاف سنائی دی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "سر! آپ تو میری بات کا یقین کرتے ہیں نا؟ قسم سے ۔۔۔ اس میں میرا بالکل کوئی قصور نہیں۔ اگر میں گولی نہ چلاتا تو چھوٹے چچا یقیناً میری کھوپڑی کھول دیتے اور ان کی جگہ اس وقت میری لاش پڑی ہوتی۔ مجھے اپنی جان بچانے کے لئے گولی چلانا پڑی۔ لیکن میری بات بھلا کون سُنے گا؟"

"چنانچہ تم نے اپنی "ڈے اینڈ نائٹ ایڈوائزری سروس" کو فون کرلیا۔" میں نے مصنوعی ناگواری سے کہا "اب تم یہ پوچھنا چاہتے ہوگے کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے؟ کس طرح تمہاری جان بچ سکتی ہے۔ یہی بات ہے نا؟"

"سر! آپ کو معلوم ہے اس دنیا میں میرا کوئی ہمدرد نہیں۔ میں کہاں جاؤں؟ کس سے مشورہ کروں؟ میری سنتا ہی کون ہے!" مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ ایک بار پھر رونے لگے گا۔ آنسو بہانے اور انہیں یکدم روکنے میں اس کا جواب نہیں تھا۔

"تمہیں یقین ہے کہ چھوٹے چچا اس جہانِ فانی سے رخصت ہوچکے ہیں؟" میں نے جلدی سے پوچھا "تم نے ایک ہی فائر کیا تھا نا؟"

"یس سر!" اس نے سعادت مندانہ لہجے میں کہا جو اس وقت مضحکہ خیز محسوس ہوا "گولی تو میں نے ایک ہی چلائی۔۔۔۔ لیکن قدرت کا کمال دیکھئے' اگر میں چھ ماہ نشانے بازی کی پریکٹس کرتا رہتا تب بھی شاید اتنا اچھا نشانہ لگانا میرے لئے مشکل ہوتا۔ بغیر نشانہ لئے اور بغیر سوچے سمجھے چلائی ہوئی یہ گولی عین ان کے دل کے پار ہوگئی ہے۔۔۔ میرا خیال ہے وہ فرش پر گرنے سے پہلے ہی مرچکے تھے۔"

"ماشاء اللہ!" میں نے کہا "مبارک ہو۔ تمہاری زندگی کا سب سے بڑا مسئلہ حل ہوگیا' اب اور کیا چاہتے ہو؟"

"سر! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" وہ گڑگڑایا "چوکیدار کسی بھی لمحے واپس آنے والا ہوگا۔ میں اس وقت کھڑکی کے راستے گیٹ کی طرف ہی دیکھ رہا ہوں۔"

"اچھا۔۔۔۔ یہ بتاؤ' کیا ریوالور تم نے ابھی تک ہاتھ میں پکڑا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی نہیں۔ میز پر رکھ دیا ہے۔ آپ کو فون کرنے سے پہلے رکھ دیا تھا۔"

"سب سے پہلے اسے کسی کونے میں پھینک دو۔" میں نے کہا "لیکن پھینکنے سے پہلے اس پر سے اپنی انگلیوں کے نشانات صاف کردینا۔"

"انگلیوں کے نشانات تو اس پر ہیں ہی نہیں سر!" وہ جلدی سے بولا "میں نے میز کی درازوں سے نوٹ وغیرہ نکالنے کی کارروائی احتیاطاً دستانے پہن کر شروع کی تھی۔ دستانے ابھی تک میرے ہاتھوں پر ہیں۔" ایک لمحے کے لئے وہ جیسے خطرات کو بھول گیا اور اپنے مخصوص احمقانہ شرمیلے پن کے ساتھ بولا "میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میں کافی جاسوسی کہانیاں وغیرہ پڑھتا رہتا ہوں۔ تھوڑا بہت احتیاط کا تو خیال تھا مجھے۔"

"بس تو پھر۔۔۔ احمق کہیں کے! اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟ سیدھا سادا حل تمہارے سامنے تو موجود ہے۔" میں نے ہلکی سی جمائی لے کر کہا "پستول۔۔۔۔ یا ریوالور۔۔۔ جو کچھ بھی وہ ہے۔۔۔ اسے چھوٹے چچا کے سامنے کسی کونے میں پھینک دو اور خود جلدی سے مشینوں والے حصے کا چکر لگانے چلے جاؤ۔ چوکیدار تمہارا ناشتا لے کر اسی کمرے میں آئے گا نا؟"

"یس سر!" وہ مستعدی سے بولا۔

"بس۔۔۔ لاش اسے ہی دریافت کرنے دو۔" میں نے کہا "تم فرض کرلو۔۔۔۔ بلکہ اپنے آپ کو یقین دلادو کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ کم از کم تم نے کچھ نہیں کیا ہے۔ چوکیدار لاش دیکھے گا تو مچائے گا یا تمہیں ڈھونڈتا ہوا دوڑا دوڑا آئے گا۔ تب تم دوسرے آدمیوں کو ساتھ لے کر کمرے میں پہنچنا اور حیرت زدہ' دہشت زدہ وغیرہ رہ جانے کی جتنی بھی اچھی اداکاری کرسکو

النا۔ تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم اداکاری میں اچھا خاصا عمل دخل رکھتے ہو؟"

"بس جی۔۔۔ یونہی تھوڑا بہت گزارا کرلیتا ہوں۔" اس نے یوں انکساری سے کہا جیسے کسی بہت بڑے پیشہ ور اداکار کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دی جارہی ہو اور اس کی بے پناہ تعریف و توصیف کی جارہی ہو۔ جس کے جواب میں وہ انکساری کا مظاہرہ کررہا ہو۔

"تم یہی ظاہر کرنا کہ تم تو چوکیدار کو ناشتے کے لئے بھیج کر مشینوں پر کام ہوتا دیکھنے چلے گئے تھے۔ تمہیں تو کچھ معلوم ہی نہیں کہ تمہارے پیچھے اتنی سی دیر میں چھوٹے چچا کہاں سے ٹپک پڑے۔ میز پر نوٹوں کی گڈیاں کہاں سے آگئیں اور چھوٹے چچا کے سینے میں سوراخ کون کرگیا۔ تم کہہ دینا کہ پٹاخے جیسی ایک آواز تم نے سنی تو تھی لیکن اس لئے زیادہ توجہ نہیں دی تھی کہ صنعتی علاقوں میں اس قسم کی آوازیں سنائی دیتی ہی رہتی ہیں۔"

وہ اتنی خاموشی سے میری بات سن رہا تھا کہ مجھے ایک لمحے کے لئے شبہ ہوا' شاید دوسری طرف کوئی موجود ہی نہیں۔ مجھے احتیاطاً پوچھنا پڑا "تم میری بات سن رہے ہو یا تمہاری روح بھی قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی ہے؟"

"نہیں سر!" وہ گڑبڑا کر جلدی سے بولا "میں تو آپ کی باتیں ذہن نشین کررہا ہوں تاکہ مجھ سے کوئی غلطی نہ ہو۔"

"لوگوں کو تم خود ہی نتائج اخذ کرنے دینا۔" میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "البتہ بیچ بیچ میں تھوڑے بہت اشارے دیتے رہنا کہ شاید تمہارے جاتے ہی کوئی چور کمرے میں آن گھسا ہوگا۔ اس نے درازوں سے ساری رقم نکال لی ہوگی لیکن کسی عجیب و غریب اور نامعلوم اتفاق کے تحت اوپر سے چھوٹے چچا پہنچ گئے ہوں گے۔ انہوں نے چور کو للکارا ہوگا' اس پر حملہ کرنے کی کوشش کی ہوگی اور اس کے ہاتھوں مارے گئے ہوں گے۔ یعنی بس تم اپنا کردار کسی نامعلوم چور کو سونپ دو۔ چچا رات کے اس پہر کیوں کر وہاں پہنچے۔۔۔ اور درازوں میں اتنا کیش کیوں موجود تھا؟ اس قسم کے سوالات پولیس کے لئے اور اپنے ابا جی کے لئے چھوڑ دو۔ وہ خود ہی جواب تلاش کرتے رہیں گے اور ابا جی پر ذرا چھوٹے چچا کی حقیقت بھی ظاہر ہوجائے گی۔ یہی وہ کام ہے جو تم کرنا چاہ رہے تھے اور جس کی کوشش میں تم نے اتنا کھڑاگ پھیلالیا۔"

"ٹھیک ہے سر! میں ایسا ہی کروں گا۔ لیکن۔۔۔" ایک بار پھر گویا اس کی روح فنا ہونے لگی۔

"اب کیا ہوا؟" میں نے پوچھا "کیا چوکیدار واپس آگیا؟"

"نہیں سر! میری قسمت اچھی ہے۔ وہ تو ابھی تک نہیں آیا۔ ریستوران پر تقریباً ہر وقت ہی خاصا رش ہوتا ہے۔ میں تو دراصل پولیس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ تو بڑی باریکی سے تفتیش کریں گے نا۔ سب سے زیادہ پوچھ گچھ تو مجھ سے ہی کریں گے' میری تو ویسے ہی کسی خوف ناک سی شکل والے پولیس مین کو دیکھ کر روح فنا ہوتی ہے۔ اگر کسی نے مجھے زیادہ ڈرا دھمکا کر پوچھ گچھ کی تو بوکھلا کر کہیں میرے منہ سے سچ نہ نکل جائے۔"

"اب یہ تمہارے نصیب ہیں بچے!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر تم کچھ دیر کے لئے اپنے دل و دماغ اور زبان کو قابو میں نہیں رکھ سکتے تو میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"اتنی رکھائی اختیار نہ کریں سر! میرا ٹوٹا ہوا دل کچھ اور ٹوٹ جائے گا۔ مجھے تھوڑا سا ہی حوصلہ دے دیں۔ شاید میں آزمائش سے گزر ہی جاؤں۔" وہ منمنایا۔

"بھائی! اب میں تمہیں اور کس طرح حوصلہ دوں؟ کیا وہاں آکر تمہارا سر سہلاؤں' تمہاری کمر پر تھپکیاں دوں' تمہیں سینے سے لگاؤں؟" میں نے ملائمت سے پوچھا "یہ تمہاری بقا کا مسئلہ ہے' تمہیں تھوڑی بہت تو ہمت کرنی پڑے گی نا۔"

"وہ ۔۔۔ سر۔۔۔۔! دراصل مجھے ان کے چھتروں' ڈنڈوں اور بھاری بوٹوں کے ٹھڈوں سے بہت خوف آتا ہے۔ اور پھر وہ دوسری بہت سی شرمناک حرکتیں بھی کرتے ہیں۔ بہت ایذا دیتے ہیں جی آدمی کو۔ ایسا لگتا ہے جی' جیسے ملزم کو بُرے بُرے طریقوں سے زیادہ سے زیادہ اذیتیں دے کر انہیں روحانی خوشی حاصل ہوتی ہے' بہت لطف آتا ہے۔ اس معاملے میں وہ ذہنی مریض لگتے ہیں سر! مجھے ایک مرتبہ ایک نوجوان کے ساتھ تفتیش ہوتے دیکھنے کا اتفاق ہوگیا تھا۔ غلطی سے یا بدقسمتی سے مجھے سب کچھ دیکھنا پڑا تھا۔ اس پر چوری کا الزام تھا حالانکہ مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس نے چوری نہیں کی تھی مگر۔۔۔" اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر گویا جھرجھری لی۔

پھر غالباً وہ تھوک نگل کر بولا "تب سے ذہن میں دہشت سی بیٹھ گئی ہے سر! کسی بارعب سی شکل کے پولیس والے کو دیکھ کر سیدھی بات بھی منہ سے الٹی نکلنے لگتی ہے۔ وہ چیزیں یاد آجاتی ہیں جن سے وہ اس بے چارے' بے قصور کی مٹی پلید کررہے تھے۔ خاص طور پر وہ چھتر۔۔۔! ستمگروں نے اس پر یہ بھی لکھا ہوا تھا۔ "چناں کتھاں گزاری ائی رات وے" حالانکہ ملزم بے چارے نے وہ رات گوجرانوالہ میں گزاری تھی' جس رات چوری ہوئی تھی۔ میں اس کا گواہ تھا۔ مگر انہوں نے کسی کی نہیں سُنی۔ بلکہ میرے بولنے پر وہ تو مجھے بھی شاملِ تفتیش کرنے لگے تھے۔ قسمت اچھی تھی' میں بال بال بچ گیا۔"

"ہر جگہ۔۔۔ ہر بار ہی ایسا نہیں ہوتا میرے بھائی!" میں نے آخر کار حوصلہ بندھانے والے لہجے میں کہا "سبھی پولیس والے یوں اندھا دھند اپنا ٹارچر کا سامان لے کر کسی پر نہیں چڑھ دوڑتے۔ تمہیں اتنا دہشت زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اگر تم نے اس واقعے کو ذہن پر مسلط رکھا تو تم اپنا کام خراب کرلو گے۔ ضروری نہیں ہے کہ وہ بہت باریکی سے ہی تفتیش کریں۔ اور یہ بھی ضروری نہیں کہ ساری تفتیش کا مرکز تم ہی بنو۔ بعض

اوقات تو وہ اس قسم کے واقعات کو بالکل عام سا معاملہ سمجھ کر رسمی کارروائی کر کے ایک طرف ڈال دیتے ہیں' زیادہ زحمت ہی نہیں کرتے۔ اور پھر آخر تم کارخانے کے مالک کے بیٹے ہو۔ اور اس معاملے میں کیش غائب نہیں ہوا بلکہ بچ گیا ہے۔"

"کارخانے دار کا بیٹا ہونے سے ہی تو مجھے زیادہ خوف آرہا ہے۔ ابا کون سا میری حمایت کریں گے۔ بلکہ مجھے اندیشہ ہے کہ چھوٹے چچا کی موت سے ان کا دماغ زیادہ ہی نہ اُلٹ جائے۔ میرے بارے میں ان کا غیظ و غضب اور نہ بڑھ جائے۔"

اس کے لہجے میں حقیقتاً بڑا خوف تھا۔ ایک بیٹے کے لہجے میں باپ کی طرف سے اتنا خوف محسوس کر کے میرے دل میں درد کی لہر سی اٹھی۔

میں نے ملائمت سے کہا "تم ہر خوف ذہن سے نکال دو۔ جس طرح میں نے کہا ہے اس طرح کرو۔ اگر پولیس واقعی تم سے کچھ زیادہ پوچھ گچھ کرے اور تم ان کے تیور ذرا بھی بدلتے دیکھو تو کسی طرح مجھے ایک فون کر دینا۔ میں سائٹ کے ایس ایچ او سے کہہ دوں گا' کوئی تمہیں انگلی بھی نہیں لگائے گا۔ اب تو ٹھیک ہے؟ اور بولو کیا چاہتے ہو؟"

اس کے لہجے میں یک بیک اس بچے کی خوشی سمٹ آئی جسے کسی خوف ناک بلا کے پنجوں سے نجات مل گئی ہو "بس ۔۔۔ آپ نے یہ کہہ دیا' میرا سارا خوف دور ہو گیا سر! اب میں شیر بن گیا ہوں۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ مجھے معلوم تھا' میرا مسئلہ آپ کے سوا کوئی حل نہیں کر سکتا۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی دے سر! اور اس سے بھی بڑا آدمی بنائے ۔۔۔"

"بس ۔۔۔ اب مجھے سونے دو اور خود بھاگ کر مشینوں کی طرف چلے جاؤ۔ اب کیا اس وقت ہی یہاں سے ہلو گے جب چوکیدار سر پر آجائے گا؟" میں نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔

میں نے سوچا' اب نیند تو خراب ہو ہی چکی ہے' لگے ہاتھوں منیر اور مسعود کی خیریت بھی دریافت کر لوں۔ میں نے دو نمبر فون کیا۔ حسب معمول جولی عرف مس ٹرمپ نے ریسیو کیا۔ معلوم نہیں یہ عورت دن رات کے کسی حصے میں سوتی بھی تھی یا نہیں۔ اگر سوتی تھی تب بھی فون بہرحال وہی ریسیو کرتی تھی۔

میں نے منیر اور مسعود کے بارے میں پوچھا تو وہ بولی "وہ تو یہاں پہنچنے کے ایک گھنٹے بعد ہی بالکل ٹھیک ٹھاک ہو گئے تھے سر! میں نے انہیں اپنے گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ایک تو دیر کافی ہو چکی تھی۔ میں نے سوچا' آپ سو گئے ہوں گے۔ دوسرے وہ کچھ شرمندہ شرمندہ سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس لئے میں نے ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ باس کو رپورٹ کرنے کی ضرورت نہیں' میں خود ہی ان سے بات کر لوں گی۔"

"شرمندہ شرمندہ کیوں تھے وہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"اسی بات پر کہ انہیں بے خبری میں چوہوں کی طرح مار لیا گیا تھا اور وہ کچھ بھی نہیں کر سکے۔ آپ نے ان پر اتنا بھروسا کیا تھا' یہی سوچ سوچ کر پانی پانی ہوئے جا رہے تھے۔" جولی نے بتایا۔

"احمق ہیں وہ۔" میں نے اس خبر سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "ایک تو انہیں اندازہ نہیں ہے کہ اس بار ہمارا واسطہ عام قسم کے جرائم پیشہ لوگوں سے نہیں ہے۔ دوسرے ان کے ساتھ پہلی مرتبہ ایسا ہوا ہے' شاید اس لئے وہ شرمندگی محسوس کر رہے ہیں۔ ابھی نوجوان ہیں' زیادہ پختہ نہیں ہوئے ورنہ انہیں معلوم ہوتا کہ جو ہمیشہ دوسروں کو ناکوں چنے چبواتے ہیں انہیں کبھی کبھی خود بھی ناک رگڑنی پڑ جاتی ہے۔ یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں۔ یہ سلسلے تو زندگی کے ساتھ ہیں اور چلتے ہی رہیں گے۔ کبھی اونچ کبھی نیچ۔"

"وہ ذرا ڈر رہے تھے کہ کہیں آپ ان سے خفا نہ ہوں۔" جولی بولی۔

"میں اسی وقت فون کر کے ان کا ڈر دور کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر کے منیر اور مسعود کو فون کیا۔ گلشن آباد کے ایک چھوٹے سے بنگلے میں وہ دونوں اکٹھے ہی رہتے تھے۔ فون منیر نے ریسیو کیا۔ انہیں قطعاً توقع نہیں تھی کہ میں رات کے اس پہر ان کی خیروعافیت دریافت کرنے کے لئے فون کروں گا۔ میں نے انہیں تسلی دی اور بتایا کہ میرے لئے ان کا بخیروعافیت لوٹ آنا ہی سب سے زیادہ اہم تھا۔

فون بند کرتے وقت مجھے اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ دونوں بے حد خوش اور پُرجوش تھے۔ ساتھیوں کا مورال بلند رکھنے کے لئے اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتیں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ تین چار افراد سے اتنی دیر باتیں کر کے نیند تو اُچاٹ ہو گئی لیکن دل پہلے سے کچھ زیادہ مطمئن سا ہو گیا۔ میں نے تکیے میں منہ چھپایا تو چند منٹ بعد دوبارہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

دوسرے روز میں آفس میں بے حد مصروف تھا کہ مارکیٹنگ منیجر نے فون کر کے بتایا "سر! وہ ایک نوجوان ہے نا ۔۔۔ محسن علی۔ جسے آپ کی خصوصی ہدایت پر یہاں پیکنگ سپروائزر کے طور پر ملازم رکھا گیا تھا' وہ کئی دن سے آپ سے ملنے کے لئے بے چین ہے۔ کوئی دفتری مسئلہ ہوتا تو میں حل کر دیتا۔ لیکن وہ کہتا ہے کہ کوئی پرسنل کام ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ جب میں نشاط عرف بے بی کے قتل کے سلسلے میں سراغ کی تلاش میں رائل پارک کی ایک بلڈنگ میں گیا تھا تو دُبلا پتلا سانولا سا یہ نوجوان مجھے سیڑھیوں میں مل گیا تھا۔ وہ ایک تلخ اور حساسیّت زدہ نوجوان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی باتوں نے مجھے کچھ متاثر کیا تھا۔ غربت اور بے روزگاری کی تلخیوں کا مارا ہوا تھا۔ میں نے اسے اپنے ہاں رکھوا دیا تھا اور بھول گیا تھا۔ آج مارکیٹنگ منیجر نے ذکر کیا تھا تو مجھے وہ سارا واقعہ اور اس نوجوان کی باتیں یاد آگئی تھیں۔

...ہے' لنچ کے بعد ڈھائی بجے اسے بھیج دینا۔ میں کوشش ...پانچ دس منٹ اس کے لئے نکال سکوں۔" میں نے

...بجے محسن علی میرے کمرے میں آیا تو یہ دیکھ کر مجھے ...وہ پہلے سے بہت بہتر اور نکھرا نکھرا دکھائی دے رہا ...بہتر تھا' صحت بھی پہلے سے بہتر تھی۔

...ت ہے محسن علی؟" میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ...ہ سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟ کیا تم یہاں خوش ...واہ اچھی نہیں مل رہی یا ڈیوٹی وغیرہ سخت ہے؟"

...ایسا ہی کوئی مسئلہ ہوتا سر!" اس کے لہجے میں ایک ...راب تھا "مجھے امید ہے کہ ایسا کوئی مسئلہ ہوتا تو بہت ...ہو جاتا۔ اس کے لئے مجھے آپ کے پاس آنے کی ...پڑتی۔ تنخواہ میری توقعات سے بہت زیادہ مل رہی ہے ...ے اندازوں سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اب یہ کوئی ...ہے سر۔ کہ آدمی ایک رجسٹر لے کر کھڑا رہے اور صرف ...ہے کہ پیکر ہر کارٹن میں چیز صحیح انداز میں اور صحیح تعداد ...ہے ہیں یا نہیں۔ بس ۔۔۔ یہ دیکھ کر ہر کارٹن پر مہر لگانا میرا ...

...ر تم کس لئے آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

...کری کا اظہار کرنے کے لئے سر؟" وہ سنجیدگی سے بولا۔

...ت خوب!" میں دھیرے سے ہنس دیا۔

...ان بہت ناشکری مخلوق ہے سر!" وہ اپنے مخصوص دھیمے ...لا۔ اس کی آنکھوں میں وہی پرانی' خفیف سی اداسی بھی ..."جب انسان بے کار ہوتا ہے ۔۔۔ بھوکوں مر رہا ہوتا ہے ...ب سے بڑا مسئلہ روزگاری ہوتا ہے۔ پیٹ اس کے لئے ...بڑا عفریت ہوتا ہے۔ لیکن جب پیٹ بھر جاتا ہے تو اسے ...اہشوں کے عفریت ستانے لگتے ہیں۔"

...سئلہ کیا ہے؟" میں نے اسے بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

...پ بات کو ۔۔۔ اور انسانی احساسات کو سمجھنے والے ...ں سر! امید ہے میری بات کو بھی سمجھنے کی کوشش کریں گے ...میں ہوں گے۔ وہ۔ دراصل میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے ...بننے سے بچالیں۔ میں صرف رجسٹر پکڑ کر کھڑا ہونا اور ...ا پر مہریں لگانا نہیں چاہتا۔ میں کوئی اہم کام کرنا چاہتا ہوں ...، میرے اس دبلے پتلے جسم اور میری آنکھوں میں پھیلی ...ی کو نہ دیکھیں' میرے اندر کوئی شعلہ سا مقید ہے جو پہلے ...گاری کی برف تلے دبا ہوا تھا۔"

...ں خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے مضطربانہ ...ں پہلو بدلتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا "آپ کوئی اہم ...ے سپرد کر کے دیکھیں سر! کوئی ایسا کام جسے کرتے ہوئے ...دس ہو کہ ہاں واقعی میں کوئی کام کر رہا ہوں۔ ضروری نہیں کہ وہ دفتری نوعیت کا ہی کام ہو۔ آپ کوئی بھی کام میرے سپرد کر سکتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کر کے دکھاؤں گا۔"

پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔ بے تابانہ لہجے میں بولا "یہ مت سمجھئے گا کہ میں زیادہ تنخواہ حاصل کرنے کے لالچ میں آپ کے پاس یہ فریاد لے کر آیا ہوں۔ تنخواہ تو میرے لئے بس اتنی ہی کافی ہے جس سے جسم و جاں کا رشتہ اور سفید پوشی قائم رہ سکے۔ اس سے زیادہ کا مجھے لالچ نہیں۔ تنخواہ آپ میری بے شک یہی رہنے دیجئے جو میں لے رہا ہوں۔ بلکہ اس سے کم بھی ہو جائے تو مجھے کوئی پروا نہیں سر! آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟" اس نے التجائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

میں نہ صرف اس کا مطلب سمجھ رہا تھا بلکہ دل ہی دل میں اس کے بارے میں فیصلہ بھی کر چکا تھا۔ اس قسم کے نوجوانوں کی تو ہمیں ہر وقت ضرورت رہتی تھی۔ لیکن کیا وہ میرے لئے اتنا ہی وفادار' اتنا ہی جاں نثار اور اتنا ہی بے خوف ثابت ہو سکتا تھا جتنا میں اسے دیکھنا چاہتا تھا؟ اس سلسلے میں فی الحال میں اس کے بارے میں زیادہ پُریقین نہیں تھا۔ خیر۔ یہ تو وقت آنے پر دیکھا جاتا۔

"تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یس سر! کافی اچھی آتی ہے کیونکہ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے سیکھی تھی۔ معاش کے لئے ایک زمانے میں یہ پیشہ بھی اختیار کرنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر وہ ٹیکسی ڈرائیور اپنے گاؤں واپس چلا گیا اور یہ معاملہ بھی درمیان میں رہ گیا۔ کوئی اور ٹیکسی چلانے کے لئے نہیں مل سکی۔"

"اور کوئی ہتھیار وغیرہ استعمال کرنے کی کچھ شدبد ہے؟ خنجر ۔۔۔ پستول ۔۔۔ ریوالور ۔۔۔ رائفل یا ہلکی مشین گن وغیرہ؟ معرکہ آرائی سے ڈرتے تو نہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس کی آنکھوں میں شکوک کے سائے رینگ آئے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "ڈرو مت۔ میں تمہیں چوری' ڈاکے یا اغوا وغیرہ کی مہمات پر بھیجنے کا ارادہ نہیں کر رہا۔ میرا اس قسم کا کوئی "سائڈ بزنس" نہیں ہے۔ میں تمہیں ایک شخص کی تلاش پر مامور کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا کوئی سراغ نہیں ہے میرے پاس۔ وہ بس یونہی کبھی ادھر اُدھر پھرتے' آوارہ گردی کرتے تمہیں کہیں بھی نظر آسکتا ہے۔"

اب اس کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا ہوئی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن وہ ہے بہت خطرناک آدمی۔ تم جیسے شریف اور عام سے آدمی کو تو چٹکی میں مسل سکتا ہے۔ انتہائی خطرناک قسم کا جرائم پیشہ شخص ہے۔ دوسرے کئی آدمی بھی اسے تلاش کر رہے ہیں جو اس قسم کے آدمیوں سے نمٹنے کے ماہر ہیں لیکن شاید اسے تلاش کرنا اور قابو میں کرنا تم جیسے عام' شریف اور اناڑی نوجوان کے مقدر میں لکھا ہو۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ

تمہارے اندر جو شعلہ مقید ہے وہ تمہیں کیا کچھ کر گزرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔"

"میں ضرور اس کام میں قسمت آزمائی کر کے دیکھوں گا سر!" وہ پُرجوش سے لہجے میں بولا "دست بہ دست لڑائی میں تو میں کسی سے نہیں ڈرتا۔ اپنے سے کئی گنا طاقتور انسانوں سے بھی نہیں ڈرتا۔ کیونکہ بے روزگاری اور مسلسل ناکامیوں کی وجہ سے میرے اندر جھنجلاہٹ اور غصے کا ناگ چپکے چپکے بس گھولتا رہا ہے۔ آپ کو شاید اندازہ ہی ہو کہ نفرت کا زہر انسان کو اندر ہی اندر بہت طاقتور بنا دیتا ہے' خواہ اس کا جسم کتنا ہی کمزور ہو۔"

محسن علی خود اپنا تجزیہ بھی عمدگی سے کر سکتا تھا۔ وہ صرف اپنا ہی نہیں بلکہ عمومی انسانی نفسیات کا اصول بیان کر رہا تھا۔ وہ اپنی مزید ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے بولا "اب یہ تو استعمال کرنے والے پر منحصر ہے کہ وہ ہم جیسوں کے سینے میں مقید اس آتش فشاں کی توانائی کو فولاد پگھلانے اور نت نئے سانچوں میں ڈھالنے کے لئے استعمال کرتا ہے یا دوسروں کا گھر جلانے کے لئے۔"

پھر ایک لمبے توقف سے وہ بولا "اگر کوئی میری ذرا سی مدد کرے تو میں دو چار دن میں ہی ہر چیز کا استعمال اچھی طرح سیکھ لوں گا۔ میں کچھ بھی سیکھنے کے معاملے میں غبی نہیں ہوں۔"

"ٹھیک ہے..... یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس کا بندوبست ہو جائے گا۔" میں نے کہا "میں چاہتا تو تمہیں دفتر میں ہی یا اپنے کسی کارخانے وغیرہ میں زیادہ مشکل اور زیادہ تھکا دینے والے کام پر لگا دیتا جس میں تمہیں سر کھجانے کی بھی فرصت نہ ملتی۔ لیکن مجھے معلوم ہے' تم دو چار دن میں اس سے بھی اکتا جاتے۔ تمہاری روح اصل ایڈونچر مانگ رہی ہے۔"

"مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ صرف آپ میری بات سمجھ سکیں گے سر!" وہ پہلے سے زیادہ پُرجوش لہجے میں بولا "اسی لئے میں نے آپ کے پاس آ کر اپنا مسئلہ بیان کرنے کی جرأت کر لی۔ آپ کی جگہ کوئی اور باس ہوتا تو میری باتوں کو حقیقتاً صرف ناشکری کی پیداوار سمجھ کر مجھے کان سے پکڑ کر نکال باہر کرتا۔ اچھا..... تو سر! اگر وہ شخص نظر آ جائے تو مجھے کیا کرنا ہے؟"

"تمہیں دو تین ایڈریس دیئے جائیں گے۔ کسی بھی طرح اس شخص کو قابو میں کر کے ان میں سے کسی ایڈریس پر پہنچانا ہے۔ یہ خیال رہے کہ آدمی مرنے نہ پائے' مجھے وہ زندہ حالت میں چاہئے۔ اب تم اسے کس طرح قابو میں کرو گے' موقع محل کی مناسبت سے کیا طریقۂ کار اختیار کرو گے' یہ سوچنا تمہارا کام ہے۔"

"بالکل ٹھیک ہے سر!" وہ مستعدی سے بولا۔ بہت خوش نظر آ رہا تھا۔ شاید اسے قطعاً توقع نہیں تھی کہ اس کے تمام تر اناڑی پن کے باوجود کوئی اہم مہم اس کے سپرد کر دی جائے گی۔ میرے لئے گو کہ یہ مہم کوئی ایسی اہم بھی نہیں تھی لیکن اسے دینے کے لئے فی الحال یہی ایک "ٹیسٹ کیس" میرے ذہن میں آیا تھا۔

وہ بالکل اناڑی اور معصوم تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ اے ن کے ہاتھوں محض ایک سیکنڈ میں مارا بھی جا سکتا تھا لیکن اس نے میں شعلہ مقید ہونے کی بات کی تھی اور سینے میں شعلہ مقید والوں کا امتحان میں اسی طرح لینے کا قائل تھا۔ اگر وہ واقعی اے ن کے مقابلے میں محض اپنے جذبے کی بدولت کچھ کر گزرتا تو ایک تجربہ ہی اسے یکدم کندن بھی بنا سکتا تھا۔ اگر اسے "رگڑا" لگ جاتا تب بھی وہ بہرحال بہت کچھ سیکھ سکتا تھا۔ بے تاب اور پُرجوش امیدوار جو بہت جلد تیراکی سیکھنا چاہتے ہوں' ان کے لئے میری نظر میں تو مناسب طریقہ یہی تھا کہ اسے کھلے سمندر میں دھکا دے دیا جائے۔ میرے تجربے کے مطابق اس بات کا بہت کم امکان ہوتا تھا کہ وہ ڈوب جائے۔

میں نے دراز سے اے ن کی ایک کوارٹر سائز کی تصویر نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ ہے وہ شخص جسے تلاش کرنا ہے۔"

تصویر کو دیکھتے ہی جیسے اس کا سارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ شاید اسے یہ گمان بھی گزرا ہو کہ میں اس سے مذاق کر رہا ہوں۔ اے ن کو تو روبرو دیکھنے سے بھی کچھ اچھے تاثرات مُرتب نہیں ہوتے تھے جبکہ یہ تصویر تو ویسے ہی عمدہ نہیں تھی۔ اگر اسٹوڈیو میں کھینچی گئی ہوتی تب تو شاید فوٹوگرافر' اے ن کی تمام تر مضحکہ خیزی کے باوجود اس میں بھی اسکرین پر پیش کرنے کی اپنی سی کوشش کرتا۔ لیکن یہ تو محض سیکیورٹی کے لئے میں استعمال ہونے والے کیمرے سے اس کی لاعلمی میں اتفاقاً کھینچی گئی تھی۔ اس میں تو اے ن تقریباً بندر ہی معلوم ہو رہا تھا۔

میں محسن علی کے تاثرات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا "سر! اسے آپ انتہائی خطرناک آدمی کہہ رہے ہیں؟ اسے قابو میں کرنے کے لئے آپ نے بہت سے لوگوں کی ڈیوٹی لگائی ہے؟" اس نے تصویر کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میرے لئے تمہارا ردِعمل غیر متوقع نہیں ہے۔ ہر عام آدمی کا ردِعمل یہی ہو گا۔ لیکن اگر تم خاص آدمی بننا چاہتے ہو تو لوگوں کے ظاہری سراپا کے اندر چھپے ہوئے اصل انسان کو پہچاننے کا ہنر سیکھنے کی کوشش کرو۔ صرف ظاہری شکل و صورت یا ظاہری رویہ دیکھ کر کسی کے بارے میں حتمی رائے قائم کرنے کی کوشش مت کرنا۔"

"یس سر!" وہ یکدم بدلے ہوئے سے لہجے میں بولا "میں معذرت چاہتا ہوں۔ میں ایک لمحے کے لئے بھول گیا تھا کہ اس شخص کے بارے میں مجھے آپ بتا رہے ہیں۔ اور جب آپ بتا رہے ہیں تو پھر ٹھیک ہی بتا رہے ہوں گے۔"

"میں اس لئے بھی تمہیں اس کے بارے میں زیادہ اچھی طرح خبردار کر کے میدانِ عمل میں بھیج رہا ہوں کہ مجھے تمہاری زندگی عزیز ہے۔" یہ کہہ کر میں نے ایک چھوٹی سی چٹ پر ایک فون نمبر لکھا اور نیچے صرف ایک جملہ لکھا "بچے کو تیرنا سکھاؤ۔"

چٹ میں نے محسن علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس نمبر پر فون کرنا۔ جو آدمی فون ریسیو کرے گا اس سے کہیں ملاقات کا وقت طے کرنا اور یہ چٹ اسے دے دینا۔ وہ تمہیں گاڑی اور ہتھیار دے گا۔ نیز چند دن میں جتنا کچھ سکھانا ضروری ہو گا وہ سکھا دے گا۔ بہت مختصر سی تربیت ہو گی۔ اپنی اصل تربیت تو تم خود ہی کرو گے یا پھر حالات تمہیں بہت کچھ سکھا دیں گے۔ لیکن تربیت کے دوران بھی اگر تمہیں یہ بندر نما شخص کہیں نظر آ جائے تو تمہیں اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش ضرور کرنی ہے یا ہمیں اطلاع کرنی ہے۔ ہمیں اطلاع دینے کے طریقے بھی تمہیں یہی شخص سمجھا دے گا۔" میں نے چٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں سر!" وہ یوں خوش نظر آ رہا تھا' جیسے من کی مراد پوری ہو گئی ہو۔ مجھے اس نوجوان میں ٹیلنٹ نظر آ رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ جوہڑ کا یہ کچھوا کھلے پانیوں میں جا کر اپنی جون بدل لے گا۔

"اب تم جا سکتے ہو۔" میں نے کہا اور وہ شکریہ ادا کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔

اچانک اسے گویا کچھ یاد آیا اور رکتے ہوئے بولا "سر! میرے موجودہ فرائض کون انجام دے گا؟"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ لوگ آتے رہتے ہیں' جاتے رہتے ہیں' ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہتے ہیں۔ اتنے بڑے سیٹ اپ میں ایک پیکنگ سپروائزر کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ صرف اپنے ڈیپارٹمنٹ کے انچارج کو مطلع کرتے جانا کہ تم میری ہدایت پر کسی اور کام پر جا رہے ہو۔"

اس کے جانے کے بعد شام تک میں بے حد مصروف رہا۔ کاروباری معاملات بہت پھیلتے جا رہے تھے۔ ادھر چند دن کے لئے میرا لندن' امریکا کے چند شہروں اور ٹورانٹو کے دورے پر جانا بہت ضروری ہو رہا تھا لیکن میں اس کا بھی کوئی شیڈول نہیں بنا پا رہا تھا۔ ادھر ریڈ ڈاٹ میری جان کو آئی ہوئی تھی۔ ادھر راحیلہ' طاہرہ خانم اور ستارہ کے ساتھ میرے وعدے وفا ہونے کی نوبت نہیں آ رہی تھی۔

حالانکہ میں نے کام کو اتنے بہت سے خود مختار شعبوں میں بانٹ رکھا تھا' اتنے آدمی آزادانہ طور پر الگ الگ میرے کاروبار کو چلا رہے تھے۔ اس کے باوجود مصروفیات میرے اعصاب پر سوار ہونے کی کوشش کر رہی تھیں' جو میں ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنے اعصاب کو ہر بوجھ سے آزاد رکھنا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس جوانی سے ہی تفکرات اور مصروفیات اس طرح مجھ پر سوار ہو جائیں کہ ادھیڑ عمری تک میرے ہاتھوں میں لرزہ آ جائے' آنکھوں سے وحشت ٹپکنے لگے اور خواب آور گولیوں کی مدد سے بھی نیند آنی بند ہو جائے۔ یہ دولت اور کاروبار کا چکر کچھ ایسا ہی طلسماتی قسم کا تھا۔ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا تھا اور یہ اسے جکڑ کر کہیں سے کہیں لے جاتا تھا۔ انسان سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس شکنجے سے نہیں نکل پاتا تھا۔ اسے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اعصاب جواب دے رہے ہیں' بوجھ اس کی برداشت سے باہر ہو رہا ہے' اس کا دماغ چٹخنے کو ہے۔ مگر وہ اپنا بوجھ کم کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ جنہیں وہ بوجھ کم کرنے کے لئے اپنے قریب لانے کی کوشش کرتا ہے وہ خود الٹا اس پر مزید بوجھ بن جاتے ہیں۔

میں آفس سے نکلا تو رات کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ آج رات بڑی صاحب کے ہاں پارٹی تھی اور میں کئی روز پہلے اس میں آنے کی ہامی بھر چکا تھا۔ بڑی صاحب بھی بہت بڑے امپورٹر ایکسپورٹر تھے۔ کنسٹرکشن کا بزنس بھی تھا۔ انگریزی فلمیں بھی امپورٹ کرتے تھے اور فلمسازی میں سرمایہ کاری بھی کرتے تھے۔

چونکہ فلمی شعبے سے کسی نہ کسی حد تک ان کا تعلق تھا' اس لئے مجھے اندیشہ تھا کہ ان کی پارٹی میں ستارہ بھی موجود نہ ہو۔ فلمی دنیا سے جن کا بھی کچھ نہ کچھ قابلِ ذکر تعلق ہوتا تھا' فلمی ہیروئنوں کے بغیر تو ان کی پارٹیاں مکمل ہی نہیں ہوتی تھیں۔ اب عالم یہ تھا کہ دو چار دن کے لئے میں ستارہ کا سامنا بھی نہیں کرنا چاہ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ اگر وہ پارٹی میں ٹکرا گئی تو وہی شکوے گلے ہوں گے اور وہی طنز کے تیر۔ اور اگر کہیں بدقسمتی سے وہاں طاہرہ خانم بھی موجود ہوئی تو صورتِ حال میرے حق میں کچھ عجیب سی ہو جائے گی۔

طاہرہ خانم آندھی طوفان کی طرح مجھ پر چھانے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ ویسے بھی بہت کھلی ڈلی عورت تھی۔ تکلفات رکھنے کی تو قائل نہیں تھی۔ اگر وہ بھی بڑی صاحب کی پارٹی میں ٹکرا جاتی تو نہ جانے اس کا رویہ کیا ہوتا اور ستارہ اسے دیکھ کر کیا تاثر لیتی۔ میں اس کشمکش کا نشانہ بننا نہیں چاہتا تھا۔

لیکن مجھے رات کم از کم بارہ بجے تک وقت بھی گزارنا تھا اور

یہ وقت بھی ایسا تھا کہ کاروباری مصروفیات میں استعمال نہیں ہوسکتا تھا۔ پرنس تمینہ نے مجھے ہوٹل کے تہ خانے میں لانڈری روم کے قریب ملنے کے سلسلے میں یہی لکھا تھا کہ میں اس کے شو کے بعد وہاں اس کا انتظار کروں' اس کا مطلب یہی تھا کہ مجھے رات ایک بجے کے قریب ہی وہاں جانا چاہئے تھا۔

چنانچہ گھر پہنچ کر دوبارہ تیار ہونے کے بعد میں وقت گزاری کے لئے ڈرتے ڈرتے بڑی صاحب کے ہاں پارٹی میں چلا ہی گیا۔ غنیمت تھا کہ وہاں ستارہ اور طاہرہ خانم دونوں ہی مدعو ہونے کے باوجود نہیں آئی تھیں۔ البتہ اور بہت سے چاند چہرے ستارہ آنکھیں موجود تھیں۔ مہربان چہرے بھی تھے اور حد سے زیادہ مہربان آنکھیں بھی۔ لیکن میرا ذہن ادھر اُدھر پھنسا ہوا تھا۔ بہرحال وقت بہت اچھا گزرا۔

رات بارہ بجے میں بڑی صاحب کی طویل و عریض حویلی نما جگمگاتی کوٹھی سے نکل آیا۔ پارٹی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی تاہم اِکا دُکا مہمان رخصت ہونے شروع ہو گئے تھے۔

روانہ ہونے سے پہلے میں نے گلی میں کھڑی ہوئی اپنی کار میں بیٹھ کر ٹونی سے رابطہ قائم کیا اور اسے سچویشن سمجھاتے ہوئے بتایا کہ میں کہاں' کس سے ملاقات کے لئے جا رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پرنس تمینہ سے ملاقات کے دوران یونہی احتیاطاً دور کہیں ٹونی کو موجود رہنا چاہئے تھا۔ پرنس کا پیغام میرے لئے کوئی چال بھی ہوسکتا تھا۔ گو کہ میری نامعلوم حس مجھے اس سلسلے میں کسی دھوکے سے خبردار نہیں کر رہی تھی لیکن پھر بھی احتیاط بہتر تھی۔

ٹونی پوری بات سمجھنے کے بعد بولا "ٹھیک ہے سر! میں آپ کو یا پرنس کو نظر نہیں آؤں گا لیکن میں آس پاس کہیں نہ کہیں موجود ہوں گا۔"

سلسلہ منقطع کرنے کے بعد بھی میں کچھ دیر تک گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ فضا میں خنکی تھی اور اوس سے بھیگی ہوئی ہوا خوشگوار محسوس ہو رہی تھی۔ آخر کار میں نے کھڑکی کا شیشہ چڑھایا' گاڑی اسٹارٹ کی اور ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

میں جب ہوٹل پہنچا تو ڈانس شو ختم ہوا ہی تھا۔ بیشتر لوگ رخصت ہوچکے تھے۔ سناٹا سا چھانے لگا تھا۔ رات گئے تک ہوٹل کی رونق شو کے دم سے ہی تھی۔ شو ختم ہوتے ہی سکوت سا چھانے لگتا تھا۔ تھوڑی بہت رونق کافی شاپ یا پھر بینکوئٹ ہال میں باقی رہ جاتی تھی۔

گاڑی پارکنگ لاٹ میں چھوڑ کر میں ٹہلنے کے سے انداز میں صدر دروازے کے سامنے سے گزر کر عمارت کے دوسری طرف پہنچا جہاں ڈھلوان کشادہ راستہ تہ خانے کی طرف جا رہا تھا۔ تہ خانے کے داخلے کا راستہ بہت بڑے گیرج سے مشابہ تھا۔ اس میں کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اندر کئی شعبے تھے۔ ان کے الگ الگ دروازے تھے۔ دو تین بڑے بڑے اسٹور روم تھے جن میں کھانے پینے کے سامان سمیت تمام فاضل چیزوں کا اسٹاک رکھا جاتا تھا۔ ایک کونے میں بڑا سا لانڈری روم تھا جہاں واشنگ اور ڈرائی کلیننگ کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔

اس وقت وہاں روشنی برائے نام تھی۔ سب دروازے مقفل تھے۔ میں نے تہ خانے کا چکر لگایا۔ کہیں کوئی موجود نہیں تھا۔ یہاں کا فرش خاصا گندا اور چکنا تھا۔ باہر آنے تک میرے جوتوں کے تلے چپ چپے ہوچکے تھے۔ میں نے انہیں باہر پختہ روش پر رگڑ کر صاف کیا اور نسبتاً اندھیرے میں ایک طرف ٹرالیوں کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔

رات کے اس پہر اس طرف شاذونادر ہی کوئی آتا تھا۔ شو ختم ہوئے چند منٹ گزر چکے تب تو ہوٹل کی مین بلڈنگ کی طرف بھی سناٹا چھانے لگا۔ سامنے کافی فاصلے پر عمارت کے کونے پر ایک پول پر لگا ہوا آرائشی گلوب دھندلی دھندلی' زرد سی روشنی بکھیر رہا تھا۔ میں کچھ زیادہ پُریقین نہیں تھا کہ پرنس تمینہ آئے گی۔ رات کو اس وقت اسے ہوٹل کے ایک نیم تاریک اور ویران گوشے کی طرف جاتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے راستے میں کتنے لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوتی۔ لابی میں تو اس وقت بھی خاصے لوگ بیٹھے ہوتے تھے' جو راتوں کو الوؤں کی طرح دیر تک جاگتے تھے اور صبح دیر تک سوتے تھے۔ اس کے علاوہ میرا خیال تھا کہ کمال نے سن سائے کی طرح پرنس کے ساتھ لگا رہتا تھا۔ اس سے وہ کیسے جان چھڑا سکتی تھی؟ یہ باتیں پہلے بھی میرے ذہن میں تھیں' اس کے باوجود میں نہ جانے کس طرح چلا آیا تھا۔

مجھے وہاں کھڑے خاصی دیر گزر گئی۔ پرنس تو نہ آئی البتہ مجھے مایوسی کی آہٹ سنائی دینے لگی۔ لیکن مجھے یاد تھا کہ اس نے خود بھی اپنے پیغام میں اس بات کا امکان ظاہر کردیا تھا کہ شاید وہ نہ آسکے۔ اس صورت میں اس نے دوسرے روز اسی وقت اسی جگہ مجھے دوبارہ انتظار کرنے کے لئے کہا تھا۔ لیکن مجھے آج ہی کچھ دیر اس طرح گزار کر احساس سا ہوگیا تھا کہ کسی معیوب سی جگہ پر کھڑے ہو کر چوروں کی طرح انتظار کرنا ۔۔۔ اور وہ بھی بے یقینی کے عالم میں انتظار کرنا واقعی بڑا تکلیف دہ مسئلہ تھا۔

عین اس وقت جبکہ میں وہاں سے ہٹنے اور واپس جانے کا ارادہ کر رہا تھا' عمارت کے کونے سے گلوب کی دھندلی روشنی میں ایک عورت مجھے بیس منٹ کے ڈھلوان راستے پر آتی دکھائی دی۔ وہ ہوٹل ہی کی کوئی ہاؤس میڈ تھی۔ میڈ کے یونیفارم میں تھی۔ یونیفارم میں دوپٹا بھی شامل تھا جسے اس نے چہرے پر کچھ زیادہ ہی آگے تک جھکایا ہوا تھا۔

موڑ مڑتے ہی چونکہ روشنی اس کے عقب میں رہ گئی تھی اس لئے میں اسے سامنے سے صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن خدوخال سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک اسمارٹ میڈ تھی۔ ورنہ بیشتر ہاؤس میڈز گھروں میں کام کرنے والی ماسیوں سے ذرا ہی بہتر دکھائی نہیں۔ ان میں شاذونادر ہی کوئی اسمارٹ اور خوش شکل ہوتی [illegible] شاید کسی مجبوری کی وجہ سے ہی اس معمولی نوکری میں آتی [illegible] تھی۔

[illegible] راستہ ڈھلوان ہونے کے باوجود وہ بڑے نپے تلے قدم اٹھاتی [illegible] میری طرف آرہی تھی۔ اس کی چال میں شاخِ گل کا سا لہراؤ [illegible] لچک تھی۔ میں شاید ابھی اسے نظر نہیں آیا تھا۔ وہ متلاشی سی [illegible] وں سے ادھر اُدھر دیکھتی آرہی تھی۔

دن میں تو عام طور پر میڈز کمروں میں بستروں کی چادریں اور [illegible] روم میں تولیے وغیرہ تبدیل کرنے کے بعد ایک ٹرالی میں بھر کر [illegible] ل کی لانڈری شاپ پر دینے کے بجائے براہ راست لانڈری روم [illegible] لے آتی تھیں لیکن رات کو اس وقت یوں بازو پر کچھ کپڑے [illegible] لٹکا کر کسی میڈ کا اس طرف آنا کسی کو قدرے عجیب لگ سکتا [illegible] مگر پھر بھی اس کی آمد پرنس تمینہ کی آمد سے بہرحال کم توجہ [illegible] صل کرتی۔ پرنس خود نہیں آسکی تھی لیکن اس نے شاید میڈ [illegible] کے ہاتھ کوئی پیغام بھیجا تھا۔

وہ جب روشنی کی رسائی سے کافی آگے تقریباً اندھیرے میں [illegible] ئی تو اس نے چہرے پر ڈھلکا ہوا آنچل ذرا پیچھے کرلیا اور آنکھیں [illegible] پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا۔ مجھے حیرت کا ہلکا سا جھٹکا لگا۔ وہ [illegible] دراصل پرنس تمینہ ہی تھی۔ اس وقت اس کا چہرہ میک اپ سے [illegible] بالکل بے نیاز تھا لیکن پھر بھی کم از کم مجھے اس سے بہتر لگ رہی تھی [illegible] جیسی وہ پورے اسٹیج میک اپ کے ساتھ تیز اور رنگا رنگ [illegible] روشنیوں میں نظر آتی تھی۔

میں دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ وہ ابھی تک مجھے نہیں دیکھ سکی تھی۔ میں دراصل یہ اطمینان کر رہا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے تو نہیں آرہا۔ لیکن اس کے پیچھے آنا تو درکنار' ابھی تک کسی نے عمارت کے کونے سے جھانکا بھی نہیں تھا۔

آخر کار اس نے تھوڑا اور آگے آکر سرگوشی کے انداز میں پکارا "راہی!"

ایک لمحے کے لئے میری دھڑکنیں بے ترتیب سی ہوگئیں۔ یہ لہجہ تو میرے لئے شناسا سا تھا۔ آواز گو کہ سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی پھر بھی مجھے پرنس تمینہ کی آواز سے بہت مختلف محسوس ہوئی تھی۔ اس نے بازو پر لٹکائے ہوئے کپڑوں کو تھکے تھکے اور بے زاری آمیز انداز میں ایک ٹرالی پر پھینک دیا۔

آخر کار میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا "میں یہاں ہوں۔"

وہ لپک کر ادھر آئی اور برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست کی طرح ملی۔ میرے اعصاب جھنجھنا اٹھے۔ کئی لمحے کی صبر آزما خاموشی کے بعد وہ میرے ہاتھ دیوانوں کی طرح اپنی آنکھوں پر ملتے ہوئے بولی "کتنی بے چین تھی میں تم سے ملنے کے لئے مگر تمہیں [illegible] سامنے دیکھ کر بھی نہیں مل سکتی تھی۔ حتیٰ کہ شناسائی کا اظہار بھی نہیں کرسکتی تھی۔ کیونکہ کچھ آنکھیں میری جانب نگراں ہوتی تھیں۔ الیکٹرانک آلات سے میری آواز ۔۔۔ میری ہر سرگوشی بھی کچھ کانوں تک پہنچ رہی ہوتی تھی۔"

"اب کیسے آئی ہو؟" میں نے اس کی مہکتی زلفوں کے قریب سرگوشی کی۔

"وہ پرانی ۔۔۔ بادشاہوں کے زمانے والی ترکیبیں آج کے دور میں بھی کام آجاتی ہیں۔" وہ پُرتعش لہجے میں بولی "معلوم نہیں یہ تاریخ کے معتبر حصے ہیں یا غیر معتبر' بہرحال کہیں پڑھا تھا کہ شہزادی کو محبوب سے ملنے جانا تھا ۔۔۔ کڑے پہرے تھے۔ آخر کار وہ اپنی جگہ کنیز کو سلا کر اس کے کپڑے پہن کر نکل گئی۔ میری جگہ اس وقت میرے شب خوابی کے لباس میں میڈ لیٹی ہوئی ہے۔" وہ ہولے سے ہنسی "آخر میں بھی تو شہزادی ہوں۔ پرنس تمینہ۔ جعلی ۔۔۔ بلکہ جعلی در جعلی پرنس ہی سہی کیونکہ اصل پرنس تو وہ بھی نہیں تھی جس کی میں نے جگہ لے رکھی ہے۔ اس نے بھی صرف نام کو زیادہ بھاری بھرکم' پُرکشش اور معززانہ بنانے کے لئے پرنس ساتھ لگایا ہوا تھا۔"

"مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ میں نے تمہیں پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی۔ صرف تمہاری آنکھوں نے مجھے بتادیا تھا کہ تم بنی ہو۔" میں نے کہا۔

"جب تم نے مجھے پہچانا تو میں بتا نہیں سکتی کہ کتنی مشکل سے میں نے اپنے اندر اٹھنے والے محسوسات کے طوفان کو دبایا۔ عجیب حالت ہوگئی تھی میری۔ مجھے یوں لگا کہ اس بھری پُری سفاک دنیا میں صرف تم ہی میرے دوست' میرے ہمدرد اور آشنا ہو۔ میرا دل چاہ رہا تھا' مٹی بن کر تمہارے پیروں میں بچھ جاؤں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔"

"خیر اب اتنی بھی انکساری ٹھیک نہیں تھی۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

"یہ انکساری نہیں تشکر تھا۔ محبت کا تشکر۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں تمہارے بارے میں کس طرح سوچتی تھی۔ کیا محسوس کرتی تھی۔ میں تو یہی سمجھتی تھی کہ میں تمہارے لئے راستے میں پڑے ہوئے تنکے سے بھی زیادہ حقیر ہوں۔ لیکن جب تم نے مجھے پہچانا' میرے لئے تشویش کا اظہار کیا تو مجھے احساس ہوا کہ تمہاری نظر میں میری کوئی اہمیت تھی' تم نے میرے بارے میں کچھ سوچا تھا' میرے بارے میں فکرمند ہوئے تھے۔ تب میں اندر ہی اندر اپنی نظر میں بہت اونچی' بہت معزز' بہت آبرومند ہوگئی۔"

"میری نظر میں تو ویسے بھی ہر آدمی اس وقت تک بہت اونچا' بہت معزز اور بہت آبرومند رہتا ہے جب تک وہ اپنی کسی حرکت اور عمل کے ذریعے اپنے آپ کو ذلیل اور ہیچ ثابت نہ کردے۔" میں نے کہا۔

"اوروں کی بات میں نہیں جانتی۔" وہ بولی "میں تو اپنی بات

کررہی تھی۔ میں تو ایک راندۂ درگاہ قسم کی عورت ہوں نا۔ چپکے چپکے دل میں تم سے پیار کرتی تھی لیکن تم سے ایک لفظ بھی کہنے کی جرأت اپنے اندر نہیں پاتی تھی۔ زمانہ اگر میرے روزوشب کا حساب کرنے بیٹھے تو مجھے طوائف' فاحشہ' بدچلن' آبروباختہ اور نہ جانے ایسے کون کون سے القابات سے نوازے۔ اور یہی بات یہ ہے کہ میں ان کی مستحق بھی ہوں۔ لیکن تمہارے سامنے آتی تھی تو میں اندر ہی اندر اپنے آپ کو سولہ سال کی معصوم اور اچھوتی لڑکی محسوس کرتی تھی۔ تم سے کچھ بھی تو کہنے کا حوصلہ نہیں پڑتا تھا۔ تم میرے لئے آسمان کی رفعتوں پر جھلملاتے ہوئے کسی بہت ہی روشن ستارے کی طرح تھے اور میں خود اپنی نظر میں زمین پر پھیلا ہوا کیچڑ تھی...."

میں عجیب سے انداز میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ ہنسی اپنے آپ پر تھی۔ نہ جانے کیا بات تھی.... اتفاق تھا.... یا میری اپنی لاشعوری طلب کا نتیجہ تھا کہ میری قسمت میں راندۂ درگاہ قسم کی عورتیں ہی لکھی تھیں۔ اس قبیل کی عورتیں بہت ہی تھوڑے وقت میں مجھ پر فریفتہ ہوجاتی تھیں۔ اور یہی بات یہ تھی کہ مجھے بھی کشش انہی میں محسوس ہوتی تھی۔ کچی عمر کی' کچے ذہن کی' چھوئی موئی سی نظر آنے والی لڑکیاں مجھے کبھی اپیل نہیں کرتی تھیں۔ دل ان کی طرف کھنچتا ہی نہیں تھا۔ شاید لڑکپن سے ہی دل و دماغ میں کوئی خرابی بیٹھ گئی تھی۔ شاید مجھ میں تاب انتظار نہیں تھی۔ بند دریچوں پر مدتوں دستک دیتے رہئے' تب کوئی پٹ کھلتا ہے اور پھر بھی کہہ نہیں سکتے اندر کتنی تھکن ہو' کتنے کمپلیکس ہوں۔ بے درو بام میدانوں میں سفر کے لئے تمہیدیں نہیں باندھنا پڑتیں' مدتوں دستکیں نہیں دینا پڑتیں۔ ان میں پیچ در پیچ راستے نہیں ہوتے۔ جو بات ہوتی ہے' سیدھی اور صاف ہوتی ہے۔

لڑکپن میں صرف راحیلہ ایک ایسی لڑکی تھی جو جنون بن کر ذہن پر سوار ہوئی تھی اور وہ راندۂ درگاہ قسم کی چیز نہیں تھی تیز طرار بہت تھی' بہت اونچی چیز تھی۔ لیکن سیپ سے نکلے ہوئے موتی کی طرح شفاف اور آبدار۔ اس سے تعلقِ خاطر کے دوران کبھی خواہشوں کے گھوڑے بے لگام نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اب وہ بھی ایک طلاق کی مار سہہ آئی تھی۔ لیکن کمبخت اب پہلے سے زیادہ اچھی لگنے لگی تھی۔ میرے ذہن میں کہیں نہ کہیں کوئی ٹیڑھ تھی ضرور۔ جب کسی کو دل سے اتر جانا چاہئے تھا اس وقت وہ دل میں کھب جاتی تھی۔

ہنی کہہ رہی تھی "اس وقت میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہی تھی جب تم نے مجھے پہچانا تھا۔ میری ماں بھی شاید اس بدلی ہوئی شکل اور اس روپ میں مجھے نہ پہچان پاتی جو دن رات کی محنت سے مجھے دیا جارہا تھا۔"

"ماں کے ذکر پر یاد آیا...." میں نے جلدی سے کہا "مجھے ان کی موت کا بہت افسوس ہوا تھا۔ کس نے قتل کیا تھا انہیں؟"

"انہیں قتل نہیں کیا گیا تھا۔" اس کے لہجے میں افسردگی آگئی۔ "یہ ایک افسوسناک اتفاق ہے کہ انہیں ریڈ ذاث والوں کی تحویل میں رہنے کے دوران ہی ہارٹ اٹیک ہوگیا۔ گوکہ ہمیں ایک دوسرے سے ملنے کی اجازت نہیں تھی لیکن رابطہ بالکل اس طرح تھا کہ میں کبھی کبھار انہیں چلتے پھرتے' اپنے چھوٹے موٹے کام کاج کرتے ٹی وی اسکرین پر بھی دیکھ سکتی تھی۔ ان سے بات بھی کرسکتی تھی۔ ان پر کوئی تشدد وغیرہ نہیں کیا جارہا تھا۔ انہیں وہ صرف مجھے بلیک میل کرنے کا ایک ذریعہ بناکر ساتھ لے گئے تھے۔ اگر میں ان کے ساتھ تعاون نہ کرتی تب وہ ضرور ان پر تشدد کرتے اور آخرکار انہیں مار ڈالتے۔"

"لیکن یہ قصہ کیا ہے....؟ مجھے سب کچھ شروع سے بتاؤ۔ بات سمجھ میں نہیں آرہی۔ تمہاری شکل بدل جانے کا کیا قصہ ہے؟ یہ ریڈ ذاث کیا ہے.... کون لوگ ہیں یہ؟ تمہیں کیوں اغوا کیا گیا تھا؟" یکدم ہی کئی سوالات میری زبان پر آگئے۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ ریڈ ذاث کیا ہے۔ میں نے بھی بس ان لوگوں میں رہنے کے دوران یہ نام ہی سنا ہے۔ بہرحال اپنے انداز و اطوار سے یہ کوئی تنظیم ہی لگتی ہے لیکن اس کا کوئی سرپیر میری سمجھ میں نہیں آیا۔" وہ بھی میرے قریب ہی دیوار سے لگ کر کھڑی ہوتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

"کیا مافیا قسم کی کوئی چیز ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مافیا کے بارے میں مجھے بہت زیادہ اور حقیقی معلومات تو نہیں۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "لیکن کہانیوں کتابوں میں جتنا کچھ پڑھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ریڈ ذاث شاید اس سے کہیں آگے کی کوئی چیز ہے۔ مافیا کا تو بس کچھ ایسا امیج ہے نا.... کہ بہت بڑی عالمگیر تنظیم ہے۔ بہت اونچے مقامات تک اس کے پنجے گڑے ہوئے ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر ان کی سرگرمیاں ناجائز تجارت' منشیات کے کاروبار اور اسلحے کی تجارت کی گرد ہی گھومتی ہیں اور اس سلسلے میں جتنی دہشت گردی کی ضرورت پیش آتی ہے وہ بے دریغ اس کا مظاہرہ کرتے ہیں۔"

"ہاں' تقریباً ایسا ہی معاملہ ہے۔" میں نے کہا۔

"لیکن ریڈ ذاث ہر معاملے میں اس سے بہت آگے معلوم ہوتی ہے۔" ہنی جھرجھری سی لے کر بولی "میرا خیال ہے میں اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جان پائی' کچھ بھی نہیں دیکھ پائی۔ اس کے باوجود میری عقل دنگ ہے۔ ان کا کیا سائنٹیفک طریق کار ہے.... کیا کیا ایجادات ہیں ان کے پاس۔ معلوم نہیں اس میں کس کس قوم کے لوگ شامل ہیں۔ یہ کہاں سے آئی ہے؟ اس کی جڑ کہاں ہے؟ اس کے مقاصد کیا ہیں؟ میں کچھ بھی نہیں جان سکی۔ اس کے باوجود ان کے اشاروں پر ناچنے پر مجبور ہوں۔"

میرے کان اس کی سرگوشی نما آواز پر لگے ہوئے تھے اور مجھے خون کی گردش کچھ تیز ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ اس نے یوں سانس لی کہ ذرا بھی آواز پیدا نہ ہونے پائے۔ پھر سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "اب یہی دیکھ لو کہ کاسمیٹک سرجری کے ذریعے شکل بدل گئی ہے۔ ایک ہفتے تک میرے چہرے پر کاسمیٹک سرجری کا عمل جاری رہا۔ صرف آنکھوں کو نہیں چھیڑا گیا کیونکہ یہ ویسی ہی تھیں جیسی انہیں مطلوب تھیں۔ اور انہی آنکھوں کی وجہ سے تم نے مجھے پہچان لیا۔" وہ اندھیرے میں میری طرف بڑے والہانہ سے انداز میں مسکرائی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "وہ ایک نہایت شاندار اور جدید ترین آپریشن تھیٹر تھا جہاں میری کاسمیٹک سرجری کی گئی۔ وہاں ایسے ایسے جدید آلات اور مشینری موجود تھی جن کے نام تک معلوم نہیں۔ اور شاید تم بھی ان کا تصور نہ کرسکو۔ لیکن مجھے یہ نہیں معلوم کہ وہ کاسمیٹک کلینک اور آپریشن تھیٹر تھا کہاں۔ میرے چہرے کی تبدیلی کا عمل مکمل ہونے اور کانوں کے پیچھے سرجری کے بعض نشانات درست ہونے میں ایک ماہ لگ گیا۔ اس کے بعد ایک ماہ تک میری برین واشنگ کی جاتی رہی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں اپنے ماضی کے کسی دوست' شناسا یا کسی بھی قسم کا تعلق رکھنے والے کو پہچانوں۔ اس مقصد کے لئے دوائیں' آلات' نفسیاتی حربے اور تمام جدید ترین ٹیکنیکس استعمال کرنے کے علاوہ مجھے ہپناٹائز بھی کیا گیا۔ ابتدا میں چند دن کے لئے واقعی میں اپنی یادداشت تقریباً کھو بیٹھی تھی لیکن اس بات کا شاید تمہیں بھی اندازہ نہ ہو کہ میں انتہائی مضبوط قوتِ ارادی کی مالک ہوں۔ میں مسلسل مزاحمت کرتی رہی۔ یوں مکمل برین واشنگ سے بچ گئی لیکن میں نے عافیت اسی میں محسوس کی کہ یہ بات ان پر ظاہر نہ ہونے دوں۔ ان کے سامنے میں واقعی ایسی بن گئی جیسے میرا برین مکمل طور پر واش ہوچکا ہے اور میں ان کے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلی بن چکی ہوں۔"

وہ اپنے اس کارنامے پر بہت خوش نظر آرہی تھی۔ مجھے اندھیرے میں بھی اس کی مسکراہٹ بڑی روشن محسوس ہوئی۔ یہ کام کتنا مشکل تھا' اس کا اندازہ تو حقیقتاً اسی کو ہوسکتا تھا جو اس تجربے سے گزر کر آرہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "پھر ایک مہینے تک مجھے پرنسس تہمینہ کے انداز میں نشست و برخاست اور اسٹیج شو پیش کرنے کی تربیت دی گئی جو میرے لئے زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔ کیونکہ میں بنیادی طور پر ڈانسر ہی تھی۔ یہ سب کام کہاں کہاں ہوتے رہے اور کون کون مرد اور عورتیں میرے پاس آتی رہیں' اس طرح کی کوئی بات مجھے نہیں معلوم۔ اس لئے اس سلسلے میں مجھ سے کوئی سوال نہ کرنا۔"

"لیکن یہ سوال تو میں کئے بغیر نہیں رہ سکوں گا کہ آخر وہ یہ سب تردد کس لئے کررہے تھے.... اور اس کے لئے ان کی نظرِ انتخاب تم پر ہی کیوں پڑی تھی؟" میں نے کہا۔

"ہاں.... اس سوال کا کچھ جواب تو میں نے مختلف لوگوں کی اُچٹتی ہوئی باتوں سے اخذ کیا ہے جو مختلف مواقع پر میرے کانوں میں پڑتی رہیں۔ دوسرے میں نے اپنے طور پر بھی کچھ اندازے لگائے ہیں۔ پرنسس تہمینہ تو واقعی اس دنیا میں موجود تھی۔ یہ تو تمہیں بھی معلوم ہوگا۔ وہ ایک ورلڈ کلاس ڈانسر اور ان کی آلۂ کار تھی۔ ان کے لئے بہت بڑے بڑے کام انجام دیا کرتی تھی۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں' کب اور کس طرح وہ ریڈ ذاث سے باغی ہوگئی۔ اس دوران وہ اپنی انفرادی حیثیت میں بھی خاصی طاقتور اور اپنی دانست میں اس پنجرے سے پرواز کرنے کے قابل ہوگئی تھی۔ لیکن پرواز کے آغاز میں ہی اسے ہلاک کردیا گیا۔ اس کی خوب صورت لاش کو نہ جانے کب بحرالکاہل کی مچھلیاں کھا چکی ہیں۔ نہایت خاموشی سے میں اس کی جگہ لے چکی ہوں۔ اسی کا پاسپورٹ' اسی کے کاغذات اور اسی کی تمام شناختی چیزیں میرے لئے استعمال ہورہی ہیں۔ لیکن ایک ایک پل میری نگرانی ہورہی ہے۔ میری ہر بات سنی جاتی ہے۔ اپنی ذرا ذرا سی حرکت کے لئے مجھے ہدایات ملتی ہیں اور میں انہی کے مطابق ہر قدم اٹھاتی ہوں۔"

"لیکن اس رات تم مجھے حسنہ کے نام سے ٹکرائی تھیں۔" میں نے یاد دلایا۔

"وہ میری بوکھلاہٹ کا نتیجہ تھا۔ اس وقت تھوڑی دیر کے لئے گویا ایک قسم کی ہنگامی صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔ قسمت کا عجیب تماشا تھا کہ مجھے ہر حال میں تم سے دور رہنے کی تلقین کی گئی تھی لیکن تم ہی اس تاریک گلی میں مجھ سے آن ٹکرائے۔ میں چند لمحے کے لئے ہدایات نہیں لے سکی تھی۔ میں نے اپنے ہی طور پر محسوس کیا کہ شاید ان مشکوک سے حالات میں میرا تم سے پرنسس تہمینہ کی حیثیت سے ملنا مناسب نہ ہو۔ تم نے اس حیثیت سے مجھے پہچانا بھی نہیں تھا۔ اس لئے فوری طور پر میں حسنہ بن گئی۔ یہ میری غلطی تھی۔ بعد میں مجھے بتایا گیا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں پرنسس تہمینہ کی حیثیت سے بھی اپنا تعارف کرادیتی تب بھی کوئی فرق نہیں پڑنا تھا لیکن بس وہ خواہ مخواہ بوکھلاہٹ میں ایک حماقت سرزد ہوگئی۔ مگر میری اس غلطی کو معاف کردیا گیا تھا کیونکہ ایک تو اس سے حالات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا' دوسرے میں تمہارے سامنے اس سے صاف ہی مکر گئی تھی۔ ان کے خیال میں بس اتنا ہی کافی تھا۔ انہوں نے اس معاملے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تھی۔ اصل اہمیت تو بس اس بلیک باکس کی تھی جو اُن کے ہاتھ میں آتے آتے پھر نکل گیا۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ زیادہ قصور اے ٹن کا تھا جو صحیح وقت پر مقررہ جگہ پر نہیں پہنچ

سکتا تھا جہاں مجھے باکس اس کے حوالے کرنا تھا۔"

"اس باکس کا کیا قصہ ہے؟ اس نے ریڈ ذاٹ کے ساتھ ساتھ مجھے بھی پریشان کر رکھا ہے۔ آخر اس میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔ صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ ہمارے ملک کے نہ جانے کن کن اہم آدمیوں کے ہاتھوں میں سے ہوتا ہوا آخر کار اس ریٹائرڈ ڈی آئی جی احمد شجاع کے پاس پہنچ گیا تھا۔ معلوم تو شاید اسے بھی نہیں تھا کہ اس میں کیا ہے لیکن اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ وہ بہت اہم چیز ہے اور اس کے لئے سر دھڑ کی بازیاں لگی ہوئی ہیں۔ اس نے اسے کہیں چھپا دیا تھا۔ احمد شجاع ایک کرپٹ آدمی تھا۔ پہلے اسے کسی ذریعے سے روپے کا لالچ دیا گیا لیکن نہ جانے کیوں وہ نہیں مانا۔ حالانکہ روپیہ اس کی کمزوری تھا۔ ہو سکتا ہے وہ دیکھنا چاہتا ہو کہ پیشکش زیادہ سے زیادہ کتنی اونچی جا سکتی ہے۔

بہرحال اس دوران ریڈ ذاٹ والوں نے اس پر دوسرا حربہ آزمانے کی کوشش کی۔ اس کی دوسری بڑی کمزوری عورت تھی۔ وہ ہوٹل میں پہلے دن میرا پہلا شو دیکھتے ہی مجھ پر فریفتہ ہو گیا تھا۔ بے باک اتنا تھا کہ اسی روز میرے میک اپ روم میں تنہائی میں پہلی ملاقات میں ہی اس نے مجھے پیشکش کر دی کہ جب تک میں پاکستان میں ہوں تب تک اگر میں اس کی داشتہ بن کر رہوں تو وہ مجھے کسی بھی بڑے سیٹھ سے زیادہ فائدے پہنچا سکتا ہے۔ اس نے مجھے گارڈن ٹاؤن میں وہ کوٹھی بھی تحفے میں دینے کی پیشکش کی جہاں میں تھوڑی دیر کے لئے تمہیں لے گئی تھی۔

مجھے جو ہدایات ملی ہوئی تھیں ان کے مطابق میں نے اس سے کہہ دیا کہ مجھے اس کی پیشکش قبول ہے مگر اس کے عوض مجھے کچھ بھی نہیں چاہئے، صرف وہ بلیک باکس میرے حوالے کر دے۔ وہ بڑا بدمعاش اور بڑا چکرباز تھا۔ بہرحال کسی نہ کسی طرح مان گیا۔ اس کی شرط تھی کہ کوئی تیسرا فرد اس معاملے میں ٹانگ نہیں اڑائے گا۔

ریڈ ذاٹ کے لئے وہ ایک مکھی سے زیادہ اہم نہیں تھا۔ اسے کسی وقت بھی ہلاک کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اندیشہ تھا کہ یہ راز وہ سینے ہی میں نہ لے جائے کہ اس نے بلیک باکس کہاں چھپایا ہوا ہے۔ بہرحال ــــ پروگرام طے ہو گیا کہ جونہی باکس وہ میرے حوالے کر دے گا میں اس کی دی ہوئی کوٹھی میں جا کر رہنا شروع کروں گی اور روزانہ شو ختم کرنے کے بعد وہیں جا کر رات گزارا کروں گی۔ اس نے کوٹھی کی چابیاں بھی مجھے دے دی تھیں۔

اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ حادثے میں مارا گیا۔ باکس وصول کرنے کے بعد اسے ویسے بھی ہلاک کر دیا جاتا تھا کیونکہ اس نے ریڈ ذاٹ والوں کا خاصا ناک میں دم کیا تھا۔ بہرحال اس رات حسب پروگرام میں شو ختم کرنے کے بعد اس کے ساتھ روانہ ہوئی۔ اس نے باکس اپنے خفیہ ٹھکانے سے نکال بھی لیا لیکن عین وقت پر نہ جانے کیوں اس کا ارادہ بدل گیا اور اس نے باکس مجھے دینے سے انکار کر دیا۔ مجھے داشتہ بنانے سے بھی کم از کم ظاہری طور پر اس کی دلچسپی ختم ہو گئی۔ اس کا ذہن بھی کسی شیطانی مشین کی طرح کام کرتا تھا۔ نہ جانے اس کے ذہن میں کیا منصوبہ آیا تھا۔

بہرحال ادھر ہمارا منصوبہ یہ تھا کہ اے ٹن بالکل غیر محسوس طور پر ہمارا تعاقب کرے گا تاکہ احمد شجاع کہیں بدک نہ جائے کہ اس کی نگرانی ہو رہی ہے۔ جونہی وہ باکس میرے حوالے کرے گا اے ٹن کسی بھی جگہ آگے آ کر وہ مجھ سے چھین لے گا اور احمد شجاع کا بھی قصہ ختم کر دے گا۔ مگر اس سارے پروگرام میں کسی طرح سے گڑبڑ ہو گئی۔ ادھر احمد شجاع کا ارادہ بدل گیا، ادھر اے ٹن وقت پر نہیں پہنچ سکا اور مجھے عین وقت پر کام بگڑتے دیکھ کر باکس کے لئے احمد شجاع سے باقاعدہ دھینگا مشتی کرنا پڑی۔ اور ادھر تم بیچ میں آن ٹپکے جس کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ یوں سب کچھ گڑبڑ ہو گیا اور ایک بار پھر وہ باکس نہ جانے کہاں غائب ہو گیا۔"

"اوہ ــــ" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ کچھ نہ کچھ گتھیاں تو کھلی تھیں لیکن معلومات کا سلسلہ ابھی چل رہا تھا۔

"وہ بات تو درمیان میں ہی رہ گئی ــــ" میں نے کہا "کہ انہوں نے تمہیں ہی پرنسس تہمینہ بنانے کا تردد کیوں کیا؟"

"ایک تو اس لئے کہ پرنسس تہمینہ بھی ایشیائی تھی اور میں بھی۔ اس کی اور میری رنگت، آنکھیں اور سراپا بالکل ایک جیسا تھا۔ میری اور اس کی تمام پیمائشیں تک ایک ہیں۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ میں بھی بنیادی طور پر ڈانسر تھی۔ انہیں میری شکل

میں درحقیقت صرف معمولی سی تبدیلیاں کرنی پڑیں جن سے زمین آسمان کا فرق پڑ گیا۔ میری شکل یکسر تبدیل ہو گئی۔"

"اور اب تم کیا کچھ کر رہی ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"مجھے ابھی کچھ زیادہ کام کرنے کا موقع نہیں ملا۔ بہرحال بڑے بڑے اہم سرکاری، غیر سرکاری لوگ اور بڑے بڑے سیٹھ میرے درِ دولت پر قطار در قطار حاضری دے رہے ہیں۔ مجھے ہدایات ملتی رہتی ہیں کہ فلاں سے تعلقات بڑھانے ہیں، فلاں سے رکھائی اختیار کرنی ہے۔ مزید ہدایات ملتی رہیں گی کہ کس کو کس طرح استعمال کرنا ہے، کس سے کیا کام لینا ہے، کس کو کس حد تک آگے آنے کی ہدایت دینی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

میں ابھی کچھ اور پوچھنے ہی والا تھا کہ تہ خانے میں بڑے زور کی کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ گہرے سکوت میں وہ آواز کسی دھماکے سے کم نہیں تھی۔ ہنی نے خوفزدہ ہو کر میرا بازو اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ وہ شاید بے اختیار چیخ اٹھتی لیکن میں نے بروقت اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

ہنی کا خوف بھی لمحاتی تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے خوف پر قابو پا لیا تھا۔ میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا لیا۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ وہ اب اتنی خوف زدہ نہیں تھی۔ گہری مگر بے آواز سی سانس لے کر اس نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔

آواز سے مجھے اس کی نوعیت کا کچھ اندازہ تو ہو گیا تھا۔ وہ ٹین کا کوئی ایسا ڈبا گرنے کی آواز تھی جس میں کچھ بھرا ہوا تھا۔ وہ ڈبا گر کر یقیناً دو تین فٹ تک لڑھکتا چلا گیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے میں اور ہنی دیوار سے چپکے رہے۔ ایک بار پھر چاروں طرف وہی سکوت چھا چکا تھا۔ میں نے ہنی کو وہیں ساکت رہنے کا اشارہ کیا اور خود دیوار سے الگ ہوئے بغیر گھوم کے بیس منٹ میں داخل ہو گیا۔ ہم بیس منٹ کے دروازے کے قریب ہی کھڑے تھے اور اس دروازے میں کوئی پٹ یا شٹر وغیرہ نہیں تھا۔

میرا پسندیدہ ترین مشین پسٹل میرے دائیں ہاتھ میں تھا۔ میرے لئے یہ ہلکی مشین گن کا کام دیتا تھا۔ مجھے کسی حد تک اندازہ تھا کہ آواز کہاں سے ابھری تھی۔ وہ یقیناً اسٹور اور ڈرائی کلیننگ پلانٹ کے درمیان کوئی جگہ تھی۔ دروازے سے اس کا فاصلہ خاصا تھا اور اندر گھپ اندھیرا تھا۔

اندر بھی میں دیوار سے لگ کر ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ اندھیرے میں انسان دیوار کے ساتھ لگ کر کسی طرف بڑھے تو اس کا ہیولا حرکت کرتا دکھائی نہیں دیتا۔ میری آنکھیں تو اندھیرے میں دیکھنے کی کافی حد تک عادی تھیں۔ ویسے بھی اب تو مجھے اندھیرے میں کھڑے بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسٹور روم کا آہنی دروازہ اور اس پر لگا ہوا بڑا سا تالا مجھے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔

اسٹور روم اور ڈرائی کلیننگ پلانٹ کے کمرے کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ گلی سی بنی ہوئی تھی۔ وہاں جو کوئی بھی تھا وہ اس گلی میں موجود تھا۔ میری نامعلوم حس مجھے وہاں کسی کی موجودگی کی اطلاع بھی دے رہی تھی۔

اس گلی کی سیدھ میں پہنچ کر میں نے ایک گھٹنے کے بل کھڑے ہوتے ہوئے جیب سے اپنی ننھی اور چپٹی سی ٹارچ نکالی جو سائز میں میری سب سے چھوٹی انگلی سے بھی چھوٹی تھی مگر اس سے روشنی گویا چکیلی دھوپ کی ایک تیز دھار کی سی صورت میں نکلتی تھی اور اگر اچانک اندھیرے میں کسی کے چہرے پر پڑتی تھی تو ایک لمحے کے لئے وہ اندھا سا ہو جاتا تھا۔ اسے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے روشنی کا یہ آبشار اس کی آنکھوں سے ہوتا ہوا کھوپڑی کے پار نکل گیا ہے۔ تاہم یہ روشنی زیادہ بڑے دائرے میں نہیں پھیلتی تھی۔

اس تنگ سی گلی میں مجھے ایک ہیولا اسٹور روم کی دیوار کے ساتھ چپکا نظر آگیا۔ مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' اکیلا ہی معلوم ہوتا تھا۔ اسٹور روم یا دوسرے کمرے کے عقب میں بھی کوئی ہو سکتا تھا لیکن اس کا امکان ذرا کم ہی تھا۔

اس شخص کو دور ہی سے بہتر طور پر دیکھنے کے لئے ٹارچ روشن کرنا ضروری تھا۔ اس کے جواب میں ادھر سے گولی بھی آسکتی تھی۔ اس کے لئے تیار رہتے ہوئے میں نے ناخن سے ٹارچ کا ننھا سا بٹن دبایا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلی ٹریگر کو بھی تقریباً دبا ہی چکی تھی۔ روشنی کی دھار اس شخص پر پڑی مگر جواب میں میری طرف گولی نہیں آئی۔ گھگھیائی ہوئی سی آواز آئی۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ شخص دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عمر معلوم ہوتا تھا۔ سفید کرتے پاجامے میں تھا۔ میں اس کی شکل نہیں دیکھ پا رہا تھا مگر مسکین سا ہی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ تاہم میں نے اس کی مسکینی پر زیادہ بھروسا نہیں کیا اور مشین پسٹل جیب میں نہیں ڈالا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا اور ٹارچ روشن رکھتے ہوئے ہی اس کے قریب پہنچا۔ اس نے چہرے سے ہاتھ نہیں ہٹائے۔ اسی دوران میں نے دیکھا بٹر آئل کا ایک بڑا سا ڈبا لڑھک کر دوسری دیوار کے پاس پہنچا ہوا تھا۔ وہ ایک طرح کا سیال مکھن سا تھا جو ان دنوں غالباً ہالینڈ سے امپورٹ ہوا کرتا تھا۔ ہم نے جو آواز سنی تھی وہ یقیناً اسی ڈبے کے گرنے اور لڑھکنے کی تھی۔

"کون ہو تم؟" میں نے نیچی آواز مگر سخت لہجے میں پوچھا۔ اس کی کپکپاہٹ کچھ اور بڑھ گئی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ شاید اس کے حلق سے آواز ہی نہیں نکل رہی تھی۔

"میں نے پوچھا ہے کون ہو تم؟ ہاتھ ہٹاؤ چہرے سے" میں نے ڈپٹ کر کہا۔ اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹا لئے مگر آنکھیں ذرا سی ہی کھول پایا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی اس کے چہرے پر ہی مرکوز کر دی تھی۔ اس طرح وہ میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"مم...... میں ہوں جی...... ویٹر چراغ دین" وہ وحشت زدہ سی آواز میں بولا۔ میں نے محسوس کیا' یہ جان کر نہ جانے کیوں اس کا خوف شاید ذرا سا کم ہوا تھا کہ میں اسے پہچانتا نہیں تھا۔

"ویٹر کی وردی میں تو نہیں ہو تم" میں نے کہا۔

"ڈ ڈ...... ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے جناب! گھر جا رہا تھا" وہ لرزتی آواز میں بولا

"تہ خانے کے راستے سے جاتے ہو گھر؟" میں نے ڈپٹ کر پوچھا اور کچھ دور پڑے ہوئے بٹر آئل کے ڈبے کی طرف دیکھا۔ اب بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کا تھر تھر کانپنا بجا تھا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا' ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ میں نے مشین پسٹل جیب میں رکھتے ہوئے کہا "چوری کرتے ہو اسٹور سے؟"

"روز تو نہیں کرتا سر......!" وہ ہاتھ باندھ کر گڑگڑانے لگا "کبھی کبھار ہی کرتا ہوں سر! خدا کے لئے کسی کو نہ بتائیں سر! میں برباد ہو جاؤں گا۔"

"کیسے کرتے ہو چوری؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا "اسٹور روم کے دروازے پر تو صحیح سلامت تالا لگا ہوا ہے؟"

"سر...... وہ...... پہلے یہ تالا فورتھ فلور والے اسٹور روم کو لگایا جاتا تھا" وہ تھوک نگلتے ہوئے اٹک اٹک کر بولا "جہاں ویکیوم کلینرز رکھے جاتے ہیں...... اس وقت اس کی ایک چابی میرے پاس بھی رہتی تھی...... پھر یہ یہاں لگا دیا گیا...... ایکسٹرا چابی مجھ سے واپس لینے کا کسی کو خیال ہی نہیں آیا......"

"اور تم نے یہاں چوری شروع کر دی؟"

"قسم سے...... روز نہیں کرتا سر! کبھی کبھار کرتا ہوں۔ خدا کے لئے آپ کسی سے شکایت نہ کریں۔ مجبوراً چوری کرتا ہوں سر۔ میرے گیارہ بچے ہیں۔ بہن بھائی بھی ہیں۔ والدین بھی ہیں۔ میں اکیلا کمانے والا ہوں سر! تنخواہ تھوڑی ہے سر! ٹپ وغیرہ کافی بن جاتی ہے سر! لیکن پھر بھی گزارہ نہیں ہوتا سر!"

میں نے سنا تھا' کئی ویٹر خاصے خوش حال ہوتے تھے لیکن جتنے افراد کا بوجھ وہ اپنے اوپر بتا رہا تھا' عین ممکن تھا اس کا گزارہ نہ ہوتا ہو۔ ہر ایک کے حالات اور مسائل الگ الگ ہوتے ہیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ درست ہی کہہ رہا ہو۔

"تم سمجھ رہے ہو کہ چوری کرو گے تو گزارہ ہونے لگے گا؟ گدھے کہیں کے! پھر تو بالکل ہی نہیں ہوگا۔ رہی سہی برکت بھی اڑ جائے گی گھر سے۔ آمدنی کم ہے' گزارہ نہیں ہوتا تو کوئی اور تدبیر کر' کوئی اور طریقہ سوچ۔ شاید وہ اس سے زیادہ آسان' اس سے زیادہ بابرکت ہو" میں نے کہا

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب!" وہ دوبارہ ہاتھ باندھتے

ہوئے جلدی سے بولا "جتنی دیر سے یہاں پھنسا کھڑا تھا' یہی سوچ رہا تھا۔ آج زندگی میں پہلی بار اپنی ہی نظر میں اتنی ذلت محسوس کر رہا تھا اور دل ہی دل میں عہد کر رہا تھا کہ آئندہ چوری نہیں کروں گا۔ جب سے میں نے یہ اسٹور سے چیزیں چرا کے گھر لے جانے کا سلسلہ شروع کیا ہے' بچے زیادہ بیمار رہنے لگے ہیں۔ گھر میں زیادہ تنگی ترشی رہنے لگی ہے۔"

"چلو۔ شکر ہے یہ سیدھی سی اور پرانی سی بات تمہاری سمجھ میں آگئی" میں نے کہا۔

"بس جی...... آپ اس مرتبہ مجھے معاف کر دیں اور کسی کو میری رپورٹ نہ کریں۔ ورنہ میں برباد ہو جاؤں گا۔ مجھے تو کہیں نوکری ملنا بھی مشکل ہو جائے گی۔ میرے بچے بھوکے مر جائیں گے" اس نے میرے پیروں کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی لیکن میں نے بروقت اس کا بازو گرفت میں لے کر اسے اس کوشش سے باز رکھا۔

"تم نے ہماری باتیں بھی سنی ہوں گی؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا

"کون سی باتیں جی......؟" اس نے حیرت اور معصومیت سے میری طرف دیکھا۔ یہ حیرت اور معصومیت مجھے مصنوعی نہیں لگی۔ ویسے بھی بیس منٹ کے دروازے سے یہاں تک کا فاصلہ اتنا تھا کہ سرگوشیوں میں کی جانے والی باتیں سنی نہیں جا سکتی تھیں۔ اس کے باوجود میں نے اسے اچھی طرح کھنگال لینا بہتر سمجھا۔

وہ خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولا "صاحب جی! میں تو اس وقت ڈبا لے کر یہاں سے نکلنے ہی لگا تھا جب سامنے سے مجھے آپ آتے دکھائی دیے۔ میں یہاں دبک گیا کہ شاید کسی کو میری چوری کی خبر ہو گئی ہے۔ کوئی مجھے پکڑنے آرہا ہے۔ لیکن آپ بیس منٹ کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ میں سمجھا کوئی صاحب راستہ بھول کر آنکلے ہیں' ابھی چلے جائیں گے مگر پھر آپ باہر ہی نہ جانے کس طرف کو ہو کر کھڑے ہو گئے۔ مجھے آپ نظر نہیں آرہے تھے لیکن معلوم تھا کہ ابھی آپ گئے نہیں ہیں۔ پھر میں نے سر ذرا سا نکال کر جھانک کر دیکھا تو ایک اور ہیولے...... کو آتے دیکھا۔ وہ عورت معلوم ہوتی تھی۔ میں نے سوچا' شاید اسٹاف میں سے کوئی عورت مرد ملاقات کے لئے آئے ہیں۔ کبھی کبھار کسی اندھیرے کونے کھدرے میں ایسا چکر ہو جاتا ہے۔ پھر میں نے سوچا' اسٹاف کے لوگوں کو ویسے بھی کہیں نہ کہیں ملنے کے مواقع میسر رہتے ہیں۔ انہیں اندھیرے میں اتنی دور دھکے کھانے کی کیا ضرورت تھی۔ مین بلڈنگ میں ہی بہت سے کونے کھدرے ہیں۔ بس ادھر یہ الجھن تھی اور ادھر خوف تھا۔ آپ دونوں تھے کہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے۔ لیکن مجھ سے جو قسم چاہے لے لیں' میں نے آپ میں سے کسی کی کوئی آواز نہیں سنی۔"

"تم شروع سے یہیں چھپے کھڑے ہو؟ آگے نہیں آئے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر! اس سے آگے تو چھپنے کے لئے کوئی جگہ ہی نہیں تھی۔ آپ ذرا اندر جھانکتے تو مجھے دیکھ لیتے۔ میں تو جب سے یہیں دیوار سے چپکا کھڑا ہوں۔ آپ میرا خوف اور بے وقوفی دیکھیں...... عقل بالکل خبط ہو کر رہ گئی تھی۔ یہ دیکھیں کہ اس وقت سے میں ڈبا ہاتھ میں ہی لٹکائے کھڑا ہوں۔ اتنی بھی عقل نہیں آئی کہ اسے آہستہ سے فرش پر ہی رکھ دوں۔ آخر کار ہاتھ شل ہو گیا اور یہ چھوٹ کر گر گیا۔ ورنہ شاید میری چوری نہ پکڑی جاتی۔ آپ آخر کار اپنی باتیں ختم کر کے چلے ہی جاتے" وہ اب کافی حد تک سنبھل چکا تھا لیکن آواز میں لرزش باقی تھی۔

"ہر چوری ایک نہ ایک دن پکڑی جاتی ہے" میں نے کہا۔ "اب تم یہ ڈبا اٹھاؤ اور یہاں سے پھوٹ لو۔ لیکن شرط یہ ہوگی کہ آنکھیں بند کر کے میرا ہاتھ پکڑ کے باہر نکلو گے۔ میں تمہیں پچھلے گیٹ تک چھوڑ آؤں گا" میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اندھیرے میں بھی ہنی عرف پرنسس تہمینہ کا ہیولا دیکھے۔

"سر! آپ واقعی کسی سے میری شکایت نہیں کریں گے؟" اسے گویا یقین نہیں آرہا تھا۔

"اب میں تمہیں یہ بات عدالتی کاغذ پر تو لکھ کر دینے سے رہا۔ جلدی سے ڈبا اٹھاؤ" میں نے ٹارچ کا رخ ڈبے کی طرف کرتے ہوئے کہا۔ نقرئی ڈبا تیز روشنی میں آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔

"خدا کے لئے یہ ٹارچ بجھا دیجئے" وہ گھگھیایا۔ اسے اب اس ڈبے سے خوف آرہا تھا جس کی خاطر اس نے اتنا خطرہ مول لیا تھا۔

میں نے ٹارچ بجھا دی تو وہ سرگوشی میں بولا "کیا واقعی ڈبا میں لے جاؤں؟"

"ہاں۔ اب یہ آخری چوری تو تمہارے حساب میں لکھی ہی گئی ہوگی۔ اسے تو اب لے ہی جاؤ۔ کوئی باہر پڑا دیکھے گا تو چوری کا راز کھل جائے گا اور چھان بین شروع ہو جائے گی" میں نے کہا۔

اس نے ڈبا اٹھا لیا۔ میں نے احتیاطاً اس کی آنکھوں پر رومال باندھ دیا جو اس نے نہایت سعادت مندی سے بندھوا لیا مگر کانپتی آواز میں بولا "سر! کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ جب رومال میری آنکھوں سے ہٹے تو میں اپنے آپ کو منیجر صاحب کے سامنے کھڑا پاؤں؟"

مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ وہ عمر میں مجھ سے کہیں بڑا تھا لیکن میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا "نہیں برخوردار! اطمینان رکھو' ایسا نہیں ہوگا۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے۔"

میں اس کا ہاتھ تھام کر لے چلا تو وہ بولا "آپ اتنی زحمت نہ کریں۔ میں آنکھوں پر رومال بندھا ہونے کے باوجود پچھلے دروازے تک چلا جاؤں گا۔ یہاں کا چپہ چپہ میرا جانا پہچانا ہے۔ آنکھیں بند کر کے بھی جا سکتا ہوں۔"

"برخوردار!" میں نے پہلے سے زیادہ شفقت سے کہا "میں تمہیں اس لئے کچھ دور تک چھوڑنے جارہا ہوں کہ راستے میں ایک شخص کھڑا ہوگا۔ وہ کچھ اور سمجھ کر کہیں تمہیں گولی نہ ماردے۔"

مجھے معلوم تھا' تہ خانے کی دیوار کے ساتھ پچھلے حصے کی طرف ٹونی کھڑا تھا۔ وہ ایک ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں وہ مین بلڈنگ کی طرف سے آنے والوں پر نظر رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ ایسے کسی شخص کو تہ خانے سے رخصت ہوتے دیکھتا جسے اس نے آتے نہیں دیکھا تھا تو تشویش میں جتلا ہو سکتا تھا۔

میں چراغ دین کو اندھیرے میں ہنی کے سامنے سے لے کر گزرا تو وہ دیوار سے چپکی کھڑی تھی اور مجھے یقین تھا کہ اس نے ہمیں دیکھ کر سانس بھی روک لی تھی۔ اس نے میڈ کی یونیفارم کا دوپٹہ نقاب کی طرح چہرے پر لپیٹ لیا تھا۔ وہ کچھ بولی نہیں۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بغور دیکھتی رہی کہ میں کیا کررہا ہوں۔ میں نے اسے وہیں رکنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ گیا۔

تہ خانے کے کونے سے گھوم کر ہم زیادہ لمبی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھے۔ کچھ دور ٹلنیجے اندھیرے میں ٹونی دیوار سے چپکا کھڑا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ جیکٹ کی جیبوں میں تھے۔ میں نے اسے "سب ٹھیک ہے" کا اشارا دیا اور چراغ دین کو کچھ آگے تک چھوڑ کر کہا "اب دُم دبا کر جہاں جانا چاہتے ہو چلے جاؤ۔ مگر مڑ کر مت دیکھنا۔ کہیں کھوپڑی میں سوراخ نہ ہوجائے۔"

وہ خوف سے کانپتی ٹانگوں کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میں واپس ہنی کے پاس آیا تو وہ بہت خوف زدہ تھی اور سارا معاملہ جاننے کے لئے تجسس سے بھی مری جارہی تھی۔

"کھودا پہاڑ' نکلا چوہا۔ اور وہ بھی چوریاں کرنے والا چوہا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "وہی غربت کی دکھ بھری سی کہانی!"

"کیا قصہ تھا؟" اس نے سرگوشی میں پوچھا۔

میں نے قصہ اسے سنایا تو وہ بولی "اس نے یقیناً ہماری باتیں سن لی ہوں گی۔ وہ ریڈ ڈاٹ والوں کا جاسوس ہوگا" اس کے لہجے میں بے پناہ خوف تھا۔ شاید برین واشنگ کے کچھ نہ کچھ اثرات باقی تھے۔ یہ اس کی شاندار قوت ارادی ہی کا کام تھا کہ اتنے سائنٹیفک انداز میں کئی مرحلوں میں کی جانے والی برین واشنگ میں وہ اپنا ذہن بچا کر لے آئی تھی لیکن کوئی بعید نہیں تھا کہ کچھ نہ کچھ گوشوں پر' کچھ خلیات پر کسی حربے' کسی الیکٹرک شاک یا کسی دوا کے تھوڑے بہت اثرات باقی رہ گئے ہوں۔

اس کے رویئے سے میں نے محسوس کیا تھا کہ اس کے ذہن پر ریڈ ڈاٹ کا بہت زیادہ خوف بیٹھا ہوا تھا۔ شاید وہ جو کچھ دیکھ کر آئی تھی وہ اسے خوف زدہ رکھنے کے لئے کافی تھا۔ میں ابھی ان کے بارے میں کچھ زیادہ آگاہ نہیں تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اکثر آگہی ایک عذاب اور نا آگہی رحمت ہوتی ہے۔

"اب میں اتنا بھی اناڑی اور احمق نہیں ہوں" میں نے تشفی آمیز انداز میں اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "میں نے کچھ سوچ سمجھ کر ہی اسے آنے دیا ہے۔"

"تمہاری یہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کسی روز تمہیں لے نہ ڈوبے۔ میں اس تصور سے ڈرتی ہوں۔"

"جب ڈوبنا ہوگا ڈوب جائیں گے۔ ابھی سے اس فکر میں دبلے ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے کہا "تم سلسلۂ کلام وہیں سے جوڑو جہاں سے ٹوٹا تھا۔ کیا کہہ رہی تھیں تم؟"

"اب تو مجھے خود بھی یاد نہیں رہا" وہ سادگی سے بولی۔ وہ ایک عجیب عورت تھی۔ زندگی میں جانے کیا کچھ دیکھ چکی تھی لیکن کبھی کبھی اس کے انداز گفتگو میں اتنا بھولپن اور سادگی ہوتی تھی کہ حیرت ہونے لگتی تھی۔ تاثرات سے وہ اسکول کی ایک نوخیز اور معصوم لڑکی نظر آنے لگتی تھی۔

"ہاں.... تم بتارہی تھیں کہ مختلف کاموں کے سلسلے میں تمہیں ہدایات ملتی رہتی ہیں۔ کون دیتا ہے ہدایات؟" میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے پوچھا۔

"کبھی کوئی' کبھی کوئی۔ ویسے زیادہ تر ہدایات کمال نے سن ہی کی زبانی ملتی ہیں۔" اس نے جواب دیا "لیکن کسی بھی وقت' کسی بھی ذریعے سے میرے لئے کوئی حکم آسکتا ہے۔"

"تمہیں کچھ اندازہ نہیں ہوا کہ اس تنظیم کا سربراہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سربراہ....؟" اسے گویا اب میری سادگی پر ہنسی آتے آتے رہ گئی "میں نے بتایا تو ہے کہ مجھے ابھی تک تنظیم کے سر پیر کی سمجھ ہی نہیں آئی۔ سربراہ تو دور کی بات ہے' مجھے ابھی تک یہی اندازہ نہیں ہو سکا کہ جتنے لوگوں سے مجھے واسطہ پڑ چکا ہے ان میں زیادہ اہم کون تھا۔ ایک ہی شخص ایک روز کسی سے احکامات لینے لگتا ہے اور دوسرے روز وہی شخص اسے احکامات دینے لگتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں تو ان کے مقاصد کا بھی کچھ اندازہ نہیں ہوگا؟" میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔

"ہرگز نہیں" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "البتہ چھوٹے چھوٹے کام جو آنکھوں کے سامنے ہوتے نظر آرہے ہوں ان کے بارے میں اپنے طور پر کچھ اندازہ ہوجاتا ہے کہ فلاں کام کے پیچھے یہ مقصد پوشیدہ ہوگا اور فلاں کے پیچھے وہ۔ مثلاً جب مجھے ہدایت ملتی ہے کہ فلاں سرکاری آفیسر کے دل میں گھر کروں اور کسی ایسے لمحے میں' جب وہ ریشہ خطمی ہورہا ہو' اس سے معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ فلاں نمبر کی فائل کس کی تحویل میں ہے اور اس کی حفاظت کے کیا انتظامات ہیں؟ تو میں سمجھ جاتی ہوں کہ اب اس فائل کی خیر نہیں۔ وہ یا تو چوری ہوجائے گی یا اس کی فلم بنالی جائے گی۔ لیکن میرا کام بہرحال صرف معلومات حاصل کرنے تک ہی

رہتا ہے۔ اس سے آگے دوسرا مرحلہ شروع ہوجاتا ہے جس کے ...ہرین الگ ہوتے ہوں گے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ اس ...اس کی نوعیت کیا ہے' اس میں ریڈ ڈاٹ کی دلچسپی کی وجہ کیا ہے' ...ب اور کس طرح اسے چرایا یا کاپی کی جائے گا اور اس کا کیا ...صرف ہوگا۔ یہ کوئی بڑا زبردست نیٹ ورک ہے۔ کوئی بہت بڑی ...ری ہے۔ مجھ سے پہلے کسی پرزے کا کام چل رہا ہوتا ہے۔ پھر ...تک پہنچتا ہے۔ میں بھی ایک چھوٹا سا پرزہ ہوں۔ میں اپنا کام ...م دے دیتی ہوں۔ اس کے بعد کسی اور پرزے کا کام شروع ...ا ہے۔ وہ حرکت میں آجاتا ہے۔ مشینری کیا ہے' اس کی ...ت کیا ہے' اس کا فنکشن کیا ہے' ظاہر ہے یہ پرزوں کو نہیں ...م۔"

"لیکن اس طرح تو تمہاری پوزیشن مشکوک ہو سکتی ہے.... تم ...خطرے سے دوچار ہو سکتی ہو کہ ادھر تم نے کسی اعلیٰ سرکاری ...رے کسی اہم اور خفیہ فائل کے بارے میں معلومات حاصل ...اور ادھر وہ فائل غائب ہوگئی۔ اس آفیسر کا خیال تو سیدھا ...ی طرف جائے گا۔ وہ پلٹ کر تمہاری طرف آسکتا ہے۔ ...رے لئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ تمہاری پرفارمنس ...نچے طبقے کے لئے سہی' لیکن بہرحال تم عوامی سطح پر کام کررہی ...میں نے کہا۔

"یہ تو میں نے محض خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ فائل چوری ...تی ہے۔ عین ممکن ہے ایسا نہ ہوتا ہو" وہ بولی "ہو سکتا ہے اس ...صرف کاپی کی جاتی ہو اور کسی کو شبہ تک بھی نہ ہوتا ہو" پھر وہ ...گہری سی لے کر بولی "ابھی مجھے سرگرم عمل ہوئے زیادہ عرصہ ...ں ہوا۔ ابھی تک تو مجھے کسی خطرے سے دوچار نہیں ہونا پڑا۔ ...کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہتا ہے کہ میرے گرد ہر طرح کا ...تی نظام موجود رہتا ہے اور میں تمہیں سچی بات بتاؤں۔ میرا یہ ...انہ ہے کہ کوئی اہم سے اہم فائل' خفیہ ترین کاغذات بھی ...ی ہوجائیں تب بھی کوئی آفیسر پلٹ کر میری طرف آنے یا کوئی ...روائی کرنے کے بارے میں شاید سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"کیوں؟" میں نے انجان بن کر دریافت کیا۔

"اس سے پہلے اسے اور بہت کچھ سوچنا پڑے گا" وہ گہری ...ں لے کر بولی "میں تو پہلے بھی حیران ہوا کرتی تھی' اب اور ...حیران ہوتی ہوں کہ ہم کیسی کرپٹ سوسائٹی میں رہ رہے ہیں۔ ...زائیاں اور عیاشیاں کس کس سطح پر اور کس کس انداز میں ...ہوتی ہیں۔ کیسی مشینری ہمارے معاشرے کو چلا رہی ہے۔ ...کا چلتے رہنا خدا کا واقعی بہت بڑا معجزہ ہے۔ یہ سب کچھ دیکھنے ...بعد مجھ جیسی گناہ گار عورت کا بھی قدرت پر یقین پختہ ہوجاتا ...۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "کوئی آفیسر پلٹ کر کسی ...جواب طلبی کے سلسلے میں بھلا میری طرف کیسے آسکتا ہے؟ جس نے میرے دربار میں حاضریاں دی ہوں.... نہ جانے کن کن حالتوں میں' کس کس انداز میں وقت گزاریاں کی وہاں' اس کے بارے میں تم پہلے ہی تصور نہیں کرسکتے کہ وہ کتنا کرپٹ ہوگا؟ جہاں جہاں وہ اپنی شرم ناک کمزوریوں اور بدعنوانیوں کے ثبوت چھوڑ کر گیا ہو وہاں وہ چھان بین کے لئے کس منہ سے آسکتا ہے؟"

پھر اسے کچھ یاد آیا اور وہ بولی "تمہارے جو آدمی اپنی دانست میں بڑی راز داری سے میری نگرانی کررہے تھے.... اور وہ یقیناً اپنی لائن کے ماہر بھی ہوں گے۔ ان پر بھی کیمرے مرکوز تھے۔ کمال نے سن میرے بیڈ روم میں بیٹھا ٹی وی پر انہیں دیکھتا تھا۔ تو سوچو کہ عیش ونشاط میں غرق لوگوں کے بارے میں کیا کچھ مواد جمع نہیں ہوتا ہوگا؟ یہ سب بھی محض میرے اندازے ہیں۔ مجھے بتایا کچھ نہیں جاتا۔ لیکن میں خاموشی سے سر جھکا کر ہدایات پر عمل کرنے کے ساتھ ساتھ کن انکھیوں سے حالات کا جائزہ لے رہی ہوں۔ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ مشاہدہ کرنے کی کوشش کررہی ہوں اور جو کچھ میری ناقص عقل میں آرہا ہے وہ تمہیں بتارہی ہوں۔"

"تمہاری عقل ناقص نہیں' بڑی کار آمد ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور شاید آگے چل کر مزید کار آمد ثابت ہو۔"

"تشویش میں جتلا ہونا اور نتائج کے بارے میں غور کرنا ویسے بھی میری ذمے داری نہیں ہے۔" ہنی اپنی دھن میں بولی "یہ کمال نے سن کا شعبہ ہے۔ مجھے ہدایت ملی ہوئی ہے کہ مجھے کسی بھی قسم کا خطرہ یا اندیشہ محسوس ہو' میں صرف کمال نے سن کو اس کے بارے میں بتادوں۔ میری تو ویسے ہی چوبیس گھنٹے نگرانی ہوتی ہے۔ مجھ سے پہلے تو ہر خطرے کو وہ خود ہی محسوس کرلیتے ہیں اور خود ہی نمٹ لیتے ہیں۔ لیکن اگر ان کی نظر چوک بھی جائے تب بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس طرف سے مجھے اطمینان ہے۔ صرف تم جیسا سر پھرا ہی گھر مجھ کے اس جزیرے میں سر گھسیڑنے کے بعد محفوظ رہ سکتا ہے۔"

"میری طرف یہ لوگ اتنے متوجہ کیوں نظر آتے ہیں؟ میری ذات میں ان لوگوں کی دلچسپی کی وجہ کیا ہے؟ اس سلسلے میں تمہیں کچھ اندازہ ہوا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "اس سلسلے میں میں کوئی اندازہ بھی نہیں لگا سکی۔ میرے سامنے اب تک جو لوگ آئے ہیں وہ شاید اتنے اہم نہیں تھے کہ ان کے درمیان تمہارے بارے میں کوئی تفصیلی تبادلہ خیال ہوتا۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ مسکرائی۔ اس کے ہموار' سفید دانت اندھیرے میں موتیوں کی طرح جھلملا اٹھے۔ شریر سے لہجے میں وہ بولی "ہو سکتا ہے میری طرح ریڈ ڈاٹ بھی تم پر بے وجہ عاشق ہو۔ اتنا اندازہ مجھے بہرحال ہوچکا ہے کہ یہ تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتے۔ ورنہ یہ ان کے لئے ذرا بھی مشکل کام نہیں ہے۔"

میں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا "جب تک اوپر والے کو منظور نہیں ہوگا تب تک ان کے کئے کیا' ان سے بھی

بڑی شیطانی قوتوں کے لئے یہ ایک مشکل کام ہی رہے گا۔ جس دن اوپر والا چاہے گا اس دن ایک ٹھوکر سے بھی موت آسکتی ہے۔"

"بہت درویشی آگئی ہے طبیعت میں" وہ بولی۔

"ہمیشہ سے ہی درویشی ہے میری طبیعت میں۔ تم نے محسوس نہیں کی ہوگی پہلے۔" میں نے کہا "اس درویشی کی وجہ سے ہی تو میں اندر سے بہت مطمئن رہتا ہوں۔"

"اور بدمعاشیاں بھی ساتھ ساتھ جاری ہیں؟" وہ مسکرائی۔

"بندہ بشر ہوں۔ گناہ گار ہوں۔ اس امید پر جی رہا ہوں کہ کسی روز ان کمزوریوں پر بھی قابو پالوں گا اور کوئی ڈھنگ کا انسان بن جاؤں گا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اسے جیسے کچھ یاد آیا "کل جب تم میرے پاس آئے اور تم نے اپنا کارڈ اندر بھیجا تو کمال نے سن کی باچھیں کھل اٹھی تھیں۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم نے مجھے پہچان لیا ہے۔ وہ تو یہی سمجھا تھا کہ آخر کار تمہیں بھی میری کشش کھینچ لائی ہے۔ گو کہ انہیں معلوم ہے' عورتوں سے تمہاری دوستی کا معیار کچھ عجیب ہی ہے۔ تم عام دولت مندوں کی طرح عیش پرست نہیں ہو۔ چیپ اور پروفیشنل عورتوں کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتے۔ اونچے طبقے کی عورتوں کی بارے میں بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی تمہیں کب اپیل کر جائے اور کس کے حسن و جمال کی چکا چوند کے باوجود تم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو......"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "میری ذات کا یہ پہلو تو خود میرے لئے بھی گورکھ دھندا ہے۔ اس معاملے میں میں خود بھی اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکا۔ لیکن میں نے جو اپنا تھوڑا بہت تجزیہ کیا ہے اس سے میں اسی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ میں نے اپنی ذات میں سے بصد کوشش ہر طرح کا کمپلیکس نکال دیا ہے لیکن کہیں نہ کہیں' لاشعور کی گہرائی میں محبت سے محرومی کا کوئی بہت بڑا خلا موجود ہے۔ باپ کے سوا مجھے بچپن سے کسی کی بے غرض محبت نہیں ملی۔ اب میں نہ چاہتے ہوئے بھی کسی کسی ایسی عورت کی طرف جھک جاتا ہوں جس میں ایک خاص قسم کی کشش تو ہوتی ہی ہے لیکن میرے لئے زیادہ اہم بات یہ ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی غرض کے مجھے چاہتی ہے' میری طلب رکھتی ہے۔ مجھ سے کوئی صلہ نہیں چاہتی' کوئی زیادہ لمبی امیدیں وابستہ نہیں رکھتی' مجھ پر قبضہ نہیں جماتی' مجھ سے بازپرس نہیں کرتی۔ مجھے کٹی پتنگ کی طرح چھوڑے رکھتی ہے لیکن جب بھی میں اس کی طرف لوٹ کر آتا ہوں' وہ اسی پرانے خلوص' اسی گرم جوشی' اسی شدت سے مجھے اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔ وہ کسی بھی وجہ سے اپنی شدتوں میں کوئی کمی نہیں آنے دیتی۔ قبضہ پرست عورتوں سے بہت گھبراتا ہوں۔"

اس کے بھرے بھرے نیم وا ہونٹوں کے عقب سے سفید دانت اب بھی جھانک رہے تھے۔ اندھیرے میں گھات لگا کر بیٹھی ہوئی کسی شیرنی...... کسی خوب صورت شیرنی کی طرح۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے سرگوشی میں ہی بولی "یہ بھی آوارگی ہی کی ایک قسم ہے۔ کسی ایک کے ہو جاؤ۔ ورنہ مارے جاؤ گے۔"

"ہاں۔ کوشش تو کر رہا ہوں آج کل کسی ایک کا ہو کر بیٹھنے کی۔ دل تو وہیں انکار رہتا ہے۔ لیکن یہ تن آوارہ نہ جانے کس شاخ سے ٹوٹا ہوا پتہ ہے۔ ہواؤں کے دوش پر ادھر ادھر بھٹکتا پھرتا ہے۔ لیکن یہ اس وقت تم کیا باتیں لے کر بیٹھ گئیں۔ یہ وقت ہے ایسی باتیں کرنے کا؟ کمال نے سن کے بارے میں کیا بتا رہی تھیں تم؟"

"بس یہی بتا رہی تھی کہ تمہارا کارڈ دیکھ کر کمال نے سن کی باچھیں کھل گئی تھیں کہ چلو اس راستے سے ہی تم ان کے پاس آ... پھنسو گے۔ تمہاری بشری کمزوریوں کے کچھ ثبوت ہاتھ آجائیں گ... تو شاید تم کچھ مجبور ہو جاؤ گے۔ شاید کچھ باتیں ماننے لگو گے۔"

میں ہولے سے ہنس دیا "کیا منوانا چاہتے ہیں وہ مجھ سے؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں" وہ بے بسی سے بولی۔

"اس قسم کے تھرڈ ریٹ ہتھکنڈوں سے میں بلیک میل ہونے والا نہیں ہوں۔ کسی کی خلوت سے چرائے ہوئے جذباتی لمحوں کی تصویروں کو استعمال کرنا بہت ہی چھوٹے بدمعاشوں کی بہت ہی پرانی ٹیکنیک ہے۔ میں ریڈ ڈاٹ سے اس کی توقع نہیں کر سکتا تھا" میں نے حقارت سے کہا۔

"ضرورت ضرورت کی بات ہے" وہ بولی "جہاں جو حربہ کارگر نظر آ رہا ہو وہاں یہ وہی استعمال کر لیتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہوتا ہے کہ مقصد پورا ہونا چاہئے' خواہ وہ کسی بھی ذریعے سے ہو۔ اسی... بعض اوقات یہ لوگ مجھے مافیا' سی آئی اے اور کے جی بی سے بھی آگے نظر آتے ہیں اور بعض اوقات بقول تمہارے بالکل تھرڈ ریٹ بدمعاش اور گروہ باز لگتے ہیں۔"

"لیکن مجھ پر تو تھرڈ ریٹ حربوں میں انہیں بالکل ناکامی ہو گی کیوں کہ میں نہ تو کوئی اعلیٰ سرکاری آفیسر ہوں...... نہ سیاسی لیڈر ہوں...... نہ وزیر ہوں' نہ سفیر ہوں...... نہ کوئی نام نہاد سماجی رہنما ہوں...... نہ ہی کسی پارسا شخصیت کے طور پر مشہور ہوں۔ حتیٰ کہ میں تو شادی شدہ بھی نہیں ہوں۔ مجھے اس قسم کے راز فاش ہو جانے سے کیا ڈر ہو سکتا ہے!"

"ایک بہت بڑے بزنس مین تو ہو۔ آخر ایک بڑے صنعت کار... ایک بڑے بزنس مین کا بھی معاشرے میں اپنا ایک مقام ہے" وہ بولی۔

"بزنس...... اور معاشرے میں اپنے اس مقام وغیرہ کی مجھے کچھ زیادہ پروا نہیں ہے۔ میں من موجی آدمی ہوں۔ اگر مجھے ان چیزوں کی زیادہ سے زیادہ پروا محسوس ہوگی تو پھر ان کی حفاظت کر لوں گا۔ اول تو ایسا کوئی امکان نہیں ہے...... لیکن اگر ان... سے کبھی مجھے رسوا کرنے کی کوئی کوشش کی جائے اور اس... کھوپڑی گھوم جائے تو پھر ریڈ ڈاٹ والے ہوں یا کوئی اور انہیں بھی دن میں تارے نظر آجائیں۔"

"ضروری نہیں ہے کہ کمال نے سن کے ذہن میں وہی خیال آیا ہو جو میں سمجھ رہی ہوں" ہنس بولی "ممکن ہے اس کی باچھیں کسی اور وجہ سے کھلی ہوں۔ بہرحال وہ تمہاری آمد کی اطلاع پاتے ہی بہت خوش ہوا تھا اور اس نے جلدی سے مجھے ہدایت کی تھی "تمہیں سب کچھ بھول بھال کر چوہدری کو قابو میں کرنا ہے۔ اسے اپنا بے دام غلام بنانا ہے۔ اسے اتنا خوش کرنا ہے کہ اپنے ہوش و حواس سے بے گانہ ہو جائے۔ چوہدری ایک آزاد پرندہ ہے' اس کے پر کترنے ہیں" وہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں ان الفاظ کی وضاحتوں میں جاتی۔ تمہارے آنے کے بعد تو بساط ہی الٹ گئی۔"

"اس بے چارے کو معلوم نہیں تھا کہ چوہدری تو پہلے ہی تمہارا بے دام غلام ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جھوٹی باتیں مت کرو۔ سہانے خواب مت دکھاؤ۔ مجھے اپنی اوقات معلوم ہے" اس کے لہجے میں یک بیک اداسی اتر آئی۔

"وہی عورتیں تو مجھے اچھی لگتی ہیں جنہیں اپنی اوقات معلوم ہوتی ہے۔ خیر...... کل کی اٹھا پٹخ کے بعد کمال نے سن اور اس ڈھانچے کا رد عمل کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس انہیں چپ سی لگ گئی تھی۔ تم انہیں ادھ موا چھوڑ کر گئے تھے لیکن شو کے وقت تک وہ دونوں ہوش میں آگئے تھے۔ اس ساری گڑبڑ کے باوجود میں نے وقت پر شو پیش کیا تھا۔ انہوں نے شاید اوپر کسی کو اس واقعے کی رپورٹ کر دی تھی۔ مجھے نہیں معلوم انہیں اوپر سے مزید کیا ہدایات ملی ہوں۔ میں نے پوچھا بھی نہیں۔ مجھے صرف یہی تبدیلی نظر آئی کہ وہ پہلے کی نسبت کچھ چپ چپ سے ہیں۔ پہلے کی طرح زیادہ چہک نہیں رہے۔"

"وہ ڈھانچا جسے تم مشو کے نام سے مخاطب کر رہی تھیں' کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں" اس نے جواب دیا اور میں اس جواب پر کچھ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جلدی سے بولی "میرا مطلب ہے مجھے اس کی اصلیت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ مجھے وہ انڈین لگتا ہے۔ وہ تقریباً گونگوں کی طرح رہتا ہے۔ شاذ و نادر ہی کچھ بولتا ہے۔ وہ میرے لئے نچلے درجے کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتا ہے۔ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا ہے۔ اس پر کمال نے سن کا حکم چلتا ہے۔ کمال نے سن گویا میرا ذرا اونچے درجے کا باڈی گارڈ ہے۔ مشو بہت خطرناک آدمی ہے۔ اس کے گھریلو ملازم جیسے حلئے کی وجہ سے بہت سے لوگ اس کے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ کمال نے سن اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک آدمی ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ کل وہ دونوں کس طرح تم سے مار کھا گئے۔"

"ابھی تمہیں اس طرح کی شاید اور بہت سی حیرتوں کا سامنا کرنا پڑے" میں نے کہا "کیا تمہیں اپنے ارد گرد زیادہ تر ایشیائی لوگ ہی نظر آئے ہیں؟"

"ہاں" اس نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا "شاید اس لئے کہ وہ یہاں زیادہ آسانی سے گھل مل جاتے ہیں۔ ویسے جس سرجن نے میری کاسمیٹک سرجری کی وہ اور اس کا اسسٹنٹ سفید فام تھے۔ بعض لوگ میں نے ایسے بھی دیکھے ہیں جن کی قومیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ وہ کئی زبانیں اسی طرح روانی اور درست تلفظ کے ساتھ بولتے تھے جس طرح انسان اپنی مادری زبان بولتا ہے۔"

"حیرت ہے!" غیر ارادی طور پر میرا انداز خود کلامی کا سا ہو گیا "یہ کوئی عجیب ہی چکر ہے۔ واقعی اس کا کوئی سر پیر سمجھ میں نہیں آتا۔ معلوم نہیں ہماری ایجنسیاں اور ادارے کیا کر رہے ہیں۔"

"ہمارے ہاں ایسا ہی ہوتا ہے" وہ تلخی سے بولی "ایجنسیوں اور اداروں کی عین ناک کے نیچے نہ جانے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔ وہ صرف اس وقت چونکتے ہیں جب بڑے بڑے سانحے ہونے شروع ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہ رسمی اور کاغذی کارروائیاں یا محض خانہ پری اور عذر خواہی کرتے ہیں۔" وہ بھی بادل نخواستہ "اسے عورت ہوتے ہوئے بھی اتنا اندازہ تھا۔

"اے نن کے بارے میں تمہیں کیا معلوم ہے؟" آج موقع میسر آگیا تھا تو میں اس سے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے کوشاں تھا لیکن یہ کوشش کچھ زیادہ سود مند ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ معلومات کے سلسلے میں وہ خود تہی دامن تھی' میری کیا مدد کرتی۔

"اے نن مجھے کوئی انسانی مخلوق نہیں لگتا" وہ کراہیت سے جھرجھری سی لے کر بولی "وہ کوئی عجیب ہی چیز ہے اور شاید عجیب غریب کام ہی اس کے سپرد کئے جاتے ہیں۔ مجھے یہ بھی اندازہ نہیں کہ وہ کوئی اہم آدمی ہے یا نہیں۔ ہر عورت کو دیکھ کر رال ٹپکا... لگتا ہے' زبان ایک بالشت باہر لٹک آتی ہے۔ مجھے تو اس کو دیکھ... گھن آتی ہے۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ میں نے ایک سفید... عورت کو اس پر فریفتہ دیکھا۔ نہایت مردار قسم کی عورت تھی... فٹ سے نکلتا ہوا تو اس کا قد ہوگا۔ لیکن تھی بے پناہ خوب صورت۔ سوئس معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس طرح اے نن کے گلے میں بانہیں ڈالے پھرتی تھی جس طرح کوئی اپنے پالتو بندر کو... پھرتا ہے۔ اس کی ہر بات پر اتنا خوش ہوتی تھی کہ میرے سا... ہی......" اس نے گہری سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا "میں تمہیں کیا بتاؤں!"

میرے خیال میں اس نے جتنا بتا دیا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ ... نے پوچھا "تم انہیں کہاں دیکھا کرتی تھیں؟"

"جہاں مجھے کاسمیٹک سرجری اور برین واشنگ کے دو... چند ماہ رکھا گیا تھا۔ وہ دونوں کبھی کبھار وہاں آتے تھے۔ یہ... نہیں معلوم کہ کس لئے آتے تھے۔ وہ کوئی بہت بڑا اور عالیشان...

پراسرار قسم کا بنگلا معلوم ہوتا تھا۔ میں وہاں صرف دو کمروں تک محدود تھی۔ مجھے کبھی معلوم نہیں ہو سکا کہ بنگلا کہاں واقع تھا یا اس میں آمد و رفت کے راستے کون سے تھے تاہم میں نے وہاں بڑی حیرت انگیز سائنسی ایجادات، الیکٹرونک آلات اور مشینریاں وغیرہ دیکھیں۔"

"کیا وہ ریڈ واٹ کا ہیڈ کوارٹر تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں" وہ جلدی سے بولی "اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا۔ وہ تو ان کے چھوٹے موٹے کاموں کے سلسلے میں زیر استعمال رہنے والی کوئی معمولی اور غیر اہم سی جگہ تھی۔ ہیڈ کوارٹر کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کہاں ہو اور کیسا ہو۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تم نے تو مجھے الجھن میں ڈال دیا۔ میں نے تو اے ٹن کو کوئی اہم آدمی سمجھ کر اپنے سب آدمیوں کو اس کی تلاش پر لگا دیا ہے۔"

"کوئی فائدہ نہیں۔ یہ بالکل بے کار اور بے مقصد اقدام ہے۔ اپنے آدمیوں کا وقت اور انرجی ضائع مت کرو" وہ مربیانہ لہجے میں بولی "اول تو وہ ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہ بڑی خبیث روح ہے۔ اور اگر ہاتھ آ بھی گیا تو میں نہیں سمجھتی اس سے تمہیں کوئی فائدہ ہو گا۔ جتنی معلومات تمہیں میں نے دی ہیں، اس سے شاید اتنی بھی حاصل نہ ہو سکیں۔ جب کہ میں یہی سمجھتی ہوں کہ ابھی مجھے کوئی کام کی بات نہیں معلوم۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گھڑی دیکھ کر جھرجھری سی لیتے ہوئے بولی "اب میں چلتی ہوں۔ میرے پاس نیند کے یہی چند گھنٹے ہوتے ہیں جن کے دوران مجھے تنہائی میسر ہوتی ہے۔ آج کی نیند میں نے قربان کر دی ہے۔ صبح سے دن بھر نہ جانے کیسے کیسے لوگوں سے ملاقاتیں کرنا پڑیں گی اور کل رات پھر شو پیش کرنا ہے۔ بڑے اعصاب شکن روز و شب ہیں میرے۔ اوپر سے جس میڈ کو اپنی جگہ، اپنے لباس میں لٹا کر آئی ہوں، اسے گو کہ میں نے بہت بھاری معاوضہ دیا ہے لیکن پھر بھی ظاہر ہے ایک راز اس کے ہاتھ میں دے دیا ہے کہ میں کچھ دیر کے لئے رازدارانہ انداز میں کہیں غائب ہوئی تھی۔ اگر کسی کو ذرا سا بھی شک ہو گیا تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ یا ویسے ہی اگر اس میڈ نے محسوس کر لیا کہ یہ کوئی بہت اہم چکر ہے اور وہ بک گئی، کسی خوف یا کسی لالچ کے تحت اس نے یہ بات اگل دی تو نہ جانے میرا کیا حشر ہو گا۔"

"کچھ نہیں ہو گا۔ تم بالکل بے فکر رہو۔ اتنا بھی مت ڈرو" میں نے اسے تسلی دی۔

"اب تم مجھ سے ملنے یا سامنے آنے کی کوئی دانستہ کوشش مت کرنا" وہ بولی "تمہارا ردعمل ایسا ہونا چاہئے جیسے تمہیں یقین آگیا ہے کہ میں ہنی نہیں، پرنسس تہمینہ ہی ہوں۔ اگر کبھی اتفاقاً سامنا ہو بھی جائے تو اجنبی ہی بنے رہنا۔ میں کوشش کروں گی کہ ان لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے اگر کوئی کارآمد اطلاع تمہیں بھجوا سکوں تو کسی نہ کسی ذریعے سے بھجوا دوں۔ اس میں میری زندگی کو خطرہ لاحق ہو گا لیکن میں یہ کام کرنے کی کوشش کروں گی۔ مگر تم از خود مجھ سے رابطہ قائم کرنے کی قطعاً کوشش نہ کرنا۔ کل کے واقعے کو گویا تم بالکل بھول جاؤ گے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے منظریانہ لہجے میں ہدایات کا سلسلہ جاری رکھا "بلکہ میرا تو تمہیں یہی مخلصانہ اور دوستانہ مشورہ ہے کہ ان سے الجھنے کا سلسلہ ہی بند کر دو۔ ان سے نمٹنا میرے تمہارے بس کی بات نہیں لگتی۔"

"میں کہاں الجھتا ہوں" میں نے کہا "الجھتے تو وہ خود ہیں۔ لیکن اب میرا تجسس اتنا بڑھتا جا رہا ہے کہ شاید میں تمہارے مشورے پر عمل نہ کر سکوں۔"

"مردوں میں...... خصوصاً تم جیسے مردوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "کہ انہیں جس کام سے منع کرو اسے وہ ضرور کرتے ہیں۔"

"کیا یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا؟ تم زندگی بھر اسی طرح ان کے اشاروں پر ناچتی رہو گی؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو مجھے اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آتا" پھر وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی "اور تم یہ "زندگی بھر" کے الفاظ اس طرح استعمال کر رہے ہو جیسے یہ کوئی بہت لمبی مدت ہو۔ ان کے ساتھ رہتے ہوئے زندگی بہت مختصر بھی ہو سکتی ہے۔ خصوصاً مجھ جیسی عورت کی۔ جو دل سے ان کی وفادار بھی نہیں ہے اور جس کی اہمیت بھی ان کی نظر میں صرف جسم و جوانی کی کشش کے حوالے سے ہے۔ اگر یہ مجھ سے خوش رہیں تب بھی جسم کے چراغ کی لو مدھم پڑتے ہی میری اہمیت ختم ہو سکتی ہے اور مجھے تمام چھوٹے موٹے رازوں سمیت دریا برد کیا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے شبہ ہوتا ہے کہ شاید اصلی پرنسس تہمینہ کو محض غداری کی وجہ سے غرق نہ کیا گیا ہو بلکہ اصل وجہ یہی ہو کہ اس کی عمر ڈھلنے لگی ہو۔ بھیڑیوں کے لئے اس خوبصورت شکار میں کشش نہ رہی ہو۔"

"تم بیٹھی بیٹھی اس قسم کے دل شکن اندازے مت لگاتی رہا کرو۔ جو نامعلوم ہے اسے نامعلوم ہی رہنے دو۔ بعض اوقات ناآگہی بڑی رحمت ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"میں نے تمہیں اصل بات تو بتائی ہی نہیں کہ فی الحال میرے ان لوگوں کے ساتھ رہنے کی سب سے بڑی وجہ کیا ہے" وہ گہری سانس لے کر گویا کہانی کے اصل موڑ کی طرف آتے ہوئے بولی۔

"وہ وجہ بھی بیان کر ڈالو، اس سے پہلے کہ صبح کی سپیدی نمودار ہو جائے" میں نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یاد ہے تم اصل میں میرے دوست کس طرح بنے تھے اور میرے خلوص کا یقین تمہیں کب آیا تھا؟" اس نے گویا میری آنکھوں میں کچھ تلاش کرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ایسی باتیں میں بھولا نہیں کرتا۔" میں نے ان بھولے

لمحوں کا تناؤ اپنے اعصاب پر محسوس کرتے ہوئے کہا
میرے خون کے پیاسے میرے تعاقب میں تھے اور میں غیر ارادی
پر بازار حسن کے ایک مکان میں جا گھسا تھا۔ وہاں تم عروسی
...ا پہنے مسہری پر بیٹھی نظر آئی تھیں۔ تم نے اپنی جان خطرے میں
...ل کر مجھے پناہ دی تھی۔ پھر اپنا پستول دیا تھا۔ فرار ہونے کے لئے
...پی گاڑی دی تھی۔"

"اور میں نے تمہیں ایک ننھی سی کہانی بھی سنائی تھی۔ کہ
...عمری میں کوئی مجھے پہلی پہلی محبت کے خوب صورت خواب دکھا کر
...روسی لباس پہنا کر سیج پر بٹھا کر گیا تھا کہ میں تھوڑی دیر میں آ رہا
...ہوں۔ مگر وہ لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ وہ شادی ادھورے خواب کی
طرح رہ گئی تھی۔ اسی دن کی یاد منانے کے لئے میں عین اسی وقت،
اسی کمرے میں، وہی عروسی لباس پہن کر ہر سال جا کر بیٹھتی تھی کہ
شاید کبھی کسی معجزے کے تحت وہ لوٹ ہی آئے۔ مگر وہ معجزہ رونما
نہیں ہوا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے یہ بھی۔ تم نے مجھے بتایا تھا" میں نے کہا۔

"وہ بھی مجھے ان لوگوں کے درمیان نظر آگیا ہے۔ وہ ان کے لئے کام کر رہا ہے" وہ سر جھکا کر افسردہ لہجے میں بولی۔ میں بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

وہ سرگوشی سے بھی دھیمے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "جس بنگلے میں مجھے رکھا گیا تھا، وہ بھی وہاں موجود تھا۔ میرا دل اسے دیکھ کر دھڑکنا بھول گیا۔ اس وقت تو میری برین واشنگ کا عمل بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بھی مجھے دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو جائے گا۔ وفا کی ڈسی ہوئی ایک طوائف زادی نے برسوں اس کا انتظار کیا تھا...." اس کی سرگوشی بھی ٹوٹ گئی۔

"لیکن کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مضبوطی سے یوں میرا ہاتھ تھام لیا جیسے ڈوبنے سے بچنے کے لئے سہارا تلاش کر رہی ہو۔ دو آنسو آتش سیال کی طرح میرے ہاتھ پر گرے مگر وہ مسکراتے ہوئے بولی "اس نے مجھے پہچانا ہی نہیں۔ میری ساری گرم جوشی، میری ساری باتوں کے جواب میں وہ یوں بُت بنا رہا جیسے میں کسی دوسرے سیارے کی مخلوق ہوں اور میری زبان اس کی سمجھ سے باہر ہے۔"

"وہ وہاں کیا کر رہا تھا؟" میں نے جلدی سے اسے سوال میں الجھانے کی کوشش کی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کا دل قطرہ قطرہ لہو رو رہا تھا مگر وہ ایک بہادر عورت تھی، مسکرائے جا رہی تھی اور اپنی آنکھیں خشک رکھنے کی پوری کوشش کر رہی تھی۔

"میں تمہیں اس کے بارے میں بتا نہیں سکی تھی" وہ اپنی سرگوشیوں میں گھلے ہوئے کرب کو دباتے ہوئے بولی "وہ بھی طوائفوں کے ایک بہت اونچے اور معروف گھرانے کا لڑکا تھا لیکن لڑکپن سے ہی بہت حساس اور ذہین تھا۔ کم عمری میں ہی یہ سوچ کر بازار حسن سے بھاگ گیا تھا کہ وہ اس خاندانی پس منظر کا بوجھ اٹھا کر زندگی کا سفر طے نہیں کر سکے گا۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک بہت اچھے خاندان میں پہنچ گیا۔ ایک آسودہ حال مگر بے اولاد جوڑے نے اسے اپنا بیٹا بنا لیا تھا اور بہت شاندار طریقے سے تعلیم دلائی تھی۔ ہمارے ہاں تو ابھی تک الیکٹرونکس کی تعلیم عام نہیں ہے مگر وہ ان دنوں امریکا سے الیکٹرونکس کا کوئی کورس کر کے آیا تھا۔"

دوپٹے سے میرے ہاتھ سے اپنے آنسوؤں کی نمی صاف کرتے ہوئے وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی "خون کی کشش جوش مارتی تھی تو وہ کبھی کبھی چھپ کر بازار حسن آیا کرتا تھا۔ اس کے ماں باپ مر چکے تھے لیکن ایک بڑی بہن اس وقت تک بازار میں تھی اور بڑی اونچے درجے کی رقاصہ تھی۔ وہ چاہتی بھی تو بازار حسن نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ وہ بہت بڑے بدمعاشوں کے قبضے میں تھی اور ویسے بھی اس پر بازار حسن کی چھاپ اتنی گہری ہو چکی تھی کہ باہر کی دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں رہی تھی۔"

"اچھا.... تو اسی پس منظر کی وجہ سے وہ تمہیں جانتا تھا؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ ہم بچپن سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ بچپن سے ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار تھے۔ اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے تو میں بھی بعد میں اپنی [illegible] کو لے کر بازار حسن سے نکل آئی تھی۔ میری ماں بہت اچھی [illegible]۔ اس نے کبھی میری کوئی بات نہیں ٹالی۔ اس جیسی مائیں شریف زادوں کو بھی کم ہی نصیب ہوتی ہیں۔ وہ جتنا عرصہ زندہ رہی، صرف میرے لئے زندہ رہی۔"

جب کوئی اس والہانہ انداز میں اپنی ماں کا تذکرہ کرتا تھا تو میرے سینے میں دل گویا ایک تاریک خلا بن جاتا تھا جس میں آندھیاں سیٹیاں سی بجانے لگتی تھیں جیسے رات کے پچھلے پہر ان دیکھے ریگزاروں میں کوئی طوفان سر اٹھا رہا ہو۔

"میں نے پوچھا تھا وہ.... تمہارا محبوب وہاں کیا کر رہا تھا؟" میں نے جلدی سے اپنا سوال دہرایا۔

"وہ شاید وہاں بعض الیکٹرونک آلات اور کچھ عجیب قسم کے کمپیوٹرز کی نگرانی پر مامور تھا۔ میرا خیال ہے اس کی حیثیت بس ایک مستری کی سی تھی اور وہ ایک روبوٹ کی طرح ادھر ادھر آتا جاتا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا چہرہ ہمیشہ تاثرات سے عاری رہتا تھا۔"

"ہو سکتا ہے کہ وہ بھی اسی طرح تمہیں نہ پہچاننے اور اپنے ماضی سے بے خبر ہونے کی اداکاری کر رہا ہو جس طرح تم کل تک میرے سامنے کر رہی تھیں؟" میں نے خیال ظاہر کیا "اس نے اسی میں عافیت اور مصلحت سمجھی ہو؟"

"مجھے اس سے تنہائی میں بھی بات کرنے کا موقع بارہا ملا۔ وہ الیکٹرونک کا ماہر ہے۔ وہ چاہتا تو اس طرح مجھ سے بات کرنے کا موقع نکال سکتا تھا کہ ہماری آواز کہیں اور نہ سنی جا سکتی۔ مگر اس نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔ اس کے چہرے پر تو کوئی تاثر ہی

نہیں ابھرا۔ اور پھر تم کیا سمجھتے ہو... ایک عورت کے جس کے تصور میں ایک عمر گزار دی ہو کیا وہ اتنا بھی محسوس نہیں کر سکتی کہ ذہنوں کا رابطہ نہیں ہو رہا۔ میں اس کے دل میں تھی ہی نہیں۔ میری کوئی تصویر' میری یاد کا کوئی نقش اس کے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں بھی محفوظ نہیں تھا۔ وہ گویا مکمل طور پر ایک نیا انسان تھا۔ نیا جنم لے کر آیا تھا۔ صرف شکل گویا کسی کی غلطی سے پرانی لگی رہ گئی تھی۔"

"ہو سکتا ہے وہ تمہارے محبوب کا ہم شکل ہو۔ اس کا کوئی جڑواں بھائی تو نہیں تھا؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"میں تمہیں کسی فلم کی کہانی نہیں سنا رہی" وہ دھیرے سے ہنس کر بولی۔ اس خاموش ہنسی میں بھی زہر تھا۔

"نام کیا تھا اس کا؟" میں نے پوچھا۔

"عدنان" اس نے آہ بھرنے کے سے انداز میں نام لیا۔

"جہاں تم نے اسے دیکھا تھا وہاں اسے اسی نام سے پکارا جا رہا تھا؟"

"وہاں میرے سامنے اسے صرف ایک بار پکارا گیا تھا۔ سفید فام سرجن کے سفید فام اسسٹنٹ نے اسے "مسٹر جے" کہہ کر پکارا تھا۔ انداز تحکمانہ تھا۔" اس نے بتایا۔

"ہو سکتا ہے وہ مسٹر جے ہی ہو" میں نے اسے بہلانے کی کوشش کی۔

"کوئی اسے جے کہے یا کے۔ مجھے معلوم ہے وہ میرا عدنان تھا" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"تم اس کا ذکر بھی جذبوں کی ان شدتوں کے ساتھ کرتی ہو۔ ادھر مجھ سے بھی عشق جتاتی ہو۔ یہ کیا چکر ہے؟" میں نے یونہی ذرا اسے ٹٹولنے کی خاطر پوچھا۔

"میرا اصل عشق وہی ہے۔ وہی بچپن کی محبت جو کبھی انسان کے دل سے جدا نہیں ہوتی' چاہے وہ کتنا بھی آوارہ ہو جائے' کتنی ہی دنیا گھوم لے' کتنا ہی بڑا بن جائے۔ وہ جو ایک میٹھی سی خلش دل میں نہاں رہتی ہے وہ تو بس زندگی بھر کے لئے ہوتی ہے نا۔ عدنان نظر آیا تو سب بھولے بسرے خواب جاگ اٹھے۔ ساری تشنگی' ساری محرومیاں' تمام ادھوری تمنائیں ... سب کچھ از سر نو زندہ ہو گیا۔ عدنان تو میری کتاب زندگی کا پہلا ورق ہے نا۔ اسے تو میں پھاڑ کر نہیں پھینک سکتی۔ کتاب بے شناخت سی ہو جاتی ہے۔"

"اور میں کیا ہوں ... اسپیئر وہیل؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

وہ دھیرے سے اسی بے آواز انداز میں ہنسی "تم بھی مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ لیکن تم سے میرا عشق بس کچھ ایسا ہی ہے جیسے انسان کو دمکتا چاند اچھا لگتا ہے ... فلک بوس چوٹیوں پر جمی ہوئی برف اچھی لگتی ہے ... شام ڈھلے چناروں پر آگ کی طرح دہکتے سے پھول اچھے لگتے ہیں۔ کبھی کبھی ایسی کسی چیز سے بھی انسان کو عشق ہو جاتا ہے مگر وہ اس کی رسائی میں نہیں ہوتی' اسے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان چیزوں کو پا نہیں سکتا لیکن محض اسی بنا پر وہ ان سے منہ نہیں موڑ سکتا۔"

"میں بددعا نہیں دے رہا... ویسے ہی حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک امکان سا ظاہر کر رہا ہوں۔ پا تو شاید تم عدنان کو بھی نہ سکو" میں نے کہا۔

"بس ایک موہوم سی امید تو ہے۔ اس کے کچھ بھولے بسرے وعدے تو میرے پاس امانت ہیں۔ تمہارا تو میرے پاس کوئی وعدہ امانت نہیں۔ چاند ستارے' برف پوش چوٹیاں اور چنار کسی سے وعدے نہیں کرتے کہ وہ ان کے ہو جائیں گے۔ تم نہ جانے کن منزلوں کے راہی ہو اور میرا انجام نہ جانے کیا ہونا ہے۔ لیکن تم یہ سب باتیں کیوں کر رہے ہو؟ تمہیں کون سا زندگی کے سفر میں میرے ساتھ چلنے کی آرزو ہے؟" وہ ایک بار پھر میری آنکھوں کے راستے دل میں جھانکتے ہوئے بولی۔

میں کچھ نہ بولا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں اس سے کوئی ایسا وعدہ نہیں کر سکتا تھا جسے پورا کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ اپنی منزل تو مجھے خود معلوم نہیں تھی۔ میں نے کسی بھی عورت سے کوئی جھوٹا وعدہ نہیں کیا تھا۔ میں اچھا انسان تھا یا برا۔ لیکن میں نے کسی جھوٹے جذبے کا کھوٹا سکہ کسی اچھی یا بری عورت کے ہاتھ چلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ رفاقتیں جیسی بھی تھیں' انہیں معلوم تھا۔ میں نے ان میں کبھی جھوٹے سچے وعدوں کے رنگ بھرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"چپ ہو گئے نا؟" وہ میری ناک چھوتے ہوئے شریر سے لہجے میں بولی "ڈرو مت۔ میرا تمہارے گلے پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ میں تو ویسے ہی پوچھ رہی تھی کہ آخر تم مجھے اتنا کیوں کرید رہے ہو؟ جب کہ تمہارا اس کھنڈر کو محل بنانے کا کوئی ارادہ نہیں۔"

"میں بھی بس ویسے ہی کرید رہا تھا" میں نے اسی کے سے لہجے میں جواب دیا "کسی معمے کی گتھیاں سلجھتے دیکھ کر ایک نامعلوم سی خوشی ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس نے کچھ دریافت کیا ہے۔"

"میں اب چلتی ہوں" اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی "گھبراہٹ سے اس میڈ کا ہارٹ فیل نہ ہو جائے۔ دو گھنٹے کا معاوضہ میں نے اسے دس ہزار دیا ہے۔ اس کی دس ماہ کی تنخواہ۔"

"یہ معاوضہ اس کا ہارٹ فیل ہونے سے بچانے میں کافی معاون رہے گا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "معاوضے کے ذکر پر یاد آیا... تمہیں کوئی مالی پریشانی تو نہیں ہے؟"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر اسی بے آواز انداز میں ہنسنے لگی۔

"کیا میں نے کوئی بہت احمقانہ بات پوچھ لی ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"مجھے تمہارے پوچھنے کے انداز پر ہنسی آ رہی ہے۔ تمہیں جو کچھ پوچھنا ہوتا ہے' بہت سادہ اور دو ٹوک انداز میں پوچھ لیتے ہو۔"

"دوستوں کے سامنے انسان کو اسی طرح رہنا چاہئے۔ خواہ مخواہ کے پیچ و خم ڈالنے سے کیا فائدہ" میں نے کہا۔

"نہیں۔ مالی مسئلہ کوئی نہیں ہے" وہ سنجیدگی سے بولی "بہت روپیہ ہے۔ بلکہ خرچ کرنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ روپے پیسے کے معاملے میں انہوں نے مجھے بہت با اختیار بنا رکھا ہے۔ اور پھر میرا اپنا سب کچھ بھی انہوں نے پہلے ہی نہ جانے کب میرے نئے نام پر ٹرانسفر کر دیا ہے۔ ہنی کی حیثیت سے میں اپنی کوٹھی بھی پرنس تہمینہ کو بیچ چکی ہوں۔ کوئی مجھ سے کسی چیز کا حساب طلب نہیں کرتا۔ کم از کم اس اعتبار سے وہ مجھے خوش اور مطمئن رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"دوبارہ اس بنگلے میں جانا نہیں ہوا جہاں تمہیں چند ماہ رکھا گیا تھا؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا۔

"پھر تو شاید عدنان سے بھی دوبارہ سامنا نہیں ہوا ہو گا؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ پھر بولی "لیکن میں اس کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گی۔ کم از کم یہی معلوم کرنے کی کوشش کروں گی کہ ان ماہ و سال میں اس پر کیا گزری۔ اور کیا اب بھی وہ کسی طرح مجھے اور اپنے آپ کو شناخت کرنے کی کوشش کرتا ہے؟ کتنی عجیب بات ہے ... دو انسانوں سے ان کی شخصیت اور ان کا ماضی چھین لیا گیا ہے۔"

اس نے جانے کے لئے قدم بڑھایا۔ وہ میڈ ہی کی معمولی سی جوتیاں پہنے ہوئے تھی۔ میں نے اس کے پیروں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اتنی دیر تک دیوار سے لگ کر کھڑی رہنے سے تمہارا تو حشر خراب ہو گیا ہو گا؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "میں بڑی سخت جان ہوں۔"

"ہاں' کافی حد تک اندازہ ہوتا جا رہا ہے" میں نے تسلیم کیا اور اس کے ساتھ چلنے کے لئے قدم بڑھایا۔

وہ مجھے روکتے ہوئے بولی "تم یہیں کھڑے رہو۔ میرے جانے کے بعد جانا۔ اور میری ہدایات یاد ہیں نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور وہ رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد کچھ دیر تک میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ وہ میری سوچوں کو کچھ نئی راہیں ضرور دے گئی تھی۔ ریڈ ڈاٹ کے بارے میں میں کسی نہ کسی حد تک روشنی میں ضرور آیا تھا۔ میں غیر جذباتی اور حقیقت پسند ہو کر سوچنے کی کوشش کرتا تھا تو میری سمجھ میں آتا تھا کہ مجھے ان کے بارے میں زیادہ جارحانہ رویہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرے حق میں بہتر یہی تھا کہ صرف چوکنا رہوں اور جب کبھی وہ مجھے کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کریں تو اپنے آپ کو اس سے بچاؤں۔ کسی حد تک دفاعی حکمت عملی پر ہی

کاربند رہوں۔ وہ کون تھے' کیا تھے' ان کے مقاصد کیا تھے' کہیں کسی بہت بڑی سازش کے تانے بانے تو نہیں بنے جا رہے تھے؟ یہ جاننا میرا نہیں' ایجنسیوں کا کام تھا۔

میں اپنے آپ کو بار بار یاد دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ مجھے بس ایک بڑے بزنس مین ہی کی طرح سوچنا چاہئے تھا اور اپنے طور طریقے بھی کافی حد تک ویسے ہی رکھنے کی کوشش کرنا چاہئے تھی۔ زیادہ سے زیادہ بس یہی مناسب تھا کہ میں اپنے آپ کو عام دولت مند یا بزنس مین کی طرح آسان شکار نہ بننے دوں اور اگر کوئی میرے ساتھ کسی بھی سطح پر زیادتی کی کوشش کرے تو اسے منہ توڑ جواب دوں یا ساتھ ساتھ تھوڑا بہت سبق سکھا دوں۔ اس سے آگے نہ بڑھوں۔ اسی حکمت عملی کو اپنی مستقل پالیسی بنا لوں۔

لیکن میرے اندر جو ایک اور افضل چوہدری چھپا بیٹھا تھا وہ مجھے اتنا نپا تلا انداز اختیار نہیں کرنے دیتا تھا۔ وہ مجھے کبھی کبھی جذباتی بھی بنا دیتا تھا۔ کبھی میرے تجسس کو بھی بڑھا دیتا تھا اور کبھی میرے دل میں یہ تشویش بھی پیدا کر دیتا تھا کہ کہیں میرے ملک کے خلاف تو کچھ نہیں ہو رہا؟ لوگوں کے پاس دولت زیادہ آتی ہے تو ان کے دل میں وطن کی محبت کم ہو جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سے ملک کے بارے میں بہت بے فکر ہو جاتے ہیں کیونکہ ان کی اپنی فکریں دور ہو چکی ہوتی ہیں۔ وہ کچھ اس انداز میں سوچنے لگتے ہیں کہ خدانخواستہ ملک کو کچھ ہو بھی گیا تب بھی ہمارے لئے کیا فرق پڑتا ہے۔ بھاگ کر فلاں ملک چلے جائیں گے۔ فلاں ملک میں ہمارا پیسہ ہے' فلاں ملک میں بنگلا ہے' فلاں ملک میں کاروبار ہے' فلاں ملک میں کمپنی میں شیئرز ہیں' فلاں ملک میں ولا ہے' فلاں ملک میں بچے پڑھ رہے ہیں۔

میرا معاملہ الٹ تھا۔ میرے پاس دولت آئی تھی تو مجھے اس ملک میں اپنی جڑیں زیادہ گہری محسوس ہونے لگی تھیں۔ میں سوچتا تھا' میں جو کچھ بھی ہوں اوپر والے کی مہربانیوں اور اس ملک کی عنایات کے سبب ہوں۔ جس شاخ پر بیٹھ کر میں نے کسی طرح بھی اپنا آشیانہ بنایا ہے' جسے میں اپنی اپنی ایپائر سمجھتا ہوں' اب اس شاخ کا بھی کچھ نہ کچھ خیال رکھنا میرا فرض ہے۔ بس اسی انداز فکر کی وجہ سے مجھے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بھی تشویش ہونے لگتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ اتنے بڑے پیمانے پر اتنے منظم اور خفیہ انداز میں نامعلوم قسم کی سرگرمیاں کسی بڑے اور منفی مقصد کے لئے ہی ہو سکتی ہیں۔ ہنی نے جو کچھ بتایا تھا اس سے میرے شبہات کچھ اور قوی ہوئے تھے۔

انہی سوچوں میں الجھا ہوا میں دیوار کے قریب سے ہٹ کر بغلی گلی کے سامنے آ گیا تاکہ ٹونی مجھے دیکھ لے اور سمجھ جائے کہ میں اب رخصت ہو رہا تھا۔ اب وہ بھی جا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہاں کھڑے ہونے کے بعد میں عمارت کے سامنے والے حصے کی طرف چل دیا۔

گھر آکر میں لمبی تان کر سو گیا۔

دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا اس لئے خوب دن چڑھے تیار ہو کر آفس جانے کے لئے گھر سے نکلا۔ میں اپنی گلی کے موڑ پر پہنچا ہی تھا کہ ایک نوجوان ایک کوٹھی کے سبزے کی باڑھ کی اوٹ سے نکل کر یوں سامنے آگیا جیسے کسی نے اس کی کمر پر لات رسید کر کے اسے میری گاڑی کے سامنے دھکیل دیا ہو۔ میں نے فوراً بریک لگائی۔ دیوہیکل گاڑی خفیف سے دھچکے کے ساتھ رک گئی۔

گاڑی کا فینڈر اس کے گھٹنوں کو تقریباً چھو رہا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس طرح ہاتھ ہلا رہا تھا جیسے ابھی میں کافی دور ہوں اور وہ سڑک کے بیچوں بیچ کھڑے ہو کر مجھے رکنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ پھر مجھے گلی کے کونے سے اس کی زرد نوکسی بھی جھانکتی نظر آگئی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا تھا۔ آج تو کسی کالی بلی نے میرا راستہ بھی نہیں کاٹا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں گھر سے نکلتے ہی یہ نوجوان آ ٹکرایا تھا۔

جی ہاں..... وہ وسیم احمد تھا! گلاس کے پیندے جتنے موٹے موٹے عدسوں والی اس کی عینک پھسل کر عین ناک کی نوک پر آئی ہوئی تھی، قمیص پتلون سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ میں وہ کوئی ڈبا سا اٹھائے ہوئے تھا۔

میں نے گاڑی ایک طرف دیوار کے ساتھ لگائی اور دروازہ کھول کر گردن نکالتے ہوئے کہا "وسیم! اگر تم نے گاڑی کے نیچے آکر ہی مرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو کم از کم مجھے بتا تو دیا ہوتا۔ میں تمہیں گاڑی کے نیچے آنے کا صحیح طریقہ بتاتا جس میں تکلیف کم ہوتی اور نتیجہ سو فیصد یقینی نکلتا۔"

"سر! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں" وہ قریب آتے ہوئے شرمیلے سے لہجے میں بولا۔

"آپ کی وجہ سے تو مجھے نئی زندگی ملی ہے۔ میں بھلا خودکشی کا کیسے سوچ سکتا ہوں۔"

"اگر نئی زندگی مل ہی گئی ہے تو اس پرانی زندگی کو کیوں ضائع کرنے پر تل گئے ہو۔ اسے بھی سنبھال کر رکھ لو۔ کبھی کام آجائے گی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھے تو یہی محسوس ہوا تھا کہ تم خودکشی کرنا چاہتے ہو جس کے لئے تم نے کافی عقل مندی کا ثبوت دیتے ہوئے میری گاڑی کا انتخاب کیا ہے کیوں کہ یہ تقریباً ٹرک جتنی بھاری ہے۔ اس کے نیچے آکر تمہاری قیمتی ہڈیوں کے سلامت رہنے کے امکانات ذرا کم ہی ہوتے۔"

"سر! میں کروں..... مجھے اسی طرح آپ کو راستے میں روکنا پڑتا ہے۔ آپ کا اسٹاف میرے اور آپ کے درمیان سماج کی دیوار بنا رہتا ہے" یکدم ہی اس کی آواز گلوگیر سی ہو گئی۔ "دفتر جاتا ہوں تو آپ کے ریسپشن والے آگے نہیں جانے دیتے۔ گھر آتا ہوں تو آپ کے سیکیورٹی گارڈز وغیرہ گیٹ سے اندر قدم بھی نہیں رکھنے دیتے۔ بلکہ آپ کو میری آمد کی اطلاع بھی نہیں بھجواتے۔ منت سماجت سے بھی موم نہیں ہوتے۔"

"اصل میں وہ لوگ کافی تجربہ کار ہو گئے ہیں۔ انہیں شکل دیکھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ کون کام کی بات کرنے آیا ہے اور کون صرف وقت ضائع کرنے" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"سر! کیا میں شکل سے اتنا ہی احمق لگتا ہوں کہ کوئی مجھ سے کسی کام کی بات کی توقع ہی نہیں رکھتا؟" اس نے دردناک سے لہجے میں پوچھا اور خود ہی اپنی ٹھوڑی تھام کر چہرہ گویا میرے معائنے کے لئے ذرا آگے کو کر دیا۔ اس کے اس انداز پر مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ اس کی شخصیت میں یہی بڑی عجیب بات تھی۔ ایک پل میں اس پر غصہ آنے لگتا تھا اور ایک پل میں ترس۔ یا پھر خواہ مخواہ ہی ہنسی آجاتی تھی۔ خصوصاً اس کی حد سے زیادہ سنجیدگی اور "دردناکی" مضحکہ خیز لگتی تھی۔ ورنہ جہاں تک اس کی شکل صورت کا تعلق تھا، اچھا بھلا ہینڈسم لڑکا تھا۔ خرابی بس یہی تھی کہ اس کی شکل پر حد سے زیادہ حماقت برستی تھی، خصوصاً موٹے موٹے شیشوں کے عقب میں اس کی آنکھیں الو کی آنکھوں کی طرح گول گول نظر آتی تھیں۔ ان کی وجہ سے چہرے پر زیادہ مضحکہ خیزی جھلک آتی تھی۔

"نہیں۔ نہیں" میں نے فوراً نرمی سے کہا "شکل صورت تو اللہ کی بنائی ہوتی ہے۔ محض شکل دیکھ کر کسی کے بارے میں اندازے لگانے کی کوشش بھی نہیں کرنی چاہئے۔ میں تو ویسے ہی مذاق کر رہا تھا۔"

وہ یک دم جیسے اپنا سارا "رنج و غم" بھول گیا اور شکایت کے بجائے بڑے مان سے بولا "آپ کو معلوم ہے..... میں ایک گھنٹے سے آپ سے ملاقات کے انتظار میں کھڑا ہوں؟ آپ کے گارڈ نے جب مجھے بھگا دیا تو میں یہاں آکر کھڑا ہو گیا۔ میں باڑھ کے پیچھے اس لئے چھپا ہوا تھا کہ کہیں آپ بھی مجھے دور سے دیکھ کر گاڑی ریورس کر کے بھگا نہ لے جائیں۔ ویسے بائی دا وے چوہدری صاحب.....! یہ دنیا مجھے دیکھ کر بھاگتی کیوں ہے؟"

"دنیا کو ابھی تمہاری قدر نہیں معلوم" میں نے تسلی دینے کے انداز میں کہا "بہرحال تم دل چھوٹا نہ کرو۔ ایک وقت آئے گا کہ دنیا اس قدر ناشناسی پر پچھتائے گی۔ تم یہ بتاؤ کہ دن چڑھتے ہی میری طرف کیسے دوڑ پڑے؟"

"مبارک باد دینے اور شکریہ ادا کرنے آیا تھا سر!" وہ نہایت مسرور لہجے میں بولا "آپ کے لئے مٹھائی بھی لایا تھا" اس نے ڈبا گاڑی میں ہی میرے گھٹنوں پر رکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے باز رکھا۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ وہ واقعی مٹھائی کا ایک بڑا سا ڈبا تھا۔ اس پر گفٹ پیکنگ کا سرخ ربن بھی لپٹا ہوا تھا۔

"مٹھائی.....! کس بات کی مٹھائی لائے ہو بھائی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ میں ابھی تک گاڑی سے نہیں اترا تھا۔

"وہ..... چھوٹے چچا قتل ہو گئے تھے نا....."

"تو اس خوشی میں تم مٹھائی بانٹ رہے ہو؟" میں نے اب خاصی حیرت سے پوچھا۔

"ویسے تو سر..... دنیا داری اور شرع کی شرم نہ ہو تو اس دنیا میں ان گنت لوگ ایسے ہیں جن کی موت پر مٹھائی بانٹنا بڑا اچھا کام محسوس ہو" اس کے چہرے پر بدستور حماقت برستی رہی مگر بات وہ گہری کر گیا۔ پھر جلدی سے بولا "لیکن بہرحال میں مٹھائی اس لئے نہیں بانٹ رہا۔ آپ کو تو سمجھ جانا چاہئے تھا۔ میں تو اس خوشی میں آپ کے لئے مٹھائی لایا ہوں کہ میں چھوٹے چچا کے قتل کے الزام میں ملوث ہونے سے بچ گیا ہوں۔ میں نے آپ کے مشورے کے مطابق کہانی گھڑ کر اباجی کو اور پولیس کو سنائی۔ پولیس نے تو ویسے ہی مجھ میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی....."

"مبارک ہو" میں نے کہا "جس کے کمرے میں قتل ہوا ہو اور پولیس اس آدمی میں دلچسپی نہ لے وہ مبارک باد کا مستحق ہوتا ہے۔"

"خیر مبارک۔ خیر مبارک" وہ ایک بار پھر تھوڑا سا شرما کر بولا "لیکن اصل مبارک باد کے مستحق تو آپ ہیں۔ اسی لئے میں حاضر ہوا ہوں۔ آپ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنے کی وجہ سے ہی میں اس چکر سے بچا ہوں۔ اباجی کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ انہیں یقین آگیا کہ چھوٹے چچا گھپلے کر رہے تھے۔ اب تو ان کے سامان کی تلاشیاں لی جا رہی ہیں۔ ان کے کاغذات دیکھے جا رہے ہیں۔ اور ہر قدم پر نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں۔ وہ تو کارخانے کو میرے اندازوں سے زیادہ چونا لگا رہے تھے۔ تبھی تو کارخانہ اتنا زیادہ منافع نہیں دے رہا تھا جتنا اسے اباجی کے اندازوں کے مطابق دینا چاہئے تھا۔"

"چلو..... دیر سے ہی سہی لیکن بہرحال اباجی کی آنکھیں تو کھل گئیں" میں نے کہا۔

"آنکھیں کیا کھلی ہیں بلکہ چودہ طبق روشن ہو گئے ہیں" خوشی کے مارے وسیم احمد کے قدرے پچکے ہوئے گالوں پر سرخی آگئی تھی۔ "میرے لئے تو کئی طرف سے خوشیوں کا سامان ہو گیا ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ اتنی بہت سی خوشیوں کو کس طرح سنبھالوں۔ ادھر پولیس نے میری کہانی پر یقین کر لیا کہ چھوٹے چچا کسی ڈاکو کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں اور انہوں نے مجھے اس میں ملوث کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ادھر چھوٹے چچا کا کانٹا درمیان سے نکل گیا جنہوں نے میری غمزدہ زندگی کو مزید غمزدہ بنا رکھا تھا۔ سب سے اچھی بات یہ ہوئی کہ اباجی کی نظر میں میری کچھ قدر ہو گئی ہے۔ فی الحال تو ان کا رویہ کافی بدل گیا ہے۔ شاید انہیں احساس ہو گیا ہے کہ دوسروں کے مقابلے میں بہرحال انسان کی اولاد پھر بھی اس کی زیادہ ہمدرد ہوتی ہے۔ چاہے وہ نکمی ہو، احمق ہو، نکھٹو ہو۔ جیسی بھی ہو۔ لیکن اولاد بہرحال اولاد ہوتی ہے۔"

"چلو..... تمہاری پانچوں گھی میں ہو گئیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری زندگی میں تو جیسے راتوں رات انقلاب آگیا ہے چوہدری صاحب!" وہ تشکر بھرے لہجے میں بولا "لیکن یہ سب آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے۔ آپ پارس ہیں سر! جسے بھی آپ چھو لیتے ہیں وہ سونا ہو جاتا ہے۔ جس دن سے میں آپ کی صورت دیکھ کر آپ کے پیچھے لگا ہوں، میری زندگی میں انقلابات ہی انقلابات آئے چلے جا رہے ہیں۔ میرے تو حالات ہی بدل گئے ہیں۔ آپ بہت لکی انسان ہیں سر! جو آپ کے ساتھ لگتا ہے اس کی بھی قسمت بدل جاتی ہے۔ میرا دل چاہتا ہے کہ آپ کے پاؤں چھو لوں..... بلکہ چوم لوں۔"

وہ سچ مچ میرے پیروں پر جھکنے لگا۔ میں نے جلدی سے پاؤں سیٹ کے نیچے گھسا لئے اور اسے کندھے سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا "انسانوں کے ساتھ اتنی زیادہ عقیدت کا اظہار اچھا نہیں ہوتا۔ اچھے برے اتفاقات تو زندگی میں آتے ہی رہتے ہیں۔"

"یہ بات نہیں ہے سر! انسان کے حق میں بعض لوگ اچھے ثابت ہوتے ہیں اور بعض برے۔ کسی کا ساتھ میسر آتا ہے تو بگڑے کام سنورنے لگتے ہیں اور کوئی ساتھ لگتا ہے تو اچھے بھلے کام بھی اوندھے ہو جاتے ہیں۔ آپ کا ساتھ میرے لئے بہت مبارک ثابت ہوا ہے سر!" اس کا جوش عقیدت کم نہیں ہو رہا تھا۔

"لیکن میں نے تو تمہارا کسی معاملے میں صحیح معنوں میں ساتھ دیا ہی نہیں بھائی! میں نے تو ٹیلی فون پر تمہیں صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ اگر حادثاتی طور پر چھوٹے چچا تمہارے ہاتھوں مارے ہی گئے ہیں تو تم اب اپنا بیان اس طرح دینا" میں نے ملائمت سے کہا "اور اگر تم میں تھوڑی سی عقل ہوتی تو جو کچھ میں نے کہا ہے، وہ بات خود بخود تمہارے ذہن میں بھی آجاتی۔"

"میرے پاس عقل ہوتی تو پھر رونا ہی کس بات کا تھا سر!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "آپ نے فون پر جو کچھ کہا تھا، میرے لئے بس وہی کافی تھا۔ اسی نے میری زندگی کا رخ بدل دیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا، کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔ سر! اس خوشی میں آپ مجھ غریب کی طرف سے تھوڑی سی مٹھائی تو کھا لیں" اس نے پھرتی سے ڈبا کھولا اور میرے سامنے کر دیا۔

"بس بھائی! بہت شکریہ۔ میں مٹھائی نہیں کھاتا" میں نے نرمی سے ڈبا اپنے سامنے سے ہٹانے کی کوشش کی۔ اس میں نہ جانے کس کس نمونے کی مٹھائی بھری ہوئی تھی۔ مٹھائی کھانا تو درکنار، ایک عرصے سے میں نے مٹھائی دیکھی بھی نہیں تھی۔

"سر! آپ تھوڑی سی کھا لیں۔ ڈائٹنگ وغیرہ کی فکر نہ کریں۔ آپ کون سا موٹاپے کا شکار ہیں۔ آپ تو ماشاء اللہ ایسے کسرتی جسم کے مالک ہیں۔ آپ کو تھوڑی بہت مٹھائی کھا لینے سے کیا فرق پڑ جائے گا" اس نے اصرار کیا۔

"یہ بات نہیں ہے یار! میں کبھی ڈائٹنگ وغیرہ کے چکر

نہیں پڑا۔ میں تو بڑا لکڑ ہضم، پتھر ہضم قسم کا انسان ہوں۔ بس ویسے ہی اس وقت دل نہیں چاہ رہا۔ میں ابھی ابھی تگڑا ناشتا کر کے نکلا ہوں" میں نے مٹھائی سے جان چھڑانے کی ایک اور کوشش کی۔ ساتھ ہی محسوسات پر ایک عجیب سی لہر آکر گزر گئی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے بچپن یاد آگیا تھا۔ کتنا شوق ہوا کرتا تھا مجھے مٹھائی ـــ اور خصوصاً برفی کھانے کا۔ گاؤں میں ممیجے حلوائی کے چھوٹے اور گندے سے شوکیس میں تھوڑی سی رنگ برنگی مٹھائی بھی رہتی تھی جو لعل، یاقوت اور زمرد سے زیادہ خوبصورت لگتی تھی۔ دیکھ کر منہ میں پانی بھر آتا تھا۔ کتنا دل چاہتا تھا ساری مٹھائی ہڑپ کر جانے کو۔ اس وقت تو سستی بھی بہت تھی ۔ مگر اس وقت سستے داموں خریدنے کے لئے بھی جیب میں پیسے نہیں ہوتے تھے۔

کیا چیزیں تبھی خوب صورت لگتی ہیں جب رسائی میں نہیں ہوتیں؟ اب ضرورت پڑنے پر شہر بھر کی دکانوں کی مٹھائی خرید کر بھی کسی تقریب میں تحفے کے طور پر بھجوائی جا سکتی تھی۔ لیکن اب مٹھائی کھانے کو ایک عرصے سے دل نہیں چاہا تھا۔ کبھی یاد بھی نہیں آئی تھی۔ اب تو کبھی کبھی شدت سے دل چاہتا تھا کہ کوئی چیز ایسی بھی ہو جسے دیکھ کر منہ میں پانی آئے اور اس کا حصول مشکل نظر آئے۔ کرب نارسائی کی لذت سے بھی آگاہ رہنا چاہئے۔ اسے بھولنا نہیں چاہئے۔

"سر! آپ تھوڑی سی کھالیں۔ مجھ غریب کا دل رہ جائے گا" وسیم ایک بار پھر گھگیایا "قسم سے ..... مجھے کوئی اتنے پیار، محبت اور عقیدت سے زہر بھی کھلائے تو میں کھالوں۔"

میں نے برفی کا ایک ٹکڑا اٹھالیا اور دھیرے دھیرے چباتے ہوئے اس میں بچپن کی گم گشتہ لذتیں تلاش کرنے لگا مگر وہ اس میں نہیں تھیں۔ وسیم کے اس قدر مجبور کرنے پر میں نے اس کی فرمائش تو پوری کر دی تھی لیکن اب وہ ڈبا ہاتھ پر ٹکائے اپنے مخصوص احمقانہ انداز میں آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا "اس کا کیا کروں سر؟ یہ تو میں آپ کے لئے لایا تھا۔"

"تم ایسا کرنا وسیم!" میں نے کچھ سوچتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا "تھوڑی سی زحمت کرنا۔ اسی دکان پر چلے جانا جہاں سے تم نے مٹھائی خریدی ہے۔ ذرا دیر کے لئے وہاں کھڑے ہو جانا اور گزرتے ہوئے لوگوں کو ذرا غور سے دیکھنا۔ ان میں تمہیں کوئی نہ کوئی ایسا کم عمر لڑکا ضرور نظر آئے گا جو شوکیسوں میں سجی ہوئی رنگا رنگ مٹھائیوں کو حسرت کی نظر سے دیکھتا ہوا گزرے گا۔ اس کی نظروں کی مایوسی بتا رہی ہوگی کہ وہ کچھ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا۔ یہ ڈبا میری یا اپنی طرف سے اسے دے دینا۔ بلکہ اگر تم وہاں زیادہ دیر کھڑے ہو سکو اور تمہیں ایسے کتنے ہی بچے اور بچیاں نظر آئیں ان سب کو میری طرف سے ایک ایک اتنا ہی بڑا ڈبا خرید کر دے دینا۔ تمہارے پاس اگر پیسے نہ ہوں تو مجھ سے لے جاؤ۔"

موٹے موٹے عدسوں کے عقب میں اس کی گول گول سی آنکھیں ایک لمحے کے لئے ساکت ہو گئیں۔ مجھے ایک بار پھر شبہ ہوا کہ ان آنکھوں کی گہرائیوں میں اتنی حماقت نہیں تھی جتنی سطحی طور پر نظر آتی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ میری بات اس کے دل پر جا کر لگی تھی۔ جب کہ حساس باتیں ایسے احمقوں کی سمجھ میں نہیں آتیں جیسا وسیم نظر آتا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ گویا کسی خیال سے چونکتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں بولا "آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ آپ فکر ہی نہ کریں سر! میں ابھی مین مارکیٹ جا کر دکان کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہوں۔ اگر آپ کا حکم ہو تو میں سارا دن وہیں کھڑا رہوں گا اور جو بھی ایسا بچہ نظر آیا جو مٹھائی کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوگا، میں اسے ایک ڈبا لے دوں گا۔ پیسوں کی آپ فکر نہ کریں سر! آج کل میرے مالی حالات کچھ ٹھیک ہی چل رہے ہیں۔ آئندہ مزید ٹھیک ہونے کی امید ہے کیوں کہ ایک تو اباجی کا رویّہ ٹھیک ہوتا نظر آرہا ہے دوسرے اب چھوٹے چچا والی جگہ مجھے ہی سنبھالنا ہوگی۔ میرا عہدہ، اہمیت اور تنخواہ..... سب کچھ بڑھ جائے گا۔ اب تو فکر کی کوئی بات ہی نہیں۔"

"چلو ٹھیک ہے۔ اب جاؤ ...... عیش کرو ..... اور مجھے اجازت دو" میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ایسے نہیں سر...!" وہ جلدی سے بولا "یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ آپ نے جو کام بتایا ہے وہ تو میں کر ہی دوں گا۔ لیکن یہ کوئی کام تو نہ ہوا سر...!"

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔

"مطلب یہ کہ سر..." وہ نظریں چراتے ہوئے سر کھجا کر بولا۔ "مجھے کوئی ٹھیک ٹھاک قسم کا کام بتائیے۔ کوئی مشکل قسم کا کام۔ مجھے اپنی خدمت کا موقع دیجئے۔ میں آپ کے لئے کوئی اہم کام انجام دینا چاہتا ہوں جس پر آپ خوش ہو کر میری پیٹھ ٹھونکیں۔ مجھے شاباش دیں۔ میرے دل میں آپ کے لئے عقیدت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ محبت کا طوفان اٹھ رہا ہے۔ میں آپ کے لئے کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ آپ میری کچھ رہنمائی کر دیجئے نا۔"

"تم میرے لئے اہم کام انجام دوگے؟" میں نے اسے گھورا۔

"سر! آپ بھی میرے اباجی کی طرح یوں بے اعتباری سے میری طرف نہ دیکھیں۔ آپ تو انسانوں کو سمجھنے والے آدمی ہیں۔ میری شکل پر نہ جائیے سر! میری روح میں جھانک کر دیکھئے۔ کسی نے آج تک میری صلاحیتوں کو سمجھا ہی نہیں۔ کسی نے آج تک مجھ سے کوئی صحیح کام لینے کی کوشش ہی نہیں کی۔ کم از کم آپ تو میرے ساتھ ایسا مت کیجئے۔ مجھے احمق سمجھ کر میری ہر بات مت ٹالئے۔ مجھے دھکے مت دیجئے" اس کی آواز فوراً ہی گلوگیر ہو گئی۔

یکدم اتنے بہت سے الیہ ڈائیلاگز کی بوچھاڑ میرے ہوش

دینے کے لئے کافی تھی۔ میں نے جلدی سے مشفقانہ لہجے میں کہا
ں تمہیں احمق ہرگز نہیں سمجھ رہا۔ اور دھکے بھلا میں تمہیں
ے دے رہا ہوں؟ میں تو گاڑی میں بیٹھا ہوں۔"

"میری مراد جذباتی دھکے دینے سے تھی سر!" وہ رومال نکال کر
ے پر رکھتے ہوئے ہلکی ہلکی سی شوں شوں کے ساتھ بولا "دھکے
ف ہاتھوں سے ہی نہیں دیے جاتے سر! دھکے لفظوں سے بھی
ے جاتے ہیں۔ اور وہ ہاتھوں کے دھکوں سے زیادہ دل شکن
تے ہیں۔"

میں ایک بار پھر ایک لمحے کے لئے خاموشی سے اس کی طرف
تا رہ گیا۔ آخر کار میں نے مزید ملائمت سے کہا "تم غلط سمجھ رہے
وسیم! مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ تم ایک بہت باصلاحیت
وان ہو۔ کوئی بھی کام کر سکتے ہو۔ لیکن اس وقت تمہیں بتانے
ے لئے کوئی خاص کام میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا۔ میرے پاس ہر
رح کے کام کرنے کے لئے سیکڑوں آدمی ہیں۔ اس وقت کوئی ایسا
م نہیں ہے جو التوا میں پڑا ہو۔ جیسے ہی مجھے تمہارے لائق کوئی
م نظر آیا، میں اب وہ اپنے کسی آدمی کے سپرد کرنے کے بجائے
مارے ہی سپرد کروں گا۔"

"سر! مجھے معلوم ہے آپ بڑے آدمی ہیں۔ سیکڑوں افراد
پ کا حکم بجالانے کے لئے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔ پھر بھی
یسا نہیں ہو سکتا کہ میرے لئے آپ کوئی ذمے داری ہی تلاش نہ
ر سکیں۔ سر! آپ ڈپلومیٹک انداز میں مجھے ٹرخانے کی کوشش نہ
ریں۔ خدا کے لئے کوئی خدمت میرے سپرد کر دیں تاکہ اسے
نجام دے کر میرے دل کو کچھ سکون ملے۔"

"تم کس قسم کا کام کرنا چاہتے ہو میرے لئے؟" آخر کار میں
نے تنگ آکر پوچھا۔ وہ واقعی جان کو آجانے والی چیز تھی۔ میں دیکھ
رہا تھا کہ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ
یں سڑک پر کھڑے کھڑے بھوں بھوں کر کے رونا نہ شروع
کر دے۔

وہ پُرامید سا ہو کر بولا "سر! کوئی بھی ایسا کام جس میں ذرا مشکلات ہوں .... سنسنی ہو ..... تھوڑا سا ایڈونچر ہو .... کچھ مزہ تو آئے سر! یہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو میں گزار رہا ہوں نہ۔"

"کام میں خواہ جان کا خطرہ ہو؟" میں نے اس کے چہرے پر نظر جماتے ہوئے پوچھا۔

"بے شک ہو سر!" وہ بلا تامل بولا "آپ کے کام کے لئے جان بھی حاضر ہے۔ آپ حکم تو کریں۔"

اس سے جان چھڑانے کی میرے ذہن میں اچانک ہی ایک تدبیر آئی تھی۔ میں نے اپنے بریف کیس سے اے نن کی ایک تصویر نکالی اور اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لو۔ اس شخص کو شہر میں تلاش کرو اور زندہ یا نیم زندہ حالت میں میرے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرو۔"

گو کہ جب سے ہنی نے مجھے بتایا تھا کہ ریڈ ذات میں اے نن کی کوئی خاص اہمیت معلوم نہیں ہوتی تھی تب سے میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ دینے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔ لیکن فی الحال کچھ دن کے لئے کچھ لوگوں کو اس کی تلاش میں لگائے رکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ جو اس قسم کے معاملات میں تربیت یافتہ نہیں تھے ان کی ذرا تربیت ہو جاتی۔ اور جو تربیت یافتہ تھے انہیں ذرا مشق ہو جاتی۔

حیرت کی بات یہ تھی کہ اے نن کی تصویر دیکھ کر وسیم جیسا آدمی بھی کچھ مایوس سا نظر آنے لگا۔ اس کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑتا نظر آیا۔ وہ ذرا بجھے بجھے سے لہجے میں بولا "یہ کون ہے سر؟ کیا بندر وغیرہ نچاتا ہے؟"

"بندر تو یہ خود نظر آتا ہے برادرم! یہ انسانوں کو نچاتا ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم بھی دیگر سب لوگوں کی طرح اس کی شکل دیکھ کر دھوکا کھا گئے ہو۔ حالاں کہ مجھے اس معاملے میں تم سے ذہانت کی توقع تھی۔ خود سوچو کہ جب میں بذات خود یہ تصویر تمہارے حوالے کر رہا ہوں اور تمہیں اس شخص کی تلاش پر مامور کر رہا ہوں تو یہ کوئی معمولی آدمی نہیں ہوگا۔"

"ہاں..... یہ بات تو ہے سر!" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا اور اس کی گول گول سی آنکھوں میں تھوڑی سی چمک آگئی "آئی ایم سوری! ابھی چند لمحے پہلے آپ نے ہی مجھے زندگی کا اہم اصول بتایا ہے کہ محض شکل دیکھ کر کسی کے بارے میں رائے قائم نہیں کرنا چاہئے۔

مجھے اس کو ذہن نشین کرلینا چاہئے۔ خود مجھے ہی لے لیجئے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں شکل سے احمق نظر آتا ہوں۔ شکل دیکھ کر ہی لوگ میرے بارے میں حتمی رائے قائم کرلیتے ہیں کہ میں احمق ہوں۔ میرے والدین تک کی رائے یہی رہی ہے۔ اسی لئے تو آج تک کسی نے بھی کبھی کوئی اہم کام میرے سپرد نہیں کیا۔"

وہ کم از کم اس حد تک تو غنیمت تھا کہ اسے اپنے بارے میں معلوم تھا' وہ شکل سے احمق نظر آتا ہے۔ ورنہ آج تک تو میں نے کسی کو یہ اعتراف کرتے بھی نہیں سنا تھا' خواہ شکل پر حماقت کے ڈونگرے برس رہے ہوں۔ اس اعتراف کے بعد تو وہ مجھے عقل مند معلوم ہونے لگا تھا۔

"بے فکر رہو" میں نے اس کا بازو تھپتھپایا "میری تمہارے بارے میں یہ رائے ہرگز نہیں ہے کہ تم احمق ہو۔ اسی لئے تو میں ایک انتہائی اہم کام تمہارے سپرد کررہا ہوں جس میں میرے تمام آدمی ابھی تک ناکام ہیں۔ بلکہ سچ پوچھو تو ایک طرح سے میں بھی ناکام ہوچکا ہوں۔ دو ایک مرتبہ تو یہ چھلاوا میری گرفت سے بھی نکل چکا ہے۔"

"آپ مطمئن رہیں سر! میں اس مردود کو لا کر آپ کے قدموں میں ڈالنے کے لئے جان بھی لڑادوں گا" وہ کسی حد تک فلمی انداز میں بولا۔

"اس حد تک جان لڑانے کی ضرورت نہیں کہ جان ہاتھ سے ہی چلی جائے" میں نے جلدی سے کہا "اپنی جان بچاتے ہوئے اسے قابو میں کرنا ہے۔ اگر یہ ممکن نظر نہ آئے تو بے شک اس کام کو کسی بھی مرحلے پر چھوڑ دینا۔ یہ اب اتنا بھی ضروری نہیں کہ اس کے لئے تم اپنی جان گنوادو" مجھے اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ میں تو اس احمق سے جان چھڑانے اور اسے تھوڑا بہت سبق سکھانے کی نیت سے یہ کام بتارہا تھا لیکن کہیں وہ اپنی کسی حماقت کی وجہ سے اے نن کے ہاتھوں ضائع ہی نہ ہوجائے۔ احمق ہونا اب کوئی جرم بھی نہیں تھا کہ اس بے چارے کو اتنی بڑی سزا دے دی جاتی۔

"ٹھیک ہے سر" وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر سیلوٹ کرتے ہوئے بولا "بس آپ سمجھ لیں کہ میں اس لمحے سے ہی اپنے مشن پر ہوں۔"

"خدا حافظ" میں نے جلدی سے کہا اور گاڑی آگے بڑھائی۔ مجھے اپنی اس حرکت پر خود ہی ہنسی بھی آرہی تھی۔ یہ میں نے اچھا سلسلہ شروع کردیا تھا کہ جو کوئی بھی مجھ سے کوئی "اہم" کام مانگتا تھا' میں اس کے ہاتھ میں اے نن کی تصویر تھمادیتا تھا۔ عارضی طور پر ان مضطرب و بے چین نوجوانوں سے پیچھا چھڑانے کا یہ اچھا طریقہ میرے ذہن میں آگیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ [illegible] سیم احمد جیسے نوجوانوں کو تو شاید اے نن اپنے قریب پھٹکنے بھی نہ دیتا۔ لیکن بہرحال ان نوجوانوں کو دھندے سے لگائے رکھنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

اس کے بعد میرے تین دن خالص کاروباری مصروفیات میں گزرے۔ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا۔ جذباتی "محاذوں" پر بھی سکوت چھایا رہا۔ کراچی سے راحیلہ کا کوئی فون نہ آیا' جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ناراض تھی۔ میری بدقسمتی تھی کہ بارہا ارادہ کرنے کے باوجود میں اسے فون نہیں کرپایا تھا۔ اب میں نے محسوس کرلیا تھا کہ صرف فون کرنے سے بات بننے گی بھی نہیں۔ اب میرا خود جاکر اسے منانا ضروری ہوگیا تھا لیکن اپنا شیڈول دیکھ کر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کس روز کراچی جاسکوں گا۔

ستارہ نے بھی فون نہیں کیا تھا۔ پہلے تو وہ شہر سے باہر بھی شوٹنگ کے لئے جاتی تھی تو فون کرلیتی تھی۔ شاید اس کی انا بھی مجروح ہوگئی تھی۔ کوئی مناسب موقع دیکھ کر مجھے جاکر اس کی مجروح انا پر بھی محبت کا مرہم رکھنا تھا۔ طاہرہ خانم البتہ مست ملنگ عورت تھی۔ وہ ایک مرتبہ خود میرے گھر آگئی تھی۔ اس کی طرف اگر میں پچھلے دنوں میں زیادہ توجہ نہیں دے پایا تھا تو اس نے ہلکے پھلکے انداز میں تھوڑا بہت شکوہ ضرور کیا تھا لیکن منہ پھلا کر نہیں بیٹھی تھی۔ اسے زندگی اور موت کا مسئلہ نہیں بنایا تھا۔ اسے زندگی کے بہتے دریا میں سے مسرتوں کا جتنا حصہ مل جاتا تھا وہ اسی میں خوش رہتی تھی' دل کھول کر اسی سے لطف اندوز ہوتی تھی۔ اور جو ہاتھ نہیں آتا تھا' اس کا غم نہیں کرتی تھی۔ اس جیسی بے فکری اور ہر حال میں خوش رہنے والی عورتیں میں نے کم ہی دیکھی تھیں۔ لیکن پارٹیوں وغیرہ میں وہ کسی پروفیسر کی طرح سنجیدہ' بلکہ کسی حد تک رنجیدہ سی عورت نظر آتی تھی۔ محفل میں اور خلوت میں وہ بالکل دو مختلف عورتوں کی طرح تھی۔ اپنے کارخانوں میں وہ ایک سخت گیر اور خشک مزاج مالک اور ایڈمنسٹریٹر کا تاثر رکھتی تھی۔

میرے جو دن کاروباری مصروفیات میں گزرتے تھے' انہیں میں "ہموار" دن میں ہی شمار کرتا تھا۔ گو کہ ان دنوں میں بھی سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی تھی اور قدم قدم پر بہت سی الجھنیں بھی درپیش ہوتی تھیں۔ پھر بھی میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا ہی محسوس کرتا تھا۔ کاروباری مصروفیات اور الجھنیں مجھے پریشان نہیں کرتی تھیں کیوں کہ میں نے اپنی زندگی کا ایک بنیادی اصول طے کرلیا تھا کہ مجھے روپیہ کمانا ضرور ہے لیکن روپے کے لئے اپنے آپ کو ہلکان نہیں کرنا ہے' پیسے پر جان نہیں دینی ہے۔ اس لئے میں تمام تر مصروفیات اور الجھنوں کے باوجود پرسکون رہتا تھا۔

لیکن زیادہ دن "ہموار" انداز میں گزرنا شاید میرے مقدر میں نہیں لکھا تھا۔ چوتھے دن میں غلطی سے رات کا کھانا کھانے انٹر کان میں چلا گیا۔ اس رات تنہائی میں ہنی سے ملاقات ہوجانے کے بعد میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ کم از کم اس وقت تک انٹرکان کا رخ نہیں کروں گا جب تک وہ وہاں مقیم ہے اور اس کا ڈانس شو چل رہا ہے۔ میں اب اس سے قطعی لاتعلق نظر آنے کا تاثر دینا چاہتا تھا۔ لیکن انٹرکان میں ایک عرصے سے آمدورفت چلی آرہی تھی۔ کچھ عادت سی بن گئی تھی۔

جب میں ریستوران میں جا بیٹھا تب اچانک احساس ہوا کہ میں نے تو فی الحال ادھر کا رخ نہ کرنے کی حکمت عملی اپنائی ہوئی [illegible] ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ اٹھ کر بل ٹن چلا جاؤں [illegible] پھر ارادہ ملتوی کردیا۔ میں نے سوچا' تھوڑی بہت "بدپرہیزی" [illegible] کوئی حرج نہیں ہے۔ میرے یہاں نظر آنے سے اب ہنی کی [illegible] پر کوئی ایسا اثر بھی نہیں پڑسکتا تھا کہ میری یا اس کی راتوں کی [illegible] حرام ہوجاتی۔ چناں چہ میں نے اطمینان سے ٹانگیں پھیلا کر [illegible] ہوئے کھانے کا آرڈر دیا۔

آرڈر لینے والا ویٹر مجھے پہچانتا تھا اور اس سے پہلے عام طور پر [illegible] عاجزانہ مسکراہٹ سے میرا استقبال کیا کرتا تھا لیکن آج تو اس [illegible] اپنی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سے بھی نہیں نوازا۔ کچھ ایسی گمبھیر [illegible] سنجیدگی سے آرڈر نوٹ کرنے لگا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کھانے کے [illegible] میں بل ادا کئے بغیر فرار ہوجاؤں گا۔

جھک کر آرڈر نوٹ کرتے ہوئے وہ بڑبڑانے کے سے انداز [illegible] بولا "بہت اچھا ہوا آپ آج آگئے سر! ورنہ اب رات کے [illegible] پہلے پہر مجھے آپ کی تلاش میں نکلنا پڑتا۔ نہ جانے آپ سے [illegible] ملاقات ہوتی یا نہیں۔"

میں نے چونک کر اس کی طرف نہیں دیکھا۔ میری خفتہ [illegible] حسیات بھی یکدم بیدار ہوگئی تھیں۔ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ اگر وہ [illegible] رازدارانہ انداز میں کوئی بات کہہ رہا تھا تو میرا چونک کر اس کی طرف دیکھنا مناسب نہیں تھا۔ آرڈر مختصر ہی تھا۔ اس نے مجھے کچھ کہنے کا موقع نہیں دیا اور مستعدی سے واپس چلا گیا۔

میں بظاہر اسی طرح ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں بیٹھا رہا۔ پھر میں نے بے مقصد سے انداز میں سرسری نظر سے ہال کا جائزہ لیا۔ صرف چند میزوں پر اکا دکا لوگ موجود تھے اور ان میں سے کوئی بھی مشکوک معلوم نہیں ہوتا تھا۔ کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا اور کوئی بھی ریڈ ڈاٹ کا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ آڈیٹوریم کی طرف سے آنے والی موسیقی کی نہایت مدھم سی آواز بتارہی تھی کہ ابھی ڈانس شو چل رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے کمال نے سن یا مٹھو کے علاوہ بھی اگر کوئی شخص ہوٹل میں ہوگا تو وہ اس وقت آڈیٹوریم میں ہی ہوگا۔

بہرحال احتیاط بہتر تھی۔ ویٹر کھانا لے کر آیا تو اس کی دیوار جیسی سنجیدگی برقرار تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آج اس کا رویہ بدلا ہوا کیوں تھا؟ وہ اجنبی نظر آنے کی پوری پوری کوشش کیوں کررہا تھا؟ اس نے خاص طور سے میرے آج آنے کو اچھا کیوں قرار دیا تھا؟ میں تو آج محض اتفاقاً ہی آگیا تھا۔ بہرحال یہ تو مجھے بارہا تجربہ ہوچکا تھا کہ اتفاقات میری زندگی میں بہت اہم کردار ادا کرتے تھے۔ شاید ہر شخص کی زندگی میں ہی اتفاقات اہم کردار ادا کرتے ہیں لیکن ہر شخص اتفاقات کو اتفاقات نہیں سمجھتا۔ کوئی اسے اپنی کارکردگی سمجھتا ہے اور کوئی تقدیر کا لکھا۔

کھانا لگانے کے دوران ویٹر نے کوئی بات نہیں کی۔ میں بھی خاموش ہی رہا۔ کھانے کے بعد وہ بل لے کر آیا جسے اچھے ہوٹلوں کے آداب کے مطابق چیک کہا جاتا ہے۔ چیک حسب معمول ایک فولڈر میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے چیک دیکھنے کے لئے فولڈر کھولا تو اس میں چیک کے ساتھ ایک چھوٹا سا لفافہ بھی رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک نظر ویٹر کی طرف دیکھا مگر اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ ظاہر ہے وہ یہی چاہتا تھا کہ میں اس سلسلے میں اس سے کوئی سوال نہ کروں۔ چیک اٹھا کر دیکھتے وقت نہایت صفائی سے لفافہ میں نے اپنی جیب میں منتقل کرلیا اور ویٹر کے لئے فولڈر میں پانچ سو روپے ٹپ رکھ دی جو اصل بل کی رقم سے زیادہ تھی۔ وہ ٹرے اٹھا کر خاموشی سے واپس چلا گیا۔

وہ یقیناً کوئی اہم اور شاید خطرناک خط تھا۔ تبھی ویٹر اسے مجھ تک پہنچانے میں اتنی احتیاط برت رہا تھا۔ اسے غالباً اس سلسلے میں خاص ہدایات دی گئی تھیں۔ ورنہ ویٹر تو ہوٹل میں اکثر نشست و برخاست رکھنے والوں کو کسی نہ کسی کا کوئی پیغام بوقت ضرورت پہنچاتے ہی رہتے ہیں۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی اور اس میں اتنی رازداری کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی تھی۔ میں بظاہر پرسکون ہی تھا لیکن اندر ہی اندر یہ سوال مجھے بے چین کئے جارہا تھا کہ خط کس کا ہوسکتا ہے؟

تھوڑی دیر کے بعد میں ریستوران سے اٹھ کر باہر آگیا۔ پارکنگ لاٹ میں گو کہ ابھی ویرانی ہی تھی لیکن وہاں بھی میں نے لفافہ نکال کر نہیں دیکھا۔ میں سیدھا گھر آگیا۔ بیڈ روم میں پہنچ کر لباس تبدیل کرنے کے بعد میں نے اس لفافے کو چاک کیا۔

اس میں نہایت باریک کاغذ پر خوردبینی سی لکھائی میں خاصا طویل خط موجود تھا۔ اس قسم کی تحریریں میں نے کالج کے زمانے میں امتحانات کے موقع پر دو ایک نالائق قسم کے لڑکوں کے پاس دیکھی تھیں جو نقل مارنے کی فکر میں رہتے تھے۔ ان تحریروں کو "بوٹی" "پھرے" یا اس قسم کے دوسرے کئی نام دیئے جاتے تھے۔ خط کے آغاز میں میرا نام' کوئی القاب یا آخر میں خط لکھنے والے کا نام وغیرہ کچھ نہیں تھا۔ میں نے بیڈ پر نیم دراز ہوکر اسے پڑھنا شروع کیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اگر میں نے یہ خط مکمل کر بھی لیا تو تم تک پہنچا بھی پاؤں گا یا نہیں۔ کیوں کہ میرا تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنا میرے حق میں بھی سخت خطرناک ہے اور تمہارے حق میں بھی۔ بہرحال میں بہت گھما پھرا کر کسی نہ کسی طرح یہ خط تم تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ کاش یہ بروقت تم تک پہنچ جائے تاکہ جو معلومات میں تمہیں فراہم کررہا ہوں ان سے تم کچھ استفادہ کرسکو اور اپنے آپ کو ایک بہت بڑے نقصان سے

بچانے کی کوئی تدبیر کر سکو۔ یہ خط لکھنے کا مقصد تمہیں ایک سازش سے خبردار کرنا ہے جسے مکمل طور پر تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکا ہوں لیکن جتنا کچھ مجھے معلوم ہو سکا ہے وہ میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ مزید معلومات کرنا' سازش کی کڑیاں جوڑنا اور اپنا بچاؤ کرنا تمہارا کام ہے۔

ایک بہت ننھا سا ٹرانسمیٹر جو ایک لاکٹ کی شکل میں خود میری تمام بات چیت کہیں نشر کرنے کے لئے ہر وقت میرے جسم کے ساتھ رہتا ہے' اس پر اتفاقاً میں نے شاید فریکوئنسی کی کسی گڑبڑ کی وجہ سے دو افراد کے درمیان بہت اہم گفتگو سن لی ہے۔ کراچی میں تمہارے فائیو اسٹار ہوٹل میں اٹھارہ جولائی کی شب کو وزیر خارجہ حفیظ احمد صاحب کے اعزاز میں ایک بہت بڑی ڈنر پارٹی کی بکنگ ہوئی ہے۔ ہمارے حامی چند ملکوں کے سفارت کاروں کی طرف سے یہ ڈنر دیا جا رہا ہے۔ تمام انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ وزیر خارجہ سترہ جولائی کو اسلام آباد سے لاہور آئیں گے۔ یہاں بھی ان کی کچھ مصروفیات ہیں۔ اٹھارہ جولائی کی صبح وہ کراچی پہنچیں گے۔ کچھ سہولتوں کے پیش نظر وہ ڈنر سے چند گھنٹے پہلے ہی اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس سے تمہارے ہوٹل منتقل ہو جائیں گے اور چند گھنٹے وہیں قیام کریں گے۔ وہیں سے رات کو وہ بینکوئٹ ہال میں ڈنر میں شرکت کریں گے۔ ان کا پروگرام سفارت کاروں کی درخواست پر انہی کی تجاویز کے مطابق رکھا گیا ہے۔ انیس جولائی کی صبح وزیر خارجہ مشرق وسطیٰ کے چھ ملکوں کے دورے پر کراچی سے ہی روانہ ہو جائیں گے۔ ان کا یہ دورہ ایک خاص مشن کے سلسلے میں ہے۔

ان معاملات سے تو خیر تمہارا کوئی تعلق نہیں۔ یہ تو عالمی سیاست کی باتیں ہیں۔ لیکن اس حد تک تمہارا بہرحال تعلق ہے کہ تمہارے ہوٹل میں عین اس تقریب کے دوران حفیظ صاحب کو قتل کروا جائے گا۔ یہ ایک ہشت پہلو سازش ہے۔ اس سے بیک وقت کئی مقاصد حاصل ہوں گے۔ ایک تو تمہیں کاروباری طور پر بہت بڑا دھچکا پہنچانا مقصود ہے۔ تمہارا ہوٹل نیا ہے۔ پہلی بار اسے ایک بہت بڑے اور اہم ڈپلومیٹک ڈنر کی بکنگ ملی ہے اور اسی کا انجام اتنا خراب ہو جائے گا۔

تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کسی ملک کے وزیر خارجہ کا قتل کوئی معمولی سا واقعہ نہیں ہوتا۔ تمہارا ہوٹل سرکاری طور پر تو بلیک لسٹ ہو ہی جائے گا لیکن ساتھ ہی اسے اتنی منفی شہرت ملے گی کہ دیگر ممتاز لوگ بھی یہاں نجی تقریبات کے لئے تو کیا' ویسے بھی نشست و برخاست کے لئے ادھر کا رخ کرنے سے گریز کریں گے۔ شاید اس منفی شہرت کو ہوا دینے کے انتظامات بھی کئے جائیں گے۔ ہوٹل کے مالک یا انتظامیہ کا تو ظاہر ہے اس سانحے میں کوئی قصور نہیں ہو گا لیکن ذرائع ابلاغ کے ذریعے ہوٹل کی شہرت کو زیادہ سے زیادہ داغدار کرنے کے لئے شاید کچھ لوگوں کو رشوتیں بھی دی جائیں گی۔ صرف یہی نہیں' چوں کہ ایسے سانحے کی تحقیقات اور

تفتیش بہت اونچے پیمانے پر ہو گی اور ایسے حالات بھی پیدا کرنے کی کوشش کی جائے گی کہ تمہیں بھی تفتیش میں کھینچ لیا جائے۔ اور یہ بات تمہارے سارے ہی کاروباری معاملات کے لئے تباہ کن ثابت ہو گی۔

وزیر خارجہ کو قتل کرانے کا دوسرا بڑا مقصد ایک خاص ملک سے ہمارے تعلقات خراب کرانا ہے اور اس سے بھی بڑا مقصد انہیں اس مشن پر جانے سے روکنا ہے جس کے لئے وہ مشرق وسطیٰ جا رہے ہیں۔ عین وقت پر اس مشن کا ملتوی ہو جانا بہت دوررس اثرات مرتب کرے گا۔ عالمی سطح پر کئی بڑی تبدیلیاں اور مسائل رونما ہوں گے۔ اگر تم اخبارات ذرا توجہ سے پڑھتے ہو تو تمہیں کچھ اندازہ ہو گا اور جہاں تک مجھے اندازہ ہو چکا ہے اس کے مطابق میں بھی اس خط میں آگے چل کر اپنا خیال ظاہر کرنے کی کوشش کروں گا لیکن اسے تم محض اشارہ ہی سمجھنا۔ اصل میں کیا کچھ ہو گا' یہ میں بھی صحیح طور پر نہیں جان سکا۔ میرا سیاسی علم بھی کچھ زیادہ نہیں ہے۔

تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہو گا کہ وزیر خارجہ کے قتل کی سازش کون لوگ کر رہے ہیں۔ مجھے ریڈ ڈاٹ کا باقاعدہ نام لینے کی تو ضرورت نہیں ہے پھر بھی محض وضاحت کے لئے لکھ رہا ہوں۔ لیکن ان کے علاوہ اس میں ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی "کوآرڈی نیٹرز انٹرنیشنل" کا نام بھی میں نے سنا ہے۔ یہ کمپنی بھی اس سازش میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ان دو فریقوں کا آپس میں کیا تعلق ہے' اس کا بھی مجھے کچھ اندازہ نہیں۔ ریڈ ڈاٹ کے کسی معاملے میں "کوآرڈی نیٹرز انٹرنیشنل" کا نام میں نے بھی پہلی بار سنا ہے۔ لیکن خیر..... میں کیا اور میری حیثیت ہی کیا۔ مجھے تو ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ یہ اتفاق تو شاید تمہاری ہی خوش قسمتی کا مرہون منت ہے کہ میں نے ٹرانسمیٹر پر یہ اہم گفتگو کافی حد تک سن لی اور یہ ایک ایسی زبان میں تھی جسے تم نہیں سمجھ سکتے تھے گو کہ بظاہر بہت آسان تھی۔

میں یہ نہیں جان سکا کہ وزیر خارجہ صاحب کو قتل کرنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا لیکن اتنا اندازہ ضرور ہو گیا ہے کہ وہ کوئی ایسا روایتی طریقہ نہیں ہو گا جس کے لئے سیکیورٹی والے پہلے ہی سے تیار ہوتے ہیں یا تمام حفاظتی تدابیر اختیار کر چکے ہوتے ہیں......"

خط میں اس سے آگے بھی بہت کچھ لکھا ہوا تھا۔ جوں جوں میں پڑھتا گیا' میرے لہو کی حرارت کچھ کم سی ہوتی گئی۔ خط ختم کرنے تک میں اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ دیر تک میری نظریں ان باریک باریک لفظوں میں ہی الجھی رہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں اپنے اعصاب کی تمام تر مضبوطی کے باوجود فی الحال پریشان سا ہو گیا تھا۔

بنیادی طور پر تو میں وہی ایک دیہاتی اور سیدھا سادا سا آدمی

...وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اتنا عروج مل گیا تھا' یہ اوپر ...ے کی شان تھی۔ کس طرح سب کچھ ہو گیا تھا' یہ میری خود بھی ...میں نہیں آتا تھا۔ اب مجھے دنیا کو سمجھنے کا کچھ سلیقہ تو آ گیا تھا' ...نچے حلقوں میں اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے عالمی سیاست کا بھی کچھ پتا ...بہت سے معاملات کی شدبد تھی لیکن اس خوش فہمی میں کبھی ...نہیں ہوا تھا کہ میں کوئی مدبر یا ماہر سیاسیات بن گیا تھا۔

میں اپنی زندگی کو حتی الامکان سیدھی سادی ہی رکھنا چاہتا ... اخبارات وغیرہ میں سب کچھ پڑھتا تھا۔ غیر ملکی رسائل اور ...بارات بھی دیکھتا تھا۔ وہاں کے حالات سے بھی آگاہ رہنے کی ...شش کرتا تھا لیکن میرا مقصد زیادہ تر کاروباری ہوتا تھا۔ بڑا ...بس یہی ہوتا تھا کہ کہیں کوئی سودا کر کے پھنس تو نہیں جائیں ...کہیں سے مال منگوا کر یا کہیں مال بھیج کر روپیہ ڈوب تو ...ہیں جائے گا۔ بین الاقوامی سیاست تو کیا' کبھی ملکی سیاست میں بھی ...ارکٹ یا ان ڈائرکٹ ٹانگ اڑانے یا کسی معاملے میں ملوث ہونے ...میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔

لیکن کبھی کبھی حالات انسان کو کسی معاملے میں بالکل اسی ...ں کی طرح دھکیل دیتے ہیں جو کسی ڈوبتے ہوئے شخص کو بچانے ...لئے سمندر میں کود پڑا تھا۔ وہ اس شخص کو بچا تو لایا تھا لیکن یہ ...چھے بغیر نہیں رہ سکا تھا کہ اسے دھکا کس نے دیا تھا؟ مجھے بھی کچھ ...یدہ ہاتھ اس معاملے میں دھکا دے رہے تھے جس کا میں اپنے ...پ کو اہل نہیں سمجھتا تھا۔

میں اس معاملے سے لاتعلق ہو کر یا اسے نظرانداز کر کے بھی ...ں بیٹھ سکتا تھا کیوں کہ میرا ہوٹل میرے لئے خوب صورت خوابوں ...ں سے ایک تھا۔ وہ میرے لئے ایک خوب صورت پھول دار ...ے کی طرح تھا جسے میں نے بڑی محنت سے سینچا تھا۔ ابھی تو اس ...پھول آنے شروع ہی ہوئے تھے۔ ابھی سے میں اسے بدنامیوں ...خطرناک اسکینڈلز کی دھوپ میں مرجھاتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ...کے ساتھ ساتھ اگر میری ذات بھی کسی ایسے معاملے میں ...ث ہو سکتی تھی جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا' تو یہ اور ...زیادہ ناقابل برداشت بات تھی۔ جب میرا کوئی قصور ہی نہیں ...تو میں اس قسم کی سزائیں برداشت کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ...خواہ سازش کرنے والوں کو اپنی طاقت پر کتنا ہی گھمنڈ تھا۔

دھیرے دھیرے میری رگ و پے میں پھیل جانے والی یخ بستگی ...ہوتی چلی گئی اور اس کی جگہ غصے کی تپش نے لے لی جو اندر ہی ...ر غیظ و غضب کا پھٹتا ہوا آتش فشاں بھی بن سکتی تھی لیکن ...لا میں اپنے دماغ کو ٹھنڈا ہی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جس ...ٹھنڈے انداز میں نہایت سفاکی کے ساتھ مجھے گھیرنے کی ...شش کی جا رہی تھی' میں بھی اسی طرح ٹھنڈے دماغ کے ساتھ ...سازش سے نمٹتا تو زیادہ بہتر تھا۔ جوش اور جذباتیت میں شاید ...کوئی ایسی حرکت کر جاتا جو ریڈ ڈاٹ یا اس کے پس پشت کارفرما

طاقتوں کو فائدہ پہنچا جاتی یہ بہت نازک معاملات تھے۔

مجھے یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ کوئی طاقت میرے ملک کے وزیر خارجہ کو قتل کرانے میں کامیاب ہو جاتی۔ میری ان سے کوئی شناسائی نہیں تھی' مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا..... اور اس سے کوئی غرض بھی نہیں تھی کہ ان کے سیاسی نظریات کیا تھے۔ مجھے تو بس یہ معلوم تھا کہ وہ ہمارے ملک کے وزیر خارجہ تھے۔

ہمارا ملک خواہ چھوٹا تھا' ترقی پذیر تھا لیکن مجھے یہ سوچنا بھی اچھا معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کوئی بھی بڑی بڑی طاقتیں ہمارے اہم لوگوں کو شطرنج کے مہروں کی طرح استعمال کریں۔ کہ جب جی چاہا' بساط سے ہٹا دیا۔ میں ان معاملات میں اپنے آپ کو ایک معمولی اور بے وقعت آدمی سمجھتا تھا لیکن جب اس قسم کا کوئی سوال پیدا ہوتا تھا تو اپنے اندر انا اور خودداری کا ایک طوفان امڈتا محسوس ہوتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ ایسی کسی بھی کوشش کا منہ توڑ جواب دیا جائے۔

ماضی میں مجھ سے صرف اس حد تک نادانیاں ضرور سرزد ہوئی تھیں کہ میرے پاس روپے پیسے کی آمد کے ذرائع کچھ درست نہیں رہے تھے۔ لیکن وہ بات اب پرانی ہو چکی تھی۔ ایک عرصے سے میں ان ذرائع کو ترک کر چکا تھا اور اس سے کہیں زیادہ دولت میرے پاس درست اور جائز ذرائع سے آئی تھی اور آئے ہی چلی جا رہی تھی۔ تب سے ہی میں اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق اپنی اس دور کی حرکتوں کا کفارہ بھی ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور اپنے آپ کو ایک معزز' معقول' متوازن اور محب وطن شہری کے سانچے میں

ڈھالنے کے لئے بھی کوشاں تھا۔ اور اگر اسے کوئی خود پرستی نہ سمجھتا تو میں کہہ سکتا تھا کہ میں ایسے بے شمار لوگوں سے بہتر تھا جو سیاست' سماجی بہبود یا زندگی کے ایسے دوسرے کئی محاذوں پر سماج کے ٹھیکیدار بنے ہوئے تھے۔ معاشرے میں جن کا بڑا مقام تھا لیکن جن کے اصل چہروں سے صرف گنتی کے چند لوگ ہی واقف ہوتے تھے۔

میرے خیالات ادھر ادھر بھٹک رہے تھے اور خط میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ خط ہنی نے لکھا تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر مرد کا صیغہ استعمال کیا تھا تاکہ اگر تمام تر احتیاطوں کے باوجود خط غلط ہاتھوں میں پہنچ جائے تو کم از کم فوری طور پر اس پر شبہ نہ جا سکے۔ یہ خط لکھ کر اس نے بلاشبہ حق دوستی ادا کر دیا تھا۔

اس نے لکھا تھا کہ اٹھارہ جولائی کی شب کراچی میں میرے ہوٹل میں اس سازش کو عملی جامہ پہنایا جائے گا۔ جب کہ اس وقت سولہ جولائی کی شب بھی تقریباً گزر چکی تھی۔ بہت دیر پہلے رات کے بارہ بج چکے تھے یعنی حقیقتاً سترہ جولائی کی تاریخ آ چکی تھی اور میں ابھی لاہور ہی میں بیٹھا تھا۔ میں نے اپنی منتشر سوچوں کو قابو میں کرنے کی کوشش کی۔ مجھے اس خط کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ پھر بھی منظم انداز میں کچھ کرنے کے لئے سب سے پہلے تو ہر بات کی تصدیق ضروری تھی اور جو کام پہلے کرنا ضروری تھا اس کی طرف پہلے ہی توجہ دی جانی چاہئے تھی۔ ابھی میں اس خط کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے میں نے اسے سائڈ ٹیبل کی دراز میں رکھ کر مقفل کر دیا اور فون پر اپنے کراچی کے بیورو چیف شفیع شاہ کا نمبر ڈائل کیا۔

تیسری گھنٹی پر ادھر ریسیور اٹھایا گیا۔ شفیع شاہ کی آواز بوجھل تھی۔ میں نے ملائمت سے کہا "معاف کرنا شفیع...... تمہیں سوتے سے جگایا۔"

وہ میری آواز سنتے ہی بولا "سر! ایسی باتیں کرکے شرمندہ نہ کیا کریں۔ آپ کی آواز سن کر تو ہم بستر پر بھی اٹھ بیٹھیں گے۔ ویسے میں اس وقت سو نہیں رہا تھا۔ باہر سے ابھی ابھی آیا ہوں۔ کپڑے بدل رہا تھا" اس کی آواز سے بوجھل پن غائب ہو چکا تھا۔

"کیا عیاشی ہو رہی تھی؟" میں نے دوستانہ لہجے میں کہا۔

"آج کل تو سب عیاشیاں بھولے ہوئے ہیں سر! بس ہوٹل میں لگے ہوئے ہیں" اس کے لہجے میں شگفتگی آ گئی "میں نے اس کے لئے کئی اہم کنٹریکٹ حاصل کئے ہیں۔ آپ سنیں گے تو یقیناً خوش ہوں گے سر! بہت... کم عرصے میں ہمارا اکوپنسی ریٹ سب سے زیادہ ہے۔ ابھی سے یہ عالم ہے کہ کسی کسی دن تو ہمارے ہاں ایک سنگل بیڈ روم بھی خالی نہیں ہوتا۔ ہمیں اسٹاف بھی بہت اچھا ملا ہے سر! سب لوگ بہت محنت کر رہے ہیں" شفیع شاہ میں یہ بھی ایک بڑی خوبی تھی۔ کبھی صرف اکیلے کسی کام کا کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کرتا تھا۔ دوسرے لوگوں کی محنت کا بھی ضرور ذکر کرتا تھا۔

"کیا ہمارے ہاں اٹھارہ جولائی کو فارن منسٹر کے اعزاز میں ڈنر کے لئے بکنگ ہوئی ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔ میں ابھی اصل بات کرکے اسے چونکانا نہیں چاہتا تھا۔

"ہاں سر!" وہ مسرور لہجے میں بولا "آپ کو معلوم ہی ہے کہ اس قسم کی تمام تقریبات وغیرہ اسلام آباد میں ہی ہوتی ہیں۔ سفارت کار اور وہاں کے سب لوگ اور تمام ڈپلومیٹس وغیرہ وہیں ہوتے ہیں۔ لیکن شاید یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ منسٹر صاحب کی مصروفیات کا شیڈول کچھ ایسا بنا کہ انہیں کراچی سے مڈل ایسٹ روانہ ہونے سے ذرا پہلے ہی اس ڈنر کا پروگرام رکھنا پڑا۔ بیشتر سفارت کار بھی اسلام آباد سے ہی یہاں آئیں گے۔ انہی کی خواہش تھی کہ پروگرام ہوٹل میں رکھا جائے تاکہ انہیں لاجنگ اور بورڈنگ میں آسانی رہے۔ اور جب کراچی میں اونچے لوگوں کی کوئی تقریب ہوٹل میں کرنے کی بات آتی ہے تو اب ہمارے ہی ہوٹل کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ انہوں نے تھوڑی سی دلچسپی ظاہر کی۔ باقی کام ہمارے پرسونل منیجر راشد نے آگے بڑھ کر کر لیا۔ وہ اچھا اور ٹینڈ لڑکا ہے سر۔"

شفیع شاہ مسرور لہجے میں سب کچھ بتائے جا رہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ جس اعزاز کے بارے میں وہ اتنا خوش ہے اس نے مجھے کتنا فکر مند کر دیا ہے۔ وہ وزیر خارجہ اور دوسرے ملکوں کے سفارت کاروں کے' اپنے ہوٹل میں اجتماع کو ایک بہت خوش آئند واقعہ سمجھ رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ یہ اعزاز کہیں ہمارے گلے ہی نہ پڑ جائے۔

شفیع شاہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آپ کو کسی نے اس ڈنر کے بارے میں بتایا تھا یا آپ نے اخباروں میں پڑھا ہے؟"

"مجھے نہ تو اس کے بارے میں کسی نے بتایا ہے اور نہ ہی یہ یہاں کے اخباروں میں چھپی ہے" میں نے جواب دیا۔

"یہاں تو چھپی ہے سر! بلکہ بعض انگریزی اخباروں نے تو ہمارے ہوٹل کا نام بھی دیا ہے۔ ڈنر کے موقع پر بھی پورا پریس موجود ہوگا۔ ٹی وی کوریج بھی ہوگی۔ ڈنر سے پہلے بہت اہم تقریریں ہوں گی نا' اس لئے اسے بہت اہمیت دی جا رہی ہے" پھر جیسے اسے اپنا اصل سوال یاد آیا اور وہ چونکتے ہوئے بولا "لیکن سر! آپ کو نہ تو کسی نے بتایا اور نہ ہی ابھی یہ خبر وہاں کے اخبارات میں چھپی...... تو پھر آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

میں فی الحال اسے پریشان نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا "اسے چھوڑو۔ یہ بتاؤ ہمارے سیکورٹی کے انتظامات کیسے ہیں؟"

ہوٹل کے اپنے بھی سیکورٹی کے انتظامات تھے۔ یہ باقاعدہ ایک الگ شعبہ تھا۔ آٹھ دس آدمی اس میں ملازم تھے لیکن ظاہر ہے' ایک پرائیویٹ ادارے کے سیکورٹی کے انتظامات تو چھوٹے موٹے معاملات کے لئے ہی ہوتے ہیں۔

"انتظامات ٹھیک ہی ہیں سر! ڈنر کی رات میں ہوٹل میں [اس] خاص جگہوں پر اپنے چار چھ خاص آدمی بھی لگا دوں گا۔ لیکن [ب] تو ہم اپنے طور پر محض احتیاطاً کریں گے۔ منسٹر صاحب' [ہوں] اور دوسرے ڈپلومیٹس کی تو اپنی سرکاری سیکورٹی ہوگی۔ [ان] کے تو اپنے ہی الگ انتظامات ہوں گے۔ ہمارے اپنے آدمی بھی [کچھ] کریں گے' جہاں تعینات ہوں گے' ان کی اجازت سے ہوں [گے] اور ہمیں اپنے تمام انتظامات ان کی ہدایت کے مطابق کرنے [ہوں] گے۔ اس سلسلے میں اٹھارہ تاریخ کی صبح ہی سرکاری سیکورٹی [وا]لے آکر ان تمام جگہوں اور راستوں وغیرہ کا تفصیلی معائنہ کریں [گے] جہاں جہاں تقریب کے دوران معزز مہمانوں کی آمد و رفت [ہو]گی۔ مہمانوں کی آمد سے ایک گھنٹا پہلے سیکورٹی چیف خود آکر [سار]ے انتظامات دیکھیں گے اور سرکاری طور پر باضابطہ کلیئرنس [دیں] گے۔ اس کے بعد وہ واپس اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس جا کر منسٹر [ص]احب کو لے آئیں گے۔ سیکورٹی چیف صاحب کا نام اکرام بیگ [ہے]۔ وہ خاص طور پر فارن منسٹر صاحب کے ساتھ ہی آتے ہیں۔ باہر [کے د]وروں پر بھی وہی ان کے ساتھ جاتے ہیں۔ اسلام آباد میں [آ]تے ہیں۔ میری خود ان سے فون پر کئی مرتبہ بات ہو چکی ہے۔ [بڑے] معقول آدمی معلوم ہوتے ہیں۔" وہ بدستور بڑے مسرور انداز میں مجھے کتنی تفصیلات بتائے جا رہا تھا۔ میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ میں یہ تمام [تفصیلات] اچھی طرح ذہن نشین کئے جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد شفیع شاہ بولا "آپ نے رات کو [اس] وقت فون کیا ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں ضرور کوئی تشویش ہے [سر!] مسئلہ کیا ہے؟"

وہ ہوٹل کے سلسلے میں اتنے جوش و خروش سے کام کر رہا تھا [ک]ہ میں ابھی کچھ بتا کر اسے پریشان کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس سے [اس] کا جوش و خروش متاثر ہوتا۔ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا [نہیں]۔ ایسی کوئی خاص تشویش نہیں ہے۔ بس ذرا ہوشیار رہنا۔ [اس قس]م کی تقریبات بہت بڑی ذمے داری ہوتی ہیں۔ ہمارا ہوٹل نیا [ہے] اور تمہیں معلوم ہے' کراچی اور لاہور میں ہمارے بہت سے [چاہنے وا]لوں کے ساتھ ساتھ تھوڑے بہت بدخواہ بھی موجود ہیں۔"

"آپ فکر نہ کریں سر!" شفیع شاہ بغیر کسی تشویش کے بولا "ہم [انشاء] اللہ اس ذمے داری سے...... بلکہ اس سے بھی بڑی ذمے [داریوں] سے بلا رکاوٹ نمٹتے رہیں گے۔ کراچی کے جتنے بھی [معام]لات ہیں ان کے بارے میں میں نے آپ کو پہلے بھی کوئی [شکایت] نہیں ہونے دی۔ انشاء اللہ آئندہ بھی نہیں ہونے دوں [گا]۔"

"اس کا تو مجھے یقین ہے' اسی لئے تو میں سب کچھ تم پر چھوڑ کر [یہاں] بیٹھا ہوا ہوں۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "بہرحال...... اب آپ نے اشارہ دے دیا ہے تو میں اس [معاملے] میں خاص طور پر ہوشیار رہوں گا۔ لیکن میں آپ کو اس طرف سے بالکل مطمئن اور بے فکر دیکھنا چاہتا ہوں سر! آپ پر لاہور میں ہی کام کا جتنا بوجھ ہے' وہی کافی ہے۔ یہاں کے معاملات میں تو بس آپ کسی بہت ہی خاص موقع پر رہنمائی دیتے رہا کریں' وہی بہت ہے۔ اگر یہاں کے مسائل میں بھی آپ کو سر کھپانا پڑا تو پھر ہم جیسے آپ کے جاں نثاروں کی زندگی کا کیا فائدہ۔"

میں جو کچھ جان چکا تھا' وہ چوں کہ ابھی اس سے آگاہ نہیں تھا اس لئے اس معاملے کو روٹین میں لے رہا تھا۔ میرا مقصد فی الحال صرف یہی تصدیق کرنا تھا کہ ڈنر کا پروگرام واقعی طے تھا۔ اس کے علاوہ سردست میں اسے صرف تھوڑا سا ہوشیار کرنا چاہتا تھا' وہ میں نے کر دیا تھا۔ اب مجھے ہنی کی طرف سے موصول ہونے والے خط کے مندرجات کے بارے میں بالکل ہی شبہ نہیں رہا تھا۔ اب مجھے اگلا قدم اٹھانا تھا۔ شفیع شاہ کو خدا حافظ کہہ کر میں نے سلسلہ منقطع کیا اور سوچ میں پڑ گیا کہ رات کو اس وقت فارن منسٹر صاحب کو اپروچ کرنے کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟

میں نے ذہن پر بہت زور دیا کہ میرے جاننے والوں میں کون ایسا آدمی ہو سکتا ہے جس کا منسٹر صاحب سے کوئی تعلق واسطہ نکل سکتا ہو۔ اور تعلق واسطہ بھی ایسا۔ کہ جس کی وجہ سے منسٹر صاحب لاہور آتے ہی فوری طور پر مجھے ملاقات کا وقت دے دیں۔ انہیں اس سازش سے خبردار کرنے کے لئے اور کوئی غیر روایتی قسم کی حکمت عملی طے کرنے کے لئے میرا ذاتی طور پر ان سے ملاقات کرنا ضروری تھا۔ اس کے بغیر بات نہیں بن سکتی تھی۔ جس سازش کا مجھے اشارہ ملا تھا اسے کسی غیر روایتی حکمت عملی کے ذریعے ہی ناکام بنایا جا سکتا تھا جس کی سازشیوں کو بالکل توقع نہ ہو۔ ورنہ اہم شخصیات کی حفاظت کے روایتی انتظامات تو موجود ہی ہوتے ہیں۔ فارن منسٹر کا تعلق چونکہ بین الاقوامی معاملات سے ہوتا تھا' اس لئے ان کے حفاظتی انتظامات غیر معمولی ہوتے تھے لیکن بہرحال وہ سب بھی روایتی ہی ہوتے تھے جن کا سازشیوں کو بھی اچھی طرح علم تھا۔ اگر منسٹر صاحب کو قتل کرنے کے لئے کوئی روایتی طریقہ استعمال کرنے کی کوشش کی جاتی تب تو ان انتظامات کے ذریعے اسے ناکام بنایا جا سکتا تھا۔ مثلاً مہمانوں میں سے کوئی دشمن کا آلۂ کار ہوتا یا کوئی شخص کسی بہروپ میں تقریب میں گھس آنے میں کامیاب ہو جاتا اور خنجر یا پستول وغیرہ سے منسٹر صاحب پر حملہ آور ہونے کی کوشش کرتا تب تو سیکورٹی والے عمدگی سے اس سے نمٹ سکتے تھے اور شاید اس کوشش کو ناکام بھی بنا سکتے تھے۔ لیکن خط میں مجھے خبردار کیا گیا تھا کہ ایسا کوئی طریقہ اختیار نہیں کیا جائے گا۔

کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ طریقہ کیا ہوگا۔ بات چوں کہ بہت مبہم تھی اور بے پناہ سوچ بچار اور احتیاط کا تقاضا کرتی تھی اس لئے میں سیکورٹی والوں پر زیادہ بھروسا نہیں کر سکتا تھا۔ وہ لوگ عموماً لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔

چند لمحے سوچنے کے بعد مجھے طارق نذیر صاحب کا خیال آیا۔ وہ ان دنوں چیمبرز آف کامرس کے صدر تھے اور بڑی جان پہچان والے آدمی تھے۔ وہ ان سے بھی جان پہچان رکھتے تھے جن سے انہیں کوئی کام نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی آئندہ کبھی کوئی کام پڑنے کا امکان نظر آتا تھا۔ اس وقت رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ طارق نذیر صاحب رت جگے کرنے والے آدمی تھے۔ رات کے ایک دو بجے تک تو ویسے ہی ان کی کوئی نہ کوئی معروفیت چلتی رہتی تھی۔ اس کے بعد وہ خواب آور گولیاں کھاتے تھے اور بقول ان کے "گولیاں کبھی کبھی اثر دکھا دیتی ہیں تو دو چار گھنٹے سو لیتا ہوں ورنہ اپنا گزارا تو زیادہ تر نیند کے بغیر ہی چل رہا ہے۔ تم دیکھ لینا..... میرے جسم کی بظاہر اچھی خاصی نظر آنے والی یہ عمارت کسی روز اچانک ہی دھڑام سے زمین بوس ہو جائے گی۔ تم سے باتیں کرتے کرتے تمہارا یہ خادم کسی روز ٹیں بول جائے گا۔"

اس پر میں نے ان سے اظہار ہمدردی کرنے کے بجائے کہا تھا "آمین! اللہ ایسی آسان موت سب کو نصیب کرے۔"

طارق صاحب خفا نہیں ہوئے تھے۔ سر کھجاتے ہوئے بولے "یار چوہدری! تم ہر بات میں کوئی الٹا ہی نکتہ نکال لیتے ہو۔"

"طارق صاحب! الٹا نہیں، یہ تو سب سے سیدھا نکتہ ہے۔ مثبت پہلو تلاش کرنے کا اپنا اپنا انداز ہوتا ہے۔ کوئی ضروری ہے کہ آدمی مہینوں یا برسوں بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر، بہو بیٹوں کی کڑ کڑ سن کر مرے؟"

یہ گفتگو یاد کرتے ہوئے میں نے ان کا نمبر ڈائل کیا۔ انہیں رات کے اس پہر فون کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ان کے ملازم نے پہلے یہ تفتیش کی کہ صاحب نے ابھی سلیپنگ پلز تو نہیں کھائیں؟ جب یہ تصدیق ہو گئی کہ ابھی ان کے بیڈ روم سے سلیپنگ پلز کھانے کی خبر نشر نہیں ہوئی ہے تو نوکر نے فون بیڈ روم میں ملا دیا۔

طارق صاحب چھوٹتے ہی بولے "یار چوہدری! تمہاری عمر لمبی ہے۔ میں ابھی تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں کل ہی جاپان سے واپس آیا ہوں۔ میں تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ جاپان جیسے ملک میں سوتی ساریوں کی زبردست مارکیٹ اچانک ہی پیدا ہو گئی ہے۔ ہمیں تو ایکسپورٹ پروموشن بیورو والوں تک نے نہیں بتایا ..... خیر..... ان بے چاروں کو تو خود بھی معلوم نہیں ہو گا۔ اور ادھر انڈیا دھڑا دھڑ....."

"طارق صاحب!" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "خدا کے لئے ..... کم از کم بیڈ روم میں پہنچ کر تو کاروبار کو بھول جایا کریں۔ اگر یاد کرنا ہی ہے تو سوتی ساریوں کے بجائے ساری والیوں کو یاد کیا کریں۔ بلکہ آپ جیسے شادی شدہ انسان کا اخلاقی فریضہ تو یہ ہے کہ بیڈ روم میں پہنچنے کے بعد بیوی کے علاوہ کسی اور موضوع پر نہ سوچے۔"

"برادرم!" وہ آہ بھر کر بولے "اب تو یہ موضوع بھی دوسرے بیڈ روم میں چلا گیا ہے۔ وہ سال سے الگ بیڈ روم میں سوتی ہیں۔ اس لئے اب تو اس موضوع پر بھی سوچنے کی ضرورت نہیں رہی" پھر وہ پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولے "وہ تو بار صاف کہہ چکی ہے کہ اگر خاندان کی عزت و ناموس اور بچوں کی شرم نہ ہوتی تو وہ کم از کم پانچ سال پہلے مجھ سے طلاق لے چکی ہوتی۔ بچے بھی مجھ سے ناراض ہیں۔ بیٹا امریکا میں جا کر بیٹھ گیا ہے۔ واپس آنے کا نام نہیں لیتا۔ بیٹی سوئٹزرلینڈ میں پڑھ رہی ہے مگر مجھے نہیں معلوم کیا پڑھ رہی ہے۔ چھٹیوں میں بھی گھر نہیں آتی۔"

"تو پھر آپ کس کے لئے اتنا کما رہے ہیں؟" میں نے پوچھا

"معلوم نہیں" وہ سادگی سے بولے۔ مگر وہ اتنے سادہ نہیں تھے۔ زیادہ سادہ ہوتے تو شاید اتنے بڑے سیٹھ نہ ہوتے۔ ایک لمحے کے توقف سے بولے "تمہاری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ تم کس کے لئے اتنا کما رہے ہو؟"

"معلوم نہیں" میں نے بھی انہی کی سی سادگی سے جواب دیا "شاید اپنے لئے۔ لیکن کم از کم اتنا تو ہے کہ مجھے سونے کے لئے سلیپنگ پلز نہیں کھانی پڑتیں۔"

"میری عمر کو پہنچو گے تو کھانے لگو گے۔ تمہاری عمر میں میں بھی نہیں کھاتا تھا برخوردار!" ان کا کمال یہ تھا کہ کبھی مجھے بھائی بنا لیتے تھے، کبھی برخوردار اور کبھی بزرگوار کے مرتبے پر فائز کر دیتے تھے۔ میں اصل موضوع کی طرف آنے کی سوچ رہا تھا کہ انہوں نے خود ہی میری مشکل حل کر دی۔ بڑے مشفقانہ لہجے میں بولے "ویسے رات کے تقریباً دو بجے تم نے میرے ازدواجی معاملات کریدنے کے لئے تو فون نہیں کیا ہو گا؟ یہ وقت تو ایسا ہی ہے..... لیکن تم سے مجھے یہ امید نہیں ہے۔"

"طارق صاحب! میری یہ مجال کہاں۔ وہ..... اصل میں ایک چھوٹا سا مسئلہ آن پڑا تھا۔ میں نے سوچا، آپ سے پوچھ لوں۔ آپ کے ملنے جلنے والوں میں کوئی ایسا آدمی ہے جو صبح وزیر صاحب سے میری ملاقات کا انتظام کرا سکے؟"

"وزیر خارجہ صاحب سے؟" وہ تعجب سے بولے "سپرپاورز کو تمہارے کاروبار پر کوئی اعتراض ہو گیا ہے جو وزیر خارجہ صاحب سے سفارش کرانا چاہتے ہو؟"

"کسی بھی قسم کی سفارش وغیرہ کا سلسلہ نہیں ہے" ان کے استہزائیہ لہجے کے جواب میں سنجیدگی سے کہا "پرائیویٹ سی بات ہے۔"

"ویسے تو خیر سفارش بھی خاصا پرائیویٹ معاملہ ہوتا ہے۔ تمہارا معاملہ کیا اس سے بھی زیادہ پرائیویٹ ہے؟ کسی شہزادی وغیرہ پر تو عاشق نہیں ہو گئے؟" پھر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر بولے "ویسے تو خیر انسان جس عورت پر عاشق ہو جائے وہی شہزادی نظر آتی ہے لیکن پھر بھی میں نے سوچا، پوچھ لوں تو بہتر ہے۔"

"طارق صاحب! زندگی میں پہلی بار آپ سے کام پڑا ہے۔ اور زندگی میں پہلی بار ہی میں ذرا زیادہ سنجیدہ ہوا ہوں تو آپ مذاق کرنے لگے ہیں۔ خدا کے لئے ذرا سنجیدگی سے میری بات کا جواب دیجئے" میں نے درخواست کی۔

"یار! جو آدمی سارا دن دفتر میں رونی صورت بنائے بیٹھا رہتا ہو، گھر آتا ہو تو گھر کی دیواریں بھی اس سے سیدھے منہ بات نہ کرتی ہوں، ایسے آدمی کو کم از کم رات کے دو بجے تو تھوڑا بہت مذاق کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔ خصوصاً جب کہ تمہارا سوال اتنا مزاحیہ ہے" طارق صاحب کے لہجے میں بہرحال بلا کی سنجیدگی تھی۔

"دنیا کا دستور یہی ہے طارق صاحب!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کوئی سخت مشکل میں ہوتا ہے لیکن دنیا کو اس کا مسئلہ بڑا مزاحیہ نظر آتا ہے۔ دنیا اس پر ہنستی ہے۔ میرا خیال ہے آپ میری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ اچھا..... خدا حافظ۔"

"ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ ابھی فون بند مت کرنا" وہ جلدی سے بولے "آخر تمہاری بات کا جواب دینا بھی تو میرا اخلاقی فرض ہے۔ کہتے ہیں انسان گڑ نہ دے، گڑ جیسی بات تو کر دے۔ میں تمہیں گڑ تو نہیں دے سکتا یعنی تمہارا کام تو نہیں کر سکتا لیکن گڑ جیسی بات ضرور کر رہا ہوں یعنی نہایت عاجزی، انکسار... اور مٹھاس سے تمہیں بتا رہا ہوں کہ ایسا کوئی آدمی میرا اتنا اچھا واقف نہیں ہے جو اتنے ہنگامی انداز میں فارن منسٹر صاحب سے تمہاری میٹنگ ارینج کرا سکے۔ البتہ اگر صنعت و تجارت کے منسٹر صاحب سے ملنا ہے تو بتاؤ۔ ان سے اپنی سلام دعا اچھی ہے۔ ان سے ملاقات چند گھنٹے کے نوٹس پر ہو سکتی ہے۔ تمہیں معلوم ہے اپنے متعلقہ وزیر تو وہی ہیں۔ فارن منسٹر صاحب سے ہمیں کیا لینا ہے۔"

"ایک تو ہم کاروباری لوگوں کی یہ بڑی مصیبت ہے کہ صرف انہی سے سلام دعا رکھتے ہیں جن سے کوئی مطلب ہوتا ہے" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا "وزیر صنعت و تجارت سے ملاقات کرنا ہوتی تو کسی نہ کسی حوالے سے تھوڑی بہت سلام دعا تو آپ کے اس خادم کی بھی نکل ہی آتی۔ آپ کو تکلیف دینے کا مقصد یہی تھا کہ معاملہ ذرا غیر متعلقہ سے منسٹر صاحب کا آن پڑا ہے۔ خیر..... معذرت چاہتا ہوں کہ آپ کا اور اپنا وقت ضائع کیا۔"

وہ دھیرے سے ہنسے۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتے، میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ وقت کی ناموزونیت کی پروا کئے بغیر میں نے شہر کی مزید دو چار بڑی بڑی کاروباری شخصیتوں کو فون کئے اور اپنی درخواست دہرائی۔ سب ہی نے معذرت کی۔ البتہ سب ہی میری ملاقات وزیر صنعت و تجارت سے کرانے پر تلے ہوئے تھے۔

میں نے دو چار ایسے دولت مندوں کو بھی فون کئے جو سیاست میں بھی منہ مارتے تھے۔ ان کی شناسائی صرف وزیر صنعت و تجارت تک نہیں بلکہ ہر زمانے، ہر حکومت میں ہر محکمے کے وزیروں تک رہتی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ کام تو کوئی مشکل نہیں تھا لیکن اس کے لئے بہرحال وقت درکار تھا۔ انہیں فارن منسٹر کا شیڈول معلوم کرنا پڑے گا، پھر اس میں گنجائش دیکھ کر کہیں مجھے فٹ کرنا پڑے گا۔ اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ان سے میری ملاقات کب ممکن ہو سکے گی۔ ایسی غیر یقینی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے اس ذریعے پر بھی انحصار نہیں کیا۔

ٹیلی فون بند کر کے ایک بار پھر نیم دراز ہو کر سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں اپنی کہانی لے کر سرکاری حکام کے پاس نہیں جانا چاہتا تھا۔ اس طرح میں لمبے چکروں میں پھنس جاتا۔ جس کا میں متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ تجربہ بھی تھا اور کچھ میرا دل بھی کہتا تھا کہ ایسے نازک اور پیچیدہ مسائل کو ہماری سرکاری مشینری مزید الجھا تو سکتی تھی، مزید خراب بھی کر سکتی تھی لیکن ان کا کوئی حل نہیں نکال سکتی تھی۔ کیوں کہ مشینری بہ ذات خود ان مسائل سے بھی زیادہ الجھی ہوئی تھی۔

پھر مجھے ستارہ کا خیال آیا۔ فلمی ستاروں، اور خصوصاً خاتون فلمی ستاروں کے شناساؤں کے حلقے میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ میں نے سوچا، اگر ستارہ ذہن پر زور دے تو شاید اس کے جاننے والوں میں کوئی ایسی شخصیت نکل آئے جو منسٹر صاحب سے میری نجی ملاقات کا ذریعہ بن سکے۔

ایک مرتبہ پھر فون کی طرف ہاتھ بڑھانے سے پہلے مجھے کچھ شرم سی بھی آئی اور میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا "واہ میاں افضل چوہدری! شہر کے بڑے معزز آدمی، بہت بڑی کاروباری شخصیت، گروپ آف کمپنیز کے مالک، بہت بڑا حلقہ احباب رکھنے والے اور اپنے تئیں بڑے پھنّے خان بنے پھرتے ہو لیکن عالم یہ ہے کہ اگر ہنگامی طور پر ایک مرکزی وزیر سے ..... اسی کی بھلائی کی خاطر ملاقات کی ضرورت آن پڑے تو اس کے لئے وسیلے تلاش کرتے پھرتے ہو۔ خواتین دوستوں تک کو زحمت دینے کی سوچتے ہو۔ کیا فائدہ تمہاری اس شان و شوکت کا؟"

لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اتنا قنوطی ہونے کی ضرورت نہیں۔ کبھی کبھی وقت اور حالات انسان کو کسی بھی ایسی عجیب و غریب الجھن میں ڈال سکتے ہیں جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوتا۔ اور ایسے موقعے پر کوئی ایسا انسان اس کے کام آ سکتا ہے جس کے بارے میں کبھی اس نے سوچا بھی نہیں ہوتا۔

میں ستارہ کو فون کرنے جا ہی رہا تھا کہ اس سے پہلے مجھے طاہرہ خانم کا خیال آ گیا۔ میں نے سوچا، اب خواتین دوستوں سے رجوع کرنے کی نوبت آ ہی گئی ہے تو پہلے طاہرہ خانم کو بھی پوچھ لیا جائے۔ وہ بھی خاصی باغ و بہار قسم کی عورت معلوم ہوتی تھی۔ کچھ کہا نہیں

جا سکتا تھا کہ اس کے شناساؤں کے حلقے میں بھی کیسے کیسے لوگ شامل ہوں۔ اور کیسے کیسے اس حلقے سے گزر کر ادھر ادھر کہیں بکھرے ہوئے ہوں یا زندگی کے راستوں پر لمحوں کی دھول میں کہیں گم ہو چکے ہوں' یوں خیالات کی روز ازا بگئی تو میں نے ستارہ کا نمبر ڈائل کرتے کرتے طاہرہ خانم کا نمبر ڈائل کر لیا۔

دوسری طرف سے اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی تو میں نے کہا "میرا تو خیال تھا کہ تم رات کو سوتی ہی نہیں ہو۔"

"اوہ...... یہ تم ہو!" میری آواز پہچان کر اس کے لہجے میں نیند کا خمار غائب ہو گیا "دراصل تمہاری نظر کرم کچھ زیادہ نہیں ہوئی ورنہ راتوں کی نیند ترک بھی کی جا سکتی تھی۔"

"طاہرہ خانم!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کبھی کبھی میں سوچتا ہوں......"

"کیا سوچتے ہو؟" وہ بے تابی سے میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"یہی کہ تم اتنی بدمعاش کیوں ہو؟"

اس نے مترنم سا قہقہہ لگایا "بدمعاشی صرف مردوں کی میراث تو نہیں ہے۔"

"ہرگز نہیں" میں نے تسلیم کیا "اس میراث پر تم بہ خوشی قبضہ کئے رکھو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ لیکن اس وقت میں نے تمہیں ایک کام کی بات کرنے کے لئے زحمت دی ہے۔"

"میں آج رات دعا کرتے ہوئے ہی سوئی تھی کہ رات کے پچھلے پہر تمہیں مجھ سے کوئی کام پڑ جائے۔ بعض دعائیں کتنی جلدی قبول ہو جاتی ہیں" اس کے سنجیدہ لہجے میں ایسی شرارت چھپی ہوئی تھی کہ کوئی اور وقت ہوتا تو جسم میں گدگدی سی ہونے لگتی۔

ایک لمحے کے معنی خیز توقف کے بعد وہ اسی لہجے میں بولی "تو پھر تم آ رہے ہو میری طرف؟"

"طاہرہ! اگر تمہارا شیطانی ذہن تمہیں ایک لمحے کی فرصت دے تو پلیز...... ذرا میری بات سن لو۔ ایک شخص رات کو اس وقت تمہیں فون کر رہا ہے۔ وہ کسی مصیبت میں بھی ہو سکتا ہے" میں نے ملامت سے کہا۔

"مجھے اچھی طرح اندازہ ہے کہ تمہارے ایج گروپ کے لوگوں پر ایسے اوقات میں کیا مصیبتیں پڑتی ہیں۔ تمہاری مصیبت دور کرنے کے لئے ہی تو تمہیں یہاں بلا رہی ہوں" وہ اطمینان سے بولی۔

"طاہرہ خانم! قسم سے' تمہاری صورت دیکھ کر کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا کہ تم کیا چیز ہو" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"آج کے دور میں بیشتر صورتوں کا معاملہ ایسا ہی ہے چنانچہ" وہ مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اب تم خود کو ہی لے لو۔ قسم سے تمہاری بھولی بھالی شکل پر خلوص کے ڈونگرے برستے ہیں۔ جس کی طرف ذرا محبت سے دیکھتے ہو' اسے یہی یقین ہونے لگتا ہے کہ تم سے زیادہ مخلص آدمی دنیا میں کوئی ہے ہی نہیں۔ مگر تم ہو کیسے پکے مطلبی۔ کبھی مطلب کے بغیر بھی فون نہ کر لیا کرو۔"

"میں سمجھا تھا تمہیں وہ فون سننے کی عادت ہی نہیں رہی جن کا کوئی خاص مطلب ہی نہ ہو" میں نے کہا۔

"چلو خیر...... بیکار باتوں کو جانے دو" اس کا لہجہ اب بھی وہی تھا لیکن اندر ہی اندر وہ گویا سنجیدہ ہو گئی تھی "کہو...... کیا بات ہے؟ مجھ جیسی بے کار عورت سے تمہیں کیا کام آن پڑا؟"

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے فوراً اپنا مدعا بیان کر ڈالا۔ اس سے قبل بھی میں نے جتنے لوگوں سے یہ درخواست کی تھی انہوں نے پہلے حیرت ہی کا اظہار کیا تھا کہ یہ بیٹھے بٹھائے اچانک مجھے وزیر خارجہ سے ملنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔ سبھی نے ہلکی پھلکی چھیڑ چھاڑ بھی کی تھی۔ طاہرہ خانم کا بھی پہلا ردعمل وہی رہا۔

"بزنس تو شاید بہت کر لیا۔ کیا اب عالمی سیاست میں ٹانگ اڑانے کا ارادہ ہے جو وزیر خارجہ صاحب سے راہ و رسم بڑھانے چل دیے؟" اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں" میں نے کراہ کر کہا "تم عالمی سیاست کی بات کر رہی ہو' میں نے تو کبھی ملکی سیاست میں بھی ٹانگ نہیں اڑائی۔ مجھے اپنی ٹانگ عزیز ہے۔ میں ابھی اسے تڑوانا نہیں چاہتا۔ بات کچھ اور ہے۔ لیکن بہت اہم ہے۔ میرے لئے بھی' اور وزیر خارجہ کے لئے بھی۔"

"اگر ان کے لئے بھی اہم ہے تو ڈائرکٹ انہیں فون کر لو" طاہرہ خانم نے مشورہ دیا۔

"اس وقت تو وہ اسلام آباد میں ہیں۔ آج صبح دس بجے کے قریب لاہور پہنچیں گے۔ میں اگر اسلام آباد یا یہاں انہیں فون کرنے کی کوشش بھی کروں تو مجھے معلوم ہے کہ ان کا اسٹاف مجھے ٹال دے گا۔ بات کچھ ایسی ہے کہ فون پر نہیں کی جا سکتی۔ اور پوری بات سنے بغیر وہ قائل نہیں ہوں گے۔ بلکہ قائل تو شاید وہ پوری بات سن کر بھی نہ ہوں۔ لیکن میرا کوشش کرنا اشد ضروری ہے۔ میرے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے ورنہ میں ملاقات تو بہرحال کر ہی لیتا۔"

"ہوں......" طاہرہ خانم نے ہنکارا بھرا۔ وہ یقیناً ذہن پر زور دے رہی تھی پھر یکدم جیسے اسے یاد آیا "بھئی کمال ہو گیا۔ بالکل سامنے کا آدمی ہے لیکن میرے ذہن میں اس کا نام ہی نہیں آ رہا تھا۔ برسوں سے اس سے ملاقات نہیں ہوئی نا۔ وہ ہمارا دور پار رشتے دار ہی ہے۔ نذیر خان اس کا نام ہے لیکن نوجوانی میں اسے نذیر پہلوان کہا کرتے تھے کیوں کہ اسے پہلوانی اور باڈی بلڈنگ وغیرہ کا بہت شوق ہوا کرتا تھا۔ مجھ پر عاشق تھا وہ اس زمانے میں۔"

"اور تم؟" میں نے ایک لمحے کے لئے اصل موضوع

بھولتے ہوئے پوچھا۔

"میں نے کبھی اسے لفٹ نہیں کرائی تھی۔ ویسے تو گپ شپ تھی' ہنسی مذاق تھا۔ آخر رشتے دار تھا۔ لیکن میں نے اس کے عشق کا جواب کبھی عشق سے دینے کی کوشش نہیں کی" وہ روانی سے بولی۔

"کیوں؟ کیا شکل کا برا تھا؟" میں نے کریدا۔

"نہیں۔ فقرا تھا بالکل۔ ایک نمبر کا کنگلا" اس نے اطمینان سے جواب دیا "عمر میں بھی مجھ سے بہت بڑا تھا۔ شادی شدہ تھا۔ بڑے بڑے بچے تھے اس کے۔ سرکاری نوکری کرتا تھا۔ معلوم نہیں کون سا ڈیپارٹمنٹ تھا اس کا۔ مگر شاید رشوت نہیں کھاتا تھا یا شاید اس کی نوکری میں رشوت کی گنجائش نہیں تھی۔ معلوم نہیں کیا چکر تھا۔ ایک چھوٹے سے سرکاری کوارٹر میں اپنی جھگڑالو بیوی کے ساتھ رہتا تھا اور مجھے لمبے لمبے خط لکھا کرتا تھا جس میں ساحر لدھیانوی کے آدھے آدھے دیوان نقل کیا کرتا تھا۔ اب میں پاگل تو نہیں تھی نا کہ ایک آدمی جو عمر میں مجھ سے اتنا بڑا ہو' اس کے اتنے بڑے بڑے بچے ہوں۔ اوپر سے غریب بھی ہو۔ اور میں اس کے عشق کا جواب عشق سے دوں۔ مجھے کیا پاگل کتے نے کاٹا تھا؟ چلو انسان اور چاہے کچھ بھی ہو۔ کم از کم غریب تو نہ ہو۔ میں نے تو نوجوانی سے ہی اصول بنا لیا تھا کہ کانے' لنگڑے لولے' بڈھے سے شادی کر لوں گی لیکن غریب سے نہیں کروں گی" وہ سفاکی کی حد تک صاف گو تھی۔

"نوجوانی میں ہی اتنی شاطر کیسے ہو گئی تھیں؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"شاید میں پیدائشی چالاک تھی" وہ اطمینان سے بولی۔

"تمہاری داستان حیات یقیناً کافی واہیات قسم کی ہو گی۔ کبھی فرصت میں سنوں گا۔ اس وقت تو نذیر پہلوان کی بات ہو رہی تھی۔ اگر وہ اتنا غریب تھا تو اس کی فارن منسٹر صاحب سے جان پہچان کہاں سے نکل آئی؟ کہیں بعد میں وہ سیاست میں حصہ لے کر دولت مند تو نہیں بن گیا تھا؟ کوئی منسٹری وغیرہ تو حصے میں نہیں آ گئی تھی اس کے؟"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولی "دراصل وہ بعد میں حفیظ احمد صاحب کا خصوصی سیکیورٹی گارڈ لگ گیا تھا۔ حفیظ احمد صاحب اس وقت وزیر خارجہ نہیں تھے۔ وہ

شاید امور خارجہ کی وزارت میں انڈر سیکریٹری تھے۔ مجھے کچھ صحیح طرح معلوم نہیں۔ بہرحال اس زمانے میں کچھ لوگ ان کے قبضے میں موجود ایک فائل حاصل کرنے کے لئے انہیں اغوا کرنا چاہتے تھے لیکن حفیظ صاحب عین وقت پر نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ان کا ٹھکانا معلوم کرنے کے لئے ان لوگوں نے نذیر پہلوان ..... میرا مطلب ہے نذیر خان کو اغواء کر لیا تھا۔ اس پر بہت تشدد کیا تھا۔ جس میں اس کا ایک ہاتھ بھی ضائع ہو گیا تھا لیکن اس نے حفیظ صاحب کا پتا نہیں بتایا تھا۔ تب سے آج تک حفیظ صاحب اس کی بہت عزت کرتے ہیں۔ اس کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔"

"چلو ..... شکر ہے' ہمارے کسی منسٹر میں اتنی وضع داری تو ہے" میں نے کہا "تو اب یہ نذیر خان کیا کرتا ہے؟ کہاں پایا جاتا ہے؟"

"سیکیورٹی کے کام کے تو وہ قابل نہیں رہا تھا۔ بلکہ دایاں ہاتھ آدھی کلائی تک ضائع ہو جانے کی وجہ سے اس کے لئے ہر کام ہی دشوار ہو گیا تھا۔ لیکن حفیظ صاحب نے ہی بہرحال اسے حکومت سے کافی رقم بھی دلوائی تھی اور بعد میں کسی پرائیویٹ کمپنی کے آفس میں جنرل مینیجر بھی رکھوا دیا تھا۔ بس کچھ اسی قسم کی باتیں تھیں۔ مجھے کچھ زیادہ صحیح طرح تفصیلات یاد نہیں۔ بہرحال ..... تم ملو گے تو خود ہی پوچھ لینا۔ اب اس کے حالات خاصے بہتر ہیں۔ وہ سمن آباد میں ایک چھوٹی سی کوٹھی میں رہتا ہے۔ میں ابھی اس کا ایڈریس تلاش کر کے تمہیں دیتی ہوں۔ میں نے سنا ہے حفیظ صاحب وزیر خارجہ بننے کے بعد بھی نذیر خان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ جس وقت چاہے انہیں فون کر سکتا ہے۔ حفیظ صاحب اس کی کوئی بات نہیں ٹالتے۔ اور وہ میری کوئی بات نہیں ٹال سکتا۔ تم میرے حوالے سے جا کر اس سے مل لو۔ میں اسے فون بھی کردوں گی۔ اچھا' شریف آدمی ہے۔ اس کی قسمت اچھی تھی جو مجھ جیسی عورت کے پلے نہیں پڑا۔ مجھے یقین ہے کہ وہ منسٹر صاحب سے تمہاری کسی بھی وقت کی ملاقات طے کرا دے گا۔"

"بس۔ پھر تو مسئلہ ہی حل ہو گیا۔" میں نے سکون کی سانس لے کر کہا "اتنی سی تو بات تھی۔ مجھے ایسے ہی کسی آدمی کی تلاش تھی۔"

"دیکھا ..... کس طرح چٹکی بجاتے میں تمہارا مسئلہ حل کر دیا؟ مجھ جیسا کھوٹا سکہ بھی کبھی کبھی کام آجاتا ہے۔ مجھے زندگی کے راستے پر بے پروائی سے کہیں ادھر ادھر نہ پھینک دینا۔"

"ہرگز نہیں۔ میں تو تمہیں طلائی اشرفی سمجھ کر سب سے اوپر والی جیب میں سنبھال کر رکھوں گا" میں نے محبت سے کہا "تم ذرا نذیر خان کا ایڈریس اور فون نمبر وغیرہ مجھے بتاؤ۔"

اس نے کچھ دیر مجھے ہولڈ کرایا اور نہ جانے کہاں سے وہ ایڈریس وغیرہ تلاش کر کے مجھے لکھانے کے بعد بولی "کہیں اسی وقت اس کے گھر نہ چل دینا۔ میری بات اور ہے۔ لیکن یہ کسی شریف آدمی کے گھر جانے کا وقت نہیں ہے۔"

"نہیں۔ میں کم از کم صبح کا اجالا نمودار ہونے کا انتظار تو کروں گا" میں نے اسے تسلی دی "اب میں تمہارا رسمی شکریہ تو ادا کروں گا نہیں۔ شکریہ ادا کرنے کے لئے مجھے تمہارے گھر ہی آنا پڑے گا۔"

"یقیناً۔ تمہارے رسمی شکریے کی تو ... ت بھی نہیں ہے۔ ویسے بائی دا وے ..... اس وقت میری نیند خراب کرنے کے بعد اب تم خود کیا کرو گے؟"

"میں دو تین گھنٹے نیند لے لوں گا" میں نے اطمینان سے جواب دیا "نذیر خان سے ملاقات کے لئے جاتے وقت میرا ذہن ذرا تازہ ہو تو اچھا ہے۔"

"بڑے ہی کمینے اور خود غرض انسان ہو تم" وہ مصنوعی خفگی سے بولی۔

"تعریف کا شکریہ" میں نے کہا "اور شب بخیر ..... بلکہ اب تو شب بھی بے چاری تقریباً گزر ہی چکی ہے۔ اس لئے صبح بخیر۔"

سلسلہ منقطع کر کے میں اپنے آپ کو قدرے مطمئن محسوس کرتے ہوئے کروٹ بدل کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ طاہرہ خانم سے شناسائی میرے لئے فائدے مند ہی ثابت ہوئی تھی۔ وہ عورت جیسی بھی تھی مگر اندر سے اچھی تھی۔ کم از کم کھری تو تھی۔

○☆○

علی الصباح اٹھ کر میں نے نذیر خان کے گھر فون کیا۔ کسی عورت نے ریسیو کیا اور بتایا کہ خان صاحب نماز پڑھ رہے ہیں۔ اس نے میرا نمبر لے لیا کہ چند منٹ بعد خان صاحب خود مجھے فون کریں گے۔ نذیر خان نماز پڑھ رہا تھا۔ میں نے سوچا آدمی ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس سے کھل کر بات کر لینے میں شاید کچھ حرج نہ ہو۔ چند منٹ بعد اس کا فون آگیا۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ غائبانہ طور پر مجھ سے واقف ہی نکل آیا۔ وہ جس کمپنی کی ایک برانچ کا جنرل مینیجر تھا' اس سے ہماری کسی کمپنی کا کچھ لین دین تھا۔ میں نے طاہرہ خانم کا حوالہ دیا تو وہ بولا "اب اس کا حوالہ دینے کی ضرورت نہیں چوہدری صاحب! بہرحال میرے بارے میں اگر اس نے آپ کو بتایا ہے تو پھر آپ مجھے اپنا دہرا خادم سمجھیں۔ فرمایئے' میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟"

میں نے اسے بتایا کہ میں فوری طور پر اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ اس کے مزاج میں اتنا انکسار تھا کہ فوراً بولا "یہ تو میرے لئے اعزاز ہو گا چوہدری صاحب! میں ابھی حاضر ہو جاتا ہوں۔ آپ اپنا ایڈریس مجھے بتا دیں۔"

"نہیں۔ میں خود ہی آرہا ہوں" میں نے کہا۔ مجھے اچھا معلوم نہیں ہوا کہ اس کے انکسار سے فائدہ اٹھاؤں۔ کام اس سے مجھے تھا۔ بہتر یہی تھا کہ میں اس کے گھر چلا جاتا۔ اس نے بہت کہا کہ مجھے اس کے "غریب خانے" پر آنے کی زحمت کی کیا ضرورت ہے۔ میں جہاں حکم کروں وہ حاضر ہو جائے گا لیکن میں نے اس کی یہ بات نہیں مانی۔

میں جب اس کا ایڈریس تلاش کرتا ہوا سمن آباد کی ایک گلی میں اس کی چھوٹی سی کوٹھی تک پہنچا تو وہ گیٹ کھولے باہر ہی میرے انتظار میں کھڑا تھا۔ وہ ایک قد آور اور سرخ و سپید آدمی تھا۔ آدھے سے زیادہ بال سفید تھے۔ پچاس پچپن کے پیٹے میں تھا۔ معمولی سی سفید شلوار قمیص میں وہ ایک عام' سیدھا سادا' ریٹائرڈ سا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن اس کے چہرے پر طمانیت کی چمک تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جو زندگی سے بہرحال مطمئن رہتے ہیں۔ کبھی شکوہ نہیں کرتے۔ اس لئے سکھ کی زندگی گزارتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تعداد دنیا میں دن بدن گھٹتی جا رہی ہے۔ اسے دیکھ کر کسی کو گمان تک نہیں گزر سکتا تھا کہ ملک کے وزیر خارجہ سے اس کی ایسی قریبی شناسائی ہو گی کہ وہ اس کی کوئی بات ٹالتے نہیں ہوں گے۔ اس کا ایک ہاتھ یقیناً مصنوعی تھا۔ اس پر دستانہ چڑھا ہوا تھا۔

میں گاڑی سے اترا تو اس نے "السلام علیکم" اور "جی آیاں نوں" کہتے ہوئے بہت گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ جو انکسار میں نے فون پر اس کے لہجے میں محسوس کیا تھا وہ اس کے رویئے میں بھی موجود تھا۔ وہ مجھے سیدھا ڈرائنگ روم سے ملحق اپنے ڈائننگ روم میں لے گیا جہاں گھریلو لباس میں ایک نہایت خوب صورت لڑکی ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے لئے برتن لگوا رہی تھی۔ ایک نوکر اس کی مدد کر رہا تھا۔

پہلی نظر میں تو اس لڑکی پر غیر ملکی ہونے کا گمان گزرتا تھا۔ اس کے بال سنہرے اور آنکھیں نیلی تھیں۔ رنگت سفید فانوس کی طرح سرخ و سپید تھی۔ لگتا تھا ناشتے کے لئے کوئی خصوصی اہتمام ہو رہا تھا۔ نذیر خان سے طے یہ پایا تھا کہ میں ناشتا اس کے ساتھ کروں گا۔ کمرے میں میرے داخل ہوتے ہی اس لڑکی نے مجھے سلام کیا۔ اس کی عمر تیس کے قریب ہو گی۔ وہ ذرا فربہی مائل تھی۔ لڑکی کیا' گھریلو سی عورت ہی معلوم ہوتی تھی۔ سلام کرتے ہی وہ دوپٹا سر پر ٹھیک کرتے ہوئے فوراً کچن میں چلی گئی۔

اس کی عدم موجودگی میں نذیر خان اس کا تعارف کراتے ہوئے بولا "یہ شکیلہ تھی۔ عام طور پر لوگ اسے میری بیٹی سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں۔ اس لئے میں پہلے ہی وضاحت کر دوں تو بہتر ہو گا کہ یہ میری بیوی ہے۔"

اچھا ہی ہوا اس نے وضاحت کر دی۔ غلط فہمی مجھے بھی ہونے لگی تھی۔ بہرحال یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ بندے پر تھوڑی سی خوش حالی آجائے اور وہ جستجو میں بھی رہے تو بڑی عمر میں بھی دوسری شادی کے لئے کم عمر اور حسین لڑکیاں میسر آجاتی ہیں۔

نذیر خان گویا میرے خیالات پڑھ رہا تھا۔ ہم بیٹھ چکے تو بولا "پہلی ہی ملاقات پر اس قسم کی وضاحتیں کرنا اور اپنے نجی معاملات کے قصے سنانا اچھا تو نہیں لگتا لیکن آپ نہ جانے کیوں پہلی ہی ملاقات میں کچھ اپنے اپنے سے لگ رہے ہیں اس لئے بتا رہا ہوں۔ پہلی بیوی کے انتقال کے بعد میرا دوسری شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیوں کہ بچے تقریباً جوان ہی ہو چکے تھے۔ خاص طور پر عمر میں اپنے سے اتنی چھوٹی لڑکی سے شادی کرنے کا تصور میرے لئے کچھ ایسا خوش کن نہیں تھا لیکن یہ خود شکیلہ کا اصرار تھا۔ اس نے صرف مجھے ہی نہیں' اپنے والدین کو بھی مجبور کر دیا۔"

"پھر تو آپ کی خوش قسمتی میں کوئی شک نہیں" اب میں نے ذرا دلچسپی محسوس کرتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے ہلکا سا شبہ بھی ہوا کہ کہیں وہ مبالغہ آرائی تو نہیں کر رہا تھا؟

وہ اپنے ہاتھوں سے میرے لئے ایک پلیٹ سے نیپکن سے نمی صاف کرتے ہوئے بولا "وہ کسی حد تک فلمی سے حالات تھے جن میں شکیلہ سے میری شادی ہوئی۔ میں اسے بالکل نہیں جانتا تھا۔ میں تو ایک صبح ٹیکسی میں مزنگ چورنگی سے گزر رہا تھا کہ صنم سینما کے قریب مجھے ایک عجیب تماشا نظر آیا۔ کالج کے یونیفارم میں ایک نہایت خوب صورت لڑکی کو تین ڈشکرے قسم کے غنڈے اٹھا کر ایک جیپ میں ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ دیکھنے میں جتنی نرم و نازک نظر آتی تھی اتنی ہی شدت سے مزاحمت کر رہی تھی۔ اس کا یونیفارم پھٹ چکا تھا۔ کتابیں بس اسٹاپ کے سامنے بکھر چکی تھیں۔ بس اسٹاپ پر چند دوسری لڑکیاں بھی تھیں جو سہمی ہوئی ہرنیوں کی طرح ادھر ادھر دبک گئی تھیں۔ کوئی ان بدمعاشوں کو روکنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا کیوں کہ ان میں سے دو کے پاس رائفلیں تھیں۔ ٹریفک چلا جا رہا تھا۔ لوگ نظر بچا کر گزرے چلے جا رہے تھے۔ پولیس تو وہاں موجود نہیں تھی۔ میں خود پولیس میں نوکری کر چکا ہوں لیکن مجھے اعتراف ہے کہ بعض اوقات پولیس موقع پر پہنچ سکنے کی اہل ہونے کے باوجود نہیں پہنچتی۔ واردات کے بعد ہی پہنچتی ہے۔ بہرحال کچھ دور ایک ٹریفک کانسٹیبل موجود تھا۔ وہ بھی بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا حالانکہ وہ ٹریفک کا آدمی ہی سہی لیکن اس کے جسم پر قانون کی دی ہوئی وردی تو موجود تھی ....."

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے متاسفانہ سے انداز میں گہری سانس لی۔ میں نہایت انہماک سے اس شخص کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا "مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کچھ لاہور جیسے شہر کی ایک بھری پُری سڑک پر ہو رہا ہے۔ میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو ٹیکسی روکنے کے لئے کہا تو وہ بولا "چھوڑیں جی! آپ کیوں چکر میں پڑتے ہیں۔ کیا پتا لڑکی کا پیچھے سے کوئی چکر ہو" میں عام طور پر شدید غصے کے عالم میں بھی گالی نہیں دیتا لیکن اس روز میں نے ٹیکسی ڈرائیور کو گالی دی۔ وہ ... تخیم چھ فٹ کا جوان تھا۔ میری مدد کرنے کے بجائے مجھے مشورہ دے رہا تھا ..... اور چوہدری صاحب! میں اس وقت بھی اسی طرح ٹھنڈا تھا ....."

اس نے اپنا مصنوعی ہاتھ گویا یاددہانی کے لئے بلند کیا۔ اس ہاتھ پر چڑھا ہوا لمبا دستانہ اس کی آستین میں گیا ہوا تھا۔ میں نے سرہلاتے ہوئے کہا "خان صاحب! ہمارے نظام کی خرابیوں نے اور تو جو گل کھلائے ہیں سو کھلائے ہیں لیکن ساتھ ہی ایک بہت بڑا ظلم یہ کیا ہے کہ بدمعاشوں کو یہ نظام دن بدن زیادہ بے خوف اور شریف آدمی کو دن بدن زیادہ بزدل بنارہا ہے۔"

"اصل میں بدمعاش دن بدن زیادہ متحد، زیادہ منظم ہورہے ہیں جب کہ شریف آدمی دن بدن بکھر رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے زیادہ دور ہورہے ہیں۔ پڑوسی بھی ایک دوسرے کو نہیں جانتے" نذیر خان نے کہا "بہرحال۔ چوہدری صاحب! وہ نظارہ دیکھ کر میری تو کھوپڑی گھوم گئی۔ ریوالور میرے پاس تھا۔ ٹیکسی سے اترتے ہی میں نے دو چار ہوائی فائر کئے اور اس نقلی ہاتھ سے ہی ان کی کھوپڑیاں چٹخا کر رکھ دیں۔ یہ ان بریک ایبل، ٹھوس پلاسٹک کا ہے اور مضبوط پٹیوں کے ذریعے کہنی تک بندھا ہوا ہے۔ یہ بھی میرا ایک معقول ہتھیار ہے۔ لکڑی کے ہتھوڑے کا کام دیتا ہے۔ آپ اسے خود پرستی یا گپ مت سمجھئے گا۔ مجھ اکیلے، اچھی بھلی عمر کے، ٹنڈے آدمی نے ان کی درگت بنادی۔ انہیں ایک گولی بھی چلانے کی مہلت نہیں دی۔ یہ صرف جذبے کا کمال تھا۔ میں دل میں صرف ایک بے غرض جذبہ لے کر گیا تھا کہ مجھے اس بے بس اور کمزور لڑکی کو بدمعاشوں کے ہاتھوں سے بچانا ہے۔ میں نے صرف یہ تہیہ کیا تھا۔ اس کے بعد مجھے نہیں معلوم کہ باقی سب کچھ کیسے ہوتا چلا گیا۔ مجھے صرف اس وقت ہوش آیا جب میں نے انہیں جیپ میں بیٹھ کر بھاگتے دیکھا۔ شکیلہ کو وہ چھوڑ گئے تھے۔ ایک کی رائفل بھی وہیں گر گئی تھی۔"

"جب اصل اور سچے مرد میدان میں آتے ہیں تو ایسا ہی ہوتا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں شکیلہ کو اس کے گھر چھوڑ کر آیا۔ اس کی کہانی کا پتا چلا۔ ایک صوبائی وزیر کا چکر تھا۔ موصوف کالج کی کسی تقریب میں شکیلہ کو دیکھ کر اس پر عاشق ہوگئے تھے۔ عمر چالیس سے اوپر تھی۔ تین چار بیویاں پہلے سے موجود تھیں۔ کوئی گاؤں میں، کوئی شہر میں۔ دو چار داشتائیں بھی تھیں۔ روپیہ بے حساب تھا۔ زمین داری اور سیاست نے بے مہار بنادیا تھا۔ کم ظرفوں کو یہ چیزیں ہضم نہیں ہوتیں۔ پہلے اس نے شکیلہ کے گھر رشتے کا پیغام بھیجا۔ شکیلہ کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا۔ اس کے والدین تو خوف اور الجھن میں کوئی جواب بھی نہ دے پائے مگر خود شکیلہ نے صاف انکار کردیا۔ وزیر صاحب نے انا کا مسئلہ بنالیا۔ وہی پرانے ہتھکنڈے، وہی غنڈہ گردی۔ اور آخرکار موصوف آخری حربے پر اتر آئے۔ غنڈے بھیج کر شکیلہ کو اٹھونے کی کوشش کی۔ لیکن قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بیچ میں ٹپک پڑے نذیر خان۔"

"کاش ایسے ہر موقع پر ٹپک پڑنے کے لئے دنیا میں بہت سے نذیر خان ہوں" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

نذیر خان سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا "شکیلہ کے ذہن پر اس واقعے کا عجیب ہی اثر ہوا۔ اس نے گھروالوں سے دوٹوک کہہ دیا کہ وہ شادی کرے گی تو صرف مجھ سے۔ وہ پڑھی لکھی اور سوچنے والی لڑکی تھی۔ اس نے عجیب ہی فلسفہ اپنالیا۔ کہنے لگی کہ وہ اس سوسائٹی میں کسی سے شادی کرکے کیا کرے گی جو اس کی عزت لٹتے دیکھ کر اس کی مدد کے لئے نہیں آسکتا۔"

"لیکن آپ بھی تو اسی سوسائٹی کے فرد تھے" میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ وہ مجھے اس گم گشتہ تہذیب کی بچی کھچی نشانیوں میں سے ایک قرار دیتی تھی جو اب نہ جانے دنیا کے کس گوشے میں منہ چھپائے پڑی ہے۔ وہی تہذیب جس کی روایتوں میں سے ایک روایت یہ بھی تھی کہ کسی پر ظلم ہوتے دیکھ کر خاموش نہ رہا جائے۔"

شکیلہ اگر کالج کے زمانے میں اتنا سوچ سکتی تھی اور اتنی زبردست قوت فیصلہ رکھتی تھی تو وہ بلاشبہ ایک ذہین اور منفرد لڑکی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے نذیر خان بولا "شکیلہ کو ایک مضبوط مرد کا سہارا میسر آیا تو وہ ایسی شیرنی بنی کہ کوئی تصور نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے عدالت میں بیانات دیے۔ پریس کانفرنسیں کیں۔ ہر جگہ خم ٹھونک کر کھڑی ہوئی۔ ادھر اپنی بھی کچھ کام کے آدمیوں سے شناسائی تھی۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ سرکاری حلقوں میں بھی دو چار آدمی آپ کے اس خادم کی عزت کرتے ہیں۔ ہم حقیر فقیر لوگ تھے۔ لیکن صوبائی وزیر صاحب کو ہم نے اچھا رگڑا لگادیا۔ انہیں ہم جیل تو نہ بھجوا سکے لیکن وزارت سے بہرحال انہیں استعفیٰ دینا پڑا۔ ان کے وہ خاص بدمعاش البتہ آج تک جیل میں سڑ رہے ہیں جنہوں نے شکیلہ کو اٹھا کر ان کی خدمت میں پیش کرنے کی ذمے داری لی تھی۔"

"بڑی خوشی ہورہی ہے مجھے یہ سن کر" میں نے کہا۔

"بہرحال اس وقت مجھے ان لوگوں سے پنگا لینا اتنا مشکل محسوس نہیں ہوا تھا جتنی مشکل میں شکیلہ نے مجھے ڈال دیا تھا۔ وہ مجھ سے شادی کرنے پر تل گئی تھی جب کہ مجھے اپنی اور اس کی عمر کا فرق دیکھ کر...... اپنے تقریباً جوان بچوں کو دیکھ کر شرم آرہی تھی۔ لیکن بہرحال...... یہ کام ہونا تھا، سو ہوگیا۔ پہلی بیوی سے میرا ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہے۔ اتفاق ہے کہ لڑکی کی شادی بھی ملک سے باہر ہوئی اور لڑکا بھی نوکری کے سلسلے میں ملک سے باہر ہے۔ شکیلہ سے بھی میرے دو بچے ہیں۔ وہ ابھی چھوٹے ہی ہیں۔ اسکول جاتے ہیں۔ زندگی ٹھیک ٹھاک ہی گزر رہی ہے" وہ بہت دھیمی آواز میں بات کررہا تھا۔

"اور طاہرہ خانم کبھی یاد نہیں آتی؟" میں نے اس سے بھی دھیمی آواز میں پوچھا۔

وہ ہولے سے ہنسا "بڑی خبیث عورت ہے۔ اس نے یقیناً آپ کو بتادیا ہوگا کہ کبھی میں دل و جان سے اس پر فدا تھا۔ انسان پر زندگی میں عجیب عجیب دور آتے ہیں۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں، قدرت جو کرتی ہے بہتر ہی کرتی ہے۔ اچھا ہی ہوا مجھے دوسری شادی کے لئے طاہرہ خانم جیسی عورت میسر نہیں آئی۔ وہ عورت نہیں، طوفان ہے، اسے اپنے گھر تک، اپنی زندگی تک محدود رکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے تو شکیلہ جیسی عورت ہی کی ضرورت تھی۔ میں قسمت کے اس فیصلے پر بہت خوش ہوں۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد اس نے اچانک ہی پوچھا "آج کل وہ آپ پر مہربان ہے کیا؟"

نہ جانے کیوں اس موقعے پر میں سچ بولنے سے کترا گیا "کاروبار کی حد تک مہربان ہے۔ ہم جلد ہی ایک جوائنٹ وینچر شروع کررہے ہیں۔ ایک دوسرے کی بہت عزت کرتے ہیں اور بس۔"

"اچھی بات ہے" اس نے سرہلایا "ہے وہ بڑی خبیث۔ لیکن عزت اس کی میں بھی کرتا ہوں۔ ابھی تک کرتا ہوں۔ بہرحال...... میں نے تو آپ کو اپنی رام کہانی سنادی۔ جو میں تقریباً ہر نئے آنے والے کو سناتا ہوں۔ میں نے آپ کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ اب آپ اپنی سنایئے۔ طاہرہ نے آپ کو کس سلسلے میں میرے پاس بھیجا ہے؟"

اب میں نے اسے اپنی رام کہانی سنائی۔ میں نے ریڈ ڈاٹ کا اور ہنی کا نام نہیں لیا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ سازش میرے لئے، ملک کے لئے اور خود وزیر خارجہ کے لئے خطرناک تھی۔ میں اس سلسلے میں ذاتی طور پر کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کے لئے منسٹر صاحب سے میری ملاقات ہونا اور ان کا مجھ سے متفق ہونا ضروری تھا۔ سازش کا سن کر وہ بھی فکرمند ہوگیا۔ تاہم اس نے غیر ضروری ...... بلکہ ضروری سوالات بھی نہیں کئے۔

"منسٹر صاحب سے ملاقات تو کوئی مسئلہ نہیں ہے" چند لمحے کسی سوچ میں ڈوبا رہنے کے بعد وہ بولا "لیکن ان کو قائل کرنا آپ کا کام ہے۔ وہ بڑے ٹیڑھے آدمی ہیں۔"

"کوشش کرکے دیکھنا ہمارا فرض ہے۔ ورنہ ویسے تو یہ معاملہ میں نے اوپر والے پر چھوڑدیا ہے۔ جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

اس نے قریب ہی تپائی پر رکھا ہوا فون اٹھا کر اپنے سامنے ڈائننگ ٹیبل پر رکھا اور یکے بعد دیگرے کئی نمبر گھمانے اور کئی افراد سے بات کرنے کے بعد فون واپس رکھتے ہوئے بولا "ابھی تو منسٹر صاحب کی فلائٹ ہی لاہور پہنچنے میں ایک گھنٹا باقی ہے۔ ایئرپورٹ پر پریس اور ٹی وی کے نمائندوں وغیرہ سے باتیں کرتے کراتے انہیں آدھا گھنٹا اور گزر جائے گا۔ وہ کافی عرصے بعد لاہور آرہے ہیں اور وہ بھی صرف ڈھائی تین گھنٹے کے لئے۔ اس دوران وہ صرف گورنر ہاؤس میں رہیں گے۔ بہت سے لوگوں سے ان کی ملاقاتیں طے ہیں۔ بہرحال آپ کو اس سلسلے میں فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان کی ملاقاتیں خواہ کسی سے بھی طے ہوں، ہم سے ملاقات بہرحال ہوجائے گی۔ لیکن اس کے لئے ہمیں کم از کم دو گھنٹے تو انتظار کرنا پڑے گا تاکہ وہ گورنر ہاؤس پہنچ چکیں اور ذرا سکون کی سانس لے چکیں۔ اس وقت تک آپ آرام سے ٹانگیں پسار کر بیٹھیں۔ ڈٹ کر، خالص لاہوری قسم کا ناشتا کریں۔ یہ غریب خانہ اس قابل تو نہیں لیکن پھر بھی آپ اسے اپنا ہی گھر سمجھیں۔ میری بھی آج دفتر سے چھٹی ہے۔ آج یہی کام کرلیتے ہیں۔ کچھ گپ شپ کرلیتے ہیں۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ چونک کر بولا "لیکن آپ تو بہت مصروف ہوتے ہوں گے۔ دو گھنٹے ضائع کرنے کے متحمل ہوسکیں گے؟"

"آپ کے پاس بیٹھنا وقت ضائع کرنا تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"ویسے بھی میرے دوسرے معاملات تو چلتے ہی رہیں گے لیکن اس معاملے کو میرا ذاتی طور پر دیکھنا ضروری ہے۔ اب تو جتنا بھی وقت صرف کرنا ضروری ہوگا، کریں گے۔"

اس دوران میز پر ناشتا لگایا جاچکا تھا۔ ناشتا ملازم نے ہی لگایا تھا۔ شکیلہ دوبارہ کمرے میں نہیں آئی تھی۔ ناشتا واقعی خالص لاہوری قسم کا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نذیر خان نے لاہور کے ہر گوشے میں ناشتے میں استعمال ہونے والے لوازمات جمع کرلئے تھے۔ پوری، پراٹھا، پائے، نہاری، چھولے، لسی اور نہ جانے کیا کچھ موجود تھا۔

میں نے حیرت سے کہا "میں تو اکیلا ہی آپ سے ملنے آرہا تھا۔ آپ نے تو ناشتے کا انتظام پوری بٹالین کے لئے کیا ہوا ہے۔"

"میں نے سوچا۔ آپ کو ان میں سے نہ جانے کون سی چیز پسند ہو۔ میں نے سبھی کا انتظام کرلیا" وہ سادگی سے بولا "انگریزی کے ناشتے تو آپ کرتے ہی رہتے ہوں گے۔ میں ذرا دیسی سا آدمی ہوں۔ ویسے آدھی بٹالین تو آپ مجھے ہی سمجھ لیں۔ آدھی چیزوں کا صفایا تو میں کردوں گا۔ جہاں تک آپ کا بس چلے آپ اپنی کوشش کیجئے۔ بس اب دیر مت کیجئے اور ان چیزوں پر ٹوٹ پڑیے۔"

اس کا اکلوتا ہاتھ حرکت میں آگیا۔ وہ واقعی ایک خوش خوراک آدمی تھا۔ پہلوانوں کی طرح کھاتا تھا۔ میں کوشش کے باوجود اس کا ساتھ نہ دے سکا۔ غربت کے زمانے میں دنیا کی ہر چیز کھاجانے کو جی چاہتا تھا۔ اب طبیعت سیر رہتی تھی۔ ویسے بھی میں نے محسوس کرلیا تھا کہ طاقت ور رہنے کے لئے زیادہ کھانا ضروری نہیں تھا۔

کھانے کے بعد لسی کا دور چل رہا تھا جب میں نے میز پر

وئے اس کے مصنوعی ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "طاہرہ خانم نے مجھے بتایا تھا کہ جس واقعے میں آپ کا یہ ہاتھ ضائع ہوا تھا' راصل وہی واقعہ آپ کو منسٹر صاحب کے قریب لانے کی وجہ بنا تھا؟"

"جی ہاں۔ اور اسی واقعے کی وجہ سے میں نے آپ کی سنائی ؤی کہانی پر اتنی جلدی یقین کرلیا ہے۔ آپ نے کسی ملٹی نیشنل کمپنی کی بات کی ہے۔ میرے ساتھ جو واقعہ پیش آیا تھا اس میں ی کوئی ملٹی نیشنل کمپنی ملوث تھی۔ وزارت خارجہ کا معاملہ تھا۔ اہر ہے بڑی لمبی چوڑی تحقیقات ہوئی تھیں۔ مجھے زیادہ تفصیل تو علوم نہیں ہو سکی۔ میں تو اس وقت محض ایک باڈی گارڈ تھا۔ لین مجھے اتنا ضرور معلوم ہوگیا تھا کہ ایک بڑے ملک کے اشارے اس کمپنی کے بارے میں تحقیقات روک دی گئی تھی۔"

"ہوا کیا تھا؟" میں نے پوچھا اور کوشش کی کہ میرے لہجے سے زیادہ تجسس کا اظہار نہ ہو۔

"کوئی خاص بات نہیں تھی۔ لیکن اب بھی وہ وقت یاد آتا ہے تو ایسا لگتا ہے جیسے میرے اس مصنوعی ہاتھ میں اذیت کی لہریں ڑ رہی ہیں۔ شاید وہ ہاتھ اب بھی کسی غیر مرئی رابطے کے ذریعے پنی یاد دلاتا ہے جو اب اس بازو کے ساتھ نہیں ہے" وہ بغور اپنے ستانہ پوش مصنوعی ہاتھ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "وہ شاید میرے لئے بیک قت خوش قسمتی اور بدقسمتی کا لمحہ تھا۔ بدقسمتی اس لئے کہ مجھے پنے دائیں ہاتھ سے 'نہایت اذیت ناک انداز میں محروم ہونا پڑا۔ وش قسمتی اس لئے کہ یہ جو تھوڑی بہت عزت اور خوش حالی میری زندگی میں آئی ہے' یہ اس واقعے کے بعد ہی رفتہ رفتہ آئی ہے۔ فیظ صاحب مہربان ہوئے تو ان کے وسیلے سے اللہ نے زندگی کی ساری آسائشیں دے دیں۔ بچے بھی سیٹ ہوگئے۔ حتیٰ کہ شکیلہ جیسی بیوی بھی مل گئی۔"

لسی کا عظیم الشان گلاس میز پر رکھ کر وہ ٹشو پیپر سے ہونٹ صاف کرنے کے بعد بولا "ان دنوں حفیظ صاحب منسٹر نہیں تھے۔ ی منسٹری میں انڈر سیکریٹری تھے۔ منسٹر ہمیشہ ڈائرکٹ آتا ہے۔ وہ سلے منسٹر ہیں جو اسی وزارت سے' نچلے عہدے سے لئے گئے۔ گویا صحیح معنوں میں "ٹیکنوکریٹ" ہیں۔ جس روز کا میں ذکر کررہا ہوں س روز میں انہیں ایک ریسٹ ہاؤس میں پہنچا کر آیا تھا۔ اس وقت گارڈ کی ڈیوٹی بدل چکی تھی۔ اس لئے میں گھر واپس جارہا تھا۔ سرکاری گاڑی میں تھا۔ حفیظ صاحب کے قبضے میں چوں کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی اہم فائل رہتی تھی یا انہیں کم از کم یہ علم ضرور ہوتا تھا کہ فلاں فائل کہاں ہے۔ اس لئے انہیں ہر وقت گارڈز کی خدمات حاصل رہتی تھیں۔ انہوں نے شاید مجھ سے باتوں باتوں میں ذکر کیا تھا کہ ریسٹ ہاؤس سے وہ کہاں جائیں گے لیکن میں نے اس وقت توجہ سے سنا نہیں تھا کیوں کہ انہیں ریسٹ ہاؤس پہنچانے کے بعد میری ڈیوٹی ختم ہورہی تھی۔ میرے حق میں' اور ان کے حق میں بھی یہ اچھا ہی ہوا کہ میں نے ان کی بات توجہ سے نہیں سنی تھی۔"

اس نے جگ سے تھوڑی سی لسی گلاس میں انڈیلی۔ چائے کی طرح اس کی چسکیاں لیتے ہوئے بولا "ریسٹ ہاؤس سے واپسی پر چند آدمیوں نے مجھے دھوکے سے بے قابو کرکے اغوا کرلیا۔ آنکھوں پر پٹی باندھ کر وہ مجھے نہ جانے کہاں لے گئے۔ جہاں میری آنکھوں سے پٹی کھولی گئی وہ ایک بہت بڑا کچن تھا' جیسے عام طور پر ہوٹلوں وغیرہ کے ہوتے ہیں۔ میرے پاؤں انہوں نے باندھ دیئے تھے۔ ہاتھ البتہ کھلے ہوئے تھے۔ حفیظ صاحب اس روز دفتر سے اپنے بریف کیس میں کوئی فائل لے کر چلے تھے لیکن مجھے ظاہر ہے اس کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا۔ باڈی گارڈز کو بھلا ایسی چیزوں کا کہاں پتا ہوتا ہے۔ لیکن انہیں شاید کہیں سے کوئی غلط اطلاع ملی تھی یا کیا بات تھی۔ بہرحال انہوں نے مجھ سے پوچھنا شروع کردیا کہ حفیظ صاحب وہ فائل لے کر کہاں گئے ہیں۔ میں نے ان کے کسی بھی سوال کا جواب دینے سے انکار کردیا۔ انہوں نے میرا دایاں ہاتھ ٹھوس لکڑی کے ایک کاؤنٹر پر رکھا اور گوشت کاٹنے والا ایک بھاری چاپڑ اٹھا کر چوڑے رخ سے اس پر مارا۔ میں نے اپنے ہاتھ کی ہڈیاں ٹوٹنے کی آواز سنی۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر گویا میرے چہرے پر کوئی ردعمل تلاش کرنے لگا۔ میں خاموش بیٹھا ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بولا "میں نے بہت چیخیں ماریں لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہاں دور دور تک میری آواز سننے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ چاپڑ کا ایک وار کرکے میری ہڈیوں کو مزید چورا بناتے پھر پوچھتے "حفیظ صاحب اس وقت کہاں ہیں؟" میں اپنے ہاتھ کا ملغوبہ بنتے دیکھ رہا تھا اور چیخیں مار رہا تھا۔ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح ڈکرا رہا تھا لیکن وہ گویا میری آوازیں سن ہی نہیں رہے تھے۔ انہیں صرف اپنے سوال کے جواب سے غرض تھی۔ بار بار وہ اپنا سوال دہرائے جارہے تھے۔ ہاتھ کا بالکل ملغوبہ بن گیا تو وہ اس سے ذرا اوپر کلائی کی طرف آگئے۔ سچی بات ہے ..... میں آپ سے حقیقت نہیں چھپاؤں گا ..... اذیت کی شدت کے باوجود میں بے ہوش بھی نہیں ہورہا تھا ...... اور اذیت میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ آخر کار میں نے انہیں بتادیا کہ میں نے کافی دیر پہلے حفیظ صاحب کو ریسٹ ہاؤس میں چھوڑا تھا۔ آج سوچتا ہوں تو شکر ادا کرتا ہوں کہ میں نے اشد مجبور ہوکر یہ بات بتا تو دی تھی مگر یہ جواب ان کے کسی کام کا نہیں تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں وہ دیکھ چکے تھے۔ حفیظ صاحب وہاں نہیں تھے۔ وہاں سے وہ کہیں اور روانہ ہوچکے تھے۔ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں گئے تھے۔ مجھے اغوا کرنے والوں کو یقین تھا کہ مجھے ان کے پروگرام کا علم ہے۔ مجھے یاد تھا' انہوں نے مجھے بتایا تو تھا کہ ریسٹ ہاؤس سے وہ دوسرے باڈی گارڈ اور دوسرے ڈرائیور کے ساتھ کہیں جائیں گے لیکن میں نے ان کی بات زیادہ توجہ سے نہیں سنی تھی۔ میرا ذہن کہیں اور پھنسا ہوا تھا۔ جگہ کا نام مجھے یاد

نہیں رہا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا۔ میں لمبے چوڑے دعوے کرنا نہیں کرتا۔ اگر مجھے یاد ہوتا تو کوئی بعید نہیں کہ اس اذیت کی ند نہ لا کر میں بتا ہی دیتا۔ انسان بہرحال انسان ہی ہوتا ہے۔ لیکن بس قدرت کو اس بہانے مجھے عزت دلانا مقصود تھا۔ میں نے ند میں حفیظ صاحب کو بھی سچ بتادیا تھا کہ وہ میری قوت برداشت کا کمال نہیں تھا جو میں نے زبان بند رکھی۔ بلکہ مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔

اس کے باوجود حفیظ صاحب نے اسے میری قربانی ہی سمجھا۔ یہ ان کی انسان نوازی تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ ان کے پاس اسلحے کی ترسیل سے متعلق ایک بہت اہم فائل تھی جو اگر کسی کے ہاتھ لگ جاتی تو ہمارے ملک کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا۔ اس وقت موقع بھی بہت نازک تھا' بہرحال میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میری ذرا سی قربانی سے ملک ایک بڑے نقصان سے بچ گیا۔ اس کے بعد حفیظ صاحب کے لئے حفاظتی انتظامات بہت بڑھا دیے گئے تھے اور فائلوں کی نقل و حمل میں بھی خصوصی احتیاطی تدابیر اختیار کی جانے لگی تھیں۔"

نذیر خان ایک بار پھر ٹشو پیپر سے ہونٹ اور مونچھیں صاف کرنے لگا تو میں نے پوچھا "اغوا کرنے والوں نے آپ کی جان کیسے چھوڑی تھی؟"

"انہوں نے رفتہ رفتہ صرف میرا ہاتھ ہی نہیں بلکہ کلائی کا کچھ حصہ بھی کچل ڈالا تھا" نذیر خان مزید بتانے لگا "پھر انہوں نے چاپڑ سیدھا کرکے دھار کی طرف سے اس کچلے ہوئے ہاتھ اور کلائی پر باقاعدہ ترتیب سے کٹ لگانے شروع کئے۔ بالکل اسی طرح جیسے قصاب پسندے بنانے کے لئے پہلے گوشت کو چپٹا کرتا ہے پھر اس پر آڑے ترچھے کٹ لگاتا ہے۔ میرے ہاتھ اور کلائی کا گوشت تو خیر چپٹا نہیں ہوا تھا' بالکل ملغوبہ بن چکا تھا۔ ہڈیوں تک کا چورا بن چکا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے باوجود مجھے کٹ لگائے جانے کی تکلیف بھی اسی شدت سے محسوس ہورہی تھی جس طرح صحیح سلامت ہاتھ پر ہوسکتی تھی۔ اس بازو سے خون بھی بھل بھل کرکے بہہ رہا تھا۔

آخر کار قدرت کو مجھ پر رحم آیا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ میری حالت اس وقت ویسے بھی قریب المرگ شخص جیسی ہی تھی۔ اس کے علاوہ جس رفتار سے میرے بازو سے خون بہہ رہا تھا اس کے پیش نظر شاید انہوں نے سوچا ہو کہ زیادہ خون بہہ جانے کے باعث آخر کار مجھے مرہی جانا ہے چنانچہ وہ مجھے ایک سڑک کی گرین بیلٹ پر جنگلے کی اوٹ میں پھینک گئے۔ مجھے بعد میں بتایا گیا کہ سڑک بالکل سنسان تھی۔ یہ صرف میری خوش قسمتی تھی کہ گھوڑوں پر گشت کرتے ہوئے دو سپاہیوں کی نظر مجھ پر پڑگئی۔ اس سے بھی زیادہ خوش قسمتی یہ تھی کہ ان میں سے ایک سپاہی مجھے پہچانتا تھا اس لئے اس نے مجھے اٹھا کر اسپتال پہنچانے میں کچھ زیادہ مستعدی دکھادی ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ دونوں صلاح مشورے میں مصروف رہتے اور میں اس دنیا سے رخصت ہوجاتا۔ کیوں کہ اسپتال والوں نے بتایا تھا' اگر مجھے وہاں پہنچنے میں مزید چند منٹ کی تاخیر ہوجاتی تو میرا بچنا مشکل تھا۔

بس اس واقعے کے بعد سے ہی حفیظ صاحب سے بہت ہی قریبی تعلقات چلے آرہے ہیں۔ یہ ان کا ظرف اور وضع داری ہے کہ وزیر خارجہ بننے کے بعد بھی انہوں نے ان تعلقات میں فرق نہیں آنے دیا۔ انہوں نے ہی مجھے اپنے ساتھ امریکا لے جاکر یہ مصنوعی ہاتھ لگوایا۔ انہوں نے ہی مجھے ایسی نوکری دلائی جس کا میں کبھی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ سب سے بڑھ کر میرے لئے وہ عزت و اہمیت ہے جو وہ مجھ جیسے حقیر آدمی کو دیتے ہیں۔ کوئی چیز اس عزت و اہمیت کی متبادل نہیں ہوسکتی۔ مجھے اپنے ہاتھ سے ضرور "ہاتھ دھونا" پڑا لیکن انہوں نے مجھے یہ صدمہ اور محرومی بھلادی۔"

"آپ نے ان لوگوں کی شکلیں دیکھی تھیں جنہوں نے آپ کو اغواء کیا تھا" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ ان میں سے تو کسی خبیث نے نقاب تک پہننے کی زحمت نہیں کی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں کسی کا خوف نہیں تھا۔ ان میں سے ایک سفید فام تھا۔ باقی چار دیسی ہی تھے" نذیر خان نے بتایا۔

"سفید فام کس ملک کا باشندہ معلوم ہوتا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں چوہدری صاحب! میں ان لوگوں میں سے ہوں جنہیں سارے سفید فام ہی انگریز معلوم ہوتے ہیں۔ آپس میں وہ سارے ہی انگریزی میں بات کررہے تھے۔ مجھ سے اردو میں بات کرتے تھے۔ سفید فام نے تو مجھ سے کوئی بات ہی نہیں کی۔ وہ جو بھی بات کرنا چاہتا تھا' مقامی لوگوں سے انگریزی میں کرتا تھا۔ وہ آگے مجھ سے اردو میں کرتے تھے۔ حالاں کہ مجھے سفید فام کی زبانی' انگریزی ہی میں بات سمجھ میں آجاتی تھی مگر وہ گویا میرے لئے ترجمہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔"

پھر وہ گویا اس وقت کو یاد کرتے ہوئے جھرجھری سی لے کر بولا "چوہدری صاحب! ایک عجیب سی بات میں نے یہ محسوس کی تھی کہ سفید فام مجھ سے نظر نہیں ملا رہا تھا۔ حالاں کہ میرے لئے باقی لوگوں کی طرح وہ بھی اجنبی تھا۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اسے دیکھا تھا' نہ اس کے بعد وہ زندگی میں کبھی مجھے نظر آیا۔ مگر ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے وہ مجھ سے شرمندہ تھا کہ مجھ پر سختی کی جارہی تھی۔ ساری کارروائی ہمارے دیسی بھائیوں نے انجام دی۔ میرے ہاتھ کا قیمہ انہوں نے ہی بنایا۔ اور بلا ہچکچاہٹ بنایا۔ سفید فام نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ بلکہ ہاتھ کا قیمہ بننے کے دوران تو وہ سر جھکائے کھڑا رہا جیسے اسے افسوس ہورہا ہو کہ بات یہاں تک پہنچ

گئی۔"

"لیکن کارروائی کا انچارج وہی معلوم ہو رہا تھا؟"

"جی ہاں۔ مگر مدعی ست گواہ چست والا معاملہ معلوم ہو رہا تھا۔ جتنی مستعدی سے ہمارے دیسی بھائی کارروائی انجام دے رہے تھے اتنی شاید اسے بھی توقع نہیں تھی۔ میرا خیال ہے مجھے بے ہوشی کی حالت میں پھکوایا بھی شاید سفید فام نے ہی ہو۔ ورنہ اپنے دیسی بھائی تو شاید میرا ایڑی سے چوٹی تک ہی قیمہ بنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ان لوگوں میں سے بھی کوئی زندگی میں دوبارہ مجھے نظر نہیں آیا آج تک۔"

"کیا وہ جگہ .... وہ کچن تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی گئی؟" میں نے پوچھا۔

"کی گئی۔ لیکن میں اس سلسلے میں کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا۔ کیوں کہ مجھے آنکھوں پر پٹی باندھ کر وہاں لے جایا گیا تھا۔ آنکھوں سے پٹی ہٹی تو میں اس بند کچن میں کھڑا تھا۔ وہاں سے پھر مجھے بے ہوشی کی حالت میں ہی نکالا گیا اور جہاں لے جا کر پھینکا گیا وہ جگہ وہاں سے نہ جانے کتنی دور تھی۔ بہرحال مجھے چوں کہ اس پر کسی ہوٹل کے کچن کا گماں گزرا تھا۔ اس لئے مجھے بہت سے ہوٹلوں کے کچن لے جایا گیا مگر ان میں سے کوئی بھی وہ کچن نہیں تھا۔ پھر یہ کوشش ترک کر دی گئی کیوں کہ وہ کسی مکان کا کچن بھی ہو سکتا تھا۔ ماشاء اللہ ہمارے شہر میں ایسی ایسی کوٹھیاں اور بنگلے موجود ہیں جن کے کچن فائیو اسٹار ہوٹلوں کے کچن سے زیادہ بڑے اور عالیشان ہیں۔ محض کچن تلاش کرتے ہوئے کہیں تک پہنچنا بڑا مشکل تھا۔ پھر کچھ عرصے بعد تو معلوم نہیں کیوں' انوسٹی گیشن ہی بند کر دی گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم اس کیس کی فائل کا کیا بنا۔ میں نے کبھی حفیظ صاحب سے پوچھا بھی نہیں۔"

اسی طرح کی باتوں' اور پھر ادھر ادھر کی گپ شپ میں دو گھنٹے گزر ہی گئے۔ اس دوران اس کی بیوی شکیلہ بھی کچھ دیر کمرے میں آکر بیٹھی اور اس سے رسمی سی گفتگو رہی۔ وہ سوچوں میں ڈوبی رہنے والی بڑی گہری سی عورت معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بچے بھی اسکول جاتے وقت مجھ سے مل کر گئے۔ اس کے گھر میں مجھے ایک عجیب سے سکون اور اپنائیت کا احساس ہو رہا تھا۔ اسی لئے اتنا وقت بغیر کسی اضطراب اور احساس زیاں کے گزر گیا۔ آئیڈیل دنیا میں حقیقت کے روپ میں کم ہی نظر آتے ہیں لیکن بہرحال وہ کافی حد تک ایک آئیڈیل گھرانا تھا۔

آخر کار نذیر خان نے خود ہی گھڑی دیکھ کر دوبارہ ٹیلی فون گھمانے شروع کئے۔ کئی نمبروں پر بات کرنے کے بعد وہ فون رکھتے ہوئے بولا "لو جی ..... حفیظ صاحب گورنر ہاؤس پہنچ گئے ہیں۔ چند گھنٹوں کے لئے وہ گورنر صاحب کے مہمان ہیں۔ اپنی ملاقاتیں بھی انہوں نے وہیں رکھ لی ہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہ ہو گورنر صاحب اور حفیظ صاحب میں پرانی شناسائی ہے۔ حفیظ صاحب شاذ و نادر ہی کسی سے بے تکلف ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں سے اگر ہوئے بھی ہیں تو وہ پرانی ہی چلی آ رہی ہے۔ گورنر صاحب گنتی کے انہی چند لوگوں میں سے ایک ہیں۔"

"آپ کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ ہم ان سے ملاقات کے لئے جا سکتے ہیں" میں نے محض تصدیق کی خاطر کہا۔

"جی ہاں۔ گیارہ بجے ہماری ان سے ملاقات طے ہو چکی ہے" نذیر خان نے گھڑی دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "یہ ملاقات کتنی دیر کی ہونی چاہئے' یہ ہماری مرضی پر منحصر ہوگا۔ میری سب سے آخر میں جو بات ہوئی ہے وہ ان کے پی اے نسیم قریشی سے ہوئی ہے۔"

میں سن چکا تھا .... وہ اس سے بڑی بے تکلفی سے بات چیت کر رہا تھا۔ میں نے یوں ہی ذرا معلومات کے لئے پوچھا "کیا منسٹر صاحب کا پی اے بھی سفر میں ان کے ساتھ چلتا ہے؟"

"صرف پی اے ہی نہیں' ان کے اسٹاف کے کئی بنیادی اور خاص خاص لوگ تقریباً ہر سفر میں ان کے ساتھ جاتے ہیں" نذیر خان نے بتایا۔

"اکرام بیگ بھی؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ وہ ان کا سیکیورٹی چیف ہے۔ وہ بھی ضرور جاتا ہے" نذیر خان نے جواب دیا "ویسے تو منسٹر صاحب اندرون ملک یا بیرون ملک جہاں بھی جائیں گے' ان کی سیکیورٹی کی ذمے داری پروٹوکول کے مطابق وہیں کی کسی نہ کسی ایجنسی کی ہوگی۔ لیکن اس ایجنسی کے آدمی کافی حد تک اکرام بیگ ہی کی ماتحتی میں کام کریں گے۔ حتیٰ کہ غیر ممالک میں بھی سیکیورٹی کے انتظامات ان کے اپنے ہوں گے لیکن اکرام بیگ چاہے تو کسی چیز پر اعتراض کر سکتا ہے۔ مناسب جواز پیش کر کے وہ کسی بھی انتظام کو یا کسی بھی فرد کو تبدیل کر سکتا ہے۔ اگر کسی جگہ کے بارے میں وہ سیکیورٹی کے انتظامات کے بارے میں رائے دے کہ وہ ان سے مطمئن نہیں ہے تو منسٹر صاحب وہاں نہیں جائیں گے۔ بہت پرانا آدمی ہے۔ منسٹر صاحب قاعدے قوانین سے قطع نظر بھی اس پر بہت بھروسہ کرتے ہیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا "کیا آپ اسے جانتے ہیں؟"

"ارے نہیں" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر جانتا ہوتا تو آپ کو کیوں زحمت دیتا۔ میں نے کراچی میں اپنی کمپنی کے ریزیڈنٹ ڈائریکٹر شفیع شاہ کی زبانی اس کا نام سنا تھا۔"

"آپ کے ہوٹل میں تقریب سے پہلے کلیئرنس وہی دے گا۔ اچھا آدمی ہے۔ سنٹرل گورنمنٹ کا افسر ہے۔ سی آئی اے سے آیا ہے" پھر اس نے مسکراتے ہوئے وضاحت کی "امریکا والی سی آئی اے نہیں۔ اپنی سی آئی اے۔"

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا "چلیں؟"

"ہاں" وہ اٹھتے ہوئے بولا "وقت تو ابھی کافی ہے لیکن ہم ذرا آرام آرام سے چلیں گے۔ حفیظ صاحب جیسے لوگوں سے ملنے کے

لئے جاتے وقت ویسے بھی پانچ دس منٹ کی گنجائش رکھ کر نکلنا چاہئے۔ وقت کے بڑے پابند ہیں۔ زندگی کا بڑا حصہ دوسرے ملکوں میں ہی گزارا ہے نا۔"

میں اپنی گاڑی میں نذیر خان کو ساتھ لے کر گورنر ہاؤس کی طرف روانہ ہوا۔ تمام تر سست رفتاری کے باوجود ہم چند منٹ پہلے ہی پہنچ گئے۔ پہلے تو گیٹ سے داخل ہوتے ہی ہماری زبردست تلاشی ہوئی۔ گاڑی کو بھی انجن کی نوک سے لے کر پچھلے فینڈر تک اچھی طرح ٹھونک بجا کر دیکھا گیا۔ عین ممکن تھا کہ تلاشی لینے والے ہماری گاڑی کے نیچے بھی گھس جاتے کہ سامنے سے ایک باوردی پولیس آفیسر مسکراتا ہوا آ گیا۔ وہ نذیر خان کو جانتا تھا۔ دونوں گلے ملے۔ گرم جوشی سے ایک دوسرے کی خیر و عافیت دریافت کی اور مجھ سے بھی تعارف ہوا۔ اس دوران تلاشی لینے والوں نے گاڑی کے نیچے گھسنے کا ارادہ شاید ملتوی کر دیا اور ہمیں گاڑی اس حصے میں پارک کرنے کی ہدایت کی جو مہمانوں کی گاڑیوں کے لئے مخصوص تھا' اس دوران داخلی ٹیلی فون وغیرہ پر یہ تصدیق کر لی گئی تھی کہ ہم "بلائے گئے" مہمان ہیں۔ بن بلائے نہیں۔

پولیس آفیسر اور نذیر خان ایک دوسرے کو مختصراً اپنے تازہ ترین حالات سے آگاہ کر چکے تو ہم آگے بڑھے اور کسی پلے گراؤنڈ سے زیادہ طویل و عریض' خوبصورت اور پُر بہار سبزہ زار کے قریب سے گزرتے ہوئے ایک استقبالیہ ہال میں پہنچے۔ یہاں خاصا ہجوم سا تھا۔ بہت سے لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔

ایک میز پر موجود شخص کو نذیر خان نے اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ اس نے اندر کسی سے فون پر بات کی۔ اونچے طرے اور کلاہ والا ایک قد آور جوان جو ملیشیا کے یونیفارم میں تھا' ہمیں ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گیا جہاں ایک بار پھر نئے سرے سے ہماری تلاشی ہوئی۔ حتیٰ کہ دھات کا سراغ دینے والے میٹل ڈیٹیکٹر تک سے ہمیں سراپا چیک کیا گیا۔ جس نے میری جیب میں گاڑی کی چابیوں تک کی موجودگی پر "بیپ بیپ" کر کے شور مچا دیا اور مجھے وہ بھی نکال کر سیکیورٹی والوں کو دکھانا پڑیں۔ مجھے اس حد تک تو نہیں' البتہ کسی نہ کسی حد تک اس تلاشی وغیرہ کے چکر کا پہلے ہی اندیشہ تھا۔ اس لئے میں ہر وقت اپنے ساتھ موجود رہنے والا مشین پسٹل ٹانگ سے بندھا رہنے والا پتلا سا زہریلا خنجر اور دو ایک دوسری چھوٹی موٹی چیزیں احتیاطاً گھر ہی چھوڑ آیا تھا۔

میرا اور میرے آدمیوں کا بیشتر آتشیں اسلحہ لائسنس یافتہ تھا لیکن پھر بھی میرے پاس سے جو کچھ نکلتا اسے دیکھ کر تلاشی لینے والوں کو یقیناً تعجب ہوتا کہ .... شہر کے ایک بڑے اور معزز بزنس مین کو آخر خود اس قسم کی چیزیں اٹھائے پھرنے کی کیا ضرورت رہتی تھی؟ زیادہ ہی ضروری تھا تو میں اپنے لئے گارڈز وغیرہ رکھ سکتا تھا۔ اب ظاہر ہے ان لوگوں کے سامنے میں اپنے معاملات کی وضاحت تو نہیں کر سکتا تھا۔

اسی تنگ سے کمرے سے ہمیں راہداری کے ذریعے ایک گارڈ ہی کی رہنمائی میں ایک طویل و عریض' صاف ستھرے اور آراستہ و پیراستہ کمرے میں بھیج دیا گیا۔ اس کی آرائش ایک شاندار ڈرائنگ روم کے طرز کی تھی۔ سیاہ شیروانی اور سفید شلوار میں ملبوس ایک ادھیڑ عمر شخص نے اس کمرے میں ہمارا استقبال کیا۔ وہ بھی نذیر خان سے بہت گرم جوشی سے ملا۔ نذیر خان نے اس سے میرا تعارف کرایا۔ وہ منسٹر صاحب کا پی اے نسیم قریشی تھا۔

اس نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا کہ ہم کس سلسلے میں آئے ہیں۔ بس ہمیں صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خوش خلقی سے

بولا "آپ کو صرف تین چار منٹ انتظار کی زحمت اٹھانا پڑے گی۔ منسٹر صاحب تشریف لا رہے ہیں" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

ہم بیٹھ گئے۔ مجھے منسٹر صاحب سے وقت کی پابندی کی اتنی امید نہیں تھی لیکن نذیر خان اور نسیم قریشی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ ٹھیک تین منٹ بعد کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا اور دھیمی سی آواز میں "السلام علیکم" کہتے ہوئے منسٹر صاحب اندر آ گئے۔ ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ منسٹر صاحب نے پہلے نذیر خان کا مصنوعی اور دستانہ پوش ہاتھ تھام کر خاصی گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سیاہ نائیلون کے دستانے میں چھپے ہوئے، پلاسٹک کے اس ہاتھ میں بھی خلوص کی حرارت محسوس کر رہے ہوں۔

خلوص کی حرارت اگر نذیر خان کے بے جان مصنوعی ہاتھ میں نہیں تھی تو اس کی آنکھوں میں ضرور تھی۔ بلکہ اس کی آنکھوں میں تو خلوص کا ایک سمندر موجزن تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ منسٹر صاحب کے سامنے شکرگزاری کے اظہار کے لئے کیا کرے۔

آخر کار اس نے حفیظ صاحب سے میرا تعارف کرایا۔ میری کاروباری حیثیت اور پوزیشن وغیرہ بتانے کے بعد وہ بولا "سر! یہ میرے بڑے پرانے دوست اور مہربان ہیں۔ ان سے کاروباری تعلق بھی ہے..." حالاں کہ نذیر خان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی مگر اس نے مجھے پرانا دوست اور مہربان قرار دے دیا تھا۔ یہ اس کی مہربانی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ صرف بڑے کاروباری آدمی ہی نہیں، اپنے وطن کے زبردست خیر خواہ اور آپ جیسی شخصیتوں کے بڑے ہی قدردان ہیں جنہوں نے ملک کے لئے بہت سی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ اسی لئے یہ آپ کے بارے میں ایک بری خبر سنتے ہی میرے توسط سے فوراً آپ کے پاس چلے آئے ہیں۔ اگر آپ ان کی بات توجہ سے سن سکیں اور مان سکیں تو بڑی نوازش، بڑا کرم ہو گا۔"

نذیر خان کو ساتھ لانا اچھا ہی رہا تھا۔ میں شاید ایسے لجاجت بھرے اور ڈپلومیٹک انداز میں گفتگو نہ کر پاتا۔ منسٹر صاحب ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ان کی تصویریں بارہا دیکھی تھیں۔ دو ایک بار ٹی وی پر بھی دیکھا تھا لیکن وہ اپنی تصویروں کی نسبت بہتر شخصیت کے مالک تھے۔ وہ سادہ مگر نفیس سی شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھے۔ ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔

وہ یقیناً ساٹھ کی عمر کو پہنچ رہے ہوں گے مگر صحت نہایت شاندار تھی۔ سرخ و سپید رنگت، چہرہ شکنوں سے بے نیاز، کمر سیدھی، کندھے چوڑے اور آنکھیں بے پناہ چمکیلی تھیں۔ چہرے پر ہلکی سی نخوت بھی تھی۔ ان کے خدوخال سے جاگیردارانہ سا جلال جھلکتا تھا۔ حالاں کہ میری معلومات کے مطابق ان کا خاندانی پس منظر جاگیردارانہ نہیں تھا۔ ان کے ہونٹوں پر نہایت ہی مدھم اور پتلی سی مسکراہٹ تھی۔ بلکہ میری طرف دیکھتے ہوئے تو یہ مسکراہٹ بھی معدوم ہو گئی۔ مجھے ان کے چہرے مہرے سے قدرے سرد مہری کا احساس ہوا۔ شاید وہ اجنبیوں سے اسی طرح ملتے تھے۔

انہوں نے ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا اور پوچھا کہ ہم کیا پئیں گے لیکن ایک تو میں اور نذیر خان گھر سے ہی ناشتے کے نام پر بہت کچھ ٹھونس کر گھر سے نکلے تھے، دوسرے ہمیں معلوم تھا کہ منسٹر صاحب کی دعوت صرف رسمی تھی۔ ان کا وقت اتنا قیمتی تھا کہ اس قسم کی رسمیات یا تکلفات میں ضائع کرنے کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ ان کے ساتھ تو اگر کسی کو واقعی چائے پینا ہوتی یا کھانا کھانا ہوتا تو اسے پہلے سے باقاعدہ شیڈول میں رکھنا پڑتا تھا۔ چنانچہ ہم نے نہایت مودبانہ انداز میں انکار کر دیا۔

نذیر خان کے کہنے پر میں نے اپنی رام کہانی شروع کی۔ ریڈ ڈاٹ اور ہنی کی جگہ مجھے اس کہانی میں "کچھ نامعلوم خطرناک لوگ" اور "معتبر ذرائع" وغیرہ جیسے الفاظ شامل کرنا پڑے... فی الحال کسی سرکاری شخصیت کے سامنے ان دونوں کا ذکر کرنا میری نظر میں خلاف مصلحت تھا۔

اس دوران منسٹر صاحب ایک ٹک میری طرف دیکھتے رہے۔ وہ آنکھ بہت کم جھپکتے تھے۔ اس انداز اور اپنی آنکھوں کی مقناطیسی چمک کی بدولت وہ شاید کمزور اعصاب کے لوگوں کو نروس کر دیتے ہوں۔ ان کی لائن ڈپلومیٹک تھی۔ انہیں دن رات جھوٹ سے واسطہ پڑتا تھا۔ اخبارات میں بیانات جاری کرنے کے لئے انہیں خواہ دوسرے کے دل کی بات کتنی پڑتی ہو، خواہ سچ پر کتنے ہی جھوٹ کا ملمع چڑھانا پڑتا ہو لیکن پس پردہ شاید وہ اپنی ان نظروں کے ذریعے سچ تلاش کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

انہوں نے خاموشی سے میری پوری بات سنی۔ اس دوران ایک بھی سوال نہیں کیا۔ وقفے وقفے سے سگار کے کش لیتے رہے۔ میں تمباکو نوش نہیں تھا لیکن خوشبو پہچانتا تھا۔ وہ ہوانا کا سگار پی رہے تھے۔ وہ اپنے تاثرات پوری طرح چھپائے رکھنے پر قادر تھے۔ اپنے قتل کی سازش کا سن کر انہوں نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔ ان کی آنکھوں سے یہ اندازہ لگانا بھی مشکل تھا کہ وہ میری بات پر یقین کر رہے تھے یا مجھے جھوٹا سمجھ رہے تھے۔

میرے خاموش ہونے پر وہ بولے "مسٹر چوہدری! آپ کی بات پر کوئی تبصرہ کرنے سے پہلے میں یہ جاننا چاہوں گا کہ آپ نے جن "نامعلوم خطرناک لوگوں" کا ذکر کیا ہے وہ کون ہیں؟ دوسرے آپ کو خط لکھ کر اطلاع دینے والا کون ہے؟ ہمیں دیکھنا پڑے گا کہ خبر کا ذریعہ خود کتنا قابل اعتبار ہے۔"

"سر! میں نے نامعلوم خطرناک لوگوں کا صیغہ اسی لئے استعمال کیا ہے کہ میں ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔ خبر کے ذریعے کے بارے میں بھی میں صرف آپ کو اپنی ذاتی ضمانت ہی دے سکتا ہوں کہ وہ ایک قابل اعتبار شخصیت ہے اور جہاں بیٹھ کر اس نے یہ اطلاع بھجوائی ہے وہاں سے آنے والی خبر غلط نہیں ہو سکتی۔ میں اس سلسلے میں زیادہ تفصیل آپ کو اس لئے بھی نہیں بتا سکتا کہ اس صورت میں مجھے خود اپنی جان کا خطرہ ہے" میں نے ملائمت سے کہا۔

"وہ کیوں؟" انہوں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"سر! میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ آپ کے توسط سے ان لوگوں کے بارے میں کسی سرکاری ایجنسی کا حرکت میں آ جانا میرے لئے ان لوگوں کے غیظ و غضب کا باعث بن سکتا ہے۔ ابھی تک میرے بارے میں ان کا رویہ خوف ناک نہیں رہا ہے۔ شاید وہ آس لگائے بیٹھے ہیں کہ کسی مرحلے پر کبھی مجھے استعمال کریں گے لیکن اب اگر ان پر یہ ظاہر ہو گیا کہ میں ان کے بارے میں کوئی کہانی لے کر آپ کے پاس آیا تھا اور اس کے بعد سرکاری ایجنسیاں حرکت میں آ گئی تھیں تو اس کا نتیجہ خوف ناک ردعمل کی صورت میں نکل سکتا ہے۔"

"مسٹر چوہدری! آپ کی آمد کا مقصد کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے آپ میری حفاظت کے سلسلے میں.... اور مجھے اس سازش سے محفوظ رکھنے کے لئے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن اگر آپ خود ہی اتنا ڈرتے ہیں تو آپ میرے لئے کیا کر سکتے ہیں؟"

"میں ڈرتا نہیں ہوں سر!" میں نے بدستور ملائمت سے کہا "بلکہ میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ مجھے سیکیورٹی کے سرکاری نظام اور ایجنسیوں کے طریقہ کار پر زیادہ بھروسہ نہیں ہے۔ یہ نظام آپ جیسی سرکاری شخصیتوں اور کچھ مخصوص خطوط پر کام کرنے والوں کو تو سوٹ کر سکتا ہے لیکن ایک عام شہری کو، مجھ جیسے شخص کو سوٹ نہیں کر سکتا۔ بعض معاملات بہت ہی باریک بینی، بہت ہی نفاست و نزاکت اور بہت ہی نرمی سے ہینڈل کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں کوئی بھی روایتی طریقہ، پکڑ دھکڑ یا جلد بازی بہت سے بے گناہ انسانوں کی ہلاکت اور تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ اس لئے فی الحال میں ان معاملات میں سرکاری مداخلت نہیں چاہتا۔ البتہ جہاں میں سمجھوں گا کہ معاملہ میرے وسائل اور اختیارات سے باہر ہو گیا ہے، یا جب میں محسوس کروں گا کہ اب اسے سرکاری وسائل سے ہی ہینڈل کرنا زیادہ بہتر رہے گا تو میں ضرور آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔"

"بہت خوب!" منسٹر صاحب نے کہا۔ مگر اس لہجے میں تحسین والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ سگار کا گہرا کش لیتے ہوئے پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے ابھی تک ان سے نظر نہیں چرائی تھی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کی مثال کسی بھری پُری عمارت میں نصب کئے گئے ایسے بم کی سی ہے جس کی ساخت کے بارے میں بم ڈسپوزل اسکواڈ بھی کچھ نہیں جانتا۔ اس لئے کوئی ذرا سی بھی غلط حرکت عمارت کو اور لوگوں کو بچانے کے بجائے ان کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔ بم کو ناکارہ بنانے سے پہلے بم کی ساخت کو سمجھنا زیادہ ضروری ہے۔"

"اور آپ کے خیال میں سرکاری ایجنسیاں یہ کام نہیں کر سکتیں" انہوں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میں ان کے بارے میں حسن ظن میں مبتلا رہنا بہتر نہیں سمجھتا" میں نے ڈپلومیٹک انداز میں جواب دیا۔

"شاید اس لئے کہ ایک عام آدمی کو سرکاری ایجنسیوں کی طاقت، پھیلاؤ اور رسائی کا اندازہ نہیں ہوتا۔ خواہ وہ شخص بہت بڑا بزنس مین یا بہت ہی باخبر آدمی کیوں نہ ہو" ان کے لہجے میں ہلکی سی سرد مہری در آئی "مسٹر چوہدری! آپ کو تو شاید معلوم بھی نہ ہو کہ ہمارے ملک میں کتنے قسم کی خفیہ ایجنسیاں کام کر رہی ہیں۔"

"سر! ہو سکتا ہے اس معاملے میں میری معلومات ناقص ہوں۔ میں ایک عام آدمی ہوں اور عام آدمی کے کسی چیز کو ناپنے کے فارمولے بھی عام سے ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک عام آدمی شربت تیار کرنے کے لئے پانی میں میٹھا ڈالتا ہے تو اسے چکھ کر اندازہ لگاتا ہے کہ شکر درست مقدار میں ڈالی جا چکی ہے یا نہیں۔ عام آدمی کو اس سے غرض نہیں ہے کہ ہمارے ملک میں کتنی ایجنسیاں کام کر رہی ہیں، ان میں کتنی تعداد میں لوگ ملازم ہیں، ان کے کتنے دفاتر اور کتنی شان و شوکت ہے۔ وہ تو آخر میں صرف نتیجہ دیکھتا ہے کہ ان ایجنسیوں کی بدولت اس کے ملک میں کتنی سازشیں ناکام ہوئیں، کتنے خطرناک مجرموں کا سراغ لگا، کتنی تعداد میں ممکنہ اور متوقع حادثات کو روکا گیا، تخریب کاری کے کتنے منصوبوں کو ناکام بنایا گیا۔ میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ اس ضمن میں عام آدمی کا تجربہ کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے" میں صاف گوئی سے کام لینے پر تل گیا تھا۔

میں نذیر خان کی طرف دیکھ نہیں رہا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ مضطرب ہو چکا تھا۔ اسے منسٹر صاحب سے اپنے قریبی تعلقات کا مان تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ان کے سامنے صاف گوئی یا تلخ نوائی کا متحمل وہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ میری منسٹروں سے زیادہ میل ملاقات نہیں تھی، زیادہ ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ اور میں میل ملاقات بلا ضرورت رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے ان کے پاس جانے والے لوگوں کی گفتگو سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ صرف اپنا کام نکالنے ان کے پاس جاتے تھے، ان کی خوشامد کرتے تھے، انہیں مس گائیڈ کرتے تھے، ان کے کارناموں پر داد و تحسین کے ڈونگرے برساتے تھے جو انہوں نے انجام نہیں دیے ہوتے تھے۔ منسٹر خواہ کسی بھی شعبے کا ہوتا، خواہ لوگوں کو اس سے کوئی قابل ذکر کام پڑتا یا نہ پڑتا لیکن وہ صرف واہ واہ سننے کا عادی ہوتا تھا۔ انہیں ایسا بنانے میں ہمارے نظام کا بھی قصور تھا، بکاؤ سیاست کا بھی قصور تھا.... اور نہ جانے کس کس کا قصور تھا۔ لیکن میں سمجھتا تھا کہ اس میں لوگوں کا بھی قصور تھا۔ لوگوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے قومی مفادات کو نظر انداز کر دیا تھا۔ ہر کسی نے

خوشامد کرنے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے میں دوسرے کو مات دینے کی ٹھانی ہوئی تھی۔

منسٹر صاحب کے چہرے پر صرف سرد مہری تھی۔ ناگواری یا کسی قسم کی ہلچل نہیں تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ہمارے ملک میں نہ جانے کیسی کیسی قوتیں سرگرم عمل رہتی ہیں' زیرِ زمین نہ جانے کیسے کیسے منصوبے بنتے رہتے ہیں۔ سیاست' سماجی بہبود' سفارتی مشن' غیر ملکی فلاحی ادارے.... ان سب چیزوں کی آڑ میں نہ جانے کون کون سی قوتیں کیا کچھ کرتی رہتی ہیں۔ ہمیں صرف اس وقت پتا چلتا ہے جب کوئی بہت بڑا سانحہ رونما ہو جاتا ہے یا کوئی برائی سیلاب بن چکی ہوتی ہے' ہمارے قابو سے باہر نکل چکی ہوتی ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس دوران ہماری ایجنسیاں کیا کرتی رہتی ہیں" میں کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ سخت الفاظ استعمال نہ کروں۔ میری یہ ان سے پہلی ملاقات تھی۔ ویسے بھی ان کا محکمہ ایسا تھا کہ ان پر زیادہ دل کا غبار نہیں نکالا جا سکتا تھا۔ آج میں یہ بھی سوچتا ہوں کہ میں تو اس وقت کے حالات پر ہی رنجیدہ خاطر رہتا تھا' جذباتی ہو جاتا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ میری گناہ گار آنکھوں کو یہاں کیا کیا سانحے' کیا کیا المیے' کیا کیا سازشیں اور کیا کیا شیطانی تماشے دیکھنا پڑیں گے۔

منسٹر صاحب نے گہری سانس لی اور تحمل سے بولے "یہ بڑی لمبی بحث ہے مسٹر چوہدری! ایجنسیوں کے اپنے طور طریقے ہیں اور عام آدمی کا سوچنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ اس معاملے میں ہمیں ایک دوسرے کے نقطۂ نظر اور حالات سے آگاہ ہونے کے لئے بہت زیادہ وقت چاہئے۔ اس لئے میں اس بحث میں نہیں پڑوں گا۔ صرف اتنا کہوں گا کہ منفی اور سازشی قوتیں ہر دور میں' ہر ملک میں سرگرم عمل رہتی ہیں۔ کسی بھی ملک کے خواہ کتنے بھی وسائل ہوں وہ اپنے آپ کو ہر سازش' ہر برائی سے بالکل پاک صاف نہیں کر سکتا۔ ایجنسیاں اپنی سی کوشش کرتی رہتی ہیں۔ عام لوگوں کو ان کا علم نہیں ہونے پاتا۔ ہمارے ملک کی کسی بھی چیز کا ترقی یافتہ ملکوں سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہی معاملہ ایجنسیوں کا بھی ہے۔ ہماری ایجنسیوں کی کارکردگی دوسرے ملکوں کی ایجنسیوں جیسی تو نہیں ہو سکتی۔ اور مجھے اعتراف ہے کہ ہمارے ہاں کام چوری اور کرپشن بھی زیادہ ہے۔ لیکن ایجنسیاں بہرحال ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہیں بیٹھی رہتیں۔ اگر وہ بالکل ہی کچھ نہ کرتی ہوں تو یہاں غدر مچ جائے۔"

میں خاموش رہا۔ یہ واقعی بہت لمبی بحث تھی۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولے "بہرحال یہ ویسے بھی ذرا الگ موضوع ہے... ہمارا اصل موضوع وہ کہانی ہے جو آپ میرے پاس لے کر آئے ہیں۔ یہ ایک جاسوسی کہانی ہے۔ ایسا ئی اسٹوری معلوم ہوتی ہے۔ مجھے حیرت ہے کہ اب ہمارا اونچا طبقہ بھی اس قسم کی کہانیوں پر یقین رکھنے لگا ہے۔ یہ باتیں ناولوں' کہانیوں اور فلموں وغیرہ میں اچھی لگتی ہیں۔"

ایک لمحے کے لئے مجھے اپنی کنپٹیوں کے پاس ہلکی سی تپش کا احساس ہوا۔ شاید منسٹر صاحب مجھے بے وقوف سمجھ رہے تھے جو میں اس قسم کی ایک "کہانی" لے کر ان کے پاس چلا آیا تھا۔ ایک بار تو میرا جی چاہا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دوں۔ ان کے قتل کی وجہ سے میرے بزنس یا ہوٹل پر جو اثر پڑتا' وہ میں بھگت لیتا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اپنی کھوپڑی ٹھنڈی رکھنی چاہئے۔ ہمارے ملک کے مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ جب کوئی ذرا بھی اونچے سنگھاسن پر بیٹھتا تھا تو وہ گویا ایک خول میں بند ہو جاتا تھا۔ ارد گرد کا منظر اس کی نظر سے اوجھل ہو جاتا تھا۔ وہ حقائق کی دنیا سے کٹ جاتا تھا۔ اس کے خیال میں حقائق صرف وہ ہوتے تھے جو اسے اس کے مخصوص ذرائع سے بتائے جاتے تھے یا جو کچھ وہ خود محسوس کرتا تھا۔ دوسرے جو کچھ محسوس کرتے تھے یا اسے بتانے کی کوشش کرتے تھے' وہ اس کی نظر میں حقائق نہیں رہتے تھے۔

منسٹر صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے "حقیقی زندگی میں اس قسم کی بڑی سازشیں کرنے والوں کے لئے کسی کو مروانا اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہوتا کہ وہ گھما پھرا کر کوئی پُرپیچ اور لمبا راستہ اختیار کریں۔ وہ بس سیدھے سادے طریقے سے کرائے کے قاتلوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور آدمی کو مروا دیتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی مناسب موقع کسی نہ کسی قاتل کو مل ہی جاتا ہے۔ بس وہ سامنے آتا ہے اور ٹھاہ سے گولی مار دیتا ہے۔ زیادہ صحیح موقع نہ ملا یا زیادہ پُرتشدد اور ہنگامہ پرور انداز میں کسی کو مارنا ہوا تو کسی مقام پر' کسی گاڑی میں یا کسی عمارت میں بم رکھوا دیا۔ تفتیشی ایجنسیاں بعد میں ٹکریں مارتی رہتی ہیں۔ کبھی وہ سازش کرنے والے اصل لوگوں تک پہنچ نہیں پاتیں۔ اور کبھی سب کچھ سمجھ جانے کے باوجود ذمے داروں پر ہاتھ نہیں ڈال پاتیں۔ بڑے بڑے ملکوں کے صدور اور وزرائے اعظم کو اس انداز میں قتل کیا گیا ہے۔ میں کیا چیز ہوں۔"

میں نے حتی الامکان ملائمت سے کہا "سر! میں جس سازش کی بات کر رہا ہوں' ہم اس کی تمام تفصیلات سے واقف نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے اس میں صرف آپ کو قتل کرنا ہی اصل مقصد نہ ہو۔ شاید یہ کوئی ایک سے زیادہ مقاصد رکھنے والی سازش ہو۔"

"اس نقطۂ نظر سے تو یہ بات اور بھی زیادہ بعید از قیاس نظر آتی ہے" وہ اپنے موقف پر ڈٹے ہوئے تھے "میرے قتل سے زیادہ مقاصد تو کیا' کوئی ایک مقصد بھی پورا نہیں ہو سکتا۔ اگر کوئی ملک میری پالیسیوں کی وجہ سے مجھے قتل کرانا چاہتا ہے تو اس کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ میرے مرنے سے ہمارے ملک کی پالیسیاں بدل نہیں جائیں گی۔ پالیسیاں کسی ملک کی حکومت اجتماعی طور پر بناتی ہے۔ وزیرِ خارجہ کا کام صرف انہیں آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ میں نہیں تو میری جگہ کوئی اور دوسرا آدمی ان پالیسیوں پر عمل درآمد کرانے کے لئے آگے آ جائے گا۔ بات وہیں کی وہیں رہے گی۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے "کوئی اور مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ فی الحال آپ کی کہانی سے صرف ایک ہی مقصد نظر آتا ہے۔ آپ کے ہوٹل' آپ کے کاروبار اور ساکھ کو نقصان پہنچانا اور آپ کے لئے پریشانیاں اور الجھنیں پیدا کرنا۔ جن نامعلوم اور خطرناک لوگوں کی آپ بات کر رہے ہیں اگر وہ واقعی اتنے ہی نامعلوم اور اتنے ہی خطرناک ہوں تو ان کے پاس دوسرے ہزاروں طریقے ہو سکتے ہیں جو زیادہ آسان ہوں گے۔ وہ ہوٹل کو بم سے بھی اڑا سکتے ہیں۔ آپ کو دوسرے کسی چکر میں بھی پھنسا سکتے ہیں۔ مجھے خاص طور پر آپ کے ہوٹل میں قتل کرانا کسی کے لئے بھی کوئی زیادہ فائدہ مند کام نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف ایک سنسنی خیز خبر تو بن سکتی ہے اور اس سے تھوڑی دیر کے لئے سرکاری اور قومی سطح پر خوف و ہراس کی فضا پیدا ہو سکتی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں ہو سکتا۔"

میں نے ماحول کے بوجھل پن کو قدرے کم کرنے کی غرض سے مسکراتے ہوئے کہا "سر! اگر آپ کا وجود یا عدم وجود برابر ہی ہے تو پھر آپ کی سیکیورٹی کا اتنا زبردست اہتمام کیوں کیا جاتا ہے؟ میں نے سنا ہے..... اور نذیر خان نے بھی اس کی تصدیق کی ہے کہ صدر اور وزیرِ اعظم کے بعد سب سے زیادہ سیکیورٹی آپ ہی کی ہوتی ہے۔"

"یہ صرف وقار کی خاطر ہوتی ہے" وہ بلا تامل بولے "وزیرِ خارجہ کسی ملک کی ناک ہوتا ہے۔ کوشش یہی کی جاتی ہے کہ یہ ناک کٹنے نہ پائے۔ وہ پورے ملک کا دفتر معانی و مطالب اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتا ہے۔ اس کی خصوصی دیکھ بھال تو ہونی چاہئے نا۔"

اب ان کے چہرے پر پہلے جیسی سرد مہری نہیں تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا تھا کہ وہ دل ہی دل میں میری بات کو کچھ اہمیت تو دے رہے تھے لیکن بحث و تمحیص کے ذریعے اس مسئلے کو محض اچھی طرح چھان پھٹک لینے کی غرض سے میرے خیال کی تردید کر رہے تھے۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ قدرے ملائمت سے بولے "بڑے ملک..... بڑی طاقتیں..... یا ان کے اشاروں پر کام کرنے والے بہت بڑے بڑے طاقت ور گروہ اور مافیا ٹائپ کی طاقتیں اگر کسی ملک کو سبق دینا چاہتی ہیں یا اسے اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتی ہیں تو اس کے لئے وزیرِ خارجہ کو قتل نہیں کرایا جاتا' سربراہِ مملکت کو قتل کرا دیا جاتا ہے یا کسی اور طریقے سے راستے سے ہٹایا جاتا ہے یا پھر لمبی منصوبہ بندی کے ذریعے اس ملک کو سیاسی و معاشی غلام بنایا جاتا ہے۔ امداد' ٹیکنالوجی اور اس قسم کے دوسرے چکروں کے ذریعے اسے اپنا محتاج' اپنا دست نگر بنا کر ہمیشہ کے لئے ایسی زنجیروں میں جکڑ لیا جاتا ہے کہ وہ کبھی نکلنے نہ پائے۔"

"سر! آپ کی سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ آپ ان معاملات کا مجھ سے بہتر علم رکھتے ہیں لیکن مجھے جو خط موصول ہوا ہے اس میں ایک مقصد کی تو خاصے واضح طور پر نشان دہی کی گئی ہے" میں نے انہیں یاد دلایا "کراچی سے آپ سیدھے مشرقِ وسطیٰ روانہ ہو رہے ہیں۔ مجھے موصول ہونے والے خط کے مطابق مشرقِ وسطیٰ کے ایک ملک کو دوسرا ویت نام بنانے کی تیاریاں کی جا رہی ہیں۔ ایک بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی' کو آرڈی نیٹرز انٹرنیشنل' کا بھی اس سلسلے میں نام آیا ہے....."

حفیظ صاحب کا سگار تقریباً ختم ہو گیا تھا۔ انہوں نے خوب صورت سگار بکس سے ہوانا کا ایک اور سگار نکال کر طلائی لائٹر سے سلگایا۔ میں نے چین اسموکرز تو بہت سے دیکھے تھے لیکن عام طور پر وہ سگریٹ پینے والے ہوتے تھے۔ سگار کا چین اسموکر میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "سر! بے شک میں ایک بزنس مین ہوں لیکن ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کی طاقت اور وسعت کے بارے میں آپ یقیناً مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے۔ مثلاً جنرل موٹرز جتنی بڑی کمپنی ہے' اس کے مقابلے میں اگر پاکستان' سوئٹزرلینڈ اور ساؤتھ افریقہ کے تمام مالی وسائل یکجا کر دیئے جائیں تب بھی وہ اس کے برابر نہیں آ سکتے۔ جب کہ ان میں سے سوئٹزرلینڈ وہ ملک ہے جہاں دنیا بھر کے بڑے بڑے لوگوں' سربراہانِ مملکت' ٹیکس چوروں اور بڑے بڑے اسمگلروں کے جائز و ناجائز ہر طرح کی کمائی جمع ہے۔ اس کے باوجود یہ کئی ملک مل کر بھی مالی اعتبار سے جنرل موٹرز کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح "ڈچ شیل" ایسی کمپنی ہے جو ایران' وینزویلا اور ترکی کے مجموعی وسائل سے زیادہ اثاثے رکھتی ہے۔ "گڈ ایئر ٹائر" نامی کمپنی سعودی عرب سے زیادہ دولتمند ہے۔ اسی طرح کو آرڈی نیٹرز انٹرنیشنل اس قسم کی جناتی کمپنیوں میں تیسرے نمبر پر ہے۔"

منسٹر صاحب کے چہرے پر اب سرد مہری کی جگہ خفیف سی مسکراہٹ نظر آنے لگی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اندر سے ان کا موڈ کافی خوش گوار تھا۔ کیوں کہ وہ اپنے تاثرات چھپائے رکھنے اور اپنی شخصیت کے سامنے ایک غیر مرئی سا پردہ تانے رکھنے کے عادی تھے۔ اس پردے میں سے اگر ذرا سی مسکراہٹ چھن کر باہر آ رہی تھی تو اس کا مطلب تھا کہ اندر مطلع کافی صاف تھا۔

"آپ اچھے بزنس مین ہیں مسٹر چوہدری!" وہ بولے "آپ کی معلومات معقول ہیں۔"

"شکریہ سر!" میں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "سرمایہ جہاں اپنے ساتھ خوش حالی لاتا ہے' بے شمار مسائل حل کرتا ہے' وہاں حد سے زیادہ سرمایہ اپنے ساتھ بے شمار مسائل بھی لاتا ہے۔ اور اس کی ہوس کبھی ختم نہیں ہوتی۔ طلب کے اس سمندر کا کوئی کنارا نہیں ہے۔ بعض جناتی قسم کی کمپنیاں دنیا کی

سیاست پر اثر انداز ہورہی ہیں۔ مختلف مقامات پر اسلحے کی ضرورت پیدا کرتی ہیں پھر اس کی سپلائی کا بندوبست بھی کرتی ہیں۔ ان کے ایجنٹ دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں جو خود کروڑپتی اور ارب پتی ہیں۔ میں اپنے ملکی رازوں میں دخل نہیں رکھتا اور نہ ہی اس موضوع پر آپ کو کریدنے کی کوشش کررہا ہوں لیکن مجھے جس حد تک اشارہ ملا ہے اس حد تک بات ضرور کروں گا۔ میں نے سنا ہے کہ آپ ایک انتہائی اہم مشن پر مشرق وسطیٰ جارہے ہیں۔ آپ ایک ایسا منصوبہ لے کر جارہے ہیں جو مشرق وسطیٰ کے ایک ملک کو دوسرا ویت نام بننے سے بچاسکتا ہے۔ اس طرح تو اسلحے کی کھپت کا ایک بڑا میدان تیار ہونے سے رہ جائے گا سر! اور آپ کو معلوم ہی ہے اسلحے کی تجارت اس وقت دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ منافع بخش صنعت ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کا یہ مشن کسی طاقت کو...... اور اس کی وجہ سے کوآرڈی نیٹرز انٹرنیشنل کو بالکل پسند نہ ہو۔"

یہ بات میں انہیں شروع میں ہی بتاچکا تھا لیکن اس وقت وہ اکھڑے اکھڑے سے تھے اور اب بات ذرا تفصیل سے ہورہی تھی۔ اب وہ ذرا پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "سر! یہ درست ہے کہ ایک وزیر خارجہ راہ سے ہٹ جائے تو ملک کی پالیسیاں تبدیل نہیں ہوجاتیں' پالیسیاں حکومتوں کے ساتھ تبدیل ہوتی ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو حکومتوں کے ساتھ بھی تبدیل نہیں ہوتیں۔ لیکن پھر بھی آپ جیسی شخصیت کے منظر عام سے ہٹنے سے ایک خلا تو پیدا ہوجائے گا جو فوری طور پر پُر نہیں کیا جاسکے گا۔ ممکن ہے یہ منصوبہ جو آپ لے کر جارہے ہیں' صرف آپ کے اپنے ہی ذہن کی تخلیق ہو۔ اسے زیادہ تر آپ نے صرف اپنی ہی کاوشوں سے مکمل کیا ہو۔ اس لئے اس کی باریکیوں کو بھی صرف آپ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر آپ کسی سازش کا نشانہ بن جاتے ہیں تو کم از کم وقتی طور پر تو منصوبہ ملتوی ہوجائے گا۔ بلکہ شاید پھر کبھی اس پر عمل درآمد ہی نہ ہوسکے۔ دونوں صورتوں میں ان نامعلوم طاقتوں کو مشرق وسطیٰ میں اپنا کھیل شروع کرنے کا موقع مل جائے گا۔ جنگ کا عفریت ایک بار بوتل سے باہر آجائے تو پھر اسے قابو میں کرنا کسی کے بس کی بات نہیں رہتی۔"

وہ بدستور خاموش تھے۔ بس سگار کے ہلکے ہلکے کش لئے جارہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "سب کو معلوم ہے کہ بڑی طاقتوں نے تمام چھوٹے اور ترقی پذیر ملکوں کو جاگیر کی طرح آپس میں تقسیم کررکھا ہے۔ یہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ بعض ملک تو علی الاعلان ان کی کالونیاں بنے ہوئے ہیں اور بعض بظاہر بڑے شیر بنے رہتے ہیں لیکن درپردہ وہ بھی ان کے سامنے کھلیاتے رہتے ہیں۔ انہوں نے واضح طور پر ہر خطے' ہر قوم کو دو بلاکوں میں بانٹ لیا ہے تاکہ دنیا ہمیشہ آپس میں دست بہ گریباں رہے' صرف وہ چند ممالک آپس میں کبھی نہ الجھیں' ایک دوسرے کو کچھ نہ کہیں۔ صرف دنیا کو دکھانے کے لئے ذرا ایک دوسرے پر آنکھیں نکالتے رہیں' ایک دوسرے کو گیدڑ بھبکیاں دیتے رہیں لیکن درحقیقت یہ صرف دوسروں کی سرزمین کو میدان کارزار بنائے رکھیں اور دوسری قوموں کے افراد ان کی چھیڑی ہوئی جنگوں کا ایندھن بنتے رہیں۔ اس صورت حال کو اب پرائمری اسکولوں کے بچے بھی سمجھتے ہیں لیکن تمام چھوٹے ملکوں کے بڑے بڑے مدبر بھی مل کر تباہی و بدحالی کے اس گڑھے سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں کرتے۔"

"مجبوریوں کی زنجیریں بہت مضبوط ہیں مسٹر چوہدری!" حفیظ صاحب ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے "چوہے ادھر ادھر بھاگنے کی بہت کوشش کرتے ہیں مگر چوہے دان بڑی خوب صورتی سے تیار کئے گئے ہیں۔ پھر چوہوں کی اپنی نااتفاقیاں بھی ہیں۔ لیڈر شپ کے جھگڑے بھی ہیں۔ کرپشن بھی ہے۔ دولت کے لئے بک جانے والے اور ہر کام کر گزرنے والے بے ضمیر چوہے بھی ہیں جو اپنی ہی قوم' اپنے ہی ملک کی جڑیں کھوکھلی کرتے رہتے ہیں۔ اچھائی کی قوتیں خواہ کتنی ہی کیوں نہ ہوں وہ برائی کی ان تمام قوتوں کو یکدم صاف کرکے اس دنیا کو صاف ستھری' پُرسکون اور آئیڈیل کبھی نہیں بناسکتیں۔ بُری قوتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں' اچھی قوتیں اپنا کام کرتی رہتی ہیں۔ دنیا کا نظام اسی طرح چلتا رہتا ہے۔"

"مجھے آپ کی بات سے اختلاف نہیں ہے" میں نے کہا "میں بھی اچھائی کے ہاتھ مضبوط کرنے کے ارادے سے آیا تھا۔ میرے لئے میرا کاروبار یا ساکھ بھی اتنی اہم نہیں ہے جتنا میری نظر میں آپ کا مشن اہم ہے۔ میں اس مشن کی جزئیات اور تفصیلات سے واقف نہیں' مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ہمارے اور ہمارے برادر ملکوں کے مفاد میں ہے لیکن عین ممکن ہے کہ بظاہر ہمارے ہمدرد نظر آنے والے کسی ملک نے ہی "کوآرڈی نیٹرز انٹرنیشنل" کو تھپکی دی ہو' گرین سگنل دیا ہو کہ حفیظ صاحب کو اس مشن سے روک دیا جائے کیوں کہ آپ کا مشن کامیاب ہونے کی صورت میں اسلحے کی تجارت کے بہت سے پول کھلنے کا بھی اندیشہ ہے۔ ایک ہی ملک بعض اوقات دو مختلف متحارب گروپوں کو اسلحہ سپلائی کررہا ہوتا ہے لیکن دونوں جگہ اس نے مختلف نقابیں پہن رکھی ہوتی ہیں۔ یہ ملٹی نیشنل کمپنیاں ہی ان کی نقابیں ہیں۔"

"کسی حد تک آپ کے تجزیے درست ہیں مسٹر چوہدری!" منسٹر صاحب پہلو بدل کر بولے "اس میں شک نہیں کہ ملٹی نیشنل کمپنیوں کی خوفناک سرگرمیاں اپنے اصل کاروباروں سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ اسلحے کی تجارت میں بعض کمپنیوں کے کردار بھی مجھے علم ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ یہ کمپنیاں بہت سے ملکوں

میں کرپٹ اور ضمیر فروش سیاست دان تیار کرتی ہیں' انہیں پالتی ہیں' مقبول ہونے کے لئے انہیں حکمت عملیاں تیار کرکے دیتی ہیں' انہیں الیکشن لڑواتی ہیں' ان کے لئے ہر طرح کی سرمایہ کاری کرتی ہیں اور بعد میں یہ سب کچھ ان کی قوموں اور ان ملکوں سے مع سود وصول کرتی ہیں......"

منسٹر صاحب اب کچھ کھلنے پر آمادہ نظر آرہے تھے تاہم اب بھی وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر' ایک ایک لفظ کو تولتے ہوئے بڑے محتاط اور مخصوص ڈپلومیٹک انداز میں بول رہے تھے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد انہوں نے سلسلۂ کلام جوڑا "جس قسم کے مشن پر میں جارہا ہوں' مجھے اس سے روکنے کے لئے "کوآرڈی نیٹرز انٹرنیشنل" یا اس کی پشت پناہی کرنے والے ملکوں کے سامنے بہت سے طریقے ہوسکتے تھے۔ ہم پر سیاسی دباؤ ڈالا جاسکتا تھا۔ کسی بھی طریقے سے ہمارے اور ہمارے برادر ملکوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کی جاسکتی تھیں۔ مجھے بہت بھاری رشوت کی پیشکش کی جاسکتی تھی جس کا حساب سن کر میری عمر بھر کی اصول پسندی اور دیانت داری ڈگمگا جاتی...... اور کئی طریقے ہوسکتے تھے۔ لیکن مجھے قتل کرانا ان کے لئے محض دردِ سر ہوگا۔"

"وہ کیوں سر؟ میرے خیال میں تو یہ شارٹ کٹ ہے۔ کیوں کہ ان کے پاس وقت کم ہے' پرسوں تو آپ روانہ ہورہے ہیں" میں نے کہا۔

ان کے ہونٹوں پر مربیانہ سی مسکراہٹ کی رمق نمودار ہوئی۔ "مسٹر چوہدری! مجھے اور آپ کو اس خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہئے کہ اس قسم کی طاقتوں کو ہمارے مشن کا عین وقت پر پتا چلا ہوگا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دنیا کے جاسوسی کے سب سے بڑے اور بہترین ادارے ان کے لئے خدمات انجام دیتے ہیں۔ ہم جیسے ملکوں میں تو کسی منصوبے پر ابھی کاغذی کام شروع ہوتا ہے تو انہیں پتا چل جاتا ہے خواہ ہم کتنی ہی رازداری برت لیں۔ انہیں جو کچھ کرنا ہوتا ہے اس کے لئے وہ بہت پہلے سے کام شروع کرتے ہیں۔ بہت لمبی منصوبہ بندی ہوتی ہے اور وہ بڑے صبر سے نتائج کا انتظار کرتے ہیں۔ اب جیسے یہ مشرق وسطیٰ میں نت نئے ناسور پیدا کرنے یا یہاں ایک نیا ویت نام بنانے کا مسئلہ ہے اس پر بھی بہت پہلے سے کام ہورہا ہے۔ اگر فی الحال مجھ جیسے کچھ لوگوں کی کوششوں سے یا کچھ سربراہان مملکت کی سمجھ داری سے یہ مسئلہ ٹل بھی گیا تب بھی وہ اس منصوبے کو منسوخ نہیں کریں گے۔ خواہ کتنی ہی سست رفتاری سہی' لیکن اس پر کام جاری رہے گا۔ خواہ اس دوران حالات کے مطابق اس کی شکل بدل جائے' اس میں بہت سی تبدیلیاں آجائیں لیکن پانچ سال' دس سال' حتیٰ کہ پندرہ یا بیس سال بعد بھی کسی نہ کسی طرح اس پر عمل ضرور ہوگا۔"

"لیکن وہ بات پھر بھی رہ گئی...... آپ کا قتل بھلا ان کے لئے دردِ سر کیوں ہوگا؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں نے کہا ناکہ وزیر خارجہ ہر ملک کی ناک ہوتا ہے" وہ بولے "اگر مجھے قتل کیا گیا تو اس کی بڑے پیمانے پر نہایت [illegible] قسم کی تفتیش ضروری ہوگی خواہ اس کی تفصیلات اخبارات میں آئیں۔ ہماری ایجنسیاں خواہ کتنی ہی سست' نااہل اور کرپٹ [illegible] جاتی ہوں لیکن وہ اتنی گئی گزری بھی نہیں ہیں کہ وہ کچھ کرتی [illegible] ہوں۔ تفتیش کا کوئی نہ کوئی سرا اس ملٹی نیشنل کمپنی تک ضرور پہنچے گا اور کسی نہ کسی ایجنسی کی رپورٹ میں اس کا نام ضرور آجا[illegible] گا۔ اس بات کو نہ تو کمپنیاں پسند کرتی ہیں اور نہ ہی اس کی [illegible] پناہی کرنے والے ممالک۔ ان کے دھندے خواہ کچھ بھی ہوں [illegible] وہ بہت نیک نام رہتی ہیں۔ اپنی نیک نامی پر وہ کروڑوں ڈالر [illegible] خرچ کرتی ہیں۔ پریس کو خوش رکھنے کے لئے کروڑوں [illegible] اشتہارات دیتی ہیں۔ خود اپنے انہوں نے سیکڑوں اخبارات [illegible] رسائل نکالے ہوئے ہوتے ہیں۔ ٹی وی چینل خریدے ہو[illegible] ہوتے ہیں۔ سیکڑوں رفاہی ٹرسٹ اور ادارے ان کے زیر انتظام کام کرتے ہیں۔ وہ کبھی برداشت نہیں کرسکتیں کہ کسی ملک [illegible] وزیر خارجہ کے قتل کی تفتیشی رپورٹ میں ان کا نام آئے۔ اور [illegible] بھی ایک ایسا وزیر خارجہ جو بہت اہم امن مشن پر جارہا تھا۔"

"سر! میں نے عرض کیا تھا کہ ضروری نہیں آپ کا قتل وا[illegible] قتل نظر آئے۔ آپ کا نظریہ ہے کہ کسی کو قتل کرانے کے [illegible] صرف ڈائرکٹ ایکشن ہوتا ہے۔ یعنی بس نشانہ کرکے گولی ماردی جا[illegible] ہے" میں نے کہا "لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ہر موقعے پر ایسا [illegible] ضروری نہیں ہوتا۔ خدانخواستہ آپ کو ہارٹ اٹیک بھی ہو [illegible] ہے۔"

"میں ہر ماہ باقاعدگی سے اپنا میڈیکل چیک اپ کراتا ہوں [illegible] میرا تازہ ترین میڈیکل چیک اپ پچھلے ہفتے ہی ہوا ہے۔ ڈاکٹر[illegible] نے بتایا ہے کہ میرا دل اتنا ہی صحت مند ہے جتنا کسی بیس سا[illegible] نوجوان کا ہوسکتا ہے" حفیظ صاحب نپی تلی مسکراہٹ کے سا[illegible] بولے۔

"ڈاکٹروں نے آپ کو یہ تو نہیں بتایا ہوگا کہ آپ پر زہر [illegible] اثر نہیں ہوسکتا؟" میں نے سادگی سے کہا۔ سچی بات یہ تھی کہ حفیظ صاحب کے ردعمل نے مجھے حیران کردیا تھا۔ میرا خیال تھا [illegible] انسان جتنے اونچے عہدے پر فائز ہوتا ہے اتنا ہی زیادہ اسے ا[illegible] جان کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ اسے اگر کوئی جھوٹے سے بھی جاکر [illegible] دے کہ اس کے قتل کی سازش ہورہی ہے تو وہ خوف سے اچھل پڑتا ہے' اس کے پیروں تلے سے زمین نکل جاتی ہے اور وہ ا[illegible] حفاظت کے ذمے دار افراد میں ایک ہلچل برپا کردیتا ہے' آسمان [illegible] پر اٹھالیتا ہے۔

لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹا تھا۔ حفیظ صاحب یقین کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھے کہ کوئی انہیں قتل کرنے کی سازش کرسک[illegible]

ہے۔ ان کا سارا زور بیان اور دلیلیں میرے اندیشوں اور میری اطلاعات کو غلط ثابت کرنے میں صرف ہو رہی تھیں۔ تاہم وہ بات کافی حد تک تحمل اور شفقت سے کر رہے تھے ورنہ شاید میں انہیں ان کے حال پر چھوڑ کر چلا آتا۔ شاید وہ میرا حوصلہ آزما رہے تھے کہ میں اپنے موقف اور اپنے اندازوں پر قائم رہنے کے سلسلے میں کتنا مستقل مزاج ہوں۔ بعض لوگ اس طرح بھی کسی کی بات کے وزن کا اندازہ کرتے ہیں۔

ایک بار پھر وہ مربیانہ سے انداز میں بولے "مسٹر چوہدری! آپ ایک بڑے بزنس مین ہیں۔ آپ کو فارغ وقت میسر تو نہیں آتا ہوگا۔ لیکن اگر کبھی تھوڑی بہت فرصت میسر آجاتی ہے تو اس میں آپ اسپائی ایجنٹوں کی کہانیاں تو نہیں پڑھتے؟ ان میں بڑی دور کی کوڑی لائی جاتی ہے۔ مثلاً سی آئی اے ایجنٹ نے کسی ڈکٹیٹر کے جوتوں پر زہریلا پاؤڈر چھڑک دیا جس کے اثر سے اس کی مونچھیں اکڑ کر گر پڑیں اور اس نے پٹ سے گر کر دم توڑ دیا۔ یا پھر کے جی بی ایجنٹ نے کسی بادشاہ کے پسندیدہ چیونگم کے ڈبے میں ایک زہریلا چیونگم شامل کردیا جس سے اس کے دانت نکل کر گر پڑے اور آنتیں ایک دوسرے سے گڈ مڈ ہو گئیں۔ یہ سب خیالی پلاؤ ہے مسٹر چوہدری! یہ لوگوں کو وقت گزاری اور تفریح مہیا کرنے کے ذرائع ہیں۔ رائٹر بیٹھے اس قسم کی کہانیاں سوچتے رہتے ہیں۔ انہیں پڑھ کر لوگوں کا وقت کچھ اچھا گزر جاتا ہے۔ وہ اپنے مسائل سے تھوڑی دیر کے لئے فرار حاصل کر کے سنسنی خیزی کی ایک انوکھی دنیا میں چلے جاتے ہیں۔ لیکن ہم اور آپ جیسے لوگوں کو حقائق کی دنیا میں رہنا پڑتا ہے۔ خصوصاً میں تو بچپن میں بھی اس قسم کے فکشن اور فلموں سے لطف اندوز نہیں ہوسکا۔"

"سر!" میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے آخر کار ٹھہرے لہجے میں کہا۔ غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں ہلکی سی سرد مہری بھی در آئی "بعض اوقات ساری دلیلیں، سارے جواز انسان کو دھوکا دے جاتے ہیں اور وہ کچھ ہو جاتا ہے جس کی کوئی دلیل، کوئی جواز نہیں ہوتا۔ ساری منطق دھری رہ جاتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں دلیلوں اور منطق سے زیادہ اپنی حسیات پر بھروسہ کیا ہے اور خدا کا شکر ہے کہ میری حسیات نے مجھے کبھی دھوکا نہیں دیا۔ آپ ایک اچھے آدمی ہیں۔ میں آپ کے عہدے کی وجہ سے نہیں، آپ کی اچھی شہرت کی وجہ سے آپ کی قدر کرتا ہوں۔ میرا مخلصانہ مشورہ ہے کہ آپ منطق، دلائل اور اپنی معلومات پر زیادہ انحصار نہ کریں۔ آپ میری بات مان لیں۔ میری حسیات پر بھروسہ کرلیں۔ اس میں آپ کا کوئی نقصان تو نہیں ہے۔ میری حسیات مجھے بتا رہی ہیں کہ مجھے موصول ہونے والی اطلاعات غلط نہیں ہیں۔ میں فضا میں سازش کی بُو محسوس کر رہا ہوں۔ حتیٰ کہ میں آپ کو یہ بھی بتا سکتا ہوں کہ آپ کو کس طرح قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ خواہ اسے آپ میرا وجدان کہہ لیجئے۔"

"کس طرح؟" انہوں نے ایک لمحے کے گہرے سکوت کے بعد پوچھا۔ اب ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے الفاظ ان کے منطق پسند پتھریلے دل میں اتر چکے تھے۔

"آپ کو ہارٹ اٹیک کے ذریعے "قتل" کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ کوئی اسے قتل کہہ ہی نہیں سکے گا۔ اس لئے تحقیقات، تفتیش اور دوسرے لمبے چکروں کی نوبت ہی نہیں آئے گی" میں نے پُریقین لہجے میں کہا۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہئے" وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی آواز اب سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"عین آخری وقت پر تقریب کی جگہ بدل لیجئے۔ ڈنر میرے ہوٹل کے بجائے کہیں اور رکھ لیجئے۔ انتہائی رازداری کے ساتھ کراچی میں یہ انتظامات میں بھی کرا سکتا ہوں۔ بالکل آخری لمحے میں مہمانوں کو اس تبدیلی سے مطلع کیا جائے" میں نے تجویز پیش کی۔

"ناممکن" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولے "جس سطح کے لوگ اس تقریب میں آرہے ہیں ان کے ساتھ اس طرح نہیں کیا جاتا۔ یہ ذاتی طور پر میرے اور میرے ملک کے وقار کے بھی خلاف ہے۔ ڈنر میں بڑے ملکوں کے سفارت کار اور بعض ملکوں کے وزرائے خارجہ بھی موجود ہوں گے۔ سب کو اندازہ ہو جائے گا کہ سیکورٹی کے مسئلے کی وجہ سے جگہ تبدیل کی گئی ہے۔ وہ دل میں ہنسیں گے کہ ہم ایک تقریب کے لئے سیکورٹی کے مسائل سے نہیں نمٹ سکتے اور ایک امن مشن لے کر دنیا کے ایک اہم خطے میں امن قائم کرانے جا رہے ہیں۔ ہمارے مقام و منزلت کے غبارے سے یہیں ہوا نکل جائے گی۔ اس معمولی سی بات کے میرے مشن پر بہت برے اثرات مرتب ہوں گے۔"

"تو پھر میری دوسری تجویز مان لیجئے۔ وہ یہ کہ کم از کم آپ اس تقریب میں نہ کوئی چیز کھائیں نہ پئیں۔ چکھیں تک نہیں۔ حتیٰ کہ پانی بھی مت پئیں۔ خرابیٔ صحت کا بہانہ کرلیں۔ کچھ بھی کرلیں" میں نے کہا۔

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی انگلیوں میں دبے ہوئے سگار سے دھوئیں کی پتلی سی لکیر ایئر کنڈیشنڈ کمرے کی خنک فضا میں بلند ہو رہی تھی۔

> زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگرانی ابھی جاری ہے باقی واقعات چوتھے حصے میں پڑھیں۔

سرکش

4

محمود احمد مودی

کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد آخر کار منسٹر صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ "مسٹر چوہدری! تقریب ہونے ڈنر نہیں ہے۔ ایک بڑی سی میز پر میرے ساتھ بہت سے خاص سفارت کار کھانے پینے میں مشغول ہوں گے۔ باقی آس پاس دوسری میزوں پر ہوں گے۔ اگر میں کھانے پینے سے ایسا زبردست پرہیز کروں گا تو اس بات کو بھی نوٹ کیا جائے گا۔ غیر ملکی پریس کے نمائندے بھی وہاں موجود ہوں گے۔ ویسے تو شوشے چھوڑنے میں اپنا پریس بھی کچھ کم نہیں لیکن غیر ملکی پریس تو خصوصاً اس میں تمسخر کا پہلو نکال لے گا۔ وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ مسئلہ سیکورٹی کا ہے۔ چھوٹے ملکوں کی تو ہر چیز انہیں ویسے ہی مضحکہ خیز نظر آتی ہے۔ یہ تو گویا انہیں لطیفہ ہی ہاتھ آجائے گا کہ وزیرِ خارجہ صاحب اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ کسی چیز کو چھو تک نہیں رہے تھے۔ یہ تدبیر بھی ہمارے لئے اتنے ہی تمسخر کا باعث بنے گی جتنا کہ تقریب کی جگہ بدلنا۔"

پھر وہ اپنی نپی تلی، نہایت خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "آپ کیوں ہم غریبوں کا مضحکہ اُڑوانا چاہتے ہیں؟ آپ کے اس غریب سے ملک کا یہ غریب سا وزیرِ خارجہ پہلی بار اتنا بڑا مشن لے کر باہر جا رہا ہے، آپ اس کے سفر کا آغاز ہی طنز و تمسخر سے کروانا چاہتے ہیں۔"

"کچھ دیر کے تمسخر کے عوض اگر ایک قیمتی جان بچ جائے تو سودا مہنگا نہیں ہے سر!" میں نے کہا۔ "بہر حال.... یہ تجویز بھی اگر

آپ کے دل کو نہیں لگتی تو پھر آپ ہی بتایئے کہ آپ کی جان کی حفاظت کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے؟"

"میرا خیال ہے ہمیں اس معاملے کو اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے۔" منسٹر صاحب بولے۔

"اللہ تعالٰی کا فرمان بھی یہی ہے کہ پہلے ہم احتیاط کریں۔ اس کے بعد توکل کریں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "اللہ پر توکل کر کے اگر ہم آگ میں کود پڑیں یا چلتی ٹرین کے سامنے آ جائیں تو یہ کوئی عقلمندی نہیں ہوگی۔ بے شک اللہ تعالٰی ہی زندگی اور موت دینے والا ہے' ہر چیز پر قادر ہے لیکن ہم جیسے گناہ گاروں کو اپنے لئے معجزوں کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔"

وہ ایک بار پھر چند لمحوں کے لئے سگار کا کش لینا بھول گئے۔ ایک ٹک میری طرف دیکھتے رہے۔ ان کی مبہم سی مسکراہٹ گویا ان کے ہونٹوں پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ شاید وہ یکدم میرے لہجے میں صوفیانہ رنگ جھلک آنے پر حیران تھے لیکن وہ انہی لوگوں میں سے تھے جن کی آنکھوں سے ان کی دلی کیفیات کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہوتا ہے۔

آخر کار وہ طویل سانس لے کر بولے۔ "مسٹر چوہدری! تجاویز پیش کرنے کے معاملے میں آپ کا ذہن بہت زرخیز ہے۔ آپ کوئی ایسی تجویز پیش کیجئے جس سے ضیافت کے انتظامات میں ذرہ برابر بھی تبدیلی نظر نہ آئے اور خطرہ بھی ٹل جائے۔ اگر واقعی کوئی خطرہ موجود ہے۔"

انہوں نے مجھے عجیب الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ ایسے آدمی بھی نہیں تھے کہ جس پر زور ڈال کر یا سخت رویہ اختیار کر کے میں کوئی بات منوا سکتا اور اس پوزیشن میں بھی نہیں تھے کہ میں سوچتا' میری طرف سے وہ جہنم میں جائیں' زندہ رہیں یا مر جائیں' مجھے اس سے کیا۔ میں فی الحال انہیں اتنا فالتو قرار دینا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد بظاہر شکست خوردہ سے انداز میں طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔ "بہت بہتر حفیظ صاحب! فی الحال تو کوئی تدبیر میرے ذہن میں نہیں آ رہی۔ لیکن ابھی کچھ وقت باقی ہے۔ میں اس سلسلے میں غور کروں گا۔ میں کوشش کروں گا کہ کراچی میں تقریب سے کچھ دیر پہلے جب آپ میرے ہوٹل میں مختصر قیام کے لئے تشریف لائیں' اس وقت آپ سے ملاقات کر سکوں۔ اس وقت تک میں فیصلہ کر لوں گا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ آپ سے صرف اتنی درخواست ہے کہ اگر آخری لمحوں میں میں آپ سے کوئی بات کہوں تو ضرور مان لیجئے گا کیونکہ اس وقت بحث و تمحیص اور دلیل کا وقت نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے ڈنر یا تقریروں کے دوران ہی مجھے آپ کو کوئی اشارہ دینا پڑے' آپ سے سرگوشی میں کچھ کہنا پڑے۔ براہ کرم میرے اشارے کو نظر انداز مت کیجئے گا۔ میری سرگوشی کو سُنی ان سُنی مت کیجئے گا۔"

"تو کیا آپ تقریب میں موجود ہوں گے؟" منسٹر صاحب نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔ میں نے پہلی بار ان کے لہجے میں ایک خفیف سی شرارت چھپی محسوس کی اور حیرت سے سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ کیا واقعی ان میں تھوڑی بہت حسِ مزاح باقی تھی؟

"جی ہاں۔ میرا وہاں موجود ہونا بہت ضروری ہے۔" میں نے جواب دیا۔ پھر میں جتائے بغیر نہ رہ سکا۔ "آپ کی اس تقریب کے لئے مجھے بہ ذاتِ خود آخری لمحے تک سر کھپانا پڑے گا اور اپنا قیمتی وقت صرف کرنا پڑے گا جبکہ آپ کی نظر میں اس سارے سلسلے کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔"

"آپ نے کیسے محسوس کر لیا کہ میری نظر میں اس سارے سلسلے کی کوئی اہمیت نہیں؟" انہوں نے پوچھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ ذرا گہری ہو رہی تھی لیکن میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ یہ میرا وہم تھا۔

"آپ کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے سر!" میں نے ملائم اور مؤدبانہ لہجے میں کہا۔ "میں تو اس سازش کی خبر پاتے ہی جس طرح بے چین و مضطرب ہوا تھا وہ میں ہی جانتا ہوں۔ آپ سے فوری ملاقات کے لئے بھی میں نے جو جتن کئے وہ مجھے ہی معلوم ہیں۔ یہ محض میری خوش قسمتی یا شاید خلوصِ نیت تھا کہ میں نے نذیر خان صاحب کو ڈھونڈ نکالا جن سے میری پہلے شناسائی تک نہیں تھی۔ سر! میری نظر میں آپ کی ذات قوم کا ایک قیمتی اثاثہ ہے اور آپ کا ذہن ملک کی امانت ہے۔ بس... یہی جذبات دل میں لئے میں دوڑا چلا آیا تھا لیکن میری چونکہ کوئی سرکاری یا سیاسی حیثیت نہیں ہے' شاید اس لئے میری باتوں کی آپ کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ کی سطح کے لوگ شاید صرف خفیہ ایجنسیوں ہی کی اطلاعات پر یقین کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔" میرے الفاظ کی نوعیت کچھ جذباتی سی تھی لیکن میں نے اپنے لہجے میں جذباتیت نہیں آنے دی تھی اور نہ ہی کھردرا پن پیدا ہونے دیا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ میرے دل میں جو کچھ ہے وہ بھی کہہ جاؤں اور وہ زیادہ برا بھی نہ منائیں۔ میری ان سے یہ پہلی ملاقات تھی۔ مجھے کچھ زیادہ تجربہ نہیں تھا کہ اس سطح کے لوگوں سے گفت و شنید کے آداب کیا ہوتے ہیں' ان کے ذہن عموماً کس نہج پر سوچتے ہیں۔ میں اس پہلی ہی ملاقات میں کوئی کشیدگی یا بدمزگی پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے بے چارے نذیر خان کا بھی خیال تھا جو تمام تر اجنبیت کے باوجود میری ہمدردی میں میرے ساتھ چلا آیا تھا اور اب بیٹھا بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ شاید اسے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ میں عزیز صاحب سے اس کے بھی تعلقات کشیدہ نہ کرا دوں۔ میں اسے نیکی کے عوض پچھتانے والے مرحلے میں لانا نہیں چاہتا تھا۔

خلافِ توقع میری تقریر خاصی دل پذیر ثابت ہوئی۔ پہلی بار میں نے حفیظ صاحب کی مسکراہٹ کو تکلفات کے شکنجے سے آزاد ہوتے دیکھا۔ وہ کھل کر مسکرائے اور ان کی آنکھوں نے بھی اس مسکراہٹ کا ساتھ دیا۔ صرف یہی نہیں' انہوں نے پروٹوکول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے' صوفے پر میری طرف بہت آگے تک کھسک کر میرے کندھے پر مشفقانہ انداز میں تھپکی دی اور یکدم بدلے ہوئے لہجے میں بولے۔ "برخوردار چوہدری! لگتا ہے تم ہمارے طرزِ عمل کا برا منا گئے۔ تمہیں ہماری باتوں پر نہیں جانا چاہئے۔ ہم ڈپلومیٹک لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ ہماری باتوں سے کوئی اندازہ نہیں کر سکتا کہ ہمارے دل میں کیا ہے۔ میری عمر ہی فارن سروس میں گزری ہے۔ عادتیں بہت پختہ ہو گئی ہیں۔"

منسٹر صاحب کے رویّے میں یہ تبدیلی دیکھ کر مجھ سے زیادہ سکون کی سانس نذیر خان نے لی۔ منسٹر صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "میں تمہیں سرد مہری اور بے اعتباری کی کسوٹی پر پرکھ رہا تھا۔ ہم ایک دم تو کسی اجنبی کی باتوں پر یقین نہیں کر سکتے نا۔ خصوصاً جبکہ وہ اجنبی بعض پہلوؤں سے رازداری بھی برت رہا ہو۔ اپنی خبر کا ذریعہ بتانے پر بھی تیار نہ ہو۔"

"میری کچھ مجبوریاں ہیں سر! ورنہ ضرور بتا دیتا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ "جو شخص میری خبر کا ذریعہ ہے اس کی زندگی پہلے ہی خطرے میں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اس کے بارے میں کسی کو بھی بتایا تو اس کی زندگی کے دن مزید کم ہو جائیں گے۔ میرے اپنے لئے بھی خطرات بہت بڑھ جائیں گے۔ سازش پھر بھی وہیں کی وہیں رہے گی۔ یعنی آپ کی ذات کو بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔"

"میری بھی کچھ مجبوریاں ہیں برخوردار!" وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔ "اور وہ ڈپلومیٹک مجبوریاں ہیں۔ میں چاہتا ہوں ہمیں اپنے پروگرام میں ذرا سی بھی تبدیلی نہ کرنی پڑے اور ہم سازش کا بھی توڑ کر لیں۔ سازش کرنے والوں کے منہ پر یہ ایک طمانچا ہوگا۔ اگر تم واقعی پُر یقین ہو کہ تم یہ کام کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے.... میں تم پر بھروسا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ ورنہ تم یہ معاملہ مکمل طور پر ہمارے ہاتھ میں دے دو۔ ہم خود ہی دیکھ لیں گے۔" وہ اب مجھے 'برخوردار' اور 'تم' کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔

"آپ یہ معاملہ میرے ہی ہاتھ میں رہنے دیں سر!" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں یہ خطرہ مول لینے کے لئے تیار ہوں۔" وہ بولے

"بس... تو پھر آپ سے کراچی میں ملاقات ہوگی۔" میں نے اٹھنے کے لئے پر تولتے ہوئے کہا۔ "نذیر خان صاحب میرے ساتھ ہوں گے۔"

"میں...؟" نذیر خان حیرت سے بول اٹھا۔ "مگر نے میں تو آفس سے چھٹی نہیں لی۔"

"ارے... آپ جیسے لوگوں کو بھی آفس سے چھٹی ملنا کوئی مسئلہ ہے کیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ایک فون کر دینا ہی کافی ہوگا۔ دراصل حفیظ صاحب کا آپ جیسا کوئی مزاج آشنا اور بھروسے کا آدمی میرے ساتھ ہوگا تو دل کو ذرا اطمینان رہے گا اور غلطی کا امکان کم ہوگا۔"

حفیظ صاحب بھی مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر کار اسے بھی مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہی بن پڑی۔ وہ اپنے مصنوعی ہاتھ پر سیاہ دستانے درست کرتے ہوئے بولا' ..."ٹھیک ہے۔ میں ضرور چلوں گا آپ کے ساتھ۔"

کچھ دیر بعد ہم نے اجازت طلب کی اور کراچی' اسلام آباد اور لاہور میں حفیظ صاحب سے رابطہ قائم کرنے کے لئے ان کے خاص خاص فون نمبر وغیرہ لے کر باہر آ گئے۔ گاڑی میں گورنر ہاؤس سے واپڈا ہاؤس پہنچنے تک ہم دونوں خاموش ہی رہے۔ آخر کار میں نے ایک نظر نذیر خان کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ "آپ تو گہری سوچ میں پڑ گئے۔ شاید میں نے آپ کو کراچی لے جانے کا فیصلہ آپ پر ٹھونس کر اچھا نہیں کیا؟"

"نہیں۔ نہیں۔ بخدا ایسی بات نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا۔ "حفیظ صاحب کے لئے تو جان بھی حاضر ہے.... اور آپ بھی مجھے اپنے ہی قبیلے کے آدمی لگے ہیں۔ سچے اور جی دار۔ آپ کے ساتھ بھی آنکھیں بند کر کے چلنے کو جی چاہتا ہے۔"

"بس.... پھر تو بات ہی ختم ہو گئی۔" میں نے کہا۔ "جب اتنا سوچ لیا تو پھر کیا پریشانی ہے؟"

"دراصل... میں سوچ رہا تھا کہ میں کسی قابل بھی ہوں یا نہیں۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "میں ایک ہاتھ سے معذور' اچھی بھلی عمر کا آدمی ہوں۔ معلوم نہیں میں اس قسم کے معاملات میں کسی کام بھی آ سکتا ہوں یا نہیں؟" اس کا مصنوعی ہاتھ اس کی گود میں ٹکا ہوا تھا اور وہ ایک ٹک اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ جیسے جہاندیدہ آدمی سے مجھے ایسی بات کی توقع نہیں تھی خان صاحب! اہمیت تو جذبوں کی سچائی کی ہوتی ہے۔ سچے جذبے تو بعض اوقات وہاں بھی کام دے جاتے ہیں جہاں دست و بازو یا اسلحے کی قوت درکار ہوتی ہے۔ آج صبح آپ نے خود ہی مجھے بتایا تھا کہ ہاتھ کی اسی معذوری کے باوجود آپ نے تین خطرناک اور مسلح غنڈوں کو مار بھگایا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ کچھ اور بات تھی۔" نذیر خان پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "وہ عام اور کچھ فلمی سے بدمعاشوں کا معاملہ تھا۔ یہ بین الاقوامی سازشوں کی باتیں ہیں۔ میں جب اس قسم کی سازشوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے وہ وقت یاد آ جاتا ہے جب چاپر سے میرا ہاتھ کچلا جا رہا تھا..." اس نے اپنے مصنوعی ہاتھ سے نظر ہٹا کر دور کہیں ہوا میں گھورتے ہوئے جھرجھری سی لی۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت اس کے جسم میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔

کھوئے کھوئے سے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولا۔ "اس کے علاوہ عمر کے ساتھ ساتھ بھی انسان میں عجیب تبدیلیاں آتی چلی جاتی ہیں۔ لڑکپن سے جوانی کی طرف کا سفر تو گویا

پہاڑ پر چڑھائی کی طرح ہوتا ہے۔ انسان بڑے جوش و خروش سے، قوت صرف کر کے چڑھتا ہے اور یہی محسوس کرتا ہے کہ فاصلہ بہت آہستہ آہستہ طے ہو رہا ہے۔ جوانی کا زمانہ گویا کچھ عرصہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے رہنے کا زمانہ ہوتا ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ وہ ساری عمر یونہی بلندی پر کھڑا رہے گا۔ دنیا اسے نشیب میں دکھائی دیتی ہے۔ مسائل ہیچ نظر آتے ہیں۔ ادھیڑ عمری کا آغاز ہوتا ہے تو گویا ڈھلان کی طرف سفر شروع ہو جاتا ہے۔ انسان اپنی جگہ رکے رہنے کی بہت کوشش کرتا ہے۔ بہت چاہتا ہے کہ اس کے پاؤں چوٹی پر ہی جمے رہیں۔ اس کے لئے ہر جتن کرتا ہے۔ مگر وقت کا عفریت اسے ڈھلان کی طرف دھکا دے چکا ہوتا ہے۔ اس کے پاؤں جمنے نہیں پاتے۔ ادھیڑ عمری سے بڑھاپے تک کا دور تو وہ ہے جب انسان ڈھلان پر اپنے ارادے و اختیار کے بغیر بس لڑھکتا چلا جا رہا ہوتا ہے۔ اردگرد کا منظر بھی صاف دکھائی نہیں دیتا۔ بس یہی احساس رہتا ہے کہ فاصلہ بہت تیزی سے طے ہو رہا ہے۔ چند برسوں میں بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ میں عمر کے اسی دور سے گزر رہا ہوں۔ دنیا تو وہی کی وہی ہے مگر میرے لئے بہت بدل گئی ہے۔ چند برس میں بہت فرق پڑ گیا ہے۔"

ایک لمحے سوچنے کے بعد میں نے کہا۔ "آپ نے بات بہت دل نشیں انداز میں کی ہے اور میری سمجھ میں آگئی ہے۔ ویسے مجھے امید نہیں ہے کہ کراچی میں فنسٹر صاحب کی تقریب میں ہمیں مار دھاڑ، فائرنگ، اٹھا پٹخ یا کسی اور خطرناک صورت حال سے واسطہ پڑے گا لیکن اگر آپ ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار محسوس نہیں کر رہے تو میں آپ کو اپنے ساتھ چلنے پر مجبور نہیں کروں گا۔"

"نہیں۔ نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میرا اتنی لمبی تقریر کرنے کا یہ مطلب نہیں تھا کہ میں اس ذمے داری سے پہلو بچانا چاہتا ہوں۔ حفیظ صاحب کے لئے کہیں جانا.... اور وہ بھی آپ جیسی شخصیت کے ساتھ جانا میرے لئے اعزاز سے کم نہیں۔ بلکہ میرے لئے یہ دُہرا اعزاز ہے۔ میرے بتانے کا مقصد تو صرف یہ تھا کہ آپ مجھ پر بہت زیادہ بھروسا مت کیجئے گا۔ مجھ سے بہت زیادہ توقعات مت رکھئے گا۔ میں صرف بڑی عمر کا ایک مٹھڈا آدمی ہی نہیں، کافی حد تک سیدھا اور پینڈو بھی ہوں۔"

"آپ سیدھے سادے اور پینڈو ہیں، اسی لئے تو آپ کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تیز و طرار اور شاطر لوگوں کا تو فنسٹر صاحب کے گرد بھی جمگھٹا ہوگا۔ اس دنیا میں زیادہ مصیبتیں تیز و طرار اور شاطر لوگوں ہی کی لائی ہوئی ہیں۔"

وہ ہنس دیا۔ اس کے چہرے پر پہلی سی بشاشت لوٹ آئی۔ گنگا رام اسپتال کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے کہا۔ "میں آپ کو گھر چھوڑ دیتا ہوں۔ آپ اپنا ایک چھوٹا سا سفری بیگ لے کر تیار رہیے گا۔ میں اپنے ٹریول ایجنٹ سے بات کرنے کے بعد آپ کو فون کر دوں گا کہ آپ کو کس وقت ائرپورٹ پہنچنا ہوگا۔ میں آپ کو وہیں ملوں گا۔ آج شام ہی ہم کراچی روانہ ہو جائیں گے۔"

"تیاری کیا کرنی ہے جی۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "اصل تیاری تو ذہنی ہوتی ہے.... اور ذہنی طور پر ہم اس وقت ہی تیار ہو گئے تھے جب حفیظ صاحب کے سامنے ہامی بھری تھی۔ آپ جب بھی حکم کریں گے، میں ائرپورٹ پہنچ جاؤں گا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "ویسے آپ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ فنسٹر صاحب ہیں واقعی بڑے ٹیڑھے آدمی۔ انہیں قائل کرنے میں مجھے تو دانتوں پسینے آگئے۔"

نذیر خان پہلو بدل کر بولا۔ "بات ہی کچھ ایسی تھی۔ لیکن شکر کیجئے آپ کے سامنے تو وہ پھر بھی بہت آسان ثابت ہوئے۔ آخر میں تو ان کا رویّہ دیکھ کر میں حیران ہی رہ گیا۔ وہ آپ کو 'برخوردار' اور 'تم' کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ برخوردار تو انہوں نے شاید کبھی اپنے سگے بیٹے کو بھی نہیں کہا ہوگا۔ آپ کے ساتھ وہ جس طرح پیش آئے، یہ ایک اجنبی کے لئے ان کا سب سے زیادہ مہربانی اور گرمجوشی کا سلوک تھا۔ یہ انداز تو وہ کئی سال کی شناسائی کے بعد اختیار کرتے ہیں۔ حالانکہ بیچ بیچ میں آپ کے لہجے میں سرکشی بھی جھلکتی رہی جسے آپ دبانے کی کوشش کرتے رہے۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آپ زبردستی اپنا لہجہ مؤدبانہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ فنسٹر صاحب ان باتوں کا سراغ پانے کے معاملے میں بڑے حساس ہیں لیکن حیرت ہے کہ آپ کے سامنے انہوں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔"

"بس.... یہ بھی خلوص نیت کا کمال ہے۔" میں نے کہا۔ "ہم دل میں خلوص لے کر انہی کی ہمدردی میں وہاں گئے تھے نا۔ جب بات میں خلوص شامل ہو تو وہ ضرور دل پر اثر کرتی ہے۔ بہرحال انہوں نے میری بات کو اتنی اہمیت نہیں دی جتنی میں توقع کر رہا تھا۔"

"اس سطح کے لوگوں کی نفسیات کو شاید آپ زیادہ نہ سمجھتے ہوں۔" نذیر خان بولا۔ "یہ بیک وقت متضاد کیفیتوں کا شکار رہتے ہیں۔ اس قسم کی خبر سن کر یہ اندر سے بے پناہ خوفزدہ بھی ہو جاتے ہیں۔ موت کا تصور انہیں عام آدمی کی نسبت کہیں زیادہ دہشت زدہ کرتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے جب یہ اپنے اردگرد پھیلے ہوئے حفاظتی انتظامات کو دیکھتے ہیں تو سمجھتے ہیں کہ انہیں کوئی ہلاک نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعض ایسی شخصیتیں جو حفیظ صاحب سے بھی زیادہ اونچے مقام پر ہوں، وہ تو بعض اوقات لاشعوری طور پر شاید اپنے آپ کو غیر فانی محسوس کرنے لگتے ہیں۔ تبھی تو یہ عالم ہے کہ آپ دنیا کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں.... آپ کو بے شمار ایسے لوگ ملیں گے جو زندگی بھر ایسی حرکتیں کرتے رہے، ایسے اقدامات کرتے رہے جیسے انہیں وہم و گمان تک نہ ہو کہ ایک روز انہیں بھی بہرحال موت آنی ہے اور انہیں ایک بہت ہی اونچی عدالت میں پیش ہونا ہے۔ یہ مقام و مرتبے بھی عجیب چیز ہوتے ہیں چوہدری صاحب!

انسان کی سائیکالوجی بدل دیتے ہیں۔ ان سے بھی زیادہ عجیب وہ انسان ہوتے ہیں جو مقام اور مرتبے والوں کو گھیر لیتے ہیں۔ ان کے گرد عجیب دیواریں کھڑی کر دیتے ہیں۔"

مزنگ چونگی کے چوراہے سے میں نے فیروز پور روڈ کی طرف مُڑتے ہوئے ایک نظر نذیر خان کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نظروں سے ٹریفک کو دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "بڑے لوگوں کو تو چھوڑیے چوہدری صاحب! عام لوگوں کی سائیکالوجی بھی کچھ کم عجیب نہیں۔ جب تک حادثہ خود کو پیش نہ آئے تب تک انسان اس کی سنگینی کو محسوس ہی نہیں کرتا۔ کسی خوبصورت اور پُر فریب سے راستے پر گڑھے کی موجودگی کا کسی کو اس وقت تک یقین نہیں آتا جب تک وہ جا کر اس میں گر نہ جائے۔ آگ کسی کو اس وقت تک آگ محسوس نہیں ہوتی جب تک اس کی تپش اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر نہ محسوس ہونے لگے۔"

میں ہنس دیا۔ یہ بات میں پہلے بھی کسی کے منہ سے سن چکا تھا اور مجھے درست لگی تھی۔ وہ گویا کسی سوچ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "چوہدری صاحب! میں زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہوں۔ شاعری مجھے کچھ زیادہ سمجھ میں نہیں آتی.... اور غالب کو سمجھنا تو بہت سے شاعروں سے کہیں زیادہ مشکل ہے۔ لیکن میں واقعی انہیں عظیم شاعر مانتا ہوں۔ کیسی کیسی پتے کی باتیں وہ اتنے برسوں پہلے کہہ گئے جو ضرب المثل بن گئیں۔ اب اسی مصرع کو لے لیجئے۔ ؎

گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

قسم سوہنے رب کی۔ انسانی نفسیات کا ایک عجیب ہی پہلو سمو دیا ہے اس ایک مصرع میں۔ آگ جب بستیوں کو جلانا شروع کرتی ہے تو ہر آدمی یہی سمجھتا ہے کہ میرا گھر اس سے محفوظ رہے گا۔ افراد کی بات تو چھوڑیے، پوری پوری قومیں بھی کسی کے کہنے میں آکر، کبھی کسی جنون میں آکر اپنے آپ کو لے جا کر کسی گڑھے میں گرا لیتی ہیں۔ حالانکہ راستے میں بہت سے دردمند اسے سمجھا رہے ہوتے ہیں کہ اس راستے پر مت چلو، آگے تباہی منہ کھولے کھڑی ہے۔ مگر کوئی ان کی نہیں سنتا۔ بلکہ بعض اوقات تو لوگ سمجھانے والوں کو مارتے ہیں۔"

میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "اصل میں انسان کا، یا قوموں کا بھی کوئی قصور نہیں۔ آج کے دور میں کنفیوژن اتنا پھیلا ہوا ہے کہ کچھ پتا نہیں چلتا کون واقعی سمجھا رہا ہے اور کون صرف چکر دے رہا ہے، ایک گڑھے سے ہٹا کر دوسرے گڑھے کی طرف دھکیل رہا ہے۔"

"بس جی.... یہ دنیا کے تماشے عجیب ہیں۔ یہ لمبی باتیں ہیں۔" وہ طویل سانس لے کر بولا۔ "آپ یہ بتایئے کہ آپ نے حفیظ صاحب والے مسئلے میں سوچا کیا ہے؟ کراچی جا کر کرنا کیا ہے؟"

"میرے ذہن میں کوئی واضح پروگرام نہیں ہے۔" میں نے گاڑی اچھرہ موڑ کی تنگ سی سڑک پر موڑتے ہوئے کہا۔ "بس ایک دھندلا سا خاکہ ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ میں اور آپ ویٹروں کے روپ میں اس تقریب میں شرکت کریں گے۔ شاید میں عین وقت پر قتل کی سازش کو سمجھ سکوں اور قاتلوں سے ایک قدم آگے بڑھ کر اسے ناکام بنا سکوں۔"

اس نے بے اختیار ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ انگلی سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آپ ویٹر بنیں گے؟" اس کے لہجے میں بے یقینی تھی۔

"ہاں.... اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے سادگی سے کہا۔

"ایک بڑا آدمی.... فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک.... اپنے ہی ہوٹل میں ویٹر بنا کھڑا ہوگا۔ کیسا عجیب لگے گا۔ مجھے اس تصور سے ہنسی آگئی تھی۔" نذیر خان بولا۔

"بالکل عجیب نہیں لگے گا۔" میں نے وثوق سے کہا۔ "جب ہم ویٹر کی وردی پہن لیں گے تو ویٹر ہی لگیں گے۔ ویٹر بھی ہم ہی جیسے انسان ہوتے ہیں۔ میں نے کئی بار ایسے ویٹر، چھوٹے موٹے کام کرنے والے مزدور پیشہ لوگ اور نوکر وغیرہ دیکھے ہیں جن کے بارے میں مجھے خیال آیا کہ اگر وہ ذرا نفاست سے نہا دھو کر، عمدہ لباس پہن کر مہنگی سی گاڑی میں بیٹھ جائیں تو خاندانی سیٹھ معلوم ہوں جبکہ بعض سیٹھوں کو دیکھ کر گمان گزرتا ہے کہ اگر وہ صرف اپنے دفتر سے نکل آئیں اور پیدل کہیں جا رہے ہوں تو شاید چپراسی معلوم ہوں۔"

"وہ تو درست ہے چوہدری صاحب!" نذیر خان ہنستے ہوئے بولا۔ "پھر بھی سماجی حیثیت کی اپنی ایک خوبُو ہوتی ہے، جو خدوخال میں رچ بس جاتی ہے۔ آدمی اگر کافی عرصے سے ویٹر چلا آ رہا ہو تو اس کی شخصیت میں ویٹری رچ بس جاتی ہے۔ اور اگر آدمی کافی عرصے سے دولت مند چلا آ رہا ہو تو اس کے سراپا کے گرد دولت ایک ہالہ سا بنا لیتی ہے۔ آپ ویٹر کی وردی ضرور پہن لیں گے لیکن راتوں رات ویٹر دکھائی نہیں دینے لگیں گے۔ اس کے لئے آپ کو کم از کم چند دن پہلے ریاضت شروع کرنی چاہئے تھی۔"

"برادرِ عزیز! آپ چند دن پہلے کی بات کر رہے ہیں، یہاں تو کل تک نہیں معلوم تھا کہ ہمارے سر پر کیا افتاد پڑنے والی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بہرحال.... یہ میں بتا دوں کہ جس پیمانے کی سازش کی آپ بات کر رہے ہیں اس کی روشنی میں میرا اندازہ ہے کہ وہاں باریک بیں آنکھیں تو موجود ہوں گی۔ میری تو کوئی بات نہیں، میں تو ویٹر کے روپ میں بچ جاؤں گا لیکن باریک بیں آنکھوں نے اگر ذرا توجہ سے آپ کو دیکھ لیا تو سمجھ جائیں گے کہ بندہ ویٹر ہرگز نہیں ہے۔"

"ویٹر کی طرف کوئی زیادہ توجہ سے نہیں دیکھتا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"ویسے ۔۔۔ چوہدری صاحب ۔۔۔!" وہ میری طرف رخ کر کے بیٹھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا۔ کیا آپ کا خود کو ۔۔۔ "بہ نفس نفیس" خطرے میں ڈالنا ضروری ہے؟ زیادہ سے زیادہ میں ویٹر کے بہروپ میں تقریب میں شرکت کرلیتا ہوں۔ آپ مجھے اپنا ہی نمائندہ سمجھ لیں۔ ہم کوئی ایسا طریقہ طے کرلیں گے کہ اگر آپ مجھے کوئی ہدایت دینا چاہیں تو فوری طور پر دے سکیں۔ آپ جو کہیں گے وہ میں کر گزروں گا۔ آنکھیں بند کر کے۔"

"آپ کے اس خلوص اور اپنائیت کا بہت شکریہ نذیر بھائی!" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔ "لیکن مجھے لگتا ہے جب تک میں خود پوری تقریب کے دوران حفیظ صاحب کے قریب نہیں رہوں گا' بات نہیں بنے گی۔۔۔۔ اور نہ ہی میرے دل کو اطمینان ہوگا۔ جو لوگ اس میں ملوث ہیں' میں انہیں کوئی فتح حاصل کرتے ہوئے دیکھنا نہیں چاہتا۔ اگر وہ میرے ہوٹل میں حفیظ صاحب کو قتل کرنے میں کامیاب ہوگئے تو یہ ان کی بڑی فتح ہوگی۔ میں یہ برداشت نہیں کرسکتا۔ میں ضدی اور ہٹ دھرم نہیں ہوں لیکن نہ جانے کیوں یہ مجھے اپنی ناک کا مسئلہ محسوس ہونے لگا ہے۔"

"سمجھانا میرا فرض تھا۔" نذیر خان بولا۔ "حالانکہ حفیظ صاحب سے میرا جو دلی رشتہ ہے اس کا تو آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو چکا ہوگا۔ ان کی جان مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ لیکن آپ بھی پہلی ملاقات میں ہی بہت زیادہ اچھے اور اپنے اپنے سے لگے ہیں۔ دل گوارا نہیں کرے گا کہ آپ کو بھی کوئی نقصان پہنچتے دیکھوں۔ مجھے تو یہ ضروری محسوس نہیں ہوتا کہ آپ اس معاملے میں ملوث ہوں۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے بھی حفیظ صاحب کی جان کو کوئی سنگین خطرہ لاحق محسوس نہیں ہورہا۔ اگر ہو بھی' تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ ان جیسی شخصیات کی حفاظت کے لئے پولیس' سی آئی ڈی' اسپیشل سیکیورٹی' حتیٰ کہ بعض مقامات پر آئی ایس آئی تک کے لوگ موجود ہوتے ہیں۔ حفیظ صاحب کا جاں نثار ہونے کے باوجود میں اتنے اداروں کی موجودگی میں عزیز صاحب کے لئے پریشانی اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

"تقریباً یہی بات خود حفیظ صاحب نے بھی کہی تھی۔" میں نے کہا۔ "اصل نکتہ ان کی سمجھ میں بھی ذرا تاخیر سے آیا تھا۔ مجھے اس سے انکار نہیں کہ ان اداروں کے لوگ عام اجتماعات میں اہم شخصیات کی حفاظت کرنے میں ماہر ہوتے ہیں' تربیت یافتہ ہوتے ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان کی تربیت لگے بندھے خطوط پر ہوتی ہے۔ وہ صرف اس قسم کی صورت حال کے لئے تیار رہتے ہیں کہ کہیں کوئی سنکی یا خبطی اس شخصیت پر حملہ نہ کردے۔ کہیں کوئی تخریب کار کسی بہروپ میں یا کسی شخصیت کی آڑ میں تقریب میں نہ آگیا ہو۔ کہیں کوئی شخص کوئی ہتھیار چھپا کر اندر لانے میں کامیاب نہ ہوگیا ہو اور یکدم فائر نہ کردے یا خنجر کا وار نہ کردے۔ وی آئی پی شخصیت کی کار میں کسی نے بم نہ فٹ کردیا ہو۔ ریڈیو ٹی وی کے مائیکروفون یا کیمرے میں کوئی بم نہ ہو۔ لیکن میں نے بتایا نا کہ عزیز صاحب کے معاملے میں اس قسم کا کوئی چکر نہیں ہوگا۔ وہ اس قتل کو قتل تو ظاہر کرنا ہی نہیں چاہتے۔"

"ہاں۔ وہ تو میں سمجھ گیا تھا۔" نذیر نے متانت سے سرہلایا۔ "خدا کرے کہ آپ بروقت ان کے طریقۂ واردات کو سمجھنے اور اس کا توڑ کرنے میں کامیاب ہوجائیں۔ لیکن میں اس بات سے ڈر رہا ہوں کہ اپنی سازش کو ناکام ہوتے دیکھ کر کہیں ان کا نزلہ آپ پر نہ گر پڑے۔"

"ہم جب اس معاملے میں ٹانگ اڑا رہے ہیں تو پھر ٹانگ کو بچانے کا بندوبست تو رکھیں گے ہی۔" میں نے کہا۔ "اپنی سی سب تدبیریں کرلیں گے۔ نتیجہ اوپر والے پر چھوڑ دیں گے۔"

"ٹھیک ہے چوہدری صاحب!" وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "جب حفیظ صاحب نے آپ کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے ہیں تو میں کیا چیز ہوں۔ جو دل چاہے کیجئے۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ بلکہ آپ کے پیچھے پیچھے ہیں۔ بے شک کراچی لے جا کر سمندر میں ڈبو دیجئے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"آپ ایسی چیز نہیں ہیں کہ آپ کو سمندر میں ڈبو دیا جائے خان صاحب!" میں نے اس کی گلی میں گاڑی موڑتے ہوئے کہا۔ "آپ سے تو ابھی بہت سے کام لینے ہیں۔"

"بڑی خوشی ہوگی کہ آپ مجھ جیسے ناکارہ کو کسی کام کے قابل سمجھیں گے۔" وہ انکساری سے بولا۔ اس کا گھر آچکا تھا۔ گیٹ بند تھا۔ میں نے گاڑی دیوار کے سائے میں روک لی۔

وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ "آیئے نا۔۔۔ اب دوپہر کا کھانا کھا کر ہی جایئے گا۔ حفیظ صاحب جیسے خشک آدمی سے مل کر آرہے ہیں۔ اب ہمیں اس خشکی کے اثرات بھی تو دور کرنا ہوں گے۔"

"دوپہر کا کھانا۔۔۔؟" میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "خدا کا خوف کیجئے خان صاحب! جو ناشتا ہم نے صبح کیا ہے اس کے بعد تو دو دن تک کھانے کی ضرورت محسوس نہیں ہونی چاہئے۔ انسان کو معدے پر صرف اتنا ہی بوجھ لادنا چاہئے کہ معدے سے اس کے تعلقات خوشگوار رہیں۔"

"آپ نے ہی اپنے معدے کو اتنا آرام طلب بنا رکھا ہوگا۔" وہ گاڑی سے اتر کر انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔ "اپنا معدہ تو مزدور معدہ ہے۔ دن رات مشقت میں لگا رہتا ہے۔"

ویسے یہ واقعی حیرت کی بات تھی کہ جتنا وہ کھاتا تھا اتنا بے ڈول اور صاحبِ توند نہیں تھا۔ میں نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "میرا فی الحال اپنے معدے کو مشقت کرانے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔ آپ تیار رہیے گا۔ خدا حافظ۔" میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔

وہاں سے آفس آکر میں نے سب سے پہلا کام یہی کیا کہ مینیجر کو ٹریول ایجنٹ سے رابطہ قائم کرکے شام کی کسی فلائٹ میں دو سیٹیں بک کرانے کی ہدایت کی اور جلدی جلدی اس روز کا کچھ کام نمٹانے لگا۔ کیتھرین کو میں نے اگلے دو تین روز کے لئے تمام ملاقاتیں منسوخ کرنے کی ہدایت کردی تھی۔

ابھی میں نے زیادہ کام نہیں نمٹایا تھا کہ کیتھرین نے اطلاع دی۔ "کوئی اکرام بیگ صاحب ملنے آئے ہیں۔ فارن منسٹر صاحب کے سیکیورٹی چیف ہیں۔"

"اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ انہیں اندر بھیج دو۔" میں نے زیر نظر فائل اٹھا کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ جس وقت میں اور نذیر خان' منسٹر صاحب سے ملنے کے لئے گئے تھے اس وقت اکرام بیگ سیکیورٹی ہی کے انتظامات کے سلسلے میں کہیں گیا ہوا تھا۔ شاید منسٹر صاحب نے اس کے واپس آتے ہی اسے میرے پاس بھیجا تھا۔ یہ امر میرے لئے خوشی اور اطمینان کا باعث تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ منسٹر صاحب کا رویہ ظاہری طور پر خواہ کچھ بھی تھا لیکن دل ہی دل میں وہ میری بات کو اہمیت دے رہے تھے۔

اکرام بیگ اندر آیا تو میری یہ خوشی یا شاید خوش فہمی زیادہ دیر تک برقرار نہ رہ سکی۔ وہ ایک لمبا تڑنگا' مضبوط آدمی تھا۔ قد چھ فٹ سے خاصا نکلتا ہوا تھا۔ بال سولجر کٹ تھے۔ چہرے پر کرختگی اور آنکھوں میں کچھ شاطرانہ اور کچھ سفاکانہ سی چمک تھی۔ وہ گرمیوں کے بہت نفیس اور بیش قیمت لباس میں تھا۔ اس نے اپنے وجود کو ضرورت سے زیادہ ہی فرانسیسی کلون سے معطر کیا ہوا تھا۔ عمر کے اعتبار سے تو اسے کچھ ایسا گرگِ باراں دیدہ نظر نہیں آنا چاہئے تھا کیونکہ ابھی اس نے چالیس کی حد کو بھی غالباً عبور نہیں کیا تھا لیکن وہ نہایت جہاندیدہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔

طویل و عریض کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے پہلے یوں چاروں طرف کا جائزہ لیا جیسے آفس کی آرائش وغیرہ دیکھ کر میری حیثیت کا تعین کررہا ہو۔ لیکن شاید یہ اس کی عادت رہی ہو۔ وہ سیکیورٹی کے شعبے کا آدمی تھا۔ شاید کسی بھی جگہ پہنچتے ہی وہ اسی طرح اسے نظروں ہی نظروں میں کھنگالتا ہو۔

میں نے اٹھ کر اس کا استقبال کیا۔ ایک خاص فطرت کے آدمیوں کی طرح اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے وقت مجھے اپنی مضبوطی اور طاقت کا احساس دلانے کی کوشش کی لیکن میں نے بھی جواباً اسے احساس دلایا کہ اس کی یہ کوشش فضول ہے۔

شاید وہ بہت جلدی میں تھا۔ بیٹھتے ہی بلا تمہید بولا۔ "منسٹر صاحب کے قتل کی سازش کی جو کہانی لے کر آپ ان کے پاس گئے تھے' میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس میں آپ کی خبر کا ذریعہ کیا تھا؟"

اس کے لہجے میں ملائمت یا خوش اخلاقی نہیں تھی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میں نے ہلکی سی سرد مہری کے ساتھ کہا۔ "کیا آپ کو منسٹر صاحب نے نہیں بتایا؟ یہ سوال انہوں نے بھی مجھ سے کیا تھا اور میں نے جس حد تک مناسب سمجھا تھا انہیں جواب دے دیا تھا۔"

"منسٹر صاحب کی بات چھوڑیئے۔ وہ تو مرنجاں مرنج اور وضع دار قسم کے آدمی ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ سیکیورٹی کے مسائل کس طرح طے کئے جاتے ہیں۔ وہ تو سب کچھ ہم پر چھوڑ کر مطمئن بیٹھے رہتے ہیں۔"

"میرے خیال میں تو وہ آپ سے زیادہ معاملہ فہم آدمی ہیں۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اور مہذب و شائستہ بھی۔"

میں پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اس نے نظر چرانی شروع کردی تھی تاہم اس کے لہجے میں وہ ہلکی سی رعونت برقرار رہی۔ "آپ ان کا اور میرا موازنہ چھوڑیں چوہدری صاحب! ان کی اور میری پوزیشن میں بڑا فرق ہے۔ وہ اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ ہمیں اپنا کام کرنا ہوتا ہے۔"

"تو آپ کرتے رہئے اپنا کام۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں نے تو آپ کو کام سے نہیں روکا۔" میں نے اٹھ کر گرم جوشی سے اس کا استقبال تو کرلیا تھا لیکن اب وہ شخص یک بیک مجھے برا لگنے لگا تھا۔ میں نے اس کی خاطر مدارت کا ارادہ ترک کردیا۔ میں نے اسے ٹھنڈا یا گرم پینے تک کے لئے نہیں پوچھا۔

"کام ہی کے سلسلے میں تو میں آپ کے پاس آیا ہوں۔" اس کے لہجے کا کھردرا پن کچھ کم ہوگیا۔ "جب آپ مجھے خبر کے ذریعے کے بارے میں بتائیں گے تبھی تو میرا کام آگے بڑھے گا۔ اگر وہ کوئی خط ہے۔۔۔۔ یا کسی خفیہ ایجنسی کی رپورٹ کی کوئی نقل۔۔۔ کوئی فوٹو اسٹیٹ وغیرہ آپ کے ہاتھ لگ گئی ہے تو آپ وہ مجھے دے دیں۔"

اس نے یوں میز پر ہاتھ پھیلادیا جیسے اسے یقین ہو کہ اس قسم کی کوئی چیز میری جیب میں ہی تھی اور وہ میں اس کے سپرد کرنے کے لئے بے تاب ہی بیٹھا تھا۔ میں نے قدرے استہزائیہ سی نظر سے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ میرا دل چاہا کہ ایک پیپر ویٹ اٹھا کر اس ہاتھ پر رکھ دوں۔ وہ ایک روایتی سرکاری آدمی تھا۔ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ اس قسم کے لوگ خواہ کسی بھی عہدے پر ہوں' وہ کسی معاملے کو نزاکت' نفاست اور خوبصورتی سے ہینڈل کرنا تو جانتے ہی نہیں۔ اسی لیے میں نے منسٹر صاحب کے اصرار کے باوجود ان کے سامنے بھی ریڈ ڈاٹ' ہنی یا اس کے خط کے معاملے میں زبان نہیں کھولی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ سرکاری مشینری یا اس کا کوئی نہ کوئی کل پرزہ مجھے بھی مروادے گا اور ہنی کو بھی۔ اکرام بیگ کا طرزِ عمل بتا رہا تھا کہ میرے اندیشے درست ہی تھے۔

تاہم میں نے حتی الامکان تحمل سے کہا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں اس قسم کی کوئی چیز آپ کی خدمت میں پیش نہیں کرسکتا۔ وہ اطلاع ٹیلیفون پر آئی تھی اور میرے ٹیلیفون کے ساتھ ریکارڈنگ

سسٹم منسلک نہیں ہے۔"

"کس نے اطلاع دی تھی؟" اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم۔" میں نے سادگی سے کہا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ وہ گویا اپنے جذبات کی جارحیت کو دباتے ہوئے گھٹے گھٹے سے لہجے میں بولا۔ "چوہدری صاحب! کیا آپ مجھے بچّہ سمجھ کر مجھ سے مذاق کر رہے ہیں؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے نہایت خلوص سے کہا۔ میرا تجربہ تھا کہ بعض اوقات کسی پر طنز کرنے، اس کی توہین کرنے یا اس کا مضحکہ اڑانے کی نسبت، سادگی سے اس کے سوالوں کا جواب دینا اور اس کے سامنے بالکل انجان اور معصوم بننے کی کوشش کرنا اس کے تن بدن میں زیادہ آگ لگاتا تھا۔

وہ گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "یہ معاملہ ایسا نہیں ہے کہ اسے مذاق میں لیا جائے اور نہ ہی میں کوئی پولیس کانسٹیبل ہوں جسے مذاق کے انداز میں الٹے سیدھے جواب دے کر ٹالنے کو کوشش کی جائے۔"

"اگر میں نے اس معاملے کو مذاق سمجھا ہوتا تو کیا میں دوڑا دوڑا منسٹر صاحب کے پاس جاتا؟" میں نے اپنے لہجے کی سادگی برقرار رکھی۔

"لیکن اگر آپ کو گمنام اطلاع ملی ہوتی تو تب تو آپ ہرگز نہ جاتے۔ وہ یقیناً کوئی ایسا ذریعہ ہے جس پر آپ بہت بھروسا کرتے ہیں۔" وہ قدرے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "میں جاننا چاہتا ہوں وہ ذریعہ کیا ہے۔"

"کاش میں آپ کو بتا سکتا۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

وہ ایک لمحے خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ میں نے اب بھی پلک نہیں جھپکائی اور اپنے چہرے کو حتی الامکان سپاٹ رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے جارحانہ پن میں کچھ کمی آگئی تھی۔ وہ اب کچھ معتدل ہو کر بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ میں کوئی عام سا کاروباری آدمی یا پھر روایتی قسم کا چھوٹا موٹا سیٹھ نہیں تھا جو پولیس والوں، انکم ٹیکس والوں، ایف آئی اے والوں، یونین والوں، ڈاکوؤں، طالب علموں اور نہ جانے کن کن لوگوں سے ڈرتا ہے۔ بے چارہ دولت کما بھی لیتا ہے، بچا بھی لیتا ہے لیکن بیشتر زندگی ڈرتے ڈرتے ہی گزر جاتی ہے۔

جس طرح ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر اکرام بیگ میرے پاس آیا تھا، اب اس کے رویے میں وہ بات تو نہیں رہی تھی لیکن اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس کا امپریشن میری نظر میں خراب ہو چکا تھا۔ اب وہ اسے بہتر نہیں بنا سکتا تھا۔ آتے ہی اس نے جو رویّہ اختیار کیا تھا، اسی سے اس کی اصل فطرت کا پتا چلتا تھا۔ اب وہ اس پر محض مصلحت کی نقابیں ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"آپ کو شاید معلوم نہیں...." وہ اب خاصے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "کہ سرکار کسی معاملے کی تفتیش میں اگر کسی شہادت کو ضروری سمجھتی ہو، اسے چھپانا یا روکنا سنگین جرم ہے۔"

"مجھے معلوم ہے سر!" میں نے لفظ "سر" پر زور دیتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھائے۔ "اس جرم میں مجھے ہتھکڑی لگا کر لے چلیے۔"

ایک لمحے کے لئے اس کے ہونٹ بھنچ گئے پھر وہ بہت ہی دھیمے لہجے میں بولا۔ "لگتا ہے آپ کو کبھی نیشنل لیول کے کسی سیکیورٹی کے آدمی سے پالا نہیں پڑا۔ آپ کو شاید ان کے اختیارات کا بھی بالکل اندازہ نہیں۔"

"اندازہ کیوں نہیں ہے بیگ صاحب! مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے، اس ملک میں صرف شریف شہریوں کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ باقی سب کے پاس اختیارات ہی اختیارات ہیں.... اور سرکاری اہلکاروں کے اختیارات کا تو کہنا ہی کیا!" میں نے اپنے لہجے سے وہ زہر چھلکنے نہیں دیا جس کی تلخی ایک بار پھر میرے دل میں پھیل رہی تھی۔

"تو گویا میں سمجھ لوں کہ آپ مجھ سے تعاون کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں؟" اس نے گہری سانس لے کر کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لیا۔

"میں نے تو اپنے آپ کو سرتاپا آپ کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ اس سے زیادہ تعاون کیا ہو سکتا ہے؟ آپ ہی بتایئے۔" میں نے انکساری سے کہا۔

"آپ بہت پہنچی ہوئی چیز لگتے ہیں چوہدری صاحب! مجھے حیرت ہے کہ اب تک کہاں چھپے ہوئے تھے۔ آپ کو تو اب تک کسی نہ کسی ایجنسی کی نظر میں ہونا چاہئے تھا۔" وہ پُر خیال انداز میں سر سہلاتے ہوئے بولا۔ "لگتا ہے مجھے کسی نہ کسی ایجنسی کو آپ کے بارے میں تحقیقات کی ہدایت کرنی پڑے گی۔"

"بس جی.... یہ میری نالائقی ہے کہ آج تک کسی ایجنسی کی نظر میں کوئی مقام، کوئی اہمیت حاصل نہیں کر سکا۔ اب آپ آگئے ہیں تو آثار بتاتے ہیں کہ اس فدوی کے آگے پیچھے ایجنسیاں ہی ایجنسیاں ہوں گی۔" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے معصومیت سے کہا۔ "مجھے پتا تو نہیں چلا.... لیکن یقین سا ہو رہا ہے کہ اس وقت ضرور مجھے کسی پاگل کتے نے کاٹا تھا جب میں اپنی بے ہودہ سی کہانی لے کر منسٹر صاحب کے پاس چلا گیا تھا۔ شاید ایسے ہی موقعوں کے لئے وہ محاورہ ایجاد ہوا ہے.... آ بیل مجھے مار۔"

"آپ یہی سمجھ لیں۔ لیکن ابھی تو بیل نے آپ کو مارا نہیں۔" وہ بولا۔ "ابھی تو بیل نے آپ کی طرف صرف رخ کیا ہے۔"

"ارے نہیں صاحب! بیل نے ہماری طرف نہیں، ہم نے خود ہی بیل کی طرف رخ کر لیا تھا۔ زندگی میں یہ اس قسم کی پہلی غلطی تھی۔ آئندہ نہیں کریں گے۔" میں نے اسے یقین دلایا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کسے فون کرنے لگے ہیں آپ؟" اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"حفیظ صاحب کو۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ اس وقت آپ کو نہیں ملیں گے۔ گورنر صاحب کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "کیا کہنا تھا آپ کو ان سے؟"

"یہی.... کہ صاحب! ہم آپ کی محبت میں دوڑے دوڑے آپ کے پاس آگئے تھے۔ ہم سے غلطی ہوئی۔ ہم اپنی محبت واپس لے لیتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"اگر آپ کو میری پوچھ گچھ گراں گزر رہی ہے تو اس سلسلے میں ان سے بات کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ سیکیورٹی چیف کی حیثیت سے مجھے پورے اختیارات حاصل ہیں کہ میں جو کچھ ضروری سمجھوں وہ کروں۔" وہ اب بھی بظاہر رکھائی سے بات کر رہا تھا لیکن در حقیقت اس کے لہجے میں تبدیلی آچکی تھی۔ میرے لئے یہ سمجھنا دشوار نہیں تھا کہ منسٹر صاحب نے در حقیقت اسے صرف صورت حال سے آگاہ کیا تھا جو ان کے لئے واقعی ضروری تھا لیکن اکرام بیگ کا میرے پاس آنا اور اس طرح کا طرز عمل اختیار کرنا خالصتاً اس کا اپنا فعل تھا جس میں شاید اس کی اپنی کوئی مصلحت تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں منسٹر صاحب کو اس معاملے سے آگاہ کروں۔ میں نے بھی فی الحال اس پر زور نہیں دیا اور انہیں فون کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

کراچی سے شفیع شاہ کی فون پر اکرام بیگ سے خاصی دیر بات چیت رہی تھی اور شفیع نے اس کے بارے میں یہی رائے دی تھی کہ وہ اچھا آدمی ہے۔ شفیع شاہ عمر میں مجھ سے بڑا نہیں تھا لیکن انسانوں کو پرکھنے کا تجربہ اسے مجھ سے زیادہ تھا۔ میں کسی بھی شخص کے بارے میں اس کی رائے کو بڑا وزن دیتا تھا، خواہ شفیع شاہ کی اس سے محض ایک آدھ ملاقات ہوئی ہو یا اس نے مذکورہ شخص سے صرف فون پر ہی بات کی ہو۔ لیکن اکرام بیگ کے بارے میں نہ جانے کیوں میری رائے اس کی رائے سے مل نہیں پائی تھی۔ اس کی وجہ یقیناً خود اکرام بیگ ہی تھا۔ شفیع شاہ سے بات چیت کرتے وقت شاید حالات کچھ اور تھے۔ اس لئے اکرام بیگ کا انداز گفتگو بھی کچھ اور رہا ہوگا۔ منسٹر صاحب سے میری ملاقات کے بعد بات کچھ اور ہو گئی تھی۔ شاید اس لئے اکرام بیگ میں بھی کوئی تبدیلی آگئی تھی۔

تاہم میرے بارے میں شاید اس کے اندازے غلط ثابت ہوئے۔ وہ اب پلٹا سا کھاتے ہوئے ملائمت سے بولا۔ "آپ کو میری باتوں سے ناراض نہیں ہونا چاہئے چوہدری صاحب! آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ ہماری ذمے داریاں کتنی نازک ہوتی ہیں۔ ہمیں کسی طرح مختلف موقعوں پر مختلف طریقے اختیار کر کے لوگوں کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ ہم ان کی اصلیت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

اس کی بات میرے حلق سے نہیں اتر رہی تھی لیکن فی الحال میں نے اسے قبول کر لیا تاہم میں نے اپنے رویّے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آنے دی۔ میرے خیال میں ابھی خوش خلقی کا مظاہرہ کرنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں بدستور سپاٹ سے انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ جس کرسی پر وہ بیٹھا تھا وہ مخملیں گدیلی اور نہایت آرام دہ تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کچھ زیادہ آرام سے نہیں بیٹھا تھا۔ اس کی وجہ سمجھنا بھی میرے لئے دشوار نہیں تھا۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی قمیص تلے دونوں پہلوؤں میں چوڑی بیلٹ کے ساتھ دو ہولسٹر لگے ہوئے تھے جن میں غالباً لوڈیڈ ریوالور موجود تھے۔

وہ خاصی حد تک دوستانہ سے لہجے میں بولا۔ "مجھے اس پر حیرت ضرور ہے کہ منسٹر صاحب نے آپ کی کہانی پر یقین کر لیا حالانکہ آپ سے ان کی یہ پہلی ملاقات تھی اور آپ نے اپنی بات کا کوئی ثبوت بھی پیش نہیں کیا تھا۔"

"مسٹر بیگ!" میں نے بوجھل سے لہجے میں کہا۔ "یہی تو المیہ ہے کہ ہمارے ہاں جرم وقوع پذیر بھی ہو جاتا ہے..... مجرم فرار بھی ہو جاتا ہے اور ہم بیٹھے ثبوت کو ہی روتے رہتے ہیں۔ ثبوت کی تلاش میں ادھر اُدھر دوڑتے رہتے ہیں۔ بلکہ بعض اوقات تو مجرم بھی سامنے موجود ہوتا ہے اور ثبوت بھی، اس کے باوجود کچھ نہیں ہوتا۔ جبکہ میں ایک ایسے معاشرے کے خواب دیکھتا ہوں جس میں جرم کو وقوع پذیر ہونے سے پہلے ہی روکا جا سکے۔ لاشوں پر بیٹھ کر بیانات قلمبند کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے بیگ صاحب! اور یہ بات میں صرف وزیروں، سفیروں اور بڑی شخصیتوں ہی کے لئے نہیں کہہ رہا، تنگ و تاریک گلی کوچوں میں کیڑوں مکوڑوں کی طرح مارے جانے والے مفلوک الحال اور بے رسوخ لوگوں کے بارے میں بھی کہہ رہا ہوں۔"

وہ میز پر ذرا آگے کو جھک آیا تھا۔ ہونٹ نیم وا تھے۔ میں نے دھیمے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "کاش کوئی ایسا طریقہ ہو جائے کہ ہم لوگ جرم کی تفتیش کے علاوہ جرم کو روکنے اور اس کی پیش بندی کے بارے میں بھی کوئی نظام وضع کر سکیں۔ ہم صرف انتظار ہی نہ کیا کریں کہ کچھ ہو جائے تو پھر حرکت میں آئیں۔ کوئی واقعہ، کوئی سانحہ، کوئی المیہ جنم لے چکے تو پھر سب حسب مراتب اپنا اپنا اسکرپٹ یاد کر کے اسٹیج پر اپنا اپنا کردار ادا کرنے جائیں۔ بیانات داغنے والے بیانات داغیں اور غمزدگان کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں۔ محکموں والے خانہ پُری کریں، اپنی اپنی فائلوں کا پیٹ بھریں اور جان چھڑائیں۔ بے اختیار لوگ چپ کر کے سب کچھ دیکھتے رہیں، ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے رہیں، دل ہی دل میں کڑھتے رہیں اور گلشن کا کاروبار چلتا رہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی بیگ صاحب"

وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "جس نظام کے آپ خواب دیکھتے ہیں وہ تو امریکا میں بھی نہیں۔"

"معلوم نہیں ہم اکثر معاملات میں امریکا' انگلینڈ اور فرانس وغیرہ کو مثال کیوں بناتے ہیں۔ امریکا کوئی بہت اچھا ملک تو نہیں ہے۔ ہماری آئیڈیالوجی تو اس سے بھی بہتر ہونی چاہئے تھی۔ وہاں بس اتنا اطمینان ضرور ہے کہ آپ امیر ہیں یا غریب' آپ کے حقوق صرف زبانی کلامی نہیں' بلکہ عملی طور پر مساوی ہیں اور آپ کی شنوائی ہوجاتی ہے۔ لیکن انسانیت تو وہاں بھی کچھ زیادہ سکھ میں نہیں ہے۔"

وہ ایک بار پھر ہنس دیا جیسے کسی خواب پرست شاعر کی خیال آرائی سے محظوظ ہو رہا ہو۔ میں نے سنجیدگی سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں اپنا اور آپ کا قیمتی وقت ضائع کرتے ہوئے آپ کو ایک چھوٹا سا واقعہ سناتا ہوں۔ شاید آپ کو میری بات سمجھنے میں آسانی ہو۔ پچھلے دنوں میں نیویارک میں تھا۔ ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا۔ شام ڈھلے ذرا فرصت میسر آئی تو فٹ پاتھ پر چہل قدمی کرنے نکل کھڑا ہوا۔ ہوٹل سے خاصی دور نکل گیا جہاں زیادہ رونق نہیں تھی۔ زرافے کی طرح لمبے اور سوکھے سے ایک امریکی نے مجھے دیکھا اور شاید سوچا کہ سوٹ وغیرہ تو قیمتی پہنا ہوا ہے' آدمی خوشحال ہوگا۔ شاید اس نے یہ بھی سوچا ہو کہ ایشیائی نظر آتا ہے' یقیناً گدھا ہوگا۔ لپک کر میرے قریب آیا اور چھوٹا سا' گندا سا ایک مجسمہ میرے ہاتھ دس ڈالر میں فروخت کرنے پر تل گیا جو بقول اس کے' ہاتھی دانت کا تھا۔ حالانکہ ایک اندھا بھی اسے دیکھ کر بتا سکتا تھا کہ وہ سفید پلاسٹک کا تھا۔

وہ مُصر تھا کہ میں اس سے مجسمہ ضرور خریدوں۔ ساتھ ساتھ وہ مجھے اپنی پھٹی ہوئی جینز کی جیب سے کھٹکے دار چاقو کی جھلک بھی دکھائے جا رہا تھا۔ اگر وہ ہمارے ہاں کے ڈھیٹ مگر مسکین فقیروں کی طرح کوئی داستانِ غم' خواہ جھوٹی ہی سہی' سنا کر عاجزی سے دس ڈالر مانگتا تو شاید میں اسے دے دیتا۔ یہ کوئی بڑی رقم نہیں تھی۔ مجھے خوشی ہوتی کہ چلو ہم نے "ایڈ" لیتے لیتے آج کسی امریکی کو "ایڈ" دے ڈالی ہے۔ لیکن وہ بدبخت مجھ سے جگا ٹیکس وصول کرنے کی فکر میں تھا۔ ایسی باتوں پر ہم جیسے پینڈو کی بھی کبھی کھوپڑی گھوم جاتی ہے۔ پھر بھی میں نے زیادہ غصے کا مظاہرہ نہیں کیا۔ وہ زیادہ ہی سر پر چڑھنے لگا تو میں نے اسے ہلکا سا دھکا دیا۔ اسے شاید اپنے لمبے چوڑے ڈھانچے پر بہت ناز تھا۔ اسی لئے وہ میرا قد کاٹھ دیکھنے کے باوجود مجھ پر چڑھا آ رہا تھا۔ ہلکے سے ایک دھکے میں وہ قلابازی کھا کر کوئی آٹھ دس فٹ دور جا گرا۔

ایک پولیس والا جو کہیں دور کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا' لپک کر قریب آیا۔ وہ امریکی غنڈہ تو پولیس والے کو دیکھ کر کھسک گیا۔ پولیس والا مجھے سمجھانے لگا کہ مجھے ہوشیار رہنا چاہئے' اس قسم کے آوارہ گردوں سے نہیں الجھنا چاہئے' میری کسی غلطی سے مجھے نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے اسے بھی تھوڑی سی جھاڑ پلائی کہ تمہارا قانون اچھا ہے جو بدمعاش کو تو لگام نہیں دیتا' اسے تو نہیں سمجھاتا کہ وہ ایک شریف آدمی کے ساتھ غنڈہ گردی نہ کرے۔ لیکن ایک شریف آدمی کو سمجھاتا ہے کہ اسے کیا کیا احتیاط کرنی چاہئے۔

وہاں کے ہوٹلوں میں بھی آپ نے دیکھا ہوگا.... لمبے چوڑے ہدایت نامے آویزاں رہتے ہیں۔ فلاں وقت باہر نکلئے' فلاں وقت مت نکلئے' نقد رقم ساتھ مت رکھئے' یہ کیجئے' وہ مت کیجئے۔ خیر جی.... میری تقریر کے جواب میں وہ پولیس والے صاحب فرمانے لگے کہ وہ بغیر ثبوت کے' کسی کے خلاف بھی کوئی کارروائی نہیں کرسکتے۔ حتیٰ کہ اس لمبو کو سرِعام غنڈہ بھی نہیں کہہ سکتے۔

میں نے کہا' وہ زبردستی لوگوں کو کوئی گھٹیا سی چیز مہنگے داموں خریدنے پر مجبور کرتا ہے' غالباً یہی اس کا پیشہ ہے۔ پولیس والا بولا' چیزیں بیچنا کوئی جرم نہیں ہے' آپ بے شک مت خریدیں۔ میں نے کہا' وہ جیب میں کھٹکے والا چاقو لئے پھرتا ہے۔ پولیس والا بولا' ہمارے ہاں چاقو جیب میں لئے پھرنا کوئی جرم نہیں۔ جرم تب ہوگا جب وہ اسے کسی ممنوعہ کام میں استعمال کرے گا۔ میں نے کہا' یہ تو بہت اچھا ہے کہ جب کسی کی آنتیں باہر آجائیں تب تمہاری تفتیش شروع ہو۔ وہ امریکیوں والے مخصوص انداز میں کندھے اچکا کر بولا' کیا کریں...... مجبوری ہے' ہر شہری کے کچھ حقوق ہیں۔ عدالتیں ہر بات کا ثبوت مانگتی ہیں۔ میں نے ان کے عظیم قوانین پر اسے خراجِ تحسین پیش کیا اور ہوٹل واپس آنے کے لئے مڑ گیا۔

تب اس نے گویا صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں بتایا کہ وہ کئی بار اس نوجوان کو "رنگے" ہاتھوں پکڑنے کے لئے آچکا ہے مگر جونہی وہ اس کی طرف لپکتا ہے' نوجوان اپنا چاقو کسی گٹر وغیرہ میں پھینک دیتا ہے۔ جب تک اس کے پاس سے کچھ برآمد ہی نہ ہو اور نہ اس بات کا کوئی گواہ ہو کہ وہ راہ گیروں کو ڈراتا دھمکاتا ہے تب تک اس کے خلاف قانونی کارروائی نہیں کی جاسکتی۔ ان تمامتر "سہولتوں" کے باوجود وہ موصوف دو تین مرتبہ سزا کاٹ چکے تھے۔ آپ سوچیں کہ وہ کیسی سنگین حد تک آگے بڑھا ہوگا جب امریکی قانون کے محافظوں نے اسے جیل جانے کی "زحمت" دی ہوگی۔

بہرحال میں ہوٹل واپس آگیا۔ دوسرے دن میں اندھیرا پھیلنے پر جان بوجھ کر اس سڑک پر چہل قدمی کے لئے نکلا۔ وہ بدبخت بانس کا بچہ اپنے گشت پر موجود تھا البتہ پولیس کی گاڑی اس روز نظر نہیں آرہی تھی۔ آپ اس شخص کی ڈھٹائی دیکھئے کہ میرے ساتھ چلتے چلتے اس نے قدرے پردہ داری سے چاقو کی نوک میری پسلیوں پر ٹکا دی اور غرا کر مجھے بتانے لگا کہ کل میں نے اس کے ساتھ بڑی بدتمیزی کی تھی اس لئے آج مجھے بیس ڈالر میں اس سے مجسمہ لینا پڑے گا۔ گویا دس ڈالر مجسمے کے اور دس ڈالر بدتمیزی کا ہرجانہ۔

میں نے اسے بتایا کہ میں بیس کے بجائے پچاس ڈالر اس کی خدمت میں پیش کردوں گا بشرطیکہ وہ مجھے تھوڑی سی کوکین خود دے دے یا کسی اور سے دلا دے۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ سمجھ گیا کہ میں اصل میں کسی اور لائن کا آدمی ہوں۔ میں اسے باتوں میں لگا کر ایک گندی گلی میں لے گیا جہاں کوئی نہیں تھا۔ اس کا چاقو وغیرہ سب دھرا رہ گیا۔ میں نے اس کی تسلی بخش قسم کی پٹائی کی۔ ناک منہ توڑ دیا اور مار مار کر بے ہوش کردیا۔ اسے گلی میں پڑا چھوڑ کر ہوٹل میں واپس آگیا۔

آدھی رات کو اسے اسپتال میں کہیں ہوش آیا ہوگا۔ اس کے ایک آدھ گھنٹے بعد پولیس ہوٹل میں میرے پاس آن پہنچی۔ وہ مجھے پوچھ گچھ کے لئے پولیس اسٹیشن لے گئے۔ میں نے پہلے ہی ایک دھانسو قسم کے وکیل کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ ادھر اسے فون کیا' اُدھر وہ حاضر۔ وہ بانڈ بھر کر مجھے ضمانت پر اسی وقت رہا کرا کے لے گیا۔ شام کو ہم جج صاحب کے سامنے پیش ہوئے۔ مدعی کے اپنے دعوے کے سوا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ میں نے اسے اس بُری طرح مارا تھا۔ میرے جسم پر خراش تک نہیں تھی۔ وہ پولیس والا بھی عدالت میں موجود تھا جس نے گزشتہ روز مجھے نصیحت کی تھی۔ صرف اسے ہی نہیں' جج کو بھی یقین تھا کہ میں نے اس بدمعاش کی ٹھکائی کی ہے لیکن اسے ثابت نہیں کیا۔ چند منٹ کی بحث کے بعد مابدولت باعزت بری ہوگئے۔

اسٹینو لڑکی نے جب باعزت بری کئے جانے کا حکم نامہ ٹائپ کرکے مجھے تھمایا تو میں نے جج صاحب سے کہا۔ "سر! مجھے آپ کا نظامِ انصاف بہت پسند آیا۔ یہ 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کی سچی اور صحیح تصویر پیش کرتا ہے۔"

اس پر جج صاحب برا مناگئے حالانکہ اس سے پہلے وہ زیرِلب مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے "عدالت کا احترام ملحوظِ خاطر نہ رکھنے" کے جرم میں مجھ پر دو ڈالر جرمانہ عائد کردیا۔ جرمانہ بہ خوشی ادا کرتے وقت بھی میں خاموش نہ رہا۔ میں نے کہا۔ "سر! مجھے آپ کا نرخ نامہ بھی بہت پسند آیا۔ دو ڈالر میں انسان کو دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع مل جائے تو سودا برا نہیں ہے۔" میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جھول وہاں کے نظام میں بھی موجود ہے۔ وہاں بہت سی اچھائیاں بھی موجود ہیں مگر وہ ہماری تہذیب و تاریخ میں ان سے پہلے موجود تھیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم ان سے محروم ہوگئے اور دوسری قوموں نے انہیں اپنا لیا۔"

میں خاموش ہوا تو اکرام بیگ علامتی طور پر خاموش تالی بجا کر مجھے داد دیتے ہوئے بولا۔ "چوہدری صاحب! آپ کے پاس اپنی سوچ اور آئیڈیالوجی بھی ہے۔ پیسہ بھی ہے۔ آپ یقیناً تقریر بھی اچھی کرسکتے ہیں۔ آپ کو تو سیاست میں حصہ لینا چاہئے۔ آپ بہت جلد آگے آجائیں گے۔"

"خدا نہ کرے کہ میں سیاست میں حصہ لوں۔" میں نے کہا۔ "ہمارے ہاں تو سیاست کا مفہوم ہی بدل دیا گیا ہے۔ جب کوئی ہمارے ساتھ دھوکا اور فریب کر جاتا ہے' ہمیں چکر دے جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ فلاں ہمارے ساتھ بڑی سیاست کھیل گیا۔ حالانکہ سیاست کا یہ مطلب' یہ معنی تو ہرگز نہیں تھے۔ یہ تو ہم نے اسے دیئے ہیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "میری اس گفتگو کا مقصد اپنے آپ کو سیاست کا اہل ثابت کرنا نہیں تھا۔ میں تو آپ کو یہ بتانا چاہ رہا تھا کہ اس طرح کے ملک میرا آئیڈیل نہیں ہیں۔ ملک اور معاشرے صرف اونچی اونچی عمارتوں' عالیشان سڑکوں' لمبی لمبی چمکتی دمکتی گاڑیوں اور رنگارنگ روشنیوں سے ہی نہیں بنتے۔ یہ چیزیں ہوں تو بہت اچھا ہے۔ لیکن ان سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ وہاں انسانیت کتنے دکھ سکھ میں ہے۔ اور جب ہم انسانیت کے سکھ میں ہونے کی بات کرتے ہیں تو اس میں نہ جانے کیا کچھ آجاتا ہے۔"

"بے شک۔ یہ تو آپ نے 'ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں' والی بات کردی۔" اکرام بیگ مسکرایا۔

"ایسا ملک میرا آئیڈیل نہیں ہوسکتا جہاں آدھی حکمرانی مافیا کی ہے۔ جہاں ایک طرف اتنی بڑی بڑی کمپنیاں ہیں جن کے بجٹ بیسیوں ملکوں کے بجٹ سے بڑے ہیں اور دوسری طرف اسّی اسّی سال کی بوڑھی عورتیں اور مرد غضب کی سردی میں فٹ پاتھوں کی بینچوں تلے اپنے جسم پر اخبار لپیٹ کر سوتے ہیں۔ ایسے ہی اور نہ جانے کتنے تضادات ہیں جو دنیا کے بیشتر ملکوں کو میرا آئیڈیل نہیں بننے دیتے۔"

"یہ ان ملکوں کی بدقسمتی ہے۔" اکرام بیگ نے اپنی دانست میں طنز کیا۔

"نہیں۔ بدقسمتی تو یہ میری ہے۔ یا پھر شاید یہ انسانیت کی بدقسمتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"بات بہت دور چلی گئی...." اس نے گویا مجھے اصلی موضوع یاد دلانے کی کوشش کی جس کی طرف میں آنا نہیں چاہتا تھا۔

"ارے صاحب! آپ تو "بات" کی بات کر رہے ہیں' آپ جیسے لوگوں سے بات کرتے وقت تو بعض اوقات میں خود بہت دور چلا جاتا ہوں۔ جسم یہاں ہوتا ہے لیکن ذہن نہ جانے کہاں پہنچ جاتا ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ میرے الفاظ پر توجہ دیئے بغیر بولا۔ "مجھے پتا چلا ہے کہ آپ اور نذیر خان بھی منسٹر صاحب کی ڈنر پارٹی میں شرکت کر رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ ارادہ تو ہے۔ منسٹر صاحب نے ازراہِ کرم ہمیں بھی مدعو کرلیا ہے ورنہ یہ تو خالصتاً ڈپلومیٹک ڈنر تھا۔ صرف ڈپلومیٹک اور چند دوسرے خاص الخاص لوگ ہی وہاں مدعو تھے۔ غالباً سیمینار کے انداز میں کچھ تقریریں بھی ہونی ہیں۔ آپ کے پاس مہمانوں کی جو

فہرست ہوگی اس میں مجھ جیسے یا نذیر خان جیسے کسی آدمی کا نام ہرگز نہیں ہوگا۔"

"اب تو آپ بھی خاص آدمی ہی ہوگئے نا جی!" ایک بار پھر اس کا لہجہ نیم طنزیہ سا ہوگیا۔ "منسٹر صاحب نے مجھے آپ دونوں کے نام دے دئے ہیں۔ میں جو اصل بات معلوم کرنے کے لئے آپ کے پاس آیا تھا وہ یہ تھی کہ آپ کا وہاں کیا کرنے کا ارادہ ہے؟ میرا مطلب ہے.... اگر واقعی کوئی سازش ہو رہی ہے تو آپ اسے کیسے روکیں گے؟"

"یہ بات اگر آپ شروع میں ہی اسی طرح سیدھے سادے انداز میں پوچھ لیتے تو آپ کی جان مجھ سے اسی وقت چھوٹ جاتی۔ آپ کو میری تقریر نہ سننی پڑتی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بات صرف اتنی ہے کہ مجھے خود نہیں معلوم' میں کیسے اس سازش کو روکوں گا۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہ گیا۔ دل ہی دل میں یقیناً پیچ و تاب کھا رہا تھا لیکن اب وہ سمجھ گیا تھا کہ ردِّعمل ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس لئے بظاہر پُرسکون بیٹھا تھا۔

"تو پھر ایک بات ضرور ذہن میں رکھئے گا...." آخر کار وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "کوئی ایسی حرکت مت کیجئے گا جو ہم سیکیورٹی والوں کے لئے' منسٹر صاحب کے لئے.... یا خود آپ کے لئے شرمندگی کا باعث بن جائے۔"

"اپنی دانست میں تو ہم تینوں فریقوں کو شرمندگی سے بچانے ہی کی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آپ کو جس ذریعے سے اس معاملے کی خبر ملی ہے' کیا وہ اس سے پہلے بھی اس نوعیت کی اطلاعات فراہم کرتا رہا ہے؟" اب وہ دوستانہ لہجے میں بات کر رہا تھا۔

"نہیں۔ وہ کوئی پرانا یا پیشہ ور مخبر نہیں ہے۔ یہ اس کی پہلی اطلاع ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"حیرت ہے! آپ اس کی پہلی اطلاع پر ہی اس طرح آنکھیں بند کر کے یقین کر رہے ہیں۔" وہ سر کو خفیف سا جھٹکا دے کر بولا۔

"بعض باتوں کو انسان ثابت نہیں کر سکتا' صرف محسوس کر سکتا ہے۔ بیشتر پولیس والوں کے پاس محسوسات کی کمی ہوتی ہے۔ وہ صرف دو اور دو چار کے فارمولے پر سوچتے ہیں اور اسی فارمولے پر تفتیش کرتے ہیں۔ اسی لئے ہمارے ہاں تفتیش کا حال زیادہ خراب ہے۔ آپ کی بنیادی تربیت بھی چونکہ پولیس والی ہے اس لئے آپ کو میری بات پر یقین کرنا دشوار ہی محسوس ہوگا۔"

"چوہدری صاحب! ہو سکتا ہے میرے بارے میں آپ کے تمام اندازے غلط ثابت ہو جائیں۔" وہ پُرخیال سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "لیکن فی الحال میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا۔ اب چونکہ آپ اس معاملے میں کود ہی پڑے ہیں اس لئے بہتر ہے کہ ہم اس کے بارے میں تھوڑا سا تبادلۂ خیال کر لیں تاکہ ہم کچھ اندازے قائم کر سکیں کہ خطرہ کس موقعے پر ہو سکتا ہے اور کہاں ہمیں ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت پڑ سکتی ہے...."

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ لگے بندھے انداز میں اپنے حفاظتی اقدامات کی منصوبہ بندی کرنا چاہ رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہوٹل میں اپنے سوئٹ میں پہنچنے کے بعد منسٹر صاحب تقریب کے وقت تک کہیں نہیں جائیں گے۔ اپنے سوئٹ میں ہی رہیں گے۔ اس آخری وقت میں وہ اپنے پریس ایڈوائزر اور ان چار آدمیوں کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہوں گے جو انہیں تقریریں لکھ کر دیتے ہیں۔ اس آخری مرحلے میں یہ میٹنگ رکھنے اور پہلے سے تیار شدہ تقریر میں کچھ ردّوبدل کرانے میں منسٹر صاحب کی کوئی مصلحت ہے جس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔ کوئی رازداری کا مسئلہ ہوگا۔ وہ نہیں چاہتے ہوں گے کہ وقت سے پہلے پریس میں یا سفارتی حلقوں میں کوئی ایسی بات آجائے جسے وہ کسی خاص وقت پر بیان کرنا چاہتے ہوں۔"

"آپ کا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔" میں نے تائید کی۔ "منسٹر صاحب کے پورے پروگرام میں وقت کے تعین کی بہت اہمیت نظر آرہی ہے۔ ہر کام وہ ایک خاص اور لگے بندھے انداز میں کسی مخصوص جگہ پر کرنا چاہتے ہیں۔ اس تقریب کے فوراً ہی بعد انہیں مشرقِ وسطیٰ بھی روانہ ہونا ہے۔ یہ سب باتیں زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے جڑی ہوئی ہیں۔"

"جی ہاں۔" اس نے سر ہلایا۔ "منسٹر صاحب جس فلور پر ٹھہریں گے' زیادہ تر غیر ملکی سفارت کار وغیرہ بھی اسی فلور پر مقیم ہوں گے لیکن تقریب میں شرکت کے لئے منسٹر صاحب اس فلور سے' ان لوگوں میں سے کسی کے ساتھ ہال کی طرف روانہ نہیں ہوں گے۔ وہ مجھ سمیت سیکیورٹی کے چار آدمیوں کے ساتھ لفٹ کے ذریعے ہال کی طرف روانہ ہوں گے۔ آخری منٹ پر بھی لفٹ کو چیک کیا جائے گا۔ ہوٹل سیکیورٹی والے' راستوں' راہداریوں اور گملوں وغیرہ کو چیک کرنے کے ذمے دار ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ یہ مجھے معلوم ہے۔" میں نے سر ہلایا۔

وہ کوئی رٹا ہوا سبق دہرانے کے انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "مہمانوں کو ان کی آمد کا اس وقت تک پتا نہیں چلے گا جب تک وہ ہیڈ ٹیبل پر نہیں پہنچ جائیں گے۔ ہال کے دروازے سے سیڑھیوں اور لفٹ تک ہمارے آدمیوں کے علاوہ ہوٹل سیکیورٹی کے بھی چند لوگ تعینات ہوں گے۔ آپ کے آدمی شفیع شاہ نے مجھے فون پر بتایا ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں کے فائیو اسٹار ہوٹلوں کی طرح آپ کے ہوٹل میں بھی سیکیورٹی کا باقاعدہ عملہ رکھا گیا ہے جس کے انچارج کا نام داؤد چوہدری ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ کوئی خاص ضرورت پڑنے پر اس عملے میں اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ انہی انتظامات کی وجہ سے ہم نے آپ کے ہوٹل کو زیادہ پسند کیا تھا۔ فارن منسٹر صاحب دس خاص خاص مہمانوں کے ساتھ ہیڈ

ٹیبل پر ہوں گے۔ یہ سب مہمان ایک قطار میں بیٹھے ہوں گے۔ میز کے دوسری طرف کوئی نہیں ہوگا بلکہ سامنے دوسری گول میزوں پر مہمان ہوں گے۔ منسٹر صاحب ہیڈ ٹیبل ہی پر اپنی نشست سے اٹھ کر تقریر کریں گے۔ ان کے پیچھے ویٹر اور سیکیورٹی کے لوگ ہوں گے۔ ہال میں موجود تمام لوگوں پر ان کی نظر ہوگی۔"

"ویٹروں پر بھی؟" میں نے پوچھا۔

"ویٹروں کی ذمے داری ہوٹل سیکیورٹی والوں کی ہے۔ داؤد چوہدری نے مجھے بتایا ہے کہ سب بھروسے کے آدمی ہیں۔ جب سے انہیں ملازم رکھا گیا ہے تب سے ہر ایک کی مکمل فائل ہوٹل کے آفس میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ سرو کرنے کے لئے اس ہال اور کچن کی حدود میں داخل ہوں گے تو ان کی تلاشی لی جائے گی اور اس کے بعد وہ تقریب کے اختتام تک اس طرح نظر میں رہیں گے کہ انہیں باہر کا کوئی بھی شخص کوئی چیز نہ دے سکے۔"

میں سیکیورٹی کے اس قدر انتظامات پر دل ہی دل میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ معلوم نہیں منسٹر صاحب کے لئے ہمیشہ ہی اتنے انتظامات ہوتے تھے یا آج کل کوئی خصوصی معاملہ تھا۔ میں اس سلسلے میں اکرام بیگ سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ بولا۔ "صرف فارن منسٹر صاحب کے لئے اتنی سیکیورٹی ہوتی ہے۔ دوسرے مرکزی وزیروں کے لئے نہیں۔ ویسے آپ کا یہ شبہ بھی درست ہے کہ آج کل کچھ خصوصی حالات چل رہے ہیں۔ ہمیں اوپر سے آرڈر ملے ہیں کہ ملک کی کچھ ایسی شخصیات کے لئے سیکیورٹی مزید ٹائٹ کر دیں جن کا تعلق بین الاقوامی معاملات سے ہے۔"

"اس کا مطلب ہے پرائم منسٹر اور پریزیڈنٹ کے لئے تو سیکیورٹی اس سے زیادہ ہوتی ہوگی؟" میں نے پوچھا۔

"کہیں زیادہ۔" اکرام بیگ نے جواب دیا۔ "اس کا تو آپ تصور نہیں کر سکتے۔"

"لیکن مسئلہ یہ ہے...." میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ "کہ یہ سب انتظامات روایتی ہیں جو ہمیشہ سے ہوتے آئے ہیں۔ یہ انتظامات صرف قاتلانہ حملے سے بچاؤ کے لئے کئے جاتے ہیں۔"

"ہاں۔ جبکہ آپ کو قاتلانہ حملے کا اندیشہ نہیں ہے۔" اکرام بیگ نے سر ہلایا۔ "مجھے منسٹر صاحب نے بتایا تھا کہ آپ کے خیال میں انہیں زہر دینے کی بھی کوشش کی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ ڈنر گو کہ بوفے نہیں ہے۔ ہر شخص کو اس کی میز پر ہی سرو کیا جائے گا۔ لیکن ظاہر ہے' بیشتر چیزیں کچن سے بڑی بڑی ڈشوں میں ہی آئیں گی۔ ویسے بھی ایک ایک ڈش سے کھانے کی چیز کئی کئی افراد لیتے ہیں۔ جو چیزیں پلیٹوں میں آئیں گی وہ بھی ویٹر کچن سے اس طرح لے کر چلیں گے کہ ہر ایک ٹرے میں کئی کئی پلیٹیں ہوں گی۔ اب یہ تو ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی پلیٹ منسٹر صاحب کے سامنے جائے گی۔ پانی کی بوتلوں اور دیگر مشروبات کا بھی یہی معاملہ ہوگا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ منسٹر صاحب کس بوتل میں سے پانی یا مشروب لیں گے یا کس برتن میں سے ان کے لئے چائے وغیرہ بنے گی۔"

"ان باتوں سے گویا آپ کو ضمانت مل جاتی ہے کہ تقریب میں کچھ نہیں ہوگا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ خود ہی ہمارے بارے میں کہہ چکے ہیں کہ ہم محسوسات پر بھروسا کرنے والے لوگ نہیں ہیں۔ اس لئے ہم تو دو اور دو چار والی بات ہی کریں گے۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی بے پروائی تھی جس پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جس پوزیشن پر تھا وہاں وہ ہلکی سی بے پروائی کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

"لیکن میرے محسوسات کہہ رہے ہیں کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے جسے روکنے کی اگر ہم نے تدبیر نہ کی تو وہ ضرور ہو کر رہے گا۔" میں نے کہا۔ "اب یہ منطق اور احساس کا معاملہ ہے۔ دیکھیں اس دوڑ میں کون جیتتا ہے۔"

اکرام بیگ اب ذرا مضطربانہ انداز میں پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "آپ کا مطلب ہے کہ منسٹر صاحب کی کسی پلیٹ میں زہر ڈالا جائے گا؟ لیکن کچن میں سیکیورٹی کے ایک آدمی کی ڈیوٹی خاص طور پر اس کام کے لئے لگائی گئی ہے کہ وہ نہ صرف دھیان رکھے کہ کسی پلیٹ میں کوئی مشکوک چیز تو نہیں ڈالی جا رہی' بلکہ وہ اگر کسی کو یہ کہتے سُنے کہ فلاں پلیٹ منسٹر صاحب کے لئے ہے تب بھی وہ فوری طور پر مجھے یا داؤد چوہدری کو رپورٹ کرے۔ یعنی اگر کسی پلیٹ کے بارے میں خاص طور پر کوشش کی گئی کہ وہ منسٹر صاحب کے سامنے ہی جائے تو اس کے بارے میں ہمیں فوراً معلوم ہو جائے گا۔ پلیٹ میز تک پہنچنے سے پہلے۔"

"میرا خیال ہے کچن میں ایسی حرکت نہیں کی جائے گی۔" میں نے کہا۔

"کچن سے ہال تک کے راستے میں بھی نگرانی کا یہی عالم ہوگا۔"

"میرا خیال ہے راستے میں بھی کوئی ایسی حماقت نہیں کرے گا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

وہ گویا زچ ہو کر بولا۔ "تو پھر کیا کوئی ہال میں ہی آکر منسٹر صاحب کے سامنے کھڑے ہو کر دست بستہ عرض کرے گا؟ جناب! ذرا منہ کھول لیجئے! مجھے آپ کی زبان پر زہر ٹپکانا ہے۔' آپ کے خیال میں کیا یہی طریقہ اختیار کیا جائے گا؟"

"نہیں۔ میرے خیال میں یہ بھی مجرموں کی نظر میں کوئی مناسب طریقہ نہیں ہوگا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"دیکھیں چوہدری صاحب! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے اور نہ ہی میں اور آپ مذاق کی پوزیشن میں ہیں۔" وہ گویا اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔

"مجھ پہ جو سوال جتنی سنجیدگی سے کیا جا رہا ہے اتنی ہی سنجیدگی سے میں جواب دے رہا ہوں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اچھا.... تو آپ کے خیال میں اس وقت منسٹر صاحب کے کھانے میں زہر ڈالنے کی کوشش کی جائے گی جب پلیٹیں ان کے سامنے رکھی جا چکی ہوں گی؟ اس وقت میں اور داؤد چوہدری خود ہال میں موجود ہوں گے۔ منسٹر صاحب کی پلیٹوں اور ویٹروں وغیرہ کی حرکات و سکنات پر ہماری نظر ہوگی۔"

"شاید اس وقت بھی ایسی کوئی حرکت نہ کی جائے۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا۔

"تو پھر آخر آپ کے ذہن میں کیا تھیوری ہے جس پر سازشی لوگ عمل کریں گے؟" اب اس نے اپنا لہجہ ہموار رکھا۔ جزجزاہٹ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ویسے وہ میرے خیال میں اندر ہی اندر سلگ رہا تھا۔

"کاش میں آپ کے سوال کا جواب دے سکتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "محسوسات پر بھروسا کرنے میں یہی تو مشکل ہے۔ محسوسات' انسان کو کسی معاملے میں اشارہ تو دے دیتے ہیں لیکن وہ پوری نقشہ کشی نہیں کرتے۔ مکمل ہدایت نامہ تیار کرکے نہیں دیتے۔"

"تو پھر میرے خیال میں آپ کو خواہ مخواہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "آپ بالکل مطمئن اور بے فکر ہو جائیں۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ اس معاملے میں نہ ہی پڑیں تو اچھا ہے۔ آپ خواہ مخواہ کراچی جانے کی زحمت نہ کریں۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "یہ مت سمجھئے گا کہ میں آپ کے محسوسات کی "کارکردگی" کو تسلیم نہیں کر رہا۔ ہو سکتا ہے دوسرے بہت سے معاملات میں آپ کے محسوسات آپ کی درست رہنمائی کرتے ہوں۔ میں بہر حال آپ کے محسوسات کو سلام کرتا ہوں۔" اس نے ہوا میں دیکھتے ہوئے ایڑیاں ملا کر کسی نادیدہ چیز کو باقاعدہ سیلوٹ کیا اور تیزی سے گھوم کر رخصت ہو گیا۔ اس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا تھا۔

میں کچھ دیر اس کے بارے میں سوچتا رہا پھر فائلوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ فائلیں دیکھتے ہوئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ کیتھرین نے بتایا' شام چھ بجے کی فلائٹ پر فرسٹ کلاس میں میرے اور نذیر خان کے لئے دو سیٹوں کا انتظام ہو گیا ہے۔ میں نے کیتھرین ہی کے ذریعے نذیر خان کو مطلع کرا دیا کہ وہ پانچ بجے ائرپورٹ پر پہنچ جائے۔

****

فلائٹ لاہور سے بالکل صحیح وقت پر روانہ ہوئی۔ ٹھیک ساڑھے سات بجے ہم کراچی ائرپورٹ پر اتر چکے تھے۔ شفیع شاہ نے ہمیں لینے کے لئے گاڑی بھیجی ہوئی تھی۔ میں نے نذیر خان کو اپنے ہوٹل کے سامنے اتار دیا۔ میں نے اس کے قیام کا انتظام وہیں کرایا ہوا تھا۔

وہ آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر اس بلند و بالا نئی اور چمکتی دمکتی خوبصورت عمارت کا سرسری جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "ہوٹل تو بہت خوبصورت بنایا ہے سر جی!"

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں نذیر بھائی!" میں نے گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی کہا۔ "میں نے تو بس ایک خواب دیکھا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح اس کی تعبیر کے اسباب پیدا ہوتے چلے گئے۔ پھر ایک روز میں کراچی آیا تو میرے خواب کی یہ تعبیر یہاں سر اٹھائے کھڑی تھی۔ بس یہ قسمت کا کچھ کمال ہے۔ اوپر والے کی مہربانی ہے۔ ورنہ آپ کو معلوم ہے خواب تو سبھی دیکھتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ بعض اوقات تو آدمی خواب دیکھ کر پچھتاتا ہے۔" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "تعبیر بالکل الٹی نکل آتی ہے۔"

"اچھا.... میں اب چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میرا کچھ پتہ نہیں' آج رات واپس آؤں یا نہیں۔ شاید آپ سے کل ہی ملاقات ہو۔ ویسے ہوٹل کی انتظامیہ نے از راہِ مہربانی مجھے آپ کے برابر والا کمرا دے دیا ہے۔ منسٹر صاحب ہم سے اوپر والے فلور پر ٹھہریں گے۔"

"ہوٹل کی انتظامیہ ....؟" نذیر خان نے مسکراتے ہوئے دہرایا۔ "آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے وہ آپ کے ملازم نہ ہوں' جیسے آپ ہوٹل کے مالک ہی نہ ہوں۔"

"بھئی ہوٹل کا مالک تو میں ہوں۔ لیکن وہ لوگ مرضی کے مالک ہیں۔ بڑی آزاد طبیعت پائی ہے انہوں نے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ہوٹل کے ڈسپلن میں وہ لوگ مجھے بھی دخل نہیں دینے دیتے۔ کہتے ہیں' اگر ہوٹل چلانا ہے تو ہمیں اپنی مرضی سے چلانے دیجئے۔ آپ نے ہوٹل بنوایا ہے' آپ کا کام ہو گیا۔ اب اسے چلانا ہمارا کام ہے۔ میں بھی سوچتا ہوں' اچھا ہے۔ ہوٹل درد سری قسم کا بزنس ہے لیکن میرے لئے یہ واحد پروجیکٹ رہا ہے جس میں مجھے خود کوئی زحمت نہیں اٹھانا پڑی۔"

"کمال ہے!" نذیر خان نے قدرے تعجب سے سر ہلایا۔ "آپ کی خوش نصیبی میں واقعی کوئی شک نہیں۔ ورنہ لوگوں کو کہتے سنا ہے کہ روپیہ ہر مسئلے کا حل نہیں ہے۔ جس کام پر بھی خود توجہ نہ دو اس کا بیڑا غرق ہو جاتا ہے' خواہ کتنے ہی بھروسے کے آدمی ہوں۔"

"آپ تو اب یہاں قیام کر رہے ہیں۔ آپ خود ہی دیکھ لیں گے۔ میرا تو اس کو چلانے میں اتنا بھی عمل دخل نہیں ہے جتنا کسی مہمان کا ہو سکتا ہے۔ مجھ سے زیادہ تو یہاں قیام کرنے والے اپنی مرضی اور مشورے چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

اتنی دیر میں ایک پورٹر نے آکر نذیر خان کا سامان اٹھا لیا۔ میں نے ڈرائیور کو بھی وہیں اتار دیا اور خود گاڑی لے کلفٹن کی طرف روانہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد میں ایک بار پھر اس فلیٹ کے سامنے کھڑا تھا جس کے بند دروازے کے پیچھے میری محبت کی کھلی کتاب رہتی تھی۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں نے اس کتاب محبت کے اب تک جتنے ورق پلٹے تھے ان سے میں اس کا صحیح مفہوم سمجھ پایا تھا یا نہیں؟ لیکن بس میں اس کتاب کا اسیر تھا۔ گھوم پھر کر اسی کے پاس واپس آنے کو دل چاہتا تھا۔

دروازے پر چسپاں رنگین کارٹون اب بدل چکا تھا۔ اب ایک بچی درخت کی ذرا اونچی شاخ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑے لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے بال ہوا میں لہراتے دکھائے گئے تھے۔ وہ پھٹی پھٹی گول آنکھوں سے زمین کی طرف دیکھ رہی تھی' گویا چھلانگ لگا کر زمین پر آنا چاہتی ہو مگر اس کی ہمت نہ پڑ رہی ہو۔ نیچے ویسا ہی ایک معصوم سا بچہ دونوں بازو پھیلائے کھڑا تھا' گویا بچی کی ہمت بڑھا رہا ہو کہ کود جاؤ' میں تمہیں سنبھال لوں گا۔ لیکن بچی کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس کی چھلانگ لگانے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ میں ہمیشہ کارٹونسٹوں کے اس ہنر سے بڑا محظوظ ہوتا تھا کہ وہ محض چند لکیروں سے شکل اور تاثرات' سب کچھ واضح کر دیتے تھے۔

راحیلہ سے پچھلی طویل ملاقات میں جہاں دنیا جہاں کی باتیں ہوئی تھیں' وہیں میں نے اس کا بہت سا کام بھی دیکھا تھا۔ مجھے تو وہ اچھی لگتی تھی' میرے لئے وہ سرتاپا خوبصورتی تھی' اس کا ہر کام خوبصورت تھا۔ میں شاید اسے اپنے چہرے پر سجی ہوئی آنکھوں سے نہیں' دل کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ مگر میں نے کئی بار جذبات کا سوئچ آف کرکے' حسن ظن کی عینک اتار کر بھی اسے دیکھا۔ وہ حقیقتاً سرتاپا خوبصورتی تھی۔ اس کے کام بھی خوبصورت تھے۔ نیشنل کالج آف آرٹس کے پڑھے ہوئے لوگ عموماً اپنی کوئی ایک لائن بنا لیتے تھے اور اسی تک محدود ہو جاتے تھے۔ کوئی تجریدی پینٹنگ کرتا تھا تو اسی میں مقام بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ کوئی REALISTIC آرٹ میں اپنا رجحان دیکھتا تھا تو اسی میں قدم جمانے کی کوشش کرتا تھا۔

کبھی کبھار کوئی کارٹونسٹ کے طور پر بھی ابھر آتا تھا لیکن زیادہ تر میکینکل قسم کے کام کرتے تھے۔ صرف لے آؤٹ اور ڈیزائنگ وغیرہ میں مہارت حاصل کرتے تھے اور رنگا رنگ رسالوں' اخباروں یا پھر ایڈورٹائزنگ ایجنسیوں میں کھپ جاتے تھے۔ ان میں سے بہت کم لوگ اپنا کوئی مقام بنا پاتے تھے۔ ان میں سے کوئی کوئی ہی بڑے نام والا بنتا تھا۔

راحیلہ کا کمال یہ تھا کہ وہ آرٹ کے ان چاروں شعبوں پر حاوی معلوم ہوتی تھی۔ صرف مجسمہ سازی یا SCULPTURE کو اس نے چھوڑا ہوا تھا۔ وہ بھی شاید اس لئے کہ اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں اس شوق کی تکمیل کے لئے جگہ نہیں تھی۔ اس نے پہلے ہی اپنی پینٹنگز وغیرہ بڑی مشکل سی سنبھالی ہوئی تھیں۔ میں نے اس کا سارا کام دیکھ کر محسوس کیا تھا کہ اگر اس کے حالات صحیح رہے ہوتے اور وہ ملازمت میں نہ پھنس گئی ہوتی تو یقیناً بڑا نام پیدا کرتی۔ حتیٰ کہ وہ کارٹون کی فیلڈ میں بھی بڑا نام بنا سکتی تھی۔ حالانکہ اس فیلڈ میں تو مرد بھی ہر دور میں گنتی کے چند ہی رہے تھے۔ عورت تو کبھی کوئی سامنے آئی ہی نہیں تھی۔

میں دروازے پر کھڑا راحیلہ کے بارے میں سوچ رہا تھا اور دستک دینے کے بارے میں متذبذب تھا۔ اچانک ایک جھٹکے سے دروازہ کھل گیا۔ راحیلہ سرمئی رنگ کی ایک جھلملاتی ہوئی سی میکسی میں سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ بے اختیار اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی اور وہ گویا غیر ارادی طور پر بول اٹھی۔ "مجھے تمہارے وجود کی خوشبو آگئی تھی۔ میں کچن میں تھی۔ اچانک ہی مجھے محسوس ہوا جیسے تم دروازے پر کھڑے ہو۔ میں نے یہی سوچا کہ یہ میرا وہم ہے۔ لیکن پھر میں نے سوچا' ایک نظر دیکھ لینے میں کیا ہرج ہے؟"

مجھے دستک دینے یا بیل بجانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی اور دروازہ کھل گیا تھا۔ میں ساکت کھڑا ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں جب بھی اس کی طرف دیکھتا تھا' دل پہلے سے زیادہ اس کی طرف کھنچتا تھا۔ وہ صبیح چہرہ میرے لئے سردیوں کی اداس راتوں میں دور آسمان پر چمکتے ہوئے چاند کی طرح تھا جو میری رسائی میں ہوتے ہوئے بھی رسائی میں نہیں تھا۔

اچانک گویا اسے یاد آگیا کہ وہ تو مجھ سے ناراض ہے۔ اس نے چہرے پر حد سے زیادہ سنجیدگی بلکہ رنجیدگی اور اجنبیت طاری کر لی۔ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "معاف کیجئے گا' میں آپ کو کوئی اور سمجھی تھی۔ فرمائیے کس سے ملنا ہے؟"

"راحیلہ سے۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"اس کا تو کب کا انتقال ہو چکا۔ آپ کو نہیں معلوم؟" اس نے نہایت معصومیت سے کہا۔ "آج تو اس کا چہلم ہے۔"

"میں چہلم ہی میں شرکت کے لئے تو آیا ہوں۔ اس کے بعد مجھے ان کا مزار بنوانا ہے اور اس پر مجاور بن کر بیٹھنا ہے۔" میں نے بھی اسی معصومیت سے جواب دیا۔

"ارے صاحب....!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "آپ مزار بنوانے والی شخصیت کہاں... آپ تو پلازے اور کوٹھیاں بنوانے والی ہستی معلوم ہوتے ہیں۔ جائیے.... اپنے انہی دھندوں میں مگن رہیے۔ یہاں غریب مرحومین کے پاس کیا لینے آئے ہیں؟"

"کیا غریب مرحومین میں اخلاقیات کا بالکل رواج نہیں رہا؟" میں نے حیرانی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے پوچھا۔ "ہزار میل دور سے آئے ہوئے مہمان کو اندر آنے کے لئے بھی نہیں پوچھتے؟"

"اُف .... کیسی ظالم دنیا ہے..... کیسے ڈھیٹ لوگ ہیں۔" وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولی۔ "مرحومین کو ان کی آخری آرام گاہوں میں

بھی آرام سے نہیں رہنے دیتے۔"

پھر اس نے ایک طرف ہٹ کر میرے لئے راستہ چھوڑ دیا اور اپنے لہجے کو جلا کٹا سا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "آیئے.... تشریف لایئے۔"

"راشد کہاں ہے؟" اندر پہنچ کر میں نے پوچھا۔

"ہوٹل ہی میں ہوگا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "اس نے تو آج کل ہوٹل کو گھر اور گھر کو ہوٹل بنالیا ہے۔ یہاں تو وہ صرف چند گھنٹے سونے کے لئے آتا ہے۔ بلکہ کسی کسی دن تو سونے کے لئے بھی نہیں آتا۔ شاید وہ کچھ ایسا محسوس کر رہا ہے جیسے ہوٹل کا پورا بوجھ اسی بے چارے کے نازک کندھوں پر ہے اور اگر اس نے اپنے کندھے ہٹالئے تو خدانخواستہ ہوٹل کی عمارت دھڑام سے نیچے آگرے گی۔"

"میرے لئے کام کرنے والا ہر شخص کچھ اسی طرح محسوس کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بہت چالاک سیٹھ ہو۔ ملازموں کو خلوص کے پھندے میں پھنسا رکھا ہے۔" وہ سرہلاتے ہوئے بولی۔

"میں تو کسی سے کچھ بھی نہیں کہتا۔ میں تو اپنے بہت سے ملازمین کو جانتا بھی نہیں۔ بہت سے ملازمین کو میں نے دیکھا تک نہیں۔ وہ جو بھی کرتے ہیں' خود ہی کرتے ہیں۔ شاید یہ بھی میری خوش قسمتی کی زنجیر ہی کی ایک کڑی ہے کہ مجھے نیچے سے اوپر تک وفادار ملازمین ملے ہوئے ہیں۔ وہ خود ہی خلوص کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ میں تو کسی کو بھی' کسی بھی پھندے میں نہیں پھنساتا۔"

"اوہ.... اتنی صفائی پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ مصنوعی بیزاری سے بولی۔ "میں کون سا تم پر کوئی فردِ جرم عائد کر رہی ہوں۔"

"ویسے بائی دا وے.... خلوص ہوگا تبھی تو اس کا پھندا بھی ہوگا۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "حقیقت یہی ہے راحیلہ! میں اپنے کارکنوں کے لئے اپنے دل میں بہت خلوص محسوس کرتا ہوں۔ میرے سامنے آج تک میرے کسی بھی پروجیکٹ کے ملازمین کے مطالبات کی جو بھی فائل آئی ہے' مجھے اگر وہ مطالبات ذرا بھی معقول لگے ہیں تو میں نے ان پر دستخط کرنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ خواہ اس سے ہمارے بجٹ میں لاکھوں کا فرق پڑ رہا ہو۔ میں سوچتا ہوں' شاید یہ میرے بے شمار کارکنوں کی کاوشیں اور دعائیں ہیں جو مجھے اتنا آگے لے جارہی ہیں ورنہ میں تو اس قابل نہیں تھا۔ ایک اور عجیب بات یہ ہے کہ جتنا میں بانٹتا ہوں' جتنا اپنی دولت میں دوسروں کو شریک کرتا ہوں' اتنا ہی وہ گھٹنے کے بجائے بڑھ رہی ہے۔ جس سال میں سوچتا ہوں کہ میرے فلاں فلاں شعبوں میں مندی رہی ہے اور شاید کوئی خاص منافع نہ ہوا ہو' اس سال حسابات آڈٹ ہو کر آتے ہیں تو پتا چلتا ہے' پچھلے سال سے کہیں زیادہ منافع ہوا ہے۔ یہ ایک عجیب بات ہے۔ میں خود اس پر کبھی کبھی بڑا حیران ہوتا ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "مجھے یہاں اپنے کاروبار کے عجائبات سنانے یا اپنی مجموعی اقتصادی رپورٹ پیش کرنے آئے ہو؟"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" میں نے جلدی سے نفی میں سرہلایا۔

"تو پھر کس لئے آئے ہو؟" اس نے کسی اسکول ٹیچر کی طرح ڈانٹ کر پوچھا۔

"اسیں رُٹھڑا یار مناون آئیں ہاں کملیئے!" میں نے ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

"وہاٹ؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"اس موقعے پر تمہیں "وہاٹ" کے بجائے کہنا چاہئے تھا "زبان یار من پنجابی و من پنجابی نمی دانم۔" کبھی تو اہلِ ذوق لوگوں کی طرح گفتگو کرلیا کرو۔"

"مجھے اس طرح کے لنگڑے لولے مصرعے پڑھ کر اپنے آپ کو اہلِ ذوق ثابت کرنے کا قطعا شوق نہیں ہے۔ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تمہارے پیوند لگانے کی وجہ سے مصرع وزن سے گر گیا ہے۔"

"اوہ.... میں تو بھول ہی گیا تھا کہ خالصتاً "انگلش میڈیم" قسم کی مخلوق ہونے کے باوجود تمہیں وزن' بحر' ردیف اور قافیے کا علم

ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "بہرحال... میرے ہاں مصرعے ڈائٹنگ نہیں کرتے۔ اس لئے ان کا وزن اوپر نیچے ہوتا رہتا ہے۔"

"ویسے تم نے جو الفاظ بولے تھے' ان کا مطلب میری سمجھ میں آگیا ہے۔ بہت سی ملکی اور غیر ملکی زبانیں ایسی ہیں جو مجھے زیادہ نہیں آتیں لیکن ان کی سمجھ بوجھ ضرور ہے۔"

مجھے یقین نہ آیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔ "اچھا بتاؤ میں نے کیا کہا تھا؟"

"تم نے کہا تھا۔ "ہم روٹھے ہوئے دوست کو منانے آئے ہیں پگلی! یہی کہا تھا نہ تم نے؟"

"ہاں۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مطلب سمجھنے کے بعد بھی تمہارے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ یوں گھورے جارہی ہو جیسے میں نے تمہاری کوئی جیب وغیرہ کاٹ لی ہے.... اوہ.... مگر معاف کرنا..... خواتین کی تو عام طور پر جیب ہی نہیں ہوتی۔"

"اچھا اب یہ ادھر اُدھر کی ہانکنا بند کرو اور سنجیدگی سے بتاؤ کہ اچانک کیسے ٹپک پڑے؟" وہ بدستور گھورتے ہوئے بولی۔

"بتایا تو ہے۔ ایک تو تم عورتوں میں یہ بڑی خرابی ہوتی ہے کہ کسی بات کا یقین ہی نہیں کرتیں۔ میں چند دن فون نہیں کرپایا تھا تو تم بہت ناراض تھیں نا۔ میں نے کہا تھا' اب فون کرنے کے بجائے میں خود آکر تمہاری ناراضگی دور کردوں گا۔ سو بندہ حاضر ہے۔"

"ہاں۔ بندہ حاضر تو واقعی ہے۔" وہ سرہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن جھوٹ بولنے میں بندے کا جواب نہیں۔ کسی بزنس ٹرپ پر آئے ہوئے ہوگے۔ تم نے سوچا ہوگا کہ یہاں ایک بے وقوف سی لڑکی رہتی ہے' چلو اس پر بھی احسان دھرتے چلو۔ یہی بات ہے نا؟"

"لڑکی کے بے وقوف ہونے کی حد تک تو مجھے تمہاری بات سے اتفاق ہے لیکن باقی بیان درست نہیں ہے۔" میں نے مُدبرانہ لہجے میں کہا۔ "اپنا تو بزنس ہی محبت ہے۔ اس کے علاوہ ہم نے کبھی بزنس کی اتنی پروا نہیں کی کہ ادھر اُدھر بھاگے پھریں۔"

"کہتے سب یہی ہیں لیکن ہزار روپے کا نقصان ہوجائے تو دل ڈوبنے لگتا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"تمہارا جو دل چاہے کہتی رہو بے وقوف لڑکی!" میں نے شاہانہ لہجے میں کہا۔ "ہم تم سے بحث نہیں کریں گے کیونکہ ہم بحث کرنے کے لئے نہیں آئے۔ بحث تو جب اور جہاں چاہو شروع کی جاسکتی ہے لیکن محبت کرنے کے لئے انسان کو بڑا صبر کرنا پڑتا ہے' بڑا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اردو میں بھی سفر کرنا پڑتا ہے۔ انگریزی میں بھی SUFFER کرنا پڑتا ہے۔ اسی کا نام محبت ہے۔"

"باتیں بہت آگئی ہیں تمہیں۔ زبان خوب چلنے لگی ہے۔ بہت تیز ہوگئے ہو۔" وہ اپنے خوبصورت بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ مسکراہٹ ضبط کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "مگر میرے سامنے یہ محبت وغیرہ کی باتیں مت کیا کرو۔ یہ سب فضولیات ہیں۔ بہت بیکار لگتا ہے مجھے یہ لفظ۔"

"جو لوگ یہ بات کہتے ہیں وہ درحقیقت زیادہ بری طرح محبت میں گرفتار ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"اچھا اپنے ان لنگڑے فلسفوں کی دُکان بند کرو اور یہ بتاؤ کیا پیوگے... کیا کھاؤگے؟"

"ہاں... اب کی ہے تم نے کام کی بات۔" میں نے ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس سے پہلے کچھ اور باتیں بھی ضروری ہیں۔ یہاں آؤ.... میرے پاس بیٹھو۔ مجھے بتاؤ کیسے گزر رہے ہیں تمہارے روز و شب؟ چاندنی راتوں میں کبھی ایک مدھم اور پُراسرار سی اداسی تمہارے دل کو گدگداتی ہے یا نہیں؟ ایک ایسی اداسی جو گراں گزرنے کے بجائے دل کو بھلی لگتی ہے؟ جس کے دامن میں پناہ لینے کو جی چاہتا ہے۔ تنہا لمحے کبھی تمہارے کانوں میں سرگوشیاں نہیں کرتے کہ زندگی کتنی بے کیف ہے؟ کبھی تمہارے دل کے آنگن میں کوئی خلا پھنکاریں نہیں مارتا؟ کبھی تمہیں میری یاد نہیں آتی۔"

وہ میرے قریب آکھڑی ہوئی تھی لیکن یہ سب کچھ سن کر بیٹھتے بیٹھتے رک گئی۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی کی گھٹا سی چھاگئی۔ اس سنجیدگی میں کسی ہلکے سے خوف کی آمیزش بھی تھی۔ وہ جیسے اپنے اندر کسی زلزلے کو چھپائے کھڑی تھی اور بالکل خاموش تھی۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بھی مجھے نہیں دیکھ رہی تھی۔ میں گویا اس کے لئے ایک شفاف دیوار تھا اور وہ اس کے پار کسی اور ہی چیز کو دیکھ رہی تھی۔

"بولو نا.... کچھ تو بولو۔" میں نے اس کے دونوں ہاتھ تھامتے ہوئے اسے ہلا جلا کر گویا کسی انجانی دنیا سے واپس لانے کی کوشش کی۔ اس نے ایک عجیب دہشت زدگی کے سے عالم میں مجھ سے ہاتھ چھڑالئے' گویا وہ ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں سے چھوگئے ہوں۔ جس طاقت سے اس نے مجھ سے ہاتھ چھڑائے تھے اس نے مجھے حیران کردیا۔ وہ ایک دبلی پتلی' دراز قد لڑکی تھی۔ اس کی جسمانی ساخت امریکی لڑکیوں سے مشابہ تھی۔ امریکی لڑکیاں بھی خواہ دُبلی پتلی ہوں لیکن ان کی حرکات و سکنات سے بھی بے پناہ توانائی کا اظہار ہوتا ہے۔ ان میں ایک خاص قسم کی تیزی وتندی ہوتی ہے جو بیشتر ایشیائی عورتوں میں تو کیا' بہت سے مردوں میں بھی نہیں ہوتی۔ لیکن راحیلہ کی حرکات و سکنات میں جو شدت ہوتی تھی وہ کبھی کبھی مجھے بھی حیران کردیتی تھی۔ اس کی تیزی وتندی امریکی لڑکیوں کو مات کرتی نظر آتی تھی۔

اس نے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپالیا اور تب میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ سر سے پاؤں تک خزاں رسیدہ پتے کی طرح کانپ رہی تھی۔ میں تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ میرے نیم شاعرانہ انداز

میں بولے ہوئے الفاظ اس سنگدل سی لڑکی پر اتنا اثر کریں گے۔

"مت کیا کرو اس طرح کی باتیں۔" وہ لرزتی آواز میں بولی۔ "تم وہی ہنستے کھیلتے بے پروا اور کھلنڈرے اِنی رہو جسے میں برسوں سے جانتی ہوں۔ خواہ مخواہ لفظوں کے نشتر لے کر میرے خوابیدہ زخموں کو کریدنے کی کوشش مت کرو۔ تمہارے منہ سے یہ باتیں اچھی نہیں لگتیں۔"

"کیوں؟" کیا تمہارے خیال میں زندگی کے اسٹیج پر میرا رول کامیڈین کا ہے؟ میں کوئی سنجیدہ بات نہیں کرسکتا؟ کیا تمہارے خیال میں میں سوچ، فکر اور محسوسات سے محروم ہوں؟" میں نے حقیقتاً مجروح سے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں.... میرا یہ مطلب نہیں۔" وہ تڑپ کر بولی۔ "مجھے معلوم ہے ان کے دل زیادہ بوجھل ہوتے ہیں جو بظاہر ہلکے پھلکے، ہنستے کھیلتے اور بے فکرے نظر آتے ہیں۔ مگر بس.... زندگی اسی طرح بھی تو گزر سکتی ہے۔ مدفون جذبوں کے مزاروں کو کریدنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ میرے پاس بیٹھ گئی اور دونوں ہاتھ چہرے سے ہٹا لئے۔ پل بھر میں اس کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں۔ سرخ ہو چکی تھیں۔

"نہیں گزر سکتی اس طرح زندگی!" میں نے قدرے تیزی سے کہا۔ "یہ جھوٹ ہے.... خود فریبی ہے۔ تمام عمر انسان اپنے آپ کو کھوکھلے لفظوں، کھوکھلے جذبوں اور کھوکھلی ہنسی سے نہیں بہلا سکتا۔" میں نے اس کی بھیگی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔ "تم نے کیوں اپنی ذات پر ضد کا اتنا سخت خول چڑھا لیا ہے؟ اپنے آپ کو بھی انا کی سولی پر مصلوب کر رکھا ہے اور مجھے بھی اذیتوں کے خارزار میں بھٹکنے کے لئے چھوڑا ہوا ہے۔ کبھی کسی کی قربت میں پناہ تلاش کرتا ہوں اور کبھی کسی کی نوازشوں سے دل کی وحشت کم کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ہر مرحلے سے گزر آنے کے بعد آج بھی اسی طرح تشنہ کام ہوں جس طرح لڑکپن میں تھا...."

اس نے کسی انجانے بوجھ سے جھکی ہوئی لمبی پلکیں اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ بھیگی بھیگی آنکھوں میں بے یقینی کی پرچھائیاں تھیں۔ نہ جانے کیوں میری آواز بیٹھی جا رہی تھی۔ بہ مشکل میں نے کہا۔ "میری کوٹھیاں، بنگلے، کارخانے، سب کچھ کبھی کبھی مجھے بہت بے مصرف لگنے لگتا ہے۔ گھر میں بہت سے لوگ ہوتے ہیں مگر در و دیوار سے ویرانی جھانکتی ہے۔ میرے ساتھ چلو اور اس ویرانی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لو۔ ہمارے لئے مناسب یہی ہے کہ ہم شادی کر لیں۔"

"میں بہت پہلے کہہ چکی ہوں کہ میں تم سے شادی نہیں کرسکتی۔" وہ غیر ضروری طور پر اونچی آواز میں بولی۔ گویا مجھ سے زیادہ اپنے آپ کو یقین دلا رہی ہو۔

"لیکن کیوں؟" میں نے جھنجلا کر کہا اور غیر ارادی طور پر اس کے بازو اتنے زور سے پکڑ لئے کہ وہ کراہ اٹھی۔ میں نے جلدی سے بازو چھوڑ دیئے۔

"تمہاری سمجھ میں بات کیوں نہیں آتی؟ میں پہلے بھی وضاحت کر چکی ہوں۔" وہ رو دینے والی آواز میں بولی۔ آنسو اب اس کی آنکھوں میں نہیں، آواز میں بول رہے تھے۔ "میں نے کہا تھا کہ میں اب اپنے آپ کو تمہارے قابل محسوس نہیں کرتی۔ مجھے اپنی جگہ رہنے دو اور تم اپنے راستوں پر اپنا سفر جاری رکھو۔ جب تک بھی زندگی رہی، بس ہم اچھے دوست رہیں گے۔"

"لنگڑے فلسفوں کا سہارا اب تم لے رہی ہو۔ یہ فیصلہ مجھ پر چھوڑ دو کہ کون کس کے قابل ہے اور کون کس کے قابل نہیں ہے۔ تم میری بات مان لو۔ اور اگر زندگی میں کبھی تمہیں احساس ہو کہ میری بات مان کر تم نے غلطی کی تھی تو بے شک اسی لمحے اپنا راستہ جدا کر لینا۔" میں نے پُر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

ہر طبقے سے تعلق رکھنے والی پچاسوں ہی لڑکیوں اور عورتوں سے آج تک تعارف ہوا تھا۔ بعض سے مراسم رہے تھے، بعض سے بہت گہرا تعلق رہا تھا۔ بعض سے تعلق ابھی تک چلا آ رہا تھا۔ یہ خود ستائشی نہیں، حقیقت تھی کہ ان میں سے کسی کو بھی اگر میں نے یہ سب کچھ کہا ہوتا جو میں راحیلہ سے کہہ رہا تھا تو نہ جانے کس جوش و خروش اور خوشی کے ساتھ یہ پیشکش قبول کر لی جاتی۔ غربت کے دور سے نکل آنے کے بعد جتنی بھی لڑکیوں سے ملاقات ہوئی تھی، میں ان میں سے کسی کے ساتھ بھی شادی کر سکتا تھا۔ لیکن یہ کمبخت دل جہاں جا کر اٹکا تھا وہاں انکار کے سوا کچھ نہیں تھا۔

یہ فطرت انسانی کا ایک عجیب پہلو تھا.... شاید یہ بھی مقدروں ہی کی ایک ستم ظریفی تھی کہ جو کچھ میسر ہوتا ہے وہ انسان کی نظر میں زیادہ نہیں جچتا۔ جو چیز رسائی سے جتنی دور ہوتی ہے، دل اتنا ہی اس کی طرف کھنچتا ہے۔ راحیلہ کی طرف سے میرے دل کو اچھا بھلا قرار آ چکا تھا۔ میں اسے بھولا تو نہیں تھا لیکن وہ صرف ایک کسک کی طرح میرے دل میں جاگزیں تھی۔ مگر دوبارہ ملاقات نے، اس کی ندامت نے، اعتراف محبت نے گویا دل میں طلب کا طوفان پہلے سے زیادہ شدتوں کے ساتھ جگا دیا تھا۔ مگر نصیبوں کی آنکھ مچولی عجیب تھی۔ جدھر دل ملتا تھا اُدھر سے "ہاں" میں جواب نہیں ملتا تھا۔ حالانکہ راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، کوئی مجبوری نہیں تھی، سماج کی کوئی دیوار نہیں تھی۔

"انی! پلیز.... تم اس موضوع پر مجھ سے بات کرنا چھوڑ دو۔" اس کے لہجے میں ہزار التجائیں تھیں۔ "دنیا میں اور بھی اتنے بہت سے موضوع ہیں بات کرنے کے لئے۔ باتیں اتنی ہیں کہ کبھی ختم ہونے میں نہ آئیں لیکن تم ہو کہ گھوم پھر کر اسی موضوع پر آ جاتے ہو۔"

"تمہارے انکار کا جواز.... تمہاری منطق میرے دل کو نہیں لگتی۔" میں نے کہا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ افسردگی سے بولی۔ "یہ سمجھ لو' میں خود اذیتی میں مبتلا ہو گئی ہوں۔ اپنے آپ کو سزا دے رہی ہوں.... اور اس سے طمانیت محسوس کر رہی ہوں۔ تمہارا کیا خیال ہے.... کیا تمہاری زندگی کی ساتھی بننے کی طلب مجھے نہیں تڑپاتی؟ بہت تڑپاتی ہے۔ تمہارے لئے میرے وجود اور میری روح میں طلب کا ایک لا متناہی صحرا پھیلا ہوا ہے لیکن میں نے ماضی میں تمہارے ساتھ جو کچھ کیا وہ اتنا سفاکانہ اور گھٹیا عمل تھا کہ اب اس کی سزا میں اپنے آپ کو ترسا رہی ہوں، سسکا رہی ہوں، تڑپا رہی ہوں۔ میں اسی کی مستحق ہوں۔"

"مگر تم سے زیادہ تو نارسائی کے عذاب سے میں تڑپ رہا ہوں۔ تمہیں سزا کاٹنے کی ضرورت کیا ہے؟ میں نے تو تمہیں معاف کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"مگر میں نے اپنے آپ کو معاف نہیں کیا۔" وہ بولی۔

"چلو خیر...." میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ہر سزا کا ایک اختتام ضرور ہوتا ہے۔ میں انتظار کر لیتا ہوں۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کب تک جاری رہے گی یہ سزا؟"

"میں چاہتی ہوں اس سزا کا اختتام موت پر ہو۔ میں یہ سزائے محرومی کاٹتے کاٹتے مر جانا چاہتی ہوں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"دل شکنی کے جرم کی سزا اتنی سنگین بھی نہیں ہونی چاہئے۔" میں نے کہا۔

"اس جرم کی سزا تو اس سے بھی کہیں زیادہ سنگین ہونی چاہئے۔" وہ بولی۔

"خیر.... میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ مجھے امید ہے، میں ایک نہ ایک دن تمہارے خیالات بدلنے میں کامیاب ہو جاؤں گا.... فی الحال کوئی اور بات کرتے ہیں۔ تم نے غصے میں تین دن سے فون نہیں کیا۔ میں بھی نہیں کر سکا۔ میں یہی سوچتا رہا کہ بہت ہی زیادہ فرصت کا وقت میسر ہو جب آرام سے ٹانگیں پسار کر، فون سینے پر رکھ کر کم از کم دو چار گھنٹے تم سے باتیں ہو سکیں۔ لیکن ایسا وقت میسر نہیں آ سکا۔ اس لئے میں فون نہیں کر سکا۔ لیکن تم بتاؤ.... اس دوران وقت کیسا گزرا؟ کبھی میری یاد آئی یا نہیں؟ کیا سوچتی رہیں؟ بوجھل، تنہا لمحے کس طرح گزارتی رہیں؟ کچھ تو بتاؤ.... کوئی اچھی سی بات کرو۔ دو محبت کرنے والے کچھ عرصے کی جدائی کے بعد ملتے ہیں تو کس طرح کی باتیں کرتے ہیں؟"

"مجھے تو معلوم نہیں۔" اس نے سر جھکا کر جواب دیا۔ اس کی تمام تر بے باکی گویا ہوا ہو گئی تھی۔ رخساروں پر گلاب کھل رہے تھے۔ اس لمحے اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ شادی اور طلاق کے تجربے سے گزر چکی تھی۔ وہ ایک چھوٹی موٹی سی اسکول گرل دکھائی دے رہی تھی جس پر سہانا سولھواں برس طلوع ہو رہا تھا۔ وہ بلا کی حسین ہی نہیں، عمر چور بھی تھی۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "مجھے بھی معلوم نہیں — بہرحال باتیں کرتے ہیں۔"

ایک بار پھر ہم پچھلی ملاقات کی طرح باتوں میں لگ گئے۔ جب انسان محبت میں گرفتار ہوتا ہے تو ایک دوسرے کی بے مقصد، بے معنی باتیں بھی کتنی خوبصورت محسوس ہوتی ہیں۔ میں.... جسے فرصت کے چند لمحے بھی میسر نہیں آتے تھے.... اور اگر میسر آ بھی جاتے تھے تو بہت گراں گزرتے تھے.... کئی گھنٹے اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا اور وقت گزرنے کا احساس تک نہ ہوا۔ اس دوران راحیلہ نے کھانا بنایا، کافی بنائی لیکن میں اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ ہماری باتیں ایک لمحے کے لئے بند نہیں ہوئیں۔ ویسی ہی باتیں جن کے بارے میں انسان بعد میں سوچتا ہے تو اسے کچھ خاص یاد نہیں آتا کہ وہ کیا تھیں؟

رات بھیگنے لگی تو میں نے یکدم چونکتے ہوئے کہا۔ "حیرت ہے..... راشد ابھی تک نہیں آیا!"

"رات کو خاصی دیر تو اسے عام طور پر روزانہ ہی ہو جاتی ہے۔" راحیلہ نے بتایا۔ "جب کوئی خاص موقع ہوتا ہے تب تو اس کے لئے رات اور دن میں کوئی امتیاز ہی نہیں رہتا۔ کل تمہارے ہوٹل میں کوئی بہت بڑا ڈنر ہے نا.... سنا ہے ملکی اور غیر ملکی دو سو نہایت اہم شخصیات شریک ہو رہی ہیں۔ راشد کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ڈنر کو خوش اسلوبی سے نمٹانا ہوٹل کے لئے بہت نازک ذمے داری ہے۔ بس بے چارہ سی فکر میں ہلکان ہو رہا ہے۔"

تب مجھے یاد آیا کہ درحقیقت میں کیوں اچانک کراچی آیا تھا۔ اس اصل مقصد کو تو میں کچھ دیر سے بالکل بھول ہی گیا تھا۔ تاہم میں نے راحیلہ سے اس سلسلے میں کوئی بات نہیں کی۔

"میں فون کر کے راشد کو بلاتا ہوں۔" میں نے کہا۔

میری توقع کے مطابق راشد کو میری آمد کی اطلاع نہیں تھی۔ فون پر یہ جان کر وہ ایک لمحے کے لئے خاموش سا ہو گیا کہ میں اسی کے گھر سے بول رہا تھا۔ آخر وہ راحیلہ کا بھائی تھا۔ گو کہ اسے معلوم تھا، ہمارے درمیان کیا سلسلہ تھا۔ لڑکپن ہی سے وہ ہر بات سے آگاہ چلا آ رہا تھا۔ میرے دل میں چور نہیں تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ہموار لہجے میں بولا۔ "آپ ہوٹل نہیں آئے۔"

"بس.... میں نے سوچا، جب گھر موجود ہے تو ہوٹلوں میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہوٹل کے مالک کے منہ سے یہ ہوٹل میں دھکے کھانے والی بات خوب کہی آپ نے۔" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"ڈنر کے انتظامات کیسے جا رہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ سب تیاریاں مکمل ہیں۔ مسئلہ تو کوئی نہیں ہے۔ یوں تو ہم لوگ دو گھنٹے کے نوٹس پر دو ہزار آدمیوں کے ڈنر کا انتظام بھی کر سکتے ہیں لیکن ایک تو یہ ڈنر ذرا خاص نوعیت کا ہے۔ دوسرے ہم لوگ بزنس میں نئے ہیں اس لئے کچھ زیادہ ہی

بھاگ دوڑ میں لگے رہتے ہیں۔" راشد نے جواب دیا۔

"خیر یہ تو اچھی بات ہے۔ لیکن اب تم گھر آجاؤ۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ کل میرے پاس وقت نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"جو حکم سر......!" اس نے کہا اور میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

کچھ دیر بعد وہ گھر آگیا۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ بلاشبہ ایک اسمارٹ اور پُر عزم نوجوان تھا۔ لمبی ڈیوٹی دے کر آرہا تھا مگر تازہ دم اور چاق و چوبند تھا۔ رسمی اور ادھر اُدھر کی باتیں ہو چکیں تو میں نے بیک وقت ان دونوں سے پوچھا۔ "راحیلہ! تم نے اپنی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھولنے اور راشد! تم نے کنسٹرکشن کے بزنس میں آنے کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چند لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ بولی۔ "ہم نے تو اس سلسلے میں کچھ نہیں سوچا۔ فرصت ہی نہیں ملی سوچنے کی۔ ویسے بھی ایک گھر میں رہنے کے باوجود ہماری تو ملاقاتیں ہی کم ہوتی جارہی ہیں۔ کبھی کبھی تو مجھے اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ میں راشد کو اس کے بیڈروم سے نکلتے دیکھ کر ڈر نہ جاؤں کہ یہ "موا کون غیر مردوا" میرے فلیٹ میں گھس آیا ہے۔"

"اور میں بھی سوچ میں پڑ جاؤں کہ یہ ڈھانچا نما لڑکی تو کچھ دیکھی بھالی ہوئی لگ رہی ہے۔" راشد بولا۔

ہم اس وقت ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے تھے۔ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ "بھئی کم از کم پانچ منٹ کے لئے مذاق اور ایک دوسرے پر جملے کسنے کا سلسلہ بالکل بند رہے گا۔ خلاف ورزی کرنے والے کو بالکونی میں راشد کی بش شرٹ کی جگہ الگنی پر لٹکا دیا جائے گا۔ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"

"ماشاءاللہ!" راحیلہ نے متانت سے کہا۔

"ہاں..... تو تم دونوں نے کیا سوچا؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"میں نے بتایا نا کہ ہمیں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ ویسے بھی کون سا بہت وقت گزر گیا ہے۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو بات ہوئی تھی۔" راحیلہ بولی۔

"تو کیا تم لوگ سوچنے میں چند سال لگاؤ گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ "اگر تم اس رفتار سے سوچو گے تو بزنس نہیں کر سکو گے۔ بزنس مین کے ذہن کو تو کمپیوٹر کی طرح کام کرنا چاہئے۔ ادھر سوال فیڈ کیا..... ادھر بٹن دبایا اور کھٹ سے جواب باہر....." میں نے چٹکی بجائی۔ "دل ہی دل میں بیسیوں فیصلے تو بزنس مین چائے پیتے پیتے کر لیتا ہے۔"

"اچھا.....؟" راحیلہ نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "بہت خوب! تو تم بھی کمپیوٹر بن چکے ہو؟ ہم تو تمہیں ابھی تک انسان ہی شمار کر رہے تھے۔ انا للہ.....!"

"راحیلہ..... پلیز..... سنجیدگی....." میں نے جلدی سے کہا۔

وہ میری درخواست پر کوئی خاص توجہ دیئے بغیر بولی۔ "آخر تم کیوں ہمیں بزنس کے میدان میں لانے پر تلے ہوئے ہو؟ کیا ضروری ہے کہ جو آدمی بزنس میں لاکھوں کروڑوں کما رہا ہو اسی کے بارے میں فرض کیا جائے کہ وہ بہت فائدے میں ہے؟ فائدے نقصان کے معاملے میں کسی کے پیمانے مختلف بھی تو ہو سکتے ہیں۔"

"راحیلہ! تم فلسفہ بھی ہرگز نہیں بگھارو گی۔ تمہیں معلوم ہے میں خود بہت بڑا فلسفی ہوں۔" میں نے متانت سے کہا۔ "میں نے مذاق پر پانچ منٹ کے لئے پابندی عائد کی تھی لیکن فلسفے پر دس منٹ کے لئے پابندی عائد کر رہا ہوں۔ اس وقت سیدھی سادی اور عام فہم سی گفتگو ہو رہی ہے جس کا تعلق دنیاداری سے ہے۔ اگر انسان تھوڑی بہت دنیاداری کو بھی ساتھ لے کر چلتا رہے تو کوئی حرج نہیں۔ ایسی دنیا داری جس سے دوسروں کا کوئی نقصان نہ ہو..... بلکہ دوسروں کو فائدہ ہی پہنچے..... بزنس کرنا..... اس سلسلے میں کسی کا تعاون حاصل کرنا..... روپیہ کمانا..... اپنی سماجی پوزیشن کو بہتر بنانے کی جدوجہد کرنا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ اگر ہم انسانیت کے تقاضوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے بزنس کریں، صنعتیں لگائیں، کاروباری ادارے قائم کریں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ انسانوں کا..... اور انسانیت کا فائدہ ہی ہے۔ یہ ایک تعمیری عمل ہے۔"

"اس لیکچر کی کیا ضرورت تھی؟" راحیلہ نے مجھے گھورا۔

"میں جب بھی تمہیں اور راشد کو بزنس میں لانے کی بات کرتا ہوں تو تمہارا ردِعمل کچھ ایسا ہوتا ہے جیسے یہ کوئی خاصا معیوب کام ہے۔ تمہارے دماغ میں کوئی خاصا شرپسند قسم کا کیڑا گھسا ہوا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے نکالنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔" میں نے قدرے بے بسی سے کہا۔

"اصل میں مجھے بزنس کرنے میں..... بڑے کاموں میں ہاتھ ڈالنے میں اب کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی۔" راحیلہ بولی۔ "اور میرے خیال میں راشد کا بھی یہی حال ہے۔ ہم بہت عافیت پسند سے ہو گئے ہیں۔ سکڑ سمٹ کر، دنیا کی نظروں سے اوجھل رہ کر اپنے گوشۂ عافیت میں زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔"

"میں کون سا تمہیں فلم اسٹار بنانے کی بات کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم دونوں کے لئے میرے ذہن میں جو کچھ ہے اس میں بھی تم سکڑ سمٹ کر اپنے گوشۂ عافیت میں ہی رہو گے۔ تمہارے زندگی گزارنے کے انداز میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

"جب زیادہ روپے پیسے کا چکر شروع ہوتا ہے تو عافیت کہاں رہتی ہے۔" راحیلہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "مجھے زیادہ بڑے کام کرنے میں اس لئے بھی کشش محسوس نہیں ہوتی کہ کبھی میرے ابو بھی خاصے بڑے صنعتکار اور بزنس مین تھے۔ آج ان کی اولاد

کہاں بیٹھی ہے؟ کاروبار، صنعتیں، تجارت .... یہ سب ریت کے گھروندے ہیں۔ میں ان میں پناہ تلاش کرنا نہیں چاہتی۔"

"یوں تو یہ ساری دنیا ہی ریت کا گھروندا ہے۔ ایک روز سب کچھ ختم ہوجاتا ہے۔ عروج اور زوال کی بھی بے شمار کہانیاں اس دنیا میں بکھری پڑی ہیں۔ اگر سب تمہارے نکتۂ نظر سے سوچیں تو لوگ دنیا میں کسی بھی کام کے لئے جدوجہد کرنا ہی چھوڑ دیں۔ لوگوں کے پاس تو سب کچھ ہوتا ہے، اس کے باوجود وہ مزید آگے بڑھنے کے لئے دوسروں کا گلا کاٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔ تمہیں میں شریفانہ انداز میں آگے بڑھانے کے لئے تمہارا ہاتھ تھام رہا ہوں مگر تم ہو کہ اپنی جگہ سے جنبش کرنے کے لئے تیار نہیں۔ عجیب فضول قسم کے انسان ہو تم دونوں۔"

"جدوجہد تو ہم اب بھی کرتے ہیں۔ بس اب اپنی اپنی نوکری کو زیادہ سے زیادہ عمدگی سے انجام دینے کی جدوجہد کرتے ہیں۔ ہم جیسے بھی ہیں، بس ہمیں ہمارے حال پر رہنے دو۔" راحیلہ بولی۔
راشد بالکل خاموش تھا۔ مجھے معلوم تھا، فیصلے راحیلہ ہی کے چلتے تھے۔ راشد اور راحیلہ کی عمر میں زیادہ فرق نہیں تھا مگر راشد کی طبیعت میں بڑی سعادت مندی تھی۔ وہ اپنی مرضی بالکل نہیں چلاتا تھا۔ راحیلہ کے پیچھے پیچھے چلتا تھا۔

"راحیلہ...!" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "دل تو میرا یہی چاہ رہا ہے کہ تمہارے منہ پر ایسا گھونسا رسید کروں کہ تم اڑتی ہوئی بالکونی کے راستے چوتھی منزل سے نیچے سڑک کے بیچوں بیچ جا گرو اور دس بارہ جہازی قسم کے ٹرک تمہارے اوپر سے گزر جائیں۔ جب میں اور راشد ازراہِ مروّت تمہاری لاش اٹھانے نیچے پہنچیں تو سڑک پر صرف ایک رنگین سا نقشہ باقی ہو۔"

"اتنی لمبی بددعا...!" راحیلہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بے آواز طریقے سے ہنسی۔

"بعض لوگ اتنے سخت جان اور ضدی ہوتے ہیں کہ اتنی لمبی لمبی بددعاؤں سے بھی ان کا کچھ نہیں بگڑتا۔" میں نے حسرت سے کہا۔ "بہرحال میں چاہتا ہوں کہ یہ نوبت آنے سے پہلے تم میری بات مان لو۔ بلاشبہ تم بہت ضدی ہو لیکن میں نے بھی تہیّہ کر رکھا ہے کہ تمہیں تمہارے حال پر نہیں چھوڑوں گا۔ میں تمہیں اس مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں تمہیں درحقیقت اس وقت ہونا چاہئے تھا۔"

وہ دونوں خاموش رہے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "میں نے تم دونوں کے بارے میں اب ایک نیا فیصلہ کیا ہے۔"

"پرانے فیصلے پر تو عملدرآمد نہیں ہوسکا۔ تم نے نیا فیصلہ بھی کرلیا۔" راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ میرے خیال میں میرا نیا فیصلہ بہتر ہے اس لئے اب اسی پر عملدرآمد کیا جائے گا۔ نیا فیصلہ یہ ہے کہ تم دونوں لاہور شفٹ ہوجاؤ۔" میں نے کہا۔ ایک لمحے کے لئے وہ دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے رہ گئے۔

"اس میں اتنا حیران ہونے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کی کیا بات ہے؟" میں نے حقیقتاً قدرے تعجب سے کہا۔ "تم تو اس طرح حیران پریشان نظر آرہے ہو جیسے میں نے تمہیں کوہ قاف میں رہائش اختیار کرنے کا مشورہ دے دیا ہو۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس بار راشد نے سکوت توڑا۔ وہ اٹک اٹک کر بولا۔ "وہ..... دراصل..... ہم لوگ کیسے جاسکتے ہیں...."

"جہاز میں بیٹھ کر۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے... ہماری نوکریاں .... ہم لوگ یہاں سیٹ ہیں...." راشد ہکلایا۔

"نوکریاں تو تمہاری جگہ کوئی بھی دوسرے دو افراد کرسکتے ہیں جو تم دونوں جیسی کوالیفکیشن رکھتے ہوں۔ اور اگر تمہارے خیال میں تم یہاں سیٹ ہو تو میں تمہیں اپ سیٹ کرنے کے لئے لاہور نہیں لے جاؤں گا۔ میں تمہیں اس سے زیادہ سیٹ کرنے کے لئے لے جارہا ہوں۔"

وہ دونوں دم بخود سے بیٹھے تھے۔ فی الحال تو گویا راحیلہ بھی بولنا بھول گئی تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "مجھے لاہور میں تم دونوں کی زیادہ ضرورت ہے۔ ملازم تو لاہور میں بھی میرے پاس بہت سے ہیں اور کراچی میں بھی۔ مزید بھی میں جتنے چاہوں مل جائیں گے۔ گو کہ میں اس اعتبار سے خوش نصیب ہوں کہ ملازم بھی میرے جاں نثار ہیں۔ وہ صرف نوکری نہیں کرتے، پیٹھ پیچھے میری ہی طرح میرے مفادات کی حفاظت کرتے ہیں۔ اس کے باوجود میرے کچھ آدمیوں کا ایک اور الگ حلقہ بھی ہے، جو خالص میرے اپنے آدمی ہیں۔ میرے ساتھی، میرے دوست، میرے شریکِ کار۔ جو کبھی مجھ سے الگ ہوکر کہیں جانے کا تصور نہیں کرسکتے اور میں بھی ان کے بغیر زندگی کے میدان میں آگے بڑھنے کا نہیں سوچ سکتا۔ تم دونوں بھی میرے انہی آدمیوں کی فہرست میں آتے ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں نوکریاں کرکے ضائع ہوتے رہو۔ میں تم سے بہتر قسم کے کام لینا چاہتا ہوں۔ اگر تم کبھی اپنے آپ کو ناخوش یا غیر مطمئن محسوس کرو تو فوراً واپس آجانا۔ تمہارا یہ فلیٹ.... تمہاری نوکریاں اسی طرح تمہاری منتظر ہوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے سنجیدگی سے بولی۔ "انی! تم ہی کراچی کیوں شفٹ نہیں ہوجاتے؟ تمہارے لئے تو یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ویسے بھی لوگ اپنے چھوٹے کاروبار کو پھیلانا چاہتے ہیں وہ کراچی کا رخ کرتے ہیں۔ کمپنیاں عام طور پر ہیڈ آفس وغیرہ یہیں بناتی ہیں۔"

"میرا معاملہ الٹا ہے۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔ "میرے کاروبار کا بڑا حصہ لاہور میں ہے۔ البتہ میں جب پہلی بار تمہارے گھر آیا تھا، اس وقت اگر ایسی کوئی بات ہوتی تو میں اپنا کاروبار شروع سے کراچی میں سیٹ کرتا لیکن اب میرے لئے بے شمار دشواریاں ہیں۔ میں نے تو ہوٹل بھی کراچی میں صرف اس لئے بنایا ہے کہ ماہرین کے سروے کے مطابق لاہور میں فی الحال ایک اور فائیو اسٹار ہوٹل کی گنجائش نہیں تھی۔ اگر میں اپنا پروگرام دو چار سال لیٹ کرلیتا تو شاید میرا ہوٹل بھی لاہور میں ہی بنتا۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہارا یہاں کراچی میں کیا رکھا ہے جسے چھوڑ کر جاتے ہوئے تمہیں اتنی پریشانی ہورہی ہے؟"

"بچپن اور لڑکپن کی یادیں ہیں... امی ابو کی قبریں ہیں۔" راحیلہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"میں تمہیں کسی ایسی جگہ تو نہیں لے جارہا جہاں سے خدانخواستہ تم کبھی یہاں نہیں آسکو گے۔" میں نے کہا۔ "تم چاہو تو ہر ویک اینڈ پر یہاں آجایا کرنا۔ میں پورے سال سال کے لئے ویک اینڈ کی کسی فلائٹ پر تمہاری راؤنڈ ٹرپ کی ریزرویشن کرادیا کروں گا۔ خوب اچھی طرح یادوں سے گلے مل لیا کرنا۔ قبروں پر بھی حاضری دے دیا کرنا۔ اور کوئی مسئلہ؟" میں نے سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔

"نہیں... مسئلہ تو کوئی نہیں ہے....." راحیلہ سر جھکاتے ہوئے بولی۔

"ویسے.... بائی داوے... تم دونوں کو اپنے والدین کی قبروں پر آخری بار گئے ہوئے کتنے دن ہوئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"یہی کوئی.... تقریباً چھ ماہ۔" راحیلہ نے جواب دیا۔
"ماشاءاللہ!" میں نے سرہلاتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "اتنی جلدی جلدی چکر لگانے والوں کو تو واقعی فکر ہونی چاہئے کہ اگر وہ لاہور چلے گئے تو کیا ہوگا۔"

راحیلہ قدرے ندامت آمیز سے انداز میں مسکرادی اور خاموش رہی۔ راشد سر اٹھاتے ہوئے بولا۔ "میں بھی اپنے محسوسات کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ بات مشکل سی ہے.... اور مجھے اس قسم کی باتیں کرنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے.... پھر بھی شاید آپ میری بات سمجھ جائیں۔ اتفاق سے اس وقت آپ دونوں ہی سامنے موجود ہیں...." اس نے ایک نظر راحیلہ کی طرف اور ایک نظر میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی تھی۔

پھر اس نے بطورِ خاص مجھے مخاطب کیا۔ "انی بھائی! ہماری زندگی کا کوئی پہلو آپ سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ آپ کی حیثیت اب ہمارے نزدیک کسی قریبی رشتہ دار سے بھی بڑھ کر ہے۔ راحیلہ کے اور آپ کے درمیان جو تعلقِ خاطر چلا آرہا ہے اس کا بھی میں ایک مدّت سے رازداں چلا آرہا ہوں۔ میں اس پر کبھی روایتی بھائیوں کی طرح چیں بہ جبیں اس لئے نہیں ہوسکا کہ میرے نزدیک اس میں کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ راحیلہ مجھ سے بڑی ہے اور یہ ہمیشہ سے اپنی زندگی میں خود مختار رہی ہے۔ میں نے کبھی اس کے معاملات میں دخل نہیں دیا۔ اس نے جب آپ کو چھوڑ کر جمیل سے شادی کے لئے ہامی بھری تب بھی میں نے اسے اپنے فیصلے پر نظرثانی تک کرنے کے لئے نہیں کہا۔ حالانکہ میری خواہش یہی تھی کہ یہ آپ کو جیون ساتھی بنالیتی۔ میں جمیل کو اس وقت بھی پسند نہیں کرتا تھا۔ لیکن بات یہی تھی کہ میں اس وقت بھی راحیلہ کے فیصلوں میں دخل دینے کی جرأت یا خواہش نہیں رکھتا تھا اور آج بھی نہیں رکھتا۔ بلکہ میری زندگی کے بارے میں بھی بیشتر فیصلے یہی کرتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ منطق کے اعتبار سے وہ کچھ ایسے غلط بھی نہیں ہوتے، البتہ تقدیر انہیں غلط ثابت کردے تو بات دوسری ہے..."

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے الجھن سے کہا۔ "یہ اتنی لمبی تمہید کس لئے ہے؟ میں ابھی تک تمہاری بات کا سرا تلاش نہیں کرسکا۔"

"میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم بہن بھائی آج بھی اکٹھے ضرور رہ رہے ہیں لیکن ہم اپنی اپنی زندگی گزارنے میں آزاد ہیں۔ مجھے معلوم ہے راحیلہ اپنا برا بھلا اچھی طرح سمجھتی ہے اور یہ دانستہ طور پر کوئی غلط قدم نہیں اٹھاسکتی۔ یہ چاہے تو اکیلی بھی آپ کے ساتھ لاہور جاسکتی ہے اور کوئی بھی بزنس سیٹ کرسکتی ہے۔ چاہے تو مجھے بھی ساتھ لے جاسکتی ہے۔ چاہے تو آپ کی تجویز رد بھی کرسکتی ہے۔ میں ہر صورت میں اس کے ساتھ ہوں۔ لیکن میں بس ایک چیز سے ڈرتا ہوں..."

"خدا کے لئے وہ بھی جلدی سے بیان کرڈالو۔ میں تجسس سے مرا جارہا ہوں۔" میں نے اسے ایک بار پھر خاموش ہوتے دیکھ کر بے تابی سے کہا۔

"راحیلہ اور آپ جو بھی پروگرام بنائیں... جس بزنس میں بھی پارٹنر شپ کریں، یہ آپ کی آپس کی بات ہے لیکن میری خواہش ہے کہ مجھے زیادہ آگے بڑھانے کے لئے کوئی سہارا وغیرہ نہ دیں۔ مجھے بس ایسے ہی کسی نوکری وغیرہ میں رہنے دیں جس میں میرا معیارِ زندگی زیادہ بلند نہ ہو۔ میں زیادہ آسودہ حال اور نمایاں کاروباری آدمی نظر نہ آؤں۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے 'اس نوجوان کو چوہدری صاحب اس کی بہن کی وجہ سے نواز رہے ہیں' میں خواہ کتنی بھی محنت کرلوں، اپنے آپ کو کسی بھی بزنس کا اہل ثابت کرلوں لیکن لوگوں کی زبان پر یہ بات ضرور آئے گی کہ بھئی اس شخص پر تو چوہدری صاحب کی نوازشات کی وجہ اس کی بہن ہے۔"

کمرے سے باہر تو رات کا گہرا سکوت پھیلا ہوا ہی تھا، اب کمرے میں بھی ایک لمحے کے لئے گہرا سکوت پھیل گیا۔ راحیلہ نے تفہیمی انداز میں دھیرے سے سرہلایا۔

"بات تم نے معقول کی ہے۔" آخر کار میں نے ملائمت سے کہا۔ "اس میں وزن ہے۔ ایسی باتیں عموماً سننے میں آتی ہیں۔ لیکن تمہیں ان اندیشوں میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ خوش قسمتی سے ہم اس ماحول' اس طبقے میں نہیں رہتے جہاں ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دوسروں کی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ میرے ملازمین اور خاص آدمیوں میں تو اس قسم کی باتوں کا "رواج" ہی نہیں ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم آسانی سے ایڈ جسٹ کر لوگے۔ کسی کو کبھی احساس ہی نہیں ہو گا کہ ہمارے درمیان رشتوں کی جو ایک قسم کی بے عنوان سی مثلث موجود ہے وہ کب اور کس طرح وجود میں آئی ہے۔ ہماری حیثیت ایک فیملی کی سی ہو گی۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم کبھی اپنے حلقوں میں اس طرح کی کوئی بات نہیں سنو گے جس کا تم اندیشہ محسوس کر رہے ہو۔ سمجھے؟ میں نہیں چاہتا کہ تم لوگ اب اس قسم کی فضول باتوں میں الجھ کر مزید تاخیر کرتے رہو۔ میں بس تمہیں ایک ماہ کا وقت دے رہا ہوں۔ ایک ماہ میں تم لاہور شفٹ ہونے کی تیاری مکمل کر لو۔ یہاں جو بھی سمیٹنے والے سلسلے ہوں انہیں سمیٹ لو۔ میں مزید کچھ نہیں سنوں گا۔"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور بے بسی سے مسکرا دیئے۔ راحیلہ متذبذب سے لہجے میں بولی۔ "ویسے مجھے لاہور پسند بہت ہے....."

"بس۔ پھر مزید کسی اگر مگر کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "آج سے ٹھیک ایک ماہ بعد تم دونوں لاہور میں اپنے نئے گھر میں ہو گے۔"

وہ خاموش رہے۔ میرے خیال میں اب راحیلہ کی ضد بھی دم توڑ چکی تھی۔ وہ بہت مشکل سے قائل ہوئے تھے لیکن ہو گئے تھے' میرے لئے یہی بڑی خوشی کی بات تھی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ ان کی خاموشی میں رضامندی شامل تھی اور اس احساس سے مجھے بڑی طمانیت حاصل ہوئی تھی۔ میں گویا کوئی اہم مسئلہ حل ہو جانے کی وجہ سے یکسو ہو گیا تھا۔ مجھے لاہور میں ان کی زیادہ ضرورت تھی۔ وہ دونوں میرے خاص ساتھیوں میں بہت اچھا اضافہ ثابت ہو سکتے تھے۔ راحیلہ تو مار دھاڑ' لڑائی جھگڑے والے خطرناک کاموں میں بھی بڑی کارآمد قسم کی ہستی ثابت ہو سکتی تھی۔ راشد بے چارے میں اس قسم کی صلاحیتوں کا فقدان تھا۔ ان بہن بھائیوں کا معاملہ گویا الٹا ہی تھا۔ لڑکی بظاہر دھان پان اور گڑیا کی طرح نازک اندام نظر آتی تھی مگر وہ انسو قسم کے مردوں کے بھی چھکے چھڑا سکتی تھی۔ اس کی مار دھاڑ کا مظاہرہ میں اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ جبکہ راشد مرد ہونے اور اچھا بھلا صحت مند ہونے کے باوجود لڑائی جھگڑے سے گھبراتا تھا۔ بہر حال وہ ایک ایماندار آدمی تھا۔ میرے لئے اس کی یہ خوبی ہی بہت اہم تھی۔ مجھے قدم قدم پر ایسے آدمیوں کی ضرورت رہتی تھی جن پر میں روپے پیسے اور دوسرے بیسیوں معاملات میں آنکھیں بند کر کے بھروسا کر سکوں۔

"میرا خیال ہے اب کچھ دیر سو بھی لیا جائے۔" راشد جما[ئی] روکنے کی کوشش کرتے ہوئے گھڑی دیکھ کر بولا۔ "کل کی شام بھ[ی] اعصابی تناؤ میں ہی گزرے گی' جب تک منسٹر صاحب کا ڈنر خیر [و] عافیت سے اختتام کو نہیں پہنچ جائے گا۔"

ابھی تو اس بے چارے کو اصل بات ہی نہیں معلوم تھی او[ر] وہ اعصابی تناؤ کا ذکر کر رہا تھا۔ اگر وہ اصل سازش کے بارے م[یں] جان لیتا تو یقیناً بہت پریشان ہو جاتا۔ اسی لئے میں نے اسے اس ج[ھنجٹ] سے بے خبر رکھنا ہی بہتر سمجھا تھا حالانکہ صورت حال سے نمٹنے [کے] لئے مجھے کئی معاملات میں اس کی مدد کی ضرورت پڑی تھی۔ مجھ[ے] اسی سے اپنے اور نذیر خان کے لئے ویٹر کی وردیاں حاصل کر[نی] تھیں۔ ویٹروں کے طور طریقوں کے بارے میں معلوم کرنا تھا۔ [ان] ویٹروں کو ڈیوٹی سے ہٹا کر اس طرح خاموشی سے ویٹروں میں شام[ل] ہونا تھا کہ دوسرے ویٹر اس تبدیلی کے بارے میں بالکل نہ جان پائیں۔ شفیع شاہ کو میں نے فون پر پہلے ہی مطلع کر دیا تھا کہ ہوٹ[ل] میں تو کیا' کراچی میں ہی میری آمد کی خبر کو بالکل خفیہ رکھا جائے۔ کسی بھی ایسے شخص سے میری آمد کا ذکر نہ کیا جائے جو میری صورت یا پھر میری حیثیت سے واقف ہو۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ہوٹل کا بیشتر اسٹاف مجھے پہچانتا نہیں تھا۔ میرا ارادہ یہی تھا کہ راشد کو آئندہ بھی اصل معاملے سے بے خبر رکھتے ہوئے ہی اس کی مدد حاصل کروں گا۔ اسے ابھی اہم معاملات میں شامل کرنے کے لئے خاصی تربیت کی ضرورت تھی۔

میں نے بھی گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اب تم دونوں کی جان فی الحال بخش رہا ہوں۔ میں ہوٹل جا رہا ہوں۔"

"آپ یہیں میرے بیڈ پر سو جائیے نا۔" راشد جلدی سے بولا۔ "میں ڈرائنگ روم میں سو جاؤں گا۔ آپ نے خود ہی کہا تھا کہ جب گھر موجود ہو تو ہوٹلوں میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"بھئی جب تک گھر میں رہنے کو دل چاہ رہا تھا' رہ لئے۔ اب گھر سے دل بھر گیا ہے۔ اب ذرا تبدیلی کے لئے ہوٹل جا کر دھکے کھا لیتے ہیں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

راحیلہ کھوئے کھوئے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "بات بنانا تو تم پر ختم ہے۔ کچھ سیاستداں سے ہوتے جا رہے ہو۔ جب چاہتے ہو نکتہ نظر بدل لیتے ہو۔"

"کبھی کبھی میں دوسروں کی بہتری اور آسانی کے لئے ایسا کر[تا] ہوں۔" میں نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ دونوں مجھے سیڑھیوں تک چھوڑنے آئے۔

نیچے آ کر گاڑی میں بیٹھتے وقت میں نے دیکھا' چوتھی منزل پ[ر] صرف ایک فلیٹ کی ایک کھڑکی میں روشنی نظر آ رہی تھی اور اس روشنی میں ایک ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کندھوں پر جھکے ہوئے بالوں کی عجیب سے انداز میں بکھری ہوئی لٹیں بتا رہی تھیں ک[ہ] وہ راحیلہ تھی۔ میں نے گاڑی سے ہاتھ نکال کر ہلایا تو ہیولے نے

ہاتھ ہلایا۔ ایک طویل اور تھکی تھکی سی سانس لیتے ہوئے میں [نے گ]اڑی آگے بڑھا دی۔

✽✽✽

دوسرے روز شام کے چھ بجے میں نے اپنے ہوٹل میں نذیر [خان] کو ساتھ لیا اور ہم لفٹ کے ذریعے ساتویں منزل کی طرف [روانہ ہو گ]ئے۔ اس پورے فلور پر غیر ملکی سفیر وغیرہ ٹھہرے ہوئے [تھے۔] حفیظ صاحب بھی اسی فلور پر ایک وی آئی پی سوئٹ میں تھے۔ [ا]س فلور پر لفٹ سے نکلتے ہی سیکیورٹی والوں نے ہمیں تقریبا [گھیر] لیا۔ لفٹ کے دروازے اور سیڑھیوں کے قریب سیکیورٹی [والے] تعینات تھے۔ ان میں وردی اور سادہ لباس والے' دونوں ہی [قسم] کے لوگ تھے۔

[م]یں اور نذیر خان ویٹروں کی وردی میں تھے اور خالی ہاتھ تھے۔ [اس ف]لور پر سیکیورٹی کے سلسلے میں جتنے بھی آدمی تعینات تھے ان [میں] سے کوئی بھی ہمیں نہیں پہچانتا تھا اس لئے ہمارے ساتھ ان کا [رویہ و]یسا ہی تھا جیسا ویٹروں کے ساتھ ہوتا تھا۔ گو کہ ہمارے پاس [خصوصی] سیکیورٹی پاس موجود تھے لیکن سیکیورٹی پاس دوسرے کئی [ویٹروں] کے پاس بھی موجود تھے جو روم سروس کی زیر نگرانی اس فلور [پر کام] کر رہے تھے۔ تاہم جب بھی ان ویٹروں میں سے کوئی کسی [آرڈر کی ت]عمیل میں اس فلور پر آتا تھا تو ہر چکر میں اس کی تلاشی لی [جاتی] اور ٹرے یا ٹرالی میں وہ جو چیزیں ساتھ لئے ہوتا تھا انہیں [بھی غو]ر دیکھا جاتا تھا۔ ہم دونوں خالی ہاتھ تھے تو ہمیں زیادہ شک [کی نظر] سے دیکھا جا رہا تھا۔ انہوں نے ہمارا پورا جسم تھپتھپا کر دیکھ[ا۔ جیب]یں الٹ کر دیکھ لیں' موزوں تک میں انگلیاں ڈال کر دیکھا۔ [اس کے] بعد بھی گویا بادل نخواستہ ہمیں آگے جانے کی اجازت دی

[حف]یظ صاحب کے سوئٹ پر پہنچ کر میں نے دروازے پر دستک [دی۔ در]وازہ ان کے باڈی گارڈ جیلانی نے کھولا۔ اس سے بھی میرا [تعارف] ہو چکا تھا۔ نذیر خان کو وہ پہلے ہی سے پہچانتا تھا۔ وہ فوری [طور پر ا]س وقت ہمیں پہچان نہ سکا۔ ویٹروں کی یونیفارم میں ہم [بہت] مختلف لگ رہے تھے۔ تاہم دوسرے ہی لمحے اس نے [ہمیں پہچا]ن لیا اور اس کے چہرے پر پھیلا ہوا تناؤ دور ہو گیا۔ حفیظ [صاحب ک]ی طرح وہ بھی بہت کم مسکراتا تھا۔ ایک طرف ہٹ کر اس [نے ہمار]ے لئے راستہ چھوڑ دیا۔

[حفی]ظ صاحب ڈرائنگ روم میں ہی موجود تھے۔ سیکیورٹی چیف [ایک] ٹھنڈے گلاس والی کھڑکی کے قریب کھڑا تھا۔ ہمیں ویٹروں [کی یونیفارم] میں دیکھ کر اس کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی کچھ اور [گہری ہو گ]ئی۔ وہ اس وقت ڈنر سوٹ میں تھا اور بڑا بارعب دکھائی [دے رہا تھ]ا۔ اس کے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے۔

[حفیظ] صاحب سینٹر ٹیبل کے قریب ایک صوفے پر موجود تھے۔ [ان کے مق]ابل ایک سفید فام بیٹھا تھا۔ میز پر ایک فائل رکھی تھی۔

عین اسی لمحے غالباً انہوں نے کسی خاص موضوع پر گفتگو ختم کی تھی۔ کمرے میں سگریٹ اور سگار کا ملا جلا دھواں بھرا ہوا تھا۔ وہ بھاری بھرکم' سفید فام کوئی سفارت کار ہی معلوم ہوتا تھا۔ ہمیں دیکھ کر وہ فائل بغل میں دباتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور حفیظ صاحب سے مصافحہ کر کے رخصت ہونے لگا۔ حفیظ صاحب اسے چھوڑنے دروازے تک گئے۔ میں اور نذیر خان ویٹروں ہی کے سے مؤدبانہ انداز میں ہاتھ باندھے ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

سفید فام رخصت ہو چکا تو حفیظ صاحب واپس اپنی جگہ پر آ بیٹھے اور سگار کا کش لیتے ہوئے گہری نظر سے ہمارا جائزہ لینے لگے۔ ان کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ میں اور نذیر خان بڑے مسکین انداز میں گردن ذرا ٹیڑھی کئے کھڑے تھے۔

آخر کار حفیظ صاحب نے گہری سانس لیتے ہوئے مجھے مخاطب کیا۔ "اس کا مطلب ہے تم ابھی تک اپنے اس نظریے پر قائم ہو کہ میری جان کو خطرہ لاحق ہے؟"

"یہاں پہنچ کر میرا یہ نظریہ کل سے زیادہ پختہ ہو گیا ہے حفیظ صاحب!" میں نے جواب دیا۔

"اور تم نے خالصتاً فلمی انداز میں اس خطرے سے نمٹنے کا فیصلہ کیا ہے؟" حفیظ صاحب نے ہماری وردیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا سر!" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔ "غور و فکر کے لئے زیادہ وقت نہیں تھا۔ ہمیں معلوم نہیں کہ خطرے کا امکان کس طرف سے..... یا کس کی طرف سے ہے۔ اگر ہم اپنی اصل حیثیت میں ڈنر میں شریک ہوتے تو صرف ہم دو ہی آدمی بالکل غیر متعلق نظر آتے۔ اس طرح شاید کسی کو چونکنے یا خبردار ہونے کا موقع مل جاتا۔ فوری طور پر ہمیں یہی آسان اور محفوظ راستہ نظر آیا۔"

"کیا تمہیں اب تک اندازہ نہیں ہوا کہ سیکیورٹی کا نظام کتنا عمدہ ہے؟" حفیظ صاحب نے دریافت کیا۔

"بے شک عمدہ ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "میں اسے مزید عمدہ بنانا چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے میرے اور نذیر خان کے آجانے سے اس نظام میں کچھ بہتری ہی پیدا ہوگی' کوئی حرج نہیں ہو گا۔"

"یہ تو ہم نے تسلیم کر لیا تھا۔ تبھی تو تمہیں خصوصی سیکیورٹی پاس ملا۔" حفیظ صاحب سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولے۔

اچانک میں نے سیکیورٹی چیف اکرام بیگ کو مخاطب کیا۔ "بیگ صاحب! اگر آپ اس ڈنر کی طرف سے صبر کر لیں تو میں کسی روز آپ کے اعزاز میں اس سے کہیں اچھے ڈنر کا انتظام کر سکتا ہوں۔"

"کیا مطلب؟" اکرام بیگ چونکا۔ "میں بھلا ڈنر سے کیسے..... غیرحاضر رہ سکتا ہوں؟ منسٹر صاحب جب بھی کسی اجتماع میں موجود

ہوتے ہیں..... کسی اجلاس میں شرکت کرتے ہیں... یا سفر کر رہے ہوتے ہیں تو میرا ان کے ساتھ رہنا لازمی ہوتا ہے۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں آپ کو ڈنر اور سیمینار سے غیر حاضر رہنے کے لئے نہیں کہہ رہا۔ میں نے سنا ہے اس تقریب میں آپ بھی ایک مہمان ہی کی طرح منسٹر صاحب کے دائیں طرف بیٹھے ہوں گے۔ کیا یہ درست ہے؟"

"ہاں۔ میں نے سیکیورٹی کو زیادہ سے زیادہ مؤثر بنانے کے لئے منسٹر صاحب کے زیادہ سے زیادہ قریب رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ منسٹر صاحب کے عین پیچھے جیلانی کھڑا رہے گا۔" اکرام بیگ نے باڈی گارڈ کی طرف اشارہ کیا جس کا چہرہ کسی مجسمے کی طرح سپاٹ تھا۔

"بس تو پھر آپ صرف اتنی زحمت کیجئے گا کہ آپ کے سامنے کھانے پینے کی جو بھی چیز سرو کی جائے اسے آپ منسٹر صاحب کی چیز سے تبدیل کرلیں۔ خواہ وہ سوپ ہو' کھانے کی کوئی چیز ہو' مشروب ہو یا پانی۔ غرضیکہ کسی بھی برتن میں کوئی چیز ہو وہ آپ منسٹر صاحب کے سامنے رکھ دیں گے اور منسٹر صاحب کے لئے آئی ہوئی چیز اپنے سامنے رکھ لیں گے لیکن اسے کھائیں یا پئیں گے نہیں۔ اگر کسی کی توجہ اس طرف چلی بھی جائے کہ آپ کچھ کھا پی نہیں رہے اور وہ اس بارے میں کوئی بات کرے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا پیٹ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"اور اگر کسی نے پوچھ لیا کہ میں ہر چیز منسٹر صاحب سے کیوں تبدیل کر رہا ہوں؟" اس نے بجھے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"آپ ہر چیز کسی نہ کسی بہانے سے تبدیل کیجئے گا۔ کبھی کچھ کہتے ہوئے' کبھی کچھ کہتے ہوئے۔ مثلاً... 'سر! آپ یہ پلیٹ لے لیجئے۔ اس میں چاول زیادہ عمدہ دکھائی دے رہے ہیں... سر! آپ یہ گوشت چکھئے۔ یہ زیادہ عمدہ بھنا ہوا دکھائی دے رہا ہے......' وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی کوئی بات کرتے ہوئے آپ چیز تبدیل کر سکتے ہیں... اور اگر کوئی آپ کی طرف متوجہ نہ ہو تو پھر بات بھی کرنے کی ضرورت نہیں۔"

حفیظ صاحب بولے۔ "برخوردار چوہدری! یہ کچھ بچکانہ سی حرکتیں نہیں ہیں؟ اکرام بیگ نے مجھے بتایا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے بارے میں تمام احتیاطی اقدامات کر لئے گئے ہیں اور ان میں کوئی شرارت نہیں کی جا سکتی۔"

"پھر بھی احتیاط کر لینے میں کیا حرج ہے حفیظ صاحب! بڑی سرکاری شخصیتوں نے تو احتیاط پسندی کے ریکارڈ توڑے ہوئے ہیں۔ آپ احتیاطی اقدامات میں اضافہ کرتے ہوئے اتنے کیوں شرما رہے ہیں؟"

حفیظ صاحب نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے اکرام بیگ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ کے خیال میں کیا اس قسم کی احتیاطی تدبیریں ہماری' ہمارے ملک کی یا حفیظ صاحب کی سبکی کا باعث بنیں گی؟"

"نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" اکرام بیگ نے نخواستہ جواب دیا۔ "لیکن مجھے ان حرکتوں کا کوئی فائدہ نہیں دے رہا۔ بہرحال آپ بضد ہیں تو ہم یہ سب کچھ کر لیتے ہیں۔ منسٹر صاحب کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ ان معاملات میں باہر کے لوگوں کی مداخلت بے کار ہوتی ہے۔

پھر وہ گویا زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے بولا۔ "میرے اعزاز میں ڈنر دینے کا وعدہ بھولئے گا مروّت میں اس قسم کی پیشکش مسترد کرنے والا آدمی نہیں

"میں نے بھی پیشکش محض رعب ڈالنے کے لئے ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس ہوٹل کو آ سمجھئے۔ جب بھی آپ کراچی آئیں' اپنے اعزاز میں جتنے لے لیں اور ان میں جتنے مہمانوں کو چاہیں' مدعو کر لیں۔ اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ سے آپ کے نام کوئی بل جاری جائے گا۔"

"آپ جذباتی ہو کر پیشکش تو کر رہے ہیں۔ بعد میں نہیں۔" اکرام بیگ مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"میں اس قسم کے معاملات میں جذباتی نہیں ہوتا ضروری پچھتاووں کو دل میں جگہ دیتا ہوں۔" میں نے جوا

منسٹر صاحب نے گہری نظر سے اکرام بیگ کی طرف وہ مزید کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر ا پہلی سی سنجیدگی چھا گئی جس سے اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگتا تھا۔ پھر منسٹر صاحب میری طرف گردن گھماتے ہو سے بولے۔ "اس وقت زیادہ حاتم طائی بننے کی ضرو برخوردار چوہدری! ذرا اپنے سراپا پر ایک نظر ڈال لو اور حیثیت کو یاد رکھو۔ کہیں سیمینار اور ڈنر کے دوران بھی کوئی بات نہ کر بیٹھنا۔"

میں نے ایک نظر اپنی ویٹر کی وردی پر ڈالی اور بدلے لہجے میں کہا۔ "آئی ایم سوری سر! میں واقعی بھول گیا تھا۔ آئی ایم جسٹ اے ویٹر۔"

حفیظ صاحب نے سگار کا گہرا کش لیا اور نذیر خا دیکھتے ہوئے بولے۔ "نذیر! تم تو بہت بولنے والے آدمی مجسمے کی طرح خاموش کیوں کھڑے ہو؟"

"بس جی..." نذیر خان اپنی ویٹروں والی یونیفارم موجود شکن درست کرتے ہوئے بولا۔ "نئی جگہ سا ماحول ہے۔ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ سوچ رہا ہو نہ ہو جائے۔"

"بس آنکھیں بند کر کے چوہدری کے پیچھے چلتے رہ ہو گئی تو ہم سب مل کر چوہدری کی گردن ناپیں گے۔" خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ پھر انہوں نے

اوران کے تاثرات یکسر بدل گئے۔

"ویٹرز!" انہوں نے بارعب لہجے میں کہا۔ "اب تم جاسکتے ہو۔ کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو ہم تمہیں بلوالیں گے۔"

"لیس سر!" میں نے سہمے ہوئے سے انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا۔ "آج جو ویٹر آپ کو اور غیر ملکی مہمانوں کو سرو کررہے ہیں انہیں اکرام بیگ صاحب کے سیکیورٹی انتظامات کے تحت نمبر الاٹ کئے گئے ہیں۔ میرا اور نذیر خان کا نمبر تیرہ اور چودہ ہے۔ اگر ہمیں طلب فرمانا ہو تو ان نمبروں سے طلب فرمائیے گا۔ نام سے نہیں۔"

"مجھے کیا بتا رہے ہو۔" حفیظ صاحب نیم بیزاری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے۔ "جس نے نمبر الاٹ کئے ہیں وہی بلائے گا۔ میں کون سا کسی کو بلانے کے لئے خود فون کرتا ہوں۔"

میں نے تفہیمی انداز میں سرہلایا اور نذیر خان کو ساتھ لے کر سوئٹ سے نکل آیا۔ اکرام بیگ کے انتظامات اپنی جگہ تھے لیکن کچھ انتظامات مجھے بھی کرنا تھے اور مہمانوں کی آمد شروع ہونے میں اب زیادہ دیر نہیں تھی۔ اس قسم کی تقریبات میں ہر کام پابندیٔ وقت کے ساتھ ہوتا تھا۔

***

اس رات ٹھیک آٹھ بجے حفیظ صاحب عقبی دروازے سے ہوٹل کے بینکوئٹ ہال میں داخل ہوئے تو مہمانوں نے ہلکی سی تالیوں کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ ان کے دائیں ہاتھ پر اکرام بیگ تھا اور بائیں ہاتھ پر جیلانی۔

ہال میں دو سو سے زائد مہمان موجود تھے۔ ان میں کئی قوموں کے لوگ تھے۔ بہت سی خواتین بھی تھیں۔ ان میں سے بیشتر تو سفید فام سفارت کاروں کی بیویاں تھیں اور باقی چند ایک کے کندھوں پر لٹکے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹیپ ریکارڈر اور ہاتھوں میں موجود ڈائریاں وغیرہ بتا رہی تھیں کہ وہ غیر ملکی اخبارات کی نمائندہ تھیں۔ مردوں میں سے بیشتر ڈنر سوٹ میں تھے۔

میں اور نذیر خان ویٹروں کی یونیفارم میں، مسکین سی شکلیں بنائے ہیڈ ٹیبل کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔ حفیظ صاحب کی آمد پر تالیاں بجیں تو ہم جلدی سے سیدھے ہو کر کھڑے ہوگئے اور مستعد نظر آنے کی ایکٹنگ کرنے لگے۔ اس سے پہلے ہم اکثر ویٹروں کی طرح ڈھیلے ڈھالے اور بے پروا سے نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ داؤد چوہدری بھی ہال میں موجود تھا۔ وہ ہوٹل کے سیکیورٹی اسٹاف کا انچارج تھا۔ وہ میرے قریب ہی کھڑا تھا۔

میں نے سرگوشی میں اس سے کہا۔ "کوئی بھی مرد یا عورت اگر تمہیں ذرا سی بھی مشکوک حرکت کرتا یا کرتی دکھائی دے تو تم فوراً مجھے سگنل دینا۔"

"میں اسے پکڑلوں گا۔" داؤد چوہدری مستعدی سے بولا۔

"اب اتنا بھی مستعد بننے کی ضرورت نہیں۔" میں [illegible] گھورا۔ "ہو سکتا ہے اس کی حیثیت ایسی نہ ہو کہ سب کے اس پر ہاتھ ڈالا جاسکے۔ دوسرے اسے صرف پکڑ لینا ہی کا ہوگا۔ اسے سرکاری ہاتھوں میں سونپنے سے پہلے میں اس [illegible] بھی کچھ معلوم کرنا چاہوں گا۔ اس کے لئے مجھے نہ جانے [illegible] اختیار کرنا پڑے۔ شاید تم ایسا کوئی طریقہ اختیار کرنے کے [illegible] ہو سکو۔"

"او کے سر! جیسے آپ کا حکم۔" داؤد نے سعادت مند [illegible] سرگوشی میں ہی جواب دیا لیکن بظاہر اس کا انداز ایسا تھا [illegible] مجھے کچھ ہدایات دے رہا ہو۔ پھر وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر ایک [illegible] میں جا کر کھڑا ہوگیا۔

ہال میں گول میزوں پر مہمان پہلے ہی اپنی نشستوں [illegible] سے بیٹھ چکے تھے۔ اب ہوٹل کا پبلک ریلیشنز منیجر اور ا[illegible] [illegible]ل کر خاص الخاص مہمانوں کو حسب مراتب ہیڈ ٹیبل پر [illegible] تھے۔ آخر میں پروٹوکول کی ذرا سی خلاف ورزی کرتے ہو[illegible] بیگ خود منسٹر صاحب کے دائیں ہاتھ پر بیٹھ گیا۔ تقریب [illegible] شروع ہوگئی۔

یہ ایک عجیب تقریب تھی۔ اسے سیمینار بھی کہا [illegible] پریس کانفرنس بھی اور سفارتی اجتماع بھی۔ لیکن دعوتی کا[illegible] اسے صرف فارن منسٹر صاحب کے ساتھ ایک ڈنر' کا [illegible] تاہم مہمانوں اور ذرائع ابلاغ کے نمائندوں کو یقیناً [illegible] نوعیت کا اندازہ تھا۔ سب پوری طرح "تیار" ہو کر آئے [illegible] اندازہ مجھے بعد میں ہوا جب میں نے بعض غیر ملکی سفیر[illegible] بعد دیگرے تقریریں کرتے دیکھا جو وہ لکھ کر لائے [illegible] ابلاغ کے نمائندے سوالات کے ہتھیاروں سے پوری [illegible] تھے۔

ہر میز پر مائیک موجود تھا۔ سوال یا تقریر کرنے [illegible] مہمان کو اپنی میز سے اٹھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پہلے [illegible] سفیروں نے مخصوص ڈپلومیٹک انداز میں مختصراً اور گول [illegible] تقریریں کیں۔ ان کی تقریروں کا لب لباب یہی تھا کہ [illegible] خارجہ پالیسی خواہ کچھ بھی ہو لیکن ان کے ممالک اپنا [illegible] رکھیں گے۔

بڑے باوقار انداز میں تقریریں جاری تھیں۔ آ[illegible] صاحب نے تقریر شروع کی اور ہال میں ایسی خاموشی چھ[illegible] مہمانوں کی سانسوں کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں [illegible] حفیظ صاحب کی تقریر بے پناہ اہمیت کی حامل تھی۔ اب [illegible] کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اسے کیوں آخری وقت تک [illegible] گیا تھا۔ وہ خارجہ پالیسی کو ایک اہم موڑ پر لے آئے [illegible] نے اس میں ایک اہم تبدیلی کردی تھی جو شاید کئی ملکوں [illegible] متوقع تھی۔ شاید اس تبدیلی کا تعلق اس امن منصوبے

[illegible] انہوں نے مشرق وسطیٰ کے لئے تیار کیا تھا۔ بہت الجھے ہوئے [illegible] حالات تھے۔ بہت نازک باتیں تھیں۔ میں نے ان میں زیادہ [illegible] سر کھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی اور مؤدبانہ انداز میں اپنی جگہ [illegible] کھڑے کھڑے ہر مہمان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنے کی کوشش [illegible] اری رکھی۔

حفیظ صاحب کی تقریر ختم ہوتے ہی غیر ملکی اخباری نمائندوں [illegible] نے ان پر سوالات کی بھرمار کردی۔ حفیظ صاحب بڑے تحمل سے دل [illegible] نشیں انداز میں جوابات دیتے رہے۔ ایک ڈپلومیٹ کی پوری [illegible] شش ہوتی ہے کہ وہ اپنا کام بھی کرتا رہے اور کوئی اس سے [illegible] اض بھی نہ ہو۔ حفیظ صاحب اسی ہنر کا نہایت کامیابی سے [illegible] اہرہ کر رہے تھے۔

سوالات کا سلسلہ کافی طول کھینچ گیا۔ تقریباً ایک گھنٹا ہی اس [illegible] صرف ہوگیا۔ اس دوران ویٹروں نے کئی بار پانی اور کولڈ [illegible] نکس کے گلاس مہمانوں کے سامنے لا کر رکھے جن میں سے کچھ [illegible] عمال ہوئے، کچھ یونہی رکھے رہے تاہم انہیں بھی تبدیل کیا جاتا [illegible]۔ ہر بار باہر سے آنے والے ویٹروں سے ان گلاسوں کی ٹرے [illegible]، کر میں نے خود گلاس مہمانوں کے سامنے رکھے۔ نہایت بے [illegible] ر نظر آنے والے ان صاف و شفاف اور خوبصورت گلاسوں میں [illegible]، کسی کی تہ میں موت بھی جاگزیں ہو سکتی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر [illegible] بنان ہوا کہ اکرام بیگ نے ہر بار نہایت صفائی سے منسٹر صاحب [illegible] گلاس سے اپنا گلاس بدل لیا۔ گو کہ ابھی تک حفیظ صاحب نے [illegible] کے صرف ایک گلاس سے چند گھونٹ پانی پیا تھا لیکن میں نے [illegible] ند منٹ بعد ان کے سامنے گلاس تبدیل کردیا تھا اور پھر اکرام [illegible] نے اسے اپنے گلاس سے تبدیل کرلیا تھا۔ سوال و جواب کے [illegible] ش ماحول میں کسی مہمان کی توجہ اس طرف نہیں گئی تھی۔

آخر کار ڈنر شروع ہوا۔ کھانے میں کافی تاخیر ہو چکی تھی۔ [illegible] وں اور سوال و جواب کے سلسلے سے کچھ لوگ تھک گئے تھے، [illegible] کے چہروں سے عدم دلچسپی جھلک رہی تھی، کچھ کو چپ سی لگ [illegible] تھی۔ بہرحال اشتہا انگیز خوشبوؤں کے ساتھ کھانوں کی آمد [illegible] ہوئی تو ہال کا ماحول بدل گیا۔ چہروں پر بشاشت آگئی۔ لوگ [illegible] آوازوں میں ہنسنے بولنے لگے۔ مترنم نسوانی ہنسی بھی سنائی [illegible] لگی۔

[illegible] ہر چیز مہمانوں کو ان کی میزوں پر ہی سرو کی جارہی تھی۔ کچھ [illegible] کے دروازے تک ٹرے لے کر آرہے تھے۔ اندر کھڑے [illegible] ویٹر ان سے چیزیں لے کر آگے بڑھاتے تھے۔ ان سے چیزیں [illegible] ہیڈ ٹیبل پر میں اور نذیر خان سرو کر رہے تھے۔ خصوصاً منسٹر [illegible] کے سامنے تو ہر چیز میں ہی رکھ رہا تھا۔ [illegible] نسٹر صاحب پوری کوشش کر رہے تھے کہ وہ میری طرف کوئی [illegible] توجہ نہ دیں اور مجھے ایک ویٹر ہی کی طرح ٹریٹ کریں۔ وہ یقیناً [illegible] حقیقت کو فراموش کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے کہ

ایک دولت مند صنعتکار و بزنس مین اور اس ہوٹل کا مالک ویٹر کی وردی پہنے مستعدی سے ان کے سامنے برتن سجا رہا تھا۔

ظاہر ہے جتنی چیزیں سرو کی جارہی تھیں، مہمان اتنا کچھ تو نہیں کھا سکتے تھے۔ حفیظ صاحب تو ویسے بھی خوش خوراک معلوم نہیں ہوتے تھے۔ وہ ہر چیز کو بس چکھ ہی رہے تھے۔ آخر کار کھانوں کا سلسلہ ختم ہوگیا اور ڈیزرٹ یعنی میٹھے کا دور چلنے لگا۔ کئی اقسام کا میٹھا سرو کیا گیا۔ اس کے برتن سمیٹے جاچکے تو پھر کافی چائے وغیرہ کی باری آئی۔ حفیظ صاحب نے اپنے لئے کافی پسند کی تھی۔

اکرام بیگ نے میری ہدایت پر عمل کرتے ہوئے حفیظ صاحب سے اپنے برتن تبدیل کرنے کا سلسلہ جاری رکھا تھا۔ ہم تینوں اس ضمن میں خواہ مخواہ ہی اندیشے محسوس کر رہے تھے کہ کوئی یہ حرکت دیکھے گا تو کیا سوچے گا۔ کسی نے بھی اس سلسلے میں کوئی نوٹس نہیں لیا۔ اگر کسی نے اکرام بیگ کو تواتر سے یہ سب کچھ کرتے ہوئے دیکھ بھی لیا تھا تو اس نے اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اس طبقے کے مہمانوں کو غالباً اندازہ تھا کہ حفاظتی اقدامات کے طور پر اس قسم کی حرکتیں کی جاتی ہیں۔ کسی نے بھی اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔

چائے کافی کا دور ابھی چل رہا تھا۔ میں ایک بار پھر حفیظ صاحب کے پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اسی اثنا میں ایک ویٹر ایک ٹرے میں چند خوبصورت اور منقش چوبی صندوقچے اٹھائے ہال میں آیا۔ یہ سگریٹوں اور سگاروں کے صندوقچے تھے۔ سگریٹوں کے چند صندوقچے تو اس نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ہیڈ ٹیبل پر سجا دیئے لیکن سگار باکس سے ایک ایک سگار نکال کر ہر مہمان کے عین سامنے طشتری میں رکھنے لگا۔ وہ ہوانا کے بہترین سگار تھے۔ ہر سگار نہایت خوبصورتی اور عمدگی سے سیلوفین میں پیک شدہ تھا۔ اعلیٰ درجے کے سگار پینے کے تقریباً تمام شوقین یہی برانڈ پیتے تھے۔ حفیظ صاحب بھی یہی پیتے تھے۔

جو لوگ سگار نہیں پیتے تھے، ویٹر نے ان کے سامنے بھی بہرحال ایک ایک سگار سجا دیا۔ اکرام بیگ ایک نئے منگوائے ہوئے برتن سے کافی انڈیل کر چسکیاں لینے میں مشغول رہا۔ اس نے سگاروں اور سگریٹوں کی طرف توجہ نہیں دی۔ میں نے اسے حفیظ صاحب سے کھانے پینے کی ہر چیز تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس میں سگریٹ یا سگار کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔ شاید اس لئے اس نے ان کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ ایک وجہ شاید یہ بھی رہی ہو کہ وہ خود اسموکر نہیں تھا۔

میں نے خود بھی سگاروں کو زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ میں اس ویٹر کو باقی میزوں پر بھی سگریٹ اور سگار سجاتے دیکھتا رہا۔ اچانک میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ سگریٹ اور سگار...... یہ گویا اس ڈنر کا آخری آئٹم تھا۔ اب تک ہم بہت مستعد، بہت ہوشیار رہے تھے۔ سب کچھ ٹھیک ٹھاک معلوم ہو رہا تھا لیکن آخر میں

آکر ہم نے اپنے آپ کو کچھ ڈھیلا سا چھوڑ دیا تھا۔

درندہ عام طور پر اپنے شکار کو اس وقت دبوچتا ہے جب وہ گرد و پیش سے ذرا بے پروا ہو جاتا ہے۔ حادثہ عام طور پر وہاں پیش آتا ہے جہاں ڈرائیور سمجھتا ہے کہ اب راستہ صاف ہے اور وہ اپنے آپ کو کچھ ڈھیلا سا چھوڑ دیتا ہے۔ میری "ساتویں حس" میرے اعصاب میں کچھ کھٹکا سا پیدا کر رہی تھی' جیسے کوئی بند پڑا ہوا ٹیبل کلاک اچانک ہی ٹک ٹک کرنا شروع کر دے۔ میں نے اپنے آپ کو مضطرب محسوس کیا۔

آخر کار میں رہ نہ سکا۔ حفیظ صاحب کے سامنے سے میز صاف کرنے کے بہانے میں نے آگے بڑھ کر چیزیں ہٹانی شروع کیں۔ اس وقت تک حفیظ صاحب کانی ختم کر چکے تھے اور غالباً سگار کی طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے۔ ان کی نظر بتا رہی تھی کہ وہ سگار میز سے اٹھانے ہی والے ہیں۔ لیکن میز سے برتن سمیٹتے اور میز پوش صاف کرتے ہوئے اسی لمحے میرا ہاتھ سگار سے ٹکرایا اور وہ نیچے جا گرا۔

"اوہ... میں معافی چاہتا ہوں سر!" میں نے نہایت عاجزانہ لہجے میں کہا۔ میں ان کے عقب سے' دائیں طرف سے' ان کے اور اکرام بیگ کے درمیان کھڑے ہو کر میز صاف کر رہا تھا۔ بظاہر میں سگار اٹھانے کے لئے جھکا لیکن اسی دوران میں نے حفیظ صاحب کے کان میں سرگوشی کی۔ "کوئی سگار مت پیجئے گا۔ اپنا بھی نہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ ایک ثانئے کے لئے حفیظ صاحب کے جسم میں تناؤ آگیا۔ انہیں سگار پینے سے باز رکھنا ویسے ہی ان کے لئے آزمائش سے کم نہیں تھا اور اس وقت تو ظاہر ہے اس ہدایت کا ایک خاص ہی مقصد تھا جو انہیں چونکا دینے کے لئے کافی تھا۔ تاہم انہوں نے یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ انہیں کوئی جھٹکا لگا ہے۔ وہ ذرا بائیں طرف جھک کر ایک سفید فام مہمان سے باتیں کرنے لگے۔

میں نے سگار میز کے نیچے سے اٹھا کر جیب میں ڈال لیا۔ سیدھا کھڑا ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ میزوں پر سگریٹیں اور سگار سجانے والا ویٹر ہال سے باہر جا چکا تھا۔ میں اس کے پیچھے لپکا تاہم میں نے مہمانوں کو یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ میں عجلت میں ہوں۔ مجھے یاد تھا کہ اس ویٹر کے سینے پر آویزاں بیج کے مطابق اس کا نمبر اُنیس تھا اور وہ ایک لمبا تڑنگا سرخ و سپید نوجوان تھا۔

باہر راہداری میں وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے ہوٹل سیکیورٹی کے ایک آدمی سے پوچھا۔ "اُنیس نمبر کہاں ہے؟ ابھی باہر آیا تھا۔"

اس نے راہداری کے اختتام کی طرف اشارہ کیا۔ میں لپک کر وہاں پہنچا۔ دائیں ہاتھ پر ایک قطار میں چند سوئٹ تھے۔ بائیں [illegible] لفٹ کا راستہ تھا۔ وہاں ایک پولیس آفیسر

تعینات تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "اُنیس نمبر ویٹر کس طرف گ[illegible] ہے؟"

اس نے رُکھائی سے جواب دیا۔ "نمبر کا تو مجھے پتا نہیں..... ایک ویٹر ادھر گیا ہے۔" اس نے اوپر جانے وال[illegible] سیڑھیوں کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے لہجے کی رکھائی اور کھردر[illegible] پن پر مجھے کوئی شکوہ نہیں ہونا چاہئے تھا۔ آخر وہ ایک "ویٹر" [illegible] مخاطب تھا۔ تاہم میں تھوڑا سا حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کیونک[illegible] سیکیورٹی انتظامات کے مطابق' سرو کرنے والے ویٹروں کا راس[illegible] مقرر تھا۔ اس حساب سے اسے اوپر نہیں جانا چاہئے تھا۔

"آپ نے اسے اوپر جانے سے روکا نہیں؟" میں نے پولیس آفیسر سے پوچھا۔ "ویٹروں کو اس فلور سے اوپر جانے کی اجاز[illegible] نہیں تھی۔"

پولیس آفیسر نے سخت نگاہوں سے مجھے گھورا۔ اسے ایک و[illegible] کا اس کے طرزِ عمل پر اعتراض کرنا یقیناً بہت گراں گزرا تھا۔ [illegible] اور موقع ہوتا تو شاید وہ مجھے کسی ناکردہ جرم کے شبے میں اندر کر[illegible] کے بارے میں غور کرتا لیکن اس وقت خاصے صبر و ضبط کا مظا[illegible] کرتے ہوئے کھردرے لہجے میں بولا۔ "یہ ہوٹل سیکیورٹی والو[illegible] کام ہے۔ مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔"

میں مزید کچھ کہے بغیر سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو وہ بولا۔ "تم [illegible] خود ہی بتایا ہے کہ ویٹروں کو اوپر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ [illegible] مجھے معلوم نہیں تھا۔ اب معلوم ہو چکا ہے تو کیوں نہ میں [illegible] روک لوں؟"

تاہم اس نے آگے بڑھ کر مجھے روکنے کی کوشش نہیں [illegible] اس کا مقصد صرف طنز سا کرنا تھا۔ میں ایک نظر اس کی طرف [illegible] کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر میں اوپر پہنچا تو یہ [illegible] کر کچھ اطمینان ہوا کہ وہاں ہوٹل سیکیورٹی کا ایک آدمی تعی[illegible] تھا۔

"اُنیس نمبر کہاں ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "اور و[illegible] کیوں آیا ہے؟"

سیکیورٹی گارڈ اپنے ہاتھ میں موجود ایک کاغذ پر نظر دو[illegible] ہوئے بولا۔ "ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد ویٹر اوپر آ سکتے ہیں کیونک[illegible] لاکر روم اس فلور پر ہے جہاں انہیں یونیفارم وغیرہ تبدیل کر[illegible] ہے۔ اُنیس نمبر کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔ وہ چودہ گھنٹے سے ڈ[illegible] تھا۔ اوور ٹائم کر رہا تھا۔"

"لاکر روم کدھر ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

یہ میری نالائقی تھی کہ ہوٹل کا مالک ہوتے ہوئے [illegible] نہیں معلوم تھا' ویٹروں کا لاکر روم کہاں ہے۔ لیکن اس [illegible] نالائقی یہ تھی کہ میں ویٹر کی وردی میں ہوتے ہوئے پوچھ رہا[illegible] ویٹروں کا لاکر روم کہاں ہے؟ الفاظ منہ سے نکلتے ہی مجھے اپنی [illegible] کا احساس ہوا تھا لیکن جلدی میں بات منہ سے نکل چکی تھی

کہتے ہیں کہ کمان سے نکلا ہوا تیر اور منہ سے نکلی ہوئی بات واپس نہیں آتی' اس کے صحیح مفہوم کا احساس اس وقت ہوا۔

سیکیورٹی گارڈ نے میری توقع سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ پلک جھپکتے میں اس نے ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور خوفناک نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے غرایا۔ "کون ہو تم؟"

میں نے اس وقت اس سے اپنا اصل تعارف کرانا مناسب نہ سمجھا اور گھٹی گھٹی آواز میں تیزی سے کہا۔ "ابے گدھے! ریوالور ہولسٹر میں ہی رکھ لو۔ میں خفیہ پولیس کا آدمی ہوں۔"

"اوہ.....!" اس نے اطمینان کی گہری سانس لی اور ریوالور واپس رکھ لیا۔ پھر اس نے اشارے سے مجھے بتایا کہ لاکر روم کس طرف تھا۔ وہ ایک گوشے میں' ایک دیوار کی آڑ میں واقع تھا۔ سامنے سے نظر نہیں آتا تھا۔ میں تیزی سے وہاں پہنچا۔ دروازہ غیر مقفل تھا۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا' لوہے کی پتلی پتلی اور لمبی لمبی سی الماریاں قطار در قطار کھڑی ہوئی تھیں۔ انہی میں سے ایک الماری کے سامنے وہ ویٹر کھڑا ہوا تھا جس نے بینکوئٹ ہال میں سگریٹیں اور سگار سرو کئے تھے۔ الماری کا دروازہ کھول کر وہ اپنے عام کپڑے نکال چکا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہونے کی آواز سن کر وہ خوفزدہ سے انداز میں گھوما لیکن جب اس نے ایک اور "ویٹر" کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تو اطمینان کی سانس لی اور شناسائی کے اظہار کے لئے خواہ مخواہ مسکرا دیا حالانکہ ظاہری بات تھی' وہ مجھے پہچانتا نہیں تھا۔

میں نے اس کے قریب پہنچ کر جیب سے وہ سگار نکالا جو میں نے حفیظ صاحب کے سامنے سے فرش پر گرایا تھا اور پھر پار کر لیا تھا۔ سگار اسی طرح سیلوفین میں پیک تھا اور اس پر خوبصورت لیبل بھی چسپاں تھا۔

"سگار پیو گے؟" میں نے سگار ویٹر کی طرف بڑھاتے ہوئے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

اس نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور سپاٹ لہجے میں بولا۔ "نہیں۔ شکریہ۔ میں سگار یا سگریٹ وغیرہ نہیں پیتا۔"

"لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم اسے ضرور پیو۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "یہ بہت خاص قسم کا سگار ہے۔ یہ تم نے فارن منسٹر صاحب کے عین سامنے رکھا تھا۔ اس کے لیبل پر میں نے بروقت ایک باریک سا نشان دیکھ لیا تھا جو بظاہر لیبل کے ڈیزائن کا ہی ایک حصہ نظر آ رہا ہے۔ اس سے یقیناً تمہیں بہت آسانی رہی ہوگی۔"

"کس بات کی آسانی؟" اس نے انجان بنتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

"یہی کہ کون سا سگار خاص طور پر حفیظ صاحب کے سامنے رکھنا ہے۔ تدبیر واقعی عمدہ تھی۔ اس طرف تو کسی کا دھیان جا ہی نہیں سکتا تھا۔ غلطی کا بھی کوئی امکان نہیں تھا۔ کامیابی بھی یقینی تھی۔ حفیظ صاحب سگار کے زبردست رسیا ہیں۔ اپنا مخصوص برانڈ دیکھ کر وہ سگار پئے بغیر رہ ہی نہیں سکتے تھے۔ اور یہ ایک ایسی چیز تھی جس کے بارے میں مَیں منسٹر صاحب کو یا اکرام بیگ کو کوئی ہدایت بھی نہیں دے سکا تھا۔ میرا خود بھی اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔"

ویٹر الماری کی طرف پشت کئے ساکت کھڑا تھا۔ سادہ کپڑے اس کے ہاتھوں میں تھے۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف نمودار ہو چکا تھا لیکن بظاہر وہ اسی طرح معصوم اور بے خبر رہا۔ قدرے غصے سے بولا۔ "میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم کیا بکواس کر رہے ہو... اور تم ہو کون؟ مجھے تو تم ویٹر معلوم نہیں ہوتے۔"

"ویٹر تو شاید تم بھی نہیں ہو۔ تم نے بھی غالباً کسی بدنصیب کی جگہ لے رکھی ہے۔ کہاں مار کر پھینکا ہے اصلی ویٹر کو؟ کیا وہ تمہارا ہم شکل تھا؟" میں نے پوچھا۔

"تم تو واقعی پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تم میرے پیچھے کیوں لگ گئے ہو۔ میں نے بہت لمبی ڈیوٹی دی ہے۔ اب میں بری طرح تھکا ہوا ہوں۔ میرے پاس تمہاری فضول اور الجھی الجھی باتوں کے لئے وقت نہیں ہے۔" وہ اپنے سادہ کپڑوں کو پہننے کے لئے درست کرنے لگا۔ لیکن اس کی نظر مجھ پر سے نہیں ہٹی تھی۔

"اچھا..... یہی بتا دو کہ حفیظ صاحب اس سگار کو پی لیتے تو کیا ہوتا؟ ان کے دل کی دھڑکن رکتی یا بلڈ پریشر بے پناہ بڑھ جانے کے باعث برین ہیمورج ہوتا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اب اس کی آنکھوں میں خوف کی جگہ سفاکی نمودار ہو رہی تھی۔ میری نظر اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ میں اس کے چہرے پر یا آنکھوں میں نمودار ہونے والی ان خفیف تبدیلیوں سے بے خبر نہیں تھا۔

وہ خاموش رہا تو میں نے پوچھا۔ "اس سگار میں جو زہر شامل کیا گیا ہے' انسانی جسم میں غالباً اس کا سراغ لگانا ناممکن ہوگا؟"

اس نے میرے اس سوال کا بھی کوئی جواب نہیں دیا تو میں نے کہا۔ "اچھا..... کم از کم اتنا ہی بتا دو کہ کس نے تمہاری خدمات حاصل کی تھیں؟ کب اور کس طرح تم ویٹروں میں شامل ہوئے تھے؟"

وہ خاموش رہا تو مجھے احساس ہوا کہ میں خواہ مخواہ ہی وقت ضائع کر رہا تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کی حرکتوں میں ملوث ہونے والے اگر اتنی آسانی سے سوالوں کے جواب دینے لگیں تو بڑی بڑی گتھیاں پلک جھپکتے میں کھلنے لگیں۔

میری نظر اس کے چہرے پر تھی لیکن میں یہ بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک ہاتھ میں پکڑے کپڑوں کی آڑ میں دوسرا ہاتھ نہایت آہستگی سے اپنی دانست میں میری بے خبری میں اپنی چوڑی بیلٹ کی طرف

بڑھا رہا تھا جو اس کی کمر کے گرد بش کوٹ کے اوپر ہی بندھی ہوئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار موجود نہیں ہوگا کیونکہ سیکیورٹی پر مامور سرکاری آدمیوں کے علاوہ آخری لمحے میں ہوٹل سیکیورٹی والوں نے بھی غیر متوقع طور پر ویٹروں کی تلاشی لی تھی۔ میں نے اپنی موجودگی کو خفیہ رکھنے کے لئے پوری کوشش کی تھی کہ زیادہ سے زیادہ آدمی میری اصل حیثیت سے لاعلم رہیں۔ چنانچہ میری بھی تلاشی ہوئی تھی۔ میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔

میرا خیال تھا کہ وہ تیزی سے بیلٹ اتار کر اسے ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کی فکر میں ہے۔ میں نے سگار اس کی طرف بڑھاتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ ”تمہیں ہر حال میں اسے پینا پڑے گا۔ کم از کم دو چار کش لے کر ہی دکھادو۔ میں تمہیں دس ہزار روپے انعام دوں گا۔ اگر تمہارے خیال میں یہ سربہ مہر سگار اتنا ہی بے ضرر ہے تو تمہیں ایک معقول انعام کے عوض دو چار کش لگانے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ خواہ تم تمباکو نوش نہیں ہو۔“

”میں نہیں پیتا۔ کوئی زبردستی ہے کیا؟“ وہ یکدم ہی جیسے پھٹ پڑا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ میں چوڑے پھل کا ایک چھوٹا مگر خوفناک خنجر دکھائی دیا۔ اس نے انتہائی پھرتی سے بیلٹ کے بکل کو کھینچا تھا اور خنجر اس کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ درحقیقت بیلٹ کا بکل ہی خنجر کا دستہ تھا اور پھل کے لئے بیلٹ ہی نیام کا کام دے رہی تھی۔

وہ ایک خوبصورت نوجوان تھا مگر یک بیک ہی بے حد خوفناک دکھائی دینے لگا تھا۔ سفاکی نے اس کے چہرے کو نقاب کی طرح چھپالیا تھا۔ اس کے دل میں کہیں نفرت کا زہر اتنا زیادہ تھا کہ اس کے چہرے کے عضلات بری طرح کھنچ کر رہ گئے تھے۔

”کون ہو تم؟ اور میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے ہو؟“ اس کی آواز پھنکار سے مشابہ تھی۔ میری نظر اس کے چہرے پر ہی جمی رہی۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ بہ مشکل تین فٹ تھا اور اس فاصلے پر اس کے ہاتھ میں خنجر کی موجودگی خاصی خطرناک تھی۔ لیکن میں نے بظاہر خنجر کو بالکل نظرانداز کئے رکھا۔

”اب بھی وقت ہے..... مجھے سب کچھ سچ سچ بتادو۔ ورنہ تمہیں ہر بات بہت برے حالات میں بتانی پڑے گی۔“ میں نے اسے گھورتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔

بظاہر اس نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے لیکن یہ میری توجہ بٹائے رکھنے کا ایک بہانہ تھا۔ درحقیقت اس کا خنجر والا ہاتھ اسی تیزی سے حرکت میں آیا جس تیزی سے کوئی طاقتور اسپرنگ ٹوٹ کر اچھلتا ہے۔ میرے لئے اس کی یہ حرکت غیر متوقع نہیں تھی۔ ظاہر ہے اس نے خنجر نکالا تھا تو اسے استعمال بھی کرنا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ محض اس کی باتیں سن کر تو میں اسے جانے نہیں دوں گا۔

مجھے صرف ذرا سا ایک طرف کو کھسکنا پڑا لیکن اصل اہمیت بروقت کھسکنے کی تھی۔ اگر اس میں مجھے ایک سیکنڈ کا دسواں حصہ بھی تاخیر ہوجاتی تو صرف اس کا خنجر ہی نہیں، شاید خنجر کے پیچھے پیچھے اس کی کلائی بھی میرے پیٹ میں گھس جاتی۔ وار اس نے کچھ اتنی ہی طاقت سے کیا تھا۔

وار خالی جانے پر وہ اپنی جھونک میں ذرا لڑکھڑایا۔ خنجر اتنے زور سے ایک ستون سے ٹکرایا کہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ اس کا دستہ بیلٹ کے بکل کی شکل کا تھا اور زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اگر اس نے خنجر چھوڑ نہ دیا ہوتا تو شاید اس کا اپنا ہاتھ ہی کٹ جاتا۔ لیکن وار کی اس ناکامی یا اپنی جھونک میں کچھ آگے چلے جانے سے اس کے لئے گویا کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ اسی لمحے اس نے عقب میں لات گھما کر مجھے بیک کک رسید کرنے کی کوشش کی۔

کک میرے منہ پر پڑی ہوتی لیکن یہ محض ایک اتفاق اور میری خوش قسمتی تھی کہ میں اسی لمحے خنجر کو ٹھوکر مار کر ذرا دور پہنچانے کے لئے اپنی جگہ سے مزید تھوڑا سا ہٹ چکا تھا اور میرا چہرہ بھی ایک ثانیے کے لئے جھک گیا تھا۔ یوں میں نہ صرف اس لات سے بچ گیا بلکہ میں نے اس پر چاپ بھی رسید کردی۔ اس کی پنڈلی کا گوشت یقیناً پھٹ گیا تھا کیونکہ وہ ایک اذیت بھری کراہ کے ساتھ

ٹا اور اس نے میرے منہ پر گھونسا رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں ایک بار پھر بروقت تھوڑا سا پیچھے کھسک چکا تھا۔ گو کہ س طرح عقب میں میرا سر ایک ستون سے ٹکرا گیا لیکن منہ پر ھونسا کھانے کی نسبت یہ ٹکر بہتر تھی کیونکہ زیادہ زوردار نہیں ھی۔ اس سے مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں پہنچی لیکن اگر اس کا ھونسا میرے منہ پر پڑ گیا ہوتا تو نہ جانے کب تک کے لئے میں مہ رخوں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا کیونکہ اس کا گھونسا الماری پر ڑا تھا۔ میرے خیال میں اس کے گھونسے اور لوہے کے وزنی ھتوڑے میں کوئی خاص فرق نہیں تھا کیونکہ میں نے لوہے کی چھی خاصی بھاری بھرکم اور موٹی چادر کی الماری میں ہلکا سا ڈینٹ ڑتے دیکھا۔

دیکھنے میں وہ محض ایک صحت مند نوجوان تھا لیکن اس لمحے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ عام صحت مند نوجوان نہیں تھا۔ جس کا گھونسا لوہے کی ایک مضبوط الماری میں ڈینٹ ڈال سکتا تھا وہ محض عام صحت مند نوجوان نہیں ہوسکتا تھا۔ اس کے گھونسے سے بچنا ہی بہتر تھا۔ میں اس کے پیٹ میں لات رسید کرچکا تھا مگر اس کا پیٹ بھی گویا لوہے کا ڈرم تھا۔ اس نے صرف ہلکی سی ’اوغ‘ کی آواز نکالی۔ اس کے علاوہ اس پر کوئی اثر دکھائی نہ دیا۔

اپنے دونوں وار خالی جاتے دیکھ کر اس پر گویا درندگی سوار ہوگئی۔ شاید وہ اتنی معمولی سی ناکامیوں سے بھی مانوس نہیں تھا۔ وہ یقیناً غیر معمولی طور پر مشاق لڑاکا‘ ناقابل یقین حد تک طاقتور اور خطرناک تھا۔ چند لمحے پہلے تک اس کی شخصیت سے اس قسم کی خصوصیات کا ذرا بھی اظہار نہیں ہورہا تھا مگر اب یکدم ہی اس کے سراپا سے گویا کوئی غیر مرئی خول اتر گیا تھا اور اندر سے کوئی بہت ہی بھیانک سی چیز نکل آئی تھی۔

وہ دونوں ہاتھ بڑھا کر میری گردن شکنجے میں لینے کے لئے جھپٹا۔ اس وقت تک مجھے یقین ہوچکا تھا کہ اس کے ہاتھ میں اگر کسی سانڈ کی گردن بھی آجاتی تو سانڈ کے بارے میں کسی اچھے انجام کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔

خود پرستی سے قطع نظر مجھے ابھی تک کسی ایسے آدمی سے واسطہ نہیں پڑا تھا جسے میں نے اپنے سے زیادہ طاقتور محسوس کیا ہو۔ اور یہ طاقت خداداد ہی تھی۔ میں نے اس کے لئے پیشہ ور پہلوانوں‘ تن سازوں یا مارشل آرٹ کے ماہرین کی طرح دن رات محنت اور ریاضت نہیں کی تھی۔ ہاں اتنا ضرور کیا تھا کہ زندگی کے سفر میں جہاں بھی کسی سے کوئی ذرا سی بھی کام کی بات سیکھنے کا موقع ملا تھا تو میں نے وہ موقع ضائع نہیں کیا تھا۔ تھوڑی بہت ورزشیں بھی میں باقاعدگی سے کرتا تھا۔ سب سے اہم بات بس یہ تھی کہ میں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی بڑی بے اعتدالی نہیں آنے دی تھی۔

پھر بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ دیگر بے شمار مہربانیوں کے ساتھ ساتھ اوپر والے نے ایک یہ مہربانی بھی مجھ پر کیوں کر رکھی تھی کہ آج تک میں نے کسی کے مقابلے میں اپنے آپ کو کمزور محسوس نہیں کیا تھا۔ تاہم مجھے جب بھی شبہ ہوتا تھا کہ میرا کوئی حریف تقریباً میرے ہی جتنا طاقتور ہے تو میں روایتی انداز میں طاقت کے جواب میں طاقت ہی کا استعمال کرتے ہوئے اس کا مقابلہ نہیں کرتا تھا۔ یہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ زیادہ تھکانے اور زیادہ جسمانی توڑ پھوڑ کرانے والی بات تھی۔

ایسے موقعوں کے لئے مجھے ایک جاپانی پہلوان سے سیکھی ہوئی چند ٹیکنکس بہت پسند تھیں۔ ایک طویل عرصے تک وہ پیشہ ور پہلوان رہا تھا۔ مشرقی اسٹائل کی کشتیوں میں اسے خصوصی مہارت حاصل تھی لیکن اور بھی نہ جانے کس کس انداز کی لڑائی میں عمل دخل رکھتا تھا اور لطف کی بات یہ تھی کہ الیکٹرونکس کی ایک بہت بڑی اور مشہور کمپنی میں چیف انجینئر کے طور پر ملازم تھا۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ اس کے دورۂ پاکستان کے موقع پر میری اس سے ملاقات ہوگئی اور تھوڑی بہت دوستی بھی ہوگئی۔

اس نے مجھے بہت سی کام کی باتیں بتائیں۔ عملی طور پر کئی گر سکھائے۔ وہ خصوصاً اس میدان میں بہت ماہر تھا کہ طاقت ور دشمن کی طاقت کو خود اسی کے خلاف کس طرح استعمال کیا جائے۔ اس نے مجھے سکھایا تھا کہ کس طرح اس اصول کے تحت صرف طاقتور انسانوں ہی کو نہیں حیوانوں کو بھی شکست دی جاسکتی تھی اور خالی ہاتھ انہیں ہلاک کیا جاسکتا تھا۔

اسی نے مجھے بتایا تھا کہ جاپان‘ چین اور تھائی لینڈ وغیرہ میں بہت سے ایسے پہلوان موجود تھے جو کسی سرکش گھوڑے یا بھینسے کی گردن بغل میں دبا کر توڑ سکتے تھے۔ اس میں طاقت کو بھی دخل ہوتا تھا لیکن اصل اہمیت ٹیکنیک کی تھی۔ وہ دراصل گھوڑے یا بھینسے ہی کی طاقت اور جھنجلاہٹ کو اس کے خلاف استعمال کرتے تھے۔ اس کی گردن کو لاک لگاتے ہوئے ایک ایسے زاوئے اور ایسے لمحے میں جھٹکا دیتے تھے کہ درحقیقت حیوان اپنے ہی زور میں اپنی گردن تڑوا بیٹھتا تھا۔ لیکن اس ٹیکنیک کو استعمال کرنا بہرحال ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔ عام سے طاقتور انسانوں کے لئے بھی اس کو سیکھنا آسان نہیں تھا۔

میں ایک بار اس کا کامیاب عملی مظاہرہ کرچکا تھا۔ ستارہ کی ایک شوٹنگ کے دوران جب اس کے گھوڑے کو ایک سازش کے تحت زہر کا انجکشن لگادیا گیا تھا تو وہ ستارہ کو پشت پر لئے پاگل ہوکر دوڑ پڑا تھا۔ اسے روکنے کی کوئی تدبیر نہیں کی جاسکی تھی۔ بالآخر میں نے راستے میں اس پر چھلانگ لگا کر اس کی گردن بغل میں دباتے ہوئے اس پر یہی ٹیکنیک آزمائی تھی اور غیر متوقع طور پر مجھے کامیابی حاصل ہوگئی تھی۔ گھوڑے کی گردن ٹوٹ گئی تھی۔ لیکن اس موقع پر موجود لوگوں کے علاوہ اگر میں کسی کو یہ بات بتاتا تو شاید وہ یقین نہ کرتا۔ خصوصاً جب میں تھری پیس سوٹ پہنے اپنے آفس میں بیٹھا فائلیں دیکھ رہا ہوتا تھا‘ کاغذات پر دستخط کر رہا ہوتا تھا تب

تو کسی کو گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ میں کبھی لڑائی بھڑائی کے معاملات میں ہاتھ بھی ہلاتا ہوں گا۔

یہ سب خیالات بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکے۔ لیکن یہ موقع ان یادوں میں الجھنے کا نہیں تھا۔ دو ہاتھ موت کے پیامبر بن کر تقریباً میری گردن تک پہنچ چکے تھے۔ وہ آہنی ہاتھ تھے' یہ میں اچھی طرح جان چکا تھا۔ لاکر روم میں کھلی جگہ بھی بہت کم تھی۔ کمرے کا بیشتر حصہ لوہے اور لکڑی کی الماریوں سے بھرا ہوا تھا یا پھر درمیان میں کہیں کہیں ستون تھے۔ یہاں زیادہ الجھنے میں زیادہ توڑ پھوڑ کا اندیشہ تھا۔ چیزوں کی توڑ پھوڑ کا نہیں اپنی توڑ پھوڑ کا۔

میں نے ایک بار پھر پسپائی کی حکمت عملی اختیار کی۔ ایک بار پھر ذرا سا پیچھے ہٹ گیا۔ اس حکمتِ عملی کی بدولت کئی بار میں اس طرح بھی کسی کی دُرگت بنانے میں کامیاب ہوا تھا کہ میرے لباس پر چند شکنیں بھی نہیں آئی تھیں۔

ویٹر جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ اصلی ویٹر نہیں تھا بلکہ کسی ویٹر کی جگہ لئے ہوئے تھا' ایک بار پھر اپنی جھونک میں ذرا آگے کو آیا اور میں نے اس کے جبڑے پر ایک زور دار قسم کا گھونسا رسید کیا۔ اس کی گردن ذرا سی گھوی لیکن قدم اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ تاہم ایک ثانئے کے لئے اس کے حواس ضرور مختل ہوئے۔

اس سے پہلے کہ وہ سر جھٹک کر سنبھل پاتا' میں نے اس کی گردن پر کراٹے کی ایک چاپ رسید کی۔ اس کی گردن واقعی سانڈ کی طرح مضبوط تھی لیکن اسی لمحے اس کا سر بھی لوہے کی الماری سے ٹکرا گیا۔ پہلی بار وہ بری طرح لڑکھڑایا۔ اس کی گردن عجیب سے انداز میں ٹیڑھی ہوگئی۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس کے جبڑے پر ایک اور گھونسا رسید کیا۔ میرا بھی یہ گھونسا شاید لوہے کی الماری میں ڈینٹ ڈالنے کے لئے کافی ہوتا۔ اس بار اس کے پاؤں زمین سے اکھڑے۔ وہ ذرا سا اچھلا اور چاروں خانے چت گرا۔ لیکن بے ہوش وہ اب بھی نہیں ہوا تھا۔

اس پر کچھ عجیب ہی اثر ہوا تھا۔ گرنے کے بعد اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ وہ چت پڑا ایک ٹک چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پہلے تو مجھے یہی گمان گزرا کہ وہ مر چکا ہے لیکن پھر اس کے سینے کے زیر و بم سے اندازہ ہوا کہ وہ سانس تو لے رہا تھا لیکن سکتے کی سی حالت میں چلا گیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر سگار جیب سے نکال کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا "لو میرے چاند! اب تو اس کے دو چار کش لگا لو۔ اتنی ضد اچھی نہیں ہوتی۔"

لیکن اب وہ گویا میری بات سن ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی حالت میں ذرا بھی تغیر نہ آیا۔ وہ اسی طرح ساکت رہا۔ ہاتھ شاید کچھ زیادہ ہی زور سے پڑ گیا تھا۔ اسے کوئی دماغی چوٹ آگئی تھی۔

میں سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ا[illegible]
مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں تیز[illegible] گھوما لیکن اکرام بیگ کو دیکھ کر گہری سانس لے کر رہ گی[illegible] دروازے کے قریب کھڑا تھا۔ خوفناک سی شکل کا ایک ب[illegible] جرمن لیوگر اس کے ہاتھ میں تھا۔ ریوالور کا رخ گو کہ میر[illegible] طرف تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو یہی تسلی دینے کی کوشش وہ درحقیقت ویٹر کو کور کئے ہوئے تھا۔

اکرام بیگ کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ وہ ایک قدم آگے آکر اپنا خالی ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "لاؤ.... سگار مجھے دے دو[illegible]
وہ سگار نہ مانگتا تو شاید میں خود ہی اس کے حوالے کر دیتا اس کے لہجے میں کوئی بات تھی جس نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "بیگ صاحب! یہ سگار ایک شہادت ہے.... اس بات کا ثبوت ہے کہ منسٹر صاحب کو قتل کر[illegible] کی سازش کی گئی تھی.... اور اس سازش کا تانا بانا یقیناً بہت تک پھیلا ہوا ہوگا۔ میں یہ ثبوت اپنے ہاتھ سے حفیظ صاحب[illegible] خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ یہ اکلوتی [illegible] اہم شہادت ذ[illegible] دار ہاتھوں میں جانی چاہئے۔"

"تو کیا تمہارے خیال میں' میں ذمے دار آدمی نہیں ہوں[illegible]
اکرام بیگ کا لہجہ یکدم درشت ہوگیا۔ غصے کی شدت سے اس کا[illegible] ارغوانی ہوگیا۔ وہ معززانہ لباس میں' نارمل حالت میں بھی ا[illegible] سفاک اور خطرناک سا آدمی دکھائی دیتا تھا لیکن اس وقت غی[illegible] غضب کے عالم میں تو پورا درندہ دکھائی دینے لگا۔

میرے اندر میری نامعلوم ساتویں حس سرگوشیاں تو بہت [illegible] سے کر رہی تھی لیکن اب جیسے کوئی تیز سی گھنٹی بج اٹھی۔ تمام تر [illegible] سے اندیشوں کے باوجود اس واضح اور یقینی انکشاف نے مجھے حیر[illegible] کے شدید جھٹکے سے دوچار کیا تھا کہ بھیڑیا تو بغل میں ہی موجود تھا وہ ایک ایسے محافظ کی کھال میں چھپا ہوا تھا کہ کسی کو اس پر شبہ ت[illegible] نہیں ہو سکتا تھا۔ کیا کوئی سوچ سکتا تھا کہ فارن منسٹر صاحب سیکیورٹی چیف ہی.....؟

لیکن پھر میرے ذہن میں ایسے کئی سربراہان مملکت کی تصو[illegible] ابھر آئی جو اپنے محافظوں ہی کے ہاتھوں انجام کو پہنچے تھے۔ وہ ماہ[illegible] و مشاق اور مسلح لوگ جنہیں بیسیوں چھلنیوں سے چھاننے کے بع[illegible] قابلِ اعتماد اور وفادار سمجھ کر اس منصب پر فائز کیا گیا تھا' جن کے بارے میں سمجھا گیا تھا کہ حفاظت کا فریضہ ان سے بہتر کوئی انجا[illegible] نہیں دے سکتا' جن کے بارے میں یقین کر لیا گیا کہ ان کی وف[illegible] داریاں شک و شبے سے بالاتر ہیں۔ لیکن ایک دن انہوں نے ہی پہلو میں کھڑے ہو کر اپنے آقاؤں کو خون میں نہلا دیا تھا۔ ایسی بہت سی تصویریں تاریخ کے کسی نہ کسی موڑ پر آویزاں تھیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔

ایک سیکنڈ کے شاید ہزارویں حصے میں خیالات کی یہ رو میرے

[illegible]ن سے گزری اور میری رگ و پے میں یخ بستگی سی پھیلا گئی لیکن [illegible]ں یہ الجھن محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ اب بھی اکرام بیگ نے [illegible]پنے آپ کو بے نقاب کرنے میں عجلت کیوں دکھائی تھی؟ وہ چاہتا تو [illegible]ی زیر نقاب ہی رہ سکتا تھا۔ میری نامعلوم ساتویں حس اس کے [illegible]ے میں سرگوشیاں تو کر رہی تھی لیکن میں نے ان سرگوشیوں کو [illegible]ہم سمجھ کر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔

اکرام بیگ کے یوں یکدم سامنے آجانے کی وجہ یہی ہو سکتی [illegible]ں کہ وہ سازش کو ناکام ہوتے دیکھ کر بہت بری طرح جھنجلا گیا تھا [illegible]ر شاید اس نے مجھے ٹھکانے لگا کر سازش کا ملبہ مجھ پر ڈالنے کا [illegible]لہ کر لیا تھا۔

میں نے سرد لہجے میں کہا "نہیں مسٹر بیگ! میرے خیال میں تم [illegible]ے ذمے دار آدمی ہو۔ سازش کے ذمے دار! میں سگار تمہارے [illegible]لے نہیں کر سکتا۔"

اس کا چہرہ کچھ اور ارغوانی ہوگیا۔ دانت پیستے ہوئے اس نے [illegible]ی پیشانی کا نشانہ لیا۔ اس کے ہاتھ بہت مضبوط تھے۔ جس ہاتھ [illegible] ریوالور تھا اس کے ننھے ننھے عضلات مضطربانہ انداز میں مچل [illegible]ہے تھے۔ اس کے اور میرے درمیان فاصلہ خطرناک تھا۔ وہ [illegible] مجھا ہوا.... بلکہ چھٹا ہوا آدمی تھا۔ اس کے سامنے کوئی غیر [illegible] قدم اٹھانے کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا۔ ہتھیار اس کے [illegible] کھلونا تھے۔ اس کے پیچھے تربیت اور گوناگوں تجربات کا ایک [illegible]ں دور تھا اور اس کی حیثیت بھی ایسی تھی کہ مجھ جیسے کسی [illegible]ین کو کسی بے وقعت خرگوش کی طرح گولی مار کر کوئی بھی کہانی [illegible]ینا اور صاف بچ جانا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

مجھے صرف ایک ہی موہوم سی امید نظر آرہی تھی۔ وہ یہ کہ [illegible] اکرام بیگ فائر کرے تو میں گولی سے بچنے کی کوشش کروں۔ [illegible] کا مجھے خاصا تجربہ تھا لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ [illegible]م بیگ جیسے گھاگ آدمی کے سامنے میرا یہ تجربہ کام آسکے گا یا [illegible]ہ۔ بہرحال اب تو صرف قسمت آزمائی ہی کی جا سکتی تھی۔

اکرام بیگ گویا میرے خیالات پڑھتے ہوئے قدرے ملائمت [illegible] بولا "میں تمہیں یہاں قتل کرنا نہیں چاہتا۔ لیکن اگر تم نے [illegible] میرے حوالے نہ کیا تو میں یہ کام بھی کر گزروں گا۔"

"اور اگر میں نے سگار تمہیں دے دیا تو تم مجھے کہیں اور لے [illegible]تل کرو گے؟ یہی مطلب ہے تمہارا؟" میں نے پلک جھپکائے [illegible]ا۔

اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ اس کی توجہ ویٹر کی [illegible] مبذول ہوگئی تھی۔ ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر وہ بولا "کیا [illegible] اسے مار دیا ہے؟"

میں نے ویٹر کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے پہلے مجھے کچھ شبہ سا ہوا [illegible]ہے اس نے خفیف سی حرکت کی ہے لیکن میں نے اس کی [illegible] دیکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر وہ

ہوش میں آگیا اور اس نے اٹھ کر مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش کی تو میں آخری لمحے پر ہی میں اپنے بچاؤ کی کوئی کوشش کروں گا۔ لیکن اب میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ پہلے ہی کی طرح ساکت نظر آیا۔

میں نے بے پروائی سے کہا "جب یہ گرا تھا اس وقت تو زندہ تھا۔ بعد میں مر گیا ہو تو معلوم نہیں۔"

وہ ویٹر پر دوبارہ نظر ڈالنے کی زحمت کئے بغیر بولا "اچھا۔ اب تم دونوں ہاتھ اوپر اٹھالو۔ منہ الماری کی طرف کر لو اور ہاتھ الماری پر ٹکالو۔ دونوں ٹانگیں چوڑی کر لو....."

"بہت خوب! تم تو کسی فزیکل انسٹرکٹر کی طرح ہدایات دے رہے ہو۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"یہ طنز و مزاح کا وقت نہیں ہے۔ اور نہ ہی میں نے تمہیں کسی بات پر کوئی تبصرہ کرنے کے لئے کہا ہے۔" وہ گھٹے گھٹے مگر غضبناک لہجے میں بولا۔ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا تھا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے اور میں کسی فیصلہ کن حرکت کے لئے تیار تھا۔ وہ گویا یاددہانی کے طور پر بولا "تم نے شاید دیکھا نہیں ہے اس ریوالور پر سائیلنسر فٹ ہے.... اور یہ ایسا سائیلنسر ہے جو بہت سے فائروں کے بعد بھی جام نہیں ہوتا۔"

"اچھا.... یہ سائیلنسر ہے؟" میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے معصومیت سے کہا "میں تو سمجھا تھا شاید تم نے یونہی ذرا ریوالور کی سجاوٹ کے لئے اوپر کچھ لگا رکھا ہے۔ ذرا دکھانا.... کیا ہوتا ہے سائیلنسر۔"

میں نے ہاتھ بھی اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کی آنکھیں شعلے اُگلنے لگیں اور اس نے بلا تامل فائر کر دیا۔ گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری۔ شاید چند بالوں کی قربانی بھی لے گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کا محض دھمکیوں سے کام چلانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ضرورت پڑنے پر شاید وہ کچھ بھی کر گزرتا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ تیزی سے حرکت کرتی ہوئی چیز پر بھی نشانہ لگانے میں ماہر ہوگا۔

میں سفاک اور عیار ترین مجرم سے بھی کسی نہ کسی غلطی کی توقع رکھتا تھا اور عام طور پر میری توقع پوری ہو جاتی تھی۔ وہ جس طرح مجھے الماری کی طرف منہ کر کے کھڑا ہونے کا حکم دے رہا تھا اس سے ظاہر تھا کہ وہ سگار میری جیب سے نکالنے کے لئے خود میرے پاس آنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہی میں چاہتا تھا۔ وہ کتنا بھی ماہر و مشاق سہی لیکن میرے قریب آجاتا تو اس کے ہاتھ میں خوفناک ریوالور کی موجودگی کے باوجود میرے لئے امید کی کرن نمودار ہو سکتی تھی۔

"یہ گولی صرف خبردار کرنے کے لئے تھی۔" وہ غرایا "میں تمہارے بارے میں معلومات کر چکا ہوں۔ مجھے پتا چلا ہے کہ تم خاصی خطرناک اور بے خوف قسم کی چیز ہو۔ لیکن میرے سامنے ذرا

آئے۔ پولیس والے اگر کچھ دیکھیں گے تو بات پھیل جائے گی۔"

حفیظ صاحب نے پولیس والوں کو باہر ہی رکنے کا حکم دیا اور میں نے آگے بڑھ کر دروازہ بند کر دیا۔ حفیظ صاحب الجھن زدہ لہجے میں بولے "بات کیا ہے؟" اسی لمحے ان کی نظر اکرام بیگ پر پڑی جو آڑا ترچھا فرش پر ڈھیر تھا۔ انہیں گویا حیرت کا شدید دھچکا لگا۔ وہ اپنی ساری نخوت' متانت اور وضع داری بھول کر ایک گھبرائے ہوئے بچے کی طرح لپک کر اکرام بیگ کے قریب پہنچے اور کسی حد تک احمقانہ سے انداز میں اسے ہلا کر دیکھنے لگے۔

"اسے کیا ہوا؟" وہ رو دینے والی آواز میں بولے "کیا اس نے میری حفاظت کرتے کرتے جان دے دی؟ اپنے آپ کو مجھ پر قربان کر دیا؟"

میں فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ اس جہاندیدہ شخص کی خوش فہمی تھی یا سادہ لوحی؟ لاعلمی تھی یا خود فریبی؟ میں نے ذرا چبھتے ہوئے سے لہجے میں کہا "حضور! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی جان لینے کی سازش میں خود مرتے مرتے بچا ہے۔"

حفیظ صاحب کو حیرت کا پہلے سے زیادہ شدید جھٹکا لگا۔ وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ ایک لمحے کے سکوت کے بعد وہ سرسراتی سی آواز میں بولے۔ "تمہیں یقیناً غلط فہمی ہوئی ہے افضل! اکرام بیگ برسوں سے میرا جاں نثار محافظ ہے۔ ایک بار حکومت کے خلاف مظاہروں کے دوران ایک ہجوم نے اچانک ہی کسی کے بہکاوے میں آ کر غیظ و غضب کے عالم میں میری گاڑی کو گھیر لیا تھا۔ انہوں نے میرے محافظوں کو بھی قابو میں کر لیا تھا۔ اس وقت تنہا اکرام بیگ ان کے سامنے سینہ سپر ہوا تھا۔ اس نے نہ صرف جرأت سے ہجوم کا راستہ روکا تھا بلکہ نہایت ہوشیاری سے مجھے ان کے نرغے سے بھی نکال لے گیا تھا۔ اس روز شاید اس کی تکا بوٹی ہو جاتی لیکن اس نے ذرا بھی پروا نہیں کی تھی۔"

"تاریخ بہت سے جاں نثاروں کے بک جانے کے قصوں سے بھری پڑی ہے حفیظ صاحب!" میں نے قدرے بیزاری سے کہا "یہ انسانوں کی دنیا ہے' فرشتوں کی نہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں' پچھلے چند منٹوں میں کیا ہوا ہے اور کس طرح ہوا ہے....."

پھر میں نے انہیں ساری بات بتائی۔ وہ دم بخود رہ گئے۔ بڑی مشکل سے ان کا ذہن اس حقیقت کو قبول کرنے پر آمادہ ہوا اور وہ متاسفانہ سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولے "میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اکرام بیگ کس کا آلۂ کار بن سکتا ہے!"

"یہ معلوم کرنا خفیہ سرکاری ایجنسیوں کا کام ہے۔ کیونکہ یہ ایک سرکاری آدمی ہے۔ اگر سرکار کا مسئلہ نہ ہوتا تو میں خود ہی سب کچھ معلوم کر لیتا۔" میں نے کہا "فی الحال میں یہ مسئلہ 'جہاں ہے اور جیسا ہے' کی بنیاد پر آپ کے سپرد کر رہا ہوں۔ اس زنجیر کی باقی کڑیاں تلاش کرانا آپ کی ذمے داری ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ یہ معاملہ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کے سپرد کیجئے گا۔ اس ہینڈل کرنا پولیس کے بس کی بات نہیں ہوگی۔ اکرام بیگ کو اس طرح بے ہوشی کے عالم میں سی آئی ڈی والوں کے سپرد کر دیجئے۔ آفیسر وہ ہونے چاہئیں جو ذاتی طور پر اکرام بیگ کے شناسا یا دوست نہ ہوں اور کچھ نہ کچھ دیانتدار سمجھے جاتے ہوں۔"

حفیظ صاحب تھکے تھکے سے انداز میں ہاتھ ہلا کر بولے "مجھے ہدایات مت دو۔ مجھے معلوم ہے اس قسم کے معاملات کو کس طرح ہینڈل کیا جاتا ہے۔"

میں محض حدِ ادب کے باعث خاموش رہا ورنہ کہنا چاہتا تھا۔ 'یہ محض آپ کی خوش فہمی ہے کہ آپ ان معاملات کو ہینڈل کرنا جانتے ہیں۔ آپ جیسے لوگ ان معاملات میں تو کیا' ہر طرح کے معاملات میں ہی ایک زنگ آلود مشینری پر تکیہ کرتے ہیں جو خوش فہمی سے کبھی کبھار صحیح کام کر جاتی ہے اور کبھی محض آپ کو گمراہ ہی کرتی ہے۔'

اچانک کمرے میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ باہر ہلکا سا شور بلند ہوتا محسوس ہوا۔ اندھیرا بہت گہرا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ لائٹ پورے ہوٹل کی گئی تھی۔ داؤد چوہدری نے اندھیرے میں اپنے مخصوص بارعب انداز میں للکارا۔ "کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے۔" پھر اسے گویا خیال آیا کہ یہ رعب ڈالنے کا موقع نہیں۔ وہ ذرا نرم لہجے میں بولا "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" حفیظ صاحب کی لرزتی ہوئی آواز ابھری۔ ان کے لہجے سے وہ رعب' طنطنہ اور نخوت غائب ہو چکی تھی جو ان کی شخصیت کا خاصہ تھی۔ سازش کے انکشاف اور عین اپنے پہلو سے ہی ممکنہ قاتل کی برآمدگی نے انہیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کا رکھ رکھاؤ دھرا رہ گیا تھا۔ وہ یکدم ہی سہما ہوا بچہ بن گئے تھے۔ میرا اپنا اندازہ تھا کہ کسی بھی بڑے آدمی کے عین قریب سے جب اس طرح سازش کا لاوا پھوٹتا ہو گا تو وہ اسی طرح خوفزدہ ہو جاتے ہوں گے۔

میں نے بہت سے سربراہانِ مملکت کا احوال پڑھا تھا جن کے حفاظتی انتظامات کی تفصیلات پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اتنے خوفزدہ رہتے تھے کہ اگر کبھی غیر متوقع طور پر ان کے قریب سے چوہا بھی پھدک کر گزر جاتا تھا تو وہ دہشت سے چیخ مار کر بے ہوش ہونے والے ہو جاتے تھے۔ یہ وہ لوگ ہوتے تھے جن کے ایک اشارے پر ہزاروں ہنستی مسکراتی زندگیاں فنا کے گھاٹ اتر جاتی تھیں' اذیت ناک موت ان کا مقدر ہو جاتی تھی۔

میں نے اندھیرے میں ہاتھ بڑھا کر حفیظ صاحب کا کندھا تھپکنے کی کوشش کی تو وہ اچھل کر پیچھے ہٹ گئے اور ایک ستون سے ٹکرا گئے۔

"کک..... کون..... کون ہے؟" وہ ہکلائے۔

"یہ تو میں تھا حفیظ صاحب!" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ "گھبرائیے نہیں۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ ہر جگہ ہمارے آدمی

موجود ہیں۔ صورت حال پوری طرح ہمارے قابو میں ہے.... اور یہ میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔ یہ کوئی سرکاری اعلان نہیں ہے۔ لائٹ ابھی آ جائے گی...." الفاظ ابھی میرے منہ میں ہی تھے کہ کمرا روشن ہو گیا۔ باہر سے بھی ویسا ہی خفیف سا شور سنائی دیا جیسا عموماً ہر جگہ سنائی دیتا ہے جہاں بجلی کے بریک ڈاؤن کے بعد دوبارہ لائٹ آتی ہے۔

میں نے دیکھا' حفیظ صاحب کے چہرے پر وحشت تھی لیکن لائٹ آئی تو انہوں نے اپنے تاثرات معمول پر لانے کی فوری کوشش کی اور پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "شکر ہے اسٹینڈ بائی جنریٹرز نے جلدی کام شروع کر دیا۔"

"جی نہیں۔ یہ اسٹینڈ بائی جنریٹرز آن نہیں ہوئے ہیں۔ لائٹ آئی ہے۔" میں نے ان کی غلط فہمی دور کی۔ "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ اس سازش پر عملدر آمد میں تاخیر ہو گی تو شاید کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی جائے گی اور اس سلسلے میں سب سے پہلے لائٹ آف کی جائے گی۔ اس لئے میں نے ہوٹل کے سوئچ روم اور پاور سب اسٹیشن پر معمول کے حفاظتی انتظامات کے ساتھ ساتھ خاص طور پر خفیہ انداز میں اپنے خاص آدمی تعینات کئے تھے۔ کسی نے لائٹ آف کی تھی۔ میرے آدمیوں نے اسے اس بات کا موقع دیا ہو گا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یا انہیں قابو کر لیا ہو گا اور لائٹ بحال کر دی ہو گی۔ اب کسی بھی لمحے اس سلسلے میں اطلاع آنے والی ہو گی۔"

"بہت وثوق سے بات کر رہے ہو!" حفیظ صاحب قدرے حیرت سے بولے۔

"بس..... یہ اپنے اپنے نظام پر اعتبار کی بات ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اسی لمحے دروازہ ایک بار پھر کھلا اور شفیع شاہ کمرے میں داخل ہوا۔ پولیس والوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے پاس خصوصی پاس تھا اور اس کے کوٹ کے کالر پر خاص بیج بھی لگا ہوا تھا اس لئے وہ انہیں دھکیلتا ہوا اندر آ گیا تھا۔

اس نے بالکل اسی طرح بات شروع کی جیسے وہ دیر سے ہمارے پاس ہی کھڑا گفتگو کر رہا تھا اور محض ایک لمحے کے لئے باہر چلا گیا تھا۔ "سر! وہ دو آدمی تھے۔ ایک نے سوئچ روم کا تالا کھولا تھا اور دوسرے نے مین سوئچ آف کیا تھا۔ پاور سب اسٹیشن پر کوئی گڑبڑ کرنے والا نظر نہیں آیا۔"

"ان دونوں کا کیا کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"انہیں قابو میں کر لیا گیا تھا۔ میں اپنے آدمیوں سے کہہ آیا ہوں کہ انہیں باندھ کر ایک طرف ڈال دیں۔" شفیع شاہ نے بتایا۔ "میں نے سوچا' آپ سے پوچھ لوں ان کا کیا کرنا ہے؟"

"ظاہر ہے سب سے پہلے تو ان سے یہی معلوم کرنا پڑے گا کہ انہیں کس نے اس کام پر لگایا تھا۔ بعد میں دیکھیں گے ان کا کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا۔ پھر پوچھا "کیا سب مہمان رخصت ہو چکے؟"

میرے سوال کا جواب شفیع کے بجائے حفیظ صاحب نے دیا۔ "اگر تمہاری مراد آج کی تقریب کے مہمانوں سے ہے.... تو میں ان سب کو رخصت کر کے ہی ادھر آیا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ ان میں سے کسی کو گمان تک نہیں گزرا کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔" پھر انہیں گویا کچھ خیال آیا اور بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "تم بھی مجھے خاصے پُراسرار لگتے ہو۔ سیدھے سادے بزنس مین تو معلوم نہیں ہوتے۔ نہایت صبر و سکون اور مشاقی سے ان معاملات کو ہینڈل کرتے ہو۔ لگتا ہے کچھ تربیت یافتہ لوگ بھی تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ کیا سلسلہ ہے؟"

"سلسلہ کوئی خاص نہیں ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "یہ دنیا بڑی سخت امتحان گاہ ہے۔ یہاں آدمی اگر تھوڑا سا نمایاں ہو جائے تو اسے زندگی گزارنے کے لئے کچھ انتظامات رکھنے پڑتے ہیں ورنہ دنیا جینے نہیں دیتی۔ بس میں نے ذرا انتظامات رکھے ہوئے ہیں۔ آدمی میرے وہی ہیں جو میرے مختلف شعبوں میں ملازم ہیں۔ میرے کاروبار سنبھالتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عام ملازمین کے مقابلے میں ذرا چوکنے ہیں' ہوشیار ہیں۔"

حفیظ صاحب پُرخیال انداز میں سر ہلا کر رہ گئے۔ پھر انہوں نے ایک پولیس والے کو بھیج کر ایک سی آئی ڈی انسپکٹر کو بلوایا اور اسے تمام معاملہ سمجھانے کے بعد ہدایات دینے لگے۔ اکرام بیگ ابھی تک بے ہوش ہی تھا۔ اچانک ہوٹل سیکیورٹی کا ایک آدمی قدرے بوکھلائے ہوئے سے انداز میں آن پہنچا۔ اس نے داؤد چوہدری کو اطلاع دی "سر! وہ سوئچ روم میں گڑبڑ کرنے والے جو دو آدمی پکڑے گئے تھے وہ تو خود بخود ہی مر گئے۔ ان کی تو عجیب ہی حالت ہو گئی ہے...." شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ان کی حالت سمجھائے۔ اچانک اس کی نظر ایک طرف پڑے ہوئے ویٹر پر پڑ گئی۔

اس کی آنکھیں کچھ پھیل گئیں۔ لیکن پھر وہ جلدی سے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ان دونوں کی بھی بالکل ایسی ہی حالت ہو گئی ہے سر! ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے آنکھ بچا کر کچھ کھا لیا تھا۔ لیکن....." اس نے الجھن آمیز سے انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں نے سی آئی ڈی انسپکٹر سے کہا "برادرم! اکرام بیگ کا ذرا اچھی طرح خیال رکھئے گا۔ کہیں یہ بھی ذرا سا ہوش میں آتے ہی بازی الٹی دیکھ کر یہی خوفناک چیز نہ کھا لے۔ بے ہوشی کی حالت میں ہی اس کی ذرا اچھی طرح تلاشی لے لیجئے۔"

وہ لوگ اپنی کارروائیوں میں مصروف ہو گئے۔ اکرام بیگ کو بے ہوشی کی حالت میں ہی وہاں سے اٹھا کر لے جایا گیا۔ میں نے شفیع شاہ کو کچھ ضروری ہدایات دیں۔ ان میں سرفہرست تو یہی تھی

کہ ویٹروں کو ایک بار پھر نئے سرے سے باریک بینی سے چیک کیا جائے کہ ان میں کوئی غلط آدمی تو داخل نہیں ہوگیا ہے، کسی کا ماضی مشکوک تو نہیں ہے۔ بلکہ ہوسکے تو ہوٹل کے تمام ملازمین کے بارے میں نئے سرے سے تحقیقات کرلی جائے۔

ویٹر کے روپ میں جو شخص مرچکا تھا اس کے بارے میں فوری طور پر معلوم ہونا مشکل تھا کہ وہ ویٹر ہی تھا یا اس نے کسی ویٹر کی جگہ لی تھی۔ کیونکہ اس کی حالت ہی قابل شناخت نہیں رہی تھی۔ مجھے اندیشہ یہی تھا کہ کہیں اس کی جگہ بے چارہ اصل ویٹر کسی مصیبت میں گرفتار، کہیں نیم مُردہ یا مُردہ حالت میں نہ پڑا ہو۔ شفیع شاہ نے مجھے تسلی دی کہ وہ اس ضمن میں تمام معلومات حاصل کرلے گا اور اگر اس کام میں تاخیر بھی ہوئی تو وہ مجھے فون پر لاہور رپورٹ دے دے گا۔

ان سب معاملات سے نمٹتے نمٹتے صبح ہوگئی۔ ساڑھے چھ بجے کی فلائٹ سے منسٹر صاحب کو مڈل ایسٹ روانہ ہونا تھا اور وہ بے چارے ایک پل کے لئے بھی نہیں سوسکے تھے۔ چار گھنٹے کی ان کی فلائٹ تھی اور وہاں جاتے ہی انہیں بے شمار مصروفیات درپیش تھیں۔ مجھے ان کی حالت دیکھ کر ترس سا آرہا تھا۔ وہ مجھے اس حفیظ سے بہت مختلف نظر آرہے تھے، جس سے میری پہلی ملاقات گورنر ہاؤس میں ہوئی تھی۔ بہرحال وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری پوری کوشش کررہے تھے۔ انہوں نے اپنا شیڈول تبدیل نہیں کیا اور مقررہ وقت پر اپنے اسٹاف کے ساتھ ائرپورٹ روانہ ہوگئے۔

ان کے جانے کے بعد ہوٹل میں گویا سکوت چھا گیا۔ سی آئی ڈی اور پولیس والوں نے بھی ہماری جان چھوڑ دی تھی۔ نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ نذیر خان کا بھی یہی حال تھا۔ اس کی بھی گویا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ تاہم میں نے اسے اس کے کمرے میں بھیج ہی دیا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ آرام کرہی لے تو بہتر ہے۔ اس کے ساتھ پروگرام یہ طے پایا تھا کہ دوپہر ایک بجے والی فلائٹ سے ہم لاہور واپس چلیں گے۔ شفیع شاہ کو میں نے سیٹیں کنفرم کرانے کی ہدایت کردی تھی۔

چند گھنٹے میسر تھے۔ میں نے سوچا آرام یا بے آرامی میں گزارنے کے بجائے راحیلہ کے پاس گزار لئے جائیں تو بہتر ہیں۔ چنانچہ میں ایک بار پھر اس کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ اس روز چھٹی تھی۔ میں نے سوچا اس کے دفتر کا حرج بھی نہیں ہوگا۔ میں ذرا یہ بھی جاننا چاہتا تھا کہ میں نے بمشکل انہیں لاہور شفٹ ہونے پر آمادہ کیا تھا تو اب بھی وہ اپنے اس فیصلے پر قائم تھے یا ان کا ارادہ کچھ ڈگمگا رہا تھا۔

راحیلہ کے ہاں یہ چند گھنٹے لمحوں کی طرح گزر گئے۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ وہ اور راشد لاہور شفٹ ہونے کے فیصلے پر قائم تھے۔ بلکہ پہلے جو تھوڑی بہت ہچکچاہٹ تھی وہ بھی دونوں بہن بھائیوں میں صلاح مشورے کے بعد دور ہوچکی تھی۔ دوسری سب

باتیں بھی پہلے ہی کی طرح ہوتی رہیں، لفظوں کے شکو[ے] رہے۔ راحیلہ کی قربت تو جاں فزا تھی ہی، اس سے بات کر[نے میں] لطف آتا تھا وہ اپنی جگہ تھا۔ اس کی وضاحت لفظوں میں [نہیں] ہوسکتی۔ راحیلہ سے تعلق میں ایک بے عنوان تشنگی بھی [تھی اور] ایک عجیب راحت بھی۔ اس کے ساتھ جو بھی وقت گزر[تا] روح کو سرشار کرجاتا تھا۔

فلائٹ کا وقت قریب آیا تو میں بادل نخواستہ اس کے ہا[ں سے] رخصت ہوا۔ وہ ائرپورٹ تک ساتھ آنا چاہتی تھی لیکن م[یں نے] ہی اسے منع کردیا۔ میں نے راستے میں ہوٹل سے نذیر [خان کو] ساتھ لیا اور وہاں سے ایک ڈرائیور ہمیں ائرپورٹ چھوڑنے [روانہ] ہوا۔ شفیع شاہ بھی ساتھ ہولیا تھا تاکہ جو باتیں نہیں ہوسکی تھ[یں] ہم راستے میں کرلیں۔

جہاز جب کراچی سے روانہ ہوا اور اس کی پرواز ہموار [ہوئی] تو میں نے حفاظتی بیلٹ کھولنے کے بعد تھکے تھکے سے اندا[ز میں] سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا کر، بٹن دبا کر اسے ترچھا کرلیا ا[ور] دراز ہوگیا۔ آنکھیں بند کیں تو گزشتہ شب کے واقعات نظروں [میں] گھومنے لگے۔ اللہ نے عزت رکھ لی تھی۔ میرے ہوٹل میں ایسا واقعہ رونما نہیں ہوا تھا جس کا اسکینڈل بن سکتا۔ اس طما[نیت] کی وجہ سے ہی مجھے قطعاً تھکن محسوس نہیں ہورہی تھی۔

میں اس طمانیت سے زیادہ محظوظ نہ ہوپایا۔ اس روز فر[سٹ] کلاس میں گوکہ مسافر بہت کم تھے لیکن میرے آس پاس کی چھ سات نشستوں پر غالباً مسافروں کا ایک ہی گروپ تھا۔ وہ ایک دوسرے سے خوب اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کررہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے ٹھسے پٹے نیم مزاحیہ جملوں پر خوب زور زور سے ہنس رہے تھے۔

میں نے بالآخر آنکھیں کھولیں اور اخبار کی اوٹ سے کن انکھیوں سے ان کا جائزہ لیا۔ ان میں سے جو شخص عین میرے ساتھ والی نشست پر بیٹھا تھا وہی ان کا سربراہ معلوم ہوتا تھا۔ باقی لوگ بھی گویا پہناوے اور رکھ رکھاؤ میں اسی جیسے دکھائی دے رہے تھے لیکن ان کا انداز بتاتا تھا کہ وہ اس کے ہم مرتبہ نہیں تھے۔ ان کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے کوشاں رہتے تھے۔ ان کی بے تکلفی بھی ذرا مؤدبانہ قسم کی تھی۔ وہ اس شخص کو 'ملک صاحب' کہہ کر مخاطب کررہے تھے۔

ملک صاحب ادھیڑ عمر، چوڑے چکلے اور گورے چٹے تھے۔ قد کاٹھ اچھا تھا۔ موٹاپے کا شکار نہیں تھے۔ ہاتھ پاؤں کے مضبوط معلوم ہوتے تھے۔ دولت نے یقیناً ان کی شخصیت میں ایک موہوم سی ملائمت اور چمک دمک پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کی تہ میں ان کا دیہاتیوں والا کھردرا پن بہرحال برقرار تھا۔ چہرہ بتاتا تھا کہ اس شخص میں جوانی میں خاصی مردانہ وجاہت رہی ہوگی جس کے بچے کھچے آثار اب بھی موجود تھے جن کا انہیں شاید اب بھی کچھ زیادہ ہی احساس تھا۔ تب ہی بار بار غیر ضروری طور پر ائرہوسٹس کو بلائے جارہے تھے اور اسے اپنی والہانہ نظروں سے نوازے جارہے تھے۔ وہ بے چاری اپنی نپی تلی پیشہ ورانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسی طرح انہیں برداشت کررہی تھی جس طرح عام طور پر ائرہوسٹس فرسٹ کلاس مسافروں کو کیا کرتی ہیں۔

ملک صاحب شاید ائرہوسٹس کو سنانے کے لئے ہی کبھی اس کی موجودگی میں اپنے کسی ساتھی کو مخاطب کرکے پوچھتے۔ "اکمل صاحب! یاد اے.... پچھلے سال جدوں اسی پیرس گئے سی تے جہاز اچ اوس میم نے کی آکھیا سی؟" (یاد ہے پچھلے سال جب ہم پیرس گئے تھے تو جہاز میں اس میم نے کیا کہا تھا؟)

کبھی وہ کسی دوسرے ساتھی کو یاد دلاتے۔ "عزیز صاحب! ایتھے تے انہاں دناں اچ اے سی دے بغیر گزارا نئیں.... پر لندن اچ تے انہاں دناں اچ ساڈے کولوں سوئمنگ وی نئیں سی ہندی۔ پانی تے انج ہندا سی جیویں برف۔" (یہاں تو ان دنوں میں ائرکنڈیشنر کے بغیر گزارا نہیں۔ لیکن لندن میں تو ان دنوں ہم سے سوئمنگ بھی نہیں ہوتی تھی۔ پانی تو ایسے ہوتا تھا جیسے برف۔)

ساتھی بار بار ان کی ہاں میں ہاں ملاتے۔ پھر لندن، پیرس اور روم کی باتیں شروع ہوجاتیں۔ کبھی ملک صاحب کے ساتھی ان سے پوچھنے لگتے کہ فلاں قیمتی گاڑی کا انہوں نے کیا کیا اور فلاں کوٹھی کا جو جھگڑا چل رہا تھا اس کا کیا بنا۔ ملک صاحب انہیں بتانے لگتے کہ فلاں گاڑی تو انہوں نے فلاں کو تحفے میں دے دی اور فلاں کوٹھی تو وہ مقدمے میں جیت گئے تھے مگر انہیں بالکل پسند نہیں تھی، اس لئے انہوں نے بیچ دی۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ملک صاحب جی بھر کے شو آف کررہے تھے اور ان کے ساتھی اس کام میں حسب توفیق ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ ائرہوسٹس خوبصورت تھی.... بلکہ بلاشبہ بہت زیادہ خوبصورت تھی۔ آتے جاتے یہ سب باتیں اس کے کانوں تک پڑ رہی تھیں۔ ملک صاحب کی نظرِ التفات کا بھی اسے احساس تھا۔ کبھی کبھی اس کی مسکراہٹ میں دلداری کی رمق بھی آجاتی تھی لیکن یہ باتیں، دولتمندی کے قصے، دولتمندوں کی نگاہِ التفات، یہ سب کچھ اس کے لئے تھوڑا بہت اہم شاید رہا ہو لیکن نیا بہرحال

نہیں تھا۔ فرسٹ کلاس میں یہ اس کے لئے آئے دن کا تجربہ تھا۔ خصوصاً جبکہ وہ خوبصورت بھی تھی۔

معلوم نہیں وہ اندر ہی اندر بور ہو رہی تھی یا نہیں۔ بہرحال میں خاصا بور ہو رہا تھا لیکن اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ سفر طویل نہیں تھا۔ منزل جلد ہی آنے والی تھی۔ یہ ان چاہی رفاقت زیادہ دیر کے لئے گلے کا ہار نہیں تھی۔ تاہم میں اپنی ناگواری کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکا۔ گو کہ یہ خاموش اظہار ہی تھا مگر کوئی محسوس کرنے والا ہوتا تو کر سکتا تھا۔

میں نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹا کر فولڈنگ ٹیبل کے ساتھ اڑس دیا اور ملک صاحب کو ناگواری سے گھور کر دیکھا۔ اسی لمحے انہوں نے پہلی بار میرا چہرہ دیکھا۔ میری ناگواری کی طرف تو شاید ان کا دھیان ہی نہیں گیا۔ انہوں نے باچھیں پھیلاتے ہوئے اپنے کسی ساتھی کو مخاطب کیا" ارے بھئی..... ہم نے تو دیکھا ہی نہیں.... ہمارے ساتھ تو چوہدری افضل صاحب بیٹھے ہوئے ہیں..... سبحان اللہ! کیا حسین اتفاق ہے۔"

انہوں نے گرمجوشی سے مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے ان کے ہاتھ کو نظر انداز کرتے ہوئے خشک لہجے میں کہا "معاف کیجئے...میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔"

وہ ذرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر بولے "یہی تو حالات کی ستم ظریفی ہے جی.... آپ کی تصویر کبھی اخبار میں نہیں چھپی لیکن ہم نے آپ کو پہچان لیا..... اور ہماری تصویریں آئے دن اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں لیکن آپ نے ہمیں نہیں پہچانا..... بڑے افسوس کی بات ہے....."

میں نے ملائمت سے کہا "اخباروں کا کیا ہے جناب! اخباروں میں تو عجیب عجیب تصویریں چھپتی رہتی ہیں۔ کبھی تصویر چھپ جاتی ہے' فلاں جگہ دو ناکوں اور چار آنکھوں والا ایک بچہ پیدا ہو گیا۔ کبھی لائن میں کھڑے ہوئے چار چھ ٹیڑھے میڑھے سے آدمیوں کی تصویر چھپی ہوتی ہے جن کے بارے میں لکھا ہوتا ہے کہ پولیس مقابلے میں یہ پکڑے گئے اور ان کے اتنے ساتھی مارے گئے۔ کبھی کبھی تو تلاش گمشدہ میں کسی بیگم صاحبہ کے کتے کی تصویر بھی چھپ جاتی ہے کہ کالی آنکھوں اور بھورے بالوں والا ٹونی تین دن سے غائب ہے اور اس کی جدائی میں بیگم صاحبہ کا رو رو کر برا حال ہے۔ اتنی تصویریں چھپتی ہیں اخباروں میں..... انسان کس کس کو یاد رکھ سکتا ہے۔"

ملک صاحب تو ایک لمحے کے لئے گڑبڑا گئے۔ ان کی رنگت کچھ متغیر سی ہو گئی۔ لیکن ان کے کچھ بولنے سے پہلے ان کے معزز قسم کے چمچوں میں سے ایک بول اٹھا "کمال ہے چوہدری صاحب!
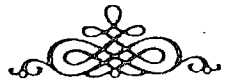
آپ بات کو کہاں لے گئے.... اپنے ملک ریاض راہی صاحب تو بڑے مشہور لیڈر ہیں۔ روز ان کے بیانات چھپتے رہتے ہیں اخباروں میں، تصویر بھی اکثر چھپتی رہتی ہے۔ بڑے پاپولر آدمی ہیں اپنے علاقے میں..... ڈنکا بجتا ہے ان کے نام کا۔"

"یہ میری بد قسمتی ہے کہ اس ڈنکے کی آواز میرے کانوں تک نہیں پہنچی۔" میں نے بدستور شائستگی سے کہا "بہرحال آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" میں نے مصافحے کے لئے ملک ریاض راہی کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی باچھیں ذرا کھل گئیں۔ اس نے گرم جوشی اور مضبوطی سے مصافحہ کیا۔ آدمی مضبوط معلوم ہوتا تھا۔

اسی لمحے مجھے کچھ یاد آیا کہ ضلعی خبروں والے صفحے پر نظر دوڑاتے وقت شاید یہ نام میری نظر سے گزرا تھا لیکن ظاہر ہے وہ صفحہ میں پڑھ نہیں پاتا تھا۔ یونہی سرسری سے انداز میں نظر ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جاتا تھا۔ اخبارات کے ان صفحوں پر شاید کبھی کبھار اس کی چند سطری کوئی خبر سنگل کالم میں ہوتی تھی۔ کبھی کبھی شاید تصویر بھی چھپتی تھی لیکن میرے ذہن میں نہیں رہی تھی۔ میں نے کبھی توجہ سے دیکھی ہی نہیں تھی۔

"یہ راہی کیا آپ کا تخلص ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا

"جی ہاں...." اس نے فخر سے جواب دیا "لیکن ابھی میں نے شاعری شروع نہیں کی۔ ابھی میں کوئی اچھا سا استاد ڈھونڈ رہا ہوں جو میرے کلام پر اصلاح دے سکے۔"

'کلام پر اصلاح دینے کی' بات بھی خوب تھی۔ میں نے کہا۔ "جب آپ نے کچھ کہنا شروع ہی نہیں کیا تو پہلے سے ہی اصلاح کرنے والے کی تلاش کیوں شروع کر دی؟"

"دیکھیں نا چوہدری صاحب! انسان کوئی بھی نیا کام شروع کرتا ہے تو اس میں غلطیاں تو ہوتی ہیں نا..... میں زیادہ خوش فہمی میں مبتلا رہنے والا آدمی نہیں ہوں۔" وہ حتی الامکان متانت سے بولا۔ میں اس کے اس بیان سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ حالانکہ اس کے ساتھ چھ سات آدمی ایسے سفر کر رہے تھے جن کا کام ہی غالباً اسے دن رات خوش فہمیوں میں مبتلا رکھنا تھا۔ مگر وہ کہہ رہا تھا کہ وہ خوش فہمیوں میں مبتلا رہنے والا آدمی نہیں۔ عجیب بات تھی۔ بیشتر لوگوں کے ساتھ میں نے یہی معاملہ دیکھا تھا کہ جو وہ ہوتے تھے' اپنے آپ کو اس کے بالکل الٹ سمجھتے تھے..... یا کم از کم الٹ ظاہر ضرور کرتے تھے۔ مثلاً ہر وقت خوشامدیوں میں گھرے رہنے والے اور ذرا ذرا سی تعریف پر پھول جانے والوں کو میں نے کہتے سنا تھا کہ وہ خوشامد کو بالکل پسند نہیں کرتے۔

میرے لئے یہ سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ ملک ریاض راہی کو دراصل استاد کی نہیں' کسی ایسے مفلوک الحال شاعر کی ضرورت تھی جو اپنا کلام اس کے ہاتھ فروخت کر سکے جسے وہ اپنے نام سے چھپوا کر اور مشاعروں میں پڑھ کر شاعر ہونے کی سند پا سکے۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ اس کا اصل شوق لیڈری ہی تھا۔ شاعری کی یہ جعلی ٹھرک اس نے فالتو میں ہی پالی ہوئی تھی۔ وہ انہی لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جن کے لئے سیاست ہر اعتبار سے منافع بخش' ہوتی ہے۔ شوق کا شوق' شہرت کی شہرت' مشغلے کا مشغلہ اور کاروبار کا کاروبار۔ جہاں لاکھ لگاؤ وہاں سے بعد میں دس لاکھ کماؤ۔ ان لوگوں کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا۔ اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ صرف لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے ہوتا ہے۔ دلی طور پر انہیں کسی نظریئے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ جدھر کا پلڑا جھکتے دیکھتے ہیں اسی طرف ہو جاتے ہیں۔

تاہم ملک ریاض راہی فی الحال ایک چھوٹی سی پارٹی میں تھا۔ شاید اس لئے کہ وہاں اسے بڑا سا عہدہ ملا ہوا تھا۔ دولت اس کے پاس ٹھیک ٹھاک ہی لگتی تھی۔ بنیادی طور پر زمیندار تھا لیکن پراپرٹی کے دھندے میں بھی سرگرم معلوم ہوتا تھا۔ لاہور میں بڑی بڑی کوٹھیاں خرید کر بیچتا رہتا تھا۔ اس کے ساتھ سفر کرنے والے چھ سات آدمی بھی خوشحال ہی معلوم ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی اس کی پارٹی کا عہدیدار تھا اور کوئی بغیر عہدے کے ہی اس کے لئے کوئی نہ کوئی خدمت انجام دے رہا تھا۔ وہ کچھ شاطر اور موقع پرست سے آدمیوں کا ایک چھوٹا سا گینگ معلوم ہوتا تھا۔

کافی باتیں ہو چکیں تو وہ سوال میری زبان پر آگیا جو شروع سے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ "ملک صاحب! آپ نے مجھے پہچانا کیسے؟ جبکہ بقول آپ ہی کے' میری تصویر اخباروں میں بھی نہیں چھپتی؟"

وہ ایک غیر ملکی سگریٹ سلگا کر طویل کش لینے کے بعد بولا۔ "آپ جیسے لوگ عوامی سطح پر مشہور نہیں ہوتے لیکن شہر کے خاص خاص لوگوں میں اور اونچے طبقوں میں بہت اچھی طرح جانے پہچانے جاتے ہیں۔" پھر وہ معنی خیز سے انداز میں ہنسا "اور آپ جیسے لوگ ہم جیسے سیاسی لوگوں کی تو لسٹ پر ہوتے ہیں۔ آپ کو پہچاننا تو ہماری ضرورت ہوتا ہے۔ خواہ غائبانہ طور پر ہی سہی۔"

"لسٹ پر ہوتے ہیں!" میں نے حیرت سے دہرایا "کون سی لسٹ پر ملک صاحب؟ کیا ہٹ لسٹ پر؟"

اس نے ایک گونجدار قہقہہ لگایا۔ سگریٹ کا ایک اور کش لے کر راکھ جہاز کے قالین پر جھاڑی اور خوشدلی سے بولا "خدا نہ کرے آپ کسی کی ہٹ لسٹ پر ہوں۔ ابھی تو آپ نوجوان ہیں۔ ابھی تو آپ کو بے شمار کام کرنے ہیں۔ ملک و قوم کے لئے...... ہمارے لئے۔"

ایک تو یہ قوم کے نحیف و نزار اور مریل گھوڑے کی پیٹھ پر سواری کرنے والے موٹے موٹے مگرمچھ ہر بات میں ملک و قوم کو درمیان میں ضرور لے آتے تھے جن کی حالت انہی کے اعمال کے بوجھ سے ابتر تھی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "حاضر ہوں مدد کو جان و دل سے۔ گرچہ کیڑا ہوں میں ذرا سا۔"

اس نے ایک بار پھر گونجیلا سا قہقہہ لگایا۔ اس کے ہنسنے کے ساتھ ہی اس کے ہم سفروں کی باچھیں بھی پھیل جاتی تھیں۔ وہ میرے ہاتھ پہ ہاتھ مار کر بولا "آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں چوہدری صاحب۔ آپ کی نوجوانی کے باوجود' آپ کی کاروباری حیثیت کو دیکھتے ہوئے مجھے اندیشہ تھا کہ آپ بھی دوسرے کاروباری بڑے لوگوں کی طرح خشک نہ ہوں۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے بولا۔ "بہرحال...... آپ کی مصروفیات زیادہ تر خشک قسم کی ہی ہوں گی۔ کاروبار بڑا خشک کام ہے لیکن اگر کبھی آپ شہر کی زندگی سے بور ہو جائیں اور آپ کی طبیعت سیرو شکار' تفریح اور ایڈونچر کی طرف مائل ہو تو ہمیں یاد فرمایئے گا۔ ہم آپ کو اپنے علاقے میں لے چلیں گے۔ کچھ دن تفریح میں گزاریں گے تو یاد کریں گے۔"

پھر وہ آنکھ دبا کر سرگوشی میں بولا "یہ مت سمجھئے گا کہ گاؤں جا کر آپ خاک پھانک کر آجائیں گے۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز موجود ہے۔ بلکہ بلا ضرورت بھی آپ جو کہیں گے' حاضر کر دیا جائے گا۔ جنگل میں منگل ہے۔ ایک بار تجربہ کر کے ضرور دیکھئے گا۔"

"مجھے اندازہ ہے ملک صاحب! آدمی کے پاس دولت ہو تو جنگل بھی شہر ہیں اور دولت نہ ہو تو شہر بھی بیاباں ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ پھڑک اٹھنے کی اداکاری کرتے ہوئے بولا "لاکھ روپے کی بات کی ہے آپ نے...... پیسے والے ہیں نا آپ...... اس لئے آپ کو پیسے کی طاقت کا اندازہ ہے۔ سارا کھیل ہی پیسے کا ہے جی۔ یہ پوری دنیا اپنے محور کے گرد نہیں' پیسے کے گرد گھوم رہی ہے۔ ہمارے ہاں ہر سرگرمی پیسے کی وجہ سے ہے یا پیسے کے لئے۔ سیاست' نوکری' حتیٰ کہ سماجی خدمت' سب کی تہ میں پیسے کا ہی چکر ہے۔ ہم بھی زمانے کے ساتھ چل رہے ہیں۔"

"کیا زمانہ بہت بُرا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کو اس میں کوئی شک ہے کیا؟ آپ دنیا کی حالت نہیں دیکھ رہے' چاروں طرف کیا ہو رہا ہے!" وہ گویا میری بے خبری پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں نے حال ہی میں ایک حدیث پڑھی ہے جس کے مطابق اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ زمانے کو بُرا مت کہو' زمانہ میں ہوں' انسان زمانے کو بُرا کہہ کر مجھے تکلیف پہنچاتے ہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "اور واقعی...... زمانہ تو غیب کی علامت ہے۔ بُرے تو ہم انسان ہوتے ہیں۔ ہم اپنی حرکتوں سے جس دور کو چاہیں اچھا بنا سکتے ہیں اور جس دور کو چاہیں بُرا۔ تو پھر ہم یہ کیوں نہیں کہتے کہ انسان بہت بُرا ہو گیا ہے۔ یہ کیوں کہتے ہیں کہ زمانہ خراب آگیا ہے۔"

ملک ریاض راہی نے حیرت سے میری طرف دیکھا اور ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "چوہدری صاحب! کہیں میں آپ کو غلط تو نہیں

"نہیں۔" میں نے جواب دیا "مولوی ہونا تو کافی مشکل کا ہے۔ میں تو پہلے اندر سے انسان بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

"اوہ...... آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔" وہ طمانیت کی گہری سانس لے کر بولا۔

"آج کل سچی بات سن کر لوگ ڈر کیوں جاتے ہیں؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"چوہدری صاحب......!" وہ ایک بار پھر آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے بولا "اب آپ اتنے بھولے بادشاہ نہ بنیں۔ آپ کو بھی اچھی طرح پتا ہے دنیا کدھر جا رہی ہے' لوگ کیا کر رہے ہیں اور کیوں کر رہے ہیں۔ آپ کو دنیا داری کے سارے چکروں کا پتا ہے۔ اگر آپ اتنے سیدھے ہوتے تو اتنے بڑے بزنس مین نہ بنتے۔"

"میں نے کب کہا کہ مجھے دنیا داری کے چکروں کا پتا نہیں" میں نے حیرت سے آنکھیں جھپکائیں۔ "جب سے پتا چلا ہے۔ دنیا کو زیادہ قریب سے دیکھا ہے تب سے ہی تو دل زیادہ دکھتا ہے۔ آگہی بلاشبہ ایک عذاب ہے۔"

"چھوڑیں جی......" وہ میرا ہاتھ تھپک کر بولا "آپ کسی کے عذاب ثواب کے چکروں میں نہ پڑا کریں۔ آپ کی ابھی عمر کیا ہے۔ دنیا دیکھیں' ہر چیز کو انجوائے کریں۔ ورنہ بعد میں پچھتائیں گے۔"

"انجوائے تو میں کر رہا ہوں۔ میں تو آپ جیسے لوگوں کی باتوں کو بھی انجوائے کرتا ہوں۔ لیکن ہو سکتا ہے پھر بھی بعد میں پچھتانا پڑے۔ پچھتاوے کا کیا ہے۔ زندگی کے آخری موڑ پر پہنچ کر تو میں نے اکثر لوگوں کو...... خصوصاً دنیا داروں کو پچھتاتے ہی دیکھا ہے۔ دنیا میں سب کچھ دیکھ لینے' حاصل کر لینے اور برتنے کے بعد بھی میں ہاتھ جھاڑ کر یہی سوچتے ہیں۔ "اچھا...... ! بس یہی تھی دنیا؟! کے لئے اتنے پاپڑ بیلے؟ اتنے پاپ کمائے؟ دُر فٹے منہ......!" چاہے وہ منہ سے ایسا نہ کہیں لیکن قریب سے مشاہدہ کرنے پر ان کے محسوسات کچھ ایسے ہی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"چھوڑیں چوہدری صاحب! آپ تو خیالوں خوابوں کی باتیں کر رہے ہیں۔" وہ فولڈنگ میز کی ایش ٹرے میں سگریٹ مسلتے ہوئے بولا "ہم نے تو زندگی کی آخری سانس تک دنیا والوں کو دنیا داری ہی کے چکروں میں پریشان دیکھا ہے۔ بستر مرگ پر پڑے ہوں گے' آخری سانس سینے میں اٹکی ہوئی ہو گی لیکن فکر پڑی ہوگی کہ فلاں جائیداد کا کیا بنا؟ فلاں کارخانہ فلاں لڑکے نے سنبھالا یا نہیں' فلاں فلاں فائلیں فلاں فلاں محکموں سے نکل آئیں یا نہیں۔ انہی فکروں میں تڑپتے ہوئے اور خواب آور دواؤں کے انجکشن لگواتے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں...... اور میں کہتا ہوں یہ ٹھیک ہی ہے۔ زندگی اسی جدوجہد کا نام ہے۔ آدمی کو اسی طرح ہاتھ پاؤں مارتے مارتے مرنا چاہئے' مفلوج ہو کر نہیں۔ بے بسی

نہ سکتا ہو۔ حتیٰ کہ سوچ بھی ٹھیک طرح سے اس کے قابو میں نہ ہے۔"

"اب یہ تو کوئی انسان یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اسے کیسی موت نصیب ہو گی۔ دنیا کی ساری دولت بھی انسان کو اس کی پسند کی موت نہیں دلوا سکتی۔" میں نے کہا۔ "اسی لئے تو میں سوچتا ہوں کہ ہر طرح کی موت کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ بلکہ صرف موت کے لئے انسان تیار رہ لے تب بھی غنیمت ہے۔ یہ یاد رکھ لے کہ موت کے بعد کسی کے سامنے پیشی ہونی ہے۔"

"اب آپ غالباً توشہ' آخرت وغیرہ کی بات کریں گے۔ خدا را معاف کر لیں چوہدری صاحب! کوئی ہم جیسے گناہ گار انسانوں میں اٹھنے بیٹھنے والی باتیں کریں۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔

"گناہ گار تو میں بھی بہت ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن گناہ کو گناہ سمجھنے میں' اچھے اور بُرے کے درمیان امتیاز رکھنے میں کیا حرج ہے؟ انسان کم از کم گناہوں پر فخر تو نہ کرے۔ نہیں زندگی کا حاصل تو نہ سمجھے۔ یہ بھی غنیمت ہے۔ اس سے انسان کا ضمیر زندہ ہونے کا سراغ ملتا ہے۔"

"چھوڑیں جی چوہدری صاحب! خالی خولی امتیاز رکھنے اور شرمندہ ہونے کا کیا فائدہ؟ جب انسان گناہوں کو چھوڑ نہ سکتا ہو' برائیوں سے پرہیز نہ کر سکتا ہو' اچھائی کے راستے پر قائم ہی نہ رہ سکتا ہو' ان ساری باتوں کی اس میں طاقت ہی نہ ہو تو پھر خالی وعظ کرتے رہنے کا کیا فائدہ؟ اس سے تو بہتر ہے کہ آپ خالص دنیا دار ہی بن جائیں۔ ہر وقت ایک خلش میں' ایک کسک میں تو مبتلا نہ رہیں۔ بیچ میں تو نہ لٹکے رہیں۔ یا تو آپ سارے احکام کی عملی پابندی کریں یا پھر پورے دنیا دار ہو جائیں' کسی ایک طرف کے ہو جائیں۔ انسان کسی بھی معاملے میں دو کشتیوں کا سوار نہیں رہ سکتا۔"

میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا' شاید وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ آدمی جاہل معلوم ہوتا تھا لیکن جاہل بھی کبھی کبھی پتے کی بات کر جاتے ہیں۔ وہ جو بھی تھا لیکن جہاندیدہ بہرحال معلوم ہوتا تھا۔ میں نے پہلے کی نسبت ذرا کمزور لہجے میں کہا "میں تو نہ اپنے آپ کو اچھے' نیک اور پارسا لوگوں میں شمار کر رہا ہوں اور نہ ہی بیچ والوں میں۔ میرا خیال ہے میں تو خود بھی آپ جیسے دنیا داروں میں ہی شامل ہوں ملک صاحب! لیکن یونہی کبھی کبھی کوئی غیبی آواز سی بے چین کر دیتی ہے۔ میرا بھی کبھی بہت نیک' بہت پارسا بن جانے کو جی چاہتا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کس چیز نے روکا ہوا ہے۔"

"دنیا کی کشش نے۔" ملک مسکرایا۔ "اس دنیا میں بڑی کشش ہے۔ اس کی ہر چیز میں بڑی لذت ہے۔ سچی ہے یا جھوٹی' پائیدار ہے یا ناپائیدار' لیکن بہرحال لذت ہے۔ آپ غیبی آواز سے زیادہ پریشان نہ ہوا کریں۔ ہم جیسوں سے دوستی رکھیں' آپ کو ہر طرح کی غیبی آوازیں ستانا بند کر دیں گی۔"

پھر اس نے انگوٹھے کے ذریعے بوتل منہ سے لگانے کا اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ شغل چلتا ہے؟" میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"یہی تو خرابی ہے آپ میں۔" وہ گویا مرض کی جڑ پکڑتے ہوئے بولا "جب بھی غیبی آوازیں آپ کو ستایا کریں' بوتل کھول لیا کریں۔ ساری آوازیں ختم ہو جائیں گی۔ صرف خواہشوں کی آواز رہ جائے گی۔ میں سچ کہہ رہا ہوں' آپ کو ہم جیسے انسانوں کی صحبت کی اشد ضرورت ہے۔ آپ پہلی فرصت میں چاہے لاہور میں ہمارے ساتھ نشست رکھیں یا پھر زمینوں پر چلنے کا کوئی پروگرام بنائیں۔"

مجھے اس کی دعوت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن معلومات کی خاطر میں نے پوچھا "کہاں ہیں آپ کی زمینیں؟"

"اوپر والے کا بڑا کرم ہے......" ایک لمحہ پہلے وہ جس طرح کی باتیں کر رہا تھا' ان کی روشنی میں یہ اوپر والے کے کرم کی بات اس کے منہ سے بڑی عجیب لگی لیکن معاشرہ ایسے ہی تضادات سے بھرا پڑا ہے۔ میں کس کس پر حیران ہوتا۔ وہ بڑے تشکر بھرے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "دو مختلف علاقوں میں زمین ہے اپنی..." اس نے علاقوں کا نام بتایا اور میں چونکے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ ان میں سے ایک علاقے کا نام شکر گڑھ تھا۔

میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "شکر گڑھ کے قریب تو کافی زمین ملک اسلم حیات کی بھی تھی۔ کئی چک آباد تھے ان زمینوں پر۔"

میں نے تو اپنا چونکنا اس پر ظاہر نہیں ہونے دیا تھا لیکن وہ واضح طور پر چونک کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "کیا آپ جانتے تھے ملک اسلم حیات کو؟"

میں نے بے نیازی سے کہا "نہیں۔ البتہ ملک اسلم حیات کا کوئی بیٹا تھا... شاید قیصر ملک نام تھا اس کا۔ وہ فلم بزنس میں بھی تھا۔ میرا بھی کچھ پیسہ فلم بزنس میں لگا ہوا ہے۔ وہیں اسٹوڈیو میں اتفاقاً ایک آدھ بار اس سے ملاقات ہوئی۔ اور وہ کچھ ایسے خوشگوار حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال اس کے بیک گراؤنڈ کا پتا چلا تھا۔"

وہ گویا اطمینان کی سانس لے کر بولا "قیصر سے تو کم ہی لوگوں کی ملاقات خوشگوار حالات میں ہوتی تھی۔ تھا تو وہ بڑا زندہ دل اور ہمارے جیسے ہی شوق رکھنے والا لڑکا۔ لیکن فلم لائن نے اسے کچھ زیادہ خراب کر دیا تھا......"

میں نے دل میں سوچا۔ میرے خیال میں تو وہ فلم لائن کو زیادہ خراب کر رہا تھا' لیکن میں خاموش رہا۔ ملک ریاض بات جاری رکھتے ہوئے بولا "خرابی اس میں صرف یہ پیدا ہو گئی تھی کہ اسے اپنے فائدے نقصان کی تمیز نہیں رہی تھی۔ کیا آپ کو معلوم ہے وہ دونوں باپ بیٹے یکے بعد دیگرے کچھ ہی عرصے میں مارے گئے تھے؟"

"ہاں۔ میں نے کچھ سنا تو تھا لیکن مجھے صحیح طور پر حالات کا علم نہیں۔ میں نے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لی تھی۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔ شاید ملک ریاض کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ دونوں باپ بیٹے میرے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچے تھے۔

وہ ترحم آمیز سے لہجے میں بولا "وہ جیسے بھی تھے بہرحال نہایت غیر متوقع طور پر ان کے خاندان کا نام ونشان مٹ گیا تھا۔ باپ پُراسرار حالات میں غائب ہوا۔ غائب کیا ہوا... سب ہی کو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مرچکا ہے۔ اس کے بعد زمین جائداد وغیرہ اکلوتے بیٹے کے نام منتقل ہوئی۔ پھر وہ بھی مرگیا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا۔ یعنی اتنی بڑی زمینداری وغیرہ کا کوئی وارث ہی نہیں۔ بس قریب ترین رشتے دار میں ہی تھا۔ میرے پاس پہلے ہی اللہ کا دیا بہت کچھ تھا لیکن ان کا سب کچھ بھی مجھے ہی مل گیا۔ کچھ عدالتی کارروائیاں ضرور کرنی پڑیں۔ لیکن تھانے کچہریاں ہم لوگوں کے لئے گھر کی طرح ہوتی ہیں۔ بس یوں سمجھ لیں کہ میں بیٹھے بٹھائے پہلے سے دگنا بڑا زمیندار بن گیا۔ حالانکہ ان لوگوں کی زندگی میں میرا کبھی ان لوگوں سے میل جول نہیں رہا.... بلکہ یوں سمجھ لیں کہ دونوں طرف ایک طرح کی ہلکی پھلکی سی ناپسندیدگی پائی جاتی تھی۔"

پھر وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "لیکن بھئی سچی بات ہے' ان کے مرنے کے بعد میں ان کا کافی شکر گزار ہوں۔ کافی فائدہ پہنچا ہے ان کی موت سے۔ میری صاف گوئی شاید آپ کو پسند نہ آئے لیکن میں کھرا آدمی ہوں۔ سچی بات کرتا ہوں۔ خواہ مخواہ منہ لٹکا کر بیٹھنے اور ایسے لوگوں کی موت پر اظہارِ افسوس کرنے کی کوشش نہیں کرتا جن کی موت کا مجھے حقیقت میں کوئی افسوس ہوا ہی نہیں ہوتا۔ کیوں جی' کیا میں غلط کہہ رہا ہوں چوہدری صاحب؟"

"نہیں۔ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔" میں نے بے دھیانی سے کہا۔ میں اصل میں اب ایک نئے زاویۂ نظر سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ مجھے یہ اتفاق بڑا عجیب سا لگ رہا تھا کہ میری زندگی کے سادہ ورق پر دشمنی اور نفرت کے خانے میں جس شخص کا نام سب سے پہلے..... اور بہت گہرے حروف میں لکھا گیا تھا' آج اس کی زمینوں اور جائداد کا وارث میرے برابر بیٹھا مجھ سے گپ شپ کر رہا تھا۔ وارث بھی وہ جو درحقیقت وارث تھا ہی نہیں۔ وقت نے ویسے ہی اٹھا کر سب کچھ اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔ اس دولت وجائداد کے لئے ملک اسلم حیات اور پھر اس کے بیٹے قیصر ملک نے نہ جانے کیا کیا پاپ کمائے تھے' کیا کیا ظلم ڈھائے تھے۔ اس دولت وجائداد کو حقیقی وارث بھی میسر نہیں آسکا تھا.... اور اس کے بل پر وہ اپنے لئے عزت کی موت بھی نہیں خرید سکے تھے۔ اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو بڑی بے وقعت لگتی ہیں یہ چیزیں۔

اچانک وہی ائرہوسٹس ایک بار پھر ہمارے قریب سے گزری جس کی نظرِ التفات کے لئے ملک ریاض خاصی دیر سے پھڑک رہا تھا۔ وہ مجھے ہلکے سے کہنی مار کر اور آنکھ دبا کر بولا "کیسی ہے؟"

"اچھی ہے۔" میں نے سادگی اور سنجیدگی سے کہا "لیکن اُسے اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ بے چاری یہاں گزرتی ہے تو کچھ سہمی سہمی سی نظر آتی ہے۔"

"چھوڑا ہوا تو ہے اس کے حال پر۔ ہم کون سا اُسے اٹھا لے جارہے ہیں۔" ملک ریاض نے قدرے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا "ویسے آپ اس کے سہمی سہمی نظر آنے پر نہ جائیں۔ یہ تو ایسے ہی ذرا دکھاوے کی باتیں ہوتی ہیں۔ یہ جہاز کا اسٹیج ہے نا۔ ذرا پرفارمنس دیتی ہیں اور ایکٹنگ کرتی ہیں کہ سیدھی سادی' پاکباز اور معصوم ہیں۔ لیکن بڑی خرانٹ ہوتی ہیں۔ یہ تو دل سے چاہتی ہیں کہ ہم جیسے مشہور اور دولت مند لوگ ان کی طرف متوجہ ہوں' انہیں لفٹ دیں۔ جال ہم تھوڑا ہی پھینک رہے ہوتے ہیں' جال تو ان کے پاس ہوتا ہے۔"

"ہوسکتا ہے کچھ واقعی سیدھی سادی' پاکباز اور معصوم ہوں۔ خرانٹ نہ ہوتی ہوں۔ جال لئے نہ پھرتی ہوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آخر ہم' لوگوں کے بارے میں حسنِ ظن کیوں نہیں رکھتے؟ ہم یہ کیوں نہیں سوچتے کہ شاید ہماری نظریں دھوکا کھا رہی ہوں۔ شاید ہمارا تجربہ جھوٹ بول رہا ہو؟ کبھی کبھی خواہ حقیقت سامنے ہو تب بھی کیا کچھ اور فرض کرلینا زیادہ بھلا نہیں لگتا؟"

"چوہدری صاحب! ہم جیسے لوگوں کے منہ سے یہ افسانوی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔" وہ ہاتھ ہلا کر بولا "ہم حقیقت کی دنیا کے لوگ ہیں۔ کم از کم میرا اپنے بارے میں تو یہی خیال ہے کہ میں ایسی سوچیں بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ دیہاتوں میں پرورش پانے والے خیالی اور خواب پرست نوجوانوں کے لئے۔ چھوٹی موٹی نوکریاں کرنے والے شریف اور شرمیلے بابوؤں کے لئے۔ ناکام شاعروں اور ادیبوں کے لئے۔ ہم بہت آگے کے لوگ ہیں چوہدری صاحب۔ ہمیں دنیا کو اسی طرح دیکھنا چاہئے جیسی وہ ہے۔"

وہ ائرہوسٹس کو خرانٹ کہہ رہا تھا لیکن خود زبردست خرانٹ معلوم ہوتا تھا۔ اندر سے وہ یقیناً بہت کُھردرا' سفاک اور خود غرض تھا۔ میں نے اس سے بحث کرنا فضول سمجھا۔ ویسے بھی اب زیادہ باتوں کا وقت نہیں رہا تھا۔ اسپیکر پر کیپٹن کی آواز ابھر رہی تھی۔ بتا رہا تھا کہ چند منٹ بعد ہم لاہور ائرپورٹ پر اترنے والے ہیں۔

ریاض ملک بولا "آپ سے تو کچھ امید نظر نہیں آرہی کہ آپ کبھی ہمارے غریب خانے پر تشریف لائیں گے۔ اس لئے جلد ہی خود آپ کے درِ دولت پر حاضری دیں گے۔"

میں ازراہِ مروت کارڈ نکال کر اسے دینے لگا تو وہ بے پروائی سے بولا "اس کی ضرورت نہیں۔ میں نے عرض کیا' نا کہ ہم جیسے لوگ آپ جیسے لوگوں کو غائبانہ طور پر بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ویسے بھی آپ جیسے لوگوں کا ایڈریس' فون نمبر وغیرہ معلوم کرنا کون سا مشکل کام ہے۔ ڈائرکٹری میں بھی آپ کی تو یہ سب چیزیں نمایاں طور پر آپ کے گروپ آف کمپنیز کے مونوگرام کے ساتھ چھپی ہوئی ہیں۔"

اس کا میرے بارے میں اس طرح سطحی سی معلومات رکھنا بھی مجھے کھٹک رہا تھا۔ بغیر کسی مطلب کے کوئی کسی کے بارے میں اتنی معلومات بھی کہاں رکھتا ہے۔ بہرحال میں نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ لاہور ائرپورٹ پر ایک چھوٹا سا جلوس اسے لینے آیا ہوا تھا۔ ملک ریاض ارائیول لاؤنج میں پہنچا تو جلوس کے شرکا نے اس کی گردن ہاروں سے لاد دی۔ دو تین فوٹوگرافر بھی اس وقت موجود تھے جنہیں یقیناً پارٹی ورکر ہی کھینچ کھانچ کر ساتھ لائے تھے۔

ملک ریاض فاتحانہ انداز میں ہاتھ ہلاتا اور ہر دو تین قدم بعد بڑی متانت سے رک کر فوٹوگرافروں کو اپنی تصویر کھینچنے کا موقع دیتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ میں اس سے چند قدم پیچھے تھا۔ اچانک اس نے ہاروں کے انبار میں بڑی مشکل سے گردن ذرا گھما کر متلاشی نظروں سے پیچھے دیکھا۔ یقیناً اسے میری تلاش تھی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی غالباً سب سے پہلے تو اسے یہ اطمینان حاصل ہوا کہ میں اس کے استقبال کا یہ عظیم اور متاثر کن نظارہ دیکھ رہا ہوں۔ پھر اس نے مجھے بھی اس اعزاز میں شریک کرنے کے لئے جلدی سے قریب آنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے اشارے سے ہی معذرت کی اور فوراً اس طرف کو کھسک لیا جہاں ٹونی کھڑا تھا۔ حالانکہ میں نے فون کرکے صرف ڈرائیور کو بلوایا ہوا تھا لیکن ٹونی میری آمد کی اطلاع سن کر خود بھی چلا آیا تھا۔

میں نے بریف کیس اسے تھمایا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ لپک کر میرے ساتھ ہوتے ہوئے بولا "خیریت ہے سر؟ آپ بہت عجلت میں دکھائی دیتے ہیں۔"

"تم نے دیکھا نہیں' قوم کا ایک عظیم خادم مجھے اپنی رفاقت کا اعزاز بخشنے پر تلا ہوا ہے۔"

ٹونی اپنے مخصوص' دھیمے سے انداز میں ہنس دیا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھے ہجوم کے سامنے آنے اور پبلک مقامات پر خواہ مخواہ خود کو نمایاں کرنے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔ وہ لوگ ابھی لاؤنج میں ہی نعرے بازی کر رہے تھے۔ ہم باہر آکر پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھے۔ مجھے معلوم تھا کہ ٹونی شہر کے تقریباً ہر قابلِ ذکر آدمی کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات رکھتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا "تم اس شخص کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟"

"ملک ریاض راہی کے بارے میں؟" اس نے تصدیق چاہی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ بولا "کچھ ہی عرصے پہلے ایک تانگہ پارٹی میں شامل ہوا تھا...."

"تانگہ پارٹی میں؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔

"اوہ... معاف کیجئے گا... یہ ایک عوامی اصطلاح ہے اور آپ کا اب عوامی اصطلاحوں سے زیادہ واسطہ نہیں رہا۔" ٹونی مسکراتے ہوئے بولا "دراصل ہمارے ملک میں بہت سی ایسی پارٹیاں بھی ہیں جن کے عہدیدار اور ارکان وغیرہ سب مل کر ایک تانگے میں سما سکتے ہیں۔ انہیں تانگہ پارٹی کہا جاتا ہے۔ ملک ریاض جب اس پارٹی میں شامل ہوا تو وہ بھی تانگہ پارٹی ہی تھی۔ لیکن اس کے آتے ہی گویا پارٹی میں بھی جان پڑگئی اور خود ملک ریاض بھی راکٹ کی رفتار سے سیاست کے افق پر سفر کر رہا ہے۔ ابھی اس سطح پر تو نہیں پہنچا کہ گلی کوچوں میں جانا پہچانا جانے لگے لیکن آثار بتاتے ہیں کہ سال دو سال میں بڑے بڑے جغادری لیڈروں کے کان کتر جائے گا۔"

"ایسی کیا خوبی ہے اس میں؟" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے پوچھا "جہاز میں سفر کے دوران میری اس سے تقریباً ایک گھنٹا گفتگو رہی۔ مجھے تو انتہائی عیار' بدمعاش' منافق اور جھوٹا آدمی دکھائی دیا۔"

"یہی تو ہمارا المیہ ہے سر!" ٹونی ٹھنڈی سانس لے کر بولا' "اکثر و بیشتر سیاست میں آنے والوں کی یہی برائیاں ان کی خوبیاں بن جاتی ہیں۔ انہی کے سہارے وہ تیزی سے آگے آتے چلے جاتے ہیں۔ سیدھے سادے اور کم علم لوگوں کو جو جتنا زیادہ اُلو بنا سکتا ہے وہ اتنا ہی بڑا اور کامیاب لیڈر بن جاتا ہے۔"

"کیا اس میں لوگوں کا کوئی قصور نہیں؟ میرا مطلب ہے' عوام کا؟" میں نے کہا۔

"عوام کا تو شاید نہیں...." ٹونی ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا' "لیکن ان کی کم علمی' کم فہمی اور بے خبری کا ضرور ہے.... لیکن مسئلہ یہ بھی ہے کہ انہیں جان بوجھ کر کم علم اور ذہنی طور پر پسماندہ رکھا گیا ہے۔"

"ملک ریاض کے بارے میں اور کچھ جانتے ہو؟" میں نے اس طوالت طلب موضوع سے کتراتے ہوئے پوچھا۔

"اس کی کامیابی کی دوسری بڑی وجہ پیسہ ہے سر!" ٹونی بولا۔ "پیسہ وہ پانی کی طرح بہا رہا ہے۔ پارٹی کے دفتروں میں لنگر کھلے رہتے ہیں۔ پریس والوں کے لئے' جلسے جلوسوں کے لئے گویا تھیلیوں کے مُنہ کھلے رہتے ہیں۔ ویسے تو بہت سے لوگ سیاست میں خاندانی دولت اس امید پر خرچ کرتے رہتے ہیں کہ آج دس بیس لاکھ لگائیں گے تو کل دس بیس کروڑ کمائیں گے۔ لیکن ملک ریاض جس دریا دلی سے خرچ کر رہا ہے اس سے تو لگتا ہے کہ وہ خاندانی دولت بھی نہیں ہے۔ جوں جوں سیاست میں اس کے خرچے بڑھ رہے ہیں' اس کی خاندانی دولت اس سے بھی زیادہ بڑھتی دکھائی دے رہی ہے۔ یہ ویسے ہی بس میرا مشاہدہ ہے۔ صحیح اعداد و شمار تو مجھے معلوم نہیں۔ کیونکہ میں نے اسے کبھی اتنی اہمیت نہیں دی۔"

"وہ زمیندار ہے اور بڑی پراپرٹی کا سائڈ بزنس بھی کرتا ہے۔ دونوں کام بہت زیادہ منافع دے رہے ہوں گے۔ جتنا مہینے میں خرچ ہو رہا ہوگا اتنا تو شاید وہ ایک گھنٹے میں کما لیتا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"ویسے بھی ہمارے ہاں جب لوگ سیاست میں آجاتے ہیں تو ان سے حساب کتاب لینے والا کوئی نہیں رہتا۔ ایک عام آدمی ذرا صاف ستھری سی کریانے کی دکان بھی کھول لے تو اس کے پاس انکم ٹیکس والے پہنچ جاتے ہیں اور حساب مانگتے ہیں۔ پوچھتے ہیں کہ دکان کھولنے کے لئے پیسہ کہاں سے آیا لیکن سپدل جوتیاں چٹخانے والے جب سیاست میں آکر مرسیڈیزوں میں گھومنے لگتے ہیں' بلڈنگیں کھڑی کرلیتے ہیں تب بھی ان سے کوئی نہیں پوچھتا کہ یہ دریا کہاں سے بہتے چلے آرہے ہیں۔"

ٹونی استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر رہ گیا۔ نذیر خان کراچی سے لے کر اب تک صرف سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ اتنی دیر سے وہ بالکل نہیں بولا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "نذیر بھائی! آپ تو بالکل ہی چپ ہیں۔ جب سے کراچی سے چلے ہیں تب سے ایک لفظ بھی نہیں بولے۔ ایسی بھی کیا خموشی۔ آپ کے سامنے اتنے اتنے عظیم موضوعات پر تبادلہ خیال ہو رہا ہے۔ آپ بھی تو کچھ اظہارِ خیال کیجئے نا۔"

نذیر خان پہلو بدلتے ہوئے ایک مربیانہ بے نیازی سے بولا۔ "پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھے ابھی تک بولنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ دوسری بات یہ کہ مجھے موقع ملتا' میں تب بھی نہ بولتا۔ ایک بے چارے نذیر خان کے بولنے سے کیا ہوگا؟ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر لوگ ہر پہلو سے بول چکے' لکھ چکے' ہر زاویئے سے ان پر اظہارِ خیال کر چکے۔ مگر اس سے کیا فرق پڑ گیا؟ کچھ بھی نہیں۔ پرنالہ وہیں بہہ رہا ہے اور وہیں بہے گا۔ الجھاوے وقت کے ساتھ ساتھ مزید بڑھیں گے۔ کم نہیں ہوں گے۔ ہمارے نظام اور ہمارے مسائل کی مثال الجھے ہوئے دھاگوں کے ایک بہت بڑے ڈھیر کی سی ہے۔ ہر دھاگا الجھا ہوا ہے۔ ہر ایک کہیں نہ کہیں جاکر پھنسا ہوا ہے۔ جس کسی کو بھی یہ ڈھیر سلجھانے کے لئے بٹھایا جاتا ہے' وہ اپنی آنکھوں پر اپنے کچھ مخصوص مفادات کی پٹی باندھ کر اسے سلجھانے بیٹھتا ہے۔ ظاہر ہے آپ آنکھوں پر پٹی باندھ کر تو اس ڈھیر کو نہیں سلجھا سکتے نا۔ آپ تو مزید الجھائیں گے۔ بس یہی ہو رہا ہے ہمارے ساتھ۔" اس نے گویا بات ختم کردی۔

گاڑی میں ایک لمحے کے لئے سکوت چھا گیا۔ صرف ائرکنڈیشنر اور انجن کی ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ آخر کار ٹونی بولا "آپ کیوں ملک ریاض کے بارے میں پوچھ رہے تھے؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس ویسے ہی مجھے لگا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا تھا جبکہ میری بے خبری کا یہ عالم ہے کہ میں اسے جانتا تک نہیں تھا۔ مجھے اس کی دلچسپی کچھ عجیب لگی۔" میں نے جواب دیا۔

"ہوسکتا ہے وہ آپ کو اپنی پارٹی میں شامل ہونے کی دعوت دینا چاہتا ہو۔" ٹونی مسکراتے ہوئے بولا "آپ جیسے لوگوں کی تو ہر پارٹی کو ضرورت رہتی ہے نا۔ الیکشن بھی قریب ہیں۔"

"خدا نہ کرے کہ وہ ایسی کوئی دعوت لے کر میرے پاس آئے۔" میں نے صدق دل سے کہا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے ٹونی سے پوچھا "میری غیر موجودگی میں یہاں کوئی خاص مسئلہ تو سامنے نہیں آیا؟"

"نہیں سر! ایسی کوئی بات نہیں ہے جو آپ کے علم میں لائی جائے۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"اس کے بارے میں کوئی خبر..... جسے تلاش کرنے کی ذمے داری میں نے تمہارے سپرد کی تھی؟" میرا اشارہ اے نن کی طرف تھا جس کی تلاش پر میں نے صرف ٹونی کو ہی نہیں بلکہ اپنے دفتر کے ملازمین محسن علی اور اس احمق نوجوان وسیم احمد کو بھی لگا دیا تھا لیکن سنجیدگی سے یہ حکم میں نے درحقیقت صرف ٹونی کو ہی دیا تھا۔

ٹونی اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور سفر کے دوران بھی اس کی نظر ہر آتی جاتی گاڑی سے الجھ رہی تھی۔ متاسفانہ سے انداز میں گہری سانس لے کر وہ بولا "سر! اس کی تلاش میں پھر پھر کر تو میں نے گاڑی کے ٹائر گھسا لئے ہیں' مگر وہ نظر نہیں آیا۔ اگر اس کا ذرا سا بھی کوئی سراغ ہوتا....." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"یہی تو مسئلہ ہے۔ سراغ ہوتا تو شاید مشکل کچھ نہ کچھ آسان ہوجاتی ہے۔ اب تک تو وہ چھلاوے کی طرح نمودار ہو کر چھلاوے ہی کی طرح غائب ہوتا رہا ہے۔ اب اس بھرے پُرے شہر میں اسے تلاش کرنا انگریزی محاورے کے مطابق گھاس کے ڈھیر میں سوئی تلاش کرنے کے ہی مترادف ہے۔ میرا خیال ہے تم خاص طور پر اس کی تلاش میں خاک چھانتے نہ پھرو۔ اپنے دوسرے کام بھی کرتے رہو۔ بس ساتھ ساتھ گرد و پیش پر نظر رکھو۔ اگر کبھی نظر آگیا تو ٹھیک ہے ورنہ لعنت بھیجو۔"

"ٹھیک ہے سر! جیسے آپ کا حکم۔" ٹونی بولا۔

نذیر خان نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "اگر یہ کوئی زیادہ پرائیویٹ معاملہ نہیں ہے تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس کا ذکر ہو رہا ہے؟ شاید کسی کی تلاش میں مَیں بھی کسی کام آسکوں۔"

"نذیر بھائی! آپ نے تو جو کام کر دکھایا ہے وہی بہت ہے..... فی الحال میں آپ کو اور کسی معاملے میں الجھانا نہیں چاہتا۔ اگر حقیقتاً آپ کی کوئی ضرورت پڑی تو ضرور دوبارہ آپ کو تکلیف دوں گا۔" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔

"ارے..... یہ بھی کوئی کام تھا؟" وہ قدرے شرمندگی سے بولا۔ "پھر جیسے اسے ہوٹل کے لاکر روم والا وہ منظر یاد آگیا اور وہ جھرجھری سی لے کر بولا "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ حفیظ صاحب کا سیکیورٹی چیف ہی انہیں قتل کرنے کی سازش کرے گا۔"

"سازش تو کہیں اور تیار ہوئی ہے نذیر بھائی! اکرام بیگ تو صرف مہرہ تھا۔" میں نے کہا "مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ کوئی اس کو مہرہ بنانے میں کیونکر کامیاب ہوا؟ اس کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ ایک وفادار اور غیر متزلزل انداز میں اپنے فرائض انجام دینے والا آدمی تھا۔"

"ہر کام کا کوئی نہ کوئی پہلا دن تو ہوتا ہے۔ اس کا بھی یہ بگاڑ بننے کا آغاز ہوگا۔"

"شکر ہے وہ آغاز میں ہی پکڑا گیا۔" میں نے کہا "اگر یہ سازش کامیاب ہوجاتی اور حفیظ صاحب کی موت کا سبب دل کا دورہ ہی سمجھا جاتا تو اکرام بیگ کی طرف یا سازش کے امکان کی طرف تو کسی کا بھی دھیان نہ جاتا اور وہ مزید آگے بڑھ کر نہ جانے کہاں کیا مزید کام دکھاتا۔"

"اب اکرام بیگ کا بنے گا کیا؟" نذیر خان نے جاننا چاہا۔

"میں نے حفیظ صاحب کو جو بندوبست کرتے دیکھا تھا اس کے مطابق تو خفیہ ایجنسیاں اسے تفتیش کے لئے لاہور لائیں گی۔ شاید آج ہی کسی فلائٹ سے اسے لاہور پہنچا دیا جائے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہمیں بھی تفتیش میں گھسنا پڑے گا؟" نذیر خان نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں نے اس کا بندوبست کرلیا تھا۔ مجھے معلوم تھا ہم دونوں ہی اس کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ میں نے حفیظ صاحب سے صاف کہہ دیا تھا کہ ہم نے جتنا کر دیا اتنا ہی کافی ہے۔ ہمیں احمقانہ قسم کے سوالوں جوابوں میں نہ گھسیٹا جائے۔ آپ کو یاد نہیں..... رات میں نے آپ سے ایک کاغذ پر سائن کروائے تھے جسے آپ نے پڑھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی کیونکہ آپ کا نیند سے بُرا حال تھا؟"

"ہاں۔" نذیر خان نے سر ہلایا "آپ نے بھی اس پر دستخط کئے تھے۔"

"جی ہاں۔ وہ ہمارا ایک سیدھا سادا سا تحریری بیان تھا۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا یا جس حد تک بتانا میں بہتر سمجھتا تھا وہ میں نے لکھ کر ان کے حوالے کر دیا تھا اور حفیظ صاحب سے کہہ دیا تھا کہ فائلوں میں جہاں جہاں بھی ضروری سمجھا جائے' بس اس کو آگے بڑھایا جائے' مجھے یا نذیر خان کو کوئی تکلیف نہ دی جائے۔ حفیظ صاحب اب اپنی بات تو نہیں ٹال سکتے نا..... انہوں نے اسی وقت اس تحریری بیان پر اپنا نوٹ لکھ دیا تھا۔"

"شکر ہے خدایا!" نذیر خان نے اطمینان کی سانس لی۔ "یہ آپ نے بڑا اچھا کام کیا۔"

میں نے ڈرائیور کو ہدایت کی کہ مجھے گھر اتار کر وہ نذیر خان کو چھوڑنے چلا جائے۔ ٹونی کی گاڑی بھی میرے ہاں کھڑی تھی۔ وہ بھی وہیں اتر گیا۔ نذیر خان رخصت ہوچکا تو ٹونی میرے ساتھ ڈرائیو وے میں آتے ہوئے بولا "سر! میں اس شخص کی موجودگی میں آپ کو بتاتے بتاتے رک گیا..... آپ کی غیر موجودگی میں ایک خاص واقعہ یہ پیش آیا تھا کہ گزشتہ رات مجھے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی تھی..... بلکہ یوں سمجھیں کہ میں تقریباً اغوا ہو ہی گیا تھا۔"

"کیا کہہ رہے ہو بھئی؟" میں نے بے یقینی لئے اس کی طرف دیکھا۔ میں اندر جاتے جاتے لان کی طرف مڑ گیا۔ میں نے اسے ایک لان چیئر پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ اپنے مخصوص کھلنڈرانہ انداز میں' ڈھیلی ڈھالی امریکی جیکٹ پہنے' دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں ٹھونسے بے پروائی سے چلا آرہا تھا۔ بھورے بال حسبِ معمول پیشانی پر بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے چہرے کا جائزہ لیا۔ کم از کم چہرے پر تو کوئی خراش وغیرہ بھی نظر نہیں آرہی تھی۔

"کیا ہوا تھا.....؟ مجھے ٹھیک سے بتاؤ۔" وہ بیٹھ چکا تو میں نے تشویش سے پوچھا۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے سر!" وہ بے پروائی سے بولا' تھوڑی سی پریشانی اس بات کی ضرور ہے کہ میں ان میں سے کسی کو قابو میں نہیں کرسکا کہ کچھ معلومات ہوجاتیں۔ اس چکر میں میرا پتہ صاف ہوجاتا' اس لئے میں نے معاملے کو زیادہ طول نہیں کھینچنے دیا۔"

"یعنی تم نے ان کا پتہ صاف کر دیا؟" میں نے اب پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"یس سر! وہ مجھے لبرٹی سے اغوا کر کے ظفر علی روڈ پر لے جاچکے تھے..... نہر والی ٹرک پر....." ٹونی بالکل دھیمے اور سرسری سے لہجے میں بتائے جارہا تھا۔ "پھر وہ درختوں کے عقب میں اندھیرے میں گاڑی روک کر انتظار کرنے لگے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کچھ اور لوگ پہنچنے ہی والے تھے۔ میں نے رسک لینا مناسب نہیں سمجھا۔ لبرٹی سے تو میں خود ہی سعادت مندی سے اغوا ہو کر ان کے ساتھ چل دیا تھا؟ لیکن جب میں نے انہیں اور لوگوں کا انتظار کرتے دیکھا تو انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں دونوں میرے ہاتھوں مارے گئے۔"

"لاشیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہر میں پھینک دی تھیں۔ کہیں بہت دور جاکر دریافت ہوئی ہوں گی۔" وہ بے پروائی سے بولا گویا دو تربوز نہر میں پھینکنے کا ذکر کر رہا ہو۔

"اغوا کیسے کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"بالکل سیدھے سادے اور پُرامن انداز میں' لبرٹی میں کتابوں کی ایک دکان سے۔" اس نے پودے سے ایک پتا توڑتے ہوئے جواب دیا۔ پھر ذرا شرمیلے سے لہجے میں بولا "آج کل مجھے تھوڑا سا مطالعے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ رات کو لیٹ کر جب تک کوئی نہ کوئی چیز تھوڑی بہت پڑھ نہ لوں تب تک نیند نہیں آتی۔ میں لبرٹی میں کتابوں کی دکان پر انگریزی رسالے دیکھ رہا تھا کہ وہ دونوں اسپائی فلموں والے انداز میں آکر میرے دائیں بائیں کھڑے ہوگئے۔ دونوں کے ہاتھ جیکٹوں کی جیبوں میں تھے اور دو ریوالوروں کی نالیں میری پسلیوں میں چبھنے لگی تھیں۔ سرگوشی میں'

نہایت سرسری انداز میں انہوں نے مجھے باہر چل کر گاڑی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے سوچا' چلو دیکھ لیتے ہیں کہ وہ کون ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔ گاڑی میں بٹھاتے ہی انہوں نے میرا ریوالور اور پستول وغیرہ بھی نکال لیا۔ وہ بھی میں نے سعادت مندی سے نکلوالیا۔ لیکن نہر پر لے جاکر جب وہ اور لوگوں کا انتظار کرنے لگے تو پھر مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ تب بھی میرا ارادہ انہیں مارنے کا نہیں تھا لیکن صورتِ حال کچھ ایسی پلٹی کہ......" اس نے معذرت خواہانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"خیر... جو ہوا سو ٹھیک ہوا۔" میں نے بے پروائی سے کہا "یہ بتاؤ کہ ان کے بارے میں کچھ اندازہ بھی ہوا؟"

"نہیں سر۔ وہ ہمارے کسی بدخواہ یا دشمن کے آدمی بھی ہو سکتے تھے اور کرائے کے قاتل یا دہشت گرد بھی' کسی گینگ سے بھی تعلق ہو سکتا تھا ان کا۔ شکلوں سے ویسے روایتی قسم کے دہشت گرد ہی لگ رہے تھے۔ کسی جرائم پیشہ گروہ کے رکن۔ خاص تراش خراش کی گھنی داڑھیاں تھیں۔ بل دار مونچھیں..... ذرا چڑھی چڑھی سی سرخ سرخ آنکھیں.... بھاری جسم.... چہرے مہرے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ کمزوروں پر ظلم کرنے اور ان کے سامنے بدمعاشی جھاڑنے کے بہت زیادہ عادی ہیں۔ لیکن انداز بہرحال فلمی یا تھرڈ ریٹ بدمعاشوں سے ذرا اونچا تھا۔"

ٹونی نے خاصی کامیابی سے ان کی شخصیت کا نقشہ کھینچ دیا لیکن میں انہیں کسی خانے میں فٹ نہیں کرسکا۔ اس لئے سرِدست میں نے اس الجھن کو ذہن سے جھٹک دیا۔

کچھ دیر بعد ٹونی رخصت ہوگیا اور میں اندر آگیا۔ شاور لینے کے بعد میں کچھ دیر کے لئے سوگیا۔ شام کو اٹھا تو میں نے اپنے آپ کو تازہ دم محسوس کیا۔ اب میں ٹیلی فون کی طرف متوجہ ہوا۔ میرے دو نمبر ایسے تھے جن پر فون ملازمین ریسیو کرتے تھے اور میری عدم موجودگی میں ایک مخصوص پیڈ پر پیغامات نوٹ کرکے رکھ دیتے تھے۔ لیکن میرا ایک ڈائریکٹ نمبر جو خاص خاص جاننے والوں ہی کے پاس تھا' اس کے ساتھ ریکارڈنگ سسٹم منسلک تھا جو میری غیر موجودگی میں کام آتا تھا۔ یہ انسورنگ مشین Answering Machine کا کام بھی دیتا تھا اور اگر فون کرنے والا کوئی پیغام چھوڑنا چاہتا تو وہ بھی ریکارڈ کرلیتا تھا۔

میں نے اس مشین کے سوئچ آن کئے تو پتا چلا کہ میری غیر موجودگی میں ستارہ اور طاہرہ خانم نے ایک ایک مرتبہ فون کیا تھا اور یہ معلوم ہونے کے بعد کہ میں دو دن کے لئے شہر سے باہر گیا ہوں' کوئی پیغام چھوڑے بغیر فون بند کردیا تھا۔

تیسرا فون کسی اور کا تھا۔ اسے جب یہ ریکارڈ شدہ آواز سنائی دی۔ "مسٹر افضل چوہدری دو دن کے لئے شہر سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ آپ براہِ کرم اپنا نام بتادیجئے اور اگر کوئی پیغام دینا چاہیں تو ریکارڈ کرادیجئے......" یہی مفہوم انگریزی میں دہرایا گیا اور اس کے بعد مشین خاموش ہوگئی۔ چونکہ دوسری طرف سے سلسلہ نہیں کیا گیا تھا اس لئے مشین آن تھی اور منتظر تھی کہ کوئی ریکارڈ کرایا جائے۔

فون کرنے والی نے ہیلو' بھی سرگوشی کے انداز میں کہا تھا اب تو وہ بالکل ہی خاموش تھی' گویا تذبذب میں ہو کہ پیغام ریکارڈ کرائے یا نہیں۔ اس نے اپنا نام بھی نہیں بتایا تھا۔ بس اتنا اندازہ ہوا تھا کہ آواز نسوانی تھی لیکن میں اسے پہچان نہیں سکا تھا۔ پھر اس سرگوشی نما آواز نے صرف اتنا کہا "رانی..... میں..." اس کے بعد یوں لگا جیسے اس عورت کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا گیا ہو۔ دوسرے ہی لمحے سلسلہ منقطع ہوگیا اس لئے مشین آف ہوگئی تھی۔ میں نے ٹیپ کو بہت آگے تک چلایا مگر اس پر کوئی آواز نہیں تھی۔

میں الجھن میں پڑگیا۔ ستارہ اور طاہرہ خانم تو اپنا نام بتا کر ریکارڈ کرچکی تھیں۔ تو پھر یہ بیٹھی بیٹھی سی نسوانی آواز کس کی تھی اور کیوں ایک جملہ بھی مکمل نہیں کرسکی تھی۔ آواز سے اندازہ مشکل نہیں تھا کہ وہ خوفزدہ تھی۔ کیا واقعی اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین لیا گیا تھا یا یہ محض میرا وہم تھا؟

میں ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ معلوم نہیں کیوں میرا ذہن فوراً ہی سامنے کی بات پر نہیں گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی انٹرکان نمبر ڈائل کیا اور آپریٹر سے کہا "سوئٹ نمبر تین سو سترہ..... پرنس تمینہ سے بات کراؤ۔"

"سر.... وہ تو جاچکی ہیں...." آپریٹر نے مخصوص پیشہ ورانہ انداز میں تیزی سے کہا اور غالباً کوئی دوسری کال اٹینڈ کرنے لگا تھا کہ میں نے تیزی سے کہا "لائن مت چھوڑنا گدھے! صحیح طرح بات کا جواب دو۔ کب جاچکی ہیں؟ کہاں جاچکی ہیں؟"

آپریٹر فوراً مؤدب ہوگیا اور ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولا "سر! مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔ بس رات ان کی پرفارمنس کے بعد سے ان کا کوئی پتا نہیں۔ ان کے اسٹاف میں سے بھی کوئی موجود نہیں ہے۔ ان کا سوئٹ خالی ہے۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو جنرل منیجر صاحب سے بات کرلیں۔ شاید وہ آپ کو کچھ بتا سکیں۔"

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا۔ "نہیں' رہنے دو۔"

"سر! آپ کا نام؟" آپریٹر نے گویا ڈرتے ڈرتے پوچھا لیکن میں نے جواب دیئے بغیر سلسلہ منقطع کردیا۔ میرا خود جانا ہی ضروری تھا۔ میں باہر آکر گاڑی میں بیٹھا اور آندھی طوفان کی طرح ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے پہلے اِدھر اُدھر معلومات کرنے کے بجائے سیدھا ہنی عرف پرنس تمینہ کے سوئٹ کا ہی رخ کیا۔ اب تو مجھے اس میں قطعاً کوئی شک رہا ہی نہیں تھا کہ میں نے اپنی مشین ریکارڈ شدہ جو سرگوشی نما آواز سنی تھی وہ ہنی عرف پرنس تمینہ کے سوا کسی کی نہیں تھی۔

تیسری منزل کی اس مخصوص راہداری میں آج ویرانی اور [illegible]وت نے میرا استقبال کیا۔ آج وہاں کوئی مسلح گارڈ نہیں تھا' کوئی [illegible]یٹنگ کارڈ لینے والا نہیں تھا۔ میں نے سوئٹ کے دروازے کی [illegible]ب گھمائی۔ دروازہ بھی مقفل نہیں تھا۔ ورنہ ہوٹلوں میں جو [illegible]رے وغیرہ خالی ہوجاتے ہیں ان کے دروازے مقفل ہوتے ہیں۔

میں نے اندر جھانکا۔ ہر چیز صاف ستھری' اسی طرح قرینے [illegible]یقے سے رکھی ہوئی تھی جس طرح اونچے ہوٹلوں کے ان خالی [illegible]روں میں ہوتی ہے جو مہمانوں کی آمد کے منتظر ہوتے ہیں۔ میں [illegible]ائنگ روم سے گزر کر بیڈ روم میں جا پہنچا۔ وہاں بھی صاف [illegible]ھری' ویرانی گویا میرا مضحکہ اُڑا رہی تھی۔ صرف ہنی کے میک [illegible]پ کے سامان اور خوشبویات کی بچی کھچی مہک کمرے میں رچی [illegible]ی تھی اور اسے بھی صرف میں ہی پہچان سکتا تھا۔ اس کے سوا [illegible]ئی ایسی نشانی نہیں تھی جس سے ظاہر ہوسکتا کہ وہ کبھی اس [illegible]رے میں آئی بھی تھی۔

گو مجھے امید نہیں تھی کہ وہاں میرے لئے کوئی سراغ' کوئی [illegible]ام' کوئی اشارہ موجود ہوگا۔ اس کے باوجود میں نے جاسوسوں کی [illegible]رح خوردبینی انداز میں دونوں کمروں کو کھنگالنا شروع کیا۔ میں نے [illegible] کی چادر' کمبل' میٹرس اور تکئے اٹھا کر' جھاڑ جھاڑ کر دیکھے۔ [illegible]یوں کے غلافوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر دیکھا۔ کونے کھدروں میں [illegible]انکا' ڈرائنگ روم کے صوفوں کے کشن کھنگالے۔ باتھ روم کی ہر [illegible] کا معائنہ کیا۔ ٹشو پیپر کا رول تک کھول کر دیکھا کہ کہیں اس پر [illegible]رے لئے کچھ لکھا ہوا تو نہیں۔ حتیٰ کہ میں نے دیواروں کا بھی [illegible]چھی طرح جائزہ لیا کہ شاید کہیں لپ اسٹک' آئی برو پنسل یا عام [illegible]ینسل سے ایک آدھ لفظ ہی لکھا ہو۔ لائٹوں کے شیڈز تک میں [illegible]انکا۔ مگر کہیں پیغام تو کیا' ایک لکیر تک موجود نہیں تھی۔ اگر اس [illegible]ت ہوٹل کا کوئی ملازم مجھے اس مصروفیت میں منہمک دیکھ لیتا تو [illegible]ں کا نہ جانے کیا ردِ عمل ہوتا! میں نے چند لمحے پہلے نظر آنے والی [illegible]تیب و صفائی اور قرینے کا جس طرح بیڑا غرق کیا تھا اس پر یقیناً [illegible]روں کے در و دیوار بھی رو رہے ہوں گے۔

فلموں اور جاسوسی کہانیوں میں عام طور پر اتنی تلاش کے بعد [illegible]سوس کے ہاتھ کوئی نہ کوئی سراغ آہی جاتا ہے لیکن میرے ہاتھ [illegible]ئی سراغ نہ آیا۔ مایوس ہوکر میں باہر آگیا۔ برابر کا کمرا پرنس [illegible]ینہ کے اسٹاف کے لئے تھا۔ اس کا دروازہ بھی غیر مقفل تھا۔ اس [illegible] بھی وہی عالم تھا۔ اس کی بھی میں نے تلاشی لی لیکن اب جوش و [illegible]روش کچھ کم ہوچکا تھا۔

وہاں سے بھی جب مایوسی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آیا تو میں نے [illegible]چا کہ جنرل منیجر سے مل ہی لینا چاہئے۔ شاید اس سے کوئی کام کی

بات معلوم ہوسکے۔ اس کا نام مائیکل تھا۔ وہ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ ادھیڑ عمر اور خوش اطوار مقامی کرسچن تھا۔ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ خصوصاً اس وقت سے تو بہت ہی احترام کرنے لگا تھا جب سے اسے معلوم ہوا تھا کہ کراچی میں میرا اپنا ہوٹل مکمل ہوچکا تھا۔ ایک بار تو ہنستے ہوئے کہہ چکا تھا۔ "آپ سے تو غرض کے تحت بھی شناسائی رکھنی چاہئے مسٹر چوہدری تاکہ اگر کبھی یہاں سے نوکری چھوٹنی پڑے تو درخواست لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوسکوں۔"

اس پر میں نے سنجیدگی سے کہا تھا "آپ کو درخواست لے کر کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر مائیکل! آپ ہوٹل مینجمنٹ میں جس مقام پر ہیں وہاں اس کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ اگر خدانخواستہ کبھی آپ کو یہ آفس چھوڑ کر نکلنا ہی پڑا تو میرے آدمی آپ کو لینے کے لئے دروازے پر کھڑے ہوں گے۔"

یہ سن کر وہ خوشی سے نہال ہوگیا تھا۔ میں نے اسے کبھی پریشان نہیں دیکھا تھا لیکن آج میں اس کے آفس میں داخل ہوا تو وہ مجھے مخبوط الحواس سا نظر آیا۔ تاہم مجھے دیکھ کر وہ حتی الامکان خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسٹاف کے کچھ آدمی کمرے میں موجود تھے۔

"سر! میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں؟" کرسی پیش کرنے کے بعد اس نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے کہا "آپ نے کیوں زحمت کی؟ مجھے کہیں بلالیا ہوتا۔"

"میں ایسی زحمتیں کرنے کا عادی ہوں۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا "تم ان لوگوں سے بات چیت ختم کرلو۔ میں تنہائی میں بات کروں گا۔"

اس نے جلد ہی ان لوگوں کو فارغ کردیا۔ موضوعِ گفتگو وہی پرنس تہمینہ کی پُراسرار گمشدگی تھی۔ اخبارات میں اشتہار دینے اور ہوٹل کی لابی میں نوٹس چسپاں کرنے کی تیاری ہو رہی تھی کہ پرنس تہمینہ کے شو کی ایڈوانس بکنگ منسوخ کی جارہی ہے۔ جو لوگ ٹکٹ کی رقم واپس لینا چاہیں وہ ہوٹل سے لے لیں۔ جو لوگ ٹکٹ استعمال کرنا چاہیں وہ متبادل شو میں استعمال کرسکتے ہیں جو آج ہی سے پرنس کے شو کی جگہ شروع ہو رہا تھا۔ انہوں نے ہنگامی طور پر ایک مقامی ڈانسر نغمہ کے شو کا انتظام کیا تھا اور بہانہ یہ کیا تھا کہ پرنس تہمینہ ناسازیٔ طبع کی بنا پر اپنے ملک واپس جارہی ہیں۔

وہ لوگ جاچکے تو مائیکل خلافِ عادت مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوا۔ "سر! آپ کیا پئیں گے؟"

"رسمی چکروں میں پڑنے کی ضرورت نہیں مائیکل! میں بھی پرنس تہمینہ ہی کے بارے میں پوچھنے آیا ہوں۔ کہاں غائب ہوگئی ہے وہ؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"مائی گاڈ....!" وہ دونوں ہاتھوں سے سر تھامتے رہ گیا۔ "سر! آپ بھی....؟"

قیصرِ اعظم جولیس کے دربار میں جب دوسرے سازشی ساتھ ساتھ اس کے سوتیلے بیٹے بروٹس نے بھی تلوار نکال کر کے پہلو میں گھونپ دی تھی اور اس نے جب یہ تاریخی جملہ تھا۔ "بروٹس! یوٹو....؟" تو اس کے لہجے میں بھی شاید وہ پنہاں نہ رہا ہو جو اس وقت مائیکل کے لہجے میں تھا۔

"گھبراؤ نہیں مائیکل! میں اس کا عاشق یا پروانہ نہیں میں کسی اور وجہ سے پوچھ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے اسے دی۔

"نہیں سر! یہ بات نہیں ہے۔" وہ گڑبڑا کر بولا "یہ معلوم ہے، آپ جیسا نفیس آدمی ایسی چلتی پھرتی عورتوں کا پروانہ نہیں ہوسکتا۔ میرا مطلب ہے کہ کہیں آپ نے اپنے کے لئے اس سے کوئی کنٹریکٹ وغیرہ.... یا کوئی بات چیت تو کرلی تھی؟"

"نہیں، ایسا بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے جواب "میرے ہوٹل میں ابھی ایسی خرافات شروع نہیں ہوئیں۔"

"اوہ...." اسے اپنے ہوٹل کی اس فخریہ پیشکش کے خرافات کا لفظ سن کر تھوڑی سی تکلیف ضرور ہوئی لیکن دو ہی لمحے اس نے غالباً اس احساس کے تحت سکون کی سانس پرنس تہمینہ سے میرا کوئی جذباتی یا کاروباری چکر نہیں تھا تو اس کے بارے میں پوچھتا ہوا آیا کیوں تھا؟

وہ ایک سگریٹ سلگانے کے بعد بولا "اس خبیث عورت چکر میں تو میں صبح سے پریشان ہوں...." ہنی کے لئے خبیث کا سن کر اب مجھے ذرا تکلیف پہنچی لیکن میں اس کا اظہار نہیں تھا۔ اصل معاملہ تو مائیکل کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

وہ ایک کش لے کر بولا "میں تو اس وقت کو کوس رہا جب اس کی آمد کی خبر سن کر میں اس کے پاس دوڑا گیا تھا۔ میں کے بیک گراؤنڈ سے واقف تھا۔ ہوٹل آج کل ٹھنڈا جارہا سامنے ہی دوسرا فائیو اسٹار ہوٹل بن گیا ہے نا.... میں نے پرنس کے شو سے ہوٹل کو سنبھالا مل جائے گا۔ اچھی بھی دوسرے ہوٹل میں ٹھہری ہوئی تھی۔ اس ہوٹل والوں نے کے ساتھ شو کا کوئی پروگرام نہیں بنایا اور میں گدھا دوڑا دو گیا۔"

"اس کا مطلب ہے تم نے ان سے رابطہ قائم نہیں کیا نے ان لوگوں کو باہر سے نہیں بلوایا تھا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں سر! مجھے تو پتا چلا تھا کہ وہ یورپ اور امریکا کے سے واپس ترکی جاتے وقت پاکستان اور بھارت سے ہوتی جائے گی لیکن ان دونوں ملکوں میں ڈانس کا کوئی پروگرام کرے گی کیونکہ وہ بہت تھکی ہوئی ہے، صرف سیر و تفریح کے ان دونوں ملکوں سے گزر رہی ہے۔ لیکن میں نے سوچا، چلو کرکے دیکھنے میں کیا حرج ہے۔ خلافِ توقع وہ بہت ہی آسانی مان گئی اور اس نے کچھ زیادہ لمبے چوڑے مطالبے بھی نہیں کئے۔"

مائیکل نے بتایا "جتنا میں ڈر رہا تھا، کام اس سے کہیں زیادہ آسان ثابت ہوا۔ میں سوچ رہا تھا، میں نے ہوٹلنگ کے ٹھنڈے پڑتے ہوئے بزنس میں بڑی گرماگرمی پیدا کردی ہے، بڑا دھماکا کردیا ہے۔ لیکن یہ بم تو عین میرے سر پر ہی آن پھٹا ہے۔" بالآخر اس نے سر تھام ہی لیا۔

"وہ غائب کب سے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! رات تو اس نے پروگرام پیش کیا ہے۔" وہ کراہ کر بولا، "اور آج حسبِ معمول دن چڑھے میڈ ان کے سوئٹ میں گئی تو وہ اس طرح خالی پڑے تھے جیسے وہاں کئی دن سے کوئی داخل نہیں ہوا۔ کسی نے بھی پرنس یا اس کے اسٹاف کے کسی آدمی کو باہر جاتے نہیں دیکھا۔ کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس وقت اور کس طرح غائب ہوئے ہیں۔ اس طرح کسی کی نظر میں آئے بغیر تو وہ دیواریں پھاند کر ہی باہر جاسکتے تھے۔" مائیکل پر ابھی تک بے یقینی طاری تھی۔

"کوئی بعید نہیں کہ انہوں نے ایسا ہی کیا ہو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"نہیں سر!" اس نے نفی میں سر ہلایا "وہ کوئی کنگلے قسم کے مسافر تو نہیں تھے جو شرارتاً یا پھر دل کی حسرت نکالنے کے لئے کسی اونچے ہوٹل میں ٹھہر جاتے ہیں اور موقع مناسب دیکھ کر اِدھر اُدھر سے کود پھاند کر بھاگ جاتے ہیں۔"

سگریٹ کا ایک کش لے کر وہ بولا "بات میری کھوپڑی میں بیٹھ نہیں رہی ہے سر! اس قبیل کے لوگ اس طرح کی حرکتیں نہیں کیا کرتے۔ چپکے سے غائب ہونا تو دور کی بات، وہ تو عام طور پر کنٹریکٹ کی خلاف ورزی بھی نہیں کرتے۔ انتہائی ناگزیر حالات میں کوئی اونچ نیچ ہوتی ہے۔ پرنس تہمینہ کا ایک نام ہے۔ ایک ریپوٹیشن ہے۔"

"ویسے تم نے اتنی جلدی کیوں فرض کرلیا ہے کہ وہ غائب ہوگئی ہے اور واپس نہیں آئے گی؟" میں نے کہا "عین ممکن ہے، جس طرح اچانک وہ غائب ہوئی ہے اسی طرح اچانک عین شو کے وقت یا اس سے ذرا پہلے کہیں سے نمودار ہوجائے، واپس آجائے۔" میں دراصل مائیکل کے لئے نہیں بلکہ خود اپنے لئے امید کی یہ کرن تخلیق کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ایسا نہیں ہوگا سر!" وہ مایوسی سے سر ہلا کر بولا۔

"آخر کیوں؟" میں نے اسے کریدا۔

"اس لئے کہ جب میں نہایت غصے کے عالم میں سوچ رہا تھا کہ مجھے پرنس کے خلاف قانونی کارروائی کرنی چاہئے، اس نے معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے، مجھے دھوکا دیا ہے، مجھے پولیس میں رپٹ بھی درج کرانی چاہئے، عین اسی وقت ایک ٹیلیفون آیا اور میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔"

"کیا کسی بہت بڑے آدمی کا فون تھا؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بڑا ہی سمجھ لیجئے سر!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ہماری سوسائٹی میں جو بھی لوگوں کو مروانے، کچلنے، ان کا حشر نشر کرنے کی طاقت رکھتا ہے وہ بڑا آدمی ہے۔ مجھے نہیں معلوم وہ کون تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کہیں دور بیٹھا میرے خیالات پڑھ رہا تھا۔ اس نے کوئی فالتو بات نہیں کی۔ بس میرا نام جانتے ہی بولا، پرنس تہمینہ کی گمشدگی کو اسکینڈل بنانے کی کوشش مت کرنا۔ بھول جاؤ کہ وہ کبھی تمہیں ملی تھی یا تمہارے ہوٹل میں اس نے کوئی پروگرام پیش کیا تھا۔ اس نے تم سے کوئی ایڈوانس نہیں لیا تھا۔ تمہارا کوئی مالی نقصان نہیں ہوا۔ اس لئے شور مچانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ایک معمولی واقعہ ہے اور اسے معمولی واقعے ہی کی طرح لینا۔ کوئی بھی مہذبانہ بہانہ کرکے کوئی متبادل انتظام کرلینا۔ زیادہ چونچ کھولنے کی ضرورت نہیں۔ جی ہاں چوہدری صاحب! بالکل یہی الفاظ تھے اس کے۔"

"تم نے کیا کہا؟"

"یہ باتیں میں نے کسی کو بھی نہیں بتائی ہیں۔ یہ صرف میرے اور آپ کے درمیان رہنی چاہئیں سر!" وہ لجاجت سے بولا "یہ کوئی پُراسرار اور خطرناک معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ میری کسی دانستہ یا نادانستہ غلطی سے میری جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔" وہ بے چارہ دُبلا پتلا، مہذب اور شائستہ آدمی تھا۔ کافی خوف زدہ نظر آرہا تھا۔

"اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں مائیکل! ہوٹل کے بزنس میں ہر طرح کے آدمی سے واسطہ پڑتا ہے۔ فون پر دھمکیاں بھی ملتی رہتی ہیں۔ اتنی لمبی سروس کے بعد تمہیں تو اس طرح کی باتوں کا عادی ہوجانا چاہئے" میں نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"وہ جو کھوکھلی دھمکیاں ہوتی ہیں، ان کا مجھے اندازہ ہوجاتا ہے سر! اس شخص کا تو لہجہ ہی رگوں میں خون ٹھنڈا کردینے والا تھا" وہ جھرجھری سی لے کر بولا "ابھی میں نے آپ کو پوری بات تو بتائی ہی نہیں۔ میں نے اپنے تمام تر خوف کے باوجود ہمت کرکے کہا کہ میں اس طرح گمنام لوگوں کی ہدایات کی پابندی نہیں کیا کرتا۔ اس پر وہ کسی بدروح کی طرح ہنسا۔ سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی اس کی ہنسی۔ وہ جیسے صرف فون پر مجھ سے بات ہی نہیں کر رہا تھا، مجھے دیکھ بھی رہا تھا۔ کہنے لگا، تم نے ابھی پانی پی کر میز پر جو گلاس رکھا ہے، ذرا اس کی طرف دیکھو۔ میں نے گلاس کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ کرچی کرچی ہو کر بکھر گیا۔ میرے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ گیا تھا۔"

"سائیلنسر لگی رائفل یا ریوالور کی گولی ہوگی؟" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔

"ریوالور استعمال کیا گیا تھا سر! اس کھڑکی سے گولی چلائی گئی

تھی ....." اس نے دائیں طرف اشارہ کیا "اور گولی میز کی سطح کو چھوئے بغیر ادھر دیوار پر لکڑی کے پینل میں پیوست ہو گئی تھی ...." اس نے بائیں طرف اشارہ کیا "وہاں میں نے اِسٹکر چسپاں کر دیا ہے۔ آپ چاہیں تو اِسٹکر ہٹا کر لکڑی میں دھنسی ہوئی گولی کا معائنہ کر سکتے ہیں۔"

"اس کی اب نہ کوئی ضرورت ہے اور نہ کوئی فائدہ" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اسے نشانی کے طور پر وہیں دھنسی رہنے دو۔ اس قسم کی شعبدہ بازیاں کچھ مشکل نہیں ہوتیں۔ ایک شخص کھڑکی پر موجود ہوگا۔ دوسرا تم سے فون پر بات کر رہا ہوگا اور ان دونوں کا آپس میں بھی رابطہ ہوگا کیوں کہ اس کھڑکی کے سامنے کوئی کمرا نہیں ہے جہاں سے کوئی بیک وقت تم سے فون پر بات بھی کر سکے اور تم پر نظر رکھتے ہوئے فائر بھی کر سکے۔"

"جی ہاں سر! وہ تو میں بھی سمجھ گیا تھا..... میرا مطلب ہے جب میرے ہوش ٹھکانے آئے تھے اور میں نے اٹھ کر کھڑکی وغیرہ کا جائزہ لیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے ریسیور دوبارہ کان سے لگایا تو وہ شخص بولا "یہ گولی گلاس کے بجائے تمہاری کھوپڑی میں بھی اتر سکتی تھی۔ ذرا سا رخ بدلنے ہی کی بات تھی۔ لیکن ہم کیڑے مکوڑوں کا شکار کرنے کے قائل نہیں۔ جب تک وہ ہمارے پیروں تلے کلبلانے نہ لگیں" یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ اور اس کے بعد سے میں نے اس کی ہدایات پر دل و جان سے عمل کیا ہے کیوں کہ میں ایک شریف آدمی ہوں اور ابھی مرنا بھی نہیں چاہتا۔"

اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی اور ٹائی کی ناٹ ٹھیک کرتے ہوئے بولا "میری تو اس تصور سے روح فنا ہو رہی ہے کہ آج رات جب شو پرنس تہمینہ کے بجائے نغمہ سلطانہ پیش کرے گی اور کل اخباروں میں اشتہارات آئیں گے کہ پرنس کا اب کوئی شو ہوگا ہی نہیں۔ تو کیسا طوفان مچے گا۔ بڑی ہیوی ایڈوانس بکنگ تھی پرنس کے شو کی۔ لوگ اگر صرف اپنے پیسے واپس لے کر مطمئن ہو گئے تو ان کی بڑی مہربانی ہوگی۔ انہیں جو کوفت ہوگی، کہیں اس کا غصہ نہ وہ ہم پر نکالنے لگیں۔"

"نہیں۔ تمہارا واسطہ کرسیاں توڑنے والے طبقے سے نہیں ہے" میں نے اسے تسلی دی۔

وہ دوسری سگریٹ نکالتے ہوئے بولا "میں نے نغمہ سلطانہ کی منت سماجت کی ہے کہ وہ خوب محنت کرے اور پرنس تہمینہ کی متبادل ثابت ہونے کی پوری پوری کوشش کرے لیکن نغمہ سلطانہ کے ہاں صرف جسم کی نمائش ہے۔ اس کے پاس وہ خوب صورتی، وہ آرٹ اور وہ "ٹچ آف کلاس" نہیں ہے۔ بہرحال بے چاری محنت بہت کر رہی ہے۔ دوپہر سے اپنے ڈانس کے استاد کے پاس ریہرسل میں لگی ہوئی ہے۔"

"قصہ مختصر یہ کہ تم نے پرنس تہمینہ کو کھو دیا اور تم سے اس کا سراغ ملنے کی کوئی امید نہیں رکھی جا سکتی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"یس سر! مجھے اپنی اس نالائقی کا اعتراف ہے" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا "لیکن اب تو آپ بتا دیجئے کہ آپ کا مسئلہ کیا ہے؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ وہ غائب ہو چکی ہے؟"

"میں نے فون کیا تھا اسے۔ آپریٹر نے بتایا کہ اب تو اس سے بات نہیں ہو سکتی۔ وہ جا چکی ہے۔ میں دیکھنے آیا تھا کہ کیا چکر ہے۔ رہی یہ بات .... کہ میرا مسئلہ کیا ہے؟ تو صحیح طرح مجھے بھی نہیں معلوم" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے الجھن میں چھوڑ کر میں اس کے آفس سے نکل آیا۔

یکدم ہی مجھ پر احساسِ زیاں نے غلبہ پا لیا تھا۔ میں ایک بار پھر وہیں کھڑا تھا جہاں عرصہ پہلے تھا۔ ہنی عرف پرنس تہمینہ کے سہارے مجھے ریڈ ڈاٹ کے سلسلے میں کچھ آگے بڑھنے کی امید ہوئی تھی لیکن میں نے اپنی حماقت سے اسے کھو دیا تھا۔ میں اس کی طرف سے کچھ زیادہ ہی بے پروا ہو گیا تھا۔ خواہ مخواہ فرض کر لیا تھا کہ وہ کہیں نہیں جائے گی، ریڈ ڈاٹ والے اس مہرے کو اس کی جگہ سے نہیں ہٹائیں گے۔ لیکن یہ سمجھنا میری غلطی تھی۔ مجھے کم از کم اس کی نگرانی کے لئے کسی کو ضرور تعینات رکھنا چاہئے تھا۔ اس کی نگرانی کرنے والے میرے دو آدمی اغوا ہوئے تھے تاہم انہیں چھڑا لیا گیا تھا لیکن اس کے بعد میں نے اس سلسلے کو بے فائدہ سمجھ کر ترک کر دیا تھا۔ لیکن اب مجھے خیال آ رہا تھا کہ مجھے اس سے بہتر کوئی بندوبست کرنا چاہئے تھا۔

اب اپنی اس کوتاہی پر پچھتانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ حالات اور شواہد سے میں جو اندازے لگا سکتا تھا وہ کچھ یہی تھے کہ کراچی میں منسٹر صاحب کے قتل کی سازش ناکام ہوتے ہی غالباً ریڈ ڈاٹ والوں کا شبہ ہنی پر ہی گیا تھا کہ اس سلسلے میں معلومات اسی کے ذریعے لیک ہوئی ہیں اور انہوں نے لاہور میں فوراً اسے اس کی جگہ سے ہٹا لیا تھا۔ میرے لئے اب یہ کوئی حیرت کی بات نہیں رہی تھی کہ ان لوگوں کا جال کہاں سے کہاں تک پھیلا ہوا تھا، ان کے رابطے کتنے تیز اور مؤثر تھے اور وہ لوگ چشم زدن میں کیسے کیسے انتظامات کر سکتے تھے۔ اب مجھے زیادہ تشویش اس بات کی تھی کہ اگر انہیں شبہ ہو گیا تھا کہ ہنی کی برین واشنگ مکمل طور پر کامیاب نہیں رہی تھی اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا تھا، نیز یہ کہ منسٹر صاحب کے بارے میں ان کی سازش کی بھنک کسی طرح ہنی کو پڑ گئی تھی اور اس نے مجھے خبردار کیا تھا۔ تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں تھی۔

وہ ہنی پر ہولناک تشدد بھی کر سکتے تھے۔ اس معاملے میں وہ پولیس سے بھی آگے تھے۔ انسان پر عقوبت خانوں میں تشدد کا سلسلہ بہت پرانا ہے۔ قدیم بادشاہوں اور سرکاری اہل کاروں کے زمانے سے لے کر آج کے تفتیشی سیلوں وغیرہ کے نام پر قائم کئے گئے ٹارچر کیمپوں اور مافیا کے تہ خانوں والے زمانے تک بعض

انسانوں نے تو شاید "ریسرچ" ہی اس موضوع پر کی ہے کہ انسان کو زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچانے کے کون کون سے نئے اور ناقابلِ یقین طریقے ایجاد کئے جا سکتے ہیں۔ دوسری طرف اسی دنیا میں وہ انسان بھی موجود ہیں جو راستے میں کوئی زخمی یا بیمار بلی پڑی دیکھ کر تڑپ اٹھتے ہیں، اسے اٹھا کر گھر لے آتے ہیں، اپنے ہاتھوں سے اس کا جسم صاف کرتے ہیں، اسے دوا لگاتے ہیں، اس کی تیمارداری کرتے ہیں۔ یہ دنیا اور انسانی زندگی شاید انہی تضادات سے عبارت رہی ہے اور ہمیشہ رہے گی۔

تشدد کے حوالے سے میں ریڈ ڈاٹ والوں کی بھیجی ہوئی ایک ویڈیو کیسٹ دیکھ چکا تھا جس نے مجھ جیسے آہنی اعصاب کے مالک کو بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ مجھے رہ رہ کر یہی خیال ستائے جا رہا تھا کہ اگر ہنی کو میری دوستی کی اتنی بھاری قیمت چکانا پڑی تو یہ بات زندگی بھر کے لئے میرے ضمیر پر ایک بوجھ بن جائے گی۔ میری عدم موجودگی میں اس نے مجھے فون کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کا مطلب تو یہی تھا کہ اسے خطرے کا احساس ہو چکا تھا ورنہ شاید وہ اس کی جرأت نہ کرتی۔ اس کا ٹیلی فون ٹیپ ہوتا تھا۔ اس کی ہر لمحے کی گفتگو اس کے لاکٹ میں پڑے ہوئے ٹرانسمیٹر کے ذریعے کہیں سنی جاتی تھی۔ صرف اسی پر بس نہیں تھی، دن رات کے بیشتر حصے میں کمال نے اور مٹھو سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتے تھے۔

میں قدرے افسردہ اور دل گرفتہ سا گھر واپس آ گیا۔ میرا کہیں جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد جب میں بستر پر نیم دراز تھا، میرے ڈائرکٹ نمبر والے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے بے دلی سے ریسیور اٹھایا لیکن دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز سن کر میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ ایڈم عرف ایڈی تھا۔

"بہت پریشان ہو ہنی کے لئے؟" وہ اپنے مخصوص تیکھے سے لہجے میں بولا۔

میں سمجھ گیا کہ اسے میرے انٹرکان جانے اور ہنی کے سوئٹ کی تلاشی لینے کی اطلاع مل چکی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کون سی غیبی آنکھ تھی جو میری نگرانی کرتی تھی اور میری پل پل کی نقل و حرکت کی خبر ان لوگوں کو پہنچاتی تھی۔ عموماً میں اس بات کا بہت خیال رکھتا تھا کہ میرا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا۔ اکثر مجھے اس کا جواب نفی میں ہی ملتا تھا۔ اس کے باوجود ایڈم عرف ایڈی جب بھی مجھے فون کرتا تھا، وہ میری تازہ ترین سرگرمی سے باخبر ہوتا تھا۔

"ہاں۔ پہلے تو صرف ہنی کے لئے ہی پریشان تھا، اب پرنس تہمینہ کے لئے بھی پریشان ہوں" میں نے کہا "اسے بھی تم لوگوں نے غائب کر دیا۔ کیا تمہیں اس بھری پری دنیا میں اور لڑکیاں نظر نہیں آتیں؟ جس لڑکی سے مجھ غریب کی دوستی ہوتی ہے اسے ہی غائب کرتے ہو" میں اسے یہ تاثر دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس حقیقت سے لاعلم ہوں کہ ہنی اور پرنس تہمینہ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ لیکن میری یہ کوشش قطعی ناکام رہی۔

وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر بولا "ایک ہی لڑکی کے لئے دو دو مرتبہ پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ انسان کو اتنا فضول خرچ بھی نہیں ہونا چاہئے۔ تھوڑی بہت پریشانی دوسرے موقعوں کے لئے بھی بچا کر رکھنی چاہئے۔ تم جیسے سرکش انسان کو تو ابھی نہ جانے کس کس موقع پر پریشان ہونے کی ضرورت پیش آ سکتی ہے۔"

میں نے گویا اس کی باقی بکواس پر توجہ دئے بغیر کہا "یہ تم ایک ہی لڑکی والی کیا بات کر رہے ہو؟ میں سمجھ نہیں سکا۔"

"افضل چوہدری! اب تم ذہنی، جسمانی اور سماجی طور پر کافی بڑے ہو چکے ہو" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "یہ ننھے بچوں والی اداکاری اور صداکاری کرتے ہوئے تم اچھے نہیں لگتے۔ اس حقیقت سے انجان بننے کا اب کوئی فائدہ نہیں کہ ہنی اور پرنس تہمینہ ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم اس حقیقت سے آگاہ ہو چکے ہو۔"

"یہ تو میں اب تمہاری زبانی ہی سن رہا ہوں اور بلاشبہ سخت حیرت زدہ ہوں۔" میں نے حیرت کی اداکاری یا صداکاری جاری رکھی۔

وہ اب میرے الفاظ پر توجہ دئے بغیر بولا "ہنی پر ہماری محنت ضائع گئی۔ اس کی برین واشنگ میں خامی رہ گئی۔ اس نے اپنی اصلیت کو یاد رکھا۔ نہ صرف یاد رکھا بلکہ تمہیں بھی یہ بات بتا دی اور تم سے مل بھی گئی۔ درحقیقت وہ ذہنی اور اعصابی طور پر بہت ہی مضبوط لڑکی ہے۔ وہ ہماری جدید ترین ٹیکنک اور جادو اثر دواؤں کو بھی شکست دے گئی۔ اس نے اپنے ذہن کا کوئی کونا ان کے اثرات سے بچا لیا اور بعد میں اسی کے سہارے اس کی یادداشت لوٹ آئی۔ بالکل اسی طرح جیسے کنویں میں ڈوبتا ہوا انسان صرف ایک رسّی کے سہارے باہر آ جاتا ہے۔ انسانی ذہن بھی ایک عجیب طلسم خانہ ہے....."

"تم مجھے انسانی ذہن کی پُراسرار پیچیدگیوں کے بارے میں بتانے کے بجائے یہ بتاؤ کیا، واقعی یہ ہنی اور پرنس تہمینہ والی بات درست ہے؟ یقین کرو مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی اور نہ ہی اس نے مجھے بتائی تھی.... بلکہ اس نے تو پرنس تہمینہ کے طور پر ہی مجھے بالکل اسی طرح گھیرنے کی کوشش بھی کی تھی جس طرح اس قبیل کی عورتیں موٹی اسامیوں کو گھیرتی ہیں۔"

"فضول باتیں مت کرو افضل چوہدری؟" ایڈم بدمزگی سے بولا۔ "اب جب کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے تو تم کیوں ضدی بچوں کی طرح ایک بات کی تکرار کئے جا رہے ہو۔"

"کس نے بتایا تمہیں سب کچھ؟" میں نے پوچھا۔

"خود ہنی نے" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ایک لمحے کے لئے میری سٹی گم ہو گئی۔

"چپ کیوں ہو گئے؟" اس نے استہزائیہ انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا "شاید تمہیں ہنی سے یہ امید نہیں تھی۔"

میرے خیال میں اب انجان بنے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ بولا "دل چھوٹا مت کرو۔ ویسے ہنی تمہاری بہت وفادار ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ کسی نہ کسی حد تک ہمیں اور ہمارے طور طریقوں کو بھی جان گئی ہے۔ اگر وہ زبان بند رکھتی تو یقیناً ہمیں زبان کھلوانے کی کچھ ترکیبیں اس پر آزمانا پڑتیں۔ یہ بات اسے اچھی طرح معلوم تھی۔ وہ ذہنی اور اعصابی طور پر بے پناہ مضبوط سہی لیکن جسمانی تشدد سہنے کا اب اس میں بالکل حوصلہ نہیں ہے۔ زندگی میں ایک بار وہ ایک خفیہ سرکاری ایجنسی کی "تفتیش" سہہ چکی ہے۔ اس کے جسم کی خوب صورتیاں بڑی مشکل سے واپس آئی ہیں۔ روح کے گھاؤ تو اب تک نہیں بھرے۔ اس لئے اس نے جب دیکھا کہ اس کا بھانڈا پھوٹ چکا ہے تو اس نے زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش نہیں کی۔"

وہ گویا اب میری خاموشی سے محظوظ ہو رہا تھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس نے فوراً اعتراف کر لیا کہ وہ اپنی اصل شخصیت کو بھولی نہیں۔ اور یہ کہ تم بھی حیرت انگیز قوتِ مشاہدہ کا ثبوت دیتے ہوئے اسے پہچان چکے ہو۔ اس کی رپورٹ ہمیں کمال نے بن سے بھی مل چکی تھی لیکن اس کے سامنے تو وہ تمہاری اس بات کی تردید ہی کرتی رہی تھی۔ بعد میں وہ تم سے کسی طرح رابطہ کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اس نے سب کچھ ہمیں بتا دیا ہے۔ ہمیں اس کی یہ بات اچھی لگی۔ اس نے خود کو اور ہمیں زیادہ دردِ سر میں مبتلا نہیں کیا۔ جوں ہی اس نے محسوس کیا کہ بازی الٹ چکی ہے تو اس نے مزید مصیبت کو دعوت نہیں دی اور جو کچھ ہم نے پوچھا وہ بتا دیا۔ اگر وہ نہ بتاتی تب بھی کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ہمیں بہت سے طریقے آتے ہیں معلوم کرنے کے۔"

میں تصور کر سکتا تھا کہ ان لوگوں کی گرفت میں ہنی کے خوف اور وحشت کا کیا عالم ہو گا۔ مجھے اس پر غصہ نہیں تھا اور نہ ہی اس سے کوئی شکوہ تھا کہ اس نے زبان کھول دی تھی۔ اس نے اچھا ہی کیا تھا کہ ستم گروں کی ستم کوشی کے لئے اپنے آپ کو مزید تختۂ مشق نہیں بنایا تھا۔ وہ زندگی میں جو کچھ سہہ چکی تھی وہی بہت تھا۔ وہ زندگی کا قرض اتار چکی تھی۔ یہی بہت تھا کہ وہ اپنے وجود کی تمام تر دلکشی اور خوب صورتی کے ساتھ اب بھی زندہ تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں چین سے جینا اس کے مقدر میں نہیں لکھا تھا۔

"تمہیں اس پر شک کیسے ہوا؟" آخر کار میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا اور انجان بننے کی کوشش ترک کر دی۔

"حفیظ صاحب والا معاملہ جب عین وقت پر ناکام ہونے کی ہمیں رپورٹ ملی تو مجھ سے اوپر والا دماغ بھی چکرا گیا ......" وہ بولا۔

"تم سے اوپر والا دماغ ....؟" میں نے دُہرایا۔ یہ اصطلاح میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔

"میرا مطلب ہے ' میرا باس" اس نے وضاحت کی۔ "ہمارے ہاں بعض لوگوں کی اہمیت صرف ان کے دماغ کے حوالے سے ہے۔ اس لئے کبھی کبھی ان کا تذکرہ صرف دماغ ہی سے کر جاتے ہیں۔ خیر..... تو میں بتا رہا تھا کہ باس چکرا گیا [illegible] نظام لیک پروف ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کہاں [illegible] گئی ہے۔ پھر یکدم ہمارا ذہن ہنی پر گیا۔ ہمارے نظام میں [illegible] کمزور پوائنٹ فی الحال اور کوئی نہیں تھا۔ لیکن مسئلہ یہ تھا کہ [illegible] اس منصوبے میں شریک ہی نہیں تھی۔ وہ مخبری کیسے کر سکتی [illegible]

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "بہرحال ہم نے [illegible] اس کی جگہ سے ہٹا لیا اور جب پوچھ گچھ ہوئی تو سب پتا چل [illegible] بھی معلوم ہو گیا کہ ذہنی طور پر وہ مکمل پرنس تہمینہ نہیں [illegible] تھی اور یہ بھی پتا چل گیا کہ ہمارے دو ٹرانسیٹروں پر ہو[illegible] گفتگو کا کچھ حصہ فریکوئنسی کی غلطی کی وجہ سے اتفاقاً اس [illegible] لیا تھا اور نہایت مستعدی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فوراً تمہیں [illegible] دیا۔ تم حسبِ عادت رہ نہیں سکے۔ فوراً کود پڑے اس [illegible] میں۔"

"تمہارے خیال میں مجھے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا [illegible] تھا؟" میں نے ملامت سے پوچھا۔

"اس طرف تو خیر ہمارا ذہن ہی نہیں گیا تھا کہ تمہیں [illegible] معاملے کی بھنک بھی پڑ سکتی ہے لیکن قسمت اکثر تمہارا ساتھ [illegible] ہے۔ بلکہ اس معاملے میں تو شاید تمہاری ہی خوش قسمتی کا [illegible] حفیظ صاحب پر بھی پڑ گیا جو وہ بچ گئے۔ بہرحال.... اگر ہم یہ [illegible] بھی کرتے کہ تم اس چکر سے آگاہ ہو جاؤ گے تب بھی ہم تم سے [illegible] مستعدی اور حاضر دماغی کی توقع نہ رکھتے۔ ہمارا خیال تھا کہ تم [illegible] تر معاملات میں مار دھاڑ کرتے ہوئے کودنے کے عادی ہو اور [illegible] ہونے کے باوجود زیادہ جوڑ توڑ نہیں کرتے۔ ایسا کوئی قدم شاذ [illegible] ہی اٹھاتے ہو جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ تم ذہنی ورزش بھی کر[illegible] ہو۔ لیکن حفیظ صاحب والے معاملے میں تو تم نے کمال کر [illegible] راتوں رات نہ صرف ان سے دوستی گانٹھ لی بلکہ پرانے جاسو[illegible] والے انداز میں بھیس بدل کر ویٹر کے روپ میں موقع پر بھی م[illegible] رہے۔"

"تو تمہیں سب رپورٹ مل چکی ہے؟" میں نے ٹھنڈی سا[نس] لی۔

"مہم ناکام ہوتے ہی ہمیں یہاں لاہور میں مکمل رپورٹ [illegible] گئی تھی۔ تمام تر جزئیات کے ساتھ" وہ طمانیت سے بولا "[illegible] ہمیں تقریباً ہر لمحے کی خبر مل رہی تھی۔ لیکن ہمارا خیال تھا ک[ہ] ہمارے طریقۂ واردات کو سمجھ نہیں سکو گے کیوں کہ حفیظ صاحب [illegible] سگار کے ذریعے ہلاک کرنے کا فیصلہ ہم نے آخری لمحوں میں [illegible] تھا۔ اوریجنل پلان کچھ اور تھا جو تمہارے ٹانگ اڑانے کی وجہ [illegible] ہم نے بدل دیا تھا۔ ہمیں اپنی مہم ناکام ہونے پر غم و غصہ تو بہت [illegible] لیکن ہم قدر شناس لوگ ہیں ' تمہاری ذہانت اور مستعدی کی [illegible] دیئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔"

"ذرہ نوازی ہے تمہاری۔ ویسے بندہ اس سے بھی زیادہ قابل ہے۔ امید ہے تم سے داد و تحسین وصول کرنے کے مواقع مجھے آئندہ بھی میسر آتے رہیں گے۔ غالباً مجھے تمہارا شکریہ بھی ادا کرنا چاہئے کہ تم نے اس بار بھی میری گستاخی پر مجھے بخش دیا" میں نے مصنوعی ممنونیت سے کہا۔

"بخشنا پڑتا ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "آخر دوست ہو ہمارے۔"

"یہ اچھی یک طرفہ دوستی ہے جس کا مجھے علم ہی نہیں۔ آخر میرے دل میں جواباً دوستی کے جذبات کیوں پیدا نہیں ہو رہے؟" میں نے بڑی حسرت سے کہا۔

"ہو جائیں گے۔ ہو جائیں گے" وہ نہایت مربیانہ لہجے میں بولا "اب وقت آ رہا ہے۔ اب ہماری تمہاری ملاقات ضروری ہو گئی ہے۔ امید ہے اس کے بعد تمہارے خیالات تبدیل ہو جائیں گے۔"

"کیا تمہارے ہاں اس قسم کا بھی کوئی آپریشن ہوتا ہے جس کے ذریعے دوسری طرح کے خیالات انسان کے دل میں یا کھوپڑی میں انڈیل دیئے جاتے ہیں؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"ارے .... ہمارے ہاں کیا کچھ ہوتا ہے اس کا تمہیں کہاں اندازہ ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "جب اندازہ ہو گا تو ہمارے ساتھ شامل ہونے کی تمنا کرو گے۔ ہم جلد ہی تمہارے ساتھ میٹنگ کو بھی اپنے کسی ایجنڈے میں رکھیں گے۔"

"میں بے تابی سے انتظار کروں گا" میں نے بڑے خلوص سے کہا "ہنی کے ساتھ تم نے کیا کیا؟"

"کچھ بھی نہیں" وہ بے پروائی سے بولا "میں نے بتایا ناکہ اس نے نہایت عقل مندی کا مظاہرہ کیا کہ آسانی سے زبان کھول دی۔ اپنے لئے مصائب کو دعوت نہیں دی۔ اب ہمیں اس پر سختی کرنے کا شوق تھوڑا ہی تھا۔ ہمارا کوئی کام بے مقصد نہیں ہوتا۔ ہمارے ہاں کوئی اپنے بیمار ذہن کو تسکین دینے کے لئے یا محض اپنی نفرت کی آگ بجھانے کے لئے کسی پر تشدد نہیں کرتا۔ جب بھی ایسا کیا جاتا ہے 'کسی ضرورت کے تحت کیا جاتا ہے۔"

"شرفاء کے یہی طور طریقے ہوتے ہیں۔ میں تو تم لوگوں کی شرافت کا قائل ہوتا جا رہا ہوں" میں نے خلوص سے کہا۔

"جلد ہی تم یہ استہزائیہ لہجہ ترک کر دو گے مائی ڈیئر افضل چوہدری!" وہ ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اور اس طرح کی باتیں سنجیدگی سے کرنے لگو گے۔"

"کیا تم نے واقعی ہنی کے ساتھ کوئی بُرا سلوک نہیں کیا؟ اس کی "غداری" پر اسے کوئی سزا نہیں دی؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ سزا کی مستحق تو تھی لیکن اب اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ ناکامی تو ہمارے سامنے آ ہی چکی تھی۔ فی الحال وہ کامیابی میں نہیں بدل سکتی تھی۔ میرے اوپر والے دماغ نے حکم دیا کہ ... فی الحال سب کچھ ڈراپ کر دیا جائے۔"

"ہنی ہے کہاں؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس سوال کا جواب ملے گا۔

"سرِدست ہم نے اسے غائب کر دیا ہے۔ اس کے بارے میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا اس کا کیا کریں" وہ بالکل اس طرح بات کر رہا تھا جیسے ہنی انسان نہیں 'کوئی ایسی چیز تھی جو بازار سے سودے سلف کے ساتھ فاضل آ گئی تھی اور اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کیا جائے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس پر ہماری ایک ٹیم کی خاصی محنت ہوئی ہے۔ ہم اسے ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ وہ کام تو آ سکتی ہے لیکن شاید اس ملک میں نہیں۔ عین ممکن ہے ہم اسے کسی اور ایشیائی ملک میں بھیج دیں۔"

"مجھے صرف ہنی کی خیریت عزیز ہے اور فی الحال میرے لئے تمہاری بات پر یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

"چندا ......!" وہ بڑے پیار سے بولا۔ وہ یقیناً غیر ملکی تھا مگر ہمارے روایتی الفاظ بھی ایسے شیریں اور منجھے ہوئے لہجے میں بولتا تھا کہ اہلِ زبان بھی شرما سکتے تھے "ہمیں جب کوئی بات بتانی نہیں ہوتی تو ہم سرے سے بتاتے ہی نہیں لیکن جو بتاتے ہیں بالکل ٹھیک بتاتے ہیں۔ اپنے رومانویت پسند دل کو تسلی دیئے رکھو۔ ہنی بالکل خیریت سے ہے۔ ہو سکا تو میں آج رات فون پر اس سے تمہاری بات کرا دوں گا۔"

"بڑی ہی نوازش ہو گی تمہاری" میں نے کہا "ویسے تم نے اتنی عجلت میں اسے پیشِ منظر سے ہٹانے کا فیصلہ کیوں کر لیا تھا؟"

"فی الحال ہم نہیں چاہتے تھے کہ تمہاری حکومت ہماری طرف متوجہ ہو جائے۔ حالاں کہ اس سے ہمارے لئے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا۔ پھر بھی غیر ضروری الجھنوں سے بچتے رہنا ہماری پالیسی ہے۔"

"حکومت تو پھر بھی تمہاری طرف متوجہ ہو سکتی تھی 'اگر میں حفیظ صاحب کو تمہارے بارے میں بتا دیتا" میں نے کہا۔

"ہمیں تم سے عقل مندی کی توقع تھی اور تم نے عقل مندی ہی دکھائی۔ تم نے اپنے حق میں بہتر ہی کیا کہ ہمارے بارے میں زبان بند رکھی۔ اس سے تمہارا ہی نہیں 'تمہارے بہت سے ہم وطنوں کا بھلا ہوا۔"

"کیا مطلب؟ میں تمہاری بات سمجھا نہیں" میں نے کہا۔

"فی الحال تمہارے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ وقت آنے پر دھیرے دھیرے تمہیں سب کچھ معلوم ہوتا جائے گا ...... اور آثار بتاتے ہیں کہ وقت اب قریب آتا جا رہا ہے" وہ مبہم لہجے میں بولا۔

"حکومت کو تو میں اب بھی بتا سکتا ہوں۔ کچھ ذمے دار لوگوں کی توجہ تم لوگوں کی طرف مبذول کرا سکتا ہوں" میں نے کہا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا گویا میں نے اسے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔

سوچ بچار حاصل کرنے ہی چڑھا گھر جاتا ہو۔ میرا تو اس سے یہ کہنے کو بھی جی چاہا "بھائی! تم پنجرے کے باہر کیا کر رہے ہو، تمہیں تو پنجرے کے اندر ہونا چاہئے" لیکن پھر مجھے فوراً اپنی زندگی کا سنہرا اصول یاد آگیا۔ کبھی کسی کا مذاق نہیں اُڑانا چاہئے۔ ویسے بھی میں ایک سنجیدہ نوجوان ہوں۔ میں پوری کوشش کرتا ہوں کہ مجھے غیر سنجیدہ گفتگو نہ کرنی پڑے....."

"خیر...... تو پھر ہوا کیا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ذرا بے تابی سے پوچھا۔

"ہونا کیا تھا سر! اس پر نظر پڑتے ہی میں نے اسے پہچان لیا تھا کہ یہ وہی پُراسرار اور خطرناک آدمی ہے جس کو قابو میں کرنے کا فریضہ چوہدری صاحب نے مجھے سونپا ہے۔ میں اب اس کام میں کوتاہی تو نہیں کر سکتا تھا نا۔ میں فوراً اس کے پیچھے لگ گیا....." اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میں فی الحال اسے داد دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

"سب سے زیادہ وقت اس نے بندروں کے پنجروں کے پاس ہی صرف کیا لیکن باقی جانوروں کا معائنہ بھی اس نے خاصے اطمینان کے ساتھ کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں تھا لیکن بہرحال میں اس کے پیچھے لگا رہا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میں نے اسے احساس بھی دلا دیا کہ میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔ مجھے امید تھی کہ اس کی تہ میں بھی کوئی فلسفہ کارفرما ہوگا۔

"یہ میری حکمتِ عملی کا ایک حصہ تھا" وہ اطمینان سے بولا۔ "ویسے بھی اگر میں اسے یہ احساس نہ ہونے دیتا تو شاید وہ گھنٹوں چڑیا گھر میں ہی ٹہلتا رہتا۔ پہلے اسے شبہ ہوا کہ میں اس کے پیچھے لگا ہوا ہوں۔ اپنی دانست میں تصدیق کے لئے اس نے اِدھر اُدھر چکر لگائے۔ میں سائے کی طرح اس کے پیچھے رہا۔ آخر کار اسے یقین ہوگیا کہ میں اس کا تعاقب کر رہا ہوں تو اس نے اچانک گھڑی دیکھی، جیسے اسے کوئی ضروری کام یاد آگیا ہو۔ پھر وہ چڑیا گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہ ایرمال سے کینٹ کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کا تعاقب جاری رکھا۔ اِدھر اُدھر چکرانے کے بعد آخر کار وہ والٹن کی طرف مڑ گیا۔ آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس دوران اس نے کس طرح کی ڈرائیونگ کی اور کس طرح میں نے اپنے کھٹارے میں اس کا تعاقب جاری رکھا۔ ایک لمحے کے لئے بھی میں نے اسے اپنی نظر سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔"

"بھئی اگر میرے الفاظ سے تمہارے یا تمہاری گاڑی کے جذبات کو ٹھیس پہنچی ہے تو میں انہیں واپس لیتا ہوں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے اسے حقارت سے نہیں بلکہ یوں ہی روانی میں اور کچھ بے دھیانی میں کھٹارا کہا تھا۔ مجھے تو خود ایسی پرانی چیزوں سے بہت پیار ہے۔ بہت وفادار ہوتی ہیں۔ میرے اپنے پاس بھی کسی زمانے میں ایسی ہی ایک کھٹارا گاڑی تھی اور میں زندگی موت کی جنگ لڑا کرتا تھا۔ اس نے کبھی مجھے د... دیا۔"

"سر! آپ نے "گاڑی کے جذبات" والی بات شاید ... کی ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے جان اشیا کے بھی جذبا... ہیں" وہ پُرجوش لہجے میں بولا "بلکہ سچ پوچھیں تو اس دنیا م... بے جان ہے ہی نہیں۔ اس کائنات کی سب چیزیں جاندا... وہ بھی انسان کی محبت کے جواب میں محبت اور نفرت ... میں نفرت کرتی ہیں۔ اکثر اوقات ان کی محبت اور نفرت ... اور مجبور ہوتی ہے۔ انسان اسے محسوس نہیں کر سکتا۔ ... معمولی حساس لوگ اسے محسوس کر سکتے ہیں اور وقت پ... محبت یا نفرت اپنا اثر دکھاتی ہے۔"

مجھے اس احمق نوجوان سے اتنی گہری بات کی توقع ... لیکن یہ موقع ایسی باتوں پر تبادلہ خیال کرنے کا نہیں تھا۔ ... نرمی سے اسے یاد دلایا "وہ اے نن کی بات ہو رہی تھی..."

"جی ہاں۔ میں وہی بتانے لگا تھا" وہ اصل موضو... ہوئے بولا "کیولری گراؤنڈ سے آگے نکل کر جب وہ ویرا... پہنچا اور اس کی گاڑی کی رفتار کم ہوئی تو میں سمجھ گیا کہ ا... گھیرنے کا ارادہ رکھتا ہے تو میں نے سڑک تنگ ہونے ... گاڑی کو یوٹرن دے لیا اور واپس روانہ ہوگیا۔ آپ ... سمجھے؟" اس نے چمکتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ میں اسی کی زبانی سننا چاہتا تھا۔

"یہ میری نفسیاتی چال تھی سر!" وہ فاتحانہ لہجے میں ... نے اس کے تجسس کو خوب ابھارا۔ اتنا ابھارا کہ اب وہ ا... کا جواب حاصل کئے بغیر گھر نہیں جا سکتا تھا کہ آخر میں ک... تعاقب کر رہا تھا؟ یہ "کیوں؟" آدمی کو بڑا بے چین کرتی ... اب وہ میرے پیچھے لگ گیا۔ اب میرا کام صرف اتنا تھا ک... ہتھے نہ چڑھنے پاؤں۔ اور یہ بڑا مشکل کام تھا۔ کیوں کہ م... آپ کو ہی زبردست ڈرائیور سمجھتا ہوں لیکن وہ میرا بھی ا... بازی گر معلوم ہوتا تھا بالکل۔ بہرحال..... میری قسمت ا... اور کچھ حواس نے ساتھ دیا۔ ٹریفک کے سلسلے میں بھی خو... سے کوئی مسئلہ پیش نہیں آیا اور میں اسے اپنے پیچھے لگا... وہاں لے آیا جہاں لانا چاہتا تھا....." وہ اب گویا می... ابھارنے کے لئے خاموش ہوگیا۔

"کہاں لے جانا چاہتے تھے تم اسے؟" مجھے پوچھنا ہی ...

"ہمارے کارخانوں کے پیچھے ایک گودام ہے۔ میرا ا... لے جانے کا پروگرام تھا۔ اور میں اس میں کامیاب ہو... نے جواب دیا "میں یہی ظاہر کر رہا تھا کہ سخت خوفزدہ ہو... گودام تک میں اس سے ذرا پہلے پہنچ گیا اور خوف زدہ ا...

گاڑی سے چھلانگ لگا کر گودام کا تالا کھول کر اندر گھس گیا۔ میں نے آوازوں وغیرہ سے تاثر یہی دیا کہ کسی پچھلے دروازے سے مزید اندر چلا گیا ہوں لیکن درحقیقت میں دروازے کے پیچھے ہی چھپا ہوا تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ درست ہی رہا کہ وہ اندھا دھند میرے پیچھے آئے گا......"

یقیناً اسے خود بھی معلوم تھا کہ وہ شکل سے جتنا ہونق نظر آتا ہے اتنا ہی اسے بے ضرر سمجھا جائے گا اور کوئی اس کے پیچھے آنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا۔ حتیٰ کہ اس کا تعاقب کرنے والا تو کسی احتیاط کی ضرورت بھی محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی مخصوص احمقانہ مسکراہٹ کے ساتھ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"وہ اندھا دھند گودام میں گھسا اور میں نہایت پھرتی سے دروازے کے پیچھے سے باہر نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کنڈی میں تالا لگا دیا۔"

میں قدرے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ کیا واقعی اس جیسا ہونق نوجوان اے نن جیسے فتنے کو اتنے سیدھے سادے طریقے سے پکڑنے میں کامیاب ہو سکتا تھا؟ پھر میں نے ٹھنڈی سانس لے کر دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا کہ بعض ایسے مشکل کام جو بڑے بڑے شاطر لوگ تمام تر چالاکی کے ساتھ بھی انجام نہیں دے پاتے، وہ نہایت سیدھے سادے انداز میں ہو جاتے ہیں۔

"گودام کا دروازہ کیسا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"لکڑی کا ہے۔ جیسے عام طور پر پرانے مکانوں میں ہوتے ہیں۔ دو پٹ والا۔ کافی مضبوط ہے" اس نے جواب دیا۔

"کوئی اور دروازہ یا کھڑکی بھی ہے گودام میں؟"

"بالکل نہیں سر!" وہ فخریہ لہجے میں بولا "اسی لئے تو میں نے گودام کو منتخب کر رکھا تھا۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں کچا کام کر کے نہیں آیا ہوں۔ ابھی تو میں نے آپ کو ان مزید احتیاطی اقدامات کے بارے میں نہیں بتایا جو میں کر کے آیا ہوں۔"

"اچھا..... تو تم نے مزید احتیاطی اقدامات بھی کئے ہیں" میں نے قدرے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ مجھے بار بار شبہ ہونے لگتا تھا کہ وسیم اتنا احمق نہیں جتنا نظر آتا ہے۔ احمق نظر آنا شاید اس کی لاشعوری کوشش تھی۔ شاید اسے احساس تھا کہ احمق نظر آنے میں زیادہ فائدے پنہاں ہیں۔ قدرت نے اس کا چہرہ ایسا نہیں بنایا تھا۔ شاید وہ بڑی کوشش سے اپنے چہرے پر حماقت طاری کئے رکھتا تھا اور اب اس کام میں بہت ماہر ہو چکا تھا۔ قدرت نے اسے اچھا بھلا ہینڈسم چہرہ عطا کیا تھا لیکن اس نے شاید جان بوجھ کر اس پر کچھ اور ہی طرح کا رنگ چڑھا لیا تھا۔ یہ حوصلہ بھی ہر کسی میں نہیں ہوتا۔ لوگ تو احمق ہونے کے باوجود بہت بڑے دانشور اور مدبّر نظر آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بہرحال وسیم کے بارے میں ابھی تک میں کوئی یقینی اور حتمی رائے قائم نہیں کر سکا تھا۔

وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا "ہمارے کارخانوں کو ایک نوجوان دکاندار کیمیکلز سپلائی کرتا ہے۔ اس سے میں نے خصوصی فرمائش کر کے اور اس کی منت سماجت کر کے ایک گیس کا چھوٹا سا سلنڈر تیار کروا کے اپنے آفس میں رکھا ہوا تھا۔"

"کیسی گیس کا سلنڈر؟" میں نے ذرا چونکتے ہوئے کہا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" وہ سر کھجا کر بولا "اس نے مجھے اس کیمیکل کا نام بھی بتایا تھا لیکن میں بھول گیا ہوں۔ بہرحال وہ بے ہوش کرنے والی گیس تھی۔ میں جب اپنے آفس سے سلنڈر اٹھا کر دوبارہ گودام کے دروازے پر پہنچا تو وہ بن مانس کا بچہ اندر سے دروازہ توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ دور سے دوڑ لگاتا ہوا بار بار آ کر دروازے سے ٹکرا رہا تھا۔ اور جس قوت سے ٹکرا رہا تھا اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں تھا۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے توپ کا گولا دروازے سے ٹکرا رہا تھا یا پھر کوئی بہت ہی پلا ہوا لڑاکا سانڈ بہت دور سے دوڑتا ہوا آ کر دروازے پر ٹکر رسید کر رہا تھا۔ میں نے اسے زیادہ ٹکریں رسید کرنے کی مہلت نہیں دی۔ دروازے کے نیچے سے میں نے سلنڈر میں لگی ہوئی ربڑ کی نلکی اندر داخل کی اور والو دبا کر گیس کھول دی۔ شوں شوں کر کے گیس اندر جانے لگی۔ وہ چیخا چلّایا، کھانسا، لیکن آخر کار میں نے اس کے دھب سے گرنے کی آواز سنی اور اس کے بعد اندر خاموشی چھا گئی۔ وہ کیا بے ہوش ہوا، گویا ایک طوفان بدتمیزی تھم گیا۔"

"اور تم دوڑے دوڑے میرے پاس چلے آئے؟" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ میں کام مزید پکا کر کے آیا ہوں۔ دروازے پر اپنا ایک چوکیدار بھی بٹھا کر آیا ہوں۔ وہ بندوق لئے بیٹھا ہے..... دروازے کے سامنے ہی.... چارپائی پر۔ اب بتائیے.... کام پکا ہے یا نہیں؟" اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں...... محسوس تو یہی ہو رہا ہے" میں نے قدرے تذبذب کے عالم میں اثبات میں سر ہلایا "تم سے مجھے اتنی امید نہیں تھی۔"

"یہی تو میری زندگی کا المیہ ہے سر!" یکدم اس کے لہجے میں دنیا بھر کی اداسی سمٹ آئی "کبھی کسی نے مجھ سے میری صلاحیتوں کے مطابق کام ہی نہیں لیا۔ ورنہ معلوم نہیں آپ کا یہ خادم اب تک کیا کچھ کر کے دکھا چکا ہوتا۔"

میں اب سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا کہ کیوں نہ اس نوجوان کو اپنے ساتھیوں میں شامل کر لوں؟ وہ یقیناً کوئی اور ہی چیز تھا۔ آنکھیں اس کے بارے میں دھوکا دیتی تھیں۔ اس کے باوجود اسے اپنے مطلب کی ٹریننگ دلوانا مجھے کچھ مشکل سا کام لگتا تھا۔

بھابڑہ پہنچ کر اس نے اس سمت میری رہنمائی کی جہاں ایک چھوٹا موٹا صنعتی سا علاقہ پھیلتا جا رہا تھا۔ ایک چھوٹی سی سڑک اس طرف جا رہی تھی۔ ہم جب اس علاقے میں پہنچ کر جھاڑ جھنکاڑ کے

قریب سے گزرتے ہوئے ایک کچے راستے پر مڑ کر بڑی سی چار دیواری کے عقب میں پہنچے تو میرا ماتھا ٹھنکا۔ صورتِ حال اس سے کچھ مختلف نظر آرہی تھی جیسی وسیم چھوڑ کر گیا تھا۔

اس نے بھی گڑبڑ کو محسوس کرلیا تھا اور اس کا منہ ایک بار پھر ہونقوں والے انداز میں کھل گیا تھا۔ اس نے گاڑی رکوائی اور ہم دوڑتے ہوئے گودام تک پہنچے۔ مجھے وسیم کے بتانے سے پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ گودام کا دروازہ کون سا تھا کیوں کہ دروازہ چوکھٹ سمیت زمین پر پڑا ہوا تھا اور چوکیدار چارپائی پر اوندھا پڑا ہائے ہائے کررہا تھا لیکن غنیمت یہ تھا کہ وہ زندہ سلامت تھا۔ دو مزدور ٹائپ آدمی اس کی کمر دبا رہے تھے۔ دو تین اس شگاف کے قریب کھڑے تھے جس میں اب دروازہ نہیں رہا تھا۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے گودام میں جھانکنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وسیم دوڑا دوڑا ٹوٹے پٹ کے دروازے تک پہنچا اور اچھی طرح اندر کا جائزہ لے کر آیا گویا اسے توقع رہی ہو کہ کسی معجزے کے تحت اے نن اسے کہیں پڑا نظر آجائے گا۔ وہ جب چوکیدار کی طرف پلٹا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ چوکیدار اسے اپنی طرف آتا دیکھ کر ذرا زیادہ زور سے ہائے ہائے کرنے لگا۔ اس کی پرانی سی تھری ناٹ تھری چارپائی کے سہارے کھڑی تھی۔

وسیم کے کچھ پوچھنے سے پہلے وہ خود ہی صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں بولا۔ "وہ خانہ خراب کا بچی باگ گئی صاب!"

وسیم کی آنکھیں عینک کے موٹے موٹے شیشوں کے عقب میں پہلے ہی کی طرح گول گول سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ وہ ادھیڑ عمر، بھاری بھرکم اور صاحب توند چوکیدار کو گھورتے ہوئے بولا۔ "کون بھاگ گئی؟" وہ گویا تحمل سے کام لینے کی کوشش کررہا تھا۔

"وئی دال خور کا بچی صاب! جس کو آپ اندر بند کرکے گیا۔" وہ کراہتے ہوئے بولا اور اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کرنے لگا لیکن پھر اس نے کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے معذرت خواہانہ سی نظروں سے وسیم کی طرف دیکھا اور لیٹے لیٹے ہی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "وہ طوفان میل تھی صاب! ام اپنی پوری زندگانی میں اتنا چھوٹے آدمی میں ایسا بلا کا مافق طاقت نئیں دیکھا۔"

"وہ کب ہوش میں آگیا تھا؟" وسیم نے بدستور اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"اس نے تو آپ کے جانے کے دو تین منٹ بعد ہی دوبارہ دروازے پہ ٹکاٹک شروع کردیا تھا صاب! ام اس کو بوت بولا کہ حرامخور کا بچہ! آرام سے بیٹھ..... مگر صاب! ذرا دیر بعد دروازہ ہمارے اوپر آگری۔ آپ امارا بات کا یقین کرو صاب! ہمارا تو کمر لخت لخت ہوگیا....." اس نے ایک بار پھر کمر پر ہاتھ رکھ کر ہائے ہائے شروع کردی۔

"تم نے اس پر گولی نہیں چلائی؟" وسیم نے پوچھا۔

"بندوق امارا ہاتھ سے چوٹ گیا تھا صاحب! ام کو سنبھلنے کا موقع بھی نئیں ملا۔ وہ ادر نظر آئی اور ادر بجلی کا مافق گاڑی میں کرغائب ہوگئی..... اور پھر آپ ام کو بولا بھی نئیں تھا کہ گولی مارنا اے کہ نئیں مارنا اے..... ابی اگر ام کو خبر ہوتی کہ چور ڈاکو اے ام ایک منٹ میں اس کو گولی مار کر لٹا دیتی..... ابی ام کو خبر نئیں تھی کہ وہ حرامخور کا بچی اے کون؟ ام سوچا کہ ام اس کو گولی مارتا اور آپ ام سے بولتا کہ ام کو تو وہ زندہ چاہیے..... تو ام کیا کرتا؟" اس نے گویا بہت اہم سوال اٹھاتے ہوئے جواب طلب نظروں سے وسیم کی طرف دیکھا۔

"چھوڑو یار! تم بالکل بے کار آدمی ہو۔" وسیم بدمزگی سے بولا۔

اب خان صاحب جوش میں اٹھ بیٹھے اور فرط جذبات سے وسیم کا ہاتھ زور سے پکڑتے ہوئے بولے۔ "امارا بے عزتی خراب مت کرو صاب! ابی ام کو بتاؤ... جب سے ام اس کارخانے پر ملازم اے، کبھی تمارا کارخانہ یا گودام میں چوری ہوا؟ ڈاکا پڑا؟"

"نہیں۔ چوری وغیرہ تو نہیں ہوئی لیکن....."

"لیکن ویکن کو چھوڑو۔ چوکیدار کا کام اے جان مال کی حفاظت۔ وہ ام کرتی اے اور کرتی رہے گی۔ اس باطلے میں ام کو کچھ خبر ہی نئیں تھا... تم اگر ام کو صحیح طرح بتاتا تو ام کچھ کوشش کرتا۔ ابی صبر کرو۔"

صبر تو واقعی صرف وسیم نے ہی نہیں، میں نے بھی کرلیا تھا۔ میں نے دروازے وغیرہ کا جائزہ لیا تو اندازہ ہوا کہ چوکھٹ کچھ زیادہ مضبوطی سے دیوار میں نصب نہیں تھی۔ عام آدمی تو شاید دو تین بھی مل کر اسے دھکیل کر نہ اکھاڑ پاتے لیکن معاملہ اے نن کا تھا۔ اس کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ کیا کچھ کرسکتا تھا۔ ویسے اس چوکھٹ کو اکھاڑنا بہرحال ناممکنات میں سے نہیں تھا۔ شاید میرے لئے بھی یہ کچھ ایسا مشکل کام نہ ہوتا۔ گودام میں رکھے ہوئے چپلوں اور ربڑ کے جوتوں کے بڑے بڑے کارٹن بھی تہ و بالا ہوچکے تھے، اِدھر اُدھر الٹے پڑے تھے۔

وسیم سر کھجاتے ہوئے بے یقینی سے بولا۔ "تو کیا واقعی میرے جانے کے بعد ہوش میں آگیا تھا؟ اور کیا واقعی یہ دروازہ اسی کی ٹکروں سے اکھڑا ہے؟"

"نہیں۔ شاید اس گودام میں رہنے والے کسی آسیب نے اس کی مدد کی ہو یا پھر وہ اپنی روحانی قوتوں سے کام لے کر نکل گیا ہو۔" میں نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔ "اب اس قسم کی باتیں کرکے اور میرا مزید دل نہ جلاؤ۔ مجھے اب اجازت دو۔" میں گودام سے نکل آیا۔

وہ میرے ساتھ چلتے ہوئے مضطربانہ لہجے میں بولا۔ "سر! میں معذرت خواہ ہوں کہ میں نے آپ کا وقت ضائع کیا لیکن پلیز آپ ناراض نہ ہوں۔ میں نے اپنی سی کوشش کی تھی....."

میں نے رک کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے کہا۔ "تم سے کس نے کہا کہ میں تم سے ناراض ہوں؟ تم نے جس حد تک کوشش کرڈالی، مجھے تو تم سے اتنی بھی امید نہیں تھی۔ تم بہت باہمت اور باصلاحیت نوجوان ہو وسیم!" میں نے اس کا کندھا تھپکا۔

اس کا سینہ گویا کچھ چوڑا ہوگیا اور وہ ذرا تن کر کھڑا ہوگیا۔ قدرے بدلے بدلے سے لہجے میں بولا "سر! میری پہلی کوشش ناکام ہوگئی۔ کوئی بات نہیں۔ اس سے مجھے اس شخص کو سمجھنے میں مدد ملی ہے۔ اب میں اس پر ہاتھ ڈالوں گا تو مار نہیں کھاؤں گا۔ آپ بہرحال اطمینان رکھئے کہ یہ کام آپ اب میرے ہی ہاتھوں پایۂ تکمیل کو پہنچتے دیکھیں گے....." پھر وہ ذرا شرمیلے سے لہجے میں بولا۔ "اس موقع پر لفظ "پایۂ تکمیل" کا استعمال درست تھا نا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں..... میں خود کوئی ایسا زبان داں نہیں ہوں۔ میں نے تمہارا مطلب سمجھ لیا، بس یہی کافی ہے۔" میں نے پُرخیال نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم اس کام کو اب ذہن پر سوار رکھو۔ اب تو الٹا مجھے تمہاری جان کی فکر پڑ گئی ہے۔ وہ تمہارے ہاتھ سے نکل چکا ہے اور تم اس کی نظر میں آگئے ہو۔ اب تو تم اپنی جان ہی بچائے رکھو تو میرے لئے بڑی خوشی کی بات ہوگی۔"

اس کے چہرے پر وہی بچوں جیسی حماقت آمیز معصومیت عود کر آئی اور وہ آنکھیں گھماتے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ "میں سمجھ رہا ہوں۔ آپ مجھے ڈرا کر اس کام سے باز رکھنا چاہتے ہیں۔ لیکن میں ڈرپوک نہیں ہوں۔ میں بہت بہادر ہوں۔ جس کام کا عہد کرلوں اسے کرکے چھوڑتا ہوں۔ موت سے نہیں ڈرتا میں۔ مجھے معلوم ہے زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں ہے۔"

یہ بات کرکے اس نے مجھے لاجواب کردیا۔ اسی یقین کے سہارے تو میں خود ہر مصیبت سے ٹکرا جاتا تھا۔ میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وسیم! تم نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ ایک طویل عرصے کے بعد تم میری زندگی میں ایک ایسے شخص آئے ہو جو بظاہر کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے ہے۔ اس کے باوجود میں تمہارے بارے میں فیصلہ نہیں کرسکا کہ تم کیا چیز ہو۔"

"سر! یہ فیصلہ تو میں خود بھی اپنے بارے میں نہیں کرسکا۔" وہ سر جھکا کر ذرا شرما کر بولا۔ "میں پہلے بھی آپ کو بتا چکا ہوں کہ میں خود بھی اپنی تلاش میں ہوں۔ میں آپ کے پیچھے اس لئے زیادہ لگا رہتا ہوں کہ شاید آپ کی مدد سے میں اپنے آپ کو تلاش کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔"

"تم مجھے صرف یہ بتادو کہ کیا واقعی تم اتنے ہی بے وقوف ہو جتنے شکل سے نظر آتے ہو؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"سر! کوئی شخص بھلا خود اپنے بارے میں کیسے بتا سکتا ہے کہ وہ کتنا بے وقوف ہے؟" اس نے نہایت معصومیت سے سوال کیا۔ سوال واقعی معقول تھا۔ انسان کو گڑبڑا دینے والا تھا۔ پھر وہ سینہ پھلاتے ہوئے بولا۔ "کون کہتا ہے میں بے وقوف ہوں یا شکل سے بے وقوف نظر آتا ہوں؟ آپ مجھ سے یقیناً مذاق کرتے ہیں سر! آپ یقیناً مجھے پیار سے بے وقوف کہتے ہیں۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ عقلمند نظر آنے کا دعویٰ کرنا بھی درحقیقت بے وقوف نظر آنے ہی کی ایک کوشش تھی۔ کیا وہ یہ کوشش شعوری طور پر کرتا تھا؟ کیا وہ اپنی عقلمندی کا دعویٰ کرتے وقت دل ہی دل میں کہہ رہا ہوتا تھا۔ پلیز..... دیکھئے مجھ پر عقلمند ہونے کا شبہ مت کیجئے..... ساری دنیا کی طرح مجھے احمق ہی سمجھتے رہیے..... آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا۔ "میری امی تو کہتی ہیں میرے چہرے پر ذہانت برستی ہے۔ آنکھوں سے دانائی جھلکتی ہے۔ خصوصاً جب میں نے عینک لگائی ہوتی ہے۔"

"ماں کی بات چھوڑو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ماؤں کی تو نظر ہی دوسری ہوتی ہے۔ انہیں تو اپنے بدشکل بچے بھی حسین ترین نظر آتے ہیں۔ صورت سے چُغد دکھائی دینے والے بھی انہیں افلاطون معلوم ہوتے ہیں....." میں کہتے کہتے یکدم رک گیا۔ یہ تو ایک عام خیال، ایک مشہور نظریہ تھا۔ وسیم کے معاملے میں کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ جو کچھ وہ دنیا کی نظر سے چھپائے پھرتا تھا، ماں کی نظر اس تک پہنچتی ہو؟

مجھے نہیں معلوم، کیوں میں نے اس لمحے وسیم کو مزید کوئی نصیحت وغیرہ نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ ایک طویل سانس لے کر میں نے گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "اچھا..... ٹھیک ہے۔ اگر اے نن تمہارے ہاتھ آتا ہے تو اسے ضرور پکڑنا۔ لیکن بس ذرا احتیاط رکھنا۔"

"یہ کی نا آپ نے ہمت بڑھانے والی بات۔" وہ باچھیں پھیلا کر بولا۔ "اب آپ جلد ہی اے نن کو اپنے قدموں میں دیکھیں گے اور امید ہے اس کے بعد آپ بڑے بڑے کام میرے سپرد کیا کریں گے۔"

مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہورہا تھا تاہم میں نے اپنے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔ اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے سے پہلے میں نے چوکیدار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وسیم سے کہا۔ "اسے ذرا چیک اپ کے لئے ڈاکٹر کے پاس بھجوادو۔ دروازہ اس کی کمر پر گرا ہے۔ کہیں زیادہ چوٹ نہ آگئی ہو۔"

اس وقت تک چوکیدار کراہنا بند کرچکا تھا اور بڑی توجہ سے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ میری بات سنتے ہی اس نے کمر پر ہاتھ رکھ کر دوبارہ کراہنا شروع کردیا۔ وسیم سر ہلا کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "دیکھا آپ نے؟ یہ اصل میں چوٹ کا نہیں، شرمندگی کا درد ہے۔"

یہ چوکیدار اتنا ناکارہ نہیں ہے جتنا آج ثابت ہوا ہے۔ شاید اسے اپنے اس عظیم الشان بجٹے کو دیکھتے ہوئے یقین نہیں آرہا کہ وہ اتنا مختصرالوجود اور کسی بندر کا فرسٹ کزن نظر آنے والا شخص اس کے سامنے سے نکل گیا اور یہ کچھ بھی نہ کرسکا۔ اپنی شرمندگی کو چھپانے کے لئے یہ ہائے ہائے کر رہا ہے۔ اب میں اتنا احمق بھی نہیں کہ اتنی سی بات نہ سمجھ سکوں۔"

"خیر... میرے خیال میں تو تم سرے سے احمق ہو ہی نہیں۔" میں نے گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "لوگ گیٹ اپ کر کے شکل بدلتے ہیں، تم نے اس طرح بدلی ہوئی ہے۔"

وہ خالص شاعرانہ انداز میں آداب بجا لاتے ہوئے بولا۔ "ذرہ نوازی اور بندہ شناسی ہے آپ کی۔ اگر آپ نے اسی طرح میری ہمت افزائی اور قدر شناسی جاری رکھی تو میں ضرور کچھ نہ کچھ بن جاؤں گا۔"

میں گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے گھر آگیا۔ اس کے بعد چند دن ذرا سکون سے گزر گئے۔ کاروباری مصروفیات کے علاوہ کوئی خاص مصروفیت نہ رہی۔ ایڈم عرف ایڈی نے بھی دوبارہ رابطہ قائم نہیں کیا۔ میرا خیال تھا کہ وسیم نے اے نن کو پکڑنے کی جو کوشش کی تھی اس کے بارے میں ضرور وہ فون کر کے تصدیق کرنا چاہے گا کہ کیا یہ میری ہدایت پر ہوا تھا۔ لیکن اس کا فون نہیں آیا۔ خود اے نن نے بھی رابطہ قائم کرنے یا شکل دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ساری ہلچل زیرِ آب چلی گئی تھی۔ اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔

ایڈم نے ہنی سے فون پر بات کرانے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس وعدے پر عمل نہیں ہوا تھا۔ مجھے اس کے وعدے پر یقین بھی ذرا کم ہی تھا۔ مجھے ہنی کے بارے میں ذرا تشویش ضرور تھی لیکن ساتھ ہی نہ جانے کیوں امید سی تھی کہ وہ لوگ اس پر تشدد نہیں کریں گے۔ کم از کم اس حد تک ایڈم نے سچ ہی کہا تھا کہ غداری کے باوجود وہ ان کے لئے ایک قیمتی اثاثہ تھی۔ اس پر ان کی خاصی محنت ہو چکی تھی اور جن چیزوں پر وہ محنت کر چکے ہوتے تھے انہیں ضائع کرنے کے عادی معلوم نہیں ہوتے تھے۔

مجھے یہ سکوت اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ کاروباری مصروفیات اپنی جگہ تھیں لیکن ان کے دوران بھی ذہن بار بار دوسرے معاملات کی طرف چلا جاتا تھا۔ خصوصاً یہ احساس ایک بار پھر ستانے لگا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی سرا کسی صورت ہاتھ نہیں آرہا تھا۔ پھر ایک روز مجھے اکرام بیگ یاد آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ خفیہ ایجنسیاں اس سے جو تفتیش کر رہی تھیں اس کا کیا نتیجہ برآمد ہوا۔ مجھ سے تو کسی نے کچھ پوچھنے کے لئے بھی رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ فارن منسٹر حفیظ صاحب کے ذریعے اپنے آپ کو ہر معاملے سے بری الذمہ قرار دلوانے اور تفتیش سے مستثنیٰ رہنے کا فائدہ تو ہوا تھا۔ لیکن ساتھ ہی یہ نقصان بھی تھا کہ مجھے اس معاملے سے بالکل لاتعلق کر دیا گیا تھا۔

سرکاری ایجنسیوں کے وسائل بے شمار تھے۔ ان کے پاس بے پناہ تجربہ تھا، بیکراں اختیارات تھے۔ اگر میں ان کی تفتیش کے نتائج سے استفادہ کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو میری معلومات میں یقیناً کچھ نہ کچھ اضافہ ہو سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید انہوں نے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم کر لیا ہو۔ شاید وہ اس سلسلے میں صحیح راستے پر چل نکلے ہوں۔

میں نے فیصلہ کیا کہ اس ضمن میں سب سے پہلے اکرام بیگ سے ملاقات کر کے دیکھنا چاہئے کہ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟ میں نے اس کے لئے اِدھر اُدھر فون کئے تو پتا چلا کہ اسے ایک قلعے میں رکھا گیا ہے اور تفتیش جاری ہے۔ ڈی آئی جی صاحب بھی مجھے اس سے ملنے کی اجازت نہیں دے سکتے تھے۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ اس کے لئے مجھے وزارتِ داخلہ سے خصوصی اجازت نامہ حاصل کرنا پڑے گا۔

یہ میرے لئے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ حفیظ صاحب ان دوران غیر ملکی دورے سے واپس آچکے تھے اور اسلام آباد میں تھے۔ مجھے اسلام آباد فون کر کے ان سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔ پہلے میں نے ان سے پوچھا کہ انہیں سازش کی کوئی تفصیل معلوم ہوئی تھی یا نہیں؟

وہ عدم دلچسپی سے بولے۔ "برخوردار! میں آج ہی تو غیر ملکی دورے سے آیا ہوں۔ مجھے فرصت ہی نہیں ملی اس طرف توجہ دینے کی۔ ویسے بھی ابھی اس معاملے کو چند روز ہی تو ہوئے ہیں۔ سرکاری مشینری تو بعض اوقات ایسے معاملات میں مہینوں الجھی رہتی ہے۔"

میں نے انہیں بتایا کہ میں اکرام بیگ سے ملنا چاہتا تھا اور اس کے لئے وزارتِ داخلہ کا خصوصی اجازت نامہ درکار تھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "وہ میرا ڈیپارٹمنٹ تو نہیں ہے لیکن بہرحال میں اس منسٹری میں فون کر دیتا ہوں۔ وہ بے چارے ہماری کوئی بات ٹالتے نہیں۔ تمہیں کل کوریئر سروس سے اجازت نامہ موصول ہو جائے گا۔ لیکن تم اس خبیث سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"

"سر! آپ تو اس معاملے میں کوئی دلچسپی لے نہیں رہے۔ میں نے سوچا، میں ہی جا کر دیکھ لوں کہ تفتیش کہاں تک پہنچی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تم تو خود مجھے کوئی خفیہ ایجنسی معلوم ہونے لگے ہو۔" وہ بولے۔

"کیا کریں سر! ہم بے چارے عوام کو سرکار کے حصے کا بھی کچھ کام کرنا پڑتا ہے نا۔" میں نے جواب دیا۔

"چلو... تم اپنا شوق پورا کر لو۔" وہ خوشدلی سے بولے۔ "مجھے اپنے کچھ ضروری کوائف بتا دو۔ تمہیں جو اجازت نامہ جاری کیا جائے گا اس میں وہ کوائف درج کئے جائیں گے۔" انہوں نے چند باتیں پوچھیں جو میں نے انہیں بتا دیں۔

دوسرے روز کوریئر سروس سے مجھے خط مل گیا اور میں اسی شام قلعے جا پہنچا۔ قلعے کا جو حصہ تفتیشی سیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا وہاں ایک دیو قامت اور سانولے سے ڈی ایس پی نے میرا استقبال کیا۔ اس کے آفس میں ملگجا سا اندھیرا تھا۔ سلاخوں والی کھڑکیوں سے بہت کم روشنی اندر آرہی تھی۔ اس کی میز کے گرد لکڑی کی بھاری بھرکم کرسیوں پر اسی جیسے سانولے اور کرخت صورت سے تین چار آدمی سر جھکائے کچھ پُراسرار سے انداز میں خاموش بیٹھے تھے۔

میرا اجازت نامہ دیکھ کر ڈی ایس پی سر اٹھاتے ہوئے ہلکی سی ناگواری سے بولا۔ "ٹھیک ہے۔ اجازت نامہ آج سے ہی کارآمد ہے، پھر بھی اگر آپ ایک آدھ دن صبر کر لیتے اور ہمیں پیشگی اطلاع کر دیتے کہ آپ فلاں قیدی سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں، تو اچھا ہوتا۔ اس طرح اچانک ملاقات کے لئے چلے آنا تو اچھا نہیں ہوتا۔ آپ کو معلوم ہے یہ خصوصی تفتیشی سنٹر ہے۔ ملک بھر میں مشہور ہے۔ ملزمان کے ساتھ اکثر تفتیش جاری رہتی ہے۔ بعض اوقات ملزم اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ اسے ملاقاتی کے سامنے پیش کیا جا سکے۔"

"اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ ملاقات کرانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"نہیں۔ میں نے یہ تو نہیں کہا۔" وہ ٹوپی اٹھا کر سر پر رکھتے ہوئے جلدی سے بولا۔ "آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔" اس نے ایک لمحے توقف کیا۔ "آپ کوئی خاص ہی آدمی معلوم ہوتے ہیں جو آپ کو یہ اجازت نامہ جاری ہوا ہے۔"

"نہیں۔ میں تو بہت معمولی سا آدمی ہوں۔" میں نے نرمی سے کہا۔

وہ ایک شخص کو اشارہ کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ مجھے بس مختصر سی ملاقات ہی کرنی ہے۔ جہاں وہ ہے وہیں مل لوں گا۔"

ڈی ایس پی عجیب سے انداز میں مسکرا دیا۔ اس کی شخصیت کو دہشت ناک حد تک بارعب کہا جا سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر وہ غیظ و غضب کی حالت میں کسی معمولی اور عام سے آدمی کی طرف دیکھ لیتا ہوگا تو اس کا پیشاب خطا ہو جاتا ہوگا۔

اس کے موٹے موٹے ہونٹ ایک لمحے کے لئے بھنچ گئے، پھر وہ میز پر ذرا جھکتے ہوئے بولا۔ "جہاں وہ ہے وہاں آپ نہ ہی جائیں تو اچھا ہے چوہدری صاحب۔ آپ سوٹ بوٹ پہننے والے معزز آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ مدتوں تک اپنے ملنے جلنے والوں کو افسانے سناتے رہیں گے۔ ویسے بھی اس اجازت نامے میں ہمیں اکرام بیگ سے صرف آپ کی ملاقات کرانے کا حکم دیا گیا ہے، آپ کو قلعے کی سیر کرانے کی ہدایت نہیں کی گئی۔ قلعے کے وہ حصے دوسرے ہیں جو سیر کرنے کے قابل ہیں اور عوام کے لئے کھلے ہیں۔ یہ ایک الگ دنیا ہے چوہدری صاحب! یہاں پہلو بہ پہلو دو الگ جہان آباد ہیں۔ یہ دوسری دنیا آپ کی نظر سے اوجھل ہی رہے تو بہتر ہے۔"

وہ اپنے ماتحت کے ساتھ باہر چلا گیا اور دیر تک واپس نہ آیا۔ اس دوران کمرے میں مختلف باوردی اور بے وردی لوگوں کی آمدورفت جاری رہی۔ بیشتر لوگوں کی صورتوں پر مجھے ایک عجیب سی کرختگی اور خشونت نمایاں محسوس ہوئی۔

ڈی ایس پی کمرے میں واپس نہیں آیا۔ کافی دیر بعد ڈھیلی ڈھالی ملیشیا کی شلوار قمیص والا ایک جلاد صورت سا آدمی اندر آیا اور سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "چوہدری محمد افضل آپ ہی ہیں نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ گویا میری آنے والی نسلوں پر احسان کرتے ہوئے بولا۔ "آیئے..... اکرام بیگ سے آپ کی ملاقات کرا دیتے ہیں۔"

میں اس کی رہنمائی میں کمرے سے نکلا تو وہ مجھے ایک راہداری میں گھما کر اسی کمرے کے عقب میں ایک برآمدے میں لے گیا۔ وہاں دیواروں پر میل اور کائی سی جمی ہوئی تھی۔ نمی اس قدر تھی کہ کہیں کہیں پانی اوس کی طرح چمک رہا تھا۔ موسم ٹھنڈا نہیں تھا مگر

وہاں ایک عجیب سی نحوست، ایک عجیب سی بے بستگی پھیلی ہوئی تھی جس کے اثر سے رگ و پے میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔

ملاقات کے لئے اکرام بیگ کسی خصوصی کمرے یا الگ جگہ پر نہیں، وہیں برآمدے میں ایک دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے آس پاس بھی کوئی ایسی چیز موجود نہیں تھی جس پر بیٹھ کر میں اس سے بات کر سکتا۔ ملیشیا کی شلوار قمیص والا جلاد صورت سا آدمی چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ "لیں جی.... کرلیں ملاقات.... زیادہ لمبی ملاقات مت کیجئے گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ میں اکرام بیگ کے سامنے دم بخود کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں۔ چند ہی دن میں اس کی تو حالت بدل گئی تھی۔ پہلی نظر میں تو شاید اس کا کوئی پرانا شناسا بھی نہ جان پاتا کہ یہ وہی اکرام بیگ تھا جس کے وجود میں بجلیاں سی مقید محسوس ہوتی تھیں، جس سے عام آدمی کا آنکھ ملا کر بات کرنا مشکل تھا۔ جس کے لباس سے قیمتی فرانسیسی کلون کی مہک اٹھتی تھی۔

شاید اسے یہاں لانے سے پہلے تھوڑا بہت اہتمام کیا گیا تھا۔ اس کی کچھ صفائی ستھرائی کی گئی تھی لیکن اس سے کچھ زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔ اس کے بال گیلے تھے۔ چہرہ سوجا ہوا اور جگہ جگہ سے نیلا تھا۔ ہونٹ متورم اور کٹے پھٹے تھے۔ وہ اس طرح ٹانگیں پھیلائے، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا جیسے اس کے جسم میں جان نہ ہو۔ مجھے دیکھ کر اس نے ہلنے کی کوشش کی لیکن بُری طرح کراہ کر رہ گیا۔

"میری ذلت کا تماشا دیکھنے آئے ہو چوہدری؟" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔

"بعض ذلتیں مقدر میں ہوتی ہیں لیکن میرا خیال ہے بعض خود بھی خریدی جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور میرے نظریے کے مطابق موجودہ ذلت تم نے خود خریدی ہے۔ تم ایک نفیس انسان کے ساتھ بہترین عہدے پر کام کر رہے تھے۔ بہترین مراعات، سہولتیں اور دنیا بھر کی نعمتیں تمہیں حاصل تھیں۔ تم نے خود ان سب پہ لات ماردی۔"

"ہاں... مجھے یہ تسلیم ہے۔" اس کا لہجہ کچھ بدل گیا اور وہ مؤدبانہ مگر رو دینے والے انداز میں بولا۔ "میری حالت بہت خراب ہے.... مجھے یہاں سے چھڑا لیجئے چوہدری صاحب۔ آپ شاید تصور بھی نہیں کر سکتے کہ یہاں میرے ساتھ کیا کچھ ہوا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے کہ میں زندہ کیسے ہوں! شاید بہت سخت جان تھا جو اب تک بچا ہوا ہوں۔ مجھے الٹا لٹکا کر نہ جانے کن کن چیزوں سے مارا گیا ہے۔ پلاس سے میرے ناخن کھینچے گئے ہیں... جسم سے بال کھینچ کھینچ کر اکھاڑے گئے ہیں..... سگریٹوں سے داغا گیا ہے.... چھ چھ جگ پانی پلا کر موٹے موٹے آدمی جوتوں سمیت میرے پیٹ پر کودتے رہے ہیں اور وہ بھی اس انتظام کے ساتھ کہ پیشاب نہ نکلنے پائے۔ گھنٹوں مجھے برف کی سلوں پر لٹایا گیا.... میرے غلاظت کے توبڑے باندھے گئے..... بجلی کے جھٹکے دیئے گئے.... بہت سی شرمناک باتیں ہیں جو میں آپ کو بتا نہیں سکتا.... ایک ٹانگ بھی ٹوٹ چکی ہے اور مجھے خطرہ ہے کہ اگر مزید ایک دن مجھے صحیح طبی امداد نہ ملی تو میں عمر بھر کے لئے معذور ہو جاؤں گا.... شاید مر ہی جاؤں۔ کبھی کبھی تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں مر ہی چکا ہوں۔ نہ جانے آپ سے کس طرح باتیں کر رہا ہوں.... صرف قوتِ ارادی کے سہارے۔ اب تو تکلیف کا احساس مر چکا ہے۔ خدا کے لئے چوہدری صاحب....!" وہ جملہ مکمل نہ کر سکا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

شاید بصد کوشش اس نے بوجھل پپوٹے ذرا اٹھائے اور ایک بار پھر بہت ہی اذیت بھرے انداز میں کراہ اٹھا۔ میں سمجھتا تھا غلط آدمیوں کے لئے میرا دل پتھر ہے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا پتھر کے کون کون سے گوشوں میں موم بھی دبا ہوا تھا۔ میرے دل میں اس کے لئے ہمدردی کی لہر ابھری لیکن میں نے سردست اسے دبایا تاہم بات نرم لہجے میں ہی کی۔ "تمہیں جو کچھ معلوم ہے تم انہیں کیوں نہیں دیتے؟"

"بتا چکا ہوں.... سب کچھ بتا چکا ہوں۔" اس کی آواز گہرے کنویں کی گہرائی سے آرہی تھی۔ "لیکن شاید یہاں انسان کی بات اس وقت بھی یقین نہیں کیا جاتا جب وہ سسک سسک کر.... تڑپ تڑپ کر دم توڑ دیتا ہے۔ وہ فرمائش کرتے رہتے ہیں، اور بتاؤ.... اور بتاؤ...."

"تم پولیس اور سی آئی اے وغیرہ میں نوکری کر چکے ہو۔ اب بھی تمہاری لائن کچھ ایسی ہی تھی۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "کئی بار یقیناً تمہاری وجہ سے.... تمہاری نشاندہی کی بنا پر کچھ نہ کچھ لوگ اسی طرح پکڑے گئے ہوں گے۔ ان کے ساتھ بھی کچھ ہوا ہوگا۔ ان میں سے کچھ بے گناہ بھی ہوں گے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہوا ان پر اور ان کے لواحقین پر کیا گزری ہوگی؟ جبکہ تو بے قصور بھی نہیں ہو۔"

"آپ مجھے جو احساس دلانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ مجھے پہلے دن ہی ہو گیا تھا....." وہ کراہا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی جا رہی تھی۔ آواز اتنی مدھم ہو چکی تھی کہ اس کی بات سننے کے لئے مجھے اکڑوں اس کے پاس بیٹھنا پڑا۔ وہ کربناک سی سرگوشی میں بولا۔ "مجھے ایسے ہی کسی بے گناہ کی بددعا لگی ہے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں بھی اس مشینری کے جبڑوں میں آسکتا ہوں جو انسانوں کو سڑک کے پتھر کی طرح پیس ڈالتی ہے۔ یہاں ایک آدمی ایسا بھی تھا جو کبھی میرے ماتحت کے طور پر کام کر چکا ہے۔ اس نے بھی میرا کوئی لحاظ نہیں کیا۔"

"تم نے انہیں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کیا بتایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ریڈ ڈاٹ.... ؟ یہ کیا ہے؟" اس نے چونکنے کی کوشش کی مگر اس میں شاید اذیت کے سوا کوئی تاثر دینے کی سکت نہیں تھی۔

"کیا تمہیں واقعی ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں تو پہلی بار یہ نام سن رہا ہوں۔" اس نے کراہتے ہوئے اپنا ہاتھ ہلانے کی کوشش کی۔ اس کی تین انگلیوں کے ناخن غائب تھے اور سوجا ہوا ہاتھ مُردوں کی طرح جھول رہا تھا۔

"تم جھوٹ بول رہے ہو۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"مجھ میں اب جھوٹ بولنے کی سکت نہیں رہی۔" اس کی سرگوشی ابھری۔

"تو پھر تم نے کس کی ہدایت پر فارن منسٹر صاحب کو قتل کرنے کی سازش کی؟"

"سازش وغیرہ تو میں نے کوئی نہیں کی۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ سازش کہاں تیار ہوئی۔ مجھے تو بس نوٹوں سے بھرے ایک بریف کیس نے مروادیا۔ ایک شخص نوٹوں سے بھرا بریف کیس لے کر میرے پاس آیا تھا.... میرا کام صرف اتنا تھا کہ وہ سگار حفیظ صاحب تک پہنچنے دوں اور اگر وہ اسے پینے نہ پائیں تو میں کسی نہ کسی طرح ایسی صورتِ حال پیدا کروں کہ وہ پی ہی لیں۔ اس کے علاوہ میری ذمے داری صرف اتنی تھی کہ جو ویٹر سگار سرو کرے اسے خیر و عافیت سے وہاں سے نکل جانے دوں۔ بس صرف اس خدمت کے عوض نوٹوں سے بھرا وہ بریف کیس میرا تھا اور کام مکمل ہو جانے کے بعد اتنی ہی مزید رقم میرے لئے سوئٹزرلینڈ میں کھولے گئے ایک اکاؤنٹ میں منتقل ہو جانی تھی۔"

"لیکن.... اکرام بیگ....!" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمہاری سروس کا ریکارڈ خاصا طویل ہونے کے باوجود بے داغ ہے۔ ایک عرصے سے تم حفیظ صاحب کے سیکیورٹی چیف ہو.... اور میری معلومات کے مطابق کچھ نہ کچھ عرصے کے لئے دوسری بڑی شخصیتوں کے سیکیورٹی کے عملے میں بھی شامل رہ چکے ہو۔ پہلے بھی تمہیں کبھی نہ کبھی ضرور اس قسم کی پیشکشوں کے ساتھ اپروچ کیا گیا ہوگا لیکن تم کبھی نہیں بکے۔"

"ہر آدمی کا بکنے کا ایک نہ ایک دن، ایک نہ ایک قیمت ہوتی ہے۔ جب وہ دن آتا ہے، وہ قیمت ملتی ہے، آدمی تبھی بکتا ہے...." وہ دردناک سی آہ بھر کر بولا۔ "بعض لوگوں کی زندگی میں وہ دن کبھی نہیں آتا، وہ قیمت کبھی نہیں لگتی جس پر وہ بک سکتے ہیں۔ یہ ان کی خوش قسمتی ہوتی ہے اور اس خوش قسمتی کی بدولت وہ "نہ بکنے والے لوگ" کہلاتے ہیں۔ قیمت اتنی بڑی تھی جتنا میں نے کبھی خواب بھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے سوئٹزرلینڈ میں بڑے لوگوں کے اکاؤنٹس کے صرف قصے سنے تھے.... نوٹوں سے بھرے بریف کیسوں کے تبادلے ہوتے دیکھے تھے.... لیکن اتنا بڑا کوئی بریف کیس بھر کر کبھی میرے سامنے نہیں رکھا گیا تھا.... سوئٹزرلینڈ میں کبھی میرے "اکاؤنٹ" کی کوئی بات نہیں ہوئی تھی.... اور پھر کام اتنا آسان تھا.... میں پھسل گیا.... میں نے اپنے آپ کو بیچ دیا.... حفیظ صاحب کو بیچ دیا جن کے مجھ پر کئی احسانات ہیں۔"

"اور پھسل کر تم کہاں پہنچے؟"

"تن ریزہ ریزہ لئے یہاں پڑا ہوں.... رگ رگ میں اذیتوں کے سمندر پھیل گئے ہیں.... رُواں رُواں ایک عجیب احساسِ ذلت میں جکڑا ہوا ہے۔ کاش میں مر ہی جاتا۔"

"اور نوٹوں سے بھرا ہوا وہ بریف کیس کہاں ہے؟"

"معلوم نہیں کس ایجنسی کے قبضے میں پہنچ چکا ہے.... اور معلوم نہیں کون کون اسے بانٹ کر کھا جائے۔ کاغذات میں نہ جانے اس کا ذکر آنے بھی پائے یا نہیں۔ شاید یہ کہانی کچھ اور ہی بن جائے۔ اگر ذکر آ بھی گیا تو نہ جانے اس کی مالیت سکڑ کر کتنی رہ جائے۔ سروس کے دوران میں نے ایسے بہت سے تماشے دیکھے ہیں۔"

"تو پھر کیسا رہا تمہارا بک جانا؟" میں نے ملائمت سے دریافت کیا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا سر سینے پر جھکتا جا رہا تھا۔ اس سے زمین پر بیٹھا بھی نہیں جا رہا تھا اور پہلو بدلنے کی بھی اس میں کچھ زیادہ سکت نہیں تھی۔

ایک لمحے بعد اس نے بڑی ہی تکلیف کے سے عالم میں سر اٹھایا اور ورم زدہ نیلے حلقوں میں تقریباً چھپی ہوئی آنکھوں کو بہ مشکل ذرا سا کھولتے ہوئے بولا۔ "آپ کو میری کہانی پر یقین آگیا یا نہیں؟" اس کی آواز اب سرگوشی سے بھی مدھم تھی۔

"میں اس سلسلے میں ابھی اپنا فیصلہ محفوظ رکھوں گا۔" میں نے کوئی واضح جواب نہ دیا۔

"خدا کے لئے میری باتوں پر یقین کر لیجئے۔" وہ گویا سسک کر بولا۔ "مجھ میں اب مزید کوئی قسم کھانے کی سکت نہیں ہے۔ میں نے ٹارچر کے دوران اتنی قسمیں کھائی ہیں جو شاید زندگی بھر کے لئے کافی ہیں۔ بشرطیکہ میں زندہ بچ سکا۔"

"میں ایک بار پھر پوچھ رہا ہوں.... کیا تم واقعی ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ نہیں جانتے؟" میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے دریافت کیا۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے ہونٹ بھی زخمی تھے اور مسکراہٹ بھی۔ ڈوبتی سی آواز میں وہ بولا۔ "شاید آپ کو میری باتوں پر یقین نہیں آیا.... آپ بھی اس قلعے کے جلادوں کی طرح ہیں...."

"جب آدمی اپنا اعتبار کھو دیتا ہے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "بہرحال میں تمہاری باتوں پر یقین کر لیتا ہوں۔"

"تو پھر آپ میری رہائی کی کوشش کریں گے؟" اس کی بجھتی ہوئی آنکھوں میں امید کی ایک موہوم سی کرن نمودار ہوئی۔ "میرے بیوی بچوں اور رشتے داروں کو تو معلوم بھی نہیں ہے کہ میں

ہوں کہاں۔ جب تک کسی کو پتا چل سکا.... اور جب تک میرے لئے قانونی یا طبی امداد کا کوئی بندوبست ہو سکا تب تک نہ جانے میرا کیا بن جائے....“

”یہ ایک مشکل کام ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”لیکن میں بہرحال اپنی سی کوشش کروں گا۔“

اسی لمحے اسے خون کی الٹی آگئی۔ اس میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ وہ کسی طرف کو جھک کر الٹی کر دیتا۔ اس کے کپڑے کچھ اور لتھڑ گئے۔ غلیظ خون گریبان میں چلا گیا۔ وہی تخیم شحیم اور سیاہ فام شخص جو مجھے وہاں چھوڑ کر گیا تھا، اچانک ہی نہ جانے کس طرف سے نمودار ہوا اور اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر ایک بچے کی طرح ایک جھٹکے سے، بیدردی کے ساتھ اٹھاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اب آپ جائیں جی.... ملاقات کا وقت ختم ہو گیا....“

دوسری طرف سے اسی قبیل کا ایک اور شخص آیا۔ وہ دونوں اکرام بیگ کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے اندر کی طرف لے گئے۔ آفس میں آکر میں نے ایک رجسٹر میں دستخط کئے، اپنے انگوٹھے کا نشان لگایا اور باہر آگیا۔ بوجھل دل کے ساتھ جب میں گاڑی میں بیٹھ کر قلعے کے عقب میں پہنچا تو ٹریفک معمول کے مطابق جاری تھا۔ وہی گاڑیوں اور انسانوں کا اژدہام تھا۔ وہی زندگی کی ہماہمی اور ہنگامہ خیزی تھی۔ بلند و بالا قلعے کی بن پٹ کی چھوٹی چھوٹی نیم تاریک کھڑکیوں اور کائی زدہ دیواروں کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا کیونکہ وہ روز نظر آنے والی مانوس چیزوں میں شامل تھا۔ شاید کبھی کسی کو خیال بھی نہ آتا ہو کہ سیلن اور کائی زدہ ان دیواروں کے پیچھے، نیم تاریک کوٹھڑیوں اور یخ بستہ تہ خانوں میں کیسی دنیا آباد ہے۔

مجھے ڈیوس روڈ پر ایک آفس میں کچھ کام تھا۔ میرا ارادہ اسٹیشن کی طرف سے گھوم کر جانے کا تھا۔ دو موریہ پل کے قریب جب میں سگنل پر روکنے کے لئے گاڑی کی رفتار کم کر رہا تھا تو مجھے ایک خفیف سا جھٹکا لگا۔ سڑک کے کنارے کاڑرائے کی جیکٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اے نن کسی فلمی ہیرو کے سے انداز میں کھڑا تھا۔ ظاہر ہے اس کی شخصیت کے ساتھ فلمی ہیرو والا انداز اپنے اندر ایک مضحکہ خیز تضاد رکھتا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے اسے پہلے ہی سے معلوم تھا کہ میں اِدھر سے گزروں گا اور وہ میری گاڑی کے انتظار میں تھا۔ اس نے دور ہی سے مجھے دیکھ لیا اور ہاتھ ہلا کر رکنے کا اشارہ کرنے لگا۔ میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ کیا ستم ظریفی تھی کہ میں نے اس کی تلاش میں ہرکارے دوڑا رکھے تھے۔ اسے کسی نہ کسی طرح پکڑنے اور قابو میں کرنے کے احکامات جاری کر رکھے تھے اور وہ خود ایک پُرہجوم سڑک پر، اُڑتی ہوئی دھول میں کھڑا مجھے ہاتھ دے کر روک رہا تھا۔

میں نے گاڑی اس کے قریب لے جا کر روکی اور وہ کچھ اسی طرح دروازہ کھول کر میرے برابر آن بیٹھا جیسے ویران سڑک کھڑی کوئی مشکوک سی حسینہ کسی امیرزادے کی گاڑی میں بیٹھ ہو۔

دروازہ بند کر کے اس نے ائرکنڈیشنڈ گاڑی کی خنکی میں گہ سانس لی اور پُرسکون لہجے میں بولا۔ ”شکر ہے یار چوہدری، تم جلد ہی آگئے ورنہ میں سوچ رہا تھا، یہاں کی دھول مٹی پھانک پھانک میرا تو ناک منہ بند ہو جائے گا اور مجھے کانوں سے سانس لینا پڑے گا۔“

انداز ایسا ہی تھا جیسے وہ میرا بے تکلف دوست تھا اور میں نے اسے وہاں ملنے کا ٹائم دیا ہوا تھا۔ میں نے گھور کر اسے دیکھا لیکن وہ میری نظروں سے بے نیاز، اپنی جیب سے ایک نفیس سی کنگھی نکال کر اپنی لمبی لمبی زلفیں درست کرنے لگا۔

میں نے خاموشی سے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ کنگھی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔ ”کیا بات ہے.... بہت چپ چپ ہو۔ کیا اکرام بیگ سے ملاقات خوشگوار نہیں رہی؟“

ایک لمحے کے لئے تو میری کھوپڑی گھوم گئی۔ آخر یہ لوگ کیا چیز تھے؟ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ میں اکرام بیگ سے ملاقات کے لئے گیا ہوں اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ میں ادھر سے گزروں گا۔

”اکرام بیگ سے بہت کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں۔“ میں نے یونہی کوئی خاص غور کئے بغیر ہوا میں تیر چھوڑا۔

وہ مجھے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے بولا۔ ”اب تم جوان ہو چکے ہو۔ اب تمہیں اس طرح بچوں والے بلف نہیں کرنے چاہئیں۔ اکرام بیگ بے چارہ ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کسی کو کیا بتائے گا، جب اسے خود ہی کچھ معلوم نہیں۔ وہ تو قربانی کا بکرا تھا۔ سلاٹر ہاؤس پہنچ گیا۔“

میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اکرام بیگ نے مجھے جو کچھ بتایا ٹھیک ہی بتایا تھا۔ اے نن بالوں پر ہاتھ پھیر کر بڑی بے نیازی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”دفع کرو اکرام بیگ کو۔ میں نے اس کے بارے میں جاننے کے لئے تم سے ملاقات کی زحمت نہیں کی۔“

”تو پھر کس لئے مجھے یہ اعزاز بخشا ہے؟“ میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

”اس چشمے والے بُدھُو کو تم نے میرے پیچھے لگایا تھا؟“ اس نے ہلکی سی خفگی سے پوچھا۔ میں سمجھ گیا کہ اس کا اشارہ وسیم احمد کی طرف تھا لیکن میں نے ایک بار پھر انجان بننے کی ہلکی پھلکی سی کوشش کر ڈالی حالانکہ مجھے معلوم تھا، اس مافوق الفطرت سے آدمی کے سامنے اس قسم کی کوششیں بے کار ہی تھیں اور میں ان کوششوں کو ناکام ہوتے دیکھ کر ہلکی سی کھسیاہٹ بھی محسوس کرتا تھا۔ پھر بھی غیر ارادی طور پر میں یکدم اعتراف نہیں کر پاتا تھا۔

”کون چشمے والا بُدھُو؟“ میں نے معصومیت سے پوچھا۔

”ایک تو تمہیں غیر ضروری موقعوں پر انجان بننے کی بڑی عادت ہے۔ حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ اس نے تقریباً وہی بات کہہ دی تھی جو میں خود ہی محسوس کر رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس چُغد نے ایک لمحے کے لئے مجھے چکر دے دیا تھا۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ اس کی شکل چُغدوں جیسی تھی لیکن گودام میں بند ہوتے ہی مجھے احساس ہو گیا تھا کہ میں چوٹ کھا گیا ہوں۔ اِس گدھے کو دیکھو.... بعد میں گودام میں گیس چھوڑ کر مجھے بے ہوش کرنے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔ یہ تم نے کس قسم کی چیزیں پال رکھی ہیں؟“

”پالنے والی اللہ کی ذات ہے.... میں کون ہوتا ہوں پالنے والا۔“ میں نے درویشانہ لہجے میں کہا۔

”وہ تمہارے آدمیوں میں سے نہیں ہے؟“ اے نن وثوق سے بولا۔ ”تمہارے جو دو چار آدمی میں نے دیکھے ہیں وہ تو بڑی ٹھیک ٹھاک چیز لگتے ہیں۔ کام کے لوگ ہیں۔ لیکن اس بے چارے کو معلوم نہیں تم نے کس چکر میں میرے پیچھے لگا دیا تھا۔ شکر کرو میرے ہاتھوں ضائع ہونے سے بچ گیا۔ آئندہ ایسی کسی مخلوق کو میرے پیچھے مت لگانا۔“

”تمہیں کیونکر خیال گزرا کہ اسے میں نے تمہارے پیچھے لگایا تھا؟“ میں نے دریافت کیا۔

”تمہارے سوا اس شہر میں اور کسے ہماری ذات سے اتنی دلچسپی ہے۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ وہ چُغد مجھے گودام میں بند کرنے کے بعد دوڑا دوڑا تمہارے پاس ہی گیا تھا کیونکہ مجھے رپورٹ ملی ہے کہ بعد میں تم اسی جگہ اسی ہونق کے ساتھ دیکھے گئے تھے۔ میرا وہاں واپس جا کر اس چُغد کو اٹھا لینے کا ارادہ تھا لیکن جب مجھے پتا چلا کہ تم اس کے ساتھ دیکھے گئے ہو تو میں نے ایک سرد آہ بھر کر صبر کر لینا ہی بہتر سمجھا۔ میں ویسے بھی بلا ضرورت کسی کو ہلاک کرنا پسند نہیں کرتا اور وہ تو مخلوق ہی ایسی تھی کہ اسے ہلاک کرنے کو دل نہیں چاہتا۔ ترس آتا ہے۔ پھر جب یہ معلوم ہوا کہ وہ تمہارے حکم کا غلام دکھائی دیتا ہے تو اسے بالکل ہی بخشنا پڑا۔ آخر تم دوست ہو ہمارے۔ تمہاری حماقتیں ہم معاف نہیں کریں گے تو کون معاف کرے گا۔“

”آپ کا یہ احسان بندہ مرتے دم تک نہیں بھولے گا ظلِ الٰہی!“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ”بس یہی بتانے کے لئے آپ نے مجھے شرفِ ملاقات بخشا تھا؟“

”نہیں۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ تم کیوں مجھ سے ملنے کے خواہشمند تھے اور اس کے لئے تمہیں ایسے الٹے سیدھے طریقے اختیار کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ تمہیں اگر اس خادم کی ضرورت ہو تو تم براہِ راست مجھے طلب کر سکتے ہو۔ میں سر کے بل تمہاری خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ وہ بڑی محبت سے بولا۔

”پہلے کی طرح سب مشین گن سے گولیاں برساتے ہوئے آؤ گے یا رائفل کا بٹ مار کر کھوپڑی توڑنے کی کوشش کرتے ہوئے؟“ میں نے بدستور تلخی سے کہا۔

”ارے نہیں یار!“ وہ ہنس کر بے تکلفی سے بولا۔ ”اب صورتِ حال بدل چکی ہے۔ اب ان چیزوں کی ضرورت نہیں۔ وہ کچھ اور مراحل تھے۔ ان کا کچھ اور پس منظر تھا۔ تاہم اس وقت بھی تمہیں ہلاک کرنا مقصود نہیں تھا۔ اب حالات کچھ اور ہیں۔ اب تو تم ہی کچھ مار دھاڑ کرو گے تو کرو گے، ہمارا تو اس قسم کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ تم ٹھنڈے دل سے ہمیں سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ ہم تو بڑے امن پسند لوگ ہیں۔“

”زیادہ اونچے درجے کے بدمعاش اور بین الاقوامی دہشت گرد اکثر یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ وہ بڑے امن پسند ہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہماری امن پسندی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ آج تک تمہیں یا تمہارے کسی ساتھی کو ہمارے ہاتھوں کوئی گزند نہیں پہنچی۔“

”ابھی تم کہہ رہے تھے کہ اگر میں تمہاری ضرورت محسوس کروں تو تمہیں بلا سکتا ہوں۔ مگر کس طرح؟ میرے پاس تو تم سے رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایڈم تو اکثر تمہیں فون کرتا رہتا ہے، اس سے کہہ دیا کرو کہ تم مجھ سے ملنا چاہتے ہو۔ مجھے فوراً پیغام مل جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر تم مجھ سے ملنے جلنے میں زیادہ سنجیدہ دکھائی دیئے تو تمہیں ایسا ٹرانسیٹر بھی دیا جا سکتا ہے۔“ اس نے اپنی جیکٹ کے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ بٹن سائز میں ایک روپے کے سکے جتنا تھا۔ اے نن سے جب پہلی بار ٹکراؤ ہوا تھا تو ایسا ایک ٹرانسیٹر میرے ہاتھ لگ چکا تھا جسے میں نے کھول کھال کر دیکھنے میں خراب کر دیا تھا۔

اے نن کے انتہائی مکار ہونے میں تو مجھے کوئی شک ہی نہیں تھا۔ ظاہر ہے وہ مجھے کوئی ایسی چیز نہیں دے سکتا تھا جس سے مجھے ان لوگوں کا سراغ پانے میں کوئی مدد مل سکتی۔ ایک بار ایڈم مجھ سے فون پر بات کر رہا تھا تو میں نے معلوم کرانے کی کوشش کی تھی کہ وہ کس نمبر سے بول رہا ہے.... اور اس حیرت انگیز انکشاف نے مجھے چکرا دیا تھا کہ وہ کسی ایسے نمبر سے بول رہا تھا جس کا سراغ لگانا ممکن نہیں تھا۔

میں نے جلے کٹے سے انداز میں کہا۔ ”بس رہنے دو۔ اب تم اتنے حسین بھی نہیں ہو کہ میں تم سے ملنے کی آرزو میں تڑپنے لگوں۔“

”وہ وقت آنے ہی والا ہے جب تم ہم سے ملنے کی آرزو میں تڑپنے لگو گے۔“ وہ کسی بندر کی طرح مسکراتے ہوئے بولا۔

"خدا مجھے وہ وقت نہ دکھائے۔" میں نے بہ آواز بلند اور صدق دل سے دُعا کی۔ اسی دوران ڈیوس روڈ پر اس دفتر کی عمارت آگئی جس میں مجھے کام تھا۔ میں نے گاڑی اس کی طرف موڑنے سے پہلے رفتار بالکل کم کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس عمارت میں کام ہے۔ تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

اس کا استخوانی ہاتھ کسی آہنی پنجے کی طرح اسٹیئرنگ وھیل پر آن جما اور وہ ہموار لہجے میں بولا۔ "سیدھے چلتے رہو۔ اپنا کام کسی اور وقت پہ اٹھا رکھو۔"

"تمہیں کیونکر یقین ہے کہ میں تمہاری بات مان لوں گا؟" میں نے گاڑی روکتے ہوئے پوچھا۔

"میری بات ماننے کے سوا تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں۔ کیونکہ تمہاری گاڑی کے نیچے ایک ریموٹ کنٹرول پلاسٹک بم چپکا ہوا ہے۔ ریموٹ کنٹرول جس جگہ موجود ہے وہاں تم کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں ہماری اس تمام گفتگو کا ایک ایک لفظ سنا جا رہا ہے اور اگر اس گفتگو کا اختتام میرے بولے ہوئے ایک کوڈ ورڈ پر نہ ہوا تو بم پھٹ جائے گا۔ اگر اس بم کو وہاں سے الگ کرنے کی کوشش کی گئی تب بھی وہ پھٹ جائے گا۔ اسے وہاں سے بہ حفاظت الگ کرنے کا طریقہ صرف مجھے معلوم ہے۔ میرے کوڈ ورڈ کے بغیر اگر تم نے گاڑی سے اتر کر بھاگنے کی کوشش کی تب بھی بم پھٹ جائے گا۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ میرے ساتھ تم بھی تو مرو گے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میری تو کوئی بات نہیں۔ میں تو اپنی طبعی عمر پوری کر چکا ہوں۔ بونس میں جی رہا ہوں لیکن تمہاری اس نئی نئی اور کارآمد جوانی کے ضائع جانے کا تو ایک زمانے کو افسوس ہوگا۔" وہ مربیانہ لہجے میں بولا۔ "اور اس بات کو اپنے بلف کی طرح مت سمجھنا۔"

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ رسک نہیں لینا چاہئے۔ ذرا آگے جا کر میں نے کہا۔ "تم لوگ الیکٹرونکس میں بہت آگے ہو۔"

"ہم ہر چیز میں بہت آگے ہیں۔ میل جول بڑھے گا تو تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ ہم تمہیں بھی بہت آگے لے جانا چاہتے ہیں۔ صرف تمہارا ذہن تھوڑا سا بدل جانے کا انتظار ہے۔"

"میں پہلے بھی کئی مرتبہ پوچھ چکا ہوں' آخر مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟" میں نے جھنجلا کر پوچھا۔

"بہت جلد ہمارے بڑے تم سے آمنے سامنے بیٹھ کر بات کریں گے اور بس اب وہ وقت زیادہ دور نہیں ہے۔ میں یہ باتیں کرنے کا مجاز نہیں ہوں اور مجھے کچھ زیادہ معلومات بھی نہیں ہیں۔"

"تو پھر تم میری گاڑی میں سوار کیوں ہوئے تھے؟ محض کچھ دیر بکواس کرنے کے لئے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"یہ بکواس نہیں۔ یہ سب ضروری باتیں ہوتی ہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ اتنی فضول باتوں کے لئے تم اتنا اہتمام کرتے ہو۔ کہیں گاڑی کے نیچے ریموٹ کنٹرول بم لگانا اور کہیں کوڈ ورڈ طے کرنا۔" میں نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔

"تمہارے لئے یہ تقریباً معمول کے کام ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "تم سے ملتے وقت تھوڑی بہت احتیاط تو رکھنی پڑتی ہے۔ تمہارے بارے میں یہ اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ تم کب کیا کر گزرو۔"

"میری نقل و حرکت کے بارے میں باخبر رہنے کے لئے میرے خیال میں تم لوگ الیکٹرونکس سے ہی سب سے زیادہ مدد لیتے ہو؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔ مگر اس کے علاوہ بھی بہت سے ذرائع ہیں۔" وہ بے نیازی سے بولا "ادھر موڑ لو۔" اس نے پی آئی اے آفس سے اپریال کی طرف مڑنے کا اشارہ کیا۔

"ارادے کیا ہیں؟ مجھے اغوا کرنا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ ہنس کر بولا۔ اس کی ہنسی میں بھی بندر کی خوخیاہٹ کی جھلک تھی۔ "تمہیں ہم بر قائمی ہوش و حواس اور جاگتی آنکھوں کے ساتھ اغوا کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ ہمارے بھی نہ جانے کس کس آدمی کو لے بیٹھو.... اور خود کو بھی ہلاکت میں ڈالو گے۔"

پھر وہ تحسین آمیز لہجے میں بولا "تمہارے اعصاب کی مضبوطی کا تو میں شروع سے قائل ہوں۔ اس وقت کچھ اور قائل ہو گیا ہوں۔ تم ایک ایسی گاڑی میں سفر کر رہے ہو جس کے نیچے بہت طاقتور پلاسٹک بم فٹ ہے۔ تمہیں کوئی خوف یا بے چینی محسوس نہیں ہو رہی؟"

"خوف یا بے چینی کا کیا فائدہ؟" میں نے بے نیازی سے کہا۔ "اوپر والے نے اگر موت لکھی ہوگی تو اسے میں روک نہیں سکتا۔ اور پھر میرے ساتھ تم بھی تو ہو۔ اگر مرا تو تمہیں ساتھ لے کر ہی مروں گا۔"

"بس یہیں روک دو۔" اچانک اس نے ایک جگہ سڑک کے کنارے موجود درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے گاڑی وہیں ملگجے اندھیرے میں روک دی۔ ایک لمحے کے لئے ہم دونوں بالکل ساکت بیٹھے رہے۔ صرف انجن کی نہایت ہلکی سی سرسراہٹ سنائی دیتی رہی۔

"تم پر کیا فالج گر گیا ہے؟" بالآخر میں نے پوچھا۔

وہ میرے الفاظ پر دھیان دیئے بغیر بولا "میرون کلر کی ایک کرولا ہمارے تعاقب میں تھی۔ لیکن وہ آگے نکلتی چلی گئی ہے اور غائب ہو چکی ہے۔ واپس بھی نہیں آئی اور آگے جا کر بھی کہیں نہیں رکی۔ کیا اس میں تمہارا آدمی تھا؟"

"خطرات جوں جوں بڑھ رہے ہیں' میں نے حفاظتی انتظامات اتنے ہی کم کر دیئے ہیں۔" میں نے جواب دیا "میں نے اب اپنے آدمیوں کو اپنے تعاقب میں رہنے سے منع کر دیا ہے۔"

"بہت خوب۔ بالکل ٹھیک کیا تم نے.... اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔"

"اگر وہ میرون کرولا غائب ہو چکی ہے تو تمہیں سمجھ لینا چاہئے کہ وہ ہمارے تعاقب میں نہیں تھی۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"میں بھی اب اسی نتیجے پر پہنچا ہوں۔" وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا "میں اب تمہاری گاڑی کے نیچے گھس کر ازراہِ مہربانی وہ پلاسٹک بم اتار دوں گا لیکن اس دوران تم دور جا کر گن وغیرہ سے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرنا۔ تم خود نقصان میں رہو گے۔ اس طرح کا ارادہ بھی مت کرنا۔ اگر تم گاڑی سے اترے تو میں بم اتارنے کا کام درمیان میں ہی چھوڑ دوں گا اور تمہارا خدا ہی حافظ ہوگا۔"

"وہ تو اب بھی ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

اس نے دروازہ کھولتے ہوئے کسی ناقابلِ فہم سی زبان میں چند الفاظ بولے۔ وہ غالباً اس کے کوڈ ورڈز تھے۔ پھر وہ اترا اور سانپ کی طرح گاڑی کے نیچے گھس گیا۔ کافی دیر تک وہ گاڑی کے نیچے سے نہ نکلا۔ یوں خالی بیٹھے بیٹھے مجھے تناؤ سا محسوس ہونے لگا۔ صورتِ حال مجھے کچھ مضحکہ خیز بھی لگ رہی تھی۔ میں کتنی سعادت مندی سے اے ٹن کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر ہنسی آگئی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے اس کی ہر بات پر یقین کرنا چاہئے تھا یا نہیں؟ لیکن فی الحال اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ اب میں اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ بم اتارنے کے بجائے درحقیقت اب بم نصب کر رہا ہو؟

پھر میں نے اپنے آپ کو پہلے کی طرح تن بہ تقدیر چھوڑ دیا اور کھڑکی سے سر نکال کر ذرا بلند آواز میں خفگی سے پوچھا "اے ٹن! تم زندہ بھی ہو یا فوت ہو چکے ہو؟"

"بے صبری مت کرو یار!" اس کی گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔ "یہ بڑا نازک معاملہ ہے اور یہاں روشنی بھی نہیں ہے۔ میں نے منہ سے ٹارچ پکڑی ہوئی ہے۔"

چند لمحے بعد بالآخر وہ گاڑی کے نیچے سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں چپٹا سا ایک مستطیل ڈبا تھا جس کے ساتھ کچھ تاریں اور فیوز نما باریک سی چیزیں جھول رہی تھیں۔

"اب یہ بے ضرر ہو چکا ہے۔" وہ ڈبا ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے بولا۔ اس کا دوسرا ہاتھ پشت پر تھا۔ پھر اس نے وہ ڈبا کچھ دور نشیب میں بہتی ہوئی نہر میں پھینک دیا۔

"لیکن بم کے خطرے سے نجات پاتے ہی کوئی الٹی سیدھی حرکت کرنے پر مت تُل جانا۔" وہ فوراً ہی پیچھے کیا ہوا ہاتھ سامنے لاتے ہوئے بولا۔ اس ہاتھ میں عجیب سی ساخت کا ایک ریوالور تھا۔ جس کی نال بہت موٹی تھی۔

"بڑی خوفناک گن ہے یہ۔ اس کی گولی جسم میں بالشت بھر چوڑا سوراخ کر دیتی ہے۔ گولی چھو کر بھی گزر جائے تو موت یقینی ہو جاتی ہے۔" وہ سرسری سے لہجے میں بولا۔

میں ساکت کھڑا رہا۔ جونہی اس نے ڈبا نہر میں پھینکا تھا' مجھے بلاشبہ ایک ثانیے کے لئے خیال آیا تھا کہ مجھے کچھ کرنا چاہئے لیکن اس فتنے سے کسی کچے پن کی توقع نہیں رکھی جا سکتی تھی۔

اسی اثنا میں مجھے درختوں کے عقب سے ایک شخص جھولتا ہوا سا اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ہیولے سے وہ دُبلا پتلا ہی معلوم ہوتا تھا۔ درختوں کے عقب میں ڈھلوان کچی زمین تھی جو سرسبز گھاس سے ڈھکی ہوئی تھی۔ اسی مختصر سی ڈھلان پر چڑھ کر وہ سڑک کے کنارے آگیا اور کچی مٹی پر چلتا ہوا بے پروائی سے سیٹی بجاتا ہوا ہماری طرف آنے لگا۔

اب میں اسے ذرا صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں تھے۔ سر پر فلیٹ ہیٹ تھا اور آنکھوں پر کچھ ایسا ابھرا ہوا سا تاریک چشمہ تھا جیسے کولہو کے بیل کی آنکھوں پر کھوپے چڑھے ہوں پتلی اور لٹکی ہوئی فومانچو کٹ مونچھیں تھیں۔ انہی سے میل کھاتی پتلی اور نوکیلی سی داڑھی تھی جو صرف ٹھوڑی تک محدود تھی۔ وہ سیاہ جیکٹ اور پتلون میں تھا۔ بغل میں چھڑی دبی ہوئی تھی جیسی عموماً پرانے زمانے میں شرفا چہل قدمی کے لئے جاتے وقت بغل میں دبا لیتے تھے۔ حالانکہ چلتے وقت اس سے سہارا لینا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ مجموعی طور پر وہ پرانی فلموں کا جوکر یا کامیڈین ہی معلوم ہو رہا تھا۔

اے ٹن نے اسے آتے دیکھ کر گن جیب میں ڈال لی لیکن اس کا ہاتھ بھی اس کے ساتھ ہی جیب میں رہا۔ جوکر نما اس شخص کے ہونٹوں کے گوشے میں سگریٹ جھول رہی تھی جو سلگی ہوئی نہیں تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ سیٹی کس طرح بجا رہا تھا۔ ہونٹوں کے گوشے میں سگریٹ دبا کر سیٹی سے اچھی خاصی دُھن الاپنا ذرا مہارت کا کام تھا۔ اے ٹن شک زدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ میری طرف سے بھی غافل نہیں تھا۔ میں یقیناً اس کی جیب میں موجود گن کی زد پر تھا۔

قریب آکر جوکر نما شخص رک گیا اور خواہ مخواہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا "ماچس ہوگی آپ کے پاس؟" اس کی آواز عجیب سی تھی۔ کچھ میٹھی میٹھی سی۔ کچھ پھٹی پھٹی سی۔

میری جیب میں لائٹر موجود تھا حالانکہ میں سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن میں نے لائٹر نکالنے کے لئے جیب میں ہاتھ نہیں ڈالا۔ مبادا اے ٹن یہ نہ سمجھ لے کہ میں گن نکالنے لگا ہوں۔

"معاف کیجئے گا' میں سگریٹ نہیں پیتا۔"میں نے شائستگی سے کہا۔

"اور میں بھی...." اے نن نے فوراً کہا "لیکن دوسروں کی سگریٹ سلگانے کا بندوبست رکھتا ہوں۔" اس نے وہی بات کی تھی جو کبھی کبھار میں بھی کرتا تھا۔

اس نے بائیں ہاتھ سے جیب سے ایک خوبصورت لائٹر نکالا اور اجنبی کی سگریٹ کو شعلہ دکھایا۔ میرے لئے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کا اصل مقصد سگریٹ سلگانا نہیں' اجنبی کے چہرے کا روشنی میں جائزہ لینا تھا۔ نہایت آہستگی سے وہ مجھ سے مزید ایک قدم دور کھسک گیا تھا تاکہ ایک ہی گن سے ہم دونوں کو کور کرسکے تاہم گن ابھی تک اس کی جیب میں ہی تھی۔

اجنبی کی سگریٹ سلگانے کے بعد اس نے لائٹر بجھاتے ہوئے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا "بہت ہی گھٹیا قسم کا میک اَپ ہے تمہارا۔"

میں بھی دیکھ چکا تھا کہ اجنبی کی داڑھی مونچھیں اور گال پر موٹا سا مسّا وغیرہ نقلی تھا لیکن میں نے فی الحال خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا تھا۔ صرف یہی نہیں ہیٹ اور عجیب سا تاریک چشمہ بھی تھا۔ کچھ صحیح اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ ان چیزوں کے بغیر اس کی صورت کیسی ہوگی۔

وہ اگر اے نن کی بات کو جھٹلانے کی کوشش کرتا تو اس کا مشکوک قرار پانا یقینی ہوجاتا لیکن اس نے پہلے ہی کی طرح باچھیں پھیلا دیں اور ذرا بھی چونکے یا نروس ہوئے بغیر اسی بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا "خیر ہو آپ کی...." اس کی آواز کچھ ایسی تھی جیسی عام طور پر ان لوگوں کی ہوجاتی ہے جنہیں زیادہ چیخ چیخ کر بولنا پڑتا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے تاثرات بدل گئے۔

وہ سگریٹ کا ایک کش لگا کر بے حد غمناک سے لہجے میں بولا۔ "آپ تو خیر خاصے جہاندیدہ اور معزز سے لوگ معلوم ہوتے ہیں۔ میرے میک اَپ کو تو اگر دن میں دس سال کا بچہ بھی دیکھ لے تو وہ بھی پہچان لیتا ہے کہ یہ چیزیں نقلی ہیں...."

اے نن لائٹر جیب میں رکھ چکا تھا۔ بائیں ہاتھ سے یکدم وہ اجنبی کا بازو پکڑتے ہوئے پھنکارا۔ "کون ہو تم؟"

مجھے اندازہ تھا کہ اس کی گرفت میں اجنبی کے بازو کا کیا حال ہوگا۔ اجنبی یکدم سہم گیا۔ وہ گھگیائی ہوئی سی آواز میں بولا "مائی باپ! آپ ایک دم کیوں غصے میں آگئے؟ آپ کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہوگئی؟ میں تو خود آپ کو یہی بتانے لگا تھا کہ میں کون ہوں۔ حضور! آپ کے بچے جئیں.... میں تو تھیٹر کا ایک معمولی سا.... بیس روپے دہاڑی والا ایکٹر ہوں...."

اب مجھے احساس ہوا کہ واقعی اس کی آواز اور لب و لہجہ تھیٹر کے روایتی سے ایکٹروں والا ہی تھا۔ وہ تقریباً گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ "سرجی! میں تو آپ کی تھوڑی سی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے رکا تھا.... آپ تو الٹا مجھ پر گرم ہونے لگے...."

"تھیٹر کے ایکٹر نقلی داڑھی مونچھیں لگائے سڑکوں پر نہیں پھرتے۔" اے نن غرایا لیکن اب اس کے لہجے میں پہلے جیسی [illegible] نہیں تھی۔

"یہی تو میں آپ کو بتانے لگا تھا جناب عالی! میں تو آپ کو [illegible] مظلومیت کی کہانی سنانا چاہتا تھا۔" وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔

"ہمارے پاس کہانی سننے کا ٹائم نہیں ہے۔ مختصر بات کرو۔" اے نن نے حکم دیا اور ساتھ ہی اس کی جیبیں وغیرہ تھپتھپا کر دیکھیں۔ "کیا واقعی تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے؟"

"ہتھیار....؟" اجنبی کراہ کر بولا گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ اس بات پر ہنسے یا روئے۔ "بادشاہو! میری جیب میں روٹی کھانے کو پیسے نہیں ہیں' آپ ہتھیار کی بات کر رہے ہیں۔"

"جن کی جیب میں روٹی کھانے کے لئے پیسے نہیں ہوتے' کبھی کبھار وہ بھی ہتھیار اٹھا لیا کرتے ہیں۔" اے نن بولا۔ اب اس کے لہجے میں سختی نہیں رہی تھی۔

"یہی تو میں آپ کو بتانے لگا تھا جی۔ ہم جیسے بے کار لوگوں [illegible] اس کا بھی حوصلہ نہیں ہوتا۔" وہ اب گویا کچھ سنبھلتے ہوئے بولا۔ "پانچ سال ہوگئے ہیں جی تھیٹر کی.... فن کی خدمت کرتے ہوئے۔ ابھی تک چار چھ لائنوں والے رول ملتے ہیں اور ان کے لئے بعض اوقات میک اَپ مین کو ہمارا تو گیٹ اَپ کرنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ جس ڈرامے کی کاسٹ ذرا لمبی ہو' اس میں میک اَپ مین بڑے آرام سے کہہ دیتا ہے۔ یار! ٹلو بادشاہ! تم تو گھر سے ہی کوئی بھی داڑھی مونچھ لگا کر آجانا۔ تمہاری طرف کون سا کسی نے غور سے دیکھنا ہے' چنانچہ جناب.... اکثر ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔"

پھر وہ اپنی فوما نچو کٹ مونچھ درست کرتے ہوئے بولا "آج کل جو آرٹس کونسل میں ڈراما چل رہا ہے نا' چھ متوالے' اس کی کاسٹ پوری بارات جتنی لمبی ہے۔ میں اس میں تھانیدار کا رول کر رہا ہوں۔ چار لائن کا رول ہے.... اب ذرا ملاحظہ فرمائیں یہ داڑھی مونچھیں میں تھانیدار کے رول کے لئے لگا کر جا رہا ہوں۔ تھانیداروں کی ایسی مونچھیں یا ایسی داڑھی آپ نے کبھی دیکھی ہے؟ لیکن میں کیا کروں.... گھر میں کوئی بارعب قسم کی داڑھی مونچھیں موجود ہی نہیں تھیں۔ میں نے سوچا چلو یہی لگا لو.... کچھ کامیڈی ہی پیدا ہوجائے گی۔ شکر ہے وردی تو پروڈکشن والوں سے مل جاتی ہے۔"

پھر اچانک اسے جیسے خیال آیا اور وہ ذرا چونک کر امید بھرے لہجے میں بولا "آپ لوگوں نے دیکھا ہے یہ ڈراما؟ چھ متوالے' میرا رول ہے تو چار لائن کا.... لیکن بڑی جان ہے اس میں۔"

"نہیں بچہ! ہمارے پاس ڈرامے اور مسخروں کی اچھل کود وغیرہ دیکھنے کے لئے وقت نہیں ہے۔" اے نن نے اس کا بازو چھوڑ دیا اور وہ اسے سہلانے لگا۔

"اگر آپ پسند فرمائیں اور میرے ساتھ چلیں تو میں دو پاس آپ کی خدمت میں پیش کرسکتا ہوں۔ مجھے ذرا آپ کی گاڑی میں لفٹ مل جائے گی۔ ورنہ ابھی مجھے مال تک پیدل جا کر کسی سے لفٹ لینی پڑے گی۔"

"ابے چل.... اپنا کام کر۔" اے نن نے اسے دھکا دیا۔

"واہ میرے مولا....!" وہ آسمان کی طرف دیکھ کر فریادی سے انداز میں بولا "ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ کسی زمانے میں فنکاروں کی یہ بے قدری ہوگی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر چھڑی گھماتا آگے چل دیا لیکن دوسرے ہی لمحے پھر پلٹ پڑا۔

"معاف کیجئے گا.... باتوں باتوں میں سگریٹ ہی بجھ گئی۔ ذرا پھر زحمت کیجئے گا۔" اس نے بجھی ہوئی سگریٹ دکھائی۔

اے نن نے غالباً اسے ڈانٹ کر بھگانے کا ارادہ کیا لیکن پھر ہونٹ بھینچ کر جیب میں ہاتھ ڈالا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اب وہ اسٹیج آرٹسٹ کی طرف سے بالکل بے پروا ہوچکا تھا۔ اس کی زیادہ توجہ صرف مجھ پر تھی لیکن یہ میں بھی نہیں دیکھ سکا کہ کب اسٹیج آرٹسٹ کا ہاتھ بجلی کی طرح حرکت میں آیا اور دوسرے ہی لمحے اے نن پیٹ سے زمین پر پڑا تھا۔

اسٹیج آرٹسٹ نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی چھڑی اتنی پھرتی سے اس کے سر پر رسید کی تھی کہ میری آنکھیں بھی صحیح طور پر اس حرکت کو نہیں دیکھ سکی تھیں۔ اس حرکت کا ردِعمل بھی میرے لئے ناقابلِ یقین تھا۔ میرے خیال میں اگر اے نن کی کھوپڑی پر چھڑی زیادہ زور سے رسید کی جاتی تو چھڑی ٹوٹ جانی چاہئے تھی اور اے نن کو زیادہ سے زیادہ کچھ لڑکھڑا جانا چاہئے تھا۔ اس کا یوں پیٹ کے بل گر جانا میرے لئے ناقابلِ فہم تھا۔ میں تو خود یہ سوچ کر اب اس پر کچا ہاتھ نہیں ڈالتا تھا کہ اس سخت جان مخلوق پر اگر کوئی وار کیا جائے تو وہ پوری طرح کارگر ہونا چاہئے۔

"کمال کردیا تم نے وسیم احمد!" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم ایسا نپا تلا وار کرسکتے ہو.... اور وہ بھی اے نن پر...."

"تو آپ نے مجھے پہچان لیا؟" وہ اپنے بہروپ میں مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں" میں نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا "پہلے تو نہیں پہچانا تھا لیکن جب تم آگے روانہ ہوئے تو اپنی اصل چال چلنے لگے۔ میں نے تمہاری چال سے تمہیں پہچانا۔ لیکن ان چند معمولی سی چیزوں نے واقعی تمہاری صورت یکسر تبدیل کرکے رکھ دی ہے۔ آواز بھی تم نے بڑی عمدگی سے بدل لی تھی.... لیکن سب سے زیادہ میں تمہارے نفسیاتی حربے سے متاثر ہوا ہوں۔ تم نے کمال یہ کیا کہ ایسی معمولی چیزوں سے مدد لی جو صاف طور پر نقلی نظر آجائیں.... اور فوراً ہی اس بات کو تسلیم بھی کرلیا۔ کہانی بھی اچھی گھڑی.... اور لہجے میں بھی کمال کا اعتماد تھا۔ اگر تمہارا میک اَپ زیادہ عمدہ ہوتا اور تم زیادہ چالاک بننے کی کوشش کرتے تو تمہاری ایک نہ چلتی۔ تم نے اپنی اصل شکل کی طرف توجہ جانے ہی نہیں دی۔ بعض اوقات سادہ ترین طریقۂ کار ہی عمدہ ترین طریقۂ کار ہوتا ہے۔"

"معلوم نہیں سر!" وہ شرمیلے سے لہجے میں بولا "میں تو زیادہ باریکیوں سے واقف نہیں ہوں۔ میں نے تو اس لئے ان چیزوں کی مدد لی تھی کہ میرے پاس ان کے سوا کچھ تھا ہی نہیں.... احتیاطاً اپنے ساتھ صرف یہی لئے پھر رہا تھا۔ گاڑی بھی ایک دوست کی لی ہوئی تھی۔ کیونکہ یہ بندر کا بچہ میری گاڑی پہچاننے لگا تھا۔ اگر میں اس میں اس کا تعاقب کرتا تو یہ فوراً کھٹک جاتا۔"

"کھٹک تو اب بھی گیا تھا۔ لیکن تم نے اچھا کیا کہ بہت آگے نکل گئے۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئے۔" میں نے کہا۔

"میں نے تو اتنی احتیاط کی کہ واپس بھی اس گاڑی میں نہیں آیا۔ لفٹ لے کر آیا ہوں.... اور خاصی دور سے آپ کو دیکھ کر باقی فاصلہ پیدل طے کیا۔"

"تم ٹپک کہاں سے پڑے؟" میں نے پوچھا۔

"جب سے یہ میرے ہاتھ آکر نکل گیا تھا' میرا ذہن اسی میں پھنسا ہوا تھا۔ میں تو پاگل سا ہوگیا تھا۔ شہر میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ پتا نہیں میں نے کتنا پٹرول پھونک ڈالا' ٹائر گھسا ڈالے۔ بہرحال اتنی سچی طلب اور لگن کے ساتھ انسان کسی کو ڈھونڈ رہا ہو تو وہ مل ضرور جاتا ہے۔" وہ اپنے نظر کے چشمے پر سے وہ تاریک شیشے اتارنے لگا جو اس نے کلپ کے ذریعے لگائے ہوئے تھے۔ پھر اس نے داڑھی مونچھیں اور ہیٹ اتارا۔ یکدم ہی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی جگہ کوئی اور نوجوان آن کھڑا ہوا ہو۔ اب وہ وہی پہلے والا وسیم احمد تھا۔

میں نے اس کی بغل میں دبی ہوئی چھڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جادو کی چھڑی معلوم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں تو اے نن کے سر پر چھڑی مار کر اسے نہیں لٹایا جاسکتا تھا۔"

"یہ چھڑی کہاں ہے سر!" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "یہ تو ٹھوس اسٹیل کی راڈ ہے۔ مجھے تو اے نن سے زیادہ واسطہ نہیں پڑا لیکن جب یہ گودام کا دروازہ توڑ کر بھاگا تھا تو مجھے بھی کچھ کچھ اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ کیا چیز ہے۔"

"اسٹیل کی راڈ؟" میں نے دہرایا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ ہونق نظر آنے والے' چھریرے جسم کے اس نوجوان کا وار بھی معمولی نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اے نن پر جھکتے ہوئے کہا' "میں تو تم سے باتوں میں لگ گیا۔ اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی۔ کہیں دنیا سے گزر ہی نہ گیا ہو۔"

اس کی پیشانی سے کچھ خون بہہ کر بھنوؤں اور آنکھوں کے پاس جم گیا تھا۔ چند لمحوں میں ہی خون کا رنگ سیاہ ہوچکا تھا۔ وہ زمین پر ترچھا پڑا تھا۔ میں نے اسے سیدھا کیا۔ اس کا دل دھڑک

رہا تھا۔ نبض بھی ٹھیک ہی چل رہی تھی۔

وسیم اس کی نبض وغیرہ دیکھے بغیر ہی یقین سے بولا "اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید مرچکا ہوتا۔ لیکن مجھے معلوم ہے اس کی کھوپڑی کی ہڈی صرف معمولی سی چٹخی ہوگی۔"

"کہیں یہ چوٹ اس کے لئے مہلک ثابت نہ ہو۔ میں اسے لے چلتا ہوں۔" میں نے اسے بازوؤں پر اٹھالیا۔ وہ مختصرالوجود تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں نے لوہے کے کسی ٹھوس مجسمے کو اٹھالیا ہو۔ اسے اٹھانے کا تجربہ ایک بار پہلے بھی ہوچکا تھا لیکن اس وقت وہ ہوش میں تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کا وزن پہلے سے بھی کچھ بڑھ گیا تھا۔

میں نے اسے گاڑی میں ڈالا۔ گاڑی کو نیچے سے چیک کیا۔ بونٹ کھول کر دیکھا۔ کم از کم مجھے کہیں کوئی بم دکھائی نہ دیا۔ میں نے وسیم کو ساتھ بٹھایا اور اللہ کا نام لے کر گاڑی اسٹارٹ کی۔ خیریت ہی رہی کوئی بم وغیرہ نہیں پھٹا۔ میں نے گیئر لگادیا۔

پُل پر پہنچ کر میں نے وسیم سے پوچھا "تمہاری گاڑی کہاں کھڑی ہے؟"

"جمخانے سے ذرا آگے۔" اس نے بتایا۔

"میں تمہیں وہاں تک چھوڑ دیتا ہوں۔ تم اپنی گاڑی میں ہی واپس جانا۔" میں نے کہا۔ میرا ارادہ اس وقت ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی میں جانے کا تھا اور وہ چونکہ میرا خفیہ ہیڈکوارٹر تھا اس لئے میں وسیم کو فی الحال وہاں تک لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ البتہ جب وہ میرے خاص رفیقوں میں شامل ہوجاتا تو بات دوسری تھی۔ میں اب اس سلسلے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا تھا۔

وسیم اپنی داڑھی مونچھیں اور عینک کے رنگین شیشے بڑی احتیاط سے جیبوں میں رکھتے ہوئے بولا "پھر کبھی کام آئیں گے۔" پھر وہ ایک نظر اے نن کی طرف دیکھ کر بولا "شکر ہے میں آپ کی امانت آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا۔"

میں اس کے انداز پر مسکرادیا۔ وہ اے نن کے لئے امانت کا لفظ ایسے استعمال کر رہا تھا جیسے وہ کوئی چیز تھی جسے وہ مجھ تک پہنچانے کے لئے اٹھائے پھر رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "وسیم! تمہارے بارے میں میرا شبہ درست معلوم ہوتا ہے۔ تم ہو واقعی کوئی پہنچی ہوئی چیز۔"

وہ سر جھکا کر اپنے مخصوص شرمیلے سے انداز میں بولا "سر! میں تو بس یونہی سا آدمی ہوں۔۔۔۔ سوچتا ہوں' آپ کی صحبت اور رہنمائی میسر رہی تو کسی قابل ہوجاؤں گا۔"

"پالیسی بھی تمہاری اچھی ہے۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا' "جب کوئی تمہیں احمق قرار دینے کی کوشش کرتا ہے تو تم سادہ لوح انسانوں والے انداز میں یہ بتانے کی کوشش کرتے ہو کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے' تم تو بڑے عقلمند ہو۔ اور جب کوئی اس شبے میں مبتلا ہوتا ہے کہ تم بہت ہوشیار' بہت باصلاحیت ہو تو تم شرمیلے انداز میں تردید شروع کردیتے ہو کہ تم تو بالکل سیدھے اور معصوم ہو۔ ہر وقت دوسرے کو اپنے بارے میں کنفیوژ رکھتے ہو تاکہ تمہارے بارے میں فیصلہ نہ کرپائے کہ تم درحقیقت کیا چیز ہو۔"

"میری سمجھ میں آپ کی باتیں نہیں آتیں سر! بہرحال آپ مرضی کے مالک ہیں۔" وہ بدستور شرمیلے انداز میں مسکراتے ہوئے عاجزی سے بولا "میرے بارے میں آپ جو بھی سمجھتے ہیں' جو کہتے ہیں' ٹھیک ہی ہوگا۔ ہم تو آنکھیں بند کرکے آپ کی ہر بات پر بھروسا کرتے ہیں۔"

چند منٹ میں ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک کے کنارے وسیم کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا "سر! آپ کوئی اور ایسا ہی ذرا مشکل سا۔۔۔۔ ذرا مزے دار سا کام میرے سپرد کیجئے گا تاکہ آپ میرے بارے میں کچھ اور اندازے لگا سکیں۔ مجھے تو اپنے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ آپ ہی میرا نفسیاتی تجزیہ کرکے میری معلومات میں اضافہ کرتے رہئے گا۔"

"میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔" میں نے اسے تسلی دی اور گاڑی آگے بڑھادی۔

دوسری سڑک پر پہنچ کر میں نے گاڑی واپس موڑی اور فاصلہ طے کرکے جم خانہ آگیا۔ میں اب گاڑی کا ریڈیو بھی استعمال کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے جم خانہ سے فون پر ٹونی سے رابطہ کیا اور اسے فوراً جم خانہ پہنچنے کی ہدایت کی۔

فون کرکے میں واپس پارکنگ لاٹ میں گاڑی میں آبیٹھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ہی تھا لیکن میری نظر پچھلی سیٹ پر تھی جہاں میں نے اے نن کو لٹایا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک بے حس و حرکت تھا۔ اس شیطان سی مخلوق کا کچھ پتہ نہیں تھا کہ کب اٹھ بیٹھے۔ پارکنگ لاٹ میں کہیں کہیں الیکٹرک پول پر گلوب لگے ہوئے تھے مگر ان میں سے ایک آدھ ہی روشن تھا۔ وہاں ملگجا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔

ٹونی نے وہاں پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ وہ اپنی گاڑی کچھ فاصلے پر پارک کرکے میری گاڑی پہچان کر اس طرف آگیا۔ میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا "اپنی گاڑی یہیں لے آؤ۔" پھر میں نے اے نن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس شخص کو تمہاری گاڑی میں منتقل کرنا ہے اور میں ہی اسے دو نمبر لے کر جاؤں گا۔ تم میری گاڑی لے جاؤ اور اپنے کسی خاص الیکٹرونک انجینئر سے اسے باریک بینی سے چیک کراؤ کہ اس میں کوئی مشکوک یا غیر متعلقہ آلہ۔۔۔۔ کسی بھی قسم کا کوئی فالتو الیکٹرونک ڈیوائس کہیں فٹ تو نہیں ہے۔ اس کی ایک ایک تار' ایک ایک پُرزہ' ایک ایک نٹ بولٹ غرضیکہ ہر چیز بہت ہی تفصیل سے چیک ہونی چاہئے۔ خواہ اس میں کتنا ہی وقت لگ جائے۔"

"میں سمجھ گیا سر!" ٹونی نے جواب دیا۔ اس نے اپنی گاڑی میری گاڑی کے قریب لا کھڑی کی اور چند ہی لمحوں میں ہم نے اے نن کو اس کی گاڑی میں منتقل کردیا۔ میں اسے لے کر روانہ ہوا

اور ٹونی میری گاڑی لے گیا۔

دو نمبر پہنچ کر میں نے اے نن کو مس ٹریپ کے حوالے کرتے ہوئے کہا "اسے گیسٹ روم' میں پہنچا دو اور ہمارے ڈاکٹر سے کہنا کہ اس کی ذرا توجہ سے دیکھ بھال اور علاج کریں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی کھوپڑی کی ہڈی چٹخ گئی ہوگی۔"

مس ٹریپ نے اس کے مختصر وجود کو دیکھتے ہوئے بے پروائی سے اسے اٹھانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں اوندھے منہ گرتے گرتے بچی۔ پھر اس نے سنبھل کر اسے بازوؤں پر اٹھایا۔ عام عورت تو شاید بے ہوش پڑے اے نن کو ہلا بھی نہ سکتی۔

"یہ اتنا بھاری کیوں ہے؟" مس ٹریپ نے حیرت سے پوچھا' "ایسا لگتا ہے جیسے گوشت پوست کا نہیں' لوہے کا بنا ہوا ہے۔"

"یہ تو میں خود بھی نہیں سمجھ سکا کہ ایسا کیوں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "یہ بڑی عجوبۂ روزگار قسم کی مخلوق ہے۔ میڈیکل سائنس کے ماہرین اس کی جسمانی ساخت کا تجزیہ کریں تو شاید کچھ پتا چل سکے۔ اسے گیسٹ ہاؤس' میں رکھ کر اسی طرح اس کی حفاظت کرنا جیسے یہ کوئی جن ہے اور فرار ہونے کی فکر میں ہے۔"

گیسٹ ہاؤس' اس طویل و عریض کوٹھی کے تہ خانے میں واقع چند کمروں پر مشتمل تھا جہاں ان لوگوں کو ٹھہرایا جاتا تھا جنہیں خصوصی تحویل میں رکھنا مقصود ہوتا تھا۔ وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہونا کسی کے لئے تقریباً ناممکن ہی تھا۔ ہر طرح کے حفاظتی انتظامات موجود تھے۔ اگر کوئی ان حفاظتی انتظامات کے باوجود گیسٹ ہاؤس سے فرار ہونے میں اس حد تک کامیاب ہوجاتا کہ کمروں اور راہداریوں سے نکل آتا تب بھی وہ تہ خانے سے باہر آنے کا راستہ تلاش نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اسٹیل اور کنکریٹ کی بہت بڑی قبر تھی جس میں ہر قسم کی آسائشیں موجود تھیں اور وقت پڑنے پر اذیتوں میں بھی تبدیل ہوسکتی تھیں۔ یہاں قدم قدم پر مختلف میکینزم موجود تھے۔ کچھ فرائض انجام دینے کے لئے وہاں دو تین افراد بھی موجود رہتے تھے۔ وہ کمانڈو تھے۔

مس ٹریپ کے تہ خانے کی طرف جاتے ہی میں وہاں سے لوٹ آیا۔ گھر آکر میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ لاشعوری طور پر مجھے ایڈم کے فون کا انتظار تھا۔ میرا خیال تھا کہ ان لوگوں کو اے نن کی گمشدگی سے آگاہ ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ پہلے تو عموماً ریڈ ڈاٹ سے متعلق کسی بھی واقعے کے کچھ دیر بعد ہی ایڈم کا فون آجاتا تھا لیکن اس رات بہت دیر تک انتظار کرنے کے باوجود فون نہیں آیا۔ حالانکہ میرا خیال تھا' اے نن کا میرے ہتھے چڑھ جانا ریڈ ڈاٹ کے لئے کافی اہم واقعہ ہوگا۔ انتظار کرتے کرتے بالآخر میں سوگیا۔

دوسرے روز میں معمول کے مطابق تیار ہوکر آفس گیا۔ آفس میں ہی ٹونی کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ گاڑی کا معائنہ جاری ہے۔ اس میں ابھی تک تو کوئی مشکوک چیز یا الیکٹرونک ڈیوائس نہیں ملا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ شام تک معائنہ مکمل ہوجائے گا۔ میں نے گاڑی میں آلٹریشن کراکے جو چند چیزیں اپنی ضرورت اور آڑے وقتوں کے استعمال کے لئے فٹ کر رکھی تھیں ان کا بھی معائنہ ہونا تھا۔

آفس میں ہی دوپہر کے قریب مس ٹریپ کا فون آیا۔ اس نے بتایا کہ اے نن کو ہوش آگیا تھا لیکن اس کی حالت کچھ عجیب سی تھی۔ وہ کچھ بول نہیں رہا تھا بس خالی خالی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا' کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ ہمارے ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ دماغی چوٹ آنے کے بعد اس قسم کی کیفیت غیر متوقع نہیں تھی۔ یہ عارضی بھی ہوسکتی تھی اور مستقل بھی۔ دماغی چوٹ کے بعد بعض لوگ ہمیشہ کے لئے یادداشت کھو بیٹھتے تھے جسے بنیاد بنا کر ہمارے ہاں نہ جانے کتنی فلموں کی کہانیاں لکھی گئی تھیں۔ ڈاکٹر نے اسے مزید دوائیں وغیرہ دے کر سلا دیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دُعا کی کہ اس کی یادداشت مستقل طور پر غائب نہ ہو' کہیں میری ساری تگ و دو اور بے چارے وسیم کی محنت ضائع ہی چلی جائے۔

اس روز بھی ایڈم کا فون نہیں آیا۔ شام کو میں گھر چلا گیا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد میں ڈائننگ روم میں بیٹھا کافی پی رہا تھا کہ ملازم نے ایک بڑا سا ڈبل وزیٹنگ کارڈ لا کر دیا۔ کارڈ ملک ریاض راہی کا تھا جس کی چاروں سائڈز چھپی ہوئی تھیں۔ اس کے نام کے ساتھ اس کی پارٹی میں اس کا عہدہ اور نہ جانے کس کس انجمن میں اس کے کتنے عہدے درج تھے۔

کارڈ طارق خان نے میرے پاس بھجوایا تھا۔ ابھی میں اسے الٹ پلٹ کر دیکھ ہی رہا تھا کہ انٹرکام کا بزر بجا۔ گیٹ ہاؤس سے طارق خان ہی بول رہا تھا۔ "سر! یہ آدمی جس کا میں نے کارڈ بھجوایا ہے' ایک چھوٹے موٹے جلوس کی سی شکل میں آیا ہے۔۔۔ ایک لینڈ کروزر اور ایک مرسیڈیز آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔۔۔ کُل دس آدمی ہیں جن میں سے چار تو شکلوں سے ہی ڈاکو لگ رہے ہیں۔۔۔ ان کے پاس سیون ایم کی رائفلیں بھی ہیں۔۔۔۔ ملک ریاض راہی کا کہنا ہے کہ [illegible] آپ کا دوست ہے اور آپ کو کسی تقریب کی دعوت دینے آیا ہے۔"

"نہیں ڈرائنگ روم میں بھیج دو۔" میں نے ہنس کر کہا' "ایک ملاقات میں ہی اسے دوستی کا دعویٰ ہوگیا ہے۔ جہاں تک زیادہ آدمیوں اور اسلحے کا تعلق ہے تو بعض ملاقاتوں کے لئے جانے کا ان لوگوں کا یہی اسٹائل ہوتا ہے۔"

"ان کا اسلحہ گیٹ پر ہی رکھوانا ہے؟" طارق خان نے پوچھا۔

"نہیں' بُرا منا جائیں گے۔ آنے دو۔۔۔۔ بس ویسے ہی ذرا الرٹ رہنا۔" میں نے کہا۔

میں نے ہال میں آکر کھڑکی کے شیشے سے باہر دیکھا۔ طارق

خان نے گیٹ ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے بٹن دبادیا تھا اور گیٹ کھل رہا تھا۔ گیٹ پورا کھل چکا تو ایک بڑی لینڈ کروزر اور نیلی مرسڈیز آگے پیچھے ڈرائیو وے میں داخل ہوئیں۔ میرا ایک ملازم برآمدے میں ان کے استقبال کے لئے موجود تھا۔ وہ انہیں ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

کافی ختم کرکے میں بھی ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ طویل و عریض ڈرائنگ روم میں بڑی رونق اور گہما گہمی سی دکھائی دینے لگی تھی۔ صوفوں پر وہ لوگ خوب چوڑے ہو ہو کر بیٹھے تھے۔ بلکہ بعض تو تقریباً لیٹے ہوئے تھے۔ سگریٹوں اور سگار کے دھوئیں سے کمرا بھر گیا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہی کرسٹل کی بڑی بڑی فرانسیسی ایش ٹریز میں راکھ بکھری نظر آنے لگی تھی۔

ملک ریاض راہی مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر آگے آیا اور یوں گرمجوشی سے گلے ملا جیسے میرا بڑا پرانا اور مدت کا بچھڑا ہوا دوست ہو۔ اس نے میری پیٹھ پر خوب تھپکیاں دیں' مصافحہ کیا پھر اپنے ساتھ آنے والوں سے میرا تعارف کرانے لگا۔ "بھئی...یہ ہیں اپنے چوہدری صاحب' جن کی میں تمہارے سامنے تعریفیں کر رہا تھا... ملک کے بہت بڑے آدمی ہیں.... اور بڑے ہیرا آدمی ہیں... بڑے بندہ نواز ہیں.... اپنے جگری یار ہیں اور آگے چل کر یہ یاری اور بھی مضبوط ہوگی۔ لوہے کی طرح۔" ایک لمحے کے لئے وہ یوں میرے کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑا ہوگیا جیسے تصویر کھنچوا رہا ہو۔

اس کے ساتھ آنے والے سب لوگ باری باری اٹھ کر بڑی عقیدت اور احترام سے مجھ سے مصافحہ کرنے لگے گویا ملک ریاض راہی کی زبانی تعارف ہوتے ہی میں ان کی نظر میں بہت معتبر اور بزرگ ہستی بن گیا تھا۔

طارق خان نے درست کہا تھا۔ ان میں سے چار آدمی شکلوں سے ہی ڈاکو لگ رہے تھے۔ وہ چاروں ہی دراز قد' چوڑے چکلے اور سانولے تھے۔ ان کے چہروں پر خشونت' کرختگی اور کھردرا پن تھا جسے وہ اس وقت مہذبانہ مسکراہٹوں میں چھپانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں درندگی اور سرخی تھی۔ ان کے ہاتھ بھی کھردرے اور فولادی تھے۔

انہوں نے اپنی رائفلیں صوفوں کے ساتھ ٹکادی تھیں۔ وہ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیصوں میں تھے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ گولیوں کی پیٹیاں ان کی قمیصوں کے نیچے ان کے جسموں سے لپٹی ہوئی تھیں۔ چاروں ہی الجھی الجھی سی گھنی داڑھیوں والے تھے۔ پکی عمر کا ایک شخص ان کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ ان کی ٹولی میں وہ سب سے نمایاں شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے چہرے پر کھردرا پن اور سفاکی دوسروں سے زیادہ تھی۔ ان میں سے دو مختصر پگڑیاں بھی باندھے ہوئے تھے۔ باقی دو ننگے سر تھے۔ ان کے بال لمبے تھے۔

سردار نے مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد دونوں ہاتھ جوڑ کر بھی مجھے سلام کیا۔ "سلام مینڈا سائیں!" اس کی آواز کسی کھوہ میں غرّانے والے بھیڑیئے سے مشابہ تھی۔

"وعلیکم السلام۔" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہو[ئے] کہا۔

"چوہدری صاحب! آپ نے اس شیر جوان کو پہچانا نہیں[؟]" ملک ریاض نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا[۔] انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں ملک کی کسی انتہائی مشہور و معر[وف] ہستی کو پہچاننے سے قاصر رہا ہوں۔

میں نے نفی میں سرہلایا تو وہ بڑے پُرجوش لہجے میں بولا "ی[ہ] اپنا نورو ماچھی ہے۔ آج کے دور کا سب سے بڑا ڈکیت۔ اس [کے] سر کے لئے دس لاکھ روپے کا انعام مقرر ہے حکومت کی طر[ف] سے۔ یوں سمجھیں ہم دس لاکھ کا چیک جیب میں ڈالے پھر ر[ہے] ہیں۔" اس نے قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھ خود نورو ماچھی بھی [ہنسنے] لگا۔ اس کی ہنسی بھی بھیڑیئے کی غراہٹ سے ہی مشابہ تھی۔

ملک ریاض راہی گویا اس کے قابلِ فخر اور عظیم کارناموں [کی] تفصیل جاری رکھتے ہوئے بولا "چھیالیس تو قتل ہیں اس کے کھا[تے] میں۔ جن کی ایف آئی آر درج نہیں ہوسکی ان میں وہ شامل [نہیں] ہیں۔"

اب اس کے تینوں ساتھیوں نے قہقہہ لگایا اور ڈرائنگ ر[وم] میں ان کی آوازیں گونج کر رہ گئیں۔ اب مجھے یاد آرہا تھا کہ [میں] نے کچھ عرصہ پہلے واقعی کسی اخبار میں اشتہار پڑھا تھا جس میں نو[رو] ماچھی کی زندہ یا مردہ حالت میں گرفتاری پر دس لاکھ کے انعام [کا] اعلان کیا گیا تھا۔ شاید میں نے کبھی اسی قسم کا کوئی پوسٹر بھی کہ[یں] چسپاں دیکھا تھا لیکن جہاں تک مجھے یاد تھا' ان میں نورو ماچھی [کی] تصویر کافی مختلف معلوم ہو رہی تھی۔ وہ غالباً نورو کی نوجوانی [کی] تصویر تھی۔ پولیس کو شاید وہی میسر آسکی تھی۔ بہرحال یہ کوئی حیر[ت] کی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے اشتہارات میں عموماً ایسا ہی ہ[وتا] ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میرے سامنے سینہ تان کر کھ[ڑا] ہوا وہ شخص نورو ماچھی ہی تھا۔ اس کے ناک نقشے میں اس تصویر [کی] جھلک موجود تھی۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ اخبارات کے مطابق پورے صوبے [کی] پولیس جس کی تلاش میں تھی اور جس کے سر کے لئے دس لا[کھ] روپے کی خطیر رقم کا انعام مقرر تھا' وہ اپنے ساتھیوں اور ا[پنے] اسلحے سمیت ایک "معزز" زمیندار اور اس کے ساتھیوں کے ہم[راہ] شہر کی نہ جانے کن کن بھری پُری شاہراہوں سے گزرتا ہوا ایک ممتاز شہری اور بزنس مین کے گھر آیا تھا اور اب ڈرائنگ روم م[یں] کھڑا قہقہے لگا رہا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ جہاں بھی وہ پایا جاتا ہ[و] اس جگہ کے سوا باقی ہر جگہ پولیس اسے تلاش کرتی پھرتی ہ[و]۔ جنگلوں' بیابانوں اور پہاڑوں میں اس کی گرفتاری کے لئے محاصرے کرتی ہو۔

"بہت خوب.... بہت خوب۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا

"معزز صاحبان! آپ سب تشریف رکھئے۔" لفظ "معزز" پر میں نے زور دیا تھا۔

وہ پہلے ہی کی طرح پھیل کر بیٹھ چکے تو میں نے پوچھا "آپ لوگ کیا کھانا پینا پسند کریں گے؟"

ملک ریاض نے سب کی ترجمانی کا فریضہ انجام دیا۔ "جس جس چیز کو دل چاہے' منگوا لیجئے چوہدری صاحب! ہمیں تو کسی چیز سے انکار ہی نہیں ہے۔ کیوں نورو؟"

"بالکل ٹھیک پئے فرماندے او مینڈا سائیں!" نورو ماچھی نے غراہٹ نما آواز میں جواب دیا اور ساتھ ہی وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنس دیئے۔

میں نے ملازموں سے کہہ کر ان کی خاطر مدارت کا بندوبست کرایا۔ اس دوران خوش گپیوں' بلند آہنگ قہقہوں اور ہنسی مذاق کا سلسلہ چلتا رہا۔ کھانے پینے کی چیزوں پر انہوں نے جنّات کی طرح ہاتھ صاف کیا۔

اسی دوران ملک ریاض گپ شپ جاری رکھتے ہوئے بولا' "میں آپ کی طرف آرہا تھا تو میں نے سوچا' نورو کو بھی ساتھ لے چلوں۔ آپ سے ملاقات ہی ہوجائے گی۔ بڑا کام کا آدمی ہے۔ آپ کو ایسے لوگوں سے میل ملاقات رکھنی چاہئے۔"

میں بدستور مسکراتا رہا۔ میں ان کے اندازِ گفتگو سے بہت محظوظ ہو رہا تھا۔ ملک ریاض' نورو کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے بولا' "بچہ ہے اپنا.... بچہ بھی ہے' یار بھی ہے' تابعدار بھی ہے۔ آپ یوں سمجھیں' بہت بڑے علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے۔ یہ جو تین جوان اس کے ساتھ ہیں.... یوں سمجھ لیں یہ اس کی کابینہ ہے۔"

"لیکن آپ کا اور نورو کا ساتھ کیسے ہوگیا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"بس' کبھی کام کے لوگ ہمیں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ کبھی ہم کام کے لوگوں کو ڈھونڈ لیتے ہیں۔" ملک ریاض شاطرانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولا "ہمارا فلسفہ ہے کہ سب کے ساتھ بنا کر رکھو.... اور وہ سب لوگ جن سے ہماری ملاقات ہوتی ہے' انہیں ہماری نصیحت یہی ہوتی ہے کہ ہم تم سے بنا کر رکھ رہے ہیں' تم بھی ہم سے بنا کر رکھو۔ نورو ماچھی کو ہماری ضرورت پڑتی ہے تو ہم اس کے کام آتے ہیں۔ ہمیں اس کی ضرورت پڑتی ہے تو یہ ہمارے کام آتا ہے۔ یونہی مل جل کر چلنا چاہئے جی۔ اس طرح زندگی میں آسانیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ چار دن کی زندگی ہے.... اور کام انسان کو بہت سارے کرنے ہوتے ہیں.... بڑے بڑے کام.... اہم کام۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" میں نے گہری نظروں سے نورو ماچھی کا جائزہ لیتے ہوئے پُرخیال لہجے میں کہا۔ وہ بھی زیرِ لب.... بلکہ زیرِ مونچھ مسکراتے ہوئے گہری نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔

ملک ریاض مزید بولا "چالیس آدمی ہیں نورو کے گروہ میں۔ اور سب ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ ان میں للو پنجو کوئی نہیں ہے۔" شاید وہ چاہ رہا تھا کہ نورو ماچھی کی اعلیٰ 'کوالیفکیشنز' کے بارے میں کوئی بات بتانے سے رہ نہ جائے۔

"بہت خوب!" میں نے کہا پھر مؤدبانہ لہجے میں پوچھا۔ "نورو ماچھی صاحب! پولیس آپ کو گرفتار نہیں کرتی؟ میں تو سمجھتا تھا' آپ کہیں جنگلوں' پہاڑوں' بیابانوں میں' کسی نامعلوم مقام پر غار یا کھوہ میں چھپے بیٹھے ہوں گے۔ لحہ بہ لحہ پولیس کا گھیرا آپ کے گرد تنگ ہو رہا ہوگا۔ آپ کے پاس کھانے پینے کے لئے کچھ نہیں ہوگا۔ درختوں سے کچے پکے پھل توڑ کر کھاتے ہوں گے۔ جوہڑوں سے پانی پیتے ہوں گے۔ دنیا سے آپ کا رابطہ کٹا ہوا ہوگا۔ لیکن آپ تو بڑی شان سے' صاف ستھرے کپڑے پہنے' بہترین قسم کی گاڑیوں میں' بھرے پُرے شہر میں' معززین کے ساتھ گھوم رہے ہیں؟"

نورو ماچھی نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا۔ اس کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے جیسے کوئی بڑا دانشور کسی سادہ لوح دیہاتی کی بات سن کر محظوظ ہو رہا ہو۔ میں نے اپنے چہرے پر حتی الامکان سادہ لوحی طاری رکھنے ہی کی کوشش کی تھی۔

نورو ماچھی جھٹکے دار اردو میں بولا "پولیس اپنا کام کرتی رہتی ہے' ہم اپنا کام کرتے رہتے ہیں مینڈا سائیں۔ کبھی کبھار گروہ کا کوئی ایک آدھ آدمی مارا جاتا ہے۔ وہ بھی اس وقت جب کوئی واردات بہت ہی سنگین ہوجائے۔ پولیس اپنی کارروائی ڈال دیتی ہے۔ تصویریں کھنچوالیتی ہے۔ پریس کانفرنس وغیرہ کرلیتی ہے۔ کچھ مالِ غنیمت آپس میں بانٹ لیتے ہیں' کچھ سامنے لے آتے ہیں۔ کچھ سارٹیفکیٹ شارٹیفکیٹ آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ ان کا بھی دل پشوری ہوجاتا ہے۔ ہمارے کو بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ پولیس میں بھی اپنے آدمی موجود ہیں۔ اگر کوئی زیادہ خردماغ افسر آجاوے اور لمبی چوڑی کارروائی کرنے کی کوشش بھی کرے تو ہم کو سب خبر ملتی رہتی ہے۔ ساڈی باغ بہاری نوں کوئی فرق نئیں پیندا مینڈا سائیں!"

ملک ریاض ہنس کر بولا "چوہدری صاحب! یہ تو جب اور جہاں چاہے چلا جاتا ہے۔ ملک سے باہر بھی چلا جاتا ہے۔ اپنے خاص خاص لوگوں کے ہاں شادی بیاہ میں بھی شرکت کرتا ہے۔"

"واہ ملک صاحب!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "زمانہ واقعی بڑی ترقی کرگیا ہے۔"

"اس میں کیا شک ہے چوہدری صاحب!" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "اب اصل کام بھی کرلیا جائے جس کے لئے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔"

اس نے اشارہ کیا اور اس کے ساتھ آنے والے ایک منشی ٹائپ آدمی نے جلدی سے ایک قیمتی بریف کیس کھول کر ایک بڑا سا سنہری لفافہ اس کی طرف بڑھایا۔ ملک ریاض نے وہ لفافہ دونوں ہاتھوں پر رکھ کر آگے بڑھ کر بڑے ادب سے میرے سامنے جھکتے ہوئے مجھے پیش کیا۔ اس پر میرا نام و پتا جلی الفاظ میں لکھا ہوا تھا۔

"یہ کیا ہے ملک صاحب؟" میں نے لفافہ کھولے بغیر پوچھا۔
"دعوت نامہ ہے چوہدری صاحب!" اس نے واپس اپنی جگہ بیٹھتے ہوئے جواب دیا۔
"کس تقریب کا؟" میں نے اب بھی لفافہ نہ کھولا۔
"بات یہ ہے چوہدری صاحب....." وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "میرا ایک ہی بیٹا ہے۔ بڑی منتوں مُرادوں سے ہوا تھا۔ وہ بھی دوسری بیوی سے۔ پہلی بیوی سے تو کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ دوسری شادی کی تو اس کے بھی کئی سال بعد اللہ تعالیٰ نے مجھے فرزند سے نوازا۔ ماشاءاللہ بڑا ہوگیا ہے۔ اس سال اسے لندن میں بورڈنگ اسکول میں داخلہ مل گیا ہے.... بہت بڑا..... بہت اونچے درجے کا اسکول ہے جی..... وزیروں سفیروں اور شہزادوں کے بچے ہی پڑھتے ہیں وہاں' جہاں میرے فرزند کو داخلہ ملا ہے۔ بس اس خوشی میں ہم نے اپنی شکر گڑھ والی حویلی میں ایک بہت بڑے جشن کا اہتمام کیا ہے۔"
"اوہ.....!" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بیٹے کو لندن کے اسکول میں داخلہ ملنے پر جشن منایا جارہا تھا۔ خیر..... یہ تو ملک جیسے لوگوں کے لئے واقعی اعزاز کی بات تھی۔ دولت کی فراوانی ہو تو زکام سے صحت یاب ہونے پر بھی جشن منایا جاسکتا ہے۔
اب میں نے کارڈ کھول کر دیکھا۔ وہ تقریباً ایک فٹ لمبا کارڈ تھا۔ لفافے کی طرح اس کا بھی رنگ طلائی تھا۔ اس پر نہ جانے کیا کیا لفاظی کی گئی تھی۔ خلاصہ بس یہی تھا کہ ایک تقریب مسرت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ تاریخ دوسرے روز ہی کی تھی۔ مقام تقریب شکر گڑھ والی وہی حویلی تھی جو کبھی ملک اسلم کی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ اس کی ساری زمینوں اور حویلی وغیرہ کا مالک بھی اب ملک ریاض ہی تھا۔
شکر گڑھ اور اس حویلی کی یاد آتے ہی ذہن میں یادوں کی ایک فلم سی چل پڑی۔ ایک لمحے کے لئے میں کھو سا گیا پھر جھرجھری لے کر چونکا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ملک صاحب! میں معذرت چاہوں گا۔ تاریخ بہت قریب کی ہے۔ یعنی کل ہی کی ہے۔ میری بہت سی مصروفیات پہلے سے طے ہیں۔"
"چوہدری صاحب! مجھے احساس ہے کہ مجھے کارڈ پہنچانے میں تاخیر ہوگئی ہے۔ لیکن ایسا صرف اس لئے ہوا کہ میں خود ذاتی طور پر کارڈ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہونا چاہتا تھا..... اور میں بڑے مان سے آیا ہوں۔ یہی سوچ کر آیا ہوں کہ خود جارہا ہوں تو چوہدری صاحب سے "ہاں" کرواکے ہی آؤں گا۔ آپ میرا دل نہیں توڑ سکتے۔"
"لیکن ملک صاحب.....!"
"چھوڑیں جی۔ کاروباری مصروفیات تو چلتی ہی رہتی ہیں۔ ملتوی کرنا چاہے تو انسان ہر مصروفیت کو ملتوی کرسکتا ہے۔ آدمی زیادہ کاروباری بن جاتا ہے تو اس کے ساتھ یہی مصیبت ہوجاتی ہے کہ وہ ہر مصروفیت کو سر پر سوار کرلیتا ہے۔ ہمارا مشورہ ہے تفریح کو بھی ضرور تھوڑی بہت اہمیت دیا کریں۔ اور پھر ہمارے جشن کوئی معمولی جشن نہیں ہوتے۔ لطف آجائے گا آپ کو مہینوں نشہ نہیں اترے گا۔ پوری رات جشن چلے گا۔ کھلے میدان میں مرغیاں اور بکرے روسٹ ہوں گے۔ شراب پانی کی طرح بہے گی۔ فلمی دنیا کی تمام ٹاپ کی ڈانسرز ہوں گی۔ بہت کھلا ڈلا ماحول ہوگا۔ لمبی عیاشیاں ہوں گی۔ ہر طرح کی آزادیاں ہوں گی۔ شہر کی گھٹن زدہ فضاؤں سے دور ہوں گے۔ بہت بڑے بڑے لوگ وہاں جمع ہوں گے۔ نورو ماچھی کے بھی خاص خاص آدمی ہوں گے۔ آپ کی جان پہچان کی بھی بہت سی بڑی بڑی ہستیاں ہوں گی۔ طبیعت خوش ہوجائے گی آپ کی۔"
"لیکن ان میں تو میری دلچسپی کی کوئی بھی چیز نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"تو پھر آپ کی دلچسپی کن چیزوں میں ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔
"یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ میرا کچھ پتا نہیں ہوتا کہ میں کب کس چیز میں دلچسپی لینے لگوں۔" میں نے کہا۔
"بس..... تو پھر آپ چلنے کی ہامی بھرئیے۔ وہاں پہنچتے ہی آپ کی دلچسپی شروع ہوجائے گی اور آپ اپنے اس فیصلے پر خوش ہوں گے، پچھتائیں گے نہیں۔ یہ نہیں سوچیں گے کہ یار اتنی دور زمینوں پر جاکر وقت ضائع کیا۔ بس..... اب میں انکار نہیں سنوں گا۔ یوں سمجھیں کہ یہ تقریب تو ہے ہی آپ کے اعزاز میں۔ آپ ہی نہ ہوئے تو تقریب کا کیا لطف رہے گا؟ میں کل دن چڑھے آپ کو لینے کے لئے گاڑی بھیج دوں گا۔"
میں ایک لمحے کے لئے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ محض ایک مختصر سفر کے دوران اتفاقاً مل جانے والا یہ شخص مجھ پر اتنا مہربان کیوں ہو رہا تھا؟ تقریباً گلے ہی ہوا جارہا تھا۔
دوسری طرف شکر گڑھ کے گلی کوچوں کی یادیں بھی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھیں۔ بالآخر میں نے کہا "اچھا..... ٹھیک ہے ملک صاحب۔ لیکن میں اپنی ہی گاڑی میں چلوں گا۔ آپ صرف ویسے ہی ساتھ چلنے کے لئے اپنی گاڑی بھی بھجوادیجئے گا۔ بہت مدتیں ہوگئی ہیں مجھے ان راستوں پر گئے ہوئے۔ ذرا راہنمائی رہے گی تو اچھا رہے گا۔"
"ضرور چوہدری صاحب! ایتھے تے گل ای کوئی نئیں۔ دل خوش کردیا آپ نے۔" وہ اٹھ کر پُرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کرنے لگا۔ اس کے ساتھ آئے ہوئے لوگ بھی جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔

ملک ریاض راہی نے دوسرے روز وعدے کے مطابق مجھے لینے کے لئے گاڑی بھیج دی لیکن میں اپنی ہی گاڑی میں روانہ ہوا۔ ملک کی بھیجی ہوئی گاڑی پائلٹ کے طور پر میرے آگے آگے چلتی رہی۔ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے میں نے ٹونی کو فون کرکے کچھ ضروری ہدایات دے دی تھیں۔
ملک ریاض کی بھیجی ہوئی گاڑی میں تین آدمی تھے۔ ان میں سے دو رائفل بردار تھے۔ ہم شام کے قریب شکر گڑھ پہنچے۔ قصبوں اور دیہات میں ویسے بھی کچھ پہلے ہی شام ہوجاتی ہے۔ مجھے وہاں قدرے ویرانی کا احساس ہوا۔ قصبہ تقریباً ویسے کا ویسا ہی تھا جیسا میں چھوڑ کر گیا تھا۔ شاید کچھ تبدیلیاں آئی بھی ہوں لیکن مجھے ان کا احساس نہیں ہوسکا کیونکہ میں قصبے کو صحیح طور پر دیکھ ہی نہیں سکا۔
ملک ریاض کی حویلی جو کبھی ملک اسلم کی ہوا کرتی تھی' تک پہنچنے کے لئے قصبے کے گلی کوچوں سے گزرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ قصبے سے بہت دور کھلے میدان میں' بالکل الگ تھلگ' آج بھی اسی طرح نخوت سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ اس کے آس پاس اب بھی کسی قسم کی تعمیرات کا اضافہ نہیں ہوا تھا۔ کچھ دور صرف ان لوگوں کے چند نیم پختہ مکانات موجود تھے جو بطورِ خاص صرف حویلی میں ہی مختلف خدمات انجام دیتے تھے۔
حویلی اپنے طول و عرض اور شان و شکوہ کے لحاظ سے کسی قلعے سے کم نہیں تھی۔ ملک اسلم اپنے زمانے میں اتنا بڑا زمیندار نہیں

تھا جتنی بڑی اور پُرشکوہ اس کی حویلی نظر آتی تھی۔ شاید یہ اس کا شوق تھا یا اس نے جان بوجھ کر اتنی لمبی چوڑی حویلی بنوائی تھی۔ اس میں مصلحت بھی کارفرما ہو سکتی تھی۔ اس قسم کی حویلی سے زمیندار کی شخصیت اور اس کی زمینداری اور بھی زیادہ بھاری بھرکم معلوم ہونے لگتی تھی۔ اس کا رعب داب اور اس کے خاندانی پس منظر کا تاثر کچھ اور گہرا ہو جاتا تھا۔

اب دولت کی ریل پیل کے اعتبار سے ملک ریاض کا زمانہ تو اور بھی بہتر تھا۔ اس نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ اس دور افتادہ مقام پر واقع یہ حویلی ایک عمدہ جائداد تھی' اس کے فائدے اپنی جگہ تھے۔ اس نے اس پرانی چیز کو کہنگی اور خستہ حالی کا شکار نہیں ہونے دیا تھا۔ اس نے اسے اور بھی بہتر بنایا تھا' اس پر اور بھی روپیہ خرچ کیا تھا۔ اتنے برس بعد وہ پرانی اور شکستہ حال نظر آنے کے بجائے پہلے سے زیادہ خوبصورت' چمکتی دمکتی اور شاندار نظر آ رہی تھی۔

اب تو ویسے بھی یہاں ہر آسائش میسر تھی۔ کم از کم ملک ریاض کو تو میسر تھی۔ بالائی کمروں کی دیواروں سے ایئر کنڈیشنر جھانکتے دکھائی دے رہے تھے۔ اس وقت تو رنگین بتیوں کی جھالروں سے در و دیوار پر "چراغاں" بھی کیا گیا تھا۔ وہی چراغاں جس میں کوئی چراغ استعمال نہیں ہوتا۔

قصبے کے قریب سے گزرتے وقت مجھے قدرے ویرانی کا احساس ہوا تھا۔ ایسا لگا تھا جیسے ایک اداس شام اپنے تاریک بازو پھیلائے دھیرے دھیرے قصبے میں اتر رہی ہے۔ کہیں کہیں آوارہ کتے بھی تھکے تھکے انداز میں گردن جھکائے اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دیئے تھے۔ لیکن یہاں حویلی اور اس کے گرد و نواح میں ایک الگ ہی دنیا آباد تھی۔ یہ غربت کے سمندر میں دولت کا جزیرہ تھا۔ شہر ہوں یا دیہات' بستیاں ہوں یا ویرانے' یہ جزیرے ہر جگہ نظر آ جاتے ہیں۔ جی ہاں' ویرانوں میں بھی نظر آ جاتے ہیں۔

غریب آدمی شکار کھیلنے کا شوق رکھتا ہے مگر زندگی کی کشاکش اسے فرصت نہیں دیتی۔ کبھی کھینچ تان کر کوئی زیادہ ہی شوقین مزاج قسم کا غریب اگر وقت نکال ہی لیتا ہے تو زیادہ سے زیادہ ایک سستی سی بنسی لے کر کسی نہر یا جھیل میں ڈور ڈال کر' قسمت پر تکیہ کر کے مچھلی پھنسنے کے انتظار میں بیٹھ جاتا ہے اور اونگھتا رہتا ہے۔ کبھی دولتمندوں کو شکار پر جاتے دیکھئے۔ آپ کو معلوم ہو جائے گا ویرانوں میں دولت کے جزیرے کس طرح نمودار ہوتے ہیں۔

حویلی کے قریب بڑی بڑی کاروں کی قطاریں موجود تھیں۔ کافی لوگ مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے۔ ہماری گاڑیاں بھی جا کر ایک قطار میں لگ گئیں۔ ملک ریاض نے اپنے چند خاص خاص آدمیوں کے ساتھ باہر آ کر میرا استقبال کیا۔ وہ اس طرح اپنے مخصوص انداز میں مجھ سے ملا جیسے برسوں سے بچھڑا ہوا میرا عزیز ترین دوست تھا۔

میدان میں جابجا اینٹوں کے عارضی چولہوں پر دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ کئی جگہوں پر الاؤ دہکا کر باربی کیو کے انتظامات کئے جا رہے تھے۔ بیسیوں آدمی تندہی سے مختلف کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ آثار بتا رہے تھے کہ ملک ریاض کا دعویٰ درست تھا۔ جنگل میں منگل کا سا سماں پیدا کرنے کی تیاریاں جاری تھیں۔

ملک بڑی ہی عاجزی' بڑی ہی ممنونیت سے بولا۔ "چوہدری صاحب! میں بتا نہیں سکتا کہ آپ کی آمد کی مجھے کتنی خوشی ہوئی ہے۔ آپ نے یہاں تشریف لا کر میری عزت بڑھائی ہے' میرا مان بڑھایا ہے۔ مجھے ڈر تھا کہ آپ نے مُروّت میں آ کر وعدہ تو کر لیا لیکن شاید بعد میں آپ کا ارادہ بدل نہ جائے..."

"میری لغت میں وعدہ خلافی کا لفظ نہیں ہے ملک صاحب!" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "میں یا تو وعدہ کرتا نہیں کر لیتا ہوں تو اسے نبھانے کے لئے جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"جواں مردوں کی یہی شان ہوتی ہے چوہدری صاحب!" اس نے میرا ہاتھ تھام کر اندر لے جاتے ہوئے کہا۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا' حویلی کی ساخت میں خاصی تبدیلیاں آ چکی تھیں۔ کئی اضافے کئے گئے تھے۔ جدید تقاضوں کے مطابق تزئین و آرائش کی گئی تھی۔ وہ کھلا صحن جو پہلے میدان کی طرح پھیلا ہوا تھا' اب اتنا کھلا نہیں رہا تھا۔ اس کا کچھ حصہ بھی تعمیر میں چلا گیا تھا۔ اوپر کی منزل پر بھی کچھ نئی تعمیرات نظر آ رہی تھیں۔ صحن کا جو حصہ اب بھی کھلا تھا اس میں شامیانے لگے ہوئے تھے۔

کچھ لوگ وہاں موجود تھے۔ سامنے ہال کا دروازہ کھلا تھا۔ کچھ لوگ وہاں نظر آ رہے تھے۔ ہر طرف رنگوں' روشنیوں اور خوشبوؤں کا سیلاب تھا۔ ادھر سے اُدھر کچھ خواتین کے رنگین پیراہن بھی لہراتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

ملک ریاض نے پہلے مجھے شامیانے میں لے جا کر کرسیوں پر بکھرے ہوئے لوگوں سے ملوانا شروع کیا۔ وہ واقعی مجھے اس اہتمام و احترام سے لوگوں کے سامنے لے جا رہا تھا جیسے میں ہی اس جشن کا مہمانِ خصوصی ہوں' جیسے واقعی میرے ہی اعزاز میں سب کچھ ہو رہا ہے۔

وہاں میرے جانے پہچانے کئی بڑے صنعت کار' تاجر اور بزنس مین موجود تھے۔ ان میں ایک تو بارِیش حاجی صاحب بھی موجود تھے جن کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ اس قسم کے جشن ہائے عیش کوشی یا دوسری لغویات کے قریب بھی نہیں پھٹکتے ہوں گے۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ جھینپے جھینپے بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے' چہک رہے تھے۔

کئی ایسے بڑے بیوروکریٹ بھی موجود تھے جنہیں میں ذاتی طور پر جانتا تھا اور سرکاری مشینری میں ان کی اہمیت سے بھی واقف تھا۔ ان میں سے بعض تو اسی طرح کچھ ریزرو نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے جس طرح دفتروں میں دکھائی دیتے تھے لیکن بعض اس طرح کھل کر ہنس بول رہے تھے جیسے مُدّت بعد اپنے آپ کو گھٹن سے آزاد محسوس کر رہے ہوں۔

نورو ماچھی بھی وہاں موجود تھا اور اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ پولیس مقابلوں اور ڈاکوں کے بعد جنگل میں جا کر چھپنے والا' دیہاتوں میں دہشت پھیلانے والا' بستیوں کو تاراج کرنے والا' گھروں کو نذرِ آتش کرنے والا اور ہنستے بستے مکانوں کو پل بھر میں ویران کر دینے والا نورو ماچھی تھری پیس سوٹ میں' چھاتی چوڑی کئے میرے سامنے کھڑا اپنے مخصوص نیم مخمور اور متکبر سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔

اس کا سوٹ گو کہ اس کے جسم پر بہت ڈھیلا تھا۔ ممکن ہے ناپ دے کر نہ سلوایا گیا ہو یا پھر شاید اپنی ضروریات کے تحت اس نے جان بوجھ کر سوٹ اتنا ڈھیلا رکھوایا ہو۔ کیونکہ اس کے کوٹ کے نیچے' پتلون کی بیلٹ کے ساتھ گولیوں کی پیٹی اور دونوں طرف دو ریوالوروں کی موجودگی کا احساس تو مجھے بھی ہو گیا تھا۔ ان کے علاوہ بھی اس کا سوٹ ڈھیلا ڈھالا ہونے کی وجہ سے اور نہ جانے کس کس چیز کے لئے پردہ داری میں استعمال ہو رہا ہو۔ بہرحال ایک نامی گرامی ڈاکو کو تھری پیس سوٹ میں سرکاری و غیر سرکاری معززینِ شہر کے درمیان دیکھنا میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا۔

آٹھ دس ڈاکو اس کے ساتھ تھے۔ وہ بھی معززانہ لباسوں میں تھے لیکن شکلوں سے بہرحال ڈاکو ہی دکھائی دے رہے تھے۔ انسانی کردار کے بارے میں ذرا سا بھی شعور رکھنے والا آدمی گہری نظر سے انہیں دیکھ کر ان کی اصلیت کا اندازہ لگا سکتا تھا لیکن مجھے یوں لگا جیسے وہاں موجود سب لوگوں نے ان کی طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی تھیں یا پھر شاید وہ انہیں اپنے ہی جیسے انسانوں کے حلقے میں شمار کر رہے تھے۔ اور اعمال کے لحاظ سے شاید یہ بات کافی حد تک درست بھی تھی۔

ان میں سے دو کے پاس تو ہلکی سی مشین گنیں تھیں۔ وہ شامیانے میں حویلی کے دروازے کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ دو ڈاکو سائے کی طرح نورو ماچھی کے ساتھ ساتھ تھے۔ آٹومیٹک رائفلیں ان کے کندھوں سے لگی ہوئی تھیں۔ وہ اس وقت اپنے سردار کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں عقاب کی آنکھوں کی سی چمک تھی اور وہ مضطربانہ انداز میں مسلسل ہر چہرے' ہر گوشے کا جائزہ لئے جا رہے تھے۔

نورو ماچھی خود کچھ ایسا چوکنا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے بے فکری سے کھڑا تھا۔ اس کے باقی ساتھی بھی حسبِ توفیق اسلحہ اٹھائے ہوئے یا اپنے ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں چھپائے ہوئے تھے۔ ملک ریاض نے باتوں باتوں میں مجھے بتایا کہ نورو ماچھی کے گروہ کے باقی آدمی کچھ فاصلہ چھوڑ کر حویلی کو چاروں طرف سے گھیرے میں لئے ہوئے ہیں۔ وہ اس طرح مختلف مقامات پر تعینات تھے کہ کسی کی نظر میں نہ آ سکیں۔

"ان بے چاروں کو بھی یہاں کے رونق میلے سے لطف اندوز ہونے دیتے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "انہیں اُدھر کیوں لٹکا رکھا ہے؟ کیا کسی کی طرف سے حملے کا خطرہ ہے؟"

"ناں چوہدری صاحب!" ملک ریاض بے پروائی کے ساتھ ہاتھ ہلا کر بولا۔ "اس علاقے میں کس کی مجال ہے کہ ہماری طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ حملہ کرنے والوں نے اپنی نسلوں کا نام نشان مٹوانا ہے؟"

میں نے دور ہی سے سرکاری ملازموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ویسے بھی سرکار تو خود یہاں موجود ہے۔ ڈاکوؤں پر اور بھلا کون حملہ کر سکتا ہے۔"

"ٹھیک کہا آپ نے چوہدری صاحب!" ملک ریاض مسکراتے ہوئے بولا "ہم اپنا کام پکا رکھتے ہیں۔ ہمارے دربار میں سبھی حاضری دیتے ہیں۔ سرکار بھی' ڈاکو بھی۔ اور یہاں کوئی ایک دوسرے کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ یہاں سب اپنے اپنے معاملات نمٹانے کے لئے اور ساتھ ساتھ شغل میلے کے لئے آتے ہیں۔ ایک دوسرے کے لئے الجھنیں کھڑی کرنے کی غرض سے نہیں۔ بہرحال' ہم چاروں طرف اپنے آدمی اس لئے لگا دیتے ہیں کہ ہماری مرضی کے بغیر علاقے میں پرندہ بھی پر نہ مار سکے۔ احتیاط اچھی چیز ہے۔ ہماری طاقت' رعب اور دبدبہ اپنی جگہ ہے لیکن رقابتوں' دشمنیوں اور حسد کے سلسلے تو چلتے رہتے ہیں نا۔ کیا پتا کب کوئی پاگل کا پُتر اپنے دماغ میں کوئی خناس لے کر ادھر کا رخ کر لے۔"

"ہاں' یہ بات تو ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے میرا ذہن ایک بار پھر پاگل سوچوں کے صحرا میں بھٹکنے لگا تھا۔ کتنا اعتماد تھا اس کے لہجے میں! ابھی وہ مُلک کا کوئی بہت ہی بڑا' بہت ہی معروف اور قابلِ ذکر زمیندار نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کا اندازِ گفتگو کچھ ایسا تھا جیسے یہ اس کی ایک علیحدہ سلطنت تھی جہاں اس کا فرمان چلتا تھا' اس کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہل سکتا تھا' اس کا حکم ہی یہاں کا قانون تھا۔

مُلک میں اسی کے قبیل کی اس سے بھی کہیں بڑی' نہ جانے کیسی کیسی توپ چیزیں بھری پڑی تھیں۔ ان سب کی اپنی اپنی الگ الگ بادشاہتیں تھیں جہاں ان کے نام کا سکہ چلتا تھا' جہاں ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ قانون کا درجہ رکھتے تھے۔ کبھی کبھی میں حیرت سے سوچا کرتا تھا کہ آخر طاقت و انصاف کا اصل مرکز کہاں تھا؟

"ڈانسرز بھی آ چکی ہیں۔" ملک ریاض نے مجھے خیالات کی دنیا سے باہر کھینچتے ہوئے کہا۔ "اوپر کمروں میں ٹھہری ہوئی ہیں۔ آرام کر رہی ہیں تاکہ اپنی رات بھر کی خدمات کے لئے تازہ دم ہو سکیں۔ کچھ فلمی کامیڈین بھی ہیں۔ بتا رہے تھے کہ وہ بڑے اچھے آئٹم تیار

کر کے لائے ہیں۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "آپ بھی چاہیں تو آرام کر لیں۔ اوپر آپ کے لئے بھی ایک کمرا خالی ہے۔ آپ بھی سفر کر کے آئے ہیں۔"

میں ہنس دیا "اب ایسا بھی کوئی دشوار گزار سفر نہیں تھا کہ آرام کی ضرورت محسوس ہونے لگے۔"

"آپ اپنے ہم پیشہ اور ہم مرتبہ آدمیوں کی طرح آرام طلب نہیں ہیں چوہدری صاحب!" وہ تنقیدی نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "سخت جان بھی معلوم ہوتے ہیں۔ آپ کچھ مختلف آدمی ہیں۔"

"شاید آپ ٹھیک ہی کہہ رہے ہوں۔ میں خود اپنے بارے میں کوئی رائے ظاہر کرنا پسند نہیں کرتا۔ ابھی تو آپ سے ملاقاتیں شروع ہوئی ہیں۔ اگر یہ ملاقاتیں جاری رہیں تو آپ میرا تجزیہ کرتے رہئے گا اور مجھے میرے بارے میں آگاہ کرتے رہیے گا۔"

"ملاقاتیں تو اب یقیناً جاری رہیں گی اور تعلق بھی بہت مضبوط ہو گا۔" وہ وثوق سے بولا۔

"آپ یہ بات اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں عمر میں آپ سے کافی بڑا ہوں چوہدری صاحب! میں نے دنیا دیکھی ہے۔ مجھے معلوم ہے کن انسانوں کے ساتھ کون سی چیزیں تعلقات کو مضبوط بناتی ہیں۔" وہ اعتماد سے بولا۔

میں کہنا چاہتا تھا "ممکن ہے آپ کے تمام اندازے غلط ہوں ملک صاحب!" لیکن میں خاموش رہا۔ ابھی میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ شخص درحقیقت کن راستوں کا مسافر تھا اور مجھے کہاں لے جانے کی فکر میں تھا۔

چند لمحے بعد وہ مجھ سے معذرت کر کے دوسرے مہمانوں سے بات چیت کرنے چلا گیا۔ میں ٹہلنے کے سے انداز میں شامیانوں سے باہر آ گیا۔ مہمانوں میں ہلکی پھلکی ڈرنکس چل رہی تھیں۔ باوردی بیرے مستعدی سے تمام لوازمات اٹھائے پھر رہے تھے۔ مہمان ابھی "موڈ" بنا رہے تھے۔ ایک ویٹر ٹرے میں سجی ہوئی مختلف چیزیں لئے میرے پاس بھی رکا۔ میں نے صرف .... کولڈ ڈرنک کا ایک گلاس لینے پر اکتفا کیا اور ذرا تنہائی کی تلاش میں ایک گوشے کی طرف چل دیا۔

حویلی کے اس صحن کا فرش کسی زمانے میں عام سیمنٹ کا ہوا کرتا تھا۔ اب ماربل کے خوبصورت ٹائلز کا تھا۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ ایک پختہ چبوترا ہوا کرتا تھا۔ ملک اسلم کے ہاں جب کبھی کسی سلسلے میں مزارع کافی تعداد میں جمع ہو جاتے تھے تو ان سے باتیں کرنے کے لئے وہ اس چبوترے پر آ بیٹھتا تھا۔ قالین اور گاؤ تکئے وہاں موجود رہتے تھے۔

اب اس چبوترے کی جگہ مغلیہ طرز کی ایک چھوٹی سی بارہ دری نما چیز تعمیر کی گئی تھی جو بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ قالین اس میں بھی بچھا ہوا تھا۔ گاؤ تکئے لگے ہوئے تھے۔ میں اس کے ایک ستون کے سہارے کھڑا ہو گیا اور ماضی کی دھندلی دھندلی پرچھائیاں میری آنکھوں میں اترنے لگیں۔

یہی جگہ تھی .... ہاں .... بالکل یہی جگہ تھی جہاں ایک گندی سی چارپائی پر میرے باپ کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش لا کر رکھی گئی تھی۔ ملک اسلم نے جو کچھ کہا تھا' ہجوم کا جو ردِ عمل تھا' تھانیدار نے مجھ سے جو سلوک کیا تھا' وہ سب مناظر' وہ سب باتیں میرے ذہن پر نقش تھیں۔ اس دن کی سوگواری مجھے نہیں بھولی تھی۔ کیا سائبان میرے سر سے ہٹ گیا تھا اور میں نے خود کو کیسا بے اماں محسوس کیا تھا۔ نوجوانی اور نوخیزی کے دور کا وہ زخم مندمل تو ہو چکا تھا لیکن دل سے اس کی کسک نہیں گئی تھی۔ اب بھی ماضی کا کوئی حوالہ سامنے آ جاتا تھا تو وہ کسک جاگ اٹھتی تھی۔

اس سانحے کے بعد ملک اسلم کے بیٹے قیصر کے دور میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب مجھے قیدی کی حیثیت سے حویلی میں لایا گیا تھا۔ یہ بات تو زیادہ پرانی بھی نہیں تھی۔ بہت ہنگامہ رہا تھا۔ اس حویلی کا تھوڑا سا حصہ منہدم بھی ہوا تھا لیکن اب وہ نہ صرف مرمت ہو چکا تھا بلکہ پہلے سے بہتر حالت میں تھا۔ میرے ذہن پر اس واقعے کی خراشیں بہرحال آج بھی موجود تھیں لیکن اب ملک قیصر اس دنیا میں موجود نہیں تھا۔

اب وقت نے یہ عجیب کروٹ لی تھی۔ آج اسی حویلی میں مجھے بصد احترام و اصرار اس محفل طرب و نشاط میں مدعو کیا گیا تھا۔ زہریلی یادوں کے زخم کسک دینے لگے تو دل نے کہا کہ مجھے اس جگہ' ایسی محفل میں رکنا نہیں چاہئے۔ جس جگہ سے اتنی بدصورت یادیں وابستہ تھیں وہاں میں کسی خوبصورتی' کسی لمحۂ نشاط سے کیونکر لطف اندوز ہو سکتا تھا؟ لیکن اب واپس جانا بھی بہت عجیب لگتا۔ ملک ریاض راہ میں حائل تھا۔ مروت کی زنجیر پیروں میں تھی۔ میں وہیں کھڑا اپنی سوچوں' اپنے محسوسات سے الجھتا رہا۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوا تو باقاعدہ پینے پلانے کا دور چلنے لگا۔ ولایتی وہسکی وغیرہ کے کریٹوں کا ایک انبار لگا ہوا تھا۔ ادھر کھلے میدان سے ہوا کے ساتھ کھانوں وغیرہ کی اشتہا انگیز خوشبوئیں بھی آنے لگی تھیں۔ شامیانوں میں ایک سرے پر بہت عمدہ اسٹیج بھی لگایا گیا تھا۔ مائیک وغیرہ بھی موجود تھے۔ فی الحال ایک غیر معروف سا کامیڈین ون مین شو پیش کر رہا تھا۔ کچھ لوگ اس کے چٹکلوں سے محظوظ ہو رہے تھے اور کچھ آپس میں گپ شپ میں لگے ہوئے تھے۔

شراب واقعی وہاں پانی کی طرح لنڈھائی جا رہی تھی۔ پینے پلانے کا دور کچھ زیادہ ہی طول کھینچ گیا۔ میرا خیال ہے وہاں صرف تین چار ہی آدمی ایسے تھے جو نہیں پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ کئی مہمان ابھی سے نشے میں بدمست دکھائی دینے لگے تھے۔ ڈاکوؤں میں سے بھی ایک آدھ مدہوش دکھائی دینے لگا تھا۔ لورو ماچھی بھی پی رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ ہاتھ روک کر پی رہا تھا البتہ اپنے ساتھیوں میں سے وہ کسی کو نہیں روک رہا تھا۔ آج کی رات شاید سب آزاد تھے۔ ڈاکوؤں نے بھی شاید اپنا ڈسپلن اور پابندیاں بالائے طاق رکھ دی تھیں۔ شہروں اور جنگلوں' دونوں جگہوں کے ڈاکو ایک دوسرے میں گھل مل گئے تھے۔

اسٹیج پر اس دوران صرف کامیڈی کا سلسلہ چلتا رہا.... میں نے وہاں فلمی دنیا کے دو تین ابھرتے ہوئے اور ایک آدھ نامور کامیڈین کو بھی دیکھا۔ حاضرین اب ان کے آئٹمز سے محظوظ ہو رہے تھے۔ بے تحاشہ ہنس رہے تھے۔ باہر آگ پر تیتر' ہرن اور مرغابیوں وغیرہ کا گوشت بھونا جا رہا تھا' ہوا کے دوش پر اشتہا انگیز خوشبوؤں کا سفر تیز تر ہو گیا تھا۔

پھر کھانے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ صحن میں رکھی ہوئی میزوں اور اسٹینڈز وغیرہ پر بھی ڈشیں لا لا کر رکھی جا رہی تھیں اور ویٹر بھی مہمانوں کے درمیان چکرا رہے تھے۔ سرو کرنے کا انتظام کچھ ایسا تھا کہ ہر مہمان کو ذرا سا ادھر ادھر پھر کر یا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ہی اپنی پسند کی ہر چیز میسر آ جائے۔ ہر چیز وافر مقدار میں تھی اور آگ سے اتار کر تازہ تازہ لائی جا رہی تھی۔ ہر برتن سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کھانے کا انتظام عمدہ تھا اور کھانے کے سبھی شوقین معلوم ہوتے تھے۔ زندگی میں نہ جانے کیا کچھ کھا گئے تھے۔

اسی دوران کھانے میں شریک ہونے کے لئے اوپر کی منزل سے خواتین بھی قطار در قطار اتر آئیں۔ ان میں سے چار تو واقعی فلم انڈسٹری کی ٹاپ کی ڈانسرز تھیں بلکہ اب تو وہ ہیروئن بننے کے عمل سے گزر رہی تھیں۔ دو ڈانسر لڑکیاں ایسی تھیں جو اِکا دُکا فلموں میں کاسٹ ہوتی تھیں۔ یہ وہ چہرے تھے جنہیں میں پہچان سکا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ بھی مجھے پہچانتی تھیں۔

میں نے محسوس کیا کہ ملک ریاض مجھے ان سے متعارف کرانے کے لئے ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ میں جلدی سے مہمانوں کے ہجوم میں ایک طرف کو ہو گیا اور پھر یوں ادھر ادھر ہونے لگا کہ ملک مجھے تلاش نہ کر سکے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ فلمی لڑکیاں مجھے اس محفل میں دیکھیں۔ ملک ریاض غالباً میری طرف سے مایوس ہو کر دوسرے خاص خاص لوگوں کو ان سے ملوانے لگا۔

وہ اپنے ہونٹوں پر نپی تلی پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجائے سب سے انکساری سے مل رہی تھیں۔ آداب بجا لا رہی تھیں۔ ان کے اچھے برے جملوں پر ہنس رہی تھیں۔ لڑکیاں بری نہیں تھیں۔ تقریباً سبھی قبول صورت تھیں بلکہ ان میں تیزی سے ابھرتی ہوئی ایک نئی لڑکی افروز کو تو خوبصورت لڑکیوں میں شمار کیا جا سکتا تھا۔ اس کی شخصیت میں ایک خوشگوار قسم کی تازگی تھی۔

شکل و صورت سے قطع نظر ان کی شخصیتوں میں ذرا دوسری ہی قسم کی کشش تھی۔ اور پھر ان کا تعلق شوبزنس سے تھا۔ یہ گوم چھلا ساتھ لگ جانے کے بعد لڑکیوں میں عام لوگوں کو ایک اور ہی طرح کا گلیمر' ایک اور ہی طرح کی کشش محسوس ہونے لگتی ہے جو درحقیقت صرف تصوراتی ہوتی ہے۔ ان کے قریب آتے وقت سب کی باچھیں پھیلی جا رہی تھیں۔

لڑکیاں صرف وہ چھ نہیں' بیسیوں تھیں۔ باقی معلوم نہیں کون تھیں' کہاں سے آئی تھیں لیکن ان کے ساتھ کچھ لوگ تھے جنہیں دیکھ کر ان کا پس منظر جاننا کچھ ایسا زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔ سب نے اس محفل میں آنے کے لئے بہت ہی اہتمام کیا تھا۔ لباس اور میک اپ کے معاملے میں گویا سب ایک دوسرے کو شکست دینے پر تلی ہوئی تھیں۔

ان کی آمد سے ہی درحقیقت وہاں رنگ' خوبصورتیاں اور خوشبوئیں بکھری تھیں۔ وہ سب میں گھل مل گئی تھیں۔ اس کام میں وہ یقیناً ماہر تھیں۔ جو بھی ان کے قریب ہوتا تھا وہ اس کے سامنے بچھ بچھ جاتی تھیں۔ انہیں معلوم تھا وہاں کوئی بھی آدمی معمولی نہیں تھا۔ مترنم اور گونجیلے' مخمور قہقہے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے تھے۔ لڑکھڑاتی زبانوں کے فقرے ایک دوسرے میں الجھ رہے تھے۔

کھانے کے بعد شامیانوں سے کرسیاں وغیرہ نکال دی گئیں اور فرشی نشست کا اہتمام کر دیا گیا۔ قالینوں پر چاندنیاں بچھ گئیں۔ گاؤ تکئے لگ گئے۔ سازندوں نے اپنی جگہیں سنبھال لیں اور پھر

مجروں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔
مجروں میں بھی کچھ ورائٹی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ پہلے ایک لڑکی نے روایتی انداز میں 'مغلیہ لباس میں' غزل گاتے ہوئے کلاسیکی رقص کیا۔ اس کے فوراً بعد موسیقی نے پلٹا کھایا اور مغربی دُھن پر ایک لڑکی خالصتاً مغربی لباس میں میدان میں آکودی۔ اس کے رقص نے گویا حاضرین کے پہلے ہی سے گرمائے ہوئے لہو میں آگ لگادی۔
اس کے بعد ایک عجیب ہی تجربہ کیا گیا۔ مشرق اور مغرب کا آمیزہ تیار کرنے کی کوشش کی گئی۔ قدامت اور جدت کو ایک دوسرے میں مدغم کردیا گیا۔ موسیقی مشرقی ہی تھی اور اس پر گائی بھی جارہی تھی غزل.... لیکن لڑکیاں دو رقص کررہی تھیں۔ ایک مشرقی اور سیمی کلاسیکل ... دوسری خالصتاً مغربی رقص اسی دُھن پر پیش کررہی تھی۔
حاضرین دیوانے ہوئے جارہے تھے۔ دادو تحسین کے نعرے بلند ہورہے تھے۔ نوٹ لٹائے جارہے تھے۔ نہ جانے کس کس انداز سے رقاصاؤں پر نچھاور کئے جارہے تھے اور اس بہانے عجیب عجیب حرکتیں کی جارہی تھیں۔ لڑکیاں ہنستے ہونٹوں' گرمجوش مسکراہٹوں اور سرد نگاہوں کے ساتھ سب کچھ سہہ رہی تھیں۔ وہ تو کٹھ پتلیاں تھیں' مشینیں تھیں' مقناطیس تھیں۔ جیبوں سے نوٹ نکل نکل کر ان کی طرف اڑے چلے جارہے تھے۔ ہر لڑکی کی نائیکہ نوٹ سمیٹنے کی مشین تھی۔
پینے پلانے کا دور اب بھی چل رہا تھا۔ جن کو طلب تھی یا جن کا ظرف ابھی ساتھ دے رہا تھا وہ اب بھی پی رہے تھے۔ بعض کا ظرف ساتھ نہیں دے رہا تھا مگر وہ بھی پی رہے تھے اور آپے سے باہر تھے۔ کبھی اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں سے کسی رقاصہ کے ساتھ ہمرقص بننے کی کوشش کرتے تھے اور کبھی اکیلے ہی جھومنے لگتے تھے۔ چند لمحے بعد گرتے پڑتے اپنی جگہ پر واپس آجاتے تھے۔ دوسرے ان کی حرکتوں سے محظوظ ہورہے تھے۔ آج کی رات ہر چیز سے محظوظ ہونے کی رات تھی۔ بعض صرف زیرِلب مسکرانے پر اکتفا کرتے تھے۔
میں ایک کونے میں چھپا بیٹھا تھا لیکن ملک ریاض آخرکار مجھے ڈھونڈتا ہوا وہاں آن پہنچا۔ مجھے دیکھ کر اس نے گویا اطمینان کی سانس لی... "شکر ہے آپ موجود ہیں ... میں تو سمجھ رہا تھا نکل گئے۔" پھر وہ خود ہی اپنے خیال کی تردید کرتے ہوئے بولا۔ "نکل کیسے سکتے ہیں۔ میں نے آپ کی اور آپ کی گاڑی کی نگرانی کے لئے بندے باہر کھڑے کئے ہوئے ہیں کہ چوہدری صاحب نکل کر جانے نہ پائیں۔" اس نے مخمور سے انداز میں قہقہہ لگایا۔ وہ یہ تاثر دینے کی کوشش کررہا تھا کہ اس نے یہ بات مذاق میں کہی ہے۔
میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جب آپ کی خوشی کی خاطر آگئے ہیں تو جائیں گے بھی آپ سے پوچھ کر ہی۔ ابھی تک تو کوئی ایسی وجہ پیدا نہیں ہوئی جو منہ چھپا کر جانے کی ضرورت پڑ آئے۔"
وہ پھنس پھنسا کر میرے پاس بیٹھتے ہوئے نیچی آواز میں بولا "آپ کچھ شغل میلہ نہیں کررہے .... پیچھے چھپے بیٹھے ہیں۔ اگر آپ کوئی کیش وغیرہ ساتھ نہیں لاسکے تو پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ حکم کریں کتنا کیش منگواؤں؟ بعد میں حساب ہوتا رہے گا۔ یا آپ ہمیں حکم دیں۔ ہم آپ کی طرف سے لاکھ دو لاکھ لٹادیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے سرکاری ملازموں کو اور تنخواہ داروں کو دیکھیں۔ کس طرح نوٹ اچھال رہے ہیں۔ آپ تو اتنے بڑے آدمی ہیں۔"
اس کا اشارہ رقص کرتی ہوئی طوائفوں پر نوٹ نچھاور کئے جانے کی طرف تھا۔ میں نے معصومیت سے پوچھا۔ "کیا طوائفوں پر نوٹ نچھاور کرنے سے ہی انسان کا مقام و مرتبہ ظاہر ہوتا ہے؟"
"نہیں' میرا یہ مطلب نہیں ہے چوہدری صاحب!" وہ اپنے پیکٹ سے اپنے لئے پان نکالتے ہوئے بولا۔ پان سے عجیب عجیب سی تیز خوشبوئیں پھوٹ رہی تھیں۔ "لیکن بہرحال' یہ زندگی کے شغل میلے ہوتے ہیں۔ ان موقعوں پر اسی طرح کرنا اچھا لگتا ہے۔ جس طرح روایتیں چلی آرہی ہوں۔ دولت عیش و عشرت کے لئے ہی ہوتی ہے۔ اس طرح کسی حسین چہرے پر لٹانے میں بھی کبھی کبھی بڑا مزہ آتا ہے' لیکن میرا خیال ہے کہ آپ محفل کو کچھ زیادہ انجوائے نہیں کررہے۔ آپ نے پینے پلانے میں بھی حصہ نہیں لیا۔ آپ کا کچھ موڈ نہیں بنا' ورنہ مجھے اتنی وضاحتیں کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"
"نہیں' یہ بات نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "میں لطف اندوز ہورہا ہوں۔ لطف اندوز ہونے کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ کچھ حرکتیں کرکے محظوظ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ انہیں دیکھ کر محظوظ ہوتے ہیں۔"
"میں ایک بار پھر کہوں گا اگر کیش کا کوئی مسئلہ ہے...."
"نہیں' یہ مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا... "بریف کیس میری گاڑی میں پڑا ہے' اتفاق سے اس میں کافی کیش ہے۔ اسی میں چیک بک بھی موجود ہے میں ابھی نوکر سے بریف کیس منگوالیتا ہوں۔ اخلاقیات کا بھی مجھے کچھ ایسا دعویٰ نہیں ہے۔ اگر میں کوئی بہت بڑا پارسا آدمی ہوتا تو اس محفل میں آتا ہی نہیں۔ کنجوسی کا مرض بھی مجھے لاحق نہیں ہے۔ میں دیانتداری سے بتارہا ہوں' اس تصور سے میرا دل نہیں ڈوب رہا کہ میں لاکھ دو لاکھ روپیہ ان طوائفوں پر لٹادوں۔"
"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟" ملک ریاض نے الجھن سے میری طرف دیکھا۔
"مجھے یہ کام بڑا عجیب' بہت مضحکہ خیز' نہایت تضحیک آمیز لگتا ہے۔" میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں ملک ریاض جیسے موٹی کھوپڑی والے آدمی کے سامنے کس طرح اپنے محسوسات کی وضاحت کروں۔ "یہ ایک بڑی عجیب سی روایت' بڑا عجیب سا رواج ہے۔ معلوم نہیں اس نے کب اور کس طرح جنم لیا ہوگا۔ آپ کو عجیب نہیں لگتا کہ ایک عورت ناچ رہی ہے' لوگ اس پر نوٹ اچھال رہے ہیں۔ یا اسے نوٹ دینے کے بہانے اس کے ساتھ عجیب عجیب حرکتیں کررہے ہیں... اور وہ مسکرارہی ہے۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ وہ اس وقت اندر سے بھی مسکرارہی ہوتی ہوگی؟"
ملک ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی موٹی موٹی خوبصورت آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان میں خمار کے گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ پان چبانے کے لئے وہ بے خیالی کے سے عالم میں دھیرے دھیرے منہ چلا رہا تھا۔
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "میں بچپن میں دیکھا کرتا تھا۔ ہمارے گاؤں میں ریچھ یا بندر والا آیا کرتا تھا۔" میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ شکرگڑھ ہی میرا گاؤں تھا جہاں میں اس وقت بیٹھا تھا "ریچھ یا بندر مختلف تماشے دکھاتا تھا' ناچتا تھا۔ پھر سب بچے اس پر پیسے پھینکتے تھے یا مداری اس کے ہاتھ میں المونیم کا ایک کٹورا دے دیتا تھا جسے لے کر وہ سارے مجمعے کے سامنے پھرتا تھا اور سب اس میں حسب توفیق پیسے ڈال دیتے تھے۔"
ملک ریاض نے غیر ملکی سگریٹ کا پیکٹ نکال کر لمبی سی ایک سگریٹ سلگائی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ریچھ یا بندر کا تماشا اور مجرا مجھے کچھ ایک ہی طرح کی چیز محسوس ہوتی ہے۔ عورت.... خواہ طوائف ہو.... اس میں اور ریچھ بندر میں کوئی فرق ہونا چاہئے۔ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم لوگ ڈانس آرام سے' یکسوئی سے بیٹھ کر دیکھا کریں اور اس کا کوئی طے شدہ معاوضہ یا حسب حیثیت اور حسب حالات کوئی رقم رقص سے پہلے یا رقص کے بعد طوائف یا اس کی نائیکہ کو ادا کردیا کریں۔ یہ ایک ایک نوٹ اچھالنا یا اس کے لئے طوائف کو قریب بلانا' اس سے چہلیں کرنا' نوچ کھسوٹ سی کرنا کچھ عجیب سا نہیں لگتا؟"
میں بہت نیچی آواز میں بات کررہا تھا' ویسے بھی وہاں ایک ہنگامہ برپا تھا' سب بقول ملک ریاض کے "شغل میلے" میں لگے ہوئے تھے ورنہ شاید آس پاس بیٹھے ہوئے معززین برا مناجاتے۔ ملک ریاض نے ایک گونجیلا قہقہہ لگایا۔ تب بھی کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا۔
وہ اپنا بھاری بھرکم ہاتھ میرے کندھے پر رکھ کر بولا۔ "چوہدری صاحب! تسی وی بڑے ای کمال بندے او... ہر گل اچ تسی گنجلاں اچ پے جاندے او..." (چوہدری صاحب! آپ بھی کمال کے آدمی ہیں۔ ہر بات میں الجھنوں میں پڑجاتے ہیں۔)
"کیا کروں' مالک نے ایسا ہی بنایا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کوئی مینوفیکچرنگ فالٹ ہے مجھ میں۔ شاید یہاں کوئی پرزہ غلط لگ گیا ہے" میں نے کنپٹی پر انگلی مارتے ہوئے کہا۔ اس دوران ملک کا نوکر میری گاڑی سے میرا بریف کیس لے آیا تھا۔
اس نے ایک اور قہقہہ لگایا پھر نیچی آواز میں بولا "جب آپ شہر میں ہوتے ہیں تو کیا کبھی شاہی بازار یا پرائیوٹ پارٹیوں میں مجرا شجرا دیکھنے نہیں جاتے؟"
"نہیں' بازاروں میں تو میں کبھی نہیں گیا۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' کسی ایسی پرائیوٹ پارٹی میں بھی جانے کا اتفاق نہیں ہوا جہاں مجرے وغیرہ کا انتظام رہا ہو۔ ذرا ماڈرن قسم کی پارٹیز میں جانے کا البتہ اکثر اتفاق ہوا ہے جہاں کھانے پینے کے بعد ڈانس وغیرہ کا سلسلہ چل پڑتا ہے۔ شاید کھانا ہضم کرنے کے لئے۔"
"وہ بھی انگریزی مجرا ہی ہوا نا" ملک نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔
"نہیں۔ میرے خیال میں وہ کافی مختلف چیز ہوتی ہے۔ اس میں کوئی ایک شخصیت تماشا اور باقی سب تماشائی نہیں ہوتے۔ اور یہ نوٹوں وغیرہ کا سلسلہ بھی نہیں ہوتا۔ سب خود ہی تماشا ہوتے ہیں اور خود ہی تماشائی۔"
"یا یوں کہہ لیں کہ ہر کوئی اپنا تماشا اپنی بغل میں لئے پھرتا ہے۔"... ملک ریاض ہنسا پھر میری طرف جھکتے ہوئے سنجیدگی سے بولا... "ویسے یقین نہیں آتا چوہدری صاحب کہ آپ اتنے ہی سادہ اور عیاشیوں سے اتنے ہی بچے ہوئے آدمی ہیں۔ آپ کی جوانی تو امنڈتا طوفان معلوم ہوتی ہے۔ کیا کریں گے اس کو بچا بچا کے رکھ کر؟"
"اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" میں نے پہلو بدلتے ہوئے طویل سانس لے کر کہا۔ "میں نے کہا نا کہ زندگی کو برتنے کا ہر کسی کا اپنا طریقہ' اپنا سلیقہ ہوتا ہے۔"
میں نے بریف کیس کھولا۔ اس کے ایک حصے میں نوٹوں کی گڈیاں ترتیب سے رکھی تھیں۔ میں نے دس ہزار کی ایک گڈی نکال کر ملک ریاض کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "لیجئے۔ یہ آپ میری طرف سے اس رقاصہ پر لٹادیجئے' جب دوسری آئے گی تو مزید رقم آپ کی خدمت میں پیش کروں گا۔"
"نہیں چوہدری صاحب! یہ کام اس طرح نہیں ہوتے..." وہ نفی میں انگلی ہلاتے ہوئے بولا "آپ کی رقم ہے۔ آپ ہی آگے آکر پیش کریں۔"
"ملک صاحب! میں ابھی تک ان لڑکیوں سے اپنی شکل چھپانے میں کامیاب رہا ہوں۔ اب آپ کیوں مجھے ایکسپوز کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ کا تعلق فلمی دنیا سے بھی ہے اور وہ مجھے پہچانتی ہیں۔ فلمی دنیا میں میرا امیج بالکل مختلف قسم کا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ میں عیش پرست قسم کا روایتی سیٹھ نہیں ہوں۔ ذوق و شوق سے اس قسم کی محفلیں نہیں سجاتا اور نہ ان

سے محظوظ ہوتا ہوں... بشری کمزوریاں میرے ساتھ ضرور ہیں۔ مجھے زہد و پارسائی کا دعویٰ نہیں ہے۔ عورت سے مجھے دلچسپی ہے' بلکہ خاصی دلچسپی ہے لیکن وہ میری خلوت کی زندگی ہے۔ میں سرِ بازار تماشے نہیں لگاتا۔ آپ میری طرف سے یہ گڈی اس کے پیروں میں رکھ دیں۔"

"فرش پر رکھی ہوئی گڈیاں طوائفیں نہیں اٹھاتیں۔ یہ مجرے کے آداب کے خلاف ہے۔" ملک ریاض مسکراتے ہوئے بولا۔

"آپ یہ کہہ کر رکھ دیجئے کہ یہ فن کے ایک گمنام پرستار کی طرف سے ہے اس کی نائکہ اٹھالے گی" میں نے کہا "جس طرح وہ نچھاور کئے جانے والے نوٹ سمیٹتی ہے۔"

"اچھا... چلیں... جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے کندھے اچکائے۔ چند لمحے بعد وہ آگے پہنچا۔ نوٹوں کی گڈی اس نے رقاصہ کے پیروں کی طرف اچھال دی اور بہ آواز بلند بولا "یہ فن کے ایک شرمیلے قدر دان کی طرف سے ہے جو سامنے نہیں آنا چاہتا' چہرہ نہیں دکھانا چاہتا۔" اس کی آواز پاٹ دار تھی۔ موسیقی اور داد و تحسین کے شور میں بھی صاف سنائی دی۔

ایک لمحے کے لئے بدمست تماشائیوں کی چیخ پکار تو تھم گئی لیکن موسیقی کی دردناک سی پکار بدستور جاری رہی۔ رقاصہ کے قدم ایک لمحے کے لئے رکے۔ اس نے متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن پیچھے بیٹھے ہوئے لوگوں میں بہت سے ایسے تھے جو نوٹ نہیں لٹا رہے تے اور پھر مجھ تک تو روشنی بھی صحیح طور پر نہیں پہنچ رہی تھی۔ وہ نہیں جان سکتی تھی کہ فن کا وہ گمنام قدردان کون ہو سکتا تھا جسے ملک ریاض نے شرمیلا قرار دیا تھا۔

رقاصہ تیز روشنی میں تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے محسوس کیا کہ اس کی آنکھوں میں نمی جھلملائی تھی یا پھر شاید یہ میرا وہم تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ماہرانہ انداز میں رقص کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑلیا۔ نائکہ نے اپنے کارندے کے ذریعے گڈی اٹھوالی جو اسی کام پر مامور تھا۔

اسی طرح میں نے ملک ریاض ہی کے ہاتھوں ہر رقاصہ کے قدموں میں دس ہزار کی گڈی پھنکوائی۔ صرف اس لئے کہ ملک یہ نہ سمجھے میں کنجوس ہوں اور حسب حیثیت خرچ کرنا نہیں جانتا۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھ سکتا تھا کہ میں چیپ نظر آنے سے بچنا چاہتا تھا۔

رات کے بارہ بجے تک شامیانوں تلے موجود مہمانوں میں سے بیشتر نشے میں دُھت ہو چکے تھے۔ محفل اپنے نکتۂ عروج پر تھی۔ اور یہ ایسا نکتۂ عروج تھا جس کے بعد یکدم لوگ تھک کر گر پڑتے ہیں۔ نورو ماچھی نشے میں بدمست ہو کر اور بھی خوفناک دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے چوڑے چکلے کھردرے چہرے پر بلا کی وحشت تھی اور سرخ انگارہ آنکھوں میں ایک ایسی درندگی تھی جو نشے کی تہ میں مدھم پڑنے کے بجائے زیادہ طاقتور ہوگئی تھی۔

اس وقت افروز ڈانس کر رہی تھی۔ وہ مہمانوں کے اصرار پر تیسری مرتبہ ڈانس کرنے آئی تھی۔ وہ شکل صورت اعتبار سے بھی سب لڑکیوں سے بہتر تھی اور اسے رقص پر بھی تھا۔ میک اپ کی تہوں کے باوجود یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا اس کی رنگت واقعی سرخ و سپید تھی۔ اس کی آنکھیں بادامی بال سنہری تھے۔ اس کے جسم میں شاخِ گل کی سی لچک تھی۔ ہی میں فلم والے اسے بازار سے اچک کر لے گئے تھے لیکن ابھی مصروف نہیں ہوئی تھی۔ میں نے سنا تھا اسے اداکاری بالکل نہیں آتی تھی اور اس کا لہجہ بہت خراب تھا ورنہ شاید وہ ہیروئن بھی بن سکتی تھی۔ اس کی یہ خامیاں سخت کوشش اور محنت باوجود دور نہیں ہو رہی تھیں۔ ڈانسر کے طور پر اس کے کامیاب ہونے کی امید تھی۔ اس کی ولدیت کا خانہ اگر کبھی پُر کیا گیا ہوگا اس میں یقیناً کسی خوبصورت آدمی کا نام آیا ہوگا۔

افروز اس وقت شاید اپنا آخری رقص پیش کر رہی تھی۔ وہ نشے میں نہیں تھی لیکن موسیقی کے ردھم' محفل کے جوش خروش یا پھر کسی انجانے اندرونی جذبے نے اس پر بھی والہانہ کیفیت طاری کردی تھی۔ وہ رقص کیا تھا' بے خودی کا ایک عجیب ہی مظاہرہ تھا۔

پھر اس بے خودی نے نورو ماچھی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وہ اس طرح کود کر آگے پہنچا جیسے کسی درندے نے درخت سے میدان میں چھلانگ لگائی ہو۔ اس نے افروز کے دونوں ہاتھ تھام لئے اور بالکل ویسٹرن فلموں کے کسی وحشی کردار کی طرح اس کے رقص میں شریک ہوگیا۔ تماشائیوں نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ سیٹیاں اور تالیاں بجنے لگیں۔ نعرے لگنے لگے۔ ان دونوں پر نوٹ نچھاور کئے جانے لگے۔ چار چھ اور ڈاکو بھی اٹھ کر ان دونوں کے گرد دائرہ بنا کر ناچنے لگے۔ باقی لوگ تالیاں بجا کر ان کا ساتھ دینے لگے۔

اس دُھن کو بہت طول دیا گیا۔ ناچتے ناچتے دونوں پسینے میں شرابور ہوگئے۔ آخر کار موسیقی ختم ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی نورو ماچھی نے افروز کو ایک بازو سے فرش سے اٹھایا اور کسی ہلکی پھلکی چیز کی طرح کندھے پر لاد لیا اور بڑے اطمینان سے ہال کی طرف چل دیا۔ پھر ہال کے کھلے دروازے سے میں نے اسے سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔ وہ اوپر کی منزل کی طرف جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے محفل پر خاموشی چھا گئی تھی۔ پھر یکدم یہ سکوت ٹوٹا اور سب قہقہے لگانے لگے۔ تالیاں بجانے لگے لیکن یہ قہقہے اور تالیاں چند لمحے بعد ایک بار پھر تھم گئے کیونکہ اوپر کی منزل کے کسی کمرے سے افروز کی کربناک چیخوں کی آواز سنائی دینے لگی تھی۔ وہ ذبح ہوتے ہوئے بکرے کی طرح چیخ رہی تھی۔

افروز کی نائکہ جو شاید اس کی ماں بھی تھی' ساکت بیٹھی ہال کی طرف دیکھ رہی تھی جس سے سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔ اس کی

پھیلی پھیلی سی تھیں اور رنگت زرد پڑ چکی تھی۔ چند لمحے پہلے تک وہ بڑے مزے اور ناز و ادا سے پان چبا رہی تھی لیکن اب اس کے جبڑے ساکت ہو چکے تھے۔

افروز کی کربناک چیخوں کا سلسلہ جاری تھا لیکن سب نے اس طرف سے کان بند کر لئے تھے۔ حاظرین کے نزدیک گویا یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ایک اور رقاصہ سے فرمائش کی جا رہی تھی کہ وہ آگے آئے اور رقص شروع کرے مگر وہ سازندوں کے درمیان اپنی جگہ ساکت کھڑی تھی۔ پھر اس نے مجبوری نظروں سے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی اس کی طرف توجہ ہی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے اپنے ساتھ آنے والے بھی اس وقت اس کی طرف دیکھنے کے بجائے بار بار ہال کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ رقص کے لئے آگے نہیں بڑھی۔

میں سب سے پیچھے گاؤ تکئے کے سہارے اپنی جگہ ساکت بیٹھا اور اپنی رگوں میں لہو کی تیز ہوتی ہوئی گردش کو معمول پر رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنے آپ کو سمجھا رہا تھا کہ اس موقع پر میرا خواہ مخواہ ہیرو بننا ضروری نہیں تھا۔ اس سے میرا کوئی ایسا تعلق نہیں تھا' جیسا فلموں میں ہیرو کا ہیروئن سے ہوتا ہے۔ اور نہ ہی میں اپنی زندگی میں اس سے ایسا کوئی جذباتی تعلق استوار کرنے کا آرزومند تھا۔

بے شک وہ نوجوان تھی لیکن بہر حال ایک منجھی ہوئی طوائف تھی۔ اس قسم کی محفلیں' بدمست شرابی' حتیٰ کہ درندہ صفت ڈاکو بھی شاید اس کے لئے کوئی نئی چیز نہیں تھے۔ جب وہ دولت سمیٹنے کی اس قسم کی مہموں پر نکلتی ہوں گی تو یقیناً ان میں پوشیدہ خطرات اور امکانات پر بھی ان کی نظر رہتی ہوگی۔

"نہیں انی میاں! یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے اپنے آپ کو مطمئن کرنے کی کوشش جاری رکھی "ابھی صبر و سکون سے دیکھو... حالات کس رخ پر جاتے ہیں۔"

اوپر سے افروز کی کربناک چیخوں کا سلسلہ جاری تھا۔ جو دوسری رقاصہ رقص کے لئے تیار ہوئی تھی مگر افروز کی چیخیں سن کر رک گئی تھی' ملک ریاض اس کی طرف دیکھ کر دہاڑا... "تو کیوں بت بن گئی ہے؟ تو اپنا کام چالو رکھ۔"

آخر کار ایک آواز بلند ہو ہی گئی۔ یہ میرا مشاہدہ تھا کہ ہر جگہ ظلم کے خلاف کوئی نہ کوئی آواز بلند ضرور ہوتی تھی۔ خواہ وہ کتنی ہی کمزور ہوتی تھی' خواہ وہ زیادہ کانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی دبا دی جاتی تھی' خواہ آواز بلند کرنے والے کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹا دیا جاتا تھا لیکن آواز ابھرتی ضرور تھی۔ انسانیت کی تاریخ یہی تھی۔

وہ ایک دبلا پتلا' غیر معروف سا کامیڈین تھا۔ سانولی رنگت' بکھرے ہوئے سے بال' زرد آنکھیں' رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی' شکن آلود سے کپڑے۔ اعصاب زدہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ افروز کی چیخیں سن کر چند لمحے ضبط کر کے بیٹھنے کی وجہ سے شاید اس کے جسم پر خفیف سا لرزہ طاری تھا۔ دولت' رسائی اور اختیارات کے نشے میں چُور بڑے بڑے قد آور لوگوں کی اس بھری محفل میں اس وقت شاید ظاہری اعتبار سے سب سے حقیر اور کمتر وہی نظر آرہا تھا مگر میرے خیال میں وہ سب سے بہتر تھا۔ اس نے زیادتی کے خلاف آواز بلند کرنے میں پہل کی تھی۔

وہ اٹھ کر سامنے آیا اور یکدم گویا پھٹ پڑا "ملک صاحب! یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم یہاں اس لئے تو نہیں آئے تھے۔"

وہ ایک منحنی سا آدمی تھا لیکن اس کی آواز میں گرج تھی۔ گو کہ اس وقت ہیجان زدگی اور فرطِ جذبات سے آواز پھٹ سی گئی تھی مگر پھر بھی سارے شور پر حاوی تھی۔ محفل میں ایک لمحے کے لئے سناٹا چھا گیا۔ پھر یکدم ملک ریاض دہاڑا... "تو اور کیا تم یہاں ثواب کمانے کے لئے آئے تھے؟"

"ثواب عذاب کی باتیں رہنے دیں ملک صاحب!" غصے سے کامیڈین کا سانولا چہرہ ارغوانی سا ہو گیا۔ شدتِ جذبات سے آواز کچھ اور کانپ گئی "ٹھیک ہے' افروز طوائف ہے' مرد اس کے لئے کوئی نئی مخلوق نہیں ہیں۔ نورو کو اسے ساتھ لے جانا تھا تو پیار محبت سے لے جاتا۔ افروز کو اس طرح دردناک انداز میں چیخیں مارنے کی ضرورت نہیں تھی۔ آخر وہ خبیث کر کیا رہا ہے؟ کہیں وہ اسے جان سے نہ مار دے' آپ اسے کچھ تو سمجھائیں نا۔"

نورو ماچھی کے لئے "خبیث" کا لفظ سن کر اس کے ساتھی ڈاکوؤں میں سے دو یکدم جھٹکے سے اٹھ کھڑے ہوئے لیکن لرزہ براندام کامیڈین اس وقت گویا اپنے گرد و پیش سے بے خبر تھا۔ اس کی نظر صرف ملک ریاض پر تھی اور دھیان غالباً افروز کی کربناک چیخوں کی طرف تھا۔

"نورو ماچھی کو بھلا کون سمجھا سکتا ہے؟" ملک ریاض خاصی خباثت سے مسکرایا "یہ اس کا اسٹائل ہے۔ کھوتے کا پُتر... گھاس کم چرتا ہے دولتیاں زیادہ چلاتا ہے۔ بے فکر رہو۔ افروز مرے گی نہیں۔ تمہیں تو زیادہ پتا ہوگا اپنی برادری کا۔ اتنی آسانی سے مرنے والی مخلوق نہیں ہیں یہ۔ تھوڑی بہت زخمی شخمی ہو جائے گی تو مرہم پٹی دوا دارو کردیں گے۔ سب انتظام ہے ہمارے پاس۔ گھاٹے میں نہیں رہے گی وہ۔ ایک آدھ ہڈی تڑالے گی' چار چھ زخم کھالے گی تو نورو ماچھی اس کی جھولی سونے چاندی سے بھر دے گا۔ بہت مال ہے اس کے پاس۔ ویسے بھی افروز نے یہاں سے کیا کم مال سمیٹا ہے؟"

کامیڈین کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ شدتِ جذبات سے اس کی آواز رُندھ گئی۔ اس کا غصہ ایک مجبور آدمی کا غصہ تھا لیکن وہ اسے بس گھولتے سانپ کی طرح سینے میں دبا کر نہیں بیٹھا تھا۔ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا "ملک صاحب! میں کہتا ہوں اس حرامزادے کو روکو۔"

"اوئے... اوئے چمٹے! تُو تو بہت ہی بڑھتا جا رہا ہے۔" ملک

بولا اور اسی لمحے دونوں ڈاکوؤں نے بیک وقت اپنی اپنی رائفل کا بٹ کامیڈین کو رسید کیا۔ ایک بٹ اس کے کندھے پر لگا اور دوسرا چہرے پر۔ وہ بہت دور جا گرا اور وہیں ساکت ہوگیا۔ دونوں ڈاکو ایک بار پھر اس پر جھپٹنے لگے تھے مگر ملک نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "بس کردیا یار! اس بے چارے کے لئے اتنا ہی کافی ہے.... اس میں رکھا کیا ہے... ہڈیوں کی مالا تو ہے۔"

ڈاکو سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رک گئے اور واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھے۔ افروز کی نائیکہ نے آگے بڑھ کر کامیڈین کو سیدھا کیا اور اپنے دوپٹے سے اس کا چہرہ پونچھنے لگی۔ خون سے اس کا آنچل لتھڑ گیا لیکن غنیمت تھا کہ کامیڈین کے چہرے سے خون کا بہاؤ جاری نہیں رہا۔

میں بدستور ساکت بیٹھا رہا۔ میری رگوں میں لہو سرگوشیاں کررہا تھا۔ 'ٹھیک ہے اٹی! یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے لیکن اگر ہر کوئی یہی سوچ کر بیٹھا رہے کہ جب تک ظلم کی آگ میرے بدن تک نہیں پہنچے گی تب تک وہ میرا مسئلہ نہیں ہے' تو ظلم گلی گلی پھیل جاتا ہے' اس سوسائٹی میں سانس لینا دشوار ہوجاتا ہے۔'

اس کے باوجود میں ساکت بیٹھا رہا۔ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ صورت حال عجیب سی تھی۔ اسی دوران افروز کی چیخیں بھی معدوم ہوگئیں۔ شاید وہ بے ہوش ہوگئی تھی یا اس میں مزید چیخنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ ہلکی آواز میں وہ اب بھی چیخ رہی ہو یا کراہ رہی ہو لیکن فاصلے کی وجہ سے اب اس کی آواز ہم تک نہ پہنچ رہی ہو۔

افروز کی نائیکہ نے کامیڈین کا سر اپنی گود میں رکھ لیا تھا اور ایک نوکر سے ٹھنڈا پانی لے کر اپنا آنچل بھگو کر اس کا چہرہ صاف کر رہی تھی۔ نائیکہ کا چہرہ سپاٹ تھا۔ صورت حال گو کہ واضح تھی پھر بھی اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہی تھی۔

ملک ریاض ایک بار پھر اس دوسری رقاصہ پر برس پڑا جس کا نام مجھے معلوم نہیں تھا اور جو ابھی تک بُت بنی کھڑی تھی "اری تجھ پر کیا فالج گر گیا ہے؟ کیوں مہمانوں کا بنا بنایا موڈ خراب کرتی ہے۔ چل... تو کسی ستھرے سے گانے پر ستھرا سا ڈانس شروع کر۔"

اس بار وہ بہت برہم نظر آیا تھا بلکہ اپنی جگہ سے اٹھتے اٹھتے رہ گیا تھا۔ ساز ایک بار پھر کراہ اٹھے اور رقاصہ کے پاؤں بھی با دل ناخواستہ حرکت میں آگئے۔ چند لمحے بعد ہی رقص و موسیقی کا سلسلہ دوبارہ عروج پر پہنچ گیا مگر اب گویا ہر چیز روح سے خالی تھی۔ رقاصاؤں کی آواز اور پاؤں کی حرکت میں ویسے بھی ان کے جذبات ذرا کم ہی شامل ہوتے ہیں۔ وہ ایک طویل مشق کے تحت مشینی سے انداز میں سب کچھ کرتی ہیں لیکن اس وقت تو رقاصہ بالکل ہی کٹھ پتلی بن گئی تھی۔ چہرہ حرکات کا ساتھ نہ دے تو انسان کچھ عجیب مضحکہ خیز سا لگتا ہے' خواہ وہ رقاصہ ہی کیوں نہ ہو اور رقص ہی کیوں نہ کر رہی ہو۔

لیکن مہمانوں کے حواس پر خمار کا قبضہ تھا۔ ان کی تو... کے لئے ضرور ہٹی تھی لیکن جلد ہی وہ دوبارہ رقص میں... رقاصہ کے جسم کی لچک' اعضاء کا مدوجزر' آواز کی کھنک... گجروں کی باسی مہک ہی سب کچھ تھی۔ ملک ریاض اور ا... کے گروہ کے ڈاکو تو سب سے زیادہ انجوائے کررہے ت... جھوم رہے تھے اور ان کی باچھیں پھیلی جا رہی تھیں۔

وہ رقص ختم ہونے سے پہلے ہی ہال کی سیڑھیوں... اترتی بلکہ تقریباً لڑھکتی دکھائی دی۔ وہ جنگلے کا سہارا لئے... نیچے چلی آرہی تھی۔ اس کا لباس جو کچھ دیر پہلے اس کے ح... کی شان بڑھا رہا تھا' اب چیتھڑوں کی صورت میں اس... جھول رہا تھا۔ اس کا چہرہ لہولہان تھا۔ جسم کا جو حصہ بھی نظ... اس پر خراشیں اور نیل ہی تھے۔

اس کی نائیکہ اور دو ایک سازندے اٹھ کر اس... دوڑے۔ انہوں نے سیڑھیوں پر اسے سنبھالا۔ وہ ان کے... میں جھول گئی۔ ملک نے اپنی جگہ سے بیٹھے بیٹھے یہ آواز... دیا۔ "اوئے جاؤ اوئے' اس شہدی کی مرہم پٹی' دوا... بندوبست کرو۔"

نوکروں نے جا کر ہال میں افروز کو خود سنبھال لیا۔ نا... سازندوں کو پیچھے ہٹا دیا۔ وہ اسے اندر ہی اندر حویلی میں ک... گئے۔ نائیکہ بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ سازندے لوٹ... رقص اسی طرح جاری رہا۔ گو کہ اس دوران رقاصہ اور... بھی کن انکھیوں سے بار بار ہال کی طرف دیکھتے رہے۔

چند منٹ بعد نورو ماچھی بھی اوپر سے واپس آگیا۔ وہ... طرح خوش اور مطمئن نظر آرہا تھا جیسے کسی درندے کو اس... پسند شکار مل گیا ہو اور وہ باچھوں پر زبان پھیرتا' اس کا لہو چا... واپس چلا آرہا ہو۔ اس کی جگہ خالی پڑی تھی۔ اس کی فرش... بھی گویا کسی بادشاہ کے خالی تخت کی طرح تھی۔ کسی نے بھی... کر اس جگہ پر بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس جگہ کی طرف بڑھتے وقت وہ ملک ریاض کے پا... گزرا تو ملک ریاض نے پیار بھرے انداز میں اسے ڈانٹ... کہا "اوئے جانگلوس کے بچے! تجھے یہ کیا گندی عادت ہے؟ ہ... تصویر کو بگاڑ دیتا ہے۔ اوئے بیوقوفا! سوہنی عورتوں کے... ایسا سلوک نہیں کرتے۔ جوانی ہم پر بھی آئی تھی..... اور... کہیں گئی نہیں ہے لیکن یہ کتے بلیوں کی طرح چیر پھاڑ ہم ن... نہیں کی۔ جوانی کی کوئی یہی تو نشانی نہیں ہے نا۔"

وہ شاہانہ انداز میں اپنی جگہ جا بیٹھا۔ ملک کا اسے ڈا... انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی باپ اپنے ناسمجھ بچے کو تنبیہ... ہو کہ اسے صاف کاغذوں پر پینسل سے آڑی ترچھی لکیریں... کھینچنی چاہئیں۔

نورو گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے...

...آواز میں بولا "ملک صاحب! آپ کو پتا ہے.... جوانی اپنی جگہ ہے' مگر یہ معاملہ دوسرا ہے۔ محفل میں سجی ہوئی سوہنی صورت برداشت نہیں ہوتی مجھ سے۔ زیادہ سوہنی ہر شکل دیکھ کر... اور ...ب کے سامنے دیکھ کر آگ لگ جاتی ہے میرے سینے میں۔ دل چاہتا ہے اسے مٹا دوں' اجاڑ دوں' گم کردوں دنیا سے۔"

پھر مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے وہ غرایا۔ "حسینہ بھی بہت ...وہنی تھی نا۔ مجھ سے بے وفائی کرگئی تھی۔ بھاگ گئی تھی۔ غائب ہوگئی تھی اپنے کسی اور یار کے ساتھ۔ نام بھی حسینہ تھا اور تھی بھی حسینہ۔ بڑا مان تھا اسے اپنی خوبصورتی پر۔"

یک بیک اس کے چہرے پر زلزلے کے سے کچھ ایسے آثار نمودار ہوئے کہ اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے 'معززین' سہم سے گئے۔ دانت پیس کر وہ بولا "گم ہوگئی اس دنیا میں وہ خبیث کی بچی۔ لیکن میں مرتے دم تک اس کو ڈھونڈتا رہوں گا ملک صاحب! جس دن بھی مل گئی اس دن اس کی شکل ایسی بنا دوں گا کہ کتے بلیاں بھی اس کو دیکھ کر ڈریں گی۔ اور جب تک وہ نہیں ملتی' مجھے ہر سوہنی شکل میں اس کی شکل نظر آتی رہے گی۔"

اس خباثت کی تہ سے بھی ایک کہانی نکل آئی تھی۔ میں نے کچھ دور رکھے ہوئے اگالدان میں تھوک دیا۔ نورو ماچھی بازو لہرا کر اور انداز میں دوسری رقاصاؤں اور نامعلوم لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ ساری بھی اچھی ہیں۔ اچھی شکلیں ہیں ان کی بھی۔ انہوں نے بھی بڑے لوگوں کو دھوکے دئیے ہوں گے......"

لڑکیاں سہم سی گئیں مگر نورو ماچھی گویا ان کی جان بخشی کرتے ہوئے بولا "مگر وہ..... افروز ان سب سے اچھی تھی۔ اس نے سب سے زیادہ لوگوں کو چکر دئیے ہوں گے۔ اس لئے میں نے اسے اٹھایا تھا۔ اب ٹھیک بھی ہوگئی تو شکل اتنی سوہنی نہیں رہے گی۔ جب بھی شیشہ دیکھے گی' نورو ماچھی کو یاد کرے گی۔ سنا آپ نے ملک صاحب؟ ایک اور خوبصورت چھوکری نورو ماچھی کو یاد کرے گی"

اس نے دیوانگی آمیز سے انداز میں قہقہہ لگایا جس کی گونج سے فضا دیر تک مرتعش رہی۔

ملک مربیانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "اوئے پاغلا! مت پال اتنا نفرت کا زہر دل میں۔ پاگل ہوجائے گا کسی دن۔"

وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ "پاگل تے اسی کدوں تے تھی گئے آں مینڈا سائیں!" (پاگل تو ہم کب کے ہوچکے ہیں میرے سائیں!)

معلوم نہیں حسینہ اس کی بیوی تھی یا محبوبہ' جو اس سے بے وفائی کرکے بھاگ گئی تھی لیکن مجھے بہرحال ایسے لوگ بہت برے لگتے تھے جو کسی کی حرکت کا بدلہ اوروں سے لیتے پھرتے تھے۔ بہت سے ڈاکوؤں اور دیگر جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ ایسی ہی کہانیاں وابستہ ہوتی تھیں کہ ان کے ساتھ بڑا ظلم' تشدد اور زیادتیاں ہوئیں جن کے ردعمل میں وہ ڈاکو یا بدمعاش بن گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے بیشتر کہانیاں درست ہوتی ہیں اور کم ذہنی استعداد کے لوگ ردعمل کے طور پر ایسے ہی راستوں پر چل نکلتے ہیں۔

اگر وہ ویسے ہی ظالم اور فرعون صفت لوگوں کو نشانہ بناتے رہیں جیسوں نے انہیں برباد کیا تھا تب بھی بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن وہ لوگ مجھے سخت زہر لگتے تھے جو پورے معاشرے سے ہی انتقام لینا شروع کردیتے تھے۔ کسی بھی فرد یا طبقے کا ان کی بربادیوں سے بالواسطہ یا بلاواسطہ کوئی تعلق ہو یا نہ ہو' وہ اسے روندتے چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی ان کے ظلم و تشدد سے محفوظ نہیں رہتے تھے جو خود پہلے سے ہی مظلوم ہوتے تھے۔ اب یہ تو کوئی ردعمل نہ ہوا کہ آپ بے گناہوں کو بھی سزا دینا شروع کر دیں۔

اس کے علاوہ میں نے یہ بھی دیکھا تھا کہ اس قسم کے لوگ جب اچھی طرح دنیا سے اپنے ماضی کا انتقام لے چکے ہوتے تھے' دل کی بھڑاس نکال چکے ہوتے تھے' ان کے پاس دولت وغیرہ بھی آجاتی تھی تب بھی وہ یہ راستہ چھوڑتے نہیں تھے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا کہ ایسا کوئی شخص منہ چھپا کر کسی طرف کو نکل گیا ہو اور باقی زندگی اس نے گمنامی و سکون کی حالت میں گزار دی ہو۔ جواز اُن کے پاس یہ ہوتا تھا کہ وہ اب انہی راستوں پر چلنے پر مجبور ہیں' ان کے پاس واپسی کا راستہ نہیں رہا۔ ایسے لوگوں کی اکثریت کے بارے میں یہ بات درست نہیں ہوتی تھی۔ اصل میں وہ بس اسی زندگی کے عادی ہوجاتے تھے۔ ان کے روز و شب کا پیٹرن ہی کچھ ایسا بن جاتا تھا کہ وہ اس سے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ کسی بھی چیز کو تج کر کہیں جانا نہیں چاہتے تھے۔ کوئی نہ کوئی لالچ ان کے پاؤں کی زنجیر بنا رہتا تھا۔ بعض اس طاقت اور دہشت سے دست بردار ہونا نہیں چاہتے تھے جو انہیں حاصل ہوچکی ہوتی تھی۔ طاقت کا بھی تو اپنا ہی ایک نشہ ہوتا ہے۔

رقاصہ نے اب دوسرے نغمے پر رقص کرنا شروع کردیا تھا لیکن محفل میں اب وہ گرما گرمی نہیں رہی تھی۔ پینے پلانے والوں کے چہرے گو کہ اب بھی تمتما رہے تھے مگر اس تمتماہٹ کی تہ میں تھکن قدم جمانے لگی تھی۔ اب تو ساز بھی گویا روں روں کر رہے تھے۔ رقاصہ کا کٹھ پتلی پن بڑھ چکا تھا۔

ایک گھنٹے بعد محفل اختتام پر نظر آنے لگی۔ اس وقت ایک اور عجیب دھندا شروع ہوگیا۔ مہمانوں میں سے کچھ خاص خاص لوگوں نے ملک ریاض سے کچھ کھسر پھسر کی پھر یکے بعد دیگرے ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی لڑکی کو ساتھ لے کر ہال کی سیڑھیوں کے راستے حویلی کی اوپر کی منزل کی طرف چلا گیا۔ ناچنے والی لڑکیاں اور ان کے ساتھ آئی ہوئی دوسری نامعلوم لڑکیاں ایک ایک کرکے غائب ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی حاضرین کی تعداد بھی کم

ہونے لگی۔ حتیٰ کہ دو ڈاکو بھی اوپر چلے گئے۔ باقی البتہ نورو ماچھی کو گھیرے میں لئے رہے۔

ملک ریاض اس دوران کھسک کر پیچھے میرے پاس آیا اور سرگوشی میں بولا "آپ کی تواضع کے لئے میں نے افروز کو منتخب کیا ہوا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ ڈنگر کا بچہ اسے کئی ہفتوں کے لئے بستر پر لٹا دے گا۔ خبیث کہیں کا۔ کھلونے سے زیادہ کھیلتا نہیں ہے۔ بس اسے توڑنے پھوڑنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ خیر' لعنت بھیجیں اس پر۔ یہ بتائیں کہ جو سامنے بیٹھی ہیں ان میں سے کوئی پسند ہے؟ ورنہ ایک گھنٹے کے نوٹس پر کوئی دوسرا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔"

میں ایک طویل لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میں بجا طور پر حیران تھا۔ کیا اتنے بڑے بڑے زمینداروں' سیاست میں حصہ لینے والوں اور دنیا کی ہر آسائش کے مالکوں نے بھی اب یہ کام سنبھال لیا تھا؟ میں نے ملگجے اندھیرے میں نظروں سے اس کے چہرے کو ٹٹولا۔ مگر اس چہرے پر خفت ندامت کی کوئی علامت نہیں تھی۔ اس نے گویا بالکل عام سی' کوئی روٹین کی بات کی تھی۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ بولا "چوہدری صاحب! شرمائیں نہیں۔ ہماری یہ دنیا ایک بالکل الگ تھلگ دنیا ہے۔ سارے ڈر' خوف اور اندیشے دل سے نکال دیں۔ زمانے کو بھی بھول جائیں اور خود کو بھی۔ یہاں آکر بڑے بڑے لوگ اپنے آپ سے اور دنیا سے بے پروا ہو جاتے ہیں۔ آپ نے دیکھا نہیں' بڑے بڑے سرکاری افسر تک کیسی ترنگ میں ہیں۔ یہاں سب بے دھڑک اپنے دل کے ارمان نکالنے آتے ہیں کیونکہ یہاں سے کوئی خبر باہر نہیں جاتی۔"

"دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں' وہ تو میں نے دیکھ ہی لیا ہے ملک صاحب!" میں نے ملائمت سے کہا "اور خبر کے باہر جانے یا نہ جانے سے بھی مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ آوارہ جذبوں کی تسکین کا میرا یہ انداز نہیں۔ میری خواہشوں کے جنگل میں ان پیشہ ور لڑکیوں' ان گوشت پوست کی مشینوں کا کبھی گزر نہیں رہا۔ میں نے کبھی ان کی تمنا نہیں کی۔"

"چوہدری صاحب! یہ کوئی ایسی ویسی لڑکیاں نہیں ہیں۔ سب ٹاپ کی سوسائٹی گرلز ہیں۔ ستھری چیزیں ہیں۔ گندی شندی گلیوں سے پکڑ کے نہیں لائی گئی ہیں۔ یہاں کوئی ایسے گرے پڑے لوگوں کا معاملہ نہیں ہے۔ ہمارا بھی کوئی معیار ہے اور ہم دوسروں کے معیار کو بھی سمجھتے ہیں۔" ملک سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آپ کی مہمانداری میں واقعی کوئی کمی نہیں ملک صاحب! لیکن مجھے معاف ہی کر دیجئے۔ یہ بڑے نازک محسوسات کے معاملے ہیں۔ آپ انہیں نہیں سمجھ سکیں گے۔"

ملک نے قدرے مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "بہت خوب! اب مجھ پر یہ وقت بھی آنا تھا کہ آپ جیسے نوجوانوں نے مجھے بتانا تھا کہ میں کیا سمجھوں گا اور کیا نہیں۔ لیکن" اس نے کندھے اچکائے "یہ معاملہ کچھ ایسا ہے کہ اس پر زور نہیں دیا جا سکتا۔ آپ کے بارے میں ہمارے اندازے سے محسوس ہو رہے ہیں۔ ہم نے تو سنا تھا کہ آپ بڑے مزاج آدمی ہیں۔ فلمی کا کیوں شاکیوں سے بھی آپ کے تعلقات ہیں۔"

"فلمی دنیا کا تو میں نے کبھی صحیح طرح رخ ہی نہیں کیا۔ فروش' جھوٹی جھوٹی سی لڑکیوں نے کبھی مجھے کوئی خاص م کیا۔ زیادہ تر تو ویسے ہی گئی گزری ہیں۔ ان کا معاملہ تو بر پردے تک ہی ٹھیک ہے۔ صرف ایک ہی "کا کی شاکی" ہے۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ لڑکپن کا کوئی تعلق وا حوالہ نکل آیا تھا۔ دوسرے اس کے ساتھ اپنا جو بھی تجارتی بنیادوں پر نہیں ہے' صرف محسوسات کی بنیادوں پر اس کو اچھے لگتے ہیں وہ ہم کو اچھی لگتی ہے.... اور جب سے ہماری میل ملاقات ہوئی ہے تب سے اس نے کم طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ فلمی دنیا میں رہتے ہوئے نا قابل یقین سی بات؟" میں نے ملگجے اندھیرے میں ملک کی میں جھانکا جہاں پہلے ہی بڑا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس نے انداز میں سر ہلایا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ نے میرے بارے زیادہ صحیح معلومات جمع نہیں کیں۔ کون ہے آپ کا مخبر؟"

"بتا دیں گے' بتا دیں گے" وہ مربیانہ انداز میں میرا ہوئے بولا "اب آپ سے تعلق واسطہ ہوا ہے تو جلد ہی کچھ جان جائیں گے۔ ویسے آپ کو اسے مخبر کا نام چاہیے۔ معزز آدمی ہے۔ آپ کا پرانا جاننے والا ہے۔ بھروسے کا آدمی ہے۔"

وہ میرے تجسس کو بھڑکا رہا تھا لیکن میں نے بھی اس طور پر نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے۔ میرا کوئی پرانا جاننے والا بھروسے کا آدمی کیونکر ہو سکتا تھا؟ میرے ذہن میں سوال نے سر ابھارا لیکن سردست میں نے ان کی طرف سے توجہ

ملک بدستور سوچ میں ڈوبے ہوئے انداز میں سر ہلا بولا "میرا دل آپ کی طرف سے پہلے ہی کچھ کھٹک رہا تھا۔ لائن کے آدمی نہیں لگتے...... آپ نے تو گویا یہاں آکر ضائع کیا۔ دوسری طرف میرا دل کہتا ہے کہ آپ ہمارے کھل نہیں رہے۔ آخر ایسی کیا مصلحت ہے؟ آپ ہمارے کھل جائیں تو شاید زیادہ فائدے میں رہیں۔"

"ملک صاحب!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا کو بتانے کی کوشش کر چکا ہوں' مجھے خود بھی معلوم نہیں ڈلا آدمی ہوں یا بند بند۔ یا میں کس لائن کا آدمی ہوں جھنجٹوں میں زیادہ نہیں پڑتا۔ اس کے باوجود میں نے

ہے کہ آپ کو اپنے بارے میں زیادہ سے زیادہ بتا دوں۔ اگر آپ نے محسوس کر ہی لیا ہے کہ میں نے یہاں آکر وقت ضائع کیا ہے تو اب مجھے اجازت دیجئے۔"

"ارے نہیں صاحب! ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ گویا یکدم کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولا۔ "ہمارے سب سے خاص مہمان تو آپ ہی ہیں۔ آپ تو سب سے آخر میں جائیں گے۔ صبح کی سپیدی نمودار ہونے سے پہلے ہی سب لوگ یہاں سے رخصت ہو جائیں گے۔ اس کے بعد آرام سے آپ کے ساتھ باتیں ہوں گی۔"

میرا تجسس بڑھتا جا رہا تھا لیکن میں بدستور اسے چھپائے بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں اسے مجھ سے کیا باتیں کرنا تھیں؟ ادھر لڑکیوں کے ساتھ حویلی میں لوگوں کی آمد و رفت جاری تھی۔ کچھ لوگ واپس بھی آنے لگے تھے۔ مزید کچھ لوگ اندر جا رہے تھے۔ کچھ عجیب بازار سا لگا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچھے بھلے بڑے بڑے لوگوں کے لئے اس بازاری سے انداز میں کیا لذت تھی؟ کیا لطف تھا؟ لوگوں کے محسوسات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ شاید ان کے لئے یہ سب کچھ ایک دلچسپ ایڈونچر ہو۔

جلد ہی لوگوں کے واپس روانہ ہونے کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ ان میں سے بیشتر کے ڈرائیور حویلی سے کچھ دور گاڑیوں میں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ خود اس وقت صحیح ڈرائیونگ کرنے کے قابل دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ کچھ لوگوں کو بھجوانے کا بندوبست ملک ریاض کر رہا تھا۔ وہ خود کسی حسینۂ دلنواز کے ساتھ اندر کا پھیرا لگانے نہیں گیا تھا۔

میدان میرے اندازے سے کچھ پہلے ہی صاف ہو گیا۔ صبح کاذب کے آثار نمودار ہونے سے پہلے ہی تقریباً سب لوگ رخصت ہو گئے۔ افروز کو بھی مرہم پٹی کے بعد بے ہوشی کی حالت میں ہی نہ جانے کہاں بھیج دیا گیا تھا۔ صرف نورو ماچھی' اس کا ٹولا اور ملک ریاض کے آدمی رہ گئے تھے۔ کسی برات کے رخصت ہو جانے کا سا منظر تھا۔ یا پھر کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سی بلاؤں کا قافلہ وہاں اترا تھا اور ایک طویل ہنگامہ برپا کرنے کے بعد رخصت ہو گیا تھا۔

ملک ریاض واپس میرے پاس آکر بولا "آیئے چوہدری صاحب! اوپر چھت پر چلتے ہیں۔ کھلی ہوا میں.... رات کے پچھلے پہر کا لطف آتا ہے۔"

مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ میں خود کچھ حرکت میں آنا چاہتا تھا۔ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تھا۔ ماربل کی سیڑھیوں کے راستے ہم اوپر چھت پر آگئے۔ چھت کیا تھی' ایک بہت بڑا میدان تھا۔ نورو ماچھی اور اس کا ٹولا ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ ان لوگوں کا نشہ اب کچھ کم ہو گیا تھا۔ گنیں سنبھالے وہ اس طرح الرٹ نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے جیسے انہیں اندیشہ ہو کہ ارد گرد کہیں دشمن گھات لگائے بیٹھا تھا حالانکہ مجھے پتا چلا تھا' حویلی سے کچھ دور ادھر اُدھر درختوں میں ان کے اپنے ساتھی ہی چھپے بیٹھے تھے۔ نہ جانے کیوں؟ ملک ریاض نے تو اس کی وجہ صرف یہ بتائی تھی کہ کبھی کبھی جشن یا خوشی کی خبر پا کر کوئی دشمن یا بدخواہ رنگ میں بھنگ ڈالنے کی کوشش کر بیٹھتا تھا۔

حویلی کی تعمیر میں قدیم دیسی اور وکٹورین اسٹائل کی ملی جلی سی جھلک تھی۔ چھت پر ٹاورز سے مشابہ برجیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ چھت کے وسط میں بہت سی خوبصورت لان چیئرز اور شیشے کی میز وغیرہ پڑی تھی۔ ابھی تک صبح کی سپیدی نمودار نہیں ہوئی تھی۔ چاند رخصت ہو چکا تھا مگر فضا میں ابھی تک چاندنی کا سراغ باقی تھا۔ منڈیر کے پاس سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا' دور ملگجے اندھیرے میں باغات اور کھیت ایک دوسرے میں مدغم نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف جنگل پھیلا ہوا تھا۔ خنک ہوا اور ملگجا آسمان بہت بھلا لگ رہا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر میں ملک ریاض کا اشارہ پا کر لان چیئر پر بیٹھ گیا۔ نورو ماچھی کے ساتھیوں میں سے چار چھت کے چاروں کونوں پر جا کھڑے ہوئے اور بے مقصد سے انداز میں فضا کی تاریکی میں نظریں دوڑانے لگے۔ نورو ماچھی عین میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔ ملک ریاض میرے مقابل بیٹھا تھا۔ باقی ڈاکو ہمارے گرد گھیرا سا ڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔ میں فضا میں یک بیک کوئی تبدیلی محسوس کر رہا تھا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا اور پہلے ہی کی طرح پُرسکون رہا۔

ملک ریاض سگریٹ سلگا کر اور ٹانگیں پھیلا کر بیٹھتے ہوئے بولا' "چوہدری صاحب! آپ کو معلوم ہے اگلی حکومت میں آپ کا یہ خادم وزیر تجارت ہوگا؟" اس نے انگلی سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "لیکن ملک صاحب! ابھی تو الیکشن بھی نہیں ہوئے اور آپ نے خود ہی اپنے آپ کو وزیر تجارت کے عہدے پر بھی فائز کر لیا؟" میں نے پوری کوشش کی کہ میرا لہجہ استہزائیہ نہ ہونے پائے۔

"سیاست میں بہت آگے کی خبر رکھنی پڑتی ہے چوہدری صاحب!" وہ آنکھ مار کر بولا۔ "آپ اس میدان میں بچے ہیں۔ کاروبار میں آپ بہت تیز ہوں گے لیکن سیاست کے بارے میں آپ کچھ نہیں جانتے۔ اس حسینہ کی زلفوں کے پیچ و خم کو سمجھنے کے لئے ایک عمر درکار ہوتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے ملک صاحب! لیکن پھر بھی' کچھ تو طور طریقے' اصول اور ضابطے ہوتے ہیں۔ آدمی کسی نہ کسی سسٹم سے تو گزر کر آگے آتا ہے۔ پارٹیاں الیکشن میں حصہ لیتی ہیں۔ ان کے امیدوار کامیاب ہوتے ہیں۔ اکثریتی پارٹی حکومت بناتی ہے اور اپنے آدمیوں میں وزارتیں تقسیم کرتی ہے۔"

وہ مسکراتا رہا جیسے اخلاقیات کے موضوع پر کسی ننھے بچے کی

تقریر سن رہا ہو۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "گستاخی معاف۔ آپ کی پارٹی کا تو شاید بعض لوگوں نے نام بھی نہ سنا ہو۔ میں بدشگونی نہیں کر رہا ویسے ہی حقیقت پسندانہ اور غیر جانبدارانہ سے انداز میں آپ کے دعوے کا تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ معلوم نہیں آپ کی پارٹی کو کوئی سیٹ بھی ملے یا نہ ملے۔ اور آپ نے وزارت اپنے لئے محفوظ کرالی!"

وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر بے پروائی سے دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے بولا۔ "یہی تو آپ کو پتا نہیں چوہدری صاحب! ہمارے ہاں بڑے بڑے گیم ہوتے ہیں.... اور پاور کا گیم تو سب سے الگ' سب سے پُرپیچ' سب سے مشکل ہے۔"

"اگر مجھ جیسے' ذرا اوپر کے آدمی کو بھی کچھ معلوم نہیں ہے تو پھر عام آدمی کو کیا معلوم ہوگا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"آپ کو بھی اچھی طرح معلوم ہے اور ہمیں بھی۔ کہ عام آدمی تو بس سیاست کی بھٹی کا ایندھن ہے۔ کچھ ایندھن کسی کے پاس ہے' کچھ کسی کے پاس۔ کبھی ادھر کا ایندھن اُدھر ہوجاتا ہے اور کبھی اُدھر کا ادھر... لیکن ایندھن بہرحال ایندھن ہی رہتا ہے۔ اس کا کام جلنا اور بھٹی کی آگ کو تیز یا مدھم کرنا ہوتا ہے۔ جس کی آگ مدھم پڑنے لگتی ہے اس کا کھیل ٹھنڈا پڑجاتا ہے۔ بھٹی میں جھونکنے کے لئے لکڑیاں میسر آتی رہیں تو ٹھیک ہے ورنہ بڑی مشکل ہوجاتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن اس حقیقت کی تہ سے بھی آپ کا وزیرِ تجارت بننا کہاں سے نکل آیا؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ "جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں وہ درست ہے۔ ہمارے ملک کے سیدھے سادے' کم علم اور بے خبر لوگوں کی یہی ٹریجڈی ہے۔ ہر ایک نے انہیں چکمے ہی دیئے ہیں۔ کبھی کسی فلسفے سے' کبھی کسی فلسفے سے۔ انہیں بھٹی کا ایندھن ہی بنایا گیا ہے۔ کسی نے انہیں سر کا تاج نہیں بنایا۔ لیکن آپ تو ابھی اس پوزیشن میں بھی نہیں ہیں۔ آپ کی بھٹی میں تو برائے نام ہی ایندھن ہے۔"

"میں جو بات کر رہا ہوں وہ پارٹی کی بنیاد پر نہیں کر رہا ہوں۔ میں آپ کو اپنے رازوں سے زیادہ آگاہ نہیں کرسکتا کیونکہ آپ ہمارے زیادہ پرانے دوست نہیں ہیں۔ ویسے تو ہمارے ہاں پینتیس سال سے پاور کے سلسلے میں ایک سے ایک بڑھ کر کمال گیم ہو رہا ہے لیکن اب جو گیم ہونے والا ہے وہ ہر گیم کو مات کردے گا۔ اور ہم اس گیم کا ایک حصہ ہیں۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا "ہماری پارٹی کو آپ گولی ماردیں۔ ہمارے ووٹوں اور ہمارے ووٹروں کو بھی گولی ماردیں۔ بس آپ کے سامنے اس ملک کا آئندہ وزیرِ تجارت بیٹھا ہے۔ اسے پتھر پر لکیر سمجھیں۔"

"ملک کا وزیرِ تجارت؟ یعنی آپ وفاقی وزیر ہوں گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ بلکہ میں اپنا عہدہ کچھ گھٹا گیا۔ اختصار میں بات تھا۔ صرف وزیرِ تجارت نہیں' بلکہ وزیرِ صنعت و تجارت۔ آ معلوم ہے یہ دونوں شعبے ایک دوسرے سے جُڑے چلے ہیں۔"

"چلیں خیر' ہم نے مان لیا۔" میں نے گویا اس کا دل رکھ لئے کہا "میں آپ کو اس پیشگی اطلاع پر پیشگی مبارکباد پیش ہوں۔"

"خالی مبارکباد سے کام نہیں چلے گا چوہدری صاحب! ہماری انتخابی مہم میں ہمارا ساتھ دینا پڑے گا۔" وہ سگریٹ خیال انداز میں انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔

"لیکن ابھی تو آپ کہہ رہے تھے' ہمارے ووٹوں کو گ ماریں اور ووٹروں کو بھی۔ تو پھر یہ انتخابی مہم کہاں سے آگئی؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"گیم تو اپنی جگہ پورا ہوگا نا' خانہ پُری بھی کوئی چیز ہے۔ ممکن ہے کوئی انتخابی اتحاد بن جائے۔ ابھی حتمی طور پر کچھ نہ جاسکتا۔ کوئی بھی بات سامنے آسکتی ہے۔ کوئی بھی پینترا بدلا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"حتمی طور پر صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ آپ آئندہ صنعت و تجارت ہوں گے؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا لیکن یہ لہجہ اس کے لئے چبھتا ہوا نہیں تھا۔ بڑے ا سے اس نے جواب دیا "بالکل۔"

میں پوچھنا چاہتا تھا' لیکن مجھے یہ سب کچھ کیوں بتا ہے؟ اس کے بجائے میں نے پوچھا۔ "تو پھر میرے لئے ہے؟"

وہ سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولا "آپ نے د ہوگا' آج کی محفل میں ہمارے کیسے کیسے مہربان موجود تھے۔ سے ہر ایک ہمارے لئے وقتاً فوقتاً اپنی حیثیت کے مطابق حیثیت سے بڑھ کر کچھ نہ کچھ کرتا رہتا ہے۔ کسی کے ذمے ہے' کسی کے ذمے کوئی کام۔ پھر جب اور جہاں ہمارا ہاتھ پڑ ہم بھی ان کے کام آتے ہیں۔ اسی طرح امدادِ باہمی سے دنیا چلتے ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا؟"

"جی ہاں۔ میرا خیال ہے کچھ کچھ سمجھ ہی رہا ہوں۔" محتاط لہجے میں کہا۔

"حتیٰ کہ آج کی محفل بھی اسپانسرڈ تھی۔" وہ مسکرائے بولا۔

"کمال ہے! اب عیاشیاں بھی اسپانسرڈ ہونے لگیں۔"

"آپ ان کے لئے ذرا زیادہ کرخت لفظ استعمال کر ہیں۔ ہم انہیں تفریحات کہتے ہیں۔ اور تفریحات اکثر ہوتی ہیں۔ صرف طور طریقے بدل جاتے ہیں۔" وہ شاطرانہ میں بولا "بہت خرچ آتا ہے ایسے کاموں پر۔ روپیہ پانی کی طرح

کہنا چاہتا تھا' تو پھر مت کیا کریں ایسے کام کیا کسی حکیم نے ورد دیا ہے ایسے کام کرنے کا؟ لیکن اس کے بجائے میں نے کہا "روپے پیسے کی آپ کے پاس کیا کمی ہے ملک !"

"وہ تو ٹھیک ہے....." وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھتے ہوئے بولا "لیکن ڑوں سے برف نہ پگھلے تو دریا کب تک بہتے رہ سکتے ہیں؟ اگر دولت جانے ہی کے راستے کھلے رہیں اور دولت آنے کے میں کوئی تدبیر نہ کی جائے تو ایک روز قارون کے خزانے بھی جاتے ہیں۔"

"آپ کے ہاں تو دولت آنے کے راستے بھی خاصے کشادہ دیتے ہیں ملک صاحب! پریشان ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔" نے کہا۔

"آپ کا مشاہدہ درست ہے۔ لیکن آپ سے کس نے کہا کہ یشان ہیں؟ ہم تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ دولت آنے کے تنگ نہ ہونے پائیں بلکہ کچھ نہ کچھ کشادہ ہوتے رہیں۔ کام روز بروز بڑھ رہے ہیں اور ان کے دام بھی بڑھ رہے جو کام پہلے ہزاروں میں ہوتا تھا وہ اب لاکھوں میں ہوتا ہے لاکھوں میں ہوتا تھا وہ کروڑوں میں ہوتا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ گفتگو کس طرف جارہی فضا میں ایک لمحے کے لئے گہرا سکوت چھا گیا۔ ملک ریاض اور چھی کی نظر میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

ملک ریاض سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "ہمارے بہت سے ہمارے لئے بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو بھی ہم نے مہربانوں کی فہرست میں شامل کرلیا ہے اور آغاز میں ہی ہم آپ ذمے بڑا کام لگا رہے ہیں۔ لیکن آپ گھبرایئے گا نہیں۔ ہم کو فائدے بھی بہت بڑے بڑے پہنچائیں گے۔ ہم وزیرِ صنعت رت ہوں گے اور آپ ملک کے ایک بڑے صنعت کار اور مکن ہیں۔ اندر خانے اگر ہم نے آپ کا ہاتھ تھاما ہوا ہوگا تو کی آپ اس ملک کے چند دولت مند ترین افراد میں سے ایک گے۔"

"ملک صاحب! بے حساب' بے اندازہ اور سب سے زیادہ ت کے خواب دیکھنا کبھی میری کمزوری نہیں رہی۔" میں نے دن لہجے میں کہا "لیکن آپ کی بات پوری سننے کی غرض سے میں رہا ہوں کہ آپ نے میرے ذمے کیا کام لگانے کا سوچا ہے؟"

"آپ کو ہمارے الیکشن فنڈ میں پچاس لاکھ روپے دینے ہوں ۔ ہمارا معاملہ ذرا دوسرا ہے۔ ہمیں بہت زیادہ روپے کی رت ہے۔ اور اس کا بیشتر حصہ ہم آپ کے ذمے ڈال رہے

"پچاس لاکھ روپیہ تو اکیلا میں ہی دوں..... کیا آپ صدرِ امریکا کا الیکشن لڑ رہے ہیں ملک صاحب؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"مذاق نہیں چوہدری صاحب! اس وقت بہت سنجیدہ گفتگو ہو رہی ہے۔ یہ زندگی اور موت کے مسئلے ہیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"ہاں' اس میں تو کوئی شک نہیں۔ یہ زندگی اور موت کے مسئلے ہیں۔" میں نے بظاہر سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا "ایسی ہی بڑی بڑی دور اُفتادہ محل سراؤں میں کبھی دن کی روشنی میں اور کبھی رات کے اندھیروں میں سرجوڑ کر کچھ فیصلے ہوتے ہیں اور ہزاروں زندگیاں موت کی آغوش میں جاسوتی ہیں۔ سیکڑوں گھر اُجڑ جاتے ہیں۔ لوگ درندوں کی طرح ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے لگتے ہیں۔"

"جذباتی اور افسانوی باتیں نہیں چوہدری صاحب!" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "کام کی بات کریں۔ صرف کام کی بات۔ اس قسم کی باتیں صرف بند کمروں میں بیٹھ کر کُڑھنے والوں کے لئے چھوڑدیں۔ ہم بڑے لوگ ہیں۔ بلندی پر بیٹھے ہیں۔ ہمیں مزید بلندی پر جانے کی باتیں کرنی ہیں۔ ہم پاور کے گیم کے کھلاڑی ہیں۔ ہمیں اپنے کھیل کے بارے میں سوچنا ہے۔" اس کے کھردرے لہجے میں بلا کی سفاکی تھی۔

"پھر بھی' مجھے معلومات بڑھانے کا تو موقع دیں ملک صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میں طفلِ مکتب ہوں۔ ذہن میں کچھ سوالات تو پیدا ہوتے ہیں۔ فطری سی بات ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے الیکشن کے اخراجات کی کوئی حد بھی مقرر ہے اور وہ خاصی کم ہے۔"

وہ اب گویا قہقہہ ضبط نہ کرسکا۔ فضا مُرتعش ہو کر رہ گئی۔ میرے برابر بیٹھا ہوا نوردما چھی بھی جھٹکے دار سے انداز میں ہنس رہا تھا اور اپنی ایک مونچھ کو بل دیئے جارہا تھا۔

"آپ بھولے بادشاہ بننے کی کوشش کرتے ہیں تو بہت اچھے لگتے ہیں چوہدری صاحب!" ملک ریاض بولا "جو لوگ یہ حدیں مقرر کرتے ہیں انہیں خود بھی پتا ہے کہ اتنے پیسے تو لوگ جمعداروں کی یونین میں عہدہ حاصل کرنے کے لئے خرچ کردیتے ہیں۔ سب کو معلوم ہے کہاں کیا ہو رہا ہے۔ سب کی ناک تلے ہو رہا ہے لیکن ہمارے آپ کے ساتھ مذاق کرنے کے لئے وہ لوگ بیٹھے قاعدے قانون بناتے رہتے ہیں۔"

"میرے خیال میں یہ ہمارے آپ کے ساتھ نہیں' قوم کے ساتھ مذاق ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اپنی دانست میں تو وہ بے چارے قوم کے سامنے سرخرو رہنے کے لئے یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ وہ قوم کو بتاتے ہیں کہ دیکھو ہم تمہارے نمائندوں کو اخلاقیات' سماجیات اور معاشیات کی حدود کا پابند رکھنے کی کیسی سرتوڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ خانہ پُری بھی

ہوجاتی ہے۔ حدیں مقرر کرنے والے جتنی حدیں مقرر کرتے ہیں اتنے نذرانے تو وہ خود کھاجاتے ہیں۔ خلاف ورزیوں کو نظرانداز کرنے کے لئے، یا پھر سیاسی مصلحتوں کے انبار میں سب کچھ دفن ہوجاتا ہے۔ لیکن خیر، ہمارا یہ موضوع نہیں ہے۔ وہ جو ایک سیدھی سادی سی کہاوت ہے نا..... تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔ بقول نورو ماچھی کے لوگ اپنا کام کرتے رہتے ہیں، ہمیں اپنا کام کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔"

"یعنی بات گھوم پھر کر پھر پچاس لاکھ پر آجاتی ہے۔" میں نے ایک نظر چھت کی منڈیر کے پار دیکھتے ہوئے کہا "پچاس لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے ملک صاحب!"

"لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ جب ہم وزیر صنعت و تجارت ہوں گے تو شاید ایک ہی جھٹکے میں آپ کو پچاس کروڑ کا فائدہ پہنچادیں۔ ہمارے تو آپ کے بارے میں بڑے اونچے منصوبے ہیں چوہدری صاحب!" وہ پیکٹ سے ایک اور سگریٹ نکالتے ہوئے بولا۔

"کل کس نے دیکھی ہے ملک صاحب!" میں نے طویل سانس لے کر کہا "کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ آج کا سورج بھی دیکھ سکیں گے؟"

"یقین نہ سہی، امید ضرور ہے۔ اور اس دنیا کی ہر بزنس ایمپائر امید کی بنیاد پر کھڑی ہے چوہدری صاحب! اگر آپ زندگی کی طرف سے اتنے ناامید ہوں تو سارے کام ہی چھوڑ دیں۔ اپنی اگلی کنسائنمنٹ کینسل کردیں۔"

"فرض کریں، میں آپ کو یہ رقم دینے سے انکار کردوں؟" میں نے ہموار لہجے میں کہا۔

"آپ ایسا کیوں کریں گے چوہدری صاحب؟" اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔

"اس لئے کہ میں آپ کو اس رقم کا مستحق نہیں سمجھتا۔ میرے نزدیک یہ رقم کا بہت برا استعمال ہے۔" میں نے بھی ملائمت سے جواب دیا۔

"آپ کا خیال ہے، آپ مستقبل کے وزیر صنعت و تجارت کو ناراض کرکے اس ملک میں صنعتیں چلا سکتے ہیں؟ کاروبار کرسکتے ہیں؟" اس کے چہرے پر سختی نمودار ہونے لگی۔

"ہوسکتا ہے جب آئندہ وزیر صنعت و تجارت آئے، میں تب ہی دیکھنا پسند کروں کہ وہ کون ہے اور کیوں مجھ سے ناراض ہے۔ اگر وہ واقعی مجھ سے ناراض ہوا تو شاید میں اس کی ناراضی کا علاج تلاش کرنے کی کوشش کروں۔"

"اس وقت کوئی علاج کارگر نہیں ہوگا۔ ممکن ہے اس وقت وہ آپ کی صورت بھی دیکھنا پسند نہ کرے۔"

"کوئی بات نہیں۔ یہ اس وقت ہی دیکھا جائے گا۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"لیکن ہم میں ایک خرابی ہے۔" ملک ریاض بولا۔ وہ زیادہ تر

"ہم" کے صیغے میں ہی بات کر رہا تھا۔ "ہم اِس وقت کے چکر میں نہیں پڑتے۔ ہم جس وقت بات کرتے ہیں ہی اس پر عمل چاہتے ہیں۔ اور جو کام خوبصورت ماحول میں ہوجائے اس کے نتائج خوبصورت ہوتے ہیں۔ ہم نے لئے ایسی خوبصورت محفل سجائی۔ ہم تو آپ کے ساتھ کی خوبصورت تمہید باندھ رہے تھے۔ آپ جیسی حیثیت تو اتنی حیل حجت میں پڑنا ہی نہیں چاہئے تھا۔"

"ان مجروں وغیرہ کو آپ حسین محفل کہتے ہیں ملک پچاس لاکھ۔ میں یہ مجرے کچھ مہنگے نہیں رہیں گے؟" ملائمت سے کہا "اس قسم کے مجرے اس سے بہت کم میں اپنے شہر میں بیٹھ کر ہی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے لئے مجھے اور اپنے آپ کو تھکانے کی کیا ضرورت تھی؟"

اس کی رنگت ایک لمحے کے لئے متغیر سی ہوگئی۔ "سے مجروں کا خرچ نہیں مانگ رہے ہیں چوہدری صاحب ہمیں ہی طمانچے لگانے کی کوشش نہ کریں۔ یہ پروگرام تھا۔ ہم نے سوچا چلو آپ کو بھی اسی موقعے پر بلالیتے ہیں ماحول میں بات ہوجائے تو اچھا ہے۔ ورنہ ہم تو جو ارادہ ہمیں تو اس پر ہر حال میں عمل کرنا ہی ہوتا ہے۔"

"یعنی اگر آپ نے سوچ لیا ہے کہ چوہدری افضل لاکھ روپے لینے ہیں تو وہ لینے ہی ہیں، خواہ کچھ بھی ہوجا نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" اس نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا۔

"لیکن کیوں؟ میرا قصور کیا ہے؟"

"آپ ایک دولت مند آدمی ہیں۔ آپ نے بہت وہ بولا۔

"یہ کوئی جرم تو نہیں ہے۔ میں کوئی چھپ کر تو چوری نہیں کر رہا۔ اسمگلنگ نہیں کر رہا، سارے ٹیکس میرے حسابات آڈٹ ہوتے ہیں۔ آپ کو میرے کس اعتراض ہے؟ اس طرح تو آپ کسی بلیک مارکیٹیے یا حصہ طلب نہیں کرسکتے۔ وہ بھی برا منا جائے گا۔ میں تو اور بزنس مین ہوں۔"

"بیشتر اسمگلر اور بلیک مارکیٹیے بھی آج کل صنعت بزنس مین ہی کے لبادے میں چھپے ہوئے ہیں۔" وہ دھیرے کر بولا۔ ہنسی بڑی طنزیہ سی تھی۔ "میں اس بحث میں آپ کیا کرتے ہیں اور کیا نہیں۔ یا ماضی میں کیا کرتے میرے سامنے زیادہ پارسائی جھاڑنے کی بھی ضرورت اس شہر میں بلکہ اس ملک میں بہت سے لوگ ہیں جن ماضی ہم سے چھپا ہوا نہیں ہے لیکن میں اس بحث میں میں کوئی حکومت کا تفتیشی نمائندہ نہیں ہوں۔ ہمیں جب پڑتی ہے، ہم باری باری کسی نہ کسی کو تکلیف دیتے رہ

ندہ بھی دیتے رہیں گے۔"

"اچھا سائیڈ بزنس ہے۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا "یوں نہیں ناکہ یہ ایک طرح کا تاوان ہے۔ جس کسی پر آپ کی نظرِ کرم ہوجائے اسے یہ تاوان ادا کرنا پڑتا ہے۔"

"ہم تو اسے تاوان کی شکل نہیں دینا چاہتے۔ اسی لئے اتنا دوستانہ ماحول تخلیق کرتے ہیں۔ رقم کی درخواست کرتے ہیں۔ اس کے بدلے آئندہ ہم اس پارٹی کی کوئی نہ کوئی خدمت بجالانے کا وعدہ کرتے ہیں جس سے رقم لیتے ہیں۔ ہم اس کے احسان کو یاد رکھتے ہیں اور اس کا صلہ چکانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی نہ مانے اور خود ہی اسے اپنے لئے تاوان بنالے تو ہم کیا کرسکتے ہیں؟ ہم تو چاہتے ہیں کہ رقم تاوان نہ بننے پائے۔ لیکن کیا کریں۔ مال بہت بری چیز ہے۔ لوگ اسے آسانی سے خود سے جُدا کرنا پسند نہیں کرتے۔"

"مال واقعی کمال چیز ہے" میں نے اس کی تائید میں سرہلایا۔ "اب یہی دیکھ لیں کہ آپ جیسے دولت مند لوگ ہر طرف سے مزید مال کھینچنے کے لئے کیا کیا جتن کرتے ہیں، کیا کیا ڈرامے رچاتے ہیں اور کیا کیا لطیفے گھڑتے ہیں۔ میں تو یہ سوچ کر پریشان ہورہا ہوں کہ آپ جیسے لوگ جب اسمبلیوں میں پہنچیں گے تو اس قوم کا کیا بنے گا؟"

"آپ قوم کو چھوڑیں، آپ اپنی فکر کریں چوہدری صاحب!" ملک ریاض بیزاری سے بولا۔ "معلوم نہیں آپ ہر بات میں ملک اور قوم کو کیوں بیچ میں لے آتے ہیں۔"

"واقعی مجھے ایسی بے ہودہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا "یہ تو آپ لوگوں کے کھلونے ہیں۔ جب دل چاہا کھیلے، جب دل چاہا توڑ دیا۔ یا پھر شاید یہ الفاظ صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ آپ جیسے لوگ تقریروں اور بیانات میں ان کی جگالی کرتے رہیں۔ مجھے کیا حق پہنچتا ہے یہ الفاظ زبان پر لانے کا۔"

میں محسوس کر رہا تھا کہ ملک ریاض نے اب تک بظاہر جو صبر و تحمل اور ٹھہراؤ اختیار کر رکھا تھا وہ جواب دیتا جارہا تھا۔ وہ مضطربانہ انداز میں سگریٹ انگلیوں میں گھما رہا تھا۔ میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ویسے میں نے واقعی اغوا برائے تاوان کی ایسی کسی واردات کے بارے میں آج تک نہیں سنا تھا جس میں شکار کو پہلے باقاعدہ دعوت نامہ دے کر بلایا گیا ہو، اس کی خوب خاطر مدارات کی گئی ہو، عیش و عشرت کے لوازمات پیش کئے گئے ہوں اور پھر اس سے لمبے چوڑے تاوان کا مطالبہ کیا گیا ہو۔"

نورو ماچھی اس ساری گفتگو کے دوران پہلی بار بولا۔ وہ ملک ریاض سے مخاطب تھا۔ "ملک صاحب! میں نے آپ کو بولا تھا کہ محبت کی زبان لوگوں کو آسانی سے سمجھ میں نہیں آتی۔ مگر آپ کے تو کسی بھی کام کو کرنے کے اپنے ہی طور طریقے ہیں۔ آپ نے تو بولا تھا یہ بڑا دوٹوک بات کرنے والا بندہ ہے مگر یہ تو ادھر ادھر کی بہت

باتیں کرتا ہے۔" اس نے موٹی موٹی آنکھوں سے مجھے گھورا جن میں ہر وقت خون سا اترا رہتا تھا۔

میں نے پلک نہیں جھپکائی۔ سرد مہری سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "آدمی تو میں دوٹوک بات کرنے والا ہی ہوں۔ ادھر ادھر کی باتیں تو میں صرف اس لئے کرتا ہوں کہ لوگوں کو بہتر طور پر سمجھ سکوں، اور ہوسکے تو لوگ بھی مجھے بہتر طور پر سمجھ لیں۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ موٹی عقل کے لوگوں کی سمجھ میں بات ذرا دیر سے آتی ہے۔ ویسے نورو! یہ جو تم نے اتنا بڑا پگڑ باندھا ہوا ہے، اس کے اندر اتنا بڑا تمہارا کھوپڑا ہے۔ یہ بتاؤ اس کھوپڑے میں تھوڑا بہت بھیجا بھی ہے یا اس کے بغیر ہی کام چلا رہے ہو؟"

نورو ماچھی کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے لیکن اس نے مجھے کوئی جواب دینے کے بجائے ملک ریاض کو ہی مخاطب کیا۔ "ملک سائیں! میں بے عزتی کرانے کے لئے ادھر نہیں بیٹھا ہوں۔" اس کی رائفل کرسی کے سہارے کھڑی تھی۔ اس کا ہاتھ اس کی نال پر جم چکا تھا۔ ملک ریاض نے ہاتھ کے اشارے سے گویا اسے کوئی قدم اٹھانے سے باز رکھا۔ وہ اب بھی انتہائی متحمل مزاج نظر آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

"مقصد یہ ہے کہ آپ رقم نہیں دے سکتے؟" ملک ریاض نے ملائمت سے تصدیق چاہی۔

میں نے ایک نظر اس حویلی کی منڈیروں اور بُرجیوں کی طرف دیکھا۔ اس حویلی میں کوئی خاص بات ضرور تھی۔ ہر چند برس بعد یہ مجھے کھینچ کر اپنے پاس بلالیتی تھی۔ اور اس کے آنگن میں کوئی نہ کوئی بدخبری، کوئی نہ کوئی مصیبت میری منتظر ہوتی تھی۔ یہ حویلی اور اس کے پس منظر میں پھیلی ہوئی زمینیں ملک خاندان کے ہاتھوں سے نکلنے کے کوئی آثار بھی نہیں تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "میں تمہیں پچاس لاکھ روپے دے سکتا ہوں۔ تم یہ حویلی اور زمینیں مجھے دے دو۔"

ملک ریاض نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا، جیسے اس نے اپنے ذوق کے حساب سے کوئی بہت ہی عمدہ لطیفہ سن لیا ہو۔ نورو ماچھی نے بھی اپنی تمامتر غضبناکی کے باوجود اس قہقہے میں اس کا ساتھ دیا۔ نورو ماچھی کے قہقہے سے فضا کچھ اس طرح مرتعش ہوتی تھی جیسے بادلوں کی گڑگڑاہٹ سے ہوتی ہے۔

"یہ حویلی اور زمینیں پچاس لاکھ سے بہت زیادہ کی ہیں چن جی!" ملک بولا۔

"چلو زیادہ لے لو۔ مارکیٹ ویلیو مقرر کرالو، اس حساب سے لے لو۔ میں نے تو یونہی ان کی تفصیل جانے بغیر بات کی تھی۔ تم ہاں کرو۔ قیمت جو بھی ہوگی وہ لے لینا۔" میں نے دلچسپی سے کہا۔

"بس..... بس۔ اب اتنا اونچا اڑنے کی ضرورت نہیں۔" ملک ریاض نے مجھے پچکارا "چیزیں بیچ کر تو رقم سب کو ہی مل جاتی

ہے۔ہم تو لوگوں کی چیزیں بکوا کر رقم لینے والے لوگ ہیں۔ بات کو گھمانا پھرانا چھوڑو۔ اصل موضوع کی طرف آؤ۔" اس کا لہجہ اب بدل رہا تھا۔

میں خاموش رہا۔ فضا میں سخت تناؤ تھا۔ اچانک ایک چوڑی سی بُرجی کے عقب سے ایک ہیولا برآمد ہوا اور اندھیرے سے نکل کر ہماری طرف روشنی کی رسائی میں آگیا۔ اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا خاصا زوردار جھٹکا لگا لیکن میں بدستور کرسی پر ساکت بیٹھا رہا۔ وہ عالم شیر تھا۔ حاجی، نمازی اور باریش اسمگلر عالم شیر۔ اس کے لمبے چوڑے تن و توش پر گہرے رنگ کی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص مدھم ہواؤں میں دھیرے دھیرے پھڑپھڑا رہی تھی۔

وہ ملک ریاض کی طرف دیکھ کر اکتاہٹ آمیز لہجے میں بولا "میں نے تم سے کہا تھا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نہیں نکلے گا۔ یہ خود دوسروں سے رقم لوٹنے والا آدمی تمہیں پچاس لاکھ اتنی آسانی سے کس طرح دے دے گا؟"

"آخر صبر نہیں ہوسکا نا تم سے۔" ملک ریاض ٹھنڈی سانس لے کر بولا "باہر آہی گئے۔ حالانکہ میں نے تم سے کہا تھا کہ جب تک میں اشارہ نہ دوں، باہر مت آنا۔"

"تمہارے اشارے کے انتظار میں تو میرے گھٹنے جام ہوجانے تھے۔ ملک یار! تم تو بات کو بہت ہی طول دیتے ہو۔ حالانکہ آدمی سے دو باتیں کرکے ہی اس کے مزاج کا اندازہ ہوجانا چاہئے۔ اور چوہدری کے بارے میں تو میں نے تمہیں پہلے ہی اتنا کچھ بتا دیا تھا۔ یہ آدمی تمہیں اتنی آسانی سے مال نکالنے والا نظر آتا ہے؟" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ میں بالکل خاموش بیٹھا ان دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ملک ریاض ہاتھ اٹھاتے ہوئے مُربیانہ لہجے میں بولا۔ "صبر...... میرے چاند، صبر۔ مجھے یقین ہے کہ بے صبری کی وجہ سے تم اپنے بنتے ہوئے کام بھی بگاڑ لیتے ہوگے۔ چوہدری ویسے بھی مزے کا آدمی ہے۔ اس سے دوستی جتانے میں، بات کرنے میں مزہ آتا ہے۔ مجھے یقین ہے اس سے دشمنی رکھنے میں بھی مزہ آئے گا۔"

"مزے وغیرہ کی باتیں تم کسی اور وقت پر اٹھا رکھو۔ فی الحال تو تم اسے اٹھا کر نیچے کہیں بند کرو اور اس کے چہیتوں سے رقم منگوانے کا بندوبست کرو۔" عالم شیر نے بیزاری سے ہاتھ ہلاتے ہوئے فیصلہ سنایا۔ وہ مجھے اٹھا کر بند کرنے کی بات کچھ اس طرح حقارت سے کررہا تھا جیسے میں لکڑی کا کوئی شہتیر وغیرہ تھا جسے اٹھا کر کہیں پھکوا دینا مقصود تھا۔ میری کنپٹیوں میں ایک ثانئے کے لئے ہلکی سی تپش آئی لیکن میں بدستور خاموش بیٹھا رہا۔ ٹھنڈے دماغ کے ساتھ اس قسم کی صورت حال سے بلکہ ہر قسم کی صورت حال سے زیادہ بہتر طور پر نمٹا جاسکتا تھا۔

میں نے مسکراتے ہوئے حاجی عالم شیر کو مخاطب کیا۔ "تمہیں یہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی عالم شیر! اگر تمہاری جگہ اس برجی کے پیچھے سے سچ مچ کا شیر نکل آتا تب بھی شاید مجھے اتنی حیرت نہ جتنی تمہیں دیکھ کر ہوئی ہے۔ لیکن ایک لحاظ سے تمہاری موجودگی نہایت مناسب بھی ہے۔ اب یہاں تینوں طبقوں کی نمائندگی ہوگئی ہے۔ کورم پورا ہوگیا ہے۔ جاگیردار، ڈاکو اور تینوں ہی موجود ہیں۔ اب تم لوگوں کو اپنے شکار کے بارے میں پر پہنچنے میں آسانی رہے گی۔"

"بات تو تم اس طرح کررہے ہو جیسے خود بڑے پرہیزگار پارسا ہو۔" حاجی عالم شیر لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر بولا "چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔"

"چلو خیر، میں تو وہ بلی ہوں جو نو سو چوہے کھانے کے بعد ہوگئی اور حج کو جانے کا ارادہ باندھنے لگی۔ لیکن تم تو وہ بلی ہو سے واپس آنے کے بعد بھی چوہے ہی کھائے چلی جارہی ہے۔" یہ کہتے ہوئے گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے دائیں با کھڑے ہوئے ڈاکو الرٹ تھے۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر باقی سب لو بھی الرٹ ہوگئے۔ ڈاکوؤں کے کندھوں پر رائفلیں اور ہاتھوں ریوالور تھے۔

ان کے اعصاب پر اتنا تناؤ تھا کہ اسے میں بھی محسوس کر تھا۔ صرف ملک ریاض میری طرح پُرسکون نظر آنے کی کوشش رہا تھا لیکن میرے اندازے کے مطابق حاجی عالم شیر کے نمو ہونے کے بعد وہ بھی اندر ہی اندر تناؤ کا شکار تھا۔

میں پشت پر ہاتھ رکھے ٹہلتا ہوا چھت کی دیوار کے قریب گیا جو دو ڈھائی فٹ بلند تھی۔ ملگجا اندھیرا کچھ ہلکا ہوتا جارہا تھا۔ فضا میں کچھ دھند سی پھیلی ہوئی تھی۔ میری نظریں اس دھند میں رہی تھیں۔

اچانک میرے عقب سے ملک ریاض بہ آواز بلند "چوہدری صاحب! ہمیں معلوم ہے آپ کے کوٹ کی اندرونی میں کوئی گن موجود ہے۔ ایک آدھ ہتھیار شاید اور بھی موجود لیکن کوئی ہتھیار نکالنے کے لئے ہاتھ کو حرکت بھی مت دیجئے۔ ایسے موقعوں پر بہادری کے جوہر دکھانا فضول ہوتا ہے۔ ہمیں آپ کی جان عزیز ہے۔ ہم اگر اسے ضائع کریں گے تو انتہا مجبوری کے عالم میں ضائع کریں گے۔"

"بڑی مہربانی ہے تمہاری۔ تم جیسے مہربان زندگی میں کبھی کبھ ہی ملتے ہیں۔" میں نے پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر انتہائی ممنونیت سے "مجھے معلوم ہے یہ بہادری کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ہے میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں صرف سوچ بچار کررہا ہوں۔"

"سوچیں، ضرور سوچیں۔" ملک ریاض مسرت آمیز لہجے بولا "سوچ سمجھ کر انسان زیادہ بہتر فیصلہ کرتا ہے۔"

دو ڈاکو میرے دائیں بائیں تھے۔ ان کی انگلیاں ریوالور ٹریگرز پر تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ دو ڈاکو میرے پیچھے بھی، کچھ فا چھوڑ کر کھڑے تھے اور باقی لوگوں کی نظر بھی مجھ پر ہی تھی جن

سب سے خطرناک میری نظر میں نورو ماچھی تھا۔

میں ایک قدم آگے بڑھ کر چھت کی دیوار سے نیچے جھانکنے لگا۔ میرا مقصد صرف اتنا تھا کہ میرے دائیں بائیں موجود ڈاکو میرا چہرہ نہ دیکھ سکیں۔ اسی لمحے ویرانے میں اُلو کی تیز اور کرخت آواز گونج اٹھی۔ اُلو ایک مخصوص انداز میں تین مرتبہ چیخا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ فی الحال وہ اُلو میں ہی تھا لیکن میں نے پوری کوشش کی تھی کہ کسی کو احساس نہ ہونے پائے' آواز میرے ہی حلق سے برآمد ہوئی ہے۔ آواز گویا کہیں دور سے ہی آئی تھی۔ یہ نوعمری کے اس خطرناک دور کی سیکھی ہوئی ٹیکنیک تھی جب ہم جان ہتھیلی پر لئے پُرخطر جنگلوں اور دشوار گزار راستوں پر رینجرز' سرحدی فوجیوں اور اینٹی اسمگلنگ دستوں کو چکمے دیتے پھرتے تھے۔ اس دور کے مقابلے میں آج کی بڑی سے بڑی خطرناک صورت حال بھی آسان لگتی تھی۔

میں بظاہر نیچے ہی دیکھ رہا تھا' جب اُلو کی پکار ابھری اور معدوم ہوگئی۔ ملک ریاض نیم استہزائیہ سے لہجے میں بولا "نیچے چھلانگ لگانے کی گنجائش نہیں ہے چوہدری صاحب! معذور ہونے کا خطرہ ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' حاجی عالم شیر نے غصیلے لہجے میں ملک ریاض کو مخاطب کیا "ابے گدھے! تم نے سنا نہیں؟ اس نے اپنے ساتھیوں کو سگنل دیا ہے۔ تم نے اُلو کی آواز نہیں سنی تھی؟"

میں نے صرف استہزائیہ انداز میں ہنسنے پر اکتفا کیا۔ اپنی کوئی صفائی پیش نہیں کی۔ ملک ریاض خود ہی بولا "آواز دور سے آئی تھی۔ اس علاقے میں اکثر اُلو بولتے رہتے ہیں لیکن ہمیں اُلو بنانا اتنا آسان نہیں ہے۔"

اس موقع پر میرا وہ مشہورِ زمانہ شعر پڑھنے کو بڑی شدت سے جی چاہا۔

برباد چمن کرنے کے لئے بس ایک ہی اُلو کافی تھا
ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے' انجامِ گلستان کیا ہوگا

لیکن میں نے دل ہی دل میں اس شعر کا گلا گھونٹ دیا۔ ملک ریاض کی رائے میرے حق میں جارہی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ویسے بھی یہ طریقہ بڑا پرانا ہوگیا ہے۔ اس قسم کے طریقوں پر عملدرآمد آج کے دور میں بڑا مشکل ہوگیا ہے۔ مجھے امید نہیں کہ چوہدری صاحب جیسے ماڈرن آدمی اس قسم کی حرکتیں کرتے ہوں گے۔ کیوں چوہدری صاحب؟"

میں ان لوگوں کی طرف گھوم گیا۔ سب کی نظریں مجھ پر تھیں۔ عالم شیر ایک کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر بدمزگی کے آثار تھے۔ ملک ریاض میری مزید صفائی پیش کرتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب ہمارے آدمیوں کے ساتھ آئے تھے اور اکیلے آئے تھے۔ ہم نے اطمینان کرلیا تھا' کوئی ان کے پیچھے نہیں تھا۔"

اس کا مطلب تھا کہ سب کچھ ایک طے شدہ پرو... تحت ہوا تھا۔ میں دل ہی دل میں اپنی احتیاط پسندی پر خو... بغیر نہ رہ سکا۔ کبھی کبھی احتیاط پسندی بہت کام آجاتی ہے... ان کے لئے یہی سمجھنا بہتر تھا کہ شکار نہایت معصومیت... جال میں آگیا تھا۔

عالم شیر گویا ملک ریاض کو سمجھانے کی ایک اور کوشـ... ہوئے بولا "ملک یار! میں نے تمہیں بتایا نہیں تھا... ا... بڑا خطرناک ہے۔ بہت تیز ہیں اس کے آدمی۔ چھر... چھری۔ اگر معاملہ کسی چھوٹے موٹے ٹولے کا ہوتا تو م... نمٹ لیتا۔"

"تم اطمینان رکھو میرے بارلیش چاند!" ملک ریاض... کے کندھے پر تھپکی دی "یہ ملک ریاض کا علاقہ ہے۔ یہ... بڑوں کی خطرناکیاں دھری رہ جاتی ہیں۔ کوئی اجنبی چہرہ یہاں... میں بھی نہیں چھپ سکتا اور ہماری اجازت کے بغیر سرعام... سکتا۔ اول تو چوہدری صاحب کو ہمارے ساتھ روانہ ہو... کسی قسم کی گڑبڑ کا بالکل شک تک نہیں تھا۔ میں ٹھیک کہ... نا چوہدری صاحب؟" اس نے براہ راست مجھے مخاطب کیا۔

"بالکل" میں نے اعتراف کیا۔

"اگر بالفرض چوہدری صاحب بہت احتیاط پسند بھی... ملک ریاض نے عالم شیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور ا... بعد میں اپنے آدمیوں کو یہاں پہنچ کر ادھر اُدھر کہیں چھپ... ہدایت کر رکھی ہو تب بھی انہیں صبر کرلینا چاہئے۔ کیونکہ... ان آدمیوں کی لاشیں بھی غائب ہوچکی ہوں گی۔ یہ علاقہ... وفادار ہے۔ ہمارے دشمنوں کو تو یہاں کی زمین اس طرح... ہے جیسے مکھی کو چھپکلی۔"

"واہ... واہ... کے مثال دتی اے میںڈا سائیں!" نو... لہک کر ملک ریاض کے کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ملک... نگاہوں سے اسے گھورا۔ شاید اس وقت وہ اپنی تعریف... محظوظ ہونے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وہ بظاہر پُرسکون تھ... کے اعصاب وائلن کے تاروں کی طرح تنے ہوئے تھے۔

"آپ نے کیا فیصلہ کیا چوہدری صاحب؟" ملک ریا... بڑی مٹھاس اور بڑے احترام سے پوچھا۔

"بات یہ ہے ملک صاحب...!" میں نے اپنے دونو... کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ ایک خطرناک... ڈاکو... ایک کرپٹ اور سیاست میں حصہ لینے والے جا... اور درمیانے درجے کے ایک اسمگلر کے درمیان کیا گٹھ جو... مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ آپ تینوں معززین کن مفادا... تحت اکٹھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے پہلے بھی اکٹھے ہوتے ر... اور بڑے بڑے کارنامے انجام دیتے رہے ہوں۔ لیکن میرا...

...کہ میں نے زندگی میں بہت پہلے ایک اصول بنالیا تھا اور آج ...اس پر سختی سے کاربند چلا آرہا ہوں۔"

"ماشاءاللہ... ماشاءاللہ!" ملک ریاض کے لہجے میں مٹھاس ...لپٹا ہوا زہر تھا "بڑے لوگوں کی یہی تو شان ہوتی ہے۔ وہ سنہرے ...ولوں کے تحت زندگی گزارتے ہیں اور ہمیشہ سختی سے ان پر کاربند ...تے ہیں۔ ارشاد فرمایئے وہ اصول کیا ہے؟"

"میں تمہارے لہجے کے گھٹیا طنز کو نظرانداز کرتے ہوئے بتا رہا ...ا..." میں نے ملائمت سے کہا "بہت پہلے میں نے فیصلہ کرلیا ...کہ میں زندگی میں کبھی بلیک میل نہیں ہوؤں گا' خواہ جان چلی ...ئے کیونکہ جو لوگ ایک بار بلیک میل ہوتے ہیں وہ زندگی بھر ...میل ہوتے ہی چلے جاتے ہیں۔"

"واہ... واہ... کیا برسوں کے تجربات کا نچوڑ ارشاد فرمایا ...۔" ملک ریاض نے جھومنے کی اداکاری کی۔

میں نے اس کے انداز پر توجہ دئیے بغیر بات جاری رکھی' ...کچھ برسوں پہلے میں نے اپنی زندگی سے رفتہ رفتہ ان کمزوریوں کو ...دیا تھا جن کی بنا پر مجھے بلیک میل کیا جاسکتا تھا۔ بلیک میل بہت ...ج لفظ ہے اور اس میدان میں واقعی ہزاروں زاویوں سے طبع ...ئی کی جاتی ہے۔ آپ جیسے لوگ تو ان باتوں کو بہت اچھی طرح ...تے ہوں گے۔ میری ہمیشہ سے کوشش رہی ہے کہ مجھے کسی بھی ...یے سے بلیک میل نہ کیا جاسکے۔"

...میں ہاتھ میں ہاتھ پھنسائے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ...کرتے کرتے میں نے کن انکھیوں سے گھڑی دیکھی۔ مجھے دو ...اور گزارنا تھے۔ اُلو کی آواز کا سگنل دئیے مجھے پانچ منٹ ...ے نہیں ہوئے تھے۔ ملک ریاض کی نظر میں بھی اس قسم کی ...پرانی اور آؤٹ ڈیٹیڈ تھیں لیکن میں نے پرانی چیزوں کو نئی ...کے جھمیلوں میں بھی ہمیشہ کارآمد پایا تھا۔ ویسے بھی میں ماضی ...زندہ رہنے والا آدمی تھا۔ قدامت اور جدت کا امتزاج مجھے ...لگتا تھا۔ نئی اور پرانی چیزوں کو گڈمڈ کرکے میں نے اکثر بڑے ...مد نتائج حاصل کئے تھے۔

ملک ریاض اس بار ذرا سنجیدگی سے بولا "اس دنیا میں کسی بھی ...کی زندگی ایسی نہیں ہوتی کہ اسے کسی بھی زاویے سے بلیک ...نہ کیا جاسکے۔"

"کافی حد تک تمہاری بات درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ ...تو اس ڈر سے ابھی تک شادی کرتے ہوئے بھی جھجک رہا ہوں۔ ...بچے انسان کے پیروں کی زنجیر ہوتے ہیں۔ اس کی کمزوری بھی ...جاتے ہیں۔ کوئی انہیں اغوا کرکے بھی آپ کو بلیک میل کرسکتا ...گو کہ میرے شادی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ابھی ...مجھے میری آئیڈیل لڑکی نہیں ملی... اور اگر ملی تو کسی اور طرف ...با نکلی۔ واپس آئی تو مجھ سے شادی پر رضامند نہ ہوئی۔ لیکن ...بڑی وجہ یہی ہے کہ میں اپنی زندگی میں یہ کمزوری پالتے ہوئے ڈر رہا ہوں۔"

میں نے غیر محسوس طور پر ایک نظر پھر گھڑی کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن پھر بھی انسان کی زندگی میں سب سے بڑی کمزوری اس کی اپنی جان ہے جسے یرغمال بنا کر اسے بلیک میل کیا جاسکتا ہے۔ جو اس وقت تم کررہے ہو۔ لیکن تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں نے اس پہلو سے بھی بلیک میل نہ ہونے کا تہیہ کر رکھا ہے۔ میں نے اپنا یہ یقین پختہ کرلیا ہے کہ جان اوپر والے کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک اس کی مرضی نہ ہو' کوئی اسے نہیں چھین سکتا۔ جب سے یقین کی یہ پختگی حاصل ہوئی ہے تب سے زندگی بڑی آسان ہوگئی ہے۔ خوف بہت کم ہوگیا ہے۔ شہر میں بغیر محافظوں کے پھرتا ہوں۔ حالانکہ شہر میں سیٹھ عالم شیر جیسے تھرڈ کلاس دشمن بھی موجود ہیں اور میری پل پل کی حرکات و سکنات کی خبر رکھنے والے نادیدہ لوگ بھی۔ جو کسی اور ہی سیارے سے آئی ہوئی مخلوق لگتے ہیں۔"

ملک ریاض مجھے گھورتے ہوئے بولا "اب میرے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہوگیا ہے۔ اتنی لمبی تقریریں سن کر بھی آدمی کو کچھ حاصل نہ ہو تو کیا فائدہ؟ آپ ان تقریروں کا خلاصہ بتادیں چوہدری صاحب!"

"کمال ہے! خلاصہ آپ کی سمجھ میں نہیں آیا ملک صاحب؟ خلاصہ صرف یہ ہے کہ میں آپ کا مطالبہ پورا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں آپ کو پچاس لاکھ تو کیا پچاس روپے بھی دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ بات اصول کی ہے۔ میں پچاس لاکھ روپے کسی اسپتال' کسی یتیم خانے کو عطئے کے طور پر دے سکتا ہوں' تمہیں نہیں دے سکتا۔"

"ٹھیک ہے۔ اب ہم پچاس لاکھ لیں گے بھی نہیں۔" ملک ریاض اطمینان سے بولا "اب ہم ایک کروڑ لیں گے... اور اس طرح لیں گے جس طرح میرے جاں نثار دوست نورو ماچھی اور عالم شیر تجویز کریں گے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میرا طریقہ فیل ہوگیا ہے۔ میں اب معاملہ اپنے دوستوں کے ہاتھوں میں دے رہا ہوں۔ یہ لوگ رقم وصول کرنے کا فن بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔"

اس نے گویا بات ختم کردی اور سگریٹ سلگانے لگا۔ نورو ماچھی ایک مونچھ کو بل دیتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر شیطانی سی مسکراہٹ تھی۔ اس نے اپنی رائفل کرسی ہی کے سہارے کھڑی چھوڑ دی تھی اور اپنا کوئی ریوالور وغیرہ بھی نہیں نکالا تھا۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چار آدمیوں نے مجھے کور کیا ہوا تھا۔ چار پانچ آدمی اور بھی ہتھیار بدست تھے۔ صرف ملک ریاض غیر مسلح اور بے پروا نظر آرہا تھا۔ ظاہر ہے اس کے لئے کوئی زحمت اٹھانا ضروری نہیں تھا۔ ہر کام اس کے اشارے پر ہوسکتا تھا۔

نورو ماچھی نہایت ڈرامائی انداز میں قدم اٹھاتا میری طرف

بڑھا۔ اب تو مجھے بھی حقیقتاً ذرا تشویش ہونے لگی تھی۔ ہمارے طے شدہ طریق کار کے حساب سے تقریباً آدھا منٹ اوپر ہوچکا تھا۔ آدھا منٹ نہ جانے کتنے انسانوں کی زندگی کا فیصلہ کردینے کے لئے کافی ہوتا ہے۔

میں نے غیر محسوس طور پر اپنے اور ریوالور برداروں کے درمیان فاصلہ ناپنے کی کوشش کی۔ دو ریوالور بردار ڈاکو کچھ دور تھے لیکن دو بالکل قریب تھے۔ درمیان کی خالی پٹی پر نورو ماچھی چلا آرہا تھا اور ان پانچوں کی نظر مجھ پر تھی۔ کسی کارروائی کا خطرہ مول تو لیا جاسکتا تھا لیکن اس کے لئے محض ایک ثانئے کو ان کی توجہ بٹانے کا کوئی سبب بن جاتا تو بہتر تھا۔ میرے لئے وہ ایک ثانئے کی مہلت کافی ہوتی ورنہ خطرات بہت زیادہ تھے۔ میری کھوپڑی یا سینے میں سوراخ ہونے کا بڑا قوی امکان موجود تھا۔

ضائع کرنے کے لئے بھی میرے پاس ایک لمحہ نہیں تھا۔ اگر نورو ماچھی عین میرے سامنے آن پہنچتا تو میرے لئے کوئی قدم اٹھانا اور مشکل ہوجاتا لیکن عین اسی لمحے اسی برجی کے عقب میں چھت کی دیوار سے ایک ہیولے نے سر ابھارا جس کے پیچھے کچھ دیر پہلے تک عالم شیر چھپا ہوا تھا۔ چھت کا وہی ایک کونا ایسا تھا جہاں نگرانی کے لئے کوئی آدمی تعینات نہیں تھا۔

ہیولا دونوں ہاتھ دیوار پر پھنسا کر اوپر اٹھا اور بے آواز طریقے سے بلی کی طرح چھت پر کود آیا۔ اس کے ساتھ ہی بیک وقت دو کام ہوئے۔ ایک تو کہیں دور بہت زوردار فائرنگ شروع ہوگئی۔ دوسرے میرے پاس کھڑے ہوئے وہ دونوں ڈاکو تقریباً ایک ساتھ اچھل کر دور جاگرے جنہوں نے ریوالور میری کھوپڑی کی طرف بلند کئے ہوئے تھے۔

خاموش رائفل کی گولیاں انہیں چاٹ گئی تھیں۔ ان میں سے ایک کا ریوالور چل گیا تھا لیکن غنیمت تھا کہ میں دیوار سے ٹیک لگائے کھڑے کھڑے تھوڑا سا نیچے کو کھسک چکا تھا۔ اس کے باوجود گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری۔ اگر میں ذرا سا بھی سیدھا کھڑا ہوتا تو میری کنپٹی میں سوراخ ہونا لازمی تھا۔

وہ مہلت میرے لئے کافی سے بھی زیادہ تھی۔ دور فائرنگ کی آواز نے سب کو چونکا دیا تھا لیکن شاید ان کی یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اتنی دور ہونے والی فائرنگ سے میرے دائیں بائیں کھڑے ہوئے ڈاکو اچھل کر دور کس طرح جاگرے تھے۔ مجھ سے ذرا دور کھڑے ہوئے دو ڈاکوؤں کے ریوالور گرجے لیکن اس وقت تک میں ایک گھٹنے کے بل بیٹھ چکا تھا۔ دوسرے انہوں نے اپنے سردار نورو ماچھی کو بچانے کے لئے زاویہ بدل کر فائر کئے تھے۔ گولیاں نہ جانے کہاں سے گزریں۔

گڑبڑ کا احساس ہوتے ہی نورو ماچھی زخمی درندے کی طرح مجھ پر جھپٹا۔ ساتھ ہی اس نے ایک ہاتھ جیب میں ڈالتے ہوئے اپنی کوئی گن وغیرہ بھی نکالنے کی کوشش کی۔ یہی اس کی غلطی تھی۔

اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میری لات نے اسے کم دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا رخ اس کے ساتھیوں کی تھا اور عقب سے اس کی گردن میری گرفت میں تھی۔ ا نکالنے کے لئے جو ہاتھ جیب کی طرف بڑھایا تھا وہ میرے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔

اس دوران دوسرے دو ڈاکو جن کے ریوالوروں کا طرف تھا، غالباً کسی ایسی پوزیشن پر پہنچنے کے لئے لپکے نورو کو گزند پہنچائے بغیر مجھے نشانہ بنا سکیں لیکن ان کی کامیاب نہ ہوسکی۔ وہ گولی چلانے سے پہلے ہی ڈھیر ہو تک کسی کی سمجھ میں صحیح طور پر نہیں آسکا تھا کہ چھت پر ہے۔ وہ ہیولا اسی برجی کی آڑ میں ہوچکا تھا جس کے پیچھے عالم شیر چھپا ہوا تھا۔

یہ احساس سب سے پہلے غالباً عالم شیر کو ہوا کہ یہ لئے کوئی چھت پر پہنچ چکا ہے۔ اس نے کرسی سے چھلانگ میز کو الٹتا ہوا رکوع کی سی حالت میں ایک دوسری برجی کے لئے دوڑا۔ اس دوران وہ نیفے سے ایک لمبا سا ر نکال چکا تھا۔ لیکن اسے بھی ریوالور کے استعمال کا موقع ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں دور جاگرا اور کے ساتھ اس کا بازو بے جان انداز میں جھول گیا۔ ا گولیوں کی زد سے بچانے کے لئے وہ فرش پر گر کر ایک لڑھکتا چلا گیا۔

ایک ڈاکو کے پاس ہلکی مشین گن بھی تھی۔ وہ ا کرنے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔ اسے غالباً کئی لگی۔ وہ پٹ سے اس طرح گرا کہ سب مشین گن اس ہی گری۔

یہ سب کچھ تقریباً بیک وقت ہی ہوا تھا۔ برجی کے لینے والے ہیولے کو میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ یقیناً آفتاب میرے خاص ساتھیوں میں سے ایک۔ وہ بہت اچھے تھا۔ صورت حال کو اس نے کم سے کم وقت میں بہت سمجھا تھا اور اس کی کارکردگی بہت شاندار رہی تھی۔

اس نے اکیلا ہوتے ہوئے بھی ایک اجنبی جگہ پر صرف انہی لوگوں کو بروقت نشانہ بنایا تھا جنہیں نشانہ بہت ضروری تھا۔ اس کی چلائی ہوئی کسی بھی گولی کو ایک تاخیر ہوجاتی تو صورت حال میں نہ جانے کتنا فرق پڑجاتا فائروں کے درمیان وقفہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اگر لڑائی کسی ماہر کو اس وقت صورت حال پر توجہ دینے کی فرصت شاید یہی سمجھتا کہ بیک وقت کئی آدمی چھت پر کود آئے آفتاب نے آکر چند سیکنڈ میں پانسہ پلٹ دیا تھا۔ مجھے زیادہ لینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس نے صحیح معنوں میں والی کارروائی کی تھی۔

ملک ریاض فرش پر گر کر ساکت ہوچکا تھا۔ وہ سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔ یہ اس نے عقل مندی کی تھی۔ اس کے پاس غالباً کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ ہروقت دوسروں پر انحصار کرنے والوں کے لئے ایسی صورت حال بڑی مشکل ہوتی ہے۔

نورو ماچھی میری گرفت میں تھا۔ میں نے اسے جیب کی طرف ہاتھ لے جانے سے روک دیا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں خود بھی اپنا مشین پسٹل یا خنجر وغیرہ نہیں نکال سکتا تھا۔ میرے دونوں ہاتھوں اور جسم کی پوری قوت نورو ماچھی کو قابو میں رکھنے میں صرف ہورہی تھی۔ وہ کسی ارنے بھینسے سے کم نہیں تھا۔ ذرا سی ڈھیل پاتے ہی وہ نہ صرف میری گرفت سے نکل سکتا تھا بلکہ مجھے بڑی مشکل میں بھی ڈال سکتا تھا۔

ہروقت ہتھیاروں اور اپنے اردگرد موجود ساتھیوں پر انحصار کرنے والے لوگ اگر جسمانی طور پر بہت طاقتور ہوں تب بھی رفتہ رفتہ انہیں زنگ لگتا جاتا ہے۔ ہاتھ پیروں سے وہ کوئی کارنامہ دکھانے کے زیادہ اہل نہیں رہتے۔ لیکن نورو ماچھی کا معاملہ مختلف معلوم ہوتا تھا۔

آج رات اس نے خوب پی تھی۔ نشے میں دُھت رہا تھا۔ پھر افروز کے ساتھ درندگی کے مظاہرے میں بھی وہ آپے سے باہر رہا تھا۔ لیکن اس وقت اس کے جسم میں ذرا سا بھی ارتعاش نہیں تھا۔ میں اسے کھینچ کر ایک طرف کو لے جانا چاہتا تھا لیکن اس کے پاؤں ہاتھی کی طرح مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔

وہ اس فکر میں تھا کہ مجھے کمر پر اچھال کر اپنے سامنے پھینک دے لیکن میرے پاؤں بھی اپنی جگہ سے اکھاڑنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ عالم شیر یا بچ جانے والا ایک ڈاکو اپنی گن تک پہنچنے میں کامیاب نہ ہوجائیں۔ ان کے لئے ایک لمحے کی مہلت بھی کافی تھی۔ اس ڈاکو نے جان بچانے کے لئے ہاتھ اٹھا دئے تھے اور آفتاب نے کمال خوش خلقی اور اصول پسندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے چھوڑ دیا تھا حالانکہ اس کی رائفل اس کے پیروں میں ہی پڑی تھی۔

نورو ماچھی شکنجے میں پھنسے ہوئے درندے کی طرح خرخرا رہا تھا اور زور آزمائی میں مصروف تھا۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبلی پڑرہی تھیں۔ میں نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کی "زیادہ زور مت لگاؤ نورو! گردن ٹوٹ جائے گی۔"

لیکن اس پر میرے مشورے کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے زور آزمائی جاری رکھی۔ میں اس کی گردن توڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن اس ٹیکنیک میں اس کی اپنی طاقت ہی اس کی گردن ٹوٹنے کا سبب بن سکتی تھی۔

میں نے اس کی گردن ٹوٹنے سے بچانے کے لئے اس کی پیٹھ پر گھٹنا رسید کیا لیکن اس حرکت سے میرا وہ توازن خراب ہوگیا جس کے تحت میں نے اسے قابو میں کیا ہوا تھا۔ وہ تڑپ کر میری گرفت سے نکلا اور گھومتے ہوئے اس نے اندھا دُھند مجھے لات رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس کی لات سے بچنے کی کوشش میں میں گر گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ مجھ پر تھا۔ ریوالور نکالنے کی کوشش نہ اس نے کی تھی اور نہ ہی میں نے۔ ہمارے پاس اتنی مہلت ہی نہیں تھی۔ یہ پلک جھپکتے میں رخ بدل لینے والی کشمکش تھی۔ اس نے چیتے کی طرح مجھ پر چھلانگ لگائی تھی اور اس کے آہنی ہاتھ سیدھے میری گردن کی طرف بڑھے تھے۔

صرف چند سیکنڈ اس سے الجھ کر مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ غیر معمولی قوت کا مالک تھا۔ اس کا جسم لوہے کی طرح سخت تھا۔ یہی ایک طرح سے اس کی خامی بھی تھی۔ اس کے جسم میں لچک نہیں تھی۔

وہ مجھ پر گرا تو مجھے یہی لگا جیسے لوہے کی ایک سل مجھ پر گر پڑی ہو۔ قطعی اضطراری طور پر میں نے اپنی گردن اس کے ہاتھوں کے شکنجے میں جانے سے بچانے کے لئے پوری قوت سے اسے اپنے گھٹنوں پر اچھال دیا۔

مجھے اندازہ ہی نہیں رہا تھا کہ اس وقت ہم چھت کی دیوار کے بالکل قریب تھے جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے نورو ماچھی کی چیخ سنی۔ میں نے اسے صرف ایک لمحے کے لئے اڑتے ہوئے ریچھ کی طرح ہوا میں بلند ہوتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ غائب ہوگیا اور پھر نشیب سے بھد کی زوردار آواز سنائی دی۔

تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نیچے جاگرا تھا۔ میں نے تیزی سے اٹھ کر چھت کی دیوار سے جھانکا۔ حویلی دو منزلہ تھی اور پرانی تعمیر میں منزلیں ذرا اونچی ہوتی ہیں۔ حویلی کے اردگرد زمین کچی ہی تھی لیکن نرم نہیں تھی۔ نورو ماچھی جہاں جاکر گرا تھا وہیں ایک بڑی سی گٹھڑی کی صورت میں ساکت ہوگیا تھا۔ وہ بلاشبہ فولادی جسم کا مالک تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ اس کے جسم میں بڑی توڑ پھوڑ ہوئی ہوگی۔

کھیل ختم ہوچکا تھا اور اس میں پورا ایک منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ میں پلٹ آیا۔ آفتاب بھی برجی کے عقب سے نکل آیا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں جرمن لیوگر تھے۔ اس نے ٹھوکروں سے وہ گنیں دور ایک کونے میں پہنچا دیں جن تک ملک ریاض، عالم شیر یا زندہ بچ جانے والے ڈاکو کی رسائی ہوسکتی تھی۔

میں نے عالم شیر کو گریبان سے پکڑ کر آگے گھسیٹا اور ملک ریاض کے قریب پہنچ کر دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑا۔ ایک جھٹکے سے میں نے دونوں کو بیک وقت کھڑا کیا۔ ملک ریاض کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ کچھ اس طرح میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔ اسے گو کہ ذرا سی چوٹ بھی نہیں لگی تھی اور نہ ہی کوئی گولی اسے چھوتی ہوئی گزری تھی۔

تو فنشنگ ٹچ لگالیں گے۔ ورنہ جو کچھ بھی ہوگا اس سے تمہیں حقائق کو سمجھنے میں آسانی رہے گی۔"

صبح کی سپیدی نمودار ہورہی تھی۔ اگر یہ علاقہ قصبے سے اتنا دور نہ ہوتا تو شاید اب تک یہاں آمدورفت شروع ہوجاتی۔ اسی اثنا میں ایک طرف سے ایک جیپ اور دوسری طرف سے ایک سفید کار ہماری طرف بڑھتی دکھائی دی۔ چند لمحے بعد ان گاڑیوں میں منیر' مسعود' صفدر اور سلیمان بھی ہمارے قریب آپہنچے۔ جیپ کے اسٹیئرنگ وھیل پر ٹونی تھا۔ وہ سب تھوڑے بہت مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ ان کے بالوں اور کپڑوں میں کہیں کہیں گھاس پھوس' تنکے اور پتے پھنسے ہوئے تھے لیکن یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ ان میں سے کوئی معمولی زخمی بھی نہیں تھا۔

"آپریشن مشکل تو ثابت نہیں ہوا؟" میں نے ٹونی کا کندھا تھپکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں سر! یہ تو بالکل آسان شکار تھے۔" ٹونی بولا "یہ لوگ اصل میں اس خوش فہمی میں رہتے ہیں کہ یہ جنگل کے بادشاہ ہیں اور کوئی دوسرا جنگل کا بھیدی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"ان کی خوش فہمی ایک لحاظ سے بجا ہوتی ہے۔" میں نے کہا "اگر پولیس کبھی انتہائی مجبور ہوکر کسی وجہ سے ان کے خلاف آپریشن پر کمربانده بھی لے تو وہ بے چاری ایسے ہی جنگلوں میں ٹامک ٹوئیاں مارتی رہ جاتی ہے۔"

صفدر مسکراتے ہوئے بولا "سر! ویسے بھی ان کا حساب تو کچھ یوں ہوتا ہے کہ پانچ ڈاکوؤں کے لئے پانچ سو پولیس والے روانہ ہوتے ہیں اور مہینوں پہلے سے منصوبہ بندیاں ہوتی ہیں۔ اخباروں میں بڑی بڑی خبریں چھپنا شروع ہوجاتی ہیں کہ ڈاکوؤں کے خلاف آپریشن شروع ہونے والا ہے۔ یہ گویا ڈاکوؤں کو خبردار کرنے کا بندوبست ہوتا ہے کہ برادران! کہیں ادھر اُدھر نکل جایئے... اپنی حفاظت کا بندوبست کرلیجئے' ہم آنے والے ہیں۔"

"اگر اخباروں میں خبریں نہ چھپیں تو پولیس میں موجود ان کے مخبر ہی انہیں خبردار کردیتے ہیں اور اتنے ڈاکو نہیں مرتے جتنے بے چارے پولیس والوں کی لاشیں واپس آتی ہیں۔" منیر نے اپنی رائفل سیٹ کے نیچے کھسکاتے ہوئے کہا۔

"سر! ایک آدھ ڈاکو تو ہم سے بھی بچ کر نکل گیا ہے۔" سلیمان نے بڑے افسوس سے اطلاع دی "ایک سائڈ کوَر کرنے سے رہ گئی تھی۔ ہمارے ساتھ ایک آدمی اور ہوتا تو..."

"خیر... کوئی بات نہیں۔ اس کا افسوس مت کرو۔" میں نے اسے تسلی دی "ڈاکوؤں کے سرپرستوں کو صحیح طور پر اطلاع دینے والا بھی تو کوئی ہونا چاہئے کہ ان پر کیا گزری۔ انہیں صرف لاشیں ہی نہ جمع کرنی پڑیں۔ ایک آدھ آدمی زندہ بھی واپس آجائے تو کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی ہمارا تو یہ پروگرام ہی نہیں تھا۔ میں نے تو احتیاطاً تم لوگوں کو یہاں آنے کی ہدایت کردی تھی اور بتادیا تھا کہ کن حالات میں کیا کرنا ہے۔ یہ ڈاکوؤں کا شکار تو بس [...] ہوگیا۔"

پھر میں نے حویلی کی طرف دیکھا۔ ابھی تک حویلی میں [...] شروع نہیں ہوئی تھی۔ شاید وہ لوگ ابھی تک سنبھل نہیں [...] تھے۔ جہاں جہاں بند تھے وہاں سے ابھی نکل نہیں سکے تھے۔ [...] نے ٹونی سے کہا "صبح کا اجالا پھیلنے والا ہے۔ تم لوگ نکل چلو۔ [...] ... قصبے سے ہوتا ہوا آؤں گا۔ میں ذرا اپنے بچپن کے ایک دوست سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک بار پہلے بھی یہاں آیا تھا تو اس طرف جانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔"

ٹونی نے قدرے حیرت سے میری طرف دیکھا اور کہے بغیر نہ رہ سکا "سر! یہ کوئی موقع ہے بچپن کے دوست سے ملنے جانے کا؟ [...] خطرہ ٹلا نہیں۔ ملک ریاض کے پاس اور بھی بہت سے آدمی [...] گے۔ اب آپ کا اکیلے زیادہ دیر اس علاقے میں موجود رہنا ٹھیک نہیں۔ آپ بھی ہمارے ساتھ ہی نکل چلئے۔"

"ملک ریاض اور اس کے آدمیوں کو تو ابھی لاشیں جمع کر[...] اور اس جھٹکے سے سنبھلنے کے لئے کافی وقت درکار ہوگا۔ تب تک میں بھی تم لوگوں کے پیچھے آجاؤں گا۔ ویسے بھی ان لوگوں کو [...] وقت جو سبق مل چکا ہے اس کے بعد وہ مجھ اکیلے پر بھی ہاتھ ڈا[...] ہوئے ایک لمحے کے لئے ضرور سوچیں گے۔" میں نے مسکرا[...] ہوئے کہا "ویسے بھی یہ علاقہ صرف ملک ریاض کا ہی نہیں [...] بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ یہاں میری کوئی حویلی' زمینیں [...]

جائداد نہیں ہے لیکن میرا بچپن تو یہاں گزرا ہے۔ یہاں کے کوچہ و بازار پر کچھ میرا بھی حق ہے' ان سے میری بھی کچھ آشنائی ہے۔"

"سر! اب میں کیا کہوں" ٹونی بھی مسکرا دیا "آپ مرضی کے مالک ہیں۔ میں تو آپ کو یہ نصیحت بھی نہیں کرسکتا کہ ہوشیار رہئے گا۔ کیونکہ ہوشیار رہنا تو خود ہم نے آپ سے سیکھا ہے۔ بہرحال آپ اجازت دیں تو میں آپ کے پیچھے پیچھے رہوں؟"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "جہاں تم لوگوں کی ضرورت تھی وہاں تم نے اپنا کام عمدگی سے انجام دے دیا۔ اب تم لوگ روانہ ہوجاؤ۔"

جیپ اور سفید کار دُھول اڑاتی' آگے پیچھے تیزی سے روانہ ہوگئیں۔ اپنی گاڑی کی طرف جانے سے پہلے میں نے اوپر چھت کی طرف دیکھا۔ ملک ریاض اور عالم شیر دیوار کے عقب سے سر نکالے نیچے دیکھ رہے تھے۔ ان کے پاس کوئی گن وغیرہ ہوتی تو وہ ضرور ہم پر فائر کرچکے ہوتے۔ وہ نیچے بھی نہیں آسکتے تھے کیونکہ سیڑھیوں کا دروازہ بند تھا اور ان کے بچے کھچے آدمی نیچے کہیں بند تھے۔ نورو ماچھی خون میں لت پت ایک طرف بے ہوش پڑا تھا۔

ملک ریاض اور عالم شیر نے مجھے اوپر کی طرف متوجہ پاکر جلدی سے سر دیوار کے پیچھے کرلئے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ میں ان پر گولی چلادوں گا۔ میں نے قدرے بلند آواز سے کہا "احمقو! اگر تمہارا بھی قصہ پاک کرنا ہوتا تو اسی وقت نہ کردیتا جب میں اوپر تھا۔ یہ میں تمہیں ایک موقع دے کر جارہا ہوں۔ اس سے فائدہ اٹھانا یا نہ اٹھانا تمہاری مرضی پر منحصر ہے۔ آئندہ پنگا لوگے تو جان بخشی نہیں ہوگی۔"

انہوں نے میری آواز تو یقیناً سن لی ہوگی لیکن دیوار کے عقب سے سر نہیں نکالا۔ میں حویلی کی بغلی دیوار کی طرف آکر اپنی گاڑی میں بیٹھا اور قصبے کی طرف روانہ ہوگیا۔ رات اس میدان میں زندگی کے ہنگامے جواں تھے اور صبح دم اجل کا سناٹا پھیل چکا تھا۔ انسان بھی زندگی کو عجب تماشا بنائے رکھتا ہے۔

قصبے کے قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں تھوڑی بہت ترقی تو ہوئی تھی لیکن ایسی کوئی نمایاں تبدیلی بہرحال نہیں آئی تھی۔ وہی ادھڑتی ہوئی کچی پکی گلیاں تھیں۔ وہی آوارہ کتے اور وہی نیم پختہ مکانات۔

گلیوں میں اِکادُکا افراد کی آمدورفت شروع ہوچکی تھی اور وہ مڑ مڑ کر میری گاڑی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جن کتوں کے آرام میں میری گاڑی کی وجہ سے خلل پڑا تھا انہوں نے بھونکنا شروع کردیا تھا۔ ایک آدھ تو کچھ دور تک گاڑی کے پیچھے دوڑا بھی آیا۔

ٹونی نے درست ہی کہا تھا' میں نے اپنے بچپن کے دوست سے ملنے کے لئے عجیب ہی وقت کا انتخاب کیا تھا۔ میری گاڑی ہی نہیں' میرا سوٹ بھی مٹی میں لتھڑا ہوا تھا لیکن تھوڑی سی جھاڑ پونچھ کے بعد یہ حلیہ بھی کم از کم ایک قصبے کے لئے تو خاصا معززانہ ہی قرار پاسکتا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مجھ جیسا آدمی جو شہر کے جھمیلوں میں اور اتنے بہت سے کاموں کے ساتھ کسی نہ کسی بدخواہ کی کھینچا تانی میں بھی پھنسا رہتا تھا' اس قسم کے کاموں کے لئے صرف سوچتا ہی رہتا تھا۔ ان کے لئے کبھی وقت نہیں نکال سکتا تھا۔ اس قسم کے کام اگر ہوسکتے تھے تو بس اچانک ہی ہوسکتے تھے۔

اس وقت گو کہ اعصاب ذرا منتشر تھے۔ ذہن کچھ الجھا ہوا تھا۔ میں ہلکی سی خونریزی اور موت و زندگی کی چند لمحے کی کشمکش سے گزر کر آرہا تھا لیکن ریاض احمد عرف راجو کا خیال اچانک ہی ذہن میں آگیا تھا اور دل اس سے ملنے کو بے چین ہوگیا تھا۔ وہ میرے بچپن کا وہ دوست تھا جس کے ساتھ کچے پکے سینما ہالز میں زندگی کی اوّلین فلمیں دیکھی تھیں' آنکھوں میں معصوم خواب سجائے تھے اور نہر کے کنارے شوٹنگز کی تھیں۔

گلی کوچے ذرا بدلے بدلے سے لگ رہے تھے۔ بہت سی چیزیں' بہت سی نشانیاں خود میرے ذہن سے محو ہوگئی تھیں۔ ایک بار پہلے بھی مجھے ذرا سی دیر کے لئے یہاں آنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن وہ بات بھی خاصی پرانی ہوچکی تھی۔ اس وقت میں ریاض احمد عرف راجو سے ملنے نہیں جاسکا تھا جس کا مجھے بڑا افسوس تھا۔

بڑی مشکل سے میں نے وہ گلی تلاش کی جس میں راجو کا گھر تھا۔ میں کسی سے پوچھنا بھی نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے خود سے شرم آرہی تھی۔ انسان جہاں پیدا ہوا ہو' پلا بڑھا ہو' جہاں کے ذرّے ذرّے میں ایک مفلس کی یادوں کا خزانہ بکھرا پڑا ہو کم از کم وہاں تو اسے کسی سے راستہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہئے تھی۔

آخر کار میں اس گلی تک پہنچنے میں کامیاب ہو ہی گیا جس میں راجو کا گھر تھا۔ وہ بھی دوسری بہت سی گلیوں کی طرح ایک تنگ اور ناہموار گلی تھی۔ بچپن میں یہی گلیاں بہت کشادہ اور کھلی کھلی لگتی تھیں۔ گاڑی بمشکل اس گلی میں داخل ہوئی۔ دو تین ننگ دھڑنگ سے بچے بھی پیچھے لگ گئے جو نہ جانے علی الصباح کیونکر گھروں سے نکل آئے تھے۔

راجو کا مکان پہچان کر میں نے اس کے سامنے گاڑی روکی۔ گلی میں کوئی خاص تبدیلیاں نہیں آئی تھیں۔ راجو کا مکان بھی جوں کا توں تھا۔ وہی اینٹوں کی دیوار' وہی ٹاٹ کا پردہ' وہی صحن سے جھانکتا ہوا شہتوت کا درخت' وہی دروازے پر بیٹھا ہوا کالے رنگ کا کُتا۔ لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ پہلے یہاں بیٹھا ہوا کُتا کتھئی رنگ کا ہوا کرتا تھا۔ چلو کم از کم اتنی تبدیلی تو آئی تھی۔

مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا کوئی خواب چند لمحے کے لئے ٹوٹ گیا تھا۔ چند لمحے بعد خواب کا سلسلہ جُڑ گیا تھا۔ میں پھر اسی دنیا میں لوٹ آیا تھا۔ گزرے ہوئے ماہ و سال گویا میرے ذہن سے محو ہوگئے تھے۔ ایک ثانیے کے لئے تو مجھے یہ گمان بھی گزرا کہ میں جس گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا وہ شاید میری اپنی نہیں تھی۔ میرے جسم پر موجود سوٹ بھی میرا اپنا نہیں تھا۔ میں تو درحقیقت ایک اُٹنگی سی

شلوار قمیص پہنے انہی گلیوں میں بھٹکنے والا نوعمر سا لڑکا تھا۔

راجو کے دروازے پر بیٹھا ہوا کالا کتا متذبذب سے انداز میں بھونکنے لگا۔ میں نے اس کی پروانہ کرتے ہوئے لوہے کی کنڈی سے دروازہ کھٹکایا اور اپنے لباس سے گرد جھاڑ کر جواب کا انتظار کرنے لگا۔

اُجڑے اُجڑے سے چہرے والی ایک پست قد گوری چٹی مگر بیمار سی عورت نے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر باہر جھانکا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور ہاتھوں کی نسیں غیر معمولی طور پر ابھری ہوئی تھیں۔ تیل میں چپڑے ہوئے بال سختی سے سر پر جمے ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنی ایک چچی یاد آگئیں۔ جوانی ..... یا یوں کہئے کہ ڈھلتی جوانی میں وہ کچھ ایسی ہی ہوا کرتی تھیں۔ میرے چچا کا کنبہ بھی یہاں سے ترکِ سکونت کرکے نہ جانے کہاں جا چکا تھا۔ مجھے آج تک ان کا سراغ نہیں ملا تھا۔

عورت نے مجھ سے پہلے دروازے پر کھڑی ہوئی جہازی سائز کی گاڑی کو دیکھا پھر میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے دوپٹا درست کرکے حتی الامکان مہذبانہ لہجے میں بولی "جی .... آپ کون ہیں؟" اس کی آنکھوں میں ہلکا سا خوف تھا۔ نہ جانے کیوں!

"میں راجو کا بچپن کا دوست ہوں افضل۔" میں نے ملائمت سے کہا "میں اس سے ملنے آیا ہوں' لاہور سے۔"

عورت کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے ہلچل سے مچی۔ اداسی کا سمندر متلاطم سا ہوا۔ ہونٹ تھرتھرائے اور وہ گویا حلق میں پھنسی ہوئی کوئی چیز نگلتے ہوئے بولی "ایک منٹ ٹھہریئے....."

وہ الٹے قدموں غالباً دوڑ کر اندر گئی۔ بظاہر مکان سکوت میں ہی ڈوبا رہا مگر مجھے یوں لگا جیسے اندر ایک خاموش بھونچال سا آگیا تھا۔ چند لمحے بعد ایک باریش بزرگ گرتے پڑتے باہر آتے دکھائی دیے۔ وہ اتنے معمر نہیں تھے لیکن ان کی کمر جھک چکی تھی۔ وہ بیک وقت واسکٹ کے بٹن بھی بند کر رہے تھے اور پگڑی بھی درست کر رہے تھے۔ عجلت میں انہوں نے مصافحے کے لئے میری طرف ہاتھ بھی بڑھا دیا اور اس کوشش میں وہ چوکھٹ سے الجھ کر گرتے گرتے بچے۔

وہ بہت کمزور تھے۔ آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ نظر خاصی کمزور معلوم ہوتی تھی۔ انہوں نے سیدھے ہو کر' بلکہ پنجوں کے بل کھڑے ہو کر انتہائی قریب سے میرا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی پھر آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولے "کون ہو بیٹا تم! میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔"

میں نے خود بھی انہیں نہیں پہچانا تھا لیکن آواز سن کر پہچان گیا۔ آواز اب بھی خاصی کراری تھی۔ وہ راجو کے والد تھے۔ جب تک میں نے انہیں دیکھا تھا انہوں نے داڑھی نہیں رکھی تھی' نہ ہی اس وقت وہ سر پر پگڑی رکھتے تھے۔ اتنے کمزور بھی نہیں

"چاچا! میں افضل ہوں۔" میں نے مؤدبانہ لہجے میں بتایا۔

"کون افضل؟" انہوں نے آنکھیں سکیڑیں۔ ان کی شکن زدہ پیشانی پر شکنیں کچھ اور بڑھ گئیں۔

"افضل .... جی وہ راجو کا دوست۔ چوہدری اجمل کا بیٹا!" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے اپنی شناخت کراؤں۔

انہوں نے ایک لمحے ذہن پر زور دیا پھر ان کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں یکدم چمک سی آگئی اور وہ مجھے سینے سے لگانے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "اوئے .... ہوئے .... اب پہچانا میں نے۔ تم وہ اجے کے پُتر فجے ہو۔"

مجھے اب یہ اجے اور فجے والی عرفیت کچھ زیادہ اچھی نہیں لگی لیکن جس انداز سے انہوں نے مجھے سینے سے لگانے کی کوشش کی تھی اور جو چمک ان کی آنکھوں میں ابھری تھی وہ بہت بھلی لگی۔ ان کے سینے سے لگنے کے لئے مجھے بہت زیادہ جھکنا پڑا۔

"بھئی میں کیسے پہچانتا" وہ معذرت خواہانہ سے انداز میں بولے "اتنے بدل گئے ہو تم۔ کوئی بھی نہیں پہچان سکتا تمہیں .... آؤ پُتر! اندر آ جاؤ۔ تمہیں بھلا اس گھر کا دروازہ کھٹکانے کی ضرورت تھی؟ سیدھے اندر آ جاتے۔"

"چاچا! آپ نے تو پہچانا ہی نہیں تھا۔ سب سے پہلے آپ ہی جوتی اٹھا کر کھینچ مارنی تھی کہ یہ کون گدھا منہ اٹھائے چلا

ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں پُتر! یہ بھی ٹھیک کہا تم نے۔" انہوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جانے سے پہلے ایک سانولے سے بچے کو ڈانٹ پلائی جو ننگے پاؤں تھا اور گاڑی پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا "اوئے .... اوئے کھوتے کے پُتر' زندگی میں تھوڑی بہت تمیز بھی سیکھ لے۔ آخر ہے نا بے ہدیتے باپ کی بے ہدیتی اولاد۔" وہ اسے ہاتھ رسید کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے آگے بڑھے۔

لڑکا ذرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر نیچے اتر گیا لیکن مجھے معلوم تھا اس کا یہ اقدام عارضی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے اندر جاتے ہی نہ صرف وہ بلکہ اس کے دو ساتھی بھی گاڑی پر چڑھ جائیں گے جو فی الحال ایک طرف کو کھڑے تھے اور بظاہر معصوم بنے صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔

میں راجو کے والد چوہدری فیاض کے ساتھ اندر پہنچا تو کئی بچوں کو خوفزدہ سے انداز میں ایک کمرے کے کھلے دروازے سے جھانکتے پایا۔ اس کمرے کے قریب ایک چھوٹی سی کوٹھری میں وہی عورت بیٹھی تیل کا چولہا جلا رہی تھی جو دروازے پر آئی تھی۔ جس کوٹھری میں وہ بیٹھی تھی وہ ان کا کچن تھا۔ اس میں دروازہ نہیں تھا۔ بچپن میں جب میں اس گھر میں آیا کرتا تھا تب بھی سب کچھ اسی طرح تھا۔ یہاں کچھ بھی نہیں بدلا تھا۔

راجو کے والد جنہیں ہم تایا فیاض اور منہ پر صرف تایا کہا کرتے تھے' میرے لئے صحن میں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر چادر بچھانے لگے۔ ان کے ہاتھوں میں ارتعاش تھا۔ بچپن میں ان کی موجودگی میں ہمیں گھر میں گھسنے کی جرأت ذرا کم ہی ہوتی تھی۔ اب ان کے لئے تایا کا لقب بھی میری زبان کو نامانوس سا لگ رہا تھا۔ میں نے انہیں چاچا ہی کہہ کر مخاطب کرنا جاری رکھا۔

"چاچا! راجو کہاں ہے؟" میں نے بیٹھتے ہوئے پوچھا "میں خاص طور پر اس سے ملنے لاہور سے آیا ہوں۔" میں نے تھوڑا سا جھوٹ بولا۔

"بتاتا ہوں پُتر! بتاتا ہوں۔ پہلے کوئی چائے پانی تو پی لے۔" ان کے لہجے میں ہلکی سی افسردگی آگئی "فردوس! ذرا میرا حقہ تو پکڑانا۔"

کچن میں بیٹھی ہوئی وہی عورت دوپٹا چہرے کے گرد لپیٹے آئی' چور سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور حقہ رکھ کر چلی گئی۔ کچن میں جا کر وہ مشینی سے انداز میں کام میں جُت گئی۔

"یہ عورت کون ہے چاچا؟" میں نے ازراہِ تجسس پوچھا۔

"تم نے پہچانا نہیں؟ یہ راجو کی بدنصیب بیوی ہے فردوس۔" چاچا فیاض نے آہ بھر کر کہا۔ مجھے یاد تھا کہ ہم جب میٹرک میں تھے تبھی راجو کی شادی ہو گئی تھی۔ اور اس نے باپ کی کریانے کی دکان پر بیٹھنا شروع کر دیا تھا۔ اس وقت سے ہی اس کا دوستوں کے ساتھ دوستی نبھانا خاصا مشکل ہو گیا تھا۔ جب وہ خود مختار نہیں تھا تو اسے زیادہ آزادی حاصل تھی۔ ہم اکثر دیشتر فلم دیکھنے چلے جایا کرتے تھے۔ آوارہ گردی بھی کرتے رہتے تھے۔ اگر ضرورت پڑتی تھی تو وہ تھوڑی بہت دیر کے لئے باپ کی دکان پر بیٹھ کر دو چار روپے چرا بھی لایا کرتا تھا جن سے فلم دیکھی جاتی تھی اور دوسری عیاشیاں کی جاتی تھیں۔ لیکن جب اس کی شادی ہو گئی اور باپ نے دکان اس کے سپرد کر دی تب یہ سلسلے ختم ہو گئے تھے۔

شادی کے وقت یا اس کے بعد میں نے کبھی اس کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا۔ آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ وہ بیوی کم اور بیوہ زیادہ لگ رہی تھی۔ اوپر سے چاچا فیاض نے 'بدنصیب' کا لفظ بھی استعمال کیا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔

"خیریت تو ہے چاچا ... کیا ہوا راجو کو؟ آپ مجھے جلدی سے بتائیں۔ میں اس سے ملنے کا بڑا ارمان لے کر آیا ہوں۔" میں نے بے تابی سے کہا۔

"ہونا کیا تھا پُتر! ڈھیٹوں اور بے شرموں کو کچھ نہیں ہوا کرتا۔ ان کی وجہ سے تو دوسروں کو ٹی بی لگ جاتی ہے۔" چاچا فیاض حقے کا کش لے کر کھانستے ہوئے بولے "دو سال ہو چکے ہیں وہ بدبخت اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔"

"بھاگ گیا ہے؟ کہاں بھاگ گیا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تو ہمیں نہیں معلوم۔ سننے میں یہی آیا ہے کہ لاہور چلا گیا تھا۔ کسی نے لاہور میں کہیں دور سے ایک مرتبہ اس کی جھلک بھی دیکھی تھی لیکن جا کر اس سے ملنے کا موقع نہیں مل سکا۔ دو سال سے ہمیں اس کی کوئی خیر خبر نہیں کہ کہاں ہے' کس حال میں ہے۔ بے ہدیتا کیسا سخت دل' کیسا طوطا چشم نکلا۔ ایسا گیا کہ مڑ کر اپنے بیوی بچوں کو بھی دیکھنے نہیں آیا ..." چاچا فیاض گویا رو دینے کو تھے۔

حقے کا ایک اور کش لے کر بولے "تم اس کے دوست ہو' تمہارے دل میں بھی اس کی ہوک اٹھی تو ملنے چلے آئے لیکن اسے دیکھو ... ذلیل کو کبھی اپنے کسی بچے کی بھی یاد نہیں آئی ..." ان کی آواز بھرائی ہوئی سی تھی۔ فردوس جو کچن میں ہماری طرف ہی منہ کئے بیٹھی تھی' جلدی سے منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔

"آخر اس طرح کیوں بھاگ گیا وہ؟" میں نے الجھن سے پوچھا۔

"کیا پتا پُتر! کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب کسی انسان کے سر میں کیا سودا سما جائے۔ شروع کے دو چار سال تو شادی کے بعد ذرا آرام سے گزر گئے تھے۔ ہٹی (دکان) پر بھی جا کر بیٹھتا تھا۔ پھر جو اس نے کڑ کڑ شروع کی تو وہ وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی چلی گئی۔ ہر وقت ہر ایک کے ساتھ لڑتا تھا۔ کہتا تھا اتنی کم عمری میں شادی کرکے تم لوگوں نے میری قسمت پھوڑ دی۔ پیسے کی طرف سے ہاتھ بڑا تنگ رہتا تھا۔ گھر والوں پر غصہ نکلتا تھا۔ ویسے بیوی سے بھی سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا مگر بچے دھڑا دھڑ ہوئے جا رہے تھے۔"

... میں نے محسوس کیا کہ فردوس کچن میں کچھ اور دبک گئی تھی۔

"پورے دس بچے ہیں ماشاء اللہ اس کے۔" چاچا فیاض نے بات جاری رکھتے ہوئے بتایا "سب سے چھوٹا والا تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوا تھا جب راجو بدبخت گھر سے بھاگا تھا۔ اس بے چارے نے تو باپ کی شکل بھی نہیں دیکھی۔" چاچا فیاض کی آواز کچھ اور بھرا گئی۔ انہوں نے جلدی سے حقے میں پناہ تلاش کی۔

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ چند لمحے حقہ گڑگڑانے کے بعد انہوں نے سنبھل کر سلسلۂ کلام جوڑا "ہم نے اس کے ساتھ کیا برائی کی تھی؟ اس کا بھلا ہی سوچا تھا۔ اس کی شادی ہی کی تھی' اسے عمر قید کی سزا تو نہیں دی تھی۔ بیچارے معصوم بچوں کا کیا قصور تھا جو کمینہ آ کر ان کی شکل بھی نہیں دیکھتا؟" یہ سوال کرتے ہوئے ان کا لہجہ کچھ ایسا جارحانہ ہو گیا جیسے وہ اس المیے میں مجھے بھی برابر کا شریک سمجھتے ہوں لیکن دوسرے ہی لمحے ان کے لہجے میں ملا مُمت لوٹ آئی۔

انہوں نے کمرے کی طرف مُنہ کر کے بِلّو، ٹِلّو، ننگو، منگو اور اسی قسم کے دوسرے نہ جانے کیا کیا نام لے کر آوازیں دینا شروع کیں۔ اس کمرے سے جھجکتے ہچکچاتے بچے نکلنا شروع ہوئے اور نکلتے ہی چلے گئے۔ بڑے بچے چھوٹے بچوں کا ہاتھ پکڑے انہیں تقریباً کھینچتے ہوئے لا رہے تھے۔ واقعی پورے دس بچے تھے۔ کسی کے پاؤں میں چپل نہیں تھی، کسی کے تن پر قمیص نہیں تھی۔ کسی کی پسلیاں نکلی ہوئی تھیں، کسی کی ناک بہہ رہی تھی۔

"چاچا کو سلام کر میرا چاند ....!" چاچا فیاض باری باری سب کو پاس بلا کر فرمائش کر رہا تھا کہ وہ مجھے سلام کرے۔ کسی نے سلام کیا، کسی نے نہیں کیا۔ میں اپنے خیالات میں گم تھا۔ میں اس گھر کو دیکھ رہا تھا' راجو کی بیوہ نما بیوی کو دیکھ رہا تھا۔ ان بچوں کو دیکھ رہا تھا اور میرا ذہن لڑکپن کے خوابوں میں بھٹک رہا تھا۔

راجو بھی تقریباً میرے ہی جیسے خواب دیکھنے والا لڑکا ہوا کرتا تھا بلکہ اس کے خواب تو مجھ سے بھی اونچے تھے۔ میں تو بعض معاملات میں قناعت پسندی سے سوچ بھی لیتا تھا۔ وہ قناعت پسندی کے نزدیک بھی پھٹکنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس وقت ہم اپنے زمانے کی حسین ترین ہیروئنوں کے ساتھ شادی کے خواب دیکھا کرتے تھے اور اس وقت ان ۔ے وہ روپ ہمارے ذہنوں میں ہوا کرتے تھے جو اسکرین پر نظر آتے تھے۔ ان کی اصل شکل صورت اور اصل روپ یا حقیقی زندگی کے بارے میں تو ہمیں کچھ نہیں معلوم تھا۔

خواب اور چاہے جیسے بھی تھے لیکن اس گھر جیسے نہیں تھے۔ ایک طویل عرصے تک تو وہ خوابوں کی شکست کو سہہ گیا تھا لیکن شاید روح کے کھنڈر میں تشنۂ تکمیل آرزوؤں اور سلگتی حسرتوں کا دھواں کچھ زیادہ ہی بھر گیا تھا۔ شاید اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔ شاید اسے فرار کے سوا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

میں نے بے دھیانی سے بچوں کو پیار کیا۔ وہ ایک ایک کر کے کمرے میں واپس چلے گئے۔ کچھ خاموش خاموش سے بچے تھے۔ کم از کم اس وقت تو عام مفلوک الحال دیہاتی بچوں کی طرح بدتمیز اور اکھڑ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

اس دوران فردوس نے لکڑی کی ایک پرانی سی تپائی لا کر سامنے رکھی اور اس پر ناشتا سجا دیا۔ گرم گرم پراٹھے تھے جن سے دیسی گھی کی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ دہی اور اچار تھا۔ سالن غالباً رات کا بچا ہوا تھا جو وہ گرم کر کے لائی تھی۔ لسی بھی تھی۔

وہ تقریباً سرگوشی نما لہجے میں بولی "اگر آپ چائے پینا پسند کریں تو وہ بھی لے آؤں' میں نے بنالی ہے۔" مٹی کے تیل کے چولہے پر اس نے اتنی چیزیں تیار کرنے میں بڑی پھرتی دکھائی تھی۔

"لے آئیں' جو کچھ بھی ہے لے آئیں۔ میں سب کچھ چٹ کر جاؤں گا۔" میں نے ذرا بھی تکلف سے کام لئے بغیر کہا۔ فردوس کے خشک اور پچنچے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق نمودار ہونے لگی تھی مگر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ مسکراہٹ کو شاید اس نے اپنے لئے شجرِ ممنوعہ بنالیا تھا۔ نام اس کا فردوس تھا مگر زندگی شاید اسے جہنم محسوس ہوتی ہو۔

چاچا فیاض کھانسی آمیز ہنسی کے ساتھ بولے "فجے ...... میرا مطلب ہے افضل! تیرا انداز وہی بچپن والا ہے۔ باہر سے تو اتنا بدل گیا ہے لیکن لگتا ہے اندر سے بالکل نہیں بدلا۔"

چاچا فیاض شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں زندگی اور

بہت ہی کس مکش سے گزر کر آ رہا تھا۔ کچھ تو ویسے بھی کھائے ہوئے بہت دیر گزر چکی تھی اور کچھ اس قسم کی ہنگامہ خیزی سے گزرنے کے بعد میری بھوک بہت بڑھ جاتی تھی۔

فردوس چائے لینے چلی گئی۔ چاچا فیاض رازدارانہ سے انداز سے میری طرف جھکتے ہوئے بولے "پُتر..... ! لگتا ہے تم نے تو بہت ترقی کی ہے۔ کیا کہیں ڈپٹی کمشنر وغیرہ لگ گیا ہے؟" دیہات والوں کی سوچ ڈپٹی کمشنر سے آگے نہیں جاتی تھی۔ ان کے خیال میں ڈپٹی کمشنر سے بڑا شاید کوئی آدمی ہوتا ہی نہیں تھا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ میں نے ہاتھ دھونے کے لئے صحن میں لگے ہوئے ہینڈ پمپ کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ "نہیں چاچا! ڈی سی تو میں نہیں لگ سکا۔ بہرحال کاروبار ہے اپنا۔ کچھ کارخانے وغیرہ ہیں۔"

"کارخانے ....؟" چاچا نے بے یقینی سے دُہرایا۔ میں ہاتھ دھو کر واپس آ گیا تب بھی ان کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

میں ناشتے پر ٹوٹ پڑا تو وہ سنبھل کر میرے ساتھ شریک ہوتے ہوئے بولے "پُتر! لاہور جا کر کیا الہ دین کا چراغ تمہارے ہاتھ لگ گیا تھا؟"

"نہیں چاچا! الہ دین کا چراغ تو نہیں ملا تھا۔ بس قسمت نے پلٹا کھالیا تھا۔" میں نے سادگی سے جواب دیا "ویسے چاچا ....! میرے خیال میں خوش قسمتی ہی کا دوسرا نام الہ دین کا چراغ ہے۔"

"ہاں پُتر! یہ بھی تو ٹھیک ہی کہتا ہے۔" چاچا فیاض ٹھنڈی سانس لے کر بولے "جب قسمت مہربان ہوتی ہے تو آدمی جس چیز کو بھی ہاتھ لگاتا ہے وہی الہ دین کا چراغ بن جاتا ہے اور جب قسمت مہربان نہ ہو تو الہ دین کا چراغ بھی کوڑے کباڑے میں چلا جاتا ہے۔"

بات چاچا فیاض کی سمجھ میں آ گئی تھی۔ چند لمحے ہم دونوں خاموشی سے ناشتے میں الجھے رہے۔ چاچا فیاض کے جذبۂ تجسس نے ایک بار پھر سر ابھارا اور وہ میری طرف کو قدرے جھکتے ہوئے بولے "بچے شچے کتنے ہیں؟"

"ایک بھی نہیں چاچا!" میں نے جواب دیا۔

"کیوں بھئی .... یہ کیا بات ہوئی؟" چاچا فیاض یکدم چونک کر بولے۔ انہیں گویا اس اطلاع سے ناقابل بیان صدمہ پہنچا تھا "شہر میں تو بڑے بڑے قابل ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹریں ہوتی ہیں۔ تم نے اپنی بیوی کو ان کے پاس لے کر جانا تھا .... مشورہ کرنا تھا۔"

"بیوی ہوتی تو لے کر جاتا نا چاچا!" میں نے منہ چلاتے ہوئے جواب دیا "اولاد نہ ہونے کا فی الحال یہی تو ایک سیدھا سادا سبب ہے کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی۔"

"شادی نہیں ہوئی؟" حیرت کے جھٹکے سے چاچا فیاض گویا چارپائی سے گرتے گرتے بچے۔ ان کی دھندلائی ہوئی آنکھیں ایک بار پھر بہت زیادہ پھیل گئیں۔ ان کے ذہن میں گویا ایسا کوئی تصور ہی نہیں تھا کہ کوئی جوان آدمی غیر شادی شدہ بھی ہو سکتا ہے۔

حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد انہوں نے جارحانہ سے لہجے میں پوچھا "کیوں نہیں کی اب تک شادی؟" میں نے محسوس کیا کہ ان کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں کچھ شک بھی جھلک آیا تھا۔

"بس چاچا ... فرصت ہی نہیں ملی اس طرف توجہ دینے کی۔" میری سمجھ میں نہ آیا کہ اپنے اس جرم کا کیا معقول جواز پیش کروں۔

"فرصت....؟" چاچا نے ایک بار پھر آنکھیں نکالیں "فرصت کی اس میں کیا ضرورت ہوتی ہے؟ شادی بس شادی ہوتی ہے۔ وہ تو کرنی ہوتی ہے۔ فرصت ہو نہ ہو۔ ٹھیک ہے تم بہت مصروف ہو گے۔ بہت بڑا کاروبار ہو گا تمہارا۔ مگر دیکھو نا ... شادیاں تو بڑے بڑے ملکوں کے صدر .... بڑے بڑے جرنیل کرنیل سبھی کرتے آئے ہیں۔" وہ گویا مجھے قائل کرنے پر تُل گئے تھے۔

"کرنی تو ہے جی شادی' مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔" میں نے کہا "بس ذرا سوچنے سمجھنے کے لئے وقت مل جائے اور کوئی مطلب کی لڑکی مل جائے۔"

"پُتر! شادی میں زیادہ سوچنا سمجھنا نہیں چاہئے۔ زیادہ باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ اس میں بقراط بننے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔" چاچا نے سمجھایا۔

"لیکن بالکل ہی سوچے سمجھے بغیر شادی کرنے کا بھی تو کوئی اچھا انجام نہیں ہوتا۔" میں نے ایک نظر کچن میں بیٹھی فردوس اور کمرے سے جھانکتے ہوئے بچوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

چاچا فیاض میرا مطلب سمجھتے ہوئے بولے "یہ مت سمجھو کہ زیادہ سوچ بچار کر کے جو شادی کی جاتی ہے وہی کامیاب ہوتی ہے۔ یہ تو قسمتوں کے سودے ہوتے ہیں پتر! جس شادی نے کامیاب ہونا ہوتا ہے وہ ہر حال میں ہوتی ہے ۔ چاہے وہ راہ چلتے ہوئی ہو۔ جس کو کامیاب نہیں ہونا ہوتا وہ نہیں ہوتی۔ چاہے اس میں پچاس اشٹام پیپر لکھے گئے ہوں۔"

"میں آپ کی بات سے بالکل متفق ہوں چاچا۔" میں نے جلدی سے کہا "بس اب میں شادی کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگاؤں گا۔"

"یہاں والوں کو اپنی شادی میں ضرور بلانا پُتر! جو محبتیں پرانے لوگوں میں ہوتی ہیں' وہ کہیں نہیں ملتیں۔" چاچا نے مشورہ دیا "تم بہت بڑے آدمی بن گئے ہو۔ شہر میں بڑے بڑے لوگ تمہارے یار دوست ہوں گے لیکن جو مزہ پرانے دوستوں کے ساتھ مل بیٹھنے میں ہے وہ نئے دوستوں میں نہیں ہوتا۔"

"چاچا! اس بات کا مجھے پتا ہے تبھی تو راجو سے ملنے آیا تھا۔" میں نے کہا۔ اس دوران فردوس نے چینی کے پیالوں میں چائے بھی سامنے لا رکھی۔ چائے بھی کنگ سائز پیالوں میں تھی۔

"لوگ میرے دروازے کے سامنے گاڑی کھڑی دیکھیں گے تو حیران ہوں گے کہ چوہدری فیاض سے ملنے کون آیا ہے۔ کسی کے وہم گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ چوہدری اجمل کا پُتّر افضل آیا ہے۔ ورنہ ابھی یہاں ملنے والوں کی بھیڑ لگ جائے۔" چاچا فیاض بولے۔

"نہیں چاچا! کسی کو بتانا مت۔" میں نے گھبرا کر کہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ چاچا فیاض درست کہہ رہا تھا۔ میں اس وقت لوگوں کی بھیڑ بھاڑ سے ملنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا گو کہ ان کے خلوص میں میرے لئے اب بھی کشش تھی۔ یہاں میرے ساتھ کسی نے کوئی ایسا اچھا سلوک نہیں کیا تھا جو میرے ذہن پر نقش رہتا۔ پھر بھی میں ان لوگوں کے بارے میں سوچتا تھا تو میرے دل کے آنگن میں خوشبو سی پھیل جاتی تھی۔

غیروں کا تو ذکر ہی کیا، مجھ سے تو میرے سگے چچا چچی نے کوئی اچھا سلوک نہیں کیا تھا لیکن ان کی یاد آئی تو دل میں کسک سی اٹھی۔ میں نے چاچا فیاض سے کہا "میں ایک مرتبہ اپنے چچا وغیرہ کو دیکھنے یہاں آیا تھا۔ ان کا کچھ پتا نہیں چلا تھا، آپ کو کچھ معلوم ہے وہ لوگ کہاں چلے گئے تھے؟"

"وہ مکان بیچ کر سیالکوٹ گئے تھے۔ لیکن پھر سنا تھا کہ وہاں سے بھی کہیں چلے گئے تھے۔ نہ وہ کبھی لوٹ کر آئے اور نہ ہی ان کی کوئی خیر خبر آئی۔" چاچا فیاض نے بتایا۔ اس سے پہلے بھی مجھے بس اتنا ہی معلوم ہوسکا تھا۔ میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ قسمت میں ہوا تو شاید زندگی میں کبھی ان لوگوں سے ملاقات ہوجائے۔

چاچا فیاض دونوں ہاتھوں [illegible] پیالہ اٹھاتے ہوئے بولے "تم انہیں تلاش کرنے کی کوشش کرنا اور راجو کو ضرور تلاش کرنا۔ وہ تو شاید تمہارے ہی شہر میں کہیں ہے۔ خدا کے لئے اسے ضرور تلاش کرنا۔ اسے سمجھانا کہ جواں مرد اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگا نہیں کرتے۔"

"میں اسے ضرور تلاش کروں گا چاچا! اس کا دماغ بھی صحیح کروں گا۔" میں نے چاچا فیاض کو تسلی دی "اخبار میں اشتہار دوں گا اس کے لئے [illegible] اور [illegible]"

"اللہ تجھے اس نیکی [illegible] جو وے کا پُتّر! یہ [illegible] دیں گے جو باپ کے ہوتے ہوئے یتیموں جیسی زندگی گزار رہے ہیں۔" چاچا فیاض نے ممنونیت سے مغلوب لہجے میں کہا۔

"گزر اوقات کا ذریعہ کیا ہے چاچا؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

"وہی اپنی پرانی ہٹی ہے پُتّر! اپنا رزق تو اسی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔" چاچا فیاض نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ریاض بھاگ گیا تو دوبارہ میں ہی وہاں بیٹھنے لگا لیکن اب دکانداری اور سودے سلف لانا میرے بس کی بات نہیں رہی پُتّر! بیماریوں نے مجھے کھوکھلا کردیا ہے۔ ہاتھ پیر کانپتے ہیں۔ سودا تولتا ہوں تو آدھا نیچے گر جاتا ہے۔ آنکھوں سے ٹھیک نظر نہیں آتا۔ شرارتی بچے دکان سے چیزیں اٹھا اٹھا کے بھاگ جاتے ہیں۔ کھوٹے پیسے دے جاتے ہیں۔ لیکن خیر.... دنیا اسی کا نام ہے۔ ایک طرف ایسے لوگ ہیں تو دوسری طرف بھلے لوگ بھی ہیں۔ ان کے وسیلے سے، اسی پرانی ہٹی کے بہانے سے رزق روزی چل رہی ہے پُتّر! اچھی یا مندی۔ بہرحال گزر بسر ہورہی ہے۔ اللہ کا بڑا احسان ہے کہ بچے کبھی بھوکے نہیں سوئے۔ میں ناکارہ، نکما بڈھا سہی، لیکن ان معصوموں کا پیٹ پالنے کے لئے اپنی سی کوشش کررہا ہوں۔" چاچا فیاض کے لہجے میں وہی تشکر وہی توکل تھا جو اب پرانے لوگوں میں بھی کمیاب ہوتا جارہا تھا۔

پھر اچانک گویا چاچا فیاض کو کچھ یاد آیا۔ وہ چونکتے ہوئے بولے "فجے.... میرا مطلب ہے افضل! بچپن میں تو تم مجھے تایا کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ یہ اب میں چاچا کیوں ہوگیا؟"

"چاچا! میں نے سوچا آپ کی ترقی ہونی چاہئے۔ آپ اب پہلے سے زیادہ جوان ہوگئے ہیں۔ اس لئے میں نے آپ کو تایا کے بجائے چاچا بنالیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں انہیں بتا نہیں سکا کہ اب نہ جانے کیوں لفظ 'تایا' زبان پر نہیں چڑھتا تھا چچا یا چاچا بڑی روانی سے کہا جاتا تھا۔

چاچا فیاض کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی لیکن وہ آہ بھر کر بولے "کیسی جوانی اور کہاں کی جوانی پُتّر! جوانی سے ہی مجھے تو پتا نہیں کیا کیا بیماریاں لگ گئی تھیں۔ ادھر ریاض کی ماں مری تو کوئی خدمت کرنے والا بھی نہیں رہا۔ اسی لئے ریاض کا ہر کام جلدی جلدی کیا تھا کہ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ میری ذمّے داریاں جلدی ختم ہوجائیں۔ لیکن اب مجھے پتا چلا کہ ذمّے داریاں تو مرتے دم تک ختم نہیں ہوتیں.... اور زندگی کا بھی کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کتنی لمبی ہوجائے۔ کیسے کیسے صحت مند میرے سامنے چلے گئے.... اور میں بیمار شیمار آدمی ابھی تک بیٹھا ہوں۔"

"ابھی آپ بہت جئیں گے چاچا! اپنے پوتے پوتیوں کے گھر آباد ہوتے دیکھیں گے۔ ابھی آپ کی عمر ہی کیا ہے۔" میں نے ان کے استخوانی کندھے پر تھپکی دی۔

پھر میں نے باہر آکر گاڑی سے اپنا بریف کیس نکالا۔ گلی میں آمدورفت شروع ہوچکی تھی۔ گزرتے ہوئے ہر شخص نے مجھے متجس بلکہ شک زدہ سی نظروں سے دیکھا۔ واپس اندر آکر میں نے چاچا فیاض کے پاس بیٹھتے ہوئے بریف کیس کھولا اور ایک گڈی نکال کر ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "ان بچوں کے لئے میری طرف سے پچیس ہزار کی یہ حقیر سی رقم رکھ لیں۔ فی الحال میرے پاس زیادہ کیش نہیں بچا ورنہ کچھ زیادہ پیش کرتا۔ بہرحال میں کوشش کروں گا کہ کچھ اور بھی بھجوا سکوں۔ یہ میرے دوست کے [بچے] ہیں۔ میرے لنگوٹیا یار کی اولاد ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ بچے [اچھے] حال میں نظر آئیں۔"

چاچا فیاض نے نوٹوں کی گڈی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ان [کی] دھندلائی ہوئی آنکھوں میں آنسو بھر آئے "بیٹا! میں نے تمہیں [اپنا] سمجھ کر اپنے حالات سے آگاہ کیا ہے۔ میرا مقصد تم سے مدد [مانگ]نا نہیں تھا۔ ہمارے لئے تو بس اتنی ہی خوشی کافی ہے کہ اللہ نے [تمہ]یں بڑا آدمی بنادیا ہے۔"

"یہ میں مدد کے طور پر نہیں دے رہا چاچا!" میں نے جلدی [سے] کہا "اتنے برسوں بعد پہلی بار دوست کے گھر آیا ہوں اور خالی [ہاتھ] آیا ہوں۔ بچوں کے لئے مٹھائی تک نہیں لاسکا۔ کیا ان بچوں [پر می]را اتنا بھی حق نہیں کہ میں ان کے لئے اچھے کپڑے، کھلونے یا [اسی] طرح کے دیگر تحائف لاسکوں؟ اگر میں وہ چیزیں لے کر آتا تو [کیا] آپ واپس کردیتے؟"

"نہیں۔" انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"بس تو پھر سمجھ لیں کہ مجھے ان کے لئے تحفے تحائف لانے کا [وق]ت نہیں مل سکا۔ دوسرے میں سیدھا گھر سے نہیں آرہا ہوں۔ [آ]پ کو کیا بتاؤں کہ کہاں کہاں سے دھکے کھاتا ہوا آرہا ہوں۔ اس [لئے] چیزوں کی جگہ نقد رقم دے رہا ہوں۔ آپ نے انکار کرکے میرا [دل] دکھایا ہے۔"

تب چاچا فیاض نے جلدی سے رقم لے لی اور گلوگیر آواز میں بولے "نہیں پُتّر! تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں سمجھا تھا تم ہم پر ترس کھا کر دے رہے ہو۔ جب تک میں زندہ ہوں، میں چاہتا ہوں ان بچوں کو ایسی کوئی چیز استعمال نہ کرنے دوں جو ان پر ترس کھا کر انہیں دی گئی ہو۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے چاچا! اور اگر دوست کو یا دوست کے بچوں کو مشکل میں دیکھ کر کوئی کچھ کرتا بھی ہے تو اسے اس نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے جس نظر سے آپ دیکھ رہے ہیں۔" میں نے شکوہ آمیز سے لہجے میں کہا۔

"بس... بس پُتّر! میں تمہارا مطلب سمجھ گیا۔ تم میری طرف سے اپنے دل میں میل نہ لاؤ۔" انہوں نے مجھے پیار کیا۔ بچپن میں وہ مجھے بہت ڈانٹا کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ راجو کو فلموں کی لت میں نے لگائی ہے۔ حالانکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔

اٹھنے سے پہلے میں نے پوچھا "چاچا! آج کل علاقہ کس کے پاس ہے؟ سب سے بڑی زمینداری کس کی ہے؟"

"ادھر کی زیادہ زمینیں تو ملک ریاض کو مل گئی ہیں۔ اسی کا حکم چلتا ہے علاقے میں۔"

"کیسا آدمی ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"پُتّر! میرا تو زمینداری کاشتکاری سے کبھی کوئی واسطہ ہی نہیں رہا۔ تمہیں تو معلوم ہے میں تو شروع سے ہی دکاندار چلا آرہا ہوں۔" چاچا فیاض نے جواب دیا "کبھی ان کے کسی کارندے کا سامنا ہوجاتا ہے تو ہاتھ باندھ کر سلام کردیتے ہیں۔ کبھی ان کے سامنے سر نہیں اٹھاتے۔ علاقے کے بادشاہ جو ہوئے، لوگ بتاتے ہیں کہ اب تو ان کے ڈیروں پر ڈاکو نظر آتے ہیں۔ ملک کے اپنے آدمی بھی بڑے سخت، بڑے اتھرے ہیں۔ مرضی کے خلاف کوئی کام ہوجائے تو گھر کے گھر اجاڑ دیتے ہیں۔ ہم تو ملک اسلم کو ہی برا سمجھتے تھے لیکن یہ تو اس سے بھی دس قدم آگے معلوم ہوتا ہے۔ کہتے ہیں زمانہ ترقی کررہا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ظلم بھی ترقی کررہا ہے۔"

"وہ اگلے الیکشن میں کھڑا ہوگا۔ کیا خیال ہے لوگ اسے ووٹ دیں گے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

چاچا فیاض عجیب سے انداز میں ہنس دئے لیکن فوراً ہی ان کی ہنسی کھانسی میں مدغم ہوگئی۔ کھانسی تھمی تو وہ ہانپتے ہوئے بولے، "لوگوں بے چاروں کا کیا ہے پُتّر! یہ لوگ جب تہیہ کرلیتے ہیں کہ ان کو جیتنا ہے... تو بس یہ جیت جاتے ہیں۔" انہوں نے گویا بات ختم کردی۔

میں جانے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا تو وہ بھی جلدی سے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "کیا تم ایک رات بھی یہاں نہیں ٹھہرو گے؟"

"نہیں چاچا! حالات ایسے نہیں ہیں کہ میں یہاں ٹھہر سکوں۔ اگر میں کچھ زیادہ دیر بھی ٹھہرا تو قصبے میں خبر پھیل جائے گی۔ ملنے

والوں کا تانتا بندھ جائے گا اور میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا۔"

"اچھا پُتر! جیسے تمہاری مرضی۔ لیکن راجو کو ضرور تلاش کرنا۔ اور اگر ذرا سی بھی کوئی خیر خبر ملے تو مجھے خبر کرنا۔۔۔ چاہے کوئی بندہ میرے پاس بھیج دینا۔ اگر وہ کھوتے کا پُتر تمہارے سمجھانے سے بھی نہ سمجھے تو بے شک اس کو تھوڑی بہت چھینٹی لگانا۔" انہوں نے گویا مجھے اجازت نامہ جاری کر دیا۔

"آپ بے فکر رہیں چاچا!" میں نے انہیں تسلی دی "میں نے اسے ڈھونڈنے کا ارادہ کیا ہے تو کوئی نہ کوئی سبیل نکل ہی آئے گی۔"

میں باہر آ گیا۔ چاچا فیاض دعائیں دیئے جا رہے تھے۔ دن کا اُجالا پھیل چکا تھا۔ گلی میں اب خاصی آمدورفت نظر آ رہی تھی۔ ادھر اُدھر اِکا دُکا لوگ کھڑے بظاہر باتوں میں مصروف تھے۔ لیکن درحقیقت وہ متجسس سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ چند ایک گھروں سے ٹاٹ کے پردوں یا چقوں کے پیچھے سے نسوانی آنکھیں بھی جھانک رہی تھیں۔

غنیمت تھا کہ ابھی کسی نے چاچا فیاض کے ہاں آ کر پتا چلانے کی کوشش نہیں کی تھی کہ ان کے ہاں کون آیا ہے۔ لیکن مجھے یقین تھا کہ میرے جاتے ہی چاچا سوالات کرنے والوں کے نرغے میں ہوں گے اور جب چاچا انہیں بتائیں گے کہ ان کے ہاں آنے والا کون تھا تو ان سب کو شکایت ہو گی کہ میں ان سے مل کر کیوں نہیں گیا۔ یہ شکایت ان لوگوں کو بھی ہو گی جو مجھے جانتے تک نہیں تھے، جنہیں میرا نام تک یاد نہیں رہا ہو گا۔

گلیوں سے نکلنے کے بعد میں خاصی تیز رفتاری سے واپس روانہ ہوا۔ میں بالکل چوکنا تھا۔ کسی بھی موڑ پر کوئی بھی واقعہ پیش آ سکتا تھا۔ لیکن خیریت ہی رہی۔ واپسی میں چونکہ مجھے ملک ریاض کی حویلی یا زمینوں کے قریب جانے کی ضرورت نہیں تھی اس لئے کسی سے سامنا نہ ہوا۔ شاید وہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ میں ابھی تک قصبے میں موجود ہوں گا۔ لاہور تک کا سفر بغیر کسی خاص واقعے کے گزر گیا۔

دوسرے روز صبح سب سے پہلے میں دو نمبر یعنی ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی پر پہنچا۔ میں اے نن کی خیر خبر لینا چاہتا تھا۔ مسلح گارڈز نے میرے لئے گیٹ کھولا اور مس ٹریپ نے ڈرائیو وے میں آ کر میرا استقبال کیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح چاق و چوبند اور تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ ابھی تو خیر اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر مجھے گمان سا گزرتا تھا کہ اس عورت پر شاید کبھی بڑھاپا نہ آئے۔ وہ کچھ عجیب ہی چیز تھی۔

"کیا حال ہے مریضِ محبت کا؟" میں نے اے نن کے بارے میں پوچھا۔

"خود ہی چل کر دیکھ لیجئے۔" مس ٹریپ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "اس کی پیشانی پر ضرب کیا آپ نے لگائی تھی؟"

"نہیں، میرے ایک نئے عقیدت مند نے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ۔۔۔۔" اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا "میں بھی سوچ رہی تھی کہ اتنا اناڑی پن کس سے سرزد ہوا ہے۔"

"اس کی جگہ اگر میں ہوتا تب بھی شاید یہ اناڑی پن ہو جاتا۔" میں نے کہا "تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہ کتنی خبیث ہے۔ اس کا قابو میں آنا بڑا مشکل تھا۔"

میں اس کے ساتھ نیچے تہ خانے میں پہنچا۔ اے نن ایک چھوٹے سے کمرے میں صاف ستھرے بستر پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا۔ ناک کی جڑ تک اس کی پیشانی پر دبیز پٹیاں بندھی تھیں۔ وہ ایک اخبار دیکھ رہا تھا۔ اخبار اس نے الٹا پکڑا ہوا تھا اور بچوں کی طرح قلقاریاں مار رہا تھا۔

ہمیں دیکھ کر اس کی قلقاریاں ختم ہو گئیں۔ وہ خالی خالی نظروں سے ایک ٹک ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اخبار اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا لیکن اس نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

"ہیلو اے نن!" میں نے اس کے قریب جا کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔

"اے نن! کیا تم نے مجھے نہیں پہچانا؟" میں نے پوچھا۔ چہرہ اب بھی ہر تاثر سے عاری رہا۔ بس وہ حلق سے غاؤں غاؤں کی سی بے معنی آواز نکال کر رہ گیا۔

"یہ اداکاری چھوڑو" میں نے ملائمت سے کہا "یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ ہمیں معزز اور شریف آدمیوں کی طرح آرام سے بیٹھ کر صرف چند ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ گویا میری بات سُن ہی نہیں رہا تھا اور اگر سُن رہا تھا تو شاید الفاظ اس کے لئے ناقابلِ فہم تھے۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا اور قدرے ناگواری سے کہا "اے نن! تمہیں اس ایکٹنگ سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ زندگی یہیں پڑے پڑے گزر جائے گی۔"

تب اس کے چہرے پر پہلی بار کوئی تاثر ابھرا لیکن وہ ایسا ہی تھا جیسے دودھ پیتا بچہ کسی چیز سے ڈر گیا ہو۔ وہ سہم کر بیڈ کی طرف کو سمٹ گیا اور اس کے حلق سے غاؤں غاؤں کی آوازیں زیادہ تیزی سے نکلنے لگیں۔

مس ٹریپ نے غیر محسوس طور پر میرا ہاتھ دبایا۔ میں اشارہ پا کر اس کے ساتھ باہر ہال میں آ گیا۔ کمرے کا خودکار دروازہ ہمارے عقب میں بند ہو گیا۔ مس ٹریپ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میں بھی اس کے ساتھ بہت مغز ماری کر چکی ہوں اور ڈاکٹر بھی کر چکا ہے۔ ڈاکٹر نے کچھ مشینیں یہاں لا کر اس کے ٹیسٹ بھی لئے تھے۔ ہوش میں بھی اور بے ہوشی کی حالت میں بھی۔ اس کی رائے ہے کہ وہ اداکاری نہیں کر رہا۔ ڈاکٹر نے مجھے انسانی

پیچیدگیوں پر ایک طویل لیکچر دیا۔ خلاصہ جس کا یہ تھا کہ سر پر لگنے والی چوٹ نے اس کے ذہن کو شیر خواری کے دور میں پہنچا دیا ہے۔"

"اوہ۔۔۔ یہ تو ساری محنت ہی ضائع ہو گئی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اس کے ٹھیک ہونے کی کوئی امید رکھی جا سکتی ہے؟"

"اس موضوع پر بھی ڈاکٹر نے مجھے ایک طویل لیکچر دیا تھا۔" مس ٹریپ مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اس کا کہنا تھا کہ انسانی ذہن قدرت کا ایک ایسا شاہکار ہے کہ سائنس اپنی تمام تر ترقی کے باوجود اس کے بارے میں یقین سے کوئی بات نہیں بتا سکتی۔ اس موضوع پر اس کے لیکچر کا خلاصہ یہ تھا کہ سال دو سال میں اس کے ذہن میں کوئی تبدیلی آنے کی موہوم سی امید رکھی جا سکتی ہے، ورنہ زیادہ امکان یہی ہے کہ یہ اب دوبارہ ذہنی طور پر اسی طرح، اسی رفتار سے پروان چڑھے گا جس طرح کوئی دودھ پیتا بچہ پروان چڑھتا ہے۔"

"تمہاری اپنی کیا رائے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ طویل لیکچر سننے کے بعد میں بھی کافی حد تک ڈاکٹر سے متفق ہو گئی ہوں۔" وہ اپنے رخسار پر انگلی رگڑتے ہوئے بولی "ڈاکٹروں سے تو ویسے بھی متفق ہونا ہی پڑتا ہے۔ پھر خود مجھے بھی ایسی علامتیں دکھنا پڑیں۔ مثلاً یہ کچھ کھا ہی نہیں رہا تھا۔ میں نے یونہی جل بھُن کر فیڈر میں دودھ ڈال کر دیا تو مزے سے پی گیا۔ چیزوں کو پکڑنے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھاتا۔ اگر بڑھاتا بھی ہے تو انداز واقعی بچوں والا ہوتا ہے۔ اسی طرح کی اور بہت سی باتیں ہیں۔ کھانے پینے کا انداز بچوں والا ہے لیکن خوراک کی طلب بڑوں سے بھی زیادہ ہے اس لئے ہر ایک گھنٹے کے بعد اسے دو بالشت لمبا فیڈر دینا پڑتا ہے ورنہ غوآں غوآں کر کے رونے لگتا ہے۔ بسکٹ بھگو کر کھلانے پڑ رہے ہیں۔ اُبلے آلو کچل کر چمچے سے کھلانے پڑ رہے ہیں۔ دوسرے کام مرد اٹینڈنٹ کو سنبھالنے پڑ رہے ہیں۔"

وہ ایک اور آہ بھر کر بولی "مجھے اپنے بچے پالنے کا تجربہ نہیں تھا۔ انہیں میرا شوہر پال رہا ہے لیکن لگتا ہے اگر یہ خبیث مخلوق یہاں رہی تو اسے پالنا کہیں میرے ہی ذمے نہ پڑے۔"

"خیر۔۔۔ اب تمہارا وقت اتنا بھی فالتو نہیں کہ اسے ایسے کاموں میں ضائع کرایا جائے۔" میں نے تسلی دینے کے انداز میں اس کا کندھا تھپتھپایا۔

"وہ کمینہ تو چلتا بھی نہیں۔" مس ٹریپ کراہ کر بولی "بستر پر ہی لیٹا ہوا ٹانگیں چلاتا رہتا ہے۔ کھلونے لا کر دیئے تو بڑا خوش ہوا۔"

"اس خبیث کی عمر تو پہلے ہی ڈیڑھ سو سال ہے۔ اب لگتا ہے کہ اس نے دوسرا جنم لے لیا ہے۔ اب کہیں نئے سرے سے نہ جینا شروع کر دے۔" میں نے کہا۔

"یہ ہے کون؟ کیا پس منظر ہے اس کا؟" مس ٹریپ نے پوچھا۔ میں نے مختصراً اسے اے نن کے بارے میں بتایا۔

ساری بات سن کر وہ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی "اب اس کا کرنا کیا ہے؟"

"ابھی دو چار دن تو اسے یہیں رکھو۔ علاج جاری رکھو۔ اس دوران میں کچھ سوچ کر بتاتا ہوں۔ فی الحال تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں نے تو بڑی امیدوں سے اسے پکڑوایا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے گا لیکن یہ تو الٹا مصیبت گلے پڑ گئی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور مس ٹریپ کو خدا حافظ کہہ کر دو نمبر سے رخصت ہو لیا۔

میرا وہ دن آفس میں بڑی مصروفیت میں گزرا۔ ذہن دوسرے معاملات میں بھی الجھا رہا۔ ملک ریاض اور عالم شیر کا تصور بار بار ذہن میں رینگ آتا تھا۔ میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ ان کی طرف سے کیا ردِعمل سامنے آئے گا۔ اس سلسلے میں بہت سی باتیں بیک وقت ممکن بھی نظر آ رہی تھیں اور ناممکن بھی۔ دوسری طرف اے نن کا بھی خیال آئے جا رہا تھا۔ اس کے بارے میں بھی میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہا تھا۔ کچھ عجیب ہی اتفاق تھا کہ جوں جوں میری کاروباری مصروفیات بڑھتی جا رہی تھی توں توں غیر کاروباری الجھاوے بھی بڑھتے جا رہے تھے۔

شام کو آفس سے اٹھنے میں مجھے خاصی دیر ہو گئی۔ وہاں سے سیدھا میں ہلٹن چلا گیا۔ کچھ لوگوں کو میں نے بزنس ڈنر پر مدعو کیا ہوا تھا۔ کھانے سے پہلے بہت سی باتیں ہونی تھیں اس لئے میں ذرا جلدی چلا گیا تھا۔ وہ ایک خریدار پارٹی تھی جسے میں نے مدعو کیا ہوا تھا۔ اس سے بات چیت کامیاب رہی اور ڈنر بھی بڑے خوشگوار ماحول میں شروع ہوا۔

اس وقت کھانے سے تقریباً سبھی فارغ ہو چکے تھے جب ہیڈ ویٹر نے قریب آ کر دھیمی آواز میں مجھے بتایا "سر! آپ کا فون ہے۔"

مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ ہوٹل میں مجھے فون کرنے کی ضرورت کسے پیش آ گئی تھی۔ کیا کوئی ایمرجنسی آن پڑی تھی؟ میں نے مہمانوں سے معذرت کی اور اٹھ کر ڈائننگ ہال کے کاؤنٹر پر پہنچا۔ کاؤنٹر کلرک ریسیور تھامے میرے انتظار میں کھڑا تھا۔

دوسری طرف آفاق تھا۔ اس کی آواز سنتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی غیر معمولی بات تھی۔ تاہم وہ اپنے لہجے کو حتی الامکان پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "سر! اس وقت آپ کو ڈسٹرب کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔ بڑی مشکل سے آپ کو ٹریس کیا ہے۔ پتا چلا کہ آپ کسی ڈنر کے سلسلے میں یہاں آئے ہوئے ہیں۔ خبر ذرا اہم تھی، میں نے سوچا جتنی جلدی آپ تک پہنچ جائے اچھا ہے۔"

"کیسی خبر؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"سر! ستارہ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"کب... کیسے... کہاں سے؟" میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئیں تاہم میں اپنا لہجہ پُرسکون رکھنے میں کامیاب رہا۔

"سر! آج اس کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں تھی اور اتفاق تھا کہ اس کی دو شوٹنگز بھی کینسل ہو گئیں۔ وہ جلدی گھر جا رہی تھی۔ شام کو چار بجے کے قریب اسٹوڈیو سے رخصت ہو گئی تھی۔ بند روڈ والے اسٹوڈیو میں شوٹنگ تھی اس کی۔ آپ کو معلوم ہے وہ سڑک خاصی سنسان رہتی ہے۔ وہ اسٹوڈیو سے زیادہ دور نہیں جانے پائی تھی جب اسے اغوا کر لیا گیا۔"

"کچھ پتا نہیں چلا کون لوگ تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سر! پولیس کو بڑی مشکل سے دو ایک موقع کے گواہ ملے ہیں۔ ان سے پتا چلا ہے کہ دائیں بائیں سے دو گاڑیوں نے آکر ستارہ کی گاڑی کو روکا تھا۔ اس کے بعد صحیح طور پر کچھ پتا نہیں چل سکا کہ کیا ہوا۔ بس ستارہ غائب ہو گئی۔ اسے اغوا ہونے سے بچانے کی کوشش میں اس کا ایک گارڈ مارا گیا اور دوسرا شدید زخمی ہوا ہے۔ اسپتال میں ہے۔ بے ہوش ہے۔ پولیس کو اس کے ہوش میں آنے کا انتظار ہے۔" آفاق نے بتایا۔

"انتظار کے علاوہ بھی پولیس کچھ کر رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں سر! خاصی مستعدی دکھا رہی ہے کیونکہ ایک فلم اسٹار کا معاملہ ہے۔ اسٹوڈیو میں بھی خاصی کھلبلی مچی ہوئی ہے اور آئندہ کا لائحۂ عمل طے ہو رہا ہے۔ پولیس نے کچھ پیشہ ور مجرموں کی تلاش میں چھاپے بھی مارنے شروع کر دیئے ہیں۔"

"کوئی رائے قائم کی ہے انہوں نے؟" میں نے دریافت کیا۔ مجھے اپنی کنپٹیوں میں ہلکی سی تپش محسوس ہو رہی تھی اور ذہن میں گویا کچھ بلب تیزی سے جل بجھ رہے تھے۔

"سر! اس موضوع پر میری ان سے براہ راست بات تو نہیں ہو سکی اور نہ ہی انہوں نے کسی دوسرے شخص کے سامنے کوئی خیال ظاہر کیا ہے لیکن میرا اپنا اندازہ ہے کہ وہ اسے اغوا برائے تاوان کی واردات فرض کر کے تفتیش کر رہے ہیں۔ ویسے ابھی وہ خود خاصے کنفیوژ ہیں۔ گھبرائے ہوئے ہیں۔ اس قسم کی وارداتوں سے پولیس افسروں کو بھی ذرا نمایاں ہونے کا موقع ضرور ملتا ہے۔ مشہور شخصیتوں کی شہرت میں سے تھوڑا سا حصہ انہیں بھی ملتا ہے لیکن شخصیت کی بازیابی میں جوں جوں دیر ہوتی جائے ان پولیس آفیسرز کو حاصل ہونے والی شہرت منفی رخ اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ اس وقت تو اخباری رپورٹر دوڑے دوڑے ان کے پاس پہنچ رہے ہیں اور وہ کلف لگی وردیوں کے ساتھ ان کے سامنے بیٹھ کر بیان وغیرہ جاری کر رہے ہیں۔ تسلیاں بھی دے رہے ہیں لیکن مجھے اندازہ ہے اندر ہی اندر ڈر بھی رہے ہیں کہ اگر ستارہ کی بازیابی میں دیر ہو گئی تو یہی پریس ان کے بخیے اُدھیڑے گا۔"

"اگر یہ واقعی عام پیشہ ور مجرموں کی واردات ہوئی تب تو شاید پولیس انہیں ڈھونڈ نکالے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"اس چکر میں نہ جانے کس کس بے قصور کی بھی چمڑی اُدھیڑی جائے گی۔" آفاق بولا۔

"تمہاری اپنی کیا رائے ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا سر! اسے تو کوئی دھمکی وغیرہ بھی نہیں ملی تھی۔ نہ ہی آج کل اس کے ارد گرد کوئی بدمعاش یا مشکوک لوگ منڈلا رہے تھے۔ ہلکے سے فلو کی وجہ سے وہ کچھ نڈھال ضرور تھی۔ آرام کرنا چاہ رہی تھی لیکن پریشان یا خوفزدہ ہرگز نہیں تھی۔"

"وہ تو مجھے بھی اندازہ ہے۔" میں نے کہا "پریشان یا خوفزدہ ہوتی تو مجھے ضرور بتا چکی ہوتی۔"

"اب تو میں اور دوسرے کئی فلم ساز پریشان ہیں سر!" وہ متوحش لہجے میں بولا "اس کی تیرہ چودہ فلمیں تو اس وقت سیٹ پر ہیں اور پندرہ سولہ مزید اس نے سائن کر رکھی ہیں جن کی کہانیاں خاص طور پر اسے سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ تین فلمیں تو ابھی بھی تکمیل کے قریب ہیں جن میں وہ ہیروئن ہے۔"

"اب تو تم بھی خاصے کاروباری بن گئے ہو آفاق!" میں نے سنجیدگی سے کہا "ستارہ کی زندگی اور عافیت کے بارے میں نہیں سوچ رہے۔ اس کی نامکمل فلموں کے بارے میں سوچ رہے ہو۔"

"سر! جب سے میں نے یہ خبر سنی تب سے میں اس کی زندگی اور عافیت کے بارے میں ہی فکر مند تھا۔" وہ قدرے ندامت سے بولا "لیکن چند لمحے پہلے ہی مجھے خیال آیا کہ پیشہ ورانہ نکتۂ نظر سے آپ کی بدولت مجھے جو نئی زندگی ملی ہے وہ ایک بار پھر داؤ پر لگ گئی ہے۔ اگر خدانخواستہ ستارہ کو کچھ ہو گیا تو میں نے اپنے نئے سرے سے لئے جو کچھ کیا ہے وہ سب مٹی میں مل جائے گا۔ دوسرے پروڈیوسرز اور ڈائریکٹرز کی پریشانی کا بھی میں نے کچھ ہی دیر پہلے اندازہ لگایا ہے۔ اس لئے بس بے اختیار ذکر کر بیٹھا۔"

"خیر... یہ بتاؤ جائے واردات سے پولیس کو کوئی سراغ ملا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر!" آفاق مایوسی سے بولا "عینی شاہدوں سے گاڑیوں کے رنگ بھی صحیح طور پر نہیں معلوم ہو سکے۔ ان میں بھی تضاد پایا جاتا ہے۔ میں خاصی دیر اس ایس ایچ او کے ساتھ رہا جس کے علاقے کا یہ کیس ہے۔ اس وقت تک تو کوئی خاص بات سامنے نہیں آئی تھی۔ بہرحال میں ان سے رابطہ رکھوں گا اور جیسے ہی کوئی نئی بات سامنے آئی، آپ کو اطلاع دوں گا۔"

"ہاں، اگر کوئی ذرا سا بھی سراغ سامنے آجائے تو میں اپنے طور پر بھی کچھ تفتیش کرا سکتا ہوں۔ کچھ لوگوں کو اس کام پر لگا سکتا ہوں جو پولیس سے زیادہ جلدی بہت سے کام کر سکتے ہیں لیکن کرنے کے لئے کچھ تو سامنے ہونا چاہئے۔" میں نے کہا۔

"سراغ سامنے ہو یا نہ ہو، آپ اس سلسلے میں ضرور کچھ کیجئے پلیز!" آفاق التجائیہ لہجے میں بولا "اور کچھ نہیں تو پولیس پر ذرا پریشر ہی ڈلوا دیجئے۔ ان پر ذرا اوپر سے دباؤ ہو تو یہ زیادہ تندہی سے کام کرتے ہیں۔"

"وہ تو میں کروں گا ہی۔" میں نے کہا "میں بہت کم باتوں پر پریشان ہوتا ہوں لیکن اس خبر نے مجھے پریشان کر کے رکھ دیا ہے۔ مجھے اس بات کی پروا نہیں ہے کہ وہ عورت ہماری کاروباری ضرورت ہے۔ کاروبار تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ مجھے بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا اور تمہارا بھی کام چلتا رہے گا۔ ویسے ہی مجھے اس عورت کی بڑی فکر ہے۔ اب تو اس کی شخصیت کی جھیل شفاف ہونا شروع ہوئی تھی۔ مٹی گرد نیچے بیٹھنے لگی تھی۔ اس کی روح کا گدلا پن دور ہوا تھا۔ اب وہ اندر سے ایک خوب صورت عورت بننے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ اب اس کے ساتھ کوئی ایسا ویسا حادثہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس کے ذہن کے شیشے پر خراشیں پڑ جائیں گی۔"

"آپ بالکل درست کہہ رہے ہیں سر!" وہ دھیمے لہجے میں بولا "میں سوچ رہا ہوں، اگر یہ صرف اغوا برائے تاوان کی واردات ہو تب بھی غنیمت ہے، اسے کوئی ذہنی یا جسمانی گزند نہ پہنچے۔ مجھے اندیشہ ہے کہیں اغوا کرنے والے نودولتیے خاندانوں کے اوباش اور سرچڑھے لڑکے نہ ہوں جو کبھی کبھی صرف کسی شخصیت کے گلیمر کی وجہ سے اسے اغوا کر لیتے ہیں، اسے اپنی آوارگی کا نشانہ بناتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ بعد میں یاروں دوستوں میں بیٹھ کر چٹخارے لے کر کہہ سکیں کہ انہوں نے فلاں مشہور فلمی ہیروئن کو اغوا کیا تھا اور اس کے ساتھ کیا کچھ کیا تھا۔ ان کی نظر میں یہ محض ایک پُرلطف ایڈونچر ہوتا ہے۔ ایک ہیجان خیز مہم ہوتی ہے۔"

"اگر ایسا ہوا تب تو شاید پولیس جلد ان کا سراغ لگا لے۔" میں نے کہا "اس صورت میں انہیں سزا عدالت نہیں دے گی، میں دوں گا۔"

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو سر!" وہ شاید جھرجھری سی لے کر بولا "روپے پیسے کے بدلے ہی ستارہ کی جان چھوٹ جائے تو اچھا ہے۔ مالی نقصان تو پورے ہو جاتے ہیں۔"

"خیر... دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا "تم پولیس سے رابطہ رکھو۔ کوئی ذرا سا بھی سراغ سامنے آئے تو فوراً مجھے مطلع کرو۔ خواہ وہ کتنا ہی غیر اہم محسوس ہو۔ میں ڈی آئی جی صاحب سے بھی کہلواتا ہوں اور اپنے دو ایک آدمیوں کو بھی لگاتا ہوں۔"

فون بند کر کے میں نے واپس آکر اپنے مہمانوں کے ساتھ مزید تھوڑا سا وقت گزارنے کے بعد ان سے اجازت چاہی۔ وہ اسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں انہیں وہیں بیٹھے چھوڑ کر گھر آگیا۔ مجھے دو ضروری ٹیلیفون کرنا تھے۔ پہلا فون تو ڈی آئی جی صاحب کو کرنا تھا۔ ان سے درخواست کرنی تھی کہ وہ اس سلسلے میں متعلقہ لوگوں کو زیادہ سرگرمی سے تفتیش کرنے کی خصوصی ہدایت کریں۔ دوسرے ٹونی کو فون کرنا تھا کہ وہ اپنے طور پر جیسے بھی ممکن ہو، پتا چلانے کی کوشش کرے کہ اس واردات کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا تھا۔

لیکن یہ دونوں فون کرنے کی نوبت نہیں آسکی۔ ان کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ میں ابھی جا کر اسٹڈی میں بیٹھا ہی تھا کہ میرے ڈائریکٹ نمبر پر فون آگیا۔ دوسری طرف ایڈم تھا۔

"ستارہ کے اغوا کی اطلاع تمہیں کافی تاخیر سے ملی" وہ چہکا۔

"تو یہ تمہارا گھٹیا پن تھا؟" میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔

"ظاہر ہے۔ گھٹیا پن کے جواب میں گھٹیا پن کا ہی مظاہرہ کرنا پڑتا ہے" وہ اطمینان سے بولا "تم نے اے نن کو غائب کر کے اچھا نہیں کیا۔"

"تو کیا یہ اس کا جواب ہے؟" میں نے اپنا لہجہ پُرسکون رکھنے کی کوشش کی۔

"ظاہر ہے۔ بعض اوقات کسی ایک چیز کے بدلے کوئی دوسری چیز ضمانت رکھنی پڑتی ہے" اس نے جواب دیا۔

"لیکن تمہیں یہ الہام کیونکر ہوا کہ اے نن کو میں نے غائب کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمہارے سوا اس شہر میں اس کا اتنا قدردان اور کون ہے؟" وہ بدستور شگفتہ لہجے میں بولا "ویسے بھی وہ جب اپنے ٹھکانے سے نکلا تھا تو تم سے ملنا اس کے شیڈول میں شامل تھا اور ہماری اطلاع کے مطابق اس کی تم سے ملاقات بھی ہوئی تھی لیکن وہ چونکہ ہر طرح کی صورت حال سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے اس کی حفاظت یا نگرانی کے لئے کوئی غیر معمولی انتظامات کرنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ہمیں یہ تو معلوم ہو چکا ہے کہ وہ تمہاری گاڑی میں بیٹھا تھا، اس کے بعد سے وہ غائب ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ تردید اور انکار کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تم سرکش سے آدمی ہو۔ بات ذرا مشکل سے ہی مانتے ہو۔ ہم تمہارے بارے میں جتنے اچھے پروگرام بناتے ہیں، تم درمیان میں اتنی ہی گندی سی کوئی نہ کوئی حرکت کر گزرتے ہو۔ اس لئے ہمیں اندیشہ ہے کہ تم نے کہیں اے نن کو ہلاک ہی نہ کر دیا ہو۔ ویسے وہ آسانی سے ہلاک ہونے والی چیز تو نہیں ہے لیکن چیز تم بھی غیر معمولی ہو۔ تم سے کچھ بعید نہیں ہے۔ بہرحال..... اگر تم نے اسے ہلاک نہیں کیا ہوگا تو یہ تمہارے حق میں بہت بہتر ہوگا۔ ورنہ سمجھ لو کہ تمہارے لئے بہت بڑی پریشانی..... بلکہ پریشانیاں کھڑی ہو جائیں گی۔ ستارہ کا غائب ہونا اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔"

میں نے اس سے صاف گوئی اور سیدھے طریقے سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں ستارہ کی جان کو خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ جلد از جلد اس کی بازیابی کی کوشش کر لینا ہی میرے حق میں بہتر

تھا۔ ویسے بھی اے نن ذہنی توازن کھوچکا تھا۔ اس حالت میں وہ میرے کسی کام کا نہیں تھا۔

"تم نے ستارہ کو کوئی گزند تو نہیں پہنچائی؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

ایڈم نے غالباً محسوس کرلیا کہ میں مذاکرات کی طرف مائل ہوں۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ خوشگوار لہجے میں بولا "ہم کسی کو بھی اس وقت تک گزند نہیں پہنچاتے جب تک گزند پہنچانا ناگزیر نہ ہوجائے۔ ابھی سے اسے گزند پہنچانے کی کیا ضرورت تھی؟ ابھی تو تم سے بات بھی نہیں ہوئی تھی۔ تم سے بات چیت ناکام ہونے کی صورت میں ہم کوئی فیصلہ کریں گے۔ اس کے بعد ایک طریقہ تو یہ ہوسکتا ہے کہ ستارہ قسطوں میں تمہیں بھیجی جائے۔ کبھی ایک ہاتھ' کبھی ایک بازو' کبھی انگلیاں' کبھی پاؤں اور سب سے آخر میں سر۔"

مجھے معلوم تھا کہ اس قسم کے لوگوں کا خوشگوار لہجے میں اس قسم کی باتیں کرنا عام قسم کے جرائم پیشہ لوگوں یا بدمعاشوں کی دھمکیوں سے زیادہ خطرناک تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ریسیور پر میری گرفت سخت ہوتی جارہی تھی۔ میں نے فوراً اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑا۔ میں اس سے اعصابی کشیدگی کے عالم میں بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جس طرح وہ اپنے آپ کو بالکل پُرسکون اور بے پروا ظاہر کررہا تھا' اسی طرح مجھے رہنا چاہئے تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ تمہیں ستارہ کے ٹکڑے اکٹھے ہی پارسل کردئے جائیں۔ ستارے کبھی کبھی ٹوٹ بھی جاتے ہیں نا۔ لیکن تم نے کسی ستارے کے اتنے ٹکڑے کبھی نہیں دیکھے ہوں گے جتنے ہم تمہیں بھیجیں گے۔ تیسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ انتہائی نرمی کا سلوک کرتے ہوئے ستارہ کو صحیح سلامت تمہارے پاس بھیج دیں۔ صرف اس کی کھوپڑی میں ایک آدھ سوراخ ہو۔ اب یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم کون سا طریقہ پسند کرو.... یا یوں کہو کہ یہ تمہارے طرزِ عمل پر منحصر ہے کہ ہم کون سا طریقہ اختیار کریں۔"

"فضولیات چھوڑو۔ مختصر بات کرو' کیا چاہتے ہو؟" میں نے رکھائی سے پوچھا۔

"کیا اب بھی پوچھنے کی ضرورت ہے؟" وہ ملائمت سے بولا' "ظاہر ہے ہم تبادلہ چاہتے ہیں۔ تم اے نن کو چھوڑو۔ ہم ستارہ کو چھوڑدیں گے۔"

"یعنی میں چھوڑنے میں پہل کروں اور پھر انتظار کرنے بیٹھ جاؤں کہ کب تم ستارہ کو چھوڑتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ ہم کوئی اٹھائی گیرے یا پیشہ ور اغوا کرنے والے تو نہیں ہیں۔ تمہیں ہماری بات پر اعتبار کرنا چاہئے" اس نے جواب دیا۔

"نہیں۔ مجھے اعتبار نہیں ہے" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"یہ تو بڑے افسوس کی بات ہے" وہ مجروح سے لہجے میں بولا "بہرحال .... تم ہی بتاؤ پھر کیا صورت ہوسکتی ہے؟ ہم تو تمہارے ساتھ بالکل فیئر چلنا چاہتے ہیں۔"

میں نے الفاظ کا سہارا لئے بغیر تسلیم کرلیا تھا کہ اے نن میرے قبضے میں ہے۔ اب میں نے بات طے کرلینا ہی بہتر سمجھا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کا فیئر رہنے کا دعویٰ کس حد تک درست تھا' بہرحال اب میں نے بالکل فیئر ہوجانے کا فیصلہ کیا تھا۔

"بات آگے بڑھانے سے پہلے میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں" میں نے اب دوستانہ لہجے میں کہا "اب تم نے فیئر ہونے کی بات کی ہے تو میں بھی حتی الامکان ایمانداری سے کام لینے کی کوشش کروں گا۔ مسئلہ یہ ہے کہ اے نن یادداشت کھو بیٹھا ہے۔"

"تم نے ٹارچر کیا ہوگا اسے" اس نے فوراً کہا لیکن پھر خود ہی بولا "مگر وہ تو ٹارچر سے بھی یادداشت کھودینے والا آدمی نہیں ہے تم نے کیا کیا ہے اس کے ساتھ؟"

"مجھے تو اس کے ساتھ کچھ کرنے کی حسرت ہی رہ گئی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں تو اس پر طبع آزمائی کرہی نہیں سکا۔ نہ جانے کس نے کس چکر میں اس کی پیشانی پر لوہے کی سلاخ کچھ زیادہ ہی طاقت سے دے ماری۔ وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ اسی لئے میرے قابو میں بھی آگیا ورنہ یہ چھلاوا تو میرے ہاتھ ہی نہیں لگ رہا تھا۔ ہوش میں آیا تو اس کی یادداشت جاچکی تھی۔" میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ اس کا طرزِ عمل دودھ پیتے بچے جیسا تھا۔

ایڈم ایک لمحے خاموش رہا پھر بولا "تمہارے سوا کسی کو اس کی پیشانی پر سلاخ مارنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟"

"کوئی ہم دونوں کو ایک ویران سڑک پر لوٹنے کی فکر میں تھا۔ خاص طور پر مجھ سے گاڑی چھیننا چاہتا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا ہم دونوں

ت ہیں۔ یہ ذرا لمبی کہانی ہے۔ تم ضروری سمجھو گے تو میں نادوں گا لیکن اصل اہم بات صرف یہ ہے کہ اے نن یادداشت کھو بیٹھا ہے۔ اس کے دماغ میں چوٹ آگئی ہے۔"

"خیر.... ٹھیک ہے" ایڈم گہری سانس لے کر بولا "میں تمہاری کہانی پر یقین کرلیتا ہوں۔ وہ جس حالت میں بھی ہے ہم اسے واپس لینے کے لئے تیار ہیں۔ وہ کسی حد تک مشینی خصوصیات رکھنے والا انسان ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اس کے کل پُرزوں میں جہاں فرق آگیا ہے اسے ٹھیک کرلیں کیونکہ اس پیچیدہ مخلوق کو صرف ہم ہی بہتر سمجھتے ہیں۔ بہرحال ہم ستارہ کو بالکل ٹھیک ٹھاک حالت میں تمہارے حوالے کریں گے۔ اس سے زیادہ فیئر معاملہ کیا ہوسکتا ہے؟"

"اس میں شک نہیں۔ تمہاری ایمانداری کے واقعات تو تاریخ میں سنہرے الفاظ میں لکھے جائیں گے" میں نے کہا "فی الحال اپنے مُنہ میاں مٹھو بننا چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تبادلہ کس طرح عمل میں آئے گا؟"

"بالکل سیدھے سادے انداز میں" اس نے جواب دیا "تم اے نن کو لے کر کہیں بھی آجاؤ۔ ہم ستارہ کو لے کر وہاں آجائیں گے۔ شرفاء کی طرح تم ہماری چیز ہمارے حوالے کردینا۔ ہم تمہاری چیز تمہارے سپرد کردیں گے۔"

"میں تو خیر ستارہ کو اپنی چیز نہیں سمجھتا" میں نے تصحیح کی "لیکن تم نے اس بے چاری کو مجھ سے تعلق کی بنا پر ہی اغوا کیا ہے اس لئے اسے تمہارے چنگل سے چھڑانا میری اخلاقی ذمّے داری بن گیا ہے۔"

"بے شک" وہ نیم استہزائیہ سے لہجے میں بولا "ہمیں پہلے ہی امید تھی کہ تم اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی پاسداری کروگے۔ اسی لئے تو ہم نے یہ زحمت کی تھی۔"

میں نے اس کے لہجے کو نظرانداز کرتے ہوئے پوچھا "تم نے مجھے ہی اغوا کیوں نہیں کرلیا؟"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "اچھا سوال ہے۔ شاید ہی کوئی اپنے بارے میں خود یہ سوال کرتا ہو کہ مجھے کیوں نہیں اغوا کرلیا گیا" پھر وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "سچی بات یہ ہے کہ تمہیں اغوا کرنا خاصا مشکل کام ہے۔ اس کے لئے ہمیں ذرا لمبی چوڑی منصوبہ بندی کرنی پڑتی اور فی الحال ہم عجلت میں تھے۔ کوئی بہت ضروری بات ہوگی تو تمہیں بھی زحمت دے لیں گے۔"

"ستارہ کے اغوا کا میرے اغوا سے زیادہ شور برپا ہوگا" میں نے کہا۔

"شور کی ہمیں کوئی پروا نہیں" وہ بے نیازی سے بولا۔ ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ "تو پھر کیا طے پایا؟"

"ابھی تو کچھ بھی طے نہیں پایا" میں نے جواب دیا "تمہارا کہنا ہے کہ میں اے نن کو لے کر کہیں بھی آجاؤں۔ بات پھر وہی بے اعتباری کی آجاتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تبادلہ کسی بارونق' بلکہ پُرہجوم سی جگہ پر ہو تاکہ تمہارے آدمی کوئی گڑبڑ نہ کرسکیں اور گڑبڑ کریں تو آسانی سے فرار نہ ہوسکیں۔"

"ہمارا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اور نہ ہی ہم اس میں زیادہ آدمیوں کو ملوث کرنا چاہتے تھے لیکن تم اپنی تسلی کے لئے جس طرح کے بھی انتظامات چاہتے ہو' کرلو۔ جو بھی طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہو کرلو اور جو بھی مقام منتخب کرنا چاہتے ہو' کرلو۔ اتنے فراخ دل لوگ تمہیں کہاں ملیں گے۔"

"واقعی۔ اگر آج حاتم طائی زندہ ہوتا تو تمہاری دریا دلی دیکھ کر شرمندگی سے دوبارہ مرجاتا" میں نے کہا "ایک تو تم اپنے مُنہ میاں مٹھو بننے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔"

وہ کھسیانا ہوئے بغیر ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "خیر.... تم جگہ بتاؤ۔"

"میرے خیال میں بھاٹی کا علاقہ ٹھیک رہے گا" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "سڑکیں اور گلیاں تنگ تنگ ہیں۔ تمہارے آدمی کوئی گڑبڑ کرکے آسانی سے بھاگ نہیں سکیں گے۔"

"معلوم نہیں تمہارے دماغ میں گڑبڑ کا خیال کیوں سمایا ہوا ہے۔ اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ ہمارا گڑبڑ کا کوئی ارادہ نہیں" ایڈم بولا "اور اگر ہم ارادہ کرہی لیں تو پھر بھاٹی ہو یا لوہاری' ہمارے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم کہیں بھی' کچھ بھی کرکے نکل سکتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ بیس تیس آدمی مرجائیں گے۔ ضرورت پڑنے پر ہم یہ بھی کرسکتے ہیں لیکن بلا ضرورت ہم کچھ نہیں کرتے۔ بے گناہ راہ گیروں یا دُکانداروں وغیرہ کو مروایا جائے تو اس کا بھی کوئی مقصد ہونا چاہئے۔"

"تمہارے اعلیٰ و عظیم فلسفوں کا تو میں پہلے ہی قائل ہوں" میں نے کہا "اب اپنا پروگرام بتاؤ۔ تبادلہ کس وقت ممکن ہوسکے گا؟"

"اب تو دیر ہوگئی ہے۔ بات صبح پر ہی جاپڑی ہے۔ ورنہ تبادلہ تو آج بھی ہوسکتا تھا۔ ہمیں ایک فلمی ہیروئن کو رات بھر مہمان رکھنے کا کوئی شوق نہیں' تم جگہ بتاؤ۔"

"بھاٹی میں پائلٹ ہوٹل کے قریب تنگ چوراہے پر یہ کام ہونا چاہئے" میں نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہا "تم گاڑی میں ستارہ کو لے آنا۔ میں اپنی گاڑی میں اے نن کو لے آؤں گا۔ گاڑیاں ایک ہی سڑک پر آگے پیچھے رکنی چاہئیں۔ تم اپنی گاڑی کا دروازہ کھول دینا۔ میں اپنی گاڑی کا دروازہ کھول دوں گا۔ تم آکر اے نن کو لے جانا۔ میں ستارہ کو تمہاری گاڑی سے اتارلوں گا۔"

"تم نے کیسے فرض کرلیا کہ اس کام کے لئے میں ہی آؤں گا" وہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

"تم سے میری مُراد وہی شخص ہے جو تمہاری نمائندگی کرے ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا "ویسے اس کام کے لئے میں خود ہی آؤں گا۔"

"یہ تو اور بھی اچھا ہے" میں نے کہا "اس بہانے تمہارا دیدار ہی ہو جائے گا۔ آج تک آواز ہی سنتا آرہا ہوں۔ بڑا اشتیاق ہے تمہیں دیکھنے کا۔"

"دیکھ کر مایوسی ہوگی" وہ خوش دلی سے بولا "ہم کون سا شوبزنس کے لوگ ہیں۔"

"مایوسی تو بعض اوقات شوبزنس کے لوگوں سے مل کر بھی ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ جیسی ہمیں ستارہ کو بہت قریب سے دیکھ کر ہوئی ہے" وہ فوراً بولا "وہ اتنی حسین تو نہیں جتنی اسکرین پر نظر آتی ہے۔"

"اتنے حسین تو کم ہی لوگ ہوتے ہیں جتنے وہ اسکرین پر نظر آتے ہیں۔ ویسے کوئی کوئی اس سے زیادہ بھی ہوتا ہے۔"

"معلومات میں اضافے کا شکریہ۔ ویسے یہ بات مجھے بھی معلوم تھی" وہ بولا "میں تو اصل میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ تم اس پر عاشق کیوں ہو؟ مجھے یقین ہے اس سے بہتر لڑکیاں تمہاری نظرِ التفات کی منتظر رہتی ہوں گی۔"

"میرا اس سے تعلق حسن کی بنیاد پر نہیں ہے۔ ویسے بھی حسن صرف اسی کا نام نہیں ہے جو آنکھوں کو نظر آتا ہے۔" میں نے جواب دیا "اور میرے اس سے تعلق کو عشق بھی نہیں کہا جاسکتا۔"

"وہ تو ہمیں معلوم ہے کہ تمہارا اس سے تعلق کس بنیاد پر ہے" وہ ہنس کر بولا "اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے اس سے تعلق کو عشق بھی نہیں کہا جاسکتا لیکن جو کچھ بھی ہے، اتنا ضرور ہے کہ اس کے لئے تم سے کوئی ناجائز نہ سہی، جائز بات ضرور منوائی جاسکتی ہے۔ اچھا تو پھر کل صبح نو بجے کا وقت تبادلے کے لئے ٹھیک رہے گا؟"

"ٹھیک ہے۔" میں نے ذرا سوچ کر کہا۔

"اردگرد یقیناً تمہارے آدمی موجود ہوں گے؟" اس نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں" میں نے دیانت داری سے جواب دیا "میں نہیں چاہتا کہ اس ڈیل میں میرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو۔ میرے آدمیوں کو شاید تم دیکھ نہ سکو، پہچان نہ سکو۔ کوئی بدمعاشی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ خواہ مخواہ کی خونریزی ہوگی۔"

"ہمارے آدمی بھی اسی طرح اردگرد موجود ہوں گے۔ تم نہیں جان سکو گے وہ کہاں ہیں، کس روپ میں ہیں۔ تم بھی کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا۔ یہ ایک بالکل فیئر ڈیل ہوگی۔ آدمی کے بدلے آدمی۔ نہایت پُرسکون اور پُرامن انداز میں سب کچھ ہونا چاہئے" ایڈم بولا۔

"امید تو ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ اگر تم نے کوئی گڑبڑ نہ کی تو شاید

شہر بیتاب کے دہشت گرد

اے حمید — قسط/(30)

قریب سے گزرتے راہ گیروں کو بھی پتا نہ چلے کہ سڑک کے کنار[ے] کھڑی گاڑیوں میں کس نوعیت کا تبادلہ عمل میں آیا ہے۔" م[یں نے] کہا۔

"اس قسم کے معاملات عام طور پر شہر سے دور، وی[ران] مقامات پر طے پاتے ہیں۔ لیکن تم بہت چالاک ہو۔ تم نے [شہر کا] گنجان ترین علاقہ منتخب کیا ہے۔"

"ذرہ نوازی ہے تمہاری۔ تم سے واسطہ رہے گا تو بہت سیکھ جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"تو پھر کل کا پروگرام طے رہا؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"ظاہر ہے۔ اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے" میں نے لمبی سانس لے کر کہا۔ اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ ریسیور رکھنے کے بعد بھی میں کئی منٹ تک ساکت بیٹھا رہا۔ اب ڈی آئی جی صاحب سے بات کرنے کا اور پولیس کی کارکردگی کی خبر رکھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ یہ معاملہ پولیس کے بس کا نہیں تھا۔ اب ستارہ کی بازیابی تک انہیں صرف ٹامک ٹوئیاں ہی مارنی تھیں۔

کئی منٹ تک سوچنے کے بعد بالآخر میں نے ٹونی کا نمبر ڈائل کیا اور اس کام کے بارے میں اس سے تبادلۂ خیال کرنے لگا جو صبح درپیش تھا۔ خاصی طویل گفتگو کے بعد بالآخر صبح کا پروگرام طے پاگیا۔ ٹونی کی تجویز تھی کہ ہم ایڈم عرف ایڈی پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں۔ یہ ریڈ ڈاٹ کا سرا ہاتھ آنے کا ایک ذریعہ ثابت ہوسکتا تھا لیکن میں ٹونی سے متفق نہ ہوسکا۔ میں بھاٹی جیسی پُرہجوم جگہ پر ان لوگوں سے تصادم کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا اور ستارہ کی زندگی بھی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ عین اس کی بازیابی کے وقت میں کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا کہ دونوں طرف سے آتش فشاں پھٹ پڑتا۔ ٹونی نے محفوظ طریقوں سے صورت حال ہینڈل کرنے کے لئے کئی تجاویز پیش کیں لیکن ان میں سے کوئی میرے دل کو نہ لگی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ میں ریڈ ڈاٹ والوں کو قدرے بہتر طور پر جاننے لگا تھا۔ ٹونی ابھی انہیں اتنا بہتر طور پر نہیں جانتا تھا۔

اس رات مزید کچھ دیر سوچ بچار کے بعد بالآخر میں کچھ دیر سونے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ دوسری صبح الارم نے مجھے ج[گایا]۔ جلدی جلدی تیار ہو کر اور ناشتا کرکے میں دو نمبر پہنچا۔ من[...]

کے ساتھ تہ خانے میں پہنچ کر میں نے اے ٹن کی آنکھوں پر پٹی بندھوائی اور احتیاطاً اس کے ہاتھ بھی پشت پر بندھوا دیئے۔ اس نے شیر خوار بچوں کے سے انداز میں غاؤں غاؤں کرکے تھوڑا سا احتجاج کیا لیکن بالآخر قابو میں آگیا۔

اسے اوپر لاکر میں نے گاڑی کی پچھلی سیٹ پر ڈالا۔ وہ اسی طرح لیٹ کر ٹانگیں چلانے لگا اور غاؤں غاؤں کرنے لگا جیسے کوئی بچہ پنگھوڑے میں لیٹا ہو۔ میرا ایک آدمی حنیف خان گن لے کر اس کے پاس بیٹھا اور ہم بھاٹی گیٹ کی طرف روانہ ہوگئے۔ میرے چھ دوسرے آدمی دو مختلف گاڑیوں میں آگے پیچھے روانہ ہوئے تھے لیکن بظاہر وہ ہم سے بالکل غیر متعلق تھے۔

بھاٹی پہنچ کر میں نے پائلٹ ہوٹل سے کچھ دور ایک فٹ پاتھ کے ساتھ گاڑی روک دی جس کی ہم نشانی مقرر کرچکے تھے۔ اس وقت نو بجنے میں دو منٹ باقی تھے۔ میں نے اتر کر گردوپیش کا جائزہ لیا۔ میرے آدمیوں نے پوزیشنیں سنبھال لی تھیں۔ کوئی گنے کے رس والے کے پاس کھڑا تھا۔ کوئی سری پائے کے ٹھکانے پر جا بیٹھا تھا۔ کوئی قلفے والے کے پاس کھڑا تھا۔ کوئی کسی پھل والے سے بھاؤ تاؤ کررہا تھا۔ وہ سب بے ضرر عام سے شہریوں میں گھل مل گئے تھے۔ ان کے ہتھیار ان کے ڈھیلے ڈھالے لباسوں میں چھپے ہوئے تھے اور وہ ایک خاص حکمتِ عملی کے ساتھ ایسے پوائنٹس پر کھڑے تھے کہ اچھے بھلے لوگوں کا ان کے نرغے سے نکل کر جانا مشکل تھا۔

دن چڑھ چکا تھا لیکن صبح کے اخبارات ابھی تک جوش و خروش سے بک رہے تھے کیونکہ ان میں ستارہ کے اغوا کی کہانی دلکش تصویروں اور چٹخارے دار تجزیوں کے ساتھ چھپی ہوئی تھی۔ ہر اخبار کے رپورٹروں اور فلمی وقائع نگاروں نے معتبر ذرائع کے حوالے سے نہ جانے کس کس زاویئے سے تجزیئے چھاپے تھے۔ انہوں نے تمام امکانات کا جائزہ لینے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ ایک اخبار نے تو خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ ستارہ کے کسی ناکام عاشق کی حرکت تھی جس کا بہت سارا روپیہ اور جائیداد ستارہ ہڑپ کرگئی تھی۔ میں تمام اخبارات میں یہ خبریں اور رپورٹیں سرسری نظر سے دیکھ کر گھر سے روانہ ہوا تھا۔ اخبارات ہی سے مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ خاص قسم کے بدمعاشوں کے اڈوں پر پولیس کے چھاپوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ان میں زیادہ تر وہ بدمعاش تھے جن کا کسی نہ کسی حوالے سے فلمی دنیا سے کوئی تعلق بنتا تھا۔ اس کے علاوہ گزشتہ رات سے ہی پولیس شہر سے باہر جانے والے راستوں کی بھی نگرانی کررہی تھی۔

—— اور میں وہاں شہر کے وسط میں ستارہ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ میری گاڑی کی پچھلی سیٹ پر حنیف نے اے ٹن کی آنکھوں سے پٹی اور ہاتھوں کی بندشیں کھول دی تھیں۔ وہ اب انگوٹھا چوس رہا تھا اور ہوا میں ٹانگیں چلا رہا تھا۔

ٹھیک نو بجے ایک سفید فورڈ کیپری میری گاڑی کے عین پیچھے آن رکی۔ میں نے اس کے اندر جھانکنے سے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا۔ میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے لوگ کہاں کہاں کھڑے ہیں لیکن اس عجلت میں، طائرانہ نظر میں کچھ اندازہ نہ ہوسکا۔ بالکل اسی طرح جیسے میرے آدمیوں کے بارے میں کسی کو اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ روز کی طرح لاہور کے مرکزی علاقے کی پُرہنگامہ زندگی رواں دواں تھی۔

تب میں نے سفید فورڈ کیپری کی طرف دیکھا۔ صرف ڈرائیونگ سیٹ پر ایک مرد تھا۔ پچھلی سیٹ پر برقعے میں ایک عورت بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ پوری طرح نقاب میں چھپا ہوا تھا۔

مرد ڈرائیونگ سیٹ سے اتر آیا۔ وہ ایک دبلا پتلا، نہایت نفیس قسم کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ سفید فام تھا اور تھری پیس سوٹ میں تھا۔ اسے دیکھ کر کوئی زیادہ سے زیادہ یہی سمجھ سکتا تھا کہ وہ کسی اچھی کمپنی میں اعلیٰ عہدیدار یا آسودہ حال قسم کا، شریف اور وضع دار بزنس مین ہوگا۔ کوئی یہ نہیں سوچ سکتا تھا کہ اس کا کسی عجیب و غریب اور پُراسرار تنظیم سے کوئی تعلق ہوگا۔ حد تو یہ تھی کہ وہ معزز آدمیوں کی طرح پائپ بھی پی رہا تھا۔

قریب آکر اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے ملائمت سے کہا "مجھے ایڈم کہتے ہیں" انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے دو شناسا بزنس مین اتفاقاً سرِراہ مل گئے ہوں۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

"بہت مایوسی ہوئی تم سے مل کر" بالآخر میں نے کہا "میرے ذہن میں تمہارا بہت مختلف قسم کا نقشہ تھا۔"

"میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تمہیں مجھ سے مل کر مایوسی ہوگی" وہ مسکراتے ہوئے شستہ اردو میں بولا۔ اس کی آواز نے تصدیق کردی کہ وہ واقعی ایڈم تھا۔ میں فون پر یہی آواز سنتا تھا۔

میں نے اس کی گاڑی میں جھانکا۔ عورت نقاب ہٹا کر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ وہ کمبخت واقعی ستارہ تھی۔ اس نے نقاب دوبارہ چہرے پر ڈال لیا اور فورڈ سے اتر کر میری گاڑی کی طرف بڑھ آئی۔ حنیف نے اس کے لئے اگلا دروازہ کھول دیا۔

ایڈم نے میری گاڑی کے قریب جاکر دروازہ کھول کر پیچھے جھانکا اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اے ٹن بڑے اطمینان سے گاڑی سے اتر آیا۔ وہ بالکل صحیح طرح اپنے پیروں پر چل رہا تھا۔ صرف یہی نہیں، میرے قریب رک کر وہ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے نہایت خوش دلی سے مسکرا کر بولا "کیا حال ہے چوہدری چندا؟"

میرا دل چاہا کہ نتائج کی پروا کئے بغیر جیب سے مشین پسٹل نکالوں اور اس کا سینہ چھلنی کردوں۔

بڑی مشکل سے میں نے اپنے غصے کو قابو میں رکھا۔ اس وقت اگر ہتھیار نکالنے کے لئے میرا ہاتھ حرکت میں آتا تو اسی لمحے

خوف ناک خونریزی شروع ہو سکتی تھی۔ میں ایک بھی بے گناہ راہگیر ....کو مروانا نہیں چاہتا تھا۔

"تم نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کو ضائع کیا" میں نے اے تن کو گھورتے ہوئے کہا "جو پرفارمنس تم نے میرے ہاں دی اس پر تمہیں اکیڈمی ایوارڈ مل سکتا تھا۔"

"ارے .... ہمیں تو نہ جانے کس کس چیز پر ایوارڈ مل سکتا ہے۔ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔" وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ اس کی وہ مسکراہٹ اچھے بھلے ٹھنڈے مزاج کے آدمی کو بھی تاؤ دلانے کے لئے کافی تھی۔

میں نے مصافحے کے لئے بڑھا ہوا اس کا ہاتھ تھاما نہیں تھا لیکن وہ زبردستی اپنا آہنی سا ہاتھ میرے ہاتھ میں پھنساتے ہوئے بولا "بہرحال ... تمہاری میزبانی کا بہت شکریہ۔ تمہارے ہاں قیام میں بڑا مزہ آیا۔ اس بہانے کچھ آرام کرلیا ورنہ مجھ غریب کو تو اکثر رات کو بھی لیٹنے کی فرصت نہیں ملتی۔"

"درختوں کی شاخوں پر چھلانگیں لگاتے رہتے ہوگے" میں نے سادگی سے کہا۔

"ہائے ...." وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بائیں آنکھ دباتے ہوئے بولا "تم نے تو وہ شاخیں دیکھی ہی نہیں جن پر ہم چھلانگیں لگاتے ہیں" پھر یکدم جیسے اسے کچھ یاد آیا اور وہ ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا "ویسے تمہارے اس خفیہ ٹھکانے پر وہ عورت بڑے غضب کی تھی جسے دوسرے لوگ مس ٹریپ کے نام سے مخاطب کرتے تھے۔ مجھے اگر تمہارے اس خفیہ ٹھکانے کا پتا چل گیا تو وہاں سے صرف اس عورت کو پار کرنے کی کوشش کروں گا۔ عجیب سانولی سلونی قسم کی قیامت ہے وہ" پھر میری طرف جھکتے ہوئے وہ نہایت سنجیدہ اور رازدارانہ سے لہجے میں بولا "تم پر تو مرتی ہوگی وہ؟ میں نے اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں تمہارے لئے ایک عجیب سا پیغام دیکھا تھا۔"

"مجھ تک تو نہیں پہنچا وہ پیغام" میں نے خشک لہجے میں کہا "اگر یہ سوال تمہیں اتنی ہی تکلیف دے رہا تھا تو وہیں اسی سے پوچھ لیا ہوتا۔"

"یہی تو مجبوری تھی" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "وہاں تو میں بقول تمہارے اکیڈمی ایوارڈ والی پرفارمنس دے رہا تھا۔ اس کے دوران اس قسم کی باتیں نہیں ہو سکتی تھیں جس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ وہ اس قسم کی عورت نہیں تھی جس کے سامنے انسان الو کے پٹھوں جیسی حرکتوں میں وقت ضائع کرکے واپس آجاتا۔"

"اتنی حسرت رہ گئی ہے تو آؤ .... تمہیں واپس لے چلتا ہوں اس کے پاس" میں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

"نہیں۔ اب ایسی بھی بات نہیں" اس نے جلدی سے ہاتھ واپس کھینچ لیا "ہر کام کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے۔ مابدولت اس سے ملاقات کا بھی کوئی مناسب وقت تلاش کرلیں گے" اس

نے اپنا لہجہ شاہانہ بنانے کی کوشش کی جو اس کی بندر نما شخصیت کے ساتھ مضحکہ خیز ہی محسوس ہوا۔

"شاید تمہاری موت اسی کے ہاتھوں لکھی ہو۔ تم نے ابھی صرف اس کے سانولے سلونے وجود میں چھپی کشش کو ہی محسوس کیا ہے، اس کے ہاتھ نہیں کھائے۔ اکثر احمق اس کے بارے میں اندازہ نہیں کرپاتے کہ وہ کیا چیز ہے" میں نے کہا۔

"ارے .... مابدولت تو ایسی .... بلکہ ہر قسم کی خواتین کے عظیم ترین قدردان ہیں۔ ان کے ہاتھوں تو موت قبول کرنے کے لئے بھی ہر وقت تیار رہتے ہیں" وہ گردن خم کرتے ہوئے بولا۔

"تمہاری اطلاع کے لئے یہ بھی بتادوں کہ وہ شادی شدہ ہے دو بچوں کی ماں ہے" میں نے کہا۔

"اوہ نو ...." اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں بے یقینی سے کچھ پھیل گئیں "مابدولت ان معاملات میں خود کو دنیا کا تجربہ کار ترین آدمی سمجھتے ہیں لیکن ہمیں تو اس کے بارے میں ایسا کوئی شبہ تک نہیں گزرا" اسے گویا اندازے کی اس غلطی کا بے پناہ افسوس تھا۔

"یہی تو اس کی شخصیت کا کمال ہے" میں نے کندھے اچکائے "کئی برس سے میں بھی اسے ایسی کی ایسی ہی دیکھ رہا ہوں۔ اس کے بچے بڑے ہو رہے ہیں مگر اس کی عمر جیسے وہیں رکی ہوئی ہے۔"

"خیر...." وہ بے پروائی سے بولا "وہ شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ، بچوں والی ہو یا بغیر بچوں والی، ہمارے لئے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم تو جس کے قدردان ہوگئے سو ہوگئے۔"

ایڈم اس دوران خاموش کھڑا مسکرا رہا تھا۔ بظاہر وہ اے تن کی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا لیکن مجھے معلوم تھا وہ غیر محسوس طور پر گردوپیش کا جائزہ لے کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میرے آدمی کہاں کہاں موجود ہیں۔ میرا خیال تھا کہ میرے آدمیوں میں سے شاید ٹونی کو وہ پہچانتا تھا لیکن ٹونی اس وقت سڑک پر نہیں تھا۔ وہ ایک پرانی عمارت کی تنگ و تاریک سیڑھیوں میں کھڑا تھا۔

ایڈم نے نہایت شائستگی و ملائمت سے گفتگو میں مداخلت کی، "میرے خیال میں یہ اس قسم کی باتوں کا وقت نہیں ہے" پھر اس نے مشفقانہ انداز میں اے تن کا کندھا تھپکتے ہوئے گویا میری معلومات میں اضافہ کیا "اے تن ہماری ٹیم کا سب سے زندہ دل آدمی ہے۔"

"آدمی ....؟ آپ اسے آدمی کہتے ہیں؟" میں نے حیرت سے کہا۔

اے تن نے ایڈم کی طرف دیکھ کر گویا میرے اندازِ گفتگو پر معذرت کی "چوہدری صاحب کبھی کبھی دل دکھانے والا مذاق بھی کرتے ہیں لیکن میں ان کی باتوں کا برا نہیں مانتا۔"

ہمارا انداز اب بھی سرِراہ مل جانے والے شناساؤں کی طرح گپ شپ کرنے کا ہی تھا لیکن تینوں ہی شکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح چوکنے تھے۔ ستارہ بڑے صبر و تحمل سے میری گاڑی میں نقاب گرائے بیٹھی تھی۔ پچھلی سیٹ پر حنیف خان بظاہر سُست سے انداز میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں لیکن مجھے معلوم تھا کہ گردوپیش پر اس کی بھی پوری طرح نظر تھی اور اس کی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے دامن تلے اس کی گود میں سب مشین گن ٹکی ہوئی تھی جو ذرا سی گڑبڑ شروع ہوتے ہی آگ اگلتی ہوئی باہر آسکتی تھی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہئے" ایڈم بولا "چوہدری ڈیئر! تم نے دیکھا ہم لوگ معاملات طے کرنے میں کتنے فیئر ہیں؟ ہمیں خوشی ہے کہ تم نے ہم سے تعاون کیا۔ ہم سب کے حق میں بہتر یہی ہے کہ آئندہ ایک دوسرے کے آدمیوں کو اٹھانے یا ہلاک کرنے کی قطعاً کوئی کوشش نہ کی جائے۔"

"مجھے تو اس قسم کا کوئی شوق ہے ہی نہیں" میں نے بے زاری سے کہا "اور نہ ہی میں نے اس طرح کی حرکتوں کا آغاز کیا تھا۔ یہ سلسلے تمہاری طرف سے ہی شروع ہوئے تھے۔ میں تو آرام و اطمینان سے زندگی گزار رہا تھا۔ اپنے معمولات میں مگن تھا۔ معلوم نہیں وہ کون سا منحوس دن تھا جب میں تمہاری نظر میں آگیا۔"

"ایک وقت آئے گا کہ تم اس دن کو منحوس کے بجائے انتہائی مبارک کہوگے اور ہم پر برہم ہونے کے بجائے ہمارے انتہائی شکرگزار ہوگے" ایڈم بدستور تحمل اور متانت سے مسکراتے ہوئے بولا۔

"جن سے شناسائی کا آغاز ایسا ہے ان کے ساتھ آگے چل کر تعلقات کی نوعیت نہ جانے کیا ہوگی؟" میں نے بدستور بیزاری سے کہا۔

"خیر.... یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی چوہدری ڈیئر! اس شہر میں .... اس ملک میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو زندگی کے میدان میں تم سے کہیں زیادہ کامیاب ہیں لیکن وہ تمنا رکھتے ہیں کہ ہم جیسے لوگ ان پر مہربان ہوجائیں، ان کی سرپرستی کریں لیکن بہرحال ... اس موضوع پر بات کرنے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ اب تم جا سکتے ہو" اس نے دوستانہ انداز میں میرا کندھا تھپکا۔

"تم بھی اب جا سکتے ہو" میں نے اسے احساس دلادیا کہ میری طرف سے اشارہ ملے بغیر وہ بھی وہاں سے نہیں ہل سکتا تھا۔

ہم دونوں اپنی اپنی گاڑی میں جابیٹھے۔ اے تن نے کھڑکی سے سر نکال کر بڑی محبت سے ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہا۔

"الّو کا پٹھا!" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ستارہ میرے برابر پسنجر سیٹ پر بدستور چہرے پر نقاب ڈالے بیٹھی تھی۔ نقاب دہرا تھا۔ قریب بیٹھ کر بھی مجھے اس کا چہرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ستارہ کو یہاں لانے میں انہوں نے یہ بڑی عقلمندانہ احتیاط کی تھی ورنہ راستے میں کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی اسے ضرور دیکھ لیتا اور پہچان لیتا۔ گاڑی انہوں نے رنگین شیشوں والی استعمال نہیں کی تھی۔

"تم خیریت سے تو ہو نا؟" میں نے ستارہ کا سرتاپا جائزہ لینے کی کوشش کی۔

"ہاں۔ میں خیریت سے ہوں اور خداوند کریم سے تمہاری خیریت نیک چاہتی ہوں" وہ خوش دلی سے بولی۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ اسے کوئی تکلیف اٹھانی نہیں پڑی تھی۔

میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور موڑ پر پہنچ کر سرکلر روڈ کی طرف مڑ گیا جب کہ میرے پیچھے آنے والی ایڈم کی گاڑی سینما کے گرد گھومتی ہوئی غالباً لوہاری کی طرف چل دی۔ ہمارے پیچھے کئی اور گاڑیاں بھی حرکت میں آئی تھیں لیکن وہ ٹریفک میں گھلی ملی ہوئی تھیں۔ کچھ تو شاید ابھی تانگوں ہی کے پیچھے پھنسی ہوئی تھیں۔

داتا دربار والے موڑ سے گزر کر میں نے گاڑی ٹکسالی کی طرف بڑھائی تو ستارہ بولی "ادھر کہاں جا رہے ہو؟ گھر نہیں چلوگے؟"

"اطمینان سے بیٹھی رہو۔ میں ذرا دیکھنا چاہتا ہوں کہ کوئی میرے پیچھے آتا ہے یا نہیں۔ ڈیل یہیں ختم ہوگئی ہے یا ابھی اس کا کچھ حصہ باقی ہے" میں نے کہا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ مجھے ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ ستارہ واقعی اتنی آسانی سے، کسی قسم کی بھاگ دوڑ، کسی قسم کی سراغ رسانی اور کسی قسم کی مار دھاڑ کے بغیر بازیاب ہوگئی تھی۔

شاہی بازار والے سگنل پر مجھے گاڑی روکنا پڑی۔ ستارہ سر جھکا کر شاہی بازار کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی، "مدت بعد ادھر سے گزر رہی ہوں تو ان گنت یادیں ذہن میں اُمڈی چلی آرہی ہیں۔"

"عام طور پر جو عورتیں یہاں سے نکل کر اپنی ایک بہتر دنیا آباد کرنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں وہ تو مڑ کر اس طرف دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں" میں نے یوں ہی بے دھیانی سے کہا۔ میری زیادہ توجہ

پیچھے آنے والی گاڑیوں کی طرف تھی۔

"کسی حد تک تمہارا خیال صحیح ہے" وہ بولی "لیکن یادیں خواہ کیسی بھی ہوں، ان کی اپنی ایک کسک ہوتی ہے، ایک کشش ہوتی ہے۔ ویسے شاید یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں نے یہاں کچھ ایسی بری زندگی نہیں گزاری کہ جس کی یادیں ذہن پر ایک شرم ناک بوجھ بن جاتیں۔ یہاں بھی باقی معاشرے کی طرح طبقہ بندی ہوتی ہے اور میں یہاں پہنچنے کے بعد خوش قسمتی سے جلد ہی اونچے طبقے میں چلی گئی تھی۔"

"اوہ ....." میں نے مسکراتے ہوئے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

"میں تمہاری نظر میں معزز بننے کی کوشش نہیں کر رہی۔ مجھ پر طوائف اور ایکٹریس ہونے کا جو ٹھپا لگ چکا ہے اس کے بعد میں معزز تو شاید دوسرا جنم لے کر ہی ہو سکتی ہوں۔ میں بس ویسے ہی.... "ریکارڈ درست" رکھنے کے لئے تمہیں بتا رہی ہوں کہ میں یہاں صرف ڈانسر اور سنگر تھی، جسم فروشی میں نے کبھی نہیں کی" اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ یکدم ہی سنجیدہ ہو گئی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ مجھے تو ان وضاحتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ زندگی بھی اس کی اپنی تھی اور وجود بھی اس کا اپنا۔ زندگی نے اسے یا اس نے زندگی کو کس طرح برتا تھا، اب ان باتوں میں الجھنے کا کیا فائدہ تھا؟ بہرحال میں نے موضوع بدلنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید یہاں کی ہوا میں کوئی بات تھی جو اسے یکدم ہی کسی اور دنیا میں لے گئی تھی۔

"کاش ہم کچھ دیر کے لئے یہاں رک سکتے" اس کے لہجے میں چھپی حسرت پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میرا خیال تھا کہ اس دلدل سے نکل جانے والی عورتیں تو یہاں کے درودیوار کے سائے سے بھی بھاگتی ہوں گی۔

وہ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس ٹکڑ پر گول گپے بیچنے والا ایک بوڑھا سا آدمی کھڑا ہوتا تھا۔ بابا فضلو نام تھا اس کا۔ بڑا مزہ آتا تھا اس کے گول گپے کھا کر۔ بہت مشہور تھا وہ اس علاقے میں۔ اس زمانے میں ظاہر ہے ہم بالکل بھی مشہور نہیں تھے لیکن پھر بھی کبھی باہر نکلتے تھے تو اسی طرح برقع پہن کر نکلتے تھے" وہ دھیرے سے ہنسی گویا ان دنوں کے تصور سے محظوظ ہو رہی ہو۔

سگنل کھل چکا تھا۔ میں گاڑی آگے بڑھا چکا تھا مگر وہ ابھی انہی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی۔ فلسفیانہ سے لہجے میں بولی "اس دنیا میں چھوٹی چھوٹی بے شمار دنیائیں آباد ہیں اور شاہی بازار ان میں سے ایک بہت ہی انوکھی دنیا ہے۔ کاش مجھے کسی کہنہ مشق رائٹر کی طرح لکھنا آتا تو میں اس پر زبردست کتاب لکھتی۔"

"بہت پرانا موضوع ہے۔ ادھر ادھر بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی صورت میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ بہت سا مواد ایسا ہے جو چھپ نہیں سکتا" ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "بہرحال اس کے لئے کہنہ مشق رائٹر ہونا بھی کوئی شرط نہیں ہے۔ تم چاہو تو جس طرح بھی تم سے ہو سکے ٹوٹے پھوٹے انداز میں اپنی یادداشتیں لکھ سکتی ہو۔ کوئی اچھا رائٹر انہیں ری رائٹ کر دے گا۔ تمہارے نام سے ..... یعنی ایک فلم اسٹار کے نام سے چھپنے گی تو بہت مشہور ہو گی۔ مشرق اور مغرب میں بہت سے ممالک میں بہت سی کتابیں اسی طرح چھپ رہی ہیں اور بڑی دھوم مچا رہی ہیں۔"

"یہ بھی میرے بس کی بات کہاں ہے۔ میں تو بس سوچتی رہتی ہوں، کر کچھ بھی نہیں پاتی۔ زندگی خود ہی جس طرف چاہتی ہے مجھے بہائے لئے جاتی ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "خیر.... چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ اس وقت ایک برقع پوش خاتون کو ساتھ بٹھا کر لے جانا تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟"

"کوئی ایسی انوکھی بات تو نہیں" میں نے اطمینان سے کہا "بس ایسا معلوم ہو رہا ہے، کوئی شریف شہری اپنی باپردہ اہلیہ کے ساتھ کہیں جا رہا ہے۔"

"کاش یہ حقیقت ہوتی" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"پچاس فیصد تو حقیقت ہے۔ شریف شہری تو میں ہوں۔ بس تم اہلیہ نہیں ہو" میں نے گاڑی بادامی باغ کی طرف موڑلی۔

"وہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ کاش ہم بھی اہلیہ کہلانے کے اہل ہوتے" اس نے سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔ یک دم ہی اس کے لہجے میں تھکن سی در آئی۔ میں خاموش رہا۔ اس قسم کا موضوع چھڑ جاتا تھا اور کوئی سنجیدہ رخ اختیار کرنے لگتا تھا تو میرے ہوش گم ہو جاتے تھے۔ میں اس سے بچنے ہی کی کوشش کرتا تھا۔ منٹو پارک کے قریب بسوں کی وجہ سے ٹریفک پھنسا ہوا تھا۔ مجھے گاڑی روکنا پڑی۔ فٹ پاتھ پر ہاکر لڑکا شام کے دو ایک اخبارات بیچ رہا تھا جو دن چڑھے ہی آ گئے تھے۔ ویسے بھی دوپہر تک یہ اخبارات آ جاتے تھے لیکن آج شاید ستارہ والی خبر کی وجہ سے انہوں نے معمول سے بھی کچھ زیادہ پھرتی دکھائی تھی۔ ان میں سنسنی خیزی اور چٹخارہ ذرا زیادہ ہوتا تھا اس لئے اچھے خاصے بک بھی رہے تھے۔ ستارہ نے بھی کھڑکی سے ہاتھ نکال کر وہ اخبارات خرید لئے۔

پہلے صفحات پر اسی کے اغواء کی خبریں شہ سرخیوں کے ساتھ لگی ہوئی تھیں۔ اس کی زیادہ سے زیادہ پُرکشش تصویریں زیادہ سے زیادہ بڑی کر کے چھاپی گئی تھیں۔ مواد کم تھا، تصویریں زیادہ۔ ہمارے چاروں طرف گاڑیاں، ٹرک، ریڑھے، تانگے، بسیں، سائیکلیں سب ہی کچھ تھا۔ انسانوں کا ایک سیلاب تھا اور ان سب کے درمیان ستارہ میرے برابر بیٹھی خود اپنے اغواء کی خبریں بڑے مزے سے پڑھ رہی تھی۔

دو تین منٹ میں ہی اس نے سرسری نظر سے سب کچھ دیکھ لیا۔ ایک اخبار کو لہراتے ہوئے بولی "یہ تو بہت ہی دور کی کوڑی لایا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ فلم اسٹار ستارہ نے خود ہی اپنے اغواء کا ڈراما رچایا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ اس وقت وہ مری یا ایبٹ آباد میں اپنے کسی قدردان یا ساتھی ہیرو کے ساتھ دادِ عیش دے رہی ہو۔ بڑے حساب سے اس نے یہ سارا تاثر دینے کی کوشش کی ہے اور یہ اشارہ بھی دے دیا ہے کہ عین جس وقت ستارہ اغوا ہوئی ہے اسی رات سے مشہور فلم اسٹار زاہد بھی اپنی ایک چلتی ہوئی شوٹنگ چھوڑ کر غائب ہے۔ ستارہ چوں کہ اپنی شوٹنگز درمیان میں چھوڑنا اور غیر ذمے دار ہونے کا الزام اپنے سر لینا نہیں چاہتی تھی اس لئے اس نے ڈراما رچانے کی زحمت کر لی۔"

ایک طویل سانس لے کر اخبار ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے وہ بولی "اسے کہتے ہیں زخموں پر نمک چھڑکنا۔ بعض اخبار نویس تو سنسنی یا چٹخارا پیدا کرنے کی کوشش میں بہت ہی سفاک ہو جاتے ہیں۔"

"ان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تم اس قسم کی خبروں اور رپورٹوں سے توجہ ہٹالو" میں نے بے پروائی سے کہا "تم اس احساس سے لطف اندوز ہونے کی کوشش کرو کہ اس وقت اخباری رپورٹوں کے مطابق شہر بھر کی پولیس تمہاری تلاش میں سرگرداں ہے اور نہ جانے کس کس ایجنسی کو چوکس کر دیا گیا ہے لیکن حقیقت تم دیکھ ہی رہی ہو۔ ہم اتنی بھری پُری سڑکوں سے گزر رہے ہیں، راستے میں کئی جگہ پولیس والے بھی نظر آئے لیکن کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی ہماری طرف نہیں دیکھا۔"

"اب ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ وہ سامنے گاڑی میں ایک نہایت معزز نظر آنے والے شخص کے ساتھ برقعے میں آرام سے بیٹھی مغویہ ہی جا رہی ہے" وہ ہنس کر بولی "وہ تو شاید منتظر ہوں گے کہ میں پورے میک اپ کے ساتھ، چہرہ کھولے انہیں کہیں نظر آؤں گی اور کوئی میرا ہاتھ پکڑے ان کے قریب جا کر کہے گا 'جناب! میں مشہور فلم اسٹار ستارہ کو اغوا کر کے لے جا رہا ہوں۔ آپ اگر اسے بازیاب کرنے کی کوشش کرنا چاہتے ہیں تو براہِ مہربانی جلدی کر لیجئے' یا پھر شاید ان کے ذہن میں یہ ہو کہ کوئی گاڑی سڑک سے گزرے گی جس میں سے "بچاؤ بچاؤ" کی چیخیں بلند ہو رہی ہوں گی۔ وہ اس کا تعاقب کریں گے۔ گولیوں کا تبادلہ ہو گا۔ بدمعاش مارے جائیں گے، فرار ہونے میں کامیاب ہو جائیں گے یا گرفتاری پیش کر دیں گے اور میں پچھلی سیٹوں کے نیچے رسیوں سے بندھی ہوئی انہیں مل جاؤں گی۔"

پھر وہ سنجیدگی سے بولی "ویسے بھی تم خود ہی سوچو اب وہ ٹریفک کے اس سیلاب میں ہر گاڑی کو روک کر اندر جھانک جھانک کر تفصیلی تلاشی تو نہیں لے سکتے۔ ابھی اگر وہ دو چار گاڑیوں کو ہی روک لیں تو دو میل لمبی لائن لگ جائے گی اور پھر شہری ہی شور مچانے لگیں گے کہ پولیس نے ان کا ناک میں دم کر دیا ہے۔ اخباروں میں ان کے خلاف خبریں اور اداریے آ جائیں گے۔ اسی لئے وہ لوگ جال لے کر کھڑے رہتے ہیں اور وقفے وقفے سے ٹریفک کے اس سمندر میں ڈال دیتے ہیں۔ کبھی کبھار واقعی کوئی مچھلی ہاتھ آ جاتی ہے تو اسے وہ افسران اور عوام کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔"

"اور جو غیر ضروری کچھوے مینڈک وغیرہ پھنستے رہتے ہیں انہیں وہ تھوڑی بہت کھینچا تانی اور نذرانے وغیرہ کی کارروائی کے بعد دوبارہ اس سمندر میں چھوڑ دیتے ہیں" میں نے کہا "ویسے مجھے اطلاع ملی ہے کہ شہر سے باہر جانے والے راستوں پر واقعی سختی سے چیکنگ ہو رہی ہے۔ معلوم نہیں کیوں انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ تمہیں شہر سے باہر لے جانے کی کوشش کی جائے گی۔"

"شاید ان کا خیال ہو کہ اتنے بڑے شہر میں مجھے چھپانے کی کوئی معقول جگہ موجود نہیں ہو گی۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولی۔

"میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اسے اغواء برائے تاوان ہی کی واردات سمجھا ہے اور ایسی وارداتوں میں عموماً شکار کو دور دراز شہروں یا علاقہ غیر میں لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے پولیس کی کارروائی بھی اپنی جگہ درست ہے" میں نے کہا۔ اس وقت ہم راوی چوک کے قریب پہنچنے والے تھے لیکن اس سے پہلے ہی میں نے گاڑی واپس شہر کی طرف موڑلی۔

"میں تو بڑا خوش ہو رہی تھی کہ شاید تم نے کسی دوسرے شہر جانے کا پروگرام بنا لیا ہے۔ اب تو واقعی چند دن کے لئے لاہور سے کہیں دور جانے کو دل چاہ رہا ہے" ستارہ بولی۔

"یہ بڑا اچھا وقت ہے لاہور سے باہر جانے کا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نے تو گاڑی اس لئے واپس موڑی ہے کہ راوی چوک پر میری اطلاع کے مطابق پولیس ابھی تک گاڑیوں کی چیکنگ کر رہی ہے۔ خواہ مخواہ جا کر پنگا لینے کی کیا ضرورت ہے۔ کہیں وہ مجھے ہی تمہارے اغوا کے الزام میں نہ دھر لیں۔"

"اتنے مسکین مت بنا کرو۔ تمہیں کون کسی الزام میں دھر سکتا ہے" وہ نقاب کی اوٹ سے شریر نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "ویسے بھی بھلا کس پولیس آفیسر کی جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ایک پردہ نشین خاتون کو نقاب الٹنے کے لئے کہے۔ میں تو ہنگامہ کھڑا کر دوں گی۔"

اس وقت تک مجھے اطمینان ہو چکا تھا کہ ہمارے پیچھے آنے والی گاڑیوں میں کوئی بھی مشکوک نہیں ہے۔ تب میں نے جسم کو ذرا ڈھیلا چھوڑتے ہوئے سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا کر کہا "تم بالکل... پُرسکون اور تازہ دم نظر آ رہی ہو۔ لگتا ہے انہوں نے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی؟"

"نہیں۔ دشمنوں کا رویّہ دوستوں سے زیادہ اچھا تھا۔ انسان کو زیادہ تکلیفیں تو دوستوں سے پہنچتی ہیں" وہ بولی۔

"زیادہ فلسفہ مت جھاڑو۔ ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ کیا واقعی انہوں نے تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی؟ کسی قسم کی سختی کا مظاہرہ نہیں کیا؟"

"ہرگز نہیں۔ ان کا رویّہ میرے ساتھ بالکل ایسا ہی تھا جیسے میں ان کی بہت معزز مہمان ہوں۔ بلکہ میں ہی ان کو پریشان کرتی رہی۔ چیختی چلاتی رہی۔ ان سے پوچھتی رہی کہ آخر وہ کون ہیں اور

مجھے کیوں اٹھالائے ہیں لیکن وہ بالکل گونگے بہرے بنے رہے۔ رات انہوں نے غالباً مجھے چائے وغیرہ میں کوئی خواب آور دوا دے دی تھی کیوں کہ رات میں جتنی گہری نیند سوئی ہوں اتنی گہری نیند مجھے برسوں سے نہیں آئی اور میں چوں کہ خواب آور دواؤں کی عادی نہیں ہوں اس لئے ہلکا سا ڈوز بھی مجھ پر بہت اثر کرتا ہے۔"

"مجھے مختصراً ذرا اپنی روداد سناؤ تو سہی' کیا ہوا تھا.... کس طرح ہوا تھا اور ان لوگوں کی تحویل میں تم پر کیا گزری؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے اغوا کی تفصیل تو اخبارات میں درست چھپی ہے۔ گاڑی اسٹوڈیو سے چند فرلانگ ہی دور پہنچی تھی جب اس گاڑی نے ہمارا راستہ روکا۔ تین آدمی گنیں لئے نیچے اترے تھے جب کہ ڈرائیور گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ میرے ڈرائیور نے گارڈز سے بھی پہلے جرأت کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی۔ اس کے پاس بھی ریوالور تھا۔ اس نے تیزی سے اترتے ہوئے پوزیشن لینے اور فائر کرنے کی کوشش کی لیکن وہ لوگ اس قسم کے کاموں میں نہایت ماہر اور مشاق معلوم ہوتے تھے۔ ذرا بھی نروس نہیں ہوئے تھے۔ بڑے سکون اور اطمینان سے وہ گویا کوئی معمولی کام کررہے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور کو گولی نہیں ماری۔ نہایت پھرتی سے اس کا ریوالور چھین لیا اور اس کی کنپٹی پر گن مار کر اسے صرف بے ہوش کیا۔"

"تم نے اس دوران کوئی چیخ وپکار وغیرہ نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنے آپ کو بڑی پُراعتماد اور باوقار ظاہر کرنے کی کوشش میں خاموش رہی۔ بعد میں جب میں چیخی چلائی تب کون سا کوئی فائدہ ہوا۔ وہاں کون سا کوئی سننے والا تھا۔ اگر ہوتا بھی تو کوئی کیا کرلیتا۔ اسلحہ برداروں کے سامنے نہتے لوگ بے چارے کیا کرسکتے تھے۔ اب وہ خواہ مخواہ آگے آکر تو اپنے آپ کو چھلنی کروانے سے رہے۔ اسی لئے تو اسلحے کے بل پر لوگ بھرے پُرے بازاروں میں واردات کرکے فرار ہوجاتے ہیں۔ ان کے پاس تو اتنی خطرناک گنیں تھیں۔ ایک کے پاس تو غالباً ہلکی مشین گن بھی تھی۔"

"تمہارے گارڈز غالباً خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ نہیں کرسکے ہوں گے؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"اپنی سی پھرتی تو انہوں نے دکھائی۔ بے چارے جان پر تو کھیل گئے" ستارہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "بلکہ اگر وہ فرض شناسی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش نہ کرتے تو شاید ان کی جانیں بچ جاتیں۔ اغوا کرنے والے یقیناً نہایت پُرامن انداز میں' بغیر کسی خونریزی کے اپنا کام کرنا چاہتے تھے لیکن گارڈز نے یہی سوچا ہوگا کہ اگر ان کے ہوتے ہوئے بھی میں ذرا سی بھی مزاحمت کے بغیر اغوا ہوگئی تو ان کو ملازم رکھنے کا بھلا کیا جواز رہے گا۔ اس لئے ان بے چاروں نے گولی چلانے میں پہل کی اور اسی لمحے مارے گئے۔"

"ان میں سے ایک بچ گیا ہے" میں نے اسے بتایا۔

"مجھے اتنا افسوس ہورہا ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے انہیں ڈھیر ہوتے دیکھا۔ میں اپنے آپ کو مجرم محسوس کررہی ہوں۔ شکر ہے ان میں سے ایک تو بچ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا دوسرے کی موت کی تلافی میں کس طرح کروں گی۔"

"یہ تمہاری ذمہ داری تو نہیں ہے۔ بعض کاموں کی نوعیت ہی ایسی ہوتی ہے۔ ان میں زندگی کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا۔ یہ بات ان لوگوں کو خود بھی معلوم ہوتی ہے" میں نے کہا "لیکن ہم جیسے لوگ در حقیقت اندر سے بہت حساس ہوتے ہیں اس قسم کے واقعات پر اپنی اخلاقی سی ذمے داری محسوس کرتے ہیں۔"

"ہاں۔ اسی اخلاقی سی ذمے داری ہی کا تو مسئلہ ہے" وہ بولی "اس کا ایک ہی طریقہ نظر آتا ہے۔ روپیا پیسا انسانی زندگی کا نعم البدل تو نہیں ہوسکتا۔ کم از کم اس کے لواحقین کے لئے تو ہرگز نہیں ہوسکتا۔ پھر بھی میں اس کی فیملی کے لئے کچھ کرنے کی کوشش کروں گی۔ ویسے وہ دونوں بیمہ شدہ تو تھے ہی۔"

"میں بھی یہی مشورہ دینے والا تھا" میں نے کہا "لیکن فوری طور پر تو ان کی فیملی کو کچھ دینے دلانے کی کوشش مت کرنا۔ ابھی ان کا زخم تازہ ہوگا۔ اس قسم کی باتیں بھی بری لگیں گی۔ کچھ دن ٹھہر کر ان کے لئے کچھ کرنا۔ ان کی کچھ اشک شوئی ہوجائے گی" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "اصل بات درمیان میں ہی رہ گئی گارڈز کے ڈھیر ہونے کے بعد کیا ہوا؟"

"میں بدحواس ہوگئی تھی۔ چیخ وپکار کرنے لگی تھی لیکن ان میں سے کسی نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا اور نہایت آسانی سے انہوں نے مجھے اٹھا کر اپنی گاڑی میں ڈال لیا۔ پھر ایک آدمی نے عین میری ناک کی نیچے انگور جتنی کوئی شفاف سی چیز انگلیوں سے کرنمتھے سے انڈے کی طرح توڑ دی۔ کسی کیمیکل جیسی تیز سی بو میری ناک میں گھسی اور چند ہی سیکنڈ بعد میں دنیا مافیہا سے بے خبر ہوچکی تھی۔ آنکھ کھلی تو میں ایک بیڈ روم میں تھی۔ وہاں سازوسامان بہت ہی کم تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں وہ بہت ہی عالی شان مکان کا کمرا معلوم ہورہا تھا۔ کچھ عجیب خواب ناک سا ماحول تھا وہاں کا۔"

"کوئی اور تھا وہاں؟" میں نے اپنی بے تابی کو چھپاتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ بہت دیر تک تو کوئی بھی میرے پاس نہیں آیا۔ میں نے کمرے سے نکلنے کی کوشش کی تو دروازہ مقفل تھا۔ عجیب بات تھی کہ اپنی تمام تر پریشانی کے باوجود میں وہاں اپنے آپ کو بہت پُرسکون محسوس کررہی تھی۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے یہ اس کمرے کی فضا کی تاثیر تھی۔ وہاں کوئی عجیب سی بات تھی ضرور۔ جیسے ہوا میں کسی مسکن دوا کا اسپرے کردیا گیا ہو اور وہ ہر سانس کے ساتھ جسم میں جا کر رگ وپے میں سکون اور فرحت کی لہریں دوڑا رہی ہو۔"

"اس وقت تمہارے موڈ پر رومانویت اور تخیل پرستی کا غلبہ ہوگا" میں نے اسے چھیڑا۔

"ہاں۔ حالات بہت خوش کن تھے نا" وہ جل کر بولی' "رومانویت کے تو سیلاب میں بہتی جارہی تھی میں۔"

"اچھا خیر.... جلومت۔ اس کے بعد کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" وہ طویل سانس لے کر بولی "میں ایک معذور مہمان کی طرح وہاں پڑی رہی۔ کافی دیر بعد ایک سفید فام عورت اور پھر ایک سفید فام مرد کمرے میں آئے۔ بعد میں بھی بس انہی سے ملاقات رہی۔ انہوں نے ہی میری ہر ضرورت کا خیال رکھا۔ وہ صاف اُردو بولتے تھے۔ مجھے انگریزی کچھ زیادہ نہیں آتی.... لیکن گزارے لائق بول لیتی ہوں۔ میں نے جب ان سے انگریزی میں بات کرنے کی کوشش کی تب بھی انہوں نے اُردو میں ہی جواب دیا۔"

"کیا کہہ رہے تھے وہ؟" میں نے دریافت کیا۔

"کوئی خاص بات تو نہیں کی انہوں نے۔ بس وہ گویا میری ضروریات کا خیال رکھنے کے لئے وہاں موجود تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد بس کچھ اسی قسم کی مؤدبانہ گزارشات کرتے رہتے تھے۔ "میڈم! یہ کھا لیجئے.... وہ پی لیجئے.... اب آپ آرام کیجئے.... کیا آپ کوئی کتاب پڑھنا پسند کریں گی؟ وغیرہ وغیرہ۔ جب میں ان سے کوئی سوال کرتی تو وہ گویا گونگے بہرے بن جاتے۔"

"ان کے سوا تمہارا کسی سے سامنا نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے جواب دیا "یہ احساس ضرور ہورہا تھا کہ اس جگہ دو ایک افراد اور بھی موجود ہیں لیکن میں انہیں دیکھ نہیں سکی۔"

"تمہیں اس کمرے سے نکلنے کا موقع نہیں ملا؟" میں نے دریافت کیا۔

"ملا تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں اس کمرے سے نکلی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ وہ سفید فام عورت جان بوجھ کر دروازہ غیر مقفل چھوڑ گئی تھی۔ کمرے سے نکلتے ہی میں ایک طویل راہداری میں پہنچی جہاں دودھیا سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں طرف سپاٹ دیواریں تھیں لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہورہا تھا کہ ان کے پیچھے کمرے ہیں۔ راہداری کے صرف ایک سرے پر کھلا راستہ تھا۔ اس سے گزر کر میں ایک طویل وعریض ہال میں پہنچ گئی" ایک گہری سانس لے کر وہ خاموش ہوگئی۔

"کیا ہوا؟ چپ کیوں ہوگئیں؟" میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہارے سامنے اس ہال کی منظر کشی کیسے کروں" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی "وہ بس دیکھنے کی چیز تھی۔ خواب نگر سا لگ رہا تھا۔ انگریزی کی اسپائی فلموں یا پھر سائنس فکشن فلموں میں اس سے کچھ کچھ ملتے جلتے سیٹ لگے نظر آتے ہیں لیکن سیٹ تو بہرحال سیٹ ہی ہوتے ہیں۔ کتنی بھی عمدگی سے لگائے جائیں لیکن کم از کم ہم فلم لائن کے لوگوں کو تو اندازہ ہوجاتا ہے کہ کہاں کیا چیز کس طرح لگائی گئی ہے اور اس سے فلاں تاثر کس طرح لیا جارہا ہے لیکن میرے سامنے جو کچھ تھا وہ سیٹ نہیں تھا۔ اس میں عارضی پن نہیں تھا۔ دیوار کے رنگ اتنے خوب صورت اور تصوراتی سے تھے کہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کس طرح کئے گئے ہیں اور کون سے پینٹ ہیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ اتنا بڑا' بلند وبالا چھت سے ملا ہوا ایکوریم موجود تھا جسے دیکھ کر چند لمحے کے لئے تو میں مبہوت ہوگئی۔ یوں لگتا تھا جیسے سمندر کو شفاف بنا کر' شرنک کرکے شیشے کے ایک گھر میں مقید کردیا گیا ہے۔ سمندر میں پائی جانے والی ہر مخلوق کا کم از کم ایک نمونہ وہاں ضرور موجود تھا۔ چٹانیں' رنگ برنگی مچھلیاں' جھاڑیاں' پودے۔ حتیٰ کہ ایک مگرمچھ بھی تہہ میں بیٹھا قیلولہ کررہا تھا۔ باقی ہال میں چاروں طرف بلندی سے نیچے کی طرف آتے ہوئے اور بل کھاتے ہوئے راستے سے بنے ہوئے تھے' جیسے غالباً بچوں کے کسی غیرملکی ونڈر لینڈ قسم کے تفریحی مقام پر ہوسکتے ہیں۔ پہاڑیاں' پودے' مصنوعی آبشار اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ چھت کی جگہ مصنوعی تاریک آسمان اور اس میں جھلملاتے ہوئے مصنوعی ستارے بھی تھے۔ ایکوریم کے عین قریب ایک نہایت خوب صورت شاہانہ قسم کی کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس کرسی پر صرف ایک ولن کی کمی تھی۔ ولن اور کیمرا ہوتا تو اس جگہ جتنا خوب صورت سین پکچرائز کیا جاسکتا تھا وہ شاید آج تک کسی انگریزی فلم میں بھی پیش نہ کیا گیا ہو۔"

"کہیں تم نے کوئی خواب تو نہیں دیکھا؟" میں نے یوں ہی اسے کچھ چڑانے' کچھ کریدنے کے لئے کہا۔

"مجھے معلوم تھا تم یہی کہوگے" وہ چڑ کر بولی "اسی لئے میں تو بتانا بھی نہیں چاہ رہی تھی اور میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا تھا کہ کیسے بتاؤں۔ اب بھی میں صحیح طرح سے اس کی منظر کشی نہیں کرسکی ہوں۔ وہ ایک بہت ہی خوب صورت جگہ تھی۔ میں سمجھ نہیں سکی کہ وہ کس طرح تیار کی گئی ہوگی۔"

"تمہیں اس میں مغز کھپانے کی ضرورت نہیں۔ دنیا میں نہ جانے کیا کچھ بنا ہوا ہے اور کیا کچھ بن سکتا ہے۔ مجھے تو بہت سے دوسرے سوالات پریشان کررہے ہیں" میں نے کہا "بہرحال..... وہاں کوئی موجود نہیں تھا؟"

"نہیں۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے کوئی چند لمحے پہلے ہی اس کرسی سے اٹھ کر گیا تھا اور شاید جلد ہی واپس آنے والا تھا۔ میں کئی منٹ وہاں سحرزدہ سی کھڑی رہی لیکن کوئی نہیں آیا۔ پھر میں ہمت کرکے چند قدم آگے بڑھی اور اسی لمحے وہ سفید فام عورت وہاں آن پہنچی جو کئی بار میرے کمرے میں آچکی تھی۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ مجھے وہاں نہیں آنا چاہئے تھا۔ وہ مجھے تاثر دینے کی کوشش کررہی تھی کہ اس کی غلطی سے دروازہ کھلا رہ گیا تھا اور اسی کی غلطی کی وجہ سے میں اس کی لاعلمی میں وہاں نکل آئی۔ لیکن میرے خیال میں وہ اداکاری کررہی تھی۔

اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ میں کب کمرے سے نکلی تھی۔ وہ لوگ خود چاہتے تھے کہ میں کمرے سے کچھ دیر کے لئے نکلوں۔ اِدھر اُدھر ذرا کچھ چیزیں دیکھوں۔ بے شک وہ عورت اداکاری اچھی کر رہی تھی لیکن میں خود اداکارہ ہوں۔ پہچان سکتی ہوں' کب کون اداکاری کر رہا ہے۔ انہیں اطمینان تھا کہ میں کہیں نہیں جا سکتی۔ وہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔ کم از کم مجھے تو نظر نہیں آیا تھا۔ بہرحال وہ مجھے فوراً کمرے میں واپس لے آئی۔ مجھے کھانا دیا گیا۔ اس کے بعد میں نے چائے کی فرمائش کی جسے پیتے ہی میں چاق و چوبند ہونے کے بجائے اس طرح سو گئی جیسے میں نے چائے نہیں بلکہ سیال افیون پی لی ہو۔"

ہم اس وقت تک واپس منٹو پارک کے قریب پہنچ چکے تھے اور میں نے گاڑی کی رفتار پہلے سے بھی کم کر دی تھی۔ میں بہت توجہ سے ستارہ کی بات سن رہا تھا لیکن کوئی بھی نکتہ کسی طرف رہنمائی نہیں کر رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پہلو بدلتے ہوئے بولی "صبح میں اٹھی تو عورت نے سب سے پہلے مجھے یہی خوش خبری سنائی کہ میری واپسی کے احکامات آ گئے ہیں۔ انہوں نے مجھے عمدہ قسم کا ناشتا کرایا۔ مجھے تیار ہونے کا موقع دیا۔ پھر یہ برقع لا کر مجھے دیا۔ میں برقع پہن چکی تو نہایت معذرت کے ساتھ انہوں نے میرے ہاتھ پشت پر باندھ دئے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر مجھے اس گھر سے نکال کر گاڑی میں بٹھایا گیا۔ کوئی میرے ساتھ بھی بیٹھا تھا۔ جب آنکھوں پر پٹی تھی تب بھی نقاب اسی طرح میرے چہرے پر گری ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے گاڑی میں ہم تقریباً ایک گھنٹا سفر میں رہے ہوں گے۔ پھر میرے پاس بیٹھے ہوئے شخص نے چلتی گاڑی میں ہی میرے ہاتھ کھول دئے اور آنکھوں سے پٹی بھی اتار دی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ ہم شہر کے بارونق بازاروں سے گزر رہے تھے۔ ایک جگہ گاڑی ایک لمحے کے لئے رکی تو میرے برابر بیٹھا ہوا شخص تیزی سے اتر گیا۔ صرف ڈرائیونگ سیٹ پر وہ شخص رہ گیا جس سے تم ملے تھے۔"

"تمہیں پھر بھی شور شرابا کرنے کا خیال نہیں آیا؟" میں نے پوچھا۔

"میرے خیال میں اس کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ انہوں نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ مجھے تمہارے پاس لے جا رہے ہیں اور مجھے ان کی بات پر یقین آ گیا تھا۔ اس کے علاوہ اپنے آپ کو شہر کے بارونق علاقوں سے گزرتے دیکھ کر مجھے حوصلہ ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا شور شرابا کرنے سے کہیں الٹا کام خراب ہی نہ ہو جائے۔"

"جو شخص گاڑی ڈرائیو کر کے لایا تھا اس کا نام ایڈم عرف ایڈی تھا" میں نے ستارہ کو بتایا "اصل نام کچھ اور بھی ہو سکتا ہے۔ بہرحال مجھے یہی بتایا گیا ہے۔ کیا اسے تم نے اس مکان میں نہیں دیکھا تھا جہاں تمہیں رکھا گیا تھا؟"

نہیں سنا۔"

"تمہاری اس سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" ستارہ نے جواب دیا "اسے تو جیسے معلوم ہی نہیں کہ اس کی گاڑی میں پچھلی سیٹ پر کوئی بیٹھا ہے۔"

"اس مکان کے بارے میں تمہیں قطعاً کوئی اندازہ نہیں کہ وہ کہاں واقع تھا؟" میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے پوچھا۔

"نہیں۔ میں تو اسے پوری طرح دیکھ ہی نہیں سکی۔ ایک ... روم اور دوسرے وہ ماڈرن الف لیلوی سا ہال۔ ان دو جگہوں کے علاوہ تو میں کہیں جا ہی نہیں سکی۔ میں تو صحیح طور پر یہ بھی نہیں ... سکتی کہ وہ مکان ہی تھا یا کوئی بحری جہاز تھا' اڑن طشتری تھی یا ... اور سیارے پر پائے جانے والے کسی مکان کی نقل تھی۔ کچھ عجیب ... اور چاروں طرف سے بند بند سی جگہ تھی۔ میں ابھی تک اس ... بارے میں الجھن میں ہوں۔"

"تمہیں یہ الجھن نہیں ہے کہ تمہیں اغوا کیوں کیا گیا تھا ...؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے بہت الجھن تھی۔ ان کا کوئی مطالبہ نہیں تھا ... بدتمیزی نہیں کی انہوں نے میرے ساتھ۔ تو پھر آخر مقصد کیا ... اس حرکت کی بے مقصدیت میرے لئے زیادہ الجھن کا باعث ہوئی تھی لیکن اب بات سمجھ میں آ چکی ہے" وہ بولی "میں نے ... سے قیدی کا تبادلہ ہوتے دیکھ لیا ہے۔ تم نے ان کے کسی وفادار ... اٹھا لیا ہو گا۔ وہ تمہاری وفادار کو اٹھا کر لے گئے تھے۔"

"تم نے شکوہ نہیں کیا کہ میری وجہ سے تمہیں اتنی زحمت ... اٹھانا پڑی" میں نے کہا۔

"شکوے کرنا اپنی عادت ہی نہیں ہے۔ خصوصاً تم سے ... کرنا تو اپنے آپ سے ہی شکوہ کرنے کے مترادف ہے" ... غالباً زیرِ نقاب مسکرا رہی تھی "اس سے پہلے کبھی کیا ہے شکوہ؟" وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر مایوسی سے بولی "ویسے بھی تم سے ... کرنے کا کوئی فائدہ تو ہو نہیں سکتا اس لئے اس فضول حرکت کی ... ضرورت ہے۔"

"شکر ہے تمہیں اتنی عقل تو آ گئی" میں نے ایک نظر اس ... طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کس چکر میں ہو؟ کن ... ساتھ الجھتے پھر رہے ہو؟ مجھے تو یہ کوئی بڑا چکر لگتا ہے اور خو... محسوس ہوتا ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ تم مجھے بتاتے کیوں نہیں؟"

"مجھے خود کچھ معلوم ہو تو بتاؤں۔ میں خود اس بے سروپا ... میں الجھا ہوا ہوں۔"

"پھر بھی..... کچھ تو معلوم ہو گا" اس نے اصرار کیا۔

...ف زدہ نہیں ہو کہ میری دوستی کی وجہ سے تم پر آئندہ بھی ایسی ...ئی مصیبت آ سکتی ہے؟"

"تمہیں کم از کم میری اتنی فکر تو ہے نا کہ ان کا آدمی واپس ...ے کر مجھے چھڑانے آ گئے۔ میرے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ جب تک ...تمہارے نزدیک میری اتنی اہمیت برقرار ہے تب تک میں تمہارے ...لئے خطرات مول لیتی رہوں گی۔ تم ہی نے درد دیا ہے تم ہی ...دارِ بنا۔" وہ دھیرے سے ہنسی "ویسے بھی انہوں نے اس بار مغویہ ...کے ساتھ جس شرافت' خوش خلقی اور محبت کا مظاہرہ کیا' اگر ...آئندہ بھی معاملہ ایسا ہی رہے تو میں مستقل بنیادوں پر مہینے میں ایک ...آدھ بار اغوا ہوتے رہنے کے لئے تیار رہوں۔"

"ابھی تم نے ان لوگوں کے رویوں کا ایک ہی رخ دیکھا ہے۔ ...دوسرا رخ دیکھو گی تو ان کے ہتھے چڑھنے کے بجائے مرجانے یا پھر ...ملک چھوڑ کر بھاگ جانے کو ترجیح دو گی" میں نے کہا۔

"کیا مجھے اپنے حفاظتی انتظامات بڑھانے پڑیں گے؟ پولیس کی خدمات حاصل کروں یا مزید گارڈ ملازم رکھوں..... کیا کروں؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"رشنا اب کچھ عرصہ تو پولیس والے خود ہی تمہارے گھر پر پہرہ دیں گے۔ کم از کم دو گارڈز تو اب تمہیں اپنے پرانے گارڈز کے متبادل کے طور پر رکھنے ہی پڑیں گے۔ میں اپنے دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگاتا ہوں جو تم سے دور رہتے ہوئے تمہاری حفاظت کریں گے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ ان انتظامات کا کوئی فائدہ بھی ہو گا یا نہیں۔"

"اب تو میرا بھی یہی خیال ہے۔ مجھے تو وہ لوگ کوئی جن بھوت قسم کی مخلوق لگتے ہیں۔ میں تو سوچتی ہوں اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دوں۔ جو ہو گا سو دیکھا جائے گا" وہ بولی۔

"خیر..... اب اتنا بھی مایوس یا بے نیاز ہونے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "اپنی سی احتیاطی تدابیر جاری رکھو۔ پھر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔"

"پولیس کو اب میں کیا کہانی سناؤں گی؟"

"اغواء کی بالکل کوئی عام سی کہانی گھڑ کر سنا دینا اور ہر بات سے لاعلمی ظاہر کر دینا' جو ایک طرح سے سچ بھی ہو گا" میں نے کہا۔

"وہ یہ بھی تو جاننا چاہیں گے کہ اتنی جلدی میری رہائی کیسے عمل میں آ گئی؟"

"بتا دینا کہ اس وقت اتفاق سے تمہاری تمام قیمتی جیولری اور کچھ کیش بھی تمہارے پاس تھا۔ وہ سب انہوں نے لے لیا' اس لئے چھوڑ دیا۔ تاوان کی رقم کا بندوبست کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کا بھی کام آسان ہو گیا اور تمہاری بھی جان جلدی چھوٹ گئی۔ کہانی ابھی سے ذرا اچھی طرح ذہن میں بُن لو۔ کوئی کچی بات ...

"بہت بہتر جناب!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "جو کچھ آپ فرماتے ہیں' کہہ دوں گی۔ ہمارا تو اب اللہ ہی حافظ ہے۔"

"تمہارا پہلے بھی اللہ ہی حافظ تھا اور آئندہ بھی اللہ ہی حافظ رہے گا" میں نے کہا "اللہ تو ہم سب کا حافظ ہے۔"

"اب تم فلسفی ہو رہے ہو" وہ گویا خبردار کرتے ہوئے بولی۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو "دیکھو..... اب تم ذہنی توازن کھونے لگے ہو۔"

اس وقت ہم دوبارہ داتا دربار کے موڑ پر پہنچ چکے تھے جہاں ایک طرف سڑک خم کھاتی ہوئی بھاٹی گیٹ کی طرف جا رہی تھی اور دوسری طرف ون وے کے مطابق ضلع کچہری کی جانب سے ٹریفک آ رہا تھا۔ کافی دیر پہلے ہم ادھر سے ہی گزرے تھے' اب دوبارہ وہیں پہنچ گئے تھے۔ اس جگہ سے ذرا دور ہی تھے جہاں ستارہ اور اے تن کا تبادلہ عمل میں آیا تھا۔

"دوبارہ یہاں کیوں آ گئے؟" ستارہ نے چونک کر پوچھا۔

"تمہیں دوبارہ ان کے حوالے کرنے آیا ہوں۔ اگر خوش قسمتی سے وہ لوگ نظر آ گئے تو ان سے کہوں گا' بھائی اپنی دی ہوئی چیز لے جاؤ۔ بہت کان کھاتی ہے" میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

"اتنی تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے یہیں اتار دو۔ میں خود ہی ڈھونڈ لوں گی۔" وہ بھی اپنا لہجہ جلا کٹا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "ویسے بھی اخلاق کے اعتبار سے وہ تم سے بہت بہتر معلوم ہوتے تھے۔"

"ہاں۔ ابھی تو تم نے ان کی کتابِ اخلاقیات کے صرف چند ابتدائی صفحات ہی پڑھے ہیں۔ تمہیں کچھ عرصہ اور ان کے ساتھ رہنا چاہئے تاکہ ان کے بارے میں بہتر طور پر جان سکو اور تمہاری طبیعت اچھی طرح صاف ہو سکے....."

ستارہ نے شاید اس کے جواب میں کچھ کہا تھا لیکن وہ میں نہیں سن سکا کیونکہ میری نظر سامنے جاتے ہوئے ایک تانگے پر جم کر رہ گئی تھی۔ تانگے کی تو خیر کوئی اہمیت نہیں تھی۔ تانگے تو وہاں بہت سے' دونوں طرف کی سڑکوں پر آ جا رہے تھے۔ ٹخ ٹخ کرتے ادھر سے اُدھر حسبِ مقدور رفتار سے بھاگ رہے تھے۔

اس وقت اسی قسم کی سواریوں کی وجہ سے ہماری گاڑی ٹریفک میں تقریباً پھنسی ہوئی تھی۔ دھیرے دھیرے رینگ رہی تھی۔ تانگے اپنا راستہ بناتے ہوئے زیادہ تیزی سے آگے جا رہے تھے۔ گاڑیوں کی رفتار کم تھی۔ یہ انہی علاقوں میں سے ایک علاقہ تھا جہاں پہنچ کر انسان کو احساس ہوتا تھا کہ وہ کار کے بجائے تانگے میں سفر کرے تو اس کے حق میں زیادہ اچھا رہے۔

جس تانگے نے مجھے چونکایا تھا وہ اوپر سے کھلا تھا' اس پر کینوس کی "چھت" تنی ہوئی تھی اور اس میں کوچبان کے علاوہ

قسم کی شخصیت تھی۔ اسے دیکھ کر ذہن میں پہلا خیال کسی ریٹائرڈ پہلوان ہی کا آتا تھا۔ بڑی سی پگڑی، اس کا کلف لگا طرہ، ریشمی ڈھیلا ڈھالا کرتہ، ریشمی لنگی، پیروں میں زری والے کھسے اور کندھے پر رنگ برنگا ریشمی رومال۔

پہلوان جی پچھلی سیٹ پر خوب پھیل کر بیٹھے ہوئے تھے۔ عمر ان کی یقیناً کافی تھی لیکن اس عمر میں بھی صحت قابل رشک تھی۔ چوڑا چکلا چہرہ سرخ و سپید تھا۔ موٹی موٹی سفید مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں اور غالباً تیل میں چپڑی ہوئی تھیں کیوں کہ دھوپ میں دور سے چمکتی نظر آرہی تھیں۔ بھنوؤں تک میں سفیدی غالب تھی مگر وہ اس طرح تن کر بیٹھے ہوئے تھے گویا اس وقت بھی کشتی کے لئے تیار ہوں۔

حسب عادت ان تمام جزئیات کا تو میں نے ایک ہی نظر میں جائزہ لے لیا تھا لیکن ظاہر ہے ان میں تو مجھے چونکانے والی کوئی بات نہیں تھی۔ درحقیقت جس چیز کو دیکھ کر میں اچھلتے اچھلتے رہ گیا تھا وہ پہلوان جی کی گود میں رکھا ہوا بریف کیس تھا، جو دراصل بریف کیس نہیں تھا!

پہلی نظر میں، میں اسے بریف کیس ہی سمجھا تھا لیکن کچھ عادت سی بن گئی تھی کہ میری نظر گرد و پیش کی غیر متعلقہ چیزوں کا بھی باریکی سے جائزہ لیتی رہتی تھی جس کا بعض اوقات تو مجھے احساس بھی نہیں ہوتا تھا۔ دیگر چیزوں پر سے ہوتی ہوئی جب میری نظر دوبارہ اس بریف کیس پر رکی تھی تب احساس ہوا تھا کہ وہ بریف کیس نہیں، وہی بلیک باکس تھا جس نے کچھ دن تک مجھے اور نہ جانے کتنے دوسرے لوگوں کو دیوانہ کئے رکھا تھا۔ بریف کیس سے وہ خاصی مختلف چیز تھی لیکن سرسری نظر میں اس پر بریف کیس کا گمان گزر سکتا تھا۔

تانگہ مجھ سے خاصا آگے تھا۔ بیچ میں کئی ٹھیلے، ہاتھ گاڑیاں اور نہ جانے کیا کچھ رینگ رہا تھا۔ بیک وقت کئی متضاد خیالات نے میرے ذہن پر یلغار کردی۔ سوچوں کے افق پر بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ کیا یہ محض اتفاق تھا کہ عین اس مقام پر ہی مجھے وہ بلیک باکس نظر آیا تھا جہاں تقریباً گھنٹا بھر پہلے میری ریڈ ڈاٹ والوں سے ملاقات ہوئی تھی۔ اگر یہ اتفاق تھا تو یقیناً بہت ہی عجیب اتفاق تھا۔

'کوئی بعید نہیں کہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی آدمی اب بھی آس پاس کہیں موجود ہو' میں نے سوچا اور اس خیال سے میرے خون کی گردش تیز ہوگئی۔ مگر پھر مجھے خود ہی یہ بات بعید از امکان لگی۔ ریڈ ڈاٹ کا کوئی آدمی اس بلیک باکس کو دیکھ کر حرکت میں آئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے یہ نظارہ بہت ہی عجیب لگ رہا تھا۔ جس بلیک باکس کے لئے کچھ عرصہ قبل سردھڑ کی بازی لگی ہوئی تھی اسے پہلوان جی بھرے بازار میں گھٹنوں پر رکھے ہوئے بے پروائی سے ایک ہاتھ اس پر ٹکائے تانگے کی حرکت کے ساتھ جھولتے ہوئے سے چلے جارہے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک ستم ظریفی تھی۔

میں پلک جھپکتے میں فیصلہ کرنے والا آدمی تھا لیکن اگر اس ستارہ میرے ساتھ نہ ہوتی تو شاید اب بھی میں پلک جھپکتے میں کوئی فیصلہ کرلیتا لیکن اس کی موجودگی نے مجھے الجھا کر رکھ دیا۔ تو میرا یہی جی چاہا تھا کہ گاڑی وہیں چھوڑ کر دوڑ کر پہلوان جی والے تانگے میں چڑھ جاؤں اور ان کے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ اس کے بعد ان سے بریف کیس نما بلیک باکس لینے کے لئے جو طریقہ مناسب محسوس ہو وہ اختیار کروں۔

لیکن میں یوں یکدم ستارہ کو چھوڑ کر بھاگنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی زندگی کو اب بھی کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ میرے یوں ایک دم بھاگنے سے بدحواس ہو سکتی تھی۔ کوئی الٹی سیدھی حرکت کر سکتی تھی۔ ادھر پہلوان جی یقیناً "سالم" تانگہ کرکے جارہے تھے۔ میرے یکدم ان کے تانگے پر چڑھ دوڑنے سے وہ بھی بوکھلا سکتے تھے۔ خواہ مخواہ کا کوئی تماشا لگ سکتا تھا۔ کسی خاص آدمی کی نظر اتفاق سے اس بلیک باکس کی طرف نہیں گئی تھی تو اب جا سکتی تھی۔

کیا پہلوان جی بلیک باکس کی اہمیت سے بھی آگاہ تھے؟ بظاہر یہ ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔ پہلوان جی باکس کی طرف سے چوکنے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس قبیل کے بیشتر لوگوں کی طرح وہ خوابیدگی کے سے عالم میں، اپنی ترنگ میں جارہے تھے لیکن وہ باکس کو لئے کیوں جارہے تھے؟

ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ کیا واقعی یہ وہی باکس تھا؟ کہیں اسی ساخت کا کوئی دوسرا باکس تو نہیں تھا؟ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہتا تھا کہ اس ساخت کا کوئی دوسرا باکس ملنا میں ہونا مشکل ہی تھا۔ وہ نہ جانے کب کا اور کہاں کا بنا ہوا تھا۔ شاید خاص طور پر کسی مقصد کے لئے ڈیزائن کیا گیا تھا لیکن بظاہر بالکل بے مصرف نظر آتا تھا۔ تمام تر سادگی کے باوجود اس کی ساخت میں ایک عجیب نفاست، مضبوطی اور خوب صورتی نمایاں تھی لیکن وہ چوں کہ کسی طرف سے کھلتا نہیں تھا اس لئے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کوئی اس کا کرے گا کیا؟

اتنے بہت سے خیالات نے بیک وقت میرے ذہن پر یلغار کی لیکن ایک فیصلے پر بہرحال میں پہنچ چکا تھا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا نہایت خاموشی اور سکون سے...... ماحول میں قطعاً کوئی غیر معمولی حرکت، کوئی ہلچل پیدا کئے بغیر کرنا تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے میں نے ستارہ کو بازیاب کرایا تھا۔ اگر قسمت میرا غیر معمولی طور پر ساتھ دے ہی رہی تھی تو ذرا سی بے احتیاطی سے یہ موقع... میرے ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہئے تھا۔

میں نے فوراً گاڑی ایک طرف فٹ پاتھ کے ساتھ لگائی اور کھڑکی سے سر نکال کر مڑ کر دیکھا لیکن ٹونی کی گاڑی مجھے کہیں نظر نہیں آئی۔ میں نے کھڑکی کا شیشہ چڑھا کر جلدی سے ریڈیو کا ایک [illegible] اس طرح نکالا کہ [illegible] کسی شخص کی نظر [illegible]

رابطہ قائم ہونے پر میں نے پوچھا "ٹونی! تم کہاں ہو؟"

"میں آپ سے کافی پیچھے رہ گیا ہوں سر! چوک پر ٹریفک سگنل کے اشارے کی وجہ سے ٹریفک رک گیا ہے" اس نے بتایا "لیکن موڑ تک بہرحال آپ کی گاڑی میری نظر میں رہی ہے۔ آپ اس وقت غالباً موڑ سے چند قدم ہی آگے ہوں گے۔"

"ہاں۔ لیکن تم فوراً یہاں پہنچو اور میری گاڑی کو سنبھالو۔ ستارہ کو حفاظت سے گھر پہنچانا اب تمہاری ذمے داری ہے۔ میں کچھ دیر کے لئے یہاں سے غائب ہو رہا ہوں۔ میرے بارے میں فکر مند مت ہونا۔ صرف ستارہ کی حفاظت کی فکر کرنا۔ اپنی گاڑی سردار یا حنیف خان کے حوالے کر دینا۔ سب کچھ بالکل اسی طرح رہے گا۔ ...رف میں جارہا ہوں" میں نے تیزی سے کہا۔

"اوکے سر! میں آرہا ہوں" اس نے جواب دیا اور میں نے ریڈیو واپس ڈیش بورڈ کے خفیہ خانے میں رکھ کر اسے بند کر دیا۔ اس دوران تانگہ اندرون بھاٹی گیٹ کی طرف مڑ چکا تھا لیکن اب یہ اطمینان تھا کہ وہ میری رسائی سے دور نہیں جا سکتا تھا۔ بھاٹی گیٹ کے اندر ایک ہی لمبا سا بازار تھا جو گھومتا گھامتا نہ جانے کہاں سے کہاں جاتا تھا لیکن وہ اتنا تنگ تھا اور ہر وقت وہاں اس قدر ہجوم رہتا تھا کہ مجھے امید تھی تانگہ زیادہ دور نہیں جا سکے گا۔ بڑی گاڑیوں والے تو اس بازار میں گاڑی لے کر گھسنے کا تصور بھی نہیں کرتے تھے۔

مجھے احساس ہوا کہ ستارہ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ جارحانہ سے لہجے میں وہ بولی "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"تمہیں حفاظت سے گھر پہنچوانے کی تدبیر" میں نے بظاہر نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"مجھے تمہاری حفاظت کی فکر ہے۔ تم کہاں غائب ہو رہے ہو؟ سامنے کیا دیکھ کر چونکے تھے؟ سامنے تو کسی تانگے میں کوئی ایسی حسینۂ دلنواز بھی نہیں جارہی تھی" وہ شک زدہ لہجے میں بولی۔ ایک لمحے کے لئے مجھے خیال آیا کہ شاید ایسے موقع پر کسی بیوی کا لہجہ بھی ایسا ہی ہوتا۔

"حسینۂ دلنواز کو دیکھ کر تو تمہارا یہ خادم ہرگز نہ چونکتا۔ اپنی قسمت میں تو اب عجیب عجیب چیزوں کو دیکھ کر چونکنا ہی رہ گیا ہے" میں نے آہ بھر کر کہا

"پھر بھی.... کچھ پتا تو چلے" اس نے اصرار کیا۔

"یہ زیادہ باتوں کا وقت نہیں ہے" میں نے بے تابی سے مڑ کر پیچھے دیکھتے ہوئے کہا۔

"تم نے گاڑی میں یہ وائرلیس وغیرہ بھی لگائے ہوئے ہیں۔ تم آخر کیا مسٹر نائٹ بنے ہوئے ہو.... کن چکروں میں رہتے ہو تم؟" وہ الجھن زدہ سے لہجے میں بولی "میرا خیال ہے تمہارے انہی چکروں کی وجہ سے میری بھی شامت آئی ہے۔"

"ہاں" میں نے سنجیدگی سے کہا "اب بھی وقت ہے۔ تم مجھ سے اعلان لاتعلقی کردو۔ اخباروں میں بڑے بڑے اشتہار دے دو کہ میرا مسمی محمد افضل چوہدری سے کسی قسم کا اخلاقی یا غیر اخلاقی، ذہنی یا روحانی، قلبی یا جسمانی تعلق ہرگز نہیں ہے۔ ایسا سمجھنے والا اپنے نفع و نقصان کا خود ذمے دار ہوگا۔ صرف یہی نہیں بلکہ میرے نفع و نقصان کا بھی وہی ذمے دار ہوگا۔ اشتہاروں کے بل مجھے بھجوا دینا۔"

"بہت خبیث ہوتے جارہے ہو تم۔ کیا قینچی کی طرح زبان چلتی ہے۔ عورتوں کو مات کر دیتے ہو" وہ جل کر بولی "میرا یہ مطلب نہیں تھا کہ تمہاری وجہ سے اگر مجھے کوئی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے تو اس پر مجھے کوئی پچھتاوا ہے لیکن پھر بھی .... اگر تمہاری دوستی میں جان جانی ہی ہے تو کم از کم مجھے مرتے وقت معلوم تو ہونا چاہئے کہ میں کیوں مر رہی ہوں۔ پھانسی پانے والے کو بھی پتا ہوتا ہے کہ وہ کس جرم میں مر رہا ہے۔"

"جب مرنا ہی ٹھہرا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کیوں مر رہا ہے۔ اس سے کوئی منزل بدل تو نہیں جائے گی۔ پہنچو گی تو وہیں جہاں تمہیں پہنچنا ہوگا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا پھر میں نے دھیرے سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا "ویسے بے فکر رہو۔ میرا دل کہتا ہے ابھی تم نہیں مرو گی۔ زندگی بھر روز و شب کے انقلابات میں قلابازیاں کھانے والے ہم تم جیسے لوگ بہت سخت جان ہوتے ہیں۔ آسانی سے نہیں مرتے۔"

اس دوران ٹونی کی گاڑی عین میری گاڑی کے پیچھے آن رکی تھی۔ سردار شیخ اس کے ساتھ تھا۔ میں گاڑی سے اتر گیا اور ٹونی میری جگہ اسٹیئرنگ وہیل پر آ بیٹھا۔

"کوئی خاص انسٹرکشن سر....؟" اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی نہیں۔ بس ستارہ کو حفاظت سے گھر پہنچانا ہے اور اس کی حفاظت کا کوئی مستقل بندوبست بھی کرنا ہے۔ باقی باتیں پھر ہوں گی" میں نے تیزی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے معلوم تھا ٹونی مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کا وقت نہیں تھا۔ اس نے آنے میں پہلے ہی کچھ دیر کردی تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تانگہ خاصا آگے نکل گیا ہوگا۔ شاید لمبے لمبے ڈگ بھرنے کے بجائے مجھے دوڑنا ہی پڑے لیکن گاڑی پھر بھی میں اندر لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ ٹونی کی گاڑی بھی بڑی تھی اور میری اس سے بھی بڑی۔ اس قسم کی گاڑیوں کا اندرون بھاٹی کے بے ہنگم ٹریفک میں پھنسنا لازمی تھا۔ ایسی جگہوں پر.... تانگہ بڑے آرام سے بھیڑ کو چیرتا، اپنا راستہ بناتا زیادہ تیزی سے نکل جاتا تھا۔ تانگہ چیز ہی کچھ ایسی تھی کہ لوگ اسے دیکھ کر، سہم کر خود ہی راستہ چھوڑ دیتے تھے۔

برسوں پہلے میں کبھی بھاٹی کے علاقے سے گزرا تھا۔ اس کے بعد عجیب اتفاق رہا کہ اس شہر میں رہتے ہوئے برسوں گزر گئے تھے

لیکن ادھر سے کبھی گزر نہیں ہوا تھا۔ میں بھاٹی کے تاریخی اور بلند و بالا دروازے کے نیچے سے گزر کر مین بازار میں داخل ہوا تو جغرافیہ اب بھی وہی نظر آیا لیکن بھیڑ بھاڑ پہلے سے زیادہ محسوس ہوئی۔

تاحدِ نظر ایک رواں دواں ہجوم تھا لیکن اس میں وہ تانگہ نہیں تھا جس میں پہلوان جی تشریف فرما تھے۔ آگے دو تین تانگے ادھر اُدھر کو لچکتے لہراتے جا رہے تھے لیکن ان میں پہلوان جی کے بجائے پردے دار خواتین موجود تھیں۔ سواریوں کے بوجھ اور بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے تانگے میری توقع کے مطابق رینگ ہی رہے تھے۔ اس کے باوجود پہلوان جی والا تانگہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس وقت مجھے ایک سائیکل کی اشد ضرورت محسوس ہوئی ...جس پر میں مسلسل گھنٹی بجاتا' تیزی سے لہراتا اور سرکس کے سے کرتب دکھاتا لوگوں اور ریڑھی تانگوں وغیرہ کے درمیان سے گزرتا آگے چلا جاتا اور بہت دور تک مطلوبہ تانگے کو تلاش کرنے کی کوشش کرتا لیکن فی الحال چوں کہ سائیکل میسر نہیں تھی اس لئے میں نے اپنے ٹانگوں سے ہی سائیکل کا کام لینے کی کوشش کی اور بہت تیزی سے اگلے تانگے تک جا پہنچا۔ اس سے آگے دور دور تک کوئی تانگہ نہیں تھا اور نہ ہی کہیں پہلوان جی کی موجودگی کے کوئی آثار تھے۔

میں نے چند لمحے میں ہی دنیا کی بھیڑ میں پہلوان جی کو کھو دیا تھا۔ مجھے اپنے آپ پر غصہ بھی آیا۔ ستارہ کی زیادہ سے زیادہ حفاظت کی فکر میں پڑ کر میں نے کچھ قیمتی وقت ضائع کر دیا تھا۔ مجھے بے حد حیرت ہو رہی تھی۔ تانگے کو اندرون بھاٹی گیٹ کی طرف مڑتے دیکھ کر مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ اتنی بھیڑ بھاڑ میں تو وہ کہیں غائب ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن میرا اندازہ غلط ہو گیا تھا۔ قسمت جب غچا دیتی ہے تو اسی طرح چھوٹی چھوٹی اور تقریباً انہونی سی باتیں سامنے آتی ہیں۔

مجھے کچھ عجیب سا تو لگا لیکن میرے خیال میں ایک کوشش کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ دو چار دُکانداروں سے پوچھ لینا چاہئے۔ بازار میں دونوں طرف کھولیوں سے مشابہ دُکانوں کی قطاریں تھیں۔ کوئی بڑی تھی' کوئی چھوٹی۔ کوئی تہ خانے کی طرح تھوڑی سی زمین میں اتری ہوئی تھی اور کوئی گویا چبوترے پر قائم تھی۔ کوئی سڑک کے کنارے سے اندر کو گھسی ہوئی تھی اور کوئی باہر آدھی سڑک تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس وقت کاروبار میں "تیزی کا رجحان" تھا۔ بیشتر دُکاندار مصروف تھے۔ ایک دُکان دار ذرا فارغ نظر آیا تو میں نے اس کے قریب رک کر پوچھا "بھائی صاحب! آپ نے چند منٹ پہلے یہاں سے تانگے میں ایک پہلوان جی کو تو گزرتے نہیں دیکھا....."

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "باؤجی! ادھر سے تو دن میں کوئی ساٹھ ستر پہلوان گزرتے ہیں۔ آپ کس پہلوان جی کی بات کر رہے ہیں؟"

وہ نوجوان تھا۔ ذرا تیز و طرار بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ دل تو چاہا کہ ایک ہاتھ رسید کر کے وہیں لٹا دوں لیکن اس وقت مجھے ... تھا۔ نہایت تحمل سے میں نے پہلوان جی کا حلیہ بیان کیا اور کہا ابھی چند منٹ پہلے ہی یہاں سے گزرے ہوں گے۔ میں سمجھا شاید آپ کی نظر پڑی ہو....."

"فرض کریں نظر پڑی بھی ہو" وہ ذرا شکی سی نظر سے سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "آپ جاننا کیا چاہتے ہیں؟"

"ان کا نام پتا.... کوئی ٹھکانہ وغیرہ؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"جب آپ ان کو جانتے ہی نہیں تو پھر اس طرح انہیں ... پر دیکھ کر ان کے پیچھے کیوں بھاگے چلے آئے ہیں؟" اس نے ... چباتے ہوئے اپنی چھوٹی چھوٹی سرمہ بھری آنکھوں سے مجھے گھورا۔ اس کی پان سگریٹ اور بوتلوں وغیرہ ہی کی دُکان تھی۔ عام طور پر میں نے دیکھا تھا کہ پان سگریٹ بیچنے والے خود پان نہیں کھاتے تھے اور نہ ہی سگریٹ پیتے تھے لیکن اس نوجوان کے منہ کی حالت بتا رہی تھی کہ شاید اتنے پان وہ بیچتا نہیں تھا جتنے کھا جاتا تھا۔

میں نے سرد نگاہوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا "... والی سرکار! تمہیں تو کہیں سی آئی ڈی وغیرہ میں ہونا چاہئے تھا۔ بدقسمتی کی بات ہے کہ یہاں بیٹھے پان سگریٹ بیچ رہے ہو۔"

اس نے کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا لیکن میں نے ایک لمحہ اسے گھورا اور اس کا منہ دوبارہ بند ہو گیا۔ کوئی لفظ برآمد نہیں ہوا۔ میری خاموش نظر نے اسے بتا دیا تھا کہ اس کے حق میں کیا ... تھا۔ میں آگے بڑھ گیا۔

ذرا آگے مجھے ایک اور دُکاندار فارغ نظر آیا۔ وہ ذرا بڑی عمر کا تھا اور قدرے معقول آدمی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ایک بار قسمت آزمائی کر ڈالی۔ وہ میری توقع سے زیادہ معقول آدمی ثابت ہوا۔ میری پوری بات سننے کے بعد بولا "میں سمجھ گیا باؤجی! آپ خلیفہ نواز پری پیکر کو پوچھ رہے ہیں" اس نے گویا کوئی پہیلی بوجھ ...

"پری پیکر.....؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔ میری نظر میں پہلوان جی کا لمبا چوڑا سراپا گھوم گیا۔ خصوصاً وہ نمایاں اور گول توند جو اُن کے لمبے چوڑے ریشمی کرتے میں تانگے کی حرکت کے ساتھ تھل تھل کرتی نظر آئی تھی اور اس کے ساتھ پری پیکر کا لقب.....!

"ہاں جی.... ان کا نام یہی ہے" دکاندار غالباً اس نام اور لقب کا اتنا عادی تھا کہ اسے اس میں کوئی تضاد یا ستم ظریفی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ وہ سنجیدگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آپ سمجھ رہے ہیں کہ وہ یہاں سے گزرے ہوں گے۔ وہ بازار کے شروع میں ہی اتر گئے ہوں گے۔ کیوں کہ وہیں ان کا اکھاڑہ ہے۔ اصل رونق تو وہاں شام کو ہی لگتی ہے لیکن صبح بھی ان کے ... بیٹھے آتے ہیں....."

مجھے اس کی بات زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوئی۔ تبھی مجھے تانگہ بازار میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ غالباً بازار کے شروع میں ہی پہلوان جی کو اتار کر وہیں سے گھوم کر لوہاری کی طرف چلا گیا تھا اور موڑ کی وجہ سے مجھے نظر نہیں آیا تھا لیکن مجھے تو بازار کے شروع میں کوئی اکھاڑہ بھی نظر نہیں آیا تھا۔ تو پھر پہلوان جی کہاں غائب ہو گئے تھے؟ ان گلی کوچوں میں کسی اکھاڑے کی موجودگی کا تصور بھی میرے لئے خاصا حیران کن تھا۔ یہاں..... جہاں سڑکیں اور گلیاں سُرنگوں سے مشابہ تھیں اور مکان اوپر نیچے بنے ہوئے غاروں کی طرح دکھائی دیتے تھے..... کیا واقعی یہاں کوئی اکھاڑہ بھی ہو سکتا تھا؟

دُکاندار نے مجھے اکھاڑے کا محل وقوع سمجھایا اور میں اس کا شکریہ ادا کر کے واپس روانہ ہوا۔ بازار کے پہلے سرے پر گیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا' بازار کی ایک شاخ کی طرح ایک چھوٹی گلی بھی ترچھے رُخ اندر کی طرف جاتی دکھائی دے رہی تھی۔ دُکان دار نے مجھے اسی گلی میں جانے کے لئے کہا تھا۔ تانگہ اس گلی میں نہیں جا سکتا تھا' اس لئے وہ یقیناً اس کے سرے پر اتر گئے ہوں گے۔ میں اپنی جھونک میں سیدھا بازار میں تقریباً دوڑا چلا گیا تھا۔ اس امکان کی طرف میرا ذہن نہیں گیا تھا۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ دُکان دار نے میری ٹھیک ہی رہنمائی کی تھی۔ وہ جسے خلیفہ نواز پری پیکر کہہ رہا تھا یقیناً وہی میرا مطلوبہ آدمی تھا۔

گلی شیطان کی آنت کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ میں دُکان دار کی ہدایت کے مطابق دائیں بائیں بڑھتا ہوا آخر کار اس نیچی اور شکستہ سی چار دیواری تک جا پہنچا جو دُکان دار کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق اکھاڑہ تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ درحقیقت وہ چند چھوٹے چھوٹے مکانوں پر مشتمل کوئی کٹڑی تھی۔ مکان سب کے سب منہدم ہو چکے تھے۔ بیشتر ملبہ نکالا جا چکا تھا۔ صرف مٹی رہ گئی تھی جس کا اونچا سا چبوترا بن گیا تھا اردگرد نیم شکستہ چار دیواری تھی۔ اسی مٹی کا ایک حصہ نرم کر کے اکھاڑہ بنا لیا گیا تھا۔ پیچھے دو تین چھپر نما کمرے تھے۔ ایک حصے میں باڈی بلڈنگ کا سامان بھی بکھرا ہوا تھا۔ ایک کونے میں ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ گھڑونچی پر تین چار گھڑے رکھے تھے۔ ایک چھپر میں اکھاڑے کے دوسرے لوازمات بکھرے ہوئے تھے۔

نرم مٹی پر چند نوجوان اپنی اپنی جان بنانے کی جدوجہد میں مصروف تھے۔ دو تین آپس میں زور آزمائی کر رہے تھے۔ کوئی ڈنڈ پیل رہا تھا۔ فی الحال ان کے جسموں میں پٹھے کم اور پسلیاں زیادہ نمایاں تھیں۔ صرف امید کی جا سکتی تھی کہ اگر وہ اسی لگن اور شوق سے پہلوانی میں جُتے رہے تو شاید آگے چل کر کوئی قابلِ دید چیز نکل آئیں۔ صرف ایک نوجوان جاندار دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا قد بھی چھ فٹ سے اوپر تھا۔ مٹی میں لتھڑے ہوئے اس ... صورت اور سرخ و سپید جسم سے طاقت جھلکتی محسوس ہو رہی تھی۔

چار دیواری ایک جگہ سے بالکل ہی ٹوٹی ہوئی تھی۔ یہی گویا اکھاڑے کا دروازہ تھا۔ اسی جگہ دیوار پر مجھے ایک بورڈ بھی آویزاں نظر آیا جو سالہا سال سے موسم کی سختیاں اور نہ جانے کن کن لوگوں کی چیرہ دستیاں سہہ سہہ کر سیاہ پڑ چکا تھا لیکن اس پر دھندلے دُھندلے سے کچھ نقوش کا سراغ مل رہا تھا۔ ٹیڑھے ٹیڑھے الفاظ میں لکھا تھا "اکھاڑہ خلیفہ نواز پری پیکر" نیچے لکھا تھا' ملک کے نوجوانو! آؤ اور تھوڑے ہی عرصے میں بغیر کسی فیس اور چندے کے ملک کے قابلِ فخر نوجوان بن جاؤ۔"

اس جملے کے پیچھے ایک مخلصانہ سی پکار پنہاں محسوس ہوتی تھی' اس میں پورے ملک کے نوجوانوں کو دعوتِ عام دے دی گئی تھی لیکن میرا خیال ہے بھاٹی کے اس بازار سے باہر کسی کو اس اکھاڑے کی موجودگی کا علم تک نہیں تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بیشتر مقامات پر جذبات اور خدمات کی بے قدری کا یہی عالم تھا۔

اسی بورڈ پر ایک طرف کو موٹی موٹی مونچھوں والے ایک پہلوان کی دُھندلی سی تصویر تھی جس کے جسم پر صرف ایک لنگوٹ اور کندھے پر ایک گرز موجود تھا۔ عین ممکن تھا کہ پینٹر نے یہ خلیفہ نواز پری پیکر کی جوانی کے زمانے میں ان کی تصویر بنانے کی کوشش کی ہو لیکن درحقیقت یہ تصویر کم اور کارٹون زیادہ تھا۔

میں نے اندر پہنچ کر' ذرا طاقتور نظر آنے والے نوجوان سے پوچھا "خلیفہ جی کہاں ہیں؟" میں نے اپنے سرسری لہجے سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں خلیفہ جی کو جانتا تھا۔ اس نے میرا سرتاپا جائزہ لیا اور بے نیازی سے پیچھے موجود ایک کوٹھری کی طرف اشارہ کر دیا جس کے دروازے پر چق پڑی ہوئی تھی۔

چق اٹھا کر میں اندر پہنچا تو کوٹھری کا منظر مجھے خاصا حیران کن سا دکھائی دیا۔ دیواروں پر مقدس مقامات کی تصویریں اور طغرے وغیرہ آویزاں تھے۔ کچے فرش پر ایک طرف اینٹوں پر صاف ستھری صراحی اور مٹی کا کٹورا رکھا تھا۔ اگر بتی کی بوجھل خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور ایک کونے میں چٹائی پر پہلوان جی بیٹھے غالباً جو کی روٹی بڑے انہماک سے توڑ توڑ کر کھا رہے تھے اور ساتھ چھاچھ کے گھونٹ بھر رہے تھے۔

ان کے گول مٹول' پھولے پھولے سے چہرے پر بلا کی معصومیت تھی۔ وہ کسی گہرے خیال میں تھے۔ کئی لمحے تک تو انہیں میری آمد کی خبر ہی نہ ہوئی۔ پھر یک لخت انہوں نے چونک کر سر اٹھا کر دیکھا۔ یہ دیکھ کر میں نے اطمینان کی سانس لی کہ خلیفہ نواز پری پیکر وہی پہلوان جی تھے جنہیں میں نے تانگے میں دیکھا تھا۔ صرف یہی نہیں' چٹائی پر ایک طرف کو وہ بلیک باکس بھی رکھا تھا جو کسی مقناطیس کی طرح مجھے کھینچ کر یہاں تک لایا تھا۔ چٹائی پر دوسری طرف جاءِ نماز بچھی ہوئی تھی۔ اس کے آگے رحل میں قرآن پاک رکھا تھا اور پاس ہی موٹی سی تسبیح رکھی ہوئی تھی۔

وہ کسی خلیفہ یا پہلوان کا ٹھکانہ نہیں' کسی درویش کا حجرہ معلوم

باتیں کسی اور دنیا کی باتیں لگ رہی ہیں۔"

"ہاں برخوردار! اس زمانے میں یہ کسی اور ہی دنیا کی باتیں لگتی ہیں" وہ افسردگی سے مسکرائے "لیکن بات یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں ہر قدم پر ایک نئی دنیا آباد ہے" وہ کبھی مجھے برخوردار کہہ کر مخاطب کرنے لگتے تھے اور کبھی باؤ جی کہہ کر۔ کبھی "آپ" کا صیغہ استعمال کرتے تھے اور کبھی "تم" کا لیکن ان کے لہجے میں رنگ اپنائیت اور بے تکلفی کا ہی محسوس ہوتا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ میں نے بلیک باکس کے بارے میں ملکیت کا دعویٰ تو کردیا تھا لیکن اگر پہلوان جی نے تسلی کے لئے پوچھ لیا کہ اس کے اندر کیا ہے اور کیا اس کی کوئی چابی وغیرہ میرے پاس ہے' تو میں کیا جواب دوں گا؟ میں تو نشانی کے طور پر اس کے اندر کے بارے میں کوئی بات نہیں بتا سکتا تھا لیکن اس وقت میں نے اطمینان کی گہری سانس لی جب پہلوان جی نے باکس اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ لو باؤ جی اپنی امانت۔"

شاید میرے معززانہ حلیے کی وجہ سے انہوں نے زیادہ گہرائی میں جائے بغیر ہی میری بات کا اعتبار کرلیا تھا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کس طرح تشکر کا اظہار کروں۔ میرے پاس اس وقت زیادہ کیش نہیں تھا۔ بریف کیس گاڑی میں ہی رہ گیا تھا۔ تاہم میں نے ادھر اُدھر کی جیبوں کو کھنگال کر تقریباً دو ہزار روپے یکجا کئے اور مؤدبانہ انداز میں ان کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا "خلیفہ جی! آپ سے مل کر طبیعت خوش ہوگئی ہے۔ آپ جیسے لوگ دنیا میں بہت کم یاب ہوتے جارہے ہیں۔ اس وقت میری جیبوں میں زیادہ رقم نہیں ہے ورنہ اس اکھاڑے کی خدمت کے لئے ضرور کچھ پیش کرتا لیکن خیر.... میں اسی شہر میں ہوں۔ زندگی رہی تو اب آپ سے ضرور رابطہ رہے گا اور آپ کے نیک مقصد کے سلسلے میں مجھ سے جو بھی خدمت ہوسکی' ضرور کروں گا لیکن فی الحال یہ حقیر سی رقم صرف ایک اچھا سا بریف کیس خریدنے کے لئے رکھ لیجئے۔"

انہوں نے روپے لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ خاموشی سے ایک ٹک میری طرف دیکھتے رہے۔ نہ جانے پہلوان جی کا ذہن اس وقت کس ٹریک پر بہہ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا "آپ کے شوق کے بارے میں سن کر بڑی خوشی ہوئی پہلوان جی! واقعی بریف کیس صرف دفتری بابوؤں کے ہاتھ میں ہی ہونا ضروری نہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ بریف کیس کے ساتھ ایک اپنے خالص دیسی پہلوان کی پرسنیلٹی کیسی لگتی ہے۔ آئندہ جب آپ سے ملاقات ہو تو میں آپ کے ہاتھ میں ایک خوب صورت سا بریف کیس دیکھنا چاہتا ہوں۔"

پہلوان جی نے کوئی جواب نہ دیا۔ میرے ہاتھ میں موجود نوٹوں میں سے صرف پچاس کا ایک نوٹ کھینچ لیا۔ نہایت ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں وہ بولے "میں نے ٹیکے کباڑیے کو بس اتنے ہی روپے دئے تھے۔ وہ میں لے لیتا ہوں۔ آپ اپنی یہ باقی رقم جیب میں ہی رکھ لیں۔ میں نے عرض کیا نا کہ میں تحفے تحائف نہیں لیا کرتا ہوں۔ بس یہ میری زندگی کا اصول ہے۔ چاہے آپ اسے اچھا سمجھیں یا برا۔"

"لیکن ..... خلیفہ جی!" میں نے قدرے خفت سے کہا "تحفے تحائف تو بڑے بڑے بزرگ اور اولیاء تک قبول فرماتے رہے ہیں۔"

"بزرگوں اور اولیاء کی مثالیں ہم جیسے گناہ گاروں کے دور میں نہ دیا کریں باؤ جی!" وہ تیزی سے بولے "وہ زمانے اور تھے وہ باتیں اور تھیں۔ انہیں تو پتا ہوتا تھا تحفہ کہاں سے آرہا ہے۔ کس کمائی سے آرہا ہے۔ کس نیت سے آرہا ہے۔ پھر بھی وہ تحفہ اپنے لئے نہیں' حاجت مندوں میں تقسیم کرنے کے لئے لیتے تھے۔ ہم تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے رشوتوں کو بھی تحفے تحائف کا نام دے رکھا ہے۔ عام طور پر ہم تحفہ محبت بڑھانے کے لئے نہیں' کسی کا احسان اتارنے کے لئے' کسی کو خوش کرنے کے لئے یا کسی سے کام نکالنے کے لئے دیتے ہیں۔"

میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ سیدھا سادا دیہاتی سا پہلوان اتنی گہری باتیں کرنے کی اہلیت رکھتا ہوگا۔ میں نے اپنا ہاتھ پیچھے لاتے ہوئے کہا "پہلوان جی! دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ میں نے تو آپ کی باتوں سے خوش ہو کر ذرا یہ اپنے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی۔ کوئی اور طریقہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ خیر... فی الحال میں آپ کی بات کا قائل ہوجاتا ہوں۔ میں اس وقت کا انتظار کروں گا' جب آپ مجھے جاننے لگیں گے۔ میرے خلوص پر اعتبار کرنے لگیں گے اور میرے کسی تحفے کے پیچھے آپ کو کوئی غرض نظر نہیں آئے گی۔"

"اللہ کرے ایسا ہی ہو" انہوں نے پچاس کا نوٹ نہایت حفاظت سے واسکٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ انداز سے ظاہر تھا کہ ان کی نظر میں وہ پچاس کا نوٹ بہت اہمیت اور قیمتی لیکن باقی رقم بالکل حقیر تھی۔

بلیک باکس میں نے گود میں رکھ لیا تھا۔ اب وہ مجھے مل گیا تھا تو کچھ زیادہ اہم نہیں لگ رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "خلیفہ جی! میں اب آپ سے جو بات کرنے لگا ہوں اس کا تعلق نہ آپ کی ذات سے ہے اور نہ میری ذات سے۔ اس لئے مجھے امید ہے کہ کم از کم اس کے سلسلے میں آپ انکار نہیں کریں گے۔ اس کا تعلق صرف ایک عظیم اور تعمیری مقصد سے ہے۔ جس کے لئے آپ زندگی وقف کئے ہوئے ہیں۔"

"میں نے تو اب اپنی زندگی صرف یاد اللہ کے لئے وقف کردی ہے باؤ جی!" وہ انگلی سے اوپر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔

"لیکن قوم کے نوجوانوں کی ذہنی اور جسمانی تعمیر و ترقی کے لئے جدوجہد کرنا بھی تو آپ کی زندگی کا مقصد ہے" میں نے انہیں یاد دلایا۔

"ہاں۔ وہ میری زندگی کا دوسرا بڑا مقصد ہے" انہوں نے تسلیم کیا "لیکن پہلے یاد اللہ۔ اس کے بعد اور کچھ۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ میں تو یہ عرض کررہا تھا کہ آپ کو جگہ کا مسئلہ درپیش ہے۔ صرف اس وجہ سے اکھاڑہ ختم نہیں ہونا چاہئے۔ میرے پاس اندرون شہر تو کوئی پراپرٹی نہیں ہے لیکن ارد گرد کے اچھے اور فیشن ایبل رہائشی علاقوں میں کچھ پلاٹس وغیرہ پڑے ہیں۔ مختلف مقاصد کے لئے ..... اور بعض صرف انوسٹمنٹ کے خیال سے لئے گئے تھے۔ ان میں سے دو تین تو خاصے بڑے ہیں۔ ان میں سے اگر آپ کوئی پسند کرلیں تو وہاں اکھاڑہ قائم کیا جا سکتا ہے۔"

نہ جانے کیوں پہلوان جی استہزائیہ سے انداز میں ہنس دئے' جیسے میں ان سے مذاق کررہا ہوں۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولے "نوجوان تو شہر کے اس مرکزی علاقے میں ہی مشکل سے آتے ہیں جہاں سواری وغیرہ کا اتنا مسئلہ نہیں ہے اور ان علاقوں میں پھر بھی پہلوانی وغیرہ کا شوق بھی پایا جاتا ہے۔ اس کے باوجود اکھاڑوں میں اتنی رونق نہیں ہوتی جتنی میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ دور دراز کے علاقوں میں کون آئے گا اور جن لوگوں کی ان علاقوں میں رہائش ہے انہیں ذرا اس قسم کے شوق کم ہی ہوتے ہیں۔ بہت تیر مارتے ہیں تو ٹیبل ٹینس کھیل لیتے ہیں۔"

"شوق ہوتے نہیں ہیں' پیدا کئے جاتے ہیں پہلوان جی! اکھاڑہ کہیں بھی چل سکتا ہے۔ آپ کو تھوڑے سے ماڈرن طور طریقے اختیار کرنے پڑیں گے۔ میں آپ کو مدد کے لئے ایک آدمی دوں گا جو آپ کی ماتحتی میں کام کرے گا۔ آپ صرف سرپرستی کیجئے گا' وہ آپ کو ماڈرن طور طریقوں کے ساتھ اکھاڑہ چلا کردے گا۔ چلیں.... اگر آپ اندرون شہر ہی رہنا چاہتے ہیں تو انہی علاقوں میں اگر کوئی مناسب خالی پلاٹ مل جائے وہ دیکھ لیں۔ میں خرید دیتا ہوں۔ آپ اس پر ایک نئی روح' ایک نئی جدوجہد کے ساتھ اکھاڑہ چلائیں۔ ساز و سامان بھی نیا خریدیں۔ اکھاڑے میں ضروری چیزیں بھی تعمیر کرائیں۔"

"اور یہ سارے خرچ آپ برداشت کریں گے؟" پہلوان جی نے عجیب سی نظروں سے مجھے گھورا۔

"جی ہاں" میں نے بلا تامل جواب دیا۔

"آپ کو معلوم ہے شہری علاقوں میں پراپرٹی کی کیا قیمت ہے؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔ بے شک میں نے یہاں کبھی جائیداد خریدنے کی ضرورت محسوس نہیں کی لیکن میں بزنس مین ہوں۔ مجھے چیزوں کی قیمتوں کا اندازہ ہے" میں نے جواب دیا۔

"کیا کاروبار ہے آپ کا؟" وہ اب کچھ متجسس دکھائی دے رہا تھا۔

میں نے انہیں مختصراً اپنے کاروبار کے بارے میں بتایا۔ جتنا میرا کاروبار پھیلا ہوا تھا اسی مناسبت سے ان کی آنکھیں پھیل گئیں مگر جتنی تیزی سے پھیلی تھیں اتنی ہی تیزی سے سکڑ بھی گئیں۔ وہ ایک زبردست معاملہ فہم کے سے انداز میں مجھے گھورتے ہوئے بولے "باؤ جی! جب آپ لاکھوں روپے خرچ کرکے ہماری مدد کریں گے تو کل کو یقیناً آپ کو بھی ہماری مدد کی ضرورت پڑ جائے گی۔ کبھی آپ کے کسی کارخانے میں ہڑتال ہوجائے گی اور یونین والوں کو سیدھا کرنے کے لئے آپ کو بندوں کی ضرورت ہوگی۔ کبھی آپ کو روپے پیسے کے لین دین پر کوئی جھگڑا نمٹانا ہوگا۔ کسی کو سیدھا کرنا ہوگا۔ کہیں رعب شوب ڈالنا ہوگا۔ ان سارے کاموں کے لئے آپ کو بندوں کی ضرورت ہوگی۔ ظاہر ہے آپ مجھے بلاوا بھیجا کریں گے کہ اتنے پہلوان لے کر آجایئے۔ بہت سے اکھاڑوں پر یہی دھندے ہوتے ہیں لیکن میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ خلیفہ نواز پری پیکر نے کبھی اس طرح کے کام نہیں کئے۔"

مجھے ان کی بات پر غصہ آنے کے بجائے ہنسی آگئی۔ میں نے ملائمت سے کہا "خلیفہ جی! آپ واقعی خاصے پرانے وقتوں میں زندگی گزار رہے ہیں۔ زمانہ بہت بدل گیا ہے۔ اب اس قسم کے کام دست بازو کے زور سے نہیں گولی اور صاحب اختیار لوگوں کی پشت پناہی سے ہوتے ہیں۔ ایک انچ کی گولی چھ فٹ کے پہلوان سے زیادہ طاقت ور ہوتی ہے اور علاقے کے ایس ایچ او کے منہ سے نکلا ہوا ایک جملہ کسی خلیفہ کی برسوں کی ریاضت پر بھاری ہوتا ہے۔"

پہلوان جی ذرا ہوشیاروں والے انداز میں مسکرائے "میں اتنا بھی پرانے خیالات کا آدمی نہیں ہوں باؤ جی! مجھے بہت اچھی طرح پتا ہے آج کل کے زمانے میں کہاں کیا ہورہا ہے۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ گولی پہلوان سے زیادہ طاقت ور ہے اور گولی چلانے کے لئے پہلوان ہونا ضروری نہیں لیکن پھر بھی .... اگر بندے کی جان ذرا اچھی ہو تو اس کے ہاتھ میں بندوق کی بھی ایک الگ ہی شان ہوتی ہے۔ آتشیں اسلحہ بھی ذرا دو آتشہ سا ہوجاتا ہے۔ جان دار آدمی کا تو ذرا ٹھکا ہی الگ ہوتا ہے نا باؤ جی! چھاتی چوڑی ہو اور ہاتھ میں بندوق بھی ہو تو بندوق بھی زیادہ طاقت ور دکھائی دیتی ہے اور چھاتی بھی۔ اسی لئے تو جرائم پیشہ لوگ پہلوانوں کو اپنی لائن پر لگانے کی زیادہ کوشش کرتے ہیں۔ پہلوان میں جان ہوتی ہے تو وہ خالی ہاتھ بھی برا وقت گزار جاتا ہے۔ پولیس کی سختیاں بھی سہہ لیتا ہے۔"

ایک بار پھر مجھے قائل ہونا پڑا۔ پہلوان جی کا یہ مشاہدہ درست تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے "آپ نے شاید دیکھا نہیں کہ جس پہلوان نے زندگی میں کبھی کشتی نہیں جیتی ہوتی وہ کن ٹٹا جب بدمعاش بنتا ہے تو اچھا بھلا ٹھکا جمالیتا ہے۔ اس لئے ہتھیار چاہے جتنے بھی آجائیں لیکن بے جگرے اور جاندار آدمی کی

شان بہرحال قائم رہے گی۔"

"میں آپ کی بات مانتا ہوں خلیفہ جی!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "لیکن مختصراً بس میں اتنا ہی وعدہ کر سکتا ہوں کہ اگر میں کبھی اپنے کسی ذاتی کام کے سلسلے میں آپ کے پاس مدد کے لئے آیا تو آپ کو اختیار ہوگا کہ مجھے گولی ماردیں' اکھاڑے کے سارے پہلوانوں کو میری تکا بوٹی کرنے کے لئے چھوڑ دیں یا کوئی بھی اور سزا جو آپ چاہیں دے لیں۔ یہ بات میں اشٹامپ پیپر پر لکھ کر دینے کے لئے تیار ہوں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنا وزیٹنگ کارڈ میں نے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس پر میرا ایڈریس وغیرہ موجود ہے۔ اگر میری بات آپ کے دل کو لگے تو جگہ وغیرہ تلاش کرلیں۔ میں کوئی آدمی آپ کے ساتھ کردوں گا جو آپ کی سرپرستی میں سارے کام کرے گا۔ مجھے امید ہے کہ ہم مل کر ایک بہت اچھا اکھاڑہ قائم کرنے میں کامیاب ہوجائیں گے اور ایک دن شہر میں اس کی دھوم ہوگی۔"

خلیفہ جی کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے چمک سی نمودار ہوئی مگر فوراً ہی معدوم ہوگئی۔ تاہم انہوں نے میرا کارڈ لے کر اسی طرح احتیاط سے واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا جس طرح کچھ دیر پہلے پچاس کا نوٹ رکھا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے "باؤجی! مجھے آپ کے چہرے پر سچائی کی روشنی تو نظر آرہی ہے اور میرا دل بھی کہہ رہا ہے کہ آپ کے ساتھ مل کر میں کوئی بڑا کام اچھے طریقے سے انجام دے سکتا ہوں لیکن فی الحال میں آپ سے کوئی وعدہ نہیں کررہا۔ میں دو ایک دن سوچوں گا۔ اگر میرا دل مانا تو آکر آپ سے ملاقات کروں گا۔ اگر مجھے آنا ہوا تو بس دو چار دن کے اندر اندر آجاؤں گا ورنہ سمجھ لیجئے گا کہ خلیفہ نواز پری پیکر بڑا کام کرنے کی ہمت نہیں کرسکا اور زندگی کے باقی دن بھی وہ اسی طرح کسی کونے کھدرے میں' اپنی کھال میں مست رہ کر گزارے گا۔"

"بہرحال میں کچھ نہ کچھ عرصہ ضرور آپ کا انتظار کروں گا" میں نے کہا اور بلیک باکس کو ایک پرانے اخبار میں لپیٹ کر بغل میں دبا کر روانہ ہونے لگا تو خلیفہ جی نے اٹھ کر مجھے گرم جوشی سے گلے لگایا۔ ان کے بازوؤں میں واقعی جان تھی اور سینہ لوہے کے ڈرم کی طرح مضبوط تھا۔

گلے ملنے کے بعد وہ گویا غیرارادی طور پر میرے بازو ٹٹولتے ہوئے بولے "میں تو پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آپ کی حیثیت چاہے جو کچھ بھی ہے لیکن آپ کو کسرت اور باڈی بلڈنگ وغیرہ کا شوق ضرور ہے اور خاصا زبردست شوق ہے۔ تبھی تو آپ اتنی دلچسپی سے میری باتیں سن رہے تھے اور اکھاڑہ قائم کرنے کے لئے اتنی فراخ دلی سے کام لے رہے ہیں ورنہ آج کل کون ہم جیسے لوگوں کی باتیں سنتا ہے ور کون اس قسم کے کاموں میں دلچسپی لیتا ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے "آپ یقیناً باقاعدہ طور پر کسی اکھاڑے میں جاتے ہیں۔ کون سے اکھاڑے میں جاتے ہیں؟"

مجھے ہنسی آگئی "خلیفہ جی! آپ نے خود ہی تو کہا تھا..... اور سچ کہا تھا کہ ان کاموں کے لئے وقت کہاں ہے لوگوں کے پاس۔ میرے پاس بھی نہیں ہے۔ بس گھر پر ہی صبح کو کچھ دیر کی سخت ورزش کو معمول بنا رکھا ہے۔"

"لیکن تھوڑی دیر کی ورزشوں سے یہ بات پیدا نہیں ہوسکتی" وہ بے یقینی سے بولے اور اپنی بے تکلفی کی معافی چاہتے ہوئے ایک بار پھر انہوں نے مجھے یوں ٹٹولا جیسے قصاب بکرا خریدنے سے پہلے اسے ٹٹولتے ہیں۔

"بس..... جو کچھ بھی ہے زیادہ تر قدرتی طور پر اسی طرح ہے" میں نے کہا

خلیفہ جی میری پیشانی پر نظر جماتے ہوئے بڑبڑانے کے سے انداز میں بولے "قسمت آپ پر بہت مہربان ہے باؤجی! میں نے بہت کم لوگوں پر قسمت کو اس طرح مہربان دیکھا ہے۔"

"ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ قسمت مجھ پر جتنی مہربان ہے اس کے لئے میں خدا کا شکر ادا نہیں کرسکتا۔ میں ہر اعتبار سے خوش قسمت ہوں" میں نے صدق دل سے کہا اور خلیفہ جی سے اجازت طلب کی۔ وہ مجھے چھوڑنے گلی کے موڑ تک آئے۔

گیٹ سے نکلتے ہی مین روڈ پر مجھے ٹیکسی مل گئی اور میں سیدھا گھر آگیا۔ تمام راستے میں اس طرح چوکنا رہا جیسے میری بغل میں کوئی خزانہ دبا ہوا ہے اور بہت سی طاقتیں اسے مجھ سے چھیننے کے لئے کوشاں ہیں۔

گھر پہنچ کر میں نے فون پر ٹونی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ابھی گھر نہیں پہنچا تھا اور نہ ہی اپنے دفتر میں تھا۔ تب میں نے ٹرانسیٹر پر اس سے رابطہ قائم کیا۔ وہ اس وقت گاڑی میں تھا اور اپنے دفتر جانے کے ارادے سے محو سفر تھا کیوں کہ وہ کئی دن سے دفتر نہیں جاسکا تھا' کام وغیرہ کی طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔ وہ میرے گروپ آف کمپنیز ہی کے ایک یونٹ کو چلاتا تھا۔

اس نے بتایا کہ وہ ستارہ کو اس کے گھر پہنچا چکا تھا۔ دور رہ کر اس کی حفاظت کے لئے اس نے دو آدمیوں کی ڈیوٹی بھی لگادی تھی۔ آفاق علی کو فون بھی کردیا تھا کہ وہ پریس اور پولیس کے سامنے ستارہ کی واپسی کے معاملے کو ہینڈل کرے۔

"بالکل ٹھیک" میں نے طمانیت سے کہا "لیکن اب تم آفس جانے کے بجائے میرے ہاں آجاؤ۔ ایک ضروری کام تمہارے سپرد کرنا ہے۔"

وہ میرے گھر سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا' جلد ہی آگیا۔ میں نے بلیک باکس گتے کے ایک ڈبے میں پیک کرواکر اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا "مجھے نہیں معلوم کہ یہ ریڈ ڈاٹ والوں کے لئے کیوں اہم ہے لیکن اتنا مجھے اندازہ ہوچکا ہے کہ اس کے لئے وہ کسی کو... بھی قتل کرنے سے دریغ نہیں کریں گے۔ اس لئے اس کے بارے میں بھی الرٹ رہنا اور اپنے بارے میں بھی۔ میرے خیال میں فی الحال تو انہیں علم نہیں ہے کہ یہ ہمارے پاس پہنچ چکا ہے لیکن بعض باتیں نہایت پُراسرار اور عجیب و غریب انداز میں انہیں معلوم ہوجاتی ہیں اس لئے بہت زیادہ چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔"

ٹونی نے خاموشی سے اثبات میں سرہلانے پر اکتفا کیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں نے بغور اس کا جائزہ لیا ہے۔ یہ دھات سیاہ رنگ کی اِن فورسڈ اسٹیل معلوم ہوتی ہے۔ باکس کے چاروں طرف جو بال جیسی باریک ایک لکیری نظر آرہی ہے' میرا خیال ہے یہی اس کا جوڑ یا پھر اس کے کھلنے کی جگہ ہے لیکن اس کے بارے میں ایک اطلاع یہ بھی ہے کہ غلط طریقے سے کھولنے کی کوشش پر یہ دھماکے سے پھٹ بھی سکتا ہے۔ اس لئے تمام تر احتیاط ضروری ہے لیکن اسے کھولنا بھی بہرحال ضروری ہے۔ ہمارا انجینئر رفیق الیکٹرونکس اور دھماکا خیز اشیاء کا ماہر ہے۔ اسے کھولنے کا کام اس کے سپرد کرو اور اس میں سے جو کچھ بھی برآمد ہو وہ لے کر فوراً میرے پاس پہنچو۔ اپنے آدمیوں میں سے مزید جس کی بھی مدد کی ضرورت ہو' حاصل کرلو تاہم اسے کھولنے میں جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ پہلی چیز احتیاط ہے۔ کسی کی جان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہئے۔"

"اوکے سر!" وہ کارٹن لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے جانے کے بعد میں آفس جانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے مترنم سی "ہیلو" سن کر تمام الجھے الجھے سے خیالات گویا یک لخت ہی میرے ذہن سے نکل گئے۔ وہ راحیلہ تھی۔

میری آواز پہچاننے کے بعد وہ بولی "حضور والا! کیا آپ کو یاد ہے کہ آپ کراچی میں دو غریبوں کو ہجرت کا حکم دے کر آئے تھے؟ میرا خیال ہے لاہور پہنچتے ہی یہ بات آپ کے ذہن سے نکل گئی ہوگی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا "میں تو یہاں تمہاری اور ارشد کی آمد کے انتظار میں گن گن کر دن گزار رہا ہوں۔"

"ارے ہاں.... میں تو بھول ہی گئی تھی۔ میرے تو ٹیلی فون کی گھنٹی دن رات بجتی رہتی ہے۔ تم ہر وقت یہی پوچھتے رہتے ہو کہ میں کب آرہی ہوں۔ میں نے یہ بھی سنا ہے کہ تم نے لاہور کے ریلوے اسٹیشن اور ائرپورٹ پر استقبالیہ دستے بھی کھڑے کئے ہوئے ہیں کہ جیسے ہی راحیلہ بیگم تشریف لائیں ان کے لئے سرخ قالین بچھایا جائے' پھول نچھاور کئے جائیں' بینڈ بجایا جائے اور پانچ سات توپوں کی سلامی دی جائے۔ ہے نا؟"

ہیں تو نہیں لیکن یہ ایسے زیادہ مشکل بھی نہیں ہیں۔ اگر تمہیں شوق ہے کہ تمہارے لئے یہ سب کیا جائے تو کردیں گے۔ بس ذرا توپوں کا انتظام مشکل ہوگا۔ ایک آدھ توپ سے کام نہیں چلے گا؟ میرا مطلب ہے وہ جو لوئر مال کے قریب ایک چوراہے پر توپ کھڑی ہے' جسے بھنگیوں کی توپ کہتے ہیں' وہ ادھار لے لیں گے اور کچھ .....؟ کوئی اور حسرت ہے تو وہ بھی بتادو۔"

"بس..... اب تو ایک ہی حسرت ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اور وہ یہ کہ تم اسی بھنگیوں کی توپ کے آگے مجھے باندھ کر اڑا دو۔ میں اسی قابل ہوں۔"

"کیوں.... تم سے کیا جرم سرزد ہوگیا؟" میں نے مصنوعی تشویش سے پوچھا۔

"یہ کرم کیا کم ہے کہ ہم نے تمہارے حکم پر عمل درآمد میں کچھ زیادہ ہی مستعدی دکھادی" وہ بولی "تم نے ہمیں لاہور شفٹ ہونے کے لئے ایک ماہ کی مہلت دی تھی لیکن اس سے کچھ پہلے ہی یکم تاریخ آگئی اور ہم نے یہ سوچ کر استعفیٰ دے دیا کہ بات پھر مزید ایک ماہ آگے چلی جائے گی۔ بس تب سے ہم دونوں بہن بھائی گھر پر بیٹھے بور ہورہے ہیں اور تمہارے فون کا انتظار کررہے ہیں۔ آخر بے شرم بن کر خود ہی فون کرنا پڑا۔"

"واقعی.... تمہاری اس بے شرمی پر تاریخ تمہیں کبھی معاف نہیں کرے گی" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ میں واقعی بڑی سنجیدہ ہوں کہ خواہ مخواہ فون کرکے تمہارے کان کھاتی ہوں" وہ بولی۔

"سنجیدہ سے زیادہ تم مجھے رنجیدہ معلوم ہورہی ہو۔ میرے کان کوئی بھیجے کے سری پائے نہیں ہیں جنہیں تم کھانے کی کوشش کرو.... اور ہاں.... میں بھی تمہیں انتہائی سنجیدہ ہوکر آخری بار بتانے لگا ہوں کہ فون چاہے میں کروں یا تم' اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اسے انا کا مسئلہ مت بنایا کرو۔ اگر تمہیں معلوم ہوجائے کہ میں کن بکھیڑوں میں پھنسا ہوا تھا تو تم اس بات پر خدا کا شکر ادا کروگی کہ اس وقت تم میری آواز سن رہی ہو ورنہ شاید تمہیں عالم بالا میں مجھ سے رابطہ قائم کرنا پڑتا اور شاید تمہیں معلوم ہو کہ وہاں فون کے ذریعے رابطہ نہیں ہوتا۔"

وہ اپنے سارے شکوے شکایتیں بھول کر یکدم تشویش سے بولی "کیوں.... کیا ہوا تھا؟ خیریت تو ہے؟"

"بس..... جب تک تم میری آواز سنتی رہو تب تک تو یہی سمجھو کہ خیریت ہی ہے' یہ باتیں فون پر نہیں ہوسکتیں۔ یہاں آؤگی تو سب معلوم ہوجائے گا۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ سر سے کفن باندھ کر آنا۔ بولو کیا اس کے لئے تیار ہو؟"

"بس اب ڈائیلاگ مت بولو.... اور نہ ہی مجھے بولنے پر مجبور کرو۔ مختصراً تو بتادو کہ کیا مسئلہ ہے؟" اس کے لہجے میں تشویش

"یہ مسئلے مسائل تو میری زندگی میں شامل ہو گئے ہیں ... تم فی الحال ان کا ذکر چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ کیا تم نے آنے کی سب تیاری مکمل کرلی ہے؟"

"ہاں۔ لیکن سامان کا سمجھ میں نہیں آرہا کیا کریں۔ کس طرح ساتھ لائیں؟" اس کے لہجے میں بلا کی معصومیت تھی۔ اس معصومیت بھری تشویش پر مجھے ہنسی آگئی۔

"ارے دفع کرو ساز و سامان کو" میں نے کہا "تمہارا خیال ہے کہ لاہور میں فرنیچر اور ضرورت کی دوسری چیزیں نہیں ملتیں؟ یہ اتنا بڑا شہر ان چیزوں کے بغیر ہی آباد ہے؟ پورے پورے امپورٹیڈ بیڈ روم سیٹ تک ملتے ہیں یہاں اور تمہیں ان چیزوں کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تمہیں ایک چھوٹی سی فرنشڈ کوٹھی ملے گی یہاں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی چیز' کہیں سے بھی منگوانا چاہو گی' آجائے گی۔"

"نوازشات کا بوجھ اتنا مت بڑھاؤ کہ ابتدا میں ہی میری ننھی سی جان پس کر رہ جائے۔"

"اتنی آسانی سے نہیں پس سکتی یہ ننھی سی جان۔ مجھے معلوم ہے اس ننھی سی جان میں بڑے بڑے جنات مقید ہیں" میں نے بے پروائی سے کہا "بس تم اتنا کرو کہ اپنے چند پسندیدہ ترین ملبوسات' ضروری کاغذات اور وہ چھوٹی موٹی چیزیں جو تمہیں بہت عزیز ہوں' ایک دو سوٹ کیسوں میں ڈالو اور اپنے آپ کو آنے کے لئے تیار سمجھو۔ راشد سے کہنا کہ شفیع شاہ کو فون کردے' وہ تمہارے لئے جہاز پر ریزرویشن وغیرہ کرادے گا۔ وہاں تمہارا جو بھی کوئی کام باقی ہو وہ بھی اسے بتا دینا۔ وہ کردے گا۔ تمہارا ساز و سامان کسی مستحق کو اٹھوا دے گا۔ مجھے صرف اپنی فلائٹ کے ٹائم سے مطلع کردینا۔ مابدولت بہ نفس نفیس تمہیں ریسیو کرنے کے لئے حاضر ہوں گے۔ اور کوئی مسئلہ؟"

"مسائل تو غریبوں کے لئے ہوتے ہیں جناب والا!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تمہارے سامنے مسائل کی بھلا کیا اہمیت؟ تمہارے پاس دولت کا چراغ الہ دین جو ہے۔"

"جب تمہیں "جناب والا" کے مسائل کا پتا چلے گا تو تم غریبوں کے مسائل بھول جاؤ گی" میں نے اس سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر کہا "فی الحال تم یہ امیر غریب کا موازنہ چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اندازاً تم کب تک روانہ ہو جاؤ گی؟"

"جس طرح تم نے چٹکی بجاتے میں سارا مسئلہ حل کردیا ہے اس طرح تو میں آج بھی پہنچ سکتی ہوں۔ بشرطیکہ شفیع شاہ ہمیں اگلی فلائٹ کی ٹکٹیں دلا دے" وہ بولی۔

"شفیع شاہ یہ بھی کردے گا۔ تم آنے کی ہامی تو بھرو۔ بولو آج آنے کے لئے تیار ہو؟ شفیع شاہ تمہیں آج ہی بھیج دے گا' خواہ اسے اس کے لئے جہاز چارٹر ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

"زیادہ تیز چلنے والے اوندھے منہ گر پڑتے ہیں۔ میری طرح۔"

"اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ گرنا ...... سنبھلنا۔ اٹھنا..... جھپٹنا..... یہی زندگی ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا دھیان بار بار اپنی زندگی کے دکھ دینے والے پہلوؤں کی طرف جاتا رہے۔ اس کی افسردگی میرے دل میں بھی افسردگی کی ایک لہر سی جگا دیتی تھی۔ مجھے گزرے زمانے یاد آنے لگتے تھے' جنہیں میں یاد کرنا نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال ایک خوش آئند بات یہ تھی کہ اب جب کہ راحیلہ نے لاہور آنے کا فیصلہ کرلیا تھا تو یقیناً وہ اس پر جلد از جلد عمل درآمد کے لئے بے چین تھی لیکن زبان سے اقرار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مردانگی کی اپنی ایک انا ہوتی ہے اور نسوانیت کی اپنی ایک انا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "ٹھیک ہے..... پھر میں دو تین روز کے اندر اندر ہی پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میں تمہیں فون کروں گی..... اور میرا خیال ہے اب میں فون بند کرتی ہوں۔ اس مہینے کے کوٹے میں اتنی ہی فضول خرچی کافی ہے۔"

"جب سے تم بقول تمہارے "غریب" ہوئی ہو تب سے بہت زیادہ کنجوس نہیں ہو گئیں؟"

"شکر کرو میں تو غریب ہونے کے بعد ہی کنجوس ہوئی ہوں۔ غریب ہونے کے بعد تو کنجوس ہونا انسان کی ضرورت بن جاتا ہے۔ لیکن بعض لوگ تو دولت کے انبار رکھتے ہوئے بھی مجھ سے سو دو سو گنا زیادہ کنجوس ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"ان کے بارے میں کوئی خیال ظاہر کرکے میں اپنے خیالات ضائع کرنا نہیں چاہتا" میں نے کہا "میں اب بے چینی سے تمہارے اس فون کال کا منتظر رہوں گا جس میں تم مجھے اپنی آمد کی اطلاع دو گی۔"

"اسی بے چینی سے جس سے تم روزانہ مجھے فون کرتے ہو؟" اس نے معصومیت سے کہا۔

"دیکھو..... تم طنز و مزاح کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتی ہو۔ یہ کوئی اچھی عادت نہیں ہے" میں نے کہا "خیر..... فی الحال خدا حافظ۔ یہاں آؤ گی تو پھر تم سے دو دو ہاتھ ہوں گے" میں نے فون بند کردیا۔

کچھ دیر آرام کرنے کے بعد میں آفس چلا گیا۔ آفس میں حسب معمول خاصی مصروفیت رہی۔ بیشتر اسٹاف کے چلے جانے کے بعد بھی میں آفس میں ہی بیٹھا تھا جب ٹونی آن پہنچا۔ کارٹن اس کی بغل میں دبا ہوا تھا۔

"کیا بلیک باکس کو کھولنے میں کامیابی نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔ ٹونی کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی دیکھ کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی تھی۔

لیکن وہ مسکراتے ہوئے بولا "ایسی تو کوئی بات نہیں ہے

...س نے اس کے بارے میں غلط معلومات دی تھیں۔"

"تمہارا مطلب ہے باکس کھل گیا ہے؟" میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے پوچھا۔

"کسی بے ڈھنگے طریقے سے کھولنا یقیناً بہت مشکل..... بلکہ شاید ناممکن ہوتا لیکن دو اعلیٰ درجے کے انجینئرز کے لئے مل کر اسے کھولنا کوئی ایسا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ بلکہ احتیاطی اقدامات میں زیادہ وقت برباد ہوا" ٹونی نے بتایا "میں خود اس کام کی نگرانی کر رہا تھا۔"

"کوئی دھماکا وغیرہ نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا

"دھماکا.....؟ سر! وہاں تو کوئی زیادہ زوردار کھٹکا بھی نہیں ہوا" ٹونی نے کارٹن میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اس میں کوئی دھماکا خیز چیز نہیں تھی۔ میرا خیال ہے کسی نے اس کے بارے میں دوسروں کو خوفزدہ رکھنے کے لئے یہ کہانی گھڑی ہوئی تھی۔ انجینئر رفیق نے الیکٹرونک آلات سے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ اس میں کوئی دھماکا خیز چیز نہیں تھی۔ بہرحال پھر بھی اس نے تمام تر احتیاطیں کی تھیں۔"

ٹونی نے باکس کارٹن سے نکالا اور میز پر میری طرف جھکتے ہوئے مجھے دکھایا۔ باکس جوں کا توں تھا۔ صرف ہینڈل کے قریب اس میں ایک چھوٹا سا نفیس قسم کا سوراخ نظر آرہا تھا۔ ٹونی نے ہینڈل کا نچلا حصہ مجھے دکھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "یہاں انسان کی نظر ویسے ہی بہت کم جاتی ہے کیوں کہ یہ فکسڈ ہینڈل ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہاں آپ کو ایک چھوٹے سے نقطے کے برابر دائرہ سا نظر آئے گا۔ یہ اس قسم کا بٹن ہے جیسا عام طور پر الیکٹرونک گھڑیوں میں ٹائم وغیرہ درست کرنے کے لئے ہوتا ہے۔ یہ درحقیقت الیکٹرونک لاک کا بٹن ہی ہے لیکن اس باکس کے بارے میں کچھ نہ جاننے والے کے لئے اسے تلاش کرنا بہت مشکل ہے۔"

میں نے کمرے کی فاضل لائٹس آن کرنے کے بعد دیکھا' تب وہ بٹن نظر آیا جو ہینڈل کی ہموار سطح پر' اسی کے ہم رنگ نقطے کی طرح تھا۔ اس کا کسی کی نظر میں آنا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ ٹونی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ایسا ہی ایک بٹن اس کے عین سامنے باکس پر موجود ہے۔ ان دونوں کو کسی نوکیلی چیز سے چند ایک مرتبہ ایک خاص ترتیب سے دبانا پڑتا ہوگا' اسے الیکٹرونک لاک کا کوڈ سسٹم سمجھ لیجئے۔ اس سے باکس نہایت آسانی سے خود بخود کھل جاتا ہوگا لیکن ہمیں چوں کہ وہ ترتیب ..... وہ کوڈ نہیں معلوم تھا اس لئے رفیق نے نہ جانے آلات سے کتنی دیر تک اسے ٹھونک بجا کر دیکھنے کے بعد عین اس جگہ سے ڈرل کیا جہاں لاک کا لیور نصب تھا اور باکس فوراً کھل گیا۔ میں اس کی مہارت کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا۔"

میں ٹونی کی زبانی رپورٹ سن کر ہی انجینئر رفیق کو داد دیئے بغیر نہیں رہ سکا تھا' وہ ہمارے اہم آدمیوں میں سے ایک تھا۔ ٹونی بولا' "یہ باکس جس شخص کا ہوگا اس کے لئے تو اس کا استعمال ایک بریف کیس ہی کی طرح آسان ہوگا..... اور درحقیقت یہ ایک زیادہ مضبوط' زیادہ محفوظ قسم کا بریف کیس ہی ہے جسے غالباً اس نکتہ نظر سے ڈیزائن کیا گیا ہے کہ اس پر کوئی حادثہ گزر جائے تب بھی اس میں موجود چیزیں محفوظ رہ سکیں۔"

ٹونی بہت کم مسکراتا تھا لیکن اس وقت میرے چہرے کی طرف بغور دیکھ کر ایک بار پھر مسکراتے ہوئے بولا "سر! اب میں سب سے اہم پہلو کی طرف آتا ہوں" اس نے بلیک باکس کو کتاب کی طرح کھولا اور وہ آسانی سے کھل گیا۔ اس میں ایک فائل رکھی تھی۔ میں نے اپنی بے تابی پر قابو رکھا اور فائل اٹھانے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔

ٹونی نے ہی فائل ہاتھ میں لے کر بلند کی اور کہا۔ "اس فائل کے علاوہ اس میں کچھ نہیں تھا۔" پھر اس نے فائل کھول کر مجھے دکھاتے ہوئے کہا "اور اس فائل میں اس ایک ورق کے سوا کچھ نہیں ہے" اس نے ورق کا کونا دو انگلیوں میں دباتے ہوئے اسے آہستگی سے پھڑپھڑایا۔

"صرف ایک ورق.....!" میں نے بے یقینی سے دہرایا اور گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا لیا۔

"یس سر! صرف ایک ورق" ٹونی نے دھیمے لہجے میں کہا اور فائل کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔ میں نے اس میں لگے ہوئے اکلوتے ورق کا جائزہ لیا۔ وہ صرف ایک طرف سے ٹائپ شدہ تھا۔ صرف اس ایک صفحے کے لئے اس قدر ہنگامہ برپا رہا تھا کہ کوئی تصور نہیں کرسکتا تھا "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" کا صحیح مفہوم آج سمجھ میں آیا تھا۔

لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کردیا۔ اگر ریڈ ڈاٹ والے اس کے لئے اتنا فکرمند تھے تو یقیناً یہ کوئی کام کی چیز تھی۔ میں نے جھک کر توجہ سے اس صفحے کو پڑھنا شروع کیا..... وہ دراصل کچھ افراد کے ناموں کی فہرست تھی۔ ہر نام کے آگے اس کا عہدہ اور محکمہ بھی لکھا ہوا تھا ان میں سے کوئی عہدہ بھی چھوٹا یا غیر اہم نہیں تھا اور محکمے بھی تقریباً سبھی اہم تھے۔ ان میں آخری نام ریٹائرڈ ڈی آئی جی احمد شجاع کا تھا جس کے ہاتھ میں' میں نے پہلی بار یہ بلیک باکس دیکھا تھا اور جس کے قبضے سے یہ نکل گیا تھا۔ میرے خیال میں تو درحقیقت اسی کے چکر میں اس کی جان چلی گئی تھی۔ وہ کار کے حادثے کا شکار ہو گیا تھا۔

اس ٹائپ شدہ فہرست کے سوا فائل میں کچھ نہیں تھا اور اس فہرست کا کوئی سرہیر نہیں تھا۔ اس پر کوئی تمہید نہیں تھی' کوئی نوٹ نہیں تھا۔ کسی بھی قسم کا کوئی مضمون نہیں تھا جس سے پتا چلتا کہ یہ فہرست کس سلسلے میں تھی' کس نے تیار کی تھی' کیوں تیار کی تھی؟ کل چوبیس افراد تھے اور ان کا تعلق سات مختلف محکموں سے تھا۔

میں کئی منٹ تک اس فہرست پر جھکا رہا۔ اس دوران ٹونی ... نہایت خاموشی اور سکون سے بیٹھا ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایک ہجوم تھا لیکن میں کسی حتمی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ آخر کار میں نے فائل بند کر کے ٹونی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "اس فہرست کی دس فوٹو اسٹیٹ کاپیاں یہیں دفتر میں تیار کرلو اور مختلف مقامات پر محفوظ کردو۔ ایک یہیں دفتر میں رکھ دیتے ہیں۔ دو تین تم اپنے ساتھ لے جاؤ اور مختلف جگہوں پر رکھ دو۔ ایک میں گھر لے جاؤں گا۔ اس طرح یہ اطمینان ہوجائے گا کہ اگر اوریجنل فہرست ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تب بھی کئی کاپیاں ہوں گی، کوئی نہ کوئی تو محفوظ رہے گی۔ ہم کوشش کریں گے کہ کبھی نہ کبھی، کسی نہ کسی طرح اس فہرست کا معما حل ہوسکے۔"

ٹونی نے اثبات میں سرہلایا۔ میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "اس وقت تک تم کم از کم اتنا تو کرو کہ ان محکموں میں فون کر کے ان لوگوں کے بارے میں جس حد تک بھی معلومات حاصل ہوسکیں وہ حاصل کر کے مجھے بتاؤ۔ ہوسکتا ہے اس طرح ہی کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔"

"ٹھیک ہے سر! اب تو دفاتر بند ہوچکے ہوں گے۔ میں کل شام تک آپ کو رپورٹ دوں گا" ٹونی نے کہا۔

تھوڑی دیر میں ٹونی اس کام سے فارغ ہو کر رخصت ہوگیا۔ چھ کاپیاں اور اصل فہرست وہ میرے پاس ہی چھوڑ گیا تھا۔ میرا تمام اسٹاف بھی رخصت ہوچکا تھا۔ بچے کھچے لوگوں کو بھی میں نے خود ہی جانے کی اجازت دے دی تھی۔ میں چوں کہ آج کل دفتر کو صحیح طور پر وقت نہیں دے پا رہا تھا اس لئے کئی فائلیں ایسی جمع ہوگئی تھیں جنہیں میرا خود دیکھنا ضروری تھا۔ میں نے سوچا تھا آج انہیں دیکھ کر اور دستخط کر کے ہی جاؤں گا کیونکہ میرا کچھ پتا نہیں ہوتا تھا کب مجھے کتنی دیر کے لئے دفتر سے غائب ہونا پڑجائے۔ گو میری عدم موجودگی سے کوئی خاص فرق تو نہیں پڑتا تھا۔ کام تو چلتا ہی رہتا تھا لیکن اپنے کاروباری حالات سے زیادہ سے زیادہ باخبر رہنے کے لئے اور اپنے اطمینان کے لئے مجھے جب بھی وقت ملتا تھا میں تمام چیزوں کو ایک نظر دیکھتا ضرور تھا۔

ذاتی خطوط کی فائل میں کئی خطوط کلپ میں لگے ہوئے تھے جنہیں کھولا ہی نہیں گیا تھا۔ کیوں کہ ان پر جلی ٹائپ میں "پرسنل" لکھا ہوا تھا۔ وہ لندن کی بزنس وومین جوڈی فوسٹر کے خطوط تھے۔ انہیں کھول کر دیکھنے اور پڑھنے میں میرا کافی وقت گزر گیا۔ خطوط ہاتھ سے لکھے ہوئے تھے، ٹائپ شدہ نہیں تھے۔ اتنی بڑی بزنس وومین نے خود بیٹھ کر ذاتی خطوط لکھنے میں نہ جانے کتنا وقت صرف کیا تھا۔ بہت لمبے لمبے خط تھے۔ سب میں یہی شکوہ تھا کہ اب صرف ہماری کمپنیوں کے درمیان کاروباری تعلق رہ گیا تھا، ذاتی تعلق کو میں نے بالکل فراموش کردیا تھا۔ وہ باتیں، وہ ملاقاتیں، وہ قربتیں، وہ انمول لمحے سب کچھ میں نے بھلا دیا تھا۔

اس نے لکھا تھا کہ "خوش قسمتی" سے اسے ایک نیا [illegible] مل گیا تھا جو میری طرح زندہ دل، گرم جوش اور مشرقی تو نہیں تھا خالص انگریز تھا لیکن وہ "قناعت" کا ثبوت دیتے ہوئے اس کے ساتھ مل کر میری جدائی کا غم غلط کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ یہ کا یہ بوائے فرینڈ کسی لارڈ کا پڑپوتا یا شاید پڑنواسا تھا۔ یہ سب اس نے بڑے "غمزدہ" اور "ہنوز مجمل" دل کے ساتھ لکھا تھا۔ ساتھ اس نے اپنی اور اس نئے بوائے فرینڈ کی تصویر بھی بھیجی جس میں وہ دونوں ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑے تھے۔

پہلے میں نے سوچا کہ اسے چند سطروں کا جواب لکھ دوں لیکن پھر ارادہ ملتوی کردیا اور تصویر سمیت تمام خطوط پھاڑ کر پرزے کرنے والی مشین میں ڈال دیئے۔ اس کے بعد میں دوبارہ بزنس سے متعلق فائلیں دیکھنے بیٹھ گیا۔ احساس ہی نہ ہوسکا کہ کب باہر رات کا اندھیرا گہرا ہوگیا۔

میں اس وقت آخری فائل دیکھ رہا تھا اور یاد کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ دفتر سے اٹھنے کے بعد مجھے کہاں جانا ہے۔ کیتھرین ہوتی تو مجھے بتادیتی کہ میری کوئی کاروباری مصروفیت تو طے نہیں ہے۔ اچانک شیشے کا زوردار چھناکا سن کر میں بری طرح چونک اٹھا اور میرے خیالات درہم برہم ہوگئے۔

شیشہ میرے اپنے کمرے کی بڑی کھڑکی کا ٹوٹا تھا۔ بڑے سائز کا نہ صرف پورا شیشہ بلکہ اس کے پیچھے لگے ہوئے بلائنڈز بھی ٹوٹ کر قالین پر آرہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ناقابل بیان پھرتی سے ایک شخص اندر آکودا۔ اس کی بغل میں سب مشین گن دبی ہوئی تھی جس کا اسٹریپ اس کے گلے میں حمائل تھا۔ اس کا حلیہ گو بالکل دیسی تھا لیکن اس کی آمد کا انداز انگریزی فلموں کے ہیرو جیسا تھا۔

وہ خاکی سے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ پیروں میں شکاریوں والے فل بوٹ تھے۔ شلوار کے پائنچے اس نے جوتوں ہی میں اڑسے ہوئے تھے۔ کھڑکی کے راستے پہلے اس کی ٹانگیں ہی اندر آئی تھیں۔ پھر اژدہے کی طرح بل کھا کر اتنی پھرتی سے باقی جسم اندر آیا کہ میں اس سے محظوظ ہوتا رہ گیا اور خطرے کا احساس مجھے ایک لمحے تاخیر سے ہوا جب وہ مجھ پر گن تان چکا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی ایک نہایت خوبصورت، نئی، چم چم کرتی گن تھی۔ غالباً جرمن تھی اور اس نے یقیناً اسی سے شیشہ توڑا تھا۔ چہرے پر اس نے اس طرح ڈھاٹا باندھا ہوا تھا کہ صرف آنکھیں نظر آرہی تھیں اور ان آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی، درندگی تھی۔ آنکھیں بتارہی تھیں کہ وہ نوجوان تھا...... اور بے حد جوشیلا نوجوان تھا۔

میں ساکت رہا۔ وہ سخت ہیجان زدہ تھا۔ میری ذرا سی حرکت سے وہ ارادتاً یا اضطراری طور پر ٹریگر دبا سکتا تھا اور اس کے ہاتھوں میں کوئی معمولی گن نہیں .... ہلکی مشین گن تھی۔ ہیجان اور اضطراب کے باعث اس کے ہاتھوں میں ہلکا سا ارتعاش تھا اور یہ ارتعاش اس کے ہاتھوں میں سب مشین گن کی موجودگی کو اور بھی خطرناک بنا رہا تھا۔

میرا آفس چوتھی منزل پر تھا۔ اس سے اوپر ایک منزل اور تھی۔ جس طرف کی کھڑکی سے وہ آیا تھا ادھر عقبی گلی تھی لیکن اس طرف سے عمارت کی ساخت ایسی نہیں تھی کہ کوئی پائپ وغیرہ کے سہارے چڑھ کر چوتھی منزل کی کھڑکی تک پہنچ سکتا۔ یہ عمارت میری اپنی تھی اور اس میں میرے دفاتر کے مختلف شعبے پھیلے ہوئے تھے۔ صرف ٹاپ فلور ایک دوسری کمپنی کے پاس کرائے پر تھا لیکن کچھ عرصہ قبل انہوں نے خالی کردیا تھا۔ میرے کچھ لوگوں کو اوپر شفٹ ہونا تھا لیکن فی الحال وہ فلور خالی ہی تھا۔ شاید وہ شخص شام کو کسی وقت وہاں جا چھپا ہو اور اب کسی طرح اوپر سے کھڑکی کے چھجے پر کودا ہو۔

میرے فلور پر بھی دفتری کمروں سے باہر ایک کشادہ لابی تھی۔ اس میں ریسپشنسٹ کے علاوہ دو مسلح گارڈز بھی بیٹھتے تھے۔ شاید یہ بات مسلح نووارد کو بھی معلوم تھی۔ اس لئے اس نے ادھر سے آنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

یہ عمارت جسے میں نے اپنا ہیڈ آفس بنایا تھا، کسی زمانے میں ایک چھوٹا سا ہوٹل تھا جو پرانا، بوسیدہ اور فلاپ ہوچکا تھا۔ میں نے عمارت خرید کر اپنے حساب سے از سر نو تعمیر کرائی تھی اور گو کہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں تھا کہ میرے دفتری ٹھکانے کو بھی خطرات لاحق ہوسکتے ہیں، اس کے باوجود میں نے عمارت کی ساخت میں سیکیورٹی وغیرہ کا خیال رکھا تھا اور حتی الامکان حفاظتی اقدامات کئے تھے۔ دفتری اوقات میں کسی غیر متعلقہ آدمی کا عمارت میں گھسنا ذرا مشکل ہی تھا لیکن اس وقت رات ہوچکی تھی۔ مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ باہر لابی میں کوئی گارڈ بھی موجود تھا یا نہیں؟ ممکن تھا کہ گارڈ موجود رہا ہو تبھی مسلح شخص سامنے دروازے سے آنے کے بجائے کھڑکی کے راستے کمرے میں کودا تھا۔

"چلو اٹھو سیٹھ سائیں!" اس نے گن کو ہلکی سی حرکت دی "تم کو میرے ساتھ چلنا ہے۔"

"کہاں؟" میں نے پرسکون لہجے میں دریافت کیا۔

"جب موت سامنے ہو تو اس قسم کے سوالات نہیں کیا کرتے" وہ جھٹکے دار لہجے میں بولا۔ پھر اس نے غیظ و غضب کا مظاہرہ کرنے کے لئے ایک کرسی کو زوردار ٹھوکر رسید کی۔ کرسی لڑھک کر دور چلی گئی۔

"چلو..... اٹھو....." وہ گرجا مگر منہ پر ڈھاٹا بندھا ہونے کی وجہ سے اس کی آواز زیادہ بارعب محسوس نہیں ہوئی۔

میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کون ہو تم؟" مجھے اس کا لہجہ کچھ شناسا محسوس ہو رہا تھا لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ آواز میں نے پہلے بھی سنی تھی یا نہیں۔

میرا خیال تھا کہ وہ میرے سوال کا جواب نہیں دے گا لیکن خلاف توقع وہ فوراً ہی گھٹی گھٹی ہوئی آواز میں بولا "میں نوروز ماچھی کا بھائی ہوں۔ ونو ماچھی....."

"اوہ....." میں نے بے اختیار گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے سر ٹکا لیا۔

وہ یکدم کچھ بھڑک کر بولا "یوں آرام سے چوڑے ہو کر مت بیٹھو سیٹھ! میرے پاس تمہارے ساتھ مذاکرات کرنے کے لئے ٹائم نہیں ہے۔ اٹھو..... میرے آگے آگے چلو..... باہر تمہارا جو گارڈ موجود ہے اس کو گن پھینکنے کا آرڈر دو۔"

"کیوں؟" میں نے ملائمت سے پوچھا "تم مجھے کیوں لینے آئے ہو؟" اب میری سمجھ میں آگیا تھا کہ مجھے اس کا لہجہ شناسا کیوں محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے لہجے میں نوروز ماچھی کے لہجے کی بڑی مشابہت تھی۔ وہی غراہٹ، وہی اتار چڑھاؤ، وہی الفاظ کی جھٹکے دار ادائیگی۔ اس کی آواز میں نوجوانی کا تیکھا پن زیادہ تھا۔ وہ یقیناً نوروز ماچھی کا چھوٹا بھائی تھا۔

"کمال ہے!" وہ زہریلے لہجے میں بولا "ہمارے سولہ آدمی مروانے اور نوروز کو موت کی منہ میں پہنچانے کے بعد تم اس کے چھوٹے بھائی سے پوچھ رہے ہو کہ وہ تمہیں لینے کیوں آیا ہے؟ تمہیں سزائے موت دینے کے لئے تو اتنا ہی کافی ہوتا کہ تم اپنے آپ کو نوروز ماچھی سے ٹکر لینے کے قابل سمجھتے لیکن تم نے تو اس کے ساتھ باقاعدہ میدان جنگ کھولا ہے مینڈا سائیں! اگر وہ مر گیا تو تمہارے ساتھ تعلق رکھنے والا کوئی بھی آدمی اس شہر میں زندہ نہیں رہے گا۔"

"مجھے تو اس کے ساتھ ٹکر لینے یا اس کے ساتھ میدانِ جنگ کھولنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ میں نے تو اس کی منحوس شکل بھی کبھی نہیں دیکھی تھی اور نہ ہی اس کا نام سنا تھا ایک دو مرتبہ اشتہاروں میں پڑھا تھا جن میں اسے زندہ یا مردہ پکڑوانے پر دس لاکھ کا انعام رکھا گیا تھا لیکن مجھے وہ بات یاد نہیں تھی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ اس کے سرپرست ملک ریاض نے مجھے مہمان کے طور پر جھانسا دے کر بلایا اور وہاں مجھ سے پچاس لاکھ تاوان لینے پر تل گئے۔"

"اگر تاوان دے دیتے تو جھگڑا اتنا تو نہ بڑھتا" وہ غرایا "روپیا جان سے زیادہ قیمتی تو نہیں ہوتا۔"

"روپیا تو واقعی جان سے زیادہ قیمتی نہیں ہوتا لیکن بات روپے کی نہیں تھی" میں نے اب بھی ملائمت سے کہا "تم لوگ اپنے آپ کو ایسا فرعون کیوں سمجھتے ہو اور خواہ مخواہ کسی کے گلے پڑجاتے ہو؟ آخر یہ کیا زبردستی ہے کہ کسی کا گلا پکڑ لیا جائے اس سے کہا جائے کہ اتنی رقم نکال دی جائے۔ میرے سامنے

ناقابلِ برداشت نہیں' یہ زبردستی ناقابلِ برداشت ہے..... اور میں چوں کہ اس زبردستی کے سامنے سر اٹھانے کی طاقت رکھتا ہوں اس لئے میں نے سر نہیں جھکایا۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"اپنے ملک میں ہر کام زبردستی ہوتا ہے مینڈا سائیں! ہم تمہارے پاس جھولی پھیلا کر نہیں آسکتا کہ ہم کو نیک کاموں کے لئے پچاس لاکھ چندہ چاہیے۔ تم دے دو۔ اچھا..... اب فالتو باتیں نہیں۔ اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔ فالتو باتوں سے ویسے بھی تمہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ بلڈنگ کو ہمارے آدمیوں نے چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔ ٹیلی فون کی تاریں ہم نے کاٹ دی ہیں۔ اگر میں تم کو لے کر زندہ یہاں سے نہیں نکل سکا تو تم بھی اس عمارت سے زندہ نہیں نکل سکو گے۔ تمہارے گن مین کو ہم نے اسی لئے نہیں مارا کہ تم وقت سے پہلے خبردار نہ ہو جاؤ۔ ہم کو اچھی طرح پتا لگ چکا ہے کہ آدمی تم خطرناک ہو لیکن تم کو ابھی اچھی طرح پتا نہیں ہے کہ ہم کتنے خطرناک ہیں۔ بے شک تم ہمارے ہی اڈے پر ہمیں ایک ہاتھ دکھا آئے تھے لیکن اس سے یہ مت سمجھ لینا کہ تم نے میدان جیت لیا ہے۔ ابھی ہمارے سب لوگ نہیں مرے ہیں۔"

"اگر تمہاری حرکتیں یہی رہیں تو وہ بھی مر جائیں گے" میں نے بے ساختہ کہا "آخر تم لوگوں کی کھوپڑی میں مغز کیوں نہیں ہے؟ تم لوگ دماغ سے کام نہیں لیتے اسی لئے کتے کی موت مرتے رہتے ہو۔"

"بکواس مت کرو اوئے!" وہ دہاڑا "ہمارے پاس تم سے زیادہ عقل ہے۔ صرف ہمارے عقل کے حساب کتاب الگ الگ ہیں۔ ہم اپنی عقل کو اپنے حساب کتاب سے استعمال کرتے ہیں اور تم اپنی عقل کو اپنے حساب کتاب سے۔ اب اٹھ جاؤ۔ مجھے تم سے اتنی لمبی بات صرف اس لئے کرنی پڑ رہی ہے کہ تم صرف ہمارے نہیں ملک ریاض کے بھی مجرم ہو اور اس نے تمہیں زندہ لانے کی قیمت دس لاکھ رکھی ہے' مُردہ لانے کی صرف پانچ لاکھ۔ میں چاہتا ہوں تمہیں زندہ ہی لے چلوں لیکن اگر تم زیادہ پاؤں رگڑو گے تو میں پانچ لاکھ پر ہی صبر کر لوں گا۔"

"میں تمہیں بیس لاکھ دیتا ہوں۔ تم مجھے ملک ریاض کا سر لا دو" میں نے کہا۔

وہ بھیڑئیے کے غرانے کے سے انداز میں ہنسا۔ یہ آواز سن کر مجھے نورو ماچھی کی ہنسی یاد آگئی۔ دونوں کے ہنسنے کے انداز میں بھی بڑی مشابہت تھی۔ اب اس کے اعصاب کا ارتعاش دور ہو چکا تھا۔ گن اس کے ہاتھ میں لرز نہیں رہی تھی' ساکت ہو چکی تھی۔

"ہم ڈاکوؤں کے تم شریف زادوں سے زیادہ پکے اصول ہیں سیٹھ سوہنا! ہم احسان فراموش نہیں ہوتے۔ ملک تعلق، قربتیں' سر تو ہم تمہیں دس کروڑ میں بھی لا کر نہیں دے سکتے" کچھ ایسا ہو گیا جیسے اسے اپنی وفاداری اور غیر متزلزل خلوص پر فخر ہو۔

"تمہارے خاندان میں کیا سبھی ڈاکو ہیں؟ کوئی شریف آدمی نہیں ہے؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"جنہیں تم شریف آدمی کہتے ہو ہماری نظر میں وہ زیادہ بڑے ڈاکو ہیں" وہ نفرت سے بولا۔

"تم مجھے زندہ لے جانے کا خطرہ کیوں مول لے رہے ہو؟ یہیں کیوں نہیں مار دیتے؟" میں نے پوچھا "وہاں لے جا کر بھی تو آخر کار تم لوگوں نے مجھے مارنا ہی ہے۔ دل میں ٹھنڈ تو تمہارے تبھی پڑے گی۔ تو پھر خواہ مخواہ معاملے کو لمبا کیوں کر رہے ہو؟"

"بات تمہاری ٹھیک ہے لیکن ہم حکم کے غلام ہیں۔ دوسرے یہ ضروری نہیں کہ تمہیں مار ہی دیا جائے۔ ہو سکتا ہے دو تین کروڑ روپیا مل جائے اور نورو زندہ بچ جائے تو تمہیں چھوڑ ہی دیا جائے۔ ملک ریاض اور نورو دونوں شاید اس بات پر مان جائیں۔ اسی لئے تو کہہ رہا ہوں' چپ چاپ میرے ساتھ چلنے میں تمہارا فائدہ ہے۔ زندگی کی تھوڑی بہت امید ہے....."

اچانک دروازے پر ایک نہایت ہی خفیف سا کھٹکا ہوا۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ میں بھی مشکل سے سن پایا تھا۔ دینو ماچھی کے ڈھاٹے نے اس کے کان بھی ڈھانپے ہوئے تھے مگر وہ مدھم سا کھٹکا اس نے سن لیا۔ سانپ کے پھنکارنے کے سے انداز میں سرگوشی میں بولا "بلڈنگ میں اس وقت تمہارے گن مین کے سوا کوئی نہیں ہے۔ وہی آیا ہوگا۔ اسے دروازے پر ہی روک دینا اور گن پھینک دینے کے لئے کہہ دینا ورنہ......" اس نے گن کو فیصلہ کن انداز میں حرکت دی اور کونے میں لگے ہوئے آرائشی پردے کے پیچھے چلا گیا۔ دو پردوں کے درمیان سے اس کی گن کی نال جھانک رہی تھی اور ایک خوں رنگ آنکھ مجھے تک رہی تھی۔ وہ کمبخت بظاہر پُرسکون ہو جانے کے بعد اندرونی طور پر ابھی تک اتنا ہیجان زدہ تھا کہ پلک بھی نہیں جھپک رہا تھا۔

میں چاہتا تو کرسی سے گرتے ہوئے اپنے کوٹ کی جیب سے مشین پسٹل نکالنے کا رسک لے سکتا تھا گُردے کی سی شکل کی وہ میز میرے لئے بہت اچھی ڈھال تھی۔ بظاہر وہ عمدہ لکڑی سے بنی ہوئی تھی لیکن لکڑی کے تختوں کے نیچے ہر جگہ اسٹیل کی موٹی تھی۔ مگر اب میں نے یہ رسک لینا ضروری نہ سمجھا۔ میز کے نیچے میرے گھٹنے کے قریب چھوٹا سا ایک بٹن موجود تھا جسے گھٹنے سے ہی میں دبا چکا تھا۔ اس بٹن کو دبانے سے گارڈ کے قریب بورڈ پر ایک بلب ہلکی سی آواز کے ساتھ روشن ہوتا تھا جو اسے خبردار کرتا تھا کہ کہاں اور کس طرح اس کی مدد کی ضرورت ہے۔

باہر کی طرف میرے کمرے کے ساتھ ہی کیترین کا کمرا تھا۔ وہ بھی خاصا کشادہ تھا۔ میرے ملاقاتیوں کو اگر کچھ دیر انتظار کرنا ہوتا تھا تو انہیں اسی کمرے میں بٹھایا جاتا تھا۔ اس کے بعد چاروں سمتوں میں کارکنوں کے کمرے وغیرہ تھے اور ان کے درمیان کراس

...صورت میں چار راہداریاں تھیں۔ ان میں سے صرف ایک ...اری سیڑھیوں اور لفٹ تک جاتی تھی۔ اسی راہداری کے ...م پر ایک بڑا سا' مضبوط اور بھاری بھرکم چوبی دروازہ تھا۔ اس ...زے سے آگے وہ لابی تھی جس میں کوئی نہ کوئی گارڈ ڈیوٹی پر تھا۔

فاصلہ خاصا تھا اور راستے میں قالین بچھے ہوئے تھے۔ قدموں ...آواز تو سنائی نہیں دے سکتی تھی لیکن میرے اندازے کے ...بق گارڈ کو میرے کمرے کے دروازے پر پہنچ جانا چاہئے تھا۔ مگر ...از بدستور بند تھا۔ وہ بڑے کشیدہ لمحے تھے۔ پردے کے عقب ...گن کی آنکھ اور اس سے اوپر دینو ماچھی کی آنکھ مجھے تک رہی ...دونوں آنکھوں میں موت کا پیغام تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ ...ے جسم کا کوئی پٹھا تک حرکت نہ کرے۔ دینو ماچھی پلک نہیں ...رہا تھا۔ کمرے میں غضب کا سکوت چھا گیا تھا۔ یہ سکوت بے شور و غل سے زیادہ اعصاب شکن تھا۔

چند منٹ کا وہ انتظار صدیوں پر محیط محسوس ہوا۔ بالآخر دینو ...ی کے اعصاب شاید جواب دے گئے۔ وہ پردے کی اوٹ سے ...آیا۔ وہ غالباً اسی نتیجے پر پہنچا تھا کہ مدھم سا جو کھٹکا اس نے سنا ...غیر اہم تھا۔ بیسیوں چیزیں اس کھٹکے کی وجہ سے ہو سکتی تھیں۔

"چلو سیٹھ.... باہر چلو....." وہ اب میز کے بالکل قریب آگیا ...را خیال ہے تمہارا گن مین وہیں بیٹھا اونگھ رہا ہوگا۔ میں ...ارے پیچھے ہوں۔ تم ہی وہاں چل کر اسے گن پھینکنے کا حکم دو۔ ہم لفٹ سے نیچے جائیں گے۔ گاڑی نیچے ایک جگہ کھڑی ہے۔"

بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اس کا خیال یہی تھا کہ میرا ...لابھی خانہ پُری کے لئے رکھا گیا کوئی عام سا گن مین ہوگا جبکہ وہ ...رے دوسرے گارڈز کی طرح سابق کمانڈو ہی تھا۔ وہ کافی عرصے ...باہر لابی میں ڈیوٹی دے رہا تھا۔ اس دوران اسے ایک مرتبہ ...ی گولی نہیں چلانا پڑی تھی لیکن اس نے ابھی تک اسی وجہ سے ...بے فکر ہو کر کم از کم ڈیوٹی کے اوقات میں اونگھنا شروع نہیں کیا ...تھا۔ اس بات کا میں نے کئی بار اطمینان کر لیا تھا۔

میں نے گہری سانس لے کر ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک ...لگاتے ہوئے کہا "بات یہ ہے دینو ماچھی..... کہ میں زندہ سلامت ...تمہارے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ میں اپنے آپ کو ...ڈاکوؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کی نسبت مر جانا بہتر سمجھتا ...ہوں بلکہ تم مجھے یہیں مار دو۔ برسٹ مار کر میرا جسم چھلنی کر دو۔ پلک جھپکنے میں موت تو آجائے گی۔ تمہارے ساتھ جا کر تو نہ جانے کس کس طرح سسکنا پڑے۔ ایسی زندگی سے موت ہی بہتر ہے۔"

پہلے اسے ذرا حیرت ہوئی "تمہیں زندگی سے پیار نہیں! آخری سانس تک زندگی کی آس رہتی ہے۔ تم اتنی جلدی آس کیسے چھوڑ رہے ہو؟"

"آس تو مجھے ہے" میں نے جواب دیا "اگر زندگی ہوئی تو جسم گولیوں سے چھلنی ہونے کے بعد بھی بچ جاؤں گا لیکن زندگی کی آس لے کر قربانی کا بکرا بن کر میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا۔"

اب حیرت کی جگہ غیظ و غضب نے لے لی۔ اس کی لال آنکھیں پچھ اور انگارہ سی ہو گئیں۔ سب مشین گن کے ٹریگر پر محتاط انداز کے بغیر انگلی کا دباؤ خطرناک ہوتا ہے اور میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی انگلی ٹریگر کو خطرناک حد تک دبا چکی تھی۔ زندگی اور موت کے درمیان شاید صرف بال برابر فاصلہ تھا لیکن اس عالم میں بھی میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ زندگی اور موت کے درمیان تو ہمیشہ ہی بال برابر فاصلہ ہوتا ہے' خواہ کسی نے آپ پر گن تان رکھی ہو یا آپ کے سر پر دستِ شفقت رکھا ہوا ہو۔

"سیٹھ....." وہ پھنکارا "یہ مت سمجھنا کہ میری دھمکیاں بس دھمکیاں ہیں۔ میں نفع نقصان پر بھی لعنت بھیج دوں گا اور ملک ریاض پر بھی۔ میری آنکھوں میں بھائی نورو کی تصویر ہے۔ آج صبح میں سیالکوٹ کے ایک پرائیویٹ اسپتال میں اس کی حالت دیکھ کر آرہا ہوں۔ وہ زندگی اور موت کے بیچ میں لٹکا ہوا ہے۔ ہم اس کو کسی بڑے اسپتال میں بھی نہیں لے جا سکتے۔ تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ میں نے ٹریگر پر اپنی انگلی کو کتنی مشکل سے روکا ہوا ہے۔"

میں اسے غضب ناک ہی دیکھنا چاہتا تھا۔ غیظ و غضب کی حالت میں انسان گرد و پیش کے بارے میں اتنا چوکنا نہیں رہتا جتنا اسے ہونا چاہئے۔ ویسے اس وقت تو وہ پہلے ہی جتنا چوکنا رہتا تب بھی شاید اسے کوئی فائدہ نہ پہنچتا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر کچھ دور کمرے کا دروازہ تقریباً اسی رفتار سے کھل رہا تھا جس رفتار سے گھڑی کی منٹ کی سوئی کھسکتی ہے۔

میں اپنے گارڈ فضل الٰہی کے تحمل کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کچھ دیر پہلے نہایت خفیف سا جو کھٹکا سنائی دیا تھا وہ تالے کی "زبان" اس کے کھانچے سے باہر آنے کا تھا۔ فضل الٰہی نے دروازے کی ناب تقریباً بے آواز طریقے سے اور نہ جانے کتنی آہستگی سے گھمائی تھی لیکن قفل جب اپنی باہر نکلی ہوئی زبان کو واپس اپنے منہ میں کھینچتا ہے تو آواز ضرور پیدا ہوتی ہے تاہم فضل الٰہی نے وہ آواز بھی پیدا نہیں ہونے دی تھی۔ بس ایک خفیف سا کھٹکا ہوا تھا جیسے ماچس کی کوئی تیلی ٹوٹ گئی ہو۔

اس کے بعد اس نے بڑا طویل انتظار کیا تھا۔ دروازے میں باہر سے اندر اور اندر سے باہر دیکھنے کے لئے دو خفیہ سوراخ موجود تھے جو میرے حفاظتی نظام کا حصہ تھے۔ فضل الٰہی تقریباً سوئی کے ناکے جتنے اس سوراخ سے دیکھ رہا تھا کہ باس کی جان کو کوئی فوری خطرہ لاحق نہیں تھا۔ تھوڑے بہت انتظار کی گنجائش موجود تھی۔ اس لئے وہ بڑے تحمل سے اپنا کام کر رہا تھا۔ دینو جب پردے کے پیچھے گیا تھا تو دروازہ ساکت تھا۔

اب دروازے میں اتنی جھری پیدا ہو چکی تھی کہ فضل الٰہی کی

سیون ایم ایم کی گن کی نال اس میں داخل ہو سکتی تھی۔ فضل الٰہی کو بس اتنی ہی جگہ درکار تھی۔ گن کی نال دروازے کی جھری میں داخل ہو چکی تھی لیکن اب مجھے یہ مدد میسر آنے پر خوشی محسوس ہونے کے بجائے خوف آرہا تھا۔ ٹریگر پر دینو ماچھی کی انگلی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھا ہوا تھا۔ اس عالم میں اگر کسی کو اچانک بے خبری میں آکر گولی لگے تو عضلات کی اضطراری حرکت کا نتیجہ دو طرح کا ہو سکتا ہے۔ ٹریگر پر انگلی کو جھٹکا لگ جانے سے گن گولیاں بھی اگل سکتی ہے اور ٹریگر سے یکدم انگلی ہٹ بھی سکتی ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے مقدر میں کیسا ردِ عمل ہوگا؟

اتنی کشیدگی اور تناؤ کے لمحے میری زندگی میں کم ہی آئے تھے۔ میں نے دینو کے ذہن کو ایک خاص نکتے سے ہٹانے کی ایک اور کوشش کی "دینو! میں کسی بھی اچھے اسپتال میں تمہارے بھائی کے علاج کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ اس نے تو خواہ مخواہ ملک ریاض کی خدمت کرنے کے لیے۔"

"میں آخری مرتبہ کہہ رہا ہوں کہ اب اٹھ جاؤ" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"دینو! تم کچھ پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔ ایک تعلیم یافتہ انسان کی طرح مجھ سے دلیل کی زبان میں بات کرو۔ بندوق کی زبان میں نہیں....." حقیقت یہی تھی کہ وہ لہجے میں اپنے بھائی سے تمام تر مشابہت کے باوجود اس کے مقابلے میں کچھ پڑھا لکھا معلوم ہو رہا تھا۔

لیکن اس نے میری بات کاٹتے ہوئے مجھے بھی ایک موٹی سی گالی دی اور تعلیم کو بھی۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ایک ساتھ تین باتیں ہوئیں۔ ایک تو میں کرسی سے پھسل کر نیچے جا گرا اور مکمل طور پر میز کی آڑ میں ہو گیا۔ دوسرے فضل الٰہی کی گن کی نال نے شعلہ اگلا۔ تیسرے دینو کی انگلی نے ٹریگر کو اس حد تک دبا ہی دیا جس سے میں ڈر رہا تھا۔ موت کا پیامبر بننے کے لئے اس ٹریگر کو صرف بال برابر فاصلہ ہی مزید طے کرنا تھا۔ وہ اس نے طے کر لیا۔

اس کی صحیح وجہ کا تعین کرنا بہت مشکل تھا۔ عین ممکن تھا کہ دینو ماچھی نے مجھے کرسی سے پھسلتے دیکھ کر ارادتاً ٹریگر دبا دیا ہو اور یہ بھی ممکن تھا کہ کنپٹی پر گولی لگنے کی وجہ سے ٹریگر خود بخود ہی دب گیا ہو جس کا مجھے خدشہ تھا۔ بہرحال..... وجہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ گن سے ترچھے رخ سے برسٹ آیا تھا اور میز کے کونے پر سے لکڑی کی تہ کے پرخچے اُڑ گئے تھے۔

نیچے پون انچ موٹی اسٹیل کی تہ تھی اور اس تہ کے نیچے میرا سر تھا جو گولیوں کی اس بوچھاڑ سے بال بال بچ گیا تھا۔ ہلکے سے اس برسٹ کے بعد ایک بار پھر کمرے میں بلا کا سکوت چھا گیا۔ کئی سیکنڈ کے بعد آخر کار میرے گارڈ فضل الٰہی کی محتاط اور نپی تلی سی آواز سنائی دی "سر! آپ ٹھیک تو ہیں؟"

وہ کمرے میں آچکا تھا۔ میں میز کے نیچے سے نکل آیا۔ میز کے کنارے پر جہاں سے لکڑی کی تہ کے پرخچے اڑ چکے تھے وہاں اسٹیل کی موٹی پلیٹ پر بھی گہرے نشان پڑ چکے تھے۔ گولیوں نے اسٹیل پلیٹ پر سے پھسلتے ہوئے اس کرسی کے پشتے کے پرخچے اُڑا دیئے تھے جس پر چند لمحے پہلے تک میں بیٹھا تھا۔ دو تین گولیاں پیچھے دیوار میں پیوست ہوئی تھیں۔

ان چیزوں کا جائزہ لینے کے بعد میں نے دینو کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ وہ وہاں نہیں تھا، جہاں چند لمحے پہلے کھڑا تھا۔ اچھل کر دور جا گرا تھا۔ سیون ایم ایم کی گولیوں نے اس کے ڈھانچے کو چیتھڑوں میں تبدیل کر دیا تھا اور اس کا آدھا چہرہ غائب ہو گیا تھا۔ اس کے چہرے پر صرف ایک آنکھ رہ گئی تھی جو اَب بھی کھلی ہوئی تھی مگر اب اس میں محاورتاً خون نہیں اترا ہوا تھا بلکہ حقیقتاً خون اتر آیا تھا۔

اس کی سب مشین گن عجیب انداز میں اس کے سینے پر آن گری تھی اور اس کے بازو اس کے گرد حمائل ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس نے مرنے سے پہلے بطورِ خاص بڑے پیار سے گن کو گلے سے لگا لیا ہو۔ بعض اتفاقات میں عجیب علامتیں پنہاں ہوتی ہیں۔ گن سے اس نے یقیناً زندگی میں بہت پیار کیا تھا۔ اس پر بہت انحصار کیا تھا لیکن گن نے اس سے وفا نہیں کی تھی۔ گن بہت کم لوگوں سے وفا کرتی ہے۔ یہ رشتے توڑتی ہے، جوڑتی نہیں اس لئے میری حتی الامکان کوشش ہوتی تھی کہ میں اس پر زیادہ انحصار نہ کروں۔ اس کے بل پر اپنے آپ کو زیادہ مضبوط محسوس نہ کروں۔

فضل الٰہی سپاٹ چہرہ لئے میرے سامنے کھڑا تھا۔ دھیمے پُرسکون لہجے میں اس نے پوچھا "سر! کیا آپ اسے جانتے تھے؟"

"ہاں..... ایک بہت بڑے ڈاکو کا بھائی تھا..... اور شاید خود بھی ڈاکو تھا" میں نے جواب دیا۔

اسی دوران بیک وقت دو طرف سے گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک تو پچھلی گلی سے غالباً ہوائی فائرنگ کے انداز میں گولیاں چلائی گئی تھیں یا پھر شاید اس کھڑکی کو نشانہ بنایا جا رہا تھا جس کے راستے دینو ماچھی اندر کودا تھا۔ غالباً پچھلی گلی میں اس کا کوئی ساتھی موجود تھا جسے اتنی دیر بعد اندازہ ہو گیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہو چکا ہے، مہم ناکام ہو چکی ہے۔ وہ جھنجلاہٹ میں یا پھر لابی میں دشمن کو بدحواس کرنے کے لئے پچھلی گلی سے اس کمرے پر فائرنگ کر رہا تھا جس میں اسے روشنی نظر آرہی تھی اور جس میں غالباً اس نے اپنے باس دینو ماچھی کو اندر جاتے دیکھا تھا۔ وہ ویسے بھی تھا محض گولیاں ضائع کر رہا تھا۔ یہ ایک احمقانہ حرکت تھی۔

لیکن ایک قدرے تشویش ناک بات یہ تھی کہ لابی کی طرف سے بھی فائرنگ کی گرج اور شیشے ٹوٹنے کے چھناکے سنائی دے رہے تھے۔ کوئی یقیناً سیڑھیوں یا لفٹ کے ذریعے اوپر آچکا تھا یا پھر پہلے سے موجود تھا۔

فضل الٰہی نے سب سے پہلے آگے بڑھ کر مین سوئچ آف کر دیا۔ اس فلور کا مین سوئچ دو جگہ موجود تھا۔ ایک میرے کمرے میں اور ایک باہر لابی میں، جہاں فضل الٰہی بیٹھا تھا۔ پورا فلور گھپ اندھیرے میں ڈوب گیا۔

"آپ یہیں رہیے گا سر!" فضل الٰہی نے اندھیرے میں سرگوشی میں مجھے ہدایت کی اور دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر کیتھرین کے کمرے میں رینگ گیا۔ دور کہیں وقفے وقفے سے کوئی اب بھی برسٹ مار رہا تھا۔ دروازے، کھڑکیاں اور پارٹیشن وغیرہ تباہ کر رہا تھا۔ اسے غالباً میرے کمرے تک پہنچنے کا صحیح راستہ معلوم نہیں تھا۔ وہ مختلف کمروں میں تباہی پھیلاتا آگے آرہا تھا۔ پھر فائرنگ کی آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک نہیں دو افراد تھے۔

اندھیرا ہوتے ہی انہوں نے بوکھلاہٹ کے انداز میں بے تحاشا کئی برسٹ مارے لیکن پھر شاید انہیں احساس ہوا کہ یہ کوئی چکر تھا اور اندھیرا دانستہ طور پر کیا گیا تھا۔ یہ انہیں گھیرنے کی کوئی تدبیر تھی، یکدم ہی گہرا سکوت چھا گیا۔

فضل الٰہی نے مجھے وہیں رکنے کی تلقین کی تھی لیکن میرا اس ہدایت پر عمل کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے مشین پسٹل نکالا لیکن پھر اسے واپس جیب میں رکھ لیا۔ یہ جاہل سے لوگ تھے۔ ڈاکو اور پولیس والے، دونوں بھاری بھرکم اور زیادہ گھن گرج والے اسلحے سے زیادہ مرعوب ہوتے ہیں۔ پہلے میں نے سوچا دینو ماچھی کی سب مشین گن اٹھا لوں لیکن پھر میں نے فیصلہ کیا کہ وہ جہاں اور جس حالت میں پڑی تھی وہیں بہتر تھی۔ اس پر دینو ہی کے ہاتھوں کے نشانات برقرار رہتے، یہ مزید بہتر تھا۔

میں نے اندھیرے میں اپنا فائلنگ کیبنٹ کو ٹٹولتے ہوئے سب سے نچلے خانے کے ایک طرف ہاتھ پھیرا اور ایک ننھا سا بٹن دبایا جو بظاہر ایک اسکریو محسوس ہوتا تھا۔ نچلے خانے کا ایک چپٹا حصہ باہر آگیا۔ اس میں ایک امریکن سب مشین گن رکھی تھی۔ یہ دینو ماچھی کی گن سے بہتر تھی۔

اس دوران پچھلی گلی سے کھڑکی پر ایک اور برسٹ مارا گیا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ دیواروں پر گولیاں چلا کر اگر وہ کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے تو میرے خیال میں انہیں اس کا موقع دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ تاہم اس برسٹ کے بعد پچھلی گلی میں بھی سکوت چھا گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ادھر موجود دینو کے ساتھی نے مزید گولیاں ضائع کرنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

میں اس دوران کیتھرین کے کمرے میں پہنچ چکا تھا لیکن فضل الٰہی اس سے آگے نکل چکا تھا اور راہداری میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔ اندھیرا خاصا گہرا تھا لیکن میں کسی نہ کسی حد تک یا چیزوں کو..... کم از کم ان کی آؤٹ لائن کی حد تک ضرور دیکھ سکتا تھا۔ ویسے بھی میں تو یہاں کے چپے چپے سے اس طرح واقف تھا کہ آنکھیں بند کر کے بھی ادھر اُدھر پھر سکتا تھا لیکن مجھے یوں ہی اندیشہ سا تھا کہ شاید ڈاکو بھی تاریکی میں عام انسانوں کی نسبت ذرا بہتر طور پر دیکھنے پر قادر ہوتے ہوں اس لئے میں بہت محتاط تھا۔ دیواروں کے ساتھ لگ کر دھیرے دھیرے آگے کھسک رہا تھا۔

عمارت میں ایک بار پھر سکوت چھا گیا تھا لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس سکوت اور اندھیرے میں کس گوشے میں موت گھات لگائے کھڑی ہو اور گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے ساتھ اپنا پیغام کسی کی لوحِ بدن پر نقش کر دے۔

میں اس راہداری میں خاصا آگے بڑھ چکا تھا جو باہر لابی تک جاتی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ فائرنگ کرنے والے دونوں آدمیوں کو یہیں کہیں ہونا چاہئے تھا۔ انہیں ادھر اُدھر زیادہ بھٹکنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ فضل الٰہی مجھ سے آگے نہ جانے کہاں تھا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں اندھیرے میں اس فلور پر ان کی تلاش جاری رکھوں اور ہر کمرے میں جھانکوں یا خاموشی سے کہیں گھات لگا کر، ساکت ہو کر انتظار کروں کہ کب کوئی کہیں اپنی موجودگی کا سراغ دیتا ہے۔ اس قسم کے معرکے کبھی کبھی صرف صبر، سکوت اور انتظار سے بھی جیتے جا سکتے تھے۔

اچانک پورا فلور ایک بار پھر منور ہو گیا اور میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ فضل الٰہی یقیناً لابی میں پہنچ چکا تھا اور اس نے ادھر کا مین سوئچ آن کر دیا تھا۔ دیواروں اور دروازوں پر جگہ جگہ گولیوں کے نشانات نظر آرہے تھے۔ لابی سے راہداری میں کھلنے والا مین دروازہ کافی لمبا چوڑا اور مضبوط تھا۔ فضل الٰہی وہ دروازہ کھول کر اندر آیا اور سیدھا میرے کمرے کی طرف آنے لگا۔ گن بے پروائی سے اس نے ہاتھ میں لٹکائی ہوئی تھی۔ وہ پہلے ہی کی طرح پُرسکون تھا۔

میں راستے میں ہی اس کے سامنے آگیا۔ وہ ٹھٹکا نہیں۔ شاید اسے پہلے ہی اندازہ تھا کہ میں اس کے پیچھے پیچھے ہی نکل آیا ہوں گا اور راستے ہی میں کہیں اسے مل جاؤں گا۔

"وہ دونوں بھاگ گئے سر" اس نے اطلاع دی "میں نے ان کا پیچھا کرنے کے بجائے یہاں رہنا بہتر سمجھا۔"

"ٹھیک ہے" میں نے کہا اور اس کے ساتھ لابی میں پہنچا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ چاروں طرف گولیوں کے نشانات موجود تھے۔ جو چیزیں ٹوٹنے والی تھیں وہ ٹوٹ گئی تھیں۔ استقبالیہ کاؤنٹر وغیرہ میں سوراخ ہو گئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہوں نے محض وحشت پھیلانے کے لئے چاروں طرف فائرنگ کی تھی اور اس وقت شاید ان کی اپنی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہئے۔ شاید انہیں ایک دفتری عمارت میں، محض دو افراد کی موجودگی میں کسی خاص مزاحمت کی توقع نہیں تھی یا پھر وہ کافی نروس تھے تبھی انہوں نے بھاگنے میں اتنی عجلت دکھائی تھی۔

اچانک ٹوٹی شکاریوں کی طرح محتاط انداز میں جنگلے کے ساتھ

لگ کر سیڑھیاں چڑھتا دکھائی دیا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ سائلنسر والا ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ گویا کسی بھی لمحے کسی مسلح شخص کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھا۔ گن کو استعمال کرنے کے معاملے میں اس شخص کی پھرتی کا مقابلہ کرنا مشکل تھا۔ وہ ایک ایسا نوجوان تھا جو صرف ریوالور سے سب مشین گن والوں کا مقابلہ کرسکتا تھا۔ اس کی کوئی گولی شاذونادر ہی ضائع جاتی تھی۔

سیڑھیوں اور لابی کے درمیانی شیشے کا پارٹیشن ٹوٹ چکا تھا اس لئے ٹونی نے ہمیں دور ہی سے دیکھ لیا اور باقی سیڑھیاں وہ تیزی سے چڑھ آیا۔

"سر! آپ ٹھیک تو ہیں نا؟" وہ تشویش زدہ انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں..... میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن تم یہاں کیسے پہنچ گئے؟ تم تو جاچکے تھے" میں نے دریافت کیا۔

"سر! میں اپنا آفس بند کرنے کے بعد واپسی میں دوبارہ ادھر سے گزر رہا تھا جب میں نے فائرنگ کی آوازیں سنیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہاں آفس میں کوئی گڑبڑ ہے۔ میں بھاگ کر آیا۔ میں نے گاڑی بھی سڑک کے کنارے چھوڑ دی ہے۔ اوپر آرہا تھا تو تھرڈ فلور پر مجھے اوپر سے دو آدمی تیزی سے سیڑھیاں اتر کر بھاگتے نظر آئے۔ گہرے رنگ کی شلوار قمیصوں میں تھے۔ چہروں پر ڈھاٹے تھے۔ ہاتھوں میں سب مشین گنیں تھیں۔ میرا ذہن فوراً نورو ماچھی والے واقعے کی طرف گیا اور میں نے تھرڈ فلور پر سیڑھیوں کے موڑ پر ہی انہیں گولی ماردی۔ اگر مجھے ایک ثانیے کی بھی تاخیر ہوجاتی تو وہ مجھے چھلنی کردیتے۔ ان کا انداز بتارہا تھا کہ وہ سامنے آنے والے ہر شخص کو چھلنی کردیں گے" ٹونی نے حسب عادت دھیمے لہجے میں بتایا جیسے کسی عام سے واقعے کے بارے میں بتارہا ہو۔

"بہت اچھا کیا تم نے" میں نے کہا "جو کام ہم سے رہ گیا تھا وہ تم نے مکمل کردیا۔ ان کی لاشیں کہاں ہیں؟"

"سیڑھیوں میں پڑی ہیں" ٹونی نے بتایا۔

"پچھلی گلی سے جو فائرنگ کر رہا تھا وہ بچ کر نکل گیا ہوگا" میں نے کہا۔

"میں دیکھ کر آؤں سر!" ٹونی نے مستعدی سے پوچھا۔

"نہیں۔ اسے جانے دو" میں نے بے پروائی سے کہا "ملک ریاض اور نورو ماچھی کو کوئی بتانے والا بھی تو ہونا چاہئے کہ مجھے اٹھوانے کی مہم کا کیا بنا؟"

ٹونی کے ساتھ میں نے اور فضل الٰہی نے نیچے تیسری منزل پر جاکر ان دونوں ڈاکوؤں کی لاشیں دیکھیں۔ دونوں آڑے ترچھے پڑے تھے۔ گنیں ان کے قریب پڑی ہوئی تھیں۔ انہیں صرف ایک ایک گولی لگی تھی۔ ایک کے حلقوم میں اتر گئی تھی اور دوسرے کی پیشانی میں پیوست ہوئی تھی۔ انتہائی ہنگامی حالات میں بھی صاف ستھرا نشانہ لگانے میں ٹونی کا جواب نہیں تھا۔ انہوں نے آفس میں آکر گولیوں کی بوچھاڑ کردی تھی لیکن اس کا کوئی [illegible] نہیں ہوا تھا۔ بس دیواروں کا پلستر اُدھڑا تھا اور کھڑکیاں دروازے یا فرنیچر ٹوٹا تھا۔ جبکہ ان دونوں کے لئے صرف ایک ایک گولی کافی رہی تھی۔

"جو چیز جہاں ہے اور جیسی ہے، اسے وہیں اور ویسی ہی رہنے دو" میں نے کہا "آؤ..... ذرا رسمی کارروائی بھی پوری کرلیں۔ پولیس کو اس واقعے کی اطلاع بھی دے دیں۔"

ہم واپس اوپر میرے کمرے میں آئے۔ دینو ماچھی کے [illegible] چہرے سے خون ایک ملغوبے کی سی صورت میں بہہ بہہ کر کچھ [illegible] میں جذب ہوگیا تھا اور کچھ جم گیا تھا۔

"یہ آپ کے کمرے تک کیسے پہنچ گیا؟" ٹونی نے حیرت [illegible] پوچھا۔

"کھڑکی کے راستے" میں نے کہا اور محتاط انداز میں کھڑکی [illegible] ذرا سر نکال کر گلی میں جھانکا۔ عقبی گلی سنسان پڑی تھی۔ کوئی [illegible] نہیں چلی۔ فائرنگ کی آواز سن کر بھی کوئی اس گلی میں نہیں [illegible] تھا۔ جن عمارتوں کی عقبی کھڑکیاں اس گلی میں کھلتی تھیں ان [illegible] بھی کوئی جھانکتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ایک تو یہ عمارتیں کاروباری اور دفتری قسم کی تھیں۔ رات کے وقت شاید ان [illegible] لوگ تھے ہی نہیں۔ اگر تھے بھی تو کم از کم گردن نکال کر نہیں جھانک رہے تھے۔

میں نے اوپر دیکھا۔ چھت کی منڈیر میں ایک رسی بندھی ہوئی تھی جو میری کھڑکی تک آئی ہوئی تھی۔ میرا اندازہ درست نکلا تھا۔ دینو ماچھی پہلے چھت پر گیا تھا۔ وہاں سے رسی کے سہارے کھڑکی تک اترا تھا، میں نے مڑکر ٹونی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "افسوس کہ مجھے ایک بھی گولی چلانے کا موقع نہیں ملا۔"

پھر میں نے دینو کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ٹونی کو [illegible]

"نورو ماچھی کا بھائی دینو ماچھی مجھے لینے آیا تھا۔ ملک ریاض اور نورو ماچھی کے حضور پیش کرنے کے لئے۔"

"یہ لوگ ہمارے پیچھے لگ گئے ہیں؟" ٹونی نے الجھن [illegible] پوچھا۔

"موت کے مختلف بہانے ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی موت اس طرح ہی لکھی ہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔ تین خبیث طاقتیں ایک جگہ جمع ہوگئی ہیں۔ ملک ریاض، نورو ماچھی اور عالم شیر۔ ملک ریاض اور عالم شیر نے مل کر ابھی نورو ماچھی اور اس کے گروہ [illegible] قربانی کا بکرا بنایا ہوا ہے۔ اس گروہ کے کافی لوگ ہمارے ہاتھوں شکر گڑھ کے علاقے میں مارے گئے تھے۔ تین اب مرگئے ہیں۔ نورو ماچھی خود موت اور زندگی کی کشمکش میں جتلا تھا۔ میرا خیال ہے اب اس گروہ کے بچے کھچے لوگ تو ہمارے سامنے آنے کی کوشش نہیں کریں گے لیکن یقین سے کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا۔ [illegible] لوگ عقل سے پیدل ہوتے ہیں۔ بہرحال اس گروہ کے مکمل

صفائے کے بعد شاید ملک ریاض اور عالم شیر اپنی اپنی طاقت کے ساتھ سامنے آئیں گے۔ ابھی وہ غیر اہم مہروں کو مروا رہے ہیں۔"

"سر! اس سے پہلے ہی ہمیں کچھ کرلینا چاہئے" ٹونی بولا "ورنہ یہ خواہ مخواہ کا دردِ سر ہمیں تنگ کرتا رہے گا۔ جبکہ اس سے کہیں بڑا خطرہ ریڈ ڈاٹ کی صورت میں ہمارے سروں پر منڈلا رہا ہے۔"

"اصل خطرہ وہی ہے" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "یہ ملک ریاض اور عالم شیر جیسے لوگوں کی میری نظر میں کوئی خاص اہمیت نہیں۔"

میں نے عام فون کا ریسیور اٹھایا۔ وہ بے جان تھا۔ عمارت کے ٹیلیفون بورڈ کا کنکشن واقعی ان لوگوں نے کاٹا ہوا تھا لیکن میرا ڈائریکٹ ٹیلیفون ٹھیک تھا۔ اس کا کنکشن کاٹا نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی حفاظت کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ میں نے متعلقہ پولیس اسٹیشن کو واقعے سے مطلع کیا۔

پولیس کی کارروائیوں وغیرہ میں دو گھنٹے لگ گئے۔ پھر بھی ہمارا کم ہی وقت ضائع ہوا تھا۔ کیونکہ یہ شہر کے ایک بڑے اور بارسوخ آدمی کا معاملہ تھا۔ میں نے اب واقعے کو ابتدا ہی سے رپورٹ کردیا تھا۔ میں نے اپنے بیان میں لکھوادیا تھا کہ بڑے زمیندار اور مشہور سیاسی شخصیت ملک ریاض کے اشارے پر نورو ماچھی نے مجھے یرغمال بنالیا تھا، بھاری تاوان وصول کرنے کی کوشش کی تھی، میرا اور میرے ساتھیوں کا ان سے مقابلہ رہا تھا اور آج نورو کے بھائی نے مجھے اغواء کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے سب کچھ بے کم وکاست بتاکر اب اس معاملے کو بالکل سیدھے طریقے سے ہینڈل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ ہر چیز ریکارڈ پر آجانی چاہئے۔ اس کے بعد جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

لاشیں اٹھائی جاچکیں اور دفتر خالی ہوچکا تو میں نے ٹونی کو ہدایت کی کہ صبح سے وہ سیکیورٹی کے انتظامات دگنے کردے، پھر میں نے جنرل منیجر کو اس کے گھر فون کرکے ہدایت کی کہ صبح سے وہ ہنگامی بنیادوں پر دفتر میں مرمت وغیرہ کا کام مکمل کرائے تاکہ ملازمین، خصوصاً خواتین کارکن پریشان یا خوف زدہ نہ ہوں۔ گوکہ میرے ہاں کام کرنے والوں میں خوف زدہ اور پریشان ہونے والوں کی تعداد بہت کم تھی پھر بھی میری کوشش یہی رہتی تھی کہ انہیں حالات میں کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس نہ ہو۔

ان چکروں سے فارغ ہوکر میں گھر آگیا اور کھانے وغیرہ کے بعد سوگیا لیکن اس رات سکون کی نیند نصیب نہیں ہوئی۔ صبح کاذب کے وقت جبکہ میں گہری نیند میں تھا، ایک خاص الارم نے مجھے جگادیا۔ میرا کمرا ساؤنڈ پروف تھا۔ اس کے باوجود فائرنگ کی مدھم سی آوازیں اندر پہنچ رہی تھیں لیکن مجھے ان آوازوں نے نہیں، الارم نے جگایا تھا۔ میری کوٹھی کی دیواروں پر خاردار تاروں کی حفاظتی باڑھ تھی اور رات کے وقت ان تاروں میں کرنٹ دوڑتا تھا۔ میرے کمرے اور گیٹ ہاؤس میں الارم اس وقت بجتا تھا جب کوئی ان تاروں کو کسی بھی چیز سے چھونے یا کاٹنے کی کوشش کرتا تھا۔

ایک بار پھر میں گن سنبھال کر کمرے سے نکلا تو اندازہ ہوا کہ کچھ لوگوں نے دو طرف سے کوٹھی میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ ایک تو عقبی دیوار کے اوپر سے اور دوسرے گیٹ پھلانگ کر۔ رات کو میرے ہاں عموماً دو گارڈز ڈیوٹی پر ہوتے تھے۔ دونوں طرف زبردست فائرنگ جاری تھی لیکن یہ معرکہ جلد ہی اختتام کو پہنچ گیا۔

اس میں حملہ آور دو لاشیں چھوڑ کر بھاگے تھے۔ ایک اس شخص کی تھی جس نے پچھلی دیوار پر چڑھ کر تاریں کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ دوسرا وہ تھا جس نے گیٹ پھلانگنے کی کوشش کی تھی۔ میرے گارڈ طارق خان نے بتایا کہ حملہ آور چھ سات تھے۔ لاشوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بھی ڈاکو ٹائپ ہی چیز تھے۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک ہی رات میں وہ لوگ یکے بعد دیگرے میرے دفتر اور گھر پر حملہ کریں گے۔

ان حملوں کے لئے انہوں نے کوئی خاص منصوبہ بندی بھی نہیں کی تھی۔ بس یونہی چڑھ دوڑے تھے۔ حالانکہ اب تک انہیں اندازہ ہوجانا چاہئے تھا کہ میں اتنی آسانی سے ہاتھ آنے والا شکار نہیں تھا لیکن شاید ان پر روایتی ڈاکوؤں والی جذباتیت غالب آگئی تھی۔ وہ شاید صرف کوئی ردِعمل ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ مجھے یہ بتانا چاہتے تھے کہ اتنی مار کھانے اور اتنے آدمی مروانے کے بعد بھی وہ نہ خود چین سے بیٹھیں گے اور نہ مجھے چین سے بیٹھنے دیں گے لیکن یہ کوشش انہیں مہنگی پڑی تھی۔ اتنے آدمی انہوں نے مزید مروادیئے تھے اور ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا تھا۔

میں نے اس واقعے کی بھی رپورٹ درج کرادی اور اپنے بیان میں ملک ریاض اور نورو ماچھی پر شبہ ظاہر کرنے کے ساتھ ساتھ عالم شیر کا نام بھی لکھوادیا۔

دوسری صبح دن چڑھتے ہی میں نے ڈی آئی جی صاحب کو فون کیا۔ وہ ابھی آفس نہیں پہنچے تھے۔ گھر فون کیا تو گھر پر مل گئے۔ ان کا نام ملک شفاعت علی تھا۔ یعنی ملک ریاض راہی کی طرح وہ بھی ملک ہی تھے۔

میرا نام سنتے ہی بولے "چوہدری صاحب! ضرور کوئی کام ہوگا تبھی آپ نے صبح ہی صبح یاد کیا ہے۔ آپ ہمیں صرف اسی وقت یاد کرتے ہیں جب کوئی کام ہوتا ہے۔"

"پولیس والوں کے بارے میں وہ بڑی مشہور کہاوت ہے نا....." میں نے کہا۔

ملک صاحب میری بات کاٹتے ہوئے بولے "نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔"

"جی ہاں۔ آپ سے بہتر اس محاورے کی حقیقت سے کون واقف ہوگا" میں نے ہنستے ہوئے کہا "میں اسی پر عمل کرنے کی

کوشش کرتا ہوں۔ نہ آپ سے زیادہ دوستی گانٹھنے کی کوشش کرتا ہوں اور نہ ہی ہم نے کبھی آپ سے دشمنی مول لینے کا سوچا ہے۔ آخر ہمیں اسی شہر میں رہنا ہے۔"

ملک صاحب نے خوش دلی سے قہقہہ لگایا اور کہا "چوہدری صاحب! اصل میں اس شہر میں آپ ہی جیسے لوگوں کو رہنا ہے۔ ہمارا کیا ہے، ہم تو ملازم آدمی ہیں۔ آج یہاں، کل وہاں۔ ہمارا تو کبھی کبھی محکمہ تک بدل جاتا ہے۔"

"آپ کہیں بھی رہیں ملک صاحب! بادشاہی تو آپ ہی جیسے لوگوں کی رہتی ہے۔ آپ فرما رہے ہیں کہ ہم جیسے لوگوں کو ہی اس شہر میں رہنا ہے جبکہ کچھ لوگ ہمیں اس شہر سے نکالنے پر تلے ہوئے ہیں۔ آپ کی بادشاہی میں ہمارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں ہو رہا۔"

"کیا ہوا چوہدری صاحب؟ آپ کی طرف کس نے آنکھ اٹھانے کی جرأت کرلی؟ آپ نے تو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے اپنے آپ کو اتنا مضبوط کر رکھا ہے کہ آپ سے الجھ کر کوئی پچھتانے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا۔"

"وہ تو درست ہے۔ لیکن بعض اوقات قانون کے دائرے میں رہنا بھی مہنگا پڑنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو بستر مرگ تک پہنچنے سے پہلے نہیں پچھتاتے۔ بلکہ بعض لوگ تو زندگی میں کبھی پچھتائے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے ہی ایسے لوگوں کا کوئی بندوبست ہو جائے۔"

"ہوا کیا چوہدری صاحب؟" ملک شفاعت علی نے تشویش سے پوچھا۔

میں نے قدرے ترمیم کے ساتھ انہیں تمام واقعات سنائے اور کہا "تھانے کچہریوں سے نمٹنے کے لئے مجھے قانونی مشیران کے طور پر ریٹائرڈ ججوں کے ایک پورے پینل کی خدمات حاصل ہیں لیکن آپ کو معلوم ہے یہ لمبے چکر ہیں اور ان چکروں کی طوالت سے فائدہ اٹھا کر ہی ملک ریاض یا نورو ماچھی جیسے لوگ اپنے مقاصد پورے کرتے رہتے ہیں۔ میں ان چکروں میں پڑنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے احتیاطاً ایف آئی آر درج کرادی ہے تاکہ کل کو آپ جیسے میرے مہربان ہی یہ طعنہ نہ دینے لگیں کہ میں نے قانون کو ہاتھ میں لے لیا اور صحیح راستہ اختیار نہیں کیا۔ ویسے بھی کبھی کبھار دھول مٹی اور رجسٹروں کے انبار میں دبی ہوئی ایف آئی آر بڑے کام آجاتی ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ ساری باتیں سننے کے بعد ملک شفاعت علی کو چپ سی لگ گئی تھی۔ وہ دھیمے سے لہجے میں بولے "چوہدری صاحب! آپ کو کچھ اندازہ ہے آپ نے کتنی بڑی بات کی ہے؟ ایک ڈاکو جس کے سر کی قیمت دس لاکھ مقرر ہے، اس کا تعلق ایک بڑے زمیندار اور خاصی مشہور سیاسی شخصیت سے ہے؟ یہ ایک

بہت بڑا الزام ہے۔ اگر یہ بات پریس میں آگئی تو خوفناک ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔"

"آپ میری پوری رام کہانی سننے کے بعد بھی اسے الزام ہی کہہ رہے ہیں ملک صاحب؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"معاف کیجئے گا چوہدری صاحب! کسی بھی تنازعے کا عدالت سے فیصلہ ہونے سے پہلے اس قسم کی ہر بات ہمارے لئے الزام ہی ہوتی ہے۔ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر مرحلے پر قانونی اور ٹیکنیکل زبان ہی استعمال کریں۔"

"خیر، آپ کے قانونی اور ٹیکنیکل زبان استعمال کرنے پر تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن کم از کم آپ کے ذہن میں تو ہر معاملے کی سچی تصویر ہونی چاہئے۔"

"ہمارے ذہن میں کیا ہے اور کیا نہیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا چوہدری صاحب!" ملک شفاعت نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "ہم سرکار کے ملازم ہیں۔ قوانین، ضابطوں اور قاعدوں کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے مجبور لوگ۔ ہمیں ہر کام ایک خاص دائرے میں رہتے ہوئے کرنا ہوتا ہے۔"

"یہ کام کرنے کی نہیں..... کام نہ کرنے کی باتیں ہیں ملک صاحب" میں نے قدرے سرد لہجے میں کہا "جب آپ لوگ کسی کام کا تہیہ کر لیتے ہیں تو ایک معمولی کانسٹیبل بھی ہزار دو ہزار کی چوری کے محض شبے میں پکڑے ہوئے کسی غریب آدمی کو اذیت ناک طریقے سے سسکا سسکا کر ہلاک کر دیتا ہے۔ اس وقت اسے

کوئی قانون، کوئی قاعدہ، کوئی ضابطہ یاد نہیں رہتا۔ اگر یاد رہتا بھی ہوگا تو اسے اس کی پروا نہیں ہوتی ہوگی۔ اسے اس سے بچنے کے سب طریقے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن جب آپ کو کوئی کام کرنا نہیں ہوتا تو ایک ڈی آئی جی کو بھی تمام قوانین، ضابطے اور قاعدے یاد آجاتے ہیں۔ وہ دائروں میں پھنسا ہوا ایک مجبور شخص بن کر رہ جاتا ہے"

"دیکھیں چوہدری صاحب.....! آپ ایک لمبی بحث چھیڑ رہے ہیں" ملک صاحب ہلکی سی بیزاری سے بولے "اس موضوع پر ہر سطح پر بڑی باتیں، بڑے مذاکرے ہو چکے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے یہ نظام کی خرابیاں ہیں اور کوئی فرد واحد انہیں درست نہیں کر سکتا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ میں کوئی جاہل سا پولیس والا نہیں، بار ایٹ لاء ہوں..... سی ایس پی ہوں..... چار سال باہر رہ کر آیا ہوں۔ آپ کی طرح میری بھی شدید خواہش ہے کہ اس ملک میں قانون کی حکمرانی ہو۔ ہر کام قاعدے قانون اور قرینے سلیقے سے ہو..... اور میں کم از کم اپنے ڈیپارٹمنٹ کو سدھارنے کی اپنی سی کوشش بھی کر رہا ہوں لیکن اس ملک میں کسی بھی چیز کی اصلاح سب سے مشکل کام ہے۔ آپ اپنے اڑوس پڑوس میں جھانک کر دیکھیں۔ ایک آدمی کا اگر چھ افراد کا کنبہ ہے تو وہ اسے صحیح طرح نہیں چلا سکتا۔ ان چھ آدمیوں میں سے کسی کا منہ کسی طرف ہوگا، کسی کا کسی طرف۔ کسی کی کوئی رائے ہوگی کسی کو کوئی اور رائے۔ زندگی کے بارے میں ہر ایک کا نظریہ اور ہر ایک کا طرز عمل مختلف ہوگا۔ ایک شخص جب چار چھ آدمیوں کے کنبے کو اپنی مرضی کے مطابق صحیح طرح نہیں چلا سکتا تو آپ کیسے توقع کرتے ہیں کہ کوئی اتنے بڑے محکموں..... اور پھر اتنے بڑے ملک کو صحیح طرح چلا سکے گا؟ اور پھر ان کاموں میں بہت سا وقت بھی چاہئے ہوتا ہے۔ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص ابھی کسی محکمے کے ایک کونے سے تھوڑا سا کچرا صاف کر کے فارغ ہوتا ہے، ذرا سکون کا سانس لیتا ہے اور عین اسی وقت اس کا کہیں اور تبادلہ ہو جاتا ہے۔ بے شمار مسائل ہیں چوہدری صاحب! جو جس کرسی پر بیٹھا ہے وہی وہاں کا حال بہتر جانتا ہے۔"

"ان سب باتوں سے میں اچھی طرح آگاہ ہوں ملک صاحب!" میں نے نرم لہجے میں کہا "لیکن ملک یا محکموں کو کوئی ایک شخص نہیں بلکہ ایک پوری مشینری چلاتی ہے....."

"وہی تو میں عرض کر رہا ہوں" ڈی آئی جی صاحب میری بات کاٹتے ہوئے بولے "کہ مشینری درست نہیں ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔"

"میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں ڈی آئی جی صاحب" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا "کہ آپ کو میری بات کا یقین ہے یا نہیں؟ نورو ماچھی اور اس کا گروہ ملک ریاض کا ہراول دستہ ہے..... یا یوں کہئے کہ ہراول دستہ تھا، میں نے اس کی کمر توڑ دی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ خود حفاظتی کے سلسلے میں ہوا ہے۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ ملک ریاض اور نورو ماچھی کے گٹھ جوڑ کی بات اگر پریس میں آگئی تو بڑا ہنگامہ کھڑا ہو جائے گا۔ مجھے حیرت اس پر ہے کہ یہ بات ابھی تک پریس میں آئی کیوں نہیں؟ اگر اب بھی آئی تو بڑی تاخیر سے آئے گی۔"

"چوہدری صاحب! کسی بات پر یقین رکھنا اور بات ہے، اسے عدالت میں ثابت کرنا اور بات" ملک شفاعت علی نے نہایت تحمل سے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "اگر یہ بات عدالت میں ثابت ہوئے بغیر پریس میں آگئی تو بہت سے لوگوں کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔"

"کیوں؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"میں صوبائی حکومت کا ملازم ہوں چوہدری صاحب! بعض معاملات میں مجھے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے۔ ملک ریاض کی پارٹی بہت چھوٹی ہے لیکن اس قسم کے لوگوں کے پاس نہ جانے کیا جادو ہوتا ہے..... ملک ریاض کی مرکز میں بھی بڑی دور دور تک پہنچ ہے۔ مجھے تو یہ بھی رپورٹ ملی ہے کہ اس الیکشن میں اپنے حلقے سے اس کے کامیاب ہونے اور فیڈرل منسٹر ہونے کے بڑے قوی امکانات ہیں۔ ان معاملات میں آج کل سیاسی طاقتوں کے درمیان پہلے ہی سے معاہدے طے پا جاتے ہیں۔"

"ڈی آئی جی صاحب!" میں نے خاص طور پر انہیں نام کے بجائے عہدے سے مخاطب کیا "کم از کم مجھے آپ کے منہ سے اس طرح کی بات سننے کی توقع نہیں تھی۔ ایک طرف آپ بات کرتے ہیں کہ آپ بھی میری طرح اس ملک میں قانون کی عملداری اور کوئی طریقہ قرینہ دیکھنا چاہتے ہیں اور دوسری طرف آپ اتنے بڑے عہدے دار ہوتے ہوئے محض اس بنا پر ایک شخص سے خائف ہیں کہ وہ بہت بڑا زمیندار اور سیاسی اثر رسوخ کا مالک ہے۔ کیا ان دونوں خصوصیات کا مطلب یہ ہے کہ وہ جو چاہے کرتا پھرے؟ ڈاکوؤں کے گروہ کے گروہ پالے... دولت مندوں کو اغوا کرے..... ان سے بھاری تاوان وصول کرے..... قتل و غارت مچائے..... لوگوں کے گھروں اور دفتروں پر حملے کرائے۔ ان سب چیزوں کا لائسنس مل جاتا ہے اسے؟"

ڈی آئی جی صاحب خاموش رہے۔ شاید وہ اس وقت میرے لہجے پر اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ملک صاحب! میں اس وقت بڑا حیران ہوا تھا جب وہ مغرور ڈاکو بڑے معززانہ لباس میں، ملک ریاض کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر اس بھرے پرے شہر کی شاہراہوں سے گزر کر میرے ڈرائنگ روم میں آکر بیٹھا تھا اور مجھے ان کا شرفِ میزبانی حاصل کرنا پڑا تھا لیکن اس سے زیادہ حیران میں اس وقت آپ کی باتیں سن کر ہوا ہوں۔ ہماری آپ سے دوستی تو ایک طرف رہی۔ بڑے بوڑھوں کی نصیحت کے مطابق ہم نے پولیس والوں کی دوستی پر

کبھی زیادہ بھروسا نہیں کیا لیکن میرا خیال تھا کہ ایک فرض شناس آفیسر کی حیثیت سے ہی آپ میری باتیں سن کر اچھل پڑیں گے اور فوراً ہی بہت سخت ایکشن لیں گے۔ آپ نے تو مجھے بہت مایوس کیا ہے ملک صاحب!"

"چوہدری صاحب! آپ نوجوان ہیں لیکن میرا خیال ہے بہت سمجھدار ہیں۔ دنیا دیکھی ہے آپ نے۔ آپ میری پوزیشن کو سمجھ نہیں رہے ہیں۔"

"میں آپ کی پوزیشن بھی سمجھ گیا ہوں اور آپ کی بات بھی" میں نے الفاظ کو چبانے کے سے انداز میں کہا "خلاصہ اس گفتگو کا یہ ہوا کہ آپ اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتے۔"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے" وہ تحمل سے بولے "اب آپ نے ایف آئی آر درج کرادی ہے تو روٹین کی کارروائی تو چلے گی لیکن میرا مقصد حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے آپ کو یہ بتانا تھا کہ آپ اس سلسلے میں زیادہ اونچی امیدیں نہ رکھیں۔ یہ معاملہ یونہی کچھ عرصہ لٹک لٹکا کر ختم ہوجائے گا ..... اور اگر ملک ریاض نے اسے انا کا مسئلہ بنالیا تو پھر آپ کے لئے وکالت کرنے والے ریٹائرڈ ججوں کے پینل سے کام نہیں چلے گا۔ آپ کو خود بھی عدالتوں میں گھسنا پڑے گا۔"

"ملک صاحب! ایک ملک کو دوسرے ملک سے اتنا بھی مرعوب نہیں ہونا چاہئے۔" میں نے طنزیہ ہنسی کے ساتھ کہا "جاگیر داری' سیاسی اثر ورسوخ اور خطرناک ڈاکوؤں سے گٹھ جوڑ ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ طاقت کے اور بھی بہت سے ذرائع ہوتے ہیں۔ ہر صنعت کار اتنا بے دست وپا اور نازک بھی نہیں ہوتا جتنا عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔"

"مجھے معلوم ہے چوہدری صاحب! آپ بے دست وپا اور نازک نہیں ہیں۔ آپ کے بارے میں زیادہ نہ سہی کچھ نہ کچھ خبر تو رکھتا ہوں" ملک صاحب بولے۔

"ہاں۔ شرفا کے بارے میں خبر رکھنے کے سلسلے میں تو آپ یقیناً بہت مستعد ہوں گے" میں نے کہا۔

"سر! یہ طرز مزاح اچھا نہیں ہے۔ بیلٹ سے نیچے وار نہ کریں۔ یہ کھیل کے اصولوں کے خلاف ہے" ملک صاحب نے انگریزی میں کہا۔

"سر! آپ بیلٹ کی بات کررہے ہیں' یہاں تو معاملہ پگڑی اور شملے تک پہنچ رہا ہے۔" ملک صاحب نستعلیق اردو اور انگریزی میں گفتگو کرتے تھے اس لئے میں نے جلدی سے کہا "شملے کو غالباً اردو میں طرّا کہتے ہیں۔ ہم سمجھتے تھے ہم اب بڑے صنعت کار' بڑے بزنس مین ہوگئے ہیں۔ اب ہم بھی طرّا ذرا اونچا کرکے پھر سکتے ہیں لیکن پتا چلا کہ طرّا اب بھی جاگیردار۔ کا ہی اونچا رہے گا ..... اور وہ بھی انتہائی بدمعاش قسم کے جاگیردار کا۔"

صاحب! جذباتی باتیں نہ کریں اور معاملے کو طبقاتی

رنگ نہ دیں۔ میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا لیکن میں احتیاطاً آپ کو لمبی چوڑی امیدیں دلانا نہیں چاہتا۔ میری پوزیشن ویسے بھی آج کل کچھ اچھی نہیں ہے۔ میں آئی جی صاحب کی گڈ بکس میں نہیں ہوں۔"

"انسان کو صرف کام اچھا کرتے رہنا چاہئے اور گڈ بکس میں ہونے یا نہ ہونے کی پروا نہیں کرنی چاہئے۔ میرا خیال ہے آپ اب اس مقام پر ہیں کہ آپ کے لئے ان باتوں سے فرق نہیں پڑنا چاہئے۔"

"معذرت کرکے کہوں گا چوہدری صاحب .....! آپ کا خیال غلط ہے۔ سرکاری ملازم کبھی اس مقام پر نہیں پہنچتا کہ اسے کسی کی گڈ بکس میں رہنے یا نہ رہنے کی پروا نہ رہے۔ سرکاری ملازمت ہمیشہ رسّی پر چلنے کے مترادف ہی رہتی ہے۔ ذرا توازن خراب ہوا اور آپ نیچے۔ جبکہ نیچے کوئی حفاظتی جال بھی نہیں ہوتا۔"

"چلئے ملک صاحب .....! کوئی بات نہیں" میں نے گہری سانس لے کر کہا "آپ ہمیں ایسی باتوں سے ہی بہلاتے رہیے۔ ہم خود دیکھیں گے کہ ملک ریاض کے ساتھ پریس کی' جاگیرداری کی سیاست کی اور ڈاکوؤں کی کتنی طاقت ہے۔"

"دیکھئے چوہدری صاحب!" وہ جلدی سے بولے "آپ سے دوستی اپنی جگہ ہے لیکن میں یہ مشورہ ہرگز نہیں دوں گا کہ آپ لا

اینڈ آرڈر کی کوئی سچویشن پیدا کرنے کی کوشش کریں۔"

"لاء اینڈ آرڈر کی سچویشن مجھ جیسے نہیں' ملک ریاض جیسے لوگ پیدا کرتے ہیں ڈی آئی جی صاحب!" میں نے کوشش کی کہ میرے دل کی تلخی میرے لہجے میں منتقل نہ ہونے پائے "اور ستم ظریفی یہ ہے کہ وہ لوگ پھر بھی نیک نام رہتے ہیں۔"

"نہیں چوہدری صاحب! نیک نام تو آپ جیسے لوگ رہتے ہیں۔ ملک جیسے لوگوں کو جب وقت کارکڑا لگتا ہے تو کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں ہوتا۔ ان کی کوئی سی بھی طاقت ان کے کسی کام نہیں آتی" ملک شفاعت صاحب کے لہجے میں قدرے خلوص تھا۔

"اور آپ لوگ آرام سے بیٹھے اس وقت کا انتظار کرتے رہتے ہیں" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا اور فون بند کردیا۔

کافی دیر تک میں سوچوں میں گم بیٹھا رہا۔ دفتر جانے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہاں مرمت وغیرہ کا کام شروع ہوچکا تھا۔ ایک دو دن تک خاصی ڈسٹربنس رہنے کا امکان تھا۔ اس کے بعد پاس پڑوس سے دو چار لوگ اظہار ہمدردی کے لئے آگئے۔ علاقے میں اس خبر نے سنسنی پھیلادی تھی کہ رات میرے گھر پر ڈاکوؤں نے حملہ کیا تھا اور اندر گھسنے کی کوشش کی تھی۔ ان دنوں ڈاکوؤں کی کارروائیاں اتنی عام نہیں ہوئی تھیں کہ اسے روز مرہ کی ایک خبر سمجھ کر نظرانداز کردیا جاتا۔ اس کے علاوہ بڑے لوگوں کے محل نما مکانوں والے علاقوں میں بھی ایک دوسرے سے اتنی زیادہ لاتعلقی کا رواج نہیں ہوا تھا۔

کافی وقت لوگوں کے ساتھ باتوں اور ان کی خاطر مدارت میں گزر گیا۔ یہ سلسلہ ختم ہوا ہی تھا کہ ٹونی کا فون آگیا۔ وہ شکوہ آمیز سے لہجے میں بولا "سر! آپ نے مجھے اطلاع ہی نہیں دی .... پتا چلا ہے رات گھر پر بھی حملہ ہوا ہے؟"

"یہ اطلاع اس قابل نہیں تھی کہ تمہیں پہنچائی جاتی" میں نے جواب دیا "وہ گھر میں گھسنے کی ایک ناکام اور بے وقوفانہ کوشش تھی۔ تین آدمی دفتر کی بلڈنگ میں مرے تھے۔ دو آدمی یہاں مرگئے۔ معلوم نہیں ابھی کتنے باقی ہیں۔ ملک ریاض شاید پاگل ہوگیا ہے یا پھر ان بے چارے ڈاکوؤں کی اس کی نظر میں اتنی ہی اہمیت ہے کہ انہیں کیڑے مکوڑوں کی طرح مروائے جارہا ہے۔"

"سر! اس سلسلے میں کچھ ہونا چاہئے۔ کوئی فیصلہ کن اقدام ....." ٹونی محتاط لہجے میں بولا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس محتاط لہجے کی تہ میں خوابیدہ آتش فشاں کا خاموش غیظ وغضب کروٹیں لے رہا تھا۔

"ہوجائے گا ..... ہوجائے گا" میں نے اسے تسلی دی "تمہیں معلوم ہے جذباتیت اور جلد بازی ہمارے منشور کے خلاف ہے۔"

"یس سر!" اس نے سعادت مندی سے کہا پھر اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے بولا "سر! وہ بلیک باکس سے ملنے والی فہرست کو میں نے چیک کیا تھا۔ ان سب میں ایک بات مشترک ہے۔ یہ تو

درست ہے کہ وہ سب مختلف اہم محکموں میں اعلیٰ عہدے دار تھے۔"

"تھے .....؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔ یہی بات تو مشترک ہے کہ وہ سب ریٹائر ہوچکے ہیں۔"

مجھے امید تھی کہ ٹونی نے اپنی کارروائی تشنہ نہیں چھوڑی ہوگی۔ میں نے پوچھا "تم نے ریٹائرمنٹ سے آگے ان کا سراغ لگانے کی کوشش کی؟"

"یس سر!" اس نے جواب دیا "اور تب مجھے ایک اور بات ان سب میں مشترک نظر آئی۔ اگر یہ اتفاق ہے تو بہت ہی عجیب اور دلچسپ اتفاق ہے کہ وہ سب کے سب ریٹائرمنٹ کے کچھ عرصے بعد یا تو مرچکے ہیں یا ملک سے باہر جاچکے ہیں۔"

"بہت خوب" میں نے کہا "ان کے مرنے کے انداز میں تو کوئی بات مشترک نہیں پائی جاتی؟"

"شاید یہ نہیں کہا جاسکتا سر" ٹونی بولا "ان میں سے کوئی کسی حادثے کا شکار ہوا۔ کسی کو بیماری سے ..... یا ویسے ہی طبعی موت آئی۔ کوئی اچانک دل کے دورے وغیرہ سے مرا اور کوئی کچھ عرصہ بستر پر رہنے کے بعد۔"

"چلو ..... فی الحال اتنی ہی معلومات کافی ہیں" میں نے کہا "اب تم میرے پاس آجاؤ۔ کچھ ضروری باتیں زبانی کرنی ہیں۔"

"میں حاضر ہوتا ہوں سر" ٹونی نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ میرے ہاں پہنچ گیا۔ ہم اسٹڈی میں جابیٹھے۔ دروازہ میں نے مقفل کردیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "ٹونی! میرا خیال ہے ملک ریاض ہمارے لئے خواہ مخواہ کا دردِ سر بننے والا ہے۔ میری ساتویں حس مجھے خبردار کررہی ہے کہ وہ خواہ مخواہ قدم قدم پر ہمارے لئے دشواریاں پیدا کرتا رہے گا۔"

"یہی تو میں کہہ رہا تھا سر!" ٹونی بولا "ملک ریاض .... عالم شیر .... نورو ماچھی۔ یہ ہمارے لئے ان کتوں کی طرح ہوگئے ہیں جو قدم قدم پر ٹانگ پکڑنے کے لئے لپکتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں آسانی سے سفر جاری نہیں رکھا جاسکتا۔ ان کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا پڑے گا۔"

"نورو ماچھی تو شاید جانبر نہ ہوسکے" میں نے کہا "ملک ریاض کی تمامتر پشت پناہی کے باوجود شاید اسے اچھے علاج کی سہولتیں میسر نہ آسکیں۔ اسے شہروں میں دندناتے پھرنے کے خواہ کتنے ہی مواقع میسر آتے رہے ہوں لیکن ایک بدنام زمانہ مفرور ڈاکو بہرحال ڈاکو ہی ہوتا ہے۔ کسی نہ کسی حد تک تو اسے اپنے آپ کو بچا کر ہی چلنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی اس کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ محاورتاً بھی اور حقیقتاً بھی۔ اس کی مجھے زیادہ فکر نہیں ہے اور عالم شیر بھی زیادہ بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ بظاہر تو وہ بھی ایک معزز بزنس مین بنا ہوا ہے لیکن

سرکاری فائلوں میں بہرحال اس کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اسے تو کسی بھی وقت راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے۔"

"یعنی آپ کی نظر میں اصل مسئلہ صرف ملک ریاض ہے؟" ٹونی نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "اس کا سیاسی اثر ورسوخ ایک مسئلہ ہے اور دوسرا مسئلہ یہ آن پڑا ہے کہ ہماری اور اس کی دشمنی ریکارڈ پر آگئی ہے۔ میں دو جگہ اس کے بارے میں ایف آئی آر درج کرا چکا ہوں اور اس کے بارے میں ڈی آئی جی صاحب سے بھی میری بات ہو چکی ہے....." میں نے ٹونی کو ڈی آئی جی صاحب سے اپنی گفتگو کے بارے میں آگاہ کیا۔

پوری بات سننے کے بعد ٹونی بولا "اس کا مطلب ہے ڈی آئی جی صاحب نے آپ سے دوستی کے باوجود اس معاملے میں آپ کی کوئی خاص ہمت افزائی نہیں کی؟"

"ہاں۔ اسی لئے تو مجھے ذرا ٹھٹھک کر سوچنا پڑ رہا ہے۔ اب احتیاط زیادہ ضروری ہو گئی ہے۔ میں جلد بازی یا جذباتیت میں کوئی قدم اٹھا کر اپنے لئے کسی قسم کی الجھن کھڑی کرنا نہیں چاہتا۔ میں اپنی اس پالیسی پر قائم رہنا چاہتا ہوں کہ اگر کچھ کرنا ناگزیر بھی ہو جائے تب بھی ہاتھ صاف رکھ کر کیا جائے۔"

"یہ پالیسی ہمارے لئے بہت مفید رہی ہے سر! میں نے خود کبھی اس سے ہٹ کر کچھ کرنے کے بارے میں نہیں سوچا" ٹونی بولا۔

"میں چاہتا ہوں اب بھی تم اسی پالیسی پر قائم رہتے ہوئے ملک ریاض کے علاج کا بندوبست کرو۔ یہ فیصلہ بہرحال میں نے کر لیا ہے کہ اس کا پتا صاف ہو جانا چاہئے لیکن یہ کام اب چند دن ٹھہر کر کرنا ہے اور بہت دیکھ بھال کر کرنا ہے۔ تین چار ساتھیوں کو اس کام کے لئے خاص طور پر ساتھ ملا لو۔ ملک ریاض کے گاؤں اور شہر والے سب ٹھکانے تمہارے علم میں ہیں، پہلے کچھ دن اس کی نگرانی کرو، اس کے معمولات کا جائزہ لو۔ اسے یا اس کے کسی آدمی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ اس پر نظر رکھی جا رہی ہے۔ خواہ اس کے لئے تمہیں اور ہمارے دوسرے آدمیوں کو میک اپ کا سہارا لینا پڑے یا کوئی بہروپ بھرنا پڑے۔"

"میں سمجھ گیا ہوں سر! سب کچھ بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ قطعاً فکر نہ کریں" ٹونی کی عادت تھی، وہ کسی بھی کام کو قطعاً مشکل نہیں سمجھتا تھا۔ ہر کام کو وہ انجام بھی کچھ اس طرح دے کر آجاتا تھا جیسے وہ اس کے لئے بائیں ہاتھ کا کھیل رہا ہو۔ وہ کسی بھی کام کو نہ تو کرنے سے پہلے ہوّا بناتا تھا اور نہ ہی اسے کر کے آنے کے بعد جتاتا تھا کہ اس میں کیا کیا دشواریاں پیش آئیں۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن ملک ریاض کے قتل میں بم، گولی، چاقو، خنجر..... حتیٰ کہ لاٹھی تک بھی استعمال نہیں ہونی چاہئے۔ کوئی بھی ہتھیار قطعاً استعمال نہیں ہونا چاہئے۔"

ٹونی کے پتلے پتلے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی،

"ٹھیک ہے سر! ایسا ہی ہو گا۔ عین ممکن ہے اس کی گاڑی کو حادثہ پیش آجائے..... بریک وغیرہ فیل ہو جائیں..... یا کوئی ٹرک اس کی گاڑی کو چکنا چور کر کے فرار ہو جائے..... یہ بھی ممکن ہے وہ کہیں سیڑھیوں سے پھسل کر گرے اور گردن تڑوا بیٹھے۔"

"ہاں..... دیکھ لینا..... موقع محل کی مناسبت سے جو بھی ٹھیک لگے" میں نے کہا "بس یہ خیال رکھنا کہ کام کچا نہیں ہونا چاہئے۔ ایسا نہ ہو کہ اس میں کچھ سانسیں باقی ہوں۔ اسپتال پہنچ کر بچ جائے۔ جو لوگ زمین کے سینے پر بوجھ ہوتے ہیں عام طور پر وہ بڑے سخت جان ہوتے ہیں۔"

ٹونی نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔ دل ہی دل میں اس نے یقیناً منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ میں نے ازراہِ احتیاط مزید تاکید کی "کوئی سراغ باقی نہیں رہنا چاہئے جو ہماری طرف نشاندہی کرتا ہو۔ ورنہ ساری محنت غارت ہو جائے گی۔"

ٹونی کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ برقرار تھی۔ دھیمے لہجے میں وہ بولا "سر! کیا آپ کو ٹونی کے کاموں پر بھروسا نہیں رہا؟"

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔ تم پر اور تمہارے کاموں پر تو بعض اوقات میں اپنی ذات سے زیادہ بھروسا محسوس کرتا ہوں۔ مجھ پر تو پھر بھی کبھی کبھی جذباتیت حملہ آور ہو جاتی ہے لیکن تم تو جذباتیت کو قریب بھی نہیں پھٹکنے دیتے۔ اس کے باوجود بس احتیاطاً بار بار یاد دلا رہا ہوں کہ اس معاملے میں ذرا سا بھی سراغ باقی نہیں رہنا چاہئے۔ ملک ریاض کو ٹھکانے لگانے کا فیصلہ میں نے قدرے تاخیر سے کیا۔ اگر آج صبح بھی میں نے یہ فیصلہ کر لیا ہوتا تو میں ڈی آئی جی صاحب سے اس موضوع پر بات ہی نہ کرتا۔ اب ان کے ذہن میں یہ بات رہے گی۔ ملک ریاض خواہ کسی بھی انداز میں مرے لیکن ان کا ذہن میری طرف ضرور جائے گا۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ذرا سا بھی سراغ ہماری طرف راہنمائی نہ کرے تاکہ اگر ڈی آئی جی صاحب اس معاملے میں کوئی بات کریں تو میں بھی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکوں، جناب! کسی چیز کے بارے میں اندازے لگانا اور بات ہے اور اسے ثابت کرنا دوسری بات، یہ انہی کا فرمان ہے جو میں بوقتِ ضرورت ان کی طرف لوٹا دینا چاہتا ہوں۔ ویسے مجھے یقین ہے کہ اگر ملک ریاض کا صفایا عمدگی سے کیا گیا تو ڈی آئی جی صاحب اس سلسلے میں مجھ سے کوئی بات نہیں کریں گے البتہ اگر ملک ریاض کے لئے ان کے دل میں کوئی نرم گوشہ ہوا تو شاید وہ خاموشی سے اس کی حادثاتی موت کی تحقیقات کرائیں۔"

"اگر آپ ابھی تشویش محسوس کر رہے ہیں تو اس معاملے کو مؤخر کر دیتے ہیں۔ ملک ریاض کو کچھ دن اور کھلنے کھیلنے کی مہلت دے دیتے ہیں" ٹونی گویا بادلِ ناخواستہ بولا۔

"نہیں" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "میں نے اس پہلو پر بھی سوچا تھا لیکن میرے خیال میں اس معاملے کو مؤخر کرنا اور بھی خراب ہو گا کیونکہ ملک ریاض اپنی حرکتوں سے باز تو آئے گا نہیں۔ چنانچہ جتنا زیادہ وقت گزرے گا اتنی ہی اس کی اور ہماری دشمنی کی داستانیں عام ہوتی جائیں گی۔ اس لئے میں نے یہی سوچا ہے کہ یہ کانٹا جسم میں زیادہ گہرا اترنے سے پہلے ہی نکل جائے تو اچھا ہے۔ ہماری طرف کم لوگوں کا دھیان جائے گا۔"

"درست ہے سر!" ٹونی نے سر ہلایا "الیکشن بھی قریب ہیں۔ اگر اس دوران اسے ٹکٹ بھی مل جائے تو اور اچھا ہے۔ اگر اس کی حادثاتی موت کی تہ میں سازش تلاش کرنے کی طرف کسی کا دھیان چلا بھی گیا تو سب سے پہلے اس کے سیاسی مخالفین کی طرف نظر جائے گی۔"

"لیکن میں یہ بھی پسند نہیں کروں گا کہ الزام کا پھندا کسی بے گناہ کے گلے میں فٹ کر دیا جائے۔" میں نے کہا۔

"آپ اس معاملے کو مجھ پر چھوڑ دیں اور بھول جائیں سر! میں اسے ہینڈل کر لوں گا۔ ہم کوئی ایسا اچانک اور جان لیوا حادثہ تخلیق کریں گے کہ اسے کوئی حادثے کے سوا کچھ کہہ ہی نہیں سکے گا" ٹونی بے پروائی سے بولا۔

"بس..... ٹھیک ہے۔ تم آج سے اسی مہم پر لگ جاؤ۔ باقی سب کام چھوڑ دو۔ اس کے لئے خاصا وقت درکار ہو گا۔ ملک ریاض اب بہت محتاط ہو چکا ہو گا۔ اس نے اپنے حفاظتی انتظامات بہت بڑھا لئے ہوں گے۔ مناسب موقع تلاش کرنے اور پھر حادثے کے انتظامات کرنے کے لئے تمہیں کافی دن اس کی نگرانی کرنا پڑے گی۔"

"ٹھیک ہے سر....." پھر قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ وہ بولا، "میں تو اس طرف لگ جاؤں گا لیکن آپ کو کچھ فکر اپنی سیکیورٹی کے بارے میں بھی کرنی چاہئے۔ میں محسوس کر رہا ہوں کہ خطرات جوں جوں بڑھ رہے ہیں آپ کی ذاتی حفاظت کے انتظامات ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ آپ کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہئے۔"

"میں نے توجہ یہی دی ہے کہ خود بہت زیادہ چوکنا رہنے لگا ہوں اور تم لوگوں سے ہر وقت رابطے کا کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور رکھتا ہوں۔ مجھے ملک ریاض، عالم شیر یا نورو ماچھی ٹائپ کے لوگوں کی کچھ زیادہ فکر نہیں ہے۔ انہیں میں زیادہ اہمیت نہیں دیتا۔ مجھے تشویش صرف ریڈ ڈاٹ کی طرف سے ہے۔ وہ لوگ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئے اور جو لوگ سمجھ میں نہ آئیں وہ مجھے زیادہ خطرناک محسوس ہوتے ہیں۔"

"میں ملک ریاض والا قضیہ نمٹا دوں، اس کے بعد ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بھی کچھ سوچتے ہیں۔ کوئی منصوبہ بناتے ہیں" ٹونی بولا۔

"ہم ان کے بارے میں کوئی منصوبہ بنانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں" میں نے طویل سانس لے کر کہا "فی الحال تو اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے بارے میں ان کے منصوبے کیا ہیں تو غنیمت ہو گا۔ تب بھی شاید ہم کچھ کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

کچھ دیر بعد ٹونی رخصت ہو گیا اور میں شاور لینے چلا گیا۔ شاور سے فارغ ہو کر میں لباس تبدیل کر کے گھر سے نکلنے کی تیاری ہی کر رہا تھا کہ کراچی سے راحیلہ کا فون آگیا۔

"راحیلہ..... میری.....!" میں اسے جان کہتے کہتے رک گیا۔

میرا اس کا تعلق بھی عجیب تھا۔ ہم ایک دوسرے کے سب کچھ تھے لیکن درمیان نہ جانے کون سی غیر مرئی دیواریں حائل تھیں جو بے تکلف اور عام سے لفظوں کا بھی راستہ روک لیتی تھیں۔ جذبے تو دلوں میں مقیّد تھے ہی۔

"راحیلہ..... میری دوست!" میں نے جلدی سے کہا "تمہاری عمر یقیناً بہت لمبی ہے..... اور ہونا بھی چاہئے۔ آخر تم شیطان کی خالہ ہو۔"

اس نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ میرے ہونٹوں پر بے ساختہ لفظوں نے کیسا پلٹا کھایا تھا۔ ایک لمحے کے لئے وہ بالکل خاموش رہی پھر جیسے اپنی خوش دلی کو آواز دیتے ہوئے بولی "بچپن میں دادی اماں سے سنا تھا کہ جھوٹ بولنے والے کے سینگ نکل آتے ہیں۔ اگر یہ بات سچ ہوتی تو تمہارے سر پر بالوں سے زیادہ سینگ ہوتے۔"

"وہ تو ہیں" میں نے کہا "لیکن وہ دوسرے جھوٹے کو نظر نہیں آتے۔ فی الحال ان باتوں کو چھوڑو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ آفس جا کر تمہیں فون کر کے معلوم کروں گا کہ تمہارے آنے کے پروگرام کا کیا بنا؟"

"کچھ بن ہی گیا ہے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اطلاعاً عرض ہے کہ ہم آج رات ساڑھے نو بجے والی فلائٹ سے پہنچ رہے ہیں۔"

"کیا واقعی.....؟ یقین نہیں آرہا" میں نے حقیقتاً حیرت سے کہا۔

"یہی سوچ کر تم گھر مت بیٹھے رہنا۔ کہیں میں اور راشد ایئرپورٹ پر ذلیل و خوار ہوتے رہیں اور تم بعد میں اطمینان سے کہہ دو کہ تمہیں تو یقین ہی نہیں آیا تھا۔ آج فرسٹ اپریل بھی نہیں ہے، جو تم یہ بہانہ کر سکو کہ تمہیں شبہ ہوا تھا بے وقوف بنائے جانے کا۔"

"بنے بنائے کو کوئی کیا بنائے گا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہرحال آپ کا یہ خادم ایئرپورٹ پر موجود ہو گا۔"

"وہ توپیں ساتھ لے کر آنا جن سے تم نے مجھے سلامی دینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔"

"تمہیں معلوم ہے کبھی کبھی توپوں کا نشانہ غلط بھی ہو جاتا ہے؟ گولا انہیں ہی جا لگتا ہے جنہیں سلامی دی جا رہی ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"ہاں۔ بشرطیکہ توپچی تم جیسا ہو۔ تم سے کس نے کہا ہے کہ

تو میں خود چلانے بیٹھ جاتا۔ تم صرف گاڑی چلاتا۔ یہاں شفیع شاہ کہہ رہا تھا کہ لاہور میں انتظامات کرا دیتا ہوں' کوئی آکر آپ کو ریسیو کرلے گا لیکن میں نے کہا' نہیں بھئی..... لاہور میں اپنا ڈرائیور موجود ہے" وہ شاہانہ لہجے میں بولی۔

"ڈرائیور.....؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا "ملکۂ عالیہ! آپ نے میرا درجہ اتنا بلند کیوں کردیا؟ میں آپ کا ڈرائیور بننے کے لائق کہاں۔ میں تو آپ کی گاڑی کا ٹائر ہوں...."

"وہ بھی گھسا ہوا" وہ جلدی سے بولی۔

"شاید اسی لئے آپ نے اسٹپنی کے طور پر رکھا ہوا ہے" میں نے دردناک لہجے میں کہا۔

"اچھا.... اب فضول باتیں مت کرو" وہ تیزی سے بولی "میں ائرپورٹ پر تمہارا انتظار رہوں کروں گی۔"

"انتظار آپ کو نہیں' مجھے کرنا پڑے گا خاتون! میں آپ کو ریسیو کرنے آرہا ہوں" میں نے تصحیح کی۔

"انتظار کا کیا ہے' کوئی جب چاہے' جہاں چاہے کرسکتا ہے۔ اچھا خدا حافظ" اس نے خلاف توقع جلد ہی سلسلہ منقطع کردیا۔

میں بیڈ روم سے نکل آیا اور ملازم سے ہلکا سا ناشتا لانے کے لئے کہا۔ آج صبح میں صحیح طور پر ناشتا نہیں کرسکا تھا۔ ناشتے کے دوران میں نے اخبارات پر نظر ڈالی۔ ستارہ کی پریس کانفرنس کو نمایاں جگہ ملی ہوئی تھی۔ ایکٹرسوں کے بیانات عموماً بڑی سج دھج سے شائع ہوتے ہیں۔ متنوع تصویروں سے ان کی شان بڑھ جاتی ہے۔

ستارہ نے معاملے کو عمدگی سے نبھالیا تھا۔ اس نے اپنی بازیابی کا کریڈٹ پولیس کو دے دیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اسے نامعلوم افراد نے تاوان کی غرض سے ہی اغوا کیا تھا لیکن پولیس نے اتنی عمدگی سے ان کے گرد گھیرا تنگ کیا تھا کہ خوف کے باعث انہوں نے تاوان وصول کئے بغیر ہی اسے چھوڑدیا تھا۔ یہ پولیس کا وہ "گھیرا" تھا جس کے بارے میں پولیس کو خود بھی کچھ معلوم نہیں تھا لیکن اندازہ بہرحال یہی ہوتا تھا کہ اس بیان سے وہ خوش ہوگئے تھے اور انہوں نے ستارہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے بجائے فخریہ بیانات دے کر ترقیاں حاصل کرنے کے لئے کارروائیاں شروع کردی تھیں۔

میں نے سوچا' ستارہ کو فون کرکے مفت میں اتنی پبلسٹی ملنے پر مبارک باد دوں لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کردیا اور گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ میں اب راستے میں اپنے آگے پیچھے آنے جانے والی گاڑیوں پر خاص طور سے نظر رکھنے لگا تھا۔ اس وقت تو میں خصوصی توجہ سے گاڑیوں کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ ان میں سے کوئی میرا تعاقب تو نہیں کررہی؟

مطمئن ہوجانے کے بعد بھی میں نے اِدھر اُدھر بے مقصد کئی چکر لگائے۔ آخر کار میں اس چھوٹی سی کوٹھی کی طرف روانہ ہوا جہاں میں نے راحیلہ اور راشد کے قیام کا بندوبست کیا تھا۔ میں

نہیں چاہتا تھا کہ ان کی رہائش کسی کی نظر میں آئے اور میرے دوست ہونے کے جرم میں وہ بھی ستارہ کی طرح کسی مصیبت میں پھنس جائیں۔

کافی عرصہ پہلے جب میں نے زیادہ ترقی نہیں کی تھی' اس کوٹھی میں میری اپنی رہائش ہوا کرتی تھی۔ پھر اس میں میرے ٹیکسٹائل کے بزنس کا آفس بھی رہا تھا۔ کچھ عرصے سے یہ کوٹھی خالی اور بے مصرف پڑی تھی۔ میرے اسٹیٹ منیجر نے اس میں راحیلہ اور راشد کی رہائش کے تمام انتظامات کروئے تھے۔ وہاں ایک نوکر اور چوکیدار کا بندوبست بھی کردیا تھا۔ میں صرف ایک نظر ان انتظامات کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ ذاتی طور پر اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ راحیلہ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ یہ میرے ایک اور خواب کی تعبیر تھی کہ وہ جانِ غزل میرے شہر میں رہنے آرہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس کی راہ میں آنکھیں بچھاؤں یا دل کو فرشِ راہ کروں۔

تین بیڈ روم کی وہ خوب صورت سی کوٹھی مجھے آج بھی خوب صورت لگی۔ شاید اس لئے کہ اس میں بھی میری جوانی کی تنہا راتوں کی ایک میٹھی اُداسی رچی ہوئی تھی۔ نوکر وہاں موجود تھا' چوکیدار بھی ڈیوٹی دے رہا تھا' صرف مکین نہیں تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے میری طرح اس گھر کے درودیوار کو بھی مکینوں کا انتظار تھا۔

وہاں کے انتظامات سے مطمئن ہوکر میں دفتر چلا گیا۔ دفتر میں زوروشور سے چوتھی منزل پر مرمت وغیرہ کا کام جاری تھا۔ جو چیزیں نئی آنی تھیں وہ آرہی تھیں۔ بہرحال کام بھی تقریباً معمول کے مطابق ہی جاری تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ایک دودن میں دفتر اپنی پرانی حالت پر لوٹ آئے گا۔

میں کچھ دیر کے لئے کیتھرین کے کمرے میں جا بیٹھا کیونکہ سب سے کم ڈسٹربنس وہیں تھی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "سر! ڈاکو آپ کے پاس کیا لینے آئے تھے؟"

"مجھے ہی لینے آئے تھے" میں نے جواب دیا "اس سے کم وہ کسی چیز پر راضی نہیں تھے۔"

"اسی لئے مارنے گئے گدھے کہیں کے!" وہ اسی شریر سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "انہیں اپنی اوقات کے مطابق کوئی چیز تلاش کرنی چاہئے تھی۔"

"تمہیں یہاں بیٹھے ہوئے خوف نہیں محسوس ہورہا کیتھرین؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا "صبح یہاں آتے ہی تم نے گولیوں سے چکنا چور اور خون میں لتھڑی ہوئی چیزیں دیکھی ہوں گی۔"

"سر! آپ کے آفس میں بیٹھ کر کسی بھی چیز سے خوف محسوس نہیں ہوتا" وہ مطمئن اور خوب صورت مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

باتوں کے دوران وہ ٹیلیفون وغیرہ بھی سنتی جارہی تھی۔ چند لمحے بعد ایک کال آئی تو وہ ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی "سر! آپ کے لئے کال ہے لیکن وہ شخص اپنا نام نہیں بتارہا۔ آپ سنیں گے؟"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "لاؤ..... دے ہی دو۔"

میں نے ہیلو کہا تو پہلے ادھر سے ایک استہزائیہ سا قہقہہ سنائی دیا پھر آواز آئی "چوہدری! میرے چاند! مبارک ہو کہ تم ابھی زندہ ہو۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ملک ریاض تھا۔ اس نے قہقہہ ضرور لگایا تھا مگر اس کے لہجے میں نفرتوں کا زہر تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "مبارکباد کا شکریہ۔ مجھے بہرحال تمہارے ابھی تک زندہ ہونے پر شرمندگی ہے۔"

ایک لمحے کے لئے میرے کانوں کی لویں تپ اٹھیں کیونکہ اس نے مجھے موٹی سی گالی دی تھی۔ میں نے اپنے جذبات کو قابو میں رکھا۔ ایک تو میں نہیں چاہتا تھا کہ جو لفظ صرف میں نے سنا ہے اس کی نوعیت کا کیتھرین کو بھی اندازہ ہو۔ دوسرے مجھے اس شخص پر ترس آرہا تھا۔ وہ اپنی دانست میں زمین پر ایک چھوٹا سا فرعون تھا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ موت کا پنچھی اس کے تعاقب میں روانہ ہوچکا تھا۔ وہ اپنی طاقت' اپنے گھمنڈ' اپنے اثر ورسوخ اور اپنے حفاظتی انتظامات کے خول میں مقید رہتے ہوئے یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ کوئی ناقابل تسخیر مخلوق ہے۔

نہایت تحقیر آمیز لہجے میں وہ بولا "سنا ہے تم نے لاہور میں دو تھانوں میں ایف آئی آر درج کرائی ہے جن میں مجھے اپنے گھر اور دفتر پر حملے کا ذمے دار' ڈاکوؤں کا سرپرست' اغوا برائے تاوان کا دھندا کرنے والا اور نہ جانے کیا کیا قرار دیا ہے؟"

میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ابھی تو شاید ان ایف آئی آرز کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی تھی کہ اسے ان کی خبر تک مل گئی تھی۔ واقعی ملک ریاض کے قبیل کے لوگوں کی اس نظام میں جڑیں بہت گہری تھیں۔

وہ استہزائیہ سے انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "چمن کھناں! تمہیں کیا پتا' یہ ایف آئی آر..... یہ تھانے کچہریاں کیا ہوتی ہیں۔ تم دو اور دو چار کرنے والے شہری سیٹھ! تمہارا خیال ہوگا کہ ایف آئی آر درج ہونے کے بعد مجھے پھانسی لگ جائے گی؟"

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "ہمارے بہت بندے مرے ہیں۔ ایف آئی آر تو مجھے درج کرانی چاہئے تھی لیکن میں ان تکلفات میں نہیں پڑا۔ پولیس نے اپنے طور پر جو ایف آئی آر چاہی درج کرلی۔ میں تو سارے واقعے سے لاعلم رہا۔ میں نے تمہارا نام بھی نہیں لیا۔ ہم تو ایف آئی آر کبھی کبھار ہی درج کراتے ہیں اور پھر دوسرے کو سمجھ آجاتی ہے کہ ایف آئی آر کس کو کہتے ہیں لیکن جب ہم ایف آئی آر درج نہیں کراتے اس وقت دوسری پارٹی کو زیادہ ڈرنا چاہئے۔ مگر تم ابھی بچے ہو۔ تمہیں دنیا کا کچھ پتا نہیں....."

میں مسکرادیا۔ اب میں اس کی باتوں سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہارا اتنا ہی اثر رسوخ کافی تھا کہ تم ایف آئی آر میں میرا نام درج کرانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس سے آگے صبر ہی کرنا۔ زیادہ لمبی چوڑی امیدیں مت رکھنا۔"

"بہت بہتر سرکار! اور کوئی حکم؟" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

"حکم تو ابھی بہت سے جاری ہوں گے چن میرے! اصل کھیل ہی اب شروع ہوگا۔" اس نے ایک بار پھر استہزائیہ سے انداز میں قہقہہ لگایا۔

"بس..... یہی بتانے کے لئے فون کیا تھا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"نہیں۔ ہم کسی کو کچھ بتانے کے لئے فون نہیں کیا کرتے۔ میں نے تو یہ پوچھنے کے لئے فون کیا ہے کہ تمہیں اپنی زندگی عزیز ہے یا نہیں؟" اس کے لہجے میں فرعونیت تھی۔

"یہ ایک نہایت ہی احمقانہ سوال ہے" میں نے رکھائی سے کہا "ویسے بھی یہ میرا اور مجھے زندگی عطا کرنے والے کا معاملہ ہے۔ میں اس موضوع پر تم جیسے جاہلوں سے بات کرنا پسند نہیں کرتا" میں نے فون بند کردیا اور کیتھرین سے کہا "اگر یہ شخص دوبارہ فون کرنے کی کوشش کرے تو مجھے امید ہے کہ تم اس کی آواز پہچان لوگی۔ آواز سنتے ہی ڈانٹ پلا کر فون بند کردینا۔"

"بہت بہتر سر!" کیتھرین نے مستعدی سے کہا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے کمرے میں کام جاری تھا۔ قالین تبدیل کیا جارہا تھا اور میز وغیرہ کا خاص طور پر تیار شدہ اسٹیل کا اندرونی ڈیزائن دوبارہ ایک کارخانے میں بھیجا جارہا تھا تاکہ اس پر لکڑی کی تہ چڑھائی جاسکے۔ یہ میز فرنیچر کے ایک بڑے زبردست ماہرِ فن نے میرے لئے ڈیزائن کی تھی۔ ہنگامی حالات میں کام آنے والی بہت سی خوبیاں اس میں موجود تھیں۔

کیتھرین نے بتایا کہ آج دفتر سے باہر میری کئی ملاقاتیں طے

تھیں۔ میں ان کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ مصروفیت آج بھی بہت تھی۔ اوپر سے ملک ریاض نے فون کرکے ذہن مزید الجھادیا تھا لیکن ان سب تصورات اور مصروفیات پر راحیلہ کا تصور غالب تھا۔ دل کو جیسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ جانِ آرزو آج واقعی مستقل رہنے کے ارادے سے میرے شہر آرہی تھی۔ باربار اس کی تصویر سوچ کے پردے پر ابھر آتی تھی۔ ہوٹل میں لنچ کے دوران باتیں دوسروں سے کرتا رہا لیکن آنکھوں کے سامنے باربار ان کی صورت دھندلاتی رہی اور راحیلہ کا چہرہ ان کی جگہ لیتا رہا۔ ہر صورت میں اسی ایک صورت کا جلوہ تھا' ہر چہرے میں وہی ایک چہرہ تھا۔ وقت تھا کہ کاٹے نہیں کٹ رہا تھا۔

خدا خدا کرکے دن ڈھلا اور رات کا اندھیرا گہرا ہوا۔ میں رات کا کھانا کھائے بغیر آٹھ بجے ہی ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے کسی ملازم' کسی ڈرائیور وغیرہ کو ساتھ نہیں لیا تھا۔ یہ گویا خالصتاً میرا نجی معاملہ تھا۔ میں اسے اپنے تک ہی محدود رکھنا چاہتا تھا۔

میں وقت سے کافی پہلے ہی ائرپورٹ پہنچ گیا تھا چنانچہ وقت گزاری کے لئے ریستوران میں بیٹھ کر گندے سے برتنوں میں آنے والی کافی سے دل بہلانے کی کوشش کرتا رہا۔ آخرکار فلائٹ کی آمد کا اعلان ہوا اور میں ارائیول لاؤنج میں سب سے آگے جنگلے کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ رن وے پر تیز روشنی تھی اور وفورِ اشتیاق سے میرا دل دھڑک رہا تھا۔

جب جہاز کچھ دور میرے سامنے آکر رکا اور سیڑھی لگائی گئی تب تو میرا دل گویا کنپٹیوں میں آکر دھڑکنے لگا۔ میں پلک جھپکنا بھول گیا اور جہاز کے شکم سے برآمد ہونے والے مسافروں کو ایک ٹک دیکھنے لگا۔ میرا اشتیاق واقعی ایک نوعمر لڑکے کا سا تھا۔ بے تابی اور جذبات کے اس تلاطم میں بڑی لذت تھی۔ میرے لئے یہ لذت بھی ایک نعمت تھی۔ بعض لوگ پختہ العمر ہونے کے بعد نوعمری اور لڑکپن کے محسوسات سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں لیکن کسی نہ کسی خاص موقعے پر میرے یہ محسوسات اب بھی بیدار ہوجاتے تھے۔

میں نے فون پر راحیلہ سے یہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ وہ فرسٹ کلاس میں ہوگی یا اکانومی کلاس میں۔ بہرحال اب میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دونوں ہی دروازوں سے برآمد ہونے والے ہر مسافر کو دیکھے جارہا تھا۔ دونوں دروازوں پر دو ائرہوسٹسیں پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی مسافروں کو رخصت کررہی تھیں۔

آخرکار دونوں دروازوں سے کڑی در کڑی باہر آنے والی مسافروں کی زنجیر مکمل ہوگئی۔ مسافروں کی آمد کا سلسلہ بند ہوگیا مگر راحیلہ اور راشد باہر نہ آئے۔ میرا دل ڈوب گیا۔ تیز روشنیاں آنکھوں کے سامنے تاریکیوں میں ڈھلنے لگیں۔ کیا پروگرام میں کوئی

گڑبڑ ہوگئی تھی؟ ایسی کون سی ناگزیر وجہ ہوسکتی تھی جس نے راحیلہ کو آنے سے روک دیا تھا؟ اگر ایسی کوئی بات تھی تو وہ فون کرکے مجھے اطلاع دے سکتی تھی۔

دونوں ائرہوسٹسوں نے ایک نظر لاؤنج کی طرف دیکھا اور اندر چلی گئیں۔ میرا دل ایک عجیب سی شکستگی و مایوسی سے بوجھل ہوگیا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی کہ آخر ا… کون سی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ وہ اگر اس فلائٹ سے نہیں آ… تھی تو اگلی فلائٹ سے آسکتی تھی۔ آج نہیں تو کل آسکتی تھی۔ جب دل پر اشتیاق لڑکپن جیسا طاری ہوتا ہے تو مایوسیاں لڑکپن جیسی ہوتی ہیں۔ افسردگی بھی کچی عمر والی ہوتی ہے۔

میں نے سوچا کہ جاکر مسافروں کے ناموں کی فہرست چ… کروں' میں اس خیال سے مڑنے ہی والا تھا کہ فرسٹ کلاس… دروازے سے آہستگی سے خوب صورت' بھورے بالوں والا آ… سر باہر آیا اور میں بے اختیار ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ مجھ میں جیسے زندگی کی توانائیاں لوٹ آئیں۔

وہ بھی یقیناً اپنی نوعمری کے دور میں واپس جارہی تھی… موقعے پر بھی شرارت کرکے اس نے غیرارادی طور پر یہ ظاہر… تھا کہ اس کی روح پر سے اداسی کی برف پگھل رہی تھی۔ وہ… جنم لے رہی تھی۔ اس کے لڑکپن کا شریر انداز واپس آرہا تھا… ایک خوش آئند علامت تھی۔ میرے اندر کی فضا جیسے لمحہ… رنگ بدل رہی تھی۔ اس لمحے میرا دل ایک عجیب سی خوشی… سرشار ہوگیا۔

وہ چوروں کی طرح قدم اٹھاتی باہر آگئی۔ منہ پر ہاتھ رکھ کر… ہنسی روکنے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ ہم لوگوں کو نہیں دیکھ سکتی… جو جنگلے کے پیچھے اپنے اپنے پیاروں کو ریسیو کرنے کے لئے کھڑ… تھے لیکن اپنے دل کی صدا پر اسے کس غضب کا یقین تھا۔ ا…

بڑا اچھی طرح معلوم تھا کہ میں اسے ریسیو کرنے کے لئے وہاں کھڑا ہوں گا۔

اس کے پیچھے پیچھے راشد بھی بریف کیس اٹھائے باہر آگیا۔ ائرہوسٹس بھی دوبارہ باہر آگئی۔ وہ بھی لاؤنج کی طرف دیکھ کر مسکرارہی تھی۔ یقیناً وہ بھی راحیلہ کی شرارت میں شریک تھی۔ راحیلہ نے یقیناً اسے بتادیا تھا کہ وہ سب سے آخر میں نکلنے والے مسافر کے بھی ایک ڈیڑھ منٹ بعد باہر آئے گی۔ اب وہ کسی کھلنڈری اور بے فکری لڑکی کی طرح تیزی سے سیڑھیاں اتر رہی تھی۔ اس کے خوب صورت بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور تیز روشنی میں تپے ہوئے تانبے کے باریک ریشمی تاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔

آج مجھے راحیلہ میں اسی لڑکی کا پرتو دکھائی دیا جسے میں نے برسوں پہلے کراچی کے ائرپورٹ پر دیکھا تھا جب وہ اپنے والد اور بھائی کے ساتھ مجھے ریسیو کرنے آئی تھی۔ میں اس وقت بھی اس کے حسن بلاخیز کو دیکھ کر گم صم سا ہوگیا تھا.... اور میں آج بھی اسے دیکھ کر گم صم سا تھا۔

کھٹ کھٹ کرتی وہ لاؤنج کے قریب آئی۔ لاؤنج کی سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے ہی اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں سے ہی نہیں' پورے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔ راشد نے آگے آکر گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

میں نے راحیلہ کے ہاتھ سے اس کا ہینڈ بیگ لینے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہ ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی "کیا کوئی ملازم وغیرہ ساتھ نہیں ہے؟"

"آپ نے صرف ڈرائیور کو طلب فرمایا تھا' اور ڈرائیور حاضر ہے میڈم!" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے سنجیدگی سے نہایت خادمانہ انداز میں کہا۔

اس نے بیگ مجھے نہیں دیا اور میرے ساتھ..... چلتے ہوئے اپنی اسی مقناطیسی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "تم یہی سمجھے تھے نا کہ میں اس فلائٹ سے نہیں آئی ہوں؟"

"نہیں۔ میں سمجھا تھا جہاز والوں نے تمہیں فالتو مسافر سمجھ کر راستے میں کہیں دریا وغیرہ میں پھینک دیا ہوگا" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ایسی جرأت کون کرسکتا ہے" وہ اکڑ کر بولی "میں خود انہیں اٹھا کر کسی ندی نالے میں پھینک دیتی۔"

"آپ کی کیا بات ہے خاتون! آپ کی دہشت سے تو جہاز بغیر انجن کے اڑنے لگتے ہیں" میں نے مصنوعی مرعوبیت سے کہا۔

ہم کنویئر بیلٹ کے قریب آکھڑے ہوئے۔ ان کے سوٹ کیس اٹھا کر ٹرالی پر رکھوا کر ہم باہر آئے اور پارکنگ لاٹ میں کھڑی گاڑی تک پہنچے۔ راحیلہ ایک نظر گاڑی کو دیکھ کر بولی "بھئی واہ.... بڑے ٹھاٹ ہیں تمہارے۔ تم تو واقعی بڑے آدمی ہوگئے ہو انی!"

"بڑا آدمی تو میں پہلے بھی تھا لیکن پہلے میرے پاس دولت نہیں تھی" میں نے کہا پھر میں نے راشد کو مخاطب کیا "تم کیوں خاموش ہو؟"

"جب آپ دونوں بول رہے ہوتے ہیں تو مجھ غریب مسکین کی جرأت کہاں ہوتی ہے بیچ میں بولنے کی" وہ عاجزی سے بولا۔ اس کے انداز پر میں اور راحیلہ ہنس دیئے۔

نہر کے قریب پہنچ کر میں نے گاڑی گلبرگ کی طرف موڑتے ہوئے کہا "راستے میں پہلے میرا غریب خانہ پڑتا ہے۔ پہلے وہاں ہولیتے ہیں۔ اگر تم پسند کرو تو آج کی رات وہیں گزار لینا۔ صبح اپنے دولت خانے میں منتقل ہوجانا۔ اگر اس تجویز سے اتفاق نہ ہوا تو میں تم دونوں کو آج رات ہی تمہارے دولت خانے پر پہنچادوں گا۔"

میں نے جب گاڑی اپنی کوٹھی کے سامنے لے جاکر روکی اور طارق خان نے کیمرے کی آنکھ سے اندر گیٹ ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے میری گاڑی دیکھنے کے بعد آٹومیٹک گیٹ کھولا تو راحیلہ کے ہونٹ دائرے کی سی صورت میں سکڑ گئے۔

"اوہ..... یہ تو سچ مچ کسی محل سے کم نہیں" وہ گاڑی سے اتر کر طویل و عریض ڈرائیو وے میں کھڑی ہوکر چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولی "انی! یہاں تم اکیلے رہتے ہو؟"

"مجبوری ہے!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "چند نوکروں' چند کتوں اور چند پرندوں کے سوا کوئی میرے ساتھ رہنے پر آمادہ ہی نہیں ہے۔"

میں نے ان کے لئے کھانا لگوایا۔ کھانے سے فارغ ہوتے ہی راحیلہ نے اصرار کیا کہ انہیں وہیں پہنچادیا جائے جہاں انہیں مستقل رہنا ہے تاکہ وہ آج سے ہی اس جگہ سے مانوس ہونے کی کوشش شروع کردیں۔

میں نے انہیں اس کوٹھی پر پہنچادیا جو میں نے ان کے لئے تیار کرائی تھی۔ راحیلہ اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد بولی' "ہماری اوقات سے تو یہ بھی بڑی ہے۔"

"تم اسے کرائے پر اٹھادینا اور خود ریلوے اسٹیشن پر بستر لگالینا" میں نے کہا "شاید اس طرح تمہارے اس اوقات والے فلسفے سے انصاف ہوسکے۔"

کچھ دیر اسی طرح میٹھی میٹھی نوک جھونک کے بعد میں انہیں خدا حافظ اور شب بخیر کہہ کر واپس روانہ ہوا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی تھی۔ گلبرگ کی سڑکوں پر ویرانی چھاچکی تھی۔

میں اس وقت گاڑی غالب مارکیٹ سے مین بلیوارڈ پر موڑ رہا تھا جب اچانک ہی ایک شخص میری گاڑی کے سامنے آگیا۔

تھی۔

وہ یکدم ہی مجھ سے لپٹ گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ بچوں کی طرح ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔ "افضل! میرے یار... تم کہاں کھو گئے تھے؟ میں نے تمہیں اتنا ڈھونڈا... اتنے بڑے شہر میں میرا کوئی جگری یار نہیں تھا... کوئی سچا دوست نہیں تھا۔ میں راتوں کو رو رو کر دعائیں مانگا کرتا تھا... یا اللہ! میرا پیارا دوست کسی دن اچانک ہی، راہ چلتے کسی موڑ پر مجھے مل جائے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اللہ میاں مجھ جیسے گناہ گار اور بُرے آدمیوں کی دعائیں بھی سنتے ہیں۔"

"گناہ گار بھی اگر کسی کا بُرا نہ چاہے... خلوصِ نیّت سے دعا مانگے... اچھی دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ سن ہی لیتے ہیں۔" میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا "میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ تم رات کے اس پہر اس طرح مجھے مل جاؤ گے... اور وہ بھی خصوصاً ان دنوں جب میں نے تمہیں تلاش کرنے کا ارادہ ہی باندھا تھا۔"

وہ پیچھے ہٹتے ہوئے اور قدرے سنبھلتے ہوئے بولا "مجھے کچھ لوگوں نے بتایا تو تھا کہ ایک محمد افضل چوہدری تو شہر کے بہت بڑے آدمی ہیں۔ بڑے سیٹھ۔ کئی کارخانے اور بڑے بڑے کاروبار ہیں ان کے۔ ان کا گروپ آف کمپنیز ملک کے بڑے بڑے گروپس میں شمار ہوتا ہے۔ میں نے یہ سنتے ہی اپنے طور پر فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اپنا یار افضل نہیں ہوسکتا۔ ٹھیک ہے... کبھی کبھی انسان کا فلوک لگ جاتا ہے۔ اس کے پاس چار پیسے آجاتے ہیں۔ جیسے میرے پاس آگئے ہیں لیکن اب اتنا بھی نہیں ہوتا کہ آدمی بارہ تیرہ سال میں آسمان پر ہی جا پہنچے۔"

"یہ تو آسمان والے کی مرضی ہے، جسے جہاں چاہے پہنچا دے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ذرا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے دوبارہ مجھے غور سے سرتاپا دیکھا۔ پھر آنکھیں سکیڑ کر میری گاڑی کا جائزہ لیا اور بے یقینی کے عالم میں بولا۔ "تمہارا مطلب ہے... تم ہی وہ افضل چوہدری ہو جس کا لوگ مجھ سے تذکرہ کرتے تھے اور میں اسے کوئی اور سمجھا کرتا تھا؟"

"ممکن ہے ایسا ہی ہو۔" میں نے غیر واضح لہجے میں کہا۔ "گروپ آف کمپنیز تو بہرحال میرا ہے... کاروبار بھی ہیں... کارخانے بھی ہیں... چھوٹی موٹی ہر چیز ہے۔"

"بس... بس۔ اب زیادہ انکساری برتنے کی ضرورت نہیں۔"

وہ ایک بار پھر مجھ سے لپٹ گیا۔ اس پر نشے کا اثر اب بہت ہی کم رہ گیا تھا۔ اس کے حواس کو جذباتیت اور حیرت کا جو جھٹکا لگا تھا اس نے سارا نشہ ہرن کردیا تھا۔

پیچھے ہٹتے ہوئے وہ مسرت سے معمور لہجے میں بولا۔ "یار... اس کا مطلب ہے تم نے تو بہت ترقی کی ہے... پرسنیلٹی بھی بڑی نکال لی ہے... واہ... کیا بات ہے..." وہ ہاتھ ہلا کر گویا کسی اچھے شعر پر داد دے رہا تھا۔ پھر ادھر اُدھر دیکھ کر وہ رازدارانہ سے انداز میں بولا۔ "یار! اگر اب ہم دونوں کو گاؤں والے دیکھیں تو انہیں یقین آئے گا کہ یہ وہی آوارہ اور کمینے قسم کے چھوکرے راجو اور فجا ہیں؟ قسم سے... کوئی یقین نہیں کرے گا... اور جب یقین آئے گا تو بے عزتی کرنا شروع کردیں گے۔ 'ابے وہ دن بھول گیا جب تیری ماں ہمارے گھر لہسن پیاز مانگنے آیا کرتی تھی۔' کوئی یاد دلائے گا۔ 'ابے تیرے باپ نے میرے باپ سے ہی تو پچاس روپے ادھار لے کر اپنی دُکان کی رجسٹری کرائی تھی۔' غربت کے زمانے والے ملتے ہیں تو اسی قسم کی کمینی اور چھچھوری باتیں شروع کردیتے ہیں۔ اس لئے میں تو گاؤں والوں سے ملتا ہی نہیں۔ اس زمانے کی کوئی جانی پہچانی شکل نظر بھی آجاتی ہے تو میں راستہ ہی بدل لیتا ہوں۔ کترا کر نکل جاتا ہوں۔"

"یہ تو تم اچھا نہیں کرتے پیارے!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "صرف غربت کی وجہ سے آدمی کو اپنے ماضی سے شرمندہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ یہ سوچ کر لطف اندوز ہونا چاہئے کہ ہم کیا تھے کیا بن گئے۔ دولت آنے کے بعد تو انسان کے کمپلیکسز COMPLEXES کم ہونے چاہئیں۔ بڑھنے نہیں چاہئیں۔"

"بقراطی نہیں چاہئے مجھے بالکل۔" وہ ہاتھ ہلا کر گویا کسی چیز کو قطعی رد کرتے ہوئے بولا۔ "گھر پر بیوی بقراطی جھاڑتی رہتی ہے۔ کان کھاتی رہتی ہے۔ ادھر تم نے ملتے ہی بقراطی جھاڑنی شروع کردی۔ میرے یار، میرے جگر، میرے پھیپھڑے! بالکل سیدھی سادی باتیں کرو۔ سیدھے سادے انسانوں والی۔ گناہ گاروں والی۔"

"باتیں تو ابھی بہت ہوں گی پیارے! ہر طرح کی ہوں گی۔ باتوں کا تو ایک سمندر امنڈا چلا آرہا ہے۔ لیکن کیا ہم رات بھر سڑک پر ہی کھڑے باتیں کرتے رہیں گے؟" میں نے پوچھا "چلنے کے بارے میں کیا پروگرام ہے؟ تمہارا تانگہ تو چل نہیں رہا۔ گھوڑا اَڑ کر کھڑا ہوگیا ہے۔"

"تانگہ..." کیا میں تانگے میں یہاں آیا تھا؟ تانگے والا کہاں گیا؟" اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر اُدھر دیکھا۔

"تم پر تو واقعی جادو سا ہوگیا۔ یکدم ہی تم تو ہوش و حواس میں آگئے۔" میں نے حیرت سے کہا "ذرا دیر پہلے تک تم اسے تانگہ کہہ رہے تھے۔" میں نے اس کی گاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

وہ بغور اس طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تو میری اپنی گاڑی معلوم ہوتی ہے..." پھر اس نے نہایت معصومیت سے پوچھا۔ "میں اسے تانگہ کہہ رہا تھا؟ کیا میں نشے میں تھا؟"

"نہیں۔ نہیں۔ وہ تو یونہی ذرا تمہاری زبان پھسل گئی تھی" میں نے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔ "چھوڑو اس بات کو۔ آؤ دیکھیں گاڑی کیوں بند ہوئی ہے؟"

گاڑی تقریباً نئی ہی تھی۔ انجن میں کوئی خرابی ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ میں نے قریب جا کر جائزہ لیا تو گاڑی کا میٹر پیٹرول ختم ہونے کی نشاندہی کررہا تھا۔ راجو سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "ہاں... مجھے یاد پڑتا ہے میٹر تو میں نے بھی دیکھا تھا... اور پیٹرول ڈلوانے کا ارادہ کیا تھا... لیکن پھر شاید میں بھول گیا... چلو خیر... کوئی بات نہیں۔ گاڑی یہیں چھوڑ دیتے ہیں۔ صبح کسی کو بھیج کر منگالیں گے۔ فی الحال تم مجھے اپنی گاڑی میں لے چلو۔"

"صبح تک تمہیں یہاں سے گاڑی نہیں، صرف ٹائروں کے نشان ہی ملیں گے پیارے۔" میں نے کہا۔

"چوری ہوجائے گی؟" اس نے کچھ ایسی بے یقینی سے پوچھا گویا یہ اس کے خیال میں کوئی انہونی سی بات رہی ہو۔ پھر خود ہی سہلاتے ہوئے بولا۔ "ہاں یار... یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ گاڑی اگر چوری ہوگئی تو میری بیوی مجھے گھر سے نکال دے گی۔"

"بہت ڈرتے ہو بیوی سے؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

"ڈرنا پڑتا ہے پیارے!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "گاڑی، کوٹھی اور سارے ٹھاٹ باٹ دراصل اسی کے دم سے ہیں۔ سب کچھ اسی کا ہے۔ میں تو آج بھی وہی ناکارہ، نکھٹو اور کنگال راجو ہوں۔ بیوی کے پیسے سے کوئی کاروبار کرتا ہوں تو اس میں گھاٹا ہوجاتا ہے۔ بیوی سے مزید جھاڑیں سننا پڑتی ہیں۔"

"اوہ...!" میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ "تو یہ قصہ ہے۔ زرخرید شوہر ہو تم..."

اچانک اسے جیسے کوئی خیال آیا۔ چونکتے ہوئے بولا۔ "یار! کہیں تمہارا بھی یہی قصہ تو نہیں ہے؟ کہیں ہم دونوں دوستوں کی ایک ہی کہانی تو نہیں ہے؟ ہم ایک ہی کشتی کے سوار تو نہیں ہیں؟"

"الحمدللہ! ایسا کوئی چکر نہیں ہے۔" میں نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا کر شکر ادا کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو ہر قسم کی بیوی سے بچا ہوا ہوں۔ میں نے تو ابھی تک شادی کے بارے میں سوچا بھی نہیں۔"

"کیا واقعی؟" اس نے یوں حیرت سے میری طرف دیکھا گویا دنیا کا ساتواں عجوبہ اس کے سامنے آگیا ہو۔ پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "یار! تم ہمیشہ سے ہی خوش قسمت رہے ہو۔"

"ہمیشہ سے ہی کہاں یار!" میں نے اس کی گاڑی کا دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ "جب تک گاؤں میں تھے تب تک تو میرے حالات تم سے بھی زیادہ خراب تھے۔ گاؤں سے نکلتے ہی قسمت نے کچھ پلٹا کھایا۔"

"بعض لوگوں کے لئے سفر واقعی وسیلۂ ظفر ہوتا ہے۔" راجو مُربیانہ لہجے میں بولا "گاؤں سے نکلا تو میں بھی یہی سوچ کر تھا۔ مالی حالات تو بدل گئے لیکن کبھی کبھی ایسا لگتا ہے جیسے ایک مصیبت سے نکل کر دوسری مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ اپنی ذلتوں کو بھلانے کے لئے شراب پیتا ہوں... بے حساب پیتا ہوں... اور اس کے بعد بیوی کے ہاتھوں مزید ذلیل ہوتا ہوں۔"

میں نے اس وقت اسے گاؤں میں پڑے ہوئے اس کے دس بچوں اور بیوی کے بارے میں بتانا مناسب نہ سمجھا۔ اس کے ذہن پر یقیناً پہلے ہی بہت بوجھ تھا۔ اب تو اس سے ملاقات ہوگئی تھی۔ اب اس سے "پوچھ گچھ" کرنے اور اسے شرم دلانے کے بہت سے مواقع میسر آنے تھے۔ جلد بازی کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے اپنی گاڑی کی ڈکی کھولتے ہوئے کہا "میں احتیاطاً پیٹرول کے دو ٹن رکھتا ہوں۔ ایک تم اپنی گاڑی میں ڈال لو۔ میرا خیال ہے اب تمہاری حالت اس قابل ہوگئی ہے کہ کافی حد تک صحیح ڈرائیونگ کرسکو۔ اس لئے پیٹرول ڈال کر تم اپنی ہی گاڑی میں بیٹھو اور میری گاڑی کے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔ میرے گھر چلتے ہیں۔ باقی گپ شپ وہیں اطمینان سے بیٹھ کر کریں گے۔"

"نہیں... نہیں یار!" وہ یکدم خوفزدہ سا ہوگیا۔ "ابھی تو مجھے اتنی رات گئے تک باہر رہنے اور پینے پلانے کے سلسلے میں بیوی کے ہاتھوں ذلیل ہونا ہے۔ اگر تمہارے ساتھ چلا گیا تو پھر تو رات ہی باہر گزر جائے گی۔ اس کے بعد تو بیوی گھر میں ہی نہیں گھسنے دے گی۔ تمہارا گھر دیکھنے کا اشتیاق تو مجھے بھی ہورہا ہے لیکن فی الحال اس پروگرام کو رہنے دو۔ ابھی تم میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ تم بارعب آدمی ہو۔ مجھے میری بیوی کے غیظ و غضب سے بچانا۔ ممکن ہے تمہاری موجودگی کا لحاظ کرتے ہوئے وہ خود ہی اپنا 'عظیم الشان ورائٹی پروگرام' ملتوی کردے۔ پلیز۔ تم میرے ساتھ چلو۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے چہرے پر بےچارگی پھیلی ہوئی تھی۔

میں ایک لمحے کے لئے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجو سے میری ملاقات ان حالات میں ہوگی۔ بیوی بچوں کو چھوڑ کر بھاگ آنے پر میرا اس کی خبر لینے کا ارادہ تھا لیکن فی الحال مجھے نہ صرف اپنا ارادہ ملتوی کرنا پڑا تھا بلکہ اس کی مسکین سی شکل دیکھ کر مجھے ترس بھی آرہا تھا۔

"چلو خیر... فی الحال میں ہی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" میں نے پیٹرول کا ڈبا اس کو تھماتے ہوئے کہا "ذرا دیکھتے ہیں اس شیر دی بچی کو... جو تمہاری بیوی کہلاتی ہے۔ مل کہاں سے گئی تمہیں ایک دولت مند عورت؟"

"بس... اتفاقات ہیں زمانے کے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر ڈبا تھامتے ہوئے بولا۔ وہ اپنی گاڑی کی طرف بڑھا تو میں بھی اس کے ساتھ تھا۔ ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد وہ بولا۔ "درحقیقت وہ بیوہ تھی۔ وہ خود تو کچھ بھی نہیں تھی۔ خاندانی پس منظر کے لحاظ سے وہ بھی میری طرح "نفری" تھی لیکن اس کا بڈھا شوہر اس کے لئے کافی دولت، جائیداد اور ایک اصطبل چھوڑ کر مرا تھا جس میں ریس کے چند گھوڑے پرورش پاتے تھے۔ وہ اعلیٰ شجرۂ نسب کے گھوڑے پالتا تھا جو ریس کورس میں دوڑنے کے لئے رجسٹرڈ ہوجاتے تھے۔"

اس نے جیب میں ہاتھ مار کر چابیاں تلاش کیں مگر وہ گاڑی میں ہی لگی ہوئی تھیں۔ میں نے چابیاں نکال کر اسے دیں اور وہ

پیٹرول کی ٹنکی کا تالا کھولتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس کی موت کے بعد اصطبل ٹھنڈا ہوگیا کیونکہ یہ ذرا الگ ہی لائن ہے۔ حالانکہ وہ اصطبل آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ تھا۔ کسی چھوٹے موٹے کارخانے سے کم نہیں تھا لیکن ظاہر ہے اسے اس لائن کا آدمی ہی چلا سکتا تھا جسے تجربہ' شوق اور لگن ہوتی۔ میری نگرانی میں آنے کے بعد اس کا کچھ اور بیڑا غرق ہوگیا۔ ہمیں بھی بھلا کیا پتا ہے کہ ریس کے گھوڑوں کی بریڈنگ کس طرح کی جاتی ہے۔ ان کے ناز کس طرح اٹھائے جاتے ہیں۔ ہم نے تو گھوڑے زیادہ تر تانگوں میں ہی جُتے ہوئے دیکھے تھے جن کی پسلیاں نکلی ہوتی تھیں' چابک کھاتے تھے اور لنگ کرکے چلتے تھے۔ دو چار سو روپے میں بک جاتے تھے۔ ریس کے گھوڑے کی تو دو چار سو روپے میں تصویر بھی نہیں ملتی....."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "ابے اُلو کی دُم! تمہارے سر پر تانگہ کچھ زیادہ ہی سوار ہے۔ میں نے پوچھا تھا اس بیوہ سے تمہاری ملاقات کیونکر ہوئی اور وہ بیوہ سے تمہاری بیوی کیونکر بن گئی؟ ریس کے گھوڑوں اور گدھوں کی کہانی بعد میں سناتے رہنا۔"

وہ ڈبے سے ٹنکی میں پیٹرول ڈالنے لگا تو اس کے ہاتھوں کے ارتعاش کے باعث آدھا پیٹرول نیچے گرنے لگا۔ میں نے ڈبا اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔ "اس وقت یہ پیٹرول بہت قیمتی ہے۔ ضائع مت کرو۔ اگر یہ بھی راستے میں ختم ہوگیا تو تمہیں گھر جانے کے لئے کوئی تانگہ بھی میسر نہیں آئے گا۔ لاؤ میں ڈال دوں۔"

وہ میرے سوال کی طرف آتے ہوئے بولا۔ "ہاں... میں بھول ہی گیا تھا کہ اصل میں تم نے کیا پوچھا تھا۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس سے میری شادی کی نوبت آجائے گی۔ قسمت کے کھیل واقعی نرالے ہوتے ہیں۔ میری اصل میں اس کے ڈرائیور سے دوستی ہوگئی تھی۔ ڈرائیور کو اسی کی کوٹھی میں سرونٹ کوارٹر ملا تھا اور میں ڈرائیور کے ساتھ اس سرونٹ کوارٹر میں چھپا ہوا تھا۔ میرا مطلب ہے میں چونکہ مالکن کی اجازت کے بغیر رہ رہا تھا اس لئے چوروں کی طرح رہتا تھا۔ ڈرائیور نے ترس کھا کر مجھے اپنے ساتھ رکھا ہوا تھا کیونکہ شہر میں میرا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔"

میں پیٹرول ڈال چکا تو وہ ڈھکن لگاتے ہوئے بولا۔ "راتوں کو وہ موقع نکال کر مجھے ڈرائیونگ سکھایا کرتا۔ پھر اسی نے پیسے خرچ کرکے مجھے لائسنس لے کر دیا۔ ارادہ یہی تھا کہ ڈرائیونگ کا "ہنر" ہاتھ میں ہوگا تو کسی بنگلے کوٹھی پر ڈرائیور کے طور پر نوکری مل جائے گی۔"

اس نے ٹنکی کو تالا لگا کر سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گویا بات ختم کرتے ہوئے بولا "لیکن پھر ہوا یہ کہ ایک روز "بیگم صاحب" نے مجھے دیکھ لیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے بستر بوریا اٹھا کر سرونٹ کوارٹر سے جانے کا حکم دے گی اور ڈرائیور کو بھی خوب ذلیل کرے گی کہ اس نے بغیر اجازت کیوں مجھے اپنے ساتھ رکھا۔ مگر ایسا کوئی چکر نہیں ہوا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھ سے نرمی سے پیش آئی۔ پھر رفتہ رفتہ یہ نرمی اتنی بڑھی کہ میری اس سے شادی ہوگئی... اور اس کے تھوڑے عرصے بعد پھر تختی کا زمانہ شروع ہوگیا۔"

میں نے تفصیل نہیں پوچھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس پہلی ملاقات اور شادی کے درمیان بہت سی باتیں ہوئی ہوں گی' بڑے چکر چلے ہوں گے۔ ریاض عرف راجو بے شک مختصر الوجود تھا لیکن اس کی شخصیت میں بہرحال صنفِ نازک کے لئے خاصی کشش موجود تھی۔ وہ سرخ و سپید اور وجیہہ تھا۔ اوپر سے عمر چور بھی تھا۔ شادی اس کی بہت کم عمری میں ہوگئی تھی۔ اب بھی اسے دیکھ کر کسی کو گمان تک نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ دس بچوں کا باپ تھا۔ اگر کسی بوڑھے کی بیوہ دولتمند ہونے کے باوجود اس پر مہربان ہوگئی تھی تو مجھے اس پر زیادہ حیرت نہیں تھی۔ عین ممکن تھا کہ شکل صورت کی طرف سے خود بیوہ ذرا کمزور رہی ہو۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ عمر میں بھی اس سے کافی بڑی ہو۔ لیکن فی الحال میں نے یہ باتیں پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے سوچا ملاقات ہوگی تو خود ہی سب کچھ سامنے آجائے گا۔

ویسے بھی راجو کا نشہ ہرن ہوا تھا تو اس پر تھکن نے غلبہ پالیا تھا۔ نہ جانے وہ کب سے اور کہاں کہاں خوار ہوتا ہوا آرہا تھا۔ اب نشے سے نہیں تو تھکن سے گرا جا رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کم از کم اپنے گھر تک تو خیریت سے ڈرائیونگ کرلے۔

وہ خود بھی اب گھر جانا چاہتا تھا۔ تھکے تھکے سے انداز میں ڈرائیونگ سیٹ پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا "تم اپنی گاڑی میں میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔"

ہم آگے پیچھے وہاں سے روانہ ہوئے۔ ڈرائیونگ اس کی اب بھی قابلِ اطمینان نہیں تھی لیکن غنیمت یہ تھا کہ سڑکوں پر اِکا دُکا ہی گاڑی آتی جاتی دکھائی دیتی تھی۔ وہ بھی خاصے وقفے کے بعد۔ میں اس کی خیریت کی دعائیں مانگتا اس کے پیچھے پیچھے گاڑی چلاتا رہا۔ ایف سی کالج کے سامنے سے گزر کر اس نے پل عبور کیا اور نہر کے دوسری طرف شاہ جمال کی طرف مڑ گیا۔ نہر کے کنارے سڑک کی چڑھائی چڑھتے وقت اس کی گاڑی بری طرح لہرائی تھی اور مجھے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ پُل پر چڑھنے کے بجائے وہ نہر میں نہ اتر جائے لیکن غنیمت رہا کہ وہ گاڑی کو سنبھالنے میں کامیاب ہوگیا ورنہ میں نے تو چھلانگ لگا کر اسے نہر سے نکالنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرلیا تھا۔

شاہ جمال ایک مختصر لیکن متمول لوگوں کی آبادی تھی اور راجو نے جس کوٹھی کے سامنے گاڑی لے جا کر روکی وہ خاصی شاندار تھی۔ اس نے ہارن سے ہلکی سی "بیپ" کی آواز نکالی اور چوکیدار نے جلدی سے گیٹ کھول دیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے ڈرائیو وے گاڑی لے گیا۔

راجو نے گاڑی سے اتر کر رازدارانہ انداز میں چوکیدار سے با۔ "بیگم صاحب سو گئیں؟"

"میرے کو کیا مالوم صاحب!" چوکیدار نے نیم بیزاری سے ب دیا۔ "میں نے ان کو بوت دیر سے نہیں دیکھا۔"

راجو کو گویا کچھ حوصلہ ہوا۔ اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ اور چابی سے اندرونی دروازے کا تالا کھولا۔ اس کی دیکھا ی میں نے بھی چوروں کی طرح ہال میں قدم رکھا۔ ہال میں ھیرا تھا۔ اس نے لائٹ آن کی اور دوسرے ہی لمحے اس کی گھگھی ہ گئی۔ غیر ارادی سے انداز میں وہ گویا میرے پیچھے چھپنے کی شش کرنے لگا۔

میں نے دیکھا سب سے اوپر والی سیڑھی پر خوبصورت نائٹ ؤن میں ایک خوبصورت عورت' دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے کھڑی تھی۔ اس کے سیاہ' دلکش ریشمی بال کندھوں پر پھیلے ہوئے ے اور اس ریشمی رات کے پس منظر میں اس کا چاند چہرہ گویا ماحول منور کئے ہوئے تھا۔ اس نے ذرا سا بھی میک اپ نہیں کیا ہوا ... اور یہ اچھا ہی کیا تھا۔ چاند چہرے پر مصنوعی رنگوں کی چھائیاں شاید اچھی نہ لگتیں۔

میں اس کا چہرہ صحیح طور پر تو نہیں دیکھ پایا تھا لیکن بے پناہ بصورتی کا ایک تاثر تھا جو فوری طور پر مجھ تک پہنچا تھا اور یہ اشبہ میرے لئے حیرت کا ایک جھٹکا تھا۔ میرے ذہن میں تاثر کچھ یسا ہی تھا کہ کسی امیر بوڑھے کی' خاصی بڑی عمر کی کوئی بھاری بھرکم ی بیوہ ہوگی جسے اپنی شخصیت کی کمزوریوں کا احساس ہوگا اور راجو ے ایک غنیمت قسم کا شوہر دکھائی دیا ہوگا۔ مجھے یہ بھی یقین تھا کہ ہ جسمانی طور پر بھی ضرور راجو پر حاوی ہوگی اور کوئی بعید نہیں کہ وقتِ ضرورت اس کی "ٹھکائی" بھی لگاتی ہو۔

لیکن وہاں بلندی پر جو عورت کھڑی تھی' اس کے ساتھ تو اگر ولت کی بیساکھیاں نہ ہوتیں تب بھی شاید اس کے لئے رشتوں کی کی نہ ہوتی۔ عمر اس کی شاید مجھ سے اور راجو سے تھوڑی سی زیادہ رہی ہو لیکن یہ اس کی شخصیت کا کمزور پہلو نہیں بلکہ اس کی خوبی بن گئی تھی۔ وہ عین بیچ آسمان پر آیا ہوا آفتاب بن گئی تھی۔ چھریرے جسم کی تھی لیکن ڈھیلا ڈھالا نائٹ گاؤن بھی اس کے سراپا کی قیامتوں کو چھپانے میں ناکام تھا۔

وہ مردمار قسم کی شخصیت کی مالک ہرگز نہیں تھی۔ کرختگی شاید اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ تمامتر نسوانی نزاکتیں اور لطافتیں اس کے پیکر سے جھانک رہی تھیں۔ اس کے باوجود راجو اس سے خوفزدہ تھا۔ اس کا خوف بے بنیاد بھی نہیں تھا۔ اس عورت میں رعب' تمکنت' حتیٰ کہ ہلکی سی خوفناکی بھی موجود تھی لیکن اس کا ماخذ و منبع کہاں تھا' یہ جاننا مشکل تھا۔ شاید وہ اس کی سردمہری تھی جو راجو جیسے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کے لئے کافی تھی یا شاید کوئی اور وجہ تھی جسے راجو ہی بہتر سمجھ سکتا تھا۔ بہرحال وہ اس کا شوہر تھا۔ میں تو ایک اجنبی تھا جو آج پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔

بعض عورتوں کی یہ عادت ہوتی ہے یا پھر یہ ان کی ایک ادا ہوتی ہے کہ وہ بظاہر آپ کو بالکل نظر انداز کردیتی ہیں لیکن درحقیقت وہ کسی نادیدہ آنکھ سے آپ کو بہت غور سے دیکھ رہی ہوتی ہیں۔ اس نے بھی کچھ اسی ادا کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف راجو پر اپنی نظر مرکوز رکھی۔ اس کے نزدیک گویا میں وہاں موجود ہی نہیں تھا۔

"تم آج پھر اتنی دیر سے آئے ہو... اور اتنی دور سے مجھے تمہارے وجود سے شراب کی بُو آرہی ہے... خدا کی پناہ! تم شراب پیتے ہو یا اس سے نہاتے ہو؟" اس کی آنکھوں اور چہرے سے کئی گنا زیادہ سردمہری گویا اس کے لہجے میں سمٹ آئی تھی۔ مجھے ان شوہروں کی بدنصیبی پر افسوس ہوتا تھا جن کی بیویوں کے لہجے میں ان کے لئے اتنی سردمہری ہوتی تھی۔ سردمہری مجھے نفرت سے زیادہ بُری محسوس ہوتی تھی۔

"تم غلط سمجھ رہی ہو چھیمرا! میں نے اتنی زیادہ تو نہیں پی تھی ... میں بالکل نشے میں نہیں ہوں ... میں خود گاڑی چلا کر لایا ہوں... دیکھو' میں بالکل سیدھا کھڑا ہوں...." راجو نے سیدھا کھڑا ہونے کی کوشش کی اور اس کوشش میں گرتے گرتے بچا۔

میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر ایک ہاتھ سے اسے سہارا دیا۔ میں دراصل ایک ٹک اس کی بیوی کی طرف دیکھ رہا تھا اور میرے ذہن میں جھماکے سے ہو رہے تھے۔ آج کی رات شاید میرے لئے حیرتوں کی رات تھی۔ پہلے راجو کا راستے میں ٹکرا جانا ایک حیرت تھی۔ پھر اس کی بیوی کو دیکھنا اس سے بڑی حیرت تھی۔ کیا اسی عورت کو اس کی بیوی ہونا تھا؟

اس عورت کی تصویر میرے ذہن کے نہاں خانوں میں بہت دور کہیں تاریک گوشے میں پڑی تھی۔ اس پر فراموشی کی گرد تہ در تہ جم چکی تھی لیکن آج تقدیر کے ان دیکھے ہاتھ نے اسے جھاڑ پونچھ کر میرے سامنے لا رکھا تھا۔

تصویر بہت بدل چکی تھی مگر بہرحال وہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ میری یادوں کے خزانوں میں اس کی جس زمانے کی تصویر محفوظ تھی اس وقت وہ ایک دھان پان سی سرخ و سپید لڑکی ہوا کرتی تھی۔ برقع پہنتی تھی۔ نقاب میں اکثر آدھے سے زیادہ چہرہ چھپاتی تھی۔ صرف آنکھیں نظر آتی تھیں .... اور یہ آنکھیں جدھر دیکھتی تھیں دلوں کو اتھل پتھل کردیتی تھیں' ہر چیز میں ایک ارتعاش سا پیدا کردیتی تھیں۔

کبھی کبھی وہ پورے چہرے پر بھی نقاب ڈال لیتی تھی مگر اس چاند چہرے کی کرنیں باریک سیاہ کپڑے کی تہوں سے بھی چھن چھن کر باہر آتی رہتی تھیں۔ باریک کپڑے کی وہ دو تہیں اس حسنِ بلا خیز کو چھپانے کے لئے قطعی ناکافی محسوس ہوتی تھیں۔

خوبصورتی اس کا ایسا اثاثہ تھا جسے ابھی وقت بھی چُرانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ عمر کے ساتھ اس کے نین نقش میں، اس کے سراپا میں پختگی آگئی تھی۔ نشیب و فراز میں بھی بڑی تبدیلیاں آگئی تھیں لیکن ان سب تبدیلیوں نے اس کی دلکشی میں اضافہ ہی کیا تھا۔ کسی اور طرح کا اضافہ!

میں ساکت کھڑا تھا اور اپنی رگوں میں دوڑتے ہوئے لہو کی سرسراہٹ سن رہا تھا۔ میرا ذہن، میرے حواس، میرے گاؤں کی ایک گلی میں بھٹک رہے تھے جہاں میں اس کے انتظار میں سستا سا رومال، سستی سی عطر کی شیشی، انمول جذبات سے آراستہ خط کے ساتھ لے کر کھڑا ہوا کرتا تھا۔ وہ خط جن کا کبھی جواب نہیں آیا تھا۔

پھر جب میں نے اس کی طرف سے مایوس ہو کر ذہن و دل کے دروازے اس کی طرف سے بند کر لئے تھے تو ایک طویل عرصے بعد اس کا خط چلا آیا تھا۔ اس نے تنہائی میں ملنے کے لئے بلایا تھا۔ میں اپنی زندگی کی وہ شام کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اسی کے نیم پختہ مکان کا پچھلا نیم تاریک کمرا۔ اس کی قربت کی خوشبو... اس کی سرگوشیوں کا نشہ۔ اس کی حوصلہ افزائی۔ بظاہر یہی لگا تھا جیسے وہ میرا ہاتھ تھام کر خواہشوں کے سمندر میں اتر گئی تھی لیکن پھر زار و قطار رونے بھی لگی تھی۔

میں نے سبب پوچھا تو روتے روتے اس نے ایک عجیب بات مجھے بتائی تھی جسے میں آج بھی نہیں بھولا تھا۔ شاید کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔ اس نے کہا تھا "تم گواہ ہو، میں نے کس طرح اپنی حفاظت کی۔ یہاں کے کس کس خوبرو نے مجھے حاصل کرنے کے لئے کیا کیا حربہ نہیں آزمایا مگر میں نے اپنے آپ کو سیپ کا موتی بنا کر رکھا۔ اس کا صلہ میرے باپ نے مجھے یہ دیا ہے کہ میری شادی ایک ایسے شخص سے طے کر دی ہے جس کی بیٹیاں عمر میں مجھ سے بھی بڑی ہیں۔ میں نے سوچا ہے اک گناہ تو کر لوں... تاکہ آئندہ جو زندگی مجھے گزارنی ہے اس کے بارے میں یہی سوچ کر دل کو تسلی دے سکوں کہ وہ میرے گناہ کی سزا ہے...."

اور اس کے بعد وہ گویا ہمیشہ کے لئے گم ہو گئی تھی۔ ایک عرصے سے شاید میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ زندگی میں کبھی کسی موڑ پر اس سے دوبارہ ملاقات ہو گی۔ خصوصاً اسے راجو کی بیوی کے روپ میں دیکھنے کا تو میں نے ظاہر ہے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں نے محاورتاً نہیں، حقیقتاً آنکھیں مل کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ شمیم ہی تھی۔ راجو نے اسے شمیمو کہہ کر پکارا تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اس کا نام شمیم ہی تھا۔ میری آنکھیں دھوکا نہیں کھا رہی تھیں۔ وہ شمیم کی کوئی ہم شکل نہیں بلکہ شمیم ہی تھی۔

راجو گویا اس کے غیظ و غضب کا رخ موڑنے کے لئے بولا۔ "ذرا ادھر تو دیکھو.... یہ میرے ساتھ کون آیا ہے۔ یہ افضل چوہدری ہے.... اجمل چوہدری کا بیٹا.... یہ بھی اپنے گاؤں کا ہی ہے۔ شاید تم نے کبھی وہاں دیکھا ہو۔ شاید تم پہچان سکو۔"

اب اس نے نہایت آہستگی سے گردن میری طرف گھمائی اور وہ فسانہ ساز آنکھیں میری آنکھوں سے آن الجھیں۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے کئی لمحے پہلے پہچان چکی تھی لیکن اس نے کچھ یوں ظاہر کیا جیسے اس کی آنکھوں میں دھیرے دھیرے شناسائی کا سورج طلوع ہو رہا ہو۔

اس نے واقعی راجو کو بخش دیا۔ اس کی برہمی، ناراضگی اور خفگی رخصت ہو گئی۔ دھیرے دھیرے ایک مدھم سی مسکراہٹ کی کرن اس کے ہونٹوں پر پھوٹی اور وہ بہت دھیمے لہجے میں بولی۔ "ہاں... میں نے انہیں پہچان لیا ہے۔ ہماری گلی سے ایک گلی چھوڑ کر ہی تو رہتے تھے یہ.... ہینڈسم تو یہ اس وقت بھی تھے۔ مگر اب تو پرسنیلٹی بہت ہی نکھر آئی ہے۔"

راجو اپنی بیوی کے منہ سے دوسرے کی وجاہت کا ذکر سُن کر ذرا بھی جیلس ہوئے بغیر بولا۔ "یہ سب پیسے کا کمال ہے میری جان! دولت آجائے تو بجھی بجھی شخصیت بھی لشکارے مارنے لگتی ہے۔ غربت تو کیچڑ مٹی کی طرح ہے۔ کیچڑ مٹی میں لتھڑ کر تو ہیرے کی چمک دمک بھی ماند پڑ جاتی ہے۔ موصوف بہت بڑے سرمایہ دار بن گئے ہیں۔ دولت چھپر پھاڑ کر ان پر برسی ہے۔"

"وہ تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔" شمیم آنکھ نہیں جھپک رہی تھی۔

راجو کے لئے گویا یہی خوشی کافی تھی کہ وہ بیوی کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے سے بچ گیا تھا۔ اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "کیا تم بھی شمیمو.... میرا مطلب ہے شمیم کو پہچانتے ہو؟"

"ہاں۔ پہچانتا ہوں۔"

"اوہ.....!" اس کے لئے یہ جواب گویا کچھ خوش کن نہیں تھا۔

"کیوں... منہ کیوں لٹک گیا تمہارا؟" میں نے پوچھا۔

"شمیم حالانکہ اس زمانے میں برقع پہنتی تھی... لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے اس وقت بھی اس کو سب جانتے تھے.... اور ابھی تک نہیں بھولے۔" راجو گویا ہمت کر کے بولا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، شمیم خود ہی اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قدرے جارحانہ سے انداز میں بولی "یہ صورت ایسی نہیں کہ لوگ اسے آسانی سے بھول جائیں۔"

"شاید برقع ہی کی وجہ سے لوگوں نے زیادہ یاد رکھا ہو۔" میں نے کہا "میرا خیال ہے پورے گاؤں میں شمیم برقع والی واحد لڑکی تھی۔"

شمیم بدستور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ مبہم لہجے میں بولی۔ "ہو سکتا ہے یہی بات ہو.... ہو سکتا ہے کوئی اور بات ہو" بے پروائی کے اظہار کے لئے اس نے آہستگی سے کندھے اچکائے اور سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔ "چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ.... کیا راجو نے تمہارے ملنے کی خوشی میں تمہارے ہی ساتھ بیٹھ کر بے حساب پی تھی؟"

"میں نے ابھی یہ شوق نہیں پالا اور نہ ہی مجھے راجو کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ہماری ملاقات تو سڑک پر ہوئی ہے۔ یہ مجھے پکڑ کر یہاں لے آیا لیکن اس میں محبت سے زیادہ ڈر کو دخل تھا۔ کہہ رہا تھا بیوی مجھے مارے گی، تم ذرا بیچ بچاؤ کرا دینا۔" میں نے معصومیت سے شمیم کی طرف دیکھا۔ "تم اس بے چارے کے ساتھ مار پیٹ مت کیا کرو نا۔ شوہر کے ساتھ ایسا سلوک کوئی اچھی بات تو نہیں ہے۔"

وہ قہر آلود نظروں سے راجو کو گھورتے ہوئے بولی "اس کا بس چلے تو پوسٹر چھپوا دے اپنی مظلومیت کے۔ رحم کی اپیل کے اشتہار چھپوا دے اخباروں میں۔ اسی بات پر تو مجھے اور بھی غصہ آتا ہے کہ اس میں اتنی بھی مردوں والی انا نہیں ہے کہ اگر جواباً کچھ نہیں کر سکتا تو کم از کم اس بات کو ہی چھپانے کی کوشش کرے۔ پکڑ پکڑ کر لوگوں کو بتاتا پھرتا ہے کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ "ظلم" کرتی ہے۔ حالانکہ مریل سے مریل مرد بھی چاہے گھر میں بھیگی بلی بن کر رہتا ہو لیکن باہر اسے یہی ظاہر کرنے کا شوق ہوتا ہے کہ وہ تو ہر شیر ہے لیکن میرا میاں اس لحاظ سے دنیا کا انوکھا مرد ہے کہ میں اسے کبھی کبھار غصے میں ایک آدھ گھونسا لگاتی ہوں تو یہ باہر جا کر بتاتا ہے کہ اسے چار گھونسے پڑے ہیں۔"

"اس کے اندر ابھی تک ایک بچہ چھپا ہوا ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "اس کے اندر چھپے ہوئے اس بچے نے ہی تو مجھے اپنی طرف کھینچ لیا تھا لیکن بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے تو ایسے مرد کی ضرورت تھی جسے میں ایک گھونسا رسید کرو تو وہ جواباً مجھے چار گھونسے رسید کرتا۔ میں اس پر ہاتھ اٹھانے کی کوشش کرتی تو وہ میرا ہاتھ مروڑ دیتا۔"

راجو ہونٹوں پر زبان پھیر کر ذرا آگے آتے ہوئے بولا۔ "یہ بات تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتائی؟ یہ کام تو میں بھی کر سکتا ہوں۔"

"یہ باتیں بتانے کی نہیں ہوتیں۔ خود بخود محسوس کر لینی چاہئیں۔" میں نے کہا۔

شمیم خونخوار انداز میں ایک قدم اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "تم مجھے مارو گے؟ مجھے...؟ اتنی ہمت ہے تمہارے اندر؟" اس نے دانت پیس کر گھونسا ہوا میں لہرایا اور راجو جلدی سے میرے پیچھے چھپ گیا۔ مجھے ہنسی آگئی۔ وہ بلاشبہ ایک عجیب جوڑا تھا۔

شمیم کو جیسے یکدم کچھ احساس ہوا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں ہاتھ نیچے کرتے ہوئے بولی۔ "میرا خیال ہے کسی مہمان کے استقبال کا یہ کوئی اچھا طریقہ نہیں ہے۔" اس کے چہرے سے غیظ و غضب رخصت ہو گیا۔ میری طرف دیکھتے ہوئے وہ خوابناک سے انداز میں مسکرائی۔ "تم نے یقیناً کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ راجو سے اور مجھ سے زندگی میں کبھی اس طرح ملاقات ہو گی.... اور یہ کہ ہم میاں بیوی ہوں گے؟"

"ہاں۔" میں نے تسلیم کیا "یہ حیرت در حیرت کے سلسلے ہیں۔"

"چلو... آج تمہاری آمد کی خوشی میں، میں راجو کو بخش دیتی ہوں۔" وہ شاہانہ انداز میں بولی۔ "آؤ... ڈرائنگ روم میں چل کر بیٹھتے ہیں اور جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ زندگی کے سفر میں ایک دوسرے پر کیا گزری۔"

راجو نے اپنی جاں بخشی پر اطمینان کی گہری سانس لی اور ہم تینوں ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔ وہ اس دوران بھی گردن گھمائے میری طرف ہی دیکھے جا رہی تھی۔ اسے گویا اپنی آنکھوں پہ یقین نہیں آ رہا تھا۔ میں بھی اسے دیکھ کر کچھ کم حیران نہیں تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں تو اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں راجو کے سامنے یہ ظاہر نہیں کر سکتا تھا کہ اس سے کبھی میری ملاقات بھی رہی تھی.... اور ملاقات بھی ایسی جس نے روح پر خراشیں ڈال دی تھیں۔

ڈرائنگ روم خوبصورت تھا۔ آراستہ و پیراستہ تھا۔ شمیم نے ایک ملازمہ کو جگا دیا تھا جس نے خاطر مدارت کے لئے کچھ اہتمام شروع کر دیا تھا۔ وہ ایک ملکہ کی سی تمکنت اور نخوت سے ایک نشست سنبھالنے کے بعد ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولی "افضل! تمہیں شاید معلوم نہ ہو کہ میرے والد سوتیلے تھے اور انہوں نے مجھے ایک بہت دولت مند آدمی کے ہاتھ بیچ دیا تھا۔"

اس نے بڑے حساب سے اور کچھ پردہ داری سے مجھے اپنے بارے میں بتانا شروع کیا۔ کچھ اس طرح کہ راجو کو احساس نہ ہونے پائے کبھی ہمارے درمیان بھی لمحے دو لمحے کی رفاقتوں کا ایک عجیب حادثاتی رشتہ استوار ہوا تھا۔ میں ابھی تک دم بخود سا بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا۔ مجھے گویا ابھی تک اپنے حواس پر، اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا یہی عورت کبھی میرے لڑکپن کا پہلا معصوم سا عشق تھی؟ کیا یہی میرے اچھوتے جذبوں کی پہلی پہلی اڑان کا مرکز و محور تھی؟

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "اس وقت مجھ پر جو گزری تھی وہ میں بتا نہیں سکتی کیونکہ اس شخص کی بیٹیاں عمر میں مجھ سے بھی بڑی تھیں لیکن آج میں سوچتی ہوں تو اپنے آپ کو اس کا شکر گزار محسوس کرتی ہوں۔ گو میں اس کی زر خرید تھی لیکن اس نے مجھ سے شادی کی۔ ایک بیوی جتنی عزت کی مستحق ہوتی ہے اس سے بھی کہیں زیادہ عزت مجھے دی۔ زندگی کا سلیقہ سکھایا۔ اونچے

طبقے میں اٹھنا بیٹھنا سکھایا۔ دنیا گھمائی۔ وہ بوڑھا تھا مگر اس کا دل جوان تھا۔ اس نے مجھ سے اتنی محبت کی.... اتنی محبت کی.... کہ میرے دل میں اس کے خلاف جتنی نفرت بیٹھی ہوئی تھی' میں اسے نکال پھینکنے پر مجبور ہوگئی۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر راجو کی طرف دیکھا۔ وہ سر کھجا رہا تھا۔ وہ دانت پیس کر مصنوعی غصے سے اس کے کندھے پر ایک گھونسا رسید کرتے ہوئے بولی "یہ شخص تو جیلس بھی نہیں ہوتا۔ میں بیٹھی اپنے مرحوم شوہر کی تعریفیں کرتی رہتی ہوں اور یہ دیدے پھاڑے آرام سے بیٹھا سنتا رہتا ہے۔"

"مرحومین پر غصہ نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی ان کے بارے میں جیلس ہونا چاہئے۔" راجو نے نہایت مُدبرانہ لہجے میں کہا "اور بالفرض میں جیلس ہوتا بھی ہوں تو ضروری نہیں تمہیں اس کا علم ہوسکے۔ دلوں کے بھید تو اللہ ہی جانتا ہے۔" اس نے درویشانہ انداز میں چھت کی طرف انگلی اٹھائی اور ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کرلیں۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

شمیم ٹھنڈی سانس لے کر گویا اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے اصل موضوع پر آگئی۔ "قسمت انسان کو کب' کہاں اور کس سے ٹکرادیتی ہے' انسان اس کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میرے شوہر کے انتقال کو ایک سال گزر چکا تھا اور مجھے معلوم بھی نہیں تھا کہ راجو میرے ہی گھر میں سرونٹ کوارٹر میں چھپ کر میرے ڈرائیور کے ساتھ رہ رہا ہے..."

"یہ قصہ میں افضل کو سنا چکا ہوں۔" راجو اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "البتہ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم ہمارے گاؤں کی نکل آئی تھیں' تم نے مجھے پہچان لیا تھا اور یہ معمولی سی شناسائی بھی ہماری شادی کی ایک وجہ بنی تھی۔"

"دوسری وجوہات بھی تھیں۔" شمیم کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی "میں یکدم بہت تنہا تنہا سی ہوگئی تھی۔ سوتیلی اولادوں کے ساتھ میری مقدمے بازی چل رہی تھی۔ میں ایک سہارے کی ضرورت محسوس کرتی تھی۔ لیکن اب میں سوچتی ہوں' راجو سے شادی کرنے سے تو بہتر تھا میں ایک بکرا پال لیتی۔"

"عام بکرا تمہارے ساتھ عدالتوں میں پیشیوں پر نہیں جاسکتا تھا۔" راجو اس کے قریب بیٹھے بیٹھے ذرا سکڑتے ہوئے بولا "اور وہ جو ایک بار میں نے تمہارے سوتیلے بیٹے کی تھوڑی سی ٹھکائی کرانے کے لئے کرائے کے غنڈوں کا بندوبست کیا تھا.... وہ کام کوئی عام بکرا کرسکتا تھا؟ وہ کام صرف قربانی کا بکرا ہی کرسکتا تھا۔ مجھ جیسا قربانی کا بکرا۔"

شمیم نے ایک بار پھر اسے قہر آلود نظروں سے گھورا لیکن میں اب اس کے رویے کے بارے میں الجھن میں پڑ گیا تھا۔ مجھے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے راجو کے لئے اس کا غصہ' اس کی برہمی' اس کی بیزاری کچھ مصنوعی مصنوعی سی تھی۔ درحقیقت یہ محبت ہی کے روپ تھے۔ اس نے اپنے بوڑھے' مرحوم شوہر سے بھی محبت کی تھی اور اب راجو سے بھی محبت کرتی تھی۔ اس کے دامن میں محبت صرف میرے لئے ہی نہیں تھی جس نے لڑکپن کا پورا دور اس کے خواب دیکھتے گزارا تھا۔ آخر میں وہ انتہائی حدوں تک مہربان بھی ہوئی تھی تو صرف تقدیر سے انتقام لینے کے لئے۔ وہ نوازش اس کی محبت کا ثبوت تو نہیں تھی۔ میرے دل میں ایک عجیب بے عنوان سے درد کی تلخی پھیل گئی اگر آپ نے کسی سے ٹوٹ کر محبت کی ہو' بے غرض محبت کی ہو اور آپ کو احساس ہوجائے کہ اس کے دل میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی تو دل کا عجیب ہی عالم ہوجاتا ہے۔ دنیا میں چاہے آپ سب کچھ پاچکے ہوں مگر احساسِ محرومی آپ کی رگ رگ میں پھیل جاتا ہے۔

شمیم نے گویا راجو کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اور میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی "میرے شوہر کی چاہے کوئی ہڈیاں بھی توڑ ڈالے لیکن اس کی زبان بند نہیں کراسکتا۔"

"اس پر مجھے حیرت ہے۔" میں نے کہا "یہ خوبی تو بہادری کی علامت ہے۔ جبکہ راجو تو تمہارے سامنے بزدلوں کی سی زندگی گزار رہا ہے۔"

"اس غلط فہمی میں مت رہنا۔" شمیم تیزی سے بولی۔ "تمہارا خیال ہے یہ مجھ سے ڈرتا ہے؟ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ مصلحتاً دبک کر رہتا ہے۔ اس عیش و آرام سے محبت کرتا ہے جو اسے میری وجہ سے میسّر ہے۔ اسے معلوم ہے اگر کبھی ہمارے درمیان اختلافات اس حد تک بڑھے کہ علیٰحدگی کی نوبت آگئی تو اسے اس گھر سے خالی ہاتھ نکلنا پڑے گا جس کا اس میں حوصلہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے..." وہ خاموش ہوکر راجو کو گھورنے لگی مگر اب اس کی نظروں میں خونخواری نہیں تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "یہ دراصل سہم کر' دبک کر' ڈرپوک بن کر اپنی پوزیشن سے محظوظ ہوتا ہے۔ تمہیں کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی چکا ہوگا کہ انسانی نفسیات بھول بھلیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ انسان نہ جانے کن کن باتوں سے لذتیں کشید کرتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ یہ مجھے چڑا کر' غصہ دلا کر اور خود بھیگی بلی بن کر بڑی لذت محسوس کرتا ہے۔ میری کیفیت سے لطف اندوز ہورہا ہوتا ہے۔ جو کچھ یہ ظاہر کرتا ہے وہ صرف اس کی ایکٹنگ ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جس روز اس کی مصلحتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا یا اس کا دل مجھ سے بھر گیا تو میرے گھونسے کے جواب میں مجھے لات رسید کرے گا۔"

"ہائے.... میری یہ جرأت کہاں چھمو' میری جان!" راجو ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ اس نے شمیم کی زبانی اپنا نفسیاتی تجزیہ بڑی توجہ سے سنا تھا لیکن اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی مسکینی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے بھی شبہ ہوا کہ اس کے مختصر وجود میں کوئی شاطر چیز مسکینی کے لبادے میں چھپی تھی جو بچپن سے نوجوانی تک اس کا اور میرا ساتھ تھا۔ یہ تو معلوم تھا کہ وہ اس وقت بھی بڑا تیز و طرار تھا لیکن عمر کے جس میں ہمیں ایک دوسرے کی کچھ خبر نہیں رہی تھی' وہ بہت زیادہ یلیاں لانے والا دور تھا۔ جب تک مجھے اس سے زیادہ واسطہ نہ اب تک میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ گزرے ہوئے ماہ سال میں اس کی شخصیت میں اندر ہی اندر کیا تبدیلیاں آچکی تھیں۔

بہرحال اسی طرح کی باتوں کے دوران انہوں نے کھانا کھایا۔ نے صرف کافی کی فرمائش کی تھی۔ اس ساری نشست کے دوران شمیم باتیں خواہ کچھ بھی کرتی رہی لیکن اس کی نظریں زیادہ تر پر ہی مرکوز رہیں۔ گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتے ہوئے وہ گویا گزرے ہوئے برسوں کی تمام ان کہی کہانیاں پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جو چیزیں وہ پڑھنے میں کامیاب نہیں ہوسکی ان کے بارے میں اس نے ان گنت سوال کئے۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جان لینے کے لئے بے چین تھی۔ میں قدرے محتاط انداز میں اپنے بارے میں بتاتا رہا۔

اس دوران وہ ایک بار ملازمہ سے کچھ کہنے کے لئے اٹھ کر کچن میں گئی تو میں نے سرگوشی میں راجو سے پوچھا "تم نے اسے بتا رکھا ہے کہ گاؤں میں بھی تمہاری ایک عدد بیوی اور دس بچے موجود ہیں؟"

اس کے چہرے سے سُرخی اور تمتماہٹ یکدم غائب ہوگئی۔ اس نے خوفزدہ سے انداز میں ایک نظر دروازے کی طرف دیکھا اور پھنسی پھنسی آواز میں بولا "تمہیں کیسے معلوم ہوا؟"

"شادی تو تمہاری میرے سامنے ہی ہوچکی تھی.... اور بچے میں دوران پہلے دیکھ کر آرہا ہوں۔ بہت بُرے حال میں ہیں۔ تم ان کی خبر کیوں نہیں لیتے؟"

وہ ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس سلسلے میں بعد میں بات کریں گے۔"

پھر جب اس نے دیکھا کہ شمیم کے فوری طور پر کچن سے واپس آنے کے آثار نہیں تھے تو وہ سرگوشی میں بولا۔ "میں جب گاؤں میں تھا تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ میری آدھی زندگی ماں باپ نے تباہ کردی تھی اور باقی آدھی زندگی بچے تباہ کردیں گے۔ میرے سارے خواب ٹوٹ گئے تھے۔ اوپر سے تنگ دستی اتنی زیادہ تھی کہ مجھے اپنے آپ سے شرم آنے لگی تھی۔ میں بہت تنگ آکر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں سے بھاگا تھا۔"

ایک بار پھر اس نے احتیاطاً دروازے کی طرف دیکھا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اب میں پلٹ کر دیکھنا نہیں چاہتا۔ مجھ میں ہمت ہی نہیں ہے۔"

"میرے خیال میں تو یہ بڑے حوصلے کی بات ہے۔ اپنے دس بچوں اور بیوی کو پیچھے چھوڑ آنا... پھر پلٹ کر ان کی طرف نہ دیکھنا۔" میں نے کہا۔

"تم چاہے اس بات کو جس طرح بھی کہو لیکن یہ بہرحال بزدلوں ہی کا کام ہے۔ مجھ جیسے کم ہمت لوگوں ہی سے اس کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔ میرے اس طرزِ عمل کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میرا دل غصے اور جھنجلاہٹ سے بھرا ہوا تھا۔ میں چونکہ محسوس کرتا تھا کہ والد صاحب نے میری زندگی خراب کی ہے۔ میری شادی بھی انہوں نے میری مرضی کے خلاف کی تھی۔ میں نے سوچا' انہیں ذرا مزہ آئے' بے شک وہ کریانے کی دُوکان کرتے ہیں لیکن ذرا صحیح طرح انہیں آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔ اس لئے میں بیوی بچوں کو ان کے سر پر چھوڑ کے بھاگ آیا۔"

"والدین کے بارے میں اس قسم کی باتیں نہیں کرتے چندا!" میں نے ملائمت سے کہا "ان کے بارے میں یہ کہنا بہت ہی بُرا ہوتا ہے کہ انہوں نے زندگی برباد کردی۔ میرا خیال ہے کوئی بھی ماں باپ اپنی اولاد کی زندگی برباد کرنا نہیں چاہتے۔"

"چاہتے تو نہیں ہیں لیکن بعض اوقات ان سے ہوجاتی ہے۔" راجو منہ بنا کر بولا۔ "اپنی دانست میں وہ ہر کام اولاد کی زندگی سنوارنے کے لئے کرتے ہیں لیکن ان میں سے بعض کام تو اولاد کو کہیں کا نہیں چھوڑتے۔"

"چلو شادی تو تمہارے باپ نے تمہاری مرضی کے خلاف کردی تھی۔ دس بچے بھی کیا تمہاری مرضی کے خلاف ہوگئے؟" میں نے پوچھا۔

"بچے..." اس نے کھسیانے سے انداز میں سر کھجایا۔ "بچے تو بس پھر ہو ہی جاتے ہیں نا... کم عمری اور ناسمجھی کی شادی میں۔ چاہے شادی زبردستی ہی کی ہو۔"

"بہرحال... تم نے شمیم کو اپنی اس شادی کے بارے میں نہیں بتایا ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں بھئی۔ اور تم بھی مت بتانے بیٹھ جانا۔" اس نے مضطربانہ انداز میں سرگوشی کی۔ اسی دوران شمیم کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ کچن سے واپس آرہی تھی۔ راجو سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے اس پر ترس بھی آیا۔ بطور شوہر اس کی پوزیشن ویسے ہی کچھ قابلِ رشک نہیں تھی لیکن اس شادی کی بنیاد بھی جھوٹ پر تھی۔

باتوں ہی باتوں میں صبح کے آثار نمودار ہوچکے تھے۔ شمیم کچن سے واپس آکر بولی۔ "راجو سے آج پہلی ملاقات میں ہی تمہاری رات خواری میں گزر گئی ہے۔ ابھی آگے آگے دیکھنا کیا ہوگا۔"

"دوستوں کی وجہ سے ہونے والی خواری میں بھی ایک لطف ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"بس.... پھر تو جی بھر کے لطف اندوز ہوتے رہنا۔" شمیم ٹھنڈی سانس لے کر بولی "فی الحال تو میں صرف یہ مشورہ دوں گی کہ تم ناشتا کرکے ہی جانا۔ صبح ہونے والی ہے۔"

"مشورہ معقول ہے۔ قبول کیا جاتا ہے۔" میں نے شاہانہ لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد ناشتا میز پر لگ گیا۔ راجو نے تو چونکہ رات کا کھانا ہی کچھ دیر پہلے کھایا تھا اس لئے اس نے ناشتے میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ وہ اب باقاعدہ اونگھ رہا تھا۔ اس کی حالت بتا رہی تھی کہ اس کا بس چلے تو کھانے کی میز پر ہی سر رکھ کر سو جائے۔

ناشتے کے بعد میں نے اجازت چاہی۔ شمیم مجھے چھوڑنے گیٹ تک آئی۔ راجو نے بھی گرتے پڑتے اس کے پیچھے پیچھے آنے کی کوشش کی لیکن چند قدم چل کر ہی اس نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ "یار! میرا سر گھوم رہا ہے۔ میں بیڈ روم میں جا رہا ہوں۔ اگر میں نے مزید چلنے کی کوشش کی تو مجھے اندیشہ ہے کہ گر پڑوں گا اور اپنی بیگم کی مزید ڈانٹ پھٹکار سنوں گا۔ اس لئے یہیں سے خدا حافظ۔"

ڈرائیو وے میں ملگجا اندھیرا تھا۔ شمیم مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ "باتیں بہت ہوئی ہیں۔ پھر بھی ایسا لگ رہا ہے جیسے بہت سی باتیں ان کہی رہ گئی ہیں۔ آئندہ ملاقات جلد ہونی چاہئے۔"

میں نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں اس کا ہاتھ تھاما اور یکدم گویا ٹوٹے ہوئے خوابوں کی کڑیاں جُڑ گئیں۔ اس کے ہاتھ کے شناسا لمس میں وہی برسوں پہلے کی سی حرارت تھی' وہی گداز تھا۔ میں نے ان جھلملاتی اور خنجر سی آنکھوں میں جھانکا جن میں کہیں میرے لڑکپن کی یادوں کا گمشدہ خزانہ دفن تھا۔ ان نیم وا ہونٹوں کی طرف دیکھا جن کی سرگوشیاں میری سماعتوں کی جھیل میں ابھی تک ڈوبی ہوئی تھیں۔

میرے محسوسات بھی کہیں آسمان اور زمین کے درمیان ہلکورے لینے لگے۔ میں نے گھبرا کر ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کی سرگوشی ہوا کی آہٹ سے بھی مدھم تھی۔ "کیا اب میں تمہیں اچھی نہیں لگی؟ کیا وہ عشق لڑکپن کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا؟ وہ مئی جون کی چلچلاتی دوپہروں میں گھنٹوں راستے میں کھڑے ہو کر انتظار کرنا..."

باقی حوالے اس نے نہیں گنوائے۔ اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ اس موضوع پر تو خاموشی بھی بول سکتی تھی۔ میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ میں جب باتیں کرنے پر آتا تھا تو اپنے آپ کو بہت باتونی ثابت کر سکتا تھا۔ بہت کم ایسا ہوتا تھا جب میں لفظوں کے جنگل میں بھٹکتا پھرتا تھا اور مناسب الفاظ میرے ہاتھ نہیں آتے تھے۔ اس وقت بھی میں گم صم تھا اور نہ جانے کیوں میری کنپٹیاں سنسنا رہی تھیں۔

وہ انگلی سے میرے کوٹ کے کالر پر لکیریں کھینچتے ہوئے بولی "میں تم سے تنہائی میں ملنا چاہتی ہوں۔ کل میں تمہیں فون کروں گی۔ جب راجو گھر پر نہیں ہو گا۔"

"تم اب میرے دوست کی بیوی ہو۔" آخر کار میرے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ میں اپنی گاڑی کے سہارے کھڑا تھا۔ چوکیدار گیٹ سے باہر چلا گیا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر تھوڑا سا حوصلہ اور بہت سی ہوا پھیپھڑوں میں جمع کرتے ہوئے کہا۔ "میں نہیں چاہتا کہ تم تنہائی میں مجھ سے ملو۔ برسوں پہلے تنہائی میں ملی تھیں تو ایک ایسا زخم دے گئیں تھیں جو مدت بعد مندمل ہوا تھا۔ آج پھر کسک ابھر آئی ہے۔"

"میں تو سمجھی تھی' میں تمہیں ایک خوبصورت یاد دے کر جا رہی ہوں۔ کھردری اور ناہموار زندگی میں ایک خوبصورت سنگ میل۔ محرومی کے مارے ہوئے روز و شب میں ایک چھوٹی سی خوشی۔" اس کے ہونٹ حرکت کرتے دکھائی نہیں دے رہے تھے مگر اس کی آواز اسی طرح میری سماعت تک پہنچ رہی تھی جیسے ٹھہری ہوئی جھیل میں مدھم ہوا سے ارتعاش سا پیدا ہوتا ہے اور لہریں کناروں تک پہنچتی ہیں۔

"وہ خوشی تھی؟" میں نے ہلکے سے کرب سے کہا "جس طرح تم پھوٹ پھوٹ کر روئی تھیں' کیا وہ بھول گئی ہو؟ تمہارے آنسو انگارے بن کر ایک مدت تک میرے محسوسات کو جلاتے رہے تھے۔ سوچ کی سطح پر ایک گھاؤ سا پڑ گیا تھا۔ اپنی نوازش کا جو جواز تم نے بتایا تھا اس نے گویا میرا سکون لوٹ لیا تھا۔ وہ ملاقات بس ایسی ہی تھی جیسے کسی کو بہت ہی خوبصورت پلیٹ میں بہت ہی عمدہ کھانا رکھ کر دیا جائے مگر اس میں زہر ملا ہوا ہو۔"

"خیر... اب ان سب باتوں کو بھول جاؤ۔ انسان کی عمر کے مختلف دور ہوتے ہیں۔ مختلف باتیں ہوتی ہیں۔ ان میں الجھے رہ کر زندگی نہیں گزر سکتی۔ ہم دونوں ہی اس وقت کم عمر تھے۔ تم مجھ سے بھی چھوٹے تھے۔ ہم دیہاتی لوگوں کی سوچیں اکثر بڑی افسانوی سی ہوتی ہیں۔ لیکن اب تو ہم دونوں نے دنیا دیکھ لی ہے۔ مجھے زمانہ حال میں زندہ رہنا آگیا ہے۔ تمہیں بھی آجانا چاہئے تھا۔"

"شاید آگیا ہو۔ مجھے خود پتا نہیں..." میں نے مبہم لہجے میں کہا "لیکن میں نے جو تمہیں بتایا ہے کہ اب تم راجو کی بیوی ہو وہ زمانہ حال ہی کی بات ہے۔ راجو میرا بچپن کا یار ہے۔ جذباتی تعلق ہے اس سے میرا۔"

"میں اس سے بے وفائی کی بات تو نہیں کر رہی۔ میں اس سے ویسے بھی طلاق لینا چاہتی ہوں۔" وہ بولی۔

"یہ بے وفائی سے بھی زیادہ بری بات ہو گی۔ ویسے بھی میں تم سے شادی کرنے کا وعدہ بھی نہیں کر سکتا۔ آج ہی ہماری تجدید ملاقات ہوئی ہے۔ ایک رات کی ملاقات میں اتنے بڑے فیصلے نہیں کئے جا سکتے۔" مجھ میں یکدم ہی صاف گوئی کی جرأت آگئی ورنہ دل کے معاملات میں صاف گوئی سے کام لینا بہت مشکل ہے۔ کبھی اپنے دل کے مجروح ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے اور کبھی دوسرے کے محسوسات لہولہو ہو جانے کا خوف دامن گیر رہتا ہے۔ مگر شمیم کے معاملے میں' میں سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہ جتنا بڑھ رہی تھی' اسے اس سے کسی حد تک باز رکھنا ضروری تھا۔ عورت کی حد سے زیادہ تیز پیش قدمی بھی مرد کو ڈرا دیتی ہے۔

"میں اتنی خوش فہمی میں رہنے والی عورت نہیں ہوں۔" وہ تیزی سے بولی "میں راجو سے طلاق لینے کی بات اس امید پر نہیں کر رہی کہ اس کے بعد تم مجھ سے شادی کر لو گے۔ مجھے معلوم ہے تم اب وہ کمسن دیہاتی لڑکے نہیں ہو' جو میری ایک جھلک دیکھنے کے لئے خود کو فنا کرنے پر تلے رہتے تھے۔ میں تو خود ہی کہہ چکی ہوں کہ وقت کے ساتھ خیالات' محسوسات... حتیٰ کہ آئیڈیلز بھی بدل جاتے ہیں۔ میں تو ویسے ہی راجو سے طلاق لینے کی بات کر رہی تھی۔ میں اس کے ساتھ زیادہ خوش نہیں ہوں۔ اس سے زیادہ خوش تو میں اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ تھی جس سے شادی طے ہوتے وقت میری نظروں میں دنیا اندھیر ہوئی جا رہی تھی۔"

میں نے ایک نظر کمروں کی کھڑکیوں کی طرف دیکھا اور سوچا' ان میں سے کسی کھڑکی کے شیشے سے راجو ڈرائیو وے کے ملگجے اندھیرے میں کھڑی دو پرچھائیوں کو دیکھ کر کچھ سوچ تو نہیں رہا ہو گا۔

شمیم بولی۔ "اگر تم سوچ رہے ہو کہ راجو اپنے بیڈ روم کی کھڑکی سے ہمیں دیکھ رہا ہو گا تو یہ خیال دل سے نکال دو۔ اب تک تو وہ بستر پر گر کر خراٹے لینے لگا ہو گا۔"

"میں تمہاری بات پر یقین کر لیتا ہوں۔ اب اسے تم سے بہتر کون جانتا ہو گا۔" میں نے کہا "میں یہ کہنے لگا تھا کہ میں ایک روایت پرست اور وضع دار آدمی ہوں۔ دوستوں کو ان کی خوبیوں اور خامیوں سمیت دوست رکھتا ہوں۔ اس لئے مجھے تو اس سے غرض نہیں کہ اس میں کیا خامیاں ہیں۔ میں صرف تمہاری حد تک پوچھ رہا ہوں کہ تمہیں اس سے کیا شکایت ہے؟"

"کوئی ایک شکایت ہو تو بتاؤں۔ ویسے تو دنیا کے سبھی میاں بیوی کو ایک دوسرے سے شکایتیں ہوتی ہیں۔ میں اس قسم کی معمولی شکایتیں کر کے تمہیں بور نہیں کرنا چاہتی۔ لیکن اس کی ایک بُری خصلت کا ذکر ضرور کروں گی جو سب بُرائیوں پر بھاری ہے۔ وہ یہ کہ راجو بلا کا خود غرض ہے۔ اسے دنیا میں اپنی ذات کے سوا کسی سے پیار نہیں۔ اپنا عیش و آرام' اپنی خوشی' اپنی خواہشیں اس کے لئے ساری چیزوں پر مقدم ہیں۔ تمہارے خیال میں کیا یہ خود غرضی اور بے حسی کی انتہا نہیں ہے کہ اس شخص کو کبھی پتا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ اس کی بیوی کس وقت کہاں ہے' کیا کر رہی ہے' کیا سوچ رہی ہے؟"

میں نے ایک لمحے کے لئے راجو کی پہلی بیوی' دس بچوں اور بوڑھے باپ کے بارے میں سوچا جنہیں وہ چھوڑ کر بھاگ آیا تھا اور جن کی اس نے پلٹ کر خبر تک نہیں لی تھی۔ لیکن میں دوست پرست آدمی تھا۔ پیٹھ پیچھے دوست کی برائیاں کرنا اور اس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا مجھے اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں اس کے دفاع پر ہی تُلا رہا۔

"وہ جیسا بھی ہے... اب اسی کے ساتھ نباہ کرنے کی کوشش کرو۔" میں نے مُربیانہ لہجے میں کہا۔ "اسے محبت دو۔ محبت بہت بڑی طاقت ہے۔ محبت کے ذریعے تم اس کی بہت سی خامیاں دور کر سکتی ہو۔ مجھے کچھ یوں لگتا ہے کہ اس کی ذات میں محبت سے محرومی کا ایک بہت بڑا خلا موجود ہے۔"

"محبت سے محرومی کا ایک بہت بڑا خلا ہم سب کی زندگیوں میں موجود ہوتا ہے۔ کسی کو اس کا احساس جلدی ہو جاتا ہے اور کسی کو دیر میں۔ لیکن اس کی وجہ سے ہر انسان اتنا خود غرض نہیں بن جاتا جتنا راجو ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"بہرحال... وہ تمہارا اپنا انتخاب ہے۔ چند برس تو اس انتخاب کی لاج رکھو۔" میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

"یہاں تو ہر لمحہ کئی کئی برس کے برابر محسوس ہو رہا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"اب ایسی انتہا پسندی سے بھی کام مت لو۔ انسان کو اپنی غلطی حوصلے سے نبھانی چاہئے۔ اتنی جلدی اس پر پچھتاوے کا اظہار نہیں کرنا چاہئے۔ وہ جیسا بھی ہے' اسی کو سُدھار کر' سنوار کر اپنے مطلب کا انسان بنانے کی کوشش کرو۔" میرے پاس فی الحال اس کے لئے اس کے سوا کوئی مشورہ نہیں تھا۔ وہ گاڑی کے دروازے پر جھکی ہوئی تھی اور میں اپنے چہرے پر اس کے سانسوں کی حرارت محسوس کر سکتا تھا۔ اس کی سانسوں میں ایک عجیب طرح کی خوشبو تھی۔ شاید یہ طلب کی خوشبو تھی۔

میں نے اپنی ذات پر ضبط کا جو بندھن باندھا تھا اس کی بنیادوں میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں نے اس سے نظر چراتے ہوئے کہا "میں اب چلتا ہوں۔"

وہ ایک طویل سانس لے کر بولی "تو تمہارے پاس میرے لئے اب نصیحتوں اور مشوروں کے سوا کچھ نہیں رہا؟"

"اسی میں تمہاری بہتری ہے۔" میں نے اگنیشن میں چابی گھماتے ہوئے کہا۔

"وقت وقت کی بات ہے۔ مجھے تمہارے منہ سے یہ بھی سننا تھا۔" وہ دروازے سے ہٹتے ہوئے بولی "بہرحال... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ راجو سے تو میرا راستہ الگ ہونا ہی ہے۔ یہ تو میرا تم سے آج کی ملاقات سے بہت پہلے کا فیصلہ ہے؟"

"یعنی اس کی ذمّے داری مجھ پر نہیں آسکے گی۔ میرے لئے یہی طمانیت کافی ہے۔" میں نے کہا۔ گاڑی کا انجن ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ بیدار ہو چکا تھا۔ میں نے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ سراٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں شب رفتہ کا خمار تھا۔

"شب بخیر تو اب میں کہہ نہیں سکتا... شب تو گزر چکی ہے۔ خدا حافظ ہی کہوں گا۔" میں نے خواہ مخواہ کا بوجھل پن دور کرنے کے

لئے کہا۔

"خدا حافظ۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا اور وہیں کھڑی ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے دونوں ہاتھ سلیپنگ گاؤن کی جیبوں میں تھے۔ سبک خرام ہوا اس کے شانوں پر اس کے تراشیدہ' خوبصورت ریشمی بالوں سے کھیل رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر اس سے نظر چرالی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے حواس اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی مہک میں الجھ جائیں۔ میں نے گاڑی ریورس کی اور ہلکی سی "بپ" دی۔ چوکیدار اندر آگیا اور اس نے میرے لئے گیٹ کھول دیا۔

میں اس کے گھر سے باہر آگیا اور اس لمحے میرا دل چاہا' کاش کوئی ایسا بھی دروازہ ہوتا جس کے راستے میں اس کے دل سے' اس کے ذہن سے' اس کے خیالات سے بھی نکل آتا۔ واقعی وقت بھی کیسے انقلابات لاتا ہے۔ کیا زمانہ تھا کہ دل اس کی اِک نظرِ التفات کے لئے بھکاری بنا رہتا تھا۔ اس کی ایک نوازش' اِک ادائے کرم کے لئے پورا وجود دستِ سوال بنا رہتا تھا اور ایک یہ بھی دور آیا تھا کہ وہ شاخ سے ٹوٹے ہوئے پھل کی طرح جھولی میں آگرنے کو بے تاب تھی لیکن میں نے دامنِ تمنا سمیٹ لیا تھا۔

میں کوئی پارسا آدمی نہیں تھا لیکن روایت پرست ضرور تھا۔ راجو خواہ میرا کیسا بھی دوست تھا لیکن بچپن کا ایک تعلق تو چلا آرہا تھا۔ میں اس کے لئے آنکھ کی شرم برقرار رکھنا چاہتا تھا' اسے شاید اس بات کی پروا بھی نہیں تھی کہ اس کی بیوی اس کی پیٹھ پیچھے کیا کرتی پھرتی ہے لیکن میں نے خود ہی اپنے لئے حدیں مقرر کرلی تھیں۔

گھر آکر میں لمبی تان کر سوگیا۔ دوپہر کے بعد میں سوکر اٹھا اور کھانا کھانے کے بعد تیار ہوکر آفس پہنچا ہی تھا کہ راحیلہ کا فون آگیا۔

"اُف! تم نے تو پلٹ کر ہماری خبر ہی نہیں لی۔" وہ بلا تمہید بولی۔

"کیا مجھے تمہارے ہاں سے آئے دو چار سال گزر گئے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہمیں تو یہی محسوس ہورہا ہے۔" وہ معصومانہ لہجے میں بولی۔ "ہم کام کرنے والے لوگ ہیں۔ صبح سے ہم دونوں فارغ بیٹھے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کریں۔ وقت گزارے نہیں گزر رہا۔ ہمیں کوئی کام بتاؤ۔"

"اب ایسی بھی کیا جلد بازی!" میں نے کہا "ایک آدھ دن تو آرام کرلو۔ کل رات ہی تو تم اپنا شہر چھوڑ کر آئے ہو۔ اگر بور ہورہے تھے تو آج گھوم پھر ہی لیتے۔"

"ارے... شہروں کا کیا ہے۔ سبھی شہر اپنے ہیں۔ ویسے بھی لاہور ہمارے لئے نیا نہیں۔ ہمارے کئی عزیز' رشتے دار یہاں ہیں۔ بہت سی تعطیلات ہم نے یہاں گزاری ہیں۔ سب کچھ دیکھا بھالا ہے گھومنے پھرنے کا کچھ زیادہ اشتیاق نہیں۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"گھر ہی سیٹ کرلیتیں۔" میں نے ایک اور مصروفیت تجویز کی۔

"گھر میں سیٹ کرنے والی کوئی چیز باقی ہی نہیں۔ ہر چیز پہلے سیٹ ہے۔ اس سلسلے میں بھی میرے لئے کوئی کام چھوڑا ہی نہیں گیا۔ جتنے اچھے انداز میں گھر سیٹ ہے اتنا شاید میں خود بھی نہ کرسکتی۔"

"یہ تو بڑا مسئلہ ہوگیا۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ "تم تو چراغ کے جن کی طرح میرے پیچھے پڑ گئی ہو کہ تمہیں کام بتایا جائے۔ سچی بات ہے کام تو میں نے ابھی تمہارے لئے کوئی سوچا ہی نہیں۔ ابھی تو سوچنے کی بھی مہلت نہیں مل رہی۔"

"میں اس طرح بیکار یہاں نہیں بیٹھوں گی۔ فوراً کراچی واپس بھاگ جاؤں گی۔"

"فی الحال تو تم ایسا کرو کہ نہایت شاندار اور پُرتکلف قسم کے کھانے کی تیاریاں شروع کردو۔ آج میری تمہارے ہاں ضیافت ہے۔ ایسا مہمان تمہیں نہیں ملے گا جو خود ہی کسی کی طرف سے اپنے آپ کو کھانے کی دعوت دے رہا ہو۔"

"یہ کوئی کام ہے؟" وہ حقارت آمیز سے انداز میں بولی۔ "کھانے وغیرہ تو وہ ملازمہ بھی تیار کرلے گی جو تم نے یہاں چھوڑ رکھی ہے۔"

"خاص مہمانوں کے لئے کھانے اپنے ہاتھ سے تیار کئے جاتے ہیں بے وقوف!" میں نے کراہنے کے سے انداز میں کہا۔

"خاص اور عام کا سوال تو تب پیدا ہوگا جب میں تمہیں مہمان سمجھوں گی۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "تم مجھے باتوں میں ٹالنے کی اور بیکار کاموں میں الجھانے کی کوشش مت کرو۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم نے میرے یہاں آنے سے پہلے ہی میرے لئے بہت سے کام سوچ کر رکھے ہوئے ہوں گے۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ چراغ کے جن اب خواتین کی شکل میں بھی پائے جانے لگے ہیں ورنہ میں ضرور بندوبست کرکے رکھتا۔" میں نے کہا۔ "مسئلہ یہ ہے کہ تمہیں کام بھی تو کچھ ٹیڑھے اور مشکل سے بتانے پڑیں گے جو تمہارے شایانِ شان ہوں۔ سیدھے سادے کام تو کوئی بھی کرسکتا ہے۔ ان کے لئے تو تمہیں کراچی سے یہاں بلانے کی ضرورت نہیں تھی۔"

"ٹیڑھے اور مشکل کام...؟" اس نے دُہرایا۔ "مثلاً؟"

"مثلاً... یہی کوئی بندے شندے اٹھواتا... کسی کو قتل کرواتا۔ کسی کو غائب کراتا۔ اسی قسم کے کام مناسب رہیں گے تمہارے لئے۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔ میں اس قسم کے کام بھی بڑی عمدگی سے انجام دے سکتی ہوں۔ بشرطیکہ تم صرف میری پشت پناہی کے لئے موجود رہو۔ دوسرے جن لوگوں کو میں غائب کروں یا قتل کروں وہ نہایت ذلیل' بدمعاش اور "دھرتی پر بوجھ" قسم کی چیز ہونے چاہئیں۔ کسی شریف آدمی کو مت مروا دینا میرے ہاتھوں۔" اس کے لہجے سے سنجیدگی عیاں تھی۔

"شریف آدمی کو مروانے کی ضرورت کہاں پڑتی ہے۔ وہ تو خود ہی مرجاتا ہے۔ حالات کے ہاتھوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "باقی جہاں تک پشت پناہی کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں صرف اتنا ہی کہوں گا۔

تو مشقِ ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر

جو تمہارا دل چاہے کرکے آیا نا۔ میری گردن حاضر ہے۔"

"اچھا..." اس نے گہری سانس لی۔ "خیر... طے یہ پایا کہ فی الحال تمہارے پاس میرے لئے کوئی کام نہیں۔"

"تم ذرا مجھے سکون کی سانس تو لینے دو۔ اس کے بعد تمہیں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملے گی۔ یہ جو اس وقت فرصت میسّر ہے اسے غنیمت جانو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ بعد میں ان دنوں کو یاد کرکے آہیں بھرا کرو۔" میں نے کہا۔

"میں دِنوں کو نہیں' دلوں کو یاد کرکے آہیں بھرنے کی قائل ہوں۔ اچھا... یہ بتاؤ کیا رات کا کھانا کھانے واقعی میری طرف آرہے ہو؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گی۔" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

آفس میں اب کام وغیرہ معمول پر آچکا تھا۔ ایک روز پہلے ڈاکوؤں نے جو حملہ کیا تھا اور مجھے لے جانے کی کوشش کی تھی اس سے گویا ایک پُرسکون جھیل میں تھوڑی سی ہلچل پیدا ہوگئی تھی مگر اب لہریں معدوم ہوچکی تھیں اور جھیل دوبارہ پُرسکون تھی۔

اس وقت میں اسٹینو کو چند ضروری خطوط کے بارے میں نوٹس لکھوا رہا تھا جب کیتھرین نے انٹرکام پر اطلاع دی۔ "سر! خلیفہ نواز پری پیکر آپ سے ملنے آئے ہیں... ان کے ساتھ تین آدمی اور ہیں... وہ سب پہلوان لگ رہے ہیں۔" وہ اس وقت یقیناً اپنے کیبن کی شیشے کی دیوار سے انہیں دیکھ رہی تھی اور حیران ہورہی تھی کہ اس ٹائپ کے لوگ کس سلسلے میں مجھ سے ملنے چلے آئے۔

"وہ پہلوان لگ نہیں رہے... بلکہ سچ مچ پہلوان ہی ہیں۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "انہیں پانچ منٹ بعد اندر بھیج دینا۔ میرا خطوں کا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔"

پانچ منٹ بعد خلیفہ نواز اپنے مخصوص "پہلوانانہ" انداز میں کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے دائیں بائیں اور پیچھے ان کے پٹھے تھے۔ وہ نوجوان تھے اور پہلوانوں والے حلئے میں نہیں تھے لیکن واقعی پہلوان نظر آرہے تھے۔ میں نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا۔ خلیفہ جی بڑے خلوص سے مجھ سے بغلگیر ہوئے۔ گرمجوشی کے اظہار کے لئے انہوں نے میری پسلیاں کڑکڑانے کی کوشش کی جس میں انہیں ناکامی ہوئی۔ ان کے تینوں پٹھے خاصے طاقتور اور مضبوط دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا رویّہ میرے ساتھ بے حد مؤدبانہ تھا۔

خلیفہ جی نے میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے اپنے شاگردوں کو بتایا۔ "پُترو! یہ ہیں محمد افضل چوہدری صاحب! بہت بڑے آدمی ہیں۔ ایک ہی دن میں .... بلکہ یوں سمجھو کہ ایک ہی منٹ میں یہ ہمارے قدردان بن گئے اور ہم ان کے زبردست قدردان ہوگئے۔"

میرے طویل و عریض کمرے کے ایک حصے کی آرائش ڈرائنگ روم کی طرز پر تھی۔ وہ وہاں بیٹھ چکے تو میں نے خوش خلقی سے پوچھا۔ "آپ کیا پینا پسند فرمائیں گے؟"

"پینے پلانے کو چھوڑو باؤ افضل چوہدری!" خلیفہ جی نے بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "آپ چائے یا کافی کو پوچھیں گے... تو عرض یہ ہے کہ چائے ہم نے زندگی میں کبھی پی نہیں۔ اور کافی ہمیں صرف ایک ہی پسند ہے... اور وہ ہے بابا بُلّے شاہ کی کافی۔"

"خلیفہ جی! ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ ہم آپ کو صرف چائے اور کافی کے لئے ہی پوچھ سکتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم شہر میں بیٹھے ہیں۔ بیڈن روڈ یہاں سے دور نہیں ہے۔ چند منٹ میں فیکے پہلوان کی دکان سے لسّی بھی آسکتی ہے۔ کاریگر آدمی ہے وہ بھی۔ لسّی تو اس کو بنانی آتی ہے۔ سُرور آجاتا ہے اس کی لسّی پی کر۔ اور اگر اس کو پیغام مل گیا کہ لسّی خلیفہ نواز پری پیکر کے لئے جارہی ہے تو پگڑی دھوتی سنبھال کے خود دوڑا آئے گا یہاں۔ اسپیشل لسّی ٹرے میں سجا کے۔"

خلیفہ نواز کی آنکھیں تھوڑی سی پھیل گئیں۔ ان کے پھولے پھولے' گول مٹول اور معصوم سے گال موٹی موٹی سفید مونچھوں کے عقب میں تھرتھرائے اور وہ بے یقینی سے بولے۔ "باؤ افضل! تمہیں بھی پتا ہے لسّیوں کا... فیکے پہلوان کا... اور ہماری اس کی جان پہچان کا...؟ کمال ہے!"

"ہمیں سب پتا ہے خلیفہ جی! ہم ہر طرف کی خبر رکھتے ہیں۔" میں نے انٹرکام پر کیتھرین کو ہدایت کی کہ وہ فیکے پہلوان کی دُکان سے تسلی بخش مقدار میں لسّی کا انتظام کرائے۔ کیتھرین کو حیران ہونے کا موقع دیے بغیر میں نے انٹرکام کا ریسیور رکھ دیا اور خلیفہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔

خلیفہ جی پُرخیال انداز میں مونچھ کو بل دیتے ہوئے

بولے۔ "باؤ افضل! میں نے اپنے سارے پٹھوں سے ' دوستوں سے' ساتھیوں سے مشورہ کیا ہے... انہیں آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ سب نے یہی مشورہ دیا ہے کہ میں آپ کی پیشکش قبول کرلوں اور آپ کے تعاون سے شہر میں کسی نئی اور بڑی جگہ کا انتظام کرکے خوب زور و شور سے... ٹھیک ٹھاک طریقے سے... بڑا 'ٹچن ناچ قسم کا اکھاڑہ شروع کیا جائے۔ ہماری طرف سے تو ہاں ہے۔ ہم تیار ہیں۔ اب آپ حکم کریں کیا کرنا ہے' کب کرنا ہے' کیسے کرنا ہے؟"

پھر انہوں نے تائید طلب نظروں سے اپنے پٹھوں کی طرف دیکھا۔ "کیوں بھئی پُترو! ٹھیک ہے نا؟ میں نے دو حرفی بات کردی ہے۔"

پٹھوں نے خاموشی سے تائید میں سرہلا دیا۔ خلیفہ جی بولے۔ "میرے یہ تینوں شنگرڈ..... میرا مطلب ہے شاگرد..." پہلوان جی اپنا بھائی والا لہجہ درست کرنے میں کامیاب ہوچکے تھے۔ صرف کبھی کبھی زبان بہک جاتی تھی۔ "یہ تینوں تھوڑے بہت پڑھے لکھے ہیں۔ سارے معاملے یہی طے کریں گے۔ اگر کوئی لکھت پڑھت ہوگی تو میں صرف انگوٹھا لگاؤں گا۔"

"بس خلیفہ جی! آپ نے ہاں کردی تو سمجھ لیں سارا مسئلہ طے ہوگیا۔ اس میں کوئی لمبی چوڑی کارروائیاں نہیں ہوں گی۔" میں نے ان کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "یہ آپ کا کام ہے۔ آپ ہی کو چلانا ہے۔"

میں نے اپنے فنانس کے شعبے کے اسسٹنٹ ڈائریکٹر مجید کو بلایا اور خلیفہ جی کا تعارف اس سے کراتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ان کے ساتھ دو چار دن لگانے ہیں۔ شہر میں جو زمین یہ پسند کریں وہ خرید کر انہیں ایک شاندار اکھاڑہ تیار کرنے میں مدد دینی ہے۔ حکم انہی کا چلے گا۔ ہمارا کام صرف ان کو فنانس کرنا ہے۔"

مجید حیران نظر آنے لگا۔ وہ مالی معاملات میں کافی دخیل تھا۔ منہ پھٹ آدمی تھا۔ بلا کھٹکے مجھ سے بات کرتا تھا۔ کوئی تجویز اسے پسند نہیں آتی تھی تو صاف میرے منہ پر ہی کہہ دیتا تھا۔ پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "سر! یہ آپ کو یکدم اکھاڑے کی کیا سوجھی؟"

"مجھے جو بھی سوجھتی ہے یکدم ہی سوجھتی ہے۔ کیا آپ کو اب تک اندازہ نہیں ہوا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اکھاڑے کے لئے خاصی زمین درکار ہوگی.... اور اندرونِ شہر زمین بڑی مہنگی ہے۔" مجید نے مجھے کچھ احساس دلانے کی کوشش کی۔ "بہت سے دوسرے اخراجات بھی ہوں گے۔"

"کیا ہمارے پاس پیسے کی کمی ہوگئی ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں سر! خدا کا شکر ہے' ایسی تو کوئی بات نہیں۔ میرا مطلب ہے... یہ کوئی فائدے کا سودا نہیں۔" اس نے قدرے محتاط لہجے میں کہا۔

"آپ کو کیونکر شبہ ہوا کہ میں یہ کام فائدے کے لئے کرنا چاہتا ہوں؟" میں نے حیرت سے کہا "میں ان لوگوں میں سے تو نہیں ہوں جو ہر کام فائدے کے لئے کرتے ہیں۔ ویسے بھی یہ تو ہمارے فلاحی کاموں والے کھاتے میں جائے گا۔"

"فلاحی کاموں کا ہمارا بجٹ ہر سال بڑھتا جارہا ہے سر! اسپتالوں اور فلاحی انجمنوں کو عطیات ہیں... انفرادی عطیات ہیں... ماہانہ وظیفے ہیں... سرکاری افسروں کی فرمائشوں پر عطیات ہیں.... اور بہت کچھ ہے..."

خلیفہ نواز پری پیکر بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولے' "باؤ افضل! اگر کوئی مسئلہ ہے تو رہنے دیں۔ ہم تو ویسے ہی آپ کی محبت میں آگئے تھے۔ ہمیں خود پرائے پیسے سے کوئی بھی کام کرنے کا بالکل شوق نہیں ہے۔"

"آپ اتنی جلدی ارادے نہ بدلیں خلیفہ جی!" میں نے مسکراتے ہوئے انہیں دلاسہ دیا۔ "آپ سیدھے آدمی ہیں۔ آپ کو دفتروں وغیرہ سے واسطہ نہیں پڑا۔ صرف سرکاری دفتروں میں ہی نہیں' پرائیوٹ دفتروں میں بھی یہ جو اکاؤنٹس اور فنانس... میرا مطلب ہے حساب کتاب اور مال پانی والے شعبے کے لوگ ہوتے ہیں وہ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کسی کو دس روپے بھی دیتے ہیں تو کچھ اسی تکلیف کے عالم میں دیتے ہیں جیسے اپنی جیب سے قرض دے رہے ہیں۔ دوسرے ان کے منہ سے فوری طور پر تو کسی کام کے لئے "ہاں" تو نکلتی ہی نہیں۔ آپ ان کی باتوں کا بالکل بُرا نہ منائیں۔ ان سے تو میں خود بھی ڈرتے ڈرتے رقم مانگتا ہوں۔"

خلیفہ جی نے غالباً اٹھنے کا ارادہ کرلیا تھا لیکن میری بات سن کر ملتوی کردیا۔ میں نے اب مسکراہٹ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے گہری سنجیدگی سے مجید صاحب کو مخاطب کیا۔ "یہ فلاحی کام ذرا مختلف نوعیت کا ہے۔ اس کا ایک بڑا مقصد اپنی پرانی روایات و اقدار اور اپنی ثقافت کے ایک مٹتے ہوئے حصے کو بچانا ہے۔"

مجید میرے بدلتے ہوئے لہجے کا مطلب سمجھتا تھا۔ وہ سعادت مندی سے سرہلاتے ہوئے بولا۔ "یس سر!"

"سب کام خلیفہ جی کی مرضی کے مطابق ہونا چاہئے اور انہیں ہم سے کوئی شکایت نہیں ہونی چاہئے۔ یوں سمجھو کہ اس پروجیکٹ میں' میں ذاتی طور پر گہری دلچسپی لے رہا ہوں۔" پھر میں نے خلیفہ جی کو مخاطب کیا۔ "آج کے بعد آپ کا زیادہ واسطہ مجید صاحب سے ہی رہے گا لیکن اگر کسی بھی مرحلے پر آپ کوئی پریشانی' کوئی بے اطمینانی محسوس کریں تو سیدھے میرے پاس آسکتے ہیں۔"

اب خلیفہ جی نے ہتھے سے اکھڑنے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔ کچھ دیر اسی سلسلے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران بڑے اہتمام سے لسی بھی آگئی۔ اپنے نئے دوستوں کا ساتھ دینے کے لئے میں نے بھی لسی کا جہازی سائز کا گلاس سنبھال لیا۔ تینوں پہلوان نے خلیفہ نواز پری پیکر کے لئے "دست بستہ" سلام بھی بھیجا تھا۔

جب وہ باقی تفصیلات طے کرنے اور پروگرام بنانے کے لئے مجید صاحب کے ساتھ رخصت ہونے لگے تو میں نے کہا "خلیفہ جی! یہ مت سمجھئے گا کہ ابھی میں نے روپیہ لگایا نہیں اور ابھی سے آپ کے کام میں دخل دینے لگا۔ میں صرف ایک گزارش کرنا چاہتا تھا۔ ایک تجویز پیش کرنا چاہتا تھا۔ آپ کا دل چاہے تو مان لیجئے گا۔ پسند نہ آئے تو بے شک ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیجئے گا۔"

"تم حکم کرو افضل پُتر! تمہارا حکم اکھ متھے پہ... میرا مطلب ہے سر آنکھوں پر ہوگا۔" خلیفہ جی بڑی اپنائیت سے بولے۔

"میں یہ چاہ رہا تھا کہ اکھاڑہ بنیادی طور پر تو ہم اپنے اس قدیم فن کو زندہ رکھنے کے لئے ہی قائم کریں لیکن اگر ہم اپنی نئی نسل کو دنیا کی جدید ٹیکنیکس سے بھی روشناس کرانے کی حتی الامقدور کوشش کریں تو کوئی حرج نہیں۔"

خلیفہ جی ٹھنڈی سانس لے کر لسی کے جگ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "پُتر! ویسے تو تم نے اس لسی سے بھی زیادہ گاڑھی اردو بولی ہے لیکن میں تمہارا مطلب سمجھ گیا ہوں۔ تمہارا اشارہ جوڈو کراٹے.... باڈی بلڈنگ وغیرہ کی طرف ہے نا؟"

"آپ بالکل ٹھیک سمجھے خلیفہ جی!" میں نے جلدی سے کہا۔

"مجھے اس میں اعتراض بھلا کیسے ہوگا باؤ افضل! مجھے تو خوشی ہوگی۔ میرا بس چلے تو میں اپنے نوجوانوں کو دنیا کی ہر ٹیکنیک سکھا دوں۔ آج کل ویسے بھی ان طور طریقوں کا بڑا رواج ہے۔ اگر ہم اپنے اکھاڑے میں ان چیزوں کا بندوبست رکھیں گے تو نوجوان زیادہ جلدی متوجہ ہوں گے اور زیادہ تعداد میں آئیں گے۔ بات یہ ہے پُتر کہ جتنا گڑ ڈالیں گے اتنا ہی میٹھا ہوگا۔"

"گڑ کی آپ فکر نہ کریں۔ یہ اپنے مجید صاحب شروع شروع میں ذرا کنجوسی کی باتیں کرتے ہیں۔ بعد میں گڑ کی بوریوں کے منہ کھول دیتے ہیں۔ اب یہ آپ کے ساتھ لگیں گے تو آپ کی توقعات سے بڑے کام کریں گے۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

ان کے جانے کے بعد میں کچھ دیر ہی کام کرپایا تھا کہ ٹونی آگیا۔ کمرے میں داخل ہوکر اس نے دروازہ اپنے عقب میں مقفل کردیا اور بیٹھتے ہی بلا تمہید بولا۔ "سر! ڈی آئی جی صاحب نے آپ سے جو گفتگو کی تھی اس سے تو لگ رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں کریں گے لیکن پولیس کافی تیزی سے حرکت میں آئی ہے۔ انہوں نے ملک ریاض راہی کو تو نہیں چھیڑا لیکن اس کی شکر گڑھ والی حویلی پر چڑھائی کرڈالی تھی۔ وہاں ایسی بہت سی نشانیاں ملی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکوؤں سے اس کے رابطے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے اپنے آپ کو پھر بھی ان چیزوں سے لاتعلق قرار دینے کے اس کے پاس بیسیوں طریقے ہیں۔"

"ہاں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں۔" میں نے اس کی تائید کی۔

"اس حویلی میں چونکہ اس کی اپنی یا اس کی فیملی کے کسی فرد کی رہائش نہیں ہے' اس لئے اس نے بڑے آرام سے کہہ دیا ہوگا کہ حویلی چونکہ ویرانے میں واقع ہے اس لئے اسے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ کب وہاں ڈاکو گھس آئے ہوں اور نہ جانے کب تک رہ کر گئے ہوں۔"

"ہاں... یہ تو ہے۔" میں نے اثبات میں سرہلایا۔ "ان بے چارے معصوموں کو کہاں کوئی بات معلوم ہوتی ہے۔"

"جو ایس پی اس پولیس پارٹی کی قیادت کررہا تھا اس نے صرف چند افراد کی موجودگی میں بعد میں لاہور میں ملک ریاض سے ملاقات کی تھی۔ ان میں دو منسٹر بھی شامل تھے۔ بند کمرے میں ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی یہ تو معلوم نہیں ہوسکا لیکن میرا اندازہ ہے کہ آپ کے بارے میں بھی منسٹروں اور ایس پی کے کان بھرنے کی کوشش کی گئی ہوگی۔ یہ صرف چند گھنٹے پہلے ہی کی بات ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "ملک ریاض جو کچھ کر رہا ہے اسے کرنے دو۔ تم اس کے گرد موت کا شکنجہ کسنے کی تیاریاں جاری رکھو۔"

"میں اسی لئے آپ سے مشورہ کرنے حاضر ہوا تھا کہ ادھر جب ملک ریاض ایک پولیس آفیسر اور دو منسٹروں کے سامنے آپ کے بارے میں جانے کیا کیا زہر افشانی کرچکا ہوگا' کیا اس کے بعد جلد ہی اس کا مارا جانا آپ کے لئے الجھنیں تو کھڑی نہیں کرے گا؟"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا۔ "میں اس کے نتائج کا سامنا کرنے کے لئے تیار ہوں۔ میں اب ملک ریاض جیسے زمینداروں' کرپٹ پولیس آفیسرز یا نورو ماچھی جیسے ڈاکوؤں سے بلیک میل ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ ہمیں بہت عرصہ ہوگیا ہے رواداری اور درگزر کی پالیسی اپنائے ہوئے۔ میرے خیال میں اب اس قبیل کے لوگوں کو ہماری طاقت کا اندازہ ہوجانا چاہئے۔ اب جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔"

ٹونی نے ایک لمحے کے لئے پُر خیال نظروں سے میری طرف دیکھا پھر نظر جھکالی۔ اس نے اپنی خوبصورت جیکٹ کا کالر درست کیا' بالوں پر ہاتھ پھیرا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "بالکل ٹھیک ہے سر!" اس کا لہجہ حسبِ معمول ایسا ہی سرسری تھا جیسے ہم اوسط درجے کی کسی کاروباری ڈیل کے بارے میں بات کر رہے ہوں۔

ایک لمحے کے سکوت کے بعد میں نے ریوالونگ چیئر کے پُشتے سے ٹیک لگا کر طویل سانس لیتے ہوئے کہا "کیسی عجیب بات ہے ٹونی! چند روز پہلے اس حویلی میں رات بھر کے لئے ایک مادر پدر آزاد قسم کا جشنِ عیش و طرب برپا ہوا تھا اور آج مالک اس کے بارے میں لاعلمی ظاہر کر رہا ہے۔ یہ ستم ظریفی نہیں ہے؟"

"یقیناً ہے سر!" وہ ٹھوڑی کھجاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔ "لیکن اب آپ نے گرین سگنل دے دیا ہے تو ان سے ہم ہی حساب لینے کا بندوبست کر لیتے ہیں۔"

پھر ایک پنسل اٹھا کر وہ انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا۔ "دوسری خبر میں آپ کو یہ سنانے والا تھا کہ عین اس وقت جب بند کمرے میں ملک ریاض کے ساتھ چند افراد کی یہ میٹنگ جاری تھی' ایک پولیس پارٹی دوسرے ایس پی کی قیادت میں روانہ ہوئی اور اس نے لاہور کے ایک پرائیوٹ اسپتال میں کچھ دیر پہلے ہی داخل کئے جانے والے نوردا ماچھی کو گرفتار کر لیا۔ وہ بے ہوش ہے .... بلکہ قریب المرگ ہی ہے۔ اسے اچھا علاج میسر آنے میں پہلے ہی تاخیر ہو چکی ہے۔ کچھ لوگ اسے گاڑی میں ڈالے چوری چھپے کبھی یہاں' کبھی وہاں پھرتے رہے۔ اس چکر میں اس کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ آپ کی مار سہہ نہیں سکا۔"

"سہہ جاتا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "بڑی خوفناک اور خبیث چیز ہے لیکن میں نے اسے اٹھا کر تقریباً ڈیڑھ منزل کی اونچائی سے نیچے پھینک دیا تھا' اس سے اس کی حالت زیادہ خراب ہوئی۔"

"خیر۔" غیر ارادی طور پر پنسل پر اس کی انگلیوں کا دباؤ بڑھ گیا اور پنسل ٹوٹ گئی۔ سوری کہتے ہوئے اس نے ٹوٹی ہوئی پنسل کے دونوں ٹکڑے ردی کی ٹوکری میں پھینکے اور ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے بولا۔ "سر! اندر کی اطلاع یہ ہے کہ پولیس کی تحویل میں آنے کے بعد نوردا ماچھی کو علاج میسر آنے میں اور بھی تاخیر ہو رہی ہے۔ پولیس تو غالباً چاہتی یہی ہے کہ وہ مر جائے۔ یقیناً اسے بھی پولیس مقابلہ قرار دیا جائے گا۔ دس لاکھ کا انعام تو پہلے ہی مقرر ہے۔ مزید کچھ انعامات مل جائیں گے۔"

"چلو خیر.... بُرے آدمی کو بہرحال مرنا چاہئے۔ خواہ کسی بھی طرح سہی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور اس کی موت سے اگر کسی کو کوئی فائدہ پہنچ جائے تو کوئی حرج نہیں۔ آخر بیچ بیچ ایسے مواقع بھی تو آتے ہی رہتے ہیں جب پولیس اپنی جان خطرے میں ڈالتی ہے اور بعض اوقات بہت سے جوان جاں بحق بھی ہو رہتے ہیں' شہید ہو جاتے ہیں۔"

"یس سر! ایسا بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھار۔" ٹونی محتاط لہجے میں بولا۔

"مجھے نوردا ماچھی سے بڑی شدید نفرت محسوس ہوئی تھی لیکن اب مجھے اس پر ترس آرہا ہے۔" میں نے کہا "بے چارہ۔ قربانی کا بکرا...! ملک ریاض کے ساتھ چند آدمیوں کی بند کمرے میں جس میٹنگ کا تم ذکر کر رہے ہو' میرا اندازہ ہے اسی میٹنگ میں فیصلہ کیا گیا ہوگا کہ نوردا ماچھی کو اب "برآمد" کر ہی لیا جائے۔ ملک ریاض نے محسوس کر لیا ہوگا کہ لنگڑا لولا اور بسترِ مرگ پر پڑا ہوا نوردا ماچھی جس کے بیشتر ساتھی مر چکے ہیں اور کچھ ساتھ چھوڑ کر بھاگ چکے ہیں' اب اس کے کسی بھی کام کا نہیں۔ بلکہ ہوش میں آنے پر یہ بھی ممکن ہے وہ اپنی بے بسی سے جھنجلا کر کوئی ایسی ویسی بات کر بیٹھتا۔ اسے احساس ہو جاتا کہ اس کا مُربی و سرپرست' ہر لمحے اس کی پیٹھ تھپکنے والا اور اس کے لئے بڑی بڑی باتیں کرنے والا ملک ریاض اس کے لئے کچھ نہیں کر سکا' اس کے لئے صحیح علاج تک کا بندوبست نہیں کر سکا۔ اس کے ردِ عمل میں اس کی زبان سے کچھ بھی نکل سکتا تھا۔ اس لئے اسے "صحیح ہاتھوں" میں پہنچا دیا گیا۔"

"میرا خیال بھی یہی تھا سر!" ٹونی نے سر ہلایا۔

"عفریت کی طرح سینہ تان کر پھرنے والے اور درندوں کی طرح لوگوں کو بھنبھوڑنے والے کا یہ انجام خاصا عبرت آموز نہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یقیناً ہے سر!" ٹونی مبہم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"اس کی فرعونیت اور بے کسی کے درمیان کچھ زیادہ لمبا فاصلہ بھی نہیں۔" میں نے کہا "ایک دن پہلے.... بلکہ چند گھنٹے پہلے وہ ایک کمزور عورت کو درندوں کی طرح بھنبھوڑ کر اس پر اپنی طاقت کا سکہ جما رہا تھا اور چند گھنٹے بعد اسی چار دیواری کے قریب پڑا سسک رہا تھا۔"

پھر مجھے کچھ خیال آیا۔ میں نے ذرا آگے جھکتے ہوئے کہا "ٹونی! وہ عورت بازاری تھی.... گناہ گار تھی۔ لیکن کیا یہ ممکن نہیں کہ اسے اسی عورت کی بد دعا کھا گئی ہو؟ اللہ تعالیٰ تو سبھی کا رب ہے نا! وہ گناہ گاروں کی بھی تو سنتا ہے نا؟"

"یس سر!" ٹونی نظریں جھکاتے ہوئے بولا۔ "شاید اس لئے کہ بعض اوقات کسی گناہ گار کی دعا کے پیچھے بہت سے بے گناہوں کی دعائیں بھی سفر کر رہی ہوتی ہیں۔"

میں پھڑک اٹھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر میز پر ٹکے ہوئے اس کے ہاتھ تھپتھپائے۔ اس کے سرخ و سپید ہاتھ زیادہ بڑے نہیں تھے۔ نفیس اور کچھ نازک سے نظر آتے تھے لیکن درحقیقت وہ فولاد کی طرح مضبوط تھے۔ وہ باقاعدگی سے باڈی بلڈنگ کرنے والا نوجوان تھا لیکن اپنی ڈھیلی ڈھالی جیکٹ میں منحنی سا ہی نظر آتا تھا۔

بڑے بڑے سنگین معاملات پر بڑے سرسری اور لاابالی سے انداز میں بات کرنے والا یہ نوجوان کبھی کبھی بڑی گہری بات کر جاتا تھا۔

"بہت عمدہ بات کی ہے تم نے۔" میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"باتیں کرنا... اور عمل کرنا۔ دونوں کام آپ ہی کی صحبت میں سیکھے ہیں۔" وہ مسکرایا۔ پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "ملک ریاض راہی والے کام کو میں نے "آپریشن ایم ڈبل آر" کا نام دیا ہے۔ ایم ڈبل آر سے مراد ملک ریاض راہی ہی ہے۔ اس آپریشن میں میرے علاوہ چار آدمی کام کر رہے ہیں۔ پھر جس مرحلے پر جس کی خدمات کی بھی ضرورت پڑتی جا رہی ہے وہ ہم حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ اصل اور سب سے اہم خبر میں آپ کو اب سنانے لگا ہوں جو شاید آپ کو زیادہ اہم نہ لگے۔"

"تم سناؤ تو سہی' فیصلہ بعد میں کریں گے۔ اس خبر کا تعلق بھی 'آپریشن ایم ڈبل آر' سے ہے؟"

"یس سر! ابھی تو یہی موضوع میرے سر پر سوار ہے۔" ٹونی بولا۔ "ایک ٹیلیفون آپریٹر کے ذریعے ایک اہم اطلاع حاصل ہوئی ہے۔ ملک ریاض پرسوں شام علاقہ غیر کے لئے روانہ ہو رہا ہے۔ صرف ایک جیپ میں چار آدمی جا رہے ہیں۔"

"شاید کمک لینے جا رہا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کوئی بعید نہیں ہے سر!" ٹونی سنجیدگی سے بولا "موقع بہت اچھا ہے... آپ کو معلوم ہی ہے علاقہ غیر تک پہنچنے کے لئے بڑے دشوار گزار راستوں پر سفر کرنا پڑتا ہے۔ بل کھاتی ہوئی تنگ پہاڑی سڑکیں ہیں جو سیکڑوں فٹ کی بلندی تک جاتی ہیں۔ ان کے ایک طرف تراشیدہ پہاڑ ہیں اور دوسری طرف سیکڑوں فٹ گہری کھائیاں۔ یہ تو پھر بھی شہری علاقوں کے راستے شمار ہوتے ہیں۔ پہاڑی اور جنگلاتی راستے تو اور بھی خطرناک ہیں۔ کسی جگہ تو پہاڑی ندی نالوں پر چوبی تختوں سے بنے ہوئے ایسے پُل بھی ہیں جو موٹے موٹے رسّوں سے بندھے جھول رہے ہیں۔ ان پر سے چند افراد اگر ذرا عجلت کے عالم میں گزریں تو وہ پُل ہنڈولے کی طرح جھولنے لگتے ہیں مگر انہی پر سے لوگ جیپوں اور مرسیڈیزوں میں گزرتے ہیں۔"

"مجھے یاد ہیں وہ سب راستے۔" میں نے کہا "ہم نے ایک ساتھ ان پر بہت سفر کیا ہے۔ کیسا عجیب تھا نوجوانی کا وہ دور بھی۔ تمہاری تو اس وقت مَسیں بھی نہیں بھیگی تھیں۔ عدم آگہی میں کیسی راحت تھی۔ ہر وقت ہم موت کے گلے میں بانہیں ڈالے پھرتے تھے۔"

"موت تو اب بھی نہ جانے کس کس روپ میں ہماری ہم قدم رہتی ہے سر!" وہ بے پروائی سے بولا "موت سے دوستی رکھے بغیر زندگی کا لطف نہیں اٹھایا جا سکتا۔"

"خیر... تم نے جو میری جغرافیائی معلومات تازہ کرنے کی کوشش کی ہے اس کا مطلب میری سمجھ میں آگیا ہے؟" میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے مخصوص اور نہایت خفیف سے انداز میں مسکرایا۔ "سر! آپ کو معلوم ہی ہے ان خطرناک اور دشوار گزار راستوں پر آئے دن حادثات پیش آتے ہی رہتے ہیں۔ میں نے سوچا تازہ ترین حالات کی روشنی میں ایک بار پھر آپ سے گرین سگنل لے لیا جائے۔"

"ہاں... بعض حادثے گرین سگنل کھل جانے کے بعد بھی پیش آتے ہیں۔" میں نے اس کی تجویز پر صرف ایک لمحے غور کیا پھر کہا۔ "ٹھیک ہے... بالکل ٹھیک ہے۔ اس سفر میں ملک ریاض راہی کو حادثہ پیش آجانا چاہئے۔ اس کے ساتھ کون کون ہوگا؟"

"ابھی تو صحیح معلوم نہیں ہو سکا لیکن میرا اندازہ ہے کہ اس کے ساتھ صرف مسلح محافظ ہوں گے۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"انہیں بھی ملک ریاض کے ساتھ حادثے کا شکار ہونا پڑے گا؟" میں نے قدرے تذبذب سے کہا۔

"ظاہر ہے سر! اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔" ٹونی بولا۔ "اس سلسلے میں کسی پچھتاوے کو دل میں جگہ نہ دیں سر! ایسے لوگوں کے گارڈ بھی کوئی شریف آدمی تو نہیں ہوتے۔ پہلے ہی سے پیشہ ور قاتل یا ڈاکو وغیرہ ہوتے ہیں یا پھر ان کی پناہ میں آنے کے بعد ایسے ہو جاتے ہیں۔ اپنا ہر جرم کو جائز اور قانون بنا لیتے ہیں لیکن ان کے اندر تو پیشہ ور مجرم ہی چھپا ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "گارڈز کو بھی صاف کر دو۔ میرا خیال ہے کوئی ٹرک ان کی جیپ کو ٹکر مارے گا؟"

"یس سر!" ٹونی نے سر ہلایا۔ "میرے خیال میں یہی مناسب رہے گا۔ ٹرک جائے حادثہ سے فرار ہو جائے گا' جیسا کہ بیشتر حادثات میں ہوتا ہے۔ ہمارے پاس ابھی دو دن ہیں۔ اس دوران ہم روٹ کا جائزہ لے لیں گے۔ اس جگہ کا... اور دو ایک دوسرے متبادل مقامات کا جائزہ لے لیں گے جہاں حادثہ پیش آنا چاہئے۔ اگر ایک جگہ کوئی گڑبڑ ہو گئی اور حادثہ ملتوی کرنا پڑا تو دوسری جگہ سہی۔ دوسری جگہ پر بھی موقع مناسب نہ ہوا تو تیسری جگہ سہی۔ یہ سفر اس کے لئے بہرحال موت کا سفر ثابت ہوگا۔"

"جیپ کو بہت گہری کھائی میں گرنا چاہئے جہاں وہ پاش پاش ہو جائے اور کسی کے زندہ بچنے کا امکان نہ رہے۔" میں نے کہا۔

"ایسا ہی ہوگا۔" ٹونی نے وثوق سے جواب دیا۔

"میں اس دوران عالم شیر کو دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا "ملک ریاض کے بعد اس کا بھی زیادہ دن زندہ رہنا ٹھیک نہیں ہوگا۔ وہ بھی ہمارے لئے دردِ سر بنتا جا رہا ہے۔ ملک ریاض کی موت کے بعد ہمیں زیادہ پریشان کرنے کی کوشش کرے گا۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ ملک ریاض کا انجام دیکھنے کے بعد خوفزدہ ہو کر خاموش ہو جائے۔" ٹونی نے خیال ظاہر کیا۔ "خود ملک ریاض کو بھی احساس ہو گیا ہے کہ اس نے آپ سے پنگا لے کر غلطی کی

ہے۔ آپ اتنے چھوٹے آدمی نہیں ہیں اور نہ ہی محض ایک بے ضرر سیٹھ ہیں۔ یہ احساس ہونے کے بعد ہی اس نے نوروما چھی سے لاتعلق ہونے کا فیصلہ کیا ہے اور اسے پولیس کے ہتھے چڑھ جانے دیا ہے۔ اس نے غالباً یہ سوچا ہے کہ جب تک آپ سے کشمکش جاری ہے تب تک اپنی شخصیت کے ساتھ کم سے کم قابلِ گرفت چیزیں وابستہ رکھی جائیں۔"

"ممکن ہے۔" میں نے کہا "بہر حال عالم شیر موٹے دماغ کا آدمی ہے۔ وہ اتنی باریکیوں میں نہیں جاتا۔ وہ شطرنج کی طرح چالیں نہیں چلتا۔"

"شاید اسی لئے وہ سیاست میں حصہ نہیں لیتا۔" ٹونی بولا "ورنہ وسائل تو اس کے پاس بھی بہت ہیں۔"

"ہاں۔ بہت موٹی مرغی ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا۔ پھر مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے مشورہ طلب سے انداز میں کہا "ملک ریاض کی حویلی میں اس رات جشنِ عیش ونشاط میں' میں نے بہت سے جانے پہچانے چہرے دیکھے تھے۔ ان میں کئی بڑے سرکاری آفیسر بھی تھے۔ میرا خیال ہے مجھے ان سب کی ایک تفصیلی فہرست تیار کرالینی چاہئے۔ کبھی کہیں حوالے کے لئے کام آسکتی ہے۔ خصوصاً جبکہ ملک ریاض کا ارشاد ہے کہ وہ حویلی تو ایک عرصے سے ویران پڑی ہے اور اسے اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"ہاں... ٹھیک ہے..." ٹونی پُرخیال لہجے میں بولا "فہرست تیار کرا کے رکھ لینے میں کوئی حرج نہیں۔ نام... ان کی حیثیتیں... عہدے وغیرہ... تحریری شکل میں محفوظ ہو جائیں تو اچھا ہی ہے۔ یادداشت سے بہت سی چیزیں محو بھی ہو جاتی ہیں۔ ویسے آپ کی اپنی تیار کردہ فہرست کی حیثیت تو وہی ہوگی جو آپ کے زبانی بیان کی ہوگی۔"

"ہاں..." میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بس... ویسے ہی ذرا ٹائپ شدہ اور فائل میں لگی ہوئی باضابطہ قسم کی فہرست کچھ مستند قسم کی چیز لگتی ہے... اور ہاں... فہرست پر مجھے یاد آیا۔ بلیک باکس میں سے جو فہرست برآمد ہوئی تھی' ان افراد کے بارے میں مزید کچھ معلومات تو حاصل نہیں ہوئیں؟"

"نہیں سر! میں اس طرف توجہ ہی نہیں دے سکا۔" ٹونی بولا۔ "میں یہ ملک ریاض والے چکر میں لگ گیا ہوں۔ آدمی ذرا اہم ہے۔ میں چاہتا ہوں اس کام میں کوئی خامی نہ رہ جائے۔"

"یہی تو میں بھی چاہتا ہوں۔ میں نے شروع میں ہی تمہیں بتا دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ویسے میں نے اس فہرست کے بارے میں ایک رائے قائم کی ہے..." ٹونی ہچکچاتے ہوئے بولا۔

"فوراً بتاؤ۔ تمہیں معلوم ہے میں تمہاری رائے کو بہت اہمیت دیتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ذرّہ نوازی ہے آپ کی۔" ٹونی بولا۔ "یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ وہ لوگ مختلف محکموں میں بڑے عہدوں پر فائز رہے تھے لیکن اب ان میں سے کوئی بھی سروس میں نہیں تھا۔ ریٹائر ہونے کے بعد کوئی طبعی موت مر چکا ہے' کوئی کسی حادثے میں اور کوئی ملک سے باہر جا چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو ہمارے مختلف محکموں میں رہتے ہوئے ریڈ ڈاٹ کے لئے کام کر رہے تھے۔"

"میں نے بھی یہی نتیجہ اخذ کیا تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اور یہ بڑی خوفناک حقیقت ہے سر!" ٹونی کے لہجے میں ہلکا سا کرب تھا۔ "کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ لوگ کب اور کس طرح ریڈ ڈاٹ کے آلۂ کار بنے ہوں گے اور انہوں نے اس کے لئے کیا کیا خدمات انجام دی ہوں گی۔"

"کاش ہمارے اندازے غلط ہوں۔" میں نے کہا۔ یہ محض ایک خواہش تھی' ایک دعا تھی۔

"ان میں سے نہ جانے کون کن حالات میں ریٹائر ہوا ہوگا... کس کی موت صرف ظاہری حد تک طبعی ہوگی... کون نہ جانے کیوں ملک سے باہر جانے پر مجبور ہوا ہوگا۔" ٹونی بولا۔

"ان میں آخری نام ریٹائرڈ ڈی آئی جی احمد شجاع کا تھا۔" میں نے اپنی یادداشت کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔ "مجھے وہ آدمی اکھڑ اور دبنگ دکھائی دیا تھا۔ فہرست میں اس کا نام شامل ہونے کا مطلب بظاہر تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ وہ بھی ریڈ ڈاٹ کا آلۂ کار رہا ہوگا لیکن شاید ریٹائرمنٹ کے بعد کچھ پھیل گیا ہو۔ کچھ کرنا چاہتا ہو۔ ریڈ ڈاٹ کے ان ایجنٹوں کی وہ فہرست شاید اسی نے تیار کرائی ہو۔ ریڈ ڈاٹ اس سے وہ فہرست حاصل کرنے تک اس کے ساتھ کوئی سختی نہ کرنا چاہتی ہو۔ اس مقصد کے لئے ہی انہوں نے ہنی کو بھی پریس تمینہ کی حیثیت سے استعمال کیا ہو۔ شاید وہ فہرست ریڈ ڈاٹ کے حوالے کرنے پر آمادہ بھی ہو گیا ہو لیکن عین آخری لمحوں میں پھر پھیل گیا ہو۔ وہ کچھ اسی قسم کا آدمی دکھائی دیتا تھا۔ میرا خیال ہے اس پھڈے کے عین آخری لمحوں کے دوران ہی میں اس طرف جا نکلا تھا۔ پھر حادثاتی طور پر احمد شجاع بھی مارا گیا تھا اور اپنے پیچھے ان گنت سوالات چھوڑ گیا تھا۔ بہر حال... یہ سب اندازے ہیں۔ محض اندازے۔"

"مجھے یہ اندازے حقیقت سے قریب تر دکھائی دیتے ہیں۔" ٹونی بولا۔

"لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی..." میں نے کہا "وہ آدمی جو شاید اب ریڈ ڈاٹ کے لئے کسی کام کے نہیں رہے تھے' ان کی مختصر سی فہرست کے لئے ریڈ ڈاٹ نے سردھڑ کی بازی کیوں لگائی ہوئی تھی؟ اس سلسلے میں تم نے کوئی اندازہ قائم کیا ہے؟"

"یس سر!" ٹونی سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے ابھی ریڈ ڈاٹ کے معاملات کسی ایسے مرحلے پر ہوں گے کہ وہ اپنے اس

قسم کے رازوں کو راز ہی رکھنا چاہتی ہوگی۔ وہ نہیں چاہتی ہوگی کسی کے علم میں آئے کہ وہ ہمارے محکموں میں بھی سرایت کر چکی ہے یا دہاں بھی اس کے مفادات کی حفاظت کرنے والے موجود ہیں۔"

"موجود ہیں ...؟" میں نے لفظ "ہیں" پر زور دیتے ہوئے کہا۔"وہ فہرست تو ریٹائرڈ اور مرحوم لوگوں کی تھی۔"

"اگر پہلے کچھ جگہوں پر ان کے لوگ موجود تھے تو اب بھی ہوسکتے ہیں۔ یہ امکان تو نظر آتا ہے نا۔ اس کے علاوہ کسی وجہ سے پرانے رازوں کی حفاظت بھی ان کے لئے اہم ہوسکتی ہے" دلیل، جواز اور قیاس کے میدان میں بھی ٹونی کا ذہن نہایت مستعدی سے کام کرتا تھا۔

"لیکن اب وہ یکدم ہی بلیک باکس کی تلاش کے سلسلے میں ٹھنڈے پڑ گئے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تو صرف ہمارا خیال ہے۔" ٹونی بولا۔ "ممکن ہے وہ ابھی سرگرمی سے اسے تلاش کر رہے ہوں۔ البتہ ہماری طرف سے وہ مطمئن ہوگئے ہوں۔ انہیں یقین ہوگیا ہو کہ بلیک باکس ہمارے پاس نہیں ہے۔ اور پہلے وہ واقعی ہمارے پاس نہیں تھا۔ یہ تو محض ایک اتفاق ہے نا کہ عین اس وقت بلیک باکس ہمارے ہاتھ لگ گیا، جب وہ اس سلسلے میں ہماری طرف سے مطمئن اور بے فکر ہوچکے تھے۔"

"تمہاری یہ بات بھی دل کو لگتی ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بھی ممکن ہے، ریڈ ڈاٹ کے حالات نے کوئی ایسا پلٹا کھایا ہو کہ اب وہ فہرست یا یہ راز ان کے لئے اتنا اہم نہ رہا ہو۔" ٹونی نے معاملے کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ یہ بھی ممکن ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ یہ سب اندازے میں نے بھی قائم کئے تھے۔ میں نے بھی ان معاملات پر انہی زاویوں سے غور کیا تھا لیکن ٹونی جیسے ذہین نوجوان سے تبادلۂ خیال کرنے کے بعد جیسے دل کو کچھ اطمینان سا ہوگیا تھا اور میری رائے اپنی ہی نظر میں معتبر سی ہوگئی تھی۔

کچھ دیر مزید اس سے گفتگو رہی۔ جب وہ رخصت ہونے لگا تو میں نے کہا "جب تم آپریشن ایم ڈبل آر پر روانہ ہونے لگو تب بھی مجھے اطلاع دے دینا اور مشن مکمل ہونے پر تو مجھے اطلاع دو گے ہی۔ میں احتیاطاً اس دوران یہاں اپنی مصروفیات ایسی رکھوں گا جن کی گواہی، وقت پڑنے پر بہت سے لوگ دے سکیں۔"

"ٹھیک ہے سر! ویسے اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔" ٹونی نے کہا اور رخصت ہوگیا۔ شام تک میں نے آفس میں کام کیا پھر گھر آگیا۔ مجھے کھانے پر راحیلہ کے ہاں جانا تھا۔ ارادہ تھا کہ گھر سے ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد تیار ہو کر نکلوں گا۔ لیکن گھر پہنچ کر میں ابھی لباس بھی تبدیل نہیں کرپایا تھا کہ گیٹ ہاؤس سے طارق خان نے انٹرکام پر اطلاع دی کہ کوئی خاتون مجھ سے ملنے آئی ہیں، شمیم نام بتاتی ہیں۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرا خیال تھا، میرے گزشتہ رات کے رویئے سے اس کی خاصی دل شکنی ہوئی ہوگی اور اب وہ میری صورت بھی کچھ دن کے بعد ہی دیکھنا پسند کرے گی لیکن وہ تو غالباً میرے وزٹنگ کارڈ سے ہی میرا ایڈریس دیکھ کر آگئی تھی۔ اور وہ بھی فون کئے بغیر۔

میں نے اپنے بیڈ روم کی فرنچ ونڈو کے تاریک شیشے سے دیکھا، طارق خان نے اسے گاڑی ڈرائیو وے میں لانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ گاڑی ہی میں بیٹھی تھی۔ مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے ایک ملازم کو بھیجا کہ اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔

چند منٹ بعد میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہ دونوں ہاتھ پشت پر رکھے شاہانہ سے انداز میں ٹہل رہی تھی۔ دیواروں پر آویزاں مشہور آرٹسٹوں کی پینٹنگز کا معائنہ کر رہی تھی۔ کمرے کی آرائش کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ مخملیں، سرخ، بھڑکیلے سے لباس میں تھی جس نے اس کی نکھری نکھری سی شخصیت کو شعلہ جوالا سا بنا دیا تھا۔ کمرا خوشبو سے مہکا ہوا تھا بلکہ اس کے وجود سے کچھ روشن روشن سا بھی ہوگیا تھا۔ وہ لباس کسی اور پر شاید اتنا نہ جچتا۔ سر سے پاؤں تک اس کا وجود گواہی دے رہا تھا کہ وہ بہت ہی خاص اہتمام سے میرے ہاں آئی تھی۔

اک ادائے خاص سے وہ میری طرف گھومی اور دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی "تمہارا مکان تو بہت شاندار ہے افضل ڈیئر! میں بہت کم چیزوں سے امپریس ہوتی ہوں لیکن اس مکان کو تھوڑا سا دیکھ کر ہی بے پناہ مرعوب ہوگئی ہوں۔ تم نے اس میں خوبصورتی اور جاہ و جلال کو یکجا کردیا ہے۔"

"یہ میرا نہیں، پیسے کا کمال ہے شمیم بیگم!" میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پیسہ اس شہر میں اور بھی بہت سے لوگوں کے پاس بے شمار ہے لیکن ان سب کے پاس ذوق نہیں ہے۔ یقین نہیں آتا کہ دیہات کی غربت اور پستیوں سے نکل کر کوئی حیثیت اور ذوق، دونوں کے اعتبار سے اتنا اونچا جاسکتا ہے۔" وہ بولی۔

میں خاموش رہا۔ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ اپنے لباس کو سنبھالتے ہوئے بڑی نزاکت سے ایک صوفے کی نرم گہرائیوں میں اتر گئی۔ اس کی شخصیت میں طاہرہ خانم کی ہلکی سی جھلک تھی لیکن وہ طاہرہ سے زیادہ ترو تازہ، شگفتہ اور قدرے کم عمر نظر آتی تھی۔

میرے حواس پر دُھند سی چھا رہی تھی کیونکہ میرے اندر ایک کشمکش برپا تھی۔ میرا دل اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا لیکن میں اپنے دل کو قابو میں رکھنے کی زبردست کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اس وقت اس اہتمام سے میرے ہاں آکر مجھے ایک امتحان میں ڈال دیا تھا... اور اس کی آنکھیں... خدا کی پناہ! وہ بولتی آنکھیں تو گویا آج مجھے تباہ کردینے پر تلی ہوئی تھیں۔

میں نے کمزور سی آواز میں پوچھا "راجو نہیں آیا تمہارے ساتھ؟"

"آنا تو اسے ہی چاہئے تھا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "وہ تمہارا بچپن کا دوست ہے۔ برسوں بعد کل رات اس سے تمہاری تشنہ سی ملاقات ہوئی ہے۔ تمہارا خیال شاید یہ رہا ہو کہ وہ دوبارہ تم سے ملنے اور اطمینان سے بیٹھ کر تفصیلی گپ شپ کرنے کے لئے تڑپ رہا ہوگا۔ تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اس کے بارے میں سُن کر دل چھوٹا مت کرنا اور مایوس مت ہونا۔ وہ حسب معمول شام تک خراٹے لیتا رہا۔ پھر اٹھ کر تیار ہو کر اپنے تھرڈ ریٹ قسم کے لفنگے اور شرابی دوستوں کے ساتھ محفل جمانے کے لئے نکل کھڑا ہوا۔ اس نے تمہارا ذکر تک نہیں کیا۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ دلکش سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "دوسری طرف ہم ہیں جو تمہارے بچپن کے دوست نہیں ہیں۔" اس نے لفظ "نہیں" پر بہت زور دیا۔ "ہمیں رات گھر جانے کے بعد دن میں بھی نیند نہیں آئی۔ ذہن کو تمہارے تصور سے فرصت ملتی تو وہ خوابوں کی وادیوں میں بھٹکتا۔ پھر اگر تھوڑی دیر کے لئے نیند بھی آئی تو خواب تمہارے ہی آئے۔ دوبارہ آنکھ کھلی تب بھی تمہارے ہی بارے میں سوچتی رہی، حیران ہوتی رہی کہ بچھڑے ہوئے لوگ زندگی کے راستوں میں کبھی کبھی کیسے عجیب انداز میں آن ملتے ہیں۔ لیکن پھر جب یہ خیال آیا کہ ہم کون سا تمہارے بچپن کے دوست ہیں، ہمارے ملنے کی تمہیں کون سی خوشی ہے، تو دل پر ایک عجیب طرح کی افسردگی چھا گئی۔ اس کے باوجود ہم تم سے ملنے آگئے۔ صرف دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر۔"

"بہت شکریہ۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ میری عزت افزائی ہے کہ تم نے مجھے اس قابل سمجھا۔ راجو کے نہ آنے کا مجھے افسوس نہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ انسان کے نظریات اور محسوسات میں تبدیلیاں آجاتی ہیں لیکن میری نظر میں اس سے کوئی زیادہ فرق نہیں پڑتا۔ وہ نہیں آیا... کوئی بات نہیں، میرا جب دل چاہے گا میں خود اس سے ملنے چلا جاؤں گا۔ یہ کوئی حساب کتاب یا ناپ تول کا مسئلہ نہیں ہے جسے برابر اور درست رکھنا ضروری ہو۔ لڑکی، محبت اور عشق کے ترازو میں کبھی ایک پلڑا جھک جاتا ہے، کبھی دوسرا۔ ان معاملات میں زیادہ باریکیوں میں نہیں جانا چاہئے۔"

"بالکل۔" وہ ذرا کھل اٹھی۔ "یہی سوچ کر تو میں چلی آئی ہوں۔ تمہیں مجھ سے ملنے کی تمنا نہ سہی، مجھے تو ہے۔"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں، اب سوال تمنا کا نہیں، رشتے ناتوں کا ہے۔ آنکھ کی شرم کا ہے۔ ہم اب اس پر مزید بحث نہیں کریں گے۔ رات تفصیل سے بات کرچکے ہیں۔ یہ بتاؤ کیا پیو گی، کیا کھاؤ گی۔"

"جو تم پلاؤ گے پی لیں گے۔ جو تم کھلاؤ گے، کھالیں گے۔" وہ دل آویز انداز میں مسکرائی۔ "بس تمہاری آنکھیں، تمہارا لہجہ مہرباں رہے، میرے لئے فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔"

وہ ستمگر صرف حرکات و سکنات اور آنکھوں سے ہی نہیں، لفظوں سے بھی مجھے آزمائش میں ڈالنے پر تلی ہوئی تھی۔ میں نے ملازم سے اس کی تواضع کے لئے کچھ چیزیں منگوائیں جن کی طرف اس نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ بس ایک کولڈ ڈرنک کا گلاس ہاتھ میں لئے بیٹھی رہی۔ چسکیاں لیتی رہی اور باتیں کرتی رہی۔ باتوں میں کوئی نہ کوئی بات ایسی ہوجاتی، کوئی نہ کوئی اشارہ ایسا آجاتا کہ میرا دل اچھل اچھل ہونے لگتا لیکن میں نے بصد کوشش اپنے آپ کو سنبھالے رکھا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ واپس جانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ شبِ رفتہ کی طرح وہ آج کی رات بھی باتوں میں گزارنے آئی تھی۔ میرا دل اِدھر راحیلہ میں اٹکا ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی اور اس دوران وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ یعنی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ریسیور اٹھانے سے پہلے ہی میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ وہ راحیلہ کا فون ہوگا۔ گھنٹی اس فون کی بجی تھی جسے ملازمین میں سے کوئی نہیں اٹھاتا تھا۔

میں نے ریسیور اٹھایا۔ میرے دل نے صحیح سگنل دیا تھا۔ دوسری طرف.... راحیلہ ہی تھی۔ میرے "ہیلو" کہتے ہی اس نے میری آواز پہچان لی اور بلا تمہید بولی۔ "شرفاء عموماً رات کا کھانا جلدی کھا لیتے ہیں ... اور میں تمہارے انتظار میں بھوکی بیٹھی ہوئی ہوں۔"

"میں اب تک پہنچ چکا ہوتا لیکن غیر متوقع طور پر میرے کچھ مہمان آگئے۔" میں نے نیچی آواز میں کہا۔

اس موقع پر شمیم نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ ظاہر ہے اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ دوسری طرف کون تھا لیکن اس کے باوجود مجھے کچھ ایسا لگا جیسے وہ اسے اپنی موجودگی کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ کمرا طویل و عریض تھا اور فون ایک گوشے میں تھا۔ میں اپنی جگہ سے اٹھ کر فون سننے آیا تھا۔ میرے اور شمیم کے درمیان خاصا فاصلہ تھا لیکن راحیلہ کی سماعت کچھ زیادہ ہی تیز تھی۔ شمیم کے کھنکارنے کی آواز اس تک پہنچ گئی۔

وہ بخشنے والی نہیں تھی۔ فوراً بولی۔ "کھنکارنے کا انداز بتا رہا ہے کہ کھنکارنے والی نے بڑا مترنم گلا پایا ہے۔ کون ہیں یہ خاتون؟"

"وہ ہمارے ایک دوست ہیں... ان سے بزنس بھی چلتا ہے... ان کی بیگم ہیں۔" میں نے بہت کوشش کی کہ میرے لہجے میں اعتماد برقرار رہے لیکن نہ جانے کیوں کچھ لنگڑا پن آہی گیا۔ ادھر راحیلہ کا انداز عموماً ایسا ہی ہوتا تھا جیسے وہ دوسری طرف فون پر میری

تصویر بھی دیکھ رہی ہو۔

"یہ تمہاری سٹی کیوں گم ہو رہی ہے؟" وہ تیزی سے بولی۔

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے اپنے لہجے میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ میں ان لوگوں میں سے تھا جن کی کسی بھی موقع پر سٹی ذرا مشکل سے ہی گم ہوتی ہے لیکن راحیلہ ایک ایسی شخصیت تھی جس کے سامنے میرے اندر کا دیہاتی اور شرمیلا' تیرہ چودہ سال پہلے کا نوجوان عیاں ہونے لگتا تھا۔ اس چنبیلی جیسی نازک اور مہکتی عورت کے سامنے میری بہانے بازی یا جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ میری ہمیشہ خواہش ہوتی تھی کہ میں اس سے بات کروں' اس کے سامنے "پیش" ہوؤں تو مجھ میں کوئی عیب' کوئی خامی نظر نہ آئے۔

"کیا واقعی کمرے میں اس خاتون کے شوہر بھی موجود ہیں؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ ہاں۔ کہو تو تمہاری ان سے بات کراؤں؟" میں نے بڑی جرأت سے کہا۔ میں شمیم کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ اس کی نظر مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ میں اپنے آپ کو یہ تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ شمیم اس گفتگو میں ربط تلاش نہیں کر پائے گی کیونکہ وہ صرف میری آواز سن رہی تھی جسے میں حتی الامکان نیچی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اگر میں زیادہ نیچی آواز میں بات کرتا تو راحیلہ اور شمیم دونوں ہی کی نظر میں مشکوک ہو جاتا۔

راحیلہ نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا تو میں ذرا شیر ہو گیا۔ میں نے کہا۔ "ان صاحب کو ویسے بھی تم جیسی شخصیات سے بات کرنے کا بہت شوق ہے۔ میں تمہاری ان سے بات کرا سکتا ہوں لیکن ذرا سوچو' تمہاری یہ حرکت کیسی لگے گی؟"

"بھاڑ میں گئے وہ صاحب۔" راحیلہ تیزی سے بولی۔ "چاہے اس وقت تمہارے پاس موجود ہوں یا نہ ہوں' مجھے اس سے کیا مطلب؟ رات کو اس وقت اگر تم کسی اکیلی خاتون سے بھی کمرے میں "بزنس ڈیل" کر رہے ہو تو میرے لئے اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں کوئی جیلس تو نہیں ہو جاؤں گی۔ میں تو ویسے ہی ذرا تمہیں چھیڑ رہی تھی۔ میرا اور تمہارا کوئی جیلس ہونے والا رشتہ تو نہیں ہے۔ تم تو میرے باس ہو۔ بلکہ بگ باس۔"

"ہاں... یہ تو ہے۔" میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔ "ذرا مجھے فرصت مل جائے' پھر میں تم پر رعب شوب ڈالا کروں گا۔ آج کل ذرا بزی ہوں۔ ابھی تم پر رعب ڈالنے کے لئے وقت نہیں مل رہا۔"

"ابھی کھانے پر آؤ گے تو جی بھر کے رعب ڈال لینا۔ میں ذرا اپنے اوپر مسکینی طاری کر لوں۔ جب تم آؤ گے' مجھے کانپتا ہوا پاؤ گے۔" اس نے بڑے خلوص سے وعدہ کیا۔ "تم مجھے کس طرح کانپتے دیکھنا پسند کرو گے... بید مجنوں کی طرح یا خزاں رسیدہ پتے کی طرح؟"

"کسی گھبرائے ہوئے اُلو کی دُم کی طرح۔" میں نے جواب دیا۔

"ہر بات میں اپنا ذکر مت لے آیا کرو۔" اس نے کہا اور پھر جلدی سے بولی "اچھا... خیر... اب بات لمبی مت کرو۔ جو خاتون کمرے میں تمہارے ساتھ بیٹھی ہے وہ بور ہو رہی ہو گی اور اس وقت یقیناً تمہیں گھور رہی ہو گی..."

میں نے شمیم کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھور تو نہیں رہی تھی تاہم ایک ٹک میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ راحیلہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "جب اس خاتون کے ساتھ تمہارا "بزنس" ختم ہو جائے تو گھر سے نکل لینا۔ اب تو تم بھی خاصے انگریزی داں ہو گئے ہو۔ تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ انگریزی میں لفظ "بزنس" کا مفہوم بہت وسیع ہے۔"

"تم نے ابھی صرف لفظوں کی وسعتیں دیکھی ہیں' میرے گھونسے کی رسائی نہیں دیکھی۔ اگر زندگی میں کبھی میں نے تمہیں گھونسا رسید کرنے کا ارادہ کر لیا تو کوئی زرہ بکتر بھی تمہیں نہیں بچا سکے گی۔"

"ہونہہ... یہ تو وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "فی الحال تم جلدی سے اس خاتون سے جان چھڑانے کی کوشش کرو اور آ جاؤ۔ میں بھوک سے مری جا رہی ہوں۔"

"ہو سکتا ہے میرا جان چھڑانے کو دل نہ چاہ رہا ہو۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے... تو پھر میں آ کر چھڑا دوں گی جان۔ ہمیشہ کے لئے۔" وہ دھمکی آمیز لہجے میں بولی۔

"تمہیں تو جیلس نہ ہونے کا دعویٰ تھا لیکن تمہارے تو ہر لفظ سے جیلسی کی بُو آ رہی ہے۔"

"یہ جیلسی کی بُو نہیں' انسان دوستی کی خوشبو ہے۔ میں تمہیں اچھے انسانوں کی صحبت میں اٹھتے بیٹھتے دیکھنا چاہتی ہوں۔ اب میں مزید کچھ نہیں سنوں گی۔ آدھے گھنٹے تک آ جاؤ۔ ورنہ..."

"ورنہ کیا؟"

"یہ عملاً بتایا جائے گا۔ خدا حافظ۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے واپس آ کر شمیم کے مقابل بیٹھتے ہوئے کہا "ایک بے تکلف دوست کا فون تھا..." مجھے اچھی طرح یاد تھا' میں نے کوئی ایسا جملہ نہیں بولا تھا جس سے اندازہ ہو سکتا کہ دوسری طرف کوئی لڑکی تھی۔ میں احتیاط کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

شمیم کچھ عجیب... سیانے سے انداز میں مسکرائی اور بولی۔ "اسے کہتے ہیں چور کی داڑھی میں تنکا۔ میں نے تم سے کب پوچھا تھا کہ کس کا فون تھا؟ ویسے بھی انسان کو جھوٹ بولنے کا سلیقہ نہ ہو تو اسے بولنا ہی نہیں چاہئے۔ اگر دوسری طرف کوئی لڑکی تھی تب بھی تمہیں میرے سامنے صفائی پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ میرا تمہارا ابھی کوئی ایسا تعلق کہاں کہ میں اس قسم کی باتوں سے جیلس ہونے لگوں۔"

دعویٰ دونوں ہی عورتوں کو تھا کہ وہ جیلس نہیں تھیں' جیلس ہونے والا ان کا کوئی رشتہ ہی نہیں تھا۔ لیکن رقابت دونوں کے لہجے میں بول رہی تھی۔ مجھے اس بات پر بھی زبردست حیرت محسوس ہوئی تھی کہ جس مرد پر عورت مہربان ہوتی تھی اس کے آس پاس کی دوسری عورت کی پرچھائیں کو بند آنکھوں سے بھی پہچان لیتی تھی۔ دور سے صرف آہٹ سن کر سمجھ جاتی تھی کہ پیش قدمی کرنے والی کوئی عورت ہے۔

"میں نے ابھی مرد یا عورت کا تو کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔" میں نے پینترا بدلا۔ "میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ ایک بے تکلف دوست کا فون تھا۔ ابھی میں نے یہ وضاحت تو نہیں کی تھی کہ وہ مرد تھا یا عورت۔"

"وضاحتوں کو چھوڑو۔" وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر گویا اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے بولی۔ "یہ بتاؤ تم نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ منتظر رہی کہ شاید میں اپنی بات کی وضاحت کروں گا لیکن میں خاموش رہا تو بولی۔ "شاید اب تم کھل کر مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔"

"یہ بات نہیں ہے شمیم...!" میں نے ملائمت سے کہا "وہ... دراصل مجھے ایک جگہ کھانے پر جانا تھا..." میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں اس کے لئے لیٹ ہو رہا ہوں... مجھے تم سے بھی شرمندگی ہو رہی ہے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو ہم دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتے... بہت مزہ آتا... تم اور راجو کسی روز میرے ہاں کھانے پر کیوں نہیں آ جاتے؟ کھانے کے بعد رت جگا کریں گے۔"

"راجو کو درمیان میں گھسیٹنا کیا ضروری ہے؟" وہ منہ بنا کر بولی "وہ ہماری وجہ سے اور ہم اس کی وجہ سے بور ہوتے رہیں گے۔"

وہ راجو کو دودھ کی مکھی کی طرح درمیان سے نکالنے پر تُلی رہتی تھی اور میں راجو کو بیچ میں موجود رکھنے کا خواہشمند تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شمیم کے ساتھ تنہا راتوں میں میری لمبی نشستیں ہوں۔ میں کوئی زاہد و پارسا نہیں تھا۔ شمیم کی تصویر تو ویسے ہی خواہشوں کے شبستان میں لڑکپن سے آویزاں تھی۔ اس کے سلسلے میں تو میں بالکل ہی کوئی دعویٰ نہیں کر سکتا تھا کہ حدود اور فاصلے برقرار رکھنے کے عہد پر قائم رہ سکوں گا یا نہیں۔ خصوصاً جبکہ وہ شعلہ بداماں تھی اور مجھے بھی راکھ کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "البتہ اگر تم نے اسے پینے پلانے کے معاملے میں چھوٹ دے دی تو وہ دھت ہو کر ایک طرف کو لڑھک جائے گا۔ پھر اسے گرد و پیش کی' اپنی بیوی کی' کسی بھی چیز کی کوئی پروا نہیں رہے گی۔ تمہارے ذہن میں راجو کا اپنے

بچپن کے دوست کی حیثیت سے جو تصور ہوگا' مجھے یقین ہے راجو اب وہ نہیں رہا۔ تم خود ہی اپنے اوپر جو بندشیں چاہے عائد کرتے رہو' چاہو تو تمام حدود پھلانگتے رہو' اس کی صحت پر ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ ان سوچوں' ان چکروں سے بے نیاز ہو چکا ہے۔ تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ کیسی عجیب و غریب چیز بن چکا ہے۔ اس کی نفسیات بہت الجھ چکی ہے۔"

"چلو۔۔۔ کوئی بات نہیں۔ ہماری نفسیات تو سلجھی ہوئی ہے نا۔ ہم ہی جہاں تک خیال کر سکتے ہیں کر لیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ غالباً اپنی بدمزگی چھپانے کی حتی الامکان کوشش کر رہی تھی۔ ہموار سے لہجے میں بولی' "ٹھیک ہے۔ اب میں چلتی ہوں۔ تم کھانے پر جاؤ۔ جب جب تقدیر یا خواہش ہمیں ایک دوسرے کے سامنے لاتی رہے گی ہم ملتے رہیں گے۔ شاید کبھی ہمارے راستے بھی مل جائیں۔"

اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں ایک ثانیے کے لئے ہچکچایا۔ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے کبھی ہم اپنی زندگی خراب کئے رکھتے تھے' اب اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھامتے ہوئے بھی خوف آنے لگا تھا۔ خوف درحقیقت اس سے نہیں' اپنے آپ سے تھا۔ انسانوں کے خیالات' خواہشیں اور محسوسات اس کے چہرے' آنکھوں اور لمس سے دوسرے تک پہنچتے ہیں۔ اس کے اندر آتشِ طلب کا جو سمندر موجزن تھا' میرا ہاتھ تھام کر وہ گویا مجھے بھی اس میں کھینچ لیتی تھی۔ آدمی ایک بار منہ زور موجوں کی زد میں آجائے تو اسے ڈوبتے کیا دیر لگتی ہے۔

لیکن اس حد تک بدخلقی کا مظاہرہ بھی میرے بس کی بات نہیں تھی کہ میں اس کا بڑھا ہوا ہاتھ نہ تھامتا۔ وہ تو محض ایک خول تھا جو میں نے اخلاقاً اپنے اوپر چڑھایا ہوا تھا ورنہ پسندیدگی کی شمع تو اب بھی اندر روشن تھی۔ دل کی دھڑکنیں تو اب بھی اس پر نظر ڈالنے سے تیز ہوتی تھیں۔

میں نے اس کا ہاتھ تھاما تو وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے اور شاہانہ سے لہجے میں بولی۔ "افضل' کبھی تم گاؤں کی گلیوں میں میرا انتظار کیا کرتے تھے۔ اب میں زندگی کی راہوں پر تمہارا انتظار کیا کروں گی۔ تمہاری محبتوں کا مجھ پر جو قرض ہے' شاید اس طرح ادا ہو جائے۔ خدا حافظ۔"

پھر وہ چلی گئی۔ میں دم بخود کھڑا رہ گیا۔ پھر میں نے دھم سے صوفے پر گر کر دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ میری زندگی میں پہلے ہی خاصی ہلچل تھی۔ اب یہ عورت مزید تلاطم برپا کرنے چلی آئی تھی۔

چند لمحے بعد میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور راحیلہ کی طرف جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ کچھ دیر بعد میں راحیلہ کی طرف روانہ ہوا تب بھی میرا ذہن شمیم میں ہی پھنسا ہوا تھا۔

میں جب راحیلہ کے ہاں پہنچا تو وہ گیٹ کے سامنے ہی پلڑ روش پر کھڑی تھی اور منتظر سی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی کہ گیٹ کھلا ہی تھا۔ میں گاڑی اندر لے گیا۔ وہ میرے پیچھے پیچھے پورچ میں آئی اور گیٹ بند کرنے کے بعد قریب آ کر بولی۔ "یہ مت سمجھنا میں باہر کھڑی تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں تو ذرا پاس پڑوس کا جائزہ لے رہی تھی۔"

"صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے گاڑی سے اترتے ہوئے کہا" کیونکہ تم جھوٹوں کی ملکہ ہو اور میں اس سلسلے میں تمہارا ایک انتہائی نالائق شاگرد ہوں۔ راشد کہاں ہے؟"

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر ایک لمحے مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔ "بہت فکر ہے تمہیں اس کی؟ تمہاری دوستی اس سے ہے یا مجھ سے؟"

"دوستی وغیرہ تو سب کچھ تم سے ہی ہے۔ لیکن اخلاقیات بھی کوئی چیز ہے۔ کبھی سنا ہے تم نے یہ لفظ؟"

"پہلے تو بہت سنا تھا لیکن جب سے تم سے واقفیت ہوئی ہے' ذہن سے ہی اتر گیا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "بہرحال تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ راشد ایک صاحب کے ہاں گیا ہوا ہے جو ہمارے رشتے دار ہی ہوتے ہیں۔ یہاں ہمارے تین رشتے داروں کے گھر ہیں۔ سب خاصے خوشحال ہیں لیکن جب ہم پر زوال آیا تو انہوں نے کترانا شروع کر دیا تھا۔ شاید ڈرتے تھے کہ ہم کوئی مدد طلب نہ کر لیں۔ کوئی کراچی آتا تھا تو فون بھی نہیں کرتا تھا۔ مجھے تو ان میں سے کسی سے بھی ملنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں رہا۔ لیکن راشد بے چارہ رہ نہیں سکا۔ صبح سے گھر میں پڑا کسما رہا تھا۔ آخر نکل ہی کھڑا ہوا۔ کچھ دیر پہلے اس کا فون آیا تھا کہ شاید وہ کھانے پر نہ پہنچ سکے۔"

"خیر۔۔۔ اس میں بُرا منانے کی کیا بات ہے۔ سب تمہاری طرح سخت دل تو نہیں ہو سکتے نا۔ بعض لوگ دوسروں کے رویئے بھول بھی جاتے ہیں۔ معاف بھی کر دیتے ہیں۔ تم تو اپنی حرکتوں پر خود کو بھی معاف کرنے کی قائل نہیں ہو۔" میں نے کہا۔

اس نے تیکھی نظروں سے مجھے گھورا لیکن کچھ بولی نہیں۔ اس دوران ہم ڈائننگ روم میں پہنچ چکے تھے۔ میز پر برتن سجے ہوئے تھے اور شمعیں روشن تھیں۔ کمرے میں روشنی مدھم تھی۔

"واہ۔۔۔ واہ۔۔۔ کیا کہنے۔" میں نے استہزائیہ لیکن پُرجوش لہجے میں کہا۔ "پورا انگریزوں والا اہتمام ہے کھانے کا۔ مدھم روشنیاں' میز پر شمعیں۔ کہیں کھانے بھی انگریزی تو نہیں ہوں گے؟ آج انگریزی کھانے کھانے کا بالکل موڈ نہیں ہے۔"

"نہیں۔ کھانے بالکل دیسی ہیں۔" اس کا لہجہ قدرے شرمیلا سا ہو گیا۔

ہم میز پر بیٹھ چکے تو وہ بولی۔ "کھانے بنائے میں نے ہیں لیکن میز پر ملازمہ لگائے گی۔ میں اب تھک چکی ہوں۔ کچھ دیر پہلے شاور

بعد میرا دل چاہ رہا تھا' سو جاؤں۔"

اس قسم کی مشقتوں کی عادت نہیں ہے نا۔ ابھی نیا نیا شوق

نیا شوق نہیں ہے جناب والا! اب تو خاصا عرصہ ہو گیا ہے ہوئے۔"

ں کا مطلب ہے رسک لیا جا سکتا ہے کھانے کا۔" میں نے ے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "اسپتال پہنچنے کا خطرہ کم ہو گیا

اگر میری پکائی ہوئی کسی چیز پر کوئی بے ہودہ تبصرہ کیا تو کوئی ار کر سر پھاڑ دوں گی۔" اس نے خبردار کیا۔

"پلیٹ مارنے کی کیا ضرورت ہے۔ اپنی پکائی ہوئی کوئی چپاتی زیادہ مہلک ثابت ہو گی۔" میں نے کہا۔

اس نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا لیکن میں نے اس کے نے کی کوئی پروا نہ کی اور کھانے کے دوران بھی اس کی تیار کی یزوں پر ہمت شکن تبصرے جاری رکھے تاہم دل ہی دل میں تراف کرنا پڑا کہ اسے نہ صرف اچھے کھانے پکانے آگئے ر اس کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے پوری گھرداری کا ز آگیا تھا۔

کھانا بہت پُرلطف رہا۔ میرے لئے تو ظاہر ہے کھانے سے زیادہ ر کا ساتھ اہم تھا۔ نوک جھونک بھی چلتی رہی لیکن کبھی کبھی ت سنجیدہ بھی ہو جاتے۔ اس دوران یہ طے پا گیا کہ راحیلہ ں ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھولے گی۔ ہمارے اپنے پ آف کمپنیز کا پبلسٹی کا ایک بہت بڑا بجٹ تھا جس کا اکاؤنٹ ی ایجنسی کے پاس تھا۔

ئی ایجنسی شروع کرنے کے لئے ہمارا اپنا ہی پبلسٹی کا کام کافی ر ہمیں امید تھی کہ اگر میں نے اور راحیلہ نے ذرا سی بھی ں تو ہم کئی دوسرے بڑے بڑے اکاؤنٹ لانے میں بھی کامیاب ئے گے اور ہماری ایڈورٹائزنگ ایجنسی ایک "ہوم ایجنسی" نے کے بجائے اپنے طور پر بھی ایک بڑی اور نمایاں کمپنی بن گی۔

ے بڑے مسائل ہم نے سرسری طور پر طے کر لئے تھے دائل شروع کا مسئلہ رہ گیا تھا۔ یعنی ایجنسی کے نام کا مسئلہ۔ یجنسی کا نام کیا ہونا چاہئے؟" آخر میں نے اس طرف آتے ا۔

تم مالک ہو۔ اپنے ہی نام پر رکھ لو۔ چوہدری رٹائزنگ۔" راحیلہ سنجیدگی سے بولی۔

بے ہودہ اور بے وقوفانہ بات کی ہے۔" میں نے تیزی سے ا کتیا ہی ڈبو دو گی۔ اگر نام ہی اتنا پینڈوانہ ہو گا تو چل چکی تم سے زیادہ کون جانتا ہو گا کہ ایڈورٹائزنگ بڑا نفیس' نیم اور پڑھے لکھے لوگوں والا کام ہے۔ اس میں چوہدری کو

کہاں سے گھسا دیا تم نے؟ بالکل ایسا معلوم ہو گا کہ کسی میٹرک پاس دیہاتی نے شہروں کی دیکھا دیکھی گاؤں کی کسی بیٹھک میں ایجنسی کھول لی ہے اور ٹینڈے توریاں بیچنے والے چھوٹے آڑھتیوں کے اشتہار تیار کرنے کا پروگرام بنایا ہے۔"

"آخر تمہارے گروپ آف کمپنیز میں بھی تو "چوہدری" لگا ہوا ہے۔ اس گروپ کی تو ساری کمپنیاں راکٹ کی رفتار سے اوپر جا رہی ہیں۔" راحیلہ منہ بنا کر بولی۔

"کاروبار میں اس قسم کے نام چل جاتے ہیں' بلکہ کچھ جاگیرداری والا رعب بھی پڑ جاتا ہے۔ ایڈورٹائزنگ بھی ہے تو کاروبار ہی لیکن ذرا مختلف قسم کا۔ اس میں امپریشن کچھ مختلف ہونا چاہئے۔ ویسے تو خیر جب کوئی چیز چل جاتی ہے تو پھر اس کا نام خواہ کچھ بھی ہو' کانوں کو بھلا لگنے لگتا ہے۔ لیکن فی الحال چوہدری کا ووٹ "چوہدری" کے خلاف ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا" اور ابھی تک تمہارے زنگ آلود دماغ میں یہ بات بھی نہیں آئی کہ تم ایجنسی میں پارٹنر ہو۔ میں اکیلا اس کا مالک نہیں۔ ایگریمنٹ میں ایک شق یہ بھی ہو گی کہ اگر کچھ عرصے بعد تم بطور پارٹنر اس قابل ہو جاتی ہو کہ دوسرے پارٹنر کا ابتدائی سرمایہ واپس کر سکو تو سول پروپرائٹر یعنی بلا شرکتِ غیرے مالک بھی بن سکتی ہو۔ الگ ہو سکتی ہو۔"

وہ ایک لمحے خاموشی سے مجھے گھورتی رہی پھر بولی۔ "کاش میں اس وقت جگ اٹھا کر تمہاری اس بڑی سی کھوپڑی پر مار سکتی۔ تمہارا خیال ہے کہ میں تم سے الگ ہونے کے لئے کراچی چھوڑ کر آئی ہوں؟"

"یہ میں تمہیں صرف آزادی کا احساس دلانے کے لئے بتا رہا ہوں۔ تاکہ زندگی کے کسی بھی موڑ پر تم اپنے آپ کو پابند محسوس نہ کرو۔" میں نے کہا۔

"بہت گزار چکی ہوں میں آزادی کی زندگی۔" وہ بیزاری سے ہاتھ ہلا کر بولی۔ "کچھ نہیں دیا مجھے آزادی نے۔ اب میں تھوڑی سی پابندیاں اپنے اوپر عائد رکھنا چاہتی ہوں۔ فائدہ مند پابندیاں۔ زندگی کچھ زیادہ ہی بے ثمر ہو گئی ہے۔ میں اب کچھ حرکت میں آنا چاہتی ہوں۔ اپنی نظر میں اپنے آپ کو کچھ اہم' کچھ مفید ثابت کرنا چاہتی ہوں۔"

"شکر ہے یہ بات یہاں آ کر تمہاری سمجھ میں آگئی۔ کراچی میں تو تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہاں بھی میں تمہیں یہی تو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"سمجھ میں تو آ رہی تھی' بس میں اپنے بندھے ٹکے معمولات کے کنویں سے نکلنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اب کنویں سے نکل کر سمندر میں چھلانگ لگا ہی دی ہے تو پھر واقعی کچھ کر گزرنا چاہئے۔" اس کے لہجے میں بلند حوصلوں کی کھنک تھی۔

"ایڈورٹائزنگ ایجنسی کے لئے کوئی دوسرا نام ہے تمہارے

ذہن میں؟" میں نے پوچھا۔

"الٹی میٹ ULTIMATE کیسا نام ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر ڈائننگ ٹیبل پر ہلکا سا ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ میں اس نام کو اوکے کرتا ہوں۔ ایک ہفتے کے بعد تم اس پروجیکٹ پر کام شروع کردو۔"

"ایک ہفتے کے بعد....؟ وہ کراہ کر بولی۔ "ایک ہفتہ کیسے گزرے گا؟"

"میں بتاتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اس دوران ملازمہ کافی لے آئی۔ ہم کافی کے مگ لے کر ڈرائنگ روم میں قالین پر پڑے ہوئے دبیز کشنوں پر آبیٹھے۔ چند لمحے خاموشی سے چسکیاں لینے کے بعد وہ بولی۔ "تم مجھے کام بتا رہے تھے۔"

"اب سوچ رہا ہوں کہ نہ بتاؤں۔" میں نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کام کچھ خطرناک بھی ہے... غیر شریفانہ سا بھی ہے... تم پسند نہیں کرو گی۔"

"خطرناک کی حد تک ٹھیک ہے۔" اس کی آنکھوں میں وہی پرانی ایڈونچر پسند لڑکی جاگتی دکھائی دی جس نے پہلی ملاقات میں ہی مجھے اپنا اسیر بنا لیا تھا۔ "لیکن یہ غیر شریفانہ سے تمہاری کیا مراد ہے؟"

"غیر شریفانہ صرف اس مفہوم میں ہے کہ تمہیں تھوڑا سا جھوٹ بولنا پڑے گا۔ کسی اور کا روپ دھارنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

"کس لئے؟" اس نے جاننا چاہا۔

"وہ... دراصل تم نے کہا تھا نا کہ اگر میں تمہاری پشت پناہی کے لئے موجود رہوں اور معاملہ کسی ذلیل' بدمعاش اور "دھرتی پر بوجھ" قسم کی شخصیت کا ہو تو تم اسے قتل بھی کرسکتی ہو۔ بس... تمہاری یہ بات سن کر ذہن میں ایک خیال آیا تھا...." میں نے تذبذب کے سے عالم میں کہا۔ "لیکن اب میں سوچ رہا ہوں کہ شاید تم نے مذاق میں یہ بات کی ہو... یا پھر یہ محض بات برائے بات رہی ہو۔"

"یہ فیصلے تم مجھ پر چھوڑ دو۔ تم صرف بات کرو۔ جو کہنا چاہتے ہو وہ کہو۔" وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "شاید تمہیں اندازہ نہ ہو کہ میں تمہارے لئے کیا کر گزر سکتی ہوں۔"

"ایک شخص ہے ...." میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "منشیات کا اسمگلر ہے۔ خطرناک آدمی ہے۔ کئی انسان اس کے حکم سے قتل کئے جاچکے ہیں اور کئی کو اس نے اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ بظاہر ایک مذہبی اور شریف آدمی کا لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔ اس کی صورت دیکھ کر کوئی اس کے کرتوت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا۔"

"ایسے تو بہت سے لوگ ہیں ہمارے ہاں۔" راحیلہ بولی۔ "ہم تو ان سے نہیں نمٹ سکتے۔ ڈرگز کا دھندا تو بہت خطرناک صورت

.... اختیار کر رہا ہے۔ ڈرگ مافیا تو کئی ملکوں میں حکومتیں الٹ رہی ہے اور حکومتیں اپنے تمامتر وسائل' اپنی قوت او جاہ و جلال کے ساتھ بھی ان سے نہیں نمٹ پا رہیں۔ ہ بچارے اس ضمن میں کیا کرسکتے ہیں؟"

"پہلے میری بات تو سن لو۔" میں نے صوفے پر بازو ہوئے کہا۔ "میں تمہیں ڈرگ مافیا کے خلاف جہاد شروع کر لئے نہیں کہہ رہا تھا۔ یہ تو موضوع ہی الگ ہے۔ کئی ملکوں تو حکومت ہی ڈرگ مافیا کی ہے۔ میں اس لمبے چکر میں نہ اس پر تو محض بات کرنے کے لئے بھی بڑا وقت چاہئے صرف اس مسئلے کی بات کر رہا ہوں جس کا تعلق میری ذا ہے.... اور مستقبل میں تمہاری ذات سے بھی ہوسکتا ہے۔"

"اوہ....!" اس نے گویا سکون کی سانس لی۔ "پھر ٹھیک آگے بات کرو۔"

"اس قبیل کے لوگ جب کسی سے ناراض ہوتے معمولی بات کو انا کا مسئلہ بنا لیتے ہیں۔" میں نے سلسلۂ کلام ہوئے کہا "یہ شخص بھی ایک چھوٹی سی بات پر مجھ سے ہوگیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اسے یا اس کے کچھ حواریوں کو لائن سے نکل آنا پسند نہ آیا ہو۔ برسوں پہلے جب میرا ا سے تھوڑا بہت تعلق تھا تب بھی میں نے ڈرگز کے دھند قریب پھٹکنے کی بھی کوشش نہیں کی حالانکہ کئی لوگوں نے

بنے کی بھی کوشش کی اور میری مزاحمت پر ناراض بھی اس میں پیسہ بھی زیادہ تھا۔ اس کے باوجود میرا کچھ دل شاید میں بنیادی طور پر اس لائن کا آدمی نہیں تھا۔"

مجھے تو اب بھی یقین نہیں آتا کہ ماضی میں تمہارا کبھی اس تعلق رہا ہے۔ تم اس لائن کے آدمی تو لگتے ہی نہیں۔" بے یقینی سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

اس چکر میں مت پڑنا کہ اس لائن کے لوگ صورت سے جاتے ہوں گے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ان کے سر پر نہیں ہوتے۔ وہ دوسرے معززین سے زیادہ معزز دکھائی ہے صرف فلموں میں ایسا ہوتا ہے کہ اسمگلر اور ڈرگ مافیا شکل سے پہچانے جاتے ہیں۔"

وہ تو مجھے معلوم ہے۔" راحیلہ بولی۔ "میں تو اس نامعلوم بات کر رہی تھی جو ہمیں انسانوں کے بارے میں خبردار کرتی لے پہل جب تم ہمارے ہاں آئے تھے اس وقت تو میری حس تمہارے بارے میں سگنل دئے تھے۔ لیکن اب تو تم مجھے ف شفاف پہاڑی چشمے کی طرح لگتے ہو جس میں جھانک کر بڑی آسانی سے دیکھ سکتی ہوں۔"

ماری حسیات بھی میری حسیات کی طرح قابلِ بھروسا ہیں۔" کہا۔ "بالکل ٹھیک ٹھیک رہنمائی کرتی ہیں تمہاری۔"

ہاں... تو تم اس شخص کی بات کر رہے تھے۔ نام کیا ہے اس ہلک راحیلہ نے پوچھا۔

ں نے ایک لمحے سوچا پھر اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دینے کرتے ہوئے کہا "اس کا نام عالم شیر ہے۔ میری گمراہی کے اسے میری ذات سے بہت فائدے تھے۔ امدادِ باہمی کے باہم نے ایک دوسرے کے بڑے بڑے مسئلے حل کئے۔ رفتہ رفتہ وہ لائن چھوڑ دی تو اس طرح کے لوگوں سے میں لا ہوگیا۔ ایک تو اس طرح کے لوگوں کے لئے یہی بڑی تکلیف تھی کہ ان کے قبیلے کا کوئی شخص اتنی آسانی سے ان کا گھیرا نکل گیا۔ پھر قدرت کی کچھ ایسی مہربانی رہی کہ میں جائز ملات میں بھی ان سے کہیں زیادہ ترقی کر گیا۔ لاشعوری طور پر اسی ازیت میں مبتلا کیا۔ اوپر سے کوئی چھوٹی موٹی بات ہوگئی۔ عالم شیر صاحب میرے خون کے پیاسے ہوگئے۔"

میں نے راحیلہ کو وہ سب کچھ تفصیل سے بتا دیا جو عالم شیر میرے ساتھ کرچکا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ ان میں مزید پھیلنے کی گنجائش نہ رہی۔

خاموش ہوا تو وہ بے یقینی سے بولی۔ "یعنی... اب بھی تم خطرناک واقعات سے دوچار ہوتے ہو؟ اس طرح بازار گرم رہتا ہے .... اور اس کے باوجود تمہارے اتنی طاقت باقی ہے کہ اس طرح سکون سے بیٹھ کر کسی باتیں کرسکو؟"

"یہ تو صرف ٹریلر ہے۔" میں نے کہا۔ "ان معاملات کو تو میں اتنا زیادہ خطرناک نہیں سمجھتا۔ اصل خطرناک معاملات تو دوسرے ہیں۔ ان کے بارے میں' میں تمہیں پھر کبھی بتاؤں گا۔"

"اُف خدایا! کیا ان سے زیادہ خطرناک حالات سے بھی واسطہ پڑ رہا ہے تمہیں؟" اس نے آنکھیں مزید پھیلانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں کامیابی نہ ہوئی۔ ابھی میں نے اسے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں مرحلہ وار اسے تمام حالات سے آگاہ کرکے اپنے خاص الخاص ساتھیوں میں شامل کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس حلقے میں شامل ہونے کی پوری پوری صلاحیت رکھتی تھی جس میں ٹونی' شفیع شاہ' حنیف' سردار وغیرہ شامل تھے۔ صرف اسے ہمارے معاملات سے مانوس ہونے کے لئے کچھ وقت درکار تھا۔

میں نے اس کا مرمریں ہاتھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "اسی لئے تو میں نے تمہیں خبردار کیا تھا کہ لاہور آؤ گی تو سر پہ کفن باندھ کے آنا۔ میں اپنے جاں نثار ساتھیوں میں اضافے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا جو بہت باصلاحیت بھی ہوں اور جن پر میں اسی طرح آنکھ بند کرکے اعتماد کرسکوں جس طرح اپنے آپ پر کرتا ہوں۔"

"میں تو سمجھتی تھی کہ تم اب صرف بزنس کر رہے ہوگے۔ تبھی تو میں خفا ہوتی تھی کہ کیا بزنس اتنا اہم ہوگیا جو تمہیں فون پر مجھ سے بات کرنے کی بھی فرصت نہیں ملتی۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم ان چکروں میں پڑے ہوگے۔"

"ان چکروں میں' میں خود نہیں پڑا۔ مجھے الجھا دیا گیا ہے۔" میں نے کہا "میں تو خود بھی ایک سیدھی سادی' امن پسندانہ زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ کاروبار کی اپنی الجھنیں' اپنے ہی مسائل کیا کم ہوتے ہیں جو میں ان چکروں میں الجھتا پھروں۔ لیکن کیا کروں... چکر خود ہی مجھے ڈھونڈتے ہوئے آجاتے ہیں۔"

اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تشویش دیکھ کر میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا "لیکن تمہارے سامنے دونوں راستے موجود ہیں۔ چاہو تو اپنے آپ کو صرف بزنس تک محدود رکھو۔ زندگی اور موت کے مسائل میں میرا ساتھ مت دو۔"

"یہی تو مسئلہ ہے....!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "جزوی رفاقت اپنے مسلک میں نہیں ہے۔ اب تمہارے ساتھ چل پڑے ہیں تو ہر معاملے میں ہی ساتھ رہیں گے۔ باقی رہا زندگی اور موت کا مسئلہ... تو وہ نہ تمہارے اختیار میں ہے نہ میرے اختیار میں۔ یہ جس کا معاملہ ہے وہی جانے۔ ہمیں اس فکر میں دُبلے ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"یہ تم نے میرے دل کی بات کردی ہے۔" میں نے کہا۔

"میری ہر بات تمہارے ہی دل کی بات ہوگی۔" وہ دھیرے سے ہنس کر بولی۔

"سوائے ایک بات کے۔" میں نے فوراً کہا۔

"بکواس مت کرو۔" اس نے فوراً ڈانٹ پلادی۔ "وہ تم عالم شیر کے بارے میں بتا رہے تھے۔" شادی کے موضوع پر تو وہ مجھے آنے ہی نہیں دیتی تھی۔ ایسی ضدی لڑکی میں نے زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔

"عالم شیر اب مجھے قتل کرانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگادے گا۔ میں اب بہت جلد اس کی طرف سے کسی خوفناک کارروائی کی توقع کر رہا ہوں جس میں وہ اپنے تمام وسائل جھونک دے گا۔"

"اور تم آرام سے بیٹھے اس وقت کا انتظار کر رہے ہو؟" اس نے ڈانٹنے کے سے انداز میں پوچھا۔ "کوئی حفاظتی انتظامات وغیرہ نہیں کئے تم نے؟"

"ابھی ایک لمحے پہلے ہی تو تم نے کہا ہے کہ زندگی اور موت جس کا معاملہ ہے وہی جانے، ہمیں اس فکر میں دُبلے ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ انسان برستی ہوئی گولیوں کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو جائے۔ احتیاط بہرحال فرض ہے۔" وہ بولی۔

"احتیاط تو میں کر رہا ہوں۔" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "احتیاط اور حفاظتی انتظامات کے میرے اپنے انداز ہیں۔ وہ تمہاری سمجھ میں ذرا دیر سے آئیں گے۔ عالم شیر جیسے آدمی کو قتل کرانا بھی میرے لئے کوئی ایسا مشکل کام نہیں ہے لیکن میں زیادہ شور شرابے کے ساتھ نہیں کرنا چاہتا۔ کسی بڑے آدمی کو بھی شرابے سے قتل کرانا میری پالیسی نہیں ہے۔ ایک تو میں کسی قتل کی طرف لوگوں کی غیر ضروری توجہ مبذول نہیں کرانا چاہتا۔ زیادہ شور پڑتا ہے تو خواہ مخواہ کبھی کوئی سراغ سامنے آجاتا ہے۔ پولس وغیرہ زیادہ پریشر میں آکر بہت زیادہ بھاگ دوڑ شروع کر دیتی ہے۔ خواہ مخواہ پچاسوں بے گناہوں کی شامت آتی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کہیں ان کی بددعائیں بھی میرے کھاتے میں نہ چلی جائیں۔"

"بہت ڈرتے ہو بددعاؤں سے؟" وہ دھیرے سے ہنسی۔

"صرف بے گناہوں کی بددعاؤں سے ڈرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا "چنانچہ میری کوشش ہوتی ہے کہ اگر کسی کا قتل ناگزیر بھی ہو جائے تو اس کے قتل کو کوئی دوسرا رنگ دے دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تب بھی اسے حتی الامکان خاموشی سکون اور "امن پسندی" سے قتل کیا جائے تاکہ معاملہ صرف اسی تک محدود رہے۔ کوئی بے گناہ لپیٹ میں نہ آئے۔ زیادہ شور نہ ہو، زیادہ لوگوں کی توجہ مبذول نہ ہو۔"

"بہت معقول اور عقلمندانہ پالیسی ہے۔" راحیلہ نے ستائش سے سر ہلایا۔ "تو پھر عالم شیر کا پتا کب صاف کر رہے ہو؟"

"یہی تو مسئلہ آن پڑا ہے کہ اس کا پتا صاف کرانے میں

صاف کرانے جتنا شور شرابا ہوگا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "اس نے مجھ سے پنگا تو لے لیا ہے اور مجھے مروانے پر بھی ادھار کھائے بیٹھا ہے لیکن میری اطلاع کے مطابق وہ اندر سے لرزدہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ قلعہ بند ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ ہر وقت مسلح محافظوں کے گھیرے میں رہتا ہے۔ تمام معمولات بدل لئے ہیں۔ کچھ پتا نہیں ہوتا کس وقت کہاں پایا جائے گا۔ اس کے دو تین بنگلے وغیرہ بھی ہیں اور کاروبار کے لئے ایک نام نہاد سا دفتر بھی بنا رکھا ہے۔ شہر میں کئی کمرشیل بلڈنگیں ہیں اس کی۔ لیکن ان میں کسی جگہ بھی نہیں جاتا۔ زیادہ تر اپنے گارڈز کی فوج ظفر موج کے ساتھ گھر میں ہی مقید رہتا ہے۔ اونچی اونچی دیواروں والی خاصی بڑی قلعہ نما کوٹھی ہے اس کی۔"

"بڑے ٹھاٹ ہیں اسمگلروں کے۔" راحیلہ نے گردن کو خفیف سا جھٹکا دیا۔

"ہاں۔ ٹھاٹ باٹ کی اس دوڑ نے ہی تو اس ملک میں افراتفری برپا کردی ہے۔ جائز اور ناجائز کی تفریق ختم کردی ہے۔ دولت کے پہاڑ جمع کرنے کے لئے ہر کسی کو شارٹ کٹ کی تلاش ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور یہ عالم شیر تو ابھی کوئی بڑی مچھلی بھی نہیں ہے۔ اگر تم بڑی مچھلیوں اور مگرمچھوں کے ظاہری اور خفیہ ٹھاٹ باٹ کے بارے میں جان لو تو تمہاری آنکھیں اس سے بھی زیادہ پھیل جائیں اور نہ جانے کتنے دن تک پھیلی رہیں گی۔ ہمارے ہاں تو ابھی یہ تقریباً آغاز ہی ہے۔ آگے یہ معاملہ نہ جانے کہاں تک جائے گا۔"

"خدا ہمیں اس وقت سے بچائے۔" راحیلہ جھرجھری سی لے کر بولی۔

"عالم شیر فون پر بھی کسی سے بات نہیں کرتا۔ صرف ایک خاص فون نمبر ہے جس پر فون کیا جائے تو کچھ لوگ فون کرنے والے کے بارے میں خوب پوچھ گچھ کرتے ہیں اور اس کا فون نمبر لے لیتے ہیں۔ اس کے بعد اگر عالم شیر ضروری سمجھتا ہے تو دس پندرہ منٹ بعد خود فون کرتا ہے۔ ان حالات میں اسے مروانا خاصے ہنگامے کا باعث بنے گا۔ ایک طرح سے چڑھائی ہی کرنی پڑے گی۔ ہمارے آدمیوں کی جان کو بھی خطرہ ہوگا۔ اس کے بھی نہ جانے کتنے گارڈز مارے جائیں۔ نہایت غیر ضروری خونریزی ہوگی۔ میں اس سے بچنے کی تدبیر کرنا چاہ رہا تھا۔ اگر تم ساتھ دو تو نہایت خاموشی سے اس کا پتا صاف ہو سکتا ہے۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں کسی بہانے اس کے گھر میں چلی جاؤں اور اسے شوٹ کرکے آجاؤں؟" اس نے پوچھا۔

مجھے ہنسی آگئی۔ "اب یہ اتنا آسان کام بھی نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم لاش کی صورت میں اس مکان سے باہر آؤ۔ میں ان نازک ہاتھوں کو شوٹنگ وغیرہ جیسے بے ہودہ کاموں کی زحمت دینے کا بھی حق میں نہیں۔"

وہ اپنے ہاتھ میرے ہاتھ سے چھڑا کر پھیلاتے ہوئے اور انہیں ان کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "ان ہاتھوں کی نزاکت محض ایک دھوکا ہے۔ ان کی سفاکی اور سختی تم دیکھ چکے ہو۔"

"وہ بہت پرانی بات ہے۔ قصۂ پارینہ ہے۔" میں نے اسے چڑانے کے لئے سنجیدگی سے کہا۔

"اب یہ ہاتھ زیادہ تکلیفیں جھیل چکے ہیں۔ اب ان کی خوفناکی بڑھ چکی ہے۔" وہ ہاتھوں کو آہنی پنجوں کی طرح اکڑاتے ہوئے بولی۔ "ایک زمانہ تو ایسا تھا کہ بظاہر نرم و نازک نظر آنے والے میرے اس وجود میں ہزاروں طوفان سمٹ آئے تھے۔ میری رگ رگ میں نفرت کا زہر بھر گیا تھا۔ دل چاہتا تھا دنیا کی ہر چیز کو توڑ پھوڑ دوں۔ ہر طرف آگ لگادوں۔ سب کچھ تباہ کردوں اور نہ جانے کس کس کو قتل کردوں۔ شکر ہے میں نے اپنی اس کیفیت پر قابو پالیا ورنہ معلوم نہیں کیا بن جاتی۔"

"ہاں... کبھی کبھی انسان اس کیفیت سے آغاز کرتا ہے تو آگے چل کر ہٹلر کہلاتا ہے۔ دنیا کو ایسے لوگوں کی وجہ سے بڑی تباہیوں کا منہ دیکھنا پڑتا ہے۔ شکر ہے دنیا ایک خاتون ہٹلر کے انتقام کی تباہ کاریوں سے بچ گئی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مذاق مت اڑاؤ میرا۔" وہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں بہت خوفناک عورت ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "اسی لئے تو میں نے تمہیں یہاں بلایا ہے۔ میں تمہارے اندر مقید طاقتوں کو کسی مثبت اور تعمیری مقصد کے لئے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم صرف دفتر کی میز تک محدود رہ کر ضائع ہو جاؤ۔"

"تم چاہتے ہو کہ میں کسی منحوس بدمعاش کی گن سے نکلی ہوئی گولیاں کھا کر اس دنیا سے کوچ کروں؟" اس نے مجھے گھورا۔

"انسان برائی سے لڑتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہو جائے تو کوئی حرج نہیں۔ یہ ایک اچھی موت ہے۔" میں نے کہا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ٹھیک ہے۔ تمہارا ہاتھ تھام لیا ہے۔ اب جہاں جی چاہے لے جا کر مروا دینا۔ بس مزار ذرا اچھا سا بنوا دینا۔"

"اتنی آسانی سے نہیں مرنے دیں گے تمہیں۔" میں نے کہا۔

"عالم شیر کے بارے میں کوئی پلان ہے تمہارے ذہن میں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ دو چار دن بعد اس پر عمل کریں گے۔ اس وقت تک میں ذرا اس کی "باریک" جزئیات پر بھی غور کرلوں گا۔ مجھے ایک خبر کا بھی انتظار ہے۔ وہ سن لوں تو گویا اس مشن کا حصۂ اول مکمل ہو جائے گا۔ پھر اسے بھی نمٹا ڈالیں گے۔ عالم شیر اب میری برداشت سے باہر ہو گیا ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" راحیلہ بے پروائی سے بولی "میرے ذمے تم جو

کام لگاؤ گے وہ میں کروں گی۔ اور کچھ نہیں تو کم از کم ایڈونچر تو رہے گا۔ میں ایک ڈل زندگی گزارتے گزارتے بور ہو چکی ہوں۔"

مجھے خوشی تھی کہ اس نے ذہنی طور پر میرے ساتھ چلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اب باقی سب کچھ سمجھنے میں اسے زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ اصل مشکل مرحلہ مجھ پر بھروسا کرنے اور ذہنی طور پر میری ساتھی بننے کا ہی تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے پوچھا "تمہارے ذہن میں خاکہ کیا ہے؟"

"عالم شیر کی کئی خفیہ کہانیاں میرے علم میں ہیں۔ میرا ان میں سے ایک سے فائدہ اٹھانے کا پروگرام ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اس کی دو بیویاں ہیں اور وقتاً فوقتاً داشتائیں بھی زندگی میں آتی جاتی رہی ہیں۔ اس کے باوجود وہ ایک لڑکی پر دل و جان سے عاشق ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ اس نے آج تک اس لڑکی کی صورت نہیں دیکھی۔ صرف فون پر اس کی آواز سنتا رہا ہے۔ اس کا نام ڈولی تھا۔ اس کا تعلق منشیات کے اسمگلرز کے ایک بین الاقوامی گروہ سے تھا۔"

راحیلہ توجہ سے سُن رہی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "کچھ عرصے سے وہ لڑکی اسمگلنگ کے ریکٹ سے بالکل غائب ہو گئی۔ حاجی عالم شیر کو معلوم نہیں کہ وہ اس وقت ترکی کی ایک جیل میں ہے۔ انٹرنیشنل گینگ نے یہ خبر عالم شیر تک پہنچنے ہی نہیں دی کیونکہ اس میں ان کا کچھ نقصان تھا۔ وہ لڑکی ترکی کی جیل میں بے یارومددگار پڑی ہوئی ہے اور غالباً وہیں مرجائے گی۔ بہت لمبی سزا ہوئی ہے اسے۔ کبھی اس کی حیثیت ایک ملکہ کی سی تھی۔ اب وہ ایک پٹا ہوا مہرہ ہے۔"

"تم مجھے ڈولی کی حیثیت سے سامنے لانا چاہتے ہو؟" راحیلہ میرا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

"ہاں۔ سامنے تو تمہیں بالکل آخری لمحوں میں آنا پڑے گا۔ اس کے ساتھ ہی کھیل ختم ہو جائے گا۔" میں نے کہا "تمہارے نام کے ساتھ عالم شیر کے لئے کوئی بڑا لالچ بھی وابستہ کرنا پڑے گا تاکہ اگر صرف تمہارے نام کی کشش ناکافی ثابت ہو تو وہ "بڑا سا لالچ" اسے کھینچ لائے۔ اصل مسئلہ اسے اس کے قلعے سے نکالنا ہے۔ اسے محافظوں کے حصار سے باہر لانا ہے۔ دو تین گارڈ ساتھ ہوں تو کوئی بات نہیں۔ بڑے شکار کے ساتھ بعض اوقات ایک آدھ چھوٹا موٹا جانور بھی مارا جاتا ہے۔"

وہ گہری نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ "بہت سفاک ہو گئے ہو!"

"سفاکوں کے ساتھ میں سفاک ہوں۔ اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اگر میں ایسا نہ ہوتا تو یہ شارک مچھلیاں مجھے کھا چکی ہوتیں۔ اس دنیا کے سمندر میں میری اِکا دُکا ہڈیاں تمہیں کہیں اِدھر اُدھر تیرتی ہوئی ملتیں۔" پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "عالم شیر کے معاملے میں اصل مسئلہ یہ ہوگا کہ ڈرامے کی پیشکش بہت عمدہ ہونی چاہئے۔ یعنی ڈرامے پر ڈرامے کا شبہ نہیں ہونا چاہئے۔ اسے گمان تک نہیں گزرنا چاہیے کہ اس کے لئے جال پھیلایا جا رہا ہے یا اسے چارا ڈالا جا رہا ہے۔"

"اندازہ تو میرا یہی ہے کہ ڈرامے کے ڈائریکٹر تم ہوگے تو ڈراما ٹھیک ہی ہوگا۔" راحیلہ بولی۔ "تمہیں امید ہے کہ میں ڈولی کے کردار میں فٹ رہوں گی؟"

"تمہارا کردار زیادہ دیر تو صوتی ہی رہے گا۔ آخر میں بہت مختصری ملاقات ہوگی تمہاری عالم شیر سے۔" میں نے جواب دیا۔

"ڈولی کس قوم کی لڑکی تھی؟ کس ملک کی رہنے والی تھی؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"یہ تو خود عالم شیر کو بھی معلوم نہیں۔ بس وہ امریکی لہجے میں انگریزی بولتی تھی جو تمہارے بائیں ہاتھ کا کام ہے...."

"معاف کرنا، بائیں ہاتھ سے انگریزی نہیں بولی جا سکتی۔" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔

"یہ میں نے محاورہ بولا ہے۔" میں نے اسے گھورا۔

"اوہ... آئی ایم سوری۔" اس نے شکل پر مسکینی طاری کرلی۔

"نہایت معمولی سے میک اپ کی مدد لے کر تم تو امریکی لڑکی کے طور پر بھی پاس ہو سکتی ہو۔ لیکن اس کی ضرورت نہیں لیکن تمہارا لہجہ ہرگز پاکستانی نہیں ہونا چاہئے۔"

"عالم شیر کس قسم کا آدمی ہے؟ میرا مطلب ہے ظاہری شخصیت کیسی ہے؟" اچانک راحیلہ نے تجسس سے پوچھا۔

"بہت ہینڈسم ہے۔ بالکل رابرٹ ریڈ فورڈ معلوم ہوتا ہے۔ دیکھتے ہی عاشق ہو جاؤ گی اور اس کے مارے جانے کا تمہیں یقیناً زندگی بھر غم رہے گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ذرا سا پوچھ لینے سے اتنے جیلس کیوں ہو رہے ہو؟ ٹھیک ٹھیک بتا دو نا۔" اس نے دانت بھینچ کر مجھے گھورا۔

"ٹھیک ٹھیک کیا بتاؤں....." میں نے الجھن زدہ لہجے میں کہا "ایک آدھ دن میں، میں تمہیں اس کی تصویر بھی مہیا کر دوں گا۔ تین چار سال پرانی ہوگی لیکن کچھ زیادہ تبدیلیاں نہیں آئیں اس میں۔ لمبا چوڑا، بھاری تن و توش کا آدمی ہے۔ خاصی توند بھی ہے۔ رنگت سرخ و سپید ہے۔ بڑی سی، گھنی داڑھی ہے۔ ناک پکوڑا سی ہے۔ آنکھیں موٹی موٹی اور خوبصورت ہیں۔ آنکھیں شرابیوں کی طرح بھاری ہیں حالانکہ شراب نہیں پیتا البتہ کسی زمانے میں کروڑوں گیلن شراب اسمگل کر چکا ہے۔ چھوٹی موٹی برائیوں اور چھوٹے موٹے گناہوں کا قائل نہیں۔ جو کچھ بھی کرتا ہے بڑے پیمانے پر کرتا ہے۔ شراب نہیں پیتا لیکن خون نہ جانے کتنے انسانوں کا پی چکا ہے۔"

"یہ پھر محاورہ بولا ہے نا تم نے؟" راحیلہ نے سادگی سے پوچھا۔ "تمہاری مراد یہ ہے کہ بہت سے انسانوں کا خون بہا چکا ہے؟"

"ہاں۔ میرا مطلب یہی ہے۔ تصحیح کا شکریہ۔" میں نے کہا "اگر عالم شیر ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص کے بجائے خاکی پینٹ شرٹ اور فوجی جیکٹ پہننا شروع کردے تو دوسرا فیڈرل کاسترو معلوم ہوگا۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے ذہن میں اس کی تصویر بن گئی ہے۔" راحیلہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"کہیں یہ تصویر ہمیشہ کے لئے نقش نہ ہو جائے۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

"اتنا گھٹیا ذوق نہیں ہے میرا۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "تمہیں بھی مجبوری میں پسند کر لیا تھا۔ مارکیٹ میں تم سے بہتر پروڈکٹ دستیاب نہیں تھی۔"

کچھ دیر ہم ایک دوسرے پر جملے کستے رہے۔ اس دوران راشد بھی آگیا۔ باتوں کا رخ ذرا بدل گیا۔ اسے بھی یہی بے تابی تھی کہ اسے جلد از جلد کسی کام پر لگایا جائے۔

"کام میرے ہاں اتنے زیادہ ہیں کہ انتخاب مشکل ہو گیا ہے کہ تمہیں کس کام پر لگایا جائے۔" میں نے کہا "بہت سے کاموں کے لئے صرف تم موزوں نظر آتے ہو۔ فی الحال تم صرف اتنا کرو کہ کینال بینک کے قریب ہماری ایک ہاؤسنگ اسکیم چل رہی ہے، اس کا چارج سنبھال لو۔ سب کچھ تمہیں اپنی نگرانی میں کرانا ہوگا۔ یہ پروجیکٹ مکمل ہونے کے بعد میں تمہارے لئے کسی اور کام کے بارے میں سوچوں گا جو میرے نزدیک زیادہ اہم اور ضروری ہوگا۔ ٹھیک ہے؟"

"جیسے آپ کی مرضی انّی بھائی!" اس نے کندھے اچکائے۔ "میں تو صرف کام سے مطلب ہے۔ کام باعزت ہونا چاہئے اور دال ٹھیک ٹھاک ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ ہمیں بھلا کیا چاہئے۔"

راحیلہ نے اسے ڈانٹا۔ "زیادہ فری ہونے کی کوشش نہ کرو۔ یہ بھائی وغیرہ جیسے القاب بھول جاؤ۔ "سر" کہا کرو۔"

"وہ تو میں کہتا ہی ہوں۔" راشد سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "بلکہ باجی اس سلسلے میں آپ کو نصیحتیں کیا کرتا ہوں لیکن اس وقت ذرا رنگ میں بیٹھے ہوئے ہیں..... بڑا اپنائیت بھرا ماحول ہے..... پیٹ بھر کر کھانا کھلانے کا سرور ہے۔ بس ان باتوں کی وجہ سے زبان ذرا پھسل گئی۔" پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکینی سے بولا۔ "سوری سر!"

"یہ موصوفہ جو تمہیں نصیحت فرما رہی ہیں، خود چند لمحے پہلے فری ہو رہی تھیں کہ میری کھوپڑی توڑنے کی بات کر رہی تھیں۔" میں نے ارشد کو بتایا۔ "وہ تو شکر ہے اپنی کچھ دہشت بیٹھی ہوئی ہے ورنہ یہ خاتون مابدولت کو بھی ضرور جوڈو کراٹے کے ہاتھ دکھانے کی کوشش کرتیں۔"

"اس قسم کی کوشش تو باجی کو اسی دن کرنی چاہئے جس دن ان کا خودکشی کا ارادہ ہو۔" راشد نے کن انکھیوں سے راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"باس کو مکھن لگانے کے لئے تم بھی اسی طرف ہو گئے غدار کہیں کے!" راحیلہ نے اسے گھونسا دکھایا۔ "یعنی جس پر گاؤ تکیہ تھا وہی سوکھا پتا ہوا دینے لگا۔"

"اُف...!" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ "مصرعے کا اتنا بُرا حشر...! حالانکہ تمہارا تو شاعری کا اچھا بھلا ذوق ہے۔ وزن بحر وغیرہ کا بھی علم ہے تمہیں۔"

"تم سے کس نے کہا کہ میں نے مصرع پڑھا ہے؟" اس نے مصنوعی خفگی سے مجھے گھورا۔ "میں نے تو نثر میں بات کی ہے۔"

مزید کچھ دیر اسی طرح کی الٹی سیدھی باتیں کرنے اور کھل کر چند قہقہے لگانے کے بعد میں نے انہیں شب بخیر کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کے ہاں کچھ وقت گزارنے اور ہنس بول لینے سے ذہن ہلکا ہو گیا تھا۔ اس رات ذرا بہتر نیند آئی۔

دوسرے روز میں آفس میں تھا کہ شمیم کا فون آگیا۔ اس کے لہجے میں کچھ مصنوعی سی مٹھاس تھی۔ اس کی وجہ چند لمحے بعد میری سمجھ آئی۔ وہ اپنے شک کی تصدیق کے لئے اور طنز کا ایک بہت ہی زہریلا تیر چلانے کے لئے تمہید باندھ رہی تھی۔

اِدھر اُدھر کی چند باتوں کے بعد اس نے اچانک ہی پوچھا۔ "اور سناؤ... داشتہ کے ہاں رات کیسی گزری؟"

مجھے ایک جھٹکا سا لگا۔ میں نے تو یہ علّت نہیں پالی تھی۔ داشتہ کے تصور نے مجھے کبھی اپیل نہیں کیا تھا۔ میں نے کبھی اس کی ضرورت بھی محسوس نہیں کی تھی۔ طاہرہ خانم اور ستارہ خواہ کیسی بھی عورتیں تھیں لیکن اپنی اپنی جگہ ان میں "ٹچ آف کلاس" ضرور تھا۔ ستارہ کا بیک گراؤنڈ خواہ اچھا نہیں تھا لیکن اب اس کی شخصیت میں اس کے بیک گراؤنڈ کی کوئی جھلک نہیں تھی۔ وہ بھی ایک نفیس عورت معلوم ہونے لگی تھی اور سوسائٹی میں بہرحال اس کا بڑا نام تھا۔

طاہرہ خانم تو خیر پڑھی لکھی، نفیس اور خاندانی عورت تھی۔ یہ دونوں میرے لئے جس طرح دیدہ و دل فرشِ راہ کئے رکھتی تھیں اس میں ایک ہلکی سی رومانویت کی آمیزش تھی۔ اس کا کوئی کاروباری پہلو نہیں تھا۔ خلوت کی زندگی میں کاروبار کی آمیزش مجھے بڑی شرمناک سی لگتی تھی۔ اگر کوئی عورت مجھے اچھی لگتی تھی تو میں اس سے دوستی کے بارے میں ضرور سوچتا تھا لیکن میں نے کبھی اسے داشتہ بنانے کے بارے میں نہیں سوچا، خواہ وہ ایک طوائف ہی کیوں نہ رہی ہو۔

تو پھر یہ شمیم کیا کہہ رہی تھی؟ میری داشتہ کہاں سے آن ٹپکی تھی؟

میں ایک لمحے خاموش رہا تو شمیم نیم طنزیہ سے لہجے میں بولی۔

"اب غالباً تم نہایت معصومیت سے پوچھو گے۔ 'کون سی داشتہ؟ میری تو کوئی داشتہ نہیں۔' ہے نا؟ یہی کہنے والے ہو نا تم؟"

"خوش قسمتی سے تمہارا اندازہ سو فیصد درست ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں واقعی جاننا چاہوں گا کہ تم کس بدنصیب کو میری داشتہ قرار دینے پر تلی ہوئی ہو؟ میری زندگی میں اس قبیل کی کسی چیز کا گزر نہیں ہے۔"

"تو پھر وہ کون تھی جو پچھلی رات اپنی کوٹھی کے گیٹ پر کھڑی تمہارا انتظار کر رہی تھی؟ کاٹن کے ڈھیلے ڈھالے قمیص شلوار میں تھی... بال کھلے تھے... کہو تو کوٹھی نمبر اور گلی کا نام بھی بتاؤں؟"

تب میری سمجھ میں آیا وہ راحیلہ کی بات کر رہی تھی۔ میری کنپٹیاں سُلگ اٹھیں۔ میں نے بہ مشکل اپنے لہجے کی سرد مہری برقرار رکھتے ہوئے کہا "شمیم بیگم! وہ کوئی اور ہی جذبہ ہوتا ہے جو کسی عورت کو گیٹ پر کھڑے ہو کر کسی کا انتظار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ داشتائیں گیٹ پر کھڑے ہو کر انتظار نہیں کیا کرتیں۔"

"اسامی بہت موٹی ہو تو اس قسم کے جذباتی ڈرامے بھی کئے جاسکتے ہیں۔" وہ بولی۔

ایک ثانئے کے لئے میرے دانت بھنچ گئے۔ پھر ایک گہری سانس لے کر میں نے اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم سے تعلق ہی کچھ اور چلا آ رہا ہے۔ کسی اور نے اگر اس لڑکی کے لئے 'داشتہ' کا لفظ استعمال کیا ہوتا تو میں اس کی زبان گُدی سے کھینچ لیتا۔"

"اوہ...!" یہ کہتے ہوئے اس نے ہلکی سی سیٹی بجائی۔ "بہت محبت کرتے ہو اس سے؟"

"محبت تو میرے دل میں تمہارے لئے بھی باقی ہے شمیم! لیکن تم اسے برباد کر دینے پر تلی ہوئی ہو۔ تم ایسی تو نہیں تھیں۔ اتنی بدل کیوں گئی ہو؟ میرے ذہن میں تو تمہارا بہت مختلف قسم کا امیج تھا۔ میں تو مدتوں تم سے دوبارہ ملنے کی آرزو میں تڑپا ہوں۔ لیکن اب میں سوچتا ہوں کاش تم سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔"

"ہو سکتا ہے تبدیلی مجھ میں نہیں، تم میں آئی ہو... اور ہاں... تمہیں کس کس سے محبت کا دعویٰ ہے؟ میری محبت کی بات بھی کر رہے ہو، اس لڑکی کی محبت بھی تمہارے لہجے میں بول رہی ہے۔ جس کے گھر میں نے گزشتہ رات تمہیں جاتے دیکھا تھا۔ میرا خیال ہے ایسی کئی اور بھی ہوں گی۔ عشق تمہارے لئے تولئے کی طرح ہوگا۔ میلا ہوا تو بدل لیا۔"

"شمیم! تم اتنی زہریلی کیوں ہو گئی ہو؟ تمہارے ہر لفظ سے زہر ٹپک رہا ہے۔" میں نے تاسف سے کہا۔

"ہو سکتا ہے مجھے محبت نے ایسا بنا دیا ہو۔" اس کا لہجہ کچھ دھیما ہو گیا۔

"محبت میں تو بڑی مٹھاس، بڑا وقار ہوتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے تمہاری بے توجہی نے مٹھاس کو زہر اور وقار کو گھٹیا پن بنا دیا ہو۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا کرب جھلک آیا۔ "آخر تم میری طرف لوٹ کیوں نہیں آتے؟ بے شک مجھ سے شادی مت کرنا لیکن مجھے یہ احساس تو دلا دو کہ تمہیں واقعی مجھ سے محبت ہے۔ مجھ سے ملنے تو آیا کرو۔ تم نے اگر راجو کو مسئلہ بنالیا ہے، بچپن کی دوستی تمہاری راہ میں حائل ہوتی ہے تو میں اس سے طلاق لے لیتی ہوں۔ اس کے بعد کیا مسئلہ رہ جاتا ہے؟"

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میں تمہارے اس اقدام کو ہرگز پسند نہیں کروں گا اور میں اس موضوع پر مزید گفتگو بھی نہیں کرنا چاہتا۔" میں نے فون بند کر دیا اور کیتھرین کو ہدایت کی کہ دوبارہ اس عورت کا فون آئے تو مجھ سے نہ ملائے۔

میری کنپٹیوں میں سنسناہٹ سی ہو رہی تھی۔ اس عورت کے جذبات کی شدت نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ کسی کی طلب میں کوئی عورت اتنی صاف گو، اتنی جارح اور ایسی دو ٹوک بھی ہو سکتی ہے۔ عورت خواہ کتنی بھی تیز، کتنی ہی ایڈوانس، کتنی بھی آزاد خیال اور خواہ کسی بھی طبقے سے تعلق رکھنے والی ہوتی، میرے ذہن میں اس کا تصور یہی تھا کہ وہ کسی نہ کسی حد تک اپنے دل کی بات دل میں ہی رکھتی تھی۔ دل کے دروازے خواہ چوپٹ کھول دیتی تھی لیکن توقع یہی رکھتی تھی کہ مرد دستک دے۔

کل شمیم میرے ہاں سے رخصت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد میں راحیلہ کی طرف روانہ ہوا تھا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ شمیم گھر واپس جانے کے بجائے گاڑی میں آس پاس ہی کہیں موجود رہی تھی اور اس نے راحیلہ کے گھر تک میرا تعاقب کیا تھا۔ ادھر میرا یہ عالم تھا کہ ایک تو شمیم نے غیر متوقع طور پر آ کر میرے دماغ کو جھنجھنا دیا تھا، دوسرے آج کل میرا شاید کچھ خوش قسمتی کا دور چل رہا تھا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کر رہا تھا اس لئے کبھی کبھار اس طرف سے میری توجہ ذرا ہٹ جاتی تھی۔ رات بھی میں نے کوئی خاص دھیان نہیں رکھا تھا کہ میرا تعاقب ہو رہا ہے یا نہیں؟ ورنہ شمیم اس معاملے میں اتنی ماہر تو نہیں ہو سکتی تھی کہ میری نظر میں نہ آتی...

بہرحال اس کی یہ حرکت میرے لئے حیران کن تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سرزنش بھی کی۔ تعاقب کے معاملے میں مجھے مستقل طور پر چوکنا رہنے کی ضرورت تھی۔ ایک طرح سے صرف یہی میری احتیاطی تدبیر تھی۔ گھر سے باہر اپنی حفاظت کے دیگر انتظامات میں نے ختم کروا دیئے تھے۔

اسی روز مجھے ایک تجربہ اور ہوا۔ انسان بعض اوقات جس چیز سے جتنا بچنا چاہتا ہے وہ اتنی ہی زیادہ اس کے سامنے آتی ہے۔ رات کو میں ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک خاص تقریب میں مدعو تھا۔ اس میں شہر کے مختلف سماجی حلقوں سے بہت ہی تھوڑے اور خاص خاص لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔

میں پارٹی کے دوران ایک کونے میں کھڑا ایک بہت بڑے بزنس مین سے گپ شپ کے انداز میں نیم کاروباری سی گفتگو کر رہا تھا کہ

طاہرہ خانم مجھ سے آن ٹکرائی۔ بزنس مین سے میری بات ختم ہوتے ہی وہ مجھے بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گئی۔

بات کوئی خاص نہیں تھی، بس وہ ذرا میری "خبر لینا" چاہتی تھی کہ میں نے اتنے دن سے اس سے رابطہ کیوں نہیں کیا تھا۔ پھر وہ مجھے کچھ اپنا احوال سنانا چاہتی تھی کہ اس کے یہ دن کس طرح گزرے اور اس دوران کیا کیا خاص باتیں ہوئیں۔

طاہرہ خانم بہت اونچے حلقوں میں میل جول والی عورت تھی۔ اس لئے مجھے وہاں اس کی موجودگی پر حیرت نہیں تھی۔ میں اپنی صفائی وغیرہ پیش کر کے ذرا محبت سے اس کی دلجوئی میں مصروف تھا کہ جھلمل کرتے لبادے میں کوئی عورت ہمارے قریب آن کھڑی ہوئی۔ میں نے گردن ذرا گھما کر دیکھا اور میری زبان کچھ لڑکھڑا سی گئی۔۔۔ وہ ستارہ تھی!

ڈرنک ہاتھ میں لئے وہ نیم استہزائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ طاہرہ خانم کو اس نے بالکل نظرانداز کر دیا تھا، جیسے وہ ایک خوبصورت اور خوش لبادہ عورت نہیں بلکہ سبزی کی دکان پر رکھی ہوئی باسی لوکی، توری یا بھنڈی ہو۔

"میں یہی سوچ رہی تھی کہ تم ابھی تک مجھے نظر کیوں نہیں آئے۔" ستارہ کی آواز ویسے بھی دلکش اور کھنک دار تھی۔ اس وقت اس میں خمار کی نہایت ہلکی سی آمیزش تھی جس نے اسے اور بھی دلکش بنا دیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "مجھے معلوم تھا تم اس پارٹی میں ضرور موجود ہو گے۔۔۔۔ اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسی طرح کسی کونے کھدرے میں چھپے کھڑے ہو گے۔"

طاہرہ خانم ایک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔ مجھے وہ سچویشن کچھ عجیب سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے طاہرہ خانم سے ستارہ کو متعارف کرانے کی کوشش کی۔ "ستارہ! ان سے ملو۔۔۔ یہ طاہر خانم ہیں۔۔۔ شہر کی ممتاز صنعت کار ہیں۔"

"اوہ۔۔۔" ستارہ نے یوں طاہرہ خانم کو دیکھا جیسے اب اس کی موجودگی کا احساس ہوا ہو۔ "صنعت کار ہیں یہ۔۔۔۔ میں تو سمجھی تھی خود ایک صنعت ہیں۔"

طاہرہ خانم نے اس موقعے پر بڑے تحمل اور بُردباری کا مظاہرہ کیا۔ ایک شائستہ اور باظرف عورت کی طرح وہ سنجیدگی سے ستارہ کی طرف دیکھتی رہی اور اس ریمارک کو پی گئی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "طاہرہ۔۔۔! انہیں تو تم نے پہچان ہی لیا ہو گا۔ ملک کی مشہور فلم اسٹار ہیں۔۔۔ فلمی ستارہ ہیں۔۔۔ نام بھی ستارہ ہے۔"

"ہاں۔" طاہرہ خانم ٹھہرے ٹھہرے لہجے بولی۔ "شکل تو کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔ اندازِ گفتگو سے تصدیق ہو گئی کہ ان کا تعلق فلم انڈسٹری سے ہے۔"

ستارہ نے بوجھل پلکیں اٹھاتے ہوئے زیادہ غور سے طاہرہ خانم کی طرف دیکھا۔ دونوں سرو قد تھیں۔ دونوں کی شخصیت اپنی اپنی جگہ پُر وقار تھی لیکن دونوں ایک دوسرے کی طرف کچھ اس طرح دیکھ رہی تھیں جیسے دونوں ایک دوسرے کی نظر میں زمین پر رینگتا ہوا کوئی حقیر سا کیڑا ہوں۔

میں نے پہلے ان دونوں کو اور پھر اپنے آپ کو کوسا۔ مجھے اس پارٹی میں آنے کا کوئی خاص اشتیاق نہیں تھا۔ خواہ مخواہ میزبان کی مُروّت میں چلا آیا تھا۔ ستارہ کو یہاں دیکھ کر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ابھی اس درجے کے دولت مندوں میں تو شمار نہیں ہوتی تھی جس درجے کے دولت مند اس پارٹی میں جمع تھے لیکن شوبزنس کی وجہ سے بہر حال اس کا نام بڑا تھا۔ فلموں پر ناک بھوں چڑھانے والے اچھے بھلے بڑے بڑے لوگ بھی اس طرح کی شخصیتوں کو بلانے کے خواہشمند رہتے ہیں۔

لیکن میں نے اس پہلو پر بالکل نہیں سوچا تھا کہ وہاں میری قریبی۔۔۔۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی قریبی شناسا خواتین یکجا ہو جائیں گی اور بیچ میں میری موجودگی سے ایک اچھا بھلا سینڈوچ تیار ہو جائے گا۔ میرے خیال میں وہ دونوں جہاندیدہ اور پختہ کار عورتیں تھیں۔ ان میں ایسی بے وقوفانہ جذباتیت اور رقابت کے جذبات نہیں ہونے چاہئیں تھے لیکن اب مجھے اپنا نظریہ تبدیل کرنا پڑ رہا تھا۔ عورت خواہ کہیں بھی ہو، کیسی بھی ہو، چراغِ خانہ ہو، شمعِ محفل ہو، پختہ کار ہو، نوخیز ہو، غرضیکہ کچھ بھی ہو لیکن جذباتیت اور رقابت سے بالکل عاری نہیں ہو سکتی۔

اچانک ستارہ بڑے مان اور اپنائیت سے میرا بازو پکڑ۔ ہوئے بولی۔ "انی! ذرا ایک منٹ ادھر آؤ۔۔۔۔ مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

میں نے طاہرہ خانم کی طرف دیکھا۔ اس کی نظر مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ بظاہر اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا لیکن مجھے معلوم تھا اس وقت کیا سوچ رہی تھی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اس کی نظر میرے پیروں کی زنجیر ثابت ہوتی ہیں یا نہیں؟ میں ایک خاموش آزمائش کے دوراہے پہ کھڑا تھا۔ اس لمحے میں نے اپنے آپ کو سخت بے وقوف محسوس کیا۔

"طاہرہ ڈیئر!" میں نے اپنائیت سے اس کا کندھا تھپتھپایا تاکہ وہ اپنی سُبکی محسوس نہ کرے۔ "میں ابھی ایک منٹ میں آیا۔"

اس سے پہلے کہ ستارہ کوئی ظالمانہ سا جملہ بولتی، میں خود اسے تقریباً دھکیلتا ہوا آگے لے گیا جدھر اس نے ایک لمحے پہلے اشارہ کیا تھا۔ ہم ستون کی اوٹ میں پہنچ کر رک گئے۔ چوکور ستون چاروں طرف آئینوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ ستارہ قدِ آدم آئینے میں اپنا اور میرا جائزہ لینے لگی جیسے دیکھ رہی ہو کہ ہم دونوں کی جوڑی کیسی لگ رہی تھی۔ ساتھ ہی وہ نہایت اطمینان سے بولی۔ "تم خواہ کتنی بے چارگی سے ایک منٹ میں واپس آنے کا وعدہ کر آئے ہو، تمہیں ایک منٹ میں چھوڑنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔"

"تمہیں مجھ سے کیا بات کرنی تھی ستارہ؟" میں نے نہا...ل سے پوچھا۔

"بات تو کوئی خاص نہیں تھی۔" وہ بڑے اطمینان سے بولی۔ ...ئی دن سے نہ تم سے ملاقات ہوئی نہ فون پر بات ہوئی۔ میں ...یشان تھی کہ آخر ایسی بھی کیا مصروفیت۔ تم تو مصروفیت کو ذہن پر ...دار کرنے والے آدمی نہیں ہو۔"

اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر ایک مصنوعی ادائے بے ...ازی سے بولی۔ "غالباً یہ طاہرہ خانم ہی تمہاری تازہ مصروفیت ہے؟"

"ستارہ! جس طبقے سے اب ہمارا تعلق ہے۔۔۔ جن لوگوں میں ...ہمارا اٹھنا بیٹھنا ہے۔۔۔۔ وہاں اس قسم کی رقیبانہ گفتگو کا رواج کم ہی ہے۔ اور اس سے پہلے میں نے تمہیں اس لہجے میں بات کرتے سنا بھی نہیں۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

"اس سے پہلے میں نے کبھی اپنی آنکھوں سے تمہیں اتنی خطرناک عورت کے شانہ بہ شانہ کھڑے نہیں دیکھا تھا۔" وہ مسکرائی۔ "اس عورت کی آنکھیں بتاتی ہیں کہ اس کے تسلط میں جانے والا واپس نہیں آسکتا۔"

"تمہیں ان باتوں کی پروا کب سے ہونے لگی؟ ہمارے درمیان کوئی عہد و پیمان تو نہیں ہے؟" میں نے ملائمت سے کہا۔ ستارہ کے طرزِ عمل میں پہلی بار تبدیلی آئی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سخت رویّہ اختیار کر کے اس کی دل شکنی کروں۔ وہ ایک ایثار پیشہ دوست تھی۔ اس نے میری وجہ سے بہت سی تکلیفیں بھی اٹھائی تھیں۔

"ہاں۔۔۔۔ میں تو صرف فاضل اور بوجھل لمحوں کا سہارا ہوں۔ میں اس حقیقت کو بھول گئی تھی" اس نے گہری سانس لی۔ اسی لمحے اس کے تاثرات یک لخت بدل گئے۔ اس کی بشاشت لوٹ آئی۔ غضب کی اداکارہ تھی اور پیشے کے اثرات زندگی پر بہر حال پڑتے ہیں۔ حقیقی زندگی میں بھی جب وہ کوئی بات واضح کرنا چاہتی تھی تو اپنے تاثرات کی مدد سے دوسروں کی نسبت زیادہ بہتر طور پر واضح کر جاتی تھی۔

جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بھی بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسی پرانے، دوستانہ اور بے غرض لہجے میں بولی۔ "انی! میرے دوست! مجھے معاف کر دینا۔۔۔۔ مجھ پر یہ ایک لہر آئی تھی۔ مجھے اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ میں تمہارے معاملے میں ایسی بننا نہیں چاہتی۔ حقیقی زندگی میں ایسی نظر آنا نہیں چاہتی۔ کم از کم تمہارے معاملے میں، میں اپنے آپ کو حسد و رقابت جیسے عامیانہ جذبوں سے بالاتر ثابت کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔ اور اب تک اس میں کامیاب بھی چلی آ رہی تھی لیکن آج یہ اچانک ہی مجھے نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔"

اس نے اپنے ہاتھ میں موجود گلاس اونچا کیا۔ "شاید یہ اس کمبخت کا اثر تھا۔۔۔۔ میرا خیال ہے میں نے طاہرہ خانم پر کوئی اچھا امپریشن نہیں چھوڑا۔ میں اتنی بڑی اداکارہ ہوں۔ مجھے لوگوں میں۔۔۔ اور خصوصاً معززین کے حلقے میں اپنا ایک بہتر امیج چھوڑنا چاہئے۔ پلیز۔۔۔ تم اس کے پاس واپس چلے جاؤ۔ میں خود تو اس سے معذرت نہیں کر سکتی۔ لیکن تم کسی طرح اس کے سامنے میرے رویّے کی تلافی کر دینا۔ شب بخیر۔" اس نے ہولے سے میرا کندھا تھپتھپایا اور نہایت پُر وقار انداز میں قدم اٹھاتی ہوئی مہمانوں کی ٹولیوں کے درمیان ایک طرف کو چل دی۔

اگر وہ جذباتی ہو کر بھی یہ بات کر رہی تھی تب بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں ایک لمحے وہیں ساکت کھڑا رہا۔ پھر میں نے طاہرہ خانم کے پاس واپس چلے جانا ہی بہتر سمجھا۔ لیکن جب میں وہاں پہنچا جہاں طاہرہ خانم کو کھڑی چھوڑ گیا تھا تو وہ وہاں نہیں تھی۔

میں نے اس کی تلاش میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی۔ وہ کہیں نظر نہ آئی۔ ہر رنگ کے پیرہن، ہر طرح کے چہرے، ہر طرح کی خوشبوئیں کچھ اس طرح چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں کہ کسی ایک مخصوص چہرے کو جلد تلاش کرنا آسان نہیں تھا۔

میں کہیں معذرت کرتا، کہیں خوش خلقی سے دانت نکالتا، کہیں کسی نرم و گداز اور کہیں کسی کرخت یا بے ہنگم ڈھیلے ڈھالے ہاتھ کو مصافحے کے لئے تھامتا ہوا مہمانوں کے درمیان چکراتا چند منٹ ادھر اُدھر پھرتا رہا لیکن طاہرہ خانم کہیں نظر نہ آئی۔ میرے دل میں ہلکی سی خلش، ہلکے سے پچھتاوے کی لہر اُبھری۔

پھر یکدم میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے وہاں سے کھسک ہی لینا چاہئے۔ میرے حق میں یہی بہتر تھا۔ بینکوئٹ ہال کا دروازہ وہاں سے خاصی دور تھا۔ میں دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا، مہمانوں کی ٹولیوں سے کتراتا اُدھر چل دیا۔ ابھی میں نے آدھا فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا کہ ایک مرمریں بازو نے میرا راستہ روک لیا۔ وہ طاہرہ خانم کا بازو نہیں تھا۔ کم از کم اتنا تو مجھے فوری طور پر اندازہ ہو گیا۔

دوسرے ہی لمحے ایک ستون کے عقب سے وہ پری چہرہ نکل آئی۔ وہ شمیم تھی اور کل سے بھی زیادہ خوبصورت، زیادہ خوش لباس نظر آ رہی تھی۔

'نہیں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔' میں اندر ہی اندر کراہ اٹھا۔ 'کیا تمہیں بھی اسی وقت یہاں موجود ہونا تھا!' مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ صبح کی گفتگو کی تمامتر ناگواری کے باوجود وہ بڑے من موہنے انداز میں مسکرا رہی تھی لیکن میں اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے نہ دے سکا۔ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کے ہاتھ میں غالباً کولڈ ڈرنک کا گلاس تھا۔

"طاہرہ خانم اور ستارہ۔۔۔۔ دونوں سے گھبرا کر بھاگ رہے ہو؟" وہ نیچی آواز میں بولی۔ "انجام دو کشتیوں کے سوار کا بھی اچھا نہیں ہوتا۔ تم تو بیک وقت نہ جانے کتنی کشتیوں کے سوار معلوم

ہوتے ہو۔ پلے بوائے بنے ہوئے ہو۔"

"میری بات چھوڑو۔" میں نے جل کر کہا۔ "میں تو گھن چکر بنا ہوا ہوں..."

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولی۔ "بالکل ٹھیک کہا تم نے۔ پلے بوائے کو سلیس اُردو میں کبھی کبھی گھن چکر بھی کہنا پڑتا ہے۔"

"تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"شاید تمہیں حیرت ہو رہی ہے کہ اتنے بڑے بڑے لوگوں کی پارٹی میں ہمیں کس نے بلالیا؟" وہ بدستور مسکرائے جارہی تھی اور اس میں شک نہیں تھا کہ کمبخت کی مسکراہٹ خوبصورت تھی۔

ایک گہری سانس لے کر وہ بولی۔ "ٹھیک ہے... ہم زیادہ دولت مند اور زیادہ اہم لوگ نہیں ہیں لیکن میں نے تمہیں بتایا تھا کہ ہمارا ریس کے گھوڑوں کا ایک چھوٹا سا اصطبل ہے... اور ریس بڑے بڑے لوگوں کا شوق ہے.... اس طرح کچھ بڑے لوگوں سے ہماری بھی سلام دعا ہے۔ ہمیں بھی محبت سے بلالیتے ہیں اپنی تقریبات میں وہ لوگ۔"

"میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ تم تو چھوٹے اور بڑے کی بحث میں پڑ گئیں۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔

تو پھر کیا مطلب تھا تمہارا؟" وہ ملائمت سے بولی۔

"چھوڑو اسے۔" میں نے بیزاری سے کہا "یہ بتاؤ راجو بھی آیا ہے تمہارے ساتھ؟"

"جتنی تمہیں راجو کی پروا ہے.... جتنا تم اسے پوچھتے ہو... جتنی محبت سے اسے یاد کرتے ہو اتنی اگر میری پروا کرتے، مجھے پوچھتے اور اتنی محبت سے مجھے یاد کرتے تو میں تمہارے قدموں کی دھول بن جاتی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"تم طاہرہ خانم اور ستارہ کو جانتی ہو؟" میں نے قدرے ملائمت سے پوچھا۔

"ستارہ کو تو خیر بے شمار لوگ جانتے ہیں۔ تھوڑی بہت قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ میں طاہرہ خانم کو بھی جانتی ہوں۔ بڑی خوش نصیب عورت ہے۔"

میں نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس کی نظر میں طاہرہ خانم کی خوش نصیبی کی وجہ کیا تھی لیکن وہ خود ہی وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ "ہر معاملے میں خوش نصیب عورت ہے۔ اس کی پہلی خوش نصیبی تو میری نظر میں یہی ہے کہ وہ تمہاری دوست ہے۔ دوسری یہ کہ دولت گویا اس کی خوشبو سونگھتی ہوئی اس کی طرف لپکتی ہے۔ یہ عورت جوئے تک میں بھی کبھی نہیں ہارتی۔ ہمارا ایک گھوڑا ہے۔ ریس کورس میں دوڑتا ہے۔ کلر KILLER اس کا نام ہے۔ اس نے بہت سے غریبوں کو تھوڑا سا خوشحال اور امیروں کو امیر تر بنایا ہے۔ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح وہ طاہرہ خانم کا بھی فیورٹ ہے۔ بہت رقمیں جیتی ہیں اس نے کلر کے ذریعے۔ میں اس حوالے سے بھی طاہرہ خانم کو جانتی ہوں۔"

"تم نے راجو کے بارے میں نہیں بتایا... وہ اس پارٹی میں آیا ہے یا نہیں؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا وہ شرفا اور معززین کی ٹھنڈی ٹھار پارٹیوں میں بور ہوتا ہے۔ کبھی کبھار میں ہی اسے کھینچ کھانچ کر لاتی ہوں۔ وہ اس وقت بازار میں بیٹھا کسی تھرڈ ریٹ طوائف کا مجرا دیکھ رہا ہوگا اور بڑی محنت سے حاصل ہونے والا روپیہ بے دردی سے لٹا رہا ہوگا۔ وہاں محفل میں خوب گرما گرمی کا احساس ہوگا۔ گندا مذاق اور فقرے بازی ہو رہی ہوگی۔ شراب کا دور چل رہا ہوگا۔"

"تم اتنی سخت گیر بیوی ہو۔ اس پر کنٹرول کیوں نہیں رکھتیں؟" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں سخت گیر نہیں ہوں۔ اس نے مجھے سخت گیر مشہور کر رکھا ہے۔ خود مظلوم شوہر بنا ہوا ہے۔ میں ڈانٹ ڈپٹ ضرور کرلیتی ہوں۔ اس سے ڈرتی نہیں لیکن باقی میں ہر لحاظ سے گھاٹے میں ہوں۔ شادی کے وقت میں نے باقاعدہ تحریری طور پر اسے اپنے آدھے سے زیادہ مالی معاملات اور جائیداد وغیرہ کا مختار بنا دیا تھا۔ پاور آف اٹارنی ہے اس کے پاس۔" اس نے سر جھکالیا اور کچھ اس طرح اپنے گلاس میں جھانکنے لگی جیسے کوئی اہم چیز اس میں ڈوب گئی ہو۔

"کینسل کیوں نہیں کردیتیں پاور آف اٹارنی؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں... میرے سامنے کوئی متبادل راستہ نہیں ہے... اور مجھے ان معاملات سے کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں۔" اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ "انسان کی زندگی میں مالی معاملات نہیں، جذباتی معاملات زیادہ اہم ہوتے ہیں لیکن زندگی کا بیشتر حصہ وہ مالی معاملات میں ہی الجھ کر گزار دیتا ہے۔"

"میرے جذباتی معاملات تو تمہیں بہت گراں گزرتے ہیں۔ بڑے زہریلے طنز وغیرہ کرتی ہو۔" میں نے کہا۔

"اس کی بھی ایک جذباتی بنیاد ہے..." وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ ہم ٹہلتے ہوئے باہر آگئے تھے اور سوئمنگ پول سے ذرا دور ایک آرائشی محراب کے قریب کھڑے تھے۔ "میں نے جب برسوں بعد تمہیں دیکھا تو یوں محسوس ہوا جیسے تم میری کوئی کھوئی ہوئی چیز تھے اور اتفاقاً مجھے مل گئے تھے۔ کچھ پرانے تعلقِ خاطر کی وجہ سے تم پر بڑا مان سا تھا، اپنائیت سی تھی لیکن میں نے دیکھا تم تو جیسے لوٹ کا مال بنے ہوئے تھے۔ مجھے تو تم نے راجو سے دوستی اور آنکھ کی شرم وغیرہ والا فلسفہ سنا کر ایک طرف بٹھا دیا لیکن میرے سوا گویا ہر کوئی تم پر حق جمائے ہوئے تھا۔ میرے سوا جیسے تم شہر بھر پر مہرباں تھے۔ مجھے ایک شاک سا لگا۔ میں جیسے کسی اونچی جگہ سے گر گئی۔ ٹوٹ پھوٹ گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی مجھ سے میری متاعِ عزیز چھین کر لے گیا ہے۔ میں اس صدمے کو فوری طور پر برداشت نہیں کرسکی۔ کچھ کم ظرف سی ہوگئی۔ میرا رویہ بھی چیپ عورتوں جیسا ہوگیا جو ظاہر ہے تمہیں اچھا نہیں لگا۔ لیکن اب میں سنبھل گئی ہوں۔ اب میں کوئی چیپ حرکت نہیں کروں گی۔ تم پر حق نہیں جتاؤں گی۔"

اس کے چہرے کی افسردگی دیکھ کر میرا دل کٹ سا گیا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا لیکن دوسرے ہی لمحے ہٹا لیا۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے میرے ہاتھ تلے اس کا وجود موم کے مجسمے کی طرح پگھل جائے گا۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ تم نے کبھی مجھے متاعِ عزیز کی طرح سمجھا تھا۔ میرا عشق تو یک طرفہ ہی تھا۔ میں خط لکھتا تھا تو وہ گویا کسی اندھے کنویں میں جاگرتے تھے۔ کبھی کسی کا جواب نہیں آیا۔"

"غلط فہمی ہے تمہاری۔" وہ جیسے تڑپ کر بولی۔ "وہ خط جس اندھے کنویں میں جاکر گرتے تھے وہ میرا دل تھا۔ دفن ہوجاتے تھے وہ میرے دل میں لیکن ان کا ایک ایک لفظ مجھے آج تک یاد ہے۔ چند ہی خطوط تو تھے۔ بہت مختصر سے۔ کہو تو سب کے سب تمہیں زبانی سنا دوں؟"

میں نے آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان آنکھوں میں نمی جھلملا رہی تھی اور ان کی گہرائیوں میں سچائی کی شمعیں روشن تھیں۔ اس کا دعویٰ محض لفاظی نہیں تھا۔

وہ گلاس کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "وہ ہم دیہاتیوں کا لڑکپن.... اس لڑکپن کا عشق.... اور اس عشق کی خوشبو۔ اسی سے تو ابھی تک خانۂ دل آباد ہے۔ ورنہ تو اس دل میں محبت کا بہت بڑا خلا ہوتا۔"

"کیونکر ہوتا؟ تم تو کہہ رہی تھیں تمہیں اپنے مرحوم شوہر سے بھی محبت تھی؟" میرا لہجہ اب بھی کم کھڑا کھڑا تھا۔

"یقیناً تھی۔" وہ بلا تامل بولی۔ "یہ غلط ہے کہ ہم زندگی میں صرف ایک محبت کرتے ہیں۔ ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری خاص الخاص محبت صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ وہ مکمل اور بھرپور ہوتی ہے۔ اس کے نقوش ان مٹ ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ، اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی ہماری کچھ محبتیں ہوتی ہیں۔ وہ ادھوری اور تشنہ ہوتی ہیں۔ بعض اوقات تو صرف اس لئے بھی ہمیں کسی سے تھوڑی سی محبت ہوجاتی ہے کہ وہ کسی آڑے وقت میں ہمارے کام آیا ہوتا ہے۔ کوئی ہمیں دیکھنے میں اچھا لگتا ہے تو اس سے بھی تھوڑی سی محبت ہوجاتی ہے۔ کسی کی باتیں ہمیں اچھی لگتی ہیں۔ کسی کے خط ہمیں اچھے لگتے ہیں۔ یہ سب محبتیں ہوتی ہیں لیکن ادھوری اور تشنہ سی محبتیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرجاتی ہیں، مٹ جاتی ہیں۔"

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ صبح تک میری نظر میں اس کا تاثر ایک سطحی عورت کا تھا لیکن اس نے یکدم پلٹا کھایا تھا اور میرے خیالات کو تہ و بالا کردیا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "لیکن وہ جو ایک بھرپور، اوّلین اور روح کو سیراب کردینے والی محبت ہوتی ہے... وہ کبھی نہیں مرتی۔ کبھی ذہن سے محو نہیں ہوتی۔ تم سمجھتے ہو کہ صرف تم نے ہی لڑکپن میں مجھ سے عشق کیا تھا؟ راتیں جاگ کر گزاری تھیں؟ راہوں میں کھڑے ہو کر انتظار کیا تھا؟ خونِ دل کے قطرے کاغذ پر نچوڑے تھے؟ میں تمہیں بہت تاخیر سے بتا رہی ہوں.... لیکن سچ بتا رہی ہوں کہ میں نے بھی اسی شدت سے تم سے عشق کیا تھا۔ میں بھی اسی طرح ہجر کی ٹھنڈی آگ میں جلی تھی۔ میں نے بھی اسی طرح رت جگے کاٹے تھے۔ لیکن میں کبھی تمہیں بتا نہیں سکی کیونکہ میں پاکیزگی کی سولی پر مصلوب تھی۔ میں اس سوتیلے باپ کی عزت کی حفاظت کر رہی تھی جس نے مجھے بوڑھے دولت مند کے ہاتھ بیچ دیا اور اس پیسے کے بل بوتے پر اس نے خود ایک اور شادی کرلی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اسے وہ پیسہ برتنا نصیب نہیں ہوا۔ اپنی نوبیاہتا بیوی سمیت وہ ٹریفک کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔"

"اور تم نے شادی کے بعد اپنے شوہر سے محبت شروع کردی؟" میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی تھی۔

"میں نے ابھی تمہیں ادھوری اور تشنہ محبتوں کے بارے میں بتایا ہے۔" وہ بوجھل سے انداز میں پلکیں اٹھاتے ہوئے بولی۔ "وہ میری ادھوری محبت تھی۔ شاید محبت بھی نہیں، ممنونیت تھی۔ میں اس پر شرمندہ نہیں ہوں۔ وہ بہرحال ایک اچھا آدمی تھا۔ میں اس کی زر خرید تھی۔ وہ چاہتا تو مجھ سے بہت برا سلوک بھی کرسکتا تھا۔ بعض عمر رسیدہ خاوند اپنی نوخیز اور نوجوان بیویوں پر بہت شک کرتے ہیں۔ اپنی خامیوں کا انتقام ان سے لیتے ہیں۔ بہت برا سلوک کرتے ہیں لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس میں کوئی کمپلیکس نہیں تھا۔ اس نے پھولوں کی طرح مجھے رکھا۔ یہ جو آج میں اتنی بیش قیمت جیولری پہنے، اتنے نفیس لباس میں اس عالیشان ہوٹل میں کھڑی اتنے اعتماد سے تم سے باتیں کر رہی ہوں، یہ اسی کی بدولت ہے۔ ورنہ ہم کیا تھے اور ہماری اوقات کیا تھی۔"

چند لمحے سکوت چھا گیا۔ ہمارے چاروں طرف ہوٹل کی بلند و بالا عمارت تھی اور ہمارے قریب مدھم روشنیوں میں سوئمنگ پول کا پانی جھلملا رہا تھا۔ ہم گویا ایک چوکور کنویں کی تہ میں کھڑے تھے۔

آخر وہ ایک طویل سانس لے کر بولی۔ "میں اب کوئی گھٹیا حرکت نہیں کروں گی۔ دنیا کے ہاتھوں سے تمہیں واپس چھیننے کے لئے بے تابی نہیں دکھاؤں گی۔ اب تو تم مجھ سے ناراض نہیں ہونا؟"

"ناراض تو میں تم سے پہلے بھی نہیں تھا۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "تم نے مجھے الجھن اور آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ تم مجھے

لڑکپن کی ایک حسین یاد کے بجائے کوئی اور ہی عجیب سی چیز بن کر ملی تھیں۔ میں حیران تھا... میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ تمہیں کیا ہوگیا ہے۔"

"میرے اندر پیاس کا ایک لامتناہی صحرا پھیلا ہوا ہے۔ اگر میں کچھ دیر کے لئے دیوانی نظر آئی تھی تو کیا ہوا؟ میں قابل معافی ہوں۔ میں اب بھی تمہیں نہیں بتاسکتی کہ نوجوانی کے آغاز سے لے کر اب تک روز و شب، ماہ و سال مجھ پر کیسے گزرے ہیں۔ کیا کیا محرومیاں دے کر گئے ہیں۔ یہ سارے رونے رونا فضول ہے۔ کچھ تم سمجھ نہیں سکو گے، کچھ میں سمجھا نہیں سکوں گی۔ تمہیں میری کیفیت کا اندازہ نہیں ہوگا۔ بظاہر میں ایک خوش حال اور خوش نصیب عورت ہوں جسے دنیا میں ہر خوشی میسّر ہے لیکن میں جتنی تنہا اور اندر سے جتنی خالی ہوں یہ مجھے ہی معلوم ہے۔"

"اندر سے تو اس دنیا میں ہر کوئی تنہا ہے شمیم!" میں نے کہا۔

"ممکن ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "تم سے مجھے بہرحال اور کچھ نہیں چاہئے۔ صرف مجھے اپنے دوستوں میں شمار کرو۔ اور بس...! مجھ سے نفرت مت کرو۔ مجھے بُرا مت سمجھو۔"

"تم میرے عزیز ترین دوستوں میں ہو۔" میں نے خلوص سے کہا۔ اس کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی۔ ایک متلاطم جھیل گویا یکدم پُرسکون ہوگئی۔

"تھینک یو۔" اس نے ایک لمحے کے لئے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں کولڈ ڈرنک تھی اور دوسرے ہاتھ میں ایک نادیدہ سی آگ۔

"میں اب چلتا ہوں۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "میرا یہاں آنا اچھا بھی ہوا اور برا بھی۔"

"دوبارہ گھر کب آؤ گے؟" اس نے بڑی مدّھم سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"اس خبیث... راجو سے کہنا کبھی تمہیں ساتھ لے کر میری طرف آئے۔ رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ تم لوگ۔ پھر رت جگا کریں گے۔ جی بھر کے باتیں کریں گے۔ اسے میری طرف سے شرم دلانا۔ پیغام دینا کہ اس گدھے سے ایسی بے وفائی کی امید نہیں تھی۔ اس نے دوبارہ فون تک نہیں کیا۔"

"تمہارا پیغام دے دوں گی لیکن میں اس کے بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

میں ہوٹل سے نکل آیا۔ سڑکوں پر ویرانی پھیلنے لگی... اور ویرانی میرے دل میں بھی تھی۔ شمیم نے مجھے اداس کردیا تھا۔ دل کی یہ ویرانی بھی عجیب تھی۔ جس کے بہت سے دوست تھے، بہت سے چاہنے والے تھے، وہ بھی تنہا تھا۔ جس کے دل میں محبت کا خلا تھا، وہ بھی تنہا تھا۔ مفلس بھی تنہا تھا، دولت مند بھی تنہا تھا۔ بلکہ وہ مفلس سے بھی زیادہ تنہا تھا۔ نہ جانے یہ تنہائی کہاں سے آتی تھی اور کیوں دل میں گھر کرلیتی تھی۔

دوسرے روز میں نے آفس سے ستارہ کو فون کیا تو پتا چلا کہ وہ کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے مری روانہ ہوچکی تھی۔ طاہرہ خانم کو فون کیا تو پتا چلا کہ وہ کسی کام سے کسی صوبائی وزیر کے دفتر گئی ہوئی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ گزشتہ رات کے واقعے کے بارے میں ان کا ردِ عمل کیا تھا اور اب وہ میرے ساتھ کس طرح پیش آئیں گی لیکن فی الحال میری یہ خواہش پوری نہ ہوسکی۔

اس رات گھر آکر میں سونے کی تیاری کررہا تھا کہ ٹونی کا فون آگیا۔ اپنے مخصوص سرسری سے انداز میں وہ بولا۔ "سر! آپ نے ملک ریاض راہی کا نام تو سنا ہی ہوگا... خاصی مشہور شخصیت تھے..."

"تھے...؟ کیا مطلب...؟" میں نے اپنے لہجے سے اپنے آپ کو حتی الامکان بے خبر اور لاتعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"سر! آج شام ایک افسوسناک حادثے میں ان کا انتقال ہوگیا!..." ٹونی نے اپنے لہجے کو متاسفانہ بنانے کی کوشش کی۔ "وہ غالباً آزاد قبائلی علاقے کی طرف جارہے تھے لیکن پہاڑی راستے پر کسی ٹرک نے ان کی جیپ کو ٹکر ماردی اور جیپ گہری کھائی میں جاگری۔ وہ اپنے چاروں گارڈز سمیت موقعے پر ہی ہلاک ہوگئے۔ جیپ میں آگ لگ گئی۔ دو گارڈز کی مسخ شدہ لاشیں تو بری طرح جھلس بھی گئیں۔ کچھ لوگ امدادی پارٹی بنا کر نیچے پہنچ گئے تھے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ملک ریاض راہی کی لاش کی تو شناخت بھی مشکل سے کی جاسکی۔"

"اوہ... یہ تو واقعی بہت بُرا ہوا۔" میں نے بھی متاسفانہ لہجے میں کہا۔ "ٹرک تو جائے حادثہ سے فرار ہوگیا ہوگا؟"

"جی ہاں۔ اس کا تو نام و نشان بھی نہیں ملا۔" ٹونی نے جواب دیا۔

"بڑا افسوس ہوا سن کر۔" میں نے کہا۔

"مزید تفصیلات کل یا پرسوں کے اخبارات میں آجائیں گی۔" ٹونی بولا۔ پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ "اور ہاں سر...! آپ کو معلوم ہی ہے میں ایک ضروری کام سے پشاور آیا ہوا ہوں۔ آج رات ہی بارہ بجے والی فلائٹ سے لاہور واپس پہنچ جاؤں گا۔ لیکن ایک اہم خبر مجھے یہاں بیٹھے مل گئی ہے جو شاید آپ کو لاہور میں رہتے ہوئے بھی نہ ملی ہو۔"

"خبریں وغیرہ اکٹھی کرنے کا ذمّہ تو آج کل تمہارا ہے۔ میں تو آج کل ذرا دوسرے ہی معاملات میں الجھا ہوا ہوں۔" میں نے کہا "کیا خبر ہے؟"

"سنا ہے مشہور ڈاکو... بلکہ ڈاکو نہیں... ڈاکو کے ساتھ شاید "مشہور" نہیں بلکہ "بدنام" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ ہاں تو... بدنام ڈاکو نورو ماچھی پولیس کی تحویل میں انتقال کرگیا ہے۔"

"اوہ...!" میں اس خبر پر کوئی تبصرہ نہ کرسکا۔

"سر! میں ائرپورٹ سے ہی بول رہا ہوں۔ میری فلائٹ کا وقت ہورہا ہے۔ باقی باتیں کل آپ سے زبانی ہوں گی۔" ٹونی بولا۔

"ٹھیک ہے۔" میں نے ریسیور رکھ دیا اور چند لمحے دیوار پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔ دیوار پر میرے سامنے ایک فلم سی چل رہی تھی لیکن پھر میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا اور سونے کے لئے لیٹ گیا۔

چھت کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے غیرارادی طور پر کہا۔ "عالم شیر! اب تمہاری زندگی کے دن بھی تھوڑے رہ گئے ہیں۔"

پھر میں سکون سے سوگیا۔ بلکہ شاید کچھ زیادہ ہی سکون سے سوگیا۔ سوتے ہوئے آدمی کو یہ اندازہ تو نہیں ہوتا کہ وہ کتنی دیر سویا ہے لیکن میری غنودگی جب ٹوٹنے لگی تو مجھے کچھ ایسا لگا جیسے میں صدیوں سوتا رہا ہوں اور اب پوری طرح بیدار ہونا میرے بس کی بات نہیں۔

میں گویا ہفتوں تک خمار کے سمندر میں غرق رہا تھا۔ میرے اعصاب پر برف کی تہیں جم گئی تھیں اور جسم کے جوڑوں میں گویا گرا ہوا سیسہ جم گیا تھا۔ کوئی مجھے زور زور سے جھنجوڑ رہا تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میں کیوں بیدار نہیں ہوپارہا تھا۔ میں آنکھیں کھولنا چاہتا تھا لیکن پپوٹے گویا پتھر کے ہوگئے تھے۔ انگلی تک کو جنبش نہیں دی جارہی تھی۔

بہت دور سے کسی کی آواز سرگوشی کی حد تک مجھے سنائی دے رہی تھی۔ "مسٹر چوہدری! اب اٹھ جایئے... بیدار ہوجایئے... مسٹر چوہدری!"

بڑی ہی مشکل سے آخرکار میں نے آنکھیں تھوڑی سی کھولیں۔ تب مجھے احساس ہوا کہ کوئی مجھے جھنجوڑ نہیں رہا تھا بلکہ میرا بیڈ یوں لرز رہا تھا جیسے برقی طاقت سے کسی مشین میں وائبریشن یا ارتعاش پیدا کیا جارہا ہو۔ آنکھ ذرا اور کھلی، نظروں کے سامنے پھیلا ہوا گہرا سفید دُھواں چھٹا تو احساس ہوا کہ وہ میرا بیڈ نہیں تھا۔ بلکہ وہ میرا کمرا ہی نہیں تھا جہاں میں لیٹا ہوا تھا۔ درحقیقت وہ کوئی عام کمرا یا بیڈ روم بھی نہیں تھا۔

وہ تو ایک نہایت طویل و عریض ہال تھا۔ اس میں گویا کسی انگریزی، اسپائی یا پھر سائنس فکشن فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا لیکن اس میں فلمی سیٹ والا عارضی پن نہیں تھا۔ درو دیوار کے رنگ واقعی تصوراتی تھے۔ روشنیوں سے یہ اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ اس وقت دن تھا یا رات؟

ایک طرف دیوار کے ساتھ، بلند و بالا چھت سے ملا ہوا اتنا بڑا ایکوریم موجود تھا جتنا میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سمندر کو شفاف اور مختصر کرکے شیشے کے گھر میں قید کردیا گیا ہے۔ سمندر میں پائی جانے والی ہر چیز اس میں موجود تھی۔ باقی ہال میں چاروں طرف بل کھاتے ہوئے اونچے اونچے راستے بنے ہوئے تھے جیسے غیر ممالک میں ونڈر لینڈ ٹائپ تفریحی مقامات پر ہوتے ہیں۔ پہاڑیاں، پودے، مصنوعی آبشار اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔

چھت کی جگہ غالباً مصنوعی تاریک آسمان اور اس میں جھلملاتے ہوئے ستارے بھی تھے۔ ایکوریم کے عین قریب ایک نہایت خوبصورت شاہانہ قسم کی کرسی بھی رکھی ہوئی تھی۔ میں جس اسٹریچر نما بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اس میں وائبریشن ختم ہوگئی تھی اور چیزیں میری نظر میں صحیح طور پر فوکس ہونے لگی تھیں۔

مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ سب کچھ میں نے پہلے بھی دیکھا ہوا تھا لیکن ذہن پر زور دینے سے بھی یاد نہیں آرہا تھا کہ کہاں دیکھا تھا۔ پھر اچانک ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ میں نے دراصل یہ جگہ نہیں دیکھی تھی بلکہ ستارہ نے میرے سامنے بالکل اسی طرح اس کی، اپنے الفاظ میں منظر کشی کی تھی جس سے میرے ذہن میں کچھ ایسا ہی تصور آیا تھا۔

شاید میں اب یہ سب کچھ خواب میں دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ میں نے ذرا فاصلے کی تو سب چیزیں دیکھ لی تھیں لیکن اپنے قریب نظر نہیں ڈالی تھی۔ میرے عین قریب ایک خوبصورت رنگ برنگی کرسی پر اے ٹن بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

"خوش آمدید مسٹر چوہدری!" اس نے گویا کسی تقریب میں میرا استقبال کرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ جیسے میرے خیالات پڑھتے ہوئے بولا۔ "وہم میں نہ پڑیں مسٹر چوہدری! یہ کوئی خواب نہیں ہے۔"

میں نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔ "میں کہاں ہوں؟"

اے نن نے مغموم سے انداز میں سرہلایا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ہر شخص ہوش میں آتے ہی سب سے پہلا سوال یہی کرتا ہے۔ نہ جانے کیوں؟"

میں خاموش رہا۔ وہ قدرے توقف کے بعد بولا۔ "اتنے اہم سوالوں کے جواب اتنی جلدی تو نہیں دیئے جاسکتے نا۔ یہ بتاؤ تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" لہجہ دوستانہ اور ہمدردانہ تھا' جیسے وہ میرا نہایت خاص خیر خواہ ہو۔

میں نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا تو وہ خود ہی ایک ڈاکٹر کی طرح گویا میری بیماری کی تشخیص کرتے ہوئے بولا۔ "ویسے تو تم ٹھیک ٹھاک ہی ہو' بس کمزوری ذرا زیادہ محسوس ہورہی ہوگی۔ وہ بھی چند گھنٹوں میں دور ہوجائے گی۔ یہ اس گیس کے اثرات ہیں جس کے ذریعے تمہیں بے ہوش کیا گیا تھا۔"

"میرے اپنے گھر میں... میرے بیڈ روم میں... نیند کے دوران مجھے گیس سے بے ہوش کیا گیا تھا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ظاہر ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

میں اصل میں یہ جاننا چاہتا تھا کہ میرے سیکیورٹی کے انتظامات کیا ہوئے؟ وہ دیواروں کے اوپر خاردار حفاظتی تاروں میں دوڑتا ہوا کرنٹ' وہ میرے دو مسلح گارڈز... وہ خفیہ کیمرے' کیا ان سب کی موجودگی میں میرے کمرے میں گیس پھیلا کر مجھے سوتے میں بے ہوش کردیا گیا تھا؟ گویا یہ تمام حفاظتی انتظامات میرے کسی کام نہیں آئے تھے؟"

اے نن گویا میرے خیالات پڑھتے ہوئے بولا۔ "تم جیسے... بلکہ ان سے بھی کہیں زیادہ حفاظتی انتظامات اس ملک میں بہت سی شخصیتیں کرتی ہیں۔ اس کے باوجود ان میں سے بعض شخصیتیں بالکل عام سے مجرموں کے ہاتھوں قتل ہوجاتی ہیں۔ ہمارے لئے تو یہ بالکل بچکانہ سی چیزیں ہیں۔ جب تک ہم کسی کو اٹھانے یا ہلاک کرنے کا فیصلہ نہیں کرتے تب تک یہ انتظامات اہم دکھائی دیتے ہیں لیکن جب ہم کوئی فیصلہ کرلیتے ہیں تو پھر ان انتظامات کا یا کسی بھی قسم کے انتظامات کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔ گزشتہ رات تمہارے گارڈز' تمہارے بلڈ ہاؤنڈز اور ملازمین سب بے ہوش ہوگئے تھے۔ خاردار تاروں میں برقی رو منقطع ہوگئی تھی اور چند آدمی گھر کے افراد ہی کی طرح تمہارے ہاں گھوم پھر رہے تھے۔"

اس کی بات سن کر میرا دل خراب ہونے لگا۔ پہلے ہی اُبکائی سی محسوس ہورہی تھی' نقاہت بھی بلا کی تھی۔ میں جب کم عمری میں ہی بالکل تن تنہا نہایت خطرناک کاموں میں ملوث ہوگیا تھا اور ہر وقت موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پھرا کرتا تھا حالانکہ میرے کوئی وسائل نہیں تھے' کوئی طاقت نہیں تھی اس وقت بھی میں نے کبھی اپنے آپ کو اتنا بے بس محسوس نہیں کیا تھا... اور بے بسی سے مجھے نفرت تھی۔ شاید یہ بے بسی کی انتہا تھی کہ ایک لمحے کے لئے مجھے اپنے آپ سے بھی نفرت محسوس ہوئی۔

بے بس انسان کا غصہ سانپ کے زہر کی طرح اس کے جسم میں اندر ہی اندر گردش کرتا ہے۔ شاید اسی کا ردعمل تھا کہ میں اس اسٹریچر نما بیڈ پر اٹھ بیٹھا۔ بیڈ اپنی جگہ سے تھوڑا آگے کو کھسک گیا۔ اسٹریچر ہی کی طرح اس کے نیچے چار چھوٹے چھوٹے گول پہیے لگے ہوئے تھے' ٹیبل ٹینس کی گیندوں سے مشابہ۔

اے نن میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "چوہدری! تم بلاشبہ ایک طاقتور آدمی ہو جو اتنی جلدی اٹھ بیٹھے ہو۔"

میرے دل میں نفرتوں کے جھکڑ چل رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اٹھ کر اے نن پر ٹوٹ پڑوں اور خالی ہاتھوں سے ہی کسی طرح اس کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں لیکن یہ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں تیزی سے اٹھ تو بیٹھا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ اس سے آگے میرا جسم میرا کچھ زیادہ ساتھ نہیں دے سکتا۔ ہاتھ پیروں سے گویا جان سی نکلی ہوئی تھی۔ مجھے اے نن کے مضحکہ خیز سراپا میں چھپی ہوئی طاقتوں کا اچھی طرح اندازہ تھا۔ میں اس پر حملے کی کوئی ادھوری کوشش نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میں سمجھتا تھا کہ مجھے اپنے خیالات چھپائے رکھنے میں بڑی مہارت حاصل تھی لیکن میری آنکھوں میں نہ جانے کہاں کوئی کھڑکی کھلی ہوئی تھی جس سے وہ میری سوچوں کی بستی میں جھانکے جارہا تھا۔

نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں وہ بولا۔ "میں تمہاری آنکھوں میں نفرتوں کے آتش فشاں دیکھ رہا ہوں چوہدری! میرا دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ ہے کہ اپنے دُکھتے ہوئے ذہن پر اس قدر بوجھ مت ڈالو۔ تمہارے دماغ کی نسوں کو آرام اور سکون کی ضرورت ہے تاکہ تمہاری ذہنی و جسمانی حالت جلد از جلد معمول پر آسکے۔ ہمیں امید ہے کہ ایک عام آدمی کی نسبت تم بہت جلد اس قابل ہوجاؤ گے کہ بہ قائمی ہوش و حواس ہمارے ساتھ میز پر بیٹھ کر مذاکرات کرسکو۔"

"کیسے مذاکرات؟" میں نے ذرا چونک کر پوچھا۔ میں لمحہ بہ لمحہ اپنی حالت بہتر محسوس کررہا تھا۔ نفرت کے زہر نے تریاق کا کام کیا تھا۔ رگ و پے میں بجلی سی دوڑ رہی تھی۔ لہو کی گردش جو سُست ہوگئی تھی' اب اس میں دوبارہ روانی آرہی تھی۔

"یہ بھی معلوم ہوجائے گا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے تم صرف اپنی توانائیاں بحال ہونے دو' جذباتیت کی لہروں کو اپنی سوچ پر غالب مت آنے دو۔ ہمیں نہایت صبر و سکون اور ذہنی یکسوئی کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنی ہیں۔ تم ایک تجربہ کار آدمی ہو' تم نے دنیا دیکھی ہے۔ تمہیں اندازہ ہوجانا چاہئے کہ یہ کوئی فلمی سچویشن نہیں ہے' جس میں ہیرو ایک نعرہ مستانہ لگا کر اٹھے گا اور کشتوں کے پشتے لگادے گا۔"

ایک ثانیے کے لئے میرے ذہن میں یہی خیال آیا تھا لیکن اب وہ جذباتیت کی لہر گزر چکی تھی۔ میں ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لینے لگا۔ اس بے پناہ طویل و عریض ہال میں اے نن اکیلا ہی نظر آرہا تھا۔ ہال کے دور اُفتادہ گوشے ملگجے اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ دیواریں کہاں ہیں اور ان میں کہیں کوئی دروازہ بھی ہے یا نہیں؟

اے نن بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "کسی قسم کی ہاتھا پائی' مار دھاڑ یا اٹھا پٹخ کا خیال بھی دل میں مت لانا۔ یہ تھرڈ ریٹ لوگوں کی باتیں ہیں۔ کسی قسم کا فلمی سین بھی یہاں نہیں چلے گا۔ نہایت سکون اور پرامن ماحول میں کچھ باتیں' کچھ فیصلے ہوں گے۔ تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ تم یہاں اپنے آپ کو قیدی نہیں مہمان سمجھو۔ تمہیں بے ہوش کرکے لانا ہماری مجبوری تھی۔ اپنی خوشی سے تم کبھی نہ آتے خواہ ہم تمہیں کتنا ہی سمجھاتے۔"

اس کی یہ بات درست تھی۔ میں نے اس نکتے پر بھی غور کیا کہ بالفرض میری جسمانی توانائی لوٹ بھی آئے اور میں کسی طرح اے نن پر قابو بھی پالوں تب بھی کیا اس کا کوئی فائدہ ہوگا؟ مجھے اس جگہ کا تو کیا' اس ہال کا بھی حدود اربعہ معلوم نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس پر قابو پانے یا اسے ہلاک کرنے کے بعد بھی میں اس ہال سے نکل نہ پاتا اور اس سے بھی زیادہ بُری صورت حال میں پھنس جاتا۔ بعض مسائل طاقت سے حل نہیں ہوتے۔

"تو پھر اب مہمان کے لئے کیا حکم ہے؟" میں نے ہموار لہجے میں پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ ایسی جلدی کیا ہے۔" وہ اطمینان سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "ابھی تمہارا ذہن سُست ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ جب تم مذاکرات کی میز پر بیٹھو تو تمہارا ذہن پوری طرح مستعد ہو تاکہ تم صحیح طور پر سوچ بچار کرسکو اور ہر بات کا معقولیت سے جواب دے سکو۔"

"کیا یہاں کوئی گول میز کانفرنس منعقد ہورہی ہے؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں دریافت کیا۔

"نہیں۔ میز تو مستطیل ہی ہوگی۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "لیکن یہ کانفرنس بہت سی گول میز کانفرنسوں سے زیادہ اہم ہوگی۔ اب تم آرام کرو۔"

اس کے ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول نما کوئی چیز تھی حالانکہ ان دنوں ہمارے ہاں ریموٹ کنٹرول چیزوں کا استعمال شروع نہیں ہوا تھا۔ اس نے ریموٹ کنٹرول کا رخ میرے اسٹریچر نما بیڈ کی طرف کرتے ہوئے کوئی بٹن دبایا اور بیڈ آہستہ آہستہ فرش میں دھنسنے لگا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے لفٹ نیچے جارہی ہو۔

دوسرے ہی لمحے بیڈ مجھ سمیت فرش کی سطح سے نیچے جاچکا تھا اور اوپر مستطیل جگہ خالی نہیں رہی تھی بلکہ فرش برابر ہوگیا تھا اور بیڈ پر بیٹھے ہی بیٹھے گویا ایک تاریک عمودی سُرنگ میں نیچے اتر رہا تھا۔ سُرنگ زیادہ گہری ثابت نہیں ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ کسی عمارت کی دو منزلوں جتنی گہرائی تھی۔

اندھیرے ہی میں بیڈ نہایت آہستگی سے رک گیا اور میرے پائنتی کی طرف ایک دروازے کی سی صورت میں روشنی نمودار ہوئی۔ ایک لمحے بعد مجھے احساس ہوا کہ درحقیقت وہ ایک تنگ سا دروازہ ہی تھا جو کھل گیا تھا۔ اسٹریچر نما بیڈ گویا ایک معمولی سی ڈھلان پر تھوڑا سا پھسل کر اس دروازے سے گزرا اور رک گیا۔

میں نے اپنے آپ کو ایک بہت ہی چھوٹے سے بیڈ روم میں پایا۔ بیڈ روم کیا تھا... کسی بحری جہاز کے کیبن کو نہایت جدید' خوبصورت اور صاف ستھرا بنا دیا گیا تھا۔ اس کا صرف رقبہ کم تھا ورنہ وہ ہر اعتبار سے ایک نہایت شاندار اور پرتعیش بیڈ روم تھا۔ یہاں کی دیواریں' چھت اور فرش وغیرہ چکنے صاف اور ٹھوس پلاسٹک کی شیٹوں سے بنے ہوئے معلوم ہورہے تھے۔ یہاں ایک خوشگوار خنکی اور فرحت بخش خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ جگہ تنگ ہونے کے باوجود گھٹن کا ذرا بھی احساس نہیں تھا۔

خوشبو شاید اس خوبصورت عورت کے وجود کی تھی جو ایک کونے میں روبوٹ کی طرح سیدھی کھڑی تھی۔ وہ ایک نہایت اسمارٹ اور ہلم' سفید فام عورت تھی لیکن یہ اندازہ لگانا بہت مشکل تھا کہ وہ کس ملک کی تھی۔ بعض عورتیں اپنی رنگت کے پھیکے پن کی وجہ سے پہچانی جاتی ہیں کہ وہ روسی ہیں۔ بعض کے سرخ بال ان کے جرمن ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ بعض کے سنہرے بال اور تیکھے نقوش ان کے فرانسیسی ہونے کی دلیل لگتے ہیں اور بعض کی حد سے زیادہ نیلی' شفاف آنکھیں ان کے انگریز ہونے کا امکان ظاہر کرتی ہیں۔

لیکن یہ سب حتمی نشانیاں نہیں ہیں۔ ان میں سے کوئی سی بھی نشانی کسی بھی قومیت کی لڑکی میں پائی جاسکتی ہے اور یہ سب نشانیاں کسی ایک لڑکی میں بھی جمع ہوسکتی ہیں۔ مجھ جیسا پاکستانی' جس نے بیرونی ممالک میں بہت زیادہ عرصہ بھی نہیں گزارا تھا یقین سے بھلا کوئی بات کیونکر کہہ سکتا تھا۔

لڑکی کے ہلکے سنہرے' ریشمی اور سیدھے بال اس کے کندھوں پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ ڈاکٹروں یا لیبارٹری میں کام کرنے والوں کی طرح لمبا سا سفید اوورآل پہنے ہوئے تھی۔ نیچے ہلکے بادامی سے رنگ کا ٹراؤزر تھا۔ پیروں میں کینوس کے خوبصورت' نفیس اور نازک سے جوتے تھے' اس کی اپنی شخصیت کی طرح۔ کمرے میں دن کا سا اجالا پھیلا ہوا تھا اور وہ خود بھی اجالے سے کم نہیں تھی۔

میرا اسٹریچر نما بیڈ عین اس کے سامنے جاکر رکا تھا اور میں اس پر کچھ اس طرح ایک کہنی کے بل نیم دراز تھا جس طرح چھوٹے موٹے دیہات میں چوہدری اپنی چوپال میں بیٹھتے ہیں۔ وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کے لئے میں نے اپنے آپ کو احمق سا محسوس کیا۔

لڑکی کی مسکراہٹ روشن تر ہوگئی۔ وہ دیوار سے بجڑے ہوئے بیڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئی شیریں لہجے اور نکھری نکھری انگریزی میں بولی۔ "مسٹر چوہدری! آپ اس بیڈ پر تشریف لے آیئے اور آرام کیجئے۔"

شاید اسے اندیشہ تھا کہ زیادہ روانی سے انگریزی بولنے پر میں آسانی سے سمجھ نہیں سکوں گا۔ بیڈ زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا مگر پھولا پھولا، گدیلا اور آرام دہ نظر آرہا تھا۔ میں اسٹریچر نما بیڈ سے نیچے اترے بغیر ہی بیڈ پر منتقل ہوگیا۔ میرے جسم پر اس وقت وہی شب خوابی کا لباس تھا جو میں اپنے گھر میں پہن کر سویا تھا۔

بیڈ بہت آرام دہ تھا اور میرے جسم پر ابھی تک نقاہت کا غلبہ تھا۔ میں آرام سے لیٹ گیا۔ لڑکی نے اسٹریچر نما بیڈ کی ایک پائے کو چھوا۔ شاید اس میں کوئی لیچ بٹن موجود تھا۔ بیڈ جس طرح اس کمرے میں پہنچا تھا بالکل اسی طرح واپس روانہ ہوگیا۔ کمرے سے اس کے نکلتے ہی تنگ سا مستطیل دروازہ بند ہوگیا اور کمرا چاروں طرف سے کسی خوبصورت اور آراستہ بڑے سے صندوق سے مشابہ دکھائی دینے لگا۔

میں اب بھی گہری نظروں سے لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے پر کسی اسکول کی نوخیز لڑکی جیسی معصومیت تھی۔ سفید گاؤن کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ میرے بیڈ کے قریب آگئی اور اسی نکھرے نکھرے لہجے میں بولی۔ "سر! آپ کچھ پینا پسند کریں گے۔"

"ہاں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "لسی مل جائے گی؟"

"کیا! لسی...؟" اس کی معصوم نیلی آنکھیں قدرے حیرت سے پھیل گئیں۔ شاید اسے معلوم تو تھا کہ لسی کیا ہوتی ہے لیکن فوری طور پر اسے یاد نہیں آسکا تھا۔ جوں ہی یاد آیا' اس کی آنکھیں معمول پر آگئیں اور وہ قدرے مایوسی سے بولی۔ "سر! میرا خیال ہے کہ فوری طور پر آپ کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی جاسکے گی۔"

"کتنی سائنسی ترقی نظر آرہی ہے یہاں۔" میں نے ہاتھ پھیلا کر چاروں طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "لیکن کیا فائدہ ایسی سائنسی ترقی کا' جو انسان کو ایک گلاس لسی بھی فراہم نہ کرسکے۔" میں نے مایوسی سے سرہلایا اور سخت مغموم نظر آنے کی اداکاری کی۔ میں اس کے معصوم سے چہرے پر پریشانی اور ندامت کے آثار دیکھ کر دل ہی دل میں محظوظ ہورہا تھا لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ کیا وہ حقیقتاً اتنی ہی معصوم تھی جتنی نظر آرہی تھی؟ وہ یقیناً عمر چور بھی تھی۔ اس کی عمر یقیناً اس سے زیادہ تھی جتنی عمر کی وہ نظر آرہی تھی۔

"سر! کسی اور ڈرنک کا حکم دیجئے۔ وھسکی' جن' وُوڈکا... جو بھی آپ پسند کریں۔" وہ نیم التجائیہ سے لہجے میں بولی۔

"نہیں۔" میں نے منہ بنا کر کہا۔ "ان بے ہودہ مشروبات میں کیا رکھا ہے۔ مجھے تو صرف لسی سے نشہ چڑھتا ہے۔ ناشتے میں بھی لسی پیتا ہوں اور رات کو سوتے وقت "نائٹ کیپ" کے طور پر بھی لسی کو ہی دل چاہتا ہے۔ لیکن خیر... تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں اس کے بغیر بھی گزارا کرلوں گا۔"

"شکریہ مسٹر چوہدری۔" اس نے گویا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے شیریں لہجے میں کہا۔ "اب میں جاؤں؟"

"کس کمبخت کا دل چاہتا ہے کہ تم جیسے مہمانوں کو جانے کے لئے کہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر عاشقانہ لہجے میں کہا۔

"سر! میں مہمان نہیں' میزبان ہوں۔" اس نے اسکول کی لڑکیوں والی بھولپن آمیز سنجیدگی سے تصحیح کی۔

"میری گرامر کمزور ہے۔ زبان و بیان کی غلطیوں پر تم زیادہ توجہ مت دینا۔" میں نے مشورہ دیا۔

"یس سر۔" اس نے سعادت مندی سے کہا اور اس دیوار کی طرف بڑھ گئی جس میں چند لمحے پہلے شگاف نمودار ہوا تھا مگر اب وہ پہلے ہی کی طرح ہموار اور بے جوڑ نظر آرہی تھی۔ دیوار کے قریب پہنچتے ہوئے وہ بولی۔ "آپ اب آرام کیجئے سر۔ اگر مجھے بلانے کی ضرورت محسوس کریں تو بیڈ کے قریب دیوار پر انگلی رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈال لیجئے گا۔"

"ایسے خطرناک رازوں سے مجھے آگاہ مت کرو۔" میں نے کراہ کر کہا۔ "ایسا نہ ہو کہ میں اس دیوار سے ہی ٹیک لگا کر سوجاؤں۔"

وہ محتاط انداز میں دھیرے سے ہنسی اور بولی۔ "آپ بہت دلچسپ آدمی ہیں سر۔" یہ ایک نہایت ہی رسمی سا ریمارک تھا۔ اس نے میرے جواب کا انتظار نہیں کیا۔

اس نے اپنے سامنے کی دیوار پر انگلی رکھی اور ویسا ہی تنگ سا مستطیل دروازہ پیدا ہوگیا جیسا کہ میرے اسٹریچر نما بیڈ کے اس کمرے میں آتے وقت پیدا ہوا تھا۔ وہ باہر جاچکی تو دیوار کا وہ شگاف پھر برابر ہوگیا۔ اب میں نے ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ہلکی سی ایک لکیر دیوار میں مستطیل ٹکڑے کی موجودگی کی نشاندہی کرتی تھی۔ یہ ٹکڑا ذرا سا پیچھے ہٹ کر دیوار ہی میں ایک طرف کو کھسک جاتا تھا تو دروازے جیسا شگاف پیدا ہوجاتا تھا۔

مجھے اس وقت واقعی ذہنی و جسمانی' دونوں طرح کے آرام کی ضرورت محسوس ہورہی تھی لیکن لڑکی کے جاتے ہی میں اٹھ بیٹھا۔ میں نے ایک منٹ انتظار کیا پھر بیڈ سے اتر کر دیوار پر عین اسی جگہ پر انگلی رکھی جہاں لڑکی نے رکھی تھی اور دیوار میں شگاف نمودار ہوگیا تھا۔

لیکن میرے انگلی رکھنے سے شگاف نمودار ہونا تو درکنار' کہیں ذرا سا سوراخ بھی نمودار نہیں ہوا۔ الٹا میری انگلی میں گویا کوئی لمبی سی سوئی اتر گئی۔ میں اچھل کر پیچھے ہٹا اور میرے حلق سے اذیت بھری آواز نکلتے نکلتے رہ گئی۔ میں نے اسے ہونٹوں میں ہی دبا لیا اور انگلی کا جائزہ لیا۔ انگلی صحیح سلامت تھی۔ صرف اس میں ہلکی سی جھنجھناہٹ باقی تھی۔

اسی لمحے کمرے میں لڑکی کی آواز ابھری۔ وہ متاسفانہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "سر! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ ایسی اُلٹی سیدھی حرکتوں کی کیا ضرورت ہے؟ آرام سے سوجائیں۔"

وہ بالکل اس طرح بات کررہی تھی جیسے دیوار شیشے کی ہو اور وہ اس کی دوسری طرف کھڑی میری تمام حرکات و سکنات دیکھ رہی ہو لیکن اس کی آواز میرے عقب سے سنائی دی تھی۔ میں نے گھوم کر دیکھا۔

پہلی نظر میں مجھے یہی محسوس ہوا کہ بیڈ کی پائنتی کی طرف جو دیوار تھی' اس میں ذرا بلندی پر واقع ایک چوکور شگاف سے وہ کمرے میں جھانک رہی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے احساس ہوا کہ دیوار میں درحقیقت ذرا بلندی پر ٹی وی کی طرح ایک چھوٹا سا اسکرین موجود تھا جو پہلے روشن نہیں تھا تو دیوار ہی کا ہم رنگ نظر آرہا تھا لیکن اب روشن ہوگیا تھا تو اس کی موجودگی کا احساس ہورہا تھا۔ اس پر اس لڑکی کا کلوزاپ نظر آرہا تھا لیکن وہ جیسے ٹی وی اسکرین پر نظر نہیں آرہی تھی بلکہ حقیقت میں سامنے کسی روشندان سے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ یعنی صرف میں ہی اسے نہیں دیکھ رہا تھا بلکہ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔

اس کے چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات تھے جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کی حرکت پر اس سے خفا ہونے کی اداکاری کررہا ہو۔ اس کے معصوم سے چہرے پر اس طرح کا مربیانہ تاثر دیکھ کر میرا ہنسنے کو جی چاہا۔

"سر!" وہ ایک بار پھر مؤدبانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے بولی۔ "آپ کو جب بھی اور جو بھی کام ہو' مجھ سے کہئے گا۔ آپ اپنے طور پر کچھ کرنے کی کوشش مت کریں۔ آپ کو نقصان بھی پہنچ سکتا ہے۔"

"نفع نقصان کی تو خیر زندگی میں کبھی تمہارے اس خادم نے پروا نہیں کی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر بیڈ پر واپس آتے ہوئے کہا۔ "لیکن تم اتنے پیار سے کہہ رہی ہو تو تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ یہ بہت بری عادت ہے مجھ میں کہ حسین لوگ پیار سے کوئی بات کہیں تو میں ٹال نہیں سکتا۔"

اسکرین سے ہی اس نے میرے بیڈ کے ساتھ والی دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس دیوار کے علاوہ آپ دیوار یا کسی بھی چیز کو ہاتھ مت لگائیں۔ آپ کو کوئی بھی مسئلہ درپیش ہو' آپ بس اس دیوار کو انگلی سے چھوئیں۔"

"عجیب امرت دھارا قسم کی دیوار ہے۔" میں نے اردو میں کہا' پھر جلدی سے انگریزی میں سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "مسئلہ تو بس یہی درپیش ہے کہ میں اپنے گھر جانا چاہتا ہوں۔"

"یہ میرے اختیار میں نہیں ہے سر' ورنہ میں فوراً آپ کے حکم کی تعمیل کرتی۔" وہ بڑی عاجزی اور ملائمت سے بولی۔

پھر وہ اسکرین پر دھیرے دھیرے پیچھے کو جانے لگی۔ اس کے سفید گاؤن کا کالر نظر آیا تو میں نے کہا۔ "میں تم سے پوچھنا بھول گیا تھا۔ تم ڈاکٹر ہو؟"

"نہیں سر!" اس نے میٹھی سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

"یہاں کسی لیبارٹری وغیرہ میں کام کرتی ہو؟"

"نہیں سر' یہاں کوئی لیبارٹری وغیرہ نہیں ہے۔"

"تو پھر تم کون ہو؟"

"میں آپ کی خادمہ ہوں سر۔"

"اف!" میں دھم سے بستر پر گر گیا۔ "مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں اتنا خوش قسمت ہوگیا ہوں۔ اتنی حسین' نفیس اور شاندار خادمائیں میسر آنے لگی ہیں مجھے۔ میں گدھا خواہ مخواہ گھر جانے کی آرزو کررہا تھا۔"

"آپ اسے اپنا گھر ہی سمجھیں سر۔" وہ محبت سے مسکرائی۔

"ٹھیک ہے۔ اب تو تم لوگ مجھے دھکے دے کر بھی یہاں سے نکالوگے تو میں نہیں جاؤں گا۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر خلوص دل سے کہا۔

"سر! یہاں کس کی جرات ہے جو آپ کو دھکے دے سکے۔ آپ ہمارے خاص مہمان ہیں اور ہمارا خاص مہمان ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔"

"میں خود بھی ہر ایک کو شرف میزبانی نہیں بخشتا۔ یہ اعزاز کسی کسی کو ہی نصیب ہوتا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسی اور پھر دیوار میں نصب وہ اسکرین سادہ ہوگیا۔ اب اس کا رنگ تقریباً دیوار جیسا ہی تھا اسی لئے وہ سرسری نظر میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر با آواز بلند کہا۔ "اس کمرے میں تو انسان کو ذرا سی پرائیویسی بھی میسر نہیں۔"

میں نے ایک بار پھر اسکرین کی طرف دیکھا لیکن وہ بدستور سادہ رہا۔ اب اس پر کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا اور نہ ہی کوئی آواز سنائی دی۔ میں نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کرلیں۔

حقیقت یہ تھی کہ میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ نہ جانے وہ کون سی گیس تھی جو مجھ پر استعمال کی گئی تھی۔ ابھی تک ایک تو اس کے اثرات ذہن اور جسم پر باقی تھے' دوسرے جو کچھ میں دیکھ رہا تھا وہ بھی کم تشویش ناک نہیں تھا۔ اتنا جدید انداز رہائش' اتنے سائنٹیفک طور طریقے آخر کس لئے اختیار کئے گئے تھے؟ یہ سب انتظامات کب اور کس نے کئے تھے؟ کس لئے کئے گئے تھے؟ ریڈ ڈاٹ والے کیا اپنے پاؤں یہاں اتنے مضبوط کرچکے تھے؟ کس لئے وہ اتنا تردد کررہے تھے؟ یہاں ان کا یہ ایک ہی ٹھکانا تھا یا ایسے اور بھی ٹھکانے موجود تھے؟ ابھی تو مجھے اس

ٹھکانے کی وسعت کا ہی کوئی اندازہ نہیں تھا۔ ستارہ بھی ایک رات یہاں قیام کرکے جاچکی تھی۔ اس نے مجھے جو کچھ بھی بتایا تھا اس کے مطابق یہاں اور بھی بہت سے کمرے تھے۔ ابھی نہ جانے کتنے گوشے ایسے رہے ہوں گے جو ستارہ بھی نہیں دیکھ سکی ہوگی۔

سوچتے سوچتے میرے ذہن کا بوجھل پن بڑھ گیا لیکن محض سوچنے سے میرے سوالوں کے جوابات نہیں مل سکتے تھے۔ اس لئے میں نے بہتر سمجھا کہ کچھ دیر واقعی آرام کرلیا جائے۔ اگر وہ لوگ موقع دے ہی رہے تھے تو اس سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔ اپنے اس پرانے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے میں جلد ہی سوگیا۔

جب میری آنکھ کھلی تو مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوسکا کہ میں کتنی دیر سویا تھا کیونکہ میری کلائی پر گھڑی نہیں تھی اور کمرے میں پھیلی ہوئی سفید روشنی سے بھی یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس وقت دن ہے یا رات۔ وہ دن کے اجالے اور ٹیوب لائٹس کی روشنی' دونوں ہی سے مختلف تھی۔ اس پر قدرتی روشنی کا بھی گمان ہوتا تھا اور مصنوعی روشنی کا شبہ بھی۔ وہ پوری چھت سے پھوٹتی محسوس ہوتی تھی۔ یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ چھت میں کہیں روشنیاں نصب تھیں۔ پوری چھت ہی یکساں روشن تھی۔

چند انگڑائیاں اور جماہیاں لینے کے بعد میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ اب میں اپنے آپ کو بالکل تازہ دم اور توانا محسوس کررہا تھا' جس طرح عام حالات میں محسوس کیا کرتا تھا لیکن میں نے پوری کوشش کی کہ اپنے چہرے پر اضمحلال ہی طاری رکھوں۔ مستعد اور پوری طرح بیدار نظر نہ آؤں۔

پھر میں نے کن انکھیوں سے دیوار گیر اسکرین کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور سادہ تھا لیکن نہ جانے کیوں کچھ ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے وہ کوئی آنکھ تھی جو میری خلوت میں جھانک رہی تھی۔

جب لڑکی اس اسکرین پر مجھ سے مخاطب تھی تو اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے میری بھی تمام حرکات و سکنات دکھائی دے رہی تھیں لیکن اس طرح کا اسکرین' کلوز سرکٹ ٹی وی کیمرے کا بھی کام دیتا' یہ میری معلومات کے مطابق ممکن نہیں تھا۔

اس بار میں نے اٹھ کر دیوار یا ٹی وی اسکرین سے چھیڑ چھاڑ کی کوشش نہیں کی۔ اپنی جگہ پر بیٹھے ہی بیٹھے اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ کیمرے کی آنکھ یعنی کیمرے کا لینس کہاں پوشیدہ ہوسکتا ہے لیکن مجھے کچھ اندازہ نہ ہوسکا۔ میں نے زیادہ سر کھپانے کی کوشش بھی نہیں کی اور فیصلہ کیا کہ لڑکی کی ہدایت پر عمل کرکے دیکھنا چاہئے۔

میں نے اپنے بیڈ کے دائیں طرف جڑی ہوئی دیوار کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر پلاسٹک کی چکنی سی دیوار دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس وقت اپنے آپ کو ایک خوبصورت کیبن میں مقید محسوس کررہا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں کھلے ہوئے تھے۔ مجھے وہاں کوئی تکلیف بھی محسوس نہیں ہورہی تھی۔ گرمی' گھٹن یا حبس کچھ نہیں تھا لیکن اپنی مرضی کے خلاف کہیں موجود ہونے کی اپنی ایک گھٹن ہوتی ہے۔ کہیں قید ہونے کے احساس کے ساتھ ایک عجیب سا حبس کا بھی احساس ہوتا ہے۔

میں نے دیوار پر آہستگی سے انگلی رکھی۔ انگلی میں نے دائیں طرف کی دیوار پر رکھی تھی اور ٹی وی اسکرین میرے پیروں کی جانب دیوار میں ذرا بلندی پر موجود تھا لیکن اس لمس کے ساتھ ہی اسکرین روشن ہوگیا۔ ایک لمحے بعد اس پر اسی لڑکی کا چہرہ نمودار ہوا۔

وہ اپنے مخصوص دلکش انداز میں مسکرائی۔ "شکر ہے آپ جاگ گئے سر' میں تو سمجھی تھی آپ سونے کا کوئی ریکارڈ قائم کرنا چاہتے ہیں۔"

"کیا میں بہت دیر سویا ہوں؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"خیر چھوڑیئے اس بات کو۔" اس نے گویا اس سوال کے جواب سے گریز ہی مناسب سمجھا۔ "امید ہے اب آپ خود کو تازہ دم محسوس کررہے ہوں گے۔"

"کچھ ایسا خاص نہیں۔" میں نے منہ کچھ اور لٹکاتے ہوئے کہا۔

اس کی خوبصورت پیشانی پر تشویش کی لکیریں ابھر آئیں۔ "کیا میں ڈاکٹر کو آپ کے پاس بھیجوں؟"

"نہیں۔ ہرگز نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "ڈاکٹر کی تو میں صورت ہی دیکھ کر بیمار ہوجاتا ہوں۔ میری صحت کا راز یہی ہے کہ میں ڈاکٹروں سے دور رہتا ہوں۔"

"اوہ۔۔۔" وہ دھیمے اور مترنم انداز میں ہنسی لیکن فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "سر! مجھے خوشی ہے کہ ایک طویل عرصے بعد آپ جیسے خوش مزاج انسان کی خدمت کا موقع مل رہا ہے لیکن آپ کو ابھی تک مضمحل نہیں رہنا چاہئے تھا۔ یہ ذرا تشویش کی بات ہے۔ کہیں اس گیس کا ڈوز زیادہ نہ ہوگیا ہو جس سے آپ کو بے ہوش کیا گیا تھا۔ میرا خیال ہے میں ڈاکٹر کو بھیج ہی دوں۔"

"خدا کے لئے میرے سامنے بار بار ڈاکٹر کا نام مت لو۔" میں نے کراہ کر کہا۔ "میری مضمحل نظر آنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مجھے بڑے زور کی بھوک لگی ہوئی ہے۔ یہاں آکر تم لوگوں کی خوش خلقی دھری رہ گئی ہے کہ تم نے ابھی تک مجھے کھانے کے لئے نہیں پوچھا۔"

"میں پوچھنے ہی والی تھی سر۔" اس کے چہرے پر نہایت وضعدار انسانوں والی شرمندگی جھلک آئی۔ "آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟"

"اگر قتلمے مل جائیں تو ذرا لطف رہے گا۔" میں نے ذرا

مسکین سی شکل بنا کر کہا۔

"قت۔۔۔ لمے۔۔۔" اس نے اٹکتے ہوئے حیرت سے اپنے تلفظ میں دہرایا۔ "وہ کیا ہوتے ہیں سر؟"

"اس انسان کی بھی کوئی زندگی ہے جسے یہی معلوم نہ ہو کہ قتلمے کیا ہوتے ہیں۔" میں نے ایک لمبی سی آہ بھر کر کہا۔ "جب تم جانتی ہی نہیں ہو کہ قتلمے کیا ہوتے ہیں تو تم ان کا انتظام کیا کروگی۔"

"سر! اگر آپ اسی قسم کی چیزوں کی فرمائش کرتے رہے تو مجھے اندیشہ ہے کہ آپ بھوکے پیاسے ہی رہ جائیں گے۔" اس نے مؤدبانہ انداز میں مجھے احساس دلایا۔

"مجھے بھی یہی محسوس ہورہا ہے۔" میں نے کہا۔ "چلو خیر' چھوڑو ان چیزوں کو۔ تم جو مناسب سمجھو کھلا دو۔ بس کوئی حرام چیز مت کھلانا۔ تمہیں معلوم ہے نا' ہم لوگوں کے ہاں کیا کیا چیزیں حرام ہوتی ہیں اور کیا کیا حلال؟"

"جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے سر۔" وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "میں تھوڑی دیر میں کھانا لے کر حاضر ہوتی ہوں۔"

"میں نے تمہارا نام ابھی تک نہیں پوچھا۔" میں نے کہا۔

"مجھے لیونا کہتے ہیں سر۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔

"تم امریکی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب دینا میرے دائرہ اختیار میں نہیں آتا سر۔" اس نے معذرت خواہانہ انداز میں مسکراتے ہوئے کہا اور اسکرین سے غائب ہوگئی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ آخر کار دائرہ اختیار یہاں بھی بیچ میں آہی گیا تھا' دائرہ اختیار' قدم قدم پر بڑے مسئلے کھڑے کرتا تھا۔

چند منٹ کے بعد وہ ایک خوبصورت ٹرالی کو صرف انگوٹھے اور ایک انگلی کے سہارے دھکیلتی ہوئی آن پہنچی۔ ٹرالی پر ایک خوبصورت ٹرے میں نفاست سے کچھ برتن سجے ہوئے تھے۔ کھانا ذرا انگریزی قسم کا تھا لیکن بہرحال عمدہ تھا۔ میرے کھانا کھانے کے دوران وہ مؤدبانہ انداز میں ایک طرف کھڑی رہی۔

چند منٹ خاموشی سے کھانا کھانے کے بعد میں نے سر اٹھا کر گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "لیونا! سچ سچ بتاؤ' کیا میری حیثیت یہاں قیدی کی ہے؟"

"ہرگز نہیں سر۔" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "آپ نے ایسا کیوں سوچا سر کیا مجھ سے کوئی گستاخی سرزد ہوگئی ہے؟"

میں ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس سے کچھ بھی پوچھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ یقیناً لگے بندھے' رٹے رٹائے اور رسمی جواب دینے پر مامور تھی۔ پھر بھی میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے پوچھا۔ "مجھے کس لئے یہاں لایا گیا ہے؟"

"جہاں تک مجھے معلوم ہے' آپ کو یہاں کسی میٹنگ میں شرکت کرنی ہے۔ آپ کھانا کھا کر' چائے کافی وغیرہ پی کر فریش ہوجائیں۔ جب آپ پسند کریں گے تب آپ کو میٹنگ میں لے جایا جائے گا۔" اس نے سادگی سے جواب دیا۔

"لیونا!" میں نے اپنائیت بھرے لہجے میں کہا۔ "جو کچھ میں جاننا چاہتا ہوں وہ مجھے تم سے معلوم ہونے کی توقع تو نہیں لیکن یونہی۔۔۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے پوچھ رہا ہوں۔ میں اور تم اس کمرے میں بند ہیں۔ فرض کرو میں اچانک تمہاری اس نازک سی خوبصورت گردن پر کراٹے کا ایک ہاتھ مار کر اسے توڑ دوں۔۔۔ گو کہ میں حسین مخلوقات کے ساتھ اس قسم کی غیر شاعرانہ حرکت کرنے کا قائل نہیں ہوں لیکن انسان بہرحال خطا کا پتلا ہے' کبھی جھنجلاہٹ میں اچانک اس سے کوئی ایسی بے ہودہ حرکت سرزد ہوسکتی ہے۔ اس صورت میں کیا ہوگا؟"

اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور اس نے کچھ ایسی مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا گویا اس کی محبوب اور نہایت قابل اعتماد ہستی نے دھوکے سے اس کی کمر میں خنجر گھونپنے کی بات کردی ہو۔

میٹھی میٹھی سی آواز میں وہ بولی۔ "سر' ایسا سوچئے گا بھی نہیں۔ اگر مجھے کچھ ہوگیا تو یہ کمرا آپ کے لئے ایک سجی سجائی قبر میں تبدیل ہوجائے گا۔ روشنی اور ائرکنڈیشن بند ہوجائیں گے' چند منٹ میں آپ کا دم گھٹ جائے گا اور آپ دیواروں سے سر ٹکراتے ٹکراتے خدانخواستہ مرجائیں گے۔ یہاں کی ہر چیز ان بریک ایبل اور فول پروف ہے۔ آپ کوئی دروازہ توڑ نہیں سکیں گے۔ کسی جگہ اتنا سا شگاف بھی نہیں بنا سکیں گے کہ ایک ہاتھ ہی باہر نکال سکیں۔ کوئی آپ کو یہاں سے نکالنے نہیں آئے گا بلکہ نہ جانے کتنے دنوں تک کوئی یہ بھی دیکھنے نہ آئے کہ آپ کی لاش کس حال میں ہے۔"

"اور اگر میں تمہیں یرغمال بنالوں؟" میں نے بدستور سنجیدگی سے پوچھا۔ نہ جانے کیوں مجھے امید تھی کہ اس کے پاس ایٹمی' کیمیائی یا شعاعی قسم کا کوئی ہتھیار نہیں ہوگا جیسا کہ عموماً سائنس فکشن پر مبنی فلموں میں لڑکیوں وغیرہ کے پاس ہوتا ہے جس کا ٹریگر دباتے ہی وہ کشتوں کے پشتے لگادیتی ہیں' انسانوں کو بھاپ بنا کر اڑادیتی ہیں یا چٹانوں کو ریزہ ریزہ کردیتی ہیں۔

اس نے بھی میرے خیال کی تصدیق کردی۔ دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی۔ "آپ چاہیں تو ایسا کرسکتے ہیں سر' میرے پاس کوئی ہتھیار تو کیا' نیل کٹر تک نہیں ہے۔ ویسے بھی میں ہاتھا پائی وغیرہ پر یقین نہیں رکھتی۔ میں ایک امن پسند' مہذب اور شائستہ لڑکی ہوں۔ مجھے یرغمال بنانے میں آپ کو ذرا بھی دقت پیش نہیں آئے گی لیکن اس کا نتیجہ بھی وہی ہوگا جو میں بیان کرچکی ہوں۔"

"تم میرے ساتھ ہوگی تب بھی؟" میں نے پوچھا۔

"یس سر۔ اس صندوق میں ایک کے بجائے دو لاشیں پڑی

ہوں گی۔" اس نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"تمہیں بھی کوئی بچانے نہیں آئے گا؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"نہیں سر۔ یہ کوئی ضروری تو نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"یہی قدر ہے تمہارے ہاں کارکنوں کی؟" میں نے اپنے لہجے میں طنز سمونے کی کوشش کی۔ "ریڈ ڈاٹ یہی صلہ دیتی ہے اپنے جاں نثاروں کی خدمات کا؟"

"میں ریڈ ڈاٹ کی ایک ادنیٰ خادمہ ہوں سر! اگر میری جان کسی کام آجائے تو میں اسے اپنے لئے فخر سمجھوں گی۔ یہ اعزاز ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں زمانے بھر کا خلوص اور عقیدت سمٹ آئی تھی۔

مجھے ایسی تنظیموں کے بارے میں پڑھ کر یا کسی بھی ذریعے سے ان کے بارے میں جان کر سخت حیرت ہوتی تھی جو خواہ کیسے ہی مذموم مقاصد کے لئے کام کر رہی ہوتی تھیں لیکن ان کے کارکنوں کا ایمان ہوتا تھا کہ وہ نہایت ہی اعلیٰ، ارفع اور عظیم ترین مقاصد کے لئے کام کر رہے ہیں اور وہ بڑی خوشی سے اس راہ میں جان دے کر اس طمانیت کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوتے تھے گویا انہوں نے عظمتوں کی نہ جانے کون سی بلندیوں کو چھولیا اور بنی نوع انسان کے لئے وہ زمین پر نہ جانے کون سی جنت تخلیق کر کے جا رہے ہیں۔

مجھے حیرت ہوتی تھی کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں قربانی کے ان بکروں کی تکمیل ہوتی تھی وہ انہیں کون سا تعویذ گھول کر پلاتے تھے، کون سی گیدڑ سنگھی سنگھاتے تھے کہ ان میں اپنی کوئی قوت فیصلہ اور اپنے طور پر صحیح و غلط میں امتیاز کرنے کی کوئی صلاحیت ہی نہیں رہ جاتی تھی۔ انہیں کچھ بھی نظر نہیں آتا تھا اور کچھ بھی سنائی نہیں دیتا تھا۔ بس وہ نہایت جاں نثاری سے ان دیکھی بھٹیوں کا ایندھن بننے کے لئے تیار رہتے تھے۔

میرے اپنے ساتھی بھی میرے جاں نثار تھے۔ وہ بھی میرے احکامات پر آنکھیں بند کر کے عمل کرتے تھے لیکن ان کی اپنی عقل، اپنا شعور اور اپنی قوت فیصلہ آزاد تھی۔

مجھے معلوم تھا، میں ان سے کوئی غلط کام نہیں لے سکتا تھا، کسی کمزور اور بے گناہ پر ظلم نہیں کرا سکتا تھا۔ وہ صرف ظلم اور زیادتی کا جواب دینا جانتے تھے یا اپنے دفاع کے لئے جو مناسب سمجھتے وہ کر سکتے تھے۔ میں نے انہیں اس نظریئے کے ساتھ زندہ رہنے کی تربیت دی تھی کہ کسی کے ساتھ زیادتی مت کرو اور اپنے ساتھ زیادتی مت ہونے دو۔

چند لمحے اپنی سوچوں میں الجھے رہنے کے بعد میں نے کہا۔ "ایک اور فضول سا سوال بھی پوچھنا چاہوں گا۔ تم بھی سوچو گی کہ کیسے عجیب آدمی سے پالا پڑا ہے۔ ہر بات تم سے ہی پوچھے جا رہا ہے۔ ویسے تو میں شریف آدمی ہوں۔ کسی بھی معاملے میں جبر مجھے بالکل پسند نہیں ہے۔ لیکن بہرحال انسان ہوں، خطا کا پتلا ہوں۔ ہم تم ایک کمرے میں بند ہیں اور چابی نہ جانے کہاں ہے... بلکہ چابی سرے سے ہے ہی نہیں۔ فرض کرو میری نیت خراب ہو جائے...؟"

"اس میں جبر کی اور اتنی لمبی تمہید کی کیا بات ہے سر۔" اس کی مسکراہٹ میں خوشی جھلک آئی۔ "آپ کو خوش رکھنا میری میزبانی کے فرائض میں شامل ہے اور اگر آپ کی خوشی اس قسم کے معاملات میں ہے تو مجھے اس سے انکار کی اجازت نہیں ہے۔ میں آپ کی خادمہ ہوں۔ خاصے وسیع معنوں میں۔" وہ میرے قریب آگئی۔ اس کی آنکھوں میں خمار سا اترنے لگا تھا۔

"خیر... اب اتنی جلد بازی کی بھی ضرورت نہیں۔" میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "جہاں کھڑی ہو وہیں کھڑی رہو۔ ابھی تو میں صرف اپنی معلومات میں اضافہ کر رہا ہوں۔ کیا پتا ابھی کب تک یہاں رہنا پڑے۔ انسان کو معلوم تو ہونا چاہئے کہ کیا کیا سہولتیں اسے میسر ہیں اور کیا کیا نہیں۔"

"سر! آپ بالکل یہی سمجھیں جیسے اپنے گھر پر ہیں۔" وہ دلآویز انداز میں مسکرائی۔

"گھر یاد مت دلاؤ۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "گھر میں تو تنہائیاں ہیں، بے رونقی ہے۔ محبت کی تلاش میں تو مجھے ہمیشہ دوسروں کے گھر جانا پڑتا ہے۔"

"اوہ... میں تو بھول ہی گئی تھی کہ آپ غیر شادی شدہ ہیں۔" وہ بدستور مسکرا رہی تھی۔

میں نے اس وقت تک کھانا تقریباً ختم کر لیا تھا۔ وہ میرے لئے تھرمک جگ سے پانی گلاس میں انڈیلنے لگی۔ اس کے سفید گاؤن کے تمام بٹن کھلے ہوئے تھے۔ نیچے اس کے نفیس لباس میں سے اس کی تمام خوبصورتیاں نمایاں تھیں۔ میرا دل ایک لمحے کے لئے بری طرح دھڑکا لیکن میں نے اس پر قابو رکھا۔ اس کے گلے میں باریک سی زنجیر میں ایک طلائی لاکٹ موجود تھا۔ اس کی ساخت کوٹ کے اسی بٹن سے مشابہ تھی جو ایک بار ایرن سے ٹکراؤ کے دوران میرے ہاتھ لگا تھا اور بعد میں وہ نہایت ہی پیچیدہ ساخت کا ایک ننھا سا ٹرانسیسٹر ثابت ہوا تھا۔

میں نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس تھامتے ہوئے کہا۔ "میں وہ احمق ہوں جس کا غیر شادی شدہ ہونا بھی اس کے کسی کام نہیں آسکا۔ میری زندگی کسی شادی شدہ آدمی کی زندگی سے بھی زیادہ بے کیف ہے۔"

"پھر بھی آپ کی گرل فرینڈز تو ہوں گی سر۔" وہ بالکل مشرقی لڑکیوں کی طرح شرمیلے سے انداز میں مسکرائی۔

"ہاں، بس یونہی گزارے لائق دو چار ہیں۔" میں نے انکساری سے کہا۔ "لیکن ان میں سے تم جیسی خوبصورت صرف ایک بھی نہیں۔"

"دو چار گرل فرینڈز کافی نہیں ہیں سر؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ گو کہ اس کے بیشتر تاثرات اداکاری پر مبنی تھے لیکن اس کے چہرے پر بہرحال معصومیت تھی اور جب وہ اس طرح آنکھیں پھیلاتی تھی تو زیادہ معصوم نظر آنے لگتی تھی۔

"کافی تو نہیں ہیں۔" میں نے پانی کا گلاس خالی کر کے کہا۔ "لیکن ہم مشرقی لوگ قناعت پسند ہوتے ہیں۔ حرف شکایت زبان پر نہیں لاتے۔"

وہ مترنم سے انداز میں ہنسی پھر اسے گویا میرے الفاظ یاد آئے۔ شرمیلی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "سر! کیا میں خوبصورت ہوں؟"

"اتنی انجان مت بنو۔ یہ بات مجھ سے پہلے نہ جانے کتنے لوگوں نے تمہیں بتائی ہوگی۔"

"نہیں سر، کچھ اتنے زیادہ لوگوں نے تو نہیں بتائی۔" وہ سادگی سے بولی۔ "ویسے بھی بعض باتیں بار بار سننا کانوں کو بھلا لگتا ہے۔"

میں نے ٹشو پیپر سے ہاتھ منہ پونچھنے کے بعد کہا۔ "لیونا! تم اتنی اچھی لڑکی ہو کہ میرا دل چاہ رہا ہے تمہیں لے کر کہیں بھاگ جاؤں۔ چلو، تم میرے ساتھ بھاگ چلو۔ مجھے امید ہے ہماری زندگی بہت اچھی گزرے گی۔"

"میری زندگی تو اب بھی اچھی گزر رہی ہے سر۔" وہ سر جھکا کر بولی۔

"تم اسے زندگی کہتی ہو؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اچھی زندگی تو دور کی بات ہے، اسے تو زندگی کہنا بھی زندگی کی توہین لگتا ہے۔ ان صندوق نما پُراسرار کمروں میں بند، جانے انجانے مہمانوں کی خدمت میں مؤدبانہ طور پر حاضر، ان کے ایک اشارہ ابرو پر خود کو بھی پیش کرنے کے لئے تیار... یہ بھی بھلا کوئی زندگی ہے؟ تمہیں کسی کے دل کی ملکہ بن کر رہنا چاہئے۔ کھلی فضاؤں میں، گل و گلزار قسم کی جگہوں پر اپنے جیون ساتھی کے ہمراہ دوڑتے بھاگتے پھرنا چاہئے۔ جس طرح فلموں میں ہیروئنیں سلوموشن میں بھاگتی پھرتی ہیں۔ تمہارے یہ ملائم ریشمی بال سلوموشن میں لہراتے ہوئے بہت خوبصورت لگیں گے۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھنے لگی اور چند لمحے کی خاموشی کے بعد ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "سر، ایک تو آپ کے بارے میں یہ پتا نہیں چلتا کہ آپ کب سنجیدہ ہیں اور کب مذاق کر رہے ہیں۔"

"وہ تو مجھے بھی پتا نہیں چلتا۔" میں نے شکل پر مسکینی طاری کرنے کی کوشش کی۔

"بہرحال..." اس نے کندھے اچکائے۔ "میں کسی کے ساتھ کہیں بھاگ چلنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتی۔ جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، ضروری تو نہیں کہ یہی کل زندگی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ زندگی کا صرف ایک رخ ہو۔ ہو سکتا ہے یہ صرف جاب ہو، ڈیوٹی ہو، ملازمت ہو۔ اتنی جلدی آپ کیسے کوئی فیصلہ کر سکتے ہیں؟ ممکن ہے میری نجی زندگی کچھ اور ہو۔ ممکن ہے ابھی آپ کی نظر کا سفر محدود ہو۔"

"جو کچھ نظر آرہا ہے وہ بہرحال بالکل اچھا نہیں ہے۔ مجھے پسند نہیں آیا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "تم اس سے بہتر مقام کی مستحق ہو۔"

"کوئی اور بات کیجئے۔" وہ بدستور دلکش انداز میں مسکرائے جا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے وہ تھکتی ہی نہیں تھی۔

"اچھا... یہ بتاؤ یہاں ہنی نامی کوئی لڑکی بھی موجود ہے؟ وہ پرنس تہمینہ کے نام سے پچھلے دنوں انٹرکان میں ڈانس شو پیش کر رہی تھی۔" میں نے اس سے کوئی کام کی بات معلوم کرنے کی ایک کوشش اور کر ڈالی۔

میری یہ کوشش بھی ناکام رہی۔ اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ نہایت ملائمت سے وہ بلا تامل بولی۔ "مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔ میں یہاں صرف ایک ہی بیرونی آدمی کی موجودگی سے باخبر ہوں اور وہ آپ ہیں۔"

"اوہ!" میں نے مایوسی سے کہا۔ "مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا کہ دنیا میں اتنی محدود معلومات رکھنے والی لڑکیاں بھی موجود ہیں۔"

اچانک ٹی وی اسکرین روشن ہو گیا اور کسی الیکٹرونک آلے کے سگنل جیسی مختصر آواز ابھری۔ لیونا نے مڑ کر اسکرین کی طرف دیکھا۔ اس زمانے میں ہمارے ہاں کمپیوٹر کا استعمال عام نہیں ہوا تھا۔ اسکرین پر کمپیوٹر کے سے انداز میں تیزی سے چند سطروں پر مشتمل عبارت نمودار ہوئی جو میرے لئے ناقابل فہم تھی۔ بس میں اتنا سمجھ سکا کہ اس میں کہیں کہیں انگریزی کے حروف تہجی سے ملتا جلتا کوئی کوئی لفظ بھی دکھائی دے رہا تھا۔

لڑکی نے عبارت کی طرف دیکھ کر سر ہلایا۔ عبارت اسکرین پر سے غائب ہو گئی۔ وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی۔ "سر! اگر آپ تیار ہوں تو میٹنگ میں تشریف لے چلیں۔ آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔"

"چلو... دیکھ لیتے ہیں تمہارا میٹنگ کا ڈراما بھی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر ہلکا سا کھنچاؤ آیا جیسے اسے لفظ "ڈراما" سن کر تکلیف پہنچی ہو لیکن فوراً ہی اپنے تاثرات پر قابو پاتے ہوئے ہموار لہجے میں بولی۔ "آپ تیار ہونا چاہیں تو ہو جائیں، میں چند منٹ بعد آجاؤں گی۔"

"مجھے کیا تیاری کرنی ہے؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "یہاں کون سا میری وارڈ روب موجود ہے کہ میں لباس منتخب کروں، غسل کروں، کلون لگاؤں، بریف کیس اٹھاؤں اور پھر چہرے پر ایگزیکٹو افسروں والی سنجیدگی اور متانت طاری کر کے اس میٹنگ

میں شرکت کے لئے روانہ ہوؤں جس کے سر پیر کا مجھے علم نہیں۔"

"سر، اگر آپ پسند کریں تو یہ تمام لوازمات آپ کو مہیا کئے جاسکتے ہیں۔"

"لوازمات نہیں، تکلفات کہو۔" میں نے تصحیح کی۔ "آج ان کی ضرورت نہیں۔ آج درویشانہ انداز میں 'سلیپنگ گاؤن میں ہی میٹنگ اٹینڈ کرکے دیکھتے ہیں۔ کوئی بعید نہیں کہ میٹنگ کے دوران مجھے نیند ہی آجائے۔"

"نہیں سر، ہمارے ہاں میٹنگ بہت سنجیدہ اور اہم معاملہ ہوتی ہے۔ آپ بھی اس کے دوران پوری سنجیدگی اور بردباری کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کیجئے گا۔" اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ وہ گویا دوستانہ انداز میں میرے مفاد میں مجھے نصیحت کررہی تھی۔

"تم کہتی ہو تو سنجیدہ ہوجاتا ہوں ورنہ عام طور پر مجھے اس وقت سنجیدہ ہونا بہت مشکل دکھائی دیتا ہے جب دوسروں کو حد سے زیادہ سنجیدہ دیکھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اسی دیوار پر انگلی رکھی جس میں دروازہ نمودار ہوتا تھا۔

عجیب بات تھی کہ اس کے انگلی رکھنے سے دروازہ اس بار بھی نمودار ہوگیا جبکہ میں نے بالکل اسی طرح، اسی جگہ انگلی رکھی تھی تو اس میں سوئی ہی اتر گئی تھی۔ شاید اس میکنزم کا انگلیوں کے نشانات سے کوئی تعلق ہو، میں نے سوچا اور سردست ان مسائل کو غیراہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا۔

میں لڑکی کی رہنمائی میں آگے بڑھا۔ وہ ایک نیم تاریک اور تنگ سی راہداری تھی۔ اس میں تین چار قدم آگے ہی ایک شافٹ اوپر جاتی اور تاریک چھت میں کہیں غائب ہوتی دکھائی دی۔ شاید اسی شافٹ کے سہارے میرا اسٹریچر نما بیڈ نیچے آیا تھا۔ اسی کے قریب راہداری میں موڑ تھا۔

موڑ مڑنے کے بعد اچانک ہی ایک دیوار سامنے آگئی۔ یہ سیاہ رنگ کی دیوار تھی اور کسی دھات کی معلوم ہوتی تھی۔ اس پر صرف ایک سرخ بٹن نصب تھا جیسا عموماً لفٹ طلب کرنے کے لیئے لگا ہوتا ہے۔ لڑکی نے اس بٹن کو پُش کیا تو اچانک چھت کی طرف سے دائرے کی صورت میں تیز نارنجی روشنی ہم پر پڑی اور دوسرے ہی لمحے غائب ہوگئی۔

لڑکی منتظر سے انداز میں کھڑی رہی۔ میں اس کے ساتھ کھڑا تھا۔ یہاں بھی نیم تاریکی تھی۔ یہ گویا ماتمی سے سکوت کا ایک سمندر تھا جس کی تہ میں ہم کھڑے تھے۔ اگر یہ کوئی عمارت تھی تو بلاشبہ نہایت عجیب عمارت تھی۔ اس کا اسٹرکچر، اس کا ڈیزائن اور اس کے سائنسی انتظامات تو اپنی جگہ عجیب تھے ہی لیکن ہر قدم پر اس کا نفسیاتی تاثر بھی بے حد عجیب تھا۔

ایک اجنبی کو اس کے اندر پہنچ کر سب سے پہلا احساس یہی ہوتا تھا کہ وہ یہاں قید ہے اور یہاں سے نکلنا تو درکنار، کسی کی مدد کے بغیر وہ یہاں چند قدم کا فاصلہ بھی طے نہیں کرسکتا۔ یہ عمارت بھول بھلیاں قسم کا ایک قلعہ معلوم ہوتی تھی جس میں قدم قدم پر ایک نیا میکنزم موجود تھا۔

چند سیکنڈ بعد دیوار بے آواز طریقے سے ہمارے سامنے سے ایک طرف کو کھسک گئی۔ اب ہم جس راہداری میں داخل ہوئے وہ خاصی چوڑی تھی۔ اس میں دونوں طرف تقریباً عام سائز کے دروازے نظر آرہے تھے لیکن وہ ذرا مختلف سے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کار کے دروازوں سے مشابہ معلوم ہوتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ بڑے، سیدھے اور مستطیل تھے۔

یہاں بھی دیواروں اور دروازوں کا رنگ سیاہی مائل ہی معلوم ہوتا تھا۔ روشنی ذرا زیادہ تھی۔ لڑکی نہایت مستعدی سے قدم اٹھاتی چلی جارہی تھی۔ مجھے گردوپیش کا زیادہ جائزہ لینے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ فرش بتدریج بلند ہوتا جارہا تھا۔ ہم گویا کسی پہاڑی پگڈنڈی پر چل رہے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ پگڈنڈی ایک خوبصورت سرنگ میں تھی اور اس پر نفیس قسم کا سُرمئی قالین بچھا ہوا تھا۔

اس راہداری میں چند منٹ چلنے اور دو موڑ مڑنے کے بعد ہم خاصی بلندی پر آگئے۔ اب ہم ایک خاصے بڑے سیاہ دروازے کے سامنے کھڑے تھے جس کے درمیان موجود ایک باریک سی لکیر بتارہی تھی کہ اس کے دو پٹ تھے۔ دروازے کی پیشانی پر الیکٹرونک گھڑیوں کے ڈائل کی طرح چند چوکور خانوں کی ایک قطار تھی۔ دائیں ہاتھ پر دیوار میں لفٹ کے بٹنوں کی طرح چند بٹن لگے ہوئے تھے۔

لڑکی نے سرخ بٹن دبایا۔ ایک بار پھر اوپر چھت میں کہیں سے ہم پر تیز نارنجی روشنی پڑی اور غائب ہوگئی۔ پھر دروازے کی پیشانی پر موجود گھڑی کے ڈائل جیسے چوکور خانوں میں سے ایک خانہ روشن ہوا اور اس پر اسٹاپ واچ کی طرح نمبر تیزی سے نمودار اور غائب ہونے لگے۔ لڑکی گویا گردوپیش سے بے نیاز ایک ٹک اس خانے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

جب خانہ تاریک ہوگیا تو لڑکی سرجھکا کر دیوار میں دائیں ہاتھ پر لگے ہوئے رنگین بٹنوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس نے تیزی سے چند بٹن دبائے۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے ایک خاص ترتیب سے بٹن دبائے تھے۔ کوڈ یقیناً بار بار تبدیل ہوتا تھا اور اسے کوئی اجنبی نہیں سمجھ سکتا تھا۔ کوئی بھی اجنبی اپنے آپ کو ان در و دیوار کے درمیان قیدی تو محسوس کرتا ہی ہوگا لیکن یہ بھی محسوس کرتا ہوگا کہ اپنے گائیڈ کے بغیر چونکہ وہ ایک قدم بھی نہیں چل سکتا اس لئے گائیڈ کو ہلاک یا بے بس کرکے اسے کچھ کر گزرنے کا خواب نہیں دیکھنا چاہئے۔ شاید یہی اعتماد اور اطمینان تھا جس کی بدولت وہ لڑکی ایک نیل کٹر تک ساتھ لئے بغیر میرے ہمراہ چل رہی تھی۔ اس کے سوا اب تک میں نے وہاں کسی کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد لڑکی نے سر اٹھا کر دوبارہ چوکور
ں کی پٹی کی طرف دیکھا۔ یوں لگا جیسے کسی نیبی آنکھ نے اس کی
ہ کا اشارہ دیکھ لیا ہو۔ دروازے کے دونوں پٹ بے آواز طریقے
ہ دائیں بائیں کھسکنے لگے۔

میں نے لڑکی کے پیچھے پیچھے اندر قدم رکھا۔ آگے موٹے شیشے
یک اور دروازہ تھا۔ وہ خود بخود کھل گیا اور تب اچانک ہی مجھے
اس ہوا کہ میں تو اسی طویل و عریض ہال میں کھڑا تھا جہاں میری
ہ کھلی تھی۔

اب وہاں وہ اسٹریچر نما بیڈ نظر نہیں آرہا تھا جس پر میری آنکھ
لی تھی۔ اب میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ بیڈ کہاں
جود تھا اور کہاں سے نیچے گیا تھا۔ اس ہال کی ساخت اور اس کا
یاتی تاثر اپنی جگہ عجیب تر تھا۔ اسٹریچر نما بیڈ اور اس کرسی کا،
پر میں نے اے نن کو بیٹھے دیکھا تھا، اب کہیں نام و نشان تک
ں تھا۔

میں لڑکی کی رہنمائی میں چھوٹی سی ایک مصنوعی پہاڑی کے
ب سے گھوم کر دوسری طرف پہنچا تو اچانک ہی میں نے اپنے
پ کو بڑی سی ایک سفید میز کے قریب پایا۔ میز کے ایک طرف
ے نن اور ایڈی بیٹھے تھے۔ دوسری طرف ایک معمر جوڑا بیٹھا
۔ وہ ایک خوبصورت اور باوقار جوڑا تھا۔ دونوں سفید فام تھے۔
رت قدرے فربہی مائل اور سنجیدہ صورت تھی۔ جوانی میں یقیناً
ے ان گنت نگاہوں کی توجہ نصیب ہوئی ہوگی۔ مرد بھی وجیہہ تھا۔

میز کا وہ سرا جس طرف آداب محفل کے تحت عموماً میزبان
تا ہے، خالی تھا۔ اس طرف جو کرسی رکھی تھی وہ بھی دوسری
رسیوں سے ذرا مختلف اور خاص معلوم ہورہی تھی۔ دوسرے
رے پر بھی کرسی خالی تھی۔ لڑکی نے مجھے اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا
ر واپس جانے کے لئے مڑگئی۔

سفید میز پر چھت کی طرف سے کچھ اس طرح دھندلی روشنی پڑ
ی تھی جس طرح آپریشن تھیٹر میں آپریٹنگ ٹیبل پر پڑتی ہے لیکن
پر اس طرح کی بڑی بڑی لائٹس نظر نہیں آرہی تھیں جیسی
پریشن تھیٹر میں ہوتی ہیں۔ روشنی گویا کسی سوراخ سے آرہی تھی
ر نیچے آتے آتے پھیلتی جارہی تھی۔ کرسیوں پر روشنی بہت کم
ی۔

میز پر خاصی دودھیا روشنی ہونے کے باوجود اس گوشے کا
ول نہایت خوابناک سا تھا۔ وہاں موجود چاروں افراد کے چہروں
کچھ ایسی گمبھیر سنجیدگی طاری تھی جیسے وہ وہاں کسی قریبی ساتھی کی
زیت کے لئے جمع ہوئے ہوں۔ اے نن مجھے جب بھی نظر آیا تھا،
غیر سنجیدہ اور چہکتا ہوا ہی دکھائی دیا تھا۔ اس کی شخصیت بھی کچھ
سی تھی کہ سنجیدگی اس کے چہرے سے میل ہی نہیں کھاتی تھی۔ وہ
سنجیدہ بھی ہوتا تو اسے دیکھ کر مسکرانے کو جی چاہتا تھا۔ جس
رح فلموں میں اگر کوئی مشہور کامیڈین سنجیدہ سین کرنے کی کوشش
کرے یا المیہ اداکاری کا مظاہرہ کرے تب بھی لوگ ہنستے ہیں۔

لیکن اس وقت اے نن بھی چہرے پر زمانے بھر کی سنجیدگی طاری کئے بیٹھا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ آج سنجیدگی اس کے چہرے پر ذرا بھلی لگ رہی تھی۔ کچھ فاصلے پر ادھر ادھر بلند ہوتی ہوئی، آڑی ترچھی پگڈنڈیاں سی موجود تھیں۔ ان پر روشنی بہت کم تھی۔ ان میں سے ایک پگڈنڈی پر وہ عجوبہ روزگار قسم کا چمپینزی بھی بیٹھا تھا جس نے کئی بار مجھے بہت پریشان کیا تھا۔

وہ غیر معمولی صلاحیتوں اور طاقت کا مالک تھا۔ اس کے بارے میں میرا اندازہ تھا کہ وہ صرف بولنے کی صلاحیت سے محروم تھا ورنہ وہ پوری طرح انسان تھا۔۔۔ اور نہایت شاطر و چالاک انسان تھا۔ وہ ایک پگڈنڈی کے کنارے پر، بلندی پر ہلکے اندھیرے میں اس طرح بیٹھا ہوا تھا کہ ٹھوڑی ہاتھ پر ٹکی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ مفکر یا دانشور نظر آنے کی پوری پوری شعوری کوشش کررہا تھا۔ ہلکے اندھیرے میں اور تاریکی کے پس منظر میں، دور سے وہ بلندی پر لٹکی ہوئی کسی تصویر کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔

اے نن سے میں کافی حد تک واقف تھا۔ ایڈم سے میری صرف ایک بار، ستارہ کی بازیابی کے موقع پر ملاقات ہوئی تھی۔ معمر جوڑا میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ وہ دونوں گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہے تھے۔ کسی کے بھی ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق تک نہیں تھی۔

میں نے بے تکلفی سے اے نن کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ "کیا حال ہیں چندا؟"

اس کے چہرے پر کچھ ایسے تاثرات ابھر آئے جیسے میرے انداز تخاطب سے اسے سخت تکلیف پہنچی ہو۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ باقی تینوں کچھ اس طرح ایک ٹک میری طرف دیکھتے رہے جیسے اونچے طبقے کے پڑھے لکھے لوگوں کے ڈرائنگ روم میں کوئی اجڈ قسم کا خالص دیہاتی گھس آیا ہو اور "وہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم" کی تصویر بنے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہے ہوں۔

چمپینزی کا نام میری معلومات کے مطابق بلیک بڈ تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اے نن سے پوچھا۔ "کیا آج کے اجلاس کی صدارت اسے کرنی ہے؟"

اے نن نے گویا خون کے گھونٹ بھرتے ہوئے کرسی کی طرف اشارہ کیا اور متانت سے بولا۔ "بیٹھ جاؤ اور سنجیدہ رہنے کی کوشش کرو۔"

"بیٹھ تو میں جاتا ہوں۔" میں نے کرسی پر تقریباً گرتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس جگہ روشنی جتنی کم اور سنجیدگی جتنی زیادہ دیکھنے میں آرہی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ اس سے میں بیمار نہ ہوجاؤں۔ میں لیونا کو بھی یہی بتارہا تھا کہ جب کوئی مجھے زیادہ سنجیدگی کی نصیحت کرتا ہے تو میرے دل میں گدگدیاں سی ہونے لگتی ہیں۔"

"فی الحال اپنی گدگدیوں کو روکو۔" اے نن آہستگی سے بولا۔

"اور سنجیدگی سے بیٹھو۔ اس وقت کی سنجیدگی زندگی بھر تمہارے کام آئے گی۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی نامعلوم ڈسپلن کے بہت سختی سے پابند تھے اور مقام و مرتبے کے لحاظ سے غالباً معمر جوڑا' ایڈم اور اے نن سے برتر تھا۔ ایڈم اور اے نن میں مجھے ایڈم سینئر معلوم ہوتا تھا۔ عمر رسیدہ مرد اور عورت بدستور گہری نظروں سے میرا جائزہ لئے جا رہے تھے لیکن ابھی تک منہ سے ایک لفظ بھی نہیں بولے تھے۔

"کیا تمہارے ہاں تعارف کا رواج نہیں ہے؟" میں نے اے نن سے پوچھا۔ میں عمر رسیدہ مرد اور عورت کے نام جاننا چاہتا تھا۔ زیادہ امکان تو یہی تھا کہ وہ نام فرضی ہوتے لیکن کم از کم کچھ بات تو آگے بڑھتی۔ ان کا خاموشی سے تکے جانا مجھے گراں گزرنے لگا تھا۔

"تعارف وغیرہ جیسی رسمیات کی ضرورت نہیں۔" اے نن بولا۔ "یہی کافی ہے کہ ہم تمہیں جانتے ہیں۔"

چند لمحے کے لئے ماتمی سا سکوت چھا گیا۔ میں پھر بولے بغیر نہ رہ سکا۔ "کیا ہم یہاں کسی تعزیتی اجلاس میں شرکت کے لئے جمع ہوئے ہیں؟"

ایڈم نے مجھے گھورا۔ اے نن نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ معمر جوڑے کے چہرے بدستور ہر تاثر سے عاری رہے۔ ایڈم نے پہلی بار زبان کھولی اور صاف ستھری اردو میں بولا۔ "ہمیں "باس ون" کا انتظار ہے۔ ان کی آمد پر میٹنگ شروع ہوگی۔"

"یہ باس ون کون ہے؟" میں نے غیر ارادی سے انداز میں پوچھا۔

ایڈم کی گویا سمجھ میں نہ آیا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ بے بسی آمیز سے انداز میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا۔ "باس ون..... بس باس ون ہے ..... تمہارے ملک میں ہماری تنظیم کے مرحلہ وار انچارجز میں سلا انچارج وہی ہے۔ تمام ضروری مسائل کو وہی ہینڈل کرتا ہے۔ اگر کوئی معاملہ اس کی حدود سے نکل جائے تو پھر باس ٹو کے سامنے آتا ہے۔"

"اور ہمارے ہاں کل کتنے باس ہیں؟" میں نے پوچھا۔

ایڈم نے عمر رسیدہ عورت کی طرف دیکھا گویا اجازت طلب کر رہا ہو کہ اس سوال کا جواب دے دیا جائے یا نہیں؟ عورت کو کہ منہ سے اب بھی کچھ نہیں بولی اور نہ ہی اس نے کوئی اشارہ کیا لیکن شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے اثبات میں جواب مل گیا۔

وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ہاں..... یعنی "پروجیکٹ پی۔کے" میں تین باس ہیں۔ باس ون ..... باس ٹو..... باس تھری۔"

اچانک میز پر سرخ روشنی پھیل گئی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ چھت سے میز پر پڑنے والی تیز دودھیا روشنی ہی سرخ روشنی میں تبدیل ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہلکا سا ایک بزر بجا۔ روشنی دوبارہ سفید ہو گئی۔ میں نے دیکھا' ایڈم' اے نن اور معمر جوڑا مودبانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

اے نن نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ جب تک مجھے معلوم نہ ہوتا کہ آنے والا کون ہے اور وہ احترام کا مستحق بھی ہے یا نہیں' میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ سب نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے گھورا لیکن میں نے سوچا' جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ وہ چاروں روبوٹس کی طرح اکڑے ہوئے اور ساکت کھڑے تھے۔

مجھے زیادہ تجسس میں مبتلا نہیں رہنا پڑا۔ کچھ فاصلے پر چھوٹی اور قدری بیضوی سی ایک پہاڑی تھی جو بالکل قدرتی پہاڑی کی طرح کھردری اور ناہموار نظر آ رہی تھی۔ اس میں کہیں کہیں گڑھے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ اس پر گھاس بھی اگی ہوئی تھی اور کہیں کہیں کائی بھی جمی ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ وہ پہاڑی اور اس پر نظر آنے والی گھاس وغیرہ سب کچھ مصنوعی تھا۔ میرے خیال میں یہ تو مشکل ہی تھا کہ وہ پہاڑی انہوں نے بالکل صحیح سالم کہیں سے لا کر یہاں سجا دی ہو۔

اس پہاڑی کے عقب میں اندھیرا تھا۔ اسی اندھیرے گوشے سے ایک دراز قد شخص نمودار ہوا اور نپے تلے قدموں سے' مستعد انداز میں میز کی طرف آ گیا۔ وہ بالکل اسی طرح نمودار ہوا تھا جیسے اندھیرے نے اسے اپنی کوکھ سے اگلا ہو۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کہاں سے اور کس راستے سے آیا تھا۔

اس کرسی کے قریب پہنچ کر وہ ڈرامائی انداز میں رک گیا جو غالباً اسی کے لئے مخصوص تھی۔ وہ دوسری کرسیوں سے ذرا مختلف اور قدرے شاہانہ سی ساخت کی تھی۔ میں اپنی جگہ بیٹھا ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آدمی تو وہ ٹھیک ہی تھا۔ بس ذرا دراز قد تھا اور اس کے کندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے نفیس اور بیش قیمت سوٹ کے نیچے بھی کوئی موٹا اور دبیز لباس پہن رکھا تھا لیکن سب سے بڑی وجہ جس نے مجھے ایک ٹک اس کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا' کچھ اور تھی۔

حیرت کی بات تھی کہ اس کا کوئی چہرہ ہی نہیں تھا۔ اس کے نہایت چوڑے کندھوں کے درمیان سر کی جگہ ایک بہت بڑا سفید انڈا رکھا ہوا تھا۔ میں نے شتر مرغ کا انڈا کبھی دیکھا نہیں تھا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ بھی اتنا بڑا نہیں ہوتا ہوگا۔ سر اور گردن کی جگہ بس وہ انڈا ٹکا ہوا تھا۔ اندازاً جہاں اس کی ناک ہونی چاہئے تھی وہاں جلی انداز اور سیاہ رنگ میں "ایک" کا ہندسہ نظر آ رہا تھا۔

اسے دیکھ کر ذہن میں ہمپٹی ڈمپٹی کا تصور آتا تھا۔ میں اگر اس وقت ان گنت سوچوں میں نہ الجھا ہوا ہوتا تو شاید اسے دیکھ کر مجھے بے اختیار ہنسی آ جاتی۔ حیرت کی بات تھی کہ اس بڑے سے انڈے میں آنکھوں کی جگہ بھی کوئی سوراخ وغیرہ نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ اسی طرح مستعدی سے چلتا ہوا آیا تھا جیسے اسے ہر چیز بالکل صاف نظر آ رہی ہو۔

ایک اچھے بھلے معقول اور سوٹڈ بوٹڈ دھڑ پر سر کی جگہ ایک بڑے سے انڈے کی موجودگی اپنی جگہ مضحکہ خیز سہی لیکن اس کا ایک عجیب' خوفزدہ سا کر دینے والا تاثر بھی تھا۔ مجھے پہلی بار تجربہ ہوا کہ اپنے سامنے ایک چلتے پھرتے بے چہرہ انسان کو دیکھ کر جسم میں ہلکی سی سرسراہٹ بھی محسوس ہو سکتی ہے۔

چند لمحے کے لئے گہرا سکوت طاری رہا۔ ہر چیز جیسے اپنی جگہ ساکت ہو گئی تھی۔ اس صورت بیضا کی آنکھیں نہیں تھیں' کم از کم ظاہری طور پر تو نہیں تھیں لیکن مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم دونوں آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ایک دوسرے کے بارے میں اندازے لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔

بے چہرہ ہونے کے باوجود اس کی شخصیت کا' اس کی موجودگی کا ایک تاثر تھا جسے میں محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میرا یہ کہنا شاید مبالغہ محسوس ہو تا کہ فضا میں مقناطیسی لہریں سی دوڑتی محسوس ہونے لگی تھیں۔ میں اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ باقی چاروں افراد بت بنے کھڑے تھے اور اپنی اپنی ناک کی سیدھ میں دیکھ رہے تھے۔

مجھے یہ توقع ہرگز نہیں تھی کہ "باس ون" اس قسم کی شخصیت ہوگی۔ آخر کار وہ خود ہی میری کرسی کے قریب آیا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "خوش آمدید مسٹر افضل چوہدری!"

میں نے مصافحے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔ ایک لمحے کے لئے ہمارے ہاتھ مضبوطی سے ایک دوسرے میں پھنسے رہے۔ اس کا ہاتھ فولادی تھا۔ اس کے ہونٹ تو تھے نہیں جو بولتے وقت ہلتے لیکن اس کی آواز مجھ تک پہنچ گئی تاہم آواز کچھ ایسی ہی تھی جیسے کسی کم طاقت کے مائیک اور اسپیکر کے ذریعے آئی ہو۔ اس نے مجھے انگریزی میں خوش آمدید کہا تھا۔

میں پوری طرح بداخلاقی کا مظاہرہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے اس کا شکریہ تک ادا نہیں کیا۔ اس کے احترام میں اٹھنے کی زحمت بھی میں نے ابھی تک نہیں کی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے میری ان گستاخیوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔ اس نے اے نن وغیرہ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آپ کو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی مسٹر چوہدری؟" اس کی آواز ایک بار پھر میری سماعت تک پہنچی۔ اگر وہ کسی اسپیکر کے ذریعے پہنچ رہی تھی تو وہ یقیناً بہت ہی چھوٹا لیکن نہایت نفیس ساخت کا اسپیکر تھا۔ اس کے ذریعے یقیناً ایک سرگوشی کا زیر و بم بھی صحیح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہوگا۔

"میری یہاں موجودگی بجائے خود میرے لئے بہت بڑی تکلیف ہے مسٹر.....!"

"باس ون۔" اس نے جملہ مکمل کیا۔ "مجھے باس ون کہتے ہیں۔" اس کی آواز سنائی دی اور وہ پلٹ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھا۔

"ہاں۔ وہ تو میں سمجھ گیا تھا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "تمہارا چہرہ ہی تمہاری نیم پلیٹ ہے لیکن میں سمجھا تھا کہ شاید تمہارا عام انسانوں کی طرح بھی کوئی نام ہوگا۔"

"میں عام انسان نہیں ہوں مسٹر چوہدری!" اس کی کراری سی آواز ابھری۔ "مجھے عام انسان سمجھنے کی غلطی کبھی نہ کرنا۔"

"عام اور خاص کو تو چھوڑو' میں تو اب تمہیں انسان ہی سمجھنے کو تیار نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

ایک کھنکھناتا ہوا سا قہقہہ فضا میں گونجا۔ میز کے دونوں طرف وہ چاروں افراد سر جھکائے' سپاٹ چہروں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ باس ون کی آواز ابھری۔ "فی الحال تمہارا یہ اکھڑ انداز گفتگو تمہاری خوبیوں میں شامل ہے۔ سردست ہمیں یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ تم ہر جگہ' ہر قسم کے حالات میں بے خوفی سے گفتگو کر سکتے ہو۔ تمہیں اس کی پروا نہیں ہوتی کہ تمہارے مقابل کون شخصیت ہے۔ ہم تمہارے اندر یہی خوبی دیکھنا چاہتے ہیں۔ ورنہ اس جگہ کے آداب کے مطابق تمہارا یہ انداز گفتگو ناقابل معافی ہوتا۔"

"میں بھی یہی چاہتا ہوں کہ تم مجھے معاف نہ کرو۔ میں اب اس روز روز کی کھینچا تانی' افراتفری اور خواہ مخواہ کے تجسس سے بیزار ہو چکا ہوں۔ تمہیں جو کچھ بھی کرنا ہے کر گزرو۔ اس وقت تو میں مکمل طور پر تمہارے اختیار میں ہوں۔ گولی مار کے ایک طرف پھینکو اور قصہ ختم کرو۔ ان پراسرار سائنس فکشن قسم کے چکروں نے تو مجھے زندگی سے بیزار کر دیا ہے۔ مجھ میں ایک بہت بڑی خامی یہ ہے کہ میں زیادہ لمبے عرصے سسپنس برداشت نہیں کر سکتا۔"

ایک بار پھر اس کا کھنکھناتا سا قہقہہ ابھرا اور وہ بولا۔ "مسٹر چوہدری! اگر ہمیں یہی کام کرنا ہوتا تو یہ بہت پہلے کسی بھی سڑک پر ہو چکا ہوتا۔ ہم نے تمہیں دریافت کرنے اور ہر زاویئے سے تمہاری شخصیت کی اسٹڈی مکمل کرنے میں بہت زحمت اٹھائی ہے۔ یہ سب کچھ ہم نے اس لئے نہیں کیا کہ تمہیں گولی مار کر کسی آوارہ کتے کی طرح ایک طرف پھینک دیا جائے۔ تم ہمارا ایک متوقع قیمتی اثاثہ ہو مسٹر چوہدری!"

"چلو مان لیا۔" میں نے بیزاری ظاہر کرنے کے لئے اپنی جماہی کو روکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "اب اس اثاثے کے لئے کیا حکم ہے؟"

"آج یہ میٹنگ منعقد ہونے کی نوبت آئی ہے تو بات تفصیل سے ہوگی مسٹر چوہدری۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ بولا۔ میں نے اسے قریب سے بھی غور سے دیکھا تھا اور اب بھی دیکھ رہا تھا لیکن سچی بات یہی تھی کہ میں ابھی تک نہیں سمجھ سکا تھا کہ اگر اس کے چہرے پر ماسک ہی چڑھا ہوا تھا تو وہ کس قسم کا ماسک تھا؟

اس کی گردن کا ذرا سا بھی حصہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ "انڈے" کا زیادہ موٹائی والا حصہ نیچے کی طرف تھا اور وہ گویا اس کے بند کالر پر ٹکا ہوا تھا۔ بند کالر میں ٹائی بھی لگی ہوئی تھی۔ انڈے کا جو حصہ

نسبتاً پتلا ہوتا ہے وہ گویا اس کی چندیا تھی۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ سانس کس طرح لے رہا تھا اور اگر سب کچھ دیکھ رہا تھا تو کس طرح دیکھ رہا تھا؟ کیا وہ ماسک پلاسٹک نما کسی ایسے میٹریل سے بنا ہوا تھا جس سے ٹنٹیڈ گلاس کی طرح باہر سے اندر کی طرف نہیں دیکھا جا سکتا تھا، البتہ اندر سے باہر کی طرف دیکھا جا سکتا تھا؟ کیا سانس لینے اور آواز باہر منتقل کرنے کے لئے بھی کوئی نظام اس ماسک کے اندر ہی فٹ تھا؟ لیکن محض اس کی طرف دیکھتے رہنے سے میں کسی نتیجے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد باس دن بولا۔ "مسٹر چوہدری! تمہارے ذہن میں بہت سے سوالات کلبلا رہے ہوں گے اس لئے میں شروع سے بات کروں گا۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ ہر ملک کی کچھ نہ کچھ خفیہ تنظیمیں ہوتی ہیں، ادارے ہوتے ہیں۔ کچھ صرف ملک کے اندر ہی کام کرتے ہیں اور کچھ حسب توفیق ملک سے باہر بھی ادھر ادھر منہ مارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر ملک کی ہر چیز اس کی حیثیت اور اوقات کے مطابق ہوتی ہے۔ دولت مند، ترقی یافتہ اور بڑے ملکوں کی خفیہ ایجنسیاں بھی دولت مند، ترقی یافتہ اور بڑی ہیں۔"

"جیسے کے۔جی۔بی اور سی آئی اے وغیرہ؟" میں نے لقمہ دیا۔

"ہاں۔ عام لوگ زیادہ تر انہی کے ناموں سے واقف ہیں۔ یہ زیادہ بدنام ہو گئی ہیں۔" باس دن نے کہا۔ "ویسے چند برسوں سے عالمی افق پر کچھ اور خفیہ ایجنسیاں بھی ابھر رہی ہیں جو خاصے بڑے بڑے اور خطرناک کام انجام دے رہی ہیں۔"

"کیا ریڈ ڈاٹ بھی انہی میں سے ایک ہے؟" میں نے پوچھا۔

باس دن نے کھنکھناتا ہوا سا قہقہہ لگایا۔ ایک بڑے سپاٹ انڈے سے کھنکھناتے قہقہے کی آواز سننا بھی ایک عجیب ہی تجربہ تھا۔ وہ گویا میری بات سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "تم نے میری تمہید سے غلط نتیجہ اخذ کیا۔ میں اس طرف نہیں آ رہا تھا۔ یہ کچھ اور خفیہ ایجنسیوں کی بات تو یونہی ضمنی طور پر درمیان میں آ گئی تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ خفیہ ایجنسیاں تو اپنا اپنا کام کرتی ہی رہتی ہیں..."

"اور دنیا ان کے نتائج بھگتتی رہتی ہے۔" میں نے پھر لقمہ دیا۔

"ہاں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ "دنیا میں یوں تو بہت سی سفید فام قومیں ہیں لیکن صحیح معنوں میں طاقتور اور قابل ذکر قومیں صرف چھ ہیں۔ باقی زیادہ طاقتور اور مضبوط قوم کے طور پر ابھر نہیں سکیں یا وہ ایک دوسرے میں خلط ملط ہیں۔ جن چھ قوموں اور چھ ملکوں کا میں ذکر کر رہا ہوں ان میں سے کچھ دوسری جنگ عظیم کے دوران آپس میں برسرپیکار رہے لیکن اس جنگ نے انہیں بہت بڑا سبق سکھا دیا..."

"اور انہوں نے لیگ آف نیشنز کی جگہ یونائیٹڈ نیشنز آرگنائزیشن یعنی یو۔این۔او بنالی۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ لیکن یہ تو محض رسمی کام ہیں جو دنیا کی تسلی کے لئے کئے جاتے ہیں اور ان میں دنیا کو بھی شریک کر لیا جاتا ہے۔ گو کہ یہ ادارہ بھی صرف سپر پاورز ہی کے مفادات کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔ اگر انصاف اور قوموں کی برابری کا تصور اس کے پیش نظر ہوتا تو اس کے منشور میں ویٹو پاور کی شق نہ رکھی جاتی۔"

"میں تمہارے اس خیال سے متفق ہوں۔" میں نے مدبرانہ انداز میں سرہلایا۔

"لیکن اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہارے ملک کی یا اس جیسے دوسرے چھوٹے ملکوں کی ہمدردی میں یہ بات کر رہا ہوں۔" اس نے گویا فوراً ہی میری خوش فہمی دور کی۔ "بات ذرا آگے چل کر واضح ہو گی۔ یہ میں صرف پس منظر بیان کر رہا ہوں اور کچھ تم بیچ میں غیر متعلق چیزوں کا ذکر لائے جا رہے ہو۔"

پھر وہ خود ہی بولا۔ "لیکن یہ بھی ایک لحاظ سے اچھا ہے۔ بات اور بہتر طور پر تمہاری سمجھ میں آ جائے گی۔ ہم تمہیں سب کچھ صاف صاف بتا دینا چاہتے ہیں، کسی دھوکے میں نہیں رکھنا چاہتے۔"

"لیکن تم جن چھ ملکوں کا ذکر کر رہے تھے، ان کے تم نے نام نہیں بتائے۔" میں نے کہا۔

"وہ میں ابھی بتاؤں گا بھی نہیں۔" اس نے بے بلا تامل جواب دیا۔ "اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اصل بات جو تمہارے لئے سمجھنا ضروری ہے، وہ کچھ اور ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ دوسری جنگ عظیم سے چھ ملکوں نے سب سے زیادہ سبق بھی سیکھ لیا، یو این او بھی بن گئی۔ اس سے بھی بڑے اور طاقتور ملکوں کے مفادات کی حفاظت ہو رہی ہے لیکن ان ظاہری انتظامات کے علاوہ بھی انہوں نے خفیہ طور پر یہ طے کیا اور ایک طرح کا "اخلاقی" سا معاہدہ کیا کہ وہ آپس میں کبھی نہیں لڑیں گے۔ ویسے تو وہ اپنے خاص چہیتوں کو بھی آپس میں نہیں لڑنے دیں گے لیکن اگر یہ ان کے بس میں نہ ہوا تب بھی کم از کم وہ چھ کبھی ایک دوسرے کو معمولی سی گزند بھی نہیں پہنچائیں گے۔

دوسری عالمی جنگ نے انہیں جو سبق دیا تھا اس کے بعد ان کے لئے اس اخلاقی معاہدے پر قائم رہنا نہایت آسان تھا۔ وہ آج تک اس پر ثابت قدم چلے آ رہے ہیں۔ جنگ کے دوران جو ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، آج وہ بھی درپردہ ایک دوسرے کے ہمدرد، بہی خواہ اور مفادات کے نگراں ہیں۔ تاہم یہ طے پایا تھا کہ دنیا کو دکھانے کے لئے وہ کبھی کبھی ایک دوسرے پر ذرا آنکھیں نکال لیا کریں گے، غرا لیا کریں گے لیکن پنجہ نہیں ماریں گے۔ حتیٰ کہ جنگ کے دوران جو ایک دوسرے کے اتحادی تھے ان میں سے دو ملکوں نے تو نہایت کامیابی سے اس ڈرامے، اس نورا کشتی کو اتنا

ے بڑھایا کہ آج دنیا کے بڑے بڑے دانشور اور ماہرین سیاست ی بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ یہ نیا کا سب سے بڑا ڈراما ہے اور اتنا کامیاب ہے کہ اس نے پوری نیا کو دو بلاکوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک عرصے سے تو ان دونوں ملکوں کی معیشت کا زیادہ دارومدار اس نورا کشتی پر ہی چلا آ رہا ہے۔ اس کی آڑ میں انہوں نے جو فائدے اٹھائے ہیں، اس کا دنیا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج پوری دنیا میدان کارزار بنی ہوئی ہے، ان کی اسلحے کی فیکٹریاں دن رات چل رہی ہیں، دھڑا دھڑ اسلحہ بک رہا ہے جو ان کی معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ لیکن انہوں نے خود براہ راست کبھی ایک دوسرے کو خراش تک نہیں لگائی۔"

اب میں تھوڑا سا چونکا۔ کیا وہ واقعی سنجیدگی سے یہ بات کر رہا تھا؟ لیکن میں اس کی سنجیدگی کا اندازہ کیونکر لگاتا؟ سنجیدگی کا اندازہ چہرے کے تاثرات سے لگایا جاتا ہے اور وہاں تاثرات تو کیا، چہرہ ہی نہیں تھا۔ میں نے سفید فام جوڑے اور ایڈم کی طرف دیکھا، ان کے چہرے بھی تاثرات سے عاری تھے۔ اب تک کی گفتگو میں انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ ابھی تک تو میں سمجھ نہیں پایا تھا کہ میز پر ان لوگوں کی موجودگی کا مقصد کیا تھا۔ پھر میں نے سوچا، ممکن ہے یہ ان کے پروٹوکول کا حصہ ہو۔

باس دن سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تقریباً تمام بڑے ممالک نے کچھ چھوٹے ممالک کو تو براہ راست اپنی کالونی بنا رکھا ہے۔ وہاں جو بھی نظام آتا ہے، انہی کے حکم سے آتا ہے، سربراہ تک انہی کے حکم سے تبدیل ہوتے ہیں۔ بعض ملکوں پر اگر گرفت اتنی مضبوط نہیں ہے تب بھی ان کی معیشت کو بڑے ملکوں نے اس طرح قرضوں وغیرہ کے جال میں جکڑا ہوا ہے کہ وہ ان کے احکامات کی خلاف ورزی کی جرات نہیں کر سکتے۔"

"درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"اس کے باوجود چند سال قبل سفید فام قوموں کے چھ بڑے ملکوں نے محسوس کیا کہ دنیا پر جس حد تک ان کی حکمرانی ہے وہ بھی ناکافی ہو چلی ہے۔ بڑے ملکوں کی معیشت اور سماجی نظام کو بہت سے خطرات لاحق ہیں۔ ویسے بھی دنیا بہت بڑی ہے۔ ابھی تک کچھ چھوٹے ممالک بڑے ملکوں کے مکمل تسلط سے بچے ہوئے ہیں۔ بعض ملکوں کی معیشت بہتر ہو جاتی ہے یا وہاں کے سربراہوں کو عوامی حمایت حاصل ہو جاتی ہے تو وہ بڑے ملکوں کو آنکھیں دکھانے لگتے ہیں، چوں چراں کرنے لگتے ہیں۔ انہیں زیادہ عظیم لیڈر بننے کا شوق چرانے لگتا ہے۔

انہیں فوری طور پر ان کی جگہ سے ہٹانا یا کوئی سبق سکھانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لئے طویل منصوبہ بندی کرنی پڑتی ہے۔ چنانچہ چند سال قبل چھ سفید فام قوموں کے نمائندوں کا ایک مقام

پر خفیہ اجلاس ہوا جو چند ہفتوں تک جاری رہا۔ ان چھ ملکوں نے باقی تمام دنیا پر حکمرانی کو نئے خطوط پر منظم کرنے کے لئے ایک نیا طریقہ کار طے کیا۔ پرانی پالیسی میں تو یہ تھا کہ جو بڑی طاقت کسی بھی حربے، ہتھکنڈے یا حکمت عملی کے تحت کسی ملک میں اپنے پنجے گاڑنے میں کامیاب ہو جاتی تھی وہ اس سے جو بھی فائدے اٹھا سکتی تھی اٹھانا شروع کر دیتی تھی۔ بعض اوقات کوئی دوسری بڑی طاقت بھی اسی ملک میں ٹانگ اڑانے لگتی تھی۔

یوں بعض اوقات تو ایک ایک ملک کئی کئی طاقتوں کا اکھاڑہ بن جاتا تھا۔ اس بندر بانٹ میں کسی بھی بڑے ملک کو زیادہ فائدہ نہیں ہوتا تھا۔ چھینا جھپٹی میں بہت سے وسائل ضائع ہو جاتے تھے۔ چنانچہ پہلا نکتہ تو یہ طے کیا گیا کہ آئندہ جو کچھ بھی کیا جائے گا، ایک مشترکہ نظام کے تحت ایک دوسرے کو آگاہ رکھ کر کیا جائے گا۔

اس خفیہ اجلاس میں چھ سفید فام ملکوں نے باقی ساری دنیا کو اپنی مشترکہ کالونی قرار دے دیا۔ طے یہ پایا کہ خفیہ ایجنسیوں کی جو کارروائیاں چل رہی تھیں یا جن جن ملکوں میں طویل المیعاد منصوبوں پر کام ہو رہا تھا وہ تو ہوتا رہے گا لیکن ان کے نتیجے میں جو بھی فوائد حاصل کئے جائیں گے، جو بھی مال غنیمت ہاتھ آئے گا اسے ایک مشترکہ فنڈ کے طور پر جمع کیا جائے گا اور سال کے سال چھ ملکوں کے درمیان مساوی طور پر تقسیم کیا جائے گا۔

اس کی ایک آسان اور عام فہم مثال کچھ یوں ہو سکتی ہے کہ جنگل میں چھ درندے شکار کے لئے نکلے ہوئے ہیں۔ پہلے ان کا طریق کار یہ تھا کہ جس کو بھی جو شکار نظر آیا وہ اس پر جھپٹ پڑا۔ شکار زیادہ سرکش یا جاندار ہوا تو بعض اوقات درندہ اسے زیر کرتے ہوئے زخمی بھی ہو گیا۔ بعض اوقات دوسرے دو تین درندے بھی اسی شکار پر جھپٹ پڑے۔ جس کے جو ہاتھ آیا لے بھاگا۔ کچھ حصہ ضائع بھی ہوا۔ نوچ کھسوٹ میں خود درندے بھی زخمی ہوئے۔ توانائی بھی زیادہ صرف ہوئی۔

اب گویا درندوں نے طے کر لیا کہ شکار خواہ کوئی اکیلا کرے یا مل کر نہایت صبر و سکون سے کیا جائے گا تاکہ توانائی ضائع نہ ہو اور ایک دوسرے کو گزند نہ پہنچے۔ اس کے بعد نہایت منصفانہ انداز میں شکار کے حصے بخرے کئے جائیں گے اور کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہونے دی جائے گی۔ پورے جنگل میں شکار کے سلسلے میں مجموعی طور پر یہی طریق کار ہو گا۔

تمام ملک اس پر راضی ہو گئے۔ اس کے لئے ایک خفیہ کمیشن قائم کر دیا گیا جو اس نظام کی نگرانی کرتا رہے گا اور خیال رکھے گا کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔ کسی کو اگر فلاں چیز زیادہ ملی ہے تو دوسرے کو فلاں چیز زیادہ مل جائے۔ کسی جگہ ایک ملک کے وسائل زیادہ خرچ ہوئے ہیں تو اسے دوسری جگہ اس طرح تلافی کا احساس ہو جائے..."

باس دن اچانک ہی خاموش ہوگیا۔ ایک لمحے کے لئے اس نے میز کو دو انگلیوں سے کھٹکھٹایا۔ یہ گویا عمر رسیدہ سفید فام مرد کے لئے اشارہ تھا۔ جس طرح اسٹیج پر ایک اداکار سے دوسرے اداکار کو کیو ملتا ہے اور اس کے خاموش ہوتے ہی دوسرا بولنا شروع کردیتا ہے بالکل اسی طرح عمر رسیدہ سفید فام نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور مسکراتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”مسٹر چوہدری! آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ آپ کو انٹرنیشنل اکانو پالیٹکس کا یہ سارا پس منظر کیوں سمجھایا جارہا ہے؟“

اتنی دیر بعد ایک انسانی چہرہ مجھ سے مخاطب ہوا اور اس پر کوئی تاثر بھی نظر آیا تو مجھے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ ہم لوگ انسانی چہروں اور ان کے تاثرات کو دیکھنے کے کتنے عادی ہوتے ہیں۔ اگر ایک بہت بڑا سپاٹ انڈا انسانی شانوں پر دھرا‘ آپ سے دیر تک ہم کلام رہے تو شاید آپ بھی ویسی ہی الجھن محسوس کرنے لگیں جیسی اس وقت میں کررہا تھا۔

”نہیں۔ میں کچھ ایسا زیادہ حیران نہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”میں تو آجکل کوشش کررہا ہوں کہ حیران ہونے کی عادت ہی ترک کردوں۔“

بوڑھا مشفقانہ انداز میں مسکرایا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس پس منظر کے بعد ہم اس پہلو کی طرف آتے ہیں جس سے ہمارا براہ راست تعلق ہے۔ چھ ملکوں نے جو نیا ورلڈ آرڈر تیار کیا تھا‘ اس پر عملدرآمد کے لئے کئی بڑے بڑے اداروں کی ضرورت تھی جو خفیہ ایجنسیوں کی طرز پر قائم کردئے گئے ہیں۔ بظاہر وہ سرکاری محکموں کے بے ضرر شعبے دکھائی دیتے ہیں لیکن ان کا اصل کام کچھ اور ہے جو وہ کئے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ ضروری سمجھا گیا کہ ایک بہت بڑی خفیہ تنظیم بھی قائم کی جائے۔ بڑے غور و خوض کے بعد اس کا بھی خاکہ تیار کیا گیا۔ اس کا نام ریڈ ڈاٹ رکھا گیا۔“

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں تقریباً غیر ارادی سے انداز میں بول اٹھا۔ ”کیا یہ مافیا کی طرز کی کوئی تنظیم ہے؟“

”اوہ... نو...“ بوڑھا دھیرے سے ہنس دیا۔ ”مافیا تو بہت چھوٹی‘ بہت پرانی اور بہت مختلف قسم کی چیز ہے۔ یہ مافیا کی طرح مجرموں اور اسمگلروں کے بڑے بڑے منظم ٹولوں کا نام نہیں ہے جو کہیں ایک دوسرے سے منتھی رہ کر اور کہیں آزادانہ طور پر کام کررہے ہیں۔ یہ ٹولے بعض ملکوں میں حکومتوں کی متوازی اپنا نظام چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ خود رو جھاڑیوں کی طرح ہیں جبکہ ریڈ ڈاٹ کو تو چھ بڑی طاقتوں نے خود بیٹھ کر تشکیل دیا ہے۔ دنیا کے بہترین دماغوں نے اس کی منصوبہ بندی کی ہے۔ دنیا کے چھ بڑے ملکوں کی سرکاری‘ انتظامی‘ سیاسی اور سائنسی طاقت اس کے پیچھے ہے۔ چھ بڑی طاقتوں کے جتنے بھی وسائل ہیں ان میں سے جو بھی ریڈ ڈاٹ چاہے‘ اپنے لئے طلب کرسکتی ہے۔ دنیا کے بہترین سائنس دانوں‘ قابل ترین انجینئروں اور بڑے بڑے ماہرین معاشیات کی خدمات ریڈ ڈاٹ کو حاصل ہیں۔“

بوڑھا ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگیا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا‘ تمسخرانہ انداز اختیار کرنا چاہتا تھا لیکن میری رگ و پے میں سنسنی سی دوڑنے لگی تھی۔ اب گویا عمر رسیدہ عورت کے بولنے کی باری تھی۔ وہ نہایت ملائم اور مشفقانہ لہجے میں بولی۔ ”اگر ہم ضرورت محسوس کریں تو ہمیں دنیا کے بہترین دہشت گردوں کی خدمات بھی مہیا کی جاتی ہیں۔“

”ریڈ ڈاٹ کے قیام کا مقصد ابھی تک واضح نہیں ہوا۔“ میں نے کہا۔

”ہم اسی طرف آرہے ہیں۔“ عمر رسیدہ عورت نے گویا بات کا تسلسل جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”پوری دنیا میں اس وقت جو پاور گیم چل رہا ہے‘ ریڈ ڈاٹ اس کا ایک اہم حصہ ہے۔ ہر ملک میں اس کی شاخ موجود ہے۔ یہ ایک ایسا نیٹ ورک ہے‘ ایسی مشینری ہے جس کا کوئی مطلوبہ بٹن دباتے ہی کسی بھی ملک میں اقتدار کا توازن تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ ان تمام نئے انتظامات پر بھاری اخراجات آئے ہیں لیکن فوائد پہلے سے کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔ پوری دنیا رفتہ رفتہ چھ ملکوں کے کنٹرول میں آرہی ہے۔ جہاں جہاں کنٹرول حاصل کرنے میں کچھ کسر ہے وہاں اس سلسلے میں کام جاری ہے۔“

میں اس کی باتوں کو محض گپ یا مبالغہ آرائی سمجھ کر دل کو تسلی بھی نہیں دے سکتا تھا۔ میں جس ماحول میں موجود تھا وہ میرے لئے طلسم ہوشربا سے کم نہیں تھا۔ بیشتر چیزیں وہاں ایسی تھیں جن کا استعمال ترقی یافتہ ممالک میں بھی عام نہیں ہوا تھا۔ وہ آج کا دور بھی نہیں تھا جب الیکٹرونکس کا سیلاب دنیا میں عجیب عجیب تماشے دکھا رہا ہے۔ یہ کئی برس پہلے کی باتیں ہیں۔

”جن ملکوں میں تمہاری شاخیں موجود ہیں‘ کیا وہ ان کی موجودگی سے باخبر ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اگر وہ باخبر ہوجائیں تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔“ عمر رسیدہ عورت نے جواب دیا۔ ”دنیا ہماری کالونی ہے اور کالونیوں میں رہنے والے‘ اپنے آقاؤں کے نمائندوں کی طرف انگلی بھی نہیں اٹھایا کرتے۔ لیکن فی الحال ہم نے ہر جگہ اپنی موجودگی کو خفیہ ہی رکھا ہوا ہے۔ ہم غیر ضروری پبلسٹی یا خواہ مخواہ دوسروں کی نظر میں آنے کو بہتر نہیں سمجھتے۔“

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے کہا۔

”ناممکنات کو ممکن بنانا ہی ہمارا کام ہے۔“ بڑھیا مشفقانہ انداز میں مسکرائی۔ ”ویسے بھی سب ممالک کی نظریں ایک دوسرے کی خفیہ ایجنسیوں پر رہتی ہیں۔ ہم اپنی طرف کسی کی توجہ مبذول ہونے کی نوبت ہی نہیں آنے دیتے۔ ہماری آمد کے انداز‘ ہمارے طور طریقے... سب کچھ بہت مختلف ہے۔“

”پھر بھی... یہ سب کچھ کیسے ممکن ہے؟“ میں نے قدرے بے یقینی سے کہا۔ ”اتنے بہت سے انتظامات اتنے بہت سے غیر ملکیوں کی موجودگی... کیا یہ سب ہماری کسی ایجنسی کی نظر میں نہیں آتا؟“

”نہیں۔“ اس بار جواب ایڈم نے دیا۔ ”ہم نہ جانے کس کس آڑ میں آتے جاتے رہتے ہیں اور کن کن منصوبوں کی آڑ میں اپنے کام کرتے رہتے ہیں۔ تمہارے ہاں تو یہ سب کچھ بہت آسان ہے۔ اتنی بدانتظامی اور افراتفری ہے یہاں‘ ہر وقت ایک خلفشار برپا رہتا ہے۔ غیر ملکیوں سے مرعوبیت بہت زیادہ ہے۔ یہاں تو ہمیں کبھی کوئی خاص دشواری محسوس ہی نہیں ہوئی۔ ہم تو ان ملکوں میں بھی سرایت کرچکے ہیں جہاں سیکیورٹی کے انتظامات اور خفیہ ایجنسیوں کی کارکردگی بہت بہتر ہے۔ دنیا تو سی آئی اے اور کے۔ جی۔ بی ٹائپ ایجنسیوں کی بدمعاشیوں پر ہی انگشت بدنداں رہتی ہے‘ ہم تو ان سے بہت آگے کی چیز ہیں۔ تم اس چکر میں مت پڑو کہ ہم جو کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ کیسے کرتے ہیں۔ بس ہم کرلیتے ہیں۔ حقائق تمہارے سامنے ہیں۔ ہمارا یہ ایک چھوٹا سا برانچ آفس تمہارے سامنے ہے۔“

”یہاں تمہارے کتنے لوگ ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”خاصے ہیں۔“ ایڈم نے جواب دیا۔ ”اور بوقت ضرورت آتے جاتے بھی رہتے ہیں۔“ اس کا جواب گول مول تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ صحیح تعداد بتانا نہیں چاہتا۔

”میں اس سارے چکر میں کہاں فٹ ہوتا ہوں؟“ میں نے پوچھا۔

ایڈم نے باس دن کی طرف دیکھا۔ اب غالباً پھر اسی کے بولنے کی باری تھی۔ وہ ایک عجیب سے مجسمے کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ اس کی آواز ابھری۔ ”کم از کم اس ملک کی حد تک‘ اس چکر میں تمہاری حیثیت بہت اہم ہے۔ ہم نے تمہیں سربراہ مملکت بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔“

میں واقعی اپنی کرسی سے تھوڑا سا اچھل پڑا۔ پھر مجھے ہنسی آگئی لیکن ان چاروں کی سنجیدگی میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ باس دن کے ”چہرے“ پر تو کوئی تغیر آہی نہیں سکتا تھا۔ باقی چاروں نے میرے ہنسنے پر اس طرح میری طرف دیکھا تھا جیسے اچھا خاصا برا مناتے ہوئے پوچھ رہے ہوں ”اس میں ہنسنے کی بھلا کیا بات ہے؟“

میں نے استہزائیہ سے لہجے میں کہا۔ ”یار! مجھے اس سے چھوٹا کوئی عہدہ دے دو‘ میں اسی پر خوش ہوجاؤں گا۔“

اس بار باس دن کی آواز ابھری تو اس میں ہلکی سی ناگواری شامل تھی۔ ”اب تک یہاں جو گفتگو ہوتی رہی ہے‘ اس کے بعد غالباً اس مخصوص موضوع کے بارے میں مذاق کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔“

”جب تک گفتگو سنجیدہ تھی تب تک میں بھی سنجیدہ تھا لیکن اب تم نے مجھ درویش سے مذاق شروع کردیا ہے تو جواب میں اخلاقاً مجھے بھی تھوڑا بہت مذاق کرنا چاہئے۔“ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”میں ایک غیر سیاسی آدمی ہوں اور جس قسم کی سیاست کا نقشہ میں نے گزشتہ برسوں میں ملک میں ابھرتے دیکھا ہے‘ اس کے بعد میں ویسے ہی اپنے آپ کو اس ”عظیم سیاست“ میں حصہ لینے کے قابل نہیں سمجھتا۔ اس سے پہلے کہ کوئی حکومت مجھے نااہل قرار دیتی‘ میں نے خود ہی اپنے آپ کو نااہل قرار دے لیا ہے۔ میں نے تو کبھی چیمبر آف کامرس کا الیکشن لڑنے کے بارے میں بھی نہیں سوچا‘ جہاں میری اچھی خاصی اہمیت ہے اور بارہا دوستوں نے مجھ پر زور بھی ڈالا کہ میں الیکشن میں حصہ لوں لیکن میں نے سختی سے منع کردیا۔ تم مجھے سربراہ مملکت بنانے پر تلے ہوئے ہو۔“

سب خاموش رہے گویا مجھے اچھی طرح بول لینے کا موقع دینا چاہتے ہوں۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اپنے موقف کی مزید وضاحت کے لئے کہا۔ ”سیاست یا ملکی نظام میں کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے کے لئے انسان کا کوئی مخصوص بیک گراؤنڈ ہونا چاہیے۔ کوئی جاگیردار یا وڈیرہ سیاست میں حصہ لیتا ہے‘ آگے آجاتا ہے۔ ہمارے ہاں سیاست میں غلبہ فیوڈل لارڈز ہی کا رہا ہے۔ کبھی کبھی کسی تیز رفتار اور ہنگامی دور میں تھوڑے بہت مڈل کلاسیے بھی آگے آجاتے ہیں لیکن آتے بہرحال تبھی ہیں جب وہ سیاست میں حصہ لیتے رہے ہوں۔ یا پھر ایک تیسری قوت اچانک اقتدار میں آجاتی ہے۔ اس کے بارے میں تم یقیناً جانتے ہوگے لیکن میرا ان تینوں طبقوں سے کوئی تعلق نہیں‘ میری کوئی سیاسی پارٹی نہیں‘ حتیٰ کہ میں تو سیاسی ورکر تک نہیں۔ میں نے تو کبھی کسی کو الیکشن لڑنے کے لئے قابل ذکر چندہ تک نہیں دیا۔ تو آخر میں کس چینل سے آؤں گا؟ کس طرح سربراہ مملکت بن جاؤں گا؟ جبکہ مجھے اس سے کوئی دلچسپی بھی نہیں۔ میں اپنے آپ کو اس مرتبے کا اہل نہیں سمجھتا۔ میری اس طرح کی کوئی تربیت نہیں ہوئی۔“

باس دن نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ باقی چاروں کے چہروں پر بھی ہلکی سی مسکراہٹ آگئی۔ انہوں نے گویا بڑے تحمل سے میری تقریر دل پذیر سنی تھی اور اس سے محظوظ ہوئے تھے۔ میں نے اپنی دانست میں انتہائی سنجیدگی اور بالغ نظری سے جو باتیں کی تھیں وہ ان کی نظر میں گویا محض ایک بچے کے ذہنی الجھاوے تھے‘ پریشان خیالات تھے۔

باس دن اب نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ”ہم نے سربراہ مملکت کا لفظ استعمال کیا‘ اس اصطلاح سے تمہیں غلط فہمی ہوگئی۔ ہم نے اسے غیر رسمی مفہوم میں ایک علامت کے طور پر استعمال کیا تھا۔ ہماری نظر میں سربراہ مملکت وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں طاقت ہوتی ہے‘ اختیار ہوتا ہے۔ جس کے ڈوریاں ہلانے سے بڑے بڑے انقلابات آجاتے ہیں۔“

”سیاسی نظام میں اس قسم کے اختیارات‘ اس قسم کی طاقت تو

سربراہ مملکت کے پاس صرف صدارتی طرز حکومت میں ہوتی ہے۔ پارلیمانی طرز حکومت میں تو زیادہ طاقت پارلیمنٹ کے پاس ہی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"درست ہے۔" باس ون مُربیانہ لہجے میں بولا۔ "اس لئے ہم اس قسم کے سربراہ مملکت کی بات ہی نہیں کررہے۔ نظام تو جہاں جو چل رہا ہے' چلتا رہے گا یا پھر حالات کے مطابق.... اور دنیا کو دکھانے کے لئے جہاں جس قسم کا نظام ضروری ہوا وہ لایا جائے گا لیکن ہم نے جو نیا عالمی نظام ترتیب دیا ہے اس میں ہم نے ان لمبے چکروں کے ساتھ ساتھ ہر ملک میں ایک ایک شارٹ کٹ بھی رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ پاکستان میں شارٹ کٹ تم ہوگے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔

"ہر ملک میں ہمارا جتنا تسلّط ہے وہ تو اپنی جگہ ہے ہی لیکن وہاں ریڈ ڈاٹ کی موجودگی کا مقصد یہ ہے کہ وہاں کے اقتدار پر زیادہ سخت اور زیادہ قریبی کنٹرول رکھا جائے۔ ہر ملک کو وہی کرنا ہوگا جو ریڈ ڈاٹ چاہے گی۔ کسی بھی ملک کا برسراقتدار طبقہ ریڈ ڈاٹ کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکے گا اور ریڈ ڈاٹ اس مقصد کے لئے ہر جگہ ایک مقامی شخص کو آگے رکھنا چاہتی ہے۔ عملی طور پر دراصل وہی اس ملک کا حاکم ہوگا۔ باقی سب چیزوں کو دکھاوا سمجھ لو' رسمی کارروائیاں سمجھ لو یا خانہ پری سمجھ لو جس میں بہت سے لوگ اپنا شوق پورا کرتے رہیں گے اور اپنا اپنا حصہ وصول کرکے جاتے رہیں گے۔

ہم جس مقامی شخص کو اپائنٹ کریں گے اسے اتنا طاقتور بنادیں گے کہ اس کی مرضی کے بغیر یہاں کچھ نہیں ہوگا۔ ملک میں بظاہر اپنے نظام کے مطابق حکمراں طبقہ حکمرانی کررہا ہوگا لیکن ان کے اوپر وہ ایک شخص حکمراں ہوگا مسٹر چوہدری! جس کی کوئی سیاسی پارٹی نہیں ہوگی' جس کا سیاست میں کوئی کردار نہیں ہوگا لیکن پس پردہ حکم اسی کا چلے گا۔"

"اور اس کے اوپر ریڈ ڈاٹ کا حکم چلے گا؟" میں نے بغور باس ون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بات کو اس طرح کہنے سے کچھ اور تاثر ملتا ہے۔ جیسے وہ شخص ریڈ ڈاٹ کی کٹھ پتلی ہوگا۔" باس ون نے پرخیال لہجے میں کہا۔ "لیکن تمہارا یہ خیال درست نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ریڈ ڈاٹ کے ضابطہ اخلاق کا پابند ہوگا جو خود نئے عالمی نظام کی پابند ہے۔ لیکن وہ اپنی جگہ بہرحال ایک بہت بڑا آدمی ہوگا۔ وہ کافی حد تک ایک آزاد شخصیت ہوگا۔ اپنی مرضی سے بھی فیصلے کرسکے گا۔ اپنی بہت سی خواہشوں کی تکمیل بھی کرسکے گا۔ اس کی کوئی حرکت ریڈ ڈاٹ... یا دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ چھ حکمراں ملکوں کے مفادات کے خلاف نہ جارہی ہو۔ بس صرف اس بات کا خیال رکھتے ہوئے وہ ہر طرح سے آزاد ہوگا۔ تم شاید تصور نہ کرسکو کہ وہ کتنا طاقتور شخص ہوگا۔"

"یہ تو میں تصور کرسکتا ہوں لیکن یہ نہیں سمجھ پارہا کہ اسے اتنا طاقتور کس طرح بنایا جائے گا؟" میں نے کہا۔

"یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔ تم صرف اس طرح کرتے رہو جس طرح تمہیں ہدایات ملتی رہیں۔" باس ون نے جواب دیا۔

"اور وہ ہدایات کس قسم کی ہوں گی؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ ابھی تو نہیں بتایا جاسکتا نا۔ جب تم اس پوزیشن پر فائز ہونے کے لئے تیار ہوجاؤ گے' وفاداری کا حلف اٹھالو گے' چند ضروری کاغذات سائن کردو گے' تقریباً چھ ماہ کی ایک خصوصی تربیت لے لوگے تب جاکر ہدایات ملنے کا مرحلہ شروع ہوگا۔" باس ون خاموش ہوگیا۔

اس خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اے نن نے پہلی مرتبہ گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی! تم تصور نہیں کرسکتے کہ تم کتنی دولت اور طاقت کے مالک ہوجاؤ گے۔ عملی طور پر کسی ملک کا حکمراں ہونا کوئی معمولی بات نہیں ہوتی۔"

"خواہ وہ چھ ملکوں کا لے پالک ہی کیوں نہ ہو۔" میں نے کہا۔

وہ گویا میرے الفاظ پر توجہ دیے بغیر بولا۔ "تمہاری یہ چھوٹی سی بزنس ایمپائر جو تم نے برسوں کی محنت سے بنائی ہے' تمہیں بہت بڑی لگتی ہوگی لیکن اس ملک میں ہمارے خاص الخاص آدمی بن جانے کے بعد یہ سب چیزیں تمہیں اونٹ کے منہ میں زیرے کی طرح محسوس ہوں گی۔ تمہیں خود بھی اندازہ نہیں رہے گا کہ تمہاری دولت و جائیداد کتنی ہے۔ دولت اور جائیداد سے قطع نظر' طاقت کا جو نشہ ہوتا ہے' کوئی بھی نشہ اس کا متبادل نہیں ہوسکتا۔ جس شخص کو یہ معلوم ہو کہ اس کے اشارے پر تاج و تخت لرز جاتے ہیں' اس کے سرور کا تم اندازہ نہیں کرسکتے کیونکہ ایسا بننے کا تم نے کبھی خواب تک نہیں دیکھا۔ تم ایسے کسی شخص کے قریب سے بھی نہیں گزرے۔ وہ بادشاہ نہیں ہوتا' بادشاہ گر ہوتا ہے۔"

"اس عظیم مرتبے پر فائز کرنے کے لئے تم لوگوں کی نگاہ انتخاب مجھ غریب پر ہی کیوں پڑی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم تمہیں خوش فہمیوں میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے لیکن جائز تعریف کے بہرحال تم مستحق ہو۔" اے نن نے ہی بدستور سنجیدگی سے جواب دیا۔ "تمہیں شاید خود بھی اپنی صلاحیتوں کا اندازہ نہ ہو کیونکہ ابھی تم نے اپنے آپ کو نچلی سطح پر ہی رکھا ہوا ہے۔ تم ذہین' بے خوف اور جسمانی و اعصابی طور پر غیر معمولی حد تک مضبوط انسان ہو۔ خوف گویا تمہاری سرشت سے ہی نکل چکا ہے۔ تم میں چیزوں کو' ارادوں کو اور افراد کو منظم کرنے کی' آرگنائز کرنے کی بھی بے پناہ صلاحیت ہے۔ ہم نے تمہیں ایک عرصے تک پرکھا ہے۔ تم ہر اعتبار سے ہمارے آئیڈیل آدمی ہو افضل چوہدری!"

میں ایک ٹک اے نن کی طرف دیکھتا رہا۔ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ شخص اس حد تک سنجیدہ بھی نظر آسکتا ہوگا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "کوئی زمانہ تھا کہ نازک اور بین الاقوامی ذمے داریوں کے لئے بوڑھے اور گرگ باراں دیدہ قسم کے لوگوں کو موزوں سمجھا جاتا تھا لیکن جو نیا عالمی نظام ترتیب دیا گیا ہے اس میں غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل نوجوانوں کو ترجیح دی جائے گی.... اور دی جارہی ہے۔"

اس کے لہجے میں جتنی ترغیب تھی وہ واقعی کسی کو حواس سے بیگانہ و بے خود کردینے کے لئے کافی تھی لیکن میرے ذہن میں اس وقت ایک کمپیوٹر آن تھا جس کے اسکرین پر ہندسے جل بجھ رہے تھے' الفاظ اور جملوں کا تجزیہ ہورہا تھا۔ ان کی ہر بات میری یادداشت میں محفوظ ہورہی تھی۔

پھر باس ون گویا معمر جوڑے کی موجودگی کی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "ریڈ ڈاٹ میں جہاں جہاں بھی بڑی عمر کے لوگ موجود ہیں وہ صرف مشکل معاملات میں مشاورت کے لئے ہیں۔ انہیں عملی ذمے داریاں نہیں سونپی جاتیں۔ ان میں سے ہر ایک عموماً کئی شعبوں کا ماہر ہوتا ہے۔" اس نے معمر جوڑے کی طرف اشارہ نہیں کیا تھا لیکن وہ دونوں غالباً مشیر قسم کی ہی چیز تھے۔

باس ون بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن ان کی اہمیت بہرحال عملی کام کرنے والوں سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ بعض اوقات تو صرف ان کے مشوروں کے تحت کوئی بہت بڑا پروجیکٹ' کوئی بہت بڑا منصوبہ ترک کردیا جاتا ہے جس کی منظوری اوپر والے دے چکے ہوتے ہیں۔"

میں نے بظاہر سرسری لہجے میں پوچھا۔ "یہاں کوئی ایجنسی تمہاری موجودگی سے واقف نہیں ہے؟"

"تم اس چکر میں مت پڑو۔" باس ون کے لہجے میں ہلکی سی بیزاری جھلک آئی۔ "یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہاں' اگر تم کسی قسم کے خوف کے تحت یہ سوال کررہے ہو تو ہمیں حیرت ہوگی کیونکہ ہمارے تجزیے کے مطابق خوف تمہاری سرشت میں شامل ہی نہیں ہے۔ بہرحال.... اگر تم اپنے مستقبل کے بارے میں کوئی بھی اندیشہ محسوس کرتے ہو تو اسے ذہن سے نکال دو۔ ہمارے ساتھ تو تمہارا مستقبل اتنا ہی محفوظ ہے جتنا کسی بھی سپرپاور کے سربراہ کا۔ جب کوئی ہمارا ہم سفر بنتا ہے تو اندیشے اس کی زندگی سے رخصت ہوجاتے ہیں کیونکہ ہم نے جب نیا عالمی نظام ترتیب دیا تو کئی برس تک ہر پہلو پر غور و خوض جاری رہا تھا۔ ہم نے ہر چھوٹے سے چھوٹے اندیشے کا حل سوچ لیا تھا۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا کہ دو نہ تین.... پورے چھ ممالک کسی ایک ورلڈ آرڈر پر متفق ہوسکتے ہیں۔ کیا ہر بڑا ملک یہ نہیں چاہے گا کہ وہ اکیلا ہی پوری دنیا پر تسلّط جمالے؟ آج تک تو یہی کوششیں ہوتی آئی ہیں۔"

"انہی کوششوں اور کھینچا تانی میں تو دنیا کی حالت زیادہ بُری تھی اور فائدہ کم تھا۔" باس ون نے جواب دیا۔ "ہر بڑے ملک نے یہ دیکھ لیا ہے اور محسوس بھی کرلیا ہے کہ کسی کے لئے بھی تنہا پوری دنیا پر تسلّط جمانا مشکل ہے۔ برطانیہ کی مثال سب کے سامنے ہے۔ اس کا تو براہِ راست پوری دنیا پر قبضہ تھا۔ ہر جگہ اس کے اپنے حاکم موجود تھے۔ یعنی یہ ان ڈائرکٹ یا معاشی زنجیروں کے ذریعے کسی ملک کو اپنی کالونی بنانے والا سلسلہ نہیں تھا بلکہ انہی کا سکّہ چلتا تھا' انہی کا جھنڈا لہراتا تھا.... اور ان زمانوں میں جہالت و پسماندگی بھی زیادہ تھی۔ جہاں جہالت اور پسماندگی زیادہ ہو وہاں حکومت کرنا اتنا ہی آسان ہوتا ہے۔ لوگوں کو لڑواتے رہو اور حکومت کرتے رہو لیکن اس کے باوجود کیا ہوا؟"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگیا۔ یقیناً وہ میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن نہ جانے کس طرح؟ پھر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "وہ برطانیہ جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا' اس کا عالم یہ رہا کہ ایک ملک کو قابو میں کرتا تھا تو دوسرا ہاتھ سے نکلنے لگتا تھا۔ دوسرے کو سنبھالتا تھا تو تیسرا آنکھیں دکھانے لگتا تھا۔ آخر ایک ایک کرکے سبھی ہاتھ سے نکل گئے اور انگریزوں کا جو جانی نقصان ہوا وہ الگ۔"

اس نے ایک گہری سانس لی پھر کہا۔ "اب تو ویسے ہی زمانہ زقندیں بھر رہا ہے۔ یہ مواصلات اور بیداری کا دور ہے۔ پسماندہ ترین ملکوں میں بھی تھوڑی بہت تعلیم' تھوڑا بہت سیاسی شعور اور تھوڑی بہت بیداری موجود ہے۔ اس لئے یہ بات تو بڑے ملکوں نے بہت پہلے محسوس کرلی تھی کہ چھوٹے ملکوں میں اپنی فوجیں بھیجنے' اپنا جھنڈا لہرانے اور زیادہ الجھنیں مول لینے کی ضرورت نہیں۔ یہ شوق پورا کئے بغیر بھی جو فائدے اٹھانے ہوں وہ اٹھائے جاسکتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھتے رہیں گے' اپنا جھنڈا لہراتے رہیں گے اور اپنی جگہ خوش رہیں گے' انہیں خوش رہنے دو' اس میں کیا حرج ہے؟"

میں اپنے سینے میں تلخی کو چھپائے خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "لیکن سیاسیات کا شعور رکھنے والے صاحبِ علم لوگ جانتے ہیں کہ چھوٹے ملکوں کی حیثیت کمپنیوں کی سی اور ان کے سربراہوں کی حیثیت ریذیڈنٹ ڈائرکٹروں جیسی ہوچکی ہے۔ ان کے لئے بس یہی ہے کہ نوکری کریں' اپنا وقت پورا کریں' جیبیں بھریں اور جائیں۔ کوئی بھی ڈائرکٹر اپنی قوم میں حقیقی بیداری' حقیقی آزادی کی خواہش یا حقیقی خوشحالی کی امنگ پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے۔"

اس نے ایک لمحے توقف کیا پھر بولا۔ "جب یہ طے ہوگیا اور کافی سالوں تک اس نظام پر خاصی حد تک کامیابی سے عملدرآمد ہوتا رہا تو پھر اس میں مزید اصلاح کی گنجائش نکلی۔ بڑے ملکوں نے نئی پالیسی وضع کی اور ان کے بہترین دماغوں نے یہ نتیجہ اخذ کرکے

دیا کہ مل کر کھانے میں زیادہ فائدہ ہے۔ اس طرح تسلط زیادہ مضبوط ہوگا' زیادہ دور تک پھیلے گا اور وسائل کم ضائع ہوں گے۔ بس اس کے نتیجے میں ہم تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تمہارے خیال میں ساجھے کی یہ ہنڈیا کب تک چلے گی؟ سپر پاورز کی یہ "لمیٹڈ کمپنی" ٹوٹ بھی تو سکتی ہے۔ ہر ملک کی انفرادی دوڑ دوبارہ بھی تو شروع ہو سکتی ہے۔ کوئی ایک ملک اس سارے ورلڈ آرڈر کو تنہا اپنی مٹھی میں دبوچنے کی ہوس میں بھی تو مبتلا ہو سکتا ہے؟"

"ان سب پہلوؤں کا جائزہ لیا جا چکا ہے۔" باس ون بولا۔ "ایسا ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ اگر ہوا بھی تو اس میں صدیاں لگ جائیں گی۔ اتنا بڑا سیٹ اپ ہے۔ اس کو ٹوٹنے بکھرنے کے لئے بھی سیکڑوں سال درکار ہوں گے۔ ہمیں اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"ہم مادّیت پرست انسانوں کی یہی تو مشکل ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ہم ہر چیز کے بارے میں اندازے اپنے معاہدوں' اپنی کاغذی رپورٹوں' اپنے شاندار انتظامات' اپنے کمپیوٹروں کے حسابات اور اپنے وسائل وغیرہ کی روشنی میں لگاتے ہیں۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک نظام اوپر آسمانوں میں بھی کام کر رہا ہے جس کے تحت یہ کائنات چل رہی ہے۔ ہم تو بیٹھے اپنے فیصلے کرتے رہتے ہیں' ہمیں نہیں معلوم ہوتا کہ اوپر آسمانوں میں کیا فیصلے ہوتے ہیں۔ ہم زمینی مخلوق' حقیر انسان زمین پر بیٹھے حساب لگاتے رہتے ہیں کہ فلاں کام کے لئے صدیاں درکار ہوں گی لیکن اوپر سے اشارہ ہوتا ہے تو وہ کام برسوں' مہینوں' ہفتوں یا پلک جھپکنے میں ہو سکتا ہے اور جس کام کو ہم سمجھتے ہیں کہ وہ چٹکی بجاتے میں ہو جائے گا وہ کبھی ہو ہی نہیں پاتا۔ اس لئے ڈیئر باس ون! اتنے وثوق سے کوئی بات مت کہو۔"

وہ پہلی بار ذرا کھل کر ہنسا۔ کم از کم اس کی آواز سے یہی اندازہ ہوا کہ وہ کھل کر ہنس رہا تھا۔ معمر جوڑا بھی مسکرا رہا تھا اور زیادہ توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ہنسی تھمی تو باس ون بولا۔ "ہمیں خوشی ہے کہ تمہاری شخصیت میں یہ لچ بھی موجود ہے۔ ہمیں معلوم ہے' تمہاری قوم کو کبھی کبھی روحانیت کی گولی بھی دینا پڑتی ہے۔"

"پلیز۔ ایسے بے درد لہجے میں بات نہ کرو۔" میں نے سنجیدگی سے التجا کی۔ "روحانیت بہت بڑی حقیقت ہے۔ مجھ جیسے گناہ گار یا تم جیسے مادّیت پرست اس کی باریکیوں کو کیا جانیں۔"

"خیر۔ فی الحال یہ موضوع غیر متعلق ہے۔" باس ون نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ اس نے پہلی بار ہاتھ کو حرکت دی تھی ورنہ اتنی طویل گفتگو کے دوران وہ بالکل ساکت رہا تھا۔ اگر سر کو چھوڑ کر اس کا باقی جسم انسانی نظر نہ آ رہا ہوتا تو اس پر کسی روبوٹ کا ہی گمان گزرتا۔

وہ ہاتھ دوبارہ میز پر ٹکاتے ہوئے بولا۔ "بہتر ہے کہ ہم اسی موضوع پر اپنی گفتگو ختم کر لیں۔ اس موضوع سے متعلق تم کسی بھی پہلو پر کوئی بھی سوال کر سکتے ہو۔"

"تم نے کمال فراخدلی سے مجھے ایک بہت بڑے اور خطرناک عالمی راز سے آگاہ کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ بات تو خیر اب کوئی راز نہیں کہ سپر پاورز پانچ کے بجائے چھ ہو گئی ہیں اور انہوں نے کوئی نیا عالمی نظام ترتیب دیا ہے لیکن وہ عالمی نظام کیا ہے' اس بارے میں صرف افواہیں مشہور ہیں۔ قیاس لگائے جا رہے ہیں۔ دنیا بھر کے دانشور اور صحافی اس پر اپنے اپنے اندازوں اور سمجھ بوجھ کے مطابق تجزیئے اور مضامین وغیرہ لکھ رہے ہیں۔" معمر مرد بولا۔

"مقصد یہی ہوا نا کہ ہماری گفتگو کا بیشتر حصہ خفیہ ہے؟" میں نے کہا۔

اس بار جواب باس ون نے دیا۔ "ہاں۔ انتہائی خفیہ۔ اس گفتگو کا ایک لفظ بھی باہر نہیں جانا چاہئے۔"

"لیکن میں باہر جاؤں گا تو باتیں بھی باہر جا سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"ان باتوں کا راز رہنا تمہاری زندگی کی ضمانت ہے مسٹر چوہدری!" باس ون کے لہجے میں ایسی سرد مہری در آئی جو مجھ جیسے انسان کی رگ و پے میں بھی ہلکی سی سنسنی دوڑانے کے لئے کافی تھی۔ کچھ وہاں کے دھندلاہٹ زدہ ماحول میں بھی بڑی خنکی تھی۔

ایڈم نے بھی ٹکڑا لگایا۔ "اپنی زندگی کی قیمت پر تم کوئی راز افشا کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ گو کہ ہمارا نظام ایسا ہے جس میں تمہارے باہر جا کر باتیں کرنے سے ہمارے لئے کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا لیکن ہم محض اپنے ڈسپلن کی خاطر تمہارے وجود کو صفحۂ ہستی سے مٹانے پر مجبور ہو جائیں گے۔"

باس ون بولا۔ "لیکن ہم تم سے ایسی توقع نہیں رکھتے۔ ہم نے تمہیں اپنے لوگوں میں شمار کر لیا ہے اور جب کسی کو اپنا کہہ دیا جائے تو اسے اس قسم کی حرکت نہیں کرنی چاہئے۔"

"لیکن تم نے کس بنیاد پر مجھے اپنے لوگوں میں شمار کر لیا؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔ "کیا میں نے کبھی تم لوگوں میں دلچسپی ظاہر کی؟ جب سے ریڈ ڈاٹ کا نام میرے علم میں آیا ہے' کیا میں نے کبھی اس کے بارے میں دوستانہ جذبات یا محض تجسس کا بھی اظہار کیا؟"

"نہیں۔" ایڈم نے تسلیم کیا۔ مجھ سے فون پر ہمیشہ اسی کا رابطہ رہا تھا۔

"تو پھر یہ یک طرفہ ٹریٹنگ کیسا ہے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"اب سے پہلے بات کچھ اور تھی۔" باس ون بولا۔ "اب سے پہلے ہم نے یہ ملک پلیٹ میں رکھ کر تمہیں پیش نہیں کیا تھا۔"

"میں یہ چاہتا بھی نہیں کہ کوئی اس ملک کو پلیٹ میں رکھ کر مہارے سامنے پیش کرنے کی جرأت کرے۔" اب میں نے قطعی سرد لہجے میں کہا۔ "میں اس ملک کا ایک معمولی سا شہری ہوں۔ میں اس دھرتی کا ایک حقیر سا ذرّہ بن کر ہی رہنا چاہتا ہوں۔"

"اوہ۔ چوہدری پلیز۔۔۔! یہ باتیں چھوڑو۔" باس ون کے لہجے میں ہلکی سی بیزاری جھلک آئی۔ "ہم نے جذبہ حب الوطنی وغیرہ پر تقریر سننے کے لئے تمہیں اتنی زحمت نہیں دی۔ تمہارے ملک میں ہر دوسرا شخص دولت اور اقتدار کی ہوس میں مرا جا رہا ہے لیکن وہ لوگوں کو سنانے کے لئے۔۔۔ یا اپنے لوگوں سے اپنی اصل شخصیت کو مخفی رکھنے کے لئے اس قسم کی باتیں کرتا ہے۔"

میں نے کرسی کے پیچھے سے ٹیک لگا لیا۔ اداسی کی ایک عجیب سی لہر میرے وجود میں پھیل گئی۔ ایک لمحے کے لئے میں افسردہ سی نظروں سے باس ون کے بیضہ نما چہرے یا ماسک کی طرف دیکھتا رہا۔

"خاموش کیوں ہو گئے؟" باس ون کی آواز ابھری۔ اس کے لہجے میں ہلکا سا اضطراب تھا۔

"مجھے اعتراف ہے کہ دولت اور کسی بھی قسم کے اقتدار کی ہوس نے ہمیں رسوا کر دیا ہے باس ون!" میں نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا۔ "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہاں قوم کی حالت پر کڑھنے والا اور اس کی اصلاح کرنے والا کوئی رہا ہی نہیں۔ یہاں درمند دل رکھنے والے ان گنت لوگ ہیں جو بند کمروں میں بحث و تمحیص کرتے اور کڑھتے رہتے ہیں' ان کے بس میں کچھ نہیں ہوتا لیکن کچھ ہیں جو اپنی بساط کے مطابق اصلاح احوال کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" باس ون قدرے بیزاری سے بولا۔ "سب اپنا اپنا کام کرتے رہتے ہیں ہم اپنی بات کرتے ہیں۔"

"میں اپنی ہی بات کر رہا ہوں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "مصیبت یہ ہے کہ ایک تو کردار کے لحاظ سے ہم لوگ پہلے ہی تباہ ہو چکے ہیں' اوپر سے ہم جیسی پسماندہ قوموں کی جان کو اتنی قسم کے موٹے موٹے ٹکر مچھ چمٹے ہوئے ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا' وہ کس کس سے نجات پائیں اور کس طرح نجات پائیں۔ ان کا کچھ خون بڑے ملک چوس جاتے ہیں' کچھ برسر اقتدار سیاستداں چوس جاتے ہیں' کچھ اقتدار کی ہوس میں مارے ہوئے سیاستداں چوس جاتے ہیں' کچھ سرکاری محکمے اور بیورو کریسی چوس جاتی ہے۔ اس کے باوجود ہم جیسی قومیں بقا کی جدوجہد میں مصروف ہیں اور یہ ایک معجزے سے کم نہیں۔ نہ جانے کب ان قوموں کی تقدیر بدلے گی۔"

"چوہدری پلیز! یہ تقریریں چھوڑو اور کام کی بات کرو۔" باس ون بولا۔ ایڈم اور ایرے نن نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

"تم نے کیونکر فرض کر لیا کہ میں بے اندازہ دولت اور ملکی نظام سے بالا بالا اصل اقتدار کی طاقت حاصل کرنے کا خواہش مند ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"تمہیں ہونا چاہئے۔" باس ون زور دیتے ہوئے بولا۔ "ظاہر ہے' تم جنگل میں بیٹھے ہوئے' دنیا سے بے نیاز کوئی ملنگ یا درویش نہیں ہو۔ تم دنیادار ہو' بزنس کرتے ہو اور اسے بڑھانے کے لئے دن رات محنت کرتے ہو۔ اس کا مطلب ہے' تمہارے دل میں دنیا کی محبت موجود ہے۔ دنیا سے محبت ہی کرنی ہے تو ذرا اچھی طرح' شان سے کرو۔ دنیاداری کا کچھ لطف تو آئے۔"

"دنیا سے محبت کرنے والوں کے دل کے کسی کونے کھدرے میں بھی تھوڑی سی درویشی موجود ہو سکتی ہے۔ میں اگر کاروبار کرتا ہوں' اسے ترقی دینے کے لئے کوشاں رہتا ہوں تو ممکن ہے میری خواہشات کی تسکین کے لئے یہی کافی ہو' میرا صرف اسی میں مگن رہنے کو جی چاہتا ہو۔ ضروری نہیں ہے کہ میرے دل میں بے پناہ اوپر جانے کی ہوس ہو اور اس کے لئے میں اپنے ہی ملک کے خلاف بین الاقوامی سازشوں کا ایک حصہ بننے کے لئے تیار ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔

"تمہارا یہ دعویٰ غیر فطری ہوگا۔ ہم اسے تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتے۔ دنیاداری' دولت کی ہوس اور طاقت و حکمرانی کا شوق' یہ ایسی چیزیں ہیں جن کی کوئی حدود نہیں ہوتیں۔ اگر ان چیزوں کی کوئی حد ہوتی تو یہ دنیا کہیں نہ کہیں پہنچ کر ضرور ساکت ہو جاتی۔ کوئی نہ کوئی منزل پا لینے کے بعد لوگوں کو ضرور قرار آ جاتا۔ لیکن بھاگ دوڑ' افراتفری اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کشمکش جاری ہے۔ یہ فطرت کا اصول ہے۔"

"فطرت کا اصول ضرور ہے لیکن نہایت مسخ شدہ حالت میں ہمارے سامنے رہ گیا ہے۔" میں نے کہا۔

"ہمیں اخلاقیات کا درس دے کر مت ڑخاؤ۔" باس ون ٹھہرے لہجے میں بولا۔

میرے ساتھ یہ بھی ایک بڑی مصیبت تھی۔ ایک بڑا بزنس مین اور صنعت کار ہوتے ہوئے جب میں درویشی کی بات کرتا تھا تو کوئی اس پر یقین نہیں کرتا تھا۔ لوگوں کا لوگوں پر سے اعتبار اس حد تک اٹھ گیا تھا کہ کوئی کسی کے دل کی بات تسلیم ہی نہیں کرتا تھا۔ ترقی کی خواہش اور ناجائز کی ہوس' دونوں کے درمیان لوگوں کی نظر میں کوئی فرق ہی نہیں رہ گیا تھا۔

میں خاموش رہا تو باس ون بولا۔ "تم ایک بڑے بزنس مین ہو' انٹرنیشنل پاور گیم کو بھی سمجھتے ہو لیکن شاید تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا کہ ہم تمہیں کیا پیشکش کر رہے ہیں۔ اگر ہم اس کے ہزارویں حصے کی بھی پیشکش لے کر کسی ایسے شخص کے پاس جائیں جس کا تم سے ہزار گنا بڑا نام ہو' اچھا خاصا سیاسی مقام ہو تو وہ عمر بھر کے لئے ہمارے سامنے دست بستہ کھڑا ہونے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ بلکہ یہ ہزارواں حصہ بھی میرے خیال میں کچھ زیادہ بڑی پیشکش ہے۔ اگر ہم نوٹوں سے بھرا ہوا صرف ایک بریف کیس لے جا کر

کسی کے سامنے رکھ دیں تو وہ باچھیں پھیلا کر ہاتھ باندھ کر اٹھ کھڑا ہوگا اور خود ہی پوچھے گا۔ "کیا حکم ہے میرے آقا؟" ہم تمہیں ایک پورے ملک کا غیر رسمی مالک و مختار بنانا چاہ رہے ہیں لیکن تم شاید اس کی اہمیت کو سمجھ ہی نہیں رہے۔ ہم اس ملک کو ترقی بھی دیں گے۔ یہاں بڑی دولتیں مدفون ہیں' ان گنت وسائل چھپے ہوئے ہیں۔ ہم سب باہر نکالیں گے۔ یہاں کے بوسیدہ نظام کو درست کریں گے۔ یہاں دولت کی ریل پیل ہوگی۔ ہم اپنا حصہ لیں گے' تمہیں تمہارا حصہ دیں گے اور باقی سب کو ان کا حصہ دیں گے۔ سب خوش ہوں گے' سب کے مزے ہوں گے۔"

"یہ تو صرف تمہارے خواب ہیں نا۔" میں نے تحمل سے کہا۔ "دنیا کے زیرک ترین انسان بیٹھ کر جو کچھ سوچتے ہیں' جس طرح کے منصوبے' جس طرح کے نقشے بناتے ہیں سب کچھ اس طرح نہیں ہوتا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات تو خلوص نیت شامل ہونے کے باوجود اس طرح نہیں ہوتا۔ تمہارے ساتھ تو نیت وغیرہ کا بھی کوئی معاملہ نہیں ہے۔ تم نے تو محض اپنے مفادات کے لئے ایک عالمی ڈراما ترتیب دیا ہے جو اعداد و شمار اور ظاہری حقائق کے اعتبار سے تمہیں درست نظر آرہا ہے' کامیاب دکھائی دے رہا ہے لیکن یہ قطعی فلاپ بھی ہوسکتا ہے۔ باقی رہا ہمارے ہاں بکاؤ لوگوں کا دستیاب ہو جانا' اس سے مجھے انکار نہیں۔ بک جانا اور ہر سطح پر بکتے رہنا ہماری قومی شناخت بنتا جارہا ہے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے ہاں نہ بکنے والے لوگ بالکل ہی ختم ہوگئے ہیں۔ کچھ نہ کچھ لوگ تو ضرور ہوں گے جن سے یہ عمارت زمیں بوس ہونے سے بچی ہوئی ہے۔"

"اور تمہیں انہی لوگوں میں شامل ہونے کا شوق چرایا ہے۔"

باس ون نے ٹھنڈی سانس لی۔

"مجھے شعوری طور پر کسی بھی قسم کے لوگوں میں شامل ہونے کا شوق نہیں۔ میں تو بس جو ہوں سو ہوں۔ ہر شخص اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے۔"

"ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ جو "برائے فروخت" قسم کے لوگ دستیاب ہیں ان میں سے ہمیں کوئی پسند نہیں۔ چھوٹے موٹے کاموں کے لئے تو ہم ان کی خدمات حاصل کرتے رہتے ہیں' ڈائرکٹ نہیں بلکہ ان ڈائرکٹ طریقوں سے۔ لیکن اتنے بڑے منصب کے لئے ہمیں ذرا مختلف قسم کا آدمی چاہئے۔"

"تم تلاش جاری رکھو۔" میں نے مشورہ دیا۔ "کوئی نہ کوئی مل ہی جائے گا۔ ہوسکتا ہے مجھ سے بہتر مل جائے۔"

"نہیں۔ ہماری تلاش مکمل ہوچکی ہے۔" باس ون فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "اب میں تمہیں سچی بات بتاؤں۔ ہمیں تمہارے جواب سے مایوسی نہیں ہوئی ہے۔ ہمیں تم سے اسی جواب کی توقع تھی۔ انسان کا کوئی کردار ضرور ہونا چاہئے۔ ہمیں بھی بالکل ہی بے کردار یا "تھالی کا بینگن" قسم کا آدمی نہیں چاہئے۔ ایسے لوگ کسی کام کے نہیں ہوتے' وہ کبھی کسی کا قیمتی اثاثہ نہیں بن سکتے۔ وہ گاڑی کے اس پہیئے کی طرح ہوتے ہیں جس کے نٹ بولٹ ڈھیلے ہوتے ہیں۔ کچھ پتا نہیں ہوتا کہ کب تک وہ گاڑی کے ساتھ چلتے رہیں اور کب کسی موڑ پر الگ ہو کر لڑھکتے ہوئے کسی طرف کو چل دیں۔"

اب گویا اس نے نیا پینترا بدلا تھا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہمیں تم سے فوری جواب نہیں چاہئے۔ اس طرح کے بڑے فیصلے فوری طور پر نہیں کئے جاسکتے۔ ہم تمہیں خاطر خواہ وقت دیں گے' تمہیں قائل کریں گے۔ تمہیں چند ملکوں کے دورے پر بھیجا جائے گا جہاں تم ان لوگوں سے ملو گے جن کا ہم نے تقرر کیا ہے۔ ہر ملک میں ہمارا ایک نمائندہ موجود ہے جسے ہمارے ہاں "ریزیڈنٹ رولر' یا آر آر" کہا جاتا ہے۔ تم ذرا ان کے ٹھاٹ اور ان کی طاقت و اختیارات دیکھنا۔ ہر ملک کی حکومت ہمارے ریزیڈنٹ رولر کے سامنے لرزہ براندام رہتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ اس کی پیشانی پر شکن نہ آنے پائے۔ جب تم سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھو گے تو تمہارے دل میں خود بخود ہمارا ریزیڈنٹ رولر بننے کی خواہش پیدا ہوجائے گی۔"

"خدا مجھے اس وقت سے محفوظ رکھے۔" میں نے خلوص دل سے بہ آواز بلند دعا کی۔

لیکن باس ون نے گویا میرے الفاظ پر قطعاً توجہ نہیں دی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پاس پورے دو ماہ کی مہلت ہوگی۔ اس دوران تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ بس ایک تو ہمارے بارے میں زبان بند رکھنی ہے' دوسرے ہماری آج کی میٹنگ میں جو بھی باتیں ہوئی ہیں ان کے بارے میں غور و خوض جاری رکھنا ہے۔ اس دوران ایڈم کبھی کبھار تم سے رابطہ قائم کرتا رہے گا۔ تمہارے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی بھی سوال ہو تو تم ایڈم سے اس کا جواب حاصل کرسکتے ہو۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے گویا میرے ردِ عمل کا جائزہ لیا۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہونے پائے۔

باس ون بولا۔ "اس دوران تمہارے لئے چند ملکوں کے دورے' قیام اور ملاقاتوں کا شیڈول تیار ہوچکا ہوگا۔ دو ماہ بعد ہمیں تم سے حتمی جواب درکار نہیں ہوگا۔ تم اطمینان سے ہمارے نمائندے کے ساتھ دورے پر جانا۔ یہ محض ایک خشک اور نیم سیاسی دورہ نہیں ہوگا۔ اس میں ہر طرح کی تفریحات شامل ہوں گی۔ تمہیں کوئی چیک بک' کوئی ٹریولر چیک حتیٰ کہ جیب میں سو روپے کا ایک نوٹ بھی لے کر جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ان ملکوں کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں کے وی آئی پی سوئٹس میں تمہارا قیام ہوگا۔ مہنگی ترین دکانوں میں جاکر تم جس چیز پر چاہے انگلی رکھ دینا' وہ تمہاری

ہو جائے گی۔ شاندار ترین کیسینوز میں جا کر لاکھوں کی رقمیں ہار کر آجانا' کوئی تم سے حقیر سا ایک سکہ بھی طلب نہیں کرے گا۔ ہوٹلوں اور کیسینوز میں نظر آنے والی حسین ترین لڑکیاں تمہارے ایک اشارے کی منتظر ہوں گی۔ تم اس دورے کے اصل مقصد کی تکمیل کے ساتھ ساتھ پوری طرح انجوائے کرنے کی بھی کوشش کرنا۔ یہ ہماری طرف سے دوستی کے آغاز کا ایک معمولی سا تحفہ ہوگا۔ واپس آکر تم ایک ہفتہ آرام کرنا۔ اس دوران بھی تمہارے ذہن میں کوئی سوال ہو تو ہم سے پوچھنا۔ ہم ہر طرح سے تسلی بخش جواب دیں گے۔ اس کے بعد ہم تم سے حتمی جواب چاہیں گے... اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ وہ اثبات میں ہوگا۔"

سچی بات یہ تھی کہ اب میری کھوپڑی میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شاید یہ سب کچھ ایک مذاق ہو۔ شاید یہ ایک خواب ہو اور جلد ہی میری آنکھ کھلنے والی ہو لیکن میری ایسی کوئی خوش گمانی سچ ثابت نہیں ہو سکی۔ مجھے یک لخت تھکن سی محسوس ہونے لگی۔

میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ "کیا ہر ملک میں تم اپنے ریزیڈنٹ رولر کے طور پر کسی بزنس مین کو ہی منتخب کرتے ہو؟"

"یہ ضروری نہیں ہے۔" باس ون نے جواب دیا۔ "اس کا تعلق کسی بھی شعبہ زندگی سے ہو سکتا ہے لیکن بہر حال وہ اپنے میدان میں ایک نمایاں اور غیر معمولی آدمی ہوتا ہے۔ وہ کوئی بہت بڑا سرکاری آفیسر بھی ہو سکتا ہے۔ تاہم وہ لازماً غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہوتا ہے۔"

"اگر میں تمہاری پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دوں تو میرا انجام کیا ہوگا؟" میں نے دریافت کیا۔

باس ون میرے سوال کا براہ راست جواب دینے کے بجائے بولا۔ "ہمیں یقین ہے کہ تم انکار نہیں کرو گے۔ جب تک حتمی جواب کا مرحلہ آئے گا تب تک تمہارے خیالات بدل چکے ہوں گے۔"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ کسی دوسرے کا مؤقف سننے یا قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ وہ صرف منصوبے بنانا' حکم جاری کرنا اور انہیں تسلیم کرانا جانتے تھے۔ میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔ "میں کافی حد تک تمہارے سیٹ اپ کو سمجھ گیا ہوں لیکن محض تصدیق کی خاطر پوچھ رہا ہوں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ چھ ملکوں کی ایسوسی ایشن نے باقی دنیا پر اپنی حکمرانی مضبوط رکھنے کے لئے ایک بہت بڑا نظام تشکیل دیا ہے۔ اس نظام کو زیادہ مؤثر اور تیز رفتار رکھنے کے لئے اور مقامی برسر اقتدار طبقے کے سر پر سوار رہنے کے لئے تمہارا ریزیڈنٹ رولر موجود رہتا ہے اور ریزیڈنٹ رولر کو قابو میں رکھنے کے لئے ریڈ ڈاٹ موجود رہتی ہے۔"

"درست ہے۔" باس ون نے جواب دیا۔ "ریزیڈنٹ رولر کی ضرورت اس لئے پیش آتی ہے کہ حکمراں طبقے بعض اوقات آزادانہ طور پر پالیسیاں بنانے لگتے ہیں' فیصلے کرنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ بعض اوقات چھ ملکوں کی ایسوسی ایشن کے لئے ان سے فوری طور پر کوئی بات منوانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ان کے پاس جواب ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں فلاں سسٹم کام کر رہا ہے' اس سے ہٹ کر اتنی جلدی فلاں فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے موقعے پر ہم غیر ملکی لوگ براہ راست آگے آکر معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنا چاہتے۔ اس سے ہمارے ملکوں کی بدنامی ہوتی ہے۔ اب جدید نظام میں ہم اپنے لئے بدنامیاں مول نہیں لیتے۔ ایسے موقعوں پر ریزیڈنٹ رولر حرکت میں آتا ہے۔ وہ کچھ ایسی ڈوریاں ہلاتا ہے کہ حکومت گھٹنے ٹیک دیتی ہے۔"

"اسی لئے ریزیڈنٹ رولر کا مقامی ہونا ضروری ہوتا ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ تاکہ سب کچھ ان کی آپس کی' داخلی کشمکش محسوس ہو۔ ریزیڈنٹ رولر کو ہم اتنا طاقتور بناتے ہیں کہ اس کے ڈوریاں ہلانے سے کسی بھی ملک کا نظام لرزنے لگتا ہے۔" پھر باس ون ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا۔ "ریزیڈنٹ رولر کا مقامی ہونا اور بھی کئی وجوہات کے تحت ضروری ہے جن پر فی الحال تبادلہ خیال کرنا ضروری نہیں۔ ہمارے بڑے دانشوروں کے ایک پینل نے تجویز کیا تھا کہ جس ملک میں بھی ریزیڈنٹ رولر تعینات کیا جائے اس کا تعلق اسی ملک سے ہونا چاہئے' اس کے پیچھے لمبا چوڑا فلسفہ ہے۔"

"ضرور ہوگا۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن یہ زبردستی کا سودا کچھ احمقانہ نہیں؟ ایک شخص ریزیڈنٹ رولر بننا نہیں چاہتا لیکن تم اسے بنانے پر تلے ہوئے ہو۔ وہ تمہارے لئے کس طرح مخلص ہوگا؟ کس طرح تمہارے لئے خدمات انجام دے گا؟"

"ہم کب کہہ رہے ہیں کہ ہم کسی کو زبردستی بھی ریزیڈنٹ رولر بناتے ہیں؟" باس ون کے لہجے میں ہلکا سا تعجب جھلک آیا۔ "جب کوئی ہمارا ہاتھ تھامتا ہے تو صدق دل سے تھامتا ہے۔ ہماری نظروں میں فی الحال تمہارا انکار قطعی تشویش کا باعث نہیں۔ بلکہ ہمیں اس سے خوشی ہوئی ہے کہ تم فوراً ہی آنکھیں بند کر کے بک جانے والے آدمی نہیں ہو۔ اصل بات دو تین ماہ بعد ہوگی۔ فی الحال تم کچھ اور پوچھنا چاہو تو پوچھ سکتے ہو۔"

"جو کچھ پوچھ لیا ہے اور جو کچھ سن لیا ہے فی الحال تو اسی سے سر چکرا رہا ہے۔ ان "صدمات" سے سنبھل لوں تو پھر کچھ اور پوچھوں گا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"بس تو پھر میٹنگ ختم کی جاتی ہے۔" باس ون یکدم ہی جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میز خاصی بڑی تھی۔ وہ دوسرے کنارے سے مجھ تک مصافحے کے لئے ہاتھ نہیں پہنچا سکتا تھا اس لئے ایک بار پھر گھوم کر میرے قریب آیا۔ باقی چاروں افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن میں اس بار بھی جان بوجھ کر بیٹھا رہا۔ تاہم اس نے یا کسی

اور نے میری اس بے ادبی پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور باس ون مجھ سے اسی فولادی انداز میں مصافحہ کر کے مارچ کرنے کے سے انداز میں مستعدی سے قدم اٹھاتا ہوا اسی پہاڑی کے عقب میں اندھیرے میں غائب ہو گیا جہاں سے نمودار ہوا تھا۔

عمر رسیدہ مرد اور عورت نے بھی میری طرف مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھائے۔ میں نے باری باری ان سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ دونوں سے تعارف نہیں ہوا۔"

"ہو جائے گا' جب ضرورت ہوگی۔" عورت نے مسکراتے ہوئے کچھ شفقت اور کچھ بے پروائی سے کہا۔ "ویسے ہم کچھ زیادہ اہم لوگ نہیں ہیں۔ کچھ عرصے بعد شاید ہم آپ ہی کے خادموں میں شمار ہوں۔"

وہ دونوں بھی اسی سمت میں چلے گئے جس طرف باس ون گیا تھا۔ اس دوران بلیک برڈ نامی سیاہ چمپنزی میز کے قریب آکھڑا ہوا تھا۔ اب میں نے دیکھا' وہ سیاہ سوٹ میں تھا اور اس نے ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی تاہم پیروں میں اس نے کینوس شوز پہنے ہوئے تھے۔ سوٹ کے ساتھ کینوس شوز جچ نہیں رہے تھے لیکن اس کے معاملے میں شاید موزونیت سے زیادہ اس کی سہولت کا خیال رکھا گیا تھا۔

وہ دونوں ہاتھ پشت پر رکھے ایسے مُدبرانہ انداز میں کھڑا تھا کہ مجھے ہنسی آگئی میں نے ایڈم سے پوچھا۔ "کیا یہ بھی ریڈ ڈاٹ میں کسی اہم عہدے پر فائز ہے؟"

"یہی سمجھ لو۔" ایڈم نے مبہم انداز میں جواب دیا۔ "یہ بڑے کام کی چیز ہے۔ جہاں انسان اپنے آپ کو عاجز اور مجبور پاتے ہیں وہاں یہ کام آتا ہے۔ ہمارے ہاں اس کی بڑی اہمیت ہے۔ اسے تم حیوان مت سمجھو۔ یہ انگریزی اور اردو زبان میں ہر بات سمجھتا ہے۔ یہ ہر اعتبار سے ایک جینئس انسان ہے۔ صرف بول نہیں سکتا لیکن ہمارے نزدیک یہ اس کی ایک اضافی خوبی ہے۔ اس کی طرف سے ہمیں افشائے راز کا کوئی خطرہ نہیں رہتا۔"

پھر ایڈم خود ہی اپنے خیال کی تصحیح کرتے ہوئے بولا۔ "خیر۔ یہ ہمارا ایسا ساتھی ہے کہ اگر بولنے پر قادر ہوتا تب بھی دوسرے ساتھیوں کی طرح ہمارا کوئی راز فاش نہ کرتا۔"

پھر اس نے بڑے پیار سے چمپنزی کو مخاطب کیا۔ "ہلکی! ذرا سر جھکاؤ۔"

ہلکی نے نہایت سعادت مندی سے سر جھکا دیا۔ ایڈم نے اس کی گُدّی اور کنپٹیوں پر سے بال ہٹا کر مجھے دکھایا' اس کے سر کے گرد دائرہ سا بنا ہوا تھا جس پر سے بال غائب تھے لیکن زخم کا سایہ نشان لمبے بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ یہ محض گولائی میں کھنچی ہوئی ایک لکیر سی تھی۔

"یہ تو کسی آپریشن کا نشان معلوم ہوتا ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔ تمہارا اندازہ صحیح ہے۔" ایڈم بولا۔ "دنیا کے بہترین نیورو سرجن میں سے ایک نے اس کے دماغ کا آپریشن کیا تھا۔ یہ محض ایک معمولی سا تجربہ تھا جس پر لاکھوں ڈالر خرچ کئے گئے۔ ایک لاکھ ڈالر سے زیادہ تو سرجن کی فیس ہی تھی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اب یہ چمپنزی ذہانت کے اعتبار سے ایک جینئس انسان کے برابر ہے۔"

"بہت اچھا کیا تم نے۔" میں نے سہلاتے ہوئے کہا۔ "انسان تو اب بغیر کسی دماغی آپریشن کی ہی جانور بنتے جا رہے ہیں۔ تم جانوروں کے آپریشن کر کے انہیں انسان بنانے کی کوشش کرو تاکہ انسانیت کا خلا کسی حد تک تو پر ہو سکے۔"

"کبھی کبھی تم دردناک حد تک سنجیدہ ہو جاتے ہو چندا!" اے نن نے ہاتھ بلند کر کے میرا کندھا تھپکنے کی کوشش کی۔ اس کا قد مجھ سے بہت چھوٹا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ باس ون اور معمر جوڑے کے جانے کے بعد ایڈم اور اے نن کی شخصیتوں پر چڑھا ہوا سنجیدگی کا خول دھیرے دھیرے اتر رہا تھا۔

"سنجیدہ تو میں ہمیشہ ہی ہوتا ہوں میری جان۔" میں نے غمزدہ سے انداز میں گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "وہ تو یونہی کبھی کبھار دل سے تفکرات کا بوجھ کم کرنے کے لئے غیر سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

ایڈم گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہلکی تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آئے گا۔ مجھے اور اے نن کو ابھی کچھ دیر یہاں بیٹھ کر باتیں کرنی ہیں۔"

پھر گویا اسے کچھ خیال آیا اور حد سے زیادہ سنجیدگی سے اس نے مجھے ہدایت کی۔ "راستے میں ہلکی کے ساتھ قطعاً کوئی شرارت کرنے کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی یہ خیال دل میں لانا کہ اس کے حیوان ہونے کا کوئی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کوئی بھی غیر ذمے دارانہ حرکت کر کے تم بڑی مشکل میں پھنس جاؤ گے یا پھر کوئی ناقابل تلافی نقصان اٹھا بیٹھو گے۔"

"ظاہر ہے۔ بندروں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کر کے انسان کو فائدے کی توقع تو رکھنی ہی نہیں چاہئے۔" میں نے کہا۔ "ویسے بھی اب تم نے مجھے اس کی ذہنی سطح کے بارے میں بتا دیا ہے تو میرے دل میں اس کے لئے احترام پیدا ہو گیا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ پنگا لینے کی کوشش نہیں کروں گا لیکن مجھے ایک بات یاد آرہی ہے۔ یہ جب ستارہ کے گھر میں گھسا تھا تو ستارہ کے سامنے بہت بے ہودہ حرکتیں کر رہا تھا۔ کیا جینئس ہو جانے کے بعد بھی اس کا یہی عالم ہے؟"

"حیوانی جبلت کی ایک آدھ جھلک تو برقرار رہنی چاہئے تھی نا۔" اے نن مسکراتے ہوئے بولا۔ "ویسے بھی تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ جینئس مرد' عورتوں کو دیکھ کر زیادہ ریشہ خطمی ہوتے ہیں۔"

چمپینزی نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ اب سن چکا تھا کہ اسے میری رہنمائی کا فریضہ انجام دینا ہے تو اس سے صبر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ حالانکہ صاف ستھرا تھا لیکن مجھے اس کے بالوں بھرے ہاتھ سے کراہیت محسوس ہوئی۔

میں نے اس سے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا ٹھہرو میری جان! مانا کہ تم چمپینزیوں کے دانشور ہو لیکن میں تمہارے حکم کا غلام تو نہیں۔ اب اتنے بے تکلف بھی مت ہو کہ ہاتھ پکڑ کر ہی کھینچنے لگو۔"

اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مجھے اپنی طاقت کا احساس دلانے کی فکر میں تھا۔ اس کے ہاتھ کی گرفت بتا رہی تھی کہ وہ حقیقتاً طاقتور تھا۔ میں نے سخت نظر سے اسے گھورا۔ میرا خیال تھا کہ اگر وہ واقعی جینئس تھا تو میری نظر کا مطلب سمجھ جائے گا۔ مجھے اس کی بدتمیزی اچھی نہیں لگی تھی۔

اس نے میرا ہاتھ نہیں چھوڑا تو اچانک میں نے خود اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر ایک خاص انداز سے جھٹکا دیا۔ وہ میرے قریب سے ہوتا ہوا اوندھے منہ دور جا گرا۔ تاہم اتنی دور جا کر نہیں گرا جتنی دور میرے اندازے کے مطابق اسے گرنا چاہئے تھا۔ اے نن کی طرح اس کی بھی جسامت زیادہ نہیں تھی لیکن وزن کے اعتبار سے وہ کچھ ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے اس کا جسم گوشت پوست کے بجائے ٹھوس لوہے سے بنا ہو۔ اس میں شک نہیں تھا کہ جنگلی درندوں کا وزن ان کی جسامت کے مقابلے میں زیادہ محسوس ہوتا ہے لیکن اے نن اور یہ چمپینزی اس صف میں بھی بہت ہی غیر معمولی مخلوق معلوم ہوتے تھے۔ اے نن کے وزن اور سخت جانی کا مجھے تجربہ ہو چکا تھا' ہلیکی کے بارے میں اب اندازہ ہو رہا تھا۔ معلوم نہیں یہ دونوں کیا کھاتے تھے۔ کیوں اتنے ٹھوس تھے!

جس داؤ سے میں نے ہلیکی کو پھینکا تھا اس کی جگہ کوئی جسیم قسم کا پہلوان بھی ہوتا تو اس سے زیادہ دور جا کر گرتا۔ جتنی تیزی سے وہ گرا تھا اس سے کہیں زیادہ پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ گو کہ وہاں مٹی کا ایک ذرہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اٹھتے ہی اس نے غیر ارادی طور پر کپڑے جھاڑے اور خونخوار نظروں سے پہلے میری طرف دیکھا پھر ایڈم اور اے نن کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔ "اجازت ہو تو اس گدھے کا دماغ ٹھکانے لگا دوں۔" لیکن اے نن نے اسے محض اشارے سے منع کر دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اے نن اور ایڈم دونوں ہی سنجیدگی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اے نن بولا۔ "چوہدری یار! سچ سچ بتاؤ تمہاری طاقت کا راز کیا ہے؟ ہلیکی کو کوئی اے کلاس' پیشہ ور ریسلر بھی محض ہاتھ پکڑ کر اتنی دور نہیں پھینک سکتا۔"

"میرے اندازے سے تو وہ اب بھی کم دور جا کر گرا ہے۔ بہر حال... قدردانی کا شکریہ۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم نے تو اتفاقاً اور نادانستگی میں صحرا میں کوئی پودا کھا لیا تھا جس سے تمہارے خون کے اجزائے ترکیبی بدل گئے اور تمہاری جوانی پر ابھی تک زوال نہیں آیا۔ بقول تمہارے اپنے' تم ڈیڑھ سو سال کے ہو چکے ہو۔ مجھے بھی ایک پہاڑ پر ایک سنیاسی بابا نے ایک طلسمی گرز دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ صبح شام اسے گھمایا کرنا' تم طاقتور ہو جاؤ گے۔ بس یہ اسی گرز کا کمال ہے۔"

اے نن ایک لمحے مجھے گھورتا رہا پھر ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ایڈم مسکرا رہا تھا۔ انہوں نے مجھ سے مزید کچھ نہیں کہا۔ ہلیکی بدستور اپنی جگہ کھڑا غصیلی نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی۔

ایڈم نے میز کے نیچے ہاتھ لے جا کر کسی چیز کو باہر کی طرف کھینچا۔ وہ پلاسٹک نما کسی چیز کا تختہ سا تھا جو چھوٹی سی دراز کی طرح باہر آ گیا۔ اس پر کیلکولیٹر کی طرح چھوٹے چھوٹے بٹن لگے ہوئے تھے۔ ایڈم نے نہایت پھرتی سے کچھ بٹنوں کو ایک خاص ترتیب سے چھوا۔ اسی بورڈ پر ننھا سا ایک سرخ دائرہ جھلملایا۔ وہ غائب ہوا تو اسی کے برابر ایک سبز دائرہ جھلملایا۔ ایک ثانیے کے بعد وہ بھی غائب ہو گیا اور ایڈم نے اس چھوٹے سے بورڈ کو واپس میز کے نیچے کھسکا دیا۔

پھر وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "لیونا ہی تمہیں لینے آ رہی ہے۔ ہلیکی کو تو تم نے ناراض کر دیا۔ ویسے میری بھی نہایت سنجیدگی سے تم سے درخواست ہے کہ آئندہ مذاق میں بھی ہاتھا پائی وغیرہ کی کوشش نہ کرنا۔ یہاں ڈسپلن کا بہت خیال رکھا جاتا ہے اور غیر سنجیدہ حرکات کو پسند نہیں کیا جاتا۔"

"وہ تو مجھے اندازہ ہے۔ مقبرے جیسا ماحول نظر آ رہا ہے یہاں لیکن تم میرے بارے میں اتنی معلومات رکھتے ہو جتنی شاید میں خود بھی نہیں رکھتا۔ تمہیں اندازہ ہونا چاہئے کہ ما بدولت ایسی باتوں کی پروا نہیں کرتے اور وہی کرتے ہیں جو دل کہے۔" پھر میں نے ہلیکی کی طرف دیکھ کر اسے چڑانے والے انداز میں کہا۔ "اس کے ساتھ چھیڑ خانی اس لئے بھی کی ہے کہ میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا۔ تم خود ہی سوچو' میں اتنی خوبصورت چیز کے ساتھ یہاں آیا تھا' اب اس سورت حرام کے ساتھ واپس جاؤں؟ یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

ہلیکی کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نظر آئے۔ انسانی عقل اور حیوانی جبلت کے ساتھ وہ کوئی عجیب چیز بن گیا تھا۔ طاقت اس میں یقیناً کسی عام چمپینزی سے زیادہ تھی۔ اس وقت اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ یقیناً مجھ پر چھلانگ لگا دیتا۔ حیوانی قالب میں ہوتے ہوئے بھی وہ ڈسپلن کا پابند تھا۔ ایڈم نے اسے محض اشارہ کیا تھا' اس کے بعد وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں تھا۔

اسی اثنا میں لیونا آن پہنچی۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو... اب یہ کوئی صورت تو ہے نا جس کے

...تھ جانے کو جی چاہے۔ ٹھیک ہے' انسان کے حالات کبھی کبھی ...اب ہو جاتے ہیں لیکن اب ایسی بھی کیا بدحالی کہ انسان ...پینزیوں کی رہنمائی میں چلنے لگے۔"

لیونا سپاٹ چہرہ لئے مؤدبانہ انداز میں سر جھکائے کھڑی تھی۔ ...ں نے اس کے قریب پہنچتے ہوئے کہا۔ "چلو... تمہارے ساتھ میں ...ق کے پار بھی جانے کے لئے تیار ہوں۔"

وہ سب انتہائی سنجیدہ صورتیں بنائے کھڑے تھے۔ میں نے ...اتے جاتے مڑ کر کہا۔ "ایک تو یہ جگہ ویسے ہی کسی مقبرے سے کم ...میں ہے۔ کم از کم شکلوں پر تو ذرا سی مسکراہٹ سجا کر رکھو۔"

لیکن انہوں نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں یا شاید ایک کان ...ے سن کر دوسرے سے نکال دی۔ چند لمحے پہلے ان کے چہروں پر ...زرا شگفتگی آئی تھی لیکن اب وہ دوبارہ اسی طرح حد سے زیادہ سنجیدہ ...صورتیں بنائے کھڑے تھے جیسی میٹنگ کے دوران تھیں۔

میں جس طریقے اور جس راستے سے لیونا کے ساتھ آیا تھا اسی طریقے سے' اسی راستے سے واپس روانہ ہوا۔ راستے میں' میں نے اس سے پوچھا۔ "کیا یہ جگہ پاکستان میں تمہارا ہیڈ کوارٹر ہے؟"

"یہی سمجھ لیجئے۔" اس نے مبہم سے انداز میں جواب دیا۔

"اس کا جتنا حصہ میں دیکھ پایا ہوں' اس سے تو یقیناً کہیں زیادہ بڑی ہو گی؟" میں نے بظاہر یونہی سرسری اور دوستانہ سے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔ بس ہماری ضروریات پوری کرنے کے لئے کافی ہے۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ کوئی غیر ضروری بات جس سے دوسرے کی معلومات میں اضافہ ہونے کا امکان ہوتا' منہ سے نکالنا ان لوگوں کی ٹریننگ میں شامل نہیں تھا۔

"اس کے علاوہ بھی ٹھکانے ہوں گے؟" میں نے اسے کریدنے کی اپنی سی کوششیں جاری رکھیں۔

وہ میری طرف دیکھ کر مربیانہ انداز میں مسکرائی اور ملائمت سے بولی۔ "اس طرح آپ کی معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا مسٹر چوہدری!"

"پھر بھی... کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟" میں نے سادگی سے کہا۔

وہ دھیرے سے ہنس دی اور اس دھندلاہٹ زدہ ماحول میں جیسے نقرئی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ ہم واپس اسی کمرے میں پہنچ گئے جو اب مجھے کسی خوبصورت جیل کی کوٹھڑی محسوس ہونے لگا تھا۔

"سر! آپ کچھ کھانا یا پینا پسند کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے بلیک کافی لا دو۔" میں نے کہا۔ وہ چلی گئی اور چند منٹ بعد بلیک کافی لے آئی۔

کافی کی ٹرے تپائی پر رکھ کر وہ خوبصورت اور ذو معنی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "جب بھی آپ میری یا کسی اور چیز کی ضرورت محسوس کریں تو مجھے بلا لیجئے گا۔"

"یعنی تم میں اور ضرورت کی دوسری چیزوں میں کوئی فرق ہی نہیں؟" میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور مسکراتی ہوئی رخصت ہو گئی۔ اس کی فراخدلانہ پیشکش پر ایک بار پھر مجھے یہی خیال آیا کہ کوئی بعید نہیں کہ یہاں کی خلوتوں کو بھی کہیں فلمایا جاتا ہو۔ یہاں کا کوئی گوشہ بھی انجانی آنکھوں کی دسترس سے باہر محسوس نہیں ہوتا تھا۔

کافی ختم کر کے میں آنکھیں بند کر کے چت لیٹ گیا۔ میں چاہتا تھا' میری آنکھیں بند ہوں لیکن ذہن پوری طرح بیدار رہو۔ میں سوچ بچار کرنا چاہتا تھا اور بلیک کافی نے حواس میں مصنوعی چستی کی لہر دوڑا دی تھی ورنہ میں اس طویل اور ہوشربا میٹنگ کے بعد اپنا سر گھومتا ہوا سا محسوس کر رہا تھا۔ گو میں نے ان لوگوں کے سامنے فکرمندی یا تشویش کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میرے ذہن کی گہرائیوں میں کہیں خطرے کی گھنٹیاں سی بج رہی تھیں۔ میرے اعصاب میں سرسراہٹ سی ہونے لگی تھی۔

میں بیٹھے بٹھائے عجیب ہی مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ مجھ میں کچھ صلاحیتیں موجود ہونا ہی میرا جرم بن گیا تھا۔ جبکہ مجھے خود بھی اپنی ان صلاحیتوں کا کچھ زیادہ اچھی طرح اندازہ نہیں تھا۔ میرے لئے ان لوگوں کی گفتگو میں چھپے ہوئے کچھ مبہم سے اشاروں کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ باتیں جتنے سیدھے سادے اور بے ضرر انداز میں کی گئی تھیں اتنی ہی خوفناک تھیں۔

انہوں نے میرے سامنے دو ہی راستے چھوڑے تھے۔ میں دل و جان سے ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو جاؤں یا پھر ہنستی مسکراتی' دلکش زندگی اور اسرار و تجسس کے پردوں میں چھپے ہوئے مستقبل کو الوداع کہہ دوں' بے مقصد موت کی اندھی گہرائیوں میں اتر جاؤں۔ موت کا ایک دن معین ہوتا ہے اور مجھے موت کا کوئی خوف نہیں تھا لیکن یہ مجھے ہرگز گوارا نہیں تھا کہ بظاہر یوں محسوس ہو جیسے کسی نے میری موت کا حکم سنایا ہے' اپنے ہرکاروں کے ذریعے مجھ پر موت کا فیصلہ صادر کیا ہے۔ میں کسی ذہنی مخلوق کو یہ اختیار دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

میری اپنی جان و مال اور آرام و آسائش یا مصائب سے کہیں زیادہ اہم سوال وطن کا تھا۔ مجھے کوئی عظیم محب وطن' یا عظیم سماجی رہنما وغیرہ ہونے کا دعویٰ نہیں تھا لیکن ملک پر آنچ آتے دیکھنا یا اس کی جڑیں کاٹنے کا تصور بھی میرے لئے ناقابل قبول تھا۔ باس ون نے تو میرے وطن کی ان ڈائرکٹ محکومی اور کم مائیگی کی جو تصویر کھینچی تھی اسی نے میرا دل لہو لہو کر دیا تھا۔

عالمی پیچ و خم کی یہ دھندلی دھندلی تصویریں تو پہلے بھی تحت الشعور کے دھندلکوں میں موجود تھیں۔ ہر وہ شخص جو عالمی معاملات کا تھوڑا بہت شعور رکھتا ہے' ادھر ادھر کی چیزیں پڑھتا ہے' سمجھدار لوگوں میں اٹھتا بیٹھتا ہے' اسے کافی حد تک اندازہ ہوتا ہے کہ عالمی بساط پر اس کا ملک کس مہرے کی جگہ کھڑا ہے۔

لیکن بڑی طاقتوں کے ایجنٹوں کے سامنے بیٹھ کر سرسری اور حقارت آمیز سے انداز میں اپنی قومی بے وقعتی کا ذکر سننا دل پر خراشیں سی ڈال جاتا ہے۔

مجھے آج معلوم ہوا تھا کہ میرے دل میں تو کہیں وطن کی شدید محبت چھپی ہوئی تھی۔ میں تو اسے دنیا میں سرفراز دیکھنا چاہتا تھا۔ میرا تعلق تو اس قوم سے تھا' میں تو اس خدا کو ماننے والوں میں تھا جنہوں نے دنیا پر حکمرانی کی تھی۔ ہماری غلطیاں' لغزشیں اور کردار کی خامیاں بے شک ہمیں پستیوں میں لے گئی تھیں لیکن دل کے کسی تاریک گوشے میں عظمت رفتہ کی چنگاری آج بھی روشن تھی۔

میں ایک گناہ گار انسان تھا لیکن مجھ جیسے گناہ گاروں کا آج بھی جی چاہتا تھا کہ دنیا کے پیشرو بنیں۔ ہمارا وطن اس کرہ ارض پر بڑی طاقتوں کے لئے شٹل کاک نہ ہو۔ ہم انہیں بتائیں کہ ہمارے اسلاف اس دنیا میں کیا مثالیں چھوڑ گئے ہیں اور اگر آج بھی ہم اپنے اپنے خول سے نکل آئیں' چھوٹی چھوٹی خود غرضیوں میں الجھ کر اپنے کردار کا بیڑا غرق نہ کریں تو آج بھی دنیا کی رہنمائی کر سکتے ہیں۔

لیکن شاید ہمارے اندر عظمت رفتہ کی اس چنگاری کو ہی سرد کرنے کے لئے ہمیں بے شمار مسائل میں الجھا دیا گیا تھا۔ یہ طاقتیں چاہتی ہی نہیں تھیں کہ ہم کبھی سر اٹھانے کے قابل ہو سکیں۔ اسی لئے انہوں نے ہمیں ایک دوسرے کے سر قلم کرنے پر لگایا ہوا تھا' ایک دوسرے کے گریبان تار تار کرنے میں الجھایا ہوا تھا۔ کبھی حقوق کے نام پر' کبھی سیاست کے نام پر' کبھی مسائل کے نام پر تو کبھی وسائل کے نام پر۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں ان سب باتوں کے بارے میں اتنے دکھ کے ساتھ سوچ سکتا ہوں۔ میں نے تو اپنے آپ کو ہمیشہ یہی یقین دلانے کی کوشش کی تھی کہ میں ایک لاابالی سا آدمی ہوں لیکن یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ میرے اندر تو موت کا سناٹا پھیل گیا تھا۔

باس ون نے مجھے نوید سنائی تھی کہ مجھے اس قدر طاقتور بنا دیا جائے گا کہ اپنے ملک کی ہر حکومت میرے خوف سے کانپتی رہے گی' دنیا کی ہر نعمت میرے قدموں میں ڈھیر ہو گی اور یہ سب کچھ بغیر کسی سیاسی عمل کے ہو گا' میری کوئی پارٹی نہیں ہو گی۔ یہ سب کچھ بھلا کیسے ممکن تھا؟ ظاہر ہے اس کے لئے کوئی اچھے طریقے تو اختیار نہیں کئے جانے تھے۔ ان کے ذہنوں میں نہ جانے کون کون سے شیطانی منصوبے تھے جن کے سلسلے میں آگے رکھنے کے لئے انہوں نے مجھے منتخب کیا تھا۔ ظاہر ہے یہ سب چیزیں میرے ملک کے مفاد میں نہیں ہو سکتی تھیں۔

میرا ذہن الجھ کر رہ گیا تھا۔ میں کوئی فیصلہ کرنے سے قاصر تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ انہوں نے فیصلہ کرنے کا اختیار میرے پاس چھوڑا ہی نہیں تھا۔ سارے فیصلے تو انہوں نے خود ہی سنا دیئے تھے۔ فی الحال تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھے یہاں سے جانے کی اجازت کب ملے گی۔ سائنسی لوازمات سے آراستہ اس طویل و عریض قبر میں تو میں اپنے آپ کو بالکل ہی بے دست و پا محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ان سے پوچھا بھی نہیں تھا کہ مجھے کب یہاں سے رخصت کیا جائے گا۔

میں نے آنکھیں کھولیں اور دائیں ہاتھ والی دیوار کو انگلی سے چھوا۔ میرے پیروں کی طرف دیوار میں موجود اسکرین روشن ہو گیا۔ چند لمحے اس پر لکیریں سی ناچتی رہیں پھر لیونا کا چہرہ نمودار ہوا۔

"یس سر؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"مجھے کب یہاں سے جانے دیا جائے گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"سر! مجھے تو اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔ میں مسٹر ایڈم سے آپ کی بات کراتی ہوں۔" لیونا نے مودبانہ لہجے میں کہا اور اسکرین سے غائب ہو گئی۔ چند لمحے تک اسکرین پر رنگ برنگے چوکور خانے ابھرتے اور معدوم ہوتے رہے پھر ایڈم کا چہرہ نمودار ہوا۔ وہ شاید کسی میز پر سر جھکائے بیٹھا تھا۔

وہ سر اٹھا کر گویا میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ اس کے سامنے اگر کوئی میز موجود تھی تو وہ اسکرین پر نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے بلا تمہید' سنجیدگی سے پوچھا۔ "مجھے کب یہاں سے جانے کی اجازت ہو گی؟"

"اجازت؟" اس نے معصومیت سی دہرایا۔ "تمہیں اجازت کی کیا ضرورت ہے؟ تم مرضی کے مالک ہو' جب چاہو جا سکتے ہو۔ ہمیں تم سے جو بات کرنا تھی' کر چکے۔ تاہم تمہیں دس بارہ گھنٹے مزید یہاں رکنے میں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے۔ اب تمہیں زحمت نہیں دی جائے گی۔ صرف آرام کرتے رہو۔"

"مجھے آرام کا اتنا زیادہ شوق نہیں ہے۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "ویسے بھی اس قسم کے مقبروں میں آرام تم لوگ ہی کر سکتے ہو۔ مجھے تو یہاں سخت وحشت ہو رہی ہے۔ اگر تم مجھے جانے کی اجازت دے دو تو تمہاری بڑی نوازش ہو گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میں اس کے انتظامات کرتا ہوں۔ تم کچھ دیر تو آرام کرو۔" ایڈم ملائمت سے بولا۔

"کیا یہاں سے جانے کے بعد میری نگرانی کی جائے گی؟" میں نے پوچھا۔ گو کہ مجھے صحیح جواب ملنے کی توقع نہیں تھی لیکن سوالات کرتے رہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ بعض باتوں کے وہ بالکل صحیح جواب بھی دے دیتے تھے' اپنے عزائم کے بارے میں صحیح طور پر بتا دیتے تھے۔

ایڈم مربیانہ انداز میں مسکرایا' جیسے میں نے کوئی بچگانہ سوال کیا ہو۔ "ہمیں تمہاری نگرانی کرانے کی ضرورت نہیں۔ تم خواہ کہیں بھی چلے جاؤ' کہیں بھی چھپ جاؤ' جب ہم تم سے رابطہ قائم کرنا چاہیں گے تو تمہیں ڈھونڈ نکالیں گے۔ یہ ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ تم غائب ہونا یا چھپنا کیوں چاہو گے؟ تم ہمارے پاس آؤ گے' ہمارے ساتھی' ہمارے دوست بنو گے۔ اپنے وسیع کاروبار اور جائیداد وغیرہ کو چھوڑ کر تم کہاں غائب ہو سکتے ہو اور کب تک غائب رہ سکتے ہو؟ جبکہ اس کی کوئی ضرورت بھی نہ ہو۔ تم کنویں کے مینڈک ہو' ہم تمہیں دریا میں لا رہے ہیں۔ تمہیں ناشکری کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے اور نہ ہی خوفزدہ ہونا چاہئے۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو خوشی سے اچھل رہا ہوتا۔"

"میں نے خوشی سے اچھلنے کی عادت بچپن میں ہی ترک کر دی تھی۔" میں نے بیزاری سے کہا۔ "تم اس طویل تقریر کو چھوڑو' یہ بتاؤ میری روانگی کا انتظام کب تک ہو سکتا ہے؟"

"میں کوشش کرتا ہوں کہ جلد از جلد ہو جائے۔ تم اطمینان سے لیٹ جاؤ۔" اس نے ملائمت سے کہا۔ "ہمیں افسوس ہے کہ تم نے ہمیں کسی خاص خدمت کا موقع نہیں دیا۔"

"یار زندہ صحبت باقی۔" میں نے کہا "ابھی تو معلوم نہیں کتنی مرتبہ تم سے واسطہ پڑے۔"

"بس۔ اب ہم سے ہی واسطہ رہے گا' اور کسی سے واسطہ رکھ کر کیا کرو گے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور آنکھیں بند کر کے چت لیٹ گیا۔ میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ایڈم کی آواز سنی۔ "اب ایسی بھی کیا بیزاری؟ روٹھے ہوئے محبوب کی طرح آنکھیں بند کر کے کیوں لیٹ گئے؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا' بدستور آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ مجھ پر حقیقتاً بیزاری کا حملہ ہوا تھا۔ چند لمحے بعد میں نے ذرا سی آنکھ کھول کر دیکھا۔ اسکرین سادہ ہو چکا تھا۔ میں نے کروٹ لی اور واقعی سونے کی کوشش کرنے لگا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اتنی جلدی اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ذرا دیر پہلے ہی میں نے بلیک کافی پی تھی' میرے ذہن پر غنودگی کا شائبہ تک نہیں تھا لیکن چند منٹ بعد ہی مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں نے بہت تیزی سے آٹھ دس پیگ چڑھا لئے ہوں۔ اس تنگ سے کمرے میں ہوا بہت بوجھل محسوس ہونے لگی۔ یوں لگا جیسے میں نتھنوں کے راستے ہوا نہیں بلکہ انتہائی باریک ذرات کی دھاریں پھیپھڑوں میں لے جا رہا ہوں۔

میں نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں۔ کمرے کی فضا میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی' سب کچھ اسی طرح تھا لیکن میرے لئے آنکھیں کھلی رکھنا مشکل ہوا جا رہا تھا۔ میں نے کونے کھدروں کا جائزہ لیا کہ شاید کسی سوراخ سے کمرے میں کوئی گیس چھوڑی جا رہی ہو لیکن کہیں ایسے کوئی آثار دکھائی نہ دیئے۔ کمرے میں کسی قسم کی بو بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔

میں تیزی سے اٹھ بیٹھا اور سانس روک کر اپنے آپ کو غنودگی کے اس حملے سے بچانے کی کوشش کرنے لگا لیکن سانس روکنے کی طویل مشق بھی میرے کسی کام نہ آ سکی۔ آخر کار مجھے سانس تو لینا ہی تھا۔ ایک طویل وقفے کے بعد جب میں نے سانس لینا شروع کیا تو غیر ارادی طور پر میں آہستگی سے لیٹ گیا اور پھر نہ چاہنے کے باوجود میری آنکھیں اس ننھے بچے کی طرح بند ہوتی چلی گئیں جسے اس کی ماں لوری دے کر سلا رہی ہو۔

جب میری آنکھ کھلی اور میرے ذہن سے بوجھل دھندلاہٹ دور ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو دوبارہ اپنے بیڈ روم میں پایا۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا' وہ واقعی میرے اپنے مکان میں میرا اپنا بیڈ روم تھا۔ میں ایک بار پھر کافی تھکن محسوس کر رہا تھا لیکن اتنی نہیں جتنی پہلی بار ہوش میں آنے کے بعد محسوس کی تھی۔

میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا' صبح کا اجالا نمودار ہو رہا تھا۔ میرے سامنے کھڑکی سے باہر میرے باغیچے کے وہی جانے پہچانے درخت لہرا رہے تھے' وہی شناسا سا ماحول تھا اور وہی آشنا سکوت جو کسی بھی صبح اس وقت بیدار ہونے پر چاروں طرف چھایا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ جو کچھ میں نے دیکھا وہ محض ایک خواب پریشاں تھا۔ میری لاشعور میں جاگزیں رہنے والے وسوسوں اور اندیشوں کی افسانویت آمیز تصویریں تھیں۔

لیکن دیوار گیر کلاک کچھ اور کہانی سنا رہا تھا۔ اس میں تاریخ بدلی ہوئی تھی۔ اس تاریخ سے اندازہ ہوتا تھا کہ میں کل رات اپنے کمرے میں سویا تھا اور آج دوسری رات کی صبح طلوع ہو رہی تھی' جب میری آنکھ اپنے کمرے میں کھلی تھی۔ میں تقریباً چھتیس گھنٹے تو اپنے کمرے میں سویا نہیں رہ سکتا تھا۔

میں نے سردست اپنے ذہن کو اس گورکھ دھندے سے نکالنے کی کوشش کی اور دیر تک آنکھیں بند کئے لیٹا رہا۔ دھیرے دھیرے میری توانائی واپس آ گئی۔ میں نے اٹھ کر غسل کر کے لباس تبدیل کیا اور انٹر کام پر بٹلر کو ہدایت کی کہ وہ ڈائننگ روم میں میرے لئے ناشتا لگوائے۔

میں جب ناشتے کی میز پر پہنچا تو تازہ دم تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ ملازم اپنے اپنے معمول کے مطابق گھر کے کاموں میں مصروف تھے۔ کسی کو بھی گویا علم نہیں تھا کہ میں گھر سے غائب ہوا تھا۔ آخر مجھے کس طرح گھر سے لے جایا گیا تھا اور کس طرح واپس پہنچایا گیا تھا؟ یہ کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔ کیا کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی؟ کم از کم میرے سیکیورٹی گارڈز کو تو تشویش ہونی چاہئے تھی۔ کیا انہیں بھی علم نہیں ہو سکا تھا؟ مجھے میرے بیڈ روم سے کوئی کھڑکی کے راستے نکال کر چھت سے ہیلی کاپٹر کے ذریعے تو نہیں لے جا سکتا تھا۔

میں نے نہایت خاموشی اور سکون سے ناشتا کیا۔ میں اپنی ذہنی اور اعصابی طاقت کو مکمل طور پر بحال کرنا چاہتا تھا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ جس سریع الاثر گیس سے مجھے تھوڑے ہی وقت میں دو مرتبہ بے ہوش کیا گیا تھا اس نے ذہن اور اعصاب کو کافی متاثر کیا

تھا لیکن غنیمت تھا کہ میں جلد ہی اس کے اثر سے نکل آیا تھا۔

مجھے معلوم تھا کہ گھریلو ملازموں سے اس سلسلے میں کچھ پوچھنا زیادہ فائدہ مند نہیں تھا کیونکہ میرے اندازے کے مطابق وہ سب اس وقت اپنے اپنے کوارٹر میں سوئے ہوئے ہوں گے جب مجھے نیند ہی کے دوران بے ہوش کرکے کہیں اور منتقل کیا گیا ہوگا۔

ناشتے کے بعد میں نے انٹرکام پر گیٹ ہاؤس سے طارق خان کو طلب کیا۔ وہ سیکیورٹی انچارج بھی تھا اور رات کو ظاہر خان کے ساتھ چاردیواری کے اندر گشت بھی کرتا تھا۔ دن میں دوسرے دو گارڈ ڈیوٹی دیتے تھے۔ یعنی مجموعی طور پر چار مسلح گارڈز جو سابق کمانڈو تھے' دن رات مکان کی چوکیداری کرتے تھے۔ ان کے پاس اپنے وقت کے لحاظ سے جدید ترین اسلحہ موجود تھا۔ میں نے گھر کے دروازے پر پرانی سی بندوق کے ساتھ ایک روایتی اور نمائشی چوکیدار بٹھانے پر اکتفا نہیں کیا تھا۔

"طارق خان! تمہیں معلوم ہے کل رات غالباً آدھی رات کے قریب میں اس گھر سے غائب ہوگیا تھا اور آج رات شاید آدھی رات کے قریب ہی مجھے یہاں واپس لایا گیا ہے۔" میں نے قدرے سرد لہجے میں کہا۔

"نہیں سر!" اس نے اطمینان سے جواب دیا اور اس کے جواب نے مجھے حیران کردیا۔ "مجھے صحیح وقت تو معلوم نہیں لیکن یہ معلوم ہے کہ کل رات آپ کسی وقت گھر سے نکلے تھے۔ دن بھر آپ باہر ہی رہے اور رات میں کسی وقت واپس آئے ہیں۔"

"تمہیں اس پر تشویش نہیں ہوئی؟" میں نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تشویش..." وہ قدرے متذبذب لہجے میں بولا۔ "ایسی کوئی خاص وجہ تو پیدا نہیں ہوئی تھی کہ مجھے تشویش ہوتی۔ کل علی الصبح کسی نے مجھے فون کیا تھا اور آپ کی طرف سے پیغام دیا تھا کہ آپ کو رات میں اچانک کہیں جانا پڑ گیا ہے۔ ایک آدھ دن میں آپ واپس آجائیں گے' مجھے آپ کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ گیٹ کی اور دوسری تمام ضروری چابیاں تو آپ کے پاس ہوتی ہی ہیں اس لئے میں نے کوئی تشویش محسوس نہیں کی۔"

"تم نے اس پر تشویش محسوس نہیں کی کہ تمہیں نہ تو میرے جانے کا پتا چلا اور نہ واپس آنے کا؟" میں نے اسے گھورا۔

"سر! آپ سے تو کچھ بعید نہیں ہے نا۔" اس نے مسکرانے کی وشش کی لیکن دوسرے ہی لمحے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "سچی بات یہ ہے سر۔ کہ مجھے تشویش تھی اور میں آپ کے پاس آنے ہی والا تھا۔ مجھے کچھ گڑبڑ کا احساس ہوا تھا۔ پچھلی سے پچھلی رات ظاہر خان اور میں کافی پینے کے لئے ذرا دیر کو گیٹ ہاؤس میں بیٹھ گئے تھے۔ ہم نے محسوس کیا کہ کافی پینے کے دوران ہماری سستی دور ہونے کے بجائے ہم پر اور بھی غنودگی سی طاری ہونے لگی تھی اور سانس لینا کچھ مشکل مشکل سا محسوس ہونے لگا تھا۔ حیرت انگیز طور پر ہم دونوں ہی کچھ دیر کے لئے سوگئے۔ جب اٹھے تو طبیعت میں بڑی سستی تھی۔ میں نے کافی کو چیک کرالیا ہے جو تھرماس میں کافی ساری بچی ہوئی تھی لیکن اس میں کچھ ملا ہوا نہیں تھا۔ اس لئے میں کچھ مطمئن ہوگیا۔ آج رات پھر مجھے اور ظاہر خان کو ایسا ہی تجربہ ہوا۔"

"اس کے باوجود تم اس حد تک تشویش زدہ نہیں ہوئے جتنا تمہیں ہونا چاہئے تھا!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "اگر اتنی گڑبڑ بھی تمہیں نہیں چونکا سکتی تو پھر کتنی گڑبڑ پر تم چونکو گے؟ تم' ظاہر خان اور دن کی شفٹ کے دونوں آدمی' سب کمانڈو ہیں لیکن مجھے افسوس ہے کہ تم میری توقعات پر پورا نہیں اترے۔"

"کمانڈو دراصل ایکشن کا آدمی ہوتا ہے سر! سازشیت کا نہیں۔" طارق خان سر جھکا کر بولا۔ "لیکن مجھے اعتراف ہے کہ مجھ سے غلطی ہوئی ہے... ویسے بات کیا ہے سر؟"

"جس دوران تم دونوں راتوں میں تھوڑی تھوڑی دیر کے لئے سوئے تھے' اسی دوران مجھے بھی اسی طرح بے ہوش کرکے اس گھر سے لے جایا اور پھر واپس چھوڑا گیا۔ تمہارے بے خبر ہونے کی وجہ سے ان نامعلوم لوگوں کو سیکیورٹی کے دیگر انتظامات کو بھی کچھ دیر کے لئے بے کار کردینے کا موقع مل گیا۔ مجھے یہ سب انتظامات بے مقصد اور بے مصرف دکھائی دینے لگے ہیں جن پر میں خاصی بڑی رقم خرچ کرتا ہوں۔"

"آپ خیریت سے تو ہیں سر؟" اس نے سر اٹھا کر تشویش زدہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔ فی الحال تو خیریت سے ہی ہوں تبھی تمہارے سامنے بیٹھا بات کررہا ہوں لیکن ان حالات میں تو تمہارے سامنے میری لاش بھی آسکتی تھی۔"

"خدا نہ کرے سر!" وہ تیزی سے بولا۔ "اصل میں مجھے کسی خاص گڑبڑ کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔ اور پھر آپ کی طرف سے بھی ہمیں اطمینان رہتا ہے کہ آپ کوئی عام آدمی نہیں ہیں جسے کوئی آسانی سے اپنے ساتھ لے جاسکے۔ اس لئے میں بروقت آپ کے بارے میں معلومات کرنے کے لئے حرکت میں نہیں آسکا۔ ملازموں کو بھی میں نے ہی اطمینان دلادیا کہ صاحب کہیں گئے ہیں لیکن میں مضطرب ضرور تھا اور اب آپ کو دیکھنے کے لئے آنے ہی والا تھا۔"

"یہ کوئی سیکیورٹی تو نہ ہوئی طارق خان!" میں نے تاسف سے کہا۔ "کوئی اگر مجھے میرے ہی گھر سے اٹھا کرلے جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو... تو اس سارے کھڑاگ کا کیا فائدہ؟ گھر سے باہر میں نے اس لئے سیکیورٹی کی فکر چھوڑ دی ہے کہ میں اس وقت بیدار ہوتا ہوں اگر کوئی مسئلہ آن پڑے تو خود ہی جو کچھ کرسکتا ہوں' کرلوں گا۔ اگر کوئی نقصان بھی اٹھا بیٹھا تو مجھے افسوس نہیں ہوگا۔ سوچ لوں گا کہ جو کچھ بھی ہوا' جاگتی آنکھوں کے ساتھ ہوا اور اس کے مقابلے کے لئے میری طاقت ناکافی رہی لیکن بے خبری میں مارے جانا مجھے گوارا نہیں۔ اپنے گھر سے جسے میں ایک محفوظ قلعہ سمجھ کر سوتا ہوں' میرا اتنے پرسکون انداز میں تیس پینتیس گھنٹے کے لئے غائب ہوجانا میرے لئے کوئی معمولی واقعہ نہیں ہے۔ میں ابھی تک حیرت اور صدمے سے سنبھل نہیں سکا ہوں۔"

طارق خان نے اپنی اسٹین گن' بیلٹ' اس میں لگا ہوا ایکسٹرا میگزین اور اپنی ٹوپی اتار کر میز پر رکھ دی اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "میں اپنی ذمے داریاں صحیح طور پر انجام نہیں دے سکا سر! میں اپنے آپ کو آپ کی خدمت کے قابل نہیں سمجھتا' اس لئے اجازت چاہتا ہوں۔ لیکن اگر آپ کو اپنے دشمنوں کے بارے میں ذرا سی بھی معلومات ہیں تو مجھے بتادیجئے۔ میں اور ظاہر خان اپنی ذاتی حیثیت میں ان کے پرخچے اڑادیں گے۔"

میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے برابر بٹھالیا۔ "مجھے تمہارے خلوص یا وفاداری پر شک نہیں ہے اور نہ ہی میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مجھے تمہاری خدمات کی ضرورت نہیں رہی۔ میں اس بات کو بھی پسند نہیں کروں گا کہ تم خود ہی شرمندگی محسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو ان ذمے داریوں سے سبکدوش کرلو۔"

"پھر میں کیا کروں سر؟" اس نے بے بسی سے پوچھا۔ "میری جان آپ کے لئے حاضر ہے۔ مجھے بتایئے میں اسے کہاں اور کیسے آپ کے لئے قربان کروں؟"

"تمہاری جان بھی میرے لئے اپنی ہی جان کی طرح قیمتی ہے طارق خان!" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ "میں اسے بے مقصد اور بے ہنگم انداز میں ضائع ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ سیکیورٹی کے انتظامات کو کچھ اور بہتر بناؤ' کچھ نئے طریقے سوچو' مکان میں کوئی نیا میکنزم فٹ کرانا ہو تو کراؤ۔ کچھ نئے آدمی رکھنا ضروری ہو تو اپنے مطلب کے آدمی تلاش کرو اور رکھو۔ تم سیکیورٹی کی لائن کے آدمی ہو' جو بھی مناسب سمجھو' کرو۔ میں نے سب کچھ تم پر چھوڑ رکھا ہے۔"

"ٹھیک ہے سر! میں اپنی سی کوشش کرکے دیکھتا ہوں۔" اس نے گن وغیرہ واپس اٹھالی۔

"ایک اور بات بتادوں..." میں نے کہا۔ "میرا اپنا اندازہ ہے کہ پہلے تمہیں اور ظاہر خان کو گیٹ ہاؤس میں گیس کے ذریعے بے ہوش کیا گیا۔ اس کے بعد مجھے بھی بیڈ روم میں نیند کے دوران ہی گیس سے بے ہوش کیا گیا۔ قابل غور بات یہ ہے کہ گیٹ ہاؤس میں گیس کس طرح پھیلائی گئی؟ گیٹ ہاؤس' گیٹ کے اندر کی طرف ہے۔ گیٹ میں کہیں ذرا سا بھی سوراخ نہیں ہے۔ دیواریں اونچی ہیں اور ان پر تاریں ہیں جن میں کرنٹ دوڑتا ہے۔ کہیں کسی قسم کی توڑ پھوڑ کے آثار نہیں ہیں۔ اصل میں سارا کام تمہیں... بے ہوش کرنے کے بعد آسان ہوا۔ نئے انتظامات میں تمہیں یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا ہوگا کہ آئندہ تم لوگوں کو ڈیوٹی کے دوران گیس سے بے ہوش نہ کیا جاسکے۔"

"ٹھیک ہے سر! میں سب چیزوں کا جائزہ لیتا ہوں اور نئے انتظامات کے بارے میں بھی غور کرتا ہوں۔" اس نے کہا اور واپس چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچوں میں گم رہا۔ مجھے ایک اہم فیصلے پر پہنچنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میں اگر ریڈ ڈاٹ کے انکشافات کو سینے میں دبائے خاموش بیٹھا رہتا تب بھی میری جان نہیں چھوٹ سکتی تھی۔ مجھے ان کا آلۂ کار بننے کے سلسلے میں اقرار یا انکار میں جواب دینا تھا۔ ان انکشافات کو اپنے تک محدود رکھنے پر میرا ضمیر آمادہ بھی نہیں تھا۔ ان باتوں سے کسی اور کو آگاہ کرنے کے نتیجے سے بھی ان لوگوں نے مجھے خبردار کردیا تھا۔

سوال یہ بھی تھا کہ میں ان انکشافات کو لے کر کس کے پاس جاؤں؟ زبان کھولنے کی صورت میں انہوں نے مجھے موت کی دھمکی دے دی تھی۔ یہ زندگی اور موت کی بازی تھی۔ وطن کے لئے اگر مجھ گناہ گار کی جان کسی کام آجاتی تو مجھے اس میں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہ ہوتی لیکن یہ سوال ضرور میرے ذہن میں تھا کہ اگر میں وطن کے لئے جان دوں گا تو وطن کو اس سے کوئی فائدہ بھی پہنچے گا یا نہیں؟ کیا ریڈ ڈاٹ کا کم از کم ہمارے ہاں سے خاتمہ ہوسکے گا؟ کیا آئندہ ان لوگوں کو یہاں منظم ہونے سے روکا جاسکے گا جن کے سامنے مافیا طفل مکتب تھی؟ جو مافیا کے ذکر پر استہزائیہ انداز میں ہنستے تھے۔

ان سوالوں کا میرے سامنے کوئی جواب نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مجھے جو کچھ بھی کرنا ہوگا وہ جوئے کی طرح ہوگا۔ ایک ایسا جوا جس میں میرے جیتنے کے امکانات بہت کم نظر آرہے تھے لیکن بات یہ تھی کہ مجھ جیسے لوگ سبھی بازیاں جیتنے کے لئے ہی نہیں کھیلتے۔

بہت دیر تک سوچ میں ڈوبے رہنے کے بعد آخرکار میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں ایک فیصلے پر پہنچ چکا تھا۔ میں وزیر خارجہ حفیظ احمد صاحب سے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ اونچی سطح کے کئی لوگوں کے نام میرے ذہن میں آئے تھے جن سے میری صاحب سلامت تھی لیکن جس قسم کا معاملہ درپیش تھا اس میں حفیظ صاحب ہی کام کے آدمی دکھائی دے رہے تھے۔

انہوں نے مجھے اپنے جو بہت سے فون نمبر دے رکھے تھے' میں ان میں سے اسلام آباد کا ایک نمبر ڈائل کرنے ہی لگا تھا کہ مجھے یاد آیا' تین روز قبل میں نے اخبار میں پڑھا تھا' حفیظ صاحب سات آٹھ ملکوں کے دورے پر روانہ ہوچکے تھے۔ ان کا خاصا طویل پروگرام تھا اور اس دوران ان کا وطن واپس آنے کا ارادہ نہیں تھا۔ انہیں اپنا یہ کثیرالمقاصد قسم کا دورہ مکمل کرکے ہی واپس آنا تھا۔ محض میرے پیغام پر تو وہ دورہ مختصر نہیں کرسکتے تھے۔

میں نے ایک گہری سانس لے کر فون سے ہاتھ ہٹالیا۔ مزید

کچھ دیر سوچوں میں الجھا رہنے کے بعد میں نے فون دوبارہ اپنی طرف کھسکایا اور راحیلہ کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف فون پہلی ہی گھنٹی پر اٹھالیا گیا' جیسے بے تابی سے کسی کے فون کا انتظار کیا جارہا ہو۔ ہیلو کہنے والی راحیلہ ہی تھی۔

"کیا کررہی ہو؟" میں نے اپنا نام بتائے بغیر پوچھا۔

"اوہ.... تو بیدار ہوگئے حضور والا۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "کیا بھنگ کا مشکا پی کر سوئے ہوئے تھے؟"

"ابھی میں نے کسی ملنگ پارٹی کو جوائن نہیں کیا' اس لئے یہ نوبت نہیں آئی۔ تم نے فون کیا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"تمہیں پیغام نہیں ملا کیا؟" اس نے الٹا مجھ سے ہی سوال کردیا۔

"نہیں۔ مجھے تو کسی نے پیغام نہیں دیا۔" میں نے جواب دیا۔

"پیغام کون دیتا۔ فون میں نے تمہارے پرائیوٹ نمبر پر کیا تھا جس کے ساتھ تم نے وہ جواب دینے والی مشین وغیرہ کے ڈھکوسلے فٹ کئے ہوئے ہیں۔" راحیلہ بولی۔ "میں نے فون کیا تو خرخراتی سی آواز میں جواب ملا۔ "چوہدری صاحب سو رہے ہیں.... پیغام چھوڑ دیجئے یا پھر بعد میں کسی وقت فون کیجئے۔" میں نے سوچا "پھر کسی وقت" سے نہ جانے کیا مراد ہو اس لئے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔ دوبارہ فون کرنے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔" وہ خوب نقل اتار اتار کر بول رہی تھی۔

"مشین کو تو میں چیک ہی نہیں کرسکا۔" میں نے کہا۔ "میں دراصل نیند میں ہی کہیں اور پہنچ گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی واپسی ہوئی ہے۔"

"نیند میں چلنے کی بیماری ہوگی۔ نیند میں چلتے چلتے کسی خوبصورت سی لڑکی کے گھر پہنچ جاتے ہوگے۔ پھر وہاں سے واپس آنے کو دل نہیں چاہتا ہوگا۔ نیند میں بعض لوگوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں مٹھاس میں لپٹا ہوا طنز تھا۔

"ایسے اپنے مقدر کہاں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ہم تو خوبصورت لڑکیوں کو صرف فون ہی کرکے رہ جاتے ہیں۔ جیسے اس وقت کر رہے ہیں۔ گھر جانے کی نوبت کہاں آتی ہے۔"

"کس نے منع کیا ہے؟ کیا راستے میں دشمن کی فوجیں کھڑی ہیں؟" اس کا لہجہ کچھ اور طنزیہ ہوگیا۔

"یہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔ "اچھا یہ بتاؤ فون کیوں کیا تھا.... کوئی ضروری بات تو نہیں تھی؟"

"ہاں۔ بہت ضروری کام تھا تم سے۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "میں تمہیں بتانا چاہتی تھی کہ کریلے بہت مہنگے ہوگئے ہیں اور عالمی سیاست پر اس کا بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔"

میں ایک لمحے کے لئے خاموش رہا۔ میں چشم تصور سے دیکھ سکتا تھا کہ اس وقت وہ اپنی مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کررہی ہوگی۔ میں نے بھی سنجیدگی سے کہا۔ "لیکن نیم چڑھے کریلے اب بھی سستے ہیں۔ اگر تم ان کی طرف محبت کی نظر سے دیکھو تو عالمی سیاست دم کے بل کھڑی ہوجائے گی۔"

"تم اسی قسم کی بکواس کرنے کے لئے فون کیا کرتے ہو؟" وہ جل کر بولی۔

"ہرگز نہیں۔" میں نے کہا۔ "میں نے تو نہایت سنجیدگی بلکہ تقریباً رنجیدگی کے عالم میں فون کیا تھا۔ بکواس تو تم نے شروع کی ہے۔ اب سنجیدگی سے ایک بات سنو' ناشتا کرچکی ہو؟"

"بہت پہلے۔" وہ بولی۔ "اب تو بیٹھی پیچ و تاب کھا رہی ہوں کہ کہاں آکر پھنس گئی ہوں۔ کوئی کام ہی نہیں ہے۔"

"کام شروع ہوگیا ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا خیال ہے میرے پاس اب وقت کم ہے اور مجھے بہت سے ضروری کام نمٹانے ہیں۔"

"یہ انکشاف اچانک ہی ہوا ہے کیا؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"یہی سمجھ لو۔ بعض اوقات صرف ایک لمحہ زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اوہو.... اتنے دیوداس کیوں ہو رہے ہو؟" اس نے استہزائیہ انداز میں پوچھا۔

"ویسے ہی.... ذرا ذائقہ بدلنے کے لئے۔" میں نے کہا۔ "تم یہ فضول باتیں چھوڑو اور ٹھیک آدھے گھنٹے بعد ہلٹن کے کافی بار میں پہنچ جاؤ۔ اس بات کا خاص خیال رکھنا کہ تمہارا تعاقب نہ ہو رہا ہو۔"

"آہ....! اب وہ زمانہ کہاں جب ہمارے پیچھے تعاقب کرنے والوں کی قطاریں ہوا کرتی تھیں۔ اب تو لوگ شکل پر برستی ہوئی پھٹکار دیکھ کر ہی سمجھ جاتے ہیں کہ بے چاری کوئی ٹریجڈی کی ماری ہوئی مخلوق ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"اتنی زیادہ کسر نفسی کی ضرورت نہیں۔ ذرا شہر میں نکل کر تو دیکھو' تعاقب کرنے والوں کی قطاریں تو اب بھی لگ جائیں گی۔ تمہارے کل اور آج میں کوئی ایسا فرق نہیں ہے کہ قدر دان اپنے راستے بدل لیں۔ لاہور تو ویسے بھی زندہ دلوں کا شہر ہے۔"

"اچھا بکواس مت کرو۔ کام کی بات کرو۔"

"دیکھا' پٹڑی بدل لی نا فوراً" میں نے کہا "خیر.... میں یہ کہہ رہا تھا کہ ذرا تعاقب کا خیال رکھنا۔"

"مجھے تو اس شہر میں آئے جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہیں ہوئے۔ کون میرا تعاقب کرے گا؟" وہ سنجیدگی سے بولی "کیا کوئی جاسوسی کہانی شروع ہوگئی ہے؟"

"نہیں۔ بس میں احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ اب تمہارا تعلق واسطہ مجھ سے ہے۔ تمہیں ہر قدم احتیاط سے ہی اٹھانا پڑا کرے گا۔ بیزار تو نہیں ہوجاؤ گی؟"

"اسی طرح گھر پڑی رہی تو بیزار ہوجاؤں گی۔ میں ایکشن میں رہنے والی عورت ہوں۔ تم نے مجھے مریضوں کی طرح گھر میں بٹھا دیا ہے۔"

"خیر.... تم آؤ تو سہی۔ تمہاری بیزاری کا علاج بھی ہوجائے گا" میں نے کہا "ٹھیک آدھے گھنٹے بعد۔ ہلٹن کا کافی بار" میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

اٹھنے سے پہلے میں نے دو نمبر پر جولی عرف مس ٹرپ کو فون کیا' "جولی! تمام اسٹاف کو ہدایت کردو کہ الرٹ رہیں۔ غیر ضروری طور پر کوئی مجھ سے فون پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش نہ کرے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اسٹاف" سے ہماری مراد اپنے خاص خاص لوگ ہوتے تھے جو محض دفتری کارکن نہیں تھے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تمہیں ساری توجہ اس بات پر رکھنی ہے کہ دو نمبر کسی کی نظر میں نہ آنے پائے اور مجھ سے اس کا کوئی تعلق بھی ظاہر نہ ہونے پائے۔ بہت زیادہ محتاط رہنا ہے۔"

"اوکے سر۔" جولی نے مستعدی سے کہا "کوئی ایمرجنسی....؟ کوئی خطرہ....؟"

"فی الحال نہیں۔ لیکن ہر قسم کی صورت حال کے لئے تیار رہنا ہے.... اور یہ سمجھ کر تیار رہنا ہے کہ ہم چیونٹی ہیں لیکن ہمارا مقابلہ ہاتھی سے ہے" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر!" جولی نے جواب دیا اور میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میرے ذہن میں کوئی لائحہ عمل نہیں تھا لیکن میں نے احتیاطاً ساتھیوں کو الرٹ کردینا بہتر سمجھا تھا۔

چند لمحے بعد میں گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ طارق خان اس وقت گھر میں چاروں طرف گھوم پھر کر در و دیوار کے معائنے میں مصروف تھا۔ میری گاڑی گلی میں آگئی اور خود کار گیٹ بند ہوچکا تو میں نے غیر محسوس طور پر دائیں بائیں گلی کا جائزہ لیا۔ گلی میں کوئی کار نہیں تھی اور نہ ہی کوئی ایسا شخص موجود تھا جس کے بارے میں مجھے شبہ ہوتا کہ وہ میری کوٹھی کی نگرانی کرنے پر مامور ہوسکتا ہے۔

میں نے نہایت سست رفتاری سے ڈرائیونگ شروع کی اور ہلٹن جانے کے بجائے لبرٹی اور پھر وہاں سے ماڈل ٹاؤن کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں بے مقصد سے انداز میں گاڑی ادھر ادھر لئے پھرتا رہا۔ کبھی میں نے رفتار بہت کم کی' کبھی درمیانی رکھی اور کبھی تیز رفتاری کے ریکارڈ قائم کرنے کی کوشش کی۔

میں بہت اچھی طرح اطمینان کرنا چاہتا تھا کہ کوئی میرا تعاقب تو نہیں کررہا۔ اس دوران میں نے ہر گاڑی پر نظر رکھی۔ آخر کار خاصا وقت ضائع کرنے کے بعد مجھے قائل ہونا پڑا کہ کوئی میرا تعاقب نہیں کررہا تھا۔ کافی دن پہلے میں اپنی گاڑی کا بھی ایک ماہر ترین الیکٹرونک انجینئر سے خوردبینی معائنہ کرا چکا تھا جس نے مکمل اعتماد کے ساتھ یہی رپورٹ دی تھی کہ گاڑی میں کہیں کوئی ایسا الیکٹرونک آلہ یا کسی بھی قسم کی مشکوک چیز موجود نہیں جو کہیں بھی گاڑی کی سمت یا فاصلے وغیرہ کے بارے میں نشاندہی کرسکتی ہو یا جس کی مدد سے کسی اور طرح کوئی میری گاڑی کا یا میرا سراغ پاسکتا ہو۔

اس کے باوجود ریڈ ڈاٹ والے میرے بارے میں اتنے مطمئن اور پر اعتماد کیوں تھے؟ یہ میرے لئے ایک معما تھا۔ انہوں نے سب کچھ بتانے کے بعد مجھے آزاد چھوڑ دیا تھا اور کوئی میری نگرانی نہیں کررہا تھا۔ میں وہ تمام معلومات کسی کو منتقل کرکے روپوش بھی ہوسکتا تھا۔ کیا انہیں میری فطرت کا اندازہ تھا اور یقین تھا کہ میں آسانی سے روپوش ہونے والا آدمی نہیں ہوں؟ یا اس سے ان کے لئے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا؟ شاید انہیں یقین تھا کہ میں روپوش بھی ہوگیا تو وہ مجھے ڈھونڈ نکالیں گے۔ یہ بات انہوں نے مجھ سے کہی بھی تھی۔ شاید یہ محض ایک دعویٰ نہ ہو' وہ واقعی ایسا کرسکتے ہوں۔ ممکن ہے انہیں یہ احساس ہو کہ آخر میں کب تک روپوش رہ سکتا ہوں۔ مجھ جیسا آدمی جس کے کاروباری سلسلے وغیرہ اتنے پھیلے ہوئے تھے' زیادہ عرصے روپوش نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا کوئی نہ کوئی سراغ حاصل کیا ہی جاسکتا تھا۔

ان سوچوں میں الجھا آخر میں ہلٹن جا پہنچا۔ میں نے گھڑی دیکھی' راحیلہ کو میں نے ٹھیک آدھے گھنٹے بعد یہاں پہنچ جانے کے لئے کہا تھا لیکن مجھے گھر سے نکلے پون گھنٹے سے بھی زائد ہوچکا تھا۔

میں اندر پہنچا تو حسب توقع راحیلہ کافی بار میں موجود تھی۔ وہ کسی میز کے بجائے کاؤنٹر کے قریب ہی ایک اسٹول پر بیٹھی تھی۔ سیاہ کڑھائی والی انتہائی سفید شلوار قمیص کے ساتھ اس نے کینوس کے جوتے پہنے ہوئے تھے۔ بھورے تراشیدہ بالوں کے ساتھ اس حلئے میں وہ کسی کالج کی ایتھلیٹ لگ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صرف کوئی ریکٹ وغیرہ ہوتا تو اس کے کھلاڑی ہونے میں کسی کو کوئی شبہ نہ ہوتا۔

وہ کافی کا ایک خالی مگ سامنے رکھے سانولی سی کاؤنٹر گرل کو ایک ٹک دیکھے جارہی تھی مگر کاؤنٹر گرل اس کی نظروں سے بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھی۔

میں راحیلہ کے قریب ایک اسٹول پر جا بیٹھا' اس نے تب بھی گردن گھما کر میری طرف نہیں دیکھا حالاں کہ مجھے معلوم تھا کہ وہ کافی بار میں میرے قدم رکھتے ہی میری آمد سے آگاہ ہوچکی تھی لیکن وہ بدستور کاؤنٹر گرل کو دیکھتی رہی۔

"کیا قصور ہوگیا ہے اس بے چاری سے؟" میں نے نیچی آواز میں پوچھا' اس نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس نے گویا میری آواز سنی ہی نہیں۔

"کیا اس بے چاری کو نظروں ہی نظروں میں کھا جانے کا ارادہ ہے؟" میں نے بدستور نیچی سی آواز میں پوچھا۔ اس نے تب بھی

کوئی جواب نہ دیا۔ وہ خفگی کا اظہار کر رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ صحیح وقت پر پہنچ گئی ہوگی اور اسے خاصی دیر انتظار کرنا پڑا ہوگا۔

ایک ۔لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "آئی ایم سوری۔ میں اپنی مرضی سے لیٹ نہیں ہوا۔ مجھے تم کو انتظار کرانے کا اتنا شوق نہیں تھا۔ اس میں میری انا کو ہرگز تسکین نہیں ملتی۔"

تب وہ گہری سانس لے کر تھوڑا سا میری طرف کو گھوم گئی۔ وہ بولی تو اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی "تمہیں معلوم ہے' انتظار کتنا تکلیف دہ کام ہے؟"

"مجھے معلوم ہے" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "میں نے زندگی میں بارہا طویل انتظار کیا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں جمی ہوئی برف یک لخت ہی پگھل گئی اور اس کے عقب سے مسکراہٹ کی کرن چمکی۔ اب وہ بولی تو اس کے لہجے میں خفگی کا شائبہ تک نہیں تھا "کیوں دیر لگی تمہیں؟ خیریت تو تھی؟ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہوئی؟"

میں نے نفی میں سرہلایا۔ کاؤنٹر پر چند اور گاہک بھی موجود تھے جن میں سے دو گورے چٹے سے لڑکے گردن موڑے نیم استہزائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھے جارہے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ میری آمد سے پہلے وہ راحیلہ کو گھور رہے ہوں گے۔

پیچھے میزوں پر کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے ذرا دور ایک کونے میں رکھی میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "آؤ وہاں چل کر بیٹھتے ہیں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں گورے سے لڑکے جو کسی کھاتے پیتے گھرانے کے بگڑے ہوئے نمونے معلوم ہوتے تھے' بدستور ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ایک نے دوسرے کو کہنی مارتے ہوئے کہا "ہو بھئی! ہم تو سوچتے ہی رہ گئے۔ پیش قدمی کرنے والے کر بھی گزرے" آواز تقریباً سرگوشی جتنی ہی تھی مگر اتنی ضرور تھی کہ میں سن سکتا۔

میں ان کے قریب سے گزرتے گزرتے رک گیا۔ میں نے صرف ایک ثانئے کے لئے اس لڑکے کو گھورا اور وہ فوراً اپنے اسٹول پر سکڑ سا گیا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ ان کے لمبے لمبے بال پکڑ کر دونوں کی کھوپڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرا کر چٹخا دوں لیکن راحیلہ نے میرا ہاتھ تھام کر کھینچ لیا اور میز کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "تمہارا کیا خیال ہے' کیا میں ان دونوں کے لئے کافی نہیں تھی؟ لیکن ہماری توانائیاں اتنی فالتو نہیں ہیں کہ گلیوں میں آوارہ پھرنے والے کتوں پر بھی ضائع کرنے لگیں۔"

لڑکوں کو کوئی جواب دینے کی جرأت نہیں ہوئی۔ ہم کونے والی میز پر جا بیٹھے تو راحیلہ بولی "انہی منحوسوں کی وجہ سے تو مجھے انتظار اتنا گراں گزر رہا تھا۔ یہ شاید مجھے اپنے ہی طبقے کی ..... کالج گرل سمجھ رہے تھے۔"

"مجبور لڑکیوں کی یہی تو مصیبت ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کئی کئی بچوں کی مائیں بن جاتی ہیں تب بھی ان کے رشتے آتے رہتے ہیں۔ اوپر سے تم نے حلیہ بھی بالکل کیئرفری قسم کی لڑکیوں والا ہی بنا رکھا ہے۔"

"میں نے تو کسی بھی قسم کا حلیہ نہیں بنایا۔ میں تو جیسے بیٹھی تھی ویسے ہی اٹھ کر چلی آئی۔ تم نے بالکل کسی سی آئی اے ایجنٹ کی طرح ٹھیک وقت پر پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔ میں ڈر گئی کہ معلوم نہیں کون سی آفت آن پڑی ہے۔ میں یہ سوچ کر بڑی مستعدی سے دوڑی دوڑی آئی کہ شاید ہم غریبوں کی حقیر سی خدمات بھی بڑے لوگوں کے کچھ کام آجائیں۔ لیکن ایسا لگتا ہے' تمہیں صرف تھوڑا سا پراسرار بننے کا شوق چرایا ہے" وہ میز پر کہنیاں رکھ کر دونوں ہاتھوں کے حلقے میں چہرہ ٹکا کر منتظر نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"بولتی رہو' بولتی رہو" میں نے گہری سانس لے کر کہا' "جب تمہاری بیٹری ختم ہو جائے گی تب میں کچھ بولوں گا۔"

"میں اصل میں اس لئے زیادہ بک بک کر رہی ہوں کہ کئی دن سے خاموش بیٹھی تھی۔ دوسرے اس لئے دل کی بھڑاس نکال رہی ہوں کہ یہاں آتے ہی ان دو لفنگوں نے موڈ آف کر دیا تھا۔ مجھے اکیلی دیکھ کر انہوں نے فوراً اپنی نظروں کے تیر چلانے اور دل پھینکڑے وغیرہ میری طرف پھینکنے شروع کر دیئے۔ کچھ فقرے بازی بھی فرماتے رہے۔ میں بیٹھی سوچتی رہی کہ اگر میرا وہ کالج والا زمانہ ہوتا تو فوراً اٹھا پٹخ شروع کر دیتی لیکن اب میں سنجیدہ خاتون ہوگئی ہوں۔ پبلک مقامات پر دھینگا مشتی اور خود کو تماشا بنانا پسند نہیں کرتی' جب تک کوئی بہت ہی بڑی مجبوری نہ آن پڑے۔"

پھر وہ ناک سکیڑ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئی بولی "جگہ تو ٹھیک ہی دکھائی دیتی ہے۔ میں سوچ رہی تھی' انی نے کیسی گھٹیا جگہ پر ملنے کا ٹائم دے دیا ہے۔ حیرت ہے' اب "لفنگا کلاس" ایسی جگہوں پر بھی آنے لگی ہے۔"

"اب کیرکٹر یا کلاس کو کوئی مسئلہ نہیں رہا۔ جس کے پاس روپیہ ہے وہ کسی بھی جگہ' کسی بھی شعبہ زندگی میں جا سکتا ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"لڑکی اگر لفٹ دے رہی ہو یا ایسی ویسی دکھائی دے رہی ہو' اس کی حرکات و سکنات سے ظاہر ہو رہا ہو کہ وہ کوئی دل پھینک قسم کی چیز ہے' پھر اگر لڑکے اس قسم کی حرکتیں کریں تو میں انہیں زیادہ قصوروار نہیں سمجھتی لیکن یہ جو منہ اٹھا کر ہر ایک کے ہی پیچھے لگ جاتے ہیں' انہیں تو میرا دل چاہتا ہے دھنک کر رکھ دوں۔"

"میرا تو اسی قسم کا پروگرام بن گیا تھا" میں نے کہا "لیکن تم نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا تو میرا بھی کچھ ارادہ بدل گیا۔ سنجیدہ خاتون والے جراثیم مجھ پر بھی حملہ آور ہو گئے۔"

"تمہارا مقام و مرتبہ اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اس قسم کا کچرا اپنے ہاتھوں سے اٹھاتے پھرو۔ تمہارے ایک اشارے پر اس قسم کی مخلوق کی توبڑی پسلی برابر کر کے سڑک پر پھینک دیا جاتا ہے" راحیلہ منہ بنا کر بولی۔

"اس قسم کے کاموں کے لئے میں "عملہ صفائی" ساتھ لئے نہیں پھرتا اور جتنی دیر میں فون وغیرہ کروں اور عملے کا کوئی آدمی آئے اتنی دیر میں کچرا غائب بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی زیادہ تر میں اپنا کام اپنے ہاتھ سے ہی کرنا پسند کرتا ہوں" پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا "او ر جو کچرا تمہارے راستے میں آئے گا اسے ہٹانا تو لازماً مجھے اپنی ذاتی ذمے داری محسوس ہوگا۔"

"اچھا ..... اب یہ ادھر اُدھر کی باتیں چھوڑو اور کام کی بات کرو ..... ایسی کیا بات تھی جس کے لئے تم گھر نہیں آسکتے تھے؟"

"میں نہیں چاہتا کہ تمہارا گھر ابھی کسی کی نظر میں آئے" میں نے جواب دیا۔

"کیا تمہاری نگرانی ہو رہی ہے؟" اس نے گویا اپنے آپ کو ادھر اُدھر دیکھنے سے باز رکھتے ہوئے نیچی آواز میں پوچھا۔

"یہ تو مجھے خود بھی معلوم نہیں۔ کوئی نگرانی کرتا نظر تو نہیں آتا لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کوئی میری تمام نقل و حرکت سے واقف ہے" میں نے جواب دیا۔

"اوہ ..... غیبی آنکھ کا چکر معلوم ہوتا ہے" وہ مسکرائی "کراماً کاتبین کے علاوہ بھی کوئی غیبی مخلوق تمہارے اعمال پر نظر رکھتی ہے" پھر وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "چکر کیا ہے؟ سچ سچ بتاؤ۔"

پہلے تو میں نے ارادہ کیا کہ اسے ریڈ ڈاٹ والے چکر کے بارے میں سب کچھ بتا دوں لیکن پھر فوراً ہی یہ ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال اسے اس چکر سے دور رکھنا ہی بہتر تھا۔

"یہ باتیں زیادہ ضروری نہیں ہیں۔ میں نے اصل میں تمہیں عالم شیر والے مسئلے پر بات کرنے کے لئے بلایا ہے۔ فی الحال وہ مسئلہ حل کرنا زیادہ ضروری ہے کیوں کہ باقی مسائل کے بارے میں سردست ہم کچھ کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں ہیں۔ میں چاہتا ہوں' عالم شیر والا کانٹا بھی راستے سے ہٹ جائے تو بہتر ہے تاکہ اگر کل کو ہمارا بھیڑیوں کے کسی بہت بڑے غول سے سامنا ہو جائے تو ایسا نہ ہو کہ راستے میں ٹانگ پکڑنے کے لئے ایک کتا بھی موجود ہو۔ وہ موقع بے موقع اپنے بل سے نکل کر سامنے آتا رہتا ہے اور میری زندگی کے لئے کوئی نیا خطرہ کھڑا کر دیتا ہے۔"

"ٹھیک ہے" وہ بے پروائی سے بولی "مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ آج کل وہ قلعہ بند ہے۔ تمہارا کام اسے صرف قلعے سے نکالنا ہے۔ اس کے بعد میں اس سے خود ہی نمٹ لوں گا۔ اس قسم کے کاموں کے لئے لڑکی کو بیچ میں لانا مجھے اچھا محسوس نہیں ہو رہا لیکن اس خبیث کی کوئی اور شدید کمزوری میرے علم میں نہیں ہے جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں اسے اس کی کچھار سے باہر لا سکوں۔"

"اب اپنی فلمی قسم کی مردانہ خودداری کو بیچ میں لانے کی کوشش مت کرو" راحیلہ خفگی آمیز لہجے میں بولی "تم اگر مجھے اپنی ساتھی بنانا چاہتے ہو تو پھر مجھے لڑکی مت شمار کرو۔ میں نسوانیت کے خول میں صرف اس حد تک رہنا چاہتی ہوں کہ کوئی بھی کام کرنے میں مجھے رکاوٹ محسوس نہ ہو اور نہ ہی کوئی مجھے محض لڑکی سمجھ کر ایک کونے میں بٹھانے کی کوشش کرے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں بن مانس شمار کیا کروں گا۔ اللہ کرے دنیا کے تمام چڑیا گھر ایسے حسین بن مانسوں سے کھچا کھچ بھر جائیں۔ ٹکٹ لینے والوں کا وہ ہجوم ہوگا کہ ہر روز لاٹھی چارج ہوا کرے گا۔ چڑیا گھر کے اندر کسی چڑیا کے لئے بھی پر پھیلانے کی گنجائش نہیں رہے گی۔"

"مرد پھر بھی شمار مت کرنا" اس نے مجھے گھورا "تم مرد کتنے حاسد ہوتے ہو۔ کسی لڑکی کو مرد کا درجہ نہیں دے سکتے۔"

"خدا نہ کرے جو ہم لڑکیوں کو مردوں کا درجہ دیں۔ تمہیں مردوں سے ایسے بے ہودہ اور غیر شاعرانہ کام کی توقع نہیں رکھنی

چاہیے۔ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ۔ تم چاہتی ہو ہم اس رنگ پر تارکول پھیر دیں۔ یہ ظلم ہم سے نہیں ہوگا۔"

"پھر اتر گئے پٹری سے" راحیلہ نے آنکھیں نکالیں "بات ہو رہی تھی عالم شیر کی۔ ذرا مجھے سمجھا دو کہ اس بغیر دُم کے شیر کو کس طرح کچھار سے نکالنا ہے۔"

"شیر تو وہ صرف نام کا ہے" میں نے کہا "زیادہ خصوصیات تو اس میں لومڑی اور بھیڑیئے وغیرہ کی پائی جاتی ہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اس کی ایک ٹیلی فونی محبوبہ تھی۔ بس تمہیں اس کے نام سے عالم شیر کو فون کرکے ایک ایڈریس پر بلانا ہے۔ میں تمہیں وہ ساری گفتگو سمجھا دوں گا جو تمہیں اس سے کرنا ہوگی۔ مجھے معلوم ہے وہ اتنی آسانی سے چکر میں نہیں آئے گا۔ تمہارے انداز میں ذرا بھی جھول نہیں ہونا چاہیے۔ بہت سے متوقع سوالات ہیں جو وہ تم سے کر سکتا ہے۔ تمہارے پاس ہر سوال کا جواب موجود ہونا چاہیے۔ تمہیں ذرا بھی گڑبڑانا نہیں چاہیے۔ جو کچھ بھی میں بتاؤں اسے اچھی طرح ذہن نشین کرلینا۔ اگر تمہاری اس سے گفتگو کامیاب رہی اور وہ بے وقوف بن گیا تب بھی مجھے یہ توقع نہیں ہے کہ وہ منہ اٹھا کر دوڑا چلا آئے گا۔ وہ کئی طریقوں سے اطمینان کرے گا۔"

"تم صرف مجھے میرا کردار اور مکالمے سمجھاؤ۔ ڈرامے کی کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ تقدیر پر چھوڑ دو" راحیلہ بولی۔

میں نے اسے سمجھانا شروع کیا کہ اسے کیا کیا مکالمے بولنے ہوں گے، عالم شیر کی طرف سے کیا کیا سوالات متوقع ہوسکتے ہیں، اسے کس سوال کا کیا جواب دینا ہوگا۔ وہ انہماک سے سنتی رہی اور سر ہلاتی رہی۔

کافی دیر تک نیچی آوازوں میں مصروف گفتگو رہنے کے بعد میں نے پوچھا "اتنی باتیں تمہیں ذہن نشین ہو جائیں گی؟"

"تم نے مجھے اپنی طرح کوڑھ مغز سمجھ رکھا ہے کیا؟" وہ میرے کافی کے مگ میں جھانکنے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے شرارت آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔

"ایک تو تمہیں اپنے بارے میں خوش فہمیاں بہت ہیں..... اور خوش فہم لوگ بیچ راستے میں مارے جاتے ہیں" میں نے کہا۔

"بیچ راستے میں تو کبھی کبھی بقراط بھی مارے جاتے ہیں" وہ بولی۔

میں نے بل ادا کرکے اٹھتے ہوئے کہا "اچھا اب اٹھو اور میرے ساتھ چلو۔"

"یس باس!" اس نے مستعدی سے کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آہستہ۔ اب اتنی مستعدی دکھانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ابھی میز الٹ جاتی۔"

"انسان کی کھوپڑی نہیں الٹنی چاہیے، باقی چاہے ہر چیز الٹ جائے" وہ بے پروائی سے بولی۔

"کمال ہے!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہ بات اب وہ لوگ بھی کہنے لگے ہیں جن کی اپنی کھوپڑی برسوں پہلے الٹ چکی ہے۔"

اس نے مجھے گھورا لیکن میں بے نیازی سے چلتا رہا۔ وہ میرے ساتھ ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتی باہر آگئی۔ پارکنگ لاٹ میں پہنچ کر وہ بولی "کیا ہم اپنی اپنی گاڑی میں چلیں گے؟"

"نہیں۔ تم میری گاڑی میں ہی چلو" میں نے کہا "اپنی گاڑی یہیں چھوڑ دو۔ پھر لے لینا۔"

وہ گاڑی میں بیٹھ گئی اور ہم ہوٹل سے نکل آئے۔ تب اس نے پوچھا "ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"شہر کے نواح میں ہمارے پاس کرائے کا ایک بنگلا ہے۔ بہت دنوں سے بے مصرف پڑا ہوا ہے۔ آج میرے ذہن میں اس کا یہ بہترین مصرف آیا ہے کہ اسے عالم شیر کے لئے پھندے کے طور پر استعمال کیا جائے" میں نے جواب دیا "تم اسے یہی کہانی سناؤ گی کہ تم منشیات کی اسمگلنگ کے سلسلے میں ایک عرصے سے ترکی کی جیل میں تھیں۔ کسی نے تمہاری خبر نہیں لی۔ اب تم سزا کاٹ کر ادھر ادھر گھومتی گھامتی پاکستان آئی ہو اور تقریباً روپوشی کے عالم میں روز و شب گزار رہی ہو۔ یہاں جمال بیگ نے تمہارے قیام کا بندوبست کیا ہے۔ جمال بیگ کا نام سن کر عالم شیر کو یقین آجائے کہ تم واقعی ڈولی ہو کیوں کہ جمال بیگ ڈرگ مافیا کا آدمی ہے۔

عالم شیر کو بتاؤ گی کہ جمال بیگ نے تمہارے چھپنے کے لئے ایک بنگلے کا بندوبست کیا ہے اور چند دن کے لئے تمہیں ایک ڈرائیور بھی دیا ہوا ہے۔ وہ بنگلا یہی ہوگا جو میں تمہیں اب دکھانے جارہا ہوں اور ڈرائیور میں ہوں گا۔ میں نہایت عمدہ قسم کے میک اپ میں ہوں گا۔"

"اور میں اسے یہ بھی بتاؤں گی کہ اس وقت بھی میرے پاس آٹھ کلو کوکین ہے لیکن نہ تو میں اسے بیچنے کی پوزیشن میں ہوں اور نہ ملک سے باہر لے جانے کی پوزیشن میں ہوں" راحیلہ بولی "میں اس سے کہوں گی کہ مجھے اس کی مدد کی بھی ضرورت ہے اور اس سے ملنے کی تمنا بھی۔"

"ہاں" میں نے تائید کی "میرا اندازہ ہے کہ پہلے اس کے آدمی اس بنگلے پر پہنچیں گے، اس کی تلاشی لیں گے، تمہیں دیکھیں گے، مجھے دیکھیں گے، پھر مطمئن ہونے کے بعد فون پر عالم شیر کو اطلاع دیں گے اور خود بنگلے کے آس پاس پوزیشن سنبھال لیں گے۔ اس کے بعد عالم شیر صاحب کی سواری وہاں پہنچے گی۔"

"پھر ہمیں ان پر قابو پا کر دیں انہیں ٹھنڈا کرنا ہوگا" راحیلہ بولی۔

"ہاں۔ تم چوں کہ اس ملاقات کو رازدارانہ قرار دو گی اس لئے مجھے امید ہے کہ وہ دو سے زیادہ آدمی نہیں بھیجے گا۔ یعنی عالم شیر سمیت کل تین آدمی ہوں گے جن سے ہمیں نمٹنا ہوگا" میں نے کہا۔

"ایک بات میرے ذہن میں آئی ہے" راحیلہ بولی "عالم شیر خود بھی ڈرگ مافیا کا آدمی ہے اور جمال بیگ بھی۔ تو کیا میرے پاس آنے سے پہلے عالم شیر، جمال بیگ سے تصدیق نہیں کرسکتا کہ اس نے ڈولی نامی ایک کیریئر لڑکی کے لئے بنگلے کا بندوبست کیا ہے یا نہیں؟"

"نہیں۔ وہ تصدیق نہیں کرسکے گا۔ کیوں کہ تم بتاؤ گی کہ تم کہاں سے پاکستان آئی ہوئی ہو۔ اس وقت جمال بیگ یہیں موجود تھا لیکن کل ہی وہ لندن کے لئے روانہ ہوا ہے۔ وہاں سے نہ جانے کہاں جائے گا۔ عالم شیر اس سے رابطہ قائم نہیں کرسکے گا۔"

"تمہیں ڈرگ مافیا کے بارے میں خاصی معلومات ہیں" راحیلہ نے بغور میری طرف دیکھا۔

"یہ تو کچھ بھی نہیں ہے جو میں نے تمہیں بتایا ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھے تو اس سے کئی گنا زیادہ معلومات ہیں لیکن کوئی ہماری معلومات سے استفادہ ہی نہیں کرتا۔ ڈرگ مافیا کو بھی خطرہ ہے کہ شاید کبھی میں ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں۔ پچھلے دنوں بھی ملک کی ایک خاصی معروف شخصیت میرے پاس آفر لے کر آئی تھی کہ اگر میں ڈرگ ٹریفک کے بارے میں اپنی کمپنی کی آڑ فراہم کردوں اور ہمارے کارگو میں منشیات بھی شامل کر جانے لگیں تو مجھے دو کروڑ روپے ماہانہ کی فاضل آمدنی ہوسکتی ہے۔ کارگو کو تحفظ دینا، منزل پر مال وصول کرنا اور فروخت کرنا، سب دوسروں کا دردِ سر ہوگا۔"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" راحیلہ نے مجھے گھورا۔

"تمہارا کیا خیال ہے..... میری رال ٹپک گئی ہوگی؟ ڈرگس کے دھندے نے تو مجھے میری گمراہی کے زمانے میں بھی اپیل نہیں کیا۔ اب میں کیسے لالچ میں آسکتا تھا؟"

باتیں کرتے ہم والٹن سے آگے نکل چکے تھے جب میں نے سامنے سے ایک نہایت شاندار جیپ کو تیز رفتاری سے آتے دیکھا۔ سنسان سڑک پر وہ اپنی سائیڈ پر چلی آرہی تھی۔ اس کے شیشے گہرے رنگ کے تھے۔ اس سڑک پر ٹریفک چوں کہ برائے نام ہوتا تھا، اس لئے اس کی تیز رفتاری پر مجھے حیرت نہیں ہوئی تھی۔

حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب اچانک اس کے تاریک شیشے پر دھوپ کا لشکارا پڑا اور وہ یکدم ہی اپنی سائیڈ چھوڑ کر سڑک کے عین بیچ میں آگئی۔ لاہور کی نواحی اور غیر معروف سڑکیں زیادہ چوڑی نہیں ہیں۔ سڑک کے کنارے زمین نشیبی تھی اور ایک نالا بھی موجود تھا۔ میری گاڑی کی رفتار بھی کم نہیں تھی۔ اگر میں یکدم کچے میں اتارتا تو گاڑی الٹنے کا خطرہ تھا۔

تاہم میں نے حواس قابو میں رکھے اور پوری قوت سے بریک لگائے۔ دونوں گاڑیوں کے بریک بیک وقت ہی چرچرائے اور دونوں کے دھیل ایک زبردست دھچکے کے ساتھ گویا سڑک میں گڑ گئے۔ راحیلہ اگر بروقت نہ سنبھل گئی ہوتی تو اس کا سر ونڈ اسکرین سے جا ٹکراتا۔ دونوں گاڑیاں ایک دوسرے سے چند انچ کے فاصلے پر رکی تھیں۔

اسی لمحے جیپ سے دونوں سمتوں سے بیک وقت چار آدمی کودے اور میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ان میں سے ایک عالم شیر تھا اور تین اس کے گن مین۔ ان تینوں کے ہاتھوں میں اسٹین گنیں تھیں۔ عالم شیر بظاہر خالی ہاتھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اتفاقاً اس سڑک پر آرہا تھا کہ اس نے دور سے میری گاڑی دیکھ کر پہچان لی تھی۔

وہی عالم شیر جسے گھیرنے کے منصوبے میں اور راحیلہ بناتے ہوئے جارہے تھے، اس نے الٹا ہمیں اچانک ہی اس ویرانے میں گھیر لیا تھا۔

میں ان پُر خطر لمحات میں بھی تقدیر کی اس ستم ظریفی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا!

وہ چاروں تیزی سے گاڑی کو گھیرے میں لینے کے لئے لپک رہے تھے۔

ان چاروں کی اچانک آمد نے مجھے اتنا حیران نہیں کیا تھا جتنا اس وقت راحیلہ نے کردیا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے اپنی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا اور دوسرے ہی لمحے مجھے اس کے ہاتھ میں چپٹا سا

ایک پستول نظر آیا۔ میرے لئے بس اتنا ہی اطمینان کافی تھا۔

وہ اپنی طرف کا دروازہ کھولتے ہوئے باہر لڑھک گئی۔ اس کے ہاتھ میں ہتھیار دیکھ کر مجھے اس کی طرف سے زیادہ تشویش نہیں رہی تھی۔ میں بھی اسی لمحے اپنا مشین پسٹل نکالتے ہوئے اپنی طرف کا دروازہ کھول کر باہر لڑھک گیا۔

اس قسم کی صورت حال میں زیادہ فائدے میں وہی رہتا ہے جو دوسرے کو زیادہ سے زیادہ حیران کردے۔ میرے اور راحیلہ کے درمیان زبردست ذہنی ہم آہنگی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے اس نکتے کو سمجھ لیا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ محسوس کرلیا تھا۔ کیونکہ ہمارے پاس بات کرنے کی تو مہلت ہی نہیں تھی۔

عالم شیر اور اس کے مسلح محافظوں سے اچانک سامنا ہونے پر ہم تو ایک ثانئے کے لئے حیران ہوچکے تھے۔ اب ان کے حیران ہونے کی باری تھی۔ ہوتا عموماً یہ ہے کہ جب مسلح افرادیوں اچانک کسی گاڑی کو گھیرتے ہیں تو اس گاڑی کے مسافر چند سیکنڈ کی اس مہلت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاپاتے جو انہیں حاصل ہوتی ہے۔ وہ تذبذب میں رہ جاتے ہیں۔ کوئی فیصلہ نہیں کرپاتے اور آخری لمحے تک اس آس میں رہتے ہیں کہ دشمن سے کوئی بات ہوجائے گی' بچاؤ کی کوئی صورت نکل آئے گی۔

ہم نے اس طرح کی کسی توقع یا تذبذب میں وقت ضائع نہیں کیا۔ میں تو خیر ایسا کرہی نہیں سکتا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ راحیلہ نے بھی ایسا نہیں کیا ورنہ وہ میرے لئے مددگار کے بجائے زحمت بن سکتی تھی۔ میں خود اپنی حفاظت کے لئے تو کچھ کرہی لیتا لیکن اس کی حفاظت میرے لئے مسئلہ بن جاتی۔

میں نے اور راحیلہ نے انہیں گنیں سیدھی کرنے کا بھی موقع نہیں دیا۔ میرا مشین پسٹل اور راحیلہ کا عام پسٹل ایک ساتھ گرجے اور میری طرف کے دونوں گارڈ جس تیزی سے میری طرف لپکے تھے' اتنی ہی تیزی سے اچھل کر زمین پر آڑے ترچھے ڈھیر ہوگئے۔ اسی دوران دوسری طرف راحیلہ نے اس گارڈ کو بھی ڈھیر کردیا تھا جو عالم شیر کے آگے آگے دوڑا آیا تھا۔

انہیں' ان کی صرف ایک ثانئے کی تاخیر نے مروایا تھا۔ عالم شیر کو شاید انہیں میرے بارے میں بتانے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ وہ شاید یہی سمجھے تھے کہ گاڑی میں بیٹھے ہوئے جوڑے کی طرف ان کا اسٹین گین لے کر لپکنا ہی کافی ہوگا' ٹریگر دبانے کی تو ضرورت ہی پیش نہیں آئے گی۔ وہ دونوں تو بت بنے بیٹھے رہ جائیں گے۔

ان کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم ایک ثانئے کے لئے بھی نہیں ہچکچائیں گے اور اتنی تیزی سے ہتھیار نکال بھی لیں گے اور ان کے سینوں میں گولیاں اتار بھی دیں گے۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوگیا۔

عالم شیر نے اپنے بھاری بھرکم جثے کے باوجود حیرت انگیز

پھرتی کا مظاہرہ کیا اور دیوار سے ٹکرانے والی ربڑ کی گیند کی طرح تیزی سے واپس دوڑا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس نے کوئی گن وغیرہ نکالنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس کے پاس کوئی ہتھیار تھا ہی نہیں۔ اس قبیل کے لوگوں کا ہر کام حکم دینے سے اور اشارہ کرنے سے ہوجاتا ہے' اس لئے عموماً وہ خود کوئی ہتھیار رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ وہ ہر وقت اسلحہ برداروں کے حفاظتی حصار میں رہتے ہیں۔

ہوا میں اس وقت بھی فائروں کی بازگشت باقی تھی جب میں تیزی سے چیخا۔ "اسے مت مارنا۔" میری یہ تنبیہہ راحیلہ کے لئے تھی۔ غنیمت تھا کہ ابھی اس کے پستول سے نکلی ہوئی کسی گولی نے عالم شیر کا لہو نہیں چاٹا تھا۔ اس سے اب مجھے اس ایک لمحے کی تاخیر کی توقع نہیں تھی جس نے عالم شیر کو پلٹ کر بھاگنے کی مہلت دے دی تھی لیکن شاید راحیلہ نے اس کے غیر مسلح ہونے ہی کی وجہ سے اسے چھوڑ دیا تھا۔ راحیلہ گاڑی کی آڑ میں تھی' میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا۔ بہرحال اس کی طرف سے مزید کوئی فائر نہیں ہوا۔

میں بھی گاڑی کے وھیل کے قریب سینے کے بل لیٹے لیٹے عالم شیر کو بھاگ کر جیپ میں بیٹھتے دیکھتا رہا۔ جیپ اسٹارٹ ہی تھی۔ ٹائروں کی چرچراہٹ کے ساتھ وہ تیزی سے ریورس ہوئی پھر لہرا کر آندھی طوفان کی طرح میری گاڑی کے برابر سے گزرتی چلی گئی۔ عالم شیر اپنی زندگی کی حفاظت کرنے والوں کی لاشیں لاوارثوں کی

طرح ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہوگیا۔

میں کپڑے جھاڑ کر سیدھا کھڑا ہوا تو گاڑی کے دوسری طرف سے راحیلہ بھی اٹھتے ہوئے بولی "یہ صلہ دیتے ہیں لوگ نیکی کا۔ میں نے اس کمینے کو نہتا ہونے کی وجہ سے نہیں مارا لیکن وہ منحوس ابھی جاتے جاتے مجھے جیپ تلے کچل جاتا' اگر میں بروقت لڑھک کر گاڑی کی نیچے نہ ہوجاتی۔"

"دل چھوٹا مت کرو۔ صلہ خواہ کچھ بھی ملے' انسان کو احسان کرتے رہنا چاہئے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور مشین پسٹل کی نال میں پھونک مارنے کے بعد اسے واپس اندر کی جیب میں رکھ لیا۔ اس کا پستول بھی شاید جہاں سے برآمد ہوا تھا وہیں واپس پہنچ چکا تھا۔

میں نے تیزی سے تینوں گارڈز کا جائزہ لیا۔ تینوں ہی مرچکے تھے۔ خون زمین میں جذب ہوچکا تھا۔ کسی میں بھی زندگی کی رمق تک نہیں تھی۔ گنیں ان کے پاس پڑی رہ گئی تھیں۔ تینوں ہی کو سینے میں گولیاں لگی تھیں۔

راحیلہ میرے قریب آئی اور جس طرف جیپ گئی تھی' ادھر اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "عالم شیر کا تعاقب نہیں کروگے؟"

"نہیں' مجھے فلمی قسم کی کارچیزنگ کا شوق نہیں ہے۔ اگر مجھے اس وقت اس کی ضرورت ہوتی تو میں اسے جانے ہی نہ دیتا۔" میں نے کہا "لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ وہ عالم شیر تھا؟"

اس نے غصیلی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس وقت اس کے ایک رخسار پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ کپڑوں پر بھی مٹی کے داغ پڑ گئے تھے۔ چہرے پر پھر وہی پہلی سی معصومیت تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے فرسٹ ایئریا سیکنڈ ایئر کی کوئی طالبہ کچھ دیر کہیں شرارتوں میں مشغول رہنے کے بعد گھر واپس آئی ہو۔ اس کا سفید لباس اس تاثر کو مزید گہرا کررہا تھا کیونکہ بیشتر گرلز کالجوں کا یونیفارم سفید تھا۔

"اتنی تفصیل سے تم مجھے عالم شیر کے بارے میں بتا چکے تھے۔" وہ بولی۔ "اس کے بعد بھی میں اسے نہ پہچانتی؟ تم مجھے الو سمجھتے ہو کیا؟"

"الو تو خیر تم نہیں ہوسکتیں' اُلو کی مادہ ہوسکتی ہو۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر جلدی سے گاڑی کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ آؤ... اس سے پہلے کہ کوئی اس طرف آنکلے' ہم بھاگ چلیں۔"

"ڈر رہے ہو؟"

"ہاں۔ لاشیں میرے رومانی خوابوں کو خراب کردیتی ہیں۔" میں نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"اوہو... اس کا مطلب ہے رومانی خواب دیکھے جارہے ہیں آج کل۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولی۔ "کون آتی ہے تمہارے رومانی خوابوں میں؟"

"بہت سی آتی ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "کچھ آوارہ بکریاں... کچھ لاوارث گائیں... کچھ بیوہ چڑیلیں۔ ان فضول باتوں کو چھوڑو۔ میں تمہیں تھوڑا سا خراج تحسین پیش کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ایکسلریٹر پر تھوڑا سا دباؤ بڑھایا اور گاڑی کسی درندے کی طرح غرا کر آگے بڑھی۔ ٹائر اسی طرح چرچرائے جس طرح چند لمحے پہلے عالم شیر کی بھاری بھرکم اور بڑی سی جیپ کے چرچرائے تھے۔

میں نے اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دے کر کہا۔ "تم نے بہت پھرتی دکھائی۔ اگر ہم دونوں میں سے کوئی بھی تذبذب میں ایک سیکنڈ بھی ضائع کردیتا تو شاید اس ویرانے میں ان گارڈز کی جگہ ہماری لاشیں پڑی ہوتیں۔ یہ بتاؤ تمہیں پستول ساتھ لے کر نکلنے کا خیال کیسے آگیا تھا؟"

"جس انداز میں تم نے بلایا تھا اور جس طرح احتیاط کی تلقین کی تھی' اس سے میں نے محسوس کیا تھا کہ خالی ہاتھ گھر سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔" وہ بولی۔

"وہ تو میں نے محض احتیاطاً تاکید کی تھی اس چکر کا تو مجھے قطعاً اندیشہ نہیں تھا۔" میں نے کہا۔

"تمہیں اندیشہ ہو یا نہ ہو لیکن مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ تمہارے ساتھ رہ کر مجھے کسی بھی قسم کے چکر کے لئے تیار رہنا چاہئے۔" وہ بولی۔

"ہاں۔ میرے دوستوں کو جلد ہی اس بات کا اندازہ ہوجاتا ہے۔" میں نے کہا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "عالم شیر سیدھا پولیس کے پاس دوڑا گیا ہوگا؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔ "اس قبیل کے لوگ پولیس کے پاس جانے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔ عین ممکن ہے' یہ گارڈز ویسے ہی کسی نہ کسی چکر میں پولیس کو مطلوب رہے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کے قبضے میں کوئی ایسی چیز نہیں ہوگی جس سے ان کا عالم شیر سے کوئی تعلق ظاہر ہوسکے۔ تبھی وہ اتنی پھرتی سے انہیں چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔"

"بھاگ تو وہ نہیں سکتا تھا۔" راحیلہ گہری سانس لے کر بولی۔ "ایک تو نہتے ہونا اس کے حق میں مسلح ہونے سے زیادہ اچھا ثابت ہوا۔ دوسرے میں بس ایک لمحے کے لئے ہچکچا گئی۔ نہ جانے کیوں میرے دل نے کہا کہ تم ابھی اسے مردہ دیکھنا نہیں چاہتے ورنہ میری انگلی تو ٹریگر کو تقریباً دبا ہی چکی تھی۔ باقی تین گولیاں اس کے حصے میں آجاتیں۔"

"اس کا مطلب ہے' ہمارے درمیان ٹیلی پیتھک رابطہ قائم ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے چیخنے سے پہلے ہی میرے ذہن کا پیغام تم تک پہنچ چکا تھا۔ اگر ہم اسی طرح دو قالب' ایک ذہن کی طرح سوچ سکیں تو ہم دو افراد دس بیس آدمیوں کی ٹیم سے زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔"

"لیکن تمہیں خطرناک ثابت ہونے کا اتنا شوق کیوں چڑھا ہوا

ہے؟" اس نے مجھے گھورتے ہوئے کہا۔

"میں بہت خطرناک حالات میں گھرا ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔

"میں دیکھ چکی ہوں۔ کچھ 'خطرناک حالات' تو ابھی جیپ میں بیٹھ کر فرار ہوئے ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"ایک لڑنگے کو شوٹ کر کے اتنی بڑی تیس مار خاں بننے کی کوشش مت کرو۔" میں نے کہا۔ "خطرناک حالات سے میرا اشارہ عالم شیر کی طرف نہیں تھا۔ حالانکہ وہ بھی کچھ کم خطرناک آدمی نہیں ہے۔ ڈرگ مافیا کا آدمی ہے اور ڈرگ مافیا کی خوفناکی کا تمہیں اندازہ نہیں۔ بہر حال اس کے باوجود میں اسے اپنے خطرناک دشمنوں میں شمار نہیں کرتا۔ وہ تو میری نظر میں ایک ہڑبڑایا ہوا گدھا ہے۔ جو خواہ مخواہ ادھر ادھر لوگوں کو دولتیاں مارتا پھرتا ہے۔"

"تو پھر کیا اس کے آقا تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"اس کے آقا ڈرگ مافیا کے بڑے لوگ ہیں اور ڈرگ مافیا کے بڑے لوگ تو جس حکومت کے پیچھے لگ جائیں اس کا بھی تختہ الٹ دیتے ہیں۔ میں بے چارہ کس شمار قطار میں ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن عجیب اور ناقابل یقین سی بات ہے کہ میرے پیچھے جو لوگ لگ گئے ہیں وہ ڈرگ مافیا سے بھی اونچی چیز معلوم ہوتے ہیں۔ بہت اونچی۔"

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ترچھی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ دل میں وہ میری بات پر یقین رکھتی تھی لیکن بظاہر مضحکہ اڑانے کی کوشش کرتی تھی۔ اب بھی وہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔ "اب ایسی بھی کوئی انوکھی چیز نہیں ہو تم۔ کون سا سرخاب کا پر لگا ہوا ہے تم میں؟"

"یہی تو خود میری سمجھ میں بھی نہیں آرہا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں تو خود کو بالکل حقیر فقیر سی چیز سمجھ کر ایک کونے میں بیٹھا اپنا کام کر رہا تھا۔"

"چلو خیر..." وہ شاہانہ سے لہجے میں بولی۔ "اب تم بتانے کے لئے بے قرار ہی ہو تو بتا دو... کیا چکر ہے؟"

"نہیں۔ میں ہرگز بے قرار نہیں ہوں۔" میں نے رُکھائی سے کہا۔ "میں نے اشارتاً بھی صرف اس لئے تذکرہ کر دیا ہے کہ جتنی ہوشیار اور مستعد اس وقت نظر آئی ہو' آئندہ اس سے بھی زیادہ رہنا۔"

"چلو اب اتنا برا مت مناؤ۔ پوری بات بتا دو نا۔" اس نے مجھے پُچکارا۔

"نہیں۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ فی الحال زیادہ جاننا تمہارے حق میں خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔" میں نے اپنے لہجے میں بھی حتی الامکان سنجیدگی سمونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہی۔ میں نے گاڑی ایک ذیلی سڑک پر موڑی تو ایک بار پھر ٹائر چرچرائے۔ راحیلہ بولی۔ "اب ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"وہیں' جہاں کے لئے روانہ ہوئے تھے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تمہیں وہ مکان دکھانے کے لئے نکلا تھا جہاں ہمیں عالم شیر کے لئے پھندا لگانا ہے۔"

"لیکن اب اس کی کیا ضرورت رہ گئی ہے؟" وہ قدرے حیرت سے بولی "مجھے تو امید نہیں کہ اب وہ ہمارے چکر میں آئے گا۔ وہ مجھے تمہارے ساتھ دیکھ چکا ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ اب وہ منصوبہ قابل عمل رہ گیا ہے۔"

"منصوبہ اب بھی قابل عمل ہے۔" میں نے کہا "اس میں صرف چھوٹی موٹی چند تبدیلیاں کرنی پڑیں گی۔" میں نے کہا۔ "ایک تو اب اس پر ہفتہ دس دن ٹھہر کر عمل کیا جائے گا۔ دوسرے تمہیں تھوڑا سا میک اپ کا سہارا لینا پڑے گا۔ وہ تمہیں بہت زیادہ اچھی طرح تو ان حالات میں نہیں دیکھ سکا۔ چھوٹی موٹی تبدیلیوں سے ہی کام چل جائے گا۔ اور میرا تو پہلے بھی حلیہ بدل کر اس کے سامنے آنے کا ارادہ تھا۔"

"تمہاری بھی کھوپڑی میں کہیں ٹیڑھا پن ہے ضرور" وہ بولی "آخر تم نے اس وقت ہی اسے گولی کیوں نہیں مار دی جب وہ اُلٹے

قدموں بھاگ کر جیپ میں سوار ہو رہا تھا؟ میں تو ہچکچا گئی تھی لیکن اس وقت وہ تمہارے بھی نشانے پر تھا۔ جہاں تین لاشیں گری تھیں اور وہاں چوتھی بھی گر جاتی اور قصہ ختم ہوتا۔ اتنے لمبے چوڑے چکر میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

"اس میں تو کوئی شک نہیں کہ میری کھوپڑی میں ٹیڑھا پن موجود ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔ "میری کوشش ہوتی ہے کہ میرا کوئی خاص دشمن جس نے بلاوجہ مجھے بہت زچ کیا ہو یا بے بنیاد باتوں پر میری جان کے درپے رہا ہو اور ہمیشہ مجھے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہا ہو' اسے میں ہنگامی یا حادثاتی انداز میں ہلاک نہ کروں بلکہ نہایت صبر و سکون سے اسے اس کی فردِ جرم سنا کر موت کے سفر پر روانہ کروں۔"

"اس کا مطلب ہے تمہارے ذہن میں کہیں اذیت پرستی کے جراثیم موجود ہیں؟" وہ بولی۔

"غلط خیال ہے تمہارا۔" میں نے کہا۔ "مجھے کبھی کسی کو' حتیٰ کہ اپنے دشمن کو بھی ایذا پہنچا کر خوشی اور طمانیت محسوس نہیں ہوئی۔ میں انہیں ان کی روش سے باز آنے کا ہر موقع مہیا کرتا ہوں لیکن وہ مجھے مجبور کر دیتے ہیں کہ جو زبان ان کی سمجھ میں آتی ہے صرف اسی میں ان سے بات کروں۔ وہ میرے لئے بقا کا مسئلہ پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ بات یقینی ہو جاتی ہے کہ ہم میں سے کوئی ایک ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ دنیا میں۔"

وہ پُرخیال سے انداز میں ہنکارا بھر کر رہ گئی۔ میں نے گاڑی ایک چھوٹے سے بنگلے کے سیاہ گیٹ کے سامنے لے جا روکی۔ چابیوں کا گچھا نکال کر میں نے کئی چابیاں تالے میں آزمائیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا' کون سی چابی اس تالے کی تھی۔ آخر ایک چابی لگ ہی گئی۔

"تمہاری سرگرمیاں کچھ مشکوک سی ہیں۔" وہ میرے ساتھ اندر آتے ہوئے مصنوعی سنجیدگی سے بولی۔ "شہر سے اتنی دور' اس ویران سی جگہ پر یہ بنگلا کیوں لے کر چھوڑا ہوا ہے؟"

"مجھ جیسے لوگوں کو ہر طرح کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ اس لیے ہر طرح کی جگہیں تیار رکھنا پڑتی ہیں۔" میں نے کہا "ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہاں سے ذرا آگے ایک انڈسٹریل ایریا ہے۔ وہاں کسی زمانے میں ہم نے ایک چھوٹا سا کارخانہ خریدا تھا۔ یہ بنگلا ہمیں اس کے ساتھ ہی ملا تھا۔ اس کے اسٹاف کے تین چار آدمی یہیں رہتے تھے۔ بنگلا کرائے کا تھا۔ وہ کارخانہ محض دردسری تھا۔ اسے ہم کب کا بیچ چکے ہیں۔ اسٹاف کے وہ لوگ بھی جا چکے ہیں جو یہاں رہتے تھے لیکن یہ ابھی تک ہمارے کھاتے میں پڑا ہوا ہے۔ مالک اس کا ملک سے باہر ہے۔ بس روٹین میں اسے کرایہ جا رہا ہے۔ اسے بھی کوئی پروا نہیں ہے' ہمیں بھی کوئی پروا نہیں ہے۔"

"ہاں بھئی' بڑے لوگوں کی بڑی باتیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"کبھی کبھار اس کی ضرورت پڑ ہی جاتی ہے۔ ہم سمجھ لیتے ہیں کہ کرایہ وصول ہو گیا۔" میں نے کہا۔

"کسی بھولی بھٹکی لڑکی کو لے کر یہاں آجاتے ہو گے۔" وہ بظاہر سادگی سے بولی۔

"احمق کہیں کی!" میں نے اسے گھورا۔ "لڑکی کو لے کر اتنی دور اس ویرانے میں دھکے کھانے کی کیا ضرورت ہے؟ میرا گھر کیا اس قسم کی سرگرمیوں کے لئے بُرا ہے؟ اس سے زیادہ محفوظ جگہ تو کوئی ہے ہی نہیں۔ میں کون سا شادی شدہ ہوں جو مجھے بیوی کا ڈر ہو گا۔"

ذرا توقف سے میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا "لیکن اے شکی لڑکی! کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا ہے کہ میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں؟"

"وہ تو مجھے معلوم ہے کہ آدمی تو تم بہت شریف ہو' لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔ مجبوراً کسی لڑکی کی طرف دیکھنا بھی پڑ جائے تو آنکھ کے بجائے کان سے دیکھتے ہو لیکن شریف آدمیوں کو بھی تو کبھی کبھی ضرورت مند اور بے سہارا لڑکیوں کو سہارا دینے اور ان کے کام آنے کے لئے خلوت میں لے جانا پڑتا ہے۔" وہ اپنی شریر مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"اچھا بکواس بند کرو اور اس مکان کو اچھی طرح دیکھ لو' ساخت کو سمجھ لو۔" میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔

"میں باتوں کے دوران بھی سب کچھ دیکھ رہی ہوں۔" وہ بولی۔

بنگلا زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اچھی طرح اس کا معائنہ کرنے کے بعد بولی۔ "جگہ تو معقول ہے۔ کتنا سکون ہے یہاں۔" اس نے گہری سانس لی۔ "میں تو سوچ رہی ہوں تم مجھے گلبرگ والی کوٹھی کے بجائے یہی دے دیتے۔"

"ہاں بہت فائدہ رہتا۔ مجھ سے تمہاری جان کافی بچی رہتی۔" میں نے کہا۔ "یہاں جو چند بنگلے نظر آرہے ہیں ان میں ایک ہی بڑی خرابی ہے کہ کبھی کبھی یہاں ڈاکوؤں کے پورے پورے گروہ آکر رہائش اختیار کر لیتے ہیں۔ تم جیسے حسین میزبان کو دیکھ کر تو وہ یہاں سے جانے کا ارادہ ہی ترک کر دیتے۔ بلکہ شاید ان میں آپس میں لڑائی شروع ہو جاتی کہ تمہاری میزبانی پر کس کا حق زیادہ بنتا ہے۔"

اس کے رخساروں پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ ایک دروازے پر گھونسا رسید کرتے ہوئے بولی۔ "ایک تو تمہیں بکواس کرنے کی بڑی عادت ہے۔ فی الحال تو میں نے یہ گھونسا دروازے پر رسید کر کے اپنا غصہ نکال لیا ہے لیکن تم نے مزید اس قسم کی کوئی بات کی تو یہ گھونسا تمہارے جبڑے پر بھی پڑ سکتا ہے۔"

"اس کے بعد بہت دنوں تک اس گھونسے کی مالش کرنا پڑے

گی۔ عین ممکن ہے ہڈیوں کے کسی ماہر کو بھی دکھانا پڑے۔" میں نے کہا۔

"خوش فہمی ہے تمہاری۔" وہ گھونسا ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو رسید کرتے ہوئے بولی "اس گھونسے کی حقیقت اس سے پوچھنا جس نے کبھی کھایا ہوگا۔"

"جسے ایک رخسار پر پڑا ہوگا اس نے دوسرا گال بھی آگے کر دیا ہوگا۔" میں نے کہا "ویسے میں تمہیں سنجیدگی سے بتا رہا ہوں۔ ایک بار ڈاکوؤں کا ایک پورا ٹولہ یہاں آکر رہنے لگا تھا' سب تالے وغیرہ توڑ دیئے تھے۔ جس طرح وہ مزے سے یہاں رہنے لگے تھے اس طرح تو خود مالک بھی اپنے مکان میں نہیں رہتے۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟" راحیلہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ اپنے صرف دو آدمیوں کو بھیجا تھا۔ ڈاکو اس طرح سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے کہ لوٹے ہوئے لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے اور کچھ زیورات بھی یہیں چھوڑ گئے تھے جو ہمیں پولیس کی خدمت میں پیش کرنے پڑے۔ نہ جانے کن بدنصیبوں کے ہوں گے۔" میں نے بتایا۔

"جگہ تو بہت معقول ہے۔" راحیلہ بولی۔ ہم معائنہ مکمل کر چکے تھے۔ "مجھے تو اب بے چارے عالم شیر پر ترس آرہا ہے۔"

"اگر وہ لوگ مجھے گولیوں سے چھلنی کرکے 'تمہیں اٹھا کر لے گئے ہوتے تو پھر شاید تمہیں ان پر اور بھی زیادہ ترس آتا۔" میں نے کہا۔

"اتنا آسان نہیں ہے مجھے اٹھا کر لے جانا۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "چلو اب واپس چلیں۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا "ابھی تم ہی کہہ رہی تھیں' بڑی پرسکون جگہ ہے۔ اب ہفتہ دس دن گزار کر ہی چلیں گے۔"

"میرا تو کچھ نہیں ہے۔" وہ کندھے اُچکا کر بے پروائی سے بولی۔ "کہیں تم اپنے کاروبار سے جدائی کے غم میں ہوش و حواس نہ کھو بیٹھو۔"

"کاروبار سے جدا رہنے کو کون کہہ رہا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "روزانہ صبح میں اپنا بریف کیس لے کر دفتر روانہ ہوا کروں گا۔ تم گیٹ پر کھڑے ہو کر ہاتھ ہلا کر مجھے خدا حافظ کہا کرنا۔ پھر شام کو گیٹ پر کھڑے ہو کر میرا انتظار کیا کرنا۔ میں تھکا ہارا آفس سے آیا کروں گا۔ تم میرے لئے اچھے اچھے کھانے پکا کر رکھا کرنا۔"

"بس... بس... شیخ چلی واپس آجاؤ۔" وہ میری آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہرا کر بولی۔ "آنسہ نیک پروین کا اصلاحی' معاشرتی اور رومانی افسانہ ختم ہو چکا ہے۔ آج کل تو جیمز بانڈ کی مار دھاڑ سے بھرپور سیریز چل رہی ہے۔"

"چلئے جناب! میں واپس آگیا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ریٹرن آف شیخ چلی۔"

میں نے مکان کو تالا لگایا اور ہم واپس روانہ ہو گئے۔ واپسی کے لئے میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ شہر پہنچ کر میں نے راحیلہ کو ہوٹل اتارا تاکہ وہ اپنی گاڑی میں چلی جائے۔ اس کے رخصت ہونے تک میں نے گاڑی باہر سڑک پر روکے رکھی اور جب وہ باہر آئی تو میں کچھ دور تک اس کے پیچھے بھی گیا۔ حتیٰ کہ مجھے اطمینان ہو گیا کہ کوئی اس کا تعاقب نہیں کر رہا تھا' تب میں دفتر لوٹ آیا۔

آج کسی وارننگ کے بغیر راحیلہ کو ایکشن میں دیکھ کر میں فیصلے پر پہنچ گیا تھا۔ ذہنی طور پر تو وہ میرے جتنا قریب تھی اور اس سے میرا جو رشتہ یا تعلق تھا' وہ اپنی جگہ تھا لیکن عملی طور پر بھی وہ میرے نہایت قریبی اور خاص ساتھیوں میں شامل ہونے کی اہل تھی۔

اپنے ان قریبی اور خاص ساتھیوں کے حلقے کو اب میں نے "دی سرکل" کا نام دے دیا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ راحیلہ کو بھی "دی سرکل" کا تمام سیٹ اپ سمجھا دوں گا اور اس میں شامل خاص خاص ساتھیوں سے متعارف کرا دوں گا۔ اس کے علاوہ اب اسے چند خاص ہتھیار وغیرہ بھی فراہم کئے جا سکتے تھے۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ وہ ہمارے حلقے میں بہت شاندار اضافہ ثابت ہو سکتی تھی۔

دفتر پہنچتے ہی یہ سب خیالات میرے ذہن سے نکل گئے کیونکہ ویٹنگ روم میں راجو میرا منتظر تھا۔ میں اسے دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔ اس کی موٹی موٹی خوبصورت آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے اور منہ میں خوشبودار پان تھا۔ ٹائی کی گرہ ڈھیلی تھی اور کالر کا بٹن کھلا ہوا تھا۔ سوٹ شکن آلود تھا۔ اس پر اس وقت بھی ہلکا سا خُمار طاری تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ اس کا مستقل ہی اسٹائل تھا۔ گھر سے باہر وہ شاید ہر وقت اسی حلئے اور اسی مُوڈ میں نظر آتا تھا۔ اس کے انداز و اطوار سے ایک دلکش سا لاابالی پن ظاہر ہوتا تھا۔

"یہ تم اچانک کہاں سے ٹپک پڑے؟" میں نے اس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

"بس... جان جگر...! ہم تو جب بھی ٹپکتے ہیں اسی طرح اچانک ٹپکتے ہیں۔" وہ ہاتھ اونچا کرکے میرا کندھا تھپکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "اچھا بھلا اصطبل جانے کے ارادے سے نکلا تھا لیکن اچانک تمہاری یاد آگئی۔ دل پر رقت طاری ہو گئی..."

"اور تم نے سوچا' چلو اصطبل نہ سہی' افضل چوہدری کا دفتر ہی دیکھ لیتے ہیں۔ ایک ہی بات ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ اس کا مختصر سا وجود بری طرح ہل کر رہ گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے میرا ہاتھ بڑی محبت سے تھامتے ہوئے بولا۔ "نہیں جان جگر! ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ تمہارا آفس دیکھ کر تو میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔"

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا' آنکھیں سکیڑ کر ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ بلڈنگ اپنی ہے یا کرائے کی ہے؟"

"پہلے کرائے پر ہی لی تھی۔ بعد میں خرید لی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"واہ واہ... کیا ٹھاٹ ہیں تمہارے۔" وہ تھوڑا سا جھوم کر بولا۔ "بھئی میں گھر سے دو پیگ پی کر چلا تھا۔ ایک پیگ کا خُمار تو اس وقت دور ہو گیا جب میں اس بلڈنگ میں داخل ہوا۔" پھر اس نے سامنے شیشے کی دیوار کے عقب میں بیٹھی ہوئی کیترین کی طرف اشارہ کیا۔ "دوسرے پیگ کا خُمار اس وقت دور ہو گیا جب اس نے مجھے روک دیا۔ میں تو تمہارے نام کی تختی دور سے ہی دیکھ کر منہ اٹھائے تمہارے کمرے میں گھسا جا رہا تھا کہ اس بی بی نے مجھے دم سے پکڑ کر کھینچ لیا اور خفا ہونے لگی کہ میں بظاہر تو تھوڑا بہت پڑھا لکھا نظر آتا ہوں لیکن دفتری آداب سے واقف نہیں ہوں۔ میں نے اسے بتایا' بی بی! چوہدری میرا بچپن کا یار ہے' میرا لنگوٹیا ہے۔ اس کے دفتر میں آنے کے لئے مجھے دفتری آداب سیکھنے کی ضرورت نہیں لیکن خاتون نے میری ایک نہ سنی اور مجھے شیشے کے اس پنجرے میں انتظار کے لئے بٹھا دیا۔ بلکہ وہ تو مجھے ٹرخانے ہی کی فکر میں تھی۔ انتظار کرنے کے لئے تو میں خود ہی بیٹھا ہوں۔"

"ختم ہو گئی تمہاری داستان غریب حمزہ؟" میں نے اسے گھورا۔

"بالکل ختم ہو گئی۔" اس نے مؤدبانہ انداز میں ہاتھ باندھ لئے۔

"تو پھر اندر چلو۔" میں نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دھکا دیا۔

"ابھی سے کیوں دھکے دے رہے ہو جان جگر!" اس نے شکوہ کیا۔ "جب رخصت کرنا ہو گا اس وقت دھکے دینا۔"

"یار' یہ "جان جگر" کون سی اصطلاح ہے؟" میں نے اسے مزید ایک ہلکا سا دھکا دے کر کمرے میں پہنچاتے ہوئے پوچھا۔ "صرف جان... جان من... یا جگری یار وغیرہ تو میں نے سنا ہے۔ یہ جان جگر کیا ہے؟ چلو جان و جگر ہوتا تب بھی ٹھیک لگتا۔"

"دیکھو یار! محبت میں گرامر کو بیچ میں مت لایا کرو۔" وہ بیزاری سے بولا۔ "بس جو لفظ دل کو اچھا لگ گیا' زبان پر چڑھ گیا اور جس سے جذبے کا اظہار ہو گیا وہ ٹھیک ہے۔ ویسے بائی دا وے تم اتنے علامہ کب سے ہو گئے؟ اسکول کے زمانے میں تو تمہاری گرامر بھی خاصی غریب تھی... میرا مطلب ہے پُور تھی۔"

"اسکول کے زمانے میں میری گرامر تو کیا' میں خود بھی پُور تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "وہ تو تم جیسے دوستوں کی مہربانی سے کچھ شغل میلہ ہو جاتا تھا ورنہ زندگی بہت ہی بے کیف ہوتی۔"

وہ صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا۔ "ویسے یار...! میں تو فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں کہ زندگی اس وقت زیادہ بے کیف تھی یا اب ہے؟"

"یاروں کی گٹھڑی میں پھر کسی وقت ہاتھ ماریں گے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "فی الحال تم میرا تجسس دور کرو۔ یہ بتاؤ کیسے آئے ہو؟"

"کمال ہے یار!" وہ حیرت سے بولا "میں نے بتایا تو ہے کہ تمہاری یاد آئی اور میں چلا آیا۔ یاروں سے یار تو اسی طرح ملنے آتے ہیں۔"

"بہت دیر سے پہنچی میری یاد تم تک۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری یاد اتنی لنگڑی لنگڑی سی ہو گئی ہے۔ ہماری اس رات کی ملاقات کو خاصے دن گزر چکے ہیں جب تم اپنی گاڑی کو تانگہ سمجھ کر گدھے کی طرح لاتیں مار رہے تھے۔" میں نے ذرا روکھے لہجے میں کہا۔ میں ابھی تک اس کے سامنے کھڑا ہی تھا۔

"او... اب میں سمجھا۔" وہ یکدم چونکتے ہوئے بولا "تم ناراض ہو مجھ سے۔ شمیم بھی بتا رہی تھی۔ تمہاری ناراضگی بجا ہے۔ میں واقعی بڑی تاخیر سے تم سے ملنے آیا ہوں۔ لنگوٹیے یار ایسے نہیں ہوتے لیکن یار... میں بس پتا نہیں' کچھ عجیب سا ہو گیا ہوں۔ ذہنی رَو جدھر کو بھٹکتی ہے بس ادھر کو بہتا چلا جاتا ہوں۔ میں آدمی نہیں گندا نالا ہو گیا ہوں۔ کسی چیز کا خیال نہیں آتا تو مہینوں نہیں آتا۔ کسی چیز کی سنک چڑھتی ہے تو وہ میری جان کو آجاتی ہے اور میں اس کی جان کو آجاتا ہوں۔"

میں خاموش کھڑا ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ذرا غور سے میری طرف دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے تمہاری ناراضگی دور نہیں ہوئی ہے لیکن یار' میں تم سے ہر طرح سے معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ میں تو اپنی غلطی پر تم جیسے دوست کے پاؤں بھی پکڑ سکتا ہوں..."

اس نے اٹھ کر سچ مچ میرے پاؤں پکڑ لئے اور یکدم ہی آنسو بہانے شروع کر دیے۔ میں حیران رہ گیا۔ رونا خواہ کسی کا بھی ہوتا ایک لمحے کے لئے مجھے کچھ پریشان کر دیتا تھا اور مرد کا رونا تو مجھے بہت ہی عجیب لگتا تھا۔ راجو نے یکدم ہی مجھے الجھن میں پھنسا دیا تھا۔ میں پیچھے ہٹنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن وہ بھوں بھوں کر کے میری ٹانگوں سے لپٹا جا رہا تھا۔ آنسو اس کے رخساروں پر بہہ رہے تھے۔

حقیقت یہ تھی کہ میں نہ تو اس سے ناراض تھا اور نہ ہی خوش۔ میں تو اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ شمیم نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس سے تو یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ ایک خود غرض' بے پروا اور لاابالی انسان تھا جسے اپنے عیش و آرام اور اپنی خواہشوں کی تکمیل کے سوا دنیا کی کسی بات سے' کسی کی ذات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن راجو کا لہجہ اور اس کے انداز و اطوار مجھے کچھ اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔ مجھے

اس کی بات سچ معلوم ہوتی تھی کہ وہ لااُبالی اور قدرے سنکی تھا مگر خود غرض نہیں تھا۔ بس جدھر ذہنی رَو بھٹک جاتی ہوگی ادھر لگا رہتا ہوگا۔

"یہ کیا بے ہودگی شروع کردی ہے تم نے؟" میں نے اسے ڈانٹا اور کوٹ کا کالر پکڑ کر ایک جھٹکے سے کھڑا کردیا۔ "بند کرو یہ بھَیں بھَیں..... اور پاؤں بھی چھوڑدو میرے۔ یہ میرا آفس ہے' کوئی اسٹیج نہیں ہے جہاں تم دھواں دھار قسم کی ایکٹنگ کرکے داد سمیٹ سکو۔ آرام سے ادھر بیٹھ جاؤ۔" میں نے اسے صوفے کی طرف دھکیلا لیکن اس نے میری ٹانگوں سے لپٹنے کی کوشش جاری رکھی اور بدستور روتے ہوئے بولا "میرے آنسوؤں اور میرے خلوص کو ایکٹنگ کا نام مت دو۔ بس تم ایک بار مجھے معاف کردو۔ میں تم سے معافی حاصل کئے بغیر نہیں ٹلوں گا۔ میں تمہاری دوستی سے محروم ہونا افورڈ نہیں کرسکتا۔ اس بھرے شہر میں میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ تمہیں مجھ کو معاف کرنا ہوگا۔"

"اچھا بابا! میں نے تمہیں معاف کیا۔ معاف کیا۔" میں نے اسے صوفے پر دھکیل کر ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "اب تم بھی مجھے معاف کردو۔ تم تو انسان کے بجائے جونک بن گئے ہو..... جھاڑ جھنکاڑ بن گئے ہو۔ چمٹ جاتے ہو تو چھوڑتے ہی نہیں۔ میں نے تو تمہیں ذرا غور سے دیکھ کر مصیبت ہی مول لے لی۔"

"شکر ہے' تم نے مجھے معاف کردیا۔" وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولا "ورنہ میں نہ جانے کیا کر گزرتا۔ جونک اور جھاڑ جھنکاڑ تو ہم صرف یاروں کے لئے بن سکتے ہیں ورنہ ہم تو وہ لوگ ہیں جنہیں دنیا ڈھونڈتی پھرتی ہے۔ بہت سے لوگ ہمارے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں مگر ہم ان کے ہاتھ نہیں آتے۔ ان میں میری بیوی بھی شامل ہے۔" اس کا لہجہ شاہانہ ہوگیا اور وہ ذرا پھیل کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ آنسو خشک ہوچکے تھے۔

میں اس کے مقابل بیٹھا ایک ٹُک اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ وہ سہمے ہوئے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "یار! تم اس طرح ایک ٹُک کیوں گھورتے ہو؟ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔ تمہاری نظر بڑی ظالم ہے۔"

میں نے گہری سانس لے کر اس کے چہرے سے نظر ہٹاتے ہوئے کہا "میں دیکھ رہا ہوں کہ بچپن سے اس عمر تک انسان میں کتنی تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ پہچاننا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ وہی انسان ہے۔"

"ہر ایک میں نہیں آتیں۔" وہ فوراً بولا۔ "جن کے حالات تیزی سے تبدیل ہوتے ہیں وہ انسان خود بھی تیزی سے تبدیل ہوجاتے ہیں۔ انسان کو اس کے حالات ہی تو تبدیل کرتے ہیں اور بھلا کیا چیز انسان میں تبدیلیاں لاسکتی ہے؟" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "تم بھی تو بہت بدل گئے ہو۔ بالکل ایک نئے انسان ہو۔ یہ تمہارا نیا جنم ہے لیکن یار' میرا خیال ہے اندر سے ہم وہی ہیں۔ تم وہی ننھے..... میں وہی راجو۔"

"میرے خیال میں تو اندر بھی کچھ تبدیلیاں آگئی ہیں۔" میں نے کہا "ہم صرف تھوڑے بہت وہی ننھے وہی راجو رہ گئے ہیں۔ اچھا ان باتوں کو چھوڑو' یہ بتاؤ کیا پیو گے؟" اس نے چند منٹ میں ہی میرے دل سے بدگمانیوں کو دھو دیا تھا۔ میں اس کے لئے اپنے دل میں وہی پہلی سی محبت' وہی پہلا سا خلوص محسوس کررہا تھا جو بچپن کی دوستی کی بنیاد ہوتا ہے۔

"میں جو کچھ پینے کا شوقین ہوں وہ تو تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "اس کا انتظام معلوم نہیں تمہارے دفتر میں ہوگا یا نہیں۔ باقی کسی چیز سے بابدولت کو اتنی دلچسپی نہیں۔ یہ ٹھنڈے' گرم' چائے اور کافیاں وغیرہ تو تم جیسے شریف شرفا کو بہلانے کی چیزیں ہیں۔"

"واہ اوئے وڈھے بدمعاش!" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "خود کو شراب کی لت لگا کر سمجھ رہے ہو کہ تم بہت بڑے بدمعاش ہوگئے ہو؟"

"نہیں' بدمعاش نہیں۔" وہ آنکھ دبا کر بولا "سمجھا کرو۔ میرا مطلب ہے ہم تو زندگی سے لطف اندوز ہونے والے لوگ ہیں۔ شریف شرفا سے ہماری مراد ہوتی ہے' بے کیف اور بور زندگی گزارنے والے لوگ۔ بحث چھوڑو' یہ بتاؤ کچھ پینے پلانے کا انتظام ہے یا نہیں؟"

"انتظام تو ہے۔" میں نے کہا "بار ایک دیوار میں باقاعدہ بار موجود ہے۔ میرے ہاں غیر ملکی مہمان بھی خاصی تعداد میں آتے رہتے ہیں لیکن میں تمہاری خدمت میں اس قسم کی کوئی چیز پیش نہیں کروں گا۔"

"آخر کار نکلے نا وہی غلامانہ ذہنیت کے مارے ہوئے۔" وہ ہاتھ کو جھٹکا دے کر بولا "گوروں کی خدمت میں ہی لگے رہنا۔ اپنے ہم وطنوں کو کبھی نہ نوازنا۔"

"میں اپنے ہم وطنوں کو ایسی چیزوں سے نوازنے والوں میں شامل ہونا نہیں چاہتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "گدھے کہیں کے! مجھ سے مانگنا ہے تو کوئی ڈھنگ کی چیز مانگو۔ خود ہی بتا رہے ہو کہ صبح گھر سے دو پیگ پی کر چلے تھے۔ ابھی پہلی ہی جگہ رکے ہو تو منہ پھاڑ کر بیٹھ گئے ہو۔ رات تک کتنی پی جاؤ گے؟"

"کبھی حساب نہیں رکھا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "جب بھی خمار ٹوٹنے لگتا ہے تھوڑی سی پی لیتا ہوں۔"

"زندگی میں کبھی پانی یا جوس وغیرہ بھی پیا ہے یا اس قسم کی چیزوں کا استعمال بالکل چھوڑ دیا؟"

"جب کچھ اور میسر نہ ہو تو مجبوراً پانی یا کولڈ ڈرنک پی لیتا ہوں۔"

میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "ا..... راجو کے بچے! اپنے حال پر رحم کرو۔ اپنے مختصر وجود کو دیکھو اور [illegible] پینے پلانے کی رفتار کو دیکھو۔ کچھ تو خیال کرو۔ پینی ہی ہے تو تھوڑی بہت پی لیا کرو۔ کچھ اپنے جثے کا ہی خیال کرلیا کرو۔"

"اس جثے میں بہت بڑی پیاسی روح مقید ہے۔" وہ ایک طویل سانس لے کر بولا "اندر کی پیاس کسی طرح بجھتی ہی نہیں۔"

"بچّو' جس دن بستر پر گر کر ایڑیاں رگڑو گے اس دن یہ سارے لنگڑے فلسفے بھول جاؤ گے۔" میں نے کہا۔

"اس بارے میں کچھ کہنا فضول ہے کہ کون ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرے گا اور کون پٹ سے گر کر مرجائے گا۔" وہ بدستور بے پروائی سے بولا۔ "میں نے بڑے بڑے پارساؤں کو بڑی تکلیف کے عالم میں جان دیتے دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ ہم جیسے رند خرابات ابھی کھڑے کسی سے بات کررہے تھے اور ابھی جملہ ادھورا چھوڑ کر ٹَیں ہوگئے۔"

"بہت ہی بدمعاش ہو تم۔" میں نے کہا۔ "تم سے بحث فضول ہے لیکن میں کم از کم اس وقت تمہیں کچھ نہیں پلاؤں گا۔ میرا مطلب ہے کوئی خُمار آور چیز نہیں پلاؤں گا۔ میری کوشش ہے کہ میں تمہارے گردوں پھیپھڑوں کو پارہ پارہ کرنے کے عمل میں شریک ہونے سے جتنا بھی بچ سکوں' بچتا رہوں۔"

"تم خواہ مخواہ تشویش میں مبتلا ہوئے جارہے ہو۔ میری صحت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں صحت کی طرف سے اتنا بے پروا نہیں ہوں جتنا نظر آتا ہوں۔"

میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ شاید وہ کسی بھی طرف سے اتنا بے پروا نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں ہر دو ماہ بعد میڈیکل چیک اپ کراتا ہوں۔ تازہ ترین رپورٹ اس وقت بھی میری جیب میں پڑی ہے۔ میرے گردے پھیپھڑے وغیرہ سب کچھ بالکل ٹھیک حالت میں ہیں۔ اس مختصر سے وجود میں بڑی جان ہے' بڑی قوت برداشت ہے۔ یہ شراب وغیرہ ابھی تک اپنا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔"

"مجھے اس پر یقین نہیں۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹروں نے بھی دیکھ لیا ہوگا کہ یہ شخص شراب تو کسی بھی حال میں نہیں چھوڑے گا اس لئے اس کو خوش فہمی میں ہی مبتلا رہ کر مرنے دو۔"

"چلو..... مستند قسم کے لوگوں کی تو دی ہوئی خوش فہمی بھی کافی ہے۔ آج کے دور میں نہ جانے کتنے لوگ ڈاکٹروں کی بخشی ہوئی خوش فہمیوں کے سہارے ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہوں گے اور ان گنت لوگ ایسے ہوں گے جنہیں بھولا کر' دہلا کر یا پھر تختہ مشق بنا کر انہوں نے بستروں پر لٹا رکھا ہوگا۔" راجو مسکراتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم بہرحال اب مجھے اس شربت پند و نصیحت پر ٹرخانے کی کوششیں بند کرو۔ کچھ پلوانا ہے تو پلواؤ ورنہ بوتل میری گاڑی میں بھی موجود ہے۔ کسی ملازم کو بھیج کر منگوا دو۔"

"اس وقت میرا دل نہیں چاہ رہا کہ تم یہاں بیٹھ کر پیو۔ اگر تم نے پینے کی کوشش کی تو میں تمہیں بوتل میں بند کرکے کسی دریا میں پھنکوا دوں گا۔ آنے والے زمانوں میں کوئی بوتل کھولے گا تو تمہیں دیکھ کر حیران ہوگا کہ یہ کس دور کا شرابی کیڑا ہے۔"

"تم تو بہت ہی بے ہودہ آدمی ہو یار!" وہ مصنوعی خفگی سے بولا۔ "چنی میں نے ہے' فیصلے تم اپنے دل کے مسلط کررہے ہو۔ میں تو تمہیں اتنا کمینہ اور تنگ نظر آدمی نہیں سمجھتا تھا ورنہ آج بھی تمہارے پاس آکر تمہارا وقت ضائع نہ کرتا۔"

میں نے سوچا' کہیں وہ سچ مچ ناراض نہ ہوجائے اس لئے ذرا ملائمت سے کہا۔ "دراصل اس وقت میرے ذہن پر کچھ بوجھ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم میرے سامنے بیٹھ کر خرافات شروع کرو۔"

"ذہن پر بوجھ ہے؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ "اسی لئے تو کہہ رہا ہوں' نہ صرف مجھے پینے کی اجازت دو بلکہ تم خود بھی میرے ساتھ بیٹھ کر پیو۔ تمام تفکرات اور سارا ذہنی بوجھ چند منٹ میں ختم ہوجائے گا۔"

"اس قسم کے بے ہودہ مشورے نہیں چاہئیں مجھے۔ میں دیوداس نہیں ہوں۔"

"پھر بتاؤ میں کس طرح تمہارے کام آسکتا ہوں جان جگر؟" وہ سیدھا ہوکر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "میں جس قابل ہوں' حاضر ہوں۔ اگرچہ کیڑا ہوں میں ذرا سا لیکن تمہارے لئے جان دینے کو تیار ہوں۔ اگر یہ ننھی سی جان کسی کام آسکتی ہے تو حاضر ہے۔ تمہارا یہ سیکنڈ ہینڈ قسم کا خادم تمہارے حکم پر آگ میں کودنے کو بھی تیار ہے۔ اپنے لئے تو میں آج تک کچھ نہیں کرسکا' تمہارے لئے شاید کر گزروں۔"

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی خلوص تھا اور لہجے میں بھی۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ ذرا آگے کو جھکتے ہوئے بولا "بات کیا ہے؟ کوئی آدمی صاف کرانا ہے؟ بھئی دیکھو..... میں نے اپنے لئے تو آج تک مکھی بھی نہیں ماری لیکن تمہارے لئے بندہ بھی صاف کردیں گے۔ پستول رکھتا ہوں جیب میں۔" اس نے اندر کی جیب سے ہاتھی دانت کے دستے والا چھوٹے کیلیبر کا ایک چپٹا سا پستول نکال کر مجھے دکھایا' جیسا عموماً تیز و طرار عورتیں پرس میں رکھتی ہیں۔

مجھے ہنسی آگئی۔ اس نے پستول واپس جیب میں رکھ لیا اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "میں بھی کتنا احمق ہوں۔ تم اتنے بڑے آدمی ہو..... اور تھوڑے سے بدمعاش بھی لگتے ہو۔ تمہارے لئے تو یہ معمولی کام ہوں گے لیکن بہرحال..... ہم جس قابل تھے وہ بتانا ہمارا فرض تھا۔ ہم سے تمہارے لئے کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اصل چیز تو جذبہ ہے۔"

"ہاں۔ مجھے بھی صرف جذبوں ہی کی تلاش رہتی ہے۔ کام تو سب کے چلتے ہی رہتے ہیں۔ بڑے سے بڑا کام ہوجاتا ہے۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا اور انٹرکام پر اس کے لئے کولڈ ڈرنک

وغیرہ کا آرڈر دیا۔

کولڈ ڈرنکس آئیں تو وہ بادل نخواستہ ایک گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ "اب تم نے منگا ہی لی ہے تو پینی پڑے گی۔ ویسے یہ اپنے پینے کی چیز نہیں ہے۔" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ رازدارانہ سے لہجے میں بولا "پھر بھی.... کچھ بتاؤ تو سہی کیسا ذہنی بوجھ ہے؟ کوئی کاروباری مسئلہ ہے.... دفتری مسئلہ ہے... عاشقانہ مسئلہ ہے... تاجرانہ مسئلہ ہے.... یا عاجزانہ مسئلہ ہے؟ عاجزانہ مسئلہ میری زبان میں اسے کہتے ہیں کہ انسان کسی کی حرکتوں سے عاجز آجائے۔ اب بتا ہی دو کس قسم کا مسئلہ ہے؟"

"ارے یار! تم نے تو بات ہی پکڑلی۔" میں نے جلدی سے کہا "وہ تو ایسے ہی منہ سے نکل گیا تھا۔ اس قسم کے مسئلے تو روزانہ ہی زندگی میں سر اٹھاتے رہتے ہیں۔ کچھ حل ہو جاتے ہیں، کچھ تحت الشعور کے اسٹور روم میں پڑے رہتے ہیں۔ مسئلہ تو کوئی ایسا خاص نہیں ہے۔ میں تو صرف پینے کی طرف سے ذرا تمہارا دھیان ہٹانا چاہتا تھا اور شکر ہے میں اس میں کامیاب ہو گیا جس کے نتیجے میں تم اس وقت اپنے پسندیدہ مشروب کے بجائے کولڈ ڈرنک پی رہے ہو۔ تم میری فکر چھوڑو.... یہ بتاؤ کہ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟ پینے پلانے کے علاوہ تمہاری کیا مصروفیات ہیں؟"

"بس یار! معززین اور ملازمین صبح صبح اپنے دفتروں کو اور دکانوں کو جاتے ہیں۔ میری بیوی صبح ہی صبح مجھے اصطبل بھیج دیتی ہے۔" وہ آہ بھر کر بولا۔

"شکر کرو وہ تمہیں صرف صبح بھیجتی ہے۔ عین ممکن ہے کوئی اور بیوی ہوتی تو تمہاری حرکتیں دیکھ کر تمہیں اصطبل میں ہی باندھ دیتی۔" میں نے کہا "سنا ہے تم نے دو تین اور کاروبار بھی تو کیے تھے۔ ان کا کس طرح بیڑا غرق کر دیا؟"

"بس یار! ایک تو میں خود ہی شاہکار چیز ہوں.... اوپر سے مجھے ہر کام بیوی کی ہدایات کے مطابق کرنا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کے کاروبار ان کی بیویاں چلاتی ہیں، ان کا بھی اللہ ہی حافظ ہوتا ہے اور ان کے کاروباروں کا بھی۔ اس نے اس وقت مجھے سیکنڈ ہینڈ کاروں کا بزنس کرا دیا جب مجھے کاروں کے بارے میں اس کے سوا کچھ پتا نہیں تھا کہ انہیں چلایا کیسے جاتا ہے۔ میں نے خود کبھی بونٹ اٹھا کر انجن کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ بعض گاڑیوں کے بارے میں تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کا انجن آگے ہوتا ہے یا پیچھے؟ نتیجہ یہ کہ میرے کاروں کے شوروم میں سے رفتہ رفتہ شو بھی ختم ہو گئی اور روم بھی نہ رہا۔ بس کھٹارا گاڑیوں کی قطاریں رہ گئیں جنہیں آخر میں کباڑ خانے والے لوہے کے بھاؤ اٹھا کر لے گئے۔"

"تم جیسے نالائقوں کو اپنی ہر ناکامی کسی نہ کسی کے سر ڈالنے کے لئے بہانہ چاہئے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جو لوگ نااہلوں کو ذمے داریاں سونپتے ہیں ان کو بھی سزا ملنی چاہئے بھئی۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ صرف نااہلوں ہی کی کھنچائی ہوتی رہے۔" وہ پُرزور لہجے میں بولا۔ "اس کے بعد چھچھوندر نے.... میرا مطلب ہے شمیم بیگم نے مجھے پراپرٹی کا کام کرا دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس قسم کے کام تھے جن میں لوگ کم سے کم سرمایہ لگا کر راتوں رات لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی بنتے جارہے تھے۔ لیکن میں کہتا ہوں، کام خواہ کچھ بھی ہو، بندے کو اس کی تھوڑی بہت الف بے کا تو پتا ہونا چاہئے۔"

"پراپرٹی کے کام میں تمہارا کاروں کے کام سے زیادہ بُرا حشر ہوا ہوگا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"بے شک۔" اس نے متانت سے سر ہلایا "جن جائیدادوں کے میں نے سودے کرائے، ان کے مالکان اور خریداروں نے راتوں رات بالا ہی بالا آپس میں معاملات طے کر لئے۔ مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ بعض جائیدادوں کے ہم نے سودے کرائے تو ان کے جھگڑے نکل آئے جن میں ہمیں بھی فریق بنا لیا گیا۔ ملنا ملانا تو کیا تھا، ابھی تک عدالتوں کے سمن آتے رہتے ہیں۔"

"تمہاری داستان غریب حمزہ تو واقعی بہت عبرت ناک ہے۔ تمہاری بیوی تمہیں امیر حمزہ بنانا چاہتی تھی لیکن تم بڑی محنت اور بڑی کوشش سے غریب حمزہ ہی رہے۔" میں نے کولڈ ڈرنک کا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے نظریئے کے مطابق تو تمہاری بیوی کو چاہئے تھا کہ تمہیں کریانے کی دکان کھلوا دیتی جو تمہارا خاندانی کام تھا۔ حالانکہ مجھے یقین ہے، تم اس کاروبار کو بھی عمدگی سے ٹھکانے لگا دیتے۔ کنستروں اور بوریوں میں دال چاول کی جگہ چوہے چھلانگیں لگا رہے ہوتے۔"

"پھر نقصانات لاکھوں میں تو نہ ہوتے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "لیکن میری بیوی اس قسم کی بات تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اب اونچی عورت ہو گئی ہے۔"

"گدھے کہیں کے! شکر کرو، وہ تمہاری بھی اوقات بدلنا چاہتی ہے لیکن تم اس کے لئے بڑے مہنگے شوہر ثابت ہوئے ہو۔" میں نے کہا۔

"بھئی، میں نے تو تمہیں پہلے ہی بتا دیا ہے کہ بادولت کو تو اب زندگی میں عیش کرنے کا موقع ملا ہے تو ضرور کریں گے اور جی بھر کے کریں گے۔" وہ انگڑائی لے کر بے پروائی سے بولا۔

"اگر بیوی نے لات مار کر اپنی زندگی سے نکال پھینکا تو؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی مجھے ہر وقت توقع رہتی ہے اور اس کے لئے میں ہر وقت تیار رہتا ہوں۔" وہ نہایت اطمینان سے بولا "کچھ روپیا میں نے بیوی سے آنکھ بچا کر ایک طرف ڈالا ہوا ہے۔ اس نے لات ماردی تو پہلی بیوی کو اپنے پاس بلا لوں گا۔ بچوں کے سر پر دست شفقت رکھ دوں گا اور کسی مڈل کلاس آبادی میں اچھا سا جنرل اسٹور کھول کر بیٹھ جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے، میری پہلی وفا شعار بیوی میری شکل دیکھتے ہی مجھے معاف کر دے گی۔ بچوں کی ٹیم خوشی سے چھلانگیں لگائے گی کہ انہیں لاہور شہر میں رہنے کا موقع ملے گا۔ اباجی اگر اس وقت تک زندہ ہوئے تو تھوڑی بہت خدمت ان کی بھی کر دیں گے۔ انہوں نے جو مزید جوتیاں وغیرہ رسید کرنی ہوں گی وہ چپ کر کے صبر وشکر سے کھالیں گے۔ یوں زندگی کی کتاب کے آخری باب بھی ہنسی خوشی ختم ہو جائیں گے۔"

"بہت ہی بدمعاش ہو تم۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "بچپن میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بڑے ہو کر تم ایسی خبیث چیز نکلو گے۔ اچھا یہ بتاؤ اب اصطبل کا کیا حال ہے؟"

"یہ تازہ ترین ستم چل رہا ہے مجھ پر۔" وہ بولا۔ "مجھے بھلا کیا پتا تھا، ریس کے گھوڑوں کے کیا کیا چکر ہوتے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ریس کے گھوڑے اور تانگے میں جُتے ہوئے گھوڑے میں صرف صحت کا فرق ہوتا ہے لیکن اب پتا چلا ہے کہ یہ تو بڑا پیچیدہ کاروبار ہے۔ کوئی کروڑ پتی اپنی بیٹی کا رشتہ کسی کو دیتا ہے تو اس کے حسب نسب کی اتنی چھان بین نہیں ہوتی جتنی کسی گھوڑے کو ریس کورس کی شکل دکھانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ ان کی دُم کا بال بھی ہماری عزت سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔"

"تمہاری عزت سے زیادہ اہم ہوگا، مجھے مت اپنے ساتھ شمار کرو۔" میں نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔

"ہاں بھئی... تم تو خود اب زندگی کے ریس کورس میں اعلیٰ حسب نسب کے گھوڑے کی طرح ہو گئے ہو۔ ہر ریس جیتتے جارہے ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "بہرحال اصطبل کو تو میں نے سنبھال لیا تھا لیکن اس پر ویسے ہی بدبختی سایہ فگن ہے۔ ویسے تو اصطبل میں چھ گھوڑے ہیں لیکن درحقیقت اصطبل ایک ہی گھوڑے پر چل رہا ہے جو ہمیں خوب کما کر دے رہا ہے لیکن اب وہ بھی سازشوں کی زد میں ہے۔"

"کیا زمانہ آگیا ہے۔ بے چارے گھوڑوں کے خلاف بھی سازشیں ہوتی ہیں۔"

"کوئی ایسی ویسی سازشیں!" وہ بولا "جس طرح ہر کاروبار، ہر صنعت اپنی جگہ ایک الگ دنیا ہے، اسی طرح یہ بھی ایک الگ اور بڑی وسیع دنیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک عرب پرنس کا ریس کا گھوڑا کیلیفورنیا کے کسی مقام سے اغوا ہو گیا تھا۔ چھ ملین ڈالر تاوان دے کر اسے رہا کرایا گیا ہے۔"

اس نے کولڈ ڈرنک کا ایک گھونٹ بھرا اور ٹھنڈی سانسوں کو اس کی مدد سے مزید ٹھنڈا بناتے ہوئے بولا "کاش میں ریس کا ایک گھوڑا ہی ہوتا!"

"بڑے بڑے لکھ پتیوں کو کنگال کر دیتے تم۔" میں نے کہا۔

"پھر بھی معاشرے میں بڑی عزت ہوتی۔ بیوی کی چخ چخ تو نہ سننا پڑتی کہ میری دولت دونوں ہاتھوں سے برباد کر رہے ہو۔ جن کی دولت برباد ہو رہی ہوتی وہ کم از کم میرے سامنے آکر تو اُف بھی نہ کرتے۔ گھوڑے سے تو انہیں جواب میں دولتی کے سوا کچھ نہیں مل سکتا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ میں نے اس کے خالی گلاس میں مزید کولڈ ڈرنک انڈیلنے کی کوشش کی تو وہ جلدی سے مجھے روکتے ہوئے بولا "اچھا خاصا ٹھنڈا موسم ہے، اس کے باوجود تم دفتر میں اے سی چلائے بیٹھے ہو۔ اوپر سے مجھے بے حساب ٹھنڈا پلانے کی فکر میں ہو۔ تم کیا مجھے یہاں سے نمونے میں مبتلا کر کے بھیجنا چاہتے ہو؟ میں اس قسم کی ٹھنڈی ٹھار چیزوں کا عادی نہیں ہوں۔ تم میں ہی ہوگی اتنی قوت برداشت، مجھے تو بخش دو۔"

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ میں تو اصل میں تمہیں ساتھ لینے آیا تھا۔ تمہیں دکھانے کے لئے ہمارے پاس اور تو کچھ ہے نہیں، میں نے سوچا تھا کہ آج تمہیں اپنا اصطبل ہی دکھانے لے چلوں لیکن اب تم سے کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی۔ تم بھلا میرے ساتھ چل کر اصطبل جیسی بے ہودہ چیز کو دیکھنے میں کہاں وقت ضائع کرو گے۔ اتنی دیر میں تم یہاں بیٹھ کر لاکھوں کا بزنس کر لو گے۔"

"اصطبل دیکھنے سے تو مجھے واقعی دلچسپی نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہارا دل رکھنے کے لئے ساتھ چل سکتا ہوں۔ کہیں تم یہ نہ سوچو کہ کاروبار دوستی کو کھا گیا ہے۔"

"تم میرے اصطبل کا دیدار کر ہی لو تو بہتر ہے۔ یہ بھی نہ جانے کتنے دن کا مہمان ہے۔" وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔ "اگر ہماری آمدنی کا یہ ذریعہ بھی ختم ہو گیا تو ہمیں واقعی بڑا دھچکا لگے گا۔ دو چار اسکیموں میں ہم نے روپیا لگایا ہوا ہے لیکن ان کی آمدنی سے ہم اتنے ٹھاٹ باٹ سے نہیں رہ سکتے۔"

"لیکن تم اس کی طرف سے اتنے مایوس کیوں ہو؟ تمہیں کیوں اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اصطبل ختم ہو جائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے جب ریس کے کاروبار کا مالک ہی اس کے پیچھے لگ گیا ہے تو تباہی و بربادی ہی اس کا مقدر ہوگی۔" وہ اب کافی سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے کہا "ریس کے کاروبار کے مالک کو تو اصطبلوں کا سرپرست ہونا چاہئے۔"

"یہ ذرا تفصیل طلب باتیں ہیں۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "اگر تمہارا واقعی میرے ساتھ چلنے کا موڈ ہے تو اٹھو، میں تمہیں راستے میں صورت حال بتا دوں گا بلکہ تمہیں تیزی سے تھوڑی سی دولت کمانے کا مشورہ بھی دوں گا۔ میں خود ایک ناکام بزنس مین سہی لیکن دوسروں کو دولت کمانے کا راستہ سجھا سکتا ہوں۔ میں اس وقت اس لئے بھی اصطبل جانا چاہتا ہوں کہ آج شمیم کے بھی وہاں پہنچنے کا امکان ہے۔ کبھی کبھی وہ اچانک چیک کرنے آجاتی ہے کہ میں اصطبل پہنچا ہوں یا نہیں؟ اپنی دانست میں تو وہ اچانک ہی چھاپہ مارتی ہے لیکن مجھے بھی اندازہ ہو گیا ہے کہ اس کے یہ "اچانک"

دورے کب متوقع ہوتے ہیں۔ اب دوسرے موقعوں پر تو میں چاہے غائب رہوں لیکن ان موقعوں پر موجود رہتا ہوں۔ وہ چاہے جتنی چالاک ہو لیکن آخر میں اس کا شوہر ہوں۔" وہ فاتحانہ انداز میں مسکرایا۔

میں نے اٹھنے سے پہلے کیتھرین اور جنرل منیجر کو چند ملاقاتوں اور ضروری کاموں کے بارے میں کچھ ہدایات دیں پھر راجو کے ساتھ چل دیا۔ نیچے آکر میں نے کہا۔ "میں تمہاری ہی گاڑی میں چلوں گا۔"

"بڑی خوشی کی بات ہے جان جگر کہ تم نے میری گاڑی کو اس قابل سمجھا۔" وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے بولا۔ "آج کھانا شانا بھی اکٹھے ہی کھائیں گے پھر میں تمہیں چھوڑ جاؤں گا۔"

گاڑی مین روڈ پر لانے کے بعد وہ بولا "اللہ میری بیوی کے مرحوم شوہر کو جنت میں جگہ دے۔ میں اسے بڑی دعائیں دیتا ہوں۔ بے چارہ میرے لئے شیم جیسی خوبصورت بیوی اور عیش کرنے کے لئے خاصی دولت چھوڑ گیا جس کا کافی حصہ میں نے بہ حسن و خوبی ٹھکانے بھی لگادیا ورنہ میں تو شاید اس وقت کسی کم ظرف نودولتیے کے پاس ڈرائیوری کررہا ہوتا۔"

"تمہارا مطلب ہے، میرے جیسے کسی آدمی کے پاس؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اس نے نفی میں سرہلایا "تم نودولتیے ضرور ہو لیکن کم ظرف نہیں ہو۔ تمہاری عادات و اطوار معلوم نہیں کیوں خاندانی دولت مندوں والی لگتی ہیں۔ بلکہ اب تو خیر خاندانی دولت مند بھی نودولتیوں سے زیادہ چیپ ہوتے جارہے ہیں۔ دوسرے مجھے تمہارا اسٹینڈرڈ بہت اونچا لگتا ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ تم جیسے آدمی کے پاس تو مجھے ڈرائیوری بھی نہیں ملنی تھی۔ میں نے تو کسی چھوٹے موٹے آسودہ حال آدمی کے پاس ہی کھپ جانا تھا۔"

"اچھا یہ مسکا پالش چھوڑو۔ تم اصطبل کے بارے میں کچھ بتانے لگے تھے۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ اصطبل کے ذکر کے ساتھ ہی تو مجھے شیم کا مرحوم شوہر یاد آتا ہے۔ اصطبل اس کے چھوڑے ہوئے اثاثوں میں سے ایک ہے۔" راجو بولا۔ "یہ اس کی زندگی میں بھی ٹھیک ٹھاک ہی چل رہا تھا۔ تین چار اوسط درجے کے گھوڑے موجود تھے۔ کبھی ان میں سے کوئی گھوڑا کوئی ریس جیت جاتا تھا، کوئی ہار جاتا تھا۔ یونہی سلسلہ چل رہا تھا۔ کوئی خاص شور شرابا نہیں تھا۔ ہمارے ملک کی بعض بہت بڑی اور نامی گرامی شخصیات کے ریس کے گھوڑے دیگر ممالک میں نہایت شاندار فارموں پر پلتے ہیں۔ بعض کے اپنے بریڈنگ فارم بھی ہیں۔ یہ کروڑوں کا کاروبار ہے لیکن ہے ذرا پیچیدہ قسم کا۔ اس میں بڑا مقابلہ ہے، بڑے چکر ہیں۔ ان نامی گرامی شخصیتوں کے گھوڑے دوسرے ملکوں کے ریس ٹریکس میں بھی دوڑتے ہیں اور ملکی ٹریکس پر راج کرنے والے گھوڑے بھی عموماً انہی کے ہوتے ہیں۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے اپنے اصطبل کے بارے میں بتاؤ۔"

"وہی بتانے لگا ہوں۔" وہ اپنی کہنی کھڑکی میں ٹکاتے ہوئے بولا "جس طرح کبھی کسی غریب، نالائق اور نہایت معمولی شکل و صورت کے آدمی کے ہاں بہت خوبصورت، ہونہار اور غیر معمولی بچہ پیدا ہوجاتا ہے، اسی طرح سال ڈیڑھ سال پہلے ہمارے ایک گھوڑے "داڑکلر" نے ریس ٹریک پر قدم رکھا اور تباہیاں مچادیں۔ وہ واقعی کِلر ثابت ہوا۔"

"بہت زیادہ جیتنے لگا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت زیادہ.....؟ ارے بھئی وہ تو کبھی ہارا ہی نہیں۔ وہ تو شاید دنیا کے سارے ریکارڈ توڑنے پر تُلا ہوا ہے۔" راجو بولا۔ "حالانکہ اس کا "حسب نسب" زیادہ اونچا نہیں ہے لیکن ریس کورس میں دوڑنے کے لئے وہ بہرحال کوالیفائی کرتا ہے۔ جب وہ جوان ہوا تو ہم نے اس کی ٹریننگ مکمل ہونے کے بعد ڈرتے ڈرتے اسے ریس کورس میں پہلی انٹری دلائی تھی لیکن اس نے تو پہلی ریس میں ہی کمال کردیا۔ ایسا لگتا ہے اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔"

"تو اسے گھوڑوں کے کسی ماہر نفسیات کو دکھاؤ جو اس کی تحلیل نفسی کرکے بتائے کہ اس کے لاشعور کے اندھیروں میں کس کمپلیکس کی ٹاپیں سنائی دیتی ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "گھوڑوں کے بھی ماہر نفسیات تو ہوتے ہوں گے؟"

"ان کے ٹرینر اور ڈاکٹر ہی ان کے ماہر نفسیات بھی ہوتے ہیں۔" راجو بولا۔ "ویسے میں مذاق نہیں کررہا، سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ اس گھوڑے کی نفسیات میں کوئی گڑبڑ ہے ضرور لیکن وہ مثبت قسم کی ہے۔ یعنی وہ کسی کو اپنے سے آگے نکلتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ بہت طوفانی قسم کا اسٹارٹ نہیں لیتا۔ اکیلا دوڑنے میں بھی کوئی ایسی قیامت کی چیز نہیں ہے لیکن جونہی وہ کسی دوسرے گھوڑے کو اپنے سے آگے نکلتے دیکھتا ہے تو پاگل ہوجاتا ہے اور اس سے آگے نکلنے کے لئے جان لڑا دیتا ہے۔ اس کے منہ سے جھاگ بہنے لگتا ہے۔ عجیب ہی حالت ہوجاتی ہے اس کی۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ کیا تمہیں ریس جیتنے والے گھوڑے اچھے نہیں لگتے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"مجھے تو اچھے لگتے ہیں، اسے اچھے نہیں لگتے جس کی جیب سے دولت جاتی ہے۔" راجو نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟"

"ہمارے ہاں ریس کے کاروبار میں تین بڑے فریق ہیں۔" راجو بولا۔ وہ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ وھیل سنبھالے، ایک بازو کھڑکی میں ٹکائے خاصی مشاقی سے ڈرائیونگ کررہا تھا۔ "ایک تو ریس کورس کا مالک، یعنی جو صرف زمین اور اس پر موجود تعمیرات وغیرہ کا مالک ہے۔ اس کا تعلق ہمارے ہاں کے مشہور ترین صنعتکار خاندانوں میں ایک سے ہے۔ دوسرا فریق وہ ہے جو ریس کے نظام کو چلا رہا ہے اور جس کے ہاتھ میں تمام مالی معاملات ہیں۔ کاروبار زیادہ منافع میں جارہا ہو تو اس کی تجوریاں راتوں رات بھر جاتی ہیں۔ تیسرا فریق یا تیسرا عنصر وہ ہے جس کے گھوڑے ریس کورس میں دوڑتے ہیں۔ ظاہر ہے یہ کوئی فرد واحد نہیں ہے۔ مختلف ادوار میں مختلف لوگوں کے گھوڑے دوڑتے رہتے ہیں۔ نئے مالکان بھی آتے رہتے ہیں، نئے گھوڑے بھی آتے رہتے ہیں۔ بہرحال کاروبار میں تین بڑے فریق یہی ہیں۔ ان کی دوسری بہت سی چھوٹی چھوٹی شاخیں ہیں جن کا ذکر ضروری نہیں ہے۔"

"میں سمجھ گیا۔" میں نے کسی ہونہار شاگرد کی طرح کہا۔

"وہ جو درمیانی فریق ہے، جس کا مالی معاملات پر کنٹرول ہے اور جس کا روپیا گردش میں رہتا ہے، وہی تقریباً مالک و مختار نظر آتا ہے۔ اس کا نام بھی مختار ہے۔ مختار رفیق۔ کروڑپتی آدمی ہے۔ شہر میں دوچار سنیما، دو تین نچلے درجے کے ہوٹل، ایک آدھ بس سروس، اسی قسم کے کاروبار ہیں اس کے۔ یہ تقریباً سبھی کاروبار ایسے ہیں جنہیں چلانا کسی مرنجاں مرنج اور بہت زیادہ شریف آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس کا تھوڑا بہت بدمعاش ہونا ہی اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ مختار رفیق تھوڑا بہت نہیں بلکہ بہت ہی بڑا بدمعاش ہے۔"

"یہ نام تو کچھ سنا ہوا سا لگ رہا ہے۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"ضرور سنا ہوگا۔ کاروباری حلقوں میں کبھی کبھار اس کا ذکر نکل آتا ہے لیکن عام طور پر اس کا ذکر کاروبار کی وجہ سے کم اور اس کی بدمعاشیوں کی وجہ سے زیادہ ہوتا ہے۔ کم از کم پندرہ بیس کیس تو اس پر ہر وقت چلتے رہتے ہیں لیکن میری معلومات کے مطابق اس نے شاید ہی کبھی عدالت کی شکل دیکھی ہو۔ ہماری سوسائٹی میں اس میدان کے بڑے بڑے اساتذہ کرام پائے جاتے ہیں جنہیں بہت زیادہ تجربہ ہوتا ہے کہ بڑے سے بڑا جرم کرکے بھی قانون کی گرفت اور سزا سے ہمیشہ کس طرح بچ کر رہا جاسکتا ہے۔ مختار رفیق انہی اساتذہ میں سے ایک ہے۔ بڑی کُتی شے ہے۔" راجو نے غصے کے مارے کھڑکی سے باہر تھوک دیا۔

ایک موٹرسائیکل سوار اس کے تھوک کی زد میں آتے آتے بچا۔ راجو جلدی سے کھڑکی سے سر نکالتے ہوئے چلّایا۔ "معاف کرنا بھائی صاحب! میں ذرا جذباتی ہوگیا تھا۔"

میں نے مڑ کر دیکھا، موٹرسائیکل سوار کے چہرے پر جو برہمی نمودار ہوئی تھی، وہ دور ہوگئی۔ کچھ آگے نکل آنے کے بعد راجو بولا۔ "ہاں، تو میں یہ بتانے لگا تھا کہ گھوڑے ریس میں جتنا زیادہ جیتتے رہیں، گھوڑوں کے مالکان کا اتنا ہی فائدہ ہے کیونکہ ہر گھوڑے پر لگنے والی شرطوں میں سے مالکان کی پرسنٹیج نکالی جاتی ہے۔ ظاہر ہے جن گھوڑوں کا جیتنے کا اوسط اچھا ہوتا ہے، جن کا ریکارڈ اچھا ہوتا ہے یا جن کے جیتنے کے امکانات زیادہ نظر آرہے ہوتے ہیں، انہی پر زیادہ شرطیں لگتی ہیں۔ اسی لئے گھوڑوں کے مالکان زیادہ سے زیادہ اچھی نسلوں کے اور بہترین گھوڑے میدان میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گھوڑوں کی بریڈنگ میں مقابلے بازی کی بنیاد یہی ہوتی ہے۔ اس سے تم اندازہ کرسکتے ہو کہ ایک اچھا گھوڑا اپنے مالک کے لئے کتنا قیمتی اثاثہ ہوتا ہے۔"

"بے شک۔" میں نے سرہلایا۔ "یعنی اس وقت "داڑکلر" تمہارے لئے ایک قیمتی اثاثہ ہے؟"

"سب سے قیمتی اثاثہ اور سب سے بڑا ذریعۂ آمدنی۔" راجو بولا۔ "جن اسکیموں میں ہمارا روپیا لگا ہوا ہے ان سب کی مجموعی آمدنی اتنی نہیں ہے جتنی اس وقت ہمیں "داڑکلر" سے ہے۔"

"یہ بات مختار رفیق کو پسند نہیں ہوگی؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔ اب مسئلے کی نوعیت کی طرف تمہارا ذہن چلا گیا ہے۔" راجو بولا "اسی خوشی میں میں ذرا دو گھونٹ حلق سے اتارلوں، ہونٹ گیلے کرلوں۔"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے نہایت مہارت و مشاقی سے ایک ہی ہاتھ سے ڈیش بورڈ کے خانے سے چھوٹی سی چپٹی بوتل نکالی، اسی ہاتھ سے ڈھکنا کھولا اور چھوٹے چھوٹے دو گھونٹ لے کر اسٹیئرنگ وھیل پر صرف ہتھیلی کا ذرا سا حصہ ٹکاتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے ڈھکنا بند کیا اور بوتل واپس خانے میں رکھ دی۔

میں نے دائیں بائیں دیکھا کہ گزرتی ہوئی کسی گاڑی والے نے راجو کی یہ حرکت دیکھی تو نہیں؟ لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ راجو میری گردن گھومتے دیکھ کر بولا۔ "تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس خاکسار کی تو یہ آئے دن کی مصروفیت ہے۔ بڑا تجربہ ہے مجھے چلتی گاڑی میں پینے کا۔ ویسے بھی تم نے شاید توجہ نہیں دی۔ میں نے وھسکی دوا کی بوتل میں ڈالی ہوئی ہے۔ بے چارہ مریض اس وقت اپنی خوراک لے رہا تھا۔"

"اللہ تمہیں اس مرض سے شفا دے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "گھوڑوں کا ریس میں کبھی جیتتے رہنا، کبھی ہارتے رہنا تو مختار رفیق جیسے لوگوں کو گراں نہیں گزرتا کیونکہ اس توازن میں بھی ان کی تجوریوں میں روپیا آتا رہتا ہے لیکن "داڑکلر" جیسا ایک بھی گھوڑا میدان میں آجائے اور اچھے خاصے طویل عرصے تک وہ اسی پوزیشن پر جما رہے تو اس جیسی فطرت کے آدمی کو مرگی کے دورے بھی پڑسکتے ہیں کیونکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کے منافع میں مسلسل کمی ہورہی ہے۔ بلکہ "داڑکلر" تو وہ گھوڑا ہے جس نے ریس کورس کی معیشت کو تہ و بالا کرکے رکھ دیا ہے۔ کچھ عرصے تک تو گھوڑے کے مسلسل جیتنے کو بھی برداشت کرلیا جاتا ہے کیونکہ اس سے ریس کورس کی اور اس دھندے کی ساکھ بنی رہتی ہے۔ زیادہ لوگ اس طرف آنے شروع ہوجاتے ہیں۔"

”لیکن زیادہ عرصے تک گھوڑے کے اس پوزیشن پر جمے رہنے سے تو کاروبار کے مالک کی اپنی جیب سے بھی رقم جانی شروع ہو سکتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”وہی تو ہونے لگا ہے۔ مالک کے تو منافع میں بھی مسلسل کمی ہوتی رہے تو وہ اسے پلّے سے ہی رقم جانے کے مترادف سمجھتا ہے جبکہ مختار رفیق کے تو کافی دنوں سے پلّے سے جانے کی نوبت واقعی آئی ہوئی ہے۔“ راجو بولا۔ ”اس کے اکاؤنٹس کے شعبے کے لوگ ہر ماہ بیلنس شیٹس تیار کرتے ہیں۔ کئی ماہ سے یہ ہو رہا ہے کہ بیلنس شیٹس کی فائل اس کے سامنے جاتی ہے تو وہ بال نوچنے لگتا ہے۔“

”تم اس کے سامنے جاؤ تو وہ یقیناً اپنے بجائے تمہارے بال نوچنے کی کوشش کرے گا۔“ میں نے کہا۔

”میرے بال نہیں‘ میری تو وہ کھال نوچنے کی فکر میں ہے۔“ راجو بولا۔ ”صورتحال بہت عجیب ہو گئی ہے۔ ایک گھوڑے نے انسانوں کو مصیبت ڈالی ہوئی ہے۔ کافی عرصے سے یہ عالم ہو گیا ہے کہ نوے فیصد شرطیں صرف ”ڈاکلر“ پر لگ رہی ہیں۔ جیتنے والوں کو ادائیگی کا تناسب چاہے کتنا ہی کم کر دیا جائے‘ بہرحال لاکھوں روپیا جیب سے جا رہا ہے۔ اسی لئے تو میں تمہیں بھی مشورہ دینا چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ ہمارے چار ٹانگوں والے بے ضرر ڈکلر کو دو ٹانگوں والا کوئی شیطان صفت کلر کوئی نقصان پہنچا دے‘ تم بھی جلدی جلدی اپنے آدمیوں سے اس پر چند لاکھ روپے لگا کر کئی گنا زیادہ رقم کما لو۔ بیٹھے بٹھائے بغیر کسی محنت کے لاکھوں روپیا ہاتھ آ جائے تو کیا برا ہے۔ گھوڑے کا مالک خود تمہیں ٹپ دے رہا ہے۔“

”مجھے دولت حاصل کرنے کے لئے اب کسی شارٹ کٹ کی تلاش نہیں رہی۔“ میں نے بے نیازی سے کہا۔ ”ورنہ تم یہ مشورہ دینے سے پہلے ہی مجھے ریس کورس میں دیکھ چکے ہوتے۔ دنیا کے تمام قمار خانے اس طرح کے خواہش مندوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن سب کے خواب پورے نہیں ہوتے۔“

”میں ان سب جھکّوں کی بات نہیں کر رہا‘ میں تو سو فیصد یقینی چیز کے بارے میں بات کر رہا ہوں‘ بہتی گنگا کے بارے میں بات کر رہا ہوں جس میں سب ہاتھ دھو رہے ہیں۔“ راجو بولا۔ ”ویسے اب یہ ذکر آ ہی گیا ہے تو میں تمہیں ایک بات اور بتاتا چلوں۔ ریس کورس یا کسی قمار خانے میں اور دنیا کے بڑے بڑے کیسینوز میں سب لوگ صرف جیتنے ہی کے لئے نہیں جاتے۔ سب کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہارنے کے زیادہ امکانات ہیں۔ وہ صرف تفریح کے لئے وہاں جاتے ہیں‘ ہار جیت کی ہیجان خیزی سے لطف اندوز ہونے کے لئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ اتنے دولت مند ہوتے ہیں کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا‘ وہ اپنی دولت کہاں خرچ کریں۔ کسی ضرورت مند کی مدد کے لئے تو شاید انہیں سو روپے یا دوسرے دو ٔالگ والوں کو سو ڈالر وغیرہ نکال کر دینا گوارا نہ ہو لیکن قمار خانوں میں وہ ایک رات میں ہزاروں روپے یا ہزاروں ڈالر پھینک کر چلے آتے ہیں کیونکہ اس کام میں بڑی لذّت ہے۔“

”انہیں اس کام میں اس لئے زیادہ لذت محسوس ہوتی ہے کہ وہ کسی ضرورت مند کی مدد کرنے کی لذّت سے واقف ہی نہیں ہیں۔“ میں نے کہا۔

”خیر۔ اب تم مجھے اخلاقیات پر لیکچر مت دینا۔“ وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں تو تمہیں گناہ گاروں کی دنیا کی باتیں بتا رہا تھا۔ مختار رفیق کبھی انکم ٹیکس والوں سے‘ ایکسائز والوں سے‘ حتیٰ کہ اپنے دھندے میں غبن کر کے بھاگ جانے والے کسی کارندے سے بھی کبھی اتنا خفا نہیں ہوا جتنا وہ آج کل مجھ سے اور ہمارے گھوڑے سے ہے۔“

”اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے؟ وہ اپنے ریس کورس میں ڈاکلر کی انٹری بین کیوں نہیں کر دیتا؟ اس کے داخلے پر پابندی کیوں نہیں لگا دیتا؟“

”وہ ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ ہم تمام ملکی اور بین الاقوامی ریس ٹریک کے قوانین اور شرائط پوری کرتے ہیں۔ ڈاکلر اس وقت تک اپنا جو مقام بنا چکا ہے‘ اس مرحلے پر اس قسم کی کوئی پابندی ریس کورس کی شہرت اور ساکھ کا بیڑا غرق کر دے گی۔ مختار رفیق پھنس کر رہ گیا ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا کہ کبھی اس قسم کا کوئی گھوڑا بھی سامنے آ سکتا ہے۔ اس کی زندگی کا ایک بہت بڑا حصہ گھوڑوں اور ان کے مالکوں کے درمیان گزرا ہے۔ اس کے خیال میں کسی گھوڑے کا مسلسل اتنے عرصے تک صرف جیتتے رہنا ممکن ہی نہیں تھا۔ اب وہ اپنی آنکھوں سے ناممکن کو ممکن ہوتے دیکھ رہا ہے۔“

”تو اب تمہاری کیوں روح فنا ہو رہی ہے؟ کیا اس نے تمہیں کوئی دھمکی دی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں کس شمار قطار میں ہوں۔ مجھ جیسے بیچارے مسکین آدمی کی تو بغیر کسی وجہ کے بھی اس جیسے آدمی سے روح فنا ہونی چاہئے جبکہ یہاں تو اتنی بڑی وجہ موجود ہے۔“ وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے تو میرے آفس میں تم بڑے پھنّے خاں بن رہے تھے‘ مجھے مدد کی پیشکش کر رہے تھے‘ ننھا سا پستول بھی نکال کر دکھا رہے تھے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”میں نے پہلے ہی کہا تھا ”گرچہ کیڑا ہوں میں ذرا سا......“ انسان جس قابل بھی ہو اسے جگری یار کی مدد کے لئے کمربستہ تو رہنا چاہئے‘ خواہ جگری یار کو اس کی مدد کی ضرورت نہ ہو۔ اپنے جذبے کا اظہار کرنا میرا اخلاقی فرض تھا۔ تمہارے لئے اس کی کوئی اہمیت ہو یا نہ ہو‘ بہرحال اپنی جان حاضر ہے۔“ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”اور اس جان کی مختار رفیق کے سامنے بھی کوئی اہمیت نہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔“ وہ مایوسی سے بولا ”اس کی نظر میں میری بت تو شاید اس کینچوے جتنی بھی نہ ہو جو کسی بھی وقت کسی گھوڑے کے سُم تلے آ کر کچلا جا سکتا ہے۔ وہ خود بہت بڑا بدمعاش ہے اور کئی خطرناک قسم کے بدمعاش اس کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ اس نے مجھے کوئی دھمکی نہیں دی‘ اسے مجھ کو دھمکی دینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ مجھے مروا کر اسے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ گھوڑا تو پھر بھی ریس میں دوڑتا رہے گا۔“

”یعنی اصلی خطرہ بے چارے ڈکلر کو ہے؟“

”ہاں۔ اس کی حفاظت کے لئے ہمیں نہ جانے کیا کیا انتظامات کرنے پڑتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی حفاظت کرتے کرتے میں بھی مارا جاؤں۔ بہرحال اصل ہدف وہی ہے۔“ راجو بولا۔ ”اس کے لئے ہم نے تین چار گارڈز رکھے ہوئے ہیں۔ سائیس اور ٹرینر وغیرہ سے لے کر اصطبل میں صفائی کرنے والے جمعدار تک کا انتخاب دیکھ بھال کر کرنا پڑتا ہے کہ وہ بھروسے کا آدمی ہو اس کا ریکارڈ اچھا ہو۔ ہمارے پاس تو خیر سب پرانے اور بھروسے کے آدمی ہیں۔ شمیم کے پہلے‘ مرحوم شوہر کے زمانے سے ہی چلے آ رہے ہیں لیکن پھر بھی ان پر نظر رکھنی پڑتی ہے۔ آدمی کو بکتے اور اس کی نیت بدلتے کیا دیر لگتی ہے۔ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی نظر بچا کر گھوڑے کو کچھ کھلا نہ دے‘ اسے کوئی انجکشن وغیرہ نہ لگا دے۔ دوسرے گھوڑوں کے معاملے میں یہ ہوتا ہے کہ ریس کورس والوں کو دھڑکا لگا رہتا ہے کہ مالکان انہیں جتوانے کے لئے کہیں کوئی انجکشن وغیرہ لگوا کر نہ لے آئیں۔ اسی لئے گھوڑوں کو ریس سے کئی گھنٹے پہلے ریس کورس کے اپنے اصطبل میں پہنچانا پڑتا ہے‘ جہاں وہ ریس کورس اور مالکان دونوں کے نمائندوں کی نظر میں رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی حفاظت کے لئے غیر جانبدار مسلح محافظ بھی ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر گھوڑوں کا معائنہ بھی کرتے ہیں کہ انہیں کوئی انجکشن وغیرہ تو نہیں دیا گیا اور ریس میں چونکہ کئی گھنٹے باقی ہوتے ہیں اس لئے یہی سمجھا جاتا ہے کہ اگر کوئی انجکشن وغیرہ دیا بھی گیا ہو گا تو اتنی دیر میں دوا کا اثر ختم ہو جائے گا اور اس کا اُلٹا اثر شروع ہو جائے گا یعنی گھوڑا مزید سُست ہو جائے گا۔“

اس وقت تک ہم بند روڈ پر پہنچ چکے تھے اور راجو نے گاڑی ایک پگڈنڈی نما نیم پختہ سڑک پر موڑلی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”لیکن ہمارا اُلٹا مسئلہ ہے۔ ہمیں اور ہمارے آدمیوں کو اب نظر رکھنا پڑتی ہے کہ ریس کورس کے اصطبل میں کوئی ہمارے گھوڑے کو سُست کرنے والی یا کسی اور طرح کا ضرر پہنچانے والی دوا کا انجکشن نہ لگا دے۔ ایک بار تو میں نے ایک جاکی کو ایک سرنج کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا بھی تھا لیکن اس کے خلاف تحقیقات آگے نہیں بڑھ سکی۔ صرف اسے بلیک لسٹ کر دیا گیا۔“

لکڑی کے ایک گیٹ کے سامنے پہنچ کر گاڑی رک گئی۔ اس کے عقب میں ایک تنومند‘ سُرخ و سپید نوجوان شلوار قمیص‘ واسکٹ اور کلاہ میں مستعد کھڑا تھا۔ کندھے پر رائفل تھی۔ گاڑی دیکھ کر اس نے گیٹ کا تالا کھول دیا تھا۔ گاڑی طویل و عریض احاطے میں داخل ہوئی۔ سامنے‘ بہت دور چند صاف ستھرے سے ایک جیسے کمرے نظر آ رہے تھے جن میں دروازوں کی جگہ جنگلے لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے تین میں گھوڑے دکھائی دے رہے تھے۔

احاطے میں بھی دو مسلح آدمی موجود تھے۔ دو تین دوسرے آدمی بھی ادھر ادھر مختلف کاموں میں مصروف تھے۔ دو گھوڑے احاطے میں سُست رفتاری سے دوڑ رہے تھے۔ ایک گھوڑے پر چست ٹریک سوٹ اور پی کیپ میں بوڑھا سا ایک دُبلا پتلا شخص سوار تھا۔ اس کے ہاتھ میں چابک تھا۔ دوسرا گھوڑا بغیر زین وغیرہ کے ہی اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔

ہمیں گاڑی سے اترتے دیکھ کر گھڑ سوار ہمارے قریب آ گیا۔ اس عمر میں وہ جس مشاقی و مستعدی سے گھوڑے سے اترا‘ وہ قابل داد تھی۔ وہ ادب سے سلام کر کے کھڑا ہو گیا۔ باقی لوگوں نے بھی دور سے سلام کیا اور اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہے۔

”کیا حال ہے نور محمد؟“ راجو نے معمر شخص کا کندھا تھپک کر پوچھا۔

”ٹھیک ہوں جی۔ کرم ہے اوپر والے کا۔“ وہ آہستہ آہستہ چابک اپنی ٹانگ پر مارتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا۔

”کسی گڑبڑ کے آثار تو نظر نہیں آئے؟“ راجو نے دریافت کیا۔

”نہیں جی۔ اللہ کا شکر ہے‘ ابھی تو امن امان ہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

راجو نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھے بتایا ”یہ ہمارے ٹرینر ہیں‘ نور محمد صاحب۔ بڑے پرانے اور منجھے ہوئے آدمی ہیں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ بڑی بڑی شاندار ملازمتیں چھوڑ کر ابھی تک ہمارے پاس ٹکے ہوئے ہیں اور اس اصطبل کو اپنا گھر سمجھ کر اس کی حفاظت کرتے ہیں۔ بیوی بچہ کوئی نہیں ہے‘ ان گھوڑوں ہی کو اپنے بچے سمجھتے ہیں اور سچ مچ اولاد کی طرح پیار کرتے ہیں۔“

عمر رسیدہ شخص بچوں کی طرح تھوڑا سا شرما رہا تھا۔ اس کے رخساروں پر ہلکی سی سُرخی آ گئی۔ اس سے ہاتھ ملانے کے بعد میری نظر اس سے ہٹی تو اس گھوڑے پر جم کر رہ گئی جس سے وہ اترا تھا۔ میں نے زندگی میں بہت سے شاندار گھوڑے دیکھے تھے‘ خصوصاً غیر ملکی دوروں میں مجھے بڑے بڑے نفیس گھوڑوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن جو گھوڑا اس وقت میرے سامنے کھڑا تھا‘ وہ واقعی دستِ قدرت کی صنّاعی کا ایک شاہکار تھا۔

سب سے پہلے تو اس کا رنگ ہی انوکھا اور حیران کن تھا۔ وہ بینگنی سا رنگ تھا جس میں شبِ دیجور کی سیاہی کی بھی آمیزش تھی اور اس کی جلد میں مخمل کی سی چمک تھی۔ وہ میرے عین مقابل سر اٹھائے ساکت کھڑا تھا‘ صرف اس کے نتھنے دھیرے دھیرے

پھول چمک رہے تھے۔ اس کا کھڑے ہونے کا انداز بھی مجھے نہایت عجیب اور غیر معمولی لگا۔ کہنے کو وہ ایک چوپایا، ایک بے زبان جانور تھا مگر عجیب شان اور نخوت تھی اس کے انداز میں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک ذی شعور کی سی تمکنت دانہ چمک تھی۔ اسے گویا خود بھی اپنی برتری، اپنے غیر معمولی پن کا احساس تھا۔

میرا جو بھی تھوڑا بہت مشاہدہ تھا اس کے مطابق تو عموماً ریس کے گھوڑے ہلکے بدن کے ہوتے تھے۔ ان کے رگ پٹھے، ہڈیاں اور جوڑ عام گھوڑوں کے مقابلے میں بہت زیادہ مضبوط ہوتے تھے مگر وزن کم ہوتا تھا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ رفتار سے دوڑ سکیں اور ان کا اپنا ہی وزن ان کے لئے رکاوٹ نہ بنے۔ مسلسل دوڑ میں رہنے کی وجہ سے ان کا فاضل گوشت اور چربی گھلتی رہتی تھی لیکن میرے سامنے جو گھوڑا کھڑا تھا وہ کافی جسیم تھا۔ خاصا بھاری بھرکم مگر سانچے میں ڈھلا ہوا جسم تھا۔ دنیا کا بڑے سے بڑا سنگتراش ایسا خوبصورت مجسمہ نہیں تراش سکتا تھا۔

راجو میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔ "میرا خیال ہے اب "دا کِلر" کو تم سے متعارف کرانے کی ضرورت نہیں رہی۔ تم نے اسے پہچان لیا ہے۔"

"جو کچھ تم اس کے بارے میں بتا چکے ہو اس کے بعد اسے پہچاننا مشکل نہیں تھا۔" میں نے کہا۔ "ویسے مجھے امکان محسوس ہو رہا ہے کہ اگر تم مجھ سے اس کا تعارف کراؤ تو یہ مصافحے کے لئے اپنا کھر بھی آگے بڑھا دے گا۔ اس کی آنکھوں میں انسانی ذہانت کی چمک ہے۔"

"آہستہ بولو یار!" راجو میرا ہاتھ دباتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "اسے خوامخواہ یہ احساس مت دلاؤ کہ اس میں کوئی انسانی خصوصیت موجود ہے۔ خواہ مخواہ زعم میں مبتلا ہو جائے گا، غلط سلط راستوں پر چل نکلے گا اور کسی کام کا نہیں رہے گا۔ اسے گھوڑا ہی رہنے دو، انسان بنانے کی کوشش مت کرو۔"

پھر وہ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کوٹھریوں کے قریب لے گیا جن میں گھوڑے بند تھے۔ ایک گھوڑا سُست سے انداز میں کچی زمین پر بیٹھا تھا۔ اس کی پسلیاں نکلی ہوئی تھیں۔ ایک لڑکا کوٹھریوں کے پاس کھڑا تھا۔ وہ نیکر اور بنیان میں تھا، ذرا باڈی بلڈر ٹائپ تھا مگر جسم پر ابھی گوشت کی خاصی کمی تھی۔

"گھوڑوں کو ایکسرسائز کرائی تھی آج؟" راجو نے اس سے پوچھا۔

"جی۔۔۔۔ سرجی!" نوجوان مستعدی سے بولا۔ "کِلر تو صبح سے استاد جی کے ساتھ ہی ہے۔ باقی گھوڑوں کو میں نے ایکسرسائز کرادی تھی۔ بلیو مون آج بھی سُست ہے۔" اس نے کوٹھری میں بیٹھے ہوئے گھوڑے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کتھئی رنگ کا ایک عام سا گھوڑا نظر آرہا تھا۔ پسلیاں نکلی ہونے کی وجہ سے اس کی حالت کچھ اور بھی قابل رحم دکھائی دے رہی تھی۔

راجو اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "تم سوچ رہے ہوگے کہ اس اصطبل میں اس گھوڑے کا کیا کام۔ اسے تو کسی تانگے میں جتا ہونا چاہئے تھا۔"

"ہاں، لیکن اس کا ماضی یقیناً شاندار رہا ہوگا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"کِلر جیسا شاندار تو نہیں لیکن بہرحال کبھی اس کا شمار بھی ٹریک کے بہت اچھے گھوڑوں میں تھا۔" راجو بولا۔ "اور تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ کِلر کا سگا بھائی ہے۔ شجرۂ نسب کے مطابق دونوں کی رگوں میں ایک ہی گھوڑے اور ایک ہی گھوڑی کا خون دوڑ رہا ہے۔ یہ کِلر سے صرف تین سال بڑا ہے لیکن دونوں میں زمین آسمان کا فرق آگیا ہے۔"

"یہ بیمار ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" راجو نے جواب دیا۔ "جب کِلر کو ٹریک کے لئے تیار کیا جا رہا تھا، اس زمانے میں بلیو مون ٹریک پر دوڑ رہا تھا اور اس کی کارکردگی خاصی بہتر تھی لیکن پھر ایک ریس میں یہ گر پڑا، اس کی کندھے کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ آپریشن ہوا۔ ہڈی تو جڑ گئی لیکن ظاہر ہے ٹریک کے لئے یہ اَن فِٹ ہوگیا۔ تب سے اسے گویا غم لگ گیا ہے۔ اسے کوئی تکلیف نہیں ہے لیکن کسی دکھیارے اور ناکام و نامراد عاشق کی طرح عام طور پر گردن جھکائے بیٹھا رہتا ہے۔ بڑی مشکل سے ایکسرسائز کرتا ہے۔ بہت کم کھاتا پیتا ہے۔ گھوڑا کم، شاعر زیادہ لگتا ہے۔"

"اس کے بھی اپنے کچھ جذبات، کچھ احساسات ہوں گے۔ معلوم نہیں یہ کیا سوچتا ہوگا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "حیوانوں کی بھی اپنی ایک الگ ہی دنیا ہے۔ انسان اس دنیا میں جھانکے تو یقیناً بہت سے انوکھے تجربات حاصل ہوسکتے ہیں۔"

"اس دنیا میں ہر طرف ہی اَن گنت دنیائیں آباد ہیں اور زندگی بہت مختصر ہے۔ انسان کو خود اپنی ذات کو صحیح طرح دیکھنے اور کھنگالنے کا موقع نہیں ملتا، وہ دوسری دنیاؤں کو کیا کھنگالے گا اور کیا سمجھے گا۔" راجو نے سادہ اور سرسری سے لہجے میں بڑی سچی بات کہی۔ "کبھی کبھی میرا پینے پلانے اور حرّافہ قسم کی عورتوں سے بھی دل بیزار ہوجاتا ہے۔ ان دنوں اس اصطبل میں میرا بڑا دل لگتا ہے۔ ان گھوڑوں سے بڑی محبت محسوس ہوتی ہے۔"

"بھائی لگتے ہوں گے۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"نہیں۔ ہم جیسے انسان ان کے بھائی بننے کے لائق کہاں ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "یہ معصوم ہم سے بہت اچھے ہیں۔"

"تو اب یہ ریٹائرڈ زندگی گزار رہا ہے؟" میں نے بلیو مون کی طرف اشارہ کیا۔ "عمر تو کچھ زیادہ نہیں لگتی اس کی۔"

"بعض لوگ افزائش نسل کے سلسلے میں اس کی خدمات حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں۔" راجو بولا۔ "بعض بڑے جاگیردار اور نواب یا دوسری بڑی شخصیتیں جو گھوڑوں کی بریڈنگ میں دلچسپی رکھتی ہیں، ان کے گھوڑے گھوڑیاں دوسرے ممالک میں صحت افزا مقامات پر پرورش پا رہی ہیں، خوبصورت فارمز بنے ہوئے ہیں ان کے لئے۔ ایسے لوگ بلیو مون اور کِلر کے شجرۂ نسب سے واقف ہیں۔ انہوں نے مجھ سے رابطہ قائم کیا تھا کہ بلیو مون اگر دوڑنے کے قابل نہیں رہا تو اس سے افزائش نسل کا کام لیا جائے۔ انہیں معلوم ہے کہ کِلر کے قریب تو میں کسی کو پھٹکنے نہیں دوں گا۔ بلیو مون بھی بہرحال بھائی تو اسی کا ہے۔ وہ لوگ اسے باہر بھجوانے اور مجھے بھاری معاوضہ دینے کے لئے بھی تیار ہیں۔"

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟"

"کبھی کبھی مجھے لالچ آتا ہے لیکن پھر کاروباری رقابت غالب آجاتی ہے۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ کبھی کِلر جیسا کوئی دوسرا گھوڑا ریس ٹریک پر آئے۔" پھر راجو آہ بھر کر بولا۔ "اس کے علاوہ مجھے ایک اندیشہ یہ بھی ہے کہ معلوم نہیں یہ بلیو مون کا بچہ اس سلسلے میں بھی دلچسپی کا مظاہرہ کرے گا یا نہیں؟ یہ تو بالکل ہی تارک الدنیا ہوگیا ہے۔ حلیم کے مرحوم شوہر کو اس اصطبل سے، ان گھوڑوں سے، مجھ سے کہیں زیادہ محبت اور لگاؤ تھا۔ کاروباری مفادات تو اپنی جگہ تھے ہی لیکن ویسے بھی وہ انہیں بچوں کی طرح چاہتا تھا۔ اس کی وصیت ہے کہ اس کے کسی بھی گھوڑے کو اشد مجبوری کی حالت میں بھی گولی مار کر ہلاک نہ کیا جائے۔ اگر کبھی اشد مجبوری بھی آن پڑے، کوئی گھوڑا کسی وجہ سے کسی ناقابل علاج اذیت میں مبتلا ہو تب بھی اسے کوئی ایسا انجکشن دے کر ہلاک کیا جائے کہ اسے کم سے کم تکلیف ہو، سکون سے موت آئے۔"

"بہت خوب!" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"اس کی وصیت میں سب سے بڑا حصہ گھوڑوں کے متعلق تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نے سب سے زیادہ روپیا گھوڑوں سے ہی کمایا تھا، دوسرے کام تو بعد میں کئے تھے۔ اس نے نزید ہدایات بھی اپنے وصیت نامے میں لکھی تھیں۔ مثلاً اس کے کسی گھوڑے کو فروخت نہ کیا جائے، خواہ وہ کتنا ہی ناکارہ ہوجائے۔ نسل کشی بھی اپنے ہاں کی جائے، معاوضے پر دوسروں کو خدمات نہ پیش کی جائیں۔ جس حد تک بھی ممکن ہو ہر گھوڑے کی طبعی موت کا انتظار کیا جائے، اسے کسی اور طریقے سے ہلاک نہ کیا جائے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے راجو بولا۔ "ان ہدایات پر بھی عمل کرنا پڑتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے، گھوڑے بھی اس مرحوم کو باپ ہی کی طرح سمجھتے تھے۔ اس کے اس دنیا سے رخصت ہوتے ہی اصطبل پر بھی زوال سا آگیا۔ میں خود محسوس کرتا ہوں کہ گھوڑے بے چارے گویا دل شکستہ ہیں۔ دو تین مر گئے، دو تین ٹریک سے آؤٹ ہوگئے۔ موصوف کے انتقال کے بعد لے دے کر ایک یہ "کِلر" ابھرا ہے۔ اسے بچا کر رکھنے کی میں اپنی سی کوشش کر رہا ہوں۔ اسے بھی کچھ ہوگیا تو اصطبل ختم ہوجائے گا۔ مجھے معلوم ہے، مختار رفیق اسے مروانے کے بارے میں مسلسل غور وخوض کر رہا ہے۔"

میں نے کچھ دور زقندیں بھرتے ہوئے کِلر کو دیکھا۔ اس کے عضلات کی پھڑکن اور لچک قابل دید تھی۔ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ "نہیں، اتنے شاندار گھوڑے کو مرنا نہیں چاہئے۔"

"اگر مختار نے اسے مروانے کا فیصلہ کرلیا ہے تو پھر اسے بچانا میرے بس کی بات نہیں۔" راجو بولا۔

"کیا اس نے تمہارے منہ پر کبھی اس سلسلے میں تمہیں کوئی دھمکی دی ہے؟"

"میرا تو عرصے سے اس سے سامنا ہی نہیں ہوا۔" راجو بولا۔ "اور نہ ہی مجھ میں اس کا سامنا کرنے کی ہمت ہے۔ میری تو اس سے روح فنا ہوتی ہے۔ البتہ خبریں مجھ تک پہنچتی رہتی ہیں۔ وہ اب کِلر کو ٹریک سے ہی نہیں، دنیا سے ہی رخصت کرنے پر تُلا ہوا ہے۔ اس کام کے لئے اسے شاید لاہور کے بڑے بڑے خطرناک بدمعاشوں میں سے کوئی مناسب معلوم نہیں ہوا جو اس نے پچھلے دنوں فیصل آباد سے ایک بندے کو بلایا ہوا تھا۔ شاید دوسرے شہر سے بندہ بلانے میں کوئی اور مصلحت رہی ہو۔"

"کیا کیا اس بندے نے؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ مختار رفیق تو اتنا جذباتی ہو رہا تھا کہ اس نے اس بندے کو حکم دے دیا تھا کہ کِلر کو ریس ٹریک پر ہی رائفل سے گولی ماردی جائے لیکن وہ اس واردات سے کترا گیا۔ بجلی کی رفتار سے دوڑتے گھوڑے کو گولی مارنا بہت ہی مشکل کام تھا۔ دوسرے گھوڑے اور دوسرے جاکی بھی مرسکتے تھے۔ دوڑ ختم ہونے کے بعد یا شروع ہونے سے پہلے گولی ماری جاتی تب بھی اس بندے کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کا کافی امکان تھا۔ حالانکہ مختار رفیق نے اسے خاصی تسلیاں دیں کہ اسے ریس کورس کے ایک محفوظ گوشے سے فرار کرانے کا بندوبست ہوگا، باہر کار بھی منتظر ہوگی لیکن وہ بندہ نہیں مانا۔"

"کیا نام تھا اس کا؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"اصل نام تو معلوم نہیں لیکن بدمعاشوں کی دنیا میں اسے "بگو گوشا" کہہ کر پکارا جاتا ہے۔" راجو نے جواب دیا۔

"بگو گوشا۔۔۔۔؟" مجھے ہنسی آگئی۔ بگو گوشا پنجابی میں ناشپاتی کی ایک قسم کو کہتے ہیں۔ بعض بدمعاشوں کے نام خاصے مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔

"نام بے شک مضحکہ خیز ہے لیکن میں نے سنا ہے آدمی بڑا خطرناک ہے۔" راجو بولا۔

"لیکن عقلمند بھی ہوگا۔" میں نے کہا۔ "دیکھ بھال کر واردات کرتا ہوگا۔ اس واردات میں اسے خطرہ نظر آیا ہوگا۔"

"ہوسکتا ہے لیکن میرا تو خیال ہے کہ میری قسمت ہی اچھی

تھی۔" راجو بولا۔

"تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"ویسے تو مجھ سے ہمدردی رکھنے والے چھوٹے موٹے لوگ مجھے کچھ باتیں بتاتے رہتے ہیں۔ کچھ جھوٹی کچھ سچی' کچھ مصدقہ کچھ غیر مصدقہ لیکن بگو گوشے سے تو مختار رفیق کی تھوڑی سی گفتگو میں نے خود سنی تھی۔ راکسی سنیما میں ایک پورے فلور پر مختار رفیق کے دفاتر ہیں۔ اس کے دفتر میں ایک عرصے سے مجھے گھسنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ دروازے پر ہمیشہ اس کا ایک جلاد صورت مسلح گرگا کھڑا رہتا ہے۔ عمارت کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ کمروں کی قطاروں کے عقب میں بھی ایک تنگ سی گلی سے مشابہ راستہ موجود ہے۔ ادھر کچھ باتھ رومز بھی ہیں۔ میں اتفاق سے اس راستے سے گزر رہا تھا تو اپنے تمام تر خوف کے باوجود تجسس سے مجبور ہو کر یونہی ذرا سُن گُن لینے کے لئے مختار رفیق کے کمرے کے پیچھے رک گیا۔ ائرکنڈیشننگ کی وجہ سے حالانکہ کمرے ہر طرف سے بند رہتے ہیں لیکن اس روز شاید لائٹ گئی ہوئی تھی۔ پچھلی دیوار میں ایک روشندان کھلا ہوا تھا اور مختار رفیق شاید غصے میں بگو گوشے سے بات کر رہا تھا اس لئے مجھے بھی ان کی گفتگو سنائی دے گئی تھی۔"

"کیا واقعی وہ قدرت کے اس بے زبان شاہکار کو مروانے کی بات کر رہا تھا؟" میں نے ایک بار پھر کلر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جو احاطے میں چکر کاٹ رہا تھا۔ "اس نے بھی گھوڑوں سے بہت دولت کمائی ہوگی۔ کیا اسے ان بے زبانوں سے ذرا بھی ہمدردی نہیں؟"

"اگر معاملہ روپے پیسے کا آن پڑے تو مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی ماں کے بھی ہاتھ پاؤں توڑنے پر تیار ہو جائے گا۔ بعض لوگوں کی تو روپے پیسے کی ہوس دیکھ کر یقین ہونے لگتا ہے کہ وہ اس معاملے میں ذہنی مریض ہیں۔" راجو بولا۔ "میں تو سوچ رہا ہوں' ایک آدھ مہینے میں گھوڑے کو کراچی کے ریس کورس میں لے جاؤں لیکن اس کے لئے بہت سے انتظامات کرنے ہوں گے۔ یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کہیں میرے کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے ہی وہ خبیث کچھ کر نہ گزرے۔"

"نہیں۔ وہ کچھ نہیں کرے گا۔ تم اطمینان سے اپنے معمولات جاری رکھو۔" میں نے اسے اطمینان دلایا۔

اس نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "یہ تم رسمی تسلّی دے رہے ہو یا کوئی ٹھوس بات کر رہے ہو؟"

"میں رسمی باتیں کرنے کا عادی نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"مختار رفیق دلیل یا شرافت کی زبان نہیں سمجھتا۔" راجو بولا۔

"کوئی بات نہیں۔ ہمیں ہر طرح کی زبان بولنی آتی ہے پیارے!" میں نے اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی۔ "مترجمین کا بھی انتظام ہے۔ ہر زبان میں مفہوم کا ترجمہ کر کے سمجھا دیتے ہیں۔ اس طرح ذہن نشین کرا دیتے ہیں کہ آدمی کبھی بھولتا ہی نہیں۔"

"تو تم اس سلسلے میں کچھ کرو گے؟" اس نے پُرامید لہجے میں پوچھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے لہجے میں خوف جھلک آیا۔ "یار! مروا مت دینا مجھے۔"

"بزدل دوستوں کی تو مدد بھی نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "اس طرح لرزنا ہی تھا تو پھر مجھے یہ سب باتیں بتانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ ... دراصل ... یار' میری مختار رفیق سے روح فنا ہوتی ہے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"ایک مختار رفیق سے کانپنا شروع کرو گے تو پھر تمہیں زندگی میں ہر قدم پر کوئی نہ کوئی مختار رفیق ٹکراتا رہے گا۔" میں نے کہا۔

"تم بڑے آدمی ہو' تم اس طرح کی باتیں کر سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"اس شہر میں بہت سے بڑے آدمی بھی کسی نہ کسی مختار رفیق سے کانپتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ گاڑی میں سے اپنی چپٹی بوتل نکال کر کوٹ کی جیب میں ڈال لایا تھا۔ اسے جیب سے نکال کر اس نے دو گھونٹ بھرے پھر بوتل جیب میں ڈالی اور غیر ملکی سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔ سگریٹ سلگا کر اس نے ایک طویل کش لیا اور مجھے ساتھ لے کر ایک بینچ پر جا بیٹھا۔ اس کی انگلیوں کی لرزش بتا رہی تھی کہ وہ ذرا نروس تھا۔ مجھے خود ہی خیال آیا کہ اس کا خوف بجا تھا۔ اس کی نظر میں تو میں محض ایک بڑا بزنس مین تھا۔ مختار رفیق اس کی نظر میں بہت بڑا بدمعاش تھا۔ وہ سوچ رہا ہو گا کہ ایک بزنس مین بھلا ایک بدمعاش سے کیونکر نمٹ سکتا تھا؟

راجو کسی سوچ میں تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "میں یہ تو بتا ہی چکا ہوں کہ مجھے محترم مختار رفیق صاحب سے شرفِ ملاقات حاصل نہیں ہے۔ موصوف کس قسم کی شخصیت کے مالک ہیں؟ کیا صورت سے ہی اعلیٰ درجے کے بدمعاش نظر آتے ہیں؟"

"ہاں' لیکن حلیہ بڑا معززانہ ہوتا ہے اس لیے بدمعاشی والا تاثر ذرا دب جاتا ہے۔ لمبا تڑنگا سیاہ فام آدمی ہے۔ بال نیگروز کی طرح گھنگریالے ہیں۔ مضبوط آدمی ہے۔ پہلی نظر میں امریکا کا کوئی سیاہ فام باکسر دکھائی دیتا ہے لیکن قریب سے دیکھنے پر احساس ہو جاتا ہے کہ پاکستانی ہے۔ میرا خیال ہے بچپن میں اسکول کی شکل زیادہ عرصے نہیں دیکھی لیکن خود کو پڑھا لکھا ظاہر کرنے کا بڑا زبردست کمپلیکس ہے۔ دفتر میں سارے انگریزی اخبار منگواتا ہے حالانکہ کسی کی ہیڈلائن بھی صحیح نہیں پڑھ سکتا۔ جن دنوں میرا اس کے دفتر میں آنا جانا تھا' ان دنوں ایک مرتبہ تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ شیکسپیئر کے ڈراموں کا مجموعہ بغل میں دبائے چلا آ رہا تھا۔ میں نے یونہی مذاق میں پوچھ لیا کہ کیا اسے شیکسپیئر کے نام کی اسپیلنگ آتی ہے؟ بہت برا منایا کیونکہ اس وقت کچھ اور لوگ بھی دفتر میں بیٹھے تھے۔ مجھے اٹھوا کر باہر پھکوانے لگا تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔"

"واہ! یہ تو دلچسپ بات بتائی تم نے۔"

"ایک طرف تو اپنے آپ کو پڑھا لکھا ظاہر کرنے کا ایسا کمپلیکس ہے' دوسری طرف اگر تم اسے اپنے بدمعاش ساتھیوں یا اُچکے قسم کے ملازموں سے بات کرتے دیکھ لو تو شرم سے تمہیں پسینے آ جائیں گے۔ ایسی گندی زبان میں بات کرتا ہے کہ باقاعدہ فضا میں تعفن محسوس ہونے لگتا ہے۔"

"خود بھی ہاتھ پاؤں چلا لیتا ہے یا بدمعاشوں پر حکمرانی ہی کرتا ہے؟" میں نے اس کوٹھری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جس میں ایک گھوڑے کی مالش کی جا رہی تھی۔

"خود بھی پکا سؤر کا بچہ ہے۔ کوک کی بوتل دانت سے کھول لیتا ہے' گھونسا مار کر کرسی کا ہتھا توڑ دیتا ہے۔ دونوں بغلوں میں ہولسٹروں میں پستول رکھتا ہے۔ اس کے گرگے اس کے سامنے کانپتے ہیں۔" راجو نے بتایا۔

"تم تو میرے اشتیاق کو ہوا دے رہے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

دفعتاً راجو گیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ارے ... یار! شیم بھی آ گئی۔"

میں نے بھی گیٹ کی طرف دیکھا۔ مسلح محافظ گیٹ کھول رہا تھا اور شیم کی سرخ گاڑی اندر آ رہی تھی۔ شیم نے غالباً ہمیں بینچ پر بیٹھے دیکھ لیا تھا۔ گاڑی تھوڑی سی دُھول اڑاتی ادھر ہی آ گئی اور ہم سے محض چند فٹ کے فاصلے پر ہی رکی۔

شیم گاڑی سے اتری تو ایک لمحے کے لئے میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ سرخ بھڑکیلے رنگ کے چُست ٹراؤزرز اور ویلوٹ کی نیوی بلیو جیکٹ میں تھی۔ کھلے ریشمی بال کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ پیروں میں جاگرز تھے۔ برسوں پرانا حسن اب بھی اس کا ساتھی تھا۔ وہ دروازے پر ہاتھ رکھ کر بڑی ادا سے کھڑی ہوئی تو تھوڑی سی دھوپ اس کے چہرے پر پڑی جس نے اس کے حسن کو کچھ اور اُجال دیا۔

"چشمِ بددُور۔" وہ مسکرائی۔ "زندگی رہے تو کبھی نہ کبھی جگری دوستوں کو برسوں کی جدائی کے بعد بھی کندھے سے کندھا جوڑ کر بیٹھنے کا موقع میسر آ ہی جاتا ہے۔"

میں بھی مسکرا دیا۔ میرے تصور میں گاؤں کی وہ شیم ابھر آئی جو برقع پہن کر دستکاری اسکول جاتی تھی۔ اس تصویر کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس کی طرف دیکھنا ایک عجیب' دلچسپ اور حیران کن تجربہ تھا۔

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم خود تو یہاں نہیں پہنچ سکتے' تمہیں راجو لایا ہوگا۔" پھر اس کی نظر نہایت آہستگی سے راجو کی طرف گھومی اور وہ طنزیہ سے لہجے میں بولی۔ "آج تمہیں کیسے یاد آ گئی افضل کی؟ میں نے تمہیں اتنی مرتبہ کہا کہ جا کر مل لو مگر تمہارے کان پر جوں نہیں رینگتی۔"

"اب اسی کے سامنے تو مت ڈانٹو۔" راجو مسکرایا۔ "دوستوں میں کوئی دیر سویر نہیں ہوتی۔ جب مل بیٹھے تبھی محفل جم گئی' گلے شکوے دور ہو گئے۔"

شیم نہایت ٹھہراؤ سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی راجو کے قریب بینچ پر آ بیٹھی۔ اس کے اور میرے درمیان راجو حائل تھا لیکن اس کے وجود کی خوشبو اور حرارت مجھ تک پہنچ رہی تھی۔ کچھ حسیات کے ذریعے اور کچھ سوچ کے ذریعے۔ وہ ذرا جھک کر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پہلے کی طرح ہی پیاس اور طلب تھی۔ راجو کی موجودگی میں بھی اس نے اسے مخفی رکھنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ راجو کا واقعی ان باتوں کی طرف دھیان نہیں تھا یا پھر شاید شیم سچ ہی کہتی تھی' اسے ان باتوں کی کوئی پروا ہی نہیں تھی۔ وہ اپنی ایک الگ دنیا آباد کئے ہوئے تھا اور اسی میں مگن تھا۔

"شیم!" دفعتاً راجو بچوں کے سے جوش و خروش سے بولا۔ "میں نے افضل کو مختار رفیق کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے۔ افضل کہہ رہا ہے کہ یہ اس کا بندوبست کر دے گا۔ اس کے لئے یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

"اگر تم کسی قابل ہوتے تو وہ ہمارے لئے بھی مسئلہ نہ بنتا۔" وہ سرد لہجے میں بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ مختار رفیق کے نام پر ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں تغیّر سا آیا تھا۔

"دیکھو بھئی' وہی پرانی لڑائی نئے سرے سے مت شروع کر دینا۔" راجو ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے کہ بندہ کسی قابل نہیں ہے لیکن آخر کار تمام مسائل اسی خادم' اسی خاکسار کے ذریعے حل ہوتے ہیں۔"

شیم نے کچھ کہنے کے لئے ہونٹ ہلائے ہی تھے کہ راجو تیزی سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے التجائیہ سے لہجے میں بولا "دیکھو پلیز! دوستوں کے سامنے شوہروں کی بے عزتی نہیں کیا کرتے۔ ان بے چاروں کی انا مجروح ہو جاتی ہے۔ یہ میرا نہیں' ایک مشہور ماہر نفسیات کا کہنا ہے۔"

مجھے یقین ہو چلا تھا کہ راجو' شیم سے مرعوب نہیں تھا۔ وہ صرف مرعوب ہونے کی اداکاری کرتا تھا اور شیم بھی اس بات سے واقف تھی۔ یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں تھا کہ دونوں ہی کا دل ایک دوسرے سے بھرا ہوا تھا لیکن دونوں کسی مجبوری کے بندھن میں بندھے ہوئے تھے۔ دونوں کی مجبوری کسی حد تک ظاہر بھی تھی۔ راجو کی مجبوری شیم کا وہ روپیا پیسا تھا جس کے بل پر وہ عیش کر رہا تھا اور شیم کی مجبوری شاید یہ تھی کہ ایک ایسے شوہر کی

آڑ میسر رہے جو حاکمانہ مزاج نہ رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ بھی شاید معاملات کی تہ میں کچھ اور مصلحتیں کارفرما رہی ہوں لیکن ابھی مجھے ان کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

اس دوران اصطبل کے عملے کے لوگ ہمارے گرد جمع ہو چکے تھے۔ شمیم ان سے مختلف معاملات کے بارے میں پوچھ گچھ کرنے لگی۔ پھر اس نے سب لوگوں کو مختلف ہدایات دیں۔ خصوصاً مسلح محافظوں کو وہ بہت محتاط رہنے کی تلقین کر رہی تھی۔ ان سب سے بات چیت کر کے اس نے انہیں واپس بھیج دیا پھر میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "یہ سب ہدایات دینا' یہ سب انتظامات کرنا راجو کا کام ہے لیکن مجھے کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ مجھے تو یہ دیکھنے کے لئے بھی آنا پڑتا ہے کہ یہ یہاں موجود ہے یا نہیں۔ بدقسمتی سے یہاں فون نہیں ہے۔"

"اب تمہاری بے اعتباری کا تو کوئی علاج نہیں۔" راجو بولا۔ "ورنہ دیکھ لو' میں یہاں موجود ہوں اور ملازموں کو وہ تمام ہدایات تم سے کہیں زیادہ مختصر الفاظ میں دے چکا ہوں' جو تم نے اب آ کر دی ہیں۔"

"تم پر اعتبار کر کے تو میں ہمیشہ گھاٹے میں رہی ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ پھر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "تمہاری گاڑی یہاں نظر نہیں آ رہی۔"

"میں راجو ہی کی گاڑی میں آیا ہوں۔ آفس سے اٹھا کر لایا ہے مجھے۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اور اب مجھے واپس بھی جانا ہے۔" پھر میں نے راجو کی طرف دیکھا۔ "چلو راجو! مجھے واپس پہنچا دو۔"

"راجو کو تم یہیں رہنے دو۔" شمیم بلا تامل بولی "تمہیں میں چھوڑ دوں گی۔ یہ آج خوش قسمتی سے یہاں آ ہی گیا ہے تو اسے کچھ وقت یہیں گزار لینے دو۔ شاید کوئی ڈھنگ کا کام کر ہی لے ورنہ مجھے تو اب اس اصطبل کا انجام قریب ہی نظر آ رہا ہے۔"

"یہ عورت کبھی دو جگری دوستوں کو گپ شپ کرتے نہیں دیکھ سکتی۔" راجو میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولا۔ میں ذرا تذبذب میں تھا کہ شمیم کے ساتھ جاؤں یا نہیں۔ راجو کے چہرے پر تشویش یا شکوک و شبہات کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔

شمیم ذرا زور دے کر بولی۔ "چلو نا' بُت بن کر کیوں کھڑے ہو گئے؟ مجھے تم سے مختار رفیق کے بارے میں بھی بات کرنی ہے۔"

میں نے اجازت طلب نظروں سے راجو کی طرف دیکھا تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "جاؤ بھائی! اسی میں میری اور تمہاری بھلائی ہے۔ میری بیوی انکار سننے کی عادی نہیں ہے۔"

اب وہ خود ہی اجازت دے رہا تھا تو میں کیا کر سکتا تھا۔ میں اسے خدا حافظ کہہ کر شمیم کے ساتھ چل دیا۔

گاڑی اصطبل سے نکل کر پختہ سڑک تک آ گئی۔ شمیم اس دوران بالکل خاموش رہی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ جب سے میرے بارے میں اس کا رویہ نارمل ہوا تھا' وہ مجھے خاصی اچھی لگنے لگی تھی۔

"تم نے ناحق مجھے لفٹ دینے کی زحمت کی۔" میں نے سکوت توڑنے کی غرض سے کہا۔ "میں یہاں سے کوئی ٹیکسی وغیرہ لے کر چلا جاتا۔"

ایک نظر میری طرف دیکھ کر وہ مترنم سے انداز میں ہنسی۔ "ٹیکسی۔۔۔؟" اس نے استہزائیہ سے انداز میں دہرایا "یہاں تو تمہیں گدھا گاڑی بھی میسر نہیں آ سکتی تھی۔ ویسے تمہیں بہت تاخیر سے یہ بات جتانے کا خیال آیا۔"

"اصل میں مجھے بار بار بے چارے راجو کا خیال آئے جا رہا ہے' جیسے تم سزا کے طور پر وہاں بٹھا آئی ہو۔" میں نے کہا۔ "وہ بے چارہ وہاں کرے گا کیا؟ اصطبل کے کام تو ظاہر ہے ملازمین ہی کو کرنے ہوتے ہیں۔"

"ملازمین سے کام لینا بجائے خود ایک اہم کام ہے اور راجو کو اس کام کی اہمیت کا قطعاً اندازہ نہیں۔ کبھی کبھار ہی تو وہ پھنستا ہے یہاں۔ اگر وہ اِدھر اُدھر گھومے پھرے' اصطبل کا جائزہ لے تو سو کام نکل آئیں۔ اصطبل کی بہتری کے لئے وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ میرا مرحوم شوہر اپنے کاروبار میں سب سے زیادہ وقت اصطبل کو دیتا تھا۔ ہمیں سب سے زیادہ آمدنی بھی اسی سے تھی۔ ساری بات دلچسپی کی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے حیرت ہوتی ہے کہ آخر شراب اور چیپ عورتوں کے سوا راجو کو کسی بھی چیز سے دلچسپی کیوں نہیں ہے؟ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ مزاج میں ذرا سی بھی نفاست' عمدہ ذوق یا اچھا رہن سہن رکھنے والی عورتیں بھی راجو کو بالکل اپیل نہیں کرتیں۔ چاہے وہ اس پر مہربان ہی کیوں نہ ہوں۔"

"پھر تم اس کے دل کو کیسے بھا گئیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس وقت وہ بوکھلایا ہوا تھا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "اس نے تو شاید تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس غربت کے عالم میں اسے خوبصورت بیوی اور عیش کوشی کا تمام سامان میسر آ جائے گا تاہم حیرت انگیز طور پر اس کا دل مجھ سے جلد ہی بھر گیا حالانکہ میرا خیال تھا وہ زندگی بھر میرا اسیر رہے گا۔"

پھر وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر رائے طلب انداز میں بولی۔ "ویسے کیا خیال ہے۔۔۔ میں کوئی ایسی گئی گزری عورت تو نہیں ہوں کہ بندے کا سال دو سال میں مجھ سے دل بھر جائے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے قدرے شرمیلے لہجے میں کہا "میں شریف آدمی ہوں' راجو خرانٹ ہے۔ وہ کم سے کم وقت میں زندگی کو زیادہ سے زیادہ برت لینا چاہتا ہے۔"

"گدھا ہے۔ نقصان میں رہے گا۔ ایسے لوگ بہت جلد زندگی کے ویران راستوں پر خالی ہاتھ کھڑے رہ جاتے ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔ "خیر۔۔۔ چھوڑو راجو کے تذکرے کو۔ میں اس کے بارے میں

بات کرنے کے لئے تمہیں ساتھ نہیں لائی۔ مجھے تو تم سے مختار رفیق کے بارے میں بات کرنا تھی۔ راجو نے تمہیں اس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے؟"

"ہاں۔ میرا خیال ہے' سبھی کچھ بتا دیا ہے۔" میں نے متذبذب لہجے میں کہا۔ "لیکن اب مجھے کیا معلوم کہ سبھی کچھ سے تمہاری کیا مراد ہے۔"

"اس نے کیا بتایا ہے؟" شمیم نے جاننا چاہا۔ میں نے وہ سب کچھ دہرا دیا جو مجھے راجو نے بتایا تھا۔ اس وقت تک گاڑی ملتان روڈ پر پہنچ چکی تھی اور ہم بے ہنگم ٹریفک میں گھر چکے تھے۔ تانگے' ریڑھے' گدھا گاڑیاں' بسیں' ویگنیں' سائیکلیں' موٹر سائیکلیں اور پیدل چلنے والے راہ گیر' سبھی تنگ سی سڑک پر ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے اور ٹریفک سُست رفتاری سے چل رہا تھا۔

سمن آباد موڑ کے قریب پہنچ کر شمیم کو ذرا رفتار بڑھانے کا موقع ملا اور اسی دوران اس نے پوچھا۔ "تم نے مختار رفیق کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"ابھی تو کچھ نہیں سوچا۔ ابھی تو راجو نے اس کے بارے میں بتایا ہی ہے۔ دیکھ لیں گے اسے' ایسی بھی کیا جلدی ہے؟" میں نے بے پروائی سے کہا "بہرحال تمہیں اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ایسے لوگوں سے پنگا لینے کا شوق اکثر نہ چاہتے ہوئے بھی میرے دل میں ابھر آتا ہے۔"

"میں تمہیں اس کے بارے میں ایک بات بتانا چاہتی تھی جو راجو کو بھی معلوم نہیں۔" وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کافی دیر کی ذہنی کشمکش کے بعد اس فیصلے پر پہنچی تھی کہ یہ بات مجھے بتا دی جائے۔

"بتا دو۔ جو کچھ بتانا ہے تم بھی بتا دو' تاکہ اس عظیم ہستی سے شرف ملاقات حاصل کرنے سے پہلے اس کے بارے میں میری معلومات مکمل ہو جائیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"وہ خبیث مجھے اپنی داشتہ بنانا چاہتا تھا۔ یہ بات اس نے صاف طور پر مجھ سے کہی تھی۔"

شمیم نے گویا حلق میں اٹکی ہوئی کوئی چیز اُگل دی۔ میں ایک لمحے کے لئے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ وہ بھی بظاہر انہماک سے ڈرائیونگ کرتی رہی۔

"پھر تم نے کیا جواب دیا؟" میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ میں نے کیا جواب دیا ہو گا؟" اس نے اُلٹا مجھ سے ہی سوال کر دیا۔

"بھئی میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے اسے چڑانے کے لئے غیر واضح لہجے میں کہا۔ "میری تو جن عورتوں سے بھی تھوڑی بہت جان پہچان رہی ہے' وہ سب کی سب مجھے من موجی ہی نظر آئی ہیں۔ من میں آ جائے تو داشتہ بننے پر بھی تیار رہتی ہیں' من نہ چاہے تو ملکہ بننے پر بھی رضامند نہیں ہوتیں۔"

"مجھے بھی ان عورتوں میں شامل ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔" خلاف توقع وہ بولی۔ "میں بھی بڑی من موجی ہوں۔ اس کے باوجود داشتہ ہونا مجھے کسی عورت کے لئے بہت ہی توہین کی بات لگتی ہے۔ عورت نہ ہوئی تولیہ ہو گیا۔ نہائے دھوئے' بدن پونچھا اور الگنی پر لٹکا کر بھول گئے۔ عورت کو اپنے من پسند آدمی کی بھی داشتہ نہیں ہونا چاہئے۔ اوّل تو اس کی بیوی ہونا چاہئے اور اگر حالات اس کی اجازت نہ دیتے ہوں تب بھی کم از کم محبوبہ تو ہو۔ رشتے کی کوئی جذباتی بنیاد تو ہونی چاہئے۔ عورت اور تولئے میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔"

"تمہارا یہ فلسفیانہ جواب مختار رفیق کی سمجھ میں آ گیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے اسے یہ جواب تو نہیں دیا تھا۔" وہ بولی۔ "اس سے تو میں نے یہ کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو راجو کی داشتہ بنا دے' وہ جتنا بھی خرچ وغیرہ مانگے گی' میں دیا کروں گی۔ تم سوچ سکتے ہو کہ اس جواب پر مختار رفیق جیسے آدمی کا کیا حال ہوا ہو گا۔"

"کہیں اس کی دشمنی کی بڑی وجہ یہی جواب تو نہیں؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ بڑی وجہ تو وہی گھوڑے والا معاملہ ہے۔ مالی نقصان اس کی نظر میں سب سے بڑا نقصان ہے۔ بہرحال میرے انکار نے اس کے غصے کو دو آتشہ کر دیا ہے۔"

"لیکن حیرت ہے اس نے ابھی تک کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔" میں نے کہا۔

"وہ گرما گرمی میں اپنا وار نہیں کرتا۔ خاص خاص معاملات میں وہ بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھاتا ہے اور ہر مسئلے کا بڑا پکّا علاج کرتا ہے۔" شمیم بولی۔ "یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہم دو مرتبہ اس کے وار سے بچ چکے ہیں۔"

"راجو نے تو صرف ایک کوشش کے بارے میں بتایا تھا۔ کسی جاکی کو اس نے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا جو کلر کو کوئی انجکشن دینے کی فکر میں تھا۔" میں نے کہا۔

"بہت سی باتیں راجو کو معلوم نہیں اور بہت سی باتیں شاید تم کو بتانے کی ابھی اسے مہلت نہ ملی ہو۔" شمیم بولی۔ "اس لئے میں بتا رہی ہوں۔۔۔۔۔"

ایک لمحے کے لئے وہ کسی سوچ میں الجھ گئی۔ پھر اچانک ہی گویا کوئی نئی بات شروع کرتے ہوئے بولی "میری پہلی شادی کے ابتدائی دنوں میں ایک لڑکی میری دوست بنی تھی۔ نازی اس کا نام تھا۔ بہت اچھے گھرانے کی لڑکی تھی۔ شادی کے کچھ عرصے بعد میں مسعود کے ساتھ ملک سے باہر چلی گئی۔ تمہیں معلوم ہے نا' مسعود میرے مرحوم شوہر کا نام تھا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے

بولی۔ "میرے بیرون ملک قیام کے دوران نازی سے میرا کوئی رابطہ نہیں رہا۔ میں واپس آئی تب بھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کافی عرصے بعد ایک روز اچانک اس سے ملاقات ہوئی تو میں اسے پہچان ہی نہیں سکی۔ وہ ایک بالکل بدلی ہوئی شخصیت تھی۔ ظاہری طور پر تو اس میں جو فرق پڑا تھا سو پڑا تھا لیکن باطنی طور پر بھی وہ بالکل بدل گئی تھی۔ جس معزز گھرانے کی وہ لڑکی تھی اس کی کوئی بھی نشانی اس میں باقی نہیں رہی تھی۔ وہ سگریٹ پینے لگی تھی اور وہ بھی سادہ نہیں۔۔۔ اس میں نہ جانے کیا کچھ بھر کر۔ گزرے ہوئے برس اس کے چہرے پر گویا کچھ زیادہ ہی گہرے نقش قدم چھوڑ گئے تھے۔ اس کی حرکات و سکنات بھی عجیب ہو گئی تھیں۔۔"

وہ خاموش ہو گئی گویا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کس طرح اپنی بات کی وضاحت کرے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "بس یوں سمجھو کہ وہ ایک کال گرل سی بن گئی تھی۔ حالانکہ وہ اپنے آپ کو پہلے ہی کی طرح ایک معزز گھرانے کی شریف لڑکی ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی لیکن اس میں وہ بات نہیں رہی تھی۔ ظاہر ہے اس قسم کی تبدیلیوں کا احساس تو ہو ہی جاتا ہے۔ میں بھی کوئی ایسی بچی تو رہی نہیں تھی' دنیا دیکھ چکی تھی۔"

چوبرجی سے اس نے گاڑی میانی صاحب کی طرف موڑی تو میں نے پوچھا "کہاں جانے کا ارادہ ہے؟"

"میں تمہیں اپنے گھر لے جا رہی ہوں۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔" وہ بولی۔ اس کا گھر گلبرگ میں ہی تھا۔

"تو پھر اتنا چکر کاٹنے کی کیا ضرورت تھی۔ سمن آباد سے ہی نکال لیتیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے مزنگ چونگی پر صرف چند سیکنڈ کا ایک کام ہے۔ ایک لیبارٹری سے اپنی ایک ٹیسٹ رپورٹ اٹھانی ہے۔" اس نے بتایا۔ میں نے یہ نہیں پوچھا کہ اس نے اپنا کون سا ٹیسٹ کرایا تھا۔ میری کوشش ہوتی تھی کہ قریبی دوستوں سے بھی کوئی حد سے زیادہ ہی نجی سوال نہ پوچھوں' وہ خود ہی بتا دیتا تو بات دوسری تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "میں تمہیں نازی کے بارے میں بتا رہی تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ اس نے اپنا گھر بھی چھوڑ دیا تھا اور بظاہر کسی معمولی سی فرم میں نوکری کر رہی تھی لیکن اس کا رہن سہن معمولی نوکری کرنے والی لڑکیوں جیسا نہیں تھا۔ اس نے خود کوئی اعتراف نہیں کیا' میں نے بھی اسے نہیں کریدا۔ میں اسے شرمندہ نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ بہر حال اتنا مجھے یقین ہو چکا تھا کہ وہ پہلے والی نازی نہیں رہی تھی "کال گرل بن چکی تھی لیکن یہ میرے لیے بہرحال معمّا ہی رہا کہ اسے کس نے اس راستے پر لگایا تھا اور اتنے کم عرصے میں ایسی خرّانٹ کیو نکر بنا دیا تھا۔

"اس سے میری دوبارہ میل ملاقاتیں شروع ہو چکی تھیں۔ میں اس سے ملنے کی کچھ ایسی زیادہ خواہش مند نہیں رہتی تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ خود موقع نکال کر مجھ سے ملنے کی فکر میں رہتی تھی۔ دو ایک بار وہ ایسے موقعوں پر آئی کہ میں اصطبل کی طرف جا رہی تھی۔ وہ بڑے اصرار سے میرے ساتھ وہاں بھی گئی۔ عملے کے لوگ اسے پہچاننے لگے۔ پھر ایک روز استاد نور محمد نے مجھے فوری طور پر اصطبل بلایا۔ اس نے میرے پاس آدمی بھیجا تھا۔ میں اصطبل پہنچی تو دیکھا' ان لوگوں نے نازی کو پکڑ کر بٹھایا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔

"استاد نور محمد نے بتایا کہ نازی میری عدم موجودگی میں وہاں پہنچی تھی اور یہ ظاہر کر رہی تھی جیسے مجھے ڈھونڈتی ہوئی پہنچی ہے۔ بہانے سے وہ ٹکر کے پاس بھی جا پہنچی جو اس وقت کوٹھری میں بند تھا۔ عملے نے اسے میری دوست سمجھ کر شک کی نظر سے نہیں دیکھا لیکن استاد نور محمد کے دل میں کھٹکا تھا۔ انہوں نے اس پر آنکھ رکھی اور یہ احتیاط کام آ گئی۔ انہوں نے نازی کو عین اس وقت پکڑا جب وہ جنگلے میں ہاتھ ڈال کر ٹکر کو چھوٹے صابن کے سائز کی ایک چاکلیٹ سی کھلانے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اسے بہت ڈرایا دھمکایا گیا کہ بتا دے وہ کس کی ہدایت پر یہ کام کرنے کی کوشش کر رہی تھی لیکن اس نے زبان بند رکھی۔ اصطبل والے بضد تھے کہ میں انہیں اجازت دے دوں' وہ اسے پیچھے کوٹھری میں لے جائیں' پھر وہ خود ہی اس سے سب کچھ معلوم کر لیں گے لیکن میرا دل نہ مانا کہ اس کی اجازت دوں۔ وہ بہت دہشت زدہ تھی' بس زار و قطار روئے جا رہی تھی اور میرے پیروں میں گرنے کی کوشش کیے جا رہی تھی لیکن زبان نہیں کھول رہی تھی۔ آخر کار تھک ہار کر میں نے اسے چھوڑ دیا جس پر ملازمین مجھ سے کچھ خفا بھی ہوئے۔

"اس دن کے بعد نازی کبھی مجھ سے ملنے نہیں آئی۔ میں نے اسے تلاش کرنے کی بھی کوشش کی لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ کافی دنوں بعد میں نے ایک روز اسے شادمان مارکیٹ میں گاڑی میں مختار رفیق کے ساتھ دیکھا۔ انہوں نے مجھے نہیں دیکھا۔ میں بھی ان سے بات نہیں کر سکی۔ وہ آگے نکل گئے۔ شبہ تو مجھے پہلے ہی تھا لیکن اس روز گویا تصدیق ہو گئی کہ نازی بھی مختار رفیق کی آلۂ کار تھی اور شاید اس کی زندگی میں آنے والے خاموش اور شرمناک انقلاب کا ذمے دار بھی وہی تھا۔ معلوم نہیں وہ شخص کن کن دھندوں میں ملوث ہے۔ بہر حال میری تو اس سے نازی والے معاملے پر بھی بات کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ویسے بھی میری اور راجو کی اس سے ملاقات شاذ و نادر ہی ہوتی ہے۔ مالی معاملات بھی زیادہ تر بینکوں اور ہمارے وکیلوں ہی کے ذریعے طے ہوتے رہتے ہیں۔"

ایک طویل سانس لے کر وہ خاموش ہوئی تو میں نے کہا۔ "تم دونوں میاں بیوی کی باتوں سے مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ تم نے اسے اپنے لئے ہوّا بنایا ہوا ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔ ہم خواہ مخواہ اس سے نہیں ڈرتے۔ ہمیں ڈرنا ہی چاہئے۔ ہم کمزور ہیں' اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اور جب وہ ہمارا کچھ بگاڑنے کا فیصلہ کر لے گا تو ہم اسے روکنے کے لئے کچھ نہیں کر سکتے۔"

"تم نے یہ سب کچھ گویا پہلے ہی سے طے کیا ہوا ہے۔" میں نے قدرے حیرت سے کہا "اگر یہ فارمولا درست ہوتا تو دنیا میں طاقتور اور بالا دست لوگ تو ایک بھی کمزور اور مجبور کو زندہ نہ رہنے دیتے۔ ہر وقت' ہر جگہ ایسا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات بڑا مضبوط ہاتھ بھی کسی کمزور سے پودے کو اکھاڑنے سے قاصر رہتا ہے۔ کیا تمہیں خدا پر بالکل بھروسا نہیں ہے؟"

"خدا پر بھروسے کے بغیر تو ہم جیسے گناہ گاروں اور سیاہ کاروں کا بھی گزارا نہیں ہے۔ اسی بھروسے کے سہارے تو بیٹھے ہوئے ہیں ورنہ ڈر کے مارے کب کے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے ہوتے لیکن وہ ایک الگ بات ہے۔ حقیقت تو اپنے بھیانک جبڑے کھول کر ڈراتی رہتی ہے۔" وہ بولی۔

میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ "اب میں تمہیں ایک اور اہم بات بتانے لگی ہوں' ایک اور چیز جس نے ہمیں مختار رفیق کے سامنے آنکھ اٹھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔ راجو ابھی تمہیں وہ بات بتانے کی جرأت نہیں کر پایا ہوگا۔ "کہکشاں انٹرپرائزز" کے نام سے ہم میاں بیوی نے فرم بنا رکھی ہے جس کے ہم دونوں ڈائریکٹر ہیں۔ اپنے سارے کام دھندے ہم اسی فرم کے نام سے کرتے ہیں۔ راجو کی حماقتوں کی وجہ سے ہماری یہ فرم۔۔۔۔ یا یوں سمجھو کہ ہم دونوں میاں بیوی' مختار رفیق کے بارہ لاکھ کے مقروض بھی ہیں۔"

"کمال ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ تو اچھا دشمن ہے جو قرضہ بھی دیتا ہے۔"

"یہ قرض اس وقت چڑھا تھا جب اس سے دشمنی شروع نہیں ہوئی تھی۔" غنیم بولی۔ "میرے شوہر نامدار نے اس کے ساتھ مچھلیوں اور مویشیوں کی فارمنگ کا عظیم الشان منصوبہ بنایا تھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا کہ بس ان کے منصوبے کے کامیاب ہونے کی دیر ہے' اس کے بعد ساری دنیا کو مچھلیوں اور مویشیوں کی سپلائی صرف وہی دونوں کر رہے ہوں گے۔ مچھلیوں کی جگہ ان کے فارموں پر حشرات الارض پیدا ہوتے رہے اور مویشیوں کی جگہ الّو بولتے رہے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ مختار رفیق نے زمین بھی اپنے ہی کسی رشتے دار کی لے لی تھی۔ کوڑیوں کے بھاؤ بکنے والی زمین تھی جو اس نے ملی بھگت سے سونے کے دام خریدی۔ قصّہ مختصر یہ کہ اس میں آخر کار بارہ لاکھ کا نقصان ہمارے حصے میں آ گیا جو معاہدے کے تحت ہمیں ہر حال میں پورا کرنا ہے اور ہم اس سلسلے میں قانونی کارروائی بھی نہیں کر سکتے۔ ہم نے اس کا وعدہ کر رکھا ہے۔ اسٹامپ پیپر لکھ کر دے رکھا ہے۔"

"بہت خوب!" میں نے کہا۔ "راجو اگر شاہکار ہے تو تم بھی کچھ کم نہیں ہو۔ حالات کو بگاڑنے میں کچھ نہ کچھ ہاتھ تمہارا بھی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ لیکن بہت معمولی حد تک۔" اس نے اعتراف کیا۔ "لیکن میں بہرحال ایک عورت ہوں اور میرا تعلق کسی کاروباری خاندان سے نہیں ہے۔ یہ کام تو مردوں کے ہوتے ہیں۔ میاں مسعود مرحوم نے تو مجھے کبھی ان کاموں میں الجھانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تھی۔"

"تو وہ بارہ لاکھ کی رقم نہیں دی جا سکی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہر وقت تو راجو کسی نہ کسی نئے کاروبار میں الجھا ہوتا تھا' کبھی گنجائش ہی نہیں نکلی اور اس وقت تو بالکل گنجائش نہیں ہے۔ اگر کسی طرح کھینچ تان کر ہم بارہ لاکھ اسے دے بھی دیں تو ہمیں گزر اوقات میں بھی دقت ہونے لگے گی۔ جس رہن سہن کے ہم عادی ہیں اس سے نیچے آنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔"

"تم لوگوں نے اپنی زندگی کو کچھ زیادہ ہی پیچیدہ بنایا ہوا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہر معاملے میں بد انتظامی کی انتہا ہے۔ تم دونوں تو اپنے معمولات اور اپنے کاروبار کو بالکل اسی طرح چلا رہے ہو جس طرح ہمارے ملک کو چلایا جا رہا ہے۔"

"تم ہمیں جتنا بھی ڈانٹو' کم ہے لیکن اب جب ہمیں۔۔۔۔ یا یوں کہو کہ صرف مجھے کچھ عقل آئی ہے تو ہم حالات کے شکنجے میں اس طرح جکڑے جا چکے ہیں کہ نکلنے کا کوئی راستہ نہیں سوجھ رہا۔ جو خطرات تلوار کی طرح ہمارے سروں پر لٹک رہے ہیں ان کے دُور ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی۔ مختار رفیق کا خوف ہماری زندگیوں کو جونک کی طرح چمٹ گیا ہے۔ ایک تو ہم ٹکر کو ریس گورس سے نہیں ہٹا رہے' دوسرے میں نے اس کے لئے سامان عشرت بننے سے انکار کر دیا۔ اب وہ ہمیں چاروں طرف سے گھیرنے والا ہے۔ قرض کی ادائیگی کے لئے بھی اس کا پیغام آ چکا ہے' اور اس کا پیغام فرشتۂ اجل کے پیغام کی طرح ہوتا ہے۔ پھر اس میں ردّ و بدل نہیں ہو سکتا۔"

اس نے مزنگ چونگی کے بجائے گنگا رام اسپتال کے قریب ایک لیبارٹری کے سامنے گاڑی لے جا کر روکی اور معذرت کر کے اندر چلی گئی۔

چند لمحے بعد وہ واپس آئی تو میں پسنجر سیٹ سے کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اب ایک لفافہ تھا جس میں غالباً ٹیسٹ رپورٹ تھی۔ اسے پرس میں رکھ کر وہ پسنجر سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "خیریت۔۔۔؟ یہ تم نے ڈرائیونگ سیٹ کیوں سنبھال لی؟"

"میں نے سوچا' تم خاصی طویل ڈرائیونگ کر چکی ہو' تھک گئی ہوگی۔ اب کچھ دیر میں تمہیں ستانے کا موقع دوں۔" میں نے کہا۔

"بہت شکریہ۔" وہ مسکرائی۔ "لگتا ہے اب واقعی تمہارے دل میں ہم جیسوں کے لئے بھی کچھ جگہ پیدا ہوتی جارہی ہے جو ہماری چھوٹی چھوٹی تکلیفوں پر بھی تمہاری نظر جانے لگی ہے لیکن یہ معمولی اور پرانی سی کار تمہارے شایانِ شان نہیں ہے۔ شاید تم الجھن محسوس کرو کہ یہ کیا کھٹارا چلانا پڑ رہا ہے۔"

"خیر' اب ایسی کسرِ نفسی سے بھی کام مت لو۔ اچھی بھلی گاڑی ہے یہ کوئی کھٹارا تو نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "تمہیں کیا معلوم ہم نے زندگی میں کیسے کیسے کھٹارے چلائے ہیں۔"

میں نے گاڑی واپس موڑی اور وارث روڈ کے راستے جیل روڈ پر لے آیا۔ اس دوران اِدھر اُدھر کی باتیں جاری تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ "مختار رفیق کا دفتر کہاں ہے؟"

"اس کا اصل دفتر تو راکسی سینما ہی کے ایک فلور پر ہے۔ زیادہ تر تو وہ وہیں پایا جاتا ہے۔ ایک دفتر ریس کورس میں بھی ہے لیکن وہاں وہ صرف ریس والے دن ہوتا ہے۔ راکسی سینما جس میں اس کا ہیڈ آفس ہے' اس کا اپنا ہی ہے۔ دو ایک دوسرے سینما بھی ہیں۔ گلبرگ میں اس کا ایک چھوٹا سا ہوٹل ہے' اس میں بھی اس کا دفتر ہے۔ ہوٹل چھوٹا ہے لیکن بڑے بڑے کاموں کے لئے مشہور ہے۔ نہایت پُرتعیش ہوٹل ہے۔ اس میں فلور شو وغیرہ بھی ہوتے رہتے ہیں۔ فلموں میں ڈانس کے ذریعے ابھرنے والی کئی اداکارائیں ماضی میں وہاں ڈانس شو پیش کرتی رہی ہیں۔" شمیم نے خاصی تفصیل بتادی۔

"اس وقت وہ کہاں ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے اپنی مرمریں کلائی پر بندھی سیاہ گھڑی پر نظر ڈالی۔ "زیادہ امکان یہ ہے کہ اس وقت وہ اپنے ہوٹل والے آفس میں ہوگا۔"

"چلو اچھا ہے' اس وقت ہمارا رخ اسی طرف ہے۔ لگے ہاتھوں اسے بھی دیکھ ہی لیتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ یک دم سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کی رنگت قدرے زرد پڑ گئی تھی۔ "کیا تم ابھی' اسی وقت اس سے ملوگے؟"

"ہاں۔ کیا حرج ہے۔ مجھے اس طرح کے کاموں کے لئے روز روز کہاں وقت ملتا ہے۔ جو کام نمٹ جائے اچھا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ مختار رفیق سے میری ایک ہی ملاقات کافی رہے گی۔ تمہارے تمام مسائل حل ہوجائیں گے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"مجھے اس کی اُمید نہیں ہے۔" وہ اضطراری سے انداز میں بولی۔

میں نے اس کے جواب میں کچھ نہ کہا۔ ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔

وہ بولی۔ "کیا میرا ساتھ جانا ضروری ہے؟"

"ہاں۔ میرے خیال میں تو بہت ضروری ہے۔ تمہارے سامنے وہ کسی بات سے مُکر نہیں سکے گا۔ اس کی ہر بات تم اپنے کانوں سے سن سکوگی' ہر ردِ عمل اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوگی۔ مجھے تمہارے پاس رپورٹ لے کر آنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ویسے بھی میں اکیلا اس کے سامنے "مدعی سُست گواہ چُست' کی تصویر بن کر جانا نہیں چاہتا۔"

"میرا مطلب تھا کہ...... تم راجو کو ساتھ لے جاتے۔" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی۔

"وہ بے کار آدمی ہے۔ تم سے بھی زیادہ بزدل ہے۔ اس سے تو بہتر ہے میں کسی بکرے کو کان سے پکڑ کر ساتھ لے جاؤں۔" میں نے کہا۔

"میرا مطلب ہے یہ کچھ عجیب اور معیوب سا نہیں لگتا کہ عورت ایک حمایتی کو ساتھ لے کر ایک بدمعاش سے بات چیت کرنے' حساب کتاب کرنے جارہی ہے۔ وہ اسے بنیاد بنا کر مجھے ذلیل اور رسوا نہیں کرے گا؟" شمیم یکدم سخت الجھن میں پڑگئی تھی۔

"تمہیں اچھا نہیں لگتا میرے ساتھ رسوا ہونا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بات کی کوئی بنیاد ہو' تھوڑی بہت حقیقت شامل حال ہو تب تو رسوا ہونے میں کچھ مزہ بھی ہے۔ خالی خولی رسوائی کا کیا فائدہ؟" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"پہلے انسان رسوا ہو کر تو دیکھے' پھر شاید بات میں سے بات نکل آئے۔" میں نے کہا "اور اگر تم خوفزدہ ہو تو میرے دوستوں کے حلقے میں شامل ہونے کے بعد خوف کو ذہن سے نکال دو۔ تمہیں ایک وقت میں صرف ایک ہی چیز سے دوستی رکھنا ہوگی۔ خوف سے یا مجھ سے۔"

"میرا خوفزدہ ہونا غلط تو نہیں ہے۔ دو بھینسے لڑتے ہیں تو جھاڑیاں بے چاری خواہ مخواہ ہی کچلی جاتی ہیں۔" وہ بولی۔

"بھینسے کون ہیں اور جھاڑی کون؟" میں نے اسے گھورا۔

"اب اتنے بھی انجان مت بنو۔ ظاہر ہے بھینسے تم اور مختار رفیق ہو' جھاڑی میں ہوں۔"

"اگر جھاڑیاں اتنی حسین ہوا کرتیں تو میں اپنے گھر کا لان جھاڑیوں ہی سے بھر لیتا' سب پھول پودے ہٹا دیتا۔" میں نے کہا۔

"لیکن اس جھاڑی سے تو تم بہت بچ کر گزرتے ہو۔" وہ اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "کیا اس میں کانٹے زیادہ ہیں؟"

"اب جھاڑی نے زبردستی دامن سے لپٹنا چھوڑ دیا ہے نا' شاید اس لئے اچھی لگنے لگی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "بہرحال...... تم کچلے جانے کی فکر مت کرو۔ ہوٹل کا نام بتاؤ' جس میں مختار رفیق کا دفتر ہے۔"

"پیلس ہوٹل۔" وہ بولی۔ "لیکن کیا تمہارا یوں تن تنہا' ایک دم منہ اٹھا کر وہاں جانا مناسب ہوگا؟ میرا مطلب ہے' کم از کم ایک آدھ آدمی...... کوئی گارڈ وغیرہ تو ساتھ لے لیتے۔"

مجھے اس کے متفکرانہ انداز پر ہنسی آگئی مگر دوسرے ہی لمحے میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔ "اگر مجھے ان تکلفات میں پڑنا ہوتا تو میں اس شخص کو اٹھوا ہی لیتا' خود کسی قسم کی زحمت ہی نہ کرتا لیکن یہ تم سے خصوصی تعلق اور لگاؤ کا نتیجہ ہے کہ میں خود تمہارے ساتھ چلا جارہا ہوں۔ میں نے سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اس کو کہتے ہیں ذاتی دلچسپی لینا۔"

"تمہاری اس جلد بازی نے ہی تو مجھے خوفزدہ کردیا ہے۔"

"چلو' آج جی بھر کے خوفزدہ ہولو۔ امید ہے اس کے بعد خوف ہمیشہ کے لئے تمہارے ذہن سے نکل جائے گا۔ جس ہوّے سے انسان ڈرتا چلا آرہا ہو' ایک بار اس کا سامنا کر ہی لینا چاہئے تاکہ معاملہ کسی کنارے لگ جائے۔ اِدھر یا اُدھر' تخت یا تختہ۔" میں نے اطمینان سے کہا اور گاڑی مین بلیوارڈ پر موڑلی۔ وہ خاموش رہی۔ میں نے ایک بار پھر اس کی طرف دیکھا' اس کے چہرے کی زردی کم نہیں ہوئی تھی۔ جوں جوں پیلس ہوٹل قریب آرہا تھا' وہ گویا اپنی جگہ سکڑتی سی جارہی تھی۔

آخر کار میں نے گاڑی پیلس ہوٹل کے سامنے لے جا روکی۔

وہ چھوٹا سا ایک خوبصورت ہوٹل تھا۔ میں ماضی میں دو چار مرتبہ اس میں کھانا کھانے آچکا تھا لیکن میں نے کبھی جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ یہ کس کا ہوٹل تھا یا کس قسم کا ہوٹل تھا۔ بہرحال اس میں شک نہیں تھا کہ چھوٹا ہونے کے باوجود وہ ایک مہنگا ہوٹل تھا۔ اس کی تزئین و آرائش پر پیسا بھی دل کھول کر خرچ کیا گیا تھا اور کم سے کم جگہ میں زیادہ سے زیادہ شان و شوکت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کے بارے میں جو اُڑتی اُڑتی سی باتیں سننے میں آتی رہتی تھیں ان سے البتہ کسی حد تک اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔

گاڑی سے اتر کر میں نے شمیم کو آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ کچھ اس طرح آگے بڑھی جیسے اسکول میں کوئی سنگین شرارت کرنے والے بچے کو پرنسپل نے اپنے دفتر میں طلب کیا ہو۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

باہر سے ہوٹل کی ساخت کئی منزلہ کوٹھی سے مشابہ تھی۔ مین گیٹ سے لابی کے دروازے تک خوبصورت اور رنگا رنگ سائبان نصب تھا جس میں چھوٹے چھوٹے رنگا رنگ فانوس آویزاں تھے۔ ایک طرف چھوٹا سا خوب صورت لان اور دوسری طرف پارکنگ لاٹ تھی۔ دونوں طرف جانے کے لئے علیحدہ علیحدہ پختہ روش موجود تھی۔

لابی کا دروازہ تاریک اور موٹے شیشے کا تھا۔ اسے دیکھ کر خوامخواہ ہی کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے عقب میں کوئی پراسرار دنیا آباد تھی۔ در و دیوار کی ساخت میں امپورٹیڈ شیشے اور امپورٹیڈ ہی ٹائیلوں کا بہت زیادہ استعمال کیا گیا تھا۔ لابی کے قالین میں پاؤں دھنسے جارہے تھے۔

ریسپشن کے نیم دائرہ نما کاؤنٹر پر جو کلرک موجود تھا وہ استقبالیہ کلرک کے بجائے ریسلنگ چیمپئن معلوم ہو رہا تھا۔ غنیمت تھا کہ وہ ریسلرز والے حلئے میں نہیں تھا۔ جدید فیشن کا کوٹ پہنے ہوئے تھا' بو بھی لگائی ہوئی تھی۔ بال بھی سلیقے سے جمے ہوئے تھے اور خوب چمک رہے تھے۔

شمیم کو دیکھ کر وہ مسکرایا لیکن نظروں میں سوال بھی تھا۔ مجھے دیکھ کر نہ جانے کیوں اس کی مسکراہٹ غائب ہوگئی اور آنکھوں میں یکدم سرد مہری آگئی لیکن چونکہ شمیم اسے نظر انداز کرتے ہوئے آگے بڑھتی چلی گئی تھی اس لئے میں نے بھی اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ میں نے مڑ کر تو نہیں دیکھا لیکن محسوس کیا کہ ہمارے آگے بڑھتے ہی اس کا ہاتھ ٹیلیفون کی طرف چلا گیا تھا۔

سیڑھیوں کے قریب سرخ ٹوپی والا ایک باوردی شخص کھڑا تھا۔ اس کے کندھے سے گن لٹکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر شمیم کو دیکھ کر شناسائی کی کوئی رمق نہیں ابھری۔ اس نے گہری نظروں سے ہمیں دیکھا تاہم روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا چہرہ بدستور پتھرایا ہوا سا رہا۔

ہوٹل چار منزلہ تھا۔ اس میں لفٹ نہیں تھی۔ پہلی منزل پر بھی ہمیں ایک باوردی' مسلح محافظ کھڑا نظر آیا۔ میں نے اس درجے کے کسی ہوٹل میں اس طرح سیڑھیوں اور لفٹ کے قریب مسلح محافظ کھڑے نہیں دیکھے تھے۔

دوسری منزل کی سیڑھیاں چڑھتے وقت شمیم میری طرف مڑتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ "مختار رفیق کا دفتر ٹاپ فلور پر ہے۔ سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے تمہیں پسینہ آجائے گا۔"

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا کیونکہ پسینہ اس وقت خود اس کی پیشانی پر چمک رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ اس کی وجہ سیڑھیاں چڑھنے کی مشقت نہیں بلکہ مختار کے سامنے جانے کی گھبراہٹ تھی۔

اس کی شخصیت پر باکسر کا گمان گزرتا تھا۔ اس کا ہاتھ بھی ایک باکسر ہی کا ہاتھ تھا۔ تاہم اس نے مجھے اپنی طاقت کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے بھی ہاتھ ڈھیلا ہی رکھا۔

اس نے بڑے احترام سے جھکتے ہوئے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "میرے پاس وقت کم ہے مسٹر مختار رفیق! میں صرف ایک چھوٹا سا معاملہ طے کرنے آیا ہوں۔"

"ارشاد۔" وہ دونوں ہاتھ میز پر ٹکاتے ہوئے ذرا آگے کو جھک آیا۔

"تمہارے پاس شیم اور ریاض کے دستخطوں کے ساتھ کوئی اسٹامپ پیپر موجود ہے، ہم وہ واپس لینے آئے ہیں۔" میں نے ہموار لہجے میں کہا۔

اس نے اداس نظروں سے شیم کی طرف دیکھتے ہوئے متأسفانہ سے انداز میں سرہلایا۔ "بہت بری بات ہے شیم بیگم! اپنے کاروباری راز اس طرح فاش کرتے پھرنا بہت بری بات ہے۔ اور اگر تم چوہدری صاحب کو مہمان کے بجائے حمایتی کی حیثیت سے ساتھ لائی ہو تب بھی بہت بری بات ہے۔"

شیم کے بجائے میں نے ہی جواب دیا۔ "ہم یہاں تم سے کسی بات کے اچھی یا بری ہونے کے بارے میں فتویٰ لینے نہیں آئے، صرف وہ اسٹامپ پیپر لینے آئے ہیں۔"

جس آہستگی سے وہ اٹھا تھا اسی آہستگی سے دوبارہ بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں بلا کی سرد مہری آگئی۔ ہم سوالیوں کی طرح اس کے سامنے کھڑے تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا تو اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ "چوہدری صاحب! آپ اتنی محبت.... اتنی اپنائیت اور اتنے جوش و خروش سے شیم بیگم کے لیے وہ اسٹامپ پیپر لینے آئے ہیں تو آپ کو یقیناً معلوم ہوگا کہ اس کی نوعیت کیا ہے؟"

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے وہ بارہ لاکھ کے قرض کی ادائیگی کا اقرار نامہ ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بارہ لاکھ بہت بڑی رقم ہوتی ہے چوہدری صاحب! مجھ جیسے کاروباری آدمی کے لیے تو بہت بڑی رقم ہے.... اور مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے بڑے آدمی کے لیے بھی یہ کچھ ایسی چھوٹی رقم نہیں ہوگی۔" اس کے لہجے میں برف زاروں کی سی سرد مہری برقرار تھی۔ "انسان معاہدے اس لیے کرتا ہے کہ ان کی پاس داری کرے۔ قانونی کاغذات اسی لیے تیار کرائے جاتے ہیں، لکھت پڑھت اسی لیے کی جاتی ہے کہ کوئی کسی کے حقوق کی خلاف ورزی نہ کرے۔ جہاں خلاف ورزی ہوتی ہے وہاں نقصان ہوتا ہے چوہدری صاحب۔ کبھی جانی نقصان، کبھی مالی نقصان۔ خلاف ورزی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" وہ گویا ایک سرد مہر بزرگ کی طرح مجھے سمجھا رہا تھا۔

"بے شک خلاف ورزی بہت بری بات ہے لیکن بے ایمانی اس سے بھی بری بات ہے۔" میں نے ملامت سے کہا "نہیں۔ میں اس وقت نصیحتیں کرنے یا نصیحتیں سننے کے لیے نہیں آیا۔ میں اس بحث میں بھی نہیں پڑوں گا کہ تم نے شیم اور راجو سے یہ بارہ لاکھ ہتھیانے.... یا اس قرض کی بنیاد پر شیم کو بلیک میل کرنے کی منصوبہ بندی کس طرح کی تھی۔ میں تو سیدھے طریقے سے اس مسئلے کو نمٹانے آیا ہوں۔"

میں نے جیب سے چیک بک نکالی، بارہ لاکھ کا چیک لکھا اور انگلی سے میز پر اس کی طرف کھسکا دیا۔ اس نے چیک اٹھا کر دیکھا۔ اس کی دونوں بھویں نیم دائروں کی سی صورت میں سکڑ گئیں۔ پھر نہایت آہستگی سے اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر مسکراہٹ ابھری۔

پُرخیال انداز میں ایک انگلی سے ٹھوڑی کھجاتے ہوئے اس نے باری باری مجھے اور شیم کو دیکھا، جیسے ہر زاویے سے ہمارے سراپے کی پیمائش کر رہا ہو۔ پھر سر ہلاتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب! شیم چیز تو ایسی ہے کہ اس کی دلداری کے لیے بارہ لاکھ خرچ کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن پھر بھی مجھے حیرت ہوئی ہے۔ آپ کی راہ و رسم تو بہت اونچے درجے کی عورتوں سے ہے۔ یہ اوپر ہی اوپر شیم سے اتنی محبتیں کب پروان چڑھ گئیں کہ ہمیں پتا ہی نہیں چلا؟"

"بات صرف اتنی ہی ہوگی جتنی ضروری ہے۔" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "میں یہاں تمہارے گندے ذہن میں پیدا ہونے والے سوالوں کے جواب دینے نہیں آیا لیکن شاید ان الجھاووں میں تمہیں رات بھر نیند نہ آئے اس لیے بتاتا چلوں کہ اتفاق سے شیم اور اس کا شوہر، دونوں ہی میرے بچپن کے ساتھی ہیں۔ ہم ایک ہی گاؤں کی گلیوں میں کھیلے اور پلے بڑھے ہیں۔ ریاض مجھے فلم دکھانے کے لیے اپنے باپ کی دکان سے پیسے چرا کر لایا کرتا تھا آج اگر مجھے بارہ لاکھ دے کر اس کی یا اس کی بیوی کی کسی خبیث کے چکروں سے جان چھڑانی پڑ رہی ہے تو میرے لیے یہ مہنگا سودا نہیں ہے لیکن تم جیسے جانور بھلا نازک جذبات اور احساسات کی ان باریکیوں کو کہاں سمجھتے ہوں گے، اس لیے ان باتوں کو رہنے دو۔"

اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے دلچسپی کی لہر ابھری لیکن اپنے لیے خبیث اور جانور وغیرہ کے القاب سن کر اس کے چہرے پر سختی سی آگئی۔ اس کا چہرہ یکدم پتھر سے ترشا ہوا دکھائی دینے لگا۔ اس نے میرے عقب میں کھڑے ہوئے منظور کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے ریوالور کی نال بہت سختی سے میری ریڑھ کی ہڈی میں چبھنے لگی۔

"چوہدری صاحب!" میرے عقب سے منظور کی آواز سنائی دی۔ "باس سے کوئی اس زبان میں بات کرے تو ہمیں بہت سخت برا لگتا ہے۔ خاص طور پر مجھ سے تو برداشت ہی نہیں ہوتا۔ دل چاہتا ہے دونوں گردوں میں ایک ایک گولی اتار دوں۔"

میں اتنی تیزی سے گھوما کہ شاید اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہو، کوئی اتنی تیزی سے بھی گھوم سکتا ہے۔ غنیمت تھا کہ میرے اور شیم کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ پھر بھی میں احتیاطاً اس طرف گھوما تھا جدھر شیم نہیں تھی ورنہ وہ لپیٹ میں آسکتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے منظور کے حلق سے ہلکی سی کراہ نکلی کیونکہ میں نے اس کی کلائی پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا تھا۔

اسے یقیناً کسی سوئیڈ بوٹیڈ "چوہدری صاحب" سے اتنی پھرتی اور اس قسم کی چاپ کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ میں نے شکر کیا کہ اس اچانک ضرب سے اس کی انگلی سے ٹریگر نہیں دب گیا تھا۔ ویسے زیادہ امکان یہی تھا کہ ٹریگر دب جاتا تو گولی مختار کو لگتی یا اس کی میز میں پیوست ہوتی کیونکہ میں سامنے سے ہٹ چکا تھا لیکن فی الحال میں مختار کو بھی گولی لگتے دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

منظور اپنی مضروب کلائی کو دوسرے ہاتھ سے پکڑ کر دہرا ہو چکا تھا، ریوالور نیچے آگیا تھا۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر وہ اٹھا لیا۔ میری نظر اب مختار اور منظور دونوں ہی پر تھی۔ مختار نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی اور میں نے اطمینان کر لیا تھا کہ اس کا ہاتھ کسی دراز کی طرف بھی نہیں بڑھ رہا تھا۔

میں نے منظور کو مخاطب کیا۔ "میری ایک نصیحت یاد رکھنا۔ ہتھیار اس وقت تک مت نکالو جب تک اسے استعمال کرنے کا قطعی فیصلہ نہ کرلو۔"

اس کے ساتھ ہی میں نے اس کی کھوپڑی پر اس کے ہی ریوالور کا دستہ رسید کیا۔ وہ ابھی کلائی کو ہی پکڑے کراہ رہا تھا۔ کلائی کی ہڈی غالباً ٹوٹ چکی تھی، اب کھوپڑی بھی چیخ گئی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح ڈھیر ہو گیا۔ میں نے ٹھوکر سے اسے کمرے کے ایک کونے میں پہنچا دیا، پھر اپنے اور شیم کے لیے کرسیاں کھینچ کر بیٹھتے ہوئے مختار کو مخاطب کیا۔ "اب ہم اطمینان سے بات کر سکتے ہیں۔ یہ مدعی سست گواہ چست قسم کے لوگ خواہ مخواہ بیچ میں دخل دیتے رہتے ہیں۔"

مختار کے چہرے پر پھیلی ہوئی طمانیت اور خود اعتمادی میں تھوڑی سی کمی آچکی تھی لیکن وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کا اظہار نہ ہونے پائے۔ وہ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے بیٹھا تھا۔ چیک اس کے سامنے رکھا تھا۔

"میں چیک کاٹ چکا ہوں مختار رفیق!" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اب اسٹامپ پیپر دینے میں تمہاری طرف سے تاخیر کیوں ہے؟"

وہ جیسے کسی خیال سے چونکا اور سنبھلتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب! ہمارے ملک میں چونکہ چیک ڈس آنر ہونے پر کوئی سزا وغیرہ نہیں ہے، اس لیے بعض لوگ بات بات پر چیک کاٹتے رہتے ہیں۔ بارہ لاکھ کا معاملہ ہے، میں کاغذ کے اس پرزے پر کیسے اعتبار کرلوں جسے اس وقت بینک میں بھی پیش نہیں کیا جا سکتا۔"

"مختار!" تم نے زندگی میں کبھی کسی پر اعتبار کرنا نہیں سیکھا؟" میں نے حقارت سے پوچھا۔

"اعتبار کا دوسرا نام خطرہ مول لینا ہے چوہدری صاحب! پیسے کے علاوہ میں ہر چیز میں خطرہ مول لینے کے لیے تیار رہتا ہوں۔" وہ بولا۔ میری طرح اب وہ بھی کونے میں پڑے ہوئے منظور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے وہ اس کا محافظ تھا، اب گویا روی کا ڈھیر تھا جو ایک کونے میں پڑا تھا۔

"روپیا پیسا دنیا میں سب سے گھٹیا چیز ہے اور تم اسی کے معاملے میں اتنے بے اعتبارے ہو؟" میں نے اپنے لہجے کی حقارت برقرار رکھی۔

"اس قسم کی باتیں فلموں اور کہانیوں میں اچھی لگتی ہیں چوہدری صاحب! آپ اس معاشرے میں بیٹھ کر روپے پیسے کو سب سے گھٹیا چیز قرار دے رہے ہیں جہاں روپے پیسے کے لیے آپ کو بہنوں کا سودا کرنے والے بھی مل جائیں گے اور وطن کا سودا کرنے والے بھی۔" وہ زہریلے انداز میں ہنسا۔ "اس قسم کی بحث میں

الجھنے کا وقت آپ کے پاس شاید ہو' میرے پاس بالکل نہیں ہے۔"

"بحث تو بہت ہی فضول چیز ہے کیونکہ ہمارے ہاں کوئی آدمی کسی دوسرے کے موقف کا کبھی قائل نہیں ہوتا۔ میرے پاس بحث میں الجھنے کے لیے تو کیا' اس کام کے لیے بھی وقت نہیں تھا جس کے سلسلے میں آیا ہوں۔ تم سے پھر کسی وقت ملاقات کا پروگرام تھا لیکن بس اچانک ہی کھوپڑی گھوم گئی۔ یہ جو تم نے چیک ڈس آنر ہونے کی بات کی ہے' تو ہر ایک کو اپنے جیسا گھٹیا بزنس مین مت سمجھا کرو۔ یہ تو چیک ہے' میں اگر چٹ بھی لکھ کر بھیج دوں تو شاید بینک منیجر تمہیں بارہ لاکھ دے دے۔ وہ صرف فون پر مجھ سے تصدیق کرے گا کہ چٹ واقعی میں نے ہی بھیجی ہے' تم جیسا کوئی اُچکا جعلی تو لکھ کر نہیں لے آیا۔"

اس کا سانولا چہرہ کچھ اور تاریک ہوتا جارہا تھا۔ یقیناً اس کے جسم میں خون کی گردش بہت تیز ہوچکی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ شمیم کی موجودگی کی وجہ سے وہ زیادہ توہین محسوس کررہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ان میاں بیوی پر اس کی زبردست دہشت طاری تھی لیکن اب یہ تاثر درہم برہم ہورہا تھا۔ ظاہر ہے وہ ایسا ہرگز نہیں چاہتا تھا لیکن میں ایسا ہی چاہتا تھا۔

وہ اس تاثر کو اتنی آسانی سے برباد ہوتے دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہوئے۔ آنکھوں میں خون سا اترا ہوا تو پہلے ہی محسوس ہورہا تھا' اب آنکھیں کچھ اور انگارہ سی ہوگئیں۔ دونوں ہاتھوں سے اس نے میز کے کنارے کو اس طرح پکڑلیا جیسے وہ ہاتھ نہیں' شکنجے ہوں۔ میرا اندازہ تھا کہ میز اگر کسی ذرا بھی نرم چیز سے بنی ہوتی تو پچک جاتی۔ اس کی چوڑی پیشانی پر ایک موٹی سی نس پھڑکتی ہوئی صاف دکھائی دینے لگی۔

جب وہ بولا تو اس کا لہجہ یکسر بدلا ہوا تھا۔ اس نے گویا اپنے اصل روپ میں آنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ وہ گویا مجھے آنکھوں اور لہجے سے قتل کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تم اس عمارت سے زندہ واپس نہیں جانا چاہتے چوہدری؟ ایک آدمی کو ڈھیر کرکے تم سمجھ رہے ہو کہ تم نے دنیا فتح کرلی؟"

اس کا ہاتھ جس تیزی سے دراز کی طرف بڑھا' اس تیزی سے شاید سانپ بھی کسی چیز پر پھن نہ مارتا ہو لیکن دراز کھلنے سے پہلے ہی میں کرسی سے اٹھ کر اس کی گردن دبوچ چکا تھا۔ میز بڑی تھی اور بیچ میں حائل تھی مگر میں اسے گردن سے پکڑ کر باہر گھسیٹنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس کی کرسی اُلٹ گئی اور میز بھی اپنی جگہ سے ہٹ گئی۔ شمیم ہلکی سی چیخ مار کر کچھ دور جا کھڑی ہوئی۔ میں نے گردن ہی سے پکڑے پکڑے مختار کو اونچا کردیا تھا۔ اس کی ٹانگیں ہوا میں جھول رہی تھیں۔ وہ ایک دراز قد' مضبوط اور ٹھوس سا شخص تھا۔ اسے اس طرح اٹھانا میری طاقت کا امتحان تھا۔ شکر ہے مجھ سے اندازے کی کوئی غلطی نہیں ہوئی تھی اور میں اس امتحان میں کامیاب رہا تھا۔

اس کی آنکھیں ابل آئی تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کے لیے مجھے گھٹنا یا ٹھوکر رسید کرتا' میں نے اسے کونے میں بے ہوش پڑے ہوئے اس کے گارڈ پر پھینک دیا۔

ایک لمحے کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے میں الجھ کر رہ گئے۔ مختار کے حلق سے خرخراہٹ کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے اس کے مزید کس بل نکالنے کے لیے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی پھر گریبان سے پکڑ کر اسے کھڑا کیا۔

میرا اندازہ غلط نکلا۔ اس کے کس بل نکلے نہیں تھے۔ اس نے سیدھا ہوتے ہی مجھے ٹھوکر رسید کرنے کی کوشش کی۔ ٹھوکر سے تو میں بچ گیا لیکن اس کے لیے مجھے اس کا گریبان چھوڑنا پڑا۔ گریبان چھوٹتے ہی اس نے بن مانس کی طرح مجھ پر چھلانگ لگائی۔

عام حالات میں وہ ایک طاقتور آدمی تھا لیکن میں نے اسے جو جھٹکا دیا تھا اور اس کی پسلیوں میں جو ٹھوکر رسید کی تھی اس کی وجہ سے اس میں زیادہ دم خم نہیں رہا تھا۔ وہ غصے میں اندھا ہوکر مجھ پر جھپٹا تھا۔ غصے میں اندھے ہونے والے عموماً مجھ سے زیادہ مار کھاتے تھے۔

جس انداز میں وہ مجھ پر جھپٹا تھا' میں چاہتا تو اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر پٹخ دیتا لیکن دو وجوہات کی بنا پر میں باز رہا۔ ایک تو انتہائی دبیز قالین کی وجہ سے اسے چوٹ کم لگتی' دوسرے نچلی منزل پر اچھی خاصی دھمک سنائی دیتی جو کسی کو تشویش میں مبتلا کرسکتی تھی۔

شمیم ایک اور ہلکی سی چیخ مار کر بالکل ہی کونے میں جا گھسی۔ میں نے مختار کو جھکائی دی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا ذرا آگے کو گیا تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کے معاملے میں میری نظر نہ جانے کس وقت ایک لمحے کے لیے چُوک گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک کھلا اُسترا نظر آرہا تھا جو اس نے نہ جانے کب اور کہاں سے نکالا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ریوالور اس کی جیب میں نہیں تھا ورنہ وہ ریوالور بھی نکال سکتا تھا۔

بہرحال میری نظر کی چوک مجھے اب بھی مہنگی پڑسکتی تھی۔ اُسترا کوئی کم خطرناک چیز نہیں تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اسی وقت ہوگیا جب وہ لڑکھڑاتا ہوا کچھ آگے نکل گیا لیکن میرے کوٹ کی آستین ایک جگہ سے کٹ گئی۔ وہ اپنا وار کرگیا تھا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اس کی زد میں صرف آستین ہی کا کچھ حصہ آیا تھا' بازو بچ گیا تھا۔

میں نے آج تک سنا تو تھا کہ کچھ بدمعاش اُسترے سے بھی لڑتے ہیں لیکن کسی کو لڑتے دیکھا نہیں تھا۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے ایک بدمعاش کا تذکرہ سنا تھا جس کے نام کے ساتھ ہی "اُسترا" لگا ہوا تھا۔ وہ "جیدا اُسترا" کے نام سے مشہور تھا۔ اصل نام عبدالمجید تھا۔ سنا تھا کہ وہ اُسترے سے لڑائی کے فن میں بادشاہ تھا۔ کئی

آدمیوں کی گردن اڑا چکا تھا لیکن ایک لڑائی میں کسی کا صرف ایک گھونسا کھا کر مرگیا تھا۔ اخبار میں خبر چھپی تھی۔

مگر یہ ذرا نچلے درجے کے.... کچھ اور طرح کے بدمعاشوں کی باتیں تھیں۔ سینماؤں کے ہجوم میں ٹکٹوں کی بلیک پر... تنگ و تاریک گلیوں میں کچی شراب کی بھٹیوں اور جوئے کے اڈوں پر اس طرح کی لڑائی کا تصور کیا جاسکتا تھا لیکن اس عمدہ ہوٹل میں' اس شاندار آفس میں میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ایک کروڑپتی اور سوٹڈ بوٹڈ شخص مجھ پر اُسترا نکال کر جھپٹ پڑے گا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ وہ بدمعاش تھا لیکن اس قسم کی بدمعاشی....!

اس معاملے میں خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا تھا۔ میں نے سوچا' کوئی بعید نہیں' وہ اُسترے سے لڑنے کے معاملے میں جیدے اُسترے ہی کی طرح ماہر فن ہو اور اسی لیے اس نے اس آڑے وقت میں یہ ہتھیار نکالا ہو۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا کچھ آگے نکل گیا تھا۔ میں نے مشینی انداز میں اس کی کمر پر لات رسید کی۔ لات ٹھیک ٹھاک ہی پڑگئی۔ وہ رکوع کی سی حالت میں دیوار سے جا ٹکرایا۔ اس کا سر یقیناً غیر معمولی طور پر مضبوط تھا۔ دیوار سے اس کا سر ٹکرانے کی کچھ ایسی ہی آواز آئی تھی جیسے لوہے کا بڑا سا گولا ٹکرایا ہو۔

وہ اوندھے منہ گرا۔ میں نے لپک کر اس کی کلائی جوتے کے نیچے دبالی۔ میں نے پاؤں پر وزن اتنا بڑھایا کہ استرا اس کی گرفت سے نکل گیا۔ میں نے پہلے اسے اٹھا کر بند کرکے جیب میں ڈالا۔ میری دوسری جیب میں منظور کا ریوالور موجود تھا۔

پھر میں نے عقب سے اس کی گردن پکڑ کے اسے اٹھایا۔ اس کے حواس مختل تھے۔ اب اس کے کس بل نکل چکے تھے۔ میں نے اسے گریبان سے پکڑ کر اٹھایا اور اس کی تلاشی لی۔ اس کے پاس اور کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میرے لیے یہ خاصی حیرت کی بات تھی۔

میں نے اسے گھسیٹ کر کرسی کے بجائے اس کی میز پر بٹھادیا اور اسے تھوڑا سا جھنجوڑتے ہوئے کہا۔ "اسٹامپ پیپر بارہ لاکھ کی ادائیگی کا ہے اور تمہیں بارہ لاکھ کا چیک مل گیا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

اس نے اثبات میں سرہلایا۔ میں نے اسے مزید ایک ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "اس میں بے ایمانی والی تو کوئی بات نہیں نا؟"

اس نے نفی میں سرہلایا۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ اس کی قمیص کا اگلا حصہ اور ٹائی چُرمُر ہوچکی تھی' کوٹ بغلوں پر سے پھٹ چکا تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا۔ "چلو.... اب اسٹامپ پیپر نکالو۔"

"وہ یہاں نہیں ہے۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا۔

"کیا تمہیں ابھی کچھ اور درگت بنوانی ہے؟" میں نے دوبارہ اس کا گریبان پکڑلیا۔ اس میں اتنی بھی سکت نہیں تھی کہ گریبان چھڑا لیتا۔ میں نے اس کے عقب میں دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ سامنے مجھے دیوار میں سیف نظر آرہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم کیش اور ضروری کاغذات اس میں ہی رکھتے ہوگے۔"

"کیش اور کاغذات اس میں ضرور ہیں...." وہ ناہموار سانسوں کے درمیان بولا۔ "لیکن وہ اسٹامپ پیپر ہیڈ آفس میں ہے۔"

"یہ مت سمجھنا کہ یہ بات سن کر میں تمہیں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ میں تمہیں اسی حالت میں تمہارے اس ہوٹل سے تمہارے جیالوں کے سامنے گھسیٹتا ہوا ہیڈ آفس تک بھی لے جاؤں گا۔ کسی خوش فہمی میں مت رہنا۔ بہتر یہی ہے کہ پیپر اگر یہاں موجود ہے تو میرے حوالے کردو۔ اگر میں تمہیں ہیڈ آفس لے گیا اور پیپر وہاں نہ ملا تو تمہارے منہ میں ایک بھی دانت باقی نہیں رہے گا۔"

اس نے ایک لمحے سوچا۔ اب غالباً اسے یقین آچکا تھا کہ میں جو کہوں وہ کرکے دکھا سکتا ہوں۔ وہ اٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا سیف کی طرف چل دیا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ اسٹامپ پیپر یقیناً سیف میں موجود تھا۔

"کوئی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرنا ورنہ تمہیں یہ بھی پتا نہیں چل سکے گا کہ تمہارے ساتھ ہوا کیا؟ بس تم اپنے آپ کو عالم بالا پر پاؤ گے۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ سیف میں کوئی ہتھیار یا اس کا متبادل بھی موجود ہوسکتا تھا اور وہ اسے استعمال کرنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ تاہم میں نے اس کے سر پہ جا کر کھڑے ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ میں میز ہی کے قریب کھڑا رہا تاکہ ضرورت پڑنے پر فوری طور پر اس کی آڑ میں ہوسکوں۔ کمرا بہت بڑا تھا' اسی لیے اتنی

دھینگا مشتی کے باوجود سامان کی ٹوٹ پھوٹ نہیں ہوئی تھی۔
شمیم میرے قریب آکھڑی ہوئی اور سرگوشی میں بولی۔ "اُف! مجھے نہیں معلوم تھا' تم اتنے نڈر اور خطرناک آدمی ہو۔"

"میرے بارے میں تمہاری معلومات میں شاید گاہے بہ گاہے اضافہ ہوتا رہے۔" میں نے سرگوشی میں ہی جواب دیا' پھر احتیاطاً مختار کو ایک بار اور خبردار کیا۔ "میرے ہاتھ میں ریوالور ہے۔ اگر تجوری سے مجھے کاغذ کے علاوہ کچھ اور باہر آتا دکھائی دیا تو اس کے ساتھ ہی تمہارا بھیجا بھی کھوپڑی سے باہر آجائے گا۔ پیپر ذرا ایک طرف کو ہٹ کر نکالنا تاکہ میں تمہارے ہاتھ پر نظر رکھ سکوں۔"

اس نے سیف میں چابی لگائی پھر ڈائل گھما کر نمبر ملائے۔ تجوری کھلی تو سامنے ہی مجھے ایک خانے میں بہت سی گڈیاں بھی دکھائی دیں جو یقیناً نوٹوں کی تھیں۔ اس نے دوسری چابی لگا کر نیچے کا ایک چھوٹا خانہ کھولا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے اسٹامپ پیپر کسی فائل میں لگا رکھا ہوگا لیکن وہ رول کی شکل میں رکھا ہوا تھا۔ مختار میری ہدایت کے عین مطابق محتاط انداز میں اسے نکال کر میز کی طرف لوٹ آیا۔ پیپر پر ربر رنگ چڑھا ہوا تھا۔

اس نے کاغذ کا رول یوں میری طرف بڑھایا جیسے مجھے کسی گن سے شوٹ کر رہا ہو۔ ظاہر ہے اس وقت اس کی دلی خواہش تو یہی تھی۔ لاشعوری سے انداز میں وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

میرے ہاتھ میں منظور والا ریوالور تھا۔ دوسرا ہاتھ جیب میں تھا۔ میں نے شمیم کو اشارہ کیا۔ اس نے لرزتے ہاتھ سے رول تھام لیا۔

"اسے کھول کر دیکھ لو' یہی تمہارا مطلوبہ اسٹامپ پیپر ہے نا؟" میں نے کہا۔ شمیم نے پیپر کھول کر دیکھا اور اثبات میں سر ہلایا۔ اس کے ہونٹ خشک نظر آرہے تھے۔ شاید اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"پرس میں رکھ لو اسے۔" میں نے اسے ہدایت کی۔ اس نے قدرے بوکھلا کر ادھر ادھر دیکھا۔ اس کا پرس کچھ دور قالین پر پڑا تھا۔ اس نے لپک کر اسے اٹھایا اور پیپر اس میں رکھ لیا۔ وہ ابھی تک بدحواس ہی تھی جبکہ مختار کچھ سنبھل چکا تھا۔ اس کے چہرے پر ٹھہراؤ اور خود اعتمادی واپس آچکی تھی۔

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں بولا۔ "یہ تم نے شمیم کے ساتھ دوستی نہیں نبھائی چوہدری! دشمنی کی ہے اس کے ساتھ۔ کتنی ہی زندگیوں کو خطرے میں ڈال دیا ہے تم نے۔ بازوؤں کی طاقت اور لڑنے میں مہارت ہر وقت' ہر جگہ کام نہیں آتی۔ تمہیں شاید شمیم نے میرے بارے میں صحیح طرح بتایا نہیں۔"

"اس نے تو بہت ہی بڑھا چڑھا کر بتایا تھا۔ دیکھ نہیں رہے یہ تم سے کتنی مرعوب ہے۔ ابھی تک اس کے حواس ٹھکانے نہیں ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئی شمیم کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن سچی بات ہے کہ اس سے تمہارے بارے میں اتنا کچھ سننے کے بعد مجھے تم سے مل کر مایوسی ہوئی ہے۔ اچھی خاصی مایوسی۔"

"تمہاری مایوسی جلد دور ہوجائے گی چوہدری!" اس کی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھی۔ "بہت مہنگا پڑے گا تمہیں اس عورت کے چکر میں الجھنا۔"

"کاش تمہارے ذہن سے یہ چکر نکل سکے کہ میں اس عورت کے چکر میں الجھا ہوا ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "خیر۔ اب تم سے تعارف ہوگیا ہے' یہ باتیں تو ہوتی ہی رہیں گی۔ فی الحال میں تمہیں ایک تکلیف اور دوں گا۔ ذرا باتھ روم میں چلے جاؤ۔ شاید اس وقت تمہیں ضرورت بھی محسوس ہو رہی ہو۔"

اس نے خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں نے ریوالور کو حرکت دی تو وہ بادل نخواستہ باتھ روم کی طرف چل دیا لیکن دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ میں نے اس کی طرف دو قدم بڑھائے تو وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ میں نے یہ پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ دروازے پر باہر کی طرف بھی بولٹ موجود تھا۔ اس سے پہلے کہ اندر پہنچتے ہی کوئی شرارت اس کے ذہن میں آتی' میں نے لپک کر بولٹ چڑھا دیا۔

پھر میں نے بے ہوش پڑے ہوئے منظور کو ہلا جلا کر دیکھا۔ اس کے جلدی ہوش میں آنے کا کوئی امکان نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے اپنا حلیہ ذرا درست کیا اور شمیم کو ساتھ چلنے کا اشارہ کرکے کمرے سے نکل آیا۔ دروازہ میں نے نہایت احتیاط اور آہستگی سے بند کیا۔

نچلی منزل پر پہنچنے تک میں نے ہونٹوں پر نہایت مہذبانہ مسکراہٹ بھی سجالی گویا ہم مختار رفیق سے نہایت خوشگوار ملاقات کرکے واپس آرہے تھے لیکن شمیم کا خوف ابھی تک دور نہیں ہوا تھا۔ راستے میں وہ سرگوشی میں بولی۔ "تم نے اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی کردی۔ واپسی کا کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔"

"اپنے حساب سے تو میں نے کم کی ہے۔" میں نے کہا۔ "ایسے آدمیوں کو تو میرا قبرستان پہنچانے کو جی چاہتا ہے جو مختلف کونوں کھدروں میں زمین کے سینے پر خدا بنے بیٹھے رہتے ہیں۔"

"لیکن وہ ابھی زندہ ہے۔ اور تم ہر لمحے تو ہماری حفاظت کے لیے ہمارے ساتھ نہیں رہ سکتے۔" وہ بولی۔

"ہر لمحے اپنے بندوں کی حفاظت کرنا اوپر والے کا کام ہے۔" میں نے چھت کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔

"تمہارا یہ درویشانہ مکالمہ مجھے اطمینان نہیں دے سکتا۔"

"بدنصیبی ہے تمہاری۔" میں نے کہا۔ "میں اس طرح خوف سے کانپنے والوں کو اپنے دوستوں میں شمار نہیں کرسکتا۔ اگر تم نے

مزید اس طرح کی بزدلانہ باتیں کیں تو میں تمہیں واپس اوپر اسی کے کمرے میں چھوڑ آؤں گا۔ تم اسٹامپ پیپر اسے واپس کردینا۔ میں اپنا چیک بھی واپس نہیں لوں گا۔ تم اس کے پیروں میں گر جانا اور رو رو کر فریاد کرنا۔ "میرے آقا! مجھے معاف کردیجئے۔ وہ بدبخت اور بدمعاش چوہدری خواہ مخواہ میری حمایت پر کمربستہ ہوگیا تھا۔ میں نے تو یونہی اسے وقت گزاری کے لیے اپنی داستان غم سنائی تھی۔" پھر شاید وہ بارہ لاکھ کے عوض اپنی اور منظور کی پٹائی کو بھول جائے اور تمہیں معاف کردے۔ یوں تم ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگو۔ اس المیہ کہانی کا انجام طربیہ ہوجائے' مار دھاڑ کا سین یہیں ختم ہوجائے۔"

"بہت کٹھور ہو تم۔" اس نے خفگی سے میری طرف دیکھا۔ "مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ تم اتنے بدمعاش ہوگئے ہو۔"

"مجھے بار بار بدمعاش کہہ کر میری توہین مت کرو۔ میں ایک انتہائی شریف آدمی ہوں لیکن نہایت مضبوط قسم کا شریف آدمی۔ زیادہ تر شریف آدمیوں کا المیہ یہ ہے کہ وہ بے چارے کمزور ہوتے ہیں اس لیے یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ اپنی کمزوری کی وجہ سے مجبوراً شریف ہیں۔ حالانکہ انہی میں سے کوئی کبھی "تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق یکدم بدمعاشی پر اتر آتا ہے تو بڑے بڑے بدمعاشوں کے چھکے چھڑا دیتا ہے۔"

اس دوران ہم نچلی منزل پر پہنچ چکے تھے۔ شوکا ایک بار پھر کسی بدروح کی طرح ہمارے سامنے آگیا۔ اس نے میرا مشین پسٹل مجھے واپس کرتے ہوئے کہا۔ "زحمت کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔"

اس قسم کے بدمعاش مہذبانہ الفاظ میں بھی کچھ کہتے ہیں تو لہجہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کی خودداری پر خراشیں ڈالتا چلا جاتا ہے۔ تاہم میں نے نہایت خوش خلقی سے دانت نکالتے ہوئے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔"

میں نے مشین پسٹل کوٹ کی باہر والی بائیں جیب میں ڈال لیا۔ جیب کے اندر اب پستول کا رخ اسی کی طرف تھا اور میں بائیں ہاتھ سے بھی ہر قسم کے حالات میں اتنا ہی عمدہ نشانہ لگا سکتا تھا جتنا دائیں ہاتھ سے۔

ہم سیڑھیوں کی طرف چل دیے۔ جب شمیم سیڑھیوں کی اوٹ میں ہوگئی تو میں نے سرگوشی میں اس سے کہا۔ "تم سیڑھیاں اترتی رہنا' واپس مت آنا۔"

اس کے بعد میں نے کچھ اس طرح چونکنے کی اداکاری کی جیسے مجھے اچانک کوئی بات یاد آئی ہو اور میں واپس شوکے کی طرف پلٹ پڑا۔ اس کے سامنے پہنچ کر میں نے دائیں جیب سے منظور کا پستول نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یار! یہ ذرا منظور کو پہنچا دینا' غلطی سے میرے پاس رہ گیا تھا۔"

اس نے اضطراری سے انداز میں ہاتھ بڑھا کر پستول لے لیا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا چہرہ متغیر سا ہوگیا۔ اس کا ذہن ایک لمحے کی تاخیر سے اس نکتے کو سمجھ سکا تھا کہ منظور کا ریوالور میرے پاس موجود ہونے کا مطلب کیا تھا۔

اس نے تیزی سے ریوالور سیدھا کیا اور ٹریگر دبا دیا۔ اگر اس میں گولی ہوتی تو یقیناً میرے سینے میں سوراخ ہوگیا ہوتا لیکن میں اتنا احمق نہیں تھا کہ لوڈڈ ریوالور اس کے ہاتھ میں دے دیتا۔

اس نے ریوالور ایک طرف پھینک دیا اور جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے بائیں جیب میں موجود مشین پسٹل کو حرکت دیتے ہوئے کہا۔ "نہیں چندا! اس قسم کی کوئی حرکت نہیں چلے گی۔ ہم تو پرسکون ماحول میں بات چیت کرنے والے مہذب لوگ ہیں نا۔"

میری جیب سے پسٹل کی نوک اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کا جیب کی طرف بڑھتا ہوا ہاتھ رک چکا تھا۔ اس کے چہرے پر اس وقت جو تاثرات تھے ان کی وضاحت بہت مشکل تھی۔ ان میں حیرت بھی تھی' بے یقینی بھی' غصے کی شدت سے نہ جانے کیا کچھ کر گزرنے کی خواہش بھی تھی اور مجبوری و بے بسی بھی۔

میں نے دائیں جیب سے مختار رفیق کا اُسترا بھی نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "یہ مختار کو دے دینا۔ یہ بھی غلطی سے میرے پاس آگیا تھا۔ اس سے کہنا' اکیلا اُسترا اچھا نہیں لگتا' باقی اوزار بھی خرید لے اور ایک صندوقچی میں رکھ کر صبح ہی صبح لوگوں کے

دروازے کھٹکا کر پوچھ لیا کرے کہ کسی کو شیو تو نہیں بنوانی یا بال تو نہیں کٹوانے؟ پارٹ ٹائم یہ کام اچھا رہے گا۔"

اس نے اُسترا لینے کے لیے تیزی سے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں پڑھ لیا کہ وہ اُسترا لے کر اسے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ اس کے ہاتھ تک پہنچنے سے پہلے میں نے اُسترا اسی طرف پھینک دیا جدھر اس نے خالی ریوالور پھینکا تھا۔ میں نے سوچا' کوئی بعید نہیں کہ وہ بھی اپنے سرپرست مختار کی طرح اُسترے کے استعمال میں استاد ہو... اور سچی بات یہ تھی کہ میں اسے کم از کم اس وقت گولی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ مشین پسٹل کی نال میں نے صرف دھمکانے کے لیے اس کی طرف کی ہوئی تھی۔

اُسترا لینے کے لیے وہ میرے قریب آچکا تھا اور اتنے قریب آکر وہ داؤ کھیلنے سے باز نہ رہ سکا۔ اس نے میری گردن اپنے بیلچہ نما چوڑے ہاتھ میں پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کا ارادہ غالباً میری گردن اپنے ہاتھ کے آہنی شکنجے میں جکڑ کر ایک طرف کو گھومتے ہوئے مجھے ہی اپنی ڈھال بنانے کا تھا۔

وہ اپنی جگہ بڑا پھنّے خاں اور بدمعاش سہی لیکن شاید اسے معلوم نہیں تھا کہ ان معاملات میں وہ میرے سامنے بچہ تھا۔ میں نے گردن بچاتے ہوئے اور ایک طرف کو ہٹتے ہوئے مشین پسٹل جیب سے نکال کر اس کا دستہ صرف ایک ہی بار اس کی کنپٹی پر رسید کیا اور وہ دُھپ سے اوندھے منہ وہیں گر پڑا۔

میں نے مشین پسٹل جیب میں رکھ لیا اور ہاتھ جھاڑ کر اطمینان سے سیڑھیوں کی طرف چل دیا۔ شمیم یوں تو اتنی ڈرپوک نظر آرہی تھی لیکن اس وقت اس نے میری ہدایت پر عمل نہیں کیا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے اتری نہیں تھی بلکہ سیڑھیوں کی دیوار کی اوٹ سے سر نکال کر سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "کیا تم نیچے پہنچنے تک راستے میں ملنے والے ہر شخص کو یونہی لٹاتے چلے جاؤ گے؟"

"میرے پاس اب اتنی بھی فالتو انرجی نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "میں تو صرف اسی کو لٹاتا ہوں جو مجھے لٹانے کی فکر میں ہوتا ہے۔"

باقی تینوں منزلوں پر بھی ہمیں اسی طرح مسلح گارڈ الرٹ کھڑے ملے۔ ان بے چاروں کو معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کا بگ باس اوپر باتھ روم میں بند تھا۔ ہم ریسپشن کے سامنے سے گزرے تو ریسلنگ چیمپئن قسم کے استقبالیہ کلرک نے ایک بار پھر بغور ہمارا جائزہ لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جب ہم لابی کا دروازہ کھول کر باہر جارہے تھے تو اس کا ہاتھ انٹرکام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ مختار کو جلد ہی مدد میسر آجائے گی اور اسے باتھ روم سے نکال لیا جائے گا۔

باہر آکر میں نے شمیم سے کہا۔ "اب گاڑی تم ہی چلاؤ۔ میں احتیاطاً پیچھے نظر رکھوں گا۔"

وہ نروس تھی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ خراب ڈرائیونگ نہ کرے اور گاڑی کہیں مار ہی نہ دے لیکن گھبراہٹ نے اس پر عجیب ہی اثرات مرتب کیے۔ اس نے طوفانی انداز میں گاڑی چلائی اور چند منٹ بعد ہی گاڑی اس کے بنگلے کے پورچ میں کھڑی تھی۔

"یہ کیا...؟" میں نے کہا۔ "تم نے تو مجھے میرے آفس پہنچانے کے لیے لفٹ دی تھی۔"

"چلے جانا آفس... مرے کیوں جارہے ہو۔" وہ گویا جل کر بولی۔ "اب وہاں کون رہ گیا ہوگا۔ لڑکیاں بھی اپنے گھروں کو جاچکی ہوں گی۔"

"لڑکیوں کی کس کمبخت کو فکر ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "مجھے تو اپنی گاڑی لینی تھی۔ وہ میری جدائی میں اداس ہوگئی ہوگی۔"

"لے لینا گاڑی بھی۔ تمہاری اپنی بلڈنگ کی پارکنگ لاٹ ہے۔ تمہارے اپنے چوکیدار ہیں' کوئی اٹھا کر نہیں لے جائے گا تمہاری گاڑی کو۔" وہ بولی۔

گاڑی سے اترتے ہوئے میں نے دیکھا' پورچ میں آگے راجو کی گاڑی کھڑی تھی۔ شمیم گاڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جلے کٹے سے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "دیکھ لو... میں اسے اصطبل میں چھوڑ کر آئی تھی۔ وہ واپس بھی آگیا۔ اب اسے اپنی شام کی سرگرمیوں کے لیے نکلنا ہوگا۔ تیار ہونے آیا ہوگا۔"

میں وہیں کھڑا رہا تو وہ میرا بازو پکڑ کر مجھے اندر لے جانے کے لیے کھینچتے ہوئے بولی۔ "خدا کے لیے اب آ بھی جاؤ اندر۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں گی' جہاں تم کہو گے۔ دم خشک کیوں ہو رہا ہے تمہارا۔ اچھا ہی ہے' اس وقت راجو واپس آگیا ہے۔ تمہارے سامنے ذرا اسے بھی حالات سے آگاہی ہوجائے گی۔"

"اچھا میڈم! چلیے... اندر چلتے ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر گویا ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا۔ "انسان دوستوں کے معاملات میں ٹانگ اڑاتا ہے تو پھر ٹانگ بہت دور تک چلی جاتی ہے۔" میں اس کے ساتھ چل دیا۔

"تم نے تو ایسی ٹانگ اڑائی ہے کہ مجھے اپنی اور راجو کی ٹانگوں کی فکر پڑگئی ہے۔" وہ بولی۔ تاہم اس کی آنکھیں بتارہی تھیں کہ اب وہ اتنی خوفزدہ نہیں تھی جتنی کچھ دیر پہلے نظر آرہی تھی۔

وہ مجھے سیدھی اپنے بیڈ روم میں لے گئی۔ راجو واقعی باتھ روب پہنے باتھ روم سے نکل رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا لیکن مجھے اس کے انداز میں گرمجوشی کی کچھ کمی محسوس ہوئی۔ شمیم نے مجھے کاؤچ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ راجو ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر ڈرائر سے بال خشک کرتے ہوئے شمیم سے مخاطب ہوا۔ "تم تو افضل کو اس کے آفس چھوڑنے گئی تھیں۔ ابھی تک پہنچ نہیں سکیں وہاں؟"

اس نے سرسری لہجے میں یہ بات کی تھی لیکن شمیم نے فوراً چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے طنزیہ لہجے میں بولی۔ "اوہو... خدا کا شکر ہے' تمہارے لہجے میں بھی شک اور رقابت کی رمق تو محسوس ہوئی۔ میں تو سمجھی تھی' تم اس صلاحیت سے ہی محروم ہو۔"

وہ ہم دونوں سے نظر چُرا رہا تھا۔ آئینے میں ہمیں دیکھ رہا تھا۔ کھوکھلے سے انداز میں ہنس کر بولا۔ "شک اور رقابت...؟ نہیں' نہیں۔ تمہارا خیال درست ہی ہے۔ میں نے یہ روگ پالا ہی نہیں۔ میں نے تو ایک سیدھا سادا سا سوال کیا تھا' تم نے اس کا جواب نہیں دیا۔"

شمیم ایک ادائے بے نیازی سے اپنے بال پھیلا کر بیڈ پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی۔ "دراصل آفس جانے کے بجائے انّی نے مجھے اپنے گھر چلنے کی دعوت دے دی جو میں نے قبول کرلی۔ وہاں پہنچ کر انّی کہنے لگا' چلو میں تمہیں اپنا بیڈ روم دکھاتا ہوں۔ میں نے سوچا' چلو ایک بڑے آدمی کا بیڈ روم دیکھنے کا شرف حاصل ہو رہا ہے' یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانا چاہیے..."

اس نے تھکے تھکے انداز میں ایک توبہ شکن انگڑائی لی اور ایک لمحے کے صبر آزما وقفے کے بعد بولی۔ "بیڈ روم صحیح معنوں میں بیڈ روم تھا۔ وہاں کا ماحول نہایت خوابناک تھا۔ اوپر سے انّی نے خوابناک سی باتیں شروع کردیں۔ مجھے اپنی سُدھ بُدھ ہی نہیں رہی۔ بس... کیا بتاؤں... آج کی شام ایک یادگار شام تھی۔"

راجو کی نظر بچا کر اس نے مجھے آنکھ ماری۔ جس لہجے میں اور جس ادا سے اس نے یہ سب کچھ کہا' میرے اعصاب میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ میں نے قدرے کھسیانے انداز میں راجو کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک کھوکھلا سا قہقہہ لگایا اور ڈرائر ٹیک پر لٹکا کر ہولے سے تالیاں بجاتے ہوئے بولا۔ "بہت خوب! بہت اچھا منظر نامہ تھا۔ ایسی باتیں کرنے میں تمہارا جواب نہیں۔"

اس نے بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کے قہقہے اور اس کے لہجے کا کھوکھلا پن بتا رہا تھا کہ اندر کہیں خلش ضرور تھی۔ وہ چاہے کتنا ہی خود غرض' کتنا ہی لاتعلق اور کتنا ہی اپنی دنیا میں مگن نظر آنے کی کوشش کرتا تھا لیکن بہرحال اس عورت کا شوہر تھا۔ مجھے اس پر ترس سا آیا۔

میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "راجو! تمہاری بیوی تو نہ جانے کب تک بکواس کرتی رہے۔ بہتر ہے میں تمہیں اصل بات بتادوں۔ ہم جب اصطبل سے روانہ ہوئے تو تمہارے اسی دیرینہ مہربان مختار رفیق کا تذکرہ جاری تھا اور کچھ زیادہ ہی دیر جاری رہا۔ شمیم نے اس کے بارے میں چند باتیں اور بتائیں۔ میں اپنے اشتیاق پر قابو نہ رکھ سکا' فوراً ہی شمیم کو ساتھ لے کر اس سے ملنے جا پہنچا۔"

راجو ہڑبڑا کر پلٹا۔ بالوں کا برش اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ "تم مختار کے ہاں چلے گئے تھے؟ پھر کیا ہوا؟ خیریت تو رہی؟ کوئی جھگڑا تو نہیں ہوا؟"

"جھگڑا...؟" شمیم استہزائیہ انداز میں ہنسی اور پھر ہنستی ہی چلی گئی۔ مجھے اس کو ہنستے دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اس کے اعصاب پر سے مختار رفیق نامی "بھوت" کا خوف دور ہو رہا تھا۔ پھر وہ ہیجان زدہ سے لہجے میں نہایت تیزی سے راجو کو سب کچھ بتاتی چلی گئی۔

راجو ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھ گیا' جیسے اس کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ہو۔ بات ختم کرکے شمیم اسٹامپ پیپر کا رول اس کے سامنے بلند کرتے ہوئے بولی۔ "اور یہ رہا وہ اسٹامپ پیپر۔"

راجو تھوک نگل کر بولا۔ "یار افضل' تم نے ہمیں مروانے کا پورا پورا بندوبست کردیا ہے۔"

میں نے اسے وہی لیکچر دیا جو میں اس سے پہلے شمیم کو دے چکا تھا' پھر اسے کافی تسلی و تشفی دی جس سے اس کی حالت کچھ سنبھلی۔ شمیم نے اس سے مشورہ طلب انداز میں پوچھا۔ "اب اس اسٹامپ پیپر کو کہاں رکھنا ہے؟"

اس کا جواب راجو کے بجائے میں نے دیا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پیپر لیتے ہوئے کہا۔ "احمقو! اب اسے سنبھال کر رکھنے کی ضرورت نہیں۔"

تپائی پر فرنچ کرسٹل کی بڑی سی ایش ٹرے رکھی تھی۔ لائٹر اور سگریٹوں کا ڈبا بھی قریب ہی رکھا تھا۔ میں نے لائٹر اٹھایا اور پیپر کو شعلہ دکھادیا۔ وہ اچھی طرح آگ پکڑ چکا تو میں نے اسے ایش ٹرے میں ڈال دیا۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" شمیم نے حیرت سے پوچھا۔ راجو بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایش ٹرے میں دم توڑتے ہوئے شعلے کو دیکھ رہا تھا۔

"اندیشہ تھا کہ تم جیسے ہونقوں کو مختار دو چار گیدڑ بھبکیاں دے کر یہ کاغذ چھین کر نہ لے جائے اور جو پھندا میں نے تمہاری گردنوں سے نکالا ہے' وہ دوبارہ گردنوں میں نہ پڑ جائے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "اس لیے میں نے قصہ ہی ختم کردیا ہے۔ نہ کاغذ ہوگا نہ وہ تم سے چھین سکے گا۔"

"تو گویا اب ہم مختار کے بجائے تمہارے مقروض ہوگئے؟" راجو طویل سانس لے کر بولا۔

"لیکن میں تم سے کبھی تقاضا نہیں کروں گا۔ تمہیں خود ہی اگر بوجھ محسوس ہو اور تمہاری بچی کچھی خودداری تمہیں تنگ کرے تو آسان قسطوں میں واپس کرتے رہنا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "اب میں چلتا ہوں۔"

"یار...! آج رات تو ہمیں بڑا ڈر لگے گا۔" راجو اٹھتے ہوئے بولا۔

"آج رات تم آوارہ گردی پر نہیں جاؤ گے۔" شمیم نے گویا اسے حکم سنادیا۔ "میں اکیلی گھر پر نہیں رہوں گی۔ تم جاؤ گے تو میں

بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔"

"اتنا ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

"تمہارا چوکیدار کیسا آدمی ہے؟"

"بس... ٹھیک ہی ہے۔ جیسے روایتی سے چوکیدار ہوتے ہیں۔ بہرحال... خطرہ نظر آنے پر جان لڑا دے گا' اتنا مجھے یقین ہے۔" راجو بولا۔

"بس ٹھیک ہے۔ دو آدمی میں اپنے بھیج دیتا ہوں۔ وہ چند دن یہاں حفاظت کے لیے موجود رہیں گے' جب تک تمہارا خوف دور نہیں ہو جاتا۔ ان کی موجودگی میں تمہیں قطعاً خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا اور انہی کے ہاں سے فون کر کے اپنے دو آدمیوں کو طلب کر لیا۔ تاہم ان کے آنے سے پہلے ہی میں ان کے ہاں سے رخصت ہو لیا۔ شیم ہی مجھے آفس تک چھوڑنے آئی۔ آفس بند ہو چکا تھا۔ میں نے پارکنگ لاٹ سے اپنی گاڑی نکالی۔

شیم اپنی گاڑی میں مردس روڈ پر ہی موجود تھی۔ میں نے گاڑی اس کے برابر روکی تو وہ کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔ "ہماری خیر خبر لیتے رہنا۔ دو آدمی ہماری حفاظت کے لیے تعینات کر کے بے فکر نہ ہو جانا۔"

"فکر مت کرو' ضرورت پڑی تو تمہارے لیے دس بیس ہزار گوریلوں کی فوج بھرتی کر لوں گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے آفس اور گھر' دونوں جگہ کا ڈائرکٹ نمبر تمہارے پاس موجود ہے۔ جب بھی ضرورت محسوس کرو' مجھے فون کر دینا۔ میں آندھی اور طوفان بن کر بالکل اسی طرح تمہاری مدد کے لیے آن پہنچوں گا جس طرح فلم میں ہیرو' ہیروئن کی پکار سن کر پہنچتا ہے۔"

"ہیروئنوں جیسے ہمارے نصیب کہاں!" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے گاڑی آگے بڑھا دی۔

گھر آ کر تازہ دم ہونے کے بعد میں ایک بار پھر حفیظ احمد صاحب کے بارے میں تازہ ترین معلومات حاصل کرنے کے لیے فون پر مصروف ہو گیا۔ پتا چلا کہ اب وہ ویانا پہنچ چکے تھے اور اعلیٰ حکومتی عہدیداروں کے علاوہ کوئی ان سے رابطہ قائم نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے بے چینی سے ان کی واپسی کا انتظار تھا۔ ریڈ ڈاٹ کے سلسلے میں بات کرنے کے لیے میں ان کے ساتھ ایک میٹنگ رکھنا چاہتا تھا۔ اونچے حکومتی حلقوں میں' میرے شناساؤں میں سب سے زیادہ کام کے آدمی وہی تھے۔ کسی اور سے بات کرنے کو میرا دل نہیں مانتا تھا۔ خصوصاً جب سے میں نے بلیک باکس سے برآمد ہونے والی فہرست دیکھی تھی تب سے تو میرا اعتبار ہی اٹھ گیا تھا۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ کس محکمے میں' کس عہدے پر ان کا مخبر بیٹھا ہو۔ اور میں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں حکومت سے بات کر کے گویا ریڈ ڈاٹ والوں کی ہدایت کی خلاف ورزی کرنے جا رہا تھا۔ صرف میں ہی اندازہ کر سکتا تھا کہ یہ خلاف ورزی کر کے میں کتنا بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔

بہت سی ٹیلیفون کالز کے بعد میں ایک ڈنر میں شرکت کے لیے چلا گیا اور رات گئے واپس آ کر گھوڑے بیچ کر سو گیا۔

معلوم نہیں وہ رات کا کون سا پہر تھا جب فون کی گھنٹی نے میرے خوشگوار خوابوں کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس روز مجھے جتنی گہری نیند آ رہی تھی اتنی کم ہی آتی تھی۔ میں نے کان تکیے میں دبا لیے کہ فون کرنے والا تھک ہار کر خود ہی سلسلہ منقطع کر دے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ مجھے ریسیور اٹھانا ہی پڑا۔

"انی! کیا تم سو رہے ہو؟" دوسری طرف سے شیم نے ہیجان زدہ سے انداز میں تقریباً چیخ کر پوچھا۔

"ہاں... میں سو رہا ہوں لیکن مجھے خواب میں ٹیلیفون ریسیو کرنے کی بیماری ہے۔" میں نے جل کر جواب دیا۔

"ناراض مت ہو... میرا تمہیں فون کرنا اشد ضروری تھا..." اس کے لہجے میں لجاجت آ گئی۔ "معافی چاہتی ہوں کہ ہم لوگ تمہارے لیے بڑی زحمت کا باعث بن رہے ہیں..."

"بس' بس۔ اب اتنا بھی باتکلف ہونے کی ضرورت نہیں۔ بات کیا ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میری غنودگی اب کافور ہو چکی تھی۔

"میں اور راجو دس منٹ میں تمہارے پاس پہنچ رہے ہیں۔ تم اس دوران تیار ہو جاؤ۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہو گا۔" اس کی آواز میں ارتعاش تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بہ مشکل اپنے آپ کو رونے سے باز رکھے ہوئے تھی۔ "ہمارے اصطبل کو آگ لگا دی گئی ہے... سب کچھ تباہ ہو گیا۔ آگ بجھائی نہیں جا سکی... اب تک گھوڑے بھی مر چکے ہوں گے... جب تک ہم وہاں پہنچیں گے تب تک تو ان کی راکھ بھی نہیں بچے گی۔ ہم برباد ہو گئے انی...! ان معصوم بے زبانوں پر بڑا ظلم ہوا ہے... ہائے میرا ظفر...!"

آخر کار وہ اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"یہ رونا دھونا بند کرو اور فوراً میرے ہاں پہنچو۔" میں نے سخت لہجے میں کہا۔ "میں تمہیں گیٹ پر ہی ملوں گا۔ باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔" میں نے ریسیور رکھ دیا۔

زندگی کے اونچے نیچے راستوں کے بیچ ایک سرکش مسافر کی سرگردانی ابھی جاری ہے، باقی واقعات پانچویں حصے میں پڑھیں۔

کیسی باصلاحیت لڑکی تھی اور کیسی بے خوف و نڈر ہوا کرتی تھی لیکن اب وہ بجھ سی گئی تھی' اس کی صلاحیتوں پر گرد جم گئی تھی' ذہن کو کچھ زنگ سا لگ گیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ لاہور میں وہ میرے قریب' میری رسائی میں رہے گی تو اس کی صلاحیتوں سے یہ زنگ اور گرد جلد صاف ہو جائے گی۔ اس کے کراچی رہنے کے دوران خواہ میں روزانہ جہاز سے اس کے پاس جاتا رہتا اور فون پر مستقل رابطہ رکھتا لیکن وہ بات پھر بھی نہ ہوتی جو ایک ہی شہر میں رہنے میں تھی۔ فاصلے بہرحال فاصلے تھے! انسان کی سائنسی ترقی رابطے آسان بنا سکتی ہے' فاصلے مٹا نہیں سکتی۔

میں انہی خیالات میں الجھا ہوا تھا کہ انٹر کام کا بزر بجا۔ گیٹ ہاؤس سے طارق بول رہا تھا "سر! وہ ہونق سا لڑکا وسیم احمد آیا ہے۔ بہت گھبرایا ہوا ہے۔ کہتا ہے اے نن کے بارے میں کوئی خبر ہے۔ میں اسے گیٹ سے باہر ہی کھڑا کر کے آیا ہوں۔ سر! میں جونہی چھوٹا گیٹ ذرا سا کھولتا ہوں وہ فوراً اندر گھسنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جب بھی آتا ہے اس کا یہی انداز ہوتا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کسی روز کوئی الٹی سیدھی حرکت کرتے وقت نادانستگی میں میرے ہاتھوں مارا نہ جائے۔"

میں تو اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔ میں نے تیزی سے کہا "نہیں' نہیں۔ اس بے چارے کا خیال رکھا کرو۔ اور اس وقت تو اسے فوراً اندر بھیج دو۔ کسی سے کہو اسے ڈرائنگ روم میں لے آئے۔"

میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو وہ بیٹھا نہیں تھا۔ کمرے کے وسط میں کھڑا سر اٹھائے فانوس کی طرف دیکھ کر یوں تیزی سے آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا جیسے فانوس نے اس کے کان میں کچھ کہہ دیا ہو۔ اس کی عینک پھسل کر ناک کی نوک پر آئی ہوئی تھی۔ بال پریشان تھے اور پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ لگتا تھا سانس بھی ابھی تک کچھ تیز ہی چل رہی تھی۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ تقریباً اچھل کر قریب آتے ہوئے اور مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملاتے ہوئے بولا "سر! آپ کے گھر پہنچ کر بھی آپ سے ملاقات کی نوبت آنے میں بہت سا قیمتی وقت ضائع ہو جاتا ہے۔ سر! میری آپ سے پُرزور اپیل ہے کہ یہ بادشاہوں والے طور طریقے ترک کر دیجئے۔ اپنے گھر کے دروازے ہر ایک کے لئے کھلے رکھئے۔ یہ سیکیورٹی...... یہ گارڈز...... یہ اونچے اونچے گیٹ...... یہ بجلی والی تاریں...... یہ سب ہٹا دیجئے سر" وہ بالکل کسی فلمی فریادی کی طرح گویا اس جذباتی اپیل کے ساتھ میرے پیروں میں گر جانے کا ارادہ رکھتا تھا لیکن پھر سنبھل گیا۔ شاید اسے بروقت اپنی آمد کا اصل مقصد یاد آ گیا تھا۔

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں برادرم!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن اس کے لئے مجھے دوبارہ فاقہ مست بننا پڑے گا۔"

"سر! اس موضوع پر میں آپ سے پھر کبھی مذاکرہ کروں گا۔ اس وقت تو آپ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر فوراً میرے ساتھ چلئے۔ جتنے لمحے ضائع ہو چکے ہیں وہی بہت ہیں" اس نے قریب آ کر ہاتھ تھام لیا اور دروازے کی طرف لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

"بات کیا ہے؟" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر اسے گھورا

"سر! آپ نے جو کام میرے سپرد کیا تھا وہ میں نے کر لیا" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "میں نے اس شخص کو پکڑ لیا ہے جس کی تصویر آپ نے مجھے دی تھی.... جس کا نام آپ نے اے نن بتایا تھا۔"

میں ایک ٹک اسے گھورتا رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ کم از کم مذاق کرنے کا اہل ہی نہیں ہے لیکن اس وقت مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ شاید وہ میرے ساتھ مذاق کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ [illegible] عقاب صفت نوجوان اے نن کی تلاش میں تھا۔ میرے دفتر کا نوجوان محسن علی جو سینے میں ایک برقِ تپاں چھپائے پھرتا تھا کا کوئی بھی کام کر گزرنے کے لئے تیار رہتا تھا' سر ہتھیلی پہ لئے پھرتا، وہ بھی اسی مہم پر نکلا ہوا تھا۔ لیکن ان دونوں کو ابھی تک کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ جب سے میں نے یہ کام ان کے سپرد کیا تھا انہیں اے نن کی جھلک بھی دکھائی نہیں دی تھی۔ چلیں یہ تو کیا جا سکتا تھا کہ اس معاملے میں ہونق وسیم کی قسمت نے [illegible] کی ہو گی یا محض اتفاقاً اسے اے نن کہیں نظر آ گیا ہو گا۔ لیکن نے اسے "پکڑ" لیا تھا' یہ میرے لئے ناقابلِ یقین سی بات تھی۔ میں نے محض جان چھڑانے کے لئے اسے یہ کام بتایا تھا۔ مجھے اس کی کامیابی کی امید تو درکنار' الٹا فکر لگی ہوئی تھی کہ کہیں بے چارہ اے نن کے ہاتھوں مارا نہ جائے لیکن وہ تو کچھ اور ہی کر آیا تھا۔

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا "کس طرح قابو میں کیا تم نے اسے؟"

"تفصیل میں آپ کو راستے میں بتا دوں گا۔ آپ وقت ضائع مت کیجئے۔ فوراً میرے ساتھ چلئے" وہ بے تابی سے بولا "میں چاہتا ہوں کہ آپ کی امانت آپ کے سپرد کر دوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ میں اسے زیادہ دیر قابو میں نہیں رکھ سکوں گا۔"

اُس نے جس سنجیدگی سے لفظ "امانت" استعمال کیا مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ کچھ ایسا ہی تصور میرے ذہن میں آیا جیسے اے نن کوئی پوٹلی وغیرہ تھی جو میں نے خود اس کے پاس رکھوائی تھی۔

میں نے اس کے ساتھ ڈرائنگ روم سے نکلتے ہوئے کہا "اگر ایسا ہی عجلت والا معاملہ تھا تو تم خود آنے کے بجائے مجھے فون کر دیتے۔ کچھ وقت تو بچتا۔"

"فون کیا تھا میں نے" وہ تیزی سے برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بولا "لیکن آپ گھر پر نہیں تھے۔ کم از کم مجھے یہی بتایا گیا تھا۔ میں نے سوچا' چل کر آپ کے دروازے پر دھرنا مار کر ہی بیٹھ جاتا ہوں تاکہ آپ کے آتے ہی آپ کو پکڑ سکوں۔"

"کچھ دیر پہلے میں واقعی گھر پر نہیں تھا" میں نے اسے احساس دلانے کی کوشش کی کہ اسے ٹرخایا نہیں گیا تھا "اور تھوڑی دیر بعد شاید میں دوبارہ نکل جاتا۔ اتفاق ہی ہے کہ ہماری ملاقات ہو گئی۔ ورنہ تو اس وقت گھر آنے کا ارادہ بھی نہیں تھا۔"

"یہ میری دعاؤں کا نتیجہ ہے۔ آپ کو کیا معلوم کہ میں دل ہی دل میں کتنی دعائیں مانگتا آ رہا تھا کہ آپ مجھے گھر پر ہی مل جائیں۔ اور آدمی کی دعائیں بڑی طاقت ور ہوتی ہیں۔"

ڈرائیو وے میں پہنچ کر میں نے اپنی گاڑی کا دروازہ کھولا تو وہ "میری گاڑی باہر ہی کھڑی ہے۔ اب گیٹ کھلنے اور گاڑی [نکا]لنے میں مزید وقت ضائع ہو جائے گا۔ اسی میں آ جائیے۔"

میں نے اسے اپنی گاڑی میں دھکیلتے ہوئے کہا "اب اتنے بھی [وقت] کے قدردان مت بنو۔ صرف چند سیکنڈ کا فرق پڑے گا۔ چند [سیکنڈ] کے فرق کے لئے میں تمہاری گاڑی میں جانے کا خطرہ مول [نہیں] لے سکتا۔ اگر وہ کھٹارا راستے میں بند ہو گئی تو کہیں گھنٹوں کا [فرق] نہ پڑ جائے" یہ کہتے کہتے میں گاڑی اسٹارٹ بھی کر چکا تھا اور [...]ن خان نے گیٹ ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے بٹن دبا دیا تھا جس سے [...] میں پوشیدہ موٹر کے ذریعے گیٹ بھی کھل چکا تھا۔

[...] اپنی گاڑی کے بارے میں ریمارکس سن کر وسیم کے چہرے پر [...] لمحے کے لئے تکلیف کے آثار ابھرے۔ میں کچھ مذاق میں اور [...] روانی میں اس کی گاڑی کو کھٹارا کہہ گیا تھا لیکن میرے دل میں [...]ت یا تمسخر کے جذبات ہرگز نہیں تھے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے [احساس ہ]وا ہوا کہ مذاق میں بھی ایسا نہیں کہنا چاہئے تھا۔ وسیم جیسے [...]وں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب بڑی سے بڑی [بات] کو نظر انداز کر دیں اور کب چھوٹی سے چھوٹی بات کو دل پر لے [لیں]۔

وہ گلی میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی کی طرف ایک نظر دیکھ کر بولا۔ "[کسی] بھی چیز کی ظاہری حالت... دیکھ کر اس کے بارے میں حتمی [رائے] نہیں کرنا چاہئے..." وہ میرے ہی چند پسندیدہ ترین اصولوں [میں] سے ایک اصول مجھے سمجھا رہا تھا لیکن چوں کہ میری زبان ذرا [...]س چکی تھی' اس لئے اب میں نے خاموشی سے اس کی نصیحت [سن]نے میں ہی عافیت سمجھی۔

وہ عینک درست کرتے ہوئے بولا "اگر آج آپ میری گاڑی کو [چل]تے دیکھ لیتے تو اسے گراں پری ریس میں بھیجنے کی سفارش [کر]تے۔ اس کے کمالات دیکھ کر تو اے نن بھی چکرا گیا ہو گا۔"

"کمالات تو اصل میں چلانے والے کے ہوتے ہیں' گاڑی بے چاری خود تو کوئی کمال نہیں دکھا سکتی۔" میں نے وسیم کو مکھن کا [...]ا ہاتھ لگانے کی کوشش کی۔

"وہ تو درست ہے سر! لیکن جب تک گاڑی ساتھ نہ دے' ڈرائیور کچھ نہیں کر سکتا" وہ مربیانہ لہجے میں بولا۔ ہم مین بلیوارڈ پر پہنچ چکے تھے۔ اس نے مجھے ماڈل ٹاؤن کی طرف چلنے کی ہدایت کی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ماڈل ٹاؤن سے آگے بھابڑہ کے علاقے میں اس کے ابا کے چپل بنانے کے کارخانے تھے اور ہمیں اس وقت وہیں جانا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کارخانوں کی طرف جانے کی کیا تک تھی۔ لیکن مجھے امید تھی کہ جب وہ اپنے کارنامے کی تفصیل سنائے گا تو وجہ سمجھ میں آ جائے گی۔

مین بلیوارڈ پر اس وقت ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ میں نے رفتار بڑھاتے ہوئے کہا "اب بتا بھی چکو' وہ بدبخت کس طرح تمہارے ہتھے چڑھ گیا؟"

"سر' میں نے اسے گھیرنے کی باقاعدہ پلاننگ کی ہوئی تھی۔ جب آپ نے یہ کام میرے سپرد کیا تھا' اسی وقت کر لی تھی پلاننگ!" وہ فخریہ لہجے میں بولا "صرف اس کے نظر آنے کی دیر تھی.... اور معلوم نہیں اب یہ آپ کی خوش قسمتی تھی یا میری۔ کہ آج وہ مجھے نظر آ گیا۔"

"کہاں؟" میں نے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"چڑیا گھر میں" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ مجھے ایک بار پھر شبہ ہوا کہ وہ کہیں اپنی حماقت کا کوئی نمونہ مجھے دکھانے تو نہیں لے جا رہا تھا۔ میں نے اے نن کی تلاش کا کام جن کے ذمے لگایا تھا وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے کم از کم چڑیا گھر تو نہیں جا سکتے تھے۔

"تم کیا اس کی تلاش میں چڑیا گھر گئے تھے؟" میں نے تصدیق کی خاطر پوچھا۔

"نہیں سر۔ سچی بات ہے میں تو اس کی تلاش میں تھا ہی نہیں" اس نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا "میں نے تو ویسے ہی سوچا ہوا تھا کہ اگر کہیں نظر آ گیا تو اپنی تدبیر پر عمل کرنے کی کوشش کر ڈالوں گا۔ چڑیا گھر تو میں ویسے ہی کبھی کبھار جاتا رہتا ہوں۔ بڑی دلچسپ جگہ ہے سر۔ میں تو غور و فکر کرنے کے لئے وہاں جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی رنگا رنگ مخلوقات دیکھ کر اور ان کی حرکات دیکھ کر سوچ بچار کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔ میری تو تمنا یہی ہے کہ ایک ایک کر کے میں ساری دنیا کے مشہور ترین چڑیا گھر دیکھوں۔"

"بہت خوب! اللہ تمہاری آرزو پوری فرمائے" میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر قدرے الجھن کے عالم میں کہا۔ مجھے بار بار یہی احساس ہوتا تھا کہ اگر وسیم کبھی مذاق کرتا تو شاید میں اس کا اندازہ لگانے سے بھی قاصر رہتا۔ اس کا چہرہ' اس کے متعلق تاثرات کچھ ایسے ہی تھے۔ پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ سنجیدگی' غیر سنجیدگی اور رنجیدگی کے درمیان حدِ فاصل کہاں کہاں تھی۔

"آمین" اس نے نہایت خلوص اور عقیدت سے کہا اور سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "اے نن پر اچانک میری نظر پڑ گئی۔ وہ چمپینزیوں کے پنجرے کے پاس کھڑا تھا اور مجھ سے بھی زیادہ محویت سے ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید وہ بھی

"کیا تمہیں اپنی، ستارہ کی اور ہنی کی جانیں عزیز نہیں ہیں؟" اس نے نہایت مشفقانہ لہجے میں سوال کیا۔

"تم نے میرے بارے میں اتنے بہت سے اندازے قائم کئے ہیں۔ کیا تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ میں بلیک میل ہونے والا آدمی نہیں ہوں؟" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔

"درست ہے۔ لیکن عقل سے کام لینے والے آدمی تو ہو" وہ بولا "اپنی اور اپنی حسین دوستوں کی جانیں محض ضائع ہی کرو گے۔ تمہاری اس قربانی سے بھی کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہیں ہمارے بارے میں معلوم ہی کیا ہے جو کسی کو بتاؤ گے۔ جنہیں معلوم تھا، ہمیں تو وہ بھی کوئی نقصان نہیں پہنچا سکے۔"

"حکومت اب بھی تمہاری راہ پر تو لگ سکتی ہے" میں نے کہا، "اکرام بیگ کو خفیہ ایجنٹوں نے اپنی تحویل میں لے لیا ہے۔ جس طرح تمہیں دعویٰ ہے کہ کسی سے بات اگلوانے میں تم لوگ بہت ماہر ہو اسی طرح ان لوگوں کی کارکردگی بھی بے مثال ہے۔ وہ تو ایسے جرائم کا اعتراف بھی کرا لیتے ہیں جو لوگوں نے کئے نہیں ہوتے۔ اکرام بیگ سے تفتیش ہو رہی ہوگی۔ وہ سب کچھ بتا دے گا۔ اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟"

اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا "بے چارہ اکرام بیگ! وہ کیا بتائے گا۔ اسے تو خود کچھ معلوم نہیں۔ تم شاید اسے خفیہ ایجنسیوں کے سپرد کرکے بڑی خوشی اور اطمینان محسوس کر رہے ہو گے کہ تم نے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہے۔ اگر اسے کچھ معلوم ہوتا تو کیا ہم اسے اتنی آسانی سے ہاتھ سے جانے دیتے؟ اس سے زیادہ تو انہیں معلوم تھا جنہوں نے موقع پر ہی خودکشی کر لی۔"

مجھے اپنے ہوٹل میں ویٹر کی جگہ لینے والا وہ نوجوان اور سوئچ روم میں گھسنے والے دو آدمی یاد آئے جن کے جسم چند لمحوں میں خشک مٹی کی طرح چٹخ گئے تھے اور دراڑوں سے گوشت کراہیت انگیز انداز میں جھانک رہا تھا۔ گوشت کی رنگت بھی بدل گئی تھی۔

"تم نے حفیظ صاحب کو ٹھکانے لگانے کی کوشش کیوں کی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اوپر سے حکم ملا تھا" اس نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

"تمہارا مطلب ہے تمہارے "اوپر والے دماغ" نے حکم دیا تھا؟" میں نے کریدا۔

"نہیں..... نہیں" وہ جلدی سے بولا "میں اور مجھ سے اوپر والا دماغ..... دونوں بہت ہی معمولی حیثیت کے لوگ ہیں۔ ہم تو چھوٹے موٹے معاملات نمٹاتے ہیں۔ حفیظ صاحب کا پتہ صاف کرنے کا حکم تو بہت اوپر سے آیا تھا۔"

"ان کا پتہ صاف کرنے سے تم لوگوں کو کیا فائدہ پہنچ سکتا تھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اب اتنے بڑے بڑے سوالات مت کرو جن کے جواب خود مجھے نہیں معلوم" وہ نیم بیزاری سے بولا "تمہیں جتنا بتا دیا جاتا ہے وہ کیا کم ہے؟ تم کوئی کام کی بات کرتے نہیں ہو۔ بس سوال پر سوال کرتے رہتے ہو۔"

"مجھے دراصل اپنی جنرل نالج بڑھانے کا بڑا شوق ہے۔ ویسے تمہارے نزدیک کام کی بات کیا ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "یعنی پھر بھی ایک سوال داغ دیا۔ بھئی کام کی بات ہے کہ ہمارے بارے میں کچھ نیک خیالات کا اظہار کرو۔ ہماری طرف ذرا مختلف زاویۂ نظر سے کچھ توجہ دو۔"

"تم جیسے خبیثوں کے بارے میں کوئی نیک خیال دل میں آئے تبھی تو ظاہر کروں نا....." میں نے اپنے لہجے سے بے بسی کا اظہار کیا۔

"عمر کے اعتبار سے اب تم لونڈے لپاڑے نہیں رہے افضل چوہدری! اب تمہیں بالکل سنجیدہ لوگوں کے انداز میں سوچنا چاہئے اور جذباتی باتیں ترک کر دینی چاہئیں" وہ ناصحانہ لہجے میں بولا۔

"سنجیدہ لوگ کس طرح سوچتے ہیں؟" میں نے جاننا چاہا۔

"جب کوئی ان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہے تو وہ اس طرف توجہ دیتے ہیں۔ خواہ مخواہ کی دشمنیاں نہیں پالتے۔ جس کام میں فائدہ نظر آتا ہے اس کے بارے میں ضرور سوچ بچار کرتے ہیں۔ جو لوگ آج کی نہیں، سو سال آگے کی باتیں سوچتے ہیں وہ خود ہی نہیں، ان کی آنے والی نسلیں بھی فائدے میں رہتی ہیں۔ ہر دور میں ان کی طرف رشک کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ اتنی بلندیوں پر چلے جاتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کی حیثیت ان کے سامنے زمین پر رینگنے والے کیڑے مکوڑوں کی سی ہو کر رہ جاتی ہے" وہ انتہائی دلنشین لہجے میں بولا۔

"ویسے تو قدرت جس کو ایسا بنانا چاہتی ہے، بنا دیتی ہے لیکن تم شاید سنجیدہ لوگوں کی نہیں، بے ضمیر لوگوں کی بات کر رہے ہو جو صرف فائدہ دیکھتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ فائدہ کس ذریعے سے ہو رہا ہے اور کس چیز کے عوض ہو رہا ہے۔ میں تو اس وقت بھی کسی حساب سے نقصان میں نہیں ہوں۔ دنیا کی ہر نعمت مجھے میسر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان گنت انسانوں سے بہتر بنایا ہے، بہتر حال میں رکھا ہے اور ابھی جدوجہد کے لئے میرے سامنے کھلا میدان پڑا ہے۔ زندگی نے جتنی مہلت دی شاید اتنا ہی مزید آگے چلا جاؤں۔ میں اپنی جگہ بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ تم مجھے کون سے فائدے نقصان کا فلسفہ سمجھانا چاہتے ہو؟"

"چہ..... چہ..... چچ.....!" وہ ترحم آمیز انداز میں بولا "بس وہی چھوٹی چھوٹی باتیں..... وہی جذباتی باتیں..... وہی بیکار باتیں.....!" پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "خیر..... ہمیں امید ہے کہ جلد ہی مینڈک کنویں سے نکل آئے گا۔ ہمارے ساتھ میٹنگ کے بعد تمہارے خیالات میں انقلاب آ جائے گا..... لیکن میں چاہ رہا تھا کہ میٹنگ سے پہلے ہی تمہارا ذہن کچھ ہموار ہو جائے۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے میرے ذہن میں کہاں سے ناہمواری تلاش کر لی ہے" میں نے کچھ سوچ کر نرم پڑتے ہوئے کہا۔ "بہرحال میں میٹنگ کا منتظر رہوں گا۔"

وہ بدبخت گویا میرا ذہن پڑھتے ہوئے بولا "وہ جو بعض پرانی کہانیوں میں ہوتا ہے نا..... کہ کوئی نیک، شریف یا قانون کے رکھوالے صاحب مصلحتاً ڈاکوؤں یا مجرموں کے ہمدرد اور ہم خیال بن کر ان کے گروہ میں شامل ہو گئے تاکہ سارے رازوں سے آگاہ ہو سکیں اور مناسب موقع ملتے ہی ان کا دھڑن تختہ کر سکیں..... جب ہمارے ساتھ میٹنگ ہوگی تو اس قسم کی کوئی کہانی ذہن میں مت رکھنا۔ ہمارے ہاں اس قسم کی کہانی بالکل نہیں چلے گی، فلاپ ہو جائے گی۔ کیوں کہ یہ کسی گروہ یا چھوٹی موٹی تنظیم کا معاملہ نہیں ہے اور نہ ہی ہمارے ہاں ایسا نظام ہے کہ کوئی سارے رازوں سے آگاہ ہو سکے یا دھڑن تختہ کر سکے۔ ہمارا تو سیٹ اپ ہی بہت مختلف اور سمجھ میں نہ آنے والا ہے۔ اب تک خود میری سمجھ میں نہیں آیا۔ حالاں کہ میرا خیال ہے شاید میں پیدا ہی ریڈ ڈاٹ میں ہوا تھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ جب تم ہمارے پاس آ ؤ گے تو بس ہمارے ہی ہو جاؤ گے۔ اس کے سوا تمہارے سامنے کوئی راستہ ہی نہیں ہوگا"

میں خاموش رہا۔ اسے گویا کچھ یاد آیا اور وہ قدرے چونکتے ہوئے بولا "ایک ضروری بات تو میں تمہیں بتانی بھول ہی گیا۔ آئندہ حفیظ صاحب والے معاملے میں..... یا کسی بھی ایسے معاملے میں جس کا تعلق ریڈ ڈاٹ سے ہو، ٹانگ اڑانے کی ہرگز کوشش مت کرنا۔ ریڈ ڈاٹ بار بار ناکامیاں برداشت کرنے کی عادی نہیں ہے۔ حفیظ صاحب والے معاملے کو بھی تم اپنی فتح اور ہماری ناکامی سمجھ کر زیادہ خوش مت ہونا۔ یہ صورتِ حال کی صرف عارضی تبدیلی ہے۔ حفیظ صاحب کو بہرحال جانا ہے۔ اپنا عہدہ یا یہ دنیا، دونوں میں سے ایک چیز ان کو بہرحال چھوڑنی ہوگی۔ ہم کوشش کریں گے کہ انہیں انتخاب کا حق دے سکیں کہ وہ کون سی چیز چھوڑنا چاہتے ہیں۔"

میں اس کی باتوں کا ترکی بہ ترکی جواب دیتا رہتا تھا اور تھوڑا بہت مذاق بھی اڑاتا رہتا تھا، بظاہر اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کا لہجہ میرے لاشعور کے بند دروازوں پر بھی دستک دیتا تھا، ذہن کے ان نامعلوم تاریک گوشوں میں سرد ہوائیں سرسرانے لگتی تھیں اور اعصاب میں خوف کی ہلکی سی سرگرمی ہونے لگتی تھی مگر میں اس طرف سے توجہ ہٹائے رکھتا تھا۔ میں اپنے آپ کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ میں اس کی باتوں سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوتا۔ انسان اپنی دانست میں کتنا ہی مضبوط، کتنا ہی طاقت ور بن جائے لیکن کہیں نہ کہیں اسے خود فریبی کی آغوش میں راحت تلاش کرنی پڑتی ہے۔

میں ایک لمحے کے لئے اپنے خیالات میں الجھ گیا تھا۔ اسی دوران میں نے ایڈم عرف ایڈی کو خدا حافظ کہتے سنا اور میرے کچھ بولنے کا انتظار کئے بغیر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ ریسیور رکھنے کے بعد میں ایک بار پھر بستر پر نیم دراز ہو گیا۔ میری نظر سفید چھت پر جمی ہوئی تھی جو میرے لئے گویا اسکرین بن کر رہ گئی تھی اور اس پر میری یادوں کی پرچھائیاں بہت بری طرح ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ ہر بات گویا الجھتی جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ زندگی کا سفر مجھے کہاں لئے جا رہا ہے۔

میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ایڈم کی باتوں کو اب مجھے کچھ زیادہ سنجیدگی سے لینا ہوگا اور کچھ اضافی اقدامات بھی کرنے ہوں گے۔ میرے آدمی بہت منظم، بہت مستعد اور بہت جاں نثار تھے لیکن میں سوچ رہا تھا، کیا میں انہیں مزید منظم کروں؟ کیا میں انہیں آگاہ کر دوں کہ ہمیں شاید کسی وقت اچانک کسی ہولناک خطرے کا سامنا کرنا پڑ جائے گا؟ میرے ساتھی ہیجان کا شکار ہونے والے تو نہیں تھے لیکن اس طرح وہ خواہ مخواہ اضطراب میں مبتلا ہو سکتے تھے جب کہ خطرے کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کب تک کچے دھاگے سے بندھی تلوار کی طرح ہمارے سروں پر ہی لٹکتا رہے؟

ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ میری قوت دو جگہ بٹی ہوئی تھی۔ میرے بہت سے بہترین ساتھی کراچی میں تھے اور باقی لاہور میں۔ ایک لمحے کے لئے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ ان سب کو لاہور میں ہی جمع کر لوں۔ اس سے کراچی کے بزنس پر بہت برا اثر پڑ سکتا تھا۔ لیکن انتہائی ناگزیر حالات میں مَیں ایسا بھی کر سکتا تھا۔ روپیہ بہرحال میری پہلی ترجیح نہیں تھا۔

ایک خیال مجھے یہ بھی آیا کہ مجھے اپنے ساتھیوں میں اضافہ کرنا چاہئے۔ لیکن محض افراد میں اضافہ کرنا میری نظر میں کبھی مفید نہیں رہا تھا۔ انتہائی غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل اور انتہائی جاں نثار لوگ ہی میرے ساتھی بن سکتے تھے۔ یہ سب خوبیاں بیک وقت ایک ہی فرد میں شاذ و نادر جمع ہوتی تھیں۔ میرے بیشتر ساتھی نوخیزی کے دور سے میرے ساتھ چلے آ رہے تھے اور کچھ حالات کے بہاؤ کے ساتھ ہم میں شامل ہو گئے تھے۔ وقت نے دھیرے دھیرے سب کو کچھ اور "پالش" کر دیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ہیرا تھا۔ صلاحیتوں کے اعتبار سے ہر ایک اپنی جگہ گروہوں پر بھاری تھا۔ ایسے لوگ آسانی سے نہیں ملتے تھے اور ہر جگہ نہیں ملتے تھے۔

البتہ اب راحیلہ لاہور آ رہی تھی اور ادھر نذیر خان سے اتفاقاً میری شناسائی بہت اچھی ڈگر پر آ گئی تھی۔ ان دونوں کو میں اپنی ٹیم میں شامل کر سکتا تھا اور یہ ہر اعتبار سے اچھے ساتھی ثابت ہو سکتے تھے۔ طاہرہ خانم بھی کام کی عورت تھی لیکن وہ زیادہ بھروسے کے قابل نہیں تھی۔ ستارہ جاں نثار تھی لیکن وہ صرف جذبوں اور خلوتوں کی غیر معمولی ساتھی تھی۔ اس میں اور کوئی ایسی غیر معمولی صلاحیتیں نہیں تھیں کہ میں اس پر زیادہ انحصار کر سکتا۔

راحیلہ کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ نوخیزی کے دور میں وہ

مگر اس کے حواس گویا مختل ہو چکے تھے۔ اس کی گویا سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ ہوا تھا وہ کس طرح ہوا تھا۔ عالم شیر کی ڈھیلی ڈھالی قمیص کی ایک آستین خون میں تر تھی لیکن اس کے حواس ٹھکانے پر تھے۔

میں نے ان دونوں کے سر آپس میں ٹکرا دئے لیکن زیادہ زور سے نہیں۔ دونوں بھاری تن و توش کے آدی تھے۔ چکرائے ہوئے سے انداز میں ادھر اُدھر جھولنے لگے۔ پھر ملک ریاض نے سر جھٹک کر وحشت زدہ سے انداز میں میری طرف دیکھا گویا پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

"دیکھا تم نے ابلیسِ سیاست؟" میں نے ملک ریاض کے گریبان کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "صرف اتنی سی دیر لگتی ہے بازی پلٹنے میں۔ نرم شکار کھاتے کھاتے بہت عادتیں بگڑ گئی ہیں تمہاری۔ میرے ساتھ پنگا لینے کے لئے تمہیں اپنے مسلح گرگوں اور ڈاکوؤں وغیرہ سے ذرا زیادہ اونچے درجے کے لوگوں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں گی۔"

میں نے ایک بار پھر ذرا آہستگی سے اس کا سر عالم شیر کے سر سے ٹکرایا۔ مجھے حیرت تھی کہ ان دونوں میں مزاحمت تک نہیں رہی تھی حالانکہ آدی جاندار تھے۔

"تم سیاست کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہو.... اور مجھے افسوس ہے کہ اس ماتھے پر کلنک کے ٹیکوں کی تعداد اتنی بڑھ گئی ہے کہ ماتھا اب کہیں نظر ہی نہیں آتا۔" میں نے ملک ریاض کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "میں کوشش کروں گا کہ تمہارا وزیر صنعت و تجارت بننے کا تو کیا' ایم این اے بننے کا خواب بھی پورا نہ ہو سکے۔ مجھے فرصت ملی تو میں ضرور ایسا بندوبست کروں گا کہ تم نہ تو اپنی پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن میں حصہ لے سکو اور نہ ہی کوئی اور جوڑ توڑ یا سودے بازی کر سکو۔ میں تو اس تصور سے پریشان ہوں کہ سیاست میں اگر تم جیسے لوگوں کی تعداد اسی طرح بڑھتی رہی تو اس ملک کا کیا بنے گا؟"

میں نے اسے فرش پر پٹخ دیا۔ اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ وہیں پڑا آنکھیں پٹ پٹاتا رہا' خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے عالم شیر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "اور تم.... خبیث آدی! تم سمجھ رہے تھے کہ ملک ریاض کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے تمہاری طاقت دگنی ہو جائے گی؟ تم مجھے آسانی سے کچل ڈالو گے... رقم بھی نکلوا لو گے؟ ایسے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔"

میں نے اس کے گھٹنے پر ٹھوکر رسید کی۔ اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ اسے کراہ بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ شاید گر جاتا لیکن میں نے اسے گرنے سے روکتے ہوئے کہا "یہ تمہارے لئے آخری موقع تھا۔ آئندہ تم نے مجھ سے الجھنا اور سازش کرنا تو درکنار' اگر میرے راستے میں آنے کی بھی کوشش کی تو وہ تمہاری زندگی کا آخری دن ہوگا۔"

میں نے جھٹکے سے اسے سیدھا کھڑا کیا "تین دن پہلے یقیناً تونی کو بھی تمہارے آدمیوں نے اغوا کرنے کی کوشش کی تھی؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا لیکن مجھے یقین ہو گیا کہ میرا اندازہ درست تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب تم جیسے لوگ میرے ایک آدی کو بھی قابو میں کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تو مجھے پکڑنے' ٹھکانے لگانے یا مجھ سے اپنے احمقانہ مطالبات منوانے کے خواب کیوں دیکھنے لگتے ہیں؟"

پھر میں نے قدرے نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی "عالم شیر! تمہارے ذہن میں میرے بارے میں ایک بھٹکے ہوئے ناتجربہ کار اور ناسمجھ نوجوان کا جو تصور ہے اسے ذہن سے جھٹک دو۔ تم کیوں ابھی تک ماضی میں پھنسے ہوئے ہو؟ میں بہت آگے جا چکا ہوں۔ میں کم از کم تم جیسے اُچکوں' ڈاکوؤں اور چھوٹے موٹے جاگیرداروں کے ہاتھ آنے والی چیز نہیں ہوں۔ کچھ سمجھ میں آرہی ہے میری بات؟"

وہ اب بھی کچھ نہ بولا۔ میں نے اسے بھی ملک ریاض کے قریب پٹخ دیا۔ دور فائرنگ کی آوازیں معدوم ہوتی جا رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے اِکا دُکا فائر کی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ آفتاب چھت کے وسط میں مستعد کھڑا تھا اور عقابی نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہا تھا۔

"کیا رپورٹ ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"تین چار گن مین نیچے بھی موجود تھے۔ احمد نے انہیں غیر مسلح کر کے ایک کمرے میں بند کر دیا ہے۔" آفتاب نے بتایا' پھر چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے بولا "کھیتوں اور جنگلوں میں کہیں کہیں ڈاکو موجود تھے۔ منیر' مسعود' صفدر اور سلیمان نے ٹونی کی رہنمائی میں ان میں سے کئی کو ہلاک کر دیا تھا۔ باقی بھی اب تک مر چکے ہوں گے یا فرار ہو چکے ہوں گے۔" اس کے لہجے میں بلا اعتماد تھا "یہ ان لوگوں کی تربیت کا ایک حصہ ہے۔ بازی پلٹے دیکھ لیں تو فرار ہونے میں دیر نہیں لگاتے۔"

"بہت خوب! تم لوگوں نے صورت حال کو بہت اچھی طرح سمجھا اور بہت اچھی طرح ہینڈل کیا۔ میں بہت خوش ہوں۔ مجھے اتنی صفائی سے سب کام ہونے کی امید نہیں تھی۔ ہمارے کسی آدی کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچا؟" میں نے دریافت کیا۔

"جب میں یہاں پہنچا ہوں تب تک تو ہمارے کسی ساتھی کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ ہم نے نہایت خاموشی سے' ایک گولی چلائے بغیر تین سیاہ پوشوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ڈاکو ہیں اور انہوں نے اس حویلی اور میدان کو اسی۔ محاصرے میں لیا ہوا ہے کہ آپ کی مدد کے لئے کوئی نہ پہنچ سکے۔ آپ نے ہمیں کچھ اشارے تو دے ہی دئے تھے۔ باقی صورت حال کا ہمیں یہاں آکر اندازہ ہو گیا۔" اس نے جواب دیا۔

"مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا کہ اگر خطرات پیش آئے تو ان کا انداز کیا ہوگا۔ میں نے تو احتیاطاً ہی سب کچھ کیا تھا لیکن کام آگیا۔ ملک ریاض اور نورو ماچھی سے ملتے ہی مجھے میری کوئی حس ان کے بارے میں خبردار کر رہی تھی۔" میں نے کہا۔

"نورو ماچھی کے گروہ کو اب تقریباً ختم ہی سمجھئے۔" آفتاب بولا۔ پھر اس نے ملک ریاض کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ الّو کا پٹھا بعد میں کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش نہ کرے۔ اسے اٹھا کر لے چلتے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے ہمارے پاس کوڑا کباڑ جمع کر کے رکھنے کے لئے جگہ نہیں ہوتی۔" میں نے ملک ریاض کو ہلکی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا "جب کوئی مسئلہ کھڑا کرے گا تب ایک بار پھر اسے دیکھ لیں گے۔ اس طرح کی بیماریوں کے بہت سے علاج ہیں ہمارے پاس۔ اس وقت تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ آؤ نیچے چلتے ہیں۔"

میں نے بچ جانے والے ڈاکو کی طرف دیکھا۔ لوگوں کو دہشت زدہ کرنے والی وہ مخلوق اس وقت خود کافی دہشت زدہ نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھ اٹھائے بدستور بُت کی طرح ساکت کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف منجمد ہو چکا تھا۔ آفتاب نے اس کے ساتھ ساتھ احتیاطاً ملک ریاض اور عالم شیر کی بھی تلاشی لی۔ پھر سب گنیں اٹھا کر چھت سے نیچے دور پھینک دیں۔

ہم سیڑھیوں سے اترنے لگے تو آفتاب نے سیڑھیوں کا آہنی دروازہ بند کر کے اپنی طرف سے بولٹ چڑھا دیا "انہیں ابھی چھت پر ہی رہنا چاہئے۔ دن چڑھے کوئی نہ کوئی آکر دروازہ کھول دے گا۔"

ہم نے حویلی کے اندر جانے کی کوشش نہیں کی۔ ہال کے راستے ہم سیدھے باہر چلے آئے۔ ہم جب اس طرف پہنچے جہاں نورو ماچھی گرا تھا تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت کا ہلکا سا جھٹکا لگا کہ وہ ہوش میں آچکا تھا اور گھسٹ کر حویلی کے قریب آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم پر نظر پڑتے ہی اس کا ہاتھ جیب کی طرف گیا لیکن مَیں نے ایک زقند لگا کر اس کے قریب پہنچ کر اس کے بازو پر ٹھوکر رسید کی۔ اس کا بازو بے جان انداز میں زمین پر پھیل گیا۔ اس نے سر بھی ڈھیلے ڈھالے انداز میں زمین پر ٹکا دیا۔

اس کی شاید ایک یا دونوں ٹانگیں ٹوٹ چکی تھیں۔ اس کے چہرے پر زبردست اذیت کے آثار تھے۔ اس کا چہرہ پسینے میں تر تھا۔ وہ بار بار سختی سے آنکھیں بند کرتا پھر کھول لیتا۔ بلاشبہ وہ زبردست قوتِ برداشت کا مالک تھا۔ آدی وہ غیر معمولی تھا۔ غلط راستوں پر نہ نکلا ہوتا تو بڑے کام کی چیز ہوتا۔

آفتاب نے آگے بڑھ کر اس کی جیب سے خوف ناک ساخت کا ایک ریوالور نکال لیا۔ نورو ماچھی نے قطعاً مزاحمت نہیں کی۔ اس میں مزاحمت کی سکت نہیں تھی۔ میں اس عالم میں اسے گولی مارنا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے خونیں آنکھوں سے مجھے گھورا۔ میں نے اس کے چہرے پر ٹھوکر رسید کی۔ رخسار پر اس کی کھال پھٹ گئی۔ چہرے پر خون کا دھبہ پھیلنے لگا۔

"گرے ہوئے دشمن کو مارنا میری عادت نہیں ہے۔" میں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا "لیکن اس کمزور اور ناتواں عورت افروز کے ساتھ تم نے جو کچھ کیا ..... یہ اس کے جواب میں ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر دوسری ٹھوکر رسید کی۔ اس کے دوسرے رخسار کی ہڈی پر سے بھی کھال پھٹ گئی۔

میں نے پے درپے اس کے چہرے پر مزید کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ اس نے چہرہ ادھر اُدھر گھما کر بچنے کی کوشش کی لیکن نہ بچ سکا۔ اپنی جگہ سے کھسکنے کی بھی اس میں سکت نہیں تھی۔ ہر ٹھوکر پر اسے ایک جھٹکا سا لگتا اور وہ اذیت کے عالم میں سختی سے آنکھیں بند کر لیتا لیکن اگلی ٹھوکر پر غیر ارادی طور پر اس کی آنکھیں کھل جاتیں۔

اس کا چہرہ چند ہی لمحوں میں ایک بڑے سے لوتھڑے میں تبدیل ہو گیا۔ اس نے اپنے چہرے کو بچانے کی کوشش ترک کر دی اور اوندھے منہ زمین پر ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن وہ ہوش میں تھا۔

میں نے اسے ٹھوکر سے سیدھا کرتے ہوئے کہا "اگر اپنے آپ کو مرد کا بچّہ سمجھتے ہو... اور زندہ بچ گئے تو آئندہ کسی عورت کے ساتھ ایسا نہ کرنا جیسا تم نے افروز کے ساتھ کیا۔ چاہے وہ طوائف ہی کیوں نہ ہو۔ عورت کو اس کی مرضی کے خلاف اٹھا کر لے جانا اور اپنی حیوانیت کی تسکین کرنا ہی ایک سنگین جرم ہے۔ مگر اس خوب صورت کتاب کے ہر ورق پر اپنی حیوانیت کے انمٹ نقوش ثبت کرنا تو میری نظر میں بالکل ہی ناقابلِ معافی ہے۔ خوب صورت کتابیں پڑھنے کے لئے ہوتی ہیں ..... تنہائی کی ساتھی ہوتی ہیں.... چیر پھاڑ کرنے کے لئے نہیں ہوتیں۔"

اس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھنے کی کوشش کی لیکن اس کی آنکھوں میں خون بھر گیا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے امید تھی کہ اس کے زخم بھر گئے تب بھی اس کی شکل پہلے جیسی نہیں رہے گی۔ اس کے لنگڑا لولا ہونے کا بھی امکان تھا۔

احمد بھی حویلی کا گیٹ باہر سے بند کر کے ہمارے پاس آگیا تھا۔ آفتاب ریوالور سے نورو ماچھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اسے گولی ہی مار دیتے ہیں' پولیس کا کافی دردِ سر ختم ہو جائے گا۔ وہ اسے ہلاک کرنے اور اس کے گروہ کا قلع قمع کرنے کا کریڈٹ بھی لے لے گی۔"

"ڈوبتے ہوئے جہاز پر آخری تنکا لادنے کی ذمے داری تو ان کے لئے چھوڑ دو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ہم نے ان کا کام تقریباً ختم کر دیا ہے۔ اگر وہ واقعی اس گروہ کا قلع قمع کرنا چاہتے ہیں

ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے پہلوان جی کو چھاچھ کے ساتھ جو کی روٹی کھاتے دیکھ کر ہوئی۔ میری معلومات کے مطابق تو پہلوان بہت کھاتے تھے اور مرتے دم تک کھاتے ہی رہتے تھے۔ توند تو ان خلیفہ جی کی بھی بہت نمایاں تھی۔ جو کی روٹی کھانے اور چھاچھ پینے والے کی توند اتنی نہیں ہونی چاہئے تھی۔

پہلوان جی نے دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے خوش آمدید کہا اور تمام تر اجنبیت کے باوجود گرم جوشی سے بولے "آؤ باؤ جی... آؤ.... بسم اللہ....." پھر انہوں نے اپنے قریب چٹائی کو تھپتھپایا اور خالص بھائی والے انداز میں بولے "ایدھر آجاؤ..... ایتھے بیٹھو"

انہیں یہ دیکھ کر غالباً خوشی ہوئی کہ میں اپنے سوٹ کو خاطر میں لائے بغیر ان کے قریب آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ چھاچھ کے بڑے سے پیالے اور ڈلیا میں رکھی ہوئی جو کی روٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "آپ کے اس غریب خادم خلیفہ نواز کے پاس تو اس وقت یہ چھاچھ اور جو کی روٹی ہے جسے کھانا یقیناً آپ کے بس کی بات نہیں ہوگی لیکن آپ حکم کریں.... کیا کھانا پسند فرمائیں گے؟ ابھی حاضر ہو جائے گا" اب وہ حتی الامکان صاف لہجے میں اردو بولنے کی کوشش کر رہے تھے جو اُن کے اصل لہجے کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ بڑی دلچسپ محسوس ہو رہی تھی۔

"بس.... خلیفہ جی.... بڑی نوازش، بڑی مہربانی۔ میں یہاں کچھ کھانے پینے نہیں آیا...." میں نے ان کا گول مٹول کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے "پُترّ! کھانے پینے تو کوئی بھی کسی کے گھر نہیں جاتا۔ یہ تو میزبان کا فرض ہے تاکہ وہ جو بھی خاطر مدارات کر سکتا ہو وہ کرے۔"

"خلیفہ جی...." میں نے ان کی توجہ آدابِ میزبانی سے ہٹانے اور اپنے تجسس کی تسکین کے لئے کہا "آج میں نے زندگی میں پہلا پہلوان دیکھا ہے جو چھاچھ کے ساتھ جو کی روٹی کھا رہا ہے۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا...! یہاں کوئی باداموں کی بوری.... کوئی دیسی گھی کا کنستر.... سردائی کے سامان کے تھیلے.... کوئی تیتر.... کوئی چرغے.... کچھ بھی نظر نہیں آرہا۔ آپ کس قسم کے خلیفہ ہیں.... یہ کس قسم کا اکھاڑہ ہے.... یہ کس قسم کا ڈیرہ ہے؟"

"تمہاری حیرانی اپنی جگہ ٹھیک ہے پُترّ!" وہ زیرِ مونچھ مسکراتے ہوئے بولے۔ وہ پوری کوشش کر رہے تھے کہ "ر" کی جگہ "ڑ" نہ بولیں لیکن عادتاً کہیں کہیں بول جاتے تھے "جو چیزیں تم بتا رہے ہو وہ ہم نے جوانی میں کھائیں اور بے حساب کھائیں۔ یہ توند دیکھ رہے ہو؟" انہوں نے پیار سے پیٹ پر ہاتھ پھیرا "یہ اسی زمانے کی کھائی ہوئی چیزوں کی نشانی ہے۔ ابھی تک کم ہونے میں نہیں آرہی۔ حالاں کہ اس وقت جتنا کھاتے تھے ساتھ اتنی ہی جان بھی کھپاتے تھے۔ خون پسینہ ایک کرتے تھے۔ وہ کشتیاں.... وہ کسرتیں.... دن رات جسم کو مٹی کے ساتھ مٹی اور لوہے کے ساتھ لوہا کئے رکھتے تھے۔ کھاتے تھے تو اس کو حلال بھی کرتے تھے۔ اب دو تین سال سے اس لئے سب کچھ کھانا چھوڑ دیا ہے کہ اب ضرورت ہی نہیں رہی۔ اب ہمیں کون سا کشتیاں لڑنی ہوتی ہیں جن کے لئے تیاریاں کریں۔ کسرت بھی بس رگ پٹھوں اور جوڑوں کو رواں رکھنے کے لئے تھوڑی بہت ہی کرتے ہیں۔ کبھی کبھار پٹھوں کو زور شور کرانے کی ضرورت پڑتی ہے اس کے لئے بس یہی کچھ کافی ہے جو میں کھا رہا ہوں۔"

میں نے ان کی تائید میں سر ہلایا۔ وہ ایک نوالا چبانے اور چھاچھ کا بڑا سا گھونٹ بھرنے کے بعد ذرا بدلے ہوئے سے لہجے میں بولے "ویسے بھی جب سے اللہ سائیں سے لو لگائی ہے تو پتا چلا ہے کہ طاقت، کھانے پینے کی چیزوں میں نہیں.... یہاں ہوتی ہے.... یہاں...." انہوں نے سینے پر دل کی جگہ ہاتھ مارا۔ ان کے لہجے میں ایک عجیب سا دھیما پن اور صوفیانہ رنگ جھلک آیا تھا۔ چہرے کے بھولپن اور کشش میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔

یکدم خلیفہ جی گویا کسی خواب سے چونکے اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولے "تمہارے خیال میں میری عمر کیا ہوگی برخوردار؟"

"یہی کوئی ساٹھ سال" میں نے جواب دیا۔

وہ بچوں کی طرح ہنسے "دیکھا.... دس سال کی غلطی کھا گئے۔ ستر سال کے قریب پہنچ رہا ہوں میں لیکن سوہنے سائیں کا بڑا کرم ہے۔ آج بھی کسی شہہ زور کی کلائی پکڑ لوں تو چھڑا نہیں سکتا۔ آزمائش کرنا چاہتے ہو؟"

"نہیں خلیفہ جی۔ مجھے آپ کی زبان پر یقین ہے" میں نے کہا۔ یہ حقیقت تھی کہ مجھے اس کے طاقت ور ہونے کا یقین تھا۔ اب ایسی بات تو نہیں تھی کہ وہ میری کلائی پکڑ لیتا تو میں چھڑا نہ پاتا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اتنا طاقت ور ضرور تھا جتنے ستر سال کی عمر میں اس دنیا میں بہت کم ہی لوگ ہو سکتے تھے۔ اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی اعتماد اور طمانیت کی روشنی مجھے یہی بتا رہی تھی۔ فی الحال مجھے آزمائش کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ روایتی پہلوانوں سے یقیناً کافی مختلف قسم کی مخلوق تھی۔

خلیفہ جی جو کچھ کھا رہے تھے وہ نہ جانے ان کا ناشتا تھا یا دوپہر کا کھانا۔ بہرحال اسے ختم کرنے کے بعد وہ اللہ کا شکر ادا کر کے بولے "برخوردار! معاف کرنا میں نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں کہ تم آئے کس لئے ہو؟"

"خلیفہ جی! میں بہت دور سے آپ کو تانگے میں جاتے دیکھ کر دوڑا دوڑا آپ کے پیچھے آیا ہوں" میں نے کہا اور بلیک باکس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ آپ کو کہاں سے ملا ہے؟"

"کیوں..... خیریت.....؟ چوری کا تو نہیں ہے؟" ان کے چہرے پر تشویش کی لہر دوڑ گئی۔

"نہیں.... چوری کا تو نہیں کہہ سکتے..... البتہ گمشدہ ضرور ہے" میں نے کہا "میری گاڑی سے غلطی سے کسی نے گرا دیا تھا تب سے میں پریشان تھا۔ کافی دن گزر گئے ہیں اس بات کو۔"

"اوہ...." ان کے چہرے پر قدرے طمانیت جھلک آئی "میں نے تو یہ فیکے.... میرا مطلب ہے رفیق کباڑئے سے کل ہی خریدا ہے۔ وہ تو اس کو ڈھلائی کے لئے اسکریپ میں بھیجنے لگا تھا۔ میری نظر پڑی۔ مجھے پسند آگیا۔ میں یوں ہی فیکے کے پاس بیٹھا تھا۔ کسی زمانے میں اسے بھی ذرا زور کرنے کا شوق تھا۔ پٹھا تھا اپنا۔ بہت بڑا کباڑ خانہ ہے موہنی روڈ پر اس کا۔ اب تو لکھ پتی ہے۔ شاید اسی لئے پہلوانی چھوڑ گیا...."

"اس کے پاس کہاں سے آیا تھا یہ؟" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی بیچ گیا تھا تول کر۔ لوہے کے بھاؤ" انہوں نے بتایا "اس نے اسے کھولنے کی بڑی کوشش کی لیکن کھلا ہی نہیں۔ وہ تو اس کی توڑ پھوڑ کرنے لگا تھا۔ میں نے کہا.... یار! خوب صورت چیز ہے۔ اس کو توڑو مت۔ مجھے دے دو۔ جو پیسے لینے ہیں لے لو۔ وہ تو ایک پیسا بھی نہیں لے رہا تھا، تحفے کے طور پر پیش کر رہا تھا لیکن میں نے عمر کا ایک یہ بھی اصول بنا رکھا ہے کہ اپنی ذات کے لئے کسی سے تحفہ نہیں لیتا۔ میں نے زبردستی اسے پچاس روپے دے دئے۔"

"لیکن پہلوان جی.... آپ نے خریدا کیوں؟ جب کہ آپ دیکھ چکے تھے نہ یہ کھلتا ہے، نہ اس میں کچھ رکھا جا سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایسے ہی.... ذرا شوق ہو رہا تھا کہ ہاتھ میں لے کر چلیں گے اچھا لگے گا۔ دیکھنے میں تو کوئی مہنگا قسم کا بریف کیس ہی لگتا ہے" پہلوان جی ذرا شرما کر بولے "آدمی ذرا معزز سا لگتا ہے۔ ایک بریف کیس جو مجھے اچھا لگا تھا..... میں نے پوچھا تھا..... وہ ہزار روپے کا تھا۔ سچی بات ہے باؤ جی! میں غریب سا آدمی ہوں، ہزار روپے کا بریف کیس ہاتھ میں لٹکا کر نہیں پھر سکتا۔ اس کی کمی پوری کرنے کی تدبیر سوچی تھی۔"

میں پہلوان جی کی معصومیت سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کے معصوم سے شوق کی بدولت میری رسائی دوبارہ بلیک باکس تک ہو گئی تھی لیکن میں سیاہ اسٹیل نما کسی دھات کے اس باکس کی قسمت پر حیران تھا۔ یہ کباڑی کے ہاتھ سے ہوتا ہوا نہ جانے کہاں کہاں گھوم پھر کر دوبارہ کباڑی ہی کے ہاتھ میں پہنچ گیا تھا۔ پہلوان جی اسے پچاس روپے میں خرید لائے تھے جب کہ میں اپنے تجسس کی تسکین کے لئے اسے حاصل کرنے کی غرض سے پچاس ہزار یا اس سے بھی زیادہ قیمت ادا کرنے کے لئے تیار تھا۔

بلیک باکس کے اس سفر کے دوران یقیناً بہت سے لوگوں نے اسے کھولنے کی کوشش کی ہوگی لیکن اس پر اب بھی کوئی خراش نہیں تھی۔ میں نے خود تو اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کی تھی، مجھے اس کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ اس دھات پر توڑ پھوڑ کی کوششوں کا اثر ہونے کی امید کم ہی تھی۔ ایڈم عرف ایڈی نے مجھے خبردار کیا تھا کہ غلط سلط طریقوں سے کھولنے کی کوشش میں باکس دھماکے سے پھٹ بھی سکتا تھا لیکن غنیمت تھا کہ وہ اب تک سلامت تھا اور کسی کی ہلاکت کا باعث نہیں بنا تھا۔

"خلیفہ جی! اکھاڑے چلانے والے پہلوان تو عام طور پر خاصے امیر ہوتے ہیں۔ یہ آپ اتنے...." میں نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اکھاڑوں سے دولت کمانے کے دو طریقے ہوتے ہیں باؤ جی!" پہلوان جی گہری سنجیدگی سے بولے "ایک تو یہ کہ اکھاڑوں پر منشیات فروشی اور قمار بازی کے دھندے ہوتے ہوں اور پہلوان کرائے کے بدمعاشوں کے طور پر چلتے ہوں یا پھر وہاں آنے والے پہلوانی اور باڈی بلڈنگ کے شوقین نوجوانوں سے اچھی خاصی فیس اور چندے وغیرہ لئے جاتے ہیں۔ یہاں یہ دونوں ہی سلسلے نہیں ہیں۔ میری آمدنی کا ذریعہ تو بس میری دودھ دہی کی ایک چھوٹی سی دُکان ہے۔ اس سے بھی جو تھوڑا بہت کماتا ہوں وہ اسی ڈوبتے ہوئے اکھاڑے پر لگا دیتا ہوں۔ وہ غریب نوجوان جنہیں جان شان بنانے یا پہلوانی کی لائن میں آنے کا شوق ہے مگر جو اچھی خوراک وغیرہ کا خرچ نہیں اٹھا سکتے، ان کو میری چھوٹی سی دُکان سے ہر چیز ملتی ہے۔ جو کچھ بھی ضروری ہوتا ہے مفت دیتا ہوں۔"

"اکھاڑہ ڈوب کیوں رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ایک تو لوگوں میں ویسے ہی صحت مند سرگرمیوں کا رواج نہیں رہا۔ کچھ لوگوں کو زندگی کی گاڑی کھینچنے سے فرصت نہیں اور کچھ لوگ بس زیادہ سے زیادہ کمانے کی فکر میں دن رات گدھوں کی طرح دوڑ رہے ہیں۔ ہانپتے کانپتے گرتے پڑتے ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی فکر میں ہیں۔ میں ان کو بغیر کسی فیس اور چندے کے بلاتا ہوں بلکہ الٹا جو مجھ سے ہو سکتا ہے ان کی خدمت کرتا ہوں۔ اس کے باوجود اتنے لوگ نہیں آتے جتنے میرے اندازے کے مطابق آنے چاہئیں۔ اس کے علاوہ دوسرا مسئلہ ہے کہ میرے پاس اکھاڑے کے لئے جگہ ہی نہیں ہے۔ پہلے ہم راوی روڈ پر ایک پلاٹ پر بیٹھے تھے۔ وہاں سے کارپوریشن والوں نے اٹھا دیا۔ اس جگہ کو اوقاف کی سمجھ کر ہم نے یہاں ڈیرے لگائے تھے۔ اب اس کے بھی دو دعوے دار نکل آئے ہیں۔ انہوں نے وکیل کے ذریعے نوٹس دے رکھا ہے کہ جگہ خالی کردو ورنہ مقدمہ کریں گے۔ مجھے زبردستی کسی کی ملکیت پر بیٹھنا اچھا نہیں لگتا ورنہ پانچ دس سال تو مقدمے میں بھی گزارے جا سکتے ہیں۔ پہلوان کو اتنی آسانی سے کوئی جگہ خالی کرتے آپ نے کبھی نہیں دیکھا ہوگا" پہلوان جی نے ٹھنڈی سانس لی۔

"واقعی پہلوان جی!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ کی

اگر میں بروقت بریک نہ لگاتا تو گاڑی اس پر چڑھ گئی ہوتی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ میں اس وقت موڑ کاٹ رہا تھا، گاڑی کی رفتار کم تھی۔ وہ گاڑی سے ٹکرانے سے تو بچ گیا لیکن لڑکھڑاتا ہوا کئی قدم دور چلا گیا۔ ایک ہلکے سے دھچکے کے ساتھ گاڑی کے پہیے گویا زمین میں دھنس چکے تھے۔ لیکن میں فوری طور پر گاڑی سے نہیں اترا۔ میں اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔

ایک گاڑی چند قدم کے فاصلے پر آڑی ترچھی کھڑی تھی۔ وہ یقیناً اسی شخص کی گاڑی تھی۔ اس کا ایک اگلا دروازہ بھی کھلا تھا۔ وہ ایک مختصرالوجود شخص تھا۔ شکن آلود سے سوٹ میں تھا۔ ٹائی ڈھیلی ہو کر گلے میں جھول رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں اس کی شکل صحیح طور پر دیکھ پاتا، وہ لڑکھڑاتا ہوا دور چلا گیا تھا لیکن پھر گھوم کر میری طرف آنے لگا۔

راتوں کو نشے میں دھت ہو کر گلی کوچوں میں یا سڑکوں پر بے مہار پھرنے والے لوگ مجھے کبھی اچھے نہیں لگے، خواہ ان میں سے کسی کے پیچھے کوئی المناک کہانی ہی رہی ہو اور خواہ وہ روایتی فلمی یا افسانوی انداز میں "غم بھلانے" کے لئے پھر رہے ہوں۔ اپنے دکھ درد اور الم بڑی نجی سے چیزیں ہوتی ہیں۔ انہیں سڑکوں پر لے کر نہیں پھرنا چاہئے۔

ویسے بھی اپنے آپ سے بیگانے ہو کر پھرنے والے یہ لوگ کوئی المیہ اگر واقعی دل میں لے کر نکلے ہوں تو دوسرا المیہ سڑک پر چھوڑ جاتے ہیں۔ یعنی عام طور پر کسی نہ کسی حادثے کا سبب بنتے ہیں۔ اگر خود گاڑی میں ہوں تو گاڑی بے چارے کسی راہ گیر پر چڑھا دیتے ہیں۔ فٹ پاتھ، کھمبے یا کسی دوسرے کی گاڑی سے ٹکرا دیتے ہیں۔ کسی موٹر سائیکل والے کو مار کر سڑک پر پڑا چھوڑ جاتے ہیں۔ خود پیدل ہوں تو کسی گاڑی والے کے سامنے آکر اس کے لئے مسئلہ بن جاتے ہیں۔

وہ کم ظرف بھی یقیناً نشے میں دُھت تھا۔ ادھر اُدھر چکراتا پھر رہا تھا۔ میں گاڑی سے اُترا۔ میرا ارادہ تھا کہ اسے ایک ایسا ٹھیک ٹھاک قسم کا تھپڑ رسید کروں گا کہ اس کا نشہ ہرن ہو جائے گا یا پھر وہ مکمل طور پر ہی دنیا و مافیہا سے بے گانہ ہو کر ایک طرف کو کہیں جا گرے گا اور آرام سے وہیں پڑا رہے گا۔ خلقِ خدا کے لئے بیزاری اور پریشانی کا باعث نہیں بنے گا۔

لیکن جب وہ قریب آیا تو میرا ہاتھ اٹھتے اٹھتے رہ گیا۔ مجھے اس کی صورت شناسا محسوس ہوئی تھی لیکن یہ شناسائی میرے لئے ناقابلِ یقین تھی۔ کہیں میری آنکھیں دھوکا تو نہیں کھا رہی تھیں؟ تبدیلیاں گو کہ بہت سی آچکی تھیں۔ وہی تبدیلیاں جو عمر بڑھنے اور حالات کے نشیب و فراز کی وجہ سے آیا کرتی ہیں لیکن پھر بھی صورت جانی پہچانی سی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ جو کچھ میں سمجھ رہا ہوں وہ درست ہو سکتا ہے۔

میں ابھی الجھن میں ہی تھا کہ وہ میرا ہاتھ تھامتے ہوئے انتہائی مخمور مگر عاجزانہ لہجے میں بولا۔ "بھائی صاحب! میرا تانگہ گڑھے میں پھنس گیا ہے... ہچ... بڑا ہی اڑیل گھوڑا ہے... بلکہ اڑیل ٹٹو ہے... ہچ... زور ہی نہیں لگاتا... گدھا کہیں کا۔ خدا کے لئے آپ ذرا چل کر اس کو سمجھائیں۔" وہ اپنی گاڑی کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

"گدھے کو تو کوئی گدھا ہی صحیح طور پر سمجھا سکتا ہے۔" میں نے غیر ارادی طور پر کہا۔ وہ جب میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی گاڑی کی طرف لے جانے میں ناکام رہا تو خود ہی لڑکھڑاتا ہوا اس کے قریب گیا اور گاڑی کے اگلے حصے کو لات رسید کی مگر دوسرے ہی لمحے پاؤں پکڑ کر ناچنے لگا۔ تھوڑا سا گھوم کر وہ گر پڑا۔

میں نے اس کے قریب جا کر گریبان سے پکڑ کر اسے اٹھایا۔ ہلکا پھلکا سا آدمی تھا۔ اس کے منہ سے وسکی کی بُو کے بھبکے اُڑ رہے تھے گو کہ اس کے دہن کی سرخی اور ایک مخصوص مہک بتا رہی تھی کہ اس نے خوشبودار پان کھا کر وسکی کی بُو کو دبانے کی کوشش کی تھی مگر یہ کوشش ناکام رہی تھی۔

وہ اپنی گاڑی کے انجن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شاکی لہجے میں بولا۔ "آپ نے دیکھا...؟ ہچ... یہ کتنا خبیث گھوڑا ہے۔ میں نے اسے ایک لتی ماری تو اس نے مجھے دولتی ماری... ہچ... کاش میرے پاس پستول ہوتا تو میں اسے بھی گولی مار دیتا... اور پھر اس کی بدمعاشی دیکھیں.... مجھے تانگے پر چڑھنے بھی نہیں دے رہا... ہچ... میں چڑھنے کی کوشش کرتا ہوں تو اچھلنے کودنے لگ جاتا ہے... ایسے تانگے سے تو گدھا گاڑی اچھی۔"

اس دوران میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا تھا۔ وہ ڈگی کی طرف سے گاڑی پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں وہ پھسل کر گر پڑا۔ ایک بار پھر میں نے اسے اٹھا کر کھڑا کیا اور ایک بار پھر اس نے مجھ سے شکایت کی۔ "سر! دیکھا آپ نے؟ یہ گھوڑا مجھے اپنے تانگے پر چڑھنے نہیں دیتا... ہچ... اسے ضرور مجھ سے کوئی دشمنی ہے..."

"تم نے آج اس کے حصے کی گھاس کھائی ہوگی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں اور وہ کھڑے کھڑے بھی ادھر اُدھر لہرا رہا تھا۔

"اوہ... نو سر..." وہ جھومتے ہوئے بولا۔ "میں نے گھاس نہیں کھائی... بالکل نہیں کھائی تھی... میں نے تو شرا... نہیں... نہیں... میرا مطلب ہے... سر، میں نے تو شربت پیا تھا۔ یہ گھوڑا بڑا شرارتی ہے سر! یہ مجھے لے کر گھر نہیں جانا چاہتا... دولتیاں مارتا ہے... اَڑی کرتا ہے... ایک بار یہ مجھے گھر لے جائے... میں اسے ضرور شوٹ کردوں گا... میرا پستول گھر پر رکھا ہے... ہمارا گھوڑا ہم ہی سے میاؤں..."

کوئی اور موقع ہوتا تو میں محاورے میں اس ترمیم سے محظوظ ہوتا لیکن اس وقت میرا ذہن اس کی شناسا صورت کے بارے میں

یقین اور بے یقینی کے درمیان الجھا ہوا تھا۔ اگر اس کی ذہنی حالت تھی کہ وہ اپنی نئی ماڈل کی کار کو تانگہ سمجھ رہا تھا تو اس سے کسی سوال کے صحیح جواب کی توقع رکھنا بھی بے کار تھا۔

تاہم میں نے اسے کندھوں سے پکڑ کر سیدھا کھڑا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک موہوم سی امید کے سہارے بغور اس کی طرف دیکھا اور مجھے اس میں کوئی شک نہ رہا کہ وہ میرا بچپن کا دوست ریاض عرف راجو ہی تھا۔

کبھی کبھی مجھے خود بھی اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آتا تھا۔ میں کچھ دن پہلے ہی گاؤں میں ریاض عرف راجو کے باپ سے وعدہ کرکے آیا تھا کہ لاہور میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کروں گا لیکن ابھی اسے تلاش کرنے کی نوبت نہیں آسکی تھی۔ میں دوسرے معاملات میں الجھ گیا تھا۔ تلاش کرنا تو درکنار، سچی بات یہ تھی کہ میرے ذہن میں دوبارہ اس کا خیال تک نہیں آیا تھا۔ لیکن وہ رات کو اس وقت یوں اچانک مجھ سے آن ٹکرایا تھا۔

بے یقینی مجھے اس لئے اپنی طرف کھینچ رہی تھی کہ ایک تو میرے ذہن میں راجو کا لڑکپن کا چہرہ تھا۔ اب اس میں خاصی تبدیلیاں آچکی تھیں لیکن ...... یہ ایک فطری سی بات تھی۔ اس سے کہیں زیادہ حیران کن میرے لئے راجو کا حُلیہ تھا۔ میرے ذہن میں راجو کا تصور ایک مفلوک الحال انسان کا تھا۔ میں چند دن پہلے گاؤں میں اس کا جو گھر دیکھ کر آرہا تھا اس میں ابھی تک غربت و افلاس کا راج تھا۔ اس کے دس عدد بچے دادا کے زیرِ سایہ مفلوک الحالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ تین چار سال سے اس نے ان کی خبر تک نہیں لی تھی۔

وہ گھر سے غائب تھا۔ اس کا بوڑھا باپ، سیدھی سادی بیوی اور دس معصوم بچے آنکھوں میں اس کا انتظار بسائے نہ جانے کس طرح زندگی کی گاڑی کھینچ رہے تھے اور وہ یہاں عمدہ سوٹ اور نئے ماڈل کی خاصی مہنگی گاڑی میں گھوم رہا تھا۔ اپنے ظرف سے بڑھ کر ڈرنک بھی کئے ہوئے تھا۔ خمار کی تمتماہٹ کے علاوہ اس کے چہرے پر خوشحالی کی چمک بھی تھی۔

"تم راجو ہو نا.... ریاض راجو؟" میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

اسے ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ آنکھیں جنہیں وہ بہ مشکل کھول پا رہا تھا، یکدم خاصی پھیل گئیں۔ اس نے بغور میری طرف دیکھا لیکن شاید نظر دھندلائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شناسائی کی چمک نہیں ابھری۔

بظاہر وہ چوکنا ہو چکا تھا لیکن اب وہ بولا تو اس کے لہجے میں پہلے سے زیادہ لکنت اور لڑکھڑاہٹ تھی۔ "تم... تم کون ہو مجھے راجو کہنے والے؟ میں کسی راجو واجو کو نہیں جانتا۔ میں تو محمد ریاض چیمہ ہوں... محمد ریاض چیمہ بی۔اے... میری کوٹھی پر بھی یہی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ کبھی آکر دیکھ لینا۔"

اس کا مطلب تھا، راجو کی کایا صرف سوٹ اور گاڑی تک ہی نہیں پلٹی تھی، موصوف کی رہائش بھی "کوٹھی" میں تھی اور اس عالمِ بے خودی میں بھی اس نے یہ بات جتانے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا تھا۔ مزید انقلاب یہ کہ وہ میٹرک سے بی اے بھی ہو گیا تھا۔ میرے سامنے تو اس نے میٹرک بڑی مشکلوں سے، گھسٹ گھسٹ کر کیا تھا۔ آدھے سے زیادہ پیپر حل کرنے میں، میں نے اس کی مدد کی تھی۔ لیکن خیر، یہ زیادہ حیرت کی بات نہیں تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ بعد میں اس نے بی اے کر لیا ہو۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں تھا کہ اس کا پورا نام محمد ریاض چیمہ ہی تھا۔ میرے لئے زیادہ باعثِ حیرت تو وہ نشانیاں تھیں جو کسی خاصے بڑے معاشی انقلاب کا پتا دے رہی تھیں۔

وہ بدستور ادھر اُدھر کو جھول رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اسے گریبان سے پکڑ کر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ "ابے او دو ٹانگوں والے گدھے! سیدھا کھڑا ہو جا ورنہ ایسا ہاتھ رسید کروں گا کہ آئندہ یہ منہ شراب پینے کے قابل نہیں رہے گا۔ کمینے! مجھے نہیں پہچانا؟ اپنے بچپن کے دوست کو؟ ابے ہم تو محاورتاً نہیں، سچ مچ کے لنگوٹیا یار ہیں۔ ایک جیسی لنگوٹیاں باندھ کر نہر میں چھلانگیں لگایا کرتے تھے۔ نہر کے کنارے "شوٹنگ" کیا کرتے تھے۔ بیہ گنوں سے تلوار بازی کیا کرتے تھے اور نہر میں خربوزے ایک دوسرے پر کھینچ کھینچ کر مارتے تھے...... تم اپنے ابا کی دُکان سے پیسے چُرا کر لایا کرتے تھے اور ہم اکٹھے فلمیں دیکھنے جایا کرتے... ابے راجو کے بچے! کیا تو وہ سب کچھ بھول گیا؟" میں نے اسے جھنجوڑ ڈالا۔

اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے۔ اس کے حواس پر خواہ نشے کا کیسا ہی غلبہ تھا لیکن بچپن اور لڑکپن کی یادوں کے نقوش کچھ اتنے گہرے ہوتے ہیں کہ فراموشی کی ان مصنوعی تہوں کے نیچے نہیں دبتے۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ یادیں اس کے مفلوج سے ذہن میں ہلچل مچا رہی تھیں، اس کے حافظے میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ وہ سب باتیں یقیناً اسے یاد تھیں۔ صرف خمار کی لہروں میں مناظر دُھندلا گئے تھے۔ کچھ میری گرفت کی وجہ سے اس کی گردن پر دباؤ تھا، کچھ وہ ذہن پر زور دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کوشش میں اس کی آنکھیں اُلّو کی طرح گول گول سی ہو گئی تھیں۔

اچانک اس کے چہرے کے عضلات کچھ زیادہ ہی پھڑپھڑائے اور وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ "تم افضل ہو نا...؟ محمد افضل چوہدری...؟"

میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ اس کی یادداشت ٹھیک ہو گئی تھی۔ نشہ یقیناً کافی حد تک ہلکا ہو گیا تھا۔ یادیں خمار پر غالب آگئی تھیں۔ اب اس کے حیران ہونے کی باری تھی۔ وہ مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ رہا تھا۔ پھر اس کے حلق سے ایک عجیب باریک سی آواز نکلی جو کسی بچے کی، آنسوؤں میں بھیگی ہوئی چیخ سے مشابہ

وغیرہ کا آرڈر دیا۔

کولڈڈرنکس آئیں تو وہ بادل نخواستہ ایک گلاس سے گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ "اب تم نے منگا ہی لی ہے تو پینی پڑے گی۔ ویسے یہ اپنے پینے کی چیز نہیں ہے۔" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ رازدارانہ سے لہجے میں بولا "پھر بھی.... کچھ بتاؤ تو سہی کیسا ذہنی بوجھ ہے؟ کوئی کاروباری مسئلہ ہے.... دفتری مسئلہ ہے... عاشقانہ مسئلہ ہے... تاجرانہ مسئلہ ہے.... یا عاجزانہ مسئلہ ہے؟ عاجزانہ مسئلہ میری زبان میں اسے کہتے ہیں کہ انسان کسی کی حرکتوں سے عاجز آجائے۔ اب بتا ہی دو کس قسم کا مسئلہ ہے؟"

"ارے یار! تم نے تو بات ہی پکڑلی۔" میں نے جلدی سے کہا "وہ تو ایسے ہی منہ سے نکل گیا تھا۔ اس قسم کے مسئلے تو روزانہ ہی زندگی میں سر اٹھاتے رہتے ہیں۔ کچھ حل ہوجاتے ہیں' کچھ تحت الشعور کے اسٹور روم میں پڑے رہتے ہیں۔ مسئلہ تو کوئی ایسا خاص نہیں ہے۔ میں تو صرف پینے کی طرف سے ذرا تمہارا دھیان ہٹانا چاہتا تھا اور شکر ہے میں اس میں کامیاب ہوگیا جس کے نتیجے میں تم اس وقت اپنے پسندیدہ مشروب کے بجائے کولڈڈرنک پی رہے ہو۔ تم میری فکر چھوڑو.... یہ بتاؤ کہ زندگی کیسی گزر رہی ہے؟ پینے پلانے کے علاوہ تمہاری کیا مصروفیات ہیں؟"

"بس یار! معززین اور ملازمین صبح صبح اپنے دفتروں کو اور دکانوں کو جاتے ہیں۔ میری بیوی صبح ہی صبح مجھے اصطبل بھیج دیتی ہے۔" وہ آہ بھر کر بولا۔

"شکر کرو وہ تمہیں صرف صبح بھیجتی ہے۔ عین ممکن ہے کوئی اور بیوی ہوتی تو تمہاری حرکتیں دیکھ کر تمہیں اصطبل میں ہی باندھ دیتی۔" میں نے کہا "سنا ہے تم نے دو تین اور کاروبار بھی تو کئے تھے۔ ان کا کس طرح بیڑا غرق کردیا؟"

"بس یار! ایک تو میں خود ہی شاہکار چیز ہوں.... اوپر سے مجھے ہر کام بیوی کی ہدایات کے مطابق کرنا پڑتا ہے۔ جن لوگوں کے کاروبار ان کی بیویاں چلاتی ہیں' ان کا بھی اللہ ہی حافظ ہوتا ہے اور ان کے کاروباروں کا بھی۔ اس نے اس وقت مجھے سیکنڈ ہینڈ کاروں کا بزنس کرادیا جب مجھے کاروں کے بارے میں اس کے سوا کچھ پتا نہیں تھا کہ انہیں چلایا کیسے جاتا ہے۔ میں نے خود کبھی بونٹ اٹھا کر انجن کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ بعض گاڑیوں کے بارے میں تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ان کا انجن آگے ہوتا ہے یا پیچھے؟ نتیجہ یہ کہ میرے کاروں کے شوروم میں سے رفتہ رفتہ شو بھی ختم ہوگئی اور روم بھی نہ رہا۔ بس کھٹارا گاڑیوں کی قطاریں رہ گئیں جنہیں آخر میں کباڑخانے والے لوہے کے بھاؤ اٹھا کر لے گئے۔"

"تم جیسے نالائقوں کو اپنی ہر ناکامی کسی نہ کسی کے سر ڈالنے کے لئے بہانہ چاہئے ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"جو لوگ نااہلوں کو ذمے داریاں سونپتے ہیں ان کو بھی سزا ملنی چاہئے بھئی۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ صرف نااہلوں ہی کی کھنچائی ہوتی رہے۔" وہ پُرزور لہجے میں بولا۔ "اس کے بعد پھیمو نے.... میرا مطلب ہے شمیم بیگم نے مجھے پراپرٹی کا کام کرادیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ اس قسم کے کام تھے جن میں لوگ کم سے کم سرمایہ لگا کر راتوں رات لکھ پتی بلکہ کروڑ پتی بنتے جارہے تھے۔ لیکن میں کہتا ہوں' کام خواہ کچھ بھی ہو' بندے کو اس کی تھوڑی بہت الف بے کا تو پتا ہونا چاہئے۔"

"پراپرٹی کے کام میں تمہارا کاروں کے کام سے زیادہ بُرا حشر ہوا ہوگا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"بے شک۔" اس نے متانت سے سر ہلایا "جن جائیدادوں کے میں نے سودے کرائے' ان کے مالکان اور خریداروں نے راتوں رات بالا ہی بالا آپس میں معاملات طے کرلئے۔ مجھے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ بعض جائیدادوں کے ہم نے سودے کرائے تو ان کے جھگڑے نکل آئے جن میں ہمیں بھی فریق بنالیا گیا۔ ملنا ملانا تو کیا تھا' ابھی تک عدالتوں کے سمن آتے رہتے ہیں۔"

"تمہاری داستان غریب حمزہ تو واقعی بہت عبرت ناک ہے۔ تمہاری بیوی تمہیں امیر حمزہ بنانا چاہتی تھی لیکن تم بڑی محنت اور بڑی کوشش سے غریب حمزہ ہی رہے۔" میں نے کولڈڈرنک کا گلاس خالی کرتے ہوئے کہا۔ "تمہارے نظریئے کے مطابق تو تمہاری بیوی کو چاہئے تھا کہ تمہیں کریانے کی دکان کھلوادیتی جو تمہارا خاندانی کام تھا۔ حالانکہ مجھے یقین ہے' تم اس کاروبار کو بھی عمدگی سے ٹھکانے لگادیتے۔ کنستروں اور بوریوں میں دال چاول کی جگہ چوہے چھلانگیں لگا رہے ہوتے۔"

"پھر نقصانات لاکھوں میں تو نہ ہوتے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "لیکن میری بیوی اس قسم کی بات تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اب اونچی عورت ہوگئی ہے۔"

"گدھے کہیں کے! شکر کرو' وہ تمہاری بھی اوقات بدلنا چاہتی ہے لیکن تم اس کے لئے بڑے مہنگے شوہر ثابت ہوئے ہو۔" میں نے کہا۔

"بھئی' میں نے تو تمہیں پہلے ہی بتادیا ہے کہ مابدولت کو تو اب زندگی میں عیش کرنے کا موقع ملا ہے تو ضرور کریں گے اور جی بھر کے کریں گے۔" وہ انگڑائی لے کر بے پروائی سے بولا۔

"اگر بیوی نے لات مار کر اپنی زندگی سے نکال پھینکا تو؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی مجھے ہر وقت توقع رہتی ہے اور اس کے لئے میں ہر وقت تیار رہتا ہوں۔" وہ نہایت اطمینان سے بولا "کچھ روپیا میں نے بیوی سے آنکھ بچا کر ایک طرف ڈالا ہوا ہے۔ اس نے لات مار دی تو پہلی بیوی کو اپنے پاس بلالوں گا۔ بچوں کے سر پر دستِ شفقت رکھ دوں گا اور کسی مڈل کلاس آبادی میں اچھا سا جنرل اسٹور کھول کر بیٹھ جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے' میری پہلی وفا شعار بیوی میری شکل دیکھتے ہی مجھے معاف کردے گی۔ بچوں کی ٹیم خوشی سے چھلانگیں لگائے گی کہ انہیں لاہور شہر میں رہنے کا موقع ملے گا۔ اباجی اگر اس وقت تک زندہ ہوئے تو تھوڑی بہت خدمت ان کی بھی کردیں گے۔ انہوں نے جو مزید جوتیاں وغیرہ رسید کرنی ہوں گی وہ چُپ کرکے صبروشکر سے کھالیں گے۔ یوں زندگی کی کتاب کے آخری باب بھی ہنسی خوشی ختم ہوجائیں گے۔"

"بہت ہی بدمعاش ہو تم۔" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا "بچپن میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بڑے ہوکر تم ایسی خبیث چیز نکلو گے۔ اچھا یہ بتاؤ اب اصطبل کا کیا حال ہے؟"

"یہ تازہ ترین ستم چل رہا ہے مجھ پر۔" وہ بولا۔ "مجھے بھلا کیا پتا تھا' ریس کے گھوڑوں کے کیا کیا چکر ہوتے ہیں۔ میں تو سمجھتا تھا کہ ریس کے گھوڑے اور تانگے میں جُتے ہوئے گھوڑے میں صرف صحت کا فرق ہوتا ہے لیکن اب پتا چلا ہے کہ یہ تو بڑا پیچیدہ کاروبار ہے۔ کوئی کروڑ پتی اپنی بیٹی کا رشتہ کسی کو دیتا ہے تو اس کے حسب نسب کی اتنی چھان بین نہیں ہوتی جتنی کسی گھوڑے کو ریس کورس کی شکل دکھانے کے لئے ضروری ہوتی ہے۔ ان کی دُم کا بال بھی ہماری عزت سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔"

"تمہاری عزت سے زیادہ اہم ہوگا' مجھے مت اپنے ساتھ شمار کرو۔" میں نے مسکراتے ہوئے تصحیح کی۔

"ہاں بھئی... تم تو خود اب زندگی کے ریس کورس میں اعلیٰ حسب نسب کے گھوڑے کی طرح ہوگئے ہو۔ ہر ریس جیتتے جارہے ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "بہرحال اصطبل کو تو میں نے سنبھال لیا تھا لیکن اس پر ویسے ہی بدبختی سایہ فگن ہے۔ ویسے تو اصطبل میں چھ گھوڑے ہیں لیکن درحقیقت اصطبل ایک ہی گھوڑے پر چل رہا ہے جو ہمیں خوب کما کر دے رہا ہے لیکن اب وہ بھی سازشوں کی زد میں ہے۔"

"کیا زمانہ آگیا ہے۔ بے چارے گھوڑوں کے خلاف بھی سازشیں ہوتی ہیں۔"

"کوئی ایسی ویسی سازشیں!" وہ بولا "جس طرح ہر کاروبار' ہر صنعت اپنی جگہ ایک الگ دنیا ہے' اسی طرح یہ بھی ایک الگ اور بڑی وسیع دنیا ہے۔ پچھلے دنوں ایک عرب پرنس کا ریس کا گھوڑا کیلیفورنیا کے کسی مقام سے اغوا ہوگیا تھا۔ چھ ملین ڈالر تاوان دے کر اسے رہا کرایا گیا ہے۔"

اس نے کولڈڈرنک کا ایک گھونٹ بھرا اور ٹھنڈی سانسوں کو اس کی مدد سے مزید ٹھنڈا بناتے ہوئے بولا "کاش میں ریس کا ایک گھوڑا ہی ہوتا!"

"بڑے بڑے لکھ پتیوں کو کنگال کردیتے تم۔" میں نے کہا۔

"پھر بھی معاشرے میں بڑی عزت ہوتی۔ بیوی کی چخ چخ تو نہ سننا پڑتی کہ میری دولت دونوں ہاتھوں سے برباد کررہے ہو۔ جن کی دولت برباد ہورہی ہوتی وہ کم از کم میرے سامنے آکر تو اُف بھی نہ کرتے۔ گھوڑے سے تو انہیں جواب میں دولتی کے سوا کچھ نہیں مل سکتا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ میں نے اس کے خالی گلاس میں مزید کولڈڈرنک انڈیلنے کی کوشش کی تو وہ جلدی سے مجھے روکتے ہوئے بولا "اچھا خاصا ٹھنڈا موسم ہے' اس کے باوجود تم دفتر میں اے سی چلائے بیٹھے ہو۔ اوپر سے مجھے بے حساب ٹھنڈا پلانے کی فکر میں ہو۔ تم کیا مجھے یہاں سے نمونے میں مبتلا کرکے بھیجنا چاہتے ہو؟ میں اس قسم کی ٹھنڈی ٹھار چیزوں کا عادی نہیں ہوں۔ تم میں ہی ہوگی اتنی قوت برداشت' مجھے تو بخش دو۔"

پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ میں تو اصل میں تمہیں ساتھ لینے آیا تھا۔ تمہیں دکھانے کے لئے ہمارے پاس اور تو کچھ ہے نہیں' میں نے سوچا تھا کہ آج تمہیں اپنا اصطبل ہی دکھانے لے چلوں لیکن اب تم سے کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی۔ تم بھلا میرے ساتھ چل کر اصطبل جیسی بے ہودہ چیز کو دیکھنے میں کہاں وقت ضائع کروگے۔ اتنی دیر میں تم یہاں بیٹھ کر لاکھوں کا بزنس کرلوگے۔"

"اصطبل دیکھنے سے تو مجھے واقعی دلچسپی نہیں۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہارا دل رکھنے کے لئے ساتھ چل سکتا ہوں۔ کہیں تم یہ نہ سوچو کہ کاروبار دوستی کو کھا گیا ہے۔"

"تم میرے اصطبل کا دیدار کرہی لو تو بہتر ہے۔ یہ بھی نہ جانے کتنے دن کا مہمان ہے۔" وہ غمزدہ لہجے میں بولا۔ "اگر ہماری آمدنی کا یہ ذریعہ بھی ختم ہوگیا تو ہمیں واقعی بڑا دھچکا لگے گا۔ دو چار اسکیموں میں ہم نے روپیا لگایا ہوا ہے لیکن ان کی آمدنی سے ہم اتنے ٹھاٹ باٹ سے نہیں رہ سکتے۔"

"لیکن تم اس کی طرف سے اتنے مایوس کیوں ہو؟ تمہیں کیوں اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اصطبل ختم ہوجائے گا؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے جب ریس کے کاروبار کا مالک ہی اس کے پیچھے لگ گیا ہے تو تباہی و بربادی ہی اس کا مقدر ہوگی۔" وہ اب کافی سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت سے کہا "ریس کے کاروبار کے مالک کو تو اصطبلوں کا سرپرست ہونا چاہئے۔"

"یہ ذرا تفصیل طلب باتیں ہیں۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "اگر تمہارا واقعی میرے ساتھ چلنے کا موڈ ہے تو اٹھو' میں تمہیں راستے میں صورت حال بتادوں گا بلکہ تمہیں تیزی سے تھوڑی سی دولت کمانے کا مشورہ بھی دوں گا۔ میں خود ایک ناکام بزنس مین سہی لیکن دوسروں کو دولت کمانے کا راستہ سُجھا سکتا ہوں۔ میں اس وقت اس لئے بھی اصطبل جانا چاہتا ہوں کہ آج شمیم کے بھی وہاں پہنچنے کا امکان ہے۔ کبھی کبھی وہ اچانک چیک کرنے آجاتی ہے کہ میں اصطبل پہنچا ہوں یا نہیں؟ اپنی دانست میں تو وہ اچانک ہی چھاپا مارتی ہے لیکن مجھے بھی اندازہ ہوگیا ہے کہ اس کے یہ "اچانک"

www.paksociety.com

"کیا میں تمہیں ایسا نظر آتا ہوں کہ چار منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر پسینے پسینے ہو جاؤں گا یا ہانپنے لگوں گا؟" میں نے پوچھا۔

"نظر تو نہیں آتے لیکن کیا پتا۔" اس کی مسکراہٹ اب بھی پھیکی تھی۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "چوتھی منزل تک کرائے پر اٹھنے والے کمرے وغیرہ ہیں۔ اس کے بعد چھت پر کسی خوبصورت انیکسی کی طرح مختار کا آفس بنا ہوا ہے۔ چوتھی منزل تک تو ہمیں کوئی نہیں پوچھے گا لیکن جب ہم چھت پر جانے کے لیے سیڑھیاں چڑھنے لگیں گے تو ہمیں جو مسلح آدمی کھڑا ملے گا، اس سے ذرا محتاط ہی رہ کر بات کرنا۔ وہ ہمیں روکے گا کیونکہ اس سے آگے جانے کا مطلب یہی ہو گا کہ ہم مختار کے پاس جا رہے ہیں۔ شاید وہ تمہاری تلاشی بھی لے۔ اس سے مت الجھنا۔ اس کا نام شوکا ہے۔ بڑا پرانا بدمعاش ہے۔"

"تم جس طرح کہو گی میں اسی طرح کروں گا۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ "لیکن تم نے کسی سے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ مختار اس وقت دفتر میں موجود بھی ہے یا نہیں؟"

"پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔" وہ بولی۔ "لابی میں قدم رکھتے ہی ریسپشنسٹ کا چہرہ دیکھ کر مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ مختار رفیق دفتر میں موجود ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ ریسپشنسٹ اور راستے میں ملنے والا ہر محافظ کتنا چاق و چوبند اور مستعد نظر آ رہا تھا؟"

"تم ان لوگوں کو بہتر جانتی ہو، تمہارا مشاہدہ اور دلیل قابلِ اعتبار ہے۔" میں نے طمانیت سے سرہلاتے ہوئے کہا۔

چوتھی منزل پر پہنچ کر جب ہم مزید سیڑھیاں چڑھنے کے لیے آگے بڑھے تو اچانک ہی ایک ستون کی آڑ سے نکل کر ایک شخص ہمارے سامنے آ گیا۔ کم از کم حلیے سے وہ 'شوکا بدمعاش' ہرگز نہیں لگ رہا تھا۔ وہ ڈنر سوٹ میں تھا اور بو لگائے ہوئے تھا۔ شرٹ بھی صاف ستھری اور سفید تھی۔ حتیٰ کہ اس نے عمدہ قسم کا کلون بھی لگا رکھا تھا۔

مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ اب بدمعاش بھی خوش لباس ہوتے جا رہے تھے۔ شاید انگریزی فلمیں دیکھنے لگے تھے لیکن اس کا چہرہ دیکھ کر شوکا بدمعاش جیسا ہی کوئی نام ذہن میں آتا تھا۔ چوڑا چکلا، کھردرا چہرہ تھا جس پر دو تین جگہ زخموں کے نشان تھے۔ موٹی موٹی مونچھوں نے بالائی ہونٹ کو چھپا رکھا تھا۔ آنکھوں میں گویا خون اترا ہوا تھا۔ دراز قد اور مضبوط تھا۔ جسم کسرتی معلوم ہو رہا تھا۔

ہم جب سے ہوٹل میں داخل ہوئے تھے، عنابی رنگ کے نہایت دبیز قالین پر چل رہے تھے۔ وال ٹو وال کارپٹ تھا۔ ہمارے قدموں کی ذرا سی بھی آہٹ نہیں ابھر رہی تھی اور اسی طرح بے آواز قدموں سے اچانک وہ ہمارے سامنے آ گیا تھا۔

"کہاں جا رہی ہیں میڈم؟" اس نے شیم کو کچھ ایسی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا کہ اگر شیم کا خانساماں بھی اس کے ساتھ ہوتا تو اسے بھی غصہ آ جاتا۔

"ہم ذرا مختار کے پاس جا رہے ہیں۔ کچھ کاروباری بات چیت کرنے۔" شیم نے پُروقار انداز میں جواب دیا۔ شوکے کی نظریں ایک لمحے کے لیے شیم کے سراپا کو چھیدتی رہیں۔ میں نے اس دوران بہ صد کوشش اپنی کنپٹیاں ٹھنڈی رکھیں۔

"باس کو آپ کی آمد کی اطلاع مل چکی ہے میڈم!" وہ نہ جانے کیوں ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ اس کا "میڈم" کہنے کا انداز مؤدبانہ کے بجائے استہزائیہ تھا۔ "اور وہ آپ کے منتظر ہیں لیکن......"

اس کی سوالیہ نظر مجھ پر آن ٹکی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ بے چین سا ہو گیا۔ اس کا ارادہ غالباً مجھے وہیں رکنے کے لیے کہنے کا تھا لیکن پھر گویا وہ حاتم طائی کی قبر پر لات مارتے ہوئے بولا "آپ بھی جا سکتے ہیں لیکن آپ کی جیب میں جو پستول ہے، وہ مہربانی کر کے مجھے دے جائیے، واپسی پر مل جائے گا۔ باس ایسے مہمانوں کو پسند نہیں کرتے جو خنجر، پستول وغیرہ لے کر کاروباری گفتگو کرنے آتے ہوں۔"

بظاہر وہ شریفانہ ہی انداز میں بات کر رہا تھا لیکن لہجہ کچھ ایسا جھٹکے دار تھا کہ خواہ مخواہ ہی نیم استہزائیہ سا محسوس ہوتا تھا۔

میں بغلی ہولسٹر نہیں لگاتا تھا۔ اپنا مشین پسٹل کوٹ کی اندرونی جیب میں ہی رکھتا تھا۔ اس نے اگر یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ میرے کوٹ کی جیب میں پسٹل موجود تھا تو اس کی نظر قابلِ داد تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا اور میرے لیے بھی یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ہاتھ کسی گن کے دستے پر تھا۔

میں ایک لمحے ساکت رہا تو وہ دھیمے مگر ویسے ہی جھٹکے دار سے لہجے میں بولا۔ "اس بات کو یقینی بنانا میری ذمے داری ہے کہ جب کوئی باس سے بات کرنے آئے تو صرف بات ہی کرے۔"

شیم مضطربانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے جیب سے مشین پسٹل نکالا اور نہایت مؤدبانہ انداز میں شوکے کی خدمت میں پیش کر دیا۔ شوکے نے اسے بائیں ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا اور تحسین آمیز لہجے میں بولا۔ "اچھی چیز ہے۔ کیا اکثر استعمال میں رہتا ہے؟"

"نہیں۔ ایسے ہی شوقیہ رکھا ہوا ہے۔ اگر یہ جیب میں موجود ہو تو کوٹ کی فٹنگ ذرا اچھی معلوم ہوتی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس نے موٹی بھویں اچکائیں اور کچھ کہنے کے لیے ہونٹ ہلائے۔ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کہنا چاہتا تھا۔ "زیادہ شوخ بننے کی کوشش نہ کرو باؤجی! شاید تم مجھ سے واقف نہیں ہو۔"

لیکن اس نے غالباً کچھ بھی کہنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ہمیں سیڑھیوں کی طرف جانے کے لیے راستہ دے دیا۔ ساتھ ہی اس کا ہاتھ دیوار میں نصب انٹرکام سیٹ کی طرف بڑھ گیا۔

ہم اوپر پہنچے تو کھلی چھت پر نہایت فرحت بخش ہوا کے

جھونکوں نے ہمارا استقبال کیا۔ سامنے ایک خوبصورت انیکسی سی نظر آ رہی تھی، جس میں مغلیہ طرز کی محرابیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں بھی شان و شوکت اور مہنگی آرائش کا عنصر نمایاں تھا۔ مختار اپنی اچھی خاصی لمبی ایمپائر بنائے بیٹھا تھا۔

یہاں بھی مین دروازے پر ایک باوردی، مسلح محافظ نظر آ رہا تھا۔ آنکھوں سے وہ نیم خوابیدہ سا نظر آ رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ حقیقت میں وہ چیتے کی طرح چوکنا تھا۔ ہمیں دیکھ کر بھی اس کے نیم خوابیدہ انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کے قریب بھی دیوار میں انٹرکام نصب تھا۔ یقیناً اسے بھی ہماری آمد کی اطلاع مل چکی تھی۔

ہم اس کے قریب پہنچے تو وہ بہت دھیمی آواز میں شیم سے مخاطب ہوا۔ "باس آج زیادہ آدمیوں سے ملاقات کے موڈ میں نہیں ہے۔ کیا ان صاحب کو ساتھ لے جانا ضروری ہے؟" اس نے آنکھوں سے میری طرف اشارہ کیا۔

"انہی صاحب کا جانا تو اصل میں ضروری ہے۔" شیم بولی۔ "میں تو یونہی ذرا سجاوٹ کے لیے ساتھ آ گئی ہوں۔"

اس جملے میں لفظ "سجاوٹ" کے استعمال سے میں محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ شیم کی جرأت اب شاید واپس آ رہی تھی۔ اب تو وہ منزل پر ہی پہنچ گئی تھی۔ غالباً اس نے سوچ لیا تھا کہ جو ہونا ہے، اب اس کے ٹلنے کی کوئی تدبیر نہیں۔ چنانچہ اب پریشان ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔

لیکن وہ مسلح گارڈ یقیناً موٹی کھوپڑی کا آدمی تھا، جیسا کہ عموماً اس قبیل کے لوگ ہوتے ہیں۔ اس نے شیم کے الفاظ پر زیادہ توجہ نہیں دی اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا "باس کو تو ان کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں۔"

"میں ہی ان کی آمد کی اطلاع ہوں۔ یعنی اطلاع اور یہ صاحب ساتھ ساتھ ہی آئے ہیں۔" شیم بولی۔

گارڈ نے قدرے الجھن کے سے عالم میں اندر کا دروازہ کھول دیا اور خود بھی ہمارے پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔ وہ دروازہ کمرے کا نہیں، ڈیوڑھی نما ایک حصے کا تھا جہاں روشنی بہت کم تھی۔ شیم وہاں ایک دم رک کر مسلح گارڈ کی طرف پلٹتے ہوئے بولی۔ "میں نے آج تک کبھی تمہارا نام ہی نہیں پوچھا۔"

گارڈ کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ "میرا نام منظور ہے۔"

"چہرے سے نامنظور لگتے ہو۔" شیم نے زیرِ لب کہا، پھر جلدی سے ذرا بلند آواز میں بولی۔ "منظور! تم باہر ہی اپنی جگہ کھڑے نہیں رہ سکتے؟"

منظور نے اپنا بڑا سا سر نفی میں ہلایا "جب کوئی مرد، باس سے ملنے آتا ہے تو میں اندر باس کے پاس رہتا ہوں۔ باس کا یہی حکم ہے۔"

"اور عورت آئے تو باہر ہی کھڑے پہرہ دیتے رہتے ہو؟" شیم نے تصدیق چاہی۔

منظور نے اثبات میں سرہلایا تو شیم میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "دیکھا..... عورت ہونے کے کتنے فائدے ہوتے ہیں۔"

"بعض جگہوں پر ناقابلِ تلافی نقصان بھی ہو جاتا ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

شیم نے آگے بڑھ کر دوسرا دروازہ کھولا اور ہم ایک طویل و عریض کمرے میں پہنچے جہاں عمدہ قسم کے ائر فریشنر کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں دودھیا سی روشنی میں ماحول کچھ خوابناک سا لگ رہا تھا۔ کمرے کا ایک حصہ نشست گاہ پر مشتمل تھا، دوسری طرف بڑی سی آراستہ میز کے عقب میں مختار ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگائے نیم دراز سی حالت میں نیل کٹر کی ریتی سے اپنے ناخن ہموار کر رہا تھا۔

پہلی نظر میں مجھے اس پر کسی نیگرو ہی کا گمان گزرا لیکن بیشتر نیگروز کی طرح اس کے نقوش موٹے موٹے نہیں بلکہ تیکھے تھے۔ اک ادائے بے نیازی کے اظہار کے لیے اس نے ہماری آمد پر بھی سر اٹھا کر نہیں دیکھا۔

شیم ایک لمحے کے لیے میری طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔ "حیرت ہے! اب بھیڑیے بھی ناخن تراشنے لگے۔"

ہم کمرے کے وسط میں پہنچ کر رک گئے۔ منظور ہمارے عقب میں کھڑا تھا۔ شیم بولی۔ "مختار! میرا خیال ہے ہم کل آ جائیں گے۔ کل تک تو تم اس ضروری کام سے فارغ ہو ہی جاؤ گے۔ ہے نا؟"

تب مختار نے نیل کٹر بند کر کے میز کی دراز میں رکھا اور نہایت آہستگی سے نظر اٹھائی۔ مجھے دیکھتے ہی اسے گویا حیرت کا شدید جھٹکا لگا لیکن اس کا اندازہ مجھے صرف اس کی آنکھوں سے ہوا، اس کی کسی اور حرکت سے ردِعمل کا کوئی خاص اظہار نہیں ہوا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ شہر میں شاید اب ایسے لوگ خاصی تعداد میں پائے جانے لگے تھے جنہیں میں نہیں پہچانتا تھا مگر وہ مجھے پہچانتے تھے۔

"زہے نصیب!" وہ کاہلی آمیز سے انداز میں اٹھتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے ہیں۔ کمال ہے! یہ انہونی کیسے ہو گئی؟ انہیں تم لائی ہو شیم بیگم؟"

"نہیں۔ میں انہیں نہیں لائی، یہ مجھے لائے ہیں۔ میں تو تمام راستے انہیں روکنے کی کوشش کرتی آئی ہوں۔" شیم بولی۔

"اگر تم انہیں واقعی یہاں آنے سے روکنے کی کوشش کر رہی تھیں تو بہت برا کر رہی تھیں۔ چوہدری صاحب خود چل کر کسی کے ہاں جائیں، یہ اعزاز ہر کسی کو کہاں حاصل ہوتا ہے۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے ذرا تامل کیا۔ میرا اس سے ہاتھ ملانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا لیکن پھر ملا ہی لیا۔ شیم نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ نہ جانے کیوں

سرکش

5

محمود احمد مودی

میں حسبِ وعدہ دس منٹ سے بھی کم وقت میں تیار ہو کر نیچے پہنچ گیا۔ گاڑی میں نے گیٹ سے باہر نکال لی اور گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ باہر آنے سے پہلے میں نے ایک فون بھی کیا۔ اس قسم کے معاملات میں کہیں روانہ ہونے سے پہلے میں کچھ احتیاطی تدابیر ضرور کر لیتا تھا جو اکثر کام آتی تھیں۔

چند لمحے بعد ایک گاڑی آندھی طوفان کی طرح گلی میں داخل ہوئی۔ وہ میرے قریب آکر رکی تو رات کے سناٹے میں اس کے بریکوں کی چرچراہٹ کچھ زیادہ ہی تیز محسوس ہوئی۔ وہ شمیم ہی کی گاڑی تھی اور وہ خود ہی ڈرائیو کر رہی تھی۔ راجو اس کے برابر بیٹھا تھا۔ پچھلی سیٹ پر ایک اور شخص موجود تھا۔ وہ غالباً اصطبل پر کام کرنے والا کوئی ملازم تھا۔

"تم گاڑی اندر کھڑی کر دو اور میری گاڑی میں آجاؤ۔" میں نے کھڑکی سے سر نکال کر کہا "دو گاڑیوں میں جانا مناسب نہیں رہے گا۔"

میں نے گیٹ کھلوایا اور شمیم گاڑی ڈرائیو وے میں لے گئی۔ وہ گاڑی وہیں چھوڑ آئی اور تینوں میری گاڑی میں آبیٹھے۔ سڑکیں ویران تھیں اور موقع اہم تھا۔ میں نے اپنی گاڑی سے ہوائی جہاز کا کام لینے کی کوشش کی۔ جب شمیم کو اطمینان ہو گیا کہ میں حتیٰ الامکان تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا تب میں نے پوچھا "قصہ کیا ہے؟"

"قصہ تو ختم ہو گیا۔" وہ افسردگی سے بولی۔ اس نے جب فون کیا تھا تو اس کا انداز ہسٹریائی تھا لیکن اب وہ اپنے آپ پر کافی حد تک قابو پا چکی تھی۔ اب بظاہر صرف افسردگی رہ گئی تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کا دل اب بھی خون کے آنسو رو رہا تھا۔

"پھر بھی کچھ تفصیل تو بتاؤ۔" میں نے ایک موڑ کاٹتے ہوئے کہا۔

وہ پچھلی سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "قادر وہاں سے آیا ہے۔ اصطبل میں فون بھی نہیں تھا کہ یہ فون ہی کر دیتا۔ اور رات کے اس پہر اسے راستے میں بھی کہیں فون میسر نہیں آیا۔ کیسی ٹریجڈی ہے۔ رات گئے کسی ایمرجنسی کی صورت میں بعض علاقوں میں میلوں تک فون بھی دستیاب نہیں ہوتا۔ یہ وہاں سے موٹر سائیکل پر چلا تھا۔ انسان جتنی زیادہ جلدی میں ہوتا ہے، بعض اوقات اتنی ہی زیادہ رکاوٹیں راستے میں حائل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ وحدت کالونی کے قریب اس کی موٹر سائیکل بھی خراب ہو گئی۔ بڑی مشکل سے اسے ایک ٹیکسی ملی۔ ہم جس حال میں تھے، اسی طرح اٹھ کر بھاگے۔ اس کے باوجود تم اندازہ کر سکتے ہو کہ کتنا وقت ضائع ہو چکا ہے... کیا بچا ہو گا وہاں!" اس کی آواز میں ایک سسکی سی شامل تھی۔

"وہاں مسلح محافظ موجود رہتے تھے۔ وہ کیا ہوئے؟" میں نے پوچھا۔

"دو محافظ موجود تھے... لیکن قادر نے جو کچھ بتایا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بڑے منظم انداز میں... خاص حکمتِ عملی کے ساتھ اصطبل پر شب خون مارا گیا تھا۔" شمیم بولی "پہلے غالباً بے خبری میں گارڈز پر حملہ کر کے انہیں بے ہوش کیا گیا۔ استاد نور محمد کو بھی بے ہوش کر دیا گیا تھا۔ قادر بند کوٹھری میں سونے کا عادی ہے، یہ بے ہوش ہونے سے بچ گیا۔ آگ کی تپش محسوس کر کے اس کی آنکھ کھلی تب اس نے دیکھا، اس کی کوٹھری بھی شعلوں میں گھری ہوئی تھی۔ بڑی مشکل سے یہ نکلا...."

راجو بالکل خاموش تھا اور ناک کی سیدھ میں دیکھ رہا تھا۔ شمیم نے اپنا نائٹ گاؤن درست کیا اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے سلسلہ کلام جوڑا "قادر کے علاوہ رات کو اصطبل میں عموماً تین چار آدمی ہی موجود ہوتے ہیں۔ سب بے ہوش پڑے ہوئے

تھے۔ ان کے سروں پر کسی بھاری چیز سے ضرب لگائی گئی تھی اور پورے اصطبل پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگائی گئی تھی جو ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ اس نے گھوڑوں کو بری طرح ہنہناتے سنا۔ یہ بوکھلا گیا۔ اکیلا تھا' اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ گارڈز اور استاد نور محمد کو اٹھا کر محفوظ جگہ پر جا کر لٹایا اور ہمیں اطلاع دینے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ اس کی موٹر سائیکل بھی آگ کی لپیٹ میں آنے ہی والی تھی۔ معلوم نہیں اب تک وہاں کیا ہو چکا ہوگا!"

"ان سڑکوں پر گاڑی اس سے تیز نہیں چلائی جا سکتی ورنہ میں کچھ اور جلدی پہنچنے کی کوشش کرتا۔" میں نے کہا۔

"میرے خیال میں تو تم اس سے بھی کچھ کم رفتار سے ہی چلاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ہم ایک ٹریجڈی کے سلسلے میں جاتے جاتے خود دوسری ٹریجڈی بن جائیں۔" وہ بولی۔

"ہاں... مجھے بھی اس رفتار سے ڈر لگ رہا ہے۔" راجو نے بھی اتنی دیر میں پہلی بار زبان کھولی۔ اس کی آواز میں لرزش تھی۔ "میرے تو ویسے ہی ہوش ٹھکانے نہیں ہیں۔ میں ابھی باہر سے آکر سویا ہی تھا۔"

"تمہارے حواس ویسے بھی کب ٹھکانے ہوتے ہیں۔" شمیم جلے بھنے سے انداز میں بولی۔

راجو نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں اور ایک سگریٹ سلگاتے ہوئے بولا "مختار رفیق نے ردِعمل ظاہر کرنے میں ذرا بھی تاخیر نہیں کی' اسی لیے میں اس سے پنگا لیتے ہوئے ڈرتا تھا۔"

"چلو.... مختار رفیق سے تو پنگا لیتے ہوئے تم ڈرتے تھے اور کس سے پنگا لینے کی ہمت ہے تم میں؟" شمیم جارحانہ لہجے میں بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت اسے اپنا غصہ اور جھنجلاہٹ نکالنے کے لیے ایک ہدف کی ضرورت تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ ہدف راجو ہو۔ صورتِ حال جو کچھ بھی تھی' راجو کا اس میں کچھ زیادہ قصور نہیں تھا۔ بدمعاش اپنی اپنی بدمعاشیاں دکھا جاتے ہیں' کمزور لوگ آپس میں لڑتے رہ جاتے ہیں۔

"اپنا گھریلو ڈراما مت شروع کرو۔ یہ وقت نہیں ہے اس طرح چونچیں لڑانے کا۔" میں نے ان دونوں کو ڈانٹا پھر دھیمے لہجے میں کہا۔ "شمیم! تمہیں افسوس تو ہوا ہوگا کہ میری دخل اندازی سے فائدے کے بجائے نقصان ہو گیا۔ میں تم سے شرمندہ ہوں۔ تمہارے مفادات کی حفاظت صحیح طور پر نہیں کر سکا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ سانپ اگر نظر آجائے تو پھر اس کا سر جتنی جلدی کچل دیا جائے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے۔"

"اب تم مجھے شرمندہ مت کرو۔" وہ تیزی سے بولی "اصل چیز نیت ہوتی ہے۔ تم نے جو کچھ کیا' ظاہر ہے میری بہتری کی نیت سے کیا تھا۔ اپنی جان و مال کو خطرے میں ڈالا تھا۔ مختار جیسے آدمی پر ایسی بے خوفی سے ہاتھ ڈالا تھا۔ یہ تمہارا احسان تھا۔ میں اس احسان کو بھول نہیں سکتی۔ مجھے نقصان وغیرہ کا کوئی افسوس نہیں مجھے تو صرف رِکلر جیسے گھوڑے کے انجام کا افسوس ہے۔ غیر معمولی انسان ہی نہیں' غیر معمولی حیوان بھی کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے رِکلر ایک غیر معمولی گھوڑا تھا۔ مجھے اس سے غیر معمولی حد تک اُنسیت تھی۔ وہ مجھے بعض انسانوں سے زیادہ عزیز تھا۔"

"میں نے تو اسے آج پہلی بار دیکھا تھا۔" میں نے اپنے تاسف کو چھپاتے ہوئے کہا "مجھے خود اس سے انسیت ہو گئی تھی۔ میں ویسے بھی غیر معمولی چیزوں اور غیر معمولی مخلوقات کا بڑا قدردان ہوں... اور اس وقت تو مجھے صرف رِکلر ہی کا نہیں' سب گھوڑوں کا بھی بہت افسوس ہو رہا ہے۔ بڑا ظلم ہے کہ کوئی پر پیٹرول چھڑک کر آگ لگا دی جائے اور مجبور بے زبان جانور زندہ جل جائیں۔"

"تم جانوروں کی بات کر رہے ہو۔ ہماری سوسائٹی میں انسانوں کے ساتھ بھی یہ سلوک ہو رہا ہے اور باتیں کرتے ہیں لوگ اخلاقیات' انسانیت اور مذہب کی۔" شمیم تلخ لہجے میں بولی۔

"میں نے تو مختار رفیق کے لیے اتنا ہی سبق کافی سمجھا تھا جو میں اسے دے آیا تھا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "لیکن لگتا ہے اسے اپنے انجام تک پہنچنے کی بہت جلدی ہے۔"

"نہیں... پلیز.... اب اسے کچھ مت کہنا۔" شمیم گویا سہم کر بولی "ایسا نہ ہو کہ اس کے انجام تک پہنچنے سے پہلے ہم اپنے انجام کو پہنچ جائیں۔"

"اب ڈرنے کا کیا فائدہ؟" میں نے کہا؟ تمہیں رِکلر کی سب سے زیادہ فکر تھی' وہ تو ہاتھ سے جا ہی چکا ہے۔"

"ابھی ہماری جانیں تو بچی ہوئی ہیں۔ تم چاہتے ہو ہم ان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھیں؟" وہ تیزی سے بولی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے لہجے میں حد درجہ نرمی آگئی "دیکھو.... میں تمہاری مہربانیوں سے منکر نہیں ہو رہی... لیکن اب بھلا مختار جیسے لوگوں کا کیا علاج ہے۔ بہتر یہی ہے کہ انسان اس جیسے لوگوں کے راستے سے ہٹ جائے۔"

"یہی تو ہمارا المیہ ہے.....!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "کہ ہم بُرے لوگوں کے لیے راستے خالی کرتے چلے جاتے ہیں جس کی وجہ سے وہ ہر قدم پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر خباثت کے راستے پر سفر شروع کرتے وقت انہیں شروع ہی سے مستقل طور پر مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑے تو ان کے حوصلے اتنے بلند نہ ہوں۔"

"جن کے پاس کسی نہ کسی قسم کی طاقت موجود ہو' ان کے منہ سے یہ باتیں اچھی لگتی ہیں۔ کمزور' بے بس اور شریف لوگ تو اپنے محلے میں گریبان کھول کر چلنے والے دو ٹکے کے لفنگوں سے بھی ڈرتے ہیں۔" شمیم بولی۔

"اگر تم جیسے لوگ بھی اپنا شمار غریب' مجبور اور قطعی بے بس لوگوں میں کرنے لگیں تو پھر مزاحمت کرنے والے کہاں سے آئیں گے؟" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا۔

"مختار رفیق کے مقابلے میں ہم غریب' مجبور اور بے بس ہی ہیں۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"خیر.... میں دوبارہ اس بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ میں صرف اتنا کہوں گا کہ اگر میں نے تمہیں اس پچھتاوے کے ساتھ چھوڑ دیا کہ تم نے مجھ سے مدد لے کر غلطی کی تھی' تو میں زندگی بھر اپنے آپ کو معاف نہیں کر سکوں گا۔"

اس نے کچھ کہنے کے لیے پہلو بدلتے ہوئے منہ کھولا لیکن میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بولنے سے باز رکھا۔ ہم بند روڈ پر مڑ چکے تھے۔ سڑک تنگ اور اونچی تھی۔ دونوں طرف نشیب میں پانی تھا اور وہاں کوئی الیکٹرک پول وغیرہ بھی نہیں تھا۔ چاروں طرف گہری تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ میں اب بھی بہت تیز رفتاری سے ڈرائیو کر رہا تھا اس لیے محتاط رہنا چاہتا تھا۔ اس سڑک پر اس رفتار سے ڈرائیو کرنے کے لیے توجہ اور یکسوئی ضروری تھی۔

آخر کار ہم اس پگڈنڈی پر مڑ گئے جو اصطبل کی طرف جاتی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ اپنے گھر سے روانہ ہونے کے ٹھیک بیس منٹ بعد میں نے ان لوگوں کو یہاں پہنچا دیا تھا' بلند ہوتے ہوئے شعلے ہمیں دور ہی سے نظر آگئے تھے۔ اصطبل میں تعمیرات اتنی زیادہ نہیں تھیں اس کے باوجود آگ خاصے بڑے رقبے پر پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ کہیں شعلے دم توڑ رہے تھے اور کہیں شباب پر تھے۔ لکڑی کا بڑا سا گیٹ بھی جل کر گر چکا تھا اور دہکتے ہوئے بڑے بڑے انگاروں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ گویا اس راستے سے بھی داخل ہونا مشکل ہو گیا تھا۔

احاطے کا بیشتر حصہ اور کچی دیواریں آگ سے محفوظ تھیں لیکن اس کا اب ظاہر ہے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ جس چیز کی ذرا بھی کوئی اہمیت ہو سکتی تھی اسے آگ نگل چکی تھی۔

میں نے گیٹ سے خاصی دور ہی گاڑی روک لی کیونکہ تیز ہوا کے ساتھ صرف دھواں اور تپش ہی نہیں بلکہ شرارے اور چنگاریاں بھی اُڑ کر آ رہی تھیں جن سے کسی اور چیز کے بھی آگ پکڑ لینے کا اندیشہ تھا۔

گاڑی بہت کشادہ تھی۔ شمیم اور راجو کسی تنگی یا دشواری کے بغیر آگے ہی اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے۔ میں تیزی سے گاڑی سے اترا لیکن وہ ایک لمحے کے لیے دم بخود سے بیٹھے ہی رہے۔ دونوں پھٹی پھٹی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے تھے جہاں اب غالباً کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ ہیجان' وہ اضطراب جو تمام راستے ان پر طاری رہا تھا' اب گویا یکدم ہی ختم ہو گیا تھا۔ مایوسی اور دل شکستگی نے اس کی جگہ لے لی تھی آخرکار وہ ڈھیلے ڈھالے اور شکست خوردہ سے انداز میں گاڑی سے اترے۔

اس وقت تک وہاں خاصے لوگ جمع ہو چکے تھے جو غالباً قریبی بستی سے آئے تھے۔ ان میں سے چند ایک کے پاس بالٹیاں بھی تھیں اور وہ ایک جوہڑ سے پانی لا کر آگ پر ڈالنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جوہڑ کا فاصلہ خاصا تھا اور آگ بہت پھیلی ہوئی تھی۔ جتنی دیر میں ایک شخص بالٹی بھر کر لاتا تھا' اتنی دیر میں اس کا آگ پر پانی پھینکنا محض مذاق ہی محسوس ہوتا تھا۔ لیکن لوگ بے چارے بہرحال اپنی سی کوشش کر رہے تھے اور یہ کوشش قابلِ تعریف تھی۔ فضا میں گوشت جلنے کی بُو اور چراند پھیلی ہوئی تھی۔ گھوڑوں کی آوازیں نہ جانے کب کی معدوم ہو چکی تھی لیکن میں فضا میں اب بھی ان کی لرزہ خیز بازگشت محسوس کر رہا تھا۔

ہجوم سے تین افراد ہماری طرف بڑھے۔ شعلوں کی لرزتی نارنجی روشنی میں' میں نے دیکھا ان میں سے ایک استاد نور محمد تھا۔ اس کے پیچھے آنے والے دو افراد گارڈز تھے۔ رائفلیں اب بھی ان کے ہاتھوں میں تھیں اور ان کے سر جھکے ہوئے تھے۔ یقیناً وہ مجبی طرح شرمندہ تھے کہ ان کی موجودگی میں سب کچھ نذرِ آتش کر دیا گیا تھا لیکن درحقیقت ان کا کچھ زیادہ قصور بھی نہیں تھا۔ اس قسم کے گارڈز عام سے چوروں' ڈاکوؤں یا دن دہاڑے آکر حملہ آور ہونے والوں کے مقابلے میں تو دیوار بن کر کھڑے ہو سکتے ہیں لیکن مکاری اور منصوبہ بندی سے کارروائی کرنے والوں کے سامنے کچھ زیادہ کارآمد ثابت نہیں ہوتے۔

ان میں سے ایک کے کان اور رخسار پر خون جما ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے کو غالباً جب عقب سے کوئی وزنی چیز مار کر بے ہوش کیا گیا تو وہ اوندھے منہ زمین پر گرا تھا اور اس کی نکسیر پھوٹ گئی تھی۔ اس کا چہرہ مٹی اور خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ ویسے بھی اصطبل جتنے بڑے رقبے پر پھیلا ہوا تھا اور جیسا اس کا محلِ وقوع تھا اس کی مناسبت سے میرے خیال میں اس کی حفاظت کے لیے رات کی تاریکی میں دو گارڈز ناکافی تھے۔ لیکن وہ بہرحال زوال کو پہنچا ہوا ایک اصطبل تھا جس کا اصل اثاثہ صرف ایک ہی گھوڑا تھا۔ اس حساب سے اس پر جتنے اخراجات اٹھ رہے تھے' میرے

اندازے کے مطابق راجو اور شمیم کے لیے وہی بہت زیادہ تھے۔

راجو استاد نور محمد سے لپٹ کر بہ آوازِ بلند رونے لگا۔ وہ اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اسے تسلیاں دینے لگے۔ ان کی اپنی آواز بھی بھرائی ہوئی تھی اور آنکھوں میں نمی تھی۔ راجو آہ وزاری کے درمیان بولا "کل تو کلر کو ریس میں حصہ لینا تھا.... اور آثار بتا رہے تھے کہ کل کی ریس میں بہت بھاری ہجوم ہوگا۔ لاکھوں روپے تو ریس کورس سے باہر شرطوں میں لگ چکے ہوں گے.... ہماری آمدنی کا آخری ذریعہ بھی ختم ہوگیا... ہم تباہ ہوگئے استاد!"

مجھے کچھ عجیب سا لگا کہ وہ کلر کا ذکر صرف ایک ذریعۂ آمدنی کے طور پر کر رہا تھا' ایک جاندار کے طور پر نہیں۔ استاد اسے تسلیاں دینے لگے۔ شمیم بدستور دم بخود کھڑی تھی اور کوٹھریوں وغیرہ کی ان قطاروں کی طرف دیکھ رہی تھی جہاں اب صرف دَم توڑتے ہوئے شعلے' دہکتے انگاروں کے انبار اور راکھ کے ڈھیر باقی رہ گئے تھے۔ ہوا میں ابھی تک گوشت اور چمڑا جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی جس سے دل خراب ہو رہا تھا۔

ہجوم بھی دھیرے دھیرے ہمارے گرد جمع ہونے لگا تھا۔ لوگوں کو علم ہوگیا تھا کہ مالکان آن پہنچے ہیں۔ وہ بھی مختلف سوالات کرکے اپنے تجسس کی تسکین کی کوشش کر رہے تھے۔ انہیں بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ آگ لگی نہیں تھی' لگائی گئی تھی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ یہ کس کی حرکت تھی۔ شمیم اور راجو کو ہجوم سے وحشت ہو رہی تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس سوال کا کیا جواب دیں۔ وہ قریب ہی ایک کچی سی آبادی میں رہنے والے نیم دیہاتی سے لوگوں کا ہجوم تھا۔ وہ ایک بے عنوان سے اخلاص اور ہمدردی کے تحت سوالات کر رہے تھے۔ انہی میں سے کچھ لوگ بالٹیوں سے آگ بجھانے کے لیے مقدور بھر کوششیں کر رہے تھے۔ میں نے محبت اور ملائمت سے ان سے درخواست کی کہ اس وقت وہ راجو اور شمیم سے کوئی سوال نہ کریں' وہ بہت پریشان ہیں اور اس وقت کسی سوال کا جواب دینے کے قابل نہیں ہیں۔

اسی اثنا میں فائر بریگیڈ کا سائرن سنائی دیا۔ شاید راجو یا شمیم نے روانہ ہونے سے پہلے فائر بریگیڈ کو فون کیا تھا۔ گو کہ اب اس کی آمد کا کوئی فائدہ نہیں تھا لیکن اپنے حساب سے وہ بہرحال جلدی ہی آگئے تھے۔ اس دور دراز مقام پر ان کا کسی اطلاع پر آجانا ہی غنیمت تھا۔ فائر بریگیڈ کی دو گاڑیاں تھیں۔ ہجوم انہیں راستہ دینے کے لیے اِدھر اُدھر بکھر گیا۔

فائر بریگیڈ والے اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ اب تو وہ بجھتی ہوئی آگ کو ہی بجھا سکتے تھے۔ کچھ بچا نہیں سکتے تھے۔ گارڈز ابھی تک شمیم کے سامنے معذرتیں پیش کر رہے تھے کہ وہ بے خبری میں مارے گئے ورنہ شاید یہ سب کچھ نہ ہوتا لیکن شمیم گویا ان کی آواز نہیں سن رہی تھی۔ میں شمیم اور راجو دونوں کو بازو سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا جہاں کوئی نہیں تھا۔

"اب تو آگ ٹھنڈی ہونے کے بعد ہی دیکھا جاسکتا ہے کہ کیا بچا ہے۔" میں نے کہا۔ مجھے اصل میں شمیم کی خاموشی سے الجھن ہو رہی تھی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ کچھ بولے۔

وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "یہاں گھوڑوں کے سوا تو کوئی قیمتی چیز نہیں تھی... اور ان کی اب کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی۔"

استاد نور محمد اپنے چھدرے اور سفید بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا "شمیم بٹی! تم دل چھوٹا مت کرو...."

دفعتاً اصطبل کی طرف آنے والی پگڈنڈی پر کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس نمودار ہوئیں۔ استاد نور محمد نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ان کی نظر ادھر ہی جم کر رہ گئی تھی۔ کوئی گاڑی مین روڈ سے پگڈنڈی پر مڑی تھی' میں بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔

چند لمحے بعد گاڑی ہمارے قریب آکر رکی۔ وہ ایک قیمتی' سیاہ' لمبی سی مرسیڈیز تھی' تمام شیشے گہرے رنگ کے تھے۔ گاڑی کے چاروں دروازے بیک وقت کھلے اور اس نے چار آدمیوں کو یکدم ہی اگل دیا۔ تین کے ہاتھوں میں رائفلیں تھیں اور ایک کے ہاتھ میں ہلکی مشین گن۔ نہایت ماہرانہ سے انداز میں انہوں نے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔

اصطبل کے گارڈز اس وقت کچھ فاصلے پر تھے۔ وہ جلدی سے پوزیشن لینے کے لیے دوڑے لیکن اسی لمحے پانچواں شخص نہایت شاہانہ انداز میں گاڑی سے اترا اور بازو لہرا کر انہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "نہیں .... نہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یہاں کوئی لڑائی جھگڑا نہیں ہو رہا۔ ہم تو صرف افسوس کا اظہار کرنے آئے ہیں۔"

لیکن گارڈز اس کے باوجود دو درختوں کی آڑ میں چلے گئے اور ایک گارڈ نے للکارا "اوئے خانہ خراب کا بچہ! اگر کسی نے کوئی بدمعاشی کیا تو اس کا لاش ایدھر سے جائے گا۔"

گاڑی سے اترنے والا پانچواں آدمی مختار رفیق تھا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا۔ رات کے اس پہر بھی وہ گویا کسی ڈنر میں شرکت کے لیے تیار ہو کر آیا تھا۔ وہ بہ آوازِ بلند گویا گارڈ کو خبردار کرتے ہوئے بولا "مت بھولنا کہ تمہارے مالک اور ان کے پیارے دوست ہمارے گھیرے میں ہیں۔ لیکن میں ایک بار پھر بتا رہا ہوں.... کوئی بے وقوفی نہ کرنا۔ ہم تمہارے مالکان کے دوست ہیں ان سے ملنے آئے ہیں۔"

گارڈز نہیں جانتے تھے کہ وہ کون لوگ ہیں۔ وہ تو صرف ان کی گنیں دیکھ کر احتیاطاً پوزیشن لے کر بیٹھ گئے تھے۔ مختار رفیق کی بات سن کر وہ گویا الجھن میں پڑ گئے۔ ایک لمحے کے لیے سکوت چھا گیا۔ ماحول پر عجیب سا تناؤ تھا۔ دوسرے گارڈ نے درخت کے عقب سے چلا کر پوچھا "بیگم صاحب! کیا حکم ہے؟"

شمیم تھوک نگل کر بولی "گولی مت چلانا۔ خطرے والی کوئی بات نہیں۔"

میں بالکل خاموش کھڑا' پلکیں جھپکائے بغیر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جیسے میرا اس ساری صورتِ حال سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔ گارڈز کے لیے شمیم کی ہدایت سن کر مختار رفیق کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ وہ اپنے مخصوص ہوسناک سے انداز میں شمیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "شمیم بیگم! میری ہمیشہ سے تمہارے بارے میں رائے یہی رہی ہے کہ تم ایک ذہین اور معاملہ فہم عورت ہو۔ بس گزشتہ شام میری تمہارے بارے میں رائے ذرا بدل گئی تھی۔ لیکن خیر.... کوئی بات نہیں۔ ایسا ہوتا رہتا ہے۔"

اس کے لہجے میں بَلا کی شائستگی اور ملائمت تھی جو اس کی شخصیت سے میل نہیں کھاتی تھی۔ اسے دیکھ کر گمان گزرتا تھا کہ اس کا بچپن گلیوں میں لڑائی مار کٹائی میں اور جوانی بدقماش لوگوں میں گزری ہوگی لیکن اس کے ساتھ اس کا نفیس سوٹ دیکھ کر اور اس کا شائستہ وشیریں لہجہ سن کر کچھ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے ببول پر مخمل کا غلاف چڑھا دیا گیا ہو۔

مختصر سا ہجوم ہم سے کچھ دور تھا لیکن لوگوں نے دور سے ہی محسوس کرلیا تھا کہ ماحول میں تناؤ تھا اور بندوقوں کی نالیں ایک دوسرے کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے دھیرے دھیرے کھسکنا شروع کردیا تھا۔ اصطبل کی آتشزنی اور پھر بندوق برداروں کی آمد دیکھ کر انہوں نے غالباً نتیجہ اخذ کرلیا تھا کہ یہ دشمنی کا کوئی چکر تھا اور وہ اس دشمنی میں الجھنا یا کسی بھی واقعے کا گواہ بننا نہیں چاہتے تھے۔ تاہم وہ دو چار آدمی جو کچھ دیر پہلے تک بالٹیوں سے پانی لاکر آگ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے وہ اب فائر بریگیڈ والوں کی مدد میں لگے رہے۔ فائر بریگیڈ والے بھی اپنے کام میں مصروف رہے۔ ہمارے اور ان کے درمیان خاصا فاصلہ تھا وہ گویا ہماری طرف سے بے خبر تھے۔

راجو اور شمیم دونوں ہی دم بخود کھڑے تھے۔ ان کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ ان پر ایک بار پھر مختار رفیق کی دہشت غالب آچکی تھی۔ بلکہ شاید وہ اس دہشت کے حصار سے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں نکلے تھے۔ مختار کو شاید ان کی پھٹی پھٹی آنکھیں اور خشک ہونٹ دیکھ کر خاصا اطمینان ہوا۔

جس طرح میں صورتِ حال سے لاتعلق' ایک بُت بنا کھڑا تھا اسی طرح اس نے اب تک مجھے قطعی نظر انداز کیا ہوا تھا۔ اب اس نے ڈرامائی تاثر پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہوئے نہایت آہستگی سے گردن موڑتے ہوئے میری طرف دیکھا اور بھوئیں اُچکاتے ہوئے اسی شائستہ وشیریں لہجے میں بولا "اوہو.... چوہدری صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔ آپ نے بہت اچھا کیا جو ان دونوں کے ساتھ چلے آئے چوہدری صاحب! مصیبت اور پریشانی کے وقت دوستوں' ہمدردوں اور خیرخواہوں کو موجود رہنا چاہیے۔"

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں تھے۔ میں نے نہایت دھیمے اور ہموار لہجے میں کہا "مختار! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فائر بریگیڈ کے اس اسٹیشن سے تمہارا بھی مستقل رابطہ رہتا ہے جس سے یہ گاڑیاں یہاں آئی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" ایک لمحے کے لیے اس کی بھویں کمان ہوگئیں۔

"مطلب یہ کہ فائر بریگیڈ کی اور تمہاری گاڑیاں تقریباً آگے پیچھے ہی یہاں پہنچی ہیں۔ کیا فائر بریگیڈ والے تمہیں اطلاع دے کر روانہ ہوتے ہیں کہ فلاں جگہ آگ لگی ہے؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

وہ سوال سے نہیں، میرے گھورنے سے ذرا مضطرب ہوا لیکن اپنا اضطراب چھپانے کے لیے نیچی آواز میں ہنسا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ میرے سوال سے.... اور اس کے عقب میں چھپی ہوئی بے بسی سے وہ محظوظ ہورہا ہے۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ ایسا محظوظ بھی نہیں ہورہا تھا۔ اس کے اعصاب اس وقت یقیناً تنے ہوئے تھے۔

"اچھا سوال ہے چوہدری صاحب! اچھا سوال ہے۔" اس نے مربیانہ انداز میں سرہلایا "لیکن اس قسم کے سوالوں سے حالات میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمارے اپنے کچھ ذرائع ہیں' ہمیں خبریں ملتی رہتی ہیں۔"

"تمہارے ذرائع کی ایسی تیسی، حرامزادے!" اچانک میں نے گرج کر کہا۔

اسے گویا حیرت کا جھٹکا سا لگا۔ بندوق برداروں نے یکدم بندوقیں سیدھی کرلیں۔ وہ گویا منتظر تھے کہ اشارہ ملتے ہی مجھے چھلنی کرڈالیں۔ میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔ فی الحال میں صرف مختار کو اشتعال دلانے کا خطرہ مول لے رہا تھا۔ لیکن اس نے ایک بار پھر اپنے آدمیوں کو ہاتھ کے اشارے سے روکا اور حیرت آمیز شائستگی سے بولا "کمال ہے چوہدری صاحب! آپ یہ زبان بھی بولتے ہیں؟ میں تو آپ کو نہایت مہذب و شائستہ آدمی سمجھا تھا۔ خاصی طاقت رکھنے والا مہذب و شائستہ آدمی۔ آپ کو قلمی زبان بولتے سن کر مجھے حیرت ہوئی ہے!"

اس نے تحقیر آمیز سے انداز میں ایک بار از سرنو میرا سرتاپا جائزہ لیا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا "گالی دینا کسی نہ کسی کمزوری کی نشانی ہوتا ہے۔ طاقتور لوگ تو اپنے دشمن کو بس مسل ڈالتے ہیں گالی نہیں دیتے۔"

"بس کر سالے! کسی معلمِ اخلاق کی ناجائز اولاد!" میں نے پہلے سے زیادہ کھردرے لہجے میں کہا "مسل تو میں نے تجھے آج دوپہر ہی دیا ہوتا۔ میں نے اپنی دانست میں تجھے سُدھرنے کا موقع دیا تھا۔ لیکن ثابت یہ ہوا کہ کتے کی دُم اکثر انسانی شکل میں بھی پائی جاتی ہے۔"

اس کے چہرے سے دھیمی سی مسکراہٹ غائب ہوگئی' آنکھیں سکڑ گئیں اور ہوا میں اُڑتی ہوئی چنگاریاں گویا ان آنکھوں میں اتر آئیں۔ اس نے اپنے اوپر تہذیب و شائستگی کا جو خول چڑھایا ہوا تھا وہ شاید چٹخنے لگا تھا۔

دفعتاً شمیم میرا بازو تھامتے ہوئے التجائیہ سرگوشی میں بولی "افضل! خدا کے لیے بات مت بڑھاؤ۔ یہی تو وہ چاہتا ہے۔ ہم جو نقصان اٹھا چکے ہیں اس کی تلافی تو نہیں ہوسکتی پھر اب خون خرابے کا کیا فائدہ۔"

مختار کی معدوم شدہ کمینی سی مسکراہٹ واپس آتی دکھائی دی۔ سفاک سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے وہ بولا "شمیم بیگم کو آپ کی زندگی بہت عزیز معلوم ہوتی ہے چوہدری صاحب! اپنے مسکین سے شوہر کی زندگی سے بھی زیادہ۔"

ساکت کھڑا ہوا راجو اتنی دیر میں پہلی بار کسمسایا۔ میں حقارت سے تھوکنا تو مختار کے منہ پر چاہتا تھا لیکن اس اقدام کو مؤخر کرتے ہوئے میں نے زمین پر ہی تھوکنے پر اکتفا کیا اور کہا۔ "تمہارے غلیظ ذہن سے 'سڑے ہوئے خیالات تمہارے گندے منہ سے باہر تو آتے ہی رہیں گے۔ انہیں تو صرف موت ہی روک سکے گی جو تم سے زیادہ دور نہیں ہے۔ فی الحال مجھے صرف اتنا بتادو کہ دشمنی نکالنے کا کیا تمہیں کوئی اور طریقہ نہیں سوجھا تھا؟"

"کیا مطلب؟" اس نے ایک بار پھر بھویں اُچکائیں۔

"دودھ پیتے بچے بننے کی کوشش مت کرو۔" میں نے غضبناک لہجے میں کہا "اس شاندار اصطبل کو آگ لگوا کر اور بے زبان گھوڑوں کو آگ میں زندہ جلوا کر تمہیں کیا مل گیا؟ کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا ہوتا جس سے تھوڑی بہت مردانگی ظاہر ہوتی۔"

"شریف آدمی کسی پر بلا تحقیق الزام نہیں لگایا کرتے چوہدری صاحب! میری طرف سے تو دائر کیے جانے والے ہتک عزت کے دعوے بھی کروڑوں میں ہوا کرتے ہیں۔" وہ مشفقانہ لہجے میں بولا۔

مجھے واقعی ہنسی آگئی "تم.... اور ہتک عزت کی دعوے؟" میں نے بے یقینی سے کہا "کیا واقعی عدالتیں تمہارے دعوے سماعت کے لیے منظور کرلیتی ہیں؟ کیا واقعی وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہوجاتی ہیں کہ تمہاری کوئی عزت بھی ہے؟"

"یہ تو ابھی آپ کو پتا چلے گا چوہدری صاحب!" وہ سہلاتے ہوئے بولا "آپ کو جلد اندازہ ہوجائے گا کہ ہماری کتنی عزت ہے اور کتنی اہمیت۔ ابھی تو بات شروع ہوئی ہے۔"

ایک بار پھر اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے شمیم کی طرف دیکھا اور طویل سانس لے کر بولا "ہم تو یہ بُری خبر سن کر یہاں شمیم بیگم سے اظہارِ افسوس کرنے آئے تھے لیکن آپ نے دل جلانے والی باتیں شروع کردیں۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ شمیم یہاں بھی آپ کو ضرور ساتھ لائی ہوگی اور آپ ضرور حالات کو بگاڑنے کی کوشش کریں گے۔ معلوم ہوتا ہے یہ آپ کی عادت ہے۔"

"ہاں" میں نے جواب دیا "مجھ میں ایک بُری عادت اور ہے۔ شاید آج شام تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہوا۔"

میں اتنی دیر سے اس کے ساتھ مکالمے بازی کے دوران کچھ اندازے لگا رہا تھا۔ اپنے اور اس کے درمیان فاصلہ دیکھ رہا تھا۔ اس کے مسلح آدمیوں کو دیکھ رہا تھا کہ وہ کہاں کہاں کھڑے تھے۔ میرا جائزہ مکمل ہوچکا تھا۔ مجھے اگر راجو اور شمیم کی فکر نہ ہوتی تو مختار کی زبان بند کرنے کے لیے میں کب سے عملی قدم اٹھا چکا ہوتا۔ اندیشہ یہی تھا کہ اگر فائرنگ شروع ہوئی تو کہیں وہ دونوں اس کی لپیٹ میں نہ آجائیں۔ اتنی بہت سی گنوں کی موجودگی میں اگر میں صرف اپنا ہی بچاؤ کرلیتا تو وہ کافی تھا۔ ان دونوں کا بچاؤ میرے لیے بہت مشکل تھا اور ان سے مجھے امید نہیں تھی کہ وہ خود اپنا بچاؤ کرلیں گے۔

لیکن مجھے باتوں باتوں میں خاصی مہلت مل گئی تھی۔ میں نے کچھ سمتوں وغیرہ کا اندازہ کرلیا تھا۔ اسی دوران قدرت نے میری ایک اور مدد کی۔ مختار نے دونوں ہاتھ کوٹ کی جیبوں سے نکال لئے۔ یہی میں چاہتا تھا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اس کے کوٹ کی دونوں جیبوں میں دو چھپٹے پستول تھے۔ میں چاہتا تھا کہ اس کے ہاتھ ان سے ہٹ جائیں۔ جن کے ہاتھوں میں زیادہ خطرناک گنیں تھیں ان کی مجھے زیادہ فکر نہیں تھی۔

وہ سگار سلگاتے ہوئے بولا "چوہدری صاحب! اب مجھے یقین ہوچکا ہے کہ آپ میں ایک دو نہیں' بہت سی بُری عادتیں موجود ہیں۔ جن میں سے سب سے بُری عادت ہے دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانا۔"

اس نے سگار کا ایک طویل کش لیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس وقت وہ اپنے آپ کو پوری طرح ایک فتح یاب محسوس کررہا تھا۔ صورتِ حال پوری طرح اس کے کنٹرول میں تھی۔ ہم گویا اس کے قیدی اس کے سامنے مجبورِ محض تھے۔ عین اس وقت جبکہ اس کی خود اعتمادی نقطۂ عروج پر تھی اور اس کے تنے ہوئے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑگئے تھے' میں نے اچانک پوری قوت سے اس کی ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا۔

جب کوئی شخص خوش فہمی میں مبتلا ہوچکا ہو اس وقت اسے جھٹکا دینا زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔ میں نے اسے اپنا بہت ہی خاص قسم کا گھونسا رسید کیا تھا۔ اس طرح ایڑی چوٹی کا زور لگا کر میں شاذونادر ہی کسی کو گھونسا رسید کرتا تھا کیونکہ اسے برداشت کرنا بھی ہر ایک کی بس کی بات نہیں تھی۔ یہ اسپیشل گھونسا ایک سانڈ کو بھی چکرا دینے کے لیے کافی تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اُچھلا اور اس شخص پر جاگرا جس کے ہاتھوں میں ہلکی مشین گن تھی۔ دونوں زمین پر ڈھیر ہوگئے۔ اس کا سگار اُچھل کر چنگاریاں اُڑاتا ہوا بہت ہی دور جاگرا۔ مجھے معلوم تھا کہ میرے اس قسم کے کسی اقدام کے نتیجے میں مختار کے آدمی اس کے حکم کا انتظار کیے بغیر گولی چلا دیں گے۔ اس لیے فوراً ہی میں بھی سینے کے بل گر گیا تھا۔

ساتھ ہی میں نے شمیم اور راجو کو بھی اوندھے منہ گر جانے کا اشارہ کیا تھا۔ راجو کو تو اس اشارے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا لیکن شمیم نے اس وقت کمال مستعدی اور حاضر دماغی کا ثبوت دیا۔ اس نے راجو کا ہاتھ پکڑ کر اسے بھی ایک جھٹکے سے اپنے ساتھ گرالیا تھا ورنہ شاید وہ ہونقوں کی طرح کھڑا رہ جاتا۔

میں نے سمتوں وغیرہ کا جو حساب لگایا تھا اُسی کے مطابق ان دونوں کو زیادہ خطرہ تو نہیں تھا لیکن احتیاط بہرحال بہتر ہوتی ہے۔ اس وقت مختار اور اس کے آدمیوں کی توجہ کا مرکز میں ہی تھا۔ ان کے غیظ و غضب کا نشانہ اگر بننا تھا تو مجھے ہی بننا تھا۔ لیکن وہ بوکھلاہٹ میں کوئی نقصان اٹھا سکتے تھے تاہم شمیم نے میری تشویش کافی کم کردی تھی۔

گولیاں چلیں لیکن وہ تقریباً بے آواز تھیں اور مختار کے آدمیوں نے نہیں چلائی تھیں۔ وہ چلانے تو لگے تھے لیکن ان کی حسرت ان کے دل میں ہی رہ گئی تھی۔ زٹ کی سی تیز آوازوں کے ساتھ گنیں ان کے ہاتھوں سے گر گئیں۔ ان میں سے دو تو اپنا ہاتھ تھام کر کراہتے ہوئے تقریباً دُہرے ہوگئے۔ جبکہ تیسرا چیخ مار کر نیم دائرے میں گھوم گیا۔ اس کا بازو کٹی ہوئی سی حالت میں اس کے پہلو میں جھولنے لگا تھا۔

مجھے اندازہ ہوگیا کہ دو آدمیوں کے تو ہاتھوں پر گولیاں لگی تھیں جبکہ تیسرے آدمی کی کہنی اُڑ گئی تھی۔ اسے یقیناً عقب سے گولی لگی تھی۔ ٹونی' سردار شیخ اور حنیف وغیرہ سے مجھے ایسے ہی بے خطا نشانے کی توقع تھی۔ مختار رفیق اور اس کے آدمی بڑے زعم میں تھے کہ انہوں نے ہمیں گھیرا ہوا تھا لیکن انہیں معلوم نہیں تھا کہ انہیں بھی کچھ لوگوں نے گھیرا ہوا تھا جو ان سے کافی دور مختلف چیزوں کی آڑ میں چھپے ہوئے تھے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس شخص کو ہم سب سے معمولی' غیر اہم اور بے ضرر سمجھ کر نظرانداز کیے رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ حاضر دماغی اور دلیری کا مظاہرہ کرتا ہے۔ بوڑھا استاد نور محمد جسے ہم نے بھی کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور مختار رفیق یا اس کے آدمیوں نے بھی غالباً کسی شمار قطار میں نہیں رکھا تھا' اس نے اس وقت سب سے اہم کام انجام دیا۔

میرے اٹھنے سے بھی پہلے اس نے تینوں گنیں اٹھا کر تیزی سے دور پھینک دیں۔ سب مشین گن والا اپنی گن سمیت مختار رفیق کے نیچے دبا ہوا تھا۔ گن آڑی ترچھی تھی اور وہ ابھی اسے چلانے کی پوزیشن میں نہیں تھا لیکن اس نے گن چھوڑی بھی نہیں تھی۔ استاد نور محمد نے گن کھینچ کر اس کے ہاتھ سے اور مختار کے

جسم کے نیچے سے نکالنے کی کوشش کی۔

استاد تقریباً ساٹھ کی عمر کا ایک مختصرالوجود شخص تھا۔ گن بھاری تھی اور ایک مضبوط آدمی کے ایک ہاتھ کی گرفت میں تھی۔ اوپر دوسرا بھاری بھرکم آدمی ڈھیر تھا۔ استاد کو اسے فوری طور پر کھینچنے میں کامیابی نہ ہوئی تو اس نے حیرت انگیز جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گن والے کی کنپٹی پر ایسی ٹھوکر رسید کی کہ اس نے بلبلا کر گن چھوڑ دی۔

استاد نے سب مشین گن دور نہیں پھینکی۔ اس جیسے شخص کے لیے اس گن کو دور پھینکنا آسان بھی نہیں تھا۔ وہ اسے سنبھال کر کچھ پیچھے ہٹ کر ان لوگوں کو کور کرکے کھڑا ہوگیا۔ گو کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میں اٹھ چکا تھا اور میرا مشین پسٹل جیب سے باہر آچکا تھا پھر بھی مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ استاد نور محمد سب مشین گن صحیح طور پر سنبھالے کھڑا تھا اور اس نے ظاہر کردیا تھا کہ اس میں اس قسم کی صورت حال میں دخل اندازی کی صلاحیتیں موجود تھیں۔

مختار ابھی تک اٹھنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ گھونسا اس کے لیے کافی تسلی بخش ثابت ہوا تھا لیکن وہ بے ہوش نہیں تھا۔ کسی تکلیف سے بُری طرح ڈکرا رہا تھا جیسے اس کا کوئی جوڑ علیٰحدہ ہوا جارہا ہو۔ اس کے نیچے دبا ہوا شخص بہرحال نکل آیا تھا تاہم اس نے اٹھ کھڑے ہونے کی جرأت نہیں کی تھی۔ اس کے لیے تو یہ اچھا ہی ثابت ہوا تھا کہ مختار اچھل کر اس پر جاگرا تھا اور وہ اس کے نیچے دب گیا تھا۔ اس طرح وہ زخمی ہونے سے بچ گیا تھا ورنہ اس کے بھی ہاتھ یا بازو پر گولی ضرور لگتی۔

میرے آدمی اب بھی سامنے نہیں آئے تھے۔ انہیں صرف پانسہ پلٹنے میں میری مدد کرنی تھی۔ وہ انہوں نے کردی تھی۔ میں مختار رفیق کے قریب پہنچا۔ وہ اوندھا پڑا تھا اور اس بکرے کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا جسے کسی اناڑی قصائی نے ادھورا ذبح کرکے ڈال دیا ہو۔ میں نے اسے گردن سے پکڑ کے کھڑا کیا تو اس کے ڈکرانے کی وجہ میری سمجھ میں آگئی۔

اس کی شکل ہی بدل چکی تھی۔ لقوہ زدہ مریض کی طرح اس کا چہرہ ترچھا اور مسخ سا ہوچکا تھا۔ ٹھوڑی کی کھال پھٹنے کی وجہ سے آدھا چہرہ خون میں لتھڑ گیا تھا۔ ایک لمحے کی تاخیر سے یہ بات میری سمجھ میں آئی کہ اس کا جبڑا ڈِس لوکیٹ ہوگیا تھا' اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا۔ اسی کی تکلیف سے وہ ڈکرا رہا تھا اور اس کی شکل بالکل بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔

میں نے مشین پسٹل جیب میں رکھ لیا تھا۔ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ دائیں ہاتھ سے اس کا گریبان مضبوطی سے پکڑتے ہوئے میں نے بائیں ہاتھ سے اس کے جبڑے پر ایک ضرب لگائی۔ جبڑا واپس اپنی جگہ پر تو آگیا لیکن شاید کوئی فریکچر بھی ہوگیا تھا۔ جبڑا ذرا نیچے کو لٹک گیا تھا۔ اور دھیرے دھیرے تھرتھرا رہا تھا' وہ اب بُری طرح تو نہیں ڈکرا رہا تھا لیکن حلق سے کراہیں بہرحال خارج ہورہی تھیں۔

"تمہاری کچھ سمجھ میں آیا مختار رفیق؟" میں نے اسے ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا "میرے لیے تم صرف ایک گھونسے کی مار ہو۔ اکثر اوقات فتح اور شکست کے درمیان صرف ایک گھونسے کا فرق ہوتا ہے۔ بشرطیکہ وہ گھونسا بالکل صحیح طور پر.... صحیح جگہ پر مارا جائے۔ تم نے دیکھا پلک جھپکنے میں پانسہ کیسے پلٹتا ہے؟"

وہ آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں' اس کا سر دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ ایک نہایت سخت جان آدمی تھا لیکن ایک ہی گھونسے میں اس کے تمام کس بل نکل گئے تھے۔ میں خواہ مخواہ اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کررہا تھا۔ مجھے اب احساس ہوا کہ شاید اس کی سمجھ میں میری کوئی بات نہیں آرہی تھی۔

مجھے کچھ افسوس بھی ہوا کہ یہ اچھا نہیں ہوا تھا۔ اس میں کچھ جان تو رہنی چاہیے تھی۔ ابھی تو میری رگوں میں لہو صحیح طور پر گرم بھی نہیں ہوا تھا۔ دشمن اتنی لن ترانی کے ساتھ سامنے آئے تو اس کے ساتھ کچھ دیر تو کھیل چلنا چاہیے تھا۔ میری پہلی کوشش تو یہی ہوتی تھی کہ زندگی عافیت پسندی کے ساتھ گزرتی رہے لیکن جب کوئی کسی قسم کی دشمنی میرے سر پر مسلط ہی کردیتا تھا تو پھر اسے مزہ چکھانے میں ذرا لطف آتا تھا لیکن یہ مختار رفیق اور اس کے ساتھی تو بہت ہی جلدی ٹھنڈے پڑگئے تھے۔

میں نے اسے ذرا زور سے جھٹکا دیا۔ اس کی آنکھیں ذرا کھلیں۔ میں نے تقریباً اس کے کان میں چیختے ہوئے کہا "خبیث! تمہیں معلوم ہے تم کس سزا کے مستحق ہو؟ میں تمہیں بتاتا ہوں تم نے اپنے لیے دنیا ہی میں جہنم تیار کرلیا ہے جو تمہارا انتظار کررہا ہے۔"

میں نے یکدم ہی اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے اونچا کرلیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اس طرف چل دیا جہاں فائر بریگیڈ والوں کی کوششوں سے کسی حد تک تو آگ ٹھنڈی ہوگئی تھی مگر بہت بڑے حصے میں ابھی تک شعلے بھڑک رہے تھے یا بڑے بڑے شہتیر اور بلیاں انگاروں کے دہکتے انبار میں تبدیل ہوچکے تھے۔

فائر بریگیڈ والوں نے سب سے پہلے چوبی گیٹ کے انگاروں کو ٹھنڈا کیا تھا اور انہی پر سے گزر کر اندر گئے تھے۔ فائر بریگیڈ کی دونوں گاڑیاں بھی اندر احاطے میں پہنچ چکی تھیں۔ میں مختار رفیق کو دونوں ہاتھوں پر اٹھائے سر سے بلند کیے آگ کے قریب جا پہنچا حتیٰ کہ اس کی تپش مجھے اپنے چہرے پر محسوس ہونے لگی۔

تب فائر بریگیڈ والوں کی سمجھ میں آیا کہ میرا ارادہ کیا تھا۔ وہ اپنے پائپ وغیرہ چھوڑ کر دوڑے آئے اور میری راہ میں دیوار بن گئے۔ ہیلمٹ والے ایک نوجوان نے متوحش لہجے میں کہا "سر! یہ آپ کیا کررہے ہیں؟"

"یہ آگ اس مزدود کی بھڑکائی ہوئی ہے.... جس کی وجہ سے لاکھوں کا نقصان ہوا۔ بہت سے بے زبان جانور زندہ جل کر مرگئے.... پچاسوں لوگوں کو پریشانی اٹھانی پڑی جن میں تم بھی شامل ہو۔ محض اپنی انا کی تسکین اور اپنی طاقت کے اظہار کے لیے اس نے یہ آگ لگوائی ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ اسی دنیا میں اس کا مزہ چکھ لے۔ اسے معلوم ہوجائے کہ اپنے آپ کو بہت بڑا بدمعاش سمجھنا اور بدمعاشی کی طاقت پر گھمنڈ کرنا کتنی بڑی حماقت ہے۔" تم لوگ میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔"

"نہیں سر! ہم آپ کو اپنی آنکھوں کے سامنے یہ نہیں کرنے دیں گے۔" ہیلمٹ کے نیچے تمتماتے ہوئے چہرے والا نوجوان بولا۔ ان لوگوں کا انداز فیصلہ کن تھا۔ وہ مضبوطی سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ پھنسا کر کھڑے ہوگئے تھے۔ بہت ہی باضمیر معلوم ہوتے تھے۔

ایک ادھیڑ عمر اور سنجیدہ صورت فائر مین بولا "حضور! اگر آپ اسے سزا دینا ہی چاہتے ہیں تو قانونی طریقے سے دیں۔ اسے پولیس کے حوالے کردیں۔ رپٹ درج کرائیں۔"

میں نے قہقہہ لگایا۔ غیر ارادی طور پر اس قہقہے میں زہریلا پن اور وحشت جھلک آئی۔ میں نے کہا "آپ کے کہنے پر میں اسے ویسے ہی چھوڑ دیتا ہوں' آپ اسے خواہ مخواہ گھما پھرا کر بہت سے لوگوں کا وقت اور روپیہ ضائع کرواکے کیوں چھڑوانا چاہتے ہیں؟ اس قسم کے لوگوں کے معاملے میں اگر ہمارا قانون' ہمارا نظام موثر ہوتا تو ان لوگوں کی تعداد اور ان کی طاقت دن بہ دن بڑھتی نہ چلی جاتی۔ ہمارے قوانین اور ہمارے نظام نے شریف کو کمزور اور بزدل اور بدمعاش کو منظم اور طاقتور بنایا ہے۔ مجھے ایسے بے وقوفانہ مشورے مت دیں۔ میرا اصول ہے' اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔"

اس سے پہلے کہ فائرمین کوئی جواب دیتا' کسی نے مجھے پیچھے سے پکڑ کر زور سے کھینچنے کی کوشش کی۔ میرا توازن ذرا خراب ہوا۔ شاید مختار رفیق میری گرفت سے نکل کر گر جاتا۔ لیکن میں سنبھل گیا۔ میں کافی دیر سے اس وزنی لاش جیسے بوجھ کو سر سے اونچا کیے کھڑا تھا۔

میں نے گردن ذرا موڑ کر دیکھا۔ وہ شمیم تھی۔ اس کے چہرے پر وحشت تھی۔ آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ وہ ایک بار پھر مجھے پیچھے کھینچنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا۔ یہ کیا کرنے لگے ہو....!"

پھر اس نے میرے کان میں سرگوشی کی "یہاں.... اتنے لوگوں کے سامنے تم یہ حرکت کرکے کیا کا ثبوت تیار کرنا چاہتے ہو؟ اس سے تو بہتر ہے ویسے ہی پوسٹر چھپوا کر شہر میں چسپاں کرادو کہ مختار رفیق کو تم نے قتل کیا ہے۔"

"اگر تم لوگوں کا اصرار یہی ہے تو میں اس کی جاں بخشی کردیتا ہوں۔" میں نے مختار کو زمین پر کھڑا کرتے ہوئے کہا "ورنہ میری عدالت نے تو جائے واردات پر ہی اس کے جرم کی سزا سنادی تھی۔"

حقیقت یہ تھی کہ میرا ان سب کے سامنے مختار کو آگ میں پھینکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں تو اسے صرف ایک نفسیاتی جھٹکا دینا چاہتا تھا۔ میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔ مختار کے حواس مختل تھے لیکن اس کی آنکھوں کی وحشت بتارہی تھی کہ جو جھٹکا میں اسے دینا چاہتا تھا وہ اسے پہنچ چکا تھا۔ اسے یقین ہوچکا تھا کہ اگر فائر بریگیڈ والوں اور شمیم نے مجھے نہ روکا ہوتا تو میں نے ضرور اسے آگ میں پھینک دیا ہوتا جس کی تپش اتنی دور سے بھی ہمیں جھلسائے دے رہی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اس جھٹکے کے بعد اس کی طاقت تو سلب ہوچکی تھی لیکن میری بات وہ اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔

"دیکھا تم نے....؟" میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر ہلکا سا جھٹکا دیتے ہوئے کہا "جس شمیم کو تم فنا کردینے پر تلے ہوئے ہو' اسی کی وجہ سے آج تمہاری جان بچی ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جواب دینے کے قابل نہیں تھا۔ اس کا جبڑا اب بھی ہولے ہولے تھرتھرا رہا تھا۔ وہ محض آنکھیں پٹ پٹا کر رہ گیا۔ میں اسے گریبان سے پکڑ کر تقریباً کھینچتا ہوا واپس لے آیا۔ استاد نور محمد نے اس کے چاروں آدمیوں کو پاس پاس زمین پر اکڑوں بٹھایا ہوا تھا اور خود ابھی تک سب مشین گن سنبھالے کھڑا تھا۔ اصطبل کے دونوں مسلح محافظ بھی درختوں کے عقب سے نکل آئے تھے۔ انہوں نے بھی ان لوگوں پر رائفلیں تانی ہوئی تھیں۔

"صاب! کیا آگ ان لوگوں نے لگایا تھا؟" ایک محافظ نے رائفل سے ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ تو شاید نہیں.... لیکن انہی کے دوسرے بھائی بند ہوں گے۔" میں نے کہا "مگر اصل میں حکم دینے والا اور فساد کی جڑ یہ شخص ہے۔" میں نے مختار کو آگے کردیا۔

"صاب! آپ ایک طرف ہوجائیں۔" محافظ رائفل سیدھی کرتے ہوئے بولا۔

"کیوں؟ تمہارا کیا ارادہ ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اَم اس کو گولی مار دے گی۔" اس نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن تمہاری مالکن نے اسے معاف کردیا ہے۔" میں نے اس کی رائفل کی نال پر ہاتھ رکھ کر اسے نیچا کرتے ہوئے کہا۔ محافظ نے سوالیہ نظروں سے شمیم کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے تھکے تھکے لہجے میں بولی "جھگڑا ختم کردو بابا گل! ان لوگوں

کو جانے دو۔ مجھے ان کی صورتیں دیکھ کر وحشت ہو رہی ہے۔ میرا بہت دل گھبرا رہا ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اس کی تلافی تو اب نہیں ہوسکتی۔ اب جھگڑے کو پھیلانے سے کیا حاصل؟ اس طرح تو یہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوگا۔ ہم ان کے آدمی ماریں گے پھر یہ ہمارے آدمی ماریں گے..... پھر ہم ان کے آدمی ماریں گے۔ یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟ کسی ایک کو تو اپنا ہاتھ روکنا ہی پڑے گا۔ ان کے ساتھ جتنی ہو گئی ہے وہی کافی ہے۔"

استاد نور محمد بولا "بیگم صاحب ٹھیک کہہ رہی ہے نایاب گل!"

"ٹیک اے ... آپ مرضی کا مالک ہے صاب!" نایاب گل کے چہرے پر برہمی کے آثار تھے۔ اس نے پشتو میں اپنے ساتھی محافظ سے بات شروع کردی۔ تھوڑی بہت پشتو میری سمجھ میں آتی تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس کا مفہوم یہ تھا کہ سانپ جب لاٹھی کے نیچے آیا ہوا ہو تو اسے چھوڑنا نہیں چاہیے۔ اس کا سر کچل ڈالنا چاہیے۔ وہ اگر ڈھیلا پڑ گیا ہو تو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اب وہ اپنی فطرت سے باز آجائے گا۔ وہ جونہی سنبھلے گا پلٹ کر ضرور ڈنک مارے گا۔

میں اس ان پڑھ سے آدمی کی اس دانشورانہ بات سے متفق تھا لیکن مصلحتوں کے تحت میں نے اپنی ذاتی عدالتِ انصاف کا فیصلہ مؤخر کردیا تھا۔ مختار رفیق بالکل خاموش کھڑا تھا۔ میں نے اس کے ٹخنے پر ہلکی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے کہا "جاؤ..... اب اپنے ان کاٹھ کے اُلوؤں کو لے کر یہاں سے بھاگ جاؤ۔ یہ جو تمہارا ایک اُلو زخمی ہونے سے بچ گیا ہے، یہ گاڑی چلا لے گا۔ تمہارا اسلحہ ضبط کیا جارہا ہے۔"

میں نے اس کی جیبوں سے بھی دونوں پستول نکال لیے "یہ تمام اسلحہ نایاب گل اور اس کے ساتھی میں تقسیم کیا جائے گا۔ تم لوگ خالی ہاتھ جاؤ گے۔ فی الحال تو صرف تمہارے ہاتھ خالی ہوں گے۔ لیکن اگر دوبارہ اِدھر کا رخ کیا تو جاتے وقت تمہارے جسم بھی روح سے خالی ہوں گے۔" میری بات سن کر نایاب گل اور اس کے ساتھی کے چہروں پر مسکراہٹ آگئی۔ اتنی اچھی گنیں ملنے کی خبر ان کے لیے غالباً ایسی ہی تھی جیسے کسی بچے کے لیے کوئی بیش قیمت کھلونا ملنے کی خبر۔

مختار اور اس کے ساتھیوں میں ذرا بھی مزاحمت نہیں رہی تھی۔ وہ بڑے زعم میں آئے تھے لیکن جونہی انہیں احساس ہوا تھا کہ ان کا واسطہ کمزور لوگوں سے نہیں تھا، یکدم سا جھاگ کی طرح بیٹھ گئے تھے۔ مختار نے انہیں اشارہ کیا اور وہ کرتے پڑتے سیاہ مرسیڈیز کی طرف بڑھ گئے۔ چند لمحے بعد مرسیڈیز نے یوٹرن لیا اور واپس روانہ ہوگئی۔

میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے شمیم کی طرف دیکھا اور کہا "بس... اتنی سی بات تھی!"

وہ طویل سانس لے کر بولی "تمہارے لیے تو ہر بات ہی اتنی سی بات ہوتی ہے۔"

"اب تمہارے لیے بھی ہونی چاہیے۔" میں نے کہا "کیا اب بھی تمہارے دل سے مختار رفیق کا خوف نہیں نکلا؟ اس کی اتنی دُرگت بنتے دیکھ کر بھی تم نے اس سے ڈرنا نہیں چھوڑا؟"

"آج دوپہر اس کی تھوڑی سی دُرگت بنی تھی تو اس کا نتیجہ نکلا ہے۔" شمیم نے آتشزدہ اصطبل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اب اس کی زیادہ درگت بنی ہے تو نہ جانے کیا نتیجہ نکلے۔" اس نے گہری سانس لے کر مسکرانے کی کوشش کی "لیکن خیر میں شکایتاً نہیں کہہ رہی۔ ظاہر ہے تم ہماری ہی وجہ سے اس معاملے میں الجھے ہو اور اتنی زحمت اٹھا رہے ہو۔"

"بلکہ میری کوشش تو اب یہ ہے کہ اس کی توجہ تمہاری طرف سے ہٹ جائے اور اس کی دشمنی کا رخ میری طرف ہو جائے۔" میں نے کہا "پھر میں زیادہ آسانی سے اس سے نمٹ لوں گا۔"

دفعتاً میں راجو کی طرف دیکھتے ہوئے چونک پڑا۔ اس کی آنکھوں سے دو آنسو اس کے رخساروں پر پھسل آئے تھے اور ایک ٹک آگ کی طرف دیکھ رہا تھا جو فائر بریگیڈ والوں کی کوشش سے اب مدھم پڑنے لگی تھی۔ ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اب آگ کا ایندھن بننے کے لیے کچھ بچا ہی نہیں تھا۔

"مت رو راجو! اب رونے کا کوئی فائدہ نہیں۔" میں نے اس کا بازو تھپکتے ہوئے کہا۔ اسے خاصی تاخیر سے صدمے کا احساس ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو مجھے عجیب لگ رہے تھے۔ شمیم کا کہنا تو یہی تھا کہ وہ ایک بے حس آدمی تھا۔

وہ گلوگیر آواز میں بولا "میں نے ان بے زبانوں کی کبھی پروا نہیں کی..... سچی بات ہے مجھے اس اصطبل کی کبھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ لیکن اب میں ان کے بارے میں سوچ رہا ہوں تو میرے دل کو جیسے کچھ ہو رہا ہے۔ یہ بے زبان جانور انسانوں کو فائدے پہنچاتے ہیں زندگی بھر انہوں نے ہمیں لاکھوں روپیہ کما کر دیا اور اب ہماری وجہ سے ہی یہ دردناک موت مر گئے۔ خاص طور پر مجھے رِکلر بہت یاد آرہا ہے۔ اس کا خوب صورت سراپا نظروں میں گھوم رہا ہے۔ کیسا شاندار گھوڑا..... کیسی بے بسی سے اس نے آگ میں تڑپ تڑپ کر مرا ہوگا۔"

استاد نور محمد نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور نایاب گل کو اسلحہ وغیرہ سنبھالنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے "آپ لوگ ذرا میرے ساتھ آنا پسند کریں گے؟" انہوں نے ہم سب کو ہی مخاطب کیا تھا۔

"کہاں؟" شمیم نے پوچھا۔

"آپ آئیں تو سہی....." ان کے لہجے میں اصرار تھا "گاڑی میں ہی چلتے ہیں۔ اس وقت پیدل چلنا شاید آپ کو گراں گزرے۔"

میں، استاد، شمیم اور راجو میری ہی گاڑی میں بیٹھ کر استاد کی رہنمائی میں وہاں سے روانہ ہوئے۔ آتشزدہ اصطبل کے گرد بڑا سا چکر کاٹ کر ہم ایک میدان سے گزرے جس میں کہیں کہیں پانی کھڑا تھا۔ پھر ہم ایک متروک کھیت سے گزرے جس میں جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ استاد ہمیں اصطبل کے عقب میں کچھ فاصلے پر واقع کچی بستی میں لے جارہے تھے۔

راجو کا ذہن بدستور رِکلر کے صدمے میں الجھا ہوا تھا۔ وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا "اس خبیث ... مردود..... مختار نے یہ درندگی دکھانے کے لیے دن بھی تو کیا چن کر منتخب کیا۔ کل شام اسے سالانہ ریس میں حصہ لینا تھا۔ سالانہ ریس پر بہت بھاری مجمع ہوتا ہے۔ ریس کو اس کی اور باہر کی سب شرطوں کو ملا کر دیکھا جائے تو چند گھنٹوں میں کروڑوں روپیہ اِدھر سے اُدھر ہو جاتا ہے۔ آج تو بے چارے رِکلر کی اخباروں میں تصویر بھی چھپی تھی۔ کل اسے ریس میں موجود نہ پاکر تماشائیوں اور اس کے شیدائیوں پر نہ جانے کیا گزرے گی۔"

اس نے رومال نکال کر آنکھیں پونچھیں۔ میں نے مڑ کر دیکھا، شمیم افسردگی سے سر جھکائے بیٹھی تھی، شاید اس نے بھی بڑی مشکل سے اپنے آنسو روکے ہوئے تھے۔ وہ بہرحال راجو سے زیادہ حوصلے والی عورت تھی۔ گاڑی ناہموار کچے راستے پر ہچکولے کھا رہی تھی۔

استاد میری طرف دیکھتے ہوئے معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولے "اس طرف سڑک تو کیا، کوئی ڈھنگ کی پگڈنڈی بھی نہیں ہے۔ گاڑی کو اِدھر لانا تو نہیں چاہیے تھا لیکن میں نے سوچا جو حالات بیت چکے ہیں ان کے بعد اب شاید آپ لوگوں کو پیدل چلتے ہوئے کوفت ہو۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا "یہ گاڑی ہر طرح کے راستوں پر چل سکتی ہے۔ یہاں رفتار البتہ کچھوے ہی جتنی رکھنی پڑے گی۔"

پھر میں نے ایک نظر راجو اور شمیم کی طرف دیکھا "کل رِکلر کے نہ ہونے سے سالانہ ریس تو میرا خیال ہے تہ و بالا ہو جائے گی؟"

"مالی لحاظ سے تو صرف یہ فرق پڑے گا کہ دولت کا بہاؤ ہمارے بجائے مجموعی طور پر مختار کی طرف ہو جائے گا۔" راجو رومال سے ناک رگڑتے ہوئے بولا "اس کے بھی دو گھوڑے بہت اچھے ہیں۔ سلور بُلٹ ... اور بلیو برڈ۔ رِکلر کے فوراً بعد انہی کی پوزیشن ہے۔ رِکلر کی وجہ سے وہ ابھر نہیں پاتے تھے۔ اب ان کا راستہ صاف ہو گیا ہے۔ ریس کورس میں لگنے والی ننانوے فیصد شرطوں کا رخ ان کی طرف ہو جائے گا۔ رِکلر کے جیتنے پر صرف معمولی پرسینٹیج مختار کے اکاؤنٹ میں جاتی تھی۔ سلور بُلٹ اور بلیو برڈ جتنا کمائیں گے وہ سارا کا سارا اس کا حصہ ہوگا۔ دوسرے گھوڑوں کی پرسینٹیج اس کی علاوہ ہوگی۔ راتوں رات اسے لاکھوں کا فائدہ ہو جائے گا اور ہماری پوزیشن اس صنعت کار کی سی ہو جائے گی جس کی انڈسٹری آگ کی نذر ہو گئی ہو۔ بلکہ انڈسٹری کے عوض تو انشورنس کی رقم بھی مل جاتی ہے۔ ہمارا رِکلر تو بیمہ شدہ بھی نہیں تھا کوئی انشورنس کمپنی اس کا انشورنس کرنے کے لیے تیار نہیں تھی شاید اس کے پیچھے بھی مختار ہی کا ہاتھ رہا ہو۔"

شمیم ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تمہارے ساتھ ساتھ، ریس کورس سے باہر غیر قانونی شرطیں لگانے والے مارے جائیں گے۔ سٹے باز ان کی شرطیں بک کر چکے ہوں گے اور وہ اب منسوخ بھی نہیں ہوسکتیں۔ ریس کورس میں ریس کھیلنے والوں کے لیے تو اتنا فرق نہیں پڑے گا لیکن باہر نہ جانے کتنے لوگوں کا لاکھوں روپیہ ڈوب جائے گا۔"

اس دوران ہم استاد نور محمد کی رہنمائی میں کچی بستی میں پہنچ چکے تھے۔ پہلی دو تین گلیاں ذرا کشادہ تھیں۔ ان سے ہم گزر گئے پھر سامنے ایک تنگ سی گلی آگئی اس سے گاڑی نہیں گزر سکتی تھی۔

"بس..... یہاں دیوار کے ساتھ گاڑی کھڑی کر دیجیے۔" استاد نے ہدایت کی پھر گاڑی سے اتر کر ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ گلیوں میں اندھیرا تھا لیکن مدھم چاندنی کی وجہ سے راستہ قدرے آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ کچی گلی میں دونوں طرف نالیاں تھیں بیشتر مکانوں پر ٹاٹ کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔

"استاد! آپ ہمیں کہاں لے جارہے ہیں؟" شمیم منمنائی۔

"میں لے جارہا ہوں تو کسی اچھی جگہ ہی لے جارہا ہوں گا۔" استاد نے جواب دیا۔

گلی مختصر ہی تھی۔ چند قدم چل کر ہم اس کے اختتام تک پہنچ گئے وہاں دوسرے مکانوں سے ذرا ہٹ کر ایک مکان نظر آرہا تھا۔ اس کی چار دیواری نیم پختہ اور خاصی اونچی تھی۔ اس کے دروازے پر ٹاٹ کا پردہ نہیں تھا۔ دروازہ بھی خاصا اونچا مضبوط اور نیا تھا۔ اس کی کنڈی میں ایک بڑا موٹا سا تالا لٹکا ہوا تھا۔

استاد نے جیب سے چابی نکال کر تالا کھولا اور ہم ان کی رہنمائی میں اندر پہنچے۔ مکان کی چار دیواری نے خاصی بڑی جگہ گھیری ہوئی تھی لیکن اس میں کمرا ایک ہی تھا۔ وہ پختہ اینٹوں کا بنا ہوا کمرا تھا جس کی دیواروں میں پرانی طرز کی سیدھی سادی کھڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ ان میں لوہے کی موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کھڑکیاں کھلی ہی تھیں لیکن کمرے میں تاریکی تھی اس لیے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کمرے کے دروازے پر بھی تالا تھا۔

استاد نے وہ دروازہ بھی کھولا اور دیا سلائی جلائی لیکن میں دیا سلائی جلنے سے پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ وہاں کیا تھا۔ دیا سلائی جلنے کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ہی کمرے میں گھوڑے کی ہنہناہٹ گونج اٹھی تھی۔ نارنجی روشنی پھیلی تو کلر پچھلی دیوار کے ساتھ اپنے مخصوص پُرنخوت انداز میں سر اٹھائے کھڑا نظر آیا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں شک کے سائے تھے جیسے وہ الجھن میں ہو کہ رات کے پچھلے پہر ہم اس کے کمرے میں کیوں گھسے چلے آرہے تھے۔ کمرے میں گھوڑے کے راتب کے لیے بڑی سی ناند اور پانی کی بالٹی بھی موجود تھی۔

کلر پر نظر پڑتے ہی راجو کو سکتہ سا ہوگیا اور شمیم کے حلق سے بے اختیار ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ آگے بڑھ کر کلر کی گردن میں تقریباً جھول ہی گئی۔ کلر بھی مسرت آمیز سے انداز میں ہنہنایا اور اس کے کندھے پر تھوتھنی رگڑنے لگا۔ استاد نے کمرے میں موجود لالٹین روشن کردی۔ تب راجو کے ہونٹوں سے سرسراتی ہوئی سی آواز نکلی "کیا کلر واقعی زندہ ہے؟ کہیں میں خواب تو نہیں دیکھ رہا؟"

"نہیں ریاض صاحب! یہ خواب نہیں حقیقت ہے۔" استاد نور محمد مسکرائے "مجھے مختار رفیق کی طرف سے کافی عرصے سے خطرہ تھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ کلر کی زندگی خطرے میں ہے۔ کچھ عرصے پہلے ہی میں نے یہ مکان صرف سو روپے مہینہ پر اس بستی میں کرائے پر لیا تھا۔ رات گئے میں چپکے سے کلر کو اصطبل کے پچھلے دروازے سے نکال کر یہاں لاکر باندھ دیتا تھا۔ یہ میرا روز کا معمول تھا اور میں نے کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہیں ہونے دی تھی۔ میں اپنے سائے سے بھی ہوشیار رہنا چاہتا تھا۔ چوکیدار بھی [illegible] نظر رکھتے نہیں تھے، احاطے میں ہی گشت کرتے رہتے تھے۔ میں احتیاط بھی بہت برتتا تھا۔ اس لیے انہیں بھی میرے اس معمول کی خبر نہیں ہوسکی۔ آج میری یہ احتیاط کام آہی گئی۔"

"جیو استاد .... جیو .... استاد نور محمد زندہ باد!" راجو نے [illegible] تھنی سی آواز میں نعرہ لگایا اور نہایت پُرجوش انداز میں آگے بڑھ کر استاد کو گود میں اٹھالیا۔ اس نے استاد کو دو تین چکر دے ڈالے۔ استاد ہلکے پھلکے آدمی تھے اس لیے راجو جیسے مختصر الوجود نے بھی انہیں اس طرح اٹھا کر چکر دے ڈالے۔ جوش سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا استاد کو زمین پر کھڑا کرنے کے بعد وہ آگے بڑھ کر کلر کو زور سے تھپتھپاتے ہوئے بولا "آج ہمارا شیر میدان میں دوڑے گا۔ مختار کے سینے پر مونگ دلے گا۔"

"شکر ہے میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔" استاد بولے۔

"لیکن استاد ....! آپ نے ہمیں بھی نہیں بتایا کہ آپ یہ احتیاط کررہے تھے۔" راجو ان کی طرف مڑتے ہوئے بولا "کرایہ وغیرہ بھی آپ اپنے پلے سے دے رہے تھے؟ حد کردی آپ نے؟" اس کے لہجے میں پیار بھرا شکوہ تھا۔

"میں نے سوچا تھا اگر کبھی کسی کی نظر میں آگیا تو بتادوں گا۔ رہی کرائے وغیرہ کی بات تو سو روپیہ مہینہ کون سا ایسا بڑا مسئلہ تھا۔ آپ نے آج تک نہ جانے کتنی مرتبہ ہزاروں روپیہ بغیر کسی حساب کتاب کے مجھ پر خرچ کیا ہے۔ اور وہ وقت تو میں کبھی بھول ہی نہیں سکتا جب میری بیوی اسپتال میں مررہی تھی اور بیگم صاحب چوبیس گھنٹے اس کے سرہانے بیٹھی رہی تھیں۔ نوٹوں سے بھرا ہوا پرس انہوں نے خالی کردیا تھا۔ ایک ایک ڈاکٹر کو پکڑ کر اس کی منت کی تھی کہ کسی طرح میری بیوی کی جان بچالی جائے۔ میں ان باتوں کو بھول تو نہیں سکتا نا ریاض صاحب!"

"چھوڑیے ان باتوں کو۔" شمیم ان کا کندھا تھپک کر بولی "میں تو بس اتنا کہوں گی کہ استاد آخر استاد ہوتا ہے۔"

میں بھی دل ہی دل میں قائل ہوگیا تھا کہ استاد نے واقعی بڑی استادی دکھائی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت مختار رفیق اسپتال میں ہوگا جب اسے خبر ملے گی کہ کلر سالانہ ریس میں دوڑ رہا ہے۔ میں چشمِ تصور سے دیکھنے کی کوشش کررہا تھا کہ اس وقت اس کی کیفیت ہوگی یہ تصور خاصا محظوظ کن تھا۔

راجو نے استاد کو مخاطب کیا "اصطبل کی صفائی ستھرائی وغیرہ میں تو شاید خاصا وقت لگ جائے۔ اس کے بعد میرا خیال ہے مختصر پیمانے پر، دو تین گھوڑوں کی رہائش کے لیے کنسٹرکشن کرالیں گے۔ مستقبل میں اگر کبھی ہمارے پاس زیادہ گھوڑے ہوئے تو دیکھا جائے گا۔ جب تک وہاں صفائی وغیرہ نہیں ہوجاتی تب تک آپ کلر کی رہائش کے لیے یہیں اس کے شایانِ شان بندوبست کرلیں۔ گارڈز کو بھی یہیں تعینات کردیں لیکن ان سے کہیں کسی کی نظر نہ ہی آئیں تو بہتر ہوگا۔ یہ بات پھیلنے نہ پائے کہ یہاں کسی گھوڑے کو رکھا گیا ہے۔ ایکسرسائز کے لیے اسے آپ ذرا میدان میں لے جایا کریں۔"

"اِن باتوں کی آپ فکر نہ کریں۔" استاد بے پروائی سے بولے "ان سب انتظامات کے بارے میں، میں نے سوچا ہوا ہے۔ بس شکر کا مقام یہ ہے کہ آج ہم بڑے نقصان سے بچ گئے۔"

"مجھے تو ان بے چارے گھوڑوں کا بھی افسوس ہے جو جل کر مرگئے۔" میں نے کہا "ان کو محض اس لیے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کا اب ریس میں کوئی مقام نہیں رہا تھا۔"

"تم درست کہہ رہے ہو افضل!" شمیم گہری سنجیدگی سے بولی "ان کا افسوس بھی میرے دل سے نکلے گا تو نہیں۔ ویسے بھی وہ سب کے سب ناکارہ نہیں تھے۔ ان میں سے چند ایک تو اب بھی کبھی کبھار ریس میں حصہ لیتے رہتے تھے۔ وہ سب کے سب ہمارے دوست تھے، رفیق تھے، محسن تھے۔ ان بے زبانوں میں بھی ہماری طرح جان تھی۔ لیکن تم نے مختار اور اس کے ساتھیوں کی جو درگت بنائی اور جس طرح ان کی اکڑفوں نکالی اس سے میرے دل میں گھوڑوں کی دردناک موت کا غم کچھ کم ہوگیا ہے۔"

کچھ دیر بعد ہم وہاں سے واپس روانہ ہوئے۔ ہمارے ساتھ ساتھ اِدھر اُدھر مختلف تاریک اور نیم تاریک گوشوں میں مختلف چیزوں کی آڑ میں چند اور سائے بھی حرکت میں تھے۔ جن کی موجودگی سے استاد، شمیم اور راجو بے خبر تھے۔ شاید وہ سمجھ رہے تھے کہ میرے ساتھی اصطبل کے آس پاس جہاں جہاں چھپے ہوئے تھے اب بھی وہیں چھپے ہوئے تھے۔ انہیں اندازہ نہیں تھا کہ مناسب فاصلہ رکھتے ہوئے وہ ہمارے ساتھ ہی متحرک تھے۔

راستے میں شمیم بولی "ہوسکتا ہے اب مختار کا ردِّعمل پہلے سے زیادہ شدید ہو۔ شاید اب وہ زندگی یا موت کی بازی کھیلے۔"

"اس کے حصے میں موت ہی آئے گی۔" میں نے کہا "تم دونوں میاں بیوی اب اسے ذہن سے جھٹک دو۔ وہ اب میرا دردِ سر ہے۔ تم اب یہ بھی اطمینان رکھو کہ وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ تمہاری حفاظت کے لیے میرے جو دو آدمی تعینات ہیں وہ مختار یا اس کے گرگوں جیسے بیسیوں آدمیوں کے لیے کافی ہیں۔"

"کم از کم میں اب خوف زدہ نہیں ہوں۔" شمیم بولی "آج جو کچھ ہوا اس کا اتنا فائدہ ضرور ہوا ہے کہ مختار کا خوف یکایک ہی میرے دل سے نکل گیا ہے۔"

"میرے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔ اس سے میرا کام آسان ہوجائے گا۔ ورنہ میرے لیے یہی الجھن رہا کرتی کہ مختار کا کوئی بندوبست کروں یا تمہاری کمزوری دور کروں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے گردن گھما کر ایک نظر راجو کی طرف دیکھا۔ وہ اب بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

"تمہارا کیا حال ہے؟ تمہارا بھی خوف وغیرہ دور ہوا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے تو پہلے بھی اپنے آپ کو تن بہ تقدیر ہی چھوڑا ہوا تھا۔" راجو بولا "اب یہ دیکھ کر اور بھی اطمینان ہوگیا ہے کہ تم جیسا یار میری مدد کے لیے موجود ہے۔ مجھے تو معلوم ہی نہیں تھا تم ہر لحاظ سے اتنے طاقتور ہوگئے ہو۔ مجھے اب کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

شمیم بولی "لگتا ہے تمہیں اس قسم کے معاملات کا بہت تجربہ ہے۔ تم آدمیوں کا بندوبست کرکے چلے تھے۔ ہمیں تو ذرا بھی احساس نہیں ہوا کہ تمہارے آدمی آس پاس کہیں چھپے ہوئے ہیں۔"

"اگر تمہیں احساس ہوجاتا تو پھر دوسروں کو بھی ہوسکتا تھا۔ اس طرح تو لینے کے دینے پڑسکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"تمہیں اندازہ تھا کہ مختار اپنے گرگوں کے ساتھ یہاں پہنچے گا؟" راجو نے پوچھا۔

"مجھے توقع تو نہیں تھی۔" میں نے اعتراف کیا "میرا خیال تھا کہ اس نے جو کرنا تھا، کرلیا۔ یعنی آگ لگوادی۔ اب وہ آرام سے گھر بیٹھ کر نتائج کا انتظار کرے گا۔ لیکن محض احتیاطاً میں نے اپنے آدمیوں کو پیچھے پیچھے آنے کے لیے کہہ دیا تھا۔ میری احتیاط اکثر کام آہی جاتی ہے۔"

"اگر وہ لوگ بروقت گولی نہ چلاتے تو نہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔" شمیم بولی۔

"پھر بھی شاید ہم پر اوپر والے کا کرم ہی رہتا۔" میں نے کہا "ان سے پنگا تو ہم نے خود ہی لیا تھا ورنہ مختار بے چارہ تو اپنی لگوائی ہوئی آگ اور ہماری بے بسی کے نظارے سے لطف اندوز ہونے ہی آیا تھا۔ میں نے سوچا اب وہ اتنے شوق سے رات کے پچھلے پہر سوٹ بوٹ پہن کر آہی گیا ہے تو اسے تھوڑا سا سبق دے ہی دیا جائے۔ ویسے وہ اور اس کے گرگے میرے اندازوں سے زیادہ بودے نکلے۔"

"یہ تم کہہ سکتے ہو، ہم نہیں۔" راجو بولا "ہماری درگت بنانے کے لیے تو وہی کافی تھے۔"

ہم واپس وہیں پہنچ چکے تھے جہاں سے روانہ ہوئے تھے۔ آگ تقریباً...... بجھائی جاچکی تھی۔ اب وہاں بجھے ہوئے کوئلوں اور سیاہ ملبے کے ڈھیر میں کہیں کہیں کوئی دیوار یا لوہے کا کوئی ڈھانچا کھڑا دکھائی دے رہا تھا۔ فائر بریگیڈ کی ایک گاڑی کسی ہائیڈرنٹ سے مزید پانی لینے گئی ہوئی تھی۔

ہمیں وہاں مختلف چکروں سے فارغ ہوکر واپس آتے آتے دن کا ایک بج گیا۔ میں نے شمیم اور راجو کو ان کے گھر اتارا۔ شمیم بضد تھی کہ میں ان کے ہاں چلوں لیکن میں نے معذرت کی اور گھر آکر کھانے کے بعد سوگیا۔

میری شامیں بھی عام طور پر مصروف ہی ہوتی تھیں، کبھی کوئی کاروباری یا غیر کاروباری ڈنر، کبھی کوئی تقریب، کبھی کوئی رسمی یا غیر رسمی میٹنگ۔ جس روز کوئی مصروفیت نہیں ہوتی تھی اس روز میں

ستارہ' طاہرہ خانم یا راحیلہ کی طرف چلا جاتا تھا۔ یہ بجائے خود ایک الگ قسم کی مصروفیت ہوتی تھی۔ شام بہرحال فارغ نہیں گزرتی تھی۔ کبھی کبھی تو آفس میں ہی رات گئے تک بیٹھنا پڑ جاتا تھا۔

اس روز بھی سو کر اٹھنے کے بعد میں ایک ڈنر میں شرکت کے لیے باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ راحیلہ کا فون آ گیا۔ خلافِ توقع اس نے طنزیہ یا استہزائیہ انداز میں گفتگو کا آغاز نہیں کیا بلکہ نہایت سنجیدہ لہجے میں بولی "آج آفس نہیں گئے۔"

"نہیں..... تم نے آفس فون کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں... فون تو آفس بھی کیا تھا اور گھر بھی۔ لیکن کوئی پیغام نہیں چھوڑا تھا۔" وہ بولی... "کیونکہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔"

"خاص بات خاص لوگوں کے پاس ہوتی ہے۔" میں نے اسے چھیڑا کہ شاید وہ کچھ چہکے۔

"ہاں..... یہ تو درست ہے۔" وہ بدستور سنجیدگی سے بولی۔ "ایک خاص آدمی آج صبح اس عام سی خاتون کو نظر آیا تھا۔"

"کون؟" میں نے کوئی خاص تجسس ظاہر کیے بغیر پوچھا۔

"عالم شیر۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"عالم شیر؟" میرے کان کھڑے ہوئے۔ "وہ تمہیں کہاں نظر آ گیا؟"

"میں صبح ضرورت کی کچھ چیزیں لینے مارکیٹ تک گئی تھی۔" وہ بولی "میں ایک جنرل اسٹور سے نکل رہی تھی تو میں نے اسے ایک بینک سے نکلتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بریف کیس تھا۔ دائیں بائیں دو نئے گارڈز تھے جو اُن سے زیادہ خطرناک معلوم ہوتے تھے جو ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔"

"فون پر اس قسم کی باتیں نہیں کیا کرتے۔" میں نے اسے ٹوکا "کیا اس نے تمہیں نہیں دیکھا؟"

"دیکھا ہوتا تو شاید اس وقت عالمِ بالا سے میری روح تم سے باتیں کر رہی ہوتی۔" وہ بولی "پہلے مجھے شبہ ہوا تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا ہے اور میری روح اس کمزور قسم کے قفسِ عنصری سے پرواز کرنے کے لیے تقریباً تیار ہو گئی تھی۔ وہ جگہ بھی ایسی تھی کہ دو بدو مقابلہ ہوتا تو اچھی بھلی پبلک دیکھتی۔ مجھ گناہ گار کے ساتھ کچھ بے گناہ بھی لپیٹ میں آتے۔"

"پبلک دیکھتی تو یقیناً خوش ہوتی کہ ہمارے ہاں کیسی کیسی مردمار خواتین پائی جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"مردمار خاتون کی تو اس وقت سٹی گم ہو گئی تھی۔ میں تو دُکان کے دروازے پر ہی بُت بنی رہ گئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ میں ایک آدھ سیکنڈ اور اسی طرح کھڑی رہتی تو عالم شیر کی نظر پڑ ہی جاتی۔ وہ تو میں بروقت پلٹ کر دُکان میں چلی گئی۔ میں نے سوچا کم از کم پوزیشن لینے کے لیے کسی دیوار' کسی شوکیس وغیرہ کی آڑ تو میسر ہو گی۔" وہ بولی "لیکن خیر ہی گزری۔ وہ لوگ ایک جیپ میں بیٹھ کر چلے گئے۔ بہت عجلت میں دکھائی دیتے تھے۔"

"بینک سے بریف کیس لے کر نکل رہے تھے تو یقیناً رقم نکلوا کر ہی باہر آ رہے ہوں گے۔" میں نے خود کلامی کے انداز میں کہا "لیکن عالم شیر کو ایسی کیا ضرورت پڑ گئی؟ اس قسم کے لوگوں کے پاس زیادہ تر تو بلیک منی ہی ہوتی ہے اور کیش کی صورت میں بہت زیادہ مقدار میں ان کے پاس موجود رہتی ہے۔ کہیں وہ خبیث ملک سے فرار تو نہیں ہو رہا؟"

"کہو تو میں جا کر پوچھ لوں؟" وہ گویا جل کر بولی۔

"تمہیں جلنے کی ضرورت نہیں۔ اس وقت میں بہ آواز بلند سوچ رہا ہوں۔" میں نے کہا اور اپنے پہلے خیال کو خود ہی مسترد کر دیا۔ "ابھی عالم شیر پر اتنی افتاد بھی نہیں پڑی کہ وہ ملک چھوڑ کر فرار ہونے لگے۔ البتہ ویسے ہی کسی دورے پر..... یا اپنے بڑے آقاؤں سے ملنے جا رہا ہو تو بات دوسری ہے۔"

فون پر دوسری طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد راحیلہ بولی۔ "اگر تم اپنی اس چیخ پکار نما سوچ بچار سے فارغ ہو گئے ہو تو میں کچھ عرض کروں؟"

"ہاں۔ عرض کرو۔ لیکن بات کو طول دیے بغیر۔ یعنی طول عرض مختصر ہونا چاہیے۔"

"ہماری یہ مجال کہاں کہ آپ سے طویل بات کر کے آپ کا قیمتی وقت ضائع کریں شہنشاہ عالی!" وہ لجاجت سے بولی۔ "مجھے صرف یہ دریافت کرنا تھا کہ کنیز کے لیے کیا حکم ہے؟"

"کنیز صاحبہ! شہنشاہ عالی کی گزارش ہے کہ صبح تیار رہیے گا شہنشاہ عالی آپ کے درِ دولت پر حاضر ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"کیوں؟" اس نے نہایت اختصار سے پوچھا۔

"میرا خیال ہے یہ عالم شیر والا قضیہ بھی نمٹا ہی دیا جائے اس سے پہلے کہ وہ ہم پر کوئی کاری وار کر جائے۔ اب تمہاری اس سے صورت آشنائی ہو چکی ہے... اور تمہیں اس شہر میں ہے۔ بزنس کرنا ہے۔ ادھر اُدھر پھرنا ہے۔ زندگی گزارنی ہے۔ شیر کی موجودگی میں یہ سب کچھ مجھے مشکل نظر آ رہا ہے... اور غفلت کے کسی لمحے میں وہ تمہیں کوئی نقصان پہنچا گیا تو میری زندگی بے معنی ہو جائے گی۔ نہ جانے میں کیا کر گزروں..... معلوم نہیں اس کے بعد بھی دل کا زخم بھرے یا نہ بھرے۔" تیزی سے کہتا چلا گیا۔

"بس..... بس..... زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ جذبات کو بریک لگاؤ۔ میں تو ایک معمولی سی' بیکار سی عورت ہوں مر مرا گئی تو کوئی ایسی قیامت نہیں آ جائے گی تم خوامخواہ میرے ادھر اُدھر ہم مچاتے نہ پھرنا۔" وہ ناصحانہ لہجے میں بولی۔

"تمہاری قدر تو کوئی ہم سے پوچھے۔" میں نے آہ بھر کر کہا

"اچھا... اب تم پھر قدر اور ناقدری کے چکر میں نہ پڑ جاؤ۔" وہ جلدی سے بولی۔ "تم تو مجھے کچھ بتانے لگے تھے۔"

"بتانا کیا ہے..... بس کل صبح تیار رہنا۔ شاید کل ہی کچھ ہو جائے۔" میں نے کہا۔

"یہ تم مجھے کس کام پر لگا رہے ہو۔" وہ کراہ کر بولی "میں تو یہاں بزنس کرنے آئی تھی۔"

"یہ بھی بزنس ہی ہے۔ دنیا کو خبیثوں سے پاک کرنا۔" میں نے کہا۔

"کہاں تک پاک کرو گے دنیا کو خبیثوں سے۔" وہ آہ بھر کر بولی "خبیثوں کو ختم کرنے کے لیے یا کم از کم انہیں خباثت سے روکنے کے لیے دنیا میں صدیوں سے اتنی طاقتیں کام کر رہی ہیں... منظم ادارے بنائے جاتے رہے ہیں... قوانین بنائے جاتے رہے ہیں... اتنے بہت سے لوگ انفرادی اور اجتماعی کوششیں کرتے رہے ہیں... مذہبی سطح پر بھی کوششیں ہوتی رہی ہیں مگر خبیثوں کی تعداد ہے کہ بڑھتی جا رہی ہے۔ اب تو ہر جگہ' ہر رنگ میں' ہر روپ میں ایک سے ایک بڑھ کر خبیث موجود ہے۔ بعض اوقات تو فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ کون بڑا خبیث ہے۔ ان حالات میں تم اکیلے کیا کرو گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے بلا تامل جواب دیا "میں کب سارے خبیثوں کی بات کرتا ہوں۔ یہ میرے بس کی بات کہاں... میں تو صرف ان خبیثوں کے سلسلے میں کوئی قدم اٹھاتا ہوں جو ہمارا جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ ان کے سلسلے میں بھی انتہائی قدم اس وقت اٹھاتا ہوں جب زندگی اور موت کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر بولی "اچھا خیر... صبح میں تمہارا انتظار کروں گی۔"

سلسلہ منقطع کر کے میں نے انوار سے رابطہ قائم کیا۔ انوار فلمی دنیا کا بہترین میک اَپ مین تھا۔ مجھے آفاق نے اس سے ملوایا تھا۔ مَیں نے اس کے کام اور کردار کو اچھی طرح پرکھنے کے بعد اسے اپنے آدمیوں میں شامل کر دیا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو بوقتِ ضرورت ہمیں کسی قسم کی تیکنیکی مدد فراہم کرتے تھے اور جن پر ہر قسم کے حالات میں بھروسا کیا جا سکتا تھا۔ عملی زندگی میں وہ مختلف شعبوں میں سرگرمِ عمل تھے۔ اپنے اپنے ہنر کی مناسبت سے کوئی نہ کوئی ذریعۂ معاش اختیار کیے ہوئے تھے لیکن ان کی وفاداریاں مجھ سے وابستہ تھیں' کچھ مفادات کا رشتہ بھی تھا لیکن میری کوشش تھی کہ وہ صرف مفادات کی زنجیر میں نہ بندھے رہیں بلکہ ذہنی طور پر بھی میرے وفادار رہیں' ایسا نہ ہو کہ مفادات کی زنجیر ٹوٹے تو وہ میرا ساتھ چھوڑ جائیں' انوار ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھا۔

میں نے اسے صبح گھر پر ہی موجود رہنے اور کچھ تیاریاں مکمل کر کے رکھنے کی ہدایات دیں۔ پھر ٹونی سے رابطہ قائم کر کے اسے صورتِ حال سمجھائی' اس نے مجھے اطمینان دلایا کہ وہ شمیم اور راجو کے اصطبل والی صورتحال کی طرح اس صورتحال کو بھی موقع کی مناسبت سے سنبھال لے گا' وہ خوش تھا کہ میں نے عالم شیر کے سلسلے میں کوئی حتمی قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ عالم شیر سے ٹونی کو بھی بڑی نفرت تھی لیکن دیگر معاملات کی طرح وہ اس معاملے میں بھی کھل کر اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ وہ جمیل کی طرح پُرسکون رہنے والا نوجوان تھا۔ اسے سب کچھ سمجھانے کے بعد میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

دوسرے روز میں ایک عام گاڑی میں بیٹھ کر گھر سے نکلا۔ مجھے معلوم تھا عالم شیر میری خاص گاڑی کو پہچانتا تھا۔ میں معمولی سی شلوار قمیص میں تھا۔ روانہ ہونے سے پہلے میں نے راحیلہ کو فون کر دیا تھا۔ میں اس کے ہاں پہنچا تو وہ تیار بیٹھی تھی وہ ایک بار پھر کالج کے یونیفارم جیسی سفید شلوار قمیص اور جوگرز پہنے بیٹھی تھی۔ لگتا تھا کہ آج کل اسے یہ لباس اور جوتے کچھ زیادہ ہی پسند آ گئے تھے۔

"جوگرز تو ٹھیک ہیں..." میں نے اس کا سرتا پا جائزہ لیتے ہوئے کہا "لیکن یہ شلوار قمیص نہیں چلے گی۔ تمہیں تو آج ایک امریکن لڑکی کا روپ اختیار کرنا ہے۔ تمہارے پاس کچھ اس طرح کے ملبوسات نہیں پڑے جیسے تم یونیورسٹی کے زمانے میں پہنتی تھیں؟ کوئی جینز... اسپورٹس شرٹ وغیرہ..."

"اچھا... تو آج تمہارا عالم شیر کے ساتھ وہ ڈولی والا ڈراما کرنے کا ارادہ ہے؟" وہ میرا مقصد سمجھتے ہوئے بولی "تم نے مجھے صرف تیار رہنے کے لیے کہا تھا۔ وضاحت نہیں کی تھی۔ ورنہ میرے پاس تو ہر قسم کے ملبوسات موجود ہیں۔"

وہ دوبارہ اندر چلی گئی۔ چند منٹ بعد وہ ڈرائنگ روم میں واپس آئی تو اس کا لباس قطعی مختلف تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کی شخصیت کا تاثر بالکل بدل گیا تھا۔ وہ ساٹھ ستر فیصد تو امریکن نظر آنے لگی تھی۔ مجھے امید تھی کہ باقی کسر انوار جیسے ماہرِ فن میک اَپ مین کی خدمات حاصل ہونے کے بعد پوری ہو جائے گی۔

میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور انوار کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ راستے میں مَیں نے اسے تمام ضروری باتیں سمجھانا شروع کر دیں۔ وہ سب کچھ ذہن نشین کرتی جا رہی تھی میں نے اسے یہ بھی سمجھایا کہ اگر عالم شیر کوئی غیر متوقع سوال کر ڈالے یا راحیلہ ویسے ہی کسی بات پر اٹکنے لگے تو اسے کیا کرنا ہو گا؟"

"تم مطمئن رہو۔ یہ ڈراما میرے لیے زیادہ مشکل نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

آخر ہم انوار کے گھر جا پہنچے۔ اس کے گھر کے ایک بظاہر معمولی سے کمرے میں میک اپ کا اعلیٰ ترین امپورٹیڈ سامان موجود تھا۔ ایک گھنٹے بعد ہم انوار کے گھر سے نکلے تو ہمارے حلیے بالکل ہی تبدیل ہو چکے تھے۔

راحیلہ اب واقعی مکمل طور پر ایک آوارہ گرد امریکی لڑکی دکھائی دے رہی تھی اور میں ایک باریش' اَن پڑھ سا ڈرائیور جس کے سر پر کا افغانی ٹوپی تھی' پیروں میں پشاوری چپل اور گلے میں مفلر۔ راحیلہ گھر سے ایک بیگ بھی لے کر چلی تھی جو اَب اس کے

کندھے پر زیادہ بج رہا تھا۔

راستے میں ہم مزید باتیں کرتے رہے اور بالآخر شہر سے دور ویران سے علاقے میں واقع اس بنگلے میں جا پہنچے جو میں راحیلہ کو دکھا چکا تھا۔ چند منٹ ستانے کے بعد میں نے ٹیلیفون راحیلہ کے سامنے لا رکھا۔ دوسرے کمرے میں اس کی ایکسٹینشن بھی موجود تھی وہ میں اپنے لیے اٹھا لایا۔

راحیلہ نے میرا دیا ہوا نمبر ڈائل کرنے کے چند لمحے بعد جونہی "ہیلو" کہا میں نے بھی ایکسٹینشن کا ریسیور اٹھا لیا۔ ایکسٹینشن اٹھانے پر چونکہ دوسری طرف والے کو معمولی سی کلک کے ساتھ آواز ہلکی سنائی دینے لگتی ہے اس لیے میں نہیں چاہتا تھا کہ گفتگو شروع ہونے کے بعد ایکسٹینشن اٹھاؤں۔ کوئی بھروسا نہیں تھا کہ دوسری طرف بات کرنے والا اس معمولی سی چیز کو محسوس کر لیتا۔ میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ لیا اب میں دونوں کی گفتگو سن سکتا تھا۔

"ہیلو۔۔!" دوسری طرف سے ایک کھردری اور بھاری آواز سنائی دی۔

میری ہدایت کے مطابق راحیلہ نے خاص امریکی لہجے میں انگریزی میں بات شروع کی۔ "میں عالم شیر سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

دوسری طرف سے بات کرنے والا کچھ گڑ بڑا گیا شاید اسے راحیلہ کے لہجے کی وجہ سے بات سمجھنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ پھر وہ انگریزی میں جواب دینے پر قادر نہیں تھا اس نے صرف اتنا کہا "ایک منٹ۔۔۔" پھر اس نے ریسیور کسی اور کو پکڑا دیا۔ "آواز اس کی بھی بھاری اور کھردری تھی۔ راحیلہ نے اپنا سوال دُہرایا۔

"عالم شیر۔۔؟" وہ کون ہے؟ یہاں تو کوئی عالم شیر نہیں رہتا۔" بڑی معصومیت سے جواب ملا۔ وہ خاصی روانی سے انگریزی بول رہا تھا۔

"دیکھو۔۔؟ مجھے پریشان مت کرو۔ میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔ یہ نمبر عالم شیر نے خود خاص طور پر مجھے دیا تھا۔" راحیلہ بولی۔

"یہ بہت پہلے کی بات ہوگی محترمہ۔" وہ ملائمت سے بولا۔

"ہاں۔ بات تو کافی عرصہ پہلے کی ہے لیکن مجھے معلوم ہے یہ عالم شیر کا نمبر۔۔ دیکھو۔۔۔۔۔ اگر تم عالم شیر کے تھوڑے سے بھی خاص آدمی ہو تو شاید تمہارے لیے میرا نام شناسا ہو۔ میں ڈولی بول رہی ہوں۔ لاس ویگاس والی ڈولی۔"

اس شخص نے فوری طور پر کسی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر محتاط لہجے میں بولا "آپ مجھے اپنا فون نمبر دے دیں۔ میں عالم شیر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اگر کچھ پتا چل گیا تو چند منٹ بعد آپ کو اطلاع مل جائے گی۔"

راحیلہ نے فوراً نمبر اسے لکھوا دیا اور منت [illegible] بولی "دیکھو۔۔۔ میری خاطر اسے تلاش کرنے کی کوشش ضرور کر[illegible] میرا اس سے رابطہ بہت ضروری ہے۔ کاش تم سمجھ سکتے۔"

"آپ اطمینان رکھیں محترمہ!" وہ بدستور محتاط لہجے [illegible] بولا "چند منٹ میں آپ کو کوئی نہ کوئی اطلاع ضرور مل جائے گ[illegible] خدا حافظ۔"

ہم دونوں کان سے ریسیور لگائے ایک دوسرے کی طرف [illegible] رہے تھے، راحیلہ نے خدا حافظ کہہ کر مسکراتے ہوئے ریسیو[illegible] دیا اور رائے طلب نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ابتدائی ٹیسٹ میں تو تم کامیاب ہو گئی ہو۔" میں [illegible] کہا "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم آسانی سے اصل مرحلہ بھی کر جاؤ گی۔"

میں اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا [illegible] اپنا جائزہ لینے لگا۔ میں واقعی خود بھی اپنے آپ کو نہیں پہچان [illegible] تھا انوار واقعی اپنے فن میں بادشاہ تھا اس کے کیے ہوئے میک [illegible] کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس پر میک اپ کا شبہ تک نہ[illegible] گزرتا تھا ورنہ فلموں میں تو میک اپ مین جو میک اپ کرتے [illegible] اسے تو اسکرین پر دیکھ کر بھی اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ ابھی ہیرو [illegible] مونچھ اکھڑ کر گر پڑے گی یا ولن کی سفید بھویں کھانے کی پلیٹ [illegible] جا گریں گی۔ کبھی ایسا لگتا تھا کہ فٹ پاتھ سے بارہ آنے والی داڑ[illegible] لے کر کسی اداکار کے چپکا دی گئی ہے۔

راحیلہ کو بھی پہچاننا بہت مشکل تھا۔ میں نے اسے سگریٹ ایک پیکٹ بھی دے دیا تھا اور ہدایت کی تھی کہ عالم شیر کا سا[illegible] کرتے وقت اس کے ہاتھ میں سگریٹ ضرور ہونی چاہیے اور ا[illegible] سگریٹ نوشی کے معاملے میں اناڑی نظر نہیں آنا چاہیے۔ اس [illegible] مجھے دو چار کش لگا کر دکھائے۔ اس کے انداز میں اناڑی پن نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر صرف تھوڑی سی "بدمعاشی" کی کمی تھی ڈولی جیسی لڑکی کا جو تصور میرے ذہن میں تھا اس کے مطابق ا[illegible] کے چہرے پر وہ ملائمت اور معززانہ سی چمک نہیں ہونی چاہیے [illegible] جو موجود تھی۔

راحیلہ کا کہنا تھا کہ وقت آنے پر وہ اپنی اداکاری سے ا[illegible] آپ کو پوری پوری "بدمعاش" ظاہر کر دے گی۔ بہرحال یہ کو[illegible] بہت زیادہ ضروری بھی نہیں تھا۔ مجھے اطمینان یہ تھا کہ عالم شیر [illegible] اصل ڈولی کو بھی دیکھا ہوا نہیں تھا۔ اس لیے تھوڑی بہت خامیا[illegible] چل سکتی تھیں۔ بلکہ جنہیں میں "خامیاں" سمجھ رہا تھا وہ عالم شیر [illegible] آنکھوں کو چندھیانے کا سبب بن سکتی تھیں۔

امید تو مجھے یہی تھی کہ عالم شیر آج ہی دوڑا ہوا آئے گا لیکن اگر کسی وجہ سے پروگرام کل پر جا پڑے تو ہم دوبارہ بھی یہاں آ سکتے تھے، اس صورت میں ہمیں صرف اپنا میک اپ دوبارہ کرانا پڑتا یا [illegible] از کم اسے درست ضرور کرانا پڑتا۔

چند منٹ بعد فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں جلدی سے بیڈ کے قریب کرسی پر آ بیٹھا۔ میں نے اور راحیلہ نے بیک وقت اپنے اپنے ٹیلیفون کا ریسیور اٹھایا۔ میں تمام گفتگو سنتے رہنا چاہتا تھا تاکہ اگر درمیان میں راحیلہ کو تھوڑی بہت مدد کی ضرورت پڑے تو اشارے سے اسے بتا سکوں کہ کیا کہنا ہے۔

"ہیلو!" راحیلہ نے بدلی ہوئی آواز میں کہا۔

"ڈولی! یہ تم بول رہی ہو؟" دوسری طرف سے عالم شیر کی بے تابانہ آواز سنائی دی۔ وہ جھٹکے دار لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔ شکر ہے تمہاری آواز تو سنائی دی۔" راحیلہ نے اطمینان کی گہری سانس لی۔ "میں تو سمجھی تھی تم سے ملے بغیر۔۔۔ تمہاری آواز سنے بغیر ہی پاکستان سے بھاگنا پڑے گا۔"

"تم تھیں کہاں ڈولی؟ میں نے تمہیں بہت تلاش کیا۔۔۔" میری توقع کے عین مطابق عالم شیر کے لہجے میں عاشقانہ بے تابی تھی۔

"جھوٹ مت بولو۔" راحیلہ نے خفگی سے کہا۔ "کسی نے مجھے تلاش نہیں کیا۔ تلاش کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی؟ سب کو معلوم تھا کہ میں کہاں ہوں لیکن کسی نے میری خبر نہیں لی۔ سینڈیکیٹ کے لیے تو خیر میں محض ایک کیریئر تھی، مال لے کر جاتے ہوئے پکڑی گئی۔ سینڈیکیٹ نے مال پر صبر کر لیا اور مجھے وہ لوگ بھول گئے۔ لیکن افسوس تو مجھے تم جیسے لوگوں پر ہے جنہیں میری صورت دیکھے بغیر مجھ سے عشق کا دعویٰ تھا۔ جو مجھ سے ملنے کی حسرت میں مرے جاتے تھے۔"

"قسم سے۔۔۔ مجھے تمہارے بارے میں کچھ پتا نہیں چلا۔" عالم شیر نے پُرزور لہجے میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔ "تمہیں یقین نہ آئے تو میں ٹیلیفون بِل پیش کر سکتا ہوں۔ لاکھوں روپے کی تو میں نے ٹیلیفون کالز کر ڈالیں امریکا۔ آخر سینڈیکیٹ والوں نے مجھے ڈانٹ دیا کہ اگر آئندہ میں نے انہیں تنگ کیا تو وہ مجھے یہیں کے کسی گندے نالے کی تہ میں پہنچا دیں گے۔ پھر امریکا کے ایک ٹرپ کے دوران میں نے خود پتا کرنے کی کوشش کی تو ایک مخبر نے مجھے صرف اتنا بتایا کہ آخری بار تمہیں نیپال بھیجا گیا تھا اس کے بعد سے تمہارا کوئی پتا نہیں۔ ساتھ ہی مخبر نے مجھے سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ کیریئرز تو آتی رہتی ہیں جاتی رہتی ہیں، میں تمہارا زیادہ پیچھا کرنے کی کوشش نہ کروں۔ اس قسم کی حرکتیں سینڈیکیٹ کی مصلحتوں کے خلاف ہوتی ہیں۔"

"ٹھیک کہا تھا اس نے۔" راحیلہ تلخ لہجے میں بولی "سینڈیکیٹ کے لیے تو ہم لوگ قربانی کے بکرے ہوتے ہیں۔ بہرحال مجھے تم سے امید نہیں تھی کہ میرا دوست۔۔۔ میرا محبوب۔۔۔۔ میرا عاشق بھی میری خبر نہیں لے گا۔ کیا تمہیں واقعی پتا نہیں چلا کہ میں تین سال ترکی کی ایک جیل میں پڑی سڑتی رہی ہوں!"

"نہیں۔ میں قسم کھانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے واقعی علم نہیں تھا۔" عالم شیر پُرزور لہجے میں بولا۔ "کیا تم وہاں سے مجھے اطلاع نہیں بھجوا سکتی تھیں؟"

"ان دنوں وہاں منشیات کے خاص کیسوں کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی تھی، بیرونی دنیا سے میرا رابطہ بالکل کاٹ دیا گیا تھا۔ ترکی کی حکومت منشیات کے انٹرنیشنل اسمگلرز سے بُری طرح الرجک تھی۔ مجھے کاغذ کا ایک پُرزہ تک فراہم نہیں کیا جاتا تھا۔ ان کا بس چلتا تو مجھے موت کی سزا دیتے، یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ تین سال میں میری جان چھوٹ گئی ہے۔"

راحیلہ بڑی کامیابی سے فی الحال فون پر ڈولی کا کردار ادا کر رہی تھی۔ دفعتاً اس نے چونک کر پوچھا۔ "کیا یہ ٹیلیفون محفوظ ہے؟"

"ہاں۔۔ محفوظ تو ہے۔" عالم شیر بولا "اس کے باوجود یہ ساری باتیں فون پر کرنا مناسب نہیں ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟"

راحیلہ نے اسے بنگلے کا محلِ وقوع سمجھایا اور بولی "راستوں وغیرہ کے بارے میں مجھے زیادہ معلومات خود بھی نہیں ہیں۔ تمہیں معلوم ہے میں یہاں اجنبی ہوں وہ تو شکر ہے یہاں جمال بیگ نے میرے قیام کا بندوبست کر دیا۔ اس نے مجھے ایک گاڑی اور ڈرائیور بھی دیا ہے۔۔"

جمال بیگ پاکستان میں ڈرگ مافیا کا خاص آدمی تھا۔ مجھے یقین تھا کہ عالم شیر کو اس کا نام سن کر ہمارے ڈرامے کے حقیقی ہونے کا زیادہ یقین ہو جائے گا۔ لیکن وہ جمال بیگ سے کسی بات کی تصدیق نہیں کر سکتا تھا۔ دونوں میں اینٹ کتے کا بیر تھا۔ شاید یہ بھی ڈرگ مافیا ہی کی حکمتِ عملی تھی۔ وہ "لڑاؤ اور حکومت کرو" کی پالیسی پر نہایت عمدگی سے عمل کرتی تھی اور ہماری قوم اس کام میں پہلے ہی سے بہت ماہر چلی آ رہی تھی۔ جائز یا ناجائز، ہر کام کے سلسلے میں ہمارے لوگ ایک دوسرے کا گلا کاٹنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ مذہب دنیا میں بے مقصد خونریزی سے بچنے کی سب سے زیادہ تلقین کرتا ہے لیکن یہاں مذہب کے نام پر بھی سب ایک دوسرے کو شہادت کے مرتبے پر فائز کرنے پر کمربستہ رہتے تھے۔ ناجائز دھندوں کا تو ذکر ہی کیا!

تاہم جمال بیگ اور عالم شیر کی رقابت زیادہ تر کاروباری حدود میں ہی رہتی تھی۔ دونوں براہِ راست تصادم سے گریز ہی کرتے تھے۔ شاید اس لیے زیادہ گہرائی میں دونوں کی جڑیں کہیں ایک ہی جگہ جا کر ملتی تھیں۔ جمال بیگ بہرحال عالم شیر سے بڑا اسمگلر اور زیادہ خطرناک آدمی تھا۔

جمال بیگ کا نام سن کر عالم شیر کو گویا جھٹکا سا لگا۔ وہ مجروح سے لہجے میں بولا "یہ تمہیں جمال بیگ کی پناہ میں جانے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی؟ میں مر گیا تھا کیا؟"

"میں کل سے تم سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں لیکن تمہارا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔" راحیلہ بولی۔

"میں آج کل منظرِ عام سے تقریباً غائب ہوں۔" عالم شیر نے تسلیم کیا۔

"پھر مجھے کیوں الزام دے رہے ہو؟" راحیلہ اس پر چڑھ دوڑی۔ "میں نے تو محسوس کرلیا تھا کہ کوئی گڑبڑ ہے تب ہی تو میں نے براہِ راست تمہارے، گھر یا آفس پہنچنے سے گریز کیا۔ تمہارے جو دوسرے فون نمبر میرے پاس تھے ان سے یہی جواب ملا کہ تم ملک سے باہر ہو۔ یہ جو خاص فون نمبر تھا یہ بھی مجھے زبانی ہی یاد تھا لیکن اس میں مجھ سے ایک ہندسے کی غلطی ہو رہی تھی۔ شکر ہے آج صبح مجھے صحیح یاد آگیا پہلے تو مجھے اس نمبر سے بھی ٹرخانے کی کوشش کی گئی تھی۔"

"ہاں... کچھ عجیب عجیب خطرات پیدا ہو گئے ہیں۔" عالم شیر مبہم لہجے میں بولا "تفصیلی باتیں تو روبرو بیٹھ کر ہوں گی۔"

"میں جمال بیگ سے رابطہ نہ کرتی تو کیا کرتی؟" راحیلہ بدستور ہلکی سی خفگی سے بولی "میں ترکی سے یہاں تک پہنچتے تک تقریباً قلاش ہو چکی تھی۔ میرے پاس اتنی رقم بھی نہیں تھی کہ کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتی۔ اس لیے مجبوراً مجھے جمال بیگ سے رابطہ کرنا پڑا۔ مجھے اس کی مدد لینے کا شوق ہرگز نہیں تھا۔ ورنہ مجھے اب بھی تم سے رابطہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے مسائل تو حل ہو چکے تھے۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" عالم شیر بولا "میں چشمِ تصور سے دیکھ سکتا تھا کہ اس احساس سے اس کی باچھیں کھل گئی تھیں کہ ڈولی جیسی جہاں گرد لڑکی اس کی ذات میں اتنی دلچسپی رکھتی تھی۔

راحیلہ نیچی آواز میں بولی۔ "لیکن ایلم شیر ڈیئر! مجھے کچھ گڑبڑ لگ رہی ہے' تجھے معلوم ہے سینڈیکیٹ مجھ سے خوش نہیں ہے اسی ڈر کی وجہ سے میں ابھی لاس ویگاس واپس نہیں جا رہی۔ لیکن جمال بیگ مجھ پر بہت مہربان معلوم ہوتا ہے۔ اس نے نہ صرف میرے تمام مسائل حل کیے' میری ہر طرح سے مدد کی' بلکہ مجھے فوراً تین کلو "سامان" بھی پکڑا دیا۔"

سامان' سے مراد کوکین تھی۔ ان دنوں ہیروئن کا دھندا اتنے عروج پر نہیں پہنچا تھا۔ ڈرگ مارکیٹ کی سب سے قیمتی اور سب سے اونچے درجے پر حرکت میں رہنے والی چیز "کوک" ہی تھی۔

عالم شیر مضطربانہ لہجے میں بولا۔ "تم اتنی احمق کب سے ہو گئی ہو؟ اس بنگلے میں تمہیں جمال بیگ نے پناہ دی ہے... فون اسی کا ہے... اور تم اسی پر ساری باتیں کیے جا رہی ہو۔"

"میں نے اطمینان کرلیا ہے۔" راحیلہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی "کمرے میں گفتگو ریکارڈز کرنے والے کسی قسم کے آلات پوشیدہ نہیں ہیں۔ ٹیلیفون سیٹ بھی میں نے کھول کر دیکھ لیا ہے اس میں بھی کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔ میں تمہیں یہ بتا رہی تھی کہ جمال بیگ چاہ رہا ہے میں یہاں سے سیدھی ویسٹ جرمنی چلی جاؤں۔ تین کلو سامان... بہت بڑی کنسائنمنٹ ہے۔ اسے لے کر ویسٹ جرمنی جانا... مجھ جیسی تازہ تازہ سزا یافتہ کے لیے کوئی آسان کام نہیں ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا جمال بیگ اتنا بڑا رسک کیوں لے رہا ہے؟"

"یہ اس کا کوئی گیم ہے ہنی! تمہیں جلد ہی پتا چل جائے گا۔" عالم شیر بولا۔

"یہی تو میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس کا گیم کیا ہے۔" راحیلہ بدستور سرگوشی کے سے انداز میں بولی۔ "لیکن اتنا ضرور ہے کہ میری چھٹی حس مجھے کسی خطرے کا احساس دلا رہی ہے۔ میرا خیال ہے میری جان کو خطرہ ہے۔"

"تمہیں پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔" عالم شیر مجھ سے بولا "میں آکر تم سے ملتا ہوں۔ پھر گیم بھی سمجھ میں آجائے اور تمہاری حفاظت کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ تمہارا مجھ سے رابطہ قائم ہو گیا ہے' اب تمہیں کسی معاملے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..."

راحیلہ نے ریسیور کان سے لگائے' مسکراتے ہوئے مجھے آنکھ ماری۔ عالم شیر بات جاری رکھتے ہوئے کہہ رہا تھا "میں ایک ڈیڑھ گھنٹے میں تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ اس کے بعد تم اپنی ہر پریشانی ہر مسئلہ میرے سپرد کر دینا۔"

"میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے تم جمال بیگ سے دشمنی مول لو۔ جو سرد جنگ چلتی رہتی ہے' وہی کافی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میری وجہ سے باقاعدہ جنگ شروع ہو جائے۔ سینڈیکیٹ اس بات کو پسند نہیں کرے گی۔" راحیلہ نے اپنے لہجے میں خوف سمونے کی کوشش کی۔

"بھاڑ میں گئی سینڈیکیٹ... اور جہنم میں گیا جمال بیگ۔" عالم شیر جوش سے بولا "اب تمہارا عالم شیر اتنا کمزور نہیں رہا کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر ڈرتا رہے۔"

راحیلہ نے ایک بار پھر مجھے آنکھ ماری۔ عالم شیر بات ختم کرتے ہوئے بولا "بس... تو پھر میں آرہا ہوں' تم کہیں جانا مت۔ اور ہاں... کیا جمال بیگ کو اس بات کی فوری خبر ہو جائے گی کہ میں تم سے ملنے آیا تھا۔"

"نہیں... میں نہیں بتاؤں گی تو نہیں ہوگی۔" راحیلہ نے اسے اطمینان دلایا۔ "اس کا جو آدمی ڈرائیور کے طور پر میرے ساتھ ہے وہ تو بالکل شریف معلوم ہوتا ہے' اسے تو شاید جمال بیگ کے اصل دھندے کا علم بھی نہیں ہے۔ داڑھی والا ہے۔ نمازی پرہیزگار ہے۔"

"داڑھی والا تو میں بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں' میں۔ دو حج بھی کیے ہوئے ہیں۔" عالم شیر قہقہہ لگا کر بولا "لیکن تمہیں معلوم ہے یہ تو صرف ایک آڑ ہے۔ اس طرح کے لوگوں کو ہمارے معاشرے میں بغیر شناسائی اور بغیر تعارف کے بھی عزت مل جاتی ہے۔ کوئی نیا پولیس آفیسر کسی قسم کی رپورٹ پڑھ کر پہلی بار میرے پاس پہنچتا ہے تو ایک لمحے کے لیے چکر میں پڑ جاتا ہے کہ کہیں اسے کوئی دھوکا تو نہیں ہوا۔"

"خدا کے لیے لوگوں کو اتنا زیادہ چکر مت دیا کرو۔ کم از کم اپنا حلیہ تو بدل لو۔" راحیلہ کراہ کر بولی۔

میں نے اشارے سے اسے منع کیا کہ وہ عالم شیر کے ساتھ اخلاقیات کے معاملے میں نہ الجھے میرے خیال میں ایک امریکی اور اونچے درجے کی "کیریئر" لڑکی کے طور پر یہ بات اس کے کردار سے میل نہیں کھاتی تھی۔

لیکن اتفاق سے راحیلہ کی یہ بات بھی ڈولی کے کردار پر فٹ بیٹھ گئی عالم شیر ایک اور ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا "میں نے پہلے بھی جب تمہیں اپنے حلیے کے بارے میں بتایا تھا تو تم نے یہی کہا تھا۔ میں نے پہلے بھی تمہیں یہی جواب دیا تھا کہ اس حلیے کے مجھے بڑے فائدے ہیں اب میں اسے تبدیل نہیں کر سکتا۔"

"اچھا۔۔۔ خیر۔۔۔ تمہاری مرضی۔" راحیلہ بات ختم کرتے ہوئے بولی "تو تم ایک ڈیڑھ گھنٹے میں آ رہے ہو؟ میں تو اشتیاق کے مارے مری جا رہی ہوں۔ اتنی پرانی اور اتنی گہری ہماری شناسائی ہے لیکن ملاقات آج ہو گی۔ کیسی عجیب بات ہے بالکل فرضی قصے کہانیوں جیسی۔ ہے نا؟"

"قصے کہانیاں بھی کہیں نہ کہیں انسانوں ہی کی زندگیوں سے جنم لیتے ہیں۔" عالم شیر خوش دلی سے بولا "ملاقات تو ہماری بہت پہلے ہو جاتی لیکن ہر بار کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو جاتی تھی۔"

"لیکن خیر۔۔۔ ہم ثابت کر دیں گے کہ لگن سچی ہو تو کبھی نہ کبھی ملاقات ہو ہی جاتی ہے۔" راحیلہ میری طرف دیکھ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"بے شک۔۔۔ بے شک۔" عالم شیر پرزور لہجے میں بولا۔

"اچھا۔۔۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ خیال رکھنا۔۔۔ کہیں میں تمہارا انتظار ہی کرتی رخصت نہ ہو جاؤں۔ میرا یہاں قیام زیادہ طویل نہیں ہو گا۔ عین ممکن ہے میں کل ہی نکل جاؤں۔ جمال بیگ مجھے جلد از جلد رخصت کر دینا چاہتا ہے۔"

"جمال بیگ کی ایسی کی تیسی۔۔۔" عالم شیر روانی میں اردو بول گیا پھر اس مفہوم کو انگریزی میں ادا کرتے ہوئے بولا "عین ممکن ہے کہ اس بار تمہارے کہیں بھی جانے کی نوبت نہ آئے۔"

"خیر یہ تو تمہارے آنے کے بعد دیکھا جائے گا۔" راحیلہ بولی۔

وہ سلسلہ منقطع کرنے لگی تھی کہ عالم شیر نے پوچھا۔ "وہ ڈرائیور اس وقت کہاں ہے جو جمال بیگ نے تمہیں دیا ہے؟"

"باہر بیٹھا چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا ہے۔" راحیلہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیوں۔۔۔ اس کا خیال کیوں آ گیا تمہیں؟"

"کوئی خاص بات نہیں۔ مجھے بس یہ اطمینان کرنا تھا کہ کہیں وہ تمہیں فون پر بات کرتے ہوئے سن تو نہیں رہا۔ بعض ڈرائیور اچھی بھلی انگریزی سمجھتے ہیں۔"

"اب میں اتنی پاگل بھی نہیں ہوں کہ بیڈ روم میں ڈرائیور کو بٹھا کر فون پر باتیں کرنے لگوں گی۔ خصوصاً جب کہ ڈرائیور کوئی ایسا خوبصورت بھی نہیں ہے۔" راحیلہ شرارت سے مسکرائی

"خیر۔۔۔ یہ تو میں آ کر دیکھوں گا۔ خدا حافظ۔" عالم شیر بولا۔

راحیلہ نے بھی خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور ریسیور رکھتے ہوئے گہری سانس لے کر بولی "لو بھئی۔۔۔ یہ مرحلہ بھی سر ہوا۔ شکار خود ہی جال میں آ رہا ہے۔"

پھر یکدم وہ کچھ زیادہ ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "کیا واقعی تم نے اسے ٹھکانے لگانے کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے؟"

"کیا اب بھی تمہیں کوئی شبہ ہے؟" میں نے حیرت سے دریافت کیا۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا اسے کسی گہری سوچ میں ڈوبے دیکھ کر میں نے پوچھا "کیا تمہیں پچھتاوا ہو رہا ہے اس سلسلے میں شریک ہونے پر؟"

"نہیں۔۔۔ ایسی بات تو نہیں"۔۔۔ وہ متذبذب سے لہجے میں بولی "بس۔۔۔ ابھی ذرا میرا ہاضمہ اتنا طاقتور نہیں ہوا کہ ایسی باتوں کو آسانی سے ہضم کر سکوں۔ وہ۔۔۔ دراصل کوئی آدمی آمنے سامنے۔۔۔ اچانک۔۔۔ لڑائی جھگڑے میں ہمارے ہاتھوں مارا جائے تو کچھ اور بات ہے۔۔۔ لیکن اس طرح ٹھنڈے دل کے ساتھ کسی کو ترکیب اور تدبیر سے بلا کر ہلاک کرنے کا تصور مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔"

"جب کوئی عادی، پیشہ ور، فریبی اور انتہائی خطرناک مجرم ثابت ہو جائے تو قانون بھی نہایت ٹھنڈے دل سے، بہ قائمی ہوش و حواس اسے سزائے موت دیتا ہے۔ میری عدالت نے بھی بہت سوچ سمجھ کر اسے اس کے دو چار ساتھیوں سمیت موت کا مستحق قرار دے دیا ہے۔ اس کی وجہ سے نہ جانے کتنے انسان موت کے گھاٹ اترے ہیں، کتنے سسک سسک کر مرے ہیں کتنوں کی زندگی اجیرن ہوئی ہے، کتنوں کے گھربار اجڑے ہیں اور جب تک یہ زندہ رہے گا، ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ ستم ظریفی یہ ہو گی کہ وہ اپنے مختلف ہتھکنڈوں اور طاقت و دولت کی وجہ سے کبھی ان عدالتوں کی گرفت میں نہ آ سکے گا جو بظاہر انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے قائم کی گئی ہیں۔ تو پھر اس کا حل کیا ہو؟ کیا ایسے لوگوں کو بنی نوع انسان کی زندگی اجیرن کرنے کے لیے آزاد چھوڑے رکھا جائے "ٹھیک ہے۔۔۔ میں ایسے تمام لوگوں کی سرکوبی نہیں کر سکتا۔ لیکن جو میری گرفت میں آ رہا ہے اسے تو کچل سکتا ہوں۔"

"بس۔۔۔ بس۔" وہ ہاتھ اٹھا کر بولی "اتنی جذباتی تقریر کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں کون سا واپس جا رہی ہوں؟ اب تو آنکھیں بند کر کے تمہارے ساتھ چل پڑی ہوں۔ چاہے مروا دینا۔ چاہے اس بے مصرف سی زندگی کو کارآمد بنا دینا۔"

"یہ کام جو ہمیں درپیش ہے۔ اسے آسان مت سمجھنا۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ "اب ایسا بھی نہیں ہے کہ کوئی چوہا ہمارے چوہے دان میں پھنسنے کے لیے آ رہا ہے یوں سمجھو کہ ہم ایک ہاتھی پر پھندا ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ شکاری جب جنگل میں شکار پر نکلتا ہے تو اس کی اپنی زندگی بھی خطرے میں ہوتی ہے۔ تمام تر حفاظتی اقدامات کے باوجود۔"

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کھڑی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "ہم کچھ ایسے بالا دست بھی نہیں ہوں گے۔ مت بھولو کہ ہم دونوں نہتے ہیں اور ہمارے ساتھ جو اس مختصر سی، ویران اور متروک کالونی کو گھیرے ہوئے ہیں، وہ ہم سے کافی دور ہوں گے۔ انہیں عالم شیر اور ان کے محافظوں کی نظر میں آنے سے بچنا ہے تاکہ وہ بدک کر بھاگ نہ جائیں۔ وہ تو اس وقت آ کر عالم شیر وغیرہ پر چھاپہ ماریں گے جب وہ اور اس کے محافظ گرد و پیش سے بے پروا ہو جائیں گے اس دوران ہمیں خود ہی صورت حال کی مناسبت سے انہیں قابو میں کرنے کی کوشش کرنی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن یہ ہم دونوں کا نہتے ہونا میری سمجھ میں نہیں آیا۔" راحیلہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

"تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ عالم شیر کس طرح یہاں پہنچے گا۔ مجھے کافی حد تک اندازہ ہے۔" میں نے کہا "وہ آج کل بہت زیادہ محتاط ہے اپنے سائے سے بھی بدکتا ہے میرا خیال ہے اس سے پہلے اس کے محافظ یہاں پہنچیں گے وہ ہماری اور اس جگہ کی تلاشی لیں گے اس کے بعد وہ کسی طرح عالم شیر کو "لائن کلیئر" ہونے کی اطلاع دیں گے تب وہ یہاں آئے گا۔"

"عالم شیر نہ ہوا کسی چھوٹی موٹی سلطنت کا سربراہ ہو گیا۔ باقاعدہ ان کا سیکیورٹی کا نظام کام کرتا ہے۔" راحیلہ منہ بنا کر بولی۔

"اس میں کیا شک ہے کہ یہ لوگ چھوٹی چھوٹی سلطنتوں کے فرماں روا ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کہیں منشیات کے اسمگلرز کی ایمپائرز ہیں۔۔۔ کہیں جاگیرداریاں۔۔۔ کہیں قبیلے۔۔۔ کہیں گروہ بندیاں۔۔۔ نہ جانے کہاں، کہاں کس کس شکل میں لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں بنائے بیٹھے ہیں کوئی انہیں چھیڑ نہیں سکتا کوئی ان کی اصلاح نہیں کر سکتا۔ وہ جو چاہے کرتے پھریں، جو چاہے کہتے پھریں۔ ان کی پیشانی پر بل آ جائے تو شہر کے شہر گاؤں کے گاؤں زیر و زبر ہونے لگتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ یہ تو ہے۔" راحیلہ نے دھیرے سے سر ہلایا۔

"بس۔ اپنے اندازوں ہی کی بنا پر میں نے اپنے اور تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں رکھا۔" میں نے کہا "میں نہیں چاہتا کہ عالم شیر کو ذرا بھی شبہ ہو کہ یہاں اس کے لیے کوئی خطرہ ہے یا کسی قسم کا جال پھیلایا گیا ہے۔ وہ فوراً ہی بدک جائے گا۔ مجھے تو یہی غنیمت لگ رہا ہے کہ وہ اپنے بل سے باہر آنے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ کچھ عرصے سے وہ انڈر گراؤنڈ ہے اس کا تو کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ کہیں جھلک بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں تو کل تمہاری زبانی سن کر حیران ہوا تھا کہ وہ بینک سے نکلتے دیکھا گیا تھا۔ کوئی اشد ضرورت ہی آن پڑی ہو گی جو وہ خود بینک پہنچا تھا ورنہ بینکوں کے عہدیدار تو خود اس کے گھر حاضری دیتے رہتے ہیں۔"

"ویسے وہ چوکنا بہت نظر آ رہا تھا۔" راحیلہ بولی "اس کے محافظ بھی اس طرح چوکس تھے جیسے انہیں کسی بھی لمحے کسی طرف سے کوئی گولی آنے کا خطرہ ہو۔"

"ایسے لوگ مکمل بے فکر تو ظاہر ہے کبھی بھی نہیں رہتے۔ لیکن آج کل اس کے ساتھ کوئی خاص ہی چکر لگتا ہے۔" میں نے کہا "خوفزدہ تو وہ میری طرف سے بھی ہے لیکن شاید کچھ اور اندیشے بھی ہیں۔"

راحیلہ چائے کی طلب محسوس کر رہی تھی۔ اس بنگلے میں گیس نہیں تھی لیکن بڑا سلنڈر موجود تھا اور کچن خاصی صاف ستھری حالت میں موجود تھا۔ ضرورت کی چیزیں بھی تھیں۔ راحیلہ نے چند برتن اچھے طریقے سے مانجھے، دھوئے اور نہایت سلیقہ شعاری سے چائے تیار کرنے لگی۔

میں کچن میں ہی کھڑا تھا۔ اس دوران وہ بولی "میں نہایت ایمانداری سے بتاؤں۔۔۔ اس وقت میرے اعصاب پر تناؤ ہے۔ میں اس کی طرف سے دھیان ہٹانے کے لیے بھی اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

چائے پینے کے بعد میں نے کہا "جس جس چیز پر بھی ہماری انگلیوں کے نشانات رہ گئے ہوں انہیں صاف کر دو۔ یہاں ہماری موجودگی کی کوئی بھی نشانی باقی نہیں رہنا چاہیے۔ اگر دوبارہ کچھ چیزوں پر نشانات ثبت ہوئے تو وہ ہم جاتے ہوئے صاف کر جائیں گے۔"

ہم اس کام سے فارغ ہو کر بیٹھے ہی تھے کہ باہر کسی گاڑی کے رکنے کی خفیف سی آواز سنائی دی۔ میرے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے میں نے لپک کر باہر جا کر گیٹ کھولا۔ میری گاڑی باہر ہی کھڑی تھی۔ اس کے آگے ایک لمبی سی گاڑی ترچھی آن رکی تھی۔ دو آدمی اس کی آڑ میں یوں کھڑے ہو چکے تھے کہ ضرورت پڑنے پر فوراً پوزیشن لے سکیں۔ ایک کے ہاتھ میں کاربائن تھی اور دوسرے کے ہاتھ میں سیون ایم ایم۔ تیسرے کے کندھے سے ابھی ایک آٹو میٹک گن جھانک رہی تھی۔ اس نے گن اتار کر ہاتھوں میں نہیں تھامی تھی۔

وہ باریش اور دبلا پتلا تھا۔ اس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی اور آنکھوں میں عقاب کی سی چمک تھی۔ گاڑی کے پیچھے کھڑے ہوئے اس کے دونوں ساتھی بھاری بھرکم اور چوڑے چکلے تھے۔ دونوں ہی گھنی مونچھوں والے تھے اور دونوں ہی کی رنگت تپے ہوئے تانبے جیسی تھی۔ پتلا دبلا شخص مجھے ان دونوں سے زیادہ خطرناک دکھائی دیا۔

"وہی آگے آیا اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر درشت لہجے میں بولا۔ "مس ڈولی کدر اے؟"

"مس صاحبہ اندر ہیں۔" میں نے کافی مودبانہ لہجے میں جواب

دیا۔ آخر میں ایک ڈرائیور تھا۔

اس نے مجھ سے اجازت لینے یا مزید کچھ پوچھنے کی زحمت نہیں کی اور مجھے ایک طرف ہٹنے کا اشارہ کرتے ہوئے اندر آگیا اس کے دونوں ساتھی گنیں سنبھالے مستعد انداز میں گیٹ پر آن کھڑے ہوئے۔ وہ شکاریوں کی طرح چاروں طرف کا جائزہ لے رہے تھے۔

دبلے پتلے اور نوکیلی ناک والے نے اندر آتے ہی میری تلاشی لینا شروع کر دی۔ میں نے اپنے ردعمل کو فطری سا بنانے کی کوشش کرتے ہوئے قدرے حیرت کا اظہار کیا اور اپنے لہجے میں ہلکا سا احتجاج بھی سمونے کی کوشش کی "آپ کو عالم شیر صاحب نے بھیجا ہو گا.... مس صاحبہ نے مجھے بتایا ہے.... لیکن آپ میری تلاشی کیوں لے رہے ہیں؟"

"چپ رہو۔" وہ کھردرے لہجے میں بولا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ عالم شیر منہ اٹھا کر خود نہیں آیا تھا۔ اس نے پہلے اپنے آدمیوں کو تفصیلی جائزہ لینے بھیجا تھا۔ وہ خود غالباً راستے میں کہیں رک گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں اس کی نفسیات کو سمجھنے میں کامیاب رہا تھا۔

نوکیلی ناک والے نے میری تلاشی سے فارغ ہو کر بنگلے کا تنقیدی انداز میں جائزہ لیا اسی دوران راحیلہ بھی باہر آگئی جو اس وقت ڈولی تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون ہو تم؟" اس نے پیشانی پر بل ڈال کر خالص امریکی لہجے میں نوکیلی ناک والے سے پوچھا۔

"میم صاب! مجھے عالم شیر نے بھیجا ہے اور اس کا حکم ہے کہ میں آپ کی، آپ کے ڈرائیور کی... اور اس جگہ کی تلاشی لوں۔" نوکیلی ناک والا ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بولا۔ "باس نے کہا ہے.... میں معافی چاہتا ہوں.... لیکن یہ بہت ضروری ہے....."

"اوہ.... تو اب تمہارے باس کو ہماری بھی تلاشی کی ضرورت پڑ گئی۔" راحیلہ نے ہاتھ نچاتے ہوئے تھوڑے سے غصے کا اظہار کیا "وہ خود کہاں ہے؟ میں اس سے بات کرنا چاہتی ہوں۔"

"وہ تھوڑی دیر میں یہاں پہنچے گا۔" نوکیلی ناک والے نے سپاٹ لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر مزید کوئی بات کیے بغیر تیزی سے راحیلہ کی سرسری تلاشی لے ڈالی اس نے صرف جیبوں پر ہاتھ مار کر دیکھا۔

پھر وہ یکے بعد دیگرے کمرے میں گھس کر ہر چیز کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے الماریاں کھول کر دیکھیں کرسیوں کے نیچے جھانکا۔ صوفوں کو ٹٹولا۔ باتھ رومز کو کھنگالا۔ اس اکیلے آدمی نے نہایت ماہرانہ انداز میں بے حد پھرتی سے چند منٹ میں پورے بنگلے کو کھنگال ڈالا۔ میں قدرے تشویش زدہ لیکن مودبانہ انداز میں ہاتھ باندھے اس کے پیچھے تھا۔

میں دل ہی دل میں یہ اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ اپنے کام میں ماہر تھا۔ وہ فالتو بات کرنے یا اپنی کارروائیوں کے لیے کسی اجازت لینے کا بھی قائل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ راحیلہ نے اس دوران ہلکا سا احتجاج جاری رکھا لیکن اب وہ گویا ہماری طرف متوجہ ہی نہیں تھا۔ اس کے دونوں ساتھی اب پورچ میں آن کھڑے ہوئے تھے وہ بھی ان کے پاس واپس آگیا۔

اس نے ان دونوں سے نیچی آواز میں مختصر سی کچھ بات کی۔ وہ گنیں بغل میں دبا کر تیزی سے باہر چلے گئے چند لمحے بعد میں نے گاڑی اسٹارٹ ہونے اور اس کے تیزی سے روانہ ہونے کی آواز سنی۔ نوکیلی ناک والے کے لئے اب میں اور ڈولی گویا قطعی غیر اہم چیزیں ہو گئے تھے۔ وہ ہماری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کی عقابی نظریں دور افق پر نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ میں نیچے پورچ میں کھڑا تھا اور راحیلہ اوپر برآمدے میں۔ نوکیلی ناک والا گیٹ کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔

آخر راحیلہ نے ہی اس سے پوچھا۔ "عالم شیر کب آئے گا۔"

"بس.... وہ آرہا ہے۔" نوکیلی ناک والے نے بے توجہی سے جواب دیا۔

"میں اندر جا رہی ہوں۔" راحیلہ بولی پھر دروازے پر رک کر وہ مڑتے ہوئے بولی "ڈرائیور! میرے ساتھ آؤ۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔"

میں مؤدبانہ انداز میں اس کے پیچھے چل دیا۔ نوکیلی ناک والے نے تب بھی مڑ کر ہماری طرف نہیں دیکھا۔ وہ گویا ہماری طرف سے کچھ زیادہ ہی مطمئن ہو چکا تھا۔ اسے ہمارے غیر مسلح اور بے ضرر ہونے کا یقین آچکا تھا۔

بیڈ روم میں پہنچ کر راحیلہ میری طرف مڑتے ہوئے نیچی آواز میں بولی "کھیل شروع ہو گیا ہے۔"

میں نے اشارے سے اسے منع کیا کہ وہ تنہائی میں بھی اردو میں بات نہ کرے۔ میری یہ احتیاط کارآمد ہی رہی کیونکہ دوسرے ہی لمحے کھڑکی کے شیشے پر عقاب نما ایک چہرہ نمودار ہوا۔ یہ وہی نوکیلی ناک والے کا چہرہ تھا جو کھڑکی کے شیشے کی دھندلاہٹ کی وجہ سے کچھ بگڑا ہوا سا نظر آرہا تھا۔

وہ مسکراتا ہوا کھڑکی کے قریب سے گزر رہا تھا اور ہمیں اس کی آہٹ بھی سنائی نہیں دی تھی۔ وہ گھر میں گشت کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کچھ دور جا چکا تو میں نے سرگوشی میں پوچھا "تم کچھ کہنا چاہتی ہو۔"

"ہاں۔ محافظوں کی تعداد تو اب ہمیں معلوم ہو گئی ہے۔ صرف تین آدمی ہیں۔ عالم شیر سمیت چار ہوں گے۔" وہ سرگوشی میں بولی۔ "سب سے پہلے ہمیں اس کمرے میں عالم شیر کو ہی قابو کرنے کی کوشش کرنا ہو گی نا؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا "اگر وہ مجھے کمرے سے نکال بھی دے تب بھی تم کسی بہانے سے مجھے بلا لینا۔ مجھے امید ہے کہ تم

اکیلی اس کے لیے کافی ہو گی لیکن میں رسک لینا نہیں چاہتا۔ محافظوں کی نظر بچتے ہی ہمیں یہ کام کر گزرنا ہے۔ اس کے بعد محافظوں سے نمٹ لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" راحیلہ سرگوشی میں بولی اس دوران نوکیلی ناک والا بیڈ روم کی دوسری کھڑکی کے قریب سے گزرا اور راحیلہ بہ آواز بلند تحکمانہ انداز میں بولی "ڈرائیور! مجھے ٹھنڈا پانی پلاؤ۔"

"یس میڈم!" میں نے بہ آواز بلند جواب دیا۔

نوکیلی ناک والا کچھ آگے جا چکا تو میں نے سرگوشی میں پوچھا۔

"کیا واقعی پانی پلاؤں؟"

"ہاں.... ڈرائیور! پلا ہی دو۔" وہ شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولی "موقعے سے فائدہ اٹھا کر تم سے کچھ خدمت ہی کرا ہی لی جائے۔"

میں نے کچن سے پانی کا گلاس طشتری میں لا کر اسے پیش کیا "لیجیے میڈم!" میں نے ادب سے جھکتے ہوئے کہا۔

وہ شاہانہ انداز میں بیڈ پر جا بیٹھی اور پانی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ اپنے اعصاب کو پرسکون رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ بظاہر وہ شرارت سے مسکرا رہی تھی لیکن درحقیقت اس کا ذہن الجھا ہوا تھا۔

میں نے گلاس اور طشتری واپس کچن میں لے جا کر رکھی اور انہیں اچھی طرح صاف کر دیا۔ میں کمرے میں واپس آیا ہی تھا کہ باہر ایک بار پھر گاڑی رکنے کی آواز سنائی دی۔ میں جلدی سے ایک کونے میں مودب ہو کر کھڑا ہو گیا جیسے راحیلہ کی کوئی بات سن رہا تھا۔ وہ اسی شاہانہ انداز میں بیڈ پر بیٹھی تھی۔

باہر گیٹ کھلنے کی ہلکی سی آواز، پھر ان لوگوں کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ چند لمحے بعد عالم شیر اپنے بھاری بھرکم جثے کے ساتھ آندھی طوفان کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔

"ڈولی.... ڈولی .... میری جان!" وہ دونوں بازو پھیلائے تقریباً چلاتا ہوا چلا آرہا تھا۔ راحیلہ اضطراری طور پر بیڈ سے اتر کر کھڑی ہو گئی تھی۔

عالم شیر بے تابی سے اس کی طرف بڑھا۔ وہ شاید اسے گلے لگانے کی فکر میں تھا۔ اسی لمحے راحیلہ نے اپنی تمام تر مصنوعی "امریکیت" کو بالائے طاق رکھ دیا اور جھکائی دے کر اس کے معانقے کی کوشش سے بچتے ہوئے کہا۔ "یہ کیا کر رہے ہو الیم شیر! کچھ تو خیال کرو۔ ڈرائیور کمرے میں موجود ہے۔"

تب عالم شیر کو یکدم بریک لگی اور اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "یہ ڈرائیور تمہارے بیڈ روم میں کیا کر رہا ہے؟"

"میں اس سے بات کر رہی تھی۔" راحیلہ بولی "تمہارے آدمیوں کی آمد کے انداز نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ میں اس سے بات کر کے ذرا اپنا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کر رہی تھی۔"

"اوہو.... ہو.... ہو...." عالم شیر نے ایک بلند و بے ہنگم قہقہہ لگایا۔ "تمہیں میرے آدمیوں کے انداز سے پریشان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ ذرا کم پڑھے لکھے لوگ ہیں۔" اس نے کچھ اس انداز سے کہا گویا وہ خود آکسفورڈ کا پڑھا ہوا تھا۔ "میں نے اسی لئے ان سے یہ بھی کہا تھا کہ میری طرف سے معافی مانگ لینا۔ دراصل میں آج کل بہت زیادہ احتیاط کر رہا ہوں۔ حالات بڑے خراب ہیں۔ لوگ مجھے سیدھا سادا دیہاتی سمجھ کر چکر دینے کی فکر میں ہیں۔ بہرحال.... جانِ من! تمہیں دیکھ کر میں سب کچھ بھول گیا ہوں۔ آج زندگی کی سب سے بڑی حسرت پوری ہو گئی ہے۔ میں تو اب مایوس ہو چکا تھا کہ شاید زندگی میں کبھی تم سے ملاقات نہیں ہو گی..."

اس کی بھاری گونجیلی آواز نے کمرے کی فضا کو مرتعش کر دیا تھا وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ ایک ٹک راحیلہ کو گھورتے ہوئے اس کی باچھیں پھیلیں۔ آنکھوں میں پُرہوس چمک ابھری اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا "ویسے تم میرے اندازوں سے زیادہ خوبصورت نکلی ہو۔ شاید یہ میرے صبر کا صلہ ہے۔ تم خود ہی دیکھو نا.... صرف فون پر تم سے واقفیت تھی اور میں صرف اس واقفیت کی بنیاد پر تم پر دل و جان سے عاشق چلا آرہا ہوں ایسے عاشق تمہیں صرف پاکستان میں مل سکتے ہیں، کہیں اور نہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

"ہاں۔ تم غلط کہہ رہے ہو۔" راحیلہ بولی "میں بھی تو صرف فون پر ہی تمہاری باتوں سے متاثر ہو کر تمہارے عشق کا جواب عشق سے دیتی آرہی ہوں۔ تم نے صرف سرسری طور پر مجھے اپنی شکل صورت کے بارے میں بتایا تھا۔

"سرسری تو نہیں۔ خاصی تفصیل سے بتایا تھا۔ لفظوں میں پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی تھی۔" عالم شیر اسے گھورتے ہوئے بولا مجھے یقین تھا کہ راحیلہ اس کی نظروں کی وجہ سے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس کر رہی ہو گی۔

وہ بات سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئی بولی "تمہارے خیال میں وہ تفصیل تھی لیکن مجھے تو بالکل ادھوری محسوس ہوئی تھی اصل آرزو تو تم سے ملاقات کی تھی۔ خدا کا شکر ہے آج یہ خواہش پوری ہو گئی۔" میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ کہتے ہوئے راحیلہ کے دل پر کیا گزر رہی ہو گی۔ پھر راحیلہ نے کاؤچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھ جاؤ نا... کھڑے کیوں ہو۔"

لیکن عالم شیر بیٹھنے کے بجائے یکدم گھوم کر میرے قریب آگیا میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے وہ کھردرے لہجے میں بولا "تم جمال بیگ کے ملازم ہو؟"

"جی... جناب۔" میں نے سر جھکاتے ہوئے جواب دیا۔

"اتنا زیادہ مودب ہو کر سر جھکانے کی ضرورت نہیں۔ ادھر دیکھو میری طرف۔" اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ آنکھوں کی مدد سے

مجھے پہچان نہ لے۔ آخر وہ میرا پرانا شناسا تھا۔ میک اَپ مین انوار نے میرے پورے چہرے کے ساتھ ساتھ میری آنکھوں کی ساخت اور ان کا تاثر بھی کچھ تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی۔ آواز بھی میں نے بدلی ہوئی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو اطمینان دلایا کہ عالم شیر مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ میں نے سر اٹھایا اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ کمبخت کی آنکھیں بہت خوبصورت تھیں لیکن ان خوبصورت آنکھوں کی گہرائیوں میں بدصورتیاں رقص کرتی تھیں۔ تاہم اس وقت وہ یکایک بہت ہی سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

"کب سے ملازم ہوئے ہو اس کے پاس؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"تقریباً دو ماہ ہوئے ہیں۔" میں نے بلا تامل جواب دیا۔

"کس کی گاڑی چلاتے ہو؟" وہ گویا تفتیش کر رہا تھا۔

"میں تو جی... اصل میں بیگ صاحب کے دفتر کی ایک وین چلاتا ہوں۔ تین چار ملازموں کو گھر سے لانے لے جانے کے لیے۔"... میں نے جواب دیا۔ جمال بیگ کا بجلی کے آلات تیار کرنے کا ایک بہت بڑا کارخانہ اور اس کا دفتر بھی تھا۔

"بہت خوب۔" عالم شیر نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ایک بھاری کو نجیلی آواز میں پکارا "ہیبت خان.... شیریں خان...."

اس کے جواب میں نہ تو کسی نے کچھ کہا اور نہ ہی کوئی کمرے میں آیا بلکہ ایک زوردار آواز کے ساتھ دروازہ بند ہو گیا اور اسی لمحے بیک وقت کمرے کے دونوں طرف کی کھڑکیوں کے شیشے چھناکے سے ٹوٹ گئے۔ شیشوں کے علاوہ کھڑکیوں میں گرل بھی لگی ہوئی تھی۔ دونوں کھڑکیوں کی گرل سے گنوں کی نالیں جھانکنے لگیں ایک طرف نوکیلی ناک والے کا چہرہ دکھائی دیا اور دوسری طرف گھنی مونچھوں والے کا۔

اس کے ساتھ ہی عالم شیر نے بجلی کی سی تیزی سے ہاتھ بڑھا کر میری داڑھی کھینچ لی۔ داڑھی بہت عمدہ میٹریل سے' بہت محنت سے تیار کی گئی تھی لیکن مصنوعی چیز بہرحال مصنوعی ہوتی ہے۔ داڑھی کا بیشتر حصہ اس کے ہاتھ میں چلا گیا۔ چند لٹیں میرے چہرے پر لگی رہ گئیں۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے ٹوپی میرے سر سے کھینچ لی۔

سچی بات یہ تھی کہ اس کا یہ حملہ میرے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ آخری لمحے تک مجھے یہی گمان تھا کہ میری تدبیر کامیاب جا رہی ہے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ سب کچھ الٹ کر میرے منہ پر دے مارے گا۔ وہ بیڈ پر جا گرا تب مجھے احساس ہوا کہ وہ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوا جا رہا تھا۔

ایک ثانیے کے لیے میں نے سوچا کہ اسی بیڈ پر اس کا کام تمام کر دیا جائے لیکن کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی گنوں کی نالیوں نے مجھے اس پر عمل درآمد سے باز رکھا۔ ایک نال میری طرف اٹھی ہوئی اور ایک راحیلہ کی طرف۔ ٹوٹے ہوئے شیشوں کے عقب سے ہیبت خان اور شیریں خان کی نظریں ہم پر جمی ہوئی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں خون کی پیاس تھی۔ دروازہ باہر سے بند کیا جا چکا تھا۔ ہم ایک چوہے دان میں پھنس چکے تھے لیکن قدرے اطمینان کی بات صرف یہ تھی کہ عالم شیر بھی اس چوہے دان میں ہمارے ساتھ تھا۔

میری نظر اس پر جمی ہوئی تھی۔ آخر وہ بیڈ پر اٹھ بیٹھا۔ میں ساکت کھڑا تھا اور کوشش کر رہا تھا کہ میرا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری رہے۔ عالم شیر کا چہرہ بتا رہا تھا کہ شاید وہ زندگی میں کبھی بھی صورت حال سے اتنا محظوظ نہیں ہوا تھا جتنا اس وقت ہو رہا تھا۔

"ڈیئر افضل چوہدری!" وہ چہکتے ہوئے لہجے میں بولا "اور تم مجھے اتنا اُلو کا پٹھا کیوں سمجھ رہے ہو؟ تمہیں معلوم ہے میرا باپ گدھے پر مٹی ڈھوتا تھا۔ میں اس باپ کی اولاد ہوں جس بے چارے کو میرے جوان ہونے تک کبھی نیا جوتا نصیب نہیں ہوا۔ کبھی اس پر ایسا دور بھی آیا کہ وہ پیروں پر گھاس لپیٹ کر سنگلاخ پہاڑوں پر سفر کرتا رہا۔ اگر میں بے وقوف ہوتا تو کیا ایسے باپ کی اولاد ہو کر آج اس مقام پر ہوتا۔" اس کے لہجے میں فخر تھا۔

"اوہ .... اس کا مطلب ہے تم اولاد تو شریف آدمی کی ہو۔" میں نے اپنی خوش مزاجی کو آواز دینے کی کوشش کی۔ گو کہ اس وقت میرا سر گھوم رہا تھا۔

"بے شک۔ لیکن تم یہ دیکھو کہ میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہوں۔" وہ اس میں فخر کا پہلو تلاش کر رہا تھا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میری اپنی کہانی بھی اس سے کچھ ملتی جلتی تھی لیکن بہت جلد اس کی اور میری راہیں جدا ہو گئی تھیں۔ میرے اور اس کے کردار اور نظریات میں زمین آسمان کا فرق تھا اس کی زندگی میں جائز ناجائز کا کوئی تصور نہیں تھا۔ وہ دولت کی ہوس' سفاکی' ظلم و تشدد' کینہ پروری' طاقت کا نشہ اور ایسی دوسری بہت سی خرابیوں کا عمل دخل دن بہ دن اپنی زندگی میں بڑھاتا جا رہا تھا جب کہ میں نے اس گرداب سے نکلنے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔ اس کے علاوہ اسے اپنے دولت مند بن جانے پر فخر تھا۔ میری نظر میں یہ کوئی فخر کی بات نہیں تھی اور نہ ہی اس میں انسان کا اپنا کوئی کمال تھا۔

میری سمجھ میں اب یہ بات آگئی تھی کہ دوسری بہت سی چیزوں کی طرح دولت بھی انسان کے مقدر میں لکھی ہوتی ہے۔ جتنی ملنی ہوتی ہے' ہر حال میں مل جاتی ہے۔ البتہ یہ اب انسان کا اپنا اختیار ہے کہ وہ اس کے لیے جائز ذرائع اختیار کرتا ہے یا ناجائز۔ دولت مقدر میں نہ ہو تو چاہے آپ سر پٹخ کر مر جائیں' نہیں ملتی خواہ ناجائز ذرائع بھی اختیار کر لیں۔ آپ پہلے دن ہی پکڑے جائیں گے۔ اللہ کے ہاں بھی انسان شاید اسی لیے پکڑا جاتا ہے کہ جب اس نے جائز اور ناجائز دونوں راستے انسان کے سامنے رکھے تھے اور عقل

شعور کے ساتھ اسے انتخاب کا حق دیا تھا تو اس نے ناجائز ہی راستے کا انتخاب کیوں کیا۔

عالم شیر کہہ رہا تھا۔ "جال تم نے اچھا بچھایا تھا۔ میری اچھی کمزوری پکڑی تھی۔ لیکن بس ایک نکتے سے مار کھا گئے... یا یوں سمجھو کہ قسمت نے تم سے تھوڑی سی بے وفائی کر دی..." وہ بھی قسمت کی بات کر رہا تھا۔ ورنہ میں تو سمجھا تھا شاید وہ قسمت پر یقین ہی نہیں رکھتا ہو گا۔ قسمت کا مذاق اڑاتا ہو گا۔ جس طرح عموماً بہت زیادہ دولت کمانے والے لوگ قسمت کو گھاس ڈالنا چھوڑ دیتے ہیں۔

مجھے حیرت تھی کہ اس معاملے میں قسمت نے میرا کیوں کر ساتھ نہیں دیا تھا! میں نے تو محسوس کیا تھا کہ لڑکپن کا دور گزرنے کے بعد سے قسمت ہمیشہ مجھ پر بہت مہربان رہی تھی۔ ہر ہر قدم پر قسمت نے میرا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ اب تو میں اس پر تکیہ کرنے لگا تھا۔ اب اگر کسی مرحلے پر قسمت نامہربانی کا سلوک کر جاتی تھی تو مجھے حیرت کا جھٹکا لگتا تھا۔

"کیا ہوا؟ کہاں گڑبڑ ہوئی میرے منصوبے میں؟" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"شاید یہ محض اتفاق تھا کہ پرسوں ہی مجھے اپنے ایک ذریعے سے خبر ملی کہ ڈولی ترکی کی ایک جیل میں تھی اور اسی ہفتے کے دوران اس نے جیل ہی میں خودکشی کر لی..." عالم شیر نے بتایا ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر خباثت کچھ کم ہوئی اور وہ حقیقتاً قدرے افسردہ لہجے میں بولا "یہ ایک اداس کر دینے والی خبر تھی۔ لیکن قسمت کے کھیل نرالے ہیں۔ کسی کی جان سے جانے کی خبر' کسی کی جان بچ جانے کا سبب بن جاتی ہے۔ اگر مجھے یہ خبر نہ ملی ہوتی تو آج میں آنکھیں بند کر کے تمہارے جال میں پھنسنے کے لیے چلا آیا ہوتا۔"

"تو اس میں تمہاری ذہانت کا کیا کمال ہوا؟" میں نے قدرے حیرت کا اظہار کیا "تم اپنے ذہین ہونے کا ڈھنڈورا کیوں پیٹنے لگے تھے؟ یہ تو محض ایک اتفاق ہوا نا کہ ایک تازہ ترین خبر تم تک پہنچ گئی' مجھ تک نہیں پہنچی۔"

"میری ذہانت یہ ہے کہ میں نے تمہیں آخری لمحے تک احساس نہیں ہونے دیا کہ میں بے وقوف نہیں بن رہا۔" وہ شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔

"لیکن اس سے فرق کیا پڑا؟" میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے کہا "جس طرح تمہاری آمد کی توقع کر رہا تھا تم اسی طرح آئے ہو۔ اسی وجہ سے ہمیں نہتے رہ کر تمہارا استقبال کرنا تھا اور ہم نہتے ہی ہیں۔"

"فرق صرف یہ پڑا ہے...." اس نے دونوں کھڑکیوں سے جھانکتی ہوئی نالوں کی طرف اشارہ کیا۔ "ورنہ میرے محافظ صرف مکان کے گرد ہی پہرہ دے رہے ہوتے۔ اس کمرے میں خلوت کا سماں ہوتا۔ میں اس دلکش حسینہ سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہوتا۔ تمہیں اس کمرے سے نکال کر۔"

پھر وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا "تم نے اس دلربا سے کچھ دیر میری بات چیت کرانے کا پروگرام بھی رکھا تھا یا نہیں؟ کیا میرے آتے ہی بدمعاشی شروع کر دینے کا پروگرام تھا؟"

میں نے دل ہی دل میں کہا "اُلو کے پٹھے! میٹھی میٹھی باتیں کرنے کی حسرت ہی لیے تم اب تک اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوتے۔ لیکن میں نے اسے کوئی جواب دینے کے بجائے کہا "کیا تمہیں ڈولی کا فون ملتے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ میرا چلایا ہوا چکر ہے؟"

"نہیں۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "تم سے میں اس قسم کی حرکت کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ تمہارے پاس بہترین آدمی ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اگر تم میری جان لینے کا فیصلہ کرو گے تو اپنے آدمیوں کو براہ راست مجھ پر چڑھائی کر دینے کا حکم دو گے۔"

"میں نے ایسا سوچا تھا...." میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن اس میں کامیابی کے امکانات کم تھے۔"

"تمہارا اندازہ درست تھا۔" اس نے سنجیدگی سے میری تائید کی "ہوتا صرف یہ کہ کچھ آدمی تمہارے مرتے اور کچھ میرے۔ تمہارے شاید کم مرتے' میرے زیادہ مارے جاتے لیکن مجھے مارنا مشکل تھا۔ میں آجکل قلعہ بند ہوں۔ میرے گرد بہت زیادہ حفاظتی انتظامات ہیں۔"

"ہاں۔ جسے تم قلعہ بند ہونا کہتے ہو اسے میں بل میں گھسنا کہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "تمہیں بل سے نکالنا میرے لیے مسئلہ بن رہا تھا۔ تمہارا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس روز سڑک پر مجھ سے تصادم کے بعد تم کہاں غائب ہو گئے ہو۔ اس لیے مجھے بھولی بسری ڈولی کا سہارا لینا پڑا۔"

"تمہارا مطلب ہے اس جعلی ڈولی کا....؟" اس نے ایک بار پھر شیطانی انداز میں مسکراتے ہوئے راحیلہ کی طرف دیکھا "چیز اچھی ہے... میک اپ کے بغیر بھی غضب کی ہو گی۔ تمہارا بہت شکریہ۔ تمہاری وجہ سے مدت بعد ایک شاندار چیز پر ہاتھ ڈالنے کا موقع ملا ہے۔ اسے ہم اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"اور مجھے!" میں نے دریافت کیا۔

"تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ یہاں سے چند فرلانگ کے فاصلے پر نہر بہتی ہے۔ تمہاری لاش بہانے کے لیے وہ نہایت مناسب رہے گی۔" وہ اطمینان سے بولا۔ میں نے ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ بت بنی کھڑی تھی تاہم اس کے چہرے سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ خوفزدہ ہے یا نہیں۔

عالم شیر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "جب تمہاری اس نقلی ڈولی کا فون ملا تو ایک لمحے کے لیے میں چکرا گیا۔ میرا دل چاہا میں اسے سچ مچ ڈولی ہی کا فون سمجھ لوں یہ میری خوش قسمتی اور ایک

حسین اتفاق بھی ہو سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ڈولی کے بارے میں خبر مجھے بہت مستند ذریعے سے ملی تھی۔ ایک ایسے شخص نے خبر دی تھی جو اس کے ساتھ ایک ہی جیل میں رہ چکا تھا۔ اس نے مجھے ترکی کے ایک اخبار کی کٹنگ بھی دی تھی جس میں صرف تین سطروں میں ڈولی کی خودکشی کی خبر چھپی تھی۔"

"خیر.... یہ سب باتیں اپنی جگہ ہیں عالم شیر۔" میں نے گہری سانس لے کر بدلے بدلے سے لہجے میں کہا "لیکن اب بالکل سنجیدگی سے ایک بات سن لو۔ ہم اس معاملے کو یہیں ختم کر دیتے ہیں تمہیں شاید علم نہیں ہے کہ تم اس وقت چاروں طرف سے نرغے میں ہو یہ مکان میرے آدمیوں کے گھیرے میں ہے جو تمہیں یا تمہارے آدمیوں کو فی الحال نظر نہیں آسکے ہوں گے۔ لیکن تم یا تمہارا کوئی آدمی اب یہاں سے زندہ نہیں جا سکتا۔ صرف میں ہی تمہیں یہاں سے زندہ جانے کا "پروانۂ راہداری" دے سکتا ہوں ورنہ یہی مکان تمہاری آخری آرام گاہ بن جائے گا۔"

وہ ایک بار پھر زور و شور سے ہنسا جیسے اس بات سے بہت محظوظ ہوا ہو پھر گویا سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "جب تمہاری اس جعلی ڈولی کا فون ملا اور میں حیرت کے جھٹکے سے سنبھل چکا تو میرا ذہن ایک اور طرف گیا تھا لیکن پھر میں نے سوچا "نہیں.... ایسا صاف ستھرا مذاق اپنا یار افضل چوہدری ہی کر سکتا ہے۔ فون سے فارغ ہونے کے بعد میں نے بھی اپنی تھوڑی سی جاسوسی لڑائی اور یقین ہو گیا کہ یہ کارروائی تمہارے علاوہ کسی کی نہیں ہو سکتی..."

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بے پروائی سے انگڑائی لینے کے بعد بولا "چنانچہ مجھے پہلے ہی اندازہ تھا کہ جس چوہے دان میں تم مجھے بلا رہے ہو اس کے اردگرد ضرور تمہارے آدمی چھپے ہوں گے۔ اب تم بھی اپنی یہ خوش فہمی دور کر لو کہ میرے ساتھ تین ہی آدمی ہیں جو پہلے یہاں پہنچے ہیں۔ اچھا ہوا کہ جب میں یہاں پہنچا تو تم باہر نہیں کھڑے تھے۔ تم نہیں دیکھ سکے کہ میں تاریک شیشوں والی ویگن میں یہاں پہنچا ہوں اور میرے ساتھ میرے دس بہترین آدمی بھی آئے ہیں..."

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے میرے چہرے کا گہری نظر سے جائزہ لیا گویا دیکھنا چاہتا ہو میرے تاثرات میں تبدیلی آئی یا نہیں۔ میں نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں اپنی کوشش میں کامیاب تھا۔

عالم شیر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ میرے ان آدمیوں میں سے ہیں جو رینجرز، کوسٹ گارڈ اور اینٹی اسمگلنگ اسکواڈ وغیرہ سے مقابلے کرنے اور ان کے گھیرے توڑ کر نکل جانے میں بے پناہ ماہر ہیں وہ اس وقت اس مکان کو گھیرے میں لے کر پوزیشنیں سنبھالے ہوئے ہیں جب تک ادھر ادھر چھپے ہوئے تمہارے آدمیوں کو ان کی موجودگی کا احساس ہوا ہوگا تب تک وہ پوزیشن لے چکے ہوں گے مجھے یقین ہے کہ اس وقت تمہارے آدمی سخت الجھن میں ہوں گے کیونکہ تمہارے اور ان کے اندازوں سے زیادہ آدمیوں نے اس مکان کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ تم اس وقت گویا مگرمچھ کے منہ میں ہو۔ اگر تمہارے آدمی اچانک حملہ آور ہوتے ہیں تب بھی تمہاری موت تو یقینی ہے مجھے معلوم ہے تمہارے آدمی تعداد میں زیادہ نہیں ہوں گے اور وہ اگر حملہ کرنے کے لیے بڑھیں گے تو انہیں کھلے میں آنا پڑے گا اس طرح وہ بالکل ہی مارے جائیں گے کیونکہ میرے آدمی عمدہ طریقے سے پوزیشن لیے ہوئے ہیں اب صورت حال بالکل الٹ ہے چوہے دان میں میں نہیں، تم پھنسے ہوئے ہو تم خوش فہمی میں مارے گئے ہو۔"

میں خوش فہمی میں نہیں، غلط فہمی میں مارا گیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار مجھے عالم شیر کچھ عقلمند، کچھ چالاک سا نظر آیا تھا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا لیکن فوری طور پر مجھے اس پھندے سے نکلنے کا کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ میرے اندازے غلط ہو گئے تھے۔ میں نے تکیہ اسی بات پر کیا تھا کہ عالم شیر زیادہ سے زیادہ دو تین آدمی لے کر آئے گا۔ ان سے اور عالم شیر سے میں اور راحیلہ آسانی سے نمٹ لیں گے۔ اپنے چار آدمی تو میں نے محض احتیاطاً مکان سے کافی دور، چاروں سمتوں میں تعینات کیے تھے تاکہ عالم شیر یا اس کے آدمیوں میں سے کوئی بچ کر نہ نکلنے پائے۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میری تدبیر غلط ہو جائے گی اور عالم شیر اپنے ساتھ گوریلوں کا ایک پورا دستہ لے کر آجائے گا۔

اب اگر اندر کسی طرح ہم اپنی جانیں بچا کر کچھ کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے تب بھی مسئلہ ان دس آدمیوں کا تھا جو مکان کے گرد گھیرا ڈالے اور مکان ہی کی آڑ لیے بیٹھے تھے۔ اب زیادہ دارومدار اس بات پر تھا کہ ٹونی، سردار شیخ اور حنیف وغیرہ کس ایسے لمحے میں کارروائی شروع کریں جب ہماری جانوں کو زیادہ خطرہ لاحق نہ ہو۔ اگر ہماری جانوں کے خوف سے وہ زیادہ دیر تک خاموشی اختیار کیے بیٹھے رہتے تب بھی ہمارے حق میں اچھا نہ ہوتا۔

عالم شیر راحیلہ کے ذرا قریب چلا گیا دل تو شاید اس کا یہی چاہ رہا تھا کہ فوری طور پر راحیلہ پر ٹوٹ پڑے مگر محض احتیاطاً اپنے آپ کو باز رکھے ہوئے تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے وہ بولا "یہ لڑکی مجھے ہر حال میں زندہ چاہیے..." یہ ہدایت شاید ہیبت خان اور رشید کو سنانے کے لیے تھی گو کہ اس نے ان کو مخاطب نہیں کیا تھا۔

پھر میری طرف اشارہ کر کے بولا "تمہارے ذمے بہت سا قرض چڑھ گیا جو تم اب صرف جان دے کر ہی ادا کر سکتے ہو۔ لہٰذا تمہاری چھٹی....!" اس نے چٹکی بجائی۔

میں اس وقت بڑی شدت سے اپنے خیالات کو ایک ہی نقطے پر مرکوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کاش اس وقت ٹونی حرکت میں آجائے وہ کچھ تو کرے، کچھ تو ہلچل شروع ہو۔ سکوت کسی طرح ٹوٹے جس میں ہیبت خان اور شیریں خان کی نظریں مجھ پر سے اور راحیلہ پر سے ایک ثانیے کے لئے بھی نہیں ہٹ رہی تھیں۔ صرف ایک سیکنڈ کی لیے ان کی توجہ ہٹ جاتی تو وہ سیکنڈ میرے اور راحیلہ کے لیے بہت قیمتی ثابت ہو سکتا تھا۔

میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے خیالات کی شدت، میری سوچ کا ارتکاز کوئی رنگ لے آئے۔ کوئی ٹیلی پیتھی جیسی بات ہو جائے۔ میری سوچ کی لہریں کسی طرح ٹونی کے ذہن سے جا ٹکرائیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ٹونی اس وقت کیا سوچ رہا تھا؟ کیا حکمتِ عملی ترتیب دے رہا تھا۔ اس نے یقیناً یہ تو دیکھ لیا ہوگا کہ مسلح آدمی ہماری توقعات سے زیادہ آگئے تھے اور انہوں نے مکان کو گھیر لیا تھا۔ مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے کس کس چیز کی آڑ میں پوزیشن سنبھالی تھی اور وہ کس حد تک میرے آدمیوں کے ٹارگٹ پر تھے۔

بہرحال میری سوچ کی شدت رنگ لے آئی یا پھر شاید یہ محض اتفاق تھا کہ اسی لمحے ایک ساتھ کئی گنیں گرج اٹھیں۔ لیکن یہ گنیں مکان کے بالکل قریب ہی گرجی تھیں وہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا مجھے اس کا بڑی شدت سے انتظار تھا۔ لیکن اس سے فائدہ حقیقتاً راحیلہ نے اٹھایا۔

ایک طویل سکوت کے بعد اچانک دھماکے ہوں تو ان کا ایک فوری اثر ضرور ہوتا ہے خواہ وہ دھماکے متوقع ہی کیوں نہ ہو رہے ہوں اور خواہ انہیں سننے والے کتنے ہی ماہر لڑاکے کیوں نہ ہوں اس نفسیاتی نکتے سے یقیناً راحیلہ بھی واقف تھی اور اسے بھی ضرور ایسے ہی لمحے کا شدت سے انتظار تھا۔ ہماری خوش قسمتی یہ تھی... کہ اس وقت عالم شیر راحیلہ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا وہ جوش جذبات کو دباتے دباتے بھی اس کے خاصا قریب چلا گیا تھا۔ راحیلہ کی ٹانگ جس تیزی سے حرکت میں آئی اسے میں بھی نہیں دیکھ سکا۔ مجھے آواز سے اندازہ ہوا تھا کہ لات اس کی کنپٹی پر پڑی تھی۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح بیڈ پر گرا، ادھر راحیلہ نے باتھ روم کی طرف چھلانگ لگائی۔ غنیمت یہ تھا کہ اس وقت دروازہ پوری طرح بند نہیں تھا۔ باتھ روم اس کے قریب تھا۔ اس نے نہایت صحیح حکمت عملی اختیار کی تھی۔ دروازے سے ٹکراتی ہوئی وہ اندر جا گری اور اسے گویا مورچہ میسر آگیا۔

دروازہ اس نے لات مار کر بند کر لیا تھا۔ حالانکہ عالم شیر اپنے آدمیوں کے گوش گزار کر چکا تھا کہ راحیلہ کو وہ زندہ لے جانا چاہتا ہے لیکن عالم شیر پر راحیلہ کے وار اور اس کے یوں بیڈ پر جا گرنے کے باعث انہوں نے گویا اس ہدایت کو بالائے طاق رکھ دیا۔ گولیوں نے راحیلہ کا تعاقب کیا۔

وہ گولیاں غالباً باتھ روم کے دروازے سے گزر گئی تھیں۔ میں صحیح طور پر دیکھ نہیں سکا لیکن مجھے امید تھی کہ اس وقت تک راحیلہ دیوار کی آڑ لے چکی ہوگی۔ باتھ روم بہت اچھا مورچہ تھا۔ وہاں ٹب بھی تھا گولیوں کی بوچھاڑ کو روکنے کے لیے وہ بھی بہت اچھا ثابت ہو سکتا تھا۔

میں خود اس وقت تک اوندھے منہ گر کر بیڈ کی پائنتی پہنچ چکا تھا۔ بیڈ کی پائنتی کی طرف بھی ٹھوس لکڑی کا خاصا اونچا منقش تختہ تھا۔ بیڈ پر میٹرس بھی بہت موٹی تھی۔ چند لمحے کے لیے تو یہ چیزیں مجھے گولیوں کی بوچھاڑ سے محفوظ رکھ سکتی تھیں۔ میری یہ توقع پوری ہوئی لیکن اس دوران میری توقع سے بڑھ کر ایک بات ہو گئی۔

راحیلہ تو نوکیلی ناک والے کی گن کی زد پر تھی اور اسی نے راحیلہ کے تعاقب میں برسٹ مارا تھا۔ دوسری کھڑکی پر مامور شخص نے بھی اتنی ہی مستعدی دکھانے کی کوشش کی تھی۔ ادھر راحیلہ نے باتھ روم کی طرف چھلانگ لگائی تھی ادھر میں بیڈ کی پائنتی کی طرف لڑھکا تھا۔ اس دوران عالم شیر جو بیڈ پر گرا تھا، اٹھ نہیں سکا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ مر ہی چکا ہو۔ راحیلہ نے اس کی کنپٹی پر جو کک رسید کی تھی وہ عموماً جوڈو میں خاصی مہلک ثابت ہوتی تھی۔

لیکن اس کام میں اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ خود عالم شیر کے اپنے آدمی کے ہاتھوں پوری ہو گئی۔ اس نے مجھ پر برسٹ مارا تھا لیکن میں تو بیڈ کی پائنتی جا گرنے کی وجہ سے بچ گیا تھا پائنتی کے تختے کے کچھ ٹکڑے مجھ پر گرے تاہم گولیاں اوپر سے گزر گئیں لیکن کچھ گولیاں عالم شیر کے نچلے دھڑ اور میٹرس کو بھی چھید گئی تھیں۔ میں فوری طور پر یہ دیکھ تو نہیں سکا تھا لیکن میں نے برسٹ مارنے والے کی خوفزدہ سی چیخ ضرور سنی تھی۔ جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس سے حماقت سرزد ہو چکی ہے۔

رائفل کی نالیں کھڑکیوں سے غائب ہو گئیں میں سمجھ گیا کہ ہیبت خان اور شیریں خان اب دروازہ کھول کر اندر آئیں گے بلکہ شاید ان کے ساتھ ان کا تیسرا ساتھی بھی آئے گا جو غالباً دروازے پر تعینات تھا میری طرف سے انہیں زیادہ تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ انہیں یقینی طور پر معلوم تھا میں نہتا ہوں۔

میرے لیے ایک سیکنڈ کا دسواں حصہ بھی قیمتی تھا۔ ان دونوں کی شکلیں کھڑکیوں سے غائب ہوتے ہی میں اچھل کر بیڈ پر چڑھا۔ میں نے عالم شیر کی حالت دیکھنے میں بھی کوئی لمحہ ضائع نہیں کیا۔ ہاتھ اونچا کر کے میں نے فانوس میں چھپایا ہوا بھاری بھرکم جرمن لیوگر نکال لیا۔ آج یہاں آنے کے بعد جب راحیلہ چائے بنانے کچن میں گئی تھی تو میں نے یہ گن فانوس کے اوپر چھپا دی تھی۔ مجھے امید تھی کہ تلاشی لینے والوں کا دھیان اس طرف نہیں جائے گا.... اور ایسا ہی ہوا تھا۔

فطری سی بات ہے کہ انسان ہتھیار ایسی جگہ چھپانے کی کوشش کرتا ہے جہاں آسانی سے اور جلد از جلد رسائی ہو سکے۔ فانوس کے اوپر سے ہتھیار نکالنے تک تو انسان کا اپنا کام تمام ہو سکتا ہے لیکن میری توقع کے مطابق یہی جگہ محفوظ ثابت ہوئی تھی۔

یہ اکلوتا ریوالور اس وقت میرا قیمتی اثاثہ تھا۔ اسے اتارتے ہی میں بیڈ کی آڑ میں سینے کے بل لیٹ گیا۔

دروازے کی کنڈی کھلی پھر یکدم دروازہ تیزی سے کھلا وہ تینوں دیوانہ وار کمرے میں گھس آئے یہ ان کی غلطی تھی۔ مجھے ان سے ایسی غلطی کی توقع نہیں تھی وہ پیشہ ور لڑاکے تھے لیکن شاید عالم شیر کو برسٹ لگ جانے سے بوکھلا کر رہ گئے تھے۔

جس طرح منہ اٹھائے وہ کمرے میں گھسے تھے' اسی طرح تقریباً ایک ساتھ منہ کے بل فرش پر ڈھیر ہو گئے۔ لیوگر میرے استعمال میں ہمیشہ سے بڑے بھروسے کی گن ثابت ہوئی تھی۔ صحیح طور پر فائر کی گئی اس کی ایک ہی گولی بڑے بڑے پھنے خان کے لیے کافی ثابت ہوتی تھی میں نے تمام تر ناموافق حالات کے باوجود عمدہ نشانے بازی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ تینوں کو ایک ایک گولی ماری تھی اور سینے پر عین دل کے مقام پر مارنے کی کوشش کی تھی۔

تینوں اوپر نیچے ڈھیر ہو گئے۔ ان کی گنیں ان کے نیچے دب گئیں۔ میں نے ایک لمحے انتظار کیا جب ان میں سے کسی کے جسم میں حرکت کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو میں نے اٹھ کر عالم شیر کا جائزہ لیا۔ وہ واقعی مر چکا تھا۔ اس کے نچلے دھڑ میں کئی گولیاں پیوست ہو گئی تھیں منہ کھلا تھا اور منہ سے بھی خون بہہ بہہ کر میٹرس میں جذب ہو رہا تھا۔ ہیبت خان' شیریں خان اور ان کا تیسرا ساتھی بھی مر چکا تھا۔

عالم شیر کی موت نے بلاشبہ مجھے بھی حیران کر دیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک منٹ پہلے اکڑ کر میرے سامنے کھڑا اور فرعون کے سے لہجے میں بات کرتا ہوا وہ لحیم شحیم طاقتور شخص گوشت کے ایک بیکار اور لہو چھوڑتے ڈھیر کی صورت میں میرے سامنے پڑا ہو گا۔

پانسہ پلٹنے کا سہرا صحیح معنوں میں راحیلہ کے سر تھا۔ اس کی ایک کک نے گویا بغیر بنیادوں کے کھڑا ہوا کوئی محل گرا دیا تھا۔ یکدم ہی گویا سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا تھا باہر بدستور فائرنگ جاری تھی اور ایسا لگتا تھا کہ کچھ لوگ مکان کے اندر گھسے ہوئے تھے اور باہر کی طرف فائرنگ کر رہے تھے۔

دفعتاً مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ ریوالور سمیت میں تیزی سے گھوما۔ مگر وہ راحیلہ تھی جو میرے پیچھے کھڑی آنکھیں پٹ پٹا رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں فلش صاف کرنے کا لمبا سا وزنی برش تھا۔

”یہ کیا....؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”تم نے تو اپنے لیے ہتھیار کا بندوبست کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا میں اسی سے ہتھیار کا کام لے لوں گی۔“ وہ اطمینان سے بولی۔

”تم بغیر ہتھیار کے بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہو۔“ میں نے کہا۔

”یہیں کھڑے باتیں بناتے رہو گے یا باہر کی بھی کچھ فکر کرو گے؟ تمہیں معلوم ہے کچھ لوگ مکان کے اندر گھس کر شوٹنگ کر رہے ہیں۔“ وہ بولی پھر اس نے گویا تصحیح کی ”فلمی شوٹنگ نہیں۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے دوبارہ بیڈ پر چڑھتے ہوئے کہا۔ میں نے فانوس پر دوسری طرف رکھا ہوا گولیوں کا ایک چھوٹا سا ڈبا اتارا۔

ابھی میں بیڈ سے اترا ہی تھا کہ راحیلہ جلدی سے دروازے کے قریب دیوار کی آڑ میں ہو گئی۔ اس نے مجھے بھی فوراً دیوار کی اوٹ میں ہونے کا اشارہ کیا۔ وہ سینے کے بل لیٹ چکی تھی۔ میں بھی سینے کے بل لیٹ کر کھسکتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ وہ کچھ ایسے زاویے پر تھی کہ اس نے شاید مجھ سے پہلے کچھ دیکھ لیا تھا۔

وہ سرگوشی میں بولی ”ایک شخص ہماری ہی طرح سینے کے بل لیٹ کر سیڑھیاں چڑھ کر برآمدے میں آنے کی کوشش کر رہا ہے۔“

مجھے دروازے سے سر نکال کر دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دروازہ نیم وا تھا اور جس طرف وہ قبضوں کے ذریعے چوکھٹ سے جڑا ہوتا ہے' اس طرف جھری موجود تھی۔ میں نے اس سے آنکھ لگا کر دیکھا۔

عین اسی لمحے اس شخص نے بھی سیڑھی سے سر اٹھا کر برآمدے کا جائزہ لیا۔ وہ ڈاکوؤں کی طرح ڈھاٹا باندھے ہوئے تھے۔ میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ وہ میرے آدمیوں میں سے نہیں تھا۔ وہ کمرے کی طرف آنا چاہ رہا تھا لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ کمرے میں صورت حال کیا ہے۔ وہ یقیناً الجھن میں تھا اور محتاط انداز میں کھسکتا ہوا آگے آ رہا تھا۔

وہ جب برآمدے میں آ چکا تو میں نے اس کی الجھن کا خاتمہ کر دیا۔ میں نے دروازے کے قبضوں والی جھری سے ہی اس پر نظر رکھتے ہوئے صرف اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر.... اور وہ بھی فرش پر ٹکا رکھتے ہوئے ریوالور کی نال ذرا اونچی کر کے فائر کیا۔ اس لحاظ سے یہ ایک منفرد فائر تھا کہ میری آنکھ کہیں اور تھی' ریوالور کہیں اور۔ لیکن ہوا وہی جو میں چاہ رہا تھا۔ گولی' ڈھاٹے والے کی پیشانی میں پیوست ہو گئی۔

وہ برآمدے میں کچھ اس طرح چلا آ رہا تھا جیسے کوئی اژدہا سر فرش سے ذرا اونچا کیے رینگ رہا ہو مگر اب ایک جھٹکے سے اس کا سر فرش سے جا ٹکرایا اور وہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ گن پر اس کا ہاتھ بے جان انداز میں ٹکا رہ گیا۔

”اسے کہتے ہیں نشانہ۔“ میں نے راحیلہ کی طرف دیکھ کر داد طلب لہجے میں کہا۔

”کوئی ایسا کمال تو نہیں دکھایا تم نے۔“ وہ منہ بنا کر بولی ”اس طرح تو میں بھی کر سکتی ہوں.... اور اگر یہ کمرے تک آنے میں کامیاب ہو جاتا تو میں اس سے ہی اسے جہنم رسید کر دیتی۔“ اس نے فلش کا برش ہوا میں بلند کیا۔

پھر وہ دروازے کی اوٹ سے سر ذرا نکالتے ہوئے بولی ”میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ باہر ہو کیا رہا ہے؟“

”جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں....“ میں نے آہستگی سے اٹھتے ہوئے کہا ”میرے آدمیوں نے پہلے دُور مار رائفلوں سے بے تحاشا فائرنگ کر کے انہیں ان کے ٹھکانوں سے نکالا ہے۔ میں نے باہر کچھ چیخ و پکار بھی سنی تھی... لگتا ہے کچھ لوگ مر بھی چکے ہیں.... کچھ شاید زخمی بھی ہوئے ہوں۔ جو بچے ہیں وہ میرے خیال میں مکان میں گھس آئے ہیں اور مورچہ بند ہو گئے ہیں۔ ان میں سے بھی ایک برآمدے میں مارا گیا ہے۔ فائرنگ کی آوازوں سے مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ وہ لوگ دو یا زیادہ سے زیادہ تین ہیں۔“

راحیلہ کان لگا کر سنتے ہوئے بولی ”میرا خیال ہے تین ہیں دو مکان کے سامنے والے حصے میں ہیں اور ایک پچھلی طرف۔“

”تمہارا اندازہ بھی خاصا ماہرانہ ہے۔“ میں نے تائید میں سر ہلایا ”آؤ ہم اپنے آدمیوں کی مدد کریں۔ عالم شیر کے آدمی مکان میں آ چھپے ہیں اس لیے میرے آدمیوں کا مزید قریب آنا اور ان کا صفایا کرنا مشکل ہو گیا ہے۔“

”تم چاہتے ہو ہم اندر رہتے ہوئے ان کا صفایا کریں؟“ راحیلہ میرا مطلب سمجھتے ہوئے بولی۔

”ہاں ان کا دھیان باہر کی طرف ہو گا۔ اگر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم کچھ مشاق ثابت ہوئے تو وہ ہمارے ہاتھوں مارے جائیں گے ورنہ یہ مقابلہ نہ جانے کتنا طول کھینچ جائے۔ اس دوران ہمارے کسی آدمی کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے کیونکہ وہ کھلے میدان میں آگے بڑھنے اور اس مکان تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہماری وجہ سے وہ بے چارے احتیاط بھی بہت کر رہے ہیں ورنہ اب تک تو وہ گرنیڈ وغیرہ مار کر اس مکان کو بھی کھنڈر بنا چکے ہوتے۔“ یہ کہتے ہوئے میں ایک کھڑکی سے باہر کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس طرف سے مکان کی چار دیواری کا جتنا بھی حصہ دکھائی دے رہا تھا اس کی آڑ میں ہمیں کوئی دکھائی نہ دیا۔ وہ لوگ کہاں کہاں تھے' یہ جاننے کے لیے کمرے سے نکلنا ضروری تھا اور اس کا مطلب خطرے کی حدود میں کچھ اور آگے جانا تھا کیونکہ اچٹتی ہوئی گولیاں برآمدے تک آ رہی تھیں۔ مکان کی چار دیواری پر تو یقیناً ان گنت گولیاں برس چکی تھیں۔

”لیکن ہمارے پاس گن صرف ایک ہے... اور وہ بھی محض ریوالور۔“ راحیلہ بولی ”جبکہ میں باہر سب مشین گن تک کی آواز سن رہی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں ہمارا صرف جذبہ ہی کافی ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”تو... یہ ریوالور بھی تم ہی لے لو۔ میں خالی ہاتھ ہی کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ ایک خنجر میری پنڈلی سے بندھا ہوا ہے۔ شاید گولیوں کی اس بارش میں وہ کچھ کام آ جائے۔“

”میرا یہ مطلب نہیں تھا....“ راحیلہ جلدی سے بولی ”کہ تم ریوالور بھی مجھے دے دو۔ مجھے تو زیادہ فکر تمہاری ہی ہے۔ مجھ پر گولی چلانے میں تو شاید کوئی ذرا جھجک بھی جائے لیکن تمہاری تو جھلک دیکھتے ہی....“

”کوئی بات نہیں۔ دیکھا جائے گا تم یہ تو پکڑو۔“ میں نے ریوالور دوبارہ لوڈ کر کے زبردستی اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

میں پنڈلی سے بندھی نیام سے خنجر نکال رہا تھا تو وہ بولی ”یہ تو تبھی کام دے سکے گا جب تمہیں کسی کے قریب پہنچنے کا موقع ملے اور اس وقت پچویشن جیسی محسوس ہو رہی ہے اس میں کسی کے قریب پھٹکنے کی نوبت نہیں آئے گی۔“

اس کا مطلب تھا کہ وہ معرکہ آرائی کے طور طریقوں کو سمجھتی تھی۔ اسے ٹریننگ کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں نے ایک نظر خنجر کو دیکھتے ہوئے کہا ”کام تو یہ دور سے بھی دے جائے گا لیکن صرف ایک بار۔ اس کے بعد انسان پھر نہتے کا نہتا۔“

”اچھا... تو خنجر پھینکنا آتا ہے تمہیں؟“ وہ دروازے کے قریب پہنچ کر بولی۔

”تھوڑا بہت ہر کام ہی سیکھنے کی کوشش کی ہے۔“ میں نے جواب دیا دروازے سے نکل کر دیوار کے ساتھ لگ کر وہ برآمدے کے ایک کونے کی طرف کھسکنے لگی اور میں دوسرے کونے کی طرف۔

وہ بغیر کہے میرا مطلب سمجھ گئی تھی۔ مکان کی ساخت ایسی تھی کہ بالکل وسط میں عمارت تھی اور اس کے چاروں طرف کھلا حصہ تھا جس میں دو طرف لان تھا اور دو طرف کورٹ یارڈ۔ دیکھ بھال نہ ہونے کی وجہ سے لان جھاڑ جھنکاڑ بنا ہوا تھا۔

میں چاہ رہا تھا کہ راحیلہ ایک طرف روانہ ہو اور میں دوسری طرف۔ ہم عمارت کے گرد چکر لگا کر آمنے سامنے آ جائیں۔ اس دوران ہمیں کھلے حصے میں جہاں کہیں بھی کوئی مسلح شخص نظر آئے اسے ٹھکانے لگانے کی کوشش کریں۔ لیکن یہ مختصر سا سفر موت کا سفر بھی ہو سکتا تھا۔ عین ممکن تھا اس میں دوبارہ ہماری ملاقات ہی نہ ہوتی۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کون مکان کے گرد چکر پورا کر پائے گا اور کون نہیں۔ اس کا زیادہ انحصار اس بات پر تھا کہ کس مسلح شخص پر ہماری نظر پہلے پڑتی ہے یا ہم پر اس کی۔

میرا راحیلہ کو تنہا دوسری طرف بھیجنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس کی صلاحیتوں کو زیادہ بہتر طور پر پرکھنے کے لیے رسک لینا ناگزیر تھا۔ اس کے علاوہ بہتر حکمت عملی بھی یہی تھی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ جاری تھی۔ مکان کی چار دیواری زیادہ بلند نہیں تھی۔ اس کا بالائی حصہ سیمنٹ کی جالیوں سے بنا ہوا تھا۔ یہ جالیاں جگہ جگہ سے ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں۔

مکان کی اصل عمارت خاصی بلندی پر تھی اس لیے بعض جگہ کھڑکیوں کے چھجوں تک پر گولیاں لگ چکی تھیں۔ تاہم میں چار دیواری سے باہر یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ میرے ساتھی کہاں تھے یا

کون کہاں سے فائرنگ کر رہا تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے زیادہ کوشش کرنا بھی سخت خطرناک تھا۔ اس لیے میں رکوع کی سی حالت میں دیوار کے ساتھ رگڑ کھاتا آگے بڑھتا گیا۔

فی الحال میں جس طرف تھا ادھر بغلی دیوار تھی لیکن اس کی آڑ میں کوئی نہیں تھا۔ اس طرف کا مورچہ شاید اس شخص نے سنبھالا ہوا تھا جو کمرے کی طرف آنے لگا تھا اور میرے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔

میں جونہی برآمدے کے کونے پر پہنچا مجھے مکان کے سامنے کا حصہ دکھائی دینے لگا جس طرف گیٹ اور پورچ وغیرہ تھا اچانک ہی میری نظر ایک شخص پر پڑی۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر لیٹا ہوا تھا لیکن اس کا سر گیٹ کے پیچھے تھا گیٹ کے نیچے اور اوپر گرل کا ڈیزائن بنا ہوا تھا۔ نیچے کی گرل سے اس نے اپنی سیون ایم جی گن کی نال نکالی ہوئی تھی تبھی وہ سر ذرا آگے بڑھا کر برسٹ مارتا پھر سر پیچھے دیوار کی اوٹ میں کر لیتا۔

وہ گہرے رنگ کی شلوار قمیض میں تھا۔ اس کا چہرہ گیٹ کی طرف تھا لیکن مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس نے بھی چہرے پر ڈھاٹا باندھا ہوا تھا۔ اس کی توجہ مکمل طور پر باہر ہی کی طرف تھی۔ میں نے خنجر نوک کی طرف سے تھاما ہوا تھا۔ میں نے اسے ہوا میں ذرا لہرایا اس دوران اس شخص کی توجہ دوسری طرف ہی رہی۔

میرا ہاتھ تیزی سے گھوما اور خنجر تقریباً گولی کی سی رفتار سے جا کر اس کے پہلو میں پیوست ہو گیا۔ اس خنجر کا دستہ وزنی تھا جو خنجر کو زیادہ گہرائی تک پیوست کرنے میں مدد دیتا تھا۔ اس کے وزن کی وجہ سے خنجر گہرائی میں اتر جاتا تھا۔ خنجر تقریباً دستے تک ہی اس کے پہلو میں اتر گیا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ ترچھا اس کے دل میں اترا ہو گا۔

اس نے تڑپ کر گن سمیت پلٹنے کی کوشش کی لیکن اس کی گن گرل میں ہی پھنس کر رہ گئی اور وہ بھی پلٹ نہ سکا۔ گن پر اس کی گرفت ایک لمحے کے لیے سخت سی ہو گئی لیکن پھر وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں اوندھا ہو گیا۔

اب میں خالی ہاتھ تھا۔ اگر میں اس شخص کی گن اٹھانے کے لیے اس کے قریب جاتا تو عین ممکن تھا کہ مکان کے دوسرے کونے پر موجود آدمی کی نظر میں آ جاتا۔ مجھے فائرنگ کی آواز سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ایک شخص ادھر کونے پر موجود تھا۔

میں ابھی الجھن میں ہی تھا کہ مکان کے عقبی حصے میں کہیں میرا لیوگر گرجا۔ ابھی تک فائرنگ وقفے وقفے سے جاری تھی۔ گیٹ کے عقب میں موجود شخص کے مرنے کے بعد فائرنگ کی شدت میں مزید کمی آ گئی تھی۔ باہر سے اب بھی وقفے وقفے سے گولیوں کی بوچھاڑ آ رہی تھی لیکن اس کا اتنا شور اور گھن گرج نہیں تھی۔

انہی آوازوں کے درمیان مجھے لیوگر کی آواز سنائی دی تھی اور اس کے ساتھ ہی فائرنگ گویا ختم ہو گئی۔ میں نے ایک لمحے انتظار کیا ایک بار پھر ایک گن گرجی ذرا وقفے کے بعد پھر اسی گن کی آواز سنائی دی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ فائرنگ کرنے والا اب صرف ایک شخص باقی رہ گیا تھا اور وہ مکان کے سامنے ہی کی طرف دوسرے کونے میں تھا۔

میں خالی ہاتھ تھا اور دیوار کی اوٹ سے نکلنے کے بعد میں اس کی نظر میں بھی آ سکتا تھا لیکن میں تن بہ تقدیر ہو کر دیوار کی اوٹ سے نکل کر سامنے والی دیوار کے ساتھ لگ کر کھسکنے لگا۔ دو تین قدم آگے بڑھنے کے بعد میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر پہنچا اور تب وہ شخص مجھے نظر آ گیا۔

وہ دیوار سے لگا کچھ جھکا کھڑا تھا۔ اس نے گن کی نال سیمنٹ کی جالی سے نکالی ہوئی تھی۔ ان احمقوں میں سے جو مرتے جا رہے تھے، زندہ بچ جانے والوں کو ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ انہیں غالباً یہ احساس تک نہیں ہوا کہ کتنی گنوں سے فائرنگ ہو رہی تھی اور کتنی خاموش ہو چکی تھیں۔ ہر کوئی بس اپنی اپنی جگہ فائرنگ میں لگا ہوا تھا وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں گولیاں برسانے کو ہی شاید بہت بڑی کامیابی سمجھ رہے تھے۔ عالم شیران کے بارے میں بہت ڈینگیں ہانک رہا تھا جبکہ مجھے یہ سخت احمق لگے تھے۔ ان کی لڑنے کی کوئی حکمت عملی نہیں تھی۔ آپس میں ربط کا کوئی احساس نہیں تھا۔

میں دیوار کو چھوڑ کر برآمدے کے ایک ستون کی آڑ میں ہو گیا۔ اب اگر وہ شخص مڑ کر دیکھ بھی لیتا اور میری موجودگی سے باخبر ہو جاتا تب بھی فوری طور پر مجھے نشانہ نہیں بنا سکتا تھا۔ لیکن اس نے مڑ کر نہیں دیکھا شاید اسے گرد و پیش کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ اتنے فاصلے سے اسے جہنم رسید کرنے کی کیا تدبیر کروں کہ دوسری طرف سے راحیلہ کے روپ میں فرشتۂ اجل کی نظر اس پر پڑ گئی۔ میں راحیلہ کو نہیں دیکھ پا رہا تھا۔ وہ غالباً مکان کی دوسری بغلی دیوار کی اوٹ میں تھی لیکن لیوگر کی آواز نے مجھے بتا دیا کہ یہ دوسرا شکار بھی اس کی رینج میں آ گیا تھا۔

اس مرتبہ لیوگر دو بار گرجا اور وہ شخص بھی دھپ سے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ ایک گولی غالباً اس کے کندھوں کے درمیان اور دوسری گدی میں پیوست ہوئی تھی۔ اس کی گن سیمنٹ کی جالی میں ہی پھنسی لٹکی رہ گئی۔ وہ چاروں شانے چت ہو گیا۔ اس کا منہ کھلا کھلا رہ گیا۔

اس کے بعد مکان کے اندر گرجنے والی گنیں خاموش ہو گئیں۔ میرا اندازہ تھا کہ اب مکان میں ہمارے دشمنوں میں سے کوئی زندہ نہیں رہا تھا۔ دو سائیڈیں میں دیکھ چکا تھا اور راحیلہ بھی غالباً دو سائیڈوں کا جائزہ مکمل کر کے پہنچ ہی والی تھی۔

میں چند لمحے ساکت کھڑا رہا۔ اس دوران باہر سے فائرنگ بھی بند ہو گئی اور مکمل سکوت چھا گیا۔ راحیلہ ابھی تک دوسرے کونے سے

نمودار نہیں ہوئی تھی۔ میں خود آگے بڑھ کر اس کونے سے جھانکنا نہیں چاہتا تھا، مبادا راحیلہ مجھے بھی دشمن سمجھ کر جلد بازی میں گولی نکا دے۔

آخر کار کونے پر دیوار کی عقب سے اس کے خوب صورت بالوں کی جھلک نظر آئی۔ وہ نہایت آہستگی سے سر آگے لا کر ادھر جھانکنے کی فکر میں تھی۔ میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا "بس..... اب تاک جھانک کی ضرورت نہیں۔ سامنے آ جاؤ میدان صاف ہو چکا ہے۔"

وہ پھر بھی جھجکتے ہوئے سامنے آئی اور گہری سانس لے کر بولی "مکان خاصا بڑا ہے۔ احتیاطاً ادھر ادھر دیکھ لینا چاہیے کسی کونے کھدرے میں چھپا ہوا کوئی بدبخت اچانک حملہ نہ کر دے۔"

لیوگر اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور ناک کی نوک پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔ اس عالم میں وہ پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔

"اس کا امکان نہیں ہے۔" میں نے کہا "یہ لوگ زیادہ حساب کتاب سے لڑنے کے عادی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ تبھی تو اتنی آسانی سے مارے گئے ہیں حالانکہ یہ تعداد میں بھی زیادہ تھے اور بہتر پوزیشن میں بھی تھے۔"

پھر میں نے حلق سے اُلو کی آواز میں مخصوص اتار چڑھاؤ کے ساتھ ایک سگنل دیا۔ اس کا مطلب ٹونی اور دوسرے ساتھیوں کو یہ بتانا تھا کہ اب مزید فائرنگ یا مورچہ بندی کی ضرورت نہیں۔

"یہ تم اپنی اصل آواز میں سگنل دے رہے ہو نا؟" راحیلہ سنجیدگی سے بولی۔

"یہ صرف میری ہی نہیں تمہاری بھی زبان ہے۔ تبھی تو آسانی سے سمجھ گئی ہو۔" میں نے جواب دیا۔

ایک لمحے کے توقف سے مجھے اسی آواز میں ٹونی کی طرف سے جواب ملا اور میں نے راحیلہ کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ گیٹ کے قریب پہنچ کر میں نے مردہ پڑے ہوئے شخص کو چھوئے بغیر گرل سے اس کی گن نکالی اور گیٹ کھولا۔ ان لوگوں نے اندر گھس کر گیٹ بند کر لیا تھا۔ شاید ان کے پسپائی اختیار کرنے سے پہلے ہی ان کے ساتھی باہر مارے جا چکے تھے۔

میں نے باہر پہنچ کر دیکھا۔ دو لاشیں گاڑی کی آڑ میں پڑی تھیں۔ ایک لاش ویگن کی آڑ میں پڑی تھی۔ تینوں کے سروں میں ہی گولیاں لگی تھیں۔ اسی دوران سامنے متروک کھیتوں کے درمیان ایک نالے سے نکل کر ٹونی مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ پورا گوریلا نظر آ رہا تھا۔ کمر پر کینوس کا ایک تھیلا بھی لدا ہوا تھا۔ کپڑے مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔

میں نے ادھر ادھر گھوم کر دیکھا۔ مکان کے دونوں طرف دو دو لاشیں اور پڑی ہوئی تھیں۔ یہ سب کچھ میری توقعات کے بالکل خلاف ہو گیا تھا۔ خواہ مخواہ اتنی خونریزی ہو گئی تھی۔ خون ریزی میرے لیے کبھی تسکین کا باعث نہیں رہی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ مجبوراً ہوا تھا۔ اگر میں اور میرے ساتھی اس قسم کے حالات سے نمٹنے کے اہل نہ ہوتے اور کچھ قسمت بھی ساتھ نہ دیتی تو ان لوگوں کی جگہ شاید ہماری لاشیں پڑی ہوتیں۔

اس دوران دوسری سمتوں سے میرے دوسرے تینوں ساتھی بھی آن پہنچے۔ سردار شیخ گاڑی میں آیا تھا۔ صورت حال کا جائزہ لینے کے بعد ٹونی بولا "ہم آپ کے بارے میں الجھن میں پڑ گئے تھے سر! مجھے بہت تشویش تھی... لگ رہا تھا کہ معاملہ اس طرح نہیں جا رہا جس طرح آپ توقع کر رہے تھے.... سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہماری مداخلت کے لیے کون سا لمحہ مناسب رہے گا۔ بس یہی ڈر تھا کہ آپ کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔"

"خیر... جو بھی ہوا اور جس طرح بھی ہوا ٹھیک ہی ہوا۔" میں نے تیزی سے کہا "میں اور راحیلہ تو فوراً یہاں سے جا رہے ہیں۔ تم لوگ بھی جلد از جلد یہاں سے نکل لینا۔ جانے سے پہلے صورت حال کو ذرا اور الجھا دو۔ ایک دو گرنیڈ بھی مار دو... ظاہر یہی ہونا چاہیے کہ اسمگلر اور جرائم پیشہ قسم کے لوگوں کے دو گروہوں میں یہاں زبردست تصادم ہوا ہے۔ اس مکان کے چند تالے وغیرہ بھی گولیوں سے توڑ دینا.... تاکہ یہی ظاہر ہو کہ یہ لوگ پناہ حاصل کرنے کے لیے زبردستی اس میں گھسے تھے۔ سمجھ رہے ہو نا؟ سب کچھ تیزی سے کرو اور نکل لو۔"

میں نے راحیلہ کو اشارہ کیا۔ غنیمت تھا کہ ہماری گاڑی عالم شیر کی ویگن کی آڑ میں تھی اور صحیح سلامت تھی۔ ہم اس میں بیٹھے اور میں نے گاڑی سڑک کے بجائے کچے کی طرف موڑ لی۔ جس راستے سے ہم آئے تھے اس پر واپس جانے کے بجائے میں کچے راستے سے رائے ونڈ روڈ پر پہنچ کر ٹریفک میں شامل ہو کر لاہور میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ چکر ذرا لمبا پڑتا لیکن یہ محفوظ طریقہ تھا۔ ٹونی وغیرہ کو بھی اپنا کام نمٹا کر اسی طرح واپس آنا تھا۔

کافی دیر بعد کچے راستے کے ہچکولوں سے نجات ملی تو راحیلہ گہری سانس لے کر بولی "تو آخر کار تمہیں عالم شیر سے نجات مل ہی گئی۔"

"صرف مجھے ہی نہیں.... یوں سمجھو انسانیت کو اس سے نجات مل گئی۔" میں نے کہا۔

"دیکھو بھئی... یہ انسانیت وغیرہ کو بیچ میں مت لاؤ۔" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی "ابھی ہم انسانیت کے خادموں والے درجے پر فائز نہیں ہوئے ہیں۔ ہمیں بات کو سیدھا ہی رکھنا چاہیے۔ بس ہمارا اس خبیث کی وجہ سے ناک میں دم تھا۔ ہم نے اس کا پتا صاف کر دیا بات ختم۔"

"خیر.... اگر تم اس طرح بھی بات ختم کر رہی ہو تو کوئی حرج نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "یہ بھی فطرت کا قدیم اصول

ہے۔ پتھر کے زمانے میں بھی انسان کو اپنی جان بچانے کے لیے درندوں کو ہلاک کرنا پڑتا تھا یا پھر وہ ان کا لقمہ بن جاتا تھا۔ اب ہم چار ٹانگوں والے درندوں سے تو محفوظ ہیں۔ انہیں تو ہم نے جنگلوں تک محدود کردیا ہے یا چڑیا گھروں کے پنجروں میں بند کردیا ہے لیکن یہ دو ٹانگوں والے درندے اب بھی زندگی اجیرن کیے رکھتے ہیں اور انہیں قابو میں رکھنے کے لیے دنیاوی قوانین ناکافی ہیں۔“

”سمجھ میں نہیں آرہا تمہاری اس تقریر دل پذیر کے جواب میں کیا کہوں.... “ پھر وہ جھرجھری سی لے کر بولی ”لیکن میں یہ ضرور پوچھوں گی کہ یہ تم مجھے کس راستے پر لگا رہے ہو؟ میں تو بڑی امن پسند سی لڑکی تھی۔“

”تم اب بھی امن پسند ہی ہو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ رہ کر تمہارے ہاتھ سے کوئی شریف‘ کوئی کمزور‘ کوئی بے ضرر‘ کوئی نہتا اور کوئی بے قصور آدمی ہلاک نہیں ہوگا۔ بلکہ ایسے لوگوں کی تو مدد کے لیے ہم بساط بھر کوشش کریں گے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”واہ.... واہ....“ اس نے تالی بجائی ”ماڈرن سلطانہ ڈاکو!“

”مگر میں نے تو آج تک کہیں ڈاکا نہیں ڈالا۔“

”تم ذرا دولت مند سلطانہ ڈاکو ہو۔ تمہیں ڈاکے ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اس بے چارے کو تو غریبوں کی مدد کے لیے ڈاکے ڈالنے پڑتے تھے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ہر دور میں اس دور کی ضرورت کے مطابق لوگ پیدا ہوتے رہتے ہیں یہ بھی شاید فطرت کا ایک اصول ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن میں تمہیں ایک بات بتادوں۔“ وہ انگلی ڈیش بورڈ پر مارتے ہوئے بولی ”مجھے کوئی فلسفہ وغیرہ نہیں معلوم.... میں اخلاقیات کی کسی بحث میں نہیں پڑتی۔ میں تو یہ سب کچھ بس تمہارے لیے کررہی ہوں۔“

”دیکھا... محبت میں کتنا اثر ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”یہ محبت کہاں سے آگئی بیچ میں؟“ وہ تنک کر بولی۔

”محبت نہیں ہے تو پھر اور کیا ہے؟“ میں نے گیئر بدلتے ہوئے گنگنا کر کہا۔

”کچھ بھی ہوسکتی ہے۔ میری حماقت ہوسکتی ہے... میرا جذبہ ترحم ہوسکتا ہے.... تمہیں کوئی مارنے آئے گا... کوئی تمہاری پٹائی لگانے کی کوشش کرے گا تو مجھے ترس تو آئے گا۔ دوستوں کو مار پیٹ سے بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں تو ہلانے پڑتے ہیں نا۔“ وہ بولی۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا وہ اپنی شریر مسکراہٹ کو چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔

”ہاں... یہ بات تو ہے۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”تمہاری پناہ میں آکر میں خود کو بہت محفوظ محسوس کررہا ہوں۔“

”ڈرپوک قسم کے بچوں کے سر پر دست شفقت رکھنا بھی

سے میری عادت ہے۔“ وہ شاہانہ انداز میں بولی ”تمہیں جب کوئی تنگ کرے‘ بلا تکلف میرے پاس چلے آیا کرو۔“

”مجھے تو جب کوئی تنگ نہیں کرے گا‘ میں تب بھی تمہار پاس آجایا کروں گا۔ صرف تمہاری اجازت کی ضرورت ہے“ میں نے فوراً کہا۔

”بس یہی تو تم جیسے بچوں میں خرابی ہوتی ہے۔ ذرا سر پر رکھا اور کمبل ہوگئے۔ روں روں کرتے جان کو آجاتے ہیں۔“ بولی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے اپنے آپ کو بہترین ساتھی ثابت کردیا تھا۔ ہتھیاروں سے یا خالی ہاتھ‘ دونو طرح لڑائی بھڑائی میں اس کا جواب نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس کے اعصاب پر اس ساری لڑائی خوں ریزی کا کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آرہا تھا۔ وہ اسی طرح تا اور خوش مزاج نظر آرہی تھی۔ ایک لڑکی ہوتے ہوئے اس کی خوبیاں اور بھی زیادہ قابل قدر تھیں۔ میرے خیال میں اب اس کو ”دی سرکل“ میں ہی شمار کرنا چاہیے تھا۔ وہ میری توقع سے کچھ بڑھ کر ہی نکلی تھی۔ ٹونی اور شفیع شاہ کے بعد مجھے ا صحیح معنوں میں اسپارک نظر آیا تھا۔ اس کے اندر بڑی بے روح اور عجیب و غریب صلاحیتیں مقید تھیں۔ جونہی اسے پناہی اور موقع میسر آیا تھا اس نے اپنی ذات کا بھرپور اظہار تھا۔

ایک عجیب بات تھی کہ میرے دل میں اس کی طلب آ تحاشا بڑھ گئی تھی۔ نہ جانے کیوں یکدم ہی یہ خواہش ایک با بڑی شدت سے ابھر آئی تھی کہ وہ میری بن جائے‘ میرے گھ رہے‘ ہر وقت میری نظر میں رہے‘ اس کی میری رفاقت ہوجائے۔ اس کے میرے درمیان جو ایک نادیدہ سی باریک ک تھی‘ وہ جو غیریت کی ایک حدِ فاصل تھی‘ وہ ختم ہوجائے۔

لیکن یہ کوئی موقع نہیں تھا اپنی خواہش بیان کرنے خواہشیں بھی عجیب ہوتی ہیں اور عجیب تر موقعوں پر بیدار ہیں۔ ویسے بھی اس کے دل پر پتھر کا جو غلاف چڑھ گیا تھا‘ ابھی پگھلنے کے لیے نہ جانے کتنا وقت درکار تھا۔ چنانچہ میں نے د بات دل میں ہی رہنے دی۔

اسے میں نے اس کے گھر اتارا اور گاڑی دو نمبر پر چھ ہوئے وہاں سے دوسری گاڑی لے کر اپنے گھر چلا گیا۔ فی الحا گاڑی کو میں اپنے گھر پر کھڑی کرنا نہیں چاہتا تھا۔

گھر پہنچ کر میں نے شاور لیا‘ لباس تبدیل کیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر آفس جا پہنچا۔ آفس میں بیٹھ کر میں یوں کا مصروف ہوگیا جیسے میرا تو خواب میں بھی کسی قسم کے لڑائی جھ سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ گو کہ میرے اعصاب ابھی تک کش لیکن میں پوری کوشش کررہا تھا کہ پرسکون نظر آؤں۔

تھوڑی دیر بعد ہی شمیم کا فون آگیا۔ مجھے کیتھرین بتاچکی تھی کہ پہلے بھی دو مرتبہ اس کا فون آچکا تھا۔ میں نے کہا ”مجھے پیغام مل چکا ہے کہ تم نے فون کیا تھا۔ میں ابھی تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ میں آج صبح سے ذرا ایک کاروباری مسئلے میں الجھا ہوا تھا۔ تم سناؤ کل کی ریس کیسی رہی؟“

”یہی بتانے کے لیے تو بے تاب تھی۔ تم نے آج کا اخبار نہیں دیکھا؟“ وہ مسرور لہجے میں بولی۔

”آج کا اخبار بھی صحیح طور پر دیکھنے کی مہلت نہیں ملی۔ بس پہلے اور آخری صفحے کی موٹی موٹی سرخیاں دیکھی تھیں۔“ میں نے جواب دیا۔

”کھیلوں کے صفحے پر کلر کی کیا خوب صورت تصویر چھپی ہے۔ بڑی کوریج دی ہے تمام اخباروں نے اسے۔“ شمیم نے بتایا ”گرینڈ ریس میں اس نے ریکارڈ قائم کیا ہے۔ ریس کورس میں بھی ٹکٹیں بکنے اور شرطیں لگنے کا ریکارڈ قائم ہوا ہے۔ اصطبل میں آتشزنی کی خبر... اخباروں میں آگئی ہے۔ ہم نے کسی کا نام نہیں لیا۔“

”بہت اچھا کیا۔“ میں نے کہا ”جس محاذ پر مختار رفیق کچھ کرے گا‘ اسی محاذ پر ہم بھی جواب دیں گے۔ اس بے چارے کی حالت کیا ہے؟“

”معلوم نہیں وہ تو بالکل غائب ہوگیا ہے۔“ شمیم نے جواب دیا ”شاید کسی اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں پڑا ہو یا گھر پر ہی علاج کرارہا ہو۔“

”اس کی طرف سے ابھی تک کوئی ردِعمل دیکھنے میں نہیں آیا؟“ میں نے پوچھا۔

”بالکل نہیں“ شمیم نے جواب دیا ”کوئی دھمکی سننے میں نہیں آئی۔ اس کے کسی آدمی نے خونخوار نظروں سے ہماری طرف دیکھا تک نہیں۔ ریس میں کوئی رکاوٹ ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ مجھے تو اس سکوت سے خوف آنے لگا ہے۔ میں نے تو چاروں محافظوں کو چوبیس گھنٹے کلر کی نگرانی پر لگادیا ہے۔ وہ باری باری ڈیوٹی دے رہے ہیں۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا ”تم احتیاطی تدابیر جاری رکھو۔ حفاظتی اقدامات میں کوئی کمی نہ کرو اور نتائج اللہ پر چھوڑ دو۔“

”ٹھیک ہے سرکار! اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولی۔

مزید چند منٹ ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ آخر سلسلہ منقطع کرکے میں دوبارہ کام میں مصروف ہوگیا۔ آفس میں بہت سے ایسے کام جمع تھے جو میری ذاتی توجہ کے منتظر تھے۔ انہیں نمٹانے کے لیے میں رات تک آفس میں بیٹھا رہا۔ میرا اب کوئی بھروسا نہیں ہوتا تھا کہ کب کتنی دیر کے لیے کس چکر میں پھنس جاؤں اور آفس کی طرف توجہ نہ دے سکوں۔ اس لیے میں کوشش کررہا تھا کہ بہت سی متوقع چیزوں کے بارے میں بھی ہدایات لکھ کر رکھ دوں۔

عین اس وقت جب میں اٹھنے کا ارادہ کررہا تھا میرے ڈائرکٹ فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا تو دوسری طرف سے قدرِ حیرت سے پوچھا گیا ”تم ابھی تک آفس میں بیٹھے ہو؟“

آواز جانی پہچانی تھی مگر کتنی ہی کیفیتوں میں الجھی ہوئی تھی۔ اس میں خمار کا رنگ بھی تھا اور آنسوؤں کی نمی بھی۔ کسی انجانے کرب کی لہر بھی تھی اور ضبط کی ناکام کوششوں کی جھلک بھی۔ وہ ایک گلوگیر سی آواز تھی جسے خوشدلانہ بنانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ وہ ستارہ کی آواز تھی۔

”ہاں.... آج مجھے ذرا دیر تک آفس میں رکنا پڑا۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا ”تم سناؤ.... تمہیں آج اس بندۂ حقیر پُر تقصیر کی یاد کیسے آگئی؟“

”یاد تو جب بھی آتی ہے مجھے ہی آتی ہے۔ فون جب بھی کرتی ہوں میں ہی کرتی ہوں خواہ کتنی ہی تاخیر سے کروں۔“

”یہ تمہاری محبت ہے اور میں اس کا قدردان ہوں۔“ میں نے خلوص سے کہا۔

”تم واقعی میری محبت کے قدردان ہو؟“ اس نے گویا بطور خاص تصدیق چاہی۔

”کیا تمہیں اس میں شک ہے؟“ میں نے الٹا اس سے سوال کردیا۔

”ہاں شک تو ہے۔“ وہ صاف گوئی سے بولی ”بہرحال اگر تمہیں دعویٰ ہے کہ تم میری محبت کے قدردان ہو تو فوراً میرے پاس پہنچ جاؤ۔“

میں ایک لمحے خاموش رہا تو وہ بولی ”الجھن میں پڑگئے نا...؟ دوسری مصروفیتیں آڑے آرہی ہوں گی۔ میری بے چاری مسکین اور صابر سی محبت کو تمہاری کسی کاروباری مصروفیت یا کسی دوسری عورت سے کیے ہوئے وعدے نے شکست دے دی ہوگی۔“

”مصروفیت تو کوئی نہیں ہے۔ ہوتی بھی تو میں اسے ملتوی کردیتا۔ کسی اور سے وعدہ ہوتا اسے بھی توڑ لیتا۔ لیکن بات کیا ہے؟ تمہاری آواز کچھ بدلی ہوئی ہے۔ تم اس وقت کہاں ہو؟“

”کسی فلم کے سیٹ پر نہیں ہوں۔“ وہ مخمور مگر تلخ سے انداز میں ہنسی ”میری آواز سے تمہیں شبہ ہوا ہوگا کہ شاید میں کوئی سین پکچرائز کرا کے فارغ ہوئی ہوں اور ابھی تک مجھ پر اس کا اثر باقی ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں گھر پر ہوں۔ آج تو میں شوٹنگ پر گئی ہی نہیں۔ میں بالکل اکیلی ہوں.... بلکہ بہت ہی زیادہ اکیلی....! تم آرہے ہو یا نہیں؟“

”میں آرہا ہوں۔“ میں نے فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

”میں تمہارا انتظار کررہی ہوں۔ بہت شدت سے۔“ اس نے کہا اور فون بند کردیا۔ میں ریسیور کو تھامے ایک لمحے غور سے دیکھتا رہا۔ مگر وہ بے چارہ محض ایک آلہ تھا۔ مجھے اتنا کچھ ہی سنا سکتا تھا

جتنا اس پر بولا جاتا۔ اس سے پہلے یا بعد کی کہانی میرے سامنے بیان نہیں کر سکتا تھا۔

میں جب ستارہ کے ہاں پہنچا تو ملازم نے بتایا کہ وہ اپنے کمرے میں میرا انتظار کر رہی تھی۔ اس کا بیڈ روم اوپر کی منزل پر تھا۔ میں نے جا کر دروازے پر آہستگی سے دستک دی تو ستارہ کی آواز گویا کسی کنویں کی تہہ سے ابھری "اگر تم افضل ہو تو اندر آجاؤ ورنہ دفع ہو جاؤ۔"

میں نے دروازہ کھولا اور اندر قدم رکھا تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنا پڑا کیونکہ کمرے میں صرف زرد کا بلب روشن تھا۔ دو تین سیکنڈ بعد ہی میں ملگجے اندھیرے میں صحیح طور پر دیکھنے کے قابل ہو گیا۔

ستارہ بیڈ پر گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ سائیڈ ٹیبل پر وہسکی، سوڈے کی بوتلیں اور گلاس رکھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں سلگتی ہوئی سگریٹ اور چہرے پر وحشت تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور مدھم نیلگوں روشنی میں، آنکھوں میں جھلملاتی نمی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ میں اس کے ملیح رخساروں پر بھی آنسوؤں کی نمی دیکھ سکتا تھا۔

میں نے آہستگی سے دروازہ اپنے عقب میں بند کیا اور اس کے قریب جا بیٹھا۔ ایک لمحے کے لیے کمرے میں بوجھل سکوت طاری رہا۔ ہر چیز گویا اپنی جگہ ساکت تھی۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔

"یہ تم نے گھر پر بھی شوٹنگ شروع کر دی؟ تم تو کہتی تھیں میں فلمی کہانیاں اسٹوڈیو میں ہی چھوڑ آتی ہوں۔" میں نے کہا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے پشیمانی کا سا احساس ہوا۔ وہ یقیناً حد سے زیادہ سنجیدہ تھی اور مجھے سنجیدگی سے ہی اس سے پرسش احوال کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ بات نہ جانے کیا تھی لیکن میں نے حسب عادت اسے خواہ مخواہ ہی مذاق میں اڑانے کی کوشش کی تھی۔

"میں نے تمہیں اپنے آنسوؤں کا مذاق اڑانے کے لیے یہاں نہیں بلایا۔" وہ تیز سرگوشی میں بولی "اور میں نے جب کہا تھا کہ میں فلمی کہانیوں کو اسٹوڈیو میں ہی چھوڑ آتی ہوں تو کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ لیکن انسان کی حقیقی زندگی فلمی کہانیوں سے زیادہ دردناک... زیادہ قابل رحم ہے۔"

"آئی ایم سوری۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "تم حد سے زیادہ سنجیدہ معلوم ہوتی ہو۔ آخر ہوا کیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں.... بظاہر تو کچھ بھی نہیں ہوا۔" اس نے گلاس سے ایک گھونٹ بھرا۔ سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور میرے چہرے پر دھواں اگلتے ہوئے بولی "اس قسم کے واقعات عموماً چند دن بعد بھلا دیے جاتے ہیں۔ محفلوں میں چند ایک مرتبہ تاسف آمیز انداز میں ان کا تذکرہ ہوتا ہے پھر لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو جاتے ہیں۔"

اس نے دوسرے گلاس میں وہسکی انڈیلی۔ اس میں تھوڑا سا سوڈا ملایا اور گلاس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "لو۔ تم بھی پیو۔"

میں پینے پلانے کا عادی نہیں تھا اور نہ ہی اسے کوئی اہم عادت سمجھتا تھا۔ مہینوں میں ایک آدھ بار جب کبھی ذات کے کھنڈر میں احساس تنہائی کے جھکڑ کچھ زیادہ ہی شدت سے چلنے لگتے تھے تو میں اپنے آپ کو فراموشی کے سمندر میں غرق کرنے کی کوشش کرتا تھا.... اور یہی معاملہ غالباً ستارہ کا تھا۔ وہ بھی عادتاً پینے والی نہیں تھی تاہم اس کی زندگی میں ڈپریشن کے حملے زیادہ ہوتے تھے اور اس عالم میں وہ فوراً شراب کا سہارا لیتی تھی۔ یہ خیال تھا کہ اگر اس نے اپنی اس کمزوری پر قابو نہ پایا تو وہ عادی پینے والی بن جائے گی۔

ایسے موقعوں پر ایک آدھ بار جب اس نے مجھے پینے کی پیشکش کی تھی تو میں نے ماحول کی تمام تر رومان انگیزی اور ساقی کی تمام تر دلکشی کے باوجود انکار کر دیا تھا۔ لیکن اس روز نہ جانے میرے اعصاب پر دباؤ زیادہ تھا، اس ماحول، اس کیفیت کا اثر تھا، ستارہ کے محسوسات میں، اس کے اپنے ہی انداز میں شریک ہونے کی خواہش تھی۔ یا پھر کوئی اور بات تھی کہ میں نے اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔

بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ اس طرح بھرائی ہوئی آواز میں بولی "عجیب آدمی ہو تم۔ یا تو بالکل ہی پیتے نہیں ہو... اور پینے پر آتے ہو تو ایسے بے ہودہ طریقے سے پیتے ہو۔ تم مانو یا نہ مانو لیکن تمہارے اندر پیاس کا ایک صحرا پھیلا ہوا ہے۔"

"شاید" میں نے مختصراً کہا مجھے اپنے اندر یکدم سناٹا سا محسوس ہونے لگا تھا میرا دل چاہ رہا تھا کہ بالکل خاموش ہو جاؤں اور بس پیتا رہوں۔

وہ میرے لیے دوبارہ گلاس میں انڈیلنے لگی تو میں نے کہا "اس میں سوڈا مت ملانا۔"

اس نے نم آلود، بوجھل اور سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور بے پروائی سے کندھے اچکا کر گلاس مجھے تھما دیا۔ اس کی آنکھوں میں تیرتے ہوئے گلابی ڈورے میری رگوں میں شرارے سے بھر رہے تھے۔ وہ ڈھیلے ڈھالے نائٹ گاؤن میں تھی اور اس کے وجود سے ایک دلفریب مہک اٹھ رہی تھی۔

"عجیب آدمی ہو تم بھی۔" وہ اپنی سگریٹ ایش ٹرے میں رگڑ کر نئی سگریٹ سلگاتے ہوئے بولی۔

"بے شک۔ میں ایک عجیب آدمی ہوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اس نے سگریٹ سلگا کر مجھے دے دی۔ میں نے وہ بھی لے لی اور رندیدوں کی طرح کش لینے لگا۔ چند لمحے کے لیے پھر سکوت چھا گیا۔ ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے اور اپنے اپنے گلاس سے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے رہے۔ میں اب خالص وہسکی زیادہ تیزی سے حلق سے اتارنا نہیں چاہتا تھا۔

آخر ستارہ نے سکوت توڑا "آج میں اپنے وقت کی ایک مشہور فلم اسٹار کے جنازے پر گئی تھی۔ جس کی قیامت جوانی اور حسن بلاخیز اپنے زمانے میں نواب زادوں کو دیوانہ بنائے ہوئے تھا۔ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ آج اپنے دو چھوٹے چھوٹے کمروں کے تنگ و تاریک فلیٹ میں اس عالم میں مردہ پڑی تھی کہ اس کے سرہانے کی طرف تین افراد تھے جن میں سے کوئی اس قابل بھی نہیں تھا کہ تکفین و تدفین کے انتظامات کر سکے اور ان کے اخراجات برداشت کر سکے...."

اس کی آنکھوں میں نمی بڑھنے لگی۔ ایک سسکی سی لے کر وہ بولی "اس کے فلیٹ میں چند برتنوں، ایک بیڈ اور ایک ٹرنک کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چھ ماہ.... سے فلیٹ کا کرایہ نہیں دیا جا سکا تھا۔ جتنا عرصہ وہ بیمار رہی اس کا زیادہ تر وقت ایک خیراتی اسپتال میں گزرا۔ مجھے اور چند دوسرے لوگوں کو اس کی موت کی خبر محض اتفاقاً ملی تو ہم نے جا کر تمام انتظامات کیے۔ آخری دنوں میں اسے گلے شکوؤں، خودداری اور بے بسی کی چڑچڑاہٹ نے اتنا ضدی بنا دیا تھا کہ اس نے سب کو سختی سے منع کر رکھا تھا اس کی بیماری یا موت کی اطلاع فلم انڈسٹری والوں کو ہرگز نہ دی جائے۔"

"اس واقعے نے تمہاری یہ حالت بنا دی؟" میں نے ملامت سے کہا۔

"ہاں، کیا تمہاری نظر میں یہ معمولی واقعہ ہے؟" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔

"نہیں واقعہ تو معمولی نہیں۔ لیکن اس کی بناء پر خود اتنے ڈپریشن میں مبتلا ہو جانا کوئی معقول بات نہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے اس میں اپنا مستقبل نظر آگیا ہے۔ ایکٹرس کا انجام آخر کار یہی ہے۔" وہ گلاس رکھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر بلک بلک کر رونے لگی۔

"یہ کیا بکواس ہے۔" میں نے اسے ڈانٹا اور اس کے ہاتھ چہرے سے ہٹاتے ہوئے اس کے آنسو پونچھ دیے "دنیا میں ایسا کہاں ہوتا ہے؟ یہ کوئی طے شدہ فارمولا تو نہیں ہے۔ کسی بھی شعبۂ زندگی کے تمام لوگوں کا انجام ایک جیسا تو کبھی نہیں ہوتا۔ یہ تو اپنے اپنے حالات، اپنے اپنے مقدر اور کبھی کبھی اپنے اعمال کی بات ہوتی ہے۔"

"لیکن میں بہت ڈر گئی ہوں راّفی!" وہ بدستور روتے ہوئے بولی "اور اعمال میرے بھی کچھ اچھے نہیں ہیں۔ مجھے یک لخت ہی احساس ہوا ہے کہ انسانوں کے اتنے ہجوم میں رہتے ہوئے بھی میں کتنی تنہا ہوں۔"

"یہ سب بے کار وا ہے اور بے کار مکالمے چھوڑو۔ ان سوچوں میں مت الجھو۔ متوازن زندگی گزارو۔ مستقبل پر نظر رکھو اور کبھی کبھی اس کی فکر کرتی رہو۔ مجھے امید ہے تمہارا انجام بخیر ہوگا۔ میں نے بہت سی اداکاراؤں کو دیکھا ہے جنہوں نے جوانی بھی شان سے گزاری اور بڑھاپا بھی آسودگی سے گزار رہی ہیں۔ کسی کسی کا انجام ہی قابل رحم ہوتا ہے۔ اس کی بھی بہت سی وجوہات ہوتی ہیں۔ تم اپنے آپ کو انہی میں شمار کرنے پر کیوں تلی ہوئی ہو؟"

"تمہارے خیال میں یہ سب محض ڈرامے ہیں؟ اور میں یہ مکالمے بول رہی ہوں؟" وہ مجروح لہجے میں بولی۔

"تم میرا مطلب غلط سمجھ رہی ہو۔ میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ بعض اوقات انسان خواہ مخواہ ڈپریش ہونا چاہتا ہے۔ ڈپریشن کو زبردستی اپنے سر پر سوار کر لیتا ہے۔ یہ بھی ایک طرح کی بھوک ہے جو کبھی کبھی بیدار ہوتی ہے۔ یونہی بس اداس ہونے کو جی چاہتا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس موڈ سے باہر آجاؤ۔"

میں نے اپنے گلاس میں کچھ اور انڈیلی، ایک سگریٹ سلگائی۔ اس دوران وہ میری طرف دیکھتی رہی اور ہولے ہولے سسکیاں لیتی رہی۔ پھر اس کا ایک ہاتھ میرے ہاتھ پہ آن ٹکا جو بخار کے مریض کی طرح تپ رہا تھا۔

"تمہارے پاس کیا میرے لیے مشوروں کے سوا کچھ نہیں؟" اس کے ہونٹ لرزائے۔

"مجھے بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کروں؟" میں نے تمام تر اخلاص سے پوچھا۔

"تم مجھ سے شادی کر لو۔" اس نے گویا ہونٹوں کی سیپ میں بند خواہش کا موتی یکدم اگل دیا۔

میں اپنی جگہ یکدم سن سا ہو کر رہ گیا۔ ادھر خالص وہسکی میری کنپٹیوں میں ٹھوکریں مار رہی تھی۔ میں نہ پینے والا آدمی تھا۔ ڈر رہا تھا کہ شراب کے زیر اثر کوئی غلط فیصلہ نہ کر جاؤں۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی۔ میری دوست تھی۔ میرے نا آسودہ لمحوں کی ساتھی تھی لیکن میں تو دل کے فیصلوں پر چلنے والا انسان تھا.... اور میرا دل مجھے ستارہ سے نہیں، راحیلہ سے شادی کرنے کو کہتا تھا۔

یہ میری نہیں اکثر انسانوں کی کہانی تھی جس درخت سے پھل انسان کی جھولی میں گرنے کو بے تاب ہوتا ہے اس سے وہ کنی کترا کر گزر جاتا ہے اور جس درخت سے پھل گرنا اس کے نصیب میں نہیں ہوتا اس کے نیچے وہ جھولی پھیلائے اک عمر کھڑا رہتا ہے!

لیکن کسی محبت کرنے والے کی دل شکنی کرنا بھی میرے لیے بڑا سخت امتحان تھا۔ یوں تو ضرورت پڑنے پر میں بے پناہ سنگدل بھی بن جاتا تھا لیکن اس معاملے میں مجھ سے کوشش کے باوجود سنگدل نہیں بنا جاتا تھا۔ مجھے معلوم تھا ستارہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیسے اسے یہ دل شکن بات بتاؤں کہ میں اس سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔ اور اس کی وضاحت کیونکر ہو، یہ بھی مجھے معلوم نہیں تھا۔

میں نے جلدی جلدی دو تین بڑے بڑے گھونٹ حلق سے اتارے۔ میرے سینے میں آگ تیز ہوتی جارہی تھی۔ میں ایک دوراہے پر کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اسی دوراہے پر کھڑے میری عمر بیت جائے گی؟ ایک طرف ستارہ کا دستِ طلب تھا دوسری طرف راحیلہ کا پیکرِ انکار۔

میرے حلق میں انگارہ سا اٹکا ہوا تھا لیکن بصد کوشش میں نے اسے اگل دیا "میں تم سے شادی نہیں کرسکتا ستارہ!"

"کیوں؟" اس نے سوال کے خنجر سے مجھے کچوکا لگایا۔ اس کی آنکھوں میں نمی بڑھ گئی۔

"یونہی...... بس... اس کی کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"میں ایکٹریس ہوں..... میرا ماضی اچھا نہیں ہے... میں غیر معمولی خوب صورت نہیں ہوں ... نوعمر نہیں ہوں ... کیا اس لیے؟" اس نے مرتعش انگلیوں میں دبی ہوئی سگریٹ ہونٹوں سے لگالی۔

"نہیں۔ میرے نزدیک پسندیدگی اور ناپسندیدگی کے یہ معیار نہیں ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اس کی آنکھیں کسی اجڑے مزار کے دریچوں سے مشابہ نظر آنے لگیں۔ اس کے دل کے نہاں خانوں میں کہیں ماتم بپا تھا۔

"پھر بھی کوئی نہ کوئی جواز تو ہوگا ..... کوئی نہ کوئی دلیل تو ہوگی۔" اس کے لہجے میں وحشتیں بول رہی تھیں۔

"بات دلیل کی نہیں' دل کی ہے۔" میں سچ کے ساحل تک پہنچنے لگا۔

"تمہارے دل میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں؟" اس کے لہجے میں وحشتیں اب ایک نقطے پر سمٹ رہی تھیں۔

"میں یہ بھی نہیں کہہ رہا۔"

"تو پھر تم کیا کہہ رہے ہو؟" وہ یکدم تقریباً چلا اٹھی "تمہاری بات کا کوئی مطلب بھی نکلتا ہے یا نہیں؟"

"مجھے یہ بھی نہیں معلوم۔ میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے گلاس خالی کردیا اور اپنے لیے مزید خود ہی انڈیل لی۔

وہ ساکت بیٹھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ آنسو خود بخود اس کے رخساروں پر پھسلتے جارہے تھے۔ میں اس کے آنسوؤں کو اپنے دل کے تپتے صحرا میں جذب کرلینا چاہتا تھا۔ لیکن جونہی میں نے اسے چھونے کی کوشش کی' اس نے اپنا گلاس مجھ پر کھینچ مارا۔ غنیمت تھا کہ اس کیفیت میں بھی میرے حواس نے اس حد تک میرا ساتھ دیا کہ میں بروقت نیچے جھک گیا اور گلاس دیوار سے ٹکرا کر قالین پر لڑھک گیا۔ عمدہ گلاس تھا۔ ٹوٹا نہیں۔

اس نے یکدم دونوں ہاتھوں سے میرا گریبان پکڑ لیا اور گھٹی گھٹی دیوانگی آمیز سی آواز میں بولی "میں کیا بس تمہاری ناآسودہ راتیں رنگین بنانے کے لیے ہوں؟ میرا کیا صرف یہی مصرف ہے؟ میں کیا تمہاری خواہشوں کا کچرا گھر ہوں؟"

وہ مجھے جھنجوڑنے کی کوشش کررہی تھی۔ جو اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے کچھ دیر اسے کھینچا تانی کا موقع دیا پھر آہستگی سے اپنا گریبان اس سے چھڑالیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ میں نے چند لمحے اسے یونہی رونے دیا۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے دل کا غبار نکالنے کا موقع دے رہا ہوں۔ لیکن جب وہ بولی تو مجھے اندازہ ہوا کہ غبار تو اس کے دل میں جمع ہورہا تھا۔

"تم نکل جاؤ یہاں سے ... فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں قتل کردوں گی۔" وہ سر اٹھاتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھیں انگارہ ہورہی تھیں۔

میں .... جسے شہر کے کئی بڑے بدمعاش اور خطرناک قسم کے لوگ قتل کرنے کی کوشش کرچکے تھے اور اس کوشش میں جان گنوا چکے تھے' اسے وہ قتل کرنے کی بات کررہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ اس کی اس معصوم دھمکی کو حقیقت کا پیرہن دے دوں۔ کوئی مہلک ہتھیار اس کے ہاتھ میں دے دوں اور سر جھکا کر کھڑا ہوجاؤں کہ وہ بصد خوشی مجھے موت کی مہرباں آغوش میں پہنچا دے۔ میں نے اس کے دل میں نارسائی کا جو الاؤ بھڑکایا تھا شاید وہ میرے لہو سے ٹھنڈا ہوجاتا۔ اس کے پندارِ نسوانیت کو جو ٹھیس لگی تھی اس کی تلافی شاید میری جان سے ہوجاتی۔

میں بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ چند لمحے اس کے پاس کھڑا رہا اس نے نفرت سے منہ پھیرلیا۔ آخر کار میں نے شکستہ لہجہ میں کہا "ٹھیک ہے... میں چلا جاتا ہوں۔ ہوسکے تو مجھے معاف کردینا۔"

"آئندہ یہاں کبھی مت آنا۔" وہ پھنکاری "سمجھ لینا تمہارے تاریک لمحوں میں تمہارا دل بہلانے والا کھلونا ٹوٹ گیا۔"

میرے ہاتھ میں سلگتی ہوئی سگریٹ تھی۔ میں نے اسے بجھائے بغیر ایش ٹرے میں رکھ دیا وہسکی سے بھرا گلاس بھی گویا منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں آہستگی سے مڑا اور دبیز قالین پر بے آواز قدموں سے دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے سے نکل کر اسے کھلا ہی چھوڑ کر میں راہداری میں آگیا۔

سیڑھیوں تک پہنچ کر مجھے مڑ کر دیکھنا پڑا۔ وہ ننگے پیروں میرے پیچھے دوڑی آرہی تھی۔ قریب آکر وہ میری ٹانگوں سے چمٹ گئی۔ اور اسی طرح روتے ہوئے بولی "نہیں..... تم مت جاؤ... اس طرح مت جاؤ... مجھ پر شاید دیوانگی کا دورہ پڑا ہے... مجھے معاف کردو۔"

"معافی تو مجھے تم سے مانگنی ہے۔" میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور بازوؤں میں بھرلیا۔ ہم کمرے میں واپس آگئے۔

جب اس کے آنسوؤں کا طوفان تھما اور دل ذرا ٹکا تو وہ بولی "یہ مت سمجھنا کہ میں اپنی کھسیاہٹ دور کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔ میں ویسے ہی گویا برسبیل تذکرہ تمہیں بتارہی ہوں .... ایک ہمدم دیرینہ سے انسان اس طرح کی باتیں کرتا ہی رہتا [illegible] مجھ سے شادی کے خواہش مند تو بہت ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ فلم اسٹار سے شادی کرنے کے خواہش [illegible]وں کی تعداد کا تو اندازہ لگانا بھی مشکل ہوتا ہے۔" میں نے تسلیم [illegible]

"میں عام پرستاروں کو تو شمار ہی نہیں کررہی۔ ان کے بارے [illegible] تو مجھے کچھ صحیح علم نہیں۔ میں تو کچھ خاص خاص لوگوں کی بات [illegible]رہی ہوں۔ دو ڈائریکٹر ہیں .... دو ہیرو ہیں .... ایک ولن ہے ... [illegible]مرتے ہوئے خوبرو اداکار تو کئی ہیں .... چند سیٹھ ہیں جو عموماً ہم [illegible]بی اداکاراؤں کو اسکرین پر دیکھ کر عاشق ہوجاتے ہیں۔ ایک [illegible] وہ قومی ٹیم کا کھلاڑی ہے ..... اور اس طرح کی کئی دوسری [illegible] فصیتیں ہیں۔"

"مجھے تمہاری بات پر قطعاً کوئی شبہ نہیں۔" میں نے دیانت[illegible]اری سے کہا۔

"لیکن مجھے معلوم ہے ان میں سے کسی سے بھی میری شادی کامیاب نہیں ہوگی۔ وہی تنہائیاں اور ان کے ساتھ بہت سی رسوائیاں میرا مقدر رہوں گی۔ ان میں سے کوئی صرف میرے گلیمر سے متاثر ہے اور کوئی شہرت سے۔ کسی کو اس روپے پیسے کا لالچ ہے جو میں اب تک کما چکی ہوں اور آئندہ کماؤں گی۔ کوئی میرا سہارا لے کر آگے بڑھنا چاہتا ہے۔ کوئی مجھ سے نہ جانے کس کس طرح کے فائدے اٹھانے کے منصوبے بنائے بیٹھا ہوگا۔ ظاہر ہے جس بندھن کی بنیاد یہ ہوگی وہ کتنا عرصہ قائم رہے گا؟"

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "لیکن تمہارا معاملہ مختلف ہوتا۔ تم اگر مجھ سے شادی کرتے تو تمہیں مجھ سے کوئی لالچ نہ ہوتا ..... اور اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم قول نبھانے والے آدمی ہو۔ تمہیں مجھ سے محبت نہ رہتی تب بھی تم مجھ سے جان چھڑانے کی کوشش نہ کرتے شادی کو ایک مقدس عہد وپیماں ہی کی طرح نبھاتے۔"

"شاید" میں نے مبہم لہجے میں کہا۔

"حالانکہ میں نے عہد کیا ہوا تھا۔ زندگی میں کبھی تم سے ایسی کوئی بات کرنا تو درکنار' ایسی خواہش بھی نہیں کروں گی۔ اپنے اور تمہارے تعلق کو بالکل بے عنوان رکھوں گی لیکن آج اپنے عہد پر قائم نہ رہ سکی۔ مجھے اس پر شرمندگی ہے۔"

"دوستی اور محبت میں شرمندہ نہیں ہوا کرتے۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "میرے لیے گلاس میں تھوڑی سی اور انڈیلو۔ میری کنپٹیاں سنسنا رہی ہیں۔"

"تو کیا تم چاہتے ہو کہ کنپٹیاں بالکل ہی بھک سے اڑ جائیں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور میرا گلاس ایک بار پھر بھرنے لگی۔ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی اس کی مسکراہٹ میرے دل پر قیامت ڈھا رہی تھی۔

رات کے نہ جانے کس پہر میری آنکھ کھلی کمرے میں وہی نائٹ بلب روشن تھا لیکن میرے اندر اب بھی اندھیرا تھا۔ رگوں میں کھولتے ہوئے آتش فشاں سرد ہوچکے تھے لیکن میرے حلق میں اب بھی انگارے بھرے ہوئے تھے اور میرا سینہ جل رہا تھا۔

ستارہ بے خبر آڑی ترچھی پڑی سورہی تھی۔ میں نہایت آہستگی سے بیڈ سے اترا۔ کونے میں رکھے ہوئے بیڈ روم فریج تک پہنچ کر میں نے پانی کی ایک ٹھنڈی بوتل نکالی اور منہ سے لگالی۔ پانی کو گلاس میں انڈیلنے کا تکلف کرنے کی بھی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ حلق میں پھنسے ہوئے انگاروں پر اگر میں نے جلد از جلد پانی نہ ڈالا تو میرا دم گھٹ جائے گا میں سانس لینے کے قابل ہی نہیں رہوں گا۔

میں نے بوتل خالی کرکے تپائی پر رکھ دی۔ ستارہ تب بھی بے سدھ رہی۔ میں چند لمحے اس کونے میں ساکت کھڑا رہا۔ کمرا اب مجھے اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔ ملگجی روشنی میں مختلف چیزوں کے ہیولے گویا حیرت سے میری طرف تک رہے تھے۔ مجھے اپنا وجود چٹخا چٹخا سا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے اب افسوس ہورہا تھا کہ میں نے کیوں خواہ مخواہ اتنی پی لی تھی۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ لاشعوری طور پر میں کچھ دیر کے لیے خود اذیتی میں مبتلا ہوگیا تھا۔ اپنے آپ کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن کس بات کی؟ یہ مجھے نہیں معلوم تھی۔

موسم خنک تھا لیکن مجھے یکدم کمرے میں حبس محسوس ہونے لگا۔ میرا دل چاہا کہ فوراً وہاں سے نکل بھاگوں۔ میری روح ان دنوں شاید کسی عجیب سے تغیر و تبدل کا شکار تھی۔ مجھے کہیں بھی'

کسی حالت میں بھی قرار نہیں تھا۔ میں کچھ کھو کر بھی بے چین رہتا تھا اور کچھ پا کر بھی مضطرب، لیکن اپنے اوپر میں نے سکون اور ٹھہراؤ کا خول چڑھا رکھا تھا۔

میں نے باتھ روم میں جا کر لائٹ جلا کر ہاتھ منہ دھویا، بال بنائے اور باہر آ گیا۔ ستارہ تب بھی بیدار نہ ہوئی۔ بلکہ اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی تھی۔ میں دبے قدموں اس کے کمرے سے نکل آیا۔ ویسے بھی میری روایت یہی تھی۔ میں کبھی اس کے ہاں صبح تک نہیں ٹھہرا تھا۔ دروازہ میں نے نہایت آہستگی سے اپنے عقب میں بند کر دیا۔ ایک گہری سانس لی اور اپنی سیمابی کو سینے میں سمیٹے نیچے آ گیا۔

باہر آ کر میں نے دیکھا چوکیدار گیٹ کو اندر کی طرف تالا لگائے برآمدے میں سو رہا تھا۔ میں نے اسے ذرا ہلایا تو وہ ہڑبڑا کر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اس نے چارپائی کے سہارے کھڑی اپنی تھری ناٹ تھری رائفل کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن مجھے دیکھ کر ہاتھ واپس کھینچ لیا۔

وہ اپنی واسکٹ کی جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کر میرے لیے گیٹ کھولنے چل دیا۔ دل ہی دل میں یقیناً مجھے گالیاں دے رہا ہو گا کہ اس شخص کو بھی رات کے پچھلے پہر نہ جانے کیا سوجھتی ہے جو منہ اٹھا کر بھاگ نکلتا ہے۔

ستارہ کی کوٹھی کا پورچ زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس میں پورچ پچھلی طرف بھی تھا۔ لیکن ستارہ کی نئی اور پرانی دونوں ہی گاڑیاں بے ہودہ طریقے سے سامنے والے پورچ میں ہی کھڑی تھیں۔ میں اپنی گاڑی باہر ہی گیٹ کے قریب کھڑی چھوڑ آیا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اندر کس قسم کے حالات سے واسطہ پڑے گا اور کتنی دیر لگ جائے گی۔ اندر جانے کے بعد میں گاڑی کو بھول ہی گیا تھا۔

گاڑی کی چھت اور ونڈ اسکرین وغیرہ پر اوس جمی ہوئی تھی۔ اندر بیٹھ کر میں نے انجن اسٹارٹ کر کے وائپر چند لمحے کے لیے چلائے پھر ان کا سوئچ آف کر کے وہاں سے روانہ ہو گیا۔ سڑکوں پر ویرانی تھی۔ دو ایک جگہ میں نے سڑک کے کنارے کسی درخت وغیرہ کے قریب بھکاریوں کو گدڑیوں میں لپٹے پڑے دیکھا۔ فضا میں ایک عجیب سا سکوت تھا۔ کبھی کبھار کوئی گاڑی قریب سے گزرتی تو چند لمحوں کے لیے فضا کچھ مرتعش سی ہو جاتی۔ رات کو سڑکیں سنسان دیکھ کر عام طور پر لوگ گاڑی بہت تیز رفتاری سے چلاتے ہیں لیکن میں نہایت سست رفتاری سے چلا رہا تھا۔

ستارہ کے گھر ٹھہرنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا اور اپنے گھر جانے کو بھی دل نہیں مان رہا تھا۔ مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں کیا چاہتا تھا لیکن میرا رخ بہرحال گھر کی طرف ہی رہا۔ آخر کار میں نے گاڑی اپنے گھر کے سامنے لے جا کر روکی۔ بلند و بالا آہنی گیٹ خود بخود کھل گیا اور گیٹ ہاؤس کے قریب سے گزر کر میں نے گاڑی برآمدے کے قریب لے جا کر روکی۔

میں فوری طور پر گاڑی سے نہیں اترا۔ چند لمحے بے جان انداز میں بیٹھا اپنے اس قلعہ نما مکان کو دیکھتا رہا جو تاریکی اندھیرے میں سر اٹھائے کھڑا تھا۔ کتنی ویرانی تھی اس مکان میں بھی اور میرے سینے میں بھی۔ میرے حواس پر ابھی تک دھواں سا چھایا ہوا تھا۔

دفعتاً اپنے عقب میں ایک ہلکی سی کراہ سن کر میں ساری افسردگی و سستی کو بھول کر تیزی سے پلٹا۔ میرا ہاتھ اس جیب کی طرف چلا گیا جس میں مشین پسٹل رہتا تھا۔

لیکن اسے نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ جو چہرہ میری سیٹ کے عقب سے نمودار ہوا وہ اتنا معصوم تھا کہ کسی گن کا رخ اس کی طرف کرنا زیادتی معلوم ہوتا تھا۔ بکھرے ہوئے سیاہ ریشمی بالوں کے حلقے میں گھرا ہوا وہ ایک بیضوی سا چہرہ تھا۔ گاڑی میں زیادہ روشنی نہیں تھی اس کے باوجود اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی رنگت انتہائی سپید تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں رحم طلب انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔ وہ بہ مشکل سترہ اٹھارہ سال کی لڑکی تھی۔ نہایت نازک اندام اور بچوں کی طرح بھولی بھالی۔

میرے اعصاب یک لخت پوری طرح بیدار ہو گئے۔ میں نے تیزی سے گاڑی سے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے پچھلی اور اگلی سیٹوں کے درمیان فرش پر لیٹ کر سفر کیا تھا۔ نہ جانے کتنی دیر وہ وہاں سکڑی سمٹی لیٹی رہی تھی۔

میں نے اسے نیچے آنے کا اشارہ کیا وہ کراہ کر قدرے رقت آمیز انداز میں گاڑی سے اتر آئی۔ وہ خوفزدہ تو نہیں تھی لیکن اس کی آنکھوں میں پھر بھی رحم کی التجا تھی اس کے چھوٹے چھوٹے مرمریں ہاتھ میرے سامنے تھے اور بالکل خالی تھے پھر بھی محض احتیاطاً میں نے پسٹل نکال لیا۔ اس کی موجودگی میرے لیے کسی بھی بدخواہ کی کوئی چال ہو سکتی تھی۔

"کوئی غلط حرکت مت کرنا ورنہ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔" میں نے تقریباً سرگوشی کے انداز میں اسے خبردار کیا۔

لیکن جب وہ گاڑی سے اتر کر ایک بار پھر کراہ کر سیدھی ہوئی تو مجھے حیرت کا خاصا شدید جھٹکا لگا۔ وہ اتنی کمسن اور فرشتہ صورت سی لڑکی امید سے تھی۔ شاید پورے دنوں سے تھی!

اس کے جسم پر ڈھیلا سا نائٹ گاؤن تھا۔ میں ایک ٹک اسے گھور رہا تھا۔ وہ نہ جانے خنکی کے باعث یا پھر خوفزدہ ہو کر دھیرے دھیرے لرزنے لگی!

"کون ہو تم؟" میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔

وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی "آپ کے خیال میں، میں کون ہو سکتی ہوں؟"

"میں نے تم سے جواب مانگا ہے، سوال نہیں۔" میں نے حقیقتاً ہلکی سی جھنجلاہٹ سے کہا۔ میں جس طرح سے رات گزار کر آ رہا تھا اس سے میری تشنگی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ ستارہ کی طرف سے وہ میرے لیے شب نوازشات تھی لیکن دل کا صحرا کچھ اور تپ رہا تھا۔

میرے لہجے نے گویا اس کے دل پر خراشیں سی ڈال دیں۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نمی جھلملانے لگی۔ پھنسی پھنسی سی آواز میں وہ بہ مشکل بولی "کیا واقعی آپ کو میں اتنی خطرناک نظر آ رہی ہوں کہ آپ نے مجھ پر پستول تان لینا ضروری سمجھا ہے؟"

وہ بے ضرر نظر آ رہی تھی۔ اس کا لباس بھی ایسا نہیں تھا کہ اس میں کوئی ہتھیار چھپا ہونے کا امکان ہوتا لیکن میرے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں بھولی بھالی شکلوں پر بھروسا کر سکتا۔ میں نے مشین پسٹل کی نال جھکا لی لیکن اسے ہاتھ ہی میں رکھا اور اپنا سوال دہرایا "میں نے پوچھا تھا تم کون ہو؟"

"اگر آپ صرف میرا نام جاننا چاہتے ہیں تو وہ نبیلہ ہے۔" وہ میٹھی میٹھی سی آواز میں بولی۔

"پوچھنا تو میں بہت کچھ چاہتا ہوں۔" میں نے بدستور سخت لہجے میں کہا "لیکن سب سے پہلے تم مجھے یہ بتا دو کہ تم کہاں سے اور کس طرح میری گاڑی میں چھپی تھیں؟"

مجھے گاڑی مجبوراً ستارہ کے گھر سے باہر کھڑی کرنی پڑی تھی لیکن ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے میں گاڑی کے بارے میں بہت محتاط رہتا تھا کہ وہ اس میں کسی قسم کا کوئی آلہ فٹ نہ کر دیں۔ اکثر میں کہیں جاتے وقت یہ اطمینان ضرور کرتا تھا کہ میری گاڑی میں بیٹھتے وقت گاڑی مجھے مقفل حالت میں ہی ملی تھی اور جب میں اتر کر کہیں جانے لگتا تھا تو ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ بند کرتے ہی چاروں دروازے خود بخود مقفل ہو جاتے تھے۔

تو پھر لڑکی کس طرح گاڑی میں گھسی تھی؟

وہ جھرجھری سی لے کر بولی "میں میڈم ستارہ کے گھر کے سامنے آپ کی گاڑی میں چھپی تھی۔ آپ کی گاڑی آج شام سے وہیں کھڑی تھی۔"

"گاڑی کا تالا تم نے خود کھولا تھا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔ سب سے زیادہ تشویش مجھے اسی سلسلے میں تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری گاڑی کے کسی بھی دروازے کا تالا کوئی ماہر کار چور بھی نہیں کھول سکتا۔

"جی نہیں، دروازہ مجھے کھلا ہی ملا تھا۔ میرا مطلب ہے، ویسے تو بند تھا لیکن تالا لگا ہوا نہیں تھا۔" وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی "میں نے دل ہی دل میں روتے ہوئے... گڑگڑا کر دعا کی تھی تاکہ اگر میں آپ کی گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاؤں تو مجھے دروازہ غیر مقفل ملے اور خدا کبھی کبھی اپنے گناہ گار بندوں کی بھی سن لیتا ہے۔ میں جب تھر تھر کانپتی ہوئی گاڑی تک پہنچی تو دروازہ غیر مقفل تھا۔"

میں جب ستارہ کے ہاں پہنچا تو بہت عجلت میں تھا۔ شاید دروازہ صحیح طور پر بند نہیں کر سکا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ کی طرف کا دروازہ صحیح طور پر بند نہ ہونے کی وجہ سے باقی دروازے بھی غیر مقفل رہ گئے تھے۔ آتے وقت ویسے ہی میرا دماغ ٹھکانے پر نہیں تھا۔ میں نے غور ہی نہیں کیا تھا کہ دروازہ مجھے مقفل ملا تھا یا غیر مقفل۔

اس نے خود ہی وضاحت کر دی "اندر چھپنے کے بعد میں نے دروازے مقفل کر لیے تھے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کب آئیں گے اور ہر لمحے مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ آپ کے آنے سے پہلے ہی مجھے ڈھونڈ لیا جائے گا، پکڑ لیا جائے گا۔"

اس نے ایک قدم پیچھے ہو کر گاڑی کا سہارا لے لیا اور گویا اپنی کراہ کو دباتے ہوئے بولی "میں تقریباً دو گھنٹے سے پچھلی سیٹوں کے نیچے گھسی ہوئی تھی۔"

"دو گھنٹے.... اس حالت میں...؟" میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"جی ہاں.... میرا خیال تھا کہ آپ کو میری لاش ہی سیٹوں کے نیچے ملے گی۔ کئی بار مجھے گمان گزرا کہ میں مرنے لگی ہوں لیکن میں بڑی ڈھیٹ ہوں جو ابھی تک زندہ ہوں اور آپ کے سامنے کھڑی آپ کے سوالوں کے جواب دے رہی ہوں۔"

میں دیکھ رہا تھا' اس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ چہرہ زرد تھا' ہونٹ بھنچ رہے تھے' آنکھیں بار بار چڑھی جارہی تھیں' اندیشہ تھا کہ کسی بھی لمحے وہ چکرا کر گر جائے گی۔ اس کے چہرے کی معصومیت' اس کے لہجے کی شائستگی میرے دل کو چھو رہی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ باقی پوچھ گچھ اسے اندر لے جانے کے بعد بھی کی جاسکتی تھی۔

میں نے پستول جیب میں رکھ لیا اور اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھی تو اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں لیکن فی الحال میں نے اسے سہارا دینے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے ڈرائنگ روم تک اس کی رہنمائی کی۔ ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی ایک گہری سانس لیتے ہوئے صوفے پر گر کر اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

خاصی دیر تک اس نے نہ تو حرکت کی اور نہ ہی آنکھیں کھولیں۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ اس کی قوت برداشت آخر کار جواب دے گئی تھی اور وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔

"نبیلہ!" میں نے دور ہی سے اسے آواز دی تو اس نے آہستگی سے آنکھیں کھول دیں۔

اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ ہلکی سی کراہ کے ساتھ وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولی "ایک گلاس پانی مل جائے گا؟"

تب میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا "پانی تو مل ہی جائے گا' تم کچھ اور کھانا پینا پسند کرو گی؟"

اس نے براہ راست اس سوال کا جواب نہیں دیا بلکہ نظر چراتے ہوئے بولی "میں نے صبح سے کچھ نہیں کھایا۔"

یکدم ہی میں نے محسوس کیا کہ میں اس کی طرف سے غیر ضروری احتیاط کررہا تھا۔ وہ میرے کسی بدخواہ کی آلۂ کار معلوم نہیں ہوتی تھی اور مجھے نقصان پہنچانے یا کسی سازش میں الجھانے کے ارادے سے نہیں آئی تھی۔ میں نے ملازم سے کہہ کر خانساماں کو بلوایا اور اس کے لیے کافی' سینڈوچ وغیرہ تیار کرنے کا حکم دیا۔ اس دوران وہ صوفے پر نیم دراز' ادھ کھلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔

میں نے بھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ چند لمحے بعد وہ کچھ سنبھل کر سیدھی ہوتے ہوئے بلا تمہید سے انداز میں بولی "لگتا ہے اس مرتبہ میں کامیاب ہو ہی گئی۔ ایک بار میں نے پہلے بھی بھاگنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ لوگ میرے پیچھے آگئے تھے۔ میں گھبراہٹ میں غلط گلی میں مڑ گئی تھی۔ حالانکہ مجھے تیرنا نہیں آتا' اس کے باوجود میں ڈوبی نہیں۔ بعض اوقات انسان کو دریا' سمندر اور نہریں بھی قبول نہیں کرتیں۔ واپس اگل دیتی ہیں۔"

اس کے لہجے میں تلخی قطعاً نہیں تھی۔ نہایت سادگی سے اس نے وہ چند جملے بولے تھے لیکن اس سادگی نے میرے اندر کی افسردگی کو بڑھا دیا تھا۔ تاہم ابھی میں نے اس کے ساتھ زیادہ نرم رویہ اختیار کرنا بہتر نہ سمجھا اور کہا "واپس تو شاید تمہیں میں بھی بھیج دوں لیکن سب کچھ جاننے کے بعد۔"

"اگر مجھے واپس ہی جانا ہے تو ابھی چلی جاتی ہوں۔ خواہ مخواہ کی باتوں میں آپ کا وقت ضائع کیوں کروں۔" اس نے صوفے کے پشتے کا سہارا لیتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھتے ہی لڑکھڑا کر رہ گئی۔

"بیٹھ جاؤ!" میں نے سخت لہجے میں کہا "اب آ ہی گئی ہو تو تم اتنی آسانی سے نہیں جاسکتیں۔ تم واپس جاؤ گی' یہیں رکو گی یا کہیں اور جاؤ گی' یہ فیصلہ اب میں کروں گا۔"

اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔ وہ بے جان سے انداز میں دوبارہ صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ اب میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی اور گویا کسی گہری سوچ میں تھی۔ اس کے چہرے پر بلا کی افسردگی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ کسی عیار' مکار اور شاطر لڑکی کا چہرہ نہیں تھا۔ اس نے معصومیت کا محض نقاب نہیں چڑھا رکھا تھا بلکہ معصومیت اس کے خون میں شامل تھی۔

چند لمحے کے سکوت کے بعد میں نے کہا "آج کی رات اس قسم کے اتفاقات کے لیے اچھی نہیں تھی۔ چھپنے کے لیے تمہیں میری ہی گاڑی ملنی تھی۔"

"میں نے بتایا نا کہ اس کے لیے میں نے دعا کی تھی۔ مدتوں کے بعد تو میری کوئی دعا قبول ہوئی ہے چوہدری صاحب!" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"تم مجھے جانتی ہو؟" میں نے قدرے چونک کر کہا۔

"تھوڑا سا۔" وہ بولی "بس یہ کہ آپ کا نام محمد افضل چوہدری ہے۔ آپ میڈم ستارہ کے دوست ہیں' کبھی کبھار ان کے ہاں آتے ہیں اور شہر کے بڑے آدمیوں میں سے ایک ہیں۔ پتا نہیں کیوں... مجھے یہ گمان تھا کہ اگر میں آپ کی گاڑی میں پناہ لینے اور آپ کے ساتھ وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تو آپ میری مدد کریں گے۔"

اس کے نچڑے ہوئے سے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "لیکن انسان کی امیدیں غلط بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔"

"تم مجھے ساری بات شروع سے بتانا۔ پہلے کچھ کھا پی لو۔" میں نے کہا۔

چند لمحے بعد خانساماں نے ڈرائنگ روم میں کچھ کھانے پینے کا انتظام کردیا۔ میں اسے سہارا دے کر وہاں لے آیا اور بے وقت

ناشتے میں خود بھی شریک ہو گیا۔

پیٹ بھرنے کے بعد اس کے جسم میں گویا جان سی آگئی۔ اجڑے اجڑے سے چہرے پر زندگی کا کچھ رنگ نظر آنے لگا۔

"اب سناؤ اپنی داستان جو یقیناً کافی غم ناک ہو گی۔" میں نے کافی کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔ میری آنکھوں میں ابھی تک انگارے سے بھرے ہوئے تھے۔

"نہیں' کوئی ایسی خاص غمناک نہیں ہے۔" وہ ویران سی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "دنیا میں ایسا ہوتا رہتا ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر نہ جانے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔"

مجھے اندازہ ہوا کہ میرے الفاظ' میرا رویہ اس کے دل پر خراشیں ڈال رہا تھا۔ وہ دل جو زندگی کے مصائب سے پتھر ہو چکا تھا۔

"تم دنیا کی بات چھوڑو' اپنی سناؤ۔" میں نے قدرے نرمی سے کہا۔

اس نے کافی کا مگ میز پر رکھ دیا اور چند لمحے تک اپنے مختصر' نازک اور مرمریں سے ہاتھ کو دیکھتی رہی۔ اس کے ہاتھوں کی پشت پر نیلی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور انگلیاں مرتعش تھیں۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سر اٹھاتے ہوئے بولی "آپ نے کبھی سیٹھ غیاث کا نام سنا ہے؟"

"ہاں.... شاید سنا تو ہے۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن.... غالباً بہت عرصہ پہلے سنا ہے۔ اب یاد نہیں آرہا کہ کس سلسلے میں سنا تھا۔"

"جی ہاں' اگر سنا ہو گا تو کافی عرصہ پہلے ہی سنا ہو گا۔ وہ بجلی کا سامان تیار کرنے والے تین کارخانوں کے مالک تھے۔ خاصی بڑی اسامی تھے۔ شاید اسی لیے تین سال قبل ان کی اکلوتی بیٹی کو اغوا کرلیا گیا تھا جو اس وقت صرف پندرہ سال کی تھی۔"

"اور وہ تم تھیں؟"

"جی ہاں! وہ بدنصیب میں تھی۔" وہ تکلیف دہ حد تک سپاٹ لہجے میں بولی "میرے علاوہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی اور میں بھی خاصی منتوں مرادوں سے پیدا ہوئی تھی۔ ان کی شادی کے کئی برس بعد۔ جب وہ اولاد کی طرف سے تقریباً مایوس ہو چکے تھے اور دوسری شادی کے بارے میں سوچ رہے تھے تب قدرت نے مجھے دنیا میں بھیج دیا۔ نہ جانے کیوں؟ حالانکہ دنیا میں المیہ کہانیوں کی کوئی کمی نہیں تھی' قدم قدم پر بکھری پڑی تھیں لیکن قدرت کو مزید ایک المیہ کہانی تخلیق کرنا تھی۔" وہ خاموش ہو گئی' شاید مزید بولنے کے لیے توانائی مجتمع کررہی تھی۔

"تمہیں کیوں اغوا کیا گیا تھا؟ کوئی خاندانی تنازع وغیرہ تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں' خاندانی تنازعے کا تو کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں تھا۔ مجھے تو بھاری تاوان کے لیے اغوا کیا گیا تھا۔ میرے والد فوراً ہی تاوان دینے کے لیے تیار بھی ہو گئے تھے۔ وہ اغوا کنندگان کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کررہے تھے۔ سخت گھبرائے ہوئے اور پریشان تھے۔ ایک شریف' حساس اور نیم بیمار باپ اپنی اکلوتی اولاد کے لیے جتنا پریشان ہوتا ہے وہ اتنے ہی پریشان تھے۔ خصوصاً جبکہ اولاد ایک نوخیز لڑکی تھی۔"

وہ اپنے سراپا پر نظر ڈالتے ہوئے خود استہزائی انداز میں مسکرائی لیکن اس کا لہجہ بدستور سپاٹ ہی رہا "وہ تاوان کی بہت بڑی رقم لے کر گاڑی میں روانہ ہوئے۔ وہ غالباً اتنے خوفزدہ اور پریشان تھے کہ دل کے سہارے کے لیے انہوں نے امی کو بھی ساتھ لے لیا' یا ممکن ہے امی نے خود ان کے ساتھ چلنے کی ضد کی ہو۔ مجھے زیادہ صحیح طور پر نہیں معلوم۔ ڈرائیونگ ابو خود کررہے تھے۔ اپنی گھبراہٹ' پریشانی اور اعصابی تناؤ کی وجہ سے انہوں نے گاڑی ایک ٹرک سے ٹکرادی۔ ممکن ہے غلطی ٹرک والے کی رہی ہو یا پھر بس یہ المیہ در المیہ ہو۔ قدرت کبھی کبھی المیوں کی زنجیر بنادیتی ہے۔ ایک کڑی سے دوسری کڑی منسلک ہوتی ہے۔"

میں اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہتا تھا۔ بساط بھر اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ اس کی کہانی میں جھوٹ کی آمیزش تو نہیں تھی لیکن وہ مجھ سے نظر نہیں ملا رہی تھی۔ اس دوران اس نے چہرے پر ہاتھ پھیرا تو میں نے دیکھا کہ اس کی انگلیوں کا ارتعاش بڑھ چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے لہجے کو جتنا سپاٹ اور اپنے آپ کو جتنا پرسکون رکھنے کی کوشش کررہی تھی' اندر ہی اندر زیادہ ٹوٹ پھوٹ رہی تھی۔

"امی اور ابو اس حادثے میں موقع پر ہی مرگئے!" ایک گہری سانس لے کر اس نے یہ جملہ گویا کسی بھاری پتھر کی طرح اپنی زبان سے اتار پھینکا اور میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے اس کی ذات میں پھیلے ہوئے کھنڈر کی ویرانی کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ میرے شکوک و شبہات دور ہوتے جارہے تھے۔ مجھے اس پر اعتبار آتا جارہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میں نے اپنے اغوا کنندگان کو آپس میں جو باتیں کرتے کبھی کبھار سنا...... اور ایک آدھ مرتبہ جو ادھر ادھر پڑے ہوئے اخبارات میری نظر سے گزرے' ان سے اندازہ ہوا کہ حادثے کے بعد اس رقم کا بھی کچھ پتا نہیں چلا تھا جو امی' ابو لے کر روانہ ہوئے تھے۔ وہ پولیس کو بھی میرے اغوا کی اطلاع دے چکے تھے اور بالا بالا اپنے طور پر بھی معاملات طے کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ حادثے میں میرے والدین کے انتقال کے بعد پولیس بھی حرکت میں آگئی اور اغوا کنندگان نے بھی محسوس کرلیا کہ کھیل بگڑ چکا ہے۔ ان کی کمند لب بام آکر ٹوٹ گئی تھی۔ رقم ان کے ہاتھ آتے آتے نکل گئی تھی اور رقم دینے والے دنیا سے رخصت ہوچکے تھے مگر وہ پرانے پیشہ ور تھے' انہوں نے مجھے چھوڑا نہیں۔ تاوان کی رقم تو چالیس لاکھ طے ہوئی تھی لیکن وہ بازی الٹ جانے کے بعد انہوں نے مجھے' بھاگتے چور کی لنگوٹی بھلی' کے مصداق ڈیڑھ لاکھ روپے میں ایک شخص کے ہاتھ بیچ دیا جس نے پہلے کئی ماہ تک خود مجھے اپنے عشرت کدے میں رکھا اور جوانی کی دہلیز پر کھڑے ہوئے میرے لڑکپن کو خوب روندا۔ پھر جب وہ کچھ نئی "مصروفیات" میں الجھ گیا تو اس نے مجھے اٹھا کر اپنے کوٹھی خانے میں ڈال دیا۔ دستر خوان بہت بھرا ہو تو کھانے والے ایک آدھ ڈش حسب خواہش کھانے کے بعد جانوروں کے سامنے بھی ڈال دیتے ہیں۔ میرا مطلب ہے اپنے سے بڑے جانوروں کے سامنے۔ لیکن شاید میں غلط کہہ رہی ہوں۔ میں جس کے قبضے میں تھی' اس سے بڑا حیوان مجھے بعد میں بھی کوئی نہیں ملا۔ میں نے اس کے پاس جو چند ماہ گزارے' میری اس دور کی ذہنی اور جسمانی اذیت کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا۔ ویسے بھی اس وقت میری عمر ہی کیا تھی! میں ناز و نعم میں پلی ہوئی ساڑھے پندرہ سال کی لڑکی تھی۔ میٹرک کا امتحان دے رہی تھی جب مجھے اغوا کیا گیا......"

آخر کار اس کے ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ کہاں تک ضبط کرتی؟ اس نے اپنے اوپر بے حسی کا جو خول چڑھایا ہوا تھا' یکدم ہی ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس نے میز پر سر رکھ کر بازو کے حلقے میں منہ چھپالیا اور خاموشی سے رونے لگی۔ نہ جانے کیونکر وہ کوئی آواز نکلنے نہیں دے رہی تھی۔ اس کے جسم کو خفیف سے جھٹکے لگ رہے تھے۔ صرف انہی سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ رو رہی تھی۔

میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ رو لینا ہی اس کے حق میں بہتر تھا۔ اس کے بے حسی کے خول تلے نہ جانے کتنی اذیتیں چھپی ہوئی تھیں۔ آنسو ان زخموں کے لیے معمولی سا مرہم تھے۔ ویسے بھی کسی ستم رسیدہ عورت کو اپنے سامنے روتے دیکھنا میرے لیے بڑی آزمائش تھی۔ اس کو چپ کرانے کا مجھے سلیقہ نہیں تھا۔ میں ساری تیزی و طراری بھول جاتا تھا' الفاظ میری زبان کی گرفت سے نکل جاتے تھے۔ اور اگر کچھ الفاظ سوجھتے بھی تھے تو دوسروں کی اذیت کے سامنے وہ بے حد حقیر محسوس ہوتے تھے۔ لفظوں سے بھلا کس کے زخم بھرتے ہیں؟

نیچے ہی نیچے کسی طرح اس نے آنکھیں خشک کرلیں اور چہرہ پونچھ لیا۔ اس نے جب سر اٹھایا تو صرف اس کی آنکھوں کی ہلکی سی سرخی اور پپوٹوں کے نم کنارے بتا رہے تھے کہ وہ روئی تھی۔ چہرہ ایک بار پھر سپاٹ تھا۔ اسے گویا کچھ خیال آیا اور وہ قدرے متجسس سے لہجے میں بولی "آپ کو معلوم بھی ہے کوٹھی خانہ کسے کہتے ہیں؟"

"ہاں۔ کسی حد تک معلوم ہی ہے۔" میں نے مبہم لہجے میں کہا۔ یہ اصطلاح عیاشی کے ان اڈوں کے لیے استعمال کی جاتی تھی جو کوٹھیوں میں قائم تھے۔ کال گرلز کے مسکن تھے۔ بعض جگہوں سے کال گرلز سپلائی بھی کی جاتی تھیں اور بعض جگہوں پر اندر ہی تمام انتظامات موجود تھے' کہیں جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کوٹھی خانوں کے بھی مختلف معیار تھے۔ بعض تو بہت اونچے تھے۔ وزیر' سفیر' بڑے بڑے معززین اور کروڑپتی سیٹھ ان سے مستفید ہوتے تھے۔ ان کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے والے پولیس افسران تبادلے اور تنزلی ہوجاتی تھی۔ دست تعاون دراز رکھنے والوں کی خوشحالی و نیک نامی میں اضافہ ہوتا تھا۔

تاہم اس سلسلے میں میرا کوئی خاص عملی تجربہ یا مشاہدہ نہ تھا۔ جب خرابات نوجوانی میں بھٹکنے کا سلسلہ جاری تھا تو اپنے ابتدائی ساتھی اور تجربہ کار دوست شرفو کے ساتھ ایک معمولی کوٹھی خانے پر جانے کا اتفاق ہوا تھا جس کی یاد بھی دھندلا تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے نبیلہ بولی "آپ کو شاید معلوم نہ ہو کہ جس گلی میں میڈم ستارہ کی کوٹھی ہے' اسی لائن کی آخری بہت بڑی... کارنر کی کوٹھی میں نہایت اونچے درجے کا کوٹھی خانہ کھلا ہوا ہے؟"

"نہیں' مجھے نہیں معلوم۔" میں نے اعتراف کیا۔

"آپ کو ایسی جگہوں پر جانے کی ضرورت پیش نہیں ہوگی۔" وہ تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے بولی "ویسے...... اگر آپ کو اس جگہ کے بارے میں علم ہوتا تب بھی آپ منہ اٹھا کر یوں وہاں نہیں جاسکتے تھے۔ اس کا اپنا ایک نظام ہے۔ بڑے بڑے لوگوں کی سرپرستی حاصل ہے اسے۔ کسی مخصوص ریفرنس کے کوئی وہاں گھس نہیں سکتا اور جب تک آدمی کو اچھی طرح پرکھ لیا جائے' کوئی جان نہیں سکتا کہ وہاں اصل میں کیا ہوتا ہے۔ چھوٹے موٹے آسودہ حال لوگ بھی وہاں نہیں جاسکتے بلکہ وہ اونچے طبقے کے لوگوں کے لیے ہے۔"

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے' وہاں تو کونے پر کسی بیوٹی پارلر کے نام کا خوب صورت سا بورڈ نصب ہے!" میں نے کہا۔

"درست ہے۔ اس طویل و عریض کوٹھی کے ایک بیرونی ہال میں چھوٹا سا لیکن نہایت جدید اور بے حد مہنگا بیوٹی پارلر بھی موجود ہے۔ بیوٹی پارلر بھی اس سلسلے میں بہت کام آنے والی چیز ہے نا۔ آڑ کی آڑ بھی ہے اور دوسرے بے شمار فائدے بھی۔ نیا ٹیلنٹ بھی خود بخود متعارف ہوتا رہتا ہے اور اپنے پرانے مکینوں کی آرائش و زیبائش کا کام بھی شاندار طریقے سے کم لاگت میں ہوتا رہتا ہے۔ اگر کوئی چاہے تو جسم فروشی اور مشاطگی میں بڑا قریبی تعلق پیدا کرسکتا ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "آپ کو یقین نہیں آئے گا کہ اس کوٹھی خانے کو جن لڑکیوں کی خدمات حاصل ہیں' ان میں نہایت اونچے کالجوں میں پڑھنے والی لڑکیاں اور بعض لیڈی ڈاکٹرز تک شامل ہیں۔"

میرے کان ایک لمحے کے لیے ذرا سنسنا اٹھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "اور مجھ جیسی کئی لڑکیاں وہاں قیدی کی سی زندگی بسر کررہی ہیں جو ابھی تک "قابل اعتبار" قرار نہیں پاسکیں۔ آپ تصور نہیں کرسکتے کہ ان میں کیسی کیسی خوب صورت' سلجھی ہوئی اور اچھے گھرانوں کی لڑکیاں ہیں جو مختلف حالات کا شکار ہوکر نہ جانے کن کن مرحلوں سے گزرتی ہوئی وہاں تک پہنچ گئی ہیں۔"

"تم وہاں کب سے تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"دو سال سے۔" اس نے جواب دیا۔

"اس دوران تم نے بھاگنے کی کوشش کی؟"

"ہاں۔ تین مرتبہ اس سے پہلے اور آج یہ میری چوتھی کوشش ہے۔ ابھی یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ میری یہ چوتھی کوشش بھی کامیاب ہے یا نہیں۔ پہلی تین کوششوں میں تو اتنی دور بھی نہیں نکل سکی تھی۔ یہ میں نہیں بتاسکتی کہ ان کوششوں کے بعد مجھ پر کیا گزری تھی۔ الفاظ میرا ساتھ نہیں دیں گے۔ الفاظ کو بھی شرم آجائے گی۔"

اس نے پہلو بدلا اور پیٹ پر ہاتھ رکھ کر آہستگی سے کراہ کر بولی "ایک کوشش میں تو ایک نوجوان نے میرا ساتھ دینے کی کوشش کی تھی۔ اس کی جذباتیت ذرا ابھر آئی تھی۔ تجربہ کار اور کھائے کھیلے ہوئے لوگ تو اس چکر میں نہیں پڑتے۔ وہ تو اپنے مقصد کی تکمیل کے بعد اپنی مصروفیات کی دنیا میں لوٹ جاتے ہیں۔ انہیں معلوم ہوتا ہے' ہم جیسی لڑکیوں کے ساتھ کوئی نہ کوئی کہانی تو لگی ہی ہوتی ہے لیکن وہ کہانیوں میں نہیں الجھتے۔ وہ صرف جوانی سے مطلب رکھتے ہیں' کہانی سے نہیں۔"

"نوجوان نے تمہارا ساتھ دیا تو کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"جان سے ہاتھ دھو بیٹھا وہ بے چارہ!" اس کی آواز ایک لمحے کے لیے رندھ سی گئی۔ "بھاگتے ہی ہمیں پکڑلیا گیا۔ اسے مار دیا گیا اور اس کی موت کو حادثے کا رنگ دے دیا گیا لیکن وہ میرے دل میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ میں نے صرف اسی سے محبت کی ہے۔ اور وہ بھی اس کے مرنے کے بعد۔ میرا خیال ہے' میں جب تک زندہ رہوں گی اس سے محبت کرتی رہوں گی۔ وہ ہمیشہ میرے دل میں رہے گا......"

اس نے ایک سسکی سی لی لیکن آنکھ سے کوئی آنسو نہ نکلنے دیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ اپنے لہجے کی لرزش پر قابو پاتے ہوئے بولی "زندگی میں بہت سے لوگ دعوئ کرتے ہیں کہ وہ آپ کے لیے جان دے دیں گے مگر حقیقتاً کسی کے لیے جان دینا بڑا مشکل کام ہے۔"

"کیا وہی تمہارے ہونے والے بچے کا باپ تھا؟" میں نے ہلکی سی ہچکچاہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"نہیں" اس کا لہجہ ایک بار پھر سپاٹ ہونے لگا "میری کوکھ کی دہلیز پر اس روح کے قدم رکھنے سے کچھ عرصہ پہلے ہی وہ اس دنیا سے رخصت ہوچکا تھا۔"

"تو پھر اس کا باپ کون ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم۔"

میری کنپٹیوں میں ایک بار پھر سائیں سائیں ہونے لگی۔ وہ سرجھکاتے ہوئے بولی "نہ جانے تمام تر احتیاطوں کے باوجود یہ بات کیسے ہوئی۔ کوٹھی خانہ چلانے والے اور خاص طور پر میڈم بہت ناراض ہے۔ وہ تو ان کی جو ایک خاص لیڈی ڈاکٹر ہے' اسی نے منع کردیا کہ لڑکی کی جان کا خطرہ ہے؟ ورنہ وہ تو اس روح کو میری شاخ بدن سے نوچ پھینکتے۔"

"تمہاری عمر کتنی ہے؟" اچانک میں نے بے ارادہ سے انداز میں پوچھا۔

"میں ابھی پورے اٹھارہ سال کی نہیں ہوئی۔" اس نے جواب دیا۔

"میں تو تمہیں اٹھارہ سے بھی کم کی سمجھ رہا تھا۔" میں نے کہا۔ "لیکن تمہارے انداز گفتگو میں بے پناہ پختگی اور شائستگی ہے۔ تمہاری عمر کی لڑکیاں اتنے مرصع انداز میں گفتگو نہیں کرتیں۔"

"مجھے جس پیشے میں ڈال دیا گیا ہے اس میں لڑکی چاہے تو اپنے آپ کو غلیظ گالیوں سے بھری' انتہا درجے کی شرمناک گفتگو کی عادی بھی بناسکتی ہے اور چاہے تو مرصع گفتگو بھی سیکھ سکتی ہے۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "اور شاید اپنے رجحان کی بھی بات ہوتی ہے۔ میں کھاتے پیتے گھر کی ہونے اور انگلش میڈیم اسکول میں پڑھنے کے باوجود خالص اردو میڈیم قسم کی لڑکی تھی۔ نویں جماعت سے میں نے ایک موٹی سی ڈائری میں نہایت دردناک اشعار جمع کرنے شروع کردیے تھے۔ تمام شاعروں اور ادیبوں کو پڑھ ڈالا تھا۔"

اس نے ایک طویل سانس لی جو ایک خاموش نوحے سے مشابہ تھی۔ یکدم ہی وہ تھک سی گئی۔ ٹوٹتی ہوئی سی آواز میں بولی "اب سنانے کو صرف باتیں رہ گئی ہیں۔ وہ بھی نہ جانے کس لمحے ختم ہوجائیں۔ ڈھائی سال میں ایک خوب صورت زندگی ختم ہوگئی۔ سسک سسک کر.... گھسٹ گھسٹ کر.... غلاظتوں میں ڈوب کر!"

"ابھی یہ فیصلہ مت دو۔ ہوسکتا ہے اس موڑ سے کسی نئی زندگی کا آغاز ہونے والا ہو۔" میں نے اتنی دیر میں پہلی بار کچھ ہمت افزا سی بات کرنے کی کوشش کی "کیا تمہارے والدین کے بعد کسی نے تمہیں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

پہلی بار اس کے تاثرات میں بہت نمایاں تبدیلی آئی۔ اس کا سپید اور روئی کے گالے جیسا چہرہ ایک لمحے کے لیے کھنچ کر رہ گیا۔ پھر وہ زہریلے انداز میں ہنس دی "یہ المیہ در المیہ زنجیر کی ایک اور کڑی ہے۔ میں اپنے والدین کی دولت و جائیداد کی اکلوتی وارث تھی۔ مجھے پتا چلا ہے کہ اس تمام دولت و جائیداد پر قریبی رشتے داروں نے قبضہ کرلیا ہے۔ انہوں نے کچھ شواہد کی مدد سے مجھے مردہ قرار دلوادیا ہے۔ میں تو ان کے لیے تاریکی میں چھپا ہوا سب سے بڑا خطرہ ہوں۔ مجھے ڈھونڈنا تو خیر کسی نے کیا تھا' میرا خیال ہے میں تو اب کسی انتہائی مضبوط سہارے کے بغیر اپنے گھر جانے کی کوشش بھی کروں گی تو مجھے قتل کردیا جائے گا۔ یہ کنویں سے نکل کر کھائی میں گرنے والی بات ہوگی۔"

"کوٹھی خانہ چلانے والے لوگ کون ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا انتظام چلانے والی تو "میڈم" ہے۔ اس کا اصل نام مجھے ... بلکہ شاید کسی کو بھی نہیں معلوم۔ سب اسے صرف میڈم کہتے ہیں۔ شاید زرینہ یا روزینہ اس کا اصلی نام ہے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ بڑی خطرناک عورت ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی خطرناک عورت نہیں دیکھی۔ تین چار اور بھی خطرناک اور بدمعاش سے لوگ کوٹھی میں اس کی مدد کے لیے اِدھر اُدھر کونے کھدروں میں موجود رہتے ہیں۔"

"تمہاری رہائش اسی کوٹھی میں تھی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' اوپر کے ایک کمرے میں جس کی کھڑکی میں گرل لگی ہوئی ہے۔ اس کھڑکی سے میں آپ کو میڈم ستارہ کے ہاں آتے جاتے دیکھا کرتی تھی۔ کوٹھی خانے والے میڈم ستارہ کو جانتے ہیں۔ گو کہ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا نہیں ہے اور نہ ہی میڈم ستارہ کو علم ہے کہ ہمارے ہاں کوٹھی خانہ ہے۔"

"وہاں اور بھی لڑکیاں ہیں؟"

"کئی ہیں جو وہیں رہتی ہیں۔ اور بہت سی ایسی ہیں جنہیں بوقت ضرورت بلایا جاتا ہے۔ ان میں بہت اچھی اچھی لڑکیاں ہیں جن کے بارے میں شاید کسی کو شبہ بھی نہ ہو کہ وہ کال گرلز ہیں۔ سب ایک مربوط نظام کے تحت کام کرتی ہیں۔ وہاں کو: ورڈز چلتے ہیں۔ سب لڑکیاں کوٹھی خانے کی وفادار ہیں۔ سب سے زیادہ ناقابلِ اعتبار میں ہی تھی اسی لیے سب سے زیادہ سختی مجھ پر ہی تھی ورنہ جو وہاں رہتی ہیں انہیں کچھ نہ کچھ آزادیاں حاصل ہیں۔ اگر و بیشتر انہیں کسی کے ساتھ بھی بھیج دیا جاتا ہے۔ بلکہ پچھلی گرمی میں ایک تو کسی کے ساتھ کچھ دن مری میں بھی گزار کر آئی تھی انہوں نے اس زندگی کو قبول کرلیا ہے۔ سب سے کم عمر میں تھی۔ ابھی میرے "سدھرنے" کا انتظار کیا جارہا تھا۔"

"کوٹھی خانے کی مالک "میڈم" ہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اسے چلانے کے سلسلے میں اہم ترین عورت وہی لیکن مالک ایک اور شخص ہے۔ اس کا نام مختار رفیق ہے۔" اس نے بغور میری طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

میں کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ میرے حواس پر جو دھند چھائی ہوئی تھی۔ وہ یکدم دور ہوگئی۔ وہ بدستور غور سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ عجیب سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "یہ آپ کے لیے اجنبی نہیں ہے نا؟"

مجھے ایک بار پھر شبہ ہوا کہ وہ کسی سازش کے تحت تو انداز میں میرے ساتھ نہیں آئی تھی؟ لیکن اسی لمحے اس نہایت معصومانہ اور مخلصانہ انداز میں پوچھا "مختار رفیق سے آپ کی کس بات پر دشمنی ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم" میں نے محتاط لہجے میں کہا "اگر کوئی دشمنی ہے تو اسی کی طرف سے ہے۔ وجہ بھی اسی کو معلوم ہوگی۔ میں خود کسی سے دشمنی مول نہیں لیتا۔ کبھی کبھار میں کسی کے اعمال بھول بھلیوں میں بھٹکتا ہوا اس سے جا ٹکراتا ہوں اور وہ اسے انا کی جنگ بنالیتا ہے۔ لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"میں نے اتفاق سے کوٹھی خانے میں آپ کے بارے ہونے والی گفتگو کا کچھ حصہ سنا تھا۔ وہیں تو آپ کا تذکرہ سنتے اور پھر کھڑکی سے آپ کو دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ آپ افضل چوہدری ہیں۔ مختار رفیق کا ایک خاص آدمی دو تین روز ہی کوٹھی خانے آیا تھا اور میڈم سے باتیں کررہا تھا۔ آپ بارے میں بات ہورہی تھی کہ آپ ستارہ کے ہاں آتے ہیں۔ سے آپ کو اٹھالیا جائے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہورہا تھا کہ رفیق کو کسی وجہ سے آپ پر بہت غصہ ہے۔ میں وہاں درحقیقت صرف اپنے لیے ہی نہیں' آپ کے لیے بھی بھاگی مختار رفیق بہت خطرناک آدمی ہے۔ میں نے سوچا' آپ کو اس بارے میں خبردار کروں گی۔ یہ گویا میری طرف سے آپ کی خیر ہوگی۔ شاید اس کی وجہ سے آپ کو مجھ پر کچھ ترس آجائے اور میری بھی کچھ مدد کریں۔"

"تم وہاں سے بھاگیں کس طرح؟" میں نے پوچھا۔

"آج اتفاق سے وہاں میڈم نہیں تھی اور وہ خطرناک بدمعاش جو اسلحہ لیے اِدھر اُدھر منڈلاتے رہتے ہیں' ان میں بھی صرف دو تھے۔ باقی دو نہ جانے کہاں گئے ہوئے تھے۔ میری طرف آج کل ان کی توجہ بھی ذرا کم تھی کیونکہ اب میں نے شکست خوردگی اختیار کرلی تھی۔ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑی رہتی تھی۔ انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ میں اس حالت میں بھاگنے کی ہمت کروں گی......"

اس نے گویا ان لمحات کو یاد کرتے ہوئے جھرجھری سی لی "میں چھت پر جاکر برابر والی کوٹھی کی چھت پر اتری۔ ان کی سیڑھیوں کا دروازہ بند تھا اس لیے ایک دیوار پر اتری۔ اس دیوار پر چلتی ہوئی ایک کھڑکی کے چھجے کی سیدھ میں پہنچی۔ پہلے چھجے پر کودی جہاں سے اوندھے منہ گرتے گرتے بچی۔ چھجے پر سے گلی میں کودی اور آپ کی گاڑی میں آچھپی۔ آج شاید قسمت کچھ مہربان تھی۔ آپ کے روانہ ہونے تک کسی کو میرے فرار کا علم نہیں ہوسکا تھا۔"

میں دل ہی دل میں اس اتفاق پر حیران تھا۔ کیا اس لڑکی کو بھی مختار رفیق کے بارے میں ایک کہانی لے کر اور خود اس کہانی کا ایک قابلِ رحم کردار بن کر انہی دنوں میرے سامنے آنا تھا؟ بیٹھے بٹھائے اس شخص کو میں نے خواہ مخواہ ہی اپنی زندگی پر مسلط کرلیا تھا۔ میں اس ڈور میں کچھ زیادہ ہی الجھتا جارہا تھا۔ نہ جانے یہ کہاں تک پھیلی ہوئی تھی اور کتنی الجھی ہوئی تھی۔

"اس کا مطلب ہے مختار رفیق ہی وہ شخص ہے جس کے ہاتھ اغواکنندگان نے تمہیں فروخت کیا تھا اور خود غائب ہوگئے تھے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور نظریں نیچی رکھتے ہوئے بولی۔ "اس کوٹھی خانے میں' میں تقریباً چھ ماہ تک صرف اسی کے لیے مخصوص رہی' کسی اور کو میری جھلک بھی نہیں دکھائی گئی۔ پھر اس کا آنا جانا بہت کم ہوگیا۔ آتا بھی تھا تو میرے لیے نہیں۔"

"لگتا ہے اس شخص کی قسمت میں بھی دولت تو بہت ہے لیکن کوئی باعزت کاروبار نہیں ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"بہرحال آپ اس سے بچنے کا بندوبست کرلیں چوہدری صاحب!" اس کی آنکھوں میں خوف در آیا "آپ کی جان کو سخت خطرہ ہے۔ اس نے حکم دے دیا ہے کہ آئندہ جب بھی آپ ستارہ کے ہاں آئیں تو آپ کو اغوا کرلیا جائے۔ آپ کو اندازہ ہی ہوگا کہ وہاں کسی کو اغوا کرنا زیادہ مشکل نہیں۔ زیادہ تر کوٹھیاں بڑی بڑی ہیں۔ رات کو تو کیا' دن میں بھی گلیاں ویران رہتی ہیں۔ پڑوسی کو پڑوسی کا پتا نہیں ہوتا۔"

اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں اور چہرے کی معصومیت دیکھ کر مجھے ہنسی آگئی۔ وہ ذرا سنبھلتے ہوئے بولی "آپ اس معاملے کو مذاق میں نہ لیں۔"

"نہیں' میں ہرگز مذاق میں نہیں لے رہا۔" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "لیکن تمہیں معلوم ہے اس وقت مختار رفیق کہاں ہے؟"

"نہیں' لیکن کوٹھی خانے میں اس کے بارے میں مجھے کچھ ہلچل سی محسوس ہوئی تھی۔ کچھ ایسا لگا تھا جیسے اس کے بارے میں کوئی بری خبر آئی ہو۔ لیکن بات کیا تھی یہ مجھے معلوم نہیں ہوسکا۔" اس نے جواب دیا۔

"میرا اندازہ ہے کہ اس وقت وہ خاصی زخمی حالت میں کسی پرائیویٹ اسپتال میں پڑا ہوگا۔" میں نے کہا۔

اس کی آنکھیں دوبارہ پھیل گئیں "اسے آپ نے اس حال پہنچایا ہے؟"

"ہاں۔ اور اب میں سوچ رہا ہوں' موقع اچھا تھا.... لگے ہاتھوں اسے قبرستان ہی پہنچا دیا ہوتا تو اچھا تھا۔" میں نے بے زاری سے کہا۔

اسے گویا یقین نہیں آرہا تھا کہ مسلح محافظوں کے حلقے کے بغیر معززانہ لباس اور بیش قیمت گاڑی میں تنہا پھرنے والا اور سہایت شائستہ و مہذب نظر آنے والا شخص اس قسم کے دعووں کا اہل تھا۔ میں اسے یقین دلانے کی زیادہ کوشش کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میری شخصیت کا یہی تاثر بہتر تھا۔

"اس صورت میں تو آپ کو زیادہ محتاط رہنا چاہیے' زخمی سانپ زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔" وہ بولی۔

"تم اس سلسلے میں قطعاً کوئی فکر نہ کرو۔" میں نے ملائمت سے کہا "مجھے اغوا کرنے' ہلاک کرنے اور میری تکا بوٹی کرنے کی حسرت دل میں لیے کئی عظیم شخصیتیں دنیا سے رخصت ہوچکی ہیں۔ آگے اللہ مالک ہے۔ تم بتاؤ کہ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم" وہ سادگی سے بولی "پہلے تو بس وہاں سے نکل آنے کا تصور ذہن میں تھا۔ کچھ نہیں معلوم تھا کہ اس کے بعد کیا ہو؟"

"میں بھی تمہارے مسائل پر ذرا اطمینان سے بیٹھ کر غور کروں گا۔" میں نے کہا "فی الحال میری ذہنی حالت ایسی نہیں ہے کہ اطمینان سے بیٹھ کر غور کرسکوں۔ مسئلہ یہ بھی ہے کہ میں تمہیں اس گھر میں بھی نہیں رکھ سکتا۔"

"کیوں' کیا آپ شادی شدہ ہیں؟" اس نے قدرے چونک کر پوچھا۔

"شادی شدہ ہوتا تو اب تک تمہیں بہت اچھی طرح معلوم ہوچکا ہوتا۔" میں نے کہا "مسئلہ یہ نہیں ہے۔ میرے کچھ دوسرے مسائل ہیں' کچھ مصلحتیں ہیں۔ میرے حالات اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ تم جیسے مسائل کا شکار کسی لڑکی کو اس گھر میں رکھ سکوں۔"

"آپ کو اپنے اوپر کوئی الزام آنے کا خطرہ ہوگا؟ بدنام ہونے کا اندیشہ ہوگا؟" وہ ہلکے سے تاسف سے بولی۔

"ان باتوں کی مجھے کوئی خاص پروا نہیں ہوتی۔ لیکن آج کل میں ذرا محتاط ہوں۔ کچھ لوگ ہیں جو میری کسی بھی کمزوری سے

فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ میں اپنی شخصیت کے ساتھ کوئی ذرا سا بھی کمزور پہلو وابستہ نہیں رکھنا چاہتا لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اور بھی کئی محفوظ ٹھکانے ہیں۔ میں خود تمہیں کہیں چھوڑ کر آؤں گا جہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ اس دوران میں کسی فیصلے پر بھی پہنچ جاؤں گا کہ تمہارے بارے میں کیا کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ سر جھکا لیا اور خاموش رہی۔ لیکن جب میں نے غور کیا تو احساس ہوا کہ وہ جس پوزیشن میں تھی' اس کے پیش نظر اسے کہیں بھی چھوڑنا تھوڑے بہت درد سر کے ہی مترادف تھا۔ سب سے زیادہ سہولتیں اور ہر طرح کے انتظامات "دو نمبر" پر موجود ہے لیکن وہاں میں اسے لے جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میرا انتہائی خفیہ ٹھکانہ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ کسی کی بھی نظر میں آئے۔ اب اس سے یہ فرمائش کرنا بھی مناسب نہیں تھا کہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے کہیں لے جایا جائے گا۔ وہ میرے بارے میں مشکوک ہو جاتی۔ راحیلہ یا اپنے کسی دوسرے ساتھی کے ہاں بھی اسے چھوڑنا قطعاً مناسب نہیں تھا۔

مزید چند منٹ غور کرنے کے بعد آخر کار مجھے ایک جگہ یاد آگئی جہاں اس کا رہنا محفوظ تھا اور اس کا ہر طرح سے خیال بھی رکھا جا سکتا تھا۔

"میرے ساتھ آؤ۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ وہ میرے اس طرح اچانک اٹھ کھڑے ہونے پر ذرا حیران ہوئی لیکن بہرحال میز کا سہارا لے کر ہولے سے کراہ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

باہر آکر میں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور روانہ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد میری گاڑی اس عمارت کے نیچے جا رکی جس کے ایک فلیٹ میں' میں نے اپنے گاؤں کی ایک عورت تاجاں کو رکھا ہوا تھا۔ صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے لیکن چاروں طرف ویرانی اور سکوت کا راج تھا۔

وہ میری رہنمائی میں دھیرے دھیرے سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی اور میں نے مطلوبہ اپارٹمنٹ کی کال بیل کا بٹن دبایا۔ یہ ایک مختصر سی عمارت تھی۔ اس میں چند ہی اپارٹمنٹ تھے لیکن کافی کشادہ تھے۔

چند لمحے بعد ملازمہ نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا۔ اس وقت مجھے سامنے پا کر اس کی سستی یک لخت کافور ہوگئی اور وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ میں نبیلہ کو ساتھ لیے اندر پہنچا۔ ملازمہ نے بتایا کہ تاجاں ابھی سو رہی تھی۔ میں اس کے بیڈ روم میں جا پہنچا۔ وہ آڑی ترچھی بے خبر پڑی تھی۔

اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی تاجاں تھی جو کچھ عرصہ قبل بیماری و شکستہ حالی سے موت کے منہ میں پہنچی ہوئی تھی۔ علاج معالجے اور زندگی کی بہترین آسائشوں میں روز و شب گزارنے کے بعد گویا اس کی لٹی ہوئی جوانی واپس آگئی تھی۔ سانولے سلونے سے رخسار زندگی کی حرارت سے تمتما رہے تھے اور بدن کے شجر کی خزاں رسیدہ شاخیں پھر سے ہری بھری تھیں۔

"یہ کون ہے؟ تمہاری داشتہ ....؟" نبیلہ نے سرگوشی میں انتہائی سادگی سے پوچھا۔

"ہش ... !" میں نے قدرے خفگی سے کہا "نتائج اخذ کرنے میں اتنی جلد بازی مت دکھاؤ۔"

ملازمہ نے اسے جگایا تو وہ مجھے سامنے پا کر حواس باختہ سی ہوگئی۔ بزرگ عورتوں کی طرح اس نے مشفقانہ انداز میں مجھے پیار کیا اور دعائیں دیتے ہوئے بولی "شالا جوانیاں مانیں... باؤ افضل! یہ آج مدت بعد صبح ہی صبح میری یاد کیسے آگئی؟ خیر تو ہے؟ مجھے تو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا۔ تم واقعی یہاں آئے ہو یا میں خواب دیکھ رہی ہوں؟"

"خواب شواب تو دیکھ لیے جتنے دیکھنے تھے تم نے۔" میں نے کہا اور نبیلہ کی طرف اشارہ کیا "اسے ... تمہارے پاس چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ شاید اسے دو چار دن یہاں رہنا پڑے۔ اس کا ہر طرح سے خیال رکھنا۔ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔"

"باؤ افضل! تمہارا حکم ہے تو اس کے لیے جان بھی حاضر ہے۔ اسے کوئی تکلیف پہنچ جائے تو سر قلم کر دینا۔"

اس نے گہری نظر سے نبیلہ کا جائزہ لیا جو ایک طرف کو سکڑی سمٹی کھڑی تھی۔ اس کے پاس کوئی بڑی سی چادر وغیرہ بھی نہیں تھی جس میں وہ اپنے آپ کو لپیٹ سکتی' چھپا سکتی۔ وہ نبیلہ کو وہیں کھڑے چھوڑ کر میرا ہاتھ پکڑ کر دوسرے کمرے میں لے گئی اور رازدارانہ انداز میں بولی "باؤ افضل! یہ تمہاری غلطی ہے؟"

"لاحول ولا ..." میں نے تیزی سے کہا۔

"بات تو یہ لاحول ہی پڑھنے کی ہے۔" وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نیند کے گلابی ڈورے لیے شریر سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "لیکن مجھ سے شرمانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو تمہاری اپنی نوکر ہوں' غلام ہوں' پیروں کی خاک ہوں...."

"بس' بس" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "اتنا زیادہ نیچے جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ میرے اور تمہارے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہوگئی تھی۔ تم میرے اور اس کے بارے میں غلط فہمی کا شکار ہو رہی ہو۔ تم عورتوں کو اس کے سوا کوئی کام نہیں ہوتا۔ جو تم سمجھ رہی ہو ایسا کوئی چکر نہیں ہے۔ وہ بھی اسی طرح مصیبت کی ماری ہے جس طرح کبھی تم مصیبت کی ماری تھیں۔ اس کا معاملہ ذرا زیادہ سنگین ہے۔"

تب تاجاں یکدم سنجیدہ ہوگئی اور بدلے ہوئے لہجے میں بولی "باؤ افضل! تم فکر نہ کرو' میں اس کو یہاں کوئی تکلیف نہیں ہونے دوں گی۔ اچھا ہوا تم اسے یہاں لے آئے۔ میں تو یہاں پڑے پڑے بور ہو چکی ہوں۔ تم نے ابھی تک میرے لیے کوئی کام نہیں سوچا؟"

"سوچیں گے' سوچیں گے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "فی الحال تو تم اسی کو سنبھالو۔ یہ بھی ایک اہم کام ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔"

"مجھے کبھی تو کسی خدمت کا موقع دیا کرو۔" وہ میرے پیچھے دوسرے کمرے میں آتے ہوئے بولی "تھوڑی دیر بیٹھو تو میں تمہارے لیے اپنے ہاتھ سے ناشتا تیار کر کے لاؤں۔ دیسی گھی کے پراٹھے کھلاؤں گی۔ میں خود مارکیٹ سے دیسی گھی تلاش کر کے لائی ہوں۔"

"نہیں۔ فی الحال نہیں کھانے ہیں مجھے دیسی گھی کے پراٹھے۔" میں نے کہا۔

بیڈ روم میں نبیلہ دیوار سے ٹیک لگائے کاؤچ پر بیٹھی تھی اور خالی خالی نظروں سے دوسری دیوار کو گھور رہی تھی۔ میں نے دھیرے سے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "تمہیں اب گھبرانے یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھ لو' تمہاری مصیبتوں کا خاتمہ ہوگیا۔"

پھر میں وہاں سے چلا آیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے منہ سے نادانستگی میں ایک اور ہی طرح کا سچ نکل رہا ہے۔ میرے اعصاب پر نیند سوار تھی۔ گھر آکر میں لمبی تان کر سو گیا۔ شام سے پہلے سو کر اٹھا تو میرے ایکسپورٹ منیجر نے مجھے فون کر کے دفتر بلا لیا۔ ایک ایسا کاروباری مسئلہ آن پھنسا تھا جو میرے جانے سے ہی بہتر طور پر حل ہو سکتا تھا۔ میں دفتر گیا تو پھنس ہی گیا۔ وہیں سے ایک پارٹی کے ساتھ ڈنر پر جانا پڑا۔

رات گئے گھر واپسی ہوئی۔ صبح اٹھتے ہی آفس جانا پڑا۔ ایک بینک کے صدر سے میری ملاقات طے تھی۔ آفس ہی سے اس ملاقات کے لیے روانہ ہوگیا۔ اس میں تقریباً پورا دن ہی نکل گیا۔ مصروفیت اس قدر زیادہ رہی کہ اس دوران مجھے صرف ایک مرتبہ نبیلہ کا خیال آیا۔ تاجاں کے فلیٹ میں فون بھی نہیں تھا ورنہ شاید میں فون کر کے اس کی خیر و عافیت دریافت کر لیتا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے یہ بھی سوچا کہ اپنے کسی آدمی کو فون کر کے ہدایت کر دوں کہ ایک چکر وہاں لگا لے اور پوچھ لے کہ کوئی مسئلہ تو درپیش نہیں ہے۔ لیکن پھر اس خیال پر بھی عمل درآمد ہونے کی نوبت نہ آسکی۔ لاشعوری طور پر مجھے یہ اطمینان تھا کہ اب تاجاں بہت ہوشیار ہو چکی۔ تھی روزمرہ زندگی کے مسائل سے تو وہ خود ہی نمٹ سکتی تھی۔ ایک خادمہ بھی اس کے پاس موجود تھی۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

دوسرے روز رات گئے ایک ڈنر سے واپسی پر گھر جاتے ہوئے مجھے نبیلہ اور تاجاں کی یاد آئی۔ گھر جاتے جاتے یکدم ہی میں نے گاڑی گارڈن ٹاؤن کی طرف موڑ لی۔

کبھی کبھی تھوڑی سی تاخیر بھی زندگی کا ناقابل تلافی نقصان بن جاتی ہے۔ مجھے بھی تاجاں کے ہاں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی۔ رات کے سناٹے میں جب میں وہاں پہنچا تو دروازہ مجھے غیر مقفل ہی ملا۔ میرا دل ایک لمحے کے لیے دھڑکنا بھول گیا۔ مجھے وہیں احساس ہوگیا کہ کوئی گڑبڑ ہو چکی تھی۔

رات کا سناٹا یوں تو چاروں طرف ہی چھایا ہوا تھا لیکن فلیٹ میں پھیلا ہوا سکوت کچھ اور ہی طرح کا تھا۔ میں نے پسٹل نکالا اور نہایت محتاط انداز میں ڈرائنگ روم میں قدم رکھا۔ فوراً ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ میری احتیاطی تدبیریں وغیرہ سب بیکار تھیں۔ اب کسی چیز کی کوئی ضرورت نہیں رہی تھی۔

درحقیقت بیرونی دروازہ کھولتے ہی مجھے لہو کی بو آگئی تھی۔ میری ناک انسانی لہو کی بو خوب پہچانتی تھی۔ شاید نوجوانی سے ہی یہ وصف مجھ میں پیدا ہوگیا تھا' جب میں سرحدی جنگلوں میں زندگی کی جنگ میں الجھا ہوتا تھا اور موت میرے تعاقب میں ہوتی تھی۔

ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہی میں نے پسٹل جیب میں واپس رکھ لیا۔ میرے دل نے گواہی دے دی تھی کہ وہاں کوئی دشمن چھپا ہوا نہیں تھا اور دوست زندگی ہار چکے تھے۔ ملازمہ سامنے ہی قالین پر چت پڑی تھی۔ اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر ایک خنجر اس طرح پیوست تھا کہ صرف دستہ باہر رہ گیا تھا۔ اس کی پھٹی پھٹی بے نور آنکھیں چھت کو تک رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں گویا ایک ہی سوال نقش تھا کہ آخر اسے کس جرم کی سزا ملی تھی؟ وہ تو محض ایک خادمہ تھی۔ اس نے تو کسی کا برا نہیں چاہا تھا۔ وہ تو کسی کے جھگڑوں میں ملوث نہیں تھی۔ اسے تو کسی بھی بات کا پتا نہیں تھا۔

میں آگے بڑھا۔ لاؤنج میں صرف ایک کرسی الٹی پڑی تھی۔ اس کے علاوہ کسی بے ترتیبی یا ہنگامہ آرائی کے آثار نہیں تھے۔ لاؤنج سے بیڈ روم میں قدم رکھتے ہی لہو میری رگوں میں کچھ اور سرد ہوگیا۔

بیڈ پر چادر بری طرح شکن آلود تھی اور نبیلہ اس پر آڑی ترچھی پڑی تھی۔ اس کی گردن بیڈ کے کنارے سے نیچے لٹکی ہوئی تھی اور اس کے تن سے تقریباً جدا ہی تھی۔ صرف چند موٹی سی نسیں تھیں جن کے سہارے وہ ابھی بے جان جسم سے منسلک تھی اور لٹکی ہوئی تھی ورنہ شاید قالین پر پڑی ہوتی۔

اس کا لہو میں لتھڑا ہوا چہرہ بے شناخت سا ہوگیا تھا اور اس کی کٹی ہوئی گردن کا بھیانک گھاؤ مجھے تک رہا تھا۔ نرخرے اور دیگر موٹی موٹی سی ناڑوں کے سرے گویا ان گنت آنکھیں بن گئے تھے اور پُرالزام نظروں سے مجھے گھور رہے تھے۔ خون اتنا بہا تھا کہ قالین پوری طرح جذب نہیں کر سکا تھا۔ اس پر چھوٹا سا ایک سرخ جوہڑ بن گیا تھا۔ خون عنابی ہونے لگا تھا لیکن پوری طرح خشک نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس فلیٹ میں قیامت گزرے کچھ زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔

تاجاں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ جنہوں نے بھی یہ سب کچھ کیا تھا' شاید وہ تاجاں کو اٹھا کر لے گئے تھے۔ میں اس کی تلاش

میں دوسرے بیڈ روم میں پہنچا تو باتھ روم کا دروازہ کھلا نظر آیا۔ اندر لائٹ آن تھی۔ دروازہ پورا نہ کھل سکا لیکن جتنا کھل گیا وہی اندر کا افسوس ناک منظر دکھانے کے لیے کافی تھا۔ کاش میں نے اندر نہ جھانکا ہوتا لیکن اس کے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔

تاجاں کا حال بہت خراب تھا۔ جس کسی نے بھی اسے اس حال کو پہنچایا تھا اسے اگر کوئی انسانوں میں شمار کرتا تو میری نظر میں وہ بھی بہت بڑا دشمن انسانیت ہوتا۔ اس کے منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور وہ اس گڑیا کی طرح مڑی تڑی پڑی تھی جسے کسی جنونی کے ہاتھوں نے توڑ پھوڑ ڈالا ہو۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس کے جسم میں بہت کم ہڈیاں سلامت رہ گئی تھیں۔

اس کے بازو دہرے تہرے ہو کر اس کے جسم کے تلے دبے ہوئے تھے اور ٹانگیں غیر فطری سے انداز میں پنڈلیوں پر سے بھی یوں مڑی ہوئی تھیں جیسے ان میں ہڈی ہی نہ ہو۔ ظاہر ہے جب ہڈیوں کو چکنا چور کیا جا چکا تھا تو ان کا ہونا نہ ہونا برابر ہی ہو گیا تھا۔

اونیکس کا ایک بڑا سا وزنی گلدان پاس ہی پڑا ہوا تھا جس سے ایک بہت بڑے ہتھوڑے کا کام لیتے ہوئے تاجاں کی یہ حالت بنائی گئی تھی۔ اسے گوشت' خون اور شکستہ ہڈیوں کے ملغوبے میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ گلدان بھی خون میں لتھڑا ہوا تھا اور فرش کا خاصا بڑا حصہ بھی خون سے رنگین ہو چکا تھا۔ تاجاں کو باندھ کر' منہ میں کپڑا ٹھونس کر' وہاں گرا کر بھاری گلدان سے اس طرح کچلا گیا تھا جیسے وہ کوئی بے جان چیز ہو۔

اس قسم کے کام شدید اور گہری دلی نفرت کے بغیر ممکن نہیں ہوتے۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوتی تھی کہ بعض لوگ ان انسانوں پر اتنا ظلم و تشدد کیونکر کر گزرتے تھے جنھوں نے ذاتی طور پر ان کا کچھ نہیں بگاڑا ہوتا تھا' انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی ہوتی تھی۔ ایسا بے تحاشہ اور بے جواز تشدد کرنے والوں کے خلاف میرے دل میں نفرت ایک طوفان بن کر اٹھتی تھی اور میرے حواس پر چھا جاتی تھی۔

میں لپک کر تاجاں کے پاس پہنچا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ابھی اس میں زندگی کی رمق باقی تھی۔ اس کے نتھنوں میں خفیف سی حرکت ہوئی جس سے اندازہ ہوا کہ اس کے جسم میں سانس کی موہوم سی آمدورفت جاری تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ صرف اس کے سر کو کچلنے کی کوشش نہیں کی گئی تھی لیکن ایسا یقیناً کسی جذبہ ترحم کے تحت نہیں کیا گیا تھا۔ اس میں بھی زبردست اذیت پرستانہ مصلحت پوشیدہ تھی۔ سر کچلنے سے یقیناً تاجاں فوری طور پر مر جاتی۔ جان بوجھ کر اس کا سر محفوظ چھوڑا گیا تھا تاکہ وہ کچھ دیر زندہ رہے اور اپنے جسم کے کچلے جانے اور ہڈیوں کو توڑے جانے کی اذیت زیادہ سے زیادہ محسوس کر سکے۔

میں نے اس کے سر کو آہستگی سے ہلایا۔ اس کی اذیت میں کسی اضافے کی گنجائش تو نہیں تھی پھر بھی مجھے اندیشہ تھا کہ سرہلا... سے اس کے تن ریزہ ریزہ میں درد کی کوئی نئی لہر نہ ابھر آئے۔ ... چہرہ بھی نیلا پڑ چکا تھا اور آنکھیں اتنی سوجی ہوئی تھیں کہ انہی... کھولنا تقریباً ناممکن نظر آ رہا تھا لیکن اس وقت میری حیرت کی ان... نہ رہی جب اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔

بری طرح سوجی ہوئی آنکھوں میں خفیف سی جھری پیدا ہوئی... اس نے یقیناً مجھے پہچان لیا تھا۔ اس عالم میں بھی اس نے مسکرا... کی کوشش کی۔ بڑے جگرے والی عورت تھی۔ مسکرانے کی کوشش... میں اس کے متورم اور کٹے پھٹے ہونٹ اذیت زدہ انداز میں کھنچ... رہ گئے۔ میرے حلق میں جیسے کوئی گولا سا اٹک گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ... اپنا کان اس کے منہ کے قریب لے گیا۔ اس کی آواز سرگوشی ... بھی مدھم تھی "باؤ افضل! میری سانس... تمہارے انتظار میں ا... ہوئی... تھی... میرا دل کہہ رہا... تھا... تم ضرور آؤ گے۔"

"کون تھے وہ؟" میں نے اپنے سینے میں ابلتے آتش فشان... اذیت کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے... نہیں معلوم۔" اس کی آواز ہوا کی سرسراہٹ... بھی دھیمی تھی "وہ چار تھے۔ دھوکے سے اندر... آئے تھے... ... کو... انہوں نے... میرے سامنے ذبح... کیا... وہ بھی... بہت ل... ... میں نے بھی... اپنی سی کوشش... کی... مگر... ہم بے بس ہو گئیں... ان میں سے... ایک نے... تمہارا بھی... پوچھا تھا۔"

"کیا پوچھا تھا؟" میں نے بے تابی سے دریافت کیا۔

"کہہ رہا تھا... تمہیں یہاں... افضل چوہدری... نے رکھا نا؟ یہ بلڈنگ... اسی کی... ہے۔ میں نے کہا... نہیں... اس پر... زیادہ... غصے ہوئے... میرا زیادہ... برا حشر کیا۔"

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی یہاں تک پہنچا کیسے؟ جب نبیلہ کو یہاں چھوڑنے آیا تھا تو میں نے خاص طور پر خیال... تھا کہ کوئی میرا تعاقب تو نہیں کر رہا؟ میں یقین سے کہہ سکتا تھا... کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔

فلیٹ میں کوئی قیمتی چیز تھی ہی نہیں۔ دوسری کوئی چیز بھی غا... معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ لوگ پیشہ ور چور ... نہیں تھے اور ڈکیتی کی نیت سے فلیٹ میں نہیں گھسے تھے۔ وہ جو... کر کے گئے تھے یہی ان کا مقصد تھا۔

ان میں سے ایک نے میرے بارے میں استفسار بھی کیا... لیکن مجھے یہ فیصلہ کرنا آسان دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ کون ل... تھے؟ وہ ریڈ ڈاٹ کے آدمی بھی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ریڈ ڈ... والوں کے لیے تاجاں اور نبیلہ قطعی غیر متعلق اور غیر اہم عور... تھیں۔ وہ انہیں اس پُراذیت طریقے سے مروانے کے لیے مخواہ کا دردِ سر مول نہیں لے سکتے تھے۔

تاجاں کی آنکھیں جو ذرا سی کھلی تھیں' بالکل ہی بند ...

جا رہی تھیں۔ میں نے بے تابی سے پوچھا "تاجاں! جب سے میں نبیلہ کو یہاں چھوڑ کر گیا ہوں' کیا تم اسے ساتھ لے کر کہیں باہر نکلی تھیں؟"

اس کی مدھم سرگوشی کچھ اور مدھم ہو گئی "ہاں... صبح نبیلہ کو... تکلیف... شروع ہو... گئی تھی تمہیں پتا ہی ہے... وہ کس حال سے... تھی... میں ڈر گئی... کہ شاید وقت قریب آ گیا ہے... میں اور زرینہ... اسے لے کر لیڈی ڈاکٹر کی تلاش میں نکلی تھیں۔"

زرینہ فلیٹ میں رہنے والی خادمہ کا نام تھا جو ڈرائنگ روم میں مردہ پڑی تھی۔ تاجاں کی آنکھیں ایک لمحے کے لیے بند ہو گئیں۔ اس کے مسخ شدہ چہرے سے اس کی اذیت کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ میں نے اس کا سر سہلایا۔ وہ دوبارہ آنکھیں ذرا سی کھول کر ڈوبتی سی آواز میں بولی "یہاں... آس پاس کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی... ہمیں دوسرے بلاک تک جانا پڑا... وہاں... ایک لیڈی ڈاکٹر... کی کوٹھی تھی... میں وہاں اسے دکھا کر لائی تھی......"

فوری طور پر مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان تینوں عورتوں کا گھر سے اتنی دیر کے لیے نکلنا ہی ان کی بدنصیبی کا باعث بنا تھا۔ یقیناً مختار رفیق کے کسی آدمی نے راستے میں نبیلہ کو کہیں دیکھ لیا تھا اور اس فلیٹ تک ان کا تعاقب کیا تھا۔ اس نے غالباً مختار کو اطلاع دی ہوگی جس نے ان کی عبرت ناک موت کے احکامات جاری کیے ہوں گے۔

تاجاں اس ڈوبتی آواز میں کہہ رہی تھی "لیڈی ڈاکٹر نے دوائیں وغیرہ لکھ دیں اور کہا... ابھی وقت آنے میں دیر ہے...... ہم واپس آ گئے... اس کے علاوہ ہم کہیں نہیں گئے۔"

"کسی نے تمہیں راستے میں خاص طور پر دیکھا تو نہیں تھا؟ کچھ کہا تو نہیں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں"

"کسی نے پیچھا تو نہیں کیا تھا؟"

"مجھے... نہیں معلوم" وہ دیہاتی عورت ان باتوں کا اندازہ کہاں کر سکتی تھی۔

"میں تمہیں اسپتال لے چلتا ہوں۔" میں نے کہا "میری سمجھ میں نہیں آ رہا' تمہیں اٹھاؤں کیسے؟ ذرا سی بھی حرکت تمہاری اذیتوں کو بڑھائے گی۔ ایمبولینس منگوانے میں بھی بہت دیر لگ جائے گی۔"

"کوئی... فائدہ نہیں۔" اس دلیر عورت نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی "میں... بس دو چار... منٹ کی مہمان ہوں... تم ذرا دیر اور نہ آتے تو یہ باتیں رہ جاتیں... مجھے جان کا غم نہیں ہے... تم نے مجھے کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا کر صاف ستھری عورت بنایا... میں سمجھ رہی ہوں کہ یہ جان تم پر ہی وار کر جا رہی ہوں... اگر وہ تمہارے دشمن تھے... تو خدا کرے ان کی دشمنی ہم تینوں کی جان پر ہی ٹل جائے... تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔"

میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا۔ میں نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا "تم نہیں مرو گی۔ میں تمہیں ایمبولینس کے بغیر ہی اسپتال لے چلتا ہوں۔ اپنی گاڑی میں ڈال کر۔ میں تمہارے لیے شہر کے بہترین ڈاکٹروں کو جمع کر لوں گا۔ وہ تمہیں بچا لیں گے۔"

میں اسے اٹھانے کے لیے گھٹنوں کے بل بیٹھنے لگا تو پہلی بار اس کے حلق سے ایک اذیت ناک سی' گھٹی گھٹی آواز نکلی اور وہ سرگوشی سے ذرا بلند آواز میں بولی "نہیں... خدا کے لیے... مجھے ہلانا مت... میں بڑی تکلیف میں ہوں... مجھے تو اوپر والے ڈاکٹر نے جواب دے دیا ہے... نیچے والے ڈاکٹر مجھے کیا بچائیں گے... بس مجھے تھوڑا سا پانی پلا دو... میرا گلا بند ہو رہا ہے۔"

میں نے جلدی سے اٹھ کر گلاس وغیرہ تلاش کر کے اس کے لیے فریج سے ٹھنڈا پانی نکالا۔ میں اس کے منہ میں پانی انڈیلنے کی کوشش کر رہا تھا جب اچانک اسے ہچکی سی آئی۔ اس کی آنکھیں اذیت زدہ انداز میں بند ہو گئیں لیکن منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ پانی اس کی باچھوں سے ادھر ادھر بہنے لگا تب مجھے احساس ہوا کہ وہ مر چکی تھی۔

میں بظاہر پُرسکون انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ گلاس دھو کر' صاف کر کے میں نے واش بیسن پر رکھ دیا۔ لیکن میرا یہ سکون مصنوعی تھا۔ میں اپنے اندر گرجتے ہوئے آتش فشاں کی طرف سے اپنا دھیان ذرا ہٹانا چاہ رہا تھا۔ اب تاجاں ایک لاش تھی جس پر درندگی کی ایک بھیانک داستان رقم تھی۔ اس کی طرف مزید دیکھنا میری قوت برداشت کے لیے ایک امتحان تھا۔

میں باتھ روم سے نکل آیا لیکن بیڈ روم میں نبیلہ کی تقریباً سربریدہ لاش میری منتظر تھی۔ وہ سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی گو کہ اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔ شاید ذبح ہوتے وقت اس نے دل ہی دل میں مجھ سے پوچھا ہو "چوہدری صاحب! بس میری یہی مدد کر سکتے تھے آپ؟ یہی تحفظ فراہم کر سکتے تھے مجھے؟"

میں اس سے شرمندہ تھا۔ اس کی طرف سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ دیر تک میں اسی طرح ساکت کھڑا رہا۔ فلیٹ میں تین لاشیں موجود تھیں۔ چند لمحے کے لیے میں چوتھی لاش بن گیا تھا۔ رات کا گہرا اور سرد سناٹا میری رگ و پے میں اتر آیا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے میرے ذہن نے کام کرنا شروع کیا تو میرے اعصاب میں ٹھہراؤ آ گیا۔

میں ایک سائے کی طرح خاموشی سے فلیٹ سے نکل کر نیچے آ گیا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔ چند لمحے تک ذہن میں ساری صورت حال کا نقشہ تیار کرنے کے بعد میں نے ٹرانسیٹر پر ٹونی سے رابطہ قائم کیا۔ غنیمت رہا کہ میں ٹرانسیٹر کے ذریعے بھی اسے نیند سے

جگانے میں کامیاب ہوگیا۔

سب سے پہلے میں نے اسے نیند سے جگانے پر ہی معذرت کی۔ میری آواز سنتے ہی اس کے لہجے سے غنودگی غائب ہوگئی تھی۔ وہ تیزی سے بولا "تکلفات کو چھوڑیئے سر! یہ بتایئے کہاں پہنچنا ہے؟"

"تم نے کیسے سمجھ لیا کہ کہیں پہنچنا ہے؟" میں نے خوش دلی سے کہا۔ میں اپنے دل میں اٹھتی ٹیس کو اپنے لہجے سے دبانے کی کوشش کررہا تھا۔

"سر! آپ رات کو اس وقت فون کے بجائے ٹرانسیٹر پر مجھے مخاطب کررہے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ آرام نہیں کررہے اور آپ کو میری ضرورت ہے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

"ہاں۔ مجھے صرف تمہاری ہی نہیں، سردار شیخ، حنیف، صفدر اور سلیمان کی بھی ضرورت ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا بہت بڑی مہم ہے سر؟ بہت زیادہ اسلحہ ساتھ لے کر آنا ہوگا؟" اس کے لہجے میں یکدم بے پناہ مستعدی آگئی۔ میں نے اپنے چار پانچ آدمیوں کو بیک وقت کبھی طلب نہیں کیا تھا۔

"نہیں، نہیں۔ ایسی کوئی خاص مہم نہیں ہے۔" میں نے اس سے کہا "بس جس طرح تم چھوٹے موٹے کاموں کے لیے جلدی نکلتے ہو، اسی طرح ان لوگوں کو ساتھ لے کر آجاؤ۔ بس وقت کم ہے، ہم نکلنا چاہیے۔" پھر میں نے اسے بتایا کہ انہیں کہاں پہنچنا تھا۔

بیس منٹ بعد ہی دو گاڑیاں میری گاڑی کے آگے پیچھے آن رکیں۔ میں نے انہیں اپنی گاڑی میں ہی بلالیا۔ گاڑی میں ہی ہم نے چھوٹی سی کانفرنس منعقد کی۔ میں نے انہیں صورت حال سے پوری طرح آگاہ کیا۔ پھر اپنا پروگرام بتایا اور فرداً فرداً انہیں ذمے داریاں سونپیں۔

مجھے صرف ٹونی کو اپنے ساتھ لے کر جانا تھا۔ باقی چاروں کو میں وہیں چھوڑے جارہا تھا۔ میں نے حنیف سے کہا "یہاں کا کام میں تمہاری نگرانی میں چھوڑ کر جارہا ہوں۔ تینوں لاشیں یہاں سے غائب ہوجانی چاہئیں کیونکہ مجھے اب جو کچھ کرنا ہے وہ ان لاشوں کی وجہ سے میرے لیے الجھن کا باعث بن سکتا ہے۔ میں انتہائی عزت و احترام سے ان تینوں کی تکفین اور تدفین کراتا لیکن مجبوری آن پڑی ہے۔ اگر میں یہ خواہش پوری کرتا ہوں تو ان کے قاتلوں کو اس انجام تک نہیں پہنچا سکوں گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ تمہیں کسی کی نظر میں نہیں آنا چاہیے، کوئی سراغ باقی نہیں رہنا چاہیے۔"

"ایسا ہی ہوگا سر!" حنیف نے سرہلا کر کہا۔ میں نے انہیں خدا حافظ کہا اور ٹونی کو اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھا کر میڈم کے کوٹھی خانے کی طرف روانہ ہوگیا۔ راستے میں، میں نے ٹونی سے کہا۔ "مختار رفیق اس وقت غائب ہے۔ اس نے کسی خفیہ مقام سے ان تینوں عورتوں کے قتل کے احکامات دیئے ہوں گے۔ اس نے اب راجو اور شمیم کے ساتھ ساتھ اپنی کارروائیوں کا رخ میری طرف بھی موڑ لیا ہے۔ اس کے آدمی کسی بھی وقت کچھ بھی کر گزر سکتے ہیں۔ اس سے پہلے ہی اسے پکی لگام ڈالنا ضروری ہوگیا ہے۔"

ٹونی پکی لگام کا مطلب سمجھتا تھا۔ آہستگی سے سرہلاتے ہوئے بولا "آپ کو یقین ہے، میڈم ہمیں اس کے بارے میں بتا سکے گی کہ وہ اس وقت کہاں ہوگا؟"

"میرے علم میں اس وقت وہی ایک عورت ہے جس سے اس کا اتا پتا معلوم ہونے کی توقع رکھی جاسکتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر اس سے بھی کچھ معلوم نہ ہوسکا تو پھر کوئی دوسرا ذریعہ تلاش کریں گے۔ قرض بہت بھاری ہے، میں چاہتا ہوں کہ آج رات ہی اتر جائے۔ میڈم تک ویسے بھی رات میں رسائی حاصل کرنا آسان ہوگا کیونکہ جہاں وہ پائی جاتی ہے وہاں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "تم سمجھ چکے ہو، تمہیں اس سے کیا کہنا ہے؟"

"جی ہاں" ٹونی بولا "آپ گلی کے کونے پر ہی کہیں اندھیرے میں گاڑی روک کر اندر بیٹھے رہیے گا۔ میں اس سے ملاقات کر کے کہوں گا کہ ایک منسٹر صاحب پہلی بار نہایت رازداری سے ملنے آئے ہیں اس لیے کسی کو ان کی آمد کی کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔ وہ گلی کے کونے پر گاڑی میں ہی بیٹھے ہیں اور کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ امید ہے وہ میرے ساتھ گاڑی تک چلی آئے گی۔"

"ہاں۔ میں چاہتا ہوں گاڑی میں ہی اس سے نمٹ لیا جائے اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔ وہ عورت سخت سزا کی مستحق ہے۔ اس کی وجہ سے نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگیاں برباد ہوئی ہوں گی اور وہ مختار جیسے آدمی کی دست راست ہے۔ مختار کا سارا اثر رسوخ اس اڈے کی وجہ سے ہی ہوگا جسے یہ عورت چلا رہی ہے۔ سنا ہے بڑی بڑی شخصیات وہاں حاضری دیتی ہیں۔"

"ہاں سر! یہی تو المیہ ہے۔" ٹونی گہری سانس لے کر بولا "ہمارے ہاں ایسے ہی اڈے بڑی بڑی شخصیتوں کی کمزوری بن جاتے ہیں اور وہ وہیں بیٹھ کر ملک و قوم کی قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ نہ جانے کیا کچھ ہار آتے ہیں۔"

"آج رات تو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "آج تو ہم صرف میڈم سے نمٹ لیتے ہیں اور مختار رفیق کو تلاش کرلیتے ہیں۔ اس کے بعد کسی بھی دن اطمینان سے بیٹھ کر تمہیں تھوڑی سی منصوبہ بندی کے ساتھ ایک اہم کام انجام دینا ہے۔ تمہیں اس کوٹھی خانے کو اجاڑنا ہے تاکہ آئندہ یہاں یہ دھندہ ہونے نہ پائے۔ ویسے ہم کوئی خدائی فوجدار یا مصلح قوم تو نہیں لیکن لگے ہاتھوں یہ کام بھی ہوجائے تو کوئی حرج نہیں۔"

"ہوجائے گا سر! میرا خیال ہے یہ کوئی ایسا مشکل کام ثابت نہیں ہوگا۔" وہ اطمینان سے بولا۔ کسی بھی معاملے میں اس نوجوان کا اطمینان مجھ تک کو قابل رشک محسوس ہوتا تھا۔ حالانکہ میری خود اپنے بارے میں بھی خوش فہمی سے قطع نظر یہی رائے تھی کہ مجھے اپنی اعصاب پر مکمل قابو حاصل تھا۔

میں نے اس سلسلے میں ایک لمحے کے لیے مزید سوچنے کے بعد کہا "کچھ لڑکیاں کوٹھی خانے میں رہائش پذیر بھی ہیں۔ بہت سی ایسی بھی ہیں جنہیں مختلف ٹھکانوں سے بلوا کر ادھر ادھر سپلائی کیا جاتا ہے۔ جو وہاں رہائش پذیر ہیں، انہیں بے شک تم پیشکش کردینا کہ اگر ان کا کوئی اور ٹھکانا نہ ہو اور وہ شریفانہ زندگی گزارنا چاہتی ہوں تو انہیں ہر طرح کی مالی یا اخلاقی مدد فراہم کی جاسکتی ہے تاکہ انہیں یہ شکوہ نہ رہے کہ حالات نے انہیں کبھی مہلت ہی نہیں دی تھی اور انہیں معاشرے نے کبھی شریفانہ زندگی گزارنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ جو اپنی مرضی سے اسی پیشے میں رہنا چاہیں انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا لیکن اس ٹھکانے پر بہرحال تالا پڑجانا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے سر! چند دن بعد اس پر تالا پڑجائے گا۔ تالا بھی ایسا جسے سال دو سال تو کوئی نہیں کھول سکے گا۔ کوئی نیا مالک ہی آکر کھولے گا، وہ بھی شریفانہ زندگی گزارنے کے لیے۔" ٹونی وثوق سے بولا۔

اس دوران ہم اس گلی میں پہنچ چکے تھے جس میں ستارہ رہتی تھی۔ اس کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے میں نے گلی کے دوسرے سرے پر ایک کوٹھی کی اونچی سی دیوار کے قریب ملگجے اندھیرے میں گاڑی روک لی۔ دوسری طرف ایک کوٹھی کے کونے پر بیوٹی پارلر کا بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس کے دو گیٹ تھے۔ ایک گیٹ تو غالباً مقفل ہی تھا۔ دوسرے پر ایک مسلح چوکیدار بڑے مستعد انداز میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد کا تھا۔ اس کی موٹی موٹی، اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں کم از کم بالشت بھر کی تو ضرور رہی ہوں گی جو مدھم روشنی میں بھی صاف نظر آرہی تھیں۔ کچھ کچھ چمک بھی رہی تھیں۔

مونچھیں عام طور پر مردانگی اور غیرت مندی کی علامت سمجھی جاتی ہیں لیکن اتنی بڑی مونچھوں کے ساتھ وہ ایک کوٹھی خانے کی چوکیداری کرتا ہوا مجھے نہ جانے کیوں بڑا عجیب دکھائی دیا۔ کیا اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کس دھندے کی چوکیداری پر مامور تھا؟

کوٹھی کے سامنے کوئی گاڑی کھڑی نظر نہیں آرہی تھی۔ اگر کچھ لوگ داد عیش دینے کے لیے اس وقت کوٹھی میں موجود تھے تو ان کی گاڑیاں شاید پچھلی گلی میں کھڑی تھیں۔ کوٹھی بہت شاندار اور طویل و عریض تھی۔ کسی قلعے سے کم نہیں تھی اور یوں سکوت میں ڈوبی ہوئی تھی جیسے اس میں کوئی ذی روح موجود ہی نہ ہو۔

ٹونی گاڑی سے اتر کر کوٹھی کے مین گیٹ کی طرف چلا گیا اور چوکیدار سے بات کرنے لگا۔ چوکیدار نے وہیں کھڑے کھڑے گیٹ کے ستون میں نصب انٹرکام کا بٹن دبایا اور اس کی جالی پر جھک کر بات کرنے لگا۔ میں انٹرکام پر ہونے والی گفتگو نہیں سن سکتا تھا... کیونکہ فاصلہ خاصا تھا اور میں نے گاڑی کے شیشے بھی نیچے نہیں کیے تھے۔

چند لمحے بعد گیٹ تھوڑا سا کھلا اور ٹونی اندر چلا گیا۔ گیٹ بند ہوگیا۔ ایک بار پھر وہی گہرا سکوت چھا گیا۔ چوکیدار ایک بار پھر تنا کھڑا تھا۔ وہ اندھیرے میں کھڑی ہوئی میری کار کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ بڑا وضع دار معلوم ہوتا تھا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے دیکھنے کی وجہ سے میں کسی قسم کا اضطراب محسوس کروں۔

کوٹھی نے گویا ٹونی کو نگل لیا تھا۔ کئی منٹ گزر گئے۔ میں نے مناسب سمجھا کہ اس دوران اپنا ریڈی میڈ سا میک اپ کرلیا جائے۔ گلوو کمپارٹمنٹ سے میں نے ایک فیلٹ ہیٹ، قدرے تاریک شیشوں کا چشمہ اور مونچھیں نکالیں اور اندھیرے میں کھڑی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی میں نے ان چیزوں کو ان کی جگہوں پر جمالیا۔

مونچھیں استعمال میں آسان تھیں، جلدی سیٹ ہوجاتی تھیں اور مصنوعی ہونے کے باوجود اصلی معلوم ہوتی تھیں لیکن یہ ذرا پختہ العمر آدمی کی مونچھیں تھیں۔ ان میں چند سفید بال بھی موجود تھے۔ لیکن یہ اتنی ہی مفید بھی تھیں۔ انہیں لگا کر اگر عمر زیادہ معلوم ہوتی تھی تو اتنا ہی زیادہ شخصیت کا تاثر بھی بدل جاتا تھا۔ ان کے ساتھ فیلٹ ہیٹ اور ڈارک گلاسز بھی شامل ہونے کے بعد تو کوئی مجھے پہچان ہی نہیں سکتا تھا۔ ان چیزوں کے ساتھ مجھے دیکھنے کے بعد اگر کوئی ان کے بغیر دیکھتا تو قسم کھا سکتا تھا کہ پہلے اس نے جسے دیکھا، وہ کوئی اور شخص تھا۔

آخر کار گیٹ کھلا اور ٹونی باہر آیا لیکن یہ دیکھ کر مجھے قدرے مایوسی ہوئی کہ اس کے ساتھ میڈم نہیں، کوئی مرد تھا۔ جب وہ قریب آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ تھوڑی سی کوشش کرتا تو وہ بھی غزل کے دعوے کی میڈم تو بن ہی سکتا تھا۔ وہ خوب لہرا لہرا کر چل رہا تھا اور ہاتھوں کو ہر قدم پر نزاکت سے بل دے رہا تھا۔ کلین شیو تھا، منہ میں گلوری دبی ہوئی تھی۔ سر پر دو پلی ٹوپی اور پیروں میں سلیم شاہی جوتی تھی۔ ایک کلائی پر ویسے ہی زری کے کام والا کپڑے کا تھیلی نما بٹوا لٹکا ہوا تھا۔ وہ بلاشبہ ایک خوب صورت آدمی تھا۔ اس کی عمر کا اندازہ کرنا ذرا مشکل تھا۔ چلتے وقت وہ اپنی پتلی کمر میں شاخ گل کی سی لچک پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کررہا تھا۔ ٹونی اپنے چہرے پر گہری سنجیدگی و متانت طاری کیے اس کے ساتھ چلا آرہا تھا۔ اس کے لیے یہ کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ویسے بھی بیشتر وقت نہایت سنجیدہ ہی رہتا تھا۔

وہ نازک اندام نوجوان قریب آنے پر بھی اندھیرے کی وجہ سے مجھے نہیں دیکھ سکا۔ آنکھوں پر ہاتھ کا چھجا سا بنا کر، آنکھیں سکیڑ

کر شیشے پر جھک گیا۔ میں نے بٹن دبا کر کھڑکی کا شیشہ اتار دیا۔ اس نے گہری نظر سے میرا جائزہ لیا پھر سیدھا ہوتے ہوئے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر ایک ادائے خاص سے لہراتے ہوئے بولا "آیئے وزیر صاحب! اتنا شرمانے کی کیا ضرورت تھی؟ میڈم جی نے آپ کے لیے پیغام بھیجا ہے کہ ہمارے ہاں تو بعض پیر فقیر گھرانوں کے چشم و چراغ بھی آتے ہوئے اتنا نہیں شرماتے' اتنی احتیاط نہیں کرتے جتنی آپ کر رہے ہیں۔ میڈم جی نے فرمایا ہے' آپ بلا خوف و خطر اندر تشریف لے آیئے۔ ہمارے سینے میں بڑے بڑے لوگوں کے راز دفن رہتے ہیں۔ بلکہ لوگوں کے کیا' ہمارے سینے میں تو اس ملک کے بڑے بڑے راز دفن ہیں۔"

شاید وہ درست ہی کہہ رہا تھا۔ زیادہ مبالغہ نہیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز بھی اسی قسم کی تھی جس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ اسے زنانہ شمار کیا جائے یا مردانہ؟ ٹونی اس کے عقب میں خاموش کھڑا تھا۔ وہ غالباً میری آنکھوں میں سوال پڑھ کر آگے آتے ہوئے بولا "میری ابھی میڈم سے ملاقات نہیں ہو سکی' اسی سے ملاقات ہوئی ہے۔ یہی پیغام لے کر میڈم کے پاس گیا تھا' یہی جواب لے کر آیا ہے۔"

"اچھا..... تو پھر اندر جانا ہی پڑے گا!" میں نے گہری سانس لے کر گاڑی سے اترتے ہوئے کہا۔ میں چاہ تو یہی رہا تھا کہ اندر جائے بغیر کام چل جاتا۔

دو پلی ٹوپی والا کورنش بجالاتے ہوئے بولا "خادم کو نذیر کہتے ہیں۔"

غنیمت تھا کہ اس نے اپنے آپ کو نذیراں نہیں کہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو نذیراں کہتے ہوئے بھی اچھا نہ لگتا اور نذیر نام بھی اس پر جچ نہیں رہا تھا۔ اس کا تو کچھ اور ہی درمیانہ سا نام ہونا چاہیے تھا۔

وہ مؤدبانہ انداز میں کوٹھی کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "ایک مدت سے میں آپ جیسے بڑے لوگوں کی خدمت پر مامور ہوں۔ کبھی کسی کو مجھ سے شکایت نہیں ہوئی' کسی کی پیشانی پر شکن نہیں آئی۔ ہر ایک نے خوش ہو کر نوازا ہے اور بہت نوازا ہے۔"

"کیا امید رکھی جائے کہ ان نوازشات کے نتیجے میں تم بڑھاپے تک ایسی ہی کوٹھی خریدنے اور ایسا ہی کوٹھی خانہ چلانے کے قابل ہو جاؤ گے؟" میں نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا کہ کہیں میں مذاق تو نہیں کر رہا؟ لیکن میں بالکل سنجیدہ تھا۔ وہ قدرے انکساری سے بولا "اتنا بڑا اور اتنا معیاری کوٹھی خانہ چلانے کا تو میں نہیں سوچ سکتا لیکن بہرحال... کچھ نہ کچھ کر ہی لوں گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ میڈم کے بعد یہ کوٹھی خانہ مجھے ہی چلانا پڑے۔"

میں نے چلتے چلتے رک کر کہا "نذیر میاں! تمہیں کیونکر امید ہے کہ تم میڈم کے بعد بھی زندہ رہو گے؟"

"میری ایسی کوئی خواہش تو نہیں ہے سرکار!" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "اللہ انہیں لمبی زندگی دے۔ میری عمر بھی انہیں لگ جائے۔ ان جیسی عظیم عورتیں صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں لیکن عمر کا فرق بہرحال دیکھنا پڑتا ہے۔ وہ ساٹھ سے اوپر کی ہیں اور میں ابھی چھبیس سال کا ہوں۔ اس بات کو بھی چھوڑیئے ان کے خواب بہت اونچے ہیں۔ وہ تو اب فرانس اور اٹلی جیسے ملکوں میں اس قسم کے اڈے چلانے کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔ کیا پتا کس وقت رخصت ہو جائیں اور آپ جیسے قدر دانوں کی خدمت کے سارے انتظامات پھر اس خاکسار کو ہی سنبھالنے پڑیں۔"

"فرانس اور اٹلی جیسے ملکوں میں میڈم کی یہ شان و شوکت اور یہ قدر کہاں ہو گی جو یہاں ہے؟" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "یہاں وہ ملکہ ہیں' وہاں تو گلی گلی ان جیسی "مادامیں" بکھری ہوئی ہیں۔"

"ان باتوں کو وہی بہتر سمجھتی ہوں گی سرکار! دنیا گھومی ہوئی ہے انہوں نے۔" وہ خواہ مخواہ ہی جسم کو لہرا سا دے کر بولا "میں سیدھا سادا دیسی آدمی ہوں۔ تشریف لایئے۔"

گیٹ غیر مقفل ہی تھا۔ وہ آگے بڑھ کر اسے وا کرتے ہوئے بولا "آیئے آیئے' بلا تکلف چلے آیئے۔ یہ دروازہ مقدر والوں کے لیے ہی کھلتا ہے۔ ہر قسم کی سازشیں اس دروازے سے باہر رہ جاتی ہیں۔ اندر قدم رکھنے کے بعد آپ دنیا کے تمام مسائل سے بے پروا ہو جایئے۔ کہیں کوئی آپ کی مخبری نہیں کر سکے گا۔ کوئی جا کر پریس والوں کو ٹپ نہیں دے گا۔ یہ ایک الگ ہی دنیا ہے۔"

"بے شک... بے شک۔" میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا اور گیٹ سے اندر قدم رکھتے وقت ذرا مڑ کر گاڑی کی چابیاں ٹونی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "میں شاید گاڑی لاک کرنا بھول گیا ہوں اور کھڑکی کا شیشہ وغیرہ بھی نہیں چڑھایا۔" ساتھ ہی میں نے چوکیدار کی طرف خفیف سا اشارہ کیا۔ اس کی پشت اس وقت میری طرف تھی۔

"آیئے آیئے' آپ اندر تشریف لے چلیے۔ آپ کا سیکرٹری گاڑی لاک کر کے آ جائے گا۔" نذیر نے آگے چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ٹونی نے اس سے اپنا تعارف غالباً میرے سیکرٹری کی حیثیت سے کرایا تھا۔ میں نذیر کی رہنمائی میں آگے چل دیا۔

ڈرائیو وے خوب طویل و عریض تھا۔ اس میں پانچ بیش قیمت گاڑیاں کھڑی تھیں۔ لان زیادہ بڑا نہیں تھا تاہم اس پُرشکوہ کوٹھی میں کمروں کی تعداد بہت زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ کوٹھی خانے کو بڑے لان کی نہیں' زیادہ کمروں ہی کی ضرورت تھی۔ دونوں منزلوں پر بیشتر کمروں کی کھڑکیوں میں تاریکی نظر آ رہی تھی۔ اندر شاید مدھم روشنی تھی لیکن کھڑکیوں پر شیشوں کے عقب میں گہرے رنگوں کے بھاری بھاری پردے پھیلے ہوئے تھے۔

میری نظریں مسلح محافظوں کی تلاش میں بھٹک رہی تھیں لیکن

مجھے کہیں کوئی نظر نہ آیا۔ صرف بغلی راہداری میں' غالباً سرونٹ کوارٹرز کی طرف جانے والے راستے پر مجھے ایک ہیولا سا نظر آیا لیکن وہ بھی فوراً ہی ایک محرابی دروازے کے عقب میں غائب ہو گیا۔ فضا میں ایک خوشگوار مہک پھیلی ہوئی تھی جو کئی خوشبوؤں کا آمیزہ معلوم ہوتی تھی۔

ڈرائنگ روم کا بھاری بھرکم منقش چوبی دروازہ ایک خوب صورت آرائشی دیوار کی آڑ میں تھا۔ نذیر نے مستعدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ڈرائنگ روم میں قدم رکھنے سے پہلے میں نے باہر ایک مدھم چھینک جیسی آواز سنی۔ کبھی کبھی کتا یا بلی وغیرہ اس طرح چھینک مارتے ہیں لیکن مجھے معلوم تھا یہ کتے بلی وغیرہ کی چھینک نہیں تھی۔

باہر یقیناً چوکیدار کا کام تمام ہو چکا تھا۔ ٹونی کو جب نہایت خاموشی سے کسی کو ٹھکانے لگانا ہوتا تھا تو وہ سیاہ رنگ کی ایک خوب صورت اور انتہائی مضبوط ریشمی ڈوری استعمال کرتا تھا جس کے ایک سرے پر جست کی ایک گولی بندھی ہوئی تھی۔ کسی کے عقب سے گزرتے وقت وہ اچانک ہی اس ڈوری کا ایک سرا پکڑ کر ایک خاص انداز میں گھماتا تھا۔ جست کی گولی کی وجہ سے ڈوری یکدم گھوم کر شکار کی گردن کے گرد حلقہ بنا لیتی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ٹونی اس کی گردن میں موت کا پھندا کس دیتا تھا۔

بڑے سے بڑا طاقتور آدمی ہاتھ پاؤں مارتا رہ جاتا تھا اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت تک اسے اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا؟ راہ چلتے بھی اگر ٹونی یہ ٹیکنیک استعمال کرتا تو چار قدم آگے جاتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو بھی علم نہیں ہو سکتا تھا کہ پیچھے کیا ہوا۔ یہ نہایت پُرسکون اور رازدارانہ طریقہ تھا۔ مجھے امید تھی کہ میرے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھنے تک ٹونی اس لمبی چوڑی لاش کو کہیں اندھیرے میں کسی باڑھ وغیرہ کے عقب میں چھپا چکا ہو گا۔ مجھے یہ بھی امید تھی کہ آتے وقت وہ اِدھر اُدھر اندھیرے کونے کھدروں اور ڈرائنگ روم کے آس پاس کا جائزہ لیتا آئے گا اور اگر مزید کوئی محافظ قسم کی چیز اس کے ہتھے چڑھ گئی تو وہ بھی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

ڈرائنگ روم بہت شاندار اور متاثر کن تھا۔ اس کی آرائش یقیناً کسی اچھے انٹیریئر ڈیکوریٹر کی رہین منت تھی۔ میں ایک نہایت آرام دہ صوفے میں دھنس گیا۔ نذیر دست بستہ میرے سامنے کھڑا تھا اور قربان جانے والے انداز میں مسکرائے جا رہا تھا۔

چند لمحے بعد ٹونی بھی آن پہنچا اور میرا اشارہ پا کر میرے برابر بیٹھ گیا۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مجھے بتا دیا کہ وہ اپنا کام کر آیا تھا۔ میں نے دیکھا' اس کے ایک ہاتھ پر تازہ خراشیں تھیں لیکن نذیر کے دیکھنے سے پہلے اس نے وہ ہاتھ الٹا کر کے اپنے پہلو میں ٹکا لیا۔ نذیر کو شاید گمان تک نہیں تھا کہ کوٹھی کا مین گیٹ ان کے لیے ترنگے' بارعب چوکیدار سے محروم ہو چکا تھا۔

اسی لمحے اندرونی دروازہ کھلا اور خوش شکل' نازک اندام لڑکی ایک خوب صورت ٹرالی دھکیلتی ہوئی اندر آئی۔ یہ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہاں ہماری آمد متوقع رہی ہو۔ لڑکی ریشمی سلیپنگ سوٹ میں تھی اور اسے پہننے کے سلسلے میں گویا بے پروائی کے ریکارڈ توڑنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس کے خوب صورت سیاہ' ریشمی بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے اور ان سے بھینی بھینی مہک پھوٹ رہی تھی۔

ٹرالی پر پینے پلانے کے تمام لوازمات سجے ہوئے تھے' صرف بوتل نہیں تھی۔ ٹرالی ہمارے سامنے روک کر وہ تھکے تھکے سے لیکن دل آویز انداز میں مسکرائی اور دھیمی آواز میں بولی "آپ کون سی پینا پسند کریں گے؟"

اس نے یہ پوچھنے کا تکلف نہیں کیا تھا کہ ہم کیا پینا پسند کریں گے۔ بلا تمہید ہی پوچھ لیا تھا کہ "کون سی" پینا پسند کریں گے؟ لگتا تھا' یہاں تمام مراحل شارٹ کٹ میں طے ہوتے تھے۔

میں نے چہرے پر کچھ بے وقوفانہ اور کچھ عاجزانہ سی مسکراہٹ لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہم دیہاتی سے آدمی ہیں۔ ہم فی الحال صرف ٹھنڈا پانی پینا پسند کریں گے۔"

اس نے تیکھی سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ خوب صورت تھی' گوری تھی مگر رنگت میں ایک عجیب سا پھیکا پن تھا۔ وہ جو زندگی کی حرارت' ملاحت اور دلکشی ہوتی ہے' اس کے چہرے پر اور اس کی آنکھوں میں نہیں تھی۔

جیسی تیکھی نظروں سے اس نے ہماری طرف دیکھا تھا ویسے ہی تیکھے لہجے میں بولی "بڑے زمینداروں میں آج کل یہ کہنے کا فیشن عام ہے کہ جی ہم تو دیہاتی سے آدمی ہیں۔ آپ بھی وزیر ہیں۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ بڑے زمیندار ہوں گے۔ لیکن اب... جبکہ آپ یہاں آ ہی گئے ہیں تو اتنے سیدھے اور معصوم بننے کی کیا ضرورت ہے۔ کھل جایئے۔ خود بھی سکھ میں رہیے اور ہمیں بھی خدمت کا موقع دیجیے۔"

نذیر اس کے رخسار پر پیار بھری ہلکی سی چپت رسید کرتے ہوئے ہم سے مخاطب ہوا "یہ ثمینہ ہے۔ یہاں نئی ہے اور تیکھی باتیں کرنا اس کی عادت ہے۔ شاید اس لیے کہ کانونٹ کی پڑھی ہوئی ہے۔ آپ مائنڈ نہ کیجیے گا۔ ویسے دل کی بڑی اچھی ہے۔ تنہائی کی بڑی اچھی ساتھی ہے۔ ہمارے پڑھے لکھے مہمانوں میں بڑی پاپولر ہے۔"

پھر وہ گویا مجھے سمجھاتے ہوئے بولا "ویسے ثمینہ کہہ ٹھیک ہی رہی ہے۔ جب آپ دل کے ارمان نکالنے کے ارادے سے گھر سے نکل ہی کھڑے ہوئے ہیں تو پھر پینے پلانے میں کیا شرمانا؟ اس کے بغیر تو یہ معاملات ایسے ہی ہیں جیسے انسان کھانا تو کھائے مگر پانی نہ پیے؟"

"منزیر میاں! ہمیں ذرا سانس لینے کی مہلت تو دو۔ ہم مرحلہ وار چلنے کے عادی ہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا "اب آتے ہی چٹنی شروع کردیں' یہ تو عجیب سا لگتا ہے۔ پہلے پانی پی لیں' میڈم سے ملاقات ہوجائے' پھر آگے چلیں گے۔ ہمیں یہاں رکنا نہیں ہے' یہاں سے کچھ لے کر جانا ہے۔"

"وہ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جیسے آپ چاہیں گے ویسے ہی ہر کام ہوجائے گا۔ ہم تو چاہ رہے تھے کہ میڈم کے آنے تک آپ کا ذرا موڈ بن جائے لیکن خیر۔ جیسے آپ مناسب سمجھیں ویسے کریں۔" نذیر نے کہا پھر وہ لڑکی سے مخاطب ہوا "ثمینہ جانی! انہیں فی الحال پانی ہی لادو۔ پینے کے لیے ہی مانگ رہے ہیں۔ اپنی امیدوں پر ڈالنے کے لیے تو نہیں۔"

ثمینہ کو "جانی" کہتے وقت اس نے جسم کو غیر ارادی طور پر ایک بار پھر لہرا دیا تھا۔ ثمینہ کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے مدھم سی مسکراہٹ ابھری اور معدوم ہوگئی۔ وہ چلی گئی اور چند لمحے بعد پانی کی ایک بوتل لئے واپس آئی۔ بوتل پر پھیلی ہوئی دھندلاہٹ بتارہی تھی کہ وہ خوب ٹھنڈی تھی۔ بوتل ٹرالی پر رکھ کر وہ چلی گئی۔

میں اور ٹونی ٹھنڈے پانی کو ہی شراب کی طرح چھوٹے چھوٹے گھونٹ لے کر پینے لگے۔ نذیر بدستور دست بستہ کھڑا تھا۔ نہ جانے کیوں اس بدبخت نے ہمارے سر پر سوار رہنا اپنا فریضہ سمجھ لیا تھا۔

"میڈم کب آئیں گی؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"بس وہ تشریف لانے ہی والی ہیں۔ میں ایک بار پھر پوچھ کر آتا ہوں۔" وہ لہراتا ہوا ان سیڑھیوں کی طرف چل دیا جو ڈرائنگ روم سے ہی اوپر جارہی تھیں۔ خلاف توقع وہ نہایت ہلکے پھلکے سے انداز میں تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتا چلا گیا۔

ٹونی سرگوشی میں بولا "اس منحوس کا پتّا صاف کیے بغیر کام نہیں چلے گا۔ لگتا یہی ہے کہ میڈم کے ساتھ یہ بھی یہیں موجود رہے گا ورنہ کمرے میں آتا جاتا تو رہے گا ہی۔ اس کی وجہ سے کام خراب ہوجائے گا۔"

"ہاں... یہ تو درست ہے۔" میں نے ایک بار پھر باریک بینی سے ڈرائنگ روم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "سوچ تو میں بھی یہی رہا تھا لیکن میرا اس بے ضرر سے انسان کی چھٹی کرانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔"

"آپ اپنے جذبہ ترحم کو کچھ دیر کے لیے سلادیں کیونکہ آج لاشیں گرانے کی رات ہے۔" ٹونی نے سرگوشی میں کہا۔ اس سرگوشی میں بھی بلا کی سفّاکی تھی۔ میں نیم رضامندی کے سے عالم میں کندھے اچکا کر رہ گیا۔

اس دوران نذیر اسی پھرتی سے سیڑھیاں اتر کر ایک بار پھر ہمارے قریب آگیا جس پھرتی سے سیڑھیاں چڑھ کر وہ گیا تھا۔ وہ گلوری کی باقیات کو ایک کلّے سے دوسرے کلّے میں منتقل کرتے ہوئے بولا "بس میڈم تشریف لایا ہی چاہتی ہیں۔"

میڈم ہمیں انتظار کرا کے غالباً اپنی اہمیت واضح کرنا چاہتی تھی۔ اس کی شانِ بے نیازی کا بہرحال مجھے دل ہی دل میں اعتراف کرنا پڑا۔ نہ جانے کتنے لوگ تھے جو کسی وزیر کا نام سن کر دوڑے چلے آتے تھے اور نہ جانے کتنے لوگوں کو ان سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لیے کتنا کتنا عرصہ انتظار کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ایک یہ بھی عورت تھی جو وزیر کو انتظار کرارہی تھی۔ وزیر جعلی ہی سہی لیکن اسے تو ابھی یہ بات معلوم نہیں تھی۔

ٹونی اپنی پی کیپ درست کرتے ہوئے مہرباں نظروں سے نذیر کی طرف دیکھ کر اپنے پاس صوفے پر ہاتھ مار کر بولا "آپ ذرا یہاں میرے پاس بیٹھیں نا۔ مجھے آپ سے ایک راز کی بات پوچھنی ہے۔"

"اجی میری یہ جرات کہاں کہ آپ جیسے لوگوں کے برابر بیٹھوں۔ میڈم تو میری کھال اتروا کر بھس بھروادیں گی۔" وہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "ویسے بھی اس چار دیواری میں آپ بے شک بہ آواز بلند بات کریں' وہ راز ہی رہے گی۔"

"نہیں یار! تم یہاں بیٹھو تو سہی۔" ٹونی ادھر ادھر دیکھتے ہوئے رازدارانہ سے انداز میں بولا "بات بہت خاص ہے اور میڈم کے آنے سے پہلے ہی ختم ہوجائے گی۔ اس کے بعد تم چاہے اسی طرح رات بھر ہاتھ باندھے کھڑے رہنا۔"

وہ ہچکچاتے ہوئے ٹونی کے قریب بیٹھ گیا۔ ٹونی نے اس کے کندھے کے گرد بازو پھیلاتے ہوئے اسے اپنے کچھ اور قریب کرلیا۔ وہ شرمیلے سے انداز میں ہنستے ہوئے بولا "سر! یہ آپ کیا کررہے ہیں؟ لگتا ہے آپ ہمارے مطلب کے آدمی ہیں۔"

وہ بدنصیب' ٹونی کے بارے میں حد سے زیادہ غلط فہمی میں مبتلا ہونے لگا تھا۔ وہ نہیں دیکھ سکا کہ ٹونی کا دایاں ہاتھ جیکٹ کی جیب سے باہر آچکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے سیاہ ڈوری کو لہراتے دیکھ لی لیکن اس کے بارے میں اسے کوئی سوال کرنے کی مہلت نہیں ملی۔ اس کا منہ جو کچھ کہنے کے لیے کھلا تھا' کچھ اور کھل گیا۔ دوبارہ بند نہیں ہوسکا۔

اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں' ٹانگیں ہوا میں لہرائیں۔ ٹونی کے ہاتھ اس کی گردن کی پشت پر تھے۔ نذیر نے پیچھے ہاتھ لے جاکر اپنے آپ کو اس شکنجے سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں تو یقیناً گیٹ پر کھڑا رہنے والا لمبا تڑنگا' طاقتور چوکیدار بھی کامیاب نہیں ہوسکا تھا۔ نذیر بے چارہ کس شمار قطار میں تھا۔ اس کے ہاتھ پیچھے پہنچنے سے پہلے ہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں پہلوؤں میں گر گئے۔

اس کے حلق سے صرف ایسی آواز نکلی تھی جیسے کسی نے ہولے سے کھنکار کر گلا صاف کرنے کی کوشش کی ہو۔ اس کے بعد وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔ اس کے چہرے پر نسوں کا جال ابھر آیا اور رنگت نیلی پڑگئی۔

جس طرف کے صوفے پر ہم بیٹھے تھے وہ دیوار کے قریب تھا اور ہمارے عقب میں بھاری پردے تھے۔ ٹونی کو جب یقین ہوگیا کہ نذیر مرچکا ہے تو اس نے ڈوری اس کی گردن سے ہٹالی اور اپنا وہ معمولی مگر نہایت خطرناک اور خاموش ہتھیار جیب میں رکھ لیا۔ نذیر کی لاش اس کے کندھے سے آن لگی۔ اس نے اسے اٹھا کر کسی بیکار چیز کی طرح صوفے کے پیچھے لے جاکر پردے کے عقب میں ڈال دیا اور ہاتھ جھاڑ کر واپس آتے ہوئے بولا "اب ہم اطمینان سے میڈم سے بات کرسکیں گے۔"

میری نظر سامنے والے دروازے پر تھی مگر وہ مکمل طور پر بند تھا اور اس میں کہیں کوئی شیشہ یا جھری وغیرہ نہیں تھی۔ ٹونی نے بھی اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ہی اپنی کارروائی کی تھی۔

ٹونی کے بیٹھنے کے چند لمحے بعد ہی اوپر سے آہٹ سنائی دی۔ پھر سیڑھیوں پر ایک عورت نمودار ہوئی۔ اس سے تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی ہمیں معلوم ہوگیا کہ وہی میڈم تھی۔ وہ نہایت ڈرامائی سے انداز میں ہر سیڑھی پر ذرا رک رک کر اتر رہی تھی۔ سیڑھیوں پر قالین ہونے کی وجہ سے اس کے اونچی ایڑی کے سینڈلوں کی بہت ہی ہلکی سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ صرف پس پردہ موسیقی کی کمی تھی ورنہ اس کی شخصیت اور اس کی آمد کا انداز بالکل فلمی محسوس ہوتا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ عورت نہایت نفیس تھی۔ نذیر نے کہا تھا کہ وہ ساٹھ سے اوپر کی تھی لیکن وہ چالیس سے زیادہ کی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ تاہم موٹاپے نے اس پر خاصا غلبہ پالیا تھا۔ وہ ایک بھاری بھرکم عورت تھی لیکن تھل تھل نہیں کررہی تھی۔ اس کا حدود اربعہ اس کے قابو سے باہر نہیں ہوا تھا۔

فرانس میرا کئی بار جانا ہوا تھا لیکن کبھی اس قسم کے کسی اڈے کا رخ نہیں کیا تھا تاہم میرا اندازہ تھا کہ کسی قدیم گلی کوچے میں اگر اس معیار کے اور اتنے لمبے چوڑے "براتھل ہاؤس" پائے جاتے ہوں گے اور انہیں کوئی "مادام موزئیل" ہی چلاتی ہوگی تو وہ اسی قسم کی شخصیت کی مالک ہوتی ہوگی۔ ویسے جدید فرانس میں یہ روایت ختم ہوتی جارہی تھی۔ نئے زمانے میں ایک تو ہر چیز بہت آگے چلی گئی تھی۔ دوسرے ان ملکوں میں تسکین کے سامان کچھ اس طرح قدم قدم پر بکھرے ہوئے تھے کہ کسی کو اتنا تردّد کرنے اور اتنی رقمیں خرچ کرنے کی ضرورت ہی کم رہ گئی تھی۔ اور ظاہر ہے جب طلب کم ہوجاتی ہے تو رسد خود بخود کم ہوجاتی ہے۔ چنانچہ اتنے بڑے بڑے اور منظم اڈے خود بخود کم ہوتے جارہے تھے۔ جو چل رہے تھے وہ بھی زیادہ تر سیاحوں اور ترستے پھڑکتے غیر ملکیوں کے کرم ہی چل رہے تھے۔

میڈم گلابی رنگ کے' جھلمل جھلمل کرتے ایک لمبے سے میکسی نما لبادے میں تھی۔ بال ڈائی کیے ہوئے تھے اور ان کا اونچا سا جوڑا بنا رکھا تھا۔ اس کی سرخ و سپید رنگت پر بالوں کا یہ اسٹائل جچ رہا تھا۔ اس کا میک اپ بھی نہایت سلیقے کا تھا لیکن اس کی طرف متوجہ کرنے والی اولین چیز وہ بالشت بھر کا موٹا سا سگار تھا جو اس کے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔

برسوں سے میری نشست و برخاست بہت اونچی سوسائٹی میں تھی لیکن اس سے پہلے میں نے زندگی میں صرف ایک ہی عورت کو سگار پیتے دیکھا تھا اور وہ بھی خالص پاکستانی نہیں تھی۔ دوغلی نسل کی تھی۔

سیڑھیوں سے اترتے اترتے اس نے دو طویل کش لیے اور اس دوران ہی گویا ہمارا جائزہ مکمل کرلیا۔ مجھے اس نے نہایت گہری نظر سے دیکھا تھا۔ مجھے خود بھی احساس تھا کہ رات کے اس پہر میرا فیلٹ ہیٹ اور تاریک چشمہ دیکھنے والے کی نظر میں کھٹک رہا ہوگا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ میرا وزیر والا فراڈ زیادہ دیر نہیں چل سکتا تھا۔

اس عورت کو دیکھتے ہی مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگا تھا جیسے ملک کے تمام جوان وزیروں مشیروں' امیرزادوں اور اہم شخصیتوں کے نام اور شکلیں اس کے ذہن کے کمپیوٹر میں محفوظ ہوں گی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مجھ سے یہ ضرور پوچھے گی میں کس محکمے کا وزیر ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میرا بھانڈا پھوٹنے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں جس محکمے کا نام لیتا اس کے وزیر سے میڈم واقف ہوتی یا کم از کم اس کی صورت سے آشنا ہوتی۔

میں یہاں اپنی اصلی شکل میں بھی نہیں آسکتا تھا۔ نبیلہ نے بتایا تھا کہ یہاں میرے بارے میں باتیں ہوتی رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میڈم مجھے بھی پہچانتی ہوگی۔ اگر میں اپنی اصلی حیثیت میں اس کوٹھی میں داخل ہونے کی کوشش کرتا تو سب پہلے ہی ہوشیار ہوجاتے اور ہنگامہ برپا ہوجاتا جبکہ میں صرف ہنگامے سے ہی بچنا چاہتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ ہم جو کچھ بھی کریں' غیر ضروری لوگوں کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہو۔ میرا مسئلہ اب حل ہوچکا تھا۔ میڈم ہمارے سامنے پہنچ چکی تھی۔ اب اگر وہ دو چار منٹ بعد مجھے پہچان بھی لیتی یا یہ جان جاتی کہ میں وزیر نہیں ہوں تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اب وہ اس کمرے سے کہیں نہیں جاسکتی تھی اور ہم یہ انتظام بھی کرسکتے تھے کہ اس کی آواز اس کمرے سے باہر نہ جانے پائے۔

"خوش آمدید۔" وہ آخری سیڑھی پر رکتے ہوئے کھنکتی آواز میں بولی۔

"شکریہ" ہم نے اٹھ کر اس کا استقبال کرتے ہوئے کہا۔

وہ سگار انگلیوں میں دبائے نہایت شاہانہ انداز میں دوسرے صوفے کی طرف بڑھی۔ صوفہ ہمارے مقابل ہی تھا لیکن وہ دوسری دیوار کے قریب تھا اور کمرا نہایت طویل و عریض تھا۔ اگر وہ اس پر بیٹھ جاتی تو ہمارے اور اس کے درمیان خاصا فاصلہ رہتا جو ہمارے لیے کوئی اچھی بات نہیں تھی۔

میں اور ٹونی جلدی سے ایک دوسرے سے ذرا دور کھسک گئے۔ ہم نے اپنے درمیان اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ چھوڑتے ہوئے اسے ادھر آنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا "آپ یہاں ہمارے پاس تشریف رکھیے نا۔ آپ اتنی دور بیٹھ جائیں گی تو ہم غریبوں کی تو آواز بھی آپ تک نہیں پہنچ سکے گی۔"

وہ ہماری طرف پلٹتے ہوئے سگار کا کش لے کر مسکرائی اور پہلے سے بھی زیادہ کھنک دار لہجے میں بولی "ہماری اب وہ عمر کہاں کہ آپ جیسے نوجوانوں کے پہلو میں بیٹھ سکیں۔ صحیح جگہ پر صحیح چہروں مہروں کو بٹھانا ہی تو ہمارا کام ہے۔ اطمینان رکھیں' اس خالی جگہ کو نہایت خوب صورتی سے پُر کرنے والے بہت مل جائیں گے۔ گوکہ آپ ذرا غلط وقت پر آئے ہیں اور بغیر اطلاع کے آئے ہیں۔"

"معذرت خواہ ہوں۔ بس اچانک ہی پروگرام بن گیا۔ اس ملاقات کا مقصد تو ویسے بھی صرف آپ سے رسم و راہ پیدا کرنا تھا۔ اور آپ کو دیکھ کر دل بہت خوش ہوا ہے۔ فی الحال تو صرف آپ ہی ہمارے پاس تشریف رکھیے' باقی مسائل بعد میں حل ہوتے رہیں گے۔"

اس نے زیادہ نخرے نہیں دکھائے اور اسی تمکنت سے قدم اٹھاتی ہمارے درمیان آبیٹھی۔ وہ اپنی عمر سے کہیں کم کی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے باوجود اس نے اپنے عمر رسیدہ ہونے کا اظہار کیا تھا جبکہ میں نے اکثر دیکھا تھا عمر رسیدہ عورتیں بھی "ابھی تو میں جوان ہوں" کی عملی تفسیر بننے کی کوشش کرتی تھیں۔ اس لحاظ سے وہ ایک کمیاب عورت تھی۔

وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ بڑا عمدہ کلون لگائے ہوئے تھی۔ وہ بے شک ایک غلیظ پیشے سے وابستہ تھی مگر بظاہر اس کا فربہی مائل پیکر نفاست اور خوشبوؤں میں لپٹا ہوا تھا۔ بدبودار ... بھی جب بلندی پر چلے جاتے ہیں تو خوشبودار معلوم ہونے لگتے ہیں۔

اس نے ہمارے سامنے موجود ٹرالی کا جائزہ لیا اور قدرے چونکتے ہوئے بولی "ارے... اس پر پینے پلانے کی چیز تو موجود نہیں۔ یہ ثمینہ کو کیا ہوا......" وہ دروازے کی طرف منہ کرکے ثمینہ کو آواز دینے ہی لگی تھی کہ میں نے جلدی سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "پلیز! ثمینہ کو مت بلائیے۔ ہم نے ہی اسے لانے سے منع کیا تھا۔ ذرا ٹھہر کر آپ کی مہمانداری سے لطف اندوز ہوں گے۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔"

"درست ہے۔" اس نے متانت سے سرہلایا "ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" پھر وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولی "یہ نذیر نہ جانے کہاں مرگیا...!"

اسے نہیں معلوم تھا کہ نذیر محاورتاً نہیں حقیقتاً مرگیا تھا اور عین اس کے پیچھے ہی پڑا تھا۔ وہ چاہتی تو ہاتھ بڑھا کر پردے کے پیچھے اسے چھوسکتی تھی۔ ناآگہی واقعی کتنے اطمینان کا باعث ہوتی ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ نذیر کو آواز دیتی۔ میں نے جلدی سے کہا "وہ چند منٹ کے لیے معذرت کرکے گیا ہے۔ شاید باتھ روم وغیرہ۔"

"اوہ" وہ گہری سانس لے کر رہ گئی۔

"ان سب کو چھوڑیئے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "ہمیں صرف آپ سے باتیں کرنا تھیں۔ ہم یہاں نئے ہیں' فی الحال تو یہاں کے طور طریقوں سے اور ضروری باتوں سے آگاہ ہونا چاہتے ہیں۔"

"ارے صاحب! چھوڑیے طور طریقوں کو۔" اس نے ادا سے بے نیازی سے اپنا گدرایا ہوا ہاتھ لہرایا اور اس کی انگلیوں میں موجود ہیرے کی انگوٹھیاں جھلملا اٹھیں "اتنے تکلفات میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں آپ کو صحیح صورت حال بتادیتی ہوں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا آپ اتنی تاخیر سے اور وہ بھی بغیر اطلاع کے تشریف لائے لہٰذا آپ کی خاطر خواہ خدمت نہیں کی جاسکتی۔ زیادہ تر لڑکیاں بک ہوچکی ہیں۔ کچھ یہیں ہیں' کچھ باہر گئی ہیں۔ صرف دو لڑکیاں فارغ ہیں۔ ایک تو وہی ثمینہ ہے' آپ کے لیے پانی وغیرہ وہی لائی ہوگی۔ وہ بھی صرف اس لیے خالی رہ گئی کہ آج اس کا کچھ موڈ آف تھا۔ شاید طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ صبح سے ہی اپنے کمرے میں منہ چھپائے پڑی ہے۔ بہرحال میں کہوں تو تیار ہوجائے گی۔ اس کا موڈ بدلتے ایک منٹ بھی نہیں لگتا۔ دوسری لڑکی بھی اچھی ہے۔ پاکستانی نہیں ہے۔"

اس نے ایک پڑوسی ملک کا نام لیا "وہاں کی بڑے اعلیٰ درجے کی ماڈل ہے۔ زیادہ عرصے یہاں نہیں رہے گی۔ اتفاقاً ہی کچھ عرصے کے لیے ہمارے پاس آگئی ہے۔" پھر وہ ان لڑکیوں کی کچھ ایسی خصوصیات روانی سے بتانے لگی کہ میرے کانوں کی لویں تپنے لگیں اور میں نے محسوس کیا کہ ٹونی کا سرخ و سپید چہرہ بھی کچھ تمتمانے لگا تھا۔

پھر یکدم جیسے اسے کچھ خیال آیا اور وہ چونکتے ہوئے بولی۔ "آپ نے اپنا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔ صرف منسٹر صاحب کہہ دینا تو کافی نہ ہوا۔ اور میں یہ بھی جاننا چاہوں گی کہ ہماری طرف آپ کی رہنمائی کس نے کی؟"

اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے سگار کا گہرا کش لیا۔ میرے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ اسے یہ سوال کرنے کا خیال اچانک نہیں آیا تھا۔ بڑے حساب سے اس نے گفتگو کو ایک خاص موڑ پر لاکر اس سوال کا باؤنسر پھینکا تھا۔ اسے امید تھی کہ اگر معاملہ کچھ گڑبڑ ہوگا تو ہم یکدم کچھ الجھ جائیں گے۔

میرے لیے اپنی یہاں موجودگی کا الزام کسی بے چارے وزیر پر دھرنا آسان کام نہیں تھا۔ وہ لوگ عموماً جانی پہچانی شخصیات ہوتے ہیں۔ میں نے ایک صوبائی وزیر کا نام لے دیا جو میرے خیال میں کسی حد تک گمنام تھا۔ کم از کم میں نے آج تک اس کی کہیں کوئی تصویر نہیں دیکھی تھی۔

تاہم میں اب اپنی پول کھلنے کے ردِ عمل کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا۔ ٹونی بھی غیر محسوس طور پر اس کے بالکل قریب کھسک آیا تھا۔ اس کا بازو میڈم کے عقب میں صوفے کے پشتے پر ٹکا ہوا تھا۔ تاہم مجھے کچھ یوں لگا کہ میڈم کے لیے میرا جواب تسلی بخش تھا۔ اس کی آنکھوں میں شک کے سائے نہیں ابھرے۔ اس نے طمانیت سے سرہلادیا۔

ریفرنس کے طور پر میں نے قالین کے ایک بہت بڑے صنعت کار کا نام لے دیا جس کے بارے میں مجھے معلوم تھا کہ وہ بڑا عیاش آدمی تھا۔ اس نے ملک کے ہی نہیں' غیر ممالک کے بھی اس طرح کے کتنے ہی اڈے کھنگالے ہوئے تھے۔ اس ضمن میں وہ خاص محفلوں میں بہت سے واقعات چٹخارے لے کر سنایا کرتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میڈم کے لیے اس کا یا اس کے لیے میڈم کا نام اجنبی نہیں ہوگا۔

میں نے اندھیرے میں مزید تیر چھوڑتے ہوئے کہا "آپ کو معلوم ہی ہے' ہم سیاسی لوگ اسکینڈل افورڈ نہیں کرسکتے' ہمیں اپنی نجی مصروفیات کے لیے بہت ہی خاص لوگوں کے حوالے سے' بہت ہی خاص جگہوں کا انتخاب کرنا ہوتا ہے۔"

"میں نے تو آپ کو باہر ہی پیغام بھجوادیا تھا کہ آپ یہاں پہنچ گئے ہیں تو سب کچھ بھول جائیں۔" وہ سگار کا دھواں میرے منہ پر چھوڑتے ہوئے بولی۔ میں نے دھوئیں کی سرمئی دھندلاہٹ کے پار اس کی آنکھوں میں جھانکا تو محسوس کیا کہ وہ باتیں ہم سے کررہی تھی لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس نے مجھے پہچان لیا تھا؟ یا کم از کم اسے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ میں صوبائی منسٹر ملک سیدار خان نہیں تھا؟ شاید وہ مطمئن نظر آنے کی صرف اداکاری کررہی تھی اور درحقیقت معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی فکر میں تھی۔ شاید اس کا ذہن کسی اُدھیڑبن میں تھا۔ شاید وہ اچانک کوئی قدم اٹھانے کا فیصلہ کررہی تھی۔ ہمیں جو کچھ کرنا تھا اس کے لیے اب مزید انتظار کرنا مناسب نہیں تھا۔

میرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں تھا۔ میڈم کی آمد سے پہلے ہی میں اپنا خنجر جیب میں منتقل کرچکا تھا۔ میں نے ٹونی کی طرف دیکھا۔ میرا اس کی طرف دیکھنا ہی کافی تھا۔ ایسے میں میری ذہنی ہم آہنگی بڑے کمال کی تھی۔ یہ ہم آہنگی ہمارا بڑا قیمتی اثاثہ تھی۔ اس کی وجہ سے ہم دونوں مل کر دو ساتھی نہیں' ایک طاقتور گروہ بن جاتے تھے۔

میڈم نے ایک بار پھر تاریک شیشوں کے پار میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "آپ کا پروگرام کیا ہے؟"

"میرا پروگرام کچھ زیادہ اچھا نہیں ہے۔" میں نے اچانک ہی خنجر کی نوک اس کے پہلو میں ٹکادی۔ صرف ایک اشارے کی دیر تھی' خنجر اس کے دل میں اتر جاتا۔ خنجر بالکل پتلا اور سیدھا تھا لیکن اس کی ساخت میں بھی ایک عجیب سی سفاکی پنہاں تھی۔

اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور چیخ مارنے کے لیے منہ کھلا لیکن اس وقت تک عقب سے ٹونی کا بازو اس کی گردن کو اپنے شکنجے میں جکڑ چکا تھا اور اس کا دوسرا ہاتھ سختی سے میڈم کے منہ پر جم چکا تھا۔ یہ کام اس نے پلک جھپکتے میں کیا تھا اور وہ اپنی جگہ سے حرکت کرتا دکھائی نہیں دیا تھا۔

میں نے نہایت دھیمی آواز میں کہا "میڈم! میرا دوست آپ کے منہ سے ہاتھ ہٹالے گا لیکن مسئلہ آپ کی زندگی اور موت کا ہے۔ اگر آپ نے چیخنے کی کوشش کی تو چیخ ادھوری رہ جائے گی' اس کے دوران ہی یہ خنجر آپ کے دل میں اتر جائے گا۔ اس کے بعد اگر آپ کے مسلح محافظ آپ کی مدد کے لیے پہنچے بھی' تو کیا فائدہ؟ آپ ہر قسم کی مدد سے بے نیاز ہو چکی ہوں گی۔ اگر آپ نے کسی کو پکارنے کی کوشش کی تو پکار کسی کے کانوں تک پہنچنے سے پہلے ہی آپ دوسری دنیا میں پہنچ چکی ہوں گی اس لیے بہتر ہے کہ جو کچھ میں پوچھوں' صرف اس کا جواب نہایت آہستگی سے 'نیچی آواز میں دیں۔ آپ کے ہونٹوں پر میری نظر جمی ہوگی اور ان ہونٹوں کی ذرا سی بھی غیر ضروری حرکت آپ کی موت کا باعث بن جائے گی۔ بات سمجھ میں آگئی؟"

وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے اثبات میں سرہلانے کی کوشش کی لیکن ٹونی کی گرفت آہنی تھی۔ وہ سر کو حرکت نہ دے سکی۔ اس کا چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا تھا۔ میں نے ٹونی کو گرفت ذرا نرم کرنے کا اشارہ کیا۔ میڈم کو ذرا سانس آئی تو میں نے کہا "میڈم! اگر آپ میں ذرا بھی عقل ہوگی تو آپ ذرا سا بھی رسک لینے کی کوشش نہیں کریں گی۔ صرف ایک سوال کے عوض زندگی کا سودا کچھ زیادہ مہنگا نہیں ہے۔"

میں نے خنجر پر دباؤ اتنا رکھا کہ اسے اپنی جلد پر نوک کی چبھن محسوس ہوتی رہے۔ پھر میں نے ٹونی کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ اس نے نہایت آہستگی سے میڈم کے منہ پر سے ہاتھ ہٹایا اور گردن پر شکنجہ ذرا ڈھیلا کیا تو میڈم کی رنگت ذرا اعتدال پر آئی۔ اس نے چیخنے کی کوشش نہیں کی تاہم غیر ارادی سے انداز میں گھٹی گھٹی آواز میں پوچھا "کون ہو تم؟"

"تم نے مجھے نہیں پہچانا؟" میں نے دریافت کیا۔ اس کی نظر ایک لمحے کے لیے میری مصنوعی مونچھوں پر ٹھہر گئی تھی۔

"نہیں" اس نے جواب دیا۔

"غیر ضروری سوالات کو رہنے دو۔" میں نے کہا "میں بہرحال تمہارے دشمنوں میں نہیں ہوں' اس لیے تمہاری جان لینا نہیں چاہتا لیکن اس کا انحصار تمہارے تعاون پر ہے۔ میری دشمنی کسی اور سے ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے تمہاری مدد کی ضرورت آن پڑی ہے جو ظاہر ہے' ہمیں تم سے سیدھے طریقے سے نہیں مل سکتی تھی۔"

"کس کی بات کر رہے ہو؟" اس نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔ ٹونی نے اس کی گردن پر دباؤ اتنا رکھا تھا کہ وہ زیادہ کھل کر نہ بول سکے۔

"تمہارا دوست' مہربان اور سرپرست۔ چاہو تو تم اس کی خاطر جان بھی دے سکتی ہو' مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"میں نہیں سمجھی!"

"سمجھ تو گئی ہو' ماننا نہ چاہو تو بات دوسری ہے۔ میں مختار کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ وہ اس وقت کہا ہے؟" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تم... تم یقیناً افضل چوہدری ہو۔" وہ بے اختیار بول اٹھ اس کی پھیلی ہوئی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔

"افضل چوہدری کو گولی مارو۔ مجھے نہیں معلوم افضل چوہدر کون ہے۔ میں تم سے مختار رفتی کی بات کر رہا ہوں۔ صرف بتادو کہ وہ کہاں ہے۔ اور تمہاری جان بخشی ہو جائے گی۔" میں خشک لہجے میں کہا۔

"مجھے تو اس کا پتا بتانے میں کوئی اعتراض نہیں' میں کو اس کے لیے مری جا رہی ہوں۔" وہ بولی "اس کے لیے تمہیں ڈراما بازی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" وہ اب کسی حد تک ا خوف پر قابو پا چکی تھی۔

"ڈراما بازی ہم نے نہیں کی' تم کر رہی ہو۔ مجھے معلوم اتنی آسانی سے یہ بات نہیں بتا سکتی تھیں۔"

وہ یونیورسٹی روڈ کے قریب ایک نو تعمیر شدہ اور نہا عالیشان پرائیویٹ اسپتال کا نام لیتے ہوئے بولی "وہ اس وقت اسپتال کے سرجیکل وارڈ نو میں ہے۔ اس کے جبڑے کا آپریش ہے۔"

میں نے اس کے بازو میں بازو پھنسا رکھا تھا۔ اسے ہلکا اس طرح دیتے ہوئے کہ خنجر کی نوک اس کی پسلیوں میں جائے' میں نے سفاک لہجے میں کہا "یہ مت سمجھنا کہ تم ہمیں الٹا سیدھا پتا بتا کر جان چھڑالو گی۔ ہم تمہیں یہاں سے جا رہے ہیں اور یرغمال بنا کر رکھیں گے۔ اگر تمہاری یہ اطلا ہوئی تو جان سے جاؤ گی اور غلطی کی تلافی پھر بھی نہیں ہو سکے"

"نہیں' یہ اطلاع غلط نہیں ہے۔" وہ زور دے کر بولی "اس کے لیے جان دینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ میں اس کی رہی ہوں لیکن اس کی دشمنیاں تو نہیں بھگت سکتی۔ اس تمہارا جو معاملہ ہے وہ تم جانو' وہ جانے۔ اس میں طاقت ہو سے نمٹ لے گا۔"

"اٹھو۔ تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے۔" میں نے کہا کے اٹھنے سے پہلے ہی ٹونی نے اسے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ میں ساتھ لے جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن میں چاہتا تھا کہ ا اگر غلط بیانی سے کام لے کر مجھے ٹرخانے کی کوشش کی ہے بھی وہ سچ بول دے' اسے احساس ہو جائے کہ اس کی جا آسانی سے نہیں چھوٹے گی۔

وہ سمجھانے کے سے انداز میں بولی "دیکھو' میں نے جھوٹ نہیں کہا۔ وہ شیخ اسپتال کے سرجیکل وارڈ میں ہے۔ پاس پرائیویٹ وی آئی پی روم ہے۔ دروازے پر اس کے مسلح گارڈ بیٹھے ہیں اور یہ بات مجھ سمیت صرف گنتی کے چ

کو معلوم ہے۔ اس کی اپنی بیوی کو بھی نہیں معلوم کہ وہ وہاں داخل ہے۔ میں نے تمہیں بالکل صحیح اطلاع دی ہے۔ تم چاہو تو اس وارڈ میں فون کر کے تصدیق کر سکتے ہو۔ وہ خود ابھی بولنے کے قابل نہیں ہے کیونکہ اس کا جبڑا پٹیوں میں جکڑا ہوا ہے۔ لیکن ڈیوٹی پر موجود نرس اس کی موجودگی کی تصدیق کر دے گی۔ اس کے لیے تمہیں صرف یہ کہنا پڑے گا کہ میڈم بات کرنا چاہتی ہیں۔ وہ سامنے فون رکھا ہے۔ چاہو تو تصدیق کرلو۔ وہ خود بول تو نہیں سکتا لیکن فون سن سکتا ہے۔ اسے اگر کچھ کہنا ہوتا ہے تو کاغذ پر لکھ دیتا ہے اور اس کا گارڈ وہ بات فون پر کہہ دیتا ہے۔ آج کل وہ اسی طرح احکامات جاری کر رہا ہے لیکن صرف نہایت ضروری احکامات۔ میں نے تمہیں ساری بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتادی ہے' اب مجھے ساتھ گھسیٹنے کا کیا فائدہ؟"

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ سچ کہہ رہی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے خاموش رہا تو وہ بولی "ویسے بھی تمہارا مجھے ساتھ لے کر جانا ممکن نہیں ہوگا۔ چار مسلح محافظ کہیں نہ کہیں سے تمہیں دیکھ رہے ہوں گے۔ اگر انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ جاتے دیکھ لیا تو انہیں گڑبڑ کا احساس ہو جائے گا اور وہ تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے ٹونی کو اشارہ کیا اور ہم نے اسے دوبارہ صوفے پر اپنے درمیان بٹھالیا۔ اس دوران اس کی گردن ستور ٹونی کے بازو کے حلقے میں رہی اور میرے خنجر کی نوک بھی اس کی پسلیوں پر ٹکی رہی۔

میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا "مسلح محافظوں اور گولیوں کی باتوں کی باتیں چھوڑو' یہ موضوعات ہمارے لیے اہم نہیں ہے۔ اگر مسلح محافظوں کی ہماری نظر میں کوئی اہمیت ہوتی تو ہم رات اس وقت اس طرح یہاں گھسنے کی جرات ہی نہ کرتے۔ تم یہ بتاؤ مختار کے کمرے کا نمبر کیا ہے؟"

"سات" اس نے بلاتامل جواب دیا "اور یہ بھی بتادوں کہ وہ سات نمبر کو اپنے لیے بہت مبارک سمجھتا ہے۔"

"دیکھتے ہیں یہ نمبر اس کے لیے کتنا مبارک ثابت ہوتا ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "تم کہہ رہی تھیں کہ بہت ضروری احکامات وہ وہیں سے جاری کر رہا ہے۔ یقیناً نبیلہ کے قتل کا حکم بھی اس نے وہیں سے جاری کیا ہوگا؟"

"نبیلہ قتل ہو چکی ہے؟" اسے حیرت کا جھٹکا سا لگا اور اس بار میں فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ سچ مچ حیران ہوئی تھی یا حیرت کی اداکاری کی تھی۔ تاہم میں اسے شک کا فائدہ دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ مختار کے گناہوں اور خباثتوں میں برابر کی شریک تھی۔

"اتنا معصوم بننے کی ضرورت نہیں!" میں نے تلخ لہجے میں کہا "لہ تو بے گناہ اور مظلوم تھی ہی لیکن اس کے ساتھ دو اور قطعی بے گناہ اور ان معاملات سے لاتعلق عورتوں کو بھی نہایت اذیت ناک طریقے سے مار دیا گیا۔ میں نے بہت غور کیا لیکن سمجھنے سے قاصر رہا کہ آخر ان تین عورتوں کے قتل کی کیا ضرورت تھی اور اس سے مختار کو کیا حاصل ہوا؟ آخر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ جس طرح پاگل کتا بلاتخصیص راہ چلتے آدمیوں کو کاٹتا پھرتا ہے اور شعور سے عاری ہوتا ہے کہ اس سے اسے کیا فائدہ یا نقصان ہے۔ بالکل اسی طرح بعض لوگ صرف اپنی منحوس فطرت کی وجہ سے اس سوسائٹی کو لہولہان اور داغدار کرتے پھرتے ہیں اور تمہیں معلوم ہی ہے کہ پاگل کتوں کا انجام کیا ہوتا ہے؟"

"لیکن اس میں میرا کیا قصور؟" اس کے لہجے میں التجا در آئی۔ "میں اس کے ایک دھندے کی انچارج ضرور ہوں لیکن اس کے تمام گناہوں میں تو شریک نہیں۔ تم نے مجھ سے جو معلوم کرنا چاہا وہ میں نے بتا دیا' اب تو مجھے چھوڑ دو۔"

"اس دنیا کے معاملات بہت الجھ گئے ہیں۔" میں نے فلسفیانہ لہجے میں کہا "کون جانے' کون کس کے دھندے میں کتنا شریک ہے۔"

"میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں...." یہ اس کی آخری سرگوشی تھی۔ میرے خیال میں وہ جتنا سچ بول چکی تھی اتنا ہی کافی تھا۔ اب اس کا خاموش ہو جانا ہی بہتر تھا۔ میں نے اس کے پہلو میں خنجر اتار دیا۔ ٹونی نے دوبارہ اس کے منہ پر سختی سے ہاتھ رکھ دیا۔ وہ عمر رسیدہ تھی مگر جاندار عورت تھی۔ بڑی قوت سے کسمسائی لیکن یہ صرف چند لمحوں کی بات تھی۔ آخر کار ساکت ہو گئی۔ اس کی پھٹی پھٹی' بے نور آنکھیں سامنے کی دیوار کو تکتی رہ گئیں۔

خنجر ابھی تک اس کی پسلیوں کے درمیان نرم جگہ میں ایک مخصوص زاویے پر پیوست تھا اور خون برائے نام نکلا تھا۔ اس کی موت کا یقین ہو جانے کے کچھ دیر بعد میں نے خنجر باہر کھینچا اور وہ بھی نہایت آہستگی کے ساتھ تاکہ کم سے کم خون نکلے۔ میں خود ذرا دور ہٹ گیا۔

پہلو میں اس کے لباس کا صرف تھوڑا سا حصہ خون میں تر ہوا اور بس! خون صوفے تک بھی نہیں پہنچا۔ ٹونی نے نہایت آہستگی سے اسے چھوڑ دیا۔ وہ صوفے پر جوں کی توں بیٹھی رہ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آنکھیں ذرا پھیلائے سامنے کی دیوار پر غور

سے کسی چیز کو تک رہی تھی۔ کوئی اس کا چہرہ بغور دیکھتا تبھی کہہ سکتا تھا کہ وہ مر چکی تھی۔ اس کے چہرے پر زندگی نہیں تھی۔ باقی ہر اعتبار سے وہ جوں کی توں تھی۔

میں نے باتھ روم میں جا کر اطمینان سے اپنا خنجر دھویا اور فی الحال اسے خشک کر کے کوٹ کی بڑی جیب میں ہی رکھا۔ ابھی اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ مشین پسٹل میرے کوٹ کی دوسری جیب میں تھا اور میرے دونوں ہاتھ بھی جیبوں ہی میں تھے۔ میں کمرے میں واپس آیا تو ٹونی اندرونی دروازے پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔ اگر اندر سے کوئی آ نکلتا تو ٹونی اس سے نمٹنے کے لئے بالکل تیار تھا۔

میرا اشارہ پا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میڈم کا چہرہ برف کی طرح سفید پڑ چکا تھا۔ وہ اسی طرح صوفے پر بیٹھی تھی' کسی طرف لڑھکی نہیں تھی۔ اس پر ایک الوداعی نظر ڈال کر ہم بے آواز طریقے سے بیرونی دروازہ کھول کر خاموشی سے باہر آ گئے۔ چاروں طرف اسی طرح سکوت طاری تھا۔ کوٹھی میں موجود دوسرے لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ گیٹ پر اور ڈرائنگ روم میں کیا ہو چکا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اندر موجود ثمینہ یا کسی دوسری لڑکی کو جب احساس ہوگا کہ ڈرائنگ روم میں سکوت طویل ہو گیا ہے اور کسی قسم کی سرگرمی کے آثار نظر نہیں آ رہے تب شاید وہ دیکھنے آئے کہ صورت حال کیا ہے۔ تب تک ہم بہت دور جا چکے ہوں گے۔

گیٹ کھول کر ہم باہر آ گئے۔ کہیں کوئی مسلح محافظ نظر نہیں آیا' کسی نے ہمارا راستہ نہیں روکا' کسی نے ہم سے کچھ نہیں پوچھا۔ باہر اس چوکیدار کا نام و نشان بھی نہیں تھا جسے میں نے آتے وقت دیکھا تھا۔

"تم نے اسے کہاں پھینکا ہے؟" میں نے ٹونی سے پوچھا۔

اس نے ایک اور کوٹھی کے سامنے موجود خوب صورت اور گھنی باڑھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس کے پیچھے۔ یہاں تو کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔"

باڑھ کے پیچھے گہرا اندھیرا تھا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ صبح کا اجالا پھیلنے پر ہی لاش دریافت ہوگی۔ میں نے طمانیت سے سر ہلایا اور ہم گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔

اس گلی سے میں نے گاڑی ہیڈ لائٹس آن کئے بغیر نکالی۔ دوسری گلی میں پہنچ کر میں نے ہیڈ لائٹس آن کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں تو مسئلہ خلاف توقع بہت ہی پُرسکون انداز میں حل ہو گیا۔ زیادہ مار دھاڑ اور خوں ریزی نہیں ہوئی۔"

"کوٹھی خانے کو بند کرنے کا آدھا مرحلہ تو طے ہو ہی گیا ہے۔" ٹونی پی کیپ سر سے اتار کر گود میں رکھتے ہوئے بولا "اب اسے مکمل طور پر بند کرانا کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ سمجھ لیں کہ میڈم اس درخت کا تنا تھی۔ تنا آج کٹ گیا' جڑ ہم اس وقت اکھاڑنے جا رہے ہیں۔ شاخوں کا کیا ہے' خود ہی سوکھ جائیں گی یا پھر انہیں تھوڑی سی آنکھیں دکھا دیں گے۔ دو چار مرتبہ رات کو یہاں اچانک چھاپا ماریں گے' چڑھائی کریں گے' دو چار چھوٹے بڑے لوگوں کی پٹائی کریں گے' تھوڑی بہت فائرنگ اور ہنگامہ آرائی کریں گے' بڑے لوگوں کو پریس میں ایکسپوز کرائیں گے جو اس قسم کے اڈوں کی سرپرستی کرتے ہیں' جن کی وجہ سے ایسے اڈے چلانے والے بہت دلیر اور نڈر رہتے ہیں' ان کے حوصلے بلند رہتے ہیں اور وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ دو چار مرتبہ اس قسم کی ہنگامہ آرائی ہوگی' کچھ لوگوں کی رسوائی ہوگی اور اخباروں میں کہانیاں آئیں گی تو اڈا خود ہی بند ہو جائے گا۔"

"کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ کون لوگ ہیں جو اڈے کے پیچھے پڑ گئے ہیں اور کیا چاہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ اس قسم کے معاملات میں آپ کی وضع کی پالیسی آج تک بڑی کامیاب جا رہی ہے کہ جب کوئی کارروائی ہو تو صورت حال کو اتنا الجھا دو کہ کسی کی کچھ سمجھ میں نہ آئے۔ سب ٹاک ٹوئیاں مارتے رہیں اور کڑیاں ملانے کی کوشش کرتے رہیں۔ اس کوشش میں بہت سے معزز چہرے بے نقاب ہوتے رہیں' چھپی ہوئی کہانیاں سامنے آتی رہیں۔ ایسی صورت میں بعض اوقات کچھ خفیہ ہاتھ خود ہی معاملے کو دبانے پر بھی مجبور ہو جاتے ہیں۔"

پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ٹونی بولا "ویسے ہم آج بھی شروع کر سکتے تھے۔ کوٹھی خانے سے جو لڑکیاں جا چکی تھیں' ان کے بارے میں تو کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چار کمروں کے دروازے توڑ کر یا کھلوا کر ذرا ہم دیکھتے تو سہی کہ کون کون سے معززین اور شرفا وہاں داد عیش دے رہے تھے۔"

"اس کی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا "ہمارا مقصد لوگوں کے چہرے دیکھنا نہیں' اس اڈے کو بند کرانا ہے۔ اس لئے تم بعد میں اطمینان سے کارروائی کرتے رہنا۔ آج رات تو ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے' دوسرے میرا موڈ زیادہ نہیں ہے۔ وہاں محافظ تو ضرور موجود ہوں گے۔ ان سے گولیاں چلتیں' اچھا خاصا ہنگامہ برپا ہوتا۔ فی الحال ہم آرام اور خاموشی سے نکل آئے۔ میں چاہتا ہوں کہ شیخ اسپتال میں ہمارا کام اسی طرح پُرسکون انداز میں ہو جائے۔ غیر متعلقہ لوگوں کے کانوں کان پتا نہ چلے۔"

"ایسا ہی ہوگا سر!" ٹونی پُراعتماد لہجے میں بولا "اسپتال جگہ پر ویسے بھی ہنگامہ آرائی مناسب نہیں۔"

"تم ہو بھی تو اپنی اصل شکل میں' تم نے بھی تھوڑا میک اپ تبدیل کر لیا ہوتا تو اچھا رہتا۔ پھر خواہ ہم کتنے ہی لوگوں کی نظروں میں آ جاتے' کوئی فرق نہ پڑتا۔" میں نے کہا۔

"میک اپ تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" ٹونی بولا "لیکن ایسے کے کاموں میں' میں اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اصل شکل میں ہونے سے بھی کوئی ایسا فرق نہیں پڑتا۔

گمنام آدمی ہوں۔ گمنام ہونے کے بھی بڑے فائدے ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بعد میں میرا حلیہ سن کر مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرے تو بہت پریشان ہوگا کیونکہ شہر میں مجھ سے ملتی جلتی شخصیت کے ہزاروں نہیں تو سیکڑوں نوجوان تو ضرور موجود ہوں گے۔ اور اگر زندگی میں کبھی کوئی مسئلہ کھڑا بھی ہوا تو آپ جو بیٹھے ہیں۔"

"اچھا یہ بتاؤ' تمہیں شیخ اسپتال کا کچھ حدود اربعہ معلوم ہے؟ میں نے تو آج تک اس کی چار دیواری میں قدم نہیں رکھا۔" میں نے کہا۔

"فکر نہ کریں۔ میرا دیکھا بھالا ہے۔" ٹونی نے مجھے اطمینان دلایا "سرجیکل وارڈ فرسٹ فلور پر ہے۔ اور یہ بہت ہی اچھی بات ہے کہ ہمارا شکار دی آئی پی روم میں ہے۔ وہ کمرے ایک بالکل ہی الگ تھلگ راہداری میں واقع ہیں۔ بڑا سکون رہتا ہے اس طرف' ہمیں اپنا کام کرنے میں آسانی رہے گی لیکن اسپتال میں داخل ہمیں بہرحال پچھلی طرف سے ہی ہونا پڑے گا کیونکہ اسپتالوں میں تو مین گیٹ کی طرف راتوں کو بھی خاصی آمد و رفت رہتی ہے۔"

"اگر ہم کہیں سے دو سفید اوورآل اور دو اسٹیتھسکوپ حاصل کر کے لیتے چلتے تو بڑی آسانی رہتی۔ اوورآل پہن کر' اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکا کر جہاں چاہتے گھومتے پھرتے' کوئی ہمیں نہ روکتا۔ لیکن افسوس کہ اب اس کا بھی وقت نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"آپ میری رہنمائی میں چلئے گا۔ ہمیں اب بھی کوئی نہیں روکے گا۔" ٹونی اطمینان سے بولا "اسپتال بے شک اعلیٰ درجے کا ہے لیکن اب سیکیورٹی ایسی بھی نہیں ہے کہ پرندہ پر بھی نہ مار سکے۔ اور جہاں پرندہ پر نہ مار سکے وہاں بھی داخل ہونے کی کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی ہے۔ جس راہداری میں وہ چند وی آئی پی رومز ہیں اسی کے سرے پر ایک چھوٹا سا کمرا ہے جس کی دیوار میں بہت بڑا شیشہ لگا ہوا ہے۔ رات کو اس وقت اس کمرے میں صرف ایک ڈیوٹی نرس بیٹھی ہوگی جو آتے جاتے لوگوں کو شیشے کے پار سے دیکھتی رہتی ہے۔"

"وہ رات کو اس وقت ہمیں راہداری میں داخل ہوتے دیکھ کر چونکے گی۔ اگر ہم سیدھے نکلتے چلے گئے تو وہ پریشان ہو سکتی ہے' کوئی گڑبڑ کر سکتی ہے' کسی کو فون وغیرہ کر سکتی ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"پہلے اسی کے پاس ہوتے چلیں گے۔" ٹونی بولا "ویسے بھی میرا اندازہ ہے کہ راہداری میں داخل ہوتے ہی مختار کے محافظوں کی نظر ہم پر پڑے گی۔ وہ غالباً کمرے کے دروازے پر ہی بیٹھے ہوں گے۔ اس صورت میں پہلے ہمارا سیدھے ڈیوٹی روم میں ہی چلے جانا مناسب ہوگا تاکہ وہ یہ نہ سمجھیں' ہم ان کی طرف آ رہے ہیں۔ انہیں تذبذب میں رکھ کر ہی ان کے قریب جانا بہتر ہوگا کیونکہ آپ خاموشی چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔ کام خاموشی سے ہی ہو جائے تو اچھا ہے۔ اسپتال میں گولیوں کے دھماکے نہ گونجیں تو بہتر ہے۔ نہ جانے بیچارے کس کس حالت کے مریض وہاں ہوتے ہیں۔ خواہ مخواہ گھبراہٹ سے ان کا برا حال ہوگا۔" میں نے کہا۔

اس دوران ہم شیخ اسپتال کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں نے گاڑی عقبی سروس روڈ کی طرف موڑ لی۔ اسپتال حال ہی میں مکمل ہوا تھا۔ ابھی اس کے عقب میں کافی زمین خالی پڑی تھی جو غالباً اس خیال سے چھوڑی گئی تھی کہ مستقبل میں اسپتال کو توسیع دینے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ اس زمین پر جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

اسپتال کی پچھلی دیوار بہت نیچی تھی۔ گاڑی کچھ دور چھوڑ کر ہم نہایت آسانی سے اسے پھلانگ کر خودرو جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے عمارت کے عقب میں پہنچے۔ عقبی دیوار میں نکاسی اور ائرکنڈیشننگ کے بڑے بڑے پائپوں کے قریب بغیر پٹ کا ایک چھوٹا سا دروازہ موجود تھا جو غالباً صفائی وغیرہ کرنے والوں کی آمد و رفت کے لئے بنایا گیا تھا۔

ہم سر جھکائے آگے پیچھے اس دروازے سے گزر کر ایک تنگ سی راہداری میں پہنچے جس میں دونوں طرف چھوٹے چھوٹے دروازے تھے۔ ان پر اسٹور روم' سوئچ روم وغیرہ کی تختیاں لگی ہوئی تھیں۔ بائیں ہاتھ پر تنگ سی سیڑھیاں تھیں۔ میں ٹونی کی رہنمائی میں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ ٹونی نیچی آواز میں بولا "یہ وہ راستے ہیں جو زیادہ تر نچلے درجے کے ملازمین کے استعمال میں رہتے ہیں۔"

"اللہ نچلے درجے کے ملازمین کا بھلا کرے۔ ان کی وجہ سے دوسروں کو کوئی نہ کوئی فائدہ پہنچتا ہی رہتا ہے۔" میں نے خلوص سے کہا۔

سیڑھیوں کے اختتام پر بائیں ہاتھ پر ایک لاؤنج سا تھا جہاں چھت میں بڑی سی سفید لائٹ نصب تھی۔ اس لاؤنج کے دروازے پر اسٹول پر ایک باوردی وارڈ بوائے ٹائپ کا نوجوان بیٹھا بڑے انہماک سے نیل کٹر سے پیروں کے ناخن کاٹ رہا تھا۔

ہم اس کے سامنے سے گزرتے چلے گئے۔ اس نے آنکھ اٹھا کر بھی ہماری طرف نہیں دیکھا۔ ہم کئی کشادہ راہداریوں سے گزرے جہاں کے فرش دھندلی دھندلی' سفید روشنی میں جھلملا رہے تھے اور ہوا میں جراثیم کش اور دوسری دواؤں کی ہلکی سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ دونوں طرف کمروں کی قطاریں تھیں۔ ایک ڈیوٹی روم سے ایک لیڈی ڈاکٹر بھی نکلتی دکھائی دی لیکن اس نے بھی ہماری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔

راستے میں لوگوں کی آمد و رفت برائے نام ہی دکھائی دی۔ ٹونی یوں آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا جیسے ہر راستہ اچھی طرح اس کا دیکھا بھالا ہو۔ اس کی جنرل نالج ہمیشہ ہی میرے لئے بڑی کارآمد ثابت

ہوئی تھی۔

آخر کار وہ چار راہداریوں کے سنگم پر رک گیا اور دیوار سے لگ کر بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اب ہم اس طرف مڑیں گے تو شیشے کا ایک دروازہ آئے گا۔ اس سے گزرتے ہی بائیں ہاتھ پر ڈیوٹی روم ہوگا۔ میرا اندازہ ہے کہ کمرا نمبر سات بھی اسی سیدھ میں کہیں ہوگا۔ کیا خیال ہے؟ گن نکال لی جائے؟"

میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا اور کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس مقام پر اسپتال 'اسپتال' کم اور ہوٹل زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ نو تعمیر شدہ ہونے کی وجہ سے چمک دمک بھی برقرار تھی۔ صرف فرش پر قالین کی کمی تھی۔

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "نہیں، گن اشد ضرورت کے بغیر نہیں نکالی جائے گی۔ ہمیں بالکل بے ضرر سے انداز میں پہلے سیدھے ڈیوٹی روم میں ہی جانا چاہئے۔ ہماری کارروائی میں چند منٹ تو ضرور لگیں گے۔ راستے میں موجود خطرے کا انتظام کرتے ہی چلیں تو بہتر ہے۔"

ہم بظاہر گرد و پیش سے بے نیاز نیچی آواز میں، سرسری انداز میں باتیں کرنے کی اداکاری کرتے ہوئے بائیں طرف مڑے اور شیشے کے اس دروازے پر پہنچے جس نے راہداری کو بند کیا ہوا تھا۔ اس پر انگریزی میں جلی حروف میں اوپر "وی آئی پی رومز" لکھا ہوا تھا اور نیچے لکھا تھا "بلا اجازت غیر متعلقہ افراد کا داخلہ ممنوع ہے۔"

لیکن اجازت دینے کے لئے وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ دروازہ غیر مقفل ہی تھا۔ اسے کھولتے ہی ہمیں راہداری کے اختتام پر، کونے میں ایک کمرے کے دروازے پر دو گن مین بیٹھے نظر آگئے۔ وہ نیچی سی کرسیوں پر کاہلی آمیز سے انداز میں بیٹھے تھے۔ ان کی آٹومیٹک گنیں ان کی گود میں رکھی ہوئی تھیں۔

ہمیں بڑے دروازے سے راہداری میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ فوراً ہی گنیں سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ انہیں غالباً احساس تھا کہ مختار کی وہاں موجودگی کا علم گنتی کے چند لوگوں کو ہی تھا۔ اسی لئے وہ شاید زیادہ خطرہ محسوس نہیں کر رہے تھے اور روایتی سے انداز میں پہرہ دے رہے تھے۔ وہ وہیں کھڑے رہے۔

ہم نے بظاہر ان کی طرف قطعاً توجہ نہیں دی جیسے ہمیں ان سے کوئی غرض نہ ہو۔ ہم فوراً ہی بائیں طرف ڈیوٹی روم میں گھس گئے جیسے ہمیں وہیں کوئی کام ہو۔ وہ ایک چھوٹا سا، صاف ستھرا کمرا تھا جس میں بہت سے طبی لوازمات موجود تھے۔ ایک طرف سفید پردوں والا پارٹیشن تھا۔

چھوٹی سی ایک میز کے عقب میں سفید یونیفارم میں ایک کم عمر سی نرس ریوالونگ چیئر پر نیم دراز کوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ وہ مطالعے میں کچھ زیادہ ہی کھوئی ہوئی تھی۔ اس نے ہمیں اس وقت دیکھا جب ہم اس کے عین قریب جا پہنچے۔ وہ ہڑبڑا کر ذرا سیدھی ہو کر بیٹھ گئی اور قدرے پریشان ہو کر بولی "آپ کون...؟"

شاید وہ رات کو اس وقت اس حصے میں کسی کی آمد کی توقع نہیں کر رہی تھی۔ ٹونی نے اسے جملہ پورا کرنے کا موقع نہیں دیا۔ وقت کم تھا' اس بات کا قوی امکان تھا کہ مختار کے گن مین ٹہلتے ہوئے اس طرف آجاتے۔ میرا خیال تھا' انہیں تجسس تو ضرور ہو رہا ہو گا کہ دو اجنبی اس وقت ڈیوٹی روم میں کیا کرنے آئے ہیں۔

مجھے شاید اس نازک اندام' خوب صورت اور کم عمر نرس کو کراٹے کا وار کرنے میں ایک لمحے کے لئے ہچکچاہٹ ہوتی لیکن ٹونی نے ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا۔ اس نے لڑکی کی کنپٹی پر کراٹے کا ایک جچا تلا ہاتھ رسید کیا۔ وہ کرسی سمیت الٹ کر دوسری طرف گرنے لگی لیکن دوسری طرف میں موجود تھا۔ میں نے اسے کرسی سمیت سنبھال لیا۔

اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلک چکی تھی۔ میں نے اسے ذرا صحیح طرح بٹھا دیا۔ دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ بیٹھے بیٹھے اسے نیند آگئی ہے۔ اس کے ہاتھ سے کتاب چھوٹ کر نیچے گر چکی تھی۔ میں نے اسے اٹھا لیا اس کا عنوان تھا "ایک نرس کی آپ بیتی۔"

معلوم نہیں اس نرس کو بھی کسی نے کبھی اس طرح کراٹے کا ہاتھ رسید کیا تھا یا نہیں' جس کی وہ آپ بیتی تھی۔ جس ذوق و شوق سے وہ نرس اس آپ بیتی کو پڑھ رہی تھی اس سے تو لگتا تھا کہ اس میں جوڈو کراٹے سے زیادہ دلچسپ باتوں کا تذکرہ تھا۔ میں نے کتاب نرس کے سامنے میز پر اوندھی رکھ دی۔ پارٹیشن وغیرہ کے پیچھے جھانک کر میں نے اطمینان کر لیا کہ اس کمرے میں کوئی موجود نہیں تھا۔

کمرے سے نکلتے وقت میں نے میز سے کسی کا ایکسرے اور ایک فائل اٹھالی اور ہم یہ دونوں چیزیں سامنے کئے' ایک دوسرے کو دکھاتے اس طرح باہر آئے جیسے نہایت تشویش سے کسی مریض کے بارے میں تبادلۂ خیال کر رہے ہوں۔

ہمارا اندازہ درست تھا۔ دونوں گن مین اسی طرف آرہے تھے۔ گنیں انہوں نے اپنے ہاتھوں میں لٹکائی ہوئی تھیں۔ متجسس نظروں سے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ ہم نے چہروں پر حتی الامکان معصومیت اور سادگی طاری کر رکھی تھی بلکہ ہم اس کافی مرعوب اور تھوڑے سے خوفزدہ بھی نظر آنے کی کوشش کر رہے تھے جس طرح شریف شہری عموماً کسی خوف ناک سے شخص کے ہاتھ میں خوف ناک سی گن دیکھ کر ہو جاتے ہیں۔ خصوصاً وہ شخص خوف ناک سی نظروں سے شریف شہری کو گھور بھی رہا ہو۔

وہ دونوں قلمی سے بدمعاش معلوم ہوتے تھے۔ شکلیں کھردری اور کرخت سی تھیں۔ آنکھوں میں سرخی اور سفاکی۔ ان میں سے ایک کی توند نکلی ہوئی تھی' دوسرا ذرا گٹھے ہوئے ورزشی جسم کا مالک تھا۔

وہ ابھی ڈیوٹی روم تک نہیں پہنچے تھے' راستے ہی میں

ہمارے بارے میں غالباً تذبذب میں تھے۔ وہ زیادہ چوکنا صرف اس لئے نہیں ہوئے تھے کہ ہم قطعی غیر مسلح نظر آرہے تھے۔ اس سے پہلے کہ وہ ہم سے کچھ پوچھتے' میں نے خود ہی انہیں مخاطب کر لیا۔ "بھائی صاحب! یہ چھ نمبر کمرا کس طرف ہے؟ سیٹھ ہدایت اللہ یہاں داخل ہیں۔ نرس تو بیٹھی سو رہی ہے۔ ہم نے اسے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔"

وہ ایک لمحے ہمیں گھورتے رہے۔ ان کی آنکھوں میں ہمارے لئے حقارت بھی تھی۔ شاید وہ فیصلہ کر رہے تھے کہ ہم اس قابل ہیں بھی یا نہیں کہ ہمیں جواب دینے کی زحمت کی جائے۔ ان کے ذہنوں میں گتھیاں تھیں۔ ہم اپنے ہاتھوں میں ایکسرے اور فائل لئے ان کے قریب جا پہنچے۔ میں نے اس فائل پر ہی کمرا نمبر چھ اور ہدایت اللہ نام لکھا دیکھا تھا۔

"یہ دیکھئے' یہ ہے ان کا نام اور کمرا نمبر۔" میں نے فائل کسرتی جسم والے کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ٹونی دوسرے کو ایکسرے دکھانے لگا۔ ہماری یہ حرکتیں صرف انہیں کنفیوز کرنے کے لئے تھیں۔ اگر انہیں ذرا بھی سکون اور طمانیت سے سوچنے کا موقع میسر ہوتا تو وہ سوچ سکتے تھے کہ جب انہوں نے ہمیں راہداری میں داخل ہوتے دیکھا تھا تو ہمارے ہاتھوں میں کچھ نہیں تھا۔ ڈیوٹی روم میں نرس بقول ہمارے سو رہی تھی تو پھر ہم وہاں سے یہ فائل ایکسرے کیوں اٹھا لائے تھے؟ اس قسم کے بیسیوں سوالات ان کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتے تھے۔

لیکن مجھے معلوم تھا' اس قسم کے موٹے دماغ والے روایتی بدمعاش سب سے زیادہ اس بات پر غور کرتے ہیں کہ آنے والا موٹا ہے یا پتلا؟ اجنبی ہے یا شناسا؟ باریکیوں کی طرف ان کا ذہن جاتا ہی نہیں تھا اور اگر جاتا بھی تھا تو بہت تاخیر کے ساتھ۔

وہ ایک لمحے کے لئے فائل اور ایکسرے کی طرف متوجہ ہوئے۔ وہ ایک لمحہ ہی ہمارے لئے کافی تھا۔ میں نے اور ٹونی نے بیک وقت انہیں دبوچ لیا۔ میں نے اپنا وہی مخصوص داؤ استعمال کیا کہ کسرتی جسم والے کی گردن' بازو کے شکنجے میں جکڑی اور گھٹنا مارتے ہوئے اس کا گن والا بازو اس پر اس طرح مارا کہ اس کا کہنی کا جوڑ ٹوٹ گیا۔

اگر اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں نہ ہوتی تو یقیناً اس کے حلق سے ایک کرب ناک چیخ برآمد ہوتی۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر خاصی زوردار آواز کے ساتھ فرش پر گری۔ میں نے اسے ٹھوکر مار کر اسی کمرے کے دروازے پر پہنچا دیا جس کے سامنے سے وہ اٹھ کر آئے تھے۔ گہرے سکوت میں گن کے گرنے اور پھر فرش پر پھسل کر کچھ دور تک جانے کی آواز بھی خاصی نمایاں محسوس ہوئی۔

میں نہیں چاہتا تھا کہ بند دروازوں کے پیچھے کوئی ایسا مریض جو ذرا بہت چلنے پھرنے کے قابل ہو' بستر سے اٹھ کھڑا ہو اور دروازہ کھول کر جھانکنے لگے یا کسی مریض کے پاس موجود کوئی تیماردار یہ جاننے کے لئے نکل آئے کہ یہ خلاف معمول آوازیں کیسی ہیں۔

میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اسے تیزی سے دھکیلتا ہوا کمرا نمبر سات کے دروازے پر ہی لے گیا۔ اس دوران ٹونی بھی اپنا کام دکھا چکا تھا۔ اس نے غالباً کراٹے کی بہت ہی خوف ناک چاپ ماری تھی۔ اس کا شکار بے ہوش ہو چکا تھا اور وہ اسے چکنے فرش پر ایک بازو سے کھینچتا ہوا کمرے کی طرف لا رہا تھا۔ اس کی گن وہ خود اٹھا چکا تھا۔ فائل اور ایکسرے وہیں پڑا رہ گیا تھا۔

ٹونی اسے گھسیٹتا ہوا قریب پہنچا تو میں نے دیکھا' اس کے شکار کے سینے میں چاقو پیوست تھا۔ میں دیکھ نہیں سکا تھا کہ اس نے کب اس کا پتا ہی صاف کر دیا تھا۔ میرا شکار ابھی ہوش میں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ خاص تکنیک سے جھٹکا دیتے ہوئے اور اپنی غیر معمولی خداداد طاقت کا استعمال کرتے ہوئے اس کی گردن کا منکا توڑ دوں لیکن اس کی نوبت نہیں آسکی۔

ٹونی نے میرے حکم یا اشارے کا انتظار کئے بغیر اپنے شکار کو چھوڑ کر ہاتھ میں پکڑی ہوئی گن کا آہنی دستہ اتنی قوت سے میرے شکار کی کھوپڑی پر رسید کیا کہ مجھے فوری طور پر اس کے مر جانے کا یقین ہو گیا۔ اس کی کھوپڑی کی ہڈی یقیناً سلامت نہیں رہی تھی۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ اپنے مردہ ساتھی پر ڈھیر ہو گیا۔

غنیمت رہا کہ اس دوران راہداری میں دونوں طرف کمروں کے دروازے بند ہی رہے۔ میں نے کمرا نمبر سات کے دروازے کا ہینڈل گھمایا۔ دروازہ غیر مقفل ہی تھا۔ ذرا سا کھول کر میں نے محتاط انداز میں اندر جھانکا۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں اسپتال کے مخصوص آہنی بیڈ پر ایک شخص ساکت' چت لیٹا نظر آیا۔

اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے رخساروں کے گرد اس طرح پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں کہ جبڑے کے نیچے سے ہوتی ہوئی سر کو بھی ڈھانپے ہوئے تھیں۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہا تھا شاید خواب آور دوا کے زیر اثر تھا۔ کمرے میں ایک بیڈ اور بھی تھا مگر وہ خالی تھا۔

میں نے دروازہ پورا کھول دیا اور ٹونی نے جلدی سے اندر داخل ہو کر دونوں لاشوں کو بھی اندر ہی کھینچ لیا۔ دروازہ میں نے آہستگی سے بند کر کے مقفل کر دیا۔ اب ہمارا راستہ بالکل صاف تھا۔ ٹونی نے جلدی سے چاقو اپنے شکار کے سینے سے نکال کر اسی کے لباس سے اچھی طرح صاف کر کے جیب میں ڈال لیا۔

میں نے کمرے کی لائٹ آن کر دی اور ہم بیڈ کے قریب جا پہنچے۔ لائٹ آن ہونے پر بھی مختار ساکت ہی رہا۔ وہ لمبی اور گہری سانسیں لے رہا تھا۔ یقیناً خواب آور دوا ہی کے زیر اثر تھا۔ اس کا چہرہ ذرا متورم تھا جس کے گرد پٹی کا حلقہ اس طرح کسا ہوا تھا کہ وہ جبڑے کو حرکت نہیں دے سکتا تھا اور نہ ہی کچھ بول سکتا تھا۔ اس کے بیڈ پر تکیے کے پاس ہی ایک رائٹنگ پیڈ اور قلم رکھا ہوا تھا۔

تکیے کے نیچے سے مجھے ایک گن کا دستہ بھی جھانکتا دکھائی دیا۔ میں نے نہایت احتیاط سے اسے نکال کر دیکھا۔ وہ اعشاریہ چار پانچ کا ایک شاندار کولٹ ریوالور تھا۔ میں نے اسے بیڈ کے قریب ہی رکھی ہوئی کوڑے کی ٹوکری میں ڈال دیا۔

بیڈ کے قریب ہی ایک اونچی کیبنٹ پر دوائیں' گلوکوز کی ڈرپ' اسٹیل کی ٹرے میں پٹیوں کے کئی رول اور ایک قینچی رکھی تھی۔ میں نے ٹونی سے سرگوشی میں بات کی۔ ہم نے پٹیاں کھول کر تین تین چار چار تہیں کر کے ان سے رسی کا کام لیتے ہوئے نہایت احتیاط اور آہستگی سے مختار کی کلائیوں اور ٹخنوں کے گرد حلقہ بناتے ہوئے اس کے ہاتھ پاؤں بیڈ کے پایوں کے ساتھ باندھ دیئے۔ اس دوران وہ بدستور ہموار انداز میں ہلکی ہلکی سی خرخراہٹ کی ساتھ گہری سانسیں لیتا رہا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے اور ٹونی نے بندشوں کا جائزہ لیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہایت عمدگی سے آہنی بیڈ کے پایوں سے بندھ چکے تھے۔ ہم نے اس کی کلائیوں اور ٹانگوں پر بندشیں بالکل ہلکی رکھی تھیں لیکن گرہیں ایسی تھیں کہ جونہی وہ ہاتھ پاؤں ہلاتا' بندشیں سخت ہو جاتیں۔

"میرے خیال میں اب اسے جگا لینا مناسب ہے۔" میں نے ٹونی سے کہا۔ ٹونی نے اس کا کندھا پکڑ کر دھیرے سے ہلایا۔ وہ ذرا سا کسمسایا لیکن بیدار نہ ہوا۔ تب ٹونی نے اسے تقریباً جھنجوڑ ڈالا۔ اس نے تکلیف زدہ سے انداز میں آنکھیں کھول دیں۔

کمرے میں روشنی اور اپنے دائیں بائیں دو اجنبیوں کو کھڑے دیکھ کر اس کے حواس بیدار ہونے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اس نے دایاں ہاتھ اٹھانا چاہا۔ نہ جانے وہ تکیے کے نیچے سے گن نکالنا چاہتا تھا یا اپنے سرہانے لگا ہوا وہ بٹن دبانا چاہتا تھا جس سے نرس وغیرہ کو بلایا جاتا تھا لیکن اس کے بجائے اس کی کلائی پر بندش سخت ہو گئی۔

اضطراری سے انداز میں اس نے دوسرا ہاتھ ہلایا تو اس پر بھی بندش سخت ہو گئی۔ اس نے غالباً اٹھ کر بیٹھنے کے ارادے سے ٹانگیں ذرا اوپر کرنا چاہیں تو ان پر بھی گرہیں سخت ہو گئیں۔ اب وہ چاروں شانے چت بالکل بے بس پڑا تھا۔ اپنے آپ کو بے پناہ طاقتور سمجھنے والا اس وقت چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی طرح بے بس تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس وقت وہ بول تک نہیں سکتا تھا' چیخ نہیں سکتا تھا اور کسی کو مدد کے لئے نہیں پکار سکتا تھا۔

صرف اس کی آنکھوں میں ایک خاموش سوال تھا۔ وہ پوچھنا چاہتا تھا "تم کون ہو؟" میرے حلیے کی معمولی سی تبدیلیوں کی وجہ سے اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ ٹونی تو اس کے لئے تھا ہی اجنبی۔

میں نے اپنی آواز بدلے بغیر نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "کیسے ہو مختار رفیق؟ ہم تمہاری عیادت کے لئے آئے ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں یکدم موت کی سی ویرانی پھیل گئی۔ اس ویرانی نے مجھے بتا دیا کہ آواز کی مدد سے اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

ایک لمحے کے لئے اس کے ہونٹ ہلے اور چہرے کے پھڑپھڑائے۔

میں نے ٹونی سے کہا "مختار کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کاٹ دو۔"

پٹیوں کی وجہ سے مختار کا منہ سختی سے بند تھا لیکن کھلوانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے دھیرے سے نفی میں لیکن ٹونی نے اسٹیل کی ٹرے میں سے قینچی اٹھا کر رخسار سے پٹیوں کا حلقہ کاٹ دیا۔

جبڑے کو اس نے تب بھی حرکت نہ دی اور منہ رکھتے ہوئے نیچی آواز میں بولا "چوہدری! مجھے معاف کر مجھے توقع نہیں تھی کہ اس کے منہ سے پہلا جملہ طلب کے سلسلے میں نکلے گا۔ منہ بھینچ کر بولنے کی وجہ الفاظ ذرا مشکل سے سمجھ میں آئے تھے تاہم میں نے میں غلطی نہیں کی تھی۔ اس کے چہرے پر بلا کی بے چار دیکھ کر مجھے ہمیشہ بڑی حیرت ہوتی تھی کہ یقینی موت کو سا ہر فرعون کے چہرے پر انتہائی لجاجت اور بے چارگی آ قدم قدم پر موت بانٹنے والے موت سے بہت خوف کھا جب وہ جبڑے کھولے ان کی طرف بڑھتی تھی۔

"تم معافی کے مرحلے سے گزر آئے ہو مختار رفیق!" گہری سانس لے کر کہا "بہت دیر کر دی تم نے۔ لیکن خیر تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو ہی گیا ہے تو تمہیں معاف کر ہے لیکن ایک شرط پر۔"

"بولو..... بولو۔ جلدی کرو۔" وہ بدستور بھینچے ہوئے جبڑ ساتھ بولا۔

"ان لوگوں کے نام اور ٹھکانے بتا دو جنہوں نے ہدایت پر نبیلہ اور اس کے ساتھ فلیٹ میں موجود دو عورتوں انداز میں قتل کیا ہے۔" میں نے کہا۔

اس نے اس بات کی تردید نہیں کی کہ اس نے ا عورتوں کو قتل کرایا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں ا پر کیونکر پہنچا تھا۔ بلکہ اس نے تو یہ بھی نہیں پوچھا کہ میں کس طرح ڈھونڈ نکالا تھا۔ اسے یقیناً احساس تھا کہ یہ سوالا ضروری تھے۔ وقت بہت قیمتی تھا اور بات چیت کرنے کے سے اہم موضوع یہی تھا کہ جاں بخشی کس طرح ہو سکتی ہے!

وہ اسی طرح بھینچے ہوئے دانتوں کے ساتھ بولا "دو تو جو باہر پہرہ دے رہے ہیں......"

"پہرہ دے رہے تھے۔" میں نے تصحیح کی "شاید تمہا صحیح طور پر کام نہیں کر رہا۔ اگر وہ اس وقت بھی پہرہ د ہوتے تو ہم اس کمرے میں کس طرح ہوتے؟ ذرا ادھر دیکھو" نے اس کے سامنے سے ہٹتے ہوئے ایک طرف اشار دروازے کے قریب اس کے دونوں محافظوں کی لاشیں پڑی

ان کی گنیں بھی ان کے قریب ہی پڑی تھیں۔

اپنے محافظوں کو مردہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے گہرے ہو گئے۔ پرائے ہاتھوں میں موجود بندوقوں پر تکیہ کرنے والوں اور دوسروں کے زور بازو کو اپنا سرمایہ سمجھنے والوں کے لئے اس طرح کے نظارے بہت ہمت شکن ہوتے ہیں۔

"دو تو بہرحال یہی تھے۔" وہ بولا۔ اب اس کے الفاظ کو سمجھنا اور مشکل ہو گیا تھا "تیسرا میرے راکسی سینما کا منیجر ہے۔ وہ بھی بہت بڑا بدمعاش ہے۔ بظاہر شرافت کی زندگی گزار رہا ہے۔ بس یہی کل تین آدمی تھے جنہوں نے اصل کام انجام دیا تھا۔ چوتھے نے صرف ڈرائیور کے فرائض انجام دیئے تھے۔"

میں نے ٹونی کو مخاطب کیا "سن لیا نا تم نے؟ راکسی سینما کا منیجر۔ بظاہر شرافت کی زندگی گزار رہا ہے۔ اسے سچ مچ شرافت کی زندگی گزارنے کے قابل بنانا ہے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے' اس قسم کے لوگ سب سے زیادہ شرافت کی زندگی قبر میں گزارتے ہیں۔"

ٹونی نے اثبات میں سر ہلایا اور مختار سے پوچھا "اس کا نام کیا ہے؟"

"بابو نواز۔" مختار نے جواب دیا۔

"بس ٹھیک ہے۔" میں نے طمانیت سے کہا "تم سے صرف یہی معلومات حاصل کرنا ضروری تھا۔" پھر میں نے ٹونی کو مخاطب کیا "مختار صاحب کی پٹیاں پہلے کی طرح کس دو۔"

ٹونی نے ٹرے سے نئی پٹی لے کر اس کے چہرے کے گرد حلقہ بنا دیا۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ ٹونی نے اس کا سر ذرا اوپر اٹھاتے ہوئے نہایت پھرتی سے اس کے ہونٹوں پر بھی پٹیاں کس دیں۔ وہ اوغ ..... اوغ ... ہی کرتا رہ گیا۔ ہونٹوں پر بھی سختی سے پٹیاں لپٹ جانے کے بعد اس کی "اوغ اوغ" بھی بند ہو گئی تھی لیکن آنکھیں بری طرح پھیل گئی تھیں۔

میرا اشارہ پا کر ٹونی نے اپنا کھٹکے دار چاقو نکال لیا۔ اس کا پھل سانپ کی زبان کی طرح یکدم باہر آیا تو مختار اپنی آپریشن کی تکلیف بھول کر گردن دائیں بائیں پٹخنے لگا۔ اپنے آپ کو بندشوں سے آزاد کرانے کے لئے اس نے ایک بار پھر زور لگایا لیکن اس کی یہ کوشش ناکام رہی۔ ہم نے اسے اس لئے نہیں باندھا تھا کہ وہ آزاد ہونے میں کامیاب ہو جاتا۔

میں نے اس پر جھکتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہا "تمہارے گرگوں نے جب آ کر تمہیں بتایا ہو گا کہ انہوں نے تم سے بغاوت کرنے والی نبیلہ کو کس طرح ذبح کیا' اسے پناہ دینے والی عورت کو کس طرح پتھر کے بھاری گلدان سے کچل کچل کر ہلاک کیا اور ان کی خادمہ کے سینے میں کس طرح خنجر اتارا تو تمہیں یقیناً بہت خوشی ہوئی ہو گی۔ تم نے اپنے آپ پر بہت فخر محسوس کیا ہو گا کہ بظاہر اس اسپتال کے ایک بستر میں لیٹے ہونے کے باوجود تم کتنے طاقتور ہو۔ بظاہر بے دست و پا ہو' بول بھی نہیں سکتے لیکن تمہارے لکھے ہوئے چند الفاظ سے کتنی ہی زندگیاں دردناک انداز میں موت کی آغوش میں سمٹ سکتی ہیں۔"

اس کی آنکھوں میں خوف کی گہرائیوں میں یہ شکوہ جھلک رہا تھا "تم نے تو مجھے معافی دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میری جاں بخشی کی آس بندھائی تھی۔ تم سے تو مجھے ایفائے عہد کی امید تھی۔"

میں ہنس دیا۔ میری ہنسی میں غیر ارادی طور پر زہر چھلک آیا۔ "میں وعدے کا پابند انسان ہوں لیکن تم جیسوں کے ساتھ نہیں۔"

میں نے ٹونی کو اشارہ کیا۔ اس نے چشم زدن میں اسے ذبح کر دیا اور تیزی سے پیچھے ہٹ گیا تاکہ خرخراہٹ کے ساتھ کٹی ہوئی گردن سے ابلنے والے خون کے چھینٹے اس کے ہاتھ یا بازو پر نہ پڑیں۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ مختار صرف دو چار سیکنڈ کے لئے تڑپا اور ساکت ہو گیا۔ ٹونی نے باتھ روم میں جا کر چاقو دھو کر' جھٹک کر اطمینان سے جیب میں رکھا اور ہم سب کچھ جوں کا توں چھوڑ کر کمرے سے نکل آئے۔

ٹونی گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "صبح کے چار بج رہے ہیں سر!"

"ہاں" میں نے گہری سانس لے کر کہا "مجھے امید ہے کہ یہ ایک سہانی اور خوب صورت صبح ہو گی۔ مجھے خوشی ہے کہ ہم رات کا حساب رات میں ہی نمٹانے میں کامیاب رہے۔ بس تھوڑی سی کسر رہ گئی ہے۔ وہ راکسی سینما کا منیجر بابو نواز۔"

"اسے اب آپ مردہ ہی سمجھیں سر! آج کی رات اس کی زندگی کی آخری رات ہو گی۔" ٹونی نے مجھے اطمینان دلایا "اور اگر آپ حکم دیں تو ابھی جا کر اس سے بھی نمٹ آتا ہوں۔"

"نہیں۔ اب تو صبح ہونے والی ہے۔ شب رفتہ میں جو کچھ ہو چکا' اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے کہا "اس کام کو اطمینان سے سر انجام دینے کے لئے رات کا انتظار کر لینا ہی بہتر ہو گا۔"

راہداری کے کونے پر پہنچ کر ہم نے دیکھا' ڈیوٹی روم میں نرس کرسی پر اسی طرح بیٹھی تھی۔ اس کی گردن اب کچھ زیادہ ہی ڈھلک گئی تھی۔ اس کا ایک بازو جو میں نے کرسی کے ہتھے پر ٹکایا تھا' اب پہلو میں جھول رہا تھا۔

"شاید آج تین لاشیں دریافت ہونے کے بعد یہ نرس بھی اپنی آپ بیتی لکھے۔" میں نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

ہم جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے واپس گاڑی تک پہنچنے میں ہمیں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میں نے ٹونی کو اس کے گھر چھوڑا اور ہدایت کی کہ وہ مجھ سے مستقل رابطہ رکھے اور ہر اہم بات سے مجھے مطلع کرتا رہے۔ گھر پہنچ کر میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک دیا اور لمبی تان کر سو گیا۔ میرے اعصاب نے کافی بوجھ برداشت کیا تھا۔ اب میں اپنے آپ کو کچھ ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

نبیلہ' تاجاں اور ملازمہ کی دردناک موت کی افسردگی ابھی میرے دل سے دور نہیں ہوئی تھی۔ ملازمہ بھی تاجاں ہی کی طرح

لاوارث اور مصائب کی ستائی ہوئی تھی۔ میں نے اسے بھی تاجاں سے کچھ ہی عرصہ پہلے اس فلیٹ میں پناہ دی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس فلیٹ میں ہی اس کی موت لکھی تھی۔

اس روز میں آفس نہیں گیا۔ شام ڈھلے تک سوتا رہا۔ شام کو اٹھ کر میں نے ٹیلی فون سے منسلک ریکارڈنگ سسٹم پر اپنے ساتھیوں کی رپورٹس سنیں۔ پھر ان سے رابطہ قائم کر کے کچھ ضروری ہدایات دیں' اخبارات دیکھے اور باہر جانے کے لئے تیار ہونے لگا۔ میں گھر سے نکلنے ہی والا تھا جب فون کی گھنٹی بجی۔

میں نے جونہی ریسیور اٹھا کر ہیلو کہا' دوسری طرف سے ایک چہکتی آواز سنائی دی "کیا حال ہے چوہدری ڈیئر؟"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ ایڈم عرف ایڈی تھا۔ میرے گہری سانس لینے کی آواز اس نے بھی سن لی۔ بڑی محبت سے بولا "کیا بات ہے' اتنی ٹھنڈی سانسیں کیوں لے رہے ہو میری آواز سن کر؟"

"کافی دنوں سے تمہاری طرف سے سکوت تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا شاید جہنم رسید ہو گئے ہو مگر آج کل کہیں سے کوئی اچھی خبر سننے کو نہیں مل رہی۔" میں نے کہا۔

"اچھی خبر تو ہم تمہارے لئے لے کر بیٹھے ہوئے ہیں چندا! لیکن تم اسے سننے میں دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔" وہ شفقت سے بولا "ہماری طرف سے سکوت بھی اسی لئے تھا کہ ہم نے تمہیں تمہارے حال پر چھوڑا ہوا تھا۔ ہم چاہ رہے ہیں تم جو فیصلہ کرو' بہت اچھی طرح' یکسوئی سے سوچ سمجھ کر کرو۔"

"لیکن ابھی تو تمہاری دی ہوئی مہلت کے بہت دن باقی ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں۔ وہ تو ہمیں بہت اچھی طرح یاد ہے۔ ہمارے ہاں تو ہر چھوٹے سے چھوٹے کام کے لئے بھی ڈیڈ لائن مقرر ہوتی ہے جبکہ تمہارا معاملہ تو بہت اہم ہے۔ ہم نے تمہارا جواب سننے کے لئے جو آخری دن مقرر کر رکھا ہے' اسے آخری ہی سمجھنا۔ تمہیں جو مہلت ملی ہوئی ہے اس میں توسیع کی امید مت رکھنا۔"

"بہت بہتر حضور والا!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "لیکن جتنی مہلت ملی ہوئی ہے اس میں تو چین سے رہنے دو۔"

"میں نے سوچا' یاد دہانی کراتے رہنا چاہئے۔" ایڈی بولا۔ "کہیں تم اب بھی اس معاملے کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔"

"میری یہ مجال کہاں۔" میں نے کہا "اب تو میں نے تمہارا ہیڈ آفس دیکھ لیا ہے۔ باس ون سے ملاقات ہو گئی ہے' دوسرے اہم لوگوں کے درشن بھی ہو گئے ہیں۔ اب تو مجھے سنجیدہ ہونا ہی پڑے گا۔"

"وہ ہمارا ہیڈ آفس نہیں تھا بے وقوف!" ایڈی ہنسا "ہیڈ آفس پاکستان میں نہیں ہے۔ وہ تو کسی اور ملک میں ہے۔ پاکستان میں ہمارے اس طرح کے تین ٹھکانے ہیں۔ یہ ان میں سے ا[ک] تھا۔ ایک طرح کا برانچ آفس سمجھ لو۔"

"خیر وہ جو کچھ بھی تھا' مجھے مرعوب کرنے کے لئے تو وہی تھا۔" میں نے کہا "تم مطمئن رہو' میں آج کل سنجیدگی سے مسئلے پر غور کر رہا ہوں کہ تمہاری پیشکش قبول کر سکتی ہے یا نہیں۔"

"نہیں کا لفظ تو تم اس معاملے میں نہ ہی استعمال کرو تو [بہتر] ہے۔" اس کے لہجے میں یک لخت ہی سرد مہری آ گئی "تمہیں [ملک] کے اہم آدمیوں میں سے ایک بننے کی پیشکش کی گئی ہے۔ ا[یسے] مواقع زندگی میں بار بار نہیں آتے اور ہر ایک کی زندگی میں [نہیں] آتے۔"

"مجھے احساس ہے۔ میں نے یہ سب پہلو ذہن میں ر[کھے] ہوئے ہیں۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

"ٹھیک ہے' ہم تمہارے جواب کا انتظار کر رہے ہیں۔" [اس] نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ آج اس نے جلدی [ہی جان] چھوڑ دی تھی۔

اس کے ٹیلی فون نے مجھے متفکر کر دیا۔ اس مسئلے کا م[یں اب] تک کوئی حل تلاش نہیں کر پایا تھا۔ یہ بات تو طے تھی کہ م[یں] زندگی میں ان کی پیشکش کبھی قبول نہیں کر سکتا تھا۔

اخبارات سے حفیظ صاحب کی واپسی کا کچھ پتا نہیں [چل رہا] تھا۔ میری چونکہ ان سے اچھی شناسائی ہو چکی تھی اور وزیر[...] کی حیثیت سے وہ حکومتی مشینری کے بہت اہم آدمی تھے۔ م[یں سوچ] رہا تھا کہ ان کے توسط سے حکومت کے کچھ خاص خاص لوگو[ں سے] کوئی خفیہ قسم کی میٹنگ ہو جائے جس میں' میں تمام تفصیلا[ت ان] کے سامنے رکھ دوں۔

اس طرح میں گویا اپنی ایک قومی ذمے داری پوری کر [دیتا]۔ اس کے بعد گیند ارباب اختیار کے کورٹ میں چلی جاتی۔ [وہ جو] مناسب سمجھتے' کرتے۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ قومی مفاد[ات کی] حفاظت کی فکر کریں۔ مجھے ریڈ ڈاٹ کے غیظ و غضب سے بچ[نے کے] لئے بھی ان کی مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تو صرف یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ ہمارے ملکی نظام کو تہ و بالا کرنے کے ل[ئے ریڈ] ڈاٹ کی پوٹلی میں نہ جانے کیا کیا منصوبے تھے اور اب تک [نہ] جانے کیا کچھ کر چکے تھے۔ ملک میں ہمیشہ انتشار' عدم استحکا[م]' لڑائی جھگڑوں کا جو سلسلہ چلتا رہتا تھا' سیاسی نظام جس طرح [...] خونریزی کی زد میں رہتا تھا۔ بات بات پر جس طرح بھائی' بھا[ئی کے] خون کے پیاسے رہتے تھے' ان سب باتوں کے پیچھے نہ جانے کہ[اں] تک ریڈ ڈاٹ کا ہاتھ رہا ہو۔

پہلے تو ہم یہی رونا روتے تھے کہ فلاں ملک کی خفیہ ایجنس[ی نے] ہمارے خلاف یہ سازش کر ڈالی' فلاں ملک کی خفیہ ایجنسی نے [...] ڈالا لیکن یہ ریڈ ڈاٹ تو خفیہ ایجنسی سے بہت آگے کی چیز تھی۔ [...]گویا خفیہ ایجنسیوں کی ایسوسی ایشن تھی جس کے پیچھے تمام انتہائی [ترقی] یافتہ ملکوں کے وسائل تھے اور تمام چھوٹے ملکوں کو ہڑپ کر جانے پر ان کا اتفاق رائے تھا۔ نہ جانے پلوں کے نیچے سے کتنا [پا]نی گزر چکا تھا اور ہم محض اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے۔

بہت دیر تک خیالات میں گم رہنے کے بعد میں نے نذیر خان کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ مجھے گھر پر ہی مل گیا۔ میں نے اس سے کہہ رکھا تھا کہ جوں ہی غیر ممالک کے دورے سے حفیظ صاحب کی واپسی کی کوئی خبر ملے' وہ فوراً مجھے اطلاع دے۔

میری آواز سن کر وہ بولا "چوہدری صاحب! میں آپ کو فون کرنے کا سوچ ہی رہا تھا۔ حفیظ صاحب آج ہی ویانا سے واپس آئے ہیں اور اس وقت اسلام آباد میں اپنی سرکاری رہائش گاہ پر ہیں۔ میری ان سے بات نہیں ہو سکی اس لئے مجھے ان کا صحیح پروگرام تو نہیں معلوم لیکن ان کے پی اے سے اتنا ضرور معلوم ہو گیا ہے کہ اب خاصے دن پاکستان میں گزاریں گے۔ آپ چاہیں تو ابھی ان سے بات کر لیں۔ ان کے فون نمبر وغیرہ تو آپ کے پاس ہیں۔ اب [آ]پ کا نام بھی ان کے خاص شناساؤں میں شامل ہے۔ آپ کو ان سے رابطہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہو گی۔"

"میرا خیال ہے ابھی ان کو زحمت نہ دی جائے۔" میں نے [ا]یک لمحے سوچ کر کہا "وہ بہت لمبے دورے سے واپس آئے ہیں۔ [آ]ج رات انہیں آرام کرنے کا موقع دیا جائے۔ میں کل ان سے رابطہ قائم کروں گا۔"

"کل سے تو شاید وہ کافی مصروف ہو جائیں۔" نذیر خان بولا۔ "حفیظ صاحب جب دورے سے واپس آتے ہیں تو دوسرے دن سے یہاں ان کی مصروفیت شروع ہو جاتی ہے۔ ان سے بات کرنے کا بہتر موقع آج ہی ہے۔"

"اچھا ٹھیک ہے' جیسے آپ کا مشورہ۔" میں نے کہا "میں آج ہی بات کرتا ہوں۔"

میں نے نذیر خان کا شکریہ ادا کر کے سلسلہ منقطع کر دیا اور اسلام آباد میں حفیظ صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ چند منٹ بعد آخر کار ان کے پرسنل سیکریٹری کے توسط سے ان سے رابطہ قائم ہوا۔

"سر! معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو آرام کا موقع دیے بغیر زحمت دے رہا ہوں۔" میں نے ان کی آواز سن کر اپنا نام بتانے کے بعد کہا "سنا ہے آپ کچھ ہی دیر پہلے واپس آئے ہیں۔"

"معذرت وغیرہ کو چھوڑو۔ کوئی خاص ہی بات ہو گی جو تم اس طرح میری تاک میں بیٹھے ہوئے تھے۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولے "اس لئے تکلفات کو چھوڑو اور بات کرو' خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے سر! میری آپ سے فوری ملاقات ضروری ہے۔"

"ایک ہفتے تک تو میرا شیڈول بہت ٹائٹ ہے برخوردار!" وہ ملائمت سے بولے "کل میری پرائم منسٹر سے ملاقات طے ہے اور پرسوں پریذیڈنٹ سے۔ اس کے بعد جی ایچ کیو میں ایک میٹنگ ہے جو شاید دو یا تین دن چلے۔ پھر کچھ سفیروں سے ملاقاتیں ہیں۔ میں جو طویل دورہ کر کے آیا ہوں' یہ سب ملاقاتیں اسی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ان ملاقاتوں کے لئے مجھے کچھ رپورٹس بھی تیار کرنی ہیں۔ میری پوری منسٹری اس وقت بے پناہ مصروف ہے۔ عام لوگوں کو تو یہی تاثر ملتا ہے کہ وزیر خارجہ کو شاید ملکوں ملکوں کی سیر کرنے کے علاوہ کوئی کام نہیں ہوتے۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ ترقی پذیر ملکوں کے وزرائے خارجہ عموماً بڑے مصروف رہتے ہیں' عموماً انہیں کوئی نہ کوئی بھگدڑ پڑی رہتی ہے اور اگر خدانخواستہ کوئی بحران آ پڑے' پھر تو انہیں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملتی۔ پورے سال میں ہمیں بہت کم دن فرصت کے نصیب ہوتے ہیں۔" وہ غیر ارادی سے انداز میں اب اردو سے انگریزی پر آ گئے تھے۔

"کب تک آپ اسی طرح مصروف رہیں گے؟" میں نے پوچھا۔

"کم از کم پندرہ دن تو یہی عالم رہے گا۔" وہ بولے۔

"بہت تاخیر ہو جائے گی سر!" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "اس لئے کہ آپ کو صرف مجھ سے میٹنگ نہیں کرنی ہے بلکہ شاید اس کے بعد بھی کچھ میٹنگوں کا بندوبست کرنا پڑے۔"

"بات کیا ہے افضل ڈیئر؟ تم بہت سنجیدہ معلوم ہوتے ہو۔"

"یس سر! میں واقعی بہت سنجیدہ ہوں لیکن بات فون پر نہیں بتائی جا سکتی۔ بات بہت اہم بھی ہے اور تفصیل طلب بھی۔ اپنے اس ٹیلی فون نمبر کو میں کافی محفوظ سمجھتا ہوں پھر بھی احتیاط برتنا چاہتا ہوں۔"

"تم بہت پُراسرار ہو رہے ہو افضل ڈیئر!" وہ شاید سوچ میں پڑ گئے تھے۔ "میں اپنی مصروفیات کے درمیان ہی تم سے تفصیلی بات چیت کے لئے کسی نہ کسی طرح وقت تو نکال لوں گا لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اسلام آباد سے ہل نہیں سکتا۔"

"آپ صرف ملاقات کے لئے تسلی بخش وقت نکالیے' اسلام آباد تو میں خود آ جاؤں گا۔" میں نے جلدی سے کہا "اور یہ کام جتنی جلدی ہو سکے اتنا ہی بہتر ہے۔"

"بھئی' کچھ اشارہ تو دو کہ مسئلے کا تعلق تمہاری ذات سے ہے یا میری ذات سے؟" وہ اب اپنے لہجے کا تجسس چھپا نہ سکے۔

"نہ آپ کی ذات سے اور نہ ہی میری ذات سے۔ مسئلے کا تعلق پورے ملک کی سلامتی سے ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ..." وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئے۔ پھر انہوں نے اپنے لہجے میں شگفتگی لانے کی کوشش کی "کوئی اسی قسم کا ڈراما ہے جیسا میرے ساتھ کراچی میں ہوا تھا؟"

"سر! کیا وہ ڈراما تھا؟" میں نے نہایت سنجیدگی سے' الٹا انہی

سے سوال کردیا۔

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہے پھر بولے "نہیں۔۔۔ یہ بات تو نہیں۔"

"بس یوں سمجھ لیجئے کہ اب اس سے ہزاروں بلکہ لاکھوں گنا زیادہ اہم بات ہے۔" میں نے کہا "مسئلہ یہ ہے کہ حکومتی حلقوں میں آپ جتنی اہمیت رکھنے والے کسی اور شخص سے میری اس حد تک شناسائی نہیں ہے کہ میں جو کچھ کہوں' وہ آنکھیں بند کرکے اس پر یقین کرسکے۔ بات آپ ہی کے لیول کی شخصیت کے ذریعے آگے بڑھ سکے گی۔"

"تمہیں یہ خوش فہمی کیونکر ہوگئی کہ میں آنکھیں بند کرکے تمہاری بات پر یقین کرلوں گا؟" انہوں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ لہجہ یکدم ہی بدل گیا تھا۔

"مجھے اس امید پر تو رہنے دیں' آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔" وہ ایک لمحے سوچ کر بولے "تم کل کی کسی فلائٹ سے اسلام آباد پہنچ کر رات کو آٹھ بجے میرے گھر آجاؤ۔"

"نہیں سر۔۔۔ میرا مطلب ہے میں اسلام آباد تو پہنچ جاؤں گا لیکن ملاقات آپ کی سرکاری رہائش پر نہیں ہونی چاہئے۔ میں وہاں نہیں آسکوں گا۔ مجھے اپنی سرگرمیوں میں نہایت احتیاط کی ضرورت ہے۔ ملاقات کے لئے کسی قطعی غیر سرکاری جگہ کا انتخاب کیجئے اور میری درخواست ہے کہ وہاں پہنچنے کے لئے بھی آپ قطعاً کوئی سرکاری قسم کا اہتمام نہیں کیجئے گا۔"

"کیا مطلب؟" وہ چونک کر بولے۔

"مطلب یہ کہ آپ سرکاری گاڑی میں مت آیئے گا۔ آپ کے ساتھ باوردی گارڈز یا پولیس والے نہیں ہونے چاہئیں۔ گارڈز اگر ہوں بھی تو سادہ لباس میں ہوں اور ظاہری طور پر مسلح نہ ہوں۔"

"بھئی تم نے تو یہ عجیب ہی کام شروع کردیا یعنی مجھے ہدایات دینی شروع کردیں۔" وہ کچھ پریشان ہوکر بولے "میرا مکمل پروٹوکول کے بغیر کہیں آنا جانا بہت مشکل ہوتا ہے اور اس قسم کی ہدایات پر عمل کرنا تو میرے لئے بہت ہی مشکل ہوگا۔"

"خیر۔۔۔ اب یہ اتنا مشکل کام بھی نہیں ہے سر! صرف ذرا روایات سے ہٹنے کی بات ہے۔ ملک اور قوم کے لئے کیا آپ اتنی سی زحمت بھی نہیں کرسکتے؟"

"ملک اور قوم کے لئے تو خیر میری جان بھی حاضر ہے۔" وہ پُرخیال لہجے میں بولے "لیکن میری پوزیشن کچھ ایسی ہے۔۔۔ خصوصاً آج کل حالات ایسے ہیں کہ قدم قدم پر کسی سازش کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

"سر! کیا میں بھی آپ کے خلاف کسی سازش میں آلۂ کار بن سکتا ہوں؟" میں نے مجروح لہجے میں پوچھا۔ درحقیقت اس وقت ایک لمحے کے لئے میرا بھی دل چاہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھول بھال جاؤں۔ ریڈ ڈاٹ کے خیال کو بھی بھاڑ میں جھونکوں۔ جو کچھ وہ کرنا چاہتی تھی یا کرسکتی تھی' اسے کرنے دوں۔ میرے انکار پر اس کا جو ردِعمل ہو' اس کے سلسلے میں بھی اپنے آپ کو تقدیر پر تقدیر پر چھوڑ دوں۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اب تو دل ہی دل میں مجھے وطن سے محبت کا دعویٰ ہو چلا تھا۔ اب تو میں نے اپنے آپ کو ان رومان پرستوں میں شمار کرنا شروع کردیا تھا جو اس قوم کی بہتری' ترقی اور خوشحالی کے خواب دیکھتے تھے۔ ظاہر ہے اس خواب کو تعبیر ملنے کی امید تبھی پیدا ہوسکتی تھی جب اس ملک میں کسی نظام کو پنپنے' کسی مخلص قیادت کو پاؤں مضبوط کرنے کا موقع ملتا۔

اور ایسا موقع تبھی مل سکتا تھا جب ملک کو بین الاقوامی سازشوں کے جنجال سے نکلنے کی مہلت ملتی۔ بہت سے پیران تسمہ پا جو لیڈری کے رنگا رنگ لبادے پہن کر اس قوم کی گردن پر سوار تھے' وہ اسے کبھی سکون کا سانس لینے کا موقع دیتے۔ تعلیم عام ہوتی لوگوں میں اپنا برا بھلا سمجھنے کا شعور پیدا ہوتا۔

اتنے عظیم مقاصد کے لئے تو بہت سی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ بہت سے چرکے سہنا پڑتے ہیں۔ اگر حفیظ صاحب کے لہجے میں بھی شک جھلک آیا تھا یا وہ حد سے زیادہ احتیاط پسندی کا مظاہرہ کررہے تھے تو مجھے اس پر ملول نہیں ہونا چاہئے تھا۔ اگر میں ابھی سے رنجیدہ خاطر ہوجاتا تو کوئی بڑی خدمت کہاں انجام دے سکتا تھا۔

لیکن اسی لمحے حفیظ صاحب بول اٹھے "تمہیں میری بات سے غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہئے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ رہا کہ تم میرے خلاف سازش میں آلۂ کار بن سکتے ہو۔ تم تو میری جان بچا چکے ہو' میرے خلاف ایک بڑی سازش کو ناکام بنا چکے ہو۔ میں تمہارے بارے میں بھلا ایسی بات سوچ سکتا ہوں احمق کہیں کے؟" انہوں نے پیار بھرے انداز میں مجھے ڈانٹا اور میرے دل سے افسردگی کی لہر یکدم دور ہوگئی۔ میری سوچ خواہ مخواہ ہی غلط سمت میں بھٹک گئی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے "مجھے یہ بھی یقین ہے کہ تمہارے سینے میں وطن سے محبت کرنے والا دل دھڑکتا ہے۔ میں تو اصل میں یہ سوچ رہا تھا کہ بین الاقوامی سازشوں کو سمجھنے کے لئے تمہارے وسائل بہت کم ہیں۔ تمہیں کچھ اندازہ نہیں کہ بین الاقوامی سازشوں کے تانے بانے کس طرح بنے جاتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں نادانستگی میں تم خود کسی سازش کی لپیٹ میں نہ آجاؤ۔ کوئی تمہیں استعمال نہ کرجائے۔"

مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ کیا ستم ظریفی تھی! وہ مجھے بے خبر سمجھ رہے تھے جبکہ میرے خیال میں وہ خود لاعلم تھے۔ وہ سازشوں کی کڑیاں تلاش کرنے نہ جانے کہاں کہاں بھاگے پھرتے تھے۔ کون کون سے ذرائع استعمال کرتے تھے لیکن انہیں یہ معلوم نہیں تھا

پنے ہی ملک میں' عین حکومت کی ناک کے نیچے کیا ہورہا تھا۔

"آپ مطمئن رہیں۔" میں نے کہا "فی الحال تو میں کسی سے بچنے کے لئے آپ سے خفیہ ملاقات رکھ رہا ہوں۔ آپ میری پوری رام کہانی سن لیجئے' اس کے بعد اگر آپ محسوس کریں کہ میں کسی سازش میں استعمال ہورہا ہوں تو آپ بات ختم کردیجئے گا۔ کوئی عملی قدم مت اٹھایئے گا۔"

"اچھا خیر ٹھیک ہے۔ کل رات آٹھ بجے ملاقات تو رکھ لیتے ہیں پھر دیکھیں گے۔" وہ بولے "لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا ملاقات کے لئے کس قسم کی جگہ کون سی منتخب کی جائے۔ میری روٹین کا تو انداز ہی کچھ ایسا بن گیا ہے کہ یاد ہی نہیں آرہا' اسلام آباد میں میرا کوئی غیر سرکاری اور قابلِ اعتماد قسم کا دوست یا شناسا ہے بھی یا نہیں؟"

"اگر آپ پسند کریں تو جگہ میں بتادوں؟" میں نے کہا۔ "میرے وہاں کاروباری دوست بھی ہیں۔ ایک کوٹھی میں میرا بزنس آفس بھی ہے۔ کوئی بھی جگہ رکھی جاسکتی ہے۔"

"نہیں۔ جگہ میں ہی منتخب کروں گا تاکہ مجھے سہولت رہے۔ دیکھی بھالی جگہ ہونی چاہئے۔ مجھے چند سیکنڈ سوچنے دو۔"

"اطمینان سے سوچئے۔" میں نے کہا اور خاموش ہوگیا۔

چند لمحے بعد وہ بولے "میرا طالب علمی کے زمانے کا ایک دوست ہے۔ ایک بڑی ٹریول ایجنسی ہے اس کی۔ ہیڈ آفس اسلام آباد میں ہے۔ وہ خاصا درویش سا آدمی ہے۔ سیاسی معاملات سے بے نیاز ہے۔ اس کے بنگلے پر ملاقات مناسب رہے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ بس ملاقات کے دوران کوئی تیسرا فرد موجود نہیں ہونا چاہئے۔ اگر کوئی تیسرا فرد موجود بھی ہوا تو وہ صرف نذیر خان ہوگا' اس کے علاوہ کوئی نہیں۔ ابھی میں نے اسے بھی لانے کا فیصلہ نہیں کیا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ میں تنہا ہی آؤں گا۔"

"بھئی فی الحال تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ معاملہ کیا ہے۔ اس لئے خود ہی فیصلہ کرتے رہو کہ کیا احتیاط کرنی ہے' کیا نہیں' کسے ساتھ لانا ہے' کسے نہیں۔ میں تو کچھ کہہ ہی نہیں سکتا۔" وہ بولے۔ "تم ایسا کرو کہ میرے دوست مرزا اکبر تیموری کے بنگلے کا فون نمبر اور ایڈریس وغیرہ نوٹ کرلو۔ کل ٹھیک آٹھ بجے میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔"

انہوں نے ایڈریس مجھے نوٹ کرادیا اور ہم نے ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔ اس کے چند منٹ بعد ہی میں نے اپنے ٹریول ایجنٹ کو فون کرکے دوسرے روز کی کسی فلائٹ میں سیٹ بک کرانے کی ہدایت کی پھر اپنی طے شدہ مصروفیات کے مطابق باہر نکل گیا۔

دوسرے روز شام سے پہلے میں اسلام آباد پہنچ چکا تھا۔ میں نے ایک ہوٹل میں سوئٹ بک کرالیا تھا۔ رات کو مجھے وہیں قیام کرنا تھا۔ اسلام آباد میں میرا قیام طویل بھی ہوسکتا تھا۔ اس کا انحصار حفیظ صاحب کے ردِعمل پر تھا۔ رات تک مجھے جو فاضل وقت میسر تھا' اس میں' میں نے اپنے اسلام آباد آفس کا جائزہ لے لیا اور وہاں سے اپنے استعمال کے لئے گاڑی بھی لے لی۔

رات کو میں مرزا اکبر تیموری کا گھر تلاش کرتا ہوا آخر کار ان کے گیٹ پر پہنچا تو ایک ملازم گیٹ پر ہی کھڑا تھا۔ میں نے گاڑی گیٹ پر روکی اور متلاشی سے انداز میں بنگلے کا نمبر دیکھا تو ملازم خود ہی آگے بڑھ کر بولا "آپ کا نام محمد افضل چوہدری ہے؟"

میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ گیٹ کھولتے ہوئے بولا "آپ اندر تشریف رکھئے' حفیظ صاحب آتے ہی ہوں گے۔"

میں گاڑی پورچ میں روکتے ہی لگا تھا کہ سامنے سے ایک اور گاڑی وہاں آن رکی۔ وہ سفید رنگ کی ایک عام سی گاڑی تھی۔ حفیظ صاحب چہرے پر گمبھیر سنجیدگی لئے گاڑی سے اترے۔ ان کا لباس بھی سفید ہی تھا۔ ان کے ساتھ دو افراد اور گاڑی سے اترے۔ وہ بھی سفید لباس میں ہی تھے۔ سرکاری لوگ عموماً جب اپنی شناخت چھپانے کی کوشش کرتے ہیں تو ہر چیز سفید رنگ کی استعمال کرنے لگتے ہیں جو بجائے خود ایک شناخت بن جاتی ہے۔

حفیظ صاحب کا ڈرائیور بھی سفید شلوار قمیص میں تھا۔ ڈرائیور کے علاوہ جو دو آدمی حفیظ صاحب کے ساتھ نظر آرہے تھے' وہ ان کے محافظ معلوم ہوتے تھے۔ تاہم ظاہری طور پر ان کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا۔

حفیظ صاحب خاصی گرمجوشی سے مجھ سے ملے۔ انہوں نے بتایا کہ مرزا اکبر تیموری خود اسلام آباد میں نہیں تھے' ملک سے باہر گئے ہوئے تھے لیکن ان کا گھر حفیظ صاحب کے لئے اپنے گھر کی طرح ہی تھا۔

ہم اندر ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے۔ حفیظ صاحب کے محافظ باہر لان پر ہی رہے۔ چائے وغیرہ کا دور چل چکا تو حفیظ صاحب نیا سگار سلگانے کے بعد جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھتے ہوئے بولے "ہاں اب بتاؤ' تم نے کس سلسلے میں اتنی پراسراریت پھیلائی ہوئی ہے؟"

"سر! آپ کو یاد ہوگا کہ کچھ عرصہ قبل آپ کو قتل کرنے کی سازش کی گئی تھی۔" میں نے کہا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کہاں سے شروع کروں۔

"کیا احمقانہ سوال ہے۔ مجھے بھلا کیوں یاد نہیں ہوگا۔" وہ حیرت سے بولے "کسی کو قتل کرنے کی کوشش کی گئی ہو تو کیا چند دن بعد وہ اس بات کو بھول جائے گا؟"

"یہ تو میں محض تمہید باندھ رہا تھا اور میری گرامر زیادہ اچھی نہیں ہے سر!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بعض اوقات غیر ضروری الفاظ منہ سے نکل جاتے ہیں۔"

وہ چونکہ چند دن کی شناسائی کے بعد ہی مجھے خاصی اپنائیت سے "برخوردار" کہنے لگے تھے اور ان کے انداز گفتگو میں ایک بزرگانہ

شفقت ہوتی تھی اس لئے اب مجھے ان کی ہلکی پھلکی ڈانٹ بری لگنے کے بجائے اچھی لگتی تھی۔

"میرا وقت بہت قیمتی ہے اس لئے صرف ضروری الفاظ استعمال کرو۔" وہ گہری نظر سے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولے۔

"میں نے اس وقت آپ کو ریڈ ڈاٹ نامی تنظیم کے بارے میں مختصراً بتایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنے وسائل کے ذریعے ہی ان سے نمٹ لوں گا لیکن اب مجھ پر انکشاف ہوا ہے کہ یہ تو بہت ہی لمبا معاملہ ہے۔ میں اب آپ کو شروع سے اس وقت تک کی تمام تفصیلات سے آگاہ کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ہمیں طے کرنا ہوگا کہ اس سلسلے میں کیا کیا جائے۔ ایک بہت بڑا خطرہ ہمارے سر پر منڈلا رہا ہے۔ سازشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہمارے ملک کو درپیش ہے۔ بلکہ صرف ہمارے ملک کو ہی نہیں، تمام پسماندہ اور ترقی پذیر ملکوں کو۔ لیکن ہمیں تو چونکہ اپنے مسائل سے نمٹنا ہی مشکل رہتا ہے اس لئے میں صرف اپنی ہی بات کروں گا۔"

پھر میں نے انہیں شروع سے آخر تک تمام واقعات سنائے کہ کس طرح ریڈ ڈاٹ والے میری طرف اور پھر میں ان کی طرف متوجہ ہوا تھا۔ کس طرح ایک عرصے تک انہوں نے مجھے الجھن میں جتلا رکھا تھا پھر دھیرے دھیرے سامنے آئے تھے۔ ان کی سائنسی ترقی اور وسائل کا کیا عالم تھا۔ پھر کس طرح انہوں نے اپنا مقصد مجھ پر واضح کیا تھا اور کیا دھمکی دی تھی۔ میں نے انہیں بلیک باکس میں سے ملنے والی بڑے بڑے ریٹائرڈ افسروں کی فہرست اور ریٹائرڈ ڈی آئی جی احمد شجاع والے واقعے کے بارے میں بھی بتایا۔

یہ تمام واقعات تفصیل سے ان کے گوش گزار کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ اس دوران حفیظ صاحب بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ انہوں نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا اور نہ ہی ان کے چہرے پر پھیلے ہوئے اطمینان اور ٹھہراؤ میں کوئی فرق آیا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اس دوران وہ سگار کے کش معمول سے کچھ زیادہ تیزی سے لیتے رہے۔

آخر میں، میں نے کہا "مجھے انہوں نے جو مہلت دی تھی، اس میں صرف دو ہفتے باقی رہ گئے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میرے انکار کی صورت میں میری جان کو خطرہ لاحق ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس قسم کی تنظیموں میں داخل ہونے کا راستہ ہوتا ہے لیکن واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ مگر مجھے اس خوف نے ان کی پیشکش قبول کرنے سے باز نہیں رکھا۔ ان کی پیشکش میں بلاشبہ کشش بہت تھی۔ ہماری سوسائٹی میں تو چھوٹے چھوٹے مفادات کے لئے لوگ دین ایمان، ضمیر اور وطن، سب کا سودا کرلیتے ہیں۔ انہوں نے تو مجھے کنگ میکر قسم کی چیز بنانے کی پیشکش کی ہے۔ مجھے معلوم ہے، وہ صرف دانہ نہیں پھینک رہے، وہ واقعی ایسا کرکے دکھا سکتے ہیں۔ اس کے باوجود میں نہیں پھسلا۔ میں کوئی بہت اچھا آدمی نہیں ہوں لیکن میری خواہشوں پر وطن کی محبت غالب آگئی۔ میں ان ہدایات کی خلاف ورزی کرکے اپنے لئے زبردست خطرات مول لے رہا ہوں لیکن مجھے ان کی زیادہ فکر نہیں ہے۔ فکر مجھے ان خطرات کی ہے جو نہ جانے کن کن کونے کھدروں سے اس ملک کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ ہم جو کچھ ہیں اسی ملک کے دم سے ہیں۔"

مجھے احساس ہوا کہ بات کرتے کرتے میں خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میرے دل کی گہرائیوں میں اس طرح کے جذبات اس شدت کے ساتھ موجود تھے۔ میں یک لخت ہی خاموش ہوگیا۔

حفیظ صاحب بدستور خاموش تھے۔ مجھے ان کی خاموشی کا وقفہ بہت طویل محسوس ہونے لگا۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن آنکھیں بتارہی تھیں کہ ان کا ذہن کہیں اور ہے۔ آخر کار ان کا سگار ان کی انگلیوں کو جلانے لگا تب وہ چونکے۔ انہوں نے سگار کو ایش ٹرے میں مسلا اور باکس سے نیا سگار نکال کر سامنے تپائی پر رکھ لیا لیکن اسے سلگایا نہیں۔

لائٹر کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے وہ بولے "تم نے تو عجیب کہانی سنادی ہے ڈیئر افضل! حالانکہ تم میری نظر میں اب ایک قابل اعتبار آدمی ہو، اس کے باوجود اس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا۔"

"میں جب آپ کو آپ کے قتل کی سازش سے آگاہ کرنے آیا تھا اس وقت بھی آپ نے میری بات کا یقین نہیں کیا تھا لیکن اس سازش پر عمل ہوتے آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ آپ کو تو کبھی گمان نہیں تھا کہ ایک سانپ عین آپ کی اپنی آستین میں موجود تھا۔"

"وہ تو پھر بھی اتنا بڑا اور گمبھیر معاملہ نہیں تھا۔ میں نے تمہیں کچھ دیر اپنے شکوک و شبہات اور سوالات سے زچ کرنے کے بعد آخر کار دل ہی دل میں تمہاری بات پر یقین کرلیا تھا لیکن یہ سب کچھ تو خیال و خواب کی باتیں لگ رہی ہیں۔"

"اگر میں خود ان تجربات سے نہ گزرا ہوتا تو میں بھی انہیں خیال و خواب ہی کی باتیں سمجھتا۔" میں نے کہا۔

"اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟" انہوں نے پوچھا۔

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا "یہ تو عجیب سوال کیا ہے آپ نے۔ ظاہر ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس تنظیم اور اس کے عزائم کا سدباب کیا جائے۔ کم از کم ہمارے ملک کی حد تک اس سے بچاؤ کی تدبیریں ہونی چاہئیں۔ میرا تحفظ تو بعد کا مسئلہ ہے۔ اگر ان لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ میں نہ صرف ان کی پیشکش قبول کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا بلکہ ان کی بیخ کنی کے لئے حکومت سے مذاکرات بھی کرتا پھر رہا ہوں تو نہ جانے ان کا ردِ عمل کیا ہو۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد حفیظ صاحب بولے "ملک کے خلاف اس قسم کی سازشوں سے خفیہ ایجنسیاں بے خبر نہیں رہ سکتیں۔ وہ عام طور پر وزارت داخلہ کو مطلع کرتی ہیں۔ وزارت داخلہ اس کی نوعیت کے حساب سے وزارت دفاع، انتظامیہ، فوج یا پولیس وغیرہ کو الرٹ کرتی ہے۔ میرے محکمے یعنی وزارت خارجہ کا اس قسم کے معاملات سے ڈائریکٹ تعلق تو نہیں بنتا لیکن ان ڈائریکٹ تعلق ضرور بنتا ہے۔ یعنی مجھے اس لئے خبردار رکھا جاتا ہے کہ جو ملک اس قسم کی سازشوں میں ملوث ہوں، ان کے دورے کرتے وقت یا ان سے مذاکرات کرتے وقت میں یہ بات ذہن میں رکھوں۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ مجھے آج تک اس قسم کی کوئی اطلاع، کوئی اشارہ تک نہیں ملا۔"

"کیا آپ کو میری رام کہانی سے اندازہ نہیں ہوا کہ ہماری خفیہ ایجنسیوں کو ابھی اس معاملے کی ہوا تک نہیں لگی ہے؟" میں نے کہا۔

"یہی چیز تو مجھے تقریباً ناممکن نظر آرہی ہے۔" حفیظ صاحب بولے "بہرحال میں اس بحث میں پڑے بغیر اپنی سی کوششیں کرنے کے لئے تیار ہوں لیکن تم ہی بتاؤ، آغاز کہاں سے کیا جائے؟"

"سب سے پہلے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ نہایت رازداری سے ہماری دو تین خاص خاص خفیہ ایجنسیوں کی ایک میٹنگ بلائی جائے جس میں صرف ان ایجنسیوں کے سربراہ اور ان کے ایک ایک دو دو خاص ماتحت شریک ہوں اور وہ سب کے سب نہایت بھروسے کے لوگ ہوں۔ ان کا ریکارڈ قطعی بے داغ ہو۔" میں نے کہا۔

حفیظ صاحب مربیانہ انداز میں مسکرادیئے اور بولے "خفیہ ایجنسیوں میں ذرا سا بھی اوپر وہی لوگ آتے ہیں جن کا ریکارڈ بے داغ ہوتا ہے۔"

"لیکن سر! معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ بلیک باکس سے ملنے والی فہرست دیکھنے اور ریٹائرڈ مرحوم ڈی آئی جی احمد شجاع جیسی شخصیتوں کا معاملہ سامنے آنے کے بعد میں آنکھیں بند کرکے یقین کرنے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔" میں نے کہا۔

"خیر۔ فی الحال ہم اس بحث میں بھی نہیں پڑتے۔" وہ بولے۔

"بالکل درست ہے سر! ہمارے پاس بحث میں پڑنے کا وقت بھی نہیں ہے۔"

"میں اس قسم کی خفیہ میٹنگ کا بندوبست تو کرسکتا ہوں۔ خواہ اس کے لئے مجھے کسی سے بھی بات کرنا پڑے، میں کرلوں گا۔ اور مجھے یقین ہے کہ کوئی میری بات نہیں ٹالے گا۔"

"لیکن یہ کام بہت جلد کرنا ہے سر! میں چاہتا ہوں، مجھے ریڈ ڈاٹ نے جتنی مہلت دی ہوئی ہے اس کے ختم ہونے سے پہلے پہلے اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کن کارروائی ہوجائے ورنہ میری بھی خیر نہیں اور ردِ عمل کے طور پر ریڈ ڈاٹ کسی غدار کو خرید کر یا کسی اور کو سنہرے خواب دکھا کر اس ملک میں نہ جانے کیا کر گزرے۔"

"بھئی انتہائی ہنگامی انداز میں کام کرکے بھی اس غیر رسمی میٹنگ کا انتظام کرنے میں مجھ جیسے آدمی کو بھی دو چار دن تو لگ ہی جائیں گے۔" حفیظ صاحب بولے۔

"چلیں دو چار دن میں بھی انتظام ہوجائے تو غنیمت ہے۔" میں نے کہا "میں اس دوران واپس لاہور چلا جاتا ہوں۔ جب انتظام ہوجائے تو آپ مجھے اطلاع دے دیجئے گا۔ میں دوبارہ اسلام آباد آجاؤں گا ویسے اگر میٹنگ لاہور میں ہی منعقد کی جاسکتی ہو تو زیادہ اچھا ہے۔"

"مرکزی خفیہ ایجنسیوں کے ہیڈ آفس تو اسلام آباد ہی میں ہیں لیکن میٹنگ بہرحال لاہور میں بھی منعقد کی جاسکتی ہے۔ یہ اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولے "اصل مسئلہ میرے لئے اپنی معروفیات کو ایڈجسٹ کرنا ہے۔ خیر...... دیکھتے ہیں، کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔"

"انتظامات مکمل ہوجائیں تو آپ مجھے فون پر اطلاع دے دیجئے گا لیکن فون صرف "حفیظ" کے نام سے کیجئے گا، اپنی سرکاری حیثیت میں نہیں۔" میں نے درخواست کی "اس کے علاوہ میٹنگ کا انتظام بھی کسی عام سی نجی جگہ پر ہونا چاہئے۔ جیسے یہ بنگلا ہے۔ اسی طرح کسی عام سے شہری کا مکان ہو تو اچھا ہے۔"

"اب میں صورت حال کو سمجھ رہا ہوں۔ اب مجھے یہ باتیں سمجھانے کی ضرورت نہیں۔" انہوں نے کہا۔ وہ اب بھی اپنے خیالوں میں الجھے ہوئے تھے۔

کچھ دیر بعد میں نے ان سے اجازت طلب کی اور اسی رات اسلام آباد سے واپس آگیا۔ دو دن معمول کی مصروفیتوں میں گزر گئے۔ اس دوران شہر کے مختلف حصوں میں لڑائی جھگڑوں اور حادثات وغیرہ میں ہلاک ہونے والوں کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی لاشیں بھی دریافت ہوچکی تھیں جو ہمارے ہاتھوں مرے تھے۔ ٹونی نے راکسی سینما کے منیجر بابو نواز کو بھی ٹھکانے لگادیا تھا۔ پولیس ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دوسرے بہت سے معاملات کی طرح کچھ عرصے بعد یہ معاملات بھی داخل دفتر ہوجائیں گے۔

اخبار میں مختار رفیق کے قتل کی خبر پڑھ کر شمیم نے خاصے ہیجانی سے انداز میں مجھے فون کیا تھا۔ وہ تصدیق کرنا چاہتی تھی کہ یہ میرا ہی کام تھا لیکن میں نے بات ہی گول کردی اور اس موضوع پر بات نہیں کی۔ وہ سمجھ گئی کہ میں فون پر اس سلسلے میں بات نہیں کرنا چاہتا۔ ملاقات کی ابھی تک نوبت نہیں آئی تھی۔

تیسرے روز حفیظ صاحب کا فون آیا۔ وہ رسمی سلام دعا کے بعد بلا تمہید بولے "میں لاہور سے ہی بول رہا ہوں۔ تمام انتظامات ہوگئے ہیں۔ ایڈریس نوٹ کرلو، کل ٹھیک دو بجے تمہیں یہاں پہنچنا ہے۔"

میں نے ایڈریس نوٹ کرلیا اور انہوں نے مزید کوئی بات کئے بغیر سلسلہ منقطع کردیا۔

دوسرے روز میں مقررہ وقت سے خاصی دیر پہلے گھر سے روانہ ہوا۔ میں نے اپنی خاص گاڑی گھر ہی چھوڑ دی تھی اور سرمئی رنگ کی ایک عام سی ٹویوٹا میں گھر سے نکلا تھا۔ ٹونی کو میں نے تمام حالات سے آگاہ کردیا تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسے میں ہربات سے آگاہ رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنی سفید گاڑی میں میرے پیچھے تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ جس گھر میں میٹنگ ہو رہی ہوگی وہ دور دور سے اس کی نگرانی کرتا رہے۔

گھر سے نکلتے وقت میں نے یہ اطمینان کرلیا تھا کہ میرا تعاقب نہیں ہو رہا تھا۔ اس کے بعد بھی احتیاطاً میں نے کچھ دیر تک اِدھر اُدھر گاڑی کبھی تیز، کبھی آہستہ بھگائی اور جب مجھے یہ اطمینان ہوگیا کہ ٹونی کے سوا کوئی میرے تعاقب میں نہیں تھا تو میں کینٹ کے علاقے کی طرف روانہ ہوا۔ حفیظ صاحب نے مجھے جو ایڈریس دیا تھا وہ کینٹ کے کسی بنگلے کا تھا۔

مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ کر میں نے دیکھا، وہ ایک شاندار اور طویل و عریض بنگلا تھا۔ اس کے گیٹ اور سامنے کے دونوں کارنرز پر تین آدمی کھڑے تھے۔ بظاہر وہ سادہ لباس میں تھے اور لاتعلق سے انداز میں کھڑے تھے لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ گرد و پیش کی نگرانی کر رہے تھے۔ عین ممکن تھا، بنگلے کے عقب میں بھی سادہ لباس والے تعینات رہے ہوں۔ ان کے چہرے بتاتے تھے کہ وہ کچھ مخصوص محکموں کے لوگ تھے۔

میرے دل میں مایوسی کی ہلکی سی لہر ابھری۔ آخر وہ لوگ تھوڑا بہت اہتمام کئے بغیر نہیں رہ سکے تھے۔ میں تو میٹنگ کو اس سے بھی زیادہ خفیہ رکھنا چاہتا تھا لیکن انہوں نے کچھ چہروں کے اشتہار باہر کھڑے کروا دیئے تھے۔

گیٹ پر کھڑے ہوئے دراز قد، سانولے اور کرخت صورت شخص نے بغیر کچھ پوچھے میرے لئے گیٹ تو کھول دیا لیکن جونہی میری گاڑی اندر پہنچی، دائیں بائیں سے دو آدمی میرے استقبال کے لئے نمودار ہوگئے۔ ان کی نظریں گویا میرے جسم کے پار ہوئی جا رہی تھیں۔ انہوں نے باقاعدہ میرا شناختی کارڈ طلب کیا اور گیٹ پر موجود ٹیلی فون پر اندر میرے بارے میں اطلاع دی۔ اندر سے کلیئرنس ملنے کے بعد انہوں نے مجھے آگے جانے کی اجازت دی۔

اندرونی دروازے پر ایک باوردی بٹلر نے مجھے ریسیو کیا اور ایک بہت بڑے ہال میں لے گیا۔ وہ اچھا خاصا ایک باضابطہ قسم کا کانفرنس ہال معلوم ہو رہا تھا جہاں بارہ انتہائی سنجیدہ صورت افراد گول سی میز کے گرد موجود تھے۔ تیرہویں حفیظ صاحب تھے۔

حفیظ صاحب کے سوا باقی سب گویا نظروں ہی نظروں میں میرا پوسٹ مارٹم کر رہے تھے گو کہ میں ابھی زندہ تھا۔ وہ تقریباً سب کے سب کرخت اور بارعب چہرے تھے اور سبھی پختہ العمر تھے۔ ان میں نوجوان کوئی نہیں تھا۔

حفیظ صاحب نے چودھویں کرسی کی طرف اشارہ کرکے مجھے بیٹھنے کے لئے کہا اور دور دور سے ہی، صرف اشارے سے تین افراد سے میرا تعارف کرایا۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر، بھاری بھرکم باقری صاحب تھے۔ دوسرے دبلے پتلے، سرخ و سپید اور طوطے کی چونچ جیسی نوکیلی ناک والے نفیس صاحب تھے۔ ان کی آنکھیں نیلی تھیں اور ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا عام انسان کے لئے تقریباً ناممکن ہی رہا ہوگا۔ اس کا اندازہ مجھے ان کی طرف دیکھتے ہی ہوگیا۔

تیسرے شہریار خان تھے۔ وہ شکل و صورت سے کوئی بزنس مین معلوم ہو رہے تھے۔ ناک پر نہایت چھوٹے چھوٹے شیشوں کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ وہ بھی حفیظ صاحب کی طرح سگار کے زبردست رسیا معلوم ہوتے تھے۔

یہ تینوں ہمارے ملک کی سب سے بڑی اور اہم ترین خفیہ ایجنسیوں کے سربراہ تھے۔ باقی لوگوں سے میرا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ وہ غالباً ان کے ماتحت اور خاص قابل اعتماد ساتھی تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حفیظ صاحب میرے بارے میں ان لوگوں کو پہلے ہی سب کچھ بتا چکے تھے اس لئے میرے بارے میں انہوں نے کوئی خاص بات نہیں کی۔

تعارف کے بعد چند لمحے اس طویل و عریض ہال میں گہرا سکوت طاری رہا۔ ان سب کی نگاہوں کا مرکز میں تھا۔ وہ گویا نظروں ہی نظروں میں مجھے تول رہے تھے، ٹٹول رہے تھے۔ گہرے سکوت کے یہ لمحے اعصاب شکن تھے لیکن میں صبر و سکون سے بیٹھا رہا۔ تینوں خفیہ ایجنسیوں کے سربراہوں کا نہ جانے کب تک خاموش رہنے کا ارادہ تھا۔ میں بھی سکوت توڑنے میں پہل کرنا نہیں چاہتا تھا۔

آخرکار حفیظ صاحب نے سکوت توڑا۔ وہ اپنے مخصوص، بھاری گونج دار اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئے "مسٹر چوہدری! میں نے ان صاحبان کو مختصراً تو تمہاری سنائی ہوئی کہانی سنا دی ہے لیکن بہتر ہوگا کہ تم خود اپنی زبان سے، نہایت تفصیل اور تمام تر جزئیات کے ساتھ شروع سے آخر تک تمام واقعات ان لوگوں کے گوش گزار کردو۔ اس کے بعد ہی بات چیت کچھ آگے بڑھے گی۔"

میں نے ایک بار پھر اسی طرح اپنی رام کہانی دہرائی جس طرح حفیظ صاحب کو سنائی تھی۔ وہ تمام لوگ اس طرح ہمہ تن گوش رہے گویا اس وقت ان کے نزدیک دنیا کا اہم ترین کام یہی تھا۔ حفیظ صاحب ہی کی طرح ان میں سے کسی نے بھی میری سرگزشت کے دوران کوئی سوال نہیں کیا۔ میں نے انہیں بھی بلا کم و کاست ہر بات بتادی اور آخر میں اسی طرح اپنے محسوسات بھی بیان کردیئے

جس طرح حفیظ صاحب کے سامنے کئے تھے۔

میرا خیال تھا کہ میرے خلوص اور حب الوطنی سے وہ بہت متاثر ہوں گے، مجھے خراج تحسین پیش کریں گے اور اطمینان دلائیں گے کہ وہ جلد از جلد اس سلسلے میں کوئی زبردست قسم کا مربوط و منظم آپریشن کریں گے، ریڈ ڈاٹ کا سراغ لگائیں گے اور اس کا قلع قمع کریں گے لیکن ان کا رد عمل میری توقعات کے بالکل ہی برعکس تھا۔

پہلے تو چند لمحے وہ سب ایک ٹک خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر طوطے کی چونچ جیسی ناک اور نیلی آنکھوں والے نفیس صاحب نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سرد لہجے میں بولے "مسٹر چوہدری! ہم نے اسپائی اسٹوریز اور سائنس فکشن پڑھنے کے بڑے بڑے شوقین دیکھے ہیں لیکن کسی کے ذہن پر ان چیزوں کا اتنا شدید اثر نہیں دیکھا کہ وہ خود ایک کہانی گھڑ کر ملک کے وزیر خارجہ کے توسط سے ملک کی تین سب سے بڑی خفیہ ایجنسیوں کو اپروچ کرے اور انہیں بھی خیالوں خوابوں کی دنیا میں الجھانے کی کوشش کرے۔"

میں دم بخود رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے تو میری سمجھ میں ہی نہ آیا کہ کیا کہوں۔ ایک مدت سے مجھے کسی نے اس طرح منہ پر صاف اور واضح انداز میں جھوٹا قرار نہیں دیا تھا۔ میری روح گویا تڑپ کر رہ گئی اور کان تپ اٹھے تاہم مجھے یہ بھی ذہن میں رکھنا تھا کہ وہ ایسے لوگ تھے جن سے ہمارے ہاں حکومتیں بھی خائف رہتی تھیں۔

میں نے بے پناہ صبر و ضبط سے کام لیتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "حفیظ صاحب نے آپ کو بتایا ہوگا کہ میں اس ملک کا ایک ممتاز بزنس مین ہوں۔ میرے پاس فکشن پڑھنے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ جب وقت ہوتا تھا تب بھی میں نے اسپائی اسٹوریز اور سائنس فکشن برائے نام ہی پڑھا......"

اب باقری صاحب میری بات کاٹتے ہوئے بولے "ہمیں آپ کے بارے میں کافی کچھ بتایا جاچکا ہے مسٹر چوہدری! جو نہیں بتایا جاسکا وہ ہم معلوم کرلیں گے۔ آپ اگر جاسوسی اور سائنسی قسم کا فکشن پڑھنے کے عادی نہیں ہیں تب تو یہ اور بھی زیادہ حیرت کی بات ہے کہ آپ اتنے زیادہ تخیل پرست ہیں۔"

"آپ کو میری کس بات پر تخیل پرستی کا گمان گزرا؟" میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں سرد مہری در آئی۔

"تقریباً ہربات پر۔" انہوں نے بلا تامل جواب دیا "سازشیں ہر ملک کے خلاف کسی نہ کسی انداز میں، کسی نہ کسی کی طرف سے جاری رہتی ہیں۔ ہمارا ملک چھوٹا، پسماندہ اور دفاعی حکمت عملی کے لحاظ سے اہم پوزیشن کا حامل ہے۔ ہمارے سیاسی، سماجی اور انتظامی ڈھانچے میں بھی بے شمار کمزوریاں ہیں۔ ان سب باتوں کی وجہ سے ہمارا ملک کچھ زیادہ ہی سازشوں کا گڑھ بنا رہتا ہے لیکن ان سازشوں کے یہ انداز نہیں ہوتے۔ ان کے جو انداز ہوتے ہیں ان سے ہم باخبر رہتے ہیں۔ باخبر رہنے کے لئے ہمارے پاس بہت بڑا نظام موجود ہے۔"

میں بے اختیار مسکرا دیا۔ انسان جب کسی بڑے نظام کا سربراہ ہوتا ہے تو اکثر اسے بہت سی خوش فہمیاں یا غلط فہمیاں لاحق ہوجاتی ہیں۔ بعض اوقات اسے اپنی ناک کے نیچے رونما ہونے والے واقعات کا علم نہیں ہوتا لیکن وہ اپنے آپ کو باخبر سمجھتا ہے۔

میز پر ٹیپ ریکارڈر اور کئی مائیک بھی موجود تھے۔ ہم سب کی گفتگو ریکارڈ ہو رہی تھی۔ میں نے ٹیپ ریکارڈر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اگر آپ میری آپ بیتی کو دوبارہ کسی وقت اطمینان سے بیٹھ کر سنیں تو اسی میں آپ کو اپنے تمام سوالات اور اعتراضات کا جواب مل جائے گا۔ وہ روایتی سازشیں، تخریب کاروں اور دہشت گردوں کی کارروائیاں، ہمارے ہاں کے بکاؤ لوگوں کی سرگرمیاں، سیاسی غداریاں، سیکرٹ ایجنٹوں کی تگ و دو ---- یہ سب تو اپنی جگہ ہیں ہی، سب کچھ ہو رہا ہے لیکن ریڈ ڈاٹ ایک نیا عالمی خطرہ ہے۔ بڑے ملکوں نے ویسے بھی ہمیں اپنی کالونیاں بنا رکھا ہے لیکن ریڈ ڈاٹ کے ذریعے وہ ہمیں مکمل طور پر نگل جائیں گے۔"

اب شہریار خان کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے "انہیں اتنا تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ انہیں جو کچھ مطلوب ہے، ان کے جو مقاصد ہیں وہ ویسے بھی پورے ہو رہے ہیں۔ انہیں اس سے زیادہ دردسری مول لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنے بہت سے غیر ملکی ہمارے ملک میں داخل ہوکر اس قسم کی، خواب و خیال کی "دنیائیں" تعمیر کرلیں، جو جی چاہے کرتے پھریں اور ہمیں اس کا ذرا بھی علم نہ ہو۔"

"یہ سوال تو مجھے آپ سے کرنا چاہئے تھا لیکن افسوس کہ میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں۔ میں تو جھوٹا قرار پانے کی پوزیشن میں ہوں۔" میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں ہلکی سی تلخی جھلک آئی۔ میں نے حفیظ صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود سے بیٹھے تھے۔ ان کی انگلیوں میں دبے ہوئے سگار سے دھوئیں کی لکیر بلند ہو رہی تھیں۔ انہیں یقیناً احساس تھا کہ میٹنگ جس مقصد کے لئے منعقد کی گئی تھی وہ پورا ہوتا نظر نہیں آرہا تھا بلکہ اس کی جگہ تلخی جنم لے رہی تھی۔ لیکن وہ گویا اس ضمن میں کچھ کرنے سے معذور تھے۔ مجھ سے نظر ملتے ہی انہوں نے سر جھکا لیا۔

نفیس صاحب کی نیلی آنکھوں میں سرد مہری کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ بے مہر سے لہجے میں بولے "مسٹر چوہدری! آپ کی کہانی میں کوئی بھی

سراغ، کوئی بھی نکتہ ایسا نہیں جس کے سہارے ہم آگے بڑھ سکیں۔ بقول آپ کے، آپ کو جس پراسرار اور خیالی سی جگہ پر لے جایا گیا، اس کے بارے میں آپ کو کوئی اندازہ نہیں کہ وہ کہاں تھی۔ باس دن، جس نے آپ سے مذاکرات کئے، اس کے کندھوں پر چہرے کے بجائے ایک بڑا سا انڈا رکھا تھا۔ ایڈم عرف ایڈی کا کوئی سراغ آپ کے پاس نہیں۔ وہ خود ہی جب چاہے آپ کو فون کرتا ہے۔ اس بندر نما شخصیت اے تن کا آپ کو کچھ اتا پتا نہیں۔ پرنسس تہمینہ عرف ہنی کے بارے میں اب آپ کو کچھ معلوم نہیں۔ جب آپ نے اس کے بارے میں ہر سراغ کھو دیا تب آپ ہمارے پاس آئے ہیں۔"

"حضور! اس سے پہلے مجھے معلوم ہی کہاں تھا کہ ریڈ ڈاٹ ہے کیا چیز؟" میں نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا "میں نے تو یہ سمجھ کر آپ کی طرف رجوع کیا ہے کہ شاید اس قسم کے معاملات میں سراغ وغیرہ لگانا آپ لوگوں کی ذمے داری ہے۔ آپ اتنی بڑی بڑی خفیہ ایجنسیاں چلاتے ہیں جن کا جال ملک بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ جہاں تک میں سمجھا تھا، آپ ہی لوگوں کا کام ملک کو اس قسم کے خطرات سے خبردار رکھنا اور محفوظ بنانے کی تدبیر کرنا تھا۔ کہیں میں خوش فہمی میں تو مبتلا نہیں تھا؟"

"طنزیہ لہجہ اختیار کرنے کی کوشش نہ کریں مسٹر چوہدری!" نفیس صاحب نے سرد لہجے میں کہا "ہم یہاں ایک سنجیدہ قومی مسئلے پر تبادلۂ خیال کے لئے جمع ہوئے ہیں، ایک دوسرے پر اپنی طنز و مزاح کی صلاحیتوں کا اظہار کرنے کے لئے نہیں۔"

"گستاخی معاف... میں تو اسے سنجیدہ قومی مسئلہ ہی سمجھ کر آیا تھا۔ میرے دل میں وطن کی محبت نے جوش مارا تھا لیکن ایسا لگتا ہے کہ نیچے یا اوپر... ہر جگہ، قدم قدم پر ہمارے ہاں وطن سے محبت کو ایک جرم کا سا رنگ دینے کی کوشش کی جاتی ہے، وطن کی بھلائی کے لئے سوچنے والوں کو پچھتانے پر مجبور کردیا جاتا ہے۔" میں کوشش کے باوجود اپنے لہجے کی تلخی پر قابو نہ رکھ سکا۔ انجام سے بے پروا ہوگیا۔

میرے سامنے بیٹھے ہوئے لوگ شاید ایسا لہجہ سننے کے عادی نہیں تھے۔ ان کے چہروں کی سردمہری بڑھ گئی لیکن شہریار خان قدرے تحمل سے بولے "تمہارے شکوک و شبہات بجا ہیں مسٹر چوہدری! یہ سوال بڑا غور طلب ہے کہ اگر اس قسم کی تنظیم کا واقعی کوئی وجود ہے تو اسے آپ میں ایسا کیا سرخاب کا پر لگا نظر آیا ہے کہ وہ آپ کو اپنا آلۂ کار بنانے کے لئے سردھڑ کی بازی لگانے پر تلی ہوئی ہے؟ جبکہ آپ ملک میں کسی خاص اہمیت کے حامل بھی نہیں، کسی سیاسی پارٹی کے سربراہ بھی نہیں۔ حتیٰ کہ آپ شہر کے چیمبر آف کامرس کے صدر تک نہیں۔ صرف سرمایہ دار ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ اس ملک میں آپ سے بڑے بڑے سرمایہ دار پڑے ہیں۔"

"میں اس ضمن میں کیا کہہ سکتا ہوں؟" میں نے بے بسی سے کہا "میرے پاس تو اس ضمن میں خود الجھنیں ہی الجھنیں، سوال ہی سوال ہیں۔ البتہ اس بات کا جو جواز انہوں نے جس حد تک بیان کیا تھا وہ میں نے آپ کے گوش گزار کردیا تھا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا کہ اس میں کس حد تک جھوٹ تھا اور کس حد تک سچ۔ اگر میں یہ سب معمے حل کرنے کے قابل ہوتا تو شاید مجھے آپ جیسی اہم شخصیات کو زحمت دینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔"

وہ کچھ ٹھنڈے پڑگئے لیکن میٹنگ بہرحال کچھ بے نتیجہ ہی رہی۔ کم از کم مجھے تو یہی محسوس ہوا۔ مزید کچھ دیر کی ایسی ہی نیم گرم اور نیم ناگوار سی بحث و جرح کے بعد انہوں نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ حفیظ صاحب مجھے چھوڑنے باہر آئے اور مشفقانہ سے انداز میں میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولے "بددل نہ ہونا۔ ابتدا میں یہ لوگ مشکوک معاملات کی اسی طرح چیر پھاڑ کرتے ہیں۔ ابھی اجلاس جاری رہے گا۔ اگر کوئی بات تمہیں بتانے کے قابل ہوئی تو میں تم سے رابطہ قائم کروں گا۔"

میں وہاں سے دفتر چلا گیا۔ راستے میں، میں نے ٹونی کو روک کر اس سے کہہ دیا کہ وہ اب میری نگرانی نہ کرے۔ دفتر میں کام کچھ خاص نہیں تھا اور میرا دل بھی نہیں لگ رہا تھا۔ میں گھر چلا گیا اور کچھ دیر بعد اپنی اصل گاڑی لے کر نکل کھڑا ہوا۔ صبح سے میں راحیلہ سے ملنے کا سوچ رہا تھا۔ میں اسی کی طرف چلا گیا۔

شاید اس کی طرف جانا ہی میری جان بچنے کا بہانہ بن گیا۔ کیونکہ رات گئے میں واپس آیا تو مجھے اپنی گلی سے بہت دور ہی رکنا پڑا۔ میری گلی اور آس پاس کے علاقے میں ہجوم تھا۔ فائر بریگیڈ کے سائرن سنائی دے رہے تھے اور بہت سے لوگ ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

گاڑی آگے لے جانے کا راستہ نہیں تھا۔ میں نے گاڑی روک کر اترتے ہوئے ایک ہیجان زدہ سے نوجوان سے پوچھا "کیا ہوا بھئی، خیریت تو ہے؟"

وہ یقیناً مجھے شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔ پرجوش سے لہجے میں بولا "جناب، اس گلی میں سیٹھ افضل چوہدری صاحب کی کوٹھی تھی۔ بہت عالیشان کوٹھی تھی۔ قلعے سے کم نہیں تھی۔ آج رات پے درپے کئی خوف ناک دھماکے ہوئے اور پوری کوٹھی ملبے کا ڈھیر ہوگئی۔ ہر چیز میں آگ لگ گئی۔ آگ، راکھ اور ملبے کے سوا کچھ نہیں بچا۔ سب لوگ مرگئے۔ شاید سیٹھ صاحب بھی مرگئے۔ سب اندر ہی تھے۔"

وہ گویا اختصار سے ساری کہانی مجھے سنا کر آگے بڑھ گیا لیکن میں وہیں کھڑا رہ گیا۔ میرا وجود گویا برف کی سل بن گیا تھا!

مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کہیں دور سے لوگوں کا شور مکھیوں کی بھنبھناہٹ کی طرح سنائی دے رہا تھا۔ میرے گرد گویا

تاریکی کی دلدل پھیلی ہوئی تھی اور میں برف کی سل کی طرح اس میں اُترتا جارہا تھا۔

دفعتاً فائر بریگیڈ کی ایک تیز رفتار گاڑی کے بریک عین میرے قریب چرچرائے۔ اس کا سائرن تو بج ہی رہا تھا لیکن ڈرائیور نے ہارن بھی بری طرح بجایا۔ میں اور میری گاڑی اس کے راستے میں حائل تھے۔ ٹرک کے دروازے پر لٹکے ہوئے نیلی ڈانگری والے ایک فائرمین نے چیخ کر مجھے شرم دلائی "او بھائی... کچھ تو احساس کرو یار! فائر بریگیڈ کا راستہ روکے کھڑے ہو۔ تمہیں ذرا احساس نہیں کہ کسی کا گھر جل رہا ہوگا۔ تم ہمیں دیر کرا رہے ہو۔"

میرا مسکرانے کو جی چاہا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوسکا تھا یا نہیں۔ میں اس فائرمین کو یہ بھی نہیں بتاسکا کہ وہ بدنصیب میں ہی تھا جس کے گھر کی وہ آگ بجھانے جارہا تھا۔ گو کہ اس کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ راستے میں ملنے والے نوجوانوں نے مجھے جو کچھ بتایا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ سب کچھ تو برباد ہوچکا تھا۔ اب وہاں بچانے کے لیے رکھا ہی کیا تھا۔ انسانی جانیں سب سے قیمتی تھیں۔ وہ بھی نہیں بچی تھیں۔

میں نے خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی ایک طرف ہٹا کر کھڑی کردی۔ فائر بریگیڈ کی گاڑی گزر چکی تو میں گاڑی سے اتر کر تھکے تھکے قدموں سے اپنی گلی میں داخل ہوا۔ آگ بجھانے والوں کو راستہ دینے کے بعد ہجوم ایک بار پھر راہ میں حائل تھا۔ وہاں فائر بریگیڈ کی دو گاڑیاں پہلے ہی سے موجود تھیں۔

وہ لوگ اس آگ کو بجھا رہے تھے جس میں اب کوئی کار آمد چیز، کوئی جاندار جسم نہیں بچا تھا۔ بس دہکتی آگ اور ملبے کا ایک بہت بڑا ڈھیر تھا۔ برابر کی دو کوٹھیوں کی دیواروں کو بھی نقصان پہنچا تھا حالانکہ ان سے میری اصل عمارت کی دیواریں جُڑی ہوئی نہیں تھیں۔ میں نے کوٹھی کی تعمیر میں خوب صورتی کے ساتھ ساتھ مضبوطی کا بھی بہت خیال رکھا تھا۔ ہر حصے میں ٹھیکیدار اور کنسٹرکشن کمپنی کو خصوصی میٹیریل استعمال کرنے کی ہدایت کی تھی۔ بہت سی چیزیں امپورٹیڈ تھیں۔

کمپنی کے تمام تر وسائل اور تیز رفتاری کے باوجود کوٹھی دو سال میں مکمل ہوئی تھی۔ اس میں میری نخرے بازیوں کو بھی بہت دخل تھا۔ بہت سی چیزیں نقشے کے مطابق ہونے کے باوجود مجھے پسند نہیں آتی تھیں۔ ان میں وہ خوب صورتی نظر نہیں آتی تھی جو اُن کے لیے میرے ذہن میں، میرے تصورات میں ہوتی تھی چنانچہ انہیں دوبارہ یا سہ بارہ بنایا جاتا تھا۔

اس کام میں، میں نے ذاتی طور پر کافی وقت صرف کیا تھا۔ رقم جو لگی تھی اس کا حساب تو الگ تھا۔ مکان خواہ غریب کا ہو یا امیر کا، اس کے خوابوں کا مظہر ہوتا ہے۔ اپنی حیثیت اور اپنے وسائل کے مطابق وہ اچھی سے اچھی چیز لاکر اس میں سموتا ہے۔ کتنے لوگوں کی کاوشیں اور مشقتیں کام آتی ہیں تب جاکر ایک مُدت میں یہ خواب تعبیر پاتا ہے۔

لیکن اچانک کہیں سے کوئی نحوست زدہ، مکروہ ہاتھ حرکت میں آتا ہے اور یہ خوب صورت خواب چند لمحوں میں بکھر جاتا ہے۔ یہ نظارہ دیکھ کر ایک بار تو اس خواب کے خالق کی روح کا منارہ بھی زمیں بوس ہوجاتا ہے۔

یہ تجربہ مجھے اس وقت ہو رہا تھا۔ آج شام تک جہاں میرا

خوب صورت خواب سر اٹھائے کھڑا تھا اب وہاں بدصورت ملبے' شعلوں' دھوئیں اور سیاہی کی سوا کچھ نہیں تھا۔ اس خواب کی بربادی کا صدمہ تو اپنی جگہ تھا لیکن ان پیاروں' وفاداروں اور جاں نثاروں کی مرگِ ناحق کا زخم بھی بہت گہرا تھا جو اسی ملبے میں گم ہوگئے تھے۔ بے شناخت' بے نشاں ہوگئے تھے۔ کئی گھریلو ملازم تھے۔ بٹلر' خانساماں' برتن دھونے والی عورت' دو مالی' ڈرائیور' صفائی کرنے والے' سودا سلف لانے والا اور ایک آدھ غیر ضروری ملازم بھی تھا۔ ان میں سے ایک آدھ کی فیملی بھی تھی۔ پھر سیکیورٹی گارڈز طارق خان اور ظاہر علی تھے۔

جس انداز میں کوٹھی تباہ ہوئی تھی اس سے مجھے یقین ہوگیا تھا کہ ان میں سے کسی کی لاش تک سلامت نہیں ملے گی۔ نہ جانے کس کے پرخچے اُڑے تھے' کون شعلوں کا لقمہ بنا تھا اور کون ملبے تلے دب کر ملبے ہی کا حصہ بن گیا تھا۔ کوٹھی کو تباہ کرنے کے لیے غالباً کئی طاقتور بم بیک وقت استعمال کیے گئے تھے۔

میں یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ خواب بہرحال بکھرنے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کنکریٹ کا لبادہ اوڑھ لیں۔ میں اپنی ان سوچوں کے ساتھ اس ہجوم میں گویا تنہا کھڑا تھا۔ میری طرف کسی کا دھیان نہیں تھا۔ کچھ لوگ نہایت انہماک سے فائر بریگیڈ والوں کی کارروائیاں دیکھ رہے تھے اور کچھ آپس میں باتیں کررہے تھے۔

ایک صاحب میرے پاس ہی کھڑے تھے۔ میں انہیں نہیں پہچانتا تھا اور وہ بھی غالباً مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ پر کھڑے ہوئے دو صاحبان سے کہہ رہے تھے "اللہ مغفرت کرے۔ چوہدری صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ کسی کے برے میں نہ بھلے میں۔ نہ جانے کس نے کیوں ان کے ساتھ یہ ظلم کیا ہے۔"

دوسرے صاحب بولے "میں آپ سے تھوڑا سا اختلاف کروں گا۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چوہدری صاحب نہ کسی کے بھلے میں تھے نہ برے میں۔ یہ تو سنا ہے کہ انہوں نے کبھی کسی کے ساتھ برائی نہیں کی۔ لیکن یہ بھی سنا ہے کہ اگر کوئی مصیبت زدہ یا مدد کا طالب ان تک پہنچ جاتا تھا تو اس کی ہر ممکن مدد ضرور کرتے تھے۔"

میرے دکھ کے صحرا میں طمانیت کی ایک بوند سی ٹپکی۔ میرے خیال میں' میں نے کوئی ایسا اچھا کام نہیں کیا تھا جس کی شہرت میرے پاس پڑوس میں پھیل سکتی لیکن غنیمت تھا کہ یہاں کے کچھ لوگ میرے بارے میں اچھی رائے کا اظہار کررہے تھے۔ شاید اس کی وجہ صرف یہ رہی ہو کہ انہوں نے مجھے مرحوم فرض کرلیا تھا۔ مرحومین کے بارے میں تو لوگ مُروّت میں بھی ایک آدھ اچھی بات کرلیتے ہیں۔

تیسرے صاحب جُھرجُھری سی لے کر بولے "بہت خوف ناک دھماکے تھے۔ ہمارا گھر تو حالانکہ یہاں سے خاصا دور ہے لیکن اس کے بھی درودیوار ہل گئے تھے۔ میں تو سمجھا تھا کہ شاید دشمن نے اچانک ہوائی حملہ کردیا ہے۔"

پہلے صاحب بولے "واقعی بھئی' ۶۵ء کی جنگ کے بعد سے ہم نے خود اتنے خوف ناک دھماکے کبھی نہیں سُنے۔ میں نے سُنا ہے چوہدری صاحب کے دائیں بائیں اور سامنے کی کوٹھیوں کے تو مکین جس طرح بیٹھے تھے اسی طرح' گھر چھوڑ کر نکل بھاگے تھے جب تک فائر بریگیڈ نہیں آگیا تب تک وہ لوگ واپس نہیں آئے۔"

دوسرے صاحب بولے "بھئی اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اگر ہمارے گھر قریب ہوتے تو شاید ہم بھی یہی کرتے۔"

کچھ اور لوگ بھی طرح طرح کے تبصرے کررہے تھے۔ میرا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ مختلف آوازوں اور رنگارنگ تبصروں کے درمیان میرے ذہن میں صرف ایک ہی سوال گونج رہا تھا "یہ کس کی حرکت تھی؟"

پچھلے کچھ عرصے میں' میں نے ملک ریاض' عالم شیر اور ... رفیق کو ان کے کچھ گرگوں سمیت ٹھکانے لگایا تھا لیکن مجھے معلوم تھا کہ ان کی موت کے بعد ان کے جمع کیے ہوئے بدمعاشوں اور خطرناک لوگوں کی کمر ٹوٹ گئی تھی۔ وہ ایسے ٹولے تھے جو اپنے سربراہ کے بغیر کسی قابل نہیں تھے۔ اس کے علاوہ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ان کے سرخیلوں اور سرداروں کو ٹھکانے لگانے میں ہی تھا۔ اس لیے میرا ذہن یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ ان ٹولوں میں سے کسی کی کارروائی ہوسکتی تھی۔

میری نظریں غیرارادی طور پر اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ ابھی تک مجھے کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آیا تھا اور نہ ہی کسی نے میری طرف کوئی خاص توجہ دی تھی۔ فائر بریگیڈ والے بدستور ملبے بجھانے میں لگے ہوئے تھے۔ بہرحال ان کی آمد کا اتنا فائدہ ضرور تھا کہ آگ آس پاس کی کوٹھیوں کی طرف نہیں بڑھی تھی۔

اچانک میری بھٹکتی ہوئی نظریں قریبی اندھیرے میں ایک جم کر رہ گئیں۔ وہ ماربل کے ایک تاجر کی بڑی سی کوٹھی تھی جس کی ایک دیوار کے ساتھ ساتھ باہر کی طرف پاپلر کے درختوں کی قطار تھی۔ ان میں سے ایک درخت پر مجھے کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی دی تھی۔ وہ یقیناً کوئی بھاری جاندار تھا جس کے وزن سے درخت کی مضبوط شاخیں ہی نہیں بلکہ پورا درخت ذرا سا لہرا گیا تھا۔

میرا ذہن جو اس وقت مجھے مفلوج محسوس ہورہا تھا' ایک دم بیدار ہوا اور جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی جو زندگی کی علامت تھی ورنہ میں تو سمجھ رہا تھا کہ اب دیر تک جسم شل ہی رہے گا۔

میری نظر اسی درخت پر جمی ہوئی تھی۔ فاصلہ کافی تھا روشنی برائے نام تھی لیکن درخت پر نظر گاڑ کر میں لمحہ بہ لمحہ طور پر دیکھنے کے قابل ہورہا تھا۔ پھر میں نے ایک سائے کو درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ لگاتے دیکھا۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ

انسانی نہیں تھا اور نہ ہی اس کا چھلانگ لگانے کا انداز انسانوں والا تھا۔ وہ اب دوسرے درخت کی شاخوں میں مدغم ہوگیا تھا تاہم اس کے وزن اور اس کی چھلانگ کے جھٹکے سے دوسرا درخت بھی ہل کر رہ گیا۔ کسی کی توجہ اس طرف نہیں تھی۔ اگر ہوتی تب بھی شاید کوئی اس سائے کو ایک درخت سے دوسرے درخت پر منتقل ہوتے نہ دیکھ پاتا ــــ وہ تاریکی ہی کا ایک حصہ تھا۔

اگر کوئی اسے دیکھ بھی لیتا تو حیران ہونے کے ساتھ ساتھ تھوڑا سا خوف زدہ بھی ہوتا۔ اسے یہ سوال یقیناً پریشان کرتا کہ آخر اس مہذب اور آباد علاقے میں ایک جسیم قسم کا چمپینزی کیا کررہا تھا' کہاں سے آیا تھا اور کیونکر اتنی آزادی سے اِدھر اُدھر چھلانگیں لگاتا پھر رہا تھا؟ وہ یقیناً بلیک برڈ تھا۔

مجھے اس سے کئی بار پالا پڑچکا تھا لیکن اب بھی میں صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر تھا کہ ریڈ ذات والے اس سے کیا کیا کام لیتے تھے اور وہ کیا کچھ کرنے کا اہل تھا۔ اس کے پاس انسانی اور حیوانی دونوں طرح کی صلاحیتیں تھیں۔ سمجھ بوجھ انسانوں والی تھی لیکن حیوان ہونے کی وجہ سے وہ بہت سے ایسے کام کرکے بھی صاف نکل سکتا تھا جنہیں انجام دینا انسان کے بس کی بات نہیں تھی۔ ایسی جگہوں تک اس کی رسائی ہوسکتی تھی جہاں تک انسان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس وقت میرے مکان کے ملبے کے آس پاس اس کی موجودگی خالی از علت نہیں تھی۔ نہ جانے وہ کیا کرچکا تھا کیا کرنا چاہ رہا تھا۔

میں ہجوم کے درمیان سے نکل کر فائر بریگیڈ کی ایک گاڑی کے عقب سے گزر کر اس گلی میں داخل ہوا جس میں درحقیقت وہ کوٹھی واقع تھی جس کی دیوار کے ساتھ پاپلر کے درختوں کی قطار تھی۔ مشین پسٹل میں نے جیب سے نکال لیا تھا۔ اس سے پہلے میں اس فکر میں رہا تھا کہ موقع ملے تو بلیک برڈ کو زندہ پکڑوں۔ لیکن آج میں نے تہیہ کیا ہوا تھا کہ اس قسم کی کسی کوشش میں وقت اور انرجی ضائع نہیں کروں گا اسے صرف شوٹ کرنے کی کوشش کروں گا۔

میں ایک دیوار کے ساتھ لگ کر اندھیرے میں اس گلی کی طرف کھسک رہا تھا۔ میری نظر اس درخت پر ہی تھی۔ اب اس میں کسی قسم کی حرکت کے آثار نہیں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بلیک برڈ ساکت ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ شاید اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ تاہم میں گلی کے کونے کی طرف کھسکتا رہا۔

جونہی میں اس گلی میں مُڑا' بلیک برڈ نے اچانک اس درخت سے اگلے درخت کی طرف چھلانگ لگائی اور عین اس وقت جب وہ دونوں درختوں کے درمیان تھا' میں نے اس پر ایک برسٹ مارا۔ میرا خیال تھا کہ میں اُڑتی ہوئی مکھی کو بھی نشانہ بنانے پر قادر ہوچکا ہوں لیکن قدرت شاید کم از کم اس وقت میری یہ خوش فہمی دور کرنے پر تلی ہوئی تھی کہ اس جسیم چمپینزی کا بال بھی بیکا ہوتا دکھائی نہ دیا۔ وہ کچھ عجیب' پارہ صفت قسم کی مخلوق تھا۔ ہوا میں بجلی کی طرح متحرک نظر آیا تھا۔ اس کے باوجود میرا خیال تھا کہ اسے ایک آدھ گولی تو لگ جانی چاہیے تھی کیونکہ میں نے ریوالور یا عام پسٹل سے نہیں بلکہ مشین پسٹل سے فائر کیا تھا۔

وہ ایک درخت سے نکل کر دوسرے درخت میں غائب ہوچکا تھا' اس کی تاریک شاخوں کا ایک حصہ بن چکا تھا۔ میں نے جھنجلاہٹ میں ...... اس درخت پر بھی ایک برسٹ مارا جہاں میرے خیال میں اسے ہونا چاہیے تھا۔ پتے اور شاخیں ٹوٹنے کی آواز آئی لیکن ایسی کوئی آواز نہیں آئی جس سے اندازہ ہوتا کہ اس بدبخت کو بھی کوئی نقصان پہنچا تھا۔

میں نے سوچا کہ مشین پسٹل اس درخت پر خالی ہی کردوں لیکن اسی لمحے درخت کی طرف سے کوئی چیز اڑتی ہوئی میری طرف آئی۔ ایک ثانیے کے لیے مجھے گمان گزرا کہ شاید وہ کوئی پرندہ تھا لیکن پھر وہ درمیانے سائز کی بوتل سی دکھائی دی مگر اس میں مدّھم سی جھلملاہٹ بھی موجود تھی' جیسے وہ کسی خاص قسم کے شیشے سے بنی ہو۔

وہ چیز عین میرے سامنے سڑک پر آکر گری اور گرتے ہی ہلکے سے دھماکے سے پھٹ گئی۔ میری آنکھوں کے سامنے گویا روشنی کا ایک گولا پھٹ گیا۔ ایک ساتھ جیسے کئی فلش بلبوں کے جھماکے ہوئے تھے اور میری آنکھیں خیرہ ہوکر رہ گئی تھیں۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں میری بینائی کو کوئی نقصان نہ پہنچا ہو۔ ایک لمحے کے لیے میں نے آنکھیں سختی سے بند رکھیں۔ بلیک برڈ کو میں بالکل بھول گیا۔

ایک خفیف سے اندیشے کے ساتھ جب میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو اس احساس سے اطمینان کی سانس لی کہ میری بینائی بالکل ٹھیک تھی۔ جس جگہ وہ بوتل سی آکر گری تھی اور پھٹ گئی تھی وہاں سفید سا دائرہ پھیل گیا تھا' جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں کوئی چیز گر کر پھٹی تھی۔

اس دائرے کے درمیان مجھے ایک چمکیلی سی نلکی پڑی دکھائی دی۔ وہ تقریباً اتنی ہی بڑی تھی جتنی عموماً دھاگے کی چھوٹی ریل میں سے نکلتی ہے۔ میں دیوار سے ہٹ کر آگے آگیا۔ مجھے یقین تھا کہ

بلیک برڈ اب پاپلر کے درخت پر نہیں ہوگا۔ اسے صرف چند لمحے کی مہلت درکار تھی جو اس نے حاصل کرلی تھی۔

سڑک کے وسط میں پہنچ کر میں نے جھک کر اس نلکی... کو دیکھا۔ بظاہر وہ بے ضرر سی دکھائی دے رہی تھی، اس کے باوجود میں اسے اٹھاتے ہوئے جھجک رہا تھا۔ ریڈ ڈاٹ والوں کی شعبدہ بازیوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

آخر کار میں رہ نہ سکا اور میں نے تمام تر احتیاط کے ساتھ اسے دو انگلیوں میں تھام کر اٹھا ہی لیا۔ اس میں ابھی ہلکی سی حرارت باقی تھی۔ وہ المونیم فوائل کی طرح ایک چمکیلا سا کاغذ ہی معلوم ہوتا تھا جسے چھوٹی سی نلکی کی طرح رول کردیا گیا تھا۔

میں نے اسے کھولا۔ ملگجے اندھیرے میں بھی اس پر انگریزی ٹائپ میں کچھ حروف نظر آرہے تھے۔ انہیں صاف طور پر دیکھنے کے لیے میں نے لیپنے کی رِنگ میں موجود سگریٹ کے فلٹر جتنی ننھی سی جیبی ٹارچ نکالی اور اس چمکیلے کاغذ پر روشنی ڈالی۔ باریک حروف میں اس پر نہایت صفائی اور قرینے سے دو سطریں درج نظر آرہی تھیں جو چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھیں لکھا تھا۔

"کیسی رہی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ تمہاری میٹنگ؟"

میں ایک لمحے کے لیے بُت بنا کھڑا رہ گیا۔ میری ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ میں سمجھتا تھا کہ میں نے اپنی زندگی سے خوف کو نکال پھینکا تھا لیکن یہ بھی شاید میری خوش فہمی تھی۔ جو چیزیں انسان کی جبلت میں شامل ہوتی ہیں وہ ان سے مستقل پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔

وہ درحقیقت حیرت کی شدت تھی، جس کی کوکھ سے اس خوف نے جنم لیا تھا۔ میں تو بہت خوش تھا کہ خفیہ ایجنسیوں سے میری میٹنگ کامیاب نہ سہی لیکن خفیہ تو رہی تھی۔ مگر اب اندازہ ہوا تھا کہ ان سے یہ بات بھی خفیہ نہیں رہی تھی۔ انہیں نہ صرف یہ معلوم ہوگیا تھا کہ میں نے خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ میٹنگ کی تھی بلکہ انہوں نے بلا تاخیر مجھے اس کی سزا بھی دے دی تھی۔ سزا بھی کچھ معمولی نہیں تھی۔ انہوں نے میرے خوابوں کے محلوں میں سے ایک محل مسمار کردیا تھا۔

میں نے چمکیلے کاغذ کے اس ٹکڑے کو اسی طرح رول کرکے جیب میں رکھ لیا اور خوف کو ذہن سے جھٹک دیا۔ میں اپنے پرانے فلسفے پر اپنا اعتقاد بحال کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ خوف زدہ ہونے سے نقصان کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔

گولیاں چلنے اور پھر اس بوتل نما چیز کے پھٹنے کے دھماکے سے کچھ لوگ اس بغلی گلی کی طرف متوجہ ہوچکے تھے اور ادھر نکل آئے تھے۔ سڑک پر نظر آنے والے سفید دائرے میں شیشے کی کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ المونیم فوائل نما کاغذ کا جو ٹکڑا مجھے ملا تھا وہ یقیناً اسی بوتل یا جار میں موجود تھا جو دھماکے سے پھٹا تھا اور آنکھیں خیرہ کردینے والی چمک پیدا ہوئی تھی۔ بعض اوقات مجھے حیرت ہوتی تھی کہ چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے ریڈ ڈاٹ والے شعبدہ بازیوں سے کیوں کام لیتے تھے؟ شاید اس میں ان کی کوئی ایسی مصلحت کارفرما ہوتی تھی جسے سمجھنے سے میں قاصر رہتا تھا۔

جو لوگ اس گلی کی طرف آئے تھے ان میں سے کسی نے مجھے پہچان لیا اور اس کے ساتھ ہی بھنبھناہٹ شروع ہوگئی جو اچھے خاصے شور میں ڈھل گئی۔ لوگ ایک دوسرے کو بتارہے تھے "بھئی چوہدری صاحب زندہ ہیں۔ چوہدری صاحب زندہ ہیں۔"

اس طرح ایک اچھا خاصا ہنگامہ سا شروع ہوگیا۔ پاس پڑوس کے لوگوں نے آکر گلے مل مل کر مجھے جان بچنے پر مبارکباد دینا شروع کردی۔ ساتھ ہی وہ تسلیاں دینے کی بھی کوشش کررہے تھے کہ کوٹھی تباہ ہوگئی تو کوئی بات نہیں، مجھے مغموم نہیں ہونا چاہیے جان بچ گئی تھی، زیادہ اہم بات یہی تھی، انسان زندہ رہے تو کوٹھیاں اور بھی بنوا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

میں ان سب کی ہمدردیوں اور خیر خواہی کا شکریہ ادا کررہا تھا۔ اس دوران ایک دو صاحبان نے مجھے کریدنے کی بھی کوشش کی کہ آخر میری کسی سے ایسی بھی کیا شدید دشمنی تھی جو اس نے ایسا شدید وار کیا تھا۔ میں لاعلم اور معصوم بن کر انہیں ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔ اسی دوران پولیس بھی آپہنچی۔ ہم سامنے والی لائن کی ایک کوٹھی میں جا بیٹھے۔ ان سب چکروں سے نمٹتے نمٹتے تقریباً صبح ہی ہوگئی۔

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ پانچ بج رہے تھے۔ جس کوٹھی میں ہم بیٹھے تھے وہ رودکڑی صاحب کی تھی۔ وہ بضد تھے کہ میں انہی کے ہاں قیام کرلوں لیکن میں نے انہیں بتایا کہ رہائش کا کوئی مسئلہ نہیں تھا، کئی ٹھکانے موجود تھے۔ ان کے خلوص کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں ان کے ہاں سے نکلا تو گلی میں سناٹا چھا چکا تھا۔ فائر بریگیڈ والے بھی رخصت ہوچکے تھے۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کو جاچکے تھے۔ واقعہ اپنی ہلچل مچا کر معدوم ہوچکا تھا۔ لمحوں کی جھیل میں ایک تلاطم برپا ہوا تھا اور اب سطح ایک بار پھر ہموار تھی۔

میں رودکڑی صاحب کو خدا حافظ کہہ کر وہاں سے کچھ دور کھڑی ہوئی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ستارہ کے گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔ فوری طور پر مجھے وہی ایک موزوں ٹھکانا دکھائی دیا تھا جہاں بیٹھ کر میں سکون سے کچھ غور و خوض کرسکتا تھا۔

ستارہ کا چوکیدار علی الصباح مجھے گیٹ پر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس وقت یا اس سے بہت پہلے میں عموماً یہاں سے رخصت ہوا کرتا تھا۔ اس نے مجھے اندر بلا کر ڈرائنگ روم میں بٹھایا اور مؤدبانہ لہجے میں پوچھا "صاب! کیا بی بی جی کو جگاؤں؟ وہ رات کو بہت دیر سے سویا ہے۔ بی بی جی رات کو شوٹنگ سے بہت دیر سے واپس آیا تھا۔"

وہ میرا حکم سن کر یقیناً جاکر ستارہ کو جگا دیتا۔ اسے معلوم تھا کہ میرے لیے کسی وقت بھی جاکر ستارہ کو جگانے پر اسے ڈانٹ نہیں

پڑے گی۔ اس کے باوجود وہ ہچکچا رہا تھا۔ میں نے جوتے اتار کر ایک صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا "نہیں، بی بی جی کو جگانے کی ضرورت نہیں۔ بس مجھے ٹیلی فون یہاں لادو۔"

اس نے سکون کی سانس لی اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ چند لمحے بعد اس نے لاؤنج سے ٹیلی فون سیٹ لاکر ڈرائنگ روم میں میرے قریب رکھ دیا۔ اس کے جانے کے بعد میں دیر تک سوچوں میں گم رہا۔ آخر ریڈ ڈاٹ والوں کو کس طرح پتا چلا تھا کہ میں خفیہ ایجنسیوں کی کسی میٹنگ میں شریک ہوا تھا؟

مجھے یقین تھا کہ کینٹ کے جس بنگلے میں میٹنگ منعقد ہوئی تھی، میرے وہاں تک کے سفر کے دوران ٹونی کے سوا کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔ ٹونی میری نگرانی کررہا تھا۔ میٹنگ میں جن لوگوں نے شرکت کی تھی وہ سب اعلیٰ درجے کے افسران تھے اور ان کا تعلق ملک کی حساس ترین ایجنسیوں سے تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان میں کوئی ریڈ ڈاٹ کا ایجنٹ بھی ہوسکتا تھا۔

ان کے علاوہ تو پھر ٹونی ہی رہ جاتا تھا۔ اور ٹونی گویا میری ہی ذات کا دوسرا نام تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو قدم قدم پر عملاً مجھ پر زندگی نثار کرنے کی کوششیں کرتے رہتے تھے۔ صرف میری حفاظت کی خاطر میرے اشارے پر اس نے کتنے ہی خطرناک بدمعاشوں کو قتل کیا تھا اور شاید کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا تھا کہ اس ضمن میں بدمعاشوں کے گروہوں یا قانون کی طرف سے اسے کیا خطرات لاحق ہوسکتے تھے۔ ٹونی کے بارے میں کوئی ایسی ویسی بات سوچنا میرے لیے گویا اپنی ہی ذات پر شک کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے اس امکان کو ذہن کے کسی تاریک گوشے میں بھی جگہ دینا مناسب نہ سمجھا۔

اس صورت میں ایک بہت بڑا سوالیہ نشان میرے ذہن میں معلق رہ جاتا تھا۔ میں نے اسے معلق ہی رہنے دیا اور مزید چند لمحے کے غور و خوض کے بعد ٹونی ہی کا نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر اس نے فون اٹھایا اور غنودگی زدہ آواز میں بولا "ہیلو؟"

"یہ میں ہوں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"سر!" میری آواز سنتے ہی ہمیشہ کی طرح اس کے لہجے سے غنودگی غائب ہوگئی اور وہ غالباً سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا "خیریت تو ہے؟ چند گھنٹے پہلے میں گھر پر آپ سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرتا رہا ہوں لیکن نہ تو آپ کے ڈائرکٹ نمبر پر رِنگ جارہی تھی اور نہ ہی گیٹ ہاؤس والے فون پر۔ کیا لائنیں خراب تھیں؟"

میں نے اسے اصل خبر سنانے سے پہلے پوچھا "تم کیوں رابطہ قائم کرنا چاہ رہے تھے؟ کوئی خاص بات تھی؟"

"ایسی کوئی خاص بھی نہیں تھی۔" وہ اپنے مخصوص لاابالی انداز میں بولا "بس کچھ اطلاعات آپ تک پہنچانا تھیں اور ایک بات پوچھنا تھی۔" بہت سی خاص باتوں کو بھی وہ خاص نہیں سمجھتا تھا، تاہم احتیاط پسند بھی تھا، وہ باتیں میرے گوش گزار ضرور کردیتا تھا۔

"اب کہہ ڈالو کیا اطلاعات تھیں اور کیا بات پوچھنا تھی؟" میں نے صوفے پر اطمینان سے دراز ہوتے ہوئے کہا۔

"یہ فون محفوظ ہے سر؟" اس نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"ہاں محفوظ ہی سمجھو۔" میں نے کہا۔

"سر! مختار رفیق اور اس کا خاص گرگا بابو نواز جو راکسی سینما کا منیجر تھا۔ ان کے بارے میں پتا چلا ہے کہ یہ خاصے اونچے درجے کے سیاسی بدمعاش بھی تھے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ان کو سابقہ حکومت نے بھی ایک آدھ اہم سیاسی قتل کرانے میں استعمال کیا تھا اور اس سے پچھلی حکومت نے بھی۔ جبکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ ویسے تو ان کا پتا صاف ہونے سے بہت سے لوگوں نے سکون کی سانس لی ہے لیکن کچھ لوگ شاید یونہی نمبر بنانے کے لیے یا پھر کسی اور مصلحت کے تحت پولیس پر دباؤ بھی ڈال رہے ہیں کہ ان کے قتل کی تحقیقات بہت سرگرمی سے کی جائے۔ بہت اہم لوگ دباؤ ڈال رہے ہیں۔"

"مجھے اندازہ تھا کہ ایسا ہوگا۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"پولیس نے کارکردگی دکھانے کے لیے کئی بے گناہ لوگوں کو پکڑ لیا ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ان کے ساتھ خواہ مخواہ کافی زیادتی ہوگی۔ میں سوچ رہا تھا کہ انہیں چھڑانے کے سلسلے میں کچھ ہوسکتا تو اچھا تھا۔ بس میں ویسے ہی سوچ رہا تھا، کوئی خاص بات نہیں تھی۔ مجھے تو صحیح طور پر معلوم بھی نہیں ہے کہ وہ ہیں کون لوگ۔"

ٹونی بلا کا سفاک تھا مگر اس کے دل کے کسی کونے میں وہ حساس شخص بھی چھپا ہوا تھا جو کسی کے ساتھ زیادتی ہوتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ دیکھیں گے۔ اپنا دامن محفوظ رکھتے ہوئے اگر کچھ ہوسکا تو ضرور کریں گے۔" میں نے کہا۔

"سر! اس وقت آپ کہاں سے بول رہے ہیں؟ گھر کی لائنیں کیا واقعی خراب تھیں؟" اسے پھر اپنی الجھن یاد آگئی۔

"لائنیں، ٹیلی فون، ٹیلی فون سننے والے سب ختم ہوچکے ہیں ٹونی ڈیئر! صرف ان کے ٹکڑے دستیاب ہوسکے ہیں۔ زندگی کی دھوپ میں جو گھر ان کے لیے سائبان تھا وہی ان کے لیے موت کا آتش کدہ بن گیا۔" میرے لہجے میں افسردگی کی جھلک آگئی۔

"کیا مطلب سر؟" ٹونی کا لہجہ سرگوشی کی حد تک دھیما ہوگیا جس کا مطلب تھا کہ وہ حد سے زیادہ چوکنا ہوچکا تھا۔

"وہ گھر ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے جس کے بنوانے میں تمہاری بھاگ دوڑ بھی شامل تھی ٹونی...!"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں سر؟" پہلی بار گویا اسے میری بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔

میں جو کچھ دیکھ کر آرہا تھا وہ میں نے اسے بتایا۔ وہ گویا سناٹے

میں آگیا‘ کچھ بھی نہ بول سکا۔ میں نے اپنے لہجے میں شگفتگی لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”جو ہونا تھا ہو چکا‘ اتنا صدمہ دل پر مت لو۔ مجھے اس عظیم الشان کوٹھی کا نہیں‘ ان ملازموں کا افسوس ہے جو ناکردہ گناہ کی سزا میں مارے گئے۔“

”کس کی حرکت ہے سر؟“ ٹونی کے لہجے میں پھنکار سی شامل تھی۔

”ریڈ ڈاٹ“ میں نے اختصار سے کہا۔

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کے دانت بھینچ گئے ہوں گے۔ پھر وہ اسی پھنکارنے کے سے انداز میں بولا ”سر! ایک بار آپ مجھے اس تنظیم کا سرا دکھادیں۔ میں اس سرزمین کو ان کے لیے جہنم بنادوں گا۔“

”اگر سرا میرے سامنے ہوتا تو شاید تم لوگوں کے ساتھ مل کر میں اب تک اس کام کا آغاز کرچکا ہوتا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”ویسے یہ کام اتنا آسان بھی نہیں۔ فی الحال تو مجھے یہی اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اس سرزمین کو ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کے لیے جہنم نہ بنادیں۔“

”پھر بھی سر۔ ہمیں کچھ تو کرنا ہوگا۔“ اس کے لہجے میں وہی خاموش اور مجبور غصہ پنہاں تھا جو میرے دل کی گہرائیوں میں کہیں کروٹیں لے رہا تھا اور جسے میں تھپک تھپک کر سُلانے کی کوشش کررہا تھا۔

”ہاں یہی ”کچھ“ تو میرے لیے اتنا بڑا سوالیہ نشان بن گیا ہے کہ اس نے باقی سب چیزوں کو چھپالیا ہے۔“ میں نے طویل سانس لے کر کہا ”خیر چھوڑو ان باتوں کو‘ فی الحال میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے کہ آج شام تم اپنے گھر پر تمام ساتھیوں کی میٹنگ کا انتظام کرو۔ میرا خیال ہے سات بجے کا وقت مناسب رہے گا۔ اس وقت سورج طلوع ہورہا ہے۔ تم مجھ سے بات ختم ہوتے ہی فون سنبھال لینا۔ کراچی والے تمام ساتھیوں کو بھی ہر حال میں آج ہی بلانا ہے۔ بارہ تیرہ گھنٹے کی مہلت سب کو جمع کرنے کے لیے کافی ہے۔“

”ٹھیک ہے سر!“

”کوئی ساتھی رہنے نہ پائے۔ اس میٹنگ میں ہر ایک کو شریک ہونا ہے۔“ میں نے ایک بار پھر زور دے کر کہا ”اور یہ بھی خیال رہے کہ میٹنگ کو حتی الامکان خفیہ رکھنے کی کوشش کرنی ہے۔ اگر تمام تر کوششوں کے باوجود خفیہ نہ رہ سکی تو دیکھا جائے گا‘ بہرحال اپنی سی احتیاط کرنی ہے۔ ہر ساتھی یہ خیال رکھے کہ تمہارے گھر تک پہنچنے کے دوران کسی بھی مرحلے پر‘ کسی بھی جگہ اس کا تعاقب نہ کیا جائے۔ تمہیں تو ریڈ ڈاٹ والے میرے ساتھی کی حیثیت سے پہچانتے بھی ہیں۔ سب سے زیادہ احتیاط کی تمہیں ضرورت ہے۔ بہرحال میٹنگ کے انتظامات کے سلسلے میں تو تمہیں گھر سے نکلنا ہی نہیں ہے۔ فون پر ہی سب سے بات ہوجائے گی اور میرا خیال ہے تمہارا گھر ریڈ ڈاٹ والوں کی نظر میں نہیں ہے۔“

”ہوا بھی تو دیکھا جائے گا۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا۔ ”سر! میرا تو خیال ہے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ ہی دیں۔ شاید اسی طرح ریڈ ڈاٹ کا کوئی سرا ہاتھ آجائے“

”وہ بعد میں دیکھیں گے۔ فی الحال اس ایک میٹنگ تک تو ہر ممکن احتیاط برتنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا ”کیونکہ اس میں ہی صحیح معنوں میں تمام ساتھی اس قصے سے باخبر ہوں گے۔ اس کے بعد ہم آئندہ کا لائحہ عمل طے کریں گے۔ سب کو تجاویز پیش کرنے کی دعوت دیں گے۔ ہوسکتا ہے کوئی اچھی تجویز سامنے آئے۔ اس وقت تک میں چاہتا ہوں‘ ہمارے کم سے کم ساتھی ریڈ ڈاٹ کی نظر میں آئیں۔ جو جتنا بے شناخت رہے گا اتنا ہی بہتر ہوگا۔“

”ٹھیک ہے سر! ہم تمام احتیاطیں پیشِ نظر رکھیں گے۔“ اس نے مجھے اطمینان دلایا۔

میں ابھی اسے مزید کچھ ہدایات دے رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا کوئی دروازے میں کھڑا ہے۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا تو ... کو دروازے میں کھڑے پایا۔ وہ نائٹ گاؤن میں تھی۔ ... صورت‘ سیاہ‘ ریشمی بال منتشر تھے لیکن اس بے ترتیبی میں بھی ایک حسن تھا۔ آنکھوں میں شب رفتہ کا خمار یا پھر شاید ٹوٹی ہوئی نیند کی کرچیاں تھیں۔ وہ قدرے غصیلی سی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں فیصلہ نہیں کرسکا کہ یہ غصہ حقیقی تھا یا مصنوعی۔

میں نے بات ختم کرکے فون بند کردیا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ تب بھی اندر نہ آئی‘ وہیں کھڑی مجھے گھورتی رہی۔ آخر میں نے کہا۔ ”کچھ بولو گی بھی...... یا وہیں کھڑی خاموش فلم چلاتی رہو گی؟“

وہ گویا دانت پیس کے بولی ”سیانے کہتے ہیں پہلے تولو پھر بولو۔ میں نے اس میں تھوڑی سی ترمیم کرلی تھی۔ یعنی پہلے تولو پھر مارو۔ میں دل ہی دل میں اس گلدان کو تول رہی تھی جو اٹھا کر تمہاری بے شرم کھوپڑی پر مارنا چاہتی ہوں۔“

”کیا قصور ہوگیا مجھ سے؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

”تم آکر مجھے جگا نہیں سکتے تھے؟ سیدھے میرے پاس نہیں آسکتے تھے؟“ اس نے غصے سے پوچھا۔

”اسے کہتے ہیں نیکی کر دریا میں ڈال۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا ”مجھے تو چوکیدار نے بتایا تھا کہ خلافِ معمول رات تم نے دیر تک شوٹنگ کی ہے اور تمہیں سوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ میں نے سوچا‘ تمہیں ڈسٹرب نہ کروں‘ سونے دوں۔ یہ صلہ ہے میری ہمدردانہ سوچ کا؟“

”کیا فائدہ ہوا مجھے تمہاری ہمدردانہ سوچ کا؟“ وہ آکر میرے قریب صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی ”دوسرے لوگ مجھے فون کرکے جگاکے بتارہے ہیں کہ تمہارے گھر میں افضل آیا ہوا ہے

سے کہو اب کہیں اور چلا جائے۔"

"کیا مطلب؟" میں چونک کر، کچھ اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا، "کس کا فون آیا تھا تمہیں؟"

مجھے یہ معلوم تھا کہ اس کے ہاں دو فون تھے۔ دوسرے نمبر والے فون کا صرف ایک ہی سیٹ تھا جو اس کے بیڈ روم میں تھا۔ وہ گویا اس کا پرائیویٹ فون تھا۔ جس کال کا وہ ذکر کر رہی تھی وہ یقیناً اسے اسی فون پر آئی ہوگی۔ دوسرے نمبر پر تو میں بات کر رہا تھا۔

"فون کرنے والے نے اپنا نام تو نہیں بتایا۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "لیکن اندازہ کرنا بہرحال مشکل نہیں تھا۔ انہی پُراسرار سے لوگوں میں سے کوئی معلوم ہوتا تھا جو تمہاری وجہ سے کبھی کبھی میری بھی زندگی خراب کرنے پر تلے رہتے ہیں۔"

"کیا کہہ رہا تھا وہ؟" میں نے انتہائی سنجیدگی سے پوچھا۔

"ابھی تو کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ میں نے اسے ڈانٹ دیا تھا کہ افضل یہاں نہیں ہے۔ اس نے سب سے پہلے یہی پوچھا تھا، "افضل پہنچ گیا؟" میری کھوپڑی گھوم گئی۔ ظاہر ہے میں رات کے پچھلے پہر آکر ابھی بمشکل دو تین گھنٹے سو پائی تھی کہ اس اُلو کے پٹھے نے فون کرکے جگا دیا۔ اوپر سے پوچھ رہا ہے 'افضل پہنچ گیا؟ میں نے کہہ دیا 'نہیں، تمہاری اماں نے ابھی اسے میرے پاس نہیں بھیجا' وہ برا منانے کے بجائے ہنسنے لگا۔"

پھر یکدم جیسے ستارہ کو کچھ خیال آیا۔ اپنے مصنوعی غصے کو بھول کر وہ میری طرف جھکتے ہوئے معصومانہ سنجیدگی سے بولی "افی! یہ لوگ خطرناک تو بہت معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے تو جو منہ میں آیا بک دیا۔ وہ بے غیرتی سے ہنستا رہا لیکن دل میں تو اس نے برا منایا ہوگا؟"

"یقیناً" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اور جب وہ بُرا مناتے ہیں تو نہایت ہی بُرے انداز میں بُرا مناتے ہیں اور بہت بُری سزا دیتے ہیں۔"

"کیا واقعی؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔

"ڈر گئیں؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"تم جو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہو مجھے۔" وہ میرے کندھے پر ہلکا سا گھونسا مارتے ہوئے دانت پیس کر بولی "اگر تم چھوڑ کر نہ بھاگا کرو تو میں دنیا میں کسی سے بھی نہ ڈروں۔"

"اچھا خیر، جذباتی مکالمے چھوڑو، یہ بتاؤ اس نے مزید کیا کہا؟" میں نے پوچھا۔

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی "میرے جذباتی مکالموں کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں؟"

"جذبات کی اہمیت ہے، مکالموں کی نہیں۔" میں نے کہا "تم میرے سوال کا جواب دو۔ تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ ان باتوں کا جاننا اس وقت میرے لیے کتنا اہم ہے۔"

"ہاں۔ تمہاری نظر میں ہمیشہ دوسروں ہی کی باتیں اہم رہیں گی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اس نے اور کوئی خاص بات نہیں کی۔ کہنے لگا میں دوبارہ فون کروں گا۔ اس وقت تک تم چیک کرلو۔ افضل تمہارے گھر پہنچ چکا ہوگا یا پہنچنے والا ہوگا۔"

عین اسی وقت فون کی گھنٹی کی دبی دبی سی آواز سنائی دی۔ ستارہ کان لگا کر سنتے ہوئے بولی "میرے بیڈ روم میں فون کی گھنٹی بج رہی ہے۔ میں جا کر سنتی ہوں۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی لیکن میں نے ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ بٹھا دیا۔ "بیٹھی رہو۔ میرا خیال ہے چند لمحے بعد اس نمبر پر فون آجائے گا۔" میں نے اپنے قریب تپائی پر رکھے فون کی طرف اشارہ کیا۔

میرا اندازہ درست رہا۔ بیڈ روم سے تین مرتبہ گھنٹی کی نہایت مدھم سی آواز سنائی دی اور جب وہاں کسی نے ریسیور نہ اٹھایا تو چند لمحے بعد میرے قریب رکھے ہوئے سیٹ کی گھنٹی بجی۔ میں نے ریسیور اٹھایا لیکن "ہیلو" نہیں کہا۔

"خاموش ہو۔ لگتا ہے ریسیور تم نے اٹھایا ہے افضل چوہدری!" دوسری طرف سے ایڈم عرف ایڈی کی استہزائیہ سی آواز سنائی دی۔

میں تب بھی خاموش رہا۔ بدبختوں کے اندازے غضب کے ہوتے تھے۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا "ہمیں پہلے ہی اندازہ تھا کہ بے گھر ہونے کے بعد سب سے پہلے تم ستارہ ہی کے گھر کا رخ کرو گے۔ یہاں "ہر طرح" کا آرام ملتا ہے نا تمہیں۔" اس نے ہر طرح پر بہت زور دیا اور پھر استہزائیہ سا قہقہہ لگایا۔

میں تب بھی خاموش رہا۔ وہ اس کی پروا کیے بغیر بولا "اور پھر ستارہ تم پر جان بھی تو نثار کرتی ہے۔ ایسے دوست آج کے دور میں ہر کسی کو کہاں ملتے ہیں۔"

میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "ایڈی! میرے بیش قیمت مکان.... اور اس سے بھی زیادہ قیمتی چند جانوں کو خاک و خون اور ملبے کے انبار میں تبدیل کرکے تمہیں کیا ملا؟"

ایڈی نے گویا میرے سوال سے محظوظ ہوتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور گویا میری نقل کرتے ہوئے اسی طرح ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "پہلے تم بتاؤ، تمہیں خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ میٹنگ کرکے اور ان کے سامنے ہماری رام کہانی بیان کرکے کیا ملا؟"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ میں نے خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ میٹنگ کی ہے اور ان کے سامنے تمہاری رام کہانی بیان کی ہے؟" میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"ہمیں دیواریں خبر دیتی ہیں، درخت سرگوشیاں کرتے ہیں، راستے کے پتھر بولتے ہیں۔" اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ بہت خوش معلوم ہوتا تھا۔

"آزاد شاعری چھوڑو، میری بات کا جواب دو۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "کسی خفیہ ایجنسی میں بھی تمہارے نمائندے موجود ہیں؟"

"ہم تمہارے سوالوں کے جواب دینے کے پابند نہیں ہیں، یہ بات تم بار بار بھول جاتے ہو۔" اس کے لہجے میں ہلکی سی سرد مہری آگئی "خصوصاً جس لہجے میں تم پوچھ رہے ہو اس پر تو ہمارا بلیک برڈ تک بُرا منا جائے گا۔"

"میں تو تمہاری فرعونیت کے ناتے سے پوچھ رہا ہوں۔ عام طور پر تم اپنے زعم میں بہت سی باتیں بتانا پسند کرتے ہو۔" میں نے قدرے نرم لہجے میں کہا۔

"میں کسی قسم کے زعم میں مبتلا ہو کر تو نہیں، بہرحال تمہاری تسلی کے لیے بتا دیتا ہوں کہ جن لوگوں کے ساتھ تم میٹنگ میں شریک ہوئے تھے ان میں کوئی ہمارا مخبر نہیں تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"تو پھر تمہیں کیسے سب کچھ معلوم ہوا؟" میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے پوچھا۔

"میں نے کب کہا کہ ہمیں سب کچھ معلوم ہوگیا ہے؟" وہ بے پروائی سے بولا "ہم تو صرف پرندوں کو اُڑتے دیکھتے ہیں کہ ان کا رخ کس طرف کو ہے۔ باقی اندازے خود بخود ہو جاتے ہیں کہ وہ کہاں بیٹھ کر کس طرح چہکے ہوں گے۔"

"صرف اتنی سی بات پر تم نے میرے خوب صورت مکان کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا؟" میں اپنی آواز کو ہموار رکھنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ ستارہ قریب بیٹھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"یہ اتنی سی بات نہیں تھی چوہدری ڈیئر!" وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا "ہم نے تمہیں بہت سمجھا بجھا کر بھیجا تھا۔ ہم ابھی تک تمہیں یہ سمجھانے میں ناکام رہے ہیں کہ جب ہم سنجیدگی سے کوئی بات کریں تو تمہیں بھی اس کو سنجیدگی ہی سے لینا چاہیے۔ یہ اس سلسلے کا پہلا سبق ہے۔"

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "تمہیں بھولنا نہیں چاہیے تھا۔ ہم نے کہا تھا کہ ہم تمہاری طرف سے انکار تو سننا ہی نہیں چاہتے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ ضروری بات یہ تھی کہ تمہیں ہمارے بارے میں زبان نہیں کھولنا چاہیے تھی۔ یہ تو ہماری ہدایات کی بالکل ہی ناقابلِ معافی خلاف ورزی تھی۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ اس کے باوجود تم زندہ سلامت پھر رہے ہو۔ یہ ہماری سب سے بڑی عنایت ہے۔"

میں نے بدستور ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں کہا "ایڈی ڈیئر! یہ تمہاری نہیں، کسی اور کی عنایت ہے۔ اگر اس کی یہ عنایت جاری رہی تو تمہاری عنایتوں کا حساب ضرور چکا دوں گا۔ لیکن اس سے پہلے میری ایک بار پھر تم سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ یا تو چوہے بلی کا یہ کھیل ختم کردو یا پھر مردوں کی طرح سامنے آجاؤ۔ زندگی اور موت کی بازی میرے لیے کبھی اہم نہیں رہی لیکن مقابلہ تو میدان میں ہونا چاہیے۔ میرے وسائل اور میری طاقت تمہارے سامنے ایسی ہی ہے جیسے ہاتھی کے سامنے چیونٹی کی طاقت۔ اس کے باوجود اسے میری درخواست سمجھ لو، چیلنج سمجھ لو یا جو تمہارا جی چاہے سمجھ لو کہ جو کچھ بھی کرنا ہے سامنے آکر کرو۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی گویا وہ اس قسم کی باتیں سُن سُن کر بہت بور ہو چکا ہو۔ پھر وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا، "چوہدری ڈیئر! یہ فلمی مکالموں اور رزمیہ داستانوں کا زمانہ نہیں ہے۔ ہم تمہیں اس دلدل سے نکالنا چاہ رہے تھے۔ ہم چاہتے تھے، تم ان قوموں کی سطح پر آکر سوچو جو عنقریب چاند ستاروں پر آباد ہونے والی ہیں۔"

"یوں کہو کہ اس دنیا کے بعد اب چاند ستاروں کو بھی برباد کرنے والی ہیں۔ ان کا سینہ بھی زخموں سے داغدار کرنا چاہتی ہیں۔" میں نے نفرت سے کہا۔

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی گویا اس نتیجے پر پہنچا ہو کہ مجھے سمجھانا فضول تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "ذرا ستارہ سے بات کراؤ۔"

"وہ تم سے بات کرنا نہیں چاہتی۔" میں نے بلا تامل کہا۔

"بچوں کی طرح ضد مت کیا کرو۔" وہ مربیانہ لہجے میں بولا "تم کیا سمجھتے ہو کہ اگر اس وقت تم اس سے میری بات نہیں کراؤ گے تو پھر کبھی نہیں ہوسکے گی؟ ذرا بات کراؤ۔ تمہارے فائدے کی بات ہے۔"

میں نے ریسیور ستارہ کی طرف بڑھاتے ہوئے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر کہا "ایک خبیث تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔" اس نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں ریسیور تھاما۔ اس کی رنگت کچھ پھیکی پڑ چکی تھی۔ اس فون کی چونکہ ایکسٹینشن بھی موجود تھی اس لیے میں جلدی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا اور دوسرے سیٹ پر ان کی گفتگو سننے لگا۔

ستارہ یقیناً ایک لمحے کے تذبذب کے بعد بولی تھی۔ میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں اسے ہیلو کہتے سنا۔

ایڈی بولا "ستارہ! تم ایک کم پڑھی لکھی مگر ذہین عورت ہو، ہماری مہمان رہ چکی ہو۔ تمہیں کچھ تو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ ہم کیا چیز ہیں۔"

ستارہ یقیناً کچھ سنبھل چکی تھی۔ وہ بولی تو اس کی آواز بیٹھی بیٹھی سی تھی لیکن اس میں ستارہ کا اپنا رنگ آچکا تھا۔ بظاہر سادگی سے بولی "ہاں مجھے اندازہ ہوگیا تھا، بہت منحوس چیز ہو۔"

ایڈی نے برا نہیں منایا۔ ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا "تمہارے انداز میں بھی افضل کا رنگ جھلکتا ہے۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔" ستارہ بدستور سادگی سے بولی، "میرے لیے اس سے بڑی خوش نصیبی کیا ہوگی کہ میرے انداز میں

افضل کا رنگ جھلکے۔ لیکن کاش افضل کو بھی اس کا احساس ہو اور مجھے اس کا کچھ فائدہ ہو۔"

"اچھا یہ واری صدقے جانے والی باتیں چھوڑو۔ کام کی بات سنو اور کان کھول کر سنو۔ تم افضل کو اپنے گھر میں رہنے کی اجازت نہیں دو گی۔ زیادہ سے زیادہ اسے ناشتے تک تمہارے ہاں ٹھہرنے کی اجازت ہے۔ اس کے فوراً بعد اسے چلتا کردو۔"

"تم تو بالکل ہی کھوتے کے پُتر ہو۔" ستارہ اپنی مصنوعی سادگی برقرار رکھتے ہوئے بولی "اس قسم کی باتیں بھلا مجھے بتانے کا کیا فائدہ؟ یہ گھر افضل ہی کا ہے۔ وہ گھر کا بھی مالک ہے، مرضی کا بھی مالک ہے اور اجازت کا بھی مالک ہے۔ اس کی مرضی ہے جب چاہے یہاں رہے، جب چاہے چلا جائے۔ میں بھلا اسے منع کرنے والی کون ہوتی ہوں؟ تمہیں جو کچھ بھی کہنا ہے اس سے ڈائریکٹ ہی کہو۔ تمہارے کہنے سے منع ہوجائے تو ٹھیک ہے، مجھ میں تو اسے کسی بھی بات سے منع کرنے کی جرأت نہیں ہے۔"

ایڈی ایک لمحے کے لیے نہ جانے کیوں خاموش ہوگیا۔ پھر عجیب سے لہجے میں بولا "کچھ زیادہ ہی فدا ہو افضل پر۔ دل و جان سے چاہتی ہو اسے؟"

"فدا ہونے اور دل و جان سے چاہنے وغیرہ کا تو مجھے پتا نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی "بس اس کے سوا دنیا میں کوئی اچھا نہیں لگتا۔"

ستارہ کو معلوم تھا کہ میں ایکسٹینشن پر گفتگو سن رہا تھا۔ وہ گویا یہ ساری باتیں صرف ایڈی کو ہی نہیں، مجھے بھی سنا رہی تھی۔ اس وقت اس کے منہ سے یہ سب کچھ سننا بہت بھلا لگا۔ تھکی ہوئی روح کو جیسے کچھ شگفتگی سی میسر آگئی۔ مجروح سے حوصلوں کو سہارا ملا۔ میں بے اختیار مسکرا دیا۔

"میں جو کہہ رہا ہوں اسے بہت سنجیدگی اور توجہ سے سنو۔" ایڈی کے لہجے میں یک لخت ہی بلا کی سفاکی اور سردمہری در آئی۔ ستارہ اداکارہ تھی، لہجوں کے اتار چڑھاؤ سے بخوبی آشنا تھی۔ اسے یقیناً اندازہ تھا کہ وہ محض دھمکیاں دینے والے کسی تھرڈ ریٹ بدمعاش یا کسی فلمی ولن سے بات نہیں کررہی تھی۔ اس کے باوجود اگر وہ حوصلے سے ہر بات کا جواب دے رہی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ اس نے خوف کو بالائے طاق رکھ دیا تھا جو ایک اچھی علامت تھی۔

ایڈی کی آواز کچھ اور نیچی ہوگئی "افضل ہمارے زیرِ عتاب آچکا ہے ستارہ بیگم! جو ہمارے زیرِ عتاب آجائے اسے تو زمین بھی پناہ نہیں دیتی پھر تم کیونکر پناہ دے سکتی ہو؟ ابھی تک تو یہ صرف ایک دوستانہ مشورہ تھا، اب تمہیں حکم دیا جارہا ہے کہ افضل کو زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے بعد اپنے گھر سے رخصت کردو ورنہ تمہارا انجام عبرت ناک ہوگا۔"

"انجام کے بارے میں کچھ مت کہو چندا!" ستارہ درویشانہ لہجے میں بولی "کسی کو کچھ پتا نہیں کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ ممکن ہے میں افضل کو رخصت کردوں لیکن اس کے باوجود بھی میرا انجام عبرت ناک ہو۔"

"نہیں، اس صورت میں، میں تمہیں ضمانت دیتا ہوں کہ تمہیں معاف کردیا جائے گا۔"

"میں پوچھ سکتی ہوں کہ اس کنیز کو یہ نادر شاہی حکم اور جاں بخشی کی ضمانت کون سے بادشاہ سلامت کی طرف سے دی جارہی ہے؟" ستارہ نے قدرے استہزائیہ سے لہجے میں پوچھا۔

"یہ حکم تمہیں ان کی طرف سے دیا جارہا ہے جن کا حکم درحقیقت پوری دنیا پر چلتا ہے۔ جو ہمارا حکم نہیں مانتے وہ پوری دنیا کے سامنے نمونۂ عبرت بن جاتے ہیں۔ تم میری بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش نہ کرو ستارہ بیگم! اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔" ایڈی کے لہجے میں بوجھل سنجیدگی تھی۔

"میں تو بہت حقیر فقیر قسم کی عورت ہوں، تم مجھے نظرانداز نہیں کرسکتے؟ تم سمجھ لو کہ میں اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہوں، یہاں بستی ہی نہیں ہوں۔" ستارہ کے لہجے میں بھی سنجیدگی آگئی لیکن اس سنجیدگی میں ملائمت بلکہ کسی حد تک التجا کی بھی آمیزش تھی۔

"میں کہہ تو رہا ہوں، افضل کو چلتا کرو اور آئندہ بھی اسے کبھی گھر میں گھسنے مت دینا۔ ہم تمہیں بھول جائیں گے۔" ایڈی نے جواب دیا۔

"یہ تم بہت ہی مشکل شرط عائد کررہے ہو۔ اسے ماننا میرے بس کی بات نہیں۔ افضل کی دوستی کے سوا میری زندگی میں کوئی خوشی ہے ہی نہیں۔ میں نے زندگی میں ایک بار اسے دھوکا دیا تھا۔ اپنی شخصیت اور اپنی فطرت کا اس پر بہت ہی گھٹیا امپریشن چھوڑا تھا۔ تب سے اب تک میں اس کی تلافی کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔ میں اب اس کی نظر میں بہت اچھی عورت بننا چاہتی ہوں۔ میں چاہتی ہوں وہ مجھے ہمیشہ بہت اچھے الفاظ میں یاد رکھے۔ میں نے کوئی زیادہ اچھی زندگی نہیں گزاری لیکن اگر میں افضل کی نظر میں اچھی ہوگئی تو سمجھوں گی کہ زندگی بہت اچھی گزری۔" وہ بہت ہی سنجیدگی سے یہ ساری باتیں کررہی تھیں۔ مجھے اس کے خلوص اور وابستگی کا کافی حد تک اندازہ تھا لیکن پھر بھی اتنے غیر متزلزل جذبات کی امید نہیں تھی۔ اس کے الفاظ میری روح کی گہرائی میں کہیں ایک عجیب سا ارتعاش پیدا کررہے تھے۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید میں اس بیکراں خلوص کی لذتوں سے زیادہ لطف کشید کرتا۔ گزشتہ راتوں کی میری تھکن کچھ کم ہوگئی۔ بے غرض محبت بھی ایک عجیب ہی ٹانک ہے۔

"اُف... اُف... اتنی افسانوی باتیں!" ایڈی نے گویا سر پیٹ لیا "ستارہ بیگم! یقین نہیں آرہا کہ تم ایک فلمی عورت ہو۔ یہ باتیں تو صرف اسکرین کے لیے ہوتی ہیں، سادہ لوح فلم بینوں کو سنانے کے لیے ہوتی ہیں۔ تم تو عجیب ہی فلمی عورت ہو۔ فلمی ہیروئن کی عملی زندگی اس سے بہت مختلف ہوتی ہے۔ یہ تم کن چکروں میں پھنسی ہوئی ہو؟ چلو عام لوگوں کی حد تک بھی تمہارے یہ مکالمے ٹھیک ہیں لیکن ہمارے سامنے اس قسم کی افسانویت میں الجھ کر اپنا اور ہمارا وقت ضائع مت کرو۔ جان سے ہاتھ دھو بیٹھو گی۔"

"اگر میں نے جان دے کر بھی افضل کے دل میں جگہ بنالی تو میں سمجھوں گی سودا مہنگا نہیں ہے۔" ستارہ بلا تامل بولی "میں چاہتی ہوں، وہ جب بھی مجھے یاد کرے آہ بھر کر یاد کرے۔ اس کے دل میں ٹیس سی اٹھے۔ ایسا ہوگیا تو میں سمجھوں گی، زندگی کی اچھی قیمت وصول ہوگئی۔ سودا مہنگا نہیں رہا۔"

"اوہ مائی گاڈ...! وہاٹ آ نان سینس!" ایڈی بے اختیار بول اٹھا۔ یہ سب کچھ گویا اس کی برداشت سے باہر تھا۔ میں خود بھی حیران تھا۔ ستارہ نے اس حد تک اور اس پہلو سے آج تک اپنے خلوص کی شدتوں کا اظہار مجھ پر بھی نہیں کیا تھا۔ مجھے اندازہ تو تھا کہ وہ اس طرح سوچتی ہے، اس طرح محسوس کرتی ہے لیکن پھر بھی اتنی وضاحت سے، اس کے اپنے منہ سے یہ سب باتیں سننا میرے لیے ایک لطیف تجربہ تھا۔

ایڈی بیزاری سے بولا "تو تم نہیں مانو گی؟ میں تمہاری طرف سے انکار سمجھوں؟"

"میں نہ تو کسی چیز سے انکار کررہی ہوں اور نہ کسی چیز کا اقرار۔" ستارہ بولی۔ "تم مجھ سے ایک عجیب، احمقانہ فرمائش کررہے ہو جس پر میرا کوئی اختیار ہی نہیں۔ میں تو تصور بھی نہیں کرسکتی کہ میں کبھی افضل سے کہوں وہ یہاں رہے یا چلا جائے۔ یہ اختیار صرف اسے خود کو ہی حاصل رہا ہے اور ہمیشہ اسے ہی حاصل رہے گا۔ میں نے کہا ناکہ یہ گھر بھی اس کی ملکیت ہے اور میں بھی اس کی ملکیت ہوں۔"

"اُلو کی پٹھی!" ایڈی نے یہ کہہ کر غالباً دانت پیس کر ریسیور رکھ دیا۔

"گدھے کا بچہ!" ستارہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا لیکن یہ جواب ایڈی تک نہیں پہنچ سکا۔ وہ سلسلہ منقطع کرچکا تھا۔ ستارہ نے بھی ریسیور رکھ دیا۔

ریسیور رکھ کر میں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ڈرائنگ روم کی طرف واپس آیا اور چوکھٹ پر رک گیا۔ وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں لیے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ادھوری نیند کے گلابی ڈورے ابھی تک تیر رہے تھے لیکن ان کے عقب میں اب ایک عجیب سی اداسی تھی۔ وہ بالکل سُست سے انداز میں بیٹھی تھی۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ چند لمحے پہلے یہی عورت ایڈی جیسے اہم اور خطرناک آدمی سے چٹاخ پٹاخ باتیں کررہی تھی۔

میں نے دونوں بازو پھیلا دیے اور وہ یکدم اٹھ کر یوں میری بانہوں میں آن سمٹی جیسے کوئی سہما ہوا پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا... اپنے آشیاں میں آچھپا ہو۔ وہ ہانپ رہی تھی، جیسے اس نے چند قدم کا نہیں بلکہ خاصا طویل فاصلہ دوڑ کر طے کیا ہو۔

"تمہاری باتوں سے مجھے بہت حوصلہ ملا ہے۔" میں نے اس کے ریشمی بالوں سے کھیلتے ہوئے سرگوشی میں کہا "میں اپنے آپ کو ایک پہاڑ کی طرح مضبوط محسوس کررہا ہوں۔"

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور مخمور سے انداز میں مسکرائی "شاید پہاڑ جیسے مضبوط ہر مرد کی بنیاد میں ریشم جیسی نازک کوئی عورت ہوتی ہے۔"

"شاید" میں نے مبہم لہجے میں کہا، پھر پوچھا "تم واقعی خوفزدہ نہیں ہو؟"

"تم میرے خوف اور بے خوفی کو چھوڑو" وہ میرا ہاتھ تھام کر واپس صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "یہ بتاؤ کیا ان لوگوں نے واقعی تمہاری کوٹھی کو بموں سے اُڑا دیا ہے؟ میں نے تمہیں فون پر اس طرح کی بات کرتے ہوئے سنا تھا۔"

"ہاں" میں نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "اسی لیے تو منہ اندھیرے آکر تمہارے ہاں پناہ لی تھی۔ کوٹھی بالکل ریت کا ڈھیر بن گئی ہے۔ بڑی مہارت سے اسے اُڑایا گیا ہے۔ مکان یا مکین کچھ بھی نہیں بچا۔ میرا خیال ہے مجھے انہوں نے جان بوجھ کر زندہ چھوڑا ہے ورنہ یہ کام شاید گھر میں میری موجودگی کے دوران ہوتا۔"

"تم نے آخر فوراً مجھے جگا کر یہ بات کیوں نہیں بتائی؟ تم تو اس طرح آرام سے آکر ڈرائنگ روم میں چپکے سے لیٹ گئے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔" وہ شکوہ آمیز لہجے میں بولی۔

"اب تمہارے آرام میں خلل ڈالنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اگر میں چیخیں مارتا ہوا تمہارے ہاں پہنچتا، گریہ زاری کرتا، میں لٹ گیا، میں برباد ہوگیا کے نعرے بلند کرتا تو تم مجھ سے زیادہ پریشان ہوجاتیں۔ میں ابھی مفلس و قلاش نہیں ہوا۔ زندگی رہی تو ویسا ہی، اس سے اچھا مکان اور بنالیں گے۔ ہاں ان جانوں کا افسوس ضرور رہے گا جن کا کوئی متبادل نہیں اور جو دوبارہ اس دنیا میں نہیں آئیں گی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ اب واقعی دل کو کچھ قرار سا آچکا تھا۔ میں جلد ہی اپنی افسردگی اور اضطراب پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ستارہ بولی "آخر یہ لوگ کون ہیں؟ کیوں اس حد تک تمہارے دشمن ہوگئے ہیں؟ کیا چاہتے ہیں یہ؟"

"میرے پاس بیٹھو۔ میں اب تمہیں بھی یہ سب کچھ بتا ہی دیتا ہوں تاکہ بات تمہاری سمجھ میں بھی آجائے۔ اب شاید تمہیں بھی بہت زیادہ ہوشیار اور محتاط رہنا پڑے۔ میں اس لیے بھی تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتا ہوں کہ اب یہ کوئی ایسا راز بھی نہیں رہا اور شاید حالات سے آگاہ رہتے ہوئے تم ان سے کچھ بہتر طور پر نمٹ

سکو۔"

وہ دوبارہ میرے پاس بیٹھ گئی اور میں نے شروع سے آخر تک اسے اس سارے چکر کے بارے میں بتایا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آئی تو وہ بھی کچھ پریشان سی ہو گئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کی زیادہ پریشانی صرف میری ذات سے متعلق تھی۔ اسے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ میرا کیا بنے گا؟ عالمی سازشوں' ملکی حالات یا ترقی پذیر ملکوں کو درپیش خطرات وغیرہ کے بھاری بھرکم معاملات میں وہ سر کھپانا نہیں چاہتی تھی۔

"اب تم کیا کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے خود نہیں معلوم" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا' "مجھے اندازہ نہیں کہ آئندہ لمحے کیا ہونے والا ہے' اس لیے میں پیشگی تو کچھ بتا ہی نہیں سکتا کہ کیا کروں گا۔ فی الحال تو میں اور مجھ سے تعلق رکھنے والے لوگ صرف احتیاطی تدابیر ہی کر سکتے ہیں' وہ ہم کریں گے۔ اس سلسلے میں بھی کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کوئی احتیاطی تدبیر کارآمد بھی ثابت ہو گی یا نہیں۔ میں تو اس امید پر یہ معاملہ سرکاری ایجنسیوں کے علم میں لایا تھا کہ شاید سب کچھ ان کی گود میں ڈال کر میں بالکل بے فکر ہو جاؤں گا۔"

"انہوں نے تو کچھ بھی نہیں کیا۔" ستارہ مایوسی سے بولی۔

"اتنی جلدی وہ کر تو واقعی کچھ نہیں سکتے تھے۔ ان کا اپنا ایک نظام ہے' بہت بڑی مشینری ہے جو دھیرے دھیرے حرکت میں آتی ہے اور لگے بندھے اصولوں کے تحت کام کرتی ہے۔ دیگر مشینوں کی طرح اس مشینری کی بھی آنکھیں اور محسوسات نہیں ہوتے۔ وہ دو اور دو چار کے اصول پر کام کرتی ہے۔ مجھے اس کا افسوس نہیں ہے کہ انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ انہوں نے شاید اس مسئلے کو زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا یا پھر شاید انہوں نے میری بات کا کچھ زیادہ یقین نہیں کیا۔ مجھے صحیح طور پر کچھ اندازہ ہی نہیں ہے کہ وہ کیا سوچ رہے ہیں' کیا چاہتے ہیں اور کیا کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ وہ بہت مشکل اور ٹیڑھے لوگ ہیں' کھل کر ہی نہیں دیتے۔"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "اب تو میں بھی محسوس کر رہا ہوں کہ ان کے پاس جا کر مجھ سے غلطی ہوئی۔ مسئلے کے تدارک کے سلسلے میں بھی کچھ ہوتا نظر نہیں آ رہا اور میں ریڈ ڈاٹ کے زیر عتاب بھی آ گیا ورنہ اب تک تو ان سے صرف اٹکھیلیاں ہی چل رہی تھیں۔ کوئی سنگین مسئلہ کھڑا نہیں ہوا تھا۔"

ستارہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "تم اس معاملے میں حکومت کو ذرا جھنجوڑنے کی کوئی اور تدبیر سوچو۔ تم اس چکر کو بالکل ہی اوپن کیوں نہیں کر دیتے؟ بہت بڑے پیمانے پر ایک پریس کانفرنس بلاؤ۔ میں تمہارا ساتھ دیتی ہوں۔ ایک فلمی ہیروئن کے گلیمر کی وجہ سے پریس ذرا آسانی سے اکٹھا ہو جائے گا۔ ہم یہ سارا قصہ ان کے سامنے بیان کر دیں گے۔ تمہاری تباہ شدہ کوٹھی ان کے سامنے ہو گی۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ قدرے جوش سے بات جاری رکھتے ہوئے بولی "سب کچھ پریس میں آ جائے گا' عوام کے سامنے آ جائے گا' ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ حکومت کو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ سرکاری مشینری ہنگامی بنیادوں پر حرکت میں آئے گی تو ریڈ ڈاٹ کا کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جائے گا۔ یہ اندھیرے خلا میں معلق رہنے والی کیفیت تو ختم ہو گی' کچھ نہ کچھ تو ہو گا۔"

"ہاں' کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "عین ممکن ہے پریس کانفرنس کے دوران ہم دونوں کا پتا ہی صاف ہو جائے۔ ملک کو خطرات سے نجات ملے نہ ملے' ہم دونوں کو تمام تفکرات سے نجات ضرور مل جائے گی۔"

"اب ایسا بھی کیا اندھیر۔" ستارہ سیدھی ہو کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "تمہارے پاس کافی تعداد میں بڑے کام کے آدمی موجود ہیں۔ میرے پاس بھی دو مسلح گارڈز ہیں' کچھ اور لوگوں کو بلا لیں گے۔ پولیس کی مدد لے لیں گے۔ پورے حفاظتی انتظامات کے ساتھ پریس کانفرنس کریں گے۔"

مجھے ہنسی آ گئی۔ اپنی تمام تر ذہانت اور جہاندیدگی کے باوجود وہ کچھ نہ کچھ سادہ تھی۔ میں نے کہا "میری گفتگو سے شاید تمہیں اندازہ نہیں ہوا کہ انہیں پانچ انتہائی ترقی یافتہ' سفید فام قوموں کی تمام تر سائنسی ترقی کا نچوڑ حاصل ہے۔ وہ کچھ اس قسم کے لوگ ہیں' جیسے اب تک ہمیں سائنس فکشن' سائنسی قصے کہانیوں میں ملتے تھے۔ اس قسم کے روایتی اور فرسودہ حفاظتی انتظامات ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے کہ ہم مسلح آدمیوں کا حلقہ اپنے اردگرد لیے پھرتے رہیں۔ اس سے تو بہتر ہے کہ ہم پہلے کی طرح اپنے آپ کو تن بہ تقدیر ہی چھوڑے رکھیں۔ اپنے انتظامات کے بجائے صرف اوپر والے پر ہی بھروسا رکھیں' یہ یقین پختہ رکھیں کہ جب تک زندگی ہے کوئی ہمیں مار نہیں سکتا۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "اس کے علاوہ بھی ایک بڑی وجہ ہے جس کی بنا پر میں تمہاری تجویز پر عمل نہیں کر سکتا۔"

"وہ کیا؟" اس نے قدرے دھیمے لہجے میں پوچھا۔ اس کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔

"یہ ایک انتہائی حساس معاملہ ہے' مجھے نہیں معلوم کہ خفیہ ایجنسیاں اس سلسلے میں کیا کریں گی' کیا نہیں' لیکن انہوں نے کم از کم ... ایک کام ضرور کیا ہے اور وہ یہ کہ مجھے اس سلسلے میں کسی سے بات کرنے سے سختی سے منع کر دیا ہے۔ میں تو یہاں بیٹھا تمہیں ساری کہانی سنا رہا ہوں۔ انہوں نے تو مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ انہیں مطلع کیے بغیر بلکہ ان کی اجازت لیے بغیر کسی سے اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہ کہوں۔" میں نے اصل وجہ بھی اسے بتا دی۔

"بس پھر تو ہو گیا کام!" وہ شکست خوردہ سے انداز میں جسم ڈھیلا چھوڑ کر صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "میں اب چلتا ہوں۔"

"کیوں؟" وہ یکدم سنبھل کر بیٹھ گئی۔

"انہوں نے تمہیں مجھ کو گھر سے نکالنے کے لیے ایک گھنٹے کی مہلت دی تھی۔ میرے خیال میں بہتر یہی ہے کہ اس مہلت کے ختم ہونے تک میں یہاں سے نکل لوں۔ میں تمہارے لیے خطرات کھڑے کرنا نہیں چاہتا۔ میری وجہ سے تم پہلے ہی کافی زحمت اٹھا چکی ہو۔"

"اوہو" وہ تمسخرانہ لہجے میں بولی "یہ تم اتنے باتکلف کب سے ہو گئے؟"

"معاملہ نازک ہے' اس میں باتکلف رہنا ہی مناسب ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

میں اٹھنے لگا تو وہ میرے دونوں بازو پکڑ کر مجھے بٹھانے کے لیے بساط بھر زور لگاتے ہوئے تحکمانہ لہجے میں بولی "بیٹھ جاؤ' تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ اگر تمہارا پہلے کہیں جانے کا پروگرام تھا بھی تو اب تم اس پر عمل نہیں کرو گے۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بس میں نے کہہ جو دیا۔" وہ ضدی لہجے میں بولی "وہ کتنے ہی بڑے' کتنے ہی خطرناک لوگ سہی' میں نہیں چاہتی' وہ یہ سمجھیں کہ ستارہ نے جان کے خوف سے افضل کو اپنے گھر سے بھگا دیا۔"

"لیکن تم تو مجھے نہیں بھگا رہیں۔ میں اپنی مرضی سے جا رہا ہوں۔ تم نے تو فون پر بھی یہی جواب دیا تھا کہ تم مجھے جانے کے لیے نہیں کہو گی لیکن میں اپنی مرضی سے جانا چاہوں گا تو چلا جاؤں گا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"ہاں اس وقت روانی میں کہہ تو دیا تھا لیکن اب میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم اپنی مرضی سے بھی نہیں جاؤ گے' کم از کم آج شام تک تو کہیں نہیں جاؤ گے چاہے تم اپنی مرضی سے جاؤ یا کسی اور وجہ سے لیکن وہ لوگ تو یہی سمجھیں گے کہ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی ہے' ان کی دھمکی سے ڈر گئی ہوں۔ میں ایک کمزور عورت ہوں لیکن انہیں بتا دینا چاہتی ہوں کہ دل کے معاملے میں عورت بڑے بڑے مطلق العنان بادشاہوں کی بات نہیں مانتی۔ میں انہیں ان کی پہلی ہی کوشش پر خبردار کر دینا چاہتی ہوں کہ کم از کم تمہارے معاملے میں وہ مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں منوا سکتے۔" اس کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

"ان جذباتی باتوں کا فائدہ؟" میں نے ملائمت سے کہا۔

"تم ہی تو کہا کرتے ہو کہ فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن جذبات کو زندگی سے خارج نہیں کرنا چاہیے' ہر چیز کو صرف فائدے اور نقصان کے پیمانے سے نہیں ناپنا چاہیے' اگر جذبات کو نکال دیا جائے تو زندگی بڑی بے کیف ہو جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اب تم خود ہی اپنی "تعلیمات" کی نفی کرنے لگے ہو۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "میں تو ویسے بھی اداکارہ ہوں۔ میری زندگی سے اگر جذبات کو نکال دیا جائے تو باقی کیا رہ جائے گا؟"

"وہ جذبات صرف اسکرین کے لیے ہوتے ہیں۔ اداکارہ کے جذبات صرف اسکرین پر ہی اچھے لگتے ہیں جو اسکرپٹ کے راستے سے اس کے کردار میں آتے ہیں۔ عملی زندگی میں یہ بے وقوفی کی باتیں لگتی ہیں۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"لیکن تم تو ایسی "بے وقوفیوں" سے محبت کرنے والے آدمی ہو۔ اب ان باتوں سے منکر تو مت ہوؤ!"

"مجھے اپنے فلسفے عزیز ہیں لیکن تمہاری جان ان سے زیادہ عزیز ہے۔ بے کار کی باتیں چھوڑو' مجھے اب جانے دو۔" میں نے اسے پچکارا۔

"ایسے ہی موقعے ہوتے ہیں جب کسی فرعون کو یہ بتایا جاتا ہے کہ دنیا میں سبھی اس کا حکم ماننے والے نہیں بستے۔" وہ غیر متزلزل لہجے میں بولی۔

"میں خود تو اب تک یہی کرتا آ رہا ہوں لیکن تم اپنے آپ کو اس حد تک کیوں ملوث کرتی ہو۔" مجھے اس کی ضد سے الجھن ہونے لگی تھی۔

یکدم ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ گلوگیر سی آواز میں بولی "زندگی کے سفر میں تو ساتھ نہیں چلنے دیتے' کبھی کبھی ان چھوٹے موٹے پُرخطر راستوں پر تو چند قدم ساتھ چلنے دیا کرو۔"

میں دم بخود اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے یکدم انتہائی جذباتی سے لہجے میں بولی "اگر تم گئے تو میں اپنے آپ کو شوٹ کر لوں گی۔"

"اُف خدایا!" میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ چند لمحے اسے گھورنے کے بعد میں نے کہا "ستارہ بیگم! ایک بات تو طے ہے کہ تمہارا بھی کوئی نہ کوئی پرزہ گرا ہوا ضرور ہے اور وہ ضرور کوئی نایاب پرزہ ہے۔"

اس نے محسوس کر لیا کہ میں نے جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ طمانیت سے مسکراتے ہوئے بولی "تھوڑا بہت سنکی تو ہر شخص ہوتا ہے۔"

"تھوڑے بہت کی تو کوئی بات نہیں' گزارا ہو جاتا ہے لیکن تمہارا معاملہ تو..." میں نے ٹھنڈی سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اب جو تمہارا دل چاہے کہہ لو۔ مجھے بس خوشی یہ ہے کہ تم نے میری بات مان لی۔" وہ کھلی جا رہی تھی۔

"اور جان کا تمہیں کوئی خوف نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے ہوا کرتا تھا' اب نہیں رہا۔" وہ بے پروائی سے بولی'

"خاص طور پر جب تم ساتھ ہوتے ہو تو کوئی خوف محسوس نہیں ہوتا۔"

"لگتا ہے میری دوستی کے چکر میں ہی تمہارا پتا صاف ہو جائے گا۔ یہ مت سمجھنا کہ بدفال منہ سے نکال رہا ہوں۔ حالات ہی کچھ ایسے نظر آرہے ہیں۔"

"یہی تو میں چاہتی ہوں۔" وہ مضبوطی سے میرے ہاتھ میں ہاتھ پھنساتے ہوئے بولی "میں نے ایک بار اپنی دانست میں بہت چالاک بنتے ہوئے تمہیں دھوکا دیا تھا۔ جذباتی دھوکا بھی اور مالی دھوکا بھی۔ تمہارا وہ قرض چلا آرہا ہے مجھ پر۔ میں چاہتی ہوں' اب الٹا تم پر کچھ قرض چھوڑ کر مروں۔"

"اچھا یہ قرض وغیرہ بعد میں چڑھاتی رہنا۔" میں نے پیٹ پر ہاتھ پھیر کر کراہتے ہوئے کہا "فی الحال تو کچھ ناشتا وغیرہ کراؤ۔ اس کے بعد میں ایک صاحب کو ضروری ٹیلی فون کروں گا... بلکہ ٹیلی فون تو شاید مجھے کئی جگہ کرنے پڑیں۔ حالانکہ میں خود ہی اپنے اور تمہارے گرد مسلح آدمیوں کا حلقہ بنانے کو فضول حرکت قرار دے چکا ہوں لیکن میرا خیال ہے' دل کی تسلی کے لیے کچھ انتظامات کر ہی لینے چاہئیں۔ خیر یہ کام بعد میں کریں گے' پہلے ناشتا کراؤ تاکہ دماغ کچھ ٹھکانے آئے۔"

"ابھی تو خانساماں وغیرہ بھی بیدار نہیں ہوئے ہوں گے۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی "کیا ستم ظریفی ہے۔ مالک جاگ رہے ہیں' نوکر سو رہے ہیں میرا خیال ہے میں انہیں جگانے کے بجائے خود تمہارے لیے ناشتا بناتی ہوں تم بھی کیا یاد کرو گے' ایک سپر اسٹار نے تمہیں اپنے ہاتھوں سے ناشتا تیار کر کے کھلایا تھا۔"

"اس کے بعد اسپتال تو نہیں جانا پڑے گا؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

وہ مصنوعی غصے سے گھورتے ہوئے بولی "مت بھولو کہ کسی زمانے میں تم ایک عرصے تک میرے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانے کھاتے رہے ہو۔ اس وقت بھی تم خوب ہٹے کٹے تھے' اسپتال جانا تو درکنار تم نے کبھی ہاضمے کی کوئی گولی بھی نہیں کھائی تھی۔"

"کیا زمانہ یاد دلا دیا ظالم!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا'

"اس زمانے کی بات مت کرو' وہ تو دور ہی کچھ اور تھا۔ اب تم سپر اسٹار ہو گئی ہو اور میں سیٹھ صاحب' اس لیے اب شاید تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا ہضم نہ ہو۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولی "مرنا تو ایک نہ ایک دن ہے ہی۔ بہتر ہے کہ میرے ہاتھ کا پکا ہوا کھا کر مرو۔ گولی کھا کر مرنے سے تو بہتر ہے۔ آؤ کچن میں ہی آجاؤ' باتیں بھی کرتے رہیں گے' میں ناشتا بھی تیار کرتی رہوں گی۔"

"یقیناً میں اپنی آنکھوں سے اپنی موت کا سامان ہوتے دیکھوں گا۔" میں نے کراہ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

کچن میں بھی ایک چھوٹی ڈائننگ ٹیبل موجود تھی۔ میں اس پر جا بیٹھا' لاؤنج والا ٹیلی فون سیٹ بھی اٹھا کر میں وہیں لے گیا۔ ستارہ اپنے آراستہ اور پُرآسائش کچن میں کھڑی چند لمحے تو حیران حیران سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتی رہی' جیسے کسی اجنبی جگہ پر آگئی ہو۔ اس کی شاید سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کام کہاں سے شروع کرے۔ آخر کار وہ کام میں لگ ہی گئی۔

میں اپنی اُدھیڑبُن میں تھا۔ سوچ رہا تھا کہ کس ساتھی کو کہاں تعینات کروں۔ دو ساتھی اس وقت بھی ستارہ کی کوٹھی کی نگرانی کر رہے تھے۔ میرے پاس زیادہ آدمی نہیں تھے اور جو تھے' میں نہیں چاہتا تھا وہ سب کے سب ہی ریڈ ڈاٹ کی نظروں میں آجائیں۔ وہ میرا محفوظ سرمایہ تھے۔ میں انہیں برے وقت کے لیے محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔

شام کو ان سب کو میٹنگ میں بھی شرکت کرنا تھی۔ وہ جہاں جہاں بھی کام کر رہے تھے یا کسی مقصد کے تحت تعینات تھے' میٹنگ میں شرکت کے لیے انہیں وہاں سے ہٹنا تھا۔ میٹنگ میں نے جان بوجھ کر ٹونی کے گھر رکھی تھی۔ گو مجھے اندازہ تھا کہ ٹونی کا گھر شاید محفوظ نہ ہو۔ ٹونی خود بھی ریڈ ڈاٹ کی نظر میں تھا اور عین ممکن کہ اس کا گھر بھی انہیں معلوم ہو لیکن فی الحال اس کے سوا کوئی جگہ مناسب بھی معلوم نہیں ہوئی تھی۔

ماڈل ٹاؤن والی کوٹھی جسے ہم دو نمبر کہتے تھے' ہمارا سب سے محفوظ ٹھکانا تھی۔ پہلے میں نے میٹنگ وہیں رکھنے کا سوچا تھا لیکن ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے سوچا' جب تک ممکن ہو سکے' اسے دوسروں کی نظر میں آنے سے بچایا جائے۔ اسی لیے میں نے خود اُدھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ حفاظتی انتظامات کے لحاظ سے بھی وہ ایک عمدہ جگہ تھی۔ کسی معرکے کی صورت میں ایک چھوٹا موٹا قلعہ ثابت ہو سکتی تھی۔ گو کہ مجھے اس طرح کا کوئی معرکہ پیش آنے کی توقع کم ہی تھی۔

"آج تم شوٹنگ پر جاؤ گی؟" میں نے ستارہ سے پوچھا۔ مجھے دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا تھا کہ وہ خوفزدہ نظر نہیں آرہی تھی بلکہ اس نے تو کچھ کمال ہی کر دیا تھا' بڑی ترنگ میں گنگنا رہی تھی۔

"آئے موسم رنگیلے سہانے"

موت ہمارے تعاقب میں تھی اور اسے موسم رنگیلے سہانے دکھائی دے رہے تھے۔ انڈا پھینٹتے ہوئے وہ خاصی پُرکشش قسم کی گھریلو خاتون معلوم ہو رہی تھی۔ بڑے اہتمام سے اس نے ایپرن بھی باندھا تھا۔

میرے سوال پر وہ قدرے چونکتے ہوئے بولی "ہاں آج تو کچھ زیادہ ہی ضروری ہے۔ دو فلمیں ایسی ہیں جن کی شوٹنگ ہیرو صاحب کی وجہ سے بہت دن سے بار بار کینسل ہو رہی تھی۔ پروڈیوسر کا بہت نقصان ہو چکا ہے۔ اب ہیرو صاحب بڑی مشکل سے ہاتھ آئے ہیں۔ شاید وہ کہیں شراب کے حوض کی تہ میں پڑے تھے۔ پروڈیوسر نے میری بڑی منت کی تھی کہ اب میری طرف

کوتاہی نہ ہو تو اس کی لٹکی ہوئی فلم کچھ آگے بڑھائی جا سکے گی۔"

پھر وہ مسکراتے ہوئے بولی "تمہیں تو شاید معلوم نہیں ہو گا' آج کل تمہاری ایک فلم کی شوٹنگ بھی چل رہی ہے۔ میرا ہی کام شوٹ ہو رہا ہے۔" اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے "خیر' تمہاری فلم کا کیا ہے۔ وہ تو پھنسی رہے یا چلتی رہے' تمہیں کیا فرق پڑتا ہے۔"

"ہاں' اس وقت تو واقعی مجھے فلموں کا کوئی ہوش نہیں۔ میری اپنی زندگی ایک عجیب' پیچیدہ اور بے سروپا قسم کا ڈراما بنی ہوئی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "فلموں کے مسائل سے تو آفاق خود ہی نمٹتا رہے گا۔ میں تو یہ کہہ رہا تھا کہ میں دو آدمی اور بلوا لیتا ہوں۔ دو پہلے ہی نگرانی پر مامور ہیں۔ یہ چاروں شوٹنگ پر بھی تمہارے ساتھ چلے جائیں گے اور حفاظت کے لیے موجود رہیں گے۔"

"خدا کی پناہ ان! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟" وہ ایک بیٹر چھوڑ کر میری طرف مڑتے ہوئے بولی "تم تو فلم انڈسٹری میں مجھے تماشا بنا دو گے۔ پہلے ہی دوسری ہیروئنیں اتنی جیلس ہیں مجھ سے۔ پیٹھ پیچھے مذاق اڑانے کے بہانے ڈھونڈتی ہیں۔"

"کیوں' مذاق کی اس میں کیا بات ہے؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی میرے دو مسلح گارڈز پر پہلے بھی حملہ ہوا تھا۔ ایک تو مارا ہی گیا تھا' دوسرا بھی مرتے مرتے مشکل سے بچا تھا۔ اس کے بعد بھی تمہاری ہدایت پر میں نے دو گارڈ اور رکھے تھے۔ وہ اب پہنچنے ہی والے ہوں گے۔ دن بھر وہ میرے ساتھ ہوتے ہیں۔ باوردی ہوتے ہیں۔ اب چار آدمی تمہارے میرے ساتھ ہو جائیں گے۔ میرا تو اچھا خاصا جلوس بن جائے گا۔ دوسری ہیروئنیں پہلے ہی ایک دوسرے کو بتاتی رہتی ہیں کہ اس عورت نے بھی پتا نہیں کیا کیا چکر پالے ہوئے ہیں تبھی تو اسے اپنی جان کا ہر وقت اتنا خطرہ لگا رہتا ہے۔"

پھر وہ اودن کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی "ان میں سے ایک آدھ نے تو مجھے اسمگلروں کی کسی بین الاقوامی سینڈیکیٹ کی آلۂ کار وغیرہ بھی مشہور کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تو شکر ہے' کچھ تمہاری وجہ سے اور کچھ میری اپنی وجہ سے میرے پریس والوں سے تعلقات بہت اچھے ہیں ورنہ انہوں نے تو اس قسم کی باتیں پریس والوں کے کان میں بھی پھونکنے کی کوششیں کی تھیں۔ مجھے سب خبریں ملتی رہتی ہیں۔"

"لیکن میرے آدمیوں کی موجودگی کا تو کسی کو احساس نہیں ہوا ہو گا۔ وہ تو کسی قسم کی وردی میں نہیں ہوتے اور دور رہ کر نگرانی کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں... اب تک تو شاید احساس نہ ہوا ہو۔" وہ بے یقینی سے بولی "لیکن دو سے چار ہو جائیں گے اور آس پاس منڈلاتے رہیں گے تو ضرور احساس ہو جائے گا۔ تاڑنے والے قیامت رکھتے ہیں۔ خصوصاً فلم انڈسٹری والے تو کچھ زیادہ ہی تیار رکھتے ہیں۔"

میں متذبذب اور خاموش رہا تو وہ بولی "مجھے تمہارا مشورہ زیادہ پسند آیا ہے کہ ہمیں اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چاہیے۔ دو میرے گارڈ ہوتے ہیں دو تمہارے آدمی ہو۔ بس اتنا ہی انتظام کافی ہے' جو ہو گا دیکھا جائے گا۔"

"اپنی ذات کے لیے تو میں اسی نظریے کا قائل ہ میری وجہ سے دوسروں کو جو نقصان پہنچ رہا ہے اس کی تکلیف ہو رہی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ا روکوں۔"

"اور مجھے تمہاری فکر ہے۔ میں چاہتی ہوں مجھے ج ہے ہو جائے۔ اگر یہ قربانی دے کر تمہاری جان سے خطرہ مجھے یہ سودا منظور ہے۔"

"مت کرو ایسی فضول باتیں۔" میں نے اسے ڈانٹا جیبی ٹیلی فون انڈیکس میں ایک فون نمبر تلاش کرنے لگا۔

خفیہ ایجنسیوں سے میٹنگ کے دوران طے پایا ت صرف ایک ایجنسی کے سربراہ نفیس صاحب سے رابطہ رک بات بھی بتانی ہو گی' انہیں ہی بتاؤں گا' جو کچھ بھی پوچھنا سے پوچھوں گا۔ باقی دونوں ایجنسیوں سے وہ کس حد تک حاصل کریں گے اور اس سلسلے میں ان کا طریقۂ کار کیا ہو گا آپس کا معاملہ تھا۔ انہیں اس میٹنگ کے بعد آپس میں کرنا تھیں' مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان میں سے کوئی میٹنگ یا نہیں' اور اگر ہوئی تھی تو اس میں کیا طے پایا تھا۔

میں نفیس صاحب کا دیا ہوا نمبر ڈائل کرتے ہوئے تھا۔ وہ بڑے آدمی تھے۔ ملک کی چند انتہائی اہم شخصیتوں ایک تھے۔ میں سوچ رہا تھا' معلوم نہیں ابھی وہ سو کر بھی ا یا نہیں۔ ان کا اصل آفس اور گھر اسلام آباد میں تھا لیکن لاہور میں بھی تھا اور آج کل کسی وجہ سے وہ لاہور میں تھے۔

چند لمحے کے تذبذب کے بعد آخر کار میں نے نمبر ڈا جلد ہی ان سے رابطہ قائم ہو گیا۔ آواز سے اندازہ ہو رہا بالکل چاق و چوبند تھے۔ تاہم لہجے میں وہی سرد مہری تھی' شخصیت کا خاصہ معلوم ہوتی تھی۔ میں چشم تصور سے ان رہا تھا۔ سرخ و سپید لیکن سوکھا اور سُتا ہوا سا چہرہ' طوطے جیسی ناک اور شفاف نیلی آنکھیں۔ بے حد دبلے پتلے تھے کی شخصیت سے رعب و داب اور سفاکی عیاں تھی۔

"مبارک ہو نفیس صاحب!" میں نے کہا اور کوش میرے لہجے سے طنز نہ چھلکنے پائے۔ ان جیسے آدمی کا میرے حق میں اچھا نہیں تھا۔

"کس بات کی؟" انہوں نے سرد لہجے میں دریافت کیا۔

میں نے آپ کو ریڈ ڈاٹ کی جو کہانی سنائی تھی آپ کو اس پر ن نہیں آ رہا تھا۔ اس کا کم از کم ایک مبہم سا ثبوت تو سامنے یا ہے۔ میں نے ان کی ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آپ ں کو اس کے بارے میں بتایا' اس جرم میں انہوں نے میرے ب خانے کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا ہے۔"

"مجھے معلوم ہو چکا ہے۔" وہ اطمینان سے بولے "میں آپ ، فون کا انتظار ہی کر رہا تھا مسٹر چوہدری! آپ نے اس واقعے کے ے میں ابھی پریس والوں سے کوئی بات تو نہیں کی؟ کوئی بیان ہو تو جاری نہیں کیا؟"

مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ انہیں میرے مکان کی تباہی کا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ میری طرف سے غافل نہیں تھے۔ ن اس واقعے پر ان کے لہجے میں تاسف یا ہمدردی کی کوئی جھلک ں تھی۔ انہوں نے اظہارِ افسوس کے لیے دو لفظ تک کہنے کی ت نہیں کی تھی۔ انہیں شاید صرف یہ فکر تھی کہ میں نے پریس وں کو اصل بات تو نہیں بتا دی۔

میں نے اپنے دل میں ابھرنے والی تلخی کو دباتے ہوئے کہا "جی ں پریس والوں سے ابھی میری ملاقات ہی نہیں ہو سکی۔ ویسے ا میں کوئی سیاسی لیڈر تو ہوں نہیں کہ میرے مکان کی تباہی ان ، لیے بہت بڑا واقعہ ہو۔"

"آپ پریس والوں سے اس سلسلے میں کوئی بات کیجئے گا بھی ں۔ ان سے ملنے یا کوئی بیان دینے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم چکا ہے' پولیس کے سامنے آپ اس سلسلے میں لاعلمی ظاہر کر چکے ہ۔ پولیس کی ایف آئی آر کی مدد سے پریس والے جو خبر بنانا ہیں گے' بنا لیں گے۔"

غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں بھی ہلکی سی سرد مہری در آئی۔ یں نے عرض کیا نا کہ میں کوئی سیاسی لیڈر نہیں ہوں کہ اس قعے سے شہرت حاصل کرنے کے لیے فوراً میدان میں کود پڑوں ریان پر بیان جاری کرنے لگوں۔ میں تو پہلے بھی پس منظر میں رہا ں اور اب بھی پس منظر میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔ میں تو آپ سے رف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ کو میری کہانی پر اب بھی کچھ یقین یا نہیں؟"

"اس بات کو ابھی آپ چھوڑ دیجئے مسٹر چوہدری! ہم اس سلے میں جو مناسب سمجھیں گے' کریں گے۔" وہ خشک لہجے میں لے "یہ بتائیے کہ اس وقت آپ کہاں ہیں؟"

"ایک دوست کے گھر۔" میں نے جواب دیا۔

"دوست کا نام و پتا؟" انہوں نے بلا تامل دریافت کیا۔

میں ایک لمحے کے لیے بالکل خاموش رہا۔ میری کنپٹیوں میں سرسراہٹ سی ہونے لگی تھی۔ میں نے خشک لہجے میں کہا "گستاخی معاف نفیس صاحب! اس وقت میں آپ کو کسی تھانے کا ایس ایچ

او' اور خود کو زیرِ تفتیش ملزم محسوس کر رہا ہوں۔ آپ ویسے ہی مجھے پکڑ کر حساس خفیہ ایجنسیوں کو مس گائیڈ کرنے کے جرم میں جیل میں کیوں نہیں ڈال دیتے؟"

"یہ بات نہیں مسٹر چوہدری!" ان کے لہجے میں نہایت خفیف سی تبدیلی آئی' بہت ہی معمولی حد تک نرمی کے آثار پیدا ہوئے' "آپ کو نہیں معلوم کہ ہمارے سامنے کتنی بڑی بساط بچھی ہوئی ہے اور کہاں کہاں ہم کیا کیا کھیل دیکھ رہے ہیں۔ کس کس معاملے کو ہمیں کنٹرول کرنا ہوتا ہے' کہاں کہاں ہمارے لیے جال بچھے ہوتے ہیں' ان سب چیزوں کے درمیان آپ ایک نئی کہانی لے کر آئے ہیں۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ کہاں فٹ ہوتی ہے اور کہاں کہاں اس زنجیر کی کڑیاں پائی جاتی ہیں۔ ہمارے وسائل بہت کم ہیں اور ہم پر ملکی و بین الاقوامی سازشوں کا بوجھ بہت زیادہ ہے۔ اس کے باوجود ہم اپنے وسائل کے مطابق ہر معاملے کو ہر پہلو سے چھاننے پھٹکنے کی کوشش کرتے ہیں' اگر آپ سچے ہیں تو آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"میرا خیال اس سے ذرا مختلف ہے۔" میں نے کہا "میں سوچ رہا ہوں' چونکہ میں سچا ہوں اس لیے مجھے زیادہ سے زیادہ پریشان ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"اگر آپ کو کوئی پریشانی ہوئی بھی تو وہ عارضی ہو گی مسٹر چوہدری!" نفیس صاحب کے لہجے میں ایک بار پھر پہلے ہی جتنی سرد مہری آ گئی "آخری فتح بہرحال سچ ہی کی ہوتی ہے۔"

"یہ تو میرا بھی ایمان ہے۔" میں نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "دیکھنا صرف یہ ہے کہ آپ جیسے مہربانوں سے واسطہ پڑنے کے بعد سچ کی کہاں تک دُرگت بنتی ہے۔ ابھی تو صرف میرا ڈیڑھ کروڑ کا مکان اور اس میں موجود نو دس انسان خاک و خون کے انبار میں تبدیل ہوئے ہیں۔ آگے آگے دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔

ابھی تو آپ کی گفتگو صرف اس موڑ پر آئی ہے کہ "اگر آپ سچے ہیں" جب آپ کے منہ سے میرے لیے یہ الفاظ نکلیں گے "آپ واقعی سچے تھے مسٹر چوہدری!" اس وقت تک قبر میں غالباً میری ہڈیاں بھی گل چکی ہوں گی۔"

"آپ جوان آدمی ہیں جذباتی باتیں کرتے ہیں مسٹر چوہدری!" وہ سپاٹ لہجے میں بولے "ہمارے کام میں جذبات کا کوئی دخل نہیں۔ ہم کبھی جذبات کے ہاتھوں مس گائیڈ ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔ آپ نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"کون سا سوال؟ میں تو آپ کے جواب سن کر سوال بھول گیا ہوں۔"

"یہی کہ آپ اس وقت کس دوست کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟"

"آپ کے لیے تو شاید اس کا نام زیادہ شناسا نہ ہو۔ ویسے وہ اس ملک کی جانی پہچانی شخصیت ہے ستارہ نام ہے سپر اسٹارز میں شمار ہوتا ہے اس کا۔" میں نے جواب دیا۔

"او یس۔ غالباً فلم سے تعلق ہے ان کا۔" وہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے۔

"آپ ٹھیک سمجھے۔" میں نے ہلکے سے استہزائیہ لہجے میں کہا۔

انہوں نے میرے لہجے پر کوئی توجہ نہ دی اور پُرخیال انداز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولے "ٹھیک ہے مسٹر چوہدری! میں کوشش کروں گا کہ آپ جہاں بھی رہیں، مجھے اس بارے میں اطلاع ملتی رہے۔ لیکن آپ کے حق میں بہتر یہی ہے کہ آپ خود بھی مجھ سے رابطہ رکھیں اور اپنی نقل و حرکت کے بارے میں مستقل مجھے آگاہ کرتے رہیں۔"

"بہت بہتر سر! بستہ (ب) کا یہ بدمعاش آپ کو اپنی تمام مصروفیات سے آگاہ کرتا رہے گا۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ میرے لہجے میں جو زہر تھا اس کا تھوڑا بہت اثر شاید ان تک پہنچا۔ وہ تنبیہہ کے سے انداز میں بولے "نو جوکس مسٹر چوہدری!"

میں نے انگریزی میں ہی جواب دیا "یہ مذاق نہیں سر! المیہ ہے لیکن عجیب بات ہے کہ انسان کو اپنے علاوہ باقی سب کے المیے مذاق نظر آتے ہیں۔"

"آپ بہت اُلجھے ہوئے آدمی ہیں مسٹر چوہدری! کبھی کبھی آپ کی ذات میں تھوڑی سی پُراسراریت جھلکنے لگتی ہے اور کبھی آپ فلسفی معلوم ہونے لگتے ہیں۔ میں آپ کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولے۔

"سر! اگر آپ مجھے ہی نہیں سمجھ سکے تو پھر ریڈ ڈاٹ کو کیا سمجھ سکیں گے۔" میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"ریڈ ڈاٹ تو جب ہمارے سامنے آئے گی تو دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو ہمارے لیے آپ ہی اہم ہیں۔" وہ گویا کچھ سوچتے ہوئے بولے "میں نے آپ کی فائل کھلوا دی ہے۔ بہت ابتدا سے آپ کی فائل تیار کی جائے گی۔ پہلے ہم آپ کے بارے میں تمام باتیں جاننا اور کھنگالنا چاہتے ہیں کہ آپ کون ہیں، کس طرح سامنے آئے ہیں اور کس طرح نمایاں حیثیت اختیار کی ہے۔ ہمارے لیے یہ بے حد ضروری ہے۔"

"بہت خوب، بہت خوب نفیس صاحب!" اب تو واقعی میری کنپٹیاں تپنے لگیں "اسے کہتے ہیں نماز بخشوانے جانا اور روزے گلے پڑ جانا۔ میں تو حب الوطنی کے نشے میں کچھ زیادہ ہی سرشار ہو کر آپ کو ایک بھیانک خطرے سے خبردار کرنے کے لیے آیا تھا۔ اس سلسلے میں تو ابھی آپ نے اور شاید دوسری ایجنسیوں نے بھی انگلی تک نہیں ہلائی لیکن میری فائل کھولنے میں قابل رشک پھرتی دکھائی ہے۔ میں آپ کو اس عظیم کارنامے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ واقعی یہ ایک ایسا عظیم کام ہے جو بہت بڑی ایجنسی ہی انجام دے سکتی تھی۔ یہ کسی چھوٹے ادارے کے بس کی بات نہیں تھی۔"

"زیادہ طنزیہ لہجہ اختیار کرنے کی ضرورت نہیں مسٹر چوہدری!" نفیس صاحب سرد لہجے میں بولے "ہم اپنے کام کو سمجھتے ہیں۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے، کون سا کام کہاں سے شروع کرنا ہے۔ ہمارے ہاں کسی خفیہ ادارے میں کسی فائل کے کھلنے کا تصور بڑا عجیب ہے اسے بڑی معیوب بات سمجھا جاتا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ یہ کوئی معیوب بات نہیں۔ بس چلے تو میں اس ملک کے ہر شہری کی فائل تیار کراؤں اور ایک بڑے سینٹر میں اس سارے ریکارڈ کو کمپیوٹرائز کراؤں۔ آپ کسی کے بارے میں کچھ بھی جاننا چاہیں تو ایک بٹن دبائیں اور وہ سامنے آ جائے۔ اس طرح ملک کا نظام چلانے میں اتنی آسانی ہو جائے کہ آپ تصور نہیں کر سکتے۔"

"جو کرنے کے کام ہیں پہلے وہ تو کیجئے نفیس صاحب!" میں نے تلخ سی ہنسی کے ساتھ کہا "یہاں تو قوم کو بربادی کے گڑھے میں دھکیل کر چلے جانے والوں کا پورا ریکارڈ نہیں ملتا۔ ڈاکو کے دھوکے میں کسی اور کو پولیس مقابلے میں ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ بعض اوقات خانہ پُری کے لیے اور افسرانِ بالا کی خوشنودی کے لیے "ہول سیل" کے حساب سے پولیس مقابلوں میں نامعلوم لوگوں کو مروا دیا جاتا ہے۔ پہلے جو اندھیر مچا ہوا ہے اس میں اصلاح تو کر لیجئے، ریکارڈ کو بعد میں کمپیوٹرائز کرتے رہیے گا۔"

"یہ سب اسی لیے تو ہے کہ ہمارے ہاں ریکارڈ درست رکھنے کا کوئی نظام نہیں ہے۔" وہ زور دے کر بولے۔

"جی نہیں، میرے خیال میں تو یہ اس لیے ہے کہ ہمارے ہاں کردار درست رکھنے کا کوئی نظام نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہمارے ہاں آ کر تو کمپیوٹر بھی جھوٹ بولنے لگیں گے۔ کیونکہ کمپیوٹر ازخود تو نہیں چلتے، انہیں بھی انسان ہی چلاتے ہیں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "ویسے میرے بارے میں تو آپ نے ناحق ہی تکلیف کی۔ میری فائل تیار کرنے میں کتنے ہی لوگوں کا وقت اور انرجی برباد ہو گی۔ آپ مجھے حکم دیتے، میں خود اپنے یوم پیدائش سے لے کر اب تک کی تمام تفصیلات لے کر خود حاضرِ خدمت ہو جاتا۔"

پہلی بار میں نے ان کی دھیمی سی ہنسی سُنی لیکن حیرت کی بات تھی کہ جب وہ بولے تو ان کے لہجے کی سردمہری میں کوئی کمی نہیں آئی تھی "اپنے بارے میں بتاتے تو سبھی بہت کچھ ہیں مسٹر چوہدری! سیاسی لیڈر بھی لاکھوں کے مجمع کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے بارے میں بہت کچھ بتاتے ہیں۔ لیکن جو ہم معلوم کرتے ہیں وہ عموماً بہت مختلف ہوتا ہے۔"

"میں کوئی بات دل میں نہیں رکھتا نفیس صاحب!" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "اس وقت میں واقعی سنجیدگی سے سوچ رہا ہوں کہ میں نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو اتنے لمبے چکروں میں پھنسایا، اتنے اہم اداروں کو بھی تکلیف دی اور ان کا وقت ضائع کیا۔ اس سے تو بہتر تھا کہ میں ریڈ ڈاٹ کی پیشکش قبول کر لیتا۔"

"ہماری طرف سے آپ کو اب بھی اجازت ہے، آپ چاہیں تو ان کی پیشکش قبول کر لیں۔ شاید اسی طرح ہمیں ان تک پہنچنے کا موقع مل جائے۔" وہ بولے۔

ان کی بات میں وزن تھا لیکن میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب تو وقت ہاتھ سے نکل گیا۔ اب تو میں ان کے زیرِ عتاب آ چکا ہوں۔ اب تو وہ میرے اقرار پر صرف ہنسیں گے۔ میں واقعی خلوصِ دل سے بھی ان کے حکم کا غلام بننا چاہوں تو وہ مجھے اس کا موقع نہیں دیں گے۔ اعتبار جو اٹھ چکا ہے۔ ہر سودا طے پانے کا ایک وقت ہوتا ہے۔ یہ سودا طے پانے کا وقت گزر چکا ہے۔ اس وقت مجھے صرف دُم کی کمی محسوس ہو رہی ہے ورنہ میں مکمل طور پر اپنے آپ کو دھوبی کا کتا محسوس کرتا، جو نہ گھر کا ہوتا ہے نہ گھاٹ کا۔"

اس بار نفیس صاحب بولے تو ان کا لہجہ خاصا بدلا ہوا تھا۔ نہایت ملائمت سے وہ سرگوشی کے سے انداز میں بولے "آپ کو اتنا بھی بددِل ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر چوہدری! آپ دراصل اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہماری ذمّے داریاں کتنی نازک ہیں۔ ہمیں ہر چیز کو نہایت غیر جانبدار، نہایت غیر جذباتی بلکہ کافی حد تک سفاک ہو کر دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ مت سمجھیں کہ ہم نے صرف آپ پر ہی نظر رکھ لی ہے اور آپ کی سنائی ہوئی کہانی کی طرف سے بالکل ہی آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے ہیں۔ ہم نے کچھ مشکوک غیر ملکیوں کی نگرانی شروع کی ہے، امید ہے جلد ہی کوئی نہ کوئی سراغ سامنے آئے گا۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے سر؟" میں نے ان کے بدلے ہوئے اندازِ گفتگو سے قدرے اطمینان محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"بس اپنے طور پر کوئی بڑا قدم مت اٹھائیں۔ ہمیں اپنی نقل و حرکت سے مطلع رکھیں اور اگر آپ زیادہ خطرہ محسوس کر رہے ہوں تو ہم آپ کی حفاظت کے لیے کچھ آدمی تعینات کر سکتے ہیں۔" انہوں نے جواب دیا۔

"بہت شکریہ سر! اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے نرمی سے کہا "میں ابھی آزادانہ طور پر حرکت میں رہنا چاہتا ہوں۔ آدمی میرے گرد گھیرا ڈالے رکھیں گے تو میں اپنے آپ کو بندھا بندھا سا محسوس کروں گا۔ میں کسی ایک جگہ قلعہ بند یا ساکت ہو کر بیٹھنا نہیں چاہتا۔ ایسی صورتِ حال میرے لیے موت سے بدتر ہو گی۔ حفاظت کا معاملہ میں نے اس پر چھوڑ دیا ہے جو سب سے بہتر حفاظت کرنے والا ہے۔"

میں نے ان کے جواب کا انتظار کیے بغیر سلسلہ منقطع کر دیا۔ میرے دل میں تلخی کم ضرور ہوئی تھی لیکن ختم نہیں ہوئی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ میری نگرانی کے لیے خفیہ ایجنسیوں کے کچھ لوگ میرے پیچھے ضرور لگیں گے اور یہ چیز میرے لیے مزید الجھن کا باعث ہو گی۔ میرے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ کون خفیہ ایجنسیوں کا آدمی ہے اور کون ریڈ ڈاٹ کا؟ اگر کسی بھی صورتِ حال میں میرے یا میرے آدمیوں کے ہاتھوں کسی غلط فہمی میں خفیہ ایجنسی کا کوئی آدمی مارا جاتا تو میرے لیے بڑا مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔

ستارہ نے ناشتا میرے سامنے سجا دیا تھا اور خود بھی سامنے بیٹھ

کر ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں اپنے تفکرات کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا تو وہ سادگی سے بولی "میں تمہیں نظر بھی آرہی ہوں یا نہیں؟"

میں نے آنکھیں سکیڑ کر انتہائی کمزور نظر والے کسی شخص کی طرح اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ہاں کوئی دُھندلی دُھندلی' بے ہنگم سی چیز نظر تو آرہی ہے۔"

"اس دُھندلی اور بے ہنگم چیز کے ہاتھوں ضائع مت ہو جانا۔ اس سے پہلے کہ میں انڈا تمہارے منہ پر اور کوئی ڈنڈا تمہاری کھوپڑی پر دے ماروں' تم ناشتا کرلو۔ میں نے اتنی محنت سے تیار کیا ہے اور تم نے پتا نہیں کس بے کار آدمی سے باتیں کرتے کرتے ٹھنڈا کردیا۔" وہ پلیٹیں میری طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔

"کاش تمہیں معلوم ہوتا کہ تم کسے بیکار آدمی کہہ رہی ہو۔ اس عہدے پر جو شخص فائز ہوتا ہے وہ ان چند ستونوں میں سے ایک ہوتا ہے جن پر حکومت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور ناشتے پر پل پڑا۔

"تم ان ستونوں کی فکر چھوڑو جن پر حکومتیں کھڑی ہوتی ہیں۔ تم ان ٹانگوں کی فکر کرو جن پر تم کھڑے ہوتے ہو۔ ناشتا وغیرہ کرتے رہو گے تو ان ٹانگوں میں جان رہے گی ورنہ یہ تمہارا وزن نہیں سہار سکیں گی۔" وہ خود بھی ناشتا شروع کرتے ہوئے بولی۔

چند لمحے خاموشی سے کھاتے رہنے کے بعد میں نے کہا "میں دونوں طرف سے مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔" میں سنجیدگی سے ستارہ سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اسے صورتِ حال مزید بہتر طور پر سمجھانا چاہتا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اب سنجیدگی سے بات کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس نے اس مسئلے کو ذہن کے کسی اور ہی خانے میں دھکیل دیا تھا۔

اطمینان سے مُنہ چلاتے ہوئے بولی "ابھی صرف دونوں طرف سے مصیبت میں پھنسے ہو؟ اب تک تو تمہیں چاروں طرف سے بلکہ آٹھوں طرف سے پھنس جانا چاہیے تھا۔"

"ستارہ! میں سنجیدہ ہوں۔" میں نے اسے گھورا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "یہی تو مصیبت ہے' جب ہمارا سنجیدہ ہونے کو جی نہیں چاہتا تو تم سنجیدہ بلکہ رنجیدہ ہونے لگتے ہو۔"

"تمہیں شاید اندازہ نہیں ہوا کہ نفیس صاحب سے میری کیا گفتگو ہو رہی تھی۔ یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ نفیس صاحب کون ہیں۔" میں نے کہا۔

"مجھے کافی حد تک اندازہ ہو گیا ہے۔" وہ قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "میرے کان ادھر ہی لگے ہوئے تھے لیکن میں فی الحال سنجیدہ ہونا نہیں چاہتی۔ سنجیدہ ہونے لگتی ہوں تو مجھے خوف آنے لگتا ہے۔" پھر یکدم ہی اس نے ہاتھ روکتے ہوئے پوچھا "اُئی! کہیں وہ اس گھر کو بھی دھماکے سے اڑا تو نہیں دیں گے؟" اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔

"بس ڈر گئیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کچھ دیر پہلے فون پر تو بڑی بڑکیں مار رہی تھیں۔"

"بھئی مجھے اس قسم کی موت سے بڑا خوف آتا ہے کہ انسان ملبے کے نیچے دبا سسک رہا ہو یا آدھا جسم دھماکے میں اُڑ گیا ہو اور آدھا پڑا تڑپ رہا ہو۔" وہ جھرجھری لے کر بولی "اگر کوئی مجھے مارنا ہی چاہتا ہے تو زیادہ سے زیادہ یہ کرلے کہ کھوپڑی میں یا عین دل کے مقام پر گولی مار دے۔ گولی بھی اس طرح نہ مارے کہ زیادہ دیر تک تڑپنا پڑے۔ میں نے سنا ہے' جسے پیٹ میں ایک آدھ گولی لگے اور فوری طبی امداد میسر نہ آئے' اس کی موت بڑے اذیت ناک طریقے سے واقع ہوتی ہے؟"

"مجھے مختلف طریقوں سے مرنے کا کچھ زیادہ تجربہ نہیں ہے اس لیے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "بس! مشورہ دے سکتا ہوں کہ تم ایک بینر ساتھ لے کر پھرا کرو جس پر موٹی سی سرخی ہو "قاتلوں کے لیے ہدایات" نیچے ترتیب وار ہدایات درج ہوں "براہِ کرم مجھے قتل کرنے کے لیے کوئی ظالمانہ طریقہ مت اختیار کیجیے۔ قتل ہی کرنا ہے تو پیار سے قتل کیجیے۔ گولی مارنی ہو تو براہِ کرم ذرا مہلک قسم کی ماریے۔ چوہے مار گولی مت استعمال کیجیے۔ دھیان رکھیے کہ گولی دل میں اترے اور کافی گہرائی تک اترے۔ بلکہ دل کے پار نکل جائے تو زیادہ مناسب ہے۔ گولی کو تیرِ نیم کش بنانے کی کوشش مت کیجیے۔ اگر دل پسند نہ آئے تو دماغ حاضر ہے۔ یقین کیجیے اس کھوپڑی میں بھوسا نہیں بھرا ہے' نہایت نفیس قسم کا دماغ موجود ہے' اس میں گولی اتاریے اور دُکھیارے کی دعائیں لیجیے۔"

وہ دھیرے دھیرے مُنہ چلاتی رہی اور مجھے گھورتی رہی' پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میں سنجیدہ ہوتی ہوں تو تمہاری رگِ ظرافت پھڑکنے لگتی ہے اور دیر تک پھڑکتی ہی چلی جاتی ہے۔ میں ویسے ہی ایک بات کر رہی تھی' تم نے مذاق ہی بنا لیا۔ ویسے تم بہت سنگدل ہو' زندگی کے انتہائی دردناک پہلوؤں میں بھی مذاق لاتے ہو۔"

"بس بس' اب رونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سنجیدہ ہو جاتا ہوں' پوچھو کیا پوچھنا ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"بس کچھ نہیں پوچھنا مجھے۔ بھاڑ میں جاؤ تم۔" وہ مصنوعی خفگی سے مُنہ پُھلا کر بولی۔

"بھئی تم اب ایسی باتیں پوچھتی ہوں جن کا جواب میں خواہ مخواہ میں بھی نہیں دے سکتا۔ ویسے میرے خیال میں تمہارے مکان کو دھماکے سے اُڑائے جانے کا امکان کم ہے۔ اتنی جلدی وہ ایک تجربے کو دُہرانے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ بہرحال اب بھی وقت ہے' تم کہو تو میں کچھ حفاظتی انتظامات کردیتا ہوں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"حفاظتی انتظامات تو تمہارے گھر پر بھی کافی موجود تھے۔" وہ بولی۔ اپنی مصنوعی خفگی کو وہ فوراً ہی بھول گئی تھی۔

"وہ انتظامات کسی اور نقطۂ نظر سے تھے۔ ہمارے ہاں حفاظتی انتظامات میں زیادہ زور اس بات پر ہوتا ہے کہ کوئی غیر متعلق شخص اندر نہ گھسنے پائے یا کوئی ٹولا چڑھائی نہ کرنے پائے۔ لیکن وہ لوگ سائنسی طور پر جتنے ترقی یافتہ ہیں' ان کے لیے اس قسم کا کوئی ہنگامہ کھڑا کیے بغیر کسی جگہ کو اڑا دینا کوئی مسئلہ نہیں۔ ممکن ہے اس کے لیے انہوں نے بلیک برڈ کو بھی استعمال کیا ہو۔ مکان کی تباہی کے بعد میں نے اسے قریب ہی موجود پایا تھا۔ وہ بدبخت صرف بول نہیں سکتا' ذہن اس کے پاس ایک مکمل انسان کا موجود ہے۔ اس کی طرف سے تم سخت ہوشیار رہنا۔ کہیں اس کی جھلک بھی نظر آجائے تو سمجھ لینا کہ کوئی سنگین خطرہ آس پاس ہی منڈلا رہا ہے۔ فوری طور پر جو بھی حفاظتی انتظامات کرسکو کرلینا۔"

وہ کافی انڈ یلتے ہوئے بولی "ناشتے کے بعد تم ذرا گھر کے اردگرد کا اور پچھلی گلی کا جائزہ تو لے لینا۔ ہوسکتا ہے کوئی مشکوک شکل منڈلاتی ہوئی نظر آجائے۔"

"وہ لوگ ایسے کچے کام نہیں کرتے۔" میں نے کہا "بہرحال تمہارے اطمینان کے لیے میں جائزہ لے لوں گا۔"

ناشتے کے بعد میں نے پورے گھر کا باریک بینی سے جائزہ لیا کہ کہیں کوئی پلاسٹک بم' کہیں کوئی مشکوک چیز تو موجود نہیں۔ لیکن کہیں کچھ نہ ملا۔ میں نے دونوں طرف لان پر بھی ہر باڑ ' ہر پودے کا جائزہ لیا۔ پچھلی گلی کا چکر لگایا۔ دیواروں تک کو چیک کیا۔ اس کام میں کافی دیر لگ گئی۔ اس دوران ملازم بھی اٹھ چکے تھے اور اپنے کاموں میں لگ گئے تھے۔ ستارہ شوٹنگ پر جانے کی تیاری کرنے لگی تھی۔

اس دوران اس کے دونوں گارڈز بھی آچکے تھے' جو صرف دن کی ڈیوٹی پر مامور تھے۔ کلف لگی نیلی وردی میں وہ دو ادھیڑ عمر' سرخ و سپید' مستعد سے افراد تھے جن کی گنیں پولیس والوں کی طرح کندھوں پر لٹکی ہوئی تھیں۔ ڈیزی نامی ایک کرسچن لڑکی بھی آگئی تھی جسے ستارہ نے آج کل سیکریٹری رکھا ہوا تھا۔ وہ تینوں باہر برآمدے میں بیٹھ کر چائے پینے اور ستارہ کے تیار ہونے کا انتظار کرنے لگے۔

میں اس دوران ٹیلی فون پر مصروف رہا۔ ستارہ تیار ہو کر آئی تو گُلابی کاٹن کے راجستھانی سوٹ میں بے حد پُرکشش لگ رہی تھی۔ میں نے اس کا سراپا جائزہ لیتے ہوئے کہا "بہت جچ رہی ہو اس لباس میں' جس علاقے کا لباس ہے اسی علاقے کی کوئی شہزادی دکھائی دے رہی ہو۔"

"شکریہ' شکریہ" وہ لکھنوی انداز میں آداب بجالاتے ہوئے بولی "غنیمت ہے کہ اس طرف بھی تمہاری نظر کام کر رہی ہے۔" اس نے راجستھانی کلچر کی نمائندگی کا پورا پورا اہتمام کیا ہوا تھا۔ چاندی کے موٹے موٹے بھاری بھاری زیورات بھی پہنے ہوئے تھے۔ میں بدستور اس کا غور سے جائزہ لیے جارہا تھا۔ وہ گویا وضاحت کرتے ہوئے بولی "آج دو شفٹوں میں میری جس فلم کی شوٹنگ ہے اس میں میرا کردار ایک راجستھانی سردار کی بیٹی کا ہے۔ پروڈکشن والوں نے عجیب سڑے سڑے سے ڈریسز تیار کرا رکھے ہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ ایک روز میں خود سین کی ڈیمانڈ کے مطابق تیار ہو کر آؤں گی' پھر شوٹ کیجیے گا۔ آپ کے گیٹ اپ سے بہتر رزلٹ آئے گا۔ میں نے اپنے شوق کے تحت یہ ڈریس اور زیورات بنوا رکھے تھے۔ میں نے سوچا' چلو آج اپنی ذاتی چیزیں شوٹنگ میں بھی استعمال کرلو۔"

پھر وہ گھوم کر لاؤنج کے دیوار گیر آئینے میں دیکھ کر اپنی لمبی اور موٹی سی چُٹیا درست کرتے ہوئے بولی "تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میں اب آفس کا ایک چکر لگاؤں گا۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے جواب دیا "شام کو میں نے ایک جگہ کچھ دوستوں کو جمع کیا ہے۔ بیٹھ کر کچھ دماغ لڑائیں گے۔ شاید کوئی کام کی بات سوجھ جائے۔ تم وہاں کا بھی فون نمبر رکھ لو۔ اگر کوئی ضرورت پڑ جائے تو تم فوراً مجھے فون کرسکتی ہو۔"

میں نے ایک کاغذ پر اسے ٹونی کا نمبر لکھ کر دیا۔ اس نے کاغذ بڑی نفاست سے تہ کرکے اپنی خوب صورت کڑھائی والی لمبی سی جیب میں رکھ لیا اور بولی "میں آج تقریباً سارا دن ایورشد میں ہی رہوں گی۔ میری آؤٹ ڈور ختم ہو چکی ہیں' اگر ہو سکے تو شام کو فارغ ہونے کے بعد ایک چکر لگا لینا۔ ذرا دل کو حوصلہ سا ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے' میں آجاؤں گا۔" میں نے اپنی متوقع مصروفیات کے بارے میں کوئی خاص غور کیے بغیر کہا۔

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی "انہوں نے مجھے دھمکی دی تھی کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر تمہیں گھر سے نکال دوں ورنہ میرا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ اس بات کو اب تین گھنٹے گزر چکے ہیں' ابھی تک تو خیریت ہی ہے۔"

"مطمئن رہو' خیریت ہی رہے گی۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"میرا تو خیال ہے کہ تم آج یہیں گھر پر ہی رہو' کہیں بھی مت جاؤ۔ جن لوگوں کو بھی بلانا ہے یہیں بلالو۔ میں بھی کوشش کروں گی کہ رات کو جلدی واپس آجاؤں۔ میں چاہتی ہوں ان کی ہدایات کی ذرا اچھی طرح ہی خلاف ورزی ہو۔"

"تم صرف یہ ظاہر کرنا چاہتی تھیں کہ تمہیں ان کی ہدایات یا ان کے الٹی میٹم کی پروا نہیں ہے۔ وہ تم نے ثابت کردیا۔ اب ہمیں خواہ مخواہ وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنا اپنا کام دھندا کرنا چاہیے۔ مجھے آج دفتر میں بھی بہت سے لوگوں سے ملاقاتیں کرنا ہوں گی۔ شام میں دوستوں کو یہاں جمع کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ وہ پروگرام طے ہو چکا ہے۔"

وہ لاؤنج کی گرل سے عقبی لان کی طرف دیکھتے ہوئے قدرے

چھکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "ویسے تو اس علاقے میں عموماً سناٹا ہی رہتا ہے لیکن آج سناٹا معمول سے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا ہے۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے ابھی عقبی دیوار سے بہت سے سیاہ پوش بھیانک قسم کی گنیں لیے، کود کر اندر آئیں گے اور ہم سب کو بھون کر رکھ دیں گے۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے اعتماد سے کہا اور اٹھ کر اس کے قریب جاکر حوصلہ بڑھانے کے لیے اس کے کندھے تھپتھپائے، "حقیقی زندگی اور مار دھاڑ سے بھرپور فلم میں کچھ فرق تو برقرار رہے گا۔"

"تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں۔" اس نے طویل سانس لے کر کہا اور گرمجوشی سے میرا ہاتھ دبا کر خدا حافظ کہتے ہوئے باہر کی طرف چل دی۔ میں اس کے ساتھ ہی تھا۔ برآمدے میں آکر میں نے دیکھا، ملازمہ اس کا خوب صورت سا لنچ کیریئر، پانی کا فلاسک اور گلاس وغیرہ گاڑی میں رکھ رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ دیگر اداکاروں اور اداکاراؤں کے برعکس پروڈکشن کی طرف سے کھانے وغیرہ منگوا کر نہیں کھاتی تھی، خواہ وہ کتنے ہی اچھے ریستوران یا کیٹرنگ سروس سے آتے۔ باہر کا پانی بھی وہ نہیں پیتی تھی اور نہ ہی اِدھر اُدھر کا کوئی برتن استعمال کرتی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ کسی زمانے میں اس نے خانہ بدوشی کی زندگی گزاری تھی۔

ایک گارڈ اور اس کی سیکریٹری پچھلی سیٹ پر اس کے ساتھ بیٹھی۔ ایک گارڈ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے مخصوص، دل کش انداز میں مسکراتے ہوئے ہاتھ ہلایا۔ چوکیدار نے گیٹ کھولا اور گاڑی باہر رینگ گئی۔ میں گیٹ تک آیا۔ میں نے دیکھا، گلی کے کونے پر ایک درخت تلے گاڑی میں میرے دو آدمی موجود تھے۔ ستارہ کی گاڑی نے موڑ کاٹا تو وہ گاڑی بھی اس کے تعاقب میں روانہ ہوگئی۔ اس احساس سے میں نے قدرے اطمینان محسوس کیا کہ میرے کوئی نہ کوئی دو آدمی ہر وقت ستارہ کے آس پاس موجود رہتے تھے۔

گیٹ بند ہونے کے بعد چند لمحے میں لان پر کھڑا اردگرد کا جائزہ لیتا رہا۔ گردوپیش پر بھی واقعی ایک عجیب، مضمحل سا سکوت طاری تھا اور دل کے آنگن میں بھی ایک افسردہ سا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ اس گھر کو ستارہ نے میرے لیے بالکل ایسا ہی بنا رکھا تھا جیسے یہ میرا اپنا ہی گھر ہو لیکن اب اس کے جانے کے بعد یہاں بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔

میرا گو کہ کچھ دیر آرام کا ارادہ تھا لیکن میں نے ارادہ ترک کردیا اور گاڑی نکال کر آفس کی طرف روانہ ہوگیا۔ سڑکوں پر اب ٹریفک رواں تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کوئی میرے تعاقب میں تھا یا نہیں۔ فضول اِدھر اُدھر چکرانے کی میں نے زحمت نہیں کی اور سیدھا آفس پہنچ گیا۔

آفس میں میرے مکان کی تباہی کی خبر پھیل چکی تھی، اسٹاف کے خاص خاص لوگوں کو سمجھانے اور تسلی دینے میں کچھ وقت لگ گیا۔ میں انہیں یہی یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ آفس میں کچھ سکون ہوا تو شناساؤں کے فون آنا شروع ہوگئے۔ خبر حالانکہ ابھی اخبارات میں نہیں آئی تھی لیکن نہ جانے کس طرح سب کو معلوم ہوگیا تھا۔

بہت دیر بعد ہلچل سی کچھ تھمی تو کام کی طرف دھیان دینے کی کوشش کی۔ اپنی اس عمارت کے گارڈز اور دو تین دوسرے آدمیوں کو میں نے علیحدگی میں بلا کر ہدایت کردی تھی کہ وہ معمول سے کچھ زیادہ مستعدی سے عمارت کی نگرانی کریں اور گردوپیش پر خصوصاً پارکنگ ایریا وغیرہ پر کڑی نظر رکھیں اور یہ کڑی نظر ایسی نہ ہو جیسے کہ حکومتیں عموماً ہر تھوڑے عرصے بعد اعلان کرتی ہیں کہ مجرموں اور شرپسندوں پر کڑی نظر رکھی جائے گی۔

تاہم وہ دن خیریت سے گزر گیا۔ کہیں سے کوئی بری خبر نہ آئی۔ ریڈ ذات نے گویا چپ سادھ لی تھی۔ شام کو میں ذرا جلدی آفس سے اٹھ گیا اور راحیلہ کے ہاں چلا گیا۔ آج میرا اسے باقاعدہ "دی سرکل" میں شامل کرنے کا ارادہ تھا۔ اس کے لیے ایک دوسری کار کا بھی بندوبست کیا جاچکا تھا جس کے خفیہ خانے میں مجھ سمیت دیگر تمام ساتھیوں سے رابطہ رکھنے کے لیے ریڈیو فٹ تھا۔

میں نے اس کے ہاں جاکر بیل بجائی تو اس نے خود ہی آکر گیٹ کھولا۔ سادہ سی سیاہ شلوار قمیص میں وہ شبنم سے نہائے ہوئے پھول کی طرح تروتازہ دکھائی دے رہی تھی۔ میں اندر پہنچا تو وہ میرا سراپا جائزہ لیتے ہوئے بولی "یہ شکل پر اتنی پھٹکار کیوں برس رہی ہے؟ قرض خواہوں سے مار کھا کر آرہے ہو کیا؟"

"ہاں، زندگی نے شاید کچھ قرض ایسا بھی چڑھا دیا ہے جس کی ادائیگی میرے بس کی بات نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اس کے ساتھ ڈرائنگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اوہو، یہ آج دیوداس کیوں بنے ہوئے ہو؟" پھر وہ خود ہی اپنی تشبیہ واپس لیتے ہوئے بولی "دیوداس کی اداسی تو بڑی رومانی اور فلسفیانہ قسم کی ہوتی تھی، تم تو اس دہقان کی طرح اداس نظر آرہے ہو جس کی اکلوتی بھینس کسی نے چرالی ہو۔"

"کاش میں ایسا کوئی دہقان ہی ہوتا! میری خوشیاں بھی چھوٹی چھوٹی ہوتیں اور غم بھی۔ میری کائنات ہی چھوٹی سی ہوتی۔ ایک محدود سی زندگی گزار کر میں چپکے سے مرجاتا۔ خواہ مخواہ اتنے بکھیڑے پالے میں نے۔ خواہ مخواہ نمایاں اور ممتاز ہونے کی کوشش کی۔" ڈرائنگ روم میں پہنچ کر میں نے صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا۔

کئی راتوں سے مجھے چند گھنٹے کے لیے بھی سکون سے سونا نصیب نہیں ہو رہا تھا۔ پے در پے اعصاب شکن واقعات کی یلغار تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھنے اور اپنے آہنی اعصاب کو پُرسکون رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔ پھر بھی خدوخال پر

اثرات تو جھلک ہی آئے تھے، کہیں نہ کہیں درماندگی کی چھاپ تو لگ ہی گئی تھی جسے اور کسی نے نہ سہی لیکن راحیلہ کی نظروں نے محسوس کرلیا تھا۔ میرے قریبی لوگوں میں صرف وہ اور طاہرہ خانم ابھی تک میرے مکان کی تباہی کے واقعے سے لاعلم تھیں۔ طاہرہ خانم کو تو خیر ابھی اطلاع ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ کسی کام کے سلسلے میں ملک سے باہر گئی ہوئی تھی اور چند دن کے لیے مسلسل سفر میں تھی۔

راحیلہ مجھے گھورتے ہوئے بولی "کیا بات ہے، آج تو ڈائیلاگ پر ڈائیلاگ مار رہے ہو۔ ٹھنڈی آہیں بھر بھر کر تم نے اس گھر میں برف باری کا سا سماں پیدا کردیا ہے۔ اندیشہ ہے کہ تمہارے غمناک تاثرات دیکھ کر درودیوار بھی دھاڑیں مار مار کر نہ رونے لگیں۔"

مجھے معلوم تھا کہ میرے چہرے پر اس قسم کے کوئی غمناک تاثرات نہیں تھے لیکن اس کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ میری روح تک میں جھانک لیتی تھی۔ آپ کو اندر سے جاننے والوں کا یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ آپ چہرے اور آنکھوں کی کھڑکیاں لاکھ بند کریں، وہ آپ کے دل کے آنگن کا ہر منظر دیکھ لیتے ہیں۔

میں نے کہا "پہلے تم میرے لیے نہایت ہوشربا قسم کی بلیک کافی بنواؤ جسے پی کر مجھ پر چودہ طبق روشن ہوجائیں اور دیر تک روشن ہی رہیں کیونکہ میں بہت دیر تک تمہیں بور کرنے کے ارادے سے آیا ہوں۔"

"میں خود بنا کر لاتی ہوں۔"

"نہیں، تم یہیں بیٹھو۔ ملازمہ سے کہہ دو۔ تم سے مجھے باتیں کرنی ہیں۔ وقت کم ہے اور باتیں زیادہ۔"

"اچھا...؟ میں تو آج تک یہی سنتی آئی تھی کہ وقت کم ہے اور مقابلہ سخت۔"

"مقابلہ تو خیر سخت ہی نہیں بلکہ جان لیوا بھی ہے۔ لیکن اس سے پہلے بات بھی تو سمجھ میں آنی چاہیے۔" میں نے کہا۔ وہ ملازمہ کو کافی کے لیے کہہ آئی تو میں نے اسے بھی شروع سے اب تک تمام حالات سے آگاہ کیا۔ وہ گویا سکتے میں آگئی۔

"کیا تم خوف زدہ ہو؟" میں نے اس کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"میں اپنے لیے نہیں، تمہارے لیے خوف زدہ ہوں۔" وہ گویا سنبھلتے ہوئے بولی "میری زندگی تو ویسے بھی اِک رائیگاں سفر ہے مجھے اس کی زیادہ پروا نہیں۔"

"اب تم نے غم ناک ڈائیلاگز کی مارا ماری شروع کردی۔" میں نے کہا "تمہاری زندگی چاہے رائیگاں سفر ہے یا بلا ٹکٹ سفر، مجھے یہ اپنی ہی زندگی جتنی عزیز ہے اور مجھے اس کے بارے میں اتنی مایوسی کی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ ہمیں جو کچھ بھی کرنا ہے، ایک دوسرے کے شانہ بہ شانہ رہ کر کرنا ہے۔ اب تم چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ باقی باتیں ٹونی کے گھر پر میٹنگ میں ہوں گی۔ یوں سمجھو کہ آج سے تم باقاعدہ "دی سرکل" میں شامل ہو چکی ہو۔"

"تیاری کیا کرنی ہے، یونہی چلتی ہوں وہ کون سا کوئی شادی کی تقریب ہے۔" وہ اپنے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "البتہ اجازت دو تو صرف گن ساتھ لے لوں؟"

"اجازت اور وہ بھی صرف گن کی؟" میں نے حیرت سے کہا، "بھئی میری طرف سے تو اب خواہ توپ کندھے پر رکھ کر چلو، مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

کچھ دیر بعد ہم ٹونی کے بنگلے پر جا پہنچے۔ راحیلہ کو میں اپنی ہی گاڑی میں لے گیا تھا۔ وہاں پہنچنے سے پہلے کافی دیر تک اِدھر اُدھر چکرانے کے دوران میں نے اطمینان کیا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کر رہا تھا۔ یہ بات بھی میرے لیے ابھی تک ایک معمّا بنی ہوئی تھی کہ اکثر و بیشتر کوئی بھی مجھے اپنا تعاقب کرتا نظر نہیں آیا تھا اور اگر کبھی میں نے کسی کو اپنا تعاقب کرتے ہوئے پایا بھی تھا تو وہ بعد میں ریڈ ذات کا نہیں بلکہ میرے کسی اور دشمن کا ساتھی ثابت ہوا تھا۔ صرف ابتدائی دنوں میں ریڈ ذات سے تعلق رکھنے والے کسی شخص نے یا پھر اے تن نے میرا تعاقب کیا تھا۔ اس کے باوجود آج تک ریڈ ذات والے زیادہ تر میری نقل و حرکت سے باخبر رہے تھے۔ یہ راز میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ شاید اسی لیے انہوں نے مجھے آزاد چھوڑا ہوا تھا کہ یہ پنچھی کہیں نہیں جاسکتا، جب چاہیں گے ہاتھ بڑھا کر دبوچ لیں گے۔

سب ساتھی ٹونی کے ہاں جمع ہو چکے تھے لیکن انہوں نے اپنی گاڑیاں ٹونی کے گھر کے آس پاس جمع نہیں ہونے دی تھیں تاکہ یہ تاثر پیدا نہ ہو کہ وہاں کسی قسم کا اجتماع ہو رہا تھا۔ وہ دو ساتھی بھی آ چکے تھے جو ستارہ کی نگرانی پر مامور تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے آنے تک ستارہ شوٹنگ میں ہی مصروف تھی۔ شوٹنگ گھسٹ گھسٹ کر ہو رہی تھی۔ بہ مشکل پندرہ منٹ شوٹنگ ہوتی تھی تو کسی نہ کسی وجہ سے گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کا بریک آ جاتا تھا جبکہ دوسرے دو سیٹوں پر بھی اس کا انتظار ہو رہا تھا۔ ان دونوں ساتھیوں کو میٹنگ سے فارغ ہو کر واپس اس کی نگرانی کے لیے پہنچنا تھا۔

شفیع شاہ بھی کراچی سے آ چکا تھا اور یوں اچانک ہنگامی انداز میں بلائے جانے پر قدرے متفکر بھی تھا لیکن چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دے رہا تھا۔ ٹونی کے گھر میں خاصا بڑا ایک ہال تھا۔ وہیں اس نے دو کھانے کی میزیں جوڑ کر اور ان کے گرد مزید کئی فاضل کرسیاں رکھ کر میٹنگ کا انتظام کیا تھا۔

دروازے وغیرہ بند کر کے اور باہر چوکیدار کو بنگلے کی چار دیواری میں گشت پر مامور کر کے ہم نے نہایت سنجیدگی سے ایک باقاعدہ اور باضابطہ قسم کی میٹنگ کا آغاز کیا حالانکہ مجھ سمیت درحقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ ہمیں اس میٹنگ میں کرنا کیا ہے؟

بہرحال سب سے ضروری کام تو ساتھیوں کو ریڈ ڈاٹ کے بارے میں آگاہ کرنا تھا کیونکہ ٹونی کے سوا کسی کو ابھی تک اس سلسلے میں مکمل معلومات ہی نہیں تھیں۔ چنانچہ میں نے پہلے تو اپنی جگہ بیٹھے ہی بیٹھے نیچی آواز میں سب سے خطاب کیا۔ ریڈ ڈاٹ کے بارے میں جو کچھ بھی مجھے معلوم تھا' جو جو واقعات اب تک پیش آئے تھے' ان سے انہیں آگاہ کیا۔ خطرہ گو کہ فی الحال تنہا میری ہی ذات کے لیے تھا لیکن میرے ساتھی چونکہ اپنے آپ کو مجھ سے الگ تصور نہیں کرتے تھے اس لیے جو بھی بات ہوتی تھی جمع ہی کے صیغے میں ہوتی تھی۔

آخر میں' میں نے کہا "دوستو! جب تک میں نے محسوس کیا کہ میں تنہا ان چکروں سے نمٹ سکتا ہوں' میں نے تم لوگوں کو اس خطرے سے خبردار کرنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ تم میں سے ہر ایک ویسے بھی اپنی اپنی جگہ کوئی نہ کوئی اہم ذمے داری سرانجام دے رہا ہے۔ میں تم میں سے کسی کو بھی ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے خود بھی ادراک نہیں تھا کہ ریڈ ڈاٹ درحقیقت کتنا بڑا خطرہ ہے۔"

جولی عرف مس ٹرپ بے تابی سے بولی "سر! خطرہ خواہ کیسا بھی ہو' ہم اس سے ٹکرانے کے لیے تیار ہیں۔ آپ صرف حکم دیں۔ آپ جہاں کہیں' وہاں ہم تباہی مچا دیں گے' لاشوں کے انبار لگا دیں گے۔"

شفیع شاہ نے سر اٹھا کر مس ٹرپ کو گھورا۔ شفیع شاہ کی آنکھیں ہلکی نیلی تھیں' وہ چھریرے جسم' تیکھے نقوش اور سرخ و سپید رنگت والا ایک باکمال نوجوان تھا۔ ٹونی اور وہ اگر بھائی نہیں تو کم از کم کزن ضرور دکھائی دیتے تھے گو کہ ان دونوں میں دور کا بھی رشتہ نہیں تھا۔

شفیع شاہ کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں کی تہ میں چنگاریاں سی سلگ رہی تھیں۔ ایک ٹک جولی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "مس ٹرپ! تم بہت حوصلے والی' بہت باصلاحیت' بہت کام کی عورت ہو لیکن کبھی کبھی باریک بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ تباہی مچانا اور لاشوں کے انبار لگانا کوئی مشکل کام نہیں ہے لیکن باس یہی تو بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ہمارے سامنے کوئی ٹارگٹ نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ تباہی کہاں مچائی جائے؟ کہاں لاشوں کے انبار لگائے جائیں؟"

مس ٹرپ کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی گہرائیوں میں تو ویسے ہی الاؤ دہکتے تھے۔ وہ شفیع شاہ کو خاکستر کر دینے والی نظروں سے گھورتے ہوئے بولی "تم باریک سے آدمی ہو' باریک باتیں تمہاری سمجھ میں زیادہ اچھی طرح آتی ہیں' ہم تو سیدھی سی بات جانتے ہیں' مارو یا مر جاؤ۔ اب کھیل شروع ہوا ہے تو ٹارگٹ بھی سامنے آ ہی جائے گا۔"

"پھر بھی ذرا خیال رکھنا کہ اپنے ہی وطن میں تباہی پھیلانا شروع نہ کر دینا۔ اپنے ہی ہم وطنوں کی لاشوں کے انبار نہ لگا دینا۔" شفیع شاہ نے تنبیہہ کی۔

"میں نابینا نہیں ہوں۔" مس ٹرپ نے واضح کیا "ویسے ہموطن اگر وطن فروش ہوں تو ان کی لاشوں کے انبار لگانے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں۔" پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "لیکن مجھے زیادہ ایکشن میں آنے کا موقع ہی کب ملتا ہے' باس نے تو مجھے بس دو نمبر کا چارج دے کر بٹھا دیا ہے۔"

"عورتیں گھروں میں ہی اچھی لگتی ہیں۔" شفیع شاہ بولا۔

اس پر صرف مس ٹرپ ہی نہیں' راحیلہ نے بھی کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔ مس ٹرپ کی خوب صورت آنکھوں میں تو خیر شعلے رقصاں تھے۔ میں نے ان دونوں کو باری باری گھورتے ہوئے کہا "ابھی دشمن کا سامنا ہوا نہیں اور تم لوگوں نے ایک دوسرے کی ٹانگ کھینچنا شروع کر دی۔ اس سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ تم لوگ دشمن سے کس عمدگی سے نمٹو گے۔"

ٹونی جو میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھا تھا' بزرگانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "سر! یہ پیار بھری نوک جھونک ہے۔ تمام ساتھیوں کو ایک جگہ جمع ہونے کا موقع بہت عرصے بعد ملا ہے' ہم سب فیملی کی طرح ہیں نا' دل کا غبار نکال رہے ہیں۔"

"مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ مجھے کیا معلوم نہیں۔ میں ہی تو اس فیملی کا سربراہ ہوں۔" پھر میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے نیچی آواز میں کہا "میں بھی تو انہیں پیار بھری ڈانٹ پلا رہا ہوں۔"

پھر میں نے بہ آواز بلند سنجیدگی سے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا "جیسا کہ میں نے تم لوگوں کو بتایا' میں نے ملک کی تین اہم ترین خفیہ ایجنسیوں سے میٹنگ کا بھی انتظام کیا اور اس طرح حکومت کو بالواسطہ طور پر اس ہولناک خطرے سے آگاہ کر کے میں نے اپنی ذمے داری پوری کر دی ہے لیکن اس کے جواب میں بھی مجھے خاصی مایوسی کا ہی سامنا کرنا پڑا ہے۔ ان لوگوں سے ہونے والی ساری گفتگو اور ساری کارروائی کی تفصیل میں نے تم لوگوں کو بتا دی ہے۔ ان سے کم از کم فی الحال تو کسی اچھی کارروائی' سرپرستی یا تعاون کی امید نظر نہیں آ رہی بلکہ الٹا وہ تو میری ہی فائل کھولنے پر تلے بیٹھے ہیں۔"

سردار شیخ بولا "گستاخی معاف سر! آپ کے ساتھ تو آ بیل مجھے مار' والا معاملہ ہوا ہے' آپ کو ان کے پاس جانے سے پہلے ہی یہ میٹنگ بلانی چاہیے تھی۔"

"ہو سکتا ہے تم لوگ بھی مجھے وہی کرنے کا مشورہ دیتے جو میں نے کیا ہے کیونکہ یہ مسئلہ ہم لوگوں کی ذات تک محدود نہیں رہا۔ اس کا ملک سے زیادہ تعلق نکل آیا ہے۔ بہرحال جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ اس کے جو بھی نتائج برآمد ہوں گے ان سے میں نمٹتا رہوں گا۔ اس میٹنگ کا سب سے بڑا مقصد صرف تمہیں ان حالات سے آگاہ کرنا تھا جن سے تم لوگوں کو آگاہ کرنا اب تک میں نے ضروری نہیں سمجھا تھا۔"

وہ سب مضطرب تھے' کچھ نہ کچھ کر گزرنے کے لیے بے چین تھے۔ لیکن یہ ایک مجبور اضطراب تھا۔ وہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھے کہ کریں تو کیا کریں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ریڈ ڈاٹ کے جن جن لوگوں سے بھی اب تک میرا سامنا ہوا ہے' ان کے حلیے' شکل و صورت سب کچھ میں نے تفصیلی طور پر بیان کر دی ہے۔ امید ہے تم لوگوں نے انہیں ذہن نشین کر لیا ہوگا۔ میں نے تمہیں اس خطرناک چمپینزی بلیک برڈ کے بارے میں بھی آگاہ کر دیا ہے۔ تم میں سے کسی کو بھی ان میں سے کسی کی جھلک نظر آئے تو تمہیں جان کی بازی لگا کر اسے قابو میں کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ یہ ممکن نہ ہو تو اس کا تعاقب کر کے یا کسی بھی اور طریقے سے اس کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہے۔ یہ بھی ممکن نہ ہو تو اسے ہلاک کر دینا ہے۔ صورت حال کے مطابق فیصلہ تمہیں خود کرنا ہوگا کہ کیا کرنا تمہارے بس میں ہے۔"

وہ سب ہمہ تن گوش تھے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "سب کو ترقی یافتہ ملکوں کی پولیس کے انداز میں ایک دوسرے سے رابطہ رکھنا ہے' ایک دوسرے کو حالات سے آگاہ رکھنا ہے۔ مجھے بھی جو نئی بات معلوم ہوگی تم لوگوں کو بتاتا رہوں گا۔ جس کسی کو بھی مدد کی ضرورت ہو وہ فوراً ٹیلی فون' ٹرانسیٹر یا کار کے ریڈیو کے ذریعے مدد طلب کرے اور جو بھی ساتھی اس کے قریب ترین موجود ہو وہ اس کی مدد کے لیے پہنچے۔ شفیع شاہ بھی اب کچھ عرصے کے لیے لاہور میں ہی موجود رہے گا۔"

راحیلہ سے بھی میں نے ان کا تعارف کرا دیا تھا اور وہ بھی راحیلہ کے بارے میں جان گئے تھے' سمجھ گئے تھے کہ وہ میری زندگی میں کیا مقام رکھتی ہے اور "دی سرکل" میں اس کی کیا حیثیت ہوگی۔

قدرے توقف سے میں نے کہا "عین ممکن ہے ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ مجھے کچھ عرصے کے لیے یا خاصی طویل مدت کے لیے روپوش ہونا پڑے......"

آفتاب نامی ایک پُرجوش ساتھی بول اٹھا "ہم ایسی نوبت نہیں آنے دیں گے سر!"

سب نے بیک وقت اسے گھورا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں تنبیہہ کر رہے ہوں کہ باس کو اپنی بات تو مکمل کر لینے دو' جوش و خروش تو ہمارے دلوں میں تم سے زیادہ بھرا ہے۔

میں نے ملائمت سے کہا "سردست ہمیں کسی قسم کا دعویٰ نہیں کرنا چاہیے۔ مجھ سمیت کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ ہمیں ہر بات کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ اگر مجھے روپوش ہونا پڑ ہی جائے اور تم لوگوں سے میرا واسطہ مکمل طور پر ٹوٹ جائے تو میری غیر حاضری میں بزنس اور "دی سرکل" کے تمام معاملات راحیلہ' ٹونی اور شفیع شاہ سنبھالیں گے۔ خصوصاً کراچی کے کاروبار میں شفیع شاہ قطعی خود مختار ہوگا اور لاہور میں بھی اگر اس کی مدد کی ضرورت ہوگی تو یہ ہر ممکن مدد کرے گا۔ لاہور کے کاروبار میں چیف ایگزیکٹو کی حیثیت راحیلہ کو حاصل ہوگی جبکہ ٹونی ہر طرح سے اس کی معاونت اور رہنمائی کرے گا۔ "دی سرکل" کے معاملات میں البتہ ٹونی کو سپریم حیثیت حاصل ہوگی اور راحیلہ اس کی معاونت کرے گی۔"

راحیلہ نے سر اٹھایا' شاید وہ اس ذمے داری سے انکار کرنا چاہتی تھی لیکن ماحول کا بوجھل پن اور میرا حتمی انداز دیکھ کر اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "ان تینوں کی حیثیت بورڈ آف ڈائریکٹرز کی سی ہوگی اور ان میں چیف ایگزیکٹو راحیلہ ہوگی۔ ویسے تو کاروبار میں میرا ایک بورڈ آف ڈائریکٹرز پہلے ہی موجود ہے لیکن ان کی حیثیت تقریباً نمائشی ہی ہے۔ ان کا بہت کم سرمایہ کاروبار میں لگا ہوا ہے اور انہیں گھر بیٹھے صرف کچھ منافع لیتے رہنے سے غرض ہے۔ مینجنگ ڈائریکٹر اس وقت میں ہوں لیکن میں اس طرح کی پاور آف اٹارنی تیار کرا دوں گا جو میری عدم موجودگی میں کارآمد ہوگی اور اس کے تحت مجھ جیسے اختیارات راحیلہ کو حاصل ہوں گے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تم سب کو اپنی اپنی جگہ ایک ضروری کام یہ کرنا ہے کہ غیر ملکیوں پر نظر رکھنی ہے۔ سیاحوں کو چھوڑ کر جو غیر ملکی مختلف حیثیتوں میں مختصر یا طویل مدتوں

کے لیے ہمارے ہاں مقیم ہیں' ان پر خصوصی نظر رکھنی ہے اور اگر کسی کی کوئی حرکت ذرا بھی مشکوک نظر آئے تو اس کی مستقل نگرانی شروع کر دینی ہے۔ اس ضمن میں ہر قابلِ ذکر بات سے دوسرے ساتھیوں کو خبردار رکھنا ہے۔"

پھر میں نے ٹونی کو مخاطب کیا "تمہیں بطورِ خاص سب سے زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کیونکہ تم میرے ساتھی کی حیثیت سے ریڈ ڈاٹ والوں کی نظر میں ہو۔"

ٹونی نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور نہایت ہی خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "ان کا بھی ایڈم عرف ایڈی' اے ٹن اور بلیک برڈ میری نظر میں ہیں۔"

"لیکن بہت ہوشیار رہنا' کوئی کچا قدم نہ اٹھانا۔" میں نے ہدایت کی "کیونکہ اب ان سے ہماری کھلی جنگ ہے پھر بھی کسی قسم کی عجلت یا بے صبری اور غیر ضروری جوش و خروش دکھانے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ ہماری حیثیت ان کے سامنے چیونٹی سے زیادہ نہیں۔ لیکن اگر ہم ان کے ناک میں دم کرنے کی تھوڑی بہت بھی امید رکھیں تو اس کے لیے ہمیں اپنے آپ کو نہایت پُرسکون اور اپنے اعصاب کو مضبوط رکھنا ہوگا۔ یہ صرف طاقت ہی کی نہیں' ذہن کی بھی جنگ ہوگی۔"

کچھ دیر اور اس طرح کے صلاح مشورے ہوتے رہے اور اندھیرا گہرا ہونے پر آخرکار میٹنگ ختم ہوگئی۔ ٹونی کے ملازم نے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ اس دوران بھی باتیں ہوتی رہیں اور باتوں باتوں میں ماحول کا بوجھل پن' سنجیدگی اور خطرات کا غیر شعوری احساس ختم ہو گیا۔ ہنسی مذاق اور نوک جھونک بھی ہونے لگی۔ آخرکار میٹنگ برخاست ہوگئی۔ سب رخصت ہو گئے۔ صرف میں' ٹونی' شفیع شاہ اور راحیلہ رہ گئے۔ میرا دو دلوں میں دل تھا۔ کبھی میں سوچتا کہ ٹونی کے ہاں قیام کرلوں اور کبھی سوچتا کہ راحیلہ کے ہاں چلا جاؤں۔

لیکن ان دونوں سے کہیں زیادہ اور کسی اور ہی طرح کی میری بے تکلفی ستارہ سے تھی۔ اس کے ہاں رہنے کی بات ہی کچھ اور تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ فی الحال قیام ستارہ ہی کے ہاں رکھا جائے۔ اگر واقعی ستارہ کے لیے خطرات کچھ بڑھ گئے تو پھر میں اس کا گھر چھوڑ دوں گا۔

ستارہ کی یاد آئی تو ساتھ ہی خیال آیا کہ اس کی خیروعافیت دریافت کرلی جائے۔ وہ صبح گویا بادل نخواستہ شوٹنگ پر روانہ ہوئی تھی۔ فون پر مجھ سے بات ہو جاتی تو اس کا حوصلہ کچھ بڑھ جاتا۔ دوسرے میں براہِ راست اس سے یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کب گھر واپس پہنچے گی۔

میں نے اپنے اسٹوڈیو والے آفس فون کیا۔ مجھے امید تھی کہ آفاق سے ستارہ کے بارے میں معلوم ہو جائے گا اور اگر وہ آس پاس ہی کسی فلور پر ہوئی تو وہ کسی کو بھیج کر اسے فون پر بھی بلوالے گا۔

دوسری طرف کئی گھنٹیاں بجنے پر بھی کسی نے فون نہ اٹھایا۔ مایوس ہو کر میں فون رکھنے ہی والا تھا کہ دوسری طرف ریسیور اٹھالیا گیا اور ہیلو کی قدرے مُرتعش سی آواز سنائی دی۔ وہ آفس ہی کا کوئی ملازم تھا۔ کسی شعبے میں اسسٹنٹ قسم کی چیز تھا۔ میں نے آفاق کا پوچھا تو وہ بولا "جی وہ تو آفس میں نہیں ہیں۔ بلکہ کوئی بھی نہیں ہے۔ میں بھی اتفاق سے ایک فون کرنے کے ارادے سے ہی واپس آیا تھا۔ آپ کون بول رہے ہیں؟"

میں نے اپنا نام بتایا تو وہ یکدم بوکھلائے ہوئے سے لہجے میں بولا "سر! آپ کہاں تھے؟ آفاق صاحب تو آپ کو فون کر کر کے پاگل ہو گئے۔ کہیں سے بھی آپ کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ آپ اس وقت کہاں ہیں۔" وہ تقریباً ہانپ رہا تھا۔

میں خود نہیں چاہتا تھا کسی کو اس بات کا علم ہو کہ میں اس وقت ٹونی کے ہاں موجود تھا۔ میں نے ملائمت سے پوچھا "آفاق کو کیا ضرورت آن پڑی تھی مجھے تلاش کرنے کی؟"

"سر! وہ آپ کو اطلاع دینی تھی۔ ستارہ بیگم کا انتقال ہوگیا۔" لڑکے کو گویا سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟" میرے لہجے کی ملائمت یکدم برہمی میں بدل گئی۔ لیکن میرا دل یک لخت ڈوب سا گیا تھا۔

"سر! میں مذاق نہیں کر رہا۔ میری یہ جرأت کہاں۔" لڑکا ہکلایا' "اس وقت یہاں کوئی بھی نہیں ہے ورنہ میں کسی اور سے تصدیق کرا دیتا۔ آفاق صاحب وہیں ہیں۔ انہوں نے سب سے پہلے آپ کو ہی اطلاع دینے کی کوشش کی تھی...."

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ دیر نہیں گزری سر!" لڑکا تیزی سے بولا "لاش ایورنیو میں میڈم کے ڈریسنگ روم میں ہی موجود ہے۔ پولیس کو اطلاع دے دی گئی ہے۔ آپ فوراً آجائیں سر! آفاق صاحب بھی آپ کو بلانا ہی چاہتے تھے۔"

"میں آرہا ہوں۔ میرے آنے سے پہلے لاش کسی کو اٹھانے مت دینا۔ پولیس کو بھی نہیں۔ لاش کو کسی نے چھیڑا تو نہیں؟"

"نہیں سر! جوں کی توں پڑی ہے۔" لڑکے نے جواب دیا اور میں نے فون بند کر دیا۔

ٹونی' شفیع شاہ اور راحیلہ تینوں ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے یقیناً میرے چہرے پر تغیر دیکھ لیا تھا اور گفتگو میں لفظ "لاش" بھی سن لیا تھا۔

"سر؟" ٹونی نے صرف اتنا کہا اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ستارہ مر گئی ہے۔" میں نے اپنے حلق میں اُمنڈ آنے والے آنسوؤں کی کڑواہٹ کو نگلتے ہوئے کہا۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں کہا تھا کہ اسے قتل کر دیا گیا ہے۔ ابھی تو میرا دل سرِدست یہ اس خبر کو سچ تسلیم کرنے کا حوصلہ ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ وہ مجھے یہی تسلی دینے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ جھوٹ ہوگا لیکن ذہن کہہ رہا تھا کہ کوئی مجھ سے اس طرح کا مذاق کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

ہال میں ایک لمحے کے لیے گہرا سکوت چھا گیا۔ صرف ٹونی اس حقیقت سے واقف تھا کہ ستارہ سے میرا کوئی خاص تعلق تھا۔ راحیلہ اور شفیع شاہ اس حقیقت سے آگاہ نہیں تھے اور وہ ستارہ سے واقف بھی نہیں تھے۔ غائبانہ طور پر بس ایک فلم ایکٹریس کی حیثیت سے اسے جانتے تھے۔

اس وقت میں بہت زیادہ ...... اندیشوں میں نہیں پڑ سکا۔ اس پہلو پر بھی غور نہیں کر سکا کہ مجھے اس موقع پر راحیلہ کو ساتھ نہیں لے جانا چاہیے تھا۔ میرے سنسناتے ذہن میں تو بس ایک ہی جملہ گونج رہا تھا "ستارہ بیگم کا انتقال ہو گیا ہے۔"

راحیلہ اور شفیع شاہ کے لیے بھی یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اس خبر نے میرے محسوسات کی دنیا کو تہ و بالا کر دیا تھا۔ میں نے راحیلہ کا ہاتھ تھام کر اٹھتے ہوئے کہا "تم میرے ساتھ آؤ۔" پھر میں نے شفیع شاہ اور ٹونی کو ہدایت کی "تم دونوں الگ گاڑی میں میرے پیچھے پیچھے آؤ۔ ایورنیو چلنا ہے' بہت زیادہ الرٹ رہنا۔"

انہوں نے مستعدی سے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ راحیلہ بادِ سُبک خرام کے سے جھونکے کی طرح خاموشی سے میرے ساتھ تھی۔ میری گاڑی آندھی طوفان کی طرح ایورنیو کی طرف روانہ ہوئی۔ ٹونی اپنی گاڑی میں' کچھ درمیانی فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے میرے پیچھے تھا' شفیع شاہ اس کے ساتھ تھا۔

ایورنیو میں داخل ہوتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہاں واقعی کوئی بڑا حادثہ رونما ہو چکا تھا۔ میں گاڑی پارکنگ لاٹ کے بجائے سیدھا وہیں لے گیا تھا جہاں سے دفاتر کی قطار شروع ہوتی تھی۔ بیشتر دفاتر کے دروازے کھلے تھے اور کچھ ویرانی کا سا سماں تھا۔ اِکا دُکا لوگ تیزی سے اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں ستونوں کے عقب میں کچھ لوگ دو دو تین تین کی ٹولیوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے تاہم اسٹوڈیو میں روز جیسی رونق نہیں تھی۔

جب ہم انہی دفاتر کے عقب میں پہنچے تو ہمیں سامنے کے حصے میں رونق کم ہونے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ غالباً وہاں کے بیشتر لوگ یہاں عقبی حصے میں جمع تھے۔ یہاں مختلف کمروں کی قطار کے درمیان ایک چھوٹے سے کمرے میں آج کل ستارہ کا ڈریسنگ روم تھا۔ اس کمرے کے سامنے اچھا خاصا ہجوم تھا۔

میں نے سرگوشی میں ٹونی اور شفیع شاہ کو ہدایت کی "تم دونوں یہیں رہنا اور ہجوم پر نظر رکھنا کوئی مشکوک چہرہ نظر آئے' کسی شخص کی کوئی حرکت مشکوک معلوم ہو تو اسے فوراً اٹھا لینا خصوصاً اگر کوئی ایسا شخص دکھائی دے جو چہرے مُہرے سے خالص پاکستانی معلوم نہ ہوتا ہو تو اس پر گہری نظر رکھنا۔"

انہوں نے سر کو خفیف سی جنبش دینے پر اکتفا کیا اور ٹہلنے کے سے انداز میں دو مختلف سمتوں میں بڑھ گئے۔ میں نے راحیلہ کا ہاتھ تھاما اور ہجوم کو چیرتا برآمدے سے گزر کر ڈریسنگ روم کے دروازے کی طرف بڑھا۔ پولیس پہنچ چکی تھی' دروازے پر ایک بندوق بردار سپاہی تعینات تھا۔

مجھے دیوانہ وار بڑھتے دیکھ کر اس نے بازو پھیلا کر روکنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "کون ہیں جی آپ؟ کیا بات ہے؟"

"شٹ اپ!" میں نے اس کا بازو جھٹک کر کمرے میں گھستے ہوئے کہا۔ وہ ایک نظر میرے چہرے کی طرف دیکھ کر سہم کر ایک طرف کو ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ راحیلہ میرے ساتھ تھی۔

وہ ایک مختصر سا کمرا تھا اور چند افراد کی موجودگی سے ہی کھچا کھچ بھرا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ان میں سے تین پولیس کی وردیوں میں تھے۔ ایک انسپکٹر تھا' ایک اے ایس آئی اور ایک شاید ہیڈ کانسٹیبل یا کچھ اور تھا۔ میرے وہ دونوں آدمی شاید ابھی واپس یہاں نہیں پہنچے تھے جو ستارہ کی نگرانی کے لیے تعینات تھے اور اسی کے آس پاس منڈلاتے رہتے تھے۔ میٹنگ میں شرکت کے بعد انہیں کچھ دیر کے لیے مس ٹرپ کے ساتھ دو نمبر جانا تھا اور وہاں سے اسٹوڈیو واپس آنا تھا شاید وہ ابھی دو نمبر پر ہی تھے یا راستے میں کہیں تھے۔

ستارہ کے باوردی گارڈز کو بھی کمرے سے نکال دیا گیا تھا۔ انہیں میں نے باہر کھڑے دیکھا تھا۔ آفاق اور دوسرے چند افراد کمرے میں موجود تھے جنہیں میں پہچانتا نہیں تھا صرف ایک چہرہ میرے لیے قدرے شناسا تھا' وہ فلمی ولن اکرم پرویز تھا۔

کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ بڑی سی ڈریسنگ ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ سفید فارمیکا کی اس سنگھار میز پر کئی لائٹس نصب تھیں اور اس وقت روشن تھیں۔ میز پر میک اپ کے سامان کے علاوہ چند پرفیومز بکھری ہوئی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ کاؤچ لگی ہوئی تھی۔ دو تین چھوٹی موٹی کرسیاں تھیں۔ ڈریسنگ ٹیبل پر کھانے کے برتن بھی پھیلے ہوئے تھے۔

کمرے میں موجود کوئی بھی شخص بیٹھا نہیں تھا۔ سب کھڑے تھے اور ڈریسنگ ٹیبل کے قریب کسی کی سفید شال سے ڈھکی ہوئی جو

چیز پڑی تھی وہ یقیناً ستارہ کی لاش تھی لیکن اس سے پہلے میری توجہ کسی اور چیز نے اپنی طرف مبذول کرائی تھی۔

ڈریسنگ ٹیبل کی بڑی دراز کے قریب فرش پر ایک لپ اسٹک کھلی پڑی تھی اور دراز کے سفید دروازے پر اسی لپ اسٹک سے ٹیڑھے میڑھے شکستہ سے الفاظ میں لکھا تھا "انی! مجھے بھول نہ جانا۔" الفاظ خود بتا رہے تھے کہ کسی دم توڑتے انسان نے بُری طرح کانپتے ہاتھوں سے انہیں بہ مشکل لکھا تھا۔ شاید اس وقت جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ موت نے اسے آن دبوچا ہے اور شاید اس وقت اس میں کسی کو مدد کے لیے پکارنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

سفید فارمیکا پر سرخ لپ اسٹک سے لکھے گئے ان الفاظ نے یکدم جیسے لہو میں ڈوبے ہاتھوں کا روپ دھار لیا اور میرے دل کو اپنی خاردار گرفت میں لے کر مسلنے لگے۔ کیا مرتے وقت ستارہ کو کوئی اور خیال نہیں آیا تھا؟ کیا وہ کچھ اور نہیں لکھ سکتی تھی؟ اسے میرے دل میں یہ تیر ہی ترازو کر کے جانا تھا؟

بدحواس آفاق جس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور عینک ناک کی نوک پر آئی ہوئی تھی مجھ پر نظر پڑتے ہی چلا اٹھا "چوہدری صاحب آ گئے چوہدری صاحب آ گئے۔"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اس نے کسی اہم ترین شخصیت کی آمد کا اعلان کر دیا ہو جس کے آتے ہی اس کے خیال میں تمام مسئلے حل ہو جانے تھے۔ میں نے ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹک انہی الفاظ کو تک رہی تھی۔ مجھ سے نظر ملتے ہی اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔

انسپکٹر نے خاصے مؤدبانہ انداز میں آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کی صورت میرے لیے اجنبی تھی لیکن شاید آفاق اس سے غائبانہ طور پر میرا کچھ زیادہ ہی متاثر کن تعارف کرا چکا تھا۔

"یہ کیسے ہوا؟" میں نے دریافت کیا اور محسوس کیا کہ میری آواز کچھ پھنسی پھنسی سی تھی۔ ستارہ کی لاش گو کہ سفید شال میں چھپی ہوئی تھی لیکن میں اس کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا۔

انسپکٹر کے سینے پر جو پٹی آویزاں تھی اس کے مطابق اس کا نام شہاب الدین تھا۔ وہ بھاری بھرکم بارعب آدمی تھا کچھ سلجھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اپنی چھڑی کو دونوں ہاتھوں میں گھماتے ہوئے بولا "میں ابھی پہنچا ہوں چوہدری صاحب! ابھی میں نے تفتیش شروع ہی کی ہے۔"

دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ تھا مجھے تو خود کچھ معلوم نہیں جناب! میں تو ابھی معلوم کرنے کی کوشش ہی کر رہا ہوں۔

آفاق ایک صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "تھوڑا بہت اگر کچھ معلوم ہے تو صرف راجہ صاحب کو معلوم ہے۔ آپ ان سے بات کیجئے چوہدری صاحب!"

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ آفاق نے جسے راجہ صاحب کے نام سے مخاطب کیا تھا وہ ایک بھاری بھرکم ادھیڑ عمر گورا چٹا شخص تھا اسے اچھے خاصے خوب صورت لوگوں میں شمار کیا جا سکتا تھا تاہم ذرا موٹاپے نے غلبہ پایا ہوا تھا۔ جبڑے لٹکے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں تھوڑا سا نشیلا پن تھا اور منہ میں خوشبودار پان۔ وہ بوسکی کی سفید شلوار قمیص میں تھا۔ کندھوں پر خوب صورت کامدار چادر تھی۔ پیروں میں زری والے کھسے تھے۔

فوری طور پر میں اس کے بارے میں کوئی واضح رائے قائم نہیں کر سکا۔ بہرحال آدمی ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ آفاق نے اس کے بارے میں مزید بتایا "راجہ صاحب پروڈیوسر بھی ہیں اور ڈائریکٹر بھی۔ ستارہ اس وقت انہی کی فلم کی شوٹنگ کر رہی تھی۔"

راجہ اپنی انگلیوں میں دبی ہوئی کسی خوشبودار سگریٹ کی راکھ چٹکی بجا کر جھاڑتے ہوئے ہلکے سے جھٹکے دار لہجے میں بولا "معلوم تو مجھ کو بھی کچھ زیادہ نہیں ہے چوہدری صاحب! میڈم جی نے آج دونوں شفٹوں میں زیادہ تر میری فلم کا ہی کام نمٹایا۔ اب شام سے اکرم پرویز کے ساتھ میڈم کا ریپ سین چل رہا تھا..." اس نے آنکھوں سے فلمی ولن کی طرف اشارہ کیا۔

اس موقع پر بھی اس کے لہجے میں ہلکی سی چہچہاہٹ جھلک آئی "اکرم پرویز صاحب کے ساتھ ریپ سین ہو تو ری ٹیکس بہوت ہوتی ہیں چوہدری صاحب! بڑی مشکل سے کوئی چھ سات شاٹ اوکے ہوئے تھے۔ میڈم ستارہ تھک گئی تھیں۔ کھانے کا بھی ٹیم ہو گیا تھا۔ آپ تو میڈم جی کے خاص آدمی ہیں۔ آپ کو تو پتا ہی ہو گا میڈم پروڈکشن کی طرف سے آیا ہوا کھانا نہیں کھاتی تھیں۔ وہ ٹفن کیریئر میں بہت سارا کھانا ساتھ لاتی تھیں کہ اگر دونوں ٹیم بھی کھانا پڑے تو کھا لیں بلکہ دوسروں کو بھی کھلا دیں۔ آج دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے اسی ڈریسنگ روم میں کھایا تھا۔ اب رات کو بھی جب وہ تھک گئیں تو انہوں نے مجھ سے کہا کچھ دیر کا بریک کر دو۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ انہوں نے ایک چھوکرے سے کہا کہ ان کا ٹفن کیریئر گاڑی سے نکال کر ڈریسنگ روم میں پہنچا دے۔ چھوکرے نے پہنچا دیا۔ وہ کھانا کھانے یہاں آ گئیں جب وہ ڈریسنگ روم میں ہوتی تھیں تو پسند نہیں کرتی تھیں کہ کوئی یہاں آئے۔ ان کے گارڈ اور دوسرے دو سادہ لباس والے آدمی بھی باہر ہی رہتے تھے۔"

وہ میرے آدمیوں کو سادہ لباس والے سمجھ رہا تھا۔ نروس سے انداز میں ایک کش لے کر اس نے ایک بار پھر چٹکی بجا کر راکھ جھاڑی اور کھنکار کر بولا "انہوں نے کہا تھا وہ پندرہ منٹ تک واپس پہنچ جائیں گی لیکن جب آدھا گھنٹا گزر گیا تو میں نے چھوکرے کو دیکھنے کے لیے بھیجا۔ چھوکرا چیخیں مارتا ہوا سیٹ پر واپس آیا۔ اس سے بتایا نہیں جا رہا تھا کہ میڈم کو کیا ہوا ہے۔ ہم بھاگے بھاگے یہاں آئے تو عجیب ہی حال دیکھا۔ میڈم فرش پر پڑی تھیں حالت بڑی عجیب تھی۔ میرا مطلب ہے پہچانی نہیں جا رہی تھیں۔ ہم نے تو بس کپڑوں سے پہچانا۔ بہت دیر میں ہمیں یقین ہوا کہ وہ میڈم ہی ہیں آپ ایک نظر خود دیکھ لیں۔ گارڈ بتا رہے ہیں کہ وہ سارا وقت باہر کھڑے تھے اور جتنی دیر میڈم اندر رہیں کوئی بھی اندر نہیں گیا۔ بس آخر میں چھوکرا بلانے آیا تھا۔ وہ فوراً ہی اُلٹے پیروں بُری طرح گھبرایا ہوا باہر آ گیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ بھی ہوا بس کھانا کھانے کے دوران ہی ہوا۔" وہ الجھن آمیز سے انداز میں خاموش ہو گیا۔

میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور جھک کر ستارہ کی لاش سے شال ہٹا کر دیکھا۔ اگر میں پہلے بھی ویسی دو لاشیں نہ دیکھ چکا ہوتا تو یقیناً ششدر رہ جاتا۔ وہاں اس پُرکشش اور قیامت بردوش ستارہ کا تو نام و نشان بھی نہیں تھا۔ وہ تو چٹخی ہوئی خشک مٹی کا ایک بدصورت مجسمہ تھا عام آدمی اس پر اچانک نظر پڑنے پر یقیناً بری طرح خوف زدہ ہو سکتا تھا۔

میری رگ و پے میں ایک عجیب ٹھنڈک سی پھیل گئی جس سے میری سانس گویا سینے میں اٹکنے لگی۔ اس ڈراؤنے مجسمے کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ یہ لوچ اور گداز سے بھرا ہوا وہی پیکر تھا جس کے ایک ایک خم ایک ایک جنبش کو کیمرا نہ جانے کتنے زاویوں سے محفوظ کرتا تھا۔ کون تصور کر سکتا تھا کہ یہی وہ قیامت ادا تھی جسے محض اسکرین پر رقصاں دیکھنے کے لیے لوگ سنیماؤں پر ٹوٹ پڑتے تھے۔

میں نے جلدی سے اسے شال سے ڈھانپ دیا۔ مجھ میں اس خوب صورت زندگی اور اس بدصورت موت کے تضاد کا زیادہ دیر نظارہ کرنے کی تاب نہیں تھی۔ ایک گہری سانس لینے کی کوشش کرتے ہوئے میں سیدھا ہو گیا۔ کئی دن سے مجھ پر اعصاب شکن مصروفیتوں اور صبر آزما واقعات کا دباؤ جاری تھا لیکن میں نے تھکن کو اپنے اوپر غالب نہیں آنے دیا تھا۔ مگر اب یکایک ہی مجھے بے پناہ تھکن کا احساس ہوا۔

سب کچھ میری سمجھ میں آ گیا تھا اور سمجھ میں آتے ہی گویا اس ماحول سے گرد و پیش سے وہاں موجود انسانوں سے میری دلچسپی یکدم ختم ہو گئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر ان لوگوں سے منہ چھپا کر کہیں دور بھاگ جاؤں۔ کسی تاریک اور ویران گوشے میں جا کر چھپ جاؤں اور اس وقت تک چھپا رہوں جب تک میری رگوں میں سرایت کر جانے والا مجبور غیظ و غضب دَم نہ توڑ جائے یا میں خود موت کی آغوش میں نہ اتر جاؤں۔

میری نظر راحیلہ پر پڑی۔ وہ گویا بغور میرے تاثرات پڑھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ انسپکٹر شہاب الدین نے ایک زوردار ہنکارا بھرا اور ڈریسنگ ٹیبل پر جھک کر برتنوں کا جائزہ لیا جن میں تھوڑا سا کھانا باقی تھا۔ پھر وہ سیدھے ہوتے ہوئے ایک ہاتھ سے چھڑی دھیرے دھیرے دوسرے ہاتھ پر مارتے ہوئے بولا "یہ اندازہ تو ہو رہا ہے کہ کھانے میں زہر ملایا گیا ہو گا لیکن ایسا کوئی زہر میں نے آج تک نہیں دیکھا جو انسان کا یہ حال کر دے۔ سترہ سال میری سروس ہو گئی ہے۔ زہر دیے جانے کے بھی چند کیس میں نے دیکھے ہیں اور انویسٹی گیشن کی ہے۔ اس کے علاوہ میں رہنے والا بھی ایسے علاقے کا ہوں جہاں کے زہریلے سانپ مشہور ہیں۔ لیکن کسی زہر کا ایسا اثر میں نے نہیں دیکھا۔" اس نے شال میں چھپے ہوئے میری دوستی کے برباد کھنڈر کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بہت دھیمی آواز میں کہا "یہ سائنسی اور سیاسی ترقی کے ناگ کا زہر ہے جو رفتہ رفتہ شاید پوری دنیا کو ڈس جائے گا شہاب صاحب!"

میری بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی کیونکہ وہ اس کے سیاق و سباق سے واقف نہیں تھا۔ ہم فلم اسٹوڈیو میں کھڑے تھے وہ شاید اسے کوئی فلمی یا جذباتی مکالمہ ہی سمجھا۔ اس میں زیادہ سر کھپائے بغیر بولا "بہرحال جی زہر کی قسم پر تو لیبارٹری والے غور کرتے رہیں گے۔ میرا کام تو یہ دیکھنا ہے کہ زہر کس نے دیا کس نے کھانے میں ملایا۔ دو آدمیوں کو یہ موقع حاصل تھا۔ ایک وہ چھوکرا جس نے گاڑی سے ٹفن کیریئر نکال کر یہاں ڈریسنگ روم میں پہنچایا دوسرے وہ ملازمہ یا خانساماں جو میڈم ستارہ کے گھر میں کام کرتا ہو گا جس نے یہ کھانا تیار کر کے دیا ہو گا۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا انسپکٹر نے راجہ سے پوچھا "کہاں ہے وہ لڑکا؟"

راجہ جیسے کسی خیال سے چونک کر بولا "باہر ہی کھڑا ہے ابھی بلاتا ہوں۔" پھر وہ قدرے ہچکچاہٹ سے بولا "لیکن وہ تو بڑا شریف بڑا تابعدار لڑکا ہے انسپکٹر صاحب! کم عمر بھی ہے اتنی بڑی حرکت نہیں کر سکتا۔"

"میں نے آپ سے درخواست کی ہے کہ اسے بلا دیں۔ میں نے آپ سے اس کے کیریکٹر کی گواہی نہیں مانگی۔" انسپکٹر نے راجہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر خاصی حد تک انسپکٹرانہ لہجے میں

کہا۔ راجہ نے کندھے اچکائے اور دروازے پر پہنچ کر باہر جھانکتے ہوئے ہانک لگائی "اوئے جیرے! کاکا کتھے اے؟ اوہنوں اندر گھل۔" (اوئے جیرے! کاکا کہاں ہے؟ اسے اندر بھیج دو۔)

تھوڑی دیر بعد سترہ اٹھارہ سال کا ایک سانولا سا لمبا تڑنگا لیکن نہایت دُبلا سا لڑکا اندر آیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ انسپکٹر نے معنی خیز انداز میں چھڑی ہاتھ پر مارتے ہوئے خونخوار نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا "کیوں بے؟ کتنی رقم ملی تھی میڈم کے کھانے میں زہر ملانے کی؟"

"زہر؟" لڑکے کی پھٹی پھٹی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑی جم رہی تھی۔ اسے ایک لمحے کے لیے تو گویا کوئی لفظ ہی نہ سوجھا پھر یکدم وہ انسپکٹر کے پیروں میں گر گیا اور بری طرح گڑگڑاتے ہوئے بولا "مجھ سے میری مری ہوئی ماں کی قسم لے لیں صاحب جی! میں نے کچھ نہیں کیا میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔ بڑے دنوں سے ادھر لوگوں کی خدمت کر رہا ہوں۔ کبھی کسی کو میرے سے کوئی شکایت نہیں ہوئی جی۔"

میرا اندازہ کچھ غلط ثابت ہو رہا تھا کہ انسپکٹر قدرے سُلجھا ہوا شخص تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ وہیں سب کے سامنے لڑکے کی کھال اُدھیڑنی شروع نہ کر دے لیکن میں سب کے سامنے اس سے کوئی ایسی بات کہنا بھی نہیں چاہتا تھا جس سے اس کی اَنا مجروح ہو جاتی۔ اس قسم کے پولیس والوں کی اَنا بڑی نازک ہوتی ہے۔ کمرے میں زیادہ جگہ بھی نہیں تھی۔ کھچا کھچ بھرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

بہرحال میں نے انسپکٹر کو بازو سے پکڑا اور ایک کونے میں لے گیا۔ میں نے نیچی آواز میں لیکن خفگی آمیز لہجے میں کہا "انسپکٹر صاحب! یہ روایتی اور فرسودہ طریقے اختیار نہ کریں، جہاں بھی ذرا ممتاز قسم کے لوگوں میں کوئی واردات ہوتی ہے، سب سے پہلے ملازموں اور چھوٹے موٹے خدمت گاروں کی شامت آجاتی ہے۔"

انسپکٹر نے ترچھی نظروں سے مجھے گھورا لیکن میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اگر یہ حرکت اس لڑکے کی ہوتی تو اب تک یہ یہاں سے غائب ہو چکا ہوتا۔ ستارہ کی ملازمہ کی یہ حرکت اس لیے نہیں ہو سکتی کہ ستارہ نے دوپہر کو بھی اسی ٹفن کیریئر میں سے کھانا کھایا تھا اور وہ رات تک ٹھیک رہی تھی۔"

بات کسی حد تک اس کی سمجھ میں آ ہی گئی۔ اس کا جوش و خروش کچھ ٹھنڈا پڑ گیا۔ وہ دھیمی آواز میں بولا "تو پھر آپ کو معلوم ہو گا، یہ کیا چکر ہے؟"

"ہاں، مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔ ستارہ کی گاڑی پارکنگ لاٹ میں ہی کھڑی ہو گی۔ ٹفن کیریئر اسی میں تھا۔ اس کی طرف کسی کی بھی زیادہ توجہ نہیں تھی۔ ستارہ کی حفاظت پر جو لوگ مامور تھے وہ اسی کے گرد منڈلاتے رہتے تھے، اسٹوڈیو میں ہزاروں لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ کسی نے دوپہر اور شام کے درمیان اس کی گاڑی کا ڈھکن کھول کر کھانے میں زہر ملا دیا۔ یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔"

"لیکن کس نے ملا دیا؟ یہی معلوم کرنا تو میری ذمے داری ہے۔" وہ تھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔

"کچھ عرصے بعد شاید اس کیس کو حل کرنے کا کریڈٹ آپ کو مل جائے۔" میں نے اسے اطمینان دلایا "لیکن فی الحال یہ ذمے داری آپ پر سے ہٹا لی جائے گی۔ میں ڈی آئی جی صاحب سے بات کر لوں گا۔ یہ آپ کے ڈیپارٹمنٹ کا کیس ہے ہی نہیں۔ یہ بہت لمبا چکر ہے، اسے خفیہ ایجنسیاں ڈیل کر رہی ہیں۔"

میں نے تینوں ایجنسیوں کے نام گنوائے اور کہا "اگر آپ چاہیں تو آپ کو اس سلسلے میں نفیس صاحب سے باضابطہ احکامات بھی مل جائیں گے۔ آپ بس رسمی کارروائیاں کریں۔ گول مول انداز میں اس معاملے کو نمٹا دیں۔ کسی غیر متعلق آدمی سے یہ کہنے کی بھی ضرورت نہیں کہ یہ معاملہ آپ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ خفیہ ایجنسیوں کا بھی کوئی حوالہ نہیں آنا چاہیے۔ آپ بات سمجھ رہے ہیں نا؟"

"بالکل سمجھ گیا جی لیکن مجھے تصدیق کرنا پڑے گی۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"وہ آپ کل کر لیجیے گا۔ آج رات میری ان سے بات ہو گی۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ وہ کچھ آسانی سے ہی مان گیا تھا۔ مرعوب بھی نظر آرہا تھا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ میرا ان معاملات سے کیا تعلق تھا؟ دو چار حوالے ہی اس کے لیے کافی رہے تھے۔

اس کے بعد بھیڑ چھٹنے اور تمام مراحل طے ہو جانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ کاکے سے لے کر غالباً راجہ تک سبھی لوگ جہاں ستارہ کی موت کے دھچکے سے پریشان تھے وہیں کم از کم یہ بات ان کے لیے قدرے طمانیت کا باعث بنی تھی کہ ان کی جان نہایت آسانی سے چھوٹ گئی تھی۔ سب کی نظروں میں میرے لیے تشکر اور مرعوبیت تھی۔ ان کی نظر میں، میں واقعی بڑا آدمی تھا جس نے آکر انسپکٹر کے کان میں کچھ کہہ کر سارا معاملہ گویا منٹوں میں ختم کرا دیا تھا۔

لیکن انہیں نہیں معلوم تھا کہ اس وقت میں خود اپنے آپ کو اپنی نظر میں کتنا چھوٹا اور شکست خوردہ شخص محسوس کر رہا تھا۔ ایک زندگی سے بھرپور اور جواں حوصلہ عورت، جو اسکرین پر، میری خلوتوں میں، محفلوں میں ہر جگہ جادو جگاتی تھی، محض مردانہ وار ڈٹ کر میرا ساتھ دینے، میرے شانہ بہ شانہ کھڑی ہونے اور مجھے پناہ دینے کے جرم میں عین اپنے عروج کے دور میں ماری گئی تھی۔ اس نے تو کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا، اس کی تو کسی سے دشمنی نہیں تھی۔ مرتے وقت بھی اسے صرف میرے لیے ہی پیغام چھوڑنے کا خیال رہا تھا اور وہ بھی صرف یہی "مجھے بھول نہ جانا" اور کسی بات کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ میں اب بھلا اسے بھول بھی سکتا تھا؟ وہ اپنے لہو میں لتھڑے ہوئے تختے سے یہ الفاظ گویا لوحِ دل پر کندہ کر گئی تھی۔ فی الحال تو آج صبح کا منظر ہی میرے ذہن سے محو نہیں ہوا تھا۔ کتنے اہتمام سے تیار ہو کر وہ کیسی دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے گھر سے روانہ ہوئی تھی۔ میں نے اسی گھر کے گیٹ پر کھڑے ہو کر اسے خدا حافظ کہا تھا۔ زندگی کی حرارت گویا اس کے سراپا سے پھوٹی پڑ رہی تھی اور اب...!

بیانات ہو چکے، لاش اٹھائی جا چکی، لوگوں کی بھیڑ چھٹ چکی تو میں اور راحیلہ، آفاق کے ساتھ میرے اسٹوڈیو والے آفس میں آئے۔ آفاق کے بال بکھرے ہوئے تھے، چہرے پر وحشت تھی۔ ستارہ کی موت نے اسے بھی ہلا کر رکھ دیا تھا۔ آفس میں اپنی کرسی پر بیٹھ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

میں اور راحیلہ اس کے مقابل صوفے پر بیٹھے تھے۔ چند لمحے کے لیے کوئی بھی کچھ نہ بولا۔ ہم تینوں اپنی اپنی جگہ الگ طرح کی سوگواری میں ڈوبے ہوئے تھے۔ راحیلہ نے تو خیر ٹونی کے ہاں سے روانگی کے بعد سے اب تک ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔

آخرکار آفاق سر اٹھاتے ہوئے پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا "اس صدمے نے جذباتی طور پر بھی ہمیں بہت بڑے خسارے سے دوچار کر دیا ہے اور مالی طور پر بھی۔ تین فلمیں تو ہماری سیٹ پر ہیں جو آدھی سے زیادہ مکمل ہو چکی ہیں اور ان میں ستارہ ہیروئن ہے۔ تیرہ چودہ فلمیں دوسرے پروڈیوسرز کی ہیں۔"

آخرکار وہ فلمی آدمی تھا۔ اسے فلموں کی پڑی ہوئی تھی لیکن میں نے سوچا وہ اپنی جگہ ٹھیک ہی تھا۔ اس کا سب کچھ تو فلموں ہی سے وابستہ تھا۔ اس کی زندگی، اس کا اوڑھنا بچھونا، اس کا ذریعۂ معاش، اس کی دلچسپیوں کا محور و مرکز فلمیں ہی تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "چوہدری صاحب! مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں ایک بدنصیب آدمی ہوں۔ جوانی کے دور میں اتنی محنت کرنے کے بعد مجھ پر عروج آیا لیکن بہت کم دنوں کے لیے۔ پھر آپ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے دلدل سے نکالا۔ لگ رہا تھا کہ قسمت رنگ لے آئے گی لیکن میں ایک بار پھر ڈوب گیا۔ ساتھ ہی میں نے آپ کا کافی سرمایہ بھی ڈبو دیا، آپ بھی سوچیں گے کہ کیا سوچ کر میں نے آپ کو فلم لائن میں کھینچا تھا۔"

"سرمائے کی کوئی بات نہیں ہے آفاق! سرمایہ تو آتا اور جاتا رہتا ہے۔ انسان اس دنیا سے جا کر واپس نہیں آتا۔ سرمائے کا بدل سرمایہ ہے لیکن انسان کا بدل انسان نہیں ہے۔ ہر انسان اپنی جگہ ایک الگ کائنات کی طرح ہوتا ہے، دوسرا انسان اس کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ اس بزنس میں اگر کچھ سرمایہ ڈوب گیا ہے تو مجھے اس کا افسوس نہیں ہے۔ میں تم سے اس کا حساب طلب نہیں کر رہا۔ ستارہ کے مر جانے اور فلمیں ادھوری رہ جانے میں ظاہر ہے تمہارا کوئی قصور نہیں۔"

میں کہنا چاہتا تھا کہ قسمت شاید اس کی نہیں بلکہ میری پلٹا کھا رہی تھی لیکن میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ راحیلہ نے ایک طویل سانس لی تھی۔ وہ ہتھیلی پر ٹھوڑی ٹکائے سر جھکائے بیٹھی تھی۔ ریشمی بھورے بالوں کی ایک لٹ نے اس کے ایک رخسار کو تقریباً ڈھانپ رکھا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے گویا اس کی موجودگی کو فراموش ہی کر بیٹھا تھا گو کہ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ اس کے چہرے سے افسردگی کے سوا کچھ ظاہر نہ ہو لیکن میری نہ جانے کس حس نے مجھے احساس دلایا کہ راحیلہ کی موجودگی میں مجھے ستارہ کے بارے میں اس طرح اپنے محسوسات کا اظہار نہیں کرنا چاہیے تھا۔ لیکن وہ تو بس ایک طرح کی بے اختیاری تھی، جو کچھ میں نے محسوس کیا تھا وہ تو زبان سے نکل ہی چکا تھا۔

میں نے یکدم اٹھتے ہوئے کہا "آؤ راحیلہ، چلتے ہیں۔"

وہ کسی عامل کے معمول کی طرح سعادت مندی سے قدرے مشینی سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے آفاق سے کہا "میں کوشش کروں گا کہ پوسٹ مارٹم وغیرہ کے بعد لاش پولیس سے جلد از جلد مل جائے۔ تم لاش لے کر ستارہ کی تدفین کے شایانِ شان انتظامات کرنا۔"

"وہ تو خود بخود ہوں گے سر!" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولا "ابھی تو اس کی موت کی خبر پوری فلم انڈسٹری میں نہیں پھیلی۔ انڈسٹری ہل کر رہ جائے گی۔ کہرام برپا ہو جائے گا۔"

وہ میرے ساتھ باہر تک آیا اور برآمدے کی سیڑھیوں کے پاس رُکتے ہوئے بولا "شاید نئے حالات کی روشنی میں ہمیں معاملات کو از سرِ نو طے کرنے کے لیے ایک تفصیلی میٹنگ کی ضرورت پڑے۔"

"نہیں اس کی ضرورت نہیں، بس تم جس طرح مناسب سمجھو کام جاری رکھو۔ کام نہیں رکنا چاہیے۔ کوئی بھی مالی مسئلہ ہو تو تم پہلے ہی کی طرح میرے ڈائریکٹر فائنانس سے مل لیا کرو۔"

"سر! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے آپ کی نوازشات کا شکریہ ادا کروں۔" اس کی آواز بھرا سی گئی۔

مجھے یاد تھا کہ کسی زمانے میں وہ بھی ستارہ کا چاہنے والا ہوا کرتا تھا لیکن اس کی طرف سے چاہت کا جواب میسر نہ آنے پر اور پھر ستارہ سے میری شناسائی نکل آنے پر اس نے گویا اپنی کتابِ زندگی سے یہ ورق پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔

میں اسے خدا حافظ کہہ کر گاڑی کے قریب پہنچا تو میرے وہ دونوں آدمی بھی فلور نمبر آٹھ کی طرف سے آتے دکھائی دیے جو ستارہ کی نگرانی پر مامور تھے۔ انہیں یقیناً سب کچھ معلوم ہو چکا تھا، ان کے چہروں پر اداسی تھی۔ ان کے نام منیر اور مسعود تھے۔

منیر قریب آکر سر جھکاتے ہوئے بولا "آئی ایم سوری سر! ہم

صرف میٹنگ میں شرکت کے لیے گئے۔ واپسی میں دو نمبر پر مس ٹرپ کے بتائے ہوئے کچھ کام کرنے میں دیر ہو گئی اور اس دوران یہاں یہ سب کچھ ہو گیا۔"

"تم یہاں ہوتے تب بھی شاید یہ ہو جاتا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "کیونکہ تم ستارہ کی حفاظت کر رہے تھے' اس کی خالی گاڑی کی نہیں۔"

"اب ہمارے لیے کیا حکم ہے؟" مسعود نے پوچھا۔

"کچھ نہیں' بس تم واپس جا کر اپنی کاروباری مصروفیات میں لگ جاؤ لیکن میٹنگ میں جو فیصلے ہوئے ہیں اور جو ہدایات دی گئی ہیں ان پر بھی عمل جاری رکھنا۔ اگر کہیں اور تمہاری ضرورت ہوئی تو میں اطلاع کرا دوں گا۔"

میں اور راحیلہ گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ٹونی کی گاڑی بدستور ہمارے پیچھے تھی۔ راحیلہ کے ہاں پہنچ کر میں نے دیکھا' گیٹ پر ایک گاڑی کھڑی تھی۔ اس پر نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ "دی سرکل" کے استعمال میں رہنے والی گاڑیوں میں سے ایک تھی اور میری ہدایت پر مس ٹرپ نے بھجوائی تھی۔

"آج سے تم صرف یہ گاڑی اپنے استعمال میں رکھو گی۔ اس کے خفیہ خانے میں ریڈیو موجود ہے جو مجھ سمیت تمام ساتھیوں سے رابطے کے لیے مخصوص فریکوئنسی پر سیٹ ہے۔ ایک وقت میں کسی ایک ساتھی سے یا بیک وقت کئی ساتھیوں سے بات چیت کا طریقہ' کچھ سگنلز اور کچھ کوڈ ورڈز مس ٹرپ صبح آ کر تمہیں سمجھا دے گی۔ یہ گاڑی کچھ اور خصوصیات کی بھی حامل ہے۔ مس ٹرپ تمہیں ان کے بارے میں بھی بتا دے گی۔" میں نے کہا۔

"تم کہاں جا رہے ہو؟" راحیلہ نے گاڑی سے اُترے بغیر پوچھا۔

"بچپن کے ایک دوست' ایک لنگوٹیے یار کی طرف۔" میں نے کہا۔

"گھر تو تباہ ہو چکا' اب تم یہیں ٹھہر جاتے۔" وہ نہایت دھیمے لہجے میں بولی۔

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا "میرے خیال میں ابھی یہ مناسب نہیں۔ ابھی بہت ٹھکانے ہیں۔ میں تمہارے سر پر مسلط ہونا نہیں چاہتا۔ میری موجودگی سے تمہارے لیے خطرات بھی بڑھ جائیں گے۔ تم پہلے ہی میری وجہ سے جتنے خطرات مول لے رہی ہو وہی بہت ہے۔ فی الحال مناسب یہی ہے کہ میں تم سے دور دور سے رابطہ رکھوں۔"

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا اور سر جھکا لیا۔

"تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں' کوئی ایسی خاص بات نہیں۔" وہ اپنی ساری تیزی و طراری گویا بھول چکی تھی۔ ایک عجیب سی افسردگی سے وہ گویا بجھ کر رہ گئی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "دراصل میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیسے تمہارا دکھ بٹاؤں۔"

"بس تم میرے ساتھ ہو' ہر کام' ہر مسئلے میں میرے شا[نہ بہ] شانہ چل رہی ہو۔ میرا دکھ بٹانے کے لیے تمہاری یہ رفاقت [کافی] ہے۔" میں نے اس کے نیم منتشر بالوں کو کچھ اور منتشر کرتے ہ[وئے] کہا۔

اس نے اپنے گداز ہاتھ سے آہستگی سے میرا ہاتھ ہٹا [کر] اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے بولی "مجھے بھی ستارہ کی موت کا [بے] پناہ افسوس ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ اس ملک کی غریب [فلم] انڈسٹری میں بہت اچھا اضافہ تھی اور ابھی اسے بہت کچھ کر[نا تھا] اور اس لیے بھی کہ وہ تم سے اس قدر محبت کرتی تھی۔ مجھے معلوم تھا....."

"مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا۔" میں نے جلدی سے کہا' [میں] اسے ایک اچھی دوست سمجھتا تھا اور بس۔ میں کیا کہہ سکتا ہوں کوئی اپنے ذہن میں کیسے خواب بُن رہا ہے۔" میں نے قد[رے] جھوٹ بولا۔ مجھے اچھی طرح معلوم تھا' ستارہ میرے بارے میں سوچتی تھی اور میں اس کے بارے میں کیا سوچتا تھا۔ لیکن راحیلہ کو نہیں سمجھا سکتا تھا کہ انسان کی چاہتیں کتنے خانوں میں ہوتی ہیں' کیوں بٹی ہوتی ہیں اور کہاں آ کر تقدیر کے دھاگے جاتے ہیں' کہاں آ کر ملاپ کی راہیں گڈمڈ ہو جاتی ہیں اور جدا[ئی] خلیج بن جاتی ہیں۔ کس سمت میں دستِ طلب بڑھتا ہے تو خا[لی] جاتا ہے اور کس سمت میں بڑھنے نہیں پاتا۔ یہ سب انسانی نف[سیات] کی بھول بھلیاں تھیں' اس وقت میں ان میں بھٹکنے اور اپنے [ساتھ] راحیلہ کو بھی بھٹکانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ بات سلجھنے [کے] بجائے اور بھی الجھ سکتی تھی۔

"میں تم سے کچھ پوچھ تو نہیں رہی' کوئی وضاحت تو [نہیں] مانگ رہی۔" وہ جلدی سے بولی "میں تو تمہارا دکھ شیئر کرنا [چاہتی] ہوں۔"

دکھ شیئر کرنے کے بھی اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ لا[ئبہ] کی طرح میرے دکھ شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود میں چاہتا تھا' اس سے میں شادی کرنا چاہتا تھا۔ ستارہ سے شادی نہیں چاہتا تھا۔

وہ گویا موضوع بدلتے ہوئے بولی "خیر' میں تو صرف یہ کہ[رہی] تھی تم یہیں ٹھہر جاتے تو اچھا تھا۔ یہ محاورتاً بھی تمہارا اپنا گھ[ر ہے] اور حقیقتاً بھی۔"

"گھر تو ابھی یہ بن ہی نہیں سکا' ابھی تو یہ صرف مکان [ہے] یہ میں نے تمہاری نذر کر دیا ہے۔" میں نے کہا۔

ایک لمحے کے لیے وہ سر جھکائے بیٹھی رہی پھر بیٹھی [ہوئی] آواز میں بولی "ہمارے درمیان محبت کے سوا کوئی رشتہ نہیں [تمہا]رے اپنے رویے سے' اپنے عمل سے ہمیشہ مجھے یہی احساس [دلایا] کہ میں اپنی اور تمہاری چیزوں کو الگ الگ نہ سمجھوں۔ اگر

[وج]ود میں بتا دوں کہ میں کسی کی بھی نوازشات کے بوجھ سے گھبرا [ج]انے والی عورت ہوں۔ میں نے بچپن سے لے کر اب تک بہت [ا]نڈی پنڈنٹ' بہت خود مختار زندگی گزاری ہے۔ مجھے نوازشات [ک]ے بوجھ تلے مت دباؤ۔ میں ٹوٹ پھوٹ جاؤں گی۔"

"جب میری اور تمہاری چیزیں الگ الگ نہیں تو یہ نوازشات [درمیان] میں کہاں سے آ گئیں؟ تمہیں ان کو نوازشات سمجھنے اور ان کے بوجھ سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھ لو کہ اب تم ہمیشہ سے [زی]ادہ آزاد' زیادہ خود مختار' زیادہ انڈی پنڈنٹ عورت ہو۔ تمہیں [کو]ئی اپنی نوازشات کے بوجھ تلے دبانے کی کوشش نہیں کر رہا بلکہ [ا]ب تم اس پوزیشن میں ہو کہ چاہو تو دوسروں کو اپنی نوازشات کے بوجھ تلے دبا سکتی ہو۔"

پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "اور آئندہ اس [قس]م کے موضوعات پر بات کرنے اور گڑے مُردے اکھاڑنے کی [ض]رورت نہیں۔ زندگی جو بھی چیلنج دے اسے قبول کرتی جاؤ اور کسی [پ]چھتاوے کے ساتھ نہیں' خوش دلی اور گرم جوشی کے ساتھ زندگی [کے م]راحل طے کرو۔ میرا ساتھ اگر دے سکتی ہو تو پورے دل سے دو' [و]رنہ ابھی کچھ نہیں بگڑا' واپسی کا راستہ کھلا ہے۔ مجھے بہرحال [تمہ]اری اشد ضرورت ہے اور تمہارے بغیر میں ٹوٹ پھوٹ جاؤں [گا]۔"

اس نے گویا تڑپ کر سر اٹھایا اور نم آلود آنکھوں کے ساتھ [بو]لی "تمہارا خیال ہے کہ میں تمہیں چھوڑ کر جانا چاہتی ہوں؟"

"اگر تمہارا ایسا کوئی ارادہ نہیں تو بس پھر کھڑی کھڑی' [ج]ذباتی اور متنازعہ باتیں مت کیا کرو' میرا دل دُکھتا ہے اور اس [و]قت میں جن حالات سے دوچار ہوں ان میں کم از کم تم سے میں یہ [تو]قع نہیں رکھتا کہ تم میرا دل دُکھانا چاہو گی۔"

"میں تمہارا دل دُکھانا ہرگز نہیں چاہتی۔" وہ گھٹی گھٹی آواز [م]ا تیزی سے بولی۔

"تو پھر تم کیا چاہتی ہو؟" میں نے اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے [ہو]ئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"مجھے نہیں معلوم میں کیا چاہتی ہوں۔" وہ بے بسی سے بولی۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اس کے سر سے ہاتھ ہٹاتے [ہو]ئے کہا "ننانوے فیصد غیر معمولی انسانوں کا یہی المیہ ہوتا ہے۔ [ان]ہیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ درحقیقت وہ کیا چاہتے ہیں۔ بہرحال [ا]ب تم جا کر اطمینان سے سو جاؤ اور الجھاوؤں سے پیچھا چھڑانے کی [کو]شش کرو۔ ہر بات کو بالکل سیدھے سادے انداز میں دیکھا کرو۔ [ہم] انسان کو کبھی کبھی بھول بھلیوں میں بھٹکاتا ہے' کوشش کیا کرو کہ [ا]ن بھول بھلیوں میں قدم نہ رکھو۔"

"میں ہر بات کو بہت سیدھے سادے انداز میں دیکھنے کی [کو]شش کرتی ہوں تو تم بہت الجھے الجھے دکھائی دینے لگتے ہو۔" وہ [ٹو]ٹی سسکی جیسی آواز میں بولی۔

"ابھی تمہیں میرے پاس آئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ کچھ عرصہ اور رہو گی تو مجھے سمجھنے لگو گی۔ میں پہیلی ضرور ہوں لیکن زیادہ مشکل پہیلی نہیں۔" میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ گاڑی سے اُتر گئی لیکن پورچ میں کھڑی اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک میری گاڑی ریورس ہو کر آگے نہیں بڑھ گئی۔

وہاں سے میں راجو کے ہاں پہنچا۔ میرے دو آدمی اس گھر کی حفاظت کے لیے بھی تعینات تھے۔ میٹنگ میں شرکت کے بعد وہ واپس اپنی ڈیوٹی پر پہنچ چکے تھے۔ میں نے دور سے انہیں دیکھا تاہم ہم ایک دوسرے سے انجان ہی بنے رہے۔ یہاں خطرہ صرف مختار رفیق کی طرف سے تھا لیکن اس کی موت کے بعد بھی میں نے ابھی اپنے آدمیوں کو نہیں ہٹایا تھا۔ اب یہاں آتے وقت البتہ میں نے ٹونی اور شفیع شاہ سے ریڈیو پر رابطہ قائم کر کے انہیں واپس بھیج دیا تھا' البتہ یہ بتا دیا تھا کہ فی الحال میں راجو اور شمیم کی طرف قیام کرنے جا رہا تھا۔

شمیم کا چوکیدار بھی مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے گیٹ کھول دیا اور میں نے گاڑی ڈرائیو وے میں لے جا روکی۔ میں نے دیکھا' برآمدے میں عین چھت کی لائٹ کے نیچے بارہ تیرہ سال کا ایک لڑکا کھڑا تھا۔ وہ ایک بے پناہ خوب صورت لڑکا تھا۔ اس کی من موہنی صورت میں اس قدر کشش تھی کہ بے اختیار میرا دل چاہا' جلدی سے آگے بڑھ کر اسے گود میں اٹھا لوں۔

میں نے بہ مشکل اپنے آپ کو روکا۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک اجنبی کی یہ اچانک حرکت بچے کو خوف زدہ کر دے گی۔ خصوصاً اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں کچھ زیادہ ہی کشش تھی۔ وہ بے پناہ سنجیدہ بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس عمر کے بچے کبھی سنجیدہ بھی کھڑے ہوں تب بھی ان کے خدوخال سے تھوڑا بہت چُلبلا پن ضرور جھلکتا ہے۔ مگر اس بچے میں وہ یکسر مفقود تھا۔ اس کے چہرے پر کمسنی کا بھولپن ضرور تھا مگر اس کے باوجود وہ اپنی عمر سے کہیں بڑا محسوس ہو رہا تھا۔

وہ وہیں کھڑا ایک ٹک مجھے گاڑی سے اترتے دیکھتا رہا۔ میں اس کے قریب پہنچا تب بھی اس نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ وہ دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے کسی بہت بڑے اور اہم شخص کے سے وقار' متانت بلکہ قدرے نخوت سے کھڑا تھا۔ قد میں ظاہر ہے وہ مجھ سے کہیں چھوٹا تھا اس کے باوجود کچھ اس طرح میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا بچہ اس کے سامنے آن کھڑا ہوا تھا۔

"السلام علیکم بیٹا!" آخر میں نے ہی بولنے میں پہل کی "آپ کون ہیں؟"

"پہلے آپ بتائیے آپ کون ہیں؟" وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "چوکیدار نے اندر اطلاع دیے بغیر آپ کے لیے گیٹ کیوں کھول دیا؟ کیا وہ آپ کو پہچانتا ہے؟" وہ نہایت روانی سے

شستہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

میں نے اس کے تابڑ توڑ سوالوں سے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہاں بیٹا! ظاہر ہے وہ مجھے پہچانتا ہے تبھی اس نے میرے لیے گیٹ کھولا ہے۔ آپ اپنا نام تو بتایئے۔" میرا آگے بڑھ کر اسے پیار کرنے کو جی چاہ رہا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ نہایت ریزرو اور لیے دیے رہنے والا بچہ تھا اس لیے میں پیش قدمی سے باز رہا۔

"عمار" اس نے اختصار سے جواب دیا "اور آپ کون ہیں؟"

"میں افضل چوہدری ہوں راجو۔ میرا مطلب ہے ریاض چیمہ صاحب کا بچپن کا دوست۔" میں نے اپنا تعارف کرایا۔

"اوہ!" اس کی پیشانی پر ہلکی سی شکن آگئی "تو آپ میرے سوتیلے باپ کے دوست ہیں۔" افسوس کہ اس کے لہجے میں بھی راجو کے لیے پسندیدگی کی جھلک نہیں تھی۔

مجھے خفیف سا جھٹکا لگا۔ اس کے الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ وہ شمیم کے سابق اور مرحوم شوہر میاں مسعود کا بیٹا تھا اور شمیم ہی اس کی ماں تھی۔ لیکن شمیم نے ابھی تک مجھے نہیں بتایا تھا کہ اس کا کوئی بیٹا بھی تھا۔

اچانک اندر سے شمیم کی آواز سنائی دی "کون ہے بیٹا؟ کس سے باتیں کر رہے ہو؟" پھر وہ ٹہلنے کے سے انداز میں خود باہر آگئی۔ وہ بالوں کو برش کر رہی تھی۔ مجھے عمار کے پاس کھڑے دیکھ کر ٹھٹکی۔ وہ ایک خوب صورت سے نائٹ گاؤن میں تھی۔ اس کے وجود سے کسی اچھے کلون کی مہک پھوٹ رہی تھی۔

"ارے ... عمار بیٹا چوہدری انکل سے باتیں کر رہا ہے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟" اس نے قریب آکر والہانہ انداز میں عقب سے بچے کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور میری طرف دیکھتے ہوئے بڑی آسودہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اچھا ہوا تم آگئے افی! کہاں رہتے ہو آج کل؟ گھر فون کرو تو فون ہی نہیں ملتا۔ آفس فون کرو تو تم نہیں ملتے۔ کیا چکر ہے بھئی؟ اتنے بڑے آدمی ہو گئے جو اب ہم غریب غربا سے ملنا ہی پسند نہیں کرتے؟ یا ہماری وجہ سے جو تکلیفیں اٹھانا پڑیں ان سے پریشان ہو گئے؟"

میں نے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دیا اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "شمیم! تم نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ تمہارا ایک بیٹا بھی ہے۔"

اس نے جھک کر عمار کا رخسار چوما اور اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر سیدھی ہوتے ہوئے بولی "ابھی تو اتنی بہت سی باتیں باقی ہیں بتانے کو۔ آرام سے بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع ہی کہاں ملتا ہے نئی سے نئی مصیبت تو گھیرے رہتی ہیں ہمیں۔"

پھر وہ بچے کا کندھا تھپکتے ہوئی بولی۔ "بہرحال ... عمار سے غالباً تمہارا تعارف تو ہو ہی گیا ہے۔ یہ ہماری اکلوتی اولاد ہے۔ مری میں ایک بورڈنگ اسکول میں پڑھتا ہے۔ آجکل چھٹیوں میں گھر آیا ہوا ہے۔ اب تو میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی، سب سے بڑا اور سب سے بڑی کشش یہی ہے۔" اس کے چہرے پر نا... خوشیاں رقصاں تھیں۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ... خوشبو کی طرح بچے کے وجود میں سما جائے یا اسے اپنے ... سمو لے۔ نہ جانے کیوں اب تک مجھے کچھ ایسا احساس ہو... جیسے شمیم کبھی محبت کرنے والی ماں نظر نہیں آسکتی لیکن ا... عمار کے عقب میں کھڑے دیکھ کر مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا ... میں اس جیسی محبت کرنے والی مائیں کم ہی پیدا ہوتی ہیں۔

وہ عمار کو میرے بارے میں بتانے لگی۔ "یہ افضل ... ہیں بیٹا جانی! تمہارے پاپا کے لنگوٹیا دوست ... ہمارے ہم ... ہیں۔ دراصل ہم تینوں ایک ہی گاؤں میں رہا کرتے تھے اور ... ہی بہت غریب تھے۔"

عمار کی متانت میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اب بھی دونوں ... پتلون کی جیبوں میں ڈالے کھڑا تھا۔ آنکھوں سے میری کا... طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ان کی گاڑی بتا رہی ہے کہ ا... بہت دولت مند آدمی ہیں۔"

شمیم مسکرائی اور غیر ارادی سے انداز میں ا... خوبصورت بالوں میں برش پھیرتے ہوئے بولی۔ "ہاں بیٹا!... سامنے تو ہم اب بھی غریب غربا ہی ہیں۔"

"فی الحال تو مجھے بھی غربا میں ہی شمار کرو۔" میں نے م... کی کوشش کی۔ "بے گھر ہوں۔ تمہارے ہاں پناہ لینے آیا ہو..."

"چشم ما روشن دلِ ماشاد۔" وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے ... "یہ گھر بھی تمہارا ہے اور گھر والے بھی تمہارے ہیں۔ ... نہ کرنے تم بے گھر ہوئے۔ تم نے تو خود نہ جانے کتنے بے گھروں ... والا بنا دیا ہوگا۔ آؤ ... اندر آؤ نا ... اس وقت تمہارے ... بہت ہی خوشی ہوئی۔ میں تمہارے ہی بارے میں سو... تھی......"

پھر اس نے بچے کو مخاطب کیا۔ "آؤ بیٹا عمار! تم ... آجاؤ۔ ٹھنڈ ہو رہی ہے۔"

"نہیں ... میں ابھی کچھ دیر اور یہیں کھڑا رہوں گا۔ ... چہل قدمی کروں گا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ "اور ... بھول گئے کہ میں مری میں رہتا ہوں جہاں اس سے کہیں زیادہ ... پڑتی ہے۔"

شمیم نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹا لیے اور میری ... دیکھ کر کچھ بے بسی آمیز سے انداز میں بولی ... "مرضی کا ما... اس کی بات پتھر پر لکیر ہوتی ہے۔ اس سے اس کی مرضی کے ... کوئی کام نہیں کرایا جا سکتا۔ لیکن خدا کا شکر ہے اسے ا... بھلے کی تمیز ہے۔ کسی غلط بات پر نہیں اڑتا۔"

بچہ بے نیازی سے منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا۔ میں ا... اندر آگئے۔ ڈائننگ روم میں پہنچ کر شمیم بولی۔ "کھانا کھا...

ہمیں شرفِ میزبانی بخشو گے؟"

"شرفِ میزبانی کا تو معلوم نہیں ... بہرحال کھانا میں کھاؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"ٹھیک ہے۔ پھر یہیں بیٹھ جاتے ہیں۔ ویسے میں کھانا کھا چکی ہوں۔"

"راجو کہاں ہے؟" میں نے ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"آوارہ گردی پر نکلا ہوا ہے۔ ویسے جب سے عمار آیا ہے اس کی شراب نوشی کچھ کم ہو گئی ہے۔ نشے میں دُھت ہو کر گھر نہیں آتا۔" اس نے ملازمہ کو کھانا وغیرہ گرم کرنے کے لیے کہا پھر میرے مقابل بیٹھ کر بالوں کا ڈھیلا سا جوڑا بناتے ہوئے بولی۔ "عمار تمہیں کیسا لگا؟"

"ماشاءاللہ بہت خوبصورت ... بہت پیارا ..." میں نے جواب دیا۔ "اور بے پناہ ذہین بھی معلوم ہوتا ہے۔"

"تمہارے خیال میں کیا وہ غیر معمولی بچہ نہیں ہے؟"

"ہر ماں کو اپنا بچہ غیر معمولی ہی لگتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "وہ ماں جو فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ایک ہاتھ سے اپنے ننگ دھڑنگ بچے کی ناک صاف کرتے ہوئے دوسرا ہاتھ بھیک کے لیے پھیلا رہی ہوتی ہے وہ بھی یہی سمجھتی ہے کہ اس کا بچہ غیر معمولی ہے۔ اس میں کوئی نہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔"

"نہیں ... میں ایک ماں کے نقطۂ نظر سے نہیں پوچھ رہی۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے تیزی سے بولی۔ "میں تو تم سے پوچھ رہی ہوں۔ تمہیں وہ غیر معمولی لگا یا نہیں؟ تمہیں اس میں کوئی خاص بات محسوس ہوئی؟" اس کے لہجے میں ایک عجیب سا اصرار تھا۔

میں ایک لمحے خاموش رہا۔ میں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور آخر کار اعتراف کیا ... "ہاں ... وہ ایک غیر معمولی بچہ ہے۔ اس کی شخصیت میں بے پناہ کشش ہے۔"

شمیم کے چہرے پر شفق کا پرتو تھا یا قوسِ قزح کھل رہی تھی۔ کچھ عجیب سے انداز میں دمک رہا تھا اس کا چہرہ۔ وہ اس وقت ہمیشہ سے زیادہ خوبصورت لگ رہی تھی۔

میں چند لمحے بغور اس کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے گہری سانس لے کر پوچھا "... تو یہ مری میں پڑھتا ہے؟"

"ہاں۔ اور سینئر کیمبرج کرتے ہی میں اسے سوئٹزرلینڈ بھیج دوں گی۔ پڑھ لکھ کر یہ بہت بڑا آدمی بنے گا۔ تمہاری طرح۔" وہ خوابناک انداز میں مسکرائی۔

مجھے ہنسی آگئی۔ 'پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بنے گا!' یہ بھی گویا ہر ماں کا خواب تھا۔ ان چند لفظوں میں دنیا کی ان گنت ماؤں کی زندگی کی کہانیاں سمٹی ہوئی تھیں۔

"مگر میں تو سوئٹزرلینڈ کا پڑھا ہوا نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

"چلو ... یہ پڑھ لے گا تو اور بھی اچھی بات ہوگی ... اس کی

شخصیت میں تم سے کچھ زیادہ نفاست آجائے گی۔ شاید یہ تم سے بھی زیادہ بڑا آدمی بنے۔" روشن خوابوں نے اس کے چہرے کے گرد ایک ہالہ سا بنایا ہوا تھا۔

"ہاں... یہ دعا کرو کہ یہ مجھ سے بھی زیادہ بڑا آدمی بنے۔" میں نے کہا۔ "میں نے تو آج تک خود کو کبھی بڑا آدمی سمجھا ہی نہیں۔ خصوصاً آجکل تو میں خود کو بہت ہی چھوٹا آدمی محسوس کر رہا ہوں۔ کوئی دھکا دیتا ہے اِدھر جا گرتا ہوں۔ کوئی آنکھیں دکھاتا ہے تو اُدھر جا دبکتا ہوں۔ کوئی میری بات پر شک کر رہا ہے۔ کوئی مجھے جھوٹا قرار دینے پر تُلا ہوا ہے۔ کہیں میرے بارے میں تفتیش ہو رہی ہے۔ کہیں مجھ پر زمین تنگ کر دینے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔"

"کیوں مذاق کرتے ہو۔ کس میں جرأت ہے کہ تمہیں دھکا دے یا تمہیں آنکھیں دکھائے۔ میں تمہاری طاقت کے مظاہرے دیکھ چکی ہوں۔" وہ بولی۔

"طاقت کی بھی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض قسم کی طاقتیں، بعض قسم کی طاقتوں کے سامنے کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔" میں نے کہا۔

اچانک اسے گویا یاد آیا۔ "یہ تم بے گھر ہونے اور پناہ لینے کی کیا بات کر رہے تھے؟ یہ کس قسم کا مذاق تھا؟"

"مذاق نہیں، حقیقت تھی۔" میں نے کہا اور اس کے سامنے بھی ایک بار پھر اپنی رام کہانی دُہرائی لیکن ریڈ ڈاٹ کا ذکر گول مول ہی کیا۔ میں نے اسے ستارہ کی موت کے بارے میں بھی بتا دیا۔

اس کے چہرے کی دمک ماند پڑ گئی۔ وہ متوحش سے لہجے میں بولی۔ "کیا واقعی یہ سب کچھ ہو چکا ہے؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔ تمہیں یقین ہے کہ یہ انہی پُراسرار لوگوں کی کارروائیاں ہیں جن کا تم ذکر کر رہے ہو؟ یہ کہیں مختار رفیق کے آدمیوں کے کام تو نہیں ہیں؟"

اس کا ذہن مختار رفیق میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ اس کے لیے وہی بہت خطرناک آدمی تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "مختار رفیق خود زندہ ہوتا تو اس کی بھی اس قسم کی کارروائیوں کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ میں اس کی بوٹیاں چیل کوّوں کو کھلا دیتا۔ اس کے آدمی بے چارے اتنی جرأت کہاں کر سکتے ہیں۔ بدمعاشوں کے یہ ٹولے اپنے سرپرست کے بغیر یتیم یتیم سے ہو جاتے ہیں۔ جن کا میں ذکر کر رہا ہوں یہ تو کچھ اور ہی طرح کے لوگ ہیں۔ ایک عالمی خطرہ ہیں۔"

"تمہارا کسی طرح ان سے پیچھا نہیں چھوٹ سکتا؟" اس نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"چاہتا تو میں بھی یہی ہوں۔ لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ جبکہ میں خود تو کمبل کے قریب بھی نہیں گیا تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اس دوران ملازمہ نے کھانا لگا دیا اور اوولٹین کا ایک گلاس بھی بنا کر لے آئی۔ شیم خود اس سے گلاس لے کر اٹھتے ہوئے بولی۔ "یہ میں ذرا عمار کو دے آؤں۔"

کچھ دیر بعد وہ واپس آئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ "مبارک ہو۔" عمار نے بھی تمہیں پسند کیا ہے۔ کہہ رہا تھا، اس شخص میں کوئی خاص بات ہے ضرور۔ میں نے اس سے کہا۔ 'بیٹا! اس میں ایک نہیں بہت سی خاص باتیں ہیں۔' ویسے تمہارے لیے اعزاز ہونا چاہیے کہ عمار نے تمہارے بارے میں اچھی رائے دی ہے۔ یہ تو ایسی عجیب ٹیڑھی قسم کی چیز ہے کہ اسے تو دنیا میں کوئی پسند ہی نہیں آتا۔"

"اچھا...!" میں نے کھانا کھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ عمار کو دیکھ کر شاید وہ سب کچھ بھول جاتی تھی۔ میری باتیں سن کر چند لمحے پہلے اس پر جو فکرمندی طاری ہوئی تھی، اسے بھی بھول گئی تھی۔ اس کے چہرے کی دمک واپس آ رہی تھی۔

عمار ہی کی بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "بہت اونچا بھی ہے۔ اس عمر میں ہی پورا بقراط لگتا ہے۔ بہت ہی عجیب حلول کر گئی ہے اس میں۔ راجو کو زیادہ پسند نہیں کرتا۔ کہتا ہے۔ 'وہ بطور انسان تو مجھے زیادہ ناپسند نہیں۔ لیکن ان سے رشتہ بہت سخت ناپسند ہے۔ سوتیلے باپ کا بھی بھلا کوئی رشتہ ہے۔ کسی کو کسی کا سوتیلا باپ نہیں ہونا چاہیے۔' اس عمر میں ایسی عجیب و غریب باتیں کرتا ہے کہ عقل چکرا جاتی ہے۔ اپنے اسکول میں یہ جینئس مشہور ہے۔"

"جینئس وہ یقیناً ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "اس کا اندازہ مجھے اس کو دیکھتے ہی ہو گیا تھا۔"

"اچھا...! کیا واقعی تمہیں اندازہ ہو گیا تھا؟" اس نے دلچسپی سے پوچھا۔ بیٹے کے بارے میں کسی ماں کا اس قدر اظہارِ جذبات کا اس قدر والہانہ انداز کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جس ماں کا بیٹا اس سے دور رہتا ہو اور کبھی کبھار گھر آتا ہو، اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے اس کی یہ شدت، اس کا یوں اصرار سے پوچھنا کچھ عجیب لگ رہا تھا۔

"ہاں۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے اسے یقین دلایا۔

وہ جیسے نہال سی ہو گئی لیکن ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کچھ افسردگی سی افسردگی سے بولی۔ "اس کا ذہن اس کی عمر سے کہیں بڑا ہوتا ہے اور کبھی کبھی یہ بات تکلیف دہ سی ہو جاتی ہے۔ جب راجو سے شادی کی تو یہ اتنا سمجھدار تھا کہ میں اسے بہلا ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر یہ چھوٹا یا بے سمجھ ہوتا تو میں اس کے ذہن میں بٹھا دیتی کہ وہی اس کا باپ ہے۔ لفظ "سوتیلا" اس کے ذہن میں پھانس کی طرح چبھتا ہے۔"

"اس لحاظ سے تو یہ اچھی بات ہے کہ وہ اس گھر سے دور ہے۔" میں نے کہا۔

"بورڈنگ اسکول میں بھیجتے وقت تو میرے ذہن میں اس کی بہتر تعلیم کا ہی تصور تھا۔ لیکن اب میں بھی واقعی سوچتی ہوں کہ

مجھے ذرا جدائی کی تکلیف تو ہوتی ہے لیکن اس کا دُہرا فائدہ ہے۔"

میں کھانا کھا چکا تو وہ بولی۔ "تم یقیناً تھکے ہوئے ہو گے۔ فوراً گیسٹ روم میں جا کر سو جاؤ۔ میں تمہارے لیے کسی سلیپنگ گاؤن وغیرہ کا بندوبست کرتی ہوں جو تمہیں کم از کم گزارے کی حد تک فٹ آسکے۔"

"میں راجو کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا۔

"اس کے انتظار میں تو عین ممکن ہے تمہیں صبح ہی ہو جائے۔ ان تکلفات میں مت پڑو اور جا کر سو جاؤ۔ وہ بہ قائمی ہوش و حواس تو اب تمہیں کل دوپہر کو ہی ملے گا۔ اس سے اسی وقت ملنا مناسب رہے گا۔" وہ بولی۔

مجھے اس کا مشورہ معقول محسوس ہوا۔ تھکن واقعی مجھ پر غالب آ رہی تھی۔ حالانکہ مجھے نفیس صاحب کو بھی فون کرنا تھا لیکن میں نے یہ پروگرام بھی صبح پر ڈال دیا۔ ان سے بات ذرا اطمینان سے ہی ہونی چاہیے تھی اور اس گفتگو کے خوشگوار ہونے کا امکان بھی ذرا کم ہی تھا۔

وہ کوئی الگ تھلگ گیسٹ روم نہیں بلکہ ان کے اپنے اور عمار کے بیڈ رومز کے قریب ہی ایک فاضل بیڈ روم تھا جو شیم نے مجھے دے دیا اور اچھا سا ایک صاف ستھرا گاؤن بھی لا دیا۔ میں شاید بستر پر گرتے ہی سو گیا تھا۔

مجھے کچھ یوں لگا جیسے چند منٹ بھی سونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ کوئی بری طرح دروازہ پیٹ رہا تھا۔ ذہن پر غنودگی کا خمار گہرا تھا لیکن میں تیزی سے اٹھ بیٹھا۔ گھڑی عام طور پر سوتے میں بھی میری کلائی پر ہی بندھی رہتی تھی۔ نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں بھی جھلملاتے نشان صاف نظر آ رہے تھے۔ رات کے دو بجنے والے تھے۔

مشین پسٹل تکیے کے نیچے سے نکالتے ہوئے میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ "کون ہے؟"

"اُف! جلدی دروازہ کھولو۔ میں ہوں شیم۔" گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دی۔ میں نے لپک کر دروازہ کھولا۔ شیم شب خوابی کے لباس میں سامنے کھڑی تھی۔ اس کے عقب میں چوکیدار رائفل سنبھالے کھڑا تھا۔

وہ تقریباً ہانپتے ہوئے بولی "وہ جو تمہارے دو آدمی مکان کی نگرانی کرتے ہیں نا... ان میں سے ایک اندر آیا ہے... نیچے کھڑا ہے... پچھلی دیوار پھاند کر آیا تھا۔ شکر ہے چوکیدار کی گولی کا نشانہ بننے سے بچ گیا... خان تو اسے کوئی چور سمجھ کر گولی چلانے لگا تھا۔ وہ فوراً تمہیں بلا رہا ہے۔ کوئی خاص بات ہے۔"

میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا۔ چوکیدار اور شیم میرے پیچھے تھے۔ نیچے احمد کھڑا تھا۔ گن اس کے ہاتھ میں تھی۔ شیم کے گھر کی نگرانی احمد اور آفتاب کرتے تھے۔ رات کو وہ دونوں طرف کی گلیوں میں چکر بھی لگاتے تھے۔ احمد کے بال بکھرے ہوئے تھے، جیکٹ پھٹی ہوئی تھی اور ایک رخسار گویا کسی دیوار سے رگڑ کھایا ہوا تھا۔

تاہم وہ خاصے پُرسکون لہجے میں بولا۔ "سر! ہم نے بلیک برڈ کو پکڑ لیا ہے۔ وہ تو بہت طاقتور ہے سر! بڑی مشکل سے قابو میں آیا ہے۔"

"کہاں ہے؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"پچھلی گلی میں۔" وہ اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ہم نے اسے ٹیلیفون کے کھمبے کے ساتھ باندھ دیا ہے لیکن وہ زیادہ دیر بندھا نہیں رہے گا۔ ہمارے پاس کوئی معقول رسی نہیں تھی۔ نائیلون کی تھوڑی سی ڈوری تھی، اسی سے باندھا ہے۔ بہرحال آفتاب اس پر گن تانے کھڑا ہے۔ آپ چل کر دیکھ لیں اور بتا دیں، اس کا کیا کرنا ہے۔"

میں اس کا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی چل پڑا تھا۔ شیم میرے ساتھ تھی۔ وہ برآمدے کی سیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔ "میں پیچھے کا چھوٹا گیٹ کھول دیتی ہوں۔ دیوار نہیں پھاندنی پڑے گی۔"

"تمہیں وہ کہاں نظر آیا تھا؟" میں نے احمد سے پوچھا۔

"وہ اس کوٹھی کے پچھلی طرف سے پائپ کے ذریعے اوپر چڑھ رہا تھا۔ وہاں بالکل اندھیرا تھا۔ اتفاق سے ہی ہماری اس پر نظر پڑ گئی اور ہم نے بڑی ترکیب سے اسے قابو میں کیا... ویسے وہ قابو میں آنے والی چیز نہیں ہے۔" احمد نے بتایا۔

میرے دل میں امید کی کرن سی ابھری۔ شاید بلیک برڈ ہی کے ذریعے ریڈ ڈاٹ کا کوئی سراغ مل جائے۔ شاید اسی معمے کو سمجھنے میں کچھ مدد مل جائے کہ جب کوئی میرا تعاقب کرتا دکھائی نہیں دیتا تھا تو انہیں میرے ٹھکانے کا علم کیسے ہو جاتا تھا؟ کہیں بلیک برڈ ہی تو اس کا ذریعہ نہیں تھا؟ کہیں اس میں شکاری کتوں جیسی... یا شاید ان سے بھی بڑھ کر کوئی حس تو موجود نہیں تھی کہ وہ ہوا میں میری بُو سونگھتا ہوا ٹھیک اس جگہ پہنچ جاتا تھا جہاں میں موجود ہوتا تھا؟

شیم نے پچھلا گیٹ کھول دیا تھا۔ احمد نے ملگجے اندھیرے میں ایک طرف اشارہ کیا۔ شیم گیٹ پر ہی کھڑی رہی۔ میں اور احمد دوڑتے ہوئے ٹیلیفون کے کھمبے تک پہنچے لیکن وہاں بلیک برڈ کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ البتہ آفتاب گٹر کے قریب ہی چاروں خانے چت پڑا تھا۔ مگر اسے دیکھ کر میرا دل ڈوب سا گیا۔

ملگجے اندھیرے میں بھی میں صاف دیکھ رہا تھا کہ اس کا نرخرہ اس طرح اُدھڑا ہوا تھا جیسے کسی درندے نے چبا ڈالا ہو۔ اس کی جیکٹ اور قمیض کی دائیں آستین ایک ساتھ ہی کندھے پر سے الگ ہو چکی تھی اور کلائی پر پھنسی رہ گئی تھی۔ اس بازو پر بھی اس طرح لمبے اور گہرے زخم پڑے ہوئے تھے جیسے کسی درندے نے منہ میں دبوچ کر جسم سے الگ کرنے کی کوشش کی ہو۔ بازو تو الگ نہیں ہو سکا تھا لیکن اس کوشش میں درندے کے دانت اس کے پورے

بازو کو چیرتے چلے گئے تھے۔ اس کا چہرہ بھی مسخ ہو چکا تھا اور آنکھیں حلقوں سے باہر لٹکی ہوئی تھیں۔ نائیلون کی ڈوری کھمبے کے قریب ہی پڑی تھی اور آفتاب کی گن کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔

احمد کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ وہ بے اختیار زمین پر بیٹھ گیا اور آفتاب کا سر اس نے گود میں رکھ لیا۔ "اوہ خدایا.....! وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔ "یہ کیا ہو گیا..... کاش میں یہاں سے نہ ہٹتا۔"

اس دوران چوکیدار بھی قریب آگیا۔ اس نے ٹارچ سے آفتاب کی لاش پر روشنی ڈالی۔ اس کی خوفناکی یکدم ناقابلِ برداشت حد تک نمایاں ہو گئی۔ تازہ خون ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔

"اوئے..... خانہ خراب کا بچہ.....!" چوکیدار بے اختیار بڑبڑایا اور اس نے ٹارچ فوراً ہی بند کر دی۔

میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل دیا تھا۔ احمد سے یقیناً غلطی ہوئی تھی لیکن غلطی دانستہ نہیں تھی۔ اپنی دانست میں تو اس نے عقل سے ہی کام لیا تھا کہ فوراً مجھے بلانے پہنچ گیا تھا لیکن اس کا ذہن اس امکان کی طرف نہیں گیا تھا کہ بلیک برڈ کے ساتھ شاید کوئی اور بھی موجود ہو۔ شاید وہ آس پاس ہی یا کہیں دور چھپا ہوا ہو۔ مجھے کچھ یقین سا نہیں آرہا تھا کہ تنہا بلیک برڈ نائیلون کی ڈوری کی بندش سے آزاد بھی ہو سکتا تھا اور آفتاب کا یہ حشر بھی کر سکتا تھا جبکہ آفتاب اس پر گن تانے کھڑا تھا۔

میرا دل ابھی پچھتاوے اور دُکھ کی اس دلدل میں ہی پھنسا ہوا تھا کہ پیچھے گھر کی طرف سے ایک چیخ سنائی دی۔ وہ باریک، مدھم اور ادھوری سی چیخ تھی لیکن اس کے بعد ایک تیز نسوانی چیخ سنائی دی۔ میں اور چوکیدار واپس گیٹ کی طرف لپکے۔ احمد نے بھی آفتاب کی لاش کو وہیں چھوڑ دیا اور ہمارے پیچھے آیا۔

شمیم جسے ہم گیٹ پر کھڑی چھوڑ آئے تھے، اندرونی دروازے کی طرف دوڑی جارہی تھی۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑتے ہوئے پوچھا۔ "یہ چیخیں کس کی تھیں؟"

"ایک چیخ تو عمّار کی معلوم ہوتی تھی... دوسری شاید ملازمہ کی تھی۔" وہ رُکے بغیر بولی۔ وہ اس طرح بدحواس تھی جیسے اس کے پیروں تلے انگارے بچھے ہوں۔ اسی لیے بگولے کی طرح دوڑی جارہی تھی۔ مجھ سے آگے رہتے ہوئے ہی اس نے بیڈ رومز کی طرف جانے والی سیڑھیاں عبور کیں۔

اوپر پہنچ کر میں نے دیکھا شمیم کی ملازمہ ٹیرس پر بدحواس کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ نیچے لان کی طرف اشارہ کیے جارہی تھی لیکن اس کے مُنہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ نیچے لان پر کچھ نہیں تھا لیکن سامنے کا گیٹ تھوڑا سا کھلا نظر آرہا تھا۔ اوپر عمّار کے بیڈ روم کا دروازہ بھی کھلا نظر آرہا تھا اور اس کا ایک سلیپر دروازے میں پڑا تھا۔

میں نے کمرے میں جھانکا اور میرے اندیشے کی تصدیق ہو گئی۔ عمّار کمرے میں نہیں تھا لیکن اس کے بستر کی چادر زیادہ بے ترتیب نہیں تھی اور سلیپر دروازے پر پڑا ہونے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خود ہی اٹھ چکا تھا اور سلیپر پہن کر غالباً دروازے پر پہنچ چکا تھا جب اسے اٹھا لیا گیا۔

اٹھانے والا جو کوئی بھی تھا غالباً پہلے چھت پر پہنچا تھا اور وہاں سے ٹیرس پر کودا تھا۔ میرے بیڈ روم کا دروازہ تو کھلا ہی تھا لیکن عین اسی وقت غالباً عمّار بھی اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر باہر آنے لگا تھا۔

میں نے ملازمہ کو جھنجوڑتے ہوئے پوچھا۔ "کون لے گیا ہے عمّار کو؟"

جھنجوڑنے سے وہ گویا قدرے ہوش میں آئی اور وحشت زدہ انداز میں ہکلائی۔ "وہ جی..... پتا نہیں کیا بلا تھی..... ریچھ تھا... بن مانس تھا... چھوٹے بابو شاید شور کی وجہ سے اٹھ کر باہر آرہے تھے... میں بھی نیچے سے آئی تھی..... وہ جناور میرے سامنے اوپر چھجے سے کود کر یہاں آیا... اور چھوٹے بابو کو بغل میں دبا کر نیچے والا چھجا پکڑ کر لان میں کود گیا اور وہاں سے گیٹ کھول کر نکل گیا..."

احمد نے صرف اتنا ہی سُنا اور اُلٹے قدموں سیڑھیوں سے چل دیا۔ شمیم کا چہرہ کفن کی طرح سفید ہو چکا تھا۔ وہ دیوانگی آمیز انداز میں مجھے گھسیٹتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف لے گئی اور گھٹی سی آواز میں بولی۔ "تمہیں ہر حال میں عمّار کو واپس لانا ہے..... ہر حال میں... سن لیا تم نے؟"

"ہاں... میں جا رہا ہوں۔ تم میرا گریبان تو چھوڑو....." میں نے نرمی سے اس کے ہاتھ ہٹانے کی کوشش کی۔

لیکن وہ اسی دیوانگی آمیز انداز میں گویا تکرار شروع کرتے ہوئے بولی۔ "تمہیں ہر حال میں عمّار کو واپس لانا ہو گا ورنہ میں زندہ نہیں رہوں گی... تمہیں ہر حال میں اسے لانا ہو گا۔ اس لیے کہ وہ اصل میں تمہارا ہی بیٹا ہے..."

"کیا بکواس ہے..." مجھے یکدم جھٹکا سا لگا۔ "میں نے تو ابھی شادی ہی نہیں کی۔ میرا بیٹا کہاں سے آگیا؟"

"یہ کہانیاں دُہرانے کا وقت نہیں ہے..." وہ بدستور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ "ایک ماں سے بہتر کون یہ بات جان سکتا ہے کہ اس کے بچّے کا باپ کون ہے؟ وہ تمہارا اپنا بیٹا ہے... جاؤ اسے واپس لاؤ..."

پھر یکدم اس کی آواز چیخ میں تبدیل ہو گئی۔ "جاؤ..." اس نے میرا گریبان چھوڑ کر مجھے دھکا دیا اور خود تیورا کر گر پڑی۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھی!

میں نے شمیم کو اس کے حال پہ چھوڑا اور دوبارہ تیزی سے سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ پورچ میں کھڑی ہوئی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر میں نے اسے اسٹارٹ کیا۔ اس دوران چوکیدار نے پُھرتی سے گیٹ کھول دیا تھا۔ میں نے اسے اس تیزی سے گلی میں نکالا کہ ٹائر بُری طرح چرچرا اُٹھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ احمد اور آفتاب کی گاڑی اسی طرف کی گلی میں کھڑی ہو گی، اسی لیے احمد اس طرف آیا تھا۔ لیکن میرے گاڑی باہر لانے تک اس کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ وہ یقیناً کسی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ لیکن کس طرف؟ یہ اندازہ لگانا میرے لیے مشکل تھا۔

صرف ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد میں نے قسمت پر بھروسا کرتے ہوئے گاڑی گلی کے اسی سرے کی طرف بڑھا دی جو مجھے سامنے نظر آرہا تھا۔ اس طرف ایک چھوٹا سا گراؤنڈ اور اس کے پار ایک چھوٹی سی مارکیٹ تھی۔ جب میں شمیم کے ہاں آیا تھا تو میں نے احمد کی گاڑی اسی طرف کھڑی دیکھی تھی۔

میں موڑ عبور کر کے گراؤنڈ کے قریب سے گزرا ہی تھا کہ ریڈیو پر سگنل موصول ہوا۔ میں نے بٹن دبا کر خفیہ خانہ کھولا اور مائیک نکالا۔ احمد ناہموار سانسوں کے درمیان کہہ رہا تھا "گاڑی مجھے نظر آگئی ہے سر! وہ چمپینزی یقیناً بچّے کو لے کر اسی گاڑی میں گھسا ہے... ابھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ گاڑی میں کتنے آدمی ہیں... گاڑی ایم ایم عالم روڈ پر مُڑ گئی ہے اور مین بلیوارڈ کی طرف جارہی ہے۔"

"تم تعاقب جاری رکھو احمد!" میں نے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں کہا "میں آرہا ہوں۔ گاڑی کسی قیمت پر نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے۔"

"میں اگر زندہ رہا تو نظر سے اوجھل نہیں ہوگی سر!" وہ بولا۔

بلاشبہ حیرت کی بات تھی کہ وہ لوگ ایم ایم عالم روڈ تک پہنچ چکے تھے۔ احمد مجھ سے ایک آدھ منٹ پہلے ہی روانہ ہوا تھا۔ مجھے ایک آدھ منٹ کے لیے شیم نے الجھا لیا تھا۔ میں ابھی غالب مارکیٹ والے موڑ پر بھی نہیں پہنچا تھا۔ اس سے ان دونوں گاڑیوں کی رفتار کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ میں نے رفتار ایک دم بڑھائی۔ گاڑی ایک طیارے کے سے انداز میں آگے بڑھی۔ دل تو اس وقت یہی چاہ رہا تھا کہ وہ گاڑی نہیں' پرواز کرنے والی ہی کوئی چیز ہوتی اور میں چشم زدن میں اس گاڑی تک جا پہنچتا جس کے بارے میں احمد نے اطلاع دی تھی۔

مشکل یہ تھی کہ جن سڑکوں سے میں گزر رہا تھا' وہ بہت چھوٹی تھیں اور تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد موڑ تھے جن کی وجہ سے میں اپنی گاڑی سے صحیح کام نہیں لے سکتا تھا۔ ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ تھام کر ایسا ہی ایک بے ہودہ سا موڑ کاٹتے ہوئے میں نے احمد سے پوچھا "گاڑی کا نمبر' ساخت اور رنگ وغیرہ؟"

"فاصلہ کافی ہے.... ابھی میں صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا۔ لیکن گاڑی بہرحال کیڈلک ہے اور رنگ سیاہ معلوم ہوتا ہے۔" احمد نے جواب دیا۔

احمد بڑی ٹویوٹا میں تھا لیکن ٹویوٹا اور کیڈلک کا بہرحال کوئی مقابلہ نہیں تھا۔ تاہم مجھے امید تھی کہ احمد اسے نکلنے نہیں دے گا۔ زیادہ امکان یہی تھا کہ کیڈلک والے کھلی سڑکوں کا رخ کریں گے۔ تنگ گلیوں اور چھوٹی سڑکوں پر انہیں بھی وہی مسائل پیش آسکتے تھے جو مجھے درپیش تھے۔ زیادہ چھوٹی گلیوں میں بڑی گاڑیاں زحمت معلوم ہوتی ہیں۔

"وہ مین بلیوارڈ پر لبرٹی کی طرف مڑ گئے ہیں سر!" احمد نے اطلاع دی۔

میں اب ایم ایم عالم روڈ پر مڑ چکا تھا۔ سڑک اب خاصی کشادہ تھی۔ میں نے رفتار کچھ اور بڑھائی تو گاڑی ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ ابھی صبح صادق کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ سڑک پر ٹریفک نہیں تھی۔ چند ہی لمحوں میں' میں بھی مین بلیوارڈ پر جا پہنچا لیکن وہ اب بھی میری نظر کی رینج میں نہیں آئے تاہم احمد اپنی اور ان کی پوزیشن کے بارے میں مسلسل اطلاع دیے جا رہا تھا۔

ماڈل ٹاؤن والا راؤنڈ اباؤٹ کراس کرنے کے بعد وہ سرخ بتیاں میری نظر میں آئیں' جو ایک دوسرے کے آگے پیچھے کبھی ذرا دائیں اور کبھی بائیں طرف کو لہرا رہی تھیں۔ آگے والی سرخ بتیاں جو یقیناً کیڈلک کی ٹیل لائٹس تھیں' گویا ہوا میں تیر رہی تھیں۔

احمد کی سفید ٹویوٹا اب مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی لیکن جس رفتار سے میری گاڑی جا رہی تھی اس میں مجھے سڑک کے دونوں طرف کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ غیر ارادی طور پر میرے دانت پر دانت جمے ہوئے تھے۔ میں گاڑی کے بند شیشوں پر شائیں شائیں کرتی ہوا کی رگڑ محسوس کر سکتا تھا۔

یہ فلمی کار چیزنگ نہیں تھی' ٹائروں کی چرچراہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گاڑیاں ایک دوسرے سے رگڑ نہیں کھا رہی تھیں اور نہ ہی دوسری گاڑیوں سے بال بال بچتی ہوئی یا ان کے آپس میں ٹکرا جانے کا سبب بنتی ہوئی گزر رہی تھیں۔ یہ ایک نہایت خاموش تعاقب تھا لیکن موت گویا ہمارے ساتھ پرواز کر رہی تھی' ہمارے کانوں میں سرگوشیاں کر رہی تھی۔

فلمی کار چیزنگ میں کاریں قلابازیاں کھا جاتی ہیں' ان کے بعض حصے ٹوٹ کر دور جا گرتے ہیں لیکن کار سوار صرف مٹی میں لتھڑے' اپنی چوٹیں سہلاتے باہر آجاتے ہیں لیکن حقیقی زندگی میں ایسا نہیں ہوتا۔ مجھے معلوم تھا اس رفتار پر اندازے کی ایک ذرا سی غلطی گاڑی کو چکنا چور کر سکتی تھی اور کار سوار کو ملغوبے میں تبدیل کر سکتی تھی۔ گاڑی کے ٹکڑے بعد میں الگ ہو کر دور جا کر گرتے ہیں' اس سے پہلے گاڑی میں موجود شخص کی ہڈیاں نہ جانے کتنے ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکی ہوتی ہیں۔

احمد اور اس کی گاڑی دونوں ہی نے کمال کر دیا تھا۔ وہ اگلی گاڑی کے کافی قریب پہنچ چکا تھا اور اس کی ہیڈ لائٹس سے روشنی اس حد تک ضرور اس پر پڑ چکی تھی کہ میں نے بھی اچھی طرح اسے دیکھ لیا تھا۔ وہ سُرمئی رنگ کی کیڈلک ہی تھی۔ اس کی نمبر پلیٹ بھی لاہور ہی کی تھی۔

اس رفتار پر ریڈیو پر احمد سے بات جاری رکھنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ میں نے مائیک کندھے اور گردن کے درمیان دبا رکھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ احمد کی گاڑی کیڈلک سے آگے نہیں نکل سکتی تھی۔ اس کا یہی کارنامہ کچھ کم نہیں تھا کہ وہ بعد میں روانہ ہو کر اس کے قریب آن پہنچا تھا اور اب اسے آگے نہیں نکلنے دے رہا تھا۔

میں نے مائیک پر احمد سے کہا "میں اس سے آگے نکلنے کی کوشش کرتا ہوں' تم پیچھے ہی رہنا' اس طرح اسے دونوں طرف سے گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سر!" احمد کی گھٹی گھٹی سی آواز سنائی دی۔

ابھی میں نے گاڑی کو ذرا سائیڈ پر لانے کے لیے اسٹیئرنگ وہیل کو بال برابر حرکت ہی دی تھی کہ سُرمئی کیڈلک کی کھڑکی سے اژدہے کی طرح ایک گن کی نال آہستگی سے باہر آئی۔ دوسرے ہی لمحے رات کے سکوت میں ہوا کی شائیں شائیں گویا چیخوں میں تبدیل ہو گئی۔ وہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ تھی جس نے سکوت کا سینہ چاک کر دیا تھا۔ احمد کی گاڑی پر سب مشین گن سے برسٹ مارا گیا تھا۔

اس رفتار پر گاڑی کو لہرانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر اندازے کی ذرا سی غلطی گاڑی کو کہیں سے کہیں لے جا سکتی تھی۔ لیکن احمد نے کمال مہارت سے گاڑی کو لہرایا۔ اس کے باوجود میں نے شیشہ ٹوٹنے کا چھناکا سنا۔ اس کی گاڑی' رکی نہیں' تاہم رفتار کم ہو گئی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ وہ زندہ تھا۔ یہ اندازہ نہیں ہو سکا کہ شیشہ کہاں کا ٹوٹا تھا۔

احمد کی گاڑی کے ساتھ ہی میں نے بھی گاڑی کو لہرایا تھا۔ لیکن میرا مقصد کچھ اور تھا۔ میرے خیال میں وہی لمحات ان سے آگے نکلنے کے لیے مناسب ترین تھے جب ان کا ہدف احمد کی گاڑی تھی اور ان کی تمام تر توجہ اسی طرف تھی۔ میری گاڑی مکمل طور پر بلٹ پروف تھی' اس کے باوجود میں اس عالم میں ان کے قریب سے گزرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ عین میری گاڑی کو تاک کر اس پر برسٹ مارتے۔ وہ بہرحال مشین گن تھی' اتنے قریب سے پورا برسٹ مارے جانے پر شیشوں کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا البتہ یونہی' اُچٹتی ہوئی دو چار گولیوں سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

لیکن میں گاڑی ان سے آگے نکال لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ میں احمد کی گاڑی کو اوورٹیک کر چکا تھا اور کیڈلک کو اوورٹیک کرنے ہی والا تھا کہ وہ بُری طرح لہرائی۔ شاید وہ کوشش کر رہے تھے کہ مجھے آگے نکلنے کے لیے راستہ نہ دیں اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس دوران دوسرا برسٹ بھی نہیں مارا گیا تھا۔ حالانکہ گن کی نال کھڑکی سے باہر ہی تھی۔

دوسرے ہی لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ کیڈلک کے لہرانے میں شاید اس کے ڈرائیور کے ارادے کو دخل نہیں تھا کیونکہ اس کے بریک بُری طرح چرچرائے تھے۔ ٹائروں نے اس طرح سڑک پر رگڑ کھائی کہ ہیڈ لائٹس کی روشنی میں دھوئیں کی لکیریں فضا میں بلند ہوتی دکھائی دیں۔ اگر میں نے بروقت اپنی گاڑی کو کنٹرول نہ کیا ہوتا تو وہ کیڈلک پر چڑھ گئی ہوتی' بہت بُرا ایکسیڈنٹ ہوتا اور شاید ہم سب کی زندگیوں کا افسانہ وہیں ختم ہو جاتا۔

کیڈلک خاصی دور تک بُری طرح لہرا کر آخرکار کچے میں اُتر گئی اور ایک قلابازی بھی کھا گئی۔ کیڈلک کا قلابازی کھا جانا آسان نہیں تھا لیکن کچی زمین میں ایسے لمبے چوڑے گڑھے موجود تھے کہ اس صورتِ حال میں کیڈلک ایک آدھ نہیں' کئی قلابازیاں بھی کھا سکتی تھی۔

میں نے گاڑی سڑک کے کنارے چھوڑتے ہوئے انجن بند کیے بغیر باہر چھلانگ لگائی۔ مشین پسٹل میرے ہاتھ میں تھا اور میری کوشش تھی کہ کیڈلک والوں کے سنبھلنے سے پہلے ان کے سر پر جا پہنچوں لیکن میری یہ کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ میں اندھا دھند نشیب میں چھلانگ لگانے ہی لگا تھا کہ سب مشین گن کا برسٹ آیا۔ ایک بار پھر قسمت نے ہی میرا ساتھ دیا تھا کہ میں کسی گولی کی زد میں آنے سے بچ گیا۔ شاید کیڈلک کے اُلٹنے کی وجہ سے سب مشین استعمال کرنے والے کے حواس کچھ ٹھکانے نہیں تھے۔ گولیاں میرے سر سے ذرا اونچی ہی گزری تھیں۔

میں فوراً پیچھے گھوم گیا اور سینے کے بل گاڑی کی اوٹ میں لیٹ گیا۔ میں نے احمد کو دیکھنے کے لیے سر کچھ اور نیچا کر کے گاڑی کے نیچے سے جھانکا۔ احمد کی گاڑی کچھ دور پیچھے موجود تھی' اس کی ہیڈ لائٹس بھی آن تھیں لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ احمد کہاں تھا اور کیا تدبیر کر رہا تھا۔

کیڈلک کی ہیڈ لائٹس بُجھ چکی تھیں لیکن میری اور احمد کی گاڑی کی ہیڈ لائٹس آن ہونے کی وجہ سے ویرانے کے کچھ حصے میں روشنی موجود تھی۔ میں نے عمّار کی چیخ سُنی اور میرے دل میں جیسے کسی نے خنجر کی نوک چبھو دی۔ دوسرے ہی لمحے میں نے کیڈلک کے عقب سے اسی بدبخت بلیک برڈ کا بھیانک سا ہیولا نمودار ہوتے دیکھا۔

اس نے ایک بازو سے عمّار کو بغل میں دبایا ہوا تھا اور اس کے دوسرے ہاتھ میں کوئی طاقتور گن تھی۔ اس نے اندھا دھند میری گاڑی کی طرف فائر کیے۔ ایک آدھ گولی شاید میری گاڑی کی چھت سے ٹکراتی ہوئی گزری۔ وہ اس کا نتیجہ دیکھے بغیر دوسری طرف بھاگا' میں اس کا مقصد سمجھ گیا۔

وہ چاہ رہا تھا کہ اس کے ساتھی ہمیں اُلجھائے رکھیں اور وہ عمّار کو لے کر اندھیرے میں ویرانے کی طرف کہیں نکل جائے۔

عمّار اس کی بغل میں بُری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ مجھے تمام تر خدشات اور خطرات کے باوجود یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ ٹھیک ٹھاک تھا۔ وحشت سے بھی مفلوج نہیں تھا۔ وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ چمپینزی کے قابو میں نہ رہے لیکن اس جسیم اور طاقتور چمپینزی نے اسے گُڈے کی طرح بغل میں دبا رکھا تھا۔

عمّار جس انداز میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا اس کی وجہ سے میرا بلیک برڈ پر گولی چلانا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن جونہی وہ ذرا میری سیدھ میں آیا میں نے اس کی مجہول سی ٹانگوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔ وہ بری طرح متحرک تھا لیکن گولی اس کی ٹانگ میں لگ ہی گئی۔ وہ بری طرح لڑکھڑایا۔

عمار کے ہاتھ میں شاید کوئی چیز تھی۔ اسی لمحے میں نے اسے اس طرح ہاتھ چلاتے دیکھا جیسے وہ خنجر سے بلیک برڈ کی آنکھ پر وار کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی کوشش شاید کامیاب ہوگئی۔ گو کہ وہ خنجر تو یقیناً نہیں تھا لیکن اس وقت خنجر سے زیادہ کار آمد رہا تھا۔ ٹانگ پر میرے پسٹل کی گولی لگنے سے تو بلیک برڈ صرف لڑکھڑایا تھا۔ مگر عمار نے اس کی آنکھ پر جو وار کیا تھا اس پر اس کے حلق سے ایک بھیانک چیخ نکلی جو انسانی اور حیوانی چیخ کا ایک عجیب و غریب مرکب تھی۔ اس نے عمار کو چھوڑ دیا مگر اس کے سر پر اپنی گن کے دستے سے وار کرنے کے لیے ہاتھ بلند کیا۔ میں نے ایک بار پھر فائر کیا۔ گن اس کے ہاتھ سے نہ جانے کہاں جا گری۔ وہ عمار کو وہیں چھوڑ کر اپنی لنگڑاہٹ کے باوجود اتنی تیزی سے ملگجی روشنی کی حدود سے نکل کر اندھیرے میں غائب ہوا کہ ایک بار پھر مجھے اس کو زندہ پکڑنے یا ہلاک کرنے کی حسرت ہی رہ گئی۔

مجھے سخت پچھتاوا محسوس ہوا۔ ایک ثانیے کے لیے وہ بالکل صاف طور پر میرے ٹارگٹ پر رہا تھا۔ میں چاہتا تو اس کے ہاتھ سے گن نکالنے کے لیے فائر کرنے کے بجائے عقب سے اس کے جسم میں گولیاں اتار سکتا تھا لیکن میں نے وہ موقع گنوا دیا تھا۔ یہ سب کچھ صرف تین یا چار سیکنڈ میں ہوا تھا۔

اس دوران سب مشین گن والے کو میری پوزیشن کا اندازہ ہوگیا اور اس نے ایک برسٹ اور مارا۔ سڑک سے کچھ پتھر اڑے۔ مجھے وہ جگہ چھوڑنا پڑی۔ اب مجھے بھی اندازہ ہوگیا کہ سب مشین گن والا کیڈلک کی ڈکی کی طرف تھا۔

لیکن اسی لمحے عمار نے ایک خطرناک غلطی کی۔ آخر بچہ ہی تھا۔ اس نے جتنی جرأت اور ہوش مندی کا مظاہرہ کیا تھا وہی ناقابلِ یقین تھا۔ اس کی عمر کا کوئی اور بچہ ہوتا تو شاید ان حالات میں خوف کے مارے اپنی جگہ سے حرکت بھی نہ کرپاتا۔ وہ کیڈلک سے کافی فاصلے پر تھا، چاہتا تو ادھر اُدھر کسی بھی طرف بھاگ پڑتا اور اندھیرے میں پہنچ جاتا۔ اندھیرے میں وہ زیادہ محفوظ رہتا اور صورتِ حال واضح ہونے پر سامنے آجاتا یا کسی اور طرف، یہاں سے دور نکلنے کی کوشش کرتا۔ لیکن ظاہر ہے وہ کوئی پیشہ ور یا ماہر جنگجو نہیں تھا۔

بلیک برڈ سے نجات پاتے ہی وہ یکدم میری گاڑی کی طرف آنے کے لیے دوڑ پڑا۔ اس کے لیے اس نے کیڈلک سے دور رہنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ لیکن شاید قدرت جو کررہی تھی، بہتر ہی کررہی تھی۔ اس صورت میں ممکن تھا کہ سب مشین گن والا اسے ہاتھ سے نکلتے دیکھ کر برسٹ مار دیتا لیکن اب اس نے عمار کو قریب سے گزرتے دیکھ کر ہاتھ بڑھا کر پکڑنے کی کوشش کی۔ عمار اب غالباً کسی کے قابو میں آنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس نے اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش کے دوران لات بھی چلائی۔

سب مشین گن بھی خاصی بھاری ہوتی ہے۔ وہ شخص اب یقیناً ایک ہاتھ سے گن سنبھال کر دوسرے ہاتھ سے عمار کو گھسیٹ رہا تھا۔ اس کوشش میں وہ ایک لمحے کے لیے گاڑی کی اوٹ سے ذرا نکل آیا۔ وہ لمحہ ایسا تھا کہ عمار بھی زد پر نہیں تھا اور یہ صرف اس لیے ممکن ہوا تھا کہ میں جگہ بدل چکا تھا۔ میں نے اس سنہرے موقعے سے فائدہ اٹھانے میں تاخیر نہیں کی اور میرے پسٹل کی گولی اسی لمحے اس کا بھیجا چاٹ گئی۔ وہ شخص اچھل کر گاڑی کے پیچھے کہیں گر گیا اور سب مشین گن بھی ڈکی کے اوپر سے پھسلتی ہوئی ٹائر کے قریب آگری۔

لیکن اس شخص کے گرنے کے ساتھ عمار بھی بری طرح لڑکھڑا گیا اور گاڑی کے عقب میں گر پڑا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس کی گھٹی گھٹی سی آواز سنی۔ میں سمجھا اسے چوٹ لگ گئی ہے۔ میں نے صرف احتیاطاً ایک لمحے توقف کیا تھا ورنہ شاید میں اپنی گاڑی کے عقب سے نکل کر اس کی طرف روانہ ہوچکا ہوتا۔

وہ ایک لمحے کی تاخیر میرے لیے بڑی کار آمد رہی۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ گاڑی کے عقب میں شاید اب کوئی دوسرا شخص موجود نہیں، ورنہ وہ بھی ضرور کوئی کارروائی کرتا، اپنی موجودگی کا ثبوت دیتا۔ میرا خیال تھا کہ اگر کوئی ہوگا بھی تو شاید وہ گاڑی کے اندر ہوگا اور غالباً کسی چوٹ وغیرہ کی وجہ سے بے ہوش ہوچکا ہوگا۔ کم از کم کسی متحرک شخص کی موجودگی کے قطعاً کوئی آثار نہیں تھے۔

لیکن وہاں نہ صرف ایک خبیث موجود تھا بلکہ اس کے پاس ریوالور یا پسٹل بھی تھا۔ وہ بہت ہی تحمل سے گھات لگائے بیٹھا تھا اور غالباً کسی بہت ہی کار آمد لمحے کا منتظر تھا۔ عمار لڑکھڑا کر گاڑی کے پیچھے گرا تو اس شخص کو وہ لمحہ میسر آگیا۔ عمار دوبارہ مجھے دکھائی دیا تو اس عالم میں تھا کہ عقب سے اس کی گردن اس شخص نے بازو کے شکنجے میں بالکل اسی طرح دبوچی ہوئی تھی جس طرح میں اپنے شکار کی گردن دبوچتا تھا۔

دوسرے ہاتھ سے اس نے عمار کی کنپٹی پر گن کی نال رکھی ہوئی تھی۔ مزید چالاکی اس نے یہ کی تھی کہ عمار کو بالکل گاڑی کے ساتھ چپکا دیا تھا یعنی اپنے اور گاڑی کے درمیان سینڈوچ بنا رکھا تھا تاکہ وہ ہاتھ پاؤں نہ مار سکے۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ لڑکا نڈر اور پھرتیلا تھا۔ اس نے اسے اچھی طرح قابو میں کیا تھا۔ وہ خود عمار کی آڑ لیے ہوئے تھا۔

رات کے سناٹے میں اس کی بھاری اور کھردری آواز گونجی "ٹھیک ہے دوستو! اب گن پھینک کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر آرام سے سامنے آجاؤ۔ میں صرف تین تک گنوں گا، اس کے بعد گولی لڑکے کی کھوپڑی سے گزر جائے گی۔ ایک... دو۔"

اس نے خاصی تیزی سے گننا شروع کیا تھا۔ میں نے مشین پسٹل سامنے سڑک پر اس طرح پھینکا کہ وہ دیکھ سکے۔ اس نے مجھے سوچنے کے لیے ایک لمحہ بھی نہیں دیا تھا اور اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ عمار کو گولی مارنے میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرے گا بلکہ شاید وہ مار چکا ہوتا لیکن پھر اس نے اسے چارے کے طور پر استعمال کرتے ہوئے مجھے اور احمد کو کمین گاہوں سے نکالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ایک جوا تھا جس میں اسے جیتنے کے قوی امکانات نظر آئے ہوں گے۔

میں دونوں ہاتھ اٹھا کر آگے آگیا جہاں روشنی ذرا زیادہ تھی۔ وہ غصیلے انداز میں چلایا "دوسرا کہاں ہے؟ اسے بھی کہو باہر آئے۔"

"دوسرا کون؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

وہ ایک گندی سے گالی دیتے ہوئے بولا "اتنے بھولے چوزے مت بنو۔ میں سفید گاڑی والے کی بات کررہا ہوں۔"

گالی ایک انگارے کی طرح میری سماعت کو مجروح کرتی چلی گئی لیکن میں نے اسے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "اس کا مجھے پتا نہیں۔ وہ شاید برسٹ لگنے سے زخمی ہوگیا ہے، شاید گاڑی میں ہی زخمی یا بے ہوش پڑا ہو۔ میں نے اسے اترتے نہیں دیکھا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے گویا الجھن میں پڑ گیا پھر بولا "سفید گاڑی کی طرف گھوم جاؤ اور آرام سے گاڑی تک جاؤ۔ بھاگنے کی ضرورت نہیں۔ بھاگے تو لڑکے کو گولی ماردوں گا۔ گاڑی کا اِدھر والا دروازہ کھولو اور اگر تمہارا ساتھی اندر موجود ہے تو اسے کھینچ کر باہر نکالو۔ اگر نہیں ہے تو جہاں بھی ہے اسے بلاؤ۔ اگر وہ گن پھینک کر سامنے نہ آیا تو لڑکے کو ختم سمجھنا۔"

میں نپے تلے قدم اٹھاتا گاڑی تک پہنچا اور دروازہ کھول کر میں نے اندر جھانکا۔ مجھے اپنے دل میں طمانیت کی ایک لہر ابھرتی محسوس ہوئی۔ احمد گاڑی میں نہیں تھا۔ وہ اگر گاڑی میں یا آس پاس کہیں نہیں تھا تو پھر کسی ایسی جگہ رہی تھا جہاں اس کا ہونا بہت کار آمد ثابت ہونے والا تھا۔ اگر وہ ابھی تک پانسا پلٹنے کے لیے نمودار نہیں ہوسکا تھا تو مجھے معاملے کو کچھ دیر کے لیے اور لٹکانے کی ضرورت تھی۔

میں نے اپنے لہجے میں تاسف پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "یہ تو زخمی پڑا ہے۔ خون بہت بہہ گیا ہے، کہیں مر نہ گیا ہو۔" میں دروازے کے سامنے ہی سیدھا کھڑا ہوگیا۔

وہ بے تابی سے چلایا "تو پھر وہاں کھڑے کیا کررہے ہو سُور کے بچے! میں نے کہا تھا اسے گھسیٹ کر باہر نکالو۔"

"اِدھر سے نہیں نکلے گا۔ وہ لڑھک کے اسٹیئرنگ وھیل کے نیچے پھنس گیا ہے۔ دوسری طرف چلا جاؤں؟ اُدھر کے دروازے سے نکلے گا۔" میں نے سعادت مندی سے اجازت طلب کی۔

"جلدی کرو۔ لڑکے کی زندگی عزیز ہے تو چالاکی مت دکھانا اور ہاں ——" وہ نہ جانے کیا کہنے لگا تھا... مگر "اوغ" کی آواز کے ساتھ خاموش ہوگیا۔ میں نے آہستگی سے مڑ کر دیکھا۔ کیڈلک کے عقب سے اس کا ہیولا غائب ہوچکا تھا۔ صرف عمار گاڑی کی چھت پر دونوں بازو اور سر ٹکائے اس بری طرح ہانپ رہا تھا کہ میں اتنے فاصلے سے بھی اس کی آواز سن سکتا تھا۔

پھر گاڑی کے عقب سے احمد کا سر نمودار ہوا اور وہ بہ آوازِ بلند بولا "کھیل ختم ہوگیا سر! آجائیے۔"

میں تیزی سے دوڑ کر کیڈلک کے عقب میں پہنچا اور سب سے پہلے میں نے بے تابی سے عمار کو گود میں اٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں ٹٹول کر دیکھے۔ وہ ٹھیک ٹھاک تھا، صرف اس کے چہرے پر دو تین خراشیں دکھائی دے رہی تھیں اور وہ گردن سہلاتے ہوئے ذرا کھانس رہا تھا۔ وہ مشفقانہ لہجے میں گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا "آپ پریشان نہ ہوں چوہدری انکل! میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"خدا کا شکر ہے۔" میں نے بے اختیار کہا۔ لفظ "انکل" گویا ایک سوالیہ نشان کی طرح میری نظروں کے سامنے جھولنے لگا۔ اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ میرا بیٹا تھا۔ ابھی میرے ذہن میں اس انکشاف سے چلنے والی آندھیاں نہیں تھمی تھیں۔ لیکن غنیمت تھا کہ ابھی مجھے اس کے بارے میں سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا تھا۔

جس شخص نے چند لمحے پہلے عمار کو دبوچا ہوا تھا، وہ چاروں خانے چت، ناہموار زمین پر پڑا تھا اور احمد اس کے پہلو سے اپنا خنجر نکال کر اسی کے کپڑوں سے صاف کررہا تھا۔ وہ بہت بھیانک سی ساخت کا خنجر تھا۔ انسان کے جسم میں اتارنے کے بعد واپس باہر کھینچا جاتا تھا تو جسم کو اُدھیڑتا ہوا باہر آتا تھا۔

"شکر ہے کہ تم نے گاڑی سے اتر کر میرے ساتھ ہی مورچہ بندی کی کوشش نہیں کی۔" میں نے احمد سے کہا۔

وہ خنجر کو بہت اچھی طرح صاف کرکے ٹانگ سے بندھی نیام میں رکھتے ہوئے بولا "آپ کا ہی تو بتایا ہوا اصول ہے کہ جب آدھی طاقت مورچہ بندی میں لگی ہوئی ہو تو باقی آدھی طاقت کے ساتھ پیچھے سے آکر شب خون مارنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

میں نے عمار کو گود سے اتارتے ہوئے کہا "قدرت نے ہماری بڑی مدد کی۔ اگر یہ گاڑی قابو سے باہر نہ ہوتی تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکتے تھے۔ سب مشین سے فائرنگ جاری رہتی تو ہم تعاقب جاری نہیں رکھ سکتے تھے۔"

عمار کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے ہلکی سی کھانسی کے ساتھ بولا "قدرت نے مجھے وہ تدبیر سجھائی تھی جس کی وجہ سے گاڑی قابو سے باہر ہوئی۔"

"کیا مطلب؟" میں نے وضاحت چاہی۔

عمار بولا "میں نے اس رفتار سے چلتی گاڑی میں پوری طاقت سے بریک پر پاؤں مارا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا تھا "الّو کے پٹھو! میں تو مروں گا لیکن ساتھ تم سب کو لے مروں گا۔""

میں نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا "تم اگلی سیٹ پر تھے؟"

"جی ہاں۔ وہ بن مانس کا بچہ جب مجھے گھر سے اٹھا کر بھاگا تو

باہر آکر جلدی سے اس گاڑی میں ڈرائیور کے پاس ہی بیٹھ گیا تھا۔" وہ بتانے لگا پھر اس نے پاؤں سے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو چند لمحے پہلے اس کی کنپٹی پر ریوالور رکھے ہوئے تھا "یہ آدمی ڈرائیونگ کر رہا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بڑا زبردست ڈرائیور تھا۔ ورنہ جس طرح اچانک میں نے بریک پر پاؤں مارا تھا' ہمارا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔"

وہ جھرجھری سی لے کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "چمپینزی مجھے دبوچے پسنجر سیٹ پر بیٹھا تھا لیکن میری ٹانگیں آزاد تھیں۔ سچی بات ہے شروع شروع میں تو میں بہت خوف زدہ ہو گیا تھا لیکن جب میرے حواس ٹھکانے آئے اور مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ کوئی ہمارے پیچھے آرہا ہے تب میں نے سوچا کہ اپنی سی کچھ نہ کچھ کوشش کرنی چاہیے۔ وہ آٹومیٹک بڑی گن والا آدمی پچھلی سیٹ پر تھا۔ اس کے ساتھ تو میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔"

"تم نے جو کچھ کر لیا وہی بہت ہے۔ تمہارا ایک بہت بڑا کمال یہ ہے کہ تم نے اپنے آپ کو بلیک برڈ... میرا مطلب ہے اس چمپینزی سے چھڑا لیا۔ میں تمہارے تعاقب میں آ نہیں سکتا تھا کیونکہ میرے راستے میں سب مشین گن حائل تھی جو گولیاں اگل رہی تھی۔ اگر چمپینزی تمہیں لے کر نکل جاتا تو میں تمہاری ماں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "تم نے اس کی آنکھ میں کیا مارا تھا؟"

"کیڈلک کی چابیاں۔" اس نے چابیوں کا ایک گچھا ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے مجھے دکھایا "جب گاڑی قلابازی کھا رہی تھی تو میں نے چابیاں نکال لی تھیں۔ میرے سوا شاید سب بوکھلا گئے تھے۔ میں چمپینزی کی گود میں بالکل سکڑ سمٹ گیا تھا تاکہ چوٹ لگے تو اسی منحوس کو لگے... اور یہی ہوا۔ الٹا ہونے کے بعد اس کا سر توپ کے گولے کی طرح ڈیش بورڈ سے ٹکرایا۔ شاید اسی لیے وہ پہلے کی طرح چست و چالاک نہیں رہا تھا۔"

پھر عمار نہایت بزرگانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "لیکن وہ تھا کوئی بہت ہی خاص قسم کا چمپینزی۔ اسے انسانوں کی طرح ہر بات کی سمجھ تھی۔ بلکہ وہ اشاروں سے ڈرائیور کو کچھ ہدایات بھی دے رہا تھا۔ گن والے کو فائرنگ شروع کرنے کا حکم بھی اسی نے اشارے سے دیا تھا۔ مزے کی بات یہ کہ وہ کالا ٹریک سوٹ بھی پہنے ہوئے تھا اور اس کے جسم سے جانوروں جیسی بُو کے بجائے کلون کی مہک اٹھ رہی تھی۔"

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ وہ انگریزی اور اردو' دونوں ہی زبانوں میں نہایت روانی سے اچھے خاصے بزرگانہ انداز میں باتیں کرتا تھا۔ مجھے اس کی عمر کے ساتھ یہ متانت' یہ بزرگی گراں گزر رہی تھی۔ اس کے چہرے پر بچپنے کا بھولپن بہرحال موجود تھا اور اس کی تمام تر سنجیدگی و بُردباری کے باوجود اس کا چہرہ اس کی بزرگی کا ساتھ نہیں دیتا تھا۔ ویسے بھی میرے خیال میں ایک بچے کو بچہ ہی ہونا چاہیے تھا۔ میری معلومات اور اندازوں کے مطابق اسے کسی قسم کے المناک حالات سے بھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ تو پھر اس میں یہ سنجیدگی' یہ متانت' یہ بزرگی کہاں سے آگئی تھی؟

وہ میرا ہاتھ پکڑ کر ہلاتے ہوئے گویا مجھے خیالات کی دنیا سے باہر لاتے ہوئے بولا "انکل! آپ مجھے بتائیں نا... آخر یہ کیا چکر تھا؟ یہ کون لوگ تھے؟ کیوں مجھے اٹھا کر لے جا رہے تھے؟"

"یہ تو ابھی مجھے خود بھی معلوم نہیں بیٹا!" میں نے اس کا گال تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"خیر مجھے کچھ اندازہ تو ہو گیا ہے۔" وہ تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا "یہ لوگ یقیناً مجھے تاوان کے لیے اغوا کر رہے ہوں گے۔ انہیں معلوم ہو گا کہ میری ممی مجھ سے بہت پیار کرتی ہیں اور چاہے ان کے پاس رقم ہو یا نہ ہو لیکن میری خاطر وہ بڑی سے بڑی رقم کا انتظام کر کے دے دیں گی۔ چاہے انہیں اپنی ہر چیز ہی کیوں نہ بیچنی پڑے۔"

پھر وہ کندھے اچکا کر بولا "خیر... یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں۔ ہر بچے کی مما اس سے اتنا ہی پیار کرتی ہے۔"

وہ صرف ماں کا ذکر کر رہا تھا باپ کا نہیں۔ باپ کا پیار شاید اسے ملا ہی نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں چھپاتے ہوئے بولا "لیکن کمال ہے! اغوا کرنے والوں نے اب جانوروں کو بھی ٹرین کرنا شروع کر دیا۔ اتنا سمجھدار چمپینزی تو میں نے فلموں میں بھی نہیں دیکھا۔ انہوں نے یقیناً اسے اس وقت سے ہی ٹرین کرنا شروع کیا ہو گا جب وہ بہت چھوٹا ہو گا۔"

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "کاش ایسا ایک چھوٹا سا چمپینزی مجھے بھی مل سکتا میں اسے بہت شاندار ٹریننگ دیتا۔"

اس کی یہ بات سن کر مجھے قدرے اطمینان ہوا۔ مجھے اس میں اس کی عمر کے لڑکے کی ہلکی سی جھلک دکھائی دی تھی۔ میں نے سر جھٹک کر کہا "بیٹا! تم نے تو مجھے باتوں میں الجھا لیا۔ میرا دل چاہتا ہے' تمہاری باتیں سنتا ہی جاؤں لیکن یہ موقع باتیں کرنے کا تو نہیں ہے نا۔"

میں اور احمد جھک کر قریب سے ذرا اچھی طرح ان دونوں آدمیوں کا جائزہ لینے لگے جو ہمارے ہاتھوں مر چکے تھے۔ دونوں ہی دیسی معلوم ہوتے تھے۔ دونوں لمبے تڑنگے اور مضبوط جسم کے تھے۔ جو احمد کے ہاتھوں خنجر سے ہلاک ہوا تھا اس کی عمر تیس کے قریب تھی۔ اس کے چہرے پر گھنی داڑھی تھی۔ اس کے بال بھی لمبے لمبے اور گھونگریالے تھے۔

دوسرا جو سب مشین گن سے فائرنگ کر رہا تھا' چالیس سے اوپر کا تھا۔ اس کی صرف گھنی مونچھیں تھیں۔ وہ جینز جیکٹ میں تھا جبکہ دوسرا جو کم عمر اور داڑھی والا تھا عمدہ قسم کی شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔

جینز جیکٹ والے کی جیب میں ایک ریوالور اور پرس موجود تھا۔ پرس میں بڑے نوٹوں کی صورت میں خاصی رقم تھی جبکہ شلوار قمیص والے کی جیبوں میں یونہی بے پروائی سے نوٹ ٹھنسے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر اس کی جیبوں میں پرس والے سے کہیں زیادہ رقم تھی لیکن ان کی جیبوں میں ایسی کوئی ایک چیٹ تک نہیں تھی کہ جس سے ان کی شناخت کے سلسلے میں کوئی سراغ مل سکتا۔

میں نے اور احمد نے کافی تیزی سے گاڑی کی بھی تفصیلی تلاشی لی لیکن اس میں بھی گاڑی کی رجسٹریشن بک تک نہیں تھی۔ نمبر پلیٹ دونوں طرف ضرور موجود تھی لیکن اس کے جعلی ہونے کا بھی امکان تھا۔ میں نے مایوسی سے ٹھنڈی سانس لی اور گاڑی سے نکل آیا۔ احمد ڈکی کی بھی اچھی طرح تلاشی لے چکا تھا۔ میں نے گاڑی کے فرش پر بچھی ہوئی میٹ تک اٹھا کر دیکھی تھی' کہیں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو ہماری نظر میں کارآمد ہوتی۔ احمد بھی کچھ مایوس نظر آرہا تھا۔ ہمارا جان ہتھیلی پر رکھنا شاید بیکار ہی رہا تھا۔ دو لاشیں بہرحال ہمارے سامنے تھیں۔ ان کے بارے میں کوئی سراغ سامنے آنے کا انتظار کیا جا سکتا تھا۔

"ان لاشوں کا کیا کرنا ہے؟" احمد نے پوچھا۔

"فی الحال ہر چیز کو جوں کا توں رہنے دو۔ کاٹھ کباڑ سمیٹنے کا کام اب ہمیں دوسروں کے لیے چھوڑنا ہے۔" میں نے بے زاری سے کہا اور سڑک پر آکر اپنا مشین پسٹل اٹھا لیا۔ عمار میرے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ ہر چیز کا بڑے دانشورانہ انداز میں مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کی قوتِ مشاہدہ واقعی بہت تیز معلوم ہوتی تھی۔

میں اس کا ہاتھ تھام کر اپنی گاڑی کی طرف لے چلا تو وہ اچانک ہی بولا "انکل! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس چمپینزی سے پہلے بھی واسطہ پڑ چکا ہے۔ آپ اس کا نام بھی لے رہے تھے۔ بلیک برڈ۔ کیا واقعی اس کا یہی نام ہے؟"

اس کا ذہن ابھی تک چمپینزی میں ہی پھنسا ہوا تھا۔ اس انسان نما جانور نے یقیناً اسے بہت متاثر کیا تھا۔ غنیمت تھا کہ ابھی تو اس نے اس کی شخصیت کی جھلک ہی دیکھی تھی۔ بہت سے پہلو تو ابھی اس کے علم میں ہی نہیں تھے ورنہ اس کے تجسس اور اشتیاق کا نہ جانے کیا عالم ہوتا۔

میں نے جھوٹ بولنا مناسب نہ سمجھا اور ملائمت سے کہا "ہاں بیٹا! مجھے اس سے واسطہ پڑ چکا ہے۔ لیکن تم اس کے بارے میں زیادہ مت سوچو۔ وہ بڑی خبیث چیز ہے۔ بلکہ تم ان چکروں میں ہی دماغ مت کھپاؤ اور اس واقعے کو بھی بھولنے کی کوشش کرو۔ یہی سمجھ لو کہ تم نے ایک بے تکا خواب دیکھا تھا۔"

وہ گویا میری طفلانہ تجویز پر ہنس دیا اور ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا "میں اب ایسا بچہ بھی نہیں ہوں کہ حقیقت کو خواب سمجھنے کی کوشش کروں۔"

گاڑی کے قریب پہنچ کر میں نے آہستگی سے احمد سے کہا "تم

جا کر آفتاب کی لاش اٹھواؤ اور شمیم کے مکان کی نگرانی اسی طرح جاری رکھنے کا بندوبست کرو۔ بلکہ اب نگرانی کچھ سخت کر دو۔ اگر اب کسی مشکوک آدمی یا جانور کو ادھر اُدھر سے گھر میں گھسنے کی کوشش کرتے دیکھو تو بلا تامل گولی مار دو۔ زندہ پکڑنے کے چکر میں نہ پڑو۔"

احمد نے سر ہلایا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ عمار بڑے غور سے اسے جاتے دیکھتا رہا پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "ویسے آپ لوگ ہیں بڑے کمال کے آدمی۔ بالکل کمانڈو لگتے ہیں۔ آپ نے کہاں سے یہ سب کچھ سیکھا ہے؟ کہاں سے ٹریننگ لی ہے؟"

"ہمیں حالات نے سب کچھ سکھایا ہے بیٹا!" میں نے اسے گاڑی میں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہم نے اس کے لیے کہیں جا کر داخلہ نہیں لیا تھا۔"

"آپ مجھے نہیں بتانا چاہتے تو نہ بتائیں انکل! لیکن فلمی قسم کے ڈائیلاگ بول کر بہلانے کی کوشش نہ کریں۔" وہ ڈرا دینے والی حد تک سنجیدگی سے بولا۔ پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "اصل میں مجھے بھی بڑا شوق ہے کہ میں ان سب کاموں میں مہارت حاصل کروں۔ کوئی میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکے اور میں بڑے بڑے بدمعاشوں کی ایسی تیسی کر دوں۔ لیکن افسوس کہ مجھے اس قسم کے کام سیکھنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ مما کی تو بس ایک ہی نصیحت ہے کہ بیٹا دل لگا کر پڑھو' اعلیٰ تعلیم حاصل کرو اور بڑے آدمی بنو۔ مجھے ٹائی لگا کر' سوٹ پہن کر دفتروں میں بیٹھنے والے بڑے آدمی اچھے تو لگتے ہیں مگر کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے۔ میں تو بس مما کی خوشی کی خاطر پڑھ رہا ہوں۔ اب میں ان کا حکم تو نہیں ٹال سکتا نا۔ ان کی خوشی کا تو میں ہر حال میں خیال رکھنا چاہتا ہوں۔ لیکن پھر بھی میں پڑھائی میں زیادہ محنت نہیں کرتا۔ معلوم نہیں کیسے ہر مرتبہ فرسٹ آجاتا ہوں۔ اب میں نے اسکول کے رائفل شوٹنگ کلب میں داخلہ لیا ہے۔ چند ہی دن میں میرا نشانہ بہت اچھا ہو گیا ہے۔

زرا اپنی گن تو دکھایئے گا۔" اس نے بڑے اطمینان سے گن لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں بیٹا! رہنے دو۔" میں نے ملائمت سے کہا "تمہاری ممّا ٹھیک کہتی ہیں۔ فی الحال تم اپنی پوری توجہ تعلیم کی طرف رکھو۔ مار دھاڑ میں پڑنے کی تمہیں کوئی ضرورت ہی نہیں۔ اور اگر ضرورت پڑی بھی۔ تو ابھی بہت عمر پڑی ہے۔ ابھی تمہاری عمر ہی کیا ہے۔ مجھے تمہاری اس سعادت مندی پر خوشی ہوئی ہے کہ تم ممّا کی خوشی کا خیال رکھتے ہو۔"

"مجھے رکھنا ہی چاہیے۔" وہ متانت سے بولا "میرا دنیا میں ممّا کے سوا ہے ہی کون؟"

میرے دل میں کہیں خفیف سی ایک ٹیس ابھری۔ وہ میرے محسوسات سے بے خبر' اپنی دھن میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا' "اور پھر وہ بھی تو مجھ سے اتنی محبت کرتی ہیں۔ میری خاطر وہ دنیا کی ہر چیز چھوڑ سکتی ہیں۔ حتّیٰ کہ میرے سوتیلے باپ کو بھی چھوڑ سکتی ہیں لیکن میں یہ بات ان سے کہتا نہیں۔ مجھے بھلا کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ آخر وہ ایک عورت ہیں اور عورت کو قدم قدم پر کسی ساتھی کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ شوہر کے بغیر عورت لنڈوری لنڈوری سی لگتی ہے' اس لیے میں سوچتا ہوں' ان بے چاروں کی جوڑی جیسی بھی ہے' اسے چلنے دو۔ ویسے بھی وہ بے چارہ مجھے کون سی تکلیف پہنچاتا ہے۔ اپنی دنیا میں مگن رہتا ہے۔ اس کی عادتیں بس ذرا معززانہ نہیں ہیں لیکن میرے ساتھ اس کا سلوک اچھا ہی ہے۔ بلکہ وہ میری کچھ اسی طرح عزت کرتا ہے جیسے کسی بزرگ کی کرنی چاہیے۔"

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے کہا "وہ ٹھیک ہی کرتا ہے۔ اسے اسی طرح تمہاری عزت کرنی چاہیے۔"

اس کی باتیں سُن کر مجھ پر چودہ طبق روشن ہوئے جا رہے تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی قبل از وقت بزرگی کو خوبی سمجھوں یا کوئی "مینوفیکچرنگ فالٹ" تصور کروں۔

میں نے گاڑی چلاتے ہوئے کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل نارمل اور پُرسکون تھا۔ یہ تمام باتیں وہ نہایت سرسری انداز میں کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بنتا ہرگز نہیں تھا' اپنے آپ کو ذہین ظاہر کرنے کے لیے شعوری طور پر یا کوشش سے اس طرح کی باتیں نہیں کرتا تھا۔ یہ اس کی فطرت تھی۔

اچانک میں نے غیر ارادی سے انداز میں پوچھا "عمّار! میں تمہیں کیسا آدمی لگا ہوں؟"

سوال میرے منہ سے نکل تو گیا لیکن مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ پوچھ نہ بیٹھے "آپ کو یہ سوال کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی؟"

لیکن اس نے یہ نہیں کہا اور تنقیدی سے انداز میں میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "آدمی آپ ٹھیک ہی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خاصی زبردست چیز ہیں۔ لیکن آپ کو شاید کچھ پُراسرار بننے کا شوق ہے۔ آپ کسی پر بھی پوری طرح نہیں کھلتے۔ ہر کسی کے لیے اپنی شخصیت کی ایک کھڑکی کھولتے ہیں' کسی پر دوسری۔ کسی کے سامنے آپ کی شخصیت کا ایک پہلو رہتا ہے' کسی کے سامنے دوسرا۔ آپ کے قریب ترین لوگوں میں بھی شاید کوئی آپ کو پوری طرح نہ جانتا ہو۔ ایم آئی رائٹ سر؟"

اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ مجھے واقعی اس لڑکے سے ہلکا سا خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ جب وہ اپنے گھر کے برآمدے میں کھڑا تھا اور میری اس پر پہلی نظر پڑی تھی' اسی لمحے میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ وہ ایک غیر معمولی لڑکا تھا اور میرے دل کا کہا درست ثابت ہو رہا تھا۔

ہم گھر پہنچے تو شمیم نہ صرف ہوش میں آ چکی تھی بلکہ گیٹ سے لگی کھڑی تھی۔ اس کی حالت دیوانوں سے مشابہ تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے' آنکھوں میں وحشت تھی اور ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ پیروں میں سلیپر تک نہیں تھے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہی وہ ہفتوں کی بیمار دکھائی دینے لگی تھی۔ شدتِ جذبات بھی کیا اثر دکھاتی ہے۔

گاڑی گیٹ کے قریب پہنچتے ہی وہ گاڑی سے تقریباً لٹک گئی حالانکہ وہ یقیناً اگلی سیٹ پر عمّار کو بیٹھے دیکھ چکی تھی۔ صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ میں نے پورچ میں گاڑی روکی تو دروازہ کھلتے ہی وہ عمّار کو باہر کھینچ کر اس سے لپٹ گئی۔ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں وہ یہی تکرار کیے جا رہی تھی "میرے بچے! تو کہاں چلا گیا تھا۔ تو کہاں چلا گیا تھا۔"

عمّار نے اپنے مخصوص بزرگانہ انداز میں اس کی کمر پر تھپکی دی اور ہلکی سی ناپسندیدگی کے ساتھ بولا "ممّا! میں نے کتنی بار آپ سے کہا ہے' اپنے جذبات پر ذرا قابو رکھا کریں۔ آپ سے تو کچھ بعید نہیں کہ گلی یا بازار میں بھی خود کو تماشا بنا لیں۔"

"ہاں بیٹا! میں ماں ہوں نا۔ مائیں تو اولادوں کی خاطر ہر جگہ تماشا بن جاتی ہیں۔" وہ آنکھیں پونچھتے ہوئے بولی "البتہ باپ اپنے آپ پر قابو رکھتے ہیں۔ یا پھر تم جیسی اولاد۔ میں نے صرف یہی پوچھا تھا کہ تو کہاں چلا گیا تھا؟"

"میں خود تو نہیں گیا تھا ممّا! مجھے تو وہ عجیب و غریب قسم کے چمپینزی اٹھا کر لے گیا تھا۔" اس نے اطمینان سے کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا "اگر انکل نہ آتے تو آپ کا پیارا بیٹا باقی عمر شاید کسی چمپینزی فیملی میں ہی گزارتا اور کچھ عرصے بعد درختوں کی شاخیں پکڑ کر لٹکتا ہوا آپ سے ملنے آتا۔"

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہوتا۔" وہ اسے دوبارہ سینے سے چمٹاتے ہوئے بولی "یہاں میں اتنی سی دیر میں نہ جانے کتنی مرتبہ مری اور کتنی مرتبہ زندہ ہوئی ہوں۔"

عمّار میری طرف دیکھ کر کندھے اُچکاتے ہوئے بولا "دیکھ رہے ہیں آپ؟ ممّا یوں تو دنیا کے ہر معاملے میں بڑی مردمار عورت ہیں۔ بس صرف میرے معاملے میں بالکل بچّہ ہیں۔"

"تم چونکہ خود اپنے معاملے میں بچّہ نہیں ہو اس لیے تمہاری ممّا کو تمہارے معاملے میں بچّہ بننا پڑتا ہے۔" پھر میں نے اس کی کمر تھپکی دیتے ہوئے کہا "اب تم اپنے کمرے میں جاؤ اور شاور لے کر کپڑے تبدیل کر لو۔ اگر نیند آ سکے تو کچھ دیر کے لیے سو جاؤ ورنہ ناشتا وغیرہ کر لینا۔"

ایک ملازمہ اسے لے جانے لگی تو شمیم ایک لمحے کے لیے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی "تم ٹھیک تو ہو نا؟ تمہیں کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں لگی؟"

"نہیں ممّا! میں بالکل ٹھیک ہوں۔" وہ جاتے جاتے مسکرا کر بولا "جس کے ساتھ آپ جیسی ماں کی دعائیں ہوں اسے کوئی نقصان بھلا کیسے پہنچ سکتا ہے۔" اس نے ماں کا ہاتھ چُوما اور رخصت ہو گیا۔ اس کے انداز میں پیار سے زیادہ عقیدت تھی۔

"تم اس کے بارے میں اتنی حساس ہو۔ میں حیران ہوں کہ تم نے اسے پڑھنے کے لیے دوسرے شہر کیسے بھیجا ہوا ہے!" میں نے کہا۔

"اپنی زیادہ حساسیّت کی وجہ سے ہی تو بھیجا ہوا ہے۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "یہاں رہتا تو ہر پَل میرے دل کو زیادہ دھڑکا لگا رہتا۔ وہاں رہتا ہے تو دل کو کچھ قرار سا رہتا ہے۔ بہت اچھا اور محفوظ ماحول ہے وہاں کا۔ مجھے یہ اطمینان سا رہتا ہے کہ میں نے اپنی ذمّے داری اپنے سے بہتر لوگوں کو سونپی ہوئی ہے۔ یہاں رہتا ہے تو گویا یہ میری ذمّے داری رہتا ہے۔"

نشست گاہ میں پہنچ کر وہ ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی "میں سوچتی ہوں' اگر تم اس وقت اسے واپس نہ لاتے تو میرا کیا بنتا؟ تب میں تو دیواروں سے سر ٹکرا کر جان دے دیتی۔" پھر اس نے جھرجھری سی لے کر پوچھا "کچھ بتاؤ تو سہی' کیا ہوا۔ تم اسے کیسے واپس لائے؟"

میں نے اسے سب کچھ بتا دیا۔ ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بھی ابھی تک میں نے جو کچھ اسے بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا' وہ بھی بتا دیا۔ میں اب کوئی بھی بات راز رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس پر یہ بھی واضح کر دیا کہ میں جہاں بھی پناہ لوں گا' اس گھر کے مکینوں کو کتنے خطرات لاحق ہو جائیں گے۔ میری وجہ سے کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ ستارہ محض مجھے پناہ دینے کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو چکی تھی۔

عمّار کے خیر و عافیت سے واپس آ جانے کے بعد شمیم کے چہرے پر زندگی کی جو تازگی' خوشی کا جو رنگ بحال ہوتا دکھائی دیا وہ ایک بار پھر گویا مفقود ہونے لگا مگر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد وہ فیصلہ کُن اور مضبوط لہجے میں بولی "لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ شمیم ان باتوں سے گھبرا کر پیچھے ہٹ جائے گی۔ یہ گھر تمہارا اپنا ہے۔ تم جب تک چاہو یہاں رہو' بلکہ اب تو میں تمہیں ضد کر کے یہاں رکھوں گی۔ تم پیسے والے ہو' یوں تو تمہارے بیسیوں ٹھکانے ہوں گے لیکن تم ہمارے ہاں رہو گے تو یہ ہمارے لیے اعزاز ہو گا۔ ہم پر تمہارا مالی قرض بھی بہت زیادہ ہے اور محبتوں کا قرض بھی۔ مالی قرض تو کبھی نہ کبھی اُتر ہی جائے گا لیکن محبتوں کا قرض شاید کبھی نہ اُترے۔"

"میں قرض چڑھا کر اتنی جلدی مع سود وصول کرنا نہیں چاہتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں نہیں چاہتا کہ قرض اُتارنے میں تم' راجو یا کوئی اور جان سے گزر جائے۔ محبتوں کا قرض بھی انسان پر اتنا بھاری نہیں ہونا چاہیے۔ انسان ہی نہ رہے تو محبتیں کس کام کی؟"

"نہیں' ایسا ہرگز نہیں ہو گا۔ تم کہیں نہیں جاؤ گے۔ یہ تو محبت کرنے والے لوگوں کی اَنا کا سوال ہے۔ اور محبت کرنے والوں کی اَنا بڑی ظالم چیز ہوتی ہے' سب کچھ فنا کر دیتی ہے۔ اب تو تمہیں ہر حال میں یہیں رہنا پڑے گا۔"

اس معاملے میں اس نے بھی بالکل اسی موڑ پر ٹھہرے ہونے کا فیصلہ کیا تھا جس پر ستارہ آ گئی تھی۔ ستارہ کو میں کھو چکا تھا۔ اب شمیم' راجو یا عمّار تینوں میں سے کسی کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "اگر تمہیں عمّار کا ڈر ہے تو اسے میں چُپکے سے راتوں رات واپس مری بھیج دیتی ہوں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ یہ مری میں پڑھتا ہے اور وہاں حفاظتی انتظامات بہت اچھے ہیں' نیم فوجی سا ادارہ ہے۔"

"نہیں' نہیں! اس کی ضرورت نہیں۔ وہ چند چھٹیاں گزارنے آیا ہے' اسے گزارنے دو۔" میں نے قدرے الجھن کے سے عالم میں کہا "اور ہاں' یہ تم نے اسے میرا بیٹا کہاں سے بنا ڈالا؟"

وہ مسکرائی اور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "ایک ماں کی گواہی کے بعد بھی تمہیں اس میں شک ہے کیا؟"

"پھر بھی....؟" میں نے نظروں ہی نظروں میں اسے ٹٹولا۔

"اس کے لیے تمہیں کتابِ ماضی کا ایک ورق پلٹنے کی کوشش کرنی چاہیے۔" اس نے میز پر پڑے باکس سے ایک سگریٹ نکال کر سلگائی اور دھوئیں کے لہروں کو تکتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی "محبتوں' رفاقتوں' حماقتوں اور کسی کے وجود سے جُڑی ہوئی پُرمسرت ساعتوں کے بارے میں مردوں کی یادداشت کچھ کمزور ہوتی ہے۔"

"نہیں' اتنی بھی کمزور نہیں میری یادداشت۔ لیکن ....." میں نے کہا۔

"مجھ سے سننا چاہتے ہو تو" وہ بات کاٹتے ہوئے بولی "میں یاد دلاؤں گی تو تمہیں ابتدا سے یاد دلاؤں گی' جب تم میری راہوں میں کھڑے ہوا کرتے تھے لیکن میں تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں

دیکھتی تھی۔ تم ہی نہیں اور بھی کئی تھے جو میری نظرِ التفات کے منتظر رہتے تھے۔ تمہیں یاد ہوگا میں اس زمانے میں برقع پہنا کرتی تھی۔"

"میں کیسے بھول سکتا ہوں وہ زمانہ۔" میں نے کراہ کر کہا۔

"مجھے حیرت ہے کہ برقعے میں رہنے اور پورا نقاب گرائے رکھنے کے باوجود لڑکوں کو کس طرح میری خوب صورتی کا اندازہ ہو جاتا تھا۔"

"وہ عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ جوانی اور خوب صورتی سات پردوں میں بھی چھپی ہو تو اس پر نظر جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"خیر تو سب دل کا نذرانہ لیے کھڑے رہتے تھے لیکن میں نے اپنی جوانی کو ہی نہیں، اپنے جلووں تک کو بہت سنبھال سنبھال کر بہت سینت سینت کر رکھا۔ میں سمجھتی تھی، میں نے کسی کی طرف محبت کی نظر سے دیکھ بھی لیا تو میرے باپ کی عزت پر حرف آجائے گا۔ لیکن اسی باپ نے ایک دن یہاں شہر لا کر میری بات چیت... بلکہ یوں کہو کہ سودا، میاں مسعود سے طے کر دیا تھا جس کی بیٹیاں عمر میں مجھ سے بڑی تھیں۔ لیکن اس کے پاس دولت بہت تھی۔"

"ہاں، مجھے وہ سب یاد ہے۔ یہ جاننے کے بعد تم نے ایک مدت کی بے رُخی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک روز اچانک ہی خط لکھ کر چپکے سے مجھے تنہائی میں اپنے پچھلے کمرے میں بلا لیا تھا۔ اس رات تم نے مجھ پر کمرے کا ہی نہیں، اپنی تمام تر نوازشات کا دروازہ بھی کھول دیا تھا اور بعد میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھیں۔" میں نے رگ و پے میں ایک بھولی بسری سی سنسنی کی لہر محسوس کرتے ہوئے کہا۔

وہ سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر گہری سانس لے کر بولی، "میں اس عمر میں بھی کیسی فلسفی ہوا کرتی تھی۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ اس جہنم میں جانے سے پہلے کم از کم ایک گناہ کر لینا تو میرا حق بنتا تھا تاکہ میں زندگی بھر اپنے آپ کو سمجھاتی رہوں کہ میرے ساتھ جو کچھ ہوا وہ میرے گناہ کی سزا ہے۔"

"ہاں مجھے تمہارا کہا ہوا ایک ایک لفظ، اس رات کی ایک ایک بات اچھی طرح یاد ہے۔ میں بھولا ہوا تھا لیکن یہاں جب تم سے دوبارہ ملاقات ہوئی تو برسوں پہلے کی وہ سب باتیں یاد آگئی تھیں۔" میرے لہجے میں یکدم ہی تھکن سی دَر آئی۔

وہ بھی سر جھکاتے ہوئے بہت ہی دھیمی سی آواز میں بولی "عمار اندھے فلسفوں کی گود میں سسکتی ہوئی اسی رات کی پیداوار ہے۔ اس کے چند دن بعد میاں مسعود سے میری شادی ہوگئی تھی۔ میاں مسعود نے عمار کو اپنی ہی اولاد سمجھا اور بہت محبت سے پالا۔ ویسے بھی سنا ہے بڑھاپے کی اولاد زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ شاید وہ اولاد بھی اسی زمرے میں آتی ہے جس پر صرف اپنی اولاد کا دھوکا ہوتا ہے۔ مگر ان باتوں کو ایک ماں سے بہتر کون جانتا ہے۔"

"سمجھ تو میں بھی گیا تھا۔" میں نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو ہتھیلیوں سے مسلتے ہوئے کہا "لیکن مجھے کچھ عجیب سا لگ رہا ہے۔ یقین نہیں آرہا تھا۔"

"میں شاید یہ بات تمہیں کبھی نہ بتاتی۔ خوف و دہشت اور دیوانگی کے سے ان لمحوں میں اچانک ہی منہ سے نکل گیا۔ ورنہ کچھ تھا اور جس طرح بات نبھ رہی تھی، وہی سب کے حق میں اچھا تھا۔" وہ بولی۔

"ہاں، یہ انکشاف میرے لیے اچھا ثابت نہیں ہوگا۔ میری روح، میری شخصیت پر ایک بوجھ بن جائے گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

وہ گویا اپنی شگفتگی کو آواز دے کر زبردستی مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "کیوں... ؟ کیا تمہیں اچھا نہیں لگ رہا؟ اس نوجوانی میں ہی پلے پلائے بیٹے کے باپ بن گئے ہو۔ پانچ سات سال بعد شاید وہ تم سے بھی نکلتے ہوئے قد کاٹھ کا مالک ہو۔ اگر کبھی پاس پاس کھڑے ہوئے تو دیکھنے والے شاید تمہیں چھوٹا بڑا بھائی سمجھیں۔"

میرے دل میں نہ جانے کیوں ایک عجیب سا تاسف، ایک بے عنوان سی اداسی پھیل گئی تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دھوکے... لاعلمی اور غلط فہمی کی کڑیوں پر مشتمل ایک عجیب سی زنجیر تیار ہوگئی ہے۔ میں اب تک اس حقیقت سے لاعلم تھا۔ میاں مسعود مرحوم زندگی بھر دھوکے میں رہے۔ راجو غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ اور ابھی یہ سلسلہ نہ جانے کہاں تک چلے۔ اس دردانگیز وصالِ نیم شب کی کہانی اتنا طول کھینچے گی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے تک میں عمار کو گہری نظر سے دیکھ رہا تھا تو ایک عجیب سی مسرت، ایک عجیب سا احساس تفاخر دل میں اُمنڈا چلا آرہا تھا لیکن اب میں اس صورتِ حال کے بارے میں سوچ رہا ہوں تو دل ڈوبا سا جارہا ہے۔"

"تمہیں اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اگر تم کہو تو میں عمار کو یہ بات بتا دوں گی؟" وہ اجازت طلب سے انداز میں بولی۔

"خدا کے لیے... یہ غضب نہ کر دینا۔" میں اُچھل پڑا "وہ ایک انمول لڑکا ہے۔ تم اس کی شخصیت کے تاج محل کو ریزہ ریزہ کر دینا چاہتی ہو؟ اسے تو راجو کے ساتھ اپنا سوتیلے باپ بیٹے والا رشتہ بھی بہت معیوب لگتا ہے۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ اس دنیا میں کسی کو کسی کا سوتیلا باپ نہیں ہونا چاہیے۔ وہ کوئی عام سا لڑکا نہیں ہے۔ اور یہ انکشاف تو شاید ایک عام سے لڑکے کے لیے بھی تباہ کن ثابت ہو کہ وہ کسی کی ناجائز اولاد ہے۔ تم اس کے ساتھ یہ ظلم ہرگز نہ کرنا۔ ہماری تو خواہ جان پر بھی بن آئے، ہمیں یہ راز اس سے چھپانا ہوگا۔ وہ چونکہ ایک غیر معمولی لڑکا ہے اس لیے مجھے اندازہ ہے کہ اس انکشاف سے اس کی شخصیت اس عمارت کی طرح ملبے کا ڈھیر بن جائے گی جس پر سیکڑوں طیارے بمباری کر کے چلے گئے ہوں۔"

وہ بغور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں قدرے پھیل گئی تھیں۔ بات اس کی سمجھ میں آرہی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "اور پھر یہ سوچو کہ اس کی نظر میں تمہارا اور میرا کیا امیج رہے گا؟ پھر راجو کا بھی مسئلہ ہے۔ یہ بات پھر ظاہر ہے اس سے بھی چھپی نہیں رہ سکے گی۔ وہ کیا سوچے گا؟ یہی سب باتیں سوچ کر تو میں وحشت زدہ ہو رہا ہوں۔ دوسری طرف یہ احساسِ محرومی بھی دل میں چٹکیاں لیتا رہے گا کہ میں کبھی اپنے خون کو اپنا نہیں کہہ سکوں گا۔"

اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔ اس کی انگلیوں میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ دھیمی آواز میں بولی "تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس کے ایک غیر معمولی لڑکا ہونے کی وجہ سے ہمیں اس راز کی غیر معمولی حفاظت کرنا ہوگی۔"

"ہاں شکر ہے، تمہیں معاملے کی نزاکت کا احساس ہو رہا ہے۔" میں نے قدرے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا "لیکن تم اس کے بارے میں جتنی زیادہ حساس، جتنی زیادہ جذباتی ہو اس کی وجہ سے مجھے اندیشہ ہی رہے گا۔ کسی بھی جذباتی یا ہسٹریائی سے لمحے میں یہ راز اُگل مت دینا۔ یہ اس بچے کو قتل کر دینے کے مترادف ہوگا۔"

"تم مطمئن رہو۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "عورت کے بارے میں یہ مردوں نے ہی مشہور کر رکھا ہے کہ وہ کسی راز کو راز نہیں رکھ سکتی۔ حالانکہ عورت جب راز کو راز رکھنے پر آتی ہے تو اس کا دل سمندروں سے کہیں گہرا ثابت ہوتا ہے۔"

"میری دعا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ میرے لیے خود اس خلش کے ساتھ زندہ رہنا ایک آزمائش سے کم نہیں ہوگا کہ میں کبھی اسے اپنا نہیں کہہ سکوں گا۔ لیکن اس کی بہتری کی خاطر میں اس آزمائش سے گزرتا رہوں گا۔"

وہ خاموشی سے بالوں کی ایک لٹ کو انگلی پر لپیٹ رہی تھی میں نے چونکتے ہوئے پوچھا "کیا راجو ابھی تک نہیں آیا؟"

"رات جب تم سونے کے لیے چلے گئے تھے تو اس کا فون آگیا تھا۔ اس نے اطلاع دے دی تھی کہ ایک دوست کے گھر تقریب ہے۔ بہت دیر ہو جائے گی، اس لیے وہ وہیں سو جائے گا۔ تقریب دیر ہوگیا... بس وہ ڈرنک ہو گیا ہوگا اور ڈرائیونگ اس کے بس کی بات نہیں رہی ہوگی۔ اس نے سوچا ہوگا، جہاں موجود ہوں وہیں سو جاؤں۔ بعض اوقات اس کے حق میں یہی بہتر ہوتا ہے۔ ڈر رہتا ہے کہ گاڑی لے کر چلے تو کہیں مار نہ دے۔ خود بھی مرے، کسی دوسرے کو بھی مروائے۔"

"تم اس کے لیے ڈرائیور کیوں نہیں رکھ دیتیں؟" میں نے کہا۔

"وہ خود ہی نہیں رکھتا۔ صاف کہتا ہے کہ میں اپنی حرکتوں کا ایک چشم دید گواہ ہر وقت ساتھ رکھنا نہیں چاہتا۔" شمیم بے پروائی سے کندھے اُچکاتے ہوئے بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اٹھتے ہوئے کہا "میں ذرا پچھلی گلی کا جائزہ لے لوں۔"

وہ میرے ساتھ ہی اُٹھ آئی۔ ہم نے پچھلا گیٹ کھول کر گلی میں جھانکا، اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ میرے آدمی آفتاب کی لاش اٹھا کر لے گئے تھے۔ آفتاب کی موت میرے لیے ایک نیا صدمہ تھی۔ ریڈ ڈاٹ والے میرے دل پر یکے بعد دیگرے ایک نیا زخم لگا رہے تھے۔ اسی دل میں نفرت کا زہر قطرہ قطرہ جمع ہو رہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ قطرہ قطرہ جمع ہونے والے اس دریا کو ایک روز راستہ ضرور ملے گا اور پھر یہ سب کچھ بہا لے جائے گا۔ میں بظاہر بالکل پُرسکون تھا لیکن میرے اندر جو شکست و ریخت برپا تھی اس کی اذیت سے میں ہی واقف تھا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ عمار میرا بیٹا تھا ورنہ شاید بلیک برڈ اسے لے کر نکل جانے کے لیے جان لڑا دیتا اور اگر اسے اس کی امید نظر نہ آتی تو عین ممکن تھا کہ وہ اسے ہلاک ہی کر دیتا۔ وہ تو غالباً اسے صرف میرے دوستوں اور پناہ دینے والوں کا بچہ سمجھ کر اٹھا لے جا رہے تھے۔

ہم واپس آئے تو ملازمہ ناشتا لگانے لگی تھی۔ میرا کچھ کھانے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن شمیم زبردستی پکڑ کر مجھے ناشتے کی میز پر بٹھاتے ہوئے بولی "بھوکے رہو گے تو دشمنوں سے کیسے لڑو گے؟ انسان کو دشمن بعد میں مارتا ہے، بھوک پہلے مار دیتی ہے۔"

آخر اس کے مجبور کرنے پر میں نے بیٹھ کر تھوڑا بہت کھایا اور کافی کے دو مگ پی کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ قدرے حیرت سے بولی "کہاں جا رہے ہو؟"

"آفس" میں نے جواب دیا۔

"ان حالات میں بھی تم آفس جانا نہیں بھولے؟" اس کی حیرت بڑھ گئی۔

"ان حالات ہی میں تو آفس جانا زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔ عام حالات میں تو میں اکثر گول ہو جاتا ہوں۔ مجھے وہاں بیٹھ کر صرف کاروباری مسائل طے نہیں کرنے ہیں، دوسرے معاملات کو بھی دیکھنا ہے۔ وہیں بیٹھ کر سب سے رابطے کرنے ہیں۔"

"لیکن وعدہ کرو، آفس سے سیدھے یہاں آؤ گے۔"

"شمیم ڈیئر! مجھے کوئی وعدہ کرنے پر مجبور مت کرو۔ مجھے خود قطعاً اندازہ نہیں ہے کہ میں کوئی وعدہ پورا کر سکوں گا یا نہیں۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ میں جہاں جہاں جانے کا ارادہ رکھتا ہوں وہاں پہنچ بھی سکوں گا یا نہیں۔ اس لیے پلیز مجھ سے کوئی وعدہ مت لو۔" میں نے درخواست کی۔

"میں نہیں چاہتی تمہیں کبھی یہ گمان بھی گزرے کہ میں کسی آڑے وقت میں تمہارا ساتھ دینے سے ڈر گئی تھی، پیچھے ہٹ گئی تھی۔" وہ اٹھ کر میرے ساتھ ساتھ دروازے کی طرف بڑھتے

ہوئے بولی "میں تمہارے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو کر جان دینے کے لیے تیار ہوں۔ اور یہ محض کوئی مکالمہ نہیں ہے آزما کر دیکھ لینا۔"

میں چلتے چلتے رک گیا۔ میرے دل میں تشکر کی ایک لہر ابھری۔ میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان خوب صورت آنکھوں میں دھواں دھواں سا پھیلا ہوا تھا مگر گہرائیوں میں کہیں کوئی چنگاری روشن تھی۔

"میں تمہارا بہت احسان مند ہوں شمیم!" میں نے سادگی سے صرف اتنا کہا اور اس کے کندھوں پر ہلکی سی تھپکی دے کر باہر جانے کے لیے تیزی سے مڑ گیا۔ میری آنکھوں میں ستارہ کی تصویر ابھر آئی تھی۔ اس نے بھی یہی کہا تھا کہ وہ ہر حال میں میرا ساتھ دے گی، چاہے اس کی جان چلی جائے۔ اور واقعی اس کی جان چلی گئی تھی۔ میرا ساتھ دینا اب کچھ ایسا خوش قسمتوں والا کام نہیں رہا تھا۔

وہ میرے ساتھ ساتھ گاڑی تک آئی اور ایک بار پھر بولی، "بہر حال جب بھی تم فارغ ہو گے یہیں آؤ گے۔"

"کوشش میری یہی ہوگی۔ وعدہ نہیں کرتا۔ میرے آدمی تمہارے مکان کے گرد موجود رہیں گے۔ کوئی بھی مسئلہ ہو تم انہیں بلا کر بات کر سکتی ہو۔ مجھے آفس فون کر سکتی ہو۔"

"تم میری نہیں، صرف اپنی فکر کرو۔"

"اب مسئلہ صرف میرا یا تمہارا ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا "عمار بھی تو ہے۔"

یکدم ہی اس کی کھنک دار سی ہنسی ابھری "ہاں بلکہ اب ہمارا تمہارا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے، اصل مسئلہ ہی اس کا ہے۔ وہ ہم دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہے، متاعِ حیات ہے ایک عجیب..... بے شناخت سی محبت کی پیداوار ہے۔ اس کی تو ہمیں سب سے زیادہ حفاظت کرنی ہوگی۔" اس کا لہجہ خوابناک سا ہو گیا۔

پھر وہ جھرجھری سی لے کر گویا چونکتے ہوئے بولی "لیکن شکر ہے، وہ پیش منظر میں نہیں ہے، پس منظر میں ہی ہے۔ اس کی طرف کسی کا زیادہ دھیان نہیں جائے گا۔ میں اسے آج کل میں ہی واپس مری بھجوا دوں گی۔"

"اس بار ذرا رازداری سے بھجوانا۔ کوشش کرنا یہ بات آئندہ کسی کے علم میں نہ آئے کہ وہ مری میں ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"تم مطمئن رہو، مجھے اب ان سب باتوں کا اندازہ ہو چکا ہے۔ میں نے تو سوچا ہے، میں اب چھٹیوں میں اسے یہاں بلایا ہی نہیں کروں گی۔ میں اور راجو خود چپکے سے راتوں رات مری چلے جایا کریں گے۔ اس کی چھٹیوں کے دن ہم وہیں گزار آیا کریں گے۔ کسی کو خبر نہیں ہونے دیں گے۔"

"ہاں، یہ بھی اچھا خیال ہے۔" میں نے کہا "چاہو تو مری میں کوئی چھوٹی موٹی کوٹھی خرید کر ڈال دو۔ سودا کر لو قیمت مجھے بتا دینا، ادائیگی ہو جائے گی بلکہ چاہو تو عمار کے نام پر ہی خرید لینا۔ چھٹیوں میں تم سب وہیں اکٹھے ہو جایا کرنا۔ زندگی نے مجھے مہلت دی تو شاید کبھی میں بھی آ جایا کروں۔"

"بیٹے پر باپ کی نوازشات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

"نوازشات کی نوبت ابھی کہاں سے آ سکتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ابھی تو مجھ پر اتنے برسوں کی بے خبری کا قرض چڑھا ہوا ہے۔"

میں اسے خدا حافظ کہہ کر آفس کی طرف روانہ ہو گیا۔ ذہن تازہ ترین حالات میں الجھا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، نفیس صاحب کو ان حالات سے مطلع کروں یا نہ کروں؟ کیا اس کا کوئی فائدہ تھا؟ فائدے کے بجائے الٹا کہیں کوئی دل جلانے والا پہلو تو سامنے نہیں آئے گا؟ نفیس صاحب سے بات چیت کے نتائج اب تک کچھ زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہوئے تھے۔

لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان معاملات کو خفیہ ایجنسیوں کے لاکر میں گویا پھنس چکا تھا۔ اب کوئی بات ان سے خفیہ رکھنا میرے لیے بڑی الجھن کا باعث بن سکتا تھا۔ نفیس صاحب نے خاص طور پر مجھے ہدایت بھی کی تھی کہ میں انہیں پل پل کی خبر دیتا رہوں۔ حتیٰ کہ انہیں اپنے ٹھکانے سے بھی باخبر رکھوں۔ آفس پہنچنے تک میں فیصلہ کر چکا تھا کہ انہیں ستارہ کی موت اور تازہ ترین جھڑپ سے مطلع کر ہی دیا جائے۔

آفس جانے سے پہلے میں نے راستے میں ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں رک کر اپنے لیے تین ریڈی میڈ سوٹ پیک کرائے۔ ضرورت کی چند دوسری چھوٹی موٹی چیزیں خریدیں۔ آفس میں اپنے پرائیویٹ کمرے میں تیار ہونے کے بعد اپنی میز پر بیٹھا۔ کام شروع کرنے سے پہلے میں نے سوچا ذرا فون کے منسلک (ANSWERING MACHINE) کو چیک کر لوں، کہیں اس میں کوئی ریکارڈ شدہ پیغام تو موجود نہیں۔ بعض اوقات ہونے کے بعد بھی بیرونِ شہر یا بیرونِ ملک سے کوئی کال آ جاتی تھی۔ مشین میں صرف ایک ہی ریکارڈ شدہ پیغام موجود تھا جو ایڈم عرف ایڈی کی طرف سے تھا۔ پیغام یقیناً آج صبح ہی آفس کھلنے سے پہلے ریکارڈ ہوا تھا۔ انہیں شمیم کا گھر تو معلوم ہو گیا تھا، پتا چل گیا تھا کہ میں وہاں جا کر پناہ گزیں ہوا ہوں لیکن شاید وہاں کا فون نمبر معلوم نہیں ہو سکا تھا ورنہ ایڈی کا فون وہیں آ گیا ہوتا۔

ایڈی کی ریکارڈ شدہ آواز مشین پر ابھر رہی تھی۔

"کیا حال ہے چوہدری ڈیئر؟ کیسا لگ رہا ہے کبھی ادھر کبھی ادھر بھاگنا؟ بس اب تمہاری زندگی اسی طرح گزرے گی۔ تمہیں احساس ہوگا کہ یہ زندگی نہیں، ایک سزا ہے۔ تمہیں اس سے نفرت ہو جائے گی۔ اتنی شدید نفرت کہ تم موت کی دعا کرو گے لیکن تمہیں موت بھی نہیں آئے گی۔ تم خودکشی کی کوشش کرو گے تو ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے۔ ہم تمہارا

بچائیں گے...؟"

ایڈی کا بولنے کا انداز بالکل ایسا تھا جیسے کوئی شخص میرے سامنے بیٹھا مجھے ہپناٹائز کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ اگر میں مضبوط اعصاب کا مالک نہ ہوتا تو تنہائی میں' اس طویل و عریض' پُرسکون کمرے میں اُبھرتی ہوئی یہ ٹھہری ٹھہری سی آواز واقعی میرے ذہن پر اثرانداز ہونے لگتی۔ میں شاید اسی طرح سوچنے لگتا جس طرح وہ چاہتا تھا۔ مایوسی کی اسی دلدل میں اُترنے لگتا جس کی طرف وہ مجھے اپنی پُرتاثیر آواز کے ذریعے دھکیلنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آواز بدستور اپنے تمام تر صداکارانہ اُتار چڑھاؤ کے ساتھ اُبھر رہی تھی۔

"تم نے محسوس کر ہی لیا ہوگا کہ ہم تمہیں ہلاک کرنا نہیں چاہتے' ورنہ یہ ہمارے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ ہم تمہیں زندہ رکھنا چاہتے ہیں لیکن اس لیے نہیں کہ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔ اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے ہمیں اس ملک میں تم سے زیادہ کارآمد اور بڑے بڑے نامور سیکڑوں لوگ میسر ہیں جو ہمارے ایک اشارے پر پالتو کُتے کی طرح دُم ہلاتے ہوئے چلے آئیں گے' اس لیے اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ ہم تمہیں اپنی طرف آنے اور وہ پیشکش قبول کرنے پر مجبور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں جو ہم نے کچھ عرصہ پہلے تمہیں کی تھی۔ نہیں ڈیئر چوہدری! ایسی کوئی بات نہیں۔ تمہارے لیے اس پیشکش کو قبول کرنے کا وقت گزر چکا۔ پیشکش کو قبول کرنا یا نہ کرنا تو ایک الگ مسئلہ تھا' تم نے ہماری دوسری ہدایات پر بھی عمل نہیں کیا۔ تم نے ہماری باتوں کو وہ اہمیت نہیں دی جو دینی چاہیے تھی...؟"

مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ ریڈ ڈاٹ کا ردِ عمل یہی ہوگا۔ یہ بات میں نے فارن منسٹر حفیظ صاحب سے کہی بھی تھی۔ میرا خیال درست ہی ثابت ہو رہا تھا۔

ایڈی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہم نے جو کچھ تمہیں سمجھانا چاہا' تم نے صحیح طور پر اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ یا پھر شاید سمجھنے کے باوجود کسی زعم میں مبتلا رہے۔ یہ دونوں باتیں ہماری نظر میں بڑا سنگین جرم ہیں۔ گزرے ہوئے لمحوں کو اب تم دوبارہ نہیں پکڑ سکتے چوہدری ڈیئر! معافی کی ہمارے ہاں نہ کوئی گنجائش ہے اور نہ دستور۔ تم اب اپنی کشتیاں جلا چکے ہو۔ اب تم مر نہیں سکو گے اور زندگی بھی تمہارے لیے اک کربِ مسلسل ہوگی۔ تمہارے دوست احباب' تمہارا ساتھ دینے والے' تمہیں پناہ دینے والے' تمہارا ہاتھ تھامنے والے' کاروبار میں تمہاری سرپرستی کرنے والے' تمہاری محبوبائیں' تمہاری تشنہ راتوں کی رفیق' تمہارے ہمدرد' کرم فرما سب تمہارا ساتھ چھوڑ جائیں گے۔ اگر ساتھ نہیں چھوڑیں گے تو دنیا چھوڑ جائیں گے۔ اگر دنیا میں رہے بھی تو نمونۂ عبرت بن کر رہیں گے۔ اور سب سے بڑا عبرت کا نمونہ تم خود ہو گے۔ تمہاری دولت' تمہارے تعلقات' تمہاری بزنس ایمپائر' کچھ بھی تمہارے کام نہیں آ سکے گا۔ سب روئی کے گالوں کی طرح اڑ جائے گا۔ زندگی کے صحرا میں تم تنہا کھڑے اپنے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھتے رہ جاؤ گے۔ تمہیں یقین نہیں آئے گا کہ تمہارے ساتھ یہ سب کچھ ہو چکا ہے۔ تمہیں یہ محض ایک ڈراؤنا خواب محسوس ہوگا۔ پھر خواب کا دوسرا حصہ شروع ہوگا جو اس سے بھی زیادہ بھیانک ہوگا۔ ہو سکے تو کبھی تنہائی میں بیٹھ کر اپنے آپ کو بتانے کی کوشش ضرور کرنا کہ کبھی کبھی انسان سے کوئی ایسی غلطی بھی سرزد ہوتی ہے جس کی خوف ناکی کا اسے ابتدا میں بالکل اندازہ نہیں ہوتا۔ خدا حافظ۔"

مشین خاموش ہو گئی۔ ہلکی سی سرسراہٹ کے ساتھ ٹیپ ریکارڈر میں خالی ٹیپ چل رہی تھی۔ میں نے سوئچ آف کیا اور چند لمحے اپنی ریوالونگ چیئر پر ساکت بیٹھا رہا۔ ساؤنڈ پروف کمرے میں سناٹا تھا۔ میں دیوار پر لگے کلاک کی نہایت خفیف سی ٹِک ٹِک بھی سُن سکتا تھا۔

کچھ ایسا ہی سناٹا میرے اندر بھی طاری تھا اور اس میں کلاک کی ٹِک ٹِک کی طرح ہی ایڈی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ پہلے کبھی فون پر اس سے اس طرح کی گفتگو ہوتی تھی تو اسے میں کھری کھری سُنا دیتا تھا اور اس کی دھمکیوں کو خاطر میں نہیں لاتا تھا لیکن اب میرا اس سے کچھ کہنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ تو ایک ریکارڈ شدہ پیغام تھا لیکن اگر اس نے فون پر براہِ راست بھی مجھ سے یہ بات ہوتی تو شاید میں خاموش ہی رہتا۔

میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ کہیں یہ شکست خوردگی کی علامت نہیں تھی؟ میرا فلسفہ اور نظریہ یہ تھا کہ انسان کو خواہ ظاہری طور پر شکست بھی ہو جائے لیکن اسے اندر سے شکست خوردہ نہیں ہونا چاہیے۔ شکست سے زیادہ شکست کا احساس تباہ کن ہوتا ہے۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ شکست خوردگی کا احساس تو مجھ پر غالب نہیں لیکن اب میں خواہ مخواہ جارحانہ لفظوں میں الجھنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ کہتے تھے' اس پر بڑی حد تک عملدرآمد کی طاقت رکھتے تھے۔ میں اگر ان کے شر اور ضرر سے تھوڑا بہت بچ جاتا تھا تو اس کی وجہ محض اوپر والے کی مہربانی' تھوڑی سی سخت جانی اور میرے پیچھے کچھ منظم و باصلاحیت ساتھیوں کا ہونا تھا۔ ورنہ شاید میں ان کے ایک آدھ رگڑے میں ہی مارا گیا ہوتا' خواہ وہ مجھے زندہ رکھنا چاہتے۔ لیکن ایک بات تو تھی کہ اگر میں اتنی ہی آسانی سے مارا جانے والا شخص ہوتا تو ریڈ ڈاٹ کی نظرِ انتخاب مجھ پر پڑی ہی نہ ہوتی اور جس مقصد کے لیے وہ مجھے تیار کرنا چاہتے تھے اس کی کوئی بات ہی نہ ہوتی اور سارا فساد ہی نہ کھڑا ہوتا۔

چند لمحے سوچوں میں الجھا رہنے کے بعد میں نے فون پر نفیس صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی لیکن پتا چلا کہ وہ لاہور سے جا چکے تھے اور اسلام آباد میں اپنی سرکاری رہائش گاہ یا دفتر میں کہیں موجود تھے۔ میں نے کیتھرین کو ان کے نمبر دیے اور چند منٹ کی کوششوں کے بعد اس نے ایجنسی کے ہیڈ آفس میں ان سے میرا رابطہ کرا دیا۔

نفیس صاحب رسمی سلام دُعا وغیرہ کے بعد کچھ پوچھنے کے بجائے بولے "مسٹر چوہدری! سب سے پہلے میں ایک ضروری بات آپ کو بتا دوں: جس نمبر پر اس وقت آپ بات کر رہے ہیں' یہ ایک خاصا خفیہ نمبر تصور کیا جاتا ہے۔ بہت کم اور نہایت اہم لوگوں کے پاس یہ نمبر پایا جاتا ہے۔"

"ہاٹ لائن کا نمبر ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں' ہاٹ لائن کا نمبر تو میں آپ کو دے ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ ہاٹ لائن سے ذرا نیچے کی چیز ہے لیکن یہ بھی بہت اہم ہے اور آپ چونکہ حفیظ صاحب کے توسط سے آئے تھے اس لیے میں نے آپ کے مسئلے کو اہمیت دیتے ہوئے آپ کو یہ نمبر دے دیا تھا۔"

"آپ کے خیال میں وہ میرا کوئی ذاتی مسئلہ تھا نفیس صاحب؟" میں نے حیرت آمیز تلخی سے پوچھا "اور یہ صرف آپ کی نظرِ عنایت تھی کہ آپ نے اسے اہمیت دی ورنہ درحقیقت اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی؟"

"اس سلسلے میں' میں ابھی کوئی تبصرہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔ تحقیقات جاری ہیں۔" وہ بولے۔

"آپ کی تحقیقات تو نہ جانے کب تک' کہاں تک اور کن خطوط پر جاری رہیں۔" میں نے ایک بار پھر ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن میرے ساتھ جو چند نئے واقعات پیش آئے ہیں' میں نے سوچا' آپ کو ان سے مطلع کر دوں تاکہ کبھی آپ کو دیگر ذرائع سے کچھ اطلاعات ملیں تو یہ گمان نہ گزرے کہ میں نے آپ سے کچھ چھپانے کی کوشش کی۔"

اس بار وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولے "لیکن وہ میرے فون نمبر کے بارے میں ابھی میری بات پوری نہیں ہوئی تھی۔ وہ اہم بات ہے' سُن لیجیے۔"

ان کا ذہن ابھی فون نمبر میں ہی اٹکا ہوا تھا۔ میں کہنا چاہتا تھا' ارشاد کیجیے جناب! میرے نزدیک تو آپ کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ ہی اہم ہے' لیکن میں خاموش رہا۔ میں اپنے آپ کو بادشاہ گردوں کے ساتھ گفتگو کے آداب کا عادی بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے "یہ نمبر آپ کسی ڈائرکٹ فون پر ہمیشہ خود ڈائل کیا کریں' سیکریٹری یا کسی آپریٹر وغیرہ سے مت ملوایا کریں اور نہ ہی ان کے پاس یہ نمبر چھوڑیں۔ جس خاتون نے بھی یہ نمبر ملایا ہے' اس سے براہِ کرم واپس لے لیجیے اور کسی ایسے فون پر خود نمبر ملا کر بات کیجیے جس پر بیچ میں کسی کے سننے کا ایک فیصد بھی امکان نہ ہو۔"

یہ کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں چند لمحے ریسیور ہاتھ میں تھامے اسے گھورتا رہا اور سوچتا رہا کہ ان سے دوبارہ رابطہ قائم کروں یا نہیں؟ ایک ٹھنڈی سانس لے کر چند لمحے بعد آخر کار میں نے ان سے دوبارہ رابطہ کر ہی لیا۔

"ویری گڈ" اس بار وہ میری آواز سُن کر قدرے خوشگوار لہجے میں بولے "اب کہیے' کیا کہنا ہے۔"

"کہنا کیا ہے جناب! مزید کچھ بربادیوں کی داستان سنانی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اپنا تو وہی معاملہ ہو کر رہ گیا ہے کہ... خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک۔ زندگی شاید اب کچھ زیادہ باقی نہیں رہی۔ اور جتنی بھی باقی ہے' وہ غالباً آپ کو یہ یقین دلانے میں گزر جائے گی کہ معاملہ واقعی سنگین ہے اور سچ مچ ویسا ہی ہے جیسا میں نے بیان کیا تھا۔ اگر میرے اس دنیا سے کوچ کرنے کے بعد بھی آپ کو یقین آ گیا تو میں سمجھوں گا کہ محنت وصول ہو گئی اور جاں سے گزر جانے کا بھی صلہ مل گیا۔"

نفیس صاحب گویا خود پر جبر کر کے تحمل سے کام لیتے ہوئے بولے "دیکھیں چوہدری صاحب! یہ شعر و شاعری اور افسانہ طرازی مجھ سے بات کرتے وقت بالائے طاق رکھ دیا کریں۔"

"بلبل ہوں گرفتار ہوں۔ رفتہ رفتہ آدابِ قفس سیکھ رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ایک ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئے اور سُنی ان سُنی کرتے ہوئے بولے "اس کے علاوہ آپ اس مسئلے کو بھی رہنے دیں کہ میں نے آپ کی کہانی پر یقین کیا ہے یا نہیں۔ یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔ آپ کو جو ہدایات دی گئی ہیں' بس آپ خاموشی سے ان پر عمل کرتے رہیں۔"

"وہ تو میں کر ہی رہا ہوں جناب! اسی لیے تو اس وقت فون پر آپ سے بات ہو رہی ہے۔ جتنی سعادت مندی سے میں آپ کی ہدایات پر عمل کر رہا ہوں اتنی سعادت مندی سے تو اگر والدین کے کہے پر عمل کیا ہوتا تو یقیناً جنت میں جاتا۔ اور یہ بھی آپ نے خوب کہا کہ میری کہانی پر آپ کا یقین کرنا یا نہ کرنا میرا مسئلہ نہیں ہے۔ چلیے یہ بھی مان لیتا ہوں۔ لیکن اپنے پیاروں کی لاشیں اٹھاتے رہنا تو میرا مسئلہ ہوگا یا وہ بھی میرا مسئلہ نہیں ہے؟"

"تمہیدیں باندھنے کے بجائے اصل بات کیجیے مسٹر چوہدری!" وہ اپنے مخصوص سپاٹ لہجے میں بولے۔ بڑے ہی سرد مُہر آدمی تھے۔ مجھے حسرت ہی تھی کہ کبھی ان کے لہجے میں جذبات کی کوئی جھلک محسوس ہو سکے۔

پچھلی بار ان سے فون پر بات ہونے کے بعد سے جو نئے واقعات رونما ہوئے تھے' میں نے وہ انہیں بتانے شروع کیے۔ سب سے پہلے ستارہ کے قتل کا ذکر کیا۔ میں اس وقت دم بخود رہ گیا جب وہ بڑے اطمینان سے بولے "ہاں اس ایکٹریس کے قتل کی رپورٹ تو میرے پاس پہنچ گئی ہے۔ میں ابھی ساری تفصیل تو پوری توجہ سے نہیں پڑھ سکا لیکن اتنا پڑھ چکا ہوں کہ اسے کوئی بہت ہی انوکھا قسم

کا زہر دیا گیا تھا جس کا کوئی خاص سُراغ نہیں مل سکا اور جسم پر اس کے جو اثرات ہوئے تھے اس سے ہمارے ماہرین اس کے اجزائے ترکیبی کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔"

انہوں نے ہماری فلم انڈسٹری کی ایک سُپر اسٹار کا ذکر محض "اس ایکٹرس" کے الفاظ کے ساتھ نہایت سرسری سے انداز میں کیا تھا۔ لہجہ کچھ ایسا تھا جیسے اس واقعے میں تھوڑی بہت اہمیت بس صرف اس بات کی ہو کہ زہر کوئی انوکھا اور نامعلوم قسم کا تھا، اس کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ اس کے علاوہ یہ امر میرے لیے حیران کن تھا کہ رپورٹ ان کے پاس اسلام آباد پہنچ چکی تھی۔ لیکن اس وقت میرے فون کرنے پر بھی انہوں نے ازخود اس سلسلے میں کوئی بات شروع نہیں کی تھی۔ شاید یہ ان کی نظر میں کوئی اہم معاملہ نہیں تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ کن معاملات کو اہم سمجھ کر ان میں خاطر خواہ دلچسپی لیتے ہوں گے۔

"خاصی جلدی رپورٹ آپ کے پاس پہنچ گئی۔" میں نے کہا۔

"ہاں پچھلی بار آپ نے مجھے لاہور میں ہی فون کیا تھا تو بتایا تھا کہ آپ اس ایکٹرس کے ہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ میں نے اسی وقت دو ایک اداروں کو ہدایت کر دی تھی کہ اس سلسلے میں کوئی بات سامنے آئے تو براہِ راست مجھے تفصیلی رپورٹ بھجوائیں۔" وہ بدستور سرسری سے انداز میں بولے۔

"اس کا مطلب ہے، آپ کو اندیشہ تھا کہ اس کے ساتھ کچھ ہو سکتا ہے؟" میں نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ درحقیقت میں یہی کہنا چاہتا تھا کہ اندیشہ ہونے کے باوجود انہوں نے اس کی حفاظت کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔ انہیں گویا صرف اس امر سے دلچسپی تھی کہ "کچھ" ہو چکے تو رپورٹ ان کی میز پر پہنچ جائے۔

وہ میرے اُن کہے الفاظ کے مفہوم کو پہنچتے ہوئے بولے "مجھے توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی کچھ ہو سکتا ہے۔ دوسرے ہر طرح کے حالات میں لوگوں کو تحفظ فراہم کرنا میری ایجنسی کے دائرۂ کار میں نہیں آتا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہر ادارے کا اپنا اپنا ایک سیٹ اپ اور طریقۂ کار ہے۔ ہمیں اسی کے مطابق چلنا ہوتا ہے۔ اس طرح عام لوگوں کے تحفظ کے لیے اگر ہم ضروری سمجھیں تو پولیس کے محکمے وغیرہ کی خدمات حاصل کرتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو اب آپ کے لیے... یا جن لوگوں کی آپ نشاندہی کریں، ان کی حفاظت کے لیے "پولیس پروٹیکشن" کا بندوبست کرنے پر غور کیا جا سکتا ہے۔"

"بہت شکریہ نفیس صاحب!" میں نے کہا اور کوشش کی کہ میرے لہجے سے تلخی ظاہر نہ ہونے پائے "یہ دفتری نظام کی پیچیدگیاں، یہ محکموں کا جال اور کسی کی سمجھ میں نہ آنے والے ان کے طور طریقے معلوم نہیں بے چارے عوام کو کہاں لے جائیں گے۔ اِدھر سڑکوں پر گولیاں چل رہی ہوتی ہیں اور اُدھر دفتروں میں فائلیں چل رہی ہوتی ہیں۔ وہ بھی کچھوے کی رفتار سے۔ ظاہر ہے، ان فائلوں کے کسی منزل پر پہنچنے تک کہاں کہاں، کیا کیا قیامتیں گزر جاتی ہیں، عظیم الشان اور قلعہ بند قسم کے دفتروں میں بیٹھنے والوں کو اس کا اندازہ کیونکر ہو سکتا ہے!"

"آپ تو اچھے خاصے مصلحِ قوم معلوم ہوتے ہیں چودھری صاحب!" وہ طنزیہ سے لہجے میں بولے۔

"جب بھی میں نے آپ جیسے کسی بڑے صاحبِ اختیار سے اس قسم کی باتیں کی ہیں، اس نے طنزیہ انداز میں مجھ سے یہی کہا ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا "حالانکہ میرے خیال میں مصلحِ قوم ہونا کوئی ایسی بُری بات نہیں کہ اس پر طنز کیا جائے۔ ویسے یہ منصب بہت اونچا ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔"

"بہت اچھی بات ہے۔" نفیس صاحب بولے "میں کہنا چاہتا تھا۔ میرا لہجہ طنزیہ اس لیے ہو گیا تھا کہ ہم کرسی نشینوں کے سامنے آپ جیسے بہت سے لوگ خواہ مخواہ ہی مصلحِ قوم بن جاتے ہیں۔ میں بھی خود کو اس کا اہل نہیں سمجھتا۔ یہ واقعی بہت اونچا منصب ہے۔ لیکن ہم لوگوں کے بارے میں یہ تاثر بھی غلط ہے کہ ہم عالیشان دفتروں میں بیٹھے فائلیں چلانے کے علاوہ کرتے ہی کچھ نہیں۔ اور یہ کہ اس نظام کے سارے الجھاوے بس ہماری ہی وجہ سے ہیں، دوسرے طبقوں کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ باقی سب بے چارے بہت دیانتدار، سچے، محنتی اور ایثار پسند ہیں۔ میں اپنے آپ کو اور اپنے محکمے کو بیوروکریسی میں شمار نہیں کرتا اور نہ ہی بیوروکریسی کا دفاع کر رہا ہوں۔ میں آپ کو صرف اپنے بارے میں بتانا چاہ رہا ہوں کہ نوکری کے تقاضے تو اپنی جگہ ہیں ہی، لیکن مجھ جیسا گناہ گار آدمی اپنی جگہ بیٹھا اپنی بساط کے مطابق اس ملک اور قوم کی بھلائی کی ہر ممکن تدبیر کرتا رہتا ہے۔ ہم تو کسی کو اپنے کارنامے بتا بھی نہیں سکتے۔ آپ کو کیا معلوم کہ جب آپ چین کی نیند سو رہے ہوتے ہیں تو ہم کن کن محاذوں پر اس ملک و قوم کے خلاف ہونے والی کیسی کیسی بھیانک سازشوں کا قلع قمع کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ اس غیر متعلقہ بحث میں نہ پڑیں۔ ویسے بھی فون پر طویل گفتگو مناسب نہیں۔ آپ صرف یہ بتائیں، آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے کس لیے فون کیا تھا؟"

"میں کیا چاہتا ہوں؟ کاش اس کا جواب اتنا ہی سادہ اور آسان ہوتا کہ میں فون پر دے سکتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "فون میں نے آپ کو صرف آپ کی ہدایت کے مطابق تازہ ترین حالات سے باخبر رکھنے کے لیے کیا ہے۔ ستارہ کے قتل کی رپورٹ تو آپ تک پہنچ ہی چکی ہے، مزید دو ایک واقعات سے بھی آپ کو آگاہ کر دوں..."

میں نے انہیں گزشتہ رات پیش آنے والے واقعات سے بھی آگاہ کر دیا جس میں تین افراد مارے گئے تھے۔ انہوں نے نہایت خاموشی سے سب کچھ سُنا۔ آخر میں، میں نے کہا "آپ کے اور آپ کے معاون اداروں کے وسائل بہت زیادہ ہیں۔ شاید مرنے والے ان دونوں بدمعاشوں اور اس گاڑی کے ذریعے کوئی کارآمد سراغ مل سکے۔ وہ چینیزی زخمی ہو کر بھاگا تھا، شاید اس کا بھی کوئی سراغ مل سکے۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ کے بتائے ہوئے کسی وقت پر آپ کو فون کر کے معلوم کرنے کی کوشش کروں کہ کوئی سراغ ملا یا نہیں؟ بات کچھ آگے بڑھی یا نہیں؟"

"اس کے لیے آپ کو مجھے زحمت دینے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولے "میں لاہور میں اپنے کسی آدمی کی ڈیوٹی لگا دوں گا۔ وہ آپ کو فون کر کے تازہ ترین حالات سے مطلع کر دے گا۔ وہ آپ کو آفس فون کرے گا کیونکہ فی الحال آپ سے رابطے کا مستقل ٹھکانا وہی ہے۔"

پھر وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر عجیب سے لہجے میں بولے "ویسے.... آپس کی بات ہے مسٹر چوہدری! آپ خود بھی کچھ کم خطرناک، کچھ کم پُراسرار آدمی نہیں ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ آپ کی فائل مکمل ہو جائے، ہمیں ایک بار پھر آپ کے ساتھ ایک تفصیلی میٹنگ کرنا پڑے گی۔ اس وقت تک کے لیے ہم نے آپ کو آزاد چھوڑا ہوا ہے۔"

"میں تو آزاد رہ کر بھی آپ کے ہاتھوں گرفتار ہوں جناب! ہر وقت آپ کی خدمت میں حاضر ہوں، دستیاب ہوں۔ جہاں حکم فرمائیں گے چلا آؤں گا۔ بلکہ یوں کہیے سر کے بل چلا آؤں گا۔" میں نے بھی انہی کی طرح غیر واضح لہجے میں کہا "فائل تیار کرانے کا شوق بھی آپ کا اپنا ہی ہے ورنہ میں نے تو عرض کیا تھا کہ جو پوچھنا ہے مجھ سے پوچھ لیجیے۔ جو دستاویز، جو ثبوت طلب فرمانا ہے مجھے حکم کیجیے۔ میری زندگی میں کوئی راز نہیں۔"

"مسٹر چوہدری!" ان کے لہجے میں ان کی مخصوص سنجیدگی لوٹ آئی "میرے خیال میں یہ دعویٰ کسی شخص کو نہیں کرنا چاہیے کہ اس کی زندگی میں کوئی راز نہیں۔ بہرحال ہم مناسب وقت آنے پر مزید باتیں کریں گے۔ فی الحال آپ کے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ قتل اور مار دھاڑ میں اپنا ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھیے، خواہ آپ کو یقین بھی ہو کہ آپ کا مدِمقابل قاتل، دہشت گرد، تخریب کار، سازشی یا آپ کے خون کا پیاسا ہے اور آپ اپنے دفاع میں اسے قتل کر رہے ہیں۔ قتل بہرحال قتل ہے، خواہ وہ کسی کا بھی ہو۔ یہ فیصلہ تو بعد میں ہوتا ہے کہ وہ جائز تھا یا ناجائز۔ اس سے بچنے کی کوشش کیا کریں، کچھ کام قانون کے لیے بھی چھوڑ دیں۔"

"بہت عمدہ نصیحت ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا "اربابِ اختیار اپنے محفوظ کمروں میں بیٹھ کر اکثر یہ نصیحت کرتے پائے جاتے ہیں۔ آپ کا مطلب ہے کہ آئندہ جب کوئی مجھ پر گولی چلائے تو میں ایک ہاتھ سے گولی کو کیچ کر لوں اور دوسرا ہاتھ اس کی ٹھوڑی کو لگاتے ہوئے درخواست کروں ' بھائی صاحب! ذرا دوسری گولی چلانے کا پروگرام ملتوی کر لیں۔ پہلے میں پولیس کو اطلاع دے آؤں۔' امید ہے اس عاجزانہ اور شریفانہ درخواست پر وہ فوراً گن جیب میں ڈال لے گا اور کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر اطمینان سے پولیس کا انتظار کرنے لگے گا۔"

مجھے احساس ہوا کہ میں تو محض بکواس کر رہا تھا۔ نفیس صاحب تو فون بند کر چکے تھے۔ حالانکہ میں ابھی انہیں وہ ریکارڈ شدہ پیغام بھی سنوانا چاہتا تھا جو مجھے اپنی انسورنگ مشین پر ریڈ ڈاٹ کی طرف سے ایڈی کی آواز میں ملا تھا۔ تاہم میں انہیں اس پیغام سے اپنی زبان میں تو مطلع کر ہی چکا تھا، صرف ثبوت کے طور پر انہیں اصل پیغام سنوانا چاہتا تھا لیکن انہوں نے اسے کوئی خاص اہمیت ہی نہیں دی تھی۔

شام تک میں نے اپنا ذہن کام میں لگانے کی کوشش کی۔ کافی کام نمٹ ہی گئے۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے چاروں طرف عارضی طور پر گہرا سکوت چھا گیا تھا لیکن اس سکوت کی تہ میں کوئی ہلچل چھپی ہوئی تھی۔

ٹھیک پانچ بجے شمیم کا فون آ گیا۔ وہ بضد تھی کہ دفتر سے میں سیدھا گھر آؤں۔ اس نے بھی ستارہ والی ضد پکڑ لی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا انجام بھی ستارہ جیسا ہو یا پھر عمار کسی کا ہدف بنے۔

میں نے اسے بتایا کہ ابھی تو میں دفتر میں ہی مصروف تھا اور یہاں سے اٹھ کر سات بجے والی فلائٹ سے مجھے اسلام آباد جانا تھا کیونکہ مجھے نفیس صاحب نے وہاں طلب کیا تھا۔ یہ بہانہ کر کے میں نے اسے بہلایا۔ تاہم اس نے وعدہ لیا کہ اسلام آباد سے واپسی پر میں سیدھا اسی کے ہاں آؤں گا۔

کیتھرین سے کہہ کر میں نے دفتر سے باہر کی اپنی تمام کاروباری اور سماجی مصروفیات ملتوی کرا دی تھیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کوئی وعدہ پورا کرنے کی پوزیشن میں ہوں یا نہیں۔ اس صورت میں خواہ مخواہ دوسروں کو انتظار کرا کے بدمزہ کرنا بہتر نہیں تھا۔

میں اپنے تمام اسٹاف وغیرہ کے جانے کے بعد بھی دیر تک آفس میں بیٹھا رہا۔ کچھ کام بھی تھا اور کچھ سوچوں کا ہجوم بھی تھا۔ جس وقت میں اٹھنے کا ارادہ کر رہا تھا، میرے ڈائرکٹ نمبر پر ایک فون آیا۔

"میرا نام بابر ہے۔" دوسری طرف سے بولنے والے صاحب نے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بتایا "مجھے نفیس صاحب نے ہدایت کی تھی کہ میں آپ کو فون کر کے کچھ ضروری انفارمیشن دے دوں۔" اس نے یہ نہیں بتایا کہ وہ کون تھا، کہاں سے بول رہا تھا۔ میں نے بھی پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ یقیناً اس کا تعلق نفیس صاحب والی ایجنسی ہی سے یا پھر کسی اور خفیہ ادارے سے ہو گا۔

"جی فرمایئے۔" میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"گزشتہ رات جھڑپ میں جو دو آدمی آپ کے ہاتھوں ہلاک ہوئے تھے، وہ خاصے خطرناک قسم کے، پیشہ ور بدمعاش اور ڈاکو تھے۔

ان کی زندہ یا مُردہ گرفتاری پر انعام بھی مقرر تھا۔ آپ چاہیں تو انعام بھی کلیم کرسکتے ہیں۔" بابر بولا۔

"خدا کی پناہ!" میں نے سوچا "میں کیا جاننا چاہ رہا ہوں اور انہیں انعام کی پڑی ہوئی ہے۔"

غیر ارادی طور پر میں نے قدرے تیز لہجے میں کہا "آپ انعام کو گولی ماریئے۔ یہ بتائیں ان کے بارے میں مزید کیا معلوم ہوا؟"

"کسی زمانے میں ان کا تعلق اسمگلروں کے ایک بہت بڑے گروہ سے تھا اور اس گروہ کے روابط انٹرنیشنل ڈرگ مافیا سے تھے لیکن پھر حکومت کی ایک مُہم کے دوران وہ گروہ تتر بتر ہوگیا۔ کچھ لوگ غائب ہوگئے اور کچھ مارے گئے' جو لوگ غائب ہوئے تھے' یہ دونوں ان میں شامل تھے۔ مختلف رپورٹوں اور تفتیش وغیرہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے باقاعدہ ڈاکا زنی اور اُجرت پر ہر قسم کی دہشت گردی شروع کردی تھی۔ قتل کی کئی سفاکانہ وارداتوں میں بھی وہ پولیس کو مطلوب تھے۔"

"یہ بتایئے کہ ان کی مدد سے ریڈ ڈاٹ کا کوئی سراغ ملا یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ریڈ ڈاٹ۔۔۔؟" بابر نے یوں دُہرایا جیسے یہ نام پہلی بار سُن رہا ہو۔ پھر جلدی سے انگریزی میں بولا "نہیں' نہیں' ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی اور نہ ہی ان کے کسی ساتھی کا سراغ ملا ہے کہ تفتیش آگے بڑھ سکے۔ درحقیقت ساری بات ان کی موت پر آکر رک گئی ہے۔"

"میرا دل کہتا ہے کہ ریڈ ڈاٹ سے تعلق رکھنے والا کوئی ذی روح زندہ حالت میں ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکے گا اور یوں کم از کم آپ لوگوں کے لیے یہ تنظیم بدستور ایک مُعما اور ایک ناقابلِ یقین سی چیز ہی بنی رہے گی۔" میں نے قدرے بے زاری سے کہا۔

"جی! کیا مطلب؟" میری بات گویا اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ معلوم نہیں اس کی ڈیوٹی کہاں تک محدود تھی اور اسے کس حد تک معلومات تھیں یا کون سی چیزیں اس کے دائرۂ اختیار میں آتی تھیں اور کون سی نہیں۔

چنانچہ میں نے جلدی سے کہا "اس بات کو چھوڑیے' یہ بتایئے اس گاڑی سے کوئی سراغ ملا جو جائے وقوعہ پر اُلٹ گئی تھی؟"

"جی ہاں" وہ اطمینان سے بولا "وہ ہمارے ہاں کے ایک بہت معروف اداکار کی گاڑی تھی۔ تین روز قبل چوری ہوچکی تھی۔ اداکار نے اس کی چوری کی رپورٹ درج کرا رکھی تھی۔"

اس نے اداکار کا نام بھی بتایا۔ وہ ہمارے ہاں کا ایک مشہور اور مقبول فلمی ہیرو تھا۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے کچھ دنوں پہلے ایک تقریب میں شرکت کے بعد اسے انٹرکان سے رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ وہ سیاہ رنگ کی کیڈلک میں ہی بیٹھ رہا تھا۔ اس تقریب میں اس سے رسمی سی ملاقات بھی ہوئی تھی۔ وہ خاصی گرمجوشی سے ملا تھا لیکن میں ہی اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دے سکا تھا۔ میرا دھیان اس وقت کسی اور طرف تھا۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ اس نے کسی وقت مجھے اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ شہر میں کیڈلک گاڑیوں کی تعداد بہت کم تھی اور تین دن سے دو لوگ ایک معروف اداکار کی گاڑی چُرائے ہوئے تھے مگر وہ پکڑی نہیں گئی تھی۔ ان حالات میں کیا اُمید رکھی جاسکتی تھی؟

"یہ سراغ کوئی سراغ نہیں ہیں مسٹر بابر!" میں نے قدرے مایوسی سے کہا "مطلب یہی ہوا کہ ہم ایک بار پھر بند گلی میں ہی کھڑے ہیں۔"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جناب!" وہ مُبہم لہجے میں بولا "مجھے آرڈر ملا تھا کہ ان باتوں سے آپ کو بھی مطلع کردوں۔ بہرحال اس سلسلے میں تفتیش تو جاری رہے گی۔ اگر کوئی خاص بات معلوم ہوئی تو میں آپ سے پھر رابطہ قائم کروں گا۔"

"شکریہ" میں نے کہا اور اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

ریسیور رکھ کر میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ تفتیش سے کوئی اسی قسم کی ستم ظریفانہ سی صورتِ حال سامنے آئے گی۔ اسی لیے میں نے ان بدمعاشوں میں کوئی خاص دلچسپی نہیں لی تھی۔ ان کے ہلاک ہونے کے بعد جب میں نے ان کا جائزہ لیا تھا مجھے تبھی اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ پیشہ ور قاتل اور بدمعاش ہوں گے۔ گاڑی کے بارے میں بھی گو کہ مجھے یہ تو اس وقت یاد نہیں آیا تھا کہ وہ فلاں اداکار کی ہوسکتی ہے لیکن یہ اندیشہ ضرور محسوس ہوا تھا کہ وہ چوری کی ہوگی۔

اصل کام کی چیز اس وقت بھی بلیک برڈ ہی تھا۔ وہ ہاتھ آجاتا تو شاید کوئی فائدہ ہوتا لیکن وہ بھی بے زبان تھا۔ اور بہرحال حیوان تھا۔ معلوم نہیں اس سے کوئی بات جاننے میں مدد مل سکتی تھی یا نہیں؟ تشدد سے بھی ظاہر ہے اس کی زبان تو نہیں کھلوائی جاسکتی تھی۔ وہ تو تھا ہی بے زبان۔ لیکن وہ ہر بات یقیناً سمجھتا تھا' تبھی اسے اچھی خاصی خطرناک مہمات پر بھیجا جاتا تھا اور وہ یقیناً کسی طریقے سے یا اشاروں وغیرہ سے اپنی بات بھی سمجھاتا ہوگا۔ میرا اندازہ تھا کہ جو دو بدمعاش میرے اور احمد کے ہاتھوں مارے گئے تھے' بلیک برڈ اُن کی مدد کے لیے ان کے ساتھ نہیں تھا بلکہ اُلٹا وہ بلیک برڈ کی ماتحتی میں' اسی کی ہدایات کے مطابق کام کررہے تھے۔

بابر نے ابھی ابھی فون پر ان دونوں بدمعاشوں کا جو پس منظر بتایا تھا اُس سے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ہمارے ہاں کے حالات سے بہت ہی زیادہ واقف تھے اور ان سے فائدہ اٹھانا بھی خوب جانتے تھے۔ سیدھی سادی دہشت گردی کی کارروائیوں کے لیے وہ مقامی بدمعاشوں' قاتلوں' ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کی خدمات حاصل کرتے رہتے ہوں گے۔

اس قسم کے عناصر جن کے ٹھکانوں تک ہماری پولیس اور خفیہ اداروں کی رسائی نہیں تھی' ان سے ریڈ ڈاٹ بوقتِ ضرورت رابطہ کرلیتی تھی اور معاوضے پر یا کچھ اور شرائط کے تحت ان کی خدمات حاصل کرتی رہتی ہوگی۔ یہی لوگ بعض اوقات قربانی کے بکرے بن جاتے ہوں گے' جس طرح کئی مواقع پر میرے ہاتھوں کئی بدمعاش مارے گئے تھے جو مختلف مقاصد کے تحت ریڈ ڈاٹ کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔

مجھے یقین تھا کہ وہ بدمعاش اگر زندہ بھی میرے یا پولیس کے ہاتھ لگ جاتے تو ان سے کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوپاتی۔ ریڈ ڈاٹ یقیناً بہت محفوظ طریقے سے اس قسم کے لوگوں کو استعمال کرتی تھی۔ وہ شاید ریڈ ڈاٹ کے نام سے بھی واقف نہیں ہوتے تھے۔ ریڈ ڈاٹ والے یقیناً ہر طرح کے مقامی عناصر سے کام لینے کے ہر طرح کے ہتھکنڈوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ دفتروں میں' اعلیٰ سرکاری حلقوں میں اور نہ جانے کہاں کہاں ان کے ایجنٹ موجود تھے۔

میں حیران تھا کہ یہ سلسلہ کب سے چل رہا تھا؟ کس طرح چل رہا تھا؟ کوئی بھی ادارہ' کوئی بھی محکمہ اب تک کیوں اس کے بارے میں پوری طرح چوکنا نہیں ہوسکا تھا؟ اور اگر اب میں اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کررہا تھا تو حکومتی مشینری کیوں پوری طرح حرکت میں نہیں آرہی تھی؟ کیوں وہ لوگ صحیح طور پر احساس نہیں کرپا رہے تھے کہ کتنا بڑا فتنہ ہمارے قومی وجود میں جڑیں گاڑ چکا تھا؟

اُلٹا میری طرف شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھا جارہا تھا۔ میرے ساتھ جو کچھ ہورہا تھا اس سے بھی مجھے اپنی سچائی ثابت کرنے میں کوئی خاص مدد نہیں مل رہی تھی۔ میں تو قدرے مایوسی سے سوچنے لگا تھا کہ واقعی اس فتنے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا کوئی بندوبست ہو بھی سکے گا یا نہیں؟ ابھی تو پوری طرح یہی واضح نہیں ہوسکا تھا کہ اس کی جڑیں کہاں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں؟

مجھے اپنی جان کی' اپنے مالی نقصانات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی۔ اگر افسوس تھا تو صرف ان لوگوں کا جو میری وجہ سے جان سے جارہے تھے یا کوئی نقصان اٹھا رہے تھے لیکن میں ان صدمات کو بھی بھلانے کی کوشش کرسکتا تھا بشرطیکہ مجھے ان کا کوئی اچھا نتیجہ برآمد ہوتا دکھائی دیتا' یہ احساس ہوتا کہ ان قربانیوں کا جلد ہی اس ملک کو اور یہاں کے بے خبر لوگوں کو کوئی بڑا فائدہ پہنچنے والا تھا۔ فی الحال تو ایسے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

بہرحال میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ نیتّوں کے صِلے کی توقع صرف دُنیا والوں کی طرف سے ہی نہیں' کسی اور طرف سے بھی رکھنی چاہیے تھی۔ میں نے مایوسی کو اپنے دل سے نکالنے کی کوشش کی اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ پوری عمارت میں بلا کا سکوت طاری تھا۔ میں نے چپراسیوں تک کو بھیج دیا تھا' صرف تین گارڈز نیچے عمارت کے کمپاؤنڈ میں ہیولوں کی طرح ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ میں نے خود ہی اٹھ کر لائٹس وغیرہ آف کیں اور دروازہ مقفل کرتا ہوا باہر آگیا۔

نیچے آکر گاڑی میں بیٹھنے کے بعد کئی لمحے تک میں سوچتا رہا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے؟ دیکھتا تھا تو اس شہر میں میرے بیسیوں ٹھکانے تھے۔ سوچتا تھا تو اپنے آپ کو بہت بے ٹھکانا سا شخص محسوس کرتا تھا۔ آج تک میں نے بہت سے لوگوں کو ٹھکانا فراہم کیا تھا لیکن آج خود اپنے بارے میں فیصلہ نہیں کرپارہا تھا کہ مجھے کس ٹھکانے کی طرف جانا چاہیے۔ فکر صرف اسی بات کی تھی کہ میری وجہ سے کہیں کوئی تباہی نہ آئے۔ آخرکار میں نے راحیلہ کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کم از کم میرے شانہ بہ شانہ کھڑی ہوکر کسی بھی ناگہانی مصیبت کا مقابلہ کرسکتی تھی۔

میں اس کے ہاں پہنچا تو میری کال بیل کے جواب میں اس نے خود آکر گیٹ کھولا۔ گیٹ کی گِرل سے جھانک کر پہلے اس نے اطمینان کیا تھا کہ آنے والا کوئی اجنبی نہیں۔ وہ اس وقت ڈھیلی ڈھالی' ذرا لمبی سی مردانہ شرٹ اور ٹراؤزر میں تھی جس کی جیب میں یقیناً پسٹل موجود تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی لیکن آنکھوں نے اس مسکراہٹ کا کچھ زیادہ ساتھ نہیں دیا۔ وہ یقیناً افسردہ تھی۔

افسردگی صرف اس کی آنکھوں میں تھی اور بہت ہلکی تھی۔ کسی اور کو شاید اس کا احساس بھی نہ ہوتا لیکن اس کے اندر کا موسم میری آنکھ سے چھُپا نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کی افسردگی کی وجہ میں ہی تھا۔ دل چاہا اُلٹے قدموں لوٹ جاؤں لیکن اس کے لیے مجھے کوئی جواز پیش کرنا پڑتا جسے شاید وہ قبول نہ کرتی۔ مجھے احساس ہوا کہ اسٹوڈیو میں ستارہ کی موت والے واقعے کے بعد سے اس نے مجھے فون بھی نہیں کیا تھا ورنہ دن میں کم از کم ایک بار وہ مجھے کہیں نہ کہیں تلاش کرکے فون پر بات ضرور کرلیتی تھی۔

میں گاڑی پورچ میں لے آیا تو اس نے گیٹ مقفل کردیا اور میرے ساتھ ساتھ اندرونی دروازے تک آئی۔ دروازے پر رک کر میں نے اس کی طرف مُڑتے ہوئے پوچھا "اداس ہو؟"

"تم سے کس نے کہا؟" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"تمہاری آنکھوں نے۔" میں نے جواب دیا۔

"آنکھوں کا زیادہ اعتبار نہ کیا کرو۔ آنکھیں دھوکا بھی کھاتی ہیں اور جھوٹ بھی بولتی ہیں۔" وہ مسکرائی۔

"دھوکا شاید کھا جاتی ہوں لیکن جھوٹ نہیں بولتیں۔ جھوٹ بولنے پر انہیں مجبور کیا جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا اندر چلو۔" وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولی "بند دروازوں کے سامنے کھڑے ہوکر فلسفہ نہیں جھاڑا کرتے۔"

"کیوں؟ کیا دروازے کھُلنے سے انکار کردیتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اگر دروازوں کے کان اور آنکھیں ہوں تو شاید وہ واقعی بعض موقعوں پر کھُلنے سے انکار کردیا کریں۔ لیکن ہر دروازہ تو دل کا دروازہ نہیں ہوتا۔" اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور شاہی دربان کی طرح جھک کر کورنش بجا لاتے ہوئے بولی "تشریف

لایئے۔"

اندر پہنچ کر میں نے پوچھا "یہ تم آج اتنی سنجیدہ کیوں ہو؟"

"انسان کو کبھی کبھی سنجیدہ بھی ہونا چاہیے۔ ویسے بھی اپنے خیال میں تو میں اکثر ہی سنجیدہ ہوتی ہوں۔ میں کوئی مسخری تو نہیں ہوں۔" وہ نہایت سنجیدہ سی صورت بنا کر میرے سامنے کھڑی ہو گئی اور ایک ٹک میری طرف دیکھنے لگی۔

"واپس چلا جاؤں؟" میں نے بھی بظاہر سنجیدگی سے پوچھا۔

"اگر واپس جانے کی کوشش کی تو میں پڑوسیوں سے کتے اُدھار مانگ کر تم پر چھوڑ دوں گی۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ میں تو خود تمہیں بلانا چاہ رہی تھی۔ تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں۔ لیکن سارا دن طبیعت کچھ ایسی ڈل رہی کہ فون تک کرنے کو جی نہیں چاہا۔ بستر میں دبکی رہی، زیادہ تر سوتی رہی۔ اب سوچ رہی تھی کہ دن سو کر گزار لیا، رات جاگ کر گزارنی پڑے گی۔"

"چلو میں تمہارا رت جگا آسان بنانے کے لیے آ گیا ہوں۔ میری شکل دیکھ کر ویسے ہی تمہاری رہی سہی نیند بھی اُڑ گئی ہو گی۔" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"خیر اب ایسی ڈراؤنی شکل بھی نہیں ہے تمہاری۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ وہ اپنی خوش مزاجی کو آواز دینے کی کوشش کر رہی تھی "فی الحال ان فضول باتوں کو چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ میرے مغز کے علاوہ کیا کھانا پسند کرو گے؟ کھانا کھا لیا ہے یا نہیں؟"

"کھانے وانے کا آج کل کوئی خاص ہوش نہیں۔ یاد ہی نہیں رہتا کہ کھایا تھا یا نہیں؟ کبھی کھانے کی جگہ بے خیالی میں صرف پانی پی کر اطمینان ہو جاتا ہے اور کبھی پیاس لگتی ہے تو کھانا کھانے کا خیال آ جاتا ہے۔ کچھ عجیب سے دن ہیں۔"

"میرا خیال ہے کھانا لگا لیا جائے۔" اس نے میرے غیر واضح جواب سے یہ نتیجہ اخذ کیا جو درست تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں چلی گئی اور چند منٹ بعد ہی اس نے مجھے آواز دے لی۔ میں ڈائننگ روم میں پہنچا تو میز پر سادہ سا کھانا لگا ہوا تھا مگر اس کی خوشبو سونگھ کر فوراً ہی میری بھوک جاگ اٹھی۔

"میں ذرا اس ننھے بچے کو بھی بلا لاؤں۔ اپنے کمرے میں پڑا مُنہ بسور رہا ہے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

"ننھا بچہ؟" میں چونکا "وہ کون ہے؟"

"راشد اور کون۔" وہ گہری سانس لے کر بولی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

چند لمحے بعد وہ واپس آئی تو راشد اس کے ساتھ تھا۔ میری خاصے دنوں بعد اس سے ملاقات ہو رہی تھی۔ وہ مجھے کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور لباس شکن آلود تھا۔ وہ کچھ سُست دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ کہیں راحیلہ بھی اسی کی وجہ سے تو کچھ پریشان نہیں تھی؟ وہ خاصی گرمجوشی سے مجھ سے ملا، مسکرا بھی رہا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں میرے دل نے مجھے بتایا کہ وہ کچھ خوش نہیں تھا۔

میں نے بہتر سمجھا کہ پہلے کھانا کھا لیا جائے پھر اسے کُریدنے کی کوشش کی جائے۔ میں نے اسے اپنی ایک ذیلی کنسٹرکشن کمپنی کا ڈائریکٹر بنایا تھا۔ اس نے اس کے بارے میں ابھی تک مجھے کوئی رپورٹ نہیں دی تھی، مجھ سے کوئی میٹنگ نہیں کی تھی۔ وہ کنسٹرکشن کمپنی پہلے بھی کچھ اچھی حالت میں نہیں تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ ایک نوجوان، پُرجوش اور باصلاحیت لڑکا تھا۔ اس میں نئی زندگی پھونک دے گا۔ لیکن اس نے مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں بتایا تھا کہ چارج لینے کے بعد اس نے کس حد تک کمپنی کے سیٹ اپ کو سمجھا تھا، وہ اسے کس طرح چلانے کا ارادہ رکھتا تھا اور کن کن مسائل کے سلسلے میں اسے مدد کی ضرورت تھی۔ کمپنی اس کی تحویل میں جانے کے بعد سے مکمل سکوت طاری تھا۔ کچھ میں بھی پریشان رہا تھا، کاروباری معاملات کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے سکا تھا لیکن بیشتر معاملات ایک خودکار نظام کے تحت چل رہے تھے۔ اس نظام کے تحت بھی کنسٹرکشن کمپنی کی تو کوئی فائل میرے سامنے آئی ہی نہیں تھی۔ کمپنی کا کام گویا وہیں کا وہیں رُکا ہوا تھا جہاں میں نے راشد کے سپرد کیا تھا۔

کھانے اور کافی کے بعد راشد نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور مجھے بھی آفر کی۔ میں نے انکار کرتے ہوئے اپنی خفیف سی حیرت کو چھپاتے ہوئے کہا "تم سگریٹ پینے لگے ہو؟"

"بس ایسے ہی کبھی کبھار تھوڑی بہت پی لیتا ہوں۔" وہ ذرا کھسیانے سے انداز میں بولا۔ میں نے اسے کوئی نصیحت وغیرہ نہیں کی، بس گہری نظر سے اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ یہ گویا اس کے مضطرب، نا آسودہ اور پریشان ہونے کی نشانی تھی۔ وہ ایک صاف ستھرا، اسمارٹ اور ایکٹیو لڑکا تھا۔ میں نے پہلے اسے اس قسم کے مصنوعی سہاروں کا متلاشی نہیں دیکھا تھا۔ یہ کچھ اچھی تبدیلیوں کے آثار نہیں تھے۔

کھانے کے بعد کچھ دیر گپ شپ ہوتی رہی جس میں راشد نے کوئی خاص دلچسپی نہیں لی۔ زیادہ تر وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں مسکراتا رہا۔ آخر کار میں نے راحیلہ سے کہا "تم کہہ رہی تھیں کہ تمہیں مجھ سے کچھ ضروری باتیں کرنا تھیں؟"

وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ ہم ضروری باتیں ہی تو کر رہے ہیں۔ میری نظر میں تو یہ گپ شپ، چھیڑ چھاڑ، فقرے بازی ہی اہم گفتگو ہوتی ہے۔ کاروباری باتیں تو مجھے بہت غیر اہم اور مزاحیہ لگتی ہیں۔"

پھر اس نے وزدیدہ سی نظروں سے راشد کی طرف دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ درحقیقت وہ اسی کے بارے میں کوئی بات کرنا چاہتی تھی یا پھر شاید وہ چاہتی تھی کہ راشد خود ہی بات شروع کرے لیکن وہ بھی خاموش تھا۔

آخر کار میں نے یونہی بات برائے بات کے انداز میں راشد

سے پوچھا "بھئی، وہ کیسی جا رہی ہے تمہاری کنسٹرکشن کمپنی؟ بے چاری زندہ بھی ہے یا فوت ہو گئی؟ تم نے تو اس کے بارے میں کوئی خیر خبر ہی نہیں دی۔" میں نے اپنا لہجہ قطعی دوستانہ رکھنے کی کوشش کی تھی اور صدقِ دل سے چاہا تھا کہ میرے انداز میں کسی بھی قسم کے "باس" کی ذرّہ برابر بھی جھلک نہ آنے پائے۔

راشد کو جیسے کچھ حوصلہ ملا۔ وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "انی بھائی! وہ دراصل میں چاہ رہا تھا کہ آپ مجھے .... میری ہوٹل والی نوکری پر کراچی واپس بھیج دیں۔"

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کمرے میں ایک لمحے کے لیے گہرا سکوت چھا گیا۔ راحیلہ نے شاید اس سکوت کے بوجھل پن کو محسوس کرتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور مصنوعی شگفتگی سے بولی "دراصل راشد بے چارے کی اوقات بہت چھوٹی ہے نا، اسے باس بننا، ڈائریکٹر بننا کچھ راس نہیں آ رہا۔ یہ خوش نہیں ہے، یہ وہاں اپنی کراچی والی نوکری میں زیادہ خوش تھا۔"

"حیرت ہے!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میرا خیال ہے، یہ اس ملک کا واحد نوجوان ہے جو ایک بہت بڑے اور تقریباً خود مختار عہدے کے بجائے اس سے کہیں چھوٹے عہدے پر زیادہ خوش تھا۔"

میں نے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے گہری نظر سے راشد کی طرف دیکھا۔ وہ نظر چُرا رہا تھا اور اس کی جن انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی، ان میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "راشد! اِدھر میری طرف دیکھ کر بات کرو۔ صاف صاف اور سچ سچ بتاؤ مسئلہ کیا ہے؟ میں یہاں بیٹھا تم سے باس کی حیثیت سے بات نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے بڑے بھائیوں کی طرح یا ذرا بڑی عمر کے دوستوں کی طرح سمجھو۔"

"مجھے آپ کے خلوص کا اندازہ ہے انّی بھائی! ہم تو آپ کا احسان چُکا ہی نہیں سکتے۔"

"یہ فضول باتیں میرے سوال کا جواب نہیں ہیں۔ احسان وغیرہ کو بھاڑ میں جھونکو، جو میں پوچھ رہا ہوں، سیدھے اور آسان ترین الفاظ میں، بغیر کسی گھماؤ پھراؤ کے اس کا جواب دو۔" میں نے دوٹوک لہجے میں کہا۔

"مسئلہ کوئی نہیں ہے انّی بھائی!" وہ مضطرب لہجے میں بولا، "بس جو ذمے داریاں آپ نے مجھے سونپی ہیں میں اپنے آپ کو ان کا اہل نہیں سمجھتا۔ عہدہ جتنا بڑا ہوتا ہے، مسائل بھی اتنے ہی بڑے ہوتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو ان سے نمٹنے کا اہل نہیں سمجھتا۔ اس میں حرج ہی کیا ہے۔ میں کراچی چلا جاتا ہوں، باجی یہیں رہیں گی۔ یہ زیادہ باصلاحیت اور زیادہ مضبوط اعصاب کی عورت ہیں، ہر طرح کے حالات میں ڈھل جاتی ہیں۔"

میں نے راحیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ یوں دھیرے سے ہنس دی جیسے دو بزرگوں کے سامنے کوئی بچہ بیٹھا سنجیدگی سے اپنا مسئلہ بیان کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور بزرگوں کی نظر میں وہ مسئلہ قطعی غیر اہم اور فضول سا ہو۔

میں نے دوبارہ راشد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں چونکہ باس نہیں ہوں اس لیے میں تمہیں کوئی شوکاز نوٹس نہیں دوں گا اور نہ ہی تمہاری کوئی باضابطہ اور دفتری قسم کی ایکسپلے نیشن کال ہو گی۔ میں تمہیں آخری موقع دے رہا ہوں کہ جو بات دل میں ہے وہ کرو۔ زیادہ وضع دار بن کر مجھے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔ ورنہ ایسا گھونسا رسید کروں گا کہ اُڑتے ہوئے باہر لان پر پہنچ جاؤ گے۔ اس کھڑکی کے راستے۔" میں نے اشارے سے بتایا۔

راحیلہ نے لقمہ دیا "بلکہ لان پر سفیدے کا جو درخت ہے اس میں جا لٹکو گے اور صبح تک جھولا جھولتے رہو گے، درخت سفیدے کا ہے لیکن تمہیں اتارا جائے گا تو تمہارا رنگ نیلا ہو گا۔"

راشد نے رحم طلب سی نظروں سے بڑی بہن کی طرف دیکھا، گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہا ہو "باجی! کبھی تو میرے مسائل کو سنجیدگی سے سمجھنے کی کوشش کیا کریں۔"

اس نے ایک بار پھر کھنکار کر گلا صاف کیا اور نئی سگریٹ سُلگانے کے لیے پیکٹ سے نکالا۔ میں نے وہ سگریٹ اس کے ہاتھ سے لے کر، مروڑ کر وہیں ایش ٹرے میں ڈالتے ہوئے کہا "سگریٹ پر سگریٹ پینے سے حوصلہ پیدا نہیں ہوتا۔ حوصلہ ہر شریف اور دیانتدار آدمی کے دل میں موجود ہوتا ہے۔ بس وہ اِدھر اُدھر کہیں دل کے کسی اندھیرے گوشے میں دبکا بیٹھا ہوتا ہے۔ اسے ڈھونڈ کر باہر لانا پڑتا ہے۔ سگریٹ کی مدد کے بغیر ہی بولو مسئلہ کیا ہے؟"

اس نے گہری سانس لی۔ شاید اسے دل کے کسی کونے کھدرے میں دبک کر بیٹھے ہوئے حوصلے کی جھلک نظر آ گئی تھی۔ وہ سر اٹھاتے ہوئے بولا "انی بھائی! آپ کی کنسٹرکشن کمپنی تو بالکل بیٹھی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے آپ کے گروپ آف کمپنیز میں یہ سب سے چھوٹی کمپنی ہے اور سب سے زیادہ خسارے میں جا رہی ہے۔ حالانکہ کنسٹرکشن سب سے زیادہ منافع بخش فیلڈ ہے۔"

"بالکل درست کہہ رہے ہو تم۔" میں نے سر ہلایا۔

"آپ کی اس کمپنی میں بہت گھپلے ہیں۔ یہ کام ہی کچھ ایسا ہے۔ آپ لاکھ کوشش کر لیں، کیسا ہی سخت سے سخت نظام بنا لیں، اس میں گھپلوں کی گنجائش رہتی ہے۔ چنانچہ بہت سے گھپلے ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ کمپنی کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔" وہ بہت اٹک اٹک کر بول رہا تھا جیسے کڑوی گولیاں نگل رہا ہو۔

"مجھے معلوم ہے، وہاں گھپلے ہوتے رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کمپنی کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"آپ کو معلوم ہے؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، "اور آپ نے اسے روکنے کے لیے کچھ نہیں کیا؟"

"میرے چندا! ان گھپلوں کو روکنے اور کمپنی کی ٹوٹی ہوئی کمر کو جوڑنے کے لیے ہی تو میں نے تمہیں کراچی سے بلایا ہے۔ تم کس

مرض کی دوا ہو؟" میں نے ملائمت سے کہا "دیکھو میرے بھائی! اس اتنے بڑے بزنس میں، میں ہر معاملے کو خود جا کر ہینڈل نہیں کرسکتا، ہر رجسٹر کو خود جا کر چیک نہیں کرسکتا۔"

"درست ہے" اس نے تسلیم کیا "میں نے جب سے چارج سنبھالا ہے تب سے میں صرف یہی کام دن رات کررہا ہوں کہ ہر چیز کو کھنگال رہا ہوں، خرابی کو سمجھنے کی کوشش کررہا ہوں۔ قدم قدم پر میری راہ میں روڑے اٹکائے جارہے ہیں، اسی لیے میں ابھی تک آپ کو کوئی رپورٹ نہیں دے سکا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن تم یہ رپورٹ تو دے سکتے تھے کہ تم رپورٹ کیوں نہیں دے سکے۔"

"میں خوفزدہ سا ہوگیا تھا۔" وہ بولا "میں نے محسوس کیا کہ اگر مجھے اس کمپنی کو چلانا ہے تو مجھے نہ جانے کتنے لوگوں کی مخالفتیں مول لینا پڑیں گی اور اس چکر میں مجھے کوئی اچھا صلہ یا نیک نامی ملنے کے بجائے رُسوائی نہ ملے۔ دفتری سیاست بڑی عجیب ہوتی ہے۔ بعض اوقات بدعنوان اور سازشی لوگ مالک کے چہیتے بن جاتے ہیں اور دیانتدار کارکن معتوب ہوجاتے ہیں۔"

"لیکن ایک اصول ہمیشہ یاد رکھنا۔ بلکہ اس پر اپنا ایمان مضبوط کرلو کہ حالات خواہ کتنے ہی خراب نظر آئیں، ظلم، جھوٹ اور بُرائی خواہ کتنی ہی غالب ہوجائے لیکن آخری فتح ہمیشہ سچ کی ہوتی ہے۔ اس یقین کے ساتھ چلوگے تبھی جھوٹ کو شکست دے سکو گے ورنہ راستوں کی دُھول بن کر ہوا کے ساتھ اُڑ جاؤ گے۔"

وہ سر جھکائے بیٹھا تھا۔ میں نے سوچا اس کا ذہن تھوڑا سا صاف کرہی دیا جائے۔ مجھے اس کو کچھ سمجھانے کا وقت نہیں ملا تھا اور میں نے ایک مشکل کام اس کے سر پر ڈال دیا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تمہیں شاید اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ میرا کاروبار خاصا وسیع ہے اور بڑی عمدگی سے چل رہا ہے۔ اس میں برائے نام کرپشن ہے۔ بلکہ مجھے ایک انفرادیت یہ بھی حاصل ہے کہ مجھے بڑے جاں نثار کارکن میسّر ہیں ورنہ مالک اور کارکن کا رشتہ بڑا ناپائیدار ہوتا ہے۔ کہیں دو سو روپے تنخواہ زیادہ ملے تو ملازم، ملازمت چھوڑ کر چل دیتے ہیں لیکن میرے ہاں سے کوئی دُگنی تنخواہ پر بھی کہیں نہیں جائے گا اور ضرورت پڑنے پر میرے پسینے کی جگہ خون بھی بہانے کے لیے تیار نظر آئے گا۔ کاروبار کو اس مقام تک لانے میں مجھ اکیلے کا کوئی کمال نہیں۔ میری خوش قسمتی یہی تھی کہ میں جو بھی ذیلی ادارے قائم کرتا چلا گیا انہیں چلانے کے لیے مجھے اچھے ساتھی ملتے چلے گئے۔ میری ہر ذیلی کمپنی کا سربراہ اس کمپنی کو اسی طرح چلا رہا ہے کہ جیسے اس کی کرسی پر وہ نہیں، میں ہی بیٹھا ہوں، میرے تمام اختیارات اسے حاصل ہیں، میرا فائدہ اس کا فائدہ ہے اور میرا نقصان اس کا نقصان ہے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر میں نے گہری سانس لے کر کہا "میری کمپنیوں میں صرف کنسٹرکشن کمپنی فلاپ ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ رہی ہے کہ اسے چلانے کے لیے مجھے کوئی صحیح آدمی نہیں مل سکا۔ دوسرے میں نے اسے کسی خاص منصوبہ بندی کے بغیر یکدم شروع کردیا تھا۔ اس کی بنیاد ہی صحیح نہیں پڑ سکی۔ شروع ہی سے مجھے صحیح لوگ نہیں مل سکے۔ اصل میں اسے شروع کرتے وقت میرے ذہن میں تھوڑا سا لالچ تھا، شاید اسی لیے یہ زیادہ نہیں پنپ سکی۔ جس کام کی تہ میں کوئی مثبت مقصد نہیں بلکہ صرف لالچ ہوتا ہے، اس پر ایک عجیب سی نحوست چھا جاتی ہے۔ جو کمپنیاں میں نے خالصتاً منافع کے لالچ میں قائم نہیں کیں بلکہ ان میں تھوڑا بہت تعمیری مقصد بھی پیشِ نظر رکھا وہ۔۔۔ زیادہ منافع دے رہی ہیں۔ کنسٹرکشن میں، میں نے صرف کچھ لوگوں کو دونوں ہاتھوں سے دولت کماتے بلکہ لُوٹتے دیکھا۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے لوگ کروڑپتی بن گئے۔ میں نے سوچا میں بھی کیوں نہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھولوں۔ حالانکہ وہ لوگ بھی لالچی تھے بلکہ بے ایمان بھی تھے لیکن وہ خوب پھل پھول رہے تھے۔ شاید انہیں حرام کی دولت راس تھی، مجھے راس نہیں تھی۔ یا شاید انہیں کہیں آگے جاکر جھٹکا لگے گا۔ مجھے شروع میں ہی لگ جاتا ہے۔ جب سے میں راہِ راست پر آیا ہوں، مجھے لالچ راس ہی نہیں آتا۔ اگر میں اس کمپنی کے مقاصد میں بھی کوئی تھوڑا بہت تعمیری مقصد سامنے رکھ لیتا، تعمیراتی کمپنی میں واقعی تھوڑی سی تعمیر بھی لے آتا۔ مثلاً یہ سوچ لیتا کہ ہر سال میں کچھ کم آمدنی والے لوگوں کو بلا منافع یا کم منافع پر اور آسان شرائط پر کچھ مکانات تعمیر کرکے دیا کروں گا تو شاید یہ کمپنی خوب پنپ جاتی، اس کے کام میں برکت ہوجاتی اور اسے ایماندار کارکن بھی میسّر آجاتے۔"

راحیلہ مسکرائی اور سراہتے ہوئے بولی "ماشاء اللہ بڑے صوفیانہ خیالات ہیں۔ تمہارا نام تو محمد افضل چوہدری کے بجائے محمد افضل صوفی ہونا چاہیے تھا۔"

"خیر اب میرا درجہ اتنا بلند بھی مت کرو۔ میں تو کسی صوفی کی خاکِ پا کے برابر بھی نہیں ہوں۔ میں تو بڑا دُنیا دار آدمی ہوں لیکن چند برسوں سے مجھے یہ تجربہ حاصل ہوا ہے کہ دُنیا داری میں بھی اگر تھوڑے سے اچھے اصول اور نیک مقاصد شامل کرلیے جائیں تو اس میں بھی بڑی برکت ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ آنکھیں بند کرکے ہر جائز یا ناجائز ذریعے سے دولت کمانے کے لیے دیوانے ہوئے رہیں، دوسرے طریقے سے چلنے میں زیادہ فائدہ ہے۔ اگر یہ بات میری سمجھ میں نہ آئی ہوتی تو شاید میں اتنی جلدی اتنا زیادہ دولت مند نہ ہوپاتا۔"

راحیلہ بولی "اور یہ جو تمہیں جھٹکے لگنے شروع ہوئے ہیں۔ مثلاً تمہارا اتنا شاندار مکان اُڑ گیا کافی بڑا نقصان تھا یہ بھی۔"

"اس کی ایک ہی توجیہہ میری سمجھ میں آتی ہے اور وہ یہ کہ میری دولت میں جو میرے دورِ گمراہی کا ناجائز روپیا شامل ہے کبھی

کبھی اس کی چھانٹی ہونے لگتی ہے۔ دودھ کا دودھ، پانی کا پانی ہونے لگتا ہے۔ گھن کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے شاید اس لیے چند بے گناہوں کی جانیں بھی چلی گئیں۔ یہ جو کنسٹرکشن کمپنی میں مسلسل نقصان ہورہا ہے شاید یہ بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ یا ممکن ہے کہ کوئی اور بات ہو، ہم قدرت کے رازوں کو کہاں سمجھ سکتے ہیں۔ ویسے بھی انسانی زندگی میں اتار چڑھاؤ تو آتے ہی رہتے ہیں۔"

پھر میں نے راشد کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "کنسٹرکشن کمپنی کی حالت چونکہ زیادہ خراب تھی اس لیے اس میں مجھے زیادہ باصلاحیت اور زیادہ مخلص آدمی کی ضرورت تھی۔ میں نے تمہیں زیادہ مخلص، زیادہ باصلاحیت اور اپنا قریبی آدمی سمجھا تھا اس لیے یہ مشکل کام تمہارے سپرد کیا تھا۔ ورنہ میں کوئی بہت سیدھی سادی سی ذمّے داری بھی تمہارے سپرد کرسکتا تھا۔ آرام سے فائلوں پر دستخط کرتے، نو سے پانچ دفتر میں بیٹھتے اور پہلی کو لگی بندھی سی تنخواہ لیتے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ لیکن میں چاہتا ہوں، تم بڑے آدمی کے بیٹے ہو تو بڑے ہی کام کرو۔"

وہ اب آنکھوں میں ہلکی سی چمک لیے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ذہن کے بند دروازے یقیناً دھیرے دھیرے کھل رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "تمہیں وہاں اس لیے نہیں بھیجا گیا ہے کہ تم کمپنی کی حالت دیکھ کر پہلے کفِ افسوس ملو، پھر اپنے بال نوچو اور آخر میں چیخیں مارتے ہوئے کراچی بھاگ جاؤ۔ تمہیں اس کو ہر قیمت پر ٹھیک کرنا ہے۔ تم ڈائریکٹر ہو، تمہارے پاس تمام اختیارات ہیں۔ جس کو چاہے رکھو، جسے چاہو نکالو۔ کسی کی بے ایمانی پکڑو تو اس کی سازشیت یا مکّاری کی پروا مت کرو۔ اسے سزا دو۔ اس کے سارے کس بل نکال دو۔ میرا نظریہ ہے کہ کسی بھی ادارے کا سربراہ اگر خود دیانتدار ہو اور اسے تمام ضروری اختیارات بھی حاصل ہوں تو وہ اس ادارے کو صحیح کرسکتا ہے ورنہ پھر وہ نااہل ہے۔ وہ موقع ملنے کے باوجود زندگی میں کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا، وہ ذہنی طور پر چھوٹا آدمی ہے۔ اب یہ تمہاری مرضی پر منحصر ہے کہ تم کیا بننا چاہتے ہو۔ راستہ تمہارے سامنے کھلا ہے۔"

وہ گہری سانس لے کر قدرے بدلے بدلے لہجے میں بولا "چلئے یہ سب کچھ میں نے آپ کے مُنہ سے سن لیا تو بات ذرا صاف ہوگئی۔ اب میں سب کچھ سنبھال لوں گا۔ وقت تو لگے گا لیکن سب ٹھیک ہوجائے گا۔ مگر میں نے محسوس کیا ہے کہ اس سے آگے بھی میں ایک مقام پر اٹکتا ہوں۔"

میں نے پاؤں ذرا پھیلا کر بیٹھتے ہوئے کہا "تم جہاں جہاں اٹکتے ہو، مجھے کُھل کر بتادو۔ میں اس وقت ذرا فرصت میں ہوں، تمہاری سب اُلجھنیں دور کرکے ہی سونے کے لیے لیٹوں گا۔ میں تو سمجھا تھا، تم بڑے ہوچکے ہو لیکن تم تو ابھی بچے ہو۔ تمہیں اگر طاقت و اختیارات دے دیے جائیں تب بھی تم ان سے استفادہ کرنے کی جرأت نہیں کرپاتے۔"

"وہی تو میں عرض کرنے لگا ہوں۔ میں نے لوگوں کو ملازمت سے نکالنے یا انہیں نکیل ڈالنے کے سلسلے میں تو نہیں البتہ کسی اور طرح سے اپنے اختیارات کا استعمال کرنے کی کوشش کی تھی تب بھی ایک جگہ جاکر گوٹ اٹک گئی۔"

"وہ کہاں؟" میں نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں نے سوچا تھا کہ ملازمین میں کھلبلی مچانے کے بجائے کچھ انقلابی اقدامات کرکے اور کچھ منافع بخش پروجیکٹ شروع کرکے کمپنی کو سنبھالنے کی کوشش کی جائے لیکن کمپنی کی حالت چونکہ اچھی نہیں ہے اور اس کے پاس اپنا کوئی ریزروڈ کیپٹل نہیں ہے، بینک اسے لون دینے کے لیے تیار نہیں ہیں اور بعض اوقات تنخواہیں تک لینے کے لیے اسے ہیڈ آفس سے سب سڈری لینی پڑتی ہے۔ اس لیے کمپنی کے اپنے بل بوتے پر کوئی پروجیکٹ شروع نہیں کیا جاسکتا۔"

"درست ہے" میں نے سرہلایا "میں نے کمپنی کے تازہ ترین حسابات نہیں دیکھے لیکن مجھے اندازہ ہے کہ تم جو کہہ رہے ہو وہ درست ہے۔"

اس تصدیق سے اس کے چہرے پر طمانیت بڑھ گئی اور وہ زیادہ اعتماد سے بولا "چنانچہ آپ کی ہدایت کے مطابق میں نے مدد کے لیے آپ کے ڈائریکٹر فائنانس سے رجوع کیا۔ پورے گروپ آف کمپنیز کے ڈائریکٹر آف فائنانس چونکہ ایک ہی ہیں اور وہ بڑی توپ چیز ہیں چونکہ وہ اتنے بڑے گروپ کے فائنانسز کو اکیلے ڈیل کرتے ہیں اس لیے بعض اوقات سسٹر کمپنیوں کے ڈائریکٹرز کو خاطر میں نہیں لاتے۔ وہ گویا ایک پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھے ہیں اور کاروبار کی شہ رگ ان کے ہاتھ میں ہے۔"

"وہ واقعی توپ چیز ہیں۔ بہت سینئر آدمی ہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا "وہ تو ایک انٹرنیشنل بینک میں بہت بڑے عہدے پر تھے۔ یوں سمجھو میں نے انہیں بڑی مشکل سے وہاں سے توڑا ہے کیونکہ وہ بڑے کام کے آدمی تھے۔ بڑے بڑے کاروباری لوگ ڈائریکٹر فائنانس کی اہمیت کو پوری طرح نہیں سمجھتے اور عام طور پر اس سیٹ پر لوگ کرپٹ ہوجاتے ہیں لیکن ہمارے سلیمی صاحب کرپٹ نہیں ہیں۔ انہیں علم نہیں ہے اور اگر علم ہوگیا تو بہت سخت بُرا منائیں گے۔ ممکن ہے نوکری ہی چھوڑ کر چلے جائیں۔ لیکن میں ان کی لاعلمی میں گویا کئی بار انہیں محدب عدسوں سے دیکھ چکا ہوں اور کئی چھلنیوں سے گزار چکا ہوں۔ کبھی ان کی کوئی کمزوری نہیں پکڑی گئی۔ دولت کی بہتی ندّی کے کنارے بیٹھ کر بھی اس شخص کا ایمان کبھی نہیں ڈگمگایا۔ نمازی پرہیزگار، دیانتدار آدمی ہیں۔ انہیں جو مراعات حاصل ہیں انہی سے وہ ایک اچھے بھلے دولت مند آدمی جیسی زندگی گزارتے ہیں اور وہ [illegible] مطمئن ہیں۔ زیادہ

ہوس میں مبتلا نہیں ہوتے۔"

"میں انہیں ابھی زیادہ نہیں جانتا لیکن ظاہر ہے آپ کی رائے درست ہی ہوگی۔ بہرحال وہ میری پہلی ہی فائل روک کر بیٹھ گئے ہیں۔ آپ کے مریض کو پیروں پر کھڑا کرنے کے لیے تازہ خون کی ضرورت ہے اور سلیمی صاحب اسے تازہ خون فراہم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کے سامنے جا کر میری ڈائریکٹر کی حیثیت دُھری کی دُھری رہ جاتی ہے۔" راشد کے چہرے پر بے چارگی ابھر آئی۔

میں ہنس دیا۔ راحیلہ بھی راشد کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی،

"بس اتنی سی بات پر تم پریشان ہوگئے؟ بستر بوریا اٹھا کر کراچی واپس جانے کی سوچنے لگے۔ بھئی تم تو چوہدری گروپ آف کمپنیز میں گھسنے کے بالکل ہی اہل نہیں ہو۔"

"اسی لیے تو چھٹی مانگ رہا تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"لیکن جنہیں میں گردن سے پکڑ کے لاتا ہوں انہیں میرے ہاں سے کبھی چھٹی نہیں ملتی۔ یہاں تو لوگ گولیوں کی چھاؤں میں بھی میرے کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے رہتے ہیں، پیچھے ہٹنے اور واپس جانے کا کبھی نہیں سوچتے۔ وہی لوگ میری ہر چیز کے مالک ہیں۔" میں نے ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار کی طرف دیکھنے لگی۔

"سلیمی صاحب نے تمہاری پہلی ہی فائل روک لی تو تم پریشان ہوگئے۔ دفتر کے چند گھاگ اور بدعنوان قسم کے کارکنوں کے ہتھکنڈوں سے گھبرا گئے۔ یہ مسائل تو چلتے ہی رہیں گے۔ رفتہ رفتہ تمہیں ان سے نمٹنے کا سلیقہ آجائے گا۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" راشد جلدی سے بولا "میں تو بس اس چیز سے گھبرا رہا ہوں کہ کہیں آپ کو میرے بارے میں یہ تاثر نہ مل جائے کہ میں نااہل، بددیانت یا آپ سے غیر مخلص ہوں۔ میرے اٹھائے ہوئے کسی قدم یا میرے خلاف بُنی گئی کسی سازش کے نتیجے میں اگر آپ کو ایسا تاثر مل گیا اور آپ نے اس پر یقین کرلیا تو وہ میرے لیے ڈوب مرنے کا مقام ہوگا۔ میں شرم سے مرجاؤں گا۔"

راحیلہ آخر کار لقمہ دیے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی،

"شرم سے مرجانا بہرحال بے شرمی کی موت مرنے سے بہتر ہے۔"

میں نے اپنی توجہ راشد پر ہی مرکوز رکھتے ہوئے کہا "تمہیں شاید یہ معلوم ہوگا کہ ہماری ایک فلم کمپنی بھی ہے جس کا ڈائریکٹر آفاق ہے۔ اس نے بھی ابھی منافع دینا شروع نہیں کیا۔ اسے بھی بینک لون نہیں دیتے اور اسے تازہ ترین جھٹکا یہ لگا ہے کہ محض مجھ سے تھوڑے سے تعلقِ خاطر کی وجہ سے ہماری ہیروئن قتل ہوگئی ہے۔ ہماری تین فلمیں ادھوری چھوڑ گئی ہے۔"

راحیلہ کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ستارہ کے تذکرے پر وہ بغور میری طرف دیکھنے لگی تھی۔ شاید کوئی تاثر تلاش کررہی تھی لیکن میں نے اپنی ٹیس کو سینے میں ہی دبائے رکھا اور کاروباری گفتگو جاری رکھی۔ میں حیران تھا، راحیلہ خود میری بننے کے لیے تیار نہیں تھی لیکن رقابت کے جراثیم اس کے ذہن میں پھر بھی پائے جاتے تھے۔ مجھے معلوم تھا اس نے جب عالمِ نزع میں ستارہ کے ہاتھ سے لپ اسٹک سے لکھے گئے الفاظ دیکھے تھے 'انی! مجھے بھولنا نہیں' تو راحیلہ کو شدید دھچکا لگا تھا مگر وہ واقعی بڑے مضبوط اعصاب کی عورت تھی۔ بڑی صفائی سے اس جھٹکے کو سہہ گئی تھی۔ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ کسی کو بھی ذرا احساس نہ ہونے پائے۔ ہر عورت عجیب ہوتی ہے۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "آفاق کو بھی ہیڈ آفس کی مدد کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ وہ بھی سلیمی صاحب سے ملتا ہے مگر مجھے معلوم بھی نہیں ہوتا۔ بالا ہی بالا اس کے کام چلتے رہتے ہیں۔ اس نے کبھی مجھ سے شکایت نہیں کی کہ اس کی کوئی فائل روک لی گئی ہے۔"

"یہ بدنصیبی میرے ہی حصے میں آئی تھی۔" راشد خود استہزائیہ کے سے انداز میں مسکرایا۔

"میرے خیال میں اس کی صرف دو تین ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کنسٹرکشن کمپنی پہلے ہی ہمارا اتنا خون چوس چکی ہے کہ سلیمی صاحب کو مزید فنڈز جاری کرتے ہوئے تکلیف ہوتی ہوگی۔ وہ کہا کرتے ہیں 'کنسٹرکشن کمپنی تو صرف اس صورت میں نقصان میں جاسکتی ہے کہ وہ سرکاری ہو۔ ورنہ کنسٹرکشن کمپنی کو نقصان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ سب مل کر کھاتے رہیں تب بھی وہ کچھ نہ کچھ منافع تو چھوڑ ہی جائے گی۔' دوسرے وہ تمہاری کم عمری اور اس فیلڈ میں تمہاری ناتجربے کاری دیکھ کر بھی گھبرا جاتے ہوں گے۔ تیسرے یہ بھی ممکن ہے کہ پروجیکٹ بڑا ہو اور وہ ابھی اس کے اچھے بُرے پہلوؤں کا باریک بینی سے جائزہ لے رہے ہوں۔ بہ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ فائل روکنے میں ان کی کسی بدنیتی کو دخل نہیں ہوگا۔ دوسرے میں انہیں تمہارے بارے میں بریف بھی نہیں کرسکا۔ میں انہیں سمجھا دوں گا۔ تمہارا یہ مسئلہ تو حل ہوجائے گا لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمہیں اپنے مسائل خود بھی حل کرنے ہوں گے۔ ایک مضبوط اور وزنی شخصیت بن کر رہنا ہوگا۔"

"مضبوطی اور وزن ہی کی تو کمی ہے بے چارے میں۔ وزن ایک سو بیس پونڈ سے بڑھتا ہی نہیں۔ حالانکہ خوب ٹھونس ٹھونس کر کھاتا ہے اور مضبوطی کا یہ عالم ہے کہ ایک بار میں نے کراٹے کا ایک ہاتھ مار دیا تھا تو بے چارہ ہفتوں دوا کی مالش کرتا رہا تھا۔ بیسیوں ایکسرے نکلوائے تھے۔" راحیلہ نے آہ بھر کر بتایا۔

میں نے راحیلہ کا سراپا جائزہ لیتے ہوئے کہا "وزن تو تمہارا بھی اس سے زیادہ نہیں ہوگا۔ اصل وزن اور اصل مضبوطی تو انسان کے اندر ہوتی ہے نا۔"

"اس کے لیے بھی میں اس سے بہت کہا کرتی تھی۔ جبر

زمانے میں میں کراٹے سینٹر جایا کرتی تھی' شوٹنگ سیکھتی تھی' اس زمانے میں راشد سے بھی کہا کرتی تھی' بھائی! تم بھی کچھ سیکھ لو' تم بھی جان کو ذرا تکلیف دے لیا کرو' شاید زندگی میں یہ چیزیں کبھی کام آجائیں۔ تو یہ کہا کرتا تھا کہ مجھے ٹارزن یا جیمز بانڈ وغیرہ کا جانشین نہیں بننا ہے۔ آپ ہی جان کھپاتی رہیں۔ اسے اپنی پڑھائی' تھوڑا بہت انگریزی ناولوں کے مطالعے اور آرام سے بستر پر لیٹ کر وی سی آر پر فلمیں دیکھنے کے علاوہ کسی کام سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔" وہ راشد کی طرف دیکھ کر چڑانے والے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ راشد ایک ٹک اسے گھور رہا تھا۔

میں نے مربیانہ انداز میں کہا "جب تک کوئی چیز مزاج میں نہ ہو' سیکھنے سے بھی کچھ نہیں ہوتا۔"

راشد بدستور راحیلہ کو گھورتے ہوئے بولا "کر چکیں ساری برائیاں یا ابھی کوئی برائی باقی ہے؟" پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا "ان موصوفہ کو اپنے بارے میں بہت سی خوش فہمیاں اور میرے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہیں۔ ان کو یہ معلوم ہی نہیں کہ ہم بھی چھپے رستم ہیں' بلکہ بقول چچا غالب۔

بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

انی بھائی! اگر آپ حکم دیں تو میں ابھی موصوفہ کی کھوپڑی پر کراٹے کا ہاتھ رسید کر کے انہیں ایک ہفتے کے لیے بے ہوش کر کے دکھاؤں؟"

"بس' بس' بس" راحیلہ ہاتھ بڑھا کر گویا اسے روکتے ہوئے بولی "تمیں مار خاں صاحب! آپ بھیس بدل کر تماشے وغیرہ ہی دیکھتے رہیں۔ ہاتھ پاؤں چلانے کے چکر میں نہ پڑیں' تاجک کلیّا میں موچ آجائے گی۔"

مجھے خوشی تھی کہ راشد کی شگفتگی لوٹ آئی تھی اور وہ دونوں بہن بھائی نوک جھونک کے موڈ میں دکھائی دے رہے تھے۔ راشد کی دل شکستگی اور اضمحلال دور ہو گیا تھا۔ میں نے ریفری کی طرح دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا "بس بس' آپ دونوں ہی اپنی اپنی ہڈی پسلی اور کھوپڑی وغیرہ کو سنبھال کر رکھیں اور اس پُرسکون کاروباری ماحول میں بلوے اور فساد کا منظر پیدا کرنے کی کوشش نہ کریں۔"

پھر میں نے راشد کو مخاطب کیا "تم اب نئے حوصلے سے کنسٹرکشن کمپنی کو سنبھالنے کے لیے تیار ہو یا نہیں؟"

"ہاں میرا خیال ہے مجھے اتنی جلدی ہار نہیں ماننی چاہیے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "اس میں کوئی شک نہیں کہ میں نے جیلیمی صاحب کو جو فائل بھیجی ہے وہ بہت بڑا پروجیکٹ ہے۔"

"کیا پروجیکٹ ہے؟" میں نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"ملتان روڈ پر آپ کی بہت بڑی زمین ہے جو غالباً آپ نے کسی زمیندار سے خریدی تھی' وہ بے کار پڑی ہے بلکہ اس پر ٹیکسوں کی مد میں ہر سال اچھی خاصی رقم ادا کی جا رہی ہے۔ میں اس کے ایک حصے پر ہاؤسنگ پروجیکٹ شروع کرنے کا پروگرام ہے۔ اگر وہ کامیاب ہو گیا تو پھر اس پوری زمین سے بہت کچھ جا سکتا ہے۔ ہاؤسنگ پروجیکٹ میں یہ فائدہ ہے کہ اپنی رقم بہت کم لون بہت کم لگانا پڑتا ہے۔ جلد ہی پبلک کا پیسا آنے لگتا ہے۔"

"ہاؤسنگ پروجیکٹ کے نقطۂ نظر سے اور لاہور کے اعتبار سے وہ جگہ دور بہت ہے لیکن تم نے اگر سارے مسائل پر غور کر لیا ہے اور ان کا حل سوچ لیا ہے تو ٹھیک ہے' قدم بڑھاؤ' فائنانس تمہارے لیے مسئلہ نہیں بنے گا۔" میں نے کہا۔

ایک لمحے خاموشی رہی پھر راحیلہ میری طرف دیکھتے ہوئے تحسین آمیز لہجے میں بولی "دماغ کے کیڑے جھاڑنے میں تمہارا جواب نہیں ہے۔ طبیعت صاف ہو گئی بے چارے کی!"

"ایک مرتبہ تمہارے دماغ کے کیڑے بھی اسی طرح جھاڑے تھے۔ اس کے بعد سے ٹھیک چل رہی ہو۔ اصل میں اچھی گاڑیوں کو بھی کبھی کبھی اوور ہالنگ کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔ اس کے بعد آرام سے چلتی رہتی ہیں ورنہ گاڑی کے بجائے اڑیل ٹٹو معلوم ہونے لگتی ہیں۔" پھر میں نے خواہ مخواہ جماہی لے کر کہا "میں نے اتنی لمبی تقریر کی ہے' اب کم از کم کافی تو پلوا دو۔ راحیلہ! تمہارا جذبۂ میزبانی تو بالکل ہی اللہ کو پیارا ہو گیا ہے۔"

"چلو راشد! کافی بنا کر لاؤ۔ تمہاری وجہ سے انی کو اتنی لمبی تقریر کرنی پڑی ہے۔ ان کے دماغ کی چولیں ہل گئی ہیں۔ تم جیسے کوڑھ مغز کے ساتھ تبادلۂ خیال کرنا کوئی آسان کام تو نہیں!" راحیلہ تحکمانہ لہجے میں بولی۔

"مجھے کوئی مردوں والا کام بتائیے۔ یہ کافی' چائے' کھانا وغیرہ بنانا آپ جیسی سلیقہ شعار خواتین کا شعبہ ہے۔" راشد اکڑ کر بولا۔

"اب اٹھ جائیے جناب مرد صاحب! ورنہ یہ سلیقہ شعار خاتون ایسا سلیقے کا جھانپڑ رسید کرے گی کہ نہایت سلیقے سے دو دانت باہر آجائیں گے۔" راحیلہ نے آنکھیں نکالیں۔

"لینگویج پلیز!" راشد نے نہایت متانت سے ہاتھ اٹھایا۔

"ملازمہ کہاں ہے بھئی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"وہ چند دن کی چھٹی لے کر گاؤں گئی ہے۔" راحیلہ نے بتایا۔

"اوہ گاؤں' پیارا گاؤں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "نوکر ہم سے اچھے ہیں' کبھی گاؤں سے ناتا نہیں توڑتے۔"

راشد غالباً کافی بنانے کے لیے اٹھنے لگا تو راحیلہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی "بس بس' بیٹھے رہو۔ اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ ہم واقعی تمہارے ہاتھ کی کافی پینا چاہ رہے تھے۔ یہ رسک بھلا کون لے سکتا ہے؟ تمہارے ہاتھ کی کافی پی کر تو انسان کو کافی دنوں کے لیے کافی سے نفرت ہو جاتی ہے۔"

وہ کچن میں چلی گئی اور جلد ہی پرکولیٹر میں کافی بنا کر لے آئی۔ اس کے چہرے پر اب بڑی طمانیت تھی' وہ مسلسل مسکرا رہا تھا۔ راحیلہ نے اس کے قریب ہی کھڑے ہو کر کافی مگوں میں انڈیلی۔ اس نے مجھے مگ دیا' پھر راشد کو دینے لگی۔ مجھے وہ منظر ہمیشہ یاد رہے گا۔ راشد شریر سے انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مگ لینے کے لیے ہاتھ اٹھا رہا تھا جب تقریباً ایک ساتھ دو چھناکے ہوئے۔

ایک چھناکا کھڑکی کا شیشہ ٹوٹنے کا تھا اور دوسرا راحیلہ کے ہاتھ میں موجود مگ ٹوٹنے کا۔ اس کے ساتھ ہی راشد کی پیشانی میں سوراخ ہو گیا اور وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہی لیے کرسی سمیت الٹ گیا۔

اگر راحیلہ نے بدحواس ہو کر یا غیر ارادی طور پر جذباتیت کا مظاہرہ کر کے ایک لمحہ بھی ضائع کیا ہوتا یا وہ راشد کو دیکھنے کے لیے لپکی ہوتی تو دوسری گولی اس کا لہو چاٹ گئی ہوتی۔ مگر اس نے ناقابلِ یقین حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا اور راشد کو الٹتے دیکھ کر فوراً بیٹھ گئی۔ میں بھی کرسی سے پھسل کر ڈائننگ ٹیبل کی آڑ لے چکا تھا لیکن راحیلہ نے مجھ سے پہلے ہی پسٹل نکال کر کمرے میں روشن فینسی بلب کے گلوب کو گولی سے چکنا چور کر دیا۔ کمرے میں اندھیرا چھا گیا۔ لاؤنج سے مدھم سی روشنی کمرے میں آرہی تھی لیکن وہ باہر موجود کسی بھی شخص کے لیے ٹارگٹ لینے کی غرض سے ناکافی تھی۔

لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ باہر کوئی ایک آدھ آدمی نہیں تھا۔ وہ یقیناً ایک سے زیادہ تھے اور انہیں اب ٹارگٹ کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ آٹومیٹک گنوں سے اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ ہر وہ چیز جو گولیوں کی زد میں آرہی تھی اس کے پرخچے اڑ رہے تھے۔ دیواروں سے سیمنٹ کے ٹکڑے اڑ اڑ کر گر رہے تھے۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ اعصاب شکن تھی۔ چند سیکنڈ پہلے ہم آرام سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ یکدم ہی گویا کوئی قیامت ٹوٹ پڑی تھی۔ میں اور راحیلہ ڈائننگ ٹیبل کے تقریباً نیچے ہی تھے۔ اندھیرے میں بھی میں دیکھ سکتا تھا کہ اس کا چہرہ کھنچ کر رہ گیا تھا اور آنکھوں میں شعلے لپک رہے تھے۔

وہ کارنر کا مکان تھا۔ صرف ایک طرف سے مکانوں کی قطار سے جڑا ہوا تھا۔ تین طرف سے اوپن تھا اور میرا اندازہ تھا کہ ان تینوں اطراف سے فائرنگ ہو رہی تھی۔ یکدم گویا پوری بٹالین نے حملہ کر دیا تھا اور یوں لگتا تھا کہ ان کا ارادہ صرف گولیوں سے کوٹھی کو مسمار کر دینے کا تھا۔ گولیاں صرف کمرے میں ہی نہیں آرہی تھیں' پوری کوٹھی پر ہی گولیوں کی بارش ہو رہی تھی۔ ہر طرف سے چیزوں کے پرخچے اڑنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ہر کمرے میں گولیاں صرف کھڑکیوں کے راستے آرہی تھیں جن کے شیشے اتنی کرچیوں تک تباہ ہو چکی تھیں۔ تاہم فائرنگ کا لیول اتنا اونچا ضرور تھا کہ ہم گھٹنوں کے بل ادھر ادھر جا سکتے تھے۔

راحیلہ گھٹنوں کے بل راشد کے قریب گئی اور ایک لمحے بعد اندھیرے میں اس کی تیز سسکی سی ابھری "یہ مر چکا ہے۔"

مجھے اس تصدیق کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اس کی پیشانی میں سوراخ ہوتے دیکھا تھا۔ جہاں اسے گولی لگی تھی' اس کے بعد اس کا بچنا ایک معجزہ ہی ہو سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہ ایک بھیانک خواب محسوس ہوا۔ ابھی تو وہ میرے سامنے بیٹھا باتیں کر رہا تھا۔ میں نے اتنی دماغ سوزی سے اسے سمجھایا تھا تو اس کے چہرے پر زندگی کی چمک اور بشاشت واپس آئی تھی۔ ابھی تو راحیلہ سے اس کی نوک جھونک چل رہی تھی اور اب وہ کرسی کے پاس مُردہ پڑا تھا۔ میں اور راحیلہ بھی موت ہی کے نرغے میں تھے۔

راحیلہ نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں طوفان مقید تھا۔ اس کی حالت پنجرے میں بند شیرنی کی سی تھی۔ دانت سختی سے بھنچے ہوئے تھے اور سانس تیز چل رہی تھی۔ پسٹل اس کی مٹھی میں دبا ہوا تھا لیکن فی الحال اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مشین پسٹل میرے ہاتھ میں بھی تھا لیکن آٹومیٹک گنوں سے برسی ہوئی گولیوں کے اس طوفان کے سامنے ان ہتھیاروں کی حیثیت کھلونوں کی سی تھی۔

وہ میرے قریب آتے ہوئے بولی "کاش تمہارے پاس کوئی آٹومیٹک گن ہوتی!"

"گاڑی میں ہے۔" میں نے جواب دیا لیکن گاڑی باہر کھلے میں کھڑی تھی اور کھلے میں جانا اس وقت گویا سیدھا موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل کھسکتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی "میں جاتی ہوں گاڑی تک۔"

"حماقت مت کرو۔" میں نے آگے بڑھ کر اس کا بازو سختی سے پکڑ لیا۔ اس نے بازو چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کا جسم اس وقت گویا فولاد تھا۔ راشد کو مرتے دیکھ کر اس کی شخصیت میں یکدم ہی ایک عجیب سا تغیر آیا تھا۔ رونے پیٹنے اور آہ و بکا کرنے کا تو خیر وہ موقع ہی نہیں تھا لیکن ویسے بھی اس نے اس اچانک صدمے سے شکست خوردگی اختیار نہیں کی تھی بلکہ فوری طور پر ایسا ہی محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے اندر سوئے ہوئے کسی درندے کو بیدار کر دیا تھا۔

"مسلح جتھوں سے مقابلے جذبات کے ذریعے نہیں ہوتے۔" میں نے تیزی سے کہا "تمہیں گاڑی تک پہنچنے اور دروازہ کھولنے کا موقع نہیں ملے گا۔ گن ویسے بھی خفیہ خانے میں ہے' تم نہیں نکال سکو گی۔ اور ایک آٹومیٹک گن آجانے سے کوئی فرق بھی نہیں پڑے گا۔"

وہ کچھ نرم پڑی۔ اس نے بازو چھڑانے کی کوشش ترک کر دی۔ میں نے تیز سرگوشی میں کہا "میں سامنے کی طرف جانے کی کوشش کرتا ہوں' تم کچن کے راستے پیچھے جاؤ اور دیکھو وہ لوگ

فائرنگ کہاں سے کر رہے ہیں۔ عقل سے کام لوگی تو شاید یہ کھلونا تمہارے لیے کچھ کار آمد ثابت ہو سکے۔" میں نے اس کے پسٹل کی طرف اشارہ کیا "جذبات میں آؤگی تو ان کے لیے تر نوالا بنو گی۔ یاد رکھو ہمیں تر نوالا نہیں بننا ہے۔" میں نے گویا ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اسے ہپناٹائز کرنے کی کوشش کی۔

اس کے حلق سے صرف غراہٹ کی سی آواز خارج ہوئی اور وہ اثبات میں سر ہلا کر لاؤنج کے اس دروازے کی طرف رینگ گئی جو کچن کی طرف کھلتا تھا۔ میں اس دروازے کی طرف کھسکنے لگا جو ڈرائنگ روم کی طرف کھلتا تھا۔ میں ڈرائنگ روم میں گھس کر لان اور پورچ وغیرہ کا جائزہ لینے کی کوشش کرنا چاہتا تھا گو کہ مجھے یہ ایک مشکل کام لگ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ مکان کے اندر بھی کود آئے تھے اور کچھ لوگ انہیں عقب سے کور دے رہے تھے۔

جس شدت اور جس رفتار سے گولیاں برس رہی تھیں' ان میں صرف دیواریں محفوظ مورچوں کا کام دے رہی تھیں۔ دوسری کسی بھی چیز کی آڑ میں ہونا محفوظ نہیں تھا۔ ٹھوس لکڑیوں کے دروازے تک چھلنی ہو چکے تھے۔

میں نے راحیلہ کو دوسری طرف بھیج تو دیا تھا لیکن فوراً ہی مجھے پچھتاوا بھی ہونے لگا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ ابھی جذبات کے دور سے آزاد نہ ہوئی ہو اور کوئی حماقت کر گزرے۔ اسے ساتھ ہی رکھنا چاہیے تھا۔ لیکن اب میرے لیے واپس جانا بھی مناسب نہیں تھا۔ ڈرائنگ روم کی طرف جو چند فٹ کا فاصلہ میں طے کر چکا تھا' وہ بھی بہت اہم تھا۔

میں نے راحیلہ کو تقدیر ہی کے سپرد چھوڑا اور کہیں گھٹنوں کے بل' کہیں سینے کے بل رینگتا چلا گیا۔ دیواروں ہی کی آڑ میں رہتے ہوئے میں ڈرائنگ روم میں پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ پوری کوٹھی تاریکی میں ڈوب چکی تھی۔ وہ زیادہ بڑی کوٹھی نہیں تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہر طرف تباہی پھیل چکی تھی۔ فائرنگ سے تمام لائٹس وغیرہ تباہ ہو چکی تھیں۔ یہی غنیمت تھا کہ ابھی تک شارٹ سرکٹ کے باعث کہیں آگ نہیں لگی تھی۔

میں ڈرائنگ روم میں پہنچا تو پسینے سے شرابور تھا لیکن اسی اثنا میں یکدم فائرنگ رک گئی۔ مجھے بالکل ایسا ہی محسوس ہوا جیسے سینما ہال میں جنگ و جدل سے بھرپور کسی فلم کا نہایت پُرشور منظر دیکھتے دیکھتے اچانک ہی فلم ٹوٹ گئی ہو یا آپریٹر نے تمام مائیک یکدم بند کر دیے ہوں۔ چاروں طرف گہرا سکوت چھا گیا۔

لیکن سکوت چھانے کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ میں یکدم دروازہ کھول کر باہر نکل جاتا۔ اب تو اور بھی اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ موت کہاں گھات لگائے بیٹھی تھی۔ دروازے کو تو اب کھولنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ ٹوٹے پھوٹے فریم میں بس کچھ ٹیڑھے میڑھے ٹکڑے ہی پھنسے رہ گئے تھے۔ باقی دروازہ کھپچیوں کی صورت میں بکھر گیا تھا۔ میں اسے کھولنے کا تکلف کیے بغیر اس سے گزر سکتا تھا۔

میں تذبذب کے عالم میں سانس روکے دیوار سے ... تذبذب بڑی ہی خراب کیفیت ہے۔ انسان کو کسی کام کا ... چھوڑتی۔ میں نے چند لمحے تذبذب میں ضائع کیے۔ اس ... کہیں دور گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آوازیں سنائی دیں ...

میں نے دروازے سے سر نکال کر جھانکا۔ گیٹ کھلا ... پورچ میں یا لان پر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں تیزی سے ... اپنی گاڑی کی طرف بڑھا لیکن برآمدے میں پہنچتے ہی میری ... حس نے نہ جانے کیوں مجھے واپس چھلانگ لگانے پر مجبور کیا ... واپس چھلانگ لگانا میرے حق میں بہتر ہی ثابت ہوا ... اسی لمحے ایک زوردار دھماکا ہوا اور سامنے کی باؤنڈری وال ... سمیت ڈھیر ہو گئی۔ اگر میں برآمدے میں ہوتا تو زخمی ضرور ہوتا کیونکہ ملبے کے خاصے بڑے بڑے ٹکڑے اڑ کر وہاں تک ... تھے۔

میں ڈرائنگ روم میں واپس پہنچ تو گیا لیکن یہ بھی اندیشہ ... کہیں دوسرا بم نہ آ جائے اور ڈرائنگ روم کو منہدم نہ کر ... میں نے ایک بار پھر باہر دیکھنے کے لیے ڈرائنگ روم ... دروازے سے سر نکالا ہی تھا کہ چھوٹے سے راکٹ ... چیز جو مجھے محض ایک ہیولے کی طرح دکھائی دی تھی' اڑ ... پر آ گری۔

ایک زبردست دھماکا ہوا اور اس کے ساتھ ہی چکا ... میری آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ وہ روشنی کے بم کی طرح پھٹا ... دوسرے ہی لمحے میں نے آنکھیں کھولیں تو اندازہ ہوا کہ ... کے بم سے ... بلکہ کسی بھی بم سے کوئی بہت ہی مختلف ... تھی۔ جہاں وہ پھٹا تھا وہاں سے چاروں طرف ہلکی سی ... کے ساتھ آگ کی ایک موٹی سی تہہ پھیلتی جا رہی تھی۔ ... انداز بالکل ایسا ہی تھا جیسے آتش فشاں کا لاوا ... لیکن ایک تو اس کی رفتار لاوے سے کہیں تیز تھی' دوسرے ... ایک سمت میں یا ڈھلان کی طرف نہیں پھیل رہا تھا بلکہ ... پر چاروں طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ تیسرے وہ لاوے سے ... دہکتا دکھائی دے رہا تھا۔ اس میں ایسی ہی چمک تھی جیسی ... میں ہوتی ہے لیکن ہوا میں جو بو پھیلی ہوئی تھی وہ قطعی ... مختلف تھی اور کچھ دیر پہلے ہونے والی اندھا دھند فائرنگ ... ہوا میں بارود کی بو بھی موجود تھی۔

آگ کی اس موٹی سی چادر کو اس سرعت سے ... ایک عجیب تجربہ تھا۔ وہ گویا اپنی راہ میں آنے والی ہر چیز ... جا رہی تھی۔ اس وقت مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا ... وہ چادر لان پر کھڑے ہوئے سفیدے کے دو درختوں ... سے بھی گزر گئی اور درخت یکدم یوں گر پڑے جیسے کوئی ... کے تنوں کو کاٹتی ہوئی گزر گئی ہو۔

میری رگوں میں لہو سرد ہونے لگا۔ اس متحرک آتشیں چادر کا ایک کنارا اصل عمارت کی دیوار کی طرف بڑھ رہا تھا' دوسرا پورچ کی طرف آ رہا تھا جہاں میری اور راحیلہ کی دونوں گاڑیاں پہلو بہ پہلو کھڑی تھیں۔ پہلے راحیلہ کی گاڑی اس کی لپیٹ میں آئی' پھر میری۔ اگر وہ اصل عمارت کو بھی اسی طرح نگلنا شروع کر دیتی یا دیواروں میں سے بھی اسی طرح گزر جاتی جس طرح درختوں کے تنوں سے گزر گئی تھی تو پھر مجھے اور راحیلہ کو بھی راکھ ہو جانے کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔

میں تیزی سے اٹھا اور ایک نظر اس آتشیں چادر پر ڈال کر راحیلہ کی تلاش میں کچن کی طرف دوڑنے ہی لگا تھا کہ وہ آگ یکدم ہی بجھ گئی' جیسے اس کا دائرۂ اثر ختم ہو گیا ہو۔ شاید وہ عجیب و غریب بم کم ہی رینج کا تھا۔ اگر وہ زیادہ رینج کا ہوتا تو ...؟ یہ تصور ہی خاصا لرزہ خیز تھا۔

ایک بار پھر چاروں طرف سکوت چھا چکا تھا۔ میں قدرے جھجکتے ہوئے دوبارہ باہر آیا۔ گری ہوئی باؤنڈری وال سے باہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب کسی بھی قسم کی جدوجہد یا تعاقب بے کار تھا۔ میں گاڑی لے کر بھی نہیں نکل سکتا تھا۔ گاڑیوں کے عقب میں دیوار کا ملبہ اور گرا ہوا گیٹ آڑھا ترچھا ہو کر پھنس کر رہ گیا تھا۔ راحیلہ کی گاڑی کے تو پچھلے دونوں ٹائر بھی برسٹ ہو چکے تھے اور شیشے چکنا چور تھے۔

میری گاڑی کسی آرمرڈ کار سے کم نہیں تھی لیکن اس وقت اس پر بھی گولیوں کی کئی آڑی ترچھی گہری خراشیں نظر آ رہی تھیں۔ ٹائر بھی بچ ہی گئے تھے ورنہ بلٹ پروف ہونے کے باوجود' اگر زیادہ قریب سے اور زیادہ طاقتور آٹومیٹک گنوں سے مسلسل فائر کیے جاتے تو ان کے بھی پھٹنے کا امکان تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ گاڑی میں بیٹھ کر ریڈیو پر کم از کم تمام ساتھیوں کو الرٹ ہی کر دوں اور لوکیشن بتا کر ہدایت کروں کہ وہ مختلف سمتوں سے اس طرف آتے ہوئے مشکوک گاڑیوں کو تلاش کرنے کی کوشش کریں لیکن پھر مجھے خود ہی یہ کام بے کار محسوس ہوا۔ میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکا تھا۔ انہیں کسی چیز کی کوئی نشانی نہیں بتا سکتا تھا' ان کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتا تھا۔ یہاں سے نکلنے کے بیسیوں راستے تھے۔

یہ کارروائی نہایت ہی ماہرانہ قسم کا کمانڈو ایکشن تھا۔ چند منٹ میں سب کچھ کر گزرنا' کسی کو جوابی کارروائی کا موقع نہ دینا' زیادہ سے زیادہ خوف و ہراس پھیلانے کا سامان کرنا اور اس طرح غائب ہو جانا کہ کوئی تعاقب میں نہ آ سکے۔ مکان میں موجود سب لوگوں کو ہلاک کرنا یقیناً ان کا مقصد نہیں تھا ورنہ یہ بھی یقیناً ان کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کچھ اور نہیں تو مزید دو چار اسی قسم کے بم پھینک جاتے۔ اگر مکان کے چاروں طرف سے اس قسم کے بم پھینکے جاتے تو شاید مجھے اور راحیلہ کو بھاگنے کا بھی موقع نہ ملتا۔ ممکن ہے یہ ایک بم پھینکنے کا مقصد بھی ہمیں محض نمونہ ہی دکھانا ہو۔

میں احتیاطاً گاڑیوں ہی کی آڑ میں رکوع کی سی حالت میں چلتا ہوا لان تک پہنچا۔ آگ کی چادر جہاں تک پھیلی تھی وہاں اب سیاہی مائل سے پاؤڈر کی بہت ہی باریک سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ دھواں ابھی تک ابھر رہا تھا اور فضا میں اب نہ جانے کیا کچھ جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے ایک ٹوٹے ہوئے گملے کے ٹکڑے سے کرید کر دیکھا۔ لان کی گھاس راکھ بن چکی تھی اور دو تین انچ نیچے تک زمین جھلس چکی تھی۔ آگ کی چادر پورچ کے پختہ فرش پر بھی ایک آدھ بالشت تک آئی تھی۔ وہاں تک فرش بُری طرح چٹخ کر اکھڑ گیا تھا اور کوئلے جیسے ٹکڑوں میں تبدیل ہو گیا تھا۔ سفیدے کے گرے ہوئے درختوں کے تنے دور سے ہی سلگتے دکھائی دے رہے تھے۔

دفعتاً مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ مشین پسٹل سیدھا کرتے ہوئے میں تیزی سے گھوما۔ وہ راحیلہ تھی جو بلی کی طرح دبے قدموں ڈرائنگ روم سے باہر آ رہی تھی۔ اب اس کے پیروں میں سلیپر بھی نہیں تھے۔ اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ بھی کسی کو نہیں دیکھ سکی تھی' کسی کو نشانہ نہیں بنا سکی تھی۔

اس نے خاموشی سے ادھر پھیلی ہوئی تباہی کا جائزہ لیا لان کی حالت اور سفیدے کے گرے ہوئے درختوں کو دیکھ کر اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا "یہ کیا ہوا؟"

میں نے جو کچھ دیکھا تھا' اسے بتایا۔ اس نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ حیرت کا اظہار بھی نہیں کیا۔ راشد کی موت نے اس کا دل لہو کر دیا تھا۔ باقی سب تباہی و بربادی اور چند منٹ کے لیے برپا ہونے والی قیامت اس کے لیے معمولی و بے معنی تھی۔

"ہم نے حرکت میں آنے میں دیر کر دی۔" وہ سر جھکا کر خود کلامی کے سے انداز میں بولی "ہمیں جان پر کھیل کر آگے بڑھنا چاہیے تھا۔"

"اتنے شدید اور اچانک حملے میں اس سے زیادہ تیزی کیا دکھائی جا سکتی تھی جو ہم نے دکھائی۔" میں نے آہستگی سے کہا "جان پر کھیل کر بھی ہم جان سے جانے کے سوا کوئی کارنامہ نہیں دکھا سکتے تھے۔"

مجھے معلوم تھا' وہ رونے پیٹنے والی نہیں' اندر ہی اندر کھنڈر ہو جانے والی لڑکی تھی۔ اس وقت اس کے اندر' اس کی ذات کے کھنڈر میں انتقام کا اژدہا پھنکار رہا تھا' بے بسی سے سر پٹخ رہا تھا۔ شاید راحیلہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میرے سینے میں برف جمی ہوئی تھی۔ لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ جسے وہ برف زار سمجھ رہی تھی وہ اس کی آتشیں انتقام سے زیادہ خوف ناک تھا۔ مجھے خاکستر کیے

دے رہا تھا۔

میں نے بازو اس کے کندھوں پر پھیلاتے ہوئے اسے اپنے قریب کرلیا اور تھپکی دیتے ہوئے کہا "حوصلہ کرو راحیلہ!"

"حوصلہ؟" اس نے سرگوشی کے سے انداز میں دُہرایا۔ گویا یہ لفظ اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ آہستگی سے اس نے اپنے آپ کو چھڑایا اور واپس اندر چل دی۔ میں اس کے ساتھ تھا۔

میرے حلق میں آنسوؤں کی نمکینی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ندامت کے آنسو تھے جو بہہ نہیں پا رہے تھے۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں تم سے شرمندہ ہوں۔"

"کس بات پر؟" اس نے اُجڑی اُجڑی سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"یہاں آکر۔ اور میرا ساتھ نبھانے کا وعدہ کرکے تم کچھ زیادہ فائدے میں نہیں رہیں۔ خصوصاً آج جو زخم لگا ہے، اس کے بھرنے کی تو کوئی تدبیر ہو ہی نہیں سکتی۔" میں نے ندامت زدہ لہجے میں کہا۔

"جب کسی کا ساتھ نبھانے کا وعدہ کر ہی لیا تو پھر نفع نقصان کیا دیکھنا۔" وہ بدستور دھیمے لہجے میں بولی "اور پھر یہ ساری باتیں تو تقدیر میں لکھی ہوتی ہیں۔ انہیں نہ تم بدل سکتے ہو اور نہ ہی میں۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں تمہاری نیت یا ارادے کو تو دخل نہیں۔ تم تو دنیا کی تمام نعمتیں، تمام آسائشیں اور تمام خوشیاں میرے لیے جمع کردینا چاہتے ہو۔ میرے لیے تو بس تمہاری یہ سوچ اور نیت اہم ہے۔ اس کے برعکس جو کچھ ہوگا اسے میں اپنی تقدیر سمجھ کر برداشت کرجاؤں گی۔ تمہیں اپنے آپ کو مجرم محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ احساسِ جرم تمہیں بزدل بنادے گا۔"

اس کی باتیں سُن کر میری ندامت کچھ کم ہوئی۔ ڈائننگ روم میں پہنچ کر اس نے نیچے بیٹھ کر راشد کا سر گود میں رکھ لیا اور کئی لمحے تک پتھرائی ہوئی سی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اس کی سپاٹ سی آواز گویا کہیں دور سے سُنائی دی "ہر بہن کو اپنے بھائی عزیز ہوتے ہیں لیکن راشد مجھے کچھ زیادہ ہی عزیز تھا۔ یہ بہت ہی پیارا، بہت ہی مختلف قسم کا بھائی تھا بے حد معصوم اور سیدھا۔ ہر ایک کو آزادی اور اطمینان سے جینے کا حق دینا چاہتا تھا۔ اس نے آسائشوں میں پرورش پائی تھی مگر اس میں امیرزادوں والی کوئی بُری عادت نہیں تھی۔ میں حیران ہوں کہ اسے کس جرم کی سزا ملی ہے۔"

"سزا اسے نہیں، ہمیں ملی ہے۔" میں نے گھُٹی گھُٹی سی آواز میں کہا۔ راشد کے خوب صورت بال اور چہرے کا کچھ حصہ خون میں تر تھا۔ خون زیادہ نہیں بہا تھا اور جو بہا تھا وہ بھی جمنے لگا تھا اگر اس کا چہرہ صاف کردیا جاتا اور پیشانی کا سوراخ چھپا دیا جاتا تو وہ بالکل زندہ معلوم ہوتا۔ اس کے چہرے پر موت کی کوئی علامت نہیں تھی۔

"اس کی جگہ کاش میں مرگئی ہوتی!" راحیلہ گلوگیر آواز میں بولی اور آخر یکدم ہی ضبط کا بندھن ٹوٹ گیا۔ اس نے راشد کی لاش کو ذرا اوپر اٹھا کر یکدم ہی سینے سے چمٹا لیا اور دیوانہ وار چومتے ہوئے پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ اب تک اس کا نہ رونا مجھے تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔

اس کے دل کا غبار نکل چکا تو وہ راشد کی لاش کو نہایت احتیاط اور آرام سے لٹانے لگی، جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو بستر میں سُلا کر کہیں جانے لگی ہو۔ پھر آنسو پونچھ کر وہ پیچھے ہٹ کر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور میری طرف دیکھے بغیر آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی "ائی! شاید تمہیں اندازہ نہ ہو کہ میں کتنی خونخوار عورت ہوں کیونکہ میں بظاہر بڑی نازک اندام اور نفیس دکھائی دیتی ہوں۔"

"مجھے اندازہ ہے۔" میں نے سر ہلایا۔

"جب مجھے کوئی گہرا زخم لگتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے، میں دنیا کو آگ لگادوں۔ جو چیز سامنے آئے اسے تہس نہس کردوں۔ بڑی مشکل سے میں اپنے آپ کو روکتی ہوں کہ میرے ہاتھ کسی بے گناہ کے خون میں نہ رنگے جائیں۔ خصوصاً یہ بے بسی کی اذیت قطعی ناقابلِ برداشت ہوتی ہے، جب انسان کو پتا ہی نہ ہو کہ اس کا دشمن کون ہے، کہاں ہے۔" وہ بے دھیانی کے عالم میں پسٹل کو ہاتھوں میں اُلٹ پلٹ رہی تھی۔

"مجھ سے بہتر تمہارے احساسات کو کون سمجھ سکتا ہے۔" میں نے کہا "میں خود ایک عرصے سے اسی کیفیت سے گزر رہا ہوں۔"

"اب میرے لیے زندگی اس وقت تک جہنم بنی رہے گی جب تک میں ان لوگوں کو تلاش کرکے عبرت ناک انداز میں نہیں ماروں گی جنہوں نے آج رات دہشت گردی کا یہ نمونہ ہمیں دکھایا ہے اور راشد کو ہلاک کیا ہے۔" ایک لمحے کے لیے اس کے دانت بھینچ گئے، پھر وہ متاسفانہ سے لہجے میں بولی "کیا ستم ظریفی ہے۔ راشد جیسے بھائی کے بدلے مجھے صرف ایک چمپینزی کو ہلاک کرنے کا موقع ملا۔"

"چمپینزی؟" میں نے چونکتے ہوئے پوچھا "تمہارا مطلب ہے بلیک برڈ؟"

"شاید وہی ہے۔" وہ بے توجہی سے بولی "نشانیاں تو وہی موجود ہیں جو تم نے میٹنگ کے دوران بتائی تھیں۔"

"کہاں ہے وہ؟ تم نے کب اور کس طرح اسے ہلاک کیا؟" میں پُرجوش سے انداز میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

وہ سرسری سے لہجے میں بتانے لگی "جونہی تم نے مجھے پیچھے بھیجا وہ مجھے نظر آگیا تھا۔ وہ کچن کی کھڑکی میں باہر کی طرف ایک ہاتھ سے چھجا پکڑ کر لٹکا ہوا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں گن تھی۔ چھجے پر چڑھ کر وہ غالباً چھت پر جانے ہی والا تھا جب میری نظر اس پر

[...] اس کی شکل تو مجھے نظر نہیں آرہی تھی۔ کھڑکی میں سے [...] پیٹ دکھائی دے رہا تھا۔ اچھی بھلی توند سی تھی، جو شرٹ [...] چھپی ہوئی تھی پھر بھی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ چمپینزی تھا۔ اسے [...] نہیں ہوسکا کہ کچن میں کوئی آگیا تھا۔ وہ اپنے جسم کو سانپ [...] طرح سمیٹ کر اوپر چڑھنے ہی لگا تھا کہ میں نے پسٹل اس کی توند [...] کرکے ٹریگر دبا دیا۔"

"اوہ" میں نے طمانیت کی گہری سانس لی۔

"لیکن دو گولیاں اسے مارنے کے لیے کافی ثابت نہیں ہوسکی [...]ں۔" راحیلہ نے گویا میری غلط فہمی دور کی "کھڑکی چھوٹی تھی مگر [...] گولیاں پیٹ سے گزر جانے کے بعد بھی وہ اسی کھڑکی سے اندر کود [...] آیا۔ اس حالت میں بھی شاید وہ میری گردن دبوچ لیتا اور توڑ کر ہی چھوڑتا۔"

میرے تصور میں آفتاب کی لاش اُبھر آئی جس کا نرخرہ اُدھڑا ہوا تھا۔ راحیلہ کو نہیں معلوم تھا کہ وہ چمپینزی بیک وقت تین قسم کی مخلوقات کی خصوصیات رکھتا تھا۔ چمپینزی تو وہ تھا ہی۔ چمپینزی والی خصوصیات سے بھی اسے ہاتھ نہیں دھونے پڑے تھے جبکہ انسانوں والی سوجھ بوجھ اور صلاحیتیں اس میں پیدا کردی گئی تھیں۔ لیکن ساتھ ہی اس کے وجود میں ایک درندہ بھی چھپا ہوا تھا۔ وہ خبیث چمپینزی نہیں، اچھا بھلا عفریت تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ راحیلہ کی گردن بھی وہ توڑنے کے بجائے اُدھیڑ ڈالتا، نرخرہ چبا جاتا۔

راحیلہ نہایت دھیمے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "وہ جب اندر کودا تو دو اچھی باتیں ہوئیں۔ ایک تو اس کی گن باہر ہی گر گئی۔ دوسرے وہ اوون پر آکودا جس کا چولہا جل رہا تھا۔ وہ اچھل کر فرش پر جاگرا۔ تب نہ جانے کیوں میرا اسے مزید گولیاں مارنے کو جی نہ چاہا۔ قریب ہی ماربل کے کاؤنٹر پر گوشت کاٹنے کا تیز دھار اور بھاری چاپڑ پڑا ہوا تھا۔ میں نے پستول چھوڑ کر وہ اٹھایا اور پلک جھپکتے میں اس کی کھوپڑی میں اتار دیا۔ اس کی کھوپڑی دو حصوں میں تقسیم ہوگئی لیکن چاپڑ وہیں پھنس کر رہ گیا۔ میں نے اسے نکالنے کی کوشش بھی نہیں کی۔"

میں نے کچن میں جاکر دیکھا۔ واقعی بلیک برڈ دیوار کے قریب اُوندھا پڑا تھا۔ اس کی کھوپڑی میں پیوست ہونے والا چاپڑ اس کے تقریباً آدھے چہرے تک اتر آیا تھا۔ وہ اسپورٹس شرٹ اور پینٹ میں تھا۔ اس وقت مُردہ پڑا نہایت حقیر، نہایت مکروہ لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین نہیں آرہا تھا کہ جب وہ زندہ تھا تو کیسی خطرناک مخلوق تھا۔ اسے یوں پڑے دیکھ کر مجھے ایک عجیب سی طمانیت کا احساس ہوا۔

○☆○

راشد کی تدفین کے بعد بھی راحیلہ کھوئی کھوئی سی نظر آتی رہی۔ گو کہ میری موجودگی میں وہ اپنی کیفیت کو چھپانے کی بہت کوشش کرتی تھی لیکن مجھے احساس تھا کہ اس کے دل پہ گھاؤ سا پڑگیا تھا اور اس سلسلے میں، میں اپنے آپ کو ہی مجرم مجرم سا محسوس کرتا تھا لیکن سرِدست میرے سامنے اس سانحے کی تلافی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

میں نے اسے اس اپارٹمنٹ میں منتقل کردیا تھا جس میں کچھ عرصہ پہلے تاجاں رہتی تھی۔ میرے خیال میں وہ کوٹھی محفوظ نہیں رہی تھی جس میں راحیلہ نے کچھ عرصہ گزارا تھا۔ یقینی طور پر تو اس اپارٹمنٹ کے بارے میں بھی نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ محفوظ تھا یا نہیں۔ تاہم یونہی بس ایک احساس سا تھا کہ شاید وہ ریڈ ڈاٹ کی نظر سے بچا ہوا تھا۔ ممکن تھا، معاملہ کچھ ایسا رہا ہو کہ میرا کوئی ٹھکانا خواہ... محفوظ ہی ہوتا ہو لیکن وہاں میری آمدورفت شروع ہوتے ہی وہ ریڈ ڈاٹ کی نظر میں آجاتا ہو۔

میں سوچ رہا تھا کہ راحیلہ کو اس اپارٹمنٹ میں منتقل کرانے کے بعد اب خود وہاں بہت کم آمدورفت رکھوں گا۔ وہ کافی بڑا اور پُرآسائش اپارٹمنٹ تھا۔ اب وہاں فون بھی موجود تھا۔ علاقہ بھی اچھا تھا۔ مجھے امید تھی کہ راحیلہ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی، سوائے زخمِ دل کی ٹیسوں کے۔ ان کا علاج وقت کے مرہم کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ خطرات ذرا کم ہوں تو اسے کسی کوٹھی میں ہی شفٹ کردوں گا۔ میں چاہتا تھا، اس کا رہن سہن اس کے شایانِ شان ہی رہے، کم از کم وہ معیار تو رہے جو اس کے ماں باپ کے زمانے میں تھا۔ بلکہ ہوسکے تو وقت کے ساتھ ساتھ اس سے بہتر ہوتا جائے۔

میں خود فی الحال ہلٹن میں منتقل ہوگیا تھا، جس کے ویٹرز سے لے کر مالک تک مجھے اچھی طرح جانتے تھے۔ اس کے مالک کراچی میں رہتے تھے لیکن کبھی کبھار لاہور آتے رہتے تھے اور مجھ سے ضرور ملاقات رہتی تھی۔ ان کے بھی کئی بزنس تھے۔ کراچی میں میرے ہوٹل کی وجہ سے ہم گویا ایک ہی لائن کے بزنس مین ہوگئے تھے۔

جولی عرف مس ٹریپ کا اصرار تھا کہ میں دو نمبر میں ہی شفٹ ہوجاؤں۔ وہ ہمارا ایک محفوظ ٹھکانا تھا۔ وہ کسی چھوٹے موٹے قلعے سے کم نہیں تھا جس میں پچاسوں قسم کے انتظامات موجود تھے۔ لیکن میں ابھی اس محفوظ ٹھکانے کو محفوظ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ میری حتی الامکان کوشش تھی کہ مجھے وہاں شفٹ نہ ہونا پڑے۔ میں اسے انتہائی ناگزیر حالات کے لیے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میرے وہاں شفٹ ہونے کے بعد وہ محفوظ ٹھکانا بھی غیر محفوظ ہوجاتا۔

راحیلہ والی کوٹھی پر حملے کے بعد سے ریڈ ڈاٹ کی طرف سے سکوت تھا۔ ویسے ان کا طریقۂ واردات تو زیادہ تر یہی رہا تھا کہ کمانڈو ایکشن کے انداز میں ایک کارروائی کے بعد سکوت چھا جاتا

تھا لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ یہ سکوت کتنے عرصے پر محیط ہوگا۔ وہ مجھے نقصانات پہنچانے کے ساتھ ساتھ چوہے بلی کے اس کھیل میں گویا مجھے اعصابی طور پر بھی ناکارہ بنانے کی کوشش کررہے تھے۔

ان کی ان کوششوں کا تصور کرکے کبھی کبھی میں تنہائی میں مسکرا دیتا تھا۔ صرف وہی مجھے نہیں آزما رہے تھے' میں خود بھی اس بہانے اپنے اعصاب کو آزما رہا تھا۔ میں خود بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ دُنیا کی سب سے بڑی' سب سے خطرناک اور سب سے زیادہ ہمہ گیر قسم کے عزائم رکھنے والی تنظیم کے ساتھ اس چوہے بلی کے کھیل میں مجھ "چوہے" کے اعصاب کہاں تک ساتھ دیتے ہیں۔

میں اب بھی حفاظتی انتظامات کے چکر میں پڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ مجھے معلوم تھا' ان کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ لیکن ساتھیوں نے ایک بار پھر اصرار کرکے دو گاڑیوں میں میری گاڑی کے آگے پیچھے چلنا شروع کردیا تھا۔ چند ساتھی ہوٹل کے ملازمین کے روپ میں ہوٹل میں بھی موجود رہنے لگے تھے۔ ایک تو فاضل دربان کے روپ میں دروازے پر ہی موجود رہتا تھا اور ہر آنے جانے والے پر نظر رکھتا تھا' دو اس فلور پر موجود رہتے تھے جس پر میرا سوئٹ تھا۔ ایک آدھ چھت پر بھی منڈلاتا رہتا تھا۔

میرے جاں نثار اپنی سی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ میں دفتر باقاعدگی سے جارہا تھا۔ نفیس صاحب کو میں ہر واقعے کی اطلاع دیئے جارہا تھا۔ ان کا کہنا یہی تھا کہ ان کی مشینری اپنا کام کررہی تھی لیکن ابھی تک میرے ذریعے بھی کوئی ایسا سراغ ان کے سامنے نہیں آسکا تھا کہ جس سے بات آگے بڑھ سکتی۔ ان کے انگریزی تبصرے کے مطابق ابھی تک میری سُنائی ہوئی کہانی ہوا میں جھولتے ہوئے توہماتی ہیولوں کی طرح ہی تھی۔

میں اس پر خاموش ہی رہا تھا۔ میں ابھی کچھ عرصے اور خاموش ہی رہ کر دیکھنا چاہتا تھا کہ ان کی کوششیں کچھ رنگ لاتی ہیں یا نہیں؟ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اگر ان کا مجھے نامعتبر ٹھہرانے کا سلسلہ یونہی جاری رہا تب بھی میں کیا کرسکوں گا؟

ایک خیال مجھے یہ آتا تھا کہ میں ایک بار پھر وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب سے بات کروں اور ان کے توسط سے سربراہِ مملکت کو اپروچ کرنے کی کوشش کروں۔ لیکن میرا یہ قدم شاید نفیس صاحب کی خفگی مول لینے کے مترادف ہوتا۔ اور میں نفیس صاحب کی خفگی مول لینے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ اس پوزیشن میں تھے کہ سربراہانِ مملکت بھی اس پوزیشن پر فائز کسی بھی شخص کی خفگی مول لینے سے گریز کرتے تھے۔ میں تو کس شمار میں تھا!

سربراہانِ مملکت بھی نفیس صاحب اور ان جیسی دو چار دوسری شخصیتوں ہی کی رپورٹوں پر بھروسا کرتے تھے اور بڑے سے بڑے ملکی معاملات جن کا تعلق عالمی سیاست سے بھی ہوتا تھا' انہی رپورٹوں پر چلتے تھے۔ میں اگر کسی طرح سربراہِ مملکت کو اپروچ کر بھی لیتا تو نفیس صاحب کو یہ گمان گزرتا کہ میں نے ان سے بالا ہی بالا کچھ کرنے کی کوشش کی ہے اور یوں گویا ان کی کارکردگی کو غیر تسلی بخش ٹھہرانے کی سعی کی ہے تو اس کے نتیجے میں میرا [illegible] خراب ہوسکتا تھا۔ ریڈ ڈاٹ کی نظر میں تو میں پہلے ہی معتوب [illegible] اس کے ساتھ ساتھ میں ملک کی طاقتور ترین خفیہ ایجنسیوں کی نظر میں بھی معتوب ٹھہرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس طرح کوئی جرم [illegible] سازش کیے بغیر ہی میری حالت چکی کے دو پاٹوں کے درمیان [illegible] ہوئے چنے سے مشابہ ہوجاتی۔ فی الحال کم از کم ایجنسیوں کی طرف سے تو مجھے چھوٹ ملی ہوئی تھی۔ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی حفاظت کے سلسلے میں آزاد تھا۔ جیسی بھی صورتِ حال ہوتی اور اس میں' میں جس طرح بھی مناسب سمجھتا تھا' ہاتھ پاؤں مار [illegible] تھا۔ اگر میرے ہاتھ پاؤں بندھ جاتے یا ایجنسیاں ویسے ہی [illegible] اپنی تحویل میں لے لیتیں تو میں مارا جاتا۔ میرے لیے تو میری [illegible] و حرکت کی آزادی ختم ہوجانا ہی آدھی موت کے مترادف تھا۔

غرض یہ کہ میں ان دنوں چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا نہیں تھا بلکہ ذہنی طور پر بھی سخت کشمکش کا شکار تھا [illegible] بظاہر میں ہمیشہ ہی کی طرح پُرسکون تھا اور پوری کوشش کررہا تھا کہ کم از کم ظاہری طور پر میرے معمولات میں کوئی فرق نہ [illegible] پائے اور ریڈ ڈاٹ کو معلوم ہوجائے کہ میں اب بھی خوفزدہ نہیں [illegible] میں اب بھی بال نہیں نوچ رہا تھا۔ اب بھی دُم دبا کر کہیں [illegible] نہیں تھا۔ چھپتا نہیں پھر رہا تھا' پہلے ہی کی طرح سوٹ بوٹ میں [illegible] جارہا تھا۔ ایک ٹھکانے پر گڑبڑ ہوتی تھی تو دوسرے ٹھکانے پر [illegible] ہوجاتا تھا لیکن میرے ماتھے پر شکن نہیں آئی تھی۔ روزانہ [illegible] آئینے کے سامنے کھڑا ہوکر دیکھتا تھا کہ میرے چہرے پر کہیں شکست خوردگی یا موت کا خوف تو جھلکنے نہیں لگا تھا؟ یہ دیکھ کر میں اطمینان کی سانس لیتا کہ میرے چہرے پر سکون' بشاشت اور بے خوفی [illegible] کی طرح برقرار تھی۔

عمار کو بھی میں دوبارہ دیکھنے نہیں جاسکا تھا۔ مجھے پتا چلا تھا [illegible] شمیم نے اسے واپس مری بھیج دیا تھا۔ اس کے حق میں یہی بہتر تھا [illegible] شمیم کو نہیں معلوم تھا کہ میں ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا ورنہ وہ [illegible] کان کھاتی۔ وہ یہی سمجھ رہی تھی کہ میں اپنے کاموں کے سلسلے میں مختلف شہروں میں پھر رہا تھا۔ کبھی اسلام آباد' کبھی کراچی اور [illegible] فیصل آباد وغیرہ۔ حالانکہ میں ابھی لاہور میں ہی تھا۔

لیکن پھر ایک روز اچانک ہی اسلام آباد سے نفیس صاحب کے پی اے کا فون آیا۔ اس کا لہجہ بظاہر تحکمانہ تو نہیں تھا لیکن اس میں پہلے سے طے شدہ فیصلہ ضرور بول رہا تھا۔ نہایت ملائمت سے اس نے کہا "مسٹر چوہدری! کل دس بجے سے پہلے آپ کو اسلام آباد میں ہونا چاہیے۔ آپ اسلام آباد ہوٹل میں ٹھہریں گے۔"

"خیریت؟ یہ حکم میرے لیے کہاں سے جاری ہوا ہے؟" میں نے اپنا لہجہ دوستانہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نفیس صاحب نے مجھے ہدایت کی تھی کہ آپ کو اطلاع دے دوں۔" اس کے لہجے کی ملائمت برقرار رہی لیکن کوئی دوستانہ رنگ ہرگز نہیں جھلکا "کل یا پرسوں آپ کے ساتھ ایک میٹنگ ہوگی۔ جگہ اور وقت کے بارے میں آپ کو ہوٹل میں ہی مطلع کردیا جائے گا۔ ممکن ہے کوئی گاڑی آپ کو لینے آئے۔ یاد رکھیے گا' کل دس بجے آپ کو اسلام آباد ہوٹل میں ہونا چاہیے۔ آپ چاہیں تو آج رات کی فلائٹ پکڑ سکتے ہیں یا علی الصباح روانہ ہوسکتے ہیں۔ لاہور سے صبح چھ بجے بھی ایک فوکر روانہ ہوتا ہے بشرطیکہ آپ فوکر سے سفر کرنا پسند کریں۔ اور ہاں' آپ کو سیٹ ملنے میں کسی دشواری کا اندیشہ ہو تو میں آپ کو ایک فون نمبر دے دیتا ہوں۔ اس پر صرف فون کردیجیے گا' آپ کے لیے سیٹ کا بندوبست ہوجائے گا۔"

"میں آجاؤں گا۔" میں نے آہستگی سے کہا "یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔ میرا ٹریول ایجنٹ کہیں کے سفر کے لیے بھی مختصر سے مختصر نوٹس پر میرے لیے سیٹ کا بندوبست کردیتا ہے۔"

"بہت خوب' خدا حافظ مسٹر چوہدری!" اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد بھی میں دیر تک سوچتا رہا اور اندازہ لگانے کی کوشش کرتا رہا کہ نفیس صاحب کو ایک بار پھر میٹنگ منعقد کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی "شاید ریڈ ڈاٹ کا کوئی سرا ہاتھ آگیا تھا اور اب وہ لوگ اس سلسلے میں مجھ سے مشورہ کرنا چاہتے تھے۔

میں احتیاطاً رات کی فلائٹ سے ہی اسلام آباد روانہ ہوگیا اور وہ رات میں نے اسلام آباد ہوٹل میں ہی گزاری۔ صبح میں دس بجے سے پہلے ہی کہیں بھی جانے کے لیے تیار تھا اور ناشتا بھی کرچکا تھا لیکن میرے لیے کہیں سے کوئی بلاوا نہیں آیا۔

ساڑھے دس بجے ایک فون آیا۔ بولنے والے نے اپنا نام بتانے کی بھی زحمت نہیں کی تاہم لہجہ مؤدبانہ تھا۔ اس نے پوچھا "سر آپ اپنے کمرے میں ہی موجود ہیں نا؟"

"ظاہر ہے' تبھی تم سے بات کررہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"میرا مطلب ہے سر! کہیں جایئے گا نہیں۔" اس نے نہایت ملائمت سے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

مجھے اس روز اندازہ ہوا کہ بے یقینی' تجسس اور لاعلمی کی کیفیت میں انتظار کرنا کتنا تکلیف دہ کام تھا۔ تیار ہوکر ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھ جانا اور یہ سوچتے رہنا کہ نہ جانے' کب کوئی بلاوا آئے' کب کوئی لینے آئے' بڑی ہی آزمائش کا مرحلہ تھا۔ میں زندگی میں اس عالم میں شاذونادر ہی بیٹھا تھا۔ برسوں سے میں نے اتنی توجہ اور اتنی تفصیل سے اخبارات نہیں پڑھے تھے جتنی تفصیل سے اس روز پڑھے۔ پھر چند بزنس کالز کیں۔

انتظار ہی انتظار میں دوپہر کے کھانے کا بھی وقت ہوگیا۔ میں نے کھانا کمرے میں ہی منگوا کر کھایا۔ آخر کار انتظار کے لمحات جب میری برداشت سے باہر ہوگئے تو کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت دستک دینے والا اگر میرا جانی دشمن بھی ہوتا تو شاید مجھے بُرا نہ لگتا۔ اس نے کم از کم یہ جان لیوا سکوت تو توڑا تھا۔

میں نے دروازہ کھولا — میرے سامنے سفید شلوار قمیصوں اور سیاہ واسکٹوں میں دو لمبے تڑنگے آدمی کھڑے تھے' ایک کے سر پر جناح کیپ بھی تھی۔

"مسٹر چوہدری؟" جناح کیپ والے نے گویا رسماً تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔ آپ کی تعریف؟"

"ہم آپ کو لینے آئے ہیں۔" جناح کیپ والے نے میرے سوال کا جواب دیے بغیر کہا "نفیس صاحب نے آپ کو بلایا ہے۔" انہوں نے گویا ازراہِ نوازش اپنے کارڈ بھی نکال کر دکھادیئے تب میں اطمینان کی گہری سانس لے کر ان کے ساتھ ہولیا۔

نیچے ہوٹل کے مرکزی دروازے کے سامنے ہی ایک سیاہ مرسیڈیز ہماری منتظر تھی جس میں باوردی ڈرائیور موجود تھا۔ گاڑی کے شیشے تاریک تھے۔ اندر بیٹھنے کے بعد میں نے دیکھا کہ کھڑکیوں پر خوب صورت پردے پھیلے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ اگلی اور پچھلی سیٹوں کے درمیان بھی پردہ حائل تھا۔ یعنی میں ونڈ اسکرین سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا کہ گاڑی کہاں کہاں سے گزر رہی تھی۔

دونوں افراد میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ گاڑی چند منٹ تک نہ جانے کن کن سڑکوں پر دوڑتی رہی۔ میں نے ملائمت سے پوچھا "ہم کہاں جارہے ہیں؟"

"نفیس صاحب کے پاس۔" جناح کیپ والے نے مُبہم لہجے میں جواب دیا۔

میں سمجھ گیا کہ جو کچھ میں جاننا چاہتا تھا' وہ بتانے کے موڈ میں نہیں تھے۔ میں نے اپنے مزید سوالات ضائع نہیں کیے اور جسم ڈھیلا چھوڑ کر آرام سے بیٹھ گیا۔ گاڑی پُرآسائش اور آرام دہ تھی۔ لیکن مزید چند منٹ بعد سفر ختم ہوگیا۔

گاڑی سے اُتر کر میں نے دیکھا' ہم سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی ایک خوب صورت اور خاصی بڑی کوٹھی کے ڈرائیو وے میں کھڑے تھے۔ کوٹھی غالباً کسی پہاڑی کے دامن میں واقع تھی کیونکہ ایک طرف بلندی سے دیودار کے درخت جھانک رہے تھے۔

میرے ساتھ آنے والوں نے مجھے گردوپیش کا زیادہ جائزہ لینے کی مہلت نہیں دی اور آگے چلنے کا اشارہ کیا۔ منقش لکڑی کے ایک موٹے سے دروازے سے گزر کر ہم ایک ہال میں پہنچے جو ڈرائنگ روم کی طرز پہ آراستہ تھا لیکن ہم اس میں داخل ہونے کے بجائے بائیں طرف مڑ گئے' اس طرف ایک اور دروازہ تھا۔

اس سے گزر کر ہم نے ایک طویل راہداری عبور کی۔ اندر روشنی بہت کم تھی جس کی وجہ سے ماحول میں خواہ مخواہ ہی کچھ

پُراسراریت سی پیدا ہورہی تھی۔ آخرکار ہم ایک دروازے پر پہنچے جہاں سادہ لباس میں، لیکن سب مشین گنوں سے مسلح دو افراد تعینات تھے۔ جناح کیپ والے نے انہیں کوئی اشارہ کیا۔ انہوں نے سر ہلایا اور ان میں سے ایک نے بڑی سی چابی سے دروازہ کھولا۔ یعنی دروازہ مقفل تھا۔ دونوں افراد کے چہرے قطعی سپاٹ تھے۔ تالا کھول کر وہ ایک طرف ہٹ گئے۔ میرے ساتھ آنے والوں نے مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا اور خود وہیں رک گئے۔ میں نے خود ہی ناب گھما کر دروازہ کھولا اور اندر جا پہنچا۔

میں گویا ملگجی شام سے یکدم صبح کے اُجالے میں جا پہنچا۔ وہ ایک بڑا سا کانفرنس ہال تھا اور وہاں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی، دن کا سا سماں تھا۔ ایک بڑی سی، نہایت خوب صورت میز کے گرد آٹھ افراد موجود تھے۔ ان میں سے تین افراد تو وہی تینوں اہم ترین خفیہ ایجنسیوں کے سربراہ تھے۔ یعنی نفیس صاحب، باقری صاحب اور شہریار خان صاحب۔

تین اور صاحبان کی شکلیں بھی اس حد تک میرے لیے شناسا تھیں کہ وہ پچھلی میٹنگ میں بھی شریک تھے۔ دو افراد میرے لیے بالکل ہی نئے تھے، تاہم کسی سے بھی میرا تعارف کرانے کا تکلف نہیں کیا گیا۔

میز کے گرد کئی کرسیاں خالی تھیں۔ وہ لوگ درمیانی کرسیوں پر تھے۔ مجھے بھی ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔ میز پر کئی فائلیں بھی موجود تھیں۔ نیلے رنگ کی ایک فائل نفیس صاحب کے سامنے موجود تھی۔ میرے لیے یہ قدرے حیرت کی بات تھی کہ آج نفیس صاحب کے ہونٹوں پر خاصی واضح مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔ لیکن وہ ایک عجیب سی مسکراہٹ تھی کہ اس سے کوئی نتیجہ اخذ کرنا بہت مشکل تھا۔ اگر وہ مسکرا رہے تھے تو اس کا یقینی طور پر یہ مطلب سمجھنا غلط معلوم ہوتا تھا کہ وہ خوش تھے۔

کافی کا دَور چل رہا تھا۔ طویل و عریض کمرے میں کافی کی خوشگوار مہک پھیلی ہوئی تھی۔ مستعد سے ایک شخص نے فوراً ہی میرے سامنے بھی خوب صورت ٹیبل میٹ پر خوب صورت ٹرے اور خوب صورت کراکری میں کافی لا رکھی۔

نفیس صاحب خاصے خوشگوار لہجے میں بولے "آپ اس وقت وی... وی آئی پی ہیں۔ مسٹر چوہدری! ملک کی چند اہم اور بڑی بڑی شخصیتیں آپ کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں۔"

"شکریہ سر!" میں نے آہستگی سے کہا "مجھے وی وی آئی پی بننے کا شوق ہرگز نہیں۔ مجھے آپ اپنا خادم ہی سمجھیے۔"

نفیس صاحب گہری نظروں سے میری طرف دیکھے جارہے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی نظریں انسان کی روح تک میں اُتر جاتی ہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ریڈ ڈاٹ کے معاملے میں شاید بات کچھ آگے بڑھی تھی اور وہ دل ہی دل میں میری ان کاوشوں کو سراہ رہے تھے کہ میں نے اتنے بڑے خطرے کی طرف ان کی توجہ مبذول کرانے کے لیے اتنا تردّد کیا تھا۔

چند لمحے خاموشی سے کافی کی چسکیاں لی جاتی رہیں۔ ایسا ہوتا تھا کہ ان لوگوں کو بات شروع کرنے کی کوئی جلدی نہیں اس سکوت سے اُکتا کر آخرکار میں نے خود ہی کہا "نفیس صا کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھے کیوں یاد کیا گیا ہے؟"

نفیس صاحب آرام دہ کرسی کے پشتے سے ٹیک لگائے تھے۔ کافی کا مگ ان کے ہاتھ میں تھا اور اب ان کی نظر مجھ بلکہ اپنے سامنے رکھی ہوئی نیلی فائل پر تھی۔ کاہلی آمیز میں انہوں نے اسے کھولا اور تفہیمی سے انداز میں سہلاتے بولے "ہاں، سوال معقول ہے۔"

انہوں نے ایک گہری سانس لی اور ایک لمحے کے توقف بولے "مسٹر چوہدری! ماضی ایک ایسا آسیب ہے جو کبھی ا پیچھا نہیں چھوڑتا۔ کبھی کبھار یہ فراموشی کے دھندلکوں یا چکاچوند میں چھپ جاتا ہے لیکن معدوم کبھی نہیں ہوتا۔ یہ رہتا ہے۔ بالکل انسان کے اپنے وجود کی طرح۔"

میں ان سے ایسے افسانوی یا فلسفیانہ آغازِ گفتگو کی تو کررہا تھا۔ ان کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوچکی تھی ا کی جگہ گمبھیر سنجیدگی بلکہ سرد مہری نے لے لی تھی۔ میرے ذ کسی تاریک گوشے میں کوئی گھنٹی سی بجی۔ نفیس صاحب کی بھی فائل پر تھی اور ان کی نیلی آنکھیں کسی مجسمے کی آنکھ طرح ساکت تھیں۔ میں خاموش رہا۔ بعض اوقات کوئی تبص ہی بہتر تبصرہ ہوتا ہے۔

وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولے "ہم نے آپ کو ا زحمت دی ہے کہ ماضی کی کچھ ایسی باتیں بتاسکیں جنہیں وا ساتھ ساتھ شاید آپ واقعی بھول گئے ہوں یا آپ نے بھ انہیں بھلا دیا ہو۔ بہت سے محکموں نے مل کر ایک ٹیم ور کرکے بڑی مشکل اور بڑی محنت سے دن رات کام کر معلومات جمع کی ہیں اور ان کے لیے بڑے عجیب عجیب استعمال کیے جن کے بارے میں شاید آپ سوچ بھی نہ سکیں

میرے بارے میں پوچھ گچھ کرنے کم از کم میرے میری موجودگی یا میری عدم موجودگی میں کوئی نہیں آیا تھا۔ محکموں اور دفاتر میں میرے ہمدرد و بہی خواہ موجود تھے اگر میرے بارے میں معلومات جمع کرنے پہنچتا اور سیدھے روایتی طریقے سے پوچھ گچھ کرتا تو مجھے ضرور علم ہوجاتا۔ ان لوگوں نے کون سے وسائل، کون سے ذرائع استعمال مجھے کچھ پتا نہیں چلا تھا؟

یہ بہت بڑا سوالیہ نشان ایک عفریت کی طرح اس وقت سامنے آن کھڑا ہوا تھا لیکن اب ان سوالوں پر غور کر نہیں تھا۔ نفیس صاحب نے میری فائل تیار کرانے کی بات اور اپنا کہا، پورا کردیا تھا۔ ان کے سامنے جو نیلی فائل ر

غالباً میری ہی حیاتِ پریشاں کا خلاصہ تھا۔ کاغذوں کے اس پلندے میں میری ہی زندگی کے نشیب و فراز مقید تھے۔

"یہ شکر گڑھ کے ایک نہایت غریب گھرانے میں جنم لینے والے لڑکے کی کہانی ہے مسٹر چوہدری!" نفیس صاحب بھاری اور گونجیلی آواز میں بولے۔ وہ دبلے پتلے تھے لیکن ان کی آواز نہایت بارُعب تھی۔ ویسے تو شخصیت کے اعتبار سے بھی وہ دُبلے پتلے ہونے کے باوجود بہت سے بھاری بھرکم لوگوں پر بھاری تھے۔

میں نے ایک ٹک ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا آپ نے یہ کہانی مجھے سنانے کے لیے ہی اتنا تردد کیا ہے نفیس صاحب؟"

"سن تو لیجئے شاید اس میں آپ کو دلچسپی کے کئی پہلو مل جائیں' جن پر اب فراموشی کی دُھول جم چکی ہو۔" وہ چبھتے ہوئے سے لہجے میں بولے۔

"آپ نے ناحق اتنی تکلیف کی۔ میں تو آپ کو پیشکش کر چکا تھا کہ جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لیجئے' میں خود حاضر ہوں۔" میں کوشش کر رہا تھا کہ میرے لہجے میں تلخی نہ آنے پائے۔

"میں کام کو اپنے انداز میں کرنے کا عادی ہوں مسٹر چوہدری!" ان کے لہجے میں سرد مہری آگئی "انسان اپنی ذات کے ساتھ دوسروں کی طرح بے رحم کہاں ہو سکتا ہے؟ انسان خواہ سرجن ہی کیوں نہ ہو' اپنا آپریشن خود نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے اسے بے ہوش کرنا اور نشتر دوسرے کے ہاتھ میں ہونا ضروری ہے۔ خیر تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ لڑکا انتہائی غربت میں پل کر جوان ہوا۔ واجبی سی تعلیم پائی لیکن اس میں بے پناہ خدا داد صلاحیتیں موجود تھیں۔ تاہم گاؤں میں رہنے تک اسے خود بھی ان کا احساس نہیں تھا۔ مختصر عرصے کے لیے وہ ایک جعلی پیر کا آلۂ کار بھی بنا۔ پھر ادھر اُدھر بھٹکتا رہا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دوران اس کا میل جول کچھ زیادہ اچھے لوگوں سے نہیں رہا۔"

انہوں نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ میں خاموش رہا۔ وہ بولے "پھر وہ لڑکا لاہور میں نمودار ہوا اور قاسم خان نامی ایک شخص کے زیرِ سایہ رہنے لگا جو بذاتِ خود ایک مشکوک آدمی تھا۔ وہ نارکوٹکس کنٹرول بورڈ کی لسٹ پر تھا۔ کچھ ایسے لوگوں کے اس سے رابطے پائے گئے تھے جو اینٹی اسمگلنگ اسکواڈ سے تصادم یا رینجرز سے مقابلے کے بعد فرار ہوئے لیکن بعد میں ان کا کوئی پتا نہیں چلا۔ پھر وہ خود بھی مشکوک حالات میں مارا گیا۔ اس کی بیوی سلمٰی بھی ایک دلچسپ' نہایت خوب صورت اور ہر اعتبار سے توجہ طلب عورت تھی۔ جن دنوں بیروت میں سکون تھا' وہ وہاں کے ایک نائٹ کلب میں ڈانسر تھی۔ شوہر کے قتل کے بعد یہاں سے امریکا چلی گئی اور حیرت انگیز طور پر انٹرنیشنل ڈرگ مافیا نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ایک عرصے تک وہ مختلف ملکوں کے درمیان چکراتی رہی اور اس دوران اس کا ٹھاٹ باٹ قابلِ دید رہا۔ وہ بیورلے ہلز کے علاقے میں ایک شاندار محل نما گھر میں رہتی تھی جس کے اردگرد ہالیووڈ کے سُپر اسٹارز اور دنیا کے بعض معروف سرمایہ داروں کے گھر تھے لیکن ایک روز وہ اپنے سوئمنگ پول میں مُردہ پائی گئی۔ ڈاکٹری رپورٹ کے مطابق سوئمنگ کرتے کرتے اس کا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔ امریکا کی دیانتداری اور اصول پسندی کے بڑے چرچے ہیں لیکن وہاں بھی ایسے ڈاکٹر پائے جاتے ہیں جو رقم کا بریف کیس وصول پا کر یا گن کی نوک پر اس قسم کی رپورٹیں لکھ دیتے ہیں۔ ویسے بھی آج کے دَور میں کسی کو اس طرح ڈبونا کوئی مشکل کام نہیں کہ اس کی موت ہارٹ اٹیک کا نتیجہ معلوم ہو۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے۔ میں نے کوشش کی کہ میرے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہ ہونے پائے۔ وہ گہری سانس لے کر بولے "اگر وہ عورت پاکستان میں رہتی تو شاید آپ کے لیے بہت مہربان اور کارآمد ثابت ہوتی۔"

لیکن پھر وہ خود ہی گویا اپنی بات کو غیر اہم قرار دیتے ہوئے بولے "خیر۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ کو زندگی کے راستے میں قدم قدم پر دوسرے مہربان ملتے ہی رہے ہیں جن کی وجہ سے ہمیشہ آپ کے کام بہت آسان ہوتے رہے۔ قاسم خان کی موت کے بعد آپ نے زیادہ ذہانت سے اپنی زندگی کے ایک نئے دَور کا آغاز کیا۔ آپ نے امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس کا آفس کھولا اور اپنے ابتدائی سرمائے کو جائز ثابت کر کے انکم ٹیکس میں رجسٹر بھی کروالیا۔ ہمیں اس بات کا کوئی سراغ نہیں ملتا کہ کس طرح آپ کا امپورٹ ایکسپورٹ کا کاروبار راکٹ کی سی تیزی سے بلندیوں کی طرف پرواز کرتا چلا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے آپ کروڑ پتیوں میں شمار ہونے لگے۔ اس دوران انکم ٹیکس اور ایف آئی اے والوں سے ایک بار آپ کی اَن بن بھی ہوئی۔ ایف آئی اے والوں نے انکم ٹیکس والوں کے کہنے پر آپ کی فائل بھی کھولی۔ ان کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آپ کا امپورٹ ایکسپورٹ کا ٹرن اوور اتنا نہیں ہے جتنی تیزی سے آپ کے وسائل میں اضافہ ہو رہا تھا۔ بہت سے افسران آپ سے خوش تھے اور بہت سے آپ سے مرعوب تھے۔ اس کی وجہ سمجھنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

پھر بھی آپ نے غالباً اس دَور کو محفوظ سمجھنے کے باوجود مستقبل کے خطرات سے بھی بچنے کے لیے اس زمانے کے چند وزیروں سے تعلقات بڑھائے۔ خصوصاً ایک وزیر کی بیگم آپ پر بہت مہربان تھیں۔ میں ان کا نام لینا نہیں چاہتا لیکن وہ نام ان فائلوں میں موجود ہے۔ ان نئے مراسم کے بعد یکدم ہی آپ پر انکشاف ہوا کہ آپ کے تو بہت سے سودے باہر رُکے ہوئے تھے جو طے پا گئے اور یکایک ہی آپ کے پاس بہت سا زرِ مُبادلہ آگیا جو بالکل جائز اور قانونی تھا۔ زرِ مبادلہ کے معاملے میں ویسے بھی ہماری حکومتیں ہمیشہ ضرورت مند رہی ہیں' ان کا رویہ نرم ہی رہا ہے۔ اس معاملے میں وہ زیادہ باریکی میں نہیں جاتیں۔ بینک بھی آپ پر مہربان ہو گئے۔ آپ نے اپنا سرمایا بھی فراخدلی سے استعمال کیا اور بینکوں

بھی دھڑا دھڑ آپ کو قرضے دیئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے آپ کا شمار ... صنعتکاروں میں بھی ہونے لگا۔

بہرحال اس میں شک نہیں کہ آپ بے پناہ خداداد صلاحیتوں ... مالک تھے اور وقت کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزیں اتنی تیزی ... سیکھتے چلے گئے جو شاید کوئی بہت سے اساتذہ کی مدد سے بھی نہ ... اگر ہم سرسری سی نظر میں ان تضادات کا جائزہ لیں تو یہ ... بالکل الف لیلوی سی لگتی ہے۔ کل تک گاؤں کی گلیوں میں ... پھرنے والا لڑکا چودہ پندرہ برس کے عرصے میں محلوں میں ... لگا۔ گاڑیوں میں گزرتے ہوئے لوگ اس کی عالیشان محل نما ... کو دیکھ کر رفتار کم کر لیتے تھے اور رشک بھرے لہجے میں ایک ... سے کہتے کہ کاش وہ بھی ایسا گھر بنوا سکتے۔

جس کے پاس کل شکر گڑھ سے لاہور آنے کے لیے بس کا ... نہیں ہوتا تھا' وہ انگلینڈ' امریکا اور یورپ اس طرح ..... اُٹھا کر جانے لگا جیسے یہ سمندر پار کے ممالک نہیں بلکہ آس ... کے محلے ہوں۔ ہر کاروبار میں اس کا عمل دخل ہو گیا۔ طبیعت ... بھی تھی۔ جس پر مہربان ہوتا تھا اسے گندے نالے سے ... مخملیں تخت پر بٹھا دیتا تھا۔"

پھر یکدم نفیس صاحب ذرا میری طرف کو جھکتے ہوئے اشتیاق سے لہجے میں بولے "مسٹر چوہدری! کیا خود آپ کو اپنی ... کچھ عجیب نہیں لگتی؟ خود آپ کو فیس نیٹ نہیں کرتی؟ کیا ... محسوس نہیں ہوتا جیسے یہ کسی اور کی کہانی ہے؟"

میری رگ و پے میں جیسے کوئی چیز کھول رہی تھی۔ میں نے پلک جھپکائے بغیر کہا "مسٹر نفیس! میں آپ کے منہ سے وہی بات تو سننے کے انتظار میں بیٹھا ہوں جو آپ کو بہت عجیب لگی ہے۔ شاید یہ ... کی ذرہ نوازی ہے جو آپ مجھے بے شمار خداداد صلاحیتوں کا ... سمجھتے ہیں ورنہ درحقیقت میں خاصا کوڑھ مغز آدمی ہوں۔ میں ... تک نہیں سمجھ سکا کہ اس ساری کہانی میں آپ کو کیا چیز الف ... سی لگی ہے؟"

"آپ کا یہ تجاہلِ عارفانہ بھی آپ کی خوب صورت اداؤں ... ایک ہے۔" نفیس صاحب سرد لہجے میں بولے "میں اس ... کی بات کر رہا تھا جو آپ نے صرف چودہ پندرہ سال کے عرصے ...۔"

"نفیس صاحب! اس ملک میں ایسی داستانیں تو قدم قدم پر ... پڑی ہیں۔ کیا وہ سب آپ کو الف لیلوی لگتی ہیں؟ کیا ان ... کی فائلیں تیار کرانے کے لیے آپ نے کبھی اتنا ہی تردد کیا ...؟" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"ہم سب کی نہیں' فی الحال صرف آپ کی بات کر رہے ہیں۔ ... اور یقیناً بہت سے لوگ آتے ہیں لیکن اتنے کم عرصے میں ... اوپر آنے والوں کی تعداد بہت کم ہوتی ہے۔ ان میں سے ... لوگوں کی کہانی یقیناً آپ سے ملتی جلتی بھی ہوگی۔ لیکن

عدالت میں اگر کوئی قاتل یہ کہے کہ اس نے قتل محض اس لیے کیا کہ دُنیا میں بہت سے لوگ اس سے پہلے بھی قتل کر چکے تھے اور پکڑے نہیں گئے تھے۔ تو عدالت اسے کوئی دلیل تسلیم نہیں کرتی۔ آپ کی داستانِ حیات میں سے جو کڑیاں غائب ہیں' ہمیں ان کے بارے میں تشویش ہے مسٹر چوہدری۔ آپ ایک پُراسرار آدمی ہیں مسٹر چوہدری! میں پہلے بھی یہ بات آپ سے کہہ چکا ہوں۔ پُراسرار لوگ ہمیں کچھ خطرناک بھی محسوس ہوتے ہیں۔

اپنی اس تمام تر پُراسراریت کے ساتھ آپ ملک کے وزیرِ خارجہ کو اپروچ کر کے ایک پُراسرار کہانی لے کر ہمارے پاس آئے تو بہت سی سوچوں نے ہمیں گھیر لیا۔ مسٹر چوہدری! ہمارے پاس ایسی اطلاعات اور ایسے شواہد تو جمع ہوتے رہتے ہیں کہ کسی سیاسی پارٹی کے سربراہ یا اسٹوڈنٹ لیڈر کو کسی غیر ملکی تنظیم نے خطرناک اور مذموم مقاصد کے تحت اپروچ کیا اور اسے آلۂ کار بنانے کے لیے بڑی بڑی رنگا رنگ پیشکشیں کیں۔۔؟"

میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن آپ ان کے بارے میں اطلاعات اور شواہد ہی جمع کرتے رہے۔ جس کو بکنا تھا وہ بک گیا' جس کو اس ملک میں خلفشار برپا کرنا تھا وہ کرتا رہا۔ بھائی بھائی کو ذبح کرتا رہا' آگ میں جھونکتا رہا۔ کہیں ملک توڑنے کی' کہیں صوبے توڑنے کی سازشیں ہوتی رہیں۔ درس گاہیں' قتل گاہیں بن گئیں۔ اتنی کتابیں نہ پڑھی جاسکیں جتنے نوجوانوں کی کتابِ زندگی ورق ورق کر دی گئی۔ آپ بتائیں آپ نے اسے روکنے کے لیے کیا کیا؟

آپ صرف اعداد و شمار جمع کرتے رہے؟"

"ہمارے ذمّے جو کام تھا وہ ہم کرتے رہے ہیں اور کرتے رہیں گے۔" نفیس صاحب پُرسکون لہجے میں بولے "اس ملک میں اور بھی بہت سے ادارے اور محکمے ہیں۔ ان کے ذمّے بھی کچھ کام ہیں۔ کبھی ان پر بھی اپنی طنز و مزاح کی صلاحیتیں آزمایئے گا۔"

"ان سے بھی اُمید ہے یہی جواب سننے کو ملے گا۔" میں نے بلا تامّل کہا "فی الحال تو مجھے جس سے واسطہ پڑ رہا ہے میں بھی صرف اسی کی بات کر رہا ہوں لیکن مشکل یہ ہے کہ میں اس ملک کا ایک عام شہری ہوں۔ میرے پاس کسی کے احتساب کا کوئی حق نہیں۔"

"آپ کو تمام حقوق حاصل ہیں، اسی لیے آپ اتنے آرام سے ہمارے مقابل بیٹھے سوال جواب کر رہے ہیں۔ ترکی بہ ترکی ہر بات کا جواب دے رہے ہیں۔ ورنہ اصولاً اس وقت آپ کو جیل میں ہونا چاہیے تھا۔" شہریار خان صاحب سگار کا کش لیتے ہوئے پہلی بار بولے۔

"اگر آپ کے خیال میں مجھے ہی جیل میں ڈال کر اس ملک اور قوم کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے تو میں حاضر ہوں۔ براہِ کرم اس نیک کام میں جلدی کیجیے۔" میں نے تیزی سے کہا۔ وہ سب ایک ٹک مجھے گھور رہے تھے۔ مجھے اس میٹنگ کا اختتام بخیر و عافیت ہوتا دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں نے اب گفتگو کی تمام احتیاط بالائے طاق رکھ دی تھی اور سوچ لیا تھا کہ جو بھی میرے دل میں ہوگا، کہہ ڈالوں گا، خواہ انجام کچھ بھی ہو۔ میری کنپٹیاں تپ رہی تھیں۔ میں بہت خوش خوش لاہور سے پرواز کر کے یہاں آیا تھا لیکن جو کچھ سوچ کر آیا تھا، معاملہ اس کے بالکل برعکس نکلا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے مزید بات کرنا چاہی تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میری آواز گلوگیر ہو چکی تھی۔ میں نے گلے میں پھیلتی ہوئی نمی کو نگلتے ہوئے کہا "نفیس صاحب! آج میری زندگی کے سب سے بڑے پچھتاوے کا دن ہے۔ مجھے یہ سوچتے ہوئے شرم آ رہی ہے لیکن مجبوراً سوچ رہا ہوں کہ اگر میں نے ریڈ ڈاٹ کی پیشکش قبول کر لی ہوتی تو کیا بہتر نہ ہوتا۔ انہوں نے جو کچھ کہا تھا اس کا ایک مطلب یہ بھی تھا کہ آپ جیسے لوگوں کے تبادلے اور تقرریاں بھی میرے لیے بائیں ہاتھ کا کام ہو جاتا۔ میرے ڈوریاں ہلانے سے بڑے بڑے بُت زمیں بوس ہو جایا کرتے لیکن پہلی بار میرے دل میں وطن کی محبت اس شدت سے جاگی کہ بادشاہ گر بن جانے میں بھی مجھے کوئی کشش دکھائی نہ دی۔ اور یہ وہ خواب ہے جو اس ملک میں بہت بڑے بڑے لوگ جاگتی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ لیکن میں نے اس پیشکش کو ٹھکرا کر جو راستہ منتخب کیا، اس پر چلتے ہوئے مجھے اپنے گھر کو راکھ کا ڈھیر ہوتے دیکھنا پڑا، اپنے جاں نثاروں کو موت کے منہ میں جاتے دیکھنا پڑا، اپنے ہمدردوں کو انتقام کا نشانہ بنتے دیکھنا پڑا اور اس قسم کے پیغامات سننا پڑے..."

میں نے ایک کیسٹ جیب سے نکالی اور میز پر پھینک دی۔ اس میں ایڈی کا وہ پیغام محفوظ تھا جو مجھے آفس کی انسورنگ مشین پر موصول ہوا تھا، جس میں اس نے زندگی کو میرے لیے موت سے بدتر بنانے کے عزم کو دُہرایا تھا۔

جہاں ہم بیٹھے تھے وہ ایک باقاعدہ کانفرنس ہال ہی تھا۔ نشست کے سامنے مائیک بھی موجود تھا لیکن آف تھا۔ شاید اس لیے کہ اجتماع مختصر ہی تھا۔ ہم نہایت آسانی سے ایک دوسرے کی آواز سن سکتے تھے۔ نفیس صاحب نے مؤدبانہ انداز میں ایک طرف کھڑے ہوئے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ اس نے کیسٹ اٹھائی اور کمرے سے ملحق ایک کیبن نما حصے میں لے گیا جہاں سے ساؤنڈ سسٹم کنٹرول کیا جاتا تھا۔ چند لمحے بعد وہ کیسٹ چلنے لگی اور دیواروں میں نصب پوشیدہ اسپیکرز پر ایڈی کی آواز اُبھرنے لگی۔ سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔

پیغام ختم ہونے کے بعد چند لمحے ہال میں سکوت چھایا رہا۔ نفیس صاحب پہلے کی بہ نسبت ذرا ملائمت سے بولے "ہم سب کے لیے یہی سوال سب سے زیادہ پریشان کن ہے کہ ریڈ ڈاٹ کا اگر واقعی کوئی وجود ہے تو آخر وہ آپ کے لیے اتنا تردد کیوں کر رہی ہے؟ پہلے وہ آپ کو آمادہ کرنے کے لیے اتنا تردد کرتی رہی اور آپ کے انکار کے بعد بھی وہ آپ کو ہلاک کرنا نہیں چاہتی بلکہ آپ کو سبق سکھانے کی خاطر آپ کی زندگی کو موت سے بدتر بنانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اور اس کے لیے اتنا تردد کر رہی ہے۔ ان مقاصد کے لیے ذرا دوسری طرح کے لوگ زیادہ کارآمد ہوتے ہیں؛ جن کی کوئی سیاسی اہمیت ہوتی ہے یا جو سرکاری سطح پر بہت پاور فل ہوتے ہیں۔ ہم سب اس پہلو پر ابھی تک مطمئن نہیں ہو سکے۔ اس کے علاوہ بقول آپ کے، آپ جب سے ریڈ ڈاٹ کے زیرِ عتاب ہوئے ہیں تب سے جس قسم کی کارروائیاں ہو رہی ہیں ان پر ڈرامائیت کا عنصر غالب ہے۔"

"بخدا یہ عنصر میں نے پیدا نہیں کیا۔ میں کوئی ڈراما ڈائریکٹر نہیں ہوں۔" میں نے زہریلی سادگی سے کہا۔

نفیس صاحب گویا میرے الفاظ پر توجہ دیے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے بولے "ہمارے پاس آپ کی زندگی کے پاس کئے کہ آپ کے ماضی کے جو تاریک گوشے ان فائلوں میں ہیں وہ ہمیں کچھ اور بھی سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ یہ کوئی گینگ وار تو نہیں ہے؟ انٹرنیشنل مافیا آپ کی کوئی دشمنی تو آپ کا تعاقب نہیں کر رہی؟ یا یہ کسی اور کے بدلے کی کوئی جنگ تو نہیں؟ جس میں آپ خفیہ ایجنسیوں کو استعمال کرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟" وہ گہری سنجیدگی سے بولے۔

مجھے ہنسی آ گئی لیکن یہ ہنسی ایک درد بھری کراہ سے

تھی۔ آخر کار میرے اندر مزاحمت اور بحث و تمحیص کی خواہش دم توڑ گئی۔ میں نے اپنی دُکھتی ہوئی کنپٹیوں کو ایک لمحے کے لیے مسلنے کے بعد کہا "بس اب بات ہی ختم ہو گئی نفیس صاحب! میں اب کچھ بھی کہنا نہیں چاہتا، کسی بھی بات کا جواب دینا نہیں چاہتا۔ مجھ سے غلطی ہوئی جو میں نے اتنے جوش و خروش سے آپ لوگوں کو اپروچ کیا۔ یہ میری زندگی کی سب سے بھیانک غلطی تھی۔ اگر آپ کے لیے ممکن ہو تو اس بات کو بھول جائیں کہ میں آپ کے پاس آیا تھا۔"

اس بار باقری صاحب نے بھی بول کر گویا اپنی موجودگی کا احساس دلایا "یہ تو ممکن نہیں ہے مسٹر چوہدری! ہمارا تعلق تو اس مشینری سے ہے جو ایک مرتبہ اسٹارٹ ہو جائے تو دوسری طرف سے کچھ پروڈکٹ برآمد ہونے کے بعد ہی رُکتی ہے۔"

"آپ کی باتوں سے مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ پروڈکٹ کس قسم کی برآمد ہوگی۔ بہرحال میں تو اب اس بحث میں ہی پڑنا نہیں چاہتا۔" میں نے بے زاری سے کہا "مجھے صرف یہ بتا دیجیے کہ میرے لیے کیا حکم ہے؟ کیا میں اپنے آپ کو زیرِ حراست سمجھوں؟"

"نہیں۔ ایسی تو کوئی بات نہیں۔ آپ نے یہ نتیجہ کیونکر اخذ کر لیا؟" نفیس صاحب حیرت سے بولے "ہمارا مقصد فی الحال آپ کو صرف آپ کے بارے میں اپنی معلومات سے آگاہ کرنا تھا۔ آپ کو حراست میں لینے کے بارے میں تو ہم نے سوچا بھی نہیں۔"

"تو پھر مجھے اجازت؟" میں نے اٹھنے کے لیے پر تولتے ہوئے کہا۔

"چلے جایئے گا، ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" نفیس صاحب یوں ملائمت سے بولے گویا میں کسی سوشل وزٹ پر ان کے گھر آیا ہوا کوئی مہمان تھا۔

"کیا میری نگرانی کی جائے گی؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں، ایسی بھی کوئی بات نہیں۔" نفیس صاحب نے جواب دیا "ہمیں امید ہے کہ آپ کہیں نہیں جائیں گے اور جب ہمیں آپ کی ضرورت ہوگی آپ ہمیں آسانی سے مل جائیں گے۔"

"جب آپ کو ریڈ ڈاٹ کے وجود پر یقین ہی نہیں تو آپ کو مجھ سے رابطہ رکھنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے تو اب یہی شرمندگی ہے کہ میں نے ابھی تک خواہ مخواہ آپ لوگوں کا اتنا قیمتی وقت ضائع کیا۔" میں نے کہا۔ مجھے درحقیقت اپنا وقت ضائع ہونے کا افسوس تھا۔

"ہماری طرف سے ابھی بات ختم نہیں ہوئی مسٹر چوہدری!" نفیس صاحب بولے "اگر ریڈ ڈاٹ کا کوئی وجود ہوا تو ہمیں امید ہے، جلد یا بدیر اس کا کوئی ٹھوس ثبوت سامنے آ ہی جائے گا۔ ہم جلد مایوس ہونے والے لوگ نہیں ہیں۔ کوئی بھی مخفی چیز کتنی ہی پوشیدہ کیوں نہ ہو، ایک نہ ایک روز ضرور عیاں ہو کر رہتی ہے۔ آپ کے مکان کا نذرِ آتش ہو جانا، تین اسٹری شیٹرز کی لاشیں، ایک چینیز کی لاش، ایک آڈیو کیسٹ۔ یہ چیزیں اس قسم کی کسی تنظیم کے وجود کا حتمی اور ٹھوس ثبوت نہیں ہیں جیسی آپ کے بیان کے مطابق ریڈ ڈاٹ کو ہونا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے، آپ منتظر رہیے۔" میں نے بے زاری سے کہا، "جب گلیاں لاشوں سے پٹ جائیں تو شاید آپ کو یقین آ جائے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ لوگوں کو کسی بات کا یقین دلانا اتنا مشکل کام ہے تو میں ہرگز زحمت نہ دیتا۔"

"ایسی بات نہیں ہے مسٹر چوہدری!" نفیس صاحب تحمل سے بولے "یہ بات پر، حالات پر اور بات کرنے والے کی ذات پر منحصر ہوتا ہے کہ اس پر کب، کس طرح اور کس انداز میں یقین کیا جائے۔"

"ٹھیک ہے سر! جیسے آپ کی مرضی۔" میں نے کندھے اُچکا دیے۔

نفیس صاحب فائل کے ورق اُلٹتے ہوئے بولے "میں نے تو آپ کو صرف خلاصہ سُنایا ہے ورنہ اس فائل میں آپ کی زندگی کی مکمل کہانی محفوظ ہے۔"

مجھے کچھ شبہ ہو رہا تھا کہ نفیس صاحب نے میری فائل صرف خفیہ اداروں کے ذریعے تیار نہیں کرائی تھی بلکہ کچھ نامعلوم ذرائع نے ان کی مدد کی تھی کیونکہ نفیس صاحب کو مجھ سے آشنا ہوئے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ ان اداروں سے مجھے اتنی مستعدی کی توقع نہیں تھی۔ دوسرے اگر اس پیمانے پر میرے بارے میں چھان بین ہوتی تو مجھے ضرور پتا چل جاتا۔

میں سوچ رہا تھا کہیں ریڈ ڈاٹ نے تو اس کام میں خفیہ اداروں کی مدد نہیں کی؟ ریڈ ڈاٹ میری طرف زیادہ عرصے سے متوجہ تھی۔ ان کے ذرائع بھی ناقابلِ یقین تھے۔ ممکن ہے انہوں نے دُہرا کھیل کھیلا ہو۔ خفیہ طور پر میرے بارے میں ایجنسیوں کو اطلاعات بہم پہنچائی ہوں۔ نفیس صاحب نے صرف ان کی تصدیق کی ہو۔ بلکہ ضروری نہیں تھا کہ تصدیق بھی کی ہو۔ ممکن تھا ابھی وہ صرف شوشا چھوڑ رہے ہوں۔ میرا ردِعمل دیکھنا چاہتے ہوں۔ مجھے ٹٹول رہے ہوں۔ اندازے لگا رہے ہوں کہ میں کس حد تک قابلِ اعتبار ہوں۔ وہ خود بھی اس بات سے بے خبر ہوں کہ ریڈ ڈاٹ مختلف سمتوں سے میری جڑیں کاٹ رہی تھی۔ مجھے ان کی نظر میں

ناقابلِ اعتبار بنارہی تھی اور یوں کسی حد تک انہیں بھی میرے خلاف استعمال کررہی تھی۔ اس فائل میں بے شک میری کہانی تھی لیکن اس کے پیچھے بھی یقیناً کوئی کہانی تھی۔

نفیس صاحب سرسری سے انداز میں بولے "میں نے آپ کے ماضی کے جن تاریک پہلوؤں کا اشارتاً تذکرہ کیا ہے ان کے بارے میں آپ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا؟" وہ واقعی مجھے ٹٹولنے کی کوشش کررہے تھے۔ میرے شبہات پختہ ہونے لگے کہ اس فائل کے پیچھے کچھ نامعلوم لوگوں کی مخبری کام کررہی تھی۔

میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "جب میں نے بات ہی ختم کردی تھی تو پھر تبصروں کا کیا فائدہ؟ میں نے تو اپنے آپ کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔ آپ بتایئے آپ کیا چاہتے ہیں؟ آپ تصدیق چاہتے ہیں تو میں سب باتوں کی تصدیق کردیتا ہوں۔ آپ تردید چاہتے ہیں تو میں سب باتوں کی تردید کردیتا ہوں۔ باتیں سُنے بغیر۔ اس سے زیادہ تعاون بھلا میں کیا کرسکتا ہوں؟"

"اتنی بے زاری؟" نفیس صاحب کے پتلے پتلے سفاک سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق ابھری۔

"یہی سمجھ لیجیے۔ میں تو صرف بے زار ہوا ہوں، میری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید خودکشی کرلیتا۔" میں نے جواب دیا۔

"بعض اوقات بے زاری کی کوکھ سے بڑے خوشگوار واقعات جنم لیتے ہیں۔" نفیس صاحب بولے۔

"میں بے چینی سے اس دن کا منتظر ہوں۔" میں نے کہا۔ باقی سب لوگ بس ایک ٹک میری طرف دیکھے جارہے تھے۔ ان میں سے بعض نے تو ابھی تک ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ شاید میٹنگ میں ان کی شرکت کا مقصد صرف گفتگو سُننا ہوتا تھا اور ان کا اصل کام میٹنگ کے بعد شروع ہوتا تھا۔

چند لمحے کمرے میں بوجھل سکوت طاری رہا۔ شہریار صاحب سگار کے کش لیتے رہے۔ باقری صاحب دھیرے دھیرے اپنی خیالی مونچھوں کو بَل دیتے رہے اور نفیس صاحب انگلیوں پر ٹھوڑی ٹکائے کسی خیال میں ڈوبے رہے لیکن نظر سب کی مجھ پر تھی۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں کوئی عجیب الخلقت انسان تھا اور ان کے معائنے کے لیے لایا گیا تھا۔

آخرکار میں نے ایک بار پھر اٹھنے کے لیے پر تولتے ہوئے کہا "مجھے اجازت دیجیے۔"

"ٹھیک ہے" نفیس صاحب گہری سانس لے کر اٹھ کھڑے ہوئے "آپ سے پھر ملاقات رہے گی۔ رابطہ رکھیے گا اور ہر چھوٹے بڑے واقعے کی اطلاع دیتے رہیے گا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے اپنی اکتاہٹ کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ لیکن دل ہی دل میں، میں سوچ رہا تھا کہ اب شاید اس ہدایت پر عمل نہ کرپاؤں۔ ابھی تک تو اس کا کوئی خاص فائدہ سامنے نہیں آیا تھا۔

خلافِ توقع نفیس صاحب اٹھ کر میرے ساتھ ہال کے دروازے تک آئے اور اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ مشفقانہ انداز میں میرے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے بولے "مسٹر چوہدری! اپنی جان کی حفاظت کرنا۔"

میں نے کہا "جب آپ کو ریڈ ڈاٹ کے وجود پر یقین ہے ہی نہیں تو پھر میری جان کی فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"یقین بے یقینی اپنی جگہ ہے لیکن آپ کی جان کو بہرحال خطرات لاحق معلوم ہوتے ہیں۔" وہ بولے۔

"میں آپ کے اس خیال سے متفق نہیں۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا "ریڈ ڈاٹ والوں کا کہنا ہے کہ وہ مجھے جان سے مارنا نہیں چاہتے۔ ان کی نظر میں یہ کوئی خاص سزا نہیں۔ وہ میری زندگی کو موت سے زیادہ عبرت ناک بنانا چاہتے ہیں۔"

"اور آپ نے ان کی بات کا اعتبار کرلیا؟" نفیس صاحب خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔

"ہاں وہ خبیث ہیں، مکروہ ہیں، ترقی پذیر ممالک کے لیے مصیبت ہیں لیکن بدبخت اپنی بات کے بڑے پکے ہیں، جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ آپ کی غلط فہمی بھی ثابت ہوسکتی ہے۔"

"تو کیا آپ کو ریڈ ڈاٹ کے وجود کا یقین آچکا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔" وہ بولے "لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ کوئی نہ کوئی چکر ضرور چل رہا ہے۔ کوئی نہ کوئی طاقت کہیں سرگرمِ عمل ضرور ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کا نام ریڈ ڈاٹ ہو اور ضروری نہیں کہ اس کے اغراض و مقاصد وہی ہوں جو آپ نے بتائے ہیں... یا یوں کہیے کہ جو آپ کو بتائے گئے ہیں۔"

"چلیے آپ اس حد تک تو آئے۔ میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ہم باہر آچکے تھے۔

ڈرائیو وے میں وہی سیاہ مرسیڈیز کھڑی تھی جو مجھے یہاں لائی تھی۔ اس کے دونوں پچھلے دروازے پہلے ہی کھلے تھے اور ڈرائیور اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ وہی دونوں افراد جو میرے ساتھ آئے تھے، نہ جانے کہاں سے برآمد ہوکر میرے دائیں بائیں آن کھڑے ہوئے۔ نفیس صاحب نے مجھ سے الوداعی مصافحہ کیا۔ وہ دُبلے پتلے تھے لیکن ان کے ہاتھ کی گرفت آہنی تھی۔

ہم نے گاڑی کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ ڈرائیور نے غالباً گاڑی اسٹارٹ کرنے کے لیے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوفناک دھماکا ہوا اور میں نے گاڑی کے پرخچے اڑتے دیکھے۔

دھماکے پر ہمارا ردِّعمل تقریباً ایسا ہی تھا جیسے کوئی چیز تیزی سے آنکھ کی طرف بڑھتی ہے تو آنکھ خودبخود بند ہوجاتی ہے۔ بالکل اسی طرح دھماکے کے ساتھ ہی میں نے اپنے آپ کو برآمدے کے موٹے سے ستون کے عقب میں گرادیا۔ نفیس صاحب نے بھی تقریباً ایسی ہی پھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ میرے قریب ہی ڈھیر ہوئے تھے۔

وہ دو افراد جو مجھے ساتھ لے کر آئے تھے اور غالباً ساتھ ہی لے جانے کے لیے ہمارے عقب میں آن کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے فرش پر ڈھیر ہونے میں ذرا تاخیر کردی۔ یہ تاخیر شاید ایک سیکنڈ کے دسویں یا بیسویں حصے پر مشتمل رہی ہو لیکن ایسے موقعوں پر اتنی تاخیر ہی عموماً زندگی اور موت کا فیصلہ کردیتی ہے۔

فضا میں جب دھماکے کا ارتعاش ختم ہوا اور دوبارہ سکوت چھا گیا تو میں اور نفیس صاحب آہستگی سے اٹھے۔ تب ہم نے اپنے عقب میں کسی کے کراہنے کی آواز سُنی۔ مُڑ کر دیکھا تو جناح کیپ

والے کے ساتھی کو عجیب حالت میں پایا۔ اس کی ایک آنکھ میں لوہے کا جھلسا ہوا ٹکڑا اس طرح پیوست تھا کہ رخسار کی ہڈی پر چھجا سا بن گیا تھا۔

دوسری طرف کا پورا رخسار ہی غائب تھا اور جبڑے کی ہڈی کے ساتھ دانت وغیرہ عریاں ہوجانے کے باعث چہرہ یکدم ہی بہت بھیانک ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ چت پڑا تھا اور خون اس کے چہرے سے بھل بھل بہہ رہا تھا۔ کراہنے کی آواز اسی کی تھی۔ وہ ابھی ہوش میں تھا۔ جناح کیپ والا تو غالباً مر ہی چکا تھا۔ لوہے کا ایک ٹکڑا عین اس کے حلقوم میں بے ہنگم ساخت کے کسی خنجر کی طرح پیوست تھا۔ چہرے اور سینے پر بھی بہت سے ٹکڑے لگے تھے۔ کچھ وہیں پیوست تھے، کچھ اپنے ساتھ گوشت اُڑاتے ہوئے لے گئے تھے۔

ایسے موقعوں پر انسان کو تقدیر پر یقین آنے لگتا ہے۔ میں تو خیر پہلے ہی یقین رکھتا تھا لیکن یقین نہ رکھنے والے بھی خدانخواستہ ایسی صورتِ حال سے گزریں تو مجھے امید ہے انہیں یقین آنے لگے گا، واقعی جیسے کوئی غیبی ہاتھ کسی کی ڈھال بن جاتا ہے اور کسی کو پلک جھپکتے میں موت کی اندھی وادی میں کھینچ کرلے جاتا ہے۔

یہ ایک عجیب اور قابلِ غور اتفاق تھا کہ میں اور نفیس صاحب ان دونوں آدمیوں کے سامنے کھڑے تھے۔ ہم گویا ان کی ڈھال تھے۔ دھماکے سے فضا میں اُڑنے والے پرخچے پہلے ہم تک پہنچنے چاہئیں تھے لیکن ہم بس ایک سیکنڈ کا دسواں، بیسواں یا شاید پچاسواں حصہ پہلے فرش پر ڈھیر ہوگئے تھے..یا یوں کہئے کہ تقدیر کے غیبی ہاتھ نے ہمیں درمیان سے ہٹادیا تھا۔ تاہم کھڑے ہونے پر مجھے احساس ہوا کہ میرے کوٹ کا کندھا فوم کے پیڈ سمیت یوں غائب ہوچکا تھا جیسے کسی نے قینچی سے کاٹ کر الگ کرلیا ہو لیکن اس کے نیچے میرے اصل کندھے پر خراش تک نہیں آئی تھی۔ کندھے میں کچھ کھنچاؤ سا ضرور محسوس ہورہا تھا لیکن مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ کب اور کس طرح میرے کوٹ کا وہ حصہ غائب ہوا تھا۔

گاڑی ہم سے کافی دور گیٹ کی دیوار کے قریب کھڑی تھی۔ دیوار کا کچھ حصہ بھی متاثر ہوا تھا لیکن گاڑی دھماکے سے پوری نہیں اُڑی تھی۔ اس کا اگلا آدھا حصہ غائب ہوا تھا اور باقی آدھے حصے کی بھی حالت تباہ ہوچکی تھی۔ مرسیڈیز جیسی مضبوط گاڑی کے آدھے حصے کے پرخچے اُڑنا بھی کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ وہ یقیناً خاصا طاقتور کار بم رہا ہوگا۔ روش کے ٹھوس پختہ فرش میں بھی گڑھا پڑچکا تھا۔

ڈرائیور کے جسم کے کچھ جھلسے ہوئے اور کچھ خون میں لتھڑے ہوئے ٹکڑے اِدھر اُدھر جاچکے تھے۔ ان میں سے کچھ سے ابھی دُھواں ہی اٹھ رہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ کلائی کے تھوڑے سے حصے سمیت کٹ کر ایک درخت پر جا اٹکا تھا اور نرم شاخ پر اس طرح جھول رہا تھا جیسے کوئی کسی کو خدا حافظ کہہ کر رخصت ہورہا ہو لیکن ہاتھ الٹا لٹکا ہوا تھا۔ وہ ماحول جو چند لمحے پہلے تک نہایت پُرسکون اور خوب صورت دکھائی دے رہا تھا اس میں یکدم ہی موت کی خوفناکی اور بدصورتی پھیل گئی تھی۔

میں نے تو عمارت کے اندر آٹھ یا نو افراد کو ہی دیکھا تھا لیکن اب ان کے علاوہ بھی بہت سے افراد باہر آگئے تھے۔ ہنگامی سی حالت نظر آنے لگی۔ اس وقت تو میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب عمارت کے عقبی حصے سے ایک ایمبولنس بھی نکل آئی۔ لوگ اِدھر اُدھر دوڑنے بھاگنے لگے لیکن یہ سب کچھ نہایت خاموشی سے ہورہا تھا۔ کوئی سائرن نہیں بج رہا تھا۔ کوئی چیخ چلا نہیں رہا تھا۔

بیشتر ہدایات نفیس صاحب ہی دے رہے تھے اور وہ بھی پہلے ہی کی طرح پُرسکون دکھائی دے رہے تھے۔ صرف ان کے چہرے کی سُرخی میں تھوڑا سا اضافہ ہوگیا تھا۔ مجھے سرِدست گویا بالکل فراموش کردیا گیا تھا۔ میں ایک طرف کھڑا ساری صورتِ حال کا جائزہ لے رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔

سب سے پہلے زخمی اور مُردہ شخص کو ایمبولینس میں ڈال کر غالباً اسپتال روانہ کیا گیا۔ اسی دوران ایک جیپ میں کچھ اور لوگ بھی آن پہنچے اور تباہ شدہ کار وغیرہ کا معائنہ کرنے لگے۔ ان میں ایک فوٹوگرافر بھی تھا۔ وہ مختلف زاویوں سے جائے وقوعہ کی تصویریں بنانے لگا مگر وہ کوئی عام پیشہ ور یا پریس کا فوٹوگرافر معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ تصویریں کھینچ چکا تو ڈرائیور اور گاڑی دونوں ہی کے ٹکڑے جمع کیے جانے لگے اور پلاسٹک کے سیاہ بڑے بڑے تھیلوں میں ڈالے جانے لگے۔ سب کی چہروں پہ گمبھیر اور اُداسی آمیز سی سنجیدگی طاری تھی۔

چند منٹ بعد وہاں صرف کچھ نشانات اور کار کا آدھا ڈھانچا سا رہ گیا۔ تب نفیس صاحب دوبارہ میری طرف متوجہ ہوئے اور انہوں نے مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ ایک بار پھر ہم لوگ اسی کانفرنس ہال میں آبیٹھے۔ میز کے گرد وہی چہرے تھے۔ نشستوں کی وہی ترتیب تھی صرف چہروں پر تاثرات ذرا گمبھیر سے ہوگئے تھے ورنہ ایسا ہی معلوم ہورہا تھا کہ ہماری میٹنگ میں چند منٹ کے لیے خلل پڑگیا تھا اور اب سلسلہ وہیں سے جوڑا جارہا تھا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

نفیس صاحب پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھے جارہے تھے۔ آخرکار میں نے ہی سکوت توڑا "ریڈ ڈاٹ آپ کی دہلیز تک بھی پہنچ گئی ہے نفیس صاحب!"

"آپ کا ذہن ریڈ ڈاٹ میں ہی اٹکا ہوا ہے مسٹر چوہدری!" خلافِ توقع وہ ملائمت سے بولے "دُنیا میں ریڈ ڈاٹ کے علاوہ بھی بہت سے معاملات ہوتے ہیں۔"

"تو پھر یہ آپ کا اپنا کوئی معاملہ ہوگا۔ مجھے تو اس پر ریڈ ڈاٹ ہی کی کارروائی کا گمان گزرا تھا۔" میں نے قدرے بے پروائی سے

کہا۔

"معاملہ تو یہ ہمارا نہیں تھا۔ معاملے کا تعلق تو آپ ہی کی ذات سے ہوسکتا ہے لیکن ہم فی الحال اس کی تہ میں ریڈ ڈاٹ نام کی اس افسانوی قوت کو تلاش کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں جس کا نقشہ آپ کھینچ چکے ہیں۔" وہ بولے۔

میں نے ایک بار پھر خون کا گھونٹ پیا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "چلئے آپ کو اس کی تہ میں جو قوت نظر آتی ہے آپ اسے ہی تلاش کرلیجئے۔ پھر اس سے پوچھ لیجئے گا کہ اس کا نام کیا ہے۔ وہ نہ بتائے تو خود اس کا کوئی اچھا سا نام رکھ لیجئے گا۔"

کمالِ شفقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے نفیس صاحب نے میرے اس طنز کو نظرانداز کردیا اور بولے "فرض کریں یہ ریڈ ڈاٹ ہی کا کام تھا تب بھی آپ کی ایک خوش فہمی تو دور ہوجانی چاہیے۔"

"کون سی خوش فہمی؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"آپ کہہ رہے تھے کہ ریڈ ڈاٹ والے آپ کو مارنا نہیں چاہتے بلکہ آپ کی زندگی کو ہی آپ کے لیے موت سے بدتر بنانا چاہتے ہیں۔ آپ نے ہمیں ایک کیسٹ بھی سنوائی تھی جس میں کچھ اسی قسم کا پیغام ریکارڈ تھا لیکن آپ خود سوچیں... اگر آپ اس گاڑی میں ہوتے تو کیا بچ سکتے تھے؟ کہیں کوئی آپ کو خوش فہمی میں رکھ کر مارنا نہ چاہتا ہو۔"

"بچانے والی تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ بظاہر بہرحال یہی نظر آتا ہے کہ اگر وہ مجھے مارنا چاہیں تو یہ ان کے لیے زیادہ مشکل کام نہیں۔ اس کے لیے انہیں مجھ کو خوش فہمی یا غلط فہمی میں رکھنے کی ضرورت نہیں۔ وہ جب میرا قلعہ نما گھر اُڑا سکتے ہیں، ملک کی سب سے بڑی خُفیہ ایجنسیوں کے ایک خُفیہ ٹھکانے پر کھڑی ہوئی مرسیڈیز اُڑا سکتے ہیں، بھری آبادی کے درمیان میری ایک بزنس پارٹنر راحیلہ کے گھر پر کمانڈو ایکشن کرسکتے ہیں تو ان کے لیے اس فانی وجود کو اُڑانا کون سا مشکل کام ہے۔" میں نے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا "مجھے ان کی بات کا یقین ہے۔ وہ واقعی مجھے مارنا نہیں چاہتے۔ کم ازکم فی الحال تو مارنا نہیں چاہتے۔"

"تو پھر اس گاڑی میں دھماکا کرانے کی کیا تُک تھی؟" نفیس صاحب نے میری آنکھوں میں جھانکا "مانا کہ وہ سائنسی طور پر بہت ترقی یافتہ ہیں لیکن غیب داں تو نہیں ہیں۔ انہیں پیشگی تو یہ علم نہیں ہوسکتا تھا کہ آپ بچ جائیں گے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ اس اتفاق میں بھی شک کا پہلو ڈھونڈ رہے تھے۔ ان کے اعتراض کا واقعی میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ اس کا جواب تو ریڈ ڈاٹ والے ہی دے سکتے تھے۔ ممکن ہے کسی بنا پر انہیں یقین رہا ہو کہ گاڑی اسٹارٹ ہونے تک میں گاڑی میں نہیں بیٹھ پاؤں گا بلکہ گاڑی کے قریب بھی نہیں ہوؤں گا۔ ممکن ہے ان کی اطلاعات یا اندازے کچھ اور ہوں۔ ممکن ہے اس گاڑی کو اُڑانے کا مقصد سرے سے کچھ اور ہی ہو۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا "نفیس صاحب! آپ کا طرزِ عمل بھی نہایت ہی ڈپلومیٹک ہے۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو ریڈ ڈاٹ کے وجود پر قطعاً یقین نہیں اور کبھی محسوس ہوتا ہے کہ آپ اس پر یقین کرنے پر مائل ہیں۔ کبھی محسوس ہوتا ہے کہ میں آپ کی نظر میں بڑی محترم اور معتبر شخصیت ہوں اور کبھی گمان گزرتا ہے کہ آپ مجھے قطعی جھوٹا اور ناقابلِ اعتبار انسان سمجھتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ کے کون سے رویے کو درست سمجھوں اور خود کیا رویہ اختیار کروں۔"

میں نے محسوس کیا کہ نفیس صاحب شاید اندر ہی اندر مسکرائے تھے۔ اگر چند لمحے پہلے ان کے دو آدمیوں کی موت کا افسوس ناک واقعہ پیش نہ آچکا ہوتا تو شاید وہ ظاہری طور پر بھی مسکرا ہی دیتے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے تذبذب، بے یقینی اور الجھن میں مبتلا دیکھ کر خوش تھے۔

وہ اپنے مخصوص ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولے "ہمارا کام ڈپلومیٹک سروس سے زیادہ مشکل ہے مسٹر چوہدری! یقین نہ آئے تو کبھی فارن منسٹر حفیظ صاحب سے پوچھ لیجئے گا۔ آپ ہمارے اور ہمارے رویّوں کے بارے میں کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش نہ ہی کریں تو اچھا ہے۔ جو سوال زیادہ اہم ہیں ہمیں ان پر غور کرنا چاہیے۔"

"تجویز آپ کی معقول ہے۔" میں نے سر ہلایا "مجھے بھی یہ سوال زیادہ اہم محسوس ہورہا ہے کہ آخر گاڑی میں بم کس وقت نصب کیا گیا؟ اگنیشن کا سوئچ آن ہونے سے بم پھٹا ہے۔ اس کا مطلب ہے بم اس وقت گاڑی میں موجود نہیں تھا جب وہ مجھے ہوٹل سے لے کر روانہ ہوئی۔ اس طرح کا بم نصب کرنے میں یقیناً تھوڑا سا وقت بھی درکار ہوتا ہوگا۔ آپ کا یہ ٹھکانا جسے آپ نے غالباً بہت خُفیہ اور کافی محفوظ تصور کیا ہوا ہے، کیا اتنا ہی غیر محفوظ

ہے کہ گاڑی کی یہاں موجودگی کے دوران کوئی اس کے انجن میں بم فٹ کر کے چلا گیا اور کسی کو پتا ہی نہیں چلا؟"

نفیس صاحب نے یوں ٹھنڈی سانس لی جیسے انہوں نے کوئی خاصا بچکانہ سوال سُن لیا ہو۔ پھر وہ نفی میں سرہلاتے ہوئے بولے "یہ سوال بھی زیادہ اہم نہیں۔ جس دوران ہم اندر میٹنگ میں مصروف تھے' گاڑی دو آدمیوں کو پنڈی پہنچانے بھی گئی تھی۔ اس دوران ممکن ہے کچھ دیر کے لیے ڈرائیور گاڑی سے دور بھی رہا ہو۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے تو شہریار خان صاحب سگار کا کش لے کر بوجھل آواز میں بولے "یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ بم اسی مرتبہ گاڑی اسٹارٹ ہونے سے پہلے پہلے گاڑی میں لگایا گیا ہو۔ ہزاروں اقسام کے تو بم ایجاد ہو چکے ہیں۔ ایسا بم بھی ہے کہ آپ چاہیں تو وہ دوسری' تیسری' چوتھی یا پانچویں مرتبہ گاڑی اسٹارٹ ہونے پر پھٹے۔ ریموٹ کنٹرول بم بھی ہیں۔ ایسا پلاسٹک بم بھی ہے جو قریب سے گزرتی کسی گاڑی کے ذریعے آپ کی گاڑی پر پھینک دیا جائے تو وہ گوشت کے لوتھڑے کی طرح گاڑی کے کسی حصے پر چپک جاتا ہے۔ وہ بھی ریموٹ کنٹرول ہو سکتا ہے۔ ایسے بم بھی ہیں جو کسی مخصوص ارتعاش سے پھٹتے ہیں۔ ایسے بم بھی ہیں کہ جب تک کوئی شخص کوئی مخصوص ڈیوائس لیے ان کے قریب موجود ہے' وہ نہیں پھٹتے لیکن جب وہ اٹھ کر دور چلا جائے تو اس کی عدم موجودگی میں بم پھٹ جاتا ہے۔ یہ اور اس طرح کی دوسری بہت سی قسمیں تو ہمارے علم میں ہیں۔ ریڈ ڈاٹ والے اگر اسی قسم کے لوگ ہیں جیسے آپ بتا رہے ہیں تو پھر ان کے پاس اس سے بھی بڑھ کر کوئی بھی چیز ہو سکتی ہے۔"

نفیس صاحب سرہلاتے ہوئے بولے "میں بھی یہی کہنے والا تھا۔ گویا اہم سوال یہ نہیں ہے کہ بم کب' کہاں اور کیسے نصب کیا گیا یا وہ کس قسم کا بم تھا۔ زیادہ قابلِ غور سوال یہ ہے کہ ریڈ ڈاٹ چاہتی کیا ہے اور ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"گویا آپ نے تسلیم کر لیا کہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی وجود ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"میں نے یہ نہیں کہا۔" وہ اپنی ہٹ پر قائم تھے۔ "میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ کچھ لوگ بہرحال موجود ہیں جو کسی خاص مقصد کے تحت کچھ کارروائیاں کر رہے ہیں۔ آپ کا دل رکھنے کو میں ان کا نام ریڈ ڈاٹ فرض کر لیتا ہوں۔"

"آپ کی اس عظیم مہربانی کا بہت شکریہ۔" میں نے ایک خفیف سے احساسِ شکست کے ساتھ کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "اب آپ جن سوالات پر غور کرنا چاہیں' کرتے رہیے۔ میں تو جو کچھ آپ کو بتا سکتا تھا' بتا چکا ہوں اور قائل کرنے کی جتنی کوششیں کر سکتا تھا' کر چکا ہوں۔ بہرحال... آپ لوگوں کی طرف سے اپنی تمام تر دل شکستگی اور مایوسی کے باوجود اس ملک اور یہاں کے بے خبر باسیوں کی بہتری اور ان کے مستقبل کی خاطر یہ حاضر ہوں۔ میرے لیے جو حکم ہو وہ بتا دیجیے اور مجھے اجازت دیجیے۔"

نفیس صاحب انگلی سے ٹھوڑی مسلتے ہوئے پُرخیال سے انداز میں ایک لمحے کے لیے خاموشی سے میری طرف دیکھتے رہے پھر طویل سانس لے کر بولے "ہمیں آپ کی ضرورت تو ہے لیکن فی الحال ہم آپ کو کوئی خاص ہدایات نہیں دے سکتے کہ یوں کیجیے اور یوں مت کیجیے۔ بس آپ اپنے معمولات جاری رکھیے اور جس طرح اب تک ہمیں ہر چھوٹے بڑے واقعے کی اطلاع دیتے رہے ہیں وہ دیتے رہیے اور ہاں....."

وہ ذرا سنبھل کر بیٹھ گئے "سب سے اہم بات یہ ہے کہ اپنے دماغ سے یہ خیال نکال دیجیے کہ ریڈ ڈاٹ آپ کو ہلاک کرنا نہیں چاہتی۔ اپنی جان کی حفاظت اسی طرح کیجیے گویا ریڈ ڈاٹ آپ کی جان لینے کے در پے ہے۔ اس ضمن میں میں آپ کی ہر ممکن مدد کر سکتا ہوں۔ آپ چاہیں تو آپ کو دس بارہ بہترین قسم کے کمانڈوز کی خدمات فراہم کی جا سکتی ہیں۔"

میں دھیرے سے ہنس دیا۔ نفیس صاحب نے قدرے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ وہ واقعی عجیب آدمی تھے۔ میرے لیے کسی معمّے سے کم نہیں تھے۔ ایک طرف انہیں ریڈ ڈاٹ کے وجود پر یقین نہیں تھا' میرا ماضی ان کی نظر میں مشکوک تھا' میری باتوں کا انہیں کوئی خاص اعتبار نہیں تھا۔ دوسری طرف وہ مجھے اپنا خیال رکھنے اور اپنی جان کی حفاظت کی تلقین کرتے تھے۔

میں نے ملائمت سے کہا "چند منٹ پہلے کار کے دھماکے میں ڈرائیور اور مجھے ساتھ لانے والے دو افراد ہلاک ہوئے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ بھی کمانڈو ہی تھے۔"

نفیس صاحب نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا۔ تاہم تسلیم کر لیا "آپ کا اندازہ درست ہے۔"

"جب تین کمانڈوز میں سے دو' پلک جھپکتے میں مر سکتے ہیں اور ایک شدید زخمی ہو سکتا ہے تو دس بارہ کا انجام بھی یہی ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اگر سب لوگ اسی انداز میں سوچنے لگیں تو تمام اہم شخصیات اپنی حفاظت کے انتظامات کرنا چھوڑ دیں۔" نفیس صاحب بولے۔

"ایک بار پہلے بھی ایک جگہ یہی بات ہوئی تھی۔ اس وقت بھی میں نے یہی جواب دیا تھا کہ دُنیا میں بہت سی مشہور شخصیات کی انہی لوگوں کے ہاتھوں قتل ہونے کی مثالیں موجود ہیں جنہیں انہوں نے اپنی حفاظت کے لیے مامور کیا تھا۔ خود ہمارے فارن منسٹر حفیظ صاحب اپنے سیکیورٹی چیف اکرام بیگ کے ہاتھوں قتل ہوتے ہوتے لگے تھے۔ بال بال بچ گئے۔ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ اوپر والا کس رُوپ میں فرشتۂ اجل کو ہمارے پاس بھیج دے۔ ویسے بھی میں اس

بحث میں تو پڑنا ہی نہیں چاہتا کہ مشہور یا اہم شخصیات اپنی جان کی حفاظت کے لیے کیا انتظامات کرتی ہیں۔ میں تو صرف اپنی بات کر رہا ہوں اور میں ایک نہایت غیر مشہور اور غیر اہم شخص ہوں۔"

نفیس صاحب بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "آپ جیسے لوگوں میں ایک عجیب بات میں نے دیکھی ہے۔ جب وہ بہت ترقی کر جاتے ہیں تو عموماً ان میں ایک عجیب بے نیازی' انکساری' کچھ صوفیانہ پن اور کچھ درویشی سی آجاتی ہے۔ بعض اوقات تو وہ مذہبی باتیں بھی کرنے لگتے ہیں۔ داڑھی رکھ لیتے ہیں۔ حج کر آتے ہیں۔"

"یہ سب کچھ تو ہر مسلمان کو کرنا ہی چاہیے۔ یہ تو ہماری بدنصیبی اور بے راہ روی ہے کہ ہم ایسا نہیں کرتے لیکن یہ "آپ جیسے لوگوں" سے آپ کی کیا مراد ہے؟ کیا آپ کے خیال میں' میں انسانوں کے کسی خاص اور الگ ہی طبقے سے تعلق رکھتا ہوں؟" میں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ میرے ماضی کے ایک مختصر مگر ناوانیوں بھرے دور کی وجہ سے مجھے اسمگلروں کے طبقے سے نتھی کر رہے تھے جو مجھے بہت بڑی زیادتی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اس لائن کو بہت جلد ترک کیا تھا اور اس کے لیے بہت سی قربانیاں بھی دی تھیں۔ بہت سی شخصیتوں کی ناراضگی بھی مول لی تھی۔

جب مَیں اس لائن میں تھا تب بھی میرا کردار گھناؤنا ہرگز نہیں رہا تھا۔ میں نے کبھی بے گناہوں کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے تھے۔ منشیات کی تجارت کے میں کبھی قریب بھی نہیں پھٹکا تھا حالانکہ سب سے زیادہ دولت اسی میں تھی۔ بلکہ منشیات کے تاجروں سے تو مجھے نفرت رہی تھی۔ میں نے کبھی اُن کی کسی قسم کی مدد یا اعانت بھی نہیں کی تھی۔ حاجی عالم شیر سے میرے اختلاف اور ٹکراؤ کی وجہ بھی یہی بنی تھی جس میں وہ اتنا آگے چلا گیا تھا کہ اپنی جان بچانے کے لیے مجھے اس کو ختم ہی کرنا پڑا تھا۔ وہ حاجی تھا' پنج وقتہ نمازی تھا اور اس کے باوجود ڈرگ مافیا کا آدمی تھا۔

اس لیے اگر کبھی کبھی میں یہ سوچتا تھا کہ مجھ جیسے گناہ گار ان جیسے "پرہیزگاروں" سے بہتر تھے تو میرے خیال میں یہ کچھ ایسی معیوب یا نامناسب بات نہیں تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان باتوں کو سطحی یا پھر محض افسرانہ نظر سے دیکھنے والے لوگ' نفیس صاحب کی طرح مجھے اور عالم شیر جیسے لوگوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دیتے تھے۔ میں نے صحیح اور جائز بزنس کی دُنیا میں ایک طویل عرصے تک جس محنت اور جانفشانی سے کام کیا تھا اور جس طرح اوپر والے کی مہربانی سے ناممکنات کو ممکن کر دکھایا تھا' اسے جب کوئی بالکل نظرانداز کر دیتا تھا تو مجھے بڑی تکلیف ہوتی تھی۔

میں چاہتا تو اسمگلنگ ہی کی لائن میں رہ کر شاید اس سے زیادہ دولت کما لیتا جتنی میرے پاس اب تھی۔ اس سے زیادہ طاقتور ہو جاتا جتنا اب تھا۔ وہ ادارے اور وہ محکمے جن کے ذمے مجھ جیسے

لوگوں کا قلع قمع کرنا ہوتا ہے' وہ شاید مجھ سے لرزہ براندام رہا کرتے۔ لیکن میں نے کسی دباؤ' کسی خوف کے بغیر خود بخود وہ لائن چھوڑ دی تھی۔ میں نے اسے اپنی ناسمجھی اور نادانی کا ایک دور سمجھ کر ہمیشہ بھلانے کی کوشش کی تھی۔ جونہی اپنی دانست میں مجھے عقل آئی تھی' میرے اندر کا منظر تبدیل ہو گیا تھا۔ کم عمری اور نوجوانی میں حالات مجھے اپنے بہاؤ کے ساتھ بہاتے لے گئے تھے لیکن بعد میں' مَیں نے اپنی راہیں خود متعین کرنے کی کوششیں کی تھیں۔ اس دوران مجھے بے شمار بڑی بڑی پیشکشیں ہوئی تھیں لیکن میں نے ان کی پروا نہیں کی تھی۔ مگر اس کا صلہ فی الحال تو مجھے یہی مل رہا تھا کہ نفیس صاحب جیسے آدمی کی نظر میں' مَیں مشکوک اور ناقابلِ اعتبار قرار پا رہا تھا۔

تاہم میں نے تیکھے انداز میں سوال کیا تو نفیس صاحب جواب دینے سے کترا گئے اور موضوع بدلتے ہوئے سرسری سے لہجے میں بولے "خیر چھوڑیے ان باتوں کو۔ یہ وقت بحث و مباحثے کا نہیں ہے۔ یہ بتائیے اگر آپ اب ریڈ ڈاٹ والوں کے سامنے ہاتھ پاؤں جوڑ لیں' ان سے معافی مانگ لیں اور انہیں بتائیں کہ ان کی چند ابتدائی کارروائیوں سے ہی آپ کی عقل ٹھکانے آگئی ہے اور آپ اب ان کی پیشکش قبول کر کے ان کی ہدایات کے عین مطابق چلنا چاہتے ہیں تو کیا وہ آپ کی بات نہیں مانیں گے؟"

"انہیں جتنی مہلت دینا تھی وہ انہوں نے مجھے پہلے ہی دے دی تھی۔ خوب اچھی طرح سوچنے سمجھنے کے لیے۔" میں نے جواب دیا "یہ بات وہ اپنے پیغام میں بھی واضح کر چکے ہیں کہ ایک بار انکار کرنے والوں کے لیے ان کے ہاں معافی کی کوئی گنجائش نہیں۔ ویسے بھی اگر انہیں یہ تک معلوم ہے کہ میری آپ کے ساتھ خفیہ میٹنگز چل رہی ہیں تو وہ میری اس پیشکش پر کیسے اعتماد کر سکتے ہیں؟"

"پھر بھی... بات کر کے دیکھنے میں کیا حرج ہے؟" ان کے لہجے میں ہلکا سا اصرار تھا۔

"اگر آپ کا خیال ہے کہ میں ان کی تنظیم میں گھس کر خفیہ طور پر آپ کے ایجنٹ کا کردار ادا کر سکوں گا تو یہ بچگانہ امید ذہن سے نکال دیجیے۔" میں نے کہا۔ اپنی تجویز کے لیے بچگانہ کا لفظ سن کر نفیس صاحب کے چہرے کی سُرخی میں ہلکا سا اضافہ ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے ان کی رنگت اعتدال پر آگئی۔ وہ اپنی کیفیات اور محسوسات پر قابو رکھنے میں یقیناً کافی ماہر تھے۔ کچھ دیر پہلے ہونے والے بم کے دھماکے اور اپنے دو آدمیوں کی ہلاکت نے بھی ان کے سکون میں کوئی خلل نہیں ڈالا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "معلوم نہیں آپ نے دلی طور پر اب بھی ریڈ ڈاٹ کے وجود کو تسلیم کیا ہے یا نہیں۔ اگر کر لیا ہے تب بھی شاید ان سب باتوں پر یقین نہیں کیا جو میں نے آپ کو ان کے بارے میں بتائی تھیں۔ فرض کر لیں میں آپ کی ہدایات پر عمل کر کے

کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مجھے قبول بھی کرلیں اور میں بظاہر ان کا آلۂ کار بن کر آپ کے ایجنٹ کا رول ادا بھی کرنا چاہوں تب بھی شاید نہ کرسکوں۔ انہیں ڈبل کراس کرنا مجھے تقریباً ناممکن نظر آتا ہے۔ وہ ہر پہلو کا خیال رکھتے ہیں۔ کوئی کچا کام نہیں کرتے۔ وہ تو نہ جانے کون کون سی ٹیکنالوجی استعمال کرتے ہوئے انسان کی شکل اور اس کا ذہن تک بدل دیتے ہیں۔"

نفیس صاحب خاموشی سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے معلوم تھا وہ میری ساری کہانی تو انہماک سے سُن چکے تھے لیکن دل ہی دل میں اس پر کچھ زیادہ اعتبار نہیں رکھتے تھے۔ تاہم میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے انہیں یاد دلانے کی کوشش کی "میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میری ایک دوست اور ہمدرد ہنی کو وہ پرنسس تہمینہ کے رُوپ میں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کررہے تھے۔ کسی چھوٹے موٹے سرجیکل عمل اور برین واش کے ذریعے انہوں نے اس کا ذہن بھی تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی اور اپنی دانست میں کامیاب بھی ہوگئے تھے۔ وہ تو محض ایک اتفاق تھا کہ شاید اس کے ذہن کے کچھ خلیات تباہ ہونے سے بچ گئے اور اس کی یادداشت لوٹ آئی۔ اس نے مجھے پہچان لیا اور خفیہ طور پر میرا ساتھ دینے کی کوشش کی لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر نہ چل سکا۔"

نفیس صاحب سرہلاتے ہوئے بولے "ہاں مجھے یاد ہے۔ آپ نے بتایا تھا وہ لڑکی اب انہی کے قبضے میں ہے۔ انہیں معلوم ہوگیا تھا کہ اس کا ذہن مکمل طور پر تبدیل نہیں ہوسکا تھا اور وہ آپ کا ساتھ دے رہی تھی۔"

"جی ہاں" میں نے تاسّف سے کہا "معلوم نہیں بے چاری زندہ بھی ہے یا نہیں۔ شروع میں ریڈ ڈاٹ والوں نے یہی کہا تھا کہ انہوں نے اسے کوئی سزا نہیں دی لیکن اس کے بعد سے مجھے صحیح طور پر اس کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔"

نفیس صاحب کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق اُبھری "آپ تو ریڈ ڈاٹ کے کہے پر بڑا یقین رکھتے ہیں۔ اس پر بھی یقین کرلیا ہوتا۔"

"ہاں۔ اس میں شک نہیں کہ ریڈ ڈاٹ والے کھرے دُشمن ہیں۔ وہ بہت سے منافق دوستوں سے بہتر ہیں۔ کم از کم میرے ساتھ انہیں جو کچھ کرنا ہوتا ہے ڈنکے کی چوٹ کرتے ہیں۔ لیکن میں یہ بہرحال نہیں کہتا کہ وہ فرشتے ہیں۔"

نفیس صاحب ہنکارا بھر کر رہ گئے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "دوسری مثال میں آپ کو بلیک برڈ کی یاد دلانا چاہوں گا۔ اس کے دماغ کی بھی سرجری کی گئی تھی اور اسے کچھ مخصوص تربیت بھی دی گئی تھی۔ ذہنی طور پر وہ پورا انسان تھا' صرف انسانی زبان بول نہیں سکتا تھا۔"

"آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ آپ کی ان کی طرف رجوع کرنے کی کوشش کا کوئی فائدہ نہیں؟" نفیس صاحب گہری سانس لے کر بولے۔

"جی ہاں میرا مقصد یہی ہے۔" میں نے تائید کی۔

"تو پھر ہمارے سامنے سرِدست کوئی راستہ نہیں۔ فی الحال ہمیں انتظار ہی کرنا پڑے گا کہ حالات کیا رُخ اختیار کرتے ہیں۔" نفیس صاحب بولے۔

"عجیب بات ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میں ایک عام سا شہری ہوں۔ میں بھی انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔ آپ ملک کی اتنی اہم شخصیت ہیں' اتنے بڑے ادارے کے سربراہ ہیں۔ آپ بھی انتظار کے علاوہ کچھ نہیں کرسکتے۔"

نفیس صاحب قدرے سرد لہجے میں بولے "مطمئن رہیں' ہمارا انتظار ذرا مختلف قسم کا ہے۔ اس دوران بہت کچھ ہورہا ہے۔ امید ہے جلد ہی کوئی نہ کوئی نتیجہ ضرور برآمد ہوگا۔ مشینری اپنا کام کررہی ہے۔"

"آج جو دھماکا عین آپ کی ناک تلے ہوا ہے اس کے سلسلے میں کچھ ہوگا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"یقیناً ہوگا" وہ اعتماد سے بولے "اس کے بارے میں تحقیقات شروع ہوچکی ہے۔"

"آپ نے کہا تھا کہ ملک بھر میں غیر ملکیوں پر کڑی نظر رکھی جائے گی۔ اس سلسلے میں کچھ ہوا یا کوئی بات سامنے آئی؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں غیر ملکیوں پر نظر رکھی جارہی ہے۔ اس پر ہماری بہت زیادہ توانائی' وسائل اور افرادی قوت صرف ہورہی ہے لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہورہا۔" وہ ایک دوسری فائل اٹھا کر اس کے ورق اُلٹتے ہوئے بولے "جو غیر ملکی ہمارے ہاں غیر قانونی طور پر گھسے ہوئے ہیں ان میں سے بعض صرف عمومی قسم کے جرائم میں ملوث ہیں۔ مثلاً اسمگلنگ' چوری چکاری' لڑائی جھگڑا وغیرہ۔ ان میں سے بعض اپنے اپنے ملکوں کے مفرور مجرم بھی ہیں۔ ان میں سے بعض اگر کچھ سازشوں میں ملوث بھی ہیں تو وہ اسی قسم کی ہیں جن سے بدامنی اور سیاسی عدم استحکام پیدا کرنے کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے ہم اپنی سی کوششیں کرتے رہتے ہیں لیکن ان لوگوں کا تعلق ریڈ ڈاٹ جیسی عجیب و غریب اور طویل المعیاد منصوبے رکھنے والی تنظیم سے نظر نہیں آتا۔ ان میں زیادہ تر عام سے پیشہ ور دہشت گرد اور تخریب کار ہوتے ہیں جو کبھی ایک ملک کے لیے کام کرنے لگتے ہیں' کبھی دوسرے ملک کے لیے۔ یہ لوگ کبھی کبھی عام اور جذباتی قسم کے سیاسی ورکرز کو بھی اپنا آلۂ کار بنالیتے ہیں اور ان کی کم علمی یا ذہنی ناپختگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں بھڑکاتے رہتے ہیں۔ یہ سلسلہ ایک عرصے سے چل رہا ہے مگر اب کچھ بڑھ گیا ہے۔ اچھا خاصا سمجھدار طبقہ بھی ان سازشوں سے متاثر ہونے لگا ہے۔ اس مقصد کے لیے غیر ملکی دولت بھی بہت استعمال ہورہی ہے۔ ہم اس کی روک تھام کی اپنی

ی کوششیں کررہے ہیں لیکن یہ بہت اُلجھا ہوا معاملہ ہے کیونکہ یہ یاست کے وجود میں کینسر کی طرح داخل ہوگیا ہے۔ اور جہاں معاملہ سیاست کا آجائے وہاں مسائل بہت نازک اور ہفت پہلو ہوجاتے ہیں۔"

پہلی بار نفیس صاحب ذرا کُھل کر حالات پر روشنی ڈال رہے تھے' تاہم اب بھی وہ بہت محتاط ہی تھے۔ میں ہمہ تن گوش تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے "دوسرا طبقہ ان غیر ملکیوں کا ہے جو جائز اور قانونی طور پر آئے ہوئے ہیں۔ ان کا کہیں نہ کہیں اندراج موجود ہے۔ ان میں مشنری ادارے ہیں' طلبا ہیں' سفارتی ادارے ہیں اور مختلف ملازمتوں کے سلسلے میں آئے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں بھی بہت سے دُشمنوں کے ایجنٹ ہیں جو کسی نہ کسی آڑ میں ہمارے خلاف کام کررہے ہیں لیکن ابھی تک ریڈ ڈاٹ قسم کی تنظیم سے کسی کا تعلق ثابت نہیں ہوسکا۔"

"کیا ہماری ایجنسیوں کے اتنے وسائل ہیں کہ تمام قانونی اور غیر قانونی غیر ملکیوں پر صحیح معنوں میں نظر رکھی جاسکے اور ان سب کی وابستگیوں کا کھوج لگایا جاسکے؟ ان کی تمام سرگرمیوں سے باخبر رہا جاسکے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہر ایک پر نظر رکھنا تو ممکن نہیں۔" نفیس صاحب نے تسلیم کیا "لیکن نگرانی وغیرہ کا ایک عمومی طریقۂ کار ہوتا ہے۔ اس میں اگر کبھی کوئی ایک تخریب کار' دہشت گرد یا غیر ملکی ایجنٹ پکڑا جاتا ہے تو گویا سِرا ہاتھ آجاتا ہے پھر اس کے ذریعے مزید بہت سی گرفتاریاں ممکن ہوجاتی ہیں۔ اس کی زبانی بہت سے انکشافات ہوجاتے ہیں۔ یوں تفتیش کا دائرہ وسیع ہوتا جاتا ہے۔"

پھر وہ فائلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "ہمارے ہاں رپورٹوں کا ایک انبار جمع ہے۔ یہ صرف ان کے خلاصے ہیں لیکن ابھی تک ریڈ ڈاٹ جیسی کسی تنظیم کی طرف کوئی اشارہ بھی سامنے نہیں آیا۔ میں نے آپ سے پچھلی ملاقات کے دوران ہی صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہہ دیا تھا کہ آپ کی کہانی مجھے محض تُخّن معلوم ہوتی ہے' افسانہ طرازی دکھائی دیتی ہے۔ میرے ساتھ یہاں دیگر خفیہ ایجنسیوں کے جو سربراہان تشریف رکھتے ہیں ان کی رائے بھی کم و بیش یہی تھی۔ اس کے باوجود ہم نے آپ کو بتائے بغیر احتیاطاً تمام ایجنسیوں کو الرٹ کردیا۔ ایک نیٹ ورک تیار کیا اور ایک خصوصی کمیٹی بنائی جس کا سربراہ عارضی طور پر میں ہوں اور اسی حیثیت کی وجہ سے زیادہ تر میں اکیلا ہی آپ سے سارے مذاکرات کرتا ہوں۔ ہم لوگ نہایت طوفانی انداز میں حرکت میں آئے لیکن افسوس کہ کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔"

"ہمارے ہاں تخریب کاری اور دہشت گردی وغیرہ معمول بن گئی ہے جس کے پیچھے آپ کے خیال میں دُشمن ملکوں کے ایجنٹ ہوتے ہیں جو بعض اوقات ہمارے مقامی لوگوں کو بھی آلۂ کار بنالیتے ہیں۔ عین ممکن ہے ان سب کے پیچھے درحقیقت ریڈ ڈاٹ ہو لیکن وہ اس بات سے بے خبر ہوں۔" میں نے خیال ظاہر کیا "کیونکہ ریڈ ڈاٹ' جہاں جیسے عناصر کو مناسب سمجھے استعمال کرتی ہے' جہاں جیسا طریقہ اسے موزوں نظر آئے وہ اختیار کرلیتی ہے اور اس کا اپنا نام کبھی سامنے نہیں آتا۔ استعمال ہونے والوں کو خود بھی صحیح طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کس کے لیے استعمال ہورہے ہیں۔ اس کے لیے شاید بہت پُرپیچ طریقے اختیار کیے جاتے ہوں۔"

نفیس صاحب توجہ سے میری بات سُن رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اب یہی دیکھ لیں کہ مجھ پر چند حملوں میں جو لوگ مارے گئے ہیں' وہ خطرناک بدمعاش' مفرور مجرم' قاتل یا دہشت گرد وغیرہ تھے اور مقامی ہی تھے۔ ان سے تفتیش کا موقع نہیں مل سکا کیونکہ وہ مارے گئے لیکن انہیں شاید خود بھی معلوم نہ رہا ہو کہ وہ درحقیقت کس کے لیے کام کررہے تھے۔ ان کے سامنے کوئی اور آیا ہو' اس کے پیچھے کوئی اور ہو' اس طرح سلسلہ در سلسلہ آخر میں کہیں ریڈ ڈاٹ کا ہاتھ ہو۔ یعنی اصل جڑ ریڈ ڈاٹ ہی ہو لیکن آپ کے ہاتھ صرف شاخیں ہی آتی رہی ہوں اور آپ انہیں ہی جڑ سمجھتے رہے ہوں۔"

وہ خاموش رہے تو میں نے ایک اور مثال دیتے ہوئے کہا' "ہمارے فارن منسٹر حفیظ صاحب کا سیکیورٹی چیف اکرام بیگ کتنا گھاگ آدمی تھا۔ اس کی پوزیشن کتنی اہم تھی۔ نہ جانے کتنی چھلنیوں سے گزر کر وہ اس پوزیشن تک پہنچا تھا۔ اس کے باوجود وہ بِک گیا تھا۔ حفیظ صاحب کے قتل کی سازش میں ملوث تھا۔ اب اس جیسا شخص آسانی سے تو نہیں بِکا ہوگا۔ اس نے اچھی طرح تحقیق کی ہوگی کہ وہ کس کے لئے کام کررہا ہے' کس کے مقاصد پورے کررہا ہے۔ مگر اپنی تمام تر چالاکی اور شاطرانہ پن کے باوجود وہ غلط فہمی کا شکار تھا۔ اسے بھی نہیں معلوم تھا کہ وہ ریڈ ڈاٹ کے ہاتھوں کھلونا بنا ہے۔ اس طرح ہمارے ہاں مختلف محکموں میں نہ جانے کس کس اہم پوزیشن پر ریڈ ڈاٹ نے اپنے مُہرے بٹھادیے ہیں لیکن انہیں شاید معلوم نہ ہو کہ انہیں خریدنے والی اصل قوت کون ہے۔ ہر ایک کی نفسیات یا کمزوریوں کے حساب سے اس کے ساتھ نہ جانے کیا کھیل کھیلا گیا ہو لیکن حقیقت اس کی نظر سے اوجھل ہی رہی ہو۔ اس کے علاوہ نچلی سطح پر تو ہمارے ہاں بہت ہی سستے داموں بِک جانے والے لوگ بھی مل جاتے ہیں جو دولت کے لیے آنکھیں بند کرکے ہر کام کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ انہیں تو اس بات سے بھی غرض نہیں ہوتی کہ وہ کس کے لیے استعمال ہورہے ہیں۔ کس دُشمن کے مقاصد پورے کررہے ہیں۔"

"درست ہے" نفیس صاحب اثبات میں سرہلاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولے "بعض اوقات ایسے لوگ بھی ہمارے ہاتھ لگے ہیں جنھوں نے صرف دس ہزار یا بیس ہزار روپے کے عوض کسی پُرہجوم مقام پر بم رکھ دیا...... اور وہ ہمارے ہی پاکستانی بھائی

ان میں سے بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی دانست میں بڑے نیک مقاصد کے لیے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ ہمارے سیاسی پارٹیوں تک میں داخل ہو چکے ہیں۔ ہم کہاں کہاں تلبیر کریں؟ جہاں ہاتھ لگاتے ہیں وہیں چیخ وپکار ہونے لگتی ہے۔"

"بہرحال... اگر آپ میری تھیوری کو درست تسلیم کر رہے ہیں تو پھر آپ کو یہ بھی تسلیم کر لینا چاہیے کہ کہیں نہ کہیں ریڈ ڈاٹ کا وجود ہے اور وہ بہت ہی دُور رَس مقاصد کے لیے کام کر رہی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"مجھے اس کو تسلیم کرنے میں عار نہیں۔" نفیس صاحب بولے "دُنیا میں ہر چیز کا امکان موجود رہتا ہے اور میری گناہ گار آنکھوں نے تو اس دُنیا میں ایسے ایسے ہولناک اور ناقابلِ یقین تماشے دیکھے ہیں کہ اب ہر بات پر ہی یقین کر لینے کو دل چاہتا ہے۔"

ایک لمحے کے توقف سے وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولے "لیکن ہم دل کے کہنے پر نہیں چلتے۔ ہم پریکٹیکل لوگ ہیں۔ جب تک کوئی شہادت، کوئی نشانی سامنے نہ آجائے، آنکھیں بند کر کے کسی راستے پر نہیں چلتے۔"

میں نے تھکے تھکے انداز میں کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے گہری سانس لے کر کہا "تبھی ہمارے ہاں انسانوں کو ظلم و بربریت کے چُنگل سے چھڑانے میں اتنی تاخیر ہو جاتی ہے۔ پہلے تو کوئی موقعے پر پہنچنے والا نہیں ہوتا۔ خدا خدا کر کے کوئی واویلا بعد از مرگ کرنے کے لیے آتا ہے تو انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اس کے اپنے تقاضے اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ انصاف بے چارہ راستے میں ہی کہیں گم ہو جاتا ہے۔ یہ ہونا چاہیے... وہ ہونا چاہیے... یہ نشانی، وہ شہادت، یہ گواہ، وہ ثبوت، سب کچھ جمع کیجیے۔ اس کے بعد انتظار کیجیے کہ ہمارے نظام کی بھول بھلیّوں میں سے کچھ برآمد ہوتا ہے یا نہیں۔ منیر نیازی نے وہ نظم شاید آپ ہی جیسے لوگوں کے لیے کہی ہے "ہمیشہ دیر کر دیتا ہوں میں" اس کے علاوہ آپ سے بات چیت کرنے کے بعد مجھے وہ ضرب المثل بھی شدت سے یاد آتی ہے... وہی "مرغ کی ایک ٹانگ" والی۔"

نفیس صاحب کے چہرے پر ناگواری کی شکنیں نہیں اُبھریں۔ وہ ملائمت سے بولے "کسی وجہ سے ہم نے آپ کو سب کچھ بولنے کی آزادی دے رکھی ہے مسٹر چوہدری! کوئی وقت آئے گا کہ آپ ہماری اور ہمارے طریقۂ کار کی افادیت کے قائل ہو جائیں گے۔"

"میری دُعا ہے کہ وہ وقت جلد از جلد آجائے۔" میں نے جلدی سے کہا "مجھے اندیشہ ہے کہ اس وقت کے انتظار میں کہیں میں دُنیا سے ہی نہ گزر جاؤں۔ مجھے اب اجازت دیجیے۔ میرا خیال ہے اب کوئی ایسی بات نہیں رہی جس پر تبادلۂ خیال کرنا ضروری ہے بلکہ جن باتوں پر تبادلۂ خیال ہوا ہے، میری نظر میں تو وہ بھی کچھ ایسی ضروری نہیں تھیں۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کبھی مجھے ایسے سنگین مسائل پر ایسی بے نتیجہ میٹنگز میں بھی شرکت کرنا پڑے گی۔"

"یہ صرف آپ کا خیال ہے۔" نفیس صاحب گہری سنجیدگی سے بولے "آپ کو اندازہ نہیں کہ ہماری نظر میں یہ میٹنگز کتنی اہم اور کتنی نتیجہ خیز ہیں۔ یہ صرف ہمیں ہی معلوم ہے کہ ان میٹنگز سے ہم کیا کچھ حاصل کر رہے ہیں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایک طرف ریڈ ڈاٹ ایک معمّا ہے۔ دوسری طرف آپ بھی کسی معمّے سے کم نہیں۔ سنگین معاملات کی طرف آپ کوئی خاص توجہ دیتے دکھائی نہیں دیتے۔ بے نتیجہ اور خشک قسم کی میٹنگز آپ کو بہت اہم اور مفید معلوم ہوتی ہیں۔"

"اہم میٹنگز کے نتائج بعض اوقات فوری طور پر نظر نہیں آتے اور خشک تو وہ ہوتی ہی ہیں۔ ظاہر ہے اب ایسی میٹنگز میں کسی گلوکارہ کو بُلوا کر اس کا گانا تو نہیں سنا جا سکتا اور نہ ہی درمیان میں وقفہ کر کے کسی ڈسکو ڈانسر کا ڈانس دیکھا جا سکتا ہے۔" وہ میٹنگ سے بھی زیادہ خشک لہجے میں بولے۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ ان خشک میٹنگز میں کسی گلوکارہ کے نغمے یا ڈسکو ڈانسر کے ڈانس سے رنگینی پیدا کی جائے، میں تو صرف یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ہماری دونوں میٹنگز میں کوئی سنسنی خیز فیصلہ نہیں ہو سکا جس سے رگ وپے میں کوئی ہیجان پیدا ہوتا۔ امید کی کوئی کرن نظر آتی، کوئی انقلاب جنم لیتا دکھائی دیتا۔" میں نے کہا۔

نفیس صاحب کے ہونٹوں پر مربیانہ سی مسکراہٹ کی جھلک نظر آئی۔ وہ بہت ناپ تول کر مسکراتے تھے۔ قدرے مشفقانہ انداز میں بولے "یہ فلمی قسم کے بدمعاشوں یا فلمی سی آئی ڈی والوں کی میٹنگ نہیں تھی چوہدری صاحب! یہ ملک کے چند نہایت اہم اور نہایت سنجیدہ لوگوں کی میٹنگ تھی۔ باقی رہی سنسنی، ہیجان خیزی اور انقلاب وغیرہ... تو مجھے یقین ہے یہ چیزیں آپ کی زندگی میں "وافر مقدار" میں آتی رہی ہیں اور امید ہے آئندہ بھی آتی رہیں گی۔ کچھ دیر ہم جیسے خشک لوگوں کے ساتھ بھی گزار لیا کریں اور زیادہ مایوس نہ ہوا کریں۔ آگے چل کر شاید آپ کو بہت فائدہ ہو۔" وہ مجھے رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "آگے چل کر تو جو فائدہ یا نقصان ہو گا وہ بعد کی بات ہے۔ میں تو اس کے بارے میں سوچ رہا ہوں جو فی الحال میرے ساتھ ہو رہا ہے۔"

وہ میرے قریب آچکے تھے۔ میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولے "ڈونٹ وری مسٹر چوہدری، سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

میں نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کا چہرہ تقریباً سپاٹ ہی تھا اور ان کی آنکھوں میں خلوص یا اپنائیت کا کوئی سیلاب نہیں آیا ہوا تھا۔ اس کے باوجود میں حیران تھا۔ ان سے میری شناسائی کو

جتنے بھی دن گزر چکے تھے، ان کے دوران نفیس صاحب کی طرف سے محبت اور قربت کا یہ پہلا مظاہرہ تھا۔ چاہے کتنا ہی معمولی تھا لیکن ان جیسے آدمی کی طرف سے یہ بھی غنیمت تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پتھر میں جونک لگ رہی تھی۔

باہر آکر ہم ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح برآمدے میں رُکے۔ ہمارے سامنے گویا وہی پہلے جیسا منظر تھا۔ اب ایک دوسری گاڑی مجھے لینے کے لیے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ مرسیڈیز نہیں تھی لیکن اس کی کھڑکیوں پر بھی پردے پڑے ہوئے تھے۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر موجود تھا۔ ابھی دھماکے کے نشانات کئی جگہ ثبت تھے۔ ڈرائیور نے اگنیشن میں چابی گھمائی تو لاشعوری طور پر ایک لمحے کے لیے میرے اعصاب تن کر رہ گئے اور جبڑے سختی سے بھنچ گئے۔ لیکن ظاہر ہے تاریخ اتنی جلدی اپنے آپ کو نہیں دُہراتی بلکہ اتنی جلدی کوئی واقعہ تاریخ بنتا ہی نہیں۔ اس لیے خیریت ہی رہی۔ کوئی دوسرا دھماکا نہیں ہوا بلکہ گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔

میں نفیس صاحب اور ان کے ساتھ باہر آنے والے دیگر دو افراد سے ہاتھ ملا کر گاڑی کی طرف بڑھا تو سیڑھیوں کے قریب کھڑے ہوئے مضبوط جسم کے دو سانولے سے جوان میرے ساتھ ہولیے۔ وہ گاڑی میں خاموشی سے دائیں بائیں میرے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان کا انداز مشینی سا تھا۔ انہوں نے نظر اٹھا کر میری صورت تک دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ گاڑی روانہ ہوگئی۔ اس میں بھی درمیان میں پردہ موجود تھا۔ گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں ڈرائیور کو نہیں دیکھ سکتا تھا اور نہ ہی یہ جان سکتا تھا کہ گاڑی کن راستوں سے گزر رہی تھی۔

چند منٹ کے سفر کے بعد میرے دائیں طرف بیٹھے ہوئے نوجوان نے اچانک گھوم کر پچھلے پردے میں ذرا سی جھری بنا کر آنکھ لگا کر باہر دیکھا۔ پھر سیٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر سیاہ رنگ کی ایک سب مشین گن نکال لی۔ میرے بائیں طرف بیٹھا ہوا نوجوان بھی یکدم چیتے کی طرح چوکنا ہوگیا۔ میں کچھ بھی نہیں دیکھ سکا تھا تاہم ان کے انداز نے مجھے بھی مُستعد کردیا۔

"کیا ہمارا تعاقب ہورہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

انہوں نے یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھا گویا فیصلہ کررہے ہوں کہ کون جواب دے۔ پھر دائیں طرف والا مُبہم سے لہجے میں بولا "کچھ کہہ نہیں سکتے۔"

پھر اس نے بہ آوازِ بلند ڈرائیور کو حکم دیا "گاڑی ایک طرف روک دو۔"

چند سیکنڈ کے بعد گاڑی رُک گئی۔ وہ سب مشین گن ہاتھوں میں لیے پردے سے آنکھ لگائے بیٹھا تھا۔ چند لمحے بعد میں نے کسی گاڑی کے قریب سے گزرنے کی مدھم سی آواز سُنی۔ اس دوران دوسرے نوجوان کے ہاتھوں میں بھی سب مشین گن آچکی تھی۔ کچھ دیر ہم تینوں ہی گویا سانس تک روکے بیٹھے رہے۔

آخرکار دائیں طرف والے نے گہری سانس لے کر پردے سے آنکھ ہٹالی اور ڈرائیور کو حکم دیا "ٹھیک ہے گاڑی چلاؤ۔"

میں نے اس دوران کسی پردے سے جھانکنے یا اپنی جگہ سے حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو نہایت مُبہم سا اشارہ کیا۔ دونوں نے گنیں واپس سیٹ کے نیچے رکھ دیں۔ دائیں طرف والے نوجوان کی پیشانی پر شکنیں تھیں جیسے وہ کسی اُلجھن میں ہو۔ دو ایک مرتبہ اس نے پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کا ڈسپلن اسے خاموش رہنے پر مجبور کررہا تھا۔

لیکن آخرکار وہ بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں اس نے کہا "کچھ عجیب سا ہی آدمی تھا وہ.... دور سے تو تقریباً بندر ہی معلوم ہورہا تھا۔ درمیانے قد کاٹھ کے انسان جتنا بندر۔"

"کون؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"وہی جس پر مجھے شبہ ہوا تھا کہ وہ ہمارا تعاقب کررہا ہے۔"

میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ میں نے اسے اے نن کی خاص خاص نشانیاں بتاتے ہوئے پوچھا "کیا وہ اس طرح کا آدمی تھا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور میں گہری متاسفانہ سی سانس لے کر رہ گیا۔

"وہ ہمارا ہی تعاقب کررہا ہوگا۔" میں نے کہا "ڈرائیور سے کہو اس کا پیچھا کرے۔"

"وہ گاڑی تو غائب ہوچکی ہے جناب!" ڈرائیور کی طرف سے جواب آیا۔

میں نے شکست خوردہ سے انداز میں سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگالیا۔ اے نن اسلام آباد پہنچا ہوا تھا۔ کوئی جگہ ان سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ کوئی سرگرمی ان سے مخفی نہیں تھی۔ گویا کسی بھی بات کو خُفیہ رکھنے کی کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

"کون تھا وہ؟" دائیں طرف والے نوجوان نے تشویش زدہ ہوئے بغیر پوچھا۔

"اب پوچھنے کا کیا فائدہ؟" میں نے ہلکی سی تلخی سے کہا "کاش آپ لوگوں کو گاڑی میں یہ بھاری بھاری پردے لٹکانے کا شوق نہ ہوتا۔ میں بھی بروقت دیکھ لیتا کہ کون پیچھے آرہا ہے۔ اسے قابو میں کرنا شاید آج کی بے ہودہ کانفرنس سے زیادہ اہم اور فائدہ مند ثابت ہوتا۔ سب کچھ بے کار رہا۔ خواہ مخواہ دو جانیں ضائع ہوئیں۔"

"لیکن اس بندر نما انسان نے ہمارا تعاقب جاری تو نہیں رکھا۔ بلکہ اس نے تو آنکھ اٹھا کر بھی ہماری طرف نہیں دیکھا۔ وہ سیدھا نکلتا چلا گیا" دائیں طرف والے نوجوان نے گویا دلیل پیش کی۔

"چلو ٹھیک ہے۔ تم یہی سمجھ کر آرام سے بیٹھو۔" میں نے گویا بات ختم کرتے ہوئے کہا "ویسے بھی اب کچھ کہنے نہ کہنے کا فائدہ ہی کیا ہے۔ سانپ تو نکل گیا اب لکیر پیٹنے سے کیا حاصل۔ اسے غالباً جو کرنا تھا کرگیا اور اپنی موجودگی کی اطلاع بھی دے گیا۔"

ایک لمحے کے لیے گاڑی میں بوجھل سکوت رہا۔ صرف انجن کی سرسراہٹ اُبھرتی رہی۔ پھر میں نے پوچھا "ہم جہاں سے آرہے ہیں کیا یہ تم لوگوں کا ہیڈ کوارٹر تھا؟"

نوجوان نے نفی میں سر ہلایا تو میں نے پوچھا "تمہارے خیال میں یہ کس حد تک خُفیہ یا محفوظ ٹھکانا تھا؟"

"میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" وہ محتاط لہجے میں بولا۔

"خیر۔ میں بھی احمق ہوں جو تم سے اس قسم کے سوالات کررہا ہوں۔ وہ جتنا خُفیہ اور جتنا محفوظ تھا، وہ تو میں اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔" میں نے جل کر کہا۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند منٹ بعد گاڑی اسلام آباد ہوٹل کے ڈرائیو وے میں جارکی اور میں اُتر گیا۔ ان دونوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور گاڑی آگے روانہ ہوگئی۔

میں چند لمحے وہیں کھڑا اردگرد دیکھتا رہا۔ مجھے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی کسی ستون کی اوٹ سے اے نن برآمد ہوگا اور اپنا لوہے کے پنجے جیسا ہاتھ مصافحے کے لیے بے پروائی سے میری طرف بڑھاتے ہوئے اپنے مخصوص سرسری انداز میں کہے گا "اور سناؤ چوہدری ڈیئر! کیا حال چال ہیں؟ یہ کیا میٹنگوں وغیرہ کے چکر میں پڑے ہو۔ ان سے کچھ نہیں ہوگا۔ جاؤ۔ جاکر آرام سے اپنے انجام کا انتظار کرو۔"

لیکن غنیمت رہا کہ کسی طرف سے بھی اے نن نمودار نہیں ہوا۔ میری واپسی کی فلائٹ رات کی تھی۔ میرے پاس کم از کم پانچ گھنٹے فاضل تھے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا وہ میں کس طرح گزاروں۔ ہوٹل کے کمرے میں میرا بالکل دل نہیں لگ رہا تھا۔ میں اپنے اسلام آباد آفس چلا گیا۔ وہاں کچھ دیر میں نے کچھ کاروباری معاملات نمٹائے۔ پھر گاڑی لے کر یونہی آوارہ گردی کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

ذہن میں یونہی ایک امید سی تھی، موہوم سا ایک خیال تھا کہ شاید کوئی میرا تعاقب کرے۔ شاید کہیں اے نن کی کوئی جھلک نظر آئے۔ شاید وہ ابھی اسلام آباد میں ہی موجود ہو لیکن میری یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ میں دیر تک سڑکوں پر بھٹکتا رہا لیکن کسی نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ کوئی گاڑی میرے تعاقب میں نہیں آئی۔

سڑکوں پر عجیب ویرانی سی تھی۔ درخت خزاں رسیدہ سے لگ رہے تھے۔ اسلام آباد کی فضا کسی حد تک خزاں رسیدہ تو مجھے اکثر ہی لگتی تھی لیکن آج بے کیفی و اُداسی کچھ زیادہ تھی۔ شاید یہ میرے اندر کا موسم تھا۔ خزاں میرے اندر پنجے گاڑ رہی تھی۔ ایک اجنبی سڑک پر ڈرائیونگ کرتے ہوئے میں نے سر جھٹکا اور اپنے آپ کو سمجھایا "برخوردار چوہدری! اب اتنے بھی دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ حالات اتنے بھی خراب نہیں۔ تم تو صرف اس کا بھی شکر ادا نہیں کرسکتے کہ زندہ ہو، تندرست ہو اور اس خوب صورت صاف ستھری فضا میں سانس لے رہے ہو۔ جبکہ تمہیں تو دوسری اَن گنت نعمتیں بھی حاصل ہیں۔ دُنیا میں لاکھوں انسان نہ جانے کیسے کیسے ہولناک مصائب کا شکار ہیں مگر مایوسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیتے۔ اچھے مستقبل کی آس پر اپنا سفر جاری رکھتے ہیں۔"

جب بھی افسردگی اور اُداسی مجھ پر غلبہ پانے لگتی تھی۔ میں اپنے آپ کو یہ لیکچر دیا کرتا تھا۔ میں خود ہی اپنا بزرگ تھا اور خود ہی اپنا برخوردار۔ میں جب بھی کبھی اپنے سے کہیں بدتر حالات کے شکار لوگوں کا تصور کرتا تھا تو اپنے حالات پر اطمینان ہونے لگتا تھا۔ قنوطیت دور ہوجاتی تھی۔

اس وقت بھی اپنے آپ کو سمجھانے بجھانے سے ذہن ذرا ہلکا ہوا تو میں نے اپنی بے کیفی مزید کم کرنے کے لیے گاڑی کے کیسٹ پلیئر میں ایک کیسٹ لگادی۔ وہ گاڑی میرے اسلام آباد آفس کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کی تھی۔ وہ تقریباً پچپن کی عمر کے تھے لیکن نہایت زندہ دل تھے۔ میں نے کیسٹ لگائی تو ان کے ذوق کا بھی اندازہ ہوگیا۔ وہ نئی نسل کی ایک نہایت بے تکلف امریکی گلوکارہ کا نغمہ تھا جس کے بول بھی خاصے "لرزہ خیز" تھے اور گانے کا انداز بھی ہوشربا تھا۔

میں نے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر صاحب کو کبھی اُداس یا دل شکستہ نہیں دیکھا۔ وہ ایک بہترین کاروباری منتظم بھی تھے اور اس عمر میں بھی نہایت مُستعد، نہایت چاق و چوبند تھے۔ میں نے اپنے آپ کو دل ہی دل میں ان کی مثال دیتے ہوئے سمجھایا "اگر وہ اس عمر میں اپنی تمام ترذمے داریوں اور زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ اتنے چاق و چوبند اور اتنے خوش رہ سکتے ہیں، اس قسم کے گانے سُن سکتے ہیں تو مجھے اس عمر میں اس طرح منہ لٹکا کر بیٹھنے کا کوئی حق نہیں۔ زندگی اب بھی اسی طرح رواں دواں ہے جیسے پہلے تھی۔ کوئی ایسا خاص فرق تو نہیں پڑا۔"

میں اپنے خیالات میں اُلجھ کر اسلام آباد سے دور نکل آیا تھا۔ دُھوپ ڈھل رہی تھی۔ سڑک بالکل ویران تھی۔ میں گاڑی واپس موڑنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ آگے کافی فاصلے پر سڑک کے وسط میں کھڑا کوئی زور زور سے ہاتھ ہلاتا دکھائی دیا جیسے کسی ہنگامی ضرورت کے تحت مجھے مدد کے لیے بلا رہا ہو۔ اس سے ذرا آگے سڑک دائیں طرف مُڑ رہی تھی۔

میں نے گاڑی موڑنے کا ارادہ ترک کردیا۔ ذرا آگے پہنچتے ہی مجھے موڑ پر نشیب میں چھوٹی سی ایک گاڑی اُلٹی ہوئی نظر آئی۔ اس

کے قریب ہی کوئی ایک پتھر پر سر ٹکائے لیٹا ہوا تھا۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی لڑکی تھی۔ پتھر پر پھیلے ہوئے اس کے بھورے بال' ڈوبتے سورج کی کندنی دُھوپ میں چمک رہے تھے۔ وہ کوئی جوڑا تھا جن کی گاڑی کو حادثہ پیش آچکا تھا۔ مجھے اچھا محسوس نہ ہوا کہ انہیں دیکھتے ہوئے بھی ان کی کوئی مدد کیے بغیر واپس لوٹ جاؤں۔

وہ بیس بائیس کی عمر کا ایک دراز قد اور خوبرو نوجوان تھا۔ حُلیہ ایسا ہی تھا جیسا عموماً کافی خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھنے والے نئی نسل کے نمائندوں کا ہوتا ہے۔ لمبے لمبے بال' ڈھیلی ڈھالی بوری جیسی شرٹ اور اُڑی اُڑی سی رنگت کی وہ جینز جسے امریکا میں چرواہے اپنی غربت' مجبوری اور ضرورت کے تحت پہنتے ہیں لیکن ہمارے کروڑپتیوں کے بچے فیشن کے طور پر بہ رضا و رغبت بلکہ فخر سے پہنتے ہیں' خواہ گرمی کے مارے ٹانگوں پر آبلے پڑجائیں۔

لڑکے کے گلے میں سونے کا لاکٹ اور ہاتھ میں سونے کی چین دور ہی سے چمک رہی تھی۔ پیروں میں پھُولے پھُولے سے جوگرز تھے۔ ہاتھ ہلاتے ہوئے وہ تقریباً اچھل رہا تھا۔ مجھے گاڑی روکتے دیکھ کر وہ دوڑ کر قریب آیا۔ وہ گورا چٹا پاکستانی ہی معلوم ہوتا تھا لیکن امریکی لہجے میں انگریزی میں بولا "سر! ایک ٹرک والا ہماری گاڑی کو سائڈ مار گیا ہے۔ میری کزن کے سر میں چوٹ آئی ہے۔ پلیز اسے اسپتال پہنچانے میں میری مدد کریں۔"

"ضرور..... ضرور" میں نے گاڑی سے اُترنے کے لیے دروازہ کھولا لیکن وہ ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا "بس بس آپ زحمت نہ کریں۔ آپ کے کپڑے گندے ہوجائیں گے۔ آپ کی یہی مہربانی کافی ہے کہ آپ رُک گئے۔ میں خود عینی کو اُٹھالاتا ہوں۔"

اس کے کپڑے مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس کی کزن بھی مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی جینز اور ڈھیلے ڈھالے سفید پُل اوور میں تھی۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ ہماری سوسائٹی میں ابھی اونچے طبقے کے لڑکے بھی گرل فرینڈ کو گرل فرینڈ نہیں کہتے تھے' عموماً کزن کہتے تھے۔ ہمارے ہاں جب کوئی لڑکا اپنی ساتھی لڑکی کو کزن کہہ کر متعارف کراتا ہے تو بہت کم یہ امکان ہوتا ہے کہ وہ واقعی اس کی کزن ہو۔ بہرحال مجھے ان کے رشتے ناتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میری نظر میں وہ محض انسان تھے جنہیں اس وقت مدد کی ضرورت تھی۔

لڑکا لپک کر گیا اور میری طرف پشت کرکے اپنی کزن کو بازوؤں پر اُٹھانے لگا۔ اسے اُٹھانے کی کوشش میں وہ اوندھے منہ گرتے گرتے بچا۔ دیکھنے میں وہ ایک تنومند اور ورزشی جسم کا لڑکا تھا لیکن بعض نوجوانوں کی جان بس نمائشی ہی ہوتی ہے۔ لڑکی مختصر الوجود تھی مگر ایسا لگتا تھا کہ لڑکے کو نشیب سے اسے اُٹھا کر چند قدم لانے میں دانتوں پسینہ آگیا تھا۔

میں نے پچھلا دروازہ کھول دیا تھا۔ اس نے بمشکل لڑکی کو پچھلی سیٹ پر تقریباً پھینک ہی دیا اور خود بھی وہیں گھُس کر بیٹھ گیا۔ لڑکی کا سر اس نے گود میں رکھ لیا۔ اس کے بال اور پیشانی کا کچھ حصہ خون میں لتھڑا دکھائی دے رہا تھا لیکن چہرے کا بیشتر حصہ بالوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھوں پر لمبے سفید دستانے تھے شاید ڈرائیونگ وہی کررہی تھی۔ بعض لڑکیاں ڈرائیونگ کرتے وقت دستانے ضرور پہنتی ہیں۔

میں نے زیادہ گہری نظر سے اس کا جائزہ نہیں لیا۔ مُبادا اس کا کزن میری گہری نظر کا مطلب کچھ اور سمجھے' بُرا مان جائے۔ میں نے گاڑی واپسی کے لیے موڑلی۔ لڑکے نے اطمینان کی گہری سانس لی لیکن وہ اتنا مطمئن نہیں تھا جتنا نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

ابھی گاڑی نے چند فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ عقب سے ایک سخت سی چیز میری گُدّی پر آن ٹکی اور لڑکے نے قطعی بدلی ہوئی آواز میں کہا "گاڑی اسی طرف واپس موڑلو جس طرف تم پہلے جارہے تھے۔"

میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا۔ لڑکے کے ہاتھ میں مجھے ایک چھوٹے سے پستول کی جھلک نظر آئی۔ اس کے تاثرات بھی یکسر بدل چکے تھے اور تاثرات بدلنے سے گویا چہرہ ہی بدل گیا تھا۔ اب وہ کسی آسودہ حال گھرانے کا ایک ایسا نوجوان ہرگز دکھائی نہیں دے رہا تھا جو اچانک کسی پریشانی یا حادثے کا شکار ہوگیا تھا۔ اب وہ اچھا خاصا خرانٹ قسم کا قاتل یا ڈاکو دکھائی دے رہا تھا۔ چہروں پر اتنی زبردست تبدیلی آتے میں نے کم ہی دیکھی تھی۔

"بُری بات ہے برخوردار!" میں نے پچکارنے کے سے انداز میں شفقت سے کہا "اس طرح کی حرکتیں نہیں کرتے۔ کچھ پیسے ویسے چاہئیں تو یونہی مانگ لو۔ خنجر پستول وغیرہ نکالنے کی کیا ضرورت ہے۔"

"میں کہتا ہوں گاڑی واپس موڑو۔" اس کا لہجہ زیادہ غضب ناک ہوگیا اور اس نے میری گُدّی پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھادیا۔

"تمہارے طبقے کے بعض لڑکے ایڈونچر کے شوق میں بھی لوٹ مار وغیرہ کرتے ہیں۔ کیا تم بھی انہی میں سے ایک ہو؟" میں نے عقب نما آئینے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے ملائمت سے پوچھا۔ ساتھ ہی میں نے گاڑی موڑنے کے بجائے رفتار کچھ اور بڑھادی۔

"طبقے اور ایڈونچر کی ایسی تیسی۔ تم سوال جواب بند کرو اور گاڑی موڑو۔" اس نے گویا پستول کا دستہ میرے سر پر رسید کرنے کے لیے ہاتھ اونچا کیا لیکن پھر نہ جانے کیا سوچ کر رُک گیا۔ میں جُھکائی دے کر اس کے وار سے بچنے کے لیے تیار تھا مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

"برخوردار! مدت ہوئی تمہارے اس خادم نے اس قسم کے کھلونوں سے ڈرنا چھوڑ دیا تھا۔ تم شاید مجھے اس قسم کا کوئی سیٹھ سمجھے ہو جو بندوق پستول وغیرہ کی شکل دیکھتے ہی تھر تھر کانپنا شروع کردیتے ہیں۔ اس کھلونے کو جیب میں رکھ لو اور اگر تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے تو سیدھی طرح بات کرو۔ میں تمہاری اس بدتمیزی کے باوجود تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔" میں نے بدستور ...ی سے کہا۔

وہ گویا میری بات سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنسا۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے کسی بھیڑیے نے ننھے سے انسانی بچے کے انداز میں غرانے/قلقاری مارنے کی کوشش کی ہو۔ اس بار وہ بولا تو لہجہ ایک بار پھر بدلا ہوا تھا۔

"غلط فہمی مجھے نہیں' تمہیں ہوئی ہے ڈیئر افضل چوہدری! میں نے تو تمہیں بالکل ٹھیک پہچانا ہے۔" وہ میری گُدّی پر پستول کی نال کا دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا "اس گن کے بارے میں بھی تم غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ اس کی ساخت عام پستول جیسی ہے لیکن تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ لیزر گن ہے۔"

اس نے مجھے نام سے مخاطب کیا تھا۔ اس پر مجھے حیرت تھی لیکن اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے میں نے بظاہر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا "اوہو... پوری سائنس فکشن فلم چل رہی ہے... اب لیزر گن بھی آگئی۔"

"ہاں" وہ گہری سنجیدگی سے بولا "فرق صرف یہ ہے کہ وہ فکشن ہوتا ہے اور جو تمہارے ساتھ ہورہا ہے وہ فیکٹ ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے فکشن اور فیکٹ میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ لیزر گن کا تذکرہ پڑھنا اور فلموں میں اس کا استعمال دیکھنا ایک تفریح ہے لیکن حقیقت میں لیزر بیم کا جسم سے گزر جانا بڑا ہولناک تجربہ ہوتا ہے اور انسان کو اس تجربے سے عبرت پکڑنے کی مہلت نہیں ملتی۔ اب گاڑی واپس موڑلو۔ اسلام آباد کی حدود میں داخل نہ ہونا ہی تمہارے حق میں اچھا ہوگا۔"

"گاڑی تو میں موڑ لیتا ہوں۔" میں نے اسٹیئرنگ وہیل گھُماتے ہوئے کہا "لیکن اس لیے نہیں کہ میں تمہاری لیزر گن سے ڈر گیا ہوں بلکہ اس لیے کہ میں تم سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں اور بارونق علاقے میں پہنچ کر غالباً ہمارے درمیان باتیں نہیں' کچھ اور شروع ہوجائے گا۔ میرے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تمہارے ہاتھ میں لیزر گن ہے یا عام پستول۔ انسان کی کھوپڑی سے گولی گزرے یا لیزر بیم۔ دونوں صورتوں میں اسے تو مرنا ہی ہے۔"

گاڑی واپس گھوم چکی تو اس کے چہرے پر قدرے طمانیت کے آثار اُبھرے اور وہ مسکراتے ہوئے بولا "کچھ نہ کچھ فرق تو پڑتا ہے چوہدری صاحب! گولی انسان کے جسم کے کسی بھی حصے سے گزر جائے' اس کے زندہ بچ جانے کا کچھ نہ کچھ امکان تو رہتا ہے۔ لیکن یہ لیزر بیم تو بہت ہی عجیب سے ہے... اور ہم نے اسے عجیب تر بنادیا ہے..."

"ہم نے...؟ یہ "ہم نے" سے کیا مراد ہے؟" میں نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

لیکن وہ گویا میرا سوال سُنے بغیر مجھے گاؤدی اور خود کو ایک عالم تصور کرتے ہوئے سمجھانے کے سے انداز میں بولا "کسی چیز کا استعمال اسے کتنا مختلف بنادیتا ہے۔ چھُری سے پھل اور سبزیاں کاٹو تو وہ زندگی میں صحت اور تندرستی لاتی ہیں وہی چھُری قاتل کے ہاتھ میں ہو تو زندگی چھین لیتی ہے۔ یہی لیزر شعاعیں کینسر سے جسم کے خلیات کے مرنے کے عمل کو روکتی ہیں لیکن یہی لیزر شعاعیں اس گن کے ذریعے اگر تمہاری ایک انگلی سے بھی گزر گئیں تو تمہاری موت یقینی ہوجائے گی۔"

"جسم میں سوراخ ہوجاتا ہے ان کے گزرنے سے؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"سوراخ ہوجانا تو معمولی بات ہے۔ یہ لیزر بیم اگر تمہارے جسم کے کسی بھی حصے سے گزر گئی تو سوراخ ہونے کے ساتھ ساتھ خلیات کے مرنے کا عمل اتنی تیزی سے شروع ہوگا کہ دُنیا کی کوئی مشین اس کو ریکارڈ نہیں کرسکتی اور دُنیا کے کسی بھی ڈاکٹر یا سرجن کے پاس تباہی کے اس عمل کو روکنے کی نہ تو مہلت ہوگی اور نہ ہی کوئی طریقہ۔ چند سیکنڈ میں تمہارا پورا جسم اس طرح گل سڑجائے گا جس طرح کینسر کے مریض کے جسم کا کوئی ایک حصہ مہینوں یا سالوں میں گلتا سڑتا ہے۔ جسم کیا.... بس سڑانڈ اور تعفن کا ایک اَنبار رہ جائے گا۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر وہ مسکرایا۔ وہ ایک خوب صورت نوجوان تھا لیکن اس وقت کسی لومڑی سے مشابہ دکھائی دے رہا تھا۔ عقب نما آئینے میں اس کی شکل کچھ اور بگڑی ہوئی نظر آرہی تھی۔

بڑے ڈرامائی انداز میں وہ ذرا آگے کو جُھکتے ہوئے بولا "تم اپنے اس خوب صورت اور فولادی جسم کو اس انجام سے دوچار کرنا پسند کروگے افضل چوہدری؟"

"تعریف کا شکریہ۔ تم نے میرے سوٹ میں چھُپے ہوئے جسم کی خوب صورتی اور مضبوطی کا اندازہ لگالیا۔ مجھے خود اس کا کوئی خاص احساس نہیں تھا۔ بہت گہری نظر ہے تمہاری۔ کاش تم کچھ اور خوب صورت ہوتے.... اور لڑکی ہوتے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہارے بارے میں ہماری معلومات خود تم سے بھی زیادہ ہیں چوہدری ڈیئر۔" وہ ملائمت سے بولا۔

"تمہارا نام؟" میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"کیا اب بھی نام جاننے کی کوئی ضرورت باقی ہے؟" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ بظاہر وہ بڑے انہماک سے مجھ سے باتیں کررہا تھا لیکن اس کی نظر سڑک پر بھی تھی۔ اپنی بات کے جواب کا انتظار کیے بغیر بولا "اب جو سنگِ میل آئے گا اس کے قریب سے بائیں

ہاتھ پر کچے میں گاڑی موڑلینا۔"

"میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "شام کا دھندلکا پھیلنے لگا ہے۔ مجھے ہوٹل واپس پہنچنا ہے۔ کھانا بھی کھانا ہے۔ ہوٹل سے چیک آؤٹ کرنا ہے اور رات ساڑھے آٹھ بجے والی فلائٹ پکڑنی ہے۔"

"میں نے تم سے تمہارا شیڈول نہیں پوچھا۔ جو کہا ہے وہ کرو۔" اس کے لہجے میں ایک بار پھر سختی در آئی۔

"ورنہ.....؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

میری بے خوفی اسے چڑا رہی تھی۔ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ اگر اس گن کا ٹریگر دب گیا تو نہایت خاموشی سے چند سیکنڈ میں تمہارا جسم تعفن اور غلاظت کا ایک انبار ہو کر رہ جائے گا۔"

"کوئی بات نہیں جلد یا بدیر انسان کا انجام یہی ہونا ہے۔ یہاں نہ سہی، قبر میں سہی۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور رفتار کچھ اور بڑھادی۔

"مائل اسٹون قریب آرہا ہے" وہ تیزی سے بولا "میں صرف تین تک گنوں گا۔ اگر تم نے گاڑی نہ روکی تو ٹریگر دب جائے گا۔"

"اس سے پہلے ہی میں گاڑی کسی درخت سے ٹکرادوں گا۔" میں نے دیوانگی آمیز سے انداز میں قہقہہ لگایا اور ایکسیلیٹر پر دباؤ مزید بڑھادیا "تمہارے ہاتھ میں لیزر گن ہے تو میرے ہاتھ میں اس گاڑی کا اسٹیئرنگ وہیل ہے۔ مرنا تو مجھے ہے ہی، تمہیں بھی ساتھ لے کر مروں گا۔"

میں نے گاڑی کو اِدھر اُدھر لہریے دینا شروع کردیا۔ گاڑی نے مست ہاتھی کی طرح کبھی اِدھر کبھی اُدھر رُخ کرنا شروع کیا لیکن یہ وہ ہاتھی تھا جس کی رفتار جہاز کے برابر محسوس ہوتی تھی۔ گاڑی میرے اشاروں پر جس طرح اِدھر اُدھر حرکت کرتی تھی، جس طرح جھٹکے کھاتی تھی اور جس طرح یکدم غرا کر آگے بڑھتی تھی، اس سے کسی اجنبی کی روح فنا ہوسکتی تھی، رگوں میں خون خشک ہوسکتا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اور کچھ نہ ہوا تو کم از کم اس کی ساتھی لڑکی تو سیٹ سے لڑھک ہی پڑے گی اور اس طرح اگر ایک لمحے کے لیے بھی اس کی توجہ ہٹ گئی تو میں کچھ نہ کچھ کر گزروں گا۔

لیکن آج کا دن میری توقعات اور اندازے غلط ثابت ہونے کا دن تھا۔ میری نظر سڑک پر جمی ہوئی تھی۔ اندازے کی ایک ذرا سی غلطی سے واقعی گاڑی کسی چیز سے ٹکرا سکتی تھی لیکن اسی دوران میری نظر ایک ثانیے کے لیے عقب نما آئینے کی طرف گئی اور میں نے اس زخمی لڑکی کو اٹھ کر بیٹھتے ہوئے دیکھا۔ اس کا ایک دستانہ پوش ہاتھ سختی سے اگلی سیٹ کے پشتے پر جما ہوا تھا۔ وہ بالکل ہوش و حواس میں تھی۔

اس کے حلق سے جو آواز برآمد ہوئی وہ اے نن کی تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے اپنے ساتھی سے مخاطب ہوئی یا ہوا

"برخوردار! یہ چوہدری صاحب بہت پہنچی ہوئی چیز ہیں۔ ان سے نمٹنا تم جیسے نوجوانوں کا کام نہیں۔ خواہ تمہارے ہاتھ میں لیزر گن ہی کیوں نہ ہو۔ ان سے تو صرف ہم جیسے استاد ہی مذاکرات کرتے ہیں۔"

دوسرے ہاتھ سے اس نے اپنے چہرے سے نہایت احتیاط اور آہستگی سے ایک ماسک اُتار لیا۔ وہ واقعی ایک نہایت خوبصورت اور بے عیب ماسک تھا۔ اس کی سب سے بڑی خوبصورتی درحقیقت یہ تھی کہ اس پر ماسک ہونے کا گمان بھی نہیں گزرتا تھا۔ اس کے عقب سے اے نن کی وہی نحوست زدہ شکل برآمد ہوتے دیکھ کر مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ یہ واقعی ایک تکلیف دہ تماشا تھا۔ ایک اچھے چہرے کے عقب سے ایک بندر نما صورت کا برآمد ہونا۔

ماسک کے ساتھ ہی خوب صورت بالوں کی وِگ بھی جڑی ہوئی تھی۔ ویسے بال اے نن کے اپنے بھی اچھے خاصے خوبصورت تھے اور شانوں تک لمبے تھے۔ اب تک وہ وِگ ہی میں گڈمڈ تھے۔ وِگ والا ماسک اُترا تو اس پر لگا ہوا خون بھی میری نظر سے اوجھل ہوگیا اور جنس بدلنے کے ساتھ ساتھ اس کے زخمی ہونے کا تاثر بھی ختم ہوگیا۔ اس کے ہاتھوں پر دستانے مجھے شروع ہی سے مشکوک لگے تھے لیکن میں نے انہیں اہمیت نہ دے کر غلطی کی تھی۔ وہ اس نے اپنے بدنما استخوانی ہاتھوں کو چھپانے کے لیے پہنے ہوئے تھے۔

میں نے رفتار کم کردی اور گاڑی سے کرتب دکھانا بھی بند کردیے۔ تب اے نن اپنے ساتھی نوجوان سے داد طلب لہجے میں مخاطب ہوا "دیکھا استادوں کی آمد کا اثر؟ بغیر کہے چوہدری صاحب نے اٹکھیلیاں بند کردیں۔"

"دراصل تبدیلیٔ جنس کے آپریشن کے بعد تمہاری تاثیر دُگنی ہوگئی ہے۔ اب بغیر کہے ہی تمہاری بات ماننے کو جی چاہنے لگا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ ذرا ٹیڑھا ہوکر عقب نما آئینے میں مجھے دیکھ رہا تھا۔

اپنے جسم پر نسوانی اضافوں کے ساتھ وہ اب عجیب لگ رہا تھا۔ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تمہاری یہی ادا تو ہمیں سب سے زیادہ پسند ہے چوہدری ڈیئر! حالات خواہ کچھ بھی ہوں، تمہاری خوش مزاجی میں فرق نہیں آتا۔ اب گاڑی ایک طرف کرکے روک لو۔ ہمیں تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔"

"بات تو میں خود بھی تم سے کرنا چاہ رہا تھا لیکن گاڑی رُکے گی نہیں۔ ہم چلتی گاڑی میں ہی بات کریں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے گاڑی روکنے پر اصرار نہیں کیا اور بے پروائی سے بولا "جیسے تمہاری مرضی گاڑی روکنا کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے۔ میں جب چاہوں گا رکوا لوں گا۔ تم کیا بات کرنا چاہتے ہو؟"

"میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں یہ علم کیسے ہوجاتا ہے میں فلاں وقت فلاں راستے سے گزروں گا؟ دو تین مرتبہ [illegible] چکا ہے کہ تم کوئی تیاری کرکے جال پھیلا کر اس راستے پر بیٹھ گئے جس سے مجھے گزرنا تھا۔ کم از کم اس وقت تو مجھے خود بھی پتا نہیں تھا کہ میں اس راستے سے گزروں گا۔ میں تو بے خیالی میں ادھر نکل آیا تھا۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ میں تمہارے ہی بارے میں سوچ رہا تھا۔ تمہاری ہی تلاش میں تھا۔ لیکن مجھے گمان بھی نہیں تھا تم اس رُوپ میں مل جاؤ گے۔"

"دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"بکواس مت کرو اور بات کو ٹالنے کی کوشش بھی مت کرو۔" میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی "مجھے امید نہیں تھی کہ تم ایسے تھیٹریکل سے میک اپ وغیرہ کا بھی سہارا لے سکتے ہو۔ میں تو تمہیں بہت 'اونچے لوگ' سمجھتا ہوں۔"

"اونچے تو ہم ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں لیکن ضرورت پڑنے پر ہم ہر چیز کا سہارا لے لیتے ہیں۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ہماری سہولت اور آسانی کس چیز میں ہے۔ کس طریقہ کار میں ہمارے لیے کم سے کم خطرات ہیں۔ بعض اوقات عجلت میں بھی کچھ کرنا ہوتا ہے۔ زیادہ وقت نہیں ہوتا ہمارے پاس۔ ویسے یہ گیٹ اَپ کچھ ایسا تھیٹریکل بھی نہیں تھا۔ میں چاہتا تو اس گیٹ اَپ میں تمہیں کئی دن تک دھوکا دے سکتا تھا۔ یہ کوئی معمولی ماسک نہیں ہے۔ اس میں اصل انسانی کھال کے ٹشوز استعمال ہوئے ہیں اور انسان کی کھال سے جُڑنے کے بعد اس میں بھی زندہ انسان کی کھال کی تمام خصوصیات پیدا ہوجاتی ہیں۔ انسانی خون سے اس کا رابطہ ہوجاتا ہے۔ اس پر باقاعدہ پسینہ تک آتا ہے۔ جس ماسک پر تمہیں بھی ماسک ہونے کا شبہ نہ ہوسکے وہ کچھ تو غیر معمولی ہوگا۔"

"تم لوگوں کی تو ہر چیز ہی غیر معمولی ہے اے نن ڈیئر!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "وہ بات بیچ میں ہی رہ گئی۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا میں اِدھر سے گزروں گا؟ تم نے کیونکر یہاں گھات لگا کر بیٹھنے کا فیصلہ کرلیا؟"

"یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں۔ اس میں تھوڑے سے حساب کتاب کو دخل ہوتا ہے لیکن اس کی تفصیل میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔ اس طرح کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو ہمارے "ٹریڈ سیکرٹس"...... کاروباری راز سمجھ لو۔"

میں شاید عقب نما آئینے میں بار بار اس کی طرف دیکھنے اور کچھ توجہ ڈرائیونگ پر رکھنے میں ہی اُلجھ گیا تھا۔ اس کے ساتھی کی طرف سے چند لمحے کے لیے میرا دھیان تو تقریباً ہٹ گیا تھا۔ اس لیے اس نے عقب سے اچانک ہی ایک [illegible] مجھ پر پھینکا جو میرے سر گردن اور چہرے کے گرد نقاب کی طرح لپٹ گیا۔

وہ کچھ عجیب سا ہی کپڑا تھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا لیکن اس کے اندر مجھے سفید روشنی کا ایک جھماکا سا محسوس ہوا جیسے کسی کیمرے کی کمزور سی فلیش لائٹ ایک ثانیے کے لیے آن ہوئی ہو۔ ایک ہلکی سی بُو میرے نتھنوں کو چڑھی لیکن وہ کلوروفارم کی بُو نہیں تھی۔ کلوروفارم شاید اتنی تیزی سے کسی کے حواس کو شل بھی نہیں کرسکتا تھا جتنی تیزی سے اس نے میرے حواس کو ناکارہ کیا۔

مجھے بس اتنا احساس ہوا کہ کپڑا میرے چہرے کے گرد لپٹتے وقت ہی اے نن نے بندر کی طرح اُچک کر اگلی سیٹ پر چھلانگ لگائی تھی۔ میں نے اپنے انجام کی پروا کیے بغیر گاڑی کا اسٹیئرنگ وہیل اندھا دُھند گھمادیا۔ میں نے چاہا تھا کہ میرے حواس پر مکمل تاریکی چھانے سے پہلے گاڑی کسی درخت وغیرہ سے ٹکرا جائے۔

میری یہ کوشش کامیاب نہ ہوسکی۔ جب حادثہ ہونا ہوتا ہے تو اچھا بھلا سیدھی اور خالی سڑک پر چلتے چلتے بھی گاڑی اچانک ہی، بغیر کسی غلطی کے بھی درخت سے ٹکرا جاتی ہے اور انسان حیرت سے سوچتا رہ جاتا ہے کہ نہ جانے وہاں یکدم ہی درخت کہاں سے نمودار ہوگیا تھا لیکن جب انسان خود گاڑی درخت سے ٹکرانا چاہتا ہے تو اسے درخت بھی میسّر نہیں آتا۔

دھچکوں سے میں نے محسوس کیا کہ گاڑی کچے میں اُتر گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کسی نے ٹھوکر مار کر پاؤں ایکسیلیٹر سے ہٹادیا اور غالباً بریک دبادی۔ میرا سر کسی چیز سے ٹکرایا تھا لیکن مجھے چوٹ کا احساس نہیں ہوا۔ ایک دُھندلا سا احساس بس یہ باقی رہا کہ حواس پر تاریکی چھانے سے پہلے میں نے وہ سیاہ کپڑا اپنے چہرے سے نوچنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کسی جھلی کی طرح چہرے سے چمٹ گیا تھا۔ پھر میرے ہاتھ پاؤں جواب دے گئے اور ذہن تاریکی میں ڈوب گیا۔

حواس کے مکمل طور پر ناکارہ ہونے سے پہلے زندگی کے نہ جانے کتنے برسوں میں پہلی بار ایک عجیب سے خوف نے نہایت شدّت سے ذہن پر حملہ کیا تھا اور وہ خوف اس بات کا تھا کہ کہیں میری بینائی تو جواب نہیں دے گئی؟ جو کپڑے جیسی چیز میرے چہرے کے گرد لپٹی تھی اور اس میں فلیش لائٹ جیسا جو جھماکا ہوا تھا، اس نے میری آنکھوں کو تو بے کار نہیں کردیا تھا؟ یہ احساس ہی بڑا لرزہ خیز تھا لیکن اس کی خوفناکی کو پوری طرح محسوس کرنے سے پہلے ہی میں دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہوچکا تھا۔

میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے اسی احساس سے میری روح طمانیت سے سرشار ہوگئی کہ میری بینائی برقرار تھی کیونکہ میں تاروں بھرا آسمان دیکھ رہا تھا۔ ذہن پر ہلکی سی دُھندلاہٹ اور خُمار سا تھا لیکن طبیعت میں کسلمندی نہیں تھی۔ میں اپنے آپ کو ہشاش بشاش اور تازہ دم محسوس کررہا تھا جیسے میں نے خوب مشقّت کرکے تھک جانے کے بعد بہت دیر تک آرام کیا تھا۔

ذہن خُمار کی گرفت سے ذرا آزاد ہوا تو احساس ہوا کہ میں کسی آرام دہ بستر پر چت لیٹا تھا۔ اوپر تاروں بھرا آسمان تھا لیکن وہ

آسمان ہل رہا تھا۔ کبھی ایک طرف کو جاتا تھا، کبھی دوسری طرف کو۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا تو پتا چلا کہ آسمان تو اپنی جگہ ساکت تھا درحقیقت میں خود ہل رہا تھا۔ ہوا میں ہلکورے لے رہا تھا۔

پھر میں نے گردن ذرا اِدھر اُدھر گھمائی تو خود کو ایک عجیب ہی منظر کا حصہ بنے ہوئے پایا۔ میں درحقیقت ایک خوب صورت اور آرام دہ ہنڈولے میں لیٹا تھا جو میری جسامت اور قد کاٹھ کی مناسبت سے کافی بڑا تھا۔ وہ خوب صورت ہنڈولا گلابی رنگ کا تھا اور لکڑی کا بنا ہوا معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ شاید لکڑی، پلاسٹک، دھات یا نائیلون وغیرہ کے قریب قریب کی کوئی چیز تھی۔ اس میں گلابی رنگ کا ہی، ریشم جیسا نرم و ملائم بستر تمام لوازمات سمیت بچھا ہوا تھا جس پر میں دراز تھا۔

قریب ہی ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ خوابوں اور خیالوں کی سی ایک لڑکی۔ اس کا لباس بھی گلابی تھا۔ بلاشبہ وہ ایک تصوراتی لڑکی معلوم ہوتی تھی جیسی عموماً بچوں کی باتصویر کہانیوں یا انگریزی فلموں میں دکھائی جاتی ہے۔ یعنی ایک خوب صورت، نرم و نازک اور رحمدل پری جس کے ہاتھ میں جادو کی چھڑی بھی ہوتی ہے۔

فرق صرف یہ تھا کہ اس پری کے ہاتھ میں جادو کی.... بلکہ کسی بھی قسم کی چھڑی نہیں تھی اور نہ ہی اس کے پر تھے۔ تاہم اس کے سر پر گلابی ہی رنگ کا ایک تاج ضرور تھا جس میں پچاسوں ننھے ننھے جواہرات سے چمک رہے تھے۔ اس کے پر نہ ہونے کے باوجود، اس پر نظر پڑتے ہی سب سے پہلا تصور ذہن میں کسی پری کا ہی اُبھرتا تھا۔

عجیب اور شاہانہ سے ڈھیلے ڈھالے گلابی لبادے میں وہ قریب بیٹھی خواب ناک سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے ہنڈولا ہلا رہی تھی۔ وہ اس قابل تھی کہ تمام تر الجھنوں کے باوجود دیر تک اس کی طرف دیکھا جا سکتا تھا لیکن تجسس سے مجبور ہو کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔

اسی دوران مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ فضا میں نہایت ہی دھیمی اور نہایت ہی دلفریب مہک پھیلی ہوئی تھی اور ویسی ہی مدھم مدھم مگر مسحور کُن سی موسیقی بکھر رہی تھی۔ میرے دائیں طرف ایک چھوٹا سا ٹیلا بھی نظر آ رہا تھا جس کا کچھ حصہ خوش رنگ پھولوں والے پودوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس کے دامن میں چھوٹا سا ایک نالہ بھی بہہ رہا تھا جس کا شفاف پانی تاروں کی مدھم روشنی میں بار بار سیال چاندی کی طرح چمک اُٹھتا تھا۔

یہ سب کچھ بلاشبہ بہت خوب صورت تھا۔ خیالوں اور خوابوں کی دُنیا کا ایک جنت نظیر گوشہ تھا لیکن ذرا توجہ سے دیکھنے پر مجھے احساس ہو گیا کہ سب کچھ مصنوعی تھا۔ وہ خوب صورت منظر تخلیق کیا گیا تھا لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ نقل مطابق اصل تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ دستِ قدرت سے جو چیزیں تخلیق پاتی ہیں، وہ بے جان ہوں تب بھی ان میں ایک روح محسوس ہوتی ہے۔ پھول ہوں تو ان میں ایک عجیب سی کشش ہوتی ہے جو آپ کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ تارے ہوں تو گویا رات کی تنہائی میں آپ سے باتیں کرتے ہیں۔ ٹیلے ہوں تو گویا آپ کو اپنے پاس بلاتے ہیں۔ پہاڑ ہوں تو اپنی عظمت و جبروت سے آپ کو مبہوت کر دیتے ہیں۔ قدرتی پہاڑی نالا ہو تو اس کی مترنم روانی دیکھ کر پُرشکوہ برف پوش چوٹیوں کا خیال آتا ہے۔ آسمان ہو تو اس کی بیکراں وسعتوں میں انسان کھو کر رہ جاتا ہے۔

فطرت کے سامنے انسان اپنے آپ کو بہت چھوٹا محسوس کرتا ہے اور فطری نظاروں کی خوب صورتی اس کی روح میں اُتر جاتی ہے لیکن یہاں وہ بات نہیں تھی۔ آسمان بہت چھوٹا تھا اور تھوڑے ہی فاصلے پر چاروں طرف ایک گنبد کی طرح زمین سے ملا ہوا تھا۔ تاروں کی جھلملاہٹ مصنوعی تھی۔ پھول اپنے تصنع اور فطرت کی نقالی پر شرمندہ سے تھے۔

لڑکی تو ظاہر ہے اصلی تھی مگر اس خوب صورت اور تخیلاتی سے لباس میں وہ بھی مصنوعی مصنوعی سی لگ رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ کسی تخیلاتی دُنیا کی باسی نہیں تھی۔ وہ اسی ترقی یافتہ اور مادیت پرست دُنیا کی مخلوق تھی جہاں چپے چپے پر انسان ہر لمحے ایک نیا فساد برپا کیے رکھتا ہے۔ وہ اپنے ملکوتی حسن اور معصومیت کے ذریعے اس بہروپ، اس خوب صورت مگر مصنوعی دُنیا کا ایک حصہ بننے کی کوشش کر رہی تھی لیکن میرے خیال میں اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں تھی۔ میں نے فطری نظاروں کی آغوش میں پرورش پائی تھی۔ میں تو فطرت کو اس کی خوشبو، اس کے رنگ، اس کے لمس سے پہچانتا تھا۔ یہ مصنوعی چیزیں کتنی ہی بے عیب سہی، لیکن مجھے دھوکا نہیں دے سکتی تھیں۔

میں نے ہنڈولے میں اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے ناگواری سے کہا "یہ کیا مذاق ہے؟"

غیر ارادی طور پر میں نے یہ سوال اردو میں ہی کیا تھا۔ لڑکی سفید فام تھی۔ وہ اپنی خوب صورت آنکھیں مصنوعی حیرت سے پھیلاتے ہوئے بولی "مذاق۔ کیسا مذاق؟ یہاں تو کسی نے تمہارے ساتھ کوئی مذاق نہیں کیا۔" وہ انگریزی بول رہی تھی۔

اس نے شاید اندازہ کر لیا تھا کہ میں غصے میں ہنڈولے سے اُترنے لگا ہوں۔ اس نے غیر محسوس سے انداز میں ہنڈولے سے ذرا دور رکھی ہوئی تپائی نما ایک چیز میں غالباً کسی بٹن کو چھوا۔ ہنڈولے پر ذرا بلندی پر پھیلی ہوئی ایک مستطیل سی جالی جو ہنڈولے کی چھت معلوم ہو رہی تھی، بے آواز طریقے سے نیچے آ گئی اور ہنڈولے سے مل گئی۔ یوں ہنڈولا گویا ایک مستطیل پنجرے میں تبدیل ہو گیا۔

اب میں اس پنجرے میں بند تھا۔ پنجرہ خواہ کتنا ہی خوب صورت کیوں نہ ہو، سونے ہی کا کیوں نہ ہو لیکن انسان تو انسان

[ہ]ی اس میں بند ہونے کے بعد ایک عجیب سی اہانت محسوس [ہوتی ہ]ے۔ آپ شاید میری بات پر ہنسیں اور اسے میرے تخیل کی [ا]نتہائی قرار دیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے زندگی میں ایک آدھ [...]چڑیا گھر جانے کا اتفاق ہوا تھا تو میں نے پنجرے میں بند ہر [...]پرند اور درندے کی آنکھوں میں پژمردگی اور بے چارگی کے [سات]ھ ساتھ ایک خوابیدہ احساسِ اہانت کی بھی جھلک محسوس کی [تھ]ی۔

میں اس وقت ایک خوب صورت لڑکی کے سامنے پنجرے میں [...] رتھا۔ میں نے اپنا چہرہ تپتا محسوس کیا۔ خدا نے مجھے اَن گنت [...]وں سے نوازا تھا۔ میں ان میں سے اپنی غیر معمولی جسمانی طاقت [...]اہاب سے قیمتی اثاثہ محسوس کرتا تھا۔ اس کے لیے میں نے [...]یں اکھاڑوں میں جا کر ڈنٹر نہیں پیلے تھے، باڈی بلڈنگ میں غیر [مع]مولی حد تک جان نہیں کھپائی تھی۔ جسمانی طاقت اور مضبوطی [بڑ]ھانے کے دوسرے طور طریقوں میں بھی بہت زیادہ وقت صرف [ن]ہیں کیا تھا۔ جو کچھ بھی کیا تھا، شوقیہ حد تک نارمل انداز میں کیا تھا۔ [...]جان بنانے" کی تھوڑی بہت کوششیں تو عمر کے کسی نہ کسی حصے [م]یں، خصوصاً نوعمری میں ہر شخص ہی کرتا ہے۔ میں نے بھی کی [تھ]یں لیکن درحقیقت میری غیر معمولی طاقت اور مضبوطی مجھے [قد]رت کی طرف سے پیدائشی طور پر ہی عطا ہوئی تھی۔ صحیح طور پر [ا]س کا احساس مجھے جوانی میں آ کر ہی ہوا تھا۔

اس طاقت سے میں نے بارہا ناقابلِ یقین کام لیے تھے۔ اس [وق]ت بھی توہین کے احساس نے مجھے مغلوب کیا تو رگ و پے میں [...]یکدم گویا طوفان سے مچل اُٹھے۔ میں نے چاہا کہ بگڑے ہوئے ہاتھی [...] اُبھرے ہوئے سانڈ کی طرح اس ہنڈولے کو توڑ پھوڑ ڈالوں جس [...]میں مجھے ایک حقیر جانور کی طرح قید کر دیا گیا تھا۔

اس کی چوکور سلاخیں دھات کی دکھائی نہیں دے رہی [تھ]یں۔ میں نے انہیں دبوچ کر پوری قوت صرف کر ڈالی مگر ایک [...]سلاخ نے بھی اپنی جگہ سے جنبش تک نہیں کی۔ اگر وہ دھات کی [ہوت]یں تو شاید تھوڑی بہت مُڑ جاتیں۔ پھر میں نے اس چھت کو اوپر [اُٹھ]انے کے لیے پورا زور لگا ڈالا جو اوپر سے آ کر صندوق کے ڈھکنے [کی] طرح ہنڈولے سے جُڑ گئی تھی اور وہ ہنڈولے کے بجائے [...]ہن گیا تھا لیکن میں اس آدھے حصے کو بھی جنبش نہ دے سکا۔ وہ [...]طرح جُڑ چکا تھا اسی طرح جُڑا رہا۔

میرے جسم سے پسینہ پھوٹ پڑا۔ شاید اس وجود کو ٹھنڈا کرنے [ک]ے لیے جو زور آزمائی کے باعث آگ کی طرح دہکنے لگا تھا۔ لڑکی [...]اس طرح میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میری طاقت آزمائی [س]ے لطف بھی ہو رہی ہو اور اسے حیرت بھی ہو کہ آخر مجھے اس طرح [...]برے سے زور آزمائی کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ ذرا پیچھے کو [...]ہو کر بیٹھ گئی تھی۔ ہنڈولا اب جھولے بھی نہیں لے رہا تھا۔ [با]لکل ساکت ہو گیا تھا۔ وہ گویا لڑکی کے ہاتھ کے اشاروں پر ہی حرکت کر رہا تھا۔

آخر کار میں نے زور آزمائی ترک کر دی اور دھپ سے دوبارہ بستر پر بیٹھ گیا۔ تب وہ تجسس اور معصومیت سے بولی "تم کیوں اپنے آپ کو تھکا رہے تھے؟"

"پہلے تم بتاؤ۔ تم نے مجھے اس پنجرے میں بند کیوں کیا ہے؟" میں نے برہمی سے پوچھا۔

"محض احتیاطاً" اس نے سادگی سے جواب دیا "تم بہت غصے میں دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے سوچا جھولے سے نکل کر اِدھر اُدھر نہ دوڑنے لگو۔ توڑ پھوڑ نہ مچا دو۔ کہیں میری ہی گردن نہ توڑ ڈالو۔"

میں نے ذرا ٹھنڈا پڑتے ہوئے کہا "مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے زندگی میں کبھی تم جیسی خوب صورت کسی لڑکی کی گردن توڑی ہو۔ کیا میں شکل سے تمہیں اتنا بدذوق دکھائی دیتا ہوں؟"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر نہایت سنجیدگی سے بولی "میں فلسفہ نہیں بگھارنا چاہتی لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ کسی کی صورت پر نہیں جانا چاہیے، صورتیں اکثر دھوکا دیتی ہیں۔ ویسے بائی داوے یہ تم ہوش میں آتے ہی اتنا غصے میں کیوں آ گئے تھے؟ ہم نے تو بے ہوشی کے دوران تمہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ ہر طرح سے تمہارے آرام کا خیال رکھا۔ میں خود ایک خادمہ کی طرح تمہارے پاس موجود رہی۔ لیکن لگتا یہی تھا کہ اس اچھے سلوک کا تمہاری طرف سے کوئی اچھا صلہ ملنے کی توقع نہیں۔"

"اچھے صلے سے تمہاری کیا مراد ہے؟" میں نے اس کی نیلی، شفاف آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

"میرے لیے تو ایک اچھی سی.... خوب صورت سی.... مہرباں سی مسکراہٹ بھی اچھا صلہ ہو سکتی تھی۔ میں بڑی قناعت پسند ہوں۔" وہ معصومیت سے بولی۔ مگر اس نے صحیح کہا تھا۔ صورت پر نہیں جانا چاہیے، صورتیں دھوکا دیتی ہیں۔ اس کی معصوم صورت کے پیچھے بھی ایک لومڑی چھپی بیٹھی تھی۔

"مجھے کیا اس ہنڈولے میں لٹانا ضروری تھا؟ میں کیا کوئی بچہ ہوں؟" میں نے اب بھی خفگی سے پوچھا۔

"اوہ...." وہ مترنم انداز میں ہنسی "تم اسے ہنڈولا سمجھ رہے ہو؟ یہ تو ہمارا ایک بہت خاص قسم کا بیڈ ہے۔ اور یہ ایک خصوصی بیڈ روم ہے۔" اس نے ہاتھوں سے چاروں طرف اشارہ کیا۔

اس کے اشارے کے ساتھ میں نے ایک بار پھر چاروں طرف نظر ڈالی۔ نیم تاریک آسمان چاروں طرف گنبد کی طرح زمین سے ملا ہوا تھا۔ وہ ایک خاصی وسیع جگہ تھی۔ کوئی سو مربع گز پر محیط رہی ہو گی۔ اس کے باوجود وہاں کچھ تنگی کا سا احساس تھا۔ شاید اس کی وجہ محض یہ تھی جو خوب صورت نظارہ وہاں سمونے کی کوشش کی گئی تھی وہ فطرت کی وسعتیں مانگتا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "اس بیڈ روم میں ان لوگوں کو

لٹایا جاتا ہے جن کے بارے میں ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن اور اعصاب پر کوئی بوجھ ہے۔ اس کے علاوہ مجھے بتایا گیا تھا کہ تمہیں پرو یسیر پی تھری کے تحت بے ہوش کیا گیا تھا۔ وہ بے ہوش کرنے کا ایک بہت ہی تیز اور سریع الاثر طریقہ ہے۔ کمزور اعصاب کے لوگوں پر اس کے کچھ اثرات رہ جاتے ہیں۔ انہیں بھی خاص طور پر اس بیڈ روم میں لٹایا جاتا ہے۔ تمہارے بارے میں مجھے بتایا گیا تھا کہ تم بے پناہ مضبوط اعصاب کے آدمی ہو اور اس حد تک دباؤ برداشت کرسکتے ہو جس سے عام آدمی برین ہیمرج وغیرہ کا شکار ہو کر مر سکتا ہے۔ اس کے باوجود احتیاطاً تمہیں یہاں لٹا دیا گیا۔ یہاں کی فضا میں خاص قسم کے ان ہیلر گردش کر رہے ہیں۔"

میں جو ایک عجیب مسحور کن سی خوشبو محسوس کر رہا تھا، شاید وہ انہی ان ہیلرز کی تھی۔ لڑکی کہہ رہی تھی "ذہنی، اعصابی اور جسمانی طور پر خواہ کوئی کتنا ہی تباہ حال ہو، دنیا بھر کی پریشانیوں نے خواہ اسے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا ہو لیکن وہ کچھ دیر اس بیڈ روم میں سو کر اُٹھے گا تو بالکل تازہ دم اور ہشاش بشاش ہوگا۔ ہنستا مسکراتا اٹھے گا۔ جاگنے کے بعد بھی وہ جتنی دیر یہاں گزارے گا اس کے مزاج کی تازگی اور خوشگواری میں اضافہ ہی ہوگا جبکہ نارمل انسان پر اس کے صرف اتنے ہی اثرات ہوں گے جتنے کسی بھی خوب صورت اور صاف ستھرے مقام پر بیٹھنے سے ہو سکتے ہیں۔"

پھر وہ دلکشی سے مسکرائی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی "صرف ایک تم ہو جو اُٹھتے ہی اتنے غصے میں آگئے تھے۔ لیکن تمہارے بارے میں مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ تم ایک ٹیڑھے آدمی ہو۔ میں تمہاری طرف سے کسی بھی ردِعمل کے لیے تیار تھی۔"

"اور اگر میں اٹھتے ہی تم سے اظہار محبت کر دیتا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

وہ پہلے سے بھی زیادہ دلکشی سے مسکرائی "میں اس کے لیے بھی تیار تھی۔"

"اُف!" میں نے متاسفانہ سے انداز میں گہری سانس لے کر کہا "میں بھی کیسا گدھا ہوں۔ بیسویں صدی کی ایک پری میرے اظہارِ محبت کی منتظر بیٹھی تھی اور میں احمقوں کی طرح اس پنجرے پر زور آزمائی کرتا رہا۔ جلدی سے اسے کھولو تاکہ میں فوراً اس سنہری پیشکش سے فائدہ اٹھا سکوں۔ کہیں چند سیکنڈ بعد تمہارے خیالات بدل نہ جائیں۔ آج کل لڑکیوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔"

"اظہارِ محبت پنجرے میں بیٹھ کر بھی تو کیا جا سکتا ہے۔" وہ آرام کرسی سے مشابہ اپنی نشست پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولی۔

"جہاں پنجرہ ہو وہاں محبت کا کیا کام۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں اپنے آپ کو بے حد تازہ دم محسوس کر رہا تھا اور اب میرا موڈ بے حد خوشگوار ہو چکا تھا۔ شاید وہاں کی فضا میں پھیلے ہوئے ان ہیلرز نے مجھ پر ذرا دیر میں اثر کیا تھا۔

وہ قدرے شرارت سے مسکراتے ہوئے بولی "ہم کہہ رہے تھے آج کل کی لڑکیوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ بہت تجربہ ہے تم آج کل کی لڑکیوں کا؟"

"نہیں۔ تجربہ تو کچھ ایسا خاص نہیں۔ ایسے ہی ذرا تم پر رُ ڈال رہا تھا تجربہ کاری کا۔" میں نے مسکین سی شکل بنانے کوشش کرتے ہوئے کہا "تمہیں یہ پنجرہ نہیں کھولنا ہے تو کھولو۔ ویسے ہی انکار کر دو۔ باتوں میں ٹالنے کی کوشش کیوں کر ہو؟"

وہ میرا سوال اَن سنا کرتے ہوئے بولی "ویسے بتاؤ تو سہی تم اتنا غصہ کیوں آگیا تھا؟"

"مجھے اپنے آپ کو پنگھوڑے میں لیٹا دیکھ کر غصہ آیا تھا" میں نے دیانتداری سے بتایا "مجھے ایسا لگا جیسے میرے ساتھ مذاق کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ میرا مذاق اُڑایا جا رہا ہے۔"

"اگر یہ سچ مچ کا پنگھوڑا ہی ہوتا اور ہم نے تمہیں بچہ فرض کر لیا ہوتا تب بھی اس میں بُرا منانے کی کیا بات تھی؟" شیریں لہجے میں بولی "اس دُنیا میں نوے فیصد انسان ذہنی طور پر ہی ہیں اور انہوں نے اس دُنیا کو تہس نہس کر رکھا ہے۔ ہر طرف غلاظت، افراتفری اور خون ریزی پھیلائی ہوئی ہے۔ انہوں اس دُنیا کو بدصورت بنا دیا ہے۔ وہ کسی چیز کو خوب صورت رہنے دیتے۔ اسی لیے تو ہم نے دُنیا پر ذہین اور بالغ نظر لوگوں حکمرانی قائم کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔"

"خواہ اس کے لیے باقی نوے فیصد کا صفایا کرنا پڑے؟" نے نیم استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

"ہاں" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اس کے لہ میں بلا کی سفاکی تھی "اب دُنیا کی بھلائی اسی میں ہے کہ ان نو فیصد کچرے کا صفایا کر دیا جائے یا پھر انہیں روبوٹس کی طرح چلنا سکھایا جائے ورنہ دُنیا ایک بھیانک انجام سے دوچار ہو جا گی۔"

"دُنیا تو مجھے تم جیسے دس فیصد لوگوں کے ہاتھوں بھی کسی انجام سے دوچار ہوتی دکھائی نہیں دے رہی۔" میں نے سانس لے کر کہا "عجب بدنصیب سیارہ ہے یہ کرۂ ارض بھی نہیں اس بے چارے نے کیا قصور کیا ہے۔ ہر وقت طرح طرح لوگوں کے ہاتھوں میں تختۂ مشق بنا رہتا ہے۔"

وہ اپنے خوب صورت سر کو خفیف سا جھٹکا دیتے ہوئے "خیر۔ یہ باتیں میرے کرنے کی نہیں ہیں۔ تم نے ابھی تک پوچھا ہی نہیں کہ تم کہاں ہو؟"

"میں نے اب پریکٹس شروع کر دی ہے کہ ہوش میں آنے کے بعد یہ سوال نہ کیا کروں۔ پچھلی مرتبہ ہوش میں آنے کے سوال کیا تھا تو وہ صورت حرام اے ٹن قریب بیٹھا تھا۔ اس نے

مضحکہ سا اُڑایا تھا کہ ہر کوئی ہوش میں آنے کے بعد پہلا سوال یہی کرتا ہے "میں کہاں ہوں؟" مجھے اپنا مضحکہ اُڑوانا بالکل پسند نہیں۔ میں اس معاملے میں بہت حسّاس ہوں۔ بہت جلد بُرا منا جاتا ہوں۔"

وہ دھیرے سے ہنس دی۔ میں نے کہا "ویسے اگر تم خود ہی بتادو کہ میں کہاں ہوں تو میں خاصا شکر گزار ہوؤں گا۔ یہ تو مجھے معلوم ہی ہے کہ میں ریڈ ڈاٹ کے کسی ٹھکانے پر ہوں۔"

"بس تو پھر اتنا ہی کافی ہے۔ اس سے زیادہ تم کیا جاننا چاہتے ہو؟" وہ قدرے حیرت سے بولی۔

"میرا مطلب تھا کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں مجھے پچھلی مرتبہ لایا گیا تھا؟"

"مجھے نہیں معلوم تمہیں پچھلی مرتبہ کہاں لے جایا گیا تھا۔" وہ سادگی سے بولی۔

"پچھلی مرتبہ مجھے اغوا کیا گیا تو میں لاہور میں تھا۔ چنانچہ جب ریڈ ڈاٹ کے ٹھکانے پر میری آنکھ کھلی تو میں نے فرض کرلیا تھا کہ وہ لاہور کی ہی حدود میں غالباً کہیں زیرِ زمین واقع ہوگا۔" میں نے بتایا۔

"مجھے اس سلسلے میں کچھ معلوم نہیں۔"

"اس بار مجھے اغوا کیا گیا تو میں اسلام آباد سے چند میل دور تھا۔ چنانچہ مجھے کچھ ایسا محسوس ہورہا ہے کہ یہ جگہ اسلام آباد ہی کے آس پاس کہیں ہوگی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"یہ بھی مجھے نہیں معلوم۔"

"انجان بننا تو کوئی تم لوگوں سے سیکھے۔ جب معلومات کا اظہار کرنے پر آتے ہو تو تمہیں یہ تک معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کے بڑے بڑے لوگوں کے بیڈ رومز میں کیا ہورہا ہے اور جب انجان بننے پر آتے ہو تو تمہیں یہ بھی علم نہیں ہوتا کہ تمہاری ناک کے نیچے تمہارا منہ ہے یا دُم۔"

وہ ہنستے ہوئے بولی "جل کیوں رہے ہو۔ ضروری تو نہیں کہ تمہیں ہر بات ہی معلوم ہو... اور معلوم ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑجائے گا۔"

"اچھا... میں کم از کم تمہارا نام تو معلوم کرسکتا ہوں۔"

"کیوں نہیں" وہ قدرے گرمجوشی سے بولی "میرا نام فیونا ہے۔"

"فیونا...؟" میں نے حیرت سے کہا "کیا تم لیونا کی بہن ہو؟" مجھے پہلی بار ریڈ ڈاٹ کے جس ٹھکانے پر لے جایا گیا تھا وہاں میری میزبانی کے سے فرائض انجام دینے والی لڑکی کا نام لیونا تھا۔ شخصیت کے لحاظ سے بھی لیونا اس لڑکی سے کچھ ملتی جُلتی سی چیز تھی تاہم وہ اتنی خوب صورت نہیں تھی اور اس نے پریوں وغیرہ جیسا کوئی روپ بھی دھارا ہوا نہیں تھا۔ اس کا حُلیہ اور وضع قطع تو لیڈی ڈاکٹروں یا لیبارٹریوں میں کام کرنے والی خواتین سے کچھ ملتی جُلتی تھی، تاہم اس میں شک نہیں تھا کہ وہ بھی بلا کی پُرکشش لڑکی تھی۔ عمر میں فیونا سے کچھ بڑی معلوم ہوتی تھی۔

"لیونا؟" لڑکی نے حیرت سے دُہرایا اور اس کی خوب صورت پیشانی پر ہلکی سی شکنیں اُبھر آئیں "میں کسی لیونا کو نہیں جانتی۔"

"پھر وہی انجان بننے کا ڈراما شروع ہوگیا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "خیر، بھاڑ میں ڈالو لیونا کو۔ جب تم سامنے ہو تو پھر لیونا کو یاد کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا ہی ہے تم اسے نہیں جانتیں۔ یہ بتاؤ مجھے کب تک طوطے کی طرح اس پنجرے میں بند رکھنے کا ارادہ ہے؟ نیز یہ مسکین طوطا بھوکا بھی ہے۔ اسے کوئی چوگا وغیرہ ڈالنے کا پروگرام ہے یا نہیں؟"

"اگر تم اب غصے میں نہ آنے اور ایک مہذب انسان کا سا رویّہ اختیار کرنے کا وعدہ کرو تو میں ابھی اس بیڈ کا حفاظتی بندھن کھلوا دیتی ہوں۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر تپائی نما چیز سے چپٹی اور لمبوتری سی ایک پٹی اٹھائی جو تپائی کا ہی ایک حصہ معلوم ہورہی تھی۔ میں نے دیکھا اس پر چند چمکیلے سے خانے بنے ہوئے تھے۔ سرسری نظر میں وہ کوئی انتہائی جدید قسم کا ریموٹ کنٹرول یا پھر کیلکیولیٹر معلوم ہوتا تھا۔

اسے ہاتھ میں لیے وہ منتظر سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے جلدی سے کہا "دیکھ کیا رہی ہو! مجھے فوراً باہر نکالو۔ تم مجھے دُنیا کا مہذب ترین انسان پاؤ گی۔"

"اسی میں تمہارا فائدہ ہے۔" وہ مسکرائی اور اس مسکراہٹ سے نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ کچھ دیر کے لیے مجھے اس پنجرے میں بند رکھا جانا شاید کسی نفسیاتی سبق کا ایک حصہ تھا۔ شاید اس کا مقصد مجھے اپنی بے بسی کا احساس دلانا تھا۔ بے پناہ جسمانی طاقت اور دولت کی طاقت کو دُنیا میں بڑی چیز سمجھا جاتا ہے۔ کسی کے پاس ان دونوں میں سے ایک طاقت بھی ہو تو وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتا ہے۔

جس کے پاس یہ دونوں طاقتیں ہوں وہ تو شاید کبھی کبھی دُنیا کو فتح کرلینے کے خواب دیکھتا ہو۔ میں نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا تھا لیکن میرے بارے میں کوئی فرض کرسکتا تھا کہ میں بھی اپنے آپ کو بڑی توپ چیز سمجھتا ہوؤں گا۔ شاید قدم قدم پر میری کم فہمی "دور" کی جاتی تھی۔ مجھے بتایا جاتا تھا کہ بعض طاقتیں بعض طاقتوں کے سامنے قطعی حقیر ہوتی ہیں۔ ہر مچھلی کو نگلنے کے لیے سمندر میں اس سے بڑی مچھلیاں بلکہ مگرمچھ موجود ہیں۔

فیونا ایک لمحے پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھتی رہی پھر اس نے اپنے ہاتھ میں موجود ریموٹ کنٹرول نما پٹی پر ایک چمکیلے خانے کو انگلی سے چھوا اور ہنگوڑے کا ڈھکن دار سا ڈھکن اوپر اٹھتا چلا گیا۔ میں نے بے تابی سے باہر آکر یوں سکون کی سانس لی گویا اب تک میں کسی صندوق میں بند تھا۔

فیونا میرے استقبال کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن سامنے کھڑی وہ بے پناہ محتاط بھی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی نظر مجھ پر ہی تھی اور وہ پلک نہیں جھپک رہی تھی۔ میں نے اپنے وعدے کا پاس کیا اور کوئی ایسی ویسی حرکت نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بچپن میں پریوں اور شہزادیوں کی کہانیاں پڑھ کر جو تصوّر میرے ذہن میں اُبھرتا تھا وہ اب تک ذہن کی لائبریری کے کسی تاریک گوشے میں محفوظ تھا۔ سرو قد فیونا واقعی اس تصوّر پر پوری اتری تھی۔

میں اس کے مقابل کھڑا ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا تو اس کے رُخساروں پر سُرخی کچھ بڑھ گئی۔ مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اسے شرمانا بھی آتا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" اس نے خمار آلود سی ہنسی کے ساتھ پوچھا۔

"تمہارے حُسن کو آنکھوں میں سمونے کے لیے یہاں روشنی کم ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر اردگرد دیکھا "کیا یہاں ہمیشہ اسی طرح نیم تاریکی سی رہتی ہے؟"

"نہیں یہاں خزاں، بہار، برسات، گرمی، سردی، ڈھلتی شام، چڑھتا دن۔ غرضیکہ ہر موسم اور ہر وقت کا سا سماں رکھا جاسکتا ہے۔" اس کے لہجے میں شاید غیر ارادی طور پر فخر سا جھلک آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں موجود پٹی پر ایک اور چمکیلے خانے کو چھوا۔ اس طویل و عریض جگہ پر دن کا اُجالا پھیل گیا۔ ٹمٹماتے ستارے غائب ہوگئے۔ آسمان نیلا ہوگیا۔ سورج نظر نہیں آرہا تھا مگر چاروں طرف دھوپ کی سی روشنی پھیل گئی۔

"سورج کو ابھی رہنے دیتے ہیں۔ ورنہ یہاں کچھ گرمی سی ہوجائے گی۔" وہ میری طرف دیکھ کر بولی۔ یعنی وہ چاہتی تو سورج بھی نکال سکتی تھی۔

روشنی پھیلی تو فیونا کی خوب صورتی کچھ اور اُجاگر ہوگئی لیکن ماحول کچھ پھیکا سا پڑگیا۔ اس کا تصنع کچھ نمایاں ہوگیا۔ میں ٹہلنے کے سے انداز میں ایک طرف چلنے لگا۔ فیونا میرے ساتھ تھی۔ میں نالے کے کنارے ایک صاف ستھرے مرمریں پتھر پر جا بیٹھا۔ فیونا میرے سامنے دوسرے پتھر پر آن بیٹھی۔

نالے کی تہ میں صاف ستھرے پتھروں پر کچھوؤں کا ایک جوڑا بھی بیٹھا تھا۔ پانی اور پتھر تو اصلی تھے لیکن مجھے گمان گزرا کہ شاید کچھوؤں کا جوڑا مصنوعی ہو۔ میرا خیال غلط نکلا۔ کچھوؤں کو شاید ہماری موجودگی کا احساس ہوگیا اور وہ گویا کچھ بُرا منا کر پانی کے نیچے ہی نیچے تیرتے ہوئے کچھ دور چلے گئے۔

میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئی کہا "اس عجائب گھر کا دروازہ کہاں ہے؟"

"کیوں... کیا بھاگنے کا ارادہ ہے؟" وہ مسکرائی۔ جب انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی اس کی قید سے بھاگ نہیں سکتا تو وہ اس قسم کے سوالات سے محظوظ ہوتا ہے۔

"اس حسین اور رومینٹک ماحول سے بھاگنے کو کس بدبخت کا دل چاہے گا۔" میں نے والہانہ لہجے میں کہا "یہاں تم ہو۔ یہ حسین و جمیل کچھوے ہیں۔ یہ ٹیکنی کلر پھول ہیں۔ یہاں بھلا کس چیز کی کمی ہے۔" ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "بس یہ بتادو کھانا کب ملے گا اور مینو میں کیا ہے؟"

"تمہیں واقعی بھوک لگی ہے؟"

"تو کیا تمہارے خیال میں، میں مذاق کررہا ہوں؟ یہ نہایت سنجیدہ بلکہ سنگین موضوع ہے۔" میں نے جواب دیا۔

تب وہ اٹھتے ہوئے بولی "اچھا۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ یوں تو چاروں طرف ہی وہ نام نہاد آسمان، زمین سے مل رہا تھا لیکن فیونا شاید ایک خاص حصے کی طرف جارہی تھی جہاں کھجور کا ایک تنہا درخت اُداس سا کھڑا تھا۔ اس درخت کے قریب سے گزرتے وقت فیونا نے ایک بار پھر اس ریموٹ کنٹرول نما چیز کو استعمال کیا اور زمین سے ملے ہوئے آسمان میں ایک شگاف سا پیدا ہوگیا۔ ایسکیموؤں کے برف سے بنے ہوئے گھروں میں آمدورفت کے لیے اسی قسم کا دروازہ ہوتا ہے لیکن یہ دروازہ ذرا بڑا تھا مجھ جیسا دراز قد شخص بھی نہایت آسانی سے اس سے گزر سکتا تھا۔

فیونا کے پیچھے پیچھے اس محرابی دروازے سے گزرنے کے بعد میں نے مُڑ کر دیکھا تو عقب میں صرف ایک سیاہ دیوار تھی۔ اس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہم ایک طویل راہداری میں کھڑے تھے۔ اس قسم کی راہداری کسی بھی عمارت میں ہوسکتی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہ ایک انتہائی سادہ سی راہداری تھی۔ اس میں کہیں کوئی کھڑکی، دروازہ، کوئی چیز نظر نہیں آرہی تھی۔ دو سرے دیوار، چھت، فرش ہر چیز کا رنگ سیاہ اسٹیل سے مشابہ تھا۔ وہ بس سیاہ اسٹیل ہی کی ایک چوکور سُرنگ معلوم ہورہی تھی۔

فیونا دائیں طرف مُڑی اور چند قدم چل کر رُک گئی۔ اس کا منہ ایک دیوار کی طرف تھا۔ وہ یقیناً کسی نشان وغیرہ کے بغیر بھی تعین کرسکتی تھی کہ اسے کہاں مُڑنا تھا۔ ایک بار پھر اس نے ریموٹ استعمال کیا اور سیاہ اسٹیل کی سی سپاٹ دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہوگیا۔ عجیب امرت دھارا قسم کا ریموٹ کنٹرول تھا۔

ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں سوال اُبھرا تھا کہ کیا میں فیونا سے ریموٹ چھین کر وہاں سے بھاگ نکلنے کی کوشش نہیں کرسکتا تھا؟ لیکن میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ یہ ایک بے فائدہ... بلکہ نقصان دہ حرکت ہوگی۔ میرا اندازہ تھا کہ ریموٹ کنٹرول کے فنکشن میں انگلیوں کے نشانات کا بھی دخل تھا۔ عین ممکن تھا کہ میری انگلی کے لمس سے وہ کام نہ کرتا۔

اس سے پہلے مجھے ریڈ ڈاٹ کے جس ٹھکانے پر لے جایا گیا تھا۔ وہاں میں نے لیونا کو محض ہاتھ کے لمس سے ایک دروازہ

کھولتے دیکھ کر بعد میں خود اسی طرح کھولنے کی کوشش کی تھی لیکن مجھے ناکامی ہوئی تھی۔

اگر میں فیونا کو بے ہوش کر کے اس کی انگلی کے لمس سے ریموٹ کو استعمال کرنے کی کوشش کرتا تب بھی کسی فائدے کا امکان نظر نہیں آتا تھا۔ ریموٹ نہایت مختصر تھا اور اس پر چند ہی چمکیلے سے خانے تھے اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ ایک ایک خانے کے کئی کئی فنکشن تھے۔ صرف انہیں مختلف انداز میں کبھی ایک بار، کبھی دو بار اور کبھی تین بار چھونے سے فنکشن میں فرق پڑ جاتا تھا۔

تمام چمکیلے خانے ایک جیسے تھے اور فیونا اتنی پھرتی و مشاقی سے ریموٹ کنٹرول کو استعمال کرتی تھی کہ مجھے ابھی تک ایک خانے کے بارے میں بھی یقینی طور پر اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ اس سے کیا کام لیا جا سکتا تھا۔ میں خواہ فیونا کو بے ہوش کر کے اسی کے ہاتھ سے ریموٹ استعمال کرنے کی کوشش کرتا تب بھی عین ممکن تھا کہ کوئی دروازہ کھلنے کے بجائے چھت کا کوئی بھاری بھرکم ٹکڑا میرے سر پر آن گرتا یا ان آہنی سے در و دیوار کے عقب میں کوئی ہیٹنگ سسٹم آن ہو جاتا اور میں یہاں سے آزاد ہونے کے بجائے کسی سرنگ نما راستے پر کسی چوہے کی طرح فرائی ہو کر رہ جاتا یا سالم بکرے کی طرح روسٹ ہو جاتا۔

میری ایک مجبوری یہ بھی تھی کہ ابھی تو اس جگہ کا سر پیر ہی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ بلکہ مجھے صحیح طور پر یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ وہی جگہ تھی جہاں مجھے پہلے لے جایا گیا تھا یا یہ کوئی دوسرا ٹھکانا تھا؟ میں اس پہلے والی جگہ کو بھی مکمل طور پر نہیں دیکھ سکا تھا اس لیے یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ اسی کا کوئی اور حصہ بھی ہو سکتا تھا۔ ان لوگوں نے بھی یقیناً ہر پہلو پر اچھی طرح غور کر رکھا تھا۔ تبھی یوں اطمینان سے ایک نرم و نازک لڑکی کو ریموٹ کنٹرول سمیت اپنے سرکش قیدی کے پاس تنہا چھوڑ دیتے تھے۔

سیاہ آہنی سی دیوار میں نمودار ہونے والے دروازے سے ہم جس کمرے میں داخل ہوئے وہ گویا مکمل طور پر اس دیوار کی ضد تھی۔ یہاں کی دیواریں، فرنیچر ہر چیز سفید تھی اور کسی بہت ہی خاص قسم کے پلاسٹک کی بنی معلوم ہوتی تھی۔ اس میں ایک لمبی سی ڈائننگ ٹیبل پڑی تھی جس کے گرد کافی مقدار میں سادہ سی کرسیاں موجود تھیں۔ وہ ڈائننگ روم ہی معلوم ہوتا تھا لیکن نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر کسی اسپتال کا سا تاثر ملتا تھا۔ شاید اس کے بے داغ سفیدی کے وجہ سے۔ حالانکہ ہمارے اسپتالوں میں بے داغ سفیدی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال ایک روایت تو چلی آرہی ہے۔ سفید سفید چیزوں کو دیکھ کر اسپتال کا خیال آتا ہے۔ غنیمت تھا کہ وہاں اسپتال جیسی، دواؤں کی بُو نہیں تھی بلکہ ایک خوشگوار سی مہک سی پھیلی ہوئی تھی۔

اس کشادہ کمرے میں ایک طرف باقاعدہ پینٹری بھی بنی ہوئی تھی جس کی محرابی سی کھڑکی کے عقب میں ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ بھی سفید فام تھا۔ میں اور فیونا ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ چکے تو وہ پینٹری سے نکل آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سفید ٹرے تھی جس میں کئی سفید ہی گلاس تھے۔ اس نے ٹرے ہمارے سامنے لا رکھی۔

اس کا انداز ویٹروں والا تھا۔ مگر حلیے سے وہ کوئی ڈاکٹرز قسم کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ اس کا لباس، جوتے سب کچھ سفید تھے۔ سر بھی سفید ٹوپی سے ڈھکا ہوا تھا لیکن وہ اس قسم کی ٹوپی نہیں تھی جیسی خانساماں پہنتے ہیں بلکہ وہ کسی حد تک فوجی ہیلمٹ سے مشابہ تھی۔ اس شخص کا چہرہ مردوں کی طرح سپاٹ تھا اور وہ بالکل خاموش کھڑا تھا۔ گلاسوں میں جو سیال اور شفاف چیز تھی وہ بظاہر تو پانی ہی معلوم ہوتا تھا۔

مجھے پیاس لگ رہی تھی لیکن میں گلاس اٹھاتے اٹھاتے رک گیا۔ فیونا نے گلاس اٹھا کر چند گھونٹ بھر لیے پھر میری ہچکچاہٹ دیکھ کر بولی "پینا چاہو تو پی لو۔ یہ سادہ پانی ہی ہے۔ فرق صرف یہ ہے اس میں کتے بلیوں کا جوس شامل نہیں ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تیکھی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ تمہارے بیشتر شہروں میں جن ذخیروں سے پانی آتا ہے ان میں کتے بلیاں اور پرندے تک مرے پڑے ہوتے ہیں۔ راستے میں کہیں گٹر کی لائنیں پانی کی لائنوں سے میل جول بڑھا لیتی ہیں اور اپنے اپنے "اثاثے" ایک دوسرے کو منتقل کر دیتی ہیں۔ یہ پانی اس قسم کی خصوصیات سے پاک ہے۔"

"یعنی صاف ستھرا، پاکیزہ اور ہر آلائش سے پاک ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو پھر یہ مجھے کہاں ہضم ہوگا۔" میں نے مایوسی سے کہا۔

ایک بار پھر اس کی مترنم ہنسی ابھری "تم بہت دلچسپ آدمی ہو افضل چوہدری!"

"یہ جاننا اچھا محسوس ہو رہا ہے کہ تمہیں میرا نام معلوم ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے تمہارا نام اور تمہارے بارے میں کچھ بنیادی باتیں بتائی گئی تھیں۔" وہ بولی۔

"لیکن یہ نہیں بتایا گیا ہوگا کہ میں بہت اچھا آدمی ہوں۔" ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر میں نے نہایت سنجیدگی سے کہا "ایسا کرو۔ تم میرے ساتھ بھاگ چلو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے ساتھ تمہاری زندگی بہت اچھی گزرے گی۔"

اس نے بے اختیار قہقہہ لگایا پھر منہ پر ہاتھ رکھ کر گویا ہنسی ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی "میری زندگی کو تو چھوڑو۔ پہلے اپنی زندگی اچھی گزارنے کی فکر کرو۔ اب مذاق چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا کھاؤ گے؟ تم مینو کی بات کر رہے تھے۔ یہ بتا دوں یہاں کھانے زیادہ شاندار، پُرتکلف یا چٹ پٹے نہیں ملتے۔ سیدھی سادی سی چیزیں ملتی ہیں۔ یہاں کھانے کا مقصد صرف جسم کی ضروریات پوری کرنا ہوتا ہے۔ اگر چاہو تو غذائی ضروریات پوری کرنے کے لیے تمہیں صرف دو چار کیپسول بھی دیے جا سکتے ہیں۔"

"ہرگز نہیں" میں نے سختی سے کہا "میں کھانے کی جگہ کیپسول ہرگز نہیں کھا سکتا۔ مجھے یہی محسوس ہوگا میں نے کھانا نہیں، دوا کھائی ہے۔ میں دیہاتی آدمی ہوں۔ میرے لیے کوئی سیدھی سادی چیز ہی منگوا لو لیکن وہ کم از کم خوراک تو محسوس ہو۔"

اس نے ویٹر نما اس شخص کو کچھ چیزیں لانے کا حکم دیا اور وہ خاموشی سے لوٹ گیا۔ چند لمحے بعد ہی وہ ایک ٹرے لیے لوٹ آیا جس میں شفاف پلاسٹک کے چند ڈبے رکھے ہوئے تھے۔ وہ دراصل نہایت نفیس قسم کے کنٹینرز تھے جن میں مختلف قسم کے مگر نہایت سادہ سی کچھ سینڈوچ نما چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔

فیونا نے وہ شفاف پلاسٹک کے ڈبے کھولے اور انہیں کاغذ کی طرح مچر مُر کر کے ٹرے میں ڈال دیا۔ میں نے دو تین سینڈوچ کھا لیے۔ میرا خیال تھا ان سے میری داڑھ بھی گرم نہیں ہوگی لیکن طبیعت سیر ہو گئی۔ ذائقہ بھی اچھا خاصا ہی تھا۔ فیونا نے صرف ایک پیسٹری نما چیز کھائی۔

میں نے چوتھی سینڈوچ نما چیز کی طرف متذبذب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا "اس سے اچھی تو وہ جگہ تھی جہاں مجھے اس سے پہلے لے جایا گیا تھا۔ وہاں ہر طرح کے کھانے موجود تھے۔ جو میں نے پسند کیا وہی پیش کیا گیا۔"

"تمہارے لیے خصوصی اہتمام کیا گیا ہوگا ورنہ ہمارے ہاں کھانوں وغیرہ کے لیے اتنا اہتمام اور ایسی جھمیلے بازی نہیں کی جاتی جس کا تمہاری سوسائٹی میں رواج ہے۔"

"تم تو اس طرح بات کر رہی ہو جیسے یہ کوئی الگ ہی دنیا ہے۔"

"ہاں ایک طرح سے یہ چھوٹی سی الگ تھلگ دنیا ہی ہے کیونکہ یہاں کی ہر چیز تمہاری دنیا سے مختلف ہے۔" وہ بولی۔

اچانک ڈائننگ روم کا دروازہ کھلا۔ میرا رُخ دروازے ہی کی طرف تھا۔ میں نے اگر بروقت اپنے آپ کو نہ روکا ہوتا تو شاید میں حیرت سے اچھل پڑتا کیونکہ دروازے سے اندر آنے والا بلیک برڈ تھا۔ وہی بلیک برڈ جسے راحیلہ موت کے گھاٹ اُتار چکی تھی۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس کی کھوپڑی میں ایک تیز دھار چاپڑ آدھے چہرے تک پیوست دیکھا تھا۔ اس کی لاش پولیس کے توسط سے ایک ایجنسی نے اپنی تحویل میں لے لی تھی اور کسی لیبارٹری کو بھجوائی گئی تھی۔ مگر وہ چمپینزی اپنے اسی مخصوص انداز میں اس وقت سامنے سے چلا آرہا تھا۔

دروازہ بند ہونے سے پہلے ایک اور شخصیت اندر آئی۔ وہ اے نن تھا۔ دوبارہ مرد کی جون میں آچکا تھا۔ بہت عمدہ قسم کے سوٹ میں تھا۔ بال بھی نہایت سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے میں نے اسے کبھی اتنے معززانہ حلیے میں نہیں دیکھا تھا۔ چہرے پر بھی بے پناہ متانت اور بُردباری طاری تھی۔ وہ بدبخت بلیک برڈ بھی پینٹ شرٹ اور ٹائی میں تھا۔ ہاتھ جیبوں میں ڈالے ہوئے تھا اور پورا دانشور نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ میرے مقابل کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا جبکہ اے نن کھڑا ہی رہا اور اُداس سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "ٹھونس لیا جو کچھ ٹھونسنا تھا؟"

میں نے منہ بنا کر کہا "ٹھونسنے کے لیے یہاں رکھا ہی کیا تھا۔ عجیب خلائی قسم کا کھانا تھا۔ مجھے تو لگ رہا ہے میں تمہارے سوئم میں شرکت کرنے چاند پر آیا ہوا ہوں۔"

"میرے سوئم میں شرکت کرنے کی تو شاید تمہیں حسرت ہی رہ جائے۔ البتہ چاند پر تم جب چاہو، ہم تمہیں بھجوا سکتے ہیں۔" اے نن نے بے نیازی سے جواب دیا پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے فیونا سے مخاطب ہوا "یہ بڑا ہی پیٹو آدمی ہے لیکن عجیب بات ہے کہ اس کا پیٹ ابھی تک پیٹ ہی ہے، توند نہیں بنا۔"

"کسی نے تمہیں غلط اطلاع فراہم کی ہے۔ میں تو کئی کئی دن کھانے کے بغیر بھی رہ سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"اونٹ کی طرح ذخیرہ کر لیتے ہو گے۔ خیر۔۔۔ اس وقت میں تم سے شکمی معاملات پر تبادلہ خیال کرنے نہیں آیا۔ تمہیں ذرا زحمت کرنا ہوگی۔ میرے ساتھ آؤ۔" اے نن بولا۔

"اب کیا ڈراما دکھانا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

اے نن کے چہرے پر تکلیف کے آثار اُبھر آئے "اتنے سنجیدہ معاملات کو تم ڈراما بازی کا نام دیتے ہو۔ تمہیں کب عقل آئے گی؟"

"تم لوگوں سے اگر اس طرح واسطہ پڑتا رہا تو مجھے لگتا ہے میری تو بچی کھچی عقل بھی رخصت ہو جائے گی۔" میں نے غمناک لہجے میں کہا پھر بلیک برڈ کی طرف اشارہ کیا "یہ خبیث تو جہنم رسید ہو چکا تھا۔ دوبارہ کہاں سے آگیا؟ کیا یہ کوئی جڑواں بھائی قسم کی چیز ہے؟"

بلیک برڈ نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر خشمگیں سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ شاید اردو بھی سمجھتا تھا اور لفظ "خبیث" پر برہمی کا اظہار کر رہا تھا پھر اس نے اجازت طلب سی نظروں سے اے نن کی طرف دیکھا گویا بہ زبانِ خموشی کہہ رہا ہو "اگر تم بُرا نہ مناؤ تو میں اس بدتمیز کو سبق سکھا دوں؟"

لیکن اے نن اس کی طرف توجہ دیے بغیر بولا "بھائی تو نہیں لیکن جڑواں قسم کی چیز ہی سمجھ لو۔ وہ بلیک برڈ ون تھا۔ یہ بلیک برڈ ٹو ہے۔ یہ مخلوق ہمارے پاس تسلی بخش تعداد میں موجود ہے۔ یہ تم سے ختم نہیں ہوگی۔ ایک کو مارو گے، دوسرا آجائے گا۔ دوسرے کو مارو گے، تیسرا آجائے گا۔ یوں سمجھ لو یہ تو ہماری ایک پروڈکٹ ہے۔ ہمارے ایک کامیاب تجربے کا نتیجہ ہے جس کی تفصیل میں تمہیں فی الحال نہیں بتا سکتا۔"

"نہیں جاننا بھی نہیں چاہتا۔" میں نے منہ بنا کر کہا "صرف اتنا بتادو کہ تم بھی کوئی پروڈکٹ تو نہیں ہو؟ کسی کامیاب تجربے کا نتیجہ تو نہیں ہو؟ تم بھی اگر کسی دن کسی طرح جہنم رسید ہو گئے تو اسی طرح تمہارا کوئی دوسرا ہم شکل اپنی نحوست سمیت سامنے تو نہیں آجائے گا؟"

"بڑی دِلی تکلیف بول رہی ہے تمہارے لہجے میں۔" اس نے گویا میری اندرونی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ پھر اس نے سنجیدگی سے میرے سوال کا جواب دیا "بہرحال تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بالکل اکیلا ہوں۔ اپنی مثال آپ۔ میرا کوئی ثانی' کوئی ہم شکل شاید پوری دُنیا میں بھی موجود نہ ہو۔"

اس کے لہجے میں ہلکا سا فخر جھلک آیا "اے نن ایک نہایت منفرد شخصیت کا نام ہے اِنی پیارے! میں ریڈ ڈاٹ کا ایک قیمتی اثاثہ ہوں۔ میرا متبادل کوئی نہیں ہو سکتا۔"

"تم تو اکیلے ہی جس دن پیدا ہوئے ہوگے اُس دن اس دھرتی نے سوگ منایا ہوگا۔ تم جیسے ایک دو اگر اور پیدا ہو جاتے تو دُنیا میں ماتم برپا ہو جاتا۔" میں نے کہا۔ اُس سے باتیں کرتے وقت میرا ذہن مسلسل اس سوال میں اُلجھا ہوا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں نے اس امکان پر بھی غور کیا کہ اگر میں ان تینوں کو بھی ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاؤں تو کیا مجھے حقیقتاً کوئی فائدہ ہوگا؟

میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس سے بھی کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ یہاں کا ہر گوشہ اپنی جگہ ایک قید خانہ تھا۔ میں دیواروں سے سر ٹکرا کر مر سکتا تھا لیکن میکنزم سے واقفیت کے بغیر ایک قدم بھی باہر نہیں نکال سکتا تھا اور ایک دروازے کو بھی جنبش نہیں دے سکتا تھا۔ اگر میں ان میں سے دو کو ہلاک کر کے کسی ایک کو مجبور بھی کرتا کہ وہ مجھے باہر لے چلے' اور اسے یرغمال بنا لیتا تب بھی وہ کوئی گڑبڑ سکتا کر تھا۔ مجھے باہر لے جانے کے بجائے کسی اور سنگین مصیبت میں پھنسوا سکتا تھا۔ بلکہ زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ جان دے دے گا لیکن میرے اشاروں پر نہیں چلے گا۔ اس کے علاوہ اے نن اور بلیک برڈ کو خالی ہاتھوں سے ہلاک کرنا بھی شاید اتنا آسان کام ثابت نہ ہوتا جتنا بظاہر نظر آرہا تھا۔ دونوں لوہے کے چنے تھے۔ حتیٰ کہ وہ نرم و نازک اور پری نما شخصیت فیونا بھی تر نوالہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تو صرف ریموٹ کنٹرول تھا لیکن عین ممکن تھا اس کے ڈھیلے ڈھالے لبادے میں کچھ اور شعبدے پنہاں رہے ہوں۔

میں اسی فیصلے پر پہنچا کہ اپنے آپ کو خواہ مخواہ مصیبت میں ڈالنا مناسب نہیں تھا۔ جب تک وہ مجھ پر کوئی سختی یا جسمانی تشدد نہیں کر رہے تھے تب تک مجھے بھی پُرسکون ہی رہنا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا چاہیے تھا کہ اس بار وہ مجھ سے کیا چاہتے تھے۔

فیونا اس دوران بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اے نن اپنی ٹائی درست کرتے ہوئے بولا "چوہدری ڈیئر! تمہارے ساتھ یہی تو مسئلہ ہے.... تم نہ تو اپنی قدر سے واقف ہو اور نہ ہی میری قدر سے۔ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ تم جیسے اور مجھ جیسے انسان صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔"

"اب تم مجھے 'من ترا ملا بگویم تو مرا حاجی بگو' والی لائن پر لگانا چاہتے ہو۔ مجھے تو تم عام سا انسان ہی رہنے دو۔ میں اسی میں خوش ہوں۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر اٹھو اے عام سے انسان! میں تمہیں کچھ خاص انسانوں سے ملوانے لے چلوں۔" اے نن ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ اس کا ہاتھ دھات کے پنجے سے مشابہ معلوم ہوتا تھا۔ رنگت کچھ کچھ تانبے جیسی تھی۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ بلیک برڈ میرے عقب میں آن کھڑا ہوا۔

میں نے فیونا کی طرف جھکتے ہوئے عاشقانہ لہجے میں پوچھا "تم نہیں چلوگی جانِ تمنا؟"

میں نے یہ جملہ اردو میں بولا تھا۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اردو بھی سمجھتی تھی لیکن وہ بدستور انجان بنی' سپاٹ چہرہ لیے میری طرف دیکھتی رہی۔ اے نن قدرے بے تابی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "جب جانِ تمنا کو بلایا جائے گا تو وہ بھی آجائے گی۔ فی الحال تم تو چلو۔"

میں نے فیونا کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا جیسے مجھے اس سے جدا ہوتے وقت شدید صدمہ ہو رہا ہو۔ وہ قدرے شرمیلے سے انداز میں مسکرا دی۔ میں اے نن کے پیچھے چل دیا۔ اے نن نے بھی جیب سے ویسا ہی ایک ریموٹ کنٹرول سا نکالا جیسا فیونا کے پاس تھا۔

اے نن اور بلیک برڈ کے درمیان چلتے ہوئے میں ایک بار پھر اسی سیاہ دیواروں والی راہداری میں پہنچا۔ ان جگہوں کی ساخت اور ڈیزائننگ واقعی نہایت عجیب اور پُرذہانت تھی۔ ایک اجنبی قطعاً اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ کس سمت میں چل کر وہ کہاں پہنچے گا یا کس دیوار کے عقب میں کیا چیز ہے۔

اس بار مجھے ان دونوں کے ساتھ راہداری میں خاصی دور تک جانا پڑا۔ آخر کار ہم ایک سیاہ دیوار کے سامنے پہنچ کر رُک گئے۔ یہ دیوار دور سے دکھائی بھی نہیں دے رہی تھی۔ اس پر ننھا سا صرف ایک سُرخ بٹن موتی کی طرح اُبھرا ہوا تھا۔ اے نن نے اس پر انگلی رکھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم تیز روشنی میں نہا گئے۔

ایک لمحے کے لیے تو میری آنکھیں چندھیا گئیں اور مجھے اندازہ نہ ہو سکا کہ روشنی کہاں سے آرہی تھی مگر پھر نظر آیا کہ چھت میں ایک سفید دائرہ نمودار ہو چکا تھا جس سے کیمرے کی فلیش لائٹ جیسی تیز روشنی خارج ہو رہی تھی مگر دو تین سیکنڈ بعد ہی روشنی غائب ہو گئی۔ چھت دوبارہ سیاہ ہو گئی اور ہمارے سامنے لفٹ کے دروازے کی طرح ایک دروازہ کھل گیا۔

جس چیز میں ہم داخل ہوئے وہ لفٹ ہی معلوم ہوتی تھی لیکن کچھ عجیب ہی اُلجھن میں ڈالنے والی لفٹ تھی۔ جب دروازہ بند ہو چکا اور لفٹ حرکت میں آتی محسوس ہوئی تو یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ اوپر جا رہی تھی یا نیچے۔ ایک لمحے کے لیے نیچے جانے کا احساس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ اوپر جاتی محسوس ہوئی۔

چند سیکنڈ بعد ہی لفٹ ساکت ہو گئی اور دروازہ کھل گیا۔ لیکن یہ وہ دروازہ نہیں تھا جس سے ہم اندر داخل ہوئے تھے۔ اب اس کی مخالف سمت میں دروازہ کھلا تھا۔ اس سے نکل کر چند قدم چل کر ہم ایک اور سیاہ دیوار کے سامنے پہنچے۔ اس میں دروازے سے مشابہ' دُودھیا رنگ کی شیشے کی سی ایک اسکرین نظر آرہی تھی۔ اس کے عقب میں گویا دُودھیا رنگ کے دُھوئیں کے گہرے مرغولے چکرا رہے تھے۔

یہاں بھی اے نن نے ننھا سا ایک سُرخ بٹن دبایا۔ یہاں بھی اسی طرح دو تین سیکنڈ کے لیے ہم پر سفید چمکیلی روشنی پڑی جس طرح پہلے پڑ چکی تھی اور وہ سفید دُودھیا سا دروازہ کھل گیا۔ اس کے عقب میں واقعی کثیف دُودھیا دُھوئیں کے مرغولے چکرا رہے تھے۔ ان کے درمیان قدم رکھتے ہی مجھے ٹھنڈک کا احساس ہوا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ان مرغولوں کے سوا کچھ بھی نظر نہ آیا اور یوں محسوس ہوا جیسے میرے پاؤں نرم روئی میں دھنسے چلے جا رہے تھے۔

چند سیکنڈ بعد میرے قدم گویا سخت زمین پر جا ٹکے۔ ہم دُھوئیں کے گاڑھے سفید مرغولوں سے بھی نکل آئے اور میں نے اپنے آپ کو ویسے ہی طویل و عریض ہال میں کھڑے پایا جیسا میں ایک بار پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ جب مجھے پہلی بار ریڈ ڈاٹ کے ٹھکانے پر لے جایا گیا تھا۔ اس خاص مقام پر باس دن وغیرہ نے مجھ سے مذاکرات کیے تھے۔

یہاں بھی چھت کی جگہ مصنوعی آسمان تھا۔ ایک طرف بَل کھاتا پُل نما راستہ اونچائی پر کہیں تاریکی میں مدغم ہو رہا تھا۔ پہاڑیاں تھیں۔ ایک طرف بلند و بالا ایکیوریم تھا جو مصنوعی آسمان سے جُڑا محسوس ہو رہا تھا۔ اس میں خوب روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اندر بالکل سمندر کا سماں تخلیق کر دیا گیا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کا پانی کسی پہاڑی چشمے سے بھی زیادہ شفاف تھا۔ ہر چیز صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

یہاں بھی ایکیوریم کے سامنے ایک شاہانہ سی کرسی موجود تھی۔ ایک گوشے میں سفید کانفرنس ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ غرضیکہ ہر چیز ویسی ہی تھی جیسی میں پہلے دیکھ چکا تھا لیکن یہ جگہ بہرحال وہ نہیں تھی۔ ایک تو اس میں داخلے کا راستہ اور طریقہ مختلف تھا۔ دوسرے یہاں کی چیزوں کے سائز میں تھوڑا سا فرق تھا۔ یہاں کی ہر چیز پہلے والے "دربار" کے مقابلے میں ذرا بڑی نظر آرہی تھی۔

یہاں پہنچتے ہی گویا بلیک برڈ کی حیوانی جبلّت عُود کر آئی۔ یا پھر شاید اس کی کوئی اور وجہ تھی کہ وہ فوراً اپنی پینٹ' شرٹ' ٹائی اور جوگرز سمیت دو ٹانگوں پر چلتے چلتے یکدم چاروں ہاتھ پیروں پر آگیا اور قلانچیں بھرتا ہوا پُل نما راستے "کیٹ واک" پر جا چڑھا اور خاصی دور چلا گیا جہاں روشنی ذرا کم تھی۔ وہاں وہ کیٹ واک کی نیچی سی منڈیر پر اپنی مٹھی پر ٹھوڑی ٹکا کر فلسفیوں کے سے انداز میں بیٹھ گیا۔ شاید اس انداز میں بھی کوئی خاص مصلحت تھی۔

مجھے یاد تھا کہ بالکل اسی طرح میں نے پچھلی مرتبہ بلیک برڈ دن کو (اگر وہ واقعی بلیک برڈ دن تھا) کیٹ واک پر بیٹھے دیکھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ کہیں مَیں نیند میں تو نہیں تھا؟ کہیں میرا ذہن تھوڑی بہت تبدیلیوں کے ساتھ اس منظر کو خواب کی صورت میں دُہرا تو نہیں رہا تھا؟

اے نن میرے تاثرات دیکھ کر گویا میرے خیالات پڑھتے ہوئے بولا "یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں تم پہلے گئے تھے اور نہ تم خواب دیکھ رہے ہو۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میری معلومات میں یہ بیش بہا اضافہ مت کرو۔" میں نے بیزاری کا اظہار کرنے کی کوشش کی' پھر ایکیوریم وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ سب کچھ تمہارا ٹریڈ مارک ہے کیا؟ اس جگہ یہ تمام چیزیں موجود ہونا۔ اور یہ اسی انداز کی سیٹنگ وغیرہ ضروری ہے کیا؟"

"ہاں" اس نے اثبات میں سر ہلایا اور مجھے کانفرنس ٹیبل پر بیٹھنے کا اشارہ کیا "اس میں کچھ سائنسی مصلحتیں بھی ہیں اور کسی کی ذاتی پسند کا دخل بھی۔ سائنسی مصلحتیں تمہاری سمجھ میں نہیں آئیں گی اور ذاتی پسند کس کی ہے' یہ مَیں تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "ایک بات البتہ تمہیں بتا دیتا ہوں۔ یہ ساری جگہ جس کے کچھ حصوں سے تم گزر کر آرہے ہو اور کچھ حصے ابھی تمہاری نظر سے پوشیدہ ہیں' مکمل طور پر ایٹمی حملے تک سے محفوظ ہے۔ اس پر ایٹم بم براہِ راست بھی مارا جائے تب بھی اس کے کسی حصے کا کچھ نہیں بگڑے گا اور اس کے اندر موجود تمام جاندار زندہ رہیں گے۔"

"ہاں' اگر خدا نے ان کی زندگی لکھی ہوگی تو۔" میں نے گویا تصحیح کی۔

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے ایک بار پھر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس جگہ کے باقی حصوں کی طرح اس حصے کا بھی سر پیر سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کون سی چیز کہاں سے شروع ہو رہی تھی' کہاں ختم ہو رہی تھی اور کس گوشے میں نظر آنے والی چیزوں کے علاوہ بھی کیا کچھ تھا جو نظر سے اوجھل تھا؟

"یہ تمام تعمیرات زیرِ زمین ہیں نا؟" میں نے دریافت کیا۔

"ضروری نہیں ہے۔" وہ مبہم انداز میں مسکرایا۔ میں سمجھ گیا وہ مجھے اس سلسلے میں کنفیوژن اور بے یقینی میں ہی مبتلا رکھنا

چاہتا تھا۔

میں نے کیٹ واک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ جو بلیک برڈ اس کیٹ واک کی بلندی پر نیم تاریکی میں جا بیٹھتا ہے کیا اس کی بھی کوئی سائنسی وجہ ہے؟" میرا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"ہاں" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا "وہاں بیٹھ کر وہ کچھ چیزوں پر نظر رکھتا ہے' کچھ چیزوں کو کنٹرول کرتا ہے۔ جو کچھ اسے وہاں بیٹھ کر نظر آتا ہے وہ تم یہاں بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتے۔"

"تم نے تو میرے تجسس کو ہوا دے دی ہے۔ میں ذرا دیکھ کر آتا ہوں وہاں سے کیا نظر آتا ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اے نن کا آہنی سا پنجہ سختی سے میرے بازو پر آجما "آرام سے بیٹھ جاؤ۔" وہ بولا۔

"یہاں بغیر اجازت... اور بغیر کسی کی رہنمائی کے دو قدم بھی کسی طرف چلنے کی کوشش نہ کرنا۔ تمہارا انجام عبرت ناک ہو سکتا ہے اور فی الحال ہم نے تمہیں ضائع کرنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ تم سمجھ رہے ہو کہ جس طرح بلیک برڈ زقندیں بھرتا ہوا کیٹ واک پر چلا گیا ہے اسی طرح تم بھی چلے جاؤ گے؟ نہیں پیارے! اس خوش فہمی میں مت رہنا۔ کیٹ واک پر چند قدم چلتے ہی تم فٹ بال کی طرح اونچا اچھل کر سر کے بل نیچے آجاؤ گے۔ ہوا میں اچھل کر سر کے بل نیچے آنے کا مطلب سمجھتے ہو نا؟"

میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اے نن میرے قریب بیٹھتے ہوئے مناصحانہ سے لہجے میں بولا "تم نے خواہ مخواہ اپنے آپ کو الجھن میں ڈال رکھا ہے اگر تم نے ہماری بات مان لی ہوتی تو آج یہ جگہ اور دوسری نہ جانے کتنی اہم جگہیں' تمہارے لیے اپنے گھر کی طرح ہوتیں۔"

"اتنی حسرت نہیں ہے مجھے ان جگہوں کو اپنے گھر کی طرح سمجھنے کی۔" میں نے بے نیازی ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"تم وہ رسی ہو جو جل جاتی ہے مگر اس کے بل نہیں جاتے۔" اے نن ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"رسیاں کبھی ایسی ہی ہوتی ہیں اے نن پیارے! جلنے کے بعد جن کے بل چلے جاتے ہیں وہ درحقیقت رسیاں نہیں ہوتیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب اپنی چونچ بند رکھو۔ باس آرہے ہیں۔ ہو سکے تو احتراماً کھڑے ہو جانا۔ تمہارے حق میں اس کے نتائج خوشگوار ہوں گے۔" اے نن اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ اس کی رسٹ واچ چھوٹی سی تھی جیسی عموماً عورتیں باندھتی ہیں اور اس کا ڈائل بھی بظاہر گھڑیوں ہی کی طرح نظر آرہا تھا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے کہیں سے باس یا کوئی اور آتا دکھائی نہیں دیا۔ معلوم نہیں اے نن کو کیسے باس کی آمد کا احساس ہو گیا تھا۔ شاید وہ صرف وقت دیکھ کر اتنے یقین سے بات کر رہا تھا۔

چند لمحے وہ گھڑی کی طرف ہی دیکھتا رہا جیسے اس میں کوئی تصویر نظر آرہی ہو۔ پھر وہ نہ جانے کس نادیدہ ہستی کے احترام میں اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے متوقع سی نظروں سے میری طرف دیکھا لیکن میں نے اپنی جگہ سے جنبش نہیں کی۔ وہ ناگواری سے بڑبڑایا "کاش تم اتنے سرکش نہ ہوتے۔"

"میری سرکشی ہی تو میرا سرمایہ ہے پیارے!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

اسی لمحے میں نے کیٹ واک کے نیچے کافی فاصلے پر ایک اندھیرے گوشے سے دو افراد کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ ذرا روشنی میں آئے تو میں نے دیکھا ان میں سے ایک تو نہایت معززانہ حلیے کی عمر رسیدہ سفید فام عورت تھی۔ دوسرا ایک دراز قد شخص تھا جو نفیس قسم کے سوٹ میں تھا۔ لیکن اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر میں گہری سانس لے کر رہ گیا کیونکہ وہاں چہرہ نہیں' وہی فٹ بال سے بھی ذرا بڑے سائز کا ایک انڈا رکھا ہوا تھا جو میں اس سے پہلے بھی ایک مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس انڈے پر ناک منہ کی جگہ نہایت جلی انداز میں سیاہ رنگ میں انگریزی کا دو کا ہندسہ دکھائی دے رہا تھا۔ یہ یقیناً باس ٹو تھا۔

میں نے نیچی آواز میں اے نن سے پوچھا "یار! یہ تمہارے باسوں کی سیریز کتنے نمبر تک چلے گی؟"

اے نن نے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا گویا میری اس گستاخی پر مجھے قتل کر ڈالنا چاہتا ہو حالانکہ میرے خیال میں ابھی میری آواز باس ٹو اور اس عمر رسیدہ عورت تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ وہ نہایت پُرسکون اور باوقار انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہماری طرف آرہے تھے۔ کسی بے چہرہ شخص کی عمر کا اندازہ کرنا ذرا مشکل ہی تھا' خصوصاً جب وہ تھری پیس سوٹ میں ہو۔ تاہم جسمانی ساخت اور چال ڈھال سے وہ نہ صرف جوان بلکہ نہایت مضبوط بھی معلوم ہوتا تھا۔

باس ون سے میری ملاقات کے موقعے پر عمر رسیدہ عورت کے علاوہ ایک عمر رسیدہ مرد بھی موجود تھا۔ اس بار صرف عورت ہی تھی اور یہ عورت بھی دوسری تھی۔ وہ ہاتھ میں پرس لیے ہوئے تھی لیکن جب وہ قریب آئی تو معلوم ہوا کہ وہ پرس نہیں بلکہ کتاب کی سائز کا ایک کمپیوٹر تھا جو اس نے اپنے سامنے میز پر رکھ لیا۔

بیٹھنے سے پہلے باس ٹو کے انڈا نما سر سے آواز اُبھری "کیسے ہو مسٹر افضل چوہدری؟" سوال اس نے انگریزی میں کیا تھا۔ اس نے گڈ مارننگ یا گڈ ایوننگ وغیرہ نہیں کہا تھا جس سے مجھے وقت کا کچھ اندازہ ہو سکتا تھا۔ اس جگہ وقت کا اندازہ کرنا بہت مشکل تھا۔ وہاں جو سماں دکھائی دیتا تھا اس سے یہ بھی سمجھا جا سکتا تھا کہ وہ رات کا وقت تھا۔ گو کہ وہاں کوئی بتی جلتی دکھائی نہیں دیتی تھی تاہم اسے دن بھی سمجھا جا سکتا تھا۔

میری گھڑی البتہ میری کلائی پر ہی بندھی ہوئی تھی جس سے

مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میں تقریباً دو گھنٹے بے ہوش رہا تھا اور اس کے بعد بھی تقریباً ایک گھنٹا مجھے یہاں گزر چکا تھا۔ اس حساب سے اب وقت رات تھی۔ میری گھڑی بتا رہی تھی کہ رات کے دس بجنے کو تھے۔ میری صرف گھڑی ہی نہیں' تقریباً ہر چیز میرے پاس ہی موجود تھی۔ صرف میری پنڈلی سے بندھا ہوا خنجر غائب تھا۔ اس کی نیام جوں کی توں بندھی ہوئی تھی۔ کوٹ کی اندر کی جیب میں مشین پسٹل بھی موجود تھا لیکن وہ کچھ ہلکا ہلکا لگ رہا تھا جس سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس میں سے میگزین نکالا جا چکا تھا۔

باس ٹو بیٹھ چکا تو میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا "میں تم لوگوں کی تمام تر خباثتوں اور ذلالتوں کے باوجود زندہ سلامت اور ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

باس ٹو کی آواز گویا کسی نہایت عمدہ قسم کے اسپیکر پر اُبھری "زندہ سلامت تم اس لیے ہو کہ ہم نے ابھی تمہیں مارنے کا فیصلہ نہیں کیا اور ٹھیک ٹھاک اس لیے ہو کہ ابھی ہم نے تم پر ہاتھ ہلکا رکھا ہے۔"

"غلط" میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "زندہ سلامت میں اس لیے ہوں کہ اوپر والے نے مجھے مارنے کا فیصلہ نہیں کیا اور ٹھیک ٹھاک بھی میں اسی لیے ہوں کہ اوپر والے نے ابھی اپنے دستِ کرم کا سایہ میرے سر سے نہیں ہٹایا۔"

"اوہ مائی گاڈ!" باس ٹو کے لہجے میں صاف طور پر بے زاری جھلک آئی "معلوم ہوتا ہے تمہاری کھوپڑی میں خاصی تعداد میں مذہبی جراثیم پیدا ہوتے جا رہے ہیں مسٹر چوہدری! یہ کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔"

"مذہبی جراثیم کے بغیر انسان کا گزارا کہاں ہے ڈیئر باس ٹو!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر مشفقانہ انداز میں کہا "اور کچھ نہ سہی لیکن کم از کم خدا پر اور اس کے رحم و کرم پر تو یقین رکھنا ہی پڑتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ تم نے بے زاری کے اظہار کے لیے بھی جو جملہ بولا وہ یہی تھا "اوہ مائی گاڈ!" یہ گاڈ کا ذکر کیے بغیر تمہارا بھی گزارا نہیں ہے۔" میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"میرا وقت بہت قیمتی ہے مسٹر چوہدری! میں اسے اس قسم کی بحث میں ضائع کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میں صرف اس موضوع پر بات کرنا چاہوں گا جس کے لیے تمہیں یہاں لانے کی زحمت کی گئی ہے۔"

"ارشاد... ارشاد" میں نے نہایت مؤدب ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ بے چہرہ انسان کے تاثرات نہیں دیکھے جا سکتے تھے۔ معلوم نہیں اس نے میرے استہزائیہ انداز پر کیا محسوس کیا تھا۔ عمر رسیدہ عورت نے اپنا کمپیوٹر نما آلہ اپنے سامنے رکھ کر بیٹھتے ہی اس کے کنسول نما حصے پر بنے ہوئے چند چمکیلے سے خانوں کو چھوا تھا اور اب اس کی چھوٹی سی اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ جس پر تیزی سے کچھ اعداد و شمار اور علامات نمودار ہو رہی تھیں اور غائب ہو رہی تھیں۔ اس انہماک سے وہ نہ جانے کس حساب کتاب میں لگی ہوئی تھی۔

باس ٹو جب بولا تو اس کا لہجہ سپاٹ تھا۔ وہ گویا مجھے میری فردِ جُرم سناتے ہوئے تاریخ' جگہ اور وقت کا حوالہ دیتے ہوئے بولا "اس رات تمہارے یا تمہاری دوست کے ہاتھوں ہمارا بلیک برڈ ون مارا گیا تھا۔ یہ ایک سنگین جُرم تھا لیکن ہم نے ابھی تک تمہیں یا تمہاری دوست کو اس کی کوئی سزا نہیں دی۔"

"میری آنے والی نسلیں اس کے لیے تمہاری احسان مند رہیں گی۔ بشرطیکہ وہ آنے میں کامیاب ہو سکیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ میرے الفاظ پر توجہ دیے بغیر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ریڈ ذات سے تعلق رکھنے والا اگر کوئی جانور بھی مارا جائے تو ہم اسے ایک سنگین واقعہ شمار کرتے ہیں البتہ اِدھر اُدھر کے کچھ لوگ یا تمہارے اپنے ملک کے باشندے جن کا ریڈ ذات سے کوئی باقاعدہ تعلق نہیں ہوتا' جن کی خدمات ہم کسی نہ کسی ذریعے سے ان ڈائرکٹ طور پر عارضی ضروریات کے لیے حاصل کرتے ہیں۔ ان کی موت کی ہمیں کوئی پروا نہیں ہوتی۔ ان میں دوسرے ممالک کے باشندے بھی شامل ہوتے ہیں۔ انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا کہ درحقیقت وہ ریڈ ذات کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ان کی حیثیت ہمارے لیے قربانی کے بکروں کی سی ہوتی ہے۔"

"یہ بتانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "ہم اور ہم جیسے نہ جانے کتنے ممالک کے باشندے ہمیشہ سے ہی تم جیسے ترقی یافتہ' سازشی اور بدمعاش قسم کے ممالک کے لیے قربانی کے بکرے ہی رہے ہیں۔"

"جذباتی تقریروں اور مکالموں سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا مسٹر چوہدری!" اس کے لہجے میں بیزاری اور حقارت تھی "تم لوگوں کو ایک دوسرے کا گلا کاٹنے سے فرصت ملے تو کبھی اس ضمن میں بھی کوششیں کرنا کہ دوسروں کو تمہیں قربانی کا بکرا بنانے کا موقع نہ ملے۔ فی الحال اس بحث کا موقع نہیں ہے۔ ہم نے تمہیں ایک نئی پیشکش کے بارے میں مذاکرات کے لیے بلوایا ہے۔"

"تم لوگ بھی کسی ضدی دکاندار سے کم نہیں ہو۔ یکے بعد دیگرے نئی سے نئی پیشکشیں کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہ صرف دوسری پیشکش ہے اور شاید یہی آخری پیشکش بھی ثابت ہو۔ اس پر تمہاری زندگی' تمہارے مستقبل' تمہاری ہر چیز کا دارومدار ہے۔" باس ٹو کی گونجیلی آواز اُبھری۔

"خیر سُن لیتے ہیں دوسری پیشکش بھی۔ سُن لینے میں کیا حرج ہے۔" میں نے بظاہر بے پروائی سے کہا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو چکی تھیں۔

باس ٹو نے ایک لمحے توقف کیا پھر بولا "پچھلی مرتبہ تمہیں جو پیشکش کی گئی تھی تم نے اسے قبول نہیں کیا بلکہ تمام ہدایات کی خلاف ورزی بھی کی۔ اس پر تمہیں سزائے موت دی جاسکتی تھی۔ لیکن مصلحتاً اس پر عمل درآمد روک دیا گیا لیکن وہ ایک معطل شدہ سزا ہے' کسی وقت بھی تمہیں دی جاسکتی ہے۔"

اس کا لہجہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی بااختیار عدالت کا جج ہو اور باقاعدہ قانونی اصطلاح میں SUSPENDED SENTANCE کی بات کررہا ہو۔ ان لوگوں کے انداز گفتگو پر میری عقل چکرا جاتی تھی۔ وہ بالکل اس طرح بات کرتے تھے جیسے کسی نامعلوم عالمی آئین کے تحت انہیں دُنیا کے ہر فرد اور ہر ملک کے بارے میں لامحدود اختیارات حاصل ہوں اور وہ نہایت سنجیدگی سے انہی کے تحت جو کام مناسب سمجھتے ہوں وہ انجام دیتے چلے جارہے ہوں۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس معطل شدہ سزا کو مذاق نہ سمجھنا۔ وہ ایک تلوار کی طرح تمہارے سر پر لٹکی ہوئی ہے۔ دوسری سزائیں بھی ہم نے تمہیں ہلکی پھلکی ہی دیں۔ ابھی ان کا دائرہ وسیع نہیں کیا گیا حالانکہ تمہارا جُرم بہت سنگین تھا۔ تم دوڑے دوڑے خُفیہ ایجنسیوں کے پاس چلے گئے تھے۔ وہ توغنیمت رہا کہ ہماری توقعات کے عین مطابق انہوں نے تمہاری کہانی پر یقین نہیں کیا اور اُلٹا تم ہی ان کی نظر میں مشکوک ٹھہرے۔۔۔"

میری رگ و پے میں سنسنی دوڑ گئی۔ گویا انہیں یہ تک معلوم تھا کہ میری کہانی پر ایجنسیوں کا ردِعمل کیا رہا تھا۔ نفیس صاحب نے آج دوپہر ہی کی میٹنگ میں ذرا کھل کر میری ذات کو مشکوک قرار دیا تھا اور میرے بارے میں تیار شدہ فائل کا خلاصہ مجھے سنایا تھا۔ انہوں نے آج ہی کی میٹنگ میں اس شک کا بھی اظہار کیا تھا کہ میرے خلاف ہونے والی کارروائیاں شاید کسی قسم کی گینگ وار کا نتیجہ ہوں۔۔۔ اور یہ سب باتیں شاید ساتھ کے ساتھ ہی ریڈ ڈاٹ کو معلوم ہوچکی تھیں۔

یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ اس احساس سے میری رگ و پے میں سنسنی دوڑتا بجا تھا۔ دونوں مرتبہ میرے ساتھ میٹنگ میں خُفیہ ایجنسیوں کے جو لوگ شریک ہوئے تھے وہ ٹاپ کے عہدیدار تھے۔ ان سب کی قومی خدمات کا ایک طویل پس منظر تھا اور ملک کو پس پردہ چلانے والے ڈھانچے میں ان سب کی' اپنی اپنی جگہ ایک اہمیت تھی۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک اہم ستون تھا۔

کیا ان میں سے بھی کوئی ریڈ ڈاٹ کا ایجنٹ تھا جو ہر بات کی مخبری کررہا تھا؟ نہ جانے کیوں میرا اس بات پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ مجھے ان سب کے چہروں پر خلوص اور دیانتداری کی چمک نظر آئی تھی۔ ان میں سے کوئی بھی بکا ہوا آدمی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ سچے اور دیانتدار آدمی کی صورت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ انہوں نے میری کہانی پر یقین نہیں کیا تھا۔ یہ ایک الگ بات تھی۔ یہ ان کے تجربے اور فہم کا مسئلہ تھا لیکن دیانتداری اس سے الگ تھلگ ایک چیز تھی۔ مجھے ان میں سے کسی کے چہرے پر غداری کی پرچھائیاں نظر نہیں آئی تھیں لیکن لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی کی صورت پر نہیں جانا چاہیے۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے نفیسہ نے بھی کہا تھا' صورت پر نہیں جانا چاہیے صورتیں اکثر دھوکا دیتی ہیں۔

میں نے اپنے لہجے میں توانائی اور خوش دلی کا تاثر سمونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تمہیں یہ خوش فہمی کیونکر ہوئی کہ ایجنسیوں نے میری کہانی پر یقین نہیں کیا اور اُلٹا ان کی نظر میں میری ذات مشکوک قرار پاچکی ہے؟"

"اس بات کو چھوڑو" باس ٹو نے ہاتھ ہلایا "تم اس چکر میں مت پڑو کہ ہمیں انتہائی اندر کی باتیں بروقت کیسے معلوم ہوتی ہیں۔ یہ سوال تمہیں بہت زیادہ الجھنوں میں ڈالے رکھے گا اور تم کبھی صحیح جواب نہیں جان پاؤ گے۔"

"ایجنسیوں میں تمہارا کوئی مخبر موجود ہے؟" میں نے باس ٹو کے چہرے کی جگہ موجود انڈے کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ میں نے یہ محض سوال برائے سوال کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ اس کا صحیح جواب تو نہیں دے سکتا تھا۔

"نہیں۔ ایجنسیوں میں ہمارا کوئی مخبر نہیں۔" باس ٹو نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا "فی الحال ہمیں وہاں مخبر کی ضرورت نہیں پڑی۔ جب پڑے گی تو کوئی نہ کوئی تلاش کرلیں گے۔ اگر کوئی نہ ملا تو ہم اپنا کوئی نہ کوئی آدمی کسی نہ کسی طرح کسی ایجنسی میں داخل کردیں گے۔"

میں نے سوچا ممکن ہے جس سطح کے لوگوں کی ساتھ میری میٹنگ رہی تھی ان میں کوئی ریڈ ڈاٹ کا ایجنٹ نہ ہو لیکن نچلی سطح پر کہیں کوئی کمزور کڑی موجود ہو' کوئی ایسی جگہ جہاں رپورٹیں تیار ہوتی ہوں' کوئی ایسی میز جہاں کاغذات فائلوں میں ترتیب پاتے ہوں' کوئی ایسا فرد جو بظاہر نہایت معمولی نہایت غیر اہم نظر آتا ہو لیکن جس سے کوئی خُفیہ ہاتھ بہت اہم کام لے سکتا ہو۔

باس ٹو بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر ایجنسیاں تمہاری کہانی پر یقین کرکے ہماری طرف متوجہ ہوجاتیں اور ہمارا کوئی سُراغ ان کے ہاتھ آجاتا تو یہ تمہارے حق میں بہت بُرا ہوتا۔ تم پر ہمارا غیظ و غضب بہت بڑھ جاتا۔ پھر شاید تمہاری معطل شدہ سزا معطل نہ رہتی۔ اگر تم زندہ بھی رہتے تو شاید اس طرح آرام سے ہمارے سامنے بیٹھے نیم سنجیدگی سے بات چیت نہ کررہے ہوتے۔ تمہاری زندگی واقعی نمونۂ عبرت بن چکی ہوتی۔ کم از کم ابھی تک تو تم نے کوئی بہت سنگین نقصان نہیں اٹھایا۔"

"کشادہ دلی ہے تمہاری۔ ورنہ بندہ تو بہت شرپسند واقع ہوا ہے۔" میں نے انکساری سے کہا۔

وہ میری غیر سنجیدگی کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا "ممکن ہے تمہیں کبھی احساس ہوا ہو کہ ہماری بات نہ مان کر تم نے اچھا نہیں کیا لیکن وہ پیشکش اب تمہیں دوبارہ نہیں کی جاسکتی۔ معافی کی ہمارے ہاں کوئی گنجائش نہیں۔ تم نے اپنے آپ کو ناقابلِ اعتبار ثابت کردیا ہے۔ اس لیے اب تمہیں اس بڑے منصب کے لیے تو منتخب نہیں کیا جاسکتا جو ہم نے تمہارے لیے ذہن میں رکھا ہوا تھا۔"

"اللہ کا بڑا کرم ہے جو اس نے مجھے اس "عظیم منصب" سے بچالیا" میں نے اطمینان کی طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"بدنصیب ہو تم!" وہ گویا مجھ پر ترس کھاتے ہوئے بولا "نہ جانے کن تصوّرات میں الجھے رہتے ہو۔ زمانے کے ساتھ نہیں چل رہے۔ اپنا بُرا بھلا نہیں سمجھ رہے۔"

"درست ہے" میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "میں ذرا قدامت پرست سا آدمی ہوں۔ دولت' طاقت اور وقتی اقتدار کے لیے ابھی میں نے ملک و قوم' ضمیر' غیرت اور اپنی سوچ کا سودا کرنا نہیں سیکھا۔ ابھی میں ترقی کی یہ "اونچی" منزلیں طے نہیں کرسکا۔"

"تمہاری یہی بَخ تو ابھی تک ہماری سمجھ میں نہیں آئی۔ تمہارے ماضی کو دیکھتے ہوئے ہمارا اندازہ تھا کہ تم نہایت ہی آسانی سے ہماری پیشکش قبول کرنے پر آمادہ ہوجاؤ گے لیکن تم اندر سے ضمیر پرست' انا پرست' وطن پرست اور نہ جانے کیا کچھ نکل آئے۔ جبکہ تمہاری سوسائٹی میں نہایت سستے داموں بکنے والے نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لو کہ دُنیا کے سب سے طاقتور ملک میں صدر کا انتخاب ہوجاتا ہے اور خون کا ایک قطرہ تک نہیں بہتا لیکن تمہارے ہاں کونسلر کی سیٹ کے لیے ایک گروہ دوسرے گروہ کو گولیوں سے بھوننے کے لیے' کتنے ہی گھروں کے چراغ بجھا دینے کے لیے' کتنے ہی انسانوں کو اپاہج و معذور بنادینے کے لیے' کتنے ہی گھروں کو پھونک ڈالنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟"

"کیا ثابت ہوتا ہے؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"یہی کہ تمہارے ہاں لوگ معمولی معاوضے لے کر' اپنے لیڈروں کی جھوٹی تقریریں سُن کر اور احمقانہ نظریات اور فلسفوں کے پرچار سے متاثر ہوکر ایک دوسرے کو فنا کردینے پر تلے رہتے ہیں۔ ہمیں یہاں اپنا کام کرنا بہت آسان محسوس ہوا ہے۔"

"لیکن یہاں مجھ جیسے لوگ بھی تو پائے جاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں" باس ٹو نے ٹھنڈی سانس لی "یہ پہلا موقع ہے کہ ہمارا اندازہ اس بُری طرح غلط ثابت ہوا ہے۔"

"تو پھر اب میرے لیے کیا حکم ہے؟" میں نے مصنوعی عاجزی سے پوچھا۔

"ہم نے سوچا کہ تمہیں جاں بخشی کی ایک اور پیشکش کرکے دیکھ لیں۔ شاید بات تمہاری عقل میں آہی جائے۔ ورنہ انجام تو

تمہارا خراب نظر آ ہی رہا ہے۔" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی نادیدہ آنکھوں سے بغور میرا جائزہ لے رہا تھا۔

میں خاموش رہا تو وہ بولا "اگر تم ہمارا ایک چھوٹا سا کام کردو تو تمہارے سر پہ لٹکتی ہوئی معطل شدہ سزا کی تلوار ہٹ جائے گی۔ ہم تمہاری جان بھی بخش دیں گے۔ اور تمہیں دوسرے نقصانات کے ذریعے سبق سکھانے کا سلسلہ بھی ترک کردیں گے۔ یعنی ہم مکمل طور پر تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔ اس کے بعد اگر تم نے ہمارے بارے میں کوئی شرارت نہ کی' ہماری کہانی لے کر اِدھر اُدھر بھاگے نہ پھرے تو ہم تمہیں بالکل معاف کردیں گے۔ ہم تمہیں بالکل بھول جائیں گے۔ تم بھی سمجھنا کہ ہم سے کبھی ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ تم نے محض ایک خواب دیکھا تھا۔"

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ تم مجھ سے کوئی کام لیے بغیر مجھے ایسا سمجھ لینے کی اجازت دے دو؟" میں نے درخواست کی۔

"نہیں۔ تمہیں ہمارا کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا کام تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہم نے تمہارے چکر میں بہت وقت' بہت رقم اور بہت اِنرجی برباد کی ہے۔" باس ٹو نے جواب دیا۔

"اس کی میں نے تو تم سے درخواست نہیں کی تھی۔" میں نے ملائمت سے کہا "یہ تو تاوان طلب کرنے والی بات ہوگئی کہ کسی کو اغوا کرکے کہا جائے کہ اسے اتنی رقم کی ادائیگی تو ہرحال میں کرنی ہی ہوگی کیونکہ اسے اغوا کرنے پر بہت محنت ہوئی ہے۔"

"یہی سمجھ لو" باس ٹو نے اطمینان سے جواب دیا۔

"اُف خدایا" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا "ہم تو مقامی دہشت گردوں سے ہی عاجز تھے' ہم سے تو انہی کا علاج نہیں ہورہا تھا۔ اب یہ بین الاقوامی دہشت گردوں اور دھونس جمانے والوں کا علاج کون کرے گا!"

"تمہیں اس فکر میں دُبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ ویسے بھی ہم اپنا علاج کروانے نہیں بلکہ خود پوری دنیا کا علاج کرنے آئے ہیں۔ جب ہم اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجائیں گے تو دُنیا میں ایک آئیڈیل حکومت قائم ہوجائے گی۔ پوری دُنیا میں صرف ایک ہی حکومت ہوگی' اس کا ایک ہی آئین ہوگا۔ ایک ہی مشینری دُنیا کا نظام چلائے گی۔ ہرکوئی اپنی اپنی ڈفلی پر اپنا اپنا راگ نہیں بجائے گا' ہرکوئی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بناکر نہیں بیٹھے گا۔ دُنیا سے بے شمار فضولیات کا خاتمہ ہوجائے گا۔ ان "فضولیات" میں انسان بھی شامل ہیں اور ممالک بھی۔ قوانین بھی شامل ہیں اور نظام بھی۔ سرحدیں بھی شامل ہیں اور افواج بھی۔ بہت کچھ ختم ہوگا تب ایک تعمیرِنو کی صورت پیدا ہوگی۔ زمین پر بوجھ بہت بڑھ گیا ہے۔"

میں نے استہزائیہ سی ہنسی کے ساتھ کہا "یوں کہو کہ تم اس دُنیا کا نظام قدرت کے ہاتھوں سے اپنے ہاتھ میں منتقل کرنا چاہتے ہو۔ مشکل کام ہے جناب باس ٹو صاحب! لیکن خیر۔ یہ بتایئے اس خادم کے لیے کیا حکم ہے؟ اس حقیرِ پُرتقصیر سے کون سا عظیم کام لینا چاہتے ہیں آپ؟"

"عظیم کام ہے تو تم فرار حاصل کرچکے ہو۔ اب تو صرف ایک حقیر سا کام ہے۔" باس ٹو نے قریب بیٹھی عمر رسیدہ عورت کو ہاتھ سے اشارہ کیا۔ باس ٹو کا انڈا نما سر اِدھر اُدھر نہیں گھومتا تھا۔ اس وجہ سے وہ اور بھی زیادہ عجیب محسوس ہوتا تھا۔

عمر رسیدہ عورت نے اثبات میں سر ہلایا اور چھوٹے سے کمپیوٹر پر تیزی سے انگلی چلائی۔ کمپیوٹر سے ہلکی سی "بیپ بیپ" کی آواز آئی۔ یہ گویا سگنل تھا۔ عورت نے کمپیوٹر پر جھکتے ہوئے دھیمی آواز میں چند الفاظ بولے جو میرے لیے ناقابلِ فہم تھے۔ وہ شاید اسے ٹیلی فون یا انٹرکام کی طرح رابطے کے ایک ذریعے کے طور پر بھی استعمال کررہی تھی۔

پھر وہ منتظر نظروں سے اس طرف دیکھنے لگی جس طرف سے کچھ دیر پہلے وہ خود باس ٹو کے ساتھ آئی تھی۔ میں بھی غیرارادی طور پر اسی طرف دیکھنے لگا۔

چند لمحے بعد اندھیرے کی کوکھ سے جو شخص برآمد ہوا وہ شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ اس کے ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ نہایت پُروقار انداز میں چلتا ہوا جب وہ ہلکی روشنی میں پہنچا تو میں حیرت کے باعث کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ ابھی وہ تیز روشنی میں نہیں پہنچا تھا لیکن میں نے اسے پہچان لیا تھا۔

وہ وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب تھے۔ وہ تنہا ہی تھے اور بڑے اطمینان سے چلے آرہے تھے۔ انہیں پہچانتے ہی میرے ذہن پر بے شمار سوالات نے یلغار کردی۔ حفیظ صاحب بھلا یہاں کیا کررہے تھے؟ وہ یہاں اپنی مرضی سے آئے تھے یا انہیں بھی میری طرح بے خبری میں لایا گیا تھا؟

وہ تنہا تھے اور ان کی چال سے بے پناہ طمانیت کا بھی اظہار ہورہا تھا۔ اس سے تو کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں اپنی مرضی سے ہی موجود تھے اور یہاں کے راستوں سے بھی واقف تھے ورنہ کوئی نیا آدمی تو رہنمائی کے بغیر ان بھول بھلیوں میں چند قدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔

تو کیا حفیظ صاحب بھی درپردہ ریڈ ڈاٹ کے ....؟ اس سے آگے میرا ذہن نہ سوچ سکا کیونکہ یہ سوال ذہن میں اُبھرتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔

کانفرنس ٹیبل کے قریب پہنچ کر حفیظ صاحب نے سگار منہ سے نکال لیا اور مؤدبانہ سے انداز میں کھڑے ہوگئے۔ باس ٹو نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ تب وہ بیٹھے۔ ان جیسے آدمی کا یہ مؤدبانہ انداز میری سمجھ سے بالاتر تھا۔

وہ خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ تب میں نے گہری نظر سے ان کا جائزہ لیا اور مجھے کئی عجیب سی باتوں کا احساس ہوا۔ ایک تو

[ان ک]ا چہرہ حد سے زیادہ سپاٹ تھا۔ دوسرے ان کی نظر مجھ سے ملی [ت]بھی ان کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے بھی شناسائی کا ہلکا سا [ر]نگ نہیں ابھرا تھا۔ تیسرے وہ سگار گویا محض رسماً پی رہے [تھے]، سگار کے عادی یا رسیا معلوم نہیں ہوتے تھے۔ میں نے حفیظ [صاح]ب کا بہت قریب سے مشاہدہ کیا تھا۔ ان کی طرح "محبت" اور [انہما]ک سے سگار پیتے میں نے کم ہی لوگوں کو دیکھا تھا۔

اس قسم کی چھوٹی چھوٹی خصوصیات انسان کی فطرتِ ثانیہ بن [جاتی] ہے لیکن انہیں کوئی بہت قریب سے جاننے والا' بہت گہری [قوتِ] مشاہدہ رکھنے والا یا پہلے سے ذہن میں شکوک و شبہات رکھنے [والا] ہی محسوس کرسکتا تھا۔

باس ٹو کا رُخ میری ہی طرف تھا۔ اس کی مخصوص گونجیلی سی [آو]از اُبھری "تمہیں یہ جان کر یقیناً حیرت ہوئی ہوگی کہ تمہارے [وزی]رِ خارجہ حفیظ صاحب بھی ہمارے ہی آدمی ہیں۔"

[م]یرے اعصاب میں پیدا ہونے والا ارتعاش اب ختم ہوچکا تھا۔ [میں] نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "نہیں' مجھے قطعاً حیرت نہیں [ہوئی] کیونکہ یہ حفیظ صاحب نہیں ہیں۔"

میں نے پہلی بار باس ٹو کا کھنکتا ہوا سا قہقہہ سنا۔ اسے [میر]ے جواب سے مایوسی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تو شاید اس سے کچھ [خوش] ہوا تھا۔

"مجھے خوشی ہے کہ تم بے وقوف نہیں ہے۔ ہم تم سے ایسی [قو]تِ مشاہدہ کی توقع رکھتے ہیں۔" وہ بولا "لیکن ہمیں یقین ہے [ک]ہ اور کسی قسم کا فرق محسوس نہیں کرپائے گا۔ اگر کرے گا بھی' [تو] اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر ہوگا اور اسے اہمیت نہیں دے [گا۔]"

[میں] نے طمانیت کی ایک گہری سانس لی۔ حفیظ صاحب کے [بارے] میں ایک لمحے کے لیے جو شکوک و شبہات پیدا ہوئے تھے' ان [کا ز]ائل ہوجانا میرے لیے بڑی راحت کا سبب بنا تھا۔ نقلی حفیظ [صاح]ب نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر سگار کا ہلکا سا کش لیا۔ [اصل] حفیظ صاحب کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان کی آنکھوں [میں ہ]ر وقت ایک عجیب بے عنوان قسم کا اضطراب رقصاں رہتا [تھا۔]

[وہ] اپنی ذمے داریوں کو محض دفتری امور یا اپنے لیے چھوڑے [گئے] امور سے انجام دی جانے والی ڈیوٹی سمجھ کر نہیں بھگتاتے تھے [بلکہ] اپنا ہرکام دل و جان سے کرتے تھے۔ نازک ملکی معاملات کے [بارے] میں متفکر رہتے تھے اور پیچیدہ مسائل کے بارے میں سوچ [بچار] کرتے تھے۔ اس لیے ان کی آنکھوں میں ہر وقت ایک [اضطر]اب' ایک عجیب سی تھکن کے سائے نظر آتے تھے جو اس [نقلی] کی آنکھوں میں مفقود تھے۔ نہ جانے اس شخص کی آنکھوں کا [رنگ] بھی اصلی تھا یا محض کونٹیکٹ لینسز وغیرہ کا مرہونِ منت تھا۔

باس ٹو کی آواز اُبھری "اس شخص میں حفیظ صاحب سے کافی حد تک مشابہت تو موجود تھی۔ مزید مشابہت پیدا کرنے کے لیے کاسمیٹک سرجری کا سہارا لیا گیا ہے۔ نتائج سے ہم مطمئن ہیں۔"

"لیکن یہ مجھے کیوں بتایا اور دکھایا جارہا ہے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ تمہیں ہمارا ایک چھوٹا سا کام کرنا ہے۔" باس ٹو بولا۔

"اس کا تعلق حفیظ صاحب سے ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ہاں یہی سمجھ لو۔ حفیظ صاحب اس کے مرکزی کردار ہیں۔" باس ٹو نے ایک لمحے کے توقف کے بعد جواب دیا "آج سے ٹھیک چار دن بعد حفیظ صاحب امریکا کے دورے پر روانہ ہونے والے ہیں۔ یوں سمجھو کہ انہیں وہاں طلب کیا گیا ہے۔ تمہاری حکومت پر دباؤ ڈال کر انہیں وہاں بلوایا جارہا ہے۔ ہم سب کی کوششوں سے ویسے بھی اس وقت تمہارا ملک چاروں طرف سے زبردست سیاسی اور اقتصادی دباؤ میں ہے۔"

"ہم سب سے تمہاری کیا مُراد ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہی تمام ممالک جن کے خفیہ اتحاد سے ریڈ ڈاٹ وجود میں آئی ہے۔" باس ٹو نے جواب دیا "فی الحال تمہاری ایٹمی طاقت کو بہانہ بناکر تم پر سب سے زیادہ دباؤ بڑھایا جارہا ہے اور تمہیں بلیک میل کرنے کے لیے ہر حربہ استعمال کیا جارہا ہے۔ آئندہ بھی ترقی یافتہ ملکوں کے ہاتھوں میں جتنے بھی پتے ہوں گے وہ سب استعمال کیے جائیں گے۔"

"وہ تو میں دیکھ رہا ہوں۔ مجھے بھی اندازہ ہورہا ہے۔" میں نے ہلکی سی افسردگی سے کہا "ہمیں چاروں طرف سے گھیرا جارہا ہے اور ہر اس عمل کی حوصلہ افزائی کی جارہی ہے جس سے ہمارے لیے اندرون اور بیرونِ ملک ہر طرح کی رکاوٹیں اور دُشواریاں پیدا ہوں۔ وطن فروش ایجنٹ بھی اس سلسلے میں سرگرمی سے اپنا اپنا کردار ادا کررہے ہیں۔"

"بالکل درست ہے" باس ٹو کے لہجے سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ اس صورتِ حال کے تصور سے محظوظ ہورہا تھا "تمہاری حکومت اس دباؤ سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں ماررہی ہے' اپنی سی کوششیں کررہی ہے لیکن یہ کوششیں بالکل غیرمنظم اور غیرمربوط ہیں۔ دوسرے ہم تمہارے ہاں ایسی صورتِ حال پیدا کرنے میں کامیاب ہوچکے ہیں کہ تمہاری حکومت تمام تر دیانتداری اور خلوص سے چاہے تب بھی کسی ایک مسئلے کی طرف بھی یکسوئی اور دلجمعی سے توجہ نہیں دے سکے۔ ویسے بھی تمہاری حکومتوں میں دیانتداری اور خلوص سے کسی مسئلے کو پائیدار بنیادوں پر حل کرنے کا رُجحان کم ہی رہا ہے۔ تمہارے پورے ملک کا نظام ایڈہاک اِزم پر چل رہا ہے۔"

یہ سب باتیں مجھے معلوم تھیں۔ نہ جانے وہ کیوں دُہرا رہا تھا۔ شاید میرے احساسِ کمتری کو بڑھانے کے لیے۔ یا پھر پس منظر کی بہتر

طور پر وضاحت کرنے کے لیے۔

باس ٹو بات جاری رکھتے ہوئے بولا "فضا ہمارے لیے بہت سازگار ہے۔ کچھ فیصلہ کن اقدامات کرنے کا وقت قریب آتا دکھائی دے رہا ہے۔ ایٹمی طاقت وغیرہ کا تو صرف بہانہ ہے۔ ورنہ تم کیا اور تمہاری ایٹمی طاقت کیا۔ اصل میں چند ملکوں کا ایک بلاک ہے جسے سب سے پہلے قابو میں کرنا ہے۔ ہم براہِ راست ان میں مداخلت کر کے دنیا میں بدنامی مول لینا نہیں چاہتے۔ ہم چاہتے ہیں مختلف جواز پیدا کر کے اس طرح ان کی کمر توڑ دی جائے اور اس طرح انہیں زمیں بوس کر دیا جائے کہ وہ خود ہاتھ باندھ کر ہم سے درخواست کریں کہ خدا کے لیے ہمیں اپنی کالونی بنا لیجیے ورنہ ہم فاقوں مر جائیں گے۔ پھر ہم وہاں سب کچھ نئے سرے سے ترتیب دیں گے۔"

میرے دل میں ایک بے عنوان سا سناٹا پھیلنے لگا۔ اس کا ہر جملہ جو بظاہر چند الفاظ پر مشتمل تھا اگر اس کی گہرائی کا تجزیہ کیا جاتا اور کسی کو ان کے حقیقی معنوں کا ادراک ہوتا تو اس کا دل دھڑکنا بھول سکتا تھا۔

ذرا توقف سے باس ٹو بولا "جن ممالک کی فہرست ہم نے بنائی ہے اور جنہیں دنیا کے نقشے پر نشان زدہ کر دیا ہے ان میں سے بعض میں تو ہماری بوئی ہوئی فصل اب پکنے کو ہے۔ مثلاً خلیج میں کویت، عراق مسئلہ ہے۔ افریقہ اور افغانستان میں خانہ جنگیاں ہیں۔ انڈیا میں سکھوں کا مسئلہ، ہندو مسلم تنازعات، کشمیر کا مسئلہ وغیرہ ہے۔ مسلمان ممالک میں ہمیں ایک بڑی آسانی رہتی ہے۔"

"وہ کیا؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم لوگوں کو دوسروں سے لڑانا تو پھر بھی ذرا مشکل ہے لیکن آپس میں لڑانا بہت آسان ہے۔ مختلف تعصبات کی بنا پر لوگ پہلے ہی ایک دوسرے کو بھنبھوڑنے کے لیے تیار بیٹھے ہوتے ہیں۔ صرف چنگاری پھینکنے کی دیر ہوتی ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی لایعنی نظریے یا فلسفے کی بنیاد پر سب کے دل ایک دوسرے کے خلاف بغض و عناد سے لبریز ہوتے ہیں۔ تمہارے مذہب میں اتحاد و اتفاق پر جتنا زور دیا گیا ہے تم اس سے اتنا ہی دور ہو۔ ایک گلی میں اگر دس گھر ہوں گے تو وہاں دس سیاسی، سماجی اور مذہبی نظریئے ہوں گے۔ اگر وہ سیاسی اعتبار سے متفق ہوں گے تو ان میں سماجی تضادات موجود ہوں گے۔ اگر سماجی طور پر وہ ایک دوسرے سے قریب ہوں گے تو مذہبی طور پر ان کے دل ایک دوسرے سے دور ہوں گے۔ تمہارے ہاں بڑا واویلا کیا جاتا ہے کہ دشمن کے ایجنٹوں نے یہ کر دیا وہ کر دیا۔ اکثر اوقات تو ہمیں تمہارے ہاں کسی ایجنٹ وغیرہ سے کام لینے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ تم تو خود ہی ایک دوسرے کو برباد کرنے کے لیے کافی ہو۔" اس کے لہجے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ان سب باتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے دل ہی دل میں بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

"بہت گہرا مشاہدہ ہے تمہارا۔ ہماری معاشرت کے بارے میں۔" میں نے اپنے لہجے میں طنز کی جھلک پیدا کرنے کی کوشش کی جبکہ اصولاً میرے لہجے میں اس وقت ندامت کی جھلک ہونی چاہیے تھی۔

"ہم جہاں کسی پروجیکٹ پر کام کرتے ہیں وہاں کے قبرستانوں میں مدفون مُردوں کے بارے میں بھی معلومات رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔" وہ فخر سے بولا۔

"لیکن ہمارے ہاں سے تم نے صرف منفی معلومات ہی اکٹھی کی ہیں۔ مثبت چیزیں تمہاری نظر میں نہیں آئیں یا ان کے بارے میں معلومات تم تک نہیں پہنچیں۔" میں نے کمزور سا احتجاج کیا "ہمارے ہاں لوگ ایک دوسرے کے لیے جانیں بھی قربان کر دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے بھی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں اور کروڑوں کی جائیدادیں خدمتِ خلق کے لیے وقف کر دی ہیں۔ ہمارے ہاں محبت، یگانگت اور بھائی چارے کے ایسے مظاہرے بھی دیکھنے میں آتے ہیں جو تاریخ کا حصہ بن جاتے ہیں۔"

"اب یہ باتیں پرانی ہوتی جا رہی ہیں اگر کچھ ہوتا بھی ہے تو ضرورت سے بہت کم ہوتا ہے اور بے وقت ہوتا ہے۔ بربادی کے بعد دلاسے دیئے جاتے ہیں۔ لٹ پٹنے کے بعد پچھتایا جاتا ہے۔ سب کچھ راکھ ہو جانے کے بعد آگ بجھانے کی تدبیریں کی جاتی ہیں۔ پہلے تک کچھ نہیں کیا جاتا۔ ان باتوں سے ہمیں اپنے کام میں بڑی آسانی رہتی ہے۔ خیر... یہ باتیں تو یونہی برسبیلِ تذکرہ ہو گئیں۔ درحقیقت میں تمہیں حفیظ صاحب کے آئندہ دورۂ امریکا کے بارے میں بتانے لگا تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ میں نے نقلی حفیظ صاحب کی طرف دیکھا۔ اس بار اس شخص نے مجھ سے نظر نہیں چرائی اور اس کے ہونٹوں پر ایک لمحے کے لیے خفیف سی مسکراہٹ بھی ابھری۔ وہ مقامی ہی معلوم ہوتا تھا لیکن ریڈ ڈائمنڈ سے اس کا تعلق شاید بہت گہرا تھا۔

باس ٹو کی آواز سن کر میں دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ کہہ رہا تھا "تمہیں معلوم ہی ہو گا کہ امریکی سینیٹرز کی ایک لابی کا تمہاری حکومت پر دباؤ بے پناہ بڑھ گیا ہے کہ اس سے ایٹمی تجربات نہ کرنے کی ٹھوس یقین دہانی حاصل کی جائے۔"

"ہاں مجھے کچھ غیر ملکی اخبارات اور کچھ ملکی اخبارات میں چھپنے والے تجزیوں کے سرسری مطالعے سے کسی حد تک اندازہ ہو رہا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"لیکن تمہیں یہ نہیں معلوم ہو گا کہ ٹھوس یقین دہانی کے وہاں کیا معنی لیے جا رہے ہیں۔ حفیظ صاحب اپنی حکومت کی طرف سے کچھ تجاویز لے کر جا رہے ہیں لیکن میں تمہیں یہاں بیٹھے بیٹھے ابھی بتا دیتا ہوں کہ وہاں ان پر کوئی کان نہیں دھرے گا۔ انہیں ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیا جائے گا۔" باس ٹو نے کہا۔

"بہت خوب... مغربی ممالک کی اسی انصاف پسندی کے تو قربان جانے کو جی چاہتا ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

اس نے حسب سابق میرے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے بات جاری رکھی "اس کی جگہ خود امریکی حکومت کی طرف سے پہلے سے تیار شدہ ایک دستاویز حفیظ صاحب کے سامنے رکھی جائے گی اور ان سے درخواست کی جائے گی کہ وہ اس پر دستخط کر دیں۔"

"اس دستاویز کے مندرجات سے بھی تم واقف ہو گے؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"بے شک میں تمہیں انہی کے بارے میں بتانے لگا تھا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا اور نہ ہی سفارتی اصطلاحات میں بات کروں گا۔ اس طرح بات طویل ہو جائے گی۔ مختصراً بس یہ سمجھ لو کہ اس دستاویز میں تمہاری حکومت کی طرف سے اعتراف کیا گیا ہو گا کہ وہ ایٹم بم بنا چکی تھی لیکن پُرامن بقائے باہمی کے کسی بھی سمجھوتے کے تحت اب انہیں تلف کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کے علاوہ وہ امداد دینے والے کسی بھی ملک کے کسی بھی وفد کو کسی بھی وقت اپنی ایٹمی تنصیبات خصوصاً کہوٹہ پلانٹ کا نہایت تفصیلی معائنہ کرانے کے لیے تیار ہے۔ نیز وہ اب تک ہونے والی تمام نیوکلیئر ریسرچ کی کاغذی تفصیلات کی ایک ایک کاپی، امداد دینے والے تمام ممالک کو فراہم کرے گا اور آئندہ بھی ایسا کرتا رہے گا۔"

"بہت خوب... بہت خوب" میں نے ڈوبتے دل کے ساتھ کہا۔

"اس کے علاوہ پُرامن بقائے باہمی کے ایک سمجھوتے کے تحت تمہاری حکومت اپنے ملک میں مستقل بنیادوں پر ایک آبزرویشن سینٹر کے قیام کی منظوری دے گی۔ ایک کمیشن اس سینٹر میں کام کرے گا جس میں تمام سپر پاورز اور امداد دینے والے ملکوں کے ایک ایک نمائندے کے علاوہ انڈیا کا بھی ایک نمائندہ شامل ہو گا۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس کی نادیدہ آنکھیں ایک بار پھر بغور میرا جائزہ لے رہی تھیں۔ اس نے اسی پر بس نہیں کی اور انکشافات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کمیشن کو اختیار ہو گا کہ جب بھی چاہے تمہاری تمام ایٹمی تنصیبات اور لیبارٹریوں حتیٰ کہ تمہارے اکلوتے ایٹمی بجلی گھر کا بھی معائنہ کر سکے گا۔ اگر اس کمیشن کو شبہ بھی ہو جائے کہ تمہارے ہاں خفیہ طور پر کوئی معمولی سا ایٹمی تجربہ بھی کیا جا رہا ہے... خواہ وہ کتنا ہی بے ضرر ہو۔ تو وہ سپر پاورز سے تمہارے خلاف کسی بھی قسم کی کارروائی کی سفارش کر سکتا ہے۔ تمہارا ملک اسے جارحیت قرار نہیں دے سکے گا۔"

"بہت خوب۔ اسے کہتے ہیں عالمی انصاف۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ترقی یافتہ ممالک خواہ اپنے ہاں مرغی کے انڈوں کی طرح ایٹم بموں کے انبار لگاتے جائیں لیکن ہمارے ملک کے

ایٹمی بجلی گھر تک کا خوردبین سے معائنہ ہوگا اور ہمیں پُرامن مقاصد کے لیے بھی ایٹمی توانائی کے استعمال کی اجازت نہیں۔ اس کا مطلب ہے دنیا میں آج بھی جس کی لاٹھی اس کی بھینس کا قانون رائج ہے۔ یہ تہذیب و تمدن... یہ ترقی .... یہ بین الاقوامی ادارے ... بین الاقوامی قوانین۔ عالمی انصاف کی باتیں... یہ سب محض مذاق ہیں' دکھاوا ہیں۔ کمزوروں کے لیے دل بہلاوے ہیں؟"

"اس فضول بحث میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ جو بات میں کہہ رہا ہوں اس پر توجہ دو۔" باس ٹو کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"کمزور فریق جب بھی کوئی سوال اٹھاتا ہے اسے فضول بحث ہی قرار دیا جاتا ہے۔" میرے دل میں حقیقتاً ایک عجیب طرح کی افسردگی پھیل رہی تھی۔

باس ٹو میرے الفاظ پر توجہ دیئے بغیر بولا "جب یہ دستاویز سائن کرنے کے لیے حفیظ صاحب کے سامنے رکھی جائے گی تو یقیناً ان کے ہوش اُڑ جائیں گے۔ وہ اس پر سائن کرنے کے لیے کسی قیمت پر تیار نہیں ہوں گے۔ اگر سی آئی اے انہیں' ان کے اسٹاف اور ان کے وفد سمیت بھی اغوا کر کے کسی دور دراز جزیرے پر لے جائے اور ان کے سینے پر گن رکھ دی جائے وہ تب بھی اس قسم کا کوئی ایگریمنٹ سائن نہیں کریں گے اور نہ ہی تمہاری حکومت انہیں اس کی اجازت دے گی۔"

"یقیناً" میں نے کہا لیکن میں فیصلہ نہ کر سکا کہ یہ میرا یقین تھا یا میری خواہش۔

"چنانچہ اس دستاویز پر سائن کرانے کا ہم نے یہی طریقہ سوچا ہے کہ اصل حفیظ صاحب کی جگہ ہمارے ان حفیظ صاحب کو امریکا بھیجا جائے۔" باس ٹو نے نقلی حفیظ صاحب کی طرف اشارہ کیا۔

"ان نقلی حفیظ صاحب کا اصل نام کیا ہے؟" میں نے گہری نظر سے اس شخص کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

جواب اس شخص نے خود ہی دیا۔ مسکراتے ہوئے بولا "آپ مجھے عرفان کہہ کر پکار سکتے ہیں۔ ویسے ضروری نہیں کہ یہ میرا اصل نام ہو۔ میں اب اپنے اس نئے کردار میں اتنا رچ بس گیا ہوں کہ حفیظ صاحب کے نام سے پکارے جانے پر ہی متوجہ ہوتا ہوں۔"

میں ایک ٹک اس شخص کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اس کا نام عرفان یا جو کچھ بھی تھا' اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ حفیظ صاحب کی حیثیت سے وہ ننانوے فیصد لوگوں کو دھوکا دے سکتا تھا۔ اس کی آواز بھی حفیظ صاحب کی آواز سے بہت زیادہ ملتی تھی۔ صرف تھوڑی سی زکام زدہ معلوم ہوتی تھی لیکن یہ چیز بھی اس کے حق میں ہی جاتی تھی۔ اگر کسی کو معمولی سا کوئی فرق محسوس بھی ہوتا تو یقیناً وہ یہی سوچ کر نظرانداز کر جاتا کہ حفیظ صاحب کو زکام ہے۔

میں نے ایک طویل سانس لے کر دوبارہ باس ٹو کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "عرفان صاحب' حفیظ صاحب کے دستخط بھی کر لیں گے؟"

"یقیناً یہ کون سا مشکل کام ہے۔" باس ٹو نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا اور اسے کھول کر میرے سامنے لہراتے ہوئے بولا "یہ جنیوا میں ہونے والے ایک معاہدے کا ورق ہے۔ اس پر حفیظ صاحب کے دستخط موجود ہیں۔ ان کی فرم کی مُہروں اور سفارتی نشانات وغیرہ کا عکس بھی موجود ہے۔ عرفان صاحب یہ دستخط اتنی عمدگی سے کرتے ہیں کہ خود حفیظ صاحب بھی انہیں چیلنج نہیں کر سکتے۔ حفیظ صاحب کو صرف دستخط ہی کرنا ہوتے ہیں باقی تمام لوازمات کی تکمیل تو ان کا اسٹاف کرتا ہے جو ظاہر ہے نقلی حفیظ صاحب کے ساتھ ہوگا۔"

"لیکن حفیظ صاحب اگر ایسا کوئی ناقابلِ یقین معاہدہ کر کے چلے آتے ہیں تو ہماری حکومت تو اس کی توثیق نہیں کرے گی بلکہ شاید وہ سرے سے اسے تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دے۔ اس صورت میں اس کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔

"یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔" باس ٹو نے بے پروائی سے کہا "ہمیں صرف اتنا ہی چاہیے کہ حفیظ صاحب بین الاقوامی پریس اور ٹی وی کے سامنے یہ ایگریمنٹ سائن کر دیں۔ اس کے بعد اگر تمہاری حکومت اس معاہدے کو اون (OWN) کرنے' اس کی توثیق کرنے یا اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتی ہے تو ہمیں ایک اخلاقی جواز مل جائے گا۔ اگر ہم کسی ملک کو خفیہ سازشوں سے تباہ کرنے کے بجائے اعلانیہ طور پر کچلنا چاہیں تو اس کے لیے ہمیں ایک اخلاقی جواز کی ضرورت ہوتی ہے جسے تم کوئی معقول بہانہ بھی کہہ سکتے ہو۔ اس کے بعد ہم اس ملک کے ساتھ جو سلوک چاہیں کروا سکتے ہیں۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد باس ٹو بولا "تمہاری حکومت جب اپنے وزیرِ خارجہ کے سائن کیے ہوئے معاہدے کو تسلیم کرنے سے انکار کرے گی تو پھر سپرپاورز کے سامنے بہت سے راستے ہوں گے۔ امریکا' اسرائیل یا کسی بھی ملک سے تمہارے ملک پر براہِ راست حملہ بھی کرایا جا سکتا ہے۔ کسی اور طرح کی فوجی کارروائی بھی کرائی جا سکتی ہے۔ دیگر سپرپاورز بھی حملہ آور ملک کی ہر طرح سے مدد کریں گے۔ اگر تمہیں صرف محدود پیمانے پر سزا دینا مقصود ہوا تو صرف ایٹمی تنصیبات کو تباہ کیا جا سکتا ہے۔ ان سب کارروائیوں کا نہایت مناسب اخلاقی جواز موجود ہوگا۔ کوئی تمہارا واویلا نہیں سنے گا۔"

"کیا اچھا طریقہ ہے دوسروں کو برباد کرنے کا۔" میں نے متاسفانہ لہجے میں کہا "لیکن یہ تو بتاؤ کہ جب یہ نقلی حفیظ صاحب ایگریمنٹ سائن کر کے واپس آئیں گے تو کیا حکومت ان سے بازپُرس نہیں کرے گی کہ آخر انہوں نے یہ کیا کیا؟ اسمبلی اور سینیٹ میں یہ مسئلہ نہیں اٹھے گا۔"

"جب نقلی حفیظ صاحب واپس آئیں گے تو کیا ہوگا' یہ سوچنا تمہارا کام نہیں ہے۔ بہرحال تمہاری توقعات کے مطابق حکومت نے بازپُرس بھی کی یا سینیٹ اور اسمبلی میں یہ بحث اٹھی تب بھی

کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہمیں جو نکتہ چاہیے وہ ہمیں مل چکا ہوگا۔" باس ٹو نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس مقام پر وہ صرف مجھے ہی نہیں بلکہ شاید نقلی حفیظ صاحب یعنی عرفان کو بھی غچہ دے رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس دورے سے واپس آتے ہی نقلی حفیظ صاحب کا بھی پتا صاف ہو جاتا اور اس کا الزام بھی حکومت پر آجاتا کہ وزیر خارجہ چونکہ اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ایک معقول اور "امن پسندانہ" سمجھوتا کر آئے تھے جو حکومت کو پسند نہیں تھا، حکومت کے عزائم کچھ اور تھے اس لیے اس نے خود اپنے وزیر خارجہ کو بھی مروا دیا۔ معلوم نہیں خود عرفان کو بھی اپنے اس متوقع انجام کا ادراک تھا یا نہیں۔ معلوم نہیں اسے کیا خواب دکھائے گئے تھے؟ وہ کس بنا پر اتنا مطمئن اور پُراعتماد تھا؟ کس تصور سے مسکرا رہا تھا؟ اس کا منطقی انجام تو موت ہی دکھائی دے رہا تھا۔ دورے سے واپسی کے بعد اس کا ایک دن بھی زندہ رہنا ریڈ ڈاٹ کے حق میں اچھا نہیں تھا اور اس کا غائب ہو جانا بھی اس سارے منصوبے کو مشکوک بنا سکتا تھا۔

"اس سارے منصوبے میں میرا کام کیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"کیا تم نہیں سمجھے؟" باس ٹو کے لہجے میں حیرت تھی۔

"نہیں۔ میں ذرا کوڑھ مغز واقع ہوا ہوں۔" میں نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھنے کی کوشش کی۔

"اصل حفیظ صاحب کی جگہ نقلی حفیظ صاحب کو پہنچانا تمہارا کام ہے۔ ہم نے اس چھوٹی سی ذمے داری کے لیے تمہیں منتخب کیا ہے جس کا صلہ تمہیں بہت بڑا ملے گا۔ یعنی ہم تمہارا نام ریڈ ڈاٹ کے معتوبین کی مختصری فہرست سے کاٹ دیں گے۔ ہم ہمیشہ کے لیے تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔ بشرطیکہ تم نے آئندہ ریڈ ڈاٹ کے مفادات کو کوئی نقصان نہ پہنچایا اور جو راز ہم نے تم پر ظاہر کر دیئے ہیں انہیں تم نے اپنے سینے میں ہی محفوظ رکھا۔"

میں سناٹے میں آگیا۔ جسے وہ معمولی کام کہہ رہے تھے وہ کتنی بڑی غداری کی بنیاد تھی۔ اس کا اندازہ کرنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ وہ گویا ملک کی بنیادوں میں ڈائنامیٹ رکھوانے کا کام میرے ہاتھ سے انجام دلوانا چاہتے تھے۔

"میں یہ کام کس طرح انجام دوں گا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہایت سیدھے سادے طریقے سے۔" باس ٹو نے جواب دیا "تم حفیظ صاحب سے تنہائی میں ملاقات کے لیے وقت لو گے۔ ان سے یہ کہو گے کہ تم ایک نہایت اہم آدمی کو ان سے ملوانا چاہتے ہو۔ وہ اہم آدمی عرفان ہوگا۔" اس نے نقلی حفیظ صاحب کی طرف اشارہ کیا "یہ معمولی سے میک اپ میں ہوگا۔ یعنی اس وقت یہ حفیظ صاحب دکھائی نہیں دے رہا ہوگا۔ جس کمرے میں حفیظ صاحب سے تمہاری ملاقات ہوگی وہاں یہ بھی موجود ہوگا۔ تم ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کوئی فرضی کہانی سناتے ہوئے یہ ٹیوب حفیظ صاحب کو معائنے کے لیے پیش کرو گے۔"

اس نے تقریباً دو انچ لمبی، پتلی سی ایک نہایت چمکیلی ٹیوب جیب سے نکال کر میری طرف بڑھائی۔ وہ ٹیوب ننھے سے ایک تھرمامیٹر سے مشابہ تھی۔ فرق یہی تھا کہ وہ تھرمامیٹر سے بہت چھوٹی تھی اور اس پر کوئی ہندسہ وغیرہ درج نہیں تھا۔ البتہ اس کے ایک سرے پر مسور کے دانے کی طرح ننھا سا ایک سرخ اُبھار موجود تھا۔

اس نشان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے باس ٹو بولا "یہ ٹیوب حفیظ صاحب کو دیتے وقت تم غیر محسوس انداز میں اس سرخ نشان کو انگوٹھے کے ناخن سے ذرا دبا دو گے اور ان سے فرمائش کرو گے کہ وہ اسے سونگھ کر دیکھیں۔ اس دوران اس سرخ نشان کو دبے پانچ سیکنڈ گزر چکے ہوں گے۔ حفیظ صاحب جونہی اس ٹیوب کو ناک کے قریب لائیں گے یہ پھٹ جائے گی تم اور عرفان ذرا فاصلے پر ہوں گے اس لیے اس ٹیوب سے خارج ہونے والی گیس تم دونوں پر کوئی خاص اثر نہیں کرے گی لیکن پھر بھی احتیاطاً تم دونوں چند سیکنڈ کے لیے سانس روکے رکھنا۔ ناک کے راستے یہ گیس حفیظ صاحب کے ذہن پر اس طرح اثر انداز ہوگی کہ ان کے حواس جواب دے جائیں گے۔ وہ ہوش میں رہیں گے لیکن نہ تو مزاحمت کے قابل رہیں گے اور نہ ہی کچھ بول سکیں گے۔ تب تم عرفان کا میک اپ وغیرہ ان پر منتقل کر دو گے۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہوگا۔ عرفان کو صرف حفیظ صاحب سے مختلف بنانے کے لیے اس کے چہرے پر دو تین چیزوں کا اضافہ ہوگا۔ وہ اضافہ ختم کرتے ہی یہ اپنی موجودہ یعنی حفیظ صاحب والی شکل میں آجائے گا۔ تم اسے حفیظ صاحب کی جگہ کمرے میں چھوڑ جاؤ گے اور حفیظ صاحب کو سہارا دے کر اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ سیکیورٹی والوں کی نظر میں یہ وہی شخص ہوگا جو تمہارے ساتھ آیا تھا۔ تمہیں یہ کام ذرا مہارت سے کرنا ہوگا۔ سیکیورٹی والوں کو شک نہ ہونے پائے۔"

وہ غالباً میرا ردِعمل دیکھنے کے لیے ذرا خاموش ہوا۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس بڑی سی انڈا نما چیز اور اس سے آنے والے سیاہ چمکیلے ہندسے کو دیکھتے ہوئے وہ گونجیلی سی آواز سننا ایک عجیب تجربہ تھا۔ وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "حفیظ صاحب تمہارا سہارا لے کر آسانی سے گاڑی تک آجائیں گے۔ تم انہیں گاڑی میں لے کر جلد از جلد وہاں سے دور کسی ویران جگہ پر پہنچ جانا اور یہ کیپسول ان کے منہ میں ڈال دینا۔ وہ اس وقت تک مزاحمت کے قابل نہیں ہوں گے۔" اس نے ایک بار پھر مداریوں کی طرح جیب میں ہاتھ ڈالا اور ننھی سی ایک شفاف ڈبیا نکالی۔ اس میں صرف ایک ہی چھوٹا سا کیپسول دکھائی دے رہا تھا۔ کیپسول نیلے رنگ کا تھا لیکن وہ بھی شفاف دکھائی دے رہا تھا۔ شاید اس میں کوئی سیال بھرا ہو لیکن اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

باس ٹو بولا "یہ کیپسول تمہیں ہر حال میں ان کے منہ میں ڈالنا ہوگا خواہ اس کے لیے تمہیں تھوڑی بہت زبردستی یا زور آزمائی بھی کرنا پڑے۔ یہ ان کے منہ میں پہنچتے ہی تحلیل ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی تم حفیظ صاحب کو گاڑی سے باہر دھکیل دینا۔ تمہیں ان کے انجام کے بارے میں تشویش زدہ ہونے یا ان کی حالت دیکھنے کے لیے رُکنے کی ضرورت نہیں۔"

"پھر بھی..... یونہی ذرا معلومات کی خاطر بتا دو کہ ان کا انجام کیا ہوگا؟" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" باس کے لہجے میں بے پروائی عیاں تھی "وہ ویسی ہی پچکی ہوئی لاش میں تبدیل ہو جائیں گے جیسی تم پہلے بھی کئی دیکھ چکے ہو۔ وہ ایک گمنام اور ناقابلِ شناخت شخص کی لاش ہوگی جسے ایک دو دن میں لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا جائے گا۔ تمہیں اس سلسلے میں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

"واقعی۔ اس میں پریشانی والی تو کوئی بات ہے ہی نہیں۔ یہ تو نہایت معمولی اور آسان سا کام ہے۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا "تم یہ کام خود کیوں نہیں کر لیتے۔ میرا مطلب ہے کسی اور شخص کے ذریعے۔ میری مدد کے بغیر۔"

"فی الحال ہمیں اس کام کے لیے تم سے زیادہ موزوں کوئی اور شخص دکھائی نہیں دے رہا۔" باس ٹو نے اطمینان سے جواب دیا "ویسے بھی ہمیں اکثر کاموں کے لیے قربانی کے ایک بکرے کی ضرورت ہوتی ہے۔ فی الحال ہمارا قربانی کا بکرا تم ہو۔ تمہیں میری صاف گوئی کی داد دینی چاہیے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "کوئی اور شخص اس کام کو شاید تم جیسی مہارت، بے خوفی اور اعتماد سے انجام نہ دے سکے۔ ذرا سی لغزش کام بگاڑ دے گی اور ہم فی الحال کسی ایجنسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا چاہتے۔ فی الحال تو ہم اسی بات کی خوشی منا رہے ہیں کہ اس سلسلے میں تمہاری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ تم نے ایجنسیوں کو ہمارے پیچھے لگانے کی سرتوڑ کوشش کر کے دیکھ لی لیکن ہماری حکمتِ عملی اور احتیاطی تدابیر کا کمال تھا کہ تمہیں منہ کی کھانی پڑی۔ کسی نے تمہاری بات کا یقین نہیں کیا لیکن اس خوشی میں ہم آپے سے باہر نہیں ہونا چاہتے۔ ہماری کوشش اب بھی یہی ہے کہ ہم سے کوئی بے احتیاطی سرزد نہ ہو۔"

"ڈرتے ہو ہماری خفیہ ایجنسیوں سے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اس احساس سے اپنے دل میں پہلی بار گہرے طمانیت کی لہر محسوس کی کہ ہماری خفیہ ایجنسیوں کا کچھ تو ریڈ ڈاٹ کو خوف تھا۔

لیکن دوسرے ہی لمحے باس ٹو کے کھنکھناتے ہوئے استہزائیہ قہقہے نے میری خوش فہمی رفع کر دی۔ وہ گویا میرے سوال سے بہت محظوظ ہوا تھا۔ اس بے چہرہ شخص کی ہنسی تھی تو وہ حقارت آمیز لہجے میں بولا "تمہاری ایجنسیوں کو خفیہ کہنا لفظ "خفیہ" کے ساتھ بہت بڑا مذاق ہے۔ ان سے نمٹنے کے لیے تو ہمارا ایک بلیک برڈ ہی کافی ہے۔"

"خیر اب اتنا بھی بانس پہ مت چڑھو۔" میں نے کہا۔

"انہوں نے تمہیں صاف طور پر جھوٹا اور مشکوک آدمی قرار دے دیا اور تم اب بھی ان کا دفاع کر رہے ہو؟" باس ٹو قدرے حیرت سے بولا۔

"وہ ایک الگ بات ہے۔ لیکن اس سے ان کی اہمیت کم نہیں ہو جاتی۔ یہی کافی ہے کہ تمہارے دل میں ان کا خوف تو موجود ہے۔ تم ان کی وجہ سے کچھ تو احتیاط کرتے ہو ورنہ تم نہ جانے کیا کر گزرتے۔" میں نے کہا۔

"ہمیں تم سے اتنے احمقانہ اندازوں کی توقع نہیں تھی۔" باس ٹو بولا "ہمیں ایجنسیوں کا کوئی خوف نہیں ہے لیکن اس وقت ہم ایک نہایت حساس پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ اس پروجیکٹ کی تکمیل تک ہم کسی کی بھی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا نہیں چاہتے۔ ہم ذرا سی بھی الجھن مول لینا نہیں چاہتے۔ جب ہمارا کام بغیر کسی دُشواری کے چل رہا ہے تو ہمیں خواہ مخواہ اپنے لیے ذرا سی بھی دُشواری پیدا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم یہاں کم سے کم آدمیوں کے ساتھ اپنے زیادہ سے زیادہ بڑے کام مکمل کر لینا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس فضول کاموں کے لیے آدمی نہیں ہیں۔ ہم یہاں زیادہ آدمی جمع بھی نہیں کرنا چاہتے۔ آدمی زیادہ ہوتے ہیں تو جلدی نظر میں آتے ہیں۔"

میں نے اب تک ریڈ ڈاٹ کے دو خفیہ ٹھکانے دیکھے تھے۔ دونوں کا انداز بھول بھلیوں والا تھا۔ مجھے صحیح طور پر تو نہیں معلوم ہو سکا تھا کہ یہ جگہیں کتنی وسیع تھیں اور یہاں بیک وقت کتنے آدمی رکھے جا سکتے تھے لیکن ایک احساس ضرور ہوتا تھا کہ پُراسرار سی بناوٹ کے یہ ٹھکانے اپنے اندر بڑی وسعت رکھتے تھے۔ ان میں بے شمار آدمیوں کو چھپانے کی گنجائش تھی اور یہاں جتنی ویرانی بظاہر دکھائی دیتی تھی۔ درحقیقت یہ اتنے ویران نہیں تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوتا تھا کہ یہاں کے مختلف گوشوں میں بہت سے افراد پوشیدہ رہتے تھے اور وہ بلا ضرورت سامنے نہیں آتے تھے۔ تاہم باس ٹو کے نقطۂ نظر سے شاید ابھی ان کے پاس "مین پاور" کم ہی ہو۔ مستقبل میں وہ نہ جانے کتنے آدمیوں کا بندوبست کرنا چاہتے ہوں۔ ابھی تو مجھے صحیح طور پر یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ ہمارے ملک میں ان کے یہی دو ٹھکانے تھے جو میں اب تک دیکھ چکا تھا یا اور بھی کمین گاہیں موجود تھیں۔ میں ان چیزوں کے بارے میں جتنا زیادہ سوچتا تھا اتنا ہی میرا دل تفکرات سے ڈوبتا جاتا تھا۔ نہایت خاموشی سے نہ جانے کیسے کیسے مہیب طوفان ہمارے ملک کی طرف بڑھ رہے تھے اور کسی کو ان کا گمان تک نہیں تھا۔ کسی نے شاید خواب میں بھی ان خطرات کے بارے میں

نہیں سوچا تھا۔ سب کو اپنے اپنے پسندیدہ و محبوب لیڈروں کے فرمان پر چلتے ہوئے ایک دوسرے کو نوچنے کھسوٹنے اور بھنبھوڑنے سے ہی فرصت نہیں تھی۔ باس ٹو جس "نہایت حساس پروجیکٹ" کا ذکر کر رہا تھا وہ ہماری تباہی کا نہ جانے کیسا منصوبہ تھا۔

میں نے اپنے اندیشوں سے نظر چُراتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا "فرض کرو میں اس کام کے لیے ہامی بھر لیتا ہوں تو کیا یہ نقلی حفیظ صاحب یہاں سے میرے ساتھ ہی جائیں گے؟"

"نہیں" باس ٹو نے بلا تامل جواب دیا "تم یہاں سوشل وزٹ پر آئے ہوئے کوئی مہمان نہیں ہو کہ ہم تمہیں رخصت کرنے دروازے تک جائیں گے، ہاتھ ہلاتے ہوئے خدا حافظ کہیں گے اور عرفان صاحب کو تمہارے ساتھ کردیں گے۔ تم جس طرح آئے ہو اسی طرح واپس جاؤ گے۔ ہم روزانہ صبح دس سے گیارہ بجے کے درمیان تمہیں تمہارے آفس میں اور شام کو چھ سے سات بجے کے درمیان ہوٹل میں فون کرتے رہیں گے جہاں تم ٹھہرے ہوئے ہو۔"

گویا انہیں یہ بھی علم تھا کہ میں آج کل ہوٹل میں رہ رہا تھا۔ ان سے کوئی بات شاید پوشیدہ رہتی ہی نہیں تھی۔ باس ٹو نے سلسلۂ کلام جاری رکھا "جیسے ہی حفیظ صاحب سے تمہیں ملاقات کا وقت مل جائے تم ہمیں مطلع کردو گے۔ ملاقات سے ایک گھنٹا پہلے تم عرفان صاحب کو کسی جگہ سے پک کرلو گے۔ جگہ تمہیں عین وقت پر بتادی جائے گی۔"

"فرض کرو میں اس کام کی ہامی نہیں بھرتا؟" میں نے پوچھا۔

"اس میں فرض کرنے اور انکار کرنے والی کوئی بات ہی نہیں۔" باس ٹو ناگواری سے بولا "اگر تمہاری کھوپڑی میں ذرا برابر بھی عقل موجود ہے تو تم انکار نہیں کرو گے اور ہم اس سلسلے میں کوئی بات فرض نہیں کریں گے۔ تمہیں اس کام کو کرنا ہی ہے۔ تمہیں اس سے بہتر موقع بھلا کیا مل سکتا ہے؟ صرف اتنے سے کام کے عوض تمہاری اتنی بڑی غلطی معاف کی جا رہی ہے جس کی وجہ سے تمہیں زندگی بھر سکون سے بیٹھنا نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ کام کرتے ہی تمہاری جان ہم سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ جائے گی۔ کیا اس وقت اس سے بڑی بھی کوئی خوشی تمہارے لیے ہو سکتی ہے؟"

"کیوں نہیں" میں نے بلا تامل کہا "اس سے بڑی خوشی میرے لیے یہی ہو سکتی ہے کہ صرف میری ہی نہیں، اس ملک کی بھی تم سے جان چھوٹ جائے۔"

"تم ملک کی فکر چھوڑو۔ فی الحال صرف اپنی فکر کرو۔" باس ٹو کے لہجے میں ناگواری تھی "بتاؤ اس کام کے بارے میں تمہارا جواب کیا ہے؟"

میں نے چند لمحے سوچا پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے۔ میں اس کے لیے تیار ہوں۔"

"بہت خوب" بے چہرہ شخص کے لہجے میں طمانیت تھی "تم

بلاشبہ ہر بار ہمارا اندازہ غلط ثابت کردیتے ہو۔ جب ہمیں توقع تھی کہ تم ہماری پیشکش قبول کرلو گے اور ہماری ہر بات پر عمل کرو گے اس وقت تم نے ہمیں دھوکا دیا اور ہمارے خلاف سرگرم ہو کر اپنی سی کوششیں کر ڈالیں۔ اس بار ہمیں اندیشہ تھا کہ اب یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی لیکن اس بار تم نے ہامی بھر کر ہمیں حیران کردیا ہے۔"

"اس بار میں نے جذباتی ہونے کے بجائے تمہاری پیشکش پر

...ے دل سے غور کیا ہے اور مجھے اس کو قبول کرنے کے سوا کوئی ...نظر نہیں آتا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اس بار بھی باہر جا کر ہمیں چکر دینے کا پروگرام تو نہیں؟" ...ں ٹو نے دریافت کیا۔

"نہیں، میں ایک بار ہی تمہیں چکر دینے کی کوشش سے تھک ...کا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

میرے لہجے کی تھکن نے اسے خوش کردیا۔ سرشار سے لہجے ...میں بولا "بہرحال احتیاطاً کہہ رہا ہوں کہ اگر دوبارہ ہمیں ڈبل کراس ...کرنے کا خیال ذہن میں آئے بھی، تو اسے فوراً نکال دینا کیونکہ اس ...بار تمہاری جان داؤ پر لگی ہوگی اور معافی کی کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔"

"مجھے صورتِ حال کا احساس ہے۔" میں نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

"دیکھتے ہیں اس بار تم اپنی زبان پر قائم رہتے ہو یا نہیں۔ بس ہمیں یہی مسئلہ طے کرنا تھا۔" باس ٹو یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے ساتھ ہی اے نن بھی مؤدبانہ انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھنے کی زحمت نہیں کی۔

باس ٹو عمر رسیدہ عورت کے ہاتھ میں موجود کمپیوٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "تم نے ہمارا کام کرنے کا اقرار کیا ہے اور یہ بات ریکارڈ ہو چکی ہے۔ ہمارے ہاں جس کام کی ہامی بھرلی جائے اور وہ ریکارڈ پر بھی آجائے، اس کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ یہ بات یاد رکھنا ہم اپنی اخلاقیات کی بڑی سختی سے پابندی کرتے ہیں اور دوسروں سے بھی اسی طرح پابندی کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم جتنی طاقت رکھنے کے باوجود ہم جیسی شائستگی سے اپنے معاملات کو چلانے والے لوگ تمہیں پوری دُنیا میں کہیں نہیں ملیں گے۔"

"بے شک" میں نے تسلیم کیا۔

"خدا حافظ" اس نے کہا اور ایڑیوں کے بل گھوم گیا۔ عمر رسیدہ عورت اس کے ساتھ چل دی۔ وہ جدھر سے آئے تھے اسی طرف جا کر اندھیرے میں غائب ہوگئے۔

میں نے اس طرف اشارہ کرتے ہوئے اے نن سے پوچھا "اس طرف اندھیرے میں کوئی دروازہ ہے؟"

"ہاں۔ اور وہ ایک ایسے راستے کا دروازہ ہے جو پاتال کی طرف جاتا ہے۔" اے نن نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔ میں نے اسے گھورا لیکن اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ میں نے مزید پوچھنا مناسب نہیں سمجھا۔ شاید وہ اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے مجھے ساتھ چلنے کا اشارہ کیا اور میں اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی رہنمائی میں اس بار میں جس کمرے میں پہنچا وہ تقریباً ویسا ہی تھا جیسا میں ریڈ ڈاٹ کے اس ٹھکانے پر دیکھ چکا تھا جہاں مجھے پچھلی مرتبہ لے جایا گیا تھا۔ یہ اس سے ذرا کشادہ تھا اور اس میں میری میزبان لیونا نہیں، فیونا تھی۔ نہ جانے کیوں اب مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ لیونا، فیونا، اے نن، ایڈم وغیرہ.... یہ سب نام فرضی تھے۔

اے نن مجھے اس کمرے میں چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ فیونا مسکراتے ہوئے بولی "اب تم آرام کرلو۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہوگی۔" وہ بڑی محبت سے بستر درست کرنے لگی۔ بیڈ ہلکے گلابی رنگ کے پلاسٹک کا بنا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور اس پر گدا وغیرہ ریشم سے مشابہ نہایت چمکیلی اور سفید کسی چیز سے تیار شدہ دکھائی دیتا تھا لیکن وہ ریشم بھی نہیں تھا۔ شاید نائیلون کی کوئی قسم تھی۔

بستر درست کرکے وہ میرا ہاتھ تھام کر باقاعدہ مجھے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے بولی "چلو اب اچھے بچوں کی طرح سوجاؤ۔"

"لگتا ہے اب تم مجھے لوری بھی دوگی۔" میں نے اپنی جگہ سے ہلے بغیر کہا۔

"ہاں کیوں نہیں۔ اگر تم چاہو تو میں تمہیں لوری بھی دے سکتی ہوں۔" وہ نہایت سنجیدگی سے بولی "یہ کوئی معیوب بات تو نہیں ہے۔ انسان کو ہر عمر میں لوری کی ضرورت ہوتی ہے۔ لوری انسانی ذہن کی بڑی اہم ضرورت ہے۔ خصوصاً جن بچوں نے بچپن میں ماں سے لوری نہیں سُنی ہوتی ان کے ذہن میں لوری کی طلب کا بڑا زبردست خلا رہ جاتا ہے...."

شاید وہ لوری کے موضوع پر اپنا عالمانہ اور فاضلانہ لیکچر جاری رکھتی لیکن میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "بس اتنا ہی کافی ہے۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے ذہن میں کوئی خلا نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو میں کسی کے سامنے ان کے بارے میں فریاد لے کر جانا پسند نہیں کرتا۔ لوری کے بارے میں تمہارا لیکچر سننے سے بہتر ہے کہ میں چپ کرکے لیٹ ہی جاؤں۔"

میں بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ افسردگی آمیز سے لہجے میں بولی "لوگوں میں اپنے علم میں اضافے کا قطعاً رُجحان نہیں رہا۔ بے ہودہ اور جھوٹی باتیں لوگ بڑے شوق سے سنتے ہیں اور ان پر سر دُھنتے ہیں۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مشفقانہ انداز میں مجھے کمبل اُڑھانے لگی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "مجھے یہاں سے نجات کب ملے گی؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" وہ سادگی اور معصومیت سے بولی۔ اس نے کمبل میرے جسم پر ٹھوڑی تک پھیلا دیا۔ بہت احتیاط سے وہ مجھے کمبل سے ڈھانپ رہی تھی۔ کمبل کے کنارے بستر سے ملے ہوئے تھے۔ اس دوران فیونا نے شاید کچھ کیا ہو لیکن میں بہرحال اس کی کوئی غیر معمولی حرکت نہیں دیکھ سکا مگر شاید وہاں چیزیں اشاروں پر بھی کام کرتی تھیں۔ ہوا یہ کہ کمبل جس طرح میرے جسم کو ڈھانپے ہوئے تھا اسی حالت میں لوہے کی طرح اکڑ گیا۔

میں نے اٹھنا چاہا تو اندازہ ہوا کہ اس کے کنارے بستر کے ساتھ گویا جڑ چکے تھے۔ میں اٹھ نہیں سکتا تھا۔ میں نے جسم کو سانپ کی طرح بل دے کر اس آہنی خول سے نکلنا چاہا تو پتا چلا کہ میرے پاؤں کمبل سے باہر ہی تھے اور اب انہیں کمبل کے اندر نہیں لایا جا سکتا تھا۔ اتنی جگہ ہی نہیں تھی۔ دونوں ٹخنوں کے گرد جس طرح کمبل لپٹا ہوا تھا اس سے پاؤں اس پوزیشن میں تھے گویا دو پائیوں سے باہر نکلے ہوئے ہوں کیونکہ کمبل اب ایک سرے سے دوسرے سرے تک دھات جیسا ہو چکا تھا۔ گویا اب مجھ پر وہ محاورہ مکمل طور پر صادق آ رہا تھا کہ میں کمبل کو چھوڑتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔

"اس زحمت کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے فیونا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم مجھے حکم دیتیں میں ویسے ہی ساکت لیٹ جاتا۔ انگلی تک نہ ہلاتا۔"

"بس... ویسے ہی احتیاطاً ہم اس قسم کے بندوبست رکھتے ہیں۔ اب تم آرام سے سو جاؤ۔" وہ بیڈ کے کنارے بیٹھ گئی۔ اس نے ڈھلی ہوئی دھات کے سے اس کمبل کو دھیرے دھیرے تھپکنا شروع کر دیا۔

"آرام سے سونے کی تم نے خوب کہی۔" میں نے زہریلے لہجے میں کہا "اس آرام دہ کمبل میں تو واقعی فرصت اور سکون کی بدولت میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہوئی جا رہی ہیں۔"

میں نے تو یہ بات طنزیہ طور پر کہی تھی لیکن فیونا نہایت سنجیدگی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ہاں واقعی اس کمبل میں انسان کو بڑے آرام سے نیند آ جاتی ہے۔"

مجھے اس کی سنجیدگی پر حیران ہونے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ اسی لمحے واقعی میری آنکھیں گویا نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ اگر کمرے میں کسی قسم کی گیس پھیل رہی تھی تو مجھے اس کی بُو محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ فیونا اسی طرح میرے پاس بیٹھی ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غنودگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ اگر کوئی گیس مجھ پر اثر انداز ہو رہی تھی تو وہ اس پر نہ جانے کیوں اثر انداز نہیں ہو رہی تھی جبکہ اس کے چہرے پر کوئی ماسک وغیرہ بھی نہیں تھا۔

یہی سوال ذہن میں لیے میں دھیرے دھیرے بے خبری کی آغوش میں اُتر گیا۔

میری آنکھ کھلی تو احساس ہوا کہ میں کسی تنگ سی جگہ پر لیٹا ہوا تھا۔ پہلے تو مجھے یہی گمان گزرا کہ شاید میں اسی آہنی کمبل میں پھنسا ہوا تھا لیکن پھر احساس ہوا کہ میرے ہاتھ پاؤں حرکت کر رہے تھے۔ آنکھیں ذرا تاریکی سے مانوس ہوئیں اور ذہن سے خنک سی دھند چھٹی تو پتا چلا کہ میں ایک گاڑی کی پچھلی سیٹ پر لیٹا ہوا تھا۔ میں آنکھیں ملتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔

تب مجھے پتا چلا میں اسی گاڑی میں تھا جس سے مجھے اغوا کیا گیا

تھا۔ وہ میرے اسلام آباد آفس کی گاڑی تھی۔ گاڑی اس وقت اسلام آباد ہوٹل سے کچھ ہی دور ایک بلند عمارت کے قریب کھڑی تھی اور اس میں میرے سوا کوئی نہیں تھا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔

میرے ذہن پر کوئی بوجھل پن وغیرہ نہیں تھا اور نہ ہی کسی قسم کی تھکن کا احساس تھا۔ بس ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں معمول کے مطابق رات کو سو کر اٹھا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے گمان گزرا کہ کہیں واقعی میں خود ہی گاڑی یہاں روک کر پچھلی سیٹ پر لیٹ کر سو تو نہیں گیا تھا؟

ساری باتیں خواب لگ رہی تھیں لیکن مجھے معلوم تھا جو کچھ مجھ پر گزری تھی، جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا تھا، وہ کتنا ہی عجیب سہی لیکن بہرحال حقیقت تھا۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر آ بیٹھا۔ چابیاں گاڑی میں لگی ہوئی تھیں۔ میں اسے اسٹارٹ کر کے ہوٹل کی پارکنگ لاٹ میں لے آیا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ پائنتی رکھے ہوئے کمبل کو دیکھ کر یک لخت مجھے اندیشہ سا محسوس ہوا کہ کہیں یہ خود بخود پھیل کر مجھے دبوچ نہ لے۔ غیر ارادی طور پر میں نے اسے ایک طرف کو کھسکا دیا اور لیٹ کر دیر تک باس ٹو سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں سوچتا رہا۔

دن چڑھا تو میں نے کمرے میں ہی ناشتا منگوایا پھر اپنے ٹریول ایجنٹ کو فون کیا۔ رات کی فلائٹ میں مس کر چکا تھا۔ دوسری فلائٹ میں سیٹ کا بندوبست کر کے میں گاڑی آفس میں چھوڑ کر لاہور روانہ ہو گیا۔

لاہور میں بھی سب سے پہلے میں نے ہوٹل ہی کا رخ کیا۔ شاور لینے اور لباس تبدیل کرنے کے بعد میں آفس روانہ ہوا لیکن

راستے ہی میں غیر ارادی طور پر گاڑی راحیلہ کے گھر کی طرف موڑ لی۔ میں محسوس کرتا تھا کہ راشد کے قتل کے بعد مجھے اس کی دلجوئی کے لیے زیادہ دیر اس کے پاس رہنا چاہیے تھا لیکن مجھے اتنا وقت ہی نہیں مل سکا تھا۔

بلڈنگ کے قریب گاڑی کھڑی کر کے میں اوپر راحیلہ کے اپارٹمنٹ پر پہنچا اور بیل بجائی۔ اندر بلا کا سکوت تھا۔ چند لمحے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہ دروازے کی میجک آئی سے شاید مجھے دیکھ رہی تھی لیکن اس کے باوجود جب اس نے دروازہ کھولا تو محتاط انداز میں کھولا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی سی ایک اسپورٹس شرٹ اور ٹراؤزر میں تھی۔ گھر میں ہونے کے باوجود جوگرز پہنے ہوئے تھی۔ سر پر پی کیپ تھی۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ زیادہ تر اس کا لباس اور جوتے وغیرہ کھلاڑیوں کے سے ہوتے تھے۔ شاید وہ اپنے آپ کو ہلکی پھلکی اور پُرتلی رکھنے کے لیے اس حلیے میں رہتی تھی۔ دو تین مرتبہ ایسا اتفاق ہو چکا تھا اس لئے شاید اسے وہم رہنے لگا تھا کہ کسی وقت بھی کوئی اُفتاد پڑ سکتی ہے اس لیے لباس اور جوتے وغیرہ ایسے ہونے چاہئیں کہ نہایت تیزی سے حرکت میں آنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

اندر پہنچ کر میں نے دیکھا اس کے ہاتھ میں رائفل تھی جس پر دوربین لگی ہوئی تھی "دی سرکل" نے اسے جو چیزیں فراہم کی تھیں ان میں یہ رائفل بھی شامل تھی۔ میں نے کمرے میں خفیف سی بارود کی بُو بھی محسوس کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جس وقت میں عمارت کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا اسی دوران اس نے رائفل سے فائر کیا تھا۔ رائفل پر سائلنسر بھی فٹ تھا جس کی وجہ سے میں فائر کی آواز نہیں سُن سکا تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ اپارٹمنٹ کے اندر رہتے ہوئے راحیلہ کو دور مار رائفل سے فائر کرنے کی کیا ضرورت پیش آ گئی تھی۔

اس نے جلد ہی دروازہ بند کر دیا۔ تاہم اس کے چہرے پر ہیجان زدگی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ میں نے اپارٹمنٹ میں اِدھر اُدھر جھانکا۔ کہیں کوئی دکھائی نہ دیا۔ تب میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا "کس کی شامت آئی تھی؟"

"معلوم نہیں۔ میں اسے پہچانتی نہیں۔" اس نے کندھے اچکاتے ہوئے بے پروائی سے جواب دیا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کھڑکیوں کے پردے گرے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے ایک کھڑکی کے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر اس نے اشارہ کیا "وہ دیکھو"

جس عمارت میں راحیلہ کا اپارٹمنٹ تھا وہ ایک بہت بڑے راؤنڈ اباؤٹ کے قریب واقع کارنر بلڈنگ تھی۔ سامنے ہی مین روڈ دور تک جا رہی تھی۔ اس روڈ پر کافی دور مجھے چھوٹا سا ہجوم نظر آیا۔ وہ لوگ ایک گاڑی کو گھیرے ہوئے تھے اور ان کی تعداد میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہو رہا تھا۔ فاصلہ کافی تھا تاہم مجھے گاڑی کی ونڈ اسکرین پر [illegible] کا جال سا پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے سوا میں کچھ نہ دیکھ سکا۔ گاڑی کا رخ عین اسی کھڑکی کی طرف تھا جس میں اس وقت میں اور راحیلہ پردے کے پیچھے کھڑے تھے۔

"پورے اڑتالیس گھنٹے ہو گئے تھے اس شخص کو وہیں گاڑی میں بیٹھے ہوئے۔" راحیلہ سپاٹ لہجے میں بولی "میں حیران ہوں کہ اس دوران کیا اسے ایک بار بھی گاڑی سے اُترنے کی ضرورت پیش نہیں آئی؟ میں نے اسے کچھ کھاتے ہوئے بھی نہیں دیکھا۔ بس پتھر کے بُت کی طرح گاڑی میں بیٹھا رہتا تھا۔ کبھی کبھار اچٹتی سی نظر سے اس کھڑکی کی طرف دیکھ لیتا تھا۔"

"اور تم نے اسے گولی مار دی؟" میں نے حیرت سے پوچھا "ممکن ہے وہ بے گناہ ہو۔ ممکن ہے کسی اور کے لیے کسی اور چکر میں بیٹھا ہو۔"

"نہیں وہ اس اپارٹمنٹ کی نگرانی کر رہا تھا۔" راحیلہ فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔

"اتنی دور سے؟" مجھے اس بات پر یقین نہیں آ رہا تھا "تم اتنے یقین سے یہ بات کیونکر کہہ سکتی ہو؟"

"کیا تمہیں میری حسیات پر بھروسا نہیں ہے؟" وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے بولی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خطرناک حد تک سنجیدہ تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کی حسیات بلا کی تیز تھیں۔ اس موقع پر اس کی بات کی تردید کرنا اس کے دل میں بدگمانی لا سکتا تھا۔

وہ نہایت دھیمے لہجے میں، لیکن ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی "جس طرح اکثر معاملات میں تمہیں اپنی حسیات پر بہت بھروسا ہے، اسی طرح مجھے بھی اپنی حسیات پر اعتماد ہے۔ میری چھٹی حس اور میرا دل مجھے دھوکا نہیں دیتا۔"

میں نے ایک بار پھر پردے میں جھری بناتے ہوئے دیکھا۔ ہجوم بڑھ رہا تھا۔ عملی طور پر کچھ نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی تک کسی ایمبولینس وغیرہ کی آمد کے کوئی آثار نہیں تھے اور نہ ہی غالباً اس شخص کو گاڑی سے نکالا گیا تھا۔ پولیس بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"کیا وہ مر گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً" راحیلہ نے غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا "میں نے اس کی پیشانی میں.... عین دونوں آنکھوں کے درمیان سوراخ نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد تو کوئی معجزہ ہی اسے بچا سکتا تھا۔"

میں نے پردہ برابر کر دیا اور تھکے تھکے انداز میں ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

راحیلہ نے گن الماری کے ایک خانے میں رکھ دی اور میرے مقابل آبیٹھی۔ وہ بغور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ افسردگی آمیز لہجے میں بولی۔ "شاید تم اس بات پر ناخوش ہو کہ میں نے اپنے طور پر کوئی فیصلہ کرلیا؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "میری ایسی کوئی خواہش نہیں ہے کہ تمہیں یہاں کٹھ پتلی بنا کر رکھوں اور میرے اشارے کے بغیر تم حرکت ہی نہ کرو۔ اس کے برعکس میں تو تمہیں زیادہ سے زیادہ آزاد' خود مختار اور پلک جھپکتے میں فیصلہ کرنے والی عورت دیکھنا چاہتا ہوں کیونکہ آگے چل کر تمہیں نہ جانے کیا کیا ذمے داریاں سنبھالنی پڑیں۔"

"تو پھر اتنے خاموش کیوں ہو؟"

"بس..... یونہی..... جب میں تمہیں اس مار دھاڑ اور ہر وقت کی اعصابی کشیدگی میں مبتلا دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں' شاید میں نے تمہیں کراچی سے یہاں لا کر اچھا نہیں کیا' خصوصاً راشد کی موت کے بعد میرا پچھتاوا بڑھ گیا ہے۔ سوچتا ہوں' تمہیں یہاں آکر کیا ملا؟ آئے دن کچھ نہ کچھ گنوانا ہی پڑ رہا ہے۔"

"تم خواہ مخواہ ان سوچوں میں الجھتے ہو۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "میں بہت کم وقت میں اس نئے لائف اسٹائل کی عادی ہوگئی ہوں۔ مجھے قطعاً افسوس یا پچھتاوا محسوس نہیں ہوتا۔ راشد کی موت کا زخم میرے سینے میں تازہ ضرور رہے گا لیکن میں یہ ہرگز نہیں سوچتی کہ اگر وہ لاہور نہ آتا تو شاید زندہ رہتا۔ اگر خدا نے اس کی زندگی اتنی ہی لکھی تھی تو اسے ہر حال میں مرنا تھا۔ گولی سے نہ مرتا تو شاید کسی اور طرح مر جاتا۔"

اس کے چہرے پر حوصلے کی چمک تھی اور اس کے سوچنے کا یہ انداز میرے لیے حوصلہ افزا تھا۔ ورنہ حقیقت یہی تھی کہ میں اس کے سامنے اپنے آپ کو مجرم مجرم سا محسوس کیے جا رہا تھا۔

"کیا واقعی تمہیں کبھی خیال نہیں آتا کہ اچھلی بھلی سکون سے زندگی گزر رہی تھی۔ اب ہر وقت گولیاں..... دھماکے..... اپنے سائے سے بھی خوف..... کچھ پتا نہیں کب رہائش بدلنی پڑ جائے؟" میں نے کہا۔

"میں بالکل خوفزدہ یا پریشان نہیں ہوں۔ یہ بھی زندگی کا ایک انداز ہے جسے میں نے قبول کرلیا ہے۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ میں بالکل مطمئن اور پُرسکون ہوں۔ اگر میں نے کچھ کھویا بھی ہے تو میں اپنے آپ کو نقصان میں نہیں سمجھتی۔ میں نے کچھ پایا بھی تو ہے۔"

"کیا؟" میں نے قدرے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے تمہیں پالیا ہے' میرے لیے بس یہی کافی ہے۔ اب کسی بھی حال میں زندگی گزارنا میرے لیے بہت آسان ہوگیا ہے۔" وہ کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔

"تم نے مجھے پالیا ہے؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ "اور مجھے خبر ہی نہیں؟"

"بیشتر مرد اصل میں یہی سمجھتے ہیں کہ پالینے کا مطلب شادی کرلینا ہوتا ہے۔ یعنی جس سے شادی کرلی' سمجھو اسے پالیا۔ یہ بڑا ہی غلط نظریہ ہے کہ شادی کیے بغیر بھی کوئی کسی کو پاسکتا ہے' بعض مرد اور عورتیں میاں بیوی ہوتے ہیں مگر وہ زندگی بھر ایک دوسرے کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ جسمانی طور پر کسی کو پالینا ہی پالینا نہیں ہوتا۔" اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

"تم تو اچھی خاصی فلسفی ہوتی جا رہی ہو۔ اس لنگڑے فلسفے کے سہارے کب تک میری شادی کی درخواست کو ردی کی ٹوکری میں ڈالے رکھو گی؟" میں نے کراہ کر پوچھا۔

"اگر ستر اسی سال کی عمر کو پہنچنا نصیب ہوا تو پھر اس سلسلے میں سوچیں گے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"اتنی عجلت کی بھی کیا ضرورت ہے۔" میں نے جل کر کہا "قبرستان میں پہنچ کر ہی یہ زحمت کرلیں گے۔ ڈھانچے ہمارے باراتی ہوں گے۔"

"تم یہ دل دکھانے والا موضوع نہ چھیڑا کرو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ "ہمارے پاس تو اتنی باتیں ہیں کرنے کے لئے۔"

"ہاں۔ یہ تو درست ہے۔" میں نے افسردہ سے لہجے میں کہا اور چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے سر جھکا لیا۔ میں اٹھا اور ایک بار پھر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہاں سے کار' لاش اور ہجوم سب کچھ غائب ہوچکا تھا۔ اگر پولیس آئی تھی تو اس کی کارروائی اتنی جلدی تو ختم نہیں ہوسکتی تھی۔

مجھے افسوس ہوا کہ میں خواہ مخواہ راحیلہ سے باتوں میں لگ گیا تھا۔ اتنی دیر میں وہاں نہ جانے کیا ہوا تھا۔ میں نے راحیلہ کو یہ بات بتائی تو وہ بھی اٹھ کر میرے پاس آن کھڑی ہوئی۔ اس نے بھی پردے کے درمیان سے جھانک کر دیکھا اور حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔

"لیکن اس سے تمہیں یہ یقین تو آگیا ہوگا کہ وہ کار سوار بہرحال ایک پُراسرار شخص تھا۔" وہ کھڑکی سے ہٹتے ہوئے بولی۔

"ہاں..... لگتا تو کچھ ایسا ہی ہے۔" میں سڑک کا جائزہ لیتا رہا۔

گاڑی میں نے سروس روڈ پر چھوٹے سے ایک پرائیوٹ اسپتال کے قریب گرین بیلٹ کے درختوں تلے کھڑی دیکھی تھی۔ روڈ کے دونوں طرف کوٹھیوں کی قطاریں تھیں۔ اسپتال بھی ایک بڑی سی کوٹھی میں ہی قائم تھا۔ اس کے دونوں گیٹوں پر اچھی خاصی آمد و رفت رہتی تھی لیکن اب وہاں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

سڑک کے کنارے چند کھوکھے بھی تھے۔ میں نے پہلی بار کھڑکی سے جھانکا تھا تو وہ کھلے دکھائی دیے تھے لیکن اب بند تھے۔ یہ بھی ہمارے ہاں کی روایتوں میں سے ایک پُرانی روایت تھی۔ کہیں کوئی واردات ہوتی تھی تو آس پاس کے لوگ کھسک جانے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے تھے۔ جرم نہ کرنے والے قانون کے محافظوں سے

زیادہ ڈرتے تھے۔

راحیلہ ایک چٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "اس کی مدد سے کوئی سراغ لگانا چاہو تو اپنی سی کوشش کر دیکھنا۔ یہ اس گاڑی کا نمبر ہے۔ میں نے دوربین سے نوٹ کرلیا تھا۔"

میں نے چٹ اپنی جیب میں رکھ لی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ "میں ابھی آرہا ہوں۔"

"کہاں جارہے ہو؟" راحیلہ نے میرے پیچھے لپکتے ہوئے پوچھا۔

"میں اپنے طور پر تھوڑی سی تفتیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

عمارت سے نکل کر میں پیدل اس مقام تک پہنچا جہاں میں نے گاڑی کھڑی دیکھی تھی۔ راحیلہ کے اپارٹمنٹ سے یہاں تک خاصا فاصلہ تھا۔ غیر محسوس طور پر میں نے راحیلہ کے اپارٹمنٹ کی طرف دیکھا۔ کوئی شبہ نہیں کرسکتا تھا کہ گولی وہاں سے آئی تھی۔

اسپتال کے گیٹ پر ایک چوکیدار کھڑا تھا۔ اب اسپتال میں کچھ آمد و رفت بھی شروع ہوچکی تھی۔ میں نے بظاہر سرسری سے انداز میں چوکیدار سے پوچھا۔ "کچھ دیر پہلے یہاں کیسا ہجوم سا لگا ہوا تھا؟ خیریت تو تھی..... کیا اسپتال میں کچھ ہوگیا تھا؟"

ویسے شاید وہ میرے سوال کا جواب نہ دیتا لیکن بات اسپتال کی آئی تو فوراً اس کا دفاع کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں صاحب! اسپتال میں کیا ہونا تھا۔ ادھر گاڑی میں کوئی آدمی بیٹھا تھا۔ کوئی اس کو گولی مار کر بھاگ گیا۔ پتا نہیں چلا کون مار گیا۔"

"لاش اور گاڑی کدھر گئی؟" میں نے متجسس سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

چوکیدار نے شک زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور قدرے تامل کے بعد جواب دیا۔ "خفیہ پولیس آئی تھی' وہ لاش اور گاڑی لے گئی۔"

"خفیہ پولیس.....؟" میں نے دہرایا۔ "تمہارا مطلب ہے' وہ لوگ سادہ لباس میں تھے؟"

چوکیدار نے اثبات میں سر ہلایا اور گویا میری بے وقوفی پر افسوس کرتے ہوئے بولا۔ "ظاہر ہے صاحب! خفیہ پولیس والے تو سادہ لباس میں ہی ہوتے ہیں نا۔ انہوں نے آکر لوگوں کو ڈانٹا کہ ادھر مجمع کیوں لگایا ہے' سب جا کر اپنا اپنا کام کرو۔ پھر وہ گاڑی میں بیٹھے اور لاش سمیت اس کو لے گئے۔"

"انہوں نے کسی سے کچھ پوچھا نہیں؟" میں نے دریافت کیا۔

چوکیدار نے نفی میں سر ہلایا اور میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ظاہر ہے وہ پولیس والے نہیں ہوسکتے تھے۔ میرے لیے اتنا ہی جاننا کافی تھا۔ میں ٹہلتا ٹہلتا راحیلہ کے اپارٹمنٹ میں لوٹ آیا۔ میں نے اسے بتایا کہ کچھ لوگ کتنی آسانی سے لاش اور گاڑی لے کر غائب ہوگئے تھے۔

"وہ شخص میرے ذہن میں بڑی اُلجھن چھوڑ گیا ہے۔ آخر وہ کون تھا اور کیوں تمہاری نگرانی کر رہا تھا؟" میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا۔

"ظاہر ہے' ریڈ ڈاٹ کا آدمی ہوگا۔" راحیلہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"نہیں۔" میں نے نہ جانے کیوں نفی میں سر ہلاتے ہوئے وثوق سے کہا۔ "اتنی اتنی دیر کے لیے اس طرح آدمی مقرر کر کے کسی کی نگرانی کرانا ریڈ ڈاٹ کا انداز نہیں ہے۔ اس طرح تو انہوں نے کبھی میری نگرانی نہیں کی جس کے ساتھ ان کی اتنی کھینچا تانی چل رہی ہے۔ اس کے باوجود وہ جب چاہتے ہیں مجھے تلاش کرلیتے ہیں۔ بلکہ شاید میری نقل و حرکت ہر وقت ہی ان کے علم میں رہتی ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ تمہارے اس ٹھکانے سے بھی واقف ہیں۔ اس کے بعد تو وہ تبھی سامنے آتے ہیں جب انہیں کچھ کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح مکھیاں مارنے کے لیے وہ اپنا کوئی آدمی نہیں بٹھاتے۔"

"لیکن لاش غائب کرنے کا انداز.....؟" وہ اُلجھن زدہ لہجے میں بولی۔

"یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ انداز تو کسی بھی منظم جرائم پیشہ گروہ کا ہوسکتا ہے۔" میں نے کہا اور ٹیلی فون اپنی طرف کھسکا لیا۔ فون پر ٹونی سے رابطہ کر کے میں نے راحیلہ کی دی ہوئی چٹ پر لکھا نمبر اسے بتاتے ہوئے کہا۔ "اس گاڑی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو اور مجھے مطلع کرو۔"

میں نے ریسیور رکھا تو راحیلہ بولی۔ "ٹونی اس قسم کی معلومات آسانی سے حاصل کرلیتا ہے؟"

"ہاں۔ بہت آسانی سے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہر محکمے' ہر ادارے میں اس نے کسی نہ کسی کو "دی سرکل" کا چھوٹا موٹا مخبر بنا رکھا ہے۔ ویسے بھی اکثر اداروں میں کچھ نہ کچھ لوگ تھوڑا بہت معاوضہ لے کر ضروری معلومات فراہم کردیتے ہیں۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ بہت سے لوگ اس سے استفادہ کرتے ہیں۔ بعض اوقات اہم راز بھی اس طرح لیک آؤٹ ہوجاتے ہیں۔ بعض اوقات راز فروخت کرنے والوں کو علم ہی نہیں ہوتا کہ یہ کسی کے

لیے کتنے اہم ثابت ہوں گے۔"

وہ تفہیمی انداز میں سرہلانے لگی۔ پھر بولی۔ "تم نے "دی سرکل" کو کافی منظم کرلیا ہے۔ سب بڑے باصلاحیت لوگ ہیں۔"

"ہاں۔ میں نے کم سے کم آدمیوں سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی ٹیکنیک اپنانے کی کوشش کی تھی۔" میں نے کہا۔

"تم نے "دی سرکل" کو منظم کس لیے کیا تھا؟" اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"انٹرویو لے رہی ہو میرا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ مجھے واقعی تجسس ہورہا ہے۔ تم اپنی جس اہم میٹنگ میں مجھے لے گئے تھے اس میں تقریباً سبھی کچھ میری سمجھ میں آگیا لیکن اس پہلو پر کوئی خاص روشنی نہیں پڑی کہ آخر تمہیں "دی سرکل" بنانے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟"

"ضرورت تو کوئی خاص نہیں تھی۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اور نہ ہی میں نے اسے بنایا۔ یہ خود بخود ہی بنتا چلا گیا۔ میرا مطلب ہے کہ اس کا کوئی باقاعدہ خیال میرے ذہن میں نہیں آیا تھا اور نہ ہی بیٹھ کر' باضابطہ طور پر اس کے قیام کا کوئی اعلان ہوا تھا اور نہ ہی کہیں کاغذوں میں اس کا کوئی وجود ہے۔ بس یہ ایک "زبانی کلامی" قسم کی تنظیم ہے جس کا نقشہ صرف ہمارے ذہنوں میں ہے۔"

"پھر بھی ذہن میں کچھ تو ہوگا؟"

"ان میں سے بیشتر میرے پرانے ساتھی ہیں۔ بعض تو لڑکپن سے میرے ساتھ ہیں۔ ہم سب میں ایک قدر مشترک تھی۔ ہم سب وہ لوگ تھے جن کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اور ہم سب کا بچپن یا لڑکپن قابلِ رحم حالات میں ہی گزرا تھا۔ ابتدا میں اسی چیز نے ہمیں ایک زنجیر میں باندھا تھا۔ پھر ہماری لائن بھی ایسی بن گئی کہ منظم اور متحد رہنا ہماری ضرورت تھا۔" میں نے بتایا۔

"اس زمانے کی بات کررہے ہو جب اِدھر کا مال اُدھر کرتے تھے؟"

"ہاں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "پھر جب ہماری زندگیوں میں سُدھار آیا تو ہم نے سوچا' ہمیں اپنے اتحاد و اتفاق کو نہ صرف پہلے ہی کی طرح برقرار رکھنا چاہیے بلکہ اسے کوئی مثبت اور تعمیری رُخ بھی دینا چاہیے۔ پھر جوں جوں دولت آتی گئی ہم نے جدید ساز و سامان کا بھی سہارا لیا۔ زیادہ منظم ہوتے گئے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کچھ یادوں کی دُھندلاہٹ میں بھٹکتے ہوئے کہا "ابتدا میں ہمارا کردار کچھ خدائی فوجداروں کا سا بھی رہا۔ کہیں کسی مظلوم کو دیکھتے تو اس کی مدد کرتے۔ مالی' جسمانی اور لفظی طور پر' غرض یہ کہ ہر طرح سے ضرورتمندوں کے کام آنے کی کوشش کرتے۔ بعض اوقات ہم کسی کا بہت بڑا مسئلہ حل کرجاتے اور اسے ہمارا نام تک معلوم نہ ہوتا۔"

راحیلہ مسکرائی۔ "افسانوی سی باتیں لگتی ہیں۔ آج کل تو لوگ دوسروں سے چندہ جمع کرکے کسی بیوہ کو ایک سلائی مشین بھی دیتے ہیں تو کوشش ہوتی ہے کہ سارے اخباروں کے فرنٹ پیج پر تصویر چھپے۔"

"ہمارے ذہن افسانوی سے ہی تھے۔ ہمارے اندر عجیب مضطرب سی روحیں مقید تھیں۔ ہم اس دنیا کو بدل دینا چاہتے تھے۔ ہماری بچپن کی محرومیاں ہمیں منفی راستوں پر زیادہ دور لے جانے کے بجائے مثبت اور تعمیری راستوں پر لے آئی تھیں۔ ہم جیسے بچپن گزارنے والے اور ہم جیسے حالات سے دوچار رہنے والے عموماً چور ڈاکو بن جاتے ہیں اور زندگی بھر معاشرے کو کوستے رہتے ہیں کہ اس نے ان کے ساتھ یہ کردیا' وہ کردیا لیکن ہم بُرائی سے اچھائی کی طرف آگئے۔ نہ جانے قدرت نے ہمیں یہ کس چیز کا انعام دیا تھا۔"

"نیت کا۔" راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم سب کے اندر ایک اچھا آدمی موجود تھا اور اچھی بات یہ ہوئی کہ وہ آدمی مرا نہیں۔"

"شاید ایسا ہی ہوا ہو۔" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہم محسوس کرتے تھے کہ بعض مسائل قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے حل نہیں کیے جاسکتے اور بعض اوقات قانونی یا روایتی طریقوں سے کسی کی کوئی مدد نہیں کی جاسکتی۔ اکثر ہمیں یہ بھی نظر آتا کہ جہاں کسی کو کسی بھی قسم کی ذرا سی بھی طاقت حاصل ہے وہاں اس نے کمزور کی زندگی اجیرن کررکھی ہے۔ اس چیز نے ہمیں خدائی فوجداروں کے سے انداز و اطوار اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔ جہاں بھی موقع ملتا ہم کمزوروں اور مظلوموں کی مدد کرنے کی کوشش کرتے۔ بہت سے علاقوں کو ہم نے بدمعاشوں سے صاف کیا' بہت سے لوگوں کے دماغ درست کیے' بہت سے فرعونوں کے ذہنوں سے فرعونیت کھُرچ کر نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن......" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ کر گہری سانس لے کر کرسی کی پُشت سے ٹیک لگالیا۔

"لیکن کیا......؟" اس نے تجسس سے پوچھا۔ وہ بڑے انہماک سے میری کہانی سن رہی تھی۔ شاید میرا تجزیہ کرنا چاہتی تھی۔

"لیکن پھر ہم تھک گئے' کچھ ناامید سے ہوگئے۔" میں نے جواب دیا۔ "ہم نے محسوس کیا کہ ہماری کوششوں سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا۔ معاشرہ جہاں کا تہاں کھڑا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ ہم معاشرے میں کوئی انقلاب نہیں لاسکتے۔ اس کے لیے نظام کی تبدیلی کی ضرورت تھی جس میں ہمارا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ دھیرے دھیرے ہماری سرگرمیاں خود بخود محدود ہوتی چلی گئیں۔ لیکن اب بھی ظلم و زیادتی کا کوئی واقعہ اگر ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں تو رہ نہیں سکتے' کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہیں لیکن ہماری زیادہ تر کارروائیوں کی تہ میں اب صرف یہ نظریہ رہ گیا ہے کہ کوئی ہمارے ساتھ زیادتی نہ کرنے پائے۔ ہم زیادہ مستعدی اور طاقت کے ساتھ اسی وقت حرکت میں آتے ہیں جب کوئی ہمارے ساتھ زیادتی کرے اور ہم سے الجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ ورنہ ہم اپنے کام سے کام رکھتے ہیں۔"

"یعنی تم بھی اس معاشرے کے دھارے میں بہہ گئے!" راحیلہ متاسفانہ سے انداز میں مسکرائی۔ "یہاں کا اصول ہے کہ اہل صرف اُسی کو سمجھا جاتا ہے جو اپنے گھر کو لگے۔ ورنہ چاہے ان پاس سب کچھ جلتا رہے' لوگ نظر چرا کر گزرتے رہتے ہیں۔ مصیبت صرف اُسی کو سمجھا جاتا ہے جو اپنے سر پر پڑے۔ کسی دوسرے کی مصیبت ہمارے لیے کوئی مصیبت نہیں ہوتی۔ اپنے پیروں میں چبھی پھانس بھی بہت تکلیف دیتی ہے۔ دوسروں کا چاہے پورا چھلنی ہوجائے' ہمارے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ عجیب نفسانفسی کا زمانہ ہے۔"

"ہاں۔ ہم سب ساتھی بھی بہت عرصے تک ایک دوسرے کے سامنے ان باتوں کا رونا روتے رہے لیکن اسی نتیجے پر پہنچے کہ ہمارے پاس اس کا کوئی حل نہیں۔ ہماری حیثیت صرف چند قطروں کی ہے۔ ہمارے پاس اس سمندر کو صاف شفاف بنانے کا کوئی طریقہ نہیں۔ ہماری طاقت' ہمارے وسائل اس کے لیے ناکافی ہیں۔"

"چنانچہ تم چند قطرے بھی اس سمندر کا حصہ بن گئے!" راحیلہ نے گہری سانس لی۔

"نہیں۔ یہ کہنا تو درست نہیں ہوگا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "ہم اپنے طور پر تو ایک صاف ستھری زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہماری ہمیشہ یہ بھی کوشش ہوتی ہے کہ ہماری ذات سے کسی کو کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ ہم اپنی طاقت کا کوئی ناجائز استعمال نہ کریں۔ اس اعتبار سے ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ہم اس گند کا حصہ نہیں ہیں۔ اس سمندر میں غائب نہیں ہوئے ہیں۔"

"پھر بھی...... مجھے افسوس ہے کہ تم لوگوں نے اپنی جدوجہد ترک کردی۔" راحیلہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "اتنی جلدی تم لوگ مایوس ہوگئے۔ اگر سب لوگ تمہاری طرح سوچنے لگیں تو اس دنیا میں تعمیری کام تو بالکل ہی بند ہوجائیں۔ دنیا میں توازن اسی طرح تو قائم ہے کہ بُرائی اپنے پاؤں پھیلانے کی کوشش کرتی رہتی ہے اور اچھائی اپنی جگہ بناتی رہتی ہے۔ دونوں میں سے کوئی ایک چیز بھی دنیا سے مکمل طور پر ختم نہیں ہوسکتی۔ یہی قدرت کا نظام ہے۔ تاریکی دنیا میں کتنی ہی بڑھ جائے لیکن اہمیت بہرحال روشنی ہی کی رہتی ہے۔ تم نے وہ کہاوت بھی سُنی ہوگی کہ دنیا بھر کی تاریکی مل کر بھی ایک چراغ کو نہیں بجھا سکتی۔ تمہیں اپنا چراغ روشن رکھنا چاہیے تھا۔"

"چراغ اب بھی روشن ہے لیکن اب وہ میرے دل میں روشن ہے۔" میں نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ "بلکہ چراغ بھی نہیں...... ایک شعلہ ہے جو ہر وقت سینے میں رقصاں رہتا ہے' مجھے اندر ہی اندر جلائے جاتا ہے۔ میں بظاہر جتنا مطمئن اور پُرسکون نظر آتا ہوں' اندر سے اتنا ہی مضطرب اور بے چین ہوں۔ میرے لاشعور میں گویا ایک دُھندلی سی خواہش بسی ہوئی ہے کہ مجھے کوئی بہت بڑا کام سرانجام دینا ہے' کوئی بہت ہی اہم اور بہت ہی بڑا کام۔ لیکن مجھے قطعاً اندازہ نہیں ہے کہ وہ کام کیا ہوگا یا کیا ہوسکتا ہے؟ مجھ جیسا آدمی جس کے ساتھ صرف چند جاں نثار ساتھی ہیں' بھلا کر بھی کیا سکتا ہے؟"

"آج مجھے تمہارے منہ سے ایسی مایوسی کی باتیں سُن کر بہت حیرت ہورہی ہے۔" راحیلہ کی آنکھوں میں واقعی حیرانی تھی۔ "تم تو بہت طاقتور آدمی ہو۔ تمہارے پاس اچھے خاصے وسائل ہیں۔ دنیا میں تو نہایت کمزور اور قطعی تہی دست لوگ بڑے بڑے کارنامے انجام دے گئے ہیں' بڑے بڑے انقلابات برپا کرگئے ہیں۔ میں تو تمہیں بڑا باعزم اور بہت بلند حوصلہ انسان سمجھتی تھی۔"

"وہ تو میں ہوں۔" میں نے کہا "لیکن جن مسائل کا مجھے سامنا ہے ان کے لیے صرف یہ خصوصیات کافی نہیں ہیں۔ ان کے لیے کسی اور ہی طرح کی طاقت ضروری ہوتی ہے۔"

"ممکن ہے ریڈ ڈاٹ کا خاتمہ ہی قدرت نے تمہارے ہاتھ سے کرانا ہو۔ تمہارا یہ کارنامہ کیا کم اہم ہوگا؟" راحیلہ نے خیال ظاہر کیا۔

"مجھے یہ بھی ممکن نظر نہیں آتا۔" میں نے دیانتداری سے کہا "میں خوش فہمیوں میں رہنے کا عادی نہیں۔ میں تکلیف دہ حد تک حقیقت پسند انسان ہوں۔ میرے سوا ابھی تک کسی کو بھی صحیح طور پر اندازہ نہیں کہ ریڈ ڈاٹ درحقیقت ہے کیا چیز۔ دنیا کی پانچ طاقتور ترین سفید فام قوموں نے...... پانچ طاقتور ترین ملکوں نے اپنے وسائل اس کے لیے وقف کردیے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک ملک ایسا ہے جس کی ایک ایک کمپنی کا بجٹ ہمارے ملکی بجٹ سے زیادہ ہے۔"

"یہ سب تو مجھے معلوم ہے۔ تم یہ سب کچھ تمام ساتھیوں کو بتا چکے ہو۔ مجھے ہر بات کا اندازہ ہوچکا ہے۔" راحیلہ بولی۔ "اس کے باوجود تم مجھے خواب دکھانے کی کوشش کررہی ہو۔ ریڈ ڈاٹ کے پیچھے انتہائی اونچی سطح کی عالمی سیاست کام کررہی ہے۔ مجھے لگتا ہے' ہم جیسے ملک تو اس کے وجود اور اس کی سرگرمیوں سے آگاہ ہوجانے کے بعد بھی اس سے چشم پوشی کریں گے۔ انجان بنے رہیں گے۔ اس صورتِ حال میں مجھ جیسا غیر اہم آدمی بھلا کیا کرسکتا ہے جس کا بین الاقوامی سیاست سے تو کیا' ملکی سیاست سے بھی دور دور کا کوئی تعلق نہیں۔ جس کے کوئی سائنسی وسائل نہیں' جس کی دولت ان لوگوں کے سامنے خاک کی چٹکی جتنی اہمیت بھی نہیں رکھتی۔"

"واقعی بعض اوقات ضرورت سے زیادہ حقیقت پسند ہونا بھی تکلیف دہ ہوجاتا ہے۔" راحیلہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔ وہ گہری سوچ میں تھی۔

پھر یکدم ہی وہ میرے سامنے رک کر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "افضل چوہدری! تمہیں معلوم ہے' دنیا میں سب سے طاقتور چیز کیا ہے؟"

"نہیں۔ مجھے نہیں معلوم۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"انجان مت بنو۔ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔" وہ آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ اس کے دونوں ہاتھ ٹراؤزر کی جیبوں میں تھے اور گردن نخوت آمیز سے انداز میں اٹھی ہوئی تھی۔ "تمہیں معلوم ہے کہ دنیا میں سب سے طاقتور چیز جذبہ ہے۔ جذبہ اس دنیا میں بڑے معجزے دکھاتا ہے۔ جذبہ طاقتور اور صادق ہو تو ناممکن کو ممکن کر دکھاتا ہے۔ اگر تمہارے اندر جذبہ مر گیا ہے تو پھر واقعی مجھے افسوس ہوگا۔ پھر میں سمجھوں گی' واقعی تمہارے پاس کچھ نہیں رہا' تم تہی دست ہوگئے ہو۔ لیکن اگر تمہارے سینے میں جذبہ زندہ ہے تو پھر تم دنیا بھی فتح کرسکتے ہو۔"

میں نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ میرے دل کے کسی گوشے میں جذبہ کہیں موجود تو تھا لیکن شاید دھول میں اٹے ہوئے ہیرے کی طرح تھا۔ پے در پے جھٹکوں نے اس پر مایوسی کی دھول جما دی تھی۔ شاید ریڈ ڈاٹ کی حکمتِ عملی کامیاب رہی تھی۔ شاید اس نے نفسیاتی طور پر مجھے فتح کرلیا تھا۔ شاید اس کا مقصد مجھے مرعوب کرنا ہی تھا۔ کسی کو مرعوب کرلینا اسے تقریباً فتح کرلینے کے برابر ہی تھا۔

میں...... جو بہت سرکش تھا' بہت خود سر تھا' شاید اندر ہی اندر مایوسی کی دلدل میں دھنس رہا تھا۔ میں...... جو اپنے آپ کو بہت حوصلہ مند سمجھتا تھا' درحقیقت شکست کو قبول کر رہا تھا اور اندر ہی اندر اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کر رہا تھا۔

راحیلہ...... جس کا تعلق صنفِ نازک سے تھا' جو میرے خیال میں مدد کی محتاج تھی' جسے میں اپنی حفاظت میں رکھنے کے لیے کراچی سے لایا تھا' جسے اپنے جان سے پیارے بھائی کی موت کا سانحہ دیکھے ایک ہفتہ بھی نہیں گزرا تھا' وہ راحیلہ مجھے سہارا دے رہی تھی' میرا ہاتھ تھام کر مجھے ایک انجانی دلدل سے نکالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ بھی زندگی کی ایک عجیب ستم ظریفی تھی۔

وہ میرے کندھوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "ہم سے سب کچھ چھن جائے۔ ہمارا سب کچھ لٹ جائے' پروا مت کرو۔ اپنے آپ کو تہی دست مت سمجھو۔ بس جذبے کو زندہ رکھو۔ اگر تمہارے اندر جذبہ زندہ ہے تو فتح کسی وقت بھی تمہارا مقدر بن سکتی ہے۔ تم تو مجھے سمجھایا کرتے تھے۔ تمہیں کیا ہوگیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے اس کے ہاتھوں پر ہاتھ رکھ کر مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں تو صورتِ حال کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کر رہا تھا۔"

"گولی مارو حقیقت پسندی کو۔" وہ جھلا کر بولی۔ "حقیقت پسند بنو مگر اتنے زیادہ نہیں کہ ہمت ہارنے لگو۔ بعض انہونے کام بڑے افسانوی انداز میں ہو جاتے ہیں۔"

شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہ میرے اپنے فلسفے تھے جو وہ مجھے یاد دلا رہی تھی۔ اس کے مرمریں ہاتھ جو بظاہر نرم و نازک نظر آتے تھے' ضرورت پڑنے پر فولاد ہو جاتے تھے۔ یہ ہاتھ میرے کندھوں پر آن ٹکے تھے تو گویا میرے کندھوں سے منوں بوجھ ہٹ گیا تھا۔ مخلص' ذہین اور بہادر ساتھی پانی پہ تیرتے تختے کی طرح ہوتے ہیں۔ جب آپ ڈوبنے لگتے ہیں' مایوسی و دل شکستگی کے سمندر میں غوطے کھا رہے ہوتے ہیں تو وہ آپ کو سہارا دیتے ہیں اور کبھی کبھی آپ کو ساحل پر پہنچانے کا ذریعہ بھی بن جاتے ہیں۔ میں نے اپنا وجود ہلکا ہوتے اور اپنے اندر سے کوئی دھند چھٹتے محسوس کی۔

راحیلہ ٹھیک کہہ رہی تھی یقین' خود اعتمادی یا جذبہ۔ میں خواہ اسے کوئی بھی نام دے لیتا لیکن بہرحال وہ ایسی ہی کوئی چیز تھی جو زندگی میں قدم قدم پر میرے کام آئی تھی' جس نے میرے لیے ناممکن کو ممکن بنایا تھا۔ پھر میرے پاس ایک سے ایک بڑھ کر ساتھی موجود تھا۔ مجھے اتنا فکر مند نہیں ہونا چاہیے تھا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ میرے اندر کی ان کیفیات کو صرف راحیلہ ہی محسوس کرسکتی تھی کیونکہ وہ میری آنکھوں کی کھڑکیوں سے میری روح میں جھانکنا جانتی تھی۔

اس وقت بھی وہ انہی دریچوں سے جھانکتے ہوئے بولی۔ "ویسے بات کیا ہے؟ بظاہر تو تم وہی افضل چوہدری نظر آرہے ہو لیکن تمہارے اندر وہ بجلیاں کوندتی دکھائی نہیں دے رہیں جو تمہاری شخصیت کو غیر معمولی اور ناقابلِ شکست بناتی تھیں۔ کچھ نہ کچھ ہوا ہے۔ کم از کم مجھے تو بتا دو۔"

"میں دراصل ریڈ ڈاٹ کے ایک اور ٹھکانے کی سیر کرکے آیا ہوں۔ ایک اور کارخانۂ عجائب کا نظارہ کرکے آیا ہوں۔ کچھ اور باتیں میرے علم میں آئی ہیں جنہوں نے مجھے افسردہ کر دیا ہے۔ میں حیران ہوں کہ یہ الف لیلوی دنیائیں ہماری ناک تلے کہیں آباد ہیں لیکن ہمیں کبھی نظر کیوں نہیں آئیں۔ بڑی بڑی خفیہ چیزوں پر نظر رکھنے والوں کی نظر ان تک کیوں نہیں گئی۔"

"تم اب ان دردناک سوالوں کو چھوڑو اور شروع سے مجھے بتاؤ کیا ہوا تھا۔" وہ بے تابی سے بولی اور دوبارہ کرسی پر جا بیٹھی۔ کرسی کھینچ کر اس نے میرے قریب کرلی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر اسے ان تمام واقعات کی تفصیل سنا دی جو مجھے اسلام آباد میں پیش آئے تھے۔ میں خاموش ہوا تو وہ سر جھٹک کر بولی۔ "واقعی یہ سب کچھ سن کر سر تو میرا بھی بوجھل ہونے لگتا ہے لیکن سر تھام کر بیٹھنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ تم نے کچھ سوچا ہے؟ کیا تم نے دلی طور پر ان کی پیشکش قبول کرلی ہے یا جان چھڑانے کے لیے ان کے سامنے ہامی بھر کے چلے آئے ہو؟"

"دو چار دن کے لیے ان سے جان چھڑا لینا تو مسئلے کا حل نہیں ہے' یہ تو تمہیں معلوم ہے۔" میں نے اس کی خوبصورت آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ان آنکھوں کی چمک ذرا بھی ماند نہیں پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے بڑا حوصلہ ملتا تھا۔ یہ آنکھیں اسی نوخیز اور نوعمر راحیلہ کی آنکھیں تھیں جس سے میں نے لڑکپن میں عشق کیا تھا۔

وہ کسی خیال میں گم' تفہیمی انداز میں سرہلانے لگی۔ میں نے پوچھا "تم کیا کہتی ہو؟ کیا میں وزیر خارجہ حفیظ صاحب کو قتل کرانے اور اپنے ملک کو تباہی و غلامی کی ایک بھیانک دلدل میں دھکیلنے کا ذریعہ بن جاؤں گا' امریکا میں جس دستاویز پر دستخط ہوں گے تم اس کا مطلب سمجھ رہی ہو نا؟"

"بہت اچھی طرح" اس کے پتلے پتلے' یاقوتی ہونٹ ایک لمحے کے لیے بھنچ کر رہ گئے "ہماری حالت غلاموں سے بدتر ہوگی۔ ہم اس دستاویز کے مطابق چلیں گے تب بھی مارے جائیں گے' اسے ماننے سے انکار کریں گے تب بھی مارے جائیں گے۔ ہم "آگے کنواں اور پیچھے کھائی" والی صورتِ حال سے دوچار ہوں گے۔ ہمارے آباؤ اجداد کی انگریزوں سے آزادی کی جدوجہد' لاکھوں جانوں کی قربانی' چالیس سال کا ہمارا جیسا تیسا سفر۔ سب رائیگاں ہوکر رہ جائے گا۔ ہم ایک بار پھر وہیں کھڑے ہوں گے جہاں سے چلے تھے۔"

"بلکہ اس سے بھی بدتر کسی مقام پر۔" میں نے کہا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرکے کنپٹیاں مسلیں پھر یکدم اٹھتے ہوئے بولی "میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

مجھے معلوم تھا' میری رام کہانی سن کر اس کے اعصاب پر بھی بوجھ پڑ چکا تھا۔ وہ چند منٹ کے لیے توجہ بٹانا چاہتی تھی لیکن ان کوششوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اپنے ذاتی مسائل ہوتے تو انہیں ذہن سے جھٹک دیا جاتا' یہ تو زہر کی طرح رگ و پے میں اتر جانے والی سوچیں تھیں۔

میں اس کے پیچھے پیچھے کچن کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ بظاہر وہ جھیل ہی کی طرح پُرسکون تھی۔ میں نے چوکھٹ کے سہارے کھڑے ہوتے ہوئے کہا "المیہ یہ ہے کہ کوئی ہماری بات پر یقین نہیں کر رہا۔"

"دوسرا المیہ یہ ہے کہ ہماری کوئی بات راز نہیں رہتی۔ ہمارا ہر ٹھکانا' ہماری ہر سرگرمی ریڈ ڈاٹ والوں کے علم میں آجاتی ہے۔ مجھے تو سب سے زیادہ جھنجلاہٹ اسی بات سے ہونے لگی ہے۔ اس سے ہم بے دست و پا ہوکر رہ گئے ہیں۔" راحیلہ' مگ ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی۔

"شاید اسی جھنجلاہٹ میں تم نے اس شخص کو گولی مار دی۔" میں نے کہا۔

"گولی تو میں نے اسے بہت غور و خوض کے بعد' بہت سوچ سمجھ کر ماری تھی لیکن تمہارا خیال کسی حد تک درست ہی ہے۔ شاید اس میں میری جھنجلاہٹ بھی شامل رہی ہو۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "اور میں تمہیں یہ بھی بتا دوں کہ آئندہ بھی اگر مجھے کوئی مشکوک شخص نظر آیا جس کے بارے میں مجھے یہ یقین ہوگیا کہ وہ میرا تعاقب یا نگرانی کر رہا ہے تو وہ زندہ نہیں بچے گا۔"

"چاہے وہ کوئی عام سا لفنگا یا دل پھینک اور فٹ پاتھیا قسم کا عاشق ہوا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آخر تم ایک خوب صورت لڑکی ہو' تمہیں سرِراہ دیکھ کر کسی کی بھی رال ٹپک سکتی ہے۔ کوئی بھی تمہارے پیچھے سیٹی بجاتا' بالوں کو جھٹکے دیتا' تمہیں گھر تک پہنچانے کے لیے روانہ ہوسکتا ہے۔ کسی بھی نودولیتے گھرانے کا چشم و چراغ اپنی قیمتی گاڑی میں پاں پاں کرتا تمہارے پیچھے آسکتا ہے۔ کیا تم اتنی سی بات پر انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دو گی؟ اس طرح تو فہرست بہت لمبی ہو جائے گی کیونکہ یہ تماشا تو ہماری گلیوں بازاروں میں ہر وقت ہوتا ہے۔"

"ہیں تو وہ بھی اسی قابل۔" وہ کافی پرکولیٹر سے مگوں میں انڈیلتے ہوئے بولی "لیکن تم کہتے ہو تو میں اس جھنجلاہٹ پر قابو رکھوں گی اور ہمیشہ کی طرح ان کی صرف دو چار پسلیاں سینکنے پر ہی اکتفا کروں گی۔ لیکن مشکوک لوگوں کو میں نہیں چھوڑوں گی' خواہ نتیجہ کچھ بھی نکلے اور خواہ تم کچھ بھی کہو۔"

"تم نے تو شروع میں ہی "دی سرکل" کے قوانین کی خلاف ورزی شروع کر دی۔ ابھی تو تم قائم مقام چیئرپرسن بھی نہیں بنیں۔ تمہیں معلوم ہے "دی سرکل" میں میری ہدایات کی خلاف ورزی کا کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا۔" میں نے قدرے سنجیدگی سے کہا۔

"تبھی ریڈ ڈاٹ کے مسئلے پر سب ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولی "جہاں سب اختیارات کسی ایک شخص کی ذات تک محدود ہو جاتے ہیں وہاں گاڑی کچھوے کی رفتار سے چلتی ہے۔"

"جہاں سب مرضی کے مالک ہوں وہاں تو گاڑی بالکل ہی نہیں چلتی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اس نے ٹرے اُٹھائی اور ہم نشست کے کمرے میں لوٹ آئے۔ کافی کا مگ اُٹھاتے وقت وہ گہری سوچ میں تھی۔ شاید میری بات پر غور کر رہی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا "میں مذاق کر رہا تھا۔ ہمارے ہاں اختیارات اور بے اختیاری کا کوئی چکر نہیں۔ ہمارا ہر آدمی کسی بھی صورتِ حال میں کوئی بھی قدم اٹھانے کے لیے آزاد ہے۔ ساتھی اگر مجھے احترام دیتے ہیں' میرے اشارے کے منتظر رہتے ہیں تو یہ ان کی محبت ہے۔ لیکن کبھی کبھی وہ مجھ پر بھی حکم چلا لیتے ہیں۔ جہاں کسی صورتِ حال کو وہ زیادہ بہتر طور پر سمجھتے ہیں اور ان کے خیال میں میرا فیصلہ صحیح نہیں ہوتا وہاں ان کی چلتی ہے' میں چپ رہتا ہوں۔ ہمارا کوئی نظام' کوئی لگے بندھے قاعدے' ضابطے یا منشور اور آئین قسم کی چیز نہیں ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں سب سے زیادہ ڈسپلن ہے۔ کیونکہ بات صرف نیّت درست ہونے کی ہوتی ہے۔ نیّت درست ہو تو انتشار اور بدنظمی خود بخود ختم ہو جاتی ہے۔ نیّت درست نہ ہو تو دنیا جہان کے قاعدے' ضابطے بھی کسی پر ٹھونس کر اسے اچھا آدمی نہیں بنایا جا سکتا۔ تم اپنے فیصلوں میں بالکل آزاد ہو۔ بس کوشش کرنا کہ جذبات کو عقل پر غالب نہ آنے دو۔"

اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ راحیلہ نے فون اُٹھایا اور دوسری طرف سے کچھ سن کر میری طرف بڑھا دیا۔ وہ ٹونی تھا۔ میری آواز سُن کر بولا "سر! آپ نے گاڑی کا جو نمبر دیا تھا وہ غلط ہے۔ یعنی اس ترتیب سے رجسٹریشن آفس کے ریکارڈ میں کوئی نمبر موجود نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ نمبر پلیٹ ہی جعلی تھی۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے اسی قسم کی کوئی بات معلوم ہونے کی توقع تھی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے یہ بات راحیلہ کو بتائی تو وہ سر کو خفیف سا جھٹکا دیتے ہوئے بولی "اگر تمہاری بات کو درست مان لیا جائے کہ وہ ریڈ ڈاٹ کا آدمی نہیں تھا تو یہ گویا ایک اور نیا پُراسرار سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ پھر آخر وہ کون تھا اور اسے اتنے صبر و سکون سے اس اپارٹمنٹ کی نگرانی کرنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں تو اب اس کا عادی ہوتا جا رہا ہوں کہ جن سوالوں کا کوئی جواب سمجھ میں نہ آئے ان کے لیے وقت کا انتظار کیا جائے۔ وقت خود بخود بعض سوالوں کے جواب سامنے لے آتا ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا "تم بھی اس بات کو ذہن سے جھٹک دو۔ جس قسم کے حالات میں ہم گھرے ہوئے ہیں' ان میں یہ معمولی باتیں ہیں۔"

"میں نے تو سب کچھ ہی ذہن سے جھٹک دیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "میں تو آج کل ایک عجیب' خالی الذہنی کے سے عالم میں دن گزار رہی ہوں۔ ایک لحاظ سے یہ بڑی خوش قسمتی کی بات ہے کہ میں اپنے آپ کو ہر فکر سے بے نیاز محسوس کر رہی ہوں۔ اس وقت دُکھ اور غم وغیرہ بھی مجھ پر اثر انداز نہیں ہو رہے۔ شاید میرا ذہن' میرے محسوسات بالکل شل ہو گئے ہیں لیکن تمہاری طرح میرے دل کی گہرائیوں میں بھی کہیں ایک شعلہ ضرور روشن ہے۔"

"بس یہی غنیمت ہے" میں نے جلدی سے کہا "یہ اس بات کی نشانی ہے کہ ابھی تمہارا انتقال پُرملال نہیں ہوا۔ ابھی تم زندہ ہو۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تم بڑا طعنہ دے رہی تھیں کہ ہم لوگ ریڈ ڈاٹ کے مسئلے پر ٹاک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ اگر تمہارے ذہن میں کچھ ہے تو بتاؤ۔ ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"میں اگر کچھ کروں گی تو اچانک ہی کر گزروں گی۔ سامنے تو میرے بھی کچھ نہیں ہے۔"

"دیکھا؟ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ باتیں کرنا بہت آسان ہوتا ہے اور کچھ کر کے دکھانا بہت مشکل۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تنقید دنیا کا آسان ترین کام ہے۔"

"جوش دلا رہے ہو مجھے؟" وہ کافی کا مگ ہونٹوں کی طرف لے جاتے ہوئے مجھے گھور کر بولی "اگر اس طرح کی باتیں کرو گے تو میں تمہاری اس نصیحت کو بھول جاؤں گی کہ جوش کو ہوش پر غالب نہ آنے دیا جائے۔"

"جوش میں آ کر کیا کرو گی راحیلہ ڈیئر؟" میں نے ملائمت سے پوچھا "دیواروں سے ٹکریں مارو گی یا گن لے کر ہوا میں گولیاں چلاتی ہوئی سڑکوں پر دوڑنے لگو گی؟"

وہ چند لمحے پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ آخر کار طویل سانس لے کر بولی "واقعی اس معاملے میں یہی مشکل ہے۔ جوش بھی کچھ کام نہیں آ سکتا۔"

"یہی تو میں تمہیں بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ گزشتہ مہینوں میں مجھے جو بھی واقعات پیش آئے ہیں ان سے مجھے اتنی تکلیف نہیں ہوئی جتنی اذیت میں نے اس بے بسی کے احساس کی وجہ سے اٹھائی ہے۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ زندگی میں مجھے ایسی صورتِ حال سے بھی واسطہ پڑے گا کہ آپ کا دشمن تو جب چاہے آپ سے رابطہ قائم کر لے' جب چاہے آپ کو اٹھا لے اور... جو چاہے کر گزرے لیکن آپ کے سامنے اس کا خفیف سا بھی سُراغ نہ ہو' آپ کو اس کے کسی ٹھکانے کا علم نہ ہو۔ آپ اس کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہیں یا بیٹھے بس پیچ و تاب کھاتے رہیں۔"

راحیلہ اب تفہیمی انداز میں سر ہلا رہی تھی۔ میں نے بات

جاری رکھتے ہوئے کہا "جن دشمنوں سے ہمارا کسی نہ کسی حد تک آمنے سامنے کا واسطہ تھا' انہیں خواہ اپنی طاقت پر کتنا ہی گھمنڈ تھا لیکن ان سے نمٹنے میں ہمیں کوئی خاص مسئلہ پیش نہیں آیا' ہم نے آخر کار انہیں ان کے انجام کو پہنچا دیا۔ لیکن ریڈ ڈاٹ ایک تو اس سطح کی دشمن نہیں ہے۔ دوسرے اس کے طریقۂ کار نے تو واقعی مجھے زِچ کر دیا ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ یہ لوگ بس تفریحِ طبع کے لیے ہمارے ساتھ چھیڑ چھاڑ کیے جاتے ہیں۔ محظوظ ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی تفریح ہے ورنہ جو بھی ان کا مقصد ہوتا ہے وہ بہرحال میں پورا کیے ہی جا رہے ہیں۔"

راحیلہ کافی کا گھونٹ بھر کر بے چارگی سے منہ بناتے ہوئے بولی "ہم سے تو فلم کا ہینڈ سا ہیرو ہی اچھا ہوتا ہے۔ ہیروئن یا ہیرو کی کوئی بہن وغیرہ میلوں اور کسی نامعلوم مقام پر ولن کی گرفت میں گلا پھاڑ کر اسے پکارتی ہے اور وہ لاٹھی لے کر یا کبھی خالی ہاتھ' کبھی گھوڑے پر ٹِک ٹِک کرتا اور کبھی پیدل ہی اچانک وہاں نمودار ہو جاتا ہے۔ اپنی گرج دار آواز سے آدھے گھنٹے تک دیواروں کو لرزاتا ہے۔ پھر کشتوں کے پشتے لگاتا ہے۔ ناہنجار اور بدتمیز ولن کا ملیدہ بناتا ہے۔"

اس نے ایک اور گھونٹ بھر کر ٹھنڈی سانس لی "ہم تو بالکل ناکارہ سے لوگ ہیں۔ ہمارے پاس جدید اسلحہ ہے' تھوڑا بہت روپیہ پیسہ ہے۔ جاں نثار ساتھی ہیں۔ جوش ہے' جذبہ ہے' جھنجلاہٹ ہے' بے خوفی و دلیری ہے اور ہم دشمن کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتے۔ یہ احساس بھی ہے کہ دشمن یہیں کہیں' آس پاس' شاید ہماری ناک تلے ہی موجود ہے مگر ہم اسے تلاش نہیں کر سکتے۔ خفیہ ایجنسیاں بھی اپنی سی کوشش کر رہی ہیں۔"

"ان کے بارے میں' میں زیادہ پُریقین نہیں ہوں۔ معلوم نہیں وہ کوشش بھی کر رہے ہیں یا نہیں۔ تازہ میٹنگ میں مجھے تو کچھ ایسا لگا جیسے انہوں نے زیادہ وقت میرے ماضی کو کھنگالنے میں ہی صرف کیا ہے۔ بس یہ اہم کارنامہ انجام دیا انہوں نے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں ذرا بھی اندازہ نہیں کہ جن خفیہ ٹھکانوں پر تمہیں لے جایا گیا وہ کہاں واقع ہو سکتے ہیں؟" راحیلہ کے لہجے سے بھی گھٹن آمیز بے بسی جھلکنے لگی تھی۔

"اندازہ ہوتا تو ہم یوں بے دست و پا بیٹھے ہوتے؟" میں نے کہا "مجھے نہ تو اس وقت ہوش تھا جب مجھے وہاں لے جایا گیا اور نہ اس وقت' جب وہاں سے نکالا گیا۔ بس نہ جانے کیوں ایک احساس ہے کہ وہ جگہیں کہیں زیرِ زمین واقع ہیں۔"

ایک لمحے کی الجھن آمیز خاموشی کے بعد میں نے کہا "ایک احساس مجھے یہ بھی ہوا تھا کہ اگر کبھی ہم ان جگہوں تک پہنچ بھی گئے تو ہمارا اسلحہ' ہمارے وسائل' ہمارا جوش جذبہ اور بے خوفی بھی ہمارے کسی کام نہیں آئے گی۔ وہاں مجھے بتایا گیا تھا کہ وہ جگہیں ایٹمی حملوں تک سے محفوظ ہیں۔ میرا خیال ہے یہ شیخی بگھارنا یا شیخی کا اظہار نہیں تھا۔"

"کیا واقعی ایسا ممکن ہے؟" راحیلہ نے دریافت کیا۔

"ان کے الف لیلوی انداز و اطوار دیکھ کر مجھے سب کچھ ممکن نظر آ رہا تھا۔ میں ان جگہوں کو ایک سرے سے دوسرے سرے تک نہیں دیکھ سکا اور نہ ہی کسی چیز کا کوئی تجزیہ کر سکا لیکن وہاں کے در و دیوار اور تمام چیزوں کی ساخت میں استعمال ہونے والا میٹریل' ان جگہوں کی ڈیزائننگ اور مختلف اشیا کی تنصیب' سب کچھ مجھے غیر معمولی لگ رہا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اگر ان جگہوں کو دریافت بھی کر لیا جائے اور وہ لوگ ان میں قلعہ بند ہو کر بیٹھ جائیں تو اچھی بھلی فوج بھی حملہ آور ہو کر ان جگہوں کو تباہ نہیں کر سکتی۔"

راحیلہ گہری سنجیدگی اور خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے بعد میں نے کہا "ابھی تو ہمیں یہ بھی صحیح طور پر معلوم نہیں کہ ان کے پاس کیسے کیسے ہتھیار اور کیسے کیسے سائنسی شعبدے موجود ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جو کچھ وہ ابھی تک ہمیں دکھاتے رہے ہیں وہ تو محض چٹکلے ہی تھے۔ ضرورت پڑنے پر وہ جو کچھ سامنے لائیں گے وہ بہت تباہ کن ہوگا۔ تمہاری طرح جذباتی ہو کر ان پر چڑھائی کرنے والے تو ایک ہی ہلّے میں گاجر مولی کی طرح صاف ہو جائیں گے۔"

"کہیں تم غیر ضروری طور پر تو مرعوب نہیں ہو رہے؟" راحیلہ نے جاننا چاہا۔

"میں مرعوب نہیں ہو رہا' صحیح تجزیہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ان باتوں کا بھی اندازہ لگا رہا ہوں جو انہوں نے مجھے نہیں بتائیں۔ اگر تم ان جگہوں کو دیکھ چکی ہوتیں تو شاید تمہارے محسوسات بھی یہی ہوتے۔ ابھی ان کی تعداد کے بارے میں بھی

یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ مجھے تو صرف دو ٹھکانوں کی سیر کرائی گئی ہے۔ وہ بھی کچھ محدود اور مخصوص حصوں کی۔ معلوم نہیں ابھی اور ایسے کتنے ٹھکانے موجود ہوں۔ ان پُراسرار اور الف لیلوی ٹھکانوں کے علاوہ شاید عام عمارتوں میں بھی ان کے کچھ اڈے ہوں جو مختلف مقاصد کے لیے استعمال ہو رہے ہوں۔ ہمیں ان کا بھی علم نہیں۔"

"آخر یہ زیرِ زمین' پُراسرار اور الف لیلوی سی جگہیں کہاں ہوسکتی ہیں؟" راحیلہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑائی۔

"یہ کہنا بہت مشکل ہے۔" میں نے جواب دیا "آبادیوں کے نیچے تو بہرحال نہیں ہوسکتیں۔ باقی جگہوں کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں۔ آبادیوں سے سیکڑوں گنا بڑے ہمارے ہاں ویرانے ہیں' جنگل ہیں' صحرا ہیں' میدانی اور پہاڑی سلسلے ہیں۔ لاکھوں مربع میل رقبے بیکار پڑے ہیں۔ کیا معلوم چپکے چپکے کہاں کہاں' کیسی کیسی طاقتوں نے پنجے گاڑ لیے ہوں۔"

"پھر بھی.... یہ کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔" راحیلہ اُلجھن آمیز سے لہجے میں بولی "آخر یہ سب کچھ کب اور کس طرح ہوا؟ چراغ الہ دین کے جن نے راتوں رات یہ سب کچھ جادو کے زور سے تو نہیں بنادیا ہوگا۔ اتنی بڑی بڑی تعمیرات کیسے ہوگئیں کہ کسی کو کانوں کان پتا نہیں چلا؟ ان میں ضروریاتِ زندگی بھی ہیں۔ اور پھر آمدورفت کے ذرائع بھی ہوں گے۔ کبھی کچھ کسی کی نظر میں نہیں آیا؟"

"یہ کچھ ایسی ناممکنات قسم کی چیزیں نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں ہزاروں میل پر مشتمل ایسے ایسے علاقے لاوارث سی حالت میں پڑے ہوئے ہیں کہ جہاں مہینوں کچھ ہوتا رہے تو کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔ عین ممکن ہے کہ ایسی باتوں کا علم رکھنا جن کے اختیارات اور فرائض میں شامل ہو وہ خود ان سازشوں میں آلۂ کار رہے ہوں۔ اس کے علاوہ مختلف پروجیکٹس کی آڑ میں بھی بہت کچھ ہوسکتا ہے۔ اگر کسی کی نظر میں کوئی چیز آئی بھی ہو تو اس کو یہی چکر دیا گیا ہو کہ وہاں کسی پروجیکٹ پر کام ہو رہا ہے۔ بہت سے طریقے ہیں۔ بہت سے راستے ہیں' ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ ہماری معلومات اس سلسلے میں ابھی بہت محدود ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگ جتنے ترقی یافتہ ہیں' جتنے جدید وسائل ان کے پاس موجود ہیں' ان سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کام انہوں نے راتوں رات چراغِ الہ دین کے جن کی طرح ہی نمٹائے ہوں گے۔"

کافی کا ایک گھونٹ بھر کر میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "بہرحال اہم بات یہ نہیں ہے کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا۔ اس سوال پر تو اب بعد میں ہی غور کیا جاسکتا ہے۔ فی الحال تو اہم بات یہی ہے کہ یہ سب کچھ ہوچکا ہے۔ یہ چیزیں ہمارے خواب و خیال میں نہیں' حقیقت میں کہیں موجود ہیں۔ ہمارے لیے تو قابلِ غور مسئلہ یہی ہے کہ ہم کیا حکمتِ عملی اختیار کریں؟"

"اگر حکومت نے تمہاری باتوں پر سنجیدگی سے توجہ دی ہوتی تو جیالوجیکل سروے' آئل اینڈ گیس ڈیولپمنٹ یا اسی قسم کے دوسرے محکموں کے تعاون اور مدد سے ان پراسرار ٹھکانوں کی تلاش شروع کی جاسکتی تھی۔ ان کے پاس مشینری' آلات اور مین پاور کے علاوہ تجربہ بھی ہے۔ یہ لوگ اپنے کاموں کی آڑ میں ان ٹھکانوں کی تلاش جاری رکھ سکتے تھے۔"

"اگر ریڈ ڈاٹ کو اس کی ذرا سی بھی بھنک پڑ جاتی جس کا بہت زیادہ اِمکان تھا تو ان کی شامت آجاتی۔ نہ جانے کتنے مارے جاتے' کتنے اغوا ہوتے۔ الٹا لینے کے دینے بھی پڑ سکتے تھے۔" میں نے کہا "اس کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ محکمے تو ہمارے ہاں بے شمار ہیں۔ محکموں کے معاملے میں تو ہم ماشاءاللہ خود کفیل ہیں بلکہ اگر کوئی ملک اپنی معیشت کی کمر توڑنا چاہے تو ہم یہ محکمے اس کے لیے ایکسپورٹ بھی کرسکتے ہیں۔ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ انہیں تو پہلے وہی چیز نہیں ملتی جس کی تلاش کے لیے یہ قائم کیے جاتے ہیں۔ پھر یہ کوئی دوسری اور پُراسرار چیز کیسے تلاش کریں گے؟"

راحیلہ دھیرے سے ہنسی اور بولی "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ محکموں کا تو ہمارے ہاں واقعی کوئی شمار نہیں۔ ایسے ایسے محکمے ہیں جن کا لوگوں کو نام تک نہیں معلوم۔ ان کے لمبے چوڑے دفاتر ہیں' عملے ہیں' بجٹ ہیں۔ عوام کے لیے ان کی کیا اَفادیت ہے یا وہ اپنا کام کس حد تک انجام دے رہے ہیں' یہ کسی کو نہیں معلوم۔" پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا "میں جب کراچی میں تھی اور ایڈورٹائزنگ کا کام کررہی تھی تو مجھے پتا چلا کہ ہمارے ہاں صحرائی پودوں کے تحفظ اور ان پر اِسپرے وغیرہ کرانے کے لیے بھی ایک محکمہ قائم ہے جس کے ایک اعلیٰ عہدیدار صاحب ایک پوش علاقے میں بڑی سی کوٹھی میں رہتے تھے اور سرکاری جیپ دوڑایا کرتے تھے۔ اس سے تم اندازہ کرسکتے ہو کہ مزید کیا کچھ ہوگا۔"

"میں تو بزنس مین ہوں' مجھے تو بہت اچھی طرح اندازہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ستم ظریفی یہ ہے کہ جس کام کے لیے یا جس مسئلے کے حل کے لیے محکمے قائم کیے جاتے ہیں وہ کام پہلے سے زیادہ مشکل ہوجاتے ہیں' وہ مسئلہ پہلے سے زیادہ سنگین ہوجاتا ہے۔ مثلاً پرائس کنٹرول کمیٹی نہیں تھی تو چیزوں کی پرائس زیادہ کنٹرول میں تھی۔ پولیس کم تھی تو جرائم بھی کم تھے۔"

راحیلہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر بولی "خیر۔ ہمارے ان باتوں پر کڑھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ہم بارہا بند کمروں میں بیٹھ کر اس قسم کے موضوعات پر دل کا بخار نکال چکے ہیں لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں۔"

"دل کا بخار نکال لینا اپنی جگہ خود ایک فائدے کی بات ہے۔ دل کا بخار دل ہی میں رہ جائے تو یہ ملیریا بخار سے بھی زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔"

"بہت نکل چکا دل کا بخار اور غبار' اب کام کی بات کرو اور اصل موضوع پر رہو۔ تم نے اس کام کے بارے میں کیا سوچا ہے جو ریڈ ڈاٹ والوں نے تمہارے سر پر لادا ہے؟ کیا تم اصل حفیظ صاحب کی جگہ نقلی حفیظ صاحب کو پہنچانے کا کام انجام دو گے؟"

"حالات کچھ بھی سہی لیکن میں اتنا بے ضمیر کیسے ہوسکتا ہوں؟" میرے دل میں ہلکی سی افسردگی در آئی۔

"بس تو پھر سمجھو کہ تمہارے ہاتھ میں ترپ کا ایک پتا آگیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ تم اسے کس طرح روک سکتے ہو اور کس طرح کھیل سکتے ہو۔" راحیلہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"کون سا ترپ کا پتا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"وہی شخص جسے ریڈ ڈاٹ والے حفیظ صاحب کی جگہ دلانا چاہتے ہیں۔ وہ یقیناً ریڈ ڈاٹ میں بڑی اہمیت کا مالک ہوگا تبھی تو اسے اس اہم کام کے لیے منتخب کیا گیا ہے...."

"یہ ضروری نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "وہ مقامی آدمی معلوم ہوتا ہے۔ غالباً پاکستان ہی کے کسی علاقے کا باشندہ ہے اور مجھے معلوم ہے کہ مقامی لوگ ریڈ ڈاٹ کے لیے صرف قربانی کے بکرے ہیں۔ وہ ان سے ایسے ہی کام لیتے ہیں جن میں ان کی جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے یا کام نکلنے کے بعد وہ خود ہی ٹھکانے لگانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ سازش کامیاب ہوئی اور یہ شخص امریکا جا کر دستاویزات پر دستخط کر آیا تو واپس آتے ہی اسے پُراسرار حالات میں ہلاک کردیا جائے گا اور یوں ہماری حکومت کے لیے مزید دشواریاں پیدا ہوجائیں گی۔"

"تمہارا یہ تجزیہ تو درست ہے کہ مقامی لوگ ان کے لیے قربانی کے بکرے ہوتے ہیں۔" راحیلہ نے تسلیم کیا "لیکن تمہیں یہ بھی تجربہ ہوچکا ہے کہ ان لوگوں کو ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہوتا۔ بلکہ انہیں تو صحیح طور پر یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ وہ درحقیقت کس کے لیے استعمال ہو رہے ہیں۔ جبکہ اس شخص کو تم نے باس ٹو وغیرہ کے ساتھ ریڈ ڈاٹ کے زیرِ زمین ٹھکانے پر دیکھا ہے۔ اس سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان کے کافی حد تک قریب ہے اور ان کے بارے میں کافی کچھ جانتا ہے۔"

"تمہارا یہ خیال تو ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا لیکن اس شخص کا منطقی انجام مجھے قربانی کے بکرے والا ہی دکھائی دیتا ہے۔" میں نے کہا "تم خود سوچو' جب یہ شخص ایسی دستاویزات پر دستخط کرکے آئے گا جو ہماری حکومتی پالیسی کے بالکل خلاف ہوں گی تو یقیناً شور برپا ہوگا۔ بے شک اس وقت اس کی حیثیت ایک ایسے وزیرِ خارجہ کی ہوگی جس کا ریکارڈ بہت اچھا ہے' قوم کی نظر میں بھی اس کی بڑی عزت اور احترام ہے۔ لیکن اتنے بڑے اور اچانک فیصلے پر حکومت ضرور اس کی طرف متوجہ ہوگی۔ پارلیمنٹ یا سینیٹ کے ذریعے ضرور اس سے جواب طلبی کی جائے گی۔ پریس ایک ہنگامہ برپا کردے گا کہ یہ شخص ملک اور قوم کو گروی رکھ آیا ہے۔ ممکن ہے صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم اپنے اختیارات استعمال کرتے ہوئے اس کے بارے میں کوئی خصوصی انکوائری کرائیں۔ ریڈ ڈاٹ یہ تمام خطرات مول نہیں لے سکتی۔"

"لیکن ضروری نہیں کہ وہ اسے قتل ہی کرادے۔" راحیلہ بولی "ہوسکتا ہے اس صورتِ حال کے لیے ان کے پاس کوئی اور منصوبہ ہو۔ ہم ابھی ریڈ ڈاٹ کے بارے میں جانتے ہی کیا ہیں؟ ہم اپنے ملک کی محلاتی سازشوں اور بین الاقوامی سیاسی گورکھ دھندوں کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتے۔ عین ممکن ہے کوئی ایسی صورتِ حال تخلیق کی جاچکی ہو کہ پاکستان چپ کرکے اس معاہدے کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائے۔ حکومت یہ سب کچھ ہوتے دیکھے اور خاموش رہنے کے سوا کچھ نہ کرسکے۔ اسے چاروں طرف سے ایسی بندشوں میں جکڑ دیا جائے کہ وہ اس معاہدے کو اون (own) کرلینے میں ہی عافیت سمجھے۔ اسے اندازہ ہوجائے کہ اس سے انکار کرنے کی صورت میں اس سے بھی بڑی مصیبتیں نازل ہوسکتی ہیں۔ خدانخواستہ ملک کی اینٹ سے اینٹ بج سکتی ہے اور ہم ایسی ہی خوف ناک اور قابلِ رحم صورتِ حال سے دوچار ہوسکتے ہیں جس سے اس وقت کئی مسلمان ممالک دوچار ہیں۔ کم از کم اس کے مقابلے میں حکومت یہی غنیمت سمجھے کہ اپنے ایٹمی پروگرام اور اپنی چالیس سال کی محنتوں اور کاوشوں کی قربانی دے دی جائے۔ گو کہ یہ بھی اِن ڈائرکٹ غلامی ہی کی ایک صورت ہوگی لیکن کم از کم ہر گلی کوچے میں خون بہنے اور ہنستے بستے شہروں کو ملبے کے ڈھیر بنانے کے مقابلے میں تو غنیمت ہوگی۔"

میں ایک ٹک راحیلہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ راحیلہ کا ذہن بھی ان معاملات میں عمدگی سے کام کررہا تھا۔ وہ جسمانی ہی نہیں' ذہنی صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی میرے لیے ایک کارآمد اور اہم ساتھی ثابت ہو رہی تھی۔

"ہاں۔ یہ سب کچھ ممکنات میں سے ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں تسلیم کیا۔

راحیلہ قدرے تیزی سے بولی "اس کے علاوہ تم جو یہ سمجھ رہے ہو کہ دیسی لوگ ریڈ ڈاٹ میں کسی اہمیت کے حامل نہیں ہوسکتے اور ان کی حیثیت قربانی کے بکروں سے زیادہ نہیں ہوسکتی تو تمہارا یہ خیال بھی غلط ہوسکتا ہے۔"

میں نے اس کی رائے کو جھٹلانے کی کوشش نہیں کی اور خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کئی انتہائی ترقی یافتہ ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں تک میں اِکا دُکا پاکستانی اور دوسرے ایشیائی ملکوں کے باشندے موجود ہیں؟ سی آئی اے اور ایف بی آئی تک میں ہم جیسے غریب غربا ملکوں کے لوگ پہنچ جاتے ہیں اور بعض اوقات اچھا خاصا مقام بنالیتے ہیں۔ ان کے خفیہ پروجیکٹس تک میں کام کررہے ہیں۔ ان میں سے بعض اپنی غیر معمولی صلاحیتوں کی بنا پر وہاں تک پہنچتے ہیں اور بعض اپنے

غدارانہ رُجحانات کی وجہ سے منتخب ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں ترقی یافتہ قوموں کو یقین ہوتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر وہ خود اپنے ملک کے خلاف کام کرنے اور اس کی جڑیں کاٹنے سے دریغ نہیں کریں گے۔"

"ہاں یہ بات مجھے معلوم ہے۔" میں نے جواب دیا "لیکن ان میں سے بھی بعض لوگوں کا جذبۂ حُب الوطنی جاگ اٹھتا ہے یا کبھی کوئی اور وجہ ہو جاتی ہے تو وہ رسی تڑا کر بھاگ پڑتے ہیں۔ اس صورت میں قبر تک ان کا پیچھا کیا جاتا ہے۔ انجام ان سب کا بھی مجھے قربانی کے بکرے والا ہی محسوس ہوتا ہے۔"

"وہ ایک الگ بات ہے لیکن یہ تو طے ہے کہ ایسے لوگ ہوتے ہیں۔ ریڈ ڈاٹ میں بھی ایسے لوگ ہو سکتے ہیں۔ ممکن ہے ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے انہیں چُن لیا گیا ہو، ممکن ہے ان کی غداریوں کا ریکارڈ بہت عمدہ ہو، ممکن ہے ریڈ ڈاٹ نے انہیں کوئی اور چکروے رکھا ہو جو فی الحال ان کی سمجھ میں نہ آتا ہو۔ تم اپنے آپ کو ہی لے لو۔ اگر تم نے ان کی بات مان لی ہوتی تو ممکن ہے آج تم بھی ریڈ ڈاٹ میں کسی اہم حیثیت کے مالک ہوتے۔"

"چلو خیر، فی الحال تمہاری بات ماننے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن تم اصل میں کہنا کیا چاہ رہی تھیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس آدمی کا اصل نام کیا ہے جسے حفیظ صاحب کی جگہ امریکا بھیجنے کا منصوبہ بنایا گیا ہے؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"اصل نام کے بارے میں تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بہرحال مجھے اس کا نام عرفان بتایا گیا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں یہ کہنے لگی تھی کہ عرفان تمہارے لیے ترُپ کا پتا ثابت ہو سکتا ہے۔ تم باس ٹُو کے سامنے ان لوگوں کی سازش میں آلۂ کار بننے کی ہامی تو بھر آئے تھے لیکن درحقیقت تمہارے ذہن میں کیا تھا؟" راحیلہ گدیلی کرسی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

"سچ پوچھو تو میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا "میں تو بس ان سے جان چھڑانے کے لیے ہامی بھر آیا تھا۔ لیکن درحقیقت میں ابھی تک فیصلہ نہیں کر پایا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔"

"بس تم اس ترُپ کے پتے عرفان کو قابو میں کرنے کی کوشش کرو۔" راحیلہ بولی "بظاہر تم سب کچھ اسی طرح کرنے کی تیاریاں کرو جس طرح ریڈ ڈاٹ نے تمہیں بتایا ہے لیکن عین آخری وقت پر تم عرفان کو پکڑ لو۔"

"جب میں سعادت مندی سے ریڈ ڈاٹ والوں کا حکم بجا لانے کا وعدہ کر رہا تھا، اس وقت بھی میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا۔" میں نے بتایا "بظاہر یہ کوئی مشکل کام بھی نہیں۔ لیکن جوں جوں میں نے اس پر غور کیا، اس کی خوف ناکی واضح ہوتی گئی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ زندگی اور موت کی بازی ہے۔ ریڈ ڈاٹ کی طرف سے اس کا فوری طور پر خوف ناک ردِ عمل ظاہر ہوگا۔"

"کوئی بات نہیں" راحیلہ بے خوفی سے بولی "ہم اس ردِعمل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہیں گے۔ ہم سب ساتھی مل کر اس کے لیے منصوبہ بنائیں گے اور اس کے جواب میں جو کچھ بھی ہوگا اس کا سامنا کریں گے۔"

"اس صورت میں یہ سبھی کے لیے زندگی اور موت کی بازی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"کوئی بات نہیں" راحیلہ بے پروائی سے بولی "کم از کم اس طرح ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھے رہنے یا پھر ان کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہنے سے تو نجات ملے گی۔ جو زندگی ہم گزار رہے ہیں اس سے تو موت ہی بہتر ہے۔"

"خیر اب ایسی بھی بات نہیں" مجھے ہنسی آ گئی "ابھی تک تو ہمارا معاملہ ریڈ ڈاٹ کے ساتھ کچھ ایسا ہی رہا ہے جیسے کچھ شرارتی بچے، بزرگوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے ہیں اور وہ نظرانداز کرتے رہتے ہیں یا یونہی کبھی تھوڑی بہت گوشمالی کر دیتے ہیں۔ اگر وہ چاہتے تو واقعی ہماری زندگی کو موت سے بدتر بنا سکتے تھے لیکن نہ جانے کیوں انہوں نے ایسا نہیں کیا۔"

"بہت نیک دل لوگ ہیں۔ صبح صبح اٹھ کر ان کی درازیِ عمر کی دعا کیا کرو۔" راحیلہ جل کر بولی۔

میں اس کی جھنجلاہٹ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا "خیر اب میں ان پر اتنا بھی فدا نہیں ہو رہا۔ میں تو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ان کی بہت سی باتیں ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آئیں۔"

"بہت سی کیا۔ یوں کہو کہ کوئی بھی ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"لیکن ایک بات بہرحال میری سمجھ میں آ رہی ہے کہ پچھلی بار تو میرے ان کو نچا دینے کے باوجود تقریباً خیریت ہی رہی تھی لیکن اس بار وہ ضرور اپنی دھمکی پر عمل کر کے دکھانے کی کوشش کریں گے۔ انہوں نے مجھے غیر معمولی سنجیدگی سے خبردار کیا ہے۔"

"ہم بھی غیر معمولی سنجیدگی سے ان کے ردِعمل کا سامنا کریں گے۔" راحیلہ بولی "پوری طرح اس کی پلاننگ کریں گے اور وہ لوگ جو کچھ بھی کریں گے اس کا منہ توڑ جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ آخر انہیں کچھ تو پتا چلے کہ ہم کوئی ایسے گئے گزرے لوگ نہیں ہیں۔"

"ہم جو کچھ بھی ہیں اور جتنے پانی میں ہیں، انہیں اچھی طرح معلوم ہے لیکن تمہیں ابھی صحیح طور پر اندازہ نہیں کہ ریڈ ڈاٹ کیا چیز ہے۔ مجھے اپنی تو کچھ ایسی خاص پروا نہیں ہے لیکن اپنے ساتھیوں کو بے مقصد اس جنگ میں جھونکنے کو میرا دل نہیں چاہتا۔ ہم کتنے ہی باصلاحیت سہی لیکن بہرحال ہم آج کے زمانے کے لوگ ہیں، ہمارے پاس آج کے زمانے کے ہتھیار ہیں۔ جبکہ وہ مجھے آنے والے زمانوں کے لوگ لگتے ہیں اور ان کے پاس آنے والے

زمانوں کی چیزیں ہیں۔ جن میں سے نہ جانے کتنی ہم نے ابھی دیکھی تک نہیں ہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ اب دیکھ لیں گے۔" راحیلہ مسکرائی "ساتھیوں کی فکر میں تمہیں دُبلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود چوہے بلی کے اس کھیل کو کسی نتیجے پر پہنچتے دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"جب سے وہ خاص میٹنگ منعقد ہوئی ہے جس میں تم نے سب کو تمام حالات سے آگاہ کیا تھا اور یہ بتایا تھا کہ تمہاری عدم موجودگی میں "دی سرکل" اور بزنس وغیرہ کی انچارج میں ہوں گی تب سے ان کا مجھ سے رابطہ رہنے لگا ہے۔ وہ لوگ بڑی شدت سے چاہتے ہیں کہ کچھ کیا جائے۔ تمہارے سامنے تو وہ حدِ ادب سے خاموش رہتے ہیں لیکن مجھ سے اصرار کرتے رہتے ہیں کہ میں تم سے بات کروں۔ انہیں شاید اندازہ ہو گیا ہے کہ مجھ سے تمہارا کوئی تعلقِ خاص ہے اور تم میری بات نہیں ٹال سکتے۔"

وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی "بے چارے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ لیکن خیر چلو، مفت میں اپنی شوبنی ہوئی ہے۔ انہیں کیا معلوم کہ تم تو صرف اور صرف اپنی ہی مرضی کے مطابق کام کرتے ہو۔"

"زیادہ طنز و مزاح فرمانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے مصنوعی غصے سے اس کی طرف دیکھا "میں تو تمہاری بات بھی ماننے کے لیے تیار ہوں اور ان کی بھی لیکن ابھی تک ہمارے سامنے کرنے کے لیے تھا ہی کیا؟ جو چھوٹے موٹے تصادم ہوتے رہے ان میں ہم ہاتھ باندھ کر تو نہیں بیٹھے، جو ہم سے ہو سکا وہ ہم نے کیا۔ ان کے آدمی بھی ہمارے ہاتھوں مارے گئے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کے لیے ہمارے سامنے کوئی راستہ ہی نہیں تھا۔"

"یہی میں بھی انہیں سمجھاتی رہی ہوں۔" راحیلہ ملائمت سے بولی "لیکن اب تو موقع میسر آ رہا ہے۔ اب فائدہ اُٹھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خصوصاً آفتاب کی موت کے بعد سے سب ساتھیوں کے دل میں بڑا غم و غصہ بھرا ہوا ہے۔"

آفتاب کی دردناک موت کی یاد آئی تو میرے دل میں افسردگی کی ایک لہر اُبھری۔ بلیک برڈ نے کسی درندے کی طرح اس کا نرخرہ اُدھیڑ ڈالا تھا۔ گو کہ راحیلہ کے ہاتھوں ایک طرح سے اس کا حساب برابر ہو گیا تھا۔ بعد میں راحیلہ نے بلیک برڈ کی کھوپڑی میں چاپڑ اتار دیا تھا لیکن میرے دل میں ایک خلش سی باقی تھی۔ اس واقعے کے اصل ذمے داروں کا ابھی تک کچھ نہیں بگڑا تھا۔

"غالباً وہ پہلا واقعہ تھا جس میں ہمارا کوئی ساتھی ہم سے بچھڑا تھا۔" راحیلہ بولی۔

"ہاں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اور میرے ساتھی بے وقوف ہوں گے، اگر وہ یہ سمجھیں گے کہ میں اس واقعے کو بھول گیا ہوں۔ جب انتقام کا موقع آئے گا تو ہم ضرور انتقام لیں گے۔ میں

نے اپنے ساتھیوں کو جب بھی کسی دشمن سے نمٹنے کے لیے استعمال کیا ہے تو اس طرح کیا ہے کہ ان میں سے کسی کو خراش تک نہیں آئی۔ ایک ذرا سی چوک ہوئی اور ہمیں آفتاب کی موت کا صدمہ اُٹھانا پڑا۔ اپنے جاں نثار اور آنکھیں بند کرکے حکم ماننے والے ساتھیوں کو موت کے منہ میں دھکیلنا تو بہت آسان ہوتا ہے۔ صرف انہیں حکم دینے کی دیر ہوتی ہے اور حکم دینے میں صرف زبان ہلانا پڑتی ہے لیکن انہیں گزند سے بچاتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کرنا اصل کام ہے۔"

"تم مرغی والا کردار ادا کرنا چاہتے ہو؟" راحیلہ مسکرائی۔

"مرغی والا....؟ کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ جب چیل اوپر سے جھپٹا مارنے کی کوشش کرتی ہے تو مرغی اپنے چوزوں کو پروں میں چھپالیتی ہیں۔" راحیلہ نے وضاحت کی۔

"ہاں۔ تقریباً یہی سمجھ لو۔ گو کہ میرے ساتھی چوزوں کی طرح نرم و نازک، بے بس اور مدد کی محتاج مخلوق نہیں ہیں۔ لیکن وہ مجھے عزیز اسی طرح ہیں جس طرح مرغی کو اپنے چوزے ہوتے ہیں۔ بہرحال اگر تمہارے خیال میں نقلی حفیظ صاحب پر ہاتھ ڈالنا اہم اور کارآمد ثابت ہوسکتا ہے اور ساتھی بھی کچھ نہ کچھ کرنے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

راحیلہ قدرے جوشیلے لہجے میں بولی "مجھے نہ جانے کیوں یقین ہے کہ اگر ہم عرفان نامی اس شخص کو درمیان سے اُچکنے میں کامیاب ہوگئے تو اس سے ضرور ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ نہ کچھ معلومات حاصل ہوں گی۔"

"اس کام کے لیے تمہارے خیال میں کیا طریقہ اختیار کرنا مناسب رہے گا؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ابھی اس پر تفصیل سے غور نہیں کیا لیکن آپس میں صلح مشورہ کرکے کوئی بھی منصوبہ بنایا جاسکتا ہے۔" وہ پُرخیال انداز میں رخسار پر انگلی رگڑتے ہوئے بولی۔

"میں تمہیں اس آپریشن کی انچارج بناتا ہوں۔ تم اس کے لیے پروگرام طے کرو۔ لیکن دو تین باتیں ضرور یاد رکھنا اور انہیں بہت اہمیت دینا۔ ایک تو یہ کہ اگر ہماری کوئی ذرا سی بھی غیر معمولی سرگرمی، بھاگ دوڑ یا صلح مشورے شروع ہوئے تو فوراً ریڈ ڈاٹ کو معلوم ہوجائے گا یا اندازہ ہوجائے گا کہ ہم ان کی ہدایات کی خلاف ورزی کی تیاری کررہے ہیں۔"

"کیسے معلوم ہوجائے گا؟" راحیلہ نے جاننا چاہا۔

"یہ تو مجھے نہیں معلوم" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا "بظاہر تو یہ بڑا غنیمت لگتا ہے کہ وہ ہر وقت ہماری نگرانی نہیں کرتے، ہم میں سے کسی کا بھی مستقل طور پر پیچھا نہیں کیا جاتا۔ اس کے باوجود وہ نہ جانے کس طرح اکثر ہماری اہم سرگرمیوں سے واقف رہتے ہیں۔ ممکن ہے، ہم ٹرانسیٹر یا ریڈیو پر جو گفتگو کرتے ہوں وہ ان کے ہاں سُنی جاتی ہو۔ ہمارے سگنلز کیچ کرنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہ ہو۔ ممکن ہے، ہم لوگوں کے ٹیلی فون بھی محفوظ نہ ہوں۔ دشمن کے لیے یہ چیز سب سے بڑا ہتھیار ثابت ہوتی ہے کہ آپ کا کوئی راز اس کے لیے راز نہ رہے۔ ہماری تو خیر ویسے بھی ان لوگوں کے سامنے کوئی حیثیت نہیں ہے۔ لیکن اس بات نے تو ہمیں بالکل ہی کمزور کردیا ہے کہ ہمارا کوئی راز ان کے سامنے راز ہی نہیں ہے۔ مثلاً میرا کوئی تعاقب نہیں کرتا لیکن میں کہیں جاتا ہوں تو شاید چند منٹ بعد ہی انہیں علم ہوجاتا ہے کہ میں فلاں جگہ موجود ہوں۔ اس چیز نے مجھے بڑا عاجز کردیا ہے۔ ہمیں کمزور بنادیا ہے، ہماری تمام صلاحیتیں بے وقعت ہوکر رہ گئی ہیں۔ ہر وقت ہمارے پیچھے گویا ایک نادیدہ آسیب لگا ہوا ہے۔"

"اس آپریشن کے لیے ہم آپس میں رابطے کی غرض سے ٹرانسیٹر، ریڈیو یا ٹیلی فون، کچھ بھی استعمال نہیں کریں گے۔" راحیلہ نے فیصلہ سُنا دیا۔ اس نے ذہنی طور پر واقعی آپریشن کی انچارج کی حیثیت سے کام شروع کردیا تھا۔

"اس کے باوجود دعا ضرور کرنا کہ ہمارے ارادے راز رہیں۔" میں نے کہا "دوسری اہم بات میں یہ کہنا چاہتا تھا کہ ہم خواہ کچھ بھی کریں، کوئی بھی حکمتِ عملی اختیار کریں لیکن اس کے ردِعمل کے لیے ضرور پوری طرح تیار رہیں۔ ریڈ ڈاٹ والوں نے یہ امکان ضرور ذہن میں رکھا ہوگا کہ میں اس بار بھی انہیں دھوکا دے سکتا ہوں۔ اس کا علم بھی یقیناً انہیں فوری طور پر ہوجائے گا۔ اس کے جواب میں وہ کیا کارروائی کریں گے، اس کے بارے میں ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بہرحال ہمیں ہر چیز کے لیے تیار رہنا ہوگا۔"

"ہم مرنے کے لیے بھی تیار رہیں گے۔" راحیلہ بولی۔

"وہی تو میں نہیں چاہتا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "میں چاہتا ہوں، موت تم لوگوں سے دور رہے۔"

"اس طرح کام نہیں چلے گا۔" وہ سر جھٹک کر بولی "موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر تو دیکھنا ہی پڑے گا۔"

"تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم ریڈ ڈاٹ کی ہدایات کے مطابق حفیظ صاحب سے ملاقات کا وقت لو لیکن انہیں اصل بات سے آگاہ کرنے کی کوشش نہ کرو۔ اس طرح ہمارے منصوبے کے لیک آؤٹ ہونے کا اِمکان ذرا کم ہوجائے گا۔" راحیلہ کچھ سوچتے ہوئے خاموش ہوگئی۔

ایک لمحے کے بعد بولی "کوشش کرو کہ حفیظ صاحب سے تمہاری ملاقات لاہور میں ہو۔ یہاں ہم ریڈ ڈاٹ والوں سے ذرا بہتر انداز میں نمٹ سکیں۔"

"ان سے لاہور میں ملاقات طے کرنا تو شاید زیادہ مشکل ہو۔" میں نے کہا "ان کا آبائی گھر لاہور میں ہے اور وہ کسی غیر ملکی دورے پر روانہ ہوتے وقت خواہ ایک رات کے لیے

لیکن اپنے آبائی گھر ضرور آتے ہیں۔ سُنا ہے، اس منصب و [illegible] پہنچنے کے باوجود وہ اپنی والدہ کا احترام نہیں بھولے۔ اس [illegible] معاملے میں وہ توہم پرستی کی حد تک ایک مؤدب بچے ہیں۔ وہ کہتے [illegible] کہ جب وہ اپنی ضعیف والدہ کی دعائیں لے کر کسی مشن پر غیر ممالک کے لیے روانہ ہوتے ہیں تو بعض اوقات ناممکن سے کام ممکن ہوجاتے ہیں اور بعض مشکلات کا ایسا حل نکل آتا ہے [illegible] کا اس مادیت پرست دنیا کے نقطۂ نظر سے کوئی جواز نظر نہیں [illegible]۔"

"انسان کا بڑا بن جانا اسے والدین اور بزرگوں کے احترام سے روکتا تو نہیں ہے۔ اس مکروہ اور مادیت پرست دنیا میں انسان اگر ان چھوٹی چھوٹی روایات کو ساتھ لے کر چلتا رہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔" راحیلہ سنجیدگی سے بولی "زندگی کتنی ہی تیز رفتار سہی لیکن روایات کو ساتھ رکھنے سے ہماری رفتار میں کوئی فرق نہیں [illegible]۔ اس کا کوئی فائدہ ہی ہوتا ہے، نقصان نہیں۔"

"خیر.... ان کی اس روایت پرستی کی وجہ سے یہ تو ممکن ہوگا کہ ان سے لاہور والے گھر میں ملاقات ہوجائے۔" میں نے کہا۔

"تم پروگرام کے مطابق عرفان کو ساتھ لے کر حفیظ صاحب سے ملاقات کے لیے جانا اور وہاں عرفان کو قابو میں کرکے حفیظ صاحب کو ساری کہانی سُنا دینا۔ اکیلے عرفان کو تو تم قابو میں کرلوگے [illegible]؟" راحیلہ نے گویا مجھے چھیڑنے کے لیے دریافت کیا لیکن اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔

مجھے ہنسی آگئی لیکن پھر میں نے کراہ کر کہا "ہاں.... اب تو تم بھی ایسے دل دُکھانے والے سوالات کرو۔ کیا میں شکل صورت سے ایسا ہی گیا گزرا دکھائی دینے لگا ہوں؟" میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔

"بھئی میں نے عرفان کو نہیں دیکھا نا، اس لیے پوچھ رہی ہوں۔" وہ مصنوعی معصومیت سے بولی۔

"ظاہر ہے وہ حفیظ صاحب کی جگہ لینے آرہا ہے تو حفیظ صاحب ہی کی کاپی ہوگا۔ جھارا پہلوان سے مشابہ تو نہیں ہوسکتا۔" میں نے اس کی تمام تر غیر سنجیدگی کے باوجود اسے بتادینا ہی بہتر سمجھا "وہ حفیظ صاحب ہی کی طرح ادھیڑ عمر اور مرنجاں مرنج نظر آتا ہے۔ اگر تم اسے اپنے منہ میاں مٹھو بننا نہ سمجھو تو میرا خیال یہی ہے کہ اس جیسے آٹھ دس آدمیوں کو میں بائیں ہاتھ سے اور آٹھ دس کو دائیں ہاتھ سے لپٹا سکتا ہوں۔"

"بس بس۔" راحیلہ ہاتھ اُٹھاتے ہوئے ریفری کے سے انداز میں بولی "تم روانی میں اصل حفیظ صاحب کو لپیٹ میں نہ لے لینا۔ صرف عرفان کو قابو میں کرلینا۔" اسے گویا عرفان کو دیکھے بغیر ہی اس پر غصہ آرہا تھا۔ دانت پیس کر بولی "اس کی مشکیں کس کر اسے گاڑی کی ڈکی میں ڈالنا اور سیدھے دو نمبر لے جاکر تہ خانے کے کسی سیل میں ڈال دینا۔ اس سے بعد میں نمٹیں گے۔"

"میری پوری کوشش یہی ہے کہ ہمارا دو نمبر ٹھکانا جتنی دیر خفیہ رہ سکتا ہے، رہ جائے۔ میں نہیں چاہتا، کوئی وہاں تک میرا تعاقب کرے۔ میں ویسے ہی احتیاطاً ایک عرصے سے وہاں نہیں گیا۔" میں نے کہا۔

"ہم کسی کو تمہارا تعاقب نہیں کرنے دیں گے۔ آخر ہم کس مرض کی دوا ہیں۔" راحیلہ بولی۔

"تم لوگ کیا آس پاس موجود رہو گے؟" میں نے دریافت کیا۔

راحیلہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولی "ہاں۔ حفیظ صاحب سے ملاقات کا پروگرام طے ہوتے ہی تم اپنا ٹیلی فون، ٹرانسیٹر یا ریڈیو وغیرہ استعمال کیے بغیر کسی اور ذریعے سے صرف مجھے مطلع کردینا کہ ملاقات کب اور کہاں ہوگی۔ میں پہلے ہی ذرا اس جگہ کا جائزہ لے لوں گی اور تمام ساتھیوں کو آس پاس تعینات کردوں گی۔"

"پھر تو ہوچکی ملاقات۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا "انہیں ذرا سا بھی شبہ ہوگیا یا معمولی سی بھی سرگرمی نظر آگئی تو سب کچھ دھرا رہ جائے گا۔ معلوم نہیں اس صورت میں کیا ہو۔ اس معاملے میں یہی تو گڑبڑ ہے کہ ہم اپنے وسائل استعمال نہیں کرسکتے۔"

"تم مطمئن رہو، کسی کو کوئی سرگرمی نظر نہیں آئے گی، کسی کو کوئی شبہ نہیں ہوگا۔ آخر ہم نے اتنی انگریزی اور اردو جاسوسی فلمیں دیکھی ہیں، ناول پڑھے ہیں، تعلیم حاصل کی ہے۔ تھوڑا بہت ذہن بھی ہمارے حصے میں آیا ہے اور تم سے بھی راہ و رسم ہوئے خاصے دن ہوگئے ہیں۔ ان باتوں کا کچھ نہ کچھ فائدہ تو ہوگا۔ بعض لوگ بڑا واویلا مچاتے ہیں کہ ان چیزوں سے لوگوں کو منفی سرگرمیوں کے لیے رہنمائی ملتی ہے مگر ہم ان چیزوں کی مدد سے کوئی تعمیری کام کرکے دکھائیں گے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اس معاملے کو ہینڈل کرسکتی تھی یا نہیں۔ وہ ایک بے پناہ باصلاحیت لڑکی تھی۔ اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ گویا مزید تسلی دینے کے لیے بولی "جس مکان میں تمہاری حفیظ صاحب سے ملاقات ہوگی، ہم اس کے پاس بھی نہیں پھٹکیں گے۔ دور دور ہی رہیں گے۔ تم اس کے بارے میں مجھے پہلے ہی بتادو گے تو میں بھی ذرا اچھی طرح اس کا جائزہ لے لوں گی کہ آس پاس کون سی گلی، کون سی سڑک اور کون کون سی عمارتیں ہیں۔ پھر اس حساب سے میں اپنی حکمتِ عملی طے کرلوں گی کہ کس ساتھی کو کہاں رہنا ہوگا، کس روپ میں رہنا ہوگا اور کون سی پوزیشن سنبھالنی ہوگی۔"

وہ ایک کمانڈر کی طرح ذہنی طور پر مستعد معلوم ہوتی تھی۔ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "لیکن ملاقات کی جگہ کے بارے میں ہمیں کم از کم دو دن پہلے معلوم ہوجانا چاہیے کیونکہ ہمیں کچھ

تیاریاں کرنی ہوں گی اور آپس میں رابطے کے لیے ہم اپنے ٹیلی فون اور ریڈیو وغیرہ بھی استعمال نہیں کررہے ہوں گے' دوسرے طریقے اختیار کریں گے اس لیے کافی وقت ضائع ہوگا۔"

"میں کوشش کروں گا کہ جیسے ہی ملاقات طے ہو' تمہیں جگہ کے بارے میں مطلع کردوں۔" میں نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "مجھے لگتا ہے کہ تم یہ کام کرنے پر تلی ہوئی ہو تو کر ہی گزرو گی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ عرفان کوئی خاص اہم آدمی نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اتنی تگ ودو سے اس پر ہاتھ ڈالیں' ریڈ ڈاٹ سے کھلی جنگ مول لیں اور وہ محض قربانی کا ایک بکرا ہی ثابت ہو۔ بکرا بھی ایسا احمق جسے علم ہی نہ ہو کہ وہ قربانی کا بکرا ہے۔"

"تم بھی کیسی بے وقوفی کی بات کررہے ہو۔" راحیلہ حیرت سے بولی "قربانی کے بکرے کو بھلا کہاں علم ہوتا ہے کہ وہ قربانی کا بکرا ہے۔ اگر اسے علم ہو تو وہ قربانی کا بکرا بنے ہی کیوں؟ رسی میں بندھا ہو تب بھی رسی تڑا کر بھاگنے کی کوشش کرے۔"

"بعض بکروں کو لاشعوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ وہ قربانی کے بکرے ہیں لیکن وہ بہت مضبوطی سے بندھے ہوتے ہیں یا پھر شتر مرغ کی طرح اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کیے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"میں نے عرفان کو نہیں دیکھا لیکن تمہاری زبانی تفصیلات سُن کر نہ جانے کیوں مجھے احساس ہورہا ہے کہ وہ اہم آدمی ہے۔" راحیلہ بولی "فرض کرو وہ اہم آدمی نہیں ہے تب بھی آخر ہم کسی اہم آدمی پر ہاتھ ڈالنے کے انتظار میں کب تک بیٹھے رہیں گے؟ اگر یہ آدمی غیر اہم ہوا تب بھی ہمارے اس آپریشن کا یہ فائدہ تو ہوگا کہ بقول تمہارے' ریڈ ڈاٹ سے ہماری کھلی جنگ شروع ہوجائے گی۔ ہوسکتا ہے اس کے بعد تیزی سے اہم واقعات رونما ہونا شروع ہوں اور کچھ کارآمد حقائق یا شخصیات سامنے آجائیں۔ معاملہ کسی طرف تو لگتا دکھائی دے۔ فی الحال تو ہم عجیب بے ہودہ صورتِ حال میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی جنگجو سی فطرت کی مالک ہو۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"میں جنگجو نہیں بلکہ "تنگ آمد بہ جنگ آمد" کی قائل ہوں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "کیا ہمیں اس معاملے میں ایجنسیوں سے مدد لینی چاہیے؟"

"ہرگز نہیں" راحیلہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "وہ اس معاملے کو اپنی مرضی اور اپنے اسٹائل کے مطابق ہینڈل کریں گے۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہے گا۔ عرفان کو بھی وہ لے جائیں گے اور ضروری نہیں کہ اس سے جو کچھ معلوم ہو وہ ہمیں بھی بتائیں۔ ہم اسی طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں جبکہ ریڈ ڈاٹ کا نزلہ صرف ہم پر ہی گرے گا۔"

"یہ تو خیر ضروری نہیں ہے۔ جو بھی راستے میں آئے گا' کچھ نہ کچھ نقصان تو اٹھائے گا۔ میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ کل ہی اسلام آباد میں خفیہ ایجنسیوں سے میری تازہ ترین میٹنگ کے دوران انہوں نے ایک گاڑی اُڑا دی' ڈرائیور کے پرخچے اڑ گئے اور نہ جانے کس ایجنسی کے دو آدمی شدید زخمی بھی ہوئے۔ اس کارروائی کا تو کوئی مقصد بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"شاید اس کا مقصد صرف ایجنسیوں کو یہ بتانا ہو کہ وہ ان کی تمام سرگرمیوں سے واقف ہیں اور وہ تمہارے ساتھ زیادہ میٹنگز وغیرہ نہ ہی رکھیں تو ان کے حق میں اچھا ہے۔" راحیلہ نے خیال ظاہر کیا۔

"وجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ ریڈ ڈاٹ والے ایجنسیوں سے کچھ محتاط سہی لیکن وہ ان سے خوف زدہ بہرحال نہیں ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ ان سے بھی تصادم مول لے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"خیر یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ فی الحال تمہیں اس میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ ہم اب جو کچھ بھی کریں اپنے طور پر کریں۔"

"حفیظ صاحب سے ملاقات کے دوران جب عین وقت پر میں انہیں اصل کہانی سُناؤں گا اور عرفان کو قابو میں کروں گا تو ممکن ہے حفیظ صاحب یہ چاہیں کہ میں عرفان کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش نہ کروں بلکہ خفیہ ایجنسیوں کے حوالے کردوں۔" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"تم ان کی بات ہرگز نہ ماننا۔" راحیلہ نے گویا مجھے نصیحت کی "تم بس فوراً عرفان کو لے کر وہاں سے غائب ہونے کی کوشش کرنا۔ ہم تمہیں چاروں طرف سے تحفظ دینے کے لیے موجود ہوں گے۔ ہم دور رہتے ہوئے بھی تم سے دور نہیں ہوں گے۔"

"واہ! کیا رومینٹک سی بات کی ہے۔" میں نے سرہلایا۔

"تمہیں اس وقت رومینس سُوجھ رہا ہے؟" راحیلہ نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا۔

"مجھے تو اس وقت کچھ بھی نہیں سُوجھ رہا۔" میں نے سہم جانے کی ایکٹنگ کی "میرا ذہن تو قطب شمالی بنا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے میری سوچوں تک پر برف جم گئی ہے۔ اسی لیے تو کوشش کررہا ہوں کہ کچھ ذمے داریاں اپنے "مضبوط" کندھوں سے ہٹا کر تمہارے نازک کندھوں پر ڈال دوں۔"

"کیا کہنے تمہارے مضبوط کندھوں کے۔" وہ جلے کٹے سے لہجے میں بولی "دل چاہتا ہے کراٹے کے دو ہاتھ مار کر ہمیشہ کے لیے تمہیں دونوں کندھوں سے "سبکدوش" کردوں۔"

"یہ حسرت دل میں لیے تو بہت سے گینڈے اس دنیا سے رخصت ہوچکے ہیں' تم کس کھیت کی بھنڈی ہو۔ مولی میں نے اس لیے نہیں کہا کہ وہ پھر بھی کچھ مضبوط ہوتی ہے۔" پھر میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "اب میں چلتا ہوں۔"

"یہ اچانک ہی کیوں اُٹھ کھڑے ہوئے؟" اس نے حیرت سے کہا "اس کرسی میں تو اسپرنگ بھی نہیں ہیں جنہوں نے تمہیں اُچھال دیا ہو۔"

"ضروری باتیں تو ہوچکیں۔ ویسے بھی تم اب قائم مقام باس ہو۔ تمہارا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"میں تو قائم مقام ہوں۔ جب تک تم اپنی جگہ پر قائم ہو تب تک تو میری کوئی اہمیت نہیں۔ اب میں سوچ رہی ہوں' تمہارا تختہ اُلٹ کر "دی سرکل" کا اقتدار حاصل کرلوں۔ لیکن کیا کروں' تمہارا تختہ تو تخت سے بھی زیادہ بھاری ہے۔ اُلٹا ہی نہیں جارہا مجھ سے۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"گھبراؤ مت' میں خود ہی اپنا تختہ اُٹھا کر ایک طرف ہوجاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا اب زیادہ بے تُکی مت ہانکو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ کہیں میں واقعی کوئی تختہ اُٹھا کر تمہارے سر پر نہ دے ماروں۔ میں تو اب تمہارے لیے کھانا بنانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔"

"یہ دردناک منظر مجھ سے دیکھا نہیں جائے گا۔"

"دردناک منظر تو تب ہوگا جب تم اسے کھانے بیٹھو گے۔ پکانے کی حد تک بھلا اس میں کیا دردناکی ہے؟"

"یہ بھی خاصی دردناک سی بات ہے کہ چند منٹ پہلے تمہارے ہاتھ میں دور مار رائفل ہوتی ہے اور چند منٹ بعد سالن کی ہنڈیا میں چلانے والا چمچہ۔ یہ تو واقعی زیادتی ہے۔ عورت کے نازک کندھوں پر بہت ہی زیادہ ذمے داریاں لاد دی گئی ہیں۔"

"پھر وہی نازک کندھے!" اس نے دانت پیس کر گھونسا ہوا میں لہرایا۔ میں اسے خدا حافظ کہتے ہوئے جلدی سے باہر آگیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے کھانا کھایا' اوپر اپنے کمرے میں جاکر لباس تبدیل کیا اور تیار ہوکر آفس چلا گیا حالانکہ چھٹی کا وقت تھا۔ آفس میں بیٹھے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اے ٹن کا فون آگیا۔

وہ بلا تمہید بولا "میں نے سوچا تمہیں یاد دہانی کرادوں۔ باس ٹو نے جو کام تمہارے سپرد کیا ہے' تمہیں اس کے سلسلے میں حرکت میں آجانا چاہیے۔"

"حضورِ والا! آپ کا یہ بندۂ بے دام ابھی آفس آکر بیٹھا ہی ہے۔ اگر حکم ہو تو ابھی سر کے بل دوبارہ اسلام آباد پہنچ جائے؟" میں نے جل کر کہا۔

"نہیں اسلام آباد آنے کی ضرورت نہیں۔" وہ طنز پر ذرا بھی توجہ دیے بغیر سنجیدگی سے بولا "حفیظ صاحب سے اگر تمہاری ذاتی طور پر ملاقات ضروری ہوتی تو ہم تمہیں گزشتہ رات اسلام آباد میں ہی روک لیتے۔ حفیظ صاحب ابھی اسلام آباد میں ہی موجود ہیں۔ ہم چاہتے ہیں ان سے تمہاری ملاقات امریکا کے دورے پر ان کے روانہ ہونے سے صرف ایک دن پہلے ہی ہو۔ اس وقت وہ لاہور میں ہوں گے۔ اس سے پہلے تمہیں ان کے ساتھ صرف فون پر ملاقات کا پروگرام طے کرنا ہے۔"

"جیسے آپ کا حکم ہوگا میں تو اسی طرح چلوں گا حضور والا! میں تو حکم کا غلام ہوں۔" میں نے بدستور جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"زیادہ طنز وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ بس اس چھوٹے سے کام کے بعد تمہاری ہم سے جان چھوٹ جائے گی۔" وہ ملائمت سے بولا "حرکت میں آنے سے میری مراد یہ تھی کہ تم کم از کم انہیں فون ضرور کرلو۔ ان کے شیڈول کا اندازہ ہوجائے گا۔ اس کام میں ہمارے لیے ہر چیز کے وقت کے تعین کی بہت اہمیت ہے۔ اگر تمہاری ان سے ملاقات نہ ہوسکی اور جو کام جس طرح تمہیں بتایا گیا ہے' اس طرح نہ ہوسکا تو نہ صرف تمہارے لیے بلکہ تمہارے ملک کے لیے بھی بڑے سنگین مسائل پیدا ہوجائیں گے۔"

"یہ کون سی نئی بات ہے جناب والا!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ملائمت سے کہا "جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں اور جب سے یہ ملک پیدا ہوا ہے' ہم دونوں ہی مسائل کے درمیان جی رہے ہیں۔ اندیشہ یہی ہے کہ جب تک تم جیسے لوگ موجود ہیں تب تک ہم جیسے لوگوں کا یہی حال رہے گا۔ بہرحال تم فکر نہ کرو' یہ کام تمہاری مرضی کے عین مطابق ہوگا۔"

"اسی میں تمہاری بہتری ہے۔" یہ کہہ کر وہ غالباً سلسلہ منقطع کرنے لگا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا "ایک منٹ ٹھہرو' مجھے تم سے ایک بات پوچھنا تھی۔ سچ سچ بتانا۔"

"کوشش کروں گا۔ وعدہ نہیں کرتا۔ ویسے زیادہ تر ہم سچ ہی بولتے ہیں۔"

"وہ جو ایک لڑکی میری دوست ہے' جس کے گھر پر تم نے حملہ کرایا تھا۔ کیا حال ہی میں تم نے اس کی نگرانی کے لیے کسی کو مقرر کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"راحیلہ کی بات کررہے ہو؟" وہ اطمینان سے بولا۔ میں اپنی دانست میں کم از کم راحیلہ کا نام اس سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن اسے تو نام پہلے ہی معلوم تھا۔ مجھے اس کے سوال کا جواب اثبات میں ہی دینا پڑا۔

"نہیں" وہ بلا تامل بولا "ہم نے اس کی نگرانی پر کسی کو مامور نہیں کیا۔ وہ لڑکی زبردست ہے لیکن ہماری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ نگرانی کے چکر میں ویسے بھی ہم عام طور پر نہیں پڑتے۔ صرف تمہاری وجہ سے وہ ہمارے عتاب کا نشانہ بننے سے بچ گئی۔"

"تمہارا یہ احسان میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔" میں

تیاریاں کرنی ہوں گی اور آپس میں رابطے کے لیے ہم اپنے ٹیلی فون اور ریڈیو وغیرہ بھی استعمال نہیں کر رہے ہوں گے' دوسرے طریقے اختیار کریں گے اس لیے کافی وقت ضائع ہوگا۔"

"میں کوشش کروں گا کہ جیسے ہی ملاقات طے ہو' تمہیں جگہ کے بارے میں مطلع کردوں۔" میں نے چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہا "مجھے لگتا ہے کہ تم یہ کام کرنے پر تلی ہوئی ہو تو کر ہی گزرو گی۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ عرفان کوئی خاص اہم آدمی نہیں ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم اتنی تگ و دو سے اس پر ہاتھ ڈالیں' ریڈ ڈاٹ سے کھلی جنگ مول لیں اور وہ محض قربانی کا ایک بکرا ہی ثابت ہو۔ بکرا بھی ایسا احمق جسے علم ہی نہ ہو کہ وہ قربانی کا بکرا ہے۔"

"تم بھی کیسی بے وقوفی کی بات کر رہے ہو۔" راحیلہ حیرت سے بولی "قربانی کے بکرے کو بھلا کہاں علم ہوتا ہے کہ وہ قربانی کا بکرا ہے۔ اگر اسے علم ہو تو وہ قربانی کا بکرا بنے ہی کیوں؟ رسی میں بندھا ہو تب بھی رسی تڑا کر بھاگنے کی کوشش کرے۔"

"بعض بکروں کو لاشعوری طور پر احساس ہوتا ہے کہ وہ قربانی کے بکرے ہیں لیکن وہ بہت مضبوطی سے بندھے ہوتے ہیں یا پھر شتر مرغ کی طرح اس حقیقت کی طرف سے آنکھیں بند کیے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"میں نے عرفان کو نہیں دیکھا لیکن تمہاری زبانی تفصیلات سُن کر نہ جانے کیوں مجھے احساس ہو رہا ہے کہ وہ اہم آدمی ہے۔" راحیلہ بولی "فرض کرو وہ اہم آدمی نہیں ہے تب بھی آخر ہم کسی اہم آدمی پر ہاتھ ڈالنے کے انتظار میں کب تک بیٹھے رہیں گے؟ اگر یہ آدمی غیر اہم ہوا تب بھی ہمارے اس آپریشن کا یہ فائدہ تو ہوگا کہ بقول تمہارے' ریڈ ڈاٹ سے ہماری کھلی جنگ شروع ہو جائے گی۔ ہو سکتا ہے اس کے بعد تیزی سے اہم واقعات رونما ہونا شروع ہوں اور کچھ کار آمد حقائق یا شخصیات سامنے آجائیں۔ معاملہ کسی طرف تو لگتا دکھائی دے۔ فی الحال تو ہم عجیب بے ہودہ صورتِ حال میں پھنسے ہوئے ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اتنی جنگجو سی فطرت کی مالک ہو۔" میں نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔

"میں جنگجو نہیں بلکہ "تنگ آمد بہ جنگ آمد" کی قائل ہوں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "کیا ہمیں اس معاملے میں ایجنسیوں سے مدد لینی چاہیے؟"

"ہرگز نہیں" راحیلہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "وہ اس معاملے کو اپنی مرضی اور اپنے اسٹائل کے مطابق ہینڈل کریں گے۔ ہمارے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں رہے گا۔ عرفان کو بھی وہ لے جائیں گے اور ضروری نہیں کہ اس سے جو کچھ معلوم ہو وہ ہمیں بھی بتائیں۔ ہم اسی طرح اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہیں جبکہ ریڈ ڈاٹ کا نزلہ صرف ہم پر ہی گرے گا۔"

"یہ تو خیر ضروری نہیں ہے۔ جو بھی راستے میں آئے گا' کچھ نہ کچھ نقصان تو اٹھائے گا۔ میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ کل ہی اسلام آباد میں خفیہ ایجنسیوں سے میری تازہ ترین میٹنگ کے دوران انہوں نے ایک گاڑی اُڑا دی' ڈرائیور کے پرخچے اڑ گئے اور نہ جانے کس ایجنسی کے دو آدمی شدید زخمی بھی ہوئے۔ اس کارروائی کا تو کوئی مقصد بھی میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"شاید اس کا مقصد صرف ایجنسیوں کو یہ بتانا ہو کہ وہ ان کی تمام سرگرمیوں سے واقف ہیں اور وہ تمہارے ساتھ زیادہ میٹنگز وغیرہ نہ ہی رکھیں تو ان کے حق میں اچھا ہے۔" راحیلہ نے خیال ظاہر کیا۔

"وجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس سے یہ تو ظاہر ہوتا ہے کہ ریڈ ڈاٹ والے ایجنسیوں سے کچھ محتاط سہی لیکن وہ ان سے خوف زدہ بہرحال نہیں ہیں۔ ضرورت پڑنے پر وہ ان سے بھی تصادم مول لے سکتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"خیر یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ فی الحال تمہیں ان میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو یہ چاہتی ہوں کہ ہم اب جو کچھ بھی کریں اپنے طور پر کریں۔"

"حفیظ صاحب سے ملاقات کے دوران جب عین وقت پر میں انہیں اصل کہانی سُناؤں گا اور عرفان کو قابو میں کروں گا تو ممکن ہے حفیظ صاحب یہ چاہیں کہ میں عرفان کو اپنے ساتھ لے جانے کی کوشش نہ کروں بلکہ خفیہ ایجنسیوں کے حوالے کردوں۔" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"تم ان کی بات ہرگز نہ ماننا۔" راحیلہ نے گویا مجھے نصیحت کی "تم بس فوراً عرفان کو لے کر وہاں سے غائب ہونے کی کوشش کرنا۔ ہم تمہیں چاروں طرف سے تحفظ دینے کے لیے موجود ہوں گے۔ ہم دور رہتے ہوئے بھی تم سے دور نہیں ہوں گے۔"

"واہ! کیا رومینٹک سی بات کی ہے۔" میں نے سراہا۔

"تمہیں اس وقت رومینس سُوجھ رہا ہے؟" راحیلہ نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا۔

"مجھے تو اس وقت کچھ بھی نہیں سُوجھ رہا۔" میں نے سہم جانے کی ایکٹنگ کی "میرا ذہن تو قطب شمالی بنا ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے میری سوچوں تک پر برف جم گئی ہے۔ اسی لیے تو کوشش کر رہا ہوں کہ کچھ ذمّے داریاں اپنے "مضبوط" کندھوں سے ہٹا کر تمہارے نازک کندھوں پر ڈال دوں۔"

"کیا کہنے تمہارے مضبوط کندھوں کے۔" وہ جلے کٹے سے لہجے میں بولی "دل چاہتا ہے کرائے کے دو ہاتھ مار کر ہمیشہ کے لیے تمہیں دونوں کندھوں سے "سبکدوش" کردوں۔"

"یہ حسرت دل میں لیے تو بہت سے گینڈے اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں' تم کس کھیت کی بھنڈی ہو۔ مولی میں نے اس لیے نہیں کہا کہ وہ پھر بھی کچھ مضبوط ہوتی ہے۔" پھر میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "اب میں چلتا ہوں۔"

"یہ اچانک ہی کیوں اُٹھ کھڑے ہوئے؟" اس نے حیرت سے کہا "اس کرسی میں تو اسپرنگ بھی نہیں ہیں جنہوں نے تمہیں اُچھال دیا ہو۔"

"ضروری باتیں تو ہو چکیں۔ ویسے بھی تم اب قائم مقام باس ہو۔ تمہارا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"میں تو قائم مقام ہوں۔ جب تک تم اپنی جگہ پر قائم ہو تب تک تو میری کوئی اہمیت نہیں۔ اب میں سوچ رہی ہوں' تمہارا تختہ اُلٹ کر "دی سرکل" کا اقتدار حاصل کرلوں۔ لیکن کیا کروں' تمہارا تختہ تو تخت سے بھی زیادہ بھاری ہے۔ اُلٹا ہی نہیں جا رہا مجھ سے۔" وہ بے بسی سے بولی۔

"گھبراؤ مت' میں خود ہی اپنا تختہ اُٹھا کر ایک طرف ہو جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"اچھا اب زیادہ بے تُکی مت ہانکو اور آرام سے بیٹھ جاؤ۔ کہیں میں واقعی کوئی تختہ اُٹھا کر تمہارے سر پر نہ دے ماروں۔ میں تو اب تمہارے لیے کھانا بنانے کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔"

"یہ دردناک منظر مجھ سے دیکھا نہیں جائے گا۔"

"دردناک منظر تو تب ہوگا جب تم اسے کھانے بیٹھو گے۔ پکانے کی حد تک بھلا اس میں کیا دردناکی ہے؟"

"یہ بھی خاصی دردناک سی بات ہے کہ چند منٹ پہلے تمہارے ہاتھ میں دور مار رائفل ہوتی ہے اور چند منٹ بعد سالن کی ہنڈیا میں چلانے والا چمچہ۔ یہ تو واقعی زیادتی ہے۔ عورت کے نازک کندھوں پر بہت ہی زیادہ ذمّے داریاں لاد دی گئی ہیں۔"

"پھر وہی نازک کندھے!" اس نے دانت پیس کر گھونسا ہوا میں لہرایا۔ میں اسے خدا حافظ کہتے ہوئے جلدی سے باہر آگیا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے کھانا کھایا' اوپر اپنے کمرے میں جاکر لباس تبدیل کیا اور تیار ہو کر آفس چلا گیا حالانکہ چھٹی کا وقت تھا۔ آفس میں بیٹھے مجھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ اے نن کا فون آگیا۔

وہ بلا تمہید بولا "میں نے سوچا تمہیں یاد دہانی کرادوں۔ باس نے جو کام تمہارے سپرد کیا ہے' تمہیں اس کے سلسلے میں حرکت میں آجانا چاہیے۔"

"حضورِ والا! آپ کا یہ بندۂ بے دام ابھی آفس آکر بیٹھا ہی ہے۔ اگر حکم ہو تو ابھی سر کے بل دوبارہ اسلام آباد پہنچ جائے؟" میں نے جل کر کہا۔

"نہیں اسلام آباد آنے کی ضرورت نہیں۔" وہ طنز پر ذرا بھی توجہ دیے بغیر سنجیدگی سے بولا "حفیظ صاحب سے اگر تمہاری ذاتی طور پر ملاقات ضروری ہوتی تو ہم تمہیں گزشتہ رات اسلام آباد میں ہی روک لیتے۔ حفیظ صاحب ابھی اسلام آباد میں ہی موجود ہیں۔ ہم چاہتے ہیں ان سے تمہاری ملاقات امریکا کے دورے پر ان کے روانہ ہونے سے صرف ایک دن پہلے ہی ہو۔ اس وقت وہ لاہور میں ہوں گے۔ اس سے پہلے تمہیں ان کے ساتھ صرف فون پر ملاقات کا پروگرام طے کرنا ہے۔"

"جیسے آپ کا حکم ہوگا میں تو اسی طرح چلوں گا حضورِ والا! میں تو حکم کا غلام ہوں۔" میں نے بدستور جلے کٹے لہجے میں کہا۔

"زیادہ طنز وغیرہ کی ضرورت نہیں۔ بس اس چھوٹے سے کام کے بعد تمہاری ہم سے جان چھوٹ جائے گی۔" وہ ملائمت سے بولا "حرکت میں آنے سے میری مراد یہ تھی کہ تم کم از کم انہیں فون ضرور کرلو۔ ان کے شیڈول کا اندازہ ہو جائے گا۔ اس کام میں ہمارے لیے ہر چیز کے وقت کے تعین کی بہت اہمیت ہے۔ اگر تمہاری ان سے ملاقات نہ ہو سکی اور جو کام جس طرح تمہیں بتایا گیا ہے' اس طرح نہ ہو سکا تو نہ صرف تمہارے لیے بلکہ تمہارے ملک کے لیے بھی بڑے سنگین مسائل پیدا ہو جائیں گے۔"

"یہ کون سی نئی بات ہے جنابِ والا!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ملائمت سے کہا "جب سے ہم پیدا ہوئے ہیں اور جب سے یہ ملک پیدا ہوا ہے' ہم دونوں ہی مسائل کے درمیان جی رہے ہیں۔ اندیشہ یہی ہے کہ جب تک تم جیسے لوگ موجود ہیں تب تک ہم جیسے لوگوں کا یہی حال رہے گا۔ بہرحال تم فکر نہ کرو' یہ کام تمہاری مرضی کے عین مطابق ہوگا۔"

"اسی میں تمہاری بہتری ہے۔" یہ کہہ کر وہ غالباً سلسلہ منقطع کرنے لگا تھا کہ میں نے جلدی سے کہا "ایک منٹ ٹھہرو' مجھے تم سے ایک بات پوچھنا تھی۔ سچ سچ بتانا۔"

"کوشش کروں گا۔ وعدہ نہیں کرتا۔ ویسے زیادہ تر ہم سچ ہی بولتے ہیں۔"

"وہ جو ایک لڑکی میری دوست ہے' جس کے گھر پر تم نے حملہ کرایا تھا۔ کیا حال ہی میں تم نے اس کی نگرانی کے لیے کسی کو مقرر کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"راحیلہ کی بات کر رہے ہو؟" وہ اطمینان سے بولا۔ میں اپنی دانست میں کم از کم راحیلہ کا نام اس سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اسے تو نام پہلے ہی معلوم تھا۔ مجھے اس کے سوال کا جواب اثبات میں ہی دینا پڑا۔

"نہیں" وہ بلا تامل بولا "ہم نے اس کی نگرانی پر کسی کو مامور نہیں کیا۔ وہ لڑکی زبردست ہے لیکن ہماری نظر میں اس کی کوئی اہمیت نہیں۔ نگرانی کے چکر میں ویسے بھی ہم عام طور پر نہیں پڑتے۔ صرف تمہاری وجہ سے وہ ہمارے عتاب کا نشانہ بننے سے بچ گئی۔"

"تمہارا یہ احسان میں مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔" میں

نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ اس کا جواب میری توقع کے عین مطابق تھا لیکن اس جواب کی وجہ سے ذہنی خلش کچھ اور بڑھ گئی تھی کیونکہ یہ سوال ایک بار پھر سامنے آن کھڑا ہوا تھا کہ راحیلہ کے اپارٹمنٹ کی نگرانی کرنے والا اگر ریڈ ڈاٹ کا آدمی نہیں تھا تو پھر کون تھا؟ کیا ہمارے لیے خطرے کی ایک اور گھنٹی بج رہی تھی؟

کچھ لوگ یہ کہہ کر اس کی لاش لے کر تیزی سے غائب ہو گئے تھے کہ وہ خفیہ پولیس کے آدمی ہیں۔ لیکن خفیہ پولیس کے یہ انداز و اطوار نہیں ہوتے۔ ہماری خفیہ پولیس اتنی بھی خفیہ نہیں تھی۔ اس کے علاوہ اس شخص کی گاڑی کا نمبر بھی جعلی ثابت ہوا تھا۔ یہ سب کچھ اچھی علامتیں نہیں تھیں لیکن فی الحال اس معاملے میں کچھ کیا بھی نہیں جا سکتا تھا۔

اے نن بولا "وہ لڑکی بہت تیز معلوم ہوتی ہے۔ تم نے اسے نصیحت کر دی تھی کہ ہمارے معاملے میں محتاط رہے؟"

"کاش میں اسے کوئی نصیحت کر سکتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہرحال میں نے تمہارے بارے میں اسے ضروری باتیں بتا دیں ہیں، وہ خاصی سمجھدار ہے۔"

"اگر اس نے سمجھداری کا ثبوت نہ دیا تو نقصان اُٹھائے گی۔" اے نن نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔ ایک لمحے کے لیے میرے دانت بھنچ گئے لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

ریسیور رکھنے کے بعد بھی میں کچھ دیر تک سوچوں میں اُلجھا رہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میرے گرد کوئی نادیدہ سا دائرہ بتدریج تنگ ہو رہا تھا۔ آخر کار میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک کر فون پر حفیظ صاحب کی اسلام آباد والی سرکاری رہائش گاہ سے رابطہ قائم کیا۔ وہاں سے پتا چلا کہ حفیظ صاحب کسی سیمینار میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ مجھے بتایا گیا کہ اگر میں رات نو بجے فون کروں تو ان سے بات ہو سکتی ہے۔ میں نے پیغام چھوڑ دیا اور سوچا کہ رات کو ہوٹل سے فون کر لوں گا۔

چند ضروری کام نمٹانے کے بعد میں دفتر سے نکل کھڑا ہوا۔ نیچے پہنچ کر میں اپنی گاڑی نکالنے پارکنگ لاٹ کی طرف جا رہا تھا کہ عمارت کے مین گیٹ سے میں نے ایک ٹرک اندر آتے دیکھا۔ وہ گیٹ سے ذرا اندر تو آ گیا لیکن گارڈز نے اسے فوراً ہی روک لیا کیونکہ وہ ہماری کمپنی کا ٹرک نہیں تھا۔

میں یہ دیکھنے کے لیے رُک گیا کہ ٹرک کس کا تھا اور کس سلسلے میں آ رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ٹرک کے اگلے حصے سے خلیفہ نواز پری پیکر کو اترتے دیکھا۔ وہ ریٹائرڈ پہلوان تھے۔ بھویں تک سفید تھیں۔ کافی بھاری بھرکم تھے، توند بھی تھل تھل کرتی تھی لیکن ان کا ٹرک سے اُترنے کا انداز تارزن کا سا تھا۔ ان کی رنگین دھوتی اور ریشمی کرتا ایک لمحے کے لیے ہوا میں پیراشوٹ بن کر رہ گیا۔

وہ دور ہی سے مجھے دیکھ کر دونوں بازو پھیلا کر تیزی سے آگے بڑھے۔ ان کے زری والے کھُسے ہر قدم پر خوب چرچرا رہے تھے۔ قریب آتے ہی وہ ایک جھٹکے سے مجھ سے لپٹ گئے۔ لپٹے بھی کیا، تقریباً لٹک ہی گئے۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی باپ برسوں اپنے بیٹے سے بچھڑا رہنے کے بعد ملا ہو اور اس دوران بیٹے پر بہت سے صدمے گزر گئے ہوں۔

کافی عرصہ پہلے میں نے ان کی نگرانی میں ایک شاندار اکھاڑہ قائم کرانے کے انتظامات کردیئے تھے اور اپنے فائنانس ڈائریکٹر سے کہہ دیا تھا کہ انہیں کوئی مالی پریشانی نہیں ہونی چاہیے۔ اس کے بعد میری ان سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور حالات کچھ ایسے رہے تھے کہ میں انہیں تقریباً بھول ہی گیا تھا۔ آج انہیں دیکھا تو خیال آیا کہ میں نے اکھاڑے کے بارے میں کوئی رپورٹ ہی طلب نہیں کی تھی۔

خلیفہ نواز پری پیکر مجھ سے لپٹ کر میری پسلیاں کڑکڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس عمر میں بھی ان میں بہت سے نوجوانوں سے زیادہ طاقت تھی۔ ان کی پگڑی کے نیچے سے جھانکتے ہوئے بالوں سے چنبیلی کے تیل اور ان کے کپڑوں سے کسی عطر کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔

اسی دوران میں نے دیکھا، ٹرک سے ایک ایک کر کے نوجوان کودنا شروع ہوئے۔ ان میں سے بیشتر ریشمی کرتوں اور لاچوں میں ہی تھے۔ بعض شلوار قمیصوں میں تھے۔ ایک آدھ جینز جیکٹ میں بھی تھا۔ بیشتر نوجوان اچھے تنومند، باڈی بلڈر ٹائپ اور کچھ پہلوان ٹائپ تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ٹرک سے پچیس تیس نوجوان اُتر آئے اور میرے سامنے جلوس کی طرح جمع ہو گئے۔ وہ تقریباً سب کے سب قابلِ رشک جوانی کے مالک تھے۔ ان کے چہروں پر زندگی اور تندرستی کی چمک تھی۔ آنکھوں میں اُمید کی روشنی تھی۔ وہ متجسس سے انداز میں کبھی میری طرف اور کبھی عمارت کی طرف دیکھ رہے تھے۔

خلیفہ نواز پری پیکر کافی دیر تک بغلگیر رہے اور حلق سے عجیب عجیب سی آوازیں نکالنے کے بعد آخر کار الگ ہوئے تو میں نے دیکھا، ان کی دُھندلائی ہوئی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"خلیفہ جی! آپ کی آنکھوں میں آنسو؟" مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا "کس نے آپ کو صدمہ پہنچایا؟ ایسی کیا بات ہو گئی؟ کچھ بتائیں تو سہی۔"

"میں بتانے نہیں، پوچھنے آیا ہوں چوہدری پتر!" وہ پگڑی کے پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے بولے "مجھے جو صدمہ پہنچا ہے وہ تو دراصل تمہارے صدمے کی وجہ سے ہے۔ مجھے بتاؤ، تمہیں کس نے صدمہ پہنچایا ہے؟ وہ کون بدبخت ہے جو تم جیسے اچھے آدمی کا دشمن ہو گیا ہے؟"

میں ذرا چونکا تاہم میں نے انجان بنتے ہوئے کہا "میں سمجھا نہیں خلیفہ جی؟"

وہ میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے "یہ بھی تمہاری بڑائی کی دلیل ہے چوہدری پتر! تم مجھے بتانا نہیں چاہتے کہ کوئی تم سے دشمنی کر رہا ہے۔ یا پھر شاید تم یہ سوچ رہے ہو کہ خلیفہ نواز بڑی پیکر تو بڈھا ضعیف آدمی ہے۔ یہ بیچارہ میری کیا مدد کرے گا۔ لیکن یہ تمہاری غلط فہمی ہے پتر! جب تک خلیفہ نواز بڑی پیکر کے اکھاڑے میں ایک بھی نوجوان پہلوان موجود ہے، خلیفہ بڈھا نہیں ہو سکتا۔ میرے ہر پٹھے کی جوانی میری جوانی ہے۔ میں اتنا بیکار یا گیا گزرا آدمی نہیں ہوں......"

انہوں نے پلٹ کر خاصے ڈرامائی انداز میں نوجوانوں کے چھوٹے سے جلوس کی طرف اشارہ کیا "یہ سب میری جوانیاں ہیں۔ میرے رگ پٹھے ہیں۔ میرے دست و بازو ہیں اور یہ سب تمہارے بھی دست و بازو ہیں۔ تم حکم تو کرو میری جان! ایک اشارہ کرو۔ بس پھر تمہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔ پھر تم آرام سے بیٹھ کر تماشا دیکھو کہ ہم تمہارے دشمن کو کس طرح تہس نہس کرتے ہیں، اس کا وہ حشر کریں گے۔ وہ حشر کریں گے کہ اس کی آنے والی نسلیں، جانے والی نسلیں سب یاد رکھیں گی۔"

"خلیفہ جی! آپ کی باتیں واقعی میری سمجھ میں نہیں آ رہیں۔ آخر قصہ کیا ہے؟" میں نے قدرے پریشانی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ آتے جاتے لوگ تماشا نہ دیکھنے لگیں لیکن غنیمت تھا کہ ہم عمارت کے بغلی حصے میں تھے۔ گارڈز گیٹ کے قریب بُت بنے کھڑے تھے اور کھلے گیٹ سے باہر سروس روڈ پر آتے جاتے لوگوں کی توجہ ہماری طرف نہیں تھی۔

"واہ چوہدری پتر! واہ...." خلیفہ جی متاسفانہ سے انداز میں بولے "تم قصہ بھی اُلٹا ہم ہی سے پوچھ رہے ہو۔ کیسی کمال کی بات ہے۔ ہمیں تو ذرا دیر سے پتا چلا ورنہ ہم پہلے ہی تمہاری مدد کو پہنچ گئے ہوتے۔ ہمیں تو آج ہی پتا چلا ہے کہ کسی نے تمہاری کوٹھی بم سے اُڑا دی ہے۔ پھر میں خود اسپیشل تانگہ کر کے وہاں جا کے دیکھ کے آیا۔ وہاں تو واقعی ظالموں نے اس کا ککھ بھی نہیں چھوڑا۔ سُنا ہے تمہارے سارے بندے بھی مر گئے۔ بس کچھ مت پوچھو کہ یہ سب کچھ سُن کر اور اپنی آنکھوں سے وہ تباہی دیکھ کر میرے دل پہ کیا گزری!"

ان کی آواز ایک بار پھر بھرا گئی اور وہ ایک بار پھر پگڑی سے آنکھیں پونچھنے لگے۔ اب بات میری سمجھ میں آئی لیکن میں پھر بھی کچھ نہ بول سکا، دم بخود کھڑا ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ ان کی ناک سے شوں شوں کی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔

آخر کار وہ سنبھل کر بولے "مجھے تو تمہارے دفتر کے کسی آدمی نے بتایا تک نہیں۔ وہ تو میں ان پٹھوں سے تمہاری باتیں کرتا رہتا ہوں۔ انہیں بتاتا رہتا ہوں کہ اس دنیا میں ابھی تم جیسے لوگ بھی موجود ہیں۔ میں نے انہیں شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ ہمارا عالیشان اکھاڑا تم نے قائم کرایا ہے۔ تمہارے دفتر سے ہی ہمیں سارے خرچے ملتے ہیں۔ غریب لڑکوں کو جان شان بنانے، پہلوانی سیکھنے اور باڈی بلڈنگ کے لیے جیب خرچ تک ملتا ہے۔ میری سفارش پر انہیں تمہارے دفتر سے وظیفہ ملتا ہے کہ وہ کھائیں پئیں اور دل لگا کر جان بنائیں۔ میں انہیں بتاتا ہوں کہ اکھاڑے کے یہ سب رونق میلے تمہارے دم سے ہیں۔ تم نے تو پرانے زمانے کے نوابوں اور راجوں مہاراجوں کی یاد تازہ کر رکھی ہے۔"

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں خلیفہ جی!" میں نے ملائمت سے کہا "یہ سب اوپر والے کا کرم ہے۔ مجھے تو پتا بھی نہیں ہے کہ یہ سب کیسے ہو رہا ہے، کہاں سے ہو رہا ہے۔ میں نے تو بس اپنے دفتر کو حکم دے دیا تھا کہ آپ جو کہیں اس پر عمل کیا جائے۔ اس کے بعد تو مجھے کچھ پتا ہی نہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پتر! ہوتا تو سب کچھ اوپر والے کے حکم سے ہے۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر گہری عقیدت سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے بولے "اس کے حکم کے بغیر تو پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ لیکن نیت بڑی ضروری ہوتی ہے۔ کوئی بھی کام اس وقت تک نہیں ہوتا جب تک اس کی نیت اور ارادہ نہ کیا جائے۔ اچھے کام... خاص طور پر ایسے اچھے کام جن میں بہت ساری رقمیں خرچ ہوتی ہیں، ایسے کاموں کی نیت کرنے کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تم حوصلہ کرتے ہو، نیت کرتے ہو، باقی کام اوپر والا کر دیتا ہے۔"

"اکھاڑہ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے نا؟ آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہے خلیفہ جی؟ کچھ ترقی ہو رہی ہے یا نہیں؟ لڑکوں میں کچھ ذوق شوق بڑھ رہا ہے یا نہیں؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"اکھاڑے کی تو کچھ مت پوچھو پتر! اللہ نے بڑی رونقیں لگائی ہیں۔ دور دور سے بچے کھنچے چلے آ رہے ہیں۔ تم اسی سے اندازہ کرلو۔" انہوں نے جلوس کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ میں خاص خاص اور اچھے اچھے پٹھے چھانٹ کر لایا ہوں۔ کمزور اور نئے پٹھوں کو میں نے چھوڑ دیا ہے۔ تم ہم سے پوچھ رہے ہو کہ ہمیں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔ ہمیں تو تمہارے ہوتے ہوئے کوئی تکلیف نہیں ہے چوہدری پتر! ہم تو تمہاری تکلیف میں کام آنے کے لیے آئے ہیں۔"

انہوں نے بے دھیانی کے سے عالم میں اپنی گھنی، سفید مونچھوں کو بل دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولے "میں ان پٹھوں سے تمہاری اتنی باتیں کرتا رہتا ہوں۔ یہ سب بھی تم سے آنکھ بند کر کے محبت کرنے لگ گئے ہیں۔ انہی میں سے کسی نے لسی میں ڈالنے کے لیے حلوائی سے پیڑے منگوائے تھے۔ جس پرانے اخبار میں بچہ پیڑے رکھ کے لایا اس میں تمہاری کوٹھی کی تباہی کی چھوٹی سی خبر چھپی ہوئی تھی۔ مجھے پٹھے نے پڑھ کے سُنائی۔ میرا تو خون

...ں مارنے لگا۔ میں خود اسپیشل تانگہ کر کے گیا اور محل وقوع پر ...ید نظارہ کر کے آیا۔ کچھ مت پوچھو کہ میرے دل پہ کیا گزری ...کچھ مت پوچھو کہ میں نے اپنے اوپر کیسے ضبط کیا ہوا ہے۔"

بے شک خلیفہ جی کی بھویں تک سفید تھیں لیکن ان کے ...ے پر غضب کی سُرخی تھی جو اس وقت گویا دہکتی آگ میں بدل ...ں اور ان کا چہرہ تانبے کی طرح تپتا دکھائی دینے لگا۔ وہ مٹھیاں ...ینچ کر فیصلہ کن لہجے میں بولے "بس اب تم صرف یہ بتا دو کہ یہ ...س کی حرکت ہے۔ وہ کہاں رہتا ہے۔ اس کا خانہ خراب کرنا ...ارا کام ہے۔ پٹھے بھی بہت جذباتی ہو رہے ہیں۔ کہتے ہیں ہم ...ہدری صاحب کے دشمن کو فنا کر کے چھوڑیں گے، چاہے اس کے ...لیے ہمیں جان بھی دینی پڑے۔ چاہے وہ کتنا ہی بڑا آدمی ہو، کتنا ہی ...اپھنے خاں ہو۔ ہم اسے نہیں چھوڑیں گے۔ بس چوہدری پتر! تم ...یک اشارہ کردو۔"

وہ منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی روئی ...یسی سفید، گھنی مونچھیں دھیرے دھیرے لرز رہی تھیں۔ میں ایک ...ول لمحے تک ان کی طرف دیکھتا رہ گیا، حتیٰ کہ مجھے یقین ہو گیا، ان کے چہرے سے جھلکنے والا خلوص زر خرید قسم کا خلوص نہیں تھا۔ پھر ...یں نے ان شگفتہ و تازہ دم نوجوانوں کی طرف دیکھا جو ایک ان ...دیکھے، ان جانے شخص پر جان قربان کرنے کا عزم لے کر آئے تھے۔ مجھے ان کے چہروں پر بھی خلوص ہی دکھائی دیا۔

وہ پُرجوش تھے۔ ان کے ذہنوں میں ہوش کا پلڑا کچھ زیادہ بھاری دکھائی نہیں دیتا تھا۔ میری جگہ کوئی سیاسی لیڈر ہوتا تو ان کا یہ خلوص، ان کا یہ جوش دیکھ کر پھولا نہ سماتا۔ اس کے لیے یہ بڑی طمانیت کی بات ہوتی کہ وہ انہیں اندھے کنویں میں بھی کود جانے کا حکم دے گا تو وہ کود جائیں گے۔ آگ کے دریا میں چھلانگ لگانے کا حکم دے گا تو وہ لگا دیں گے۔ انہیں اپنے لیے ہر راہ مسدود کرنے کا حکم دے گا تو وہ کرلیں گے۔

ان نوجوانوں کی زندگی، ان کے مستقبل، ان کی خوشیوں، ان کے سکون اور ان کی امیدوں کے پروانے ہاتھ میں لے کر سیاسی لیڈر کسی میز پر جا بیٹھتا اور ان سب چیزوں کی قیمت وصول کر کے اپنی اور اپنے چیلوں کی جیب میں ڈال لیتا۔ یہ تو بہت چھوٹی سی ٹولی تھی۔ مجمع جتنا بڑا ہوتا، جذباتیت جتنی زیادہ ہوتی، لیڈر کی سودے بازی اتنی ہی بڑی ہوتی۔ سامنے والا اس کی بات ماننے میں ذرا تامل کرتا تو وہ ان سب کو ایک اشارے سے آگ کے دریا میں دھکیل دیتا۔ ایک عرصے سے ہمارے گلشن میں کاروبارِ حیات اسی طرح جاری تھا۔ اپنی غرض کے مزاروں پر دوسروں کی زندگیوں کے چراغ جلانا اور بجھانا ہمارے بڑے لوگوں کا مشغلہ تھا۔ ستم یہ تھا کہ عام لوگ اس تماشے میں ایندھن بننے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے۔

میں نے ایک طویل سانس لے کر کہا "خلیفہ جی! شروع میں تو جب میں نے آپ کو اکھاڑہ قائم کرنے کے لیے رقم اور زمین وغیرہ فراہم کرنے کی پیشکش کی تو آپ مان نہیں رہے تھے۔ آپ کو یہی اندیشہ تھا کہ امیر لوگ اگر پہلوانوں کی سرپرستی کرتے بھی ہیں تو پھر انہیں اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے بل بوتے پر بدمعاشی جھاڑتے ہیں۔"

"ہاں ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے۔ میں نے یہی کہا تھا اور اب بھی ڈنکے کی چوٹ یہی کہتا ہوں۔ میں اپنی بات سے مکرنے والا انسان نہیں ہوں۔" وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولے۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تو پھر اب آپ میرے لیے استعمال ہونے کیوں آ گئے ہیں؟ ان پٹھوں کو بھی لے آئے ہیں اور میرے حکم پر آپ لوگ کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار ہیں۔"

وہ بھی گویا میرا مطلب سمجھتے ہوئے زیرِ مونچھ مسکرائے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ملائمت سے بولے "میں اس لیے آیا ہوں پتر کہ تم ہمیں بلانے نہیں آئے۔ تم نے تو ہمیں اس واقعے کی خبر بھی نہیں دی۔"

میں اگر انہیں یہ بتاتا کہ مجھے تو یاد بھی نہیں تھا کہ میں ایک اکھاڑے کو فنانس کر رہا تھا تو شاید انہیں یقین نہ آتا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے "اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تم ہمیں استعمال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے۔ تمہاری نیت ایسی نہیں تھی۔ اور میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ساری بات نیت کی ہوتی ہے۔ تم اچھے آدمی ہو، تمہاری نیت اچھی ہے۔ اس لیے ہم تمہاری مدد کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ ہم تمہارا مال کھا کر پل رہے ہیں۔ بلکہ اس لیے کہ ایک اچھے آدمی کو اگر بُرے آدمی نقصان پہنچائیں تو باقی لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ اچھے آدمی کی مدد کریں۔ ہمارے اس معاشرے میں چونکہ زیادہ تر لوگوں میں اچھے آدمی کی مدد کرنے اور اسے ظالموں سے بچانے کا حوصلہ نہیں ہے اس لیے وہ بے چارے چُپ کر کے بیٹھے رہتے ہیں۔ ہم میں حوصلہ تھا تو ہم آ گئے۔ ہم تم سے زیادہ قریب بھی ہیں اور ہم پر تمہارا حق بھی بنتا ہے اس لیے ہم آ گئے۔ ہم اپنی مرضی سے آئے ہیں، اپنی محبت سے مجبور ہو کر آئے ہیں۔ ہمارا ضمیر مطمئن ہے کہ تم ہمیں کسی غلط کام کے لیے استعمال نہیں کرو گے۔ سمجھ میں آ گئی نا میری بات؟ اب تو تمہارے دل کو تسلی ہو جانی چاہیے۔"

"ہاں تسلی تو مجھے پہلے بھی تھی خلیفہ جی! میں تو ویسے ہی ذرا آپ کو ٹٹول رہا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس بڈھے پھونس، بڑی پیکر کو ٹٹول کر کیا کرو گے چوہدری پتر! اس وجود میں تمہیں سچائی اور اچھائی کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔" وہ گہری سانس لے کر بولے۔

"مجھے یقین ہے، مجھے یقین ہے خلیفہ جی!" میں نے انہیں ایک لمحے کے لیے سینے سے لگا لیا۔ ان کے چہرے پر بشاشت آ گئی۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "لیکن مسئلہ یہ ہے خلیفہ جی! کہ میں آپ لوگوں کو کسی غلط کام کے لیے تو کیا، صحیح کام کے لیے

بھی استعمال نہیں کرسکتا' کسی بھی کام کے لیے استعمال نہیں کرسکتا۔ میرا ایسا کوئی ارادہ تھا بھی نہیں اور انشاء اللہ آئندہ بھی نہیں ہوگا۔"

"کیوں نہیں استعمال کرسکتے؟ یہ تو تم ہمارے ساتھ بھی اور اپنے ساتھ بھی زیادتی کرو گے۔ ہماری بے قراری تو دیکھو۔ ہمارے جذبے کا کیا بنے گا؟" خلیفہ جی جھرجھری سی لے کر بولے۔

"جذبے کو سنبھال کر رکھیں۔ جذبہ کبھی نہ کبھی ضرور کام آجاتا ہے۔" میں نے ان کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "میں فی الحال آپ کے اس انمول جذبے سے اس لیے فائدہ نہیں اٹھا سکتا کہ مجھے خود بھی نہیں معلوم' میرا دشمن کون ہے اور اس کا ٹھکانا کہاں ہے۔"

"یہ کیسی بات کررہے ہو چوہدڑی پتڑ! دشمن اتنا بڑا کام کر گزڑا اور تمہیں اس کا کوئی نام ونشان ہی پتا نہیں۔ تھوڑا بہت کوئی اشارہ ہی دے دو' باقی ہم خود معلوم کرلیں گے۔" ان کے لہجے میں قدرے بے یقینی تھی۔

اب میں انہیں کیا بتاتا کہ وہ جسے بہت بڑا کام سمجھ رہے تھے' وہ تو میرے دشمن کی بہت معمولی سی کارگزاری تھی۔ وہ جن منصوبوں پر عمل پیرا تھا اور جو کچھ اس کے ذہن میں تھا' اگر خلیفہ جی کو اس کی ہوا بھی لگ جاتی اور وہ باتیں ان کی سمجھ میں آجاتیں تو شاید صدمے اور اندیشوں سے ان کی جان ہی نکل جاتی۔

وہ اپنی دانست میں بات کی تہ کو پہنچتے ہوئے بولے "تم شاید یہ کوشش کررہے ہو کہ دشمن کو معاف کردیا جائے کیونکہ معاف کردینا انتقام لینے سے بہتر ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں پتڑ کہ طاقت رکھتے ہوئے بھی دشمن کو معاف کردینا جہاد کے برابر ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ ظلم کرنے والے کو معاف کرنا بھی کچھ زیادہ اچھی بات نہیں۔ اس طرح اس کے حوصلے اور زیادہ بلند ہوجاتے ہیں' ظلم کا سلسلہ پھیلتا جاتا ہے۔" انہوں نے دونوں ہاتھوں سے کسی چیز کے پھیلنے کا باقاعدہ اشارہ کرکے بتایا۔

"وہ تو ٹھیک ہے خلیفہ جی! میں خود اسی کا قائل ہوں۔ مگر کیا کروں' مجبوری ہے۔ جب کسی بات کا ذرا بھی پتا ہی نہ ہو تو انسان کیا کرے۔ پتا بھی ہوتا تو شاید میں آپ لوگوں کو زحمت نہ دیتا۔ میں تو جب آپ سے پہلی بار ملا تھا تو اچانک ہی میرے ذہن میں خیال آیا تھا کہ ہمارے ملک میں پہلوانی کی روایت دم توڑ رہی ہے اور ہم ہر کام حکومت پر ہی چھوڑ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ حکومتیں تو کبھی وہ مسئلے حل نہیں کرسکیں جن پر زندگی اور موت کا دارومدار ہوتا ہے' وہ روایتوں کو زندہ رکھنے کے لیے کیا کریں گی۔ اس لیے ہمیں ہی اس سلسلے میں کچھ کرنا چاہیے۔ میں جس قابل تھا' میں نے وہ پیشکش کردی۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ مجھے آپ جیسا آدمی مل گیا جس نے میرے خواب کو سچ کردکھایا۔"

"اگر آپ جیسے سب لوگ آپ کی طرح سوچنے لگیں اور آپ جتنے فراخدل ہوجائیں تو اس ملک کے آدھے مسئلے تو حل ہوجائیں۔" خلیفہ جی سرہلاتے ہوئے بولے۔ کبھی کبھی وہ بالکل ٹھیک اور صاف اردو بولنے لگتے تھے۔ جب جھنکے دار اردو بولتے تھے تب بھی ہربار "ر" کو "ڑ" نہیں بولتے تھے۔ شاید کچھ مخصوص لفظوں پر آکر ان کی زبان قلابازی کھاتی تھی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "خلیفہ جی! خواب تو میرے بے شمار ہیں لیکن ہر خواب کو تعبیر نہیں ملتی۔ کبھی کبھی تو ایک خواب کو بھی تعبیر نہیں ملتی۔ میں تو بہت خوش قسمت ہوں کہ میری اپنی زندگی کے بارے میں تو مجھے بہت سے خوابوں کی تعبیریں مل گئیں۔ بلکہ بعض ایسی تعبیریں بھی مل گئیں جن کے میں نے خواب نہیں دیکھے تھے۔"

"اللہ ابھی تمہیں اور نوازے گا۔ بہت نوازے گا۔" خلیفہ جی وثوق سے بولے۔

"مجھے اپنے بارے میں کوئی خاص ارمان نہیں ہے۔ میں نے تو زندگی میں سب کچھ دیکھ لیا۔ میں تو اب زیادہ تر خواب اس ملک کے بارے میں اور یہاں رہنے والوں کے بارے میں دیکھتا ہوں۔"

"وہ سب بھی پوڑے ہوجائیں گے۔" خلیفہ جی نے وثوق سے سرہلایا "ہماڑی تمہاڑی زندگیوں میں نہ سہی' ہماڑے بعد سہی لیکن پوڑے ضرور ہوں گے۔ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہیں گے جو ان خوابوں کی خاطر اپنی زندگیاں تک قربان کرتے رہیں گے۔ ہمیں کسی نہ کسی اچھائی کا بیج بوتے رہنا چاہیے۔ کوئی نہ کوئی اچھا پودا تو اگتا رہے گا۔ ہم نہ سہی' ہماڑی آنے والی نسلیں تو اس کا پھل کھاتی رہیں گی۔"

"بس یہی سوچ کر میں اپنی سی کوشش کرتا رہتا ہوں' چاہے وہ کوشش کتنی ہی حقیر کیوں نہ ہو۔" میں نے کہا۔

"میں نے کہیں بچوں کے اخباڑ میں بڑی اچھی بات پڑھی تھی چوہدڑی پتڑ! بڈھے اور بچے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ میں اب بچوں کا اخباڑ بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ بعض بڑی بڑی اچھی اچھی باتیں بچوں کے صفحے پر پڑھنے کو ملتی ہیں' جو بڑوں کے صفحے پر نہیں ملتیں۔ میں نے پڑھا تھا کہ ساڑی دنیا کا اندھیڑا مل کر بھی روشنی کی ایک کڑن کو قابو میں نہیں کرسکتا۔ تو بس پتڑ! تم ایک کڑن بھی اس دنیا میں چھوڑ جاؤ گے تو وہ ساڑی دنیا کے اندھیڑے سے لڑتی رہے گی۔ ٹھیک ہے وہ اندھیڑے کو دھوبی پٹڑا ماڑ کے نہیں گرا سکتی لیکن اندھیڑا بھی اس کو چت تو نہیں کڑ سکتا نا۔"

"واقعی خلیفہ جی! آپ نے بچوں کے اخبار سے بڑی حکمت کی بات پڑھ کر یاد رکھی۔ ایسی باتیں ہم صرف پڑھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں۔ عمل کرنا تو دور کی بات' انہیں یاد بھی نہیں رکھتے بلکہ بعض اوقات تو ان پر ناک بھوں بھی چڑھاتے ہیں کہ یہ کیا بور باتیں ہیں۔"

"لوگوں کو اپنے بڑے بھلے کی تمیز نہیں رہی۔ سائنس بڑھ گئی

ہے' علم گھٹ گیا ہے۔ لیکن ہم اپنی سی کوشش کرتے رہیں گے۔ میں ان نوجوانوں کو پہلوانی سکھانے کے ساتھ ساتھ یہی تعلیم دیتا ہوں۔" انہوں نے چھوٹے سے جلوس کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے ان نوجوانوں کے دمکتے سے چہروں کی طرف دیکھا اور میرے دل میں خوشی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے خلیفہ جی کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "میں اپنے ملک کے سب نوجوانوں کے چہرے ایسے ہی دیکھنا چاہتا ہوں۔ آج کی زندگی نے' آج کے مسائل نے انہیں مرجھا دیا ہے۔ ان کے چہروں پر امنگ نہیں' تازگی نہیں۔ کچھ کو مایوسیاں کھا رہی ہیں' کچھ کو عیاشیاں کھا رہی ہیں۔ کچھ کو سیاست کھا رہی ہے کچھ کو بے روزگاری کھا رہی ہے اور کچھ کو جرائم پیشہ مگرمچھ کھا رہے ہیں۔ ہم سب کو تو نہیں بچا سکتے۔ اگر چند کو بچانے میں بھی کامیاب ہوگئے تو سمجھیں گے' ہماری زندگی کام آگئی۔"

"چوہدڑی باؤ! جب تک میں زندہ ہوں' میں تمہاڑے ساتھ ہوں۔ لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ تم ہمیں خدمت کا موقع ہی نہیں دے رہے۔ تم صرف زبان کھولو' تمہاڑے دشمن کو لاکر تمہاڑے قدموں میں پھینکنا ہماڑا کام ہے۔" خلیفہ جی سینہ ٹھونک کر بولے۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آج کل دست و بازو کی لڑائی کا زمانہ نہیں ہے خلیفہ جی! یہ چمکتے دمکتے چہروں اور چوڑی چھاتیوں والے نوجوان بڑے شہ زور سہی۔ لیکن اگر یہ خالی ہاتھ ہوں اور ان کے سامنے کالی' مکروہ اور سوکھی سی شکل کا کوئی ڈیڑھ پسلی کا دہشت گرد کلاشن کوف' اوزی یا کوئی اور سب مشین گن لیے آجائے تو چند لمحوں میں انہیں ڈھیر کردے گا۔ یہ جوانیاں ہم سڑکوں پر تڑپنے کے لیے نہیں' اس زندگی کو' اس دنیا کو خوب صورت بنانے کے لیے جمع کررہے ہیں۔ دشمنیوں کی کوئی بات نہیں خلیفہ جی! دشمنیاں تو چلتی رہیں گی' جو ہوگا سو دیکھا جائے گا۔ لیکن آپ ان پھولوں کو سنبھال کر رکھیں اور ان کی نگہداشت کریں۔ پھولوں کو پروان چڑھانے میں بڑا وقت لگتا ہے مگر انہیں ڈالیوں سے نوچنے اور گولیوں کی بھینٹ چڑھانے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگتا۔"

"چوہدڑی باؤ! تمہاری باتیں میرے دل میں صبح کی بارش کی طرح ٹھنڈ ڈال دیتی ہیں۔ کہتے تو تم ٹھیک ہو لیکن پھر بھی... پتا نہیں کیوں تمہاڑے ساتھ ظلم ہوتے دیکھنا ہم سے برداشت نہیں ہوتا۔ ہم دل و جان سے چاہتے ہیں کہ تمہاڑے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کڑیں۔"

پھر انہوں نے مجھے کان قریب لانے کا اشارہ کیا اور رازدارانہ سے انداز میں بولے "یہ جو تم بندوق' پستولوں کی بات کررہے ہو...... تو اس سلسلے میں بھی ہم کوئی ایسے گئے گزرے نہیں ہیں۔ اللہ کا بڑا کرم ہے' بڑی عزت ہے شہر میں تمہاڑے خلیفہ نواز بڑی پکڑ ہے۔ اسلحے شسلحے کا بھی ٹھیک ٹھاک بندوبست ہوجائے گا۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ یہ اپنے پٹھے خالی خولی ہاتھ پیر چلانا نہیں جانتے' ٹھوں ٹھاں کرنا بھی جانتے ہیں۔ تم آزما کے تو دیکھو۔"

میں نے بغور ان نوجوانوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر صحت مندی کی تب و تاب کے ساتھ حوصلے کی چمک بھی تھی لیکن پھر بھی وہ بہرحال سادہ دل اور سادہ مزاج تھے۔ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں گنیں بھی زیادہ کارآمد نہیں ہوتیں۔ گلی کوچوں کی سیدھی سادی' عام سی لڑائیوں اور سطحی سے جھگڑوں میں تو ان کے تگڑے بدن یا ان کے ہاتھوں میں موجود گنیں بہت کام آسکتی تھیں لیکن جن معاملات سے میرا واسطہ پڑا ہوا تھا ان میں یہ لوگ کسی کام کے نہیں تھے۔ میں انہیں ایندھن بنانا گوارا نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے خلیفہ جی کو پہلوانوں والی ایک زوردار تھپکی دی اور ہنستے ہوئے کہا "خلیفہ جی! چھوڑیں اس موضوع کو' کوئی اور بات کریں۔ ان مسائل سے میں خود ہی نمٹتا رہوں گا۔"

میری تھپکی سے خلیفہ جی ہل کر رہ گئے۔ بڑی مشکل سے سنبھل کر ذرا کھسیانے سے انداز میں بولے "چوہدڑی باؤ! مجھے تو لگتا ہے' تم خود بھی کسی اکھاڑے میں جاکر بڑا زوڑ شوڑ کرتے ہو۔ اگڑ ایسا کوئی شوق ہے تو آکر اپنے اکھاڑے کو ہی رونق بخشا کرو۔ کچھ ہمیں اس طرح کی خدمت کا ہی موقع دو۔"

"نہیں خلیفہ جی! میں کہاں زور شور کرتا ہوں۔ یہ تو جو کچھ بھی ہے بس خداداد ہی ہے۔ جب غریب خانہ سلامت تھا تو گھر پر ہی کچھ تھوڑی بہت ایکسر سائز کرلیا کرتا تھا۔ آج کل تو ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ کبھی گھنٹا آدھ گھنٹا سوئمنگ کے لیے میسر آجاتا ہے تو اسے ہی بڑی ایکسر سائز سمجھ کر خدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔"

"کمال ہے!" خلیفہ جی بے یقینی سے بولے "تمہاڑے رگ پٹھوں میں کوئی بات ہے جو سالوں پہلوانی اور باڈی بلڈنگ کرنے والوں میں بھی نہیں ہوتی۔"

"مجھے تو معلوم نہیں خلیفہ جی!" میں نے بے پروائی سے کہا "اگر کچھ ہے تو بس وہ قدرتی طور پر ہے۔ چلیں ان باتوں کو چھوڑیں' یہ بتائیں کہ آپ کی کیا خاطر تواضع کی جائے؟ آپ سب لوگ پہلی بار میرے پاس یہاں آئے ہیں لیکن اب تو آفس بھی بند ہوچکا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کیا کیا جائے۔ ایسا کرتے ہیں کہیں چلتے ہیں۔"

"بس چوہدڑی باؤ! آپ کی محبت اور سرپرستی ہمارے لیے ساری خاطر تواضع سے بڑھ کر ہے۔ ہم آپ کی کوئی خدمت کڑتے تو ہمیں زیادہ خوشی ہوتی۔"

"نہیں' میں آپ کو اس طرح نہیں جانے دوں گا۔ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ آپ لوگ میرے پاس آئیں اور کچھ کھائے پیے بغیر چلے جائیں۔ آج کل تو ہوٹل ہی میرا گھر ہے۔ آپ وہیں میرے ساتھ چلیں۔ کچھ نہ کچھ شغل تو ہونا چاہیے نا۔ میں آگے آگے گاڑی میں چلتا ہوں' آپ اپنا ٹرک پیچھے پیچھے لے آئیں۔" میں نے ان کے احتجاج کو نظرانداز کردیا اور اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔

مجھے معلوم تھا کہ اس چھوٹے سے جلوس کو ہلٹن لے کر جانا

اچھا خاصا تماشا ہو گا لیکن مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ مجھے ان سادہ سے لوگوں کے خلوص نے بہت متاثر کیا تھا۔ یہ درست تھا کہ اکھاڑہ میرے پیسوں سے چل رہا تھا لیکن آج کے دور میں ان باتوں پر کون کسی کے لیے جان قربان کرنے آتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اکھاڑے کے پہلوانوں نے تو مجھے دیکھا بھی نہیں تھا۔ میں نے ان سے کوئی چکنی چپڑی باتیں نہیں کی تھیں' انہیں ان گنت سہانے خواب نہیں دکھائے تھے۔

میرے وہ ساتھی جو میری حفاظت کے لیے دور دور سے میری نگرانی کرتے رہتے تھے اور جب میں ہوٹل میں ہوتا تھا تو اس کے دروازوں پر تعینات رہتے تھے یا آس پاس منڈلاتے رہتے تھے' اس وقت بھی کہیں سے مجھ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ وہ پہلوانوں سے بھرے ٹرک کو میری گاڑی کے پیچھے چلتے دیکھ کر شاید اُلجھن میں پڑ گئے۔

کار کے ریڈیو پر ٹونی نے مجھ سے پوچھا "سر! یہ کیا ہو رہا ہے؟ ان لوگوں کو آپ کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی اندرونی کیفیت کا تصور کر کے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "یہ ایک سوشل ملاقات ہے۔ میں ان لوگوں کو خاطر مدارات کے لیے لے جا رہا ہوں۔"

"اوہ!" ٹونی گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے کوئی تبصرہ نہیں کیا اور میں نے ریڈیو کا سوئچ آف کر کے خفیہ خانہ بند کر دیا۔

ہم ہوٹل پہنچے اور ٹرک اندرونی دروازے کے سامنے جا کر رُکا۔ پہلوان ایک ایک کر کے دھڑ دھڑ ٹرک سے اُترنے شروع ہوئے تو دربان بھی پریشان ہو گیا۔ خلیفہ نواز پری پیکر بھی پگڑی اور توند سنبھالتے ہوئے اتر آئے تھے۔ دربان نے جب دیکھا کہ وہ سب میرے ساتھ ہیں تو ذرا سکون کی سانس لی اور سیلوٹ کرتے ہوئے ہمارے لیے دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا۔

تمام پہلوان ذرا پھیلی پھیلی آنکھوں سے چمکتے دمکتے در و دیوار کو دیکھ رہے تھے۔ خلیفہ نواز پگڑی درست کر کے اِدھر اُدھر دیکھ کر نیچی آواز میں بولے "یہ تم ہمیں کہاں لے آئے چوہدڑی پتتر! ہمارا ان فائیو اسٹار ہوٹلوں میں کیا کام؟ ہم تو گوا لمنڈی' لکشمی چوک اور بھاٹی میں بیٹھ کر پاوے کھانے اور لسیاں پینے والی مخلوق ہیں۔ ہمیں یہاں انگریزی کھانے کھا کے اور رنگ برنگے شربت پی کے کیا مزہ آئے گا۔"

"آپ آئیں تو سہی' یہاں بہت سی دیسی چیزیں بھی ملتی ہیں۔" میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"اچھا تم کہتے ہو تو چلے چلتے ہیں۔" وہ نیم دلی سے بولے "ویسے یہاں کی دیسی چیزوں میں بھی ولایتی ملاوٹ ضرور ہو گی۔"

دھم دھم کرتے ہوئے ہم لوگ لاؤنج سے گزر کر ڈائننگ ہال میں پہنچے تو ہوٹل میں اچھی خاصی ہلچل سی پیدا ہو گئی۔ بتیس تو پہلوان ہی تھے۔ ان کے علاوہ خلیفہ جی' میں' ٹرک ڈرائیور اور کلینر بھی تھے۔ میں سب کو اندر لے آیا تھا۔

ڈائننگ ہال میں ویٹروں نے جلدی جلدی ہمارے لیے کرسیوں کی ترتیب بدلی۔ ابھی رات کے کھانے کا رش شروع نہیں ہوا تھا' اس لیے ہمیں نشستیں آسانی سے مل گئیں۔ پہلوانوں کی موجودگی ویسے بھی عام آدمیوں کی نسبت ذرا بھاری بھرکم ہوتی ہے۔ ہم سب مجموعی طور پر اپنی اصل تعداد سے ڈیڑھ دوگنا محسوس ہو رہے تھے۔

بیٹھنے کا مرحلہ سر ہو چکا تو ویٹروں نے مینو لا کر ہماری خدمت میں پیش کیے۔ خلیفہ جی مینو کو الٹتے پلٹتے ہوئے اور چندھی چندھی آنکھوں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولے "یہ رجسٹر سا کیا پکڑا گیا ہے میرے ہاتھ میں؟"

"یہ مینو ہے خلیفہ جی!" میں نے انہیں بتایا "اس میں ان چیزوں کے نام چھپے ہوئے ہیں جو یہاں مل سکتی ہیں۔"

"چھڈ دی ایہہ مینوں تیتوں۔" خلیفہ جی نے مینو میز پر ایک طرف رکھ دیا "مجھے کون سا انگریزی پڑھنی آتی ہے۔ ہمارے لیے تو بیچے پاوے والے کا شتم ٹھیک ہے۔ بیرا آتا ہے۔ ایک سانس میں ساری چیزوں کے نام بتا جاتا ہے۔"

پہلوانوں میں جو تھوڑے بہت پڑھے لکھے تھے' وہ مینو کا مطالعہ کرنے لگے تھے۔ خلیفہ جی انہیں بھی ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے بولے "چھڈ دو کی! تسی کیس چکروچ پے گئے او۔ (چھوڑو بھئی! تم کس چکر میں پڑ گئے ہو) چوہدڑی صاحب سے پوچھ لیتے ہیں' یہاں ہمارے مطلب کی کیا کیا چیزیں ملتی ہیں۔"

میں نے انہیں چند چیزوں کے نام بتائے۔ چرغے اور روغنی نان پر سب کا اتفاق رائے ہو گیا۔ چرغے آئے تو پھر آتے ہی چلے گئے۔ ہوٹلوں میں جیسے مریل قسم کے چرغے ملتے ہیں' وہ ایک پہلوان کے لیے دو دو تین تین چٹ کر جانا معمولی بات تھی۔ پلیٹوں میں ہڈیوں کی چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں بنتی چلی گئیں۔ ہال میں جو چند لوگ موجود تھے وہ سب بار بار مڑ مڑ کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے اور زیر لب مسکرا رہے تھے۔ سویٹ ڈش بھی تھوک کے حساب سے آئی۔

خاصی دیر میں جا کر کھانے کا سلسلہ رُکا تو میں نے خلیفہ جی سے پوچھا "آپ چائے پئیں گے یا کافی؟"

"چائے؟" خلیفہ جی نے چونک کر میری طرف دیکھا جیسے میں نے کسی معیوب چیز کا نام لے دیا ہو۔ پھر وہ گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے بولے "پاکستان بننے سے کافی پہلے جب میں چھوٹا سا تھا۔ امبڑسر (امرتسر) میں تھے ہم لوگ' تو مجھے ایک دفعہ نزلہ زکام ہو گیا تھا تو میری اماں نے مجھے زبردستی چائے پلائی تھی۔ اس کے علاوہ مجھے یاد نہیں کہ میں نے زندگی میں کبھی چائے پی ہو۔ اور کافی کا بھی میں نے اب اس عمر میں آکر نام سُنا ہے کہ یہ بھی کوئی پینے کی چیز ہوتی ہے۔ دیکھی اب بھی نہیں۔ ورنہ میں تو بس یہی سمجھتا تھا کہ

رف وہی ہوتی ہے جو بابا بلھے شاہ' غلام فرید لکھ گئے ہیں۔"

"چلیں تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ کولڈ ڈرنکس لے لیتے ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کچھ بوتلیں شوتلیں؟" خلیفہ جی نے چاہی۔

جی ہاں وہی لیکن گلاسوں میں۔"

کوئی خاص اچھی چیز تو وہ بھی نہیں ہے لیکن چلو منگوالو کے بعد کچھ پیے بغیر صبر سا نہیں آتا۔" خلیفہ جی نے سر

لڈ ڈرنک کا کاروبار چل رہا تھا تو میں نے دیکھا میرے دائیں بیٹھا ہوا ایک نوخیز اور نو عمر پہلوان غیر محسوس سے انداز میں ردن گھما کر ایک طرف دیکھے جا رہا تھا اور ہر بار اُدھر دیکھ کر چہرہ سُرخ ہو جاتا تھا۔ ویسے بھی اس کی رنگت سُرخ و سفید ہی ں مخصوص سمت میں دیکھتا تھا تو بالکل ہی ٹماٹر کی طرح سُرخ تھا۔ وہ ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ آنکھیں بلوری اور رے تھے۔ قد کاٹھ اور جسمانی ساخت بھی اچھی تھی۔

ں نے اس سمت میں دیکھا جدھر وہ بار بار دیکھ رہا تھا۔ اُدھر ز پر تین چار لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان میں سے ایک کو میں فا۔ وہ خاصی معروف اور مقبول ٹی وی آرٹسٹ ثناء سعید یں نے اسے دو ایک مرتبہ ہی ٹی وی پر دیکھا تھا لیکن ار رسالوں میں اس کے کئی انٹرویو سرسری سے انداز میں نظر رے تھے تو اندازہ ہوا تھا کہ خاصی معروف شخصیت تھی۔ ٹی رز کو ویسے بھی بچہ بچہ پہچانتا ہے۔

ھے یاد پڑتا تھا کہ کسی تقریب میں بھی اس سے ملاقات ہوئی ر میرے ذہن پر پہلا تاثر یہی مرتب ہوا تھا کہ وہ حقیقت میں کشش نہیں تھی جتنی ٹی وی پر دکھائی دیتی تھی۔ ٹی وی کی رکیوں کا معاملہ میں نے اس کے برعکس بھی دیکھا تھا۔ یعنی وہ میں جتنی خوب صورت تھیں' ٹی وی پر ان کے حُسن کا یصد بھی ان کے ساتھ نہیں رہ جاتا تھا۔ رنگ روپ کی خوب صورتیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جنہیں صرف قدرت کی لی آنکھ ہی محسوس کر سکتی ہے۔ دنیا کے بہترین کیمروں کی ی انہیں اسکرین پر منتقل نہیں کر سکتی۔ جبکہ یہی کیمرے کی ت سی ایسی خوب صورتیاں اسکرین پر منتقل کر دیتی ہے جو یں موجود نہیں ہوتیں۔ قدرتی اور مشینی چیزوں میں یہی ہے۔

ثناء سعید کھاتے پیتے گھر کی تھی۔ ٹی وی پر شوقیہ کام کرتی تھی۔ کم از کم وہ یہی بتاتی تھی۔ دوسرے کچھ مقاصد رہے ہوں تو ان کا نہیں تھا۔ میرے ذہن میں اس کے بارے میں تاثر یہی تھا خاصی شوخ و شنگ اور تیز و طرار چیز تھی۔ اس وقت وہ غالباً سہیلیوں کے ساتھ تھی۔ نہ جانے کس بات پر وہ سب بے کر رہی تھیں۔

ثناء سعید نے مجھے اپنی طرف دیکھتے پایا تو فیشن ایبل اور آسودہ حال گھرانوں کی لڑکیوں کے مخصوص انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے دور ہی سے کہا "ہائے چوہدری صاحب! ہاؤ آر یو؟"

"فائن تھینک یو۔" میں نے جواب دیا۔ دل ہی دل میں ہلکی سی خوشی بھی ہوئی تھی کہ صرف ایک ہی ملاقات کے بعد اور خاصا عرصہ گزر جانے پر بھی اس نے مجھے یاد رکھا تھا۔ وہ چاروں لڑکیاں سر جوڑ کر کچھ باتیں کرنے لگیں۔

میں نے اپنے برابر بیٹھے ہوئے نو عمر اور وجیہہ پہلوان سے پوچھا "تم اتنی دور دور سے ہی ایک ٹی وی آرٹسٹ کو دیکھ کر اتنا کیوں شرما رہے ہو؟"

"وہ جی چوہدری صاحب!" پہلوان کچھ گڑبڑا سا گیا۔ اس کا چہرہ کچھ اور سُرخ ہو گیا لیکن آخر کار اس نے گویا غیر ارادی سے انداز میں اصل بات اُگل ہی دی "وہ دراصل مجھے آنکھ مار رہی تھی۔ جب بھی میں اس کی طرف دیکھتا تھا تو وہ مجھے آنکھ مار دیتی تھی۔"

خلیفہ جی نے آنکھیں سکیڑ کر اس میز کی طرف دیکھا پھر اپنے پٹھے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے "وہ تجھے آنکھیں مار رہی تھی تو تم اس کی طرف دیکھ ہی کیوں رہے تھے؟ اگر اب تم نے ادھر دیکھا تو میں تمہیں فلائنگ کِک مار دوں گا۔ وہ بڑی چھُری چیزیں ہیں۔ تمہاری ان کے چکر میں پڑنے کی نہ تو عمر ہے اور نہ اوقات۔ آئی عقل میں؟"

"خلیفہ جی! میں تو ویسے ہی دیکھ رہا تھا۔" پہلوان مسکین سے لہجے میں بولا لیکن اسی دوران غیر ارادی سے انداز میں ایک بار پھر اس کی نظر اس میز کی طرف چلی گئی اور میں نے خود دیکھا۔ واقعی ثناء نے اسے آنکھ ماری لیکن دوسرے ہی لمحے سہیلیوں کی طرف متوجہ ہو گئی اور سب سر جوڑ کر کھی کھی کرنے لگیں۔

نوخیز پہلوان کا چہرہ ایک بار پھر ٹماٹر کی طرح سُرخ ہو گیا۔ میں اس کیفیت سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔ یہ شرم' یہ حیا اور وہ بھی مردوں میں؟ یہ خزانے تو اب ختم ہوتے جا رہے تھے۔ اس نوجوان کو ثناء آنکھ مار رہی تھی تو وہ اپنی جگہ بیٹھا شرم سے سُرخ ہوا جا رہا تھا۔ حالانکہ وہ راہ چلتے کسی کی طرف آنکھ بھر کر بھی دیکھ لیتی ہو گی تو وہ گھر تک اس کا پیچھا کرتا ہو گا یا وہیں گلے کا ہار بننے کی کوشش کرتا ہو گا۔

میں نے سر جھٹک کر خیالات کی دنیا سے باہر آنے کی کوشش کی اور ایک بار پھر خلیفہ جی کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ ابھی تک اپنے پٹھے پر آنکھیں نکال رہا تھا اور وہ بڑی مسکینی سے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"خلیفہ جی! آپ اس عمر میں بھی فلائنگ کِک لگا لیتے ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

خلیفہ جی ٹھنڈی سانس لے کر بولے "اب تمہیں کیا بتائیں چوہدڑی باؤ! تم نے تو کبھی آکر اپنا اکھاڑہ دیکھا بھی نہیں۔ کبھی اپنے

اس خادم کو دیکھو تو سہی آ کر کہ ان پٹھوں کو کیسے ٹریننگ دیتا ہوں۔ پھر تمہیں پتا چلے گا خلیفہ نواز بڑی پکڑ کیا چیز ہے۔ سفید بال اپنی جگہ ہیں۔ عمر اپنی جگہ ہے..... ریاضت اپنی جگہ ہے' فن اپنی جگہ ہے۔ جوانی والی بات تو پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ہم کو پتا ہے کہ جوانی جوانی ہی ہوتی ہے۔ لیکن پھر بھی یہ بڑھاپا بہت سی جوانیوں سے بہتر ہے۔"

جو بات میرے دل میں تھی' خلیفہ جی نے اپنے منہ سے کہہ دی تھی۔ وہ گلاس رکھ کر اپنے دونوں ہاتھ اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے بولے "کون سا داؤ ہے جو خلیفہ نواز بڑی پکڑ نہیں لگا سکتا۔"

ابھی ہمارا کولڈ ڈرنکس کا سلسلہ چل ہی رہا تھا کہ لڑکیاں جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئیں۔ ثناء سعید جاتے جاتے میری کرسی کے قریب رُک گئی اور مسکراتے ہوئے بولی "چوہدری صاحب! کیا پہلوانوں کا کنونشن بلا رکھا ہے؟"

"ہاں میں نے سوچا دانشوروں کے کنونشن تو بہت ہو چکے۔ سب کئی کئی بار لفظوں کی جگالی کر کے' ٹی اے ڈی اے لے لے کر جا چکے۔ ملک کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہوا۔ اب پہلوانوں کا کنونشن ہی بُلا کر دیکھ لیا جائے' اور کچھ نہیں تو کم از کم اچھی جانیں ہی دیکھنے کو ملیں گی۔ دل میں زندگی کی اُمنگ کچھ بڑھے گی۔"

"بہت اچھا سوچا آپ نے۔" وہ پرس کندھے پر لٹکاتے ہوئے بولی "کبھی ہمارے غریب خانے پر بھی تشریف لایئے نا۔ میں نے آپ کو اپنا کارڈ بھی دیا تھا۔"

"معذرت چاہتا ہوں مجھ سے کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا ہو گا۔ دوبارہ عنایت فرمادیجئے۔" میں نے شائستگی سے کہا۔ اس کی سہیلیاں ڈائننگ ہال کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی تھیں لیکن اپنے پیچھے خوشبوؤں کا ایک قافلہ چھوڑ گئی تھیں۔

ثناء اپنا پرس کھولتے ہوئے بولی "اتنی بے نیازی بھی اچھی نہیں ہوتی کہ آپ نے ہمارا کارڈ بھی سنبھال کر نہیں رکھا۔ لوگ تو گلی کوچوں میں' اخباروں کے دفتروں میں' ٹی وی سینٹر پر ہمارا فون نمبر پوچھتے پھرتے ہیں۔" اس نے پرس سے اپنا خوب صورت وزیٹنگ کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا۔

"اس بار ضرور سنبھال کر رکھوں گا۔" میں نے کارڈ کو بظاہر احتیاط سے جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اور غریب خانے پر بھی تشریف لائیں گے؟" وہ گویا وعدہ لینے پر تُلی ہوئی تھی۔

"ضرور جب بھی موقع ملا میں ضرور حاضر ہوں گا۔"

"اس کیوٹی کو بھی اپنے ساتھ ضرور لایئے گا۔" اس بار اس نے مجھے آنکھ مار کر اس نوجوان پہلوان کی طرف اشارہ کیا جو حجلۂ عُروسی میں بیٹھی دلہن کی طرح سر جُھکائے ہوئے تھا اور شرم سے سُرخ تھا۔ اور تو اور' خلیفہ جی بھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے تھے۔

"اس بے چارے پر رحم کرو۔ اسے ابھی زندگی میں کوئی ڈھنگ کا کام کر لینے دو۔" میں نے مسکراتے ہوئے درخواست کی۔

"میں کون سا اسے دنیا کے کسی کام سے روک رہی ہوں۔ بلکہ میں تو اسے لوگوں کے کام آنا سکھاؤں گی۔" وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ کچھ پہلوان کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ اور اس کی سہیلیاں نظر سے اوجھل ہو چکیں تو خلیفہ جی نے سر اُٹھایا۔ ان کی مونچھیں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ چھت کی طرف دیکھ کر وہ کراہنے کے سے انداز میں بولے "مولا! یہ زمانہ کدھر کو جا رہا ہے!"

کولڈ ڈرنکس کا سلسلہ بھی ختم ہو چکا تو تھوڑی دیر بعد خلیفہ جی بولے "چلو بھئی چوہدری پتر! آج تمہاری مہربانی سے ہم نے اس اونچے ہوٹل میں بھی کھانا کھا لیا۔ اب اجازت دو۔ آج تمہاری خدمت میں حاضر ہو کر بڑی خوشی ہوئی لیکن اصل خوشی اس دن ہو گی جب تم ہمیں کسی خدمت کا موقع دو گے۔"

"بس آپ اکھاڑے کو دل و جان سے چلاتے رہیں۔ اس کی ترقی کی کوشش کرتے رہیں یہ بھی میری اور اس قوم کی بڑی خدمت ہو گی۔" میں نے اٹھ کر انہیں رخصت کرتے ہوئے کہا۔

وہ لوگ جا چکے تو ڈائننگ ہال میں جیسے ویرانی سی چھا گئی حالانکہ ابھی خاصی تعداد میں دوسرے لوگ موجود تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی' آٹھ بجنے کو تھے۔ میں نے اپنے لیے کافی کا آرڈر دیا اور مزید کافی دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ میزیں صاف کی جا چکی تھیں اور کرسیوں کی ترتیب بھی بدل چکی تھی لیکن مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ لوگ ابھی وہیں بیٹھے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ابھی میں انہی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ خلیفہ جی نے اکھاڑہ شروع کر کے گویا میرے ایک اور چھوٹے سے خواب کو تعبیر دے دی تھی۔ میں خود وہاں جا کر کچھ وقت صرف کرنا چاہتا تھا لیکن عجب بد نصیبی تھی' زندگی اتنی مہلت ہی نہیں دے رہی تھی کہ میں خلیفہ جی کے توسط سے بسائی ہوئی اس چھوٹی سی دنیا کو دیکھنے جا سکتا۔

پھر کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے میرا ذہن اپنے اصل مسئلے میں جا پھنسا۔ میں سوچ رہا تھا اگر لاہور میں حفیظ صاحب سے میری ملاقات طے نہ ہو سکی تو ریڈ ڈاٹ کا ردِعمل کیا ہو گا؟ اور اگر ملاقات طے ہو گئی تو اس کے لیے مجھے کیا کیا تیاریاں کرنے کی ضرورت تھی؟ راحیلہ جس آپریشن کا منصوبہ بنا رہی تھی وہ اپنی جگہ تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ میرا بھی کچھ کاموں کے لیے تیار رہنا ضروری تھا۔

کچھ دیر بعد ایک ویٹر' فولڈر میں بل لئے مجھ سے سائن کرانے کے لیے آیا۔ میں نے فولڈر کھولا تو اس میں بل سے ذرا اوپر ایک چٹ بھی رکھی ہوئی تھی۔ اس پر لکھا تھا۔

"سر! کل سے ایک مشکوک سا نوجوان ہوٹل کے گرد منڈلا رہا ہے۔ وہ آپ کے چکر میں ہے۔ آج کلرک سے آپ کا کمرا نمبر پوچھ رہا تھا اس کا کیا کرنا ہے؟" ڈبل ایس۔

میں نے ویٹر کی طرف دیکھا۔ وہ ہونٹوں پر رسمی سی مسکراہٹ لیے کھڑا تھا۔ چٹ سردار شیخ کی طرف سے تھی۔ میں نے اسی پر لکھا "اسے قابو میں کر کے پچھلے احاطے میں لے آؤ۔ میں دیکھتا ہوں۔ مارنا نہیں۔"

بل پر سائن کر کے میں نے فولڈر بند کر کے ویٹر کی طرف کھسکا دیا۔ وہ رخصت ہو چکا تو میں اپنے آپ کو کچھ اور ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ سرسری نظر سے میں نے ہال کا جائزہ لیا۔ ہال میں اب کئی نئے پیراہن نظر آنے لگے تھے لیکن کوئی صورت میری شناسا نہیں تھی۔ کوئی میری طرف متوجہ بھی نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد میں اُٹھ کر ہوٹل کے صدر دروازے سے باہر آ گیا۔ ایک خوشگوار رات تھی۔ میں دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے ٹہلنے کے سے انداز میں پارکنگ لاٹ کے سامنے سے ہوتا ہوا عقبی حصے کی طرف چل دیا۔ ہوٹل اب میرے لیے گھر کی طرح ہو گیا تھا اور میں گویا گھر کے احاطے میں ہی ٹہل رہا تھا۔

میں عمارت کے عقب میں پہنچا تو عقبی دیوار کے قریب بغیچے میں ایک سفید گاڑی کھڑی نظر آئی۔ میں ٹہلتا ہوا گاڑی کے قریب چلا گیا۔ اس حصے میں کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے کھڑکی سے گاڑی میں جھانکا تو اندر اس کی لائٹ آن ہو گئی۔ تاہم مجھے لائٹ آن ہونے سے پہلے ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ ڈرائیونگ سیٹ پر کوئی موجود تھا اور عقبی سیٹ پر ٹونی اور سردار شیخ اپنے درمیان کسی کو قابو میں کیے بیٹھے تھے۔ اس کے چہرے پر انہوں نے بڑا سا کپڑا ڈالا ہوا تھا۔

"ذرا لڑکی تو کراؤ دلہن کی۔" میں نے دھیرے سے کہا۔

سردار شیخ نے چادر اس کے چہرے سے ہٹائی تو میرا سارا جوش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اپنی ہونق سی شکل لئے وسیم احمد میرے سامنے موجود تھا۔ لیکن اس شکل میں کچھ اضافے نظر آ رہے تھے۔ مثلاً نہایت سستی سی نقلی مونچھیں تھیں جو تقریباً اس کی ناک میں گھس چکی تھیں۔ ربڑ کا ایک سیاہ ٹکڑا تھا جسے غالباً اس نے مسّے کے طور پر گال پر چپکا رکھا تھا لیکن اب وہ چپٹا ہو کر اس کے منہ میں گھسا جا رہا تھا۔ ایک گلے میں بھی اس نے غالباً کچھ دبایا ہوا تھا جس کی وجہ سے ایک طرف سے اس کا منہ کچھ پھولا پھولا سا لگ رہا تھا۔ یہ اپنی جگہ کہ اس نے میک اپ کیا ہوا تھا۔ ویسے شاید کوئی اس کی طرف دیکھتا لیکن اس میک اپ کی وجہ سے ضرور متوجہ ہو سکتا تھا اور جان سکتا تھا کہ یہ چیزیں نقلی تھیں۔ اس طرح وہ کسی کی نظر میں زیادہ مشکوک قرار پا سکتا تھا۔ عام حالات میں بھی اس کے چہرے پر ہوائیاں سی اڑتی دکھائی دیتی تھیں۔ اس وقت تو بالکل ہی ابتر تھا۔

مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے غالباً چیخ کر کچھ کہنا چاہا لیکن ٹونی نے فوراً اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا جس کی وجہ سے مونچھ اس کی ناک میں کچھ اور گھس گئی۔ اسے چھینک آئی مگر وہ بھی دب کر رہ گئی البتہ ٹونی کا ہاتھ کچھ گندا ہو گیا۔ ٹونی دانت پیس کر رہ گیا۔

"اس ہونق کو کہاں سے پکڑ لیا تم نے؟" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کیا یہ شکل سے ہی تمہیں چُغد نظر نہیں آ رہا؟"

"سر! اس کی حرکتیں بڑی مشکوک تھیں۔" سردار بولا "پھر ہم نے یہ بھی سوچا کہ صورت سے چُغد نظر آنے والے بعض لوگ بڑی پہنچی ہوئی چیز ہوتے ہیں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اسے چھوڑ دو' اسے اپنے دوستوں ہی میں سے سمجھو۔ اس کا نام وسیم ہے۔ اسے پُراسرار بننے کا شوق ہے۔" میں نے بتایا۔

ٹونی نے محتاط انداز میں اسے چھوڑ دیا۔ وسیم چند لمحے گہری گہری سانسیں لیتا رہا' پھر میرے ساتھیوں کی طرف اشارہ کر کے بولا "یہ اپنے ہی آدمی ہیں؟"

"ظاہر ہے تبھی تو اتنے اطمینان سے گفت و شنید ہو رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"خدایا تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر خدا کا شکر ادا کیا پھر اپنی نقلی مونچھیں ناک سے نکالتے ہوئے بولا "میں تو سمجھا تھا کہ دشمنوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ میں دل ہی دل میں خود سے کہہ رہا تھا' لو وسیم بیٹا! تمہیں تو وصیت کرنے کی بھی مہلت نہیں ملی۔ منگنی تک نہیں ہوئی تمہاری..... اور سفرِ آخرت پر روانہ ہونے کا وقت بھی آن پہنچا' لیکن جب آپ کی صورت نظر آئی تو یقین ہو گیا کہ آپ ضرور مجھے دشمنوں سے بچا لیں گے۔"

وہ ایک بار پھر تشکر بھرے انداز میں ٹھنڈی سانس لے کر بولا "لیکن خدا کا شکر ہے یہ لوگ دشمن نہیں' اپنے ہی آدمی نکلے۔ ورنہ بڑا خون خرابہ ہوتا۔"

"کون کرتا خون خرابہ؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے آپ ہی کرتے۔ میں تو ان کے شکنجے میں بے بس تھا۔ میرا تو نقلی پستول بھی انہوں نے چھین لیا تھا۔ میں احتیاطاً اصل پستول لے کر نہیں آیا تھا۔ یونہی کبھی کبھار غلط موقع پر گولی چل جاتی ہے۔" اس کی عینک ناک پر آن ٹکی تھی اور فریم بھی کچھ ٹیڑھا سا ہو گیا تھا۔ وہ اسے سیدھا کرنے لگا۔

"اگر یہ لوگ تمہیں قابو میں نہ کرتے تو تم یقیناً نقلی پستول سے کشتوں کے پشتے لگا دیتے۔" میں نے کہا۔

"کشتوں کے پشتے نہ سہی' کچھ نہ کچھ تو ضرور کرتا۔ کبھی کبھی نقلی پستول بھی بڑا کام آ جاتا ہے۔"

پھر وہ کراہ کر پسلیوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "ویسے انی بھائی! آپ کے ان آدمیوں نے مجھے اچھے خاصے رگڑے دیے ہیں۔ حالانکہ میں نے بالکل مزاحمت نہیں کی تھی۔" اس کا انداز کچھ

ایسا ہی تھا جیسے کوئی بچّہ لڑائی میں دوسرے بچّوں سے پٹنے کے بعد کسی بزرگ سے شکایت کر رہا ہو۔

"ان کا ہاتھ ہی ذرا سخت پڑتا ہے اور تم ذرا نازک اندام ہو۔ لیکن جس حالت میں تم نظر آرہے ہو' یوں سمجھو کہ انھوں نے تمہیں پھولوں کی طرح سنبھالا ہے۔ ورنہ جو حماقت تم کر رہے تھے اس میں تمہاری جان بھی جا سکتی تھی۔ اچھا یہ بتاؤ' تم تھے کس چکر میں؟ تم ہوٹل کے آس پاس کیوں منڈلا رہے تھے؟ میرا کمرا نمبر وغیرہ کیوں پوچھ رہے تھے؟ مجھے یہاں آتے جاتے دیکھ کر تم سیدھے میرے پاس نہیں آسکتے تھے؟"

"میں تو آپ کی مدد کرنا چاہتا تھا۔ لیکن میں ذرا جاسوسوں والا طریقہ اختیار کر رہا تھا۔" اس نے ذرا شرمیلے سے لہجے میں جواب دیا "میں آپ کے گھر گیا تھا۔ میں نے دیکھا آپ کا گھر تو بالکل تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ وہاں ملبے کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں سمجھ گیا کہ آپ دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں اور کھلی جنگ شروع ہو چکی ہے لیکن مجھے کوئی نہیں بتا رہا تھا کہ آپ ہیں کہاں؟ وہ تو اتفاقاً ہی میں نے آپ کو اس ہوٹل میں آتے جاتے دیکھ لیا۔ میں چھپ کر آپ کی نگرانی کرنے لگا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے معلوم تھا دشمن آپ پہ نظر رکھے ہوگا۔ کھلم کھلا اور علی الاعلان آپ کے پاس آنا بالکل مناسب نہیں تھا۔ اس طرح میں بھی دشمن کی نظر میں آسکتا تھا اور نہ صرف اپنی بلکہ آپ کی جان بھی خطرے میں ڈال سکتا تھا۔ اس لیے میں بڑے صبر و تحمل سے مناسب موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ لیکن مجھے یہ خیال ہی نہیں رہا تھا کہ آپ کے اپنے آدمی بھی آپ پر نظر رکھے ہوں گے اور وہ میرے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے ہیں آئندہ میں احتیاط کروں گا۔"

ٹونی' سردار شیخ اور حنیف تینوں ہی اس کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ آخر وہ تھی کیا چیز؟ میں نے ان کے محسوسات کو سمجھتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا "تم لوگ خواہ مخواہ اپنے ذہنوں پر زور مت دو۔ ابھی تو میں ہی سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔"

پھر میں نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا "اسے چھوڑ دو۔ میں اِسے اوپر لے جاؤں گا مجھے اس سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔"

اس وقت وسیم کو دیکھ کر اچانک ہی ایک خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ ٹونی اور سردار نے اسے چھوڑ دیا لیکن ٹونی اس کے ساتھ خود بھی گاڑی سے اُتر آیا اور مجھے ایک طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "سر! مجھے علیحدگی میں آپ سے ایک بات کرنی تھی۔"

ہم وسیم کو گاڑی کے پاس ہی چھوڑ کر ذرا آگے چلے گئے۔ ٹونی دھیمی آواز میں بولا "راحیلہ ایک چھوٹے سے آپریشن کا پلان بنا رہی ہے اور ساتھیوں کو احکامات جاری کر رہی ہے۔ مجھے یہ تو اندازہ ہے کہ آپ نے اسے اختیار دیا ہوگا۔ آپ کی اجازت کے بغیر تو ہم میں سے کوئی بھی یہ جرأت نہیں کر سکتا۔ لیکن میں نے سوچا پھر بھی احتیاطاً آپ سے تصدیق کر لوں۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔ وہ میری اجازت سے ہی یہ سب کچھ کر رہی ہے۔ آئندہ کسی وجہ سے اگر مجھے پیش منظر سے ہٹنا پڑا تو میری عدم موجودگی میں "دی سرکل" کی انچارج کی حیثیت اسی کو حاصل ہوگی۔ میٹنگ میں بھی یہ بات ہو چکی تھی۔" میں نے طمانیت سے کہا۔

وہ طمانیت سے سر ہلاتے ہوئے بولا "سر! آپ سے دوبارہ تصدیق کر کے مجھے زیادہ اطمینان ہو گیا ہے۔ اب میں یکسوئی سے کام کر سکوں گا۔ دراصل ہمیں عادت نہیں رہی آپ کے سوا کسی کا حکم ماننے کی۔ اس لیے ہمیں عجیب سا لگ رہا تھا۔"

"میں چاہ رہا ہوں اس کی صلاحیتوں کا کچھ امتحان ہو جائے اس کے ناکام ہونے یا اس کی عدم موجودگی کی نوبت آنے پر تم اس کی جگہ سنبھالو گے اور کسی وجہ سے اگر تم اپنی ذمّے داریاں انجام نہ دے سکو تو شفیع شاہ تمہاری جگہ سنبھالے گا۔ اپنے اس چھوٹے سے گروپ کا نظام چلانے کی یہ ترتیب رہے گی۔" میں نے کہا۔

"سر! میں تو "دی سرکل" کو سنبھالنے کی ذمّے داری اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ میں تو بس آنکھیں بند کر کے آپ کے حکم کی تعمیل کرنا جانتا ہوں اور اسی میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔

"لیکن ضرورت پڑنے پر تمہیں... بلکہ ہمارے ہر ساتھی کو کام بھی کرنا ہوگا۔ کوئی بھی ذمّے داری سنبھالنا ہوگی۔" میں نے کہا۔

"سر! کیا یہ آپریشن بہت زیادہ اہم ہے؟ آپ کے انداز سے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا واقعہ رونما ہونے والا ہے۔؟" ٹونی نے گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔

"بظاہر بات کچھ بھی نہیں ہے۔ میرے اندیشے غلط بھی ثابت ہو سکتے ہیں اور صورتِ حال میرے اندیشوں سے بدتر بھی ہو سکتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ جتنا ہم اس معاملے کو اہم سمجھ رہے ہیں یہ اتنا ہی معمولی ثابت ہو۔ ٹائیں ٹائیں فش والی بات ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ زندگی اور موت کی بازی یا ہم سب کی زندگی کا اہم موڑ ثابت ہو۔ میں خود بڑی اُلجھن میں ہوں۔ میں کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔ بس... ایک احساس سا ہے جیسے ہمارے اردگرد ایک دائرہ سا کھینچ دیا گیا ہے جو روز بہ روز تنگ ہو رہا ہے۔ تمہیں راحیلہ نے اصل بات بتا دی ہے کہ ہم درحقیقت کس لیے ایک نئے سرے سے منظم ہو رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔ اس نے سب سے پہلے صرف مجھے ہی پوری صورتِ حال سمجھائی ہے۔ اس سلسلے میں ہم فون یا ریڈیو پر ایک دوسرے سے رابطہ نہیں کر رہے ہیں اس لیے پیغامات

دوسرے کو پہنچانے میں ذرا تاخیر ہو رہی ہے اور ہم یہ بھی نہیں چاہتے کہ غیر معمولی بھاگ دوڑ کرتے نظر آئیں۔ ہم بظاہر اپنے پیشے کے معمولات برقرار رکھنے کی کوشش کررہے ہیں۔" ٹونی نے بتایا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ عقبی احاطے میں اس وقت ہمارے سوا کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے پہلے سے بھی نیچی آواز میں کہا "ریڈ ڈاٹ سے آخری لمحے تک کسی بات کو خفیہ رکھتے ہوئے اور اس کی حکم عدولی کرتے ہوئے اس کے کسی منصوبے کو ناکام بنانا بہت مشکل کام ہے لیکن ہمیں بہرحال اپنی سی کوشش کرنی ہے۔ بس دو کام ہو جائیں' اس کے بعد خواہ کچھ بھی ہوتا رہے مجھے اس کی پروا نہیں۔ ایک تو عرفان' حفیظ صاحب کی جگہ نہ لینے پائے دوسرے وہ ہمارے قابو میں آجائے بعد کے حالات خواہ کچھ بھی ہوں' دیکھا جائے گا۔ میں بدترین صورتِ حال کے لیے تیار ہوں اور تم سب لوگ بھی تیار رہنا۔ میرا دل کہتا ہے ریڈ ڈاٹ کے لیے یہ معاملہ بہت اہم ہے۔"

"آپ فکر نہ کریں سر! ہم ہر طرح کی صورتِ حال کے لیے تیار رہیں گے اور عرفان ایک بار ہمارے سامنے آنے کے بعد کہیں نہیں جاسکے گا۔ ٹونی نے مجھے اطمینان دلایا۔

ہم واپس گاڑی کے پاس آگئے۔ میں نے دیکھا وسیم کی مونچھیں غائب ہوچکی تھیں۔

"یہ تمہاری مونچھیں کہاں چلی گئیں؟" میں نے پوچھا۔

"جیب میں رکھ لی ہیں۔" اس نے جیب پر ہاتھ رکھتے ہوئے سادگی سے بتایا "ناک میں گھسی جارہی تھیں جس کی وجہ سے چھینکیں آرہی تھیں۔ آپ کے آدمیوں نے ان کی سیٹنگ خراب کردی۔ ورنہ بہت اعلیٰ قسم کی مونچھیں تھیں' گڑھی شاہو سے خرید کر لایا تھا۔" انداز کچھ ایسا تھا جیسے کہہ رہا ہو' پیرس سے خرید کر لایا تھا۔

میں نے اسے اپنا سوئٹ نمبر اور فلور وغیرہ بتاتے ہوئے کہا "میں اوپر جارہا ہوں' ایک آدھ منٹ بعد تم میرے سوئٹ میں پہنچ جاؤ۔ آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ کوشش کرنا کہ کم سے کم لوگوں کی نظر میں آؤ۔ لیکن خدا کے لیے جاسوس یا پُراسرار انسان بننے کی کوشش ہرگز مت کرنا۔ اس طرح تم زیادہ لوگوں کی نظروں میں آتے ہو۔"

"آپ اطمینان رکھیں سر! میں اس طرح آپ کے سوئٹ میں پہنچوں گا کہ میرا سایہ بھی مجھے نہیں دیکھ سکے گا۔" اس نے مجھے سلیوٹ کرتے ہوئے قدرے پُرجوش لہجے میں کہا۔ میں صرف دھیرے سے ہنس کر رہ گیا۔ لیکن اپنی ہنسی مجھے خود بھی ہلکی سی کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی۔

"تم بس سیدھے سادے طریقے سے آجانا۔ جس طرح کوئی عام سا شریف آدمی دوسرے عام سے شریف آدمی سے ملنے جاتا ہے۔" میں نے اسے تاکید کی اور وہاں سے واپس آگیا۔

مجھے اپنے سوئٹ میں آئے خاصی دیر گزر گئی۔ میں نے لباس بھی تبدیل کرلیا۔ ہاتھ منہ دھو کر ذرا دیر سستا کر ایک کولڈ ڈرنک بھی فریج سے نکال کر ختم کرلی' لیکن وسیم کی آمد کے آثار دکھائی نہ دیے۔ آخر کار میں مایوس ہو کر سوچنے لگا کہ اب حفیظ صاحب کو ہی فون کرلیا جائے لیکن ابھی نو بھی نہیں بجے تھے۔

میں ڈرائنگ روم میں آکر ٹہلنے لگا۔ اچانک دروازے پر نہایت خفیف سی دستک ہوئی۔ میں نے دروازے کی میجک آئی سے دیکھا۔ سامنے مجھے وسیم کی وہی ہونق سی صورت دکھائی دی لیکن اب اس کے چہرے پر سفید مونچھیں نظر آرہی تھیں۔ سیاہ بالوں کو چھپانے کے لیے اس نے پی کیپ کا بھی سہارا لیا تھا لیکن احمق کو شاید یہ نہیں معلوم تھا بال پھر بھی ٹوپی کے نیچے سے جھانکتے دکھائی دے رہے تھے۔

میرے دروازہ کھولتے ہی وہ یوں اُچک کر اندر آگیا جیسے کوئی کتا اس کی ٹانگ پکڑنے کے لیے لپکا ہو۔ میں حالانکہ کچھ بول نہیں رہا تھا۔ لیکن اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کر "شش" کی آواز کے ساتھ مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ پھر دروازہ بند کر کے اس سے کان لگا کر کھڑا ہوگیا حالانکہ باہر راہداری میں سناٹا تھا۔ میں دروازہ کھولتے وقت ہی دیکھ چکا تھا باہر کوئی نہیں تھا۔

ایک لمحے بعد اس نے دروازے سے ہٹتے ہوئے سرگوشی میں مجھے بتایا "میں جب آپ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا تو برابر کے دروازے سے ایک پُراسرار سیاہ فام جھانک رہا تھا۔ شکل سے وہ کوئی جادوگر دکھائی دے رہا تھا لیکن مجھے معلوم ہے اس قسم کے لوگ جاسوس ہوتے ہیں۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر اس کا بازو پکڑ کر اسے اندر لے جاتے ہوئے کہا "احمق! مجھے معلوم ہے میرے برابر والے سوئٹ میں کون مقیم ہے۔ وہ نہ کوئی جادوگر ہے اور نہ جاسوس۔ وہ صومالیہ کا ایک ڈپلومیٹ ہے کسی سفارتی مشن پر آیا ہوا ہے۔"

میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے اتنی دیر کیوں لگائی لیکن اس دوران میری نظر اس کے ہاتھوں پر پڑ چکی تھی جو چھلے چھلے سے نظر آرہے تھے۔ ان پر کچھ سیاہی سی بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی پتلون پر بھی گھٹنوں کی جگہ رگڑ کے نشانات وغیرہ دکھائی دے رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کوئی کارنامہ دکھا ہی آئے ہو۔ حالانکہ میں نے کہا تھا۔ سیدھے سادے طریقے سے شریفوں کی طرح آجانا۔" میں نے اسے گھورا۔

"میں تو سیدھے سادے طریقے سے ہی لفٹ کے راستے شرفا..... بلکہ معززین کی طرح آرہا تھا لیکن جونہی میں راہداری میں قدم رکھنے لگا مجھے سامنے میڈ کھڑی نظر آگئی۔ میں فوراً اِسی لفٹ سے واپس چلا گیا۔"

"کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے ان اونچے ہوٹلوں کے بارے میں بڑی معلومات ہیں۔" اس نے فخریہ لہجے میں بتایا "مجھے معلوم ہے اکثر میڈز کسی نہ کسی کے لیے جاسوسی کررہی ہوتی ہیں۔"

"ہاں خیال تو تمہارا صحیح ہے۔" میں نے سرہلایا "اس فلور پر ڈیوٹی دینے والی میڈز کے بارے میں تو مجھے معلوم ہے کہ وہ جاسوسی کرتی ہیں۔"

"کس کے لیے؟" اس نے گول گول سی آنکھیں گھماتے ہوئے اشتیاق سے پوچھا۔

"میرے لیے" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے مایوسی پھیلی مگر پھر وہ کھل اُٹھا اور فاتحانہ لہجے میں بولا "بہرحال میرا اندازہ تو درست ثابت ہوا نا۔ جاسوسی تو وہ کرتی ہیں' کسی کے لیے بھی سہی۔"

"ابے گدھے! تمہارے ذہن پر آج جاسوسی اتنی کیوں سوار ہے؟ میڈ کو دیکھ کر تمہیں واپس جانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر اس سے ہوشیار رہنا ضروری ہوتا تو میں تمہیں ہدایت کرکے آتا۔ بہرحال واپس جاکر تم نے کیا کیا؟"

"میں پائپ کے سہارے چڑھ کر آیا ہوں۔ اس فلور کے اسٹور کی کھڑکی اتفاق سے کھلی مل گئی تھی ورنہ ائرکنڈیشننگ کی وجہ سے اس قسم کی عمارتیں چاروں طرف سے صندوق کی طرح بند ہوتی ہیں۔ یہ بڑی مصیبت ہے۔" اس نے شکوہ کیا۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا "اور یہ تمہاری نقلی مونچھیں اتنی دیر میں کالی سے سفید کیسے ہوگئیں؟"

"یہ دوسری ہیں۔ یہ تو میں نے انارکلی سے خریدی تھیں۔" اس نے قدرے شرمیلے سے لہجے میں بتایا "میں گاڑی میں ہمیشہ اسپیئر وہیل اور جیب میں ہمیشہ اسپیئر مونچھ ضرور رکھتا ہوں۔"

"اب یہاں سے واپس جاتے وقت کہیں سبز یا سُرخ رنگ کی مونچھ مت لگالینا۔" میں نے درخواست کی۔

"نہیں سر! اب میں اتنا بے وقوف بھی نہیں ہوں۔" وہ دھیرے سے ہنسا پھر ذرا اِدھر اُدھر کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "بڑی شاندار جگہ ہے۔ میرا خیال ہے وی آئی پی سوئٹ ہے؟"

میں نے اثبات میں سرہلایا تو وہ بولا "واہ صاحب! کیا ٹھاٹ ہیں بڑے لوگوں کے!"

میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا' تب گویا اسے اصلی مقصد یاد آیا۔ وہ چونکتے ہوئے بولا "آپ نے مجھے کسی کام کے لیے بلایا تھا! یقیناً وہ کوئی عظیم مقصد ہوگا جس کے لیے آپ مجھ سے کام لینا چاہتے ہوں گے؟"

"ہاں یوں سمجھ لو کہ ایک عظیم مقصد کا ایک حصہ ہے۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا "تم بہت اصرار کیا کرتے تھے تاکہ تم میرے کسی کام آنا چاہتے ہو؟"

"ہاں سر! میں تو آپ کے لیے بہت سارے کام کرنا چاہتا ہوں۔ میں تو آپ کا دستِ راست بننا چاہتا ہوں۔ دستِ راست سمجھتے ہیں نا آپ؟ یعنی دایاں ہاتھ۔" پھر یکدم ہی اس کے چہرے پر بلا کی افسردگی چھاگئی مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ وہ زاروقطار رونے لگے گا لیکن وہ گویا مجھ پر رحم کھا کر بھرائی ہوئی آواز پر اکتفا کرتے ہوئے بولا "مگر مجھے معلوم ہے آپ مجھے بہت بے وقوف سمجھتے ہیں۔ آپ مجھے کسی اہم کام کے قابل نہیں سمجھتے لیکن انسان کو آزمائے بغیر اس کے بارے میں رائے قائم نہیں کرنی چاہیے۔"

میں اس کے چہرے پر برستی ہوئی حماقت اور اداسی کے امتزاج کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بار پھر اس کے بارے میں اُلجھن میں پڑگیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اپنی تمام تر حماقتوں کے باوجود اس نے میرے لیے پہلا اہم کام یہ کیا تھا کہ اے ٹن کو بے ہوش کر کے میرے سامنے گرایا تھا اور وہ یہ کام تھا جو میرا کوئی بھی ساتھی میرے لیے انجام نہیں دے سکا تھا۔ اب یہ دوسری بات تھی کہ اے ٹن ہمیں غچا دے کر اور ہماری مجبوری سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے آخرکار ہمارے قبضے سے نکل گیا تھا۔

"تمہیں اس ملک سے بھی محبت ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ ویسے تو آپ کسی سے بھی پوچھیں گے تو وہ آپ کو اس کا جواب اثبات میں ہی دے گا بلکہ اس موضوع پر ایک لمبی تقریر جھاڑے گا لیکن عملی طور پر وہ آپ کو اس کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں مصروف نظر آئے گا۔ کسی کو مسائل کا سامنا ہوگا یا کسی کے حالات خراب ہوں گے تو وہ فوراً ملک کو بُرا بھلا کہنا شروع کردے گا۔ یہ نہیں سوچے گا کہ وہ کسی اور ملک میں پیدا ہوجاتا تو کیا معلوم اس کے حالات اس سے بھی زیادہ خراب ہوتے۔ سر! میں تو عملی طور پر اس ملک کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں لیکن مجھے کوئی گھاس ہی نہیں ڈالتا۔" وہ تیزی سے کہتا چلا گیا۔

"فی الحال تم چھوٹے سے کام سے آغاز کرو۔ اگر تم نے اِسے اچھے طریقے سے انجام دیا تو تمہیں آئندہ اپنے وطن کے لیے بڑے بڑے کام کرنے کا بھی موقع مل سکتا ہے۔"

"جلدی سے بتائیں سر!" وہ مارے اشتیاق کے' صوفے پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر برستی ہوئی حماقت کچھ اور گہری ہوگئی۔

"فی الحال تمہیں صرف میرے خصوصی قاصد کا فریضہ انجام دینا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ قدرے مایوس نظر آنے لگا۔ میں نے جلدی سے کہا "بظاہر یہ معمولی کام سہی لیکن درحقیقت بہت اہم ہوگا اور تمہاری یہ خدمت میرے لیے نہیں اپنے وطن کے لیے ہی ہوگی۔ کل صبح سے تم چوبیس گھنٹے اپنے گھر یا آفس کے فون کے قریب موجود رہا کرو۔ میں کسی بھی وقت تمہیں فون کرسکتا ہوں۔ دراصل مجھے شبہ ہے

کہ میرے اور میرے ساتھیوں کے ٹیلی فون اور رابطے کے دوسرے ذرائع محفوظ نہیں رہے۔"

میرا ارادہ تھا کہ میں اب کسی پبلک فون سے وسیم کو فون کیا کروں گا۔ وہ اب خاصی توجہ اور انہماک سے میری بات سُن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر برستی ہوئی حماقت میرے خیال میں میرے لیے ایک مفید چیز ثابت ہو سکتی تھی۔ ریڈ ڈاٹ والے یا کوئی اور مشکل سے ہی تصور کر سکتا تھا کہ صورت سے ہی اتنا احمق نظر آنے والا نوجوان میرے لیے کام کر رہا ہو گا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "مجھے اپنے ساتھیوں کے لیے جو بھی پیغام دینا ہوا کرے گا وہ میں اختصار کے ساتھ تمہیں دیا کروں گا اور تم اسے لکھ کر لفافے میں بند کر کے اسکوٹر پر کسی کوریئر سروس کے نمائندے کی حیثیت سے لے جایا کرو گے۔ جواباً اگر اِسے بھی مجھے یا کسی دوسرے ساتھی کو کوئی پیغام دینا ہوا کرے گا تو وہ تحریری صورت میں ہی تمہیں دے دیا کرے گا۔ تم وہ بھی مطلوبہ شخص تک پہنچا دیا کرنا اور فارغ ہوتے ہی ٹیلی فون کے قریب موجود رہا کرنا۔ کل دوپہر تک تم کسی بھی کوریئر سروس کا یونیفارم تیار کرلو۔ یہ کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ جتنے بھی رنگوں کی پینٹ شرٹ یہ کمپنیاں استعمال کر رہی ہیں وہ عام استعمال کے رنگ ہیں۔ شاید تمہارے کپڑوں میں اس طرح کی کوئی نہ کوئی پینٹ شرٹ موجود ہو۔ بس جیب پر ٹریڈ مارک کی کڑھائی کرالینا اور اسکوٹر پر ٹریڈ مارک پینٹ کرالینا۔"

"اگر میں اس کمپنی والوں کی نظر میں آگیا۔ اور کسی نے مجھے پکڑ لیا تو؟" اس نے خوف زدہ سے لہجے میں پوچھا لیکن نہ جانے کیوں میں نے محسوس کیا کہ وہ درحقیقت ایسا خوف زدہ نہیں تھا۔ محض احتیاطاً پوچھ رہا تھا۔

"فکر مت کرو۔ کوئی تمہاری طرف توجہ نہیں دے گا۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی بھی تو میں تمہیں چھڑا لوں گا۔ چند باتوں کا خیال رکھنا۔ تمہارا انداز واقعی کوریئر سروس کے ملازم جیسا ہونا چاہیے۔ اگر تم نے اپنے انداز میں پُراسراریت پیدا کرنے کی کوشش کی تو مارے جاؤ گے۔ جاسوسیت کا خبط ذہن سے نکال دینا۔ اگر تم نے جاسوس بننے کی کوشش کی تو فوراً کسی کی نظر میں آجاؤ گے۔ بس یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ تم ایک سادہ لوح سے کوریئر ہو اور عام سی کاروباری یا نجی ڈاک اِدھر سے اُدھر لے جا رہے ہو۔ کینوس کا ایک تھیلا اور چند ردی لفافے' ایک آدھ پیکٹ وغیرہ بھی ساتھ رکھ لینا۔"

"آپ ذرا بھی تردد نہ کریں سر! آپ نے کبھی مجھے ایکشن میں تو دیکھا ہی نہیں ہے۔ آپ کو نہیں معلوم کہ جب میں کوئی کام کرنے کی ٹھان لیتا ہوں تو اسے کتنے عمدہ طریقے سے انجام دیتا ہوں۔" وہ آنکھیں گھماتے ہوئے بولا۔

"وہ تو میں دیکھ چکا ہوں' کیسی عمدگی سے تم میری نگرانی کر رہے تھے اور کیسی عمدگی سے میرے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔" میں نے ذرا خشک لہجے میں کہا۔

"آپ کے آدمیوں والی بات اور ہے سر! یہ بڑے غیر معمولی لوگ ہیں ورنہ میں آسانی سے ہتھے چڑھنے والی چیز نہیں ہوں۔"

"لیکن جن لوگوں سے تمہیں آئندہ واسطہ پڑ سکتا ہے وہ ان سے بھی کہیں زیادہ غیر معمولی ہیں۔ بلکہ انہیں تو تم کسی حد تک مافوق الفطرت ہی سمجھو۔ میں تمہیں کسی غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا۔ اس کام میں کسی معمولی سی غلطی سے تمہاری جان بھی جا سکتی ہے۔"

"جان کی کوئی بات نہیں سر! جان تو کبھی راہ چلتے محض ٹھوکر لگ کر گرنے سے بھی جا سکتی ہے۔ اگر کسی اچھے کام میں چلی گئی تو اس سے اچھی کیا بات ہے۔" وہ آنکھیں پٹ پٹاتے ہوئے بولا۔

"یقین نہیں آتا کہ تم واقعی ان بڑی بڑی باتوں کا شعور رکھتے ہو۔" میں نے اسے گھورا۔

"سر! میں دنیا پر یہی تو ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ میں بڑی بڑی باتوں کا شعور رکھتا ہوں۔ بڑے بڑے کام کر سکتا ہوں۔ لیکن کوئی مجھے موقع ہی نہیں دیتا۔ آپ جیسے بڑے آدمی کے زیرِ سایہ رہ کر شاید میں بھی بڑا آدمی بن جاؤں۔"

"بڑا آدمی!" میں کراہنے کے سے انداز میں ہنس دیا "تم مجھے بڑا آدمی سمجھتے ہو' یہ بات بھی کسی لطیفے سے کم نہیں۔ آج کل تو تمہارا یہ بڑا آدمی گھن چکر بنا ہوا ہے۔ اس کے زیرِ سایہ آکر تم بھی گھن چکر بن سکتے ہو۔"

"مجھے یہ بھی قبول ہے سر! انسان کچھ نہ کچھ تو بنے۔ حرکت میں تو آئے۔ بیل پر لٹکی ہوئی کسی توری یا لوکی جیسی غیر اہم زندگی گزار کر تو نہ مر جائے۔"

"کوشش کرنا کہ اس کام کے دوران کسی کے ہتھے نہ چڑھو۔ تمہاری پیغام رسانی پر ایک اہم مشن کا دارومدار ہو گا۔ اور خدا کے لیے نقلی موچھیں' نقلی داڑھی یا اس قسم کی کوئی اور چیز استعمال نہ کرنا۔ قدرت نے تمہیں ویسے ہی بہت عمدہ گیٹ اپ سے نوازا ہوا ہے۔ اور وہ ہے تمہارے چہرے پر برستی ہوئی حماقت۔"

یکدم ہی وہ بالکل مختلف انداز میں مسکرایا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا جیسے اس کے چہرے سے حماقت کا ہر نقشِ مٹ گیا ہو۔ اس کی آنکھیں مجھے کسی انتہائی ذہین انسان کی آنکھیں نظر آئیں۔ لیکن یہ سب کچھ جیسے محض ایک ثانیے کے لیے تھا۔ جیسے بادلوں کے عقب میں بجلی کوندے اور معدوم ہو جائے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے چہرے پر وہی حماقتوں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

وہ کسی گاؤدی ہی کی طرح اپنے لہجے کو دانشمندانہ بنا[illegible] کوشش کرتے ہوئے بولا "نقلی داڑھی موچھیں وغیرہ بھی [illegible] سمجھ کر ہی استعمال کرتا ہوں سر! اس کا بھی کوئی مقصد [illegible] مقصد عام طور پر پورا ہو جاتا ہے۔ اپنے کام کر[illegible] اسٹائل ہے۔ لیکن آپ جو کام بتا رہے ہیں اسے میں آپ ہی کی ہدایات کے مطابق انجام دوں گا۔ آپ دیکھ لیجئے گا۔ آپ کو مایوسی نہیں ہو گی۔"

اس کی تمام تر حماقت مآبی کے باوجود واقعی میں پیغام رسانی کا کام اس کے سپرد کر کے بڑی طمانیت محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں نے اسے کچھ ضروری کوڈ ورڈز بھی سمجھا دیے۔ ان کے بارے میں' میں نے آزمائشی طور پر اس سے سوالات کیے تو اس نے بالکل صحیح جواب دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کوڑھ مغز نہیں تھا۔

سب کچھ سمجھانے کے بعد میں نے کہا "ایک بات کا اور خیال رکھنا۔ ہمارے درمیان یہ ملاقات تو ہو گئی ہے لیکن آئندہ میرے اور تمہارے درمیان کوئی تعلق ظاہر نہ ہونے پائے جب تک میں خود پیغام نہ دوں' مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کرنا۔ فون پر تو بات ہوتی ہی رہے گی۔ لیکن مجھے یہاں ہوٹل میں فون نہ کرنا۔"

وہ اثبات میں سر ہلانے لگا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "اب تم جا سکتے ہو۔"

وہ پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے دردناک لہجے میں بولا "سر! یہ کوئی انصاف کی بات تو نہیں ہے۔ آج شام ورہنوں پہلوانوں نے آپ کے دسترخوان پر بیٹھ کر چرغوں کا ایک پہاڑ صاف کر دیا' سویٹ ڈشیں اور نہ جانے کیا کیا اُڑا ڈالا اور ہم جیسے غریب غربا کو آپ پانی کے گلاس کے لیے بھی نہیں پوچھ رہے۔ میں نے تو آپ کو آئیڈیل بنایا ہے لیکن آپ کی اس رکھائی کے باعث میرے ذہن میں آئیڈیل کا یہ بُت بری طرح لرزنے لگا ہے۔"

"اسے لرزنے دو' بلکہ ناک کے بل گر کر پاش پاش ہو جانے دو۔"

"سر! میں تو آپ کو اپنی عظیم تہذیبی روایات کا امین سمجھا تھا جن کے مطابق گھر آئے مہمان کو کچھ کھلائے بغیر رخصت نہیں کیا جاتا۔" وہ کراہا۔

"میں امین نہیں افضل ہوں۔ افضل چوہدری۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "اب فوراً اٹھ جاؤ۔"

"سر! آپ کی یہ حرکت آپ کو افضل نہیں رہنے دے گی اور آپ چوہدری کے بجائے کوئی فاقہ کش مزارع دکھائی دینے لگیں گے۔" اس نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا "قسم سے بڑی بھوک لگی ہے۔ صبح سے خالی پیٹ بیگار پر لگا ہوا ہوں۔"

میں گھونسا تان کر اس کی طرف بڑھا تو وہ اُچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی عینک گرتے گرتے بچی۔ تب مجھے اس کی صورت دیکھ کر ہنسی آگئی۔ وہ سوکھے سے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے جلدی سے بولا "مجھے معلوم تھا آپ مذاق کر رہے ہیں۔"

"ہاں لیکن میں نہیں چاہتا کہ تم اب زیادہ دیر کمرے میں ٹھہرو۔ نیچے ڈائننگ ہال میں فون کر دیتا ہوں۔ وہاں بیٹھ کر جو دل چاہے کھا کر لو۔ لیکن [illegible] رخصت ہوتے وقت محتاط رہنا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ واپسی میں بھی پائپ کے راستے اُترنے کی کوشش کرو۔"

"ہرگز نہیں سر! میرا آنے اور جانے کا راستہ ہمیشہ مختلف ہوتا ہے۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "ڈائننگ ہال میں فون ضرور کر دیجئے گا۔ میں پرس گھر بھول آیا ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈٹ کر کھانے پینے کے بعد شہر کی معزز اور خوب صورت خواتین بادولت کی رسوائی کا تماشا دیکھیں۔"

اس نے دروازہ کھول کر اپنے مخصوص احمقانہ انداز میں باہر جھانکا اور دائیں بائیں دیکھنے کے بعد لنگور کی طرح چھلانگ لگا کر غائب ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے ڈائننگ ہال میں فون کر کے ہیڈ ویٹر کو اس کے بارے میں ہدایات دیں۔ پھر چند منٹ بعد اسلام آباد' حفیظ صاحب کی سرکاری رہائش گاہ سے رابطہ قائم کیا۔ حفیظ صاحب گھر پر موجود تھے لیکن ایک صاحب نے میرے بارے میں اچھی طرح پوچھ گچھ کرنے کے بعد اور چند منٹ انتظار کرنے کے بعد ان سے لائن ملائی۔

جب وہ بولے تو مجھے ان کے لہجے میں گرم جوشی کی کمی محسوس ہوئی۔ تاہم انہوں نے خاصی خوش خلقی سے میری خیر و عافیت دریافت کی۔ رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے کہا "سنا ہے انتیس تاریخ کو آپ امریکا کے اہم دورے پر روانہ ہو رہے ہیں؟"

وہ گویا ذرا چونک کر بولے "تمہیں کیسے پتا چلا؟ ابھی اس سلسلے میں' پریس میں تو کوئی خبر نہیں آئی۔"

"ہمارے بھی کچھ ذرائع ہیں سر!" میں نے خواہ مخواہ انہیں ذرا تجسس میں مبتلا کرنے کے لیے کہا۔

انہوں نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ کسی سوچ میں پڑ گئے تھے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "سر! اس دورے پر روانہ ہونے سے پہلے آپ لاہور آئیں گے نا؟"

"ہاں" وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولے "مجھے روانہ کراچی سے ہونا ہے۔ دو دن پہلے میں لاہور آجاؤں گا' پہلے میرا جلدی جانے کا پروگرام تھا لیکن میرا دورہ کچھ آگے چلا گیا ہے۔"

"سر! مجھے لاہور میں آپ سے ملاقات کے لیے وقت چاہیے۔ میں آپ کو ایک بہت اہم آدمی سے ملوانا چاہتا ہوں۔ ملاقات کے لیے وقت بھی مجھے کچھ زیادہ درکار ہو گا۔ دوڑتے بھاگتے ملاقات نہیں ہونی چاہیے۔" میں نے درخواست کی۔

"کون ہے وہ شخص؟ کس سلسلے میں اسے مجھ سے ملوانا چاہتے ہو؟"

"یہ سب کچھ تو میں آپ کو ملاقات کے دوران ہی بتاؤں گا۔ فون پر یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں معلوم ہے مجھ سے ملاقات کے کسی خواہش مند' کسی اجنبی کو پہلے اپنا نام دینا' ملاقات کی غرض وغیرہ بتانی پڑتی ہے۔ پھر

سیکیورٹی کے نکتۂ نظر سے اس کے بارے میں رسمی سی چھان بین کی جاتی ہے۔ تب ملاقات ہوتی ہے۔ اس شخص کے بارے میں کچھ تو معلوم ہونا چاہیے۔" وہ ملائمت سے بولے۔

"سر! جس طرح میں نذیر خاں کے ساتھ پہلی مرتبہ آپ سے ملاقات کے لیے حاضر ہوا تھا تو میرے بارے میں اس قسم کی کوئی رسمی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ اسی طرح اب یہ شخص میرے ساتھ آرہا ہے۔ میں تو اب آپ کے قریبی شناساؤں کی فہرست میں شامل ہوں۔ کیا اس شخص کا میرے ساتھ آنا کافی نہیں؟"

"کافی تو ہے... لیکن پھر بھی... کچھ تھوڑی بہت معلومات ہوجاتیں تو اچھا تھا۔" وہ غالباً کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ لیکن پھر یکدم ہی وہ گویا فیصلے پر پہنچ گئے "خیر ٹھیک ہے۔ تم آجانا۔ لیکن وقت وغیرہ کے بارے میں کل میرا پی اے یا سیکریٹری خود تمہیں فون کرکے بتادے گا۔ میری مصروفیات کا جائزہ لیتے ہوئے یہی لوگ مناسب وقت کا تعین کرسکتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں کل منتظر رہوں گا۔ بہت بہت شکریہ۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع ہوگیا۔

دوسرے روز میں آفس پہنچا ہی تھا کہ ایڈم کا فون آگیا۔

"حفیظ صاحب سے بات ہوئی؟" اس نے بھی بلا تمہید پوچھا۔

"یار! تم لوگ تو اس سلسلے میں اس شوہر سے بھی زیادہ بے چین ہو جس کی بیوی پہلے بچے کے سلسلے میں لیبر روم میں جاچکی ہو۔" میں نے قدرے بے زاری سے کہا۔

"یہی سمجھ لو" وہ سپاٹ سے لہجے میں بولا "دراصل ہم جس کام کے بارے میں طے کرچکے ہوتے ہیں کہ اسے فلاں روز، فلاں وقت پر، فلاں طریقے سے ہونا چاہیے اس کا ذرا بھی اِدھر اُدھر ہونا برداشت نہیں کرسکتے۔ ہم بھی کہیں جواب دہ ہیں۔"

"میرا خیال تھا کہ میرا کوئی بھی ٹیلی فون تم لوگوں کی دست بُرد سے محفوظ نہیں۔ اس لیے تمہیں معلوم ہوچکا ہوگا کہ کل رات میری حفیظ صاحب سے بات ہوئی ہے اور آج ان کا پی اے یا سیکریٹری مجھے اپائنٹمنٹ کے بارے میں اطلاع دے گا۔"

"ہمیں معلوم ہو بھی جائے تب بھی ہمارا تم سے پوچھنا ضروری ہوگا۔ جو کام جس طرح طے ہوچکا ہے اس پر اسی طرح عمل ہوگا۔" اس نے مبہم لہجے میں جواب دیا۔ اس نے اس بات کی تصدیق یا تردید نہیں کی کہ انہیں میرے ٹیلی فونوں پر ہونے والی باتوں کا علم ہوتا تھا یا نہیں؟

ایک لمحے کی توقف سے وہ بولا "ٹھیک ہے میں دوپہر تک تمہیں فون کروں گا۔ اس وقت تک حفیظ صاحب کے پی اے یا سیکریٹری کا فون آچکا ہوگا۔"

"اُمید تو یہی ہے۔ وہ بڑے پنکچوئل انسان ہیں۔ جو وعدہ کرلیتے ہیں اس پر عمل کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہمیں معلوم ہے۔" ایڈم ملائمت سے بولا "ہمیں ان کے بارے میں تم سے زیادہ معلومات ہیں۔" اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔ میں حفیظ صاحب کے بارے میں اس کے اس جملے پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کے تقریباً پون گھنٹے بعد اسلام آباد سے حفیظ صاحب کے پی اے کا فون آگیا۔ انہوں نے ستائیس تاریخ کی شام چھ سے آٹھ بجے تک کا وقت میرے لیے مخصوص کردیا تھا۔ یہ ملاقات لاہور میں ہی ان کے گھر پہ ہونا تھی۔

یہ پیغام ملتے ہی میں آفس سے نکل کھڑا ہوا۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں کسی پی سی او کی تلاش میں نکلا تو اندازہ ہوا کہ کوئی مناسب پبلک ٹیلی فون تلاش کرنا اور کسی کی توجہ مبذول کرائے بغیر اس پر بات کرنا کتنا مشکل کام تھا۔

بہرحال کافی دور جاکر ایک مناسب فون میسر آیا تو میں نے وسیم کے آفس کا نمبر ڈائل کیا۔ وہ آفس میں موجود تھا اور گویا منتظر ہی بیٹھا تھا۔ پہلی گھنٹی پر ہی اس نے فون اٹھالیا۔

"یونیفارم کا بندوبست کرلیا؟" میں نے پوچھا۔

"جی سر! وہ تو کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس وقت میں یونیفارم میں ہی بیٹھا ہوں۔ سب تیاریاں مکمل ہیں۔ گاڑی چھوڑ کر میں نے اپنا اسکوٹر بھی نکال لیا ہے۔ لیکن ابا بڑے پریشان ہے۔" وہ مستعدی سے بولا۔

"انہیں پریشان ہی رہنے دو۔ بے چارے اباؤں کے مقدر میں اسی دن سے پریشانیاں لکھ دی جاتی ہیں جس دن وہ ابا بنتے ہیں۔"

"خیر اتنے پریشان بھی نہیں ہیں۔ میں نے انہیں گولی دے دی ہے۔ میں بہت چالاک ہوں۔"

"پیغام نوٹ کرو چالاک آدمی!" میں نے کہا اور راحیلہ کے نام پیغام لکھوانے کے بعد ایڈریس بھی سمجھایا۔ پیغام کے بعض جملے عام فہم ہونے کے باوجود درحقیقت کوڈ ورڈز میں تھے اور کچھ جملوں کا مطلب وہی تھا جو بظاہر ہونا چاہیے تھا۔ یہ زیادہ کنفیوژ کرنے والی ٹیکنک تھی۔ میں نے راحیلہ کے لیے یہ بھی لکھوادیا تھا کہ وہ بھی چاہے تو وسیم سے پیغام رسانی کے سلسلے میں کام لے سکتی ہے۔

فون کرکے واپس آتے وقت میں نے فیصلہ کیا کہ ہر بار مختلف فون استعمال کیا کروں گا۔ کبھی کسی ہوٹل یا ریستوران سے، کبھی کسی دوست کے آفس سے اور کبھی پبلک فون کے ذریعے وسیم سے رابطہ قائم کیا کروں گا۔ وسیم کے گھر اور دفتر کے فون کے بارے میں مجھے اُمید تھی کہ وہ ابھی محفوظ تھے، تاہم یہ سلسلہ زیادہ دن نہیں چلایا جاسکتا تھا۔ زیادہ دن کے لیے مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

مجھے آفس میں واپس آئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ ایڈم کا دوبارہ فون آگیا۔

"مبارک ہو" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "حفیظ

صاحب سے ملاقات طے ہوگئی ہے" میں نے اسے تاریخ اور وقت بتایا۔

اس نے شاید یہ سُن کر اطمینان کی سانس لی اور کہا "ٹھیک ہے ستائیس تاریخ کو ٹھیک پانچ بجے عرفان تمہارے پاس اسی ہوٹل میں پہنچ جائے گا۔ جہاں آج کل تم ٹھہرے ہوئے ہو۔ تم وہیں موجود رہنا۔ وہ کس حلیے میں ہوگا یہ تمہیں بعد میں بتادیا جائے گا۔ یہ یاد دلانے کی تو غالباً ضرورت نہیں کہ اس سلسلے میں تمہاری طرف سے کسی بھی قسم کی غیر ذمّے داری کا مظاہرہ تمہارے لیے خطرناک ثابت ہوگا۔ ہم اس سارے عمل کے دوران کسی خفیہ ایجنسی کے آدمی، تمہارے کسی ساتھی یا کسی بھی اور شخص کی صورت دیکھنا نہیں چاہتے۔ تم یہی سمجھنا کہ کوئی غیبی آنکھ ہر لمحے تمہیں دیکھ رہی ہوگی۔"

"یہ ہدایات میں ذہن نشین کرچکا ہوں حضور والا!" میں نے کہا۔

"لیکن تمہارا لہجہ اس بات کی گواہی نہیں دیتا۔" ایڈم نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"ایسے لہجے میں بات کرنا میری عادت ہے۔" میں نے جواب دیا "ویسے بھی تمہیں لہجے پر تو جانا ہی نہیں چاہیے۔ تمہیں معلوم ہی ہے میں یہ کام خوشی سے نہیں، محض مجبوراً کررہا ہوں۔ ایک مجبور آدمی اپنے لہجے میں شہد تو نہیں گھول سکتا۔"

بات شاید ایڈم کے دل کو لگی۔ نسبتاً خوشگوار لہجے میں بولا "ہاں یہ تو درست ہے۔"

"میں اب بھی وہی افضل چوہدری ہوں جو پہلے تھا۔ اور اب بھی تم لوگوں پر اتنی ہی لعنتیں بھیجتا ہوں جتنی پہلے بھیجتا تھا۔ میں خواہ مخواہ جھوٹ بولنا ضروری نہیں سمجھتا۔ میرا دل اب تمہاری محبت میں سرشار تو نہیں ہوگیا ہے۔ بس یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ بعض کام انسان کو نہ چاہتے ہوئے بھی دل پر جبر کرکے کرنا پڑتے ہیں۔ سو میں بھی کررہا ہوں اور دعاگو ہوں کہ اس کے بعد اگر اس ملک کی نہیں، تو کم از کم میری تو تم سے جان چھوٹ جائے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"چھوٹ جائے گی، چھوٹ جائے گی۔" وہ ہلکا سا قہقہہ لگا کر مربیانہ انداز میں بولا۔

میں نے اپنے لہجے سے جس بے بسی کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی وہ گویا اس سے محظوظ ہورہا تھا۔

"ستائیس تاریخ کو شام پانچ بجے میں منتظر رہوں گا۔" میں نے کہا۔

"باقی تمام ہدایات تو تمہیں یاد ہی ہوں گی؟" ایڈی نے تصدیق کی۔

"یاد ہیں" میں نے بے زاری سے کہا اور اس نے سلسلہ منقطع کرلیا۔

اس کے بعد گویا ایک نادیدہ سی مشین حرکت میں آگئی۔ وسیم اس مشین کے اہم پرزے کا کردار ادا کررہا تھا۔ میں سب کچھ دیکھ نہیں رہا تھا لیکن مجھے اڑتی اڑتی سی اطلاعات مل رہی تھیں کہ راحیلہ کچھ تیاریاں کررہی تھی۔ ہمارے پاس چار دن تھے اور ڈائریکٹ رابطہ نہ ہونے کی وجہ سے ہمارا کام کچھ دشوار ہوچکا تھا۔ ان چار دنوں میں اگر کسی کو یہ شک نہ ہونے پاتا کہ وسیم درحقیقت کون تھا اور کیا کام انجام دے رہا تھا تب بھی غنیمت تھا۔ اس صورت میں راحیلہ کی تدبیروں کی کامیابی کی اُمید رکھی جاسکتی تھی۔

اس دوران میں نے اپنے ایک ساتھی صفدر سے رابطہ قائم کرکے اسے الگ سے کچھ خصوصی ہدایات بھی دی تھیں۔ صفدر کی مجھے بھی خاص طور پر ضرورت پڑ سکتی تھی۔ ستائیس تاریخ تک کوئی خاص قابلِ ذکر واقعہ پیش نہ آیا۔ اس دوران ایڈم نے دو مرتبہ فون کرکے پوچھا کہ پروگرام میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی تھی۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔

ستائیس تاریخ کو احتیاطاً میں نے خود بھی حفیظ صاحب کو لاہور والے گھر فون کرکے تصدیق کرلی کہ میرا اپائنٹمنٹ برقرار تھا گو کہ مجھے امید تھی کہ اگر ملاقات منسوخ ہوجاتی تو حفیظ صاحب کے اسٹاف میں سے کوئی نہ کوئی مجھے ضرور مطلع کرتا۔ لیکن ریڈ ڈاٹ ہی کی طرح میں بھی احتیاط برت رہا تھا۔ مجھے پتا چلا کہ حفیظ صاحب لاہور پہنچ چکے تھے وہ آرام کررہے تھے اور میرا ان سے اپائنٹمنٹ برقرار تھا۔

اس روز میری حفاظت کے لیے آس پاس موجود رہنے والے ساتھی غائب ہوچکے تھے۔ میں معمول کے مطابق دفتر گیا تھا لیکن جلدی واپس آگیا تھا۔ ٹھیک ساڑھے چار بجے ایڈی کا ہوٹل میں فون آیا "عرفان مقررہ وقت پر پہنچ جائے گا تم تیار رہنا۔"

"اگر حضور کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں ہار گلدستے لے کر نیچے کھڑا ہوجاؤں؟" میں نے زہریلے لہجے میں پوچھا۔

"نہیں، تمہیں نیچے آنے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود ہی تمہارے کمرے میں پہنچ جائے گا۔" ایڈی نے سخت سے لہجے میں ہدایت کی۔ غالباً وہ نہیں چاہتے تھے کہ میں دیکھوں، عرفان کس طرف سے، کیسے اور کس گاڑی میں آرہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "ہم نے ہوٹل اور اردگرد کا علاقہ چیک کرالیا ہے۔ معلوم تو یہی ہوتا ہے کہ وہاں کسی خفیہ ایجنسی کا آدمی یا کوئی مشکوک شخص موجود نہیں ہے لیکن احتیاطاً ہم ایک بار پھر تم سے تصدیق کررہے ہیں کہ تم نے رازداری کا وعدہ یاد رکھا ہے نا؟"

"میں نے اس قسم کے کسی شخص سے اس بات کا ذکر نہیں کیا۔" میں نے سچ بولا۔

"ٹھیک ہے" وہ طمانیت سے بولا "تم اپنے کمرے میں رہنا۔ ٹھیک پانچ بجے عرفان تمہارے پاس پہنچ جائے گا۔" اس نے سلسلہ

منقطع کردیا۔

میں کمرے میں موجود رہا لیکن پانچ بج کر پانچ منٹ تک بھی عرفان نہیں پہنچا۔ پانچ منٹ کر دس منٹ پر فون کی گھنٹی بجی دوسری طرف وہی منحوس ایڈی تھا۔

"تم انتظار کر رہے ہوگے۔" وہ اطمینان سے بولا "پروگرام میں ذرا تبدیلی ہوگئی تھی۔ ویسے بھی ہم نے سوچا ابھی وقت تو خاصا باقی ہے۔ تمہارے ہوٹل سے حفیظ صاحب کے گھر تک کا فاصلہ بھی زیادہ نہیں ہے۔ اب تم ذرا زحمت کرو۔ کمرے سے نکل کر نیچے آجاؤ اور گاڑی میں بیٹھ کر ایرپال کی طرف چل پڑو۔ تمہارے ہوٹل سے ذرا ہی آگے سڑک کے کنارے تمہیں عرفان کھڑا نظر آجائے گا۔ وہ آسمانی رنگ کے سوٹ میں ہوگا۔ سر پر سیاہ فیلٹ ہیٹ اور آنکھوں پر ذرا گہرے رنگ کے شیشوں کا چشمہ ہوگا۔ وہ خود بھی تمہاری گاڑی دیکھ کر پہچان لے گا اور رکنے کا اشارہ کرے گا۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ محض احتیاطاً انہوں نے آخری لمحے پر یہ تبدیلی کی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اتنے نڈر، بے خوف اور بے پرواہ وہ بھی نہیں تھے جتنا اپنے آپ کو ظاہر کرتے تھے کہیں نہ کہیں کوئی خوف تو موجود تھا تبھی وہ بھی ہر ممکن احتیاط کرتے تھے۔

"ٹھیک ہے میں روانہ ہو رہا ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھنے ہی لگا تھا کہ وہ بولا "ایک بات کا خیال رکھنا۔ اگر راستے میں سے بھی کسی گاڑی وغیرہ نے تمہارا تعاقب شروع کردیا تو بات وہیں ختم ہوجائے گی۔ اس کے بعد تمہاری زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہوگی۔"

"کسی کی بھی زندگی کی کوئی ضمانت نہیں ہے پیارے ایڈی!" میں نے کہا اور ساتھ ہی ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا "میں نے تو کسی کو اس قسم کی کوئی ہدایت نہیں کی۔ اب اگر کوئی عرفان کے حسن و جمال سے متاثر ہو کر اس کا تعاقب شروع کردے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔"

"میں ایک بار پھر تمہیں بتا رہا ہوں۔ اس معاملے میں مذاق کی گنجائش نہیں ہے۔ افضل چوہدری!" ایڈی گہری سنجیدگی سے بولا۔

"میں عادت سے مجبور ہوں ایڈی ڈیئر! گنجائش ہو یا نہ ہو، میں خود گنجائش نکال لیتا ہوں۔" میں نے کہا اور ریسیور رکھ کر ایک لمحے کے لیے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ میرا چہرہ بظاہر اب بھی پُرسکون ہی تھا۔ لیکن میری رگ و پے میں ہلکا سا ارتعاش تھا۔ میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ حفیظ صاحب کی نجی رہائش پر بھی سیکیورٹی وغیرہ کی غرض سے مختصر سا اسٹاف تعینات رہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا، میں یا عرفان کوئی ہتھیار لے کر اندر نہیں جاسکیں گے۔ اس لیے کچھ ساتھ رکھنا فضول تھا۔

نیچے آکر میں نے گاڑی نکالی۔ گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور سست رفتاری سے روانہ ہوگیا۔ ہوٹل سے بہ مشکل سو گز کے فاصلے پر ایک درخت کے قریب کھڑا عرفان مجھے فوراً ہی نظر آگیا۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا فیلٹ ہیٹ اور تاریک چشمے کے علاوہ اس کے چہرے پر خاصی گھنی مونچھوں کا اضافہ بھی نظر آرہا تھا۔

ان چند چیزوں نے واقعی اس کی شکل صورت بدل دی تھی۔ مجھے معلوم تھا ان چیزوں کے ہٹتے ہی وہ حفیظ صاحب دکھائی دینے لگے گا۔ لیکن وہ بھی مکمل طور پر اس کی اصل صورت نہیں تھی۔ ان سارے چکروں میں اس کی اصل شکل نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھی۔

وہ مہذبانہ انداز میں لفٹ کے لیے اشارہ کر رہا تھا۔ میں نے گاڑی اس کے قریب لے جا کر روکی۔ سڑک پر ٹریفک معمول کے مطابق رواں تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سڑک کے کنارے کھڑا ہوا یہ مہذب اور خوش پوش شخص ہمارے وزیرِ خارجہ کی جگہ لینے جا رہا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھ چکا اور گاڑی ذرا رفتار پکڑ چکی تو میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہارے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں؟ ہتھیار کی موجودگی تمہیں وہاں مشکوک بنا سکتی ہے۔"

وہ دھیرے سے ہنسا "ہم اتنے احمق نہیں ہیں مسٹر چوہدری! ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کون سا کام کیسے کرنا چاہیے۔ ہم مستقبل قریب میں دنیا کا نظام سنبھالنے والے ہیں۔ میرے پاس اس وقت پنسل تراش تک موجود نہیں ہے۔"

"دنیا کا نظام سنبھالنے کے سلسلے میں میری طرف سے پیشگی مبارک باد قبول کرو۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ وہ ہم کے صیغے میں بات کر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اپنے آپ کو ریڈ ڈاٹ ہی کا حصہ سمجھتا تھا اور دنیا پر حکمرانی کے پروگرام میں اس کے اپنے نہ جانے کتنے خواب شامل تھے۔ میرے لیے یہ جاننا بھی مشکل تھا کہ وہ پاکستانی تھا یا کسی اور ایشیائی ملک کا باشندہ؟ معلوم نہیں وہ مسلمان بھی تھا یا نہیں؟ بہرحال ریڈ ڈاٹ کے قریبی اور خاص لوگوں میں وہ مجھے پہلا شخص دکھائی دیا تھا جو اپنا ہی بھائی بند معلوم ہوتا تھا۔

وہ جیب سے شیشے کی ایک ننھی سے تھرمامیٹر نما ٹیوب اور نیلے رنگ کا ایک شفاف کیمیکل نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "یہ دونوں چیزیں آپ اپنی جیب میں رکھ لیں مسٹر چوہدری! ان کے استعمال کا طریقہ آپ کو سمجھا دیا گیا تھا۔ پھر بھی اگر آپ کوئی بات پوچھنا چاہیں تو مجھ سے پوچھ سکتے ہیں۔"

"میں آپ سے جو بات پوچھنا چاہتا ہوں وہ فحاشی کے زمرے میں آسکتی ہے۔ اس لیے رہنے دیں۔" میں نے وہ دونوں چیزیں لے کر جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"بعض اوقات مجھے حیرت ہوتی ہے کہ اس دنیا میں آپ جیسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو موقع محل دیکھے بغیر مذاق کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ بھی بھونڈا۔" اس کے لہجے میں ناگواری تھی۔

"ہاں حیرت تو ہونی چاہیے۔" میں نے سر ہلایا "کیونکہ بعض لوگوں میں موقع محل دیکھ کر بھی مذاق کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ خیر...... چھوڑیئے اس بات کو۔ میں یہ کہنے لگا تھا کہ اگر حفیظ صاحب کے ہاں سیکیورٹی والوں نے یہ دونوں چیزیں مشکوک سمجھ کر نکال کر رکھ لیں اور ہم سے کہہ دیا کہ واپسی پر لے لیجیے گا۔ تو اس کی ذمے داری مجھ پر نہیں ہوگی۔"

"ہم نے آپ کا انتخاب بلاوجہ نہیں کیا مسٹر چوہدری!" وہ مربیانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "ہمیں معلوم ہے آپ کی تلاشی نہیں ہوتی۔ اگر ہوتی بھی ہے تو نہایت سرسری قسم کی۔ صرف اس نکتۂ نظر سے چیک کیا جائے گا کہ کوئی ہتھیار پاس نہ ہو۔ یہ تو بے ضرر سی چیزیں ہیں۔ انہیں آپ اپنی دوا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اول تو ان کی موجودگی کو کوئی محسوس ہی نہیں کرے گا۔ بشرطیکہ..."

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ پھر اس کی مسکراہٹ معنی خیز سی ہوگئی "بشرطیکہ آپ نے انہیں ان چیزوں کے بارے میں خبردار نہ کر رکھا ہو۔"

"تم لوگوں کو مرتے دم تک مجھ پر اعتبار نہیں آئے گا۔" میں نے تاسف زدہ لہجے میں کہا۔

"تم اپنے آپ کو ناقابلِ اعتبار ثابت کرچکے ہو۔ ویسے بھی تمہاری فطرت کچھ ایسی ہے کہ کم از کم ہم تمہارے بارے میں اب بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔" وہ بولا۔

"میرے بارے میں تو خود میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

آخرکار ہم ماڈل ٹاؤن میں داخل ہوئے۔ عرفان اب بالکل خاموش تھا۔ میں نے گاڑی حفیظ صاحب کے گھر کی طرف جانے والی سڑک پر موڑی تو پھٹے پرانے سیاہ برقعے والی ایک بھکارن سڑک عبور کرتے ہوئے گاڑی کے سامنے آگئی۔ میں نے بروقت بریک نہ لگائی ہوتی تو شاید ہلکا پھلکا ایکسیڈنٹ ہی ہوجاتا۔

بھکارن کی گود میں چھوٹا سا ایک بچہ تھا۔ جس کا ناک منہ لتھڑا ہوا تھا اور تن پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ وہ مسلسل اوں اوں کر رہا تھا۔ میلے کچیلے، پیوند زدہ اور بوسیدہ برقع والی بھکارن کو گویا اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ گاڑی سے ٹکرا بھی سکتی تھی۔ وہ گاڑی رکتے دیکھ کر فوراً اپنے ٹوٹے چپل گھسیٹتی، کھسر کھسر کرتی میری طرف کی کھڑکی پر آگئی۔

"اللہ کے نام پر بابو جی...! کچھ بیوہ محتاج کو بھی دیتے جاؤ۔ شالا جوانیاں مانیں۔ اللہ تینوں ترقیاں ای ترقیاں دیوے۔" وہ ہاتھ پھیلاتے ہوئے منمنائی۔

اس کا ہاتھ بھی میلا کچیلا تھا۔ اس پر سیاہ سے دھبے تھے جو میل کے معلوم نہیں ہوتے تھے اور ان دھبوں کے نیچے اس کی سفید جلد کی خوب صورتی چھپ نہیں پا رہی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا تو اس نے عرفان کی نظر بچا کر باریک نقاب کی اوٹ سے مجھے آنکھ ماری۔ عرفان ویسے بھی اس کی طرف نہیں، سامنے دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ منزل پر پہنچنے کے لیے بے تاب تھا یا اپنے خیالوں میں الجھا ہوا تھا۔ ویسے بھی بھیک مانگنے والے ہماری سڑکوں پر نظر آنے والے لوازمات میں شامل تھے۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میں نے جیب سے پرس نکالتے ہوئے اسے ڈانٹا "تم لوگوں کو جان کی پروا نہیں ہوتی۔ بس ہاتھ پھیلانے کی فکر لگی رہتی ہے۔ اپنا نہیں تو اپنے اس بچے کا ہی خیال کرو۔"

میں نے ایک نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ وہ نہایت روانی اور فراٹے سے دعائیں دینے لگی "تمہارے بیوی بچے جیتے رہیں۔ اللہ لمبی حیاتی دیوے۔ کاروبار میں ترقی ہووے۔"

اگر عرفان میرے ساتھ نہ ہوتا تو بیوی بچوں والی بات پر میں راحیلہ کو ایک ہاتھ رسید کردیتا۔ نوٹ لیتے ہوئے اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک طرف اشارہ کیا۔ ادھر تین چار آدمی فٹ پاتھ کے کنارے پر رنگ کر رہے تھے۔ انہوں نے شاید فٹ پاتھ کی مرمت بھی کی تھی۔ ان کے آس پاس متعلقہ سامان بکھرا ہوا تھا۔ ایک ڈرم اور ہاتھ گاڑی بھی تھی جس پر ترپال پڑی ہوئی تھی۔

وہ پبلک سروس سے تعلق رکھنے والے کسی محکمے کے آدمی ہی معلوم ہوتے تھے۔ اور انہی جیسے کاہلی آمیز انداز میں نیم بے زاری سے کام کر رہے تھے لیکن ان میں سے ایک جب ذرا گھوما تو تمام تر بدلے ہوئے حلیے کے باوجود میں نے پہچان لیا۔ وہ ہمارا ساتھی احمد تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باقی بھی یقیناً ہمارے ہی ساتھی تھے۔ ہاتھ گاڑی اور ڈرم میں یقیناً آٹومیٹک ہتھیار ہوں گے۔

بھکارن لنگڑاتی ہوئی ایک طرف کو چل دی۔ میں اسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ راحیلہ نے بھکارن کا بہروپ نہایت ہی عمدگی سے بھرا تھا۔ بچہ بھی شاید کسی بھکارن سے کرائے پر لے لیا تھا۔ معلوم نہیں لنگڑاہٹ بھی اس کے بہروپ کا حصہ تھی یا اس کے بھکارنوں والے لباس میں بھی کوئی گن وغیرہ چھپی ہوئی تھی جس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ حفیظ صاحب کے گھر سے ذرا پہلے سڑک کے کنارے ایک درخت کے نیچے ایک پھل والا اپنے

ٹیلے سے کھیاں اڑاتا دکھائی دیا۔ وہ بڑی سی پگڑی باندھے ہوئے تھا اور اس کی دھوتی ٹخنوں سے اونچی تھی۔ میں اس کی طرف زیادہ توجہ سے تو نہیں دیکھ سکا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ ٹونی تھا۔

ان لوگوں نے جگہیں خاصی عمدہ منتخب کی تھیں۔ حفیظ صاحب کی طویل و عریض اور پرانی سی کوٹھی کارنر کی تھی۔ میرے ساتھی شاید پرلی سڑک پر بھی موجود تھے۔ انہوں نے یقیناً اس بات کا خیال رکھا تھا کہ فاصلہ ہونے کے باوجود کوٹھی پر ہر زاویے سے نظر رکھیں۔ اپنی سی کوشش تو وہ اچھی کر رہے تھے۔ آگے مقدر میں نہ جانے کیا لکھا تھا۔ فاصلے' کم وقت میں' اور رابطے کی تمام دشواریوں کے باوجود انہوں نے اچھے خاصے انتظامات کرلیے تھے۔

میں نے گاڑی حفیظ صاحب کی کوٹھی کے بلند' سیاہ گیٹ کے سامنے جا روکی۔ دو پولیس والے گیٹ سے باہر بھی تعینات تھے۔ انہوں نے ہمیں اُترنے کا اشارہ کیا' معذرت کے ساتھ ہماری ہلکی پھلکی سی تلاشی لی۔ گاڑی میں ادھر ادھر جھانک کر دیکھا۔ ڈکی کھلوا کر دیکھی اور ہمارے اپائنٹمنٹ کے بارے میں سن کر ہمارے لیے گیٹ کھول دیا۔

اندر بائیں ہاتھ پر لان کے قریب ہی ایک کمرے میں کچھ اور لوگ موجود تھے۔ ان میں سے ایک نے دوبارہ ہمیں ذرا اچھی طرح اوپر سے نیچے تک تھپتھپا کر دیکھا۔ ایک رجسٹر میں وقت دیکھا۔ دوسرے شخص نے نیلی فون پر اندر اطلاع دی اور چند منٹ بعد ہمیں اندر جانے کی اجازت دے دی۔

برآمدے میں ملیشیے کی شلوار قمیص' کلاہ اور کلف لگے طُرّے والا ایک شخص ہمارا منتظر تھا۔ وہ مودبانہ انداز میں ہمیں برآمدے میں ایک طرف کو لے چلا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ حفیظ صاحب کی کوٹھی میں ڈرائنگ روم سامنے کے بجائے پچھلی طرف تھا۔

وہ ایک طویل و عریض اور آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم تھا لیکن اس کی آرائش میں قدامت کا رنگ جھلکتا تھا۔ فرنیچر بھاری بھرکم اور وکٹورین اسٹائل کا تھا۔ دیواروں پر چند پورٹریٹس آویزاں تھیں وہ غالباً حفیظ صاحب کے بزرگوں کی تصاویر تھیں۔

عرفان میرے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی میں بولا "یہاں سیکیورٹی کا انتظام کوئی خاص نہیں ہے۔ تم حفیظ صاحب کو آسانی سے لے جاسکو گے۔"

"ہاں اُمید تو یہی ہے۔" میں نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔

اسی اثنا میں بٹلر اندر آیا اور پوچھنے لگا کہ ہم کیا پینا پسند کریں گے۔ ہم نے بے توجہی سے ٹھنڈے کی فرمائش کی۔ اس وقت کھانے پینے میں بھلا کس کا دھیان تھا۔

چند منٹ بعد حفیظ صاحب آن پہنچے۔ وہ گہرے رنگ کی شلوار قمیص میں تھے۔ اور نہایت تازہ دم نظر آرہے تھے۔ شاید آج کل ان کے دن آرام میں گزر رہے تھے۔ سگار حسب معمول ان کی انگلیوں میں دبا ہوا تھا۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ڈرائنگ روم میں کسی قسم کا ڈراما ان کا منتظر تھا۔

ہم ان کے استقبال کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے خاصی گرمجوشی سے ہم سے مصافحہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ عرفان کا انہوں نے گہری نظروں سے جائزہ لیا۔ اس کے حلیے میں اس وقت ویسے ہی انٹرنیشنل ڈرگ مافیا کے کسی نمائندے کی سی جھلک تھی لیکن میرا دل اس احساس سے دھڑک اُٹھا تھا کہ انہوں نے اس میں کہیں اپنی مشابہت تو تلاش نہیں کرلی تھی؟

لیکن جب وہ اطمینان سے بیٹھ گئے تو میں نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ فون پر گفتگو کے دوران مجھے ان کے لہجے میں گرمجوشی کی کمی محسوس ہوئی تھی لیکن اب وہ بولے تو ان کے لہجے میں گرمجوشی ہی نہیں اپنائیت اور بے تکلفی بھی تھی جس کا مظاہرہ وہ شاذونادر ہی کرتے تھے۔

"کیا خیال ہے برخوردار پُراسرار چوہدری؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "کیا اس بار بھی کوئی پُراسرار سی کہانی لے کر آئے ہو؟ یہ تمہارے ساتھ کون صاحب ہیں؟ یہ بھی خاصے پُراسرار دکھائی دے رہے ہیں۔"

"بس... کیا کروں حفیظ صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جس طرح بدقسمتی بعض لوگوں کا تعاقب کرتی ہے اس طرح پُراسراریت میرا تعاقب کرتی ہے۔ ویسے اسے پُراسراریت کہنا کچھ درست نہیں۔ میں نے تو پہلے بھی آپ کو حقائق بتائے تھے اور اب بھی ایک بہت بڑی حقیقت سے آگاہ کرنے آیا ہوں۔"

عرفان نے قدرے چونک کر میری طرف دیکھا۔ وہ میرے برابر بیٹھا تھا۔ بظاہر میں اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا لیکن میرا دھیان اسی کی طرف تھا۔ حفیظ صاحب کے چہرے پر بھی ان کی مخصوص سنجیدگی لوٹنے لگی۔

"کیسی حقیقت؟" انہوں نے ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"آپ بُرا نہ محسوس کریں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا امریکا کا دورہ کس سلسلے میں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نہیں بتا سکتا اور نہ ہی میں تم سے توقع رکھتا تھا کہ تم ایسا کوئی سوال کرو گے۔ اس قسم کے دوروں کے بارے میں' بعد میں ایک گول مول سا اعلامیہ جاری کردیا جاتا ہے اور ضروری سمجھا جائے تو کچھ باتیں بتادی جاتی ہیں۔"

"آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ مجھے تو معلوم ہے آپ اپنی دانست میں وہاں کیا کرنے جارہے ہیں۔ لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ آپ کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا ہونے والا ہے؟" وہ چونکے اور سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔

ان سے زیادہ عرفان چونکا۔ وہ سرسراتی سی آواز میں بولا "مسٹر چوہدری! آپ کے ارادے کیا ہیں؟ آپ جس کام کے لیے آئے ہیں وہ کریں۔"

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر سرد لہجے میں کہا "میں وہی کر رہا ہوں جس کے لیے میں آیا ہوں۔ لیکن تمہیں کیا معلوم کہ میں یہاں کس لیے آیا ہوں۔"

وہ بظاہر حفیظ صاحب ہی کی طرح شریف' مہذب اور بے ضرر سا شخص نظر آتا تھا لیکن اس وقت اس کے تاثرات یکسر بدل گئے۔ وہ کسی زہریلے سانپ کی طرح خطرناک دکھائی دینے لگا۔ پھنکارنے کے سے انداز میں بولا "مسٹر چوہدری! ہمیں ڈبل کراس کرنے کی کوشش مت کرو۔ اس کا نتیجہ تمہاری توقعات سے زیادہ خطرناک ہوگا۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" حفیظ صاحب متوحش سے لہجے میں بولے "آپ دونوں میں کس بات پر جھگڑا شروع ہوگیا؟" انہوں نے عرفان کو مخاطب کیا تھا لیکن عرفان کی توجہ میری طرف تھی۔ عینک کے قدرے تاریک شیشوں کے عقب میں اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھی تھیں۔

میں نے انہیں مخاطب کیا "اگر اس شخص کا فلیٹ ہیٹ' چشمہ اور یہ مونچھیں اتار دی جائیں تو یہ بالکل آپ کا عکس نظر آئے گا۔ اور یہ آپ ہی کی جگہ لینے آیا ہے۔"

"یہ کیا بکواس ہے؟" حفیظ صاحب حیرت اور غصّے سے بولے۔

عرفان یکدم اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا چہرہ غصّے سے لال بھبھوکا ہوگیا۔ وہ غضب ناک انداز میں غرایا "مسٹر چوہدری! تمہارا خیال ہوگا کہ میں اس وقت غیر مسلح اور تنہا ہوں۔ اس لیے تم آسانی سے اپنے کسی منصوبے پر عمل کرلو گے۔ میں تمہیں اب بھی موقع دے رہا ہوں۔ اب بھی وقت ہے۔ اصل منصوبے پر عمل کر ڈالو۔ یہ سب کے حق میں بہتر ہوگا ورنہ جو کچھ ہوگا اس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے۔"

"میں کشتیاں جلا چکا ہوں۔ مجبور بھی ہوں۔ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ میں خواب میں بھی نہیں کرسکتا۔" میں نے دیانتداری سے کہا پھر میں نے حفیظ صاحب کو مخاطب کرکے انتہائی تیزی اور اختصار سے ریڈ ڈاٹ کے منصوبے کے بارے میں بتایا۔

حفیظ صاحب اس دوران اپنی نشست سے اُٹھ کھڑے ہوئے تھے لیکن یہ سب کچھ سُن کر وہ دوبارہ تھکے تھکے سے انداز میں صوفے پر ڈھیر ہوگئے لیکن ساتھ ہی انہوں نے گھنٹی بجائی وہ اونچے طرّے والا لمبا تڑنگا شخص یکدم چراغ کے جن کی طرح نمودار ہوا۔ حفیظ صاحب نے اسے کوئی اشارہ کیا۔ وہ فوراً ہی غائب بھی ہوگیا۔

عرفان اب بالکل پُرسکون انداز میں کھڑا تھا۔ اسے گویا منصوبہ ناکام ہو جانے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ دوسرے ہی لمحے سات آٹھ گنیں ہاتھوں میں لیے دھڑ دھڑ کرتے اندر آگئے اور انہوں نے ہم تینوں کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ سادہ لباس میں تھے۔ ان کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ شاید ملٹری انٹیلی جنس کے آدمی رہے ہوں۔

حفیظ صاحب میری طرف دیکھتے ہوئے بولے "فون پر جب تم نے کہا تھا کہ کسی اہم شخص کو مجھ سے ملوانا چاہتے ہو تو نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہوا تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے' شاید کوئی غیر متوقع چیز سامنے آئے۔ میں نے احتیاطاً کچھ لوگوں کو بلالیا تھا۔ یونہی محض حفاظت کے نکتۂ نظر سے۔"

"آپ نے اچھا ہی کیا تھا' حفیظ صاحب!" میں نے عرفان کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔ وہ اب بھی بالکل پُرسکون تھا۔ اس پر گویا غیظ و غضب کی ایک لہر آکر گزر گئی تھی۔

وہ ایک ٹک حفیظ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے گھُٹی گھُٹی سی آواز میں بولا "جو طے ہوچکا ہے وہ ضرور ہوگا منسٹر صاحب! چاہے آپ اس سے دس گنا آدمی اور بلوالیں۔"

پھر ایک دم ہی اس کا لہجہ بے پناہ تحکمانہ ہوگیا۔ اس نے مسلح افراد کو براہ راست مخاطب کیا "تم لوگ اگر اپنی زندگی چاہتے ہو تو فوراً اس کمرے سے نکل جاؤ۔"

مگر ان لوگوں نے گویا اس کی آواز سُنی ہی نہیں۔ ان کے چہرے بدستور پتھرائے ہوئے تھے۔ وہ کسی اور ہی کے حکم کی تعمیل کرنے کے عادی معلوم ہوتے تھے۔ غیر متعلقہ آوازوں کی طرف سے گویا کان بند رکھتے تھے۔

عرفان میری طرف دیکھ کر ویسے ہی تحکمانہ لہجے میں بولا "موت تمہارا مقدر ہوچکی ہے۔ مسٹر چوہدری! ہم حفیظ صاحب کو ہر حال میں لے جائیں گے۔"

یہ سن کر مسلح افراد نے تیزی سے حفیظ صاحب کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور گنوں کا رخ عرفان کی طرف کرلیا۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ ہوئے بغیر بارعب لہجے میں بولا "اگر مجھے گزند پہنچا تو اس کوٹھی میں موجود کوئی ذی رُوح زندہ نہیں بچے گا۔"

میں اس کی خود اعتمادی کی وجہ سمجھ سکتا تھا۔ اس کے پاس یقیناً کوئی ڈیوائس موجود تھی جس کے ذریعے ہماری تمام گفتگو کہیں سُنی جارہی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہاں آنے سے پہلے میں خود اس کی تلاشی نہیں لے سکتا تھا۔ وہ فوراً ہی مشکوک ہوجاتا۔

"تمہیں گزند پہنچا کر ہمیں کیا حاصل ہوگا۔" میں نے کہا "تم ایسا کرو کہ خاموشی سے ان لوگوں کے ساتھ چلے جاؤ۔" میں نے مسلح افراد کی طرف اشارہ کیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا اور بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ارمان یا اس خواب کو کس طرح تمہارے ذہن سے نکالوں۔ جانا مجھے نہیں' حفیظ صاحب کو ہے۔ میں تو یہیں رہوں گا اور اس تبدیلی کے تمام چشم دید گواہ اب مارے جائیں گے۔ اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں رہا۔ ہم خونریزی اور شور شرابے کو نظر انداز کرنا چاہتے تھے۔ ہم نہایت خاموشی اور امن و سکون سے اپنا کام کرنا چاہتے تھے لیکن تم [illegible] نہیں چھوڑا

مسٹر چوہدری!"

کوئی غیبی قوت گویا انہی الفاظ کی منتظر تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک خوف ناک دھماکا ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری سماعت زائل ہو گئی ہو۔ میری ہڈیاں تک جھنجھنا اٹھیں۔ حفیظ صاحب تو اوندھے منہ گر پڑے۔ مسلح آدمیوں میں سے دو نے انہیں سنبھالا۔ وہ سینے کے بل لیٹ گئے تھے۔ معلوم نہیں گر پڑے تھے یا پوزیشن لے رہے تھے۔ اگر پوزیشن لے رہے تھے تو نہ جانے کس کے خلاف لے رہے تھے وہاں تو کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔

دھماکا یقیناً کوٹھی ہی میں ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے تھے اور دیواروں میں دراڑیں پڑ گئی تھیں۔ کھلے دروازے سے میں نے دھول اور ملبہ ہوا میں بلند ہوتے دیکھا تھا۔

عرفان بھی ایک لمحے کے لیے لڑکھڑا گیا تھا۔ لیکن میں نے اسے سنبھلتے دیکھا۔ اس نے فیلٹ ہیٹ اور چشمہ اتار لیا تھا۔ نہایت پھرتی سے اس نے مونچھیں بھی اُتار کر پھینک دیں۔

میں باہر جھانکنے کے لیے دروازے کی طرف لپکا تو عرفان تیزی سے بولا "اسی کمرے میں رہو مسٹر چوہدری! ورنہ جلدی مارے جاؤ گے۔ آدھے سے زیادہ کوٹھی ڈھیر ہو چکی ہے اور اس کمرے کے سوا یہاں کوئی جگہ محفوظ نہیں۔" وہ گویا کسی غیبی آنکھ سے باہر کا منظر دیکھ رہا تھا۔

لیکن میں نے اس کی بات پر کان نہیں دھرا۔ غنیمت تھا کہ مسلح افراد میں سے کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے باہر جھانکا۔ بائیں طرف جہاں لمبائی کے رخ پر کوٹھی کا بیشتر حصہ ہونا چاہیے تھا۔ وہاں اب ملبے کا ڈھیر نظر آرہا تھا۔ گرد و غبار اور دھوئیں کے بادل بلند ہو رہے تھے۔

اچانک چاروں طرف سے بے تحاشا گولیاں چلنے کی آوازیں سُنائی دینے لگی۔ کوٹھی کا واقعی صرف تھوڑا سا حصہ ہی سلامت رہ گیا تھا اور ڈرائنگ روم اسی حصے میں شامل تھا۔ نہ جانے ایک مخصوص حصے کو چھوڑ کر باقی عمارت کو اڑانے کی پلاننگ کس طرح کی گئی تھی۔

گولیاں کچھ اس طرح چل رہی تھیں جیسے اچھی بھلی دو فوجیں کہیں برسرپیکار ہوں۔ میں کچھ سمجھنے سے قاصر تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ دشمن میرے سامنے نہیں تھا اور میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔

اچانک میں نے ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے درمیان سے چھلانگ لگا کر راحیلہ کو ملبے پر چڑھتے دیکھا۔ ایک کلاشنکوف اس کے ہاتھوں میں تھی لیکن ستم ظریفی یہ تھی کہ بھکارنوں والا لباس اور پھٹا پرانا پیوند زدہ برقع اسی طرح اس کے جسم پر موجود تھا۔ صرف نقاب شاید اس نے نوچ پھینکی تھی اور اس بے چارے بچے کو بھی .... نہ جانے کہاں چھوڑ آئی تھی۔ اگر کسی نے ایک بھکارن کو کلاشنکوف اٹھائے بھاگتے دیکھا ہوگا تو یقیناً حیران ہوا ہوگا۔

اس کے سرخ و سپید چہرے پر خود جمائے گئے میل کچیل کے داغ چمک رہے تھے۔ وہ سخت وحشت زدہ تھی اور ملبے کو پھلانگتی دیوانہ وار چلی آرہی تھی۔ پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے اس نے وحشت زدہ انداز میں پکارا "انی! انی تم کہاں ہو انی، تم ٹھیک تو ہو۔"

وہ شاید اس تصور سے وحشت زدہ تھی کہ کہیں اس دھماکے میں میرا کام بھی تمام نہ ہو گیا ہو۔ میں نے بے تابی سے اسے آواز دی "راحیلہ! میں یہاں ہوں۔"

وہ کچھ ٹوٹے ہوئے دروازوں کھڑکیوں کو پھلانگتی ہوئی میرے قریب آئی۔ مجھے زندہ سلامت دیکھ کر اس نے طمانیت کی اتنی گہری سانس لی کہ اس کے جسم سے گویا جان ہی نکل گئی۔

"لاؤ یہ کلاشنکوف مجھے دے دو۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"خبردار......! تم گن ہاتھ میں مت لینا مسٹر!" میرے عقب میں موجود مسلح افراد میں سے ایک چیخا "اے عورت! تم کون ہو؟ یہ گن فوراً نیچے پھینک دو۔"

یہی وہ لمحہ تھا جب سب کی توجہ ایک لمحے کے لیے عرفان کی طرف سے ہٹ گئی۔ میں نے گھوم کر پیچھے دیکھا تو اسے اپنی ٹائی سے ٹائی پن اتارتے ہوئے دیکھا۔ موٹے سے نگینے والی وہ پن اس نے زور سے تپائی پر دے ماری۔ میں نے شر شر کی ہلکی سی آواز سنی جیسی عموماً بچوں کی آتشبازی کی بعض معمولی چیزوں کے جلائے جانے پر آتی ہے۔

"راحیلہ! سانس روک لو۔" میں نے گھٹی گھٹی آواز میں تیزی سے کہا۔ میں نے خود بھی سانس روک لی۔ فائرنگ میں شدت آچکی تھی اور آوازیں قریب آتی جارہی تھیں لیکن اسی شور کے درمیان مجھے بلندی کی طرف سے کچھ ایسی آواز سنائی دی جیسے کوئی بہت بڑی بھڑ بھنبھناتی ہوئی تیزی سے قریب آرہی ہے۔

میں اور راحیلہ دروازے کے بالکل قریب تھے۔ ہم نے بیک وقت سر اُٹھا کر آواز کی سمت میں دیکھا اور میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے دو آدمیوں کو غوطہ خوری کے لباس میں ہوا میں اُڑتے دیکھا۔ کم از کم پہلی نظر میں مجھے ان کے لباس پر غوطہ خوری کے لباس ہی کا گمان گزرا تھا اور ان کا انداز بھی غوطہ خوروں والا ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ پانی میں تیرنے کے بجائے ہوا میں تیر رہے تھے اور ان کی رفتار بھی بہت تیز تھی۔ ان کی پشت پر آکسیجن کے سلنڈروں کی طرح کچھ بندھا ہوا بھی تھا۔

وہ فضا میں پرواز کرتے تیزی سے ہماری طرف آرہے تھے۔ ان کے قریب آنے کے ساتھ ساتھ بھنبھناہٹ کی آواز تیز ہوتی جارہی تھی۔ پھر وہ تیزی سے نیچے آنے لگے اور چند سیکنڈ میں ہمارے سامنے ملبے کے ڈھیر پر آن اُترے۔

فضا کی بلندیوں سے اترنے والے دونوں افراد بظاہر غوطہ خور ہی دکھائی دے رہے تھے۔ سر سے پاؤں تک ان کا وجود غوطہ خوروں جیسے لباس اور ماسک میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے باوجود وہ غوطہ خوروں سے کافی حد تک مختلف بھی تھے۔ غوطہ خوروں کا لباس عام طور پر گہرے رنگ کے کینوس یا ربڑ جیسے میٹریل سے بنا ہوتا ہے۔ جبکہ ان کا لباس نقرئی اور چمکیلا تھا۔ کسی عجیب ہی میٹریل سے بنا دکھائی دیتا تھا۔

ان کی کمر پر بھی آکسیجن ٹینک کے بجائے مختصر مشینری سی بندھی نظر آرہی تھی۔ شاید وہی انجن تھا جس کی مدد سے وہ اُڑ رہے تھے۔ ان کے سینوں پر بھی نقرئی رنگ کا ایک ایک ڈبا سا بندھا ہوا تھا جو بظاہر بہت ہی جدید ساخت کا وی سی آر یا کوئی خاصا بڑا الیکٹرانک آلہ معلوم ہو رہا تھا۔

ان کے پیروں پر غوطہ خوروں کی طرح چوڑے چوڑے فلیپر بھی موجود تھے جن سے غوطہ خور پانی میں آگے بڑھنے میں مدد لیتے ہیں۔ وہ ملبے سے اتر کر نہایت اطمینان سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھے۔ بظاہر وہ خالی ہاتھ ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے باوجود میری چھٹی حس نے مجھے کسی زبردست خطرے کا احساس دلایا۔

میں راحیلہ سے کلاشنکوف لینا چاہتا تھا لیکن حفیظ صاحب نے اپنی حفاظت کے لیے جن لوگوں کو طلب کیا تھا۔ انہوں نے عقب سے مجھے خبردار کیا تھا کہ میں کلاشنکوف کو ہاتھ نہ لگاؤں بلکہ انہوں نے راحیلہ کو بھی کوئی مشکوک عورت سمجھتے ہوئے کلاشنکوف پھینکنے کا حکم دیا تھا..... وہ چھ افراد تھے اور ان کے سب کے پاس ہلکی مشین گنیں تھیں۔

میرے لیے ان کا حکم ماننے میں ہی عافیت تھی۔ اس دوران نقلی حفیظ یا عرفان نے اپنی ٹائی پن اتار کر تپائی پر دے ماری تھی جس کی وجہ سے "شوں" کی ہلکی سی آواز کے ساتھ کمرے میں غالباً کوئی گیس پھیل گئی تھی۔

میں نے مڑ کر دیکھا تو مجھے کلاشنکوف سے دور رہنے کا حکم دینے والے فرش پر گردنیں ڈالے پڑے تھے۔ ان کی گنیں ان کی گرفت میں نہیں رہی تھیں۔ حفیظ صاحب بھی کرسی سے لڑھک چکے تھے اور غالباً بے ہوش تھے۔ صرف عرفان ہوش میں تھا۔ شاید اس نے بھی میری طرح سانس روک لی تھی یا کوئی اور وجہ تھی۔

میں اور راحیلہ کمرے سے تقریباً باہر ہی تھے۔ غوطہ خور نما انسان ہماری ہی طرف آرہے تھے۔ گیس کی وجہ سے میں کمرے میں گھسنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ عرفان کو اس ساری صورتِ حال یا اردگرد پھیلی ہوئی تباہی پر گویا قطعاً کوئی تشویش نہیں تھی اور وہ نہایت اطمینان سے مسکراتا ہوا دروازے کی طرف آرہا تھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ کمرے سے نکل کر میرے اور راحیلہ کے درمیان سے گزرتا ہوا نہایت سکون سے رخصت ہو جائے گا۔ آس پاس کے علاقے میں بدستور زور و شور سے فائرنگ جاری تھی۔

میں نے راحیلہ کے ہاتھوں سے کلاشنکوف چھینتے ہوئے تیزی سے کہا "تم عرفان کو جانے سے روکو۔ میں انہیں آنے سے روکتا ہوں۔" میں نے غوطہ خوروں کی طرف اشارہ کیا۔

کلاشنکوف میرے ہاتھوں میں منتقل ہوتے ہی راحیلہ نے اپنے فقیرنیوں والے لباس سے فوراً ایک ٹی ٹی نکال لیا اور عرفان کا نشانہ لیتے ہوئے چلائی "رک جاؤ۔"

اس وقت تک وہ تقریباً دروازے پر ہی پہنچ چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ برقرار رہی تاہم وہ دروازے پر رک گیا۔ اس نے گویا راحیلہ کی بات مان لی تھی۔ تاہم اس کے چہرے پر تشویش یا فکرمندی کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ بھی غوطہ خوروں کو ملبے پر اترتے دیکھ چکا تھا اور ان کی آمد کے ساتھ ہی گویا اس کی تمام تشویش دور ہو گئی تھی۔

میں کسی چیز کی آڑ لینا چاہتا تھا لیکن کمرے سے باہر آنے کے بعد مجھے کسی چیز کی آڑ میسّر نہیں تھی۔ برآمدے کے ستون ذرا فاصلے پر تھے۔ میں نے دیوار سے لگتے ہوئے کلاشنکوف کا رخ غوطہ خوروں کی طرف کیا اور چیخ کر انہیں رکنے کا حکم دیا لیکن انہوں نے گویا سنا ہی نہیں۔

آخرکار میں نے ایک گھٹنے کے بَل جھکتے ہوئے ان دونوں پر بیک وقت برسٹ مارا اور اس کے ساتھ ہی میری کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ گولیاں ان کے چمکیلے لبادوں سے ٹکرائیں تو سیکڑوں سفید چنگاریاں فضا میں اڑیں جیسے بجلی کے بہت سے ننگے تار آپس میں ٹکرا گئے ہوں۔ گولیاں شاید پھسلتی ہوئی اِدھر اُدھر کہیں چلی گئیں۔

انہیں صرف ایک خفیف سا جھٹکا لگا۔ اس کے علاوہ کلاشنکوف کے برسٹ کا ان پر کوئی اثر دکھائی نہ دیا۔ میں نے ایک اور برسٹ مارا۔ اسی طرح چنگاریاں سی اُڑیں۔ گولیوں کا کچھ پتا نہ چلا کہ کہاں گئیں۔

اس قسم کے مناظر کی توقع صرف سائنس فکشن فلموں میں ہی کی جاسکتی ہے۔ لوگ ان فلموں میں تفریحِ طبع کے لیے یہ مناظر شاید دیکھ تو لیں لیکن ان پر یقین نہ کریں مگر ہم سے پچھلی نسلوں کے لیے شاید آج کل کے کرشماتی کمپیوٹر، ریموٹ کنٹرول کی معجزاتی سی کارروائیاں اور ترقی کے دوسرے نمونے بھی سائنس فکشن رہے ہوں اور اس وقت ان کے سامنے اگر یہ امکان ظاہر کیا گیا ہو کہ آگے چل کر ایسی چیزیں بھی بنیں گی تو شاید انہوں نے بھی اس پر یقین نہ کیا ہو۔

دونوں غوطہ خور نما افراد کافی دراز قد اور جسیم تھے یا پھر شاید اپنے لباس وغیرہ کی وجہ سے ایسے معلوم ہو رہے تھے۔ نہ جانے اس چمکیلے خول کے نیچے کیا کچھ چھپا ہوا تھا۔ وہ بدستور کسی خوب صورت بَلا کی طرح ہماری طرف بڑھتے رہے۔

میرے جسم سے ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ ایک موہوم سی امید کے سہارے میں نے ان میں سے صرف ایک کو ہدف بناتے ہوئے

لسبائی کے رخ یعنی سر سے پاؤں تک برسٹ مارا کہ شاید اس کے پورے وجود میں کوئی ایسی کمزور جگہ' اس کے عجیب و غریب لبادے یا خول میں کوئی نازک حصہ موجود ہو جس پر کوئی گولی اثر کر جائے۔

مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ میری یہ توقع پوری نہیں ہوگی۔ ایسا ہی ہوا۔ کلاشنکوف ان کے سامنے بالکل بیکار تھی۔ میری تیسری کوشش نے شاید ان کا موڈ بھی آف کردیا۔ جس پر میں نے تیسرا برسٹ مارا تھا۔ اس نے اپنے سینے پر لگے ہوئے چوکور ڈبے کو چھوا اور اس میں سے یکے بعد دیگرے تین چار ڈسک تیزی سے گھومتی ہوئی برآمد ہوئیں۔

ہر ڈسک' گراموفون ریکارڈ سے کچھ چھوٹی تھی' نقرئی تھی اور بے پناہ چمکیلی تھی۔ ڈسک کیا تھی۔ گویا چھوٹا سا ایک سورج تھا جو بے پناہ تیزی سے گھومتا ہوا برآمد ہوا تھا۔ یہ تھالیاں سی کچھ اسی طرح گھومتی' لرزتی میری طرف بڑھیں جیسے کسی بچے نے فریسبی کے کھیل میں یکے بعد دیگرے تیزی سے تین چار فریسبی پھینک دی ہوں۔

میں پہلے ہی کچھ جھکا ہوا تھا' بروقت گھٹنوں کے بل گر پڑا۔ چاروں نقرئی تھالیاں سی' بالکل ایک سیدھ میں میرے سر سے گزرتی ہوئی ڈرائنگ روم کی دیوار میں سے گزر گئیں۔ میرے اندازے کے مطابق دیوار خاصی موٹی تھی لیکن ہر ڈسک اس میں سے یوں گزرتی چلی گئی تھی جیسے وہ سیمنٹ اور اینٹوں سے نہیں بلکہ کھن کی ٹکیوں سے بنی ہوئی دیوار تھی اور ہر ڈسک کا گولائی دار کنارا گویا تلوار کی طرح تیز دھار تھا۔

دوسرے غوطہ خور نما شخص نے بھی اسی طرح اپنے سینے پر نصب بکس کے کسی مخصوص حصے کو چھوا تھا اور اس میں سے بھی اسی طرح تین چار چمکیلے ریکارڈ سے نکل کر ہوا میں تیرتے ہوئے اور تیزی سے گردش کرتے راحیلہ کی طرف بڑھے تھے۔ اس نے بھی بروقت جھک کر میری ہی طرح اپنے آپ کو بچایا تھا۔

ہم دونوں بیک وقت ہی اس عجیب و غریب ہتھیار کے حملے سے بچے تھے۔ غنیمت تھا کہ راحیلہ بھی انہیں کوئی بے ضرر اور معمولی چیز سمجھ کر یا محض حیرت اور تجسس میں مبتلا ہو کر سیدھی کھڑی نہیں رہ گئی تھی ورنہ جو چیزیں سیمنٹ اور اینٹوں کی ٹھوس دیواروں میں سے اس طرح گزر گئی تھیں ان کے بارے میں اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ہمارے جسم سے کس طرح گزر جاتیں۔ یقیناً ہماری گردنیں ہی الگ ہو کر کہیں پڑی ہوتیں۔ مزید بھی نہ جانے جسم کا کون کون سا حصہ پھل کی قاشوں کی طرح الگ ہو کر گرتا۔

فوری طور پر میں نے اور راحیلہ نے کمرے میں چھلانگ لگائی۔ ہمیں پناہ کی ضرورت تھی اور وہاں کوئی جائے پناہ نہیں تھی۔ سامنے سے وہ عفریت چلے آرہے تھے۔ اردگرد ملبہ تھا۔ بائیں ہاتھ پر برآمدے کا کچھ حصہ سلامت دکھائی دے رہا تھا اور اس طرف ایک دو کمروں کے دروازے بھی تباہی سے محفوظ دکھائی دے رہے تھے لیکن ادھر بھاگنے کی صورت میں بھی عفریت ہمارا راستہ روک سکتے تھے۔

چنانچہ ہمیں اپنی عقب میں ڈرائنگ روم ہی قدرے محفوظ جگہ دکھائی دی تھی حالانکہ گراموفون ریکارڈ نما وہ چمکیلی سی چیزیں جس طرح اس کی دیوار سے گزر کر اندر چلی گئی تھیں اس کے بعد ڈرائنگ روم کو بھی محفوظ سمجھنا محض خوش فہمی تھی لیکن نفسیاتی سہارے کے لیے کوئی نہ کوئی آڑ تو ضروری تھی۔

اندر پہنچتے ہی میری نظر دوسری دیوار کی طرف گئی اور مجھے فوراً اندازہ ہوگیا کہ وہ ڈسک نما چیزیں کمرے میں سے ہوتی ہوئی دوسری دیوار میں سے نکل گئی تھیں۔ اس دیوار پر ایسے ہی نشانات موجود تھے جیسے لکڑی میں سے آری کے گزرنے کے بعد باقی رہتے ہیں۔ آری کا نشان البتہ موٹی لکیر کی طرح ہوتا ہے جبکہ وہ نشان بہت ہی باریک لکیر کی طرح تھے۔

راحیلہ نے ایک عقلمندی کی۔ اس نے کمرے میں چھلانگ لگائی تو عرفان کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹتی لے گئی۔ کمرے میں گیس کا اثر اب بہت کم ہو چکا تھا۔ حفیظ صاحب اور ان کے سیکیورٹی گارڈز بدستور بے ہوش پڑے تھے۔ راحیلہ نے عرفان کو ڈھال بنالیا اور اس کی پسلیوں پر ٹی ٹی کی نال رکھتے ہوئے چلائی "اگر تم لوگ آگے بڑھے تو میں اس شخص کو گولی ماردوں گی۔"

لیکن عرفان کے بارے میں اس کا اندازہ غلط ہوگیا۔ وہ اتنا بے ضرر اور مرنجان مرنج نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ راحیلہ نے اس کی پسلیوں پر گن کی نال ضرور رکھی تھی لیکن اس کی توجہ نقرئی لباس والوں کی طرف تھی۔ عرفان نے اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے راحیلہ کے گن والے ہاتھ پر زور سے کہنی ماری اور تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گیا۔

ٹی ٹی سے فائر ہوگیا لیکن گولی فرش پر لگی۔ راحیلہ بھی لڑکھڑا چکی تھی۔ اس دوران دونوں نقرئی لباس والے زقند بھر کر کمرے میں پہنچ چکے تھے۔ وہ ہمارے اور عرفان کے درمیان حائل ہو چکے تھے۔ عرفان ان کی آڑ میں ہوگیا تھا۔ دونوں نے ایک بار پھر اپنے سینوں پر لگے ہوئے ڈبوں کو چھوا۔ ایک بار پھر ان میں سے یکے بعد دیگرے چار چار چمکیلے ریکارڈ سے برآمد ہوئے۔

ایک بار پھر میں نے اور راحیلہ نے فرش پر لوٹ لگائی۔ عجیب و غریب چیزیں سنسناتی ہوئی ہمارے اوپر سے گزر گئیں اور کمرے کی دوسری دیوار سے پار ہو گئیں۔ نہ جانے وہ کہاں جاکر کس چیز سے ٹکرا کر رکتی تھیں۔

کمرا خاصا طویل و عریض تھا لیکن اس میں بھاری بھرکم فرنیچر بھی موجود تھا۔ سات افراد ادھر ادھر لڑھکے پڑے تھے۔ ان کی گنیں آڑی ترچھی پڑی تھیں۔ میں' راحیلہ اور عرفان بھی تھے۔ اب نقرئی لباس والے بھی گھس آئے تھے جو دیو قامت دکھائی دے رہے تھے۔ کمرا گویا کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ جدوجہد کے لیے "میدان" وسیع نہیں رہا تھا۔

راحیلہ دیکھ چکی تھی کہ میں نے تین مرتبہ نقرئی لباس والوں پر کلاشنکوف سے برسٹ مارا تھا لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اس کے باوجود اس نے نہ جانے کس امید کے سہارے ان پر اپنا پستول خالی کر ڈالا۔ وہ اس وقت گھٹنوں کے بل کھڑی تھی اور اس کی گنیاں ایک تپائی پر رکھی ہوئی تھیں جس پر کولڈ ڈرنکس کے برتن رکھے پڑے تھے۔

ایک نقرئی لباس والے نے گویا راحیلہ کی گستاخی پر خفا ہو کر آگے بڑھ کر اس کی کھوپڑی پر کراٹے کا ہاتھ رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس لبادے میں اس کا ہاتھ کسی بیلچے جتنا چوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ راحیلہ اچھل کر پیچھے ہٹی۔

نقرئی لباس والے کا ہاتھ تپائی پر پڑا۔ مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک زوردار چھناکے کے ساتھ تمام برتن اچھل کر نہ جانے کہاں کہاں جا گرے۔ کچھ آپس میں ٹکرا کر ٹوٹ گئے اور اسٹین لیس اسٹائل کی وہ تپائی درمیان سے دو ٹکڑے ہوگئی۔ حالانکہ وہ جتنی ٹھوس' مضبوط اور بھاری بھرکم دکھائی دے رہی تھی' میرا خیال تھا کہ کوئی بھاری بھرکم کلہاڑا بھی کم از کم ایک وار میں اس کا یہ حشر نہیں کرسکتا تھا۔

ان نقرئی لبادوں میں انسان یا جو بھی مخلوق چھپی ہوئی تھی کیا وہ اتنی ہی طاقتور تھی یا یہ ان لبادوں کی کرشمہ سازی تھی؟ ان سوالوں پر غور کرنے کا یہ وقت نہیں تھا اور نہ ہی کوئی فی الحال مجھے ان کا جواب دے سکتا تھا۔ اس وقت تو صرف جان بچانے کی فکر کی جاسکتی تھی کیونکہ دوسرا نقرئی لباس والا میری طرف بڑھ رہا تھا۔

میری توجہ راحیلہ کی طرف سے ہٹ گئی۔ میں خود اس وقت گویا ایک چوہے کی طرح کونے میں پھنس چکا تھا اور بلی مجھے پکڑنے کے لیے بڑھ رہی تھی۔ ان لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ ہم ان چمکیلی ریکارڈ نما چیزوں سے بچ سکتے تھے۔ اپنی پھرتی کی وجہ سے ہم کسی ڈسک کی زد میں نہیں آئے تھے ورنہ ڈبے سے ان کے برآمد ہونے کا انداز ایسا ہی تھا کہ سامنے آنے والی کسی بھی چیز کا کوئی نہ کوئی حصہ کسی نہ کسی ڈسک کی زد میں آسکتا تھا۔

اب شاید نقرئی لباس والوں نے اپنی وہ عجیب و غریب چیزیں استعمال کرنے کے بجائے ہاتھوں سے ہی ہمیں پکڑنے کا ارادہ کیا تھا۔ نقرئی لباس والا میری طرف بڑھ رہا تھا اس کے دونوں بازو نیم دائرے میں پھیلے ہوئے تھے کہ میں کسی طرف سے نکلنے نہ پاؤں۔ میں ایک کونے میں پھنس چکا تھا اور اب قدرے پچھتا بھی رہا تھا کہ خواہ مخواہ کمرے میں کیوں گھسے تھے۔

نقرئی لباس والے نے یکدم جھپٹ کر میری گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچنے کی کوشش کی۔ میں تو جھکائی دے کر بچنے میں کامیاب ہوگیا لیکن اسٹینڈ پر لگی ہوئی پیتل کی ایک بڑی سی ایش ٹرے اس کے ہاتھوں میں آگئی اور میں نے دیکھا وہ گتے سے بنی ہوئی کسی چیز کی طرح تڑ مڑ گئی۔

میں اس کونے سے نکلنے میں تو کامیاب ہوگیا تھا لیکن اسی لمحے میں نے فیصلہ کرلیا کہ ان کے ساتھ طاقت آزمائی کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اپنی وہ غیر معمولی اور خداداد طاقت اور سخت جانی جو مجھے اپنا قیمتی سرمایہ محسوس ہوتی تھی ان لوگوں کے سامنے بالکل بیکار تھی جو نہ جانے حقیقت میں ہی مافوق الفطرت سی مخلوق تھے یا محض عام سے انسان تھے مگر اپنی سائنسی ایجادات کے خول میں بند ہو کر مافوق الفطرت بن گئے تھے۔

گولیاں ان پر اثر نہیں کررہی تھیں۔ اس لیے یہ توقع رکھنا یا خوش فہمی میں مبتلا رہنا بے کار تھا کہ ہم انہیں شکست دے سکتے تھے۔ فی الحال تو ان سے بچ نکلنا ہی غنیمت تھا لیکن ہمارے سامنے مسئلہ صرف اپنی جانوں کا نہیں' حفیظ صاحب کی جان کا بھی تھا۔

اپنی دانست میں انہوں نے بڑی عقلمندی دکھائی تھی کہ مجھے بتائے بغیر غالباً کسی خفیہ ایجنسی سے کہہ کر اپنی حفاظت کے لیے چھ آدمیوں کا بندوبست کرلیا تھا لیکن وہ ان کے کسی کام نہیں آسکے تھے۔ حفیظ صاحب انہی کے درمیان لڑھکے پڑے تھے۔

میں نے دیکھا راحیلہ بھی دوسرے نقرئی لباس والے کی گرفت سے بچنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ وہ بھی یقیناً اسی نتیجے پر پہنچی تھی کہ ان سے ٹکرانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا تھا۔ ہم دونوں بیک وقت ہی کمرے سے نکلے اور میں نے تیزی سے پلٹ کر دروازہ بند کرکے بولٹ چڑھادیا۔

ان لوگوں کو حفیظ صاحب کے ساتھ کمرے میں تنہا چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن اس وقت اس کے سوا کوئی چارہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کلاشنکوف میرے ہاتھ سے گر چکی تھی لیکن راحیلہ کے ہاتھ میں ٹی ٹی موجود تھا۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم ملبے کی طرف بھاگے۔

ملبے کے دوسری طرف نشیب میں پہنچ کر میں نے ملبے کی آڑ لیتے ہوئے راحیلہ سے پوچھا "باہر فائرنگ کون لوگ کررہے ہیں؟"

"صحیح طور پر تو پتا نہیں چل سکا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولی "تربیت یافتہ دہشت گرد معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارے ساتھی مختلف پوزیشنوں سے انہیں روکے ہوئے ہیں۔ ان میں سے کچھ شاید مارے بھی گئے ہیں۔ تمہیں شاید یہ سن کر حیرت ہو کہ کوٹھی پر انہوں نے لانچر سے راکٹ پھینکا تھا۔" اس نے ایک گہری سانس لی "ہمارے ملک کا کیا بنے گا؟ یہاں لوگ آباد علاقوں میں' گلی کوچوں میں راکٹ لانچر تک لے کر پہنچ جاتے ہیں۔ فارن منسٹری کوٹھی اور آس پاس کے علاقوں کو گھیرے میں لے کر اتنی اتنی دیر تک فائرنگ کرتے ہیں اور کوئی پوچھنے والا نہیں!"

"اطمینان رکھو۔ اللہ بہتر کرے گا۔" میں نے کہا۔

اسی لمحے ڈرائنگ روم کا دروازہ چرچرایا اور باہر آگرا۔ مجھے یہی اندیشہ تھا۔ شاید اسی لیے میں وہاں رک گیا تھا۔ میں نے دونوں

نقرئی لباس والوں کو باہر آتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے عرفان کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے یوں اٹھایا ہوا تھا جیسے کوئی کسی بچے کو اٹھا کر کسی اونچی جگہ پر چڑھانے لگا ہو۔

وہ عرفان کو اسی حالت میں لٹکائے یکدم فضا میں بلند ہوا۔ اس کی پشت پر بندھی ہوئی مختصر سی مشینری کی بھنبھناہٹ کی سی آواز ذرا تیز ہوئی اور وہ عرفان کو لیے خاصی تیز رفتاری سے پرواز کر گیا۔ دوسرا ہماری تلاش میں ٹیلے کی طرف آرہا تھا۔ میں خود سمجھنے سے قاصر تھا کہ ہم وہاں کیوں رک گئے تھے۔ شاید لاشعوری طور پر مجھے اندیشہ تھا کہ حفیظ صاحب کو کوئی گزند نہ پہنچائی جائے حالانکہ موجودہ حالات میں، میں ان کی مدد کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ فی الحال تو ہمیں خود مدد کی ضرورت تھی۔

نقرئی لباس والے کو گویا اچھی طرح اندازہ تھا کہ ہم کہاں چھپے ہوئے تھے۔ وہ سیدھا اسی طرف آرہا تھا۔ راحیلہ بھاگنے کے بجائے سرگوشی میں بولی "کاش! اسے قابو میں کرنے کی کوئی تدبیر ہو سکتی!"

"فی الحال تو اس کے قابو میں آنے سے بچنے کی تدبیر کرو۔" میں نے تیزی سے کہا۔

وہ ٹیلے کی بلندی پر آن کھڑا ہوا تھا۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ اس کے خلا بازوں جیسے ہیلمٹ میں اس کی آنکھیں کہاں تھیں لیکن وہ یقیناً ہمیں دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ تیزی سے آگے نہیں بڑھا۔ شاید اب وہ چوہے بلی والا کھیل کھیل کر محظوظ ہونا چاہتا تھا۔

شاید ان کے لیے زیادہ ضروری کام صرف عرفان کو وہاں سے نکالنا تھا۔ یہ کام وہ کر چکے تھے۔ اب انہیں کوئی تشویش نہیں تھی۔ راحیلہ کی تمام تیاریاں ... اس کا یہ خصوصی آپریشن محض ایک دردسری ثابت ہوا تھا۔ اس نے نہ جانے اس سلسلے میں کتنی محنت کی تھی۔ کتنا اسلحہ اس وقت استعمال ہو رہا تھا اور کتنی جانیں خطرے میں تھیں۔ حاصل کچھ بھی نہیں تھا۔ عرفان ہمارے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

بس ایک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ عرفان، حفیظ صاحب کی جگہ نہیں لینے پایا تھا۔ ریڈ ڈاٹ کا وہ منصوبہ فی الحال تو دھرا کا دھرا رہ گیا تھا لیکن راحیلہ اس آپریشن کی تیاریاں نہ بھی کرتی، تب بھی میں نے یہ تو سوچ ہی رکھا تھا کہ ان کی سازش کامیاب نہیں ہونے دوں گا اور ان کا آلۂ کار نہیں بنوں گا۔

اس صورت میں شاید ان کا ردِعمل بھی اتنا شدید نہ ہوتا۔ اس وقت تو شاید وہ اس جھنجلاہٹ کا شکار تھے کہ ایک طرف تو میں نے انہیں غچا دیا تھا، ان کے کام کی ہامی بھر کر عین وقت پر آکر انہیں دھوکا دیا تھا، دوسرے بھرپور تیاریاں کرکے ان کی دانست میں ان سے ٹکر لینے کی کوشش کی تھی۔ اب انہیں بھلا کیا معلوم تھا کہ

جسے میں نے دل کی حسرت نکالنے کا موقع دیا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس کی حسرت نکالنے کی یہ کوشش ہمیں بہت مہنگی پڑ رہی تھی۔

ریڈ ڈاٹ کی حکمتِ عملی بھی بڑی عجیب اور حیران کن تھی۔ کہیں چڑھائی کرنے کے سلسلے میں وہ ایک طرف عام سے وسائل بھی استعمال کرتی تھی۔ یعنی باقاعدہ گھیرا ڈال کر حملہ کرنا... پیشہ ور قاتلوں، ڈاکوؤں یا دہشت گردوں کو استعمال کرنا... عام اور مروج اسلحہ استعمال کرنا۔ تمام روایتی طریقے استعمال کرنا۔ جس کی وجہ سے ریڈ ڈاٹ کی کارروائیاں کسی بھی خطرناک مگر عام سے خفیہ گروہ کی کارروائیاں معلوم ہوتی تھیں۔

لیکن اسی کے ساتھ ساتھ متوازی سے انداز میں وہ اپنا سائنسی شعبدہ بازیوں کے ناقابلِ یقین سے نمونے بھی سامنے لے آتے تھے۔ وہ چاہتے تو صرف انہی شعبدے بازیوں سے بھی ان کا کام چل سکتا تھا۔ وہ اپنا مقصد حاصل کر سکتے تھے لیکن نہ جانے کیوں وہ ساتھ ہی دوسری عامیانہ سی کارروائیوں کی بھی زحمت اٹھاتے تھے۔ اس میں اگر کوئی مصلحت تھی تو میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔

نقرئی لباس والا چند لمحے ٹیلے کی بلندی پر قطعی ساکت کھڑا رہا۔ ہم نشیب میں، دھماکے سے تباہ شدہ فرش پر خرگوش کے جوڑے کی طرح دبکے ہوئے تھے۔ اس وقت تک دوسرا نقرئی لباس والا عرفان کو لے کر فضا کی بلندیوں میں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔

نقرئی لباس والے نے اچانک ہی نیچے چھلانگ لگائی۔ وہ مجھے دبوچنے کے لیے کودا تھا لیکن میں اور راحیلہ دونوں ہی بیک وقت اپنی جگہ سے ہٹ گئے۔ وہ شخص جس خول میں لپٹا ہوا تھا اور جو چیزیں اس کے سینے اور کمر پر بندھی ہوئی تھیں، ان کی وجہ سے شاید اس کی حرکات و سکنات میں زیادہ پھرتی نہیں تھی تاہم پھر بھی وہ ایک عام انسان کی سی آسانی سے حرکت کر رہا تھا اور یہ بھی کچھ کم حیرت کی بات نہیں تھی۔

راحیلہ اب بھی اپنی کوششوں سے باز آنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے ہٹتے ہٹتے اور جھکائی دیتے ہوئے اپنی ٹی ٹی کا دستہ اس کی پسلیوں میں رسید کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس کے پہلو میں ضرب لگانے میں کامیاب تو ضرور ہوگئی لیکن اس پر اتنا ہی اثر ہوا جتنا زمین کی گہرائیوں میں جڑیں گاڑ کر کھڑے ہوئے سو سال پرانے کسی برگد پر ہو سکتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔

اس نے راحیلہ کی اس گستاخی کو بھی نظرانداز کر دیا۔ اس کی تمام تر توجہ صرف میری طرف تھی۔ میں دھیرے دھیرے پیچھے ہٹنے لگا۔ مجھے پیچھے بھی دھیان رکھنا پڑ رہا تھا کہ کسی چیز سے ٹکرا کر گر نہ جاؤں۔

کن چیزوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ دھواں بھی بلند ہو رہا تھا۔ فضا میں تپش اور مختلف چیزوں کے جلنے کی بو پھیلی ہوئی تھی۔

راحیلہ نے گویا جھنجلا کر ٹی ٹی اپنے فقیرنیوں والے لباس میں اُڑستے ہوئے ٹیلے سے ایک بڑا تودا سا اٹھایا۔ وہ کئی اینٹوں اور سیمنٹ وغیرہ کا مجموعہ تھا اور دیکھنے سے ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کافی بھاری تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ راحیلہ اسے اٹھا سکتی تھی لیکن اس نے نہ صرف انتہائی پھرتی سے اسے اٹھایا بلکہ نقرئی لباس والے پر دے بھی مارا۔

جس طرح گولیاں اس کے نقرئی لبادے سے ٹکرا کر پھسلتی ہوئی اِدھر اُدھر جاتی محسوس ہوئی تھیں اس طرح ٹی ٹی کا دستہ اس لبادے پر سے نہیں پھسلا تھا۔ اسے ضرب لگتی محسوس ہوئی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ اب تودا بھی اس سے ٹکرایا۔ اب بھی اسے ضرب لگتی محسوس ہوئی اور وہ ذرا سا لڑکھڑا بھی گیا لیکن اس سے اس کے لیے گویا کوئی فرق نہیں پڑا۔

وہ بدستور میری طرف بڑھتا رہا۔ راحیلہ نے ایک اور تودا سا اٹھا کر اس پر پھینکا۔ اب اس کا مقصد میری سمجھ میں آیا۔ وہ بے چاری اس نقرئی عفریت کی توجہ میری طرف سے ہٹا کر اپنی طرف مبذول کرانا چاہتی تھی۔ جو خطرہ میری جان کو لاحق نظر آرہا تھا وہ اسے اپنی طرف منتقل کرنا چاہتی تھی۔

دوستی اور محبت میں انسان یہی کر سکتا ہے کہ دوسرے کی بلا اپنے سر لے لے لیکن وہ بلا راحیلہ کو اس ایثار کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ وہ بدستور میری ہی طرف متوجہ رہی۔ اس نے مڑ کر راحیلہ کی طرف ایک نظر دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔

موقع پاکر وہ حتی الامکان پھرتی سے مجھ پر جھپٹا۔ میں ایک بار پھر اسے جھکائی دے گیا اور بائیں طرف پھیلے ہوئے ٹیلے پر چڑھ گیا۔ راحیلہ کا پھینکا ہوا تودا اس سے ٹکرانے پر اسے ذرا سا لڑکھڑاتے دیکھ کر مجھے امید کی ایک کرن سی نظر آئی تھی۔ میں نے اس سے بھی بڑا ایک تودا سا اٹھا کر اس پر پھینکتے ہوئے اس کی کھوپڑی کو نشانہ بنانے کی کوشش کی۔

اس وار سے وہ بچ گیا تاہم وہ تودا اس کی ران سے ٹکرایا۔ جھکائی دے کر کھوپڑی اس نے بچالی۔ مجھے راحیلہ کو اشارہ کرنے کی مہلت نہیں مل سکی لیکن وہ سمجھ گئی کہ اس وقت میں کیا چاہتا تھا۔ وہ رفاقت جس میں ایک تعلقِ خاطر بھی شامل ہو، اس کا ایک کمال یہ بھی ہوتا ہے کہ ذہنوں میں ہمیشہ گویا ایک رابطہ سا قائم رہتا ہے۔

نقرئی لبادے والے کا منہ اب میری طرف ہو چکا تھا اور پشت راحیلہ کی طرف۔ راحیلہ نے میرا مطلب سمجھتے ہوئے جلدی جلدی مختلف سائز کے، ٹیلے کے ٹکڑے اٹھا اٹھا کر اس پر پھینکنے شروع کیے۔ تاہم اس نے کوئی ہلکا ٹکڑا نہیں اٹھایا تھا۔ میں زیادہ جلدی جلدی جھک کر ٹیلے کے بھاری بھرکم ٹکڑے نہیں اٹھا سکتا تھا کیونکہ اس دوران وہ چھلانگ لگا کر مجھ تک پہنچ سکتا تھا۔

تاہم اب عقب سے راحیلہ کے تابڑ توڑ حملوں کی وجہ سے اس کی توجہ ذرا بٹنے لگی تھی۔ جونہی وہ ایک ثانیے کے لیے مڑ کر راحیلہ کی طرف دیکھتا، میں ٹیلے کا کوئی بھاری سا تودا نما ٹکڑا اٹھا کر اس پر کھینچ مارتا۔ وہ کیسا ہی ناقابلِ تسخیر سہی لیکن ہم نے بہرحال اسے اُلجھن میں ڈال دیا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ وہ مجھے دبوچ کر، بے ہوش کر کے یا یونہی قابو میں کر کے اُڑ جانا چاہتا تھا۔ میں اب جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہتا تھا لیکن میرے یونہی منہ اٹھا کر بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ سُپرمین کی طرح فضا میں اڑنے پر قادر تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ اُڑ کر میرا تعاقب کرے گا۔ اسے چند منٹ کے لیے الجھائے بغیر میرا فرار کی کوشش کرنا بے کار تھا۔

نقرئی لباس والے نے ایک بار پھر اپنے سینے پر بندھے ڈبّے کا سہارا لیا اور اس کے کسی مخصوص حصے کو چھوا۔ ایک بار پھر ڈبے سے چمکیلی طشتریاں سی برآمد ہوئیں اور سنسناتی ہوئی میری طرف بڑھیں۔ دوسری بار اس نے منہ پھیر کر چند طشتریاں راحیلہ پر چھوڑیں۔ ہمیں ان سے بچنے کی پڑ گئی اور ہماری پتھر پھینکنے کی کارروائی موقوف ہوگئی۔

اس کے پٹارے میں شاید اس وقت ان چمکیلی طشتریوں والے شعبدے کے علاوہ کچھ نہیں تھا ورنہ اس نے اب تک ضرور استعمال کیا ہوتا۔ لیکن یہ ہتھیار بھی کچھ کم خوفناک نہیں تھا۔ عجیب چیز تھی جو ہر چیز کو کاٹتی ہوئی گزر جاتی تھی۔ اسے کسی دوسرے ہتھیار کی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہ خود بھی تو موجودہ شکل میں ناقابلِ شکست تھا۔

ہم اِس بار بھی چمکیلی طشتریوں کے حملے سے بچ گئے۔ اس بار تو قسمت نے میرا بہت ہی ساتھ دیا تھا۔ میں چونکہ ٹیلے کے ناہموار ڈھیر پر تھا اس لیے طشتریوں سے بچنے کی کوشش میں ایک بار توازن کھو بیٹھا تھا اور لڑکھڑا گیا تھا۔ اسی دوران میرا ایک بازو ایک چمکیلی ڈسک کی زد میں آتے آتے بچا تھا۔

ڈسک میرے بازو کو تو نہیں البتہ میرے کوٹ کی آستین کو چھوتے ہوئی گزری تھی اور وہیں سے آستین اس طرح کٹ گئی تھی جیسے کوئی انتہائی تیز دھار بلیڈ اس کے درمیان سے گزر گیا ہو۔ لڑکھڑاتے ہوئے اگر میں بائیں طرف کو تھوڑا سا اور جھک گیا ہوتا تو میرا بازو کسی نرم لکڑی کی طرح کٹ کر دور جا گرا ہوتا۔ اچھا بھلا افضل چوہدری "افضل ٹنڈا" بن جاتا۔

میں ٹیلے کے جس حصے پر پہنچ چکا تھا۔ وہاں یقیناً کچھ انسان بھی دبے ہوئے تھے۔ کہیں سے لہو میں لتھڑا ہوا کوئی ہاتھ، کہیں سے کوئی شکستہ ٹانگ اور کہیں سے کوئی کچلی ہوئی کھوپڑی جھانک رہی تھی۔ کوٹھی کو دھماکے سے منہدم ہوئے ابھی چند منٹ بھی نہیں گزرے تھے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ کچھ لوگ ٹیلے تلے دبے، زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار سسک رہے ہوں لیکن ابھی نہ جانے

کب تک انہیں امداد میسّر آنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ان حالات میں اس وقت تک کوئی معجزہ ہی کسی کو زندہ رکھ سکتا تھا — فی الحال تو ملبے کے اوپر بھی دو انسان زندگی کی جنگ لڑ رہے تھے۔

مجھے اپنے عقب میں کچھ فاصلے پر کوٹھی کی چار دیواری کا بھی کچھ حصہ منہدم دکھائی دیا تھا۔ اس طرف گلی کا کارنر تھا اور اس طرف کوٹھیوں کی آڑ سے دو طرفہ فائرنگ جاری تھی۔ فائرنگ کرنے والا کوئی بھی شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آس پاس کے مکین بھی شاید اپنے اپنے محفوظ ترین کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔

میں اس طرف بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کھلی جگہ میں انسان کسی کی بھی فائرنگ کی زد میں آسکتا تھا۔ ہمارے لیے جس طرف سے نکلنا مناسب اور محفوظ دکھائی دے رہا تھا اس طرف نقرئی لباس والا ہمارا راستہ روکے کھڑا تھا۔

دفعتاً میں نے کہیں دور سے لاؤڈ اسپیکر کی کھڑکھڑاہٹ سنی پھر ایک مدّھم اور گونجیلی سی آواز سنائی دی "پولیس اس علاقے کو گھیرے میں لے چکی ہے۔ جو لوگ بھی قانون کو ہاتھ میں لیتے ہوئے فائرنگ میں مصروف ہیں۔ انہیں ہدایت کی جاتی ہے کہ فوراً اپنے اپنے ہتھیار پھینک دیں اور اپنی اپنی پناہ گاہوں سے باہر آجائیں۔"

اعلان کے شروع ہوتے ہی نقرئی لباس والا بھی اپنی جگہ رک گیا تھا۔ ہم تینوں گویا اپنی اپنی جگہ ساکت ہوگئے تھے۔ فائرنگ تھمی تو نہیں لیکن اس کی شدّت میں نمایاں کمی آگئی۔ اعلان بار بار دہرایا جارہا تھا۔ آواز سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اعلان کرنے والا فائرنگ اور ساری گڑبڑ کے اصل مرکز سے خاصا دور تھا اور علاقے کو محاصرے میں لیے جانے کے کوئی آثار کم از کم آس پاس تو دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ نہ جانے پولیس کتنی دور سے اور کس انداز سے علاقے کو محاصرے میں لے رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے منظر گویا اپنی جگہ ساکت ہوگیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ نقرئی لبادے والے کو اپنے ہیلمٹ نما حصے میں بھی نہایت معمولی سی کھڑکھڑاہٹ اور پھر کوئی ایسی آواز ابھری تھی جیسے بہت کم طاقت کے اسپیکر پر پیغام موصول ہو رہا ہو۔ نقرئی لباس والا غالباً پولیس کے اعلان کو نہیں بلکہ اسی پیغام کو بغور سننے کے لیے ساکت ہوا تھا۔ مجھ تک صرف ہلکی سی آواز پہنچ رہی تھی جو مکھی کی بھنبھناہٹ سے مشابہ تھی۔

چند سیکنڈ بعد یہ مدّھم آواز ختم ہوگئی اور ایک صاف، بلند واضح آواز ابھری۔ یہ آواز بھی گویا اسپیکر پر ہی ابھر رہی تھی لیکن صاف سمجھ میں آرہی تھی۔ ایک لمحے کی تاخیر سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ نقرئی لباس والے کی آواز تھی اور وہ مجھ سے ہی مخاطب تھا۔

"میں جارہا ہوں افضل چوہدری!" وہ کہہ رہا تھا "لیکن موت تمہارا مقدر ہو چکی ہے۔ دنیا کے کسی کونے میں بھی چلے جاؤ۔ کوئی طاقت تمہیں موت سے نہیں بچا سکے گی۔ چاہو تو اسی وقت سے بھاگنا شروع کردو۔ فائدہ تو کچھ نہیں ہوگا لیکن کچھ دیر کے لیے تمہارے دل کو ڈھارس رہے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے۔ دوسرے ہی لمحے وہ بھی سپرمین کی طرح زمین سے بلند ہو چکا تھا۔ چند سیکنڈ میں وہ اتنی بلندی پر پہنچ چکا تھا کہ ایک گڑیا کے برابر دکھائی دینے لگا تھا۔ پھر وہ ایک طرف کو پرواز کرتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

میں سرِدست اپنی حیرت کو فراموش کرتے ہوئے زقندیں بھرتا ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا۔ راحیلہ میرے پیچھے تھی۔ ڈرائنگ روم میں سب اسی طرح آڑے ترچھے پڑے تھے۔ میں نے سب سے پہلے حفیظ صاحب کو ہلا جُلا کر دیکھا۔ وہ بے ہوش تھے لیکن بظاہر یہی محسوس ہوتا تھا کہ انہیں کوئی گزند نہیں پہنچائی گئی تھی۔

لیکن جو لوگ ان کی حفاظت کا فریضہ انجام دینے آئے تھے ان کی حالت پر میں دل ہی دل میں افسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ ان سب کی گردنیں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ ان ہٹے کٹے، تنومند اور بظاہر کافی سخت جان نظر آنے والے جوانوں کی گردنیں اس طرح ٹوٹی ہوئی تھیں جیسے کسی ضدی بچے نے جھنجلا کر کسی بچی کی گڑیوں کی گردنیں مروڑ ڈالی ہوں۔ حفیظ صاحب کو نہ جانے کیوں بخش دیا گیا تھا۔ شاید اس میں بھی کوئی مصلحت رہی ہو۔ وہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن انہیں محفوظ پاکر بہرحال میرے دل کو قدرے اطمینان ہوا تھا۔

"راحیلہ!" میں نے گہری سانس لے کر اٹھتے ہوئے کہا "میں یہاں سے فوراً نکل رہا ہوں۔ ساتھیوں کے لیے بھی پیغام دے دو کہ وہ فوراً یہاں سے نکلنے کی کوشش کریں۔ میرا خیال ہے، حفیظ صاحب نے خفیہ ایجنسیوں کو بھی الرٹ کر رکھا تھا تبھی پولیس اتنی جلدی یہاں پہنچ گئی ہے۔ شاید پولیس کے ساتھ خفیہ ایجنسیوں کے لوگ بھی ہوں۔ میں نہیں چاہتا۔ انہیں معلوم ہو کہ ہم نے اپنے طور پر بھی کوئی آپریشن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ساتھیوں تک پیغام پہنچاؤ کہ وہ بچ کر نکل جائیں۔ کوئی ساتھی کسی سرکاری آدمی سے تصادم مول نہ لے اور نہ ہی کسی کے ہتھے چڑھے۔"

"یہ سب کچھ تو پہلے ہی سے طے ہے۔" راحیلہ نے بتایا "ان میں سے بیشتر تو کھسک بھی چکے ہوں گے۔ تم نے محسوس نہیں کیا، فائرنگ کی آوازیں تقریباً معدوم ہو چکی ہیں۔"

"چلو یہ بھی غنیمت ہے۔" میں نے اطمینان کی سانس لی "اب تم ایک کام کرو۔ کوٹھی کے گیٹ پر..... باہر گلی میں میری گاڑی کھڑی تھی۔ تباہی کی وجہ سے ادھر کا حصہ بالکل اوپن ہو چکا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری شکل پہچاننے والا کوئی شخص دور سے بھی مجھے دیکھے۔ تم ادھر جا کر دیکھو۔ اگر گاڑی کو زیادہ نقصان نہ پہنچا ہو اور وہ آسانی سے اسٹارٹ ہو جائے تو اسے پچھلی گلی میں اس کوٹھی سے ذرا آگے لے آؤ۔ اگر تم ذرا بھی خطرہ محسوس کرو تو پھر گاڑی کے چکر میں نہ پڑنا۔ خود کھسکنے کی فکر کرنا۔ میں صرف ایک

آدھ منٹ تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر مجھے بھی محاصرہ کرنے والوں کی نظر میں آنے کا خطرہ محسوس ہوا تو میں گاڑی کا انتظار کیے بغیر ہی نکل جاؤں گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں گاڑی ادھر لانے کی کوشش کرتی ہوں۔" راحیلہ نے کہا۔

ہم دونوں تیزی سے ڈرائنگ روم سے نکلے اور الگ الگ سمتوں میں بھاگے۔ میں ملبے کو پھلانگتا پچھلی گلی کی طرف آیا۔ ایک شکستہ دیوار کی آڑ لے کر میں نے گلی میں جھانکا۔ عقبی گلی بھی کافی چوڑی تھی۔ شاید اسی لیے تباہی کے اثرات دوسری طرف کی کوٹھیوں تک نہیں پہنچے تھے۔

گلی میں ویرانی تھی۔ کوٹھیوں سے بھی کوئی جھانکتا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شاید سب محفوظ ترین کونے کھدروں میں دبکے ہوئے تھے۔ میں نے رکوع کی سی حالت میں دوڑتے ہوئے چند قدم کا فاصلہ طے کیا اور ایک کوڑے دان کی اوٹ میں ہوگیا۔ میں حفیظ صاحب کی تباہ شدہ کوٹھی سے کچھ دور ہٹ جانا چاہتا تھا۔

محاصرہ کرنے والوں کا کہیں کوئی نام و نشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نہ جانے وہ کس حکمتِ عملی سے اس طرف بڑھ رہے تھے۔ ممکن تھا فی الحال ان کی تعداد بہت کم رہی ہو اور وہ اعلان انہوں نے مرعوب کرنے کے لیے ہی کیا ہو۔ ارد گرد چھا جانے والا سناٹا بتا رہا تھا کہ کمانڈو ٹائپ کے جو دہشت گرد میرے ساتھیوں سے برسرِ پیکار تھے وہ بھی نہایت آسانی سے اپنی اپنی کمیں گاہوں سے نکل کر فرار ہو چکے تھے۔

میرا بوجھل دماغ کوڑے دان کی بو سے کچھ اور بوجھل ہوا جارہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر سانس روک لی جس کی مجھے کافی مشق تھی۔ چند سیکنڈ بعد ہی میں نے اپنی گاڑی آندھی طوفان کی طرح گلی میں داخل ہوتی دیکھی۔ راحیلہ ابھی تک بھکارن ہی کے حلیے میں تھی لیکن یہ بھکارن لاہور کی چند مہنگی ترین گاڑیوں میں سے ایک گاڑی ڈرائیو کرتی آرہی تھی۔

میں کوڑے دان کے عقب سے نکل آیا تھا۔ گاڑی ایک دھچکے سے میرے برابر آن رکی۔ راحیلہ ڈرائیونگ سیٹ سے کھسک گئی اور اس نے اشارے سے بتایا "پولیس بہت کم تعداد میں آئی ہے۔ شاید ابھی انہیں کمک کا انتظار ہے۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ صرف تین سمتوں میں موجود ہیں۔ تم ادھر سے نکل سکتے ہو۔" اس کا اشارہ گلی کے دوسرے سرے کی طرف تھا۔

یہ کہہ کر وہ خود گاڑی سے اترنے لگی تو میں نے کہا "تم بیٹھی رہو نا۔ میں تمہیں بھی لیے چلتا ہوں۔"

"نہیں" وہ تیزی سے بولی "میں یہ اطمینان کرنے کے بعد ہی نکلوں گی کہ تمام ساتھی یہاں سے نکل گئے ہیں۔ رانی! مجھے افسوس ہے کہ اس آپریشن کا وہ نتیجہ نہیں نکل سکا جس کی مجھے امید تھی۔"

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔" میں نے اس کا مٹی میں لتھڑا ہوا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "ریڈ ڈاٹ کے سلسلے میں ابھی تک میرے اپنے اندازے غلط ہو جاتے ہیں۔ بہرحال اس تجربے سے تمہیں یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ ہمارا واسطہ کس قسم کے لوگوں سے ہے اور تم نے وہ دھمکی بھی سن لی ہوگی جو وہ سپرمین کا بچہ دے کر گیا ہے۔"

وہ گاڑی سے اتر چکی تھی لیکن کھڑکی پر جھکی ہوئی تھی۔ ذرا دور سے کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ ان حالات میں بھی بھکارن گاڑی والے سے بھیک لینے کی کوشش کر رہی تھی۔

"اب تم کہاں جا رہے ہو؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔"

"کیا مطلب؟" وہ بری طرح چونکی۔

"میری شاید اب کافی عرصے تک تم سے ملاقات نہ ہو سکے۔" میں نے کہا۔

"آخر تم کہاں...... جا کہاں رہے ہو؟ کچھ تو پتا چلے۔" کھڑکی کے کنارے پر اس کے ہاتھوں کی گرفت اتنی مضبوط ہوگئی کہ اس کے ناخن سفید نظر آنے لگے۔ اتنا ہنگامہ برپا رہنے کے دوران وہ ذرا بھی متاثر دکھائی نہیں دی تھی لیکن اب یکدم ہی گویا اس کی آنکھوں میں ویرانیاں اتر آئیں۔

"یہ وقت زیادہ باتیں کرنے کا نہیں ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا "صفدر تمہیں سب کچھ بتا دے گا۔ مجھے جلد از جلد اس کے پاس پہنچنا ہے۔ وہ میرا انتظار کر رہا ہوگا۔"

"کیا اسی لیے تم نے اسے اس مہم میں حصہ نہیں لینے دیا تھا؟" راحیلہ نے پوچھا۔

"ہاں۔ مجھے اس کی ضرورت تھی۔ میں نے احتیاطاً اسے ایک جگہ بٹھا رکھا ہے۔ مجھے اس قسم کی صورتِ حال کا اندیشہ تھا۔" میں نے کہا اور کلچ سے پاؤں دھیرے دھیرے اٹھانے لگا۔ گاڑی رینگنے لگی۔

راحیلہ نے کھڑکی نہیں چھوڑی اور گاڑی کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتے ہوئے بولی "کیا تمہیں میری ضرورت نہیں؟"

"راحیلہ... میری جان! کیسی باتیں کر رہی ہو؟" میں نے یکدم گاڑی روک دی "مجھے جتنی تمہاری اب ضرورت ہے۔ زندگی میں پہلے کبھی نہ تھی لیکن مجھے تمہاری ضرورت تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لیے نہیں ہے۔ مجھے تمہاری ضرورت یہاں ہے۔ میری عدم موجودگی میں تمہیں سب کچھ سنبھالنا ہے۔ جیسا کہ میٹنگ میں طے ہوا تھا۔ اپنے آپ کو بھاری ذمّے داریوں کے لیے تیار کر لو۔"

میں نے گاڑی آگے بڑھائی تو وہ ایک بار پھر گاڑی کے ساتھ ساتھ بڑھتے ہوئے بولی "میں ان ذمّے داریوں کی اہل نہیں ہوں۔"

"اب اہلیت اور نااہلیت پر بحث کرنے کا وقت نہیں رہا۔"

میں نے تیزی سے کہا۔

"اچھا... ایک بات بتاتے جاؤ؟" وہ گاڑی کے ساتھ تقریباً دوڑتے ہوئے بولی۔

"پوچھو۔ عورت سُولی پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور پوچھے گی۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"کیا تمہارے خیال میں یہ سب کچھ میری حماقت کی وجہ سے ہوا؟" اس فولادی عورت کی آنکھوں میں نمی جھلملا رہی تھی۔

"نہیں۔ یہ سب کچھ ہماری قسمت کی وجہ سے ہوا اور اس میں پریشان یا دل شکستہ ہونے اور پچھتاوا محسوس کرنے کی کوئی بات نہیں۔ ہم زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے والے لوگ ہیں۔ ہماری زندگی میں نشیب و فراز تو آتے ہی رہیں گے۔ تم جو سمجھ رہی ہو' میں اس طرح نہیں سوچ رہا۔ نہ تمہاری وجہ سے مجھ پر کوئی مصیبت آئی ہے اور نہ میری وجہ سے تم پر۔ یہ تو اپنی اپنی قسمت ہے جو ساتھ رہے گی۔ خوش قسمتی یہ ہے کہ ہمیں ایک دوسرے کا سہارا میسّر ہے۔ خدا حافظ۔"

اس کے ہاتھ اب بھی کھڑکی پر جمے ہوئے تھے۔

"پلیز... راحیلہ کھڑکی چھوڑ دو۔ ہو سکتا ہے میں کل ہی واپس آجاؤں۔ عام سی عورتوں کی طرح جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"قسم کھاؤ' تم مجھ سے خفا نہیں ہو!"

"خدا کی پناہ...! دل چاہ رہا ہے یہیں اسٹیئرنگ وہیل سے سر ٹکرا کر مرجاؤں۔" میں نے بے بسی سے کہا "تم نے تو فلمی ہیروئن کی طرح مجھ سے قسمیں لینی شروع کردیں۔ تم نے ایسا کون سا کام کیا ہے جو میں تم سے خفا ہو جاؤں؟ ویسے بھی میں نے تمہارے لیے دل میں جتنی محبت جمع کر رکھی ہے اس کے بعد خفگی کی گنجائش ہی نہیں رہی۔"

تب اس کی جھلمل کرتی آنکھوں میں طمانیت دَر آئی۔ گہری سانس لے کر وہ سیدھی کھڑی ہوگئی اور میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھادی۔

یہ تمام واقعات درحقیقت پندرہ منٹ سے بھی کم وقت میں گزرے تھے لیکن جب میں اس گلی سے نکلا تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میں جنگ و جدل اور مار دھاڑ سے بھرپور ایک طویل دَور گزار کر آرہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ گلی کے سرے پر شاید اچانک کہیں سے کوئی نکل آئے اور مجھے روکنے کی کوشش کی جائے۔ میں گاڑی کو کسی بھی قسم کی رکاوٹ سے نکال لے جانے کے لیے تیار تھا لیکن اس بات پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ کسی نے مجھے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ دہشت گرد اکثر مقامات سے اسی لیے نہایت اطمینان سے اپنی کارروائی کرکے فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ کم سے کم وقت میں انہیں روکنے اور گھیرنے کی کوئی منصوبہ بندی ہی نہیں ہو پاتی۔ برستی گولیوں اور گھات میں لگی بندوقوں کے سامنے جانے کی بھی کوئی جرأت نہیں کرپاتا۔ سرکاری لوگوں سمیت سب اسی فکر میں ہوتے ہیں کہ "مطلع" ذرا صاف ہو تو وہ آگے بڑھیں۔

میں ایک گلی سے دوسری میں گھستا ہوا جلد ہی اس بلاک سے نکل گیا تاہم میں نے یہ احتیاط ضرور رکھی کہ زیادہ تر عقبی گلیوں میں ہی رہا گو کہ اس کے لیے مجھے زگ زیگ کے سے انداز میں خاصا طویل فاصلہ طے کرنا پڑا لیکن فائدہ یہ رہا کہ کسی خطرے کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ سوائے اس کے کہ ایک بار میری گاڑی کا وہیل بغیر ڈھکنے کے ایک گٹر میں پھنستے پھنستے بچا۔

ماڈل ٹاؤن پرانے دور کا پوش علاقہ ہے۔ اس میں بلاکوں کی ساخت بیضوی سی ہے۔ زیادہ تر گلیاں اور بڑی سڑکیں نیم دائرے کی صورت میں ہیں۔ مین روڈ پر پہنچ کر میں نے گاڑی آندھی طوفان کی رفتار سے دوڑانا شروع کی۔ مجھے خاصا طویل فاصلہ طے کرنا تھا۔ بظاہر کوئی میرا تعاقب نہیں کررہا تھا۔

اس کے باوجود میں نے منزل پر پہنچنے سے پہلے اِدھر اُدھر کی سڑکوں پر کئی غیر ضروری چکر کاٹے۔ تب بھی مجھے کوئی اپنے تعاقب میں دکھائی نہ دیا۔ آخر کار میں نے گاڑی وارث روڈ کی طرف موڑی اور پھر ایک بغلی گلی میں گھُس گیا۔

اس گلی میں ٹی وی کی ایک مشہور ادھیڑ عمر اداکارہ رہتی تھی جو بیشتر ڈراموں میں بھابھی یا پھر ماں کا رول کرتی تھی۔ اس کے مکان کے عین عقب میں آج کل وہ ماہرِ فن میک اپ مین انوار رہتا تھا جو انسان کو کچھ سے کچھ بنادیتا تھا۔ دوسری گلی میں گھوم کر میں اس کے مکان پر پہنچا۔

انوار گیٹ پر ہی کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں مستقل طور پر یوں سرخ رہتی تھیں جیسے شب بیداری یا پھر ہر وقت پینے پلانے کا عادی ہو۔ حالانکہ دونوں میں سے کوئی بات درست نہیں تھی۔ اس نے دور سے ہی مجھے دیکھ لیا۔

وہ گیٹ کھول کر خاموشی سے اندر چلا گیا۔ میں بھی گاڑی کھڑی کرکے اس کے پیچھے پیچھے اندر جا پہنچا۔ اس کا مکان باہر سے کچھ خاص دکھائی نہیں دیتا تھا لیکن اندر سے اچھا خاصا شاندار تھا۔

اس کے پیچھے پیچھے میں جس طویل و عریض ہال میں داخل ہوا۔ وہ ایک شاندار میک اپ روم تھا۔ ہمارے کسی فلم اسٹوڈیو کو بھی ایسا میک اپ روم میسّر نہیں تھا۔ وہیں ایک گوشے میں ایک آرام دہ کرسی پر اطمینان سے "میں" بیٹھا سگریٹ کے ہلکے ہلکے کش لے رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر ذرا جھک کر بغور "اپنا" جائزہ لیا۔ مجھے یہی محسوس ہوا جیسے میں آئینہ دیکھ رہا تھا۔ درحقیقت وہ صفدر تھا۔ میرے قریبی اور جاں نثار ساتھیوں میں سے ایک.....

صفدر کی شخصیت میں پہلے ہی مجھ سے بڑی مشابہت پائی جاتی تھی لیکن انوار نے تو اسے ہو بہو میرا عکس بنادیا تھا۔ صفدر اپنی گھنی مونچھوں اور بھوری آنکھوں کی وجہ سے مجھ سے کچھ مختلف نظر آتا تھا لیکن اب مونچھیں صاف ہوچکی تھیں اور کونٹیکٹ لینز کی وجہ سے آنکھوں کا رنگ بھی میری آنکھوں کی طرح سیاہ ہوچکا تھا۔

انوار نے باقی چھوٹی موٹی تبدیلیاں بھی ایسی کی تھیں جو مستقل رہنے والی تھیں اور صفدر کو بار بار اس کے پاس آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ انوار تو ایسا ماہرِ فن تھا کہ باقاعدہ اور کوالیفائیڈ سرجن نہ ہونے کے باوجود چھوٹی موٹی پلاسٹک سرجری بھی کرلیتا تھا۔ صفدر کا قد کاٹھ اور جسمانی ساخت بھی کافی حد تک مجھ جیسی تھی۔ جو تھوڑا بہت فرق تھا وہ انوار نے لباس وغیرہ کی مدد سے چھپادیا تھا۔

انوار کے کام کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ بالکل فطری نظر آتا تھا۔ صفدر پر کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے روپ میں وہ کوئی اور تھا۔

دراصل میں نے ریڈ ڈاٹ والوں کے ہاں جب عرفانؔ کو دیکھا تھا اور پہلی نظر میں مجھے اس پر حفیظ صاحب کا شبہ ہوا تھا شاید تبھی میرے ذہن میں ایک خیال بیج کی طرح پھوٹ پڑا تھا جو بعد میں دھیرے دھیرے ایک واضح شکل اختیار کرتا چلا گیا تھا۔ آخر کار میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ اگر اشد مجبوری میں کبھی مجھے روپوش ہونا پڑا تو میں صفدر کو اپنی جگہ چھوڑ جاؤں گا۔

گویا یہ آئیڈیا مجھے ریڈ ڈاٹ نے ہی دیا تھا اور اس سے میں ریڈ ڈاٹ ہی کو غچہ دینے کی فکر میں تھا۔ زیادہ دیر کے لیے نہیں تو تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی۔ اگر دو چار دن کے لیے بھی ان کی توجہ میری طرف سے ہٹ جاتی تو میں دنیا کی بھیڑ میں ریڈ ڈاٹ سے زیادہ سے زیادہ دور نکل سکتا تھا۔ میرے ساتھیوں نے بھی کبھی اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ صفدر میں میری شخصیت کی کافی مشابہت پائی جاتی تھی۔

صفدر کا جائزہ لیتے لیتے میں انوار کی آواز سن کر چونکا۔ وہ کہہ رہا تھا "کیا خیال ہے سر؟ کام چل جائے گا؟"

"ضرور... ضرور" میں نے پُرامید لہجے میں کہا "انوار! تم اپنے فن سے واقعی مجھے حیران کردیتے ہو۔"

"یہ تو کوئی مشکل کام ہی نہیں تھا سر!" انوار انکساری سے بولا۔ "صفدر صاحب میں تو پہلے ہی آپ کی بڑی مشابہت موجود تھی۔ اگر آپ کسی ایسے شخص کو بھی بھیج دیتے جو آپ سے کافی مختلف ہوتا تو میں اسے بھی آپ کے سانچے میں ڈھال دیتا۔ بس اس کے لیے وقت ذرا زیادہ درکار ہوتا۔"

صفدر اطمینان سے سگریٹ کا ایک طویل کش لے کر مسکراتے ہوئے بولا "سر! میں آپ کے احترام میں اس لیے اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا کہ اس وقت میں واقعی خود کو افضل چوہدری محسوس کررہا ہوں۔"

"لیکن ساتھ ہی اتنی بڑی حماقت کررہے ہو جو تمہیں افضل چوہدری سے بہت مختلف بنا رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا سر؟" وہ ذرا چونکا۔

"تم اتنا دل لگا کر سگریٹ پی رہے ہو۔ تم نے کبھی مجھے سگریٹ پیتے دیکھا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اوہ" وہ انگلیوں میں دبی سگریٹ کی طرف دیکھ کر گہری سانس لے کر بولا "یہ فرق تو مجھے یاد ہے۔ میں بھولے سے سگریٹ نہیں پی رہا ہوں۔ یہ تو میں یہاں تخلیے میں بیٹھا تھا اس لیے سوچا کہ اپنا شغل جاری رکھوں لیکن آئندہ میں اپنی اس عادت پر کنٹرول رکھوں گا اور دوسروں کے سامنے کبھی بھول کر بھی سگریٹ نہیں پیوں گا۔ بلکہ ہو سکا تو یہ عادت ہی چھوڑ دوں گا۔"

"میرے لیے تو تمہاری یہی قربانی کافی ہوگی۔ میں اس کا بھی کوئی صلہ نہیں دے سکوں گا۔ کسی کی خاطر کوئی اپنا نشہ چھوڑ دے یہ بڑی محبت کی بات ہوتی ہے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "صفدر! میں یہ بھی واضح کردینا چاہتا ہوں کہ اس روپ میں تمہاری جان کو شدید خطرہ لاحق ہوگا۔ خطرہ ریڈ ڈاٹ کی طرف سے ہوگا اور یہ تو اب میں سب ساتھیوں کو بتا ہی چکا ہوں کہ ریڈ ڈاٹ کیا چیز ہے۔ وہ جسے اپنی ہِٹ لسٹ پر رکھ لے اس کے بچنے کی صرف دعا ہی کی جاسکتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے سر! یہ بات تو آپ مجھے بتا چکے ہیں۔" صفدر بے خوفی سے بولا۔ اس کی مسکراہٹ برقرار تھی۔

"ابھی وقت تک تو ریڈ ڈاٹ نے مجھے مارنے کی باقاعدہ دھمکی نہیں دی تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب تو میری موت کا فرمان جاری ہوچکا ہے۔ اس لیے میں نے سوچا ایک بار پھر تمہیں یاد دہانی کرادوں۔ اب تو مجھے بھی یقین ہوچکا ہے کہ ریڈ ڈاٹ جب موت کی بات کرتی ہے تو اس کا مطلب واقعی موت ہوتا ہے۔ تم جب میرے روپ میں ہوگے تو یوں سمجھو کہ فرشتۂ اجل کے زیرِ سایہ پھر رہے ہوگے۔"

"اگر اوپر والے کو منظور ہوا تو فرشتۂ اجل ہی میری زندگی کا محافظ بن جائے گا۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"پھر بھی... بہرحال تم اس ذمّے داری کے لیے مجبور نہیں ہو۔ یہ محض ایک تجویز تھی۔ اسے قبول کرنا یا نہ کرنا تمہارے اختیار میں تھا۔ تم چاہو تو اب بھی انکار کرسکتے ہو۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ ابھی تم صرف اپنی گھنی مونچھوں سے محروم ہوئے ہو۔ وہ تھوڑے عرصے میں دوبارہ اُگ آئیں گی۔ فی الحال گزارے کے لیے انوار تمہیں نقلی مونچھیں لگادے گا۔ تم یہاں سے صفدر ہی کی حیثیت سے واپس جاسکتے ہو۔"

صفدر ہنسنے لگا پھر سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے بولا "سر! ایک میں ہی کیا.... ہمارے ساتھیوں میں کوئی بھی ایسا نہیں جو ایک بار آپ کے سامنے کسی کام کی ہامی بھر کے بیک آؤٹ کرجائے۔ ... معلوم ہے ہم آپ کے غلام نہیں۔ جانیں تو ہم اپنی خوشی سے

آپ پر نثار کرنے کے لیے ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ مجھے یہ موقع مل رہا ہے تو میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھ رہا ہوں۔ آپ مجھے کیوں اس اعزاز سے محروم کرنا چاہتے ہیں کہ کبھی میں نے افضل چوہدری کی حیثیت سے کچھ وقت گزارا تھا۔"

"لیکن ایک بات کا خیال رکھنا یار!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کچھ خواتین بھی میری قریبی دوست ہیں۔ کوئی ناجائز فائدہ مت اٹھا جانا۔"

اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ وہ جلدی سے بولا "نہیں میں سب سے پہلے بتادوں گا کہ میں نقل مطابق اصل ہوں۔ دو نمبر مال ہوں۔"

"پھر تو اس راز کا اللہ ہی حافظ ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "خیر... چھوڑو ان باتوں کو۔ میں بہت بوجھل ذہن لے کر یہاں آیا تھا۔ تم سے بات چیت کرکے دل کو بڑا اطمینان ہوا ہے۔ باقی تیاریاں مکمل ہیں؟"

"جی ہاں۔ آپ کا مطلوبہ لباس ادھر موجود ہے۔ آپ پہلے لباس تبدیل کرلیں۔ پھر انوار اپنا کام کرے گا۔" صفدر نے ایک پارٹیشن کی طرف اشارہ کیا۔ پارٹیشن کے دوسری طرف کا حصہ ڈریسنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

وہاں پہنچ کر میں نے لباس تبدیل کیا۔ میں واپس کمرے میں آیا تو ایک ڈھیلے ڈھالے پرانے اور معمولی سے شلوار قمیص میں تھا۔ گلے میں مفلر تھا۔ پیروں میں پشاوری چپل۔

ان معمولی تبدیلیوں سے ہی میری شخصیت کا تاثر بدل کر رہ گیا۔ میں بڑے سے دیوار گیر آئینے کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔ انوار میرے چہرے میں کچھ اور تبدیلیاں لانے لگا۔ وہ بلاشبہ ایک ذہین آدمی تھا۔ مستقل میک اپ جدید تیکنیک سے تو کرتا ہی تھا لیکن اس میں اپنی ذہانت سے بھی خوب کام لیتا تھا جس کا ایک نمونہ یہ تھا کہ وہ بہت چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں لاتا تھا' بہت معمولی اضافے کرتا تھا تاکہ میک اپ جلد خراب نہ ہو لیکن ان معمولی تبدیلیوں اور اضافوں سے زمین آسمان کا فرق پڑجاتا تھا۔

صفدر اس دوران ڈریسنگ روم میں چلا گیا جہاں میں اپنا لباس اور جوتے وغیرہ چھوڑ آیا تھا۔ کچھ دیر بعد وہ یہ چیزیں پہن کر باہر آیا تو مکمل طور پر افضل چوہدری نظر آرہا تھا۔ اس کے میری شخصیت میں ڈھلنے میں جو تھوڑی بہت کمی رہ گئی تھی اب وہ بھی پوری ہوگئی تھی۔

میں نے گاڑی کی چابیاں اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ بھی رکھ لو۔ یہ گاڑی مجھے بہت عزیز رہی ہے۔ بہت ساتھ دیا ہے اس نے میرا۔ تمہیں معلوم ہے اس میں بہت سے اضافے خاص طور پر خود کرائے تھے میں نے۔ کچھ کمپنی سے اور کچھ یہیں۔"

"میں اس گاڑی کی پوری پوری حفاظت کرنے کی کوشش کروں گا سر۔" صفدر چابیاں لیتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔ میرا یہ مقصد نہیں تھا۔ حفاظت تو تم صرف اپنی جان کی کرنا۔ جان سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں۔ جان سلامت رہے تو انسان نہ جانے کیا کچھ بنانے کی امید رکھ سکتا ہے۔ میرا کہنے کا مقصد یہ تھا کہ گاڑی کو محض گاڑی کے طور پر ہی مت استعمال کرنا۔ اس سے پورا پورا کام لینے کی کوشش کرنا۔ یہ تمہاری جان کی حفاظت کے سلسلے میں بڑا اہم کردار ادا کرسکتی ہے۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے سر! میں پوری کوشش کروں گا۔" صفدر بولا۔

"بس اب تم نکل جاؤ۔" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "تاکہ اگر کوئی غیبی آنکھ اس مکان کی نگرانی کررہی ہو تو اسے زیادہ شک نہ ہونے پائے۔"

"اوکے سر! میں چلتا ہوں۔ وش یو گڈ لک۔"

"تھینک یو" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور وہ دروازے کی طرف چل دیا۔ میں عقب سے بغور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ میری ہی طرح چلنے میں کافی حد تک کامیاب تھا۔

وہ رخصت ہوچکا تو انوار نے ایک بار پھر اپنا کام شروع کردیا۔ اس نے میرے بال تراش کر چھوٹے کردیے۔ انہیں چکنائی زدہ بنادیا اور اسٹائل بھی بدل دیا۔ میرے رخسار کی ہڈی کے ابھار پر ایک موٹے سے مسّے کا بھی اضافہ ہوگیا۔ چھوٹے چھوٹے بالوں والی لیکن پٹی کی طرح چوڑی مونچھیں بھی نمودار ہوگئیں۔

"یہ مونچھیں کافی دن تک آپ کا ساتھ دے جائیں گی۔" انوار اپنا کام جاری رکھتے ہوئے بولا "مجھے نہیں معلوم آپ کو کس نوعیت کا خطرہ لاحق ہے لیکن اس دوران شاید آپ خطرے کی زد سے نکل ہی جائیں۔ جب آپ کی اصل مونچھیں تھوڑی بہت نکل آئیں تو انہیں یہی اسٹائل دینا شروع کردیجیے گا اور یہ نقلی والی جس حد تک باقی رہ جائیں ان سے جان چھڑانے کا طریقہ بھی سمجھ لیجیے۔ اگر یہ میک اپ خراب ہونے کے بعد بھی ختم نہ کیا گیا تو پھر پول کھلنے لگے گا۔"

اس نے میک اپ صاف کرنے کا طریقہ بھی مجھے سمجھادیا۔ کچھ دیر بعد میں اس کی کرسی سے اٹھا تو ایک سیدھا سادا بلکہ کسی حد تک بے وقوف سا دیہاتی لگ رہا تھا۔ شاید یہی اصل افضل چوہدری تھا۔ شاید انوار نے مجھ پر کوئی نیا خول چڑھایا نہیں تھا بلکہ گزرے برسوں میں مجھ پر چڑھ جانے والا خول اتار دیا تھا۔ میں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر مسکرادیا۔ برسوں بعد میری اپنے لڑکپن کے افضل چوہدری سے ملاقات ہورہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ لڑکپن میں میری ایسی سیاہ پٹی جیسی احمقانہ مونچھیں نہیں تھیں۔

ایک کرسی پر صفدر میرے لیے ایک تھیلا چھوڑ گیا تھا۔ وہ موٹے کپڑے کا ایک مستطیل اور پرانا سا تھیلا تھا جیسا عام طور پر پرانی وضع کے غریب دیہاتی سودا سلف لانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس تھیلے میں سب سے اوپر ڈیڑھ دو کلو پیاز تھی۔ اس سے نیچے اخبار میں لپٹا ہوا کپڑوں کا ایک فاضل جوڑا تھا اور اس سے نیچے ایک پوٹلی میں بڑے نوٹوں کی گڈیوں کی صورت میں پندرہ لاکھ روپیہ تھا۔ اوپر سے کوئی تھیلے میں جھانکتا تو اسے صرف پیاز ہی دکھائی دیتی۔ ان کے نیچے میرا زادِ راہ پوشیدہ تھا۔

انوار کا شکریہ ادا کرکے میں اس کے گھر سے نکلا تو گیٹ سے ذرا آگے مکان کے کونے پر دیوار کے سہارے ایک سائیکل کھڑی ہوئی تھی جس کے کیریئر پر دونوں طرف دودھ کا ایک ایک ڈرم لٹکا ہوا تھا۔ اس پر جو دودھ والا آیا تھا وہ انوار کے مکان میں کچھ دیر پہلے سامنے کے گیٹ سے داخل ہوکر پچھلے دروازے سے نکل کر جاچکا تھا۔ میں درحقیقت اب اسی دودھ والے کے حلیے میں تھا۔ یہ انتظام بھی میرے لیے انوار نے کیا تھا۔

میں سائیکل کے قریب پہنچا تو ایک صاف ستھرا سا بچہ نیکر بش شرٹ پہنے' ہاتھ میں ڈول لئے سائیکل کے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے سائیکل سنبھالی تو وہ جلدی سے ڈول آگے بڑھاتے ہوئے بولا "دودھ والے انکل! ایک لیٹر دودھ تو دیتے جائیں۔"

مجھے معلوم تھا ڈرم خالی تھے' مجھے سائیکل پر خاصا فاصلہ طے کرنا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سائیکل چلانے کی مشقت کے ساتھ ساتھ مجھے خواہ مخواہ دودھ سے بھرے ڈرم کھینچنا پڑیں۔ اس لیے جب میں نے صفدر کو یہ تمام انتظامات کرنے کی ہدایت کی تھی تو یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ڈرم خالی ہی ہونے چاہئیں۔ اس نے آگے انوار کو ہدایات دی تھیں۔

"دودھ تو ختم ہوگیا ہے بیٹا! تم دکان سے لے لینا۔" میں نے بچے کے گال پر تھپکی دیتے ہوئے کہا اور جلدی سے سائیکل پر بیٹھ کر روانہ ہوگیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ دودھ کے مزید طلبگار نہ آن پہنچیں۔

کچھ دیر پہلے میں ایک بیش قیمت اور مخصوص ساخت کی مرسیڈیز میں یہاں پہنچا تھا تو ہر نظر مرعوبیت زدہ انداز میں میری طرف اٹھ رہی تھی۔ اب میں دودھ والے کی سائیکل پر جارہا تھا تو کوئی اک نگاہِ غلط انداز سے بھی میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ یہی میں چاہتا تھا۔ اب میں گلی کوچوں میں حرکت کرتی زندگی کا ایک حصہ تھا' روزمرہ کے منظر میں شامل ہوچکا تھا۔ لوگوں کی نظر میں ایک غیراہم انسان ہوچکا تھا جس کی طرف کسی کو نظر بھر کر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔

برسوں بعد سائیکل چلانے کا اتفاق ہورہا تھا۔ وہ بھی ایسی سائیکل جس کی گویا دم سے بندھے دو ڈرم کھڑکھڑا رہے تھے۔ شروع شروع میں مجھے کچھ اناڑی پن محسوس ہوا لیکن چیرنگ کراس کے قریب پہنچتے تک میں روانی سے سائیکل چلانے لگا تھا۔

بظاہر میں ٹریفک کا خیال رکھنے کے لیے پینڈووں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا لیکن درحقیقت میں جائزہ لینے کی کوشش کررہا تھا کہ کوئی میری طرف متوجہ ہے یا نہیں؟ آس پاس کوئی مشکوک صورت موجود ہے یا نہیں؟

بظاہر تو کوئی میری طرف متوجہ نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی ان معنوں میں کوئی مشکوک صورت دکھائی دے رہی تھی جو معنی اس وقت میرے ذہن میں تھے۔ ورنہ ویسے تو شہر کی سڑکوں پر رواں دواں چہروں میں سے بہت سے مجھے مشکوک ہی دکھائی دیتے تھے۔

بہرحال یہ بھی کوئی اطمینان بخش صورتِ حال نہیں تھی۔ ویسے تو کافی عرصے سے یہی ہورہا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی بھی شخص یا کوئی بھی مشکوک آدمی کبھی مجھے اپنا تعاقب کرتا دکھائی نہیں دیا تھا لیکن ریڈ ڈاٹ والوں نے جب بھی اور جہاں بھی چاہا تھا مجھے آن لیا تھا لیکن اب اپنی ہر چیز.... حتیٰ کہ اپنی اصل شکل و صورت سے بھی چھٹکارا پانے کے بعد میں ایک موہوم سی امید دل میں لیے جارہا تھا کہ شاید وہ مجھے تلاش نہ کرسکیں۔ میں ایک بہت ہی عام سا' بہت ہی حقیر سا آدمی بن کر اس دنیا کی بھیڑ میں کھوجانے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا اور مجھے اس میں وقت محسوس ہونے کے بجائے کچھ لطف سا آرہا تھا۔

واپڈا ہاؤس کے گرد چکر کاٹ کر آخرکار ذرا مطمئن ہوجانے کے بعد میں نے ڈیوس روڈ کے راستے ریلوے اسٹیشن کی طرف سفر شروع کردیا۔ پیاز کا تھیلا میری سائیکل کے ہینڈل پر لٹکا ہوا تھا۔

ریلوے اسٹیشن پہنچ کر میں نے سائیکل ڈرموں سمیت اسٹینڈ پر چھوڑی اور تھیلا ہاتھ میں لٹکائے ٹہلنے کے سے انداز میں ریلوے اسٹیشن کے اس وسیع حصے کی طرف بڑھا جو تھرڈ کلاس کے مسافروں کے لیے ویٹنگ روم' لاؤنج' مسافر خانہ وغیرہ کا کام دیتا تھا بلکہ بچے تو اسے باتھ روم کے طور پر بھی استعمال کرنے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ لگتا تھا کہ آج کل ریلوے اسٹیشن کو صاف ستھرا رکھنے اور مسافروں میں نظم و ضبط پیدا کرنے کی کافی کوششیں کی جارہی تھیں لیکن مسافر ان کوششوں کو حسبِ معمول ناکام بنانے میں لگے ہوئے تھے۔

پلیٹ فارم پر وہی بھگدڑ' وہی افراتفری' وہی آپا دھاپی مچی ہوئی تھی جو میں ہوش سنبھالنے کے بعد سے ریلوے اسٹیشنوں پر دیکھتا آیا تھا۔ اسی طرح لوگ بدحواس' ایک دوسرے پر گرتے پڑتے' منہ اٹھائے اِدھر سے اُدھر بھاگے جارہے تھے۔ اسی طرح کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

قلی سازوسامان کے انبار اٹھائے لرزاں و ترساں چلے جارہے تھے۔ لوہے کے ٹرنک اور بستر ایک دوسرے کی کھوپڑیوں سے ٹکرا رہے تھے۔ کہیں کہیں شوروغوغا' آہ وفغاں اور فریاد یا احتجاج ذرا زیادہ بلند ہوجاتا تھا۔ شوہر بیویوں پر اور بیویاں بچوں پر چیخ رہی تھیں۔

کسی نے گھبراہٹ میں کولر گود میں اٹھایا ہوا تھا اور بچے کو ہاتھ میں لٹکایا ہوا تھا۔ کہیں مسافر اس قلی کو ڈھونڈ رہے تھے جو ان کا

سامان اٹھا کر آگے روانہ ہوا تھا اور کہیں قلی مسافروں کو ڈھونڈ رہا تھا' اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سامان کو کس ڈبّے میں پھینکے اور کہیں قلی اور مسافر دونوں مل کر ان لوگوں کو ڈھونڈ رہے تھے جو انہیں چھوڑنے آئے تھے۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا لیکن بڑے بڑے "عظیم الشان" سجے سجائے لمبے چوڑے ٹھیلوں والے اپنے ٹھیلے اسی ہجوم کے درمیان سے گزارنے کی فکر میں تھے۔

میری نہ تو کوئی ریزرویشن تھی' نہ میں نے کوئی ٹکٹ لیا تھا اور نہ ہی میں ابھی صحیح طور پر فیصلہ کرپایا تھا کہ مجھے کہاں جانا تھا۔ میں پبلک ایڈریس سسٹم پر نشر ہونے والے اعلانات اس شوروشغب کے درمیان سنتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ ائرپورٹس اور ریلوے اسٹیشنوں پر ان اعلانات کے لیے استعمال ہونے والے اسپیکر کچھ عجیب ہی ہوتے ہیں اور آوازیں عجیب تر۔ بعض اوقات تو شبہ ہوتا ہے کہ خلا سے کسی ناقابلِ فہم زبان میں کوئی پیغام موصول ہورہا ہے۔

اعلانات سے اندازہ ہوا کہ سب سے پہلے پلیٹ فارم نمبر ایک سے تیز گام کراچی کے لیے روانہ ہونے والی تھی۔ میں بظاہر اپنی مطلوبہ بوگی تلاش کرتے ہوئے پلیٹ فارم پر اسی ٹرین کے قریب قریب چلنے لگا۔ تھرڈ کلاس کے ڈبّے جن پر اب سیکنڈ یا اکانومی کلاس کا جھومر لٹکا کر ان کی تباہ حالی کو چھپانے کی کوشش کی گئی تھی' میری توجہ کا مرکز تھے۔

ایک ڈبّا میں نے تاڑ لیا تھا۔ جس میں سب سے زیادہ رش تھا لیکن میں اس میں سوار نہیں ہوا۔ میرا ارادہ تھا کہ اس وقت سوار ہوں گا جب ٹرین ذرا رفتار پکڑے گی تاکہ اگر کوئی میری طرف متوجہ ہو تو آخری لمحے تک اندازہ نہ کرسکے کہ میرا کدھر کا ارادہ تھا اور میں کس ڈبّے میں سوار ہونا چاہتا تھا۔ میں اپنی دانست میں اب بھی ہر ممکن احتیاط کررہا تھا۔

میں گردوپیش کے بارے میں اب بھی چوکنا تھا۔ غیر محسوس طور پر اب بھی چاروں طرف کا جائزہ لینے کی کوشش کررہا تھا لیکن نتیجہ وہی تھا۔ اب بھی آس پاس کوئی ایسا شخص دکھائی نہیں دے رہا تھا جس کے بارے میں' میں سوچ سکتا کہ وہ میرے چکر میں تھا۔

تاہم ابھی میرے دل میں یہ امید پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ریڈ ڈاٹ کی توجہ واقعی میری طرف سے ہٹ گئی تھی۔ اب صفدر کو میری جگہ ہوٹل میں رہنا تھا۔ میری گاڑی میں میرے آفس جانا تھا۔ مجھے اس کو قربانی کا بکرا بنانا اچھا نہیں لگا تھا لیکن ایک تو میری تجویز سنتے ہی وہ مُصر ہوگیا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جان کو آگیا تھا۔ دوسرے مجھے کچھ خاص یقین نہیں تھا کہ میرے حصے کی مصیبتیں اس کی طرف منتقل ہوسکتی تھیں۔

میری یہ کوشش محض ایک طرح کا دل بہلاوا تھی۔ آخرکار میں نے یہی سوچا تھا کہ ایسا کرکے دیکھ لینے میں کوئی حرج شاید نہیں تھا۔ روپوش تو مجھے ہونا ہی تھا لیکن میں نے سوچا شاید صفدر کو اپنی جگہ چھوڑ کر جانے سے مجھے کچھ زیادہ مہلت مل جائے ورنہ اس قسم کی کسی کوشش کے ذریعے ریڈ ڈاٹ کو بے وقوف بنانے کی امید مجھے ذرا کم ہی تھی۔

ٹرین نے رینگنا شروع کیا تو بہت سے لوگ ٹرین سے باہر لڑھک پڑے۔ یہ وہ لوگ تھے جو کسی نہ کسی کو چھوڑنے آئے تھے۔ کچھ گردوپیش سے بے نیاز' منہ اٹھائے' ہاتھ ہلاتے ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ ان سب کی مجموعی تعداد مسافروں سے کہیں زیادہ معلوم ہوتی تھی۔

میں بھی ٹرین کے ساتھ ساتھ بظاہر آرام سے چلا جارہا تھا۔ جب میرا تاڑا ہوا کمپارٹمنٹ میرے قریب آیا تو میں اچانک ہی لپک کر اس میں سوار ہوگیا۔ جہاں تک میری نظر گئی' میں نے اپنے بعد کسی کو بھی ٹرین میں سوار ہوتے نہیں دیکھا۔

میں دروازے ہی میں کھڑا ہوگیا۔ آس پاس تین چار افراد اور بھی کھڑے تھے۔ رنگ برنگے چولے اور گھاگرے والی ایک سیاہ فام عورت بھی باتھ روم کے دروازے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ اس کے ساتھ تین چار سیاہ فام سے ہی بچے بھی تھے جو انتہائی اتحاد اور یگانگت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کورس کی سی صورت میں ریں ریں کررہے تھے۔

عورت نے سفید پلاسٹک کی چوڑیاں یوں کہنیوں تک پہنی ہوئی تھیں جیسے دونوں بازوؤں پر پلستر چڑھا ہوا تھا۔ سیاہ جلد کے ساتھ سفید چوڑیوں کا تضاد خوب تھا۔ ناک' کان' گلے میں چاندی کے بھاری بھاری زیورات لٹکے ہوئے تھے۔ وہ کسی گہرے خیال میں کھوئی معلوم ہوتی تھی لیکن تھوڑی دیر بعد وہ خیالوں سے چونکتی' سب بچوں کو ایک ایک دھموکا رسید کرتی' تھری زبان میں تیزی سے سب کو نہ جانے کیا کچھ کہتی اور پھر اسی طرح ہاتھ رخسار پر ٹکا کر خیالوں میں کھوجاتی۔

تنگ سے راستے میں بہت سا سامان بھی ٹھُنسا ہوا تھا۔ نہ جانے کس کس کا تھا۔ بہرحال گھریلو ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ جھاڑو سے لے کر ہانڈیاں اور کنستر تک۔ کپڑے ٹانگنے کی کھونٹیوں سے لے کر چارپائیاں تک۔ چارپائیوں کے پائے نکال کر ان کے لمبے لمبے بنڈل سے بنادیے گئے تھے۔

اسی سازو سامان کے درمیان ہم کئی افراد پاؤں پھنسائے کھڑے تھے۔ ٹرین ابھی لاہور کی حدود میں ہی تھی۔ کوٹ لکھپت کی طرف جارہی تھی۔ آبادیوں کے درمیان سے ہی گزر رہی تھی لیکن یہ احساس بہرحال دل میں لحہ بہ لحہ گہرا ہورہا تھا کہ وہ لاہور سے دور ہوتی جارہی تھی۔

اداسی کی ایک لہر نے میرے دل میں پنجے گاڑنے کی کوشش کی لیکن میں نے جلد ہی اس سے جان چھڑالی۔ دراصل دل کے کسی تاریک گوشے سے ایک مبہم سا سوال باربار سر اٹھا رہا تھا "کیا میں دوبارہ لاہور کی صورت دیکھ سکوں گا؟"

اس سوال کا کوئی یقینی جواب میرے پاس نہیں تھا اور یہی بے یقینی خنجر کی طرح سینے میں اتر رہی تھی۔ برف کی طرح حواس پہ چھا رہی تھی۔ لاہور کی خوشبو میری نس نس میں رچ چکی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اب یہاں میری جڑیں بہت گہری ہوچکی تھیں۔ یہاں کے گلی کوچے ہر لمحے گویا میرے لیے بازو پھیلائے رکھتے تھے لیکن اب جیسے کوئی نادیدہ ہاتھ اس شہرِ بے مثال سے میرا رشتہ کاٹنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ سبھی ہاتھ انتہائی مکروہ' گھناؤنے اور سفاک ہوتے ہیں جو ان شہروں سے انسانوں کا رشتہ کاٹ دینے میں لگے رہتے ہیں جہاں ان کی جڑیں گہری ہوچکی ہوتی ہیں۔

لاہور کے مقابلے میں کراچی کہیں بڑا شہر تھا۔ زیادہ بڑا کاروباری مرکز تھا۔ بندرگاہ' انٹرنیشنل ائرپورٹ اور بینکوں کے صدر دفاتر وہیں تھے۔ اس کے باوجود میں نے اپنا ہیڈ آفس لاہور میں بنایا تھا حالانکہ بظاہر میرا اس شہر سے کوئی رشتہ بھی نہیں تھا۔

پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اتنا دیوداس بھی بننے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر قسمت میں ہوا تو ضرور دوبارہ لاہور آؤں گا۔ دوستوں کے درمیان رہوں گا۔ محبت کرنے والوں سے مجلس رہے گی۔ پھر وہی شب و روز ہوں گے۔ پھر وہی محفل آرائیاں ہوں گی۔ میری یہ سزا مستقل نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ میں نے کوئی غلط کام نہیں کیا تھا۔ میں راستی پر تھا۔ دیس کی محبت میں یہ تکالیف اٹھا رہا تھا۔ نادانی کا زمانہ ہوتا تو شاید میں بک چکا ہوتا' بدخواہوں کے بہکاوے میں آچکا ہوتا۔ میں یہی سمجھتا کہ میں لوگوں پر حکمرانی کی طاقت حاصل کررہا ہوں' عیش و آرام اور دولت کے انبار میرا مقدر ہوں گے لیکن درحقیقت میں ان طاقتوں کی کٹھ پتلی ہوتا جن کے چنگل میں ایک بار پھنسنے کے بعد کوئی نکل نہیں سکتا۔ ملکوں کے سربراہ بن جانے کے بعد بھی لوگ ان کے شکنجے سے آزاد نہیں ہوسکتے تھے۔ جو آزاد ہونے کی کوشش کرتے تھے وہ مارے جاتے تھے۔

اب میں نادانیوں کے دور سے نکل آیا تھا اس لیے اس سنہرے جال میں پھنسنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ دولت اور طاقت کی ہوس نے مجھے اپنا غلام نہیں بنایا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ ان کی بات مان کر بھی مجھے چین کی زندگی نصیب نہیں ہوسکتی تھی تو پھر خواہ مخواہ اپنے ساتھ پوری قوم کو مروانے اور پورے ملک کے گلے میں غلامی کا طوق ڈلوانے کا کیا فائدہ تھا؟

میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ میری یہ تکالیف عارضی ہوں گی بلکہ اگر میں اپنی اصلیت کو یاد رکھوں تو یہ تکالیف مجھے تکالیف بھی محسوس نہیں ہوں گی۔ میرے ملک کے اسی فیصد لوگ انہی حالات میں زندگی گزار رہے تھے جن کے دائرے میں' میں قدم رکھ رہا تھا۔

مجھے اگر اس ٹرین میں بیٹھنے کی جگہ میسر نہیں تھی' باتھ روم کی بُو محسوس ہورہی تھی' اپنے اردگرد موجود محنت کشوں کے پسینے کی بُو محسوس ہورہی تھی' ہر چیز گندی گندی لگ رہی تھی اور ناگواری کا احساس دلا رہی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ مجھے برسوں بعد ان چیزوں سے واسطہ پڑ رہا تھا۔ ورنہ میرے لاکھوں ہم وطن تو اب بھی روزانہ انہی حالات سے گزر رہے تھے۔ وہ انہی "سہولتوں" کے ساتھ سفر کرتے تھے۔ انہی آسائشوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ اور وہ سب بھی میری ہی طرح انسان تھے۔ مگر مسئلہ یہی ہے کہ ہمیں صرف اس بے آرامی کا پتا چلتا ہے جو ہمیں خود اٹھانی پڑتی ہے۔ ہماری نظر میں تکلیف صرف وہی ہوتی ہے جو ہمیں اٹھانی پڑتی ہے۔ دوسرے کس جہنم میں جل رہے ہیں اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہوتی۔

میں اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کررہا تھا کہ یہ میرے لیے اچھا ہی ہے مجھے ان اسّی فیصد لوگوں میں واپس آنے کا موقع مل رہا تھا جو اس ملک کی اصل بنیاد تھے۔ مجھے اب زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع مل سکتا تھا۔ شاید گم نامی اور بے وقعتی میں میرے لیے امان اور عافیت تھی۔ اگر میں ایک حقیر قطرے کی طرح اس سمندر میں گم ہوجاتا تو شاید ریڈ ڈاٹ کو مجھے تلاش کرنے اور کوئی اہمیت دینے کی ضرورت نہ پڑتی۔

ٹرین کو لاہور سے روانہ ہوئے تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے۔ آبادی کے آثار بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ دونوں طرف سرسبز کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ شام کا اندھیرا گہرا ہورہا تھا۔ میرے آس پاس کھڑے ہوئے تینوں مرد تھک ہار کر اِدھر اُدھر جگہ بنا کر بیٹھ چکے تھے۔ میں ابھی ستون کی طرح دروازے ہی کے پاس گڑا کھڑا تھا۔ کھلے دروازے سے بے تحاشا مٹی آنے لگی تھی اس لیے ساتھی مسافروں کی درخواست پر میں نے دروازہ بند کردیا تھا اور اسی کے قریب کونے میں سکڑ سمٹ کر کھڑا ہوگیا تھا۔

میں زندگی کو قریب سے دیکھنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ زندگی جلد ہی خود میرے قریب آگئی۔ وہ ٹکٹ چیکر کے روپ میں آئی تھی۔ راستے میں بیٹھے ہوئے تینوں مردوں اور سیاہ فام سی عورت نے جس کا تعلق غالباً تھرپارکر سے تھا' ٹکٹ دکھادیے تو چیکر میرے قریب آگیا۔

وہ اچھا خاصا عمر رسیدہ اور بھاری بھرکم تھا۔ شاید ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ اس کے گول مٹول سے چہرے پر مسکینی سی طاری تھی۔ ناک پہ موٹی سی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میرے پاس ٹکٹ نہیں تھا تو اس کی دھندلائی ہوئی آنکھوں میں ذرا چمک اور مسکین چہرے پر کچھ تازگی آگئی۔

"کیوں نہیں ہے ٹکٹ؟" اس نے میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے نیچی آواز میں پوچھا۔

"بس جی... ذرا جلدی میں سوار ہوا تھا۔ ٹکٹ نہیں لے سکا۔ ٹرین نکلنے لگی تھی بڑی مشکل سے پکڑی ہے۔ آپ ٹکٹ بنادیں۔" میں اپنا لہجہ کسی سادہ لوح مگر تمیزدار دیہاتی کا سا رکھنے کی کوشش

کررہا تھا۔

"ٹکٹ تو اب جرمانے کے ساتھ بنے گا برخوردار!" اس نے سرہلایا۔

ٹرین روانہ ہونے کے بعد سے اس حصے میں پہنچنے والا وہ پہلا ہی چیکر تھا۔ لیکن میں نے اس سے بحث نہیں کی کہ ٹکٹ جرمانے کے ساتھ کیوں بنے گا۔ میں نے نرمی سے کہا "جرمانے کے ساتھ ہی بنا دیجیے۔"

"اِدھر آؤ میرے ساتھ!" اس نے حکم دیا اور میں سعادت مندی سے اُس کے ساتھ چل پڑا۔ بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ کہیں کہیں سیٹوں پر ٹفن کیریئر کھل چکے تھے۔ بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

چیکر مجھے اس درمیانی سرنگ نما راستے میں لے آیا۔ جس کے ذریعے بوگیاں ایک دوسرے سے جُڑی ہوتی ہیں۔ ہمارے پیروں تلے آہنی تختے ہل رہے تھے۔ وہ میرے تھیلے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "اس میں کیا ہے؟"

میں نے تھیلا اس کے سامنے اونچا کرتے ہوئے کھول کر دکھا دیا۔

"اوہ... یہ تو گنڈے (پیاز) ہیں۔" وہ قدرے مایوسی سے بولا۔

"آپ کو کیا انڈوں کی تلاش تھی؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس شخص کو معلوم ہو جائے اس میلے سے تھیلے کی تہ میں پندرہ لاکھ روپیہ پڑا تھا' تو اس کے کیا تاثرات ہوں گے؟

"نہیں.... نہیں... میں تو یونہی ذرا چیک کررہا تھا۔ آج کل تخریب کاری بہت ہو رہی ہے نا۔ ٹرینوں میں بھی ہو رہی ہے۔" وہ جلدی سے بولا "ہمیں اوپر سے آرڈر ملا ہے کہ کوئی مشکوک چیز نظر آئے تو اس کی ذرا تلاشی لے لیا کریں یا پولیس کو خبر دیا کریں۔"

پھر وہ جیب سے واؤچر بک نکالتے ہوئے بولا "کہاں کا ٹکٹ بنانا ہے؟"

"کراچی کا" میں نے جواب دیا۔ حالانکہ مجھے کراچی نہیں جانا تھا۔ میں ایسے کسی شہر نہیں جانا چاہتا تھا جہاں میری موجودگی کا امکان محسوس کیا جاسکتا تھا۔ میں کسی ایسی جگہ جانا چاہتا تھا جہاں میری موجودگی کا کسی کو گماں بھی نہ گزرتا لیکن ایسی جگہ کون سی ہوسکتی تھی' یہ ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ ٹکٹ بہرحال آخری اسٹیشن ہی کا لے لینا بہتر تھا۔

اس نے جتنی رقم کا ٹکٹ بنایا۔ اتنا ہی جرمانہ مجھ پر ڈالا جو یقیناً اس کی اپنی جیب میں جارہا تھا کیونکہ اس کا کہیں اندراج نہیں تھا۔ لیکن میں چونکہ اس وقت ایک سیدھا سادا ان پڑھ دیہاتی تھا اس لیے زیادہ سمجھداری کا اظہار نہیں کرسکتا تھا۔ میری جیب میں اخراجات کے لیے معقول رقم موجود تھی۔ میں نے چند نوٹ نکالے اور ادائیگی کردی۔

تب وہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "کیا کام کرتے ہو؟"

مجھے اچانک احساس ہوا کہ میں اپنے بہروپ کے ساتھ کچھ انصاف نہیں کررہا تھا۔ اگر میں ایک سیدھا سادا مگر غریب دیہاتی تھا تو مجھے اتنی فراخدلی اور بے پروائی سے خرچ نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بے چون و چرا کوئی ادائیگی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ خواہ مخواہ کسی کی نظر میں نمایاں ہونے یا مشکوک نظر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ مجھے ہر خرچ پر چوں چوں کرنا چاہیے تھا۔

میں نے جلدی سے کہا "گجر ہوں باؤ جی! لاہور میں مُجھ (بھینس) بیچ کر آیا ہوں۔ کراچی ذرا اپنے بھائی کے پاس جارہا ہوں۔" میں نے اپنی جیب میں رقم کی موجودگی کا جواز گھڑ دیا۔

چیکر پُرخیال انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "لمبا سفر ہے' کھڑے کھڑے یا فرش پر بیٹھ کر کس طرح کرو گے؟ اگر تم ایک سو کا پاپا (نوٹ) مجھے اور لگاؤ تو میں تمہیں سیٹ دے سکتا ہوں۔"

ابھی تک مجھے کہیں کوئی سیٹ خالی نظر نہیں آئی تھی لیکن مجھے معلوم تھا' سرکاری لوگ بڑے باکمال ہوتے ہیں۔ جب چاہیں موجود کو ناموجود اور ناموجود کو موجود بنا سکتے ہیں۔ اگر میں ایک لمحے پہلے اپنے طرزِ عمل کے بارے میں چوکنا نہ ہوگیا ہوتا تو فوراً سو کا نوٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا۔ میری نظر میں سو روپے بھی حقیر سی رقم ہی تھی لیکن میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا "سو کا پاپا؟ کمال کرتے ہیں باؤ جی آپ! اگر مجھ بیچ کر میں چار پیسے لے ہی آیا ہوں تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آپ مجھے راستے میں ہی لوٹ لیں۔ کوئی جائز پیسے بتائیں۔"

اس سے پہلے مجھے یہ الفاظ سن کر ہنسی آتی تھی کہ رشوت میں بھی کچھ رقم جائز اور کچھ "ناجائز" ہوتی تھی۔ لیکن اس وقت میں نے خود نہایت سنجیدگی سے "جائز" کا لفظ استعمال کیا تھا اور سو کے نوٹ کے مطالبے پر اس طرح آنکھیں پھیلائی تھیں جیسے میری جان ہی نکل گئی ہو۔ وہ زمانہ فی الحال میرے لیے ایک بھولا بسرا خواب تھا جب چار آٹھ آنے کے لیے بھی اسی طرح ہماری جان نکل جایا کرتی تھی۔

سو روپے سے شروع ہونے والا سودا آخر کار بیس روپے پر طے پا گیا اور میں خود اپنی اس سودے بازی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ چیکر نے جلدی سے میرے ٹکٹ پر ایک نمبر ڈالا اور مجھے ساتھ لے کر دوسرے ڈبے میں چلا گیا۔ کھڑکی کے قریب ایک سیٹ پر ایک نوجوان بڑے آرام سے بیٹھا باہر تاریکی میں جھانک رہا تھا اور غالباً کوئی نظارہ دکھائی نہ دینے کے باوجود لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ بھی دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔

"اٹھ بھئی! تم کیا یہاں لاٹ صاحب کی طرح بیٹھے ہو۔" چیکر نے تیزی سے کہا۔ پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ شریف آدمی بے چارہ ان پڑھ ہونے کی وجہ سے دھکے کھا رہا ہے۔ گھنٹوں سے اپنی سیٹ تلاش کررہا ہے۔ کوئی اس کو بتا ہی نہیں رہا۔

اور تم بغیر ریزرویشن کے ہی اس پر چوڑے ہو کر بیٹھے ہو۔"

وہ نوجوان بادلِ نخواستہ اٹھ کھڑا ہوا اور سیٹ کے نیچے سے اپنا سالخوردہ سا بیگ نکال کر کچھ دور دیوار کے سہارے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹکٹ چیکر نے اب اس ڈبے میں ٹکٹ چیک کرنا شروع کردیے۔

میں اس سیٹ پر بیٹھ تو گیا لیکن مجھے وہاں سکون کا احساس نہ ہوسکا۔ میں بظاہر کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ نوجوان کی نفرت بھری نظریں مجھ پر لگی ہوئی تھیں۔ جب میں اس کی طرف دیکھتا تو وہ نظر چرا لیتا۔ اسے یقیناً اندازہ ہوگیا تھا کہ سیٹ چیکر نے بچا کر رکھی ہوئی تھی اور بعد میں مجھے دی تھی۔

حالانکہ اس سیٹ پر حق اس کا بھی نہیں تھا لیکن وہاں سے اٹھائے جانے پر وہ کتنا غصہ اور کتنی نفرت محسوس کررہا تھا اس پر مجھے حیرت تھی۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ تو چند گھنٹوں کے سفر کا معاملہ تھا جب رشوت اور سفارش کے ذریعے کوئی زندگی بھر کے لیے کسی کی سیٹ پر بیٹھ جاتا ہوگا اور محروم رہ جانے والے کی ایک عمر کی محنت برباد ہو جاتی ہوگی تو اس کے دل پر کیا گزرتی ہوگی! اس کے غم و غصے کا کیا عالم ہوتا ہوگا؟ اس اذیت سے گزرنے والے اور اس طرح کے تماشے دیکھنے والے نوجوان ہی ظاہر ہے سیاست کار مگرمچھوں کی بھڑکائی ہوئی آگ کے لیے بہترین ایندھن کا کام دیتے تھے۔ وہ یقیناً اپنے آپ کو اور ساری دنیا کو پھونک ڈالنے کے لیے تیار رہتے ہوں گے۔

آخر کار میں رہ نہ سکا اٹھ کر اس نوجوان کے قریب پہنچا اور اس کا کندھا تھپکتے ہوئے پنجابی میں کہا "جاؤ بھائی! وہیں بیٹھ جاؤ دل برا نہ کرو۔"

وہ کچھ خجل سا ہوگیا۔ سٹپٹا کر بولا "نہیں جی آپ بیٹھیں' آپ کی سیٹ ہے۔ میں نے تو دل برا نہیں کیا۔ میری ریزرویشن نہیں ہے۔ میں کیسے بیٹھ سکتا ہوں۔ چیکر پھر آکر اٹھا دے گا۔"

"نہیں اب تو میں تمہیں وہ سیٹ تحفتاً پیش کررہا ہوں۔ جب میں ہی تمہیں نہیں اٹھاؤں گا تو کوئی اور کس طرح اٹھائے گا۔" میں نے کہا۔

"نہیں جی آپ تو مجھے شرمندہ کررہے ہیں۔" وہ واقعی شرمندہ نظر آرہا تھا۔

"نہیں یار! شرمندہ تو میں ہو رہا ہوں' کسی سے چھین کر تو اپنا حق لینا بھی مجھے اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔ گفتگو پنجابی میں ہی جاری تھی لیکن میں کوشش کررہا تھا کہ دوسرے لوگ ہماری طرف متوجہ نہ ہونے پائیں۔

"لیکن پھر آپ کہاں بیٹھیں گے؟" وہ بولا۔

"میں کوئی بندوبست کرلوں گا۔" میں نے اسے سیٹ پر بٹھا ہی دیا اور تب میں نے محسوس کیا کہ کئی مسافر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں اس ڈبے میں مزید نہیں ٹھہرا اور واپس اسی جگہ آگیا جہاں سے ٹکٹ چیکر مجھے لے کر روانہ ہوا تھا۔ دروازے کے قریب اس اندھیرے گوشے میں میری جگہ خالی تھی۔

میں اپنا تھیلا سنبھال کر وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر اطمینان سے فرش پر بیٹھ گیا۔ چند منٹ کے اس تجربے نے ہی مجھے عوامی زندگی کے قریب لانا شروع کردیا تھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ اپنے سفر کے اختتام تک ہی میں مکمل طور پر ایک عام آدمی بن چکا ہوؤں گا۔ ہر سانچے میں جلد ڈھل جانے کی میری عادت نے یقیناً ابھی میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا۔

خانیوال کے اسٹیشن پر میں نے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے لوگوں کی دیکھا دیکھی' پلیٹ فارم پر پھرتے ہوئے ایک ٹھیلے سے نان پکوڑے لیے۔ اچھے تو نہیں لگے لیکن مجھے امید تھی کہ دو چار دن میں اس قسم کی چیزیں اچھی لگنے لگیں گی۔

ٹرین خانیوال سے روانہ ہوئی تو بیشتر مسافروں نے کھانا کھا لیا تھا اور اونگھنے لگے تھے۔ رات کے گیارہ بجے تک ڈبے میں خاموشی چھا چکی تھی یعنی ٹرین کی اپنی گڑگڑاہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کسی کونے میں کوئی شیرخوار بچہ البتہ اواں اواں کر اٹھتا تھا لیکن غنیمت تھا کہ جلد ہی چپ ہو جاتا تھا۔ ٹرین اس وقت کسی تاریک ویرانے سے گزر رہی تھی۔

اچانک ہی ٹرین کی رفتار کم ہونے لگی "ٹھکا ٹھک ٹھکا ٹھک" کی وہ آوازیں جن سے انجن کے زور و شور کا اندازہ ہوتا ہے یکدم ہی کمزور پڑ گئیں۔ حالات اچھے نہ ہوں اور ٹرینوں کے بارے میں آئے دن کوئی نہ کوئی بری خبر سننے میں آتی ہو' ایسے میں رات گئے ایک ویرانے میں ٹرین کی رفتار یکدم کم ہو جانا بہت سے مسافروں کو چونکا دینے کا سبب بن جاتا ہے۔

جو مسافر زیادہ غنودگی میں نہیں تھے' یکدم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ کوئی بہ آواز بلند خود کلامی کے سے انداز میں بول اٹھا "خیر تو ہے' یہ ٹرین ایک دم رکنے کیوں لگی ہے؟"

"شاید کسی نے زنجیر کھینچ دی ہے۔" کسی نے خیال ظاہر کیا۔ سنبھل کر اٹھ بیٹھنے والوں کی تعداد بڑھنے لگی۔

"بھئی... کوئی ذرا باہر جھانک کر تو دیکھو۔ ڈاکو تو نہیں آگئے؟" کوئی سہمے ہوئے لہجے میں بولا۔

"خدا کا نام لو بھائی! کوئی اچھی بات منہ سے نکالو۔" دھوتی اور پگڑی والا ایک شخص پگڑی سنبھالتے ہوئے بولا۔

ایک گوشے سے رائے کا اظہار ہوا "سندھ میں ڈاکوؤں کا زیادہ زور ہے۔ ابھی تو ہم پنجاب ہی کے علاقے میں ہیں۔"

ایک باریش بزرگ جل کر بولے "اِدھر کون سی کمی ہے ڈاکوؤں کی۔ ڈاکوؤں کے معاملے میں تو ہم بھی خود کفیل ہیں۔ بلکہ جو اُدھر سے بھاگتے ہیں وہ بھی اِدھر ہی آجاتے ہیں۔ تھوڑا بہت ہی فرق ہوگا۔"

ٹرین کی رفتار اب بہت کم ہو چکی تھی۔ سیٹوں والے حصے میں

کھڑکیوں کے صرف شیشے ہی نہیں' بلائنڈز بھی گرے ہوئے تھے۔ ایک نوجوان نے بلائنڈز اٹھانا چاہا تو انہی باریش بزرگ نے اسے ڈانٹ دیا "اگر ڈاکوؤں کا اندیشہ ہے تو کھڑکی دروازہ بالکل مت کھولو بلکہ زور لگا کر انہیں بند رکھو۔"

کسی کو بھی ٹرین کی رفتار کم ہونے کی صحیح وجہ معلوم نہیں تھی لیکن ڈبے میں ایک بے عنوان سا اضطراب اور سراسیمگی پھیل چکی تھی۔ میرے آس پاس فرش پر ہی بیٹھے ہوئے نوجوان بھی سنبھل کر بیٹھ چکے تھے۔ چند لمحے پہلے وہ اِدھر اُدھر لڑھکے ہوئے تھے۔ وہ بھی خوف زدہ نظر آرہے تھے۔ حالانکہ ان کے پاس پوٹلیوں اور ایک آدھ پرانے سے ٹرنک کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن ڈاکوؤں کی عجیب ہی وحشت ہوتی ہے۔ اس میں مال کا ہی نہیں' جان کا خوف بھی شامل ہوتا ہے۔

تاہم میں نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ ذرا سا کھولا تو ان نوجوانوں میں سے کسی نے بھی مجھے روکا نہیں۔ وہ تھری عورت بھی اپنی موٹی موٹی آنکھوں میں خوف لیے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے محتاط انداز میں سر ذرا سا نکال کر باہر جھانکا اور دوسرے ہی لمحے لہو میری رگوں میں سرد ہو گیا۔

ٹرین اس وقت تک تقریباً رک چکی تھی۔ میں نے دیکھا کچے میں پیڑوں کے متوازی دو جیپوں گاڑیاں اُچھلتی کُودتی تیز رفتاری سے انجن کی طرف جارہی تھیں۔ ایک جیپ ٹرین کے پچھلے سرے پر گارڈ کے ڈبے کے قریب رینگ رہی تھی۔ ٹرین کی کسی کسی کھڑکی سے زرد اور بیمار سی روشنی کا ٹکڑا باہر رینگ رہا تھا۔ ان کھڑکیوں کے بلائنڈز یا تو نیچے نہیں آسکے تھے یا پھر ان ڈبوں کے مسافر زیادہ متجسّس اور بے خوف تھے۔

روشنی برائے نام تھی اس لیے باہر سب کچھ بہت دُھندلا' محض ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جیپ اپنی ساخت سے پہچانی جارہی تھیں۔ ان کی ہیڈلائٹس بجھی ہوئی تھیں اس وجہ سے ان کی موجودگی اور بھی خوف ناک محسوس ہورہی تھی۔ رات کے سناٹے میں ایک ویرانے میں رنگا رنگ مسافروں سے بھری ایک ٹرین کا روکے جانا میرے لیے ایک انوکھا ہی تجربہ تھا۔

میں تو صرف ایک طرف کا منظر دیکھ رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ دوسری طرف بھی گاڑیاں موجود رہی ہوں لیکن میری رگوں میں لہو گاڑیوں کو دیکھ کر سرد نہیں ہوا تھا۔ صرف گاڑیوں کے ہیولے دیکھ کر تو شاید میں یہی سمجھتا کہ ٹرین کو ڈاکوؤں نے گھیر لیا تھا۔ پرانے زمانے میں بھاپ کے کالے انجن والی گاڑیوں کو ڈاکو گھوڑوں پر بیٹھ کر روکتے تھے۔ اب زمانہ ترقی کر گیا تھا' ڈاکو جیپ میں آتے تھے۔

لیکن میرا لہو درحقیقت اس وقت سرد ہوا تھا جب میں نے نہایت ہلکی سی زوں کی آواز سن کر بیٹھے ہی بیٹھے سر گھما کر اوپر دیکھا تھا۔ ایک ڈبے کی چھت سے ایک ہیولا بلند ہوا تھا اور اوپر ہی اوپر پرواز کرتے ہوئے انجن کی طرف جارہا تھا۔ اندھیرے میں اس کا لبادہ نقرئی نظر نہیں آرہا تھا لیکن ہیولے سے میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ وہی یا اس جیسا کوئی دوسرا نقرئی لبادے والا تھا جس سے میں اور راحیلہ گزشتہ شام بڑی مشکل سے جان بچانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ جو وقتی طور پر ہماری جاں بخشی کر کے' کسی وجہ سے خود ہی رخصت ہو گیا تھا۔

ایک اور ہیولے کو میں نے پچھلے ڈبوں کی چھت کے قریب ہوا میں تیرتے دیکھا۔ وہ جناتی سائز کے چمگادڑ دکھائی دے رہے تھے۔ ٹرین رک چکی تھی۔ نہایت آہستگی سے دروازہ بند کرتے ہوئے میں پیچھے ہٹا تو باتھ روم اور سیٹوں کے درمیانی راستے سے ڈبے کے دوسرے سرے سے میں نے تین سیاہ پوشوں کو اسی درمیانی سرنگ سے اندر آتے دیکھا جہاں چند گھنٹے پہلے ٹکٹ چیکر مجھے لے گیا تھا۔

ان تینوں کا حلیہ بظاہر ہمارے ہاں کے روایتی یا فلمی قسم کے ڈاکوؤں والا ہی تھا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی سیاہ شلوار قمیصوں میں تھے۔ چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ ہاتھوں میں گنیں تھیں لیکن مجھے ایک نظر ان پر ڈالتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ نہ تو پیشہ ور ڈاکو تھے اور نہ ہی ان کے ہاتھوں میں موجود گنیں وہ تھیں جو عام طور پر جرائم پیشہ لوگوں کے استعمال میں رہتی تھیں۔

ان تینوں کی صرف آنکھیں اور چہرے کا کچھ حصہ دکھائی دے رہا تھا۔ آگے چلنے والا اپنے دونوں ساتھیوں کے مقابلے میں دراز قد تھا اور وہ یقیناً سفید فام تھا۔ باقی دونوں ایشیائی ہی معلوم ہوتے تھے۔ تاہم ان کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

میں نے اپنے قریب نیم تاریکی میں بیٹھے ہوئے نوجوان کی طرف دیکھ کر خود استہزائی کے سے انداز میں' سرگوشی میں کہا "اب تو انگریزوں نے بھی ہمارے ہاں ڈاکے ڈالنے شروع کر دیے۔"

میں نیم تاریکی میں بھی دیکھ سکتا تھا کہ اس نوجوان کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے سرگوشی میں ہی بولا "انگریز تو نہیں ہو سکتا...... پٹھان ہو گا۔"

ہمارے ہاں نچلے طبقے میں سبھی سفید فاموں کو انگریز کہا جاتا ہے اسی لیے میں نے انگریز کی اصطلاح استعمال کی تھی لیکن وہ بے چارا نوجوان "انگریز" کو ڈاکو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ڈبے میں گہرا سناٹا تھا۔ اب تو کوئی بچہ بھی "اُواں اُواں" یا "ریں ریں" نہیں کر رہا تھا۔

شاید اس لیے میں نے نیچی آواز میں سفید فام کو اپنے ساتھیوں سے کہتے سن لیا "وہ یقیناً یہیں کہیں ہے۔ فاصلہ چند گز سے زیادہ نہیں ہے۔" وہ انگریزی میں بولا تھا۔

کوئی بعید نہیں تھا کہ میرے قریب موجود نوجوان اب بھی اسے انگریزی یا غیر ملکی تسلیم نہ کرتا اور کہہ دیتا کہ آج کل اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ بھی ڈاکوؤں میں شامل ہو چکے تھے' یہ بات اکثر سننے میں آتی رہتی تھی۔

تاہم میرے پاس نوجوان سے مزید تبادلۂ خیال کی مہلت نہیں

رہی تھی۔ چند لمحے تک میں اس خیال سے مطمئن تھا کہ شاید میں ریڈ ڈاٹ والوں کو جُل دینے میں کامیاب ہو گیا ہوں لیکن اب اس تصور سے میرا دل بیٹھنے لگا تھا کہ یہ محض میری خوش فہمی تھی۔

انہوں نے میرے اندازوں سے کہیں پہلے مجھے تقریباً ڈھونڈ نکالا تھا۔ ان کے پاس گویا ہر طرح کی تیاریوں کے ساتھ کسی بھی علاقے میں پہنچنے اور کسی بھی قسم کا ڈراما رچانے کے انتظامات مکمل رہتے تھے۔ شاید اسی خود اعتمادی کی وجہ سے وہ مجھے کہیں بھی اطمینان سے چھوڑ کر چل دیتے تھے کہ یہ تو گھڑے کی مچھلی ہے' جب چاہیں گے ہاتھ ڈال کر پکڑ لیں گے۔

تینوں سیاہ پوش ڈبے کے پرلے سرے سے ایک ایک مسافر کا چہرہ بغور دیکھتے آرہے تھے۔ انہوں نے نہ تو کسی مسافر کے سامان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا تھا اور نہ ہی کسی عورت کا زیور اُتروانے کی کوشش کی تھی۔ یہ اس بات کا ایک اور ثبوت تھا کہ وہ ڈاکو نہیں تھے۔ وہ ڈاکوؤں کا بہروپ ضرور بھر کر آئے تھے لیکن اس کے تقاضے پورے نہیں کر رہے تھے۔ ابھی تک انہوں نے ڈاکوؤں والی کوئی حرکت نہیں کی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ تاریکی میں ڈوبے ہوئے اس ویرانے میں' میں رات کے اس پہر' بغیر کسی سواری کے کہاں جاؤں گا اور کس طرح جاؤں گا لیکن اس ٹرین سے اتر جانا بہرحال ضروری ہو گیا تھا۔ میرا تو نہ جانے کیا انجام ہوتا تھا لیکن ٹرین میں میری موجودگی کی وجہ سے نہ جانے کتنے بے قصور مسافروں کی جان خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

میں نے نہایت آہستگی سے دوبارہ دروازہ کھولا۔ اس کے ساتھ ہی میرے قریب بیٹھے نوجوان نے حیرت سے منہ کھولا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہ سکا۔ دوسرے دروازے کی طرف بیٹھے ہوئے دو آدمی اور تھری عورت بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے انہیں اسی حال میں چھوڑا۔ اپنے تھیلے کو گرہ لگائی اور اسے دانتوں سے پکڑ کر لٹکاتے ہوئے دونوں ہاتھ خالی رکھ کر باہر رینگ گیا۔

ٹرین گویا خاصی بلندی پر کھڑی تھی۔ پٹریاں دراصل زمین کے لیول سے اونچی تیار کی گئی ایک پٹی پر بچھی ہوئی تھیں۔ ٹرین کے دونوں طرف خاصا نشیب تھا۔ میرا پاؤں ابھی دوسرے پائیدان پر ہی تھا کہ ایک ہیولا گویا عین میرے پیروں کے نیچے سے نکل آیا۔

وہ ٹرین کے نیچے ہی اُس جگہ سے پٹریاں عبور کر کے آیا تھا جہاں دو ڈبے بمپروں کے ذریعے جُڑے ہوتے ہیں۔ جس دروازے سے میں اتر رہا تھا وہ ڈبے کے ایک سرے پر ہی تھا اور بمپر قریب ہی تھے لیکن اس ہیولے کا اچانک برآمد ہونا مجھے کچھ ایسا ہی لگا تھا جیسے وہ میرے پیروں تلے سے نکل آیا ہو۔

وہ رکوع کی سی حالت میں تھا۔ اس کی نظر سے بچتے ہوئے میں نشیب میں چھلانگ بھی نہیں لگا سکتا تھا اور ڈبے میں واپس چڑھنے کی بھی مجھے مہلت نہیں مل سکی۔ وہ سیدھا ہو گیا اور اس کی مجھ پر نظر پڑ گئی۔ میرے دونوں ہاتھ ابھی دروازے کے ڈنڈوں پر ہی تھے جبکہ اس کے ہاتھوں میں گن تھی۔

اس گن پر مجھے دوربین نما کوئی چیز بھی نصب دکھائی دی جس میں گھڑی کے ڈائل سے ذرا بڑی کوئی چیز ٹی وی اسکرین کی طرح روشن تھی۔ کمپیوٹر کے سے انداز میں اس پر کچھ ہندسے تیزی سے جل بجھ رہے تھے۔

چاہتا تو میں یہی تھا کہ اندھیرے میں نہایت خاموشی سے کسی طرف کو کھسک جاؤں۔ ابھی شاید وہ شیطان کی آنت کی طرح لمبی اس ٹرین کو پوری طرح کوَر نہیں کر پائے تھے۔ مجھے اگر کسی سے الجھنا پڑ جاتا تو چند لمحوں میں دوسروں کے بھی میری طرف متوجہ ہو جانے کا امکان تھا۔

اپنے شکار کو تلاش کرنے کی مہم پر اس وقت وہاں نہ جانے کتنے افراد موجود تھے' مجھے ان کی تعداد کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا لیکن اتنا اندازہ ضرور تھا کہ اگر وہ سب کے سب بیک وقت میری طرف متوجہ ہو جاتے تو پھر میرے بچنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ لیکن اب یوں مشکوک انداز میں ڈبے سے اترتے ہوئے' اس ہیولے کی نظر میں آجانے کے بعد بھی میرے خاموشی سے نکل جانے کا کوئی امکان نہیں رہا تھا۔

یہ سب کچھ میں نے شاید ایک سیکنڈ میں سوچا ہو گا۔ ہیولا گن سیدھی کرنے ہی لگا تھا کہ میں نے نشیب میں چھلانگ لگانے کے بجائے اُسی پر چھلانگ لگا دی۔ میری پنڈلی سے نیام تو اب بھی بندھی ہوئی تھی اور اس میں خنجر بھی موجود تھا لیکن اسے نکالنے کی ظاہر ہے نوبت نہیں آسکی تھی۔

وہ ہیولا بھی ڈاکوؤں ہی والے حلیے میں تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگاتے وقت ہی بازو کے شکنجے میں اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کی تھی تاکہ ایک تو وہ کوئی آواز نہ نکال سکے۔ دوسرے میں اس پر اپنا مخصوص داؤ آزما سکوں۔

میں اپنی اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا۔ غنیمت تھا کہ وہ کوئی عام ہی آدمی معلوم ہوتا تھا۔ نقرئی لبادے والے کی طرح کسی ناقابلِ شکست خول میں بند نہیں تھا۔ اس کی گردن میرے بازو کے شکنجے میں تو آگئی لیکن میں فوری طور پر گردن توڑنے والا داؤ نہیں لگا سکا کیونکہ ہم دونوں ہی نشیب میں لڑھکتے چلے گئے تھے۔

مگر اس دوران وہ ایک بار اپنی گن کا ٹریگر دبانے میں کامیاب ہو گیا۔ گن تقریباً کلاشنکوف جتنی تھی۔ وہ اس کا رخ میری طرف تو نہیں کر سکا تھا لیکن اس وقت گن کا استعمال ہو جانا ہی میرے حق میں خطرناک تھا۔

فائر ہوتے وقت گن کا رخ ٹرین کی چھت کی طرف ہو گیا تھا۔ فائر کی نہ تو کوئی آواز آئی اور نہ ہی گولیاں برآمد ہوئیں بلکہ الیکٹرک ویلڈنگ کے دوران اسپارک سے جو چمکیلی نیلی روشنی پیدا

ہوتی ہے، گن کی نال سے آنکھوں کو خیرہ کردینے والی روشنی کی ایک ویسی ہی بیم ایک ثانیے کے لیے لپکی اور آہنی ڈبے کی چھت اور دیوار کے جوڑ پر سے ایک بہت بڑے حصے کے پرخچے اُڑ گئے۔

روشنی کی بیم برآمد ہونے کا تو محض ایک جھماکا سا ہوا تھا اور معدوم ہوگیا تھا لیکن ڈبے کے کچھ حصے کے پرخچے اُڑنے کی اچھی خاصی آواز پیدا ہوئی تھی۔ مجھے یہ دیکھنے کی مہلت نہیں مل سکی کہ اس آواز کا کیا ردِعمل ہوا تھا البتہ میں نے اسے دوبارہ ٹریگر دبانے کا موقع نہیں دیا۔

ایک ہاتھ سے میں اس کا بازو اس طرح مروڑ چکا تھا کہ گن اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ ہم جب لڑھکتے لڑھکتے رکے تو وہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہوچکا تھا۔ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔

میں وہاں ایک لمحے کے لیے بھی رکنا نہیں چاہتا تھا۔ تیزی سے اسے ایک طرف دھکیل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس کی گن لے کر بھاگنا چاہتا تھا۔ وہ کارآمد چیز معلوم ہوتی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ مجھے فوری طور پر نظر نہ آسکی۔ نہ جانے کہاں جاگری تھی۔ البتہ میرا تھیلا جو میرے اس شخص پر چھلانگ لگاتے ہی میرے دانتوں سے نکل چکا تھا، مجھے قریب ہی پڑا نظر آگیا۔ میں نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور گویا ریس کے تمام ریکارڈ توڑنے کے لیے دوڑ پڑا۔

ٹرین میں سفر کے دوران میں نے دیکھا کہ ایک طرف تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر ریلوے لائن کے متوازی ایک سڑک بھی جارہی تھی۔ سڑک کے پرلی طرف جنگل پھیلا ہوا تھا۔ سڑک پر کبھی کبھار کسی ٹرک یا گاڑی کی ہیڈلائٹس حرکت کرتی دکھائی دے جاتی تھیں۔

میں اندھیرے میں اندازاً اسی سڑک کی طرف بھاگ رہا تھا مجھے اگر ایک روٹ چھوڑنا پڑ رہا تھا تو دوسرے روٹ کے آس پاس ہی رہنا چاہتا تھا۔ سمت کے احساس کے بغیر یونہی منہ اٹھا کر جنگل یا ویرانے میں بھٹکنا میرے لیے نقصان دہ ثابت ہوسکتا تھا۔ کھلے آسمان تلے دوڑتے بھاگتے ہوئے میں تاریکی کے باوجود نقرئی لبادے والوں کی نظر میں آسکتا تھا جو غالباً اپنی پشت پر بندھی ہوئی مختصر سی مشینری کی وجہ سے اِدھر اُدھر اُڑتے پھرتے تھے۔

ذرا دور نکل آنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ مجھے اس جگہ کچھ نقل و حرکت اور ذرا روشنی نظر آئی جہاں میں سیاہ پوش کو ہلاک کرکے پھینک آیا تھا اور جہاں بوگی کے بالائی کنارے کے پرخچے بھی اُڑے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ اس طرف ان لوگوں کی توجہ مبذول ہوچکی تھی۔

کوئی بعید نہیں تھا انہیں یہ اندازہ بھی ہوچکا ہو کہ بھاگنے والا کس سمت میں بھاگا تھا۔ پٹڑیوں کے آس پاس کچھ دور تک زمین نرم ہی تھی۔ اگر کسی کو پیروں کے نشانات دیکھنے کی فرصت ہوتی تو کچھ نہ کچھ اندازہ کیا جاسکتا تھا۔

میں نے کچھ اور تیزی سے دوڑنے کی کوشش کی۔ جلد ہی میں نے سڑک عبور کرلی اور جنگل میں داخل ہوگیا۔ لیکن کچھ دور تک بھاگنے کے بعد میں نے رخ بدل لیا اور جنگل ہی میں رہتے ہوئے سڑک کے متوازی دوڑنے لگا۔ جنگل میں تاریکی اور بھی گہری تھی۔ درختوں کے ہیولے بھی مشکل سے نظر آرہے تھے اس لیے میرے دوڑنے کی رفتار خاصی کم ہوگئی تھی۔ اگر پرانے تجربات اور کچھ خداداد غیر معمولی صلاحیتیں کام نہ آرہی ہوتیں تو اس رفتار سے بھی دوڑنا ممکن نہیں تھا۔

میں سڑک کے متوازی اسی سمت میں دوڑ رہا تھا جس طرف کچھ دیر پہلے تک ٹرین چل رہی تھی۔ جلد ہی میں رکی ہوئی ٹرین تو کافی پیچھے چھوڑ گیا تھا لیکن بدستور دوڑتا رہا۔ یہ میرے حوصلے اور طاقت کے ساتھ ساتھ میرے پھیپھڑوں کی بھی آزمائش کی رات تھی۔ جنگل میں رہتے ہوئے بھی مجھے بعض دھندلی دھندلی زرد لکیروں وغیرہ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ٹرین کہاں کھڑی تھی اس کے انجن کی ہیڈلائٹ بھی آف کی جاچکی تھی۔

تاریکی میں اس پُراسرار انداز میں ویرانے میں کھڑی اس ٹرین کے مسافروں کے تاثرات اس وقت نہ جانے کیا تھے۔ ابھی تک سڑک پر یا آس پاس ویرانے میں کہیں ہلچل کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ حالانکہ میرا خیال تھا میں مجبوراً جس انداز میں اس سیاہ پوش کی گردن توڑ کر بھاگا تھا اور وہ ایک بار اپنی گن کا ٹریگر بھی دبا چکا تھا، اس سے گویا وہاں میری موجودگی کا اعلان ہوگیا تھا۔

کسی عام سے مسافر کے اس طرح وہاں سے نکل بھاگنے اور اس طرح مشاقانہ انداز میں غائب ہوجانے کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ انہیں یقیناً میری نقل و حرکت کا اندازہ بھی ہوتا رہتا تھا۔ اس کے باوجود انہوں نے ابھی تک اِدھر اُدھر پھیل کر میری تلاش شروع نہیں کی تھی۔ کیا وہ ابھی تک ٹرین ہی کو چھانے ہوئے تھے؟ اسی میں مجھے تلاش کررہے تھے؟ کیا ان سے اندازے کی کوئی غلطی سرزد ہورہی تھی؟

مجھے اس کا یقین نہیں تھا۔ تاہم ایک بات کا مجھے کسی حد تک اندازہ تھا۔ وہ غالباً یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے اُڑتے ہوئے کارندے ٹرین کے مسافروں کی نظر میں آئیں۔ وہ ٹرین پر ڈاکوؤں ہی کی یلغار کا تاثر برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ میں نے شروع ہی سے محسوس کیا کہ وہ اپنی کوئی غیر معمولی چیز یا سائنسی شعبدے بازیاں عام لوگوں کی نظر میں لانے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔ وہ ایسی کسی بھی چیز کو کسی عام سی جگہ پر صرف مجبوراً یا پھر کسی مصلحت کے تحت استعمال کرتے تھے۔

میں انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں دوڑتا رہا حتی کہ ٹرین کی موجودگی کے وہ خفیف سے آثار جو مجھے دور سے نظر آرہے تھے، مدھم ہوتے ہوتے آخر کار غائب ہوگئے۔ پھیپھڑوں اور ٹانگوں نے میرا بہت ساتھ دیا تھا۔ اب جاکر سانس ذرا پھولنے لگی تھی اور جسم پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ میں نے رفتار کم کرلی اور جوگنگ کے انداز

میں دوڑنے لگا۔

درختوں کا سلسلہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا ورنہ ہی میں نے جنگل سے باہر آنے کی کوشش کی تھی۔ سڑک بھی اسی طرح متوازی چل رہی تھی۔ پھر اسی سڑک پر مجھے اپنے عقب سے بہت دور دو ہیڈ لائٹس نمودار ہوتی دکھائی دیں۔ فاصلہ زیادہ ہونے کی وجہ سے وہ کافی چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں۔

میں دوڑتا رہا اور مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے وہ بڑی ہوتی جارہی تھیں اور ہوا کے دوش پر انجن کی آواز بھی سنائی دینے لگی جو فی الحال ہلکی سی سرسراہٹ سے مشابہ محسوس ہورہی تھی۔ دھیرے دھیرے آواز ذرا واضح ہوئی تو مجھے اندازہ ہونے لگا کہ وہ کوئی ٹرک تھا۔

ٹرک اسی سمت میں آرہا تھا جس طرف میں دوڑ رہا تھا۔ فرق یہ تھا کہ میں جنگل میں تھا اور سست رفتاری سے دوڑ رہا تھا۔ وہ سڑک پر تھا اور تیز رفتاری سے آرہا تھا۔ درختوں کے درمیان سے کبھی اس کی ہیڈلائٹس دکھائی دے جاتیں اور کبھی درخت درمیان میں حائل ہوجاتے تو نظر سے اوجھل ہوجاتیں۔

آخرکار مجھے گاڑی کی اپنی ہی روشنی میں اس کا بدھم سا ہیولا بھی دکھائی دینے لگا۔ وہ واقعی ٹرک تھا۔ انجن کی گھرگھراہٹ بھی اب صاف سنائی دے رہی تھی۔ رات کے سناٹے میں ویران سڑک پر وہ خاصی تیز رفتاری سے چلا آرہا تھا۔ اونچا سا وہی ٹرک تھا جو عام طور پر بار برداری میں استعمال ہوتا ہے۔

میں نے اب سڑک پہ نکل آنا ہی بہتر سمجھا۔ میں اس ٹرک میں لفٹ لینے کی کوشش کرنا چاہتا تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ رات کو اس وقت اس ویرانے میں ایک اجنبی کو سڑک پر کھڑے دیکھ کر ڈرائیور ٹرک نہیں روکے گا بلکہ اگر میں ٹرک کے عین سامنے بھی کھڑا ہوگیا تب بھی کچھ بعید نہیں کہ وہ مجھے کچلتا ہوا ہی گزر جائے یہاں کون دیکھنے والا تھا۔

سڑک کے کنارے نشیب میں کافی بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے۔ میں نے ان میں سے چار پانچ بڑے پتھر اٹھا کر سڑک پر ایک قطار میں رکھ دیے اور اپنی دانست میں اس طرح روڈ بلاک کرکے پتھروں سے ذرا پیچھے ہٹ کر سڑک کے عین درمیان کھڑے ہوکر زور زور سے ہاتھ ہلانے لگا۔

ٹرک قریب آچکا تھا۔ رفتار بے حد کم ہوچکی تھی۔ ڈرائیور نے یقیناً پتھروں کو اور ان کے عقب میں مجھے بھی دیکھ لیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس ٹرک پر مجھے لفٹ مل جائے گی۔

وہ تو میری قسمت اچھی تھی جو بچ گیا ورنہ ٹرک پر لفٹ ملنے کے بجائے شاید ملک الموت نے مجھے اوپر لفٹ کرلیا ہوتا۔ معلوم نہیں وہ محض اتفاق تھا یا میری چھٹی حس کا کمال کہ بغور ٹرک کا جائزہ لیتے ہوئے میری نظر کیب کی چھت کی طرف چلی گئی۔ ٹرک کی [illegible] عموماً جو بڑا سا [illegible] بنا ہوتا ہے اس کے عقب سے میں نے بروقت ایک گن کی نالی برآمد ہوتے دیکھ لی۔

اس کے باوجود شاید میں اسے ٹرک والوں کی احتیاطی اقدام سمجھ کر وہیں جما کھڑا رہتا لیکن اندر سے اچانک ہی گویا کسی آواز نے خبردار کیا اور میں نے یکدم ہی نشیب کی طرف چھلانگ لگادی۔

اگر مجھے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہوگئی ہوتی تو سڑک پر میری جگہ گولیوں سے چھلنی ایک لاش پڑی ہوتی۔ کیب کی چھت سے ایک زوردار برسٹ آیا تھا۔ آواز اشین گن کی معلوم ہوتی تھی۔ یہ بھی بڑی ہی ستم ظریفی ہوتی کہ ریڈ ڈاٹ والوں سے تو میں بچ کر نکل آیا تھا لیکن ان نامعلوم ٹرک والوں کے ہاتھوں مارا جاتا جن سے میرے خیال میں تو میری کوئی دشمنی نہیں تھی۔

دوسرا برسٹ اندھیرے میں اسی جگہ آیا جہاں میں نے چھلانگ لگائی تھی لیکن اس قسم کی صورتِ حال میرے لیے نئی نہیں تھی۔ میں چھلانگ لگانے کے فوراً بعد ہی وہ جگہ بھی چھوڑ چکا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ فائرنگ کرنے والے کو خواہ ہدف نظر نہ آئے لیکن اس کی گن اندازاً اپنے شکار کا تعاقب کرتی ہے۔

دوسرے برسٹ کے بعد میں نے ڈرائیور کو دروازہ کھول کر اپنی سیٹ سے چھلانگ لگاتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ وہ تیزی سے ٹرک کی آڑ میں ہوگیا۔ کیب کی چھت پر جو گن والا موجود تھا وہ وہیں ساکت رہا۔ وہ گویا ایک عمدہ مورچے میں تھا۔ اسے وہاں سے نکلنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ڈرائیور نے ٹرک کی ہیڈلائٹس بجھادی تھیں لیکن انجن اسٹارٹ رہنے دیا تھا۔

میں اندھیرے میں پتھروں کی اوٹ میں متحرک رہا لیکن دوسرے برسٹ کے بعد گن خاموش ہی رہی کوئی گولی میرے تعاقب میں نہیں آئی۔ انہیں یقیناً اب اندازہ نہیں رہا تھا کہ میں کہاں تھا۔

چند لمحے یہ سکوت برقرار رہا۔ صرف انجن کی ہلکی سی گھرگھراہٹ سنائی دیتی رہی۔ پھر اس گھرگھراہٹ کے پس منظر میں ایک بھاری گونجیلی اور پرجوش آواز ابھری "اوئے خانہ خراب .... ڈاکو کا بچی .... سامنے آؤ۔ اپنے سب ساتھی کو بھی بلاؤ۔ ام تمہارا مقابلہ کرے گی۔ امارا نام شیر خان ہے۔ ام شیر کا بچی ہے۔ تمہارا باپ سے بھی نہیں ڈرتی۔"

آواز ٹرک کے نیچے سے آتی محسوس ہوئی تھی۔ یقیناً ڈرائیور کی آواز تھی جسے میں نے کیب سے کود کر ٹرک کی آڑ میں پناہ لیتے دیکھا تھا۔ وہ بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح معلوم ہوتا تھا۔ اپنی دانست میں اس نے بڑی پھرتی سے چھلانگ لگا کر ٹرک کی آڑلی تھی لیکن وہ کیب کی غلط سائڈ سے کودا تھا۔ اگر اس وقت میرے پاس گن ہوتی اور میں اسے مارنا چاہتا تو میرے لیے وہ سنہری موقع ہوتا۔ ایک سیکنڈ کے لیے وہ میرے ٹارگٹ پر رہا تھا اور میرے لیے وہ ایک سیکنڈ ہی کافی تھا۔

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بات میری سمجھ میں آگئی

تھی۔ وہ مجھے ڈاکو سمجھ رہے تھے۔ پتھر رکھ کر روڈ بلاک کرنا میری حماقت ثابت ہوا تھا۔ وہ مجھے ڈاکو سمجھے تھے۔ عموماً ڈاکو اسی طرح راستہ روک کر ٹرکوں یا بسوں کو گھیرتے تھے۔ پہلے ایک ڈاکو سامنے آتا تھا اور جونہی ٹرک یا بس رکتی تھی، سب اپنی کمین گاہوں سے نکل کر یلغار کردیتے تھے یا پھر راستہ کسی طرح بند کرنے کے بعد بھی آس پاس گھات لگائے رہتے تھے۔

میں اب نشیب میں ایک خاصے بڑے پتھر کی اوٹ میں پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا۔ گولیوں سے مجھے زیادہ خطرہ لاحق نہیں تھا۔ میں نے بہ آواز بلند کہا "خان صاحب! میں ڈاکو نہیں ہوں، میں تو ایک مصیبت زدہ مسافر ہوں۔ آپ نے دیکھا نہیں میرے پاس کوئی بندوق وغیرہ نہیں ہے۔"

دوسری طرف سے جواب میں گولی نہیں آئی۔ میری آواز کی مدد سے بھی نشانہ لگانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس خاموشی سے حوصلہ پاتے ہوئے میں نے جلدی سے مزید کہا "آپ نے راستے میں الٹے ہاتھ پر ایک ٹرین رکی ہوئی نہیں دیکھی؟"

ایک لمحے کے بعد ہچکچاہٹ آمیز انداز میں جواب آیا "نئیں ... ام ادھر ادھر نہیں دیکھتا اے۔ ام ناک کی سیدھ میں گاڑی چلاتی اے۔"

"بہرحال دو ڈھائی میل پیچھے ایک ٹرین کو ڈاکوؤں نے گھیر رکھا ہے۔ میں تو ان سے جان بچا کر ٹرین سے اتر کر بھاگا ہوں۔ آپ الٹا مجھے ہی ڈاکو سمجھ رہے ہیں۔ میں تو ایک غریب مصیبت زدہ مسافر ہوں۔ آپ سے لفٹ لینا چاہتا تھا۔" میں نے بہ آواز بلند مذاکرات جاری رکھے۔ مجھے امید تھی کہ بات خان صاحب کی سمجھ میں آجائے گی۔ یہی خاصی اچھی علامت تھی کہ کیب کی چھت پر موجود شخص نے گولیاں چلانا بند کردی تھیں اور خان صاحب نے تو اپنی گن ابھی استعمال ہی نہیں کی تھی۔

"کیا لینا چاہتی تھی؟" خان صاحب نے شک زدہ لہجے میں پوچھا۔

"لفٹ۔ میرا مطلب ہے اگر آپ مجھے اپنے ساتھ بٹھا کر آگے کہیں آبادی میں کسی شہر میں چھوڑ دیتے تو آپ کی بڑی مہربانی ہوتی۔ میں وہاں سے کوئی بس یا دوسری ٹرین پکڑلوں گا۔" میں نے ذرا عاجزی سے کہا۔

"قسم کھاؤ کہ تم ڈاکو نئیں مسافر اے۔" خان صاحب نے شرط عائد کی۔

میں نے قسم کھالی۔ ظاہر ہے یہ کوئی جھوٹی قسم نہیں تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا مزید وقت ضائع ہو۔ ابھی میں خطرے کی حدود سے باہر نہیں تھا۔ میں چاہتا تھا خان صاحب ہچکچاہٹ میں مبتلا رہنے کے بجائے جلد از جلد مجھے بٹھا کر روانہ ہوجائیں۔

"اچھا .... دونوں ہاتھ اٹھا کر سامنے آؤ۔" خان صاحب نے فرمائش کی۔

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب یہ شرط مان لینے میں زیادہ رسک نہیں تھا۔ تاہم میں نے احتیاطاً کہا "خان صاحب! میرے پاس کوئی بندوق پستول نہیں ہے۔ میں باہر آرہا ہوں۔ اگر آپ نے گولی چلائی تو ایک بے گناہ کا خون آپ کی گردن پر ہوگا۔"

"خانہ خراب کا بچہ! تقریر بند کرو۔ سامنے آؤ ام خود دیکھے گی۔" خان صاحب ذرا جھنجلا کر بولے۔

"میرے ہاتھ میں ایک تھیلا ہے۔ اسے کچھ اور مت سمجھ لیجیے گا۔" میں نے ہانک لگائی اور پتھر کی اوٹ سے نکل کر ہاتھ بلند کرتے ہوئے سیدھا کھڑا ہوگیا۔ پھر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتا سڑک پر چڑھ آیا۔ میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ رسک میں بہرحال اب بھی لے رہا تھا۔ میں خالی ہاتھ تھا اور دو آٹومیٹک گنوں کی زد پر تھا۔ ذرا سی بداعتمادی یا کوئی ذرا سی احمقانہ سوچ ان بے خوف ہاتھوں سے گولیاں چلوا سکتی تھی اور جو کام ریڈ ڈاٹ نہیں کرسکی تھی وہ ایک معمولی ٹرک ڈرائیور اور کلینر کے ہاتھوں انجام پاسکتا تھا۔

انہوں نے چند لمحے انتظار کیا اور جب دیکھا کہ ڈاکو کہیں سے برآمد ہونے میں ہی نہیں آرہے تھے اور میں بھی خالی ہاتھ دکھائی دے رہا تھا تو خان صاحب ٹرک کی آڑ سے نکل آئے۔ دوسرا شخص بھی کیب کی چھت سے اتر آیا۔ حلیے سے وہ کلینر ہی معلوم ہوتا تھا۔

خان صاحب نے ٹرک کی ہیڈلائٹس آن کردی تھیں۔ ہم ان کے سامنے تو نہیں، بہرحال ملگجی روشنی میں تھے۔ ٹرک سڑک کے کنارے کھڑا تھا۔ کلینر نے پتھر سڑک سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن وہ اس سے اٹھائے نہیں گئے۔ حالانکہ وہ ایک لمبا تڑنگا شخص تھا۔ بہرحال اس نے انہیں لڑھکا کر راستے سے ہٹادیا۔

ہاتھ جھاڑ کر وہ بھی خان صاحب کے قریب آگیا اور دونوں نے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ خان صاحب ابھی مجھ پر گن تانے ہی کھڑے تھے۔ وہ تحیم شحیم اور ذرا موٹاپے کی طرف مائل تھے لیکن حرکات و سکنات میں پھرتی تھی۔ کلینر نے مجھے تھپتھپا کر دیکھا اور انہیں اطمینان ہوگیا کہ میرے پاس کوئی گن وغیرہ نہیں تھی۔

خان صاحب اطمینان کی گہری سانس لے کر مجھے ڈانٹنے کے سے انداز میں بولے "خانہ خراب کا بچہ! تم کیسا بے وقوف آدمی ہے! تم نے روڈ پر یہ پہاڑ جتنا بڑا بڑا پتھر کیوں رکھا تھا؟ بے گناہ امارے ہاتھ سے مرتا۔ ام تو دل میں یہی سمجھا تھا کہ لیو شیر خان! آج ڈاکوؤں سے واسطہ پڑگیا۔"

"اگر میں سڑک کے کنارے کھڑا ہوکر آرام سے ہاتھ ہلاتا تو کیا آپ رک جاتے خان صاحب؟" میں نے ملامت سے پوچھا۔

خان صاحب سر کھجاتے ہوئے بولے "نئیں .... امارا خیال ہے ام نئیں رکتا، اس روڈ پر کوئی بھی نئیں رکتا۔"

"بس یہی مجبوری تھی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"چلو گاڑی میں بیٹھو۔ ایدر زیادہ دیر کھڑا ہونا ٹھیک نئیں

اے۔" خان صاحب نے اپنی اسٹین گن سے اشارہ کیا۔

انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کیب میں بٹھالیا۔ کلینرز دوبارہ کیب کی چھت پر چلا گیا۔ ٹرک ایک بار پھر تیز رفتاری سے آگے روانہ ہوگیا۔ اسٹین گن میرے اور خان صاحب کے درمیان سیٹ کے سہارے کھڑی تھی خان صاحب بنیادی طور پر خوش مزاج معلوم ہوتے تھے اور اب ان کی خوش مزاجی لوٹ آئی تھی۔

وہ اپنا بھاری بھرکم ہاتھ میرے کندھے پر مارتے ہوئے بولے "اویارا تمہارا نام کیا ہے؟"

"اقبال چوہدری۔ ویسے یار دوست مجھے بالا گجر کہتے ہیں۔ بھینسوں کی خرید و فروخت اور دودھ کا کام ہے میرا۔" میں نے بتایا لیکن غیرارادی طور پر میرے لہجے میں ملائمت اور شائستگی تھی جو بھینسوں اور دودھ کا کاروبار کرنے والوں کے لہجے میں نہیں ہوتی بعض اوقات اگر ان کا موڈ ٹھیک نہ ہو تو ان کا بات کرنا کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے بھینس نے سینگ ماردیا ہو۔

"بالا گوجر...!" خان صاحب نے دہرایا پھر بائیں ہاتھ سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال کر دایاں ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھاتے ہوئے بولے "امارا نام شیر خان ہے۔"

"وہ تو میں جان چکا ہوں۔" میں نے مضبوطی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ خان صاحب کا ہاتھ بھاری بھرکم اور آہنی تھا۔

"یارا... اگر تم بے گناہ امارا ہاتھ سے یا امارا کلینرز ریشم خان کے ہاتھ سے مارا جاتی تو ام کو بہوت افسوس ہوتا۔" شیر خان نے گویا چند لمحے پہلے کی صورت حال کا تصور کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں خان صاحب! آپ کو بھلا افسوس کیوں ہوتا۔ آپ تو یہی سمجھ کر گاڑی بھگاتے چلے جاتے کہ آپ نے ایک ڈاکو کو مارا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں نے اپنے لہجے کی شائستگی برقرار رکھی تھی مجھے یقین تھا خان صاحب ایک دودھ والے کو اتنی شائستگی سے بات چیت کرتے سن کر حیران نہیں ہوں گے۔ وہ زیادہ باریکی میں جانے والے آدمی معلوم نہیں ہوتے۔

"آں... یہ بھی ٹھیک اے۔" خان صاحب نے پُرخیال انداز میں اپنا بڑا سا سر ہلایا "یارا اقبال گوجر۔ تم آدمی تو عقلمند معلوم ہوتی اے۔ اور تم ریشم خان کی اسٹین گن سے بچ گیا' یہ بھی تم نے بڑا کمال دکھایا۔ آج سے تم امارا دوست اے۔ یارا ام کو معاف کرنا۔ ام نے تم کو بڑا تکلیف دیا۔" شیر خان کے لہجے میں یکدم ہی بے پناہ خلوص آگیا تھا۔

"معافی کی اس میں کیا بات ہے یار شیر خان!" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "غلط فہمی میں ایسا ہوجاتا ہے۔"

"تم کدر جاتی اے؟"

"جانا تو مجھے کراچی ہے لیکن آپ راستے میں مجھے کہیں بھی اتار دیں جہاں سے مجھے بس یا ٹرین مل جائے۔" میں نے کہا۔

"جانا تو ام کو بھی کراچی اے۔" شیر خاں نے بتایا "لیکن ام کو راستے میں دو تین دن ملتان رکنا اے۔ امارا گاڑی میں اس وقت انگور لوڈ اے۔ اس کو ام ملتان میں اتارے گا۔ ادھر دو تین دن ٹھہرے گا۔ آم لوڈ کرے گا پھر کراچی جائے گا۔ ملتان میں تم امارے ساتھ ٹھیرو۔ ام تم کو عیش کرائے گا۔ مرغی مچھلی کھلائے گا۔"

"بہت بہت شکریہ خان صاحب! زندگی میں کبھی موقع ملا تو ضرور آپ کی میزبانی کا شرف حاصل کروں گا۔"

"کیا حاصل کرے گی؟" خان صاحب نے چونک کر میری بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے آپ کا مہمان ضرور بنوں گا لیکن اس وقت نہیں' فی الحال میرا جلدی کراچی پہنچنا ضروری ہے' آپ مجھے ملتان اتار دیجیے گا۔" میں نے کہا۔

"ٹیک اے۔ ٹیک اے جیسا تمہارا مرضی۔" خان صاحب نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولے "اس روڈ پر آج کل ٹرک بس والا لوگ قافلہ بنا کر چلتی اے۔ صرف شیر خان اپنا ٹرک اکیلا چلاتی اے۔ ام پروا نہیں کرتی۔ ام نے سوچ لیا اے... جان مال... سب خدا کے ہاتھ میں اے... جب ڈاکو ماکو سامنے آئے گا تو دیکھا جائے گا... یا ڈاکو نئیں یا ام نئیں... کیوں اقبال گوجر' ام ٹیک بولا کہ غلط؟"

"بالکل ٹھیک ہے خان صاحب! آپ کے اور میرے خیالات تو بہت ملتے جلتے ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ خان صاحب نے ایک گونجدار قہقہہ لگایا اور ٹرک کی رفتار کچھ اور بڑھادی۔ ٹرک کسی جمبو جیٹ کی طرح تاریکی اور سناٹے کا سینہ چیرتا جارہا تھا۔

"تمہارا خیالات شیر خان سے ملتا اے۔ اسی لیے تم بھی ڈاکوؤں سے بچ کے نکل آئی اے۔ اور شیر خان کو بھی آج تک ڈاکو سے پالا نہیں پڑا۔ یہ سب قسمت کا کھیل اے۔" پھر یکدم جیسے شیر خان کو کچھ خیال آیا۔ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "یارا یہ تو بتاؤ ٹرین پر ڈاکو لوگ نے کوئی زیادتی میادتی تو نئیں کیا؟ کسی کو قتل مل تو نئیں کیا؟ عورت یا بچہ لوگ پر ظلم تو نئیں کیا؟"

"نہیں میرے سامنے تو کچھ نہیں کیا بلکہ میرے سامنے تو مال بھی نہیں لوٹا تھا۔ مجھے کچھ ایسا لگتا ہے جیسے انہیں کسی کی تلاش تھی۔" میں نے سچ بولا۔

"ہاں' ایسا بھی ہوسکتا ہے۔" شیر خان نے سر ہلایا "ڈاکو لوگ کوئی موٹا مرغی تلاش کرتی ہے اغوا کرکے تاوان وصول کرنے کے واسطے۔"

"ٹرین میں موٹی مرغیاں ذرا کم ہی ہوتی ہیں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد شیر خان پُرخیال لہجے میں بولا "ملتان اب زیادہ دور نئیں اے۔ ملتان پہنچ کر ام کو پولیس وغیرہ کو اس بات کی خبر کرنی چاہیے۔"

"میرا خیال ہے خبر تو پہنچ گئی ہوگی۔ ٹرین میں ریلوے پولیس

بھی ہوتی ہے اور وائرلیس وغیرہ بھی۔ آج کل تو کافی انتظامات ہوتے ہیں۔" میں نے خیال ظاہر کیا "بہرحال ہوسکے تو آپ اطلاع دے دیجیے گا۔ میں تو جلد سے جلد کوئی ٹرین یا بس پکڑنے کی کوشش کروں گا۔"

میں غیرارادی طور پر یہ کہہ تو گیا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں خان صاحب شک زدہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھ نہ بیٹھیں کہ کہیں ڈاکوؤں کو تمہاری ہی تلاش تو نہیں تھی؟ وہ یہ بھی پوچھ سکتے تھے کہ میں کہیں پولیس کا سامنا کرنے سے کترا تو نہیں رہا تھا؟ کہیں میں بھی کوئی مفرور تو نہیں تھا؟

لیکن خان صاحب نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ ان کے بارے میں میرا اندازہ کچھ ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ زیادہ باریکیوں میں جانے والے آدمی نہیں تھے۔ بہرحال اس میں شک نہیں تھا کہ خان صاحب تھے بھلے آدمی۔ دوستی کے قابل معلوم ہوتے تھے۔

ٹرک یکساں رفتار سے رواں دواں تھا۔ خان صاحب کسی خیال میں کھوگئے تھے۔ پلک بھی نہیں جھپک رہے تھے۔ ان کی آنکھیں انگارہ سی ہورہی تھیں۔ میرے اعصاب اب کچھ پُرسکون ہونے لگے تھے۔ میرا خیال تھا کہ میں خطرے کو پیچھے چھوڑ آنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میں نے جسم ڈھیلا چھوڑتے ہوئے سیٹ کے پُشتے سے ٹیک لگالیا۔

میرا ہاتھ ٹرک کے ڈیش بورڈ پر بنے ہوئے ایک ہینڈل نما حصے پر جما ہوا تھا اور میری کلائی پر خوب صورت سنہری گھڑی چمک رہی تھی جس کی چین سونے کی تھی۔ میری کھدر کی معمولی قمیص بُری طرح مٹی میں لتھڑ چکی تھی اور آستین پھٹ کر لٹک چکی تھی جس کی وجہ سے گھڑی نہ صرف نظر آنے لگی تھی بلکہ بہت نمایاں محسوس ہورہی تھی۔

وہ ایک بیش قیمت اور خوب صورت گھڑی تھی۔ یکدم ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کیسی حماقت سرزد ہوچکی تھی۔ میرے غریبانہ حلیے اور مسکین سراپا کے ساتھ اس گھڑی کا تضاد بہت نمایاں تھا لیکن ایک طویل عرصے سے گویا یہ گھڑی میری شخصیت کا ایک جزو بنی ہوئی تھی اس لیے کبھی بطورِ خاص اس کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ یہ گویا میرا ایک عضو ہی تھا' میری کلائی کا ایک حصہ تھا۔

میرے پاس کئی اچھی گھڑیاں تھیں لیکن ایک طویل عرصے سے میں نے کوئی دوسری گھڑی نہیں لگائی تھی۔ عجیب بات تھی کہ انوار نے مجھے جب ایک گجر کا روپ دیا تھا تو اس کا دھیان بھی گھڑی کی طرف نہیں گیا تھا۔ اس نے مجھے ہدایت نہیں کی تھی کہ مجھے اس گھڑی کو بھی اتار دینا چاہیے۔ وہ میری غریبانہ شخصیت کے ساتھ میل نہیں کھارہی تھی۔ ممکن ہے انوار کی توجہ اس طرف گئی بھی ہو لیکن اس نے اسے اہمیت نہ دی ہو۔

مگر اس وقت میری تشویش کی وجہ یہ نہیں تھی کہ گھڑی میرے وجود پر مشکوک سی لگ رہی تھی' میری تشویش کی وجہ کچھ اور ہی تھی اور میں یکدم سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی معمّا آپ کو بہت ہی پریشان کیے رکھتا ہے حالانکہ اس کا حل آپ کے سامنے ہوتا ہے' بہت معمولی اور بہت سیدھا سادا ہوتا ہے لیکن آپ کا ذہن اس کی طرف نہیں جاتا۔

لیکن کسی روز اچانک ہی گویا آپ کے ذہن میں بجلی سی کوندتی ہے اور یکدم ہی گویا کوئی گمشدہ کڑی مل جاتی ہے۔ زنجیر مکمل ہوجاتی ہے' معمّا حل ہوجاتا ہے۔ میں اب بھی یقین سے تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ معمّا حل ہوگیا تھا لیکن ایک خیال بجلی کی کوندے کی طرح ذہن میں ضرور لپکا تھا۔

ایک عرصے سے ریڈ ڈاٹ والے مستقلاً مجھے اپنا تعاقب کرتے نظر نہیں آئے تھے لیکن انہیں معلوم رہتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ جب بھی ضرورت محسوس کرتے تھے میرے سر پر پہنچ جاتے تھے اور اس معمّے نے مجھے پریشان کیا ہوا تھا۔

اپنی گاڑی میں نے "دی سرکل" کے ایک ماہر الیکٹرانک انجینئر سے چیک کروالی تھی۔ اس کے کسی حصے میں کوئی ڈیوائس فٹ نہیں تھی۔ میں اپنے جسم کے ایک ایک حصے کا تنہائی میں تقریباً خوردبینی سے معائنہ کرچکا تھا۔ مجھے خیال آیا تھا کہ جس دوران میں ریڈ ڈاٹ کے خفیہ ٹھکانوں پر بے خبری میں ان کی تحویل میں رہا تھا' اس دوران انہوں نے خفیف سی سرجری کے ذریعے کوئی مائیکرو چپ میرے جسم میں جلد کے نیچے تو کہیں نہیں چھپا دیا تھا جو کسی خاص دائرے میں' کسی خاص کمپیوٹر پر میری نقل و حرکت کی نشاندہی کرتا رہتا ہو؟

لیکن باتھ روم میں کئی بار اپنے نہایت باریک بینی سے معائنے کے بعد بھی مجھے اپنی جلد پر سرجری کا کوئی بال برابر بھی نشان دکھائی نہیں دیا تھا لیکن ظاہر ہے اس وقت گھڑی میری کلائی پر نہیں ہوتی تھی اور اس کی طرف میرا دھیان نہیں جاتا تھا۔ بعد میں کہیں بھی آتے جاتے وقت بغیر کسی خاص توجہ کے تیار ہوتے وقت روانی میں گھڑی لگاتا تھا اور نکل جاتا تھا۔

اس دوران مجھے کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ دو مرتبہ جب ریڈ ڈاٹ نے مجھے اغوا کیا تو یہی گھڑی میری کلائی پر بندھی ہوئی تھی اور اسی طرح واپس آئی تھی۔ وہ اتنی عمدہ گھڑی تھی کہ بے تحاشا مار دھاڑ میں بھی کبھی اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔

ریڈ ڈاٹ والے سائنسی طور پر جتنے ترقی یافتہ تھے' ان کے نزدیک کوئی ڈیوائس چھپانے کے لیے گھڑی سے زیادہ اچھی کیا چیز ہوسکتی تھی؟ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس ڈیوائس کے ذریعے میری تمام گفتگو بھی ان تک پہنچتی رہی ہو۔

مجھے یاد آیا کچھ دیر پہلے جب میں ٹرین میں تھا اور تین سیاہ پوش کمپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تھے تو سب سے آگے والے سیاہ

پوش نے جو میرے اندازے کے مطابق سفید فام تھا' بڑے وثوق سے کہا تھا "وہ یہیں کہیں موجود ہے۔ فاصلہ چند گز سے زیادہ نہیں ہے۔"

ظاہر ہے ان کے پاس کوئی ایسی چیز موجود تھی جس کے ذریعے وہاں میری موجودگی کی نشاندہی ہو رہی تھی لیکن یقیناً میرے وجود پر بھی تو کوئی ایسی چیز تھی جس کی وجہ سے یہ نشاندہی ممکن ہو پاتی تھی۔ اس کمبخت گھڑی کی طرف بھی میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا۔ شاید قسمت اسی کا نام ہے۔ انسان کی آنکھیں کھلی ہوتی ہیں مگر قسمت اسے اندھا بنا دیتی ہے۔

محض چند سیکنڈ میں یہ سب خیالات ایک انتہائی تیز رفتار فلم کی طرح میرے ذہن میں گزر گئے۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میں ساکت بیٹھا ایک ٹک اس گھڑی کو دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی ابھی کوئی اجنبی یہ گھڑی میری کلائی پر لگا کر چلا گیا تھا۔

شیر خان جس کے بارے میں میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ باریکیوں میں جانے والا آدمی نہیں تھا' وہ بھی میری کلائی پر چمکتی اس گھڑی کی طرف متوجہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا جو اس وقت خود مجھے بہت عجیب لگ رہی تھی۔

"گھڑی تو بہت اچھی اے۔" وہ کن انکھیوں سے گھڑی کی طرف دیکھ کر بولا۔ میں نے اس کے لہجے میں شک کا شائبہ محسوس کیا۔ وہ کتنا بھی بے پروا سہی لیکن یہ اندازہ تو کر سکتا تھا کہ گھڑی بیش قیمت تھی۔ اس وقت میری حیثیت اس کے قابل دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

"ایک بہت ہی عزیز دوست کا تحفہ ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "وہ میرے لیے دبئی سے لے کر آیا تھا۔"

یہ ایک لنگڑی سی وضاحت تھی۔ جو حیثیت اس وقت میری نظر آرہی تھی' اس حیثیت والوں کے دوست دبئی سے بھی ان کے لیے اتنے بیش قیمت تحفے نہیں لایا کرتے لیکن یہ وضاحت کچھ کام دے ہی گئی۔ شیر خان مزید کچھ نہ بولا۔

"تمہیں اچھی لگی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اچھا چیز سب کو اچھا لگتا ہے یارا!" شیر خان ڈرائیونگ سیٹ پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

میں نے گھڑی اتار کر اس کے سامنے ڈیش بورڈ پر رکھتے ہوئے کہا "بس تو پھر آج سے یہ تمہاری ہوگئی۔ میرے دوست نے مجھے تحفہ دیا تھا' میں آگے اپنے دوست شیر خان کو وہی چیز تحفے میں پیش کرتا ہوں۔"

"یہ کیا کرتا اے یارا!" اس نے بائیں ہاتھ سے گھڑی اٹھا کر میری گود میں تقریباً پھینک دی "ام نے اس لیے تو اس کا تعریف نہیں کیا تھا کہ تم ام کو دے دیوے۔"

"میں بھی اس لیے تھوڑا ہی دے رہا ہوں۔ میں تو اس لیے دے رہا ہوں کہ تم مجھے اچھے لگے ہو۔ مصیبت کے وقت میرے کام آئے ہو۔ جلدی دوست بننے والے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ آج کے دور میں تم جیسے آدمی کم ہوتے جا رہے ہیں اگر تم نے اسے نہ رکھا تو میں سمجھوں گا تم نے مجھے دوست ہی نہیں سمجھا۔"

"یارا تم تو بڑا ہی خانہ خراب قسم کا آدمی ہے۔ ارے بابا کسی کا تحفہ کسی دوسرے کو تحفے میں نہیں دیتے۔ یہ کوئی اچھا بات نہیں اے۔" اس نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ بے چارہ واقعی شرمندہ نظر آرہا تھا گویا گھڑی کی تعریف کر کے پھنس گیا ہو۔

"بھئی اگر کسی نے مجھے تحفہ دیا تھا تو اب یہ میری چیز ہوگئی نا۔ اور میں اپنی خوشی سے تمہیں دے رہا ہوں۔ تمہیں یہ لینی پڑے گی ورنہ میں سمجھوں گا تم نے مجھے اپنا دوست نہیں بنایا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

وہ گویا عاجز آگیا۔ دونوں کہنیاں اسٹیئرنگ وہیل پر ٹکا کر ایک لمحے کے لیے دونوں ہاتھ سر پر مارتے ہوئے بولا "او یارا اقبال گوجر! تو تم بہت ظالم آدمی ہے۔ اگر تم امارے ہاتھ سے ضائع ہوجاتا تو کتنا افسوس کا بات تھا۔"

میں نے گھڑی اس کی کلائی پر لگا دی۔ اس نے مزید احتجاج نہیں کیا اور غیر ارادی طور پر اشتیاق بھری نظروں سے گھڑی دیکھنے لگا۔ اس وقت میرے پاس کوئی ایسی چیز نہیں تھی کہ گھڑی کو کھول کر دیکھ سکتا آیا اس میں کوئی ڈیوائس موجود تھا یا نہیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ میں اسے کھول لیتا تب بھی ڈیوائس میں اور گھڑی کی مشینری میں امتیاز نہ کرپاتا۔ ممکن ہے ڈیوائس مائیکرو ساخت ہی کا ہوتا اور مشینری ہی کا ایک حصہ نظر آتا۔

بہر حال مجھے ایک اطمینان تو تھا کہ اس کی وجہ سے شیر خان کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر گھڑی کی بدولت کوئی اس تک پہنچ بھی جاتا تو دیکھ سکتا تھا کہ گھڑی کا مالک تبدیل ہوگیا تھا۔ شیر خان کے اور میرے قد کاٹھ' جسمانی ساخت' شکل وصورت غرضیکہ ہر چیز میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ کوئی اس غلط فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہوسکتا تھا کہ میں نے شیر خان کا روپ دھار رکھا تھا۔

میں نے اطمینان کی سانس لے کر سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا لیا۔ میں اب اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا لیکن گھڑی بہر حال ابھی میرے قریب ہی موجود تھی۔ اب میں منتظر تھا کہ جلد از جلد ملتان پہنچ کر شیر خان کو خدا حافظ کہہ کر اس سے دور نکل جاؤں۔

لیکن اطمینان تو شاید اب میری قسمت میں رہا ہی نہیں تھا۔ اسی لمحے کیب کی چھت سے ایک دہشت زدہ سی چیخ سنائی دی۔ چیخ بینا ریشم خان کی تھی۔ اوپر اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔

شیر خان بری طرح چونکا۔ ایکسیلیٹر سے اس کا پاؤں غیر اضطراری طور پر ہٹ گیا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا ایک

انسانی جسم اوپر سے گرا اور ونڈ اسکرین پر سے پھسلتا ہوا بونٹ پر آیا' وہاں سے لڑھک کر ٹرک کے آگے جا گرا۔ ٹرک رکتے رکتے بھی اس کے اوپر سے گزر گیا۔

شیر خان کے حلق سے بھی خوف زدہ سی چیخ نکل گئی۔ اسے یقیناً اندازہ ہو گیا تھا کہ اوپر سے گرنے والا ریشم خان تھا۔ اس پر شاید خوف کے ساتھ ساتھ یکدم اس پچھتاوے نے حملہ کیا تھا کہ ریشم خان اس کے اپنے ہی ٹرک تلے آ کر کچلا گیا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ ریشم خان جس لمحے ونڈ اسکرین پر گرا وہ اس وقت ہی مر چکا تھا۔ میں نے اس کی گردن اس انداز میں ڈھلکی ہوئی دیکھی تھی جیسے محض ایک پتلی سی رتی کے سہارے جسم سے بندھی ہو۔ صرف ایک لمحے کے لیے مجھے اس کا چہرہ اپنے چہرے کے قریب نظر آیا تھا اور پھر میری نظر سے اوجھل ہو گیا تھا لیکن وہ ایک لمحہ مجھے یہ بتا دینے کے لیے کافی تھا کہ ہم نے جو چیخ سنی تھی وہ ریشم خان کی زندگی کی آخری آواز تھی۔

اسٹیئرنگ پر شیر خان کا ہاتھ بہک گیا۔ ٹرک نشیب میں اترا اور بری طرح ادھر اُدھر ڈولتا ہوا درختوں کے بالکل قریب جا کر ایک زوردار دھچکے سے ترچھا رک گیا۔ وہ اس بری طرح ایک طرف کو جھکا ہوا تھا کہ شاید کسی کے ایک ہاتھ کے دھکے سے گر سکتا تھا۔

اسی لمحے ہم دونوں نے بیک وقت اسے دیکھا۔ وہ غالباً ٹرک کے اوپر سے پرواز کرتا ہوا آیا تھا اور اب کسی جناتی سائز کے چمگادڑ کی طرح ہوا میں تیرتا ہوا یکدم ہی ونڈ اسکرین کے سامنے آ گیا تھا۔ وہی نقرئی لبادے والا۔

وہ ہیڈ لائٹس کی زد میں تو نہیں تھا لیکن تھوڑی بہت روشنی اوپر تک بھی پہنچ رہی تھی۔ اس کے لبادے میں ہلکی سی جھلملاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ کیب میں روشنی برائے نام تھی۔ باہر سے جھانکنے والے کو ہماری شکلیں صاف دکھائی نہیں دے سکتی تھیں۔

"اوئے خانہ خراب! یہ کیا بلا اے؟ یہ تو اُڑتی اے۔"

شیر خان کی آنکھیں حیرت و خوف سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں اسی لمحے اپنی طرف کا کیب کا دروازہ کھول چکا تھا لیکن میں نے باہر چھلانگ نہیں لگائی' فوری طور پر چھلانگ لگا کر میں فوراً ہی نقرئی لبادے والے کی نظر میں آ سکتا تھا۔

نقرئی لبادے والے کے لیے ہوا میں ایک جگہ ساکت ہونا شاید ممکن نہیں تھا۔ وہ کسی کھڑکی پر پھڑپھڑاتے ہوئے پرندے کی طرح اِدھر اُدھر ہو رہا تھا۔ دفعتاً اس کا ہاتھ اپنی پشت کی طرف گیا اور واپس آیا تو میں نے اس ہاتھ میں کسی چیز کی جھلک دیکھی۔ میں سمجھا وہ کوئی گن تھی۔ اس وقت تک میں شیر خان کی اسٹین گن اٹھا چکا تھا۔ یہ ایک غیر ارادی سی حرکت تھی ورنہ میں اور راحیلہ اس پر چلائی ہوئی گولیوں کا انجام دیکھ چکے تھے۔

دوسرے ہی لمحے میں اور شیر خان انتہائی سفید چمکیلی روشنی میں نہا گئے۔ ویسی ہی روشنی جیسی کیمرے کے فلیش بلب سے ایک ثانئے کے لیے نکلتی ہے اور معدوم ہو جاتی ہے لیکن ہم پر روشنی جھماکے کی طرح نہیں پڑی تھی۔ کیب میں جیسے روشنی کا سیلاب آ گیا تھا۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں۔

نقرئی لبادے والے نے جو چیز اپنی کمر سے اتاری تھی وہ کوئی گن نہیں بلکہ انتہائی طاقتور فلیش لائٹ یا اسپاٹ لائٹ تھی۔ میں اس پر نظر نہیں جما سکتا تھا لیکن اندازاً میں نے اس پر برسٹ مارا۔ ٹرک کے ونڈ اسکرین چھلنی ہونے کے ساتھ لائٹ بھی معدوم ہو گئی۔ میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ کم از کم اسپاٹ لائٹ پر تو گن کا برسٹ کارگر رہا تھا۔

روشنی شاید ایک سیکنڈ کے لیے ہی ہم پر پڑی تھی لیکن مجھے احساس تھا کہ نقرئی لبادے والا ہماری شکلیں تو دیکھ ہی چکا ہو گا تاہم امید تھی کہ فوری طور پر وہ مجھے نہیں پہچان سکا ہو گا لیکن اگر کوئی ڈیوائس اس کی رہنمائی کر رہی تھی تو اسے یہ یقین ضرور ہو چکا ہو گا کہ میں اس ٹرک میں موجود تھا تبھی تو آخر کار وہ یہاں تک آن پہنچا تھا جس طرح شکاری کتے اپنے شکار کی بُو سونگھتے ہوئے آخر کار اس تک جا پہنچتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ شکاری کتوں کی یہ صلاحیت بیسوں' پچاسوں یا سیکڑوں میل کے دائرے میں کارآمد نہیں رہتی۔ فاصلہ بڑھتا تھا تو وہ اپنے شکار کا سراغ کھو بیٹھتے تھے لیکن ان لوگوں کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ اپنے شکار کا سراغ کھوتے تھے یا نہیں۔

اس روشنی نے میری آنکھیں خیرہ کر دی تھیں' اس کے معدوم ہونے کے بعد بھی ایک لمحے کے لیے تو مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ شیر خان تو اس دوران گویا مفلوج اور گم صم ہو گیا تھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر اس کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ شاید اس کے لیے کسی ناقابلِ یقین اور ڈراؤنے خواب کا حصہ تھا۔ اس دوران میں نے ہاتھ بڑھا کر ٹرک کی ہیڈ لائٹس بھی آف کر دی تھیں۔ موت خواہ کتنی ہی قریب تھی لیکن حاضر دماغی سے کام لینے والا بقا کی جنگ میں بہرحال اپنے لیے کچھ بہتر امیدیں رکھ سکتا ہے۔

میرا یہ یقین برقرار تھا کہ آئی ہوئی موت کو کوئی نہیں ٹال سکتا تھا لیکن اس یقین کے بعد بھی میں ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ جدوجہد ترک نہیں کر سکتا تھا۔ بقا کی جنگ میں آخری سانس تک لڑنا بھی میرے یقین کا ایک حصہ تھا۔

باہر پھیلے ہوئے اندھیرے میں نقرئی لبادے والے کا ہیولا ایک لمحے کے لیے ہی میری نظر سے اوجھل رہا جب وہ دوبارہ مجھے نظر آیا تو وہ ذرا بلندی پر جا چکا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں کسی چمکیلی چیز کی جھلک دیکھی جسے وہ ٹرک پر پھینکنے لگا تھا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر اپنے تھیلے سمیت نیچے پھسل گیا۔

میرا خیال تھا کہ میں زمین پر جا کر گروں گا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا ٹرک اس وقت ایک برساتی نالے کے کنارے کھڑا تھا اور میں اسی میں گرنے کو تھا۔ برساتی نالے میں اچھا خاصا' سہرجتنا پانی موجود تھا۔ میں خاصی گہرائی میں جا کر "غڑاپ" سے پانی میں گرا اور اس کے ساتھ ہی فضا میں ایک خوف ناک دھماکا سنائی دیا۔

میرے گرنے کی آواز اس دھماکے میں مدغم ہو کر رہ گئی۔ میں تیزی سے پانی میں نیچے جا رہا تھا لیکن سرپانی کی سطح سے نیچے لے جانے سے پہلے میں نے اس طرح ٹرک کے ٹکڑے اُڑتے دیکھے جیسے کسی طیارے نے اس پر بہت ہی طاقتور بم گرایا ہو حالانکہ میں نے نقرئی لبادے والے کو جو چیز ٹرک پر گراتے دیکھا تھا وہ مرغی کے انڈے سے زیادہ بڑی نہیں تھی۔ وہ اس کے ہاتھ میں بہت ہی مدھم روشنی دینے والے اس بلب کی طرح چمک رہی تھی جس پر سفید پینٹ کی بہت ہی موٹی سی تہ جما دی گئی ہو۔

میرے پانی میں گرنے اور ٹرک کے پرخچے اُڑنے میں شاید ایک چوتھائی سیکنڈ کا فرق رہا ہو۔ شاید اسی لیے نقرئی لبادے والے کو اس کا پتا نہیں چل سکا۔ وہ یقیناً یہی سمجھا ہو گا کہ ٹرک میں جو کوئی بھی موجود تھا' جو کچھ بھی موجود تھا' سب ٹکڑوں میں تقسیم ہو کر فضا میں بکھر گیا تھا۔

میں پانی میں گرنے کی وجہ سے مزید بہت سے نقصانات سے بچ گیا۔ خشکی پر گرا ہوتا تو شاید پرخچے میرے جسم میں پیوست ہو جاتے۔ یا کوئی بھاری بھرکم ٹکڑا مجھ پر آ گرتا۔ میں نالے کی تہ سے ٹکرایا تو میں نے کوشش کی کہ تہ میں ہی رہوں۔ فوری طور پر دوبارہ سطحِ آب پر اُبھرنے نہ پاؤں۔ پانی کی تہ میں ہی سب سے زیادہ عافیت تھی۔

پانی بدبودار اور کثیف تھا لیکن اس وقت مجھے بہت بھلا محسوس ہوا تھا۔ اس نے گویا مجھے اپنی تاریک آغوش میں لے کر نہ جانے کس کس مصیبت سے بچا لیا تھا۔ میں نے پانی میں ہلچل محسوس کی تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ ٹرک اور اس کے سازوسامان کے کچھ ٹکڑے نالے میں بھی آ کر گرے تھے۔

ایک ٹھوس چیز تو میرے جسم سے رگڑ کھاتی ہوئی تہ میں دھنس گئی۔ میں نے گدلے پانی میں اسے ٹٹول کر دیکھا اور میرے جسم میں مزید ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ ٹرک کا منوں وزنی لوہے کا ایکسل تھا۔ اگر وہ سیدھا مجھ پر آ گرا ہوتا تو پھر پانی کی پناہ بھی ناکافی ہوتی۔ شاید میری کھوپڑی ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی' کمر ٹوٹتی یا پھر میں پورا ہی اس کے نیچے دب کر کچلا جاتا۔ موت تھی کہ بار بار مجھے چھوتی ہوئی گزر رہی تھی اور زندگی تھی کہ مجھے اپنے دامن میں چھپائے' اس سے کتراتی' اسے غچے دیتی چلی جا رہی تھی۔

وہی ایکسل جو میری اذیت ناک موت کا سبب بن سکتا تھا' اسی ایکسل کو مضبوطی سے پکڑ کر میں تہ میں جم کر بیٹھ گیا۔ سانس میں نے روک رکھی تھی۔ سانس روکنے کی مجھے جتنی بھی مشق تھی اسے میں اس وقت کام میں لایا۔ آخر کار پانی دوبارہ ساکت ہو گیا۔ پانی سے باہر کیا صورتِ حال تھی' اس کے بارے میں' میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

تاہم دو تین منٹ یہ خیروعافیت گزر چکے تو مجھے احساس ہونے لگا کہ باہر بھی سکوت ہی تھا۔ میں نے نہایت آہستگی سے اوپر آنا شروع کیا۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ پانی میں زیادہ ہلچل پیدا نہ ہونے پائے۔

تھیلا اب بھی میرے ہاتھ میں تھا۔ زندگی اور موت کی اس کشمکش میں' میں نے اپنے اوسان خطا نہیں ہونے دیے تھے اور اسے ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اس میں سے پیاز وغیرہ تو سب گر چکے تھے لیکن کپڑوں کا جوڑا اور اس کے نیچے رقم کا پیکٹ اب بھی موجود تھا۔ مجھے امید تھی کہ نوٹوں کا کچھ نہیں بگڑا ہو گا وہ پولیتھین کی تھیلی میں پیک تھے۔

شلوار قمیص بھی شاپنگ بیگ میں تھے۔ مجھے امید تھی کہ وہ بھی زیادہ نہیں بھیگے ہوں گے۔ کم از کم ان کی وہ حالت نہیں ہو گی جو میرے تن پہ موجود کپڑوں کی ہو چکی تھی۔

نہایت آہستگی سے میں نے سطحِ آب سے سر اُبھارا اور اردگرد دیکھا۔ موت صرف چند لمحوں میں اپنا ایک ہنگامہ بپا کر کے غائب ہو چکی تھی۔ اب وہاں سکوت ہی سکوت تھا لیکن موت اپنی بدصورتی کے نقوش ضرور چھوڑ گئی تھی۔

ٹرک کے ٹکڑے دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔ بعض میں آگ لگی ہوئی تھی اور مدھم ہوا میں شعلے دھیرے دھیرے پھڑپھڑا رہے تھے۔ انگوروں کی پیٹیاں تک بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں اور اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں کچھ شکستہ پیٹیاں برساتی نالے میں بھی تیر رہی تھیں۔ چوبی ٹکڑوں میں کہیں کہیں لگی ہوئی آگ کی وجہ سے مدھم سی روشنی پھیل گئی تھی مگر یہ روشنی گویا زندگی کا ماتم کر رہی تھی۔

میں نے آسمان کی طرف نظر دوڑائی۔ نقرئی لبادے والے کا ہیولا مجھے کہیں دکھائی نہ دیا۔ کیا وہ واقعی اپنے مشن کی تکمیل سے مطمئن ہو کر لوٹ گیا تھا؟ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں دھیرے دھیرے تیرتا ہوا نالے کے کنارے تک پہنچا۔ نالہ خاصی گہرائی میں تھا۔ ریتلے کنارے پر بہ مشکل قدم جماتے ہوئے میں اوپر آیا تو ٹرک کے مزید ٹکڑے اِدھر اُدھر بکھرے دکھائی دیے۔ کہیں کہیں پامال شدہ انگوروں کی ڈھیریاں پڑی تھیں اور کہیں انگوروں کے رس کی وجہ سے چپ چپا سا کیچڑ پھیلا ہوا تھا۔

کہیں کہیں مجھے گوشت کے جھلسے ہوئے سے لوتھڑے بھی دکھائی دیے۔ وہ شیر خان کا تن پارہ پارہ تھا۔ وہ واقعی شیر جیسا جوان تھا۔ شیر دل بھی تھا لیکن زندگی اچانک ہی اسے دغا دے گئی تھی۔ اس کی تو شاید سمجھ میں بھی نہ آیا ہو گا کہ اس کے ساتھ ہوا کیا تھا۔ وہ تو حیرانی کے عالم میں ہی بیٹھا رہ گیا تھا اور پلک جھپکنے میں اس کا وجود عدم وجود میں بدل گیا تھا۔

ایک جگہ مجھے اس کی کھوپڑی دکھائی دی۔ کندھے کا کچھ حصہ

بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے چہرے سے گوشت اس طرح غائب تھا جیسے درندوں نے نوچ کھایا ہو "کارنامہ" تو واقعی یہ درندوں ہی کا تھا۔ دو ٹانگوں پہ چلنے والے اور سائنس کے میدان میں بہت زیادہ ترقی کرجانے والے درندوں کا۔

میری رگ وپے میں غیظ وغضب کی آتشِ مجبور کی تپش پھیل گئی۔ برساتی نالے کا پانی یک لخت ہی میری آنکھوں میں تیزاب کی طرح جلنے لگا۔ شاید یہ ان آنسوؤں کی جلن تھی جو بہنا چاہتے تھے لیکن میں نے انہیں روکا ہوا تھا۔

"ہوسکے تو مجھے معاف کردینا دوست!" میں نے اس کی کھوپڑی کے پاس اکڑوں بیٹھتے ہوئے خاموشی کی زبان میں کہا "تمہاری موت شاید لکھی تو اسی طرح ہو لیکن میں خود کو ہی اس کا ذمے دار سمجھوں گا۔ بہت سے قرض مجھ پر واجب الادا ہیں۔ تمہارا نام بھی میں نے قرضوں کے اس رجسٹر میں لکھ لیا ہے۔"

پھر میں نے کچھ پیچھے سڑک پر آکر دیکھا۔ ریشم خان کی لاش سڑک کے کنارے کچلی مسلی سی پڑی تھی۔ اس کی گردن اس طرح ٹوٹی ہوئی تھی جیسے اسے پھانسی دی گئی ہو اور باقی جسم تین چار جگہ سے ٹرک کے پہیوں تلے کچلا گیا تھا۔ میں نے اس کی لاش احتیاط سے ایک طرف کو ہٹا کر سڑک کے کنارے ڈال دی کہ کہیں کوئی بدمست ڈرائیور اس پر سے مزید کوئی گاڑی نہ گزار دے۔

مجھے نالے سے نکلے بہ مشکل تین چار منٹ ہوئے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے آگے چل دینا چاہیے تھا۔ وہ تو غنیمت تھا کہ مخدوش حالات کی وجہ سے سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا ورنہ اب تک شاید کوئی اس دھماکے کی وجہ سے متوجہ ہوکر اس طرف آنکلتا۔ میرا سفر جاری رکھنا ہی بہتر تھا۔

میں ایک بار پھر جنگل میں داخل ہوگیا اور پہلے ہی کی طرح کچھ اندر جانے کے بعد سڑک کے متوازی چلنے لگا۔ بھیگے ہوئے کپڑوں کی وجہ سے مجھے سردی لگ رہی تھی لیکن میں دانت پر دانت جمائے تیز تیز چلتا رہا۔ اس وقت شاید حقیقتاً تو سردی نہیں تھی لیکن میرے اندر کا موسم تیزی سے تبدیل ہورہا تھا۔ شاید میرے اندر ہی یخ بستگی پھیل گئی تھی۔ آخرکار مجھے کپکپی کا سا احساس ہونے لگا تو میں نے جسم کو گرمانے کے لیے دوڑنا شروع کردیا۔

کافی دیر تک میں دوڑتا رہا اور اپنی توانائیوں کا امتحان لیتا رہا۔ مسلسل دوڑنے سے جسم بھی گرما گیا اور کپڑے بھی کافی حد تک سوکھ گئے۔ اس دوران مجھے سڑک پر وقفے وقفے سے تین چار بسیں اور ٹرک گزرتے دکھائی دیے لیکن میں نے سڑک پر آکر کسی کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ ان میں سے کوئی گاڑی والا شاید ریشم خان کی لاش دیکھ کر آرہا ہو یا شاید گاڑی میں ڈال کر ہی کہیں پولیس وغیرہ کو پہنچانے کے ارادے سے لے کر آرہا ہو اور مجھے اس ویرانے میں مشکوک سی حالت میں دیکھ کر اس لاش سے میرا ناتا جوڑنے لگے۔

میں نے کئی گاڑیوں کو گزر جانے دیا۔ آخرکار ایک گاڑی کو روکنے کا ارادہ کیا۔ وہ بس معلوم ہوتی تھی۔ قریب آئی تو آگے کو نکلے ہوئے بونٹ والی بس ہی ثابت ہوئی۔ اس کی ونڈ اسکرین کے عقب میں، روشنی میں تختی لگی ہوئی تھی جس پر نمایاں الفاظ میں "لاہور سے ملتان" لکھا ہوا تھا۔

میں نے سڑک کے کنارے کھڑے ہوکر زور زور سے ہاتھ ہلایا۔ ڈرائیور کا روکنے کا ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن پھر شاید اس کا جذبۂ ترحم کچھ جاگا اور اس نے کافی آگے جاکر آخرکار بس روک ہی لی۔ میں دوڑ کر اس تک پہنچا۔ کنڈیکٹر نے پہلے کھڑکی سے جھانک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور نہ جانے کس بات کا اطمینان کرنے کے بعد دروازہ کھولا۔

پائیدان پر میرے قدم رکھتے ہی ڈرائیور نے تیزی سے بس آگے بڑھادی اور کنڈیکٹر نے مجھے خبردار کیا "سیٹ کوئی خالی نہیں ہے۔"

"بھائی! سیٹ کون مانگ رہا ہے۔ اس وقت تو میں جتنی پریشانی میں ہوں، تم کہو گے تو چھت پر بیٹھ کر بھی چلا جاؤں گا۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

میرے یہ کہنے پر اس کا رویّہ کچھ ہمدردانہ سا ہوگیا اور اس نے پچھلے حصے میں لمبی سیٹ کے ایک کونے پر میرے لیے جگہ بنا ڈالی لیکن جس مسافر کے پاس میں پھنس پھنسا کر بیٹھا وہ ناگواری سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میرے کپڑے ابھی تک ذرا گیلے ہی تھے۔ کھیسے میں پڑے ہوئے چند نوٹ بھی گیلے ہوچکے تھے۔ میں نے بھیگے ہوئے نوٹ سے ہی کنڈیکٹر کو کرایہ ادا کیا تو اس نے پنجابی میں مذاق کرنے کی کوشش کی "بھائی صاحب! یہ رات کو نہانے کی کیا سوجھی تھی؟ وہ بھی کپڑوں سمیت۔"

"شاید تمہیں معلوم نہیں۔ پیچھے تیزگام پر ڈاکا پڑا تھا۔" میں نے بہ آوازِ بلند کہا "میں ڈاکوؤں کی نظر بچا کر ٹرین سے اتر کر بھاگا تھا تو اندھیرے میں ایک نالے میں گر گیا۔ کئی میل سے پیدل چلا آرہا ہوں۔"

میرے برابر والے مسافر کی ناگواری ہمدردی میں بدل گئی۔ دوسرے کچھ اونگھتے ہوئے مسافر بھی ذرا چونک گئے جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس گاڑی والوں کو ریلوے لائن یا سڑک پر راستے میں ہونے والی کسی گڑبڑ کا علم نہیں تھا۔ بہرحال میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھے مشکوک سمجھیں اس لیے میں نے تھوڑی سی وضاحت کردی تھی۔

میرے برابر والا باریش مسافر بولا "اللہ رحم کرے جی۔ سندھ میں تو ٹرینوں وغیرہ پر ڈاکو کا بڑا ذکر سنتے تھے۔ اب تو ادھر بھی آئے دن اس قسم کی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔"

"سندھ کوئی دوسرے ملک میں تو نہیں ہے ناجی!" ایک اور عمر رسیدہ مسافر دانشورانہ لہجے میں بولا "اِسی ملک کا ایک حصہ

ہے۔ ایک حصے میں حالات خراب ہوتے ہیں تو دوسرے حصے میں اس کے اثرات ضرور آتے ہیں۔"

تیسرا مسافر بولا "اُدھر سختی ہوتی ہے تو ڈاکو اور دہشت گرد اِدھر آجاتے ہیں، اِدھر سختی ہوتی ہے تو علاقۂ غیر چلے جاتے ہیں۔ یونہی گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ ان کے لیے زمین بہت بڑی ہے۔ انہیں ہر راستہ معلوم ہے۔ ہر جگہ پناہ لینے کا طریقہ انہیں آتا ہے۔ اپنا ہر مقصد پورا کرکے روپوش ہوجانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ مشکل تو بے چارے شریف آدمی کی ہے۔ اس کے لیے آرام سے کہیں رہنا اور اپنا جائز کاروبار کرنا بھی مشکل ہوتا جارہا ہے۔"

میری اطلاع نے گویا ہشت پہلو بحث کا دروازہ کھول دیا تھا۔ مسافروں کو جیسے دل کا غبار نکالنے کے لیے موضوع مل گیا۔ سب مختلف زاویوں سے حسبِ توفیق حالات پر روشنی ڈالنے لگے۔ سب گویا جلے دل لیے بیٹھے تھے، پھپھولے پھوڑنے لگے۔ بحث میں سیاست کا آن شامل ہونا بھی ناگزیر تھا۔ ظاہر ہے سیاسی حالات ہی کا ملک کے سماجی حالات پر زیادہ اثر پڑتا ہے اس لیے لوگ اسے بیچ میں لائے بغیر رہ بھی نہیں سکتے تھے۔

میں نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور کھڑکی سے سر ٹکا کر اونگھنے اور سستانے کی کوشش کرنے لگا لیکن دھچکوں اور انجن کی جھنجناہٹ کی وجہ سے سر کھڑکی پر ٹکائے رکھنا مشکل تھا اس لیے میں نے ہٹالیا اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے اپنے آپ کو ماحول سے لاتعلق کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ مسافروں کی آوازیں مجھے دور سے آتی محسوس ہونے لگیں۔

دفعتاً میں چونک اٹھا۔ عقب سے سیاہ رنگ کی ایک مرسیڈیز تیز رفتاری سے چلی آرہی تھی۔ اس کے شیشے بھی گہرے رنگ کے معلوم ہوتے تھے۔ اندر کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے اعصاب جو بس کے پُرحرارت ماحول اور خفیف سے ایک احساس تحفظ کی وجہ سے کچھ پُرسکون ہوچلے تھے یکدم پھرتن گئے۔ میں چوکنا ہوکر بیٹھ گیا۔

بھری پری بسوں اور ٹرکوں والوں کے رویّے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ رات کے وقت ان سڑکوں کو سفر کے لیے محفوظ نہیں سمجھتے تھے لیکن ایسے میں وہ مرسیڈیز نہ جانے کہاں سے فراٹے بھرتی آرہی تھی۔

جلد ہی اس نے بس کو اوورٹیک کرلیا۔ میں کھڑکی سے گردن نکال کر دیکھنے لگا کہ شاید ابھی وہ ترچھی ہوکر رکے گی اور بس کو بھی رکنے پر مجبور کردے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ تیز رفتاری سے گزرتی چلی گئی۔ وہ نظر سے اوجھل ہوچکی تب میں نے ذرا سکون کی سانس لی۔ وہ صرف چند سیکنڈ نظر کے سامنے رہی تھی لیکن میرے بے سکون اعصاب کو یکدم مرتعش کرگئی تھی۔

اس کے بعد ملتان تک کا سفر کسی خاص واقعے کے بغیر گزر گیا۔ سفر طویل بھی نہیں تھا۔ صبح سے پہلے میں ملتان جا پہنچا لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے اسی سیاہ مرسیڈیز کو لاری اڈے کے کچھ ہی دور سڑک کے کنارے کھڑے دیکھا۔ اس کی نمبر پلیٹ لاہور کی تھی اور نمبر میں نے ذہن نشین کرلیا تھا۔ لیکن اس کے چاروں دروازے بند تھے۔ کھڑکیوں کے تاریک شیشے بھی اسی طرح چڑھے ہوئے تھے جس طرح میں نے راستے میں دیکھے تھے۔ کوئی باہر بھی نہیں کھڑا تھا۔ گاڑی کی ونڈ اسکرین تک گہرے رنگ کی تھی۔ یہ کہنا بھی مشکل تھا کہ گاڑی میں کوئی موجود تھا یا نہیں؟

وہ بس پُراسرار سے انداز میں ایک طرف کو کھڑی تھی۔ وہ ایسی گاڑی تھی کہ دیکھتے ہی نظر میں کھٹکتی تھی اس لیے مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ ریڈ ڈاٹ سے اس کا کوئی تعلق ہوسکتا تھا۔ وہ اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ نظر میں کھٹکنے والی کوئی چیز استعمال کرتے۔ وہ بالکل عام سی چیزوں کو عام سے انداز میں استعمال کرتے اس طرح اِدھر اُدھر پھرتے تھے کہ ان کی طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی تھی۔

وہ اپنی کسی سائنسی شعبدے بازی کے ساتھ بھی نکلتے تھے تو ان کی حکمتِ عملی ایسی ہوتی تھی کہ عام لوگوں کی نظر میں کم ہی آتے تھے۔ ان کی یہ مصلحت کوشی ان کے لیے بہت فائدہ مند تھی۔

مرسیڈیز سے کچھ ہی دور لاری اڈے کے دوسرے کونے پر پولیس کی ایک موبائل کھڑی تھی لیکن مرسیڈیز کی طرف پولیس والوں میں سے کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ جب وہ لوگ اتنی مشکوک نظر آنے والی گاڑیوں کو چیک نہیں کرتے تھے تو پھر آخر کون سی گاڑیوں کو چیک کرتے تھے؟ ممکن ہے چیک کرتے بھی ہوں لیکن جس وقت چیک کرتے ہوں اس وقت ان میں سے کوئی مشکوک یا قابلِ اعتراض چیز برآمد نہ ہوتی ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چیک کرنے کے لیے بڑھتے ہوں لیکن کھڑکیوں سے جھانکتی کلاشنکوفیں دیکھ کر دُم دبا کر اپنے ٹھکانے پر واپس آجاتے ہوں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ چیک کرنے پہنچتے ہوں تو ان کے ہونٹوں پر لال نوٹوں کی ٹیپ اور آنکھوں پر نیلے نوٹوں کی پٹیاں باندھ دی جاتی ہوں۔ وہ کچھ بولنے اور دیکھنے کے قابل نہ رہتے ہوں۔

وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ ہمارے ہاں جرائم پیشہ افراد کی نقل وحرکت شریف افراد کی نقل وحرکت سے زیادہ آسان تھی اسی لیے یہاں تخریب کاری بھی بہت آسان تھی۔ جہاں گندم کے ٹرک تو ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے ہوئے پکڑے جاتے ہوں لیکن اسلحے کے ٹرک ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں، کسی کی نظر میں آئے بغیر پہنچ جاتے ہوں وہاں تخریب کاری کی نہیں تو کیا اصلاحِ معاشرہ کی امید رکھی جاسکتی تھی؟

میں سب سے آخر میں بس سے اترا اور آخری مسافروں کی آڑ میں ہی رہتے ہوئے احتیاطاً جلدی سے بس کے پیچھے اس طرح

چلا گیا کہ اگر مرسیڈیز میں بیٹھا کوئی شخص مسافروں کا جائزہ لے رہا ہو تو وہ مجھے نہ دیکھ پائے۔

لاری اڈا خاصا وسیع تھا اور اس کے دو طرف کہیں کہیں دیوار تھی۔ ایک طرف کچھ عمارات تھیں اور ایک طرف پھلوں' پان سگریٹ اور نہ جانے کن کن چیزوں کے کیبن تھے۔ چند رکشا اور تانگے لاری اڈے کے اندر ہی چکرا رہے تھے۔ قدرے اندھیرے میں ایک رکشے کو روک کر میں اس میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن روانہ ہوگیا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ اسٹیشن پہنچتے ہی مجھے مزید آگے روانہ ہونے کے لیے ٹرین مل گئی۔ کراچی ایکسپریس روانہ ہونے کے لیے وسل ہی دے رہی تھی کہ میں اس تک جا پہنچا۔ تمام ڈبوں کے دروازے مسافر بند کیے بیٹھے تھے۔ بھیڑ بھاڑ نے انسان کو بڑا خودغرض بنا دیا ہے جو اندر بیٹھے ہوتے ہیں ان کی کوشش ہوتی ہے کہ باہر والے اندر نہ آنے پائیں۔

ٹرین اس وقت رینگنے لگی تھی جب میں کسی نہ کسی طرح اس میں گھسنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس ٹرین کی بھی وہی حالت تھی جو تقریباً ہر ٹرین کی ہوتی ہے۔ میں اپنا تھیلا گود میں لیے ایک کونے میں فرش پر سکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت مجھے آئینہ میسر نہیں تھا کہ اپنا عکس دیکھتا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس وقت میں کوئی تباہ حال دہقان یا مزدور دکھائی دے رہا تھا۔

اب بھی میں نے کسی خاص منزل کا تعین نہیں کیا تھا۔ میں ایک بے منزل مسافر ہی تھا لیکن میں مسلسل حرکت میں رہنا چاہتا تھا۔ سفر کے لیے میں ٹرین کو اس لیے ترجیح دے رہا تھا کہ اس میں معمولی سے تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے موہوم سی امید تھی کہ میری وجہ سے وہ لوگ پوری ٹرین یا اس کے کچھ حصے کو اُڑانے سے گریز کریں گے کیونکہ وہ بڑے پیمانے پر کوئی کارروائی کرکے زیادہ لوگوں کی نظر میں آنے سے حتی الامکان گریز کرتے تھے۔

لیکن یہ میری خوش فہمی بھی ہوسکتی تھی۔ ان کے بارے میں یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ مجھے ہلاک کرنے کے لیے وہ کسی پورے شہر کو ہی تباہ کر ڈالتے۔ اس مقصد کے لیے اگر وہ فارن منسٹر کی نجی کوٹھی' مکینوں سمیت تباہ کرسکتے تھے' پلک جھپکتے میں ٹرک کے پرخچے اُڑا سکتے تھے تو کسی ٹرین' ہوائی جہاز یا بحری جہاز کو اُڑانے میں بھی انہیں کوئی تامل نہیں ہوسکتا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ مصلحتیں زیادہ دیر تک ان کے آڑے آتی رہتیں۔

بظاہر تو یہی محسوس ہو رہا تھا کہ خطرہ میرے سر سے ٹل گیا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ ٹرین میں مجھے پانے میں ناکامی کے بعد شاید وہ سب لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے تھے جو مجھے پکڑنے یا ہلاک کرنے کی مہم پر نکلے ہوئے تھے۔

جس نقرئی لبادے والے نے ٹرک کو اُڑایا تھا اسے تو یقیناً اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ میں بچ گیا تھا۔ اس نے واپس جاکر اپنی کامیابی کی رپورٹ دی ہوگی۔ اس کے بعد بھی کئی طرح کے امکانات ہوسکتے تھے۔

اگر واقعی میری اس گھڑی میں ہی کوئی ڈیوائس موجود تھا جس پر مجھے شبہ ہوا تھا تو ٹرک کے ساتھ یقیناً وہ بھی تباہ ہوچکی تھی۔ اب وہ میرے ہاتھ پہ نہیں تھی۔ اس سے میں امید رکھ سکتا تھا کہ انہیں میری نقل و حرکت کا سراغ ملنا بند ہوچکا تھا۔ عین ممکن تھا کہ جو کوئی بھی اس مہم کا انچارج رہا ہوا سے اب اطمینان ہوگیا ہو اور وہ لوگ واپس لوٹ گئے ہوں۔

لیکن یہ امکان بھی موجود تھا کہ مہم کا انچارج یا کوئی بھی دوسرا زیادہ بااختیار شخص نقرئی لبادے کی رپورٹ سے مطمئن نہ ہوا۔ وہ بہت باریک بین لوگ تھے۔ ممکن تھا کہ باقی لوگوں میں سے کوئی اس جگہ آیا ہو جہاں ٹرک کے پرخچے اُڑے تھے وہاں انہیں میری لاش کا کوئی ٹکڑا یا کوئی بھی دوسرا سراغ نہ ملا ہو جس سے انہیں شبہ یا یقین ہوگیا ہو کہ میں بچ نکلا ہوں اور اب وہ کوئی نئی مہم ترتیب دے رہے ہوں۔ نہ جانے کس کس سمت میں میری تلاش میں بکھر رہے ہوں۔

یہ سب میرے اندازے تھے' سوچوں کی بھول بھلیاں تھیں جن میں' میں بھٹکے جا رہا تھا۔ یہ اندازے غلط بھی ہوسکتے تھے اور درست بھی۔ میں فی الحال اندازے لگانے کے سوا کر بھی کچھ نہیں سکتا تھا۔

چاہتا تو میں بھی یہی تھا کہ اب مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤں۔ اپنے آپ کو تسلی دے لوں کہ ریڈ ڈاٹ والوں نے مجھے مُردہ سمجھ لیا ہے اور میرا پیچھا چھوڑ دیا ہے لیکن وہ جو چھٹی حس سے بھی آگے میری ایک نامعلوم حس تھی جسے میں ساتویں حس کہتا تھا مجھے مطمئن نہیں ہونے دے رہی تھی۔

میری اس حس کو نہ جانے کہاں سے... شاید کہیں بہت دور سے خطرے کے سگنل اب بھی موصول ہوئے جا رہے تھے۔ سگنل بہت کمزور تھے' خفیف تھے لیکن بہرحال معدوم نہیں ہوئے تھے۔ ہوا کے دوش پر نہ جانے کس سمت سے آرہے تھے۔ کبھی میں سوچتا کہ شاید خطرے کی بُو میرے حواس میں رچ گئی تھی ایک طویل عرصے سے میں جن حالات کا شکار رہا تھا اس کے بعد شاید اب مجھے اپنے آپ کو خطرے سے محفوظ محسوس کرنے کی عادت ہی نہیں رہی تھی۔

میں بُری طرح تھک چکا تھا۔ میرا جسم اور ذہن دونوں ہی شل تھے۔ میں نے خطرے کے اس خفیف سے احساس پہ لعنت بھیجی اور ایک کونے میں دیوار سے ٹیک لگا کر سو گیا۔ وہ جو محاورہ ہے کہ نیند سولی پہ بھی آجاتی ہے اس کا عملی تجربہ مجھے اس وقت ہوا۔

میری آنکھ کھلی تو صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ ٹرین کسی *

بڑے اسٹیشن پر کھڑی تھی۔ پلیٹ فارم پر خوب چہل پہل اور روشنی تھی۔ بھانت بھانت کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ لوگ میرے پیروں پر سے اور ان کے آس پاس بکھرے ہوئے ساز و سامان پر سے پھلانگتے ہوئے آجا رہے تھے۔ کوئی ٹرین میں سوار ہو رہا تھا' کوئی اتر رہا تھا۔

میں ہڑبڑا کر وہیں اتر گیا۔ میں نے دیکھا وہ روہڑی جنکشن تھا۔ میں نے سوچا میرا وہاں اتر جانا ٹھیک ہی تھا۔ میں اس سے آگے کراچی کی سمت میں سفر جاری رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں خاصی دیر بے خبر سویا رہا تھا۔ غنیمت تھا کہ میرے تھیلے کی ظاہری حقیر حالت دیکھ کر کسی نے اس پہ ہاتھ صاف نہیں کیا تھا۔

سامنے ہی ایک نل کی ٹونٹی کھلی تھی اور پانی زور شور سے بہہ رہا تھا' بے مقصد ضائع ہو رہا تھا۔ میں نے نل کی منڈیر پر بیٹھ کر اچھی طرح ہاتھ منہ دھویا' بال کچھ درست کیے اور ایک ٹی اسٹال کے قریب بینچ پر بیٹھ کر چائے بسکٹ وغیرہ کا آرڈر دیا۔

اور ہلکے پھلکے ناشتے کے بعد میں نے اپنے آپ کو کافی تازہ دم محسوس کیا۔ اس وقت تک میں دل ہی دل میں ایک مبہم سے فیصلے پر بھی پہنچ چکا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ مجھے اندرون سندھ کے کسی نہایت غیر معروف اور بے آباد سے مقام کی طرف نکل جانا چاہیے اور کچھ عرصہ مکمل روپوشی سے گزارنا چاہیے۔ اس دوران اگر اطمینان ہوجائے کہ کوئی طاقت میری تلاش میں نہیں ہے' کوئی خطرہ میرے تعاقب میں نہیں ہے تو پھر لاہور کی طرف واپس جانے یا کراچی کی طرف نکلنے کا کوئی پروگرام بنانا چاہیے۔

اپنی آوارہ گردی اور گمراہی کے دور کی کچھ یادیں اور کچھ معلومات ذہن میں محفوظ تھیں۔ جب ہم چھوٹے پیمانے پر مال اِدھر سے اُدھر کرنے کے چکر میں پورے پاکستان کو کھنگالتے پھرا کرتے تھے۔ ان دُھندلی دُھندلی یادوں میں بھٹکتے ہوئے میں نے سوچا کہ پہلے تو سکھر پہنچنا مناسب ہوگا۔ روہڑی اور سکھر کے درمیان صرف دریائے سندھ حائل تھا۔

اسٹیشن کے باہر رکشے' تانگے اور سوزوکیاں موجود تھیں جن میں بیٹھ کر روہڑی سے سکھر جایا جاسکتا تھا۔ سکھر جانے کا فائدہ یہ تھا کہ وہاں ٹرینوں کے انتظار میں بیٹھے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہاں سے سندھ کی ہر سمت میں' ہر روٹ پر' ہر جگہ جانے کے لیے کوئی نہ کوئی بس پکڑی جاسکتی تھی گوکہ اسٹیشن پر اپنے اردگرد کہیں بھی مجھے خطرے کی کوئی علامت نظر نہیں آرہی تھی لیکن فی الحال میں احتیاطاً ایک جگہ ٹک کر بیٹھنا نہیں چاہتا تھا۔ ابھی مجھے وہ اطمینان حاصل نہیں تھا جو کہیں ٹک کر بیٹھنے کے لیے ضروری تھا۔ ناشتا کرتے ہی میں اسٹیشن سے باہر آگیا۔

ایک رکشے میں بیٹھ کر میں سکھر کی طرف روانہ ہوا تو صبح کا اُجالا پھیلنے لگا تھا لیکن ابھی فضا میں سُرمئی دُھندلاہٹ موجود تھی۔ سکھر جانے والے بیشتر مسافر مختلف سواریوں میں بیٹھ کر سکھر جاچکے تھے۔ میرے حصے میں ایک ایسا رکشا آیا تھا جس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ خود زیادہ کھٹارا تھا یا اس کا ڈرائیور۔

وہ جوان ہی تھا لیکن نشے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ تباہ حالی اس کے چہرے پر رقم تھی۔ بظاہر کوئی اسے دیکھتا تو شاید بیمار سمجھتا لیکن میں نے جس انداز سے اسے سگریٹ پیتے دیکھا اس سے اس کی بیماری میری سمجھ میں آگئی۔ لوگ کہتے ہیں ہیروئن کی کوئی بُو نہیں ہوتی' سگریٹ میں کوئی پی رہا ہو تو اس کا پتا نہیں چلتا لیکن میرا خیال تھا کہ تجربہ کار آنکھ اور حساس ناک ہیروئن کے سگریٹ اور سگریٹ پینے والے کو پہچان سکتی تھی۔

وہ خود بھی کھانس رہا تھا اور اس کے رکشے کا انجن بھی کھانسنے ہی کے انداز میں چل رہا تھا۔ پُل کی چڑھائی شروع ہونے سے پہلے ہی رکشے کا انجن کچھ زیادہ زور دار انداز میں کھانس کر خاموش ہوگیا۔ نوجوان نے جلدی سے اتر کر پلگ کھول کر صاف کیا اور انجن کو بھی کچھ ٹھونک بجا کر دیکھا لیکن انجن اسٹارٹ ہو کر نہ دیا۔

میں نے رکشے سے اتر کر ایک بے وجہ جذبۂ ترحم کے تحت پچاس روپے اس کے ہاتھ پہ رکھے اور اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "جو سگریٹ تم پیتے ہو اسے چھوڑ دو۔ ورنہ ایک روز اسی طرح اچانک تمہارا انجن بھی بند ہوجائے گا اور پھر پلگ صاف کرنے سے بھی اسٹارٹ نہیں ہوگا۔"

میں اپنا تھیلا اٹھائے آگے بڑھ گیا اور وہ وہیں کھڑا حیرت سے مجھے تکتا رہ گیا۔ سڑک پر ابھی تک ویرانی تھی۔ ابھی زندگی کی ہماہمی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ میں بتدریج بلند ہوتے راستے پر پیدل ہی پُل کی طرف بڑھنے لگا۔ مُڑ مُڑ کر دیکھتا بھی جا رہا تھا کہ کوئی سواری آتی نظر آئے تو ہاتھ دوں۔ دفعتاً ایک موٹر سائیکل سوار خود ہی میرے قریب آکر رک گیا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص میں تھا۔ گلے میں گرم چادر جھول رہی تھی۔

"سکھر جانا ہے بھائی صاحب؟" اس نے خاصی شائستگی سے پوچھا۔

"جی ہاں!" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بیٹھ جاؤ" اس نے پیچھے اشارہ کیا۔

میں اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھ گیا۔ اس وقت خاصی ٹھنڈ تھی لیکن وہ خوشگوار محسوس ہو رہی تھی اگر میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں خطرے کا مبہم سا احساس موجود نہ ہوتا تو اب میں اپنی بھاگ دوڑ سے خاصا لطف اندوز ہوسکتا تھا۔

یہ بھی گویا ایک طرح کا ایڈونچر تھا۔ ایک طویل عرصے بعد اپنا عیش و آرام اور ٹھاٹ باٹ چھوڑ کر ایک نہایت ہی عام سے انسان کی زندگی گزارنا ایک طرح سے نہایت دلچسپ تجربہ بھی تھا۔ راستے کی تکالیف کو کسی دلچسپ اور پُرخطر مہم کا حصہ سمجھ کر بھی برداشت کیا جاسکتا تھا۔ کبھی ٹرین' کبھی بس' کبھی رکشا کبھی ٹرک اور کبھی

موٹر سائیکل پر سفر کرنا، نشیب و فراز سے بھرپور اس عوامی زندگی میں کوئی نئی بات نہیں تھی جو ہمارے ہاں کے نوّے فیصد سے زائد لوگ گزار رہے تھے۔ اور جسے اب میں بھولتا جا رہا تھا۔

لیکن اب اسی زندگی سے دوبارہ واسطہ پڑا تھا تو جیسے تمام بھولے ہوئے سبق تیزی سے یاد آنے لگے تھے۔ موٹر سائیکل پہ بیٹھ کر میں اچھا خاصا لطف اندوز ہونے لگا تھا۔ ایک طویل عرصے کے بعد اس سواری سے واسطہ پڑا تھا جو لہراتی بل کھاتی، تیز ہوا کا سینہ چیرتی آگے بڑھتی تھی تو ذہن سے غنودگی دور ہو جاتی تھی۔

وہ پرانے پُل کے راستے جا رہا تھا جسے قینچی والا پل بھی کہا جاتا تھا۔ سرخ رنگ کے اس عجیب و غریب پل میں ٹنوں وزنی لوہے کے ہزاروں گرڈرز کا ایک جال سا بنا ہوا تھا جو ایک خاص ترتیب سے قینچی کی طرح ایک دوسرے کو کراس کر رہے تھے۔ سنا تھا کہ ہوائی حملے کی صورت میں اس پل کو درمیان سے کھول کر دریا میں لٹکایا بھی جا سکتا تھا۔ اس صورت میں وہ ٹوٹنے سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

انگریزوں کے زمانے کے بنے ہوئے اس پل کے بارے میں کئی روایات مشہور تھیں جن میں سے ایک یہ بھی تھی کہ انگریزوں نے اسے ڈیزائن کرنے والے مسلمان انجینئر کے ہاتھ کٹوا دیے تھے تاکہ وہ کہیں اور ایسا ڈیزائن دوبارہ تخلیق نہ کر سکے۔ لیکن مجھے یہ روایت کچھ ایسی مستند معلوم نہیں ہوتی تھی۔ انگریز اتنے بے وقوف نہیں ہو سکتے تھے۔ انہیں اگر مسلمانوں کو کسی قابل انجینئر سے محروم کرنا ہوتا تو وہ اس کے لیے زیادہ عقلمندانہ طریقہ اختیار کرتے۔ یعنی اسے انگلستان لے جاتے۔

اس کے بارے میں ایک مستند روایت... بلکہ ایک طرح کی لوک داستان یہ بھی تھی کہ اس کی تکمیل کے بعد پہلی بار اس پر سے آزمائشی طور پر ٹرین گزارنے کے لیے کوئی اپنی جان خطرے میں ڈالنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

آخر کار سندھ کی کسی جیل میں عمر قید کاٹنے والے جمال نامی قیدی کو اس شرط پہ تیار کیا گیا کہ اگر وہ ٹرین کو لے کر خیر و عافیت سے پل سے گزر گیا تو اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی۔ جمال ٹرین لے کر خیریت سے گزر گیا اور اس کے بعد نہ جانے کتنی ٹرینیں نہ جانے کتنی مرتبہ اس پل سے گزر چکی تھیں جو نیچے سے کسی سہارے کے بغیر دریا پر معلق تھا۔ اسی جمال کے اعزاز میں مشہور سندھی لوک نغمہ "ہو جمالو" تخلیق ہوا تھا جو امر ہو چکا ہے۔

چھوٹی چھوٹی لانچوں اور کشتیوں کو چھوڑ کر برس ہا برس تک صرف یہ پل اندرون سندھ کو باقی ملک سے ملانے کا سب سے بڑا ذریعہ رہا۔ دوسرا پل جسے عام طور پر نیا پل کہا جاتا تھا کمان کے ڈیزائن پر بنایا گیا تھا۔ اس کے نیچے بھی کوئی سپورٹ نہیں تھی۔ الٹی کمان کی صورت میں دریا پر معلق تھا۔ یہ بھی اب کچھ ایسا نیا نہیں رہا تھا۔ ایوب خان مرحوم کے زمانے میں نیا تھا لیکن بہرحال قینچی والے پل کے بعد بنا تھا۔ اس لیے ابھی تک نیا پل کے نام سے ہی مشہور تھا۔

میں یہ سب کچھ سوچتا اور دریا کے نظارے سے محظوظ ہوتا، اس اجنبی مہربان کے پیچھے موٹر سائیکل پر بیٹھا چلا جا رہا تھا مگر شاید آج روانی اور تیزی سے سفر میری قسمت میں نہیں تھا جب ستارہ گردش میں ہوتا ہے تو ہر قدم پر رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

عین پل کے وسط میں پہنچ کر موٹر سائیکل نے زور زور سے "گھوں گھوں" کی اور بند ہو گئی۔

"پیٹرول تو ریزرو پر نہیں لگ گیا؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"نہیں پیٹرول تو بہت ہے شاید پلگ میں کچرا آگیا ہے۔ ذرا اترنا میں دیکھتا ہوں۔" موٹر سائیکل والے نے کہا۔

ہم دونوں اتر گئے۔ اس نے موٹر سائیکل پل کے کنارے لگا دی۔ سامنے نشیب میں دریا کے کنارے سکھر کے مکانات نظر آرہے تھے۔ میں سوچنے لگا اس سے تو بہتر تھا میں پیدل ہی چل دیتا شاید اس قسم کی سواریوں سے پہلے پہنچ جاتا۔

پل پر درمیانی حصے میں ٹریفک کے گزارنے کے لیے سڑک بنی ہوئی تھی جبکہ دونوں طرف پیدل چلنے والوں کے لیے چوبی تختوں سے راستہ بنا ہوا تھا۔ آہنی قینچیوں کے درمیان سے سکڑ سمٹ کر گزرتے ہوئے اس طرف پہنچا جا سکتا تھا۔

موٹر سائیکل والے کو گویا اچانک ہی اس طرف کوئی چیز پڑی نظر آگئی اور وہ پلگ صاف کرنے کے بجائے اس طرف جاتے ہوئے بولا "ارے... یہ کیا پڑا ہے!"

پل کے اس طرف وہ گویا تخلیے میں چلا گیا۔ پھر اس نے وہیں سے ہانک لگائی "بھائی صاحب! ذرا آکر دیکھو تو سہی.... یہ کیا ہے!" اس کے لہجے میں بے پناہ حیرت تھی۔

اس کی پشت میری طرف تھی اور وہ چوبی فرش پر جھکا ہوا تھا۔ مجھے کچھ نظر نہیں آرہا تھا جو کچھ وہ مجھے دکھانا چاہ رہا تھا شاید وہ اس کی اپنی آڑ میں چھپا ہوا تھا۔ میں اس کا دل رکھنے کو کسی طرح پھنس پھنسا کر اس طرف چلا گیا۔

"کیا چیز ہے بھئی، جس نے آپ کو اتنا حیران کر دیا ہے؟" میں نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے پوچھا۔

تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ قطعاً حیران نہیں تھا بلکہ مجھے حیران کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ وہ یکدم تیزی سے گھوما۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا جس کا رخ میرے پیٹ کی طرف تھا۔ وہ پہلے سے قطعی مختلف اور کھردرے لہجے میں بولا "نکال دو جو کچھ تمہارے پاس ہے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ درحقیقت یہ اطمینان کی سانس تھی۔ میرے لیے یہ خوشی کا مقام تھا کہ وہ کوئی زیادہ خطرناک چیز نہیں، محض ایک عام سا اُچکّا اور لٹیرا تھا۔ اس وقت میرے ذہن میں تو بس ایک ہی خیال تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے کسی آدمی سے ٹکراؤ نہ ہو۔ باقی خواہ کسی سے بھی سامنا ہو جاتا، مجھے کوئی پروا نہیں تھی۔

لیکن ساتھ ہی مجھے دل ہی دل میں اپنے آپ پر ترس بھی آیا اور میں نے اپنے آپ سے کہا "دیکھا برخوردار افضل چوہدری؟ ظاہری اوقات بدلنے سے کتنا فرق پڑ گیا! اب تو راہ چلتے اچکے بھی تم پر ریوالور تاننے لگے ہیں۔"

اب تک میں نے یہ تو بارہا سنا تھا اور کبھی کبھار چھوٹی موٹی خبریں پڑھی تھیں کہ کوئی اچکا، لٹیرا یا راہزن لفٹ لے کر کسی موٹر سائیکل پر یا گاڑی میں سوار ہوا اور بعد میں گاڑی والے کی کنپٹی پر ریوالور رکھ کر اسے لوٹ کر لے گیا، گاڑی چھین کر لے گیا لیکن اس لٹیرے اور راہزن نے ایک انفرادیت ضرور قائم کی تھی کہ وہ اپنے شکار کو لوٹنے کے لیے خود لفٹ دے کر لایا تھا۔

میں نے خوف سے کانپنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا "سائیں! میں آپ کو کہاں سے اس قابل نظر آگیا کہ آپ مجھے لُوٹ سکیں؟ میں تو ایک غریب مسکین ہاری ہوں۔ میرے پاس تو ان ڈھائی تین سو روپے کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ یہی میری کل پونجی ہے۔" میں نے اسے جیب سے بچی کچھی رقم نکال کر دکھائی۔

"بکواس مت کرو۔ یہ تھیلا ادھر دے دو۔" اس نے اشارہ کیا "مجھے معلوم ہے تم غریب لوگ جب کسی بڑے کام پر نکلتے ہو تو زندگی بھر کی جمع پونجی ایسے ہی پھٹے پرانے تھیلوں میں رکھ کر لے جاتے ہو تاکہ کوئی اس طرف توجہ نہ دے۔"

وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی معلوم ہوتا تھا۔ منجھا ہوا فنکار تھا۔ یقیناً اسے کچھ مفلوک الحال لوگوں سے اس قسم کے پھٹے پرانے تھیلے چھیننے کا تجربہ تھا جن سے موٹی رقمیں برآمد ہوئی تھیں۔ بعض اوقات غریب آدمی واقعی اپنی عمر بھر کی جمع پونجی ایسے کسی تھیلے یا پوٹلی میں رکھ کر بیٹی کی شادی کے لیے زیور بنوانے، جہیز خریدنے یا کسی چھوٹے موٹے مکان دکان کا سودا کرنے جا رہا ہوتا ہے مگر ایسے کسی لٹیرے کے ہاتھوں زندگی بھر کی کمائی گنوا بیٹھتا ہے۔

"اس تھیلے میں کچھ نہیں ہے بھائی! بس دو جوڑے کپڑے ہیں۔ سفر پہ نکلا ہوا ہوں اس لیے ساتھ لے لیے تھے۔ آپ چاہیں تو لے لیں۔" میں نے تھیلا اس کی طرف بڑھایا۔

میرا خیال تھا کہ وہ آرام سے آگے بڑھ کر تھیلا میرے ہاتھ سے لینے کی کوشش کرے گا اور میں اسی دوران ریوالور کسی ترکیب سے اس کے ہاتھ سے چھین کر اس کی تھوڑی سی ٹھکائی کر کے اسے سبق سکھانے کی کوشش کروں گا۔

لیکن اندازے کی ذرا سی غلطی کبھی کبھی کایا پلٹ دیتی ہے۔ نہ جانے کیوں وہ شخص دانت پیس کر اچانک ہی ریوالور سمیت تھیلے پر جھپٹا۔ میں نے جھکائی دینے کے لیے تھیلا اوپر اٹھاتے ہوئے گھمایا اور قطعی غیر متوقع طور پر وہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ وہ کچھ دور کہیں نہ کہیں ایسی جگہ جا گرتا جہاں سے دوبارہ اٹھایا جا سکتا تھا۔

مگر اس وقت تو ہم ایک عجیب ہی مقام پہ کھڑے تھے۔ پیدل چلنے والے راستے کا حفاظتی جنگلا زیادہ اونچا نہیں تھا۔ تھیلا جنگلے پر سے ہوتا ہوا نیچے پُرشور دریا میں جا گرا اور نظر سے اوجھل ہو گیا۔

میں اس شخص کے حملے سے بچنے کے لیے ایک طرف کو تو ہو گیا تھا اور وہ اپنی جھونک میں کچھ آگے چلا گیا تھا لیکن میں اس پر کوئی وار نہیں کر سکا۔ میری رگوں میں لہو سرد ہو گیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے گویا سارا منظر میری نظر میں دھندلا گیا تھا۔

پلک جھپکتے میں میرا پندرہ لاکھ روپیہ دریا برد ہو گیا تھا۔ اور جس گدھے کی وجہ سے یہ حادثہ ہوا تھا اس کے شاید تصور میں بھی نہیں تھا کہ تھیلے میں اتنی بڑی رقم تھی۔ وہ تو میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ پانچ دس ہزار کے آسرے پر واردات کرنے کے لیے اترا تھا۔

کسی عام سرمایہ دار کے لیے تو رقم کا صدمہ ہی کافی ہوتا۔ رقم بہرحال کچھ کم نہیں تھی۔ خواہ وہ کسی طرح، کسی بھی قسم کے حالات میں ضائع ہوتی، ایک بار تو ضرور مالک کی دھڑکنیں رکنے کو ہو جاتیں۔

لیکن میرے لیے تو اس رقم کی اہمیت کسی اور نکتۂ نظر سے تھی۔ میری روپوشی طویل بھی ہو سکتی تھی اور اس دوران مجھے کہیں بھی، کسی بھی مقصد کے لیے رقم کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ گزر اوقات کے علاوہ بھی سو مسائل درپیش آسکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ مجھے کسی خفیہ راستے سے ملک سے نکلنا پڑتا۔

یہ رقم ساتھ لے کر میں گویا ان تمام امکانات کے لیے بندوبست کر کے نکلا تھا لیکن محض کسی کے ذرا سے لالچ کی وجہ سے میرا یہ بندوبست دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ اب میں تقریباً تہی دست تھا۔ رقم کی موجودگی سے انسان کو خواہ مخواہ ہی بڑا حوصلہ سا رہتا ہے۔ اب تو یکدم ہی گویا کسی نے میرے قدموں تلے سے پل کھینچ لیا تھا۔ میرا تھیلا نہیں گویا میں خود دریا میں جا گرا تھا۔

رقم کوئی مسئلہ نہیں تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ میں رقم کے لیے یا کسی بھی اور مقصد کے لیے اپنے کسی ساتھی کارکن سے رابطہ قائم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ میں کسی کو اپنا اتا پتا، اپنا کوئی سراغ دینا نہیں چاہتا تھا۔ میں اس طرح روپوش ہونا چاہتا تھا گویا اس کرۂ ارض پر کبھی میرا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔ یہ میری ایک کوشش، ایک تجربہ تھا۔ ناکام بھی ہو سکتا تھا۔ فی الحال اسی پر میری زندگی اور موت کا دارومدار تھا۔

صرف ایک ثانیے میں یہ سب خیالات میرے ذہن میں آئے لیکن فوراً ہی مجھے اپنے ذہن کو اس صورتِ حال کی طرف واپس بھی لانا پڑا جس سے اس وقت میں دوچار تھا۔ رقم تو جا ہی چکی تھی لیکن میری غائب دماغی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ خبیث مجھے کوئی اور نقصان بھی پہنچا سکتا تھا۔ میں نے بظاہر ایک لمحہ بھی ضائع نہیں

کیا تھا اور دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا تھا۔

وہ اپنی جھونک میں آگے تو چلا گیا تھا لیکن دیکھ چکا تھا کہ تھیلا دریا میں جاگرا تھا اور غائب ہوچکا تھا۔ اس چیز نے اسے بھی ذرا بوکھلا دیا تھا۔ جس چیز کا جھگڑا تھا وہی جاچکی تھی۔ اس کے باوجود شاید جھنجلاہٹ کے باعث وہ ریوالور کا رخ میری طرف کرتے ہوئے تیزی سے گھوما۔

مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ فائر کرنے میں دریغ نہیں کرے گا۔ شاید مجھے سبق دینا چاہتا تھا کہ میں نے اس کے حکم کی تعمیل نہیں کی تھی۔ اس بدبخت کو تو اپنی ناکامی کی جو جھنجلاہٹ تھی سو تھی لیکن اسے میری جھنجلاہٹ کا اندازہ نہیں تھا۔

میرے اندر کا درندہ بیدار ہوچکا تھا جو بلاوجہ زیادتی کرنے والوں کی گردن دبوچنے کے لیے بے تاب رہتا تھا۔ میں اسے سُلائے رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتا تھا لیکن کبھی کبھی کسی کی کوئی حرکت اسے یکدم ہی غضبناک بنادیتی تھی۔

ویسے تو اس معاشرے میں بعض اوقات پانچ روپے کے لیے بھی انسان کے ہاتھوں انسان قتل ہوجاتا ہے لیکن میں پندرہ لاکھ کے لیے بھی کسی کو قتل کرنے کے حق میں نہیں تھا مگر اس وقت صورتِ حال کچھ اور ہی تھی۔ اس بدبخت نے بہت ہی عجیب، بہت ہی بے وقت اور بہت ہی ستم ظریفانہ قسم کی زیادتی کی تھی۔

اس کے بعد شاید اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا ہو کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ اسے اندازہ نہیں ہوسکا ہوگا کہ میں کس طرح اس پر جھپٹا تھا، کس طرح میں نے اسے فائر کا موقع دیے بغیر اس کا ریوالور والا ہاتھ اس کی پشت پر لے جاتے ہوئے بازو مروڑ کر شاید کندھے کا جوڑ ہی الگ کردیا تھا۔

وہ لٹو کی طرح گھوم چکا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ اس کے حلق سے ایک ہلکی مگر کرب ناک سی چیخ برآمد ہوئی۔ میں نے اس کی کمر پر گھٹنا رسید کرتے ہوئے اچانک ہی غیر ارادی سے انداز میں اسے ہوا میں اچھال دیا۔ دوسرے ہی لمحے میرے تھیلے کی طرح وہ بھی جنگلے کے اوپر سے ہوتا ہوا دریا میں جاگرا۔ اسے دوسری چیخ مارنے کی مہلت نہیں ملی۔

میں اس کا انجام دیکھنے کے لیے وہاں رکا نہیں۔ میں جو چند نوٹ جیب سے نکال کر اسے دکھانے لگا تھا، وہ چوبی فرش پر گر چکے تھے۔ میں نے جلدی سے انہیں سمیٹ کر جیب میں ڈالا۔ اب یہی میرا کل سرمایہ تھا۔ میں تو دریا بُرد ہوجانے والی رقم کے بل پر ابھی تک اپنے آپ کو حاتم طائی ہی محسوس کررہا تھا لیکن اب "حاتم طائیت" مجھے اپنے اندر سے رخصت ہوتی محسوس ہورہی تھی۔

وہ سب کچھ ذرا سی دیر میں ہوگیا تھا۔ اس دوران پل پر تو سناٹا ہی رہا تھا۔ البتہ نیچے دریا کے کنارے جہاں پل کا ایک سرا کنکریٹ کے پلیٹ فارم وغیرہ میں نصب تھا۔ وہاں قریب ہی دو کمرے سے دکھائی دے رہے تھے جن کے دروازے کھلے تھے لیکن اندر اندھیرا تھا، نہ جانے ان کمروں میں کوئی موجود تھا یا نہیں اور اگر کوئی موجود تھا تو اس نے پل پر ہونے والا تماشا دیکھا تھا یا نہیں؟

میں اس سوال پر زیادہ غور کرنے کے بجائے جلدی سے اس حصے پر واپس آیا جہاں ٹریفک رواں رہتا تھا۔ پیدل چلنے سے پہلے میں اس بدبخت کی موٹر سائیکل پر قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔

میں نے موٹر سائیکل کو دو تین مرتبہ کک لگائی تو وہ اسٹارٹ ہوگئی۔ اب تو ظاہر ہوچکا تھا کہ اس شخص نے موٹر سائیکل خراب ہونے کا بہانہ کیا تھا۔ اس نے خود ہی موٹر سائیکل بند کی تھی۔ مجھے موٹر سائیکلوں کے بارے میں اب زیادہ معلومات نہیں تھی لیکن کچھ پرانے تجربات ذہن میں محفوظ تھے۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ میں نے اسے پہلا ہی گیئر لگایا تھا یا دوسرا تیسرا۔ میرے لیے تو بس غنیمت یہ تھا کہ وہ چل پڑی اور پھر چلتی ہی چلی گئی۔

پل سے اتر کر کچھ دیر میں اِدھر اُدھر گلی کوچوں میں بھٹکتا رہا۔ ابھی ٹریفک بہت کم تھا اس لیے مجھے کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ جب مجھے یقین ہوگیا کہ کوئی میرے تعاقب میں نہیں تھا تو میں نے موٹر سائیکل ایک سنسان گلی میں چھوڑ دی۔

ایک قریبی سڑک پر پہنچ کر مجھے رکشا مل گیا۔ رکشے میں بیٹھ کر میں نے ڈرائیور کو لاری اڈے چلنے کی ہدایت کی۔

"کون سے لاری اڈے بھائی؟ جی ٹی ایس کے یا پرائیویٹ؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

"پرائیویٹ" میں نے سوچے سمجھے بغیر جواب دیا۔ میں اس وقت دل ہی دل میں یہ فیصلہ کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ مجھے کس علاقے کا رخ کرنے کے لیے بس پکڑنی چاہیے۔ مجھے یاد آیا کہ برسوں پہلے کندھ کوٹ میرا تھوڑا بہت دیکھا بھالا علاقہ تھا۔ کسی زمانے میں مختصر عرصے کے لیے وہاں کے ایک ہندو تاجر سے ہمارے "کاروباری" مراسم قائم ہوئے تھے مگر ہماری ہی کچھ دشواریوں کی وجہ سے وہ زیادہ عرصے برقرار نہیں رہ سکے تھے۔

مجھے معلوم تھا کندھ کوٹ سے سوئی (جہاں سے پٹرولیم گیس نکلتی ہے مگر اس مقام کی مناسبت سے اس کا نام سُوئی گیس پڑگیا ہے) کے راستے بوقتِ ضرورت بلوچستان کی طرف بھی نکلا جاسکتا تھا اور غیر معروف مقامات تو راستے میں یا کندھ کوٹ کے آس پاس بھی بیسوں تھے۔ ہزاروں میل میں پھیلا ہوا ادھر کا علاقہ کہیں نیم دیہی نظر آتا تھا، کہیں نیم شہری۔ کہیں میدانی معلوم ہوتا تھا تو کہیں صحرائی، مجھے توقع تھی کہ گزرے برسوں میں ادھر کچھ زیادہ تبدیلیاں نہیں آئی ہوں گی۔

راستے میں احتیاطاً میں نے رکشا ڈرائیور سے پوچھ لیا "اس وقت کندھ کوٹ جانے والی بس مل جائے گی نا؟"

"کندھ کوٹ جانے کے لیے آپ کو لاری اڈے جانے کی کیا ضرورت ہے بھائی صاحب!" ڈرائیور ملائمت اور خاصی شائستگی سے بولا "وہ تو آپ کو یہاں قریب ہی روڈ پر کھڑی مل جائے گی۔"

اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ میں شہر میں نیا ہوں اور میرا حلیہ بھی مفلوک الحال دیہاتیوں والا تھا۔ اس کے باوجود اس نے مجھے اِدھر اُدھر گھما پھرا کر ٹھگنے کی کوشش نہیں کی اور دو چار موڑ مڑ کر تھوڑا سا فاصلہ طے کرکے بس کے پاس لے جا کھڑا کیا جس کا کنڈیکٹر زور و شور سے "کندھ کوٹ، کندھ کوٹ" کی آوازیں لگا رہا تھا۔

دن کا اجالا پھیل چکا تھا تاہم ابھی سڑکوں پر زیادہ ٹریفک نہیں تھا۔ اس کے باوجود بس تقریباً بھری ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کنڈیکٹر مسافروں کو بلانے کے لیے صدائیں لگائے جارہا تھا۔ اب میں عوامی زندگی کو قریب سے دیکھ رہا تھا تو یہ جان کر حیرت سی ہورہی تھی کہ بسیں 'ٹرینیں' ہر وقت' ہر جگہ کھچا کھچ بھری ہوئی ہی ملتی تھیں۔ معلوم نہیں وسائل اور آسائشیں کتنی بڑھی تھیں لیکن میں تو یہ دیکھ رہا تھا کہ ہر جگہ تنگی پریشانی اور مسائل میری غربت کے زمانے سے زیادہ بڑھ چکے تھے۔ اب تو غریب و تنگ دست کے لیے...... سکھ کا سانس لینا بہت ہی دشوار ہوچکا تھا۔

اس بس میں بھی مجھے بالکل پیچھے ایک کونے میں سیٹ میسّر آئی اور میں صبر شکر کے ساتھ سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ رقم کے ضائع جانے کا تاسّف ابھی تک میرے دل میں دھند کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، دو ڈھائی سو روپے کب تک میرا ساتھ دیں گے۔ رقم حاصل کرنے کے لیے میں کوئی مجرمانہ طریقہ بھی اختیار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر میں ایک عام اور تہی دست انسان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے لیے اور خود بھی کچھ عرصہ اسی طرح گزارنے کے لیے نکل ہی کھڑا ہوا تھا تو مجھے صحیح طرح اس آزمائش سے گزرنا چاہیے تھا۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ حلیہ تو ایک غریب اور مفلوک الحال شخص کا بنایا ہوا ہے اور تھیلے میں پندرہ لاکھ روپیہ رکھے گھوم رہے ہیں کہ جہاں بھی کوئی دشواری نظر آئی یا مسئلہ درپیش ہوا وہاں نوٹ نکال کر کسی کے منہ پر دے ماریں گے۔ یہ کوئی آزمائش تو نہ ہوئی۔

اس دنیا میں ان گنت لوگ ایسے تھے جن کی جیب میں دو ڈھائی سو تو کیا، دو ڈھائی روپے کے مساوی رقم بھی نہیں ہوتی تھی۔ جنہیں یہ بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ اگلے وقت کی روٹی کہاں سے کھائیں گے۔ قدرت کو اگر منظور ہوتا تھا تو وہ انہیں بھی زندہ رکھتی تھی۔ مجھے بھی زندگی کے اصل مسائل کا اندازہ تو بالکل قلاش ہونے کے بعد ہی ہوسکتا تھا۔ مجھے اس کے لیے تیار رہنے کا حوصلہ رکھنا چاہیے تھا۔ میں نے تو وہ زمانہ بھی دیکھا ہوا تھا جب شکرگڑھ سے لاہور آنے کے لیے بس کا کرایہ جیب میں نہیں ہوتا تھا۔ بقا کی جنگ تو اس وقت بھی لڑی تھی اور کہاں سے کہاں آن پہنچا تھا۔ بقا کی جنگ کے صحیح معنی ہی درحقیقت انتہائی مفلسی میں سمجھ میں آتے تھے۔

اپنے آپ کو سمجھانے بجھانے سے مجھے کچھ حوصلہ ملا اور میں نے رقم وغیرہ کا خیال دل سے نکال دیا۔ میں نے اپنے آپ کو یقین دلا دیا کہ رقم وغیرہ ضمنی اور ثانوی چیز تھی۔ اصل چیز حوصلہ تھا۔ مجھے اپنا حوصلہ ڈھلنے نہیں دینا چاہیے تھا۔ میرے لیے فی الحال تو مستقل حرکت میں رہنا بھی ضروری تھا کیونکہ ابھی تک میرا یہ احساس باقی تھا کہ کوئی نادیدہ خطرہ میرے تعاقب میں ہے۔ اس شکار کے محسوسات بھی شاید یہی ہوتے ہوں جس کی بُو سونگھتے ہوئے شکاری کتے، مختلف سمتوں سے اسے تلاش کرتے ہوئے بڑھتے چلے آرہے ہوں۔

بس نہ صرف پوری بھر چکی تھی بلکہ کچھ لوگ کھڑے بھی تھے لیکن اس کے چلنے کے ابھی کوئی آثار نہیں تھے۔ انجن گھرر گھرر کیے جارہا تھا لیکن ڈرائیور سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ آخرکار ایک اور خالی بس آکر اس کے پیچھے کھڑی ہوئی تب ہماری بس کا ڈرائیور کہیں دور سے دوڑا دوڑا آیا اور اس نے ازراہِ کرم بس کو کسی لنگڑے کچھوے کی رفتار سے چلانا شروع کیا۔

بس جتنی دیر شہری حدود میں رہی اس پر مزید سواریاں لدتی رہیں۔ خانپور پہنچنے تک بس میں مسافر کچھ اس طرح لد چکے تھے جس طرح ٹرک میں تربوز لدے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر مسافر راستے کے چھوٹے چھوٹے دیہات سے چڑھنے اترنے والے تھے۔ خانپور حالانکہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا لیکن نہ جانے کیوں بس وہاں آدھا گھنٹا کھڑی رہی۔ شاید اس لیے کہ قصبے سے مسافروں کی آمد کا سلسلہ جاری تھا۔ قصبہ سڑک سے کافی پیچھے ہٹ کر تھا۔ مجھے یاد تھا کہ پنجاب میں بھی اسی نام کا ایک چھوٹا سا شہر موجود تھا۔

بس خانپور سے روانہ ہوئی تو اس میں دو تین بکریوں اور کئی مرغیوں کا بھی اضافہ ہوچکا تھا لیکن وہ بے چاریاں بھی مسافروں کے درمیان اس طرح پھنسی ہوئی تھیں کہ اندازہ کرنا مشکل تھا آیا بکریاں مسافروں پر سوار ہیں یا مسافر، بکریوں پر یا پھر دونوں مل کر مرغیوں پر سوار ہیں لیکن بکریاں بھی مسلسل ممیا رہی تھیں اور مرغیاں بھی عالمِ دہشت میں مستقل کُڑکُڑا رہی تھیں۔

میں یہی شکر کررہا تھا کہ مجھے سیٹ ایک ایسی کھڑکی کے پاس ملی ہوئی تھی جو بالشت بھر کھلی تھی ورنہ شاید میری ناک کسی مسافر کی بغل میں ہوتی، میری کمر پر کسی مسافر کا ٹرنک ہوتا اور میری سانسیں کسی بکری کی سانسوں سے ہم آہنگ ہوتیں۔ بس کی چھت پر بھی لوگ سوار ہوچکے تھے جس کی وجہ سے وہ ناہموار سڑک پر اِدھر اُدھر لہرا رہی تھی۔

دیکھنے میں بس اچھی بھلی نظر آرہی تھی لیکن چلنے میں وہ خاصی کھٹارا معلوم ہوتی تھی۔ جو سلوک اس کے ساتھ ہوتا تھا اسے دیکھتے ہوئے یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں تھی۔ جس بری طرح اس کا ہر حصہ کھڑکھڑا رہا تھا اس سے اندیشہ محسوس ہورہا تھا کہ پہلے تو ایک ایک کرکے مسافر اس پر سے لڑھکیں گے جس طرح درخت سے پکے پھل گرتے ہیں۔ پھر بس کے اجزائے ترکیبی ایک

ایک کر کے اس کا ساتھ چھوڑیں گے اور آخر میں صرف انجن منزل مقصود تک پہنچے گا۔

لیکن یہ سب روزمرّہ کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔ ایک عام آدمی کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہم سب سخت جان پاکستانی تھے۔ لشتم پشتم منزل مقصود کی طرف بڑھتے ہی رہے۔ لڑتے جھگڑتے، ہانپتے کانپتے، بھانت بھانت کی بولیاں بولتے محوِ سفر رہے۔

کندھ کوٹ تک کا سفر مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے میں نے دنیا کے گرد چکر مکمل کرلیا ہو۔ شہر کے آثار نظر آنے لگے تو میں نے ذرا سکون کی سانس لی لیکن یہ سانس کچھ زیادہ طویل ثابت نہیں ہوئی کیونکہ بس شہر کی حدود میں داخل نہیں ہو سکی۔

اس سے پہلے ہی سڑک کے کنارے درختوں کے جھنڈ سے گہرے نیلے رنگ کی ایک پجارو برآمد ہوئی جس پر چھت تک دھول جمی تھی۔ صرف شیشے صاف تھے۔ مست ہاتھی کی طرح لہراتی ہوئی وہ نشیب سے سڑک پر چڑھی اور ایک دھچکے سے عین وسط میں اس طرح آن رکی کہ بس کے ڈرائیور کے لیے بس کو روکنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

میں نے سنا تھا سندھ کی شاہراہیں ڈاکوؤں سے کافی حد تک محفوظ ہو چکی تھیں لیکن یہ تو دن دہاڑے ڈاکے کا کوئی سین چلتا نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا قدرت کو میری جیب میں بچ جانے والے تقریباً دو سو روپے کے "خطیر" سرمائے کا میرے پاس رہ جانا بھی منظور نہیں تھا۔

پجیرو سے مجھے پانچ افراد اترتے دکھائی دیے۔ پانچوں کے پاس کلاشنکوفیں تھیں۔ وہ سب گہرے رنگوں کی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیصوں میں تھے۔ سروں پر مخصوص انداز کی پگڑیاں تھیں۔ ان میں سے تین لمبے تڑنگے اور گھنی داڑھی مونچھوں والے تھے۔ دو ان کے مقابلے میں ذرا پستہ قد تھے لیکن جسم ان کے بھی گٹھے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ ان کی صرف گھنی مونچھیں تھیں لیکن وہ اس قسم کی مونچھیں تھیں جن کی موجودگی میں داڑھی کی کمی محسوس نہیں ہوتی۔

مسافروں نے بھی انہیں دیکھ لیا تھا۔ بس میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک تیز بڑبڑاہٹ شروع ہوئی جو فوراً ہی دم توڑ گئی۔ دوسرے ہی لمحے گویا سب کو سانپ سونگھ گیا۔ حتیٰ کہ بکریاں بھی گویا فضا میں کسی انجانے خطرے کی بُو محسوس کرتے ہوئے ممیانا بھول گئیں۔ صرف ایک مرغی نے صدائے احتجاج جاری رکھا۔

کلاشنکوفوں والے پجیرو سے اترتے ہی بس کے دروازوں والی سمت میں چلے گئے اور میری نظر سے اوجھل ہوگئے۔ ان میں سے ایک البتہ دوسرے ہی لمحے ڈرائیور والے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ باقی چاروں میں سے دو بس کے اگلے دروازے سے اور دو پچھلے دروازے سے بس میں چڑھے۔ ان میں سے ایک نے بھاری، گونجیلی اور بارُعب آواز میں سب مسافروں کو پہلے بلوچی

سرکش

6

محمود احمد مودی

چند لمحے بعد بس نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس وقت تک میرے ہاتھ مضبوطی سے پشت پر باندھے جا چکے تھے۔ بس کے مسافر مجھے ان کلاشنکوف برداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر بڑے اطمینان سے رخصت ہو چکے تھے۔

معاشرے کی جن باتوں پر میرا دل کڑھتا تھا' ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ گاؤں یا شہر' کسی بھی جگہ لوگوں نے کسی دوسرے کی مصیبت کو اپنی مصیبت سمجھنا چھوڑ دیا تھا۔ بارہا ایسا بھی ہوتا ہے کہ لوگ تعداد میں بہت زیادہ ہوتے ہیں' وہ چاہیں تو صرف تھوڑی سی جرأت کر کے ظلم کو روک سکتے ہیں لیکن وہ سوچتے ہیں کہ پرائے پھڈے میں کون ٹانگ اڑائے۔

وہ کنی کترا کر گزر جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ اپنے آپ کو بے بس و مجبور سمجھ لیتے ہیں۔ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ تو کچھ کر ہی نہیں سکتے۔ یہ بھی درحقیقت فرار کا ایک آسان راستہ ہوتا ہے۔ خصوصاً اسلحہ برداروں کے سامنے تو کوئی چوں کرنے کا بھی تصور نہیں کرتا۔ "بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے" والا معاملہ ہو جاتا ہے۔

کلاشنکوف بردار تعداد میں پانچ تھے۔ بس میں میرے اندازے کے مطابق ساٹھ ستّر افراد سوار تھے۔ ان سب کے سامنے ایک شخص کو بس سے اُتار کر یوں رسی سے باندھ لیا گیا تھا جیسے وہ کسی کا گمشدہ بکرا تھا اور اسے واپس اس کے مالک کے پاس لے جایا جا رہا تھا۔

بس کے مسافروں میں سے بعض کے پاس کلہاڑیاں' بعض کے پاس لاٹھیاں اور ایک کے پاس تو میں نے ریوالور بھی دیکھا تھا جو اس نے گولیوں والی پیٹی کے ساتھ کندھے پر لٹکایا ہوا تھا۔ مانا کہ پانچ کلاشنکوفوں کے سامنے ان چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور ان لوگوں کی اچھی بھلی تعداد سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا لیکن انسانوں میں اگر ظلم کے خلاف صرف حوصلہ اور تشدّد کے خلاف دلی نفرت پیدا ہو جائے تب ضرور فرق پڑ جاتا ہے۔ بڑے بڑے بلند و بالا قلعے حیرت انگیز طور پر نہایت آسانی سے زمیں بوس ہو جاتے ہیں۔

میں نے خود بھی چند قیمتی لمحے سوچ بچار اور اُلجھن میں ضائع کر دیئے تھے۔ صورتِ حال بے شک ایسی تھی کہ میرے حرکت میں آنے کی صورت میں میری جان کی سلامتی کا امکان ذرا کم ہی تھا لیکن آسانی سے ان کے قابو میں آ کر گویا میں نے اپنے لیے اور بھی زیادہ خطرہ مول لے لیا تھا۔

میرے ہاتھ بندھ چکے تو سرخی مائل داڑھی مونچھوں والے نے کلاشنکوف کی نال سے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے پجارو کی طرف اشارہ کیا "چلو ڑے... گاڑی میں بیٹھو۔"

میں نے دل میں سوچا کہ جب ہاتھ ہی بندھوا لیے تو پھر حکم عدولی کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں سست قدموں سے پجارو کی طرف چل دیا جو اب بھی سڑک کے وسط میں کھڑی تھی۔ بس بڑی مشکل سے اس سے بچ بچا کر کچے راستے سے گزری تھی۔

پجارو میں وہ خود سیٹوں پر براجمان ہو گئے۔ مجھے انہوں نے فرش پر بٹھایا۔ فرش پر میٹ بچھی ہوئی تھی اور دو تین کُشن بھی پڑے تھے جو غالباً فاضل سیٹوں کا کام دیتے تھے۔ بغیر داڑھی والوں میں سے ایک نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور خالص فلمی انداز میں پجارو کو ٹرن دے کر اس طرح کچے سے پکی سڑک پر لایا کہ عقب میں گرد و غبار کا بادل پھیل گیا۔

سُرخی مائل داڑھی والے اور اس کے دو ساتھیوں کی نظریں مستقل طور پر مجھ پر تھیں۔ ان کے کرخت چہروں پر میرے لیے نفرت تھی جو میری حیرانی میں اضافہ کیے جا رہی تھی۔ میرے اعصاب کو ابھی تک اسی حیرت اور الجھے اُلجھے سوالات نے شل کر رکھا تھا۔

آخر وہ لوگ کون تھے اور بھری بس میں سے انہوں نے مجھے ہی

کیوں منتخب کیا تھا؟ وہ تصویر کس کی تھی اور ان کے پاس کہاں سے آئی تھی جس میں انہوں نے میری مشابہت تلاش کرلی تھی؟

کیا وہ لوگ ریڈ ڈاٹ کے اشاروں پر چلنے والوں میں سے تھے؟ کیا ان دور افتادہ آبادیوں میں بھی ریڈ ڈاٹ کی رسائی تھی؟ کیا ان کا نیٹ ورک اتنا مضبوط اور وسیع تھا کہ وہ جب اور جہاں چاہتے ناکا بندی کرا کے اپنے مطلوبہ شخص کو پکڑ سکتے تھے؟ خواہ وہ کتنا ہی حلیہ بدل لیتا' شکل صورت میں کتنی ہی تبدیلیاں لے آتا؟

یہ کام تاحدِ نظر پھیلے ہوئے بیکراں سمندر میں سے کوئی مخصوص مچھلی پکڑنے کے مترادف تھا اور آج تک یہ ہماری پولیس یا دوسری طاقتوں کے لیے تو ممکن نہیں ہوسکا تھا۔ فردِ واحد تو کیا' پورے گروہ کے گروہ ان کے جانے پہچانے راستوں سے گزرتے ہوئے غائب ہوجاتے تھے' بلکہ بعض اوقات ملک سے بھی فرار ہوجاتے تھے اور ان کے ہاتھ نہیں آتے تھے۔

جو لوگ مجھے پکڑ کے لے جارہے تھے وہ بظاہر تو ریڈ ڈاٹ کے آدمی معلوم نہیں ہوتے تھے لیکن اس ضمن میں یقین سے کچھ کہا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ مجھے تجربہ ہوچکا تھا کہ ریڈ ڈاٹ نہ جانے کن کن رابطوں کے ذریعے ہر طرح کے لوگوں سے کام لے لیتی تھی اور انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ درحقیقت کس طاقت کے لیے استعمال ہورہے تھے۔ سرکاری اہل کار' پیشہ ور ڈاکو اور دہشت گرد' خاص خاص کاموں میں مہارت رکھنے والے تخریب کار' گروہ رکھنے والے یا اکیلے دُکیلے ہی کام کرنے والے نامی گرامی بدمعاش' کوئی بھی ان کی رسائی سے باہر نہیں تھا۔

لیکن کسی سے بھی کام لینے کا ریڈ ڈاٹ کا طریق کار یقیناً زبردست تھا۔ وہ بیچ میں اتنے چکر اور اتنی پیچیدگیاں ڈال دیتے تھے کہ کٹھ پتلیوں کو اندازہ ہی نہیں ہوپاتا تھا کہ جو ڈوریاں اُنہیں ہلا رہی ہیں ان کے سرے اصل میں کہاں ہیں۔ بعض لوگوں کو اس سے غرض بھی نہیں ہوتی تھی۔ وہ صرف اپنے مالی یا کسی اور طرح کے مفادات سے غرض رکھتے تھے۔ ہمارے معاشرے میں پھیلے ہوئے انتشار' بدکرداری' کرپشن' افراتفری اور ہوس کی وجہ سے ریڈ ڈاٹ کو بڑی "سہولتیں" میسر تھیں۔ باس ٹو نے مجھ سے بات کرتے ہوئے ذکر کیا تھا کہ تین ملکوں میں کام کرنا انہیں بہت آسان محسوس ہوا تھا۔ پاکستان' بنگلہ دیش اور انڈیا۔ میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ سکتا تھا۔

یہ لوگ جو مجھے پکڑ کر لے جارہے تھے اگر ان کی ڈوریاں بھی بہت پیچھے کہیں درحقیقت ریڈ ڈاٹ ہی کے ہاتھ میں تھیں تو میرے لیے یہ بڑی مایوس کن صورتِ حال تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ میری بھاگ دوڑ' میری تمام کوششیں بے کار تھیں۔ میرا یہ سوچنا فضول تھا کہ میں کسی بہت ہی عام اور مفلوک الحال سے شخص کا روپ دھار کر انسانوں کے سمندر میں کہیں گم ہوسکتا ہوں۔ میں تو گویا ایک لامتناہی جال میں تھا۔ جتنا چاہے بھاگ لیتا' مجھے بہرحال جال میں ہی رہنا تھا۔ جال جس کے ہاتھ میں تھا' وہ جب چاہتا جال سمیٹ کر مجھے قابو میں کرلیتا۔

اگر یہ لوگ ریڈ ڈاٹ کے آلۂ کار نہیں تھے تو اس کا مطلب یہی ہوسکتا تھا کہ میں کسی عجیب وغریب اتفاق کے تحت ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔

انہوں نے کسی تصویر سے میری صورت ملائی تھی لیکن میں تو اس وقت اپنی اصل صورت سے کافی حد تک مختلف شکل صورت میں تھا۔ تو کیا میری تبدیل شدہ صورت اس تصویر سے مل گئی تھی؟

اس صورت میں بھی مجھے اپنی بد نصیبی پر افسوس ہی کرنا چاہیے تھا کہ قسمت مجھے کتنی دور سے گھیر گھار کر اس دور افتادہ علاقے میں لائی تھی۔ کتنی رُکاوٹیں پھلانگ کر' کتنی جگہ موت کو جُل دے کر' کتنے مصائب برداشت کرکے میں یہاں تک پہنچا تھا۔ محض اس لیے کہ میری شکل کسی نامعلوم اجنبی سے مل جائے جسے میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں دیکھا تھا اور جو نہ جانے کس سلسلے میں ان لوگوں کو مطلوب تھا جو جیب میں اس کی تصویر اور ہاتھوں میں کلاشنکوفیں لیے اس کی تلاش میں گھات لگائے بیٹھے تھے۔

پجارو کنٹھ کوٹ کو پیچھے چھوڑتی ہوئی اس ناہموار اور تنگ ہائی وے پر فراٹے بھرتی جارہی تھی جسے ہائی وے کہنا خاصا مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ وہ پانچوں بھی اپنی اپنی جگہ سوچ میں ڈوبے دکھائی دے رہے تھے۔

آٹھ دس میل کے سفر کے بعد میں نے پولیس کی ایک موبائل سامنے سے آتے دیکھی۔ سرخی مائل داڑھی والے نے بھی دیکھ لیا کہ میں ذرا توجہ سے موبائل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کلاشنکوف کی نال خاصی بے رحمی سے میرے کندھے پر رگڑتے ہوئے بولا "خبردار! جو آواز نکالی" لہجہ بتارہا تھا کہ اسے پولیس کے سامنے بھی اپنی پجارو میں ایک جیتے جاگتے انسان کو لاش میں تبدیل کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں ہوگا۔

بعد میں مجھے اندازہ ہوا کہ آواز نکالنے کا کوئی فائدہ بھی نہ ہوتا۔ میں پولیس والوں کو نظر بھی نہیں آسکتا تھا۔ میری آواز بھی باہر جانی مشکل تھی۔ کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور اے سی آن تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ موبائل والے تو خود پجارو والوں کو دور سے ہی دیکھ کر باچھیں کھلا کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔ پجارو والوں نے بھی جواباً ہاتھ ہلایا۔

قانون کے محافظوں کی گاڑی اس پجارو کے قریب سے گزرتی چلی گئی جس کے فرش پر ایک شخص بھیڑ بکری کی طرح رسی سے بندھا بیٹھا تھا۔ جسے نہ تو اپنا جرم معلوم تھا اور نہ ہی یہ پتا تھا کہ اسے کہاں لے جایا جارہا تھا۔

آخر کار سکوت سے اُکتا کر میں نے پوچھا "کم سے کم مجھے اتنا تو بتادیں کہ آپ لوگوں نے مجھے کیا سمجھ کر پکڑا ہے؟"

"چپ کر کے بیٹھے رہو۔" سرخی مائل داڑھی والے نے مجھے ڈانٹا۔ خیالوں میں اُلجھے ہونے کے ساتھ ساتھ وہ سب گویا بے حد بے زار بھی تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ انہیں غصہ دلانا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن تجسس بھی مجھے مارے ڈال رہا تھا۔

میں اس کے حکم کی تعمیل میں چند لمحے تو خاموش رہا لیکن ایک بار پھر یہ سکوت توڑے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے پہلے ہی کی طرح ٹوٹی پھوٹی اور مکسچر قسم کی زبان میں نہایت ملائمت سے سوال کیا جس کا مفہوم تھا "پھر بھی... آخر کچھ تو پتا چلے کہ میرا جرم کیا ہے؟ سزا جو آپ کا دل چاہے دے لینا۔"

اس نے خونخوار نظروں سے مجھے گھورا لیکن خاموش رہا۔ میں نے اس کی خاموشی سے ذرا شہ پاکر اسی ملائمت سے کہا "میں تو بارہ تیرہ سال بعد اس علاقے کی طرف آیا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا' مجھ سے ایسا کیا قصور ہوگیا ہے جو آپ لوگوں نے مجھے پکڑلیا ہے۔ چلیں میں اپنی صفائی پیش نہیں کروں گا۔ کم سے کم مجھے بتا تو دیں کہ معاملہ کیا ہے۔ اگر بُرا نہ منائیں تو مجھے وہ تصویر ہی دکھادیں جس سے آپ میری صورت مِلا کر دیکھ رہے تھے۔"

ڈرائیونگ کرنے والے نے بہ آواز بلند بے زاری سے اپنے ساتھی کو مشورہ دیا جس کا مفہوم میں سمجھ سکتا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا "عیسیٰ خان! اس کی کھوپڑی پر کلاشنکوف مار کر اسے لٹادو یا اس کے منہ میں کچھ ٹھونس دو تاکہ یہ آرام سے چُپ کرکے سفر کرے۔"

سُرخی مائل داڑھی والا جسے عیسیٰ خان کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا بدستور برہم نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا لیکن اس نے اس مشورے پر عمل نہیں کیا۔ میرے دوسری طرف بیٹھے ہوئے کلاشنکوف بردار کی داڑھی مونچھیں گہری سیاہ اور جھاڑ جھنکاڑ کی طرح ایک دوسرے میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر بھی ایک عجیب سی وحشت تھی لیکن اپنی اس ظاہری شکل وصورت کے باوجود وہ ان سب سے زیادہ متحمل مزاج اور عقل سے کام لینے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ شروع سے ہی مجھے اُلجھن آمیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ بظاہر وہ اس وقت بھی مجھ پر کلاشنکوف تانے بیٹھا تھا اور اس کی شکل پر بھی خونخواری تھی لیکن شاید وہ میرے بارے میں باقی چاروں کی طرح نہیں سوچ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں شک کا پہلو تھا۔

آخر کار وہ اپنے خیال کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا جس سے مجھے اپنا اندازہ درست محسوس ہوا۔ وہ پہلو بدلتے ہوئے میری طرف اشارہ کرکے عیسیٰ خان سے مخاطب ہوا "مجھے یہ وہ آدمی معلوم نہیں ہوتا عیسیٰ خان!"

"تم نے کیا اس آدمی کو دیکھا ہوا ہے بلال شیدی؟" عیسیٰ خان نے اسے گھورا۔

جھاڑ جھنکاڑ داڑھی مونچھ والا جسے بلال شیدی کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا' نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا "نہیں' دیکھا تو نہیں ہے۔ اس کے بارے میں جتنا تمہیں معلوم ہے' اتنا ہی مجھے بھی معلوم ہے۔ میں نے بھی صرف وہی تصویر غور سے دیکھی ہے جو تمہارے پاس ہے لیکن پتا نہیں کیوں' میرا دل کہتا ہے کہ وہ تصویر اس آدمی کی نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں اُلجھن برقرار تھی۔

"لیکن میں کہتا ہوں یہ وہی تصویر والا آدمی ہے۔" عیسیٰ خان کے لہجے میں ضد تھی "میں نے شکل مِلا کر دیکھ لی ہے۔"

"ذرا تصویر ایک بار پھر مجھے دکھاؤ۔" بلال شیدی نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے فرمائش کی۔

وہ دونوں برابر کی حیثیت کے آدمی معلوم ہوتے تھے یا پھر شاید عیسیٰ خان کو تھوڑی سی برتری حاصل تھی لیکن وہ بلال شیدی کی بات ٹالنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تصویر نکالی تاہم کافی ناگواری سے بلال کی طرف بڑھائی۔ شاید اسے ایک نمٹے نمٹائے کام میں بلال کی رخنہ اندازی اچھی نہیں لگ رہی تھی۔

بلال نے تصویر اس کے ہاتھ سے لے لی اور از سرِنو مجھ سے اس کا موازنہ کرنے لگا۔ وہ میرے قریب تھا۔ میں بھی اُچک کر تصویر دیکھنے لگا۔ چند لمحے کے لیے میں نے ان کی ناگواری اور برہمی کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ میں خود اس تصویر کو دیکھنے کے تجسس میں مرا جارہا تھا جو میرے لیے مصیبت کی پیامبر بن گئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے تو واقعی میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ بہت دُھندلی سی تصویر تھی۔ غالباً بہت دور سے' کم روشنی میں اور نامناسب زاویے سے کھینچی گئی تھی لیکن وہ کوئی پورٹریٹ یا صرف چہرے کی تصویر نہیں تھی۔ اس میں صرف اس شخص کی ٹانگیں نظر نہیں آرہی تھیں باقی پورا بالائی دھڑ نظر آرہا تھا۔

وہ شخص خاصے جنگجویانہ ایکشن میں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی خوف ناک قسم کی سب مشین گن تھی اور وہ اس سے گولیاں چلا رہا تھا۔ تصویر بہت ہی دُھندلی تھی لیکن جس حد تک بھی ممکن ہوسکا تھا' اسے انلارج کیا گیا تھا۔ اس میں چہرہ کافی حد تک قابلِ شناخت لگ رہا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ چہرہ کافی حد تک مجھ سے مشابہ تھا لیکن یہ مشابہت ان تبدیلیوں کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی جو میک اپ مین انوار نے میرے چہرے پر کی تھیں جن میں سب سے نمایاں وہ سیاہ پٹی نما مونچھیں اور بائیں رخسار کے اُبھار پر نظر آنے والا موٹا سا مسّہ تھا۔ بال چھوٹے ہونے اور دوسری چھوٹی موٹی تبدیلیوں سے بھی مشابہت پیدا ہونے میں مدد ملی تھی۔ اگر میں اپنی اصل شکل صورت اور اصل حلیے میں ہوتا تو اس تصویر سے بالکل مختلف دکھائی دیتا۔

لیکن ظاہر ہے انوار نے یہ جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ اس نے تو شاید خواب میں بھی اس شخص کو نہ دیکھا ہو۔ اس کے علاوہ اسے

تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کس طرف جاؤں گا' کس علاقے کا رُخ کروں گا بلکہ روہڑی پہنچنے تک تو خود مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں جاؤں گا۔ میں نے تو اسٹیشن پر اُترنے کے بعد فیصلہ کیا تھا۔ اس کا مطلب ظاہر ہے یہی تھا کہ یہ محض ایک اتفاق تھا لیکن بہت ہی بد نصیبانہ اتفاق تھا۔

مگر اس تمام تر مشابہت کے باوجود کوئی بہت غور سے دیکھتا تو جان سکتا تھا کہ وہ میری تصویر نہیں تھی لیکن یہ دیکھنے سے زیادہ محسوس کرنے کی بات تھی اور محسوسات اس قسم کے لوگوں کے پاس ذرا کم ہی ہوتے ہیں جن کے ہتھے اس وقت میں چڑھا ہوا تھا۔

پجارو فراٹے بھرتی جا رہی تھی اور بلال شیدی تصویر میں کھویا ہوا تھا۔ آخر کار وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "نہیں عیسیٰ خان! میرا دل کہتا ہے کہ یہ وہ آدمی نہیں ہے۔ ہم غلط آدمی کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں۔ کہیں ہماری اتنے دن کی محنت برباد نہ ہو جائے۔"

بلال شیدی ظاہری طور پر جتنا جانگلوس دکھائی دیتا تھا' ذہنی طور پر اپنے ساتھیوں سے اتنا ہی بہتر معلوم ہوتا تھا یا پھر شاید اس میں درندے والی کوئی حس تھی جو بتاتی تھی کہ شکار وہی ہے یا نہیں جس کی اسے تلاش تھی۔

اس نے تصویر عیسیٰ خان کی طرف واپس بڑھا دی جس نے بے زاری سے اسے دوبارہ جیب میں ڈال لیا۔ اس بار اس نے بلال شیدی کی رائے کی تردید نہیں کی۔ بلال شیدی کی وجہ سے مجھے اُمید کی ایک دُھندلی سی کرن دکھائی دینے لگی لیکن ابھی تک تو معاملہ ہی میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد عیسیٰ خان ذرا نرم لہجے میں بولا "...را کام صرف حکم کی تعمیل کرنا ہے۔ اب محنت چاہے برباد ہو یا آباد' ہمارے مخبر نے ہمیں سکھر سے فون کیا کہ یہ آدمی کندھ کوٹ کی فلاں بس میں سوار ہوتا دیکھا گیا ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم اس وقت کندھ کوٹ میں ہی موجود تھے اور ہم نے ناکہ لگا کر اس کو پکڑ لیا۔ ہمارے پاس بھی اس کی صرف یہی تصویر ہے اور ہمارے مخبروں کے پاس بھی۔ ہم نے شکل ملا کر دیکھ لی ہے' تصویر اس آدمی ہی کی لگتی ہے۔ اب ہم اسے لے جا کر نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر دیں گے' وہ خود ہی فیصلہ کریں گے کہ انہیں یہی آدم چاہیے تھا یا کوئی اور۔ اگر وہ حکم کریں گے کہ یہ صحیح آدمی نہیں ہے' صحیح آدمی پکڑ کر لاؤ تو ہم دوبارہ تلاش میں نکل جائیں گے۔ مخبر بھی دوبارہ چاروں طرف پھیل جائیں گے۔"

"اس وقت تک اصل آدمی علاقے سے... بلکہ ملک سے ہی نہ نکل جائے۔" بلال شیدی پُرخیال انداز میں داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"یہ سوچنا ہمارا نہیں' بڑوں کا کام ہے جن کی کھوپڑی میں تم سے بھی زیادہ عقل ہے۔ ہم تو چھوٹے لوگ ہیں' ہمیں جتنا کام بولا جاتا ہے وہ ہم کر دیتے ہیں۔" عیسیٰ خان نے ناگواری سے جواب دیا

تاہم اس کے لہجے میں اب پہلے جیسی خونخواری نہیں رہی تھی۔ باقی تینوں بھی خاموش تھے۔

"کام کو اگر صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کی زیادہ قدر ہوتی ہے۔" بلال شیدی نے ملائمت سے کہا۔ کام کے بارے میں اس نے بڑے ہی کام کی بات کر ڈالی تھی۔ جھاڑ جھنکاڑ سے بالوں اور کھُردری صورت والا وہ شخص یکدم ہی مجھے اس گروپ کا دانشور دکھائی دینے لگا۔ وہ گروپ میں اتنا بے وقعت بھی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے قسمت آزمائی کے لیے اسی کا سہارا لینے کا فیصلہ کیا۔

میں نے طبیعت پر جبر کرتے ہوئے اسی مکسچر قسم کی زبان میں خاصی لجاجت سے اسے مخاطب کیا "سائیں بلال شیدی! ان لوگوں میں آپ مجھے جوش کے ساتھ ساتھ ہوش سے بھی کام لینے والے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ میں قسم کھا کے بتاتا ہوں' میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں کہ کم سے کم مجھے یہ تو بتا دیں کہ معاملہ کیا ہے۔ سلوک آپ جو چاہے کریں جہاں چاہیں مجھے لے جائیں لیکن مجھے اپنا قصور تو معلوم ہو جائے۔ تھوڑی سی بات چیت کرنے میں کیا حرج ہے؟ سفر ہی کٹے گا۔"

"مجھے بات چیت کرنے کا اتنا شوق نہیں ہے۔" خلافِ توقع بلال شیدی بھی غُرانے کے سے انداز میں بولا "میں عیسیٰ خان سے صرف اس لیے بحث کر رہا ہوں کہ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس ہو رہا ہے۔ ہم سے کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے لیکن یہ مت سمجھنا کہ مجھے تم سے کوئی خاص محبت ہو گئی ہے۔"

اتنا ہی غنیمت تھا کہ اسے گڑبڑ کا احساس تو تھا۔ اس کی محبت کی تو مجھے بھی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ ایک خفیف سا اطمینان مجھے یہ بھی ہوا تھا کہ ان کا ریڈ ڈاٹ سے کوئی تعلق معلوم نہیں ہوتا تھا۔

مجھے کندھ کوٹ کی طرف آتے وقت لاشعوری طور پر جس خفیف اور مبہم سے خطرے کا احساس لاحق رہا تھا' شاید وہ خطرہ میرے تعاقب میں نہیں تھا بلکہ مجھ سے آگے میرا منتظر تھا۔ شاید میری نامعلوم حس مجھے اسی کے بارے میں خبردار کر رہی تھی لیکن میں اس دُھندلے اور موہوم پیغام کو سمجھنے سے قاصر رہا تھا ورنہ میں اپنا روٹ بدل کے کسی اور طرف کو نکل جاتا تو اس مصیبت میں پھنسنے سے بچ جاتا۔

"آپ کو بالکل صحیح احساس ہو رہا ہے سائیں بلال شیدی!" میں نے ہمت نہ ہاری اور بات جاری رکھی "آپ سے گڑبڑ ضرور ہو گئی ہے اور مجھے آپ کی وہ بات بڑی اچھی لگی ہے کہ انسان کام کو اگر صحیح طریقے سے کرنے کی کوشش کرے تو اس کی قدر زیادہ ہوتی ہے۔ آدمی تو آپ نے پکڑ لیا ہے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ فی الحال آپ کو میری شکل بھی اس سے ملتی جلتی دکھائی دے رہی ہے لیکن جہاں کہیں بھی آپ مجھے لے جا رہے ہیں اگر وہاں جا کر ثابت ہو گیا کہ میں وہ آدمی نہیں ہوں جس کی آپ کو تلاش تھی تو اور کچھ ہو یا نہ ہو' تھوڑی بہت شرمندگی تو ضرور ہوگی۔"

پجارو میں اب پہلی سی گرما گرمی کی فضا نہیں تھی۔ خاصی خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔ ہماری گفتگو کے دوران وقفہ آتا تو انجن کی گھر گھراہٹ اور اے سی کی سرسراہٹ ذرا واضح محسوس ہونے لگتی۔ بلال شیدی کے اختلاف رائے نے بہرحال فرق ضرور ڈالا تھا۔

"خیر... تم جو کوئی بھی ہو... بات کرنے میں واقعی کوئی حرج نہیں۔" بلال شیدی سر جھٹک کر بولا "بات زیادہ لمبی چوڑی بھی نہیں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے ہمارے قبیلے کے سردار نواب سرور کے بیٹے نواب زادہ خاقان کو قتل کر دیا گیا ہے..."

مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ اس لیے نہیں کہ یہ میرے لیے کوئی انکشاف تھا۔ یہ خبر تو میں اخبارات میں پڑھ چکا تھا۔ نواب سرور کوئی معمولی شخصیت نہیں تھے۔ وہ بہت بڑے قبیلے کے سردار اور بہت بڑی سیاسی شخصیت تھے۔ ان کی زندگی میں جہاں بے شمار خوش نصیبیاں جمع تھیں وہاں انہیں ایک بد نصیبی کا سامنا بھی کرنا پڑا تھا۔

چند سال قبل ان کا چھوٹا بیٹا قتل ہوا تھا اور کچھ عرصے پہلے بڑے بیٹے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ تفصیلات کا مجھے علم نہیں تھا اور نہ ہی صحیح تفصیلات کبھی سامنے آئی تھیں لیکن بظاہر یہ قبائلی جھگڑوں ہی کا شاخسانہ معلوم ہوتا تھا۔ بہرحال یکے بعد دیگرے دو شیر جیسے بیٹوں کی موت نواب صاحب کے لیے ظاہر ہے دو بڑے اور ناقابلِ بیان سانحوں سے کم نہیں تھی لیکن میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ان واقعات سے کبھی میرا بھی کوئی تعلق جُڑ جائے گا۔

بلال شیدی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "قاتلانہ حملہ بازار میں ہوا تھا۔ قاتل تین تھے۔ انہوں نے بھرے بازار میں نواب زادہ صاحب اور... ان کے گارڈز پر فائرنگ کی تھی۔ نواب زادہ صاحب کے ساتھ دو گارڈز بھی مرے تھے۔ دو قاتل پکڑے گئے ہیں اور پولیس کے قبضے میں ہیں لیکن ہمیں جب بھی موقع ملا' ہم خود انہیں سزا دیں گے۔ ہمیں پولیس تھانے' کچہریوں سے اپنے معیار کے مطابق انصاف ملنے کی امید نہیں۔"

وہ ایک لمحے کو خاموش ہوا تو میں نے ملائمت سے کہا "لیکن اس معاملے سے میرا کیا تعلق؟"

"تیسرا آدمی جو غائب ہو گیا تھا' ابھی تک پکڑا نہیں گیا ہے۔" بلال شیدی بولا "ان تینوں کے پیچھے جو اصل لوگ ہیں' ہم ان سے بھی نمٹ لیں گے لیکن پہلے اس تیسرے آدمی کا پکڑا جانا ضروری ہے۔ ہمارے پاس جو تصویر ہے اسی کی ہے۔ ہمارے سیکڑوں آدمی اس تصویر کی کاپیاں لے کر ان علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں جہاں اس آدمی کے روپوش ہونے کی امید ہو سکتی ہے۔ ہم اس وقت کندھ کوٹ میں ایک زمیندار کے گھر تھے جب سکھر سے ہمارے ایک مخبر کا فون آیا کہ اس آدمی کو اس نمبر کی بس میں سوار ہوتے دیکھا گیا ہے۔ اس نے کندھ کوٹ کا ٹکٹ لیا ہے۔"

میں ایک بار پھر احتجاج کرنا چاہتا تھا کہ میں وہ شخص نہیں ہوں لیکن بلال شیدی نے مجھے اس کی زحمت نہیں کرنے دی۔ میں اسے اپنا حامی محسوس کرتے ہوئے ذرا پُر امید ہو چلا تھا لیکن وہ بھی گویا میری امید پر پانی پھیرتے ہوئے میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی کھُردرے اور روکھے سے لہجے میں بولا "تم وہ آدمی ہو بھی سکتے ہو۔ میں صرف ایک شبہ ظاہر کر رہا تھا جو میرے دل میں آیا تھا کہ شاید تم وہ آدمی نہیں ہو لیکن مجھے پکا یقین نہیں ہے۔ میں بھائی عیسیٰ خان کی بات کو پوری طرح جھٹلا نہیں رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تصویر تو تمہاری ہی لگتی ہے۔ بڑی مشکل سے تم ہاتھ آئے ہو۔ صرف میرے دل کے کہنے پر تمہیں چھوڑ کر ہم اپنے لیے موت کا سامان نہیں کر سکتے۔"

اس کے اس طرح پلٹ جانے پر بھی میں مایوس نہیں ہوا۔ امید کی موہوم سی کرن ابھی پوری طرح معدوم نہیں ہوئی تھی۔ میرے اگر ہاتھ بندھے ہوئے تھے تو زبان بہرحال آزاد تھی۔ میں نے اس سے کوئی مفید کام لینے کی کوشش جاری رکھی اور خود پر جبر کرتے ہوئے منت آمیز لہجے میں بات جاری رکھی "لیکن میں تو باہر کا آدمی ہوں۔ میرا قبائلی جھگڑوں سے کیا تعلق؟"

"وہ بھی باہر کا آدمی تھا۔" بلال شیدی تیزی سے بولا "ہمیں پتا چلا ہے' اس کا نام ماکھو چانڈ ہے۔ کسی زمانے میں وہ ڈاکوؤں کے گروہ کا سردار تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا گروہ ٹوٹ گیا۔ کچھ لوگ مارے گئے' کچھ پکڑے گئے' کچھ بھاگ گئے۔ اب وہ اکیلا پھرتا ہے لیکن پہلے سے زیادہ خطرناک ہو گیا ہے۔"

عیسیٰ خان حقارت بھری نظروں سے میری طرف دیکھ کر منہ بناتے ہوئے بولا "غضب خدا کا! ہم کو یہ دن بھی دیکھنے تھے۔

چھوٹے چھوٹے ڈاکو جو سرداروں کی جوتیاں چاٹتے تھے' اب سرداروں کے قتل میں حصہ لینے لگے ہیں۔" پھر اس نے متاسفانہ انداز میں سر ہلایا اور بولا "پتا نہیں اس دھرتی کا کیا بنے گا۔"

یہ ایک نئی کرم فرمائی تھی۔ انہوں نے مجھے نواب زادہ خاقان کا قاتل ہی نہیں' ماکھو چاچڑ ڈاکو بھی بنا دیا تھا۔ میری مثال تو آسمان سے گرا' کھجور میں انکا والی ہو گئی تھی۔ ریڈ ڈاٹ سے بچ کر بھاگا تھا تو ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ بے بسی کی حالت میں تو یہ بھی میرے لیے ریڈ ڈاٹ سے کم خطرناک نہیں تھے۔

پجارو اب پکی سڑک کو چھوڑ کر ایک کچے راستے پر اتر چکی تھی۔ یہ راستہ بھی سڑک نما ہی تھا لیکن پکا نہیں تھا۔ تاہم بارشوں وغیرہ کی وجہ سے اس کی مٹی جم کر خاصی سخت ہو چکی تھی۔ کہیں کہیں سے نرم تھی۔ پجارو ایسے ٹکڑوں پر سے گزرتی تو ہچکولے کھانے لگتی اور گرد و غبار کے بادل بلند ہونے لگتے لیکن اس کی رفتار میں کمی نہ آتی۔

میں اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیے انہیں یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ جن چیزوں کی وجہ سے اس تصویر سے میری مشابہت پیدا ہو گئی ہے وہ مصنوعی ہیں۔ ضروری نہیں تھا کہ اس انکشاف کی وجہ سے وہ مجھے بے قصور تسلیم کر لیتے۔ میں ان کی نظر میں مزید مشکوک قرار پا سکتا تھا۔ بھلا دودھ اور بھینسوں کا کاروبار کرنے والے "بالا گجر" کو میک اپ میں پھرنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟

زندگی میں کئی بار مجھے تجربہ ہوا تھا کہ ایک جھوٹ کو نبھانے کے لیے سو جھوٹ بولنا پڑتے تھے۔ اس لیے بُرے سے بُرے حالات میں بھی میں نے ہمیشہ یہی کوشش کی تھی کہ جھوٹ نہ بولنا پڑے۔ اب بولا تھا تو وہ گلے کا پھندا بنتا جا رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر میں انہیں اپنی اصلی شخصیت کے بارے میں بتا دوں تو کیا وہ یقین کر لیں گے؟ کیا میرا افضل چوہدری کی حیثیت سے اپنے آپ کو متعارف کرانا کچھ سود مند ثابت ہو گا؟ کہیں مزید الجھنیں تو کھڑی نہیں ہو جائیں گی؟

یہ بات کرتے ہوئے میں اس لیے بھی ہچکچا رہا تھا کہ ابھی تک خود مجھے ان کی کہانی پر پورا یقین نہیں تھا۔ وہ نظر تو ویسے ہی لوگ آ رہے تھے جیسے اپنے آپ کو بتا رہے تھے لیکن کوئی بعید نہیں تھا کہ بہت پیچھے کہیں ان کی ڈوریاں ریڈ ڈاٹ ہی کے ہاتھ میں ہوں۔ عین ممکن تھا کہ کسی رہنمائی یا اطلاعات کی روشنی میں انہوں نے مجھے راستے سے اُچک لیا ہو لیکن اب میرے ہی منہ سے تصدیق چاہ رہے ہوں کہ میں افضل چوہدری تھا۔

کہانی انہوں نے ایسی گھڑی ہو کہ مجھے یقین آ جائے اور میں اپنی دانست میں جان بچانے کے لیے سچ بولنے پر مجبور ہو جاؤں جس کے بعد انہیں کوئی تردد نہ کرنا پڑے اور وہ مجھے آگے کسی ایسی جگہ پہنچا دیں جہاں کے بارے میں انہیں ہدایات ملی ہوں۔ مجھے تجربہ

ہو چکا تھا کہ ریڈ ڈاٹ والے بے شک سیدھی' صاف اور دو ٹوک بات کرتے تھے لیکن ڈراما بازی میں بھی ان کا جواب نہیں تھا۔ بعض اوقات بڑا چکر دینے والا ڈراما رچاتے تھے۔

صرف وہ تصویر مجھے ان کی بات سچ تسلیم کرنے پر کسی حد تک مجبور کر رہی تھی۔ اگر وہ ریڈ ڈاٹ کے اشاروں پر چلنے والے لوگ ہوتے تو ان کے پاس پہلے سے میری موجودہ شکل و صورت کی تصویر نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ محض چہرے کی تصویر ہوتی تب بھی شاید میں امکان محسوس کرتا کہ روہڑی یا سکھر میں کہیں دور سے کسی پولرائڈ کیمرے وغیرہ سے کھینچ لی گئی ہو گی اور اسے ساتھ لے کر وہ لوگ پجارو میں وہیں سے بس کا تعاقب کرتے آ رہے ہوں گے۔ کندھ کوٹ پہنچ کر انہوں نے ناکا بندی کا ڈراما رچایا ہو گا۔

لیکن تصویر میں وہ شخص ایکشن میں تھا۔ اس کے ہاتھوں میں ہلکی مشین گن تھی۔ وہ واقعی فائرنگ کرتا دکھائی دے رہا تھا اور اس کے جسم پر لباس بھی دوسرا تھا۔

میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا "ماکھو چاچڑ کی یہ تصویر کیا عین اس وقت کی ہے جب وہ نواب زادہ خاقان صاحب پر قاتلانہ حملہ کر رہا تھا؟"

"ہاں" بلال شیدی نے اختصار سے جواب دیا۔

"یہ کس طرح کھینچی گئی اور آپ لوگوں کو کس طرح ملی؟" میں نے پوچھا۔

"کوئٹہ کے جس بازار میں نواب زادہ صاحب پر حملہ ہوا اسی بازار میں اس جگہ سے کافی دور ایک عمارت کی دوسری منزل پر ایک چھوٹے سے اخبار کا دفتر ہے۔ اس کا فوٹو گرافر اتفاق سے دفتر کی کھڑکی میں کھڑا تھا۔ وہ کیمرا لے کر کہیں روانہ ہونے والا تھا۔ وہ صرف یہ ایک تصویر کھینچنے میں کامیاب ہو سکا۔ چند سیکنڈ میں سب کچھ ختم ہو گیا۔ نواب صاحب نے اس فوٹو گرافر کو ایک لاکھ روپیا دے کر یہ تصویر لی ہے۔ حالانکہ وہ چاہتے تو فوٹو گرافر کو ایک دن کے لیے اٹھوا لیتے۔ وہ اپنی عمر بھر کی کھینچی ہوئی ساری تصویریں مفت میں دے جاتا لیکن جہاں شرافت سے اور روپے پیسے سے کام چل سکتا ہو وہاں نواب صاحب زور زبردستی نہیں کرتے۔"

پہلی بار اس کی جھاڑ جھنکاڑ نما داڑھی مونچھوں کے درمیان س کے پتلے پتلے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق نظر آئی اور وہ پہلو بدلتے ہوئے بولا "اگر تم ماکھو چاچڑ ہی ہو تو تمہیں اس وقت بڑا فسوس ہو رہا ہو گا کہ تمہارا دھیان اس کھڑکی اور اس فوٹو گرافر کی لرف کیوں نہیں گیا۔ جہاں تین لاشیں گری تھیں وہاں چوتھی بھی لر جاتی تو کیا حرج تھا۔"

"لیکن میں چونکہ ماکھو چاچڑ نہیں ہوں اس لیے میں یہ نہیں' بجھ اور سوچ رہا ہوں۔" میں نے بھی فرش پر پہلو بدلتے ہوئے کہا عام طور پر اس قسم کی وارداتوں میں قاتل اور ڈاکو چہروں پر ڈھاٹے باندھ لیتے ہیں۔ کیا انہوں نے یہ احتیاط بھی نہیں کی تھی؟"

"کر رکھی تھی لیکن دو گارڈز ان سے گتھم گتھا ہو گئے تھے۔ انہوں نے ماکھو چاچڑ کو پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اسی چکر میں اس کا ڈھاٹا کھل گیا تھا۔ باقی دو کو نواب صاحب نے خود شبہ ظاہر کر کے پکڑوا دیا ہے مگر ہمارے قبیلے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تیسرا آدمی ماکھو چاچڑ ہو گا۔ اس کا ہمارے قبیلے سے' ہماری دوستیوں دشمنیوں سے' ہمارے جھگڑوں سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس نے کیوں اس واردات میں حصہ لیا؟ اس بات پر ہمیں زیادہ غصہ ہے۔"

"لمبا مال ملا ہو گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"مال کی ضرورت تھی تو ہمارے پاس آ جاتا۔ ہم اس سے زیادہ مال دے دیتے جتنا دشمنوں نے دیا ہو گا۔" عیسیٰ خان خونخوار سے لہجے میں بولا۔

"اسے یہ بات معلوم نہیں ہو گی۔" میں نے دھیمی سی مسکراہٹ ہونٹوں پر لانے کی جرأت کر لی۔

عیسیٰ خان بے چینی سے کلاشنکوف کو حرکت دیتے ہوئے بولا "تم مان کیوں نہیں لیتے کہ تم ہی ماکھو چاچڑ ہو؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "جس صورتِ حال سے میں دوچار ہوں اس سے تو بہتر تھا کہ میں واقعی ماکھو چاچڑ ہوتا۔"

پھر میں نے دوبارہ عاجزانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا "اچھا یہ تو بتائیں کہ قبیلہ تو آپ کا کچھ اور ہے لیکن ایک کے نام کے ساتھ "خان" لگا ہوا ہے اور دوسرے کے نام کے ساتھ "شیدی" شاید باقی لوگوں کے نام کے ساتھ بھی کچھ اور لگا ہو۔ یہ کیا چکر ہے؟"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" جواب بلال شیدی نے دیا "بنیادی طور پر ہم خان ہی کہلاتے ہیں۔ یہ ہماری مین کاسٹ ہے۔ اس کے بعد خاندانوں کے لحاظ سے ہمارے اندر سب کاسٹ ہوتی ہیں ... اور "شیدی" تو میری سب کاسٹ بھی نہیں ہے۔ میرے کالے رنگ کی وجہ سے پیار سے لوگ مجھے شیدی کہتے ہیں۔ ہمارے قبیلے میں میرے جتنے کالے رنگ والا کوئی کبھی کبھار ہی پیدا ہوتا ہے۔"

وہ خود استہزائی انداز میں ہولے سے مسکرایا۔ میں نے ایک بار پھر بغور اس کی طرف دیکھا۔ میں یہ مکالمے اردو میں دُہرا رہا ہوں لیکن درحقیقت وہ پوری طرح اردو نہیں بول سکتے تھے۔ میری سہولت کے لیے وہ لوگ بھی ملیچھر قسم کی زبان میں بول رہے تھے۔ لہجے کا کھردرا پن اور خونخواری برقرار تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس لمحے مجھے شبہ ہوا کہ بلال شیدی پڑھا لکھا تھا۔ زیادہ نہیں تو کچھ نہ کچھ پڑھا لکھا ضرور تھا۔ اپنے ساتھیوں میں وہ سب سے زیادہ کھردرا' سب سے زیادہ تُند خو دکھائی دیتا تھا اور اس کی شخصیت میں وحشت اور جنگلی پن سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ اس

کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ یہ اس کی اصل شخصیت نہیں تھی۔

کسی خوب صورت اور چمکیلے برتن کو بھی اگر زیادہ عرصے کے لیے جنگل یا صحرا میں پھینک دیا جائے تو اس پر کائی' سیاہی' مٹی کی تہیں اور نہ جانے کیا کچھ جم جاتا ہے۔ اصلی برتن کہیں چھپ کر رہ جاتا ہے۔ بلال شیدی کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی معلوم ہوتا تھا۔

تاہم میں نے اس سلسلے میں بلال شیدی سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میرا ذہن اس وقت بہت سی دوسری الجھنوں میں پھنسا ہوا تھا۔ پجارو اس وقت جس علاقے سے گزر رہی تھی وہ تاحدِ نظر ویرانہ دکھائی دے رہا تھا۔ نیم صحرائی اور نیم میدانی سا علاقہ تھا۔ نہ جانے وہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔

آخر کار میں نے تھوڑا سا رسک لینے کا فیصلہ کرتے ہوئے کہا "برادر بلال شیدی! میں نہ تو بالا گجر ہوں اور نہ ہی ماکھو چاچڑ....."

"بالا گجر تو تم نہیں ہو' یہ تو ہمیں اندازہ ہو چکا ہے۔" عیسیٰ خان میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"لیکن میں ماکھو چاچڑ بھی نہیں ہوں' اس بات کا اندازہ کیوں نہیں ہو رہا ہے تمہیں؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"تصویر کی وجہ سے۔" عیسیٰ خان نے جواب دیا "اگر تمہاری تصویر ہمارے پاس نہ ہوتی اور ہم نے صرف شبے کی بنیاد پر تمہیں پکڑا ہوتا تو شاید ہم تمہاری بات مان لیتے۔"

"اگر میں آپ کو بتاؤں کہ جن چیزوں کی وجہ سے میری شکل اس تصویر سے ملتی جلتی نظر آ رہی ہے وہ مصنوعی ہیں تو آپ کیا کہیں گے؟"

"کیا مطلب؟" بلال شیدی نے تیزی سے پوچھا۔ عیسیٰ خان سے زیادہ وہ چونکا تھا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا تھا۔

"میری یہ مونچھیں .... میری آنکھ کے نیچے گال کی ہڈی پر یہ مسّہ مصنوعی ہے' میرے مسوڑھوں پر مصنوعی مسوڑھوں کی ایک اور تہہ بھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے میرے ہونٹ آگے کو نکل آئے ہیں' میرے ایک دانت پر سونے کا خول چڑھا ہوا ہے جبکہ عام زندگی میں میرے کسی دانت پر ایسا کوئی خول نہیں ہے۔ میرے بال بہت چھوٹے کر دیئے گئے ہیں' اسٹائل اور رنگ بھی بدلا ہوا ہے۔ عام زندگی میں میرے بال ایسے نہیں ہیں — میری جلد میں بھی کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں — یہ سب چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں ہیں لیکن میری شکل میں زمین آسمان کا فرق پڑ گیا ہے۔ میں ایسا بالکل نہیں ہوں جیسا آپ لوگوں کو نظر آ رہا ہوں۔" میں نے ٹھہر ٹھہر کر بتایا۔

بلال شیدی فوراً میری طرف جھک گیا۔ میری مونچھوں کے بال زیادہ لمبے نہیں تھے۔ کسی بہت گھسے ہوئے برش کی طرح چھوٹے تھے۔ بلال نے یکدم ناخنوں سے چٹکی میں پکڑ کر میری مونچھیں اکھاڑنے کی کوشش کی۔

"کیا کر رہے ہو یار؟" میں نے چہرہ پیچھے کرتے ہوئے تکلیف سے ذرا چلا کر کہا "اب یہ اس قسم کی مونچھیں بھی نہیں ہیں کہ چٹکی سے پکڑ کر اتار لی جائیں۔ یہ میک اپ دس پندرہ دن کے لیے کیا گیا ہے۔ دس پندرہ دن میں آہستہ آہستہ یہ خود ہی اتر جائے گا۔ اس سے پہلے اسے اتارنے کے لیے امونیم پر اکسائیڈ کے ایک خاص محلول کی ضرورت ہے۔ اس مسّے کو البتہ تم کسی تیز دھار چاقو یا چھری سے کاٹ کر اتار سکتے ہو' تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ یہ مصنوعی ہے۔ مجھے ذرا بھی تکلیف نہیں ہو گی۔ بس چاقو' چھری یا بلیڈ کی دھار میری جلد سے ذرا اوپر اوپر رکھنا۔"

انہوں نے اس کی زحمت نہیں کی۔ دونوں ہی پُرخیال نظروں سے مجھے دیکھ رہے تھے اور خاموش تھے۔ باقی تینوں نے بھی کئی بار مُڑ مُڑ کر میری طرف دیکھا لیکن کچھ نہیں بولے۔

آخر کار عیسیٰ خان گہری سانس لے کر مونچھ کو بل دیتے ہوئے بولا "اگر تم بالا گجر بھی نہیں ہو اور ماکھو چاچڑ بھی نہیں ہو تو پھر تم کون ہو؟ حاجی فضل؟"

"حاجی تو میں نہیں ہوں۔ یہ سعادت مجھے حاصل نہیں ہو سکی لیکن بہرحال میں ایک شریف آدمی ہوں۔ اس وقت مجبوری کی حالت میں ہوں۔" میں مزید کچھ کہتے کہتے یکدم رک گیا۔ مجھے اپنے الفاظ کچھ عجیب سے محسوس ہوئے تھے۔ انداز بیاں کچھ کچھ ان لوگوں جیسا ہو گیا تھا جو راہ چلتے کبھی کبھی ٹکرا جاتے ہیں اور کسی سفید پوش کو روک کر کہتے ہیں "جناب! میں بھکاری نہیں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں۔ یہاں مال خریدنے آیا تھا لیکن بازار میں میری جیب کٹ گئی۔ اب واپسی کا کرایہ نہیں ہے۔"

"خاموش کیوں ہو گئے؟" عیسیٰ خان نے مجھے گھورا۔

"اپنی مجبوریوں کا رونا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میرے حالات جو کچھ بھی ہیں وہ میرا نجی معاملہ ہے۔" میں نے کہا۔

بلال شیدی کی آنکھوں کی سُرخی کچھ بڑھ چکی تھی۔ وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے سے لہجے میں بولا "پولیس سے بھاگے ہوئے ہو؟"

"میں نے کہا ناکہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ مجھے پولیس سے بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ مت کہو۔ بعض اوقات شریف آدمی کو پولیس سے بھاگنے کی جیسی ضرورت پڑتی ہے ویسی بدمعاش کو بھی نہیں پڑتی۔" بلال شیدی بولا۔

"بہرحال میں پولیس سے نہیں' بہت ہی خطرناک قسم کے کچھ لوگوں سے جان بچا کر بھاگا ہوں۔" میں نے کہا اور ایک ٹھنڈی سانس لی "لیکن جو مصیبت مقدّر میں ہو وہ اُٹھانی ہی پڑتی ہے' خواہ انسان کتنا ہی بھاگ لے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "آپ لوگوں کو میری بے گناہی کا یقین آ گیا یا نہیں؟"

"نہیں" عیسیٰ خان نے کھردرے اور روکھے لہجے میں جواب

دیا۔ میرے دل میں امید کی جو موہوم سی کرن اُبھر رہی تھی وہ ڈوب گئی۔

عیسیٰ خان بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "اگر تم میک اپ میں ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم ماکھو چاچڑ نہیں ہو سکتے بلکہ اب تو تمہارے ماکھو چاچڑ ہونے کا امکان اور بڑھ گیا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ تم اس وقت بھی اسی میک اپ میں تھے جب تم نے نواب زادہ صاحب کے قتل میں حصّہ لیا اور اتفاق سے تمہاری تصویر کھنچ گئی۔"

"ہاں۔ عیسیٰ خان ٹھیک کہہ رہا ہے۔" میری توقع کے خلاف بلال شیدی نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی "عیسیٰ خان کی کھوپڑی عقل سے اتنی بھی خالی نہیں ہے جتنی میں سمجھتا تھا۔"

"میرے خیال میں تو آپ ٹھیک ہی سمجھتے تھے۔" میں یہ کہتے کہتے رہ گیا۔

عیسیٰ خان سنجیدگی سے بولا "ماکھو چاچڑ اندرونِ سندھ کا ڈاکو ہے' ہمارے علاقے کا نہیں ہے۔ ہمیں اس کی اصل شکل صورت کے بارے میں کسی قسم کی معلومات نہیں ہیں۔"

"مجھے نہیں معلوم' ماکھو چاچڑ کتنا جاہل ہے۔" میں نے دلیل سے کام لینے کی کوشش جاری رکھی "لیکن وہ اتنا احمق نہیں ہو سکتا کہ جس گیٹ اپ میں وہ ایک بہت بڑی اور بہت خطرناک واردات کر چکا ہو اور اسے یہ بھی معلوم ہو کہ اسے دیکھ لیا گیا تھا' اسی بہروپ میں وہ بعد میں بھی گھومتا رہے۔ آپ نے خود ہی بتایا کہ نواب زادہ صاحب کے ایک گارڈ نے اس کے چہرے سے ڈھاٹا کھینچ لیا تھا اور یہ واردات بھرے بازار میں ہوئی تھی۔"

اس بار جواب بلال شیدی نے دیا "گارڈ نے ڈھاٹا تو کھینچ لیا لیکن وہ کچھ بتانے کے لیے زندہ کہاں بچا تھا۔ وہ تو گولیوں سے چھلنی ہو گیا تھا۔ رہی یہ بات کہ واردات بھرے بازار میں ہوئی تھی' چھوٹے شہروں کے بازار کچھ ایسے زیادہ بھرے پُرے بھی نہیں ہوتے۔ مارکیٹ کے باہر جو چند لوگ موجود تھے' گولیوں کی تڑتڑ ہوتے ہی ان میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ ہر ایک کو جان بچانے کی پڑی تھی۔ سب کچھ جیسے آناً فاناً ہو گیا۔"

عیسیٰ خان بولا "لوگوں نے اگر دیکھا بھی تو صرف اتنا کہ کچھ لوگ گولیوں سے چھلنی ہو کر گرے تھے اور کچھ لوگ کلاشنکوفیں اُٹھائے گاڑیوں میں بیٹھ کر بھاگ رہے تھے۔ ہمیں کام کی بات بتانے والا کوئی گواہ نہیں ملا۔ کام کی چیز صرف یہ ایک تصویر ہے۔" اس نے اپنی جیب کو تھپتھپایا جس میں تصویر موجود تھی "اسی لیے نواب صاحب نے اس کی ایک لاکھ روپے قیمت ادا کی۔ ایک طرح سے فوٹو گرافر کے لیے انعام تھا۔"

بلال شیدی بولا "اس کے علاوہ شاید تم اس لیے بھی اطمینان سے بہروپ میں گھوم رہے تھے کہ اب تم اس علاقے سے بہت دور تھے جہاں تم نے واردات کی تھی۔ اب تم دوسرے صوبے میں تھے اس لئے اپنے آپ کو محفوظ سمجھ رہے ہو گے۔" ان کی کھوپڑیاں دلیل کے میدان میں بھی تھوڑا بہت کام کرتی تھیں۔ ان پر محض وحشت و خونخواری کا غلبہ نہیں تھا۔

وہ باری باری بات کر رہے تھے۔ اب عیسیٰ خان بولا "ویسے بھی ان چکروں میں پڑنا ہمارا کام نہیں ہے کہ تم کون ہو اور کون نہیں۔ ہمیں جو کام سونپا گیا تھا وہ ہم نے کر دیا ہے۔ ہم تمہیں لے جا کر نواب صاحب کے سامنے پیش کر دیں گے۔ اگر خوش قسمتی سے تمہیں اپنی کہانی سنانے کا موقع مل گیا تو سنا دینا۔ اگر اس پر یقین کر لیا گیا تو تمہاری اور بھی زیادہ خوش قسمتی ہو گی ورنہ ...."

اس نے بھویں اُچکا کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

"ورنہ کیا؟" میں نے اپنی دھڑکنیں ذرا مرتعش ہوتی محسوس کیں۔

"ورنہ جہاں تم ہو گے وہاں کے درودیوار بھی تمہارا حشر دیکھ کر کانپیں گے۔" بلال شیدی نے جواب دیا۔

میں خاموش رہا۔ پشت پر ہاتھ بندھے ہونے اور نیچے بیٹھے رہنے کی وجہ سے میں تھک چکا تھا۔ ویسے بھی میں گزشتہ چوبیس گھنٹوں میں جن حالات سے گزر کر آ رہا تھا وہ کسی نہایت غیر معمولی انسان کو بھی توڑ پھوڑ کر رکھ دینے کے لیے کافی تھے۔ یہ تو صرف خدا داد سخت جانی تھی جو میرا ساتھ دے رہی تھی۔

پجارو اب ایک جنگل میں داخل ہو چکی تھی۔ وہ کچّا سڑک نما راستہ تقریباً معدوم ہو چکا تھا مگر ایک طرح کی پگڈنڈی سی اب بھی باقی تھی جو جنگل میں بھی بل کھاتی نہ جانے کہاں تک جا رہی تھی۔ دن ڈھلنے لگا تھا اور جنگل میں داخل ہونے کے بعد تو تقریباً رات ہی کا سماں دکھائی دینے لگا تھا۔ ڈرائیور نے ہیڈ لائٹس روشن کر لی تھی۔

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟" کئی منٹ کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

"اپنے علاقے میں" بلال شیدی نے مبہم لہجے میں جواب دیا "یہ شارٹ کٹ ہے۔"

شارٹ کٹ اتنا طویل تھا' اصل راستے سے جاتے تو نہ جانے کیا عالم ہوتا۔ میری ٹانگیں سُن ہو چکی تھیں اور کمر تختہ ہوئی جا رہی تھی۔ میں نے ذرا پیچھے ہٹ کر گاڑی کی دیوار سے ٹیک لگائی اور ٹانگیں پھیلا لیں۔ انہوں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ وہ میری نگرانی سے اب بھی غافل نہیں تھے۔ کلاشنکوفوں کا رُخ اب بھی میری طرف ہی تھا لیکن اب ان کے چہروں پر اور ان کے رویّے میں وہ خونخواری نہیں رہی تھی۔ اتنی دیر کی بات چیت کا یہ فائدہ ہوا تھا۔ اس کے علاوہ شاید انہیں اطمینان ہو چکا تھا کہ میں اب مکمل طور پر قابو میں آیا ہوا ایک شکست خوردہ شکار ہوں۔ سردست تو ایک بند گاڑی میں پانچ کلاشنکوف برداروں کے درمیان بندھے ہوئے ہاتھوں اور تھکن سے ٹوٹتے جسم کے ساتھ میں کسی قسم کی مزاحمت

یا مقابلے کی کسی تدبیر کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ ان کا رویّہ اب تقریباً بے ضرر لوگوں والا ہی تھا اس لیے فی الحال تو مجھے اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دینے میں بھی راحت محسوس ہو رہی تھی۔

جنگل سے نکلنے میں تقریباً ایک گھنٹا لگ گیا جبکہ پجارو کی رفتار اس دوران بھی کچھ ایسی کم نہیں رہی تھی۔ ڈرائیونگ کے فرائض انجام دینے والا ان بل کھاتے راستوں پر گاڑی چلانے میں بہت ماہر معلوم ہوتا تھا۔

جنگل سے نکلے تو نیم کوہستانی سا علاقہ شروع ہو گیا۔ بائیں ہاتھ پر کافی دور' ستاروں کی دُھندلی روشنی میں نیچی پہاڑیوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ کہیں کہیں کوئی اونچا پہاڑ بھی دکھائی دے جاتا لیکن ہم ان سے دور دور ہی رہے۔ تاہم جس بل کھاتے راستے پر ہم جا رہے تھے وہ بتدریج بلند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔ راستے میں کہیں کہیں جوہڑ اور برساتی نالے بھی دکھائی دیے۔ پجارو بھی کئی جوہڑوں سے گزری اور پانی کے چھینٹے اڑ کر شیشوں تک آتے دکھائی دیے۔

سفر مزید ایک ڈیڑھ گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران پہاڑیوں کا سلسلہ ایک بار غائب ہو کر دوبارہ نمودار ہو چکا تھا لیکن اب پہاڑیاں ہمارے دائیں ہاتھ پر تھیں اور ہم شاید گھوم کر انہی کے پیچھے جا رہے تھے۔ ایک تو میں گاڑی میں بالکل پیچھے بیٹھا تھا' دوسرے راستے میں اتنے پیچ و خم آئے تھے' گاڑی اتنی تیزی سے رُخ بدلتی رہی تھی کہ سمت کا تعین کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ ان علاقوں سے بہت پرانی آشنائی رکھنے والے ہی اس طرح سفر کر سکتے تھے۔

آخر کار ہم ایک ایسے میدان میں جا پہنچے جو چاروں طرف سے نیچی پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس میدان کے وسط میں ایک طویل و عریض مکان سر اُٹھائے کھڑا تھا جو کسی چھوٹے موٹے قلعے سے کم نہیں تھا۔ وہ گارے اور کچی اینٹوں سے بنا ہوا تھا لیکن اس کی دیواریں بہت موٹی اور دروازے' کھڑکیاں کسی قلعے کے دروازے کھڑکیوں کی طرح بلند و بالا اور بھاری بھرکم دکھائی دے رہے تھے۔

اس دشت کی ویرانی میں اس قلعہ نما مکان کا وجود بہت عجیب معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے در و دیوار سے عجیب آسیب زدگی سی جھلک رہی تھی۔ پجارو صدر دروازے پر جا رکی۔ بلند و بالا یہ دروازہ منقش لکڑی کا تھا۔ ڈرائیور نے ہارن دیا۔ چند لمحے بعد ایک دروازے میں چھوٹی سی ایک چوکور درز پیدا ہوئی جس سے پہلے تو کسی گن کی نال باہر آئی پھر کسی نے درز سے آنکھ لگا کر جھانکا۔

گن کی نال واپس اندر چلی گئی اور چند لمحے بعد ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ پجارو طویل و عریض احاطے میں جا رکی۔ اس وقت تک آدھا چاند نمودار ہو چکا تھا۔ وہ گویا اپنے ادھورے پن پر تاسف سے سر جھکائے مدھم ہوا کا ہاتھ تھامے رینگ رہا تھا۔ چاروں طرف ایسی ملگجی سی چاندنی پھیلی ہوئی تھی جیسے صبح کے آثار نمودار ہو رہے ہوں۔

اس دُھندلاہٹ میں ہر چیز پُراسرار سی لگ رہی تھی۔ چوبی دروازہ کھولنے والے کے علاوہ بھی احاطے میں تین کلاشنکوف بردار کھڑے تھے۔ ان کے سروں پر بڑی بڑی پگڑیاں تھیں۔ احاطے میں مجھے دو جیپیں اور ایک پجارو مزید کھڑی دکھائی دی۔

میرے ہم سفروں میں سے تین پہلے اُتر گئے۔ پھر انہوں نے مجھے اُتارا۔ دو میرے پیچھے اُترے۔ چوبی گیٹ عقب میں بند ہو چکا تھا اور اس کی بڑی سی آہنی کُنڈی میں بڑا سا تالا ڈال دیا گیا تھا۔

میں نیچے اتر کر انگڑائی لینا چاہتا تھا لیکن ہاتھ پُشت پر بندھے ہونے کی وجہ سے حسرت ہی رہ گئی اور میں نے گدھے گھوڑوں کی طرح صرف ٹانگیں جھٹکنے پر ہی اکتفا کیا۔ مکان کے اندر مجھے خاصی روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ پھر کھلے دروازوں اور کھڑکیوں سے مجھے کمروں میں برقی بلبوں کی جھلک بھی دکھائی دی۔

میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس لق و دق ویرانے میں بجلی موجود تھی؟ جبکہ کہیں تاریں بھی دکھائی نہیں دے رہی تھیں لیکن پھر خفیف سی گھرگھراہٹ کی طرف دھیان گیا تو میری حیرت دور ہو گئی۔ مکان میں یقیناً کہیں کوئی طاقتور جنریٹر چل رہا تھا۔

مکان کی حالت بتا رہی تھی کہ وہ بہت پرانا تھا لیکن کچا ہونے کے باوجود امتدادِ زمانہ کا مقابلہ کر گیا تھا۔ کیونکہ وقتاً فوقتاً شاید اس کی مرمت کرائی جاتی رہی تھی۔

وہاں' موجود لوگوں نے اپنی زبان میں ان لوگوں کی خیر و عافیت پوچھی جو میرے ساتھ آئے تھے۔ اپنا احوال بتایا' دو ایک خبریں سنائیں جن کے پس منظر سے آگاہ نہ ہونے کی وجہ سے میں انہیں سمجھ نہ سکا۔ میرے بارے میں مختصراً ان لوگوں کو بتایا گیا کہ میں نواب صاحب کا قیدی ہوں۔

مجھے گھیرے میں لیے وہ لوگ آگے بڑھے تو میں نے پوچھا "یہ نواب صاحب کی حویلی ہے؟"

لیاقت شیدی بے اختیار ہنس دیا پھر حقارت سے چاروں طرف اشارہ کرتے ہوئے استہزائیہ سے انداز میں بولا "نواب صاحب کی حویلی ایسی ہونی چاہیے تھی تمہارے خیال میں؟ نواب صاحب کی حویلی اگر تم نے دیکھ لی تو آنکھیں کھل جائیں گی اور وہاں تم آسانی سے داخل بھی نہیں ہو سکو گے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "یوں سمجھو کہ یہ بھی مقامات میں سے ایک مقام ہے جہاں دونوں صوبوں کی سرحدیں ملتی ہیں۔ یہ مکان ایک طرح سے ہماری پرائیویٹ چیک پوسٹ ہے۔ بہت کام آتی ہے' بہت فائدے ہیں اس کے۔ آج کل حالات خراب ہیں۔ ایک قبیلے سے دشمنی ہوئی ہے ہماری۔ اس لیے راستے کچھ محفوظ نہیں رہے۔ ابھی کافی سفر باقی ہے۔ رات ہم یہاں بسر کریں گے۔ کل دن چڑھے آگے روانہ ہوں گے۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا' مسکراتے ہوئے بولا "لیکن تم ماکھو چاچڑ ہو تو تمہیں سب کچھ معلوم ہو گا۔ شاید تم صرف مزے لینے کے لئے پوچھ رہے ہو۔"

"اگر مزے لینا اسی کو کہتے ہیں تو اللہ اس قسم کے مزے لینے کا موقع تم سب کو عطا فرمائے۔" میں نے پُرخلوص لہجے میں کہا۔

"نئی نئی بیواؤں کی طرح بددعا کیوں دے رہے ہو۔" بلال شیدی مسکرایا۔ اس کا رویّہ اب تقریباً دوستانہ ہی تھا۔ عیسیٰ خان اور دوسروں کے چہروں پر بھی زیادہ کرختگی نہیں تھی۔ شاید خیر و عافیت سے یہاں پہنچنے پر ان کا اعصابی تناؤ کافی حد تک دور ہو گیا تھا۔ شاید انہیں اس بات سے بھی اطمینان ہو گیا تھا کہ میں نے ابھی تک ان کے لئے دردِ سر بننے یا کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی اور آئندہ بھی اس کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ مجھے بھی اب کم از کم یہ اطمینان ہو چکا تھا کہ ان کا تعلق ریڈ ڈاٹ سے نہیں تھا۔ میرے لئے سرِدست یہ طمانیت بھی کافی تھی۔

برآمدے سے گزر کر ہم اس بڑے سے کمرے میں پہنچے جو سامنے ہی نظر آ رہا تھا۔ بیشتر لوگ باہر ہی رہ گئے' صرف بلال شیدی اور عیسیٰ خان میرے ساتھ اندر آئے۔ وہ میرے دائیں بائیں ذرا پیچھے رہتے ہوئے چل رہے تھے۔

کمرے میں پہنچ کر میں نے دیکھا' وسط میں ایک بڑی سی چٹائی بچھی ہوئی تھی جس پر ایک مرد اور عورت بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ عورت خوش شکل' قدرے فربہ اندام اور گھریلو سی تھی۔ مرد تنومند اور مضبوط کاٹھی کا تھا۔ اس کے کندھے خاصے چوڑے تھے۔ وہ میاں بیوی معلوم ہوتے تھے۔

عیسیٰ خان اور بلال شیدی کو دیکھ کر وہ دونوں کھانا چھوڑ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ باندھ کر سلام دعا کرنے لگے' حال دریافت کرنے لگے۔

"بیٹھ جاؤ... بیٹھ جاؤ۔ کھانا چھوڑ کر مت اُٹھو۔ کھاتے رہو۔" بلال شیدی ہاتھ ہلا کر بولا۔

وہ دونوں بیٹھ گئے۔ عورت بولی "باقی سب لوگوں کو تو میں نے کھلا دیا ہے۔ آپ لوگوں کے لیے ابھی تیار کرتی ہوں۔ مجھے پتا تھا کہ آپ لوگ آئیں گے۔"

"تم آرام سے کھاؤ اور آرام سے ہمارے لیے کھانا تیار کرنا' جلدی نہیں ہے۔" عیسیٰ خان نے اسے تسلی دی۔ ان میاں بیوی نے سرسری نظر سے میری طرف دیکھا تھا۔ میرے ہاتھ بندھے دیکھ کر وہ ذرا بھی نہیں چونکے تھے۔ یہ گویا ان کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

کمرے میں ایک بہت بڑی اور بھاری بھرکم چارپائی اور لکڑی کی بے ہنگم کرسیاں بھی موجود تھیں۔ ایک طرف پانی کے مٹکے رکھے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ چٹائی پر بیٹھ کر کھانا کھاتا ہوا جوڑا یہاں کا انتظام سنبھالتا تھا۔ آنے جانے اور ٹھہرنے والوں کے لئے کھانے پینے کا بندوبست کرتا تھا۔ دو آدمی کلاشنکوفیں سنبھالے کمرے کے دروازے پر ہی ایک دوسری چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔

بلال شیدی نے مجھے اشارہ کیا "وہ اس کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر جا کر بیٹھ جاؤ۔ کوئی غلط حرکت مت کرنا' زندگی اور بھی مختصر ہو جائے گی۔ تمہیں یہ اندازہ تو ہو ہی گیا ہو گا کہ یہاں سے تم نکل نہیں سکتے۔ نکل کر جاؤ گے بھی کہاں؟ چاروں طرف ویرانے کے سوا کچھ نہیں۔ بھاگ کر کوئی کہیں نہیں جا سکتا۔ دوبارہ ہمارے ہی ہاتھ آتا ہے۔"

میں نے سعادت مندی سے اس کے حکم کی تعمیل کی اور کونے میں پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا جہاں سبھی مجھ پر نظر رکھ سکتے تھے۔ یہی غنیمت تھا کہ وہ مجھ سے اس قسم کا سلوک نہیں کر رہے تھے جیسا میرے خیال میں اس قبیل کے لوگ اپنے قیدیوں سے کرتے تھے۔ کسی نے مجھے ٹھڈے نہیں مارے تھے' رائفل کے بٹ رسید نہیں کیے تھے۔ حتیٰ کہ ابھی تک تو کسی نے مجھے گالی بھی نہیں دی تھی حالانکہ ان کے شبہات کے مطابق میں ماکھو چاچڑ تھا اور میں نے ان کے سردار زادے کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ اس لحاظ سے تو مجھے بہت ہی معتوب و مطعون ہونا چاہیے تھا۔

میں کرسی پر بیٹھ چکا تو میری نظر کمرے کے بڑے سے دروازے کے عقب میں دیوار سے لگ کر کھڑی ہوئی عورت پر پڑی۔ وہ کچھ اس طرح دیوار سے چپکی کھڑی تھی جیسے دروازے سے داخل ہونے والوں کو اچانک زور سے "ہاؤ" کر کے ڈرائے گی لیکن اس نے اس قسم کی کوئی شرارت نہیں کی تھی۔

وہ اتنے بھڑکیلے لباس میں تھی کہ کمرے میں داخل ہوتے ہی میری نظر اس پر پڑ جانی چاہیے تھی لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ شاید تھکن نے میری حسیات پر اثر ڈالا تھا۔

اسی لمحے بلال شیدی اور عیسیٰ خان آگے بڑھ کر گاؤ تکیوں کے سہارے بڑی سی چارپائی پر نیم دراز ہو چکے تھے۔ ان کی نظر بھی اسی وقت اس عورت پر پڑی۔ ہم تینوں نے تقریباً بیک وقت ہی اسے دیکھا تھا۔

وہ گدرائے ہوئے جسم کی ایک سانولی سی عورت تھی مگر اس میں خاصی کشش تھی بلکہ اس نے اپنی کشش دیہاتی قسم کے میک اپ کی وجہ سے کچھ کم کر لی تھی۔ وہ لال ہرے' نیلے پیلے کئی شوخ رنگوں کے لہنگے اور چولی میں تھی۔ گوٹا کناری بھی چمک رہی تھی۔ بہت گہرا میک اپ تھا۔ ذرا سلیقے سے کیا گیا ہوتا تو وہ اوسط درجے کی کسی تھیٹر کی اداکارہ دکھائی دیتی۔ کھڑی وہ کچھ ایسے انداز سے تھی جیسے کسی ڈرامے کے دوران اسٹیج کے ونگ میں تھی اور منتظر تھی کہ اس کی باری آئے تو جا کر اپنے مکالمے بولے یا اپنا ایکٹ پیش کرے۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ تھی۔

عیسیٰ خان اور بلال شیدی دونوں ہی اسے دیکھ کر بُری طرح چونکے اور اُٹھ بیٹھے۔ اس عورت کو دیکھ کر انہیں گویا ایک خوشگوار

سی حیرت ہوئی تھی۔

بلال شیدی مسکراتے ہوئے بولا "چھماں! میری بلبل! تو یہاں کیا کررہی ہے؟؟"

"کچھ بھی نہیں۔ آج رات میں تمہارے اس ڈاک بنگلے میں مہمان ہوں۔" وہ بھی ایک ادائے خاص سے مسکراتے ہوئے بولی۔ اس کی آواز حترنم تھی۔

"پھر بھی... کوئی بات تو ہوگی۔ کسی خاص وجہ کے بغیر تو یہاں اتنی دور، ہمارے اس ڈیرے پر تو آنے سے رہی۔" بلال نے کُریدا۔

وہ بڑی ادا سے اپنی چولی اور لنگا دُرست کرتے ہوئے بولی "میں آج کل ذرا انسپکٹر حیات خان کے ساتھ رہ رہی ہوں۔ اس کا حکم ہے کہ چند دن اور مجھے اس کے ساتھ رہنا ہوگا پھر اس کی بدلی ہوجائے گی لیکن بیچ میں اسے اپنے گاؤں جانا پڑگیا۔ وہ مجھے بھی جیپ میں ساتھ بٹھا کر لے آیا لیکن راستے میں یہاں چھوڑگیا۔ کہنے لگا گاؤں سے واپسی پر ساتھ لے لوں گا۔"

"واہ... واہ!" اب عیسیٰ خان بھی بول اُٹھا "بڑے ٹھاٹ ہیں تمہارے۔ اب تو بڑی اونچی اڑان اڑنے لگی ہے۔ بڑی پہنچ ہوگئی تمہاری۔ انسپکٹروں سے تعلقات ہوگئے ہیں۔ کیا کہنے!"

چھماں ذرا نخرا دکھانے کی اداکاری کرتے ہوئے بولی "اب تو یہی ہوگا جان جی! اب چھوٹے موٹے قبائلیوں، سپاہیوں، کارندوں اور دہقانوں کو منہ لگانا میں نے چھوڑدیا ہے۔ یوں سمجھو، اس وقت میں تمہارے اس مہمان خانے میں انسپکٹر حیات خان کی امانت ہوں۔"

"واہ بھئی واہ...! ہماری دُعا ہے ایسی امانتیں تو روز روز ہمارے پاس رکھوائی جائیں۔" بلال شیدی بولا پھر اس نے چارپائی پر تھپکی دی "ذرا ادھر تو آ۔ ہمارے پاس تو بیٹھ۔ بڑے دنوں بعد ملاقات ہوئی ہے۔ کوئی دلداری کی بات کر۔"

چھماں بڑے نازو انداز سے آگے بڑھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے بدن میں شاخ گُل کا سا لوچ تھا۔ ہلکے سے بھونڈے پن کے باوجود وہ بھلی لگ رہی تھی۔ وہ آکر چارپائی پر ذرا ایک طرف کو ہٹ کر بیٹھ گئی۔ چٹائی پر بیٹھے میاں بیوی سر جھکائے کھانا کھانے میں مصروف رہے۔ وہ گویا گردوپیش سے بالکل لاتعلق تھے۔ کوئی آواز ان کے کان میں نہیں جارہی تھی۔ میں بغور یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔

"اچھا... تو اب تو امانت ہے ہمارے پاس انسپکٹر حیات خان کی؟" بلال شیدی نے شریر نظروں سے اسے گھورا۔

"بے شک" چھماں نے مصنوعی سنجیدگی سے جواب دیا جس کی تہ میں ایک شوخ مسکراہٹ مچل رہی تھی۔

"ایسی امانت جس میں جب چاہیں اور جتنی چاہیں خیانت کرلیں۔ ٹھیک ہے نا؟" عیسیٰ خان نے تصدیق چاہی۔

"جی نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" چھماں نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں "اگر تم نے کوئی بدمعاشی کی تو میں حیات خان کو بتادوں گی۔"

"اور حیات خان تو جیسے ہمیں پھانسی پر چڑھا دے گا۔ اس سالے کو بھی آخر ہمارے علاقے میں رہنا ہے۔" عیسیٰ خان مونچھ کو بل دیتے ہوئے مسکرایا۔

بلال شیدی بولا "اسے پتا نہیں تھا، وہ خرگوشنی کو بھیڑیوں کی کچھار میں چھوڑ کر جارہا ہے؟ تو، تو ایسے ناز دکھا رہی ہے جیسے اس کی بیوی بن گئی ہے۔ ارے یہ چار چار دن کی دوستیاں تو تیری زندگی میں بہت آئی ہیں اور آئندہ بھی آتی رہیں گی۔ تیرے پُرانے اور اصل شناسا تو ہم ہی ہیں۔ اس زمانے کے شناسا جب تجھ جیسے جنگل پھول کی خوشبو جنگل سے آگے نہیں گئی تھی۔"

اس نے چھماں کی زلفیں بکھیرنے کی کوشش کی مگر اس نے پھرتی سے سر پیچھے ہٹالیا۔ عیسیٰ خان نے چٹائی پر بیٹھے جوڑے کو مخاطب کیا "جان محمد! رکھاں بی بی! تم نے چھماں کو کھانا وانا کھلایا ہے نا؟"

عورت جسے رکھاں بی بی کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا، سر اُٹھائے بغیر بولی "ہاں سائیں! حیات خان نے جیسا بولا تھا ویسی ہی اس کی خاطر تواضع کی ہے۔ مرغی پکا کے کھلائی ہے اس کو۔ میٹھا بھی تھا اس کے لیے۔"

"ہاں بھئی! اب اس کی خاطر مدارات کیا کرو۔ اس کا رہنا بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ہونے لگا ہے۔ کیا پتا، کل اس پر کوئی مہربان ہوجائے۔" عیسیٰ خان بدستور مونچھ کو بل دیتے ہوئے چھماں کو گھورتے ہوئے مسکرا کر بولا۔

چھماں کی کلائیوں میں کہنیوں تک سفید پلاسٹک کی چوڑیاں بھری ہوئی تھیں۔ وہ بے نیازی سے ان سے کھیلتے ہوئے کوئی لوک نغمہ گنگنانے لگی۔ اس کی آواز اچھی خاصی معلوم ہوتی تھی۔ ریڈیو پر چوں چوں کرنے والی کئی بے سُری، بے استادی گلوکاراؤں سے بہتر لگ رہی تھی۔

جان محمد اور رکھاں کھانا کھا کر برتن ساتھ ہی لیتے ہوئے کھڑے ہوئے اور رکھاں ایک نظر عیسیٰ خان کی طرف دیکھ کر "کھانا تو بس تیار ہی ہے، صرف گرم کرکے لانا ہے۔ آپ لوگ منہ دھولیں۔"

"ہاتھ منہ دھولیں!" عیسیٰ خان استہزائیہ سے انداز میں "اری رکھاں! کیوں پانی ضائع کراتی ہے۔ تجھے تو اچھی طرح پتا ہے اس علاقے میں ایک ایک بوند قیمتی ہے۔ تیرے ہی میاں کو دور سے بھربھر کے لانا پڑتا ہے۔"

"کوئی بات نہیں سائیں! میں لاتا رہتا ہوں۔ اور لے آؤں گا۔ ہم یہاں انہی کاموں کے لیے تو بیٹھے ہیں۔" جان محمد بھی کھانا ہی رکھتے ہوئے بولا اور وہ دونوں میاں بیوی کمرے سے چلے گئے۔

میرا خیال تھا کہ پہلے کی نسبت ذرا زیادہ تنہائی میسّر آنے کے بعد چھماں سے بلال شیدی اور عیسیٰ خان کی چھیڑ خانی بڑھ جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا۔ ان کا موڈ بیک وقت ہی کچھ بدل سا گیا۔ پہلے بھی وہ بظاہر تو اٹکھیلیاں اور چہلیں ہی کررہے تھے لیکن درحقیقت ان کی آنکھوں میں فکرمندی کی پرچھائیاں تھیں۔ اب جیسے ان کے اندر کی تشویش کچھ اُبھر آئی۔

وہ دونوں چھماں کے قریب ہوگئے مگر دست درازی کے بجائے نہایت سنجیدگی سے رازدارانہ سے انداز میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ وہ تیزی سے اپنی زبان میں باتیں کررہے تھے۔ آوازیں بہت نیچی ہونے کی وجہ سے میں صحیح طور پر تو کچھ سمجھنے سے قاصر تھا لیکن اتنا اندازہ بہرحال ہوگیا کہ آج کل ان کی کسی دوسرے قبیلے کے لوگوں سے تقریباً جنگ سی چھڑی ہوئی تھی۔

ان لوگوں کو غالباً نذیریوں کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ بلال اور عیسیٰ، چھماں سے نذیریوں کے بارے میں کچھ معلوم کرنے کی کوشش کررہے تھے لیکن وہ نفی میں سرہلاتے ہوئے بار بار یہی کہے جارہی تھی کہ ابھی اسے کچھ معلوم نہیں ہوسکا تھا لیکن وہ کوشش جاری رکھے گی اور جہاں بھی ہوئی، کسی نہ کسی کے ہاتھ پیغام بھجواتی رہے گی۔

اس سے بات ختم کرکے بلال شیدی کو جیسے کچھ یاد آیا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر دروازے کی طرف منہ کرتے ہوئے آواز دی "رادھن! ایک رسی تو لے آؤ۔"

"حاضر سائیں! ابھی لایا۔" باہر سے آواز آئی۔

چند لمحے بعد ایک میانہ قامت مگر سخت جان سا نوجوان پتلی رسی کا ایک گچھا اٹھائے کمرے میں آیا۔ بلال شیدی نے رسی اس سے لی اور اُٹھ کر میرے قدموں میں آبیٹھا۔ اس نے بالشتوں سے باقاعدہ ناپ کر اپنے خنجر سے رسی کا ایک ٹکڑا کاٹا اور اس کے دونوں سروں سے میرے دونوں پاؤں اس طرح خاص قسم کی بندشوں میں جکڑ دیے کہ درمیان میں کچھ فاضل رسی موجود رہی۔ یعنی میں چاہتا تو چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا احتیاط سے چل سکتا تھا۔ لمبے قدم اُٹھا کر تیزی سے چلنا یا دوڑنا میرے لیے ناممکن تھا۔

"کیا یہ کام بھی ضروری تھا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا "تم نے خود ہی کہا تھا کہ یہاں سے فرار ہونا ناممکن ہے اور مجھے بھی ایسا ہی نظر آرہا ہے۔ ویسے بھی میں نے ابھی تک بھاگنے کی کوئی کوشش تو نہیں کی۔"

"ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ پکڑا گیا کوئی شخص کبھی بھاگنے کی کوشش ہی نہ کرے۔" بلال شیدی دانشورانہ لہجے میں بولا "ایک تو وہ صرف اس وقت کوشش نہیں کرتا جب وہ حد سے زیادہ خوف زدہ ہوتا ہے۔ خوف دور ہوتے ہی وہ قسمت آزمائی ضرور کرتا ہے۔ ورنہ وہ اس وقت کوشش نہیں کرتا جب کوشش ناممکن ہوتی ہے۔ یعنی اسے پتا ہوتا ہے کہ کوشش کا کوئی فائدہ نہیں۔ الٹا سختی زیادہ ہوگی، ہڈیاں ٹوٹیں گی۔"

وہ بغور میری طرف دیکھ کر تقریباً دوستانہ انداز میں مسکرایا "تم نے بھی ابھی تک کوشش نہیں کی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ تمہیں ہم سے محبت ہوگئی تھی بلکہ صرف اس لیے کہ تم کوشش کرنے کی پوزیشن میں ہی نہیں تھے لیکن جونہی تمہیں ذرا سا بھی موقع نظر آیا تم کوشش ضرور کروگے۔ اس لیے احتیاط اچھی چیز ہے۔"

وہ اپنی لگائی ہوئی بندشوں کو آزمائشی انداز میں جھٹکا دے کر دیکھنے کے بعد مطمئن ہوکر اٹھ کھڑا ہوا اور گہری سانس لے کر بولا "ہم تمہارے ساتھ انتہائی نرمی کا سلوک کررہے ہیں ورنہ یہاں قید خانہ بھی موجود ہے جس کی کوٹھریاں ہر طرف سے پانچ بائی پانچ فٹ کی ہیں۔ اس میں نہ تم سیدھے کھڑے ہوسکتے تھے اور نہ سیدھے لیٹ سکتے تھے۔ فرش پر خشک گھاس پھونس ہوتا ہے اور قیدی کی ایک ٹانگ دیوار کے ساتھ زنجیر سے بندھی رہتی ہے۔ اصولاً ہمیں تم کو انہی کوٹھریوں میں سے کسی میں ڈالنا چاہیے تھا لیکن اس وقت کوئی کوٹھری خالی نہیں ہے اور ہم ایک ایک کوٹھری میں دو دو آدمی رکھنا نہیں چاہتے۔"

جتنی دیر وہ بیٹھ کر میرے پیروں میں رسی باندھتا رہا، میری رگوں میں لہو خشک ہوتا رہا کیونکہ اس نے میری ڈھیلی ڈھالی شلوار کے پائنچے ذرا اوپر کردیے تھے لیکن غنیمت رہا کہ زیادہ اونچے نہیں کیے اور میری پنڈلی کے ساتھ بندھا ہوا چھوٹا سا خنجر اس کی نظر میں آنے سے محفوظ رہا۔ خنجر نیام میں ذرا اوپر اونچا بندھا ہوا تھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ اس تک ہاتھ پہنچانے یا اس سے کوئی کام لینے کا موقع میسر آتا تھا یا نہیں لیکن وہ بہرحال میرے لیے امید کی ایک موہوم سی کرن تھی۔ اس کرن کو بھی معدوم ہوتے دیکھنا میری مایوسی میں بھی اضافہ کرتا اور ان کے شکوک میں بھی۔

اس اثنا میں جان محمد کھانا لاکر چٹائی پر رکھنے لگا۔ وہ پانچوں افراد جو پجارو میں آئے تھے، چٹائی پر آبیٹھے۔ بلال شیدی نے مجھے اشارہ کیا "تم بھی ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاسکتے ہو۔"

یہ گویا اس کی طرف سے ایک اور عظیم رعایت یا اعزاز تھا جس سے وہ مجھے نواز رہا تھا۔ گرم گرم روٹیوں اور سالن کی خوشبو سے میرے پیٹ میں بل پڑرہے تھے۔ میں فوراً اٹھا اور ان کے درمیان جا بیٹھا۔

بلال شیدی گویا میری خوش فہمی دور کرتے ہوئے بولا "لیکن ہم تمہارے ہاتھ کھولنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔ ہم کھانا امن اور سکون سے کھانا چاہتے ہیں۔"

پھر اس نے گردن گھما کر چھماں کو مخاطب کیا "او چھماں! ادھر آ... ذرا اس قیدی کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلادے۔ کیا یاد کرے گا یہ بھی کہ کن رئیسوں سے پالا پڑا تھا جو قیدیوں کو بھی مہمانوں کی طرح رکھتے تھے۔ آگے تو پتا نہیں اس کی زندگی کا کیا

انجام ہونا ہے۔ فی الحال تو اس کو دو ایک دن ہنسی خوشی گزار لینے دیں۔"

چھماں چارپائی پر بیٹھی یوں ٹانگیں جُھلائے جارہی تھی جیسے رقص کرنے کے لیے بے قرار ہو۔ ساتھ ہی وہ اپنی چوڑیوں سے کھیلتے ہوئے گنگنائے بھی جارہی تھی۔ بلال کا حکم سُن کر سر اٹھاتے ہوئے شوخی آمیز بے نیازی سے بولی "میں نوکر نہیں ہوں تمہاری یا اس قیدی کی۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا تو میں صرف اپنے گھر والے کو کھلاؤں گی۔"

"گھر والا؟" بلال شیدی اور عیسیٰ خان نے ہم آہنگ ہو کر زور دار قہقہہ لگایا۔ بظاہر یہی لگتا تھا کہ ان دونوں میں اکثر اختلاف رائے پایا جاتا تھا لیکن درحقیقت ان میں بڑی ذہنی ہم آہنگی تھی۔

بلال شیدی استہزائیہ لہجے میں بولا "تیرے جیسی عورتوں کی زندگی میں گھر والا نہیں آیا کرتا۔ اگر تیرے جیسی عورتوں کو بھی گھر والا ملنے لگے تو شریف عورتوں کی تو کوئی قدر ہی نہ رہ جائے۔"

چھماں کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں اُداسی کی ایک لہر سی آکر گزر گئی لیکن بظاہر اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ چمک کر بولی "میرے ہی جیسی عورتوں کے پیچھے تو مرد لوگ دُم ہلاتے پھرتے ہیں۔ ہر کوئی میرا گھر والا بننے کے لیے تیار ہے مگر میں خود ہی ان جیسے مردوں میں سے کسی کو گھر والا بنانا نہیں چاہتی۔ مجھے پتا ہے' یہ سب غرض کے بندے ہیں۔ ان کی محبت کچی ہے۔ پانی کے بلبلے کی طرح۔"

"اچھا اب وہیں چارپائی پر بیٹھی بیٹھی' زیادہ عقلمندیاں نہ جھاڑ۔" بلال شیدی نے ذرا سختی سے اسے ڈانٹا "ادھر نیچے آ... اور اس قیدی کو کھانا کھلا۔ لگتا ہے' تیری یہ پٹر پٹر چلنے والی زبان کسی دن گُدی سے کھینچنی ہی پڑے گی۔"

"اونہہ!" چھماں نے منہ بنا کر سر جھٹکا لیکن فوراً اٹھ کر نیچے آگئی۔ میرے پاس بیٹھ کر پہلے اس نے بغور میرا جائزہ لیا پھر نوالے توڑ توڑ کر میرے منہ میں ڈالنے لگی۔ اس نے کوئی عطر بھی لگایا ہوا تھا جس کی تیز خوشبو ناک میں چڑھی جارہی تھی تاہم بُری نہیں لگ رہی تھی۔

کھانا کھانے کے دوران میں اداس اُداس سی نظروں سے ایک ٹک اسی کی طرف دیکھتا رہا حتیٰ کہ وہ مضطرب ہو کر پہلو بدلنے لگی۔ آخر وہ بولے بغیر نہ رہ سکی "یہ ایسی بیمار سی شکل بنا کر میری طرف کیوں دیکھے جارہے ہو تم؟"

عیسیٰ خان گویا محظوظ ہوتے ہوئے بولا "بے چارہ عاشق ہوگیا ہے تم پر۔ اس بے چارے کا بھی قصور نہیں' تم چیز ہی ایسی ہو۔"

میں غم ناک انداز میں مسکرا دیا جس طرح عموماً ناکام عاشق اپنی محبت کا مذاق اُڑائے جانے پر مسکراتے ہیں۔ چھماں نے ابھی تک یہ نہیں پوچھا تھا کہ میں کون تھا اور مجھے کس سلسلے میں پکڑا گیا تھا۔ وہاں موجود سبھی لوگوں کے لیے یہ گویا روزمرہ کے معمولات تھے۔

چھماں منہ بنا کر بولی "ایسے آدمی کا عشق میرے کس کام کا جس کے ہاتھ بھی بندھے ہوں اور پاؤں بھی۔ اوپر سے اس کی جیب بھی خالی ہو۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میری جیب خالی ہے خاتون؟" میں نے انتہائی شائستگی اور ملائمت سے پوچھا۔ مجبوری کی وجہ سے زبان اب بھی کمبخت ہی چل رہی تھی۔

عیسیٰ خان قہقہہ لگا کر بولا "اڑے... اس کی شکل کی معصومیت پر نہ جانا۔ بڑی خرانٹ عورت ہے۔ اُڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہے۔"

چھماں اس کی طرف ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی "کبھی کسی کو میرے بارے میں کوئی اچھی بات نہ بتانا۔"

"تم میں جو بھی اچھی باتیں ہیں وہ بتانے کے قابل نہیں ہیں۔" عیسیٰ خان مسکراتے ہوئے بولا۔

برتنوں کے درمیان پانی سے بھرے' شیشے کے دو جگ بھی رکھے تھے۔ چھماں ایک نظر ان کی طرف دیکھ کر عیسیٰ خان کو گھورتے ہوئے بولی "دل تو چاہتا ہے یہ جگ تمہارے اوپر اُلٹ دوں۔"

"ابھی نہیں۔ یہ کام صبح کے لیے اٹھا رکھو۔" عیسیٰ خان بے پروائی سے بولا۔

چھماں اسے گھور کر رہ گئی۔ چند لمحے کے لیے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ سب لوگ کھانا کھا کر پیچھے ہٹ چکے تھے۔ تین افراد اُٹھ کر واپس باہر بھی چلے گئے لیکن میں کھاتا ہی رہا۔ پہلے کی پکی ہوئی روٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ شاید رکھاں تندور میں روٹیاں لگا کر بھیجے جارہی تھی۔ جان محمد کمرے میں لائے جارہا تھا اور میں چٹ کیے جارہا تھا۔ روٹیاں زیادہ بھاری بھرکم نہیں تھیں۔

"خدا کی پناہ!" آخرکار چھماں ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی "میرا تو بازو شل ہوگیا تمہیں کھلاتے کھلاتے۔ تم انسان ہو یا دیو؟"

"تھا تو انسان ہی' حالات نے دیو بنا دیا ہے خاتون!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ایک بار پھر مہذبانہ اور شائستہ اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی کوشش کی "تقریباً دو دن سے بھوکا ہوں اور مسلسل ایسے حالات سے گزرا ہوں کہ سر سے پاؤں تک بھوک بن کر رہ گیا ہوں۔"

پھر میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی "ویسے بھی جب تم جیسی خاتون کھلا رہی ہو تو کس کافر کا بس کرنے کو جی چاہے گا۔"

بلال شیدی اور عیسیٰ خان ہنستے ہنستے دُہرے ہوگئے۔ میری سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ چھماں اپنا نوالے والا ہاتھ روکے الجھن آمیز انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھی گویا سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔

بلال شیدی بولا "خبردار چھماں! یہ مجنوں کا بچہ تم پر ڈورے

ڈالنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

چھماں نے بے پروائی سے ہاتھ ہلایا لیکن جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں ایک عجیب سی افسردگی در آئی تھی "ارے... چھماں پر کوئی کیا ڈورے ڈالے گا۔ ڈل چکے جتنے ڈورے ڈلنے تھے۔ اب تو چھماں بڑی چھُری چیز ہے۔ صرف اپنا فائدہ دیکھتی ہے لیلیٰ مجنوں والے چکر میں نہیں پڑتی۔"

زیادہ چالاک اور مکار لوگ اپنی مکاری پر معصومیت کا خول چڑھائے رکھتے ہیں۔ اناڑی قسم کے چالاک اپنی چالاکی کا اعلان کرتے رہتے ہیں۔ وہ درحقیقت ایک طرح کے سادہ لوح ہی ہوتے ہیں۔ اصل چالاک اور مکار لوگ تو آخری دم تک کسی کو پتا ہی نہیں چلنے دیتے کہ وہ چالاک اور مکار ہیں۔

آخرکار میں نے کھانا ختم کیا اور چھماں سے پانی کی فرمائش کی۔ وہ المونیم کا گلاس میرے منہ سے لگانے لگی تو میں نے کہا "اس سے کیا بنے گا۔ جگ ہی منہ سے لگا دو۔"

اس نے خفگی سے مجھے گھورا پھر دونوں ہاتھوں سے جگ اُٹھا کر میرے منہ سے لگا دیا۔ وہ غالباً چشمے کا پانی تھا اور گھڑے میں رہنے کی وجہ سے گویا "لذیذ" ہوگیا تھا۔ میں نے جگ خالی کر دیا۔ میرے کھانے پینے کا یہ انداز دیکھ کر بلال شیدی اور عیسیٰ خان کی آنکھیں بھی پُرخیال انداز میں سُکڑ گئی تھیں۔

میں بسیار خور نہیں تھا مگر بعض حالات میں بہت زیادہ بھی کھا سکتا تھا اور بعض حالات میں دو تین دن بغیر کچھ کھائے پیے بھی نکال سکتا تھا۔ اس وقت بھی حالات کا کچھ پتا نہیں تھا۔ میں گویا اونٹ کی طرح کچھ ذخیرہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

جگ خالی کر کے میں نے ایک آسودہ سی ڈکار لیتے ہوئے کہا "خاتون! سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس منہ سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔"

"اسی منہ سے جس سے اتنا کچھ کھایا ہے۔" چھماں نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"یہ منہ صرف کھانے ہی کے قابل ہے' تم جیسی مہربان خاتون کا شکریہ ادا کرنے کے قابل نہیں ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "کاش! میں تمہارے بارے میں زیادہ جان سکتا۔ میرا مطلب ہے ان لوگوں کی گفتگو سے جو اندازہ ہوا ہے اس سے کچھ زیادہ۔"

بلال شیدی کلاشنکوف پاس ہی رکھ کر ایک بار پھر چارپائی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بولا "غم زدہ کیوں ہوتے ہو میری جان! ہم تمہیں اس سے زیادہ بھی بتا دیتے ہیں۔ چھماں سے چھماں کے بارے میں کیا پوچھتے ہو۔ چھماں کے بارے میں پوچھنا ہے تو ہم سے پوچھو۔ یہ تو ایک سانس میں سو جھوٹ بول دے گی۔"

میں نے چھماں کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "نہیں۔ مجھے اس خاتون سے ایسی اُمید نہیں ہے۔" پھر میں نے بلال شیدی کی طرف دیکھا "لیکن خیر... چلو تم بتا دو۔"

"یہ ہمارے علاقے میں گھوم پھر کر گڑوی بجا کر گانے والی لڑکی تھی۔ جب تک اس کی ماں زندہ تھی اس کی کچھ حفاظت کرتی رہی لیکن ماں کے مرنے کے بعد یہ کچھ بے آسرا سی ہوگئی۔ اس کے قبیلے کے لوگ بھی اِدھر اُدھر بکھر گئے۔" بلال شیدی اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بتانے لگا "ہمارا علاقہ خاصا خطرناک ہے' تمہیں پتا ہی ہوگا۔ ویسے بھی لاوارث درخت کے پکے پھل دیکھ کر راہ چلتے لوگوں کی بھی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ اکیلی لڑکی کب تک اور کس طرح اپنے آپ کو بچاتی۔ شکل صورت بھی تم دیکھ رہے ہو۔ بُری نہیں ہے۔ ناک نقشہ ذرا بھی اچھا ہو تو نوجوانی میں اور بھی اچھا لگتا ہے۔ یہ کٹی پتنگ کی طرح اِدھر اُدھر ڈولتی پھرتی تھی۔ کبھی کوئی دبوچ کر اپنے ڈیرے پر لے جاتا تھا' کبھی کوئی ڈرا دھمکا کر اپنے مکان میں بند کر لیتا تھا۔"

چھماں نے مجروح سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن بلال شیدی نے بات جاری رکھی "پھر اسے تھوڑی سی عقل آگئی۔ دھکے کھا کر' ٹھوکریں کھا کر انسان بہت کچھ سیکھتا ہے۔ اس نے سوچا' اگر یہی کچھ ہونا ہے تو ذرا طریقے سلیقے سے ہونا چاہیے۔ یہ کیا کہ رضا رغبت بھی شامل نہیں۔ ملتا ملاتا بھی کچھ نہیں اور عزت بھی کوئی نہیں۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو ذرا بنایا سنوارا' تھوڑا حوصلہ اور جرأت پیدا کی۔ اپنے دو چار حمایتی اور ضرورت کے وقت کام آنے والے تلاش کیے اور اپنی مرضی سے' سوچ سمجھ کر اس لائن پر چلنا شروع کیا۔"

بلال شیدی اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا مگر وہ سر جھکائے اپنی دو چُٹیوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کا چہرہ یکدم سپاٹ سا ہوگیا تھا مگر اب گویا اس کے چہرے پر زیادہ کہانیاں تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بلال شیدی گہری سانس لے کر بولا "اب حالات کافی مختلف ہیں۔ اب چھوٹے موٹے' للو پنجو قسم کے لوگ اس کی مرضی کے بغیر اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔ کوئی ڈھنگ کا اور ذرا سنجیدہ آدمی مل جائے تو کافی کافی دن ایک ہی کے ساتھ بھی رہ لیتی ہے۔ اس کا کوئی گھربار نہیں ہے لیکن سُنا ہے' اب اس کے پاس اچھا خاصا روپیہ پیسہ ہے جو پتا نہیں اس نے کہاں چھپا کر رکھا ہے۔ اب بھی اس کے شب و روز اکثر خطرناک ماحول میں خطرناک لوگوں میں ہی گزرتے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے' کبھی کوئی اس کے روپے پیسے کے چکر میں اسے قتل ہی نہ کر دے۔"

پھر اس نے مسکرا کر چھماں کی طرف دیکھا "کیوں چھماں! کہاں چُھپا کر رکھی ہے اپنی دولت؟ اپنے اس پُرانے دوست کو تو بتا دے۔ تجھے پتا ہے' ہم تو تجھے لوٹنے سے رہے۔"

چُٹیوں سے کھیلتے کھیلتے اس نے سر اُٹھایا۔ اس کی ہرنی جیسی آنکھوں میں افسردگی تیر رہی تھی۔ دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولی "کہاں ہے میرے پاس دولت؟ میں سب کچھ بیچ کر بھی خالی ہاتھ کی خالی ہاتھ ہوں۔ دولت اب بھی دولت والوں ہی کے پاس ہے۔ مجھ

جیسوں کے صرف افسانے ہیں' کہانیاں ہیں۔ مجھے تو اگر کسی نے ایک ہاتھ سے کچھ دیا تو دوسرے سے لوٹ لیا۔ یا اس نے نہیں تو کسی اور نے لوٹ لیا۔ مجھے تو کبھی کبھی یوں لگتا ہے' یہ پوری دنیا ہی لٹیروں سے بھری پڑی ہے۔ بس واردات کے طریقے الگ الگ ہیں۔ کوئی کسی طرح لوٹتا ہے' کوئی کسی طرح۔"

اس نے سر جھکالیا۔ بلال شیدی میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا "دیکھا' کیسی عقل کی باتیں کرتی ہے۔ یہ سُریلی بھی بہت تھی اور اسے ڈانس بھی آتا تھا۔ اگر اسے بھی ٹی وی پر چانس مل جاتا تو یہ ریشماں کے بعد دوسری بلبلِ صحرا ثابت ہوتی۔ فرق صرف یہ ہے کہ ریشماں کو شریفانہ زندگی گزارنے' ٹی وی پر گانے اور گانے پر محنت کرنے کا موقع مل گیا جبکہ چھیماں بے چاری کو حالات نے ایسا کوئی موقع نہیں دیا۔ یہ تو شاید فلموں میں بھی چل جاتی کیونکہ بنیادی طور پر اسے ڈانس آتا ہے اور اس میں کام بڑی جلدی سیکھنے کی صلاحیت موجود ہے مگر افسوس...! شہر والوں کو پتا ہی نہیں چلا کہ کیسی باصلاحیت فنکارہ یہاں جنگلوں بیابانوں میں بے قدروں کے ہاتھوں میں رُل رُل کے پتا نہیں کس طرف جارہی ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "لیکن تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اس کا ریشماں سے کوئی تعلق ہے۔ اس کا ریشماں سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں۔"

بلال شیدی نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر گہری سانس لی اور اپنی کلاشنکوف کی نال پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "بس یہ ہے چھیماں کی کہانی۔"

"بلال شیدی کی زبانی" میں نے لقمہ دیا۔ اس دوران جان محمد ایک ٹرے میں قہوے کے پیالے رکھ کر لے آیا تھا۔ گرم گرم قہوے کا دور چلنے لگا۔ مجھے قہوہ بھی چھیماں پلا رہی تھی۔ وہ اپنے پیالے سے ایک چسکی لیتی پھر میرا پیالہ میرے ہونٹوں سے لگاتی۔ میں نے محسوس کیا' اس کے چہرے پر پھیلے ہوئے رنگ پھیکے پڑگئے تھے۔

بلال شیدی نے قہوہ ختم کرکے پیالا چٹائی پر تقریباً پھینکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور مسکراکر بولا "منہ کیوں لٹک گیا تیرا؟ اداس ہوگئی کیا؟"

"میری کہانی سُنانی بہت ضروری تھی کیا؟" وہ افسردہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "خواہ مخواہ کی چھیڑ چھاڑ سے سوئے ہوئے زخم بھی تکلیف دینے لگتے ہیں۔ تم جنگلیوں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ ہم جیسی عورتوں کا بھی ایک بھرم ہوتا ہے اور تم تو کچھ ایسے جنگلی بھی نہیں ہو....." وہ جیسے کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

بلال شیدی نے اپنی بڑی سی پگڑی اُتارلی۔ اس کے بال اس کے کندھوں تک آگرے۔ اس کے سر کے بال بھی اس کی داڑھی مونچھوں کی طرح جھاڑ جھنکاڑ تھے۔ ان میں انگلیاں پھیرتے ہوئے وہ پُرخیال انداز میں چھیماں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہاں... یہ تو میں بھول ہی گیا تھا۔ تم جیسی عورتوں کا بھی ایک بھرم ہوتا ہے۔ اور میرا تو خیال ہے تم جیسی عورتوں کی عزت بھی ہونی چاہیے۔ چلو ایسا کرتے ہیں' میں تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ تم بھی کیا یاد کرو گی۔ معاف کردو مجھے۔"

اس نے دور ہی سے ہاتھ جوڑ دیے۔ چھیماں ہولے سے مسکرادی لیکن اب اس کی مسکراہٹ میں وہ پہلی سی شگفتگی نہیں تھی۔

بلال شیدی بولا "پیٹ بھر کر کھانا کھالیا ہے اور قہوہ بھی پی لیا ہے۔ قسم سے' سرور سا طاری ہوگیا ہے لیکن بس ایک چیز کی کمی ہے۔"

"کس چیز کی؟" چھیماں نے گویا جانتے بوجھتے بھی دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"تمہارے گانے کی۔ اب تم اپنی سُریلی سی آواز میں کوئی سُریلا سا گانا سنادو۔" بلال شیدی نے فرمائش کی۔

"ہاں بھئی" عیسیٰ خان نے بھی اس کی تائید کی "اس مرتبہ تم بہت دنوں بعد ہاتھ آئی ہو۔ گانا بھی ضرور ہونا چاہیے۔"

پھر اس نے دروازے کی طرف منہ کرتے ہوئے ہانک لگائی "رادھن! بخشل... تم دونوں اپنی سارنگی اور بنجو لے کر آؤ۔"

"ابھی لایا خان!" رادھن کی آواز آئی۔

چند لمحے بعد وہ دونوں ایک ایک ساز اٹھائے کمرے میں آگئے اور چٹائی پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئے۔ چھیماں گویا گردوپیش سے بے نیاز سر جھکائے دو زانو بیٹھی تھی۔ پھر ہلکی سی گنگناہٹ کے ساتھ اس نے سر اُٹھایا اور دوسرے ہی لمحے سکوتِ شب کو چیرتی ہوئی اس کی پُرسوز آواز سماعتوں کے سینے میں اُتر گئی۔

ہائے اوئے ربّا نیئوں لگدا دل میرا
سجناں باج ہو یا ہیرا.....!

یہ ان لوگوں کی زبان نہیں تھی مگر جب دل مفہوم سمجھنے کے لیے آمادہ ہو تو زبان کوئی مسئلہ نہیں رہتی۔ دوسرے لوگ بھی سر جھکائے کمرے میں آن بیٹھے تھے اور گم صم تھے۔ سارنگی تو نغمے کا ساتھ دے رہی تھی مگر بنجو جیسے ساز کا اس نغمے کے ساتھ کوئی میل نہیں تھا لیکن اس وقت وہ بھی بھلا لگ رہا تھا۔ جب دل میں گداز ہو تو بے میل چیزیں بھی اچھی لگتی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ چھیماں کی آواز دلوں پر لگے بے حسی کے قفل کھولنا جانتی تھی۔ ہم سب ہی شاید اس آواز کا دامن تھام کر اپنی اپنی دنیاؤں میں کہیں بہت دور کھو گئے تھے' اس لیے رات کے سناٹے میں باہر کسی گاڑی کے انجن کی آواز نہیں سُن سکے تھے۔

یکدم ہی ہارن کی کریہہ آواز سُن کر گویا سب کو جھٹکا لگا۔ سب

کے ہاتھوں سے خوابوں کی کمند چھوٹ گئی اور سبھی گویا لبِ بام یار سے نیچے آرہے۔ ساز ہاتھوں سے چھوٹ گئے اور ان کی جگہ کلاشنکوفیں آگئیں۔ کھردرے چہروں پر درشتیں لوٹ آئیں۔ وہ سب کلاشنکوفیں اٹھائے باہر کو لپکے۔ گاڑی کا ہارن مسلسل چیخ رہا تھا۔ وہ آواز مجھے بہت مکروہ لگ رہی تھی۔ اس نے ایک پُرسوز آواز کا گلا گھونٹا تھا' ایک ایسے سادہ مگر پرکار نغمے کو خاموشی میں تبدیل کردیا تھا جو پتھر دلوں میں گداز کی رمق تلاش کررہا تھا۔

ان سب کو گویا میری کوئی پروا نہیں رہی تھی۔ وہ مجھے چھیماں کے پاس ہی بیٹھا چھوڑ کر باہر دوڑے جارہے تھے۔ بلال شیدی نے البتہ جاتے جاتے میری طرف اشارہ کرکے چھیماں کو ہدایت کی "ذرا اس کا خیال رکھنا۔"

اس طویل و عریض ہال نما کمرے میں صرف میں اور چھیماں رہ گئے تو میں نے فوراً اس سے پوچھا "تم نے زندگی میں کوئی کام اُدھار پر بھی کیا ہے؟"

"سبھی کچھ اُدھار پر کیا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "نقد تو مجھے صرف رسوائیاں ملی ہیں۔"

الفاظ ذرا مختلف تھے لیکن بات اس نے یہی کہی تھی۔ اس کے منہ سے اتنی بڑی بات سُن کر مجھے دھچکا سا لگا لیکن میں نے اپنے مطلب کی بات پر رہتے ہوئے جلدی سے کہا "اگر تم میرے ہاتھ کھول دو... اور میں زندہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا تو جلد ہی کسی نہ کسی طرح تمہیں تلاش کرکے منہ مانگی رقم دوں گا۔"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"ہاں بات تو رونے کی ہے۔" وہ یکدم سنجیدہ ہوتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اپنے اور تمہارے انجام پر رونے کی۔"

اس کے لہجے میں ہلکی سی سردمہری آگئی "اگر میں تمہاری بندشیں کھول بھی دوں تب بھی تم نے مجھے کچھ دینے کے راستے میں بڑی اونچی شرط کا پہاڑ کھڑا کردیا ہے۔ یعنی...." اگر میں زندہ یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہوگیا۔" یہی تو سب سے مشکل کام ہے۔"

میں خاموش رہا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "فی الحال تو شاید تم اکیلے موت کے منہ میں جارہے ہو۔ تمہارے ہاتھ کھولنے کا مجھے یہ فائدہ ہوگا کہ ساتھ میں بھی مروں گی اور وہ بھی بہت ہی ذلیل طریقے سے۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو؟"

"میں ایسے کہہ سکتی ہوں کہ میری زندگی ان لوگوں میں گزری ہے۔ وہ میری ایک ٹانگ ایک جیپ سے باندھ دیں گے اور دوسری ٹانگ دوسری جیپ سے۔ پھر دونوں جیپوں کو اُلٹ سمتوں میں چلادیں گے۔ تمہیں اس قیمت پر میری مدد قبول ہے؟"

میں نے نفی میں سرہلادیا۔ وہ بولی "بچ تم پھر بھی نہیں سکو گے۔ اوّل تو اس مکان سے ہی تمہارا نکلنا مشکل ہے۔ اگر نکل بھی گئے تو انہیں فوراً ہی پتا چل جائے گا۔ بغیر سواری کے تم ذرا دور بھی نہیں جاسکو گے اور اس علاقے میں وہ تمہیں چند منٹ میں ڈھونڈ نکالیں گے۔ اس لیے چپ کرکے بیٹھے رہو اور میری مدد کا نہیں' اللہ کی مدد کا انتظار کرو۔"

"اللہ کی مدد بھی کسی نہ کسی روپ میں ہی آتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"باہر ہارن خاموش ہوچکا تھا اور چوبی گیٹ کی چرچراہٹ بتارہی تھی کہ اسے کسی کے لیے کھولا جارہا تھا۔ میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "اچھا.... ہم دروازے میں کھڑے ہوکر یہ تو دیکھ سکتے ہیں کہ کون آیا ہے۔"

"ہاں' میرا خیال ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔" وہ میرے پیروں میں بندھی رسی کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "یہ انہوں نے اسی لیے باندھی ہے کہ تمہاری طرف سے دھیان ہٹا بھی رہے تو کوئی فرق نہ پڑے۔ آدمی کے ہاتھ پیچھے بندھے ہوں اور وہ دوڑ بھی نہ سکتا ہو تو اس میں اور مینڈک میں کوئی فرق نہیں رہتا۔"

ہم دونوں دروازے پر آکھڑے ہوئے۔ احاطے میں اب دو آدمیوں کے ہاتھوں میں پیٹرومیکس لیمپ بھی موجود تھے جن کی روشنی سے احاطے کا بڑا حصہ منور ہوگیا تھا۔ چوبی گیٹ کھولا جاچکا تھا اور گہرے رنگ کی ایک پجارو لہراتی ہوئی اندر آرہی تھی۔ پجارو گولیوں سے چھلنی تھی اور اس کے سارے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ٹائر نہ جانے کیسے بچ گئے تھے جو وہ یہاں تک پہنچ گئی تھی۔

پجارو کے اندر آتے ہی گیٹ فوراً بند کرکے مقفل کردیا گیا۔ پجارو ہم سے ذرا دور' برآمدے کے قریب ہی آرکی تھی۔ بلال شیدی' عیسیٰ خان اور دوسرے دو آدمی اس کے ساتھ دوڑتے ہوئے آئے۔ انہی میں سے کسی نے اس کا دروازہ کھولا اور رودینے کے انداز میں کسی کی آواز اُبھری "یہ کیا ہوا نواب زادی صاحبہ....؟"

ڈرائیونگ سیٹ پر مجھے جو چہرہ نظر آیا اس کی رنگت میں گویا چاندنی گندھی ہوئی تھی۔ اس چہرے کے گرد سیاہ اسکارف لپٹا ہوا تھا۔ اسٹیئرنگ وھیل پر ٹکے ہوئے اس کے ہاتھوں پر بھی سیاہ دستانے تھے۔ پیٹرومیکس لیمپ کی روشنی براہِ راست چہرے پر پڑی تو میں نے دیکھا' اس پر خوف' دہشت' تھکن اور درماندگی کے سائے تھے مگر انہیں چھپانے کی کوشش کی جارہی تھی۔

دروازہ کھلتے ہی وہ عورت اسٹیئرنگ وھیل چھوڑ کر پجارو سے اُتر پڑی لیکن پھر دروازے ہی کو تھامے سر جھکائے چند لمحے یوں ہانپتی رہی جیسے پجارو ڈرائیو کرتی ہوئی نہیں بلکہ دوڑتی ہوئی وہاں تک پہنچی ہو۔

ایک لمحے کے لیے منظر گویا ساکت ہوگیا۔ سب اس کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے مگر کسی میں بھی جیسے اسے چھونے' اسے سہارا دینے یا اس سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں تھی۔ پھر دو

بھی تقریباً لڑھکتے ہوئے پجارو سے باہر آگئے۔ آٹھ نو سال کا ایک لڑکا تھا اور چھ سات سال کی ایک لڑکی۔ دونوں بے پناہ خوب صورت تھے لیکن اس وقت حواس باختہ تھے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اردگرد کھڑے کلاشنکوف برداروں کو دیکھتے ہوئے وہ اس عورت سے لپٹ گئے جو یقیناً ان کی ماں تھی لیکن ایک نوعمر لڑکی نظر آتی تھی۔ عرب عورتوں کی طرح اس نے برقع نما ایک سیاہ، خوب صورت، ریشمی گاؤن پہنا ہوا تھا۔ پیروں میں ہلکے پھلکے، خوب صورت جوتے تھے جو غیر ملکی معلوم ہوتے تھے۔

"یہ کون ہے؟" میں نے گویا اپنے آپ سے زیرِلب پوچھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ چھماں میرے پاس کھڑی تھی۔

"یہ نواب زادی نگینہ ہے۔" وہ سرگوشی میں بولی "نواب سرور صاحب کی بھانجی۔ یہ کسی قبائلی سردار زادے کو بیاہی ہوئی ہے۔ نواب حشام اس کا نام ہے۔ کشمور کے قریب ان کی بہت بڑی جاگیریں ہیں۔ آبائی حویلی بھی وہیں ہے۔"

پھر وہ اُلجھن آمیز سے انداز میں بولی "لیکن یہ اور اس کا میاں تو زیادہ تر باہر رہتے ہیں۔ یہ یہاں کہاں نظر آرہی ہے۔ بچے بھی ساتھ ہیں!"

میرے پاس اس سوال کا تو کیا، کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں خاموشی سے باہر کا منظر دیکھتا رہا۔ اس وقت چھماں کے سوا کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ میں نے بھاگ نکلنے کے امکانات پر غور کیا۔ میں اگر کسی طرف سے مکان کی بیرونی دیوار پر چڑھنے میں کامیاب ہوجاتا تو باہر کود کر بھاگ سکتا تھا۔

لیکن ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے میں مجبور ہوکر رہ گیا تھا۔ دیوار پر چڑھنا تو درکنار، میں تیز تیز چل بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے علاوہ میں نے مکان میں داخل ہوتے وقت چھت پر بھی دو تین کلاشنکوف برداروں کی جھلک دیکھی تھی جو یقیناً اوپر سے گردوپیش پر نظر رکھتے تھے۔ چھت سے انہیں چاروں طرف کھلے میدان کا چپہ چپہ صاف دکھائی دیتا ہوگا۔ چھماں سے مدد ملنے کی مجھے کوئی توقع نہیں رہی تھی۔ وہ اس غلام کی طرح تھی جو خوابوں میں بھی اپنے آقاؤں سے دہشت زدہ رہتا ہے اور ان سے غداری کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔

چند گہری گہری سانسیں لینے کے بعد نواب زادی نگینہ کے اوسان بحال ہوتے محسوس ہوئے۔ اپنے لوگوں کے حلقۂ حفاظت میں پہنچ جانے کے بعد گویا اس کی خود اعتمادی لوٹ آئی۔ وہ تحکمانہ لہجے میں بولی "نواب صاحب کو گاڑی سے نکالو لیکن بہت احتیاط سے۔ پھولوں کی طرح اُٹھانا۔ وہ بہت زخمی ہیں۔"

بلال شیدی، عیسیٰ خان اور دوسرے دو آدمیوں نے اپنی کلاشنکوفیں دوسروں کو تھمائیں اور پجارو میں گھس گئے۔ چند لمحے بعد ایک شخص کو نہایت ہی احتیاط اور آہستگی سے پجارو سے نکالا جانے لگا۔ وہ بے ہوش تھا بلکہ صحیح معنوں میں تو وہ ایک لاش ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے کپڑے خون میں تر تھے۔

وہ لوگ اسے جس احتیاط اور آہستگی سے پجارو سے نکال کر ہاتھوں ہی ہاتھوں پہ اٹھائے کمرے میں لانے لگے اس طرح پیرا میڈیکل اسٹاف کی ایک مکمل ٹیم بھی اسے اسٹریچر پر ڈال کر نہیں لاسکتی تھی۔

چھماں بڑبڑائی "یہ ہے نواب زادی نگینہ کا شوہر نواب حشام۔ لگتا ہے ان پر راستے میں کہیں جاجی قبیلے والوں نے حملہ کیا ہے۔ جاجیوں کے ساتھ آج کل ان لوگوں کی جنگ چل رہی ہے۔"

میں ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے لفظ "جنگ" استعمال کیا تھا۔ مجھے بارہا ایسے مناظر دیکھنے اور ایسی باتیں سننے کا اتفاق ہوا تھا جب میں حیرت سے سوچنے پر مجبور ہوگیا تھا کہ آخر اس ایک ملک..... جو زیادہ بڑا بھی نہیں تھا، کتنی چھوٹی چھوٹی بادشاہتیں تھیں جن کے اپنے اپنے طور طریقے، اپنی اپنی حدود و قیود، اپنے اپنے قوانین اور اپنے اپنے مزاج تھے۔ وہ اپنی جنگیں بھی خود ہی لڑتے رہتے تھے۔ انسانی خون پانی کی طرح بہتا رہتا تھا۔ ان کے معاملات میں ملکی قوانین یا قومی مفادات کا گویا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اگر تھا بھی تو محض رسمی طور پر خانہ پُری کے لیے۔

وہ لوگ نواب حشام کو اُٹھائے اسی کمرے میں لے آئے۔ شاید اس لیے کہ وہی سامنے پڑتا تھا اور وہی سب سے بڑا معلوم ہوتا تھا۔ میں اور چھماں ایک طرف ہٹ گئے۔ بڑی سی چارپائی پر یوں تو صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا، گاؤ تکیے بھی موجود تھے لیکن جان محمد اور رکھاں نے حیرت انگیز پھرتی سے ایک اور صاف چادر لاکر بستر پر بچھائی۔

نواب حشام کو بستر پر اوندھا لٹادیا گیا۔ اس کی وجہ سمجھنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کے جسم میں دو گولیاں پیوست تھیں اور دونوں ہی اسے پشت کی طرف سے لگی تھیں۔ ایک ران میں اور ایک کمر میں۔ خون ابھی تک رس رہا تھا۔ جلد ہی صاف ستھرے بستر پر سُرخی پھیلنے لگی۔

نواب حشام کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی مگر وہ نوجوان نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ سانس کی آمدورفت بہت مدّھم معلوم ہوتی تھی۔ اس کی رنگت میں موت کی زردی آن رچی تھی۔ نہ جانے کتنا خون بہہ چکا تھا اور جو باقی تھا وہ بھی گویا شریانوں کے جال سے نکلا جارہا تھا۔

نواب زادی اندر آکر لکڑی کی ایک بے ہنگم کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔ دونوں بچے دوسری کرسی پر سکڑ سمٹ کر اکٹھے بیٹھ گئے۔ وہ دونوں گویا ایک دوسرے سے اور ماں سے ذرا بھی دور ہونا نہیں چاہتے تھے۔ ان کی آنکھیں ابھی تک پھیلی ہوئی تھیں اور دہشت کے باعث وہ گویا بولنا بھول گئے تھے۔

بلال شیدی اور عیسیٰ خان سب سے آگے، ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ آخرکار عیسیٰ خان نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور نظریں نیچی رکھتے ہوئے بولا "یہ سب کیا ہوا نواب زادی صاحبہ؟ کیا جاجیوں نے حملہ کیا تھا؟"

"نہیں" نواب زادی نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔ وہ اب سنبھل چکی تھی۔ اس کے چہرے پر وہی تمکنت، وہی نخوت لوٹ آئی تھی جو اس طبقے کے اکثر لوگوں کی شخصیت کا جزو ہوتی ہے۔

ایک لمحے کے توقف سے اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں ہی بتانا شروع کیا "ہم آج کل زمینوں پر اپنی حویلی میں ہی تھے جب ہمیں بڑے نواب صاحب کا پیغام ملا کہ جاجیوں کی طرف سے حشام کی جان کو خطرہ ہے اس لیے ہم سب کچھ دن کے لیے بڑی حویلی میں ہی آجائیں۔"

بڑے نواب سے اس کی مراد یقیناً اپنے ماموں یعنی نواب سرور تھے جو قبیلے کے سردار، سب سے طاقتور اور ایک طرح کی مرکزی شخصیت تھے۔ خاندان کی سب چھوٹی چھوٹی شاخیں خطرے کے وقت انہی کے زیرِ سایہ تحفظ محسوس کرتی ہوں گی۔ بڑی حویلی سے مراد یقیناً ان کی وہ آبائی حویلی ہوگی جو بلوچستان کے ایک دور افتادہ علاقے میں پہاڑوں کے درمیان کہیں واقع تھی اور جہاں سے درحقیقت قبیلے کا نظام چلایا جاتا تھا۔

"حشام بہت احتیاط کررہے تھے۔ مسلح محافظ ہر وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ بڑے نواب صاحب کا پیغام ملنے کے بعد بھی ہمیں روانہ ہونے میں کچھ دیر ہوگئی۔ کئی دن لگ گئے..." نواب زادی اب بالکل دھیمے لہجے میں بول رہی تھی "حشام نے انہی دنوں اپنے کافی اثاثے سونے میں تبدیل کرائے تھے اور کچھ زمین بھی بیچی تھی۔ کسی وجہ سے وہ نقد رقم کے بجائے کچھ سونا لے کر چلنا چاہتے تھے۔ پہلے ہم نے سوچا، اُلٹا سفر کرکے ارائیں روڈ جاکر وہاں سے کوئی عام فلائٹ پکڑیں یا کوئی سیسنا وغیرہ چارٹر کرالیں لیکن سفر اس طرح بھی بہت لمبا پڑ رہا تھا۔ خطرہ اس میں بھی زیادہ تھا، اس لیے ہم بائی روڈ چل پڑے لیکن...."

اس نے گہری سانس لے کر کرسی کے پُشتے سے سر ٹکالیا۔ اس کی نظریں اپنے شوہر پر تھیں لیکن اس کے چہرے پر وہ ہسٹریائی تلاطم نہیں تھا جو ان حالات میں کسی عام عورت کے چہرے پر ہوسکتا تھا۔

"لیکن کیا... نواب زادی صاحبہ؟" بلال شیدی نے بے تابی سے پوچھا۔ نظریں اس کی بھی نیچی تھیں۔

"شاید ڈاکوؤں کو مخبری ہوگئی تھی۔ راستے میں انہوں نے ہم پر حملہ کردیا۔ چھ گارڈز ہمارے ساتھ تھے۔ سب مرگئے، ڈرائیور بھی مرگیا۔ حشام نے بھی مقابلے کی کوشش کی۔ دو گولیاں انہیں بھی لگیں۔ پتا نہیں میں اور بچے کس طرح بچ گئے۔ ہم سیٹوں کے نیچے چھپ گئے تھے لیکن پھر بھی کسی بھی لمحے کوئی گولی ہمیں لگ سکتی تھی۔" اس وقت کو یاد کرتے ہوئے اس نے خفیف سی جھرجھری لی۔ کمرے میں بوجھل سکوت چھاگیا۔ کسی کے سانس لینے کی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نواب زادی بولی "شکر ہے پجارو اسٹارٹ رہی اور کوئی ٹائر برسٹ نہیں ہوا۔ میں نے ڈرائیور کی لاش کو باہر دھکا دیا اور اندھا دُھند گاڑی وہاں سے بھگائی۔ میں ڈاکوؤں کے نرغے سے تو نکل گئی لیکن راستہ بھول بیٹھی۔ بہرحال میں اندھا دُھند گاڑی بھگاتی رہی۔ سوچ رہی تھی کہیں نہ کہیں تو پہنچوں گی۔ پھر پیٹرول ختم ہونے لگا، ریزرو میں رہنے والا ٹینک بھی میں استعمال کرچکی تھی۔ پھر میں نے رک کر اِدھر اُدھر ذرا غور سے دیکھا تو علاقہ کچھ جانا پہچانا محسوس ہوا اور مجھے یاد آیا کہ یہاں کہیں قریب ہی اپنا ایک ڈیرا موجود ہے۔ جہاں تک مجھے یاد تھا، اس حساب سے چلتی رہی اور آخرکار یہاں پہنچ گئی۔ مجھے اُمید تھی یہاں اپنے کافی لوگ ہوں گے۔" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"شکر ہے... نواب زادی صاحبہ! آپ کی اور بچوں کی جان بچ گئی۔" بلال شیدی مرتعش سے لہجے میں بولا "اللہ سائیں کرم کرے گا۔ نواب صاحب کی جان بھی بچ جائے گی۔ ان کی حالت ایسی تو نہیں ہے کہ انہیں گاڑی میں ڈال کر کسی قریبی شہر تک لے جایا جاسکے۔ اگر ہم کسی آدمی کو بھیج کر کہیں سے ایمبولینس اور ڈاکٹر وغیرہ بلوائیں تو اس میں بھی بہت دیر لگ جائے گی۔ کل دوپہر تک کا وقت ہوجائے گا پھر جاکر شاید یہ کسی اسپتال پہنچ سکیں اور وہاں بھی معلوم نہیں میجر آپریشن کا بندوبست ہو یا نہیں..."

وہ کپڑا ذرا ہٹا کر نواب حشام کے زخموں کا بڑی سنجیدگی اور متانت سے معائنہ کرنے لگا پھر قدرے مایوسی سے سرہلاتے ہوئے بولا "گولیاں گہرائی میں اُتری ہوئی ہیں۔ میجر آپریشن کا معاملہ ہے خون کی بھی ضرورت ہوگی۔ گولیاں جسم سے نکل جائیں تو اچھا ہے کیونکہ ان کی وجہ سے جسم میں انفیکشن پھیلنا شروع ہوچکی ہے۔"

اس کا اس طرح معائنہ کرنا اور رائے دینا مجھے ذرا حیران کن لگا۔ اس سے زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب میں نے نواب زادی کو پُرسکون لہجے میں کہتے سُنا "بلال! سچی بات یہ ہے کہ مجھے حشام کی زندگی کی زیادہ اُمید نہیں ہے۔ ہم چاہے ان کو گاڑی میں لے کر جائیں، چاہے کسی شہر سے ان کے لیے ایمبولینس یہاں منگوائیں، ہر طریقے میں ان کی زندگی کے لیے ایک ہی جتنا خطرہ ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ تم یہیں ان کے لیے جو کچھ کرسکتے ہو، کرو۔"

"یہیں؟" بلال کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں "یہاں کیا ہوسکتا ہے نواب زادی صاحبہ؟ یہاں تو ایک صاف پٹی، ایک صاف قینچی تک موجود نہیں ہے۔ نواب صاحب کو میجر آپریشن کی ضرورت ہے۔ مکمل آپریشن تھیٹر، اسٹرلائزڈ آلات وغیرہ اور خون

لگانے کا بندوبست۔ یہ سب ہونا چاہیے۔"

"لیکن یہ سب میسر نہیں ہے اور ان تک پہنچتے پہنچتے حشام ویسے بھی مرجائیں گے۔ حقیقت پسند بن کر سوچو۔" میں اس عورت کے اپنے شوہر کے بارے میں اس زبردست، حقیقت پسندانہ اندازِ گفتگو پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "لہٰذا یہیں اپنی سی کوشش کرو۔ میں نے تو ان کی طرف سے صبر کرہی لیا ہے۔ اب اگر وہ کسی معجزے کے تحت بچ جاتے ہیں تو یہ میرے لیے قدرت کا ایک تحفہ ہی ہوگا۔"

اس کے لہجے میں ایک مخصوص ضد سی آگئی "تم کچھ نہ کچھ ضرور کرو۔ آخر تم میڈیکل اسٹوڈنٹ رہے ہو۔"

میڈیکل اسٹوڈنٹ؟ مجھے خفیف سا جھٹکا لگا۔ میں نے جھاڑ جھنکاڑ داڑھی مونچھوں میں چھپے اس کھردرے، سیاہ فام چہرے کو دیکھا۔ بظاہر اس سراپا کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ تعلیم اسے چھو کر بھی گزری ہوگی۔

اس کا سر جھک گیا، چہرے پر کچھ ایسے تاثرات پھیل گئے جیسے اس تذکرے پر وہ شرمندہ ہوگیا ہو، جیسے بھرے مجمع میں اس کے کسی عیب کا تذکرہ کردیا گیا ہو۔ اس سے ایک بات یہ بھی ظاہر تھی کہ نواب زادی اسے اچھی طرح جانتی تھی۔

وہ دھیمے لہجے میں بولا "میں نے فورتھ ایئر کلیئر نہیں کیا تھا نواب زادی صاحبہ! آپریشن تھیٹر میں مجھے صرف چار چھ مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔ اگر میں کلیئر کر بھی لیتا تب بھی سرجن تھوڑا ہی بن جاتا۔ اور بغیر آلات کے تو سرجن بھی کچھ نہیں کرسکتا۔"

"میں نے کہا نا... جو تمہارے بس میں ہے وہ کر ڈالو۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہوگئی تو میں کوئی شکوہ نہیں کروں گی۔ میں تو ایک طرح سے صبر ہی کرچکی ہوں۔" نواب زادی نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی ضرور تھی لیکن نمی نہیں تھی۔ وہ بھی شاید اپنے علاقے کی کوئی سنگلاخ چٹان ہی تھی۔

بلال خاموش تھا۔ نواب زادی بولی "تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ انفیکشن پھیلنا شروع ہوچکی ہے۔"

"جی ہاں۔ نواب صاحب کا جسم بخار سے تپ رہا ہے۔" بلال بولا۔

"گولیاں جسم سے نکل جائیں تو شاید انفیکشن پھیلنے کا عمل ذرا سست ہوجائے۔ میں تمہیں حکم دیتی ہوں کہ کوشش کرکے دیکھو۔" نواب زادی کے لہجے میں واقعی تحکم آگیا۔

"غلط سرجری اور زخموں سے چھیڑ چھاڑ کی انفیکشن بھی اتنی ہی خطرناک ہوگی۔" بلال نے گویا بے بسی سے خبردار کیا۔

"ان کی زندگی کا معاملہ تو اب ہر حال میں جوا ہی ہے۔ ہم یہ جوا کھیل کر دیکھ لیتے ہیں۔" نواب زادی فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"اگر آپ کا حکم اسی طرح ہے تو کوشش کرکے دیکھ لیتے ہیں۔" بلال نے ہتھیار ڈال دیے پھر آواز دی "رکھاں! کسی صاف برتن میں بہت سا پانی اچھی طرح ابال کرلا... اور جان محمد... وہ جو پچھلے مہینے میں احتیاطاً کچھ دوائیں یہاں رکھ گیا تھا وہ ساری لے آ دیکھیں ان میں سے کون سی اس وقت کام آسکتی ہیں۔"

پھر اس نے اپنے لباس میں کہیں چھپا ہوا ایک دودھاری خنجر نکالا اور اسے روشنی میں بلند کرکے دیکھنے لگا۔ روشنی میں وہ جھلمل جھلمل کررہا تھا مگر اس چمک میں ایک خوفناکی پنہاں تھی۔ مجھے جھرجھری سی آگئی۔ وہ خنجر سے نواب حشام کے آپریشن کی تیاری کررہا تھا اور یہ نواب کی اپنی بیوی کی فرمائش تھی۔

میں نے نواب حشام جائزہ لیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور اس پر جیسے کسی نے موم مل دیا تھا۔ پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چہرے پر چمک رہی تھیں۔ اس کے ادھ کھلے منہ سے پتلی سی رال بہتی ہوئی بستر میں جذب ہورہی تھی۔ وہ واقعی دھیرے دھیرے موت کی دلدل میں اُتر رہا تھا۔ اسے فوری طور پر کسی اعلیٰ قسم کے اسپتال میں لے جایا جانا اشد ضروری معلوم ہوتا تھا لیکن اسپتال تو درکنار اسے ایک مکمل ڈگری یافتہ ڈاکٹر بھی میسر نہیں تھا۔

وہ بھی ایک کروڑ پتی تھا۔ نہ جانے کتنی جائدادوں اور جاگیروں کا مالک مگر اس وقت ایک عجیب عالمِ بے کسی میں پڑا تھا۔ میں بھی ایک کروڑ پتی تھا اور اس وقت ایک حقیر قیدی کی حیثیت سے نہایت مفلوک الحالی کے عالم میں ہاتھ پاؤں بندھوائے ایک کونے میں کھڑا تھا۔

قدرت کے ان کھیل تماشوں میں عبرت کے عجیب پہلو پنہاں نظر آتے ہیں۔ میں اس ستم ظریفانہ صورتِ حال پر دل ہی دل میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا لیکن خود استہزائی کی یہ ہنسی دراصل ایک خاموش کراہ تھی جسے میرے اپنے سوا کوئی نہیں سُن سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا، شاید یہ سب عذاب انسان نے خود مول لے رکھے تھے۔

آخر انسان یہ ساری قبیلے بازیاں، سرداریاں، جاگیرداریاں، بڑی بڑی بزنس ایمپائرز اور ان سے چمٹے ہوئے لاتعداد جھگڑے... یہ سب کچھ چھوڑ کیوں نہیں دیتا؟ ایک عام سا، سیدھا سادا فقیر منش سا انسان کیوں نہیں بن جاتا؟ سب میں گھل مل کیوں نہیں جاتا۔ اتنا سادہ، اتنا عام، اتنا بے ضرر کیوں نہیں بن جاتا کہ کوئی اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر ہی نہ دیکھے؟ بے وقعتی میں کتنی امان تھی۔ بے حیثیتی میں کتنا سکون تھا!

لیکن مجھے ایک بار پھر ہنسی آگئی۔ وہی خاموش ہنسی۔ سکون اور امان بھی دراصل مقدر کی باتیں تھیں۔ اگر مقدر میں سکون اور امان نہیں تھا تو بھلا کہاں سے مل سکتا تھا؟ میں بھی تو عام سا، گمنام سا، غریب سا انسان بن کر امان کی تلاش میں نکلا تھا لیکن پھر بھی میرے گلے میں سزا کا پھندا آن پڑا تھا اور وہ بھی کسی اور کے حصے کی سزا۔

جہاں تک قبیلے بازیوں، سرداریوں، جاگیرداریوں اور بڑی بڑی

کاروباری سلطنتوں کا تعلق تھا تو شاید انہی کے دَم سے دنیا کی رنگا رنگی اور ہما ہمی برقرار تھی۔ کچھ انسان شاید اس لیے ہر وقت انہیں وسعت دینے کی ہوس میں مبتلا رہتے تھے کہ دوسرے ان گنت انسانوں کو اگر ان کے پورے حقوق نہیں تو کم از کم رزق تو میسر آتا رہے۔

میں تو نواب حشام یا نواب زادی نگینہ کو قبیلے بازیوں کا طعنہ بھی نہیں دے سکتا تھا۔ ہم شہریوں کی حالتیں کون سی اچھی تھیں۔ ہمیں ہمارے لیڈر قبائلی نظام کی طرف لے جارہے تھے۔ پرانے قبیلوں کی تو پھر بھی کچھ روایات تھیں، وہاں چھوٹے کا لحاظ، بڑے کا احترام اور تھوڑے بہت انصاف یا شنوائی کی توقع رکھی جاسکتی تھی لیکن نئے زمانوں میں جو یہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں، چھوٹے چھوٹے گروہ اور مسلح قبیلے بن رہے تھے ان میں تو سوائے خون ریزی اور انتقام در انتقام کے کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

میں اس وقت چونکا جب نواب زادی نے کرسی کے پُشتے سے ٹیک لگا کر ایک گہری سانس لی اور آنکھیں ملتے ہوئے بولی "مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ میں یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوگئی ہوں۔"

دونوں بچے منمناتی سی آواز میں اس سے پوچھنے لگے کہ کیا پاپا جانی ٹھیک ہوجائیں گے؟ وہ انہیں سینے سے لگاتے ہوئے تسلیاں دینے لگی اور چومتے ہوئے بتانے لگی کہ وہ دو ایک دن میں ٹھیک ہوجائیں گے۔ بڑی حوصلے والی عورت تھی۔ اپنے لہجے میں ذرا سی بھی لرزش نہیں آنے دے رہی تھی۔

بچے واپس اپنی کرسی پر بیٹھ گئے تو نواب زادی اپنی ٹانگیں سہلاتے ہوئے بولی "شاید مجھے بھی افراتفری میں ٹانگوں پر چوٹ آئی ہے۔"

چھیماں جو اس وقت ذرا آگے جاچکی تھی اور نواب زادی کے قریب تھی، کچھ اور آگے بڑھ کر بڑے اشتیاق سے نواب زادی کے پیروں میں بیٹھتے ہوئے بولی "میں آپ کے پاؤں دبا دیتی ہوں نواب زادی صاحبہ!"

نواب زادی نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے گویا پہلی بار وہاں چھیماں کی موجودگی کا احساس ہوا۔

"تم کون ہو؟" نواب زادی نے نخوت سے پوچھا۔

"وہ... جی... میں چھیماں ہوں۔" وہ کچھ گڑبڑا گئی۔

"اچھا... تو تم ہو چھیماں" نواب زادی کے لہجے میں بھی حقارت آگئی اور آنکھوں میں بھی "تذکرے سُنے ہیں میں نے تمہارے" پھر یکدم اس کی آنکھیں دہک اُٹھیں اور لہجے میں بھی تپش آگئی "تم میری ٹانگیں دباؤ گی؟ میرے جسم کو چھوؤ گی؟ گندی عورت! تمہاری یہ جرأت؟"

اس نے باری باری سب کے چہروں کی طرف دیکھا پھر اس کی نظریں عیسیٰ خان کے چہرے پر آرکیں۔ تحکمانہ لہجے میں وہ بولی "یہ ہورہا ہے ہمارے ڈیروں پر؟ کون لایا تھا اسے یہاں؟"

"کوئی بھی نہیں نواب زادی صاحبہ!" عیسیٰ خان ہاتھ جوڑ کر بولا "ہم میں سے کوئی اسے نہیں لایا۔ اسے تو ہمارے آنے سے بھی پہلے انسپکٹر حیات خان یہاں چھوڑ گیا تھا۔ وہ اپنے گاؤں گیا ہے، کہہ گیا تھا، واپسی پر ساتھ لے لوں گا۔"

نواب زادی گویا کچھ اور بھڑک اٹھی "بڑے پر لگ گئے ہیں انسپکٹر حیات خان کو بھی۔ خود تو ہے زمانے بھر کا گندا آدمی، ہمارے آدمیوں کو بھی گندا کررہا ہے۔ میں ذرا بڑے نواب صاحب کے پاس پہنچ جاؤں۔ بُلواؤں گی اس کو حویلی میں۔ اس سے بھی پوچھ لیتے ہیں، اس کو نوکری کرنی ہے یا نہیں۔"

بے چاری! اپنے آدمیوں کا ذکر کچھ اس طرح کررہی تھی جیسے وہ بڑی پاکیزہ مخلوق تھے۔ انہوں نے تو دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں تھا۔ بے چاری کو شاید معلوم نہیں تھا کہ ان معاملات میں اس کے آدمی شاید انسپکٹر حیات خان کے بھی کان کترتے ہوں۔ کچھ دیر پہلے میں ان کی باتیں سُن چکا تھا۔ وہ سب کھائے کھیلے ہوئے لوگ تھے۔

نواب زادی یقیناً پڑھی لکھی تھی۔ چھیماں مجھے بتاچکی تھی کہ وہ لوگ زیادہ تر باہر رہتے تھے۔ شاید تعلیم بھی باہر حاصل کی ہو۔ اس کے باوجود مزاج میں وہی سردارانہ نخوت، وہی تکبر، وہی برہمی برقرار تھی جو اس طبقے کی اکثریت کی پہچان سمجھی جاتی تھی۔ تعلیم، زمانے کی تیز رفتاری اور بہت سے عوامل نے بہت سی روایتوں، بہت سی قدروں کو بدل دیا تھا مگر بعض لوگ اندر سے پتھر ہوتے ہیں۔ ٹوٹ جاتے ہیں، کسی سانچے میں نہیں ڈھلتے۔

چھیماں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ ایک طرف کو ہٹی اور تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ بے چاری! بڑا شوق چرایا تھا اسے خدمت کا۔ میرا دل چاہا اس کے پیچھے باہر جاؤں اور اسے تسلی دوں لیکن دو کلاشنکوف بردار بدستور دروازے پر کھڑے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ مجھے باہر جانے سے روکیں گے۔ اس وقت سب نے مجھے نظر انداز کیا ہوا تھا اور میں بھی کسی کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا نہیں چاہتا تھا۔

نواب زادی کو یکدم جیسے کچھ یاد آیا چونکتے ہوئے بولی "ارے ہاں... گاڑی میں ایک بستر بند سیٹوں کے نیچے پھنسا ہوگا۔ کوئی جائے اور اس کو نکال کرلائے۔"

ایک شخص فوراً مستعدی سے باہر چلا گیا۔ نواب زادی بطورِ خاص کسی کو مخاطب کیے بغیر بولی "یہاں لوہے کا کوئی مضبوط ٹرنک یا لکڑی کی کوئی مضبوط پیٹی وغیرہ موجود ہے؟"

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ایک نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "جی ہاں۔ میں ابھی لاتا ہوں۔"

نواب زادی بولی "ایک مضبوط تالا بھی ہو تو بہت اچھا ہے۔"

وہ شخص اثبات میں سرہلا کر مستعدی سے رخصت ہوگیا۔ اس دوران جان محمد ایک کارٹن میں بہت سی دوائیں لیے آگیا۔ دوائیں

بے ترتیبی سے کارٹن میں الٹی سیدھی بھری ہوئی تھی۔ اس میں سرنجیں، پٹیاں اور روئی بھی نظر آرہی تھیں۔ بلال شیدی ایک ایک دوا کو اٹھا کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے چہرے کا جو تھوڑا بہت حصہ نظر آرہا تھا اس پر تفکر اور تذبذب کی شکنیں تھیں۔ بعض دواؤں کو وہ الگ کرکے رکھنے لگا۔

اس دوران وہ شخص واپس آگیا جو گاڑی سے بستر بند نکالنے گیا تھا۔ بستر بند اس نے کمر پر لادا ہوا تھا۔ وہ ایک تنومند شخص تھا لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ بستر بند کے بوجھ سے دُہرا ہوا جارہا تھا۔ اس نے بستر بند کو نواب زادی کے سامنے چٹائی پر پٹخا تو بالکل یوں محسوس ہوا جیسے کوئی ٹھوس چیز زمین پر پٹخ دی گئی ہو۔

نواب زادی چند لمحے پُرخیال انداز میں بستر بند کی طرف دیکھتی رہی۔ اسی اثنا میں دوسرا شخص لوہے کا ایک سیاہ مضبوط ٹرنک اُٹھائے آگیا جیسا عموماً فوجیوں یا پھر ریلوے گارڈز کے پاس ہوتا ہے جس میں وہ اپنا سفری سامان رکھتے ہیں لیکن یہ ٹرنک اس سے بھی زیادہ مضبوط معلوم ہوتا تھا، بس ذرا مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ایک مضبوط تالا بھی موجود تھا۔ وہ شخص چٹائی پر بیٹھ کر ایک کپڑے سے ٹرنک کو صاف کرنے لگا۔

ٹرنک صاف ہوچکا تو نواب زادی نے حکم دیا "بستر بند کو کھولو۔"

وہ لکڑی کی اس بڑی سی، بے ہنگم کرسی پر کچھ اس تمکنت سے بیٹھی تھی گویا کوئی ملکہ اپنے تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو اور کچھ ایسی ہی نخوت سے وہ احکامات جاری کررہی تھی۔

بستر بند کو کھولا گیا تو گدے میں لپٹی ہوئی سونے کی بہت سی اینٹیں گدے پر ہی بکھر گئیں۔ وہ میرے اندازے کے مطابق ستر اسی اینٹیں تھیں۔ اینٹ کے نام سے ذہن میں اس اینٹ کا تصور آتا ہے جو تعمیر میں استعمال ہوتی ہے لیکن ظاہر ہے سونے کی اینٹ اس سائز کی نہیں ہوتی۔

سونے کی اینٹ چھوٹے سائز کے ایک مستطیل بسکٹ کے برابر ہوتی ہے اور ایک کلو کی ہوتی ہے۔ عام مروج پیمانوں میں سے یہ ایک پیمانہ ہے۔ ویسے سونے کی نقل و حمل دوسری بہت سی شکلوں، بہت سی قسموں اور بہت سے پیمانوں میں بھی ہوتی ہے۔

وہ کم از کم ڈھائی کروڑ روپے کا سونا تھا۔ بستر بند لانے والے کی کمر اسی کے بوجھ سے جھکی جارہی تھی۔ نواب زادی نے کہا تھا کہ نواب حشام نے کچھ اثاثے سونے میں تبدیل کرائے تھے مگر مجھے بات کچھ اور لگ رہی تھی۔ مجھے یہ سونا کہیں اور سے آیا ہوا لگ رہا تھا۔ معلوم نہیں مصلحتاً یہ سونا بستر بند میں پیک کیا گیا تھا کہ بستر بند میں سونے کی موجودگی کا خیال کسی کو کم ہی آسکتا تھا۔ یا عجلت کی وجہ سے ایسا کیا گیا تھا؟ دونوں ہی باتیں ممکن تھیں۔

بہرحال اس میں نواب زادی کی مرضی شامل معلوم نہیں ہوتی تھی۔ شاید اس کی نظر میں سونے کو لے جانے کا یہ طریقہ مناسب نہیں تھا، اس لیے وہ اسے تبدیل کررہی تھی۔

اس نے سونے کی اینٹیں ایک نئی ترتیب اور مضبوطی گدے ہی میں لپٹوا کر اس کی ایک چوکور تہ سی بنوائی۔ اس بنڈ اس نے لوہے کے ٹرنک میں ٹھونسنے کا حکم دیا پھر ٹرنک کو بڑا ار لگوا کر چابی خود لے لی اور اپنے سیاہ لبادے میں کہیں رکھ لی۔

میں نے محسوس کیا کہ اس دوران اس کا دھیان چند منٹ لیے اپنے شوہر کی طرف سے مکمل طور پر ہٹ گیا تھا جو زندگی موت کی کشمکش میں مبتلا تھا۔ میرے لیے یہ مشاہدہ بھی قدر حیرت کا باعث تھا کہ سونے کی اتنی بڑی مقدار کو دیکھ کر بھی و موجود کسی بھی شخص کی آنکھیں نہیں پھیلی تھیں، کسی کی آنکھ میں کوئی نئی چمک نہیں ابھری تھی اور کسی کے تاثرات نہیں بد تھے۔ ان میں سے دو افراد نہایت انہماک کے ساتھ نواب زا کے احکامات کی تعمیل میں مصروف تھے۔ باقیوں کے چہرے بد پتھرائے ہوئے تھے۔

وہ صرف حکم کے بندے معلوم ہوتے تھے۔ انہیں اچھی ط معلوم تھا کہ سرداروں کے خاندان کی کس بات سے کوئی تعلق ہے اور کس بات سے بالکل لاتعلق رہنا ہے۔ جس معاملے سے اپنا کوئی تعلق نہیں سمجھتے تھے اس کے بارے میں شاید کسی خیال بھی اپنے دماغ میں گھسنے نہیں دیتے تھے۔

نواب زادی نے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد قدر اطمینان کی سانس لی اور بلال شیدی کی طرف دیکھا جو "آپریشن کی تیاریاں تقریباً مکمل کرچکا تھا۔ اس نے لکڑی کی ایک بھا بھرکم اور کھردری سی تپائی منگوا کر چارپائی کے پاس رکھ لی تھی ا اپنی منتخب دوائیں اس پر سجا دی تھیں۔

جان محمد نے کھولتے ہوئے پانی کا پیتل کا ایک تسلا بھی ا بے ہنگم تپائی پر لا کر رکھ دیا تھا اور بلال شیدی نے ایک جراثیم کُ دوا اس میں ملادی تھی۔ اب وہ کاٹن کا ایک رول کھول رہا تھ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی اور فکرمندی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا اس وقت اس کے محسوسات تقریباً وہی ہوں گے جو تبد قلب کا پہلا آپریشن کرتے وقت کرسچن برنارڈ کے رہے ہوں گے

نواب حشام جس حالت میں لیٹا تھا، بلال شیدی کا ارادہ تھا اسی حالت میں اس کا آپریشن کرنے کا تھا۔ چارپائی آپریٹنگ ٹیبل کے طور پر استعمال ہونے والی تھی۔ بلال غالباً مارفین کا انجکشن تیا کررہا تھا۔

انجکشن تیار کرکے اس نے نواب زادی کی طرف دیکھا او مؤدبانہ لہجے میں بولا "آپ اور بچے دوسرے کمرے میں چلے جائیں۔ وہاں ذرا بہتر قسم کا بیڈ بھی لگا ہوا ہے۔ آپ آرام کرنے کی کوشش کریں اور سب کچھ خدا پر چھوڑ دیں۔"

"میں بچوں کو بھیج دیتی ہوں لیکن خود یہیں رہوں گی۔" نواب زادی نے ایک لمحے سوچنے کے بعد جواب دیا۔

"آپ کو بھی یہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ اس کام میں بہت دیر لگے گی اور... آپ یہ سب کچھ نہیں دیکھ سکیں گی۔" بلال شیدی نظر جھکاتے ہوئے بولا۔ ویسے تو بلال کی آنکھیں کسی درندے کی آنکھوں جیسی چمک و توانائی رکھتی تھیں لیکن میں نے محسوس کیا، وہ نواب زادی سے آنکھ ملاتے ہوئے کتراتا تھا۔ معلوم نہیں یہ حدِ ادب کا تقاضا تھا یا واقعی اس میں اتنی جرأت نہیں تھی۔

نواب زادی سرد نگاہوں سے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "بلال! کیا تمہیں بھی میرے اعصاب کی مضبوطی اور میرے حوصلے کا اندازہ نہیں؟"

"اندازہ تو ہے نواب زادی صاحبہ! لیکن... یہ شوہر کا... سر کے تاج کا معاملہ ہے۔" بلال دھیمے لہجے میں بولا۔

"میں اپنے حوصلوں کو وہیں آزمانا پسند کرتی ہوں جہاں انہیں آزمانا واقعی بہت مشکل... بلکہ تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔" نواب زادی نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔

پھر اس نے حکم دیا "رکھاں! تم بچوں کو دوسرے کمرے میں لے جاؤ۔ انہی کے پاس موجود رہنا اور انہیں سُلانے کی کوشش کرنا۔"

رکھاں ہاتھ باندھے آگے آئی اور منمناتی سی آواز میں بچوں کو اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہنے لگی۔ لڑکا تو باپ پر ایک اُداس سی نظر ڈال کر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ لڑکی عمر میں لڑکے سے چھوٹی تھی۔ عمر کے حساب سے اسے لڑکے سے کم سمجھدار ہونا چاہیے تھا لیکن وہ گویا صورتِ حال کی نزاکت کو لڑکے سے زیادہ سمجھ رہی تھی۔

وہ باپ کے سرہانے جا کھڑی ہوئی اور ایک ہاتھ تکیے پر، دوسرا منہ پر رکھ کر بلک بلک کر رونے لگی۔ ماں نے فوراً ہاتھ بڑھا کر اسے نرمی سے پیچھے کھینچا اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "روتے نہیں ہیں بیٹا! رونا بزدل لوگوں کا کام ہے۔ ایسے حالات میں رونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ تمہارے ڈیڈی ٹھیک ہوجائیں گے۔ بلال ابھی ان کی مرہم پٹی کرلے گا، انہیں انجکشن لگائے گا تو صبح تک وہ ٹھیک ہوجائیں گے۔ تم دوسرے کمرے میں جا کر سونے کی کوشش کرو اور اپنے ڈیڈی کے لیے دعا کرو۔"

اس وقت بلال اپنا خنجر چھپا چکا تھا لیکن بچی بہرحال اس کی جھلک دیکھ چکی تھی اور اس کی آنکھوں میں شاید اس کی دہشت باقی تھی۔ وہ کم عمر اور ناسمجھ سہی لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کے باپ کے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ نواب زادی کا اشارہ پا کر رکھاں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے وہاں سے لے تو گئی لیکن جاتے جاتے بھی اس کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

ان کے جانے کے بعد نواب زادی نے گہری سانس لی اور دو آدمیوں کو حکم دیا "تم یہ ٹرنک لے جا کر کسی ایسی گاڑی میں رکھ دو جس کی کنڈیشن سب سے اچھی ہو اور جس میں سب سے زیادہ پیٹرول موجود ہو۔ پیٹرول کے اگر فالتو ڈبے موجود ہوں تو وہ بھی اسی گاڑی میں رکھ دو۔"

اس نے اس ٹرنک کی طرف اشارہ کیا جو بظاہر زنگ خوردہ اور معمولی سا تھا لیکن اس وقت ڈھائی تین کروڑ کا سونا اپنے شکم میں چُھپائے ہوئے تھا۔ بظاہر اسے دیکھ کر شاید کوئی یہی سمجھتا کہ اس میں کسی رنگروٹ کے کپڑے یا کسی ریلوے گارڈ کا سامان ہوگا لیکن اس سے پہلے شاید بستر بند کو دیکھ کر بھی کسی کو گمان تک نہ گزرتا کہ اس میں اتنا بہت سا سونا موجود تھا۔ البتہ اگر کسی کو اس کے وزن کا اندازہ ہوتا تو شاید اس کے بارے میں کسی شک میں مبتلا ہوتا۔

وہ دونوں آدمی ٹرنک اُٹھا کر باہر جاچکے تو بلال شیدی، نواب حشام کو انجکشن لگانے کے لیے اس کی خون آلود آستین اوپر چڑھانے لگا۔ اب نواب زادی نے اپنا تختِ شاہی چھوڑا اور اُٹھ کر اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے آگے بڑھتے ہوئے بولی "میں یہاں موجود رہوں گی تو ایک نرس کے طور پر تمہاری مدد کروں گی۔"

دوسرے ہی لمحے اس کے لہجے میں مخصوص نخوت لوٹ آئی اور وہ مڑ کر دیکھے بغیر بولی "میرے علاوہ اگر تم کمرے میں کسی کا موجود رہنا ضروری سمجھتے ہو تو اسے روک لو، باقی سب کو باہر بھیج دو۔"

"اگر آپ ایک نرس کے طور پر یہاں میرا ہاتھ بٹانے کا حوصلہ کرسکتی ہیں تو پھر کسی اور کی ضرورت نہیں۔" بلال نے جواب دیا اور سب کو کمرے سے باہر جانے کی ہدایت کی۔

میں سب سے پیچھے باہر آیا۔ سب اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ سب کسی نہ کسی خیال میں الجھے ہوئے تھے۔ کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی لیکن کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوئے کلاشنکوف بردار نے فوراً مجھے ہدایت کی "میری نظر سے دور مت جانا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دائیں طرف کچھ دور دیوار کے ساتھ پڑی ایک بینچ پر جا بیٹھا جس پر چھیماں پہلے ہی سے ایک طرف کو بیٹھی تھی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔ میری موجودگی کا احساس ہونے پر اس نے آہستگی سے سر اُٹھایا۔ پیٹرومیکس لیمپ کی روشنی وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں ابھی تک نمی جھلملا رہی تھی۔

"بہت شوق چڑھا تھا تمہیں نواب زادی کی خدمت کا۔" میں نے نیچی آواز میں استہزائیہ سے انداز میں کہا۔

"ٹھیک ہی تو کہا انہوں نے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی "ایک نواب زادی کو... ایک سردار زادی... اور ایک سردار زادے کی بیوی کو ایسا ہی کہنا چاہیے تھا۔ غلطی تو میری تھی۔ میں اپنی اوقات بھول گئی تھی۔"

میں اندازہ نہ کرسکا کہ اس کے لہجے میں خود استہزائی تھی، تاسف تھا یا وہ واقعی اپنے آپ کو اس سلوک کا مستحق سمجھ رہی تھی جو اس کے ساتھ ہوا تھا؟ اگر ایسا سمجھ رہی تھی تو بڑی صابر

عورت تھی۔ کمال کی حد تک صابر عورت۔ میرا خیال تھا کہ دنیا میں کوئی انسان انا کے بغیر نہیں ہوتا لیکن انا کسی میں کم ہوتی ہے' کسی میں زیادہ۔ البتہ یہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کس کی انا کس وقت بیدار ہو اور کس وقت تک سوئی رہے لیکن اس عورت میں شاید انا تھی ہی نہیں یا پھر شاید یہاں کے لوگوں میں نوابوں اور سرداروں کے سامنے انا کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے ایک اجنبی' ایک زیرِ عتاب قیدی سمجھتے ہوئے اپنے محسوسات' اپنے دل کی بات مجھ سے چھپا رہی ہو۔

پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔ ذرا چونکتے ہوئے بولی "یہ مت سمجھنا کہ مجھ سے ہمدردی جتا کر' میرا دل جیت کر تم مجھے اپنی رسیاں کھولنے پر آمادہ کرلوگے۔"

"جہنم میں گئیں رسیاں... اور ساتھ ہی تمہارا دل۔" میں نے جل کر کہا "مجھے نہ تو رسیاں کھلوانی ہیں اور نہ ہی تمہارا دل جیتنا ہے۔ میں نے اب یہاں سے فرار ہونے کا ارادہ ہی ملتوی کردیا ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ مجھے یہاں سے لے جاکر بڑے نواب صاحب کی خدمت میں پیش کر ہی دیا جائے تو بہتر ہے۔ انہوں نے مجھے پکڑ کر اور قید میں رکھ کر جو کارنامہ انجام دیا ہے' شاید بڑے نواب صاحب سے انہیں اس کی داد اور انعام ملنے کے بجائے سزا ملے۔"

"اچھا..." اس کی آنکھیں ذرا پھیلیں "کیا کوئی خاص آدمی ہو تم؟"

"خاص نہیں تو بے گناہ ضرور ہوں' لیکن یہ فیصلہ اب بڑے نواب صاحب کے سامنے پہنچ کر ہی ہوگا۔" میں نے سر جھٹک کر کہا۔

اچانک بلال شیدی نے بڑے کمرے کے دروازے سے سر نکال کر جان محمد کو پکارا۔ وہ دونوں پیٹرومیکس لیمپ اندر منگوا رہا تھا۔ اسے یقیناً زیادہ سے زیادہ روشنی کی ضرورت تھی۔ جہاں تک اس کے بس میں تھا وہ اس کام کو سمجھداری اور ہوشیاری سے کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن درحقیقت یہ ناممکن کو ممکن بنانے کی کوشش تھی۔

پیٹرومیکس لیمپ اندر چلے گئے تو احاطے میں ملگجا سا اندھیرا پھیل گیا لیکن اتنی روشنی ضرور تھی کہ دروازے پر کھڑا ہوا کلاشنکوف بردار اب بھی مجھ پر آسانی سے نظر رکھ سکتا تھا اور اِدھر اُدھر آتے جاتے لوگ بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔

چند منٹ بعد ایک اور مسلح آدمی بڑے کمرے کے دروازے پر آکھڑا ہوا۔ باقی لوگوں کی آمدورفت تقریباً ختم ہوگئی۔ وہ سب اِدھر اُدھر کہیں کمروں وغیرہ میں چلے گئے تھے۔ دھیرے دھیرے ایک عجیب سوگوار سا سکوت ماحول کو اپنی آغوش میں لے رہا تھا۔ وقت کی رفتار جیسے سست سی ہوگئی تھی۔

چھیماں نے ایک بار پھر سر جھکا لیا تھا اور خاموش بیٹھی تھی۔

نواب زادی کی آمد سے پہلے میں نے اس کی شخصیت میں جو چُلبلا پن' جو طغیانی دیکھی تھی وہ یکدم ہی گویا جھاگ کی طرح بیٹھ گئی تھی۔

میں نے تصور ہی تصور میں بلال شیدی کو خنجر سے نواب حسام کی چیر پھاڑ کرتے دیکھا۔ بچا کھچا خون اس کے جسم سے بھل بھل بہہ رہا تھا۔ گوشت قتلوں کی سی صورت میں کٹ گیا تھا اور ساتھ ہی نہ جانے کون کون سی نسیں اور شریانیں بھی۔ اگر کہیں سرجن یہ دیکھ لیتا کہ یہاں کس ماحول میں' کن چیزوں کی مدد سے کیا کام کرنے کی کوشش کی جارہی تھی تو شاید وہ حیرت سے بے ہوش ہوجاتا۔

میں نے اس تصور سے ذہن ہٹانے کے لیے چھیماں سے کہا "کوئی بات کرو نا۔"

"میرا نہیں دل چاہ رہا بات کرنے کو۔ کوئی زبردستی ہے کیا؟" وہ ناگواری سے بولی۔ عجیب عورت تھی۔ اسے یہ تجسس تک نہیں تھا کہ میں کون تھا اور کس سلسلے میں گرفتار تھا۔ اس سلسلے میں بھی اس نے کوئی سوال کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ زیادہ اِدھر اُدھر پھرنے کی مجھے اجازت نہیں تھی۔ کوئی مجھ سے بات کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ایسے میں انتظار کے لمحات گزارنا بڑا کٹھن تھا۔

لیکن وقت' انسان سے بھی کہیں عجیب تر چیز ہے۔ حالات کچھ بھی ہوں' وقت گزر ہی جاتا ہے۔ تقریباً دو گھنٹے گزر گئے۔ میں کبھی اُٹھ کر چھوٹے چھوٹے قدموں سے ٹہلنے لگتا اور کبھی دوبارہ بنچ پر بیٹھ جاتا۔ چھیماں اس دوران اُٹھ کر رکھاں کے ساتھ غالباً کچن میں چلی گئی' بائیں ہاتھ پر کونے پر وہ کمرا تھا جسے باورچی خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ وہاں سے لکڑیوں کے جلنے کی بو اور سالن روٹی وغیرہ کی خوشبو ابھی تک آرہی تھی۔ سب کمروں میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں اور ان میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔

آخرکار بڑے کمرے کا دروازہ کھلا اور بلال نے سر نکال کر رکھاں' جان محمد اور دوسرے دو تین آدمیوں کو پکارا۔ سب دوڑے دوڑے آئے۔ کمرے کا دروازہ پورا کھل گیا اور وہ اندر چلے گئے۔ بلال شیدی انہیں مختلف کام بتا رہا تھا۔ اس کی آواز مجھ تک پہنچ رہی تھی لیکن الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے تھے۔

میں بھی اُٹھ کر دروازے تک چلا گیا۔ محافظوں نے مجھے اندر جھانکنے سے منع نہیں کیا۔ رکھاں پانی کا تسلا اٹھائے باہر لا رہی تھی۔ پانی خون کی طرح رنگین ہوچکا تھا۔ بلال نے غالباً اس میں روئی بھگو بھگو کر نواب زادے کے جسم سے خون صاف کیا تھا۔ تیز روشنی میں تپائی پر کلاشنکوف کی تین گولیاں رکھی دکھائی دے رہی تھیں جو ابھی تک خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔

نواب زادہ اب بھی بڑی سی چارپائی پر اسی طرح اوندھا پڑا تھا جس طرح میں نے اسے دیکھا تھا لیکن اس کے چہرے پر زندگی کا رنگ اب بالکل ہی معدوم ہوچکا تھا۔ اس کی رنگت دُھلے ہوئے

لٹھے کی سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے جسم میں دو نہیں' تین گولیاں پیوست تھیں۔ بلال انہیں نکالنے میں کامیاب تو ہوگیا تھا لیکن میرے خیال میں نواب زادی نے اپنے شوہر کی چیر پھاڑ کروا کے اچھا نہیں کیا تھا۔ نواب زادے کے جسم پر چادر ڈال دی گئی تھی۔

نواب زادی اب چارپائی کے قریب ہی بڑی سی بے ہنگم کرسی پر ٹانگیں اوپر کیے اور ان کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنائے بیٹھی تھی۔ وہ اس وقت اپنے شوہر کی طرف دیکھنے کے بجائے کھوئی کھوئی نظروں سے چھت کو تک رہی تھی۔ زندگی کا رنگ اس کے چہرے پر بھی بہت پھیکا پڑ گیا تھا لیکن وہ اپنے آپ کو آہنی اعصاب کی مالک ثابت کرنے کے لیے خود کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کی قصابانہ "سرجری" ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ ایک بار تو یقیناً اس کے آہنی اعصاب بھی خاصے زوردار طریقے سے جھنجھنا اُٹھے ہوں گے۔

فرش پر خون میں لتھڑی روئی اور پٹیوں کے بہت سے گولے پڑے تھے۔ ایک آدمی انہیں سمیٹ رہا تھا۔ ایک آدمی دوائیں وغیرہ سمیٹ رہا تھا۔ میں خاموشی سے بنچ پر واپس آبیٹھا۔

کچھ دیر بعد بلال شیدی بھی کمرے سے باہر آیا اور ایک طرف کو بیٹھ گیا۔ وہ دراصل صابن سے ہاتھ دھو رہا تھا۔ ایک شخص لوٹے سے اس کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہا تھا۔ "سرجن صاحب" آپریشن سے فارغ ہوچکے تھے۔

وقت کبھی کبھی انسان کو گھیر گھار کر عجیب' ناقابلِ یقین حالات کے دائرے میں لے آتا ہے۔ نواب زادہ اس طبقے سے تعلق رکھتا تھا جس کے لوگوں کو چھینک بھی آجاتی ہے تو وہ انگلینڈ اور امریکا بھاگے جاتے ہیں یا پہلے ہی سے وہیں موجود ہوتے ہیں لیکن آج اس کی زندگی کا خطرناک ترین آپریشن جس پر اس کی زندگی کا دارومدار تھا' بلال شیدی نے کیا تھا اور جن حالات میں کیا تھا وہ ویسے ہی رونگٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی تھے۔

میں بنچ پر بیٹھا رہا اور قدرت کے کھیل تماشوں پر مزید کچھ دیر حیران ہوتا رہا۔ اسی اثنا میں بلال شیدی بھی میرے قریب آبیٹھا۔ تھکے تھکے انداز میں اس نے کچی دیوار سے ٹیک لگالیا۔ اس کی شخصیت' اس کی شکل صورت' اس کا حلیہ اب بھی وہی تھا لیکن اب مجھے اس میں وحشت' درندگی اور کرختگی نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید اس کی کیفیات بھی بدل گئی تھیں اور میرا زاویۂ نظر بھی۔ اب گویا اسے اس بات کی کوئی خاص پروا نہیں رہ گئی تھی کہ اس کے برابر اس کا قیدی بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا "تو تم میڈیکل اسٹوڈنٹ تھے؟"

اس نے سر میری طرف گھماتے ہوئے آہستگی سے آنکھیں کھولیں۔ ایک لمحے کے لیے اس نے عجیب سے انداز میں مجھے گھورا لیکن سوال کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔ درحقیقت یہ سوال تھا بھی نہیں۔ سوال وہ تھا جو میں نے اس کے بعد کیا۔

"ڈاکٹر کیوں نہیں بن سکے؟" میں نے پوچھا۔

"اسٹوڈنٹ پالیٹکس کی وجہ سے۔" اس نے نہایت دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

"کمال ہے!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اسٹوڈنٹ پالیٹکس کی وجہ سے تو لوگ کچھ سے کچھ بن جاتے ہیں' تم ڈاکٹر بھی نہیں بن سکے؟"

"ہاں۔ جس لیڈر کے پیچھے میں چل رہا تھا وہ تو یقیناً کچھ سے کچھ بن گیا' لیکن مجھے کالج چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔" اس کے لہجے میں خود استہزائی تھی۔

"کیوں؟" میں بھی اب اس سے کچھ اس طرح بات کررہا تھا جیسے وہ کلاشنکوفوں کے زور پر مجھے اغوا کرکے اور رسیوں سے باندھ کرلانے والا نہیں بلکہ ٹرین کے سفر میں دوست بن جانے والا کوئی شخص تھا اور ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر جاننے کی کوشش کررہے تھے۔

"اپنے لیڈر کے حکم پر مجھ سے تین چار قتل ہوگئے تھے۔ حالانکہ وہ میرے قبیلے ہی کا تھا لیکن اقتدار کی جنگ میں کسی اور زاویے سے شریک تھا۔ مجھ پر جب بُرا وقت آیا تو وہ نہ مجھے بچا سکا اور نہ پناہ دے سکا۔ میں اِدھر اُدھر بہت مارا مارا پھرا' بہت تکلیفیں اُٹھائیں پھر آخرکار اپنی اصل قبائلی زندگی میں لوٹ آیا۔ بڑے نواب صاحب واقعی بہت بڑے آدمی ہیں۔ اقتدار کی جنگ میں حالانکہ یہ بھی ہمیشہ کسی نہ کسی طرح سے ایک فریق رہتے ہیں لیکن ان کی بات ہی کچھ اور ہے۔ وہ چاہے اقتدار میں ہوں یا اقتدار سے باہر ان کی چھاؤں میں پناہ ہے' عافیت ہے۔"

"لیکن اس وقت تو انہیں خود عافیت میسّر نہیں۔ دو بیٹے مرچکے ہیں' بھانجی کا شوہر اندر زندگی اور موت کی کشمکش میں نازک مرحلے پر پڑا ہے۔" میں نے کہا۔

"قبائلی زندگی میں ایسے مرحلے آتے رہتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا "یہ وقت بھی گزر جائے گا۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"گویا..." ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "اگر تم اسٹوڈنٹ پالیٹکس میں نہ پڑے ہوتے اور تمہارے ہاتھوں تین چار قتل نہ ہوئے ہوتے تو آج تم ڈاکٹر ہوتے اور اپنے گاؤں یا شہر میں... یا کہیں اور باعزت طریقے سے روپیہ کمانے کے ساتھ ساتھ' پریشان حال لوگوں کے کام آرہے ہوتے؟"

"شاید" اس نے بے پروائی سے کندھے اُچکائے۔

"ایک ذرا سا غلط موڑ انسان کو منزل سے کتنی دور لے جاتا ہے۔"

"دراصل میری سمجھ میں بہت دیر سے آیا کہ ہم نو عمر' نوجوان' ناسمجھ اور جوشیلے لڑکے دراصل لکڑیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ہمیں آگ میں جھونکا جاتا ہے اور کچھ لوگ اس آگ پر اقتدار کی دیگ پکاتے ہیں۔ آگ ٹھنڈی پڑنے لگتی ہے تو اس میں مزید لکڑیاں جھونکی جاتی ہیں لیکن جب تک یہ کھیل سمجھ میں آتا ہے تب تک بہت دیر ہوچکی ہوتی ہے۔" اس کے لہجے میں کوئی خاص تاسف نہیں تھا۔ شاید اب وہ تاسف وغیرہ کے زمانوں سے بھی گزر چکا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "نواب زادہ کے بچنے کے کتنے فیصد امکانات ہیں؟"

"اللہ کی مرضی کو فیصدوں میں نہیں ناپا جاسکتا۔" اس نے جواب دیا "میڈیکل سائنس کی رو سے اس کے بچنے کے بہت کم امکانات ہیں لیکن میں نے اس سے بدتر حالات میں بھی لوگوں کو بچتے دیکھا ہے اور اس سے معمولی زخموں کے باعث مرتے دیکھا ہے۔"

ذرا توقف کے بعد وہ بولا "تینوں گولیاں نکالنے میں تو زیادہ وقت نہیں پیش آئی۔ غنیمت تھا کہ کوئی بھی گولی کسی ہڈی میں پیوست نہیں تھی۔ میں نے زخموں میں پنسل بھر کے بینڈیج کردی ہے لیکن ظاہر ہے یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ زخموں کو ٹانکے نہیں لگائے جاسکے۔ خون کا رساؤ نہیں رُک رہا۔ یہ غنیمت ہے کہ خون کا بہاؤ روکنے والے دو انجکشن موجود تھے۔ ایک میں نے اسے لگادیا ہے۔ تین گھنٹے بعد دوسرا لگادوں گا لیکن اس کے جسم میں خون بہت ہی بہت کم گیا ہے۔ گلوکوز کی شکل میں خوراک بھی اس کے جسم میں نہیں جارہی۔ خون بھی اسے نہیں لگایا جاسکتا۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کیا ہوگا۔ میں یقین سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتا۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر اس نے گہری سانس لی پھر بولا "بہرحال... میرے بس میں جو کچھ تھا وہ میں نے کردیا ہے۔ مجھے دشمنوں سے دوبدو مقابلہ اتنا مشکل محسوس نہیں ہوا جتنا آج کا یہ کام میرے لیے مشکل تھا۔"

پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا "اور یہ نواب حشام وہ شخص ہے جس نے لڑکپن میں میری پیٹھ پر دس کوڑے مار کر میری کھال اُدھیڑدی تھی۔"

"کیوں؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"کیونکہ میں نے نواب زادی نگینہ کو راستے میں روک کر اس سے بات کرلی تھی۔ اس وقت ہم تینوں تقریباً بچے ہی تھے۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں ہنسنے لگا۔ اس نے فوراً آنکھیں کھول کر حیرت سے میری طرف دیکھا "تم ہنس کیوں رہے ہو؟"

"وقت کی ستم ظریفی پر ہنس رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا "جس نواب زادی سے سرِراہ تمہارا بات کرنا جرم ٹھہرا تھا۔ وہ آج تمہاری منت کررہی تھی کہ اس شخص کے جسم کی چیر پھاڑ کر کلاشنکوف کی گولیاں نکال دو جس نے تمہاری کمر کی کھال اُدھیڑی تھی۔"

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" اس نے سُرخ سُرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔

"تم سب لوگ ہو بہت وفادار۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "حتیٰ کہ وہ خانہ بدوش گلوکارہ بھی سرداروں کی زبردست وفادار ہے جس کا تعلق تمہارے قبیلے سے نہیں ہے۔ تم نے بھی نواب حشام کو معاف کردیا اور اس کی جان بچانے کی بساط بھر کوشش کررہے ہو۔ ادھر چھیماں کو نواب زادی نے اس بُری طرح حقارت سے دھتکارا لیکن وہ پھر بھی نواب زادی کے خلاف لفظ سننے کو تیار نہیں تھی۔"

"اس وفاداری پر ہی قبائلی نظام قائم ہے۔" بلال شیدی نے کہا اور ایک بار پھر آنکھیں بند کرکے دیوار سے ٹیک لگالیا۔

بار رادھن اور ایک بار پنھل ادھر سے گزرے تو انہوں نے آنکھیں سکیڑ کر اُلجھن آمیز انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بلال شیدی ایسے دوستانہ سے انداز میں ایک قیدی کے برابر کیوں بیٹھا تھا!

اچانک بلال شیدی اس چیتے کی طرح چونک کر اُٹھ کھڑا ہوا جس نے غنودگی کے عالم میں شکار کی بو سونگھ لی ہو۔ وہ کان لگا کر سُننے کی کوشش کررہا تھا۔ جو کچھ سننے کی وہ کوشش کررہا تھا اس سے پہلے سُن چکا تھا لیکن خاموش تھا۔ اس نے غالباً صحراؤں اور بیابانوں میں ہی پرورش پائی تھی لیکن میری حسیات بھی ایسے معاملات میں کچھ کم کارآمد نہیں تھیں۔

"تم کچھ سُن رہے ہو ماکھو چاچڑ؟" اس نے جاننا چاہا۔

مجھے ایک بار پھر ہنسی آگئی۔ وہ ابھی تک مجھے ماکھو چاچڑ سمجھنے پر تُلا ہوا تھا۔ بعض لوگوں کے دماغ میں ایک بار کوئی خیال بیٹھ جائے تو اسے نکالنا یا اس خناس کا علاج کرنا بہت مشکل... تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔

"مجھے تو کچھ سنائی نہیں دے رہا۔" میں نے معصومیت سے کہا۔ "اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ میں ماکھو چاچڑ نہیں ہوں۔"

وہ گاڑیوں کے انجنوں کی آواز تھی جو مدھم ہوا کے دوش پر لحہ بہ لحہ قریب آتی محسوس ہورہی تھی۔ بلال شیدی نے سر اٹھا کر کے ان لوگوں کو پکارا جو چھت پر تعینات تھے "پنھل، خدا بخش! تم لوگوں کو کوئی گاڑی ماڑی ادھر آتی نظر آرہی ہے؟"

پنھل اور خدا بخش چھت کے کنارے پر آکر ادھر اُدھر دیکھنے لگے۔ فضا میں صرف تاروں کی مدھم روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ معلوم تھا' اس روشنی میں انہیں تیس چالیس گز سے زیادہ دور کسی چیز کا ہیولا بھی دکھائی نہیں دے سکتا تھا۔

چھت کے کنارے منڈیر تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی

چھت پر کھڑے کم از کم مجھے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک نیچے جھانکتے ہوئے بولا "نہیں سائیں! چاروں طرف کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔"

"لیکن ہوشیار رہنا۔ مجھے گاڑیوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔" اس نے ہدایت کی۔ اسی لمحے عیسیٰ خان بھی کسی طرف سے نکل آیا۔ وہ دونوں بیرونی دیوار کے قریب چلے گئے۔ مکان کی طرح یہ دیوار بھی کچی تھی لیکن دو فٹ موٹی تھی۔ اچھے بھلے مورچے کا کام دے سکتی تھی۔ میں دیکھ چکا تھا' اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوکور سوراخ بھی بنے ہوئے تھے۔ وہ یقیناً گنوں کی نالیں باہر نکالنے کے لیے تھے۔ مکان خواہ کچا تھا لیکن اس میں مورچہ بند ہوکر بیٹھا جاسکتا تھا۔

بلال شیدی اور عیسیٰ خان سامنے کی دیوار میں موجود دو الگ الگ سوراخوں سے باہر دیکھنے لگے لیکن شاید انہیں بھی کچھ نظر نہ آیا۔ پھر انہوں نے دروازے کا جائزہ لیا۔ دروازہ مضبوطی سے بند تھا اور اس پر ان کی طرف ایک بھاری بھرکم قفل لٹکا ہوا تھا۔ وہ لوٹ آئے لیکن ان کے چہروں پر خفیف سی تشویش کے آثار تھے۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ ایک خوب صورت اور پُرسکون رات تھی۔ اس سیاہ رات کی مانگ میں تاروں کی افشاں چمک رہی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی۔ میں آلودگی سے پاک اس شفاف ہوا کو سینے میں قید کرلینا چاہتا تھا جو میرے تھکے ہوئے اعصاب کو گدگدا رہی تھی۔

بلال شیدی اور عیسیٰ خان دونوں ہی سامنے کھڑے بغور میری طرف دیکھ رہے تھے۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے مچھیروں کے جال میں کوئی عجیب الخلقت چیز پھنس گئی ہو اور وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے اُلجھن کے سے عالم میں سوچ رہے ہوں کہ اس کا کیا کیا جائے' کہاں لے جایا جائے۔

گاڑیوں کے انجنوں کی آواز یکدم ہی معدوم ہوچکی تھی لیکن ان کے معدوم ہونے سے کم از کم میری اُلجھن کم نہیں ہوئی تھی۔ اچانک ہی فضا گولیوں کی گرج اور تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔ دوسرے شب کے سر سے سکوت کی چادر گویا یکدم ہی کسی نے کھینچ لی اور تار تار کرڈالی۔

پنھل اور خدا بخش جو چھت کے کنارے پر ہی کھڑے تھے' ڈال سے ٹوٹنے والے پھلوں کی طرح دھپ سے نیچے آگرے۔ ایک چت گرا اور ایک اوندھا۔ ان کی کلاشنکوفیں دور جاگریں۔ جہاں گرے' وہیں ساکت رہے۔

بلال شیدی اور عیسیٰ خان دوبارہ دوڑ کر دیوار کے سوراخوں تک پہنچے۔ انہوں نے صرف ایک سیکنڈ باہر جھانکا اور اُلٹے قدموں مڑتے ہوئے واپس آگئے۔ وہ چیخ چیخ کر اپنے آدمیوں کو بُلا رہے تھے اور انہیں پوزیشن لینے کا حکم دے رہے تھے لیکن اس کی ضرورت نہیں تھی۔

اِدھر اُدھر کمروں میں جتنے بھی لوگ تھے' گنیں اٹھائے دوڑتے ہوئے باہر آچکے تھے۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی سب گویا جھرجھری لے کر سکوت کی آغوش سے نکل آئے تھے۔ وہ تعداد میں کم تھے لیکن مکان کی اصل عمارت کے چاروں طرف پھیل کر' ایک دوسرے کے درمیان کافی فاصلہ چھوڑتے ہوئے چاردیواری کی آڑ میں ہورہے تھے۔ ہر ایک اپنی اپنی گن چوکور سوراخ سے باہر نکالتے ہوئے' اسی سے آنکھ لگا کر باہر دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ بیچ بیچ میں کوئی کوئی سوراخ خالی بھی رہ گیا تھا۔

بلال شیدی اور عیسیٰ خان نے چوبی گیٹ کے دائیں بائیں پوزیشن سنبھالی تھی۔ میرے خیال میں کوئی شخص مکان میں بیٹھا نہیں رہ گیا تھا۔ حتیٰ کہ جان محمد جو ایک مسکین سا شخص معلوم ہوتا تھا' اسے بھی میں نے کلاشنکوف اٹھائے دوڑ کر مکان کے پچھلی طرف جاتے دیکھا۔ عیسیٰ خان ہدایت کرچکا تھا کہ چھت پر کوئی نہ جائے۔

فائرنگ اسی شدت سے جاری تھی جس شدت سے اچانک شروع ہوئی تھی۔ گولیاں نیچے سے اوپر کی طرف جارہی تھیں۔ میں لائن آف فائر کی زد میں قطعاً نہیں تھا لیکن احتیاطاً میں فائرنگ شروع ہوتے ہی بینچ سے پھسل کر زمین پر پہنچ چکا تھا اور اب اکڑوں بیٹھا دیوار سے چپکا ہوا تھا۔

نواب زادی دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر آئی اور چیخ کر بولی "یہ کیا ہورہا ہے؟ کون لوگ فائرنگ کررہے ہیں؟"

"ڈاکو ہیں نواب زادی صاحبہ!" بلال شیدی نے پلٹ کر فائرنگ کے شور کے درمیان چیخ کر جواب دیا "آپ اس طرح کھلے میں کھڑی نہ ہوں۔ کمرے میں واپس چلی جائیں۔"

لیکن نواب زادی نے اس کی ہدایت کی کوئی پروا نہیں کی۔ وہ وہیں کھڑی رہی جہاں عقب سے اس پر کھلے دروازے سے روشنی پڑرہی تھی۔ وہ بہ آواز بلند بولی "مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ یہ لوگ میرا تعاقب کرتے ہوئے یہاں تک نہ آپہنچیں۔ اس سے تو اچھا تھا' میں سفر جاری رکھتی۔"

پھر اس کے لہجے میں بلا کی نفرت اور غیظ و غضب سمٹ آیا "ڈاکوؤں کی واقعی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے اور حوصلہ بھی۔ ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ ہمارے ڈیروں اور چوکیوں پر بھی حملہ کرنے لگیں گے۔ ان کی مثال ان کتوں کی سی ہوگئی ہے جو دوسروں کو ڈرانے کے لیے پالے جاتے ہیں مگر وہ مالکوں کو ہی کاٹنے لگتے ہیں۔ ان کا کچھ نہ کچھ علاج کرنا پڑے گا۔"

عیسیٰ خان نے چلّا کر حکم دیا "رکھاں! تمام بتیاں بجھادو۔ کہیں روشنی نظر نہ آئے۔"

یہ اس کی زندگی کا آخری حکم تھا کیونکہ اس کے بعد اس کے اپنے وجود سے زندگی کی روشنی رخصت ہوگئی۔ اس نے دوبارہ آنکھ سوراخ سے لگائی ہی تھی کہ ایک جھٹکے سے' چاروں خانے چت

پیچھے آن گرا۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسے یقیناً کسی نے تاک کر، نشانہ باندھ کر گولی نہیں ماری تھی۔ فائرنگ قطعی طور پر اندھادھند ہو رہی تھی۔

اس ملگجے اندھیرے میں زیادہ دور سے دیوار کے وہ چھوٹے چھوٹے چوکور سوراخ دیکھے بھی نہیں جاسکتے تھے۔ وہ یقیناً کوئی آوارہ گولی تھی جو سوراخ میں سے آئی تھی اور آنکھ کے راستے عیسٰی خان کی کھوپڑی میں بھی ایک سوراخ بناتی ہوئی گزر گئی تھی۔

بلال شیدی نے عیسٰی خان کو گرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں چیخا "عیسٰی خان...!" لیکن وہ اپنا مورچہ چھوڑ کر عیسٰی خان کے پاس نہیں آیا۔ عیسٰی خان ساکت تھا اور یہ اندازہ کرنا قطعاً مشکل نہیں تھا کہ وہ مرچکا تھا۔ ہر درد سے بے نیاز ہوچکا تھا۔

نواب زادی کی چیخ وپکار فوری طور پر ختم گئی تھی۔ وہ آگے آ کر عیسٰی خان کی لاش کا کھڑے کھڑے ہی جائزہ لینے لگی۔ اس دوران رکھاں نے بتیاں بجھانا شروع کردی تھیں۔ وہ ایک پُراسرار سائے کی طرح ایک سے دوسرے کمرے میں جارہی تھی۔

پیٹرومیکس لیمپ بھی بجھ گئے تو مکان اندھیرے میں ڈوب گیا۔ تب نواب زادی اس سوراخ پر جاکھڑی ہوئی جس پر چند لمحے پہلے تک عیسٰی خان آنکھ لگائے کھڑا تھا۔ نواب زادی چند لمحے باہر کا جائزہ لیتی رہی۔

بلال شیدی کو احساس ہوا کہ وہ عیسٰی خان کی جگہ کھڑی تھی تو وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا "آپ اندر چلی جائیں نواب زادی صاحبہ!"

"کیوں چلی جاؤں میں اندر؟" نواب زادی غرّائی "میں کوئی گائے بکری جیسی عورت تو نہیں ہوں جو مصیبت کے وقت اندر دبک کر بیٹھ جائے۔ کسی سے کہو مجھے بھی ایک گن دے دے۔"

بلال شیدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے کہے بغیر ہی کونے کی طرف سے ایک شخص آیا اور نواب زادی کو ایک کلاشنکوف تھما کر چلا گیا۔ بلال شیدی اس وقت اپنی گن کا میگزین تبدیل کررہا تھا۔

حملہ آوروں کی فائرنگ میں اب وہ شدت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے آندھی طوفان کی طرح مکان پر چڑھائی کرنے کی کوشش کی تھی لیکن یہاں سے بھرپور قوت اور شدت کے ساتھ جواب ملا تھا۔ شاید اس لیے انہوں نے پسپائی اختیار کرلی تھی اور اب وقفے وقفے سے برسٹ مار رہے تھے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ یہ سب ان کی اسٹراٹیجی ہی رہی ہو۔ شاید ان کا مقصد تیزی سے ایمونیشن ختم کرانا اور یہ اندازہ لگانا ہو کہ اندر کتنی فورس موجود ہے۔

نواب زادی نے بھی گن کی نال سوراخ سے نکال کر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی تھی۔ وہ یقیناً ایک حوصلے والی عورت تھی لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ لڑائیاں صرف حوصلے سے ہی نہیں لڑی جاسکتیں۔ حوصلہ، ہتھیار اور حکمتِ عملی۔ تینوں کا یکجا ہونا ضروری تھا۔ شاید اس کا خیال ہو کہ وہ اندھادھند فائرنگ کرکے یہ کارنامہ انجام دے رہی تھی لیکن مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ دھڑا دھڑ میگزین خالی کرنے کے سوا کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اس کے ہاتھوں شاید صرف وہی دشمن مارا جاسکتا تھا جو بے چارہ خود ہی سینہ تان کر گولیوں کی بارش کے سامنے آجاتا۔

اچانک میں نے محسوس کیا کہ اندھیرے میں کوئی اور بھی میرے قریب آن دبکا تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ اس کے بدن کی خوشبو نے پہلے ہی اس کی آمد کی خبر دے دی تھی لیکن مڑ کر دیکھنے سے تصدیق ہوگئی۔ وہ جھماں تھی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اس نے تیز سی سرگوشی میں پوچھا۔

"سنا ہے دنیا میں سارے فساد صرف زر، زن اور زمین کے لیے ہوتے ہیں۔ فی الحال صرف زر کے لیے فساد ہو رہا ہے۔" میں نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا "یہ تمہاری نواب زادی کی آمد کی برکت ہے۔ پیچھے پیچھے ڈاکو بھی سونے کی خوشبو سونگھتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔"

"اس سے پہلے تو ڈاکوؤں نے کبھی یہاں حملہ نہیں کیا۔" فکرمندانہ سے لہجے میں بولی۔

"اس سے پہلے یہاں کبھی ڈھائی تین کروڑ روپے کا سونا نہیں آیا ہوگا۔" میں نے اپنا خوشگوار لہجہ برقرار رکھا۔

"نواب زادی صاحبہ لے کر آئی ہیں؟" جھماں نے پوچھا۔ اس کے لہجے میں کوئی خاص حیرت نہیں تھی۔

"ظاہر ہے۔ میں تو اس پوزیشن میں نہیں تھا۔"

"پھر بھی... ڈاکوؤں کو یہاں حملہ کرنے کی جرأت نہیں ہونی چاہیے تھی۔ انہیں یہ تو معلوم ہوگا کہ یہ سرداروں کی جگہ ہے" وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔

"دریا جب منہ زور ہوجاتے ہیں تو کناروں کو بھی کاٹنے لگتے ہیں۔"

"تم کون ہو؟" اچانک اس نے پوچھا۔ اس نے ابھی تک جاننے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن اب خطرے کے احساس کے ساتھ گویا اس کا تجسس بھی جاگا تھا۔

"میں بے چارہ وہ گھن ہوں جو شاید چنے کے ساتھ پس جائے۔" میں نے جواب دیا۔

میں نے بات تقریباً اسی کی زبان میں کی تھی لیکن شاید اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ بدستور الجھن زدہ لہجے میں بولی "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ بلال شیدی مجھے ڈاکو سمجھ رہا ہے اور ڈاکو بھی ایسا جس نے نواب زادہ خاقان کے قتل میں حصہ لیا تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اور اگر ڈاکو یہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تو کہیں وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ کسی وجہ سے مجھ پر عتاب نازل ہوگیا ہوگا لیکن بہرحال میں سرداروں کا آدمی ہوں۔ پتا نہیں میرا انجام کیا ہوگا!"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ایک بار پھر وہی گانا سُنادو۔ ہائے اوربا نیئوں لگدا دل میرا۔"

میں نے ملگجے اندھیرے میں اس کی غزالی آنکھیں حیرت سے پھیلتے دیکھیں "یہ گانا گانے کا وقت ہے؟" اسے ضرور شبہ ہو رہا تھا کہ میرا دماغی توازن درست نہیں تھا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ اسی لیے مجھے ہاتھ پاؤں باندھ کر رکھا جارہا تھا۔

"ہاں۔ وقت تو یہ ماتم کرنے کا ہے لیکن یہ گانا بھی خاصا ماتمی سا ہے، اسی لیے میں نے سوچا...." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اب فائرنگ دونوں ہی طرف سے بہت کم ہوگئی تھی لیکن نواب زادی سمیت سبھی لوگ بدستور دیواروں سے چپکے ہوئے تھے۔

"تم سچ سچ کیوں نہیں بتاتے، تم اصل میں ہو کون؟" جھماں نے پوچھا۔

تب میں نے نہایت سادگی اور اختصار سے اسے سچ سچ بتادیا "میں ایک شریف شہری اور خاصا بڑا کاروباری آدمی ہوں۔ کچھ مجبوری ایسی آن پڑی تھی کہ بھیس بدل کر بھاگ رہا تھا۔ اچانک ہی ان لوگوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ یہ مجھے ماکھو چاچڑ سمجھ رہے ہیں جبکہ میں نے کبھی خواب میں بھی اس کی شکل نہیں دیکھی اور نہ ہی کبھی اس کا نام سُنا لیکن یہ لوگ میری بات ہی مان کر نہیں دے رہے۔"

وہ خاموش رہی تو میں نے پوچھا "تمہیں میری بات کا یقین آیا؟"

"کچھ کچھ۔" اس نے جواب دیا۔

"اچھا تو ایسا کرو، تم میرے ہاتھوں کی بندشیں کچھ کچھ کھول دو۔ یعنی تھوڑی سی ڈھیلی کردو، باقی کام میں خود کرلوں گا۔"

"نا بابا!" اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا "اگر مجھے تمہاری بات کا پورا یقین بھی ہوتا تب بھی میں یہ کام نہ کرتی۔ سرداروں کے کاموں میں دخل دینے کی ہم جیسے لوگوں میں ہمت کہاں ہے۔ تم خواہ مخواہ مجھ سے اس کام کے لیے مت کہے جاؤ۔ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے۔"

میں اس کی طرف سے بالکل مایوس ہوگیا۔ اس عورت پر قسمت آزمائی کرنا فضول تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "ویسے بھی تم رسیاں کھلوا کر کروگے کیا؟ یہاں سے تم بھاگ تو سکتے نہیں۔ چاروں طرف تو دیواروں کے ساتھ اندر یہ لوگ مورچہ لگائے کھڑے ہیں۔ اوّل تو تم دیوار ہی نہیں پھلانگ سکتے۔ کوئی فوراً ہی تمہیں دیکھ لے گا اور بطخ کی طرح مار گرائے گا۔ اگر کسی طرح باہر کھلے میں نکل بھی گئے تو اندر والوں کی نظر میں بھی آجاؤ گے اور ڈاکوؤں کی نظر میں بھی۔ تمہیں اتنی گولیاں لگیں گی کہ کچومر نکل جائے گا۔"

"اس وقت میری شکل کچھ ایسی ہے کہ میں کافی بے وقوف لگ رہا ہوں لیکن میں اتنا بے وقوف ہوں نہیں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا "مجھے اتنی بے تابی بھی نہیں ہے کہ رسیاں کھلتے ہی باہر کو بھاگنے کی کوشش کروں گا۔ میرا مطلب تھا کہ رسیاں دکھاوے کے لیے چاہے اسی طرح بندھی رہیں لیکن ان کی گرہیں کچھ ایسی ہوجائیں کہ میں خود ہی جب چاہوں کھول سکوں۔ پھر میں کوئی مناسب موقع دیکھ کر بھاگنے کی کوشش کروں گا۔"

"تمہارا ارادہ چاہے جو کچھ بھی ہے، میری طرف سے بالکل کوئی اُمید نہ رکھو۔" وہ اب بھی اپنے انکار پر قائم تھی "بلکہ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے تمہیں بھاگتے دیکھ لیا تو میں ان لوگوں کو خبردار کردوں گی۔ میری طرف سے خواہ مخواہ تسلی میں مت رہنا۔ میں پہلے سے تمہیں بتارہی ہوں کہ اگر خوش قسمتی سے تمہیں بھاگنے کا موقع مل ہی جائے تو میری طرف سے بھی ہوشیار رہنا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں اندھیرے میں بیٹھ کر میٹھی میٹھی سرگوشیاں کرکے تمہاری رازدار بن گئی ہوں۔"

"کیوں... کیا دشمنی ہے تمہیں مجھ سے جو تم ان لوگوں کو خبردار کروگی؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "میں تو اپنے دل میں تمہارے لیے محبت محسوس کررہا تھا۔"

"اپنے پاس ہی رکھو اپنی محبت۔ مجھے تمہاری محبت کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر کسی زندہ انسان کے جسم سے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اس کی چمڑی اُتاری جارہی ہو تو پھر کسی کی محبت اس کے کسی کام نہیں آسکتی، اس کی تکلیف میں کوئی کمی نہیں آسکتی۔ میں تمہیں بھاگتے دیکھ کر اس لیے ان لوگوں کو خبردار کرنے کی کوشش کروں گی کہ اگر تم بھاگنے میں کامیاب ہوگئے تو سب کا شک میری طرف ہی جائے گا۔ پانی ہمیشہ نیچی زمین کی طرف مرتا ہے اور میں یہاں کی نیچی زمین ہوں۔ ایک نیچ عورت ہوں۔"

میں نے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اتنی بھی جاہل اور موٹی عقل کی نہیں تھی جتنی میں سمجھ رہا تھا۔ میں چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ منہ پھیر کر اکڑوں ہی بیٹھے بیٹھے کھسک کر کمرے کے دروازے کی طرف جانے لگی۔

میں گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ فائرنگ اب تقریباً بند ہوچکی تھی۔ وقفے وقفے سے دونوں طرف سے ایک آدھ برسٹ مارا جارہا تھا۔ دھیرے دھیرے چلتا میں عیسٰی خان کی لاش کے قریب سے گزر کر ایک روزن کی طرف بڑھا جس پر کوئی موجود نہیں تھا۔ اب شاید صرف ایک دوسرے کو اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے گولیاں چلائی جارہی تھیں۔

میں نے روزن سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ ستاروں کی برائے نام روشنی میں نظر جہاں تک کام کررہی تھی، وہاں تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ کوئی لاش بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی جبکہ کچھ دیر پہلے فائرنگ کی آواز سے اندازہ ہوا تھا کہ وہ لوگ کافی قریب آگئے تھے۔

جس وقت میں نے گاڑیوں کی آواز سُنی تھی اس وقت وہ لوگ یقیناً کافی دور، پہاڑیوں سے پیچھے تھے لیکن انہوں نے گاڑیاں یقیناً

وہیں چھوڑ دی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے باقی فاصلہ نہایت تیزی سے پیدل ہی طے کیا تھا کیونکہ اس کے بعد کسی گاڑی کی آواز سنائی نہیں دی تھی اور فائرنگ بہت جلد شروع ہو گئی تھی۔

چھت پر موجود محافظوں کو بھی یقیناً انہوں نے دور سے دیکھ لیا تھا' اسی لیے خاموشی سے آکر مکان کی چار دیواری پر چڑھنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ پہلے انہیں ہی مار گرایا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ انہوں نے سینے کے بل لیٹ کر فائرنگ کی تھی اور اگر ان کا کوئی ساتھی مرا بھی تھا تو وہ اس کی لاش گھسیٹتے ہوئے پیچھے ہی لے گئے تھے۔

میرا یہ بھی اندازہ تھا کہ وہ صرف سامنے کی طرف سے آئے تھے لیکن ان لوگوں نے بوکھلاہٹ میں یا پھر شاید بہتر دفاع کے خیال سے چاروں طرف سے فائر کھول کر بے تحاشا میگزین ضائع کیے تھے۔

"میرا خیال ہے وہ لوگ بھاگ گئے۔" نواب زادی نے قدرے فاتحانہ لہجے میں اعلان کیا۔

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" بلال شیدی نے محتاط لہجے میں جواب دیا۔

بلال شیدی یقیناً ان معاملات کی زیادہ سمجھ بوجھ رکھتا تھا' اس لیے خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہوا تھا۔ میرا بھی یہی خیال تھا کہ جو ڈاکو اتنا طویل تعاقب کر کے یہاں تک پہنچے تھے وہ اتنی آسانی سے فرار ہونے والے نہیں تھے۔ انہیں فرار ہونے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ چاہتے تو چاروں طرف پھیلی ہوئی پہاڑیوں کے پیچھے جاکر' ان پر چڑھ کر مکان کے گرد گھیرا ڈال کر بیٹھ سکتے تھے۔

کھلے میں ہونے کے باوجود انہیں بالادستی حاصل رہتی۔ مکان میں موجود لوگ محصور ہو کر رہ جاتے' وہ صرف اپنا دفاع کر سکتے تھے۔ بلکہ ڈاکو اگر پہاڑیوں پر چڑھ جاتے اور ان کے پاس دور مار رائفلیں ہوتیں تو مکان والوں کے لیے اپنا دفاع بھی مشکل ہو جاتا کیونکہ ڈاکو بلندی پر ہوتے اور مکان کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ چاروں طرف سے کھلا دکھائی دیتا تھا۔

آخر کار گنیں خاموش ہو گئیں لیکن بلال شیدی اور اس کے ساتھی دیواروں سے پیچھے نہیں ہٹے۔ نواب زادی البتہ جلد ہی اس خاموشی سے شاید اکتا گئی یا پھر اسے اپنے شوہر کا خیال آگیا۔ وہ کمرے میں واپس چلی گئی۔ چند لمحے بعد اس نے بتی بھی جلا لی۔ گو کہ اس نے کھڑکی اور دروازہ بند کر لیا تھا لیکن ریخوں اور روزنوں سے بہرحال روشنی باہر آرہی تھی۔ بلال شیدی نے گردن گھما کر ناگواری سے کمرے کی طرف دیکھا لیکن شاید اس میں نواب زادی کو منع کرنے کی جرأت نہیں تھی۔

پھر نواب زادی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی تو ایک لمحے کے لیے اچھی خاصی روشنی پھیل گئی۔ بلال شیدی ایک بار پھر ناگواری سے پیچھے دیکھ کر رہ گیا۔ نواب زادی نے دروازہ بند کر دیا اور اس کمرے کی طرف چلی گئی جس میں غالباً رکھاں اس کے بچوں کو سنبھالے بیٹھی تھی۔ ان حالات میں بچوں کی نہ جانے کیا کیفیت تھی۔

کچھ دیر بعد بلال شیدی نے اپنے کچھ ساتھیوں کو پوزیشن سنبھالے رکھنے کا حکم دیا اور کچھ کا نام لے کر انہیں پیچھے آنے کی ہدایت کی۔ چار آدمی سامنے والے صحن میں اس کے پاس آن پہنچے اور وہ سب مل کر تینوں لاشوں کا جائزہ لینے لگے۔ وہ غالباً یہ دیکھ رہے تھے کہ کسی میں زندگی کے کوئی آثار تو نہیں حالانکہ یہ تو دور سے ہی اس برائے نام روشنی میں بھی اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں زندگی کی کوئی رمق نہیں تھی۔

وہ ان لاشوں کو اٹھا کر پیچھے شاید کسی کمرے میں لے جانے لگے۔ جب بلال شیدی ایک ساتھی کی مدد سے عیسیٰ خان کی لاش اٹھائے میرے سامنے سے گزرا تو میں نے اس کے کھردرے' سیاہ رخساروں پر آنسوؤں کی چمک دیکھی۔ گو کہ اس کے رخساروں کا بہت کم حصہ بالوں سے خالی تھا لیکن جتنا بھی تھا وہ آنسوؤں سے تر تھا۔ میرا خیال تھا کہ عیسیٰ خان سے تمام ترنوک جھونک کے باوجود اس کی گہری دوستی تھی۔

سنگلاخ وادیوں میں بھٹکتے بھٹکتے خواہ دل بھی پتھرا سے گئے ہوں تب بھی اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہنستے بولتے ہمدم دیرینہ کو چٹ سے گر کر مرتے دیکھنا ایک کڑی آزمائش تھی۔ پتھریلے دلوں میں بھی ایک بار تو زلزلہ سا آجاتا تھا۔ یہ ستم انگیز تماشا میں نے زندگی میں کئی بار دیکھا تھا۔

اس کے بعد پوری رات کوئی فائر نہیں ہوا لیکن وقت ایک عجیب کشمکش' کشیدگی اور ہیجان میں گزرا۔ کوئی بھی سو نہ سکا۔ بلکہ سونے کا تو خیر ذکر ہی کیا' کوئی کمر سیدھی کرنے کی غرض سے چند منٹ کے لیے لیٹ بھی نہ سکا۔ گو کہ اس دوران باہر سے ایک گولی بھی نہیں آئی تھی اور چاروں طرف گہرا سکوت طاری رہا تھا لیکن کوئی مکان سے نکلنے کی ہمت نہیں کر سکا تھا۔ سب باری باری دیواروں سے لگ لگ کر ادھر سے اُدھر پھرتے رہے۔ ہر ایک کے ذہن پر غالباً اسی سوال کا بوجھ تھا کہ نہ جانے اب کیا ہونے والا تھا؟

کوئی اس آزمائش کے لیے بھی مکان سے نہ نکلا کہ ڈاکو اب بھی باہر کہیں موجود تھے یا فرار ہو گئے تھے۔ میری طرح غالباً سبھی کو لاشعوری طور پر اندیشہ تھا کہ وہ فرار نہیں ہوئے تھے۔

سپیدۂ سحر نمودار ہونے سے ذرا پہلے نواب زادی نے بلال شیدی کو کمرے میں بلایا۔ دوسرے دو تین آدمی پہلے ہی سے کمرے میں موجود تھے۔ میں بھی چپکے سے اندر رینگ گیا۔

نواب زادی اس وقت بڑی سی چارپائی پر نواب زادہ حشام کے قریب ہی آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں نمی اور چہرے پر تلاطم تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ چٹان سے تراشی گئی وہ عورت شاید پہلی بار چٹخنے لگی تھی۔ اس کی وجہ سمجھنا مشکل نہیں

چادر سے باہر نواب زادہ حشام کا صرف چہرہ دکھائی دے رہا تھا ...وہ بُری طرح سوج چکا تھا۔ اس پر نیلاہٹ غالب تھی۔ اب تو ...کی شکل ہی پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ چہرہ ایک نیلی فٹ بال سے ...بہ ہو گیا تھا۔ آنکھیں' ناک اور منہ ورم میں تقریباً چھپ چکا ...معلوم نہیں باقی جسم کا کیا حال تھا۔

"بلال۔! ذرا نواب زادہ صاحب کی حالت تو دیکھو" پہلی ہی ...یں نے نواب زادی کے لہجے میں ارتعاش بھی محسوس کیا "ان ...لیے کچھ کرو پلیز!"

بلال نے ایک متاسفانہ سی سانس لے کر نواب زادہ کے جسم ...چادر ہٹائی۔ ورم سے اس کے جسم کا بھی وہی حال تھا۔ اس کی ...اور ٹانگ پر پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں لیکن ورم کے باعث وہ گویا ...ت میں دھنس کر رہ گئی تھیں اور خون میں رنگین ہونے کے ...شک ہو چکی تھیں۔ شاید اب نواب زادہ کے جسم میں خون ہی ...رہ گیا تھا جو رس سکتا۔

بلال نے سب سے پہلے اس کی پٹیاں ڈھیلی کیں پھر اس کا ...ہ کیا اور مایوس سے انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "وہی ہوا ...کا مجھے ڈر تھا۔ انفیکشن بہت بُری طرح پھیل گئی ہے اور جسم ...ون بھی نہیں رہا۔ پنسلین کا ایک آدھ انجکشن باقی ہے' وہ ...ا رہا ہوں۔"

"جلدی سے لگاؤ" نواب زادی لرزتی آواز میں بولی۔

بلال شیدی دواؤں کے کارٹن سے انجکشن نکالتے ہوئے بولا ...لگتا ہے اب پنسلین بھی نچلے دھڑ میں گنگرین بننے کے عمل ...ں روک سکتی۔"

میرے خیال میں تو گنگرین کی نوبت آنے سے پہلے ہی نواب ...ل زندگی کا چراغ بجھنے والا تھا۔ سانسوں کی آمد و رفت تقریباً ...ہی لگ رہی تھی لیکن جب تک سانس تب تک آس' جیسے ...کا صحیح مفہوم ایسے ہی موقعوں پر سمجھ میں آتا ہے۔ نواب ...کچھ ایسی متوحش مگر پُرامید نظروں سے بلال کو ڈسٹلڈ واٹر اور ...ن کا پاؤڈر ملا کر انجکشن تیار کرتے دیکھ رہی تھی جیسے اسی پر ...زادہ کی زندگی کا انحصار تھا اور اس کے لگاتے ہی کوئی معجزہ ...ہونے والا تھا۔

...ہر اس کا دھیان جیسے یکدم نیم بند کھڑکی اور دروازے کی ...لیا۔ وہ برہمی سے بولی "دروازہ اور کھڑکی تو کھول دو۔ صبح ...ہے' تازہ ہوا کا کوئی جھونکا اندر آنے دو۔"

...یک لمحے کے لیے وہ گویا ڈاکوؤں کو بھول گئی تھی اور یہ بھی ...تھی کہ رات کس طرح کٹی تھی۔ ایک شخص نے سعادت ...سے پیچھے ہٹ کر پہلے دروازہ اور پھر کھڑکی کھول دی۔

...رکی کھلتے ہی تازہ ہوا سے پہلے گولیاں اندر آئیں!

...ر کہیں فائروں کی تڑتڑاہٹ گونجی اور اس کی بازگشت گویا کمرے میں سُنائی دی۔ کھڑکی کھول کر پلٹنے والا شخص اپنی کلاشنکوف سمیت کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گرا اور ایک طرف کو لڑھک گیا۔

بلال شیدی خود بال بال بچا۔ اس نے فوراً اپنے آپ کو چٹائی پر گرا دیا۔ انجکشن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نہ جانے کہاں گیا۔

نواب زادی نے بھی خاصی بوکھلاہٹ کے سے عالم میں چارپائی سے چھلانگ لگائی اور کچے فرش پر گری۔ دوسرے ہی لمحے وہ کیچڑ میں لتھڑ گئی کیونکہ کمرے میں رکھے ہوئے بڑے بڑے لمبوترے گھڑے گولیوں سے ٹوٹ گئے تھے اور پانی بہل بہل کر کے بڑے سے کمرے کے کچے فرش پر پھیل گیا تھا۔

کمرے میں میرے' بلال شیدی اور نواب زادی کے علاوہ تین افراد موجود تھے جن میں سے ایک کو گولی چاٹ گئی تھی۔ باقی دو فوراً فرش پر لیٹ گئے تھے اور اپنی کلاشنکوفیں گرفت میں لینے کے بعد انہیں سیدھی کر رہے تھے۔ بلال شیدی نے اپنی کلاشنکوف چارپائی کے سہارے کھڑی کی تھی' وہ بھی دھیرے دھیرے اس کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا۔

قدرت نے ایک عجیب تماشا یہ بھی دکھایا تھا کہ کئی گولیاں اس چارپائی پر سے گزر گئی تھیں جس پر نواب زادہ حشام لیٹا زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا لیکن کوئی گولی اسے نہیں لگی تھی حالانکہ وہ کھڑکی کی سیدھ میں تھا۔ شاید کوئی گولی اسے زندگی کی اذیت سے نجات دلانے کی سزاوار بننا نہیں چاہتی تھی۔

میں اسی دیوار کی آڑ میں تھا جس میں بڑی سی کھڑکی تھی۔ میں محفوظ ہی تھا پھر بھی احتیاطاً اکڑوں بیٹھ گیا۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا تھا۔ ڈاکو پہاڑوں کے عقب میں جاکر اوپر چڑھ گئے تھے اور تمام رات انہوں نے نہایت صبر و سکون سے دن کا اجالا پھیلنے کا انتظار کیا تھا۔

ان کے پاس دور مار رائفلیں بھی تھیں۔ اب انہوں نے فائرنگ انہی رائفلوں سے کی تھی۔ ہم سب اب کافی بُری پوزیشن میں تھے۔ مکان اب گویا ڈاکوؤں کے سامنے طشتری میں رکھا ہوا تھا۔ بس کمروں کے اندر جہاں جہاں دیواروں کی آڑ میسر تھی وہی جگہ محفوظ تھی۔ جہاں بھی کسی کھلی جگہ میں یا کھڑکی دروازے کے سامنے کوئی ذرا سی بھی حرکت کرتا دکھائی دیتا' وہ گولی کا نشانہ بن سکتا تھا۔ یہاں چار آدمی مر چکے تھے' ایک پہلے ہی سے دم توڑ رہا تھا۔ ایک کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور وہ کب سے بے بسی کی اذیت میں مبتلا تھا۔

بلال شیدی نے کھڑکی کے راستے برسٹ مار کر فائرنگ کا جواب دیا۔ جو تین چار آدمی بیرونی چار دیواری سے چمٹے ہوئے تھے' وہ بھی کافی حد تک محفوظ تھے لیکن اگر وہ احاطہ عبور کر کے کمروں کی طرف آنے کی کوشش کرتے تو ان کا بھی اللہ ہی حافظ تھا۔

انہوں نے بھی جواباً برسٹ مارے۔ اس کے جواب میں مزید بہت سے فائر ہوئے لیکن اس بار نشانہ شاید دوسرے کمروں کی

کھڑکیاں تھیں۔ کسی کمرے سے چیخ سی سُنائی دی۔ چیخ نسوانی معلوم ہوتی تھی‘ شاید کچھ اور کھڑے بھی ٹوٹے تھے۔

مکان کا محل وقوع اس لحاظ سے بہت ہی خراب تھا کہ تقریباً چاروں طرف سے وہ پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا لیکن اس سے پہلے یہ خصوصیت ایک عیب کی طرح اس لیے محسوس نہیں کی جاسکی ہوگی کہ اس سے پہلے شاید یہاں قیام کرنے والوں کو اس قسم کی صورت حال سے پالا ہی نہیں پڑا تھا۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا "آپ لوگ خواہ مخواہ بچے کھچے میگزین ضائع کررہے ہیں۔ اب کلاشنکوفوں کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر آپ لوگوں کے پاس لانگ رینج رائفلز ہیں تو وہ استعمال کریں جس طرح ڈاکو استعمال کررہے ہیں۔"

"ہمیں لڑنا مت سکھاؤ۔" بلال شیدی میری طرف گردن گھما کر خونخوار لہجے میں بولا "ہمارے پاس دور مار رائفلیں ہوتیں تو اب تک ہم نکال چکے ہوتے۔"

کلاشنکوف کی ہلاکت آفرینی کے باعث اس قسم کے لوگوں کا اس پر انحصار اتنا بڑھ گیا تھا کہ ہر طرح کے حالات میں وہ اسی کو کافی سمجھتے تھے اور اس کی موجودگی میں خود کو محفوظ محسوس کرتے تھے لیکن کبھی کبھی ایسی صورتِ حال سے بھی واسطہ پڑ سکتا تھا جب رینج زیادہ نہ ہونے کی وجہ سے کلاشنکوف کا کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔

جس طرح کے مکان میں‘ جس طریقے سے ہم محصور ہوچکے تھے‘ دور مار رائفلوں کی عدم موجودگی میں ہمارا انجام کچھ خوشگوار دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

رات میرے ساتھ بلال شیدی کے رویّے میں ملائمت کی جو جھلک دکھائی دی تھی‘ اب اس کا کہیں دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اپنے ساتھیوں... خصوصاً عیسیٰ خان کی موت... رات بھر کی بیداری اور صورتِ حال کی سنگینی کے احساس سے اس کے اعصاب یقیناً خشک ٹہنیوں کی طرح چٹخ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ کشیدگی اور کھنچاؤ سے اس کا کھردرا چہرہ کچھ اور کھردرا دکھائی دے رہا تھا۔

نواب زادی تو یقیناً حسین عورتوں میں سے تھی لیکن انہی سب وجوہات کی بنا پر اس وقت اس کا چہرہ بھی بُری طرح کھنچ کر رہ گیا تھا اور وحشت زدگی کے عالم میں عجیب دکھائی دے رہا تھا۔

میری آواز سُن کر نواب زادی کو گویا پہلی بار میری موجودگی کا احساس ہوا۔ وہ چٹائی پر آچکی تھی اور اپنے ہاتھوں سے کیچڑ پونچھ رہی تھی۔ پانی کچّے فرش میں تقریباً جذب ہوچکا تھا۔ اس کی نظر میرے پیروں کی بندشوں پر پڑی اور اسے یہ اندازہ بھی ہوگیا کہ میرے ہاتھ پُشت پر بندھے ہوئے تھے۔

"یہ کون ہے؟" وہ ناگواری سے بولی۔

"قیدی" بلال شیدی نے جواب دیا "ہم اسے بڑے نواب صاحب کے سامنے پیش کرنے کے لیے جارہے تھے۔ راستے میں ایک رات کے لیے یہاں رُکے تھے۔"

"تو یہ اس طرح اِدھر اُدھر کیوں پھر رہا ہے؟ تم نے ا
خانے میں کیوں نہیں ڈالا؟" نواب زادی نے برہمی سے
حالات خواہ کچھ بھی تھے‘ اس کی نخوت‘ اس کا تحکمانہ اندا
کا مجموعی مزاج اب بھی دھیما نہیں پڑا تھا۔

"موقع ہی نہیں ملا جی... ویسے بھی ہر کوٹھری میں قید
ہے۔" بلال شیدی نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں پھر بھی ٹھونس دیتے کسی کوٹھری میں۔
اس طرح تو اِدھر اُدھر نہیں پھرنا چاہیے نا۔" نواب زادی
برقرار رہی۔

"اچھا جی... دیکھتے ہیں۔ اب موقع ملا تو ڈال دیں گے
میں۔" میں نے محسوس کیا‘ بلال کا لہجہ اب بھی سپاٹ تھا
میں نے پکا بندوبست کیا ہوا ہے۔ یہ کہیں بھاگ نہیں سکتا
کچھ کرسکتا ہے۔"

"ویسے اگر آپ کے پاس ایک بھی دور مار رائفل ہ
آپ میرے ہاتھ کھولنا پسند کرتے تو میں ان ڈاکوؤں سے
میں آپ کا تھوڑا بہت ہاتھ بٹا سکتا تھا۔" میں نے مؤدبانہ
کہا۔

"ہاں... یہی مدد کرتے کہ رائفل کا سہارا لے کر بھا
جاتے اور ڈاکوؤں سے مل جاتے۔ آخر وہ تمہاری برادری
ہیں۔" بلال شیدی غُرایا۔

"یہ ڈاکو ہے؟" نواب زادی بے یقینی سے چلائی۔

"شہادتیں تو یہی بتاتی ہیں نواب زادی صاحب! ہمیں
کہ یہ ماکھو چانچڑ ہے اور اس نے نواب زادہ خاقان صا
قتل میں حصہ لیا تھا۔" بلال شیدی آخرکار اپنا یہ منحوس
کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"تو پھر اس کو زندہ کس لیے رکھا ہوا ہے؟" نواب
آنکھیں نکالیں "اور یہ اتنے مزے سے اِدھر اُدھر گھ
ہے؟ اسے کسی درخت سے لٹکا کر پھانسی کیوں نہیں دی
تک؟"

"اس کا فیصلہ بڑے نواب صاحب خود کریں گے۔
اختیار نہیں ہے۔ ان کا حکم تھا کہ اگر یہ زندہ ہاتھ آجا
زندہ ہی ان کی خدمت میں پیش کیا جائے۔" بلال
جواب دیا۔

میں نے افسردہ سی نظروں سے نواب زادی کی طر
شُستہ انگریزی میں کہا "آپ جیسی پڑھی لکھی خاتون
مجھے اس قسم کی بات سُننے کی توقع نہیں تھی۔ آپ نے
اور امریکا وغیرہ میں تعلیم پائی ہوگی اور زندگی کے بہت
وہاں گزارے ہوں گے لیکن بات آپ نے زمانۂ غار
والی کی ہے۔ کسی بے گناہ انسان کو درخت سے لٹکا کر

مہذب یا انصاف پسند انسانوں کا کام تو نہیں۔ قبائلی زندگی کی بھی کچھ روایات ہوتی ہیں۔ میرا خیال ہے صفائی پیش کرنے کا موقع تو وہاں بھی دیا جاتا ہوگا۔"

"انگریزی بول کر ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش مت کرو۔" نواب زادی بھی تیزی سے انگریزی میں ہی بولی "ہمیں معلوم ہے۔ ڈکیتی کو ایک منافع بخش انڈسٹری یا ٹریڈ سمجھ کر بہت سے پڑھے لکھے نوجوان بھی ڈاکوؤں کے گروہوں میں شامل ہوگئے ہیں بلکہ اندرونِ سندھ کے تو کسی علاقے میں‘ سُنا ہے ایک ایسے ڈاکو نے بھی اپنا گروہ بنا رکھا ہے جو امریکا سے ایم ایس سی کرکے آیا ہوا ہے۔ ان لوگوں کے پاس پولیس‘ رینجرز اور فوج تک کی وردیاں ہیں‘ سرکاری گاڑیوں کی نمبر پلیٹیں بھی ہیں۔ وہ بڑے سائنٹیفک انداز میں ڈاکے بھی ڈال رہے ہیں اور کروڑوں روپے تاوان بھی وصول کررہے ہیں۔ اس لیے یہ مت سمجھنا کہ تمہیں انگریزی بولتے سُن کر ہم تمہیں ڈاکو کے بجائے کچھ اور سمجھ لیں گے۔"

یہاں تو بھی کا معاملہ ‘مرغے کی ایک ٹانگ‘ والا تھا۔ دل میں ایک عجیب سی اُداسی اور جھنجلاہٹ کی لہر محسوس کرتے ہوئے میں نے خاموش ہوجانا ہی بہتر سمجھا لیکن نواب زادی کی برہمی اس پر بھی کم نہ ہوئی۔ بلال شیدی کی طرف دیکھ کر بولی "تمہارے اس قیدی کی زبان بہت لمبی معلوم ہوتی ہے۔ ذرا ان ڈاکوؤں سے نمٹ لیں‘ پھر اس کی زبان بھی کاٹ کر چیل کوؤں کو ڈالیں گے۔ اُمید ہے بڑے نواب صاحب اپنے قیدی کی صرف زبان کم دیکھ کر بُرا نہیں منائیں گے۔ اس طرح وہ اس کی جھوٹی صفائی سننے سے بھی بچ جائیں گے۔"

بلال شیدی کو کوئی جواب دینے کا موقع نہیں ملا‘ کیونکہ اسی اثنا میں گولیوں کی ایک اور بوچھاڑ آئی۔ گولیاں نواب زادہ حشام کے جسم پر پڑی چادر کو تقریباً چھوتی ہوئی گزریں۔ کچھ فائر غالباً کسی دوسرے کمرے کی کھڑکی پر بھی کیے گئے تھے۔

نواب زادی کی توجہ میری طرف سے ہٹ گئی اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ وہ بلال شیدی سے مخاطب ہوئی "نواب زادہ صاحب گولیوں کی زد میں ہیں۔ کیا ہم کسی طرح اس چارپائی کو گھسیٹ کر اس کھڑکی کے قریب نہیں لاسکتے؟"

اس نے اس کھڑکی کی طرف اشارہ کیا جس سے گولیاں اندر آرہی تھیں۔ اگر چارپائی کو گھسیٹ کر اسی کھڑکی کے نیچے لاکر دیوار کے ساتھ لگادیا جاتا تو نواب زادہ واقعی گولیوں کی زد میں آنے سے بچ سکتا تھا۔

"کوشش کرکے دیکھتے ہیں۔" بلال شیدی نے جواب دیا اور اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ مسئلہ یہ تھا کہ کوئی بھی کمرے میں سیدھا کھڑا ہونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ فرش پر کیچڑ سا ہوچکا تھا۔ چارپائی بہت بڑی اور بھاری بھرکم تھی۔ اس پر ایک لمبا چوڑا انسانی جسم بھی پڑا تھا جسے تقریباً لاش ہی سمجھنا چاہیے تھا۔

اس کے باوجود انہوں نے گھٹنوں ہی کے بل رہتے ہوئے کلاشنکوفیں چٹائی پر رکھ کر چارپائی کا ایک ایک پایہ پکڑا اور اسے کھڑکی کی طرف کھینچنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب انہیں کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی تو چوتھا پایہ خود نواب زادی نے پکڑلیا اور وہ بھی زور لگانے لگی۔ اس کا چاندنی سا چہرہ ڈوبتے سورج کی طرح شفق رنگ ہوکر دہکنے لگا۔

نواب زادہ حشام کی زندگی کا کمزور تار کسی بھی لمحے ٹوٹنے والا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کس موہوم اُمید کے سہارے اسے فائرنگ سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

قیدی ہونے کا مجھے کم از کم یہ فائدہ ضرور تھا کہ ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے میں آرام سے ایک طرف بیٹھا تھا۔ مجھے اس سعیٔ رائیگاں میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں پڑرہی تھی۔

آخرکار وہ چارپائی کو کھڑکی کے نیچے لانے اور دیوار کے ساتھ لگانے میں کامیاب ہوگئے۔ ان کے کپڑے کیچڑ میں لتھڑ گئے تھے۔ نواب زادی کا برقعے جیسا سیاہ گاؤن بھی کیچڑ میں لتھڑ کر کسی اور ہی رنگ کا دکھائی دینے لگا۔ اس نے چٹائی پر بیٹھ کر اسے اُتار دیا۔ نیچے وہ جدید ترین فیشن کا لباس پہنے ہوئے تھی مگر اس وقت اس کی بھی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔

بلال شیدی اور اس کے دونوں آدمیوں نے اپنی کلاشنکوفیں اُٹھالیں۔ ان میں سے ایک نے کھڑکی کے نیچے ہی رہتے ہوئے نہایت محتاط انداز میں ہاتھ اونچا کرکے قدیم ساخت کی اس کھڑکی کے پٹ بند کیے لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ دوسرے ہی لمحے ان پر اتنی گولیاں برسیں کہ دونوں پٹوں کے پرخچے اُڑ گئے۔

لکڑی کے کچھ ٹکڑے نواب زادہ حشام پر بھی گرے مگر وہ بے چارہ دنیا و مافیہا سے بے خبر پڑا تھا۔ وہ بے ہوشی کی حالت میں دھیرے دھیرے موت کی آغوش میں اُتر رہا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا

کہ اس کے اردگرد کچھ لوگ بقا کی جنگ میں مصروف تھے۔

اچانک کمرے کا دروازہ نہایت آہستگی سے تھوڑا سا کھلا۔ روشنی اندر آئی تو بلال شیدی ہڑبڑا کر مڑا لیکن پھر ہولے سے غرا کر رہ گیا۔ وہ چھیماں تھی جو گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل چوپائے کی طرح چلتی ہوئی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ اندر گھستے ہی اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔

اس کی آنکھوں میں نمی بھی تھی اور وحشت بھی۔ نواب زادی کی طرف دیکھتے ہوئے وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی "جی... وہ رکھاں مر گئی ہے۔ اسے گولی لگ گئی ہے۔"

"تو پھر بچّوں کے پاس کون ہے؟" نواب زادی نے دیوار کی آڑ لے کر بے تابی سے اٹھتے ہوئے پوچھا۔ اس نے رکھاں کی موت کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا۔ وہ دوسرے کمرے میں نواب زادی کے بچّوں کو سنبھالے ہوئے تھی۔

"اس وقت تو کوئی نہیں ہے جی۔" چھیماں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

نواب زادی دروازے کی طرف لپکنے کے لیے ذرا جھکی لیکن بلال شیدی خلافِ توقع سخت لہجے میں بولا "آپ کمرے سے مت نکلیے گا نواب زادی صاحبہ! ہم اس وقت بہت خطرناک پوزیشن میں ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہم بڑے نواب صاحب کے سامنے جواب دہ ہوں گے۔"

"لیکن میرے بچّے... وہ اکیلے ڈر رہے ہوں گے۔" نواب زادی نے ایک نظر دروازے کی طرف اور ایک نظر اپنے شوہر کے نیلے چہرے کی طرف دیکھا۔

"چھیماں سنبھال لے گی بچّوں کو۔" بلال شیدی بدستور سخت لہجے میں بولا۔

"میں اسی کی اجازت لینے آئی تھی۔" چھیماں ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی "بڑی مشکل سے دیوار سے چپک کر رینگتی ہوئی آئی ہوں۔"

"اجازت لینے؟ کیا مطلب؟" نواب زادی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

چھیماں سر جھکا کر بولی "وہ جی۔ بچّوں کو سنبھالنے میں مجھے ان کو چھونا بھی پڑے گا۔ ہاتھ واتھ تو لگانا ہی پڑے گا نا۔ اور میں... میرا مطلب ہے... میں ایک گندی عورت..." اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کے لہجے میں طنز کی رمق بھی نہیں تھی لیکن کسی صاحبِ دل کے لیے اس کی بات چھری کی طرح دل میں اُتر جانے والی تھی۔

مگر نواب زادی نے اس پر کوئی خفت یا ندامت محسوس نہیں کی۔ اگر محسوس کی بھی تھی تو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ غصیلے انداز میں ہاتھ ہلا کر بولی "ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ جلدی جاؤ۔ ہاتھ لگ گیا تو کوئی بات نہیں۔ ہم تمہیں معاف کر دیں گے۔"

"جیسے آپ کا حکم" چھیماں نے ہاتھ جوڑ دیے پھر چوپایوں کی طرح واپس جانے کے لیے چاروں ہاتھ پیروں پر جھک گئی۔

گیلا فرش دیکھ کر اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ بلال شیدی کی طرف مڑتے ہوئے بولی "یہاں کے گھڑے بھی ٹوٹ گئے۔ جو باورچی خانے میں رکھے تھے وہ بھی ٹوٹ گئے۔ دو گھڑے باہر رکھے تھے وہ بھی ٹوٹ گئے۔"

"یہ مجھے کیوں بتا رہی ہے؟" بلال غرایا۔

"ویسے ہی بتا رہی ہوں۔ ذرا یاد رکھنا کہ اب پورے مکان میں پینے کے لیے پانی کی ایک بوند بھی نہیں ہے۔" چھیماں دھیمے لہجے میں بولی۔

"اوہ!" بلال شیدی کے ہونٹ سکڑ گئے۔ اب اسے احساس ہوا تھا کہ یہ ایک سنگین خبر تھی۔ اس صحرائی سے علاقے میں پانی کا ختم ہو جانا کوئی معمولی مسئلہ نہیں تھا۔ خصوصاً جبکہ اردگرد ڈاکو گھیرا ڈالے بیٹھے ہوں۔

نواب زادی ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولی "مجھے تو پہلے ہی پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے کل شام سے کچھ کھایا پیا نہیں۔" اس کی آواز بھی گلے میں پھنسنے لگی تھی۔

اسے واقعی اپنے شوہر کی حالت کی وجہ سے کھانے پینے کا ہوش نہیں تھا اور اب پانی ضائع ہو جانے کی خبر سُن کر پیاس کا جاگ اُٹھنا کوئی حیرت کی بات نہیں تھی ـــ ویسے بھی انسانی فطرت کچھ عجیب سی ہے۔ کوئی چیز انسان کے پاس ڈھیروں پڑی رہے تو اس کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی لیکن جونہی احساس ہو کہ وہ ختم ہو گئی ہے، اس کی ضرورت کا احساس شدت سے جاگ اُٹھتا ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ عموماً وہ غریب آدمی جس کے گھر میں کھانے کو کچھ نہیں ہوتا، اس کے بچّوں کو عام بچّوں کی نسبت زیادہ بھوک لگتی ہے۔ گھر میں جو چیز موجود نہیں ہوتی شاید لاشعوری طور پر چھوٹوں کو بھی اس کی طلب زیادہ رہتی ہے۔ جن لوگوں کے گھر دن میں کچن اور فریج کھانے پینے کی چیزوں سے بھرے رہتے ہیں، وہ خود اپنے یا اپنے بچّوں کے بارے میں شکایت کرتے پائے جاتے ہیں کہ ان سے تو کچھ کھایا ہی نہیں جاتا۔ شاید ہر چیز کی فراوانی دیکھ کر طبیعت سیری رہتی ہے۔

خود مجھے بھی پانی ختم ہو جانے کی خبر سُن کر ہلکی سی پیاس محسوس ہونے لگی تھی۔ گزشتہ رات نواب زادی کے آنے سے پہلے کھانے پینے اور گانے بجانے کا جو خوب صورت دور چلا تھا اس کے بعد سے میں نے بھی پانی نہیں پیا تھا لیکن بلال شیدی فی الحال گویا اس خبر کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا۔ ہاتھ ہلا کر بولا "ہو جائے گا... ہو جائے گا پانی کا بندوبست۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکو یہاں زندگی بھر تو گھیرا ڈال کر نہیں بیٹھے رہیں گے۔ جاؤ تم بچّوں کو سنبھالو۔"

چھیماں نے دروازہ تھوڑا سا کھولا اور ایک لمحے انتظار کیا، جب کوئی فائر نہ ہوا تو وہ دھیرے سے باہر رینگ گئی۔ نواب زادی نے بلال شیدی سے پوچھا "یہاں پانی کہاں سے آتا ہے؟ کس طرح آتا ہے؟"

جو لوگ صرف حکم دیتے ہیں اور ہر چیز ان کے سامنے حاضر کر دی جاتی ہے انہیں اکثر علم ہی نہیں ہوتا کہ کون سی چیز کہاں سے اور کس طرح آتی ہے۔

بلال بولا "جن پہاڑیوں کے اوپر ڈاکو چڑھے بیٹھے ہیں، انہی میں سے ایک پہاڑی سے ذرا ادھر ہی نشیب میں صاف اور میٹھے پانی کا ایک چشمہ ہے۔ جان محمد اور دوسرے دو ایک نوکر جو یہاں رہتے ہیں وہ کندھوں پر کنستر لٹکا کر بھر بھر کر لاتے رہتے ہیں۔"

"تمہیں اس سے بہتر کوئی بندوبست رکھنا چاہیے تھا۔" نواب زادی کا انداز ہلکی سی ڈانٹ پلانے کا تھا "اس مرتبہ بڑے نواب صاحب کے پاس جاؤ گے تو انتظامات کر کے آنا۔ چشمے سے یہاں تک پائپ لائن ڈلواؤ اور یہاں ڈیزل یا پیٹرول سے چلنے والا کوئی پمپ وغیرہ فٹ کراؤ۔"

میں نے بلال شیدی کے عُنّابی سے ہونٹوں پر استہزائیہ مسکراہٹ کی ایک نہایت خفیف سی جھلک دیکھی۔ میری طرح شاید اس کے ذہن میں بھی یہ خیال آیا تھا کہ نواب زادی کو غالباً آج زندگی میں پہلی بار پانی کی نایابی کا مسئلہ درپیش تھا تو نہایت مشکل مسئلے کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکالنے کی باتیں ہونے لگی تھیں۔

بلال شیدی سپاٹ لہجے میں بولا "آج تک اس قسم کی صورتِ حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا اور نہ ہی کبھی سوچا تھا کہ واسطہ پڑ سکتا ہے۔ اس لیے اس قسم کے انتظامات کرنے کا خیال ہی نہیں آیا۔"

پھر وہ ملائمت سے بولا "ویسے بھی... انتظامات کا کیا ہے نواب زادی صاحبہ! پائپ لائنیں بھی توڑی جا سکتی ہیں، کاٹی جا سکتی ہیں، بند کی جا سکتی ہیں۔ جب انسان دشمنوں کے نرغے میں ہوتا ہے تو اس کی ہر سپلائی لائن کٹ سکتی ہے۔ مجھے تو اب اس مکان کی لوکیشن ہی بہت خراب لگ رہی ہے۔ میں سوچ رہا ہوں، ان پہاڑوں میں سے ہی کسی ایک کو اچھی طرح دیکھ بھال کر، اوپر سے کٹوا کر اس پر مکان بنوایا جائے اور پکّا بنوایا جائے بلکہ بہت ہی پکّا۔ پتھروں اور کنکریٹ سے بنوایا جائے۔"

"ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک ہے۔ میں خود نواب صاحب سے کہوں گی۔" نواب زادی نے تائید کی "اگر اس جگہ کوئی ڈیرا یا چیک پوسٹ رکھنی ہے تو وہ صحیح قسم کی ہونی چاہیے تاکہ مقصد تو پورا ہو۔ اب تو ان ڈاکوؤں وغیرہ کا بھی خیال رکھنا پڑے گا۔ ان کو اب ہم لوگوں کا بھی کوئی لحاظ نہیں رہا۔"

وقت کچھ اسی عالم میں اور اسی طرح کی باتوں میں نہایت سست رفتاری سے گزرنے لگا۔ حتیٰ کہ سورج سر پر آ گیا۔ مجھے ڈاکوؤں کے صبر و تحمل پر حیرت تھی۔ وہ گویا نہایت اطمینان سے پہاڑیوں پر

ڈیرے ڈال کر بیٹھ گئے تھے۔ مکان کے کسی بھی کھلے حصے میں یا کسی بھی شکستہ کھڑکی دروازے کے پیچھے خفیف سی بھی حرکت ہوتی تو زبردست تڑتڑاہٹ کے ساتھ گولیاں آتیں۔

ایک اور شخص جسے راوحن کے نام سے پکارا جا رہا تھا، لقمۂ اجل بن چکا تھا۔ اس کی تو لاش بھی اُٹھانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اس کی لاش احاطے میں، دھوپ میں ہی پڑی تھی۔ جان محمد کو دو منٹ کے لیے اپنی بیوی رکھاں کی لاش کے پاس بیٹھنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ وہ انہی لوگوں میں شامل تھا جو اسی خیال کے تحت دیواروں کے روزنوں سے آنکھ لگائے اور دیواروں کو مورچہ بنائے ان کی آڑ میں کھڑے تھے کہ کہیں ڈاکو اچانک پہاڑیوں سے اتر کر مکان پر یلغار نہ کر دیں۔

سورج سر پر آیا تو بے پناہ تمازت کا احساس ہونے لگا۔ بیشتر کھڑکیاں اور دروازے ٹوٹ چکے تھے، ناہموار دیواریں بھی گولیوں کی بوچھاڑوں سے کچھ اور ناہموار ہو چکی تھیں۔ نقل و حرکت بہت مشکل ہو گئی تھی۔ بس جو تھوڑی بہت پناہ میسّر تھی، وہ دیواروں کی آڑ میں میسّر تھی۔

صرف چھیماں قدرے محفوظ حصے میں دیواروں سے چپک کر چوپائے کی طرح رینگتی ہوئی چند ایک مرتبہ ادھر سے اُدھر آتی جاتی نظر آئی تھی۔ اسی نے نہ جانے کس طرح بچّوں کو کچھ کھلانے کا بھی بندوبست کیا تھا۔ یوں اس "گندی" عورت کے ہاتھوں سے نواب زادی کے بچّوں کا پیٹ بھرا تھا اور نواب زادی نے اس پر اعتراض نہیں کیا تھا۔

پیاس سے سب کا بُرا حال تھا۔ اب تو نواب زادی کے آہنی اعصاب بھی چٹخنے لگے تھے۔ اس کی چڑچڑاہٹ اور تند خوئی کا اب وہ عالم نہیں رہا تھا۔ اب وہ گویا اندر ہی اندر بل کھا رہی تھی۔ اس کی حالت اس زخمی شیرنی سے مشابہ تھی جسے دھوکے سے پکڑ لیا گیا

تھا۔

میں اپنے بندھے ہوئے بازوؤں کو جس حد تک بھی ممکن تھا، حرکت دیے جا رہا تھا۔ کبھی ہاتھوں کو ہلانے جلانے لگتا تھا، کبھی مٹھیاں کھولنے بند کرنے لگتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے بازو شل ہوتے محسوس ہو رہے تھے۔ ٹانگوں کو حرکت دینے اور دورانِ خون برقرار رکھنے کے لیے میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد چند ایک مرتبہ اٹھ بیٹھ لیتا۔

بلال شیدی بدستور کلاشنکوف سنبھالے کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ وقفے وقفے سے دونوں طرف سے گولیوں کا تبادلہ اب بھی جاری تھا۔ ڈاکوؤں کی چلائی ہوئی گولیاں تو ہر بار کچھ نہ کچھ نقصان پہنچا ہی جاتی تھیں لیکن مکان میں محصور لوگ گولیاں ضائع ہی کر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کے پاس اب میگزین بھرنے کے لیے گولیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔

نواب زادی چارپائی سے ٹیک لگاتے ہوئے پہلی بار ذرا مضمحل انداز میں بولی "ہمارے لوگوں کی کوئی ٹولی.... کوئی قافلہ...یا کوئی اور لوگ بھی تو اس طرف نہیں آ رہے۔" پھر اسے گویا کچھ یاد آیا "وہ بدبخت چھماں کہہ رہی تھی کہ انسپکٹر حیات خان اسے واپسی میں لینے آئے گا۔ وہ بھی تو نہیں آ رہا۔"

"وہ دو تین روز بعد آنے کا کہہ گیا تھا۔" بلال شیدی قدرے استہزائیہ سے لہجے میں بولا "اور اگر آج بھی آجائے تو وہ اکیلا کیا کرلے گا؟ وہ بے خبری میں یقیناً سیدھا پہاڑیوں کے قریب آجائے گا اور ڈاکوؤں کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ اگر وہ وردی میں ہوا تب بھی ڈاکو اس وقت اسے نہیں چھوڑیں گے۔"

جب دوپہر بھی ڈھلنے لگی تو نواب زادی کے چہرے سے اندازہ ہونے لگا کہ اس کے اعصاب جواب دے رہے تھے۔ پیاس کے باعث اس کا گلا اس بُری طرح خشک تھا کہ آواز نہیں نکل رہی تھی۔ وہ پھنسی پھنسی لیکن جھنجلاہٹ زدہ آواز میں بولی "آخر یہ ڈاکو اتنے صبر و تحمل سے کس بات کا انتظار کر رہے ہیں؟ یہ سامنے کیوں نہیں آتے؟ کوئی فیصلہ کن حملہ کیوں نہیں کرتے؟"

"میرا اندازہ ہے کہ وہ کسی کمک کا انتظار کر رہے ہیں۔" میں دھیمے لہجے میں بول اُٹھا۔

نواب زادی اور بلال شیدی دونوں نے بیک وقت مجھے گھورا۔ نواب زادی کھرکھراتی آواز میں بولی "تم کیسے کہہ سکتے ہو؟"

میرے کوئی جواب دینے سے پہلے بلال شیدی بولا "میں نے اس کے بارے میں ٹھیک اندازہ لگایا ہے۔ یہ خود ڈاکو ہے نا' اسے ڈاکوؤں کی حرکات و سکنات اور ان کی فطرت کا اندازہ ہے۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے اس شخص پر غصہ آگیا۔ وہ مسلسل حماقت میں مبتلا چلا آ رہا تھا۔ میں اپنی زندگی کے ان گنت تجربات کی روشنی میں اس گدھے کو ہمدردانہ انداز میں بھی کوئی بات بتانے کی کوشش کرتا تھا تو وہ اس سے اُلٹا ہی مطلب اخذ کر لیتا تھا۔ اب میں اسے کیا بتاتا کہ میں نے زندگی میں کیسا کیسا وقت دیکھا تھا اور میری نامعلوم حسیات کس کس انداز میں میری رہنمائی کرتی تھیں۔

میں نے مزید کچھ کہنے کی زحمت نہیں کی اور ناگواری سے سر جھٹک کر رہ گیا۔ حالات خواہ کیسے بھی تھے لیکن ابھی تک میں نے ان لوگوں کے چہروں پر خوف کی پرچھائیں نہیں دیکھی تھی مگر میری "کمک" والی بات سُن کر نواب زادی اور بلال شیدی تک کے چہروں پر خوف کی مدھم سی پرچھائیاں اُبھر آئیں جنہیں چھپانے کی وہ ہر ممکن کوشش کر رہے تھے۔

بہت دیر سے میری نظر گھوم پھر کر نواب زادہ حشام کے چہرے پر جمی جا رہی تھی جو اب گہرا نیلا ہو چکا تھا۔ نواب زادی اس کے سرہانے چارپائی کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی لیکن اب تک اس اندوہناک حقیقت سے بے خبر تھی جس کا اندازہ مجھے نواب زادہ کی نبض دیکھے بغیر ہو رہا تھا۔

میری کچھ ہمت ہی نہیں پڑ رہی تھی کہ وہ بات نواب زادی کو بتاؤں۔ وہ مغرور، متکبر، قبیلہ پرست، خود پسند یا جیسی بھی تھی لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ اس پتھریلی عورت کے سینے میں بہرحال ایک روایتی اور وفا پرست بیوی کا گداز پنہاں تھا۔ وہ ابھی تک نہ جانے کس آس کا دامن مضبوطی سے تھامے اپنے شوہر کے پلنگ کی پٹی سے لگی بیٹھی تھی۔

آخرکار میں ایک بار پھر بولے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے بلال شیدی سے کہا "کم از کم ایک بار نواب زادہ صاحب کی نبض تو دیکھ لو' انہیں چیک تو کرلو۔"

بلال شیدی نے ایک نظر چارپائی کی طرف دیکھا پھر کلاشنکوف رکھ کر گھٹنوں کے بل چلتا ہوا نواب زادہ کے پہلو میں آیا اور بیٹھے ہی بیٹھے چارپائی پر ہاتھ لے جا کر دیر تک نواب زادہ کی نبض دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہمت کرکے سر تھوڑا سا اُٹھایا اور ورم زدہ چہرے میں دھنسی ہوئی آنکھوں کو تھوڑا تھوڑا کھول کر دیکھنے لگا۔ اس نے نواب زادہ کے نتھنوں پر انگلیاں رکھیں۔ دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔

آخرکار اس کا تاریک چہرہ مایوسی سے کچھ اور تاریک ہو گیا۔ اس نے چادر سے نواب زادہ کا چہرہ ڈھانپ دیا اور سر جھکا لیا۔ وہ دھیمی آواز میں "اناللہ..." پڑھ رہا تھا۔

نواب زادی چند لمحے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر چارپائی کی پٹی پر سر ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

آخرکار اس چٹان کے سینے سے چشمہ پھوٹ پڑا تھا۔

نواب زادی خاصی دیر تک روتی رہی۔ کسی نے اسے چپ کرانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ شاید کسی میں اتنی جرأت ہی نہیں تھی یا پھر میری طرح وہ بھی یہی سوچ رہے تھے کہ اس پتھر کے لیے کچھ دیر اشک بہا لینا ہی بہتر تھا۔

آخرکار اس کے آنسو ختم ہی ہو گئے۔ آنسوؤں سے تر چہرہ اس نے اپنے اسکارف سے اچھی طرح پونچھ لیا۔ اب اس کا چہرہ پتھرا سا گیا تھا۔ اس پر کوئی تاثر باقی نہیں رہا تھا۔ صرف متورم اور سرخ آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ روتی رہی تھی۔

بلال شیدی کی طرف دیکھے بغیر اس نے بدلی بدلی اور سپاٹ سی آواز میں پوچھا "اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

عجیب احمقانہ سوال تھا۔ وہاں تو کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کوئی نواب زادی کو کیا بتاتا۔

"میں... میں کیا بتا سکتا ہوں نواب زادی صاحبہ!" بلال شیدی اُلجھن آمیز لہجے میں بولا۔

نواب زادی کو شاید جواب کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ وہ تو گویا یونہی بس تنویمی سی حالت میں سوال کر گئی تھی۔ اس نے اپنے شوہر کا چہرہ جو اب بے حد بھیانک ہو چکا تھا' چادر سے ڈھانپ دیا۔ وہ خود بھی اب شاید اس چہرے پر نظر ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔

پھر وہ دھیرے دھیرے اٹھی اور یوں تن کر کھڑی ہو گئی کہ اس کا قد اصل سے کچھ اونچا محسوس ہونے لگا۔ رات سے اب تک اس کی حالت میں بڑا تغیر آ چکا تھا۔ اس کا حسن گویا کہیں پس منظر میں چلا گیا تھا۔ وہ ایک آسیب زدہ سی مخلوق دکھائی دینے لگی تھی۔

پھر وہ ویسی ہی بدلی بدلی اور آسیب زدہ سی آواز میں بولی "مجھے ایک گن دو۔ میں باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن کس سے نواب زادی صاحبہ؟" بلال شیدی نے تعجب سے پوچھا "کیا باہر آپ کو کوئی نظر آ رہا ہے؟"

"نظر آئے یا نہ آئے' ہمیں کچھ تو کرنا ہوگا۔ آخر ہم کب تک یونہی چوہوں کی طرح دبکے بیٹھے رہیں گے؟" وہ برہمی سے بولی اور یکدم ہی اس کے چہرے کا پتھریلا پن دور ہو گیا۔ وہ پھر سے ایک زندہ عورت نظر آنے لگی۔ اس کا چاندنی سا چہرہ ڈوبتے سورج کی طرح دہک اٹھا۔

"کبھی کبھی یوں بھی بیٹھنا پڑتا ہے نواب زادی صاحبہ!" بلال شیدی احترام اور تحمل سے بولا "یہ اسلحے کی نہیں' حوصلے اور اعصاب کی جنگ ہے۔ اپنی قبائلی لڑائیوں میں ہم نے ایسا بھی وقت گزارا ہے جب ہم آٹھ آٹھ دن پہاڑوں پر مورچے لگائے بیٹھے رہے۔ ہمارا تجربہ تو پھر بھی بہت کم ہے۔ قبیلے میں ایسے بھی لوگ ہیں جو سرکار سے جھگڑوں میں مہینوں اور برسوں پہاڑوں پر رہے۔ بکریاں ذبح کرکے کچا گوشت کھاتے رہے۔ جب وہ نیچے آئے تو ان میں سے بہت سوں کو ٹی بی تھی اور ان کے جسموں پر جوئیں اس طرح چل رہی تھیں جس طرح مٹھاس سے لتھڑی ہوئی جگہ پر

چیونٹیاں چلتی ہیں۔ میل کی تہیں اس طرح جمی ہوئی تھیں کہ چاقو سے کھرچی جاسکتی تھیں۔"

"تم مجھے تاریخ سنانے مت بیٹھ جایا کرو۔" نواب زادی غصے سے بولی "اس وقت کی بات کرو' اس وقت ہم کیا کریں۔ نہ وہ سامنے آرہے ہیں اور نہ ہی ہم کوئی فیصلہ کن قدم اٹھا رہے ہیں۔ یہ سب کچھ میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔"

میں نے بلال شیدی کے چٹختے ہونٹوں پر ایک لمحے کے لیے خفیف سی مسکراہٹ کی جھلک دیکھی۔ وہ نہایت دھیمے اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ آپ کو زندگی میں کبھی اس قسم کی صورت حال سے واسطہ ہی نہیں پڑا۔ آپ نے صرف حکم کی تعمیل ہوتے دیکھی ہے' جنبش ابرو سے حالات تبدیل ہوتے دیکھے ہیں۔ بے بسی شاید پہلی بار آپ کی زندگی میں آئی ہے۔"

اسے شاید احساس ہوا کہ اس کے الفاظ اور انداز کو گستاخی نہ سمجھ لیا جائے۔ اس کے لہجے میں یکدم مٹھاس اور ملائمت آگئی "خواہ آپ اسے میری گستاخی سمجھیں اور خواہ کتنی ہی برہم ہوں لیکن میں آپ کو باہر جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ صرف خودکشی ہوگی اور کچھ نہیں۔ نواب زادہ صاحب کے ساتھ جو کچھ ہوا اس وقت ہم آپ کے ساتھ نہیں تھے۔ جو لوگ ساتھ تھے انہوں نے جان دے کر اپنا فرض ادا کردیا۔ اب آپ ہماری حفاظت میں ہیں۔ اگر خدانخواستہ آپ کو کچھ ہوگیا اور ہم زندہ بچ گئے تو ہم قبیلے میں واپس جانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ بڑے نواب صاحب کو کیا منہ دکھائیں گے؟ اس لیے اگر اب جان دینے کا مرحلہ آئے گا تو پہلے ہم دیں گے۔ موت کے سامنے سینہ تان کر جانے کی ضرورت ہوگی تو ہم جائیں گے۔ آپ اس قسم کی کوئی کوشش نہیں کریں گی۔ اس کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔"

"یہ بے بسی میرے لیے موت سے زیادہ تکلیف دہ ہے۔" نواب زادی مٹھیاں بھینچ کر بولی۔ وہ یقیناً مبالغے سے کام نہیں لے رہی تھی' سچ بول رہی تھی۔ اس طبقے کے لیے بے بسی سب سے بڑی سزا تھی۔

اس کا انداز دیکھ کر مجھے راحیلہ یاد آگئی۔ وہ سردار زادی تو نہیں تھی لیکن اس کے مزاج میں بھی کہیں کچھ ایسے ہی جراثیم موجود تھے۔ ریڈ ڈاٹ کے مقابلے میں اسے بھی بے بسی گوارا نہیں تھی۔ ایک خاص حد تک پہنچنے کے بعد اس کے لئے سب کچھ ناقابل برداشت ہوگیا تھا۔ اس نے جو کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کیا تھا وہ بہت تباہ کن ثابت ہوا تھا۔ میں جو آج اس ویرانے میں پھنسا بیٹھا تھا' اس میں کسی حد تک اس کی کارروائیوں کو بھی دخل تھا۔ بہرحال میں اسے زیادہ قصوروار نہیں سمجھتا تھا۔ اس کی نیت نیک تھی اور سب سے بڑی چیز نیت ہی ہوتی ہے۔ وہ میری دوستی اور تعلق خاطر میں ہی جان پر کھیل رہی تھی اور اپنی دانست میں اس نے مسئلہ حل کرنے ہی کی کوشش کی تھی۔

میں نے جلدی سے یادوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی۔ جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے زمانۂ حال میں ہی رہنا چاہیے تھا اور اپنی توجہ اس پر رکھنی چاہیے تھی جو میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا۔

نواب زادی چند لمحے اپنی جگہ مٹھیاں بھینچے کھڑی رہی اور گہری سانسیں لیتی رہی۔ ایک اچھی علامت یہ تھی کہ وہ اپنے غصے کو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آپے سے باہر نہیں ہو رہی تھی۔

آخرکار وہ قدرے شکست خوردہ سے لہجے میں بولی "میں اپنے بچوں کے پاس جا رہی ہوں۔"

بلال شیدی نے بے تابی سے ہاتھ بلند کیا "پلیز... نواب زادی صاحبہ! آپ اس کمرے سے کہیں بھی جانے کی کوشش نہ کریں۔ اس دیوار کی اوٹ میں ہی رہیں۔ یہ کمرا ہر لحاظ سے بہترین ہے۔ پناہ کے طور پر بھی اچھا ہے اور ڈاکوؤں پر نظر رکھنے کے لیے بھی۔ یہاں ہم اپنا بچاؤ بھی کرسکتے ہیں اور جب ڈاکو سامنے آئیں گے تو یہاں سے جوابی فائرنگ بھی سب سے زیادہ فائدہ مند رہے گی۔ یہ کمرا سب سے بڑا بھی ہے۔ فی الحال آپ یہاں سے کہیں بھی نہ جائیں۔"

"جہاں بچے ہیں وہ کمرا یہاں سے بہت دور تو نہیں ہوگا۔" نواب زادی کے لہجے میں اب تیز و تندی نہیں تھی "وہ... جھماں بھی تو وہاں سے دو تین مرتبہ یہاں آچکی ہے۔"

"اس کی بات اور ہے نواب زادی صاحبہ!" بلال بولا "اسے گولی لگ بھی گئی تو کیا فرق پڑ جائے گا۔ اس کی اور آپ کی جان برابر تو نہیں ہے۔"

کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا لیکن یہ وہ مسکراہٹ تھی جو دل میں زہر سا پھیلنے کے بعد ہونٹوں پر آتی ہے۔ بلال کے خیال میں نواب زادی اور جھماں کی جان برابر نہیں تھی۔ میں سوچ رہا تھا' خدا نے تو سب کو برابر پیدا کیا تھا مگر وقت کے ساتھ ساتھ نہ جانے کتنی درجہ بندیاں ہوتی چلی گئیں۔ بادشاہ' سردار' نواب' اُمراء اور صاحبانِ حیثیت تو محلوں' قلعوں اور فصیلوں میں محفوظ رہنے لگے۔ جتھے کے جتھے ان کی حفاظت پر مامور رہنے لگے اور بے چارہ عام' غریب اور بے حیثیت انسان کھلے آسمان تلے آفتوں' دشمنوں' درندوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنے کے لیے بے سہارا رہ گیا۔ نہ جانے کس کس کا نوالہ بنتا رہا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ حیثیتیں اور انداز خواہ کتنے ہی بدل گئے تھے لیکن فرق اب بھی وہی چھوٹے بڑے کا تھا۔ وہ جو بڑے تھے' ان کے گرد آج بھی فصیلیں تھیں' محافظ تھے۔ ان کے لیے جان دینے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ جو بے چارے چھوٹے تھے' بے حیثیت تھے ان کا خون آج بھی پانی سے ارزاں تھا۔

ستم تو یہ تھا کہ جو غریبوں اور بے حیثیتوں کے کندھوں پر سوار ہو کر بڑے بنتے تھے' ان کے نام کی مالا جپتے تھے' ہر وقت غریبوں کی وکالت کرتے ہوئے جن کا گلا سوکھتا تھا وہ بھی جب بڑے بن جاتے تھے' انہیں کوئی مقام مل جاتا تھا' وہ لیڈر' وزیر سفیر یا کچھ اور بن جاتے تھے تو ان کے گرد بھی فصیلیں بہت اونچی ہوجاتی تھیں۔ ان کی جان قیمتی ہوجاتی تھی اور عام آدمی کی جان بے قیمت۔ سودے بازیوں' عہدوں' وزارتوں' سفارتوں کے لئے وہ ہوتے تھے اور لاٹھیاں' گولیاں کھانے' خون بہانے کے لیے بے چارے عوام اور ورکر۔ بڑوں کی حفاظت کے لیے چھوٹے بے چارے اپنے سروں کی فصیل کھڑی کیے رکھتے تھے اور اسی میں خوش رہتے تھے۔ یہ بڑی پرانی کہانی تھی۔ ہزاروں سال میں بھی کبھار کوئی ایسا بڑا بھی پیدا ہوجاتا تھا جس کے دل میں واقعی چھوٹوں کا درد ہوتا تھا' جو واقعی اپنی جان کو چھوٹوں کی جان کے برابر سمجھتا تھا ورنہ بس کھوکھلی باتیں تھیں' جھوٹے نعرے تھے' دلوں کو گرمانے والے مگر جان کا نذرانہ لینے والے الفاظ تھے۔

"لیکن میں اب ہر حال میں بچوں کے پاس جانا چاہتی ہوں۔" اس کے لہجے میں تھکن آمیز ضد تھی۔ وہ اب اپنے شوہر کی لاش کی طرف بالکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ جس حد تک بھی ممکن تھا' فی الحال وہ شاید اس حقیقت سے نظر چرانا چاہتی تھی کہ وہ بیوہ ہوچکی تھی' اس کے سر سے ایک مضبوط چھت ہٹ چکی تھی۔

"میں انہیں یہیں بلواتا ہوں۔" بلال شیدی بولا۔

"وہ یہاں آئیں گے تو کیا ان کی جان کو خطرہ لاحق نہیں ہوگا؟" نواب زادی تڑپ کر بولی "اس سے تو بہتر ہے میں اپنی جان کو ہی خطرے میں ڈال لوں۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے نواب زادی صاحبہ!" بلال زور دے کر بولا "آپ مطمئن رہیں' ہمارے آدمی انہیں کسی ترکیب سے اور بہت حفاظت سے لائیں گے۔ وہ بچوں کی ڈھال بن کر چند گز کا یہ فاصلہ طے کریں گے۔"

کمرے میں اب صرف دو کلاشنکوف بردار زندہ تھے اور میرا اندازہ تھا کہ باہر احاطے میں بھی چار دیواری کی اوٹ میں صرف تین چار آدمی ہی زندہ رہ گئے تھے۔ بلال شیدی نے کمرے میں موجود دونوں کلاشنکوف برداروں کو ہدایات دیں اور وہ دروازہ نہایت آہستگی سے تھوڑا سا کھول کر سینے کے بل باہر رینگ گئے۔ بلال نے خود نہایت محتاط انداز میں آگے بڑھ کر دروازہ بند کردیا تاہم کنڈی نہیں چڑھائی۔

کمرے میں موت کا سا سکوت چھا گیا۔ موت اپنی تمام تر بدصورتی کے ساتھ کمرے میں موجود ہی تھی۔ بہت دیر سے ڈاکوؤں نے کوئی فائر نہیں کیا تھا۔ میں جس زاویے پر بیٹھا تھا وہاں سے مجھے کھڑکی کے راستے ایک پہاڑی کا کچھ حصہ ترچھے سے انداز میں دکھائی دے رہا تھا۔ فضا پر جیسا گہرا سکوت طاری تھا اس سے کوئی اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہوسکتا تھا کہ شاید ڈاکو ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔

لیکن کم از کم میں اور بلال شیدی اس خوش فہمی میں نہیں تھے۔ مجھے پہاڑی کا جو حصہ نظر آرہا تھا میں نے اس کے عقب میں چند لمحے پہلے ایک سیاہ سی چیز کو حرکت کرتے دیکھا تھا جو غالباً کسی ڈاکو کی پگڑی تھی۔ پہاڑیوں کے پیچھے کچھ پُراسرار سی نقل و حرکت جاری تھی۔ بلال شیدی کو بھی اس کا احساس تھا۔ وہ پُرخیال انداز میں اپنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے ترچھے زاویے سے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا۔

دن ڈھلنے لگا تھا۔ بھوک اور پیاس اب میرا بھی امتحان لینے لگی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ دوسروں کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ باورچی خانے میں کھانے کا سامان تو موجود تھا لیکن مکان میں جس طرح لاشیں بکھری پڑی تھیں ان کی موجودگی میں کسی کو بھی اخلاقی طور پر یہ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ مُرکھاں کو کھانا تیار کرنے کا پیغام بھیجے۔ خصوصاً جبکہ خود مُرکھاں کا شوہر بھی مارا جاچکا تھا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ مکان میں نواب زادہ حسام کی لاش موجود تھی۔ اس کے سرہانے بیٹھ کر تو کوئی کچھ کھانے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

بہت دیر سے پھیلی ہوئی سکوت کی چادر یک لخت ہی تار تار ہوگئی۔ ڈاکوؤں کی رائفلیں ایک بار پھر گرج اٹھیں تھیں۔ بلال شیدی کچھ اس طرح اچھلا جیسے شکار کی گھات میں بیٹھے ہوئے درندے پر عقب سے کسی نے پتھر کھینچ مارا ہو۔ اس نے ہڑبڑا کر دروازے کی طرف دیکھا مگر دروازہ بدستور بند تھا۔

اس بار مکان میں سے کسی نے بھی فائرنگ کا جواب نہیں دیا۔ حتیٰ کہ بلال شیدی نے بھی گولی نہیں چلائی۔ شاید ان لوگوں کو احساس ہوگیا تھا کہ وہ گولیاں ضائع کر رہے تھے۔ جب تک دشمن قریب نہ آجاتا' ان کا کلاشنکوفوں سے برسٹ مارتے رہنا بیکار تھا۔ اُدھر ڈاکو کوئی فیصلہ کن کارروائی کرنے کے لیے مکان کے قریب نہیں آسکتے تھے کیونکہ مکان کے چاروں طرف کھلا میدان تھا اور کھلے میدان میں کم فاصلے پر موجود کلاشنکوفیں بہرحال ان کے لیے خطرناک تھیں۔ اس طرح صرف محصورین ہی نہیں' محاصرہ کرنے والے بھی ایک عجیب سی صورت حال میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ مکان والوں کے سامنے تو اس صورت حال سے نکلنے کی کوئی تدبیر نہیں تھی۔ ڈاکوؤں کی طرف کیا کھچڑی پک رہی تھی اس کا کسی کو کچھ اندازہ نہیں تھا۔

شاید ڈاکو اپنی تمام تر جہالت کے باوجود اعصابی جنگ کی اہمیت سے آگاہ تھے۔ شاید وہ انتظار کر رہے تھے کہ ڈیرے والوں کے اعصاب جواب دے جائیں تو وہ کوئی حتمی کارروائی کریں۔ اگر وہ کسی کمک کے انتظار میں تھے تب بھی فائدے میں تھے کیونکہ ڈیرے داروں کے اعصاب واقعی چٹخنے لگے تھے۔ میں جن لوگوں کو

دیکھ پا رہا تھا' ان میں مجھے صرف بلال شیدی کے اعصاب کچھ ٹھکانے پر محسوس ہو رہے تھے۔

ڈاکوؤں کے فائروں کی بازگشت معدوم ہونے سے پہلے دوبارہ فائروں کی تڑتڑاہٹ گونجی اور بلال شیدی کا اضطراب بڑھ گیا۔ اس کی نظر دروازے پر تھی۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ گولیاں اسی دیوار پر برس رہی تھیں جس میں دروازہ تھا لیکن لکڑی کا وہ بھاری بھرکم' موٹا اور بھدا سا دروازہ فی الحال کسی طرح گولیوں سے بچا ہوا تھا۔

اچانک دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور نواب زادی کے دونوں بچے اندر لڑھک آئے۔ وہ چوپایوں کی طرح چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چل رہے تھے۔ کسی نے عقب سے انہیں ہلکا سا دھکا دیا تھا اور وہ منہ کے بل گرتے گرتے بچے تھے۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید یہ حرکت کرنے والا موت کی سزا کا مستحق قرار پاتا لیکن موت کے احکامات جاری کرنے والوں کے سروں پر بھی اس وقت موت پَر پھیلائے ہوئے تھی اس لیے کسی کو اس گستاخی کا احساس نہ ہوا۔

دونوں بچے سخت وہشت زدہ اور حواس باختہ تھے۔ فوری طور پر تو انہیں اپنی ماں بھی نظر نہیں آئی۔ نواب زادی یکدم چٹائی سے اٹھی اور انہیں سنبھالنے کے لیے لپکنے ہی لگی تھی کہ بلال کلاشنکوف سے اشارہ کرتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں چیخا "جھک کر۔۔۔ جھک کر"

نواب زادی کو بروقت اپنی غلطی کا احساس ہوگیا۔ وہ جس طرح سیدھی کھڑی تھی اگر اسی طرح تیزی سے اپنے بچوں کی طرف بڑھتی تو اسے کھڑکی کے سامنے سے گزرنا پڑتا اور عین ممکن تھا کہ اس دوران کھڑکی کے راستے آنے والی کوئی گولی اس کا لہو چاٹ جاتی۔ کھڑکی کے سامنے اب تک جس چیز نے بھی حرکت کی تھی' اس پر گولی ضرور آئی تھی۔

دیوار کی اوٹ میں رہنے کے لیے نواب زادی کو بھی ہاتھ پیروں کے بل جھکنا پڑا۔ ان اعصاب شکن حالات میں بھی بلاشبہ یہ میرے لیے ایک دلچسپ نظارہ تھا۔ بلاشبہ حالات کبھی کبھی بڑے ستم ظریفانہ مناظر دکھاتے ہیں۔ وہ گردنیں جو نخوت اور تکبر سے ہمیشہ اکڑی رہتی ہیں' پل بھر میں شاخِ ثمربار کی طرح جھک جاتی ہیں۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن ان کا جھک جانا۔۔۔ بلکہ مضحکہ خیز حد تک جھک جانا بڑا دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔

نواب زادی اگر چند لمحے انتظار کرلیتی تو بچے خود ہی اس کے پاس پہنچ جاتے۔ وہ اتنی دیر اس کی آنکھوں سے دور رہے تھے' وہ جدائی تو اس نے برداشت کرلی تھی لیکن اب سامنے آگئے تھے تو اس سے ایک لمحے کے لیے بھی چند گز کا فاصلہ برداشت نہیں ہوا تھا۔ اس نے لڑکے اور لڑکی دونوں کو بیک وقت آغوش میں بھرلیا۔

وہ روئی تو نہیں البتہ اس کی آنکھیں ایک بار پھر نم ضرور ہوگئیں۔ بچے رونے لگے حالانکہ ابھی شاید انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ چارپائی پر چادر سے ڈھکا ہوا ان کے باپ کا وجود اب ایک لاش میں تبدیل ہوچکا ہے۔

دروازہ ابھی کھلا ہی تھا۔ چھیماں بھی چوپائے ہی کی طرح چلتی' گرتی پڑتی تیزی سے کمرے میں آگئی۔ پھر ان کلاشنکوف برداروں میں سے ایک رینگتا ہوا اندر آنے لگا لیکن اسے اندر آنے میں بڑی دقت پیش آرہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے ساتھی کو گھسیٹتا ہوا لا رہا تھا۔

اس کا ساتھی جو زندہ سلامت اس کے ساتھ گیا تھا' اب اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ مرچکا تھا۔ وہ دونوں اور شاید چھیماں بھی بچوں کی ڈھال بن کر آرہے ہوں گے اور آخرکار ایک ڈھال کام آگئی تھی۔ اس کی خون میں لت پت لاش اندر آگئی۔ بلال شیدی کے چہرے کے کھنچاؤ میں اضافہ ہوگیا۔ مجھے مرنے والے کا نام معلوم نہیں تھا۔ اس کے سر پر پگڑی نہیں رہی تھی۔ ایک گولی اس کی ایک کنپٹی میں پیوست ہوکر دوسری کنپٹی سے نکل گئی تھی۔ دوسری گولی ہنسلی کی ہڈی کے قریب کچھ ایسے رُخ سے لگی تھی کہ غالباً سینے میں اُتر گئی تھی۔

دوسرا شخص جو اس کے ساتھ گیا تھا اور زندہ واپس آنے میں کامیاب ہوگیا تھا' بہت دل گرفتہ تھا۔ مقتول سے شاید اس کی دوستی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے لیکن وہ بالکل خاموش تھا۔ اس نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا ساتھی کس طرح مارا گیا۔ کسی نے اس سے پوچھا بھی نہیں۔ شاید پوچھنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ چند گز کا فاصلہ اس کے لیے موت کی مسافت بن گیا تھا جبکہ وہی فاصلہ چھیماں کئی بار خیروعافیت سے طے کرچکی تھی۔ یہ بھی نصیب نصیب کی بات تھی۔ اس کا اپنا ساتھی اور بچے بھی خیریت سے آگئے تھے۔ بس صرف اسی کی موت گویا اسے کمرے سے باہر لے گئی تھی۔

نواب زادی نے صرف ایک نظر اس کی طرف دیکھا تھا اور نہایت معمولی سے تاسف سے کہا تھا "اوہ۔۔۔ یہ مرگیا!" اس کے بعد وہ دوبارہ اپنے بچوں کی طرف متوجہ ہوگئی تھی۔ ہمارے ملک میں بہت سے طبقات ایسے ہیں جن کے لیے اس قسم کی باتیں نئی یا اہم نہیں ہوتیں۔ لوگ ان کے لیے جانیں دیتے ہی رہتے ہیں۔ بعض لوگوں کو صدقہ اتارنے کے لیے ایک بکرا میسّر نہیں آتا اور بعض لوگوں پر سے سیکڑوں انسان نچھاور ہوتے رہتے ہیں۔ یہ بھی نصیب نصیب کی بات ہے۔ جن پر سے وہ نچھاور ہوتے ہیں انہیں شاید دوسرے دن یاد بھی نہیں رہتا کہ کسی نے ان کے لیے جان دی تھی۔ بہت ہوا تو اظہارِ افسوس کے لیے دو چار جملے بول دیے اور سوگوار لواحقین کے ہاتھ پر کچھ نوٹ رکھ دیے۔ چلیے حق ادا ہوگیا حساب برابر ہوگیا۔

کمرے میں اس لاش کے اضافے کے بعد ایک بار پھر سکوت چھا گیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بچوں کی حالت کچھ خراب

ی تھی۔ وہ کچھ کھانے پینے کے لیے مانگ رہے تھے۔ پینے و کچھ تھا ہی نہیں۔ البتہ ان کے لیے کھانے کی کسی چیز کی ایک بار پھر قربانی کی بکری چھیماں کو روانہ کیا گیا۔ کھاں کے پاس گئی جس کے شوہر کو مرے ہوئے دو گھنٹے بھی رے تھے۔ اس نے رات کے بچے ہوئے گوشت کی ایک کے لیے بھیجی۔ نواب زادی' بچوں کو اس باسی گوشت کی ملانے کی کوشش کرنے لگی۔ انہوں نے تھوڑی بہت یکن خالی سالن کھانے سے ان کی پیاس اور بڑھ گئی۔ نی کے لیے باقاعدہ رونے لگے۔ پیاس سے سبھی کا بُرا حال ب زادی کے ہونٹوں پر بھی پپڑیاں جم رہی تھیں اور وہ بھانے کی کوشش کررہی تھی کہ پانی ابھی نہیں مل سکتا۔ وقت تک شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا لیکن ڈاکوؤں کی وجہ میں کہیں کوئی بتی روشن نہیں کی جارہی تھی۔ لاشوں کی ی وجہ سے کمرے میں ایک عجیب سی بو محسوس ہونے لگی

پنے ہاتھوں کی حالت دیکھ تو نہیں سکتا تھا لیکن مجھے ان پر اس ہونے لگا تھا۔ کندھے اور ٹانگیں شل ہونے لگی تو میری قوت برداشت بھی جواب دینے لگی تھی۔ بڑی دل چاہ رہا تھا کہ اب میری بندشیں کھل جائیں' دھڑکا ختم ہوجائے اور میں کھلے میدان' کھلی ہوا میں طرح کافی دیر تک یونہی بے مقصد اِدھر اُدھر دوڑتا لہو گرماتا رہوں۔ یہ مجھے ہی معلوم تھا کہ میں کس طرح کھے بیٹھا تھا۔

و بھی بڑے ہی صابر اور مستقل مزاج قسم کے لوگ تھے۔ میں تو ڈاکوؤں کا تصور خاصا مختلف قسم کا تھا کہ وہ اتے' گھوڑے دوڑاتے آتے ہوں گے۔ چند لمحوں میں س نہس کرتے ہوں گے اور لوٹ مار کرکے بھاگ گے۔ یعنی آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح یہ ڈاکو تو گویا خود کو پرانے زمانے کے بادشاہوں کی فوج ے مکان کو قلعہ سمجھ کر اس کے گرد بڑے صبروسکون سے کر بیٹھ گئے تھے۔

کا اندھیرا گہرا ہوا تو پانی کے لیے بچوں کا اصرار بڑھنے ب زادی بھی اب پژمردہ و مضمحل نظر آرہی تھی۔ شاید وحشت انگیزی کا بھی اثر تھا۔ ابھی تک کہیں بتیاں ی کی گئی تھیں لیکن آسمان پر ابتدائی تاریخوں کا چاند اور ر دور تارے بھی بکھرے ہوئے تھے۔ ان کی وجہ سے کم روشنی ضرور موجود تھی جتنی صبح صادق کے وقت ہوتی

را ہونے کا تھوڑا سا فائدہ بھی ہوا تھا۔ نقل و حرکت میں ہونے لگی تھی۔ اب ایسا نہیں تھا کہ دیوار کی آڑ سے ہٹ کر کسی نے ذرا حرکت کی اور فوراً گولی آئی بلکہ گولی چلے اتنی دیر گزر گئی تھی کہ بلال شیدی کو خوش فہمی ہونے لگی کہ شاید ڈاکو مایوس ہوکر یا کسی اور وجہ سے محاصرہ ترک کرکے چلے گئے تھے۔

اپنے اس خیال کی تصدیق کے لیے اس نے ایک لالٹین روشن کرکے ایک ڈنڈے پر ٹانگ کر' خود دیوار کی اوٹ میں ہی رہتے ہوئے کھڑکی کے سامنے کی۔ دوسرے ہی لمحے تڑاتڑ کئی فائر ہوئے اور لالٹین کے پرخچے اڑ گئے۔ کمرے میں پھیلی ہوئی عجیب طرح کی بُو میں مٹی کے تیل کی بُو کا بھی اضافہ ہوگیا۔ بلال شیدی کی خوش فہمی رفع ہوگئی۔ غنیمت تھا کہ وہ لالٹین لے کر خود کھڑکی کے سامنے نہیں گیا تھا ورنہ اپنے خیال کی تصدیق اسے بہت ہی مہنگی پڑتی۔

بچے مسلسل رو رہے تھے۔ آخرکار نواب زادی پھنسی پھنسی آواز میں بولی "بلال! پانی کے لیے کچھ کرونا۔۔۔ اب تو میرا بھی دم نکلا جارہا ہے۔"

"کیا کروں نواب زادی صاحبہ؟" بلال شیدی نے بے بسی سے پوچھا "پانی کا چشمہ پہاڑیوں کی طرف ہی ہے۔ اُدھر جانا موت کو دعوت دینے والی بات ہے۔ ڈیرے میں اس وقت مجھ سمیت صرف چار مرد زندہ رہ گئے ہیں۔ دو طرف کی دیواروں سے تو اب فائرنگ کا جواب دینے والا یا ڈاکوؤں کو روکنے والا بھی کوئی نہیں رہا۔ ان میں سے بھی ایک اگر پانی لینے چلا جائے تو اس کے زندہ واپس آنے کی روپے میں چار آنے بھی امید نہیں ہے۔ ان حالات میں' میں کسی کو بھیجنا نہیں چاہتا۔ بھیجنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔"

"لیکن اس طرح تو ہم پیاس سے مرجائیں گے۔ بچوں کی حالت بھی تم دیکھ رہے ہو۔" نواب زادی کراہنے کے سے انداز میں بولی۔ کم از کم فی الحال ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کا طنطنہ اور نخوت رخصت ہوچکی تھی۔ بلال شیدی نے یہ نہیں کہا کہ باقی سب لوگوں کا بھی تو پیاس سے یہی حال تھا۔

بلال نے کوئی جواب نہ دیا تو نواب زادی بولی "آخر یہ لوگ کب تک اسی طرح گھیرا ڈالے بیٹھے رہیں گے؟"

"میری تو خود سمجھ میں نہیں آرہا۔" بلال بولا "اتنی دور سے تو ان سے مذاکرات بھی نہیں ہوسکتے ورنہ میں زور سے چیخ کر ہی یہ پیغام ان تک پہنچا دیتا کہ ہم سب کچھ ان کے حوالے کرنے کے لیے تیار ہیں۔ وہ صرف آپ کی اور بچوں کی جان بخش دیں۔"

نواب زادی کے پژمردہ وجود میں گویا برقی رو سی دوڑ گئی۔ تڑپ کر بولی "ہم ان ڈاکوؤں سے جان بخشی کی بھیک مانگیں گے! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ سونا بھی ہم ہرگز ان کے حوالے نہیں کریں گے۔ جب نواب زادہ صاحب ہی نہیں رہے۔۔۔" پھر گویا اسے کچھ خیال آیا اور اس نے باقی لوگوں کا ذکر بھی شامل کرلیا "اور ہمارے اتنے آدمی بھی مرچکے تو اب ان کے آگے سر جھکانے سے کیا فائدہ؟"

میں نے دل ہی دل میں سوچا' اور یہ سب کچھ ہونے سے پہلے آپ نے اس لیے سونا ڈاکوؤں کے حوالے نہیں کیا ہوگا کہ شاید آپ سب کچھ بچانے میں کامیاب ہوجائیں' واقعی زر' زن' زمین اور اقتدار نے انسان کو بڑی مصیبت میں ڈالا ہوا تھا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے یہ بھی خیال آیا کہ مصیبت کا کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ میں تو سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تہی دست و قلاش پھر رہا تھا مگر اس کے باوجود مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ مصیبت میں پھنسنا مقدر میں لکھا ہو تو انسان پھنس کر ہی رہتا ہے۔ صرف مصیبت کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔

نواب زادی کا بیٹا روتے روتے چند لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ پھر اس نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں پوچھا "ممی! کیا پاپا.....؟" وہ سوال مکمل نہ کرسکا۔ اسے ہچکی سی آگئی۔ وہ دونوں بہن بھائی شاید ابھی اپنے پاپا کو زندہ ہی سمجھ رہے تھے تاہم جب سے وہ کمرے میں آئے تھے' انہوں نے اپنے باپ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

نواب زادی نے بیٹے کے ادھورے سوال کا جواب دینے کے بجائے ایک بار پھر اسے سینے سے لگالیا اور بلال سے مخاطب ہوئی "خدا کے لیے پانی کا کچھ کرو..... ورنہ ہم مرجائیں گے۔" ایک بار پھر اس کی آواز ٹوٹ سی گئی۔

بلال شیدی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ الجھن میں تھا۔ اچانک چھیماں نے کھنکار کر گلا صاف کیا تو گویا ایک طویل وقفے کے بعد دوسروں کو کمرے میں اس کی موجودگی کا احساس ہوا۔

وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں نواب زادی سے مخاطب ہوئی "اگر آپ کی اجازت ہو... آپ بُرا محسوس نہ کریں تو میں پانی لانے کی کوشش کروں؟ میں یہاں لڑائی میں تو حصہ نہیں لے سکتی۔ میں یہی کام کرنے کی کوشش کروں۔"

نواب زادی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اس پیشکش پر شکر گزار نہیں ہوئی تھی۔ اس کے نزدیک گویا اس کا یہی بڑا احسان تھا کہ اس نے کوئی اعتراض یا انکار نہیں کیا تھا۔

بلال شیدی بولا "تم پانی لے کر واپس نہیں آسکو گی' اس لیے تمہاری بھی جان گنوانے کا کیا فائدہ؟" گویا اسے بھی اصل فکر اس بات کی تھی کہ پانی نہیں آسکے گا ورنہ چھیماں کا مرجانا تو ایسی کوئی اہم بات نہیں تھی۔

"میں کوئی ترکیب کرتی ہوں۔ شاید میں زندہ واپس آجاؤں۔" چھیماں کے لہجے میں اب بھی ہچکچاہٹ تھی۔

"کیسی ترکیب؟" بلال شیدی نے پوچھا۔

"آپ سُنیں تو شاید مذاق اُڑائیں۔" چھیماں نے شرمساری کے سے انداز میں سر جھکالیا۔ پیاس کے مارے اس کے حلق سے بھی آواز مشکل سے نکل رہی تھی۔

"ہم میں سے کسی میں بھی اس وقت کسی کا مذاق اُڑانے کی سکت نہیں ہے۔" بلال شیدی تلخی سے بولا "جو کہنا ہے جلدی کہو۔"

"میں صبح سے اس کمرے سے دوسرے کمرے [illegible] طرح چاروں ہاتھ پیروں پر چلتی ہوئی کئی چکر لگا چکی ہوں [illegible] لہجے میں بولی "مجھے لگ رہا ہے کہ اس کام کی مجھے کافی [illegible] ہے۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔

"تو پھر؟" بلال شیدی نے بے تابی سے پوچھا۔

"پچھلی رات کے کھانے کے لیے یہاں ایک بکر[ی ذبح] کی گئی تھی۔" چھیماں بولی۔ "اس کی کھال ابھی تک [...] میں پڑی ہے اور خراب نہیں ہوئی ہے۔ اس میں ابھی [...] ہے۔ میں وہ کھال لپیٹ کر بکری بن کر جاتی ہوں۔ اگر [...] موجود ہے' وہ آپ میری گُدی پر باندھ دیں۔ کم روشن[ی] میں بکری ہی نظر آؤں گی یا یوں سمجھ لیں کہ بکری کا [...] گی۔"

"کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں ہنستا لیکن اس [...] زخمی ہے اور روح اداس ہے۔" بلال شیدی بولا "[...] ٹھیک ہے؟"

"کوشش کرکے دیکھنے میں کیا حرج ہے؟" چھیماں [...] ویسے بھی بچتی دکھائی نہیں دے رہی۔ اگر میں کامیاب [...] ذرا فخر ہوجائے گا کہ میں نے نواب زادی صاحبہ کی کو[ئی خدمت کی] تھی اور اگر جان چلی گئی تب بھی کوئی ایسی خاص بات [نہیں۔] کون سا یہاں کوئی رونے والا بیٹھا ہے۔ ایک گندی ع[ورت دنیا] میں نہیں رہے گی' دھرتی کا کچھ بوجھ ہی کم ہوجائے گا۔

اس کے لہجے میں طنز کی چبھن نہیں تھی لیکن اگر [کوئی محسوس] کرنا چاہتا تو محسوس کر بھی سکتا تھا۔ میرا خیال تھا' نواب [زادی اس] کی پیشکش مسترد کردے گی' اسے کسی بھی طریقے سے منع کردے گی لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ چہرے [پر] اضمحلال لیے خاموش بیٹھی رہی۔

بلال شیدی بھی ایک لمحے خاموش رہا پھر تھکے [سے لہجے] میں بولا "بکری کیا پانی کا مٹکا اپنے سر... بلکہ سری پر [لائے] گی؟"

"ظاہر ہے' میں مٹکا تو نہیں لاسکتی۔" چھیماں بو[لی "پیٹ] کے ساتھ باندھ کر کوئی چھوٹا موٹا برتن لاسکتی ہوں [...] ڈھکن والا برتن ہو جس میں پانی گرنے یا چھلکنے سے بچا [رہے۔"]

"ایسا تو یہاں کوئی برتن بھی نہیں ہوگا۔" بلال [شیدی] بولا۔

نواب زادی جلدی سے بولی "باہر ہماری گاڑی [میں] تھرموس موجود ہے۔ وہ ٹوٹنے سے بچ گیا ہے۔ وہ اس [کام کے لیے] بہت مناسب ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ چھیماں کے ہونٹوں [پر مسکراہٹ] آئی تھی لیکن وہ میرا وہم بھی ہوسکتا تھا۔ کمرے میں [...] خاص نہیں تھی۔

[چھ]یماں دھیمے لہجے میں بولی "ہاں تھرموس ٹھیک رہے گا۔ [...] پیٹ سے باندھ کر جاسکتی ہوں اور اس میں پانی بھی [...] آسکتا ہے۔" پھر اس نے اجازت طلب نظروں سے [...] کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "میں تیاری کروں؟"

[...]لو۔ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" بلال شیدی نے کچھ [...]ردہ سے لہجے میں اعتراف کیا۔

[...]رے کو ذرا میرے ساتھ بھیج دیں' ہم باہر سے چیزیں لے [...] چھیماں نے فرمائش کی۔ تب مجھے معلوم ہوا' فقیرا اس [...] بردار کا نام تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے ساتھی کے ہمراہ [...]رے سے نواب زادی کے بچوں کو لینے گیا تھا۔ اس کے [...] لاش اب کمرے میں اس کے سامنے ہی پڑی تھی اور وہ [...]کھوئی کھوئی سی نظروں سے اسی کو دیکھے جارہا تھا۔

[...] شیدی کا اشارہ پاکر وہ تھکے تھکے سے انداز میں چھیماں [کے ساتھ] چل دیا۔ رکوع کی سی حالت میں وہ نہایت آہستگی سے [...] باہر چلے گئے۔ ایک بار پھر کمرے میں اعصاب شکن [...] کیا۔ زندگی کچھ عجیب سا ہی تماشا مجھے دکھا رہی تھی۔ اس [...]ت حال کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا جس سے میں دوچار تھا۔ میں بس ایک عضوِ معطل کی طرح ایک [...] تھا۔ ایک بے وقعت جانور کی طرح مجھے باندھ کر ایک [...] یا گیا تھا۔

مجھے افسوس ہورہا تھا کہ جس وقت بلال شیدی اور اس [...]ں نے مجھے قابو میں کیا تھا اس وقت میں نے ذرا بھی [...]ں نہیں کی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ اس وقت ذرا [مزا]حمت یا فرار کی کوشش میں جان جانے کا ننانوے فیصد [...] اسی لیے میں نے اپنے آپ کو بلا مزاحمت ان کے [...] تھا۔ میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ بعد میں کوئی موقع نظر [...]وں ماروں گا۔

[اس و]قت مجھے یقین تھا کہ بعد میں بھی کوئی نہ کوئی موقع ضرور [...] میری یہ امید پوری نہیں ہوسکی تھی اور صورت حال [...] خراب تر ہی ہوتی گئی تھی۔ نواب زادی گویا صرف [...] نہیں' سبھی کے لیے نحوست کا پیغام لے کر آئی تھی۔ [...]جانے کی وجہ سے میں کچھ زیادہ ہی بے بس ہوکر رہ گیا [...]لوؤں والا مسئلہ نہ آن پڑتا تب بھی شاید کوئی صورت [...]۔ اب جو حالات تھے ان کی نسبت تو مجھے ننانوے فیصد [...]ب لے لینا بہتر معلوم ہونے لگا تھا۔ بے شک اس وقت [...] تھا اور پانچ کلاشنکوف برداروں کے نرغے میں تھا لیکن [...] تو آزاد تھے اور میرے اردگرد کھلا میدان تھا۔ اگر میں شاید زندہ بچ جانے کا ایک فیصد امکان بڑھ کر ننانوے فیصد ہوجاتا۔ تقدیر کے ترازو میں امکانات کے پلڑے ادل بدل جاتے۔ یہ بے بسی تو موت سے بدتر محسوس ہونے لگی تھی۔

چھیماں اور فقیرا آخر کار خیروعافیت سے لوٹ آئے۔ ان کے پاس بکری کی کھال' تھرموس اور سُتلی کے بہت سے ٹکڑے تھے۔

چھیماں کو بکری بنانے کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ بکری کی کھال خاصی حد تک خشک ہوچکی تھی لیکن ابھی تڑنے مڑنے کے قابل تھی۔ میں ذرا فاصلے پر بیٹھا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ اس فاصلے پر مجھے کھال میں سے ایک خاص قسم کی بدبُو اٹھتی محسوس ہورہی تھی لیکن چھیماں نے کسی خاص کراہیت کا اظہار کیے بغیر کھال اپنے جسم پر لپٹوالی۔

بکری سینگوں والی تھی۔ اس کی سری بھی کسی نہ کسی طرح چھیماں کے سر پر باندھ دی گئی اور اس کے گویا دو سر ہوگئے۔ کچھ دیر بعد آخر کار ایک بھدی سی بکری تیار ہوگئی تاہم مجھے امید تھی کہ دور سے وہ محض ایک ہیولے کی طرح دکھائی دے گی اور اگر اس کی زندگی کچھ لمبی ہوئی تو ڈاکوؤں کی آنکھوں کو دھوکا دے جائے گی۔

البتہ ایک دعا کرنی چاہیے تھی کہ کہیں بھون کر کھانے کے لیے ڈاکوؤں کو بھی کسی بکری کی ضرورت نہ ہو اور چشمے پر بکری کا ہیولا دیکھ کر وہ خوشی سے اچھل نہ پڑیں۔ گولی چلا کر اسے شکار کرلیں اور جب اٹھانے آئیں تو اندر سے کچھ اور برآمد ہو۔ اس صورت میں شاید انہیں پچھتاوا ہوتا کہ اس بکری کو تو زندہ سلامت پکڑنا چاہیے تھا۔

بہرحال اس کے پیٹ سے بڑا سا تھرموس بھی باندھ دیا گیا جس کی وجہ سے وہ کچھ اور بے ہنگم ہوگئی۔ اسے مکان کے عقبی دروازے سے روانہ ہونے کی ہدایت کی گئی۔ دیواروں سے لگ کر سرکتی ہوئی وہ رخصت ہوگئی۔ فی الحال وہ دو ٹانگوں پر ہی چل رہی تھی لیکن نہ جانے کتنا فاصلہ اسے چاروں ہاتھ پیروں پر طے کرنا تھا۔ میں اس عورت کی ہمت کی دل ہی دل میں داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ سب کچھ وہ اس عورت کے لیے کررہی تھی جس نے اسے گندی عورت کہا تھا اور اپنی ٹانگیں دبانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ عورت واقعی عجیب ہوتی ہے۔ ہر عورت!

میرے اندازے کے مطابق اسے ڈیرے سے نکلے ہوئے بہ مشکل چند منٹ ہوئے ہوں گے کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے ایک بار پھر فضا مُرتعش ہوگئی۔ میرا دل ڈوب سا گیا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ شیرنی جو بکری کی کھال پہن کر سنگدل و سفاک انسانوں کے لیے پانی لینے گئی تھی' زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی ہے۔

لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ گولیاں تو مکان پر برسی تھیں۔ کھڑکی سے گولیاں اس کمرے میں بھی آئی تھیں جہاں ہم لوگ موجود تھے۔ کھڑکی کی چوکھٹ کا کچھ بچا کچھا حصہ بھی اڑ گیا تھا۔ شاید ڈاکوؤں نے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لیے ایک بار پھر زور شور سے فائرنگ کی تھی۔ سکوت کا وقفہ چونکہ بہت طویل ہوگیا

تھا۔ شاید ڈاکوؤں نے سوچا ہو کہ ہم دوبارہ ان کے بارے میں اس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوگئے ہوں کہ وہ محاصرہ ترک کر کے چلے گئے ہیں۔

میں دل ہی دل میں جھیماں کی سلامتی کی دعا کر رہا تھا جسے خواہ مخواہ ہی نواب زادی کی نظر میں عظیم عورت بننے یا اسے ایثار و احسان کے بوجھ تلے دبانے کا شوق چرایا تھا۔ نواب زادی نے اپنی زبان سے اس کی شخصیت پر "گندی عورت" کی جو چھاپ لگائی تھی شاید وہ اسی کی زبان سے اسے صاف کرانا چاہتی تھی مگر اس کے لیے وہ جو کچھ کر رہی تھی وہ ایک مہنگا سودا تھا۔

ڈاکو صرف چند سیکنڈ زوردار فائرنگ کرنے کے بعد ایک بار پھر آرام سے بیٹھ گئے۔ اس بار سکوت کا وقفہ زیادہ صبر آزما اور زیادہ طویل محسوس ہوا کیونکہ سب کو جھیماں کی واپسی کا انتظار تھا۔ بچوں کا رونا دھونا بھی اب ہلکی ہلکی روں روں میں بدل گیا تھا۔ انہیں بھی اتنا احساس تو تھا کہ جھیماں ان کے لیے پانی لینے گئی تھی اور اس کی واپسی کا انتظار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

یہ انتظار بے ثمر ثابت نہیں ہوا۔ ایک طویل انتظار کے بعد آخر کار جھیماں لوٹ آئی۔ کم از کم جان کے معاملے میں وہ عورت واقعی قسمت کی دھنی تھی۔ وہ تھکن سے چُور اور بے حال تھی۔ کمرے میں پہنچتے ہی فرش پر ڈھیر ہوگئی۔ بلال شیدی نے اس کے پیٹ پر بندھا ہوا بڑا سا تھرموس علیحدہ کیا۔

سینگوں والی وہ سری جو اس کی گُدّی پر باندھی گئی تھی، اب اس کے گلے میں لٹک رہی تھی اور وہ کوئی عجیب الخلقت سی چیز نظر آرہی تھی۔ اس کے گھٹنے اور ہاتھ چھلے ہوئے تھے۔ بلال شیدی نے اسے سہارا دے کر چٹائی پر لٹایا اور پہلے اسی سے پوچھا "پانی پیو گی؟"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی "میں تو چشمے پر ہی خوب پیٹ بھر کر پانی پی آئی ہوں۔ میں تو شاید اب کل تک آرام سے پیاس برداشت کرلوں۔ ہم تو ویسے بھی صحراؤں میں بھٹکنے والے لوگ ہیں۔ تم پانی نواب زادی صاحبہ کو دو۔"

بلال شیدی نے تھرموس نواب زادی کے حوالے کردیا۔ اس نے تھرموس ہی کے ڈھکنے میں پہلے دونوں بچوں کو پانی پلایا پھر خود پیا اور تھرموس بند کر کے حفاظت سے ایک طرف کو رکھ لیا۔ تھرموس بڑا تھا اور اب بھی یقیناً آدھے سے زیادہ بھرا ہوا تھا لیکن اس نے بلال شیدی تک کو پانی کے لیے نہیں پوچھا حالانکہ مجھے یقین تھا، بلال کے حلق میں بھی کانٹے پڑ چکے تھے۔ مگر بظاہر وہ بے نیاز بنا ہوا تھا۔ تھرموس نواب زادی کے حوالے کرنے کے بعد وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔

پانی پینے کے بعد بچوں کی روں روں بھی بند ہوگئی اور نواب زادی کے تن مردہ میں بھی گویا جان سی آگئی۔ اس کے لہجے میں کچھ دیر

کے لیے جو اضمحلال آیا تھا، وہ دور ہوگیا۔ وہ سنبھ
ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح نخوت بھرے سے لہجے
کب تک اس طرح معذور اور مجبور سے بنے بیٹھ
ترکیب سوچو نا... کچھ کرو نا۔"

"جب سے ڈاکوؤں نے ہمیں گھیرے میں لیا
مسلسل سوچ ہی رہا ہوں۔" بلال شیدی کمزور
"لیکن میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ جو ترکیب ہم
نہ کوئی مجبوری اس کی راہ میں حائل ہو جاتی۔
مشورہ دیجیے۔" بھوک اور پیاس نے بلال شید
شروع کردیا تھا۔

نواب زادی نے پہلے اپنے دونوں بچوں کو
اوپر، پیچھے کھسکا کر بٹھایا پھر اس نے بہت جھک کر
گرزتے ہوئے آگے بڑھ کر ایک مرنے والے کی
اور دوسرے کونے میں جا کر ترچھے زاویے سے
کی کوشش کرنے لگی۔

وہاں سے وہ تیسرے کونے میں چلی گئی۔ اپن
وہ کسی ماہر جرنیل کی طرح گویا اپنے مورچے
جائزہ لے رہی تھی لیکن مجھے اس کا انداز مضحکہ
کمرے کے مختلف کونوں سے کھڑکی کے راستے پہا
کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ بلال شیدی کو اپنی جگہ

اندازہ تھا، وہ ان معاملات میں زیادہ ماہر تھا لیکن مسئلہ وہی تھا کہ وہ مجبور تھا۔

نواب زادی تیسرے کونے کی طرف جانے کے لیے بظاہر بڑے زبردست انداز میں گویا گھات لگائے دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھی تو اُدھر میں دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ میں اس غلط فہمی میں رہا کہ وہ میری موجودگی سے بہت اچھی طرح باخبر ہے اس لیے خود ہی کترا کر گزر جائے گی۔

لیکن وہ ایکشن کی ملکہ شاید اس وقت کسی تدبیر کی تلاش میں زیادہ ہی دور نکلی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے نہیں دیکھا اور میں بھی اپنی حالت کی وجہ سے بروقت اس کے راستے سے نہیں ہٹ سکا۔ وہ مجھ سے ٹکرا کر گرتے گرتے بچی۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں اسے سنبھالنے کا "اعزاز" بھی حاصل نہیں کرسکتا تھا۔

غصے سے اس کا برا حال ہوگیا۔ طیش اور حقارت سے اس نے مجھے ٹھوکر رسید کی۔ اس ٹھوکر کی چوٹ مجھے اپنے جسم پر نہیں، دل میں محسوس ہوئی۔

نواب زادی نے برہمی سے بلال شیدی کی طرف دیکھا اور میری جانب اشارہ کرتے ہوئے گھٹی گھٹی لیکن غیظ آلود آواز میں بولی "ایک تو اس منحوس کو تم نے معلوم نہیں کیوں یہاں بٹھا رکھا ہے۔ آخر اس کا یہاں مصرف کیا ہے؟ کب سے یہ اس دیوار کے ساتھ چپکا بیٹھا ہے اور مسلسل سب کو گھورے جارہا ہے۔ مجھے اس کی نظروں سے الجھن ہونے لگی ہے۔ یہ قیدی ہے تو اسے قید خانے میں پہنچاؤ۔"

"میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ وہاں کوئی کوٹھری خالی..." بلال نے اسے یاد دلانا چاہا۔

لیکن وہ اس کی بات کاٹتے ہوئے بولی "ضرورت پڑنے پر ایک کوٹھری میں چار قیدی بھی ٹھونسنے پڑیں تو ٹھونس دیا کرو۔ اسے فوراً قید خانے میں پہنچاؤ۔ میں مزید ایک منٹ بھی یہاں اس کی صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔"

بلال شیدی نے مزید کچھ نہ کہا۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنے خشک ہونٹ بھینچ کر رہ گیا۔ پھر اس نے فقیرے کو اشارہ کیا "جاؤ رُکھاں سے چابیاں لے آؤ اور اس قیدی کو قید خانے میں پہنچاؤ۔"

فقیرے نے اثبات میں سر ہلایا اور کلاشنکوف چھوڑ کر کمرے سے باہر رینگ گیا۔ میرے سینے میں مایوسی کی یخ بستگی کچھ گہری ہوگئی۔ بیٹھے بٹھائے خواہ مخواہ مجھے قید خانے میں بھیجے جانے کا حکم صادر ہوگیا تھا۔ میں اس کمرے میں سب کے درمیان بیٹھا تھا تو نہ جانے کیوں میرے دل پر مایوسی کا غلبہ گہرا نہیں تھا۔ میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ جب سے جھیماں بہ خیر و عافیت چشمے سے پانی لے کر آئی تھی تب سے تو نہ جانے کیوں میرے دل میں ایک بے عنوان اور موہوم سی امید کی کرن ابھر آئی تھی۔

لیکن قید خانے میں جانا گویا میرے لیے مزید مجبور ہو جانے کے مترادف تھا۔ بہرحال میں خاموش تھا۔ ظاہر ہے بولنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا، اُلٹا کوئی نقصان ہی پہنچ سکتا تھا تاہم میں ایک ٹُک نواب زادی کی طرف ضرور تکتا رہا حالانکہ مجھے احساس تھا کہ وہ تنک مزاج عورت ایک حقیر قیدی کو یوں اپنی طرف تکتے پا کر مزید چڑ کر کلاشنکوف کا برسٹ بھی مار سکتی تھی۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھوں میں ہی تھی۔

اس نے میری طرف مزید توجہ نہیں دی۔ میرے بارے میں حکم صادر کر کے وہ گویا کچھ مطمئن ہوگئی تھی۔ چاروں کونوں سے کھڑکی کا جائزہ لینے کے بعد وہ اسی کونے میں واپس پہنچ گئی جہاں اس کے بچے موجود تھے۔ ایک بار پھر اس نے تھرموس کھول کر نہایت احتیاط سے دو گھونٹ پانی پیا۔ بلال شیدی ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا لیکن نواب زادی نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔

اس نے تھرموس نہایت احتیاط سے واپس کونے میں رکھ دیا اور کلاشنکوف گود میں لیے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ کم از کم بظاہر تو یہی نظر آرہا تھا۔

فقیرا چابیاں لے آیا اور کلاشنکوف اس نے دوبارہ اٹھالی۔ نواب زادی اس وقت بے خیالی میں دھیرے دھیرے تھرموس پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ وہ گندی عورت کا لایا ہوا پانی دو مرتبہ پی چکی تھی اور اس نے ایک بار بھی اس "گندی عورت" کا شکریہ ادا نہیں کیا تھا۔

جھیماں نے اس وقت تک بکری کی کھال اور سری وغیرہ اتار کر ایک طرف پھینک دی تھی۔ گزشتہ رات تک وہ اچھی بھلی، صاف ستھری عورت دکھائی دے رہی تھی۔ اب ظاہری طور پر واقعی بہت گندی دکھائی دے رہی تھی لیکن اس کے اندر کا اُجلا پن میری نظر میں بہت بڑھ گیا تھا۔

کسی ایسے انسان کے لیے ایثار کرنا، اپنی جان کو خطرے میں ڈالنا اور بے پناہ تکلیف اٹھانا بہت بڑے ظرف کی بات ہوتی ہے جس نے آپ کو حقیر سمجھا ہو، آپ کی عزتِ نفس کو مجروح کیا ہو، بہت سے لوگوں کی موجودگی میں آپ کو ذلیل کیا ہو۔ اس انسان کے لیے ایثار اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں اور اس ایثار پر بھی نہ پگھلنے، نہ بدلنے والا انسان نہیں، کوئی پتھر ہی ہوسکتا ہے، وہ بھی نہایت بیکار قسم کا۔ ورنہ پتھر تو ہیرے جواہرات بھی ہوتے ہیں۔

بلال شیدی نے مجھے فقیرے کے آگے آگے چلنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا "یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ کس طرح چلنا ہے۔ اگر فی الحال تم اپنے بھائی بندوں یعنی ڈاکوؤں کے ہاتھوں گولی کھا کر مرنا نہیں چاہتے تو بہت احتیاط سے جانا۔"

میں اور فقیرا آگے پیچھے، شتر مرغ کی طرح بالکل کُبڑے ہو کر، دیوار سے لگ کر چلتے ہوئے کمرے سے نکلے اور اسی طرح دیواروں ہی کے ساتھ لگ کر نہایت آہستگی سے قدم اٹھاتے خاصا فاصلہ طے

کرکے آخرکار مکان کے عقب میں جا پہنچے۔

یہاں چار دیواری کے اندر بھی ایک اور نیچی سی دیوار تھی۔ فقیرا عقب سے نیچی آواز میں مجھے ہدایات دیتا آرہا تھا۔ میں اس کی ہدایت کے مطابق بہت زیادہ جھک کر چلتا ہوا جب اس دیوار کے عقب میں پہنچا تو مجھے بالکل حوالات کی طرح ایک سیدھ میں سات آٹھ کوٹھریاں نظر آئیں۔

کوٹھریاں بہت ہی چھوٹی تھیں۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ ہر کوٹھری ایک بڑے صندوق سے مشابہ تھی جس میں سلاخ دار دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس کوٹھری میں اوسط قد کاٹھ کا آدمی بھی نہ تو سیدھا کھڑا ہوسکتا تھا اور نہ پاؤں پھیلا کر لیٹ سکتا تھا۔

ہر کوٹھری کے فرش پر خشک گھاس پھونس کی تہ جمی ہوئی تھی۔ مدّھم روشنی میں ذرا غور سے دیکھنے پر سب کچھ نظر آرہا تھا۔ ہر کوٹھری کے دروازے سے ایک قیدی سلاخیں تھامے باہر جھانکنے کی کوشش کررہا تھا۔ تقریباً سبھی کے سر کے بال اور داڑھی مونچھیں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح بڑھی ہوئی تھیں اور جسموں پر چیتھڑے جھول رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ مُدّت سے وہیں قید تھے۔

فقیرے نے پہلی ہی کوٹھری کا تالا کھولا اور مجھے اندر دھکیل دیا۔ وہ اس وقت زندگی سے بے زار معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کوئی بات نہیں کی، مجھے کوئی ہدایت نہیں دی، بس کوٹھری میں دھکیلا اور تالا لگا کر واپس چلا گیا۔

کوٹھری میں جو قیدی پہلے سے موجود تھا، وہ ایک طرف کو سُکڑ سمٹ سا گیا۔ کوٹھری اتنی چھوٹی تھی کہ میری آمد کے بعد گویا ہجوم ہوگیا تھا اور وہ کھچا کھچ بھر گئی تھی۔ اندر اس سے بھی بُری بُو پھیلی ہوئی تھی جیسی چڑیا گھر کے کٹہروں سے آتی ہے۔

کوٹھری میں پہلے سے موجود قیدی نہایت افسردہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک میانہ قامت مگر مضبوط کاٹھی کا آدمی تھا۔ کھدر کی بوسیدہ اور کہیں کہیں سے پھٹی ہوئی شلوار قمیص میں تھا۔ بال اس کے بھی بڑھے ہوئے تھے مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس کی شخصیت میں وہ کھُردرا پن نہیں تھا جو میں نے اب تک تقریباً سبھی کے چہروں پر دیکھا تھا۔

صحراؤں، جنگلوں اور پہاڑوں میں زندگی گزارنے والوں کی شخصیت میں ایک مخصوص کھردرا پن ضرور آجاتا ہے مگر اس کی شخصیت میں وہ مفقود تھا۔ اس کی جھاڑ جھنکاڑ اور میلی کچیلی سی شخصیت کی تہ میں گویا کوئی شہری شخص چھُپا ہوا تھا۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ جگہ فراہم کرنے کے لیے ایک دیوار سے لگ کر اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔

میں نے دیکھا، اس کی ایک ٹانگ خاصی موٹی زنجیر سے بندھی ہوئی تھی اور وہ زنجیر لوہے کے ایک حلقے سے منسلک تھی جو کچی دیوار میں پیوست تھا۔ کوٹھریاں کچی ہی تھیں۔ سلاخ دار دروازہ بھی کچی دیوار ہی میں پیوست تھا اور اس کے آہنی قبضے نہ جانے کتنی گہرائی میں گئے ہوئے تھے۔

دیواریں وغیرہ کچی ہی سہی لیکن اتنی موٹی موٹی اور ٹھوس تھیں کہ ان میں جو کچھ بھی جڑا ہوا تھا، مضبوطی سے ہی جڑا ہوا تھا۔ کوٹھری میں کسی قسم کا کوئی سامان، کمبل یا چادر تک موجود نہیں تھی جبکہ صحرائی علاقوں کی راتیں گرمیوں میں بھی خاصی سرد ہوتی ہیں۔ کوٹھریوں کے دروازے سلاخ دار ہونے کی وجہ سے گویا کھلے ہی تھے۔

یہ غنیمت تھا کہ ان کوٹھریوں کے سامنے نہ صرف چار دیواری کا ایک حصہ بلکہ ایک اور موٹی سی فاضل دیوار بھی موجود تھی ورنہ ڈاکو تو جس طرح چاروں طرف سے فائرنگ کررہے تھے اس سے ان قیدیوں کا تو صفایا ہو ہی جاتا۔ سلاخ دار دروازوں سے گولیاں سیدھی اندر آتیں۔

کوٹھریاں ذرا اونچائی پر بنی ہوئی تھیں۔ چار دیواری اور فاضل دیوار دونوں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تھیں، اس لیے کوٹھری میں بیٹھ کر بھی آسمان کا کچھ حصہ نظر آتا تھا اور کھڑے ہوکر تو دور پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں سے کسی کی چوٹی بھی دیکھی جاسکتی تھی۔ اس کے باوجود کوٹھریاں گولیوں کی براہ راست رسائی سے محفوظ تھیں۔

دوسرا قیدی بدستور خاموش تھا اور گہری نظروں سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "معاف کرنا

بھائی! میں نے آکر تمہارے لیے بھی تنگی پیدا کردی لیکن تم نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ میں اپنی خوشی سے نہیں آیا ہوں، بھیجا گیا ہوں۔"

وہ غالباً مجھے صاف اُردو بولتے سن کر ذرا چونکا۔ میرا حلیہ اس لہجے سے میل نہیں کھا رہا تھا لیکن میں نے جان بوجھ کر صاف اُردو میں بات کی تھی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ میری بات سمجھتا ہے یا نہیں۔

جھاڑ جھنکاڑ داڑھی مونچھوں کی اوٹ سے جھانکتے ہوئے اس کے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور ایک لمحے گویا کچھ سوچنے کے بعد وہ بولا "ظاہر ہے بھائی۔ اپنی خوشی سے کون بدنصیب یہاں آتا ہے۔ سب لائے ہی جاتے ہیں، بھیجے ہی جاتے ہیں۔"

لہجے سے صاف ظاہر تھا کہ اُردو اس کی مادری زبان نہیں تھی لیکن وہ بہت اچھے طریقے سے اُردو بولنے پر قادر تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی شخصیت کا جائزہ لینے کے بعد مجھے اس بات کی توقع تھی، اس لیے مجھے زیادہ حیرت نہیں ہوئی۔

اس نے قدرے دوستانہ سے لہجے میں پوچھا "تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ کیا قصور سرزد ہوا ہے تم سے؟"

"معلوم نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔ "شاید میں نے اللہ میاں کے سامنے زیادہ بڑا بننے کی کوشش کی تھی۔ جب تک میں نے اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑے رکھا، میں بڑے سے بڑے خطرے سے بچ کر نکلتا رہا۔ جونہی میں نے اپنی دانست میں بہت عقلمند بن کر تدبیر لڑانے کی کوشش کی، میں عجیب و غریب گورکھ دھندے میں پھنس گیا۔ میری شکل ایک ایسے شخص سے جا ملی جس کا میں نے زندگی میں کبھی نام بھی نہیں سنا تھا۔ ایک ایسا جرم میرے کھاتے میں پڑ گیا جو میں نے خواب میں بھی نہیں کیا تھا۔"

اس کی کشادہ پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ وہ آنکھیں سکیڑ کر مجھے گھورتے ہوئے بولا "بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی، بہت اُلجھی ہوئی سی بات ہے۔"

"ہاں۔ اس وقت میرا ذہن بھی اُلجھا ہوا ہے اور اس سے زیادہ میری زندگی اُلجھی ہوئی ہے۔ ان لوگوں نے مجھے ایک ایسا ڈاکو سمجھ لیا ہے جس کا نام میں نے کبھی اخبار میں بھی نہیں پڑھا۔ ماکھو چاچڑ۔ اور ان کا خیال ہے کہ میں نے نواب زادہ خاقان کے قتل میں حصہ لیا تھا۔" میں نے اپنی رام کہانی کا خلاصہ دُہرایا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہا پھر عجیب سے انداز میں ہنس دیا۔

"معلوم ہوتا ہے تمہیں فوراً ہی میری بے گناہی کا یقین آگیا ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں" اس نے اطمینان سے جواب دیا "تم ماکھو چاچڑ نہیں ہوسکتے۔"

"کیوں؟ تم ماکھو چاچڑ کو جانتے ہو کیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر اتنے وثوق سے کیوں کہہ رہے ہو؟" میں نے جاننا چاہا۔

"یہ میں نہیں کہہ رہا، میرا دل کہہ رہا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"کمال ہے!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "تم نے کسی دلیل، کسی بحث کے بغیر میری بات کا یقین کرلیا اور ان لوگوں کو میں کل صبح سے یقین دلانے کی کوشش کررہا ہوں لیکن یہ مان کر ہی نہیں دیتے۔"

"یہ ہماری فطرت ہے یا شاید ہمارا قومی مزاج ہے۔" وہ دانشورانہ لہجے میں بولا "ایک بار کوئی بات ہمارے دماغوں میں بیٹھ جائے بس پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے ہمارے دماغ سے نکال نہیں سکتی۔ اسی طرح جب ہم کسی انسان کو سر پر بٹھاتے ہیں تو اس کی باقاعدہ پوجا شروع کردیتے ہیں۔ کوئی لاکھ ہمیں بتائے وہ ایسا نہیں، ایسا ہے لیکن ہم سمجھانے والے کی بات سننا تو درکنار، اسے ٹکڑے ٹکڑے کردینے پر تُل جاتے ہیں۔ ہمارا المیہ یہی ہے۔ ہم کبھی کسی کی معقول بات کو معقولیت سے نہیں سنتے۔"

اب میں نے بغور اس کی طرف دیکھا اور غیر ارادی سے انداز میں پوچھا "تم کون ہو؟"

وہ ایک بار پھر عجیب سے انداز میں ہنسا اور بولا "میرا حلیہ دیکھنے کے بعد تمہیں میرے منہ سے یہ باتیں عجیب لگ رہی ہوں گی۔ تم چونک گئے ہو۔ میں بھی تمہیں مہذب لہجے میں بات کرتے سن کر چونکا تھا۔ لگتا ہے ہم دونوں کو حالات نے زیادہ ہی لسبا رگڑا دیا ہے۔ تم اپنے بارے میں بتاؤ یا نہ بتاؤ، بہرحال میں تمہیں اپنے بارے میں بتا دیتا ہوں۔ میرا نام بابو غلام حسین ہے اور میں سیاسی قیدی ہوں۔"

"سیاسی قیدی؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "اور یہاں؟ اس ویرانے میں؟"

"ہاں۔ سیاسی قیدی کوئی صرف سرکاری جیلوں میں ہی تو نہیں ہوتے۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے تلخ سے لہجے میں بولا "لگتا ہے تم نے دنیا کچھ زیادہ نہیں دیکھی۔"

"میرا خیال تو یہی تھا کہ میں نے بہت دنیا دیکھی ہے لیکن دنیا بہت بڑی ہے جسے انسان اپنی مختصر سی زندگی میں نہیں دیکھ سکتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ساری دنیا دیکھ لیتا ہے لیکن اپنی ناک تلے کی چیز نہیں دیکھ پاتا اور ہمارے ہاں تو ویسے بھی بے شمار چیزوں پر بہت گہرے گہرے رنگوں کے ..... بہت دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔" میں نے ہلکے سے تاسّف سے کہا۔

"یہ بڑے نواب صاحب کی حوالاتوں میں سے ایک ہے۔ چھوٹی اور عارضی جیل۔" وہ گرد و پیش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہاں سے ہم سب کو بڑے نواب صاحب کی اصل، بڑی اور پکی جیل میں جانا ہے۔ باقاعدہ سزا سننے کے بعد۔ اور اگر قید کی سزا

نہ ہوئی' کوئی اور سزا ہوئی تو پھر..." اس نے کندھے اُچکا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کیا سب قیدی بہت عرصے سے یہیں پڑے ہوئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ کوئی کوئی ایسا بھی ہے جسے زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔ دراصل ہم مختلف مقامات سے پکڑے گئے ہیں۔ ہم ابھی راستے میں ہیں۔ کبھی ہمیں لے جانے کے لیے گاڑی نہیں ہوتی اور کبھی ہمیں لے جانے والوں کا موڈ نہیں ہوتا کہ وہ ہمیں لے کر جائیں۔ اصل اور بڑی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک ہمارا تخت سے بلاوا ہی نہیں آیا۔ نواب صاحب کو تو معلوم ہی نہیں ہوگا کہ ہم یہاں قید ہیں۔ کبھی ان کا کوئی ذمّے دار اہلکار اس سلسلے میں ان کے سامنے زبانی رپورٹ پیش کرے گا اور انہیں اس طرف توجہ دینے کی فرصت ہوگی تو وہ حکم صادر کریں گے۔ پھر ہمیں فٹافٹ وہاں پہنچا دیا جائے گا۔ اگر اس وقت تک ہم زندہ ہوئے۔"

"سب لوگ مختلف چکروں میں پکڑے گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ کوئی کسی دوسرے اور دشمن قبیلے کا ہے' کوئی زمینوں یا مال کے لین دین کے جھگڑے میں پکڑا گیا ہے' کسی سے ویسے ہی نواب صاحب کا کوئی خاص اہلکار اپنے کسی معاملے میں ناراض ہوگیا ہے اور اس نے اسے کسی چکر میں پھنسا دیا ہے۔ کوئی قبیلے کا مفرور مجرم ہے' قبیلے کے کسی قانون کے خلاف ورزی کرکے بھاگا تھا۔ کوئی واقعی کسی قسم کا جرم کرکے بھاگا ہے لیکن اسے سرکار یا پولیس کے بجائے نواب صاحب کے اہلکاروں نے گرفتار کیا ہے۔" اس نے کہا۔

"اور تم سیاسی قیدی کیسے ہوگئے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"میں ایک نہایت معمولی سا' غیر اہم سا اور غریب سا ورکر ہوں' اس لیے شاید مجھے تو سیاسی قیدی کہلانا بھی زیب نہیں دیتا۔ یہ دو الفاظ سن کر ہمارے ذہنوں میں مشہور' بڑے اور پیشہ ور سیاست کاروں.. بلکہ یوں کہو کہ سیاست فروشوں کے نام آتے ہیں جن کے جیل میں جاتے ہی اخباروں میں بیانات چھپنے شروع ہوجاتے ہیں کہ انہیں وہاں اے کلاس دی جائے' ٹی وی ریڈیو فراہم کیے جائیں' خدمت گار دیا جائے' اخبارات مہیا کیے جائیں۔ اور بے چارہ معمولی ورکر جو جلسے جلوسوں میں بھی ڈنڈے کھاتا ہے' پھر تھانے میں چھتر کھاتا ہے' جیل میں آکر ڈنڈا بیڑی لگواتا ہے' بند وارڈ میں رہتا ہے یا جیل سے باہر رہ کر ہی تحریکوں کا ایندھن بنتا ہے' گاجر مولی کی طرح کٹتا ہے اور اپنے لیڈر کا قد اونچا کرتا ہے۔"

"یہ سب کچھ تو صحیح ہے' میں خود اکثر ان باتوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں لیکن میرا پوچھنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر تم سیاسی قیدی ہو تو اس حوالات میں کیوں پائے جا رہے ہو؟ اگر جیل ہی تمہارا مقدر تھی تو تمہیں سرکاری جیل میں ہونا چاہیے تھا۔" میں نے اپنے سوال کی وضاحت کی۔

"میں بڑے نواب صاحب کا باغی ہوں اور جو لوگ ہما قبائلی نظام کے دائرے میں رہتے ہیں' ان پر کوئی اور قانون ہونے کی نوبت نہیں آتی۔ ہمارے نواب صاحب اتنے جاگیردار' سردار اور نواب ہوتے ہوئے بھی انقلاب لانے غریبوں کی حالت بدل دینے کی باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کی پارٹی منشور کی بنیاد بھی یہی تھی۔ ہم جیسے لوگوں کی سادگی دیکھو کہ ان کی حیثیت اور مقام کو دیکھتے ہوئے بھی ان سب باتوں پر ا کرتے تھے' ان کے لیے دن رات سیاسی کام کرتے تھے۔ میں چھوٹے سے شہر میں ان کی پارٹی کی شاخ کا صدر تھا اور اپنی دا میں بہت بڑا انقلابی تھا' انقلاب کے لیے کام کر رہا تھا۔"

غلام حسین نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر اپنے بالوں میں انگلیاں پھیریں' عجیب سے انداز میں مسکرایا پھر "لیکن جب بالوں میں چاندی چمکنے لگی تب سمجھ میں آیا کہ ہما ہاں تو نیچے سے اوپر تک فراڈ ہو رہا ہے۔ کہیں مذہب کے نا کہیں حقوق کے نام پر' کہیں سیاست کے نام پر' کہیں انقلاب نام پر۔ علامہ اقبال کتنے دور اندیش تھے۔ کتنے برس پہلے وہ کہ تھے۔

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے' سلطانی بھی مکاری

ان کے زمانے میں تو پھر بھی کچھ اخلاقی اقدار باقی تھیں۔ وہ آج زندہ ہوتے تو یقیناً ان میں شعر کہنے کی بھی سکت نہ ر شدتِ غم سے گریباں چاک کرکے وہ بیابانوں کی طرف جاتے۔"

"بہت دیر سے انکشاف ہوا تم پر ان باتوں کا۔" میں مسکراتے ہوئے کہا۔

"المیہ تو یہ ہے کہ بعض لوگوں پر تو اس عمر میں بھی ہوتا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"خیر... تم پر جب انکشاف ہوا تو تم نے کیا کیا؟" میں پوچھا۔

"میں رسّی تڑا کر بھاگا۔ میں نے اقتدار کی جنگ میں کچھ ا تماشے دیکھے کہ میری انقلابی روح شدید زخمی ہوگئی۔ میں نے ا انقلاب کی کٹھڑی کمیٹی اور عہدے سے استعفا دے کر بھاگ اِدھر اُدھر بیٹھ کر کچھ باتیں بھی کیں۔ انقلابی کی روح پر تازیانہ ہے تو وہ کچھ دنوں کے لیے بہت بھڑکتا ہے' بکواسی ہوجاتا ہے۔ بکواس کی رپورٹیں بھی اوپر پہنچیں تو مجھے باغی قرار دے دیا گیا میری گرفتاری کے احکامات جاری ہوگئے۔ نجی سطح پر گرفتاری احکامات جن کے نتیجے میں اس وقت میں تمہارے سامنے ہوں۔"

اس نے استہزائیہ انداز میں اپنے سراپا کی طرف اشار "یہ تمہارے سامنے انقلاب بیٹھا ہے۔ پاؤں میں زنجیر پہنے' دار دروازے کے پیچھے۔ ہر انقلاب کی ہمارے ہاں یہی کہانی ہے جو بار بار دُہرائی جاتی ہے۔"

پھر وہ ایک طویل سانس لے کر قدرے پُرسکون لہجے میں بولا "تم آئے ہو تو تم سے یہ باتیں کرکے دل کی بھڑاس نکال کے بڑا سکون ملا ہے۔ یہ آس پاس کی کوٹھریوں میں جو قیدی بند ہیں' ان سے اس قسم کی باتیں نہیں کی جاسکتیں۔ یہ تو اُردو بھی زیادہ نہیں سمجھتے اور سیاست و فلسفے کی باتیں تو یہ اپنی زبان میں بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا' ہمدردانہ لہجے میں بولا "لاؤ یار! میں تمہاری رسّیاں تو کھول دوں۔ لگتا ہے بہت دیر سے بندھے ہوئے ہو۔"

"اگر کسی نے دیکھ لیا تو کیا تمہیں سزا نہیں ملے گی؟" میں نے پوچھا۔

"سزا...؟ سزا تو بہت سخت ملے گی۔ ہم قیدی.... اپنی اپنی کوٹھری میں رہتے ہوئے اپنی تنہائی اور ذلت کے احساس سے تنگ آکر اگر اونچی آوازوں میں باتیں کرنے لگ جاتے ہیں تو اس پر بھی یہاں کے محافظ آکر بہت مارتے ہیں۔ گدھوں کو بھی اگر اس طرح ڈنڈوں سے پیٹا جائے تو شاید کسی کونے کھدرے میں سوئے ہوئے یا کھوئے ہوئے محکمۂ انسدادِ بے رحمیٔ حیوانات والے آجائیں لیکن ہماری چیخ و پکار پر کان دھرنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ اسی لیے تم نے شاید محسوس کیا ہو کہ برابر کی کوٹھریوں میں قیدی بالکل خاموش ہیں ورنہ شاید تمہاری آمد پر وہ کوئی سوال کرتے' کچھ جاننے کی کوشش کرتے۔ حالانکہ انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت کسی کو ادھر آنے کا ہوش نہیں ہے۔ اس کے باوجود بے چارے خاموش کھڑے ہیں۔ خوف ان کے لاشعور تک میں بیٹھ گیا ہے۔"

"اور تمہیں سزا کا خوف نہیں ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بہت زیادہ ہے" وہ جھرجھری سی لے کر بولا "ڈنڈے کھانے اور کسی بھی طرح کا تشدد سہنے سے میں بہت ڈرتا ہوں۔ میری روح فنا ہوتی ہے۔ میں کم تعلیم یافتہ ہوں لیکن پڑھنے لکھنے کا شوق رکھنے والا آدمی ہوں۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ کبھی یہ کچھ ہوگا۔"

"اس کے باوجود میری رسّیاں کھول رہے ہو؟"

"ہاں۔ میں یہ تو نہیں چاہتا کہ میں کوئی چھوٹی موٹی حرکت کروں اور وہ لوگ آکر میری کھال اُدھیڑیں یا ہڈیاں توڑیں۔ میں کوئی بڑی حرکت کرنا چاہتا ہوں جس کے نتیجے میں وہ لوگ آکر فوراً ہی غصے میں مجھے گولی مار دیں اور میرے خیال میں تمہاری رسّیاں کھول دینا ایسی ہی حرکت ہوگی۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "حالانکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اس پنجرے میں تو پھر بھی تم قیدی ہی رہو گے لیکن ہاتھ کُھلے ہوں گے تو تھوڑا بہت آزادی کا احساس ضرور ہوگا۔"

"خواہ اس کے عوض تمہیں گولی کھا کر مرنا پڑے؟"

"ہاں۔ گولی کھا کر مرنے سے میں نہیں ڈرتا۔ جو ذلّت اس وقت میں ظاہری طور پر اٹھا رہا ہوں' اس سے زیادہ اپنے دل میں محسوس کر رہا ہوں۔ اس سے تو لاکھ درجے بہتر ہے کہ انسان گولی کھا کر مر جائے۔" اس کے لہجے میں گہرا کرب پنہاں تھا۔

میں نے پشت اس کی طرف کرلی اور وہ میری بندشیں کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ رسّیاں میری کلائیوں پر بہت زیادہ سختی سے تو نہیں باندھی گئی تھیں لیکن گرہیں خاص ترکیب سے لگائی گئی تھیں کہ آسانی سے نہ کھل سکیں۔

غلام حسین گرہیں کھولنے کی کوشش کر رہا تھا اور میں قسمت کے اس تماشے پر حیران ہو رہا تھا کہ بعض اوقات انسان جس چیز سے ڈر رہا ہوتا ہے اسی میں اس کی بھلائی کا سبب نکل آتا ہے۔ جس چیز کو دیکھ دیکھ کر وہ کُڑھتا ہے وہی اس کی بہتری کا باعث بن جاتی ہے۔

میں جب سے اس ڈیرے پر پہنچا تھا' کئی بار قید خانے کا ذکر سن چکا تھا اور ڈر رہا تھا کہ کہیں مجھے لے جاکر وہیں نہ ٹھونس دیا جائے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہاں غلام حسین جیسا قیدی مل جائے گا جو فوراً ہی میرا دوست بن جائے گا اور اپنی بساط کے مطابق میری مدد پر کمربستہ ہوجائے گا۔

میں نواب زادی کی نخوت اور تکبر دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کباب ہوا جا رہا تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس نخوت اور تکبر کی وجہ سے مجھے قید خانے جانا پڑے گا جو میرے حق میں بہتر ثابت ہوگا۔

کب سے میری خواہش تھی کہ کسی طرح میرے ہاتھ کُھل جائیں۔ انسان خواہ قید میں ہی ہو لیکن اس کے ہاتھ پاؤں کُھلے ہوں تو وہ اپنے آپ کو اتنا مجبور محسوس نہیں کرتا لیکن اگر ہاتھ بندھے ہوں تو خواہ آپ کُھلے میں بھی پھر رہے ہوں' آپ اپنے آپ کو واقعی ایک قیدی اور مجبورِ محض محسوس کرتے ہیں۔ اس نکتے سے غلام حسین بھی آگاہ تھا۔

بلال شیدی شاید اسی اندیشے سے مجھے قید خانے میں نہیں بھیج رہا تھا کہ اتنی تنگ سی کوٹھری میں دو قیدی موجود ہوں گے تو شاید وہ ایک دوسرے کی مدد کی کوئی صورت نکال لیں لیکن شاید دل ہی دل میں نواب زادی کی رعونت سے بے زار ہوکر اس نے اس سارے معاملے پر لعنت بھیج دی تھی اور سوچ لیا تھا کہ اس کی طرف سے سب بھاڑ میں جائیں' جو بھی ہوگا دیکھا جائے گا' اسے نواب زادی کی خفگی مول لینے کی کیا ضرورت ہے۔ اسی لیے اس نے فقیرے کو مزید کسی احتیاطی تدبیر کی ہدایت بھی نہیں کی تھی۔ بس وہ آیا تھا اور مجھے کوٹھری میں دھکا دے کر چلا گیا تھا۔

غلام حسین آخر کار گرہیں کھولنے میں کامیاب ہوگیا۔ چند

لمحے بعد ہی اس نے پتلی سی وہ رسّی میرے قدموں میں ڈال دی۔ رسّی کھلنے کے بعد بھی میں فوری طور پر بازو سیدھے کرنے اور سامنے کی طرف لانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ کندھوں تک بازو گویا لکڑی کے ہوگئے تھے۔

بڑی مشکل سے بازو سیدھے کرکے میں نے ہاتھوں کا جائزہ لیا۔ ان پر ورم سا آگیا تھا اور رسّیاں زیادہ سختی سے نہ بندھی ہونے کے باوجود ان کے گہرے گہرے نشان جلد میں خوب اچھی طرح نقش ہوکر رہ گئے تھے۔ ہاتھ بالکل سُن تھے۔ میں نے بازوؤں کو پچاس ساٹھ زوردار جھٹکے دیے‘ ہاتھوں کو آپس میں رگڑ کر ان کی مالش کی۔ نہ جانے کتنی مرتبہ مٹھیاں کھولیں‘ بند کیں۔

آخرکار بازوؤں میں وہی طاقت و توانائی لوٹ آئی جس سے دل کو بڑی ڈھارس رہتی تھی۔ غلام حسین نے سچ کہا تھا۔ اب بھی گو کہ میں آزاد تو نہیں ہوگیا تھا‘ پنجرے جیسی کوٹھری میں ہی بند تھا لیکن دل کو جیسے کچھ قرار سا آگیا تھا۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا ”اب میں تمہاری... بلکہ یوں کہو کہ اپنی اور تمہاری مدد کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔“

کوٹھری کا سلاخ دار دروازہ چونکہ کچی دیواروں میں نصب تھا اس لیے مجھے امید کی کرن نظر آرہی تھی۔ میری غیر معمولی اور خدا داد جسمانی طاقت جو زندگی میں بارہا بڑے عجیب اور ناقابلِ یقین انداز میں میرے کام آئی تھی‘ اس وقت بھوک پیاس اور مسلسل ذلّت و خواری کی وجہ سے کافی متاثر ہوچکی تھی پھر بھی مجھے امید تھی کہ اس وقت وہ شاید کام دے جائے۔

میں نے ترچھے ہوکر پاؤں زمین پر جمائے‘ دروازے کی دو موٹی موٹی سلاخیں مضبوطی سے گرفت میں لیں اور پہلے تو دروازے کو جھنجوڑ کر اس کے وہ آہنی حصے ڈھیلے کرنے کی کوشش کی جو مٹی کی دیواروں میں پیوست تھے۔

اس میں مجھے معمولی سی کامیابی ہوتی دکھائی دی لیکن ساتھ ہی کچھ کھڑکھڑاہٹ بھی پیدا ہوئی۔ بابو غلام حسین فوراً گھبرا کر کھڑا ہوگیا اور میری کمر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا ”یہ کیا کررہے ہو یار؟ تم تو مروا دو گے۔ بڑا شور ہورہا ہے‘ وہ لوگ آجائیں گے۔“

”ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ تم گولی کھاکر مرنے سے نہیں ڈرتے۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

”وہ تو میں نے غلط نہیں کہا تھا لیکن اب اس بات کی گارنٹی تو نہیں ہے کہ وہ آتے ہی ہمیں گولی ماردیں۔ ہوسکتا ہے وہ ہم پر تشدد شروع کردیں جس سے میں بہت ڈرتا ہوں۔“ وہ بے بسی سے بولا۔

میں نے دروازے کو جھنجوڑنا بند کردیا اور دوبارہ پاؤں مضبوطی سے جماکر خاموشی سے اسے باہر کی طرف دھکیلنے لگا۔ سانس روک کر میں نے اس پر پوری طاقت صرف کردی۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ اکھڑ کر باہر جاگرے گا لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ یہ محض میری خوش فہمی ثابت ہوئی۔ طاقت آزمائی کرتے کرتے مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ میری کنپٹیوں کی نسیں پھٹ جائیں گی۔

بابو غلام حسین ایک بار پھر میری پیٹھ تھپکتے ہوئے بولا ”ہیرو بننے کی کوشش مت کرو۔ یہ دروازہ نہیں اکھڑے گا۔ کہنے کو مکان کچی اینٹوں اور مٹی سے بنا ہوا ہے لیکن یہ خاص قسم کی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بھربھری اور کمزور ہونے کے بجائے زیادہ ٹھوس ہوگئی ہے۔ تقریباً سیمنٹ کی طرح۔ بارش پڑنے سے یہ گھلتی کم ہے اور مضبوط زیادہ ہوتی ہے۔“

”دروازے کو جھنجوڑنے سے مجھے کچھ نتیجہ برآمد ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔“ میں نے زور آزمائی ترک کرتے ہوئے کہا۔

”نتیجہ یقیناً برآمد ہوتا مگر وہ ہم دونوں کے لیے عبرت ناک ہوتا۔“ غلام حسین ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

”اب میرے ہاتھ کھلے ہیں‘ اب مجھے ان لوگوں کی کچھ پروا نہیں ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”دوسری بات یہ کہ اس وقت ان لوگوں کا تھوڑے بہت شور کی طرف دھیان نہیں جائے گا۔ ان کی جان پر بنی ہوئی ہے۔ بہت برا حال ہے ان لوگوں کا۔“

”پھر بھی میں تمہیں اس دروازے کو اس طرح کھڑکھڑانے کی اجازت نہیں دوں گا۔ اگر ان کا حال برا ہے تو کہیں وہ ہم پر اور زیادہ غصہ نہ اتاریں۔“ غلام حسین دھیمی آواز میں بولا ”اب صورت حال کیا ہے؟ میرے خیال میں تو اب ڈاکو چلے گئے ہیں۔“

”ڈاکو جانے کے لیے نہیں آئے۔ وہ جو لینے کے لیے آئے ہیں وہ لے کر ہی جائیں گے۔“ میں نے وثوق سے کہا۔

پھر میں نے اسے اندر کی صورت حال سے آگاہ کیا۔ اسے بتایا کہ ڈیرے پر صرف تین یا چار مرد زندہ رہ گئے ہیں۔ باقی مرچکے ہیں۔ ڈاکوؤں کو یقیناً تین چار کروڑ کے سونے کی خبر ملی تھی اور لگتا یہی تھا کہ وہ ہر حال میں سونا حاصل کرکے رہیں گے۔ میرے خیال میں انہیں ایک فیصلہ کن حملہ کرنے کے لیے کمک کا انتظار تھا۔

ملگجی روشنی میں بھی مجھے غلام حسین کی آنکھوں میں چمک نمودار ہوتی محسوس ہوئی۔ وہ دبی دبی آواز میں ذرا جوش سے بولا ”تمہارا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ تبھی وہ اتنے صبر و سکون سے گھیرا ڈالے بیٹھے ہیں ورنہ یہ مخلوق اتنا صبر کرنے والی تو نہیں۔“

”لیکن اس میں ہمارے لیے تو ایسی کوئی خوش ہونے والی بات نہیں ہے۔“ میں نے کہا ”ڈاکو جب فیصلہ کن حملہ کریں گے تو ساتھ ہی ہم بھی شاید بے بسی کی موت مارے جائیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ اس نے تسلیم کیا اور اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑگئی۔ کوٹھریوں کے سامنے موجود فاضل دیوار کے اوپر سے نظر آنے والے تاروں کی طرف دیکھتے ہوئے وہ پُرخیال لہجے میں بولا ”اگر میرا زندہ حالت میں ڈاکوؤں سے سامنا ہوگیا تو میں ہاتھ باندھ کر ان سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے اپنے گروہ میں شامل کرلیں۔ شاید وہ میری بات مان لیں۔“

”مجھے امید نہیں ہے کہ تم ان کے معیار پر پورا اتر سکو گے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”تم انٹرویو میں کوالیفائی نہیں کرسکو گے۔ اگر انٹرویو میں پاس ہو بھی گئے تو عملی امتحان میں یقیناً رہ جاؤ گے۔“

اس نے ایک طویل اور سرد آہ بھری ”گویا تم میرے اس خیال کی تصدیق کررہے ہو کہ آئیڈیلسٹ لوگ ہر میدان میں ناکام ہوتے ہیں؟“

”ہاں۔ کافی حد تک یہی درست ہے لیکن کبھی کبھی آئیڈیلسٹ لوگ بہت حیرت انگیز کامیابی بھی حاصل کرجاتے ہیں‘ دنیا میں مثالیں چھوڑ جاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں سوچتا ہوں۔“ بابو غلام حسین نے کہا لیکن وہ جملہ مکمل نہ کرسکا۔ مجھے معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کیا سوچتا تھا کیونکہ اسی لمحے اچانک ہی گویا جہنم کا دہانہ کھل گیا۔ یک لخت ہی اتنے خوف ناک انداز میں فائرنگ شروع ہوئی گویا کسی بہت بڑی فوج نے مکان کو نرغے میں لے کر حملہ کردیا ہو۔ اس بار تو مشین گنوں کی تڑتڑاہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔

اتنی دیر سے چھایا ہوا سکوت یک لخت ہی درہم برہم ہوگیا تھا۔ میرے اندیشے درست ہی معلوم ہوتے تھے۔ آخرکار فیصلہ کن حملہ ہوگیا تھا۔ ڈاکوؤں کو جس کمک کا انتظار تھا شاید وہ آن پہنچی تھی۔ میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ ہم چڑیا گھر کے پنجروں سے بھی بدتر اس کوٹھری میں بند‘ بالکل ہی مجبور اور لاچار تھے۔

غلام حسین خوف زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ فائرنگ کا شور خاصا تیز تھا اور مجھے اندازہ تھا کہ اندر کافی ہڑبونگ مچ چکی ہوگی۔ میں نے غلام حسین سے کہا ”اگر اس وقت کسی نے دروازے کی کھڑکھڑاہٹ سن بھی لی تو زیادہ توجہ نہیں دے گا۔ اس لیے میں ایک بار پھر کوشش کررہا ہوں۔“

یہ کہہ کر میں نے پوری طاقت سے ایک بار پھر دروازے کو جھنجوڑنا شروع کردیا۔ دروازہ خاصا ڈھیلا ہوگیا تھا لیکن اس کے اکھڑنے کے آثار اب بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ مجھے موت سے تو نہیں البتہ بے بسی کی موت سے ضرور خوف آتا تھا۔ انسان آزاد ہو اور اپنی بقا کے لیے ہاتھ پاؤں مار سکتا ہو‘ اس عالم میں اسے موت آجائے‘ میرے خیال میں یہ کوئی خوف ناک بات نہیں تھی۔ لیکن انسان مقید ہو یا اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں اور اس عالم میں وہ چوہے کی طرح مارا جائے‘ یہ تصور مجھے ضرور خوف زدہ کرتا تھا۔

سامنے کی دیوار سے اوپر آسمان کا جتنا ٹکڑا دکھائی دے رہا تھا‘ اچانک ہی میری نظر اس طرف اٹھی اور میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ فضا میں کوئی چیز تیرتی ہوئی سیدھی مکان کی طرف آرہی تھی۔ میں نے فوراً دروازے کا پیچھا چھوڑا اور دیوار کے ساتھ لگ کر سجدے کی سی حالت میں گر گیا۔ میں نے چیخ کر غلام حسین سے کہا ”تم بھی یونہی کرو۔“

دوسرے ہی لمحے مجھے معلوم ہوگیا کہ میرا اندازہ صحیح تھا۔ میں نے فضا میں جس چیز کو پرواز کرتے دیکھا تھا وہ راکٹ ہی تھا اور اسے یقیناً راکٹ لانچر سے ہی فائر کیا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈاکوؤں کے پاس راکٹ لانچر اور مشین گنیں تک پہنچ چکی تھیں۔ ان چیزوں کے ساتھ یقیناً مزید افراد بھی آئے ہوں گے۔ اب اس مکان کا اور اس میں زندہ بچ جانے والوں کا اللہ ہی حافظ تھا۔

غلام حسین تو صحیح طور پر سجدے کی سی حالت میں بھی نہیں آنے پایا تھا کہ ایک خوف ناک دھماکا ہوا اور مجھے یہی لگا کہ دیواریں ہم پر آگریں گی لیکن ہماری قسمت اچھی تھیں جو ایسا نہیں ہوا لیکن چھت اور دیواروں سے ڈھیروں مٹی ہم پر گری۔

اندر سے کسی کے چیخنے کی آوازیں سنائی دیں۔ آوازیں نسوانی معلوم ہوتی تھیں لیکن میرے لیے اندازہ کرنا مشکل تھا کہ وہ نواب زادی کی آواز تھی‘ چھماں کی یا پھر گرکھاں کی۔ وہ گھٹی گھٹی سی آواز تھی۔ اندر یقیناً کوئی اور قیامت گزر گئی تھی۔ آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ مکان کا کچھ حصہ منہدم بھی ہوا تھا۔

درودیوار میں ارتعاش تھمنے سے پہلے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔ دوسرا راکٹ لانچ ہونے سے پہلے اگر ہم اس کوٹھری سے نکلنے میں کامیاب ہوجاتے تو شاید ہمارے حق میں بہتر ہوتا۔ فی الحال بھی قسمت ہم پر مہربان ہی رہی تھی کہ راکٹ غالباً مکان کے اس حصے پر جاکر گرا تھا جہاں کچھ دیر تک پہلے میں دیگر لوگوں کے ساتھ موجود تھا۔ مجھے اب اس متکبر نواب زادی کا شکر گزار ہونا چاہیے تھا جس نے بری طرح خار کھاکر مجھے اس قید خانے میں بھیج دیا تھا۔

میں نے ایک بار پھر دروازے کو پکڑا اور زور آزمائی شروع کی۔ مجھ پر ایک خوش کن انکشاف ہوا کہ راکٹ کی تباہ کاری نے میرا کام بہت آسان کردیا تھا۔ دیواریں شاید کچھ اس طرح جھنجھنائی تھیں کہ آہنی دروازے کے جو حصے ان میں پیوست تھے‘ وہ مزید ڈھیلے ہوکر باہر نکل آئے تھے۔

میں نے پوری طاقت صرف کرکے ایک جھٹکا دیا جو آخری جھٹکا ثابت ہوا۔ سلاخ دار دروازہ باہر جاگرا۔ اس کے ساتھ شاید اوندھے منہ میں بھی جاگرتا لیکن میں نے بروقت اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

اس وقت تک کوئی وہاں نہیں پہنچا تھا۔ معلوم نہیں کون زندہ بچا تھا‘ کون مرچکا تھا۔ جو زندہ بچے بھی ہوں گے انہیں یقیناً اس طرف توجہ دینے کا ہوش نہیں ہوگا۔ تاہم میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ دوسرا راکٹ لانچ ہونے سے پہلے مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ دوسرا راکٹ قید خانے پر ہی آگرتا۔

یہ خیال بجلی کی سی تیزی سے میرے ذہن میں آیا لیکن میں

فوری طور پر وہاں سے نہ بھاگ سکا۔ مجھے غلام حسین کا خیال آگیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے زنجیر اس کے پاؤں میں ہی نہیں، میرے پاؤں میں بھی تھی۔ اس کے پاؤں میں قید خانے کی زنجیر تھی اور میرے پاؤں میں اس کے احسان کی زنجیر تھی۔ اس نے سزا کی پروا کیے بغیر میرے ہاتھوں کی بندشیں کھولی تھیں۔

اگر اس نے یہ زحمت اور ہمت نہ کی ہوتی تو میرے لیے اس وقت کوٹھری کا دروازہ اکھاڑنا ممکن نہ ہوتا۔ فائرنگ شروع ہونے کے بعد تو اتنی مہلت ہی نہیں مل سکتی تھی کہ وہ میری رسّیاں کھولتا۔

میں تیزی سے گھوما۔ غلام حسین پُرامید نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی زنجیر کا وہ سرا پکڑا جو دیوار میں پیوست کڑے سے منسلک تھا۔ میں نے ایک پاؤں دیوار پر جمایا اور کڑے کو دیوار سے اکھاڑنے کے لیے زور آزمائی شروع کی۔ ایک ہمت افزا بات یہ تھی کہ آہنی کڑا بھی دیوار میں ڈھیلا پڑچکا تھا۔ کچھ اوپر تو دیوار میں ہلکی سی دراڑ بھی نمودار ہوچکی تھی۔

غلام حسین نے بھی حسب مقدور میرا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی۔ ہم رسّا کشی کے انداز میں زنجیر کو کھینچ رہے تھے۔ مشین گنوں اور دور مار رائفلوں سے فائرنگ اس دوران بھی جاری تھی لیکن ہماری خوش قسمتی تھی کہ قید خانے کی طرف فائرنگ کا زور کم ہی تھا اور فاضل دیوار کی وجہ سے تو ہم بالکل ہی محفوظ تھے۔

چند سیکنڈ میں ہی ہماری کوشش بار آور ہوگئی۔ کڑے کا پچھلا حصہ ایک بڑی سی "ٹی" کی شکل کا تھا جو دیوار سے آخر کار نکل آیا لیکن اس زور آزمائی اور لوہے کی مسلسل رگڑ سے میرے ہاتھوں میں جلن سی ہونے لگی۔ خود پرستی سے قطع نظر میں اپنے ہاتھوں کو آہنی ہاتھوں میں شمار کرسکتا تھا لیکن لوہا بھی اتنی دیر تک اور اتنے دباؤ کے ساتھ لوہے سے رگڑ کھاتا رہے تو اس پر بھی کچھ نہ کچھ اثرات تو نمودار ہو ہی جاتے ہیں۔

غلام حسین نے اپنی زنجیر کا سرا ہاتھ میں تھام لیا۔ فی الحال اس زنجیر کو اس کے پاؤں سے نہیں نکالا جاسکتا تھا۔ ہم دونوں رکوع کی سی حالت میں کوٹھری سے نکلے اور سامنے والی دیوار کی اوٹ میں جا پہنچے۔ اسی دوران پیچھے سے دوسرے قیدیوں کا شور سنائی دیا۔

وہ ہمیں فرار ہوتے دیکھ کر شور مچا رہے تھے کہ ہم ان کی بھی کچھ مدد کریں لیکن یہ ممکن نہیں تھا۔ ہر کوٹھری کا تالا توڑنا یا دروازہ اکھاڑنا اور پھر ہر قیدی کی زنجیر دیوار سے نکالنا ہمارے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے ہم نے انھیں ان کے حال پر چھوڑا اور فاضل دیوار کی اوٹ سے نکل کر چاروں ہاتھ پیروں کے بل بیرونی دیوار کی طرف بڑھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ اس طرف ایسی شدید نہیں تھی اور ہم چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے ان کی زد سے محفوظ رہ سکتے تھے۔

ہم بیرونی دیوار تک تو صحیح سلامت پہنچ گئے لیکن اس کے اوپر چڑھنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔ گولیاں اس کے بالائی کنارے کو اُڑاتی ہوئی اندر آرہی تھیں۔ اس بدنصیب مکان پر جانے کتنی گولیاں برسائی جاچکی تھیں کہ اس کی دیواریں اوپر دندانے دار سی ہوچکی تھیں۔

میں اور غلام حسین دیوار سے چپک کر سکڑے سمٹے بیٹھے تھے۔ میں آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہی میرے اندیشے کے مطابق دوسرا راکٹ آتا دکھائی دیا۔ اس راکٹ نے تو اس طویل و عریض مکان کا خاصا بڑا حصہ منہدم کردیا اور کہیں آگ بھی بھڑک اٹھی۔ قیدیوں کی بھی چیخ و پکار سنائی دے رہی تھی۔ حالانکہ قید خانہ اب بھی سلامت تھا۔

چار دیواری کا جتنا حصہ ہم دیکھ سکتے تھے، اس کے عقب میں اب بلال شیدی کا کوئی آدمی تعینات دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ معلوم نہیں کوئی زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔ کچھ ہی دور مکان کے ایک کونے پر ہمیں ایک لاش تو آڑی ترچھی پڑی نظر آرہی تھی۔

دوسرا راکٹ پھینکے جانے کے بعد فائرنگ بند ہوگئی تھی۔ شاید ڈاکو دوسرے راکٹ کی تباہ کاری کا جائزہ لے رہے تھے۔ میں نے غلام حسین سے کہا "جلدی آؤ۔ یہی موقع ہے کہ ہم دیوار پھلانگ جائیں۔"

لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ جب ہم دیوار کے اوپر پہنچیں گے تو ملگجی روشنی میں شاید بہت دور سے بھی ہمارے ہیولے دیکھ لیے جائیں۔ ڈاکوؤں کے پاس یقیناً دوربینیں بھی تھیں یا پھر ان کی دور مار رائفلوں پر دوربینیں لگی ہوئی تھیں۔ ادھر مکان میں کہیں آگ لگ جانے کی وجہ سے بھی اس دیوار تک روشنی ذرا سی بڑھ گئی تھی جہاں ہم موجود تھے۔

ہمارے لیے صرف وہی ایک لمحہ خطرناک تھا جب ہم دیوار کے اوپر پہنچتے۔ باہر چھلانگ لگا دینے کے بعد تو ہمارے عقب میں دیوار ہوتی یعنی پس منظر گویا تاریک ہوجاتا اور ہم اس میں گڈمڈ ہوجاتے۔ بس اسی ایک درمیانی لمحے میں اگر کوئی گولی ہمارے جسم کے پار نہ ہوتی تو ہم بچ نکلنے کی کچھ امید رکھ سکتے تھے۔

میں نے غلام حسین کا ہاتھ پکڑا اور اسے چار دیواری کے کونے کی طرف تقریباً کھینچتا ہوا لے چلا۔ اس طرف روشنی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اس گوشے میں دو تین اُجڑے اُجڑے درخت بھی موجود تھے۔ درختوں کے پس منظر کا سہارا لیتے ہوئے دیوار پر چڑھنا کافی حد تک محفوظ ثابت ہوسکتا تھا۔

غلام حسین تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرا راکٹ گرتے دیکھ کر اور اس کا دھماکا سن کر وہ دہشت زدہ ہوگیا تھا حالانکہ ہم ابھی مکان کے پچھلی طرف ہی تھے اور دونوں راکٹوں کی تباہ کاری کا صحیح طور پر نظارہ نہیں کرسکے تھے۔ دوسرا راکٹ گرنے کے بعد تو مکان کے اگلے حصے کی طرف سے کوئی چیخ بھی سنائی نہیں دی تھی۔ معلوم نہیں کوئی زندہ بھی بچا تھا یا نہیں۔

کونے میں پہنچ کر میں نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے غلام حسین کو پہلے

اپنے کندھوں پر چڑھایا اور اسے ہدایت کی "دیوار پر ایک لمحے کے لیے بھی نہ بیٹھنا، فوراً باہر کود جانا۔"

وہ بری طرح حواس باختہ تھا۔ دو مرتبہ تو وہ میرے کندھوں پر چڑھنے کی کوشش میں گر پڑا۔ پاؤں میں پڑی ہوئی بھاری زنجیر بھی اس کے لیے مصیبت بن رہی تھی۔ آخر کار میں نے ہی اسے تقریباً گود میں اٹھا کر دیوار پر چڑھایا اور وہ ہانپتا کانپتا دوسری طرف کود گیا۔

میں نے ایک لمحے انتظار کیا۔ کوئی گولی نہیں چلی تو میں نے بازو بلند کرکے ہاتھ دیوار پر جمائے اور بلی کی طرح جسم کو بل دیتے ہوئے دیوار پر چڑھ کر فوراً ہی دوسری طرف کود گیا۔ دوسری طرف بھی میں دیوار سے چپک گیا اور فوری طور پر حرکت کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے دیکھا، غلام حسین قریب ہی تقریباً سجدے کی سی حالت میں پڑا کمر پر ہاتھ رکھے کراہ رہا تھا۔

"کیا ہوا؟" میں نے تیز سی سرگوشی میں پوچھا۔

"لگتا ہے کمر میں جھٹکا آگیا ہے۔ مجھ سے تو سیدھا کھڑا ہی نہیں ہوا جارہا۔" وہ کراہتے ہوئے بولا "اصل میں مجھے پہلے بھی کچھ چوٹیں بڑی غلط سلط جگہوں پر لگی ہوئی ہیں۔ قید خانے میں محافظوں نے کئی بار مارا تھا۔"

"فکر مت کرو، صرف حوصلہ بلند رکھو، سب ٹھیک ہوجائے گا۔" میں نے اس کی ہمت بڑھانے کی کوشش کی "سیدھے کھڑے ہونے کی ہمیں ویسے بھی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں تو ابھی نہ جانے کتنا فاصلہ رکوع کی سی حالت میں یا چوپایوں کی طرح طے کرنا ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔" میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

ہم دونوں بالکل کبڑے ہوکر دیوار کے ساتھ لگ کر ایک طرف کو کھسکنے لگے۔ میں بہت زیادہ پُریقین نہیں تھا کہ ہم ڈاکوؤں کے گھیرے سے زندہ سلامت نکل جائیں گے لیکن میرا فلسفہ یہی تھا کہ جدوجہد آخری سانس تک جاری رکھنی چاہیے۔

صورت حال خاصی مایوس کن تھی۔ میں بہت پہلے سے ہر امکان پر غور کرچکا تھا۔ مکان چاروں طرف سے پہاڑیوں میں گھرا ہوا تھا۔ پہاڑیوں اور مکان کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ پہاڑیوں ہی کے درمیان ایک طرف کچھ حصہ خالی تھا۔ اسے گزرگاہ سمجھا جاسکتا تھا۔

یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس پہاڑی کے عقب میں ڈاکو موجود تھے اور کس کے عقب میں نہیں۔ بہرحال پہاڑیوں کے درمیان سے گزرنے کا تو تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ جو ایک گزرگاہ میسّر تھی، مجھے یقین تھا کہ اس کے دونوں طرف کی پہاڑیوں پر ضرور ڈاکو موجود ہوں گے اور گزرگاہ کی کڑی نگرانی کررہے ہوں گے۔ توقع یہی رکھنی چاہیے تھی کہ اس گزرگاہ پر متحرک نظر آنے والے کسی سائے پر بھی وہ گولی ضرور چلائیں گے۔ اس کے علاوہ درمیانی میدان کو عبور کرکے اس گزرگاہ تک یا کسی بھی پہاڑی تک پہنچنا اپنی جگہ ایک جان لیوا امتحان تھا۔

اس سارے طویل دائرے میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کی آڑ لے کر انسان آگے بڑھ سکتا۔ بس یہ غنیمت تھا کہ زمین سپاٹ نہیں تھی۔ نشیب و فراز سے پُر تھی۔ اگر کوئی زمین پر تقریباً رینگنے کے سے انداز میں سفر کرتا تو یہ نشیب و فراز اس کا ساتھ دے سکتے تھے۔ ان کی وجہ سے، محض تاروں کی روشنی میں دور سے کسی کو اس کی حرکت نظر نہیں آسکتی تھی۔ ابتدائی تاریخوں کا چاند بھی اب غائب ہوچکا تھا۔

دیواروں میں وہ چھوٹے چھوٹے چوکور سوراخ موجود تھے جن کے عقب میں، میں نے بلال شیدی کے آدمیوں کو مورچہ بند ہوکر فائرنگ کرتے دیکھا تھا۔ ہم اتنا نیچے ہوکر گزر رہے تھے کہ ان سوراخوں سے کوئی ہمیں نہ دیکھ سکے۔ کسی سوراخ سے اب گن کی نال جھانکتی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر بھی ہم ہر ممکن احتیاط کررہے تھے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کسی سوراخ کے عقب میں اب بھی کوئی شخص موجود ہو۔

چار دیواری کے کونے پر پہنچ کر ہم رک گئے۔ غلام حسین ہانپتے ہوئے سرگوشی میں بولا "اگر مزید کوئی راکٹ فائر ہوگیا تو؟"

"بس ... پھر تو اس مکان اور مکان والوں کا کچھ نہیں بچے گا۔" میں نے کہا۔

"لیکن میرا خیال ہے ڈاکو اس بری طرح تباہی پھیلانے کی حماقت نہیں کریں گے۔ انھیں اندازہ ہوگا کہ اس کے بعد تو سونا بھی نہ جانے کس شکل میں، کہاں کہاں تک بکھر جائے۔ اسے سمیٹنا بہت مشکل ہوجائے گا۔ وہ صرف مزاحمت کے امکان کو ختم کررہے ہیں۔ میرے خیال میں وہ صرف یہ چاہتے ہیں کہ جب وہ پہاڑیوں سے اتر کر مکان کی طرف بڑھیں تو کوئی ان کا راستہ روکنے والا موجود نہ ہو۔ اور اگر ہو بھی تو اسے اپنی کوشش میں کوئی کامیابی نہ ہو۔"

اسی لمحے ایک بار پھر فائرنگ شروع ہوگئی لیکن اب اس میں شدت نہیں تھی۔ ڈاکو گویا بہت سوچ سمجھ کر وقفے وقفے سے اور کہیں کہیں سے گولیاں چلا رہے تھے۔ مکان کی طرف سے اب قطعاً کوئی فائر نہیں ہورہا تھا۔ اس کے ایک حصے سے شعلے بلند ہورہے تھے جو پھیلتے دکھائی دے رہے تھے۔

مکان کے طویل و عریض احاطے میں تین چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ آگ ابھی ان تک نہیں پہنچی تھی۔ آگ ان تک پہنچنے کے بعد تباہی کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوسکتا تھا۔ سونا بھی انہی میں سے کسی گاڑی میں موجود تھا۔

میں نے سرگوشی میں غلام حسین سے کہا "میرا خیال ہے ڈاکوؤں کو اندازہ ہوچکا ہے کہ یہاں مزاحمت بالکل دم توڑ چکی ہے۔ اب جلد ہی وہ پہاڑیوں سے اترنا شروع کریں گے۔ وہ لوگ مشین گنیں پہاڑیوں پر نصب کرچکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ کچھ ڈاکو

پہاڑیوں سے اُتر کر مکان کو گھیرے میں لے کر اس کی طرف بڑھیں گے اور کچھ ڈاکو پہاڑیوں پر ہی رہ کر مشین گنوں کے ذریعے ان کو کور دیں گے۔"

پھر ایک گہری سانس لے کر میں نے کہا "اگر ہم جلد اس دائرے سے نکلنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو راستے میں ڈاکوؤں سے ہمارا آمنا سامنا بھی ہو سکتا ہے۔"

"اور ہم بالکل نہتے ہیں۔" غلام حسین ہونٹوں پر زبان پھیر کر پھنسی پھنسی سی آواز میں بولا۔

"ہاں" میں نے نہ جانے کیوں اس صورت حال میں بھی غیر ارادی سے انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "لیکن تم قدرت کے ایک تماشے پر ذرا غور کرو۔ ہم نہتے تھے اور ایک کوٹھری میں مقید تھے۔ تمہاری ٹانگ اور میرے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے لیکن ہم اس مکان سے زندہ سلامت نکل آئے ہیں۔ وہاں بہت سے کلاشنکوف بردار موجود تھے جو آزاد تھے' مورچہ بند تھے مگر وہ مر چکے ہیں۔"

غلام حسین نے آنکھیں پٹ پٹا کر میری طرف دیکھا۔ میری بات سے اسے گویا ایک نیا حوصلہ ملا۔ میرا اشارہ پا کر وہ اپنی کمر کی تکلیف کو بھول کر ذرا مستعدی سے میرے ساتھ ساتھ مزید آگے کھسکنے لگا۔ فضا میں اب بھی اِکّا دُکّا گولیوں کی سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی لیکن وہ ہمارے سروں سے کافی اوپر' دیوار کے کنارے کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھیں۔

بغلی دیوار کے وسط میں پہنچنے کے بعد سمت کے حساب سے میں نے فیصلہ کیا کہ اب ہمیں مکان سے دور ہٹنا شروع کر دینا چاہیے۔ دیوار سے الگ ہونے کے بعد ہم گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل اس پہاڑی کی طرف بڑھنے لگے جو درّے سے مشابہ گزرگاہ کے قریب واقع تھی۔ میرا خیال تھا کہ اگر ہم زندہ سلامت اس پہاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے تو پھر ڈاکوؤں کی نظر سے بچ کر اس راستے سے گزرنے کی کوئی ترکیب سوچیں گے۔

ابھی ہم نے اس طرح تھوڑا ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ غلام حسین منمنایا "یار! اس طرح تو گھٹنے چھل رہے ہیں... میں بڑی تکلیف میں ہوں۔ مجھے لگتا ہے تمہارا ساتھ دینا میرے بس کی بات نہیں۔"

"ہمت نہ ہارو غلام حسین!" میں نے نیچی آواز میں کہا "اگر ہم اس آزمائش سے سرخرو گزر گئے تو شاید کبھی کسی آرام دہ کمرے میں لیٹے لیٹے اس رات کی یاد ہماری رگوں میں لہو کی گردش تیز کر دیا کرے۔"

میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میرے ذہن کے نہاں خانوں میں ایسی بہت سی راتوں کی یادیں محفوظ تھیں۔ اس کے بجائے میں نے کہا "اگر تمہارے گھٹنے چھل رہے ہیں تو اس طرح چلو۔" میں نے اسے ہاتھوں اور پیروں کے پنجوں کے بل چل کر دکھایا جس میں گھٹنے زمین پر نہیں لگتے تھے۔

عجیب مضحکہ خیز سی حالت میں ہم زمین کے نشیب و فراز گزرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے کے غلام رسول کو ستانے کے لیے رکنا پڑتا۔ اس کے پاؤں کی زنجیر کمر کی تکلیف بھی اسے تنگ کر رہی تھی۔ ابھی تک ہم پر کوئی نہیں ہوا تھا۔ اس سے میرا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ شاید ڈاکوؤں کی توجہ مکان کی طرف تھی۔ بہرحال ہم کھڑے ہو کر چلنے کا خطرہ نہیں لے سکتے تھے۔

اس مضحکہ خیز سی حالت میں چلتے چلتے راستے میں کہیں جھاڑی میسّر آ جاتی تو اس کی اوٹ میں بیٹھ کر ذرا تحفظ کا احساس ہوتا۔ پیاس سے میرے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ اب تو پیاس واقعی میری برداشت سے بھی باہر ہوتی جا رہی تھی۔ پچھلے ایک گھنٹے کے دوران میں نے جو طویل زور آزمائی کی تھی اور اس کے بعد سے جس طرح پُرمشقت انداز میں ہم تقریباً رینگ رینگ کر آگے بڑھ رہے تھے' اس سے میری پیاس بھڑک اٹھی تھی۔ بھوک الگ ستا رہی تھی۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا لگتا۔ ایک بار مجھے نواب زادی کا خیال آیا جس نے بڑے تھرمس میں بچا ہوا پانی سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ معلوم نہیں اسے پینا نصیب بھی ہوا تھا یا نہیں۔

تقریباً آدھا راستہ طے کر کے غلام حسین ہمت ہار گیا اور زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے حلق سے اب جو آواز نکل رہی تھی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی لیکن اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی "میں اب ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔" وہ ہانپتے ہوئے بولا "میں تو اب یہیں لیٹ کر انتظار کروں گا اور جو قسمت میں ہوا وہ بھگتوں گا۔ تم اپنا سفر جاری رکھو دوست... ہاں۔ کم از کم مجھے اپنا نام تو بتاتے جاؤ۔ میں نے ابھی تک تمہارا نام ہی نہیں پوچھا۔"

"افضل ہے میرا نام" پیاس کی شدت سے الفاظ گویا میرے حلق میں خراشیں سی ڈالتے ہوئے برآمد ہوئے "اور میں تمہیں یہاں چھوڑ کر ہرگز نہیں جاؤں گا۔ خواہ مجھے تم کو بازوؤں پر اٹھا کر سیدھے کھڑے ہو کر چلنا پڑے۔"

"بیکار باتیں مت کرو۔" اس کے چٹختے ہوئے ہونٹ تھرتھرائے "اب تو باقی فاصلہ اسی طرح چلتے ہوئے بھی خیریت سے طے ہو جائے تو یہ خدا کا خاص ہی کرم ہو گا۔ اب تو پہاڑیاں قریب ہی نظر آ رہی ہیں۔ تم سیدھے کھڑے ہونے کا رسک ہرگز مت لینا۔ کسی بھی لمحے کسی ڈاکو کی نظر پڑ سکتی ہے۔ میں تو اسی پر حیران ہوں کہ ابھی تک زمین پر اس طرح حرکت کرتے ہوئے بھی ہم ان کی نظر میں کیوں نہیں آئے۔ ڈاکوؤں کی نظر تو بہت تیز ہوتی ہے۔"

"ہم یہاں تک خیریت سے پہنچ گئے' اس کے باوجود تم مایوس ہو رہے ہو۔" میں نے اس کا سر سہلاتے ہوئے کہا "مشکل مراحل تو ہم نے سر کر لیے ہیں۔ اٹھو... بس تھوڑی ہمت اور کرو۔ تم کیسے انقلابی ہو؟ میرا تو خیال تھا انقلابی کی روح بڑی طاقتور اور اس کی قوتِ ارادی بہت مضبوط ہوتی ہو گی۔"

"میرے دماغ سے انقلاب... سیاست... سب کچھ نکل چکا ہے۔ میں ہر چیز سے تائب ہو چکا ہوں۔ میں تو شاید اس وقت زندگی سے بھی تائب ہو چکا ہوں۔ مجھے اب زندگی سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی۔ میں یہیں لیٹ کر آرام و سکون سے مر جانا چاہتا ہوں۔ خدا حافظ افضل' میرے دوست! کاش تم سے کچھ اچھے حالات میں ملاقات ہوئی ہوتی۔"

اس نے یوں آنکھیں بند کر لیں جیسے اسے یقین ہو کہ فرشتۂ اجل اس کے سرہانے پہنچ چکا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر ذرا زور سے جھٹکا دیا تو اسے آنکھیں کھولنا پڑیں۔

"بکواس مت کرو۔" میں نے اسے ڈانٹا "اگر تم سے نہیں چلا جا رہا تو میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ۔ میں تمہیں لے چلوں گا بودے قسم کے انقلابی!"

"نہیں... اب مجھے اپنی جان پر اتنا بھی بوجھ مت بناؤ"

آخر کار وہ کراہ کر ایک بار پھر اٹھ بیٹھا۔ میرے اصرار کے باوجود وہ میری پیٹھ پر سوار نہیں ہوا اور ایک بار پھر پہلے کی طرح میرے ساتھ گھسٹنے لگا۔

مزید کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد زمین یکدم ہی کچھ زیادہ نشیبی سی ہو گئی۔ ہم اس نشیب میں اتر گئے۔ وہاں مٹی نم تھی اور مجھے پانی کی "خوشبو" بھی محسوس ہوئی۔ پھر سامنے نہایت خفیف سی جھلملاہٹ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ ایک بہت بڑی کڑاہی سے مشابہ اس نشیبی حصے کے مرکز میں چھوٹا سا ایک چشمہ موجود تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں بالکل دم بخود سا ہو گیا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ یہ دستِ غیب کی کیسی عجیب مہربانی تھی کہ ہم قطعی لاعلمی میں' قطعی غیر ارادی طور پر چشمے پر آ پہنچے تھے۔ مجھے گمان تک نہیں تھا کہ میں نے درّہ نما گزرگاہ تک پہنچنے کے لیے جو سمت منتخب کی ہے اس کے راستے میں چشمہ بھی پڑتا ہو گا۔

مجھے ایک اور خیال نے بھی حیران کر دیا تھا۔ وہ چھماں کا خیال تھا۔ میں یہاں تک کا فاصلہ طے کر کے آیا تھا اور مجھے ہی معلوم تھا کہ یہ فاصلہ میں نے کس طرح طے کیا تھا۔ چھماں بکری کی گندی کھال جسم پر لپیٹ کر گردن پر بکری کی سری باندھ کر یہاں تک آئی تھی اور پھر پانی سے بھرا تھرموس پیٹ پر باندھ کر واپس بھی گئی تھی۔ کیا کوئی اس کے اس احسان کا صلہ دے سکتا تھا؟ کیا کوئی اس "گندی عورت" کی جرأت و ہمت کی داد دینے کے لیے الفاظ تلاش کر سکتا تھا؟

میں غلام حسین کو تیزی سے آگے لپکتے دیکھ کر اپنے خیالات کی دنیا سے باہر آیا۔ غلام حسین کو ذرا تاخیر سے پانی نظر آیا تھا اور اس کے جسم میں گویا زندگی کی نئی لہر دوڑ گئی تھی۔ وہ چوپایوں کی طرح پانی تک پہنچا اور سنبھل نہ سکا۔ غڑاپ سے منہ کے بل پانی میں گر گیا۔

وہ سنبھل کر اٹھ گیا لیکن چوپایوں ہی کی طرح کھڑے پانی سے منہ لگا کر پینے لگا۔ میں بھی اس کے قریب پہنچ کر اسی طرح پانی پینے لگا۔ میرے ہاتھ تقریباً کہنیوں تک پانی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

وہ میری زندگی کا عجیب ہی تجربہ تھا۔ برسوں بعد شاید مجھے پانی اتنا لذیذ محسوس ہوا تھا۔ ذہن کے کسی گوشے میں یہ خیال بھی نہیں رہا تھا کہ پانی گندا یا خراب تو نہیں۔ اس میں کوئی آمیزش یا آلودگی تو نہیں۔

غلام حسین نے زیادہ پانی نہیں پیا۔ چند سیکنڈ ہی ٹڑپ ٹڑپ اور غڑپ غڑپ کرنے کے بعد وہ پیچھے ہٹ کر چشمے کے کنارے چت لیٹ گیا' وہ آنکھیں بند کیے ہانپ رہا تھا۔ میں نے پانی سے منہ نہیں ہٹایا۔ وہ گویا آبِ حیات تھا جو گھونٹ گھونٹ میرے معدے میں اتر رہا تھا اور رگ و پے میں نئی زندگی کی لہر دوڑ رہی تھی۔

اسی دوران ایک اور احساس نے مجھے حیران کر دیا۔ مجھ پر انکشاف ہوا کہ اس وقت اس طرح پانی پینے میں مجھے بڑا لطف آ رہا تھا۔ اس انکشاف پر مجھے دل ہی دل میں حیرت کے ساتھ شرمندگی بھی ہوئی۔ کہیں اس کا مطلب یہ تو نہیں تھا کہ ہر انسان کے اندر ایک درندہ چھپا ہوتا ہے جو مختلف مواقع پر مختلف انداز سے سامنے آ سکتا ہے اور اپنی جبلت کا اظہار کر سکتا ہے۔

گھُپ اندھیرے میں چوپایوں کی طرح پانی پیتے ہوئے مجھے ان فائیو اسٹار ہوٹلوں کا بھی خیال آیا جہاں میری نشست و برخاست رہتی تھی۔ میرے لیے ٹشو پیپر میں لپٹا ہوا اور اسٹرلائزڈ یعنی کھولتے پانی سے جراثیم سے پاک کیا گیا گلاس آتا تھا جس میں میں فلٹر شدہ پانی پیتا تھا۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں عموماً پانی کے لیے فلٹر پلانٹ بھی لگا ہوتا ہے۔ میری جو کوٹھی تباہ ہو چکی تھی اس میں بھی فلٹر پلانٹ موجود تھا۔

لاہور میں پانی ٹیوب ویلوں کے ذریعے سپلائی ہوتا ہے۔ زمین کا پانی میٹھا ہوتا ہے لیکن ایک بار میں نے ایک رسالے میں سائنسی رپورٹ پڑھی کہ زمین کا پانی قدرتی طور پر فلٹر شدہ تو ہوتا ہے لیکن پینے کے لیے بہتر ہوتا ہے کہ اسے ایک بار پھر فلٹر کر لیا جائے۔ چنانچہ میں نے گھر میں نصب کرانے کے لیے چھوٹا سا ایک فلٹر پلانٹ جرمنی سے منگوایا تھا۔

مجھے ان سارے انتظامات اور اہتمام کے بارے میں سوچتے ہوئے پھر اپنی موجودہ حالت پر غور کرتے ہوئے ہنسی آ گئی۔ اللہ اللہ کیا تضاد تھا! کیسا فرق تھا!

بہت شدید پیاس میں زیادہ پانی پی جانا اکثر نقصان دہ ہوتا ہے لیکن اس وقت مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی۔ میں پانی پیتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میرے معدے کی جگہ

ایک بڑی سی مشک نے لے لی ہے۔

آخر کار جب پانی حلق کے راستے اُلٹ کر واپس آنے لگا تب میں نے پینا بند کیا اور غلام حسین ہی کی طرح چشمے کے کنارے چت لیٹ گیا۔ نہ جانے کیوں اس وقت میرا کسی بیل کی طرح ڈکرانے کو جی چاہ رہا تھا۔

آخر میں نے دل ہی دل میں خود ہی اپنے آپ کو ڈانٹا۔ اب ایسی بھی کیا حیوانی جبلت کہ انسان کا ڈکرانے کو ہی دل چاہنے لگے۔ مجھے انسانی کھال میں ہی رہنا چاہیے تھا۔ چند لمحے بعد میں نے اپنی حالت بہتر محسوس کی تو میں اٹھ بیٹھا۔

چشمے سے مزید استفادہ کرنے کے لیے میں نے ہاتھ منہ اور پاؤں اچھی طرح دھوئے حالانکہ مجھے معلوم تھا اس کا کوئی خاص فائدہ نہیں ہوگا۔ چند منٹ بعد پھر وہی حالت ہو جائے گی لیکن اس سے طبیعت میں بڑی تازگی اور فرحت آگئی۔

لیکن اس کام سے فارغ ہو کر جب میں نے از سرِ نو اپنے گردوپیش کا جائزہ لیا تو وہ تازگی اور فرحت فوراً رخصت ہوگئی۔ قریب ترین پہاڑی جو درّہ نما راستے کے بھی قریب ہی تھی' ایک بہت بڑے ہیولے کی طرح دکھائی دے رہی تھی اور اس کی بلندی پر چھوٹا سا ایک اور ہیولا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ ٹرائی پوڈ یعنی تین ٹانگوں والے اسٹینڈ پر نصب ایک مشین گن کا ہیولا تھا لیکن اس کے عقب میں کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ رات کے سناٹے اور تاریکی میں اس قسم کی چیزوں کے ہیولے زیادہ خوف ناک سے دکھائی دیتے ہیں۔ فائرنگ اس وقت بالکل بند تھی۔ معلوم نہیں ڈاکو اس وقت پہاڑیوں کے عقب میں کیا کر رہے تھے اور کیا حکمتِ عملی اختیار کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

مجھے یہ بھی اندیشہ تھا کہ کہیں انہوں نے پہاڑیوں سے اترنا شروع نہ کردیا ہو۔ اگر انہوں نے اب مکان کی طرف پیش قدمی کا فیصلہ کرلیا تھا تو واقعی راستے میں ان سے مڈبھیڑ کا شدید خطرہ تھا۔

میں نے غلام حسین کو اشارہ کیا اور ہم نے ایک بار پھر چوپایوں کی طرح سفر شروع کردیا۔ میں تو پانی پی کر اپنے آپ کو کافی تازہ دم محسوس کر رہا تھا لیکن غلام حسین کچھ ست پڑ گیا تھا تاہم وہ میرا ساتھ دینے کی حتی الامکان کوشش کر رہا تھا۔

غنیمت یہ تھا کہ جوں جوں ہم پہاڑی کے نزدیک ہوتے جا رہے تھے' راستے میں جھاڑیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ان کی وجہ سے ملگجے اندھیرے میں ہمارے دیکھ لیے جانے کا امکان ذرا کم ہو رہا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ پہلے ہم پہاڑی کے دامن میں پہنچیں پھر اس [illegible] دائرے میں چکر کاٹ کر درّہ نما راستے تک پہنچیں۔ اس [illegible] ہمیں کم از کم ایک طرف سے پہاڑی کی اوٹ میسّر

میرے لیے یہ بات خاصی حیرت کا باعث بنی کہ ہم خیروعافیت پہاڑی کے قریب پہنچ گئے۔ اس دوران سکوت ہی طاری رہا۔

میں نے مُڑ کر مکان کی طرف دیکھا۔ اس کی چار دیواری میں نارنجی سی روشنی رقص کرتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ مکان میں بدستور آگ لگی ہوئی تھی لیکن زیادہ نہیں پھیلی تھی۔ شاید بیچ بیچ میں مٹی کی بھاری بھرکم دیواروں نے آگ کا راستہ روک لیا تھا۔

مکان کے اندر کا منظر تو ظاہر ہے ہم نہیں دیکھ سکتے تھے لیکن احساس یہی ہو رہا تھا کہ اندر کسی قسم کی نقل و حرکت نہیں ہو رہی تھی۔ جہاں ہم پہنچ چکے تھے' اس زاویے سے مجھے ایک جگہ سے مکان کی چار دیواری بھی ٹوٹی ہوئی نظر آئی لیکن شگاف زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس میں سے صرف ایک ٹوٹی چھت کا لٹکتا ہوا حصہ نظر آ رہا تھا جس پر ایک شعلہ پھڑپھڑا رہا تھا۔

ادھر پہاڑیوں پر بھی سکوت طاری تھا۔ کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ان کے پچھلی طرف ڈاکو اوپر ہی چڑھے ہوئے تھے یا اتر آئے تھے۔ ابھی تک کوئی ڈاکو پہاڑی کے عقب سے نکل کر سامنے آتا بھی دکھائی نہیں دیا تھا۔ ان کا پُراسرار انداز مجھے زیادہ تشویش میں مبتلا کر رہا تھا۔ آخر وہ کمبخت کیا کر رہے تھے؟

کیا پیش قدمی کرنے کے لیے وہ صبح کا انتظار کر رہے تھے؟ مگر یہ تو ایک حماقت ہوتی۔ دن کی روشنی میں تو مکان کے اردگرد پھیلا ہوا میدان عبور کرتے وقت وہ خود بڑا واضح ٹارگٹ بن جاتے۔ اگر مکان میں کوئی ایک کلاشنکوف بردار بھی زندہ ہوتا تو وہ چار دیواری کی آڑ میں رہتے ہوئے ان میں سے بہت سوں کو ہلاک کر سکتا تھا۔

تو پھر آخر وہ کیا کر رہے تھے؟

میں نے اس سوال میں سر کھپانا ترک کر کے غلام حسین کو پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور پہاڑی کے دامن میں ہی رہتے ہوئے ہم خرگوشوں کی طرح اچھلتے درّہ نما راستے کی طرف بڑھے۔

ہم اس ہموار اور نہایت کشادہ پگڈنڈی کے کافی قریب پہنچ چکے تھے جب اچانک ہی ہمیں گھوڑے کی تیز ہنہناہٹ سنائی دی۔ گھوڑا پہاڑی کے دوسرے طرف کہیں ہنہنایا تھا لیکن فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ قدرت نے ایک بار پھر ہماری مدد کی تھی۔ یہ آواز ہمارے لیے گویا خطرے سے خبردار کرنے والا سگنل ثابت ہوئی۔

ہم سے چند قدم آگے ایک جھاڑی موجود تھی۔ ہم لپک کر اس کی آڑ میں سینے کے بل لیٹ گئے۔ ہم سے یہ احتیاط بروقت ہی ہوگئی ورنہ ہم تو سیدھے پگڈنڈی کی طرف ہی جا رہے تھے۔ اگر ہم کچھ اور آگے پہنچ گئے ہوتے تو وہ درّہ ہمارے لیے درّۂ مرگ ثابت ہوتا کیونکہ دوسرے ہی لمحے بیک وقت کئی گاڑیوں کے انجن اسٹارٹ ہونے اور کئی گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بلند ہوئیں۔

آوازیں پہاڑی کے دوسری طرف سے سنائی دی تھیں۔ چند ہی لمحے میں وہ تیزی سے قریب آگئیں اور پھر ہم نے خاصے فلمی سے انداز میں درے سے چار جیپیں اور چھ گھوڑے نمودار ہوتے

دیکھے۔ سکوتِ شب کی چادر یکدم ہی تار تار ہوگئی تھی۔

جیپیں نہایت تیز رفتاری سے گرجتی' دھول اُڑاتی اور ادھر اُدھر لہراتی مکان کی طرف روانہ ہوئی تھیں اور گھوڑے بھی ان کا ساتھ دینے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔ جیپوں میں اور گھوڑوں پر سوار کئی ڈاکو طوفانی اور خالص "ڈاکوانہ" انداز میں رائفلوں اور سب مشین گنوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔

انہوں نے محصورین کو شکست دینے کی کارروائی تو مکمل کرلی تھی۔ اب وہ شکار پر آخری وار کرنے کے لیے اچانک اور نہایت بھرپور طریقے سے آگے بڑھے تھے۔ انہوں نے درمیانہ فاصلہ بہت تیز رفتاری سے اور ایک ہی سمت سے طے کرنے کی حکمت عملی اپنائی تھی تاکہ اگر مکان میں ایک آدھ یا اس سے زیادہ کلاشنکوف بردار بھی زندہ ہوں تب بھی ڈاکوؤں کو زیادہ جانی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

پہاڑیوں کے عقب میں اسی لیے اتنی دیر سے سکوت چھایا ہوا تھا کہ وہ سب پیچھے ہی پیچھے پہاڑیوں سے اتر کر ایک جگہ جمع ہو رہے تھے اور یکدم دھاوا بولنے کی تیاری کر رہے تھے۔ میری دھڑکنیں تو اس تصور سے تیز ہو رہی تھیں کہ اگر ہم چند لمحے پہلے پگڈنڈی کے قریب پہنچ گئے ہوتے تو ہمارا کیا انجام ہوتا؟ گو کہ ڈاکوؤں نے اپنی جیپوں کی ہیڈ لائٹس روشن نہیں کی تھیں لیکن ان کی نظر ضرور ہم پر پڑ جاتی اور اگر ہم ادھر اُدھر بھاگنے کی کوشش کرتے تب بھی بالکل اسی طرح مارے جاتے جس طرح شکاریوں کے ہاتھوں وہ جنگلی خرگوش مارے جاتے ہیں جو بے خبری میں اچانک ہی جھاڑیوں یا جھنڈوں سے نکل کر ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ اب وہ ہم سے صرف پچیس تیس قدم کے فاصلے سے گزرے جا رہے تھے لیکن اس وقت وہ یقیناً بہت جوش میں تھے۔ ان کی تمام تر توجہ صرف مکان کی طرف تھی' اس لیے ہمارے دیکھ لیے جانے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ ویسے بھی ہم جھاڑی کی اوٹ میں تھے۔ کسی کو وہاں ہماری موجودگی کا شبہ ہوتا اور وہ ہمیں تلاش کرتا تبھی ہم کسی کی نظر میں آسکتے تھے۔

جس وقت ہم اپنا سفر طے کر رہے تھے' اس دوران ڈاکو یقیناً پہاڑیوں کے عقب میں بلندی سے اتر کر جمع ہو رہے تھے۔ شاید اسی لیے کسی کو ہماری موجودگی کا شبہ تک نہیں ہوا تھا۔ اب وہ ہمارے سامنے سے گزر گئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ ہم نے اپنے سفر کا مشکل ترین مرحلہ سر کرلیا تھا۔

ڈاکو ہم سے خاصی دور اور مکان کے کافی قریب پہنچ چکے تو میں نے غلام حسین کو اشارہ کیا اور ہم اٹھ کر اب چوپایوں کی طرح چلنے کے بجائے رکوع کی سی حالت میں دوڑتے ہوئے پگڈنڈیوں کی طرف بڑھے۔

درّہ نما حصے میں پہنچ کر ہم رک گئے پھر محتاط انداز میں چند قدم آگے بڑھائے۔ ہم چوروں کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھ رہے تھے۔ جب ہمیں یقین ہوگیا کہ پہاڑی کے دوسری طرف کوئی موجود نہیں ہے تو ہم نے پگڈنڈی کے کنارے تیز دوڑنا شروع کردیا۔ میں نے مُڑ کر یہ بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی کہ ڈاکوؤں کو مکان کی طرف سے کسی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا یا نہیں۔ ہمیں تو اس وقت اپنی پڑی ہوئی تھی تاہم عقب سے فائرنگ کی آوازیں بدستور آرہی تھیں۔

پگڈنڈی پر زیادہ اندھیرا محسوس ہو رہا تھا' اس کے باوجود ہمیں اپنا سفر آسان لگنے لگا تھا۔ ایک تو راستہ ہموار تھا' دوسرے ہمیں چوپایوں کی طرح یا خرگوشوں اور مینڈکوں کی طرح پھدک پھدک کر نہیں چلنا پڑ رہا تھا۔

جلد ہی پگڈنڈی معدوم ہوگئی۔ سمت کا کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ چاند بھی معدوم تھا۔ میں اپنی دانست میں اسی سمت میں بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا جدھر سے بلال شیدی وغیرہ کے ساتھ بیہڑ میں آیا تھا حالانکہ اسی سمت میں سفر کرنا کوئی عقلمندانہ فیصلہ نہیں تھا۔ کیونکہ اس وقت ہم بیہڑ میں تھے اور گھنٹوں ہم نے صرف ویرانوں ہی میں سفر کیا تھا اور نہ جانے کتنی مرتبہ ڈرائیور نے کس کس سمت میں گاڑی موڑی تھی۔ اب بھلا پیدل اس طرف سفر کر کے میں کہاں پہنچنے کی امید رکھ سکتا تھا؟

بہرحال ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا کہ بس چلتے رہیں اور ڈاکوؤں سے زیادہ سے زیادہ دور نکلنے کی کوشش کریں لیکن جلد ہی ہمیں سمت بدلنا پڑی۔ جس طرف ہم جا رہے تھے' ادھر تقریباً چالیس پچاس قدم آگے مجھے ایک ٹیلہ سا دکھائی دیا اور میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کیا کہ اس ٹیلے کے عقب میں کوئی موجود تھا حالانکہ ہمیں کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی' کوئی حرکت دکھائی نہیں دی تھی۔

میں نے غلام حسین کا ہاتھ پکڑا اور اس ٹیلے سے کترا کر گزرنے کے لیے یکدم دائیں طرف مُڑ گیا۔ غلام حسین بے چارہ اپنے آپ کو اپنی بساط سے بڑھ کر مضبوط آدمی ثابت کرنے کی کوشش تو کر رہا تھا لیکن اس میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں تھا۔ وہ میرے ساتھ تقریباً گھسٹ رہا تھا۔

وہ میرے ساتھ رہنے اور فرار میں کامیاب ہونے کے معاملے میں اتنا زیادہ پُرجوش بھی نہیں تھا۔ قید خانے میں اس نے نہ جانے کتنا عرصہ گزارا تھا۔ اس کی روح خاصی پژمردہ تھی یا پھر شاید بات صرف یہ تھی کہ وہ بہرحال ایک عام سا آدمی تھا اور جس صورت حال سے ہم گزر رہے تھے وہ ایک عام آدمی کے لیے نہایت اعصاب شکن تھی۔

لیکن میری شدید خواہش تھی کہ وہ میرے ساتھ چلتا رہے اور اگر میں اپنی فرار کی کوششوں میں کامیاب ہو جاؤں تو وہ میرا ہم قدم ہو۔ وہ ایک اچھا آدمی معلوم ہوتا تھا اور اچھے آدمی میری کمزوری تھے۔

ہم جوگنگ کے سے انداز میں دوڑ رہے تھے۔ سمت تبدیل کرکے ہم چند قدم ہی بڑھے تھے کہ غلام حسین کا پاؤں کسی چھوٹے سے گڑھے میں آگیا جسے میں پھلانگ چکا تھا۔ وہ لڑکھڑایا۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ اوندھے منہ گر گیا۔ اس کے گرنے سے اچھی خاصی دھپ کی سی آواز پیدا ہوئی اور اس کے منہ سے زوردار کراہ بھی نکلی۔

میں نے ہڑبڑا کر مُڑ کر دیکھا۔ مجھے ٹیلے کے عقب میں ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ اور کچھ حرکت کا احساس ہوا۔ اس وقت مجھے حیرت کا جھٹکا سا لگا جب دوسرے ہی لمحے میں نے کسی جیپ کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سُنی۔ ادھر میں غلام حسین کو کھینچ کر کھڑا کرنے میں کامیاب ہوا اور اُدھر ٹیلے کے عقب سے ایک جیپ نکل آئی۔

"غلام حسین ... جتنا تیز بھاگ سکتے ہو بھاگو۔" میں نے سرگوشی میں کہا کیونکہ ہمارے آس پاس چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔

اس نے بھی میری طرح پنجوں کے بل بھاگنے کی کوشش کی تاکہ ہمارے قدموں کی آواز پیدا نہ ہو لیکن ہماری اس احتیاط کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ہمیں دیکھ لیا گیا تھا۔ جیپ ہمارے ہی تعاقب میں آرہی تھی۔ اس کی ہیڈلائٹس تو روشن نہیں ہوئی تھیں لیکن ہمارے ہیولے یقیناً دیکھ لیے گئے تھے۔

میں دل ہی دل میں ڈاکوؤں کی مہارت اور تجربہ کاری کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ انہوں نے اس امکان کو نظرانداز نہیں کیا تھا کہ مکان میں محصور لوگوں کے لیے بھی کوئی کمک پہنچ سکتی تھی۔ شاید کوئی اچانک ہی اس طرف آنکلتا اور وہ بلال شیدی وغیرہ کا مددگار ہوتا یا ویسے ہی کوئی ایسا فرد یا افراد اس طرف آجاتے جو صورت حال میں مداخلت کرنے کے قابل ہوتے۔

اسی لیے ڈاکوؤں نے ایک جیپ اس مقام پر بھی کھڑی کر رکھی تھی۔ یہ گویا ان کی جائے واردات کی "سرحد" تھی۔ انہوں نے اپنے شکاروں کے گرد جس طرح گھیرا ڈالا ہوا تھا' وہ نہیں چاہتے تھے کہ کوئی آکر ان کی کارروائی میں خلل ڈالے یا ان کی یکسوئی کو متاثر کرے۔ یہ بات میری سمجھ میں آگئی لیکن اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

میں بہت تیز بھاگا اور غلام حسین نے بھی ہمت کرکے میرا ساتھ دیا لیکن انجن کی غراہٹ تیز ہوئی اور وہ اس سے زیادہ تیز رفتاری سے ہمارے تعاقب میں آئی۔ اس کی ہیڈلائٹس بھی روشن ہوگئیں اور ہم دونوں روشنی میں نہا گئے۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے ہم دونوں سربازار عریاں ہوگئے ہیں۔

انجن کی غراہٹ سے بلند تر کسی کی گرج سنائی دی "رک جاؤ"

اس سے آگے کچھ نہیں کہا گیا تھا لیکن ان دو لفظوں میں جو دھمکی پوشیدہ تھی میں نے اسے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر محسوس کرلیا اور دونوں ہاتھ اٹھا کر فوراً رک گیا لیکن غلام حسین سے غلطی سرزد ہوئی۔ یا پھر شاید اس کی تقدیر کا اختتامی باب کچھ اسی طرح تھا کہ وہ دوڑتا چلا گیا۔

وہ چند قدم سے زیادہ نہ دوڑ سکا۔ اسٹین گن گرجی اور وہ ناہموار زمین پر بہت دور تک قلابازیاں کھا گیا۔ میں نے اس کے بوسیدہ لباس میں سوراخ نمودار ہوتے اور پھر انہیں خون سے رنگین ہوتے دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ساکت ہوگیا۔ یہ سب کچھ گویا سلوموشن میں ہوا تھا۔

وہ مُڑی تُڑی سی حالت میں اس طرح مجھ سے کچھ دور پڑا تھا جیسے بچوں نے کسی گڈے سے کھیلنے اور دل بھرنے کے بعد اسے توڑ پھوڑ کر پھینک دیا ہو۔ ایک طرف سے اس کا چہرہ مجھے دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا منہ اور آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ چہرہ کو مسخ ہو کر رہ گیا تھا۔ زبان منہ سے باہر آگئی تھی۔

میری دھڑکنیں یک لخت جیسے تھم سی گئیں۔ اس بے چارے نے تو میری رفاقت کا سہارا پاکر اپنی بساط سے بڑھ کر جدوجہد کی تھی۔ نہایت جاں گسل مرحلوں سے وہ گزر آیا تھا اور اب جبکہ بیکراں فضاؤں میں آزادی کی سانس لینے کا عمل شروع ہوتا دکھائی دے رہا تھا تو یک لخت ہی سانسوں کی ڈور کاٹ دی گئی تھی۔ یہ بھی ہی وحشیانہ مذاق تھا!

میرا جسم تختے کی طرح اکڑ کر رہ گیا تھا کیونکہ میرے خیال میں دوسرے ہی لمحے میرے جسم میں بھی گولیاں پیوست ہونے والی تھیں۔ یہ انتظار شاید ایک آدھ سیکنڈ پر ہی مشتمل رہا ہو لیکن اس کی اذیت اور طوالت کو میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ اس کا اندازہ بھی صرف وہی کرسکتا ہے جسے کبھی ایسا انتظار کرنے کا اتفاق ہوا ہو موت جس کے قریب سے سرگوشی کرتی ہوئی گزری ہو۔

لیکن دوسرا برسٹ نہیں مارا گیا۔ کچی زمین پر زوردار رگڑ کی آواز کے ساتھ جیپ میرے عقب میں آن رکی۔ میں نے کن انکھیوں سے پیچھے دیکھا۔ وہ یقیناً ڈاکو ہی تھے۔ ڈاکوؤں کی دوسری جیپوں کی طرح یہ بھی ایک کھلی جیپ تھی اور اس میں صرف دو اشخاص موجود تھے۔

ایک ڈرائیو کررہا تھا' دوسرا اس کے برابر اسٹین گن سنبھالے بیٹھا تھا۔ جیپ رکی تو وہ دونوں ہی چھلانگ لگا کر اتر آئے اور میرے قریب آگئے۔ اسٹین گن والا مجھے کوَر کیے کھڑا رہا۔ ڈرائیو کرنے والا دوڑ کر غلام حسین کے قریب پہنچا۔ اس کی لاش کو سیدھا کرکے یوں اس کا چہرہ بغور دیکھنے لگا جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس نے غلام حسین کے پاؤں میں بندھی ہوئی بھاری زنجیر کا سرا بھی ہاتھ میں اٹھا کر دیکھا۔

اس کے ہاتھوں میں گن نہیں تھی لیکن اس کی کمر کے گرد موٹے رستے کی طرح بل کھایا ہوا ایک سیاہ کپڑا بندھا ہوا تھا۔ اس میں ایک ماؤزر اڑسا ہوا تھا۔

غلام حسین کا معائنہ کرکے وہ واپس آیا اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا "یہ تو قیدی معلوم ہوتا ہے۔"

اس کے لہجے میں یہ تاثر تو تھا جیسے وہ کہنا چاہ رہا ہو کہ ہم نے خواہ مخواہ ہی اسے مارنے کی زحمت کی لیکن لہجے میں تاسف ہرگز نہیں تھا۔ غلام حسین گویا ایک بے وقعت جانور یا کیڑا مکوڑا تھا جو اپنی غلطی یا ان کی جلدبازی سے مرگیا سو مرگیا' اس میں افسوس یا پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔

پھر اس نے خونخوار سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "تم کون ہو؟"

وہ لوگ سندھی میں بات کررہے تھے۔ میں نے ٹوٹی پھوٹی سندھی میں جواب دیا "میں بھی قیدی ہوں۔" پھر میں نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا "میں بھی اُدھر ڈیرے پر قید تھا۔ آپ کے ساتھیوں نے راکٹ پھینکے تو ہماری کوٹھری ٹوٹ گئی اور ہم نکل بھاگے۔"

"لیکن تمہارے پیر میں زنجیر نہیں ہے۔" اس نے مجھے گھورا۔

"میں ابھی نیا قیدی تھا۔ کل رات ہی پہنچا تھا۔ کوٹھری میں اس کے ساتھ بند تھا۔" میں نے غلام حسین کی طرف اشارہ کیا "کوٹھری میں دوسری زنجیر نہیں تھی۔ میرے صرف ہاتھ رسّی سے بندھے ہوئے تھے۔ اس نے کھولے تھے۔"

اسٹین گن والا کچھ اور قریب آگیا۔ اب وہ بھی میرے تقریباً سامنے ہی تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی خیال کی چمک ابھری تھی۔ ہمارے عقب میں جیپ کا انجن بدستور گھرگھرا رہا تھا اور ہیڈلائٹس آن تھیں۔

اسٹین گن والے نے کھرکھراتی آواز میں کہا "اڑے ... تم قیدی ہے' ڈیرے سے بھاگا ہے۔ تم کو کچھ پتا ہے ادھر نواب زادی کا سونا کدھر رکھا ہے؟"

"آپ لوگوں کے راکٹ پھینکنے سے پہلے تک کا تو مجھے پتا ہے۔" میں نے ادب سے جواب دیا "ڈیرے پر اندر تین چار گاڑیاں کھڑی ہیں۔ نواب زادی نے اپنی پجیرو سے نکلوا کر ان میں سے کسی میں رکھوایا تھا۔"

اب گویا اس بات کی تصدیق ہوگئی تھی کہ انہیں سونے کے بارے میں معلومات حاصل تھیں۔ اسٹین گن والے نے ماؤزر والے کو اشارہ کیا اور اس وقت مجھے حیرت کا ہلکا سا جھٹکا لگا جب اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر نہایت عمدہ قسم کا ایک واکی ٹاکی نکالا اور اس کا بٹن دباتے ہوئے' ایریل باہر نکالتے ہوئے اسے منہ کے قریب لایا۔

دوسری طرف رابطہ قائم ہونے پر پہلے تو چند فائروں کی آواز سنائی دی پھر کسی کی کھُردری سی آواز ابھری۔

"کیا پوزیشن ہے؟" ماؤزر والے نے پوچھا۔

"آدمی اندر کود گئے ہیں لیکن ایک آدمی کمرے میں بند ہوگیا ہے۔ اس کے ساتھ شاید عورتیں بھی ہیں۔ دیکھتے ہیں' منٹ دو منٹ میں کچھ ہوجائے گا۔ قابو میں نہیں آیا تو گرنیڈ ماریں گے۔" دوسری طرف سے جواب ملا۔

ماؤزر والا اسے شرم دلانے کے سے انداز میں بولا "اڑے۔ ادھر ڈیرے سے دو قیدی نکل کر یہاں تک پہنچ گئے' تمہیں پتا ہی نہیں چلا۔"

"کوئی بات نہیں' دفع کرو ان کو' گولی مارو۔" دوسری طرف سے بے پروائی سے کہا گیا۔

"ایک کو تو مار ہی دی ہے' دوسرے کو بھی ماردیں گے۔" ماؤزر والے نے کہا "ویسے اس نے کام کی بات بتائی ہے۔ سونا اُدھر کھڑی ہوئی گاڑیوں میں کسی گاڑی میں ہے۔ پہلے اس کو قابو کرو۔"

"ٹھیک ہے" دوسری طرف سے جواب ملا اور ماؤزر والے نے واکی ٹاکی دوبارہ قمیص کے نیچے کہیں اڑس لیا۔ اس دوران اس کی نظر مسلسل مجھ پر رہی تھی۔ اس کا ماؤزر اب بھی کمر سے بندھے کپڑے میں ہی اڑسا ہوا تھا۔ اس نے اسٹین گن والے کو اشارہ کیا۔ یہ اشارۂ اجل تھا۔

اس نے گویا بہ زبانِ خموشی کہا تھا "اڑا دو اسے بھی۔"

میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ مجھ سے انہیں کیا خطرہ یا کیا پرخاش تھی؟ غلام حسین اگر جلدبازی میں ان کے ہاتھوں قتل ہو بھی گیا تھا تو اب مجھے قتل کرنے کا مقصد کیا تھا؟ اس سے وہ کون سا فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے؟

غلام حسین کی لاش اب بھی میری نظروں کے سامنے تھی اور میری کھوپڑی میں اس وقت سے نہایت تیزی کے ساتھ بارود کا ایک ڈھیر جمع ہورہا تھا جب سے میں نے اسے گولیاں کھا کر گرتے دیکھا تھا۔ اس بے ضرر اور شریف آدمی کی زندگی کا سفر ہی یوں تو رائیگاں گیا تھا لیکن میرے ساتھ ایک نئی امید کا دامن تھام کر اس نے جیسے جاں سوز مرحلے سے گزر کر آزادی حاصل کی تھی' اس کے بعد اس کا ایک حقیر جانور کی طرح مارے جانا میرے دل پر بڑی گہری خراش ڈال گیا تھا۔

ماؤزر والے نے اسٹین گن والے کو اشارہ کرکے میری موت کا حکم صادر کیا تو گویا میری کھوپڑی میں ابھرتے ہوئے بارود کے ڈھیر کو چنگاری مل گئی۔ میرے حلیئے سے انہوں نے یقیناً مجھے ایک مفلوک الحال اور گیا گزرا دیہاتی ہی سمجھا ہوگا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں ہلاک کرڈالنا ضروری سمجھا تھا۔ شاید غیرضروری سفاکی ان کی فطرت میں شامل ہوچکی تھی۔

بہرحال اپنی لاشعوری حقارت کی وجہ سے اسٹین گن والا بے خیالی میں میرے کافی قریب آچکا تھا جتنا اسے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اس سے پہلے کہ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھتا' میرا ہاتھ اتنی تیزی سے گن کی نال پر پہنچا کہ وہ بروقت دیکھ نہ سکا۔

ایک ہاتھ سے گن کی نال آسمان کی طرف کرتے ہوئے میں نے اس کے پیٹ میں لات رسید کی اور دوسرے ہی لمحے گن

میرے ہاتھ میں تھی۔ ماؤزر والے نے انتہائی پھرتی سے پیچھے ہٹتے ہوئے کمر میں باندھا ہوا ماؤزر نکالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔

شاید اس کے وہم و گمان میں بھی نہ رہا ہو کہ میں گن کے استعمال میں اتنا ماہر ہو سکتا ہوں۔ دوسرے ہی لمحے اسٹین گن گرجی اور ایک ہی برسٹ میں دونوں کا قصہ تمام ہوگیا۔ وہ دونوں اچھل کر پیچھے جاگرے اور ساکت ہوگئے۔

غلام حسین کی لاش کے قریب جاکر میں نے صرف اتنا کہا "معاف کرنا دوست۔"

اسٹین گن میں نے اس کے قریب ہی پھینک دی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا تھا کہ اسٹین گن ساتھ ہی رکھ لوں لیکن پھر ارادہ ملتوی کردیا حالانکہ اس کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی۔ میں اب وہاں مزید رکنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں جلدی سے ڈاکوؤں کی جیپ میں بیٹھا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

میں اپنی دانست میں اب بھی اسی راستے پر چلنے کی کوشش کررہا تھا جس سے بلال شیدی وغیرہ مجھے لائے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کسی طرح کندھ کوٹ یا کشمور واپس پہنچ جاؤں لیکن اس ویرانے اور تاریکی میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ میں درحقیقت کس طرف جارہا تھا۔

سردست مجھے اس کی کوئی زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔ میرا مقصد تو کسی آبادی میں پہنچنا ہی تھا۔ کندھ کوٹ یا کشمور نہ سہی' کوئی اور شہر سہی۔ جیپ زیادہ اچھی کنڈیشن میں نہیں تھی لیکن جیپ کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ ہر حال میں بھاگتی رہتی ہے۔ کوئی بہت ہی بڑا نقص ہوجائے تب شاید رکتی ہے ورنہ یہ بڑا ساتھ دینے والی سواری ہے۔ میں اسے حتی الامکان تیز رفتاری سے بھگائے لیے جارہا تھا۔

راستے میں' میں نے جیپ میں ذرا اِدھر اُدھر نظر ڈالی تو اگلی سیٹوں کے نیچے مجھے کینوس کا ایک بڑا سا بیگ پھنسا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے گاڑی روک کر اسے کھول کر دیکھا۔ اس میں ہینڈ گرنیڈ اور مختلف گنوں کے بہت سے میگزین بھرے ہوئے تھے۔ میں نے وہ تھیلا بھی اٹھا کر راستے میں پھینک دیا۔ میں چاہتا تھا کہ اگر اچانک کہیں قانون کے محافظوں سے سامنا ہوجائے تو میں انہیں زیادہ سے زیادہ بے ضرر حالت میں ملوں۔

کئی گھنٹے کے سفر کے بعد بھی میں ویرانے میں ہی رہا۔ حتیٰ کہ جیپ ریزرو پر لگ گئی۔ پھر ریزرو پیٹرول بھی ختم ہوگیا۔ جیپ کے پیچھے پیٹرول کا بڑا سا ایک فاضل ڈبا لگا ہوا تھا۔ اس میں تین چار گیلن پیٹرول موجود تھا۔ میں نے وہ بھی ٹینک میں اُنڈیل لیا اور سفر جاری رکھا۔

پیٹرول پر چلنے والی جیپیں پیٹرول بہت کھاتی ہیں۔ مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ پرانی ساخت کی اس جیپ میں جو فاضل ڈبا میں نے اُنڈیلا تھا وہ بھی زیادہ دیر ساتھ نہیں دے گا۔ صبح کا اُجالا پھیل چکا تھا اور میں ابھی تک ویرانے میں ہی تھا۔ اب تو مجھے تشویش ہونے لگی تھی کہ میں اس ویرانے سے نکل بھی سکوں گا یا نہیں؟

مجھے حیرت تھی کہ کیا ہمارے ملک میں اتنے طویل و عریض غیر آباد علاقے بھی موجود تھے جن میں اتنی دیر تک اتنی تیز رفتاری سے سفر کرتے رہیں اور کسی آبادی کا نام و نشان دکھائی نہ دے۔ ٹرین یا سڑک سے سفر کرتے وقت تو احساس ہوتا تھا کہ کچھ نہ کچھ دیر کے بعد آخرکار کسی نہ کسی قسم کی آبادی کے آثار دکھائی دے ہی جاتے تھے لیکن میرے راستے میں تو ویرانے کے سوا کچھ بھی نہیں آیا تھا۔

کبھی چٹیل میدان' کبھی صحرائی سا علاقہ' کبھی جنگل' کہیں ٹیلے' کہیں برساتی جوہڑ اور نالے آتے رہے لیکن کوئی آبادی نہیں آئی۔ میں یقیناً بھٹک چکا تھا اور مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ میں کس طرف جارہا تھا۔ حتیٰ کہ میرے لیے تو یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہوگیا تھا کہ میں بلوچستان میں بھٹک رہا تھا یا سندھ میں۔

جس طرح کے علاقے میرے راستے میں آئے تھے ویسے دونوں ہی صوبوں میں ہوسکتے تھے۔ ایک بار تو مجھے یہ اندیشہ بھی محسوس ہوا کہ میں لاعلمی میں کسی ایسے سرحدی علاقے سے ایران میں داخل نہ ہوجاؤں جہاں کوئی چوکی' پہرہ' کوئی باڑھ یا حدود ظاہر کرنے والا نشان موجود نہ ہو۔ یا اگر کچھ نشانیاں موجود ہوں تو وہ میرے لیے ناقابل شناخت ہوں۔

بھوک سے الگ جان نکل رہی تھی۔ اب تو بار بار آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ بڑی مشکل سے میں ڈرائیونگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس وقت میں جہاں سے گزر رہا تھا وہ علاقہ تو نیم صحرائی سا تھا لیکن خاصا دشوار گزار تھا۔ بار بار میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگتا تو اسٹیئرنگ وھیل پر بھی قابو نہ رہتا اور جیپ بری طرح غراتے ہوئے اِدھر اُدھر لہرانے لگتی۔

ایسے ہی دو ایک موقعوں پر جیپ اُلٹتے اُلٹتے بچی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ جیپ اُلٹتی تو میں گردن یا ہاتھ پاؤں تڑوا بیٹھتا۔ اس اندیشے سے سہم کر میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر خود کو زیادہ سے زیادہ مستعد رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے ڈرائیو کررہا تھا۔

کبھی کبھی ایک آدھ لمحے کے لیے مجھے کچھ یوں محسوس ہوتا جیسے میں خواب کے عالم میں سفر کررہا ہوں۔ وہی جیپ کی مستقل گھرر گھرر' وہی بیاباں' وہی ویرانے' وہی سکوت' وہی تنہائی۔ بس کبھی کبھی چیلوں کی آواز سنائی دے جاتی تھی' وہ بھی روح کی افسردگی اور مایوسی کو بڑھا دینے والی آواز تھی۔

میں نے گزشتہ رات جانوروں کی طرح پیٹ بھر کے جو پانی پیا تھا' وہ بھی اندر ہی اندر نہ جانے کہاں تحلیل ہوگیا تھا۔ جس طرح جیپ دھڑا دھڑ پیٹرول کو ٹھکانے لگا رہی تھی اسی طرح میرے اندر بھی گویا کوئی انجن رواں تھا جو شاید خوراک نہ ملنے کی وجہ سے پانی کو ہی دھڑا دھڑ جذب کررہا تھا' ٹھکانے لگا رہا تھا۔ پیاس سے ایک

بار پھر میری گزشتہ رات جیسی ہی حالت تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی تھیں اور حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے۔ بالکل ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے میں نے کئی دن سے پانی نہیں پیا تھا۔

میں نے جیپ کی اچھی طرح تلاشی لی۔ میرا خیال تھا کہ ڈاکوؤں کی کوئی نہ کوئی چھاگل' کوئی تھرموس' بوتل یا کوئی نہ کوئی اور ایسی چیز ضرور موجود ہوگی جس میں پانی ہوگا لیکن میرے لیے یہ انکشاف بڑی حیرت کا باعث تھا کہ اس جیپ میں ایسی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔

آخرکار وہی ہوا جس کے اندیشے سے میرا دل پہلے ہی ڈوب رہا تھا۔ جیپ ایک دھچکے سے ایک گڑھے سے باہر آئی اور مزید صرف چند فٹ کا فاصلہ طے کرکے اس کا انجن گھر گھرا کر خاموش ہوگیا۔ میں نے کئی بار سیلف لگایا لیکن انجن چند ایک مرتبہ گویا صرف کھانس کر رہ گیا۔ مجھے معلوم تھا' یہ کوشش فضول ہے۔ جیپ کی "رگ و پے" میں دوڑتے ہوئے اس سیال کے سوتے خشک ہوگئے تھے جو اس کے لیے عرقِ حیات تھا' جو اسے زندہ و متحرک رکھتا تھا۔ سردست جیپ مُردہ ہوچکی تھی۔

میں نے اسٹیئرنگ وھیل پر سر ٹکا دیا اور چند منٹ اسی طرح آنکھیں بند کیے بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ مجھے غنودگی سی محسوس ہونے لگی لیکن مجھے معلوم تھا' یہ غنودگی میرے لیے اچھی نہیں تھی۔ میں نے اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے آنکھیں کھولیں اور سر اٹھایا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ تاحدِ نظر وہی ویرانہ تھا۔ میں نے جو سفر کیا تھا وہ محض رائیگاں ہی گیا تھا۔ میں نے جس مقام پر ڈاکوؤں کو ہلاک کیا تھا' اگر میں وہیں کھڑا رہتا تب بھی میرے لیے کیا فرق پڑتا تھا؟ وہ بھی ایک ویرانہ تھا اور یہ بھی اک بیاباں تھا۔ وہاں بھی میرے سامنے کوئی منزل نہیں تھی اور یہاں بھی میں گم کردہ راہ مسافر تھا۔

میں جیپ سے اتر آیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کس سمت میں چلنا چاہیے۔ ہر سمت ایک ہی جیسی بے اماں دکھائی دے رہی تھی۔ سورج اب سر پر آچکا تھا اور گویا پورے جسم کو جھلسا رہا تھا۔ خصوصاً میرے چہرے اور ہاتھوں کی کھال تو گویا چیخ رہی تھی۔ سورج سر پر تھا تو یہ اندازہ کرنا بھی مشکل ہوگیا تھا کہ مشرق کدھر تھا اور مغرب کدھر۔

چند لمحے کے تذبذب کے بعد آخرکار میں اندازاً مغرب کی طرف چل دیا۔ میں تقریباً ایک گھنٹا چلتا رہا۔ اس دوران کئی بار میری آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے دائرے لہرائے اور سب کچھ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ میں لڑکھڑا کر گرتے گرتے بچا۔ میں نے اپنی یوگا کی مشقوں کو کام میں لانے کی بہت کوششیں کیں لیکن مصیبتوں کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ جسم اور روح ایک دوسرے کی کچھ خاص مدد نہیں کرپارہے تھے۔

میں نے اپنی قوتِ ارادی سے کام لینے کی انتہائی کوشش کی۔ اس کے بعد میرا حال کچھ عجیب ہی ہوگیا۔ میرا ذہن گویا میرے جسم کے ساتھ نہ رہا۔ میں اس ویرانے میں تیز تیز چلا جارہا تھا لیکن مجھے واضح طور پر احساس نہیں تھا کہ میں چل رہا ہوں۔ میرا ذہن گویا زمین اور آسمان کے درمیان کہیں معلق تھا جبکہ میرا جسم مشینی انداز میں حرکت کیے جارہا تھا۔

مجھے وقت گزرنے کا احساس نہیں تھا اور نہ ہی یہ اندازہ تھا کہ میں نے کتنا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ لاشعور میں کہیں بس یہ احساس بیٹھا ہوا تھا کہ میرے اردگرد بیکراں ویرانہ پھیلا ہوا تھا اور مجھے اس کو عبور کرنا تھا۔ میرا جسم گویا ایک مشین تھی جسے کسی کمپیوٹر نے پروگرام فیڈ کردیا تھا اور وہ بس چلتی جارہی تھی۔ میرے احساسات گویا مرچکے تھے۔

جسم آخر جسم ہی تھا اور وہ بھی انسانی جسم' کہاں تک ساتھ دیتا۔ مجھے احساس ہوا کہ شام کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میرے اندر بھی روشنی دم توڑنے لگی تھی۔ میں اپنے اندر قوتِ ارادی کی جو مصنوعی برقی رو دوڑائے ہوئے تھا' وہ آخرکار جواب دینے لگی تھی۔ ویرانہ گویا جوں کا توں میرے گرد موجود تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ میں دو قدم بڑھتا تھا تو ویرانہ چار قدم مزید پھیل جاتا تھا۔

پیٹ میں بھوک کا عفریت پنجے گاڑے ہوئے تھا اور پیاس کی شدت سے حلق کچھ ایسا ہورہا تھا جیسے وہ خشک لکڑی سے بنا ہوا اور کوئی مسلسل اس پر ریگ مال رگڑ رہا ہو۔

آخرکار جسم نے مشین کی طرح حرکت کرتے رہنے سے انکار کردیا' قوتِ ارادی نے ساتھ چھوڑ دیا' قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس وقت مجھے سامنے ہی ایک خاصی کشادہ پگڈنڈی دکھائی دینے لگی تھی جس پر گاڑیوں کے پہیوں' جانوروں کے کھُروں اور انسانی قدموں کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔

وہ پگڈنڈی اس ویرانے کو کراس کررہی تھی جس میں میرا سفر جاری تھا۔ اچانک ہی اس پر میری نظر پڑی تھی۔ ظاہر تھا کہ وہ پگڈنڈی کسی نہ کسی آبادی کی طرف سے کسی دوسری آبادی کی طرف جارہی تھی۔ ایک لاحاصل سے سفر کے بعد مجھے پہلی بار کسی آبادی کی طرف اشارہ کرتی ہوئی کوئی چیز دکھائی دی تھی لیکن مجھ میں اس تک پہنچنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ مزید چند قدم کا فاصلہ طے کرکے پگڈنڈی تک پہنچ جاؤں اور اس پر دائیں یا بائیں کسی بھی سمت میں ایک نئی امید کے سہارے سفر جاری رکھ سکوں لیکن جسم نے ساتھ نہ دیا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ مجھے ایک پتھر سے ہلکی سی ٹھوکر لگ گئی۔ یوں گویا کسی گرتی ہوئی دیوار کو ایک غیبی ہاتھ نے ٹھوکا دے دیا۔

میں اوندھے منہ گرا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ گرنے کے بعد بھی مجھے کافی دیر تک ہوش رہا اور میں اٹھنے کی کوشش کرتا رہا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ جسم اپنی جگہ سے جنبش نہیں کررہا تھا لیکن پھر

بھی میں اپنی دانست میں کھڑا ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا رہا۔

آخر کار مجھ میں اس بے حرکت جدوجہد کی بھی سکت نہ رہی۔ لیٹے رہنا مجھے بھلا محسوس ہونے لگا۔ میرے شکستہ جسم اور کچلے ہوئے سے اعصاب کو بے حد سکون سا ملا۔ درحقیقت تو میں پہلے ہی بے حس و حرکت تھا لیکن اب میں نے ذہنی طور پر بھی اپنے آپ کو بے حس و حرکت تسلیم کرلیا اور آنکھیں بند کرلیں۔ مجھے گویا ایک مُدت کے بعد ذرا آرام کا احساس ہوا اور یک بیک ہی مجھے گہری نیند آگئی۔ معلوم نہیں وہ نیند تھی یا بے ہوشی لیکن اس وقت وہ مجھے ایک انمول راحت کی پیامبر محسوس ہوئی۔

وہ بے خبری کا وقفہ نہایت خوب صورت اور تسکین بخش تھا کیونکہ اس کے دوران ایک تو اذیتوں کا احساس مٹ گیا' دوسرے اس دوران مجھے خوب صورت اور دل فریب خواب آتے رہے۔ پریاں مجھے جھولا جُھلاتی رہیں اور خوب صورت کنیزیں میرے لیے اپنے کندھوں پر خوب صورت بلوری صراحیاں لاتی رہیں جن میں یخ بستہ آبِ شیریں بھرا ہوا تھا۔ میں دھڑا دھڑا نہیں خالی کرکے ایک طرف پھینکتا رہا۔

مجھے نہ جانے کتنی دیر بعد احساس ہوا کہ خواب کچھ ایسے خوب صورت نہیں رہے تھے۔ پریاں مجھے جھولا جُھلانے کے بجائے شاید اِدھر اُدھر دھکیل رہی تھیں۔ کوئی ایک طرف دھکا دیتی تھی تو دوسری فوراً واپس دھکیل دیتی تھی۔

پھر وہ پریاں بھی غائب ہوگئیں۔ بس کوئی غیبی ہاتھ تھا جو مجھے جھٹکے دیے جا رہا تھا۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کی صراحیاں لے کر آنے والی کنیزیں بھی نہ جانے کہاں چلی گئیں۔ کوئی غیبی ہاتھ ہی مجھے پانی پلانے کے بجائے میرے منہ پر پھینکنے لگا۔

آخر کار یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ میں گویا کسی تاریک دلدل کی تہ میں بہت دیر تک پڑا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے خود بخود اوپر آنے لگا۔ جسم اب بھی دھیرے دھیرے ہلکورے لے رہا تھا' کبھی کبھی نارنجی اور کندنی سی روشنی میری آنکھوں میں چبھنے لگتی۔

پھر اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ میری آنکھیں تو کھلی ہوئی تھیں اور میں کسی ایسی چیز میں لیٹا ہوا تھا جو مسلسل ہل رہی تھی۔ سورج ڈوبنے کو تھا اور اس کی الوداعی کرنیں میری آنکھوں میں چبھ رہی تھیں۔

میں نے گردن ہلا کر اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ میں کچھ اس قسم کی ایک گھوڑا گاڑی میں لیٹا ہوا تھا جیسی پنجاب میں گجر دودھ کے ڈرم ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانے کے لیے استعمال کرتے ہیں تاہم یہ اس سے کچھ چھوٹی اور ہلکی تھی' اس میں گھوڑے کی جگہ خچر جتا ہوا تھا۔

تقریباً میرے ہی جیسے میلے کپڑوں میں ایک دیہاتی اگلے تختے پر خچر کی لگامیں تھامے بیٹھا تھا اور رخ کررہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں خشک گھاس پھونس کے آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

عیاشی کی انتہا یہ تھی کہ میرے سرہانے بھی تکیے کی کمی پوری کرنے کے لیے ایک میلی کچیلی سی گدی رکھی ہوئی تھی۔

میرا چہرہ پانی سے تر تھا' گریبان بھی نم محسوس ہو رہا تھا۔ یقیناً میرے چہرے پر پانی چھڑکا گیا تھا اور شاید مجھے پلانے کی بھی کوشش کی گئی تھی کیونکہ میرے منہ میں اب پہلے جیسی انتہا کی خشکی نہیں تھی۔ شاید اس شخص نے مجھے ہوش میں لانے کی تدبیریں کی تھیں لیکن اس وقت میں ہوش میں نہیں آیا تھا۔ شاید اس کے خاصی دیر بعد میری آنکھیں کھلی تھیں۔

گھوڑا گاڑی میں کوئی سامان نہیں تھا۔ گاڑی چلانے والے کا چہرہ ایک طرف سے میں دیکھ سکتا تھا۔ وہ مضبوط کاٹھی اور پکی عمر کا ایک سیدھا سادا سا دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ حلیہ ویسا ہی تھا جیسا عموماً غریب اور سیدھے سادے دیہاتیوں کا ہوتا ہے۔ چہرے پر خشخشی سی داڑھی تھی۔

میں گردن موڑے اس کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اچانک اس نے بھی گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ وہ شاید کسی گہری سوچ میں تھا۔ مجھے اچانک ہوش میں دیکھ کر کچھ گڑبڑا سا گیا۔ خچر ڈُلکی چل رہا تھا۔ اس نے اس کی رفتار اور بھی کم کردی اور میری طرف کو ذرا ترچھا سا ہو کر بیٹھ گیا۔

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری؟" اس نے سوال سندھی میں کیا تھا۔

"ہوش میں آگیا ہوں... یہی بڑی بات ہے۔" میں نے ٹوٹی پھوٹی سندھی میں جواب دیا جس میں اُردو کی زیادہ آمیزش تھی "تمہاری بڑی مہربانی کہ تم نے راستے میں سے مجھے اٹھالیا۔"

اب وہ بھی تقریباً اُردو میں بات کرنے لگا "ہاں اڑا... میں نے جب تم کو راستے میں پڑے دیکھا تو پہلے تو میں ڈر گیا۔ میں نے سوچا پتا نہیں کیا معاملہ ہے۔ مجھے اس چکر میں نہیں پڑنا چاہیے۔ غریب آدمی ہوں بابا... تم کو پتا ہے غریب آدمی ویسے ہی ہر بات سے ڈرتا ہے۔ میں آگے نکل گیا تھا لیکن پھر اللہ کا خیال آگیا۔ آخر مسلمان ہوں' دل نہیں مانا کہ کسی کو مصیبت میں دیکھ کر ایسے گزر جاؤں۔"

وہ مشفقانہ سے انداز میں مسکرایا۔ وہ ذرا بھی خوب صورت نہیں تھا لیکن کم از کم مجھے اس لمحے بہت خوب صورت دکھائی دیا۔ وہ اپنی میلی اور مختصر پگڑی درست کرتے ہوئے بولا۔

"تم لمبے چوڑے' وزنی آدمی ہو اور بے ہوشی میں آدمی کا وزن کچھ اور بھی زیادہ لگتا ہے۔ میرے لیے تم کو اٹھا کر گاڑی میں ڈالنا بہت مشکل کام تھا۔ بہت ہی مشکل۔ مگر بس اچھے کاموں میں اللہ آدمی کی مدد کرتا ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر سرسری سے لہجے میں بولا "تم کون ہو؟ کیوں بے ہوش پڑے تھے؟ وہاں کیسے پہنچے تھے؟"

"یہ بہت لمبی کہانی ہے پھر کسی وقت سہی۔" میں نے گاڑی میں لگا ہوا ایک بانس پکڑ کر اٹھنے کی کوشش کی۔ میں اپنے آپ کو

برسوں کا بیمار محسوس کررہا تھا اور اپنی آواز مجھ سے پہچانی نہیں جارہی تھی۔

میں اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہوگیا تو پیٹ میں جیسے کوئی خوابیدہ عفریت بیدار ہوگیا۔ میں نے ساری شرم اور تکلف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟"

"ہاں ہاں" اس نے لگام ڈھیلی چھوڑتے ہوئے مستعدی سے کہا "میں اپنے لیے روٹی لے کر گیا تھا لیکن مجھے راستے میں وقت ہی نہیں ملا اور بھوک بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ میں نے سوچا' رات کو گھر واپس پہنچ کر ہی کھاؤں گا۔ لو یہ تم کھالو۔"

اس نے گاڑی کے ایک کونے سے ایک پوٹلی برآمد کی اور میری طرف بڑھائی۔ میں نے بے تابی سے اسے کھولا۔ اس میں موٹی موٹی' مکڑی تڑی اور ذرا سوکھی سی دو روٹیاں تھیں۔ ان کے درمیان کٹا ہوا کچھ پیاز اور تھوڑا سا اچار تھا۔

میں بتا نہیں سکتا کہ پہلا نوالہ منہ میں ڈالنا مجھے کتنا لذت بخش عمل محسوس ہوا لیکن خشک منہ اور خشک حلق میں وہ خشک سا کھانا اٹکنے لگا۔ میرے محسن نے گویا میری مشکل کو سمجھتے ہوئے مجھے ایک چھوٹی سی مشک سے المونیم کے ایک پچکے ہوئے سے گلاس میں پانی نکال کر دیا اور بولا "چباتے جاؤ اور ایک ایک گھونٹ پانی کے ساتھ نگلتے جاؤ۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور جلد ہی میرے نظامِ ہضم کے وہ غدود بھی رطوبتیں بنانے لگے جو اپنا کام بھول چکے تھے۔ چند منٹ میں ہی دونوں روٹیاں میرے پیٹ میں پہنچ گئیں۔ پیاز' اچار کچھ بھی نہ بچا۔ اس وقت اگر دو چار ویسی روٹیاں اور ہوتیں تو میں وہ بھی چٹ کرجاتا۔

وہ شخص معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا "میرے پاس کوئی دال' سالن وغیرہ نہیں تھا ورنہ ضرور پیش کرتا۔ ہم لوگ تو زیادہ تر پیاز اور اچار سے ہی روٹی کھاتے ہیں۔ سالن ہمارے گھروں میں کبھی کبھار ہی پکتا ہے۔"

گویا ایک عام دیہاتی کا آج بھی وہی حال تھا جو میرے بچپن میں ہوا کرتا تھا۔ وہ آج بھی مفلس' قلاش اور کچلا ہوا تھا مگر محبت' انسانیت اور اللہ کا شکر آج بھی اسی میں تھا۔ میں نے پکے مکانوں میں' زندگی کی تمام آسائشوں کے درمیان بیٹھے ہوئے لوگوں کو بُری بُری شکلیں بنا کر کہتے سنا تھا' اس ملک نے ہمیں کیا دیا ہے۔ ہمیں مسائل کے علاوہ کیا ملا ہے۔ ہر جگہ ہماری حق تلفی ہو رہی ہے' وغیرہ وغیرہ۔

مگر جو بے چارے ہر اعتبار سے واقعی کُچلے' مسلے ہوئے اور مظلوم لوگ تھے وہ بات بات پر خدا کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتے تھے۔ کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے' کسی سے کچھ نہیں چھینتے تھے' کسی کو نہیں جلاتے تھے' کسی کو آگ میں نہیں جھونکتے تھے۔

میرے پیٹ کے دوزخ کو ایندھن مل گیا تھا تو رگ و پے میں زندگی کی حرارت دوڑ گئی تھی۔ آنکھوں میں روانی سی آگئی تھی اور نظر گویا تیز ہوگئی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو مجھے ایک طرف نہر یا دریا کا پشتہ سا نظر آیا جو بہت دور تک جارہا تھا۔ دیوارِ چین کی طرح دونوں طرف ہی اس کا کوئی سرا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم اس سے بہت دور رہتے ہوئے اس کے متوازی ہی سفر کررہے تھے۔ اس علاقے میں سبزے کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔

"بھائی! تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد پوچھا۔

"حاتو" اس نے جواب دیا۔

"بھائی حاتو! یہ کون سا علاقہ ہے اور ہم اس وقت کہاں جارہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ کچے کا علاقہ ہے اور ہم اس وقت کیٹی مراد جارہے ہیں۔ میں وہاں رہتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"خدا کی پناہ!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ یہ میں کہاں سے کہاں نکل آیا تھا۔ اگر میری تمام تر سخت جانی کے باوجود میری حالت خراب تھی تو اس میں جسم کا کوئی قصور نہیں تھا۔ میں نے جیپ میں غالباً سیکڑوں میل سفر کیا تھا اور اس کے بعد پیدل بھی نہ جانے کتنا چلا تھا۔ بھٹک کر میں اس علاقے میں آنکلا تھا جس کے بارے میں' میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

حاتو' خچر کو ایک چھڑی رسید کرکے اس کی رفتار بڑھاتے ہوئے بولا "تم نے بتایا نہیں تم کون ہو' کہاں سے آئے ہو' کہاں جارہے تھے اور تمہارے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا؟"

"میرا نام افضل ہے" میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد کہا "قصہ تو بہت لمبا ہے' بس یوں سمجھ لو کہ ڈاکوؤں نے مجھے کسی امیر آدمی کے دھوکے میں اغوا کرلیا تھا جبکہ میں ایک غریب سا آدمی ہوں۔ بہت دن وہ مجھے لیے اِدھر اُدھر پھرتے رہے تھے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ میں وہ آدمی نہیں ہوں جسے وہ اصل میں اغوا کرنا چاہتے تھے پھر جب انہیں پتا چل گیا کہ ان سے غلطی ہوگئی ہے تو انہوں نے مجھے جنگل میں ہی چھوڑ دیا۔ میں کل سے پیدل چل رہا تھا۔ بھوک' پیاس اور تھکن سے بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔"

"چہ۔ چہ۔ چچ" اس نے متاسفانہ سے انداز میں سرہلایا "اڑا! ڈاکوؤں نے تو ایسی زندگی خراب کی ہے کہ کیا بتائیں۔ کوئی زمانہ تھا کہ صرف امیر آدمیوں کو ڈاکوؤں سے خطرہ رہتا تھا۔ اب تو میرے جیسے کنگلے کو بھی گھر سے نکلتے ہوئے ڈر لگتا ہے کہ کوئی میرا خچر ہی نہ چھین لے۔ بابا! اب تو ڈاکو یہ نہیں دیکھتے کہ پیسے والا ہے یا بے حیثیت۔" اس نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا "تمہیں اس وقت کہیں پناہ نہیں ملے گی' کوئی دروازہ کھلا نہیں ملے گا۔ کوئی تمہاری دستک سن کر بھی دروازہ نہیں کھولے گا۔ گلیوں میں آوارہ کتے تمہیں گھیر لیں گے اور ان کا شور سن کر ہوسکتا

آئے اور امام سمیت سارے نمازیوں کو اٹھا کرلے گئے۔"

حاتو نے آسمان کی طرف دیکھ کر ہاتھ جوڑے' ایک ٹھنڈی سانس لی اور افسردہ لہجے میں بولا "ادا! یہ سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ پہلے ڈاکوؤں کا بھی کچھ دین ایمان ہوتا تھا۔ عورت پر کبھی ظلم نہیں کرتے تھے' کوئی قرآن شریف اٹھا کر سامنے آجاتا تھا تو اسے معاف کردیتے تھے' سیّد کو کچھ نہیں کہتے تھے اور مسجد کے سامنے تو اونچی آواز میں بات بھی نہیں کرتے تھے۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہا۔ پھر بولا تو اس کے لہجے کی افسردگی بڑھ چکی تھی "اب تو سب کچھ بدل گیا ہے۔ گوٹھوں پر دھاوا بولتے ہیں تو سب سے پہلے خوب صورت لڑکیاں تلاش کرتے ہیں۔ قرآن کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کوئی سیّد ہو یا کچھ اور گولیوں سے بھون ڈالتے ہیں اور مسجد کا تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ امام سمیت نمازیوں کو اٹھا کرلے جاتے ہیں۔ پتا نہیں ہمارا کیا بنے گا۔"

"فکر نہیں کرو ادا حاتو!" میں نے ذرا آگے کھسک کر اس کے کندھے پر تھپکی دی "ظلم جب حد سے بڑھتا ہے تو مٹ جاتا ہے۔ انسان جب اپنے ہاتھ پاؤں اتنے پھیلا لیتے ہیں کہ دوسرے انسانوں کے لیے عذاب بن جاتے ہیں تو پھر ان کی گردنیں پکڑنے کے لیے ایک غیبی ہاتھ حرکت میں آجاتا ہے۔ جب نیچے والوں کی بادشاہی ناکارہ ہوجاتی ہے تو آسمان والے کی بادشاہی حرکت میں آتی ہے۔ آخر وہ بھی تو دنیا کا تماشا دیکھ رہا ہے نا۔"

"ہاں بھائی! آجکل تو ہم اسی امید پر زندہ ہیں۔" وہ اداسی سے بولا۔

ہم ایک گاؤں کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن رات کے گھپ اندھیرے میں مجھے دور سے اس کے آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ابھی آسمان پر ایک تارا بھی نمودار نہیں ہوا تھا اور خود گاؤں کا یہ عالم تھا کہ کسی گھر میں شاید کوئی دیا روشن نہیں تھا' کوئی دروازہ یا کھڑکی کھلی نہیں تھی۔ کسی روزن سے روشنی کی کرن نہیں پھوٹ رہی تھی۔ گلیاں ویران تھیں۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ گلیوں میں کہیں کوئی مویشی تک بندھا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شہرِ خموشاں کا سا منظر تھا۔

لیکن جب گاڑی ایک چوڑی سی گلی میں داخل ہوئی تو دو تین آوارہ کتوں نے بھونک کر ہمارا استقبال کیا اور شہرِ خموشاں کا سکوت ٹوٹ گیا۔ حاتو نے انہیں ڈانٹا۔ وہ یقیناً حاتو کو پہچانتے تھے اور اس کا لحاظ کرتے تھے۔ اس کے "احترام" میں خاموش ہوکر اِدھر اُدھر

س

استعمال کرتے ہیں۔ گئے۔

گھوڑے کی جگہ خچر جتا ہوا تھا۔ . . طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "دیکھ

تقریباً میرے ہی جیسے میلے کپڑوں میں ایک دیہاتی اسے کیٹی مراد سے

خچر کی لگامیں تھامے بیٹھا تھا اور رخ کررہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں خشک گھاس پھونس کے آرام دہ بستر پر لیٹا ہوا تھا۔

مجلس کو کہتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"لیکن اب سب کچھ ختم ہوگیا ہے۔ شام ہوتی ہے تو لگتا گاؤں میں جن پھر گیا ہے۔" وہ بولا "ہماری کیٹی' کچے کے علا کی سب سے بڑی کیٹی تھی۔ یہاں زندگی کی ساری دلچسپیاں تھیں سارے کھیل تماشے ہوتے تھے۔ اب اگر کچھ ہوتا بھی ہے تو مغر کی اذان سے پہلے ختم ہوجاتا ہے۔ سیلاب کے دنوں کو چھوڑ کر سب دنوں میں یہاں فصلیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ کچے کی ز بہت زرخیز ہے لیکن ہم وڈیرا سائیں کے غلام ہیں' ان کے ہیں۔ فصلیں آتی ہیں تو ان کے آدمی لے جاتے ہیں۔ ہمیں گزر کے لیے کچھ ملتا ہے تو وڈیرے کے آدمیوں کے بعد ڈاکو آجا ہیں۔ کسی کے پاس اگر کسی طرح چار پیسے یا زیور وغیرہ ہوجائے ڈاکو لے جاتے ہیں۔ ہم تو بس دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی کے دن رات خون پسینہ ایک کرتے ہیں اور شاید زندگی بھر کرتے گے۔"

"فصلیں کہاں ہوتی ہیں؟ ادھر تو کوئی زرعی زمین نظر آرہی۔" میں نے آنکھیں سکیڑ کر اندھیرے میں دور تک دیکھ کوشش کی۔

"زمینیں بند کے دوسری طرف ہیں۔" اس نے اشارہ بتایا "پہلے ہم لوگ بھی عارضی سی جھونپڑیاں بنا کر اُدھر ہی ر لیکن جب سیلاب آتا تھا تو فصلوں کے ساتھ ساتھ ہمارے گو یا کیٹیاں بھی اُجڑ جاتی تھیں۔ اس لیے اب ہم لوگ اس آگئے ہیں۔ اگر بند نہ ٹوٹے تو ہم لوگ اِدھر بچے رہتے ہیں۔"

میں سوچ رہا تھا اور حیران ہو رہا تھا کہ کس کس حال میں زندگی گزار رہے تھے۔ اور یہ وہ لوگ تھے جو کبھی احساس کے نعرے لگاتے ہوئے سڑکوں پر نہیں آتے تھے۔ کبھی کانفرنسیں نہیں کرتے تھے۔ بس سر جھکا کر جفاکشی اور صبر ساتھ اپنا کام کرتے رہتے تھے' زندگی کی صعوبتیں جھیلتے ر اور کچھ لوگ عالیشان بنگلوں اور پُر آسائش مکانوں میں کے نام پر سودے کیے کرتے رہتے تھے۔ ان بے چاروں کو نہیں ہوتا تھا کہ ان کے نام پر ان کے دلالوں نے کیا کچھ کرلیا۔

وہ اپنی دُھن میں بولا "ویسے سائیں۔ یہ سیلاب بے کی چیز۔ جب بھی آتا ہے کئی سال کے لیے زمینوں کو ا جاتا ہے کہ ساری کسریں پوری ہوجاتی ہیں۔"

"کچے کی زمینیں ہیں کس کی؟" میں نے پوچھا۔

"کئی بڑے زمینداروں نے آپس میں بانٹ رکھی ہیں

"یہ بتایا "جیسے ہم وڈیرا سائیں مراد خان کے ہاری ہیں میں لگا ہوا ایسری طرف نئی ہزار ایکڑ زمین ان کی ہے۔ ہم انہی کے اس کیٹی کا نام بھی کیٹی مراد ہے۔"

"اور یہ مراد صاحب رہتے کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سی جگہوں پر رہتے ہیں۔ نواب شاہ' حیدر آباد اور کراچی میں ان کی شاندار کوٹھیاں ہیں۔ ان کی اصل زرعی زمین تو اب شاہ کے قریب ہے۔ یہ کچے کی زمین تو انہوں نے یونہی فالتو میں دبا رکھی ہے۔ یہاں تو وہ دو چار سال میں ایک آدھ مرتبہ ہی تے ہیں۔ زیادہ انتظام ان کے آدمی ہی چلاتے ہیں۔ ان کا ایک اص آدمی ہے دلبر خان... بس وہ سب کچھ کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کا لک ہے۔"

پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھ کر رازدارانہ سے انداز میں بولا "بلکہ میں نے تو سنا ہے کہ ڈاکو بھی اس کی بات مانتے ہیں۔ ویسے ڈاکو تو وڈیرا ئیں مراد خان کے آگے بھی ہاتھ جوڑتے ہیں اور اپنی سب رداتوں میں سے ان کو حصہ بھی بھیجتے ہیں لیکن میری سمجھ میں بات نہیں آتی۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہم تو وڈیرا سائیں ہی کے آدمی ہیں اور بہت غریب ہیں۔ کے باوجود کبھی کبھی ڈاکو ہم کو بھی تنگ کرنے آجاتے ہیں۔ جس پاس کچھ ہو وہ لے جاتے ہیں۔ ہم دلبر خان کی بھی منت کرتے اور کئی مرتبہ ہم نے وڈیرا سائیں مراد خان کو بھی پیغام بھیجا ن انہوں نے آج تک ڈاکوؤں کو روکا نہیں۔ چلو وہ باقی دنیا میں تو ل چاہے کرتے پھریں لیکن کم سے کم ہم غریبوں کو تو بخش دیں۔ سائیں مراد اپنی رعایا کو ڈاکوؤں سے محفوظ رکھنے کا کوئی بست کیوں نہیں کرتے؟"

"میری سمجھ میں تو ایک ہی بات آتی ہے۔" میں نے ایک لمحے کر کہا "سائیں مراد چاہتے ہیں کہ آپ لوگ زیادہ سے زیادہ ڈرے سہمے اور مالی طور پر بالکل کمزور رہیں تاکہ ہمیشہ ان کے نے ہاتھ جوڑتے رہیں اور کبھی بغاوت کا نہ سوچیں۔ شاید ان کا ال ہو کہ ان لوگوں پر ذرا خوشحالی آئے گی تو یہ پر پرزے نکالنے گے۔ رسّی تڑا کر بھاگنے کی سوچنے لگیں گے۔"

"یہ تو ہمیں بھی اندازہ ہے کہ شاید وہ ایسا سوچتے ہوں۔" حاتو نہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولا اور تب مجھے احساس ہوا کہ یہ حے سادے اور ان پڑھ سے لوگ عقل و شعور اور آگہی سے بھی محروم نہیں ہوتے جتنا سمجھا جاتا ہے۔ وہ بے چارے اپنی ا خوف' مصلحت یا کسی اور وجہ سے بند رکھتے ہوں یا انہیں ت کہنے کا سلیقہ نہ آتا ہو لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں وہ کچھ سمجھتے ہی نہیں تھے۔

باتیں ہم دونوں ایک دوسرے کی سہولت کے لیے گڈمڈ قسم کی میں کررہے تھے۔ میں آپ کی سہولت کے لیے یہ سب کچھ اور آسان اُردو میں بیان کررہا ہوں۔ ظاہر ہے حاتو اس اُردو بولنے پر قادر نہیں تھا اور نہ ہی وہ دوسرے کردار جو مجھے اس علاقے میں ملے اس طرح بولتے تھے لیکن ان کا مفہوم

کم و بیش یہی تھا جو میں بیان کرتا جارہا ہوں یا آئندہ کروں گا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد حاتو بولا "لیکن وڈیروں کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ جب آدمی حد سے زیادہ مجبور ہوتا ہے تب بھی رسّی تڑا کر بھاگ جاتا ہے۔ آٹے کو بھی چکی میں حد سے زیادہ پیستے رہو تو وہ جل جاتا ہے' کھانے کے قابل نہیں رہتا۔ انسانوں کو بھی ایک حد تک پیسنا چاہیے' اس سے زیادہ نہیں۔"

"ان کی سمجھ یا تجربے میں یہ بات ابھی تک آئی نہیں ہوگی یا انہیں یقین ہوگا کہ آپ لوگ کہیں جا ہی نہیں سکتے۔ آپ کے لیے فرار کا کوئی راستہ ہے بھی نہیں۔ آپ کی جڑیں یہیں ہیں اور یہیں رہیں گی۔ اس لیے بے فکری سے وہ وہی کرتے ہیں جو اُن کا دل چاہتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ یہ مزاج بھی بن جاتا ہے۔ انسانوں کو بالکل مجبور اور محتاج کرکے ان پر حکومت کرنے میں ایک لذت ہے جو ایک بار منہ کو لگ جائے تو چھوٹتی نہیں۔"

اس دوران گاڑی ایک کچے گھر کے سامنے جا رکی تھی جس کی چھت سرکنڈوں کی تھی اور اس پر توڑی والی مٹی کی بہت موٹی تہ تھوپی گئی تھی۔ گاڑی سے اترنے سے پہلے حاتو رازدارانہ سے انداز میں بولا "بھائی! میں تم سے سچی سچی بات کروں گا۔ تم مجھے مصیبت زدہ اور اچھے آدمی لگے۔ میں تمہیں باتوں باتوں میں یہاں تک لے تو آیا لیکن ایک تو میں بتا چکا ہوں کہ میں بہت ہی غریب آدمی ہوں' ویسے ہی تمہاری کوئی زیادہ مدد نہیں کرسکتا۔ دوسرے حالات بہت خراب ہیں۔ ہمیں بڑی سختی سے ہدایت ملی ہوئی ہے کہ اجنبیوں کے بارے میں بہت احتیاط کریں۔ کسی اجنبی کو گھر میں پناہ نہ دیں۔"

"کوئی بات نہیں بھائی حاتو!" میں نے جلدی سے کہا "تم نے میری جتنی مدد کی اتنی ہی بہت ہے۔ میں تمہارے ہاں پناہ نہیں لوں گا۔ اللہ کی زمین بہت بڑی ہے اور میں اس وقت گویا اللہ کی زمین ہی دیکھنے کے لیے نکلا ہوا ہوں۔ میں آگے چلا جاؤں گا۔"

"نہیں نہیں۔ تم سمجھے نہیں۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے ذرا شرمندگی سے بولا "حالات کتنے ہی خراب سہی لیکن ہم غریب لوگ دروازے پر آئے مہمان کو دھکا نہیں دے سکتے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم بڑی خوشی سے آج رات میرے گھر میں ٹھہرو لیکن صبح سورج نکلنے سے پہلے رخصت ہوجانا۔ کسی کو پتا نہیں چلنا چاہیے کہ تم میرے ہاں ٹھہرے تھے۔"

"نہیں' اس کی بھی ضرورت نہیں۔ تم نے میرے لیے بڑی تکلیف اٹھائی۔ میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میں اب چلتا ہوں۔" میں گاڑی سے اترنے لگا۔

"یہ نہیں ہوسکتا۔" اس نے جلدی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا "تمہیں اس وقت کہیں پناہ نہیں ملے گی' کوئی دروازہ کھلا نہیں ملے گا۔ کوئی تمہاری دستک سن کر بھی دروازہ نہیں کھولے گا۔ گلیوں میں آوارہ کتے تمہیں گھیر لیں گے اور ان کا شور سن کر ہوسکتا

دلبریا اس کے آدمی تمہیں کوئی مشکوک شخص سمجھ کر پکڑلیں۔"

میرے ہاتھ پر اس کی گرفت مضبوط تھی اور اپنے محسن کا ہاتھ تو انسان جھٹک بھی نہیں سکتا۔ وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا "رات کو تو تمہیں میرے پاس ہی ٹھہرنا پڑے گا۔ صبح جہاں جی چاہے چلے جانا۔"

آخر کار مجھے رکنا ہی پڑا۔ حاتو نے کئی بار دروازے پر دستک دی تب اندر سے ایک خوف زدہ سی' نسوانی آواز سنائی دی "کیر آہے؟" (کون ہے؟)

"ماں آیاں... حاتو" (میں ہوں.. حاتو)

"ہک منٹ ترس" (ایک منٹ ٹھہرو)

دروازہ کھلا تو پرانی اور بوسیدہ سی اجرک میں لپٹی ایک سانولی سی عورت لالٹین اٹھائے سامنے کھڑی دکھائی دی۔ تیرہ چودہ سال کا ایک لڑکا اس کے پاس کھڑا آنکھیں مل رہا تھا۔ حاتو نے باری باری عورت اور لڑکے دونوں کے سروں پر ہاتھ رکھا پھر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے عورت کو بتایا "مومل! ہی اساں جو مہمان آہے۔ صبح موکلی ویندو" (مومل! یہ ہمارا مہمان ہے' صبح رخصت ہوجائے گا۔)

"ادا! بھلی کرے آیا۔" عورت نے سر جھکا کر مجھے خوش آمدید کہا۔

میں نے اسے سلام کیا' بچّے کو پیار کیا اور اس لمحے مجھے اپنی تہی دامنی کا بڑی شدت سے احساس ہوا۔ میں ابھی تک کم از کم اس احساس سے افسردہ نہیں ہوا تھا کہ میری جیب میں پھوٹی کوڑی تک نہیں ہے لیکن اس لمحے میں نے اپنے آپ کو بے حد افسردہ' شرمندہ بلکہ عریاں عریاں سا محسوس کیا۔

میرا دل چاہا کہ کاش اس وقت میرے ہاتھ میں کوئی حقیر سا ہی تحفہ ہوتا جو میں اس سیدھی سادی مگر بہت بڑا دل رکھنے والی عورت کی خدمت میں پیش کرسکتا جُو اپنی تمام تر غربت اور حالات کی تمام تر خرابی کے باوجود لفظ "مہمان" سن کر پیشانی پر شکنیں ڈالنے کے بجائے خوش آمدید کہہ رہی تھی۔ کاش میں اس بچّے کے ہاتھوں پر کچھ رکھ سکتا جو نہایت پرانے اور بوسیدہ لباس میں تھا مگر اپنے چہرے پر نہایت ہی معصوم اور من موہنی سی مسکراہٹ لیے ہوئے تھا۔

روپیہ واقعی روپے کو کھینچتا ہے اور غریب کے نصیب واقعی غریبانہ ہوتے ہیں۔ امیروں کے گھر مہمان آتے ہیں تو تحفوں سے لدے پھندے آتے ہیں۔ غریب کے گھر مہمان بھی خالی ہاتھ آتے ہیں۔ ویسے میں کروڑپتی' سیٹھ' صنعتکار' بزنس مین اور نہ جانے کیا کچھ کہلاتا تھا لیکن آج حالات نے کچھ ایسا گھیرا ہوا تھا کہ ایک غریب کے گھر آنے کا اتفاق بھی ہوا تھا تو ہاتھ خالی تھے' جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔

حاتو مجھے ایک کوٹھری میں لے گیا جس میں چھوٹی سی ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی۔ اس پر پرانی سی رلّی بچھی تھی۔ کپڑ[ے کے] چھوٹے چھوٹے' رنگا رنگ بیکار ٹکڑوں کو جوڑ کر گھر کی عور[تیں] تھوڑا تھوڑا وقت نکال کر یہ گدا سا بناتی تھیں۔ کلچر کے تاج[ر] بیچ کر خوب کماتے تھے۔ مہینوں محنت کرنے والی عورتوں [کو] پچاس روپے بھی نہیں پہنچتے تھے۔

یہی معاملہ سندھی ٹوپیوں کا تھا جن میں شیشے جڑے [ہوتے] ہیں۔ ایک عورت ہفتوں کی محنت اور دیدہ ریزی سے خوب [صورت] اور باکمال کڑھائی کے درمیان شیشے جڑ کر ایک ٹوپی تیار کر[تی ہے] جس کا اسے معمولی سا معاوضہ ملتا ہے حالانکہ بازار میں و[ہ بھاری] قیمت میں بکتی ہے۔ یہ اور اس قسم کی کچھ باتیں مجھے پہلے [سے معلوم] تھیں' کچھ ان علاقوں میں بھٹکنے کے دوران معلوم ہوئیں۔

"تم ذرا آرام کرو لیکن سونا مت' میں ابھی آتا ہو[ں۔" حاتو] نے کہا اور مجھے کوٹھری میں چھوڑ کر چلا گیا۔ میں چارپائی پ[ر لیٹ گیا] لیکن چارپائی خاصی چھوٹی تھی۔ میری ٹانگیں پائنتی [سے] آگے جا رہی تھیں۔ کوٹھری میں ایک طرف چٹائی بھی [بچھی] تھی۔ میں نے رلّی چارپائی سے اتار کر چٹائی پر بچھالی' یوں کا[مچلاؤ] وہ بستر تیار کرکے میں اس پر دراز ہوگیا۔

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ حاتو کیوں مجھے جاگتے رہنے [کی تاکید] کرگیا تھا۔ اندازہ اس وقت ہوا جب وہ ایک ڈلیا میں تاز[ہ] دو گرم گرم روٹیاں اور ایک کٹوری میں تھوڑا سا مکھن او[ر ذرا] سی چٹنی لیے کوٹھری میں آیا۔ اس کا بیٹا پانی سے بھرا المو[نیم کا] گلاس اٹھائے پیچھے پیچھے تھا۔

ممنونیت اور شرمندگی سے میری حالت عجیب ہو گ[ئی۔] میرے تمام ممنونیت بھرے الفاظ کو ان سُنا کرتے ہوئے [اس] نے راستے میں تمہیں جو دو روٹیاں کھانے کو دی تھیں' [مجھے خیال] ہوگیا تھا کہ ان سے تمہارا کچھ بھلا نہیں ہوا۔ اس لیے م[یں نے] مومل سے کہا کہ کچھ اور بندوبست کر۔ اس بھاگوا[ن نے یہ] بندوبست کیا ہے۔ گھر میں اس وقت بس یہی کچھ تھا۔ تم [جانو] جس کی یہ روٹیاں پکادیں' یہ ذرا سا مکھن اور ذرا سی چٹنی [...] تو بہت چاہ رہا تھا کہ تمہاری کچھ خاطر تواضع کریں لیکن [ہم] نہیں کرسکتے۔ ہم کو غریب اور مجبور سمجھ کر معاف کردینا۔

میرے حلق میں آنسوؤں کا غبار سا پھیل گیا۔ [الفاظ] ساتھ چھوڑ گئے۔ میں اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ بس اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ مجھے کچھ یقین نہیں آرہا تھا [کہ اس دنیا] میں جہاں ذرا ذرا سی بات پر بھائی بھائی کا گلا کاٹ رہا تھا [ایسے] لوگ بھی باقی تھے۔ ایسے ہی لوگوں کو دیکھ کر دل کو حوصل[ہ ہوتا] لگتا تھا کہ دنیا جس المناک انجام کی مستحق نظر آتی ہے [وہ] کچھ عرصہ اور اس انجام سے بچی رہے۔

اس کے اصرار پر میں نے وہ کھانا بھی کھالیا۔ یہ [میری زندگی] کے لذیذ ترین کھانوں میں سے ایک کھانا تھا یا یوں [کہیے کہ]

کھانے کی دوسری قسط تھی۔ اس دوسری قسط کے بعد میں واقعی شکم سیر ہوگیا اور ٹانگیں پسار کر سوگیا۔

لاشعور میں چونکہ یہ احساس موجود تھا کہ مجھے صبح منہ اندھیرے اس گھر سے نکلنا تھا شاید اسی لیے مرغے کی پہلی بانگ کے ساتھ میری آنکھ کھل گئی۔ اب میں اپنے آپ کو بالکل تازہ دم محسوس کررہا تھا۔ گزشتہ روز کے واقعات کی تھکن اور درماندگی نے جلد ہی میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

چند لمحے بعد ہی میرا میزبان کوٹھری میں داخل ہوا اور مجھے پہلے سے بیدار بلکہ جانے کے لیے تیار دیکھ کر کچھ شرمندہ سا ہوگیا اور خجالت آمیز لہجے میں بولا "میں ہرگز تمہیں جانے کے لیے نہ کہتا لیکن تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔ ایک اجنبی کے لیے ہماری کیٹی میں رہنا اچھا نہیں ہے۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم یہاں زیادہ دیر نہ ٹھہرنا۔ اگر تم بند کے ساتھ ساتھ اور آگے سفر کروگے تو ڈھائی تین میل کے سفر کے بعد ایک دوسری کیٹی آئے گی۔ اس کا نام کیٹی خدا بخش ہے۔ وہاں کا ماحول ذرا مختلف ہے۔ اگر تمہیں کچھ دن گزارنا بھی پڑیں تو وہاں گزارنا۔ وہاں شاید تمہیں کچھ کام بھی مل جائے۔ جیسے ہی تمہاری مجبوری ختم ہوجائے اور تمہارے ہاتھ میں چار پیسے آجائیں' فوراً اپنے علاقے کی طرف واپس چلے جانا۔ سمجھ گئے نا؟"

"بالکل سمجھ گیا۔" میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا "میں اب چلتا ہوں۔"

میرے ساتھ باہر آنے سے پہلے اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر غالباً واسکٹ کی جیب سے ایک ایک روپے کے دو مُڑے تُڑے نوٹ نکال کر شرمندہ شرمندہ سے انداز میں میری جیب میں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرے گھر میں اس وقت کل یہی پیسے ہیں۔ آج منشی میرا حساب کرے گا تو تھوڑے سے پیسے ملیں گے تبھی گھر میں بھی سودا سلف آئے گا۔"

میں نے اس کی کلائی تھام کر اسے وہ روپے اپنی جیب میں ڈالنے سے روک دیا۔ میں کبھی ان دو مُڑے تُڑے نوٹوں کی طرف اور کبھی حاتو کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے یہ دو روپے کسی سیٹھ یا صنعتکار کے دو لاکھ روپوں سے زیادہ قیمتی تھے۔

"یہ روپے تم اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے حاتو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "ویسے تو دنیا کا کوئی کام پیسے کے بغیر نہیں چلتا لیکن میں تجربہ کرکے دیکھ رہا ہوں کہ شاید انسان پیسے کے بغیر بھی زندہ رہ سکتا ہو۔ میرا خیال ہے انسان پیسے کے بغیر تو زندہ رہ سکتا ہے' انسانوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"

"معلوم نہیں۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ سادگی اور تذبذب سے بولا "لیکن یہ پیسے تو تم کو ہرحال میں رکھنے پڑیں گے۔ میرا دل نہیں مان رہا کہ کوئی مصیبت زدہ اور خالی ہاتھوں والا مسافر میرے گھر سے خالی ہاتھ ہی چلا جائے۔"

اس وقت میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب میں نے اس کی آنکھوں میں آنسو آتے دیکھے۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا "مجھے معلوم ہے' دو روپے کی آج کل کے زمانے میں کوئی وقعت نہیں ہے لیکن تم ان پیسوں کو نہیں' اپنے ایک مسلمان بھائی کی محبت کو دیکھنا..."

"یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اپنے حلق میں پھیلتے غبار کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جو تم کہہ رہے ہو' میں تمہارے کہنے سے پہلے ہی وہ سوچ رہا تھا۔ جب تم جیسے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو زندگی اچھی لگنے لگتی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ تمہارے ان دو روپوں کو خرچ نہ کروں۔ نشانی کے طور پر سنبھال کر رکھوں۔"

میں نے دونوں نوٹ اس سے لے کر جیب میں رکھ لیے۔ وہ مجھے رخصت کرنے دروازے تک آیا۔ پہلے اس نے دروازہ کھول کر باہر اِدھر اُدھر جھانکا پھر یوں مجھے رخصت کیا جیسے میں دشمن ملک کا کوئی ایجنٹ تھا جسے اس نے ازراہِ ہمدردی دوسروں سے چھپ کر پناہ دے رکھی تھی۔ اس نے جلدی سے دروازہ بند کرلیا۔

ابھی صبح کا اجالا پھیلنا شروع نہیں ہوا تھا۔ میں نے گلی میں تیز تیز چلنا شروع کردیا لیکن گلی کے موڑ پر پہنچ کر میرے قدم خود بخود سُست پڑ گئے۔ مجھے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ جانا کہاں تھا۔ ابھی میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکا تھا۔

دوسری گلی میں دو آوارہ کُتوں نے میرا استقبال کیا۔ پہلے انہوں نے متجسس سی نظروں سے میرا جائزہ لیا پھر باہمی اتفاق رائے سے وہ غالباً اسی نتیجے پر پہنچے کہ انہیں بھونکنا چاہیے۔ وہ نقاہت زدہ سے انداز میں بھونکنے لگے لیکن جب میں اس گلی سے گزرتا چلا گیا تو انہوں نے میرا پیچھا چھوڑ دیا۔

کئی گلیوں سے گزرنے کے بعد میں نے اپنے آپ کو اچانک ہی گاؤں سے باہر پایا لیکن گاؤں سے ذرا ہٹ کر کھلے میدان میں ایک بہت بڑا چھپر پھیلا ہوا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک خاصا بڑا چھپر ریستوران' تھا جیسے عموماً گاؤں دیہات میں ہوتے ہیں۔

لیکن اس چھپر ریستوران کے گرد چار دیواری نہیں تھی۔ البتہ اس کے عقب میں بہت سی کچی اینٹیں ترتیب سے رکھی تھیں۔ ایک طرف چکنی مٹی کا ڈھیر بھی نظر آرہا تھا۔ ان چیزوں کی حالت سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ بہت دن سے وہاں پڑی تھیں لیکن ان کے استعمال ہونے اور تعمیر شروع ہونے کی نوبت نہیں آرہی تھی۔

ریستوران کے سامنے کئی بڑی بڑی' پرانی سی چارپائیاں اور بہت سی بنچیں پڑی ہوئی تھیں لیکن ابھی ان پر کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ چارپائیوں کے نیچے صرف دو تین سُست الوجود سے کُتے گردنیں جھکائے غالباً دنیا کی بے ثباتی پر غور کررہے تھے۔

چھپر کے نیچے بھی چند بنچیں پڑی تھیں۔ وہ زیادہ صاف ستھری

تھیں اور ان کے سامنے موٹے موٹے چوبی تختوں کی میزیں بھی موجود تھیں۔ جس طرف مٹی کے کاؤنٹر کی سی صورت میں چولھے اور انگیٹھیاں بنی ہوئی تھیں اس طرف ایک شخص کھڑا کچھ برتن اور دوسرا سامان سیٹ کر رہا تھا۔ وہ ریسٹوران کا مالک معلوم ہوتا تھا۔ اس کا لباس کچھ صاف ستھرا تھا اور سر پر پگڑی بھی ذرا معززانہ سی تھی۔

ایک شخص کہیں دور سے ایک ڈنڈے میں دو کنستر باندھے کندھوں پر لٹکائے پانی بھر کر لا رہا تھا۔ وہ غالباً مالک کے معاون اور بیرے وغیرہ کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا تھا۔

میں کچھ دیر گلی کے کونے پر ہی کھڑا ان کا جائزہ لیتا رہا۔ انہوں نے میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ مالک ایک چولھے میں آگ روشن کرنے لگا۔ بیرا پانی لا کر ایک طرف رکھے ہوئے لمبوترے ڈرم نما مٹکوں میں ڈالنے لگا۔

میں نے چند لمحے صورت حال پر غور کیا اور آخر کار فیصلہ کیا کہ اس چھپر ریسٹوران پر قسمت آزمائی کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ حالانکہ گزشتہ رات میں نے ڈٹ کر کھانا کھالیا تھا لیکن اس وقت پھر اچھی خاصی بھوک محسوس ہو رہی تھی اور اس سے بھی زیادہ چائے یا کافی کی طلب ہو رہی تھی۔ کافی کی موجودگی کا تو ظاہر ہے یہاں تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کسی بھی قسم کی چائے ہی میسّر آجاتی تو غنیمت تھا۔

یہ تجربہ مجھے پہلے بھی ہوچکا تھا کہ غربت میں بھوک زیادہ لگتی ہے۔ دولتمندی کے دور میں عموماً ڈائٹنگ کرنے کو جی چاہتا ہے اور غربت میں دل چاہتا ہے جو سامنے آئے کھا جاؤ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ غربت میں عموماً انسان کو بھگدڑ، مشقت اور تجل خواری سے واسطہ رہتا ہے۔ غربت اور مشقت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ مشقت ہوتی ہے تو کھانے کی طلب بھی بڑھتی ہے۔ گاڑی بہت زیادہ حرکت میں رہتی ہے تو پیٹرول بھی زیادہ مانگتی ہے۔ زندگی سے مصنوعی آسائشیں اور آرام رخصت ہوتا ہے تو فطرت کے اصلی تقاضے بیدار ہونے لگتے ہیں۔

میں چھپر ریسٹوران کے قریب جا پہنچا۔ مالک نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور ذرا چونکا۔ یقیناً اسے پہلی ہی نظر میں اندازہ ہوگیا تھا کہ میں یہاں اجنبی تھا۔ وہ خاصا بارعب سا، ادھیڑ عمر شخص تھا۔ موٹی موٹی مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔

"کون ہو بھئی... اور کیا چاہیے؟" اس نے کھردرے اور نامہرباں سے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ ناشتا واشتا... چائے وائے مل جائے گی؟" میں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ میرے لہجے سے گویا اس کے خیال کی تصدیق ہوگئی کہ میں وہاں قطعی اجنبی تھا۔

"ضرور مل جائے گی۔ ابھی تو میں صرف اپنے لیے بنا رہا تھا، تمہارے لیے بھی بنادوں گا۔" اس نے آنکھیں سکیڑ کر میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ عام طور پر ہوٹلوں اور ریسٹورانوں والے کسی مفلوک الحال گاہک سے بھی پیشگی یہ نہیں پوچھتے کہ اس کے پاس پیسے [illegible] نہیں۔ لیکن اسے میری ظاہری حالت دیکھ کر شاید کچھ شبہ گزرا [illegible] اس نے اپنے شبہے کی تصدیق کرلینا ہی بہتر سمجھا۔

"کچھ پیسے ویسے بھی ہیں جیب میں؟" اس نے پوچھا۔ [illegible] میری مفلسی کا عکس میرے چہرے پر بھی آگیا تھا۔

"نہیں، پیسے تو نہیں ہیں۔" میں نے بہت دھیمی آواز میں [illegible] حاتو کے دیے ہوئے دو روپے میں واقعی خرچ کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"تو پھر کیا یتیم خانہ سمجھ کر ادھر آگیا ہے؟" چھپر ریستوران کے مالک کا لہجہ یک لخت ہی پہلے سے کئی گنا زیادہ کھردرا ہوگیا۔ [illegible] نے قدرے فخریہ انداز میں چاروں طرف اشارہ کیا "اڑے یہ [illegible] ہوٹل ہے، کوئی یتیم خانہ نہیں ہے کہ سب حالی موالی منہ اٹھا [illegible] اِدھر آجاتے ہیں۔ مفت خورے میرے پاس دن میں بہت [illegible] ہیں۔ اگر میں سب کو مفت کھلانے لگوں تو میرا ہوٹل تو چار دن [illegible] نیلام ہوجائے گا۔"

اس نے ایک بار پھر حقارت سے میرا سرتاپا جائزہ لیا اور [illegible] چڑھاتے ہوئے بولا "کام کے نہ کاج کے، دشمن اناج کے۔ [illegible] چوڑا آدمی ہے، اتنی جان لیے پھر رہا ہے، گبھرو جوان ہے۔ تیر [illegible] مفت مانگ کر کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی!"

اس کے چہرے اور لہجے کی تمام تر حقارت کے باوجود [illegible] وقت نہ جانے کیوں مجھے بدمزگی یا توہین کا احساس نہیں ہوا۔ [illegible] انسان جب اندر سے بھرا بھرا اور آسودہ حال ہوتا ہے تو [illegible] مفلس و قلاش کہلانا اور حقارت کا برتاؤ کیا جانا زیادہ برا نہیں لگ[illegible] جب میں حقیقتاً مفلس و قلاش تھا تو اس قسم کا رویّہ دل میں [illegible] لگادیا کرتا تھا۔

اب تو مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میں دل ہی دل میں [illegible] صورت حال کو تقریباً انجوائے کر رہا تھا۔ فقیروں کا بھیس بدل [illegible] تماشائے اہلِ کرم دیکھنے میں بھی ایک عجیب اور الگ ہی طرح [illegible] لذت پوشیدہ تھی۔ اس کا اندازہ مجھے دھیرے دھیرے ہو رہا تھا۔ [illegible] پرانے بادشاہ اور خلفا اگر راتوں کو بھیس بدل کر رعیّت کا حال جاننے کے لیے نکلتے تھے تو اس میں ادائیگیِ فرض کی دشواریوں [illegible] اپنی ظرف کی آزمائش کے علاوہ یقیناً ایک طرح کی دلچسپی بھی پوشیدہ ہوتی ہوگی۔

اس عالم میں انسان پر دوسروں کے کردار کے بڑے عجیب عجیب پہلو آشکار ہوتے ہیں۔ زندگی بڑے تحیر خیز انداز میں اپنے [illegible] گنت پہلو لیے سامنے آتی ہے۔ سب کچھ بہت دلچسپ بھی لگتا [illegible] اور عبرت آموز بھی۔ لیکن یہ سب کچھ بہرحال ایک کڑی آزمائش سے کم نہیں تھا۔ اس سے گزرنے کے لیے بڑا حوصلہ چاہیے تھا۔

دینو یقیناً حقارت سے ہنستا، اگر اسے یہ بتایا جاتا کہ اس وقت اس کے چھپر ہوٹل کے سامنے کراچی کے ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا

مالک کھڑا تھا جس کا کاروبار پاکستان کے طول و عرض میں پھیلا ہوا تھا۔ جس کے لیے پاکستان کے کسی بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں بل کی ادائیگی ضروری نہیں تھی، صرف بل پر دستخط کردینا ہی کافی ہوتا تھا۔ جسے معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ کب اس قسم کے بل اس کے اکاؤنٹس ڈیپارٹمنٹ میں جاتے تھے اور کب ان کی ادائیگی ہوجاتی تھی۔ وہ شخص دینو کے چھپر ہوٹل پر ناشتے کا سوالی بنا کھڑا تھا۔

دینو کو یقیناً اپنے چھپر ہوٹل پر خاصا ناز تھا۔ شاید وہ گاؤں کے خوش حال لوگوں میں سے ایک ہو۔ اس دوران اس نے غالباً رات کے بچے ہوئے ایک آدھ سالن کا برتن چولھے پر رکھ دیا تھا اور دوسرے چولھے پر المونیم کا ایک کالا سا فرائنگ پین رکھ کر اس میں کچھ مکھن ڈال رہا تھا۔

ان چیزوں کی خوشبوؤں سے میری اشتہا تیز ہونے لگی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ شاید میرے محسوسات اس درندے کے سے رہے ہوں جو لحہ بہ لحہ شکار کے قریب جارہا ہوتا ہے۔ میری بھوک پیاس، طلب اور توانائیاں سبھی اپنی تمام تر شدتوں کے ساتھ جاگ اٹھی تھیں۔

میں نے اپنے لہجے میں مسکینی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "دینو سائیں! میں بھکاری نہیں ہوں۔ مانگ تانگ کر کھانا نہیں چاہتا۔ میں تو کام کی تلاش میں ہوں۔ آپ مجھے اپنے ہوٹل میں ویٹر... میرا مطلب ہے بیرا رکھ لیں۔"

"اڑے.. بیرے کا کام بھی کوئی آسان نہیں ہے۔ جو بھی موالی ادھر مفت کھانا کھانے کے چکر میں آتا ہے، وہ بولتا ہے ہم کو بیرا رکھ لو۔ کوئی بولتا ہے ہم کو برتن دھونے پر رکھ لو۔ کوئی بولتا ہے ہم کو باہر والا بنالو۔ تم نے کبھی پہلے اس طرح کا کوئی کام کیا ہے؟" اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔ وہ باتوں کے دوران اپنا کام بھی کرتا جارہا تھا۔ کھانے پینے کی مختلف چیزیں گرم کر رہا تھا اور ساتھ ساتھ اپنے لیے اچھا خاصا پُرتعیش ناشتا تیار کر رہا تھا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیانتداری سے دیتے ہوئے کہا "نہیں۔ میں نے پہلے یہ کام نہیں کیے لیکن میں کرلوں گا۔ انسان کرنا چاہے تو دنیا کا کوئی کام مشکل نہیں ہے۔"

"اڑے یہ سب زبان سے بولنا آسان ہے، کر کے دکھانا بہت مشکل ہے۔" وہ بدستور حقارت سے بولا "میں نے کام چور اور حرام خور زندگی میں اتنے دیکھے ہیں کہ اب میں دور سے ان کی شکل دیکھ کر پہچان لیتا ہوں۔"

اس کا ملازم بھی پانی لینے کے لیے جاتے جاتے رک گیا تھا اور متجسس نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ کتوں نے بھی سر اٹھا کر کچھ دیر تک میرا جائزہ لیا تھا لیکن بھونکے بغیر سر جھکالیا تھا۔

دینو نے مکھن میں دو انڈوں کا شاندار آملیٹ تیار کرلیا تھا۔ فرائنگ پین چولھے سے اتارتے ہوئے وہ بولا "سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مجھے ویٹر، برتن دھونے والے یا باہر والے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ میں اور سومرل کر سارے کام کرلیتے ہیں۔ ہمیں کسی تیسرے آدمی کی ضرورت نہیں۔ یہ کوئی شہر کا ہوٹل تو نہیں ہے نا۔ میں کوئی لاکھوں روپیہ تو نہیں کما رہا ہوں کہ پوری فوج بھرتی کرلوں۔"

میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن وہ کچھ سننے سے پہلے ہی ماتھے پر ہاتھ مار کر جھنجلاہٹ سے بولا "اڑے بابا.. ماں چیو تا، مکھے ماڑھو نہ گھرے... نہ گھرے۔" (ارے بابا! میں نے کہا تو ہے کہ مجھے آدمی نہیں چاہیے۔ نہیں چاہیے)

میں نے اس کے چھپر کے عقب میں پڑی ہوئی اینٹوں اور مٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور اگر میں تمہارے اس ہوٹل کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کردوں تو مجھے کتنے دن تک کھانا مل سکتا ہے؟"

میں نے شاید لاعلمی میں اس کی کمزوری دریافت کرلی تھی۔ اس کی برہمی یک لخت ہی کافی کم ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں اچھی خاصی دلچسپی کی چمک ابھر آئی تھی لیکن وہ اسے دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بظاہر بے نیازی سے بولا "تم نے پہلے کبھی چنائی وغیرہ کی ہے؟ راج مستری کا کام کیا ہے؟ اکیلے سب کچھ کرلوگے؟"

"یہ سیدھا سادا سا کام ہے۔ اس کے لیے کوئی راج مستری یا مزدور ہونا ضروری نہیں۔ صرف محنت کی ضرورت ہے۔ میں نے اپنے گوٹھ میں کئی مرتبہ اپنے اور دوسروں کے مکانوں کی دیواریں بنائی ہیں۔ ان میں کھڑکیاں دروازے بھی لگائے ہیں، اوپر چھتیں بھی ڈالی ہیں۔ یہ کون سا شہر میں پلازا بنانے کا کام ہے۔ آسان ہی ہے۔ میں سب کرلوں گا۔ تم دیکھو گے تو طبیعت خوش ہوجائے گی۔" مجھے اس کو قائل کرنے کی کوشش میں لطف آرہا تھا۔

"وہ تو کام دیکھ کر ہی پتا چلے گا۔" اس کے لہجے میں مزید نرمی آگئی۔ اس کے الفاظ سے ظاہر تھا کہ وہ تقریباً آمادہ ہوچکا تھا "لیکن جب تک کچھ کام کر کے نہیں دکھاؤ گے، کھانے کو کچھ نہیں ملے گا۔ مجھے مفت خوروں سے بڑی نفرت ہے۔ میں نے خود زندگی میں کبھی مفت کا نہیں کھایا اور نہ ہی کسی کو کھلاتا ہوں۔"

وہ کھڑے ہی کھڑے ایک شاندار پراٹھے کے ساتھ اپنا شاندار آملیٹ چٹ کرنے لگا۔ میں نے تھوک نگلتے ہوئے نظر چرالی اور دھیمے لہجے میں کہا "ٹھیک ہے، میں بھی جب تک تمہیں کچھ کر کے نہیں دکھادوں گا، تم سے کچھ کھانے کو نہیں مانگوں گا۔"

"ہاں، یہ ہوئی نا مرد بچے والی بات۔" موٹی موٹی مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹوں پر پہلی بار خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی "اگر مجھے تمہارا تھوڑا سا کام دیکھ کر اندازہ ہوگیا کہ تم کام ٹھیک کرلوگے تو میں تمہیں چاروں دیواریں بنانے کی اجازت دے دوں گا جب تک تم کام کرو گے، تمہیں تینوں وقت کھانا یہاں سے ملے گا

بلکہ اگر تمہارے پاس رہنے کا ٹھکانا نہیں ہے تو رات کو تم یہیں سو بھی سکتے ہو۔ یہ میرا ملازم سومر بھی ادھر ہی سوتا ہے۔" اس نے بڑی بڑی چارپائیوں کی طرف اشارہ کیا۔

پھر ایک بڑا سا نوالا حلق سے اتارتے ہوئے اسے گویا کوئی خیال آیا اور وہ خبردار کرنے کے سے انداز میں بولا "لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم اس کام میں پورا مہینہ ہی لگادو۔ اکیلے آدمی کے لیے یہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کا کام ہے۔ اگر ساتھ ایک مزدور بھی مل جاتا تو تین دن میں کام ہو جاتا....."

پھر اس نے اعتراف کر ہی لیا کہ اسے اس کام کے لیے آدمی نہیں مل رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "کیٹی میں آدمی تو بہت ہیں لیکن سب سائیں مراد کی زمینوں پر مصروف ہیں۔" اس نے بند کی طرف اشارہ کیا "چاہے پیسے زیادہ ملیں پھر بھی وڈیرا سائیں مراد کی زمینوں سے کام چھوڑ کر تو کوئی نہیں آسکتا نا۔"

میرے دیکھتے ہی دیکھتے اس نے تیزی سے ناشتا چٹ کرلیا۔ سومر نے اس دوران پانی کا ایک پھیرا اور لگالیا۔ دیٖنو ہونٹ صاف کرکے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے بولا "اب تم ذرا لنگر کس لو۔ کام کرنے کے لیے تمہیں جس سامان کی ضرورت ہوگی وہ سب میرے پاس ہے لیکن کام سارا کا سارا واقعی تمہیں اکیلے ہی کرنا پڑے گا پانی تک خود ہی بھر کر لانا پڑے گا۔ کیونکہ سومر اب دن چڑھتے ہی اِدھر ہوٹل میں مصروف ہوجائے گا۔"

"وہ تو میں کہہ ہی چکا ہوں کہ سب کچھ میں خود ہی کروں گا۔" میں نے اسے ایک بار پھر اطمینان دلایا۔

"ذرا احتیاط بھی کرنا۔ گاہکوں میں آکر اٹھنے بیٹھنے کی ضرورت نہیں۔ لوگوں کو یہ پتا نہ چلے کہ تم کوئی باہر کے آدمی ہو۔ یہ تمہارے ہی حق میں اچھا ہے۔ حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ کہیں خواہ مخواہ تمہارے لیے کوئی پریشانی نہ کھڑی ہوجائے۔" اس کا لہجہ اب اچھا خاصا ہمدردانہ ہوگیا تھا۔

"تم فکر نہ کرو' میں سب سمجھتا ہوں۔ مجھے تمہارے گاہکوں میں آکر اٹھنے بیٹھنے کی فرصت ہی کہاں ملے گی۔" میں نے کہا۔

وہ خاصا مطمئن اور خوش نظر آنے لگا۔ صرف تین وقت کے کھانے پر اسے آدمی مل گیا تھا جو راج اور مزدور دونوں کے فرائض انجام دینے کے لیے تیار تھا۔ اس نے چھپری میں رکھا ہوا سامان میرے حوالے کیا۔ مجھے ایک پرانی' میلی سی' مختصر سی دھوتی بھی دی جس کا میں نے واقعی لنگوٹ کس لیا اور اپنی عظیم الشان شلوار قمیص سنبھال کر ایک طرف رکھ دی۔

بھوک کے عفریت نے میرے معدے کی دیواروں کو اپنے ناخنوں سے کھرچنا شروع کردیا تھا لیکن میں کام میں لگ گیا۔ خود ہی پانی بھر بھر کر لایا۔ غنیمت تھا کہ کنواں زیادہ دور نہیں تھا۔ خود ہی میں نے بہت سا گارا تیار کیا' اینٹیں لادلاد کر لایا اور دیوار تعمیر کرنی شروع کردی۔ جلد ہی میں کام میں مگن ہوگیا اور بھوک کی اذیت

کچھ کم ہوگئی۔

دوپہر تک میں ایک طرف کی آدھی سے زیادہ دیوار تعمیر کرچکا تھا اور دیوار کچھ ایسی بری بھی نہیں تھی۔ دیٖنو نے اعتراف تو نہیں کیا لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ میرا کام اور کام کی رفتار' دونوں ہی چیزیں دیکھ کر حیران تھا۔ لیکن میرا خیال ہے اس سے زیادہ حیران وہ اس وقت ہوا ہوگا جب اس نے بڑی محبت سے مجھے کھانے کے لیے مدعو کیا۔

اس نے میری ہی بنائی ہوئی دیوار کی آڑ میں بینچ ڈلوا کر سومر کے ہاتھ میرے لیے کھانا بھجوایا... اور پھر بھجواتا ہی چلا گیا کیونکہ میں منگواتا ہی چلا گیا۔ میں نے اس کے کھن گوشت اور روٹیوں پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ اس نے بھی ہاتھ تو نہیں روکا لیکن آخرکار جب میں شکم سیر ہوچکا تو وہ میرے پاس آیا اور بولا "خدا کا شکر ہے' میں نے تمہیں صرف تین وقت کے کھانے پر ہی کام پر لگایا تھا۔ اگر ساتھ مزدوری بھی دینے کا وعدہ کرتا تو بڑے گھاٹے میں رہتا۔"

میں نے یونہی اس کا دل دہلانے کے لیے کہا "میں نے تو ابھی ہاتھ روک کر کھایا ہے ورنہ میری خوراک تو اس سے زیادہ ہے۔"

"خیر" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میں اس لیے نقصان میں نہیں رہوں گا کہ میرے خیال میں تم آدمی ایماندار ہو۔ کام کو لمبا نہیں لٹکا رہے۔ تم تو شاید میرے اندازے سے بھی آدھے وقت میں چاروں دیواریں بنادو گے۔"

"انشاء اللہ" میں نے بڑے خلوص سے عزم ظاہر کیا۔

تین دن میں' میں نے چھپر کے گرد تین دیواریں کھڑی کردیں۔ میں نے دو راتیں وہاں گزاری تھیں اور حیرت کی بات یہ تھی کہ یہ تین دن اور دو راتیں مجھے بہت اچھی محسوس ہوئی تھیں' بڑا لطف

آیا تھا۔ دن بھر شدید مشقت کا پسینہ بہانے' ڈٹ کر کھانے اور شام کو گاہکوں کا سلسلہ ختم ہوجانے کے بعد میں کنویں کے ٹھنڈے ٹھنڈے پانی سے نہا کر کھلے آسمان تلے' لہلہاتے درختوں کے قریب لمبی چوڑی چارپائی پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹتا تو میٹھی میٹھی تھکن کی تہ سے ایک نئی اور انوکھی سی زندگی کی لذت میرے وجود میں چٹکیاں لیتی۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں ایک عمدہ' مضبوط اور طاقتور انجن تھا مگر میرے اندر کہیں کہیں میل' گریس اور زنگ جمنے لگا تھا۔ تین دن میں ہی جیسے وہ میل' گریس اور زنگ دُھل گیا تھا۔ میرے پُرزے اور گراریاں اندر ہی اندر صاف ستھرے ہوکر چمکنے دمکنے لگے تھے۔

اس دوران میں نے نہ صرف اپنے کپڑے دھولیے تھے بلکہ سومرے کوئلوں والی استری لے کر انہیں استری بھی کرلیا تھا۔ دن بھر لنگوٹ کس کر جان توڑ محنت کرنے کے بعد رات کو صاف ستھرے لباس میں تاروں بھرے آسمان تلے بیٹھ کر دودھ پتی پینے اور سومرے باتیں کرنے میں بڑا مزہ آتا' بڑی فرحت محسوس ہوتی۔ وہ بہت ہی سیدھا سادا اور صاف دل سا نوجوان تھا۔

"ریستوران" میں آنے والے گاہکوں نے میری طرف زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ اگر کسی نے کچھ پوچھا بھی تھا تو دیٖنو نے انہیں نہ جانے کیا بتایا تھا۔ بہرحال مجھے اس سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ میرا وقت اچھا گزر رہا تھا۔

چوتھے روز دوپہر کو جب میں چوتھی دیوار آدھی سے زیادہ بنا چکا تھا تو یکایک ہی مجھے اس سوال نے آن گھیرا کہ اب کیا ہوگا؟ کام تو ختم ہونے کے قریب تھا۔ اس کے بعد دیٖنو کو میری ضرورت نہیں تھی۔ اب مجھے کدھر کا رخ کرنا تھا؟ مجھے نہیں معلوم تھا زندگی کا دھارا اب مجھے کس طرف لے جانے والا تھا۔

میں نے چوتھے اور آخری نمبر پر سامنے کی دیوار کو رکھا تھا۔ سامنے کی اس دیوار کی تعمیر کرتے وقت میری پشت باہر بیٹھے گاہکوں کی طرف تھی۔ اچانک میں نے دو آدمیوں کو اپنی ادھوری سی دیوار کے قریب سے گزر کر دیٖنو کے قریب پہنچتے دیکھا۔ ان میں سے ایک خوب لمبا چوڑا' تنومند تھا۔ اس کی مونچھیں دیٖنو کی مونچھوں سے کہیں بڑی اور بارُعب تھیں۔ وہ نوجوان ہی تھا۔ سر پر بڑی سی پگڑی تھی۔

دوسرا ذرا چھوٹے قد کا اور کم جسیم تھا لیکن اس کے کندھے پر کلاشنکوف موجود تھی۔ وہ دونوں مٹی کے کاؤنٹر کے سامنے دیٖنو کے مقابل جارکے۔ میں دیوار میں اینٹیں بھی چُن رہا تھا اور یہ منظر بھی دیکھ رہا تھا۔

دیٖنو نے پھیکی سی مسکراہٹ سے ان کا استقبال کیا۔ وہ یقیناً دیٖنو کے لیے اجنبی نہیں تھے لیکن انہیں دیکھ کر دیٖنو کے چہرے سے گویا زندگی کی چمک رخصت ہوگئی تھی۔ تاہم بظاہر وہ حوصلے سے کھڑا رہا۔

لمبے تڑنگے شخص نے خاموشی سے اپنا بڑا سا ہاتھ پھیلادیا۔ دیٖنو نے گلے سے کچھ نوٹ نکال کر گنے اور اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ دراز قد نے گونجیلی سی آواز میں سندھی میں ذرا برہمی سے جو کچھ کہا اس کا مطلب یہ تھا۔

"ابے... کیا تجھ کو پیغام نہیں ملا تھا کہ اب بھتہ تین سو روپے ہفتہ کے بجائے چار سو روپے ہفتہ ہوگا؟ سائیں دلبر کا حکم نہیں پہنچا تیرے تک؟"

"پیغام تو ملا تھا سائیں!" دیٖنو ہاتھ جوڑ کر بولا "لیکن آپ سائیں دلبر کی خدمت میں ہماری طرف سے فریاد کرنا... آپ خود ہی بتائیں ہم چار سو روپے ہفتہ کیسے دے سکتے ہیں؟ اتنا تو اب خود ہمارے حصے میں نہیں آتا۔ ہم تو تین سو روپیہ ہفتہ ہی پیٹ کاٹ کر دے رہے ہیں۔ گاہکی آدھی رہ گئی ہے۔ پہلے تو رات گئے تک محفلیں جمتی تھیں' گاہک بیٹھے رہتے تھے۔ اب تو مغرب کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے۔"

"ابے تقریر بند کر۔ حالات خراب ہیں اسی لیے تو بھتے کی رقم بڑھ گئی ہے۔ تمہیں کیا پتا' ہمیں علاقے کی حفاظت کے لیے اور تم لوگوں کے کاروبار جاری رکھنے کے لیے کیا کیا مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ بس سیدھی طرح بتا.... چار سو روپے ہفتہ دے گا یا نہیں؟"

"سائیں! چار سو روپیہ ہفتہ دینے سے تو بہتر ہے میں یہ ہوٹل ہی بند کردوں۔" دینو ہاتھ باندھ کر بولا۔ اس کے ہاتھ بے شک بندھے ہوئے تھے لیکن اس کے لہجے میں بغاوت تھی۔ اس کا لہجہ بلاشبہ اس شخص کا لہجہ تھا جو کسی کی مسلسل زیادتیوں سے تنگ آکر آخرکار زندگی سے بے زار ہوجاتا ہے' اسے اپنی جان کی بھی پروا نہیں رہتی۔

"یعنی تیری طرف سے انکار ہے؟" دراز قد نوجوان پھنکارا۔ چاروں طرف گہرا سناٹا چھا گیا تھا۔ میں نے محسوس کیا' ریستوران کے بیشتر گاہک کھسک چکے تھے۔

"تین سو روپے ہفتہ دینے سے میں نے انکار نہیں کیا۔ اس سے زیادہ دینا میرے لیے ممکن نہیں ہے۔" دینو نے فیصلہ کن لہجے میں جواب دیا۔

اچانک ہی ان دونوں نے دینو کو پکڑ کر کاؤنٹر کے عقب سے کھینچ لیا اور فرش پر گرا کر بھاری بوٹوں کی ٹھوکروں پر رکھ لیا۔ دینو رو رہا تھا' فریاد کررہا تھا۔ آخرکار مجھ سے برداشت نہ ہوسکا۔ میں نے گارے کا تسلا ایک طرف رکھا اور جس بینچ پر میں کھڑا تھا اس سے چھلانگ لگادی۔

چھپر ریستوران کے اندرونی حصے میں اس وقت کوئی گاہک موجود نہیں تھا۔ بینچیں دیواروں کے ساتھ لگی ہوئی تھی۔ بیچ میں جتنی بھی جگہ خالی تھی' اس میں دینو ان دونوں کی ٹھوکروں کے درمیان فٹ بال کی طرح لڑھک رہا تھا۔ وہ دراصل ٹھوکروں سے بچنے کی کوشش میں تڑپ کر کبھی ایک طرف کو لڑھکتا تھا اور کبھی دوسری طرف کو لیکن بچ نہیں پا رہا تھا۔

دراز قد اور پستہ قد' دونوں ہی نوواردوں کے پیروں میں بھاری بوٹ تھے۔ کبھی ایک کی ٹھوکر دینو کی پسلیوں پر پڑتی' کبھی دوسرے کی ٹھوکر اس کی کھوپڑی پر۔ مجھے اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ ضربیں اس کے لیے کتنی اذیت ناک ثابت ہو رہی ہوں گی۔ وہ بری طرح بلبلا رہا تھا' درد سے تڑپ رہا تھا لیکن ٹھوکریں مارنے والے دونوں آدمی گویا اس کی اذیت سے محظوظ ہو رہے تھے۔

میں "دھم" کی خاصی زوردار آواز کے ساتھ اندر کودا تھا لیکن انہوں نے پلٹ کر میری طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔ انہیں یقیناً پورا اطمینان تھا کہ کوئی ان کی کارروائی میں مداخلت کی جرأت نہیں کرسکتا۔

دینو کے حلق سے کچھ ناقابلِ فہم سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ درحقیقت ایک تو وہ معافی مانگ رہا تھا' فریاد کر رہا تھا' دوسرے یہ بتانے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ منہ مانگا بھتہ دینے کے لیے تیار ہے' اگر نہ دے سکا تو وہ ریستوران بند کرکے چلا جائے گا لیکن اب کوئی اس کی بات نہیں سُن رہا تھا۔ اس کے لیے اب گویا معافی کا وقت گزر چکا تھا۔

میرے خیال میں پہلے پستہ قد کا بندوبست کرنا ضروری تھا کیوں کہ اس کے کندھے پر کلاشنکوف موجود تھی۔ میں نے اپنی تمامتر قوت گویا ایک نقطے پر مرکوز کرتے ہوئے اس کی کنپٹی پر صرف ایک ہی گھونسا رسید کیا۔ اس کے لیے وہ ایک ہی گھونسا کافی تھا۔ وہ اچھل کر خاصی دور تک گیا اور میری ہی بنائی ہوئی ایک دیوار سے ٹکرا کر پٹ سے چھپکلی کی طرح گرا اور وہیں ساکت ہوگیا۔

دراز قد اور بارُعب مونچھوں والا نوجوان یوں تو اپنے ساتھی کی کنپٹی پر گھونسا پڑتے ہی میری طرف گھوم چکا تھا لیکن کئی لمحے تک وہ کچھ بھی نہ کرسکا۔ اس نے مجھ پر حملہ آور ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ مجھ سے خوفزدہ تھا۔ درحقیقت وہ حیرت سے بُت بن کر رہ گیا تھا۔

اسے یقین ہی نہیں آرہا تھا کہ ایک "مزدور" نے اس کے ساتھی پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت کی تھی۔ میرے ہاتھ ابھی تک مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے اور جسم پسینے سے تر تھا۔ لباس کے نام پر میرے جسم پر صرف وہی دھوتی تھی جو دینو نے مجھے دی تھی اور جسے میں نے لنگوٹ کی شکل میں باندھ رکھا تھا۔

میں نے دراز قد نوجوان پر حملہ کرنے میں پہل نہیں کی کیوں کہ وہ دینو کو ٹھوکریں مارنا بند کرچکا تھا۔ میں اس کے سامنے بالکل ساکت کھڑا تھا اور اسے گویا سوچنے سمجھنے کا موقع دے رہا تھا کہ اسے مجھ سے "پنگا" لینا چاہیے یا نہیں۔

ایک لمحے کے لیے گویا پورا منظر ہی ساکت ہو کر رہ گیا۔ میں پلکیں تک نہیں جھپکا رہا تھا اور دراز قد نوجوان بھی اسی طرح ساکت کھڑا تھا۔ صرف پسِ پردہ آوازوں کی طرح دینو کی درد بھری کراہیں ابھر رہی تھیں۔

پھر یکدم ہی جیسے اس تنومند نوجوان کو کسی نادیدہ ننگے تار سے زوردار کرنٹ لگا لیکن اس سے وہ ہوش و حواس کی دنیا میں واپس نہیں آیا بلکہ اس پر اچانک جیسے پاگل پن کا دورہ پڑگیا۔ اس کے چہرے پر زلزلے کے آثار نمودار ہوئے' آنکھوں میں وحشت اور دیوانگی در آئی۔

اس نے چولھے پر سے المونیم کا فرائنگ پان اٹھالیا جس میں "دال فرائی" تیار ہوتا تھی۔ دال کو مکھن کا بگھار لگانے کے لیے دونوں چیزیں ڈالی گئی تھیں مگر اس وقت تک دال جلنے لگی تھی اور کھُدبُد کررہی تھی۔

جو لوگ ہمیشہ اپنی طاقت کے زعم میں رہے ہوں' جنہیں کوئی پوچھنے والا نہ ہو' جن کے سامنے کبھی کسی نے سر نہ اٹھایا ہو' وہ عموماً لڑائی بھڑائی کے معاملے میں احمق ثابت ہوتے ہیں۔ خصوصاً جب کوئی پہلی بار ان کے سامنے سر اٹھا کر' سینہ تان کر کھڑا ہوا ہو۔

اگر وہ سمجھ رہا تھا کہ میں اسے فرائنگ پان اٹھاتے دیکھوں گا اور پھر بھی سعادت مندی سے کھڑا رہوں گا یا ضربیں لگوانے کے لیے اپنی کھوپڑی اس کے سامنے کردوں گا' تو یقیناً وہ سخت احمق تھا۔

اس نے کھُدبُھد کرتی دال سمیت فرائنگ پان میرے سر پر رسید کرنے کے لیے طاقت بھی غیر ضروری پر کچھ زیادہ ہی صرف کردی۔ مجھے ایک طرف ہٹنے میں ذرا بھی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ نہ صرف اپنی جھونک میں بہت آگے چلا گیا بلکہ کھُدبُد کرتی ساری دال بھی اس کے ساتھی کے کپڑوں اور چہرے پر گری۔ بے ہوش ہونے کے باوجود اسے زبردست جھٹکا سا لگا۔ وہ زمین سے تقریباً اچھل پڑا۔

فرائنگ پان نوجوان کے ہاتھ سے پھسل کر نکل گیا اور دیوار سے جا ٹکرایا۔ نوجوان خود بھی اپنی جھونک میں دیوار سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ فرائنگ پان بے شک المونیم کا تھا لیکن جس قوت سے نوجوان نے گھمایا تھا اس سے یقیناً فرائنگ پان اور میری کھوپڑی' دونوں ہی میں گہرا ڈینٹ پڑجاتا۔

وہ دیوار سے ٹکرانے سے بچا اور فوراً ہی اس نے جھک کر اپنے ساتھی کے کندھے تلے دبی کلاشنکوف نکالنے کی کوشش کی لیکن اس وقت تک میری لات اس کی پسلیوں پر پڑچکی تھی۔ وہ اچھل کر دور جا گرا۔

میں نے بھی اسے ہاتھ لگانے کی زحمت نہیں کی۔ جس طرح وہ دونوں' دینو کو ٹھوکروں پر رکھے ہوئے تھے' میں نے بھی اسے اٹھنے کا موقع دیے بغیر چند ٹھوکریں رسید کیں۔ حالانکہ میرے پیروں میں بھاری بوٹ نہیں تھے لیکن نوجوان بلبلا اٹھا کیوں کہ میں نے اسے جوڈو اور کراٹے کی ٹیکنیک سے ٹھوکریں رسید کی تھیں۔ تاہم احتیاط برتی تھی ورنہ نوجوان کے تنومند ہونے اور میرے ننگے پاؤں ہونے کے باوجود اس کی ایک آدھ پسلی ٹوٹ سکتی تھی۔

وہ کسی طرح اٹھنے میں کامیاب ہوگیا اور ایک بار پھر "ٹیکنیکی" غلطی کرتے ہوئے اندھا دھند مجھ پر جھپٹا۔ اس کی کنپٹی پر بھی میں نے ایک گھونسا رسید کیا لیکن پوری طاقت صَرف نہیں کی۔ میری ان سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔ میں انہیں صرف زیادتی سے روکنا چاہتا تھا۔ میں نے دینو کو اپنا محسن شمار کرلیا تھا۔ وہ دونوں میری آنکھوں کے سامنے اس کا جو حشر کر رہے تھے وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔

میں نے نوجوان کی خبر لینے کے سلسلے میں اس پر ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا ورنہ میں چاہتا تو ایک گھونسے میں وہ بھی بے ہوش ہوسکتا تھا۔ گھونسا کھا کر وہ لڑکھڑایا اور ایک گھٹنے کے بل گرا۔ میں نے اس پر مزید وار کرنے کے لیے کوئی تیزی نہیں دکھائی اور اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔

اس دوران دینو بھی اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کاؤنٹر کا سہارا لے کر پسلیوں پر ہاتھ رکھے کچھ ہانپ رہا تھا' کچھ کھانس رہا تھا۔ اس کی پھیلی پھیلی آنکھیں اور چہرے کے تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ مجھے اس دھول دھپّے سے روکنا چاہتا تھا لیکن ابھی اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ ہم دونوں کے بیچ میں آتا۔

نوجوان سر جھٹکتا ہوا اٹھا۔ اب اس کی عقل ٹھکانے آچکی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ اس کے ہاتھ میں ایک خنجر بھی آچکا تھا۔ میں نہیں دیکھ سکا تھا کہ خنجر اس نے کہاں سے نکالا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اس کی پشت میری طرف ہوئی تھی۔ غالباً اسی دوران اس نے قمیص کے نیچے سے خنجر نکالا تھا۔

میرا اندازہ درست تھا کہ اس کی عقل ٹھکانے آچکی تھی کیوں کہ اس نے اندھا دھند مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ میں محض ایک دراز قد' توانا اور ورزشی جسم کا مالک دکھائی دینے والا مزدور نہیں تھا۔ میرے پاس صرف جسم ہی جسم نہیں تھا' مجھے اس کا استعمال بھی بہت اچھی طرح آتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں دھندلاہٹ آگئی تھی لیکن اس دھندلاہٹ کی تہ میں شبہات کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ میری طرف سے شک میں مبتلا ہو چکا تھا بلکہ شاید اسے یقین ہو چکا تھا کہ میں وہ نہیں تھا جو نظر آرہا تھا۔ خنجر پر اس کی گرفت بتا رہی تھی کہ وہ اس کے استعمال میں ماہر تھا۔ ابتدا میں وہ صرف زعم میں مبتلا ہونے کی وجہ سے اتنی آسانی سے مار کھا گیا تھا ورنہ اتنا ترنوالا بہرحال نہیں تھا۔

اس کی نظر سانپ کی طرح مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ میں بھی پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دینو میری زندگی کی طرف سے یقیناً مایوس ہو چکا تھا کیوں کہ وہ جلدی سے کاؤنٹر کے عقب میں چلا گیا تھا۔

چھپر کے نیچے زیادہ جگہ میسّر نہیں تھی لیکن جتنی بھی تھی اس میں وہ نوجوان نیم دائرے میں نہایت آہستگی سے چکر کاٹتے ہوئے نہایت ہی آہستگی سے میرے قریب آرہا تھا۔

اس کے ہونٹ سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ اس کا خنجر بھی میرے خون کا پیاسا دکھائی دے رہا تھا اور وہ خود بھی۔ اب میرے اعصاب تن چکے تھے۔ میرے اندازے کی ذرا سی غلطی میرے لیے مہلک ثابت ہو سکتی تھی۔

اس بار اس کا ہاتھ میری توقع سے زیادہ تیزی سے حرکت میں آیا۔ اتنی ہی تیزی سے میں پیچھے ہٹا۔ خنجر کی نوک میرے پیٹ سے بمشکل آدھ انچ کے فاصلے سے گزری ہوگی۔ اس کے ساتھ ہی قدرت نے عجیب طریقے سے میری مدد کی اور میرے کام کو بہت آسان بنا دیا۔ دینو اور اس نوجوان کی پگڑیاں زمین پر گر کر کھل چکی تھیں اور ایک دوسرے میں گڈمڈ سی ہو گئی تھیں۔

اس نوجوان نے پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے ناکام وار کو کامیاب وار میں بدلنے کے لیے فوری طور پر ایک قدم بڑھاتے ہوئے خنجر والا ہاتھ الٹا گھمایا لیکن اسی لمحے اس کا پاؤں پگڑیوں میں الجھ گیا۔

وہ لڑکھڑا گیا۔ میرے لیے اتنی ہی مہلت کافی تھی۔ میں نے اس کی کنپٹی پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا۔ یہ ہاتھ اس کے لیے کافی ثابت ہوا۔ وہ لہرایا اور اپنے ساتھی پر ہی جا گرا۔ خنجر اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ ہوش میں تھا لیکن تیزی سے آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ جیسے بینائی کھو بیٹھا ہو۔

دینو کو جب یقین ہو گیا کہ وہ اب نہیں اٹھ سکے گا تو وہ کراہتا اور لنگڑاتا ہوا کاؤنٹر کے عقب سے نکلا۔ میرے قریب آکر چند لمحے تو وہ بے یقینی سے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتا رہا۔ اسے گویا یقین نہیں آرہا تھا کہ میں وہی مزدور تھا جسے اس نے صرف تین وقت کی روٹی کے معاوضے پر دیواریں تعمیر کرنے پر لگایا تھا۔ اسے شاید شبہ تھا کہ میرے اندر کوئی اور روح حلول کر گئی تھی۔

پھر یکدم ہی وہ پھٹ پڑا۔ "میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہارا شکریہ ادا کروں یا تمہیں جوتے ماروں۔"

"میں دونوں کے لیے تیار ہوں۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"تم نے مجھے بھی مروا دیا ہے اور اپنی موت کا بھی سامان کر لیا ہے۔" اس نے انتہائی گھبراہٹ کے عالم میں مجھے مطلع کیا۔

"کیوں؟" میں نے نہایت سادگی سے پوچھا۔

"تمہیں ان دونوں کو نہیں مارنا چاہیے تھا۔" اس نے فرش پر گرے ہوئے دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو کیا میں ان کے ہاتھوں تمہیں مرتے دیکھتا رہتا؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"نہیں ... خیر... انہیں روکنا بھی ضروری تھا۔" اسے اپنی چوٹیں یاد آگئیں اور وہ ایک بار پھر پسلیاں اور کھوپڑی وغیرہ سہلاتے ہوئے کراہ اٹھا۔ "لیکن تم بیچ بچاؤ کرانے کی کوشش کرتے تو اچھا تھا۔ تمہیں ان پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔"

"اس قسم کے لوگ بیچ بچاؤ کرانے والوں کو بھی مارتے ہیں۔ یہ تو ایک ہی زبان سمجھتے ہیں جو میں نے استعمال کی ہے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں معلوم ہے یہ لوگ کون ہیں؟" دینو نے دریافت کیا۔

"مجھے کیا معلوم۔ میں تو یہاں اجنبی ہوں۔ میرا خیال ہے یہاں کے کوئی نامی گرامی غنڈے ہوں گے۔ عام طور پر اس قسم کے لوگ غنڈہ ٹیکس یا بھتہ لینے آتے ہیں۔"

"یہ عام قسم کے غنڈے بدمعاش نہیں ہیں۔ یہ سائیں دلبر خان کے آدمی ہیں۔" دینو نے خوفزدہ لہجے میں مجھے بتایا۔ "کیٹی مرادمیں بھلا ان سے جھگڑا کرنے کے بارے میں کوئی کیسے سوچ سکتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں... باہر جو گاہک بیٹھے تھے ان میں کوئی میرا مہربان تھا' کوئی دوست تھا' کوئی پڑوسی اور کوئی اُدھار کھانے والا تھا

لیکن جیسے ہی انہوں نے دیکھا کہ مسکین علی اور محبت علی سے میری تکرار شروع ہو رہی ہے' تو سب بھاگ گئے۔"

پھر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "گاؤں گوٹھ کہیں کے بھی ہوں... اب لوگوں میں ظلم کے خلاف ایک ہو کر لڑنے کا جذبہ نہیں رہا۔"

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یہ بات صرف گاؤں گوٹھوں ہی کی نہیں' شہروں کا اس سے بھی برا حال تھا۔ لوگوں کو گلی کوچوں میں' ٹکڑیوں میں' حتیٰ کہ اِکائیوں میں بانٹ دیا گیا تھا۔ ان کے دلوں میں نہ جانے کتنی طرح کے خوف بٹھا دیے گئے تھے' نہ جانے کتنی طرح کے تعصبات بٹھا دیے گئے تھے۔ یہ بھی پیشہ ور سازشیوں کی بہت بڑی سازش تھی تاکہ لوگ ظلم کے خلاف متحد ہو کر کبھی نہ لڑ سکیں۔ لوگ متحد ہونے لگتے ہیں تو ظلم مٹنے لگتا ہے۔ ظلم مٹتا ہے تو بہت سے لوگوں کے بہت سے دھندے چوپٹ ہوتے ہیں۔ وہ اپنی سازش میں کامیاب تھے۔ اب کہیں کسی پر ظلم ہوتا ہے تو بعض اوقات دیکھنے والے سوچتے ہیں' یہ فلاں حوالے سے ہمارا آدمی نہیں ہے' ہماری پارٹی کا نہیں ہے' ہمارے علاقے کا نہیں ہے' ہماری زبان نہیں بولتا اس لیے اس پر ظلم ہونے دو' کوئی بات نہیں۔ وہ ظلم انہیں ظلم ہی نہیں لگتا۔ بعض اوقات تماشا دیکھنے والے کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ کسی کے ساتھ کچھ ہو رہا ہے تو ہونے دو' اپنی فکر کرو' اپنی جان بچاؤ' حالات خراب ہیں۔ بس یہی ساری خرابی کی جڑ ہے۔ ظلم کا سلسلہ دراز ہونے میں اس کیفیت کا بڑا ہاتھ ہے۔

میں یہ سب کچھ دینو سے کہنا چاہتا تھا لیکن نہ کہہ سکا۔ مجھے معلوم تھا وہ میرا فلسفہ ہضم نہیں کر سکے گا۔ چنانچہ میں نے یہ سب کچھ کہنے کے بجائے دیوار کے قریب پڑے دونوں آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تصدیق چاہی۔ "مسکین علی اور محبت علی ان کے نام ہیں؟"

"ہاں۔ چھوٹے قد والے کا نام مسکین علی ہے۔" اس نے اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "اور یہ جو لمبا سا... تگڑا سا نوجوان ہے اس کا نام محبت علی ہے۔ یہ آپس میں تائے چاچے کے بیٹے ہیں۔"

"کمال ہے!" میں نے تاسف سے سوچا۔ "ناموں اور شخصیتوں میں بھی تضاد کتنا بڑھتا جا رہا ہے۔ مسکین علی کے پاس مسکینی کے بجائے کلاشنکوف تھی اور محبت علی محبت بانٹنے کے بجائے خنجر لیے لوگوں کے پیٹ پھاڑنے کو پھر رہا تھا۔"

"یہ دلبر خان کے آدمی ہیں؟" میں نے مزید تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ اس کے سارے کام یہی کرتے ہیں۔ دلبر خان تو خالی حکم چلاتا ہے۔" دینو نے بتایا۔

"لیکن میں نے سنا ہے' دلبر خان تو خود وڈیرا سائیں مُراد خان کا آدمی ہے؟"

"ہاں۔ ٹھیک سنا ہے تم نے۔ لیکن دلبر خان خود کسی بادشاہ سے کم نہیں۔ سائیں مراد کو کون سا روز روز اِدھر آنے کی فرصت ملتی ہے۔ دلبر خان تو یہیں رہتا ہے۔ وہ یہاں ان کا خاص آدمی ہے۔ یہاں سب کچھ اس کے ہاتھ میں ہے۔ جب تک سائیں مراد یہاں نہ ہوں' یوں سمجھو' دلبر خان ہی کیٹی کا مالک ہے۔ اسی کا حکم چلتا ہے۔ اس کے آدمی جو حکم لے کر آجائیں وہ ہمارے لیے پتھر پر لکیر ہے۔"

"بھتہ تمام دُکانداروں سے لیا جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ صرف دُکانداروں سے ہی نہیں' چھابڑی والے اور ریڑھی والے تک سے لیا جاتا ہے۔" دینو نے جواب دیا۔

"یہ صرف دلبر خان کا اپنا دھندا ہے یا اس میں سے حصہ سائیں مراد کو بھی جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم کو کیا معلوم بابا!" وہ بیزاری سے بولا۔ "اتنی اندر کی باتوں کا ہم کو کیا پتا۔ ہم کو تو بس حکم ملتا آرہا ہے اور ہم اس کی تعمیل کرتے آرہے ہیں۔ میرا تو اب بھی بولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن کیا کروں... میرے پاس واقعی چار سو روپے ہفتہ کی گنجائش نہیں ہے۔ میں بھی بال بچے دار آدمی ہوں۔ یہ چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ اِدھر اُدھار کھاتہ بھی چلتا ہے۔ سیلاب کے دنوں میں ہم بھوکے مرتے ہیں۔ کیا کریں... کہاں جائیں... ہم کہیں جانے کے قابل بھی تو نہیں ہیں..." وہ ایک بار پھر کراہنے لگا۔

ایک آدھ ٹھوکر جو اس کے چہرے یا پیشانی پر پڑی تھی وہاں اب نیلے گومڑ نمودار ہونے لگے تھے۔ کچھ کھال بھی پھٹ گئی تھی اور وہاں سے خون رِس رہا تھا۔

وہ اپنے چوبی تخت پر بیٹھ کر ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "تم نے جو کرنا تھا کر دیا' اب ادھر کھڑے ہو کر تھانیداروں کی طرح پوچھ گچھ مت کرو بلکہ اپنی جان بچانے کی فکر کرو۔ کپڑے پہنو اور فوراً یہاں سے بھاگ جاؤ۔ جدھر منہ اٹھے چلے جاؤ لیکن یہاں مت ٹھہرو۔"

پھر اس نے خوفزدہ سی نظروں سے ان دونوں افراد کی طرف دیکھا اور تقریباً رو دینے والی آواز میں بولا۔ "دلبر خان کو سارے واقعے کی خبر مل چکی ہو گی اور وہ یہاں پہنچنے ہی والا ہو گا۔ خدا کے لیے تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔"

"اور تمہیں اس کے ہاتھوں مرنے کے لیے چھوڑ جاؤں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ارے بابا! ہم کو اگر اس کے ہاتھوں سے مرنا ہو گا تو تم کیا ہمیں بچا لو گے؟" وہ پریشانی اور بیزاری کے عالم میں تقریباً چلّا اٹھا پھر اس نے مسکین علی اور محبت علی کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر تم نے ان دونوں کو مار لیا ہے تو یہ مت سمجھنا کہ تم دلبر خان کو بھی مار لو گے۔"

"کیا وہ بہت طاقتور ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"بات طاقت کی نہیں۔ طاقت میں تو شاید وہ محبت علی سے کم ہی ہو گا۔" اس نے دراز قد نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ "لیکن وہ سائیں مراد کا کمدار ہے' یہاں کا بادشاہ ہے۔ ہم تو اس کے سامنے سر اٹھا کر بات بھی نہیں کر سکتے۔ اس کے ساتھ ہر وقت دو کلاشنکوف والے ہوتے ہیں۔ وہ بات بعد میں کرتے ہیں گولی پہلے چلاتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے گولی کے سامنے یہ باڈی واڈی... یہ جان وان کام نہیں آتی۔" اس نے میرے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"معلوم ہے تو پھر یہاں کھڑے کیا کر رہے ہو؟ جاؤ... بھاگ جاؤ۔ جان بچانے کی فکر کرو۔ ادھر کھڑے ہو کر باتیں مت بناؤ۔" اس نے بے اختیار ماتھے پر ہاتھ مارا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی چیخ نکل گئی کیوں کہ اس کا ہاتھ گومڑ پر پڑ گیا تھا۔

"میں پیدل کہاں تک بھاگوں گا... اور کتنا بھاگوں گا۔" میں نے مصنوعی اداسی سے کہا۔ "میری جیب میں تو کوئی پیسہ بھی نہیں ہے۔"

"ارے بابا... جو سو دو سو روپیہ لینا ہے مجھ سے لے جاؤ۔ جتنی تباہی مقدر میں لکھی ہے وہ تو اب برداشت کرنی ہے۔" وہ بیزاری سے بولا۔ بھتے کے سلسلے میں جن نوٹوں کا لین دین ہو رہا تھا وہ فرش پر بکھرے پڑے تھے۔ اس نے ان میں سے ایک پچاس کا اور کچھ دس دس کے نوٹ اٹھا کر میری طرف بڑھائے۔

میں نوٹ لینے کے بجائے جھک کر وہ کلاشنکوف اٹھانے لگا جو مسکین علی کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ کلاشنکوف اس کے نیچے سے کھینچ کر میں نے اس کا میگزین نکال لیا۔ چھپر کے باہر ایک خاصا بڑا گڑھا کھُدا ہوا تھا جو گٹر کا کام دیتا تھا۔ چھپر میں سے ایک نالی بھی اس میں جا رہی تھی۔ میگزین میں نے اس میں پھینک دیا۔

دینو نے گویا مجھے مزید سمجھانے کی کوشش کی۔ "میں تو دلبر خان کے پیروں میں گر کر... اس کی منت سماجت کر کے... خدا رسول کا واسطہ دے کر شاید اپنی جان بچا لوں لیکن تمہاری جان بچنا مشکل ہے' اسی لیے میں کہہ رہا ہوں تم یہاں سے نکل جاؤ۔ تم نے میری ہمدردی میں یہ سب کیا ہے۔ میں تمہیں مرتے نہیں دیکھ سکتا۔"

اسی دوران دراز قد نوجوان جس کا نام دینو نے محبت علی بتایا تھا' کسمسایا پھر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر وہ سر جھٹکتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے حواس تھوڑی ہی دیر کے لیے مختل ہوئے تھے۔ وہ میرے اندازے سے کم وقت میں ہوش میں آ گیا تھا۔ میں چوکنا ہو گیا۔

لیکن محبت علی نے اپنی نفرت کو قابو میں رکھا اور مجھ پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس دوران اس کے حواس کام کرتے رہے ہوں۔ وہ میری اور دینو کی گفتگو بھی سنتا رہا ہو' سمجھتا رہا ہو۔ تاہم اس وقت اس کا چہرہ تاثرات سے عاری اور پتھرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔

اس نے جھک کر مسکین علی کو کندھے پر اٹھایا' دوسرے ہاتھ میں بغیر میگزین کی کلاشنکوف پکڑی اور باہر چلا گیا۔ اس کی چال غیر متوازن تھی لیکن وہ گرا نہیں۔ دینو ہاتھ جوڑتے ہوئے اس کے پیچھے لپکا اور فریادی سے انداز میں بولا۔ "سائیں محبت علی...! میں آپ سے معافی مانگتا ہوں... آپ کے پاؤں پڑتا ہوں... اس آدمی کو میں نے نہیں بولا تھا کہ یہ آپ سے لڑے یا بدتمیزی کرے۔ اس نے جو کچھ کیا ہے اپنی مرضی سے کیا ہے۔ میں اس کی طرف سے بھی معافی مانگتا ہوں سائیں... اور اپنی طرف سے بھی۔ آپ کو اللہ سائیں کا واسطہ... مجھ کو معاف کر دیں۔"

اس کی فریاد جاری رہی لیکن محبت علی گویا اس کی آواز سن ہی نہیں رہا تھا۔ ریستوران کی چارپائیوں اور بینچوں سے ذرا ہٹ کر' درختوں کی چھاؤں تلے ایک صاف ستھرا' چمکتا ہوا رنگ برنگا سا تانگا کھڑا تھا۔ اس میں جُتا ہوا گھوڑا خوب صحت مند تھا اور وہ بھی گویا چمک رہا تھا۔

محبت علی نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو تانگے میں ڈالا اور اس میں سوار ہو کر خود ہی چلاتا ہوا اسے گھما کر ایک گلی کی طرف لے گیا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

دینو میری بنائی ہوئی ادھوری دیوار کے قریب سے میری طرف پلٹا۔ اب تو اس کا چہرہ خوف سے بالکل ہی بگڑ کر رہ گیا تھا۔ وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔ "محبت خان کے اس طرح جانے کا مطلب میری موت ہے... اور تمہاری بھی۔ وہ کچھ بول لیتا... اپنا غصہ نکال لیتا... بے شک مجھے مار بھی لیتا تو اچھا تھا لیکن وہ جس طرح خاموشی

سے گیا ہے وہ بہت بری نشانی ہے۔"

وہ ایک بار پھر نوٹ میرے ہاتھ میں تھمانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "تو بھائی! یہ لے لو... اور خدا کے لیے اب یہاں سے چلے جاؤ۔ تم کیوں میری جان کو آ گئے ہو۔"

"نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں ہے۔" میں نے نوٹ لیے بغیر ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اگر میں تمہیں نہ بچاتا تو وہ تمہارا ملیدہ بنا دیتے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے..." وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم صرف بیچ بچاؤ بھی تو کرا سکتے تھے۔ انہیں مارنا کیا ضروری تھا؟"

"اگر میں صرف بیچ بچاؤ کراتا تو وہ مجھے بھی مارتے۔ شاید تمہیں چھوڑ کر وہ مجھے فٹ بال بنا لیتے۔" میں نے کہا۔ "بہرحال... میں جا رہا ہوں... اور یہ پیسے بھی تم اپنے پاس ہی رکھو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں۔ جب میں بغیر پیسے کے یہاں تک آن پہنچا تو آگے بھی کہیں پہنچ ہی جاؤں گا۔"

میں چھپر کے پچھلے حصے کی طرف بڑھا جہاں ریستوران کے اکلوتے ملازم سومر کا ایک ٹرنک' بستر اور ضرورت کی چند دوسری چھوٹی موٹی چیزیں رکھی رہتی تھیں۔ سومر کا کوئی گھر نہیں تھا۔ وہ چوبیس گھنٹے چھپر ریستوران میں رہتا تھا۔ یہ چند چیزیں ہی اس کا کُل اثاثہ تھیں۔

"اثاثے" کے معاملے میں سردست میں اس سے بھی گیا گزرا تھا۔ میرا کُل اثاثہ تو بس کپڑوں کا ایک جوڑا تھا جو اَب صاف ستھری حالت میں اس کے ٹرنک پر ہی رکھا رہتا تھا۔ کسی اور چیز کی ضرورت پڑتی تو وہ میں سومر ہی کی استعمال کرتا تھا۔

میں نے ٹرنک پر سے اپنی شلوار قمیص اٹھائی تو دینو میرے قریب آ گیا اور بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "دل میں ناراضگی لے کر مت جاؤ۔ یہ مت سمجھو کہ میں تمہارا احسان مند نہیں ہوں لیکن میں کیا کروں؟ غریب آدمی ہر طرح سے مجبور ہوتا ہے۔ تمہارا احسان مانتا ہوں تو اپنی جان پر بنتی ہے۔ اگر دوسروں کے سامنے یہ کہتا ہوں کہ تم نے جو کچھ کیا بہت اچھا کیا' تو خود میرے ساتھ بہت برا ہو گا۔"

"اچھا تو شاید تمہارے ساتھ اب بھی نہ ہو لیکن میں تمہیں آزمائش میں نہیں ڈالوں گا۔" میں نے کہا۔ "تمہارے سلوک پر مجھے کوئی شکایت نہیں کیوں کہ تمہارے دل کا حال مجھے معلوم ہے۔ جس نظام میں تم لوگ زندگی گزار رہے ہو اس میں ظاہر ہے' تمہارا حال یہی رہے گا۔ مجھے تم سے کوئی گِلہ نہیں۔ تمہارا اس میں کوئی قصور نہیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے حالات بدل دے۔"

"اگر تمہیں مجھ سے کوئی گِلہ نہیں ہے تو یہ پیسے رکھ لو بلکہ یہ سارے پیسے جو میں محبت علی کو بھتے کے طور پر دے رہا تھا' تم لے جاؤ۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ میں کہہ دوں گا کہ تم ان سے بھی بڑے بدمعاش تھے' سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔" وہ تیزی سے بولا۔

"کوئی تمہاری کہانی پر یقین نہیں کرے گا۔ میں تمہاری مصیبت کو بڑھانا نہیں چاہتا۔ ویسے بھی میں نے زندگی میں کبھی کسی سے اس طرح رقم نہیں لی۔ میرا دل نہیں مان رہا۔ ایسی رقم لینے سے بہتر ہے' میں خالی ہاتھ ہی رہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ کوئی خیرات یا بھتہ تو نہیں ہے۔" دینو مجروح سے لہجے میں بولا۔ "اس سے زیادہ کا تو تم نے میرے لیے کام کر دیا ہے۔ میرا ارادہ تو ویسے بھی تمہیں مزدوری دینے کا تھا لیکن میں نے تمہیں آزمانے کے لیے صرف تین وقت کی روٹی کا وعدہ کر کے کام پر لگایا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ تم کام چور یا مُفت خورے تو نہیں ہو لیکن تم تو جن نکلے۔ تم نے چار آدمیوں کا کام کیا ہے۔ اس رقم کو اپنی آدھی مزدوری سمجھ کر لے جاؤ۔"

"اس کام کو میری طرف سے تحفہ سمجھنا۔ اگر کبھی تمہارے حالات بدل جائیں' تمہارا یہ ریستوران ترقی کر جائے تو کبھی کبھار یاد کر لیا کرنا کہ ایک پردیسی آیا تھا جو یہاں تمہارے چھپر ہوٹل کی پہلی چاردیواری بنا کر گیا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

میں ابھی لباس تبدیل نہیں کر پایا تھا کہ آٹھ دس آدمیوں کی ایک ٹولی چھپر کی طرف آتی دکھائی دی۔ ان میں مختلف عمروں اور مختلف حُلیوں کے لوگ تھے۔ وہ خاصے جوش میں دکھائی دیتے تھے۔ وہ چھوٹا موٹا سا ایک جلوس تھا جو چھپر کی طرف چلا آ رہا تھا۔

میں بری طرح چونکا۔ شلوار قمیص میرے ہاتھوں ہی میں رہ گئی۔ میرے اعصاب ایک بار پھر تن گئے لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ وہ دلبر خان کے آدمی نہیں ہو سکتے تھے اور نہ ہی خود دلبر خان ان میں شامل تھا۔

وہ جوش و خروش میں ضرور تھے مگر پھر بھی ان کی شخصیتوں میں ایک بے عنوان سی مسکینی کی جھلک تھی جو عموماً کچلے اور پسے ہوئے لوگوں کے وجود کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ ان کے حُلیے کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ ان میں سے دو تین کو بہ مشکل صرف سفید پوش کہا جا سکتا تھا' سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ دلبر خان کے آدمی نہیں ہو سکتے تھے۔

میں نے نیچی آواز میں دینو سے پوچھا۔ "یہ کون لوگ ہیں؟"

وہ آنکھیں سکیڑے ان لوگوں کو آتے دیکھ رہا تھا۔ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ "یہ تو کیٹی کے دکاندار ہیں... لیکن یہ یہاں کیوں آ رہے ہیں؟" وہ لوگ چھپر کے قریب آ پہنچے۔ ہم دونوں آگے بڑھ کر ادھوری دیوار کے قریب جا کھڑے ہوئے۔ آدھے حصے میں دیوار نہیں تھی۔ گویا چھپر میں آمدورفت کے لیے اب بھی راستہ کھلا ہوا تھا۔ سب نے باری باری دینو سے یوں معانقہ کیا گویا عید کی نماز پڑھ کر عیدگاہ سے نکلے ہوں۔

پھر ایک بھاری بھرکم' ادھیڑ عمر شخص آگے بڑھا جو دوسروں کی نسبت زیادہ سفید پوش تھا۔ وہ گویا ان لوگوں کی قیادت کر رہا تھا۔ وہ

سندھی میں دینو سے مخاطب ہوا۔ "بھئی سنا ہے تمہارے ہاں کوئی شیر جوان آیا ہے جس نے دلبر خان کے آدمیوں کی پٹائی کر دی؟"

"تمہارے خیال میں کیا یہ کوئی بہت اچھا کام ہوا ہے؟" دینو کراہ کر بولا۔ "اس کے جواب میں اب میرا جو حشر ہوگا وہ دنیا دیکھے گی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے دینو بھائی!" ادھیڑ عمر شخص اس کا کندھا تھپک کر بولا۔ "ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تمہیں تو پتا ہے کہ دلبر خان کے چکروں سے ہم کتنا تنگ آ گئے ہیں۔ اب اس نے بھتہ ایک دم ہی دُگنا کر دیا ہے۔ ہمیں تو پیٹ پالنا مشکل ہو رہا ہے۔ ہم کہاں سے دیں اتنے پیسے۔"

دینو اپنی چوٹوں کو سہلاتے ہوئے بولا۔ "جن شہروں یا گوٹھوں میں بھتے لینے والے اور لوگوں سے اپنے غلاموں جیسا سلوک کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں وہ کبھی نہیں پنپتے۔ وہ آہستہ آہستہ ویران ہو جاتے ہیں' اُجڑ جاتے ہیں۔ مجھے لگتا ہے' کیٹی مراد بھی اب ویران ہو جائے گی' اُجڑ جائے گی۔ ظاہر ہے ہم بھتے نہیں دے سکتے اور دلبر خان کے آدمی ہم پر رحم نہیں کر سکتے تو ہمیں آہستہ آہستہ یہاں سے کوچ ہی کرنا ہوگا۔ اب ہمیں یہ جگہ چھوڑ دینے کی تیار کرنی چاہیے۔" اس کے لہجے میں بلا کی دانشمندی بھی تھی اور افسردگی بھی۔

ادھیڑ عمر شخص اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔ "ہر ظلم کی ایک حد ہوتی ہے دینو بھائی! ہماری حالت اب غلاموں سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ دلبر خان اور اس کے آدمی جب' جہاں اور جس کو چاہیں مار مار کر ادھ مرا کر دیتے ہیں۔ ڈیرے پر اٹھا کر لے جاتے ہیں اور وہاں جو کچھ ہوتا ہے اس کو دیکھ کر شاید آسمان بھی کانپ اٹھتا ہو..."

"نہیں کانپتا۔" دینو اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "ورنہ یہاں کوئی ایسا عذاب نازل ہو چکا ہوتا جو ظالموں کو بہا کر لے جاتا اور مظلوموں کو ان سے نجات دلا دیتا لیکن ابھی تک ایسا نہیں ہوا۔"

"ہو جائے گا... ہو جائے گا۔" ادھیڑ عمر نووارد نے دینو کو تسلی دی۔ "تم دیکھنا' جب اوپر والے کی لاٹھی حرکت میں آئے گی تو ایک منٹ میں کایا پلٹ جائے گی۔ جب تک ظلم اور زیادتی پھلتی پھولتی رہتی ہے' وہ بہت طاقتور لگتی ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسے کوئی نہیں روک سکتا لیکن جب اس کے مٹنے کا وقت آتا ہے تو اس کے اپنے ہی آس پاس سے کوئی آندھی سی اٹھتی ہے جو اس کو ریت کے ذرّوں کی طرح اُڑا کر لے جاتی ہے۔ آنکھوں کو یقین نہیں آتا کہ سب کچھ اتنی جلدی ہو گیا۔"

"میرا تو اب اس جگہ سے دل کھٹا ہو گیا ہے بھائی غلام حسین۔" دینو بیزاری سے بولا۔ "اب تو یہاں ظلم بہت بڑھ گیا ہے۔ آپ ذرا اس ماں کی حالت پر غور کریں جس کو پتا ہو کہ اس کے سولہ سترہ سال کے لڑکے کو دلبر خان کے آدمی اٹھا کر ڈیرے لے گئے ہیں اور وہاں تین راتوں اور تین دن سے اس پر وہ تشدد رہا ہے جو پولیس والے بھی نہیں کرتے... آپ سوچیں' اس ماں وہ تین دن اور تین راتیں کیسی گزری ہوں گی؟ اور پھر اس ماں کو بھی پتا ہو کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ آپ سوچیں' اس بے بسی اس کا کیا حال کیا ہوگا؟" کرب سے دینو کی آواز بیٹھ سی گئی۔

ادھیڑ عمر شخص جسے غلام حسین کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا افسردگی سے بولا۔ "میں سمجھ گیا' تم دیدار علی اور اس کی ماں کی بات کر رہے ہو۔ میں اس بات کو بھولا نہیں ہوں۔ مجھے یاد ہے' سترہ سال کا وہ معصوم دیدار علی کنوئیں کے پاس پڑا ملا تھا۔ اس کا جسم زخموں سے چُور تھا اور ان میں مرچیں بھری ہوئی تھیں۔ اس کے جسم کے نازک حصوں کو پتھروں سے کچلا گیا تھا۔ معلوم نہیں کہاں کہاں کیلیں ٹھونکی گئی تھیں' ناخن کھینچے گئے تھے' نسیں کاٹی گئی تھیں' زبان کاٹی گئی تھی' آنکھیں نکالی گئی تھیں۔ پتا نہیں اس بچے نے کس طرح سسک سسک کر جان دی ہو گی..." غلام حسین کی زبان اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ سب لوگوں کے سر افسردگی اور بے بسی سے جھک گئے۔ مجھے اپنے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہوئیں۔

دینو تلخ لہجے میں بولا۔ "اور اس جوشیلے لڑکے کا قصور صرف یہ تھا کہ جب اس کی پیٹھ پر بلاوجہ چابک ماری گئی تو اس نے بھی پلٹ کر دلبر خان کے آدمی کے منہ پر گھونسا مار دیا تھا۔ اب اس کی ماں پاگل ہو چکی ہے۔ کُتے کے ایک پلّے کو سینے سے لگائے پھرتی ہے۔ کوئی اسے کھانے کو کچھ دینے کے لیے بھی اس کے قریب جاتا ہے تو دہشت زدہ ہو کر بھاگتی ہے اور اپنے پلّے کو اپنے سینے کے ساتھ بھینچ کر گڑگڑاتی ہے۔ "نہیں... نہیں... میرے دیدار علی کو مجھ سے مت چھیننا۔ اس کے پھول سے بدن کو مت چھیڑنا... مت کچلنا... اس کے زخموں میں مرچیں مت بھرنا... کیلیں مت ٹھونکنا..." وہ بھوکی پیاسی جنگل میں ماری ماری پھرتی ہے۔ ایک دن وہ بھی اسی طرح مر جائے گی۔"

"میرا دل کہتا ہے' یہ سب کچھ ختم ہونے والا ہے' حالات بدلنے والے ہیں۔" غلام حسین کے لہجے میں عجیب سا یقین تھا۔ "کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ظلم کرنے والوں کی اپنی بغل سے ہی کوئی ہاتھ نکلتا ہے اور ان کی گردن دبوچ لیتا ہے۔"

دینو استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا لیکن اس کی ہنسی گویا ایک درد بھری کراہ میں ڈھل گئی۔ "غلام حسین! مجھے نہیں پتا تھا' تم اپنی دکان پر بیٹھے کپڑا بیچتے بیچتے دن میں خواب بھی دیکھتے رہتے ہو؟"

"مجھے امید کی کرن نظر آئی ہے۔" غلام حسین بولا۔ "ہم تو انتظار کر رہے تھے کہ کوئی ہمارے آگے چلنے والا ملے' ہمارا ساتھ دینے والا ملے تو ہم دلبر خان اور اس کے آدمیوں کے سامنے سینہ

تان کر کھڑے ہوں اور اس سے کھل کر بات کریں کہ آخر یہ ظلم اور زیادتیاں کب تک چلیں گی...."

وہ ذرا خاموش ہوا تو ایک اور اسی جیسا قدرے سفید پوش شخص آگے بڑھ کر بولا۔ "مصیبت یہ ہے کہ یہاں نہ کوئی تھانہ ہے' نہ کچہری ہے۔ ہم اپنی فریاد لے کر جائیں تو کہاں جائیں۔"

دینو تلخ لہجے میں بولا۔ "تھانے کچہری کی بات رہنے دو یار محمد! جہاں تھانے کچہریاں ہیں وہاں کون سا لوگ ظلم سے بچے ہوئے ہیں؟" وہ اس وقت پوری دنیا سے بیزار معلوم ہو رہا تھا۔

"پھر بھی .... دل کو ڈھارس سی تو رہتی ہے۔" یار محمد بولا۔ "یہاں تو وہ بھی نہیں ہے۔ سائیں مراد خان بھی آ کر ہماری کوئی خیر خبر نہیں لیتے۔ بس زبردستی زمینوں کے مالک بنے ہوئے ہیں لیکن آ کر کبھی یہ نہیں دیکھتے کہ ہم یہاں کس حال میں رہ رہے ہیں اور ہمیں کیا کیا مصیبتیں بھگتنی پڑ رہی ہیں۔ وہ اگر آتے بھی ہیں تو بس دلبر خان کی حویلی پر ایک آدھ دن رہ کر' حساب کتاب کر کے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں تو ان کی صورت دیکھنی بھی نصیب نہیں ہوتی۔ دوسری کیٹیوں میں حالات پھر بھی کچھ بہتر ہیں۔ سختی وہاں بھی ہوتی ہے لیکن اتنا ظلم نہیں ہوتا۔ وڈیرے لوگ اپنی رعایا کی خیر خبر رکھتے ہیں۔"

"وہ سائیں مراد جتنے بڑے وڈیرے نہیں ہیں نا۔" دینو کے لہجے میں بدستور تلخی تھی۔

غلام حسین بولا۔ "خیر... اس بحث کو چھوڑو۔ فی الحال تو ہم اس بات کا فیصلہ کر کے آئے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے اب اس کے جواب میں ہم تمہارے ساتھ مزید کوئی زیادتی نہیں ہونے دیں گے۔ ہم اکٹھے ہو کر اور ایک زبان ہو کر دلبر خان اور اس کے آدمیوں سے بات کریں گے اور اسے ہماری بات سننی پڑے گی۔ ہم آج پہلی بار متحد ہونے کی کوشش کر رہے ہیں اور اس سے ضرور فرق پڑے گا۔"

دینو ہنسنے لگا۔ یہ عجیب ہنسی تھی۔ شاید وہ ہنسنے کے انداز میں رو رہا تھا۔ وہ بولا۔ "ہاں۔ فرق تو ضرور پڑے گا۔ پہلے سب کو الگ الگ مار پڑتی تھی' آج سب کو اکٹھی پڑے گی۔"

"یہی سوچ کر ہم نے آج تک اکٹھے ہو کر بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔" غلام حسین بولا۔ "اسی لیے ان کا حوصلہ بڑھتا جا رہا ہے' دن گزرنے کے ساتھ ساتھ ہم پر ظلم بڑھتا جا رہا ہے۔ تمہیں یاد ہوگا' کسی زمانے میں اس علاقے کی زمینیں آباد کرنے کے لیے ہم کو منت خوشامد کر کے یہاں لایا گیا تھا۔ سیلاب کے ڈر سے کوئی ادھر کا رخ نہیں کرتا تھا۔ ہمارے بزرگوں' بھائیوں اور رشتے داروں نے یہ علاقہ آباد کیا ہے۔ پہلے ہم سے محبت کی جاتی تھی' ہمارا خیال رکھا جاتا تھا لیکن اب انہیں احساس ہو گیا ہے کہ ہماری جڑیں یہاں گہری ہو گئی ہیں۔ ہم کہیں جا نہیں سکتے تو مہربانیاں کم ہوتے ہوتے آہستہ آہستہ ظلم میں بدل گئی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں اگر ہم سب کیٹی والے متحد ہو جائیں تو دلبر خان کو اپنا رویّہ بدلنا پڑے گا اور ہماری کچھ خیر خبر سائیں مراد تک بھی پہنچے گی جنہوں نے ہمیں ان لوگوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہے۔"

دینو گویا اس کی سادگی پر ترس کھاتے ہوئے بولا۔ "تمہارے پاس کتنی کلاشنکوفیں ہیں؟ لڑائی جھگڑا اور توڑ پھوڑ' ظلم زیادتی کرنے والے کتنے ہٹے کٹے بدمعاش ہیں؟ کتنی دولت ہے؟ ضرورت پڑنے پر کتنے ڈاکو' قاتل' خونی اور بدمعاش تمہاری مدد کو پہنچ سکتے ہیں؟ تم لوگوں کو سائیں مراد کی کتنی سرپرستی حاصل ہے؟ آخر تم لوگ کس بنیاد پر دلبر خان اور اس کے ساتھیوں کے مقابلے میں کھڑے ہونے جا رہے ہو؟"

"یار دینو! تم تو بہت ہی بے وقوف آدمی ہو۔" غلام حسین بولا۔ "ہم کوئی ان سے مقابلہ کرنے کی بات تھوڑا ہی کر رہے ہیں۔ ہم تو مل جل کر انہیں سمجھانے کی بات کر رہے ہیں۔ ہم انہیں صرف یہ احساس دلانے کی کوشش کریں گے کہ ہم ان کی جائز و ناجائز زیادہ تر باتیں آج تک مانتے آ رہے ہیں لیکن اب معاملہ حد سے بڑھ گیا ہے۔ اب انہیں رک جانا چاہیے ورنہ...."

"ورنہ کیا؟" دینو نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

"ورنہ اب ہم ان کی کوئی بات نہیں مانیں گے۔ بھتہ جتنا ہم دے سکتے ہیں اتنا ہی دیں گے اور ظلم و زیادتی کا جواب ہم سب مل جُل کر دیں گے بلکہ ہم انہیں یہ بتانے کی کوشش کریں گے کہ اب پوری کیٹی کے لوگ ان سے تنگ آ چکے ہیں اور اگر انہوں نے اپنا رویّہ نہیں بدلا تو سب ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔" غلام حسین نے جواب دیا۔

"تم اپنے ساتھ کیٹی کے باقی لوگوں کو بھی مرواؤ گے۔" دینو بولا۔ "ہم سب کا تو یہیں موقعے پر ہی جو حشر ہوگا سو ہوگا لیکن میری ایک بات لکھ لو کہ آج رات ہی ڈاکو کیٹی پر دھاوا بول دیں گے اور لوگوں کا جو حشر کریں گے اس کے بعد وہ ڈاکوؤں کو نہیں' ہمیں بددعائیں دیں گے۔"

"ایسا نہیں ہوگا' تم دیکھ لینا۔ آج تک ہوتا یہی آیا ہے کہ ایک کو مار پڑتی ہے تو دوسرا کھسک لیتا ہے۔ آج ہم کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہوں گے تو ہماری حیثیت ایک دیوار کی ہو جائے گی۔ اس دیوار کے سامنے انہیں رکنا ہی پڑے گا۔" یہ بات اس شخص نے کہی تھی جسے یار محمد کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا۔

"اچھا... خیر..." دینو ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "گھوڑا بھی یہیں ہے اور میدان بھی یہیں۔ مجھے یقین ہے دلبر خان اور اس کے آدمی جیپ اور بگھی وغیرہ میں بھر کر یہاں پہنچنے والے ہی ہوں گے۔ جو کچھ ہونا ہوگا تھوڑی دیر میں ہو جائے گا۔"

ایک اور جوان سا شخص بولا۔ "میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آتی کہ دلبر خان کے اشاروں پر چلنے والے... پندرہ بیس ہٹے کٹے اور شکل سے ہی خطرناک بدمعاش نظر آنے والے ان آدمیوں کے

خرچے اور ٹھاٹ باٹ کہاں سے چلتے ہیں۔ یہ لوگ کوئی کام نہیں کرتے' کوئی کاروبار نہیں کرتے۔ نہ زمینوں پر کام کرتے ہیں' نہ دکانداری کرتے ہیں۔ دن رات ڈیرے پر پڑے اینڈتے رہتے ہیں۔ ہر عیاشی کرتے ہیں۔ اچھے سے اچھا کھاتے پہنتے ہیں۔ آخر ان لوگوں کے پاس اتنا روپیہ کہاں سے آتا ہے؟"

دینو استہزائیہ انداز میں ہنکارا بھر کر بولا۔ "تو جی... یہ بھولا بادشاہ ابھی اسی سوچ میں الجھا ہوا ہے۔ بھائی ان کو دلبر خان کے ذریعے سائیں مراد کی طرف سے بھی وظیفہ ملتا ہے۔ زمینوں کے حساب میں بھی کچھ ہیرا پھیریاں ہوتی ہیں جس میں سب کا حصہ ہوتا ہے۔ بھتوں سے حاصل ہونے والی رقم کے حصے بخرے ہوتے ہیں۔ ڈاکوؤں سے بھی انہیں کچھ نہ کچھ ملتا ہے بلکہ مجھے تو یہ خود بھی ڈاکو ہی لگتے ہیں۔ شاید ضرورت کے وقت یہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور بھی معلوم نہیں کیا کیا ناجائز دھندے ہوں گے۔ بہت لمبے چوڑے گٹھ جوڑ ہیں جو نہ جانے کہاں سے کہاں تک پھیلے ہوئے ہیں۔"

میں دل میں ایک عجیب سے تاسف کی لہر محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ چاہے امریکا اور یورپ کے چمکتے دمکتے شہر تھے یا ایشیا کی بے ہنگم بستیاں' ہمارے اپنے رنگا رنگ شہر تھے یا دور افتادہ اور گمنام گاؤں' دیہات۔ ہر جگہ چھوٹی یا بڑی' کسی نہ کسی قسم کی مافیا ضرور موجود تھی۔ ہر جگہ دوسروں کا خون چوس کر اور ناجائز دھندوں کے جال پھیلا کر پلنے والے چھوٹے یا بڑے گروہ ضرور موجود تھے' دن بہ دن یہ سلسلہ زیادہ ہی پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر جگہ کسی نہ کسی قسم کی مافیا اپنی پنجے گاڑ رہی تھی۔ اب تو وہ چھوٹی چھوٹی معصوم بستیاں اور آبادیاں بھی اس کی لپیٹ میں آتی جا رہی تھیں جنھوں نے کبھی منظم قسم کے شر' فساد اور بد معاشی کی جھلک بھی نہیں دیکھی تھی اور وہاں رہنے والوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان پر ایسے بھی دن آئیں گے۔ معلوم نہیں یہ چیزیں کس قسم کی ترقی کے ساتھ آ رہی تھیں؟ سائنس کی ترقی کے ساتھ؟ تمدن کی ترقی کے ساتھ یا سیاست کی ترقی کے ساتھ؟

وجوہات خواہ کچھ بھی رہی ہوں لیکن زیادہ افسوسناک بات یہی تھی کہ کوئی اس سیلاب کو روکنے میں دلچسپی لیتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ باقی دنیا تو اجتماعی خودکشی کی طرف جا ہی رہی تھی لیکن اپنے معاشرے کا انجام بھی کچھ اچھا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"اچھا خیر... ان باتوں کو چھوڑو۔" میں یار محمد کی آواز سن کر چونکا' وہ دینو سے مخاطب تھا۔ "تم ہمیں اس جوان سے تو ملواؤ جس نے دلبر خان کے آدمیوں کی ٹھکائی لگائی۔ اسی کے بارے میں تو سن کر ہمیں اکٹھے ہونے اور یہاں آنے کی ہمت ہوئی۔ ہم نے سوچا' جب کوئی اکیلا پردیسی اتنی ہمت دکھا سکتا ہے تو ہم سب تعداد میں اتنے زیادہ ہوتے ہوئے اور یہاں کے پرانے باشندے ہوتے ہوئے بھی کیوں مار کھاتے رہتے ہیں اور اس مصیبت کو روکنے کے لیے کیوں کچھ نہیں کرتے جو دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ ذرا اس کو بلاؤ تو سہی۔ کدھر ہے وہ؟ اگر وہ ہمارے ساتھ کھڑا ہو گا تو ہم اور زیادہ ہمت کے ساتھ دلبر اور اس کے آدمیوں سے بات کریں گے؟"

میں ان لوگوں کو آتے دیکھ کر دینو کا اشارہ پا کر مٹی کے کاؤنٹر کے پیچھے چوبی تختے پر جا بیٹھا تھا۔ میں انہیں دیکھ رہا تھا لیکن انہیں شاید صرف آنکھوں تک میرا چہرہ نظر آ رہا تھا' اس لیے انہوں نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ میں ابھی شلوار قمیص بھی نہیں پہن سکا تھا۔ مختصر دھوتی کو لنگوٹ کی صورت میں ہی جسم پر کسے ہوئے تھا۔

"میں اس کو یہاں سے بھگا رہا تھا۔" دینو بولا۔ "میں ایک بے گناہ کا خون اپنے سر نہیں لے سکتا۔ میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ اس کو جانے دیں اور اپنے جھگڑے خود ہی طے کریں۔ ہم دلبر خان اور اس کے آدمیوں کے سامنے ہاتھ باندھ لیں گے' معافی مانگ لیں گے۔ ان کے پاؤں پکڑ لیں گے' شاید وہ ہمیں معاف کر دیں لیکن اس جوان کا یہاں رہنا ہمارے لیے زیادہ مصیبت کھڑی کر دے گا۔ ایک تو ان لوگوں کو اسے دیکھ کر غصہ زیادہ آ جائے گا' دوسرے یہ بے گناہ مارا جائے گا' بچے گا نہیں... اور ایسے شیر جیسے جوان کی موت کا مجھے بہت افسوس ہو گا۔ میں اپنے آپ کو زندگی بھر معاف نہیں کر سکوں گا۔"

اپنے لیے 'شیر جیسے جوان' کے الفاظ سن کر میں مسکرا دیا۔ یہ دینو کی ذرہ نوازی تھی ورنہ میں تو اس وقت اپنے آپ کو اول درجے کا گدھا محسوس کر رہا تھا۔ میری خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اپنے آپ کو کس چکر میں الجھا لیا تھا۔ ان لوگوں کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سلسلہ میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں اندیشوں کے جال سے نکل آیا۔ میرا یہ یقین تو ہمیشہ ہی سے پختہ چلا آ رہا تھا کہ زندگی اور موت صرف خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن گزشتہ چند دنوں میں یہ یقین پختہ تر ہو گیا تھا۔ اپنے آپ کو جان بوجھ کر تو موت کے منہ میں پھینکنا کوئی دانشمندی نہیں تھی۔ حفاظت کی تدبیر کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن موت کے خوف سے تھر تھر کانپتے رہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے اپنے آپ کو تن بہ تقدیر تو چھوڑا ہوا ہی تھا' ایک بار پھر میں نے ہر خوف کو ذہن سے جھٹک دیا۔

غلام حسین' دینو سے مخاطب ہوا۔ "یار! یہ تم بڑی بڑی باتیں چھوڑو اور اس جوان کو بلاؤ۔" یہ کہتے ہوئے اس نے میری تلاش میں ادھر اُدھر نظر دوڑائی پھر اس کی نظر مجھ سے ملی۔ اس کے ساتھ ہی غالباً سبھی نے مجھے دیکھ لیا لیکن صرف آنکھوں کی حد تک۔

دینو نے شکست خوردہ سے انداز میں آواز لگائی۔ "آ جاؤ بھائی افضل خان۔" میں نے اسے اپنا نام صرف افضل بتایا تھا۔ "خان" اس نے خود ہی لگا لیا تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے افضل خان ہی کہہ کر بلاتا تھا۔

میں نے کاؤنٹر کے عقب میں ہی رہتے ہوئے شلوار قمیص "زیب تن" کی۔ یوں اپنے حلیے کو حتی الامکان معززانہ بنایا اور ان کے سامنے چلا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ سب بالکل مبہوت سے میری طرف دیکھ رہے تھے حالانکہ میں اس وقت خود کو خاصا چُغد محسوس کر رہا تھا۔ میرے خیال میں تو میری حالت تباہ ہی تھی۔ میری قمیص کے بٹن ٹوٹے ہوئے تھے' گریبان لوفروں کی طرح کھلا تھا۔

چھپر ریستوران میں ایک عجیب مرعوبیت زدہ سا سکوت چھا گیا تھا جو مجھے بہت ہی گراں گزر رہا تھا۔ بالآخر یار محمد میرا بازو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "دوست! دینو ٹھیک کہتا تھا۔ تم واقعی شیر جوان ہو۔"

دینو ایک بار پھر اپنی چوٹیں سہلاتا ہوا بولا۔ "لیکن کلاشنکوف کے سامنے شیر اور بکری سب برابر ہیں۔ ایک ہی برسٹ میں دونوں کا کام تمام ہو سکتا ہے۔ ابھی جب دلبر خان اور اس کے آدمی کلاشنکوفیں لیے آئیں گے تو اس شیر کی جوانی ایک منٹ میں اس مٹی میں ملتی نظر آئے گی..." اس نے چھپر ریستوران کے فرش کی طرف اشارہ کیا۔ "اگر ہم زندہ رہے تب بھی شاید اس کے جنازے تک کو کاندھا نہ دے سکیں... اور کیا خبر' جنازہ اٹھے بھی یا نہیں۔ ایسے گستاخ دشمن کی لاش تو وہ جنگل کے قریب لے جا کر پھینک دیتے ہیں جہاں اسے چیل کوّے' گدھ اور گیدڑ کھا جاتے ہیں' ہڈیاں تک نہیں چھوڑتے۔"

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "اس غریب کے پاس تو چاقو تک نہیں ہے۔"

غلام حسین بولا۔ "لیکن اس کے پاس حوصلہ ہے اور حوصلہ اسلحے سے زیادہ طاقتور ہے۔"

میں نے اپنی تعریفوں پر انکساری سے سر جھکا لیا۔ آخر کسر نفسی بھی کوئی چیز تھی لیکن دینو بڑا ہی حقیقت پسند یا پھر حالات کا کچھ زیادہ ہی ستایا ہوا اور دل جلا انسان تھا۔ اپنی اسی درد بھری سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "کیوں اس بے چارے کو بانس پر چڑھا کر مروانے کی تیاری کر رہے ہو۔ بے چارہ غریب پردیسی ہے۔"

پھر وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ہماری بک بک میں بڑا ٹائم ضائع ہو گیا ہے لیکن اب بھی دیر نہیں ہوئی ہے' تم چاہو تو بھاگ جاؤ۔"

میں نے دکانداروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ اب زیادتی کے خلاف دیوار بن کر کھڑے ہونے کے لیے آئے ہیں تو میرا دل نہیں چاہ رہا کہ انہیں چھوڑ کر بھاگ جاؤں۔ میں ان کا... اور تمہارا... میرا مطلب ہے تم سب کا ساتھ دوں گا۔"

"شاباش نوجوان۔" غلام حسین نے آگے بڑھ کر مجھے گلے لگا لیا۔ "تمہارا ذکر سن کر ہی ہمارا تو حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اب تمہیں دیکھا ہے تو ہم بھی اپنے آپ کو شیر محسوس کر رہے ہیں۔ اب ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ آج ہم دلبر خان کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہوں گے اور بات کریں گے۔ آج کے بعد وہ اپنا رویّہ ٹھیک کرے گا' ظلم اور زیادتی بند کرے گا یا پھر ہم بھی اس کے خلاف جو کچھ کر سکتے ہیں وہ کریں گے اور سائیں مراد کے پاس بھی اپنی فریاد لے کر جائیں گے۔ ہم ان سے صاف کہہ دیں گے کہ اس طرح کیٹی کا نظام نہیں چل سکتا۔ ہم بغاوت کر دیں گے یا کہیں اور کوچ کر جائیں گے۔ کہیں نہ کہیں تو اللہ روزی لگا ہی دے گا۔"

"میرا خیال ہے اس کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ آپ لوگ حوصلہ کریں گے تو مجھے امید ہے جلدی نہ سہی' کچھ دیر سے سہی' لیکن سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔"

ابھی میں انہیں یہ نوید سنا ہی رہا تھا کہ بہت دور ایک سمت میں غبار بلند ہوتا دکھائی دیا۔ دینو کپکپاتی ہوئی آواز میں بولا۔ "وہ لوگ آ رہے ہیں۔"

میں نے دیکھا' سب کی رنگت متغیّر ہو گئی اور آنکھوں میں خوف اُتر آیا۔ سب سے زیادہ حالت دینو کی خراب تھی۔ وہ مجھے دھکیلتے ہوئے بولا۔ "جاؤ... جلدی سے جا کر میرے مکان میں چھپ جاؤ۔ جب تک ہم تمہیں مدد کے لیے نہ بلائیں' تم مت آنا۔ تمہارے یہاں ہونے سے بات زیادہ خراب ہو گی۔ ہم پہلے منت خوشامد کر کے' ان کے پاؤں پکڑ کر انہیں سمجھانے کی کوشش کریں گے..."

وہ اپنے مؤقف پر قائم تھا اور تیزی سے بات کرتے ہوئے مجھے دھکیلتا بھی جا رہا تھا۔ "خدا کے لیے چلے جاؤ۔ تم ان کے سامنے کچھ نہیں کر سکو گے... تمہارے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

مجھے اب افسوس ہو رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ کچھ زیادہ ہی بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مسکین علی کی کلاشنکوف سے صرف میگزین نکال کر گن واپس پھینک دی تھی جسے محبت علی

جاتے وقت اٹھا کر لے گیا تھا۔ مجھے کم از کم وہ ایک کلاشنکوف تو رکھ لینی چاہیے تھی۔

دینو کا گھر سامنے ہی چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اسے بارہا وہاں آتے جاتے دیکھا تھا لیکن گزشتہ چار دنوں میں مجھے ایک مرتبہ بھی اندر جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ دینو تیزی سے بولا۔

"دروازے کے پاس ہی سیڑھیاں ہیں۔ اوپر چھت پر جا کر چھپ جانا۔ اگر وہاں سے بھاگنا پڑا تو آسانی رہے گی۔ دوسرے مکانوں کی چھتوں پر سے پھلانگتے ہوئے اوپر ہی اوپر کسی طرف نکل جانا اور چھلانگ لگا کر بھاگ جانا۔ اپنی جان کی فکر کرنا۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس شخص کے دل میں یہ خواہش شدید تھی کہ مجھے دلبر خان اور اس کے آدمیوں کے ہاتھوں موت نہ آئے۔ وہ مجھے چھپر کے پچھلے حصے کی طرف دھکیل رہا تھا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ میں پچھلی طرف سے نکل کر بھاگوں اور تھوڑا سا چکر کاٹ کر اس کے مکان تک پہنچوں تاکہ دور سے آتے ہوئے لوگوں کو یہ اندازہ نہ ہو سکے کہ کوئی یہاں سے نکل کر بھاگا تھا۔

دوسرے لوگ کچھ نہ بولے۔ سب کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کچھ دیر پہلے وہ جو تقریریں کر رہے تھے وہ سب ان کے ذہنوں سے محو ہو چکی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ دینو کی ہدایت پر عمل کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا بلکہ شاید کچھ فائدہ ہی ہو جاتا۔ ویسے بھی وہ میرا محسن تھا۔ دل کا بہت اچھا تھا اور جو کچھ بھی وہ کہہ رہا تھا اس کے پیچھے اس کا بے پناہ خلوص بول رہا تھا۔ جب میں اس کے پاس پہنچا تھا تو وہ شخص مجھے بے پناہ روکھا اور بدلحاظ لگا تھا لیکن اب مجھے اس کے انداز سے وہی فکر مندی، وہی تشویش جھلکتی نظر آ رہی تھی جو کسی باپ کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے ہو سکتی ہے۔

میں چھپر کے عقبی حصے میں پڑی بینچ پر چڑھ کر اس مستطیل شگاف سے باہر کود گیا جو میں نے دیوار میں کھڑکی کے لیے چھوڑا تھا۔ چھپر کے عقب سے دوڑتا ہوا میں ایک کنویں کے قریب سے گزر کر ایک چھوٹی اور ٹیڑھی سی گلی عبور کر کے گویا گھوم کر واپس آیا اور دینو کے مکان کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

دروازے کی کوئی کنڈی وغیرہ چڑھی ہوئی نہیں تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا، دینو کی کوئی فیملی تھی یا نہیں۔ میں نے گزشتہ چار دنوں میں دینو کے مکان سے دینو کے علاوہ کسی کو آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔

دروازے سے گھستے ہی میں نے اپنے آپ کو ڈیوڑھی نما ایک حصے میں پایا لیکن ڈیوڑھی کی نسبت یہ جگہ کافی کشادہ تھی۔ ایک طرف ایک بکری اور بھینس بندھی ہوئی تھی۔ کُتَرّ کاٹنے کی ہاتھ کی مشین کھڑی تھی، ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا اور وہیں سے کچی سیڑھیاں اوپر جا رہی تھیں۔

میں نے ڈیوڑھی سے آگے دیکھنے کی زحمت نہیں کی سیڑھیاں چڑھتا چلا گیا۔ وہ ایک نیم پختہ مکان تھا۔ چھت لکڑ بلیوں اور اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ اوپر چھت پر گارے کی تھی۔ چھت پر میں نے اپنے آپ کو تقریباً تین فٹ اونچی منڈیر عقب میں پایا۔ اینٹیں اس ترتیب سے رکھ کر منڈیر بنائی گئی تھ اس میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوکور سوراخ موجود تھے۔

میں اس منڈیر کے عقب میں جا کر بیٹھ گیا۔ یہاں سے میں ریستوران کا منظر صاف دیکھ سکتا تھا۔ دور سے دھول اڑاتے تیزی سے آتے ہوئے لوگ بھی اب مجھے صاف نظر آ رہے ایک جیپ تھی جس میں لوگ گنیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ اس پیچھے ایک بگھی تقریباً جیپ ہی کی رفتار سے دوڑی آ رہی تھی۔ میں بھی لوگ بھرے ہوئے تھے۔ وہ بھی مسلح تھے۔ کسی کے پا تھری ناٹ تھری تھی، کسی کے پاس کلاشنکوف۔ بگھی کے پیچھ آدمی گھوڑوں پر بھی آ رہے تھے۔

ایسا لگتا تھا بنی نوع انسان کے حالات کبھی نہیں بدلے تاریخ ایک ہی تھی۔ کسی گھسے پٹے ریکارڈ کی طرح وہ خود کو دہرا جا رہی تھی، ایک دائرے میں گھومے جا رہی تھی۔ ان لوگو آتے دیکھ کر میرے ذہن میں رومنوں، چنگیزیوں اور تاتاریوں دور کے تصوراتی مناظر گھومنے لگے۔ پرانے زمانوں میں بھی طاقتور اور صاحب اقتدار لوگوں کے نمائندے گھوڑے اور ر دوڑاتے ہوئے آتے تھے اور محکوم اور کمزور لوگوں کی بستی تاراج کرتے چلے جاتے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کے ہاتھ میں تلواریں، نیزے، بھالے اور کوڑے ہوتے تھے جبکہ آج لوگوں کے پاس جیپ اور کلاشنکوفیں تھیں۔ آنے کا انداز وہی چہروں پر غیظ و غضب اور خونخواری وہی تھی۔ صدیاں خواہ کتنی بیت گئی تھیں لیکن نہ انسان بدلا تھا، نہ انسان کے نصیب۔ ہر میں کہانی وہی چلی آ رہی تھی۔

میں نہ جانے کس دور کے اور کس طبقے کے انسان کا نمائ تھا جو شاید دینو کے مکان کی چھت سے نہیں، تاریخ کے جھرو سے جھانک کر یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ وہ آٹھ دس دکاندار کے ساتھ چھپر کے باہر اس طرح کھڑے تھے جیسے کسی شہر باشندے کسی خاص وفد کے استقبال کے لیے کھڑے ہوں۔

فرق صرف یہ تھا کہ وفد کا استقبال کرنے والوں کے چہروں تجسس، مسکراہٹ، مصنوعی اشتیاق یا حقیقی مسرت ہوتی ہے لیکن ان لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، خوف و دہشت پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ وہ گویا کچھ لوگوں کو نہیں، اپنی موت کو سامنے سے آتے دیکھ رہے تھے۔ سب سے زیادہ حالت دینو خراب تھی۔ اس نے تو اگر ادھوری دیوار کا سہارا نہ لیا ہوتا تو پڑتا۔

ان کی تمامتر خوفزدگی اور کمزوریوں کے باوجود ان کی عظم

کردار کا ایک پہلو مجھ پر ضرور واضح ہوا تھا۔ وہ اگر اتنے ہی خوفزدہ تھے تو یہ بھی کر سکتے تھے کہ مجھے بھاگ کر چھپنے کا موقع فراہم کرنے کے بجائے قربانی کا بکرا بنا کر ان لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے اور ہاتھ جوڑ کر کہتے۔ 'سائیں! جو کچھ کیا ہے اس نے کیا ہے۔ ہم تو بالکل بری الذمہ ہیں۔ آپ کے نوکر ہیں، آپ کی رعایا ہیں، آپ کے حکم کے غلام ہیں، آپ کا مجرم حاضر ہے' لیکن انہوں نے ایسا کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے وہاں سے بھگا دیا تھا اور اپنی جان پر عذاب سہنے کے لیے تیار تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا میں ایسے لوگوں کو چھوڑ کر بھاگ سکتا تھا۔

"جیپ، بگھی اور گھوڑے چھپر ریستوران کے قریب آ رکے۔ جیپ کا انجن غرا رہا تھا، گھوڑے ہنہنا رہے تھے اور ان پر سوار لوگوں کے چہرے دیکھ کر کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی پھنکارنے لگیں گے۔

دلبر خان سے کسی کو بھی میرا تعارف کرانے کی ضرورت نہ ہوتی اگر میں وہاں موجود ہوتا اور میرے لیے بھی دلبر خان کو پہچاننا ذرا مشکل نہیں تھا۔ وہ جو اس قسم کے گروہوں کے سرخیل ہوتے ہیں، دور ہی سے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی شان اور ٹھسّا الگ ہی ہوتا ہے۔

وہ بوسکی کی سفید، بے داغ شلوار قمیص اور کلف لگی اونچی پگڑی میں تھا جس کا کچھ حصہ حلقے کی سی صورت میں اس کے سینے پر جھول رہا تھا۔ کندھوں پر اجرک تھی۔ وہ کھلی جیپ میں ایک ہاتھ میں کلاشنکوف اور دوسرے ہاتھ سے جیپ کا ایک آہنی پائپ تھامے ڈرائیور کے برابر والی سیٹ پر بیٹھنے کے بجائے کھڑا تھا۔

بعض لوگوں کی بداعمالیوں کا اثر ان کی شخصیت پر ضرور نظر آنے لگتا ہے۔ وہ خواہ خوش شکل ہوں لیکن شکل سے ہی خبیث دکھائی دیتے ہیں مگر بعض لوگوں پر دستِ قدرت بڑا مہربان رہتا ہے۔ دلبر خان کو بھی قدرت نے اچھی شخصیت سے نوازا تھا۔ وہ کوئی فلمی ولن قسم کی شخصیت ہرگز نہیں تھا۔ کھلتا ہوا رنگ، موٹی موٹی سیاہ آنکھیں، اوپر کو اٹھی ہوئی موٹی موٹی بارعب مونچھیں، دراز قد اور مضبوط کاٹھی۔ عمر بھی زیادہ نہیں تھی۔ پینتیس اور چالیس کے درمیان ہو گی۔ وہ کسی بڑے جاگیردار کا نمائندہ ہونے کے بجائے خود کوئی چھوٹا موٹا جاگیردار دکھائی دے رہا تھا۔

اس کے ساتھ آنے والوں میں محبت علی اور مسکین علی بھی شامل تھے۔ ان کی حالت اب بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن شاید جوشِ انتقام نے انہیں جلدی سنبھلنے میں مدد دی تھی۔ وہ بگھی میں تھے۔ سب لوگ سواریوں سے کود پڑے تھے۔ دلبر خان نے ایک ہی نظر میں چھپر ریستوران کا جائزہ لے لیا تھا۔

اس نے یکدم ہی دینو کو گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔ اگر دینو ذرا بھاری بھرکم نہ ہوتا تو شاید اس کے پاؤں زمین سے اٹھ گئے ہوتے۔

"کدھر ہے وہ؟" دلبر خان گرجا۔ فاصلہ محض چند قدم کا تھا، میں آسانی سے ان کی آواز سن سکتا تھا۔

"وہ تو بھاگ گیا سائیں!" دینو ہاتھ جوڑے کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ خود زیادہ کانپ رہا تھا یا اس کی آواز۔ اس نے حتی الامکان تیزی سے بولنے کی کوشش کی۔ "ہم نے اس کو بہت سمجھایا سائیں!! اس کو جھگڑے سے روکنے کی کوشش کی ... لیکن سائیں! وہ انجان تھا... پردیسی تھا... آپ کو، آپ کے آدمیوں کو نہیں جانتا تھا... گستاخی کر بیٹھا لیکن بعد میں جیسے ہی اس کو پتا چلا کہ اس نے کس کے ساتھ گستاخی کی ہے تو بھاگ گیا۔ فوراً بھاگ گیا۔ میرا تو اس میں کوئی قصور نہیں۔"

"تیرا کوئی قصور نہیں؟" دلبر خان نے اس کا گریبان چھوڑ کر اس کے منہ پر گھونسا رسید کیا اور وہ دور جا گرا۔ اس بے چارے کا بگڑا ہوا چہرہ کچھ اور بگڑ گیا۔ ہونٹ پھٹ گیا اور خون بہہ نکلا۔ وہ کافی ٹھڈے پہلے ہی کھا چکا تھا، اب دلبر خان نے بھی اسے ایک ٹھڈا رسید کیا تو وہ بلبلا اٹھا۔

دلبر خان نے اس کے سینے پر اس طرح پاؤں رکھ لیا جس طرح بعض شکاری شیر کا شکار کرنے کے بعد اس پر پاؤں رکھ کر تصویر کھنچواتے ہیں۔ دلبر خان گرجا۔ "تیرا یہ قصور کم ہے کہ تو نے کیٹی میں ایک اجنبی کی آمد کی ہمیں اطلاع تک نہیں دی اور پھر اس کو کام پر بھی لگا لیا۔ سنا ہے تیرا یہ انٹر کانٹی نینٹل اسی نے بنایا ہے۔" اس نے چھپر کی نامکمل کچی چار دیواری کی طرف اشارہ کیا۔

"سائیں!" دینو زمین پر پڑے پڑے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "وہ بھوکا پیاسا تھا۔۔۔ پردیسی تھا۔ ہم سندھیوں کی روایت ہے 'بھوکے پیاسے' پردیسی اور مسافروں کی مدد کرنا۔ میں اس کی مدد کیے بغیر نہیں رہ سکا۔ میرے خیال میں تو کسی بھی مسلمان کو وہی کرنا چاہیے تھا جو میں نے کیا۔۔۔ لیکن اگر آپ ناراض ہیں تو میں معافی چاہتا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی۔"

"ایسی تیسی تیری روایت کی۔ سالے! مولوی بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ تجھے جو کچھ بھی کرنا تھا ہم سے پوچھ کر کرنا تھا۔ یہ بات بھول گیا تھا کیا؟" دلبر خان نے اسے ایک اور ٹھوکر رسید کی۔

میری رگوں میں لہو کی گردش تیز ہو رہی تھی لیکن مجھے اس صورت حال میں اس طرح مداخلت کرنے کا کوئی طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا جس سے کوئی فائدہ حاصل ہوتا۔ یونہی منہ اٹھا کر بیچ میں کود پڑنے اور مارے جانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ جن لوگوں کے میں کام آنا چاہتا تھا' اس طرح تو انہیں بھی فائدہ نہیں پہنچ سکتا تھا۔ میں اس مکان میں آکر چھپنے کے بجائے چھپر ہی میں کسی طرح چھپنے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید کوئی ایسا موقع مل جاتا جس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں پانسا پلٹنے کی کوشش کرتا لیکن فی الحال تو میں بے بسی سے تماشا دیکھنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا تاہم میں ہر زاویے سے جائزہ لے رہا تھا اور میرے ذہن میں کھد بد جاری تھی۔

دلبر خان کو دینو نے حالانکہ یہی بتایا تھا کہ وہ اجنبی یعنی میں فرار ہو چکا تھا لیکن اس کے آدمی پوری طرح چوکنا نظر آرہے تھے۔ وہ ہر طرف نظر رکھے ہوئے تھے۔ شاید انہیں دینو کی بات کا یقین نہیں تھا اور تھوڑا بہت اندازہ اس بات کا بھی ہو گیا تھا کہ جس نامعلوم شخص نے کلاشنکوف بردار مسکین علی اور محبت علی کی ٹھکائی کر ڈالی تھی' وہ یقیناً کوئی عام آدمی نہیں تھا۔

اچانک دلبر خان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ اس کے اس خفیف سے اشارے کا مطلب اس کے آدمی گویا نہایت تفصیل سے سمجھ گئے۔ ان میں سے پانچ چھ آدمی کلاشنکوفیں لیے چھپر ریستوران کے گرد گھیرا ڈال کر کھڑے ہو گئے اور پانچ چھ آدمیوں نے وہیں پڑی ہوئی وہ تمام چیزیں اٹھالیں جن کی مدد سے میں نے گارا تیار کیا تھا اور کچی اینٹوں کی دیواریں تعمیر کی تھیں۔ کدال' تیشہ' لوہے کی سلاخیں' لکڑی کی بلیاں' جس کو جو بھی ملا وہ اس نے اٹھالیا اور دیواروں پر پل پڑے۔

وہ نو تعمیر شدہ کچی دیواریں تھیں۔ ابھی تو پوری طرح خشک بھی نہیں ہوئی تھیں' تیزی سے ٹوٹتی چلی گئیں۔ ویسے بھی تعمیر کے مقابلے میں تخریب آسان کام ہے۔ چیزیں تعمیر ہونے میں بڑا وقت لگتا ہے لیکن انہیں تباہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگتا۔ یوں بھی کچھ لوگ تعمیر میں اور کچھ تخریب میں زیادہ ماہر ہوتے ہیں۔ چیزیں توڑنے پھوڑنے' جلانے اور تباہ کرنے میں وہ نہ صرف مہارت د

مشاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں بلکہ اس سے لطف اندوز بھی ہوتے ہ
یہ بھی اسی قبیل کے لوگ معلوم ہوتے تھے۔

وہ تمام دکاندار جو کچھ دیر پہلے بڑے جوش و خروش اور ع
اظہار کر رہے تھے کہ وہ اب دلبر خان اور اس کے آدمیوں کو
زیادتی نہیں کرنے دیں گے' کندھے سے کندھا جوڑ کر اس
راستے کی دیوار بن جائیں گے' ان کے سامنے دیواریں گر
تھیں لیکن وہ دم بخود کھڑے تھے۔ دینو کی پٹائی ہوتے بھی انہوں
اسی خاموشی سے دیکھی تھی۔

وہ کندھے سے کندھا ضرور جوڑے کھڑے تھے مگر یک جہتی
مزاحمت کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ وہ درحقیقت خوف کے
ایک دوسرے سے تقریباً چپٹے کھڑے تھے۔ وہ دیوار ضرور بنے
تھے مگر یہ راستہ روکنے والی نہیں بلکہ آڑ فراہم کرنے والی
تھی۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ وہ یقیناً اپنی ۔
تقریریں بھول چکے تھے۔ ان کے چہرے دیکھ کر اب تو مجھے یہ ۔
ہو رہی تھی کہ وہ ابھی تک دُم دبا کر بھاگے کیوں نہیں تھے۔
وحشت کے باعث وہ اپنی جگہ سے حرکت کرنا بھی بھول گئے تھے

دیکھتے ہی دیکھتے دیواریں ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔ وہ ریستو
کے سازو سامان پر ہی گر گئی تھیں۔ اپنے آدمیوں کی کارگزار
کر دلبر خان کے چہرے پر طمانیت بھری مسکراہٹ ابھری آئی۔
دوران اس نے دینو کا پیچھا چھوڑ دیا تھا اور وہ ہاتھ باندھ کر
اکڑوں بیٹھ گیا تھا۔ آنکھوں میں آنسو لیے وہ اپنے چھپر ریستو
کی تباہی دیکھ رہا تھا۔

"یہ لے۔۔۔ تیرا انٹر کان ہم نے ٹھیک کر دیا ہے۔ ابھی ا
اور اچھا بناتے ہیں۔۔۔" دلبر خان نے کہا اور اپنے آدمیوں کو
اشاروں میں اپنا مقصد سمجھایا۔

وہ لوگ بینچوں پر چڑھے اور چند ہی لمحوں میں انہوں نے
بھی ملبے پر گرا دیا پھر انہوں نے اس پر مٹی کا تیل چھڑک کر آ
دی۔ ان کاموں میں وہ واقعی بہت مشاق معلوم ہوتے تھے۔
ہی پھرتی سے وہ یہ سب کچھ کر رہے تھے۔ باقی آدمی کلاشنکو
چاروں طرف کھڑے تھے اور عقابی نظروں سے ادھر اُدھر دیکھ
تھے گویا انہیں اندیشہ ہو کہ کوئی وہاں آکر ان کے کام میں مد
کرنے کی کوشش نہ کرے حالانکہ دور دور تک ایسی کسی ہستی
و نشان نہیں تھا لیکن وہ بہرحال ایسی کسی بھی طاقت سے نمٹنے
لیے تیار کھڑے تھے۔

دینو اب باقاعدہ سر پر دو ہتڑ مار مار کر اور فریاد کے ۔
میں بار بار آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر رو رہا تھا اور دلبر
مسکراتے ہوئے مونچھ کو بل دے رہا تھا۔

اس دوران ایک عجیب احساس نے نہ صرف مجھے شل
تھا بلکہ میں اپنی اس کیفیت پر بے پناہ حیران بھی تھا۔ ۔
احساسات اس وقت بالکل وہی تھی جو اس وقت تھے جب

میں' میں نے اپنے پُرشکوہ مکان کو ملبے کا ڈھیر بنے دیکھا تھا۔ اس مکان کی مالیت کروڑوں میں تھی۔ اس کا اور اس معمولی چھپر کا کوئی مقابلہ نہیں تھا مگر میرے دل میں وہی رنج' وہی غم و غصہ تھا اور کچھ ویسے ہی نقصان کا سا احساس تھا۔

شاید وہ دکھ' وہ احساسِ زیاں درحقیقت دینو کا تھا جو میرے دل میں منتقل ہو گیا تھا۔ ظاہر ہے دینو کے لیے تو اس کا چھپر ریستوران اتنا ہی اہم رہا ہوگا جتنا میرے لیے میرا کروڑوں کا بنگلا۔۔۔ یا پھر میرے اس بے اندازہ دکھ کی شاید ایک اور وجہ تھی۔ وہ یہ کہ میں نے کچی اینٹوں اور گارے کی اس چار دیواری کو اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا تھا۔ کوئی شاید تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ یہ چار دیواری بنانے کے لیے ملک کے ایک معروف گروپ آف کمپنیز کے مالک' ایک نہایت ہی سرکش قسم کے کروڑپتی نے زمین کھودی تھی' مٹی نکال کر گارا بنایا تھا' تسلے میں گارا اور اینٹیں ڈھوئی تھیں پھر ایک ایک اینٹ اپنے ہاتھ سے رکھی تھی۔ چار دن تک ایک راج مزدور کے روپ میں اس نے اپنا خون پسینہ اس چار دیواری کی بنیادوں میں رچایا تھا۔

یہ سب کام اس شخص نے کیے تھے جسے پانی پلانے کے لیے بھی سیکریٹری' ملازم' بٹلر یا فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ویٹر مستعد کھڑے رہتے تھے۔ کیا کوئی اس پر یقین کر سکتا تھا؟ مجھے امید نہیں تھی۔

وہ چار دیواری میری تخلیق تھی۔ نہ جانے کتنے برسوں بعد میں نے اس قسم کی مشقت میں اپنا ہاتھ ڈالا تھا اور یہ سچ تھا کہ میں نے اس کام کو مصیبت یا بیگار سمجھ کر نہیں بھگتایا تھا۔ میں اس سے لطف اندوز ہوا تھا۔ دیکھنے والے کے لیے وہ ایک معمولی سی کچی چار دیواری تھی اور کسی معمار یا کاریگر کو شاید اس میں ہزاروں نقص نظر آتے لیکن میری نظر میں وہ بہت خوبصورت تھی۔ بدصورت دل و دماغ رکھنے والے اور انسانی احساسات سے محروم ان لوگوں نے ذرا سی دیر میں اسے ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔

بہتر ہی تھا کہ میرے ہاتھ میں اس وقت کوئی گن نہیں تھی ورنہ ان میں سے جتنے لوگ اس وقت مجھے نظر آرہے تھے' کم از کم ان سب کو تو میں ضرور ڈھیر کر چکا ہوتا۔ میرے غم و غصے کا یہ عالم تھا کہ میرے لیے منڈیر کی آڑ میں چھپ کر بیٹھنا ناممکن ہوا جا رہا تھا۔ شاید قدرت مجھے بے جا خونریزی سے باز رکھنا چاہتی تھی اس لیے کسی ذریعے سے میرے ہاتھ میں گن نہیں آئی تھی۔

چھپر ریستوران کا معمولی سا دروازہ ساز و سامان اور اشیائے خورونوش کا تھوڑا سا ذخیرہ کچھ تو دیواریں گرنے سے تباہ ہو چکا تھا' رہی سہی چیزیں چھپر کو آگ لگنے سے برباد ہونے لگیں۔ سب لوگ اب چھپر ریستوران سے کچھ دور ہٹ گئے تھے۔

اب دلبر خان ان دُکانداروں کی طرف متوجہ ہوا جو اس سے "فیصلہ کن" مذاکرات کرنے آئے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ اگر وہ دلبر خان کے نرغے میں نہ ہوتے تو کب کے وہاں سے فرار ہو چکے ہوتے۔ ان کی سٹی گم تھی۔

دلبر خان غضب ناک نظروں سے ان سب کا جائزہ لیتے ہوئے گرجا۔ "کیوں رے۔۔۔ تم سب ادھر کس لیے جمع ہوئے ہو؟" کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

غلام حسین جو کچھ دیر پہلے تک ان سب کا قائد نظر آرہا تھا' اب سب سے پیچھے دبکا ہوا تھا۔ باقی لوگوں کا حال تو تھا ہی خراب۔ اس وقت نیلی شلوار قمیص والا ایک دُبلا پتلا ادھیڑ عمر شخص بدقسمتی سے دلبر خان کے عین سامنے کھڑا تھا۔ دلبر خان نے اسے ہی گریبان سے پکڑ لیا۔

گریبان بُری طرح مُٹھی میں جکڑے ہوئے اس نے اس بے چارے کو دو تین ایسے جھٹکے دیے کہ اس کی آنکھیں باہر آنے لگیں۔ "ارے بتا۔۔۔ میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ تم لوگ ادھر کس لیے جمع ہو؟ جلسہ کر رہے تھے ادھر؟ اسکیم بنا رہے تھے دلبر خان کے خلاف؟"

ظاہر تھا' دلبر خان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ بیک وقت اتنی تعداد میں ان لوگوں کے وہاں جمع ہونے کا مقصد کیا تھا۔ یقیناً کوئی کھچڑی پک رہی تھی لیکن دلبر خان اور اس کے آدمیوں کے آتے ہی وہ کھچڑی جس طرح دانہ دانہ ہو گئی تھی' اس پر مجھے حیرت بھی تھی اور افسوس بھی لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ ذہنوں پر صدیوں سے جما ہوا خوف آسانی سے نہیں نکلتا۔

وہ اگر اپنے ارادے پر عمل کرتے ہوئے دلبر خان کے سامنے سر اٹھا کر کھڑے ہو جاتے اور دل کی بات کہہ گزرتے تب بھی شاید انہیں اتنی ہی مار کھانا پڑتی جتنی اس وقت ان کے مقدر میں نظر آرہی تھی۔ اس صورت میں کم از کم ان کے دل کا غبار تو نکل جاتا اور شاید دلبر خان کے دل میں بھی خوف کا بیج بیٹھ جاتا کہ اس کے خلاف بھی بغاوت ہو سکتی ہے۔ لوگ اس کے جبر اور زیادتیوں سے تنگ آکر اس کے سامنے بھی تن کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔

نیلی شلوار قمیص والا خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے' ہاتھ جوڑ کر گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ "سائیں! ہم تو یہاں چائے پینے کے

لیے آئے تھے... صرف چائے پینے... پیر مرشد کی قسم... ہم نے تو آپ کے خلاف ایک بات بھی نہیں کی۔ ہم آپ کے خلاف بھلا کیوں بات کریں گے؟ آپ تو ہمارے مائی باپ ہیں۔"

"چائے پینے آئے تھے...!" دلبر خان نے استہزائیہ لہجے میں دُہرایا اور ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ رسید کیا۔ وہ ایک ہی تھپڑ میں بری طرح چیخنے' معافیاں مانگنے اور دلبر خان کے پیروں میں گرنے کی کوشش کرنے لگا لیکن اس مقصد میں اسے کامیابی نہیں ہوئی۔

دلبر خان نے لات مار کر اسے فٹ بال کی طرح ہوا میں اچھال دیا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ دلبر خان ایک طاقتور شخص تھا لیکن ایسے لوگوں کی طاقت نے مجھے کبھی مرعوب یا متاثر نہیں کیا تھا جو اپنے سے کہیں کمزور' بے بس اور مجبور لوگوں کو مارتے تھے اور مارتے ہی چلے جاتے تھے۔

طاقتور انسان تب ہی اچھے اور متاثر کن لگتے ہیں جب وہ بہادر بھی ہوں اور یہ کوئی بہادری نہیں کہ انسان کسی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے مارنا شروع کر دے یا ایسے لوگوں پر مشق ستم کرنے لگے جن کے بارے میں اسے یقین ہو کہ وہ آنکھ اٹھا کر بھی اس کی طرف نہیں دیکھ سکتے۔

نیلی شلوار قمیص والا فٹ بال کی طرح ہوا میں اچھلا لیکن دلبر خان نے اس کا گریبان نہیں چھوڑا۔ جونہی اس کے پاؤں دوبارہ زمین پر ٹکے' دلبر خان نے اس کے پیٹ پر ایک اور زوردار لات رسید کی اور ساتھ ہی اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ اچھل کر دور جا کر گرا۔ اس کا سر ایک بینچ سے ٹکرایا۔ وہ زمین پر گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی اور ہونٹ نیم وا رہ گئے۔

میرے خیال میں وہ دماغی چوٹ سے فوری طور پر مر گیا تھا لیکن شاید کسی کے لیے بھی یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کسی نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی۔

دلبر خان نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ تین چار آدمی ان مسکین سے دُکانداروں پر پل پڑے۔ وہ انہیں گھونسوں' لاتوں' تھپڑوں اور گنوں کے دستوں سے نہایت بے رحمی سے مار رہے تھے۔ وہ آٹھ دس آدمی' تین چار آدمیوں کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہے تھے۔ کسی کو ایک طرف سے گھونسا پڑتا' وہ دوسری طرف جا کر گرنے لگتا لیکن فوراً ہی اُدھر سے لات پڑتی۔ ابھی وہ تکلیف سے دُہرا ہی ہوتا کہ کمر پر کسی کی گن کا دستہ پڑتا۔

وہ ایک عجیب' تکلیف دہ نظارہ تھا۔ میرے دل کو جیسے کوئی مسلسل مٹھی میں مسل رہا تھا۔ انسانوں اور انسانیت کی ایسی تذلیل اور اذیت رسانی کے ایسے مناظر میری رگوں میں آتش فشاں دہکا دیا کرتے تھے۔

چند ہی لمحوں میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا جیسے مجھے تیز بخار چڑھ گیا تھا۔ میرے جسم میں گویا چنگاریاں پھوٹنے لگی تھیں۔ مجھے خود اپنا چہرہ' اپنے ہاتھ پاؤں آگ کی طرح دہکتے محسوس ہو رہے تھے۔

باقی بندوق بردار اب بھی سب لوگوں کے گرد حصار باندھے کھڑے تھے۔ ان میں سے بعض گویا اس کھیل سے لطف اندوز ہو رہے تھے اور بعض کے چہرے بالکل سپاٹ تھے۔ تاہم وہ سب کے سب اب بھی اردگرد نظر رکھے ہوئے تھے۔ کلاشنکوفیں سنبھالے وہ پہلے ہی کی طرح مستعد کھڑے تھے کہ کوئی اس تماشے میں مداخلت کرنے کے لیے آئے تو وہ اسے بھون کر رکھ دیں۔

میں نے محسوس کیا کہ بستی کی سمت جو بھی دوسرے کچے پکے سے مکان آس پاس موجود تھے ان کی چھتوں پر بھی منڈیروں کے عقب میں کچھ نہ کچھ لوگ ضرور دبکے ہوئے تھے لیکن کسی کو منڈیر سے سر اونچا کرنے کی بھی جرأت نہیں تھی۔

یہ بھی غنیمت تھا کہ دینو ان لوگوں میں شامل نہیں تھا جن کی پٹائی ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ اس کی حالت پہلے ہی بہت خراب تھی اور وہ ایک طرف کو لڑھکا ہوا تھا اور دلبر خان کے درندوں نے اس پر رحم کھا لیا تھا یا پھر شاید اس لیے کہ پٹائی کرنے والوں میں محبت علی اور مسکین علی شامل نہیں تھے۔

وہ دونوں اگر پٹائی کرنے والوں میں شامل ہوتے تو شاید اب بھی دینو کی حالت پر ترس نہ کھاتے اور میرے حصے کا غصہ اسی پر نکالتے۔ پٹائی کرنے والوں میں شاید وہ اس لیے شامل نہیں ہوئے تھے کہ ان کی اپنی حالت ابھی تک کچھ زیادہ اچھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ بس کلاشنکوفیں سنبھالے کھڑے تھے اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی طرح گرد و پیش پر نظر رکھے ہوئے تھے۔

چند ہی منٹ میں سب کے سب دکاندار ڈھیر ہو گئے۔ ان میں سے بعض ایک دوسرے پر گر پڑے تھے۔ ان کی حالت قابل رحم تھی۔ مار کھانے کے دوران انہوں نے بہت فریادیں کی تھیں' ہاتھ جوڑ جوڑ کر رحم کی بھیک مانگی تھی لیکن کسی نے ان کی آواز دل پر کان نہیں دھرا تھا۔ اب ان میں سے بعض خون میں اور بعض اپنی ہی گندگی میں لتھڑے پڑے تھے۔ سب کے سب بے حال تھے۔ دلبر خان کے آدمیوں نے گویا بادل نخواستہ ہاتھ روک لیے۔ انہیں شاید اس کام میں بڑا لطف آ رہا تھا۔

دلبر خان مونچھ کو بل دیتے ہوئے گونجیلی سی آواز میں بولا۔ "چائے پینے آئے تھے نا تم لوگ؟ چائے تو میں نے تم لوگوں کو پلوا دی ہے۔ ابھی بولو تو کیک بھی کھلاؤں؟ میرے خیال میں ابھی تم لوگوں کو اور خاطر تواضع کی ضرورت ہے۔"

زمین پر گرے ہوئے افراد میں سے دو تین نے ہاتھ جوڑ دیے اور دھیمی آواز میں کچھ کہا جو میں سن نہیں سکا۔ غالباً معافیاں ہی مانگ رہے ہوں گے۔ دلبر خان بدستور مونچھ کو بل دیتے ہوئے اونچی اور بارعب آواز میں بولا۔ "اڑے... میں اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ میں کوئی ایسا چریا نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے تم لوگ یہاں میرے خلاف اسکیم بنانے کے لیے اکٹھے ہوئے تھے۔ بھتہ دینے سے انکار کرنے کے منصوبے بنا رہے تھے۔ باہر کا کوئی آدمی آ کر ذرا مسکین علی اور محبت علی کو چوٹ دے گیا تو تم نے سمجھ لیا کہ دلبر خان کا تختہ اُلٹ گیا۔ دلبر خان ابھی اتنا کمزور نہیں ہوا ہے۔ دلبر خان سے تو دوسری کیٹیوں والے بھی کانپتے ہیں۔ تم کیا چیز ہو۔"

زمین پر گرا ہوا ایک شخص ابھی تک ہاتھ جوڑے ہوئے تھا۔ دلبر خان اس کے ہاتھوں پر ہلکی سی ٹھوکر رسید کرتے ہوئے یکدم گرج کر بولا۔ "اڑے... تم لوگ جس کو بھتہ کہتے ہو... خبیثو! وہ کوئی میری جیب میں تو نہیں چلا جاتا۔ یہ سب روپیہ تمہاری بھلائی کے لیے... تمہارے ہی کاموں پر خرچ ہوتا ہے۔ اُلو کے پٹھو! تم کو اتنا بھی احساس نہیں ہے کہ ہم کیٹی کا انتظام چلاتے ہیں' تم لوگوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں' تمہارے کاروباروں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ان کاموں پر خرچا تو ہوتا ہے نا..."

اس کے یہ الفاظ کچھ زیادہ ہی ستم ظریفانہ تھے۔ لوگوں کی وہ جیسی "دیکھ بھال" کرتے تھے' وہ زمین پر گرے ہوئے لوگوں کی حالت سے ظاہر تھا اور لوگوں کے کاروبار کی وہ جیسی "حفاظت" کرتے تھے' اس کا اندازہ دینو کے چھپر ریستوران سے بہ آسانی لگایا جا سکتا تھا جس سے ابھی تک شعلے اور دھواں بلند ہو رہا تھا۔

دلبر خان کسی غضب ناک سانڈ کی طرح زمین پر پاؤں پٹخ کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اڑے حرامزادو... اگر ادھر تھانہ کچہری ہوتی... سرکاری دفتر ہوتے... محصول چنگی ہوتی... پھر بھی تو تم لوگ طرح طرح کے ٹیکس دیتے۔ تم لوگوں سے ہی پیسہ لے کر گورنمنٹ تمہارا انتظام چلاتی۔ اب گورنمنٹ کے بجائے ہم یہاں کا انتظام چلاتے ہیں۔ ہم یہاں کا ہر کام کرتے ہیں... ہم تمہارے اپنے لوگ ہیں... تو ہم کو پیسہ دیتے ہوئے تم لوگوں کو اتنی تکلیف کیوں ہوتی ہے؟"

پھر وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "یاد رکھو' سائیں مراد نے مجھے اس علاقے کا حاکم بنایا ہے۔ میں صرف کمدار نہیں ہوں' میں ان کا خاص آدمی ہوں۔ انہوں نے مجھے ہر طرح کا اختیار دیا ہے۔ مجھے اس علاقے کا انتظام چلانا ہے اور میں اپنا کام کرنا بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں جس طرح بہتر سمجھوں گا' اپنا کام کروں گا۔ جو کوئی زیادہ ہوشیار بننے کی کوشش کرے گا... میری پیٹھ پیچھے میٹنگیں کرے گا... لوگوں کو بھڑکائے گا... میرا حکم ماننے سے انکار کرے گا' اس کا حشر اس سے بھی زیادہ خراب ہو گا۔" اس نے زمین پر پڑے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔

معلوم نہیں وہ اپنی تقریر کسے سنا رہا تھا کیوں کہ وہاں سامعین تو موجود نہیں تھے۔ وہی لوگ اس کی بات سننے والے تھے جو مار کھا کر پہلے ہی عبرت پکڑ چکے تھے اور جن میں بغاوت کی لہر اُن لوگوں کی آمد کے ساتھ ہی دم توڑ چکی تھی لیکن دلبر خان کو شاید اندازہ تھا کہ آس پاس کے مکانوں میں بھی اس کی آواز جا رہی تھی اور اگر ان میں چند افراد بھی موجود تھے تب بھی اس کا "پیغامِ محبت" پوری بستی میں پہنچ جائے گا۔

وہ ایک چھوٹی سی راجدھانی کا چھوٹا سا فرعون تھا۔ اسے اپنے

فرمان ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچانے کے لیے اخباروں میں اشتہارات یا خبریں چھپوانے اور ٹی وی پر اعلانات یا مذاکرے نشر کرانے کی ضرورت نہیں تھی۔

ایسے ہی نہ جانے کتنے چھوٹے اور بڑے مختلف درجوں اور مختلف رُتبوں کے فرعون میری سرزمین پر بکھرے پڑے تھے۔ میں کس کس سے لڑ سکتا تھا؟ کس کس پتھر سے سر پھوڑ سکتا تھا؟ میرا غیظ و غضب فضول تھا' میرا غصہ بیکار تھا۔ یہ ایک مجبور آدمی کا غیظ و غضب' ایک بے بس آدمی کا غصہ تھا۔

یہ باتیں اس سے پہلے بھی زندگی میں ایسے ہی کئی موقعوں پر میں نے سوچی تھیں۔ اپنے آپ کو بارہا سمجھایا تھا لیکن کھوپڑی میں نہ جانے کون سی ایسی رگ تھی جو ہر بار بری طرح پھڑکنے لگتی تھی' قابو میں نہیں آتی تھی۔ نہ جانے وہ کون سی اضافی روح تھی جو میرے اندر گھسی ہوئی تھی اور میرے قابو میں نہیں آتی تھی۔ مجھے مجبور کرتی تھی کہ ایسے فرعونوں سے جا ٹکراؤں' خواہ انجام کچھ بھی ہو۔

یہ روح مجھے تسلیاں دیتی تھی کہ اس راہ میں اگر میں فنا بھی ہو جاؤں تو پروا نہیں' اس میں بھی میری بقا ہے اور اگر سبھی نے عقل کی پیروی کرتے ہوئے صرف اپنے لیے عافیت کا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی تو بنی نوع انسان کی بقا ہی خطرے میں پڑ جائے گی پھر عقل کی پیروی کرنے والوں کو بھی کہیں عافیت کا راستہ نہیں ملے گا۔ میں اس روح کی سرگوشیاں سننے سے باز رہنے کی بہت کوشش کرتا تھا لیکن نہیں رہ پاتا تھا۔ اس کی سرگوشیاں مسلسل سنائی دینے والی بازگشت بن جاتی تھیں۔ شاید پیدائشی طور پر ہی میرے ذہن کی ساخت میں کوئی نقص تھا' کوئی پُرزہ غلط لگ گیا تھا۔ میں اس طرح نہیں سوچ سکتا تھا جس طرح معاشرے میں... بلکہ پوری دنیا میں سوچنے کا رواج تھا۔ یہ میرا "مینوفیکچرنگ فالٹ" تھا۔ اسے دور کرنا میرے اپنے بس کی بات نہیں تھی۔

میرے دونوں ہاتھ چھت پر پڑی پتھر کی ایک چھوٹی سی سل پر جمے ہوئے تھے اور کچھ ایسی سختی سے جم چکے تھے کہ میں سوچ رہا تھا شاید انہیں وہاں سے ہٹانا میرے لیے ممکن نہیں ہوگا۔ ان کی حالت ان آہنی شکنجوں کی سی تھی جو کسی چیز کو اپنی انتہائی مضبوط گرفت میں لیے وہیں زنگ آلود ہو گئے تھے' کسی نے انہیں کھولا نہیں تھا اور اب وہ جام ہو چکے تھے۔

شاید لاشعوری طور پر میری کوشش یہ تھی کہ پتھر کی وہ سل میری گرفت میں ریزہ ریزہ ہو جائے۔ میں انسانوں کی سنگدلی کا بدلہ پتھر کے اس ٹکڑے سے لینا چاہتا تھا جو شاید انسانوں کی سفاکی کے مظاہرے دیکھ کر شرمندہ تھا۔

ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ میرے اندر غیظ و غضب کے جو شعلے رقصاں تھے وہ ویسے ہی مجھے راکھ بنانے پر تلے ہوئے تھے لیکن اسی لمحے ان شعلوں کو ہوا دینے کا بھی سامان ہو گیا۔ میں اپنی کنپٹیوں کی سنسناہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا کہ زہر میں بجھی ایک آواز کا تیر میری سماعت میں آن پیوست ہوا۔

"اب تو ٹھنڈ پڑ گئی تمہارے دل میں؟ سب کچھ تباہ کرا دیا۔ سب کو ادھ مرا کروا دیا.... سب کو اچھی طرح ذلیل کرا دیا۔ اب خوش ہو؟"

وہ ایک نسوانی آواز تھی۔ میں اس آواز میں پہلا لفظ سنتے ہی بجلی کی سی تیزی سے گھوما تھا اور باقی الفاظ میں نے بولنے والی کی صورت دیکھتے ہوئے سُنے تھے۔ وہ ایک دُبلی پتلی اور لمبی سی سانولی لڑکی تھی۔ بعض سانولی لڑکیوں کی آنکھیں نہ جانے کیوں غضب کی ہوتی ہیں۔ وہ ان ہی میں سے ایک تھی۔

بلکہ یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ اس کے چہرے پر آنکھوں کے سوا کچھ تھا ہی نہیں لیکن یہ دو آنکھیں ان گنت تیکھے نقوش پر بھاری تھیں۔ وہ سندھی کڑھائی والی لمبی سی جامنی قمیص اور پیلے رنگ کی پرانی سی سوتی شلوار میں تھی۔ قمیص کے گلے پر چھوٹے چھوٹے شیشے چمک رہے تھے۔

اس کا کئی رنگوں کا سوتی دوپٹہ ڈھلک کر اس کے گلے میں آ گیا ہوا تھا اور سیاہ ریشمی زلفیں پریشان تھیں۔ اس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور ایک رخسار پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ حلیہ اور شخصیت تو یہی بتاتی تھی کہ وہ ایک سیدھی سادی' ان پڑھ سی دیہاتی لڑکی ہے لیکن اس کی آنکھیں ایک بے پناہ ذہین لڑکی کی آنکھیں تھیں۔ بہت سی پڑھی لکھی لڑکیوں کی آنکھوں میں بھی ذہانت کی وہ چمک نہیں ہوتی جو اُن جادوگر آنکھوں میں تھی۔

لیکن ان آنکھوں نے اس کا ایک نقصان بھی کیا تھا' اس کی عمر غالباً بیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن ان دانشور آنکھوں نے اس کی عمر بڑھا دی تھی۔ دیکھنے والے کو یہ بولتی آنکھیں گویا سب سے پہلے یہی بتانے کی کوشش کرتی تھیں کہ اس کم عمر وجود میں ایک نہایت کہنہ و عمر رسیدہ روح مقید ہے۔

اس کی آنکھوں کے بعد جو چیز مجھے قدرے عجیب لگی وہ یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں ایک کلہاڑی تھی جس کا پھل پتلا اور چمکیلا تھا۔ گویا ابھی ابھی کسی کارخانے سے پالش ہو کر نکلا ہو۔ دستہ لمبی اور پتلی لاٹھی کی طرح تھا جس پر سرخ اور سیاہ رنگ چمک رہا تھا' وہی رنگ جو بعض علاقوں میں پرانے وقتوں سے چارپائیوں اور پیڑھیوں وغیرہ کے پایوں پر کیا جاتا ہے۔ وہ ایک ہلکی پھلکی خوبصورت کلہاڑی تھی۔ لکڑیاں کاٹنے کی یقیناً نہیں تھی۔ کلاشنکوف کے سیلاب نے جب تک سندھ کو لپیٹ میں نہیں لیا تھا' زیادہ تر لڑائیاں ایسی ہی کلہاڑیوں سے لڑی جاتی تھیں۔

معلوم نہیں کب وہ لڑکی بے آواز قدموں سے سیڑھیاں چڑھ کر میرے عقب میں آن پہنچی تھی۔ ایک لمحے کے لیے اس خیال سے میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی کہ وہ چاہتی تو اس کلہاڑی سے میری کھوپڑی کو دو حصوں میں تقسیم بھی کر سکتی تھی۔ یہ کوئی اچھی

بات نہیں تھی کہ مجھے اس کی آمد کا پتا ہی نہیں چلا تھا۔

لیکن پھر ان موٹی موٹی' سیاہ اور غیر معمولی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ عقب سے میری کھوپڑی کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کا شاید خیال بھی اس کے دل میں نہیں آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میرے لیے صرف برہمی تھی' نفرت نہیں تھی۔

"کون ہو تم؟" میں نے تیز سرگوشی کے سے انداز میں پوچھا۔

"یہ سوال و جواب کا وقت نہیں ہے۔" وہ زخمی ناگن کی طرح پھنکاری۔ "تمہاری وجہ سے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ اب تم ہی جا کر جو بھی کر سکتے ہو وہ کرو۔"

اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ تمام حالات سے واقف تھی۔ شاید کہیں سے سارا تماشا دیکھتی رہی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا' وہ سوال و جواب کا وقت نہیں تھا پھر بھی میں اس سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔ "تمہیں سب کچھ کیسے معلوم ہے؟"

اس بار اس نے بادل نخواستہ میرے سوال کا جواب دے دیا۔ "جس دن سے تم آئے تھے اور ہوٹل کی دیواریں بنا رہے تھے' اس دن سے میں تمہیں اسی چھت کی منڈیر کے پیچھے سے اسی طرح چھپ کر دیکھ رہی تھی۔ اگر یہ جان کر تمہیں تسلی ہو گئی ہے تو اب جاؤ اور ان منحوسوں پر ٹوٹ پڑو۔"

"میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ وہ کلاشنکوفوں سے مسلح ہیں اور چوکنا ہیں۔ میں فلمی ہیرو نہیں ہوں کہ....."

میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے اس نے کلہاڑی میری طرف اچھال دی۔ میں نے کلہاڑی کو کیچ کر لیا اور حیرت سے کہا۔ "اس سے میں کلاشنکوفوں کا مقابلہ کروں گا؟"

"نہیں' مقابلہ تو تم صرف اپنے حوصلے اور مردانگی سے کرو گے۔ یہ تو میں تمہیں صرف دل کی تسلی کے لیے دے رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے' تم حوصلے' مردانگی یا اس کلہاڑی سے اتنے بہت سے لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے جن کے پاس کلاشنکوفیں بھی ہیں اور دلبر خان کی حمایت بھی' سائیں مراد کی تھپکیاں بھی ہیں اور روپے پیسے کی طاقت بھی۔ یہ سب اس علاقے کے حاکم ہیں' ان کے اشارے پر یہاں سب کچھ ہوتا ہے اور برسوں سے ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے تم یہ کلہاڑی لے کر ان کے سامنے جاؤ گے تو ایک منٹ میں مارے جاؤ گے... اور مجھے تمہاری موت کا دکھ بھی بہت ہوگا..." اس نے ایک طویل سانس لی جو شاید اس کے دل کی گہرائیوں کو چیرتی ہوئی باہر آئی تھی۔

اس احساس سے نہ جانے کیوں مجھے اپنی رگ و پے میں لطیف سی سنسنی محسوس ہوئی کہ اسے میری موت کا بہت دکھ ہوگا حالانکہ جب انسان مر ہی گیا تو کسی کو دکھ ہو یا خوشی' مرنے والے کے لیے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اس کے باوجود اس دنیا میں ان گنت لوگ کسی کو خوش یا افسردہ کرنے کے لیے جانیں دیتے آئے ہیں۔

وہ گویا اپنے حوصلے کو مجتمع کرتے ہوئے ایک لمحے کے توقف سے بولی۔ "اس کے باوجود میں چاہتی ہوں کہ تم سینہ تان کر ان کے سامنے جاؤ اور بے شک مارے جاؤ۔ عزت کی خاطر جان دینے میں بھی ایک شان ہوتی ہے۔ تم یا تو بابا کی حمایت اور مدد کرنے کی کوشش ہی نہ کرتے بس اپنے کام سے کام رکھتے۔ یہاں تو یہ تماشے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن اب تم نے ان کی مدد کی کوشش کی ہے تو اسے انجام تک پہنچاؤ۔"

"خواہ انجام یہی ہو کہ میں مارا جاؤں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ خواہ انجام یہی ہو۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔ "میرا تم سے وعدہ ہے' میں تمہارے سوگ میں زندگی بھر شادی نہیں کروں گی اور روز شام کو ننگے پیر تمہاری قبر پر دیا جلانے آیا کروں گی۔ میں جب تک زندہ رہی' اپنی ہر رات تمہاری قبر پر گزارا کروں گی۔"

مجھے نہ جانے کیوں ہنسی آ گئی۔ وہ سندھی میں بات کر رہی تھی اور میں ٹوٹی پھوٹی سندھی میں جواب دے رہا تھا لیکن اس کی بات پر مجھے پریم وار برٹنی کا ایک شعر یاد آ گیا تھا۔ شاید وہ آسان اُردو کا یہ شعر سمجھ بھی لیتی مگر وہ شعر سنانے کا تو کیا' نثر میں بھی اتنی باتیں کرنے کا وقت نہیں تھا جتنی ہم کر رہے تھے لیکن اتنا ضرور تھا کہ یہ سب باتیں بہت تیزی اور بہت اختصار سے ہوئی تھیں۔ شعر بھی صرف میرے ذہن میں ہی گونج کر رہ گیا۔

کون آئے گا ننگے پیروں شمع جلا کر شام ڈھلے
پریم' محبت کی منزل کے بڑے بھیانک رستے ہیں

"میرے مرنے کے بعد تم کیا کرو گی' اسے رہنے دو۔ یہ بتاؤ' وڈیرو تمہارا بابا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ میرا باپ نہیں لیکن میرے لیے باپ سے بڑھ کر ہے۔ اس نے مجھے پالا ہے اور بہت عزت سے پالا ہے ورنہ شاید میں بہت چھوٹی عمر میں مر گئی ہوتی اور اگر زندہ بھی بچتی تو شاید کسی کے گھر میں نوکرانی یا زرخرید کنیز جیسی زندگی گزار رہی ہوتی۔ شاید ایسے بچوں کو جنم دے رہی ہوتی جن کے باپوں کے ناموں کا بھی مجھے پتا نہ ہوتا۔" وہ بڑی تیزی سے کہتی چلی گئی۔

اس نے اپنی عمر سے بڑی بات کی تھی۔ اس کا اندازِ گفتگو ہی اپنی عمر سے کہیں بڑی لڑکیوں والا تھا۔ معلوم نہیں بعض لوگ دنیا کے سمندر میں کودے بغیر اتنی پختگی سے بات کرنا کہاں سے سیکھ لیتے ہیں؟ دور اُفتادہ گوشوں اور بند گھروں میں بیٹھے بیٹھے زندگی کا ہر راز ان پر کیسے منکشف ہو جاتا ہے۔ شاید عقل و دانش بھی آسمانی پیغام کی طرح ہے۔ خود بخود اوپر سے اترتی ہے۔

اچانک وہ برہمی سے بولی۔ "اب جاؤ گے بھی... یا اس وقت تک یہیں کھڑے باتیں کرتے رہو گے جب تک وہ سب کو اپنے پیروں تلے روندتے ہوئے یہاں سے رخصت نہیں ہو جاتے؟"

"تمہارا نام کیا ہے لڑکی؟" میں نے ایک بار پھر اس کا سراپا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ چند ہی لمحوں میں مجھے احساس ہو گیا تھا کہ

وہ کوئی عام سی' ان پڑھ سی' دیہاتی لڑکی بہرحال نہیں تھی۔ اس کا ظاہر بے شک ایسا ہی تھا لیکن اس کے اندر کوئی بہت مختلف روح مقید تھی۔

''مومل'' اس نے مضطربانہ انداز میں منڈیر کے پار دیکھتے ہوئے کہا۔

''مومل!'' میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''میں نے اپنی جان کی بڑی حفاظت کی تھی۔ بڑا طویل سفر کر کے اور بڑی مصیبتیں اٹھا کر اس جان کی حفاظت کرتا یہاں تک پہنچا ہوں لیکن تمہارے کہنے پر آج اسے موت کے منہ میں پھینک کر بھی دیکھ لیتا ہوں۔ کبھی کبھی کسی اجنبی کی بات مان لینے... کسی انجانی ہستی کے لیے جان دینے میں بھی بڑی لذت ہوتی ہے۔ تم کہتی ہو تو میں زندگی کی یہ آخری لذت حاصل کرنے چلا جاتا ہوں۔''

میں نے ہلکی پھلکی کلہاڑی کو ہاتھ میں تولا پھر اپنے دل کو ٹٹولا۔ عجیب بات تھی' میں ذرا بھی خوفزدہ نہیں تھا۔ وہ اندیشے بھی رخصت ہو چکے تھے جو چند لمحے پہلے تک پیروں کی زنجیر بنے ہوئے تھے۔ عقل و ذہن کی وہ سرگوشیاں بھی معدوم ہو چکی تھیں جو ذرا دیر پہلے تک اندازے اور تخمینے پیش کر رہی تھیں کہ جب دشمن کی تعداد اتنی ہو' اس کے پاس گنیں اتنی ہوں' وہ ایسی جگہ پر کھڑا ہو' اس کا موڈ ایسا ہو اور اس کی حرکات و سکنات سے اتنی مہارت جھلکتی ہو تو کیا کرنا چاہیے۔ اب ذہن گویا سارے سوالوں' ساری دلیلوں اور نفع نقصان کی الجھنوں سے آزاد ہو چکا تھا۔

میں اس کے قریب سے گزر کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ وہ گھڑی کی سوئی کی طرح میری ہی طرف گھومتی چلی گئی۔ میں نے ابھی پہلی ہی سیڑھی پر قدم رکھا تھا کہ وہ تیزی سے بولی۔ ''ٹھہرو....''

آواز سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی لیکن اس میں اضطراب بے پناہ تھا۔ میں رک گیا تو وہ قریب آ کر بولی۔ ''پہلے میں وہاں جاتی ہوں۔ میں بہت شور شرابا کروں گی۔ رونا پیٹنا مچاؤں گی۔ میں سب کا دھیان' سب کی توجہ اپنی طرف کر لوں گی پھر تم کسی طرح نظر بچا کر آنا اور صرف دلبر خان کو قابو میں کرنے کی کوشش کرنا۔ اگر وہ قابو میں آگیا تو سمجھو سب قابو میں آگئے۔''

گویا اب اس کے دل پر دماغ غالب آگیا تھا۔ اب وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں بالکل ہی آنکھیں بند کر کے موت کے گڑھے میں چھلانگ لگا دوں۔ وہ زندگی کا تھوڑا بہت امکان باقی رکھنے کی تدبیر کرنا چاہتی تھی۔

میں مسکرا دیا لیکن اس نے مجھے مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ ہی اس نے میرے جواب کا انتظار کیا۔ وہ کسی بلی کی سی پھرتی سے کچی اور ناہموار سیڑھیاں اترتی چلی گئی۔ پھر میں نے دھڑ سے دروازہ کھول کر بگولے کی طرح اسے باہر جاتے دیکھا۔ اس کا رنگ برنگا دوپٹا اس کے عقب میں ہوا میں لہرا رہا تھا۔

میں واپس منڈیر کے قریب آگیا۔ میں نے دیکھا' دلبر خان کے آدمی اس وقت زمین پر گرے ہوئے دکانداروں کی جیبوں سے پیسے نکال رہے تھے۔ جس کی جیب میں جتنی بھی رقم موجود تھی وہ نکال کر ایک جگہ جمع کرتے جا رہے تھے۔ دینو کی نقدی تو وہ پہلے ہی چھین چکے تھے اور اس کے گلے میں بھی جو کچھ موجود تھا وہ نکال چکے تھے۔ حتیٰ کہ لڑائی جھگڑے کے دوران جو نوٹ زمین پر گرے تھے انہوں نے وہ بھی ڈھونڈ ڈھونڈ کر اٹھا لیے تھے۔ اس کے بعد دیواروں کو توڑا تھا اور چھپر کو آگ لگائی تھی۔

میں دنیا میں اتنے عجیب عجیب تماشے دیکھ چکا تھا کہ اب مجھے کسی بھی تماشے پر حیران ہونا چھوڑ دینا چاہیے تھا پھر بھی نہ جانے کیوں میں اس منظر پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس دنیا میں پیسے کے لیے چھینا جھپٹی کا ہر جگہ ایک عجیب ہی عالم تھا۔ روپے پیسے کی لوٹ مار کے جو مناظر دیکھنے میں آتے تھے' اس پر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں اور دل ڈوبنے لگتا تھا۔ اس میں وہ لوٹ مار بھی شامل تھی جو بندوق یا خنجر کی نوک پر نہیں کی جاتی تھی۔

ان سب مناظر کا عادی ہو جانے کے باوجود نہ جانے کیوں اب بھی کوئی کوئی منظر مجھے حیران کر دیتا تھا۔ آپ نے گنا بیلنے والی مشین تو دیکھی ہی ہوگی۔ گنے کا رس نکالنے والے اس میں گنا ایک بار' دو بار اور کبھی کبھی تین مرتبہ بھی پیل دیتے تھے حتیٰ کہ گنے کا بالکل ہی طلیہ نکل جاتا تھا' اس کا ایک ایک قطرہ نچڑ جاتا تھا اور صرف پھوک باقی رہ جاتا تھا۔ آخر کار وہ لوگ گنے کا پیچھا چھوڑ ہی دیتے تھے' اسے بخش دیتے تھے۔

لیکن ہماری سوسائٹی میں غریب آدمی کا پھوک نکل جانے کے بعد بھی اسے کوئی نہیں چھوڑتا۔ کوئی نہ کوئی طاقت' کسی نہ کسی طریقے سے اس کی رگوں سے اس کا کوئی نہ کوئی بچا کھچا قطرہ نچوڑنے کی کوشش میں رہتی ہے۔ ادھر وہ کسی ظلم کی مشین سے نکلتا ہے اُدھر اسے دوبارہ اس میں پیل دیا جاتا ہے۔ پیلنے والے یہ بھی نہیں سوچتے کہ یہ گنا نما انسان جب بالکل ہی پھوک رہ جائیں گے' جب ان میں مال و زر یا زندگی کے رس کا ایک قطرہ بھی نہیں رہے گا تو وہ کیا کریں گے؟ شاید انہیں بھی گنے والوں کی طرح یہی اطمینان رہتا ہے کہ یہ گنا نما انسان ختم ہو جائیں گے یا کسی قابل نہیں رہیں گے تو اور انسان آجائیں گے۔ انسان بہت سستا ہے اور دنیا میں اس کی بڑی بہتات ہے۔

دلبر خان کے آدمی ابھی ان گنوں سے رس کے بچے کھچے قطرے نچوڑ ہی رہے تھے... میرا مطلب ہے ابھی وہ ان کی جیبوں سے ان کی چھوٹی موٹی رقمیں نکال ہی رہے تھے کہ مومل جلتے ہوئے چھپر ریستوران کے گرد چکر کاٹ کر ایک جھکڑ کی سی تیزی سے یکدم ان لوگوں کے قریب جا پہنچی۔

وہ اپنے سر پر دو ہتڑ مار رہی تھی' بال نوچ رہی تھی' دہائیاں دے رہی تھی اور ان لوگوں کو بری طرح کوس رہی تھی۔ اس کے لیے اسے اداکاری کی ضرورت نہیں تھی۔ ظاہر تھا' اس کے حقیقی

جذبات بھی اس وقت یہی تھے۔ یہ دوسری بات تھی کہ جب تک وہ میرے سامنے کھڑی تھی' اپنے آپ پر پوری طرح قابو رکھے ہوئے تھی۔

دینو جو اس وقت تک بے جان سے انداز میں ایک طرف لڑھکا پڑا تھا' اٹھ بیٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا اس کے قریب آیا اور کانپتے ہاتھوں سے اسے دھکیل کر واپس بھیجنے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ اس وقت گویا اپنے آپ میں نہیں تھی۔ وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا اٹھا کر دلبر خان کو کوسنے دینے لگی۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے وہاں جاتے ہی ایک ہنگامہ برپا کر دیا تھا۔ دلبر خان اور اس کے سب آدمیوں کی توجہ اسی کی طرف مرکوز ہو کر رہ گئی تھی۔ خباثت بھری مسکراہٹ تو ان کے چہروں پر پہلے ہی موجود تھی لیکن اب یہ مسکراہٹ کچھ اور معنی خیز ہو گئی تھی۔ اس کا شیطانی رنگ کچھ اور نمایاں ہو گیا تھا۔

دلبر خان ایک ہاتھ سے اپنی مونچھوں کو بل دے رہا تھا۔ یہ غالباً اس کا مخصوص انداز تھا۔ اس کے ہاتھ اس وقت خالی تھے۔ اس کی کلاشنکوف اس کے قریب ہی اس کا ایک آدمی تھامے کھڑا تھا۔ وہ گہری نظروں سے مومل کا جائزہ لیتے ہوئے پُرخیال انداز میں مسکرا رہا تھا۔ دینو اپنی تباہ حالی کی وجہ سے مومل کو گھر کی طرف واپس دھکیلنے میں ناکام ہو چکا تھا۔

اچانک مومل کی چیخ و پکار کے درمیان دلبر خان کی گونجیلی آواز ابھری۔ ''اڑے دینو! ہم کو تو پتا ہی نہیں چلا' تیرا یہ پوپٹ تو بہت بڑا ہو گیا۔ بڑی ٹھیک ٹھاک جوانی آئی ہے اس پر تو۔ کسی نے ہم کو بتایا ہی نہیں۔''

لہجہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے یہ جاننا اس کا پیدائشی حق تھا اور اس خبر سے محروم رکھ کر اس کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی گئی تھی۔

دینو کا نیل زدہ چہرہ یکدم کچھ اور تاریک پڑ گیا۔ شاید وہ اس وقت سے ہی ڈر رہا تھا۔ اس کے جسم سے رہی سہی جان بھی نکل گئی۔ وہ شاید گر پڑتا مگر مومل نے اسے سہارا دے کر کچھ دور ایک بینچ پر بٹھا دیا۔ روتے روتے اس نے دینو کی پیشانی اور ہاتھ چومے۔ دلبر خان اور اس کے آدمیوں کی نظریں اس دوران ایک لمحے کے لیے بھی اس پر سے نہیں ہٹی تھیں۔ وہ لڑکی نہیں گویا چلتا پھرتا لالی پاپ تھی جو بہت سے ندیدے بچوں کے درمیان چکرا رہی تھی۔

دینو کو بٹھا کر اچانک ہی وہ بپھری ہوئی شیرنی کی طرح پلٹی اور دلبر خان پر جھپٹی۔ اس کے آدمیوں کی کلاشنکوفوں کا رخ اس کی طرف ہو گیا لیکن کسی کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دلبر خان نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ یوں اس نے صرف ایک ہاتھ سے اسے روک لیا۔

اس نے دوسرے ہاتھ سے دلبر خان کا منہ نوچنا چاہا تو اس نے اس کی دوسری کلائی بھی پکڑ لی اور اسے کسی گڑیا کی طرح گھما کر یوں قابو میں کر لیا کہ اب اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ اس کا چہرہ غصے اور خجالت سے لال بھبھوکا ہو رہا تھا مگر اس سرخی پر اس کی رنگت کے سانولے پن کا ہلکا سا دھواں چھایا ہوا تھا۔

شکار اس وقت درندے کے قابو میں تھا۔ فاتحانہ عقاب کے پنجوں میں تھی۔ دینو کے لیے یہ نظارہ ناقابل برداشت تھا اور کچھ کرنے کی اس میں سکت نہیں تھی۔ اس نے منہ پھیر لیا۔ اس کا جسم جھٹکے کھا رہا تھا۔ شاید وہ ہچکیاں لے رہا تھا۔ ممکن تھا دل ہی دل میں مومل کو کوس بھی رہا ہو کہ آخر وہ اس جھگڑے میں کیوں گھس آئی تھی۔

دلبر خان کے آدمیوں نے مومل کو یوں اس کی گرفت میں دیکھ کر ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا۔ فضا مُرتعش ہو کر رہ گئی۔ مومل یقیناً ایک نرم و نازک سی لڑکی تھی۔ وہ جوڈو کراٹے یا اس طرح کے کسی اور ہُنر سے یقیناً واقف نہیں تھی کہ اس وقت اپنے آپ کو چھڑا بھی لیتی اور دو چار کی ہڈیاں پسلیاں بھی سینک دیتی لیکن یہ بھی اسی صورت میں ممکن ہوتا جب اتنی کلاشنکوفوں کا رخ اس کی طرف نہ ہوتا۔

اتنی کلاشنکوفوں کے سامنے تو مارشل آرٹس کا بڑے سے بڑا ماہر بھی صرف فلموں میں ہی کُشتوں کے پشتے لگا سکتا تھا۔ اس صورت حال میں تو صرف کوئی حکمتِ عملی' کوئی تدبیر ہی کچھ نتیجہ خیز ثابت ہو سکتی تھی۔

سب سے زیادہ بری چیز اس وقت مجھے چھپر ریستوران کا محل وقوع محسوس ہو رہا تھا جو عام حالات میں یقیناً اس کی خوبی رہی ہو گی۔ یعنی اس کے چاروں طرف کھلی جگہ تھی۔ گاہک وہاں بیٹھ کر چاروں طرف سے ہوا سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے لیکن میرے لیے مسئلہ یہ تھا کہ میں کسی چیز کی آڑ لیتے ہوئے ان لوگوں کی طرف نہیں بڑھ سکتا تھا۔

اردگرد صرف چند درخت تھے جو تھوڑے بہت کارآمد ثابت ہو سکتے تھے۔ سب سے بڑی آڑ خود چھپر ریستوران کا ملبہ تھا جس کے بالائی حصے میں آگ لگی ہوئی تھی۔ چھپر کا گھاس پھونس تو جل چکا تھا' اب صرف بلیاں جل رہی تھیں۔

دلبر خان گویا مومل کی بے بسی سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ تو بڑا اچھا چوزہ ہے۔ اڑے دینو! کیٹی کی ساری عورتیں لڑکیاں زمینوں پر کام کرتی ہیں۔ تو نے اس کو کیوں پردے میں چھپا کر رکھا ہوا تھا؟''

دینو نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس نے دلبر خان کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ وہ بدستور منہ پھیرے بیٹھا رہا اور اس کا جسم ہولے ہولے جھٹکے سے کھاتا رہا۔ دلبر خان نے اپنے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ ''اوئے آچر! اس کو گاڑی میں ڈال۔ ہم تو اس کو بھول ہی گئے تھے۔ ہمیں تو یاد ہی نہیں تھا کہ یہ چوزہ اتنا بڑا ہو گیا ہو گا۔ اوپر سے اس کا یہ جھوٹ موٹ کا باپ ہمارے خلاف بغاوت پھیلا رہا ہے' لیڈر بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اب ذرا اس کو پکا قسم کا سبق

دینا پڑے گا۔ آئندہ ادھر رہے گا تو سر جھکا کر رہے گا۔"

دینو نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس نے اس کی منت سماجت کی بھی کوشش نہیں کی۔ وہ اب قطعی طور پر ایک ایسا شخص معلوم ہو رہا تھا جو ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ شاید دنیا کی ہر اچھائی سے اس کا یقین اٹھ چکا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ اس وقت وہ دل ہی دل میں اپنے مر جانے کی دعا کر رہا تھا۔

جس شخص کو آچر کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا وہ درمیانے قد کا مگر خونخوار سی صورت والا تھا۔ سفید پگڑی کے نیچے اس کی سیاہ داڑھی خوب چمک رہی تھی۔ غالباً اس پر تیل چپڑ کر خوب کنگھی کی گئی تھی۔ وہ اپنی کلاشنکوف کندھے پر لٹکا کر آگے بڑھا۔ اس کے دونوں بازو پھیلے ہوئے تھے تاکہ موِل کو دلبر خان کی گرفت سے اپنی گرفت میں منتقل کر سکے۔

موِل ہوا میں لاتیں چلا رہی تھی مگر اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ پرانے شکاری تھے۔ موِل جیسی نازک و ناتواں لڑکی کا تڑپنا' مچلنا اور بل کھانا شاید ان کے لیے زیادہ لطف اندوز ہونے کا ذریعہ بن رہا تھا۔

موِل نے اس وقت صرف ایک لمحے کے لیے منڈیر کی طرف دیکھا لیکن اس ایک لمحے میں' میں اتنی دور سے بھی نہایت آسانی سے اس کی آنکھوں میں اس کی سوچ کا پیغام پڑھ سکتا تھا۔ وہ یقیناً یہی کہنا چاہ رہی تھی۔ "دے گئے نا دھوکا آخر۔ نہیں آئے ہماری مدد کے لیے۔ ڈر گئے؟ بزدل کہیں کے!"

وہ یہ سوچنے میں حق بجانب تھی۔ وہ تو نہیں جان سکتی تھی کہ ان چند لمحوں میں میرے ذہن میں کیسی آندھیاں چلتی رہی تھیں' جو کچھ میں دیکھ رہا تھا اس نے میرے حواس پر کیسا غضب ڈھایا تھا' وہ نہیں جان سکتی تھی کہ میں نے یہ چند لمحے ضائع نہیں کیے تھے۔ میں نے اس مقام کے چپے چپے کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا۔ کون سی چیز کہاں تھی' کن کن چیزوں کے درمیان کتنا فاصلہ تھا' کون کہاں کھڑا تھا' کسی کی طرف سے زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت تھی' کس صورتِ حال میں کس طرف سے کیا ردِعمل ظاہر ہونے کا امکان تھا' ان تمام پہلوؤں کا جائزہ میں نے اچھی طرح لے لیا تھا۔

میں تنہا تھا' غیر مسلح تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ اندھا دھند منہ اٹھا کر جاؤں اور کسی سگِ آوارہ کی طرح ان کے ہاتھوں مارا جاؤں۔ جان دینی ہی تھی تو اپنے مقصد میں تھوڑی بہت کامیابی حاصل کرنے کی کوشش تو کرنی چاہیے تھی۔ میرے جان دینے سے بھی ان مظلوموں کو ظلم سے نجات تو شاید نہیں مل سکتی تھی لیکن ظالموں کو بھی تھوڑا سا احساسِ زیاں ہو جاتا تو یہ بھی میری چھوٹی موٹی کامیابی ہی ہوتی۔

میرے حرکت میں آنے کا لمحہ آ چکا تھا۔ کلہاڑی ہاتھ میں لیے میں تیزی سے گھوما اور آندھی اور طوفان کی طرح سیڑھیاں اتر کر پلک جھپکتے میں دروازے سے نکل کر ایک درخت کی اوٹ میں پہنچا۔ میرے اندر جیسے کوئی اور ہی روح سما گئی تھی' رگ و پے میں بجلیاں سی بھر گئی تھیں۔

چھت پر سے میں نے دلبر خان کو اپنے ساتھیوں سے ذرا دور ہٹ کر ایک درخت کی طرف بڑھتے دیکھا تھا وہ غالباً سائے میں کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ اس وقت تک اس نے اپنے ساتھی سے اپنی کلاشنکوف بھی واپس نہیں لی تھی۔ اسے اس کی ضرورت بھی کیا تھی؟ اس کے سامنے تو کچلے' مسلے اور شکستہ حال انسانوں کا ایک چھوٹا سا "انبار" تھا جو اس کے ساتھیوں کے گھیرے میں ہلنے جلنے کی بھی جرأت نہیں کر رہے تھے۔ دلبر خان کے ساتھی خواہ مخواہ ان بے چاروں پر کلاشنکوفیں تانے کھڑے تھے۔ بندوقوں' رائفلوں کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان بے چاروں کے لیے تو دلبر خان اور اس کے ساتھیوں کی دہشت ہی بہت تھی۔

میں درخت کے عقب میں صرف ایک ثانیے کے لیے رکا۔ وہ درخت چھپر کے دوسری طرف تھا جس کی طرف میں نے دلبر خان کو بڑھتے دیکھا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اُدھر وہ درخت کے نیچے پہنچے اور ادھر میں اس کے سر پر پہنچوں اور اس سے پہلے مجھے راستے میں ایک شخص کی کلاشنکوف بھی چھیننی تھی جسے میں پہلے ہی سے تاڑ چکا تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے ذرا پیچھے' تباہ شدہ چھپر ریستوران کے ایک کونے کے قریب کھڑا تھا۔

اس نے اپنی کلاشنکوف بھی ذرا ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک ہاتھ میں پکڑی ہوئی تھی۔ ویسے وہ سب ہی اب پہلے جیسے مستعد اور وحشت زدہ نظر نہیں آ رہے تھے۔ غالباً انہیں اطمینان ہو چکا تھا کہ وہاں ان کے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا' انہیں کسی مزاحمت کا سامنا نہیں تھا۔

کسی پر حملہ کرنے کا بہترین وقت وہی ہوتا ہے جب اسے حملے کی توقع نہ رہی ہو۔ ویسے بھی جب سے موِل ان کے درمیان پہنچی تھی' ان کا دھیان بٹ چکا تھا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ موِل نے جو تجویز پیش کی تھی اس پر عمل کر کے دکھایا تھا اور میری مداخلت کے لیے راستہ ہموار کر دیا تھا لیکن وہ یقیناً یہی سمجھ رہی تھی کہ میں نے مداخلت میں تاخیر کر دی تھی جب کہ میرے خیال میں چند لمحے مزید انتظار کر لینا زیادہ سود مند ثابت ہوا تھا۔ وہاں کھڑے ہوئے آدمیوں کی ترتیب ذرا بدل گئی تھی۔

درخت کی اوٹ سے نکل کر میں تقریباً چوپائے ہی کی طرح دوڑتا چھپر ریستوران کے کونے پر پہنچا۔ ملبے کے اوپر ابھی تک شعلے پھڑپھڑا رہے تھے اور دھواں بلند ہو رہا تھا لیکن نہ تو شعلے زیادہ اونچے تھے اور نہ ہی دھواں زیادہ کثیف تھا۔

کونے کے دوسری طرف میرا شکار کھڑا تھا لیکن اگر میں کونے کے گرد چکر کاٹ کر جاتا تو اس تک پہنچنے سے پہلے کسی کی نظر میں آ سکتا تھا۔ میں نے ذرا سا سر اونچا کر کے ملبے کے دوسری طرف دیکھا۔ میرا شکار بھی اپنی جگہ سے ہلنے ہی لگا تھا۔ میں جب چھت پر تھا تب ہی اس جگہ سے اپنے شکار تک کا فاصلہ نظروں ہی نظروں میں ناپ چکا تھا۔

میں نے اپنی تمام تر توانائی مجتمع کرتے ہوئے اس آتش زدہ ملبے کے اوپر سے اس شخص پر چھلانگ لگائی۔ میرے پاؤں زمین پر لگنے سے پہلے کلہاڑی کے پھل کا پچھلا آہنی حصہ ہتھوڑے کی طرح اس کی کھوپڑی پر پڑ چکا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس کے سر پر پگڑی نہیں تھی۔ اس کے لمبے لمبے بھورے بال بڑے سلیقے سے بنے ہوئے تھے۔ مانگ اس نے درمیان میں سے نکالی ہوئی تھی۔

میں اس مانگ کو ہی نشانی مقرر کرتے ہوئے عین اسی جگہ سے اس کی کھوپڑی کلہاڑی سے دو حصوں میں تقسیم بھی کر سکتا تھا لیکن میں غیر ضروری طور پر کسی کو بھی قتل کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اپنی دانست میں تو میں نے اس کی کھوپڑی ذرا سی چٹخا کر ہی اپنا کام نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن ہاتھ اگر اندازے سے ذرا بھاری پڑ گیا ہو تو میں نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس شخص کے زمین پر گرنے سے پہلے میں کلہاڑی پھینک کر اس کی کلاشنکوف عین اس لمحے تھام چکا تھا جب وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ رہی تھی۔ وہاں سے فوراً ہی دوسری چھلانگ مجھے دلبر خان کے عقب میں لے گئی۔

یہ ایک ایسا کام تھا جس کے لیے چھلاوے کی سی پھرتی اور شیر کی سی بے خوفی درکار تھی۔ محض ایک سیکنڈ کے اندازے کی غلطی کے نتیجے میں میرے چیتھڑے بھی اُڑ سکتے تھے۔ دلبر خان کی گردن میرے ایک بازو کے شکنجے میں آ گئی۔ دوسرے ہاتھ سے کلاشنکوف سے ہلکا سا ہوائی برسٹ مار کر میں نے اس کی نال دلبر خان کی پسلیوں میں گھسیڑ دی۔

وہ سب دم بخود رہ گئے تھے۔ انہیں یہ اندازہ تو یقیناً ہوا ہو گا کہ ان کے گرتے ہوئے ساتھی کے قریب سے کسی نے دلبر خان کی طرف چھلانگ لگائی تھی لیکن اس کے بعد کیا ہوا تھا' یہ ان کی سمجھ میں نہیں آیا ہو گا۔ اس کے علاوہ انہیں میری آمد کا پتا چلنے میں بھی ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی تھی اور وہی ایک لمحہ میرے لیے زندگی یا موت کا فیصلہ کرنے والا لمحہ تھا۔

دلبر خان میری ڈھال بن گیا تھا اور میں اسے گھسیٹتا ہوا مزید دو قدم پیچھے لے گیا تھا۔ میں نے پشت درخت کے تنے کے ساتھ ٹکا لی تھی۔ ویسے بھی اس طرف کوئی موجود نہیں تھا۔ عقب سے کوئی مجھ پر حملہ نہیں کر سکتا تھا۔

موِل اس وقت آچر کی گرفت میں مچل رہی تھی۔ وہ اسے دلوچے جیپ کے قریب پہنچ چکا تھا۔ موِل کے ساتھ کھینچا تانی میں اس کی کلاشنکوف زمین پر گر چکی تھی۔ کسی نے اسے نہیں اٹھایا تھا۔ موِل کا رنگ برنگا دوپٹا بھی ایک طرف پڑا تھا۔ اس کا پرانا سا سوتی لباس کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ کسی نے غیر اضطراری طور پر برسٹ نہیں مار دیا تھا ورنہ دلبر خان کا اور میرا ایک ساتھ ہی کام تمام ہوتا۔

"لڑکی کو چھوڑ دو... کوئی اپنی جگہ سے نہ ہلے ورنہ دلبر خان زندہ نہیں بچے گا۔" میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔ انہیں میری آمد کے انداز اور میرے لہجے کی سفاکی سے اندازہ ہو گیا کہ میں جو کچھ کہہ رہا تھا وہ کر گزرنے کی اہلیت رکھتا تھا۔ وہ سب اپنی جگہ ساکت کھڑے رہ گئے۔ آچر نے موِل کو چھوڑ دیا۔ ان سب کی حالت کچھ ایسی ہی تھی جیسے وہ جاگتی آنکھوں سے کوئی ناقابلِ یقین خواب دیکھ رہے ہوں۔ موِل نے اپنا دوپٹا اٹھا کر اپنے جگہ جگہ سے پھٹے ہوئے لباس پر ساری کے انداز میں لپیٹ لیا۔

دلبر خان میری گرفت میں ساکت تھا۔ ایک تو اس کی گردن پر بازو کا شکنجہ بہت سخت تھا۔ اس گرفت میں جو بھی آتا تھا' اگر اس میں تھوڑی بہت عقل موجود ہوتی اور اسے لڑائی بھڑائی کا کچھ تجربہ ہوتا تو اسے اندازہ ہو جاتا تھا کہ اگر اس نے ذرا بھی غلط انداز میں زور آزمائی کی تو اس کی گردن ٹوٹ بھی سکتی ہے۔ دوسری بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کی پسلیوں پر بہت سختی سے کلاشنکوف کی نال جمی ہوئی تھی جس کا دستہ میرے پہلو میں دبا ہوا تھا۔

تناور درخت سے پشت ٹکا لینے کی وجہ سے ایک تو مجھے اس طرف سے کچھ تحفظ کا احساس میسر آ گیا تھا گو کہ اس طرف کوئی موجود نہیں تھا لیکن وہ پگڈنڈی اسی طرف تھی جس کے راستے وہ لوگ آئے تھے۔ دوسرے درخت کی وجہ سے مجھے کلاشنکوف اور دلبر خان دونوں کو بیک وقت قابو میں رکھنے میں مدد بھی مل رہی تھی۔ دلبر خان کوئی مریل یا معمولی آدمی نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا' اسے ذرا بھی موقع ملا تو وہ بپھرے ہوئے درندے کی طرح حرکت میں آئے گا۔ فی الحال تو اسے سانس بھی مشکل سے آ رہا تھا۔

"کلاشنکوفیں پھینک دو۔" میں نے دوسرا حکم دیا۔

کسی نے میرے حکم کی تعمیل نہ کی۔ صورت حال صحیح طور پر اب ان کی سمجھ میں آئی تھی اور اب وہ کسی موقع کی تلاش میں تھے۔ ان میں سے ہر ایک یقیناً یہی سوچ رہا تھا کہ جس پوزیشن میں وہ کھڑا ہے کیا وہاں سے وہ کچھ کر سکتا ہے؟ میں چاہتا تھا کہ کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے وہ گنیں پھینک دیں۔

اچانک موِل نے آگے بڑھ کر آچر کی گری ہوئی کلاشنکوف اٹھا لی اور اسے چاروں طرف گھماتے ہوئے مجنونانہ سے انداز میں چیخی۔ "میں ان سب کو مار دوں گی... ذلیل... کمینے... کتے... انہوں نے ہماری زندگی حرام کر دی ہے...."

تب ان سب نے قطعی غیر متوقع طور پر کلاشنکوفیں پھینک دیں اور ہاتھ اٹھا دیے۔ موِل کے مجنونانہ انداز نے انہیں خوفزدہ کر دیا تھا۔ معلوم نہیں اس سے پہلے موِل نے کبھی کوئی ہتھیار استعمال کیا تھا یا نہیں لیکن اس وقت یہی معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے سامنے توپ بھی ہوتی تو وہ اسے چلا سکتی تھی۔ اس دُبلی پتلی' سانولی اور نازک سی لڑکی کے اندر ان گنت طوفان مقید معلوم

ہوتے تھے۔ نہ جانے کتنی صدیوں کا غصہ اس کے اندر جمع تھا۔

"لڑکی! گولی نہ چلانا۔" میں چلا اٹھا۔ میرے خیال میں فی الحال اس کی ضرورت نہیں تھی۔

"لڑکی! گولی نہ چلانا..." مومل نے نہایت برہمی کے عالم میں میری نقل اتاری۔ "اگر تم انہیں گولی نہیں مارو گے تو کیا ان کا اچار ڈالو گے؟ تمہارا خیال ہے کہ تم انہیں چھوڑ دو گے تو یہ بھی تمہیں چھوڑ دیں گے؟"

مومل ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ گھٹیا ذہنیت رکھنے والے لوگ تھے اور مجھے بھی کافی حد تک یقین تھا کہ وہ کمینے دشمن ثابت ہوں گے۔ ان کی فطرت سانپ کی طرح ہو گی۔ اگر میں ان پر احسان کروں گا تب بھی وہ مجھے ڈنک ہی ماریں گے۔ وہ جب اپنی پناہ اور اپنی امان میں رہنے والے لوگوں پر اتنا ظلم کرتے تھے تو مجھ جیسے اجنبی کو کہاں بخش سکتے تھے؟ جب کہ اجنبی نے ان کے حضور میں زبردست گستاخیاں بھی کی تھیں۔ ان کے کارندوں کو مارا تھا اور اب ان کے سرخیل کو ان سب کے سامنے بے بس کیا تھا۔

ان کی پناہ اور امان میں رہنے والے وہ لوگ جن کی حفاظت ان پر فرض تھی، جو بہت کمزور اور سادہ لوح تھے، جو ہر وقت ان کے سامنے ہاتھ باندھے رہتے تھے، جب ان پر ان کے ظلم کا یہ عالم تھا تو مجھے بھلا وہ کیونکر معاف کر سکتے تھے؟

لیکن میں بُرے سے بُرے آدمی کو بھی ایک موقع دینے کا قائل تھا گو کہ اس میں کبھی کبھی مجھے نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا لیکن اچھے نتائج کی امید پر میں اکثر ایسا کرتا آیا تھا۔

کلاشنکوف مومل کے ہاتھوں میں لرز رہی تھی۔ مجھے معلوم تھا اس پر دیوانگی کی سی جو کیفیت طاری تھی وہ زیادہ دیر برقرار نہیں رہے گی اور وہ ایک بار پھر وہی نرم و نازک اور کمزور سی لڑکی ہو گی جو کچھ دیر پہلے دلبر خان اور آچر کی گرفت میں فاختہ کی طرح مچل رہی تھی۔ میں چاہتا تھا اپنا جنون ٹھنڈا پڑنے سے پہلے وہ ایک اہم کام تو کر دے۔

"ہاں..." میں نے بہ آواز بلند کہا۔ "میں ان کے ساتھ اچھائی کرنا چاہتا ہوں اور دیکھنا چاہتا ہوں کہ یہ اس کے جواب میں میرے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ تم صرف اتنا کرو کہ دو تین چکروں میں یہ سب کلاشنکوفیں اٹھا کر اپنے گھر میں رکھ آؤ۔ جلدی کرو۔"

ساتھ ہی میں نے ایک بار پھر ان لوگوں کو خبردار کیا۔ "تم میں سے کوئی بھی چالاکی دکھانے کی کوشش نہ کرے ورنہ دلبر خان زندہ نہیں بچے گا۔"

ان سب کی خونخوار نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ مومل نے بادل نخواستہ میری ہدایت پر عمل شروع کر دیا۔ میں نے دینو کو آواز دے کر کہا۔ "تم بھی مومل کی مدد کرو۔ یہ کلاشنکوفیں اٹھا کر جلدی سے گھر میں پہنچا دو۔"

وہ دور ہی سے دونوں ہاتھ جوڑ کر چڑچڑے سے انداز میں بولا۔

"نہ بابا! مجھے تو معاف ہی رکھو۔ میں مالکوں کے خلاف کسی کام میں حصے دار بننا نہیں چاہتا۔ جو تمہارا دل چاہے کرو پھر خود ہی بھگتنا۔ میں اس جھگڑے سے بالکل الگ ہوں۔"

پھر اس نے دانت پیس کر ہاتھ نچاتے ہوئے مومل کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کمینی کو بھی آج کچھ زیادہ ہی جوش چڑھ رہا ہے۔ اری... او... چری! میں کہتا ہوں تو مالکوں کی کسی چیز کو ہاتھ نہ لگا۔ بس خود جا کر گھر میں بیٹھ جا۔ تجھے کس نے باہر آنے کے لیے کہا تھا؟ تیرے باہر آنے سے تو مصیبت اور بڑھ رہی ہے۔"

شاید یہ عمر کا اثر تھا۔ دینو پر غلامی کا رنگ گہرا تھا اور لہو میں حرارت کم۔ مومل خواہ لڑکی تھی لیکن کم عمر تھی۔ اس کے ذہن پر غلامی کے پنجے زیادہ گہرے نہیں گڑے تھے اور اس کے لہو میں بغاوت کی حرارت بھی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اس نے دینو کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور جتنی کلاشنکوفیں اٹھا سکی، اٹھا کر گھر کی طرف دوڑتی چلی گئی تاہم دینو کی بات سن کر میں نے دلبر خان کے آدمیوں کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوتے دیکھی۔

وہ طنزیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے گویا خاموشی کی زبان میں کہہ رہے تھے۔ "دیکھ لی تم نے ہماری وحشت؟ تم ہمارے شکنجے سے بچ کر نہیں جا سکو گے۔"

مومل نے انتہائی ہمت اور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ذرا سی دیر میں دو چکروں میں نو کلاشنکوفیں گھر میں پہنچا دیں۔ دسویں میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ دوسرے چکر کے بعد گھر میں ہی رہے، واپس نہ آئے لیکن لگتا تھا کہ آج وہ کسی کا بھی کہنا ماننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ وہ آندھی کی طرح گئی اور طوفان کی طرح پھر واپس آ گئی۔

"میں نے تم سے کہا تھا گھر میں رہنا۔" میں چیخا۔

"میں اپنے بابا کو لینے آئی ہوں۔" وہ دینو کے قریب پہنچ کر اسے سہارا دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

لیکن دینو نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "میں تیرا بابا نہیں ہوں۔ بیٹیاں وہ ہوتی ہیں جو باپوں کا کہنا مانتی ہیں، اجنبیوں کا نہیں۔ تجھے مالکوں کے سامنے سر نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں ہمارا کیا بنے گا۔" وہ ایک بار پھر رونے لگا۔

مومل اسے یوں سمجھانے بجھانے اور چمکارنے لگی جیسے وہ بزرگ ہو اور دینو بچہ لیکن دینو مان کر نہیں دے رہا تھا۔ دلبر خان خود خاصی سعادت مندی سے میری گرفت میں ترچھا کھڑا تھا، کسمسایا تک نہیں تھا۔

مومل کے وہاں سے جانے کے بعد میرا ارادہ دلبر خان کو چھوڑ دینے کا تھا۔ میرا سب سے بڑا مقصد ان لوگوں کو غیر مسلح کرنا تھا۔ غیر مسلح لوگ اگر تعداد میں زیادہ بھی ہوتے تھے تو مجھے ان کی کچھ زیادہ فکر نہیں ہوتی تھی، خواہ میں خالی ہاتھ بھی ہوتا جب کہ فی الحال تو میرے پاس کلاشنکوف موجود تھی جو میرے زیادہ ہاتھ پاؤں

ہلائے بغیر بھی سب کو قابو میں رکھنے کے لیے کافی تھی۔ دلبر خان کو چھوڑنے کے بعد میرا ان لوگوں سے بات چیت کا ارادہ تھا۔ مجھے کامیابی کی امید تو نہیں تھی پھر بھی میں تجربہ کر کے دیکھنا چاہتا تھا کہ ان پر شرافت کی زبان اثر کرتی تھی یا نہیں۔

لیکن اس کی نوبت نہیں آ سکی۔ مجھے اپنی فیاضی دکھانے اور اپنے تجربات کرنے کا موقع نہیں مل سکا۔ مومل اس وقت دینو کا بازو پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کر رہی تھی اور اس کی پشت میری طرف تھی کہ اچانک ہی ایک جھٹکے سے کلاشنکوف میرے ہاتھ سے نکل گئی اور اس جھٹکے کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے میرا توازن بھی خراب ہو گیا۔

جس داؤ سے میں نے دلبر خان کی گردن دبوچی ہوئی تھی اس میں توازن ہی کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ گرفت میں دبے ہوئے شخص کی گردن ایک خاص زاویے پر ہوتی تھی تب ہی ضرورت پڑنے پر ایک خاص انداز میں جھٹکا دے کر اسے توڑا جا سکتا تھا۔ توازن بگڑ جانے کے بعد گردن گرفت میں تو رہ سکتی تھی اور طاقت استعمال کرتے ہوئے دشمن کو قابو میں بھی رکھا جا سکتا تھا لیکن پھر ضروری نہیں تھا کہ میں گردن توڑ بھی سکتا۔ اگر حریف طاقتور ہوتا تو اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لیے جدوجہد بھی کر سکتا تھا لیکن گردن اگر خاص زاویے سے گرفت میں رہتی تھی تو وہ ہل بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے خود بھی احساس ہو جاتا تھا کہ اگر اس نے زیادہ ہلنے جُلنے کی کوشش کی تو اس کی گردن ٹوٹ جائے گی۔

میرے ہاتھ سے بیک وقت دو چیزیں نکل گئی تھیں۔ ایک تو وہی خاص توازن جس کی وجہ سے دلبر خان نازک پوزیشن میں تھا اور کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ دوسرے کلاشنکوف جو صرف دلبر خان کو ہی نہیں، ان سب کو سیدھا رکھنے کے لیے ضروری تھا۔

میں نے اپنے عقب کی طرف سے مطمئن رہ کر غلطی کی تھی۔ میں بروقت نہیں دیکھ سکا، پیچھے سے ہی کوئی ہاتھ آیا تھا اور میرے ہاتھ سے کلاشنکوف ایک جھٹکے سے نکال کر لے گیا تھا۔ میں اس ہاتھ کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا اور وہ بھی ایک ثانیے کی تاخیر کے ساتھ۔ اس ہاتھ نے کلاشنکوف کی مختصر سی نال کو گرفت میں لیا تھا اور اسے بجلی کی سی تیزی سے پیچھے کی طرف گھما لیا تھا، اسی لیے وہ کچھ آسانی سے میری گرفت سے نکل گئی تھی اور ٹریگر دب جانے کا خطرہ بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ ایک چوڑا چکلا ہاتھ تھا جس کی میں نے جھلک دیکھی تھی اور اس کے کام کے اس مختصر سے نمونے ہی نے مجھے بتا دیا تھا کہ وہ کسی اناڑی کا ہاتھ نہیں تھا۔

میں نے چاہا کہ تیزی سے دلبر خان کو گھماتے ہوئے بدستور اپنے سامنے ڈھال بنائے رکھوں تاکہ کلاشنکوف چھیننے والوں کو اس کا کوئی خاص فائدہ نہ پہنچ سکے لیکن توازن خراب ہونے کی وجہ سے ایک تو دلبر خان پر میری گرفت پہلے جیسی نہ رہی، دوسرے دلبر خان کو فوری طور پر احساس ہو گیا کہ کلاشنکوف میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور اسے گردن ٹوٹنے کا خطرہ بھی لاحق نہیں رہا تھا۔

وہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے میں چُوکا نہیں۔ اس نے پوری قوت سے میری پسلیوں میں کہنی رسید کی اور تڑپ کر میرے بازو کے شکنجے سے نکل گیا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا ورنہ شاید میری کھوپڑی بری طرح چٹخ گئی ہوتی کیوں کہ درخت کے عقب میں جو نامعلوم شخص نہ جانے کہاں سے پہنچا تھا، اس نے کلاشنکوف نال سے ہی پکڑے پکڑے ہتھوڑے کی طرح اس کا دستہ میری کھوپڑی پر رسید کرنا چاہا تھا لیکن دلبر خان کی زور آزمائی کی وجہ سے میری کھوپڑی وہاں سے ہٹ چکی تھی اور دستہ ٹھک کی زوردار آواز کے ساتھ تنے سے ٹکرایا تھا۔

دلبر خان نے فوراً مجھ پر کوئی حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی بلکہ تیزی سے مجھ سے دور ہو گیا۔ میں تیزی سے اس شخص کی طرف گھوما جس کی وجہ سے پل بھر میں پانسا پلٹ گیا تھا لیکن اس پر حملہ کرنے کے بجائے مجھے رک جانا پڑا کیوں کہ اس کے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف کا رخ میری طرف ہو چکا تھا۔

وہ ایک عجیب و غریب ڈراؤنی سی شخصیت تھی۔ اس قسم کی شخصیتوں کو عام طور پر ہمارے ہاں فلموں میں جن کا کردار دیا جاتا ہے۔ میک اپ وغیرہ سے انہیں مزید بھیانک بنایا جاتا ہے اور کیمرا ٹرک سے انہیں ان کی اصلی جسامت سے بڑا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

تاہم وہ شخص اپنی اصلی جسامت میں بھی چھوٹا موٹا جن ہی تھا۔ قد تو اس کا تقریباً میرے برابر ہی تھا لیکن چوڑائی میں وہ مجھ سے تقریباً دو ڈھائی گُنا پھیلا ہوا تھا اور اس کی توند کسی گنبد سے کم نہیں تھی۔ تھل تھل کرتا یہ گنبد یا جیلی کا چھوٹا سا پہاڑ اس وقت بھی دھیرے دھیرے تھرک رہا تھا۔

وہ شخص جو شلوار پہنے ہوئے تھا اس میں یقیناً ایک خیمے جتنا کپڑا صرف ہوا ہو گا۔ جسم کے بالائی حصے پر صرف واسکٹ تھی جس کے بٹن کھلے تھے۔ اسی لیے اس کی گنبد نما توند کا نظارہ بلا رکاوٹ کیا جا سکتا تھا۔ گلے میں دو تین بڑے بڑے تعویز جھول رہے تھے۔ اس کی کھوپڑی پر بالوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ گلابی چندیا دھوپ میں آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کی رنگت سرخ و سپید تھی مگر مجموعی طور پر وہ ایک بدصورت شخص تھا۔

اس کے ہونٹ موٹے موٹے تھے اور رخساروں پر اس قدر گوشت تھا کہ آنکھیں تقریباً چُھپ کر رہ گئی تھیں۔ بھویں برائے نام تھیں۔ داڑھی مونچھیں بھی صاف تھیں۔ عجیب چھلا چھلا سا چہرہ تھا۔ وہ گندمی، سانولے اور پُرکشش نقوش والے چہروں کی سرزمین سندھ کا باشندہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ تبت کے پہاڑوں سے اُترے ہوئے کسی لاما سے ملتی جُلتی قسم کی چیز نظر آ رہا تھا۔ ناک بھی چپٹی تھی لیکن اس جسامت اور تن و توش کا کوئی تبتی باشندہ میں نے کسی فلم میں بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بازو شہتیروں سے کم

نہیں تھے۔ کلاشنکوف اس کے ہاتھوں میں کھلونا معلوم ہو رہی تھی۔

پس منظر میں خاصی دور مجھے ایک گھوڑا گھاس چرتا نظر آیا۔ جب میں دینو کے مکان کی چھت پر تھا تو مجھے آس پاس کہیں کوئی گھوڑا نظر نہیں آیا تھا۔ اس طرف زمین بھی کچی اور نرم تھی۔ دھول اُڑ رہی تھی۔ شاید وہ دیو زاد کچھ دور تک گھوڑے پر آیا تھا اور باقی فاصلہ اس نے پیدل طے کیا تھا۔

دو باتیں میرے لیے خاصی حیرت کا باعث تھیں۔ ایک تو اس گھوڑے کا صبر و استقامت اور مضبوطی جو اس دیوزاد کو پشت پر اٹھا کر لایا تھا۔ دوسرے اس دیوزاد کی چالاکی اور مشاقی قابل داد تھی جو کچھ فاصلہ گھوڑے پر اور کچھ پیدل طے کرکے میرے عقب میں آن پہنچا تھا اور مجھے پتا نہیں چل سکا تھا۔

ایک لمحے میں میں نے یہ سب کچھ سوچا، سب کچھ دیکھا اور دوسرے ہی لمحے دلبر خان کے آدمی فاتحانہ نعرے بلند کرتے چاروں طرف سے میری طرف بڑھے۔ ان کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ خالی ہاتھوں سے ہی میری تِکا بوٹی کر ڈالیں گے۔ میں اس یلغار کے لیے تیار تھا۔ نہتّے لوگوں کے حملے سے میں زیادہ خوفزدہ نہیں تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس تھل تھل کرتے دیوزاد نے کلاشنکوف کا ٹریگر نہیں دبایا تھا۔

شکل صورت سے نہ جانے کیوں وہ ذہنی طور پر مجھے کچھ پسماندہ سا دکھائی دیا تھا لیکن اس نے کم از کم اتنی عقلمندی ضرور دکھائی تھی کہ اندھا دھند کلاشنکوف نہیں چلائی تھی۔ اسے غالباً احساس تھا کہ اندھا دھند مجھ پر برسٹ مارنے کی صورت میں دلبر خان یا اس کے آدمی بھی گولیوں کی زد میں آسکتے تھے۔

ویسے مجھے یہ بھی احساس تھا کہ اس شخص کی محض شکل دیکھ کر مجھے اس کی ذہنی حالت کے بارے میں زیادہ خوش فہمی میں نہیں رہنا چاہیے تھا۔ ایسے نظر آنے والے لوگ بعض اوقات بلا کے مکار ثابت ہوتے ہیں۔ اس کی آمد کا انداز اس بات کی دلیل تھا۔

میں اپنی پوری قوت کو مجتمع کیے ان لوگوں کے نرغے سے نکل جانے کے لیے تیار تھا لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوسکوں گا یا نہیں۔ دوسرے ہی لمحے مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ دلبر خان نے چیخ کر اور دونوں ہاتھ بلند کرکے اپنے آدمیوں کو مجھ پر حملہ آور ہونے سے روک دیا۔

وہ رک تو گئے لیکن انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے بھیڑیوں کے سامنے سے اچانک ان کا شکار ہٹا لیا گیا ہو۔ ایک لمحے کے لیے گویا سارا منظر ساکت ہوگیا۔ ہر ایک جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ میرے اعصاب داملن کے تاروں کی طرح تنے ہوئے تھے۔ میں اب بھی منتظر تھا کہ کوئی مجھ پر حملہ آور ہو تو میں کچھ کروں لیکن ایسا نہیں ہوا۔ دلبر خان کے ایک اشارے اور حکم نے گویا بپھرے ہوئے درندوں کی یلغار کو روک دیا تھا۔

اس وقت صرف میں ہی نہیں، مومل بھی ان لوگوں کے نر[غے] میں تھی اور اسے بھی صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوچکا [تھا]۔ اس کی تندی و تیزی جیسے یکدم ہی ہوا ہوگئی تھی۔ شاید وہ اس [قسم] کے لوگوں میں سے تھی جن پر جذبات آندھی طوفان کی طرح [طاری] ہوتے ہیں اور جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کی پھٹی [پھٹی] آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس طرح اچانک پانسا پلٹ جانے پر سخت خوفزدہ تھی اور شاید فرار کے لیے راستہ تلاش کررہی تھی۔

وہ ایک لمحہ جس میں منظر ساکت ہوکر رہ گیا تھا، مجھے [بہت] طویل محسوس ہوا۔ پھر جونہی دلبر خان کے اوپر اٹھے ہوئے باز[و نیچے] آئے گویا سکوت یک دم ہی ٹوٹ گیا۔ دلبر خان مسکراتا ہوا نہا[یت] ڈرامائی انداز میں میری طرف بڑھا۔ تب اچانک ہی ایک خیا[ل] میرے ذہن میں ابھرا۔

شاید دلبر خان نے اس لیے اپنے آدمیوں کو میری تِکا [بوٹی] کرنے کا موقع نہیں دیا تھا کہ وہ خود مجھ پر "طبع آزمائی" کرنا [چاہتا] تھا۔ اسے چند لمحے کے لئے جو ذلت سی اٹھانا پڑی تھی اس [کے] جواب میں شاید وہ خود میری دُرگت بنانا اور اس کام سے لط[ف] اندوز ہونا چاہتا تھا۔ وہ اس لذت میں کسی اور کو شریک کرنا [نہیں] چاہتا تھا۔

میرے لیے اس کا یہ ارادہ زیادہ پریشانی کے بجائے اطمینان کا باعث تھا۔ اس قسم کی صورت حال سے مجھے ک[ئی بار] واسطہ پڑ چکا تھا کہ کسی وحشی ٹولے کا سردار اپنے زعم میں ا[پنے] ساتھیوں کو پیچھے ہٹا کر مجھے "سبق سکھانے" کے ارادے سے آگیا۔ مجھے اس کو قابو میں کرنے کا کوئی نہ کوئی موقع مل ہی جا[تا] اور یوں صورت حال میرے حق میں پلٹ جاتی تھی۔

مجھے کچھ امید سی نظر آئی کہ شاید دلبر خان اپنی کسی حماقت [کی] وجہ سے ایک بار پھر میرے قابو میں آجائے اور میں اسے ڈھا[ل بنا] لوں لیکن اب اس کا کوئی خاص فائدہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ا[س دیو] زاد کی آمد نے اب صورت حال بالکل بدل دی تھی جس کے [ہاتھ] میں کلاشنکوف تھی۔ اب میں ہر طرف سے ہی گھرا ہوا تھا، کوئی سائڈ خالی نہیں تھی۔ اس صورت میں میرا دلبر خان کو ڈھال [بنانے] کا حربہ کامیاب نہیں ہوسکتا تھا۔ میں اگر اسے ڈھال بنا کر دیوزاد کے سامنے کرتا تو پیچھے سے دلبر کے باقی آدمیوں میں سے کوئی بھی ہوشیاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ بھی کرسکتا تھا اور اگر میں رخ ان لوگوں کی طرف رکھتا تو دیوزاد اپنی کلاشنکوف سے کوئی کام دکھا سکتا تھا۔

اس کے باوجود میں کچھ نہ کچھ کر گزرنے کے ارادے [سے] مستعد رہا لیکن اچھا ہی ہوا کہ میں نے دلبر خان پر ہاتھ چھوڑ[نے میں] زیادہ پھرتی نہیں دکھائی اور پہلے یہ دیکھنے کا منتظر رہا کہ وہ کیا [کرتا] ہے۔

دلبر خان نے قریب آکر مجھے تھپڑ، گھونسا یا لات رسید کر[نے کی]

کوشش نہیں کی بلکہ کچھ یوں میرا جائزہ لینے لگا جیسے کسی میکینک کے سامنے کوئی نئی قسم کی مشین آگئی ہو اور وہ اس کی ساخت کو سمجھنے کی کوشش کررہا ہو۔

میرا گریبان کھلا ہی نہیں بلکہ اب تو کچھ پھٹا ہوا بھی تھا اور میں شکستہ حالی کا ایک خاصا قابل رحم سا نمونہ دکھائی دے رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی حالت پر ذرا شرم بھی محسوس ہوئی لیکن پھر میری حیرت بڑھتی چلی گئی۔ دلبر خان کی آنکھوں میں میرے لیے ستائش و تحسین کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ میری شکستہ حالی اور بے بسی پر ہنسنے کے بجائے مجھ سے بے پناہ مرعوب اور متاثر نظر آرہا تھا۔

پھر اس نے ایک اور عجیب کام شروع کردیا۔ اس نے میرے بازوؤں کو ٹٹولا، ان کے مسلز دبا کر اور دونوں ہاتھوں سے گویا ان کی پیمائش کرکے دیکھی، میرے سینے پر یوں ہولے ہولے گھونسے مار کر دیکھے گویا کسی دیوار کی مضبوطی کا اندازہ کررہا ہو۔ کئی لمحے تک اس نے کچھ اسی طرح مجھے ٹٹولا اور پرکھا جیسے قصائی قربانی کے لیے کسی عمدہ جانور کا جائزہ لے رہا ہو۔

بالآخر اس کا معائنہ مکمل ہوگیا اور وہ میرے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "دوست! تم واقعی شیر جوان ہو۔ تمہیں جب موقع میسّر تھا تو تم نے ہم پر گولی نہیں چلائی، ہمیں قتل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تم نے کہا تھا کہ تم ہمارے ساتھ اچھائی کرنا چاہتے ہو اور دیکھنا چاہتے ہو کہ ہم اس کے جواب میں کیا کرتے ہیں..."

میں کہنا چاہتا تھا۔ "ہاں۔ میں نے کہا تو تھا لیکن مجھے جواب میں تم سے اچھائی کی کوئی توقع نہیں تھی۔ بس ایک نہایت ہی موہوم سی امید تھی۔ شاید وہ خود فریبی ہی کی کوئی صورت تھی۔"

لیکن میں نے زبان سے یہ بات نہیں کہی اور خاموش ہی رہا۔ اس کی تمام حرکات و سکنات پر میری نظر تھی۔ مجھے اب بھی اندیشہ تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اچانک اور غیر متوقع طور پر مجھ پر کوئی خطرناک وار کرسکتا تھا۔

مگر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ہم اس کے جواب میں یہ کررہے ہیں کہ تمہیں انگلی بھی نہیں لگائیں گے۔ تم نے اب تک جو کچھ بھی کیا اس کے لیے ہم نے تمہیں معاف کیا۔ اب تم ہمارے مہمان ہو۔ اس لمحے اور اس گھڑی سے تم ہماری پناہ میں ہو، ہماری امان میں ہو۔"

میں نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا جو بری طرح مار کھا کر زمین پر پڑے تھے۔ ابھی تک انہوں نے زمین سے اٹھنے کی جرأت نہیں کی تھی اور اب خوفزدہ نظروں سے حالات کی اس نئی کروٹ کا جائزہ لے رہے تھے۔

"یہ شریف لوگ..." میں نے ملائمت سے کہا پھر دینو کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک بینچ پر بیٹھا تھا اور حالات کو پلٹا کھاتے دیکھ کر بھی جس کی آنکھوں میں امید کی کرن نہیں ابھری تھی۔ "یہ بے چارہ نیک دل انسان... ایک جوان لڑکی کا باپ..." پھر میں نے مومل کی طرف اشارہ کیا جو ابھی تک دم بخود کھڑی تھی۔ "یہ جذباتی اور سادہ لوح سی لڑکی... یہ سب لوگ بھی تمہاری پناہ اور امان میں تھے۔ یہ سب کمزور اور تمہارے فرماں بردار بھی تھے۔ ان کے ساتھ تم نے کیا سلوک کیا؟ اس کے بعد بھی کیا میں اپنے لیے کسی اچھے سلوک کی امید رکھ سکتا ہوں!"

دلبر خان کے تاثرات ایک لمحے کے لیے تبدیل ہوئے۔ اس کے چہرے پر وہی سخت گیری اور سفاکی واپس آنے لگی جو اس کی شخصیت کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی لیکن پھر اس نے گویا اپنے آپ کو سنبھال لیا۔ اس کے انداز میں یکدم بڑا ٹھہراؤ سا آگیا تھا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "ہم اس علاقے کے حاکم ہیں اور حکمرانی کے ہمارے اپنے کچھ طور طریقے ہیں۔ ہم اس زمین کو... اور اس زمین پر رہنے والوں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ تم یقیناً یہاں اجنبی ہو۔ میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو، کیوں آئے ہو لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ تم ان معاملات میں دخل نہ دو۔ جب تک ضرورت محسوس کرو ہماری میزبانی کا لطف اٹھاؤ اور پھر اپنی جان سلامت لے کر اپنا رستہ پکڑ لو، اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ خدائی فوجدار بننے کی کوشش مت کرو۔ آج کے زمانے میں خدائی فوجداروں کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔"

"درست کہا تم نے۔" میں نے بھی ملائمت سے کہا۔ "لیکن خدائی فوجداری کے جراثیم خود بخود خون میں شامل ہو جاتے ہیں۔ وہ وقت یا زمانہ نہیں دیکھتے۔ ویسے بھی... ہو سکتا ہے جو تمہاری نظر میں خدائی فوجدار ہو وہ دراصل امن، انصاف اور سب انسانوں کے لیے عزت و آبرو کا کوئی ادنٰی سا طلبگار ہو۔"

دلبر خان کی مسکراہٹ گہری ہوگئی اور اس کا ایک ہاتھ غیر ارادی انداز مونچھ کی طرف چلا گیا۔ نہایت آہستگی سے مونچھ کو بل دیتے ہوئے وہ پُرخیال اور گہری نظروں سے گویا ازسرِنو میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہو۔ شہر سے تو نہیں بھاگے ہو؟ کوئی مفرور لیڈر تو نہیں ہو؟"

"نہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں اور صرف اپنے لیے نہیں، سب کے لیے امن، محبت، انصاف اور سکون کی تلاش میں ہوں۔" میں نے پلکیں جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"خیر..." وہ بدستور مونچھ کو بل دیتے ہوئے گہری سانس لے کر بولا۔ "ہم جب معلوم کرنا چاہیں گے کہ تم کون ہو، کہاں سے آئے ہو اور کیوں آئے ہو، تو کسی نہ کسی طرح معلوم کر ہی لیں گے۔ فی الحال تمہاری دلداری کے لیے ہم ان لوگوں سے کچھ محبت کا سلوک کر دیتے ہیں..." اس نے دینو اور دوسرے دکانداروں وغیرہ کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ سب ہمارے اپنے ہی لوگ ہیں۔ ان کے

ساتھ کبھی ہماری نرمی، کبھی سختی، کبھی گرمی چلتی ہی رہتی ہے۔ ہم سب کو یہیں رہنا ہے اور ہم ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔"

دلبر خان کم از کم لب و لہجے سے اب ایک قطعی بدلا ہوا انسان معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو تیزی سے ہدایات دیں۔ وہ ان ہدایات پر کچھ خوش نظر نہیں آئے۔ ان کے چہروں پر ہلکی سی ناگواری تھی تاہم انہوں نے ان پر عمل شروع کر دیا۔ انہوں نے زمین پر پڑے دکانداروں کو ایک ایک کر کے اٹھایا، ان کے کپڑے جھاڑے اور معذرت خواہانہ انداز میں سہارا دے کر کچھ دور پڑی بینچوں اور چارپائیوں پر بٹھا دیا۔

انہوں نے دینو کے چہرے سے رستا ہوا خون بھی ایک کپڑے سے صاف کیا۔ اس کی کمر تھپتھپائی، ہاتھ پاؤں سہلائے۔ وہ بے چارہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ دلچسپ بات یہ تھی کہ اس کی دلجوئی محبت علی کر رہا تھا جس نے کچھ دیر پہلے بے رحمی سے اس کی دھنائی کی تھی اور پھر میرے ٹانگ اڑانے پر ہی اس کی جان بچی تھی۔

یہی نہیں، ان لوگوں نے دینو اور دیگر دکانداروں سے چھینے ہوئے پیسے بھی نکال کر، ان سے پوچھ پوچھ کر... کہ کس کی کتنی رقم تھی، واپس کرنے شروع کر دیے۔ وہ بے چارے کانپتے ہاتھوں سے اپنے پیسے واپس لے رہے تھے۔

موٹل کو بھی آچرنے ہی نہ صرف مشفقانہ انداز میں تھپکی دے کر گھر جانے کی ہدایت کی بلکہ ہاتھ جوڑ کر اس سے معافی بھی مانگی۔ موٹل گرتی پڑتی گھر کی طرف چل دی۔ ان کا طرزِ عمل بلاشبہ حیرت انگیز تھا۔ دلبر خان نے انہیں یہ احکامات اس وقت دیے تھے جب وہ میرے قابو میں نہیں بلکہ میں اس کے قابو میں تھا اور وہ مجھ سے جو سلوک چاہتا، کر سکتا تھا یا کم از کم کوشش تو کر سکتا تھا۔

میں نے دینو کے مسمار شدہ چھپر ریستوران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اس غریب کا ہوٹل بھی تو تباہ ہوا ہے۔ نیچے دب کر ساری چیزیں بھی خراب ہو گئیں۔"

میرا خیال تھا کہ اس کے جواب میں دلبر خان کہے گا۔ "یار! اب اتنا بھی پھیلنے کی کوشش نہ کرو۔ جو کچھ میں نے کر دیا ہے وہی کیا کم ہے۔"

میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ چلو موقعے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بات کرنے میں کیا حرج ہے لیکن اس وقت مجھے ایک اور حیرت کا سامنا کرنا پڑا جب دلبر خان نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر بے پروائی سے کہا۔ "اڑے ..... یہ بھی بنوا دیں گے یار، یہ کون سا تاج محل تھا۔"

"میرے لیے تو تاج محل ہی تھا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی چار دیواری اٹھائی تھی۔" میں نے اپنے کھردرے اور مٹی میں لتھڑے ہوئے ہاتھ پھیلا کر ان کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

وہ دوستانہ انداز میں میرا ہاتھ تھام کر گویا اس کی مضبوطی کا اندازہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ ہاتھ اینٹیں اور گارا ڈھونے کے لیے نہیں ہیں۔ ان سے کوئی بڑا کام لینا سیکھو۔ بڑے لوگوں سے دوستی کرو۔ ان ہاتھوں کے صرف اشارے سے بڑے بڑے ہوٹل تعمیر ہو جائیں گے۔"

اسے نہیں معلوم تھا کہ ان ہاتھوں نے کیا کیا کام کیے تھے اور ان کے اشارے پر واقعی ایک فائیو اسٹار ہوٹل تعمیر ہو چکا تھا۔ جو ہاتھ اس نے تھاما ہوا تھا، وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس کے دستخطوں سے کتنی دولت ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر ہو چکی تھی۔ کبھی کبھی ناآگہی میں بڑی معصومیت ہوتی ہے۔ وہ جسے بڑے آدمیوں سے دوستی کا سبق سکھا رہا تھا، بہت سے بڑے آدمی اس سے دوستی رکھنے کے کتنے خواہش مند تھے، اس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے محسوس کیا کہ میں اس صورتِ حال اور دلبر خان کی باتوں سے محظوظ ہو رہا تھا۔ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "کیا واقعی...؟"

پھر میں نے اپنے چہرے پر مایوسی طاری کر لی اور کہا۔ "ہم غریبوں کی بڑے آدمیوں سے دوستی کہاں ہو سکتی ہے!"

وہ سینے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "ہم کرائیں گے بڑے آدمیوں سے تمہاری دوستی۔ ہم خود یہاں بہت بڑے آدمی ہیں۔ سائیں مراد کے بعد ہم ہی یہاں کے حاکم ہیں۔ بہت دور دور تک اپنا حکم چلتا ہے اور اثر رسوخ ہے۔ ہم تمہیں سائیں مراد سے بھی ملوائیں گے۔ شرط بس یہی ہے کہ تم ہمیں اپنا دوست سمجھو اور خود کو بھی ہمارا دوست ثابت کرو۔"

شبہ تو مجھے پہلے ہی تھا لیکن اس لمحے اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی جال بچھا رہا تھا، میرے لیے دانہ پھینک رہا تھا مگر یہ اندازہ کرنا فی الحال میرے لیے مشکل تھا کہ وہ جال کس قسم کا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ مجھے محض طاقتور اور لڑائی بھڑائی میں ایک ماہر شخص سمجھ کر اپنے گرگوں میں شامل کر لینا چاہتا ہو۔ اسے یہ اندازہ تو یقیناً ہو گیا ہو گا کہ میں اس کے لیے بہت کارآمد آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔ مجھے ضائع کرنے کی نسبت اپنا اثاثہ بنا لینے میں زیادہ فائدہ تھا۔

"اگر تم مجھے اپنا دوست سمجھنے کے لیے تیار ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں ہر خدمت کے لیے حاضر ہوں۔" میں نے اپنے لہجے میں سعادت مندی کی جھلک پیدا کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو تم سے... یا کسی سے بھی دشمنی مول لینے کا کوئی شوق نہیں۔ مجھ میں بس یہ بڑی خرابی ہے کہ میں کمزور پر ظلم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔"

"یہ تو بڑی اچھی عادت ہے۔" دلبر خان نے سر ہلایا۔ "لیکن ٹانگ صرف وہاں اڑانی چاہیے جہاں انسان لوگوں سے اور حالات سے واقف ہو۔ بعض جگہ لوگ بظاہر بڑے کمزور اور مظلوم نظر

آتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں۔ خیر... چھوڑو ان باتوں کو۔ ادھر آؤ، چارپائی پر بیٹھتے ہیں اور کچھ کام کی باتیں کرتے ہیں۔"

اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک درخت کی چھاؤں میں پڑی ہوئی چارپائی کی طرف لے چلا لیکن پھر رک کر دکانداروں سے مخاطب ہوا۔ "تم لوگ بھی اپنے اپنے کام دھندے پر جاؤ بابا! پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم لوگ جس حساب سے پہلے ٹیکس دیتے رہتے تھے اسی حساب سے دیتے رہنا۔ ہمارے اس سنگتی (دوست) پہلوان سے ملاقات کی خوشی میں ہم تمہاری ہر بات تمہارے کہنے سے پہلے ہی ماننے کے لیے تیار ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے فخریہ انداز میں میرا کندھا تھپتھپایا جیسے واقعی برسوں سے بچھڑے ہوئے کسی دوست سے ملاقات ہو گئی ہو اور وہ اس پر بہت خوش ہو۔

دکانداروں میں اٹھنے کی ہمت نہیں تھی۔ کچھ تو مار پٹائی نے ان کی حالت خراب تھی۔ شاید وہ آسانی سے اٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل نہیں تھے۔ کچھ انہوں نے ویسے ہی گویا خود کو دلبر خان کا قیدی بنا لیا تھا۔ انہیں جیسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ دلبر خان نے انہیں معاف کر دیا ہے، رہائی دے دی ہے۔ وہ الجھن زدہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

"اڑے بابا...! سنا نہیں کیا؟" دلبر خان گرجا۔ "میں بولتا ہوں جاؤ بھاگ جاؤ۔ اپنا اپنا کام دھندا دیکھو... اور ہاں... دیکھو... یہاں جو کچھ ہوا ہے اس کا دوسرے لوگوں سے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ سمجھ گئے نا؟"

سب نے خوفزدہ سے انداز میں اثبات میں سر ہلا دیا اور گرتے پڑتے وہاں سے رخصت ہو لیے۔ تب دلبر خان، دینو سے مخاطب ہوا۔ "بھئی تمہارا یہ اسٹرکان تو اب کل پرسوں تک ہی مرمت ہو سکے گا۔ فی الحال تم ایسا کرو، اپنے گھر سے ہی کوئی چائے پانی کا بندوبست کرو۔ یوں سمجھو آج ہم سب تمہارے ہوٹل پر نہیں بلکہ تمہارے گھر پر مہمان آئے ہیں۔"

"بھلی کرے آیا سائیں!" دینو ہاتھ جوڑ کر اٹھتے ہوئے بولا پھر وہ کراہتا اور لنگڑاتا ہوا تیزی سے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

دلبر خان نے عقب سے آواز دے کر اسے روکا اور کہا۔ "یہ آچر بھی تمہارے ساتھ آ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ ساری کلاشنکوفیں بھی بھیج دینا۔ بس... اب بھول جاؤ کہ یہاں کوئی لڑائی جھگڑا ہوا تھا۔"

دینو نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور گرتا پڑتا چل دیا۔ آچر اس کے پیچھے ہو لیا۔ دلبر خان میرا بازو تھامے چارپائی کی طرف بڑھا۔ وہ دیوزاد جو ابھی تک کلاشنکوف سنبھالے بت کی طرح ساکت کھڑا تھا، عجیب انداز میں قدم اٹھاتا، دھپ دھپ کرتا ہمارے پیچھے آنے لگا۔ کلاشنکوف کا رخ اس نے ابھی تک میری طرف ہی رکھا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ اپنی بٹن جیسی آنکھیں بہت کم جھپکتا تھا۔ اب تک میں نے اسے بولتے نہیں سنا تھا۔ وہ خاموشی کے معاملے میں اتنا ثابت قدم تھا کہ مجھے اس پر گونگا ہونے کا شبہ ہونے لگا تھا۔

دلبر خان نے پہلے مجھے بٹھایا پھر خود بیٹھا۔ اس کا اشارہ پا کر اس کے آدمی بھی اردگرد کی چارپائیوں پر بیٹھ گئے۔ دیوزاد عین میرے سامنے تقریباً پانچ فٹ کے فاصلے پر مجھ پر کلاشنکوف تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی حرکات و سکنات کسی حد تک روبوٹ سے مشابہ تھیں مگر اس کی بٹنوں جیسی آنکھیں تاثرات سے عاری نہیں ہیں، ان میں ایک عجیب قسم کی کمینگی پنہاں تھی۔

دلبر خان کی توجہ اب جیسے اچانک ہی اس کی طرف گئی۔ اس کا دھیان اب تک اس کی طرف سے ہٹا ہی رہا تھا۔ وہ یکدم چونک کر بولا۔ "ارے ہوشو خان! تم ابھی تک کلاشنکوف اٹھائے کیوں چل رہے ہو؟ تم نے سنا نہیں، اب اس سے ہماری صلح ہو گئی ہے..."

اس نے میرے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "اب یہ ہمارا مہمان ہے... سنگتی ہے "مائٹ" (عزیز) ہے... وری اب اس کے اوپر بندوق تان کر ہماری بے عزتی نہیں کروانی۔ یہ کیا سوچے گا کہ ہمارے ہاں مہمان کی عزت اس طرح ہوتی ہے؟"

تب مجھے معلوم ہوا کہ اس دیوزاد کا نام ہوشو تھا۔ پہلی بار میں نے اس کے موٹے موٹے اور لٹکے ہوئے سے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوتے دیکھی جس کی وجہ سے اس کی بٹن جیسی آنکھیں رخساروں پر چڑھے ہوئے گوشت میں کچھ اور چھپ گئیں۔ اس نے کلاشنکوف جھکا لی۔

دلبر خان نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس نے اپنے لیے ایک چارپائی کسی کھلونے کی طرح کھینچ لی۔ وہ ہمارے عین مقابل بیٹھ گیا۔ معلوم نہیں کیوں وہ بغور میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ دلبر خان اس کی ٹانگ پر جو کسی ہاتھی کی ٹانگ سے کم نہیں تھی، تھپکی دیتے ہوئے بڑے پیار سے بولا۔ "آج تو میرے پیارے ہوشو خان نے وہ کام دکھایا ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا اسے کیا انعام دوں؟"

تب میں نے پہلی بار اس دیوزاد کی آواز سنی۔ اس نے قہقہہ لگایا تھا اور بالکل ایسا ہی محسوس ہوا تھا جیسے ایک ڈرم میں بہت سے پتھر ڈال کر اسے سڑک پر لڑھکا دیا گیا تھا۔ اسی گڑگڑاہٹ کے درمیان وہ بولا۔ "میرا انعام تو آپ کو معلوم ہی ہے سائیں!"

اس کی ایک آنکھ معنی خیز انداز میں بالکل ہی دب گئی اور گڑگڑاہٹ سے مشابہ قہقہہ کچھ مزید طول کھینچ گیا۔ دلبر خان جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھٹنا تھپکتے ہوئے بولا۔ "صبر کر... صبر کر... وہ بھی ہو جائے گا۔ ابھی حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ تو دیکھ نہیں رہا، کیٹی میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔"

"ہا... ہا..." دیوزاد نے منہ پھاڑ کر حلق سے عجیب سی آواز

نکالی۔ "کب تک صبر کروں؟ اس دنیا میں سب عیش کر رہے ہیں، ایک مجھے ہی اکثر صبر کرنا پڑتا ہے۔" اس نے مٹھیاں بھینچ کر چارپائی کی پٹی پر ہلکے سے گھونسے مارے۔ چارپائی جو اس کے بوجھ تلے پہلے ہی چرچرا رہی تھی، بری طرح لرز کر رہ گئی

"کیا کریں... تیری لائن ہی بڑی اُلٹی ہے۔ اگر تو بھی سیدھے سادے انسانوں کی طرح کسی انسان کا بچّہ ہوتا تو کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔" دلبر خان مسکراتے ہوئے بولا۔ "اور کچھ نہیں ہوتا تو کوئی تیرے جیسی دیونی ڈھونڈ کر تیری شادی ہی کرا دیتے۔ لیکن خیر... فی الحال تو زبان بند رکھ۔ ابھی تو تجھے بڑے ضروری کام کرنے ہیں۔"

میں ان کی گفتگو کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں نے قیاس کے گھوڑے دوڑانے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی تاہم مجھے ان الفاظ سے کسی گھٹیا پن کی بُو ضرور آ رہی تھی اور شاید میری ہی وجہ سے دلبر خان نے موضوع بدل دیا تھا۔ دلبر خان کے آدمیوں میں سے بعض کے ہونٹوں پر بڑی معنی خیز سی مسکراہٹ تھی۔

اچانک دلبر خان میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ "یار! میں نے ابھی تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا۔ میں تمہیں کریدنا نہیں چاہتا۔ اپنے بارے میں جو بھی مناسب سمجھتے ہو، بتا دو۔ میں کوئی سوال نہیں کروں گا۔"

"میرا نام افضل خان ہے۔" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ "میں کسی مجبوری کی وجہ سے اپنا شہر چھوڑ کر نکلا ہوں۔ بہرحال میں کوئی مفرور مجرم نہیں ہوں۔ پولیس میرے پیچھے نہیں ہے۔"

"بالکل ٹھیک۔" دلبر خان نے طمانیت سے سر ہلایا۔ "میرا بھی تمہارے بارے میں یہی خیال تھا۔ تمہارا حلیہ دیہاتیوں والا ہے لیکن میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ آدمی تم شہری ہو۔"

اس دوران آچر، دینو کے گھر سے تمام کلاشنکوفیں لے آیا تھا اور سب نے اپنی اپنی کلاشنکوف سنبھال لی تھی۔ ان کی گنیں ان کے ہاتھوں میں واپس آتے دیکھ کر ایک بار پھر میرے اعصاب میں ہلچل سی ہوئی کہ امن پسندی اور دوستی کا ڈراما اب ختم ہونے کو تو نہیں ہے لیکن میرا اندیشہ غلط ہی ثابت ہوا۔ ماحول پُرسکون ہی رہا۔ سب نے اپنی اپنی گن گود میں رکھ لی تھی۔ بالکل پنچایت کا سا سماں تھا۔

دلبر خان، ہوشو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "افضل خان! یہ ہوشو خان ہے۔ اس کا پورا نام ہوش مردان خان ہے لیکن یہ ہماری کیٹی اور آس پاس کی کیٹیوں میں صرف ہوشو کے نام سے مشہور ہے۔ یہ پوری دنیا کا... ہمارے ملک کا... یا اس صوبے کا نہ سہی لیکن کم از کم اس علاقے کا ایک عجوبہ ضرور ہے۔ بہت طاقتور آدمی ہے۔ یہ اپنے اوپر تختے رکھ کر ٹریکٹر گزروا سکتا ہے۔ سینے پر پتھر کی سلیں رکھ کر تڑوا سکتا ہے..."

دلبر خان بڑی اپنائیت سے ہوشو خان کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ہوشو خان کی بھی باچھیں کھل گئیں اور نہ جانے کیوں بن مانس کی طرح دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں سی بھینچ کر اپنا سینہ پیٹنے لگا۔ "بھد بھد" کی کچھ ایسی ہی آوازیں بلند ہوئیں جیسی گوشت اور چربی کے انبار کو کوٹنے پیٹنے سے برآمد ہو سکتی تھیں۔

دلبر خان شاید اس کا کچھ زیادہ ہی تفصیلی تعارف کرانے پر تلا ہوا تھا، بات جاری رکھتے ہوئی بولا۔ "بنیادی طور پر یہ ایک ملھ ہے۔ ملھ سمجھتے ہو نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا لیکن وہ پھر بھی وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "مخصوص سندھی کشتی ملاکھڑا لڑنے والے پہلوان کو ملھ کہا جاتا ہے۔ بہت سیدھی سادی سی کشتی ہوتی ہے۔ دونوں پہلوان ایک دوسرے کی کمر پر بندھا ہوا کپڑا یا شلوار پکڑ کر ایک دوسرے کو اٹھا کر پٹخنے اور چت کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن ہوشو کو اب اس کشتی سے کوئی دلچسپی نہیں رہی بلکہ ہوشو کو ہی کیا، اب تو کشتیاں دیکھنے والوں کو بھی اس سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ اس قسم کے مقابلے صرف سرکاری سرپرستی میں ہی منعقد ہوتے ہیں اور زیادہ لوگ انہیں دیکھنے نہیں آتے۔ تماشائیوں کی تعداد دن بہ دن گھٹتی جا رہی ہے۔"

"تو اب کیا یہ لڑنے کے لیے میڈیسن گارڈن اسکوائر جا رہا ہے... ورلڈ ریسلنگ فیڈریشن کے مقابلوں میں حصہ لینے کے لیے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

وہ میرے لہجے میں چھپے طنز کو شاید نظر انداز کرتے ہوئے یا نہ سمجھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔ "ظاہر ہے وہاں تک تو ہماری رسائی نہیں ہے۔ ہم یہیں اپنا شغل میلہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنا اور اپنی رعایا کا دل خوش کرنے کا بندوبست کرتے رہتے ہیں..."

میں ایک بار پھر دل ہی دل میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ گفتگو میں نہایت اطمینان سے وہاں کے لوگوں کے لیے "رعایا" کا لفظ استعمال کرتا تھا۔ غنیمت تھا کہ وہ اپنے لیے بادشاہ سلامت کا لقب استعمال نہیں کرتا تھا تاہم اپنے اور اپنے ساتھیوں کے لیے "حاکم" اور "حکومت" وغیرہ کے الفاظ تو استعمال کر چکا تھا۔

وہ سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ظاہر ہے، اس ویرانے میں لوگوں کے لیے تفریح کے کوئی خاص ذرائع نہیں ہیں لیکن ہم اپنی سی کوشش کر کے کچھ نہ کچھ شغل میلہ کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اب ملاکھڑے وغیرہ سے لوگ زیادہ خوش نہیں ہوتے۔ ٹی وی اور اخباروں کے ذریعے دنیا بھر کی باتیں دور دراز کے کونے کھدروں تک بھی پہنچ جاتی ہیں۔ یہاں بھی لوگوں کو ایکٹروں، ایکٹرسوں اور ٹی وی پر کام کرنے والوں کے بارے میں کافی کچھ معلوم ہے۔ فری اسٹائل ریسلنگ کا بھی کافی پتا ہے۔ میری حویلی کے علاوہ بھی جب سے کیٹی میں بجلی آئی ہے، دو چار ٹی وی بھی آ گئے ہیں۔ جب حالات ذرا اچھے تھے تو ان کے سامنے رات تک لوگوں کا رش رہتا تھا اور ہم بھی اپنے لوگوں کی تفریح کا کوئی نہ کوئی سامان کرتے رہتے تھے..."

میں پوچھنا چاہتا تھا۔ "کیا ویسا ہی سامان جیسا کچھ دیر پہلے دینو اور دوسرے دکانداروں کے لیے کیا تھا؟" لیکن اجنبی ماحول میں کچھ نہ کچھ مصلحت کوشی برتتے رہنا چاہیے تھا اس لیے میں خاموش رہا۔

دلبر خان کہہ رہا تھا۔ "کبھی ہم قریب کے شہروں سے چھوٹے موٹے، سستے اور غیر مشہور قسم کے اسٹیج کے آرٹسٹ وغیرہ پکڑ لاتے تھے لیکن یہاں ان کی زبردست شہرت کر دیتے تھے کہ ٹی وی اور فلم کے مشہور ترین آرٹسٹ آئے ہوئے ہیں حالانکہ ان بے چاروں نے ٹی وی اور فلم اسٹوڈیو وغیرہ کی شکل صرف باہر سے ہی دیکھی ہوتی تھی۔ بہرحال لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ جاتے تھے۔ دوسری کیٹیوں سے بھی لوگ آتے تھے کیوں کہ اور کہیں اس طرح کے شغل میلے نہیں ہوتے تھے۔ یہ ساری اسکیمیں صرف میں اور میرے ساتھی ہی سوچتے تھے۔ چار پیسے کی آمدنی بھی ہو جاتی تھی اور محنت کر کے تھکے ہارے رہنے والے لوگوں کو چار چھ مہینے میں دو چار دن کی تفریح بھی میسّر آ جاتی تھی..."

روپیہ بنانے کے معاملے میں جن لوگوں کا ذہن کام کرتا ہے، ضروری نہیں ہوتا کہ وہ بڑے بڑے بارونق، صنعتی یا ثقافتی شہروں میں رہیں تبھی روپیہ پیدا کر سکیں۔ وہ دنیا کے نہ جانے کن کونے کھدروں اور دور افتادہ گاؤں دیہات یا ویرانوں میں بھی روپیہ بنا لیتے تھے۔ دلبر خان اور اس کے ساتھی بھی غالباً روپیہ پیدا کرنے کا ہنر جانتے تھے، وہ ہر فن مولا تھے اور جائز یا ناجائز، کوئی بھی ذریعہ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ معلوم نہیں ان لوگوں نے اس پسماندہ اور دور افتادہ علاقے میں رہتے ہوئے بھی کتنی دولت اکٹھی کر لی تھی۔

دلبر خان سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "لیکن جب سے حالات زیادہ خراب ہوئے ہیں اور بعض باتیں ہمارے اختیار سے بھی باہر نکل گئی ہیں تب سے کوئی ہمارے ساتھ یہاں آنے پر تیار نہیں ہوتا۔ آخری پروگرام جو ہم نے یہاں پیش کیا، اس میں جانو ڈاکو ایک گلوکارہ کو اٹھا کر لے گیا تھا۔ اچھی خاصی عمر کی تھی۔ کالی سی تھی۔ شکل و صورت کوئی خاص نہیں تھی لیکن تیز روشنیوں میں اسٹیج پر ظاہر ہے وہ کچھ اور نظر آ رہی تھی۔ بال بھی اس نے سنہرے رنگے ہوئے تھے۔ جانو سائیں اپنے گروہ کا سردار تھا۔ شراب کے نشے میں دُھت تھا اور ہماری فرمائش پر پانچ سو روپے کا وی آئی پی ٹکٹ خرید کر آیا ہوا تھا۔ گانے کے دوران ہی گلوکارہ پر عاشق ہو گیا۔"

"شاید اس نے آپ لوگوں کی فرمائش پر مُروّت میں پانچ سو روپے کا ٹکٹ تو خرید لیا تھا لیکن بعد میں خیال آیا کہ ذرا اچھی طرح پیسے پورے کرنے چاہئیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔ "جب نشہ اُترا ہو گا تو اس نے ضرور اس بے چاری کو کہیں چھوڑ دیا ہو گا۔"

"معلوم نہیں..." دلبر خان بے پروائی سے بولا۔ "اس کا کچھ پتا ہی نہیں چلا۔ ہم نے جانو کو ایک آدھ مرتبہ پیغام بھی بھیجا کہ بے چاری کو چھوڑ دے لیکن سالے نے کوئی جواب ہی نہیں دیا۔"

پھر اس نے گویا ایک نئے تصور سے ٹھنڈی سانس لی۔ "کیا بُرا زمانہ آ گیا ہے۔ اب تو ڈاکو بھی ہماری بات نہیں مانتے جنہیں ہم نے ہی ڈاکو..." اس نے نہ جانے کیا سوچ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کسی نے اس بے چاری کو بازیاب کرانے کی کوشش نہیں کی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے بعد سے جانو اور اس کے گروہ کا ہی کچھ پتا نہیں، کہاں ہے۔ بازیاب اگر کرا سکتے تھے تو ہم لوگ ہی کرا سکتے تھے اور کون کرا سکتا تھا؟ پولیس تو ادھر کا رخ نہیں کرتی۔ اگر کوئی بہت ہی اہم مسئلہ ہو جائے تو کبھی آ جاتی ہے اور مُرغیاں شُرغیاں کھا کر، ہمارے مشورے سے رپورٹ وغیرہ لکھ کر چلی جاتی ہے۔ پولیس شہروں سے آتی ہے، اسے یہاں کے سر پیر کا بھی پتا نہیں ہوتا۔ اس عورت کی فیملی کے کچھ لوگ آئے تھے۔ ادھر اُدھر ٹکریں مار کر چلے گئے۔"

پھر اس نے متاسفانہ انداز میں گہری سانس لی۔ "بہرحال... اس کے بعد ہمارا ورائٹی پروگراموں وغیرہ کا دھندا ختم ہو گیا۔ اب تو کوئی یہاں سرکس میلہ وغیرہ لگانے کے لیے بھی نہیں آتا۔ خیر... یہ باتیں تو یونہی بیچ میں آ گئیں، میں اصل میں تمہیں ہوشو کے بارے میں بتا رہا تھا..." اس نے ایک بار پھر پیار بھرے انداز میں اس دیو زاد کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں عمر میں تقریباً برابر ہی ہوں گے لیکن نہ جانے کیوں دلبر خان کی آنکھوں میں ہوشو کے لیے پدرانہ سی شفقت تھی۔ ہوشو نے بھی اسے اپنی طرف دیکھتے پا کر فوراً باچھیں کھلا دیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد دلبر خان بولا۔ "ہوشو دیسی کشتی اور فری اسٹائل ریسلنگ، سب میں خوب ماہر ہے۔ ہماری کیٹی اور آس پاس کی تمام کیٹیوں میں جسے بھی پہلوان ہونے کا دعویٰ تھا یا جو بھی اپنے آپ کو شہ زور سمجھتا تھا، ان سب کو ہوشو بری طرح ہرا چکا ہے۔ دو تین کی ہڈیاں بھی توڑ چکا ہے۔ ملاکھڑے میں تو اب لوگوں کو زیادہ دلچسپی رہی نہیں۔ فری اسٹائل ریسلنگ کے ہم کئی مقابلے کرا چکے ہیں۔ لوگ بہت شوق سے آتے ہیں۔"

"یہاں...؟" میں نے حیرت سے ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں یہاں۔" دلبر خان مسکراتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں فخر جھلک آیا۔ "ابھی تم نے شاید اس کیٹی کو ہی اچھی طرح نہیں دیکھا۔ آس پاس اس سے بھی بڑی آبادیاں ہیں پھر ہم انتظامات بھی بہت شاندار کرتے ہیں۔ اچھا بھلا سماں باندھ دیتے ہیں۔ بڑی رونق ہوتی ہے۔ منادیاں ہوتی ہیں۔ تانگوں اور بیل گاڑیوں پر بڑے بڑے بورڈ لگا کر پھرائے جاتے ہیں۔ شہر سے پوسٹر

بھی چھپوا کر منگوا لیتے ہیں۔ کیٹیوں میں جو کچّے سے سینما وغیرہ موجود ہیں ان میں سلائڈیں چل جاتی ہیں۔ ہم جس کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں اس کو بہت اچھی طرح کرتے ہیں۔ ہمارا ساتھ دینے والے کو بھی مزہ آجاتا ہے۔

اسی دوران دنّو کے ہاں سے ہمارے لیے چائے آگئی۔ وہی دنّو جو بے چارہ کچھ دیر پہلے ان کے ہاتھوں مار کھا رہا تھا' اب ان کے لیے چائے لے کر آرہا تھا۔ کچھ کپ تھے' کچھ گلاس اور کچھ مگ۔ دنّو کو جو بھی برتن میسّر آئے تھے' پورے کرکے لے آیا تھا۔

دو چکروں میں چائے دے کر اور اجازت پاکر دنّو لنگڑاتا اور کراہتا ہوا واپس چلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ دلبر خان نے مجھے اپنے علاقے کی ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں کے بارے میں اور خصوصاً اپنے پروموٹر کے سے کاروبار کے بارے میں کیوں بتانا شروع کردیا تھا۔ تاہم میں نے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا اور اس گفتگو کے نتیجے کا منتظر رہا۔

دو ایک زوردار چسکیوں کے بعد دلبر خان نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب ہوشو کے ساتھ لڑنے والا کوئی نہیں رہا۔ کچے کے پورے علاقے میں گنتی کے چند چھوٹے موٹے پہلوان تھے' ان سب کا ہوشو کے ہاتھوں حشر خراب ہوچکا ہے۔ اب نہ تو ان میں سے کوئی ہوشو کے ساتھ لڑے گا اور اگر ہم زبردستی کسی کو تیار کر بھی لیں تو کوئی ٹکٹ لے کر مقابلہ دیکھنے نہیں آئے گا جب کہ ہم ایک عرصے سے یہاں کوئی زوردار قسم کا "ہلا گلا" کرنے کے لیے بے چین بیٹھے ہیں...."

میری دھڑکنیں کچھ تیز ہونے لگیں۔ اب مجھے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ گفتگو کس طرف آرہی تھی تاہم میں خاموش ہی رہا اور چائے کا گلاس ہونٹوں سے لگائے گہری نظروں سے دلبر خان کی طرف دیکھتا رہا۔

وہ پُرخیال انداز میں ایک بار پھر میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "تمہارا جسم شاندار ہے۔ ہم تمہیں یہاں کراچی یا لاہور سے آیا ہوا کوئی نامی گرامی ریسلر بنا کر پیش کرسکتے ہیں...."

گو مجھے اب اس قسم کی بات سننے کی توقع ہوچلی تھی' اس کے باوجود چائے کا گھونٹ میرے حلق میں اٹکتے اٹکتے رہ گیا۔ میں نے اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے تصدیق چاہی۔ "تمہارا مطلب ہے میں ہوشو سے ریسلنگ کا مقابلہ کروں...؟ پبلک کے سامنے...؟"

"ہاں۔ اس میں حیران پریشان ہونے کی کیا بات ہے؟" اس نے اطمینان سے پوچھا۔

"حیرانی پریشانی یہ ہے کہ میں نے کبھی اس قسم کا کوئی کام کیا نہیں اور نہ ہی مجھے امید ہے کہ اب کرسکوں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"بھئی تمہیں اس طرح صاف جواب تو نہیں دینا چاہیے۔"

وہ گویا ذرا بُرا مناتے ہوئے بولا۔ "تم اس وقت موت کے منہ پر تھے جب ہم نے تمہاری جان بخشی کی اور تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تم میرا احسان مانو لیکن انسان کو کم سے کم دوستی کا بھرم تو رکھنا چاہیے۔ دوستی میں اگر اسے کوئی کام کہا جائے تو انکار نہیں کرنا چاہیے۔ میں نے تم پر پہلی نظر پڑتے ہی تمہارے بارے میں اندازہ لگا لیا تھا کہ تم ایک شیر جوان ہو۔ اور شیر جوان تو دوستی میں... محبت میں... جان دے دیتے ہیں۔" اس کے لہجے میں بلا کی ملائمت تھی۔

میں ایک لمحے کے لیے خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کیا یہ وہی دلبر خان تھا جس کا ایک روپ میں نے کچھ دیر پہلے دیکھا تھا؟ اس وقت وہ کمزور اور مجبور انسانوں کے لیے سراپا قہر و غضب تھا جنہوں نے اس کا کچھ بگاڑا نہیں تھا اور اب وہ اس شخص کے لیے سراپا لطف و عنایت تھا جس نے سب کے سامنے اس پر حملہ کیا تھا اور اسے بے بس کردیا تھا۔ اس قبیل کے لوگوں کے پندار پر اس طرح کے واقعات کا زخم بڑا گہرا لگتا ہے۔ ایسی حرکت کرنے والے کو وہ آسانی سے معاف نہیں کرتے مگر اس نے تو بظاہر مجھے نہ صرف فوری طور پر معاف کردیا تھا بلکہ یکدم ہی اس کے دل میں "دوستی اور محبت" اُمڈ آئی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "میں یہ بھی نہیں کہتا کہ تم صرف دوستی میں ہی اپنی جان رگڑو۔ اس علاقے کے لحاظ سے تمہیں معقول معاوضہ بھی ملے گا۔ دس ہزار روپیہ تو ہم ہر حال میں تمہاری خدمت میں پیش کریں گے۔ اور اگر اس مقابلے نے اچھا رش لے لیا... آس پاس کے علاقوں سے بھی لوگ بڑی تعداد میں آگئے تو بعد میں مزید مل سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اس وقت تم جن حالات کا شکار ہو' ان میں یہ رقم معمولی نہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ تم نے بہت اچھا وقت دیکھا ہے۔ شاید اس وقت دس پندرہ ہزار کی تمہارے لیے کوئی اہمیت نہ رہی ہو لیکن بات اس وقت کی ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر شاید میرے ردِعمل کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگا لیکن میرے چہرے نے شاید اسے کوئی اندازہ نہیں ہوا۔ تب وہ مجھے قائل کرنے کی مزید کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "یہ کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں ہے۔ مجھے تو یقین ہے کہ تمہیں اس کام میں لطف آئے گا۔ تم تو چھلاوا ہو چھلاوا۔ جب تم عام لڑائی بھڑائی میں اتنے باکمال آدمی ہو تو ریسلنگ تو عام لڑائی بھڑائی کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔ مجھے یقین ہے تمہیں اس میں لطف آئے گا۔"

"اپنی دُرگت بنوانے میں کسے لطف آتا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ "سب سے اہم نکتے کی تو میں وضاحت کرنا ہی بھول گیا۔ میرا خیال تھا کہ تمہیں خود ہی اندازہ ہو گا..." پھر اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ رازدارانہ سے انداز میں بولا۔

"تمہارا کیا خیال ہے... کیا یہ سچ مچ کی ریسلنگ ہوگی؟"

"ظاہر ہے... ریسلنگ تو ریسلنگ ہی ہوتی ہے۔" میں نے غیر واضح سا جواب دیا۔

تب وہ میرے کندھے پر زور سے ہاتھ مار کر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "یار! ویسے تو آدمی ہوشیار لگتے ہو لیکن اس معاملے میں واقعی اناڑی معلوم ہوتے ہو۔ بھئی یہ ایک نورا کشتی ہوگی۔ ہم تمہیں سب سمجھا دیں گے۔ مجھے یقین ہے' تم جیسے شہ زور اور لڑائی بھڑائی میں ماہر آدمی کو اس میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ مقابلے کی خوب اچھی طرح پہلے سے ریہرسل وغیرہ بھی کرلیں گے۔ رِنگ میں بظاہر خوب مار دھاڑ نظر آئے گی۔ لوگوں کے پیسے بھی تو حلال کرانے ہیں نا لیکن حقیقت میں تم دونوں کو کوئی زیادہ چوٹ نہیں آئے گی۔"

میں نے اپنے چہرے سے ذرا حیرت کا اظہار کیا تو وہ تیزی سے بولا۔ "باہر کے ملکوں میں بھی سب اسی طرح ہوتا ہے۔ میں تو دوسرے ملکوں میں بھی کافی دھکے کھا چکا ہوں۔ میں نے یہ سب چکر بہت قریب سے دیکھے ہیں' ہر چیز کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیا ہے۔ یہ جو اتنی بڑی بڑی کشتیاں ہوتی ہیں جن کے ہمارے ہاں لوگ دیوانے ہیں' یہ بھی دس میں سے نو جعلی ہوتی ہیں۔"

یہ بات مجھے معلوم تھی لیکن میں نے اس پر حیرت کا اظہار مناسب سمجھا۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "لیکن یار! بات یہ ہے کہ یہ کمبخت گورے جو بھی کام کرتے ہیں بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ ان کے فراڈ میں بھی سلیقہ ہوتا ہے۔ مقابلوں میں اگر کوئی کسر رہ بھی جاتی ہے تو وہ وڈیو فلمیں بنانے والے پوری کردیتے ہیں۔ وہ جہاں کوئی بات نمایاں کرنا چاہتے ہیں وہاں نمایاں کردیتے ہیں' جہاں چھپانا چاہتے ہیں وہاں چھپا دیتے ہیں۔"

پھر وہ اصل موضوع پر آتے ہوئے بولا۔ "یقین کرو... تمہارے لیے یہ کام بالکل آسان ہوگا اور تمہیں بہت مزہ آئے گا۔ تمہاری جان شان ایسی ہے کہ ہم تمہیں یہاں بہت بڑا ریسلر بنا کر پیش کریں گے تو کسی کو ذرا بھی شبہ نہیں ہوگا لیکن تمہیں ہوشو خان سے ہارنا ہوگا۔ بہت زبردست مقابلے کے بعد۔" اس نے فیصلہ پہلے ہی سنا دیا۔

میں نے ہوشو خان کی طرف دیکھا۔ اس کے موٹے موٹے ہونٹ مکروہ سے انداز میں پھیل گئے۔ وہ مسکرایا تھا۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہوشو خان کی طاقت کا جو عالم تم بتا رہے ہو تو یہ ویسے ہی مجھے ہرا دے گا۔"

"ہو سکتا ہے...." دلبر خان مبہم لہجے میں بولا۔ "لیکن پھر بھی ہمیں ہر بات... ہر تفصیل' حتیٰ کہ ہر داؤ پیچ تک پہلے سے طے کر کے چلنا ہوگا۔ میں نہیں چاہتا کہ تم دونوں سچ مچ لڑنے کی کوشش کرو اور دونوں کو زیادہ چوٹیں آئیں اور میں خاص طور پر تم سے کہہ رہا ہوں..." اس نے انگلی سے میری طرف اشارہ کیا۔ "کہ تم ہوشو خان پر ہاتھ بالکل ہلکا رکھو گے۔ تم جو کچھ بھی کرو گے' محض دکھاوے کے لیے۔ ہوشو خان کو سچ مچ کوئی ضرب نہیں لگنی چاہیے۔"

"اس چربی کے پہاڑ پر کوئی ضرب اثر ہی کہاں کرے گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پھر بھی... احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ دراصل میں نے تمہیں یہ پیش کش کرنے میں کچھ زیادہ ہی عجلت دکھائی ہے۔ ہم نے صحیح طرح تمہارے ہاتھ نہیں دیکھے' صرف اندازہ لگایا ہے۔ بس... تمہیں دیکھتے ہی نہ جانے کیوں یہ خیال بجلی کی طرح میرے ذہن میں لپکا اور میں نے اس پر عمل کر گزرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن آدمی تم مجھے خاصے پہنچے ہوئے لگتے ہو' اس لیے احتیاطاً سب کچھ سمجھا رہا ہوں۔" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرایا۔

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے بارے میں اندازے لگانے کے معاملے میں حقیقت کے قریب قریب تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ خود بڑی پہنچی ہوئی چیز تھا۔ اس نے تقریباً فرض ہی کرلیا تھا کہ میں اس کی تجویز پر عمل درآمد کے لیے آمادہ ہوگیا ہوں۔ میں نے اس کے تاثر کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

مجھے اس تجویز کے بارے میں سوچ کر ہی ہنسی آرہی تھی لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اس تجربے میں کوئی حرج بھی نہیں۔ میں اب ایک گمنام اور بے حیثیت آدمی تھا۔ مجھے اپنی ہیئت کذائی پر کوئی شرمندگی' کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی بلکہ میں تو گویا اپنی اصل حیثیت تج کر زندگی کے رنگا رنگ تجربات حاصل کرنے کے لیے ہی گھر سے نکلا تھا.... اب تو ہر چیز میرے لیے ایک ایڈونچر تھی اور میں اس پر خون جلانے یا کڑھنے کے بجائے لطف اندوز ہونے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے نرمی سے کہا۔ "اگر یہ ایک نورا کشتی ہی ہوگی تو تم ہوشو خان کو ہی جتوانے پر کیوں تلے ہوئے ہو؟ افضل خان کو ہی کیوں نہیں جتوا دیتے؟"

"یہی تو سارا گیم ہے دوست!" دلبر خان مضطربانہ انداز میں پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "اگر ہوشو خان ہی ہار گیا تو پھر سارا گیم ہی ختم ہوجائے گا۔ ہوشو خان اس علاقے کی ایک زندہ روایت ہے۔ مائیں اس کا نام لے کر اپنے بچوں کو ڈراتی ہیں۔ یہ آج تک کوئی مقابلہ نہیں ہارا۔ تم تو آج یہاں ہو' کل چلے جاؤ گے۔ ہمیں تو یہاں اپنے ریکارڈ' اپنے نام' اپنی ساکھ... اور اپنی دہشت کے ساتھ ہی زندہ رہنا ہے۔"

پھر وہ مشفقانہ انداز میں میرا کندھا تھپکتے ہوئے مسکرایا۔ "یہی تاثر دینے کے لیے تو سارا ڈراما رچانا ہے کہ باہر کا بھی ایک نامی گرامی پہلوان اتنے بڑے بڑے دعووں کے ساتھ آکر مار کھا کر چلا گیا۔"

"لیکن میں تو ایسا کوئی دعویٰ نہیں کر رہا۔" میں نے کہا۔

"تم تو کچھ بھی نہیں کر رہے ہو بھولے بادشاہ!" دلبر خان بولا۔ "تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا ہے' جو کچھ بھی کریں گے ہم کریں گے۔ یقین کرو' یہاں کے دیہاتیوں کے لیے ہم تمہاری حیثیت کچھ ایسی بنا دیں گے کہ جیسے نیویارک سے کوئی عالمی چیمپئن قسم کا ریسلر آیا ہوا ہے۔ دلبر خان ہر فن مولا ہے۔ یقین کرو' ہم لوگ بڑے شہروں میں کام کرنے والے بڑے پروموٹروں سے کم نہیں ہیں۔ تم یہاں سے بہت خوش خوش جاؤ گے۔ تمہارے لیے یہ ایک خوبصورت تجربہ ہو گا بلکہ عین ممکن ہے تم فرمائش کرو کہ آئندہ کے لیے ہم تمہیں اپنے ساتھیوں میں ہی شامل کرلیں اور تمہیں فائدہ پہنچانے والے ایسے ہی کچھ اور منصوبے بھی بنائیں۔"

میں ایک لمحے کے لیے خاموش رہا۔ اس نے ابھی تک مجھے کوئی دھمکی نہیں دی تھی کہ انکار کی صورت میں کیا ہو گا لیکن مجھے ویسے ہی اندازہ تھا کہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ میرے چاروں طرف کلاشنکوف بردار بیٹھے ہوئے تھے۔۔ دلبر خان شاید صرف اپنی اسکیم میں اچھا رزلٹ لینے کے لیے میرے ساتھ بیٹھ کر اتنے پیار سے منصوبہ بندی کر رہا تھا ورنہ وہ سیدھے سادے طریقے سے مجھے حکم بھی دے سکتا تھا۔

میں نے اسے ٹٹولنے کے لیے پوچھا۔ "مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت مل سکتا ہے؟"

"سوچنا تو ہمیں ہے۔ ہمیں پچاسوں تیاریاں کرنی ہیں' سب انتظامات کرنے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں یہ کام جلدی کرلیں۔ اس وقت سیزن ہے۔ فصلوں کی کٹائی کا زمانہ ہے۔ لوگوں کی جیبوں میں کچھ پیسے ہیں۔ میں تو کب سے اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ تم سے ملاقات ہو گئی اور وہ بھی اتنے عجیب حالات میں۔"

"تم کب یہ پروگرام رکھنا چاہتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہفتے دس دن کے اندر اندر۔" دلبر خان نے جواب دیا۔

"اور یہ ہفتہ دس دن میں کہاں گزاروں گا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"میری حویلی میں۔" دلبر خان نے جواب دیا۔

"میں تمہارے ہاں ٹھہرنا نہیں چاہتا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"اعتبار نہیں ہے ہم پر؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"بات اعتبار کی نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "اگر میں تمہاری حویلی میں مہمان رہوں گا تو پہلے ہی اس کشتی کے بارے میں نورا کشتی ہونے کا تاثر پھیل سکتا ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" دلبر خان بولا۔ "یہاں کی روایت یہی ہے کہ شہر وغیرہ سے جب بھی کوئی اہم مہمان آتا ہے تو میرے پاس حویلی میں ہی ٹھہرتا ہے۔ اس سلسلے میں لوگ کسی شک و شبے میں نہیں پڑتے۔ بہرحال میں تم پر زور نہیں دوں گا۔ تم کہاں ٹھہرنا چاہتے ہو؟"

"یہیں۔ جہاں ہم اس وقت بیٹھے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "یہیں میں نے چار دن' چار راتیں گزاری ہیں۔"

"یہاں کھلے میں ٹھہرنا تو مناسب نہیں۔۔۔" دلبر خان ادھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم دینو کے گھر میں ٹھہرنا۔ میں دینو سے کہہ دیتا ہوں۔ اب تم راج مزدوری والی کوئی حرکت نہ کرنا۔ مجھے پتا چل گیا ہے۔۔۔ اور تم خود بھی بتا رہے تھے کہ تم اس چھپر کی یہ دیواریں بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ ابھی ہمیں اس کے بارے میں بھی کوئی کہانی مشہور کرنی پڑے گی کہ دراصل تم بھیس بدل کر حالات کا جائزہ لے رہے تھے۔ اصل میں تو تمہیں بہت دن پہلے بلوایا گیا تھا لیکن جب تم آئے تو تم نے اپنی آمد کی اطلاع نہیں دی۔ تم اپنے حریف کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتے تھے اس لیے راج مزدور بنے ہوئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کی کوئی بکواس ہم گھڑ لیں گے۔ گاؤں کے لوگ بڑے سادہ ہوتے ہیں۔ دوسرے معاملوں میں نہ سہی لیکن جھوٹی سچی کہانیوں پر یقین کرنے کے معاملے میں بہت سادہ ہوتے ہیں۔ کہانی جتنی زیادہ جھوٹی ہو گی اتنی ہی زیادہ مقبول ہو گی اور سینہ گزٹ کے ذریعے سفر کرتی ہوئی ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا پہنچے گی۔"

وہ مسکرایا اور میری طرف سے غالباً کسی تبصرے کا منتظر رہا لیکن میں خاموش ہی رہا تب وہ اپنا سلسلۂ ہدایات جوڑتے ہوئے بولا۔ "اب تم کوئی گھٹیا کام نہ کرنا اور بڑے رعب داب سے رہنا۔ میں اپنے آدمیوں کو بھیج کر یہاں درختوں کی چھاؤں میں تمہارے لیے چھوٹا موٹا سا اکھاڑا کھدوا دوں گا اور باڈی بلڈنگ کا کچھ سامان بھی بھجوا دوں گا۔ تم ذرا لوگوں کو دکھانے کے لیے اور قصے کہانیاں پھیلانے کے لیے روزانہ شام کو لنگر لنگوٹ کس کر یہاں کچھ دیر ایکسر سائز کرلیا کرنا اور اگر لوگ جمع ہو کر تم سے بات چیت کرنے کی کوشش کریں تو تھوڑی بہت ڈینگیں بھی مار دیا کرنا کہ تم ہوشو خان کی ہڈی پسلی ایک کر دو گے' اس کی تکا بوٹی کر دو گے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟ ذرا شاندار مقابلے کے لیے فضا تو تیار کرنی ہے نا۔"

"میں سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"یورپ' امریکا وغیرہ میں یہی کام ریڈیو' ٹی وی' اخبارات وغیرہ کے ذریعے ہوتا ہے۔ ہمیں یہاں سب کچھ بہت چھوٹے پیمانے پر سینہ گزٹ کے ذریعے کرنا ہے۔ تم اپنا کردار جتنی اچھی طرح ادا کرو گے اتنی ہی اچھی طرح ہم اپنی اسکیم پر کام کر سکیں گے اور روپیہ زیادہ آئے گا۔ تمہیں بھی حصہ زیادہ ملے گا۔"

"میں اپنی سی کوشش کروں گا۔" میں نے مدھم لہجے میں کہا۔ "لیکن میں کوئی وعدہ یا دعویٰ نہیں کر سکتا کیوں کہ اس سے پہلے مجھے پبلک کے سامنے تماشا بننے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔"

"تمہیں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میری طرف سے تمہیں ہر لحہ ہدایات ملتی رہیں گی۔" دلبر خان نے مجھے تسلی دی۔ "ہو سکتا ہے تمہیں اس پہلے تجربے میں ہی اتنا لطف آئے کہ تم یہی لائن پکڑ لو اور سچ مچ کوئی بڑے ریسلر بن جاؤ۔ بظاہر تو تمہاری باڈی میں ہر وہ خوبی نظر آ رہی ہے جو کسی ریسلر میں ہونی چاہیے۔ باقی اندازہ آنے والے دنوں میں ہو جائے گا۔ مقابلے سے ایک دو دن پہلے رات میں کسی وقت ہم ہوشو کو لے کر یہاں آجائیں گے اور دینو کے مکان کے اندر ہی خفیہ طور پر تم دونوں ذرا مقابلے کی ریہرسل کرلینا۔ ویسے تو ظاہر ہے رِنگ میں مقابلہ اس سے کافی مختلف ہو جائے گا لیکن پھر بھی بنیادی باتیں طے ہو جائیں گی۔ دینو کے مکان میں کافی جگہ ہے۔ وہاں یہ کام آسانی سے ہو جائے گا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ "میرے چار آدمی ہر وقت یہاں موجود رہیں گے۔ جب تم مکان کے اندر رہو گے تو وہ مکان کے باہر چاروں طرف گشت کیا کریں گے اور جب تم اکھاڑے میں باڈی بلڈنگ اور ایکسر سائز وغیرہ کرو گے تب بھی وہ تمہارے اردگرد موجود رہیں گے۔"

"مجھ پر اعتبار نہیں ہے کیا؟" میں نے مسکراتے ہوئے اسی کے لہجے میں اس کا سوال اس پر لوٹا دیا۔

"اعتبار تو ہے لیکن انسان کا ارادہ بدلتے دیر نہیں لگتی۔" وہ برا منائے بغیر بولا۔ "ویسے تو مجھے یقین ہے' تم شیر جوان ہو اور شیر جوان وعدہ کرکے پیٹھ نہیں دکھایا کرتے' خواہ انہیں جان سے جانا پڑے۔ لیکن پھر بھی احتیاط بہتر ہے۔ یہ محض ایک احتیاطی قدم ہے۔ ممکن ہے تم کسی کے بہکاوے میں آجاؤ اور ارادہ بدلنے کے بارے میں سوچنے لگو۔ خود دینو بڑا بکواسی اور سازشی ہے۔ ممکن ہے وہ تمہارے دل میں کوئی وہم ڈال دے۔ تم اس کی باتوں پر دھیان مت دینا۔"

میں نے سعادت مندانہ سے انداز میں سر ہلا دیا حالانکہ میں دل میں اس کی رائے سے متفق نہیں تھا۔ مجھے صرف چار دن دینو سے واسطہ رہا تھا اور ہمارے درمیان بہت کم بات چیت ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ وہ بکواسی یا سازشی آدمی نہیں تھا جب کہ یہ دونوں صفات "دلبر خان" میں بدرجۂ اتم موجود تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد دلبر خان بولا۔ "بس تو پھر میں تمہاری طرف سے ہاں سمجھوں نا؟"

"میرا خیال ہے میرا ہاں کر دینا ہی بہتر ہے۔" میں نے ایک بار پھر اپنے اردگرد موجود کلاشنکوف برداروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ان سب کے ہاتھ اپنی گنوں پر تھے اور وہ پتھرائے ہوئے سے چہروں کے ساتھ میری ہی طرف ایک ٹک دیکھ رہے تھے۔ میرے اور دلبر خان کے درمیان ہونے والی گفتگو سے گویا انہیں کوئی سروکار نہیں تھا۔ ان کا کام جیسے صرف مجھ پر نظر رکھنا تھا۔

"آدمی سمجھ دار ہو۔" دلبر خان مسکرایا۔ "مجھے خوشی ہے کہ مسئلہ نہایت دوستانہ اور خوشگوار انداز میں طے ہو گیا۔"

دلبر خان کے جس آدمی کی کھوپڑی پر میں نے اُلٹی طرف سے کلہاڑی رسید کی تھی' وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ اسے ایک چارپائی پر لٹا دیا گیا تھا اور سر' چہرے پر ٹھنڈا پانی ڈالا گیا تھا لیکن وہ ہوش میں نہیں آیا تھا۔ تاہم دلبر خان نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔

اب اس کی بات چیت اس کے مطلوبہ انداز میں تکمیل کو پہنچ چکی تھی' شاید اسی لیے اب اس نے اپنے اس گرگے کی طرف توجہ دی اور اسے ہلا جُلا کر دیکھنے کے بعد میری طرف مُڑتے ہوئے ہلکی سی تشویش سے بولا۔ "یہ مر تو نہیں جائے گا؟"

"میرا ارادہ تو مارنے کا نہیں تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "ورنہ میں کلہاڑی پھل کی طرف سے رسید کرتا۔ میں نے تو ہاتھ بھی ذرا ہلکا ہی رکھا تھا۔"

میں نے خود اٹھ کر اس کا معائنہ کیا۔ اس دوران دلبر خان بولا۔ "میرا خیال ہے اس کو شہر کے اسپتال لے جائیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا۔ "میرے تجربے کے مطابق اس کی حالت تشویش ناک نہیں۔ ایک آدھ گھنٹے میں ہوش میں آجائے گا۔"

"چلو۔۔۔ خیر۔۔۔ دیکھا جائے گا۔" دلبر خان کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "اب ہم چلتے ہیں۔ بس سمجھو' ہماری اسکیم پر عمل شروع ہو گیا ہے۔"

ہوشو خان نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ مضبوط تھا لیکن میں نے اسے یہ احساس نہیں ہونے دیا کہ وہ کسی کمزور آدمی سے ہاتھ ملا رہا ہے پھر وہ مجھ سے معانقہ بھی کرنے پر تُل گیا۔ اس نے گویا وہیں اچھی خاصی زور آزمائی شروع کر دی۔ وہ مجھے بازوؤں کے شکنجے میں جکڑ کر بھینچنے لگا۔ اگر اس کے بازو لمبے نہ ہوتے تو شاید اس کی گنبد نما توند کی وجہ سے میرا صحیح طور پر اس سے

معانقہ ہی مشکل ہوتا۔

وہ بہ مشکل میرے بازوؤں کے حلقے میں آیا تھا لیکن میں نے جواباً اس پر طاقت صرف نہیں کی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ابھی وہ میری طاقت کا صحیح اندازہ کرسکے۔ میں نے اسے پورا موقع دیا کہ وہ مجھ پر زور آزمائی کا شوق پورا کرلے۔ بالآخر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور ایک بار پھر بن مانس کی طرح گھونسوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگا۔

دلبر خان پدرانہ شفقت سے اس کی کمر تھپتھپاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "آج یہ بہت خوش ہے۔ بڑی مُدت سے بیکار بیٹھا تھا۔ اب یہ بھی دھندے سے لگے گا۔"

پھر اس نے اپنے ایک آدمی کو حکم دیا کہ وہ دینو کو بلا لائے۔ اس کے جانے کے بعد دلبر خان میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "دینو کے گھر میں رہو گے تو اس کی لڑکی کے چکر میں نہ پڑنا۔ کم از کم فی الحال نہ پڑنا۔ مقابلے کے بعد جو دل چاہے کرتے پھرنا' ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ لڑکی کے چکر میں پڑ کر آدمی کے خیالات بہت بدل جاتے ہیں' اسی لیے ہم اس چکر میں نہیں پڑتے۔ بس... اگر کوئی پسند آئی' اٹھالیا' دل بہلایا' چھوڑ دیا۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ یہ لڑکیاں اس سے زیادہ کسی قابل نہیں ہوتیں۔ ویسے یہ دینو کی لڑکی بڑی پٹاخا معلوم ہوتی ہے۔ اس کے اندر کوئی بجلی بھری ہے۔ تمہاری وجہ سے ہم اسے چھوڑ رہے ہیں۔"

"بہت شکریہ۔" میں نے اس کے "ارشاداتِ عالیہ" سے دل ہی دل میں خاصی نفرت محسوس کرتے ہوئے کہا۔

چند لمحے بعد دینو ہاتھ باندھے لنگڑاتا ہوا آگیا۔ دلبر خان نے مختصراً اسے ساری بات سمجھائی اور حکم دیا کہ وہ میرے قیام و طعام کا خاص خیال رکھے اور ہر طرح سے میری خدمت کرے۔ حویلی سے ضرورت کی ہر چیز آجائے گی۔

پھر اس نے اپنے مخصوص انداز میں مونچھ کو بل دیتے ہوئے بہت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کچھ خاص ہی انداز میں دینو کو ہدایت کی۔ "افضل خان کے ساتھ فالتو باتیں کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بس اپنے کام سے کام رکھنا اور افضل خان کی صرف خدمت کرنا۔ باتیں مت گھڑنا... اور اپنی چھوکری کو بھی ہماری طرف سے حکم دے دینا کہ اس مسافر پر ڈورے ڈالنے کی کوشش نہ کرے۔ اب یہ ہماری امانت ہے۔"

دینو نے مجروح سی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔ ہاتھ باندھے اثبات میں سر ہلاتا رہا۔

آخر کار دلبر خان نے ساری باتیں طے کرنے کے بعد اپنے چار آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ وہیں رک گئے' باقی لوگ واپس روانہ ہو گئے۔ جب ان لوگوں کی جیپ' بگھی اور گھوڑا نظر سے اوجھل ہو گیا تو دینو میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "آؤ افضل سائیں! اندر چلتے ہیں۔"

میں اس کے ساتھ چل دیا۔ دلبر خان کے چاروں مسلح آدمی ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ مکان کے قریب پہنچ کر ان میں مکان کے سامنے کے دونوں کونوں پر کھڑے ہو گئے اور طرف چلے گئے۔ اب گویا میں دلبر خان کا قیدی تھا اور دینو میں نظر بند تھا۔

کچھ دیر پہلے میں اس مکان میں آیا تھا تو ڈیوڑھی سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلا گیا تھا۔ اس بار دینو کے سا پہنچا۔ وہ ویسا ہی مکان تھا جیسے عام طور پر گاؤں' دیہات میں ہیں لیکن خاصا طویل و عریض تھا۔ بڑے سے صحن میں ایک ذرا اونچے چبوترے پر ایک چھپر تلے کھانے پکانے کی جگہ تھی۔ دیوار کے ساتھ مٹی کے دو چولھے بنے ہوئے۔ انگیٹھیاں بھی رکھی تھیں۔ وہیں مومل بیٹھی ایک تنکے زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اس نے آتے یقیناً دیکھ لیا تھا لیکن سر نہیں اٹھایا تھا۔ وہ لباس تبدیل تھی۔ چولھے میں آگ دم توڑ رہی تھی اور مومل کی تیکھی ناک پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں دور سے چمکتی دکھائی د تھیں۔

دینو وہیں چولھے کے قریب جا بیٹھا۔ مجھے بھی اس نے پڑے ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ تب مجھے اندازہ چولھے پر کوئی تیل سا گرم کر کے غالباً اپنی چوٹوں کی سنکا کرتے اٹھ کر باہر گیا تھا۔ وہ کراہ کر ایک ٹانگ زمین پر ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب مجھے تفصیل سے بتاؤ تمہا خان سے کیا باتیں ہوئیں... اور ہاں... آواز بالکل نیچی دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔"

مومل بدستور تنکے سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ دیہات کی لڑکیوں کو جب اپنی سوچ کے اظہار کی راہ نہیں

وہ چولھے کے قریب بیٹھ کر تنکے سے آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے لگتی ہیں۔

میں نے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں دینو کو وہ ساری باتیں بتا دیں جو میرے اور دلبر خان کے درمیان ہوئی تھیں۔ انہیں سن کر وہ متاسفانہ انداز میں سر ہلاتا رہا۔ اس دوران مومل نے کئی بار سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی جادوگر آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ شاید وہ روتی رہی تھی یا پھر اس کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔

میں خاموش ہوا تو دینو بولا۔ "ہوشو کی طاقت کے بارے میں وہ بکواس کرتا ہے۔ وہ اتنا طاقتور نہیں ہے جتنا دلبر خان اور اس کے ٹولے نے اسے مشہور کر رکھا ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ وہ بالکل ہی بودا ہے۔ کچھ نہ کچھ طاقت اس میں ہے... اور اتنے ڈیل ڈول کے آدمی میں ہونی بھی چاہیے لیکن اس کی زیادہ طاقت بس اس کا وزن ہی ہے۔ یعنی جس پر وہ گر جاتا ہے' اس کے لیے اٹھنا محال ہو جاتا ہے لیکن اس کے بارے میں باقی سب افسانے ہیں۔ اس نے آج تک جتنے بھی مقابلے کیے ہیں سبھی نورا کشتیاں تھیں ورنہ آس پاس کے علاقوں میں دو ایک جوان ایسے موجود ہیں جو اسے مار سکتے تھے۔"

"لیکن وہ بھی مقابلے میں ہار گئے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ کسی کو روپیہ دیا گیا' کسی کو دھمکی۔ انہوں نے بھی باقی پہلوانوں ہی کی طرح جعلی مقابلہ کیا۔ دلبر خان نے شغل کے طور پر وہ ایک دیو پالا ہوا ہے۔ یونہی... بس لوگوں کو ڈرانے کے لیے۔ حالانکہ دلبر خان کی دہشت ویسے ہی کچھ کم نہیں ہے مگر پتا نہیں کیوں ہوشو خان کو بھی رکھا ہوا ہے۔ کچھ اس کی شکل بھی ایسی ہی ہے کہ اس کے بارے میں مشہور کیے ہوئے افسانے سچ لگتے ہیں۔ شاید وہ دلبر خان کو اس لیے بھی عزیز ہے کہ اس کے لیے وہ بھی روپیہ کمانے کی ایک مشین ہے۔"

"مجھے کچھ یقین سا نہیں آرہا کہ مجھے دیکھتے ہی دلبر خان کے ذہن میں یہ اسکیم آئی ہوگی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"اسکیم تو آئی ہوگی..." دینو اپنے رخسار پر مالش کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن مجھے بات صرف نورا کشتی کی نہیں لگتی۔ نورا کشتی تو اپنی جگہ ایک سازش ہے ہی لیکن مجھے اس میں سے کسی اور سازش کی بھی بُو آرہی ہے۔ سازش در سازش۔"

"میں یہی کہنا چاہ رہا تھا۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے لیکن وہ کیا سازش ہو سکتی ہے؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" دینو بے بسی سے بولا۔ "یہ شیطان لوگ ہیں۔ ان کے دماغ شیطانی کارخانے کی طرح چلتے ہیں۔"

مومل نے ایک بار پھر انگارہ سی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور پہلی بار اپنے ہونٹوں پر لگی سکوت کی مہر توڑی۔ وہ گھٹی گھٹی لیکن غصیلی آواز میں بولی۔ "تم نے مقابلے کی ہامی کیوں بھری؟"

"اس کے سوا چارہ نہیں تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "مجھے ہر حال میں کسی نہ کسی سے مقابلہ کرنا ہی تھا۔ یہ مقابلہ بہتر تھا۔ اس میں مجھے سوچ بچار اور تیاری کرنے کا وقت مل گیا ہے۔ باقی ہر طرح کا مقابلہ اس سے زیادہ خطرناک تھا۔"

وہ خاموش ہو گئی۔ انہی باتوں اور ان کی کوکھ سے جنم لینے والے سوالوں پر غور کرتے ہوئے ہمارے سروں پر رات اتر آئی۔ دینو نے پچھلی ایک کوٹھری میں میرے قیام کا انتظام کیا تھا جس کی کھڑکی صحن میں کھلتی تھی اور اس میں کھڑکھڑ کرتا ایک پرانا سا ٹیبل فین بھی موجود تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ دینو کے گھر میں بجلی تھی۔

رات کو میں تمام تفکرات ذہن سے جھٹک کر پنکھے کی ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ میں سونے کی کوشش کرنے لگا۔ کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا۔ کھلی کھڑکی سے ادھورے چاند کی مدھم سی چاندنی کمرے میں آرہی تھی۔ موسم خنک نہیں تھا' اس کے باوجود میں نے دروازہ بند کر کے کنڈی چڑھا لی تھی۔ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں تھیں۔ اس سے کوئی اندر نہیں گھس سکتا تھا۔

رات بیتی جا رہی تھی اور میں سونے میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا حالانکہ میں کچھ ایسا خاص پریشان بھی نہیں تھا۔ اچانک دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ پہلے تو میں اسے پنکھے کی کھڑکھڑاہٹ سمجھا لیکن ایک لمحے کے توقف کے بعد دستک دوبارہ ہوئی تب میں نے اٹھ کر دروازے کی جھری سے جھانکا اور باہر موجود ہیولے کو دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔

مومل جلدی سے اندر آگئی۔ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ دروازہ بند کر کے اس سے ٹیک لگا کر اس نے ایک طویل سانس لی اور مرتعش لہجے میں بولی۔ "میں رات کو یوں چھپ کر تمہارے کمرے میں آئی ہوں... تم نے مجھے آوارہ اور بدچلن تو نہیں سمجھا؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے دیانتداری سے جواب دیا۔ "میں عورتوں کے بارے میں بہت زیادہ تجربے کار ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا... لیکن... بہرحال... مجھے تمہارے چہرے پر آوارگی اور بدچلنی کی کوئی پرچھائیں نظر نہیں آئی۔ تم ایک اُجلی لڑکی ہو' سانولی ہونے کے باوجود۔"

اس نے ایک اور گہری سانس لی۔ اس سانس میں طمانیت تھی۔ وہ سرگوشی میں بولی۔ "میں صرف یہ پوچھنے کے لیے آئی ہوں کہ کیا تم یہاں سے بھاگنا چاہتے ہو؟ اگر تم بھاگنا چاہو تو میں تمہاری مدد کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

میں ملگجے اندھیرے میں بغور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ میرے جواب کی منتظر تھی۔

میں نے چند لمحے سوچا پھر دھیمے مگر فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔ "نہیں... میں بھاگنا نہیں چاہتا۔"

''کیوں؟ کیا تمہیں اپنی جان عزیز نہیں ہے؟'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ میں اب اس ملگجے اندھیرے میں اس کا ایک ایک نقش ہی نہیں' اس کی آنکھوں میں تیرتے جذبوں کی پرچھائیاں بھی دیکھ سکتا تھا۔

''جان تو عزیز ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''لیکن اسے بچانے کے لیے میں نے جب بھی حالات کا مقابلہ کرنے کے بجائے بھاگنے کا راستہ اختیار کیا ہے تو میں پچھتایا ہوں۔''

''کیا اس وقت بھی بھاگے ہوئے ہو؟'' وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ دن کے اُجالے میں مجھے اس کی آنکھوں میں اتنی ذہانت کی چمک نظر نہیں آئی تھی جتنی اس وقت نظر آ رہی تھی۔

''ہاں۔'' میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اعتراف کیا۔ ''لیکن یہ مت سمجھنا کہ میں کوئی جرم کر کے قانون سے بھاگا ہوا ہوں۔ وہ ایک اور مسئلہ ہے' لمبا چکر ہے۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔''

اس نے مجھے اس موضوع پر کریدنے کی کوشش نہیں کی اور مضطربانہ سے انداز میں' تپتی انگلیوں سے میرا بازو دباتے ہوئے تیز سی سرگوشی میں بولی۔ ''میں کہتی ہوں بھاگ جاؤ۔ اس وقت تو میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں مگر کل کیا ہو گا' میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

''کل کیا ہو گا' اس کے بارے میں تو کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارے خلوص کا شکر گزار ہوں لیکن اگر مجھے بھاگنا ہوتا تو میں تمہاری مدد کے بغیر بھی بھاگ چکا ہوتا۔''

''نہیں بھاگ سکتے تھے۔'' وہ وثوق سے بولی۔ ''اب چار دوسرے تازہ دم آدمی نگرانی کے لیے پہنچ چکے ہیں۔ وہ کلاشنکوفیں لیے مسلسل مکان کے چاروں طرف گشت کر رہے ہیں۔ مکان کا کوئی گوشہ ایک لمحے کے لیے بھی ان کی نظر سے اوجھل نہیں ہو رہا۔''

''اس کے باوجود تم مجھے بھگانے کے لیے میری مدد پر تُلی ہوئی ہو۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ اگر میں تمہاری مدد کے بغیر بھی تمہارے گھر سے بھاگ گیا تو تم باپ بیٹی کا کیا حشر ہو گا؟''

''مجھے اچھی طرح اندازہ ہے۔'' وہ سر جُھکاتے ہوئے افسردگی سے بولی۔ ''اس کے باوجود میں تمہاری مدد کے لیے آگئی ہوں۔''

''اگر انہیں یہ اندازہ ہو گیا کہ مجھے بھگانے میں تمہاری مدد بھی شامل تھی' پھر تو وہ تمہارے انجام کو اور بھی زیادہ عبرت ناک بنانے کے لیے نہ جانے کیا کر گزریں گے۔''

''مجھے معلوم ہے.... اور اس تصور سے میری روح لرز اُٹھتی ہے۔'' وہ دھیرے دھیرے پلکوں کی جھالریں اُٹھاتے ہوئے بولی۔

''اس کے باوجود جب مجھے یہ احساس ہوا کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا ہے تو میں رہ نہیں سکی۔ میرے دل نے مجھے بتایا کہ میں تمہیں کچھ ہوتے نہیں دیکھ سکتی۔ میں چاہتی تو یہی تھی کہ تم یہاں سے کبھی نہ جاتے' زندگی بھر یہیں رہتے... لیکن مسئلہ زندگی کا آن پڑا ہے تو میں چاہتی ہوں' تم یہاں سے چلے جاؤ۔ تم جا...

جہاں بھی رہو.... لیکن زندہ رہو....''

وہ پیشانی میرے کندھے پر ٹکا کر چپکے چپکے رونے لگی۔ اس کے آنسو میرے دل کے صحرا کی تپش کچھ اور بڑھانے لگے۔ چند لمحے کے لیے میں دم بخود سا کھڑا رہ گیا۔ مجھ میں اسے چھونے کی بھی ہمت نہیں تھی۔

مجھے زندگی میں سب کچھ ملا تھا۔ محبتیں بھی' نفرتیں بھی۔ دولت کی آسائشیں بھی اور غربت کی سختیاں بھی۔ دوستوں کی جان نثاری بھی اور دشمنوں کی دل فگاری بھی۔ میرا خیال تھا کہ میں نے زندگی میں سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اس کے باوجود دامنِ دل بالکل خالی محسوس ہوتا تھا۔ انسان اپنے آپ کو بالکل تہی دست و تہی داماں محسوس کرتے ہوئے زندگی کے خار زاروں میں دوڑتا چلا جا رہا ہو اور یکدم ہی کسی بے عنوان سی محبت کا نخلستان اس کے سامنے آ جائے' چاہت بھرے آنسوؤں کے نگینے اس کی جھولی میں آ گریں تو جیسے کچھ یقین سا نہیں آتا۔

میں نے بہت آہستگی سے اس کا سر اوپر اُٹھایا۔ اس کے سانولے چہرے پر آنسوؤں کی سیال چاندی چمک رہی تھی۔ میں نے سرگوشی سے بھی دھیمے لہجے میں پوچھا۔ ''کیا یہ پہلی نظر کی محبت ہے؟''

''معلوم نہیں۔'' اس نے سادگی اور بے بسی سے جواب دیا۔ ''میں تو بس یہ جانتی ہوں کہ میں تمہیں مرتے نہیں دیکھ سکتی۔ تم بابا کے ہوٹل پر آئے تو میں پہلے دن سے چُھپ چُھپ کے تمہیں دیکھ رہی تھی۔ تم سارا دن گارا بناتے' اینٹیں ڈھوتے اور دیوار بناتے۔ میں منڈیر کے پیچھے چھپی تمہیں دیکھتی رہتی اور دل ہی دل میں سوچتی' نہ جانے کس دن تم یہاں سے چلے جاؤ گے اور تمہیں پتا بھی نہیں ہو گا کہ کوئی کہاں سے اور کب تک تمہیں چُھپ چُھپ کر دیکھتا رہا۔ تمہاری ہر جنبش پر کسی کا دل الٹ پلٹ ہوتا رہا...''

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اس نے سسکی سی لی پھر لہجے میں صدیوں کا پچھتاوا سمیٹتے ہوئے بولی۔ ''کاش ایسا ہی ہوا ہوتا! کاش تم اسی طرح چلے گئے ہوتے' تمہیں کچھ پتا نہ چلتا۔ میرے دل میں حسرت کا زخم آخر کب تک تازہ رہتا؟ کبھی نہ کبھی تو بھر ہی جاتا لیکن اب تم روبرو آ چکے ہو' تم سے سب بات ہو چکی ہے.... اور اب تم چلے جاؤ گے تو یہ زخم کبھی نہیں بھرے گا' ناسور بن جائے گا۔''

پھر جیسے وہ کسی اُمید افزا خیال کے تحت دھیرے سے مسکرا دی۔ بھیگی ہوئی آنکھوں کے ساتھ مسکراہٹ کا یہ امتزاج عجیب تھا۔ وہ انگلی سے گویا میرے چہرے کے گرد لکیر کھینچتے ہوئے بولی۔ ''لیکن چلو... یہ اطمینان تو ہو گا کہ تم جہاں بھی ہو' زندہ ہو۔ اگر میری آنکھوں کے سامنے تمہیں کچھ ہو گیا تو میں بھی زندہ نہیں رہ سکوں گی۔''

یہ اس نے عجیب ہی بات کی تھی یا شاید میں آدمی ہی کچھ عجیب تھا۔ میں محبتوں کی کچھ عجیب اور ناقابل تشریح شدتوں کا متلاشی تھا لیکن جب کبھی کہیں محبتوں کی یہ شدت اچانک ہی مجھے نظر آتی تھی تو میں خوفزدہ سا ہو جاتا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اگر اس کی آنکھوں کے سامنے مجھے کچھ ہو گیا تو وہ بھی زندہ نہیں رہے گی... اور وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کی صورت میں نے آج پہلی بار دیکھی تھی' جسے میرے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ معلوم نہیں محبت نے اس کے ذہن میں میرا کیسا بُت تراشا تھا۔

میں نے اس کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن جب وہ لوگ آ کر تمہارے بابا اور دوسرے لوگوں کو مار رہے تھے تو تم نے خود کلہاڑی میرے ہاتھ میں دے کر مجھے ان کے ساتھ لڑنے کے لیے بھیجا تھا جب کہ ان سب کے پاس کلاشنکوفیں تھیں۔ اس وقت بھی تو تم مجھے موت کے منہ میں ہی بھیج رہی تھیں۔''

''نہیں۔ اس وقت نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ میں ناممکن کو ممکن محسوس کر رہی تھی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

''اور اب تمہیں یقین نہیں ہے کہ میں ہوشو خان کا مقابلہ کر لوں گا؟'' میں نے دل کا بوجھل پن کم کرنے کے لیے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''ہوشو خان سے تو تم دس مرتبہ مقابلہ کر لو گے اور دس مرتبہ ہی جیت جاؤ گے۔'' وہ وثوق سے بولی۔ ''لیکن اس مقابلے کے پیچھے جو سازش کام کر رہی ہے' اس کا مقابلہ شاید نہ کر سکو کیوں کہ ہمیں معلوم ہی نہیں ہے' وہ سازش ہے کیا؟''

''لیکن تمہیں یہ یقین ہے کہ کوئی سازش ہے ضرور؟'' میں نے اس کی جھلملاتی ہوئی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہاں۔ یہ مجھے یقین ہے ورنہ مجھے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ ہوشو خان سے ... بلکہ اس علاقے کے کسی بھی شہ زور سے تمہارا مقابلہ ہوتا... یعنی سچ مچ کا... اصلی... اور ایماندارانہ مقابلہ ہوتا تو مجھے بالکل فکر نہ ہوتی۔ یہ تو نورا کشتی ہے' اس میں تو مجھے بالکل پریشان نہیں ہونا چاہیے تھا۔ نورا کشتی کے مقابلے میں تو مجھے کیا' کسی کو بھی پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں تو خطرے والی کوئی بات ہی نہیں۔ لوگوں کو بے وقوف ہی بنانا ہوتا ہے لیکن نہ جانے کیوں اس سے میرا دل زیادہ ڈر رہا ہے۔ اگر یہ طے پایا کہ تمہیں ہوشو خان سے مردوں کی طرح بالکل صحیح مقابلہ کرنا ہے تو شاید میرا دل نہ ڈرتا۔'' اس نے بے آواز سے انداز میں طویل سانس لی۔

''دل کے کہنے پر بہت چلتی ہو تم؟'' میں نے پوچھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مجھے پہلی ہی نظر میں اچھی کیوں لگی تھی۔ وہ بھی میرے ہی ''قبیلے'' کی معلوم ہوتی تھی۔ غربت میں پرورش پانے والی مگر نہ جانے کہاں سے بے پناہ ذہانت سمیٹ لینے والی۔ تلخ حقائق کے بھیانک ریگزاروں میں رہنے والی مگر دل کے کہنے پر چلنے والی....

"ہاں۔ دل کے سوا میرے پاس ہے ہی کیا۔ اس کے کہنے پر بھی نہ چلوں تو کس کے کہنے پر چلوں؟ دل نے کبھی مجھے دھوکا بھی نہیں دیا۔ یہ مجھے جو کچھ بھی کرنے کو کہتا ہے' وہ ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ بہت اچھا دل ہے میرا' مجھے کبھی بہکاتا نہیں' کوئی غلط کام نہیں بتاتا' کوئی غلط راستہ نہیں دکھاتا..." نمی اب صرف اس کی آنکھوں میں جھلملا رہی تھی۔ اس کا چہرہ میں نے اپنے ہاتھوں سے پونچھ دیا تھا۔

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا' ذرا چونکتے ہوئے بولی۔ "اور ہاں... دینو بابا بھی بہت اچھا ہے۔ اس کا کہنا بھی میں بالکل نہیں ٹالتی۔ ایک دل .... اور ایک دینو بابا... دنیا میں بس یہی دونوں میرے ہیں۔"

"اور میں...؟"

"تم...؟ تم تو شاید اپنے بھی نہیں ہو۔ معلوم نہیں دل میں کیا کیا بھید چھپائے پھر رہے ہو۔ تم اس دنیا میں شاید صرف بھٹکنے کے لیے آئے ہو۔ حالات تمہیں ایک خزاں رسیدہ پتے کی طرح اُڑائے پھر رہے ہیں۔ تمہاری کوئی منزل نہیں ہے..." وہ میرا ہاتھ تھامے' اسے دونوں ہاتھوں سے پھیلائے یوں تک رہی تھی جیسے لکیروں کی مدد سے میری قسمت کا حال پڑھ رہی ہو۔ ایک پیشہ ور نجومی ہی کی طرح روانی سے وہ مجھے میرا ماضی' حال اور مستقبل بتا رہی تھی۔

فرق صرف یہ تھا کہ وہ پیشہ ور نجومیوں کی طرح جھوٹی نہیں تھی۔ وہ جو کچھ کہہ رہی تھی' سچ کہہ رہی تھی۔ میں خود اپنے بارے میں اکثر یہی محسوس کرتا تھا لیکن اس کے منہ سے یہ سب کچھ سُن کر میں دم بخود رہ گیا۔

"تم نجومی ہو کیا؟ تمہیں ہاتھ دیکھنا آتا ہے کیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"نہیں.... بالکل نہیں۔ مجھے ہاتھ دیکھنا نہیں آتا۔ ہاتھوں کی ٹیڑھی میڑھی لکیریں مجھے ہمیشہ صرف بھول بھلیاں لگی ہیں۔ میں ان میں کبھی کوئی مطلب تلاش نہیں کر سکی۔ ہاتھ تو میں یونہی دیکھ رہی تھی۔ مشقت کرنے والے اور فرعون صفت لوگوں کا گریبان پکڑنے والے ان آہنی ہاتھوں کی خوبصورتی کا اندازہ کر رہی تھی۔"

"پھر مجھے میرے بارے میں یہ سب باتیں کیسے بتا رہی ہو؟"

"یہ سب کچھ تو اس وقت ہی میرے دل میں آیا تھا جب میں نے پہلی بار تمہاری صورت دیکھی تھی۔" وہ بولی۔ "کرنے کو بے شک تم ہر کام کر لیتے ہو لیکن میرا دل کہتا ہے کہ تم محنت مزدوری کرنے والے آدمی نہیں ہو۔ میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" اس نے پلکوں کی چلمن اُٹھا کر ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کی۔

مجھے اس سے خوف آنے لگا تھا۔ میں نے زندگی میں کبھی کسی پامسٹ کو ہاتھ نہیں دکھایا تھا' کبھی کسی ماہرِ نجوم سے اپنا زائچہ نہیں بنوایا تھا' کبھی کسی سے اپنے مستقبل کا حال جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے مستقبل کے بارے میں کچھ جاننے سے خوف آتا تھا۔

لندن میں میری کاروباری شناسا جوڈی فوسٹر جو بعد میں میری بہت گہری دوست بھی بن گئی تھی' لندن ہی میں قیام کے دوران ایک بار مجھے ویسٹ اینڈ کے علاقے میں لگنے والے ایک بہت بڑے میلے میں لے گئی تھی۔ وہیں وہ زبردستی مجھے شیشے کے گولے میں جھانک کر قسمت کا حال بتانے والی ایک عورت کے ٹینٹ میں بھی لے گئی تھی۔

اس نے مجھے کچھ انٹ شنٹ باتیں بتائی تھیں جنہیں میں نے ایک کان سے سُن کر دوسرے سے نکال دیا تھا لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ اس کا انداز بے پناہ متاثر کن تھا اور اس نے ٹینٹ کے اندر ہی ایسا ماحول تخلیق کر رکھا تھا کہ اندر قدم رکھنے والا سحر زدہ ہو کر رہ جاتا تھا۔ وہ عورت جپسی تھی مگر اپنے عالمانہ انداز سے کسی ڈاکٹریٹ کی ڈگری رکھنے والے کو بھی مرعوب کر سکتی تھی۔ یہ دوسری بات تھی کہ اس کی علمیت محدود اور مکالمے رٹے رٹائے سے تھے......... لیکن ان چیزوں کو صرف مجھ جیسے آوارہ گرد ہی محسوس کر سکتے تھے۔ بات پھر وہی آ جاتی تھی کہ گورے فراڈ بھی کرتے ہیں تو بڑے سلیقے' بڑی تیاریوں سے کرتے ہیں۔

مگر مجھے اس سفید فام' خرانٹ' سرد و گرم چشیدہ اور دنیا کی خاک چھاننے والی عورت نے خوفزدہ نہیں کیا تھا' ایک دور افتادہ دیہاتی علاقے کی اس ان پڑھ اور نوخیز لڑکی نے ضرور ڈرا دیا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ میری ذات کے شفاف گولے میں جھانک کر میری ہر بات جان سکتی تھی۔

"اس گھر میں تمہارے اور دینو بابا کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا۔" میں نے کہا۔ "دینو بابا کی بیوی بھی زندہ نہیں ہے کیا؟"

"نہیں۔ وہ بیماری سے مر گئی تھی۔ ٹی بی ہو گئی تھی اسے۔ علاج نہیں ہو سکا۔" موتی نے افسردگی سے بتایا۔ "وہ بہت خوبصورت عورت تھی لیکن بیماری اسے کسی آدم خور بلا کی طرح کھا گئی۔ میرے ہاتھوں میں ہی جان دی تھی اس نے۔ وہ بھی دینو بابا کی طرح ایک اچھی انسان تھی۔ دینو بابا نے مجھے باپ کا پیار دیا اور اس نے ماں کا لیکن مجھے زیادہ عرصہ اس کے پیار کی چھاؤں میں بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔"

"اور تمہارے اپنے ماں باپ...؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ وہ لڑکی اس قابل تھی کہ اسے بہتر طور پر جاننے کی کوشش کی جاتی۔

"وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔" اس نے سر جھکا کر افسردگی سے جواب دیا۔

"چھوڑ کر بھاگ گئے تھے؟" میں نے بے یقینی سے دُہرایا۔ "کیا ماں باپ بھی اپنی اولاد کو چھوڑ کر بھاگ جاتے ہیں؟"

"کیوں نہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی۔ "حالات کی بات ہے۔ اس دنیا میں لوگوں پر ایسے بھی حالات گزرتے ہیں کہ وہ اپنی اولاد کو بیچ دیتے ہیں۔"

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی کچھ تفصیل بتانے لگی۔ "ہم لوگ منگن ہار تھے۔ منگن ہار سمجھتے ہو نا؟ بھیک مانگ کر گزارا کرنے والے۔ ان دنوں ہمارا کنبہ ایک گاؤں میں ٹوٹی پھوٹی سی جھونپڑی میں ٹھہرا ہوا تھا۔ میں پانچ چھ سال کی تھی۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے... وہ ایک عجیب صبح تھی۔ آسمان کے کناروں پر جیسے خون اُترا ہوا تھا..." اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے بالکل معدوم ہو گئی۔ اس کی نظریں ملگجے اندھیرے میں کہیں دور بھٹک رہی تھیں۔ میں اس کے دوبارہ بولنے کا منتظر رہا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پہلے سے بھی دھیمے لہجے میں بولی۔ "اس روز ماں باپ ابھی بھیک مانگنے کے لیے نہیں نکلے تھے۔ گاؤں سے کافی دور لاری اڈا تھا۔ ہم لوگ وہاں بھیک مانگنے جاتے تھے۔ مجھ سے بڑی بھی ایک بہن تھی اور مجھ سے چھوٹی بھی۔ مجھ سے چھوٹی تو گود میں تھی۔ صرف اسے ماں گود میں رکھتی تھی' باقی سب الگ الگ ہو کر اِدھر اُدھر بکھر جاتے تھے اور شام ڈھلے اکٹھے ہو جاتے تھے۔ دن بھر بھیک مانگتے لاری اڈے پر اور اس کے آس پاس ہی پھرتے رہتے تھے۔ اس روز ابھی جھگی سے روانہ ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ گاؤں میں شور پڑ گیا' دوسرا قبیلہ حملہ کرنے آ رہا ہے۔ اس گاؤں میں جو قبیلہ آباد تھا اس کی برسوں سے کسی دوسرے قبیلے سے دشمنی چلی آ رہی تھی....."

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولی۔ "ایک تو ہم لوگوں کو دشمنوں نے اُجاڑ کر رکھا ہوا ہے۔ شہروں کا تو مجھے پتا نہیں لیکن ہم دیہات والوں کے حالات تو ایسے ہیں کہ دوست بن کر جینا بھی خاصا مشکل کام ہے مگر ہم پتا نہیں کیسی کیسی معمولی باتوں پر دشمنیاں پالتے رہتے ہیں۔"

"شہروں کا بھی یہی حال ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں اس وقت کھیلنے نکلی ہوئی تھی اور گھر سے کافی دور نکل گئی تھی جب شور مچا کہ دشمن قبیلے کے لوگ آ رہے ہیں۔ میں نے لوگوں کو خوفزدہ انداز میں اِدھر اُدھر بھاگتے دیکھا تو میں کچھ زیادہ ہی ڈر گئی۔ میں اس وقت ایک بیل گاڑی کے نیچے بیٹھی ہوئی تھی جس میں بیل جُتے ہوئے نہیں تھے۔ میں گیلی مٹی سے کوئی کھلونا بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں گاڑی کے نیچے ہی چھپی بیٹھی رہی۔ اَدھورا کھلونا میرے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ گولیاں چلنے لگیں.... مکانوں کو آگ لگائی جانے لگی..."

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے وہ منظر اُبھر آیا تھا اور اس کے حواس پر برف سی جم گئی تھی۔ پھر اچانک ہی اس نے دھیرے سے میرا بازو ہلاتے ہوئے بڑی سادگی سے پوچھا۔ "تمہارے ہاں لوگ اتنی بے رحمی سے ایک دوسرے کی جانیں کیوں لیتے ہیں؟ ایک دوسرے کے گھر کیوں اجاڑتے ہیں؟ ہم ایسے انسانوں کو درندے کہتے ہیں مگر درندے تو ایسا نہیں کرتے۔"

میں اسے کیا جواب دیتا۔ میں تو خود عرصے سے ان سوالوں کے جواب تلاش کر رہا تھا۔ اسے جب اندازہ ہو گیا کہ میں ان سوالوں کے جواب دینے کا اہل نہیں ہوں تو وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "پانچ چھ سال کی وہ بچی اپنا ادھورا کھلونا لیے بیل گاڑی کے نیچے بیٹھی رہ گئی اور اس کے اردگرد کچے پکے مکانوں سے شعلے اُٹھنے لگے۔ گلیوں میں لاشیں بکھر گئیں۔ میں اس وقت بیل گاڑی کے نیچے سے نکلی جب اسے بھی آگ لگ گئی۔ اس وقت تک دشمن قبیلے کے لوگ جا چکے تھے.... اور میرے ماں باپ بھی۔"

وہ میری طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ "میں انہیں ڈھونڈتی پھر رہی تھی مگر ان کا کچھ پتا نہیں چلا۔ ہماری جھگی بھی جل کر راکھ ہو چکی تھی مگر اس میں ان کی لاشیں نہیں تھیں۔ میں نے گلیوں میں پڑی ہر لاش کا چہرہ دیکھا مگر میرے ماں باپ کہیں نہیں تھے۔ وہ شاید بھاگ گئے تھے لیکن عجیب بات یہ ہے کہ امن و سکون ہو جانے کے بعد بھی وہ مجھے ڈھونڈنے نہیں آئے۔ کوئی میری طرف توجہ نہیں دے رہا تھا۔ سب کو اپنی اپنی پڑی ہوئی تھی۔ دینو بابا وہاں مہمان آیا ہوا تھا۔ وہ اس گاؤں کا رہنے والا نہیں تھا۔ صرف اس کا دھیان میری طرف گیا۔ اس نے مجھ سے ساری بات پوچھی اور مجھے ساتھ لیے میرے ماں باپ کی تلاش میں اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ پھر اس انتظار میں وہ بہت دن وہاں ٹھہرا کہ شاید میرے ماں باپ مجھے ڈھونڈنے آئیں مگر وہ نہیں آئے۔ آخر کار مایوس ہو کر دینو بابا اور اس کی بیوی مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔"

"تمہارا مطلب ہے یہاں لے آئے؟" میں نے کہا۔

"نہیں۔ اس وقت دینو بابا نواب شاہ کے قریب ایک گاؤں میں رہتا تھا اور غربت کے ہاتھوں پریشان تھا۔ یہاں تو ہم صرف تین چار سال پہلے آئے ہیں۔ اس سے پہلے کچے کے علاقوں میں برائے نام آبادی تھی۔ اب تو رونق بہت بڑھتی جا رہی ہے۔"

پھر اسے جیسے کچھ یاد آیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ "دینو بابا کی بیوی بیمار رہتی تھی۔ جب ہم گاؤں میں تھے تو سب لوگوں کا خیال تھا' دینو مجھے اس لیے ساتھ لایا ہے کہ پال پوس کر مجھ سے شادی کر لے گا۔ یہاں ایسا بھی ہوتا ہے۔ دینو بابا... جو اس وقت کچھ ایسا "بابا" نہیں تھا' سب کو سمجھاتا کہ اس کے اولاد نہیں ہے اور اس کی بیوی سے اولاد ہونے کی اُمید بھی نہیں ہے' اس

لیے وہ مجھے منہ بولی بیٹی بنا کر لایا ہے اور بیٹی ہی کی طرح پالنا چاہتا ہے مگر کوئی اس کی بات کا یقین نہیں کرتا تھا لیکن اس نے بہرحال مجھے باپ ہی کی طرح پالا ہے بلکہ شاید میں غلط کہہ رہی ہوں۔ میرا باپ بھی مجھے اس طرح نہ پالتا۔"

پھر وہ جھرجھری سی لے کر بولی۔ "اگر میں اپنے ماں باپ کے پاس ہوتی تو شاید اس وقت بازو پر بچہ لٹکائے کہیں نہ کہیں بھیک مانگتی پھر رہی ہوتی۔"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ جو بھی باتیں کرتی تھی' ذرا ٹوٹے پھوٹے سے انداز میں کرتی تھی لیکن مفہوم کم و بیش یہی تھا جو میں بیان کرتا جا رہا ہوں اور اس سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک ذہین لڑکی تھی۔ میرا یہ خیال ایک بار پھر پختہ ہو گیا تھا کہ ذہانت واقعی کسی کی میراث نہیں ہوتی۔ ذہانت ایک بھکاری کے گھر میں جنم لینے والی بچی یا بچے کے پاس بھی ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اسے اپنی ذات کے اظہار کا موقع ملے۔ کوئی اس کے پاس بیٹھ کر اس کی شخصیت کی گہرائیوں میں جھانکے' اس کی بات سُنے۔

ہمارے اردگرد ان گنت لوگ ہوتے ہیں جن کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ انہیں کسی سے بات کرنے کا موقع نہیں ملتا' ان کی سوچیں کبھی نہ کھل سکنے والے پھولوں کی طرح ان کے ذہنوں میں مرجھا کر رہ جاتی ہیں۔ دینو بابا کے اس لڑکی پر دوسرے احسانات تو اپنی جگہ سہی لیکن یہ احسان سب سے اہم تھا کہ اس نے اس لڑکی کو زبان دے دی تھی' سوچنا سکھا دیا تھا۔

"تمہیں اپنے ماں باپ کی یاد نہیں آتی؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے آتی تھی لیکن پھر ان کی یاد سے زیادہ یہ بات یاد آنے لگی کہ وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور پھر تلاش کرنے بھی نہیں آئے۔ اب صرف یہی بات یاد رہ گئی ہے۔" اس نے جواب دیا پھر کچھ چونک کر بولی۔ "یہ تم نے مجھے کن باتوں میں لگا لیا ہے۔ تم مجھے صرف یہ بتاؤ.... کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے کہ تم یہاں سے نہیں بھاگو گے؟"

"ہاں۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر جواب دیا۔ "میرے اندر صدیوں پُرانے انسانوں والی انا بیدار ہو گئی ہے۔ میرا یوں منہ چھپا کر بھاگنے کو دل نہیں مان رہا۔ دوسرے جب میں یہ سوچتا ہوں کہ تم لوگوں کے گھر سے میرے بھاگنے کے بعد تم پر کیا گزرے گی' تو میرا بھاگنے پر بالکل ہی ضمیر آمادہ نہیں ہوتا۔ میری وجہ سے دینو بابا پہلے ہی بہت تکلیف اُٹھا چکا ہے۔ لگتا ہے' دلبر خان نے مجھے جان بوجھ کر تمہارے ہاں ٹھہرایا ہے۔ اس میں دونوں طرح اس کے کمینے انتقام کی تسکین کا سامان ہو سکتا ہے۔ اگر میں یہاں ٹھہرا رہتا ہوں تو اسے اپنی سازش پر عمل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ اگر میں بھاگ جاتا ہوں تو اسے تم لوگوں پر اچھی طرح غصہ نکالنے کا موقع ملتا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کی خبیث فطرت کو خوشی حاصل ہو گی مگر میں اس یہ خوشی فراہم کرنا نہیں چاہتا۔"

"تم ہماری فکر نہ کرو' میں نے تو سوچا ہے' میں اب بابا کو لے کر کچھ لوگوں سے ملوں گی اور ہم مل کر کسی طرح سائیں مراد کے پاس شہر جائیں گے۔ ہم فریاد لے کر ان کے سامنے پیش ہوں گے اور انہیں یہاں کے حالات سے آگاہ کریں گے' انہیں بتائیں گے کہ یہاں ہم پر کیا ظلم ہو رہا ہے۔ مجھے یقین ہے' انہیں یہاں کے حالات کا پتا نہیں ہے۔ ورنہ وہ کبھی یہ سب کچھ برداشت نہ کرتے۔ سائیں مراد بُرے آدمی نہیں ہیں۔ سب وڈیرے بُرے نہیں ہوتے۔ یہ خواہ مخواہ کا پروپیگنڈہ ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا۔ "کوئی بھی طبقہ بُرا نہیں ہوتا۔ ہر طبقے میں اچھے اور بُرے دونوں طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔"

"بعض وڈیرے تو اپنے ہاریوں کے لیے فرشتوں سے کم ہیں۔" موتل بولی۔ "میں سائیں مراد کو نہیں جانتی۔ میں نے دیکھا تک نہیں لیکن ان کے بارے میں جو چند باتیں میں نے سنی ہیں' ان کی وجہ سے مجھے یقین ہے کہ وہ ایک اچھے آدمی ہیں۔"

"لیکن انہوں نے دلبر خان جیسے آدمی کو تمہاری ہر چیز کا مختار بنا دیا ہے' یہ کیا کم بڑی برائی ہے؟" میں نے کہا۔

"یہ اس علاقے کی بدقسمتی ہے کہ یہاں کے لوگوں کو سائیں مراد سے خود میل ملاقات کا موقع نہیں ملتا اور انہیں یہاں کے حالات کا صحیح پتا نہیں چلتا۔ وہ مصروف بھی بہت ہوتے ہیں۔ اصل زمینیں تو دوسری ہیں' یہ تو یونہی فالتو کی ہیں۔ ادھر دھیان دینے کا تو ان کو وقت ہی نہیں ملتا۔ وہ سیاست میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ میں نے سُنا ہے شہر میں بڑے مشہور ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"اس کا مطلب ہے' تم بھی شہر سے آئے ہو؟" اس نے گھورا۔

"فی الحال مجھے رہنے دو' سائیں مراد ہی کے بارے میں باتیں کرتی رہو۔" میں نے مسکرا کر اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ اس نے میری بات مان لی۔

"دلبر خان نے انہیں بُری طرح اپنے جال میں جکڑا ہوا ہے" وہ واپس اسی موضوع پر آتے ہوئے بولی۔ "اس نے سائیں مراد کو یقین دلا رکھا ہے کہ وہ یہاں کا انتظام بہت اچھا چلا رہا ہے اور اس کے علاوہ یہ انتظام کوئی چلا ہی نہیں سکتا۔"

"ان کا یہ یقین کر لینا ہی ان کا بہت بڑا جرم ہے۔ یہاں اوپر والا یہ یقین کیے اپنے کاموں میں مگن ہے کہ نیچے والا اپنی ذمہ داریاں بڑے اچھے طریقے سے ادا کر رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں لیکن اتنا مجھے یقین ہے کہ اگر کچھ لوگ دلبر خان سے چُھپ کر سائیں مراد سے ملاقات کرنے اور یہاں کے حالات سے انہیں اچھی طرح آگاہ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو ہماری جان دلبر خان سے چھوٹ سکتی ہے۔" وہ بولی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس کے کمزور سے وجود میں ایک انقلابی روح مچل رہی تھی۔ وہ کچھ کرنا چاہتی تھی۔

"اور تمہارا خیال ہے تم یہ کام کر سکتی ہو؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"میں کوشش تو کر سکتی ہوں۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ مجھے ہنسی آ گئی۔

"وہ سات آٹھ سفید پوش سے دکاندار بھی کوشش کرنے آئے تھے جن کی پٹائی رکوانے کے لیے تم نے مجھے بھیجا تھا۔" میں نے کہا۔ "دلبر خان کی صورت دیکھتے ہی ان کی گھگھی بندھ گئی تھی۔ وہ دلبر خان سے بات کرنے' احتجاج کرنے جمع ہوئے تھے۔ دلبر خان کی صورت دیکھتے ہی ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے تھے اور کانپتی آوازوں میں بتانے لگے تھے کہ وہ تو چائے پینے کے لیے جمع ہوئے تھے۔"

"کیا کریں.... ان کی بھی مجبوری ہے۔" موتل متاسفانہ سے لہجے میں بولی۔ "یہاں سب لوگوں کے ذہنوں پر دلبر خان کی دہشت ہی ایسی بیٹھی ہوئی ہے۔ اس دہشت کو ان کے ذہنوں سے کھرچنے کے لیے کوئی بہت ہی طاقتور ہاتھ چاہیے۔"

"وہ ہاتھ تمہارا بہرحال نہیں ہو سکتا۔" میں نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"تو کیا تمہارا ہو سکتا ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"ہو سکتا تھا...." میں نے دلبر خان کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ "دلبر خان کوئی ایسی توپ چیز بھی نہیں ہے۔ ایک معمولی سا بدمعاش ہے۔ صرف کمزوروں پر ظلم ڈھانے والا۔"

"تو کیا تم اس کا کوئی علاج کر سکتے ہو؟" اس نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔ کچھ دیر پہلے تک وہ مجھے یہاں سے بھگانے پر تلی ہوئی تھی مگر اب جاننا چاہ رہی تھی کہ کیا میں دلبر خان کا کوئی علاج کر سکتا۔

"میں ان جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔" میں نے صاف گوئی سے کام لیا۔ "میری جان پہلے ہی نہ جانے کتنے جھگڑوں میں پھنسی ہوئی ہے۔ میں بس دلبر خان کی یہ نورا کشتی والی فرمائش پوری کرنے کے لیے رُکا ہوں۔ اس کی تہ میں کیا چُھپا ہے' وہ بھی دیکھا جائے گا۔ اگر زندہ رہا تو اس کے بعد میں آگے روانہ ہو جاؤں گا۔"

"اور اگر زندگی نے کبھی فرصت دی تو کیا لوٹ کر آؤ گے؟" اس نے ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد پوچھا۔

"شاید۔ یہ وعدہ نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

وہ پلک جھپکائے بغیر چند لمحے میری طرف دیکھتی رہی۔ اس کے چہرے پر یک بیک صدیوں کی تھکن رینگ آئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی جادوگر آنکھیں جیسے کسی کھنڈر کی دو شکستہ کھڑکیاں بن گئی تھیں جن سے اس کی ذات کے' دور تک پھیلے ہوئے ویرانے کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

"تم خواہ وعدہ نہ کرو.... لیکن اگر میں زندہ رہی تو تمہارا انتظار کروں گی۔" بالآخر وہ سرگوشی میں بولی۔

"کس لیے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔ اس کے آبگینۂ دل پر یقیناً بہت سی خراشیں تھیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے ایک اور ٹھیس لگے۔

"ضروری نہیں ہوتا کہ ہر انتظار کا کوئی مقصد ہو؟" وہ سر جُھکا کر اپنے دوپٹے کے پلّو سے دھاگا کھینچتے ہوئے بولی۔ "مجھے معلوم ہے' شہر میں کسی اور کو بھی تمہارا انتظار ہو گا۔ اس سے تمہارا کوئی وعدہ بھی ہو گا۔ میں تم سے کوئی وعدہ نہیں لے رہی.... میں اس قابل ہوں بھی نہیں.... ایک غریب' معمولی اور مسکین ہار لڑکی.... میرے یہ نصیب کہاں کہ تم سے کوئی وعدہ لے سکوں لیکن تم مجھے اپنا انتظار کرنے سے تو منع نہیں کر سکتے نا...." اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔

"دیکھو.... شہر میں میرا کسی سے کوئی وعدہ نہیں ہے...." میں نے اُلجھن سے کہا۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اپنے بارے میں اسے کس حد تک بتاؤں اور کس حد تک نہ بتاؤں۔

اس نے خود ہی میری اُلجھن حل کر دی۔ ہاتھ اُٹھاتے ہوئے بولی۔ "میں تمہارے بارے میں کچھ بھی سُننا نہیں چاہتی۔ تمہیں کوئی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ تم کوئی سیدھے سادے' غریب دیہاتی نہیں ہو لیکن مجھے یہ معلوم نہیں ہے کہ تم اصل میں کیا ہو۔ میں جاننا بھی نہیں چاہتی۔ تم سے پوچھنا بھی نہیں چاہتی' تم جو بھی ہو' جہاں سے بھی آئے ہو' جب وہاں واپس جاؤ تو بس کبھی کبھی مجھے یاد کر لیا کرنا۔ شاید کبھی تمہارا واپس آنے کو اور مجھ سے ملنے کو جی چاہے۔"

وہ خاموش ہو گئی اور گویا دھیرے دھیرے رینگتی ہوئی رات خاموش ہو گئی۔ میرے ذہن میں خیالات کا ایک ہجوم تھا۔ الفاظ کا ایک ریلا ہونٹوں تک آتا تھا اور لوٹ جاتا تھا۔ ہر بات پر یہی خیال آتا تھا کہ یہ مجھے اس سے نہیں کہنی چاہیے' اس کا کیا فائدہ۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے سر اٹھایا اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "یقین کرو' یہ سب باتیں کرنے کا میرا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہ تو بس ہوتی چلی گئیں۔ اصل میں تو میں تم سے صرف یہی کہنے آئی تھی کہ یہاں سے بھاگ جاؤ۔"

پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "تمہارا فیصلہ یہی ہے کہ نہیں بھاگو گے؟ مقابلہ کرو گے؟"

"ہاں۔ میرا فیصلہ یہی ہے۔" میں نے دھیمے مگر مضبوط لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے۔ میں تمہیں خدا کے سپرد کرتی ہوں۔ وہی تمہاری حفاظت کرے گا۔" اس نے سرگوشی میں کہا۔

"ظاہر ہے۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ "اب تک بھی وہی میری حفاظت کرتا رہا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور بے آواز قدموں سے واپس چلی گئی۔ رات کے سناٹے نے ایک بار پھر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا لیکن اس سے زیادہ سناٹا میرے دل میں تھا۔ موِل سے میرا ملنا کچھ ویسا ہی تھا جس کے لیے ساحر نے کہا تھا.... تجھ سے ملنا خوشی کی بات سہی۔ تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں... میں بھی اس اداسی کو سینے سے لگائے اس چارپائی پر سکڑ سمٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگا جو میرے قد کاٹھ کے لیے چھوٹی تھی۔

کہتے ہیں نیند سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ وہ تو بہرحال سولی بھی نہیں تھی جس پر میں لیٹا ہوا تھا۔ اندر ہی اندر البتہ شاید میں اپنی اُلجھنوں کی سولی پر مصلوب تھا۔ دیر تک میں موِل کے بارے میں سوچتا رہا۔ انسان قطعاً پیش گوئی نہیں کر سکتا کہ زندگی کے سفر میں، کس گوشے میں اسے کس قسم کی شخصیت ٹکرا جائے۔ اپنے دل میں ایک بے عنوان سی کسک کو دبائے بالآخر میں سو ہی گیا۔

مجھے یوں لگا کہ میں بہت کم سویا تھا۔ کوٹھری میں کسی کی موجودگی کے احساس سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میں تیزی سے اٹھنے لگا لیکن پھر دروازے پر دِنو کو کھڑے دیکھ کر میں نے جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور دوبارہ لیٹ گیا۔ کھلے دروازے سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔

دِنو کا چہرہ کل سے زیادہ سوجا ہوا لگ رہا تھا۔ نیل بھی زیادہ نمایاں دکھائی دے رہے تھے۔ مجھے بے دار ہوتے دیکھ کر وہ کل سے زیادہ لنگڑاتا اور زیادہ کراہتا ہوا میرے قریب آ گیا۔ چوٹیں ٹھنڈی ہو کر شاید زیادہ تکلیف دے رہی تھیں لیکن وہ کل جتنا خوفزدہ نہیں تھا بلکہ کسی حد تک خوش سا نظر آ رہا تھا۔

"کیا تم کافی دیر سے میرے جاگنے کے انتظار میں کھڑے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ نہیں۔" وہ جلدی سے بولا۔ "میں نے تو ابھی آ کر دروازہ ہی کھولا تھا کہ تم جاگ گئے۔ بہت ہلکی نیند ہے تمہاری۔ میں تو صرف دیکھنے آیا تھا، تمہیں جگانا نہیں چاہتا تھا۔"

"مجھے تو کافی پہلے جاگ جانا چاہیے تھا۔" میں نے کوٹھری میں آتی ہوئی دھوپ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر میں نے بغور دِنو کے چہرے کی طرف دیکھا۔ "تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

"ہاں۔" اس نے متورم ہونٹوں کے ساتھ ذرا مسکرانے کی کوشش کی۔ "میں تمہیں بتانا چاہتا تھا... صبح منہ اندھیرے ہی دلبر خان کے بھیجے ہوئے آدمی آ گئے تھے۔ میرا ہوٹل بھی دوبارہ.... پہلے سے زیادہ اچھے طریقے سے بننا شروع ہو گیا ہے۔ ہوٹل کے قریب ہی درختوں کی چھاؤں میں زمین تھوڑی تھوڑی کھود کر اور مٹی نرم کر کے ایک اکھاڑہ بھی بنا دیا گیا ہے۔ دلبر خان نے تمہارے لیے بہت ساری چیزیں بھی بھجوائی ہیں۔ انڈے... مکھن... دودھ... گھی.... مرغیاں، وغیرہ۔ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ ہمارے مہمان کو کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے اور اس کی خوراک کا خاص طور پر خیال رکھا جائے۔"

میں مسکراتے ہوئے اُٹھ بیٹھا۔ "لگتا ہے دلبر خان کو سندھ کی مہمان نوازی کی روایتوں کا خیال آ گیا ہے۔" میں نے جماہی لے کر کہا۔ "چلو خیر... آگے تو جو ہو گا دیکھا جائے گا، فی الحال تو اس کی مہربانیوں سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ اب تم تینوں وقت اپنے اس خادم کو خوب زبردست کھانے کھلاؤ۔ قربانی کے بکرے کو خوب کھلا پلا کر موٹا کرو۔"

جس قسم کی پُرمشقت زندگی آج کل گزر رہی تھی، اس میں مجھے کسی پرہیز کی ضرورت تو تھی نہیں۔ میں تو شہر میں بھی اپنے لیے مشقتیں تلاش کیے رکھتا تھا تاکہ میرا جسم ایک آرام طلب دولت مند کا زنگ آلود جسم نہ بن جائے۔

دِنو ایک بار پھر کچھ متفکر نظر آنے لگا۔ "پتا نہیں یہ دلبر خان کیا چکر چلا رہا ہے۔" وہ بولا۔

"جو بھی چکر چلا رہا ہے، چلانے دو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "وہ بہرحال یہاں کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا سامان کر رہا ہے۔ ہمیں بھی اس میں مزے لینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ... میں جو لکھا ہے وہ تو ہوتا ہی ہے۔"

"عجیب آدمی ہو تم۔" دِنو ایک رخسار پر ہاتھ رکھے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں۔ عجیب آدمی تو میں ہوں۔" پھر میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔ "میں بھی ذرا چھت پر سے دیکھ لوں، کیا سرگرمیاں ہیں پھر نہا دھو کر زبردست قسم کا ناشتا کیا جائے۔" میں نے ایک انگڑائی لی۔ "شکر ہے دِنو چاچا! مجھے تمہاری مشقت سے تو نجات ملی۔ اب دیکھ رہے ہو، کیا ٹھاٹ ہیں مابدولت کے؟"

"ہاں ... یہ بات تو ہے ادا افضل! چار دن تم نے ہماری خدمت کی، اب ہمیں پتا نہیں کتنے دن تمہاری خدمت کرنی پڑے۔" دِنو کراہ کر بولا۔

"گھبراؤ نہیں دِنو چاچا! میں زیادہ دن کا مہمان نہیں ہوں۔ مقابلہ ہو یا نہ ہو، میں جلد یہاں سے چلا جاؤں گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔ "میں تو مذاق کر رہا تھا۔ تمہاری خدمت میرے لیے بوجھ نہیں ہے۔ بے شک تم ساری زندگی یہیں رہو.... سر آنکھوں پر رہو۔ ہم ساری زندگی تمہاری خدمت کریں گے۔ ہم تو ذرا سی بات پر کسی کے غلام بن جانے والے لوگ ہیں۔ تم نے تو پھر بھی ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ ہم احسان فراموش نہیں ہیں۔"

"احسان...؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "میری وجہ سے تو تمہیں اتنی تکلیفیں اُٹھانی پڑ رہی ہیں اور آئندہ بھی نہ جانے کیا کچھ سہنا پڑے۔ تم اسے احسان سمجھ رہے ہو؟"

"ہاں۔ بات کو سمجھنے کے اپنے اپنے انداز ہوتے ہیں۔ تکلیف اور زحمت تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہوتی ہے۔ سمجھنے کی بات تو یہ ہے کہ تم ہمارے جھگڑے میں ہمیں بچانے کے لیے کودے۔ تم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈالا۔ ہم اس بات کو نہیں بھول سکتے۔ آج کل دوسروں کے لیے اپنے آپ کو ڈھال بنانے والے لوگ کہاں ملتے ہیں؟ آج کل تو وہ زمانہ ہے کہ لوگ اپنے پڑوسی، اپنے بھائی کے گھر کو آگ لگی دیکھ کر اپنے گھر میں دبک کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

اس نے میرے دل کی بات کر دی تھی۔ مجھے اس سے اتنی سمجھداری کی توقع نہیں تھی۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بعض لوگ بہت سطحی اور عام سے نظر آتے ہیں مگر وہ بہت گہرے ہوتے ہیں اور بعض لوگ بہت گہرے دکھائی دیتے ہیں مگر وہ بہت سطحی ہوتے ہیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پھر کراہتے ہوئے بولا۔ "مجھے اندرونی چوٹیں کافی شدید لگی ہیں۔ اس بڑھاپے میں اتنی چوٹیں برداشت کرنا آسان کام نہیں۔ میں صرف ڈھٹائی سے کام لیتے ہوئے چل پھر رہا ہوں ورنہ میری چلنے پھرنے والی حالت نہیں ہے۔"

"چاچا! تم آرام سے جا کر لیٹ جاؤ اور اس بات کی بالکل پروا نہ کرو کہ تمہارے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں اپنے کام خود کرتا رہوں گا۔ جس چیز کی ضرورت ہو گی، موِل سے لے لوں گا۔" میں نے محبت سے اس کا کاندھا تھپتھپانے کی کوشش کی مگر وہ اس پر بھی کراہ اُٹھا۔

"آرام سے لیٹنا ہی تو میرے بس کی بات نہیں ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "دس سال کی عمر سے لے کر آج تک رات کی چند گھنٹے کی نیند کے سوا کبھی آرام سے لیٹ کر دیکھا ہی نہیں۔ دکھ بیماری میں بھی آرام سے لیٹنا نصیب نہیں ہوا۔ یہ فرمائش تم مجھ سے مت کرو۔ اسے پورا کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے۔ میں آرام سے لیٹنا چاہتا بھی نہیں۔ میں چاہتا ہوں، صرف اس وقت آرام سے لیٹوں جب مجھے موت آنے والی ہو۔ آرام ہو تو بس پھر ہمیشہ ہی کے لیے ہو۔"

"ٹھیک ہے... اگر تم اسی طرح ہائے دہائی کرتے اِدھر اُدھر پھرتے رہنا چاہتے ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آؤ ذرا چھت پر چلیں۔" میں نے کہا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کوٹھری سے نکل آیا۔

موِل مجھے اس چھپر نما حصے میں جو کچن کا کام دیتا تھا، چولھے ہی کے قریب بیٹھی نظر آئی۔ وہ گزشتہ روز ہی کی طرح تنکے سے کچی زمین پر آڑی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے بیٹھنے کی مستقل جگہ وہی تھی اور تنکے سے زمین پر لکیریں کھینچنا اس کا محبوب ترین مشغلہ تھا۔

ہمیں قریب سے گزرتے دیکھ کر اس نے سر اُٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں شبِ رفتہ کا خمار تھا۔ دیر تک جاگنے کے باعث اس کی پلکیں بوجھل تھیں اور ان بڑی بڑی آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے لیکن اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ بعض چیزیں شاید اُجالے کی نسبت تاریکی میں زیادہ نمایاں ہوتی ہیں۔ ذہانت کی وہ چمک، جذبات کا وہ تموج جو میں نے گزشتہ رات ملگجے اندھیرے میں اس کے چہرے پر دیکھا تھا، اب دن کے اُجالے میں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں دِنو کے ساتھ چھت پر پہنچا تو اس کے چھپر ریستوران میں اور اس کے آس پاس بڑی رونق، بڑی سرگرمی نظر آئی۔ کل جہاں تخریب نے اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھے، آج وہاں تعمیر اپنی بہار دکھا رہی تھی۔ چار آدمی بڑی تندہی اور مستعدی سے میری بنائی ہوئی وہ دیواریں از سرِ نو تعمیر کر رہے تھے جنہیں گرا دیا گیا تھا۔ چھپر کی صفائی کی جا چکی تھی اور قابلِ استعمال سامان کو جھاڑ پونچھ کر، ٹھیک ٹھاک کر کے رکھ دیا گیا تھا۔

دو گدھا گاڑیاں بھی قریب کھڑی تھیں۔ ان میں غالباً ضرورت کا سامان لایا گیا تھا اور وہ غالباً اب مزید سامان لانے کے لیے تیار تھیں۔ کچھ دور درختوں کی چھاؤں میں اکھاڑہ تو تقریباً تیار بھی ہو چکا تھا۔ اس کے اردگرد باڑھ لگائی جا رہی تھی۔ اکھاڑے میں باڈی بلڈنگ کا سامان بھی ڈال دیا گیا تھا۔

یہ ہلچل' یہ مستعدی بہت بھلی لگ رہی تھی کیوں کہ کچھ بگڑتا نہیں' بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں آج کل چونکہ کچھ کٹھن وقت گزار رہا تھا' شاید اس لیے ذہن پر غمزدہ سے خیالات کی کچھ زیادہ ہی یلغار تھی۔ اپنے سامنے اس چھوٹی سی مثال کو دیکھ کر میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ ہمارے ہاں وسائل' طاقت اور اختیار رکھنے والے لوگ واقعی "تعمیر" اور صرف "تعمیر" پر کمربستہ ہونا چاہیں تو کیا کچھ نہیں کر سکتے۔ کیا کچھ تعمیر نہیں ہو سکتا۔

دلبر خان کسی شمار قطار میں نہیں تھا مگر جب تخریب اور خباثت پر اُترا ہوا تھا تو بنی بنائی بستیاں اس کے ہاتھوں اُجڑ سکتی تھیں' لوگوں کی زندگیاں برباد ہو سکتی تھیں۔ اب وہ خواہ اپنی کسی غرض یا سازش کے تحت ہی ذرا سی "تعمیر" پر آمادہ ہوا تھا تو یکدم جیسے گیٹی کا یہ گوشہ خوبصورت' بارونق اور آباد آباد سا نظر آنے لگا تھا۔

اگر ہمارے ہاں دلبر خان سے کہیں زیادہ بڑے' کہیں زیادہ بااختیار' کہیں زیادہ طاقتور اور کہیں زیادہ باوسیلہ لوگوں کو بھی توفیق ہوتی' انہیں ایک دوسرے کے خلاف جنگ وجدل' سازشوں' محاذ آرائیوں اور اپنے اپنے مفادات کے لیے لڑنے مرنے سے فرصت ملتی اور کسی معجزے کے تحت ان کے دلوں میں بھی تعمیر کا جذبہ پیدا ہو جاتا' لوگوں کے لیے کچھ کرنے اور ذرا سی بھی قربانی دینے کا حوصلہ پیدا ہو جاتا تو کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا؟ میرے خیال میں تو اس ملک' اس معاشرے کا نقشہ ہی بدل سکتا تھا۔

زمانہ کچھ ایسا آن لگا ہے کہ آج کل تو بات بات پر ملک اور معاشرے وغیرہ کے بارے میں سوچنا بھی بیماری سمجھا جاتا ہے۔ مجھے تو یہ بیماری کافی عرصے سے خاصی شدت سے لاحق تھی۔ سردست میں نے ان خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے مسکرا کر دینو کی طرف دیکھا اور کہا۔ "مبارک ہو۔ مار دھاڑ تو کافی ہوئی' کئی آدمیوں کو چوٹیں بھی کھانی پڑیں لیکن نتیجہ اچھا نکلا۔ کچھ بگڑنے کے بعد کچھ بن رہا ہے۔"

"لیکن مجھے اب بھی خوف آ رہا ہے۔" دینو بولا۔

"قصور تمہارا نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ہم لوگوں نے آج تک کچھ نہ کچھ ٹوٹتے بگڑتے ہی دیکھا ہے۔ کچھ بنتے دیکھتے ہیں تو دل ڈرنے لگتا ہے کہ ہمارے ساتھ کوئی دھوکا تو نہیں ہو رہا۔"

"یہ مسکرانے کی بات نہیں ہے۔" دینو گہری سنجیدگی سے بولا۔ "دلبر خان کسی کا بھلا چاہے' کسی کو کچھ بنا کر دے' یہ اس کی فطرت نہیں ہے۔"

"چلو خیر.... وہ بنوا کر تو دے رہا ہے۔ فی الحال تو ذہن یہیں تک رکھو۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "اس سے آگے کیا ہو گا' یہ ابھی مت سوچو۔"

مکان کے گرد چار آدمی اس وقت بھی کلاشنکوفیں لیے گشت کر رہے تھے اور یہ وہ نہیں تھے جنہیں میں نے گزشتہ رات دیکھا تھا۔ انہوں نے کن انکھیوں سے ہمیں دیکھا' وہ پوری طرح مستعد اور چوکنا تھے لیکن بظاہر بے پروائی سے ٹہل رہے تھے۔ دلبر خان نے اپنی دانست میں مجھے نظر بند رکھنے کا پورا پورا بندوبست کیا ہوا تھا۔ نگرانی کرنے والے بھی غالباً شفٹوں میں کام کر رہے تھے تاکہ تازہ دم اور چاق وچوبند رہیں۔

میں نے دینو سے کہا۔ "تم ذرا تگڑا قسم کا ناشتا تیار کراؤ۔ میں اکھاڑے کا افتتاح کر آؤں۔ دلبر خان نے اکھاڑہ تیار کرنے میں اتنی پھرتی دکھائی ہے تو مجھے اس کو استعمال کرنے میں بھی پھرتی دکھانی چاہیے۔"

"کیا مطلب؟" دینو سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"باڈی بلڈنگ کا سامان دیکھ کر جسم ذرا مچلنے لگا ہے کہ اسے استعمال کر ہی لیا جائے۔ بڑا ہی عجیب قسم کا جسم دیا ہے اللہ نے مجھے۔ ہر وقت زیادہ سے زیادہ مشقت مانگتا رہتا ہے۔ جتنی مشقت کرتا ہوں اتنا ہی ٹھیک رہتا ہوں۔ چار دن عیش و آرام سے گزار لیتا ہوں تو بڑی بے چینی سی رہنے لگتی ہے۔ ویسے بھی اگر میں ابھی سے تیاری وغیرہ شروع کر دوں گا اور دلبر خان کو اس کی خبر ملے گی تو وہ بڑا خوش ہو گا کہ میں سنجیدگی سے اپنے حصے کا کام کر رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہیں کون سا اس سے صحیح مقابلہ کرنا ہے جو تیاریوں کی بات کر رہے ہو؟" دینو نے مجھے گھورا۔ "دلبر خان تو صرف تمہارے قد کاٹھ اور ورزشی جسم کی وجہ سے تمہیں پہلوان کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے۔"

"تھوڑی بہت اُٹھا پٹخ بھی آتی ہے مجھے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"آنا تو خیر تمہیں بہت کچھ ہے۔ دلبر خان کی نظر تو شکاریوں والی ہے۔ اس نے تمہیں خواہ مخواہ ہوشو سے مقابلے کے لیے منتخب نہیں کر لیا لیکن .... میرا مطلب ہے.... تمہیں اپنی جان کو اتنی مصیبت میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟ تمہیں نورا کشتی ہی تو لڑنی ہے۔" دینو نے مجھے یاد دلایا۔

"میں نے کہا نا کہ میرا جسم تو مشقت کے لیے بے چین رہتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اس کے علاوہ لوگوں کو دکھانے کے لیے بھی تو کچھ کرنا ہے۔ یہ سارا لوگوں کو بے وقوف بنانے کا ہی تو دھندا ہے۔"

میں اس کے ساتھ نیچے آ گیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے میں نے کہا۔ "ناشتا ذرا دیر سے تیار کرانا اور جب تیار ہو جائے تو مجھے بلا لینا۔"

میں نے جیسے ہی دروازے سے باہر قدم رکھا' مکان کے سامنے والے دونوں کونوں سے دو کلاشنکوف بردار فوراً میرے قریب آ گئے۔ بظاہر وہ لاتعلق سے انداز میں میرے ساتھ چلنے لگے لیکن درحقیقت ان کی نظر مجھ پر اور انگلی ٹریگر کے قریب ہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے دوسرے دو کلاشنکوف بردار بھی لپک کر آن پہنچے۔ انہوں نے مجھ سے کچھ بھی نہیں کہا لیکن غیر محسوس سے انداز میں مجھے گھیرے میں لے کر چلنے لگے۔

میں چھپر ریستوران کے گرد گھومتا ہوا اکھاڑے کی طرف بڑھا۔ وہاں کام کرتے ہوئے لوگ کن انکھیوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اکھاڑے کے گرد دو آدمی چند بانس گاڑ کر ہلکی پھلکی سی باڑھ تقریباً تیار کر چکے تھے۔ اکھاڑے میں آمدورفت کے لیے انہوں نے راستہ چھوڑ دیا تھا۔

میں اکھاڑے میں داخل ہو کر ویٹ اور ڈمبلز وغیرہ کا جائزہ لینے لگا اور دیکھنے لگا کہ میرے لیے ہر چیز میں کتنا وزن کافی رہے گا۔ میں ابھی ان چیزوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ تھل تھل کرتا ایک سیاہ فام اور پستہ قد سا شخص نہ جانے کہاں سے نمودار ہوا اور اکھاڑے میں آ گیا۔ وہ تولیہ' لنگوٹ' تیل کی شیشی اور سرخ رنگ کی ایک نیکر وغیرہ اُٹھائے ہوئے تھا۔

"ایسے نہیں سائیں...." وہ خوشامدانہ سے انداز میں اپنے پیلے پیلے' چھدرے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔ "پہلے لنگوٹ کس کے.... اس کے اوپر لال رنگ کی یہ نیکر پہن کر آئیں.... پھر میں آپ کے بدن پر تیل کی مالش کروں گا.... پھر آپ کسرت کریں گے تو مزہ آئے گا۔"

"تم کون ہو؟" میں نے اسے گھورا۔

"میں آپ کا مالشیا ہوں سائیں۔ مجھے دلبر خان نے بھیجا ہے۔ آپ کی خدمت کروں گا۔" اس نے باچھیں کھلاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر اس نے لنگوٹ اور نیکر مؤدبانہ انداز میں میری طرف بڑھا دی۔ دونوں چیزیں نئی تھیں۔ نیکر خاصی خوبصورت تھی اور ریڈی میڈ معلوم ہوتی تھی۔ میں دلبر خان کے انتظامات پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے ہاں ہر چیز کا پہلے ہی سے بندوبست تھا۔ وہ گویا کوئی کمی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر وہ چیزیں اس کے ہاتھ سے لے لیں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہ ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ "آرام سے گھر جا کے پہن آئیں سائیں! کوئی مسئلہ نہیں ہے۔"

میں ایک بار پھر گھر کی طرف چل دیا۔ چاروں کلاشنکوف والے اس دوران اکھاڑے کے گرد جم کر کھڑے ہو چکے تھے لیکن جونہی میں اکھاڑے سے نکلا' وہ ایک بار پھر میرے ساتھ ہو لیے۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی مجھے اپنے دائرے سے نکلنے نہیں دے رہے تھے۔

گھر جا کر میں نے ایک ڈربا نما باتھ روم میں لنگر لنگوٹ کسا اور مالشیے کی فرمائش کے مطابق تیار ہو کر دوبارہ اکھاڑے میں آیا۔ اس نے تیل کا ایک چلو بھر کر میرے جسم پر دو ہتڑ سا مار کر تیل کو پھیلایا اور جوش و خروش سے مالش شروع کر دی۔ وہ پیشہ ور مالشیا معلوم ہوتا تھا اور لگتا یہی تھا کہ اسے پہلوانوں کی مالش میں مہارت حاصل تھی۔ اس کے اپنے ہاتھوں میں خاصی جان اور مہارت تھی۔ وہ کچھ اس طرح رگ پٹھوں کو چھیڑنا جانتا تھا جس طرح ماہر بربط نواز' بربط کے تاروں کو چھیڑتے ہیں۔

ساتھ ہی اس کی قصیدہ گوئی بھی جاری تھی۔ "واہ سائیں واہ.... کیا سونا بدن ہے آپ کا...." پھر اس نے خود ہی اپنے خیال کی تردید کر دی۔ "نہیں سائیں! سونا نہیں.... فولاد ہے فولاد.... سونا تو نرم ہوتا ہے۔"

اس کی مالش نے جسم میں واقعی ایک نئی حرارت دوڑا دی تھی۔ اس نے مجھے اوندھا لیٹنے کی ہدایت کی اور کچھ اس طرح رگڑے لگانے لگا جیسے بڑھئی رندے سے کسی بڑے سے شہتیر کو چھیل رہا ہو۔ نرم' ٹھنڈی اور سوندھی مٹی کا لمس مجھے بہت بھلا محسوس ہو رہا تھا۔ میرے نیچے زمین میں گڑھے جا رہے تھے۔ اپنے ہاتھ مجھے واقعی ہاتھوں کے بجائے پنجے محسوس ہو رہے تھے۔ مجھے ایک بار پھر کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے اندر کوئی حیوانی قوت سر اُبھار رہی تھی۔ زندگی میں یہ احساس کبھی کبھی اچانک ہی نہ جانے کیوں میرے ذہن کو کسی انوکھے خمار کی طرح گرفت میں لینے لگتا تھا۔

"سائیں! ہوشو خان اس فولادی جسم کے سامنے نہیں ٹھہر سکے گا۔ آپ کا ہر پٹھا فولاد ہے۔" مالشیا اپنی قصیدہ گوئی جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"بکواس مت کرو۔" میرے حلق سے عجیب غراہٹ نما سی آواز نکلی۔ "اس دنیا میں کوئی جسم نہ سونا ہے نہ فولاد۔ یہ صرف

مٹی ہے... مٹی جسے اس مٹی میں مل جانا ہے۔" میں نے سوندھی سوندھی خوشبو دینے والی نرم مٹی کی ایک مٹھی بھر کر اس کے سینے پر کھینچ ماری۔

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر حیرت سے منہ کھولے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے ایک رخسار مٹی پر ٹکا کر آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ "اس دنیا میں کوئی ہمیں شعلہ بدن لگتا ہے' کسی کا بدن چاندی اور کسی کا بدن چاندنی نظر آتا ہے۔ کسی کے جسم کو ہم سونا کہتے ہیں اور کسی کے جسم کو فولاد لیکن یہ سب مٹی کی ڈھیریاں ہیں۔ چلتی پھرتی ڈھیریاں۔ تمہیں کبھی قبرستان کی ٹوٹی پھوٹی اور تباہ شدہ قبروں میں جھانکنے کا موقع ملے تو جھانک کر دیکھنا۔ تمہیں ٹوٹی پھوٹی اور گلی سڑی چند ہڈیاں مٹی میں رُلتی نظر آئیں گی۔ ان میں سے کوئی کبھی شعلہ بدن تھا... کوئی چاندی بدن.... کوئی سونا بدن اور کوئی فولاد بدن۔ انجام سب کا یہی ہونا ہے۔ مٹھی بھر ہڈیاں باقی رہ جاتی ہیں جنہیں دیکھ کر پیٹ بھرے کتے بھی گھن کھاتے ہیں۔"

میں نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دم بخود تھا۔ ایک مکھی اس کے کھلے منہ کے قریب بھنبھنائی تو وہ چونکا اور ہاتھ ہلا کر اسے اُڑاتے ہوئے بولا۔ "سائیں! آپ کی بات تھوڑی تھوڑی سمجھ میں آئی ہے لیکن جتنی سمجھ میں آئی ہے اتنی ہی کافی ہے۔ آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں لیکن میں نے کبھی کسی پہلوان کے منہ سے ایسی باتیں نہیں سُنیں۔ دینو تھل تھل کرتے گوشت کا پہاڑ ہے مگر وہ بھی اپنے بدن کو فولاد کہتا ہے۔"

میں ہنس دیا پھر میں نے لیٹے ہی لیٹے اس کی سیاہ کلائی اپنی گرفت میں لے لی۔ وہ بُری طرح کراہ اٹھا۔ میں نے اس کی کلائی ہلاتے ہوئے کہا۔ "اور تمہارے بدن کو کیا کہیں گے؟"

"کوئلہ بدن۔" وہ بلا تامل بولا۔ مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ آدمی ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ چھوٹے سے چھوٹا' بڑے سے بڑا آدمی اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہوتا ہے مگر وہ خوش فہم معلوم نہیں ہوتا تھا البتہ کچھ خوشامدی ضرور تھا۔

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "سائیں! میری کلائی چھوڑ دیں۔ ٹوٹ جائے گی تو مالش کے قابل نہیں رہوں گا۔ دلبر سائیں میرا خرچہ پانی بند کر دیں گے۔ معذور لوگوں کو وہ اپنے آس پاس بالکل برداشت نہیں کرتے۔"

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی۔ وہ اسے سہلانے لگا پھر دو تین جھٹکے دے کر دوبارہ مالش میں جُت گیا۔ میں نے پوچھا۔ "تم نے ہوشو خان کی بھی مالش کی ہے؟"

"بہت دفعہ کی ہے سائیں!" اس نے جواب دیا۔

"اور اس کی کشتیاں بھی دیکھی ہیں؟"

"ہاں سائیں! ہر کشتی دیکھی ہے۔"

"کیسا پہلوان ہے وہ؟" میں نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

"سائیں.... سچی بات بتاؤں؟"

"ہاں۔ خوشامد نہیں چاہیے۔"

"سائیں! اس میں شک نہیں کہ طاقت اس میں بہت ہے۔ اتنے موٹے اور تھل تھل کرتے آدمیوں میں اتنی طاقت نہیں ہے۔ اور وہ کچھ زیادہ کسرت وغیرہ بھی نہیں کرتا لیکن قدرتی طور پر ہی وہ کچھ جنات قسم کی چیز ہے۔"

گویا ادھر بھی کچھ ویسا ہی "قدرتی" سا معاملہ تھا جیسا میرے ساتھ تھا۔ دینو نے ہوشو خان کو زیادہ طاقتور آدمی قرار نہیں دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اتنی جسامت کے آدمی میں تھوڑی بہت طاقت ہونی ہی چاہیے تھی لیکن مالشیے کی باتوں سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ خاصا طاقتور آدمی تھا۔ دینو کا اندازہ غلط بھی ہو سکتا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے سیاہ فام مالشیے سے پوچھا۔

"میرا نام حاکم ہے سائیں!" وہ باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ "ماں باپ بھی کبھی کبھی بڑا مذاق کرتے ہیں۔ غلاموں کا نام حاکم رکھ دیتے ہیں۔" کمبخت اونچی بات کر گیا تھا۔ شاید اتنا احمق نہ تھا جتنا شکل سے نظر آ رہا تھا۔

"حاکم! تمہیں تمہاری سب سے پیاری چیز کی قسم' سچ سچ بتانا۔ اِدھر اُدھر کی مت ہانکنا۔ کیا تمہارے خیال میں ہوشو خان مجھے ... سکتا ہے؟ دل رکھنے والی بات مت کرنا۔ کبھی یہاں کہہ دو کہ ہو... خان کا تو مجھ سے کوئی مقابلہ ہی نہیں' میں تو ایک ہاتھ سے اسے ... دوں گا اور ادھر ہوشو خان کے پاس جا کر میرے بارے میں بولو ... میں تو اس کے ایک ہاتھ کی مار ہوں۔"

"نہیں سائیں! میں تو جو کہوں گا' خدا کو حاضر ناظر جان کر کہوں گا۔" وہ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ "میں ... پہلے بھی آپ سے یہ نہیں کہا کہ ہوشو خان کمزور آدمی ہے۔ میں ایک ان پڑھ' جاہل سا آدمی ہوں۔ میری جتنی سمجھ ہے' اس حساب سے جو مجھے ٹھیک لگا وہ میں نے بتا دیا۔ وہ غلط بھی ہو ... ہے۔"

"اسی لیے تو میں تم سے رائے لے رہا ہوں۔ تم آدمی ... ٹھیک ہی لگے ہو' بس تھوڑے سے خوشامدی ہو۔" میں نے دل ... بات اس پر ظاہر کر دی۔

اسے گویا جھٹکا سا لگا۔ اس صدمے سے سنبھلتے ہوئے وہ مجروح لہجے میں بولا۔ "سائیں! آپ نے تو میرا دل ہی توڑ دیا۔ میں اگر خوشامدی ہوتا تو مالشیا نہ ہوتا بلکہ دلبر سائیں کا کوئی خاص آدمی ہوتا۔ میں نے تو وہی کچھ کہا تھا جو دل میں محسوس کیا تھا۔ چاہے ... غلط تھا یا صحیح۔"

"چلو... مان لیا۔ اب تم میرے سوال کا جواب دو۔" میں ... کہا۔

"سائیں! آپ اتنے بڑے پہلوان ہیں۔ شہر میں آپ ... ریسلنگ کے اتنے بڑے بڑے مقابلے جیتے ہیں۔ آپ کو تو خود ...

کافی تجربہ ہو گا' کافی اندازہ ہو گا...."

میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا مطلب تھا کہ دلبر خان کی پروپیگنڈہ مشینری حرکت میں آ چکی تھی۔ اس نے مجھے عظیم ریسلر' مشہور کرنے کا کام شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنا ہر کام پروگرام کے عین مطابق اور بہت تیزی سے کر رہا تھا۔ حاکم بے چارہ شاید سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میں نے کبھی رِنگ میں قدم بھی نہیں رکھا تھا۔

وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو یہ تجربہ بھی ضرور ہو گا کہ اگر کشتی سچی اور اصلی ہو تو میدان کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ وہاں کیا ہو گا۔ خاص طور پر فری اسٹائل کشتی میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بعض اوقات کمزور پہلوان کا بھی کوئی زبردست داؤ لگ جاتا ہے۔ کبھی کبھی بڑے پہلوان کو کوئی خطرناک چوٹ لگ جاتی ہے۔ آپ کے اور ہوشو خان کے بارے میں بھی یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے۔ اگر آپ نے اس کو کوئی بے ایمانی کرنے کا موقع نہیں دیا تو آپ اس کو ہرا بھی سکتے ہیں۔ اگر اس نے کوئی بے ایمانی کر لی یا اچانک وہ کوئی خطرناک داؤ لگانے میں کامیاب ہو گیا تو وہ جیت بھی سکتا ہے۔ بہرحال میں یہی کہوں گا کہ اسے ہرانا کوئی اتنا زیادہ آسان کام بھی نہیں ہے۔"

اس کی رائے دینو کی رائے سے کافی مختلف تھی اور مجھے یہی حقیقت سے زیادہ قریب معلوم ہوتی تھی۔ حاکم نے ہوشو کو زیادہ قریب سے دیکھا ہوا تھا اور وہ مالشیا تھا۔ پھر اس نے ایک اور ایسی بات بتائی جس کی وجہ سے میں اس کی رائے کو زیادہ وزن دینے پر مجبور ہو گیا۔

اس نے شرمیلے سے لہجے میں بتایا۔ "سائیں! میں تو خود پہلوان بننا چاہتا تھا۔ بڑا شوق تھا مجھ کو چھاتی چوڑی کر کے اور گرز کندھے پر رکھ کر اکھاڑے میں اُترنے کا لیکن دو باتوں سے مار کھا گیا...."

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ایک غربت' دوسرے قد۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا۔ "غربت کا یہ عالم تھا کہ صبح کھا لیتے تھے تو یہ پتا نہیں ہوتا تھا کہ شام کو کہاں سے کھائیں گے۔ پہلوانوں والی خوراک تو کیا کھاتے' روکھی سوکھی بھی بڑی مشکل سے میسر آتی تھی۔ قد بھی آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔ اس قد کے آدمی کو تو لوگ آدمی ہی نہیں سمجھتے' پہلوان کیا سمجھیں گے۔"

مجھے اس کے انداز پر ہنسی آ گئی۔ وہ بھی ہنس دیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "سائیں! میں آپ کو بالکل نہیں جانتا۔ آج پہلی بار آپ کو دیکھا ہے لیکن آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں۔"

"بہت شکریہ بھائی!" میں نے اُٹھ کر اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ "آج کے دور میں کوئی بغیر غرض کے کسی کو اچھا لگ جائے' یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔"

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور ہلکی پھلکی ورزش کے ذریعے اپنے آپ کو وارم اپ کرنے لگا۔ حاکم آلتی پالتی مارے بیٹھا ایک ٹک میری طرف دیکھے جا رہا تھا۔ میں نے ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے جوگنگ کرتے ہوئے پوچھا۔ "حاکم! کیا واقعی ان علاقوں میں لوگ فری اسٹائل ریسلنگ شوق سے دیکھنے لگے ہیں؟"

"ارے صاحب! کچھ نہ پوچھیں۔ ریسلنگ کے تو ادھر لوگ دیوانے ہیں۔ مرد تو مرد' بہت سی عورتیں بھی شوق سے دیکھتی ہیں۔ ادھر تین چار جگہوں پر ٹی وی موجود ہیں۔ ویسے بھی شام کو ٹی وی دیکھنے کے لیے ان سب جگہوں پر بھیڑ لگ جاتی ہے۔ ایک ٹی وی تو اندر کیٹی میں ایک دوسرے ہوٹل میں بھی ہے اور صرف ٹی وی کی وجہ سے اس کی کمائی اپنے دینو کے اس ہوٹل سے کم سے کم چھ گنا زیادہ ہے۔ وہ ٹی وی دکھانے کے بھی پیسے لیتا ہے۔ جس دن ریسلنگ کا پروگرام ہوتا ہے اس دن تو ہر ٹی وی پر رش بہت بڑھ جاتا ہے۔ مردوں نے بیلوں کی ریس' ریچھ اور کتوں کی لڑائی' مرغوں کی لڑائی اور ملاکھڑا دیکھنے کے لیے جانا کم کر دیا ہے۔ کبھی کبھار کہیں وی سی آر پر کوئی آس پاس کے ملک کی فلم یا ریسلنگ کی کوئی فلم لگ جاتی ہے تو اس دن لوگوں کی حالت دیکھنے والی ہوتی ہے۔"

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "کیا کریں سائیں! ادھر لوگوں کی یہی تفریح ہے' یہی عیاشی ہے۔ شہروں میں تو...."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "شہروں میں بھی لوگوں کی یہی تفریح ہے بھائی! وی سی آر پر فلم لگا کر ٹی وی کے آگے لیٹ جاتے ہیں۔ وہاں بھی اور کیا رکھا ہے؟ وہاں بھی لوگ گھروں سے نکلتے ہوئے ڈرنے لگے ہیں۔ جو دو چار تفریح گاہیں ہوتی ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر لوگوں کے دل بھر جاتے ہیں اور ان کی حالت بھی دن بہ دن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ پارکوں میں خاک اُڑتی ہے۔ کھیل کے میدانوں میں چرسیوں اور ہیروئنچیوں نے ڈیرے ڈالے ہوتے ہیں۔"

"اچھا سائیں! ایسی بات ہے؟" حاکم نے حیرت سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے پوچھا۔

"شہر کی تفریح گاہوں میں تمہیں شہری لوگ بہت کم نظر آئیں گے۔ تمہاری طرح کے دیہاتوں سے یا چھوٹے چھوٹے شہروں سے آئے ہوئے لوگ زیادہ نظر آئیں گے۔ ان ہی کے لیے ان جگہوں میں تھوڑا بہت نیا پن اور دلچسپی ہوتی ہے۔"

"سائیں! آپ کراچی سے آئے ہیں نا؟" حاکم کی آنکھوں میں ایک نئی چمک اُبھری۔ میرے خیال میں دلبر خان نے اسے یہی بتایا تھا۔ میں نے اثبات میں ہی جواب دیا۔

"اللہ کرے آپ کشتی جیت جائیں سائیں!" وہ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر بولا۔ "اور جب آپ جیت کر واپس کراچی جانے لگیں تو مجھے بھی ساتھ لے چلیں' میں آپ کی بڑی خدمت کروں گا سائیں!"

"دلبر خان تمہیں جانے دے گا؟" میں نے ایک ویٹ کو آزمائشی طور پر اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔ وہ مجھے کوئی خاص وزنی نہ لگا۔ میں اس میں مزید ویٹ شامل کرنے لگا۔

"بالکل اجازت دے دیں گے سائیں! مجھ سے تو وہ خوش ہی رہتے ہیں۔ مجھے کسی کام سے منع نہیں کرتے۔ ویسے بھی میں کون سا بہت خاص آدمی ہوں۔ میں کچھ اتنا زیادہ ان کے کام کا آدمی نہیں ہوں۔ میں ان کی خدمت میں نہیں حاضر رہوں گا تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔" پھر وہ کن انکھیوں سے کلاشنکوف برادرون کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "کام کے آدمیوں کو وہ کہیں جانے نہیں دیتے۔"

کلاشنکوفوں والے بالکل پتھرائے ہوئے چہرے لیے اکھاڑے کے چاروں طرف کھڑے تھے۔ انہیں گویا میرے سوا گرد و پیش کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور وہ جیسے کوئی آواز بھی نہیں سُن رہے تھے لیکن حاکم نے کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھا تو ان میں سے ایک جو زیادہ جسیم اور زیادہ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی والا تھا' اکھاڑے کے اندر آگیا اور حاکم کے سامنے رک کر خونخوار نظروں سے اسے گھورتے ہوئے بولا۔ "بہت دیر سے بک بک کیے جا رہے ہو۔ زبان کو ذرا کنٹرول میں رکھو اور جس کام کے لیے تمہیں بھیجا گیا ہے' صرف وہ کرو۔" اس کی آواز کچھ ایسی ہی تھی جیسے سخت لکڑی میں کُند آری چل رہی ہو۔

میں اس وقت بھاری ویٹ سے ورزش شروع کر چکا تھا۔ میں سانس روکے خاموش رہا۔ حاکم سہم سا گیا لیکن پھر ہمت کر کے باچھیں پھیلانے کی کوشش کرتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "سائیں! آپ لوگ اپنی محفلوں میں تو کبھی مجھے بولنے نہیں دیتے۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالنے دیتے۔ اب یہ باہر کا آدمی آیا ہے۔ اس کے ساتھ تو ذرا دو چار باتیں کر لینے دیں۔ دل ہلکا ہو جاتا ہے۔"

میں غیر ارادی طور پر مسکرا دیا۔ چھوٹا ہو یا بڑا' امیر ہو یا غریب' دل کا بخار نکالنے کی ضرورت سب ہی محسوس کرتے ہیں۔

کلاشنکوف والا پہلے سے زیادہ کُھردرے لہجے میں بولا۔ "ایک بار کہی ہوئی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی کیا؟ تیرے بھی منہ میں زبان آگئی ہے۔ دو ٹکے کے انسان۔"

اس نے کلاشنکوف اس انداز سے بلند کی گویا زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے حاکم کی کھوپڑی پر دستہ رسید کرنا چاہتا ہو۔ اسی لمحے میں نے ویٹ ذرا بلندی سے ہی چھوڑ دیا۔ وہ زمین میں دھنس گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر کلاشنکوف کو نال سے پکڑ کر اسے اس ارادے سے باز رکھنا چاہا لیکن وہ ویٹ گرنے کی آواز سُنتے ہی پلٹ چکا تھا۔ حاکم کے سر پر دستہ رسید کرنے کا ارادہ اس نے خود ہی ملتوی کر دیا تھا اور کلاشنکوف کا رُخ نہایت پھرتی سے میری طرف کر لیا تھا۔ اکھاڑے سے باہر کھڑے تینوں آدمیوں کی کلاشنکوفوں کا رُخ بھی میری طرف ہو چکا تھا۔

وہ ہر طرف سے مجھے کور کیے ہوئے تھے۔ میرا ان سے اُلجھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے اس سے ایک قدم دور رہتے ہوئے ہی حتی الامکان پُرسکون اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ "اس غریب کو بولنے دو... جی بھر کر بولنے دو۔ لوگوں کی زبانیں بند کرنے کے لیے ہر وقت کلاشنکوفیں لے کر مت کھڑے رہا کرو ورنہ کوئی سیلاب آئے گا اور تمہیں بہا کر لے جائے گا۔ یہ کلاشنکوفیں تمہیں بچا نہیں سکیں گی۔"

وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسا لیکن کچھ بولا نہیں۔ اس کی نظریں البتہ کہہ رہی تھیں۔ "کسی کے حکم سے ہم مجبور ہیں ورنہ تمہارا تو ابھی کام تمام کر دیتے۔"

ایک لمحے کے لیے ہم دونوں' آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے پھر وہ اسی عالم میں اُلٹے قدموں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اکھاڑے سے نکل گیا۔ تاہم حاکم کے چہرے پر بشاشت واپس نہ آسکی۔ وہ قدرے افسردگی سے سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ میں نے دوبارہ کسرت شروع کر دی۔ جلد ہی میرے جسم سے بے تحاشا پسینہ بہنے لگا پھر یہ نوبت آئی کہ پسینہ جسم سے پھسلتا ہوا مٹی میں جذب ہونے لگا۔ کلاشنکوفوں والے ایک بار پھر پہلے ہی کی طرح خاموشی اور لاتعلقی سے اپنی اپنی جگہ جم کر کھڑے ہو گئے۔

میں نے ویٹ لفٹنگ کا ایک راؤنڈ مکمل کر کے ویٹ زمین پر رکھا اور چند لمحے کے لیے سستانے لگا۔ حاکم کو منہ لٹکائے بیٹھے دیکھ کر میں نے کہا۔ "تم تو بالکل ہی چپ ہو گئے۔ کچھ تو بولو۔ یہ لوگ اب تمہیں کچھ نہیں کہیں گے۔"

"مجھے تو کچھ نہیں کہیں گے لیکن یہ دلبر سائیں سے میری کوئی بھی جھوٹی سچی شکایت کر سکتے ہیں۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دھیمی آواز میں بولا پھر ایک لمحے کے توقف سے اس نے پوچھا۔ "سائیں! آپ تو کشتیاں لڑنے باہر کے ملکوں میں بھی جاتے ہیں نا؟"

میرے لیے یہ تصور ہی کچھ مضحکہ خیز سا تھا لیکن اب تو ساری صورتِ حال ہی مضحکہ خیز سی تھی اور میں دلبر خان کے پروپیگنڈے کی نفی کرنا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے نیم دلی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"سائیں! بس آپ مجھے اپنے ساتھ باہر کے کسی ملک لے جایئے گا۔" اس نے فرمائش کر ڈالی۔

"اچھا... تم بھی اسی چکر میں ہو؟" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ہمارے یہاں کے نوّے فیصد لوگ زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے کے چکر میں باہر جانے کی فکر میں رہتے ہیں۔"

"نہیں سائیں! مجھے روپیہ کمانے کا لالچ نہیں ہے۔ روپیہ بے شک نہ ملے۔" وہ کچھ اور دھیمی آواز میں بولا۔ "بات کرنے کی آزادی تو ملے... اپنی مرضی سے کچھ کرنے کی آزادی تو ملے۔ میں یہاں سے کہیں بہت دور چلا جانا چاہتا ہوں صاحب!"

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ آدمی ان پڑھ ہو' جاہل ہو' بے وقوف ہو' بے ہنر ہو تب بھی پنجرے کا پنچھی بن کر رہنا کبھی نہ کبھی ضرور اسے بہت مشکل محسوس ہونے لگتا ہے۔ پھر اس نے گویا اس قسم کے تمام خیالات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے تیل کی شیشی اُٹھاتے ہوئے پوچھا۔ "سائیں! میں آپ کی اور مالش کر دوں؟"

"خدا کا خوف کرو یار حاکم!" میں نے جلدی سے کہا۔ "مالش بھی بہت ہو چکی ہے اور تیل میں بھی تم نے مجھے نہلا دیا ہے۔"

میرے انکار کے باوجود وہ تیل کی شیشی لے کر میرے قریب آتے ہوئے سرگوشی میں بولا۔ "کشتی والے دن بھی آپ اچھی طرح تیل کی مالش ضرور کر کے جایئے گا۔ آپ ہوشو خان کے قابو میں نہیں آئیں گے' مچھلی کی طرح پھسل کر نکل جائیں گے۔"

"اگر اس نے بھی مالش کر رکھی ہوگی تو وہ بھی اسی طرح نکل جائے گا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"وہ نکل کر کہاں جائے گا؟ اس میں پُھرتی بالکل بھی نہیں ہے۔" حاکم نے بتایا۔ بہرحال اس نے مجھے بخش دیا' مزید مالش پر اصرار نہیں کیا اور اکھاڑے کے ایک گوشے میں باڑھ کے قریب جا بیٹھا۔ باڑھ اب مکمل ہو چکی تھی لیکن کام کرنے والے وہیں کھڑے ہو کر مجھے ورزش کرتے دیکھ رہے تھے۔ کھیتوں پر جاتے یا شاید کھیتوں سے آئے ہوئے کچھ اور لوگ بھی رُک چکے تھے۔ اچھا خاصا مجمع سا لگ چکا تھا۔

میں نے ورزش جاری رکھی۔ مجمع دھیرے دھیرے بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ اس میں کچھ عورتیں بھی شامل ہو گئیں۔ وہ سب لوگ آنکھوں میں خاموش حیرت' رشک اور نہ جانے کن کن جذبات کے امتزاج کے ساتھ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ مجھے اب یوں ایک ہجوم کا مرکزِ نگاہ بننا قطعاً عجیب محسوس نہیں ہو رہا تھا اور مشقت سے اپنے جسم کو پانی پانی کرنے میں بھی مجھے لطف آرہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب میں نے اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا ہے تو اب میں ہر چیز سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔

اچانک دور سے دلبر خان کی جیپ دھول اُڑاتی آتی دکھائی دی۔ اس طرف سے ہجوم فوراً کائی کی طرح پھٹ گیا۔ چند لمحے بعد جیپ اکھاڑے کے قریب آ کر رکی۔ میں نے ورزش جاری رکھی۔ جیپ دلبر خان خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ ایک کلاشنکوف بردار اس کے ساتھ والی سیٹ پر اور ایک پیچھے موجود تھا۔ پیچھے سانولا اور لمبا سا اکسریلا پتلا شخص اور بھی تھا جس کے گلے میں کیمرا لٹکا ہوا تھا۔

دلبر خان کے آتے ہی ہجوم میں باتوں کی بھنبھناہٹ ختم ہو گئی اور گہرا سکوت چھا گیا۔ صرف میرے ورزش کے آہنی سامان کی کھنکناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ دلبر خان جیپ سے اُتر کر اکھاڑے میں آگیا۔ میں نے ورزش روک ہی دی۔ اس کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ تھی۔

اس نے پُرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا پھر تیل' پسینے اور مٹی میں لتھڑے ہوئے میرے کندھے تھپکتے ہوئے بولا۔ "بہت اچھے افضل خان صاحب... بہت اچھے...! جتنی تیزی سے ہم اپنے حصے کا کام کر رہے ہیں' اچھا ہوا کہ آپ بھی اسی تیزی سے حرکت میں آگئے۔ ہمیں جلد ہی علاقے کے لوگوں کو ایک بہت بڑی تفریح دینی ہے۔"

"میں تو آج بھی مقابلے کے لیے تیار ہوں۔" میں نے کہا۔ "میری طرف سے تو خواہ آج شام کو ہی رکھ لیں مقابلہ۔"

"ہمیں آپ سے یہی اُمید تھی خان صاحب!" دلبر خان شاید لوگوں کو سُنانے کے لیے مجھ سے بہت مہذبانہ انداز میں بات کر رہا تھا۔ "لیکن ہمیں اب اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ ہمیں بہت سے انتظامات کرنے ہیں۔"

"آپ کی مرضی۔" میں نے بے پروائی سے کندھے اُچکا دیے اور ڈمبلز اُٹھا کر ایک بار پھر ورزش کرنے لگا۔ وہ میرے جسم میں مچلتے ہوئے پٹھوں کو چند لمحے غور سے دیکھتا رہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو ایک ثانیے کے لیے مجھے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سے جذبے کی پرچھائیں نظر آئی جسے میں کوئی نام نہ دے سکا۔ وہ حسد بھی ہو سکتا تھا' کمینگی بھی' سازشیت کی خواہش بھی۔ ممکن ہے وہ کوئی اور جذبہ رہا ہو۔ بہرحال جونہی میں نے اس کی طرف دیکھا' اس کی آنکھوں سے وہ پرچھائیں معدوم ہو گئی اور اس کے چہرے پر دوبارہ وہی دوستانہ اور خلیق سی مسکراہٹ پھیل گئی جو پہلے سجی ہوئی تھی۔

اس کے ساتھ آنے والے کلاشنکوف برداروں میں سے ایک نے ہجوم کو مخاطب کرتے ہوئے اعلان کے سے انداز میں بتانا شروع کر دیا تھا کہ ان کے محسن و مہرباں دلبر خان نے ان کی تفریحِ طبع کے لیے ہوشو خان کے ساتھ ایک زبردست اور یادگار مقابلہ منعقد کرانے کی غرض سے کتنے بڑے ریسلر کو بلوایا تھا' اب وہ عظیم ریسلر ان سب کا مہمان تھا اور اس کے آرام و آسائش کا خیال رکھنا سب کا فرض تھا۔

دلبر خان کے ساتھ جو شخص گلے میں کیمرا ڈالے آیا تھا اس نے کیمرا سیدھا کر لیا تھا اور فوکس وغیرہ صحیح کر کے مجھے پوز بنانے کے بارے میں ہدایات دینے لگا تھا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" میں نے ہاتھ اُٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے دلبر خان سے پوچھا۔

"بھئی .... وہ ... ہم ایک بہت اچھا سا رنگین پوسٹر بھی چھپوا رہے ہیں نا..." دلبر خان نے ذرا فخر سے بتایا۔ "وہ ہماری کیٹی میں ... آس پاس کے سارے علاقوں میں' دیواروں پر' درختوں پر' ہوٹلوں' چائے خانوں میں' دکانوں میں اور دوسری خاص خاص جگہوں پر لگایا جائے گا۔ تانگوں پر بورڈ لگا کر منادی کرا دی جائے گی۔

ان بورڈوں پر بھی وہ پوسٹر لگے گا۔ اس کے لیے آپ کی دو چار شاندار سی تصویریں اُتاریں گے۔ ان میں سے جو سب سے اچھی ہو گی' وہ پوسٹر پر چھپے گی۔ ہم چاہتے ہیں' پوسٹر جلد سے جلد چھپنے کے لیے شہر چلا جائے۔"

میں ایک لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ صبح میں نے دینو کے گھر میں آئینہ دیکھا تھا۔ انوار نے میرا جو میک اپ کیا تھا وہ گزشتہ دنوں کی خجل خواریوں میں ختم ہو چکا تھا۔ میں اب اپنی اصل شکل میں تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا اصل شکل کے ساتھ میری تصویر چھپنا مناسب ہو گا؟

یہ مضحکہ خیزی تو اپنی جگہ تھی کہ میں اس میں ایک "نامی گرامی" ریسلر کے طور پر ایکشن دکھا رہا ہوں گا اور میرا نامی گرامی ہونا محض ایک فراڈ ہو گا لیکن اس سے قطع نظر مجھے تشویش یہ تھی کہ پوسٹر سے کہیں کسی ایسی شخصیت کو تو یہاں میری موجودگی کا علم نہیں ہو جائے گا جو میرے لیے خطرے کا باعث بن سکتی ہو؟

دوسرے ہی لمحے میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس دور افتادہ اور غیر معروف سے علاقے میں ہونے والی کسی سرگرمی کے سلسلے میں کسی چھوٹے موٹے شہر کے پریس سے چھپنے والے معمولی سے پوسٹر کی رسائی ان ہاتھوں تک نہیں ہو سکتی تھی جن سے مجھے خطرہ تھا۔ اب جب میں نے اس مضحکہ خیزی میں ٹانگ اڑا ہی لی تھی تو اس کے تقاضے بھی پورے کرنے چاہئیں تھے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی بھی کوشش کرنی چاہیے تھی۔

میں نے گہری سانس لے کر اپنے آپ کو اس شخص کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جو اس وقت اپنے آپ کو دنیا کا ایک انتہائی اہم اور ماہر فوٹو گرافر سمجھ رہا تھا۔ اس نے پہلے اس انداز میں میری ایک تصویر اُتاری جس طرح باڈی بلڈر پوزنگ کرتے ہیں' اپنے جسم کا ایک ایک پٹھا نمایاں کرتے ہیں۔ اپنے رگ پٹھوں کی اس طرح نمائش کرتے وقت میں اپنے آپ کو الو کا پٹھا محسوس کر رہا تھا لیکن کبھی کبھی اپنے آپ کو الو کا پٹھا محسوس کرنے میں بھی ایک انوکھا ہی مزہ آتا ہے۔

دوسری تصویر اُتارنے کے لیے اس نے فرمائش کی۔ "آپ جتنا بھی زیادہ سے زیادہ ویٹ اٹھا سکتے ہیں وہ اُٹھا کر کھڑے ہو جائیں۔"

میں نے کہا۔ "یہاں زیادہ ویٹ موجود نہیں ہے۔ جتنا ویٹ پڑا ہے اس کے ساتھ میں تمہیں بھی اُٹھا کر کھڑا ہو سکتا ہوں۔"

اس نے کچھ اس طرح ایک قدم پیچھے ہٹایا جیسے اسے ہلکا سا جھٹکا لگا ہو پھر اس نے یوں دلبر خان کی طرف دیکھا جیسے شکایت کر رہا ہو۔ "یہ آپ کیسا بدتمیز ریسلر پکڑ لائے ہیں؟"

دلبر خان نے کندھے اچکا دیے گویا بہ زبانِ خموشی کہہ رہا ہو۔ "کوئی بات نہیں بھائی! فی الحال برداشت کرو۔"

میں نے تمام ویٹ اُٹھا لیا تو وہ آڑا ترچھا ہوتے ہوئے اور اپنے آپ کو عظیم فوٹو گرافر ظاہر کرنے کی جدوجہد کرتے ہوئے کیمرے سے آنکھ لگا کر بولا۔ "ذرا ایکشن تو دیں... آپ کے چہرے سے تو پتا ہی نہیں چل رہا کہ آپ نے کوئی خاص وزن اُٹھایا ہے۔"

میں نے ویٹ اچانک نیچے پھینک دیا۔ وہ خوفزدہ سے انداز میں اچھل پڑا۔ میں نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ "میں ریسلر ہوں' ایکٹر نہیں۔"

اس بار اس نے رحم طلب انداز میں دلبر خان کی طرف دیکھا پھر گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔ "آپ نے تو باہر کے ملکوں میں بھی مقابلے کیے ہیں... ٹی وی پر بھی دیکھے ہوں گے... آپ نے دیکھا نہیں' باہر کے ریسلر کتنے اچھے ایکٹر ہوتے ہیں۔"

میں نے استہزائیہ انداز میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو پھر نیویارک سے ہی بلا لیا ہوتا کسی ورلڈ کلاس ریسلر کو۔ یہاں میڈی سن اسکوائر گارڈن والا اسٹینڈرڈ لانا چاہتے ہو؟"

اس بار جواب دلبر خان نے دیا۔ وہ تحمل سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔"

میں نے مصنوعی ناگواری سے ویٹ اُٹھاتے ہوئے اور دل ہی دل میں فوٹو گرافر کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے کچھ "ایکشن" دینے کی کوشش کی۔ وہ کیمرے کے ویو فائنڈر میں میرا عکس دیکھتے ہوئے طمانیت سے بولا۔ "ہاں... اب بنی نا بات۔"

ایک تصویر اس نے مجھے بالکل سیدھے سادے انداز میں کھڑا کر کے کھینچی اور ایک اس طرح انگلی اُٹھائے ہوئے کھینچی جیسے میں کسی کو چیلنج دے رہا ہوں۔ اس کے لیے اس نے مجھے چہرے پر زیادہ سے زیادہ خوفناک تاثرات لانے کی ہدایت کی۔

بالآخر تصویریں کھینچنے کا مرحلہ سر ہو گیا۔ اس دوران مجمع بڑھ چکا تھا اس میں ہر عمر کے لوگ' بچے' عورتیں' بوڑھے سب تھے۔ کلاشن کوف والے کی تعارفی تقریر ختم ہو چکی تھی۔ سب لوگ نہایت دلچسپی آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ جو پیچھے کھڑے تھے وہ اُچک اُچک کر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

اچانک میری نظر دینو کے مکان کی طرف اٹھی اور میں نے محسوس کیا کہ منڈیر کے عقب میں کہیں سے دو آنکھیں اور بھی میری جانب نگراں تھیں۔ وہی ظالم آنکھیں جن میں نہ جانے کتنے افسانے نہاں تھے۔ میں ان آنکھوں کو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن ان کی نظروں کی حرارت اپنے وجود پر محسوس کر سکتا تھا۔

"کیا اس وقت دینو گھر میں نہیں تھا جو موتی چھت پر چلی آئی تھی؟" میں نے سوچا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا۔ دینو واقعی گھر پر نہیں تھا۔ وہ مجمع کے قریب کھڑا اپنے "ہوٹل" کی "تعمیرِ نو" کے کام کا جائزہ لے رہا تھا۔ دلبر خان نے بھی اسے دیکھ لیا اور بارعب انداز میں آواز دے کر قریب بلا لیا۔

وہ دوڑا دوڑا آیا۔ دلبر خان نے گویا انتہائی مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا کندھا تھپک کر پوچھا۔ "اب تو خوش ہو نا؟ اب تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے نا؟"

دینو ہاتھ جوڑ کر اسے دعائیں دینے لگا مگر یہ دعائیں کسی فقیر کی دعاؤں کی طرح خلوص سے خالی تھیں۔ دلبر خان ذرا نیچی آواز میں بولا۔ "آئندہ تم بھی ہمارے خلاف کسی قسم کی سازش کرنے کا خیال دل میں نہ لانا۔ ہم بھی تمہارے ساتھ سیدھے چلیں گے۔"

"بس سائیں...! آپ ہمارے سر پر ہاتھ رکھیں' ہم تو آپ کی غلامی کے لیے تیار ہیں۔ کل بھی آپ کے حکم کے غلام تھے' آئندہ بھی غلام رہیں گے۔" دینو لجاجت سے بولا۔

دلبر خان کے چہرے پر طمانیت تھی۔ وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "میں اب چلتا ہوں۔ کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو یہاں کسی بھی آدمی سے کہہ دینا' مجھے پیغام مل جائے گا۔"

"ہوشو خان کی تصویریں کھنچ چکی ہیں یا ابھی کھنچیں گی؟" میں نے پوچھا۔

"ہوشو خان کی تو ہمارے پاس پہلے ہی بہت شاندار تصویریں موجود ہیں۔ اگر آپ کی تصویروں کا بھی رزلٹ اچھا آ گیا تو شاید ہم تین طرح کے پوسٹر چھپوا لیں۔" دلبر خان نے جواب دیا پھر اس نے پلٹ کر ہجوم کو منتشر ہونے کی ہدایت کی تو لوگ گویا بادلِ نخواستہ اپنے اپنے راستوں پر ہو لیے۔ چند لمحے بعد دلبر خان بھی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ رخصت ہو گیا جو وہاں پہلے سے موجود تھے۔

میں بینچ پریس کے لیے لیٹنے لگا تو دینو مصنوعی خفگی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔ "ارے بابا... بس بھی کرو۔ بہت ہو گئی ورزش۔ کیا آج اپنا خون پسینہ ایک کر دو گے؟ چلو... گھر پر ناشتا تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

میں نے مزید بینچ پریس کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے تولیا فوراً تولیا لے کر لپکا اور سر سے پاؤں تک میرا جسم صاف کرنے لگا۔ اس سے جان چھڑا کر پہلے میں نے سوچا کہ کنویں پر جا کر نہایا جائے اور دیہی زندگی کا پورا پورا لطف اُٹھایا جائے لیکن پھر میں نے سوچا کہ گزشتہ چند دنوں میں ایک مزدور کی حیثیت سے میں دیہی زندگی کا خاصا لطف اٹھا چکا ہوں اب مجھے ایک معزز مہمان کی حیثیت سے جو سہولتیں میسر تھیں ان سے بھی تھوڑا بہت فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ ان میں سے ایک عظیم سہولت یہ تھی کہ میں دینو کے گھر میں ہی ڈربا نما باتھ روم میں ہینڈ پمپ سے نہا لوں۔

میں نے یہی کیا۔ ہینڈ پمپ سے نہانے میں بھی بڑا لطف آیا۔ اس کے بعد خالص پہلوانوں والا ناشتا میرا منتظر تھا۔ میں نے اسے ٹھکانے لگانے میں قطعی سستی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ مجھے اس بات پر حیرت تھی کہ دینو اور موتی کو مجھے اس طرح کھاتے دیکھ کر حیرت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ بڑے آرام سے پاس بیٹھے مجھے دیکھ رہے تھے۔

بالآخر میں خود ہی دینو سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "تمہیں مجھ کو اس طرح کھاتے دیکھ کر حیرت نہیں ہو رہی؟"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے؟" دینو اطمینان سے بولا۔ "اس سے تین گنا تو ہوشو خان کھا جاتا ہے۔ ایک وقت میں سالم بکرا کھا جاتا ہے۔ دودھ پینے لگتا ہے تو پوری بالٹی پی جاتا ہے۔ روٹیاں کھانے لگتا ہے تو تندور میں روٹیاں لگانے والی عورت کو غش پڑنے لگتے ہیں۔ سنا ہے اپنے پرانے پہلوان بھی کچھ اسی طرح کھاتے تھے اور جو تھوڑے بہت خاندانی پہلوان اب باقی رہ گئے ہیں' وہ بھی اسی طرح کھاتے ہیں۔"

میں اپنے کھانے پر کچھ شرمندہ تھا۔ خصوصاً موتی کی موجودگی کی وجہ سے لیکن دینو کا جواب سن کر میری شرمندگی کچھ کم ہو گئی۔

اس کے بعد روز و شب تقریباً اسی طرح گزرنے لگے۔ بظاہر میں دلبر خان کا معزز مہمان تھا اور اس نے میری حفاظت کے لیے کلاشنکوف بردار تعینات کر رکھے تھے لیکن درحقیقت میں نظربند تھا۔ میرے مسلح نگران دو شفٹوں میں کام کر رہے تھے۔ دن میں کوئی اور ہوتے' رات میں کوئی اور۔

ان کی وجہ سے مجھے یہ فائدہ بھی تھا کہ علی الصباح جب میں اکھاڑے میں جا کر ورزش شروع کرتا اور دن چڑھے تک وہاں خاصا ہجوم جمع ہو جاتا تب بھی مجھے کوئی پریشانی نہ ہوتی۔ ان کلاشنکوف برداروں کی وجہ سے ہجوم مجھ سے ذرا دور ہی رہتا اور لوگ آنکھوں میں تجسس و اشتیاق لیے ذرا فاصلے سے ہی مجھے دیکھتے رہتے۔ رفتہ رفتہ ہجوم خود بخود ہی چھٹ جاتا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی کہ ہجوم میں اچھی خاصی تعداد عورتوں کی بھی شامل ہوتی تھی حالانکہ میرا خیال تھا' عورتوں کو... خصوصاً دیہات کی عورتوں کو ریسلنگ یا ریسلرز سے کوئی دلچسپی نہیں ہو گی لیکن ہجوم کو دیکھ کر تو میرا خیال کچھ غلط ثابت ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

رات کو میں اپنی کچھار کے بجائے کہیں سرِراہ سوئے ہوئے درندے کی طرح سوتا مگر نیند میں بھی گویا چوکنا رہتا اور بعض اوقات تو کسی خفیف سے کھٹکے کے بغیر بھی اٹھ بیٹھتا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے کسی قسم کا خوف لاحق تھا۔ خوف کو تو میں نے قریب پھٹکنے ہی نہیں دیا تھا اور اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا تھا۔

مجھے دراصل موتی کا انتظار تھا لیکن وہ اس پہلی رات کے بعد نہیں آئی۔ دل میں بس ایک بے عنوان سی خلش جگا کر اس نے قطعی چپ سادھ لی تھی۔ میں نے اس کے ہر سوال کا سیدھا' صاف اور سچا جواب دیا تھا۔ میں نے اس سے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا' اسے کوئی جھوٹی آس نہیں دلائی تھی۔ شاید اسی لیے اس نے بھی سوچ لیا تھا کہ بلا وجہ دل میں ایک زخم' ایک حسرت پالنے کی کیا ضرورت ہے۔ وہ جو خود بخود ایک کسک نے جنم لیا تھا بس وہی کافی ہے۔ اس کسک کی جگہ دل پر ایک زخم' ایک گھاؤ کھانا کیا ضروری ہے؟ یہ

طے تھا کہ ملاپ مقدر میں نہیں ہے تو پھر روز ملنے سے خود کو اذیت میں مبتلا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ ایک تشنۂ تعبیر خواب کی حسرت کو ایک پچھتاوے' ایک عذاب میں بدلنا کہاں کی عقلمندی ہے؟

لیکن کیا عشق میں عقل کا بھی دخل ہو جاتا ہے؟ کیا مومل اس حد تک عقلمند ہے؟ کیا وہ اتنی گہرائی میں جا کر سوچ سکتی ہے؟ میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری اس سے غرض کیا تھی...... میں اپنے اور اس کے تعلق کو کیا عنوان دینا چاہتا تھا۔ آیا ہمارے درمیان کوئی تعلق پیدا ہوا تھا یا نہیں؟ اس کے باوجود میرا تنہائی میں اس سے ملنے کو' ان گنت باتیں کرنے کو بہت جی چاہتا تھا۔

"لیکن وہ نہیں آئی۔

اس...... پہلی رات کے بعد چھ راتیں اور گزر گئیں مگر وہ نہیں آئی۔ کوئی بلی بھی صحن میں کودتی تو مجھے گمان گزرتا کہ شاید وہ آ رہی ہے۔ کوئی خفیف سا کھٹکا ہوتا تو مجھے اس کی آمد کا شبہ ہوتا۔ کوئی مدھم سی آواز اُبھری تو میرے دل میں اُمید کی چنگاری تپش دے اُٹھتی۔ کہیں پتا بھی ہلتا تو مجھے اس کی آہٹ کا گمان گزرتا۔

میں کچھ سویا' کچھ جاگا سا رہتا۔ اسی عالم میں اب سپیدۂ سحر نمودار ہونے کے ساتھ پرندوں کی چہچہاہٹ کانوں میں پڑتی تو ایک عجیب سی مایوسی کا اندھیرا رگ و پے میں اُتر آتا۔ میں خود بھی حیران تھا کہ حالات میرے گرد کیا تانا بانا بُن رہے تھے اور میرا ذہن کہاں اُلجھا ہوا تھا۔ میں کون تھا' کہاں سے آیا تھا' زندگی نے میرے دامن میں کیا کچھ نہیں ڈالا تھا مگر ایک منکن ہار لڑکی میرے حواس پر شب خون مار رہی تھی۔

دن میں زیادہ تر اس سے سامنا رہتا لیکن وہ میری طرف بہت کم دیکھتی۔ سر جھکائے کبھی کھانا دے دیا' کبھی پانی۔ کوئی اور ضرورت کی چیز مانگی تو وہ دے دی لیکن وہ شاذ و نادر ہی بولتی اور شاذ و نادر ہی نظر اُٹھاتی۔ میری طرف دیکھتی بھی تو آنکھوں میں ایک عجیب سا سونا پن ہوتا۔ کوئی وعدہ نہ پیام' کوئی آس نہ اُمید۔ کوئی شوخی نہ شرارت' کوئی اشارہ نہ کوئی خاموش مکالمہ۔ اس نے تو بس ایک بار گویا میرے پاس آ کر مجھے حیران کرنا تھا' سو کر دیا۔ اس کے بعد وہ جیسے اس رات کو اور اس رات کی ہر بات کو ایک خواب کی طرح بھول گئی تھی۔

دیتو نے بھی ابھی تک اپنا چھپر ریستوران دوبارہ شروع نہیں کیا تھا حالانکہ تمام تیاری ہو چکی تھی۔ اُدھر حاکم ماشیا بھی دن بھر سائے کی طرح میرے ساتھ رہتا۔ گھر میں بھی گھسا رہتا۔ بظاہر وہ میری ضروریات کا خیال رکھنے کے لیے میرے ساتھ رہتا تھا اور غلاموں کی طرح میرے آگے پیچھے پھرتا تھا لیکن کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ دلبر خان کی ہدایت پر ایسا کرتا ہو۔ بہرحال وہ اور دیتو زیادہ تر گھر میں ہی رہتے' اس لیے بھی مومل سے کوئی خاص بات کرنے کا موقع نہ ملتا۔

میں نئے حالات میں بہت جلد ڈھل گیا تھا اور شاید کچھ زیادہ ہی ڈھل گیا تھا۔ میں واقعی اپنے آپ کو کوئی ریسلر محسوس کرنے لگا تھا جو حقیقتاً کسی زبردست مقابلے کی تیاریاں کر رہا ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ہوشو خان کیا کر رہا تھا۔ بہرحال دلبر خان سے روز ملاقات ہوتی تھی اور اس کی تیاریوں کی رپورٹ مل رہی تھی۔ جس جس انداز سے بھی آس پاس کے علاقوں تک پبلسٹی ہو سکتی تھی' وہ ہو رہی تھی۔ کچھ سینما ہاؤسز میں سلائیڈیں بھی چل رہی تھیں۔ تانگے رنگا رنگ بورڈ لے کر بھی گھوم رہے تھے۔ منادی جاری تھی' پوسٹر بھی لگ چکے تھے۔ میرے خیال میں تو ان ذرائع کے بغیر ہی گیٹی میں اور آس پاس کے تمام علاقوں میں لوگوں کو اس مقابلے کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔

دلبر خان نے پوسٹر میرے لیے بھی بھیجے تھے۔ دو طرح کے پوسٹر چھپے تھے۔ دونوں میں میری اور ہوشو خان کی بڑی تصویریں دائروں میں آمنے سامنے لگائی گئی تھیں۔ مزید کچھ تصویریں چھوٹے دائروں میں اِدھر اُدھر بکھیری گئی تھیں۔ پوسٹر کا مضمون سنسنی خیز تھا اور لہو کو گرما دینے والا تھا۔

اس مضمون میں میرے بارے میں جو دعوے کیے گئے تھے ان کو پڑھ کر بھی بہت ہنسی آئی اور اپنی تصویریں دیکھ کر بھی۔ اپنی اصل شکل میں تصویریں کھنچوانے سے جتنا ڈر رہا تھا' اب اندازہ ہوا کہ میرا خوف فضول تھا۔ کچھ تو میرا حال ہی ان دنوں ایسا تھا کہ آئینے میں مجھے خود اپنی صورت دیکھ کر پہچاننے میں چند لمحے لگتے تھے۔ اس کے بعد تصویروں میں اس "عظیم فوٹوگرافر" کا کمال بھی شامل ہو گیا تھا۔ رہی سہی کسر ایک چھوٹے سے شہر کے پریس نے رنگین چھپائی میں پوری کر دی تھی۔

پوسٹر میں چھپی ہوئی میری تصویروں میں میری اصل صورت اور شخصیت کی بس ذرا سی جھلک ہی باقی رہ گئی تھی۔ میں خود بھی کسی کو یقین دلانا چاہتا کہ یہ میری ہی تصویریں ہیں تو اس کے لیے خاصی کوشش کرنا پڑتی۔ اوپر سے فوٹوگرافر نے مجھ سے جو پوز بنوائے تھے اور جو "ایکشن" دلوائے تھے' وہ مجھے اور بھی زیادہ مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ بہرحال میں پوسٹر دیکھ کر خود اپنی حالت سے خاصا محظوظ ہوا۔ زندگی کے ڈرامے میں یہ بھی ایک بہروپ تھا جو میں نے بھرا تھا' یہ بھی ایک کردار تھا جو مجھے نبھانا تھا۔

ہوشو خان اپنی تصویروں میں ایک قطعی غیر انسانی مخلوق لگ رہا تھا۔ اگر اس کے چہرے اور جسم پر بال ہوتے تو وہ کافی حد تک "مائٹی ہمالین مین" معلوم ہوتا۔ فرق صرف یہ تھا کہ "ہمالین مین" کی اتنی بڑی توند نہیں تھی۔ ہر تصویر میں اس نے بن مانسوں والا انداز اپنانے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ اس میں غالباً فوٹوگرافر کی ہدایات کو بھی دخل تھا۔

بہرحال میں نے محسوس کیا کہ پوسٹر میری نظر میں خواہ

مضحکہ خیز تھے لیکن عوامی مزاج کے قریب تر تھے۔ مجھے اطلاعات مل رہی تھیں کہ ان دنوں گلی کوچوں' بازاروں' چائے خانوں اور دکانوں میں موضوعِ گفتگو یہی کشتی تھی۔ روزانہ آس پاس کی کیٹیوں اور شاید کچھ دوسری جگہوں سے بھی لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ مجھے دیکھنے آ رہے تھے۔ پوسٹروں میں کشتی کی تاریخ کا اعلان کر دیا گیا تھا اور اب اس میں صرف دو دن باقی تھے۔

اس شام ہمیں دلبر خان کا پیغام ملا کہ رات کا سناٹا چھا جانے کے بعد وہ ہوشو خان کو لے کر دیتو کے ہاں آئے گا تاکہ مقابلے کی فائنل ریہرسل کر لی جائے۔ اس کا کہنا تھا کہ بہتر تو یہی تھا کہ یہ ریہرسل بھی رِنگ میں ہی کی جاتی لیکن رِنگ چونکہ ایک بہت بڑے کھلے میدان میں تیار کیا گیا تھا اس لیے وہاں رات کے وقت بھی ریہرسل کا خطرہ مول نہیں لیا جا سکتا تھا کیونکہ پول کُھلنے کا ڈر تھا۔

رات کو دلبر خان دو گھوڑوں والی بگھی میں خاموشی سے آیا۔ اس کے ساتھ ہوشو خان' دو کلاشنکوف بردار اور پینٹ شرٹ میں ایک شخص تھا۔ دیتو نے دروازہ کُھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ لوگ خود دبے قدموں اندر آ گئے۔ ہم انہی کے انتظار میں صحن میں چارپائیوں پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔

دیتو اٹھ کر دروازہ بند کرنے گیا اور واپس آ کر دلبر خان سے کہنے لگا۔ "آپ کی اس دو گھوڑوں والی بگھی کو تو سب پہچانتے ہیں۔ کسی نے دیکھ لی تو سب کو معلوم ہو جائے گا کہ آپ آدھی رات کے قریب اس خادم کے گھر آئے تھے جہاں افضل خان ٹھہرا ہوا ہے۔"

"میرے آنے کی کوئی بات نہیں۔ ہے بے وقوف!" دلبر خان نے نیچی آواز میں اسے ڈانٹا۔ "میں تو یہ مقابلہ کرا رہا ہوں۔ بے شک ہوشو خان میرا آدمی ہے لیکن افضل خان میرا مہمان ہے۔ میں تو اس سے ملنے کسی بھی وقت آ سکتا ہوں۔ اصل میں کسی کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ ہوشو خان یہاں آیا تھا۔"

پھر وہ میری طرف دیکھ کر تیکھی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ہمیں تو ریہرسل کے لیے افضل خان کو اپنی حویلی میں بُلانا چاہتا تھا لیکن میں نے سوچا کہ کہیں اسے یہ وہم نہ ہو کہ ہم اس کے ساتھ کوئی سازش کر رہے ہیں اور وہاں کچھ کر گزریں گے' اس لیے ہم خود ہی یہاں آ گئے۔ اب شاید افضل خان کو یقین آ جائے کہ ہمارے دل بالکل صاف ہیں۔ وہ تو پہلے پہل غلط فہمی میں جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب تو بالکل ایمانداری سے...... سیدھے سادے طریقے سے بس نورا کشتی کرانی ہے۔"

"ایمانداری" سے "نورا کُشتی" والی اصطلاح پر میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ہمارے ہاں بعض لوگ واقعی بے ایمانی بھی بڑی "ایمانداری" سے کرتے ہیں۔

ہوشو خان آج بالکل خاموش اور نہایت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ وحشیوں اور بن مانسوں والی کوئی بھی حرکت نہیں کر رہا تھا' حتیٰ کہ اس کی سانسوں کی خرخراہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی البتہ اس کی شکل ہی کچھ عجیب اور وحشت زدہ سی تھی تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔

دلبر خان نے پینٹ شرٹ والے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "یہ ماسٹر عبداللہ ہے..." وہ خاص طور پر اس شخص کا تعارف مجھ سے کرا رہا تھا۔ ابھی تک میں نے وہاں جتنے لوگوں کو بھی دیکھا تھا' وہ ان میں پینٹ شرٹ والا پہلا شخص تھا۔ لگتا تھا کہ کسی زمانے میں اس شخص کو ورزش اور باڈی بلڈنگ وغیرہ سے شغف رہا ہو گا لیکن اب شاید اس نے مدت سے کوئی مشقت نہیں کی تھی۔ گوشت ہڈیوں کا ساتھ چھوڑ رہا تھا اور وہ بے ڈول نظر آنے لگا تھا۔

دلبر خان نے اس کا تعارف جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ماسٹر عبداللہ دیسی اور فری اسٹائل' دونوں طرح کی کشتیوں کا بہت بڑا ماہر ہے۔ خود بھی کسی زمانے میں بڑا ٹھیک ٹھاک ریسلر رہا ہے لیکن کمر کا ایک پٹھا پھٹ جانے کی وجہ سے اکھاڑہ اور ورزش دونوں چھوڑنا پڑے۔ یہ تمہیں اور ہوشو خان کو نورا کشتی کی ریہرسل کرائے گا۔ اگر تم اس کی ہدایات پر صحیح طرح عمل کرو گے تو کسی کو شبہ تک نہیں ہو سکے گا کہ یہ نورا کشتی ہے۔"

دلبر خان تمام جزئیات کا خیال رکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ مجھے اس سے اتنے اہتمام کی امید نہیں تھی۔ ماسٹر عبداللہ نے پُرجوش انداز میں مجھ سے مصافحہ کیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ پان بھی چبا رہا تھا اور سگریٹ بھی پی رہا تھا۔ شاید اکھاڑہ چھوٹنے کے ساتھ ہی پہلوانوں والے طور طریقے بھی چھوٹ گئے تھے۔

لیکن پھر مجھے خود ہی احساس ہوا کہ میری حیرت بے جا تھی۔ میں نے تو اس دور میں بعض پہلوانوں کو اکھاڑے میں بھی پان کھاتے اور سگریٹ پیتے دیکھا تھا۔ سگریٹ بھی سادہ نہیں' بھری ہوئی۔ اب اکھاڑے بھی شاید اکھاڑے نہیں رہے تھے۔ دوسری بہت سی اعلیٰ اقدار کی طرح پہلوانی کی روایات کو بھی دیمک لگ چکی تھی۔ جس قسم کا اکھاڑہ میں نے خلیفہ نواز پری پیکر کی نگرانی میں کھلوایا تھا اس قسم کے اکھاڑے اور خلیفہ نواز جیسے استاد اب معدوم ہوتے جا رہے تھے۔

ماسٹر عبداللہ کی آنکھیں سُرخ تھیں۔ اس کی نظریں گویا میری ہڈیوں تک میں اُتری جا رہی تھیں۔ وہ گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں میرا ایکسرے اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ہمارے عقب میں برآمدے میں نہایت کم طاقت کا ایک بلب جھول رہا تھا جس کی مدھم اور بیمار سی روشنی صحن میں پہنچ رہی تھی۔ ہم پُراسرار ہیولوں کی طرح ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ مومل اندر اپنے کمرے میں تھی۔

دلبر خان نے سر اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ وہ غالباً یہ اطمینان کر رہا تھا کہ آس پاس کے کسی مکان سے کسی کی نظر صحن تک تو نہیں پہنچ سکتی لیکن دیتو کا مکان اس لحاظ سے منفرد تھا کہ

چاروں طرف سے کوئی اور مکان اس کے ساتھ جڑا ہوا نہیں تھا۔ اس کے علاوہ جہاں تک میں دیکھ سکا تھا' وہاں تک مجھے تو کوئی دو منزلہ مکان نظر ہی نہیں آیا تھا۔

مطمئن ہو کر دلبر خان نے دینو کو صحن سے چارپائیاں ہٹانے کا حکم دیا۔ صحن کافی لمبا چوڑا تھا۔ زمین کچی لیکن سخت تھی۔ ماسٹر عبداللہ نے ایک نوکیلی لکڑی سے زمین پر چاروں طرف لکیر کھینچ کر بڑا سا ایک مربع بنا دیا اور بولا۔ "یوں سمجھ لو کہ یہ رِنگ ہے۔ رِنگ کا سائز تقریباً یہی ہے..."

پھر وہ مجھے اور ہوشو خان کو باقاعدہ عملی مظاہرے کے ساتھ ہدایات دینے لگا کہ ہم کس طرح غیظ و غضب کا مظاہرہ کرتے' اُچھلتے کودتے' دہاڑتے رِنگ میں داخل ہوں گے۔ ہوشو خان کس طرح میری نظر بچا کر باضابطہ طور پر کشتی شروع ہونے سے پہلے ہی مجھے فاؤل کے ذریعے مار گرانے کی کوشش کرے گا۔ اس کی اس حرکت سے کس طرح میرا غیظ و غضب بڑھے گا اور پھر میں اس پر کیا کیا داؤ پیچ آزماؤں گا۔

بڑی مشکل سے ریفری جو خود بھی ایک سابق پہلوان ہو گا' بیچ میں پڑ کر اس مار پیٹ کو رکوائے گا اور باضابطہ طور پر کشتی شروع کرائے گا۔ ہمیں یہاں تک سب کچھ سمجھانے اور کر کے دکھانے کے بعد اس نے ہمیں عملی طور پر یہ سب کچھ دُہرانے کے لیے کہا۔ ہم نے یہ سب محض ایکٹنگ کی حد تک اسے کئی بار کر کے دکھایا اور پوری کوشش کی کہ ایک دوسرے کو چوٹ نہ لگنے پائے۔ ہوشو خان بہت موٹے دماغ کا آدمی معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی ہدایات پر وہ زیادہ عمدگی سے عمل کر رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس قسم کی کشتیاں لڑنے کا اس کا تجربہ مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔

ایسا لگتا تھا کہ اسے ٹی وی اور وی سی آر کے ذریعے دیکھی ہوئی سیکڑوں کشتیوں کی تفصیلات ازبر تھیں اور وہ ہماری کشتی کو ان میں سے کئی معرکے کی کشتیوں کا ملغوبہ بنانا چاہتا تھا۔ اس نے باضابطہ کشتی کی ریہرسل شروع کرائی تو ترتیب سے تمام مراحل ہمیں ذہن نشین کرانے لگا کہ ہوشو خان کیا کرے گا اور میں اس کے جواب میں کیا کروں گا۔

کس طرح مقابلے میں نہایت خطرناک' سپنس فل اور ایکشن سے بھرپور موڑ لائے جائیں گے۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ریہرسل میں ماسٹر عبداللہ کی ذہانت کا پہلو شامل تھا۔ وہ زیادہ تر فاؤل ہوشو خان کے حصے میں ڈال رہا تھا۔ بعض لوگوں پر فاؤل ہی جچتے ہیں۔ ان کی صورت دیکھ کر ہی تماشائیوں کو توقع ہوتی ہے کہ وہ فاؤل کھیلیں گے۔ میرے خیال میں ہوشو خان بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔ خود پرستی سے قطع نظر' میں ریسلر تھا یا نہیں لیکن شاید میں صورت سے ہی فیئر کھیلنے والا نظر آ رہا تھا۔

وجہ کچھ بھی رہی ہو' بہرحال ماسٹر عبداللہ نے میرے حصے میں فاؤل کم ڈالے تھے اور وہ بھی کچھ اس طرح جیسے ہوشو خان نے بعض موقعوں پر مجھے فاؤل کھیلنے پر مجبور کر دیا ہو اور میں غصے میں آ کر اس کی حرکتوں کا جواب اسی کی طرح دینے لگا ہوں لیکن بنیادی طور پر فیئر ہونے کی وجہ سے دوبارہ فیئر ہی کھیلنے لگتا ہوں۔ ہم ایک ایک مرحلے کو ذہن نشین کرتے جا رہے تھے۔

اسی دوران ماسٹر عبداللہ بولا۔ "ظاہر ہے کشتی کافی لمبی ہو گی۔ اس سے پہلے چند چھوٹے موٹے مقابلے ہوں گے۔ وہ تو منٹوں میں ختم ہوتے رہیں گے۔ اصل میں لوگ اسی کشتی کے لیے اپنی استطاعت سے زیادہ پیسے خرچ کر کے آئے ہوں گے' اس لیے ہمیں اس کو کافی طول دینا ہو گا۔ اتنی لمبی کشتی میں ایک ایک بات ذہن نشین نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی تمام ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کرنا ممکن ہے۔ رِنگ میں جا کر اس ساری طے شدہ کشتی میں بہت سی تبدیلیاں آ جائیں گی۔ بہت سی باتیں اچانک ہو جائیں گی' تمہیں اس وقت حاضر دماغی کے ساتھ صورتِ حال کے مطابق اپنا ردِعمل ظاہر کرنا ہو گا..."

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "تمہارا فن بس یہ ہو گا کہ کسی کو اندازہ نہ ہونے پائے کہ یہ نورا کشتی ہے۔ ہر وار اس طرح کرنے کی ٹیکنیک میں نے تمہیں سمجھا دی ہے کہ بظاہر یہی محسوس ہو گا کہ وار پوری قوت سے کیا گیا ہے لیکن درحقیقت اس سے بہت معمولی سی چوٹ آئے گی۔ تقریباً ہر وار تمہیں اسی ٹیکنیک سے کرنا ہے۔"

پھر اس نے بطورِ خاص مجھے مخاطب کیا۔ "ہوشو خان کو تو پھر بھی اس کام کی بڑی پریکٹس ہے لیکن تمہیں خاص طور پر خیال رکھنا ہے کہ حالات خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ہوشو خان پر تمہارا کوئی بھی وار سچ مچ طاقت کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہوشو خان کے ہاتھ سے غلطی سے تمہیں کوئی زوردار ضرب لگ بھی جائے تو تمہیں اس کو برداشت کر جانا ہے۔ سچ مچ غصے میں آ کر اصل طاقت کے ساتھ اس کا جواب نہیں دینا ہے۔ تمہارا غصہ مصنوعی ہونا چاہیے اور ہر وار ٹیکنیک کے ساتھ ہی ہونا چاہیے۔ سمجھ گئے نا؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ دینو' دلبر خان اور اس کے آدمی ایک طرف دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ رِنگ کے درمیان صرف میں' ہوشو اور ماسٹر عبداللہ ہی تھے۔ ماسٹر عبداللہ ہمیں تمام ہدایات دینے کے ساتھ ساتھ اس وقت ریفری کے فرائض بھی انجام دے رہا تھا۔ میں اور ہوشو اس بیمار سی روشنی میں دیوؤں کی طرح ایک دوسرے سے اُلجھ رہے تھے اور نہایت خاموشی سے زبردست "مار دھاڑ" کی ریہرسل کر رہے تھے۔ ہماری لمبی چوڑی پرچھائیاں بھوتوں کی طرح صحن میں اور دیواروں پر ناچ رہی تھیں۔

ماسٹر عبداللہ مزید بولا۔ "باہر کے ملکوں میں رِنگ میں تھوڑی ربر کی ایک موٹی تہہ بچھی ہوتی ہے جس پر کینوس چڑھا ہوتا ہے۔ چوٹ تو اس پر گرنے سے بھی خاصی لگتی ہے لیکن بہرحال ہڈی وغیرہ ٹوٹنے کا خطرہ نہیں ہوتا۔ ہم اپنے رِنگ میں ربڑ کی ٹھوس تہہ کا

بندوبست تو نہیں کر سکے لیکن بہرحال کینوس کے نیچے لکڑی کے تختوں پر اوپر نیچے دو قالین چپکے ہوئے ہوں گے۔ ہڈی ٹوٹنے کا خطرہ کافی اونچائی سے گرنے کے باوجود کم ہو گا۔"

اس نے اب تک جو ہدایات دی تھیں ان سے نقشہ کچھ ایسا بنا تھا کہ مقابلہ تو کانٹے کا ہو گا۔ تماشائی سانس روکے بیٹھے رہیں گے اور ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گا کہ کون جیتے گا لیکن پھر میری اپنی غلطی کی وجہ سے مجھے ایک خطرناک چوٹ لگ جائے گی جس سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہوشو خان جیت جائے گا۔

یوں دلبر خان کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا ہوشو خان کی دہشت بھی برقرار رہے گی اور میرے ساتھ بھی تماشائیوں کی ہمدردیاں برقرار رہیں گی۔ یعنی پلڑے کو تھوڑا بہت برابر رکھنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس "خطرناک چوٹ" کی بھی ریہرسل کر لی گئی۔

ریسلنگ کے پروگراموں میں آپ نے اکثر دیکھا ہو گا کہ ایک ریسلر نے بازو سے کھینچ کر دوسرے ریسلر کو کارنر میں پھینکا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں سر جھکائے ابھی وہیں بدحال کھڑا ہے کہ پہلا ریسلر اسے ٹکر رسید کرنے دوسرے کارنر سے دوڑا۔ وہ پوری قوت سے آیا لیکن عین آخری لمحے میں بدحال ریسلر اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور......

بالکل اسی طرح مجھے ایک کارنر میں رسیوں کے جوڑ سے ذرا پیچھے زمین میں گڑے ہوئے ایک گول شہتیر سے ٹکرا کر خطرناک چوٹ کھانا تھی جس کے بعد ہوشو خان مجھے پِن کر دیتا اور مجھے بے ہوشی کی حالت میں اُٹھا کر رِنگ سے لے جایا جاتا۔

ریہرسل بظاہر ایک معمولی کام تھا لیکن اس میں ڈھائی تین گھنٹے لگ گئے۔ خدا خدا کر کے تمام تفصیلات تمام تر باریکیوں کے ساتھ طے ہو گئیں۔ ایک ایک چیز کو بار بار دُہرایا گیا۔ بالآخر ماسٹر عبداللہ مطمئن ہو گیا اور دلبر خان غالباً اسی کو مطمئن کرنا چاہتا تھا۔

میں جب اپنے فلم اسٹوڈیو والے آفس میں تھوڑی بہت دیر بیٹھتا تھا تو میں نے سُنا تھا کہ ماسٹر عبداللہ ہماری فلم انڈسٹری کے ایک ماہر موسیقار تھے۔ ان کے کئی مقبولِ عام گیتوں کا بھی ذکر آیا تھا لیکن یہ ماسٹر عبداللہ جس سے مجھے واسطہ پڑ رہا تھا' کچھ دوسری ہی طرح کا ماسٹر عبداللہ تھا۔ یہ گاؤں دیہات کے سیدھے سادے لوگوں کے لیے فراڈ کی نئی ہی دُھن تیار کر رہا تھا۔ آنکھوں میں دھول جھونکنے والی پس پردہ موسیقی دینے کی تیاریاں کر رہا تھا۔

سب کچھ طے ہو جانے کے بعد بالآخر ان لوگوں نے میری جان چھوڑ دی پھر انھوں نے وہاں مزید وقت ضائع نہیں کیا اور فوراً رخصت ہو گئے۔ میں نے فوراً صحن میں چارپائی بچھائی اور دھم سے اس پر گر گیا۔ چت لیٹ کر میں ایک ٹک آسمان کو تکنے لگا۔ آج پھر رات کی مانگ میں تاروں کی افشاں چمک رہی تھی۔ کچھ تارے جھلملا رہے تھے اور کچھ شاید میری ہیئت کذائی پر مسکرا رہے تھے۔

دینو میرے قریب ہی دوسری چارپائی کھینچ کر بیٹھ گیا اور یوں ایک ٹک میری طرف دیکھنے لگا جیسے میں سرکس سے بھاگا ہوا کوئی جانور تھا۔ اسی دوران موہل بھی اندر سے نکل کر دینو کی چارپائی پر پائنتی کی طرف آ بیٹھی۔ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ رات کو اس وقت کپڑے پر ایک بلوچی گلا کاڑھ رہی تھی۔ معمولی طاقت کے بلب سے اتنی دور دُھندلی سی روشنی میں بیٹھ کر بھی اس نے کڑھائی کا کام جاری رکھا۔ وہ کچھ اس طرح کڑھائی میں مصروف تھی جیسے وہاں اس کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔

"کیوں اپنی آنکھوں کی دشمن ہوئی ہو؟" میں نے بالآخر سکوت سے تنگ آ کر کہا۔ "اس وقت اتنی کم روشنی میں کڑھائی کرنی ضروری ہے کیا؟"

اس نے موٹی موٹی آنکھوں سے پلکوں کی جھالریں اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ میں موجود سوئی گویا کپڑے کے بجائے میرے دل میں اُتر گئی۔ ان آنکھوں میں ان گنت ان کہی باتیں تھیں' شکوے تھے' تاسف تھا' حسرت تھی۔ یا پھر شاید کچھ بھی نہیں تھا۔ میں غلط سمجھ رہا تھا۔

وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ "اگر میں کڑھائی نہیں کروں گی تب ضرور میری آنکھوں کو کچھ ہو جائے گا۔ کڑھائی سے کچھ نہیں ہو گا۔ ہمارے ہاں تو لڑکیاں دن بھر کام کاج کرتی ہیں اور راتوں کو لالٹین یا دیے کی روشنی میں کڑھائی کرتی ہیں۔ یہ تو پھر بلب کی روشنی ہے۔"

دینو مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اس لڑکی کو تم کچھ مت کہا کرو بھئی۔ یہ تو چری ہے چری۔"

وہ اسے پاگل کہہ رہا تھا۔ میرے خیال میں تو اس کے سامنے ہم دونوں پاگل تھے۔ شاید وہ اپنی آنکھوں کو آنسوؤں کی اذیت سے بچانے کے لیے کڑھائی میں پناہ تلاش کر رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے پھر گہرا سکوت چھا گیا مگر یہ ایک ایسا سکوت تھا جس کا شور ہماری سماعتوں کے پردے تار تار کیے دے رہا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ ہم سب کے ذہنوں میں ان گنت سوال گونج رہے تھے لیکن کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سوالات کیا تھے' کون کس سے کیا پوچھنا چاہتا تھا۔

بالآخر دینو گہری سانس لے کر بولا۔ "اس کا مطلب ہے' یہ مقابلہ ہو کر ہی رہے گا۔" یہ کوئی سوال تھا اور نہ ہی کوئی بیان۔ بس اس نے اپنے خیالات کے الجھے الجھے جنگل میں ہاتھ مار کر چند الفاظ کے پرندوں کو زبان کے جال میں پھنسا لیا تھا اور میرے سامنے چھوڑ دیا تھا۔

"ہاں۔ مقابلہ تو ہو گا۔" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں کہا۔

تب اچانک ہی دینو میری چارپائی کی طرف جھکتے ہوئے سخت اُلجھن زدہ لہجے میں بولا۔ "یار...! تم مجھے بتا کیوں نہیں دیتے کہ تم اصل میں کون ہو... کیا کرتے ہو... کہاں سے آئے ہو اور کیوں

اپنے آپ کو ان چکروں میں پھنسا رہے ہو؟"

"میں اپنے بارے میں تمہیں مختصراً بتا تو چکا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور چکروں میں اپنے آپ کو میں نہیں پھنسا رہا۔ چکر خود آگے بڑھ کر مجھے اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ میں تو بالکل سیدھے سادے انسانوں کی طرح زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ اپنے کام سے کام رکھنا چاہتا ہوں۔"

دینو خفگی آمیز انداز میں گہری سانس لے کر بولا۔ "ٹھیک ہے بابا... تم اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ لیکن ہمیں بھی چکر تو مت دو۔ جو کچھ تم نے ہمیں بتایا ہے وہ صرف ٹرخانے کے لیے بتایا ہے۔ ہم سیدھے سادے دیہاتی ضرور ہیں مگر بے وقوف نہیں ہیں۔"

اچانک موہل نے سر اُٹھا کر باپ کی طرف دیکھا اور تنبیہہ کے سے انداز میں بولی۔ "چھوڑو بابا! جب کوئی اپنے بارے میں نہ بتانا چاہے تو اسے کریدا نہیں کرتے۔ اس طرح دوسرا بھی شرمندہ ہوتا ہے اور خود کو بھی شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

"ہاں۔ تم ٹھیک کہتی ہو میری عقلمند بیٹی!" دینو دھیمی مگر استہزائیہ سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ میں خاموش رہا۔ میرے خیال میں اب خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔ کوئی بھی بات کرنا مناسب معلوم نہیں ہو رہا تھا۔

چند لمحے کے بوجھل سکوت کے بعد دینو انگڑائی لے کر بولا۔ "اب چل کر سوتے ہیں۔ جو تھوڑا سا وقت مل رہا ہے اس میں آرام ہی کر لیں۔ صبح سے اُٹھ کر میں بھی ہوٹل چالو کروں گا۔ آجکل اس کشتی کی شہرت کی وجہ سے کیبن کی رونق کچھ بڑھی ہوئی ہے۔ میرا خیال ہے، چار پیسے کما ہی لیے جائیں۔ امید ہے، سارا نقصان پورا ہو جائے گا۔ ہم غریبوں کو صرف اپنے دھندے پانی اور سیدھی سادی باتوں سے غرض رکھنی چاہیے، زیادہ گہرے چکروں میں نہیں پڑنا چاہیے، مشکل باتوں کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔"

میں اُٹھ کر اپنی کوٹھری میں آ گیا۔ نہ جانے کیوں اس رات مجھے کچھ زیادہ ہی اُمید تھی کہ موہل آئے گی اور شاید کوئی ضروری بات کرے گی مگر وہ اس رات بھی نہیں آئی۔ وہ تو بس پہلی ہی رات اپنا دل کھول کر میرے سامنے رکھ کر چلی گئی تھی، پھر کبھی نہ آنے کے لیے.... کبھی زبان نہ کھولنے کے لیے۔ اسے بس جوں ہی یہ معلوم ہوا کہ میں زندگی کے سفر میں ان کا ہاتھ تھام کر نہیں چل سکتا تو گویا بات ہی ختم ہو گئی تھی۔ اس کے بعد کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

رات کے پچھلے پہر مجھے وہم سا ہوا جیسے موہل میری کوٹھری کے دروازے تک آئی تھی اور پھر لوٹ گئی تھی۔ میں نے جلدی سے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ اب تو میں کنڈی لگا کر بھی نہیں سوتا تھا۔ لیکن باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ طویل و عریض خالی صحن میں سر سراتی ہوا گویا میرے کان کے قریب استہزائیہ سے انداز میں ہنس رہی تھی۔ میں واپس آ کر دھم سے بستر پر گرا اور نیند کی وادی میں اتر گیا یا پھر شاید وہ مایوسی کی تاریک دلدل تھی جس کی گہرائیوں نے مجھے اپنی پناہ میں لے لیا تھا۔

اس کے بعد مقابلے میں صرف ایک دن اور ایک رات باقی تھی۔ آخری رات میں نے موہل کا بالکل انتظار نہیں کیا۔ میری زندگی کی کتاب میں کئی ورق ایسے تھے جن پر غلش کی خراشوں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک ایسا ہی ورق تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ اگر میں اسے پھاڑ کر نہ پھینک سکا تو کم از کم بار بار پلٹ کر تو نہیں دیکھوں گا اور یہ کوشش میں نے ابھی سے شروع کر دی تھی۔

بالآخر مقابلے کا دن آ گیا۔ اس روز جمعہ تھا اور اچھا بھلا موسم یکدم حرارت زدہ ہو گیا تھا۔ میں ناشتے سے فارغ ہوا تو موہل، دینو کی موجودگی میں ہی خلافِ معمول گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "آج لوگوں کے سامنے اپنا ڈراما پیش کرنے جا رہے ہو؟"

"یہ میرا نہیں، دلبر خان کا ڈراما ہے۔" میں نے تصحیح کی۔ "مجھے ڈرامے کرنے کا کوئی شوق نہیں۔ میں تو اس میں مجبوراً صرف ایک اداکار کے طور پر کام کر رہا ہوں۔"

وہ ایک لمحے شریر سی نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ نہ جانے کیوں آج شوخی اور شرارت اس کے چہرے سے پھوٹی پڑ رہی تھی لیکن مجھے یہ شوخی اور شرارت کچھ مصنوعی سی لگ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنی کسی اندرونی کیفیت کو چھپانے کے لیے اپنے اوپر کوئی بہت ہی گہری تہہ چڑھا لینا چاہتی تھی۔ دینو بھی میری طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں عجیب سی تھکن اور اداسی تھی۔

موہل بولی۔ "اگر تمہیں ہوشو خان سے سچ مچ، صحیح مقابلہ کرنا پڑتا تو تم کر لیتے؟"

"وہ میں زیادہ خوشی سے کرتا۔" میں نے بلا تامل جواب دیا۔ "میں نے زندگی میں کبھی، کسی بھی قسم کا کوئی جعلی مقابلہ نہیں کیا۔ یہ کشتی صحیح ہوتی تو مجھے بہت خوشی ہوتی۔ میں سچ مچ ہوشو خان سے ہار جاتا تو مجھے کوئی دکھ نہ ہوتا۔ اس جگہ سے اور دلبر خان سے پیچھا چھڑانے کی مجھے بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ خواہ مخواہ لوگوں کے سامنے ہوشو خان سے ہارنا قبول کرنا پڑ رہا ہے۔"

موہل بدستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ذرا توقف سے بولی۔ "اگر ہوشو سے تمہارا صحیح اور سچا مقابلہ ہوتا تو تمہارا خیال ہے، تم جیت جاتے؟"

"میں کوئی دعویٰ کرنا نہیں چاہتا۔ بہرحال صحیح کشتی میں ہار جیت، دونوں ہی کا امکان ہوتا ہے۔ میں ہارتا یا جیتتا کم از کم مطمئن رہتا۔"

"ویسے... میرا خیال ہے تم جیت ہی جاتے۔" موول بدستور سنجیدگی سے بولی۔ "اگر دلبر خان اور ہوشو خان کو تمہارے جیتنے کا خطرہ نہ ہوتا تو انہیں تمہاری ہار کا ڈراما رچانے کی ضرورت ہی کیا تھی؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خیر... چھوڑو ان باتوں کو' یہ بتاؤ تم لوگ یہ ڈراما دیکھنے آرہے ہو یا نہیں؟"

"کیوں نہیں۔" موول کی ذہین آنکھوں میں وہی شریر سی مسکراہٹ لوٹ آئی۔ "ہمیں تو دلبر خان نے اسپیشل ٹکٹ بھجوائے ہیں۔ سب سے آگے کے ٹکٹ ہیں۔ سو سو روپے والے لیکن اس نے ہمیں بالکل مفت بھجوائے ہیں۔ اس نے ہمیں اپنے خاص مہمان کے طور پر بُلوایا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سرہلاتے ہوئے کہا۔ "دینو بابا اب مجھے تو کوئی بات بتاتا ہی نہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے دینو بابا کی طرف دیکھا۔ "اوپر ہی اوپر معلوم نہیں کیا کچھ کرتا رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے' یہ بھی دشمن کے کیمپ سے مل گیا ہے' دلبر خان کا آدمی بن گیا ہے۔"

"خدا نہ کرے کہ ایسا ہو۔" دینو بابا سنجیدگی سے بولا۔ "خدا مجھے وہ دن نہ دکھائے کہ میں دلبر خان کا وفادار بنوں۔ دراصل میں تو کشتی دیکھنے جانا ہی نہیں چاہتا لیکن موول کی ضد ہے کہ ہم ضرور چلیں گے۔"

"ہاں۔ اسے تو میری ذلت کا تماشا ضرور دیکھنا ہوگا۔" میں نے گہری نظروں سے موول کی طرف دیکھا۔ وہ دھیرے سے ہنسی مگر یہ گویا خود اپنا مذاق اُڑانے والی یا خود کو دھوکا دینے والی ہنسی تھی۔

"ضروری نہیں ہے کہ ہم تمہاری ذلت کا تماشا دیکھنے ہی آئیں۔" وہ اپنے دوپٹے کے پلو میں بندھی کوئی چیز کھولتے ہوئے بولی۔ "ہو سکتا ہے ہم اس لیے آرہے ہوں کہ کوئی ہمیں اتنی محبت سے بُلا رہا ہے۔ ذرا دیکھو تو... دلبر خان نے ہمارے لیے دو نہیں پورے چھ ٹکٹ بھیجے ہیں۔ اس نے پیغام بھیجا ہے کہ ہم اپنے دو چار پڑوسیوں کو بھی ساتھ لا سکتے ہیں۔"

اس کے دوپٹے کے پلو میں دراصل تہ شدہ ٹکٹ بندھے ہوئے تھے۔ اس نے وہ میری طرف بڑھا دیے۔ اپنی دانست [illegible] دلبر خان کی "محبت" کا ذکر کر کے مجھے جلانا چاہ رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا' ان الفاظ کا اس کی سوچوں سے دور دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اس لیے مجھ پر ان کا کوئی اثر نہیں ہوا لیکن میں نے گویا اس کی توقع پوری کرنے کے لیے جلے کٹے سے لہجے میں کہا۔ "ہاں... دلبر خان واقعی بہت محبت کرنے والا آدمی ہے۔ اس کی محبت کا مزہ تو تم اس روز ہی چکھ لیتیں جس روز وہ تمہیں اُٹھوا کر لے جا رہا تھا۔"

دینو کا رنگ یکدم زرد پڑ گیا اور موول کو بھی دھچکا سا لگا۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ مجھے مذاق میں بھی یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "معاف کرنا... مجھے مذاق میں بھی یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ بس یونہی ذرا زبان پھسل گئی۔ ... کے دن ہمیں ایسی بے کار اور بے ہودہ باتیں نہیں کرنی چا[ہئیں]۔ اچھی اچھی باتیں کرنی چاہئیں۔ آج کا دن میرے لیے بڑ[ا] ہے۔ آج میں وہ کام کرنے جا رہا ہوں جس کے بارے میں [میں نے] زندگی میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

دینو کے چہرے کی زردی کچھ کم ہوئی لیکن موول کے چہر[ے پر] مصنوعی شوخی و شرارت کا جو رنگ یک لخت غائب ہوا تھا وہ لو[ٹ کر] نہ آسکا۔ روز کی طرح وہ ایک بار پھر تنکے سے زمین پر آڑی [ترچھی] لکیریں کھینچنے لگی۔

میں نے ماحول کا بوجھل پن دور کرنے کے لیے ٹکٹوں کا [جائزہ] لیتے ہوئے خوشگوار لہجے میں کہا۔ "ٹکٹ تو اچھے خاصے چھپوا[ئے] ہیں دلبر خان نے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کافی ٹھیک ٹھاک [اور] لمبے چوڑے انتظامات کر رہا ہے۔"

دینو کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے دھیمے لہجے میں بو[لا۔] "ہاں... اس میں کیا شک ہے۔ اس نے تو شہر سے کئی ٹرک بھ[ر کر] بینچیں اور کرسیاں بھی کرائے پر منگوائی ہیں۔ وہ ان کاموں میں ماہر ہے۔ پہلے بھی جنگل میں منگل والے بہت سے تماشے کر[تا رہا] ہے۔"

"ہاں۔ اس نے مجھے بتایا تھا۔" میں نے بھی دھیمے لہجے میں [کہا] اور ٹکٹ تہ کر کے واپس موول کی طرف بڑھا دیے۔ اس نے اُٹھا کر میری طرف دیکھے بغیر ٹکٹ دوبارہ پلو میں باندھ لیے۔

چند لمحے بعد دینو اٹھتے ہوئے بولا۔ "آؤ ہوٹل پر چلتے ہیں۔" وہ کوشش کرتا تھا کہ مجھے موول کے پاس تنہا نہ چھوڑے۔ [لیکن میں نے] بھی قطعاً یہ ظاہر نہیں کرتا تھا کہ مجھے تخلیے میں موول کے پاس ر[ہنے] یا اس سے بات کرنے کا خاص اشتیاق ہے۔ اس کا چھپر ریستورا[ن] اب کھل چکا تھا۔ میں اٹھ کر اس کے ساتھ باہر آگیا۔ میرے با[ہر] قدم رکھتے ہی مکان پر تعینات چاروں کلاشنکوف بردار حسب[ِ] معمول مجھے گھیرے میں لے کر ساتھ ہو لیے۔ میں چھپر ریستورا[ن] کی اس لمبی چوڑی اور بھاری بھرکم چارپائی پر جا بیٹھا جو میرے [لیے] بیٹھنے کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔

مقابلے کا وقت شام چار بجے کا تھا لیکن دوپہر کے کھانے [کے] فوراً بعد ہی دلبر خان اپنے دو تین آدمیوں کے ساتھ مجھے لینے آ[گیا]۔ اس نے بڑی تعظیم اور احترام سے مجھے جیپ میں بٹھایا۔ پہلے [سے] وہاں موجود کلاشنکوف بردار ایک الگ بگھی میں جو دلبر خان ہی [کی] تھی' جیپ کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ بہت سے لوگ راستے [میں] کھڑے میری روانگی کا نظارہ دیکھ رہے تھے۔ دلبر خان کے آدمیو[ں] نے مجھے بہت سے پھولوں اور نوٹوں کے ہار بھی پہنائے۔ جیپ [کے آگے] ایک شخص ڈھول بھی بجاتا جا رہا تھا اور جیپ نہایت سست رفتار[ی] سے چل رہی تھی۔ جن راستوں سے ہم گزرے ان پر بڑی رو[نق] اور چہل پہل نظر آئی۔

وہ میدان دینو کے مکان سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں مقابلے کا انتظام کیا گیا تھا۔ بہت بڑی جگہ تھی اور جس طریقے سے وہاں انتظامات کیے گئے تھے' میں اس دور افتادہ اور دیہاتی علاقے میں ان کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

بہت بڑے رقبے میں دائرہ در دائرہ بینچیں اور فولڈنگ چیئرز سجائی گئی تھیں اور ایک قطار کو دوسری قطار سے اونچا رکھنے کا بندوبست بھی کیا گیا تھا۔ وسط میں رِنگ کے قریب کچھ حصے میں صاف ستھری دریاں بچھی ہوئی تھی۔ دو تین قطاریں صوفوں کی بھی نظر آرہی تھیں۔ شاید وہ زیادہ ہی معززین کے لیے تھیں۔

رنگ سے دور سب سے پیچھے کچی اینٹوں سے اسٹیڈیم کی طرح کچھ سیڑھیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ یہ غالباً سب سے سستی کلاس تھی۔ آمدورفت اور درجہ بندیوں کے لیے بانس اور رسے باندھ کر بہت سے راستے بنائے گئے تھے۔ ابھی تماشائیوں کی آمد شروع نہیں ہوئی تھی لیکن بہت سے لوگ جو غالباً منتظمین تھے' تیزی اور مستعدی سے اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے۔ میدان کے اردگرد کچھ تانگے' سائیکلیں اور موٹر سائیکلیں بھی نظر آرہی تھیں۔ کچھ خوانچے اور ٹھیلے والوں نے بھی آکر ابھی سے آس پاس ڈیرا جما لیا تھا۔

میدان کے وسط میں بہت بڑا اور رنگا رنگ قسم کا رِنگ تیار کیا گیا تھا۔ اس کے اوپر کافی بلندی پر ایک بہت بڑا گول ٹینٹ بھی چھت کی طرح تانا گیا تھا جس نے رِنگ کے علاوہ آس پاس کی "فرسٹ کلاس" نشستوں پر بھی سایہ کیا ہوا تھا۔ ایک طرف سے لمبی لمبی تاریں لا کر بڑی بڑی لائٹس کا بھی بندوبست کیا گیا تھا لیکن میرے خیال میں پروگرام میں بہت زیادہ تاخیر ہونے کی صورت میں ہی ان کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔

"صرف ایک کشتی کے لیے بہت زحمت اُٹھائی ہے تم نے۔" میں نے اپنے برابر بیٹھے دلبر خان سے کہا۔ "بہت لمبے چوڑے انتظامات کیے ہیں۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ کشتی صرف ایک نہیں ہے۔" دلبر خان دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "فری اسٹائل ریسلنگ' کی کشتی اور باکسنگ کے کئی مقابلے رکھے گئے ہیں۔ بہت بڑے علاقے کے بہت سے جوانوں کو اپنے دل کے ارمان نکالنے اور اپنی صلاحیتوں کے اظہار کا موقع ملے گا لیکن اصل شو تمہارا اور ہوشو خان کا ہی ہے۔"

پھر وہ اردگرد اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہ سارے انتظامات یہاں بالکل نئے سرے سے نہیں کیے گئے۔ یہ میدان ایک طرح سے ہمارا اسٹیڈیم ہے۔ بہت سی چیزیں اسی طرح موجود رہتی ہیں۔ سال کے سال انہیں کچھ مرمت وغیرہ کر کے ٹھیک ٹھاک کر لیا جاتا ہے۔ صرف بینچیں اور کرسیاں ضرورت کے وقت کرائے پر منگوائی جاتی ہیں۔ یہاں سال چھ مہینے میں کوئی نہ کوئی شغل ہوتا رہتا ہے۔ کبھی میلہ لگ گیا' کبھی سرکس۔ کبھی کچھ' کبھی کچھ۔"

"سب کے انتظامات تم ہی کرتے ہوگے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ظاہر ہے۔ اس علاقے میں اس قسم کے کام اور کر بھی کون سکتا ہے؟" وہ مونچھ کو تاؤ دے کر بولا۔ "ہم اپنے لوگوں پر سختی کرتے ہیں تو ان کی تفریح اور خوشی کا بھی خیال رکھتے ہیں۔"

"اور ساتھ ہی ان دھندوں سے روپیہ بھی کما لیتے ہیں۔ شغل میلہ الگ رہتا ہے۔ سب سے زیادہ تفریح تو تم خود ہی لیتے ہوگے بچو!" میں نے دل ہی دل میں سوچا لیکن اس سے نہیں کہا۔

میدان میں ایک طرف پکی اینٹوں سے دو تین چھوٹے چھوٹے کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ ان کمروں سے لے کر رِنگ تک راستہ خالی چھوڑا گیا تھا۔ اس راستے کے دونوں طرف بانس لگے ہوئے تھے۔ دلبر خان نے جیپ کمروں کے قریب لے جا کر روکی۔

جس کمرے میں ہم داخل ہوئے وہ باہر سے کچھ چھوٹا ہی دکھائی دے رہا تھا لیکن اندر پہنچ کر خاصا کشادہ نظر آیا۔ اس میں کئی پیڈسٹل پنکھے چل رہے تھے' اس کے باوجود بہت حبس تھا۔ یہاں کئی اچھے جسموں والے نوجوان نیکروں میں اِدھر اُدھر بیٹھے نظر آئے۔ کچھ لوگ گپ شپ کے انداز میں باتیں کر رہے تھے' قہقہے لگا رہے تھے اور کچھ کے درمیان تیز و تند انداز میں بحث و تمحیص سی جاری تھی۔

اندر سے اس کمرے کا جائزہ لینے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ درحقیقت مقابلے میں حصہ لینے والے تمام ریسلرز اور باکسرز وغیرہ کا مشترکہ ڈریسنگ روم تھا۔ ان میں سے تین چار نوجوان ایک دوسرے پر کچھ داؤ پیچ بھی آزما رہے تھے۔ معلوم نہیں ان کے مقابلے بھی صحیح تھے یا وہ بھی نورا کشتیاں ہی لڑنے جا رہے تھے۔

کمرے میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی لیکن دلبر خان کے وہاں پہنچتے ہی شور یکدم تھم گیا۔ دو کلاشنکوف بردار سائے کی طرح ہمارے پیچھے تھے۔ باقی دروازے پر ہی رک گئے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ دلبر خان کے ساتھ ساتھ میں بھی تمام لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بن گیا تھا۔

تاہم دلبر خان نے کسی کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور ایک بغلی دروازے کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ میں اس کے پیچھے تھا۔ اس دروازے سے گزرنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بھی چھوٹے سے ایک کمرے کا دروازہ تھا۔ اس کمرے میں ہوشو خان موجود تھا۔ وہ فرش پر بڑی سی ایک دری پر لیٹا ہوا تھا اور وہی حاکم مالشیا زور و شور سے اس کی مالش کر رہا تھا جو کل تک ہر وقت میری خدمت میں حاضر رہتا تھا لیکن کل سے پُراسرار انداز میں غائب تھا۔ بہرحال میں نے نہ تو اس کی موجودگی کو کوئی خاص اہمیت دی تھی اور نہ ہی اس کے غائب ہونے کو۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے

بولا۔ ”میں تو صرف نام کا حاکم ہوں‘ اصل حاکم تو یہ ہیں....“ اس نے دلبر خان کی طرف اشارہ کیا۔ ”انہوں نے حکم دیا تو میں ہوشو خان کی خدمت کے لیے آگیا۔“

”تو اس میں صفائی پیش کرنے کی کیا بات ہے۔“ میں نے اس کے کندھے پر ہلکا سا ہاتھ مار کر کہا۔ وہ اس ہلکے سے ہاتھ سے ہی لڑکھڑا گیا۔ میں نے خود ہی اسے جلدی سے سنبھالا اور تسلی دینے کے انداز میں کہا۔ ”تم ہوشو خان کی خدمت کرو یا میری‘ بات تو ایک ہی ہے۔ کیوں ہوشو خان؟“ میں نے ہوشو خان کی طرف دیکھتے ہوئے آنکھ ماری۔

ہوشو اُٹھ بیٹھا تھا اور دری پر آلتی پالتی مارے کچھ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے پہلی بار مجھے دیکھ رہا ہو۔ وہ بہرحال وہاں کی ایک ”وی آئی پی“ شخصیت تھا کیوں کہ وہ اکیلا‘ ایک الگ تھلگ ”ڈریسنگ روم“ میں لیٹا ہوا تھا جب کہ مقابلوں میں حصہ لینے والے دوسرے سب لوگوں کو ایک ہی کمرے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

ہوشو خان نے کوئی جواب نہ دیا تو میں نے اس کے قریب جاتے ہوئے کہا۔ ”اتنے چپ چپ کیوں ہو ہوشو خان؟ کوئی بات کرو۔ ہم آپس میں کوئی دشمن تو نہیں ہیں نا۔ ہمیں صرف ایک نورا کشتی ہی تو لڑنی ہے‘ کون سا ایک دوسرے کا خون پینا ہے۔“

”شش...؟“ دلبر خان نے میری طرف دیکھتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور ذرا آنکھیں نکالتے ہوئے بولا۔ ”دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ تمہیں نورا کشتی کا ذکر بھی زبان پر نہیں لانا ہے۔ رِنگ میں تم اسی طرح ایک دوسرے کے سامنے آؤ گے جیسے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو۔“

اس دوران ہوشو خان بھی ہاتھی کی طرح ڈکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میرا سرتاپا جائزہ لے رہا تھا۔ آج وہ گویا ایک نئے ہی زاویے سے مجھے نظروں ہی نظروں میں تول رہا تھا۔ ایک جگہ کھڑے کھڑے بھی اس کے شہتیر جیسے بازو اور بیلچے جیسے ہاتھ دھیرے دھیرے ہل رہے تھے۔

”تمہیں ریہرسل کی ہر بات اچھی طرح یاد ہے نا؟“ دلبر خان نے مجھ سے پوچھا۔

”ہاں... یاد تو ہے۔“ میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔

”نہیں بھی یاد ہو گی تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ موقعے پر ہی صورتِ حال کے مطابق کچھ نہ کچھ کرلیں گے۔ اب ہم دونوں اتنے گئے گزرے بھی نہیں ہیں۔ کیوں ہوشو خان؟“

ہوشو خان نے اب بھی کوئی جواب نہ دیا۔ محض ڈکرا کر رہ گیا۔ دلبر خان نے حاکم مالشیے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”ماسٹر عبداللہ کہاں ہے؟“

”وہ کسی کام سے گئے ہیں جی۔ کہہ رہے تھے کہ آدھے گھنٹے تک آجاویں گا۔“ حاکم نے جواب دیا۔ وہ دری پر بیٹھ کر ہوشو خان کی موٹی موٹی پنڈلیوں پر مالش کرنے لگا۔ اس نے ٹھیک ہی کہا والدین کا اپنی اولاد کے نام رکھنا بھی کبھی کبھی بڑی ستم ظریفی جاتا ہے۔ اب اس کا نام حاکم اور کام پہلوانوں کی مالش کر لیکن اگر غور کیا جاتا تو شاید یہ کچھ ایسی زیادہ ستم ظریفی کی بات نہیں تھی۔ بعض حاکم واقعی دہشت گردوں کو مالشیے نظر آتے ہیں

دلبر خان نے گویا مجھے مطلع کرنے کے لیے کہا۔ ”تمہیں ہے‘ تمہارے اور ہوشو خان کے مقابلے میں ماسٹر عبداللہ ہی ر کے فرائض انجام دے گا؟“

”معلوم تو نہیں تھا لیکن... بہرحال... اس سے کوئی فرق پڑتا۔“ میں نے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔

دلبر خان مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ”تم بہت بے پروا آرہے ہو؟“

”تو کیا اب تمہیں میرا بے پروا نظر آنا بھی ناگوار گزر ہے؟“ میں نے ذرا حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ تمہارے خیال میں مجھے نورا کشتی کے لیے بھی فکرمند ہونا چا تھا؟“

”تم بار بار اس کے نورا کشتی ہونے کا اعلان مت کیے جاؤ“ دلبر خان دانت پیس کر گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ ”تمہیں اس حقیقت کا رنگ بھرنا ہے۔ آس پاس کے علاقوں سے کئی زمیندار بھی آج کے مقابلے دیکھنے آرہے ہیں۔ وہ میرے دوست ہیں میں نے انہیں بھی اشارہ تک نہیں دیا کہ کسی بھی مقابلے میں گھپلا ہو رہا ہے۔“

”بہت اچھا کیا تم نے۔“ میں نے مربیانہ انداز میں سرہلا ہوئے کہا۔ ”انسان کو اپنی سازشوں اور اپنی خباثتوں کو ا دوستوں سے بھی چھپانا چاہیے۔ عقلمندی کا تقاضا یہی ہے۔“

دلبر خان نے مجھے گھورا لیکن کچھ بولا نہیں۔ میں نے کہا۔ نے خاصا لمبا چوڑا اہتمام کرلیا ہے۔ اپنے باس سائیں مراد کو بُلا لیا ہوتا۔“

”رئیس مراد خان آج کل ملک سے باہر گئے ہوئے ہیں لیے تو میں نے جلدی جلدی میں یہ سب کچھ کیا ہے۔ وہ اگر ملک ہوتے ہیں تب بھی ہم کوئی اس قسم کا شغل میلہ کرتے وقت ا اطلاع نہیں دیتے۔ رئیس مراد زیادہ ہلا گلا پسند نہیں کرتے۔“ خان نے بتایا۔ ”ان کا حکم تو صرف یہ ہے کہ یہاں بھی ملاکھڑے‘ دیسی کشتی یا کبڈی وغیرہ کے چھوٹے موٹے مقا کرائے جائیں۔ وہ بھی سال میں صرف ایک آدھ مرتبہ۔ ہم؟ رئیس کے کہنے پر عمل نہیں کرتے۔“

وہ تو اب تک میں بھی اچھی طرح دیکھ چکا تھا۔ دلبر خان عملاً کمپنی کو اپنے قبضے میں لیا ہوا تھا۔ مالک کے طور پر تو مراد کا کام صرف نام ہی چل رہا تھا۔ عملاً تو دلبر خان کا جو دل چاہ رہا تھا رہا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جو کچھ وہ کرتا تھا اس کے پس پر مقاصد کچھ اور ہوتے تھے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنے مفادات کی فصل کاٹ رہا تھا۔

اوّل تو مجھے امید نہیں تھی کہ رئیس مراد خان‘ دلبر خان کے اصل کرتوت سے کبھی واقف ہوسکے گا اور اگر واقف ہو بھی گیا تو یہ توقع رکھنا فضول تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ کرے گا لیکن اگر یہ فرض بھی کرلیا جاتا کہ کبھی مراد خان ان سب چکروں سے واقف ہو جائے گا اور دلبر خان سے چھٹکارا بھی حاصل کرلے گا تب بھی مجھے یقین تھا کہ اس وقت تک دلبر خان خود ایک اچھے بھلے زمیندار جتنا مضبوط ہو چکا ہو گا۔ وہ کہیں اور پنجے گاڑ کر تقریباً وہی کچھ کرتا رہے گا جو وہ اب کر رہا تھا۔

میں اور ہوشو خان ایک دوسرے کے آمنے سامنے تن کر کھڑے تھے۔ دلبر خان ہم دونوں کے سینوں پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ ”میں ایک بار پھر تم دونوں کو یاد دلا دوں کہ بچ بچ ایک دوسرے پر کوئی مہلک وار نہیں کرنا ہے۔ بظاہر تمہارے وار بہت خطرناک نظر آنے چاہئیں لیکن ایک دوسرے کو زیادہ چوٹ نہیں آنی چاہیے البتہ اگر نکسیر پھوٹنے سے تھوڑا بہت خون نکل آئے تو کوئی حرج نہیں۔“

”ارے یار! تم اتنے پریشان کیوں ہو؟“ میں نے ذرا بے تکلفی سے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”جب ایک بار طے ہو گیا کہ ڈراما ہی کرنا ہے تو بس ڈراما ہو جائے گا‘ تم فکر مت کرو۔ تم یہ بتاؤ کہ تم نے ہمیں اتنا پہلے ہی یہاں بُلا کر کیوں بٹھا لیا ہے؟ پوسٹروں میں وقت چار بجے لکھا تھا مگر ابھی تو دو بھی نہیں بجے۔ تماشائیوں کی آمد کے آثار بھی نہیں ہیں۔ ابھی تو تیاریاں مکمل ہو رہی ہیں۔“

”میں اس میدان کا پُرانا کھلاڑی ہوں۔“ دلبر خان مسکرایا۔ ”جب بھی ہم کسی بھی قسم کا کوئی پروگرام کرتے ہیں تو اس میں حصہ لینے والوں کو احتیاطاً وقت سے بہت پہلے ایک جگہ جمع کرلیتے ہیں۔ بہت سے آدمیوں کو ایک جمع کرنا بہت بڑا مسئلہ ہوتا ہے۔ کوئی چیز کم ہو جائے تو اس کی کوئی بات نہیں‘ اس کی کمی پوری کرنے کے بہت سے طریقے نکل آتے ہیں لیکن عین وقت پر کوئی آدمی کم ہو جائے تو بڑی مصیبت ہو جاتی ہے۔ آج کے پروگرام کے سپر اسٹارز ہی تم اور ہوشو خان ہو۔ تم دونوں وقت سے کافی پہلے یہاں موجود رہو گے تو میرے دل کو اطمینان رہے گا۔“

”لیکن اس وقت تک میں یہاں کروں گا کیا؟ بے مصرف اور بے مقصد بیٹھ کر تو میرے لیے ایک گھنٹا گزارنا بھی بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اتنے دن سے بیکار بیٹھ کر اتنا وقت گزارا ہے کہ اب چند لمحے گزارنا بھی مشکل ہو رہا ہے۔ دل چاہ رہا ہے کہ جلد از جلد تمہاری فرمائش پوری کروں اور تم سے اجازت چاہوں۔“ میں نے مضطربانہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

”اب ایسی بھی کیا جلدی ہے۔“ دلبر خان مسکرایا۔ ”جہاں اتنے دن گزار لیے وہاں چند گھنٹے اور گزار لو۔ ہم سے نجات پانے میں تمہیں اب زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ تب تک تم یہاں آرام کرو‘ حاکم سے مالش کراؤ۔ کچھ کھانا پینا ہے تو یہاں کسی کو بھی حکم دو‘ حاضر ہو جائے گا۔“

”یہ سب کام یہاں بہت مشکل ہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر اس تنگ اور حبس زدہ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا جس میں سب سے زیادہ جگہ ہوشو خان کے وجود نے گھیری ہوئی تھی۔

بہرحال اپنی تمام تر بے چینی اور اضطراب کے باوجود مجھے کئی گھنٹے وہاں گزارنے پڑے۔ کسی نہ کسی طرح وقت گزر ہی گیا۔ دلبر خان مجھے وہاں چھوڑ کر خود تیاریوں کا جائزہ لینے باہر چلا گیا۔ بعد میں بھی وہ وقفے وقفے سے آتا رہا اور بڑے اصرار سے پوچھتا رہا کہ کسی چیز کی‘ کسی خدمت کی ضرورت ہو تو میں حکم دوں لیکن میں نے کوئی حکم نہ دیا۔ صرف ایک بار فرمائش کی۔ ”یار! مجھے باہر کہیں کھلی ہوا میں بیٹھ جانے دو‘ یہاں تو میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ یہ تو مقابلے سے پہلے ہی ریسلر کو ادھ موا کر دینے والی جگہ ہے۔“

”یہ تو بھائی تم نے بڑی ٹیڑھی فرمائش کردی۔“ دلبر خان مونچھ کو بل دیتے ہوئے پُرخیال لہجے میں بولا۔ ”اس جگہ کو ائرکنڈیشنڈ کرانا میرے بس میں نہیں تھا ورنہ ضرور کرا دیتا.....“

”ائرکنڈیشنڈ کی خواہش کس کمبخت کو ہے۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ میں یہ کہتے کہتے رک گیا کہ ائرکنڈیشنڈ جگہوں سے تو میرا دل بھر چکا ہے۔

”لیکن اب تو پبلک جمع ہو چکی ہے۔ اب تمہارا کھلی جگہ پر بیٹھنا ٹھیک نہیں ہو گا۔ لوگ تمہیں قریب سے دیکھنے کے لیے جمع ہونے کی کوشش کریں گے اور بعض اوقات کلاشنکوفوں کے باوجود ہجوم کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اب تمہارے باہر جانے سے مقابلے کا سسپنس ختم ہو جائے گا۔ اب تو تمہیں اور ہوشو کو مقابلے کا اعلان ہونے کے بعد اسی طرح آگے پیچھے ان کمروں سے نکل کر دوڑتے ہوئے رِنگ کی طرف جانا ہے جیسے دو خطرناک بلائیں اپنی کچھار سے نکل کر دوڑتی ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ ایک بار پھر غائب ہو گیا۔ باہر سے تماشائیوں کا شور سنائی دے رہا تھا لیکن کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی کہ میں باہر جھانک کر دیکھ سکتا۔ صرف ایک دروازہ تھا جو بڑے کمرے میں کھلتا تھا۔ ہوا کے لیے کمرے میں پیڈسٹل فین کھڑکھڑا رہے تھے جو کمرے کی حبس زدہ فضا میں کوئی تبدیلی لانے سے قاصر تھے۔ تماشائیوں کو شاید گمان بھی نہیں تھا کہ آج کے سب سے بڑے مقابلے کے دونوں حریف اندر ایک ہی چھوٹے سے کمرے میں آمنے سامنے بیٹھے تھے اور مڑ مڑ کر ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔

حاکم مالشیے نے اس دوران مجھے تیل سے چپڑ کر رکھ دیا تھا۔ میں مالش نہیں کرانا چاہ رہا تھا کیوں کہ اس کمرے میں مجھے جتنا پسینہ آ رہا تھا‘ میرے خیال میں وہی جسم کا جوڑ جوڑ کھول دینے کے لیے کافی تھا‘ مالش کی ضرورت نہیں تھی لیکن حاکم ہر حال میں مالش پر

تکا ہوا تھا۔ اسے میرے جسم کو فولاد قرار دینے اور اس پر سے نادیدہ زنگ اُتارنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔

ابتدائی مقابلے شروع ہوئے تو میں دوسرے کمرے میں آ گیا اور نوجوانوں کو مقابلوں کے لیے رخصت ہوتے اور واپس آتے دیکھتا رہا۔ اس دوران کبھی باہر سے زبردست شور سنائی دینے لگتا اور کبھی گہرا سکوت چھا جاتا۔ کمرے کے دروازے کا رخ کچھ ایسا تھا کہ میں صحیح طور پر مقابلوں کا منظر نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دروازے پر کلاشنکوف بردار تعینات تھے اور کمرے کے اندر موجود تمام افراد بار بار مبہوت سی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگتے تھے۔ کوئی مجھ سے بات نہیں کر رہا تھا۔ چھوٹے مقابلوں میں حصہ لینے والے ریسلرز اور باکسرز کی آنکھوں میں بھی بے پناہ مرعوبیت نظر آ رہی تھی۔ لگتا تھا' میرے بارے میں جو افسانے اُڑائے گئے تھے ان سے وہ بھی بے حد متاثر تھے۔

باکسنگ کے صرف دو مقابلے تھے۔ انہوں نے کچھ زیادہ وقت لیا جب کہ ریسلنگ کے مقابلے صرف چند چند منٹ میں ختم ہوتے رہے۔ ایک مقابلہ تو شروع ہونے کے بعد ڈیڑھ دو منٹ میں ہی ختم ہو گیا اور اس میں حصہ لینے والے ایک نوجوان کو چارپائی پر ڈال کر کمرے میں لایا گیا۔ اس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ پتا چلا کہ وہ دوڑتا ہوا اپنے ہی زور میں رسوں کے درمیان سے گزرتا سر کے بل باہر جا گرا تھا اور اس کا سر لکڑی کی ایک بینچ کے نوکیلے کونے سے ٹکرا گیا تھا۔ نوجوان بے ہوش تھا۔

غنیمت تھا کہ دلبر خان نے انتظامات میں اس پہلو کا بھی خیال رکھا تھا۔ کمرے میں میڈیکل کٹ اور خاصی دواؤں کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی موجود تھا اور اہتمام کا یہ عالم تھا کہ وہ سفید اوور آل بھی پہنے ہوئے تھے۔ گلے میں اسٹیتھسکوپ بھی لٹکائے ہوئے تھا۔ دور دراز' دیہاتی علاقوں میں عموماً ڈسپنسر وغیرہ بھی بڑی شان سے ڈاکٹر بنے رہتے ہیں۔ معلوم نہیں وہ شخص بھی کوالیفائڈ ڈاکٹر تھا یا نہیں۔

اپنی متانت' سنجیدگی اور خود اعتمادی کی وجہ سے وہ کچھ کوالیفائڈ ہی لگتا تھا۔ اس نے فوری طور پر نوجوان کا سر صاف کر کے بینڈیج کی اور اسے انجکشن لگا دیا۔ اس دوران پروگرام کے مطابق اگلا مقابلہ جاری رہا اور باہر وقفے وقفے سے شور برپا ہوتا رہا۔

اس وقت غالباً آخری چھوٹا مقابلہ جاری تھا جب دلبر خان کمرے میں آیا۔ اس کے چہرے سے اضطراب نمایاں تھا۔ وہ بیشتر اوقات پُرسکون رہنے اور اپنے تاثرات چھپائے رکھنے پر قادر تھا لیکن اس وقت کچھ ہیجان زدہ نظر آ رہا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات بھی نہیں تھی۔ اس وقت پورے ماحول پر ہی ہیجان غالب تھا۔

میرے قریب آ کر وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ "بس.... اب اس مقابلے کے بعد تمہاری باری ہے۔ تم تیار ہو نا؟"

"میں تو آٹھ دن سے تیار ہوں۔" میں نے تولیے سے جسم صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔

وہ قدرے مطمئن انداز میں سر ہلاتا اندر چھوٹے کمرے میں ہوشو کے پاس چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھوں میں کچھ کاغذات تھے۔ وہ قریب آیا تو میں نے دیکھا' وہ ٹائپ شدہ اسٹامپ پیپرز تھے۔ ایک اسٹامپ پیپر وہ اسٹول پر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولا۔ "معاف کرنا یار! میں اپنے کاموں میں اُلجھا رہا۔ تم سے اس پر سائن کروانا تو بھول ہی گیا۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے کاغذ اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بس یونہی ایک رسمی کارروائی ہے' خانہ پُری ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ "ہمارے کاموں میں قریبی شہر کی انتظامیہ کوئی دخل تو نہیں دیتی لیکن بعض کاموں کے لیے ہم احتیاطاً کاغذی کارروائی مکمل کر کے رکھتے ہیں۔ ویسے تو ہم ٹکٹ رکھ کر پروگرام کرتے ہیں لیکن ہمیں کبھی ایکسائز والوں نے بھی آ کر نہیں پوچھا۔ ریسلنگ کے مقابلوں کے لیے ہم یہ اقرار نامہ سائن کروا کر رکھتے ہیں....."

اقرار نامہ انگریزی میں تھا اور میں سرسری نظر سے اسے پڑھ چکا تھا لیکن میں دلبر خان پر یہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ مجھے انگریزی پڑھنا آتی ہے۔ اس لیے میں نے سادگی سے پوچھا۔ "اس میں کیا لکھا ہے؟"

"بس... یہ تمہاری طرف سے اقرار نامہ ہے کہ میں اپنی خوشی اور اپنی مرضی سے اس مقابلے میں حصہ لے رہا ہوں اور کسی بھی قسم کے مالی' جسمانی یا ذہنی نقصان کی ذمّے داری خود مجھ پر ہوگی۔ کوئی دوسرا اس کا ذمّے دار نہیں ہوگا۔" دلبر خان بے پروائی سے بولا۔

اقرار نامہ تقریباً اسی مضمون پر مشتمل تھا۔ لفظوں کی مزید تھوڑی سی ہیرا پھیری تھی۔ دلبر خان گویا مجھے تسلی دینے کے لیے اسٹامپ پیپرز کی گڈی کو تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "باقی سب لوگوں سے تو میں نے پرسوں ہی سائن کروا لیے تھے۔ صرف تمہارے اور ہوشو خان کے اقرار نامے سائن ہونے سے رہ گئے تھے۔ ہوشو خان نے بھی اب کر دیے ہیں....."

اس نے گڈی میں سب سے اوپر والا کاغذ مجھے دکھاتے ہوئے کہا۔ "یہ رہا ہوشو خان کا اسٹامپ پیپر۔ اب صرف تمہارا باقی ہے۔"

ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا میں نے اس سے قلم لیا اور اردو میں یونہی ایک جعلی سائن کر دیے۔

"شناختی کارڈ ہے تمہارے پاس؟" دلبر خان نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔ وہ غالباً اس بہانے میری شناخت کی تصدیق بھی کرنا چاہتا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ فی الحال تو میں اپنی شناخت کو بُھلائے رکھنے کے لیے ہی اپنے شہر سے نکلا ہوا تھا۔ میرے پاس شناختی کارڈ تو کیا' کسی بھی قسم کا کوئی کارڈ' سادہ گتے کا کوئی ٹکڑا بھی نہیں تھا۔

"میری بھاگ دوڑ میں کارڈ کہیں گر گیا ہے۔ زندگی نے مہلت دی تو دوبارہ بنواؤں گا۔" میں نے جواب دیا۔

زیرِ مونچھ اس کے پتلے پتلے سفاک ہونٹوں پر کشیدہ سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے پُرخیال سے انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "ہاں... زندگی نے مہلت دی تو ضرور بنوانا۔"

لاؤڈ اسپیکر پر میرے اور ہوشو کے مقابلے کا اعلان ہونے لگا تھا۔ ہر چیز کی ریہرسل تو ہو چکی تھی' سب کچھ طے ہو چکا تھا۔ اسی کے مطابق پہلے ہوشو خان چھوٹے کمرے سے نکلا۔ اب اس کے چہرے سے متانت اور سنجیدگی غائب ہو چکی تھی۔ وہ ایک بار پھر وحشت زدہ عفریت نظر آ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں رخساروں کے گوشت میں کچھ اور چھپ گئی تھیں' باچھیں پھیل گئی تھیں۔ چہرہ سُرخ نظر آ رہا تھا اور شدتِ غیظ و غضب سے اس کے چہرے اور جسم کے پٹھے پھڑک رہے تھے۔

میں اندازہ نہیں کر سکا کہ وہ غیظ و غضب کی کامیاب اداکاری کر رہا تھا یا سچ مچ جوش میں آ چکا تھا۔ بہرحال اگر وہ اداکاری کر رہا تھا تو بہت عمدہ کر رہا تھا۔ وہ بڑے کمرے سے سب کے درمیان سے گزرتے ہوئے دروازے سے نکلا اور باہر قدم رکھتے ہی بُری طرح چیخنے' دہاڑنے اور سینہ پیٹنے لگا۔

دروازے سے نکل کر وہ بائیں طرف مڑا اور میری نظر سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے چیخنے اور دہاڑنے کی آوازیں لحہ بہ لحہ دور ہوتی گئیں۔ وہ مجھے دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن میں اندازہ کر سکتا تھا کہ وہ درمیانی راستے پر دوڑتا ہوا کس رفتار سے رِنگ کے قریب پہنچ رہا تھا۔ تماشائیوں کا شور بھی کچھ کم نہیں تھا لیکن ہوشو کی گرج اور دہاڑیں اس میں بھی نمایاں محسوس ہو رہی تھیں۔

مجھے اور ہوشو دونوں ہی کو چونکہ کوئی منیجر وغیرہ میسر نہیں تھا جو ہمارے پیچھے پیچھے دوڑا جاتا چنانچہ ہوشو کے پیچھے تو حاکم مافیا ہی دوڑتا چلا گیا تھا اور مجھے اکیلے ہی دوڑتے ہوئے جانا تھا۔ میرے کان لاؤڈ اسپیکر کی طرف لگے ہوئے تھے۔ لاؤڈ اسپیکر پر کوئی ہوشو خان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہا تھا۔ اسی کے ساتھ شور شرابا بھی جاری تھا۔

بالآخر لاؤڈ اسپیکر پر میرا نام لیا گیا۔ تب میں بھی اپنے چہرے پر حتی الامکان جوش و خروش اور غیظ و غضب کے تاثرات لاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور اچھل کر کمرے سے نکلا۔ کمرے سے باہر گویا ایک اور ہی دنیا میری منتظر تھی۔

درمیانی راستے کے دونوں طرف لوگوں کا ایک ہجوم تھا جسے رسّے اور بانسوں وغیرہ کی رکاوٹوں نے روکا ہوا تھا ورنہ شاید وہ میری تکا بوٹی کر ڈالتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ وہ مجھ پر برہم تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ مارے "پسندیدگی" کے مجھ پر "ٹوٹ" پڑنا چاہتے تھے۔ ہمارے ہاں بعض اوقات محبت میں بھی لوگ اپنی محبوب ہستی کی تکا بوٹی کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

معلوم نہیں لوگوں میں میرے بارے میں کیا افسانے مشہور ہو چکے تھے۔ اُدھر لاؤڈ اسپیکر پر میرے بارے میں ہوشو خان سے بھی زیادہ مبالغہ آرائی کی جا رہی تھی۔ چند لمبے لمبے ڈگ بھر کر اور چار سیڑھیاں چڑھ کر میں رِنگ میں جا پہنچا۔ میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور ایک لمحے کے لیے دم بخود سا رہ گیا۔

جب میں وہاں پہنچا تھا تو میدان تقریباً خالی ہی تھا اور چاروں طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی لیکن اب شام کا اندھیرا گہرا ہو چکا تھا اور میدان میں جہاں تک میری نظر کام کر رہی تھی' سر ہی سر نظر آ رہے تھے۔ رِنگ میں اور اس کے چاروں طرف کچھ حصے میں تیز روشنی تھی۔ اس کے بعد اندھیرے کا دائرہ بتدریج گہرا ہوتا گیا تھا لیکن دھندلے دھندلے سر بہرحال دیکھے جا سکتے تھے۔

اتنے بڑے ہجوم کے لیے مرکزِ نگاہ بن کر کھڑے ہونا میرے لیے پہلا اور نہایت انوکھا سا تجربہ تھا۔ اپنی حالت کچھ مضحکہ خیز بھی لگ رہی تھی۔ میں سرخ نیکر پہنے' تیل سے چمکتا جسم لیے اتنے بڑے ہجوم کے سامنے اچھل کود رہا تھا' غیظ و غضب کی اداکاری کر رہا تھا۔ مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ اتنے بڑے ہجوم کے سامنے اداکاری کرنا کچھ ایسا آسان کام بھی نہیں تھا۔ خصوصاً اس قسم کی اداکاری جو مجھے کرنا پڑ رہی تھی۔

جب اس سارے کام کی منصوبہ بندی ہو رہی تھی تو مجھے گمان تک نہیں تھا کہ اس علاقے میں اتنا بڑا مجمع اکٹھا ہو جائے گا۔ یہ اچھا خاصا بڑا اہتمام تماشا تھا جس کے مرکزی کردار میں اور ہوشو خان تھے۔

ہوشو خان مجھ سے زیادہ تجربہ کار تھا۔ وہ زیادہ بہتر اداکاری کر رہا تھا۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ میں خود اپنی اداکاری کا جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ بہرحال میں بھی شروع ہی سے مقابلے میں جان ڈالنے کی اپنی سی کوشش کر رہا تھا۔ جذبوں کی مصنوعی تخلیق بہرحال کوئی آسان کام نہیں تھا۔ غیظ و غضب یا کوئی اور جذبہ واقعی انسان کے دل سے پھوٹ رہا ہو تو کچھ اور بات ہوتی ہے۔ میں تو ویسے بھی شروع ہی سے حقیقی جذبوں پر یقین رکھنے والا' ان ہی پر انحصار کرنے والا اور ان ہی کو اہم سمجھنے والا انسان تھا۔ میں نے اداکاری کو کبھی کوئی اچھا کام نہیں سمجھا تھا لیکن آج احساس ہوا تھا کہ یہ بہرحال ایک فن تھا۔ بعض لوگ اس کی خداداد صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ بعض سیکھ لیتے ہیں اور کمالِ مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض میری طرح صرف بوقتِ ضرورت اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔

میں اپنی دانست میں صرف ضرورت کے تحت اپنی سی کوشش کر رہا تھا لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ ہر ماحول کے اپنے کچھ

اثرات بھی ہوتے ہیں۔ فضا میں گویا کچھ جراثیم‘ کچھ نادیدہ لہریں پھیل جاتی ہیں جنہیں ذہن اور جسم جذب کرتا چلا جاتا ہے۔

میرے سامنے ہوشو خان زمانۂ غار کے کسی انسان کی طرح دونوں ہاتھوں سے سینہ پیٹ رہا تھا اور حلق سے عجیب غضبناک سی آوازیں نکال رہا تھا۔ اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کسی درندے کے سامنے اس کا شکار موجود ہو لیکن کسی نادیدہ رکاوٹ کی وجہ سے وہ فوری طور پر اس پر جھپٹ پڑنے کے قابل نہ ہو تاہم بے تابی سے رکاوٹ کے ہٹنے کا منتظر ہو۔

وہ بار بار غرا کر میری طرف بڑھ رہا تھا لیکن ریفری ماسٹر عبداللہ اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیتا تھا اور بظاہر مقابلے کے کچھ اصول سمجھانے لگتا تھا لیکن ہوشو خان اس کا یقیناً ایک لفظ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا۔ میری توجہ بھی ماسٹر عبداللہ کی طرف نہیں تھی۔

میں بظاہر دھیرے دھیرے اُچھلنے کودنے اور حقارت سے ہوشو خان کی طرف دیکھ کر پھنکارنے میں مصروف تھا۔ میری نظر رنگ کے چاروں طرف بھی بھٹک رہی تھی۔ صوفوں پر مجھے اونچے اونچے طُرّوں‘ عمدہ سندھی ٹوپیوں اور اجلے لباسوں والے کچھ لوگ بیٹھے نظر آئے۔ وہ یقیناً معزز اور وی آئی پی شخصیات تھیں۔ اسی دائرے میں دوسری طرف کچھ مردوں اور عورتوں کی قطاریں موجود تھیں۔

وہ غالباً وی آئی پی نہیں‘ صرف آئی پی تھے اس لیے انہیں جگہ تو رِنگ کے قریب ملی تھی لیکن وہ نشستوں پر نہیں بلکہ دریوں پر تھے۔ ان ہی میں سب سے اگلی قطار میں مجھے دینو اور موہل بھی نظر آئے۔ تیز روشنی میں موہل کا سانولا چہرہ دھواں دھواں دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ویسے ہی بڑی بڑی تھیں۔ اس وقت کچھ اور پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ سراونچا کیے مبہوت سے انداز میں رِنگ کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ریسرسل کے عین مطابق ہوشو نے ریفری کی بات ختم ہونے اور باضابطہ مقابلہ شروع ہونے سے پہلے ہی اپنی دانست میں آنکھ بچا کر دھوکے سے مجھ پر وار کرنا چاہا لیکن ریسرسل کے عین مطابق ہی میں بروقت ہوشیار ہو گیا اور جھکائی دے کر اس وار سے بچ گیا۔ ہوشو کا زبردست گھونسا ریفری کے منہ پر پڑتے پڑتے رہ گیا لیکن یہ بھی ریسرسل کے عین مطابق ہی تھا۔ تماشائیوں میں زبردست شور بلند ہوا۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا‘ ہر ماحول کے اپنے کچھ اثرات ہوتے ہیں۔ ہوا میں گویا کچھ جراثیم‘ کچھ نادیدہ لہریں پھیل جاتی ہیں جنہیں ذہن اور جسم جذب کرتا چلا جاتا ہے۔ میرے ساتھ اس وقت یہی ہو رہا تھا۔ اتنا بڑا مجمع.... تیز روشنیاں.... رگوں میں لہو کی گردش تیز کر دینے والا شوروغل.... کسی بن مانس کی طرح شور مچاتا ہوا ہوشو خان اور دھواں دھواں سے چہرے سے جھانکتی ہوئی وہ کنول سی آنکھیں۔ موہل کی آنکھیں۔

یہ سب کچھ گویا میرے حواس پر چھا رہا تھا‘ مجھے خواب و خیال کی کسی اور ہی دنیا میں لے جا رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو سچ مچ ریسلر محسوس کر رہا تھا۔ ہوشو خان نے اچانک ہی کسی سانڈ کی طرح سر جھکا کر میرے سینے پر پوری قوت سے ٹکر رسید کی۔ میں رسے سے جا ٹکرایا اور اپنے ہی زور میں تیزی سے آگے آیا۔

اس کی ٹکر مجھے کچھ ایسی ہی محسوس ہوئی تھی جیسے کوئی پہاڑ اچانک متحرک ہو کر نہ جانے کتنی قوت سے میرے سینے سے آٹکرایا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ میری کئی پسلیاں ٹوٹ پھوٹ کر دل اور پھیپھڑوں میں گھس گئی تھیں‘ آنتیں اتھل پتھل ہو گئی تھیں اور معدہ حلق میں آ گیا تھا۔

رِنگ میں بجلی کے موٹے تاروں جیسا رسا استعمال کیا گیا تھا جو باریک باریک تاروں کو بٹ کر بنایا جاتا ہے۔ اسے بڑی عمدگی اور مضبوطی سے رِنگ کے چاروں کونوں میں آہنی کڑوں سے گزارا گیا تھا اور ان کڑوں کو زمین میں گڑے ہوئے بہت موٹے شہتیروں سے باندھا گیا تھا۔ غیر ملکی انداز میں ہی ان آہنی کڑوں پر فوم یا ربڑ لپیٹ کر اور اوپر چمڑا لپیٹ کر انہیں کم ضرر رساں اور گدیلا بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ آہنی رسوں پر سائیکل کی ٹیوبوں سے بنا کور چڑھا کر ان کی رگڑ کو بھی کم تکلیف دہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن ان سب چیزوں کے نیچے سے اصل چیزیں کہیں نہ کہیں سے جھانک رہی تھیں۔ میں نے رِنگ میں داخل ہوتے ہی ہر چیز کا باریک بینی سے جائزہ لیا تھا۔

آہنی رسے نے کافی طاقت سے مجھے آگے دھکیلا اور اس سے پہلے کہ میں اپنے بچاؤ کے لیے کچھ کرتا‘ ہوشو خان نے اپنا شہتیر جیسا بازو پوری قوت سے میری گردن پر رسید کیا۔ میں چت فرش پر گرا اور ایک لمحے کے لیے میرا سر گھوم گیا۔ فرش پر کسی ہوئی دری کے نیچے یقیناً ایک یا دو قالین موجود تھے لیکن اتنی طاقت سے گرنے پر ان کی نرمی گویا کوئی خاص تحفظ فراہم نہیں کر رہی تھی۔

یوں تو ہوشو خان نے دونوں وار ریسرسل کے مطابق ہی کیے تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس نے طاقت غیر ضروری طور پر اتنی استعمال کی تھی جتنی اس کے بس میں تھی۔ اس کے وار دکھاوے کے نہیں تھے۔ اس نے اپنا پورا پورا زور لگایا تھا اور یہ معاہدے کی خلاف ورزی تھی۔

میرے ساتھ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ مجھے رِنگ میں لڑنے کا تجربہ نہیں تھا۔ دینو کے گھر پر خواہ میں نے ہوشو کے ساتھ کئی ریسرسل کی تھی لیکن رِنگ میں لڑنا اور بات تھی ہوشو کو رِنگ میں کئی مرتبہ لڑنے کا تجربہ حاصل تھا۔ بہرحال مجھے تجربہ کار بنانے کے لیے اس کے دو وار ہی کافی تھے۔

چت گرنے سے مجھ پر چودہ طبق روشن ہوئے تو جیسے سارے کچھ خوابیدہ سی حسیات بھی بیدار ہو گئیں۔ اندر سویا ہوا کوئی گویا جھرجھری لے کر بیدار ہوا اور میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو خبردار کیا۔ ”برخوردار افضل! ہوشیار ہو جا۔ صرف ریسرسل کے دائرے میں قید مت رہ۔ اپنے حواس کو پوری طرح بیدار کر لے اور اپنی تمام تر قوت کو مجتمع کر لے۔ جذباتیت کی دلدل سے نکل آ۔ موہل کو کچھ دیر کے لیے بھول جا۔ اس کی آنکھوں کی حیرانی اور اس کی نظروں کے سحر میں نہ اُلجھ۔ فی الحال سب کچھ ذہن سے جھٹک دے اور صرف ہوشو پر نظر رکھ۔ اسی کو ذہن میں رکھ۔‘

یہ سب باتیں میں نے صرف ایک لمحے میں اپنے آپ سے کہیں۔ اس دوران ہوشو خان میرے سینے یا شاید منہ پر کہنی رسید کرنے کے لیے اُچھل کر پورے وزن سے مجھ پر گرنے لگا تھا لیکن میں اس ایک لمحے کے دوران ہی گویا کسی عجیب سی دُھندلاہٹ سے یکدم روشنی میں آ چکا تھا۔ میں مچھلی کی طرح تڑپ کر وہاں سے ہٹ چکا تھا۔

ہوشو خان کا وزن اس کے لیے جتنا فائدہ مند تھا اس سے زیادہ نقصان دہ تھا۔ اگر وہ مجھ پر گر کر کہنی مارنے میں کامیاب ہو جاتا تو اس کے وزن کا اسے بے پناہ فائدہ پہنچتا۔ پے در پے اس کا یہ تیسرا وار اسے بہت سہارا دیتا اور مجھے ابتدا ہی میں کافی زوردار جھٹکے لگ جاتے لیکن چونکہ وہ مجھ پر نہیں گر سکا تھا بلکہ ایک ہاتھی کی طرح فرش پر گرا تھا اس لیے اس کے اپنے وزن نے اس کا جو حشر کیا اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے اس کے حواس مختل سے ہو گئے۔ میں چاہتا تو اس دوران اس پر ٹوٹ پڑتا اور اس کی حالت مزید خراب کر دیتا لیکن میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیا۔ وہ سر جھٹک کر بہ مشکل اُٹھا تو اس کی بٹن جیسی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ اس کا شکوہ بجا تھا۔ میرا اس کی کہنی کے نیچے سے نکل جانا ریسرسل کے خلاف تھا لیکن اگر موقع ہوتا تو میں اس سے پوچھتا کہ اس نے مجھ پر جو پہلے دو وار اپنی پوری طاقت سے کیے تھے‘ کیا وہ حرکت ریسرسل کے مطابق تھی؟ اس کے علاوہ میں نے اسے گرنے کے بعد سنبھلنے کا بھی موقع دیا تھا‘ میرا یہ احسان کم اہم نہیں تھا۔

چند لمحے ہم بھوکے شیروں کی طرح رِنگ میں ایک دوسرے کے سامنے نیم دائرے میں چکراتے رہے پھر جھپٹ کر ایک دوسرے سے اُلجھے۔ ہوشو خان نے مجھے دھکیل کر ایک بار پھر رسوں سے ٹکرانے کی کوشش کی لیکن اس بار میں نے اس کی کوشش کامیاب نہ ہونے دی اور میں بھی اس سے کہیں ہلکے جسم کے باوجود ہاتھی ہی کی طرح اپنی جگہ جم کر کھڑا ہو گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ شروع میں مجھے مار پڑتے دیکھ کر تماشائیوں میں سکوت پھیل گیا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر تیزی سے کمنٹری جاری تھی لیکن اس کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی مگر جب میں نے سنبھل کر ہوشو خان سے نمٹنا شروع کیا تو چاروں طرف سے یکدم تحسین آمیز شور بلند ہونے لگا۔

یہ بات میرے لیے حیران کن تھی۔ کیا تماشائیوں کی ہمدردیاں میری ساتھ تھیں؟ مگر میں تو ان کے لیے قطعی اجنبی تھا۔ تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر باقی سب تو میری صورت ہی پہلی بار دیکھ رہے تھے۔ ان تک تو شاید صرف میرے افسانے ہی پہنچے تھے جو دلبر خان نے مصلحتاً پھیلائے تھے۔ وہ ان افسانوں سے لوگوں کے ذہنوں میں میرے بارے میں یہ تاثر تخلیق کرنا چاہتا تھا کہ میں ناقابلِ شکست ہوں۔

اس تاثر کے بعد جب اچانک مجھے ہوشو خان کے ہاتھوں شکست ہوتی تو لوگوں کو شدید دھچکا لگتا اور اس قسم کے کاموں میں دھچکے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اسی کیفیت میں لوگوں کے ذہنوں میں ہمیشہ کے لیے یہ بات نقش ہو جاتی کہ ناقابلِ شکست تو درحقیقت ہوشو خان ہے.... اور ہوشو خان‘ دلبر خان کا ایک ادنیٰ غلام تھا۔ اس سے دلبر خان کی دہشت اور بھی مستحکم ہوتی۔ بہرحال میرے لیے یہ خوشی ہی بہت تھی کہ تماشائیوں کی ہمدردیاں میرے ساتھ تھیں۔ ان کا تحسین آمیز شور میری رگ و پے میں دوڑتی ہوئی آتشِ سیّال کو مزید بھڑکا رہا تھا۔

ہوشو خان گویا کسی نئی سوچ کے ساتھ‘ اپنے تمام تر بھاری تن و توش کے باوجود انتہائی پھرتی سے اچانک مجھ پر جھپٹا۔ میں نے اس کی بغل میں ہاتھ دے کر اسے قلابازی کھلاتے ہوئے فرش پر پٹخا تو تماشائیوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ انہیں شاید یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بھاری بھرکم اور لمبے چوڑے انسان کو ایک بازو سے قلابازی بھی کھلائی جا سکتی ہے۔

اتنے بھاری ریسلر کے لیے باڈی سلیم (BODY SLAM) خاصی ہوش اُڑا دینے والی چیز ہوتی ہے۔ خصوصاً جب یہ ریسرسل کے مطابق کوئی جعلی باڈی سلیم بھی نہیں تھا جس میں اس کے لیے اپنے بچاؤ کا موقع پنہاں ہوتا۔ یعنی وہ اپنے پاؤں پہلے زمین پر لگنے دیتا جس سے دھچکے کی شدت کم ہو جاتی اور اسے ہلکی چوٹ آتی لیکن میں نے تو اس کی توقع کے خلاف اسے باڈی سلیم دیا تھا۔

اس کی ریڑھ کی ہڈی کے مہرے یقیناً جھنجھنا اٹھے تھے۔ وہ چت پڑا آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ اس وقت اسے پن کرنا ریسرسل میں شامل نہیں تھا لیکن میرے خیال میں اسے خبردار کرنے کا یہ ایک اچھا موقع تھا۔ میں اسے چت کرنے کے لیے اس کے اوپر جا گرا۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح پھول پچک رہا تھا۔ میں نے اسے پوری قوت سے دبا کر اس کی سانس تقریباً روک دی اور اس کے کان میں اس طرح سرگوشی کی کہ کسی کو میرے ہونٹ ہلتے نظر نہ آ سکیں۔

”ریہرسل کے مطابق چلو ہوشو خان! ورنہ....“

میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ ماسٹر عبداللہ ایک لمحے کے لیے دم بخود کھڑا رہ گیا تھا۔ اسے شاید بالکل توقع نہیں تھی کہ میں ابتدائی مراحل میں ہی ہوشو خان کو پن کرنے کی کوشش کروں گا۔ میرے لیے ہدایات یہی تھیں کہ میں مقابلے کو زیادہ سے زیادہ طول دینے کی کوشش کروں تاکہ لوگوں کو اپنے پیسے وصول ہونے کا بھی

احساس ہو سکے اور جو تاثر قائم کرنا مطلوب تھا وہ بھی صحیح طور پر قائم ہو سکے۔

بہرحال اب تو میں ہوشو خان کے سینے پر جا ہی گرا تھا اس لیے ماسٹر عبداللہ کو لپک کر آگے آنا پڑا۔ وہ تقریباً سینے کے بل گر کر کینوس پر ہاتھ مارتے ہوئے چلایا۔ "ون ....." اس کے بعد اس نے مقررہ یعنی ایک سیکنڈ کے وقفے سے کہیں زیادہ وقفہ دیا۔

پھنسی پھنسی سی آواز میں گویا بڑی مشکل سے اس کے منہ سے نکلا۔ "ٹو..." وہ ہوشو خان کو پورا پورا موقع دے رہا تھا کہ وہ سنبھل جائے اور مجھے سینے پر سے اُچھال پھینکے لیکن ہوشو خان کے حواس تو شاید کچھ زیادہ ہی مختل ہو گئے تھے۔ وہ تو بالکل بے دم پڑا تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے بھی اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ سچ مچ پن نہ ہو جائے۔ میں تو صرف اس کے کان میں سرگوشی کرنے کے لیے اس کے سینے پر گرا تھا۔ ابھی سے اسے سچ مچ پن کرنا نہیں بلکہ صرف خبردار کرنا، وارننگ دینا میرا مقصد تھا۔ میں نے تو اب اس کے سینے پر سے وزن بھی ختم کر دیا تھا لیکن اب میں خود تو اچھل کر دور جا کر نہیں گر سکتا تھا۔ یہ تو فراڈ کی انتہا ہی ہو جاتی۔ ہوشو کا تھوڑا بہت ہاتھ ہلانا تو ضروری تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ خود ہی اُٹھ کر ہوشو خان کی گردن پکڑ کر اسے دوبارہ اُٹھا لوں اور ہلکی پھلکی مار لگانا شروع کر دوں جس طرح بعض ریسلر اپنے حریف کو کچھ زیادہ ہی سبق سکھانے کے لیے کرتے ہیں لیکن اسے مکمل طور پر پن نہیں ہونے دیتے، ریفری کے "تھری" کہنے سے پہلے ہی خود دوبارہ اٹھا لیتے ہیں اور نئے سرے سے مارنا شروع کر دیتے ہیں۔

غنیمت رہا کہ اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ماسٹر عبداللہ کئی سیکنڈ کے وقفے کے بعد غالباً انتہائی مجبوری کی حالت میں اس وقت اپنا بازو نیچے لا کر تھری کہنے ہی والا تھا جب ہوشو خان نے سچ مچ مجھے دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے سے اُچھال کر دور پھینک دیا۔

حقیقت میں تو وہ پن ہو چکا تھا لیکن ریفری کے فیصلے کے مطابق بہرحال نہیں ہوا تھا۔ وہ نہ صرف ناقابلِ یقین پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوا بلکہ میری توقع کے خلاف اس نے میرے اٹھنے سے پہلے ہی میری پسلیوں میں ایک زور دار ٹھوکر بھی رسید کر دی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یہی محسوس ہوا کہ میری کوئی پسلی ٹوٹ کر پھیپھڑے میں پیوست ہو گئی تھی یا میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔

میرے خیال میں مجھے اب اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے تھا کہ ہوشو خان گوشت اور چربی کا محض تھل تھل کرتا ایک پہاڑ تھا۔ حاکم ماشیہ نے دبے دبے الفاظ میں مجھے صحیح بتایا تھا کہ طاقت بہرحال اس میں کچھ کم نہیں تھی اور اب اپنے طور پر میں نے ایک بات اور محسوس کی تھی کہ ہوشو خان میں بہرحال ایک ریسلر کی روح بھی موجود تھی۔ وہ کس معیار کا ریسلر تھا، یہ ایک الگ بحث تھی لیکن مجھے اس کے ریسلر ہونے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ اس یقین کے بعد مجھے اور زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت تھی۔ اگر اسے کسی ترقی یافتہ ملک میں ریسلنگ کے میدان میں داخل ہونے کا موقع ملتا، تمام ضروری مدد اور رہنمائی میسر آتی، بہتر ٹریننگ ملتی تو کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ نامی گرامی ریسلرز کی صف میں شامل ہو جاتا۔ اس میں قدرتی قسم کا کوئی غیر معمولی پن موجود تھا۔

مجھے سنبھلنے کا موقع نہیں ملا۔ اس نے میری پسلیوں پر دوسری ٹھوکر رسید کی۔ میں دوسری طرف لڑھک گیا۔ سانس میرے سینے میں اٹک گئی تھی اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ اس وقت رسوں کے قریب تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے رسا پکڑ کر میرے سینے پر چڑھ گیا اور اچھلنے لگا۔

مجھے یہی لگا کہ میں کسی ہاتھی کے پیروں تلے کچلا جا رہا ہوں۔ میری آنتیں، دل، گردے اور معدے وغیرہ سب ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو گئے ہیں اور ان کا کچومر بن گیا ہے۔ شاید تماشائی شور مچا رہے تھے۔ شاید ماسٹر عبداللہ بادلِ نخواستہ گنتی گن رہا تھا جو ہوشو خان کے لیے دراصل رسا چھوڑنے کا حکم تھا۔

لیکن اسے اس کی شاید کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے یہ آوازیں کہیں بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ریہرسل اور ہدایات سب کہیں دھری رہ گئی تھیں۔ ہوشو خان جو کچھ کر رہا تھا وہ ریہرسل میں شامل تو تھا کیوں کہ ہمیں بہرحال ایک طویل کشتی لڑنی تھی اور اس میں ہر رنگ، ہر داؤ پیش کرنا تھا لیکن سب چیزوں کی ترتیب اُلٹ پلٹ ہو گئی تھی۔

سب سے خطرناک بات یہ تھی کہ ہوشو خان کوئی بھی کام دکھاوے کے لیے نہیں کر رہا تھا۔ ہر حملے، ہر وار میں پوری طاقت استعمال کر رہا تھا۔ اس کے پیشِ نظر یقیناً کوئی اور مقصد تھا۔ اسے میرے سینے پر چڑھنا ضرور چاہیے تھا لیکن صرف ایک پاؤں رکھ کر اور وہ بھی وقفے وقفے سے تاکہ مجھ پر پورا وزن نہ پڑتا لیکن اس وقت ہوشو خان کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ مجھے پیروں تلے روند کر گوشت اور خون کا ملغوبہ بنا دینا چاہتا تھا۔

یکدم اگر یوگا کی مشق میرے کام نہ آئی ہوتی تو شاید میرے جسم میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو چکا ہوتا۔ میں نے سانس روک لی اور ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر کے ذہن دنیا کی طرف سے ہٹا لیا۔ اس ایک لمحے میں میرا جسم گویا پتھر کا ہو گیا۔ ہوشو میرے جسم پر اچھل کود رہا تھا لیکن مجھے تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

تکلیف کا احساس ختم ہوا تو میں نے ہوشو خان کی شہتیر جیسی ٹانگ پکڑ کر اسے اتنے زور سے دور دھکیلا کہ رسا بھی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ اتنے زور سے دور جا کر گرا کہ ایک بار رِنگ کے فرش میں بھی ارتعاش سا آگیا۔ ایک لمحے کے لیے گویا سماعت نے بھی کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور کوئی آواز مجھے سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرا گویا دنیا سے رابطہ ہی منقطع ہو گیا تھا۔

میں نے ہوشو خان کو دور پھینکا تو مجھے یک لخت تماشائیوں کا شور سُنائی دیا۔ میرے لیے یہ کچھ ایسی ہی کیفیت تھی جیسے برقی رو منقطع ہو جانے کی وجہ سے کسی سینما ہال وغیرہ کے اسپیکر یکدم خاموش ہو گئے تھے اور بجلی آجانے پر آوازوں کا سلسلہ بحال ہو گیا تھا۔

میں اُچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ عین اسی وقت ہوشو بھی اُٹھ رہا تھا۔ اس کے اور میرے تن و توش میں زمین آسمان کا فرق تھا لیکن وہ اُٹھنے میں تقریباً مجھ جتنی ہی پھرتی دکھا رہا تھا۔ معلوم نہیں ابھی مجھے ایسی کتنی حیرتوں کا سامنا کرنا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ گرانے کے لیے اس پر چھلانگ لگائی۔ اس وقت تک وہ رسا پکڑ کر تقریباً کھڑا ہو چکا تھا۔

مجھے کچھ ایسا ہی لگا جیسے میں ذرا نرم قسم کے کسی پہاڑ سے ٹکرا گیا تھا۔ وہ لڑکھڑایا۔ اس نے مجھے ساتھ لے کر گرنے کی کوشش کی لیکن میں فرش پر لڑھک کر تیزی سے پیچھے ہٹ گیا۔ وہ خوفناک انداز میں ڈکراتا ہوا میری طرف بڑھا۔ میں نے اس کی کنپٹی پر پوری قوت سے ایک گھونسا رسید کیا۔ وہ ایک بار پھر اچھل کر گرا۔ میں نے محسوس کیا کہ بار بار گرنا ہی اس کی حیوانی سی طاقت کو انسانی سطح پر لا سکتا تھا۔ اس کی شکل پر اب درندگی برس رہی تھی۔

اس بار وہ گرا تو میں نے اسے پن کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے خیال میں ابھی وہ پن ہونے کی حالت کو نہیں پہنچا تھا۔ جس طرح میرے اندر کچھ خفتہ سی قوتیں سر اُٹھا چکی تھیں اسی طرح اس کے اندر بھی کوئی درندہ بیدار ہو چکا تھا۔

میں نے اسے ٹھوکروں پر رکھ لیا لیکن یہ میری غلطی تھی۔ اس کے جسم پر چربی کی اتنی موٹی حفاظتی تہیں موجود تھیں کہ ٹھوکروں سے اسے کوئی خاص نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اس کی کنپٹی پر ٹھوکر رسید کرنا چاہی۔ وہ بدحواس سا نظر آ رہا تھا لیکن اس وقت اس نے اچانک ہی لپک کر میری ٹانگ پکڑ لی۔

توازن خراب ہونے کی وجہ سے میں دھپ سے گرا۔ وہ میری ٹانگ کو گرفت میں رکھتے ہوئے اچھل کر اُٹھا اور دوسرے ہی لمحے اگر میں نے دوسری ٹانگ کی ضرب سے اسے پیچھے نہ دھکیل دیا ہوتا تو میری وہ ٹانگ یقیناً ٹوٹ چکی ہوتی جو اس کی گرفت میں تھی۔

وہ رسے سے جا ٹکرایا اور اس کی لچک کی وجہ سے تیزی سے واپس آگے آیا۔ اس وقت تک میں اُچھل کر کھڑا ہو چکا تھا۔ ہم دونوں غیر ارادی طور پر، آمنے سامنے سے آتی ہوئی گاڑیوں کی طرح ٹکرا گئے۔ اس لمحے مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے ہم انسان نہیں رہے تھے۔ کسی نامعلوم قوت سے چلنے والی فولادی سی مشینیں ہی بن گئے تھے۔ دو بڑے بڑے روبوٹ یا کچھ اور۔ مجھے تو یہ شبہ بھی ہوا کہ اگر ہم دوبارہ اسی طرح ٹکرائے تو شاید ہمارے جسموں سے چنگاریاں بھی پھوٹیں گی۔

حالانکہ ہوشو خان بہت تیزی میں آیا تھا اور میں غیر ارادی طور پر اس سے ٹکرایا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ میں گرا نہیں تھا۔ اس ٹکر کو برداشت کر گیا تھا اس سے میری خود اعتمادی کو سہارا ملا۔ ابھی تک مجھے یقین نہیں تھا کہ میں اس متحرک پہاڑ کی ٹکر کو سہہ سکتا تھا اور اپنی جگہ جما کھڑا رہ سکتا تھا۔

اس نے میری کھوپڑی پر کراٹے کے انداز میں اپنا بیلچہ نما ہاتھ رسید کیا۔ میں اس وار سے بچ نہ سکا۔ ایک لمحے کے لیے میری کھوپڑی جھنجھنا گئی لیکن لڑکھڑانے سے پہلے میں نے بھی اس کے چہرے پر اندھا دُھند گھونسا رسید کیا۔ دوسرے ہی لمحے میری آنکھوں کے سامنے سے دھندلاہٹ صاف ہوئی تو میں نے اپنے آپ کو کارنر میں پایا۔ ہوشو خان کسی ریلوے انجن کی طرح میری طرف آ رہا تھا۔ اس کا چہرہ خون سے تر تھا۔

اب شاید اس کے حواس پر خون ہی سوار تھا۔ وہ مجھے کارنر میں کچل دینا چاہتا تھا لیکن میں بروقت ہٹ گیا۔ وہ کارنر کی بندشوں سے ٹکرایا۔ غنیمت تھا کہ اس رِنگ میں ستون، کارنروں سے کافی دور رکھے گئے تھے۔ اس رفتار سے سچ مچ کسی ستون سے ٹکرا جانے کے بعد تو اس کا اللہ ہی حافظ تھا۔

کارنر سے ٹکرا کر ہوشو خان بُری طرح ڈکرایا مگر اس سے پہلے کہ میں اس پر کوئی وار کر سکتا، وہ گھوم گیا۔ میں اس لمحے اس پر جھپٹ رہا تھا۔ اس نے مجھے زور دار لات رسید کی۔ میں دور جا گرا، میرے حواس کے ساتھ ساتھ ایک لمحے کے لیے میری خود اعتمادی بھی زیر و زبر ہو گئی۔

میں تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے ہوشو خان میرے سر پر تھا۔ اس نے پوری قوت سے میرے بائیں گردے پر گھونسا رسید کرنا چاہا لیکن یہ محض ایک اتفاق تھا کہ میں لڑکھڑاتے ہوئے تھوڑا سا جھک گیا۔ گھونسا میرے کندھے پر پڑا۔ میں کچھ اور لڑکھڑاتا ہوا دور چلا گیا۔

مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرا بازو یا تو شل ہو گیا تھا یا جسم سے الگ ہو گیا تھا۔ یہ گھونسا اگر واقعی میرے گردے پر پڑا ہوتا تو یقیناً گردہ پھٹ گیا ہوتا یا شاید ہمیشہ کے لیے ناکارہ ہو گیا ہوتا۔ گھونسا کیا تھا، میرے کندھے پر بڑا سا ایک آہنی ہتھوڑا پڑا تھا۔

ریہرسل اور ہدایات وغیرہ تو میں بتا چکا ہوں کہ کئی منٹ پہلے ہی دھری رہ گئی تھیں لیکن اب تو شاید سب کچھ ہی میرے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اب میں چاہتا بھی تو کسی چیز کو طے شدہ منصوبے کے تحت نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب یہ ایک خونریز مقابلہ تھا۔ زندگی اور موت کی بازی تھی۔

خصوصاً ایک لمحے پہلے کا وہ گھونسا جو اصل ہدف پر نہیں پڑ سکا تھا، اس کا انداز مجھے بہت کچھ بتا گیا تھا۔ یکدم جیسے ساری سازش

الہامی سے انداز میں کسی روشن تصویر کی طرح میرے سامنے آگئی تھی۔ ہوشو خان کے چہرے پر پھیلی ہوئی درندگی نے بھی مجھے بہت کچھ بتا دیا تھا۔ یہ درندگی محض اداکاری نہیں تھی۔

ہوشو خان نے شروع ہی سے ہر وار پوری طاقت سے کیا تھا۔ یہ محض اتفاق نہیں تھا اور نہ ہی اس پر وقتی جذباتیت غالب آئی تھی۔ شروع سے یقیناً منصوبہ ہی یہی تھا۔ وہ تو میری قسمت اچھی تھی کہ کوئی وار خالی چلا گیا تھا' کوئی صحیح ہدف پر نہیں پڑ سکا تھا اور کوئی میری غیر معمولی قوتِ برداشت کی وجہ سے وہ نتیجہ نہیں دے سکا تھا جو ہوشو خان یا اس کے آقا نے سوچا ہوا تھا۔

میں نے تو اب محسوس کیا کہ ہوشو خان نے تقریباً ہر وار ہی میرے جسم کے کسی ایسے حصے پر' اس شدت سے اور اس انداز میں کرنے کی کوشش کی تھی کہ وہ میرے لیے مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ ایسے کسی بھی ایک وار سے میں بے بس ہو کر گر پڑتا تو پھر بظاہر کشتی ہی کشتی میں میرا خاتمہ کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔

سازش بہت سادہ سی تھی' شاید اسی لیے شروع میں میری سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ بعض اوقات ہم' شاطر و مکار لوگوں کی ہر بات میں پیچیدگی تلاش کرتے رہ جاتے ہیں جبکہ وہ نہایت سیدھا سادا وار کر جاتے ہیں۔ بات بالکل سامنے کی ہوتی ہے لیکن ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

تاہم سازش کی تمام تر سادگی کے باوجود مجھے دل ہی دل میں دلبر خان کی ذہانت کی داد دینی پڑی۔ وہ اصل مالک کے ہوتے ہوئے بھی خواہ مخواہ ہی اس علاقے پر حکمرانی نہیں کر رہا تھا۔ میں اور دینو بہت حیران و پریشان تھے کہ آخر دلبر خان اپنے آدمیوں سمیت میرے ہاتھوں زک اُٹھانے کے بعد اچانک ہی مجھ پر مہربان کیوں ہو گیا تھا؟

اس قبیل کے لوگ تو بہت کینہ پرور ہوتے ہیں۔ ان کے حضور میں کسی سے غیر ارادی طور پر معمولی سی گستاخی بھی سرزد ہو جائے تو وہ بات دل میں رکھ لیتے ہیں۔ اگر اس وقت کسی مصلحت یا مجبوری کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکیں' کچھ نہ کر سکیں تو کبھی نہ کبھی اس بدنصیب کو سبق ضرور سکھاتے ہیں۔

میں تو ایک اجنبی اور بظاہر بے حیثیت آدمی تھا۔ میں نے تو اس کے خاص کارندوں کو مارا تھا اور غالباً پوری بستی میں یہ بات پھیل چکی تھی۔ وہ بھلا مجھے کیسے بخش سکتا تھا؟ میں اور دینو بہت حیران تھے کہ کیا علاقے میں کشتیوں کے مقابلے کرانا اس کے لیے اتنا ہی اہم تھا کہ ان میں محض ایک نورا کشتی لڑنے کے عوض وہ میری جان بخشی کرنے پر تیار ہو گیا تھا؟

دلبر خان کا ذہن یقیناً کمپیوٹر کی طرح کام کرتا تھا۔ میں جب جا کر اس کے آدمیوں سے اُلجھا تھا تو اس نے ایک لمحے کے اندر اندر واقعی میرے لیے بڑے کمال کی سزا سوچی تھی۔ میرا سراپا اور لڑائی بھڑائی کا انداز دیکھتے ہوئے اس نے جو تجویز پیش کی تھی وہ بظاہر بے ضرر دکھائی دیتی تھی۔

اس کی سازش نہایت سادہ ہوتے ہوئے بھی اس کے ہشت پہلو فائدے رکھتی تھی۔ میرا اور ہوشو خان کا جوڑ تیار کر کے اس نے کشتیوں کے پروگرام میں جان ڈال دی تھی' اس سے کما لیا تھا اور اپنی فطرت کی تسکین کا سامان بھی کر لیا تھا۔

اس نے مجھے چند لمحے کے کسی جھگڑے میں گولی کا نشانہ بنانے کے بجائے یا کسی طرح اغوا کر کے مروانے کے بجائے ایک بڑے ہجوم کے سامنے' اپنے معزز دوستوں کے سامنے تڑپا تڑپا کر سسکا سسکا کر مارنے کا بندوبست کیا تھا۔ یوں اس نے اپنے معزز دوستوں اور اپنے گرگوں کی تفریح کا بھی انتظام کیا تھا۔ یہ بلاشبہ اس کے لیے ایک دلچسپ کام تھا۔ اتنا سا [illegible] سے اور دینو سے حل نہیں ہوا تھا۔

لیکن اب رنگ میں ذرا تاخیر سے سہی' تاہم حقیقت منکشف ضرور ہو گئی تھی۔ مقابلہ شروع سے ہی خواہ مخواہ نہیں ہوا تھا۔ ریہرسل اور ہدایات بلا وجہ ہی دھری نہیں تھیں۔ ریہرسل اور ہدایات در حقیقت صرف میرے لیے تھیں۔ میں چند منٹ بھی ان کی پابندی میں اُلجھا رہ جاتا تو میرا [illegible] ہو جاتا۔ گو میں نے لاعلمی میں ان کی پابندی کی کوشش کی تھی لیکن قدرت نے مجھے بچا لیا تھا۔

دلبر خان شاید اس وقت اپنے گرگوں' مصاحبوں اور خاص معزز دوستوں کے ساتھ اگلی صف میں صوفے لگائے قدیم رومن بادشاہوں کے انداز میں ہزاروں تماشائیوں کے سامنے مجھے مرتے دیکھنے کا منتظر تھا۔ یہ رومنوں کے دور کا تماشہ سے ملتا جلتا تماشا تھا جس میں کسی معتوب یا قیدی کو

شیر کے سامنے ڈال دیا جاتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے سامنے چار ٹانگوں والا نہیں' دو ٹانگوں والا درندہ تھا اور میں بالکل ہی کمزور' بے بس اور عام سا قیدی نہیں تھا۔ مجھے خدا نے خاصی طاقت سے نوازا تھا لیکن مجھے نورا کشتی کے جھانسے میں رکھ کر میری اس طاقت کو ناکارہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔

اب جب کہ اچانک ہی میرے ذہن میں بجلی کا کوندا سا لپکا تھا اور اندھیرے میں چھپی ہوئی یہ تصویر میری نظر کے سامنے آگئی تھی تو میرے جسم میں ایک نئی سنسنی دوڑ گئی تھی۔ کشتی بے قابو ہو جانے کا احساس ہونے کے بعد بھی میں اُلجھن میں تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ کسی طرح وہ پٹڑی پر آ جائے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر کشتی اس طرح طے شدہ پروگرام کے بغیر بھی جا رہی تو مجھے اس میں جان بوجھ کر ہارنا ہی چاہیے یا فتح حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ یہ امکان بھی موجود تھا کہ کسی اتفاق کے تحت یا اپنی تجربہ کاری کی وجہ سے ہوشو خان سچ مچ ہی مجھے ہرا دیتا۔

لیکن اب میں یہ سب کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ مجھے تو مسئلہ ہی کوئی اور درپیش تھا جو اب میری سمجھ میں آیا تھا۔ غنیمت تھا کہ ابھی تاخیر نہیں ہوئی تھی۔ مجھے جو چوٹیں لگ چکی تھیں وہ میرے لیے قابلِ برداشت تھیں۔

میں تو صرف پسینے میں ہی شرابور تھا لیکن ہوشو خان کے جسم سے پسینہ اور چہرے سے خون بھی ٹپک رہا تھا۔ میں نے اندھا دھند جو گھونسا اس کے چہرے پر رسید کیا تھا وہ شاید اس کی ناک پر پڑا تھا۔ اب میں نے محسوس کیا کہ اس کی درندگی میں ایک طرح کی بوکھلاہٹ کی آمیزش بھی تھی۔ وہ یقیناً پریشان تھا کہ سازش اس انداز میں آگے نہیں بڑھ رہی تھی جس طرح اس نے اور اس کے آقا نے سوچا تھا۔

سوچوں کا یہ سیلاب جو میرے ذہن کے کمپیوٹر سے ایک لمحے میں گزرا تھا' اس نے ایک لمحے کے لیے مجھے اپنی جگہ سُن کر دیا تھا لیکن اسی لمحے ہوشو خان ایک نئے جوش سے خوفناک انداز میں ڈکراتا ہوا میری طرف بڑھا تو میں گویا حواس میں آگیا۔ میرے جسم میں اب ایک اور ہی طاقت کروٹ لے کر بیدار ہوئی تھی۔ بات جب انسان کی سمجھ میں آ جائے تو کام آسان ہو جاتا ہے۔ آگہی ایک الگ طرح کی طاقت ہے اور نا آگہی ایک الگ طرح کی۔

میں تڑپ کر اپنی جگہ سے ہٹا اور ساتھ ہی میں نے پوری قوت سے لات گھما کر اس کے پیٹ پر رسید کی لیکن میری لات گویا ایک لمبے کے لیے چربی کے گنبد میں دھنس کر واپس آگئی۔ میرا خیال تھا کہ اس قسم کے وار سے اس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا لیکن میں نے تکلیف کی شدت سے اس کے ہیبت ناک چہرے کو مزید ہیبت ناک ہوتے دیکھا۔ اس لمحے سے فائدہ اُٹھانے کے لیے میں نے فوراً اس کی چکنی چندیا پر کراٹے کا ایک وار کیا لیکن اس کے لیے مجھے اس کے کچھ زیادہ ہی قریب جانا پڑ گیا۔

وہ لمحہ میرے لیے کچھ زیادہ فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکا کیوں کہ عین اسی لمحے اس نے بھی دونوں ہاتھوں کے درمیان میرے سر کو خربوزے کی طرح پچکانے کا فیصلہ کیا تھا۔ ادھر میرا کراٹے کا وار اس کی کھوپڑی پر پڑا' ادھر دائیں بائیں دونوں طرف سے اس کے گھونسے بیک وقت میری دونوں کنپٹیوں پر پڑے۔

میری کھوپڑی کی جگہ اگر کوئی تربوز ہوتا تو ہوشو خان کے دونوں گھونسوں کے درمیان شاید اس کے ٹکڑے اُڑ جاتے لیکن کھوپڑی اللہ نے بڑی مضبوط چیز بنائی ہے۔ تاہم اس مضبوط چیز کی قوتِ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ کنپٹیاں ویسے بھی کھوپڑی کا ذرا نازک حصہ ہوتی ہیں۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہی محسوس ہوا کہ میری کھوپڑی کوئی تربوز ہی تھی اور اس کے پرخچے اُڑ چکے تھے۔

میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ دھم کی آواز سے مجھے احساس ہوا کہ میں گر چکا تھا۔ اس کے بعد مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ آخری خیال ذہن میں بس یہی تھا کہ یہ میری پہلی اور آخری کشتی کا بھی اختتام تھا اور میری زندگی کا بھی۔ میرا خیال تھا کہ یا تو میں موت کی آغوش میں جا رہا ہوں یا پھر بے ہوش ہو رہا ہوں لیکن اس بے ہوشی کے دوران ہی ہوشو خان میرا کام تمام کر دے گا۔

میں نے اپنی قوتِ ارادی کو ایک نقطے پر مرکوز کرتے ہوئے بے ہوشی سے بچنے کی کوشش کی لیکن مجھے تاخیر ہو چکی تھی اور وار بھی شدید تھا۔ تاریکی نے یک لخت ہی میرے ذہن کو گرفت میں لے لیا۔ میرے وجود میں جیسے شارٹ سرکٹ ہو جانے کی وجہ سے کوئی بلب بھک سے اُڑ گیا تھا۔

مجھے نہیں معلوم کہ میرے حواس پر وہ بلیک آؤٹ کتنی دیر طاری رہا۔ شاید وہ صرف چند سیکنڈز کی بات تھی۔ میں نے ایک مانوس سا شور سُنا تو احساس ہوا کہ میں زندہ تھا۔ مرنے کے بعد تو ایسا شور سنائی نہیں دے سکتا تھا کیوں کہ وہ تماشائیوں کا شور تھا لیکن میری کیفیت پانی میں ڈوبتے اُبھرتے انسان کی سی تھی۔ کبھی مجھے یہ شور سنائی دینے لگتا اور کبھی معدوم ہو جاتا۔ میں سطحِ آب پر اُبھرتا تو شور صاف سنائی دیتا لیکن دوبارہ سطحِ آب سے نیچے چلا جاتا تو شور تقریباً ختم ہو جاتا۔

میں نے آنکھیں کھولیں تو احساس ہوا کہ میں قطعی غیر ارادی طور پر' بے خبری میں ہی اُٹھ بیٹھا تھا۔ میں نے سر جھٹکا تو آنکھوں کے سامنے سے دُھند سی صاف ہوئی اور اردگرد کا منظر ذرا صاف ہوا۔ بات کچھ سمجھ میں آئی۔ میں نے اور ہوشو نے بیک وقت ایک دوسرے پر وار کیا تھا۔ میرے کراٹے کے وار سے وہ بھی چکرا کر گر پڑا تھا۔ اب وہ بھی اُٹھ کر میری طرف بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا وجود اس کے راستے کی رکاوٹ بنا ہوا تھا جس کی وجہ سے اسے ذرا تاخیر ہو گئی تھی۔ میں اس سے پہلے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ اگر وہ

بھی میرے ساتھ ہی چکرا کر نہ گرا ہوتا تو میں اپنی چند سیکنڈ کی بے ہوشی کے دوران ہی اس دارِفانی سے کوچ کر چکا ہوتا۔

میں اُچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ زندگی اور موت کی کشمکش میں اگر میں کسی وجہ سے ذرا بھی کمزور پڑ جاتا تو میری موت یقینی تھی۔ بس یہی ایک احساس اس وقت میرے لیے ناممکن کو ممکن بنا رہا تھا۔

ہوشو کی کھوپڑی پر میرا کراٹے کا ایک وار خاصا کامیاب رہا تھا۔ میں نے جھپٹ کر اس کے اُٹھنے سے پہلے اس کی گنجی کھوپڑی پر ایک اور وار کیا۔ وہ بیٹھے ہی بیٹھے اِدھر اُدھر جھولنے لگا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں پے درپے دو تین ٹھوکریں رسید کیں۔

ماسٹر عبداللہ اچھلتا کودتا ہمارے گرد چکرا رہا تھا۔ میں اگر دو تین ٹھوکریں ہوشو کی پسلیوں پر اور رسید کرنے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید وہ دوبارہ لیٹ جاتا لیکن ماسٹر عبداللہ درمیان میں آگیا اور چیخ چیخ کر مجھے بتانے لگا کہ گرے ہوئے حریف کو مارنا فاؤل ہے۔

مجھے یقین تھا کہ اگر یہی کچھ ہوشو خان میرے ساتھ کر رہا ہوتا تو وہ کبھی اسے منع نہ کرتا۔ ایسا ہوتا میرے لیے تعجب کی بات نہ ہوتی۔ آخر ماسٹر عبداللہ اس سازش کا اہم مہرہ تھا۔ اس کا چہرہ پسینے سے تر تھا۔ وہ خاصا حواس باختہ نظر آ رہا تھا۔ اس کی پریشانی اور حواس باختگی بجا تھی۔ جیسا انہوں نے سوچا تھا' مقابلہ اس نہج پر نہیں جا رہا تھا۔

اس کا شاید بس نہیں چل رہا تھا کہ میرے دونوں ہاتھ پکڑ کر پشت پر باندھ دیتا اور ہوشو خان کو موقع دیتا کہ وہ میرا قیمہ بنا دے۔ میرا جی چاہا کہ ایک آدھ ہاتھ اس کے بھی رسید کر دوں لیکن پھر یہی سوچ کر رہ گیا کہ ابھی اس کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر وہ حد سے بڑھتا تو دیکھا جاتا۔ مجھے ابھی اپنا فیئر کھیلنے والے کھلاڑی کا تاثر برقرار رکھنا تھا۔

ماسٹر عبداللہ کے روکنے پر میں پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے ہوشو خان کو اُٹھنے کا موقع دیا۔ اس بار وہ درندے کی طرح اندھا دُھند مجھ پر نہیں جھپٹا۔ کم از کم کسی بے وقوف درندے کی طرح نہیں جھپٹا۔ اُسے سنبھلنے کے لیے کچھ مہلت بھی درکار تھی جو ماسٹر عبداللہ اسے فراہم کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا اور ہمارے درمیان حائل ہو کر خواہ مخواہ ہی گنتی گِنے جا رہا تھا حالانکہ ٹیکنیکلی اب گنتی گِننے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے اس کی پروا نہیں کی۔ مجھے خود بھی سنبھلنے اور تازہ دم ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ میں نے رِنگ کا چکر لگاتے ہوئے کئی گہری گہری سانسیں لیں۔ تماشائیوں کا شور اب معدوم ہو چکا تھا۔ کشیدگی اور تناؤ کی بھی شاید مقناطیسی لہریں ہوتی ہیں جو اس وقت مجھے پورے میدان میں پھیلی محسوس ہو رہی تھیں۔ سب سے زیادہ تناؤ شاید اگلی صفوں میں تھا۔ میں نے پہلے دلبر خان اور پھر مولی کی تلاش میں نظر دوڑائی لیکن وہ دونوں ہی مجھے دکھائی نہیں دیے۔

میں زیادہ توجہ سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے اپنا دھیان ہو خان اور ماسٹر عبداللہ کی طرف رکھنا تھا۔

ہوشو خان چہرے سے لہو پونچھ کر ہاتھ جھٹک کر نہا شاطرانہ انداز میں میرے سامنے نیم دائرے میں نہایت آہستگی چکرا رہا تھا۔ میں وہ ہڈی تھا جو ان لوگوں کے حلق میں اٹک تھی۔ وہ مجھے نہ تو نگل پا رہے تھے اور نہ ہی اُگلنے کے لیے تیار ہوشو خان شاید اپنے طور پر اس کا کوئی حل سوچ رہا تھا لیکن ظا ہے اس کے جسم کی طرح اس کا دماغ بھی موٹا تھا۔ اس کی نظر ایک ہی حل تھا کہ کسی نہ کسی طرح وہ مجھے ہلاک ہی کرنے کوشش کرے۔

اپنی دانست میں وہ بڑی چالاکی دکھاتے ہوئے بظاہر مجھ پر لیکن درحقیقت اس نے خود نیچے گر کر میری ٹانگوں میں اڑنگی مجھے گرانے کی کوشش کی لیکن وہ خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ نہیں سکا۔ میں نہ صرف اُچھل کر ہٹ گیا بلکہ میں نے زور سے ا گرتے ہوئے کہنی اس کے سینے پر رسید کی۔

اب وہ صاف طور پر فاؤلز پر اُتر آیا۔ اس نے میری آ میں پنجہ مارنے کی کوشش کی لیکن میں تیزی سے سر پیچھے ہوئے بچ گیا۔ اس نے مجھے اپنے اوپر سے دھکیل دیا اور کوئی وار کرنے کی مہلت نہیں دی۔ وہ نہایت غضبناک انداز میں میں نے اُٹھتے اُٹھتے ایک ایڑی پر گھوم کر اس کی گُدی پر لات کی۔ وہ اوندھے منہ گرا اور اس کی غضبناکی دھری کی دھری رہ

شاید اس وقت میں اسے سیدھا کر کے پِن کرنے میں کامیاب ہو جاتا لیکن ماسٹر عبداللہ ایک بار پھر اس کے اور میرے درمیان آگیا۔ اس نے ایک بار پھر ہوشو کو سنبھلنے کے لیے چند سیکنڈ کی مہلت دی اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ سست پڑ چکا ہو گا لیکن اس بار وہ میری توقع کے بالکل برعکس یکدم اتنی تیزی سے ناک کی سیدھ میں میری طرف آیا کہ ماسٹر عبداللہ بھی اس کی لپیٹ میں آتے آتے بچا۔

میں اسے نہیں روک سکا اور اس سمیت اس طرح رسّے سے جا کر ٹکرایا کہ اس کے اور رسّے کے درمیان سینڈوچ بن کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے یوں لگا کہ میری ریڑھ کی ہڈی دُہری ہو کر ٹوٹنے لگی ہے لیکن اُدھر رسّے نے ہمیں دھکیلا اور اِدھر ہوشو نے مجھے بازو پر لیتے ہوئے قلابازی کھا کر باڈی سلیم کیا۔

یہ بہت زوردار باڈی سلیم تھا۔ میں دوسری طرف رسّوں کے قریب جا کر گرا تھا۔ بالکل اسی طرح میں نے ہوشو کو باڈی سلیم کیا تھا۔ میرے جسم کے تمام جوڑ گویا ہل کر رہ گئے۔ میری آنکھیں کھلی تھیں' میں سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن چند سیکنڈ کے لیے میں تمامتر کوشش کے باوجود اُٹھ نہ سکا۔

اس دوران ہوشو خان نے ایک مہلک غلطی کی۔ وہ کچھ زیادہ ہی شیخی میں آگیا۔ شاید وہ خود کو امریکی ریسلرز کا ہم پلہ ظاہر کرنے کے لیے رسّوں پر چڑھنے لگا۔ وہ کچھ زیادہ ہی اسٹائل سے مجھے سبق سکھانا چاہتا تھا لیکن رسّوں پر چڑھنے کا فیصلہ کر کے درحقیقت اس نے بہت ہی بڑی حماقت کی تھی۔

ایک تو اس وقت وہ تازہ دم نہیں تھا' دوسرے اس کا جُثہ ایک عجیب چیز تھی۔ رسّوں کے آس پاس سہارے کے لیے کوئی دوسری چیز بھی میسر نہیں تھی۔ فاضل رسّوں کے ذریعے انہیں جن شہتیروں سے باندھا گیا تھا وہ بھی کچھ دور تھے۔ ان سب باتوں کی وجہ سے اسے رسّوں پر چڑھنے میں کئی سیکنڈ لگ گئے۔

مجھے یقین ہے کہ اس دوران ماسٹر عبداللہ' دلبر خان اور اس کی پشت پناہی کرنے والے دوسرے لوگ دانت پیس پیس کر دل ہی دل میں اسے گالیاں دے رہے ہوں گے۔ جب وہ اوپر رسّے پر کارنر میں کھڑا ہو کر میری طرف گھوما تو بُری طرح ڈگمگا رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے اس وقفے میں میرے اوسان بحال ہو چکے تھے۔ میرے سامنے اب دو راستے تھے۔

میں چاہتا تو بظاہر حواس باختہ بنا وہیں پڑا رہتا' ہوشو خان کو اپنے اوپر چھلانگ لگانے کا موقع دیتا اور عین آخری لمحے میں اپنی جگہ سے ہٹ جاتا۔ یہ طریقہ بھی اسے چوکڑی بُھلا دینے کے لیے اچھا تھا لیکن میں اس کشمکش سے اب اُکتا رہا تھا۔ تھکن مجھ پر غلبہ پا رہی تھی۔

میں نے ہوشو خان کو اور بھی شدید جھٹکا دینے کا فیصلہ کیا تاکہ یہ کشمکش کسی کنارے لگنے کے آثار پیدا ہوں۔ میں اُچھل کر اُٹھا اور انتہائی تیزی سے اس کارنر میں پہنچا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اگر میں اسے اوپری رسّے سے اُچھال کر پھینکوں گا تو اسے زیادہ چوٹ آئے گی' اس کے کس بل نکل جائیں گے اور شاید میں شریفانہ طریقے سے اسے پِن کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔

اس نے دونوں بازو ہوا میں لہراتے ہوئے میری گرفت سے بچنے اور رِنگ میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی لیکن میں نے اُچھل کر اسے ہاتھوں پر اُٹھاتے ہوئے ہوا میں اُچھال کر پھینکا۔ مجھے اُمید نہیں تھی کہ میں اس بھینسے کو اس طرح اور اتنا اونچا اُچھال سکوں گا۔

لیکن اس وقت میں کھڑا دیکھتا رہ گیا جب وہ چت یا اوندھا گرنے کے بجائے سر کے بل نیچے آیا۔ رِنگ میں کچھ ایسی ہی آواز پیدا ہوئی جیسے پتھر کی کوئی سِل بلندی سے رِنگ میں گری ہو۔ اس کے ساتھ ہی لکڑی کے ٹوٹنے کا سا ہلکا کڑاکا سُنائی دیا۔

ہوشو خان دھپ سے گر کر دو تین ہلکے سے جھٹکے لے کر ساکت ہو گیا۔ میں نے دیکھا' اس کی گردن عجیب ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں مُڑی ہوئی تھی۔ اس کا سر اس کے کندھے سے بالکل جُڑ گیا تھا۔ اس کی گردن اتنی چھوٹی تھی کہ عام حالات میں یہ بات ممکن نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں اذیت زدہ انداز میں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور زبان منہ سے باہر جھانک رہی تھی۔ تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ اس کی گردن ٹوٹ چکی تھی۔ وہ مر چکا تھا!

چاروں طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اس وقت لاؤڈ اسپیکر پر کمنٹری کرنے والا بھی خاموش تھا۔ شاید وہ بھی کمنٹری کرنا بھول گیا تھا۔

ماسٹر عبداللہ اُچھل کر ہوشو کے پاس پہنچ چکا تھا اور اسے ہِلا جُلا کر دیکھ رہا تھا پھر اس نے اس کے سینے سے کان لگا کر دھڑکن سُننے کی کوشش کی۔ اچانک ہی سیدھا ہوتے ہوئے وہ دونوں بازو پھیلا کر پھٹی پھٹی سی آواز میں چیخا۔ "اڑے دلبر خان..... یہ تو مر گیا ہے.....!"

اتنا بڑا مجمع وہاں موجود ہونے کے باوجود سکوت اتنا گہرا تھا کہ ماسٹر عبداللہ کی آواز لاؤڈ اسپیکر پر گونجتی محسوس ہوئی۔ حالانکہ حقیقت میں وہ لاؤڈ اسپیکر پر نہیں گونجی تھی۔ مائیک تو وہاں سے بہت دور تھا۔

میں نے وحشت زدہ سا ہو کر چاروں طرف دیکھا۔ رِنگ کے چاروں طرف کئی کلاشنکوف بردار نمودار ہو چکے تھے اور نپے تلے قدموں سے رِنگ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ان کی نظریں مجھ پر تھیں اور انگلیاں ٹریگروں پر۔

میرا دل ڈوب سا گیا!

میں بُری طرح ہانپ رہا تھا۔ جسم پسینے میں تر تھا اور ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ ہوشو خان سے مقابلے نے میرا جوڑ جوڑ ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ایک طویل مدت کے بعد میں ایسی شدید جسمانی مشقت سے گزرا تھا جس کی بنیاد زندگی اور موت کی کشمکش تھی۔ ابھی مجھے سنبھلنے اور اوسان بحال کرنے کے لئے تھوڑی سی مہلت کی ضرورت تھی لیکن لگتا یہی تھا کہ حالات مجھے یہ مہلت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ ہوشو خان کُشتی کے کسی مرحلے میں رسوں پر چڑھنے کی بھی کوشش کرے گا اور یہ اندیشہ بھی مجھے ہرگز نہیں تھا کہ میں اس بدبخت کو رسے سے اُچھال کر پھینکوں گا تو وہ سر کے بل جا گرے گا اور گردن تڑوا بیٹھے گا۔ یہ سب کچھ قطعی اچانک اور نہایت غیر متوقع طور پر ہوگیا تھا۔ میں تو اگر اسے صرف شکست دینے میں ہی کامیاب ہوجاتا تو میرے لئے کافی تھا۔ میری طمانیت کے لئے یہی کافی ہوتا کہ میں نے دلبر خان اور اس کے حواریوں کی سازش کامیاب نہیں ہونے دی۔ ہوشو خان کو ہلاک کرنے کا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔

لیکن ظاہر تھا، اب صفائی پیش کرنے کا موقع نہیں تھا اور کسی کو میری صفائی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ہوشو خان، دلبر خان کا ایک قیمتی سرمایہ تھا۔ اسے مزید قیمتی بنانے کے لئے اس نے یہ سارا کھڑاگ کیا تھا۔ وہ سرمایہ اس کے ہاتھ سے جاتا رہا تھا۔ میں اس کا معتوب تو پہلے ہی تھا، اب تو بالکل ہی ناقابلِ معافی ہوگیا تھا۔ [اسی] لئے اس نے سارا ڈراما بالائے طاق رکھ دیا تھا اور اتنے بہت لوگوں کی نظروں کے سامنے ہی میرا قصہ پاک کرنے کا فیصلہ [کر لیا] تھا۔

رِنگ کے صرف ایک طرف سیڑھیاں تھیں لیکن ان سے کسی نے اوپر آنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ رِنگ کے چاروں طرف کچھ فاصلے پر ہی رُک گئے۔ وہ تعداد میں دس تھے اور ان [کی] کلاشنکوفوں کا رُخ میری طرف تھا۔ ان کے چہروں پر خونخواری [تھی] لیکن وہ گویا کسی حکم کے انتظار میں تھے ورنہ ان کی انگلیاں ٹر[یگر] ٹریگر دبانے کے لئے بے چین تھیں۔

میں نے چاروں طرف دیکھا مگر کوئی راہِ فرار نظر نہ آئی۔ [ہر] طرف کوئی نہ کوئی کلاشنکوف بردار موجود تھا۔ میں نے اپنے آپ [کو] سزائے موت کا وہ قیدی محسوس کیا جسے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کیا جاچکا تھا۔ دلبر خان کہیں نظر نہیں آرہا تھا یا پھر شاید میری نظر ہی کچھ صحیح طور پر کام نہیں کررہی تھی۔ سارا منظر ہی میری نظروں کے سامنے ہلکورے سے لے رہا تھا۔

میں مرنے کے لئے تیار ہوچکا تھا لیکن اسی لمحے میری آنکھوں نے عجیب نظارہ دیکھا۔ وہ ہجوم جو ملگجے اندھیرے میں مجھے صحیح طور پر نظر نہیں آرہا تھا، نہایت خاموشی سے روشنی میں آگیا۔ روشنی صرف اگلی چند صفوں تک دائرے میں محدود تھی۔ ان صفوں میں

سے بھی بیشتر لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ رِنگ کے گرد کلاشنکوف بردار ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی حیثیت اس چار دیواری کی سی تھی جس میں بڑے بڑے شگاف تھے اور ہجوم اس وقت گویا بہتا ہوا پانی بن گیا تھا جو ان شگافوں کے درمیان سے لہروں کی سی صورت میں آگے آگیا تھا۔

پچاسوں آدمی یکدم ہی میرے اور کلاشنکوف برداروں کے درمیان حائل ہوگئے تھے اور لمحہ بہ لمحہ ان میں اضافہ ہی ہورہا تھا۔ کلاشنکوف برداروں نے ہجوم کے تیور دیکھے اور اپنے آپ کو رِنگ سے دور ہوتے محسوس کیا تو بری طرح گڑبڑا گئے۔

انہوں نے چیخ چیخ کر لوگوں کو غالباً دھمکیاں اور احکامات دیئے لیکن کوئی ان کی بات نہیں سُن رہا تھا۔ لوگوں کا ریلا عجیب سے انداز میں آگے آئے جارہا تھا اور انہیں تیزی سے پیچھے لے جارہا تھا۔ ان کی چیخ و پکار کے جواب میں ہجوم میں بھی چیخ و پکار شروع ہوگئی تھی۔ بے پناہ شور برپا تھا۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اس رات مجھے اپنی زندگی کا ایک انوکھا ہی تجربہ ہوا جسے میں لفظوں میں بیان نہیں کرسکتا۔ وہ ہجوم کوئی بڑا یا تاریخی قسم کا ہجوم نہیں تھا لیکن اس رات مجھے معلوم ہوا کہ ہجوم کی طاقت بہت بڑی ہوتی ہے۔ جب یہ طاقت متحرک ہوتی ہے، خوف کا خول اپنے اوپر سے اُتار پھینکتی ہے تو ایک عجیب طوفان بلاخیز کی طرح بڑے بڑے تناور درختوں کو بھی اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ بڑے بڑے پہاڑوں کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں، ان کا غیظ و غضب دھرا رہ جاتا ہے۔

میں نے اس ہجوم کو جب ایک خاموش سیلاب کی طرح رِنگ کی طرف بڑھتے دیکھا تھا تو میں خوفزدہ ہوگیا تھا۔ اتنا خوفزدہ میں کلاشنکوف برداروں کو دیکھ کر نہیں ہوا تھا جتنا نہتے لوگوں کے اس سیلِ رواں کو دیکھ کر ہورہا تھا کیونکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ لوگ میری حمایت میں آگے آرہے تھے۔

اس لحاظ سے بھی یہ ایک عجیب تجربہ تھا کہ میں تو کیٹی مراد کے لوگوں کے لئے بھی اجنبی تھا جبکہ اس ہجوم میں تو اکثریت آس پاس کے علاقوں کی تھی جنہوں نے پہلی مرتبہ مجھے رِنگ میں ہی دیکھا تھا۔ انہیں مجھ سے کیا ہمدردی محسوس ہوئی تھی جو وہ اپنے آقاؤں کے ٹولے سے تعلق رکھنے والوں ان سفاک اور بے حس لوگوں کے سامنے سیلاب کی طرح امنڈ آئے تھے اور کلاشنکوفوں کو بھی خاطر میں نہیں لائے تھے۔

میرے لیے یہ سب کچھ کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ مجھے بچانے کے لئے نہتے لوگوں کا سیلاب چند کلاشنکوف برداروں کو بہائے لے جارہا تھا۔ مجھے پہلی بار صحیح معنوں میں یقین ..... آنے لگا کہ انسانی زندگی میں نہ جانے کب کب اور کہاں کہاں ایسے مواقع آئے ہوں گے جب ہجوم کے سیلاب نے تاریخ کا رُخ بدل دیا ہوگا۔ کمزور، نہتے اور کچلے ہوئے لوگ ایک ہجوم کی صورت میں، ایک سیلاب کی صورت میں ڈھلتے ہوں گے تو کتنی بڑی طاقت بن جاتے ہوں گے۔

کلاشنکوف بردار اس ہجوم میں چھپ کر رہ گئے تھے۔ شور بدستور برپا تھا۔ کان پڑی آواز سُنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک عجیب افراتفری سی مچی ہوئی تھی۔ لوگ ایک دوسرے میں اُلجھ کر رہ گئے تھے لیکن اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہوگیا تھا کہ میں اس بھگدڑ سے کوئی فائدہ اُٹھانے کے بجائے دم بخود سا کھڑا تھا۔

دفعتاً میں نے انسانوں کے اس سیلاب سے موتل کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھ کر رِنگ میں آرہی تھی۔ وہ بُری طرح ہانپ رہی تھی اور اس کے چہرے پر عجیب سی دہشت تھی۔ اس کھینچا تانی میں اسے رِنگ تک آنے کے لئے نہ جانے کتنی زور آزمائی کرنا پڑی ہوگی۔

میدان میں اس وقت گوکہ کوئی لڑائی جھگڑا یا مار دھاڑ نہیں ہورہی تھی لیکن ایک ہنگامہ سا بہرحال برپا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ہنگامہ شروع ہونے کے بعد وہاں موتل کے سوا کوئی لڑکی یا عورت باقی نہیں رہی تھی۔ تماشائیوں میں جتنی بھی عورتیں شامل تھیں، مجھے یقین تھا کہ اب تک وہ وہاں سے بھاگ چکی تھیں۔

میرا اندازہ تھا کہ یہ مزارعے، یہ غریب لوگ دلبر خان اور اس کے آدمیوں کے لئے غلاموں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے اور وہ ان پر بے دریغ گولی چلا دینے یا ان کے ساتھ کوئی بھی سلوک کرنے کے عادی تھے لیکن عجیب بات تھی کہ یہ لوگ جب ایک سیلاب کی سی صورت میں اُمنڈ کر آئے تھے تو کلاشنکوف برداروں میں سے کسی کی کلاشنکوف نہیں گرجی تھی۔ ایک بھی گولی نہیں چلی تھی ورنہ لوگوں کا سیلاب جب آکر ان کے راستے میں حائل ہونے لگا تو میرا دل اسی تصور سے کانپ گیا تھا کہ اگر انہوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کردی تو کیا ہوگا؟

وہاں دس بارہ کلاشنکوف بردار موجود تھے۔ اگر وہ بوکھلا کر، غیظ و غضب سے مغلوب ہو کر، کچھ سوچے سمجھے بغیر یا پھر دلبر خان کے حکم کی تعمیل میں اندھا دھند فائرنگ شروع کردیتے تو میدان میں نہ جانے کتنی لاشیں بکھر جاتیں۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ بے قابو ہجوم کے سامنے کلاشنکوفیں خاموش ہی رہی تھیں۔ ایک دوسرے سے جو بھی کہا جارہا تھا، زبانی کلامی ہی کہا جارہا تھا۔ گولی کی زبان میں بات نہیں کی گئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ دلبر خان اور اس کے آدمیوں کا تکبر، دیوانگی یا طاقت کا زعم اور مطلق العنانی ابھی اس حد کو نہیں پہنچی تھی کہ وہ قتلِ عام ہی شروع کردیتے۔

موتل میرے قریب نہیں آئی۔ کچھ دور ہی رک کر ایک ہاتھ سے رسا تھام کر ہانپتے ہوئے چیخ کر بولی۔ "اب تم یہاں سے ہلو گے بھی یا بُت کی طرح یہیں کھڑے رہو گے؟"

میں نے گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آتے ہوئے ذرا چونک کر کہا۔ "تو پھر کیا کروں؟"

"بھاگ جاؤ یہاں سے۔ پاگل کہیں کے.....!" وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولی۔

"بھاگ جاؤں......؟ مگر کہاں.....؟" میں نے بے اختیار پوچھا۔ اپنا انداز مجھے خود بھی احمقانہ محسوس ہوا۔

"اب یہ بھی میں ہی بتاؤں؟" اس نے زور سے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ "کہیں بھی بھاگ جاؤ...... خدا کے لئے یہاں سے چلے جاؤ...... خدا نے تمہیں مہلت دی ہے۔ اللہ نے لوگوں کے دلوں میں تمہارے لئے ہمدردی ڈالی ہے۔ انہوں نے دلبر خان کے آدمیوں کو روک لیا ہے لیکن یہ مہلت تمہارے لیے زیادہ لمبی نہیں ہے۔ تمہاری جان خطرے میں ہے اور خطرے میں ہی رہے گی۔ فوراً بھاگ جاؤ۔"

"اسی حال میں......؟" میں نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ تیل' مٹی اور پسینے میں لتھڑا ہوا جسم جس پر صرف ایک لنگوٹ اور اس کے اوپر موٹے سرخ کپڑے کی ایک نیکر موجود تھی۔ پیروں میں کینوس کے جوتے تھے۔ اس کے سوا میرے بدن پر کچھ نہیں تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ بلکہ جیب ہی نہیں تھی' پھوٹی کوڑی کہاں سے ہوتی تھی۔

"تمہارے کپڑے جہاں بھی ہیں وہاں سے لے سکتے ہو تو لے لو ورنہ خدا کے لئے اسی طرح بھاگ جاؤ۔ تم اپنے حلئے کی نہیں' جان کی فکر کرو۔" وہ ایک بار پھر تیزی سے بولتی چلی گئی۔

میرے ذہن میں وہی پُرانا خیال اُبھرا۔ جس نے زندگی دی تھی' اسی نے اب تک بڑے بڑے خطرناک حالات میں بچایا تھا۔ اگر ابھی اسے میری زندگی منظور تھی تو وہ اب بھی بچالے گا۔ گوکہ ذہن کے کسی گوشے میں دھندلا سا یہ خیال بھی موجود تھا کہ جان بچانے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا' جدوجہد کرنا بھی میرا فرض تھا...... اور اب تک میں جدوجہد کرتا ہی آیا تھا۔ اسی چکر میں یہاں تک آن پہنچا تھا۔

میں نے اس دھندلے سے خیال پر زیادہ توجہ نہیں دی۔ میری سمجھ میں واقعی نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اسی اُلجھن نے میرے لہجے کو فیصلہ کن بنادیا۔ میں نے گہری سے سانس لے کر کہا۔ "میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

اچانک اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ باہر آیا تو میں نے دیکھا' اس میں ایک لمبی سی چھری تھی۔ یہ وہی چھری معلوم ہوتی تھی جس سے اس کا باپ دینو اپنے چھپر ریستوران پر گوشت کاٹتا تھا۔ گویا موتی بھی کسی انجانے خطرے سے نمٹنے کے لئے اپنی سی تیاری کر کے آئی تھی۔ چھری سے مسلح ہو کر آئی تھی۔

لیکن کسی خطرے سے نمٹنے کے بجائے اس نے چھری کی نوک اپنے پیٹ پر رکھ لی اور کچھ زیادہ ہی وحشت زدہ لہجے میں بولی۔ "اگر تم فوراً یہاں سے نہ بھاگے تو میں یہ چھری اپنے پیٹ میں اُتار لوں گی۔"

مجھے دھچکا سا لگا۔ چھری اس کے پیٹ پر ٹکی ہوئی تھی لیکن اس کی نوک گویا میرے دل میں چبھ رہی تھی۔ چھری کے دستے پر اس کی گرفت اور اس کی آنکھوں کی وحشت بتا رہی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے' اسے کر کے دکھانے میں ذرا بھی دریغ نہیں کرے گی۔ اس کی طرف جھپٹنا اور چھری اس سے چھیننے کی کوشش کرنا بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ دیوانے جذبوں کو سینے سے لگا کر جینے والی لڑکی تھی۔ اس سے کچھ بعید نہ تھا۔

لڑکیاں جن سے اچانک اور اندھا عشق کرتی ہیں' انہیں اپنے پاس روکنے کے لئے جان کی دھمکی دیتی ہیں مگر وہ مجھے وہاں سے بھگانے کے لئے اپنی جان سے گزر جانے کو تیار تھی۔ لیکن یہ بھی محبت ہی کی ایک انتہا تھی۔ اسے میری زندگی عزیز تھی۔ مجھے کوئی گزند پہنچتے دیکھنے سے پہلے وہ خود مرجانے کے لئے تیار تھی۔

"ٹھیک ہے موتی......! زندگی رہی تو شاید پھر کبھی ملاقات ہو۔" میں نے گھٹی گھٹی سی آواز میں کہا اور رسے کو پکڑ کر اچھلتے ہوئے رِنگ سے نیچے چھلانگ لگادی۔ میرے کپڑے ڈریسنگ روم میں پڑے ہوئے تھے اور غریبی دعوے کے اس ڈریسنگ روم کی طرف جانے والے راستے پر ہجوم نہیں تھا۔

میں اس راستے پر دوڑتا چلا گیا اور سیدھا کھولی نما اس کمرے جا پہنچا جہاں میں نے مقابلہ شروع ہونے سے پہلے کافی وقت گزارا تھا۔ بڑے کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ ہنگامہ اور شور شرابا شروع ہونے پر شاید وہ سب لوگ وہیں جا پہنچے تھے یا پھر چھوٹے ریسلرز اور باکسرز وغیرہ چونکہ اپنے مقابلوں سے فارغ ہو چکے تھے اسی لئے وہ میرے اور ہوشو خان جیسے بڑے ریسلرز' کا مقابلہ دیکھنے کے لئے تماشائیوں میں شامل ہو چکے تھے۔

چھوٹے کمرے میں صرف حاکم ماشیا موجود تھا۔ اس نے شاید مجھے دور سے ہی آتے دیکھ لیا تھا اور وہ میرے کپڑے اُٹھائے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں' آنکھیں پھٹی پھٹی سی نظر آرہی تھیں۔ کپڑوں کا اس نے گولا سا بنایا ہوا تھا۔ وہ گویا جاگتی آنکھوں سے کوئی ڈراونا خواب دیکھ رہا تھا۔ منہ سے وہ ایک لفظ بھی نہ بولا۔ خاموشی سے اس نے کپڑوں کا گولہ میری طرف بڑھادیا۔

کپڑے پہننے کا وقت نہیں تھا۔ میں کپڑوں کا گولا اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر مڑنے ہی لگا تھا کہ اس نے چابیوں کا ایک گچھا بھی میری طرف بڑھادیا اور گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا۔ "یہ دلبر خان کی جیپ کی چابیاں ہیں...... اگر آپ کو چلانی آتی ہے تو لے جائیں...... دلبر خان چابیاں یہاں بھول گیا ہے...... جیپ کمروں کے پیچھے کھڑی ہے۔"

میں اس کا شکریہ بھی ادا نہ کرسکا۔ چابیاں بھی اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر میں اُڑنے کے سے انداز میں بھاگتا ہوا کمرے سے نکلا۔ وہ راستہ جو کمروں سے رِنگ تک جارہا تھا' اس پر میں نے چند لوگوں کو دوڑ کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ ان کے پاس گنیں نہیں تھیں لیکن ان میں سے دو تین کے پاس مجھے چمکتے پھلوں والی کلہاڑیاں دکھائی دیں۔

وہ کچھ بھی نہیں بولے تھے لیکن نہ جانے کیوں وہ مجھے اپنے دوست یا ہمدرد دکھائی نہیں دیے۔ وہ تیزی سے دوڑے آرہے تھے۔ راستے کے دونوں طرف حد بندیوں کے لئے جو بانس اور رسے وغیرہ لگے ہوئے تھے' سب ٹوٹ کر گر چکے تھے۔ انسانوں کے سیلاب کا ریلا اس طرف بھی پھیلتا دکھائی دے رہا تھا۔

میں بگولے کی طرح کمرے کے عقب میں پہنچا۔ اس طرف اندھیرا تھا لیکن دلبر خان کی جیپ کا ہیولا نظر آرہا تھا۔ میں اُچھل کر جیپ میں بیٹھا۔ اندھیرے میں چابی بھی اگنیشن میں مشکل سے لگی۔ اس وقت تک شور میرے قریب آنے لگا تھا۔ میں نے ہیڈلائٹس روشن کیے بغیر جیپ کو بگھیوں اور دوسری دو تین گاڑیوں کے درمیان سے تیزی سے بچاتے ہوئے نکالا۔

تنگ اور ٹوٹی پھوٹی سی وہ نیم پختہ سڑک اسی طرف سے زیادہ قریب پڑتی تھی جو میرے خیال میں اس علاقے سے گزرنے والی مین شاہراہ کا کام دیتی تھی۔ یہ سڑک ذرا اونچائی پر تھی۔ جیپ ہچکولے کھاتی اس سڑک پر چڑھی اور میں نے اسٹیئرنگ وھیل تیزی سے دائیں طرف گھمایا۔ اس سمت سفر کرتے ہوئے میں اپنی دانست میں کیٹی مراد سے دور جاسکتا تھا۔

میرے عقب میں جو شور بلند ہوا تھا' جلد ہی وہ بہت پیچھے رہ گیا اور آخر کار معدوم ہوگیا۔ صرف جیپ کی گھڑگھڑاہٹ میری ہم سفر تھی۔ سڑک بہت تنگ اور کافی خراب حالت میں تھی۔ کئی بار جیپ نشیب میں اُترتے اور الٹتے الٹتے بچی۔ اس لیے میں نے ہیڈلائٹس آن کرلیں۔

جیپ ویرانے میں اس ناہموار سڑک پر اچھلتی کودتی چلی جارہی تھی۔ چند میل کے سفر کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا تو بہت پیچھے کہیں دو روشن نقطے متحرک نظر آئے۔ وہ یقیناً کسی گاڑی کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میرا تعاقب شروع ہوگیا تھا۔ دلبر خان اور اس کے آدمی یقیناً تمام تر مزاحمت کے باوجود میرا پیچھا چھوڑنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

میرے اور اس گاڑی کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ تھا تاہم میں نے رفتار کچھ اور بڑھادی۔ دلبر خان کی جیپ کچھ زیادہ اچھی حالت میں نہیں تھی لیکن بہرحال جیپ تھی اس لیے اس ناہموار راستے پر بھی اس رفتار سے چلی جارہی تھی مگر وہ روشن نقطے مجھے اپنے عقب میں دکھائی دیتے رہے بلکہ کچھ واضح ہونے لگے۔

تب میں نے سوچا کہ سڑک جیسی بھی ہے' ایک ہی ہے اور جیپ کی ہیڈلائٹس اگر روشن رہیں گی تو ٹیل لائٹس ان لوگوں کی رہنمائی کرتی رہیں گی چنانچہ مجھے کسی طرح ان لوگوں کو ڈاج دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میں نے لائٹس آف کردیں اور گاڑی بالکل ہی کچے میں اُتار لی۔ کچے میں ہیڈلائٹس کے بغیر گاڑی چلانا تقریباً خودکشی ہی کے مترادف تھا۔ کہیں درخت تھے' کہیں بڑے بڑے گڑھے اور کہیں سخت مٹی کے اونچے اونچے تودے سے بنے ہوئے تھے۔ آسمان پر محض تاروں کی مدھم روشنی تھی۔ چاند بھی نہ جانے کہاں چھپا ہوا تھا۔ بہرحال میری آنکھیں اس اندھیرے میں کسی نہ کسی حد تک میرا ساتھ دے رہی تھیں اور میں ذرا کم رفتار سے گاڑی کو' کسی چیز سے ٹکرانے اور زور سے الٹنے سے بچاتا ہوا نامعلوم سمت میں لئے جارہا تھا۔

جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میں سڑک سے بہت دور کسی طرف نکل آیا تھا۔ وہ روشن نقطے یا گاڑی کی کوئی بھی اور نشانی مجھے کہیں دور تک نظر نہیں آرہی تھی۔ تاہم میں نے سمت کا تعین کئے بغیر اِدھر اُدھر چکراتے ہوئے کم رفتار سے ہی اندھیرے میں اپنا سفر جاری رکھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میرے لئے اس نیم پختہ اور ناہموار سڑک سے دور نکل جانا ہی بہتر تھا۔ وہ علاقہ میرے لئے قطعی اجنبی تھا۔ کسی نہ کسی حد تک بھٹکنا تو میرا مقدر ہی تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اُمید تھی کہ گاڑی میں اگر ڈیزل ختم نہ ہوا تو میں بھٹکتا بھٹکتا بھی آخر کار کسی نہ کسی پگڈنڈی یا سڑک تک جا ہی پہنچوں گا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے ایسے ہی پیچ در پیچ سفر کے بعد جب مجھے یقین ہوگیا کہ میرا تعاقب کرنے والے میرا نشان کھو بیٹھے ہیں تو میں نے ایک جگہ جھاڑیوں کے قریب جیپ روکی اور سیٹ کے نیچے سے شلوار قمیص نکال کر پہننے لگا۔ ابھی تک میں سُرخ نیکر ہی میں محوِ سفر تھا اور بیچ کشتی کے میدان سے بھاگا ہوا ریسلر ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اگر کوئی دیکھتا تو یقیناً حیران ہوتا کہ یہ بھگوڑا ریسلر اس ویرانے میں کیا کر رہا ہے۔ پسینہ سوکھ چکا تھا۔ اب تو کھلے علاقے کی بھیگی بھیگی سی ہوا میں خنکی سی محسوس ہونے لگی تھی۔

قدرے شریفانہ حلئے میں آنے کے بعد میں دوبارہ جیپ میں بیٹھا۔ اب میں نے ہیڈلائٹس بھی آن کرلیں' یوں سفر کافی آسان ہوگیا۔

میں کسی پگڈنڈی یا سڑک تک تو نہیں پہنچ سکا لیکن ایک جنگل کے قریب ضرور جا پہنچا۔ خاصا گھنا جنگل تھا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ جہاں سے جنگل شروع ہوتا تھا وہاں درخت تاحدِ نظر اس طرح ایک سیدھ میں چلے گئے تھے جیسے کسی نے سیدھی لکیر کھینچ کر ان کے بیج بوئے ہوں اور اسی لئے جنگل کے باہر کی طرف کے درخت بالکل ایک دیوار کی طرح سیدھ میں اُگے ہوں۔

جنگل کے ساتھ تقریباً سات آٹھ فٹ چوڑی زمین کی پٹی بالکل ہموار اور ریتلی سی نظر آرہی تھی۔ یہ گویا ایک اچھا بھلا صاف ستھرا

راستہ تھا۔ اس پر کہیں کہیں صرف خزاں رسیدہ پتے بکھرے ہوئے تھے، کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ یہ راستہ نہ جانے کہاں تک چلا گیا تھا۔ میں نے جیپ اسی راستے پر ڈال دی۔ یوں جنگل کے متوازی میرا سفر شروع ہوگیا۔ اب جیپ دھچکے اور ہچکولے نہیں کھا رہی تھی۔ میں نے ذرا سکون کی سانس لی۔

لیکن سکون میری قسمت میں کچھ زیادہ نہیں تھا۔ کم از کم ان دنوں نہیں تھا۔ اس راستے پر میرا سفر کافی دیر تک جاری رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک نہ ختم ہونے والا راستہ تھا لیکن میں اس یقین اور استقامت کے ساتھ اس پر رواں تھا کہ وہ مجھے کسی نہ کسی منزل کی طرف ضرور لے جائے گا۔

اچانک جیپ کے انجن میں ایک زوردار کڑاکا ہوا اور گاڑی کو زبردست دھچکا لگا۔ ایک لمحے کی تیز گھرگھراہٹ کے ساتھ جیپ رُک گئی اور انجن خاموش ہوگیا۔ ایک لمحے کے لئے گویا میرا دل بھی دھڑکنا بھول گیا۔ رات کے اس پہر، اس ویرانے میں، جنگل کے قریب نامعلوم مقام پر سواری سے محروم ہوجانے کا تصور ہی خاصا ہولناک تھا۔ انجن سے مجھے دھوئیں کی خفیف سی لکیریں بلند ہوتی دکھائی دیں۔

چند لمحے ساکت بیٹھے رہنے کے بعد میں نے ڈرتے ڈرتے دوبارہ جیپ کو اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن سیلف کی کھرکھراہٹ کے سوا کوئی آواز پیدا نہ ہوئی۔ کافی دیر تک میں اسے اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن یہ کوشش بالکل فضول ثابت ہوئی۔ اندھیرے میں انجن کا جائزہ بھی نہیں لیا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی مجھے انجنوں کی ٹوٹ پھوٹ سے نمٹنے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ اگر میں انجن کا جائزہ لے بھی لیتا اور کسی طرح مجھے نقص کا علم ہو بھی جاتا تو بغیر اوزاروں کے میں اس ویرانے میں کیا کرسکتا تھا؟ اگر کوئی چیز ٹوٹ گئی تھی تو اسے تبدیل کرنا ممکن نہیں تھا۔

میں نے ہیڈلائٹس بھی آف کردیں اور سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا کے گہری سانسیں لینے لگا۔ یکدم ہی مجھ پر بے پناہ تھکن نے غلبہ پالیا تھا۔ ہوشو خان سے ایک طویل اور جاں گسل کشتی...... بلکہ زندگی اور موت کی کشمکش کے بعد مجھے ایک لمحے کے لئے بھی ستانے کا موقع نہیں ملا تھا لیکن رگ و پے میں طوفان برپا تھا اور جسم زندگی کی طلب میں مسلسل حرکت میں تھا۔ ایک عجیب سا بہاؤ تھا جو مجھے خود بخود ساتھ لئے جارہا تھا۔

لیکن اب گھرگھراتا ہوا انجن کیا خاموش ہوا، گویا ساری سرگرمی دم توڑ گئی۔ رگ و پے میں جو طوفان برپا تھا وہ یکدم ہی ٹھنڈا ہوگیا۔ حتیٰ کہ شعور میں ہیجان اور ایڈونچر پسندی کی جو چنگاری کہیں راکھ تلے سلگتی رہتی تھی وہ بھی ایک بار تو جیسے بجھ سی گئی۔

میں اگلی سیٹوں پر لیٹ گیا۔ فوری طور پر تو پیدل چلنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں کم از کم چند منٹ ضرور ستانا چاہتا تھا اور کچھ سوچنا چاہتا تھا لیکن لیٹنے کے بعد مجھے یوں لگا جیسے ذہن سوچنے کے

قابل ہی نہیں رہا تھا۔ ذہن بھی جسم ہی کی طرح تھکا تھکا سا تھا اور خنک ہوا کے جھونکے اسے غنودگی کی آغوش میں لے جارہے تھے۔

کئی منٹ اسی عالم میں گزر گئے۔ میں اپنے آپ کو وہ شرابی محسوس کررہا تھا جو وادیٔ خمار میں پہلا قدم رکھتے ہی لگا تھا مگر پھر جیسے اچانک ہی میرے ہاتھ سے جام چھین لیا گیا۔ مجھے اپنے حواس میں ہلکا سا ارتعاش محسوس ہوا۔ میں نے آنکھیں کھولیں اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ گردوپیش اسی طرح سرمئی اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

اگر کہیں ایسی کوئی چیز نمودار بھی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میرے حواس میں ارتعاش پیدا ہوا تھا تو اسے دیکھنا بہت مشکل تھا۔ لیکن میں اُٹھ بیٹھا۔ تھکن کا پیدا کردہ وہ خمار جو میرے ذہن اور جسم کو گرفت میں لینے کی کوشش کررہا تھا، اسے میں نے اپنے وجود سے جھٹکنے کی کوشش کی اور تب اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرا چونکنا بے سبب نہیں تھا۔

کہیں دور سے ایک خفیف سی آواز بڑے تسلسل سے آرہی تھی۔ میں ہمہ تن گوش ہوگیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ نرم زمین پر

گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ دو گھوڑے تھے۔ آواز جنگل کے اندر سے آرہی تھی۔

میں آہستگی سے جیپ سے اُتر آیا۔ اب میں نے پہلی بار آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر جیپ میں اِدھر اُدھر جھانکا کہ شاید اس میں کوئی گن یا کوئی اور ہتھیار موجود ہو لیکن اس میں پشاوری چپلوں کی ایک جوڑی اور موٹی سی ایک زنجیر کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ چپلیں معلوم نہیں کس کی تھیں اور موٹی وہ عام سی زنجیر جیپ میں نہ جانے کیوں پڑی تھی۔ وہ اسی قسم کی زنجیر تھی جس سے بھینسوں وغیرہ کو باندھا جاتا ہے۔

میں نے اسے اُٹھالیا۔ میری یہ حرکت تقریباً غیرارادی سی تھی۔ زنجیر کی کھنکھناہٹ بھی اس سناٹے میں مجھے کچھ بلند محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے اسے ہاتھ کے گرد لپیٹ لیا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ آس پاس چھپنے کے لئے کوئی مناسب جگہ نہیں تھی۔ بس مٹی کے چند تودے تھے۔ وہ بھی زیادہ اونچے نہیں تھے۔

ٹاپوں کی آواز لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جارہی تھی اور اب خاصی واضح ہوگئی تھی۔ آخرکار میں نے فیصلہ کیا کہ چھپنے کے لئے اس وقت سب سے بہتر جگہ جنگل ہی ہے۔ ٹاپوں کی آواز جس طرف سے آرہی تھی، میں دبے قدموں تیزی سے کچے راستے پر اس سے کچھ آگے چلا گیا اور پھر درختوں کے درمیان گھس گیا۔ درخت زیادہ گنجان نہیں تھے لیکن جتنا بھی دور کھڑے ہوکر دیکھا جاتا ہے، جنگل اتنا ہی گھنا نظر آتا ہے۔

میں ایک تناور درخت کے عقب میں دبک کر بیٹھ گیا۔ میں اب جیپ سے خاصا آگے تھا۔ ٹاپوں کی آواز اب مجھے بالکل صاف سنائی دے رہی تھی۔ میں درخت کے عقب سے جھانک کر جیپ کو بھی دیکھ سکتا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے چند قدم کے فاصلے سے ہی درختوں کے درمیان سے دو گھڑسواروں کے ہیولے آگے پیچھے باہر آتے دیکھے۔ باہر آنے کے بعد وہ کچے راستے پر جیپ کے عقب میں تھے۔

ملگجے اندھیرے میں انہوں نے جیپ کو فوراً دیکھ لیا اور یکدم ٹھٹک کر رہ گئے۔ ان کے کندھوں پر گنوں کے ہیولے نظر آرہے تھے۔ گنیں فوراً ان کے ہاتوں میں آگئیں اور انہوں نے گھوڑوں سے چھلانگیں لگا کر یوں پوزیشن لے لی جیسے کوئی ان دیکھا دشمن ان پر حملہ کرنے لگا ہو۔

ایک لمحے بعد ان میں سے ایک نے کڑکدار آواز میں للکارا۔ "کون ہے؟ سامنے آؤ...... نہیں تو ہم گولی چلادیں گے۔"

انہوں نے دو تین سیکنڈ انتظار کیا۔ جب انہیں جیپ میں کوئی حرکت دکھائی نہ دی تو انہوں نے رہی سہی کسر پوری کردی۔ انہوں نے جیپ پر ایک برسٹ ماردیا۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے علاوہ دو دھماکے سنائی دیئے۔ غالباً پچھلے دونوں ہی ٹائر برسٹ ہوگئے تھے۔ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے اندازہ ہوا کہ برسٹ کلاشنکوف سے مارا گیا تھا

اس ویرانے میں گولیوں کی بازگشت کئی سیکنڈ تک گونجتی محسوس ہوتی رہی۔ آخرکار وہی پہلا سا سکوت چھا گیا۔ وہ ہیولے دھیرے دھیرے زمین سے اُٹھے۔ میں نے انہیں جیپ کے عقب سے نمودار ہوتے دیکھا۔ انہیں شاید اب بھی یہ یقین نہیں آیا تھا کہ جیپ میں کوئی نہیں تھا۔ وہ بہت محتاط انداز میں جیپ کی طرف آرہے تھے۔

جیپ کے قریب پہنچ کر جب انہیں یقین ہوگیا کہ جیپ میں کوئی نہیں ہے تب وہ صحیح طور پر سیدھے کھڑے ہوئے۔ ان میں سے ایک نے ٹارچ سے جیپ میں روشنی ڈالی اور مزید اطمینان کیا۔ ٹارچ کی روشنی تھوڑی بہت منعکس ہوکر ان پر بھی پڑی اور مجھے ان کی شخصیتوں کے بارے میں کچھ نہ کچھ اندازہ ہوگیا۔ وہ ڈاکو ہی معلوم ہوتے تھے۔

ٹارچ والے نے آگے بڑھ کر روشنی جیپ کی نمبرپلیٹ پر ڈالی اور اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "خیرو! یہ تو نہ پولیس کی جیپ ہے نہ رینجرز کی۔ پھر یہ کس کی ہے؟ کون یہاں تک آگیا ہے؟"

جسے خیرو کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا، وہ داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ "اس سے زیادہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ کہاں گیا ہے؟" اس نے بونٹ پر ہاتھ رکھا اور ایک دم ہٹاتے ہوئے بولا۔ "انجن گرم ہے۔ اس کا مطلب ہے اسے جیپ سے اُترے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔"

پھر اس نے اپنے ساتھی کو ڈانٹا۔ "ٹارچ تو بجھا دو بیوقوف!"

اس کے ساتھی نے ٹارچ بجھادی۔ وہ سیدھے، رتیلے راستے پر دونوں طرف کچھ دیکھنے کی کوشش کرتے رہے مگر اس اندھیرے میں بھلا انہیں کیا نظر آتا۔ وہ یقیناً بڑی الجھن میں تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے۔ کلاشنکوفیں انہوں نے کندھوں سے اُتار کر ہاتھوں میں لے لی تھیں۔

چند لمحوں کے سکوت کے بعد خیرو بیزاری سے بولا۔ "چھوڑو یار! دفع کرو۔ جب کوئی سامنے آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ ہم جس کام کے لئے نکلے تھے، وہ تو کرنے چلیں۔"

میں اس وقت تک درختوں کی آڑ لیتا ہوا شکار پر نکلے ہوئے درندے کی طرح نہایت خاموشی سے ان کے قریب جا پہنچا تھا۔ مزید قریب ہونے کے لئے میں ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر رکوع کی سی حالت میں پنجوں کے بل دوسرے درخت کی طرف بڑھا تو اچانک ہی کچھ خزاں رسیدہ پتے جو شاید کچھ زیادہ ہی خشک تھے، میرے قدموں تلے چرچرا اُٹھے۔

میں اس وقت تک درخت کی اوٹ میں تو پہنچ چکا تھا لیکن بالکل اس طرح اپنی جگہ سن ہوکر رہ گیا جیسے دن کی تیز روشنی میں اچانک ہی ڈاکوؤں کے سامنے جا پہنچا ہوں۔ میں اب گویا بھول چکا تھا کہ رات کے سناٹے میں جنگل میں قدموں تلے خشک پتوں کے

چرچرانے کی آواز کتنی بلند محسوس ہوتی ہے۔

لیکن قدرت نے عجیب انداز میں میری مدد کی۔ عین اسی وقت ڈاکوؤں کے گھوڑوں میں سے ایک گھوڑا نہ جانے کیوں بری طرح ہنہنا اُٹھا۔ پتوں کے چرچرانے کی آواز اُبھری ہی تھی کہ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز اس پر غالب آگئی۔ یوں پتوں کے چرچرانے کی آواز کی طرف ڈاکوؤں کا دھیان نہیں گیا۔

لیکن جو گھوڑا ہنہنایا تھا' وہ تھوتھنی فضا میں بلند کیے عجیب سے انداز میں دانت نکال رہا تھا اور نتھنے پھڑپھڑا رہا تھا۔ وہ یقیناً میری بو پا چکا تھا اور اپنے مالک کو اس بات کا احساس دلانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن میں اس وقت حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا جب میں نے دیکھا کہ ڈاکوؤں نے گھوڑے کے انداز پر قطعاً توجہ نہیں دی تھی۔

وہ جنگلوں میں زندگی گزارنے والے لوگ تھے۔ انہیں ان باتوں کا زیادہ علم ہونا چاہیے تھا مگر ان کے نزدیک شاید گھوڑا صرف ان علاقوں میں سواری کا ایک ذریعہ تھا جہاں گاڑی یا جیپ وغیرہ نہیں جاسکتی تھی۔ اور بس۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ شاید انہیں کبھی گھوڑوں کی خصوصیات کی طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہیں ملی تھی یا پھر ان کے ذہن ان باریکیوں میں جانے کے اہل نہیں تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ بہت سے گھوڑے بو کے معاملے میں تقریباً کتے ہی جتنے حساس ہوتے ہیں۔

گھوڑا انہیں اشارہ دے رہا تھا کہ آس پاس کوئی موجود ہے لیکن انہوں نے اس کی طرف توجہ ہی نہیں دی تھی۔ میں نے ان کی اس غفلت پر دل ہی دل میں ان کا ممنون ہوتے ہوئے پنجوں کے بل دو قدم آگے بڑھ کر ایک اور درخت کی آڑ لی۔ میں لحہ بہ لحہ ان کے قریب پہنچ رہا تھا۔

مجھے ان سے اُلجھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں چاہتا تو درختوں ہی درختوں کے درمیان سے گزرتا اور ریتلے راستے کے متوازی چلتا ہوا ان سے دور نکل سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ جیپ کے ناکارہ ہونے کے بعد مجھے سواری کی اشد ضرورت تھی۔ مجھے دور دور تک کسی بستی کے آثار محسوس نہیں ہو رہے تھے اور میں ان اجنبی ویرانوں میں پیدل بھٹکنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ اس کی نسبت مجھے یہ خطرہ کم سنگین محسوس ہو رہا تھا کہ میں ان ڈاکوؤں کو قابو میں کر کے یا بے ہوش کر کے ان میں سے کسی کا گھوڑا حاصل کرنے کی کوشش کروں۔

وہ اگر واقعی ڈاکو تھے تو یقیناً ان اندھیروں سے اور اس ماحول سے زیادہ مانوس تھے۔ یہاں کے متوقع خطرات سے نمٹنا اچھی طرح جانتے ہوں گے۔ اس کے باوجود ان سے اُلجھنا مجھے کچھ زیادہ خطرناک محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ شاید خود میرے اندر وہ افضل چوہدری جاگ اُٹھا تھا جو کبھی اس طرح ان گنت خطرات سے بچتا بچاتا رات کی تاریکی میں نہ جانے کن کن ویرانوں میں بھٹکتا پھرتا تھا۔

اس کے علاوہ اس علاقے میں میرے گزشتہ چند دن جس طرح گزرے تھے انہوں نے میری درندوں جیسی خوابیدہ حسیات کو گویا جگا دیا تھا۔ ان چند دنوں میں ہی مجھے کچھ ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے میری زندگی انہی ویرانوں میں کچھ اسی قسم کے خطرات سے کھیلتے گزری تھی اور اب نہ صرف ہر طرح کے خطرات مجھے معمولی نظر آنے لگے تھے بلکہ ان سے اُلجھ کر گویا میں اپنی پُراسراری حیوانی جبلت کی تسکین کا سامان کرتا تھا۔

ان دونوں کی پشت میری طرف تھی۔ جنگل سے باہر آنے کے بعد میرے اور ان کے درمیان محض دو قدم کا فاصلہ ہوتا۔ میں ایک ہی زقند بھر کر ان میں سے ایک کو قابو کر کے۔ بے ہوش کر کے گرا سکتا تھا۔ مسئلہ بیک وقت دونوں کو گرانے کا تھا۔ جبکہ دونوں کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں تھیں اور انگلیاں یقیناً ٹریگر دبانے کے لئے بے تاب تھیں۔

ایک لمحے کے گہرے سکوت کے بعد خیرو پر پھر بیزاری نے حملہ کیا اور وہ اپنی کلاشنکوف کندھے پر لٹکاتے ہوئے بولا۔ "چھوڑو یار! چلتے ہیں۔ وہ جو کوئی بھی تھا' یقیناً دور نکل گیا ہے۔ ہمیں سردار نے جو کام بتایا ہے اس کی فکر کرنی چاہیے۔"

دوسرے ڈاکو نے بھی گویا بادلِ نخواستہ کلاشنکوف کندھے پر لٹکالی اور آخری بار متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر انہوں نے اپنے گھوڑوں کی طرف قدم بڑھایا۔ میرے لیے وہی مناسب ترین لمحہ تھا۔ کم از کم اب ان کی انگلیاں کلاشنکوف کے ٹریگروں پر نہیں رہی تھیں اور ابھی وہ گھوڑوں پر سوار بھی نہیں ہوئے تھے۔

میں پنجوں کے بل دوڑتا ہوا درختوں کے درمیان سے نکلا اور دونوں بازو پھیلاتے ہوئے ان پر چھلانگ لگائی۔ میں ان دونوں کو

اپنے ساتھ لے کر گرتے گرتے دونوں کے سر پوری قوت سے ایک دوسرے سے ٹکرا دینا چاہتا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ روایتی قسم کے ڈاکوؤں کی طرح ان کے سروں پر پگڑیاں نہیں تھیں ورنہ ان کے سر آپس میں ٹکرانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

میں اپنی کوشش میں کامیاب رہا۔ ان کے سر بُری طرح ایک دوسرے سے ٹکرائے اور میں انہیں لیتے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ وہ بے ہوش تو نہیں ہوئے لیکن ان کے حواس بُری طرح مختل ضرور ہو گئے۔ انہیں شاید اندازہ نہیں ہو سکا کہ عقب سے ایک انسان نے ہی ان پر چھلانگ لگائی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک کے حلق سے کچھ ایسی گھگھیائی ہوئی سی آواز برآمد ہوتے محسوس کی جیسے وہ کسی بلا کی گرفت میں آگیا ہو۔

اس سے پہلے کہ اس کا سر زمین سے اُٹھتا' میں نے اس کی کھوپڑی پر ہتھوڑے کی طرح ایک گھونسا رسید کیا اور وہ وہیں ساکت ہو گیا۔ دوسرا اس وقت تک میرے نیچے سے نکلنے میں تو کامیاب ہو گیا تھا لیکن ابھی صحیح طور پر سیدھا بھی نہیں کھڑا ہو سکا تھا کہ میں نے اس کی ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔

وہ دوبارہ اوندھے منہ گرا اور میں نے اس کا بازو مروڑتے ہوئے کلاشنکوف اُٹھانے کی اس کی کوشش ناکام بنادی۔ اس کی کلاشنکوف اس وقت تک کندھے سے اُتر کر زمین پر گر چکی تھی۔

وہ کچھ زیادہ جاندار آدمی نہیں تھا۔ آسانی سے میرے قابو میں آچکا تھا۔ میں نے اس کے لمبے بال مٹھی میں جکڑتے ہوئے اس کا سر تیزی سے کئی بار زمین سے ٹکرا ڈالا۔ زمین گو کہ نرم اور ریتلی تھی لیکن اس طرح کئی بار سر ٹکرانا اس کے لئے کافی ثابت ہوا۔ میں نے اسے چھوڑا تو وہ بھی اپنی جگہ ساکت ہی رہا۔

تاہم میں چند لمحے محتاط رہا کہ ان میں سے کوئی ذرا بھی حرکت کرے تو ایک آدھ ہاتھ اور رسید کر دوں لیکن وہ ساکت ہی رہے۔ مجھے خوشی یہ تھی کہ یہ چھوٹی سی مہم آسانی سے سر ہو گئی تھی۔ کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوا تھا۔ ایک فائر تک کی آواز نہیں گونجی تھی۔ ایسی کوئی آواز کسی کو متوجہ نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے تیزی سے ان دونوں کی تلاشی لی۔ ان دونوں کی جیبوں میں سو سو کے کئی نوٹ موجود تھے۔ ایک کی جیب میں پستول بھی تھا۔ میں نے رقم اور پستول نکال کر جیب میں ٹھونس لیا۔ ان میں سے ایک کی کلاشنکوف بھی میں نے اُٹھالی اور دوسری کا میگزین نکال لیا۔ ان کی ٹارچ بھی میں نے اُٹھالی۔ ٹارچ اور میگزین نیفے میں اڑس کر اور کلاشنکوف کندھے پر لٹکا کر میں گھوڑوں کی طرف متوجہ ہوا جو کچھ اور پیچھے ہٹ گئے تھے۔

ان میں سے ایک گھوڑا ہنہنائے جا رہا تھا۔ وہی گھوڑا زیادہ طاقتور' مضبوط اور اچھی نسل کا دکھائی دے رہا تھا۔ جو کچھ اس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا تھا' اس پر یقیناً احتجاج کر رہا تھا۔ گھوڑا خاصا سمجھدار جانور ہوتا ہے۔ اپنی آنکھوں کے سامنے مالک کو مرتے دیکھنے کے بعد مشکل سے اس شخص کے قابو میں آتا ہے جس نے مالک کو مارا ہو۔

تاہم میری نظر اسی پر تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ اسے قابو میں کرنا میرے لیے زیادہ مشکل مسئلہ نہیں ہوگا۔ اس کے لئے طاقت اور تجربہ دونوں درکار ہوتے ہیں۔ میرے پاس دونوں چیزیں تھیں۔ گو کہ ایک عرصے سے میں اس قسم کے کاموں کے سلسلے میں پریکٹس میں نہیں تھا لیکن اب زندگی کا چلن بدلا تھا تو گویا کئی خفیہ اور خفتہ صلاحیتیں بھی بیدار ہو چکی تھیں۔

دوسرا گھوڑا کچھ زیادہ حساس معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ قدرے بے نیازی سے کھڑا تھا لیکن اس کی جھلملاتی سی آنکھوں.... میں میرے لیے ناپسندیدگی تھی۔ وہ زیادہ اچھی نسل کا اور زیادہ مضبوط معلوم نہیں ہوتا تھا۔

میں جونہی ان کے قریب پہنچا' اچھا گھوڑا ایک بار پھر ہنہنا کر اچانک پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ پر حملہ آور ہونے لگا ہے۔ میں ہڑبڑا کر ذرا پیچھے ہٹا لیکن گھوڑا دو ٹانگوں پر ہی گھوم کر جنگل کی طرف مڑا اور دوسرے ہی لمحے دوڑتا چلا گیا۔ جنگل میں داخل ہو کر وہ غائب ہو گیا اور میں کھڑا دیکھتا رہ گیا۔

میرے حق میں یہ کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ گھوڑا اتنا جذباتی ہو جائے گا اور اچانک ہی بھاگ کھڑا ہوگا۔ اب زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ سیدھا اپنے ٹھکانے پر جائے گا اور وہاں موجود لوگ اسے خالی اور تنہا واپس آتے دیکھ کر فوراً حرکت میں آجائیں گے۔

میرے لئے نہ صرف خطرے کا امکان بڑھ گیا تھا بلکہ اب مجھے قناعت بھی کمتر گھوڑے پر کرنا تھی۔ میں نے جھپٹ کر اس کی لگام پکڑلی کہ کہیں وہ بھی اپنے ساتھی کی تقلید میں بھاگ نہ جائے۔ اس کا پہلے تو ایسا کوئی ارادہ معلوم نہیں ہوتا تھا لیکن جونہی میں نے اس کی لگام پکڑی' اس نے اچھل کود شروع کر دی۔

وہ شاید ذرا تاخیر سے فیصلے پر پہنچنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ جب اس کی لگام میرے ہاتھ میں آگئی تھی' اس نے تب عملی احتجاج کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جب لگام کسی کے ہاتھ میں چلی جائے تو احتجاج عموماً بے کار ہوتا ہے۔ اس کے احتجاج میں کوئی خاص شدت بھی نہیں تھی۔

میں نے لگام کو دو تین جھٹکے دیے اور موقع پاتے ہی اُچھل کر اس پر سوار ہو گیا۔ اس نے ذرا اچھل کود کر اور پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو کر مجھے خوفزدہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے یہ حربے مجھ پر کارگر نہیں رہے۔ میں نے اس کی پسلیوں کو ٹانگوں کے درمیان دباتے ہوئے چند زوردار رگڑے دیے۔ اس کام کے لئے ذرا طاقت درکار تھی۔ میری یہ تدبیر ضرورت کے وقت ہمیشہ کارگر رہی تھی۔

مزید چند سیکنڈ کی حیل حجت کے بعد گھوڑا سیدھا ہو گیا اور

ریتلے راستے پر دوڑنے لگا۔ دو تین منٹ بعد ہی وہ میرے اشاروں پر چل رہا تھا۔ میں نے اسی سمت میں سفر جاری رکھا جدھر جیپ میں جارہا تھا۔ یعنی جنگل سے کے متوازی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ جنگل کہاں ختم ہوتا ہے۔ اس کے بعد ہی میں کوئی فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ مجھے کدھر مڑنا چاہیے تھا۔

عام لوگ جنگل سے گھبراتے ہیں لیکن میرا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ مجھے آس پاس جنگل کی موجودگی سے ڈھارس رہتی تھی کیونکہ میری زندگی کے تجربات کے مطابق کسی سے ٹکراؤ کی صورت میں جنگل بڑی عمدہ پناہ گاہ ثابت ہوتا تھا۔ حملہ کرنے میں بھی اس سے بڑی مدد ملتی تھی اور اپنا بچاؤ کرنے میں بھی۔ جنگل جتنا گھنا ہوتا تھا اتنا ہی مجھے تحفظ کا احساس زیادہ ہوتا تھا۔

میرے بائیں ہاتھ پر موجود جنگل بھی کافی گھنا تھا۔ شاید اسی لیے ڈاکو اس میں سواری کے لیے گھوڑے استعمال کررہے تھے۔

مجھے اب جنگل کے علاوہ چند دوسری چیزوں کی موجودگی سے بھی طمانیت کا احساس تھا۔ ایک تو اب میں کچھ دیر پہلے کی طرح بالکل ہی تہی دست نہیں تھا۔ میری جیب میں کچھ رقم موجود تھی اور میں نہتا بھی نہیں تھا' ایک کلاشنکوف اور ایک پستول میرے ہاتھ آچکا تھا۔ سواری کے لیے گھوڑا میسر آگیا تھا۔ گویا اب حالات پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر تھے۔ خطرات اب بھی کم نہیں ہوئے تھے لیکن اب بالکل ہی بے سروسامانی کا احساس نہیں تھا۔

میں گھوڑے کو جتنا تیز بھگا سکتا تھا' بھگائے جارہا تھا اور وقفے وقفے سے مڑ مڑ کر بھی دیکھتا جارہا تھا۔ فی الحال تو میرے عقب میں دور تک اندھیرے کی دلدل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ آخر کار میں مطمئن ہوگیا کہ اب اگر کوئی میرے تعاقب میں آئے گا بھی تو اس کے اور میرے درمیان کافی فاصلہ ہوگا۔

تقریباً ایک گھنٹے تک گھوڑا اسی رفتار سے دوڑتا رہا لیکن پھر دھیرے دھیرے اس کی رفتار میں کمی آنے لگی۔ وہ پہلے بھی کچھ تازہ دم معلوم نہیں ہوتا تھا کیونکہ جب میں اس پر سوار ہوا تو اس کے جسم پر پسینے کی نمی تھی۔ اب وہ بُری طرح ہانپ رہا تھا لیکن حتی الامکان تیز دوڑنے کے لئے جان لڑا رہا تھا۔

ادھر جنگل تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مجھے تشویش ہونے لگی کہ کہیں میرا جنگل کے ساتھ چلتے رہنے کا فیصلہ غلط تو نہیں تھا؟ کہیں میں آباد علاقوں سے اور بھی دور تو نہیں ہوتا جارہا تھا؟

ابھی میں اس اُلجھن سے ہی نکل نہیں پایا تھا کہ بہت دور کہیں سے مجھے ایک نہایت مدھم سی آواز سنائی دی۔ میں چاہتا تو اسے اپنا واہمہ بھی سمجھ سکتا تھا لیکن فوراً ہی مجھے احساس ہوگیا کہ وہ میرا واہمہ نہیں تھا۔ میں نے اپنی سماعت کی تمامتر طاقت اس آواز پر مرکوز کردی۔ پھر اس کی ضرورت نہ رہی' آواز خود ہی دھیرے دھیرے واضح ہونے لگی۔

وہ مشینری کی مخصوص گھرگھراہٹ تھی۔ کسی گاڑی کے انجن کی آواز۔ میں نے مڑ کر دیکھا' عقب میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا لیکن آواز عقب سے ہی آرہی تھی۔ پھر اندازہ ہوا کہ آواز ایک نہیں دو گاڑیوں کی تھی۔ آوازیں اب بھی مجھے محض اس حد تک سنائی دے رہی تھیں جیسے مجھ سے کافی فاصلے پر کہیں دو مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں لیکن اب مجھے اس میں شبہ نہیں رہا تھا کہ وہ گاڑیوں ہی کی آواز تھی۔

میں نے پیچھے مڑ کر ایک بار پھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن اندھیرے میں مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ آواز البتہ تھوڑی ہی دیر میں کچھ اور واضح ہوگئی۔ اب میں اور بھی بہتر طور پر پہچان سکتا تھا۔ یقیناً جیپوں کی آواز تھی۔ ان کی ہیڈلائٹس آن نہیں تھیں لیکن یقیناً تیز رفتاری سے آرہی تھیں۔

ایک تھکا ہوا گھوڑا رفتار میں جیپوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ میرا تعاقب میرے اندازے سے زیادہ تاخیر سے شروع ہوا تھا لیکن بہرحال شروع ہوگیا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ لوگ ہیڈلائٹس بجھا کر بھی بالکل صحیح سمت میں' یعنی میرے پیچھے ہی آرہے تھے۔

میں نے گھوڑے کی پسلیاں مسل کر اور اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر اسے مزید تیز دوڑانے کی کوشش کی لیکن وہ بے چارہ پہلے ہی اپنی بساط سے بڑھ کر تیز دوڑ رہا تھا۔ اس کے ہانپنے کی آواز سانپ کی پھنکاروں کی طرح سُنائی دے رہی تھی۔ اس کی رفتار تیز ہونے کے بجائے کچھ اور سست ہوتی جارہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھا۔ اس بار اچانک ہی دور اندھیرے میں کسی بہت بڑے اور غضبناک درندے کی شعلہ بار آنکھوں کی طرح دو ہیڈلائٹس آن ہوئیں اور وہیں ساکت ہوگئیں۔ فاصلہ ابھی بہت زیادہ تھا۔ میں روشنی کی رسائی سے بہت دور تھا لیکن پھر بھی ایک لمحے کے لیے میرا دل ڈوب سا گیا۔

روشنی زندگی کی علامت ہوتی ہے لیکن اس وقت وہ مجھے موت کی پیامبر لگ رہی تھی۔ میں نے ڈاکوؤں کو بے ہوش کرکے کچھ زادِ راہ ہتھیار اور گھوڑا تو حاصل کرلیا تھا لیکن یہ چیزیں شاید مجھے مہنگی پڑنے والی تھیں۔

جیپ صرف ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی اور اسی دوران اس کی ہیڈلائٹس آن ہوئی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے ہیڈلائٹس آف ہوگئی تھیں اور آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ جیپیں دوبارہ حرکت میں آگئی تھیں۔

میرے لیے ان کا مقصد سمجھنا دشوار نہیں تھا۔ انہوں نے ایک لمحے کے لئے رک کر اور ہیڈلائٹس آن کرکے یقیناً میرے گھوڑے کے سموں کے نشانات دیکھے تھے۔ میں تو اس گھپ اندھیرے میں' دوڑتے ہوئے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے اپنے عقب میں وہ نشانات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے اندازہ ضرور تھا کہ نرم زمین پر گھوڑا سموں کے تازہ اور خاصے واضح نشان چھوڑتا ہوا آرہا ہوگا۔

اگر مجھے گھوڑے پر سواری کرنا تھی تو سردست ان نشانات سے چھٹکارے کا کوئی طریقہ اختیار نہیں کرسکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے گھوڑے کو چھوڑ دینے کے بارے میں بھی سوچا۔ جس رفتار سے اس وقت گھوڑا دوڑ رہا تھا میں اس سے زیادہ تیز دوڑ سکتا تھا اور جنگل میں داخل ہوکر اس راستے کے متوازی سفر کرسکتا تھا۔

جنگل میں ان کے لیے میرے قدموں کے نشانات تلاش کرنا بہت مشکل ہوتا اور جیپ گھنے درختوں کے درمیان تیزی سے فاصلہ طے کر بھی نہیں سکتی تھی لیکن پھر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجھے اپنی توانائی آخری لمحے تک بچا کر رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ جب تک گھوڑا میرا ساتھ دے سکتا تھا تب تک مجھے اسی پر سفر کرنا چاہیے تھا۔ اس کے بعد اپنے جسم و جاں پر تو نہ جانے کب تک اور کہاں تک بھروسا کرنا ہی تھا۔

لیکن قدرت کو میرے اس فیصلے سے اتفاق نہیں تھا۔ مجھے فیصلہ کیے چند سیکنڈ بھی نہیں گزرے تھے کہ اوپر سے کچھ اور فیصلہ آگیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ انسانی فیصلے کتنے حقیر ہوتے ہیں۔

ایک بار ہیڈلائٹس آن ہوتے دیکھنے کے بعد میں بار بار مڑ کر دیکھتا جارہا تھا کہ اچانک گھوڑے نے کسی چیز سے ٹھوکر کھائی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی درخت کا شکستہ تنا تھا۔ حالانکہ وہ کچھ ایسا راستے میں حائل بھی نہیں تھا لیکن گھوڑا نہ جانے کس طرح تھوڑا سا لہرا کر اگلی ٹانگ اس سے ٹکرا بیٹھا تھا۔

گھوڑا بہت بُری طرح' کافی آگے جا گرا۔ میں اس وقت بھی پیچھے مڑ کر دیکھ رہا تھا۔ وہ تو غنیمت رہا کہ گھوڑے کا توازن خراب ہونے کا احساس ہوتے ہی میں نے اس کی لگام چھوڑ دی تھی اور خود کو سنبھال لیا تھا ورنہ شاید میری بھی گردن ٹوٹ گئی ہوتی۔

میں غیر ارادی طور پر اپنے سر کو بازوؤں کے حلقے میں چھپاتے ہوئے' قلابازی کھا کر اور بھی دور جا کر گرا۔ کلاشنکوف میرے پہلو میں بُری طرح چبھی لیکن اس وقت وہ چوٹ مجھے معمولی محسوس ہوئی اور معمولی چوٹوں پر دھیان دینے کا وہ وقت نہیں تھا۔

میں تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اس اُمید کے ساتھ گھوڑے کے قریب پہنچا کہ وہ بھی اُٹھ کھڑا ہوگا لیکن قریب سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے مجھے جھرجھری سی آگئی۔ اپنے ہی زور میں اور اپنے ہی وزن تلے اس کی اگلی بائیں ٹانگ اس بری طرح ٹوٹی تھی کہ ہڈی کھال پھاڑ کر باہر نکل آئی تھی۔

وہ بے چارہ اس کے باوجود اُٹھنے کی کوشش کررہا تھا۔ ابھی شاید تکلیف کا احساس صحیح طور پر اس کے پورے وجود میں سرایت نہیں کرسکا تھا۔ اس کی کھال سے جھانکتی ہوئی نوکیلی' سفید ہڈی کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ چند لمحے بعد وہ تکلیف سے بُری طرح ہنہنا رہا ہوگا۔

اس وقت اور ان حالات میں یہ بھی اس کے ساتھ ایک نیکی ہوتی کہ میں اسے گولی مار دیتا لیکن میں یہ بھی نہ کرسکا۔ میں اسے اسی حال میں چھوڑ کر پلٹ کر بھاگا۔ اس دوران جیپوں کی آواز کچھ اور قریب آچکی تھی۔ میرے لیے اب جنگل میں داخل ہونے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ اس سیدھے راستے پر بھاگتے رہنے یا بیکراں میدانی علاقے میں کسی بھی سمت دوڑتے رہنا اپنے آپ کو ان کے سامنے پیش کردینے ہی کے مترادف تھا۔

میں جنگل میں گھس گیا لیکن میں نے اندر کی طرف زیادہ دور جانے کی کوشش نہیں کی اور اندازاً ریتلے راستے کے متوازی ہی بھاگنے لگا۔ لیکن جنگل بڑا پُر فریب ہوتا ہے۔ خصوصاً رات کی تاریکی میں ڈوبا ہوا جنگل۔

درختوں سے بچتے ہوئے دوڑنے کی کوشش میں انسان کو درختوں کے درمیان اس طرح چکرانا پڑتا ہے کہ آخر کار سمت کا احساس ذہن سے محو ہوجاتا ہے اور انسان کہیں کا کہیں نکل جاتا ہے لیکن میں پوری کوشش کررہا تھا کہ مجھ سے یہ غلطی نہ ہونے پائے۔ جیپوں کی آوازیں بھی میری مدد کررہی تھیں۔ وہ آوازیں لحہ بہ لحہ قریب آتی محسوس ہورہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میں ریتلے راستے سے دور نہیں جارہا تھا۔ گو کہ میں اس راستے کو دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے اطمینان تھا کہ میں اس کے قریب رہتے ہوئے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔ پھر جیپوں کی آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ ایک جگہ رک گئی تھیں۔

میں سمجھ گیا کہ وہ اس مقام پر پہنچ چکی تھیں جہاں گھوڑا ٹانگ تڑائے پڑا تھا۔ چند لمحے سکوت رہا۔ جیپوں کی خفیف سی گھرگھراہٹ سنائی دیتی رہی لیکن جیپیں بہرحال حرکت میں نہیں تھیں۔ پھر اچانک ہی فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اُٹھی۔

میں حیرت کے باعث دوڑنا بھول گیا۔ حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ میں تو وہاں نہیں تھا پھر وہ لوگ کس پر فائرنگ کررہے تھے؟ اگر گھوڑے کو تکلیف سے نجات دلانے کے لیے گولیاں ماری جارہی تھیں تو اس کے لیے ایک گولی کافی تھی۔ بہت ہوتا تو دو تین گولیاں ماردی جاتیں لیکن وہاں تو برسٹ پہ برسٹ مارے جارہے تھے۔ اتنی گولیوں سے تو ہاتھی چھلنی ہوسکتا تھا' بے چارے ایک زخمی گھوڑے کی کیا وقعت تھی۔ اگر میں وہاں ہوتا تب بھی شاید اتنی فائرنگ کی ضرورت پیش نہ آتی۔

یہ فائرنگ جنگل سے باہر ہی ہورہی تھی تاہم میں نے احتیاطاً کلاشنکوف کندھے سے اُتار کر ہاتھوں میں لے لی۔ پھر میں نے فائرنگ کے انداز پر غور کیا تو احساس ہوا کہ وہ حقیقت میں دو گروہوں کے درمیان ہورہی تھی۔ ڈاکوؤں کا غالباً کسی نامعلوم پارٹی کے ساتھ مقابلہ ہورہا تھا۔ ویسے میں تو یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ جن لوگوں کو میں نے اپنے تعاقب میں آتے دیکھا تھا

وہ ڈاکو ہی تھے۔ یہ تو محض میرا اندازہ تھا۔
بہرحال یہ تو جنگل کے اسرار تھے۔ معلوم نہیں اندھیرے میں کہاں کیا ہو رہا تھا۔ میرے لیے تو یہی غنیمت تھا کہ میں فی الحال خطرے سے دور تھا اور خاصی تیز رفتاری سے جنگل میں اپنا سفر جاری رکھے ہوئے تھا۔
رفتہ رفتہ میں نے ہوا کی لہروں کے دوش پر کہیں بہت دور سے آتی ہوئی مدھم سی آواز سُنی۔ وہ آواز یقیناً میگا فون سے ابھر رہی تھی۔ بہت دور کی آواز تھی اور الفاظ میرے لیے ناقابلِ فہم تھے لیکن میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ کسی قسم کا اعلان تھا جو میگا فون پر بار بار دہرایا جا رہا تھا۔
ظاہر ہے ڈاکو تو میگا فون استعمال نہیں کر سکتے تھے۔ انہیں اس کی بھلا کیا ضرورت پیش آسکتی تھی؟ میگا فون عموماً پولیس یا قانون نافذ کرنے والے دیگر ادارے مخصوص قسم کے حالات میں استعمال کرتے ہیں۔ تو کیا ڈاکوؤں کا پولیس یا اس قسم کے کسی دیگر ادارے سے رن پڑ گیا تھا؟ لیکن پولیس یا اس طرح کی کوئی اور فورس کہاں سے نکل آئی تھی؟ مجھے تو کہیں دور تک ایسی کسی فورس کی موجودگی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔
میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے ان سوالوں میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے تو جلد از جلد اس مقام سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جانے کی فکر کرنی چاہیے تھی جہاں فائرنگ یا میگا فون پر کوئی اعلان ہو رہا تھا۔ شاید دستِ قدرت نے ایک بار پھر میری مدد کی تھی کہ میرے تعاقب میں آنے والا خطرہ ٹل گیا تھا۔
آخرکار میگا فون پر اُبھرنے والی آواز معدوم ہو گئی لیکن اس کے بعد بھی وقفے وقفے سے ایک آدھ برسٹ کا تبادلہ جاری رہا مگر آوازیں اب مجھے اتنی مدھم سُنائی دے رہی تھیں کہ محض واہمہ محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر یہ آوازیں بھی بند ہو گئیں۔ جنگل میں بے آرام ہو جانے والے پرندے اور دیگر جانور بھی رفتہ رفتہ اپنے ٹھکانوں میں دبک گئے اور رات کی تاریکی و سناٹے میں جنگل اپنی تمامتر پُراسراریت کے ساتھ سائیں سائیں کرتا رہ گیا۔
ایسا لگتا تھا جیسے درختوں کے اس لامتناہی سے سلسلے میں صرف ایک میں ہی متحرک جاندار تھا۔ کبھی کبھی خشک پتے میرے پیروں تلے آکر چرچرا اُٹھتے۔ اس کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کہیں کوئی کمبخت جھینگر بھی نغمہ سرائی کر رہا تھا۔ کبھی کبھی رات کے سکوت میں مدھم سی آوازیں بھی بُری لگتی ہیں اور کبھی انتہائے سکوت سے گھبرائے ہوئے انسانوں کو آوازوں کی طلب محسوس ہونے لگتی ہے۔
میں بہت تیز رفتاری سے دوڑنا چاہتا تھا لیکن ایسے اندھیرے میں گھنے جنگل میں اندھا دھند نہیں دوڑا جا سکتا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں سیدھے اور ریتلے سے اس راستے کے متوازی اپنا سفر جاری رکھا جسے میں چھوڑ آیا تھا۔

میں اسی طرح تقریباً ایک گھنٹہ دوڑتا رہا۔ آخرکار سانس بری طرح پھول گئی۔ بہت دیر سے صرف صعوبتیں میری ہم سفر تھیں۔ یوگا کی مشقیں، دیگر تھوڑی بہت ورزشیں اور قدرت کی عطا کردہ بے پناہ سخت جانی بھی آخر کہاں تک میرا ساتھ دیتی۔ ایک وقت آتا ہے کہ مشین بھی تھک جاتی ہے، میں تو پھر بھی انسان تھا۔ میں بری طرح ہانپ رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہیں کسی درخت کے نیچے چت لیٹ جاؤں اور دنیا جہان کے ہر مسئلے سے بیگانہ ہو کر گہری نیند سو جاؤں۔
جنگل سے اب مجھے وحشت ہونے لگی تھی۔ جنگل کیا تھا گویا درختوں کا ایک سمندر تھا جو ختم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا، جس کا کوئی کنارہ ہی نہیں تھا۔
آخرکار قدرت کو شاید میری بیزاری پر ترس آگیا۔ مجھے اندھیرا نہایت معمولی حد تک ہلکا ہوتا محسوس ہوا اور پھر چند لمحے بعد میں نے اپنے آپ کو درختوں کے سلسلے سے باہر پایا۔
کھلے آسمان تلے رک کر میں نے یوں گہری گہری چند سانسیں لیں گویا ابھی ابھی مجھے کسی قید سے رہائی ملی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں کوئی تارا جھلملا رہا تھا اور تاریکی میں دھندلاہٹ آچکی تھی۔ شاید صبح کاذب کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔
میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ آنکھیں اب بھی زیادہ دور تک دیکھنے سے قاصر تھیں۔ بہرحال محسوس کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا جیسے میں ایک ایسے مقام پر کھڑا تھا جہاں دن کی روشنی میں بھی شاید مجھے تاحدِ نظر پھیلے ہوئے میدان کے سوا کچھ نظر نہ آتا۔ جنگل اب میرے عقب میں تھا اور بائیں طرف نہ جانے کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔
میں نے جھک کر زمین پر اچھی طرح ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ وہاں کی مٹی نم آلود اور نیم ریتلی سی تھی۔ مٹی بہت سی باتوں کا پتا دیتی ہے۔ وہاں کی ہوا میں پانی کی خوشبو بھی شامل تھی۔ ان سب باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہاں بائیں ہاتھ پر دور کہیں شاید دریا بہہ رہا تھا۔
میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کس سمت میں چلنا چاہیے۔ آخرکار میں نے تن بہ تقدیر ہو کر دائیں طرف دوڑنا شروع کر دیا۔ گو کہ اب مجھ میں دوڑنے کی ہمت نہیں تھی لیکن میں اپنے جسم پر جبر کرتے ہوئے دوڑ رہا تھا۔ میری کوشش تھی کہ میں کسی طرح جلد از جلد جنگل سے دور نکل جاؤں۔ جنگل یقیناً ایک اچھی پناہ گاہ ہوتا ہے لیکن اس جنگل میں بہت سے خطرات بھی پنہاں تھے۔
تمامتر تھکن اور شکستگی کے باوجود میں تقریباً ڈھائی تین میل کا فاصلہ دوڑتے دوڑتے مزید طے کر گیا۔ آخرکار ٹانگیں جواب دے گئیں۔ دوڑنا بس میں نہ رہا تو میں نے چلنا شروع کر دیا۔ ایسا لگتا تھا کہ دنیا ایک لامتناہی میدان میں تبدیل ہو گئی تھی جو کسی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ اس وقت جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ سہارا دیا ہوا تھا وہ نیم صحرائی علاقے کی ہوائے آخرِ شب تھی جو اتنی خنک اور فرحت بخش تھی کہ اس کا ہر جھونکا میرے تنِ نیم جاں میں زندگی کی نئی لہر دوڑا دیتا تھا اور میرے رکتے ہوئے قدم پھر اٹھنے لگتے تھے۔
اس وقت مایوسی کے عفریت نے میرے ذہن میں پنجے گاڑنے شروع کر دیے تھے جب اچانک ہی مجھے اپنے سامنے ذرا بلندی سی نظر آئی۔ بالکل قریب جا کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ تنگ اور ذرا شکستہ سی ایک سڑک تھی جو سرمئی پٹی کی طرح میرے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں طرف سے وہ اندھیرے کی کوکھ سے نمودار ہو رہی تھی اور بائیں طرف اندھیرے ہی کی آغوش میں غائب ہو رہی تھی۔
میرے تپتے ہوئے وجود میں اُمید کی ٹھنڈک اُتر آئی۔ سڑک آبادی کی نشانی ہوتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جہاں سڑک نہ ہو وہاں آبادی نہیں ہوتی۔ لیکن سڑک کی موجودگی سے کہیں پہنچنے کا تصور آسان محسوس ہونے لگتا ہے، رہنمائی بھی میسر آتی ہے کہ کس طرف جانا چاہیے۔ اس ویرانے میں پھیلی ہوئی تنگ سی سڑک کی یہ حقیر پٹی اس وقت مجھے بہت اہم محسوس ہوئی۔
زندگی میں پہلے بھی کئی بار شدت سے احساس ہو چکا تھا کہ سڑک انسانی تمدن کی کتنی اہم علامت اور ضرورت ہے۔ اگر چھوٹی سے چھوٹی آبادی کو دوسری آبادی سے ملانے کے لئے سڑک موجود ہو تو انسانی زندگی کتنی آسان ہو جائے۔ لیکن اس دلِ ناتواں میں تو حسرتوں کا انبار تھا۔ میں کس کس حسرت کا رونا رو سکتا تھا؟ چنانچہ میں اپنی حسرتوں اور اس قسم کی سوچوں کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کرتے ہوئے سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگا۔
دھیرے دھیرے صبح کا اجالا نمودار ہونے لگا اور آخرکار روشنی نے ہر چیز کو اُجال دیا لیکن اس وقت تک میری ہمت ٹوٹ چکی تھی۔ دن کی روشنی نے میرا دل بندھانے کے بجائے یکدم ہی گویا مجھے تھکا دیا تھا۔ میں سڑک کے کنارے اونچے سے ایک پتھر پر بیٹھ کر سستانے لگا۔ درحقیقت میں اپنی قوتِ ارادی کو کمک پہنچانے، اسے سہارا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔
گردوپیش کا منظر اب واضح ہو چکا تھا لیکن وہاں دیکھنے کو تھا ہی کیا؟ سڑک کے دونوں طرف پھیلی ہوئی تقریباً بنجر اور سیم و تھور کی ماری ہوئی زمین جس میں کہیں گڑھے اور کہیں ٹیلے نظر آرہے تھے۔ کہیں کہیں صحرائی سی خاردار جھاڑیاں بھی پھیلی ہوئی تھیں جن کے درمیان میں نے ایک آدھ گرگٹ کو رینگتے اور نیولے کو بھاگتے بھی دیکھا۔
وہ ایک عجیب لاوارث سی سڑک تھی۔ ابھی تک میں نے اس پر سے کوئی سواری گزرتے نہیں دیکھی تھی۔ جب تک میں کچھ تازہ دم ہوا اور توانائیاں ذرا بحال ہوئیں تب تک میرے نخلِ آرزو پر بھی پھل آتا دکھائی دینے لگا۔ یعنی سڑک پر دور سے ایک ڈگمگاتی ہوئی سی بس آتی دکھائی دی۔

وہ قریب آئی تو اس کی کھڑکھڑاہٹ بھی واضح ہو گئی۔ وہ ویسی ہی ایک بس تھی جیسی عموماً ہمارے ملک کے اندرونی، دور دراز اور دیہاتی علاقوں میں چلتی ہیں۔ اس قسم کی بسیں دیکھنے اور ان میں سفر کرنے کا تجربہ میرے لیے نیا نہیں تھا۔ یہ بس اس لحاظ سے غنیمت تھی کہ اس کی چھت پر مسافر نہیں بیٹھے تھے۔
میں سڑک کے بیچ میں جا کھڑا ہوا اور زور زور سے دونوں ہاتھ ہلانے لگا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید بس ڈرائیور مجھے مشکوک سمجھ کر بس روکنے کی زحمت ہی نہ کرے۔ میرا حلیہ کچھ اچھا نہیں تھا اور میرے کندھے پر کلاشنکوف بھی تھی۔ گو میرا اندازہ تھا کہ اس علاقے میں کسی کا اس قسم کے حلئے اور کندھے پر کلاشنکوف کے ساتھ نظر آنا کوئی ایسی غیر معمولی بات نہیں ہوگی لیکن میں کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا چنانچہ بس کو روکنے کے لیے سڑک کے بیچ میں جا کھڑا ہوا تھا۔
بس کھڑکھڑاتی ہوئی میرے قریب آرکی۔ کنڈیکٹر پچھلے دروازے پر لٹکا میرا منتظر تھا۔ میں دوڑ کر بس میں چڑھ گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بس میں مسافر کم ہی تھے۔ پچھلی سیٹ تو خالی ہی پڑی تھی۔ میں تنہا اس لمبی سی سیٹ پر جا بیٹھا۔ بس ہچکی سی لے کر لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی۔ کسی نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ کئی مسافر سر جھکائے اونگھ رہے تھے۔
کنڈیکٹر ہاتھ میں چند نوٹ دبائے قریب آیا اور بھویں اُچکاتے ہوئے بیزاری سے بولا۔ "کاڈھے ویندیں؟" (کہاں جاؤ گے؟")
"یہ بس کہاں جائے گی؟" میں نے ٹوٹی پھوٹی سندھی میں اُلٹا اس سے سوال کیا تب اس نے چونک کر ذرا شک زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ پھر گویا بے نیازی برتنے کا فیصلہ کرتے ہوئے بولا۔ "ڈھل مٹھار۔"
"ڈھل مٹھار......؟" میں نے غیر ارادی طور پر دہرایا۔ یہ میرے لیے ایک عجیب نام تھا لیکن یہ معلومات حاصل کرنے کا وقت نہیں تھا اور معلومات سے میرے لیے کوئی فرق بھی نہیں پڑتا تھا۔ مجھے تو کسی بھی بستی تک پہنچنا تھا جہاں ضروریاتِ زندگی میسر ہوں۔
ایک لمحے کے توقف سے میں نے جیب سے سو کا نوٹ نکالتے ہوئے کہا۔ "ایک ٹکٹ ڈھل مٹھار کا دے دو۔"
اس نے پیسے کاٹ کر بقایا میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ٹکٹ ٹکٹ ادھر کوئی نہیں ہوتا، بس کرایہ ہوتا ہے۔"
مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا؟ مجھے کون سا ٹکٹ کو چبانا تھا۔ میں نے تو محض رسماً کہا تھا۔ وہ آگے ڈرائیور کے پاس جا بیٹھا۔ بس اب ذرا رفتار پکڑ چکی تھی اور اس کے تمام اجزائے ترکیبی سے صدائے احتجاج بلند ہو رہی تھی، ہر حصہ کھڑکھڑا رہا تھا لیکن میں جب اس شکستہ حال اور پرانی سی سیٹ پر ذرا پھیل کر بیٹھا تو مجھے راحت کا جو احساس ہوا اسے لفظوں میں بیان کرنا ممکن نہیں۔

اس وقت وہ کھڑکھڑاتی ہوئی بس مجھے دنیا کے کسی انتہائی جدید اور پرتعیش طیارے سے زیادہ آرام دہ محسوس ہوئی۔ میں نے کلاشنکوف گود میں رکھی' پشتے سے سر ٹکایا اور آنکھیں بند کرلیں۔ میرا گویا دنیا سے ہی رابطہ کٹ گیا اور میں زمین و آسمان کے درمیان کہیں ہلکورے لینے لگا۔

میں پچھلی سیٹ پر بالکل کونے میں گھس کر بیٹھ گیا تھا۔ تھکن مجھ پر اس بری طرح سوار تھی کہ شاید میں آنکھیں بند کرکے چند سیکنڈ بعد ہی سو گیا تھا۔

پھر اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے میں نے صرف ایک سیکنڈ کے لیے آنکھ جھپکی تھی۔ باہر اچھی خاصی دھوپ چڑھ آئی تھی۔ بس رکی ہوئی تھی۔ اس میں کئی مسافروں کا اضافہ ہوچکا تھا اور وہ سڑک سے کچے میں اتر کر درختوں کے ایک جھنڈ کے قریب کھڑی تھی جہاں کئی ٹھیلے اور خوانچے والے کھڑے مختلف چیزیں بیچنے کے لیے آوازیں لگا رہے تھے۔

اچھا خاصا شور سا برپا تھا۔ شاید اسی شور کی وجہ سے میری آنکھ کھلی تھی۔ میری سیٹ پر بھی تین مسافروں کا اضافہ ہوچکا تھا۔ میں ہڑبڑا کر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ میرے ہڑبڑانے کی وجہ وہ سیاہ فام اور چھوٹے قد کا پولیس والا تھا جو دروازے میں کھڑا قہر آلود سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے میں نے چند لمحے پہلے اس کی شان میں کوئی گستاخی کی ہو۔ شاید وہ میری مدہوشی پر برہم تھا۔

میں نے بغور اس کی طرف دیکھا تو اس کی نظر میرے چہرے سے ہٹ کر کچھ نیچے آگئی۔ میں نے بھی اس کی نظروں کی تقلید میں اپنی گود کی طرف دیکھا اور تب مجھے احساس ہوا کہ میری گود میں کلاشنکوف رکھی ہوئی تھی جو نیند میں بھی میری گود سے نیچے نہیں گری تھی۔

پھر میں نے دیکھا' بس کے اگلے دروازے میں بھی ایک پولیس والا کھڑا تھا۔ وہ غالباً نظروں ہی نظروں میں پوری بس کی تلاشی لے چکے تھے اور آخر کار ان دونوں کی نظر مجھ پر آن ٹکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھ والے مسافر کی طرف دیکھا جو میری نیند کے دوران نہ جانے کس وقت وہاں آبیٹھا تھا۔ اس نے اپنے اور میرے درمیان حتی الامکان فاصلہ رکھا تھا۔

"کیا ذحل مشار آگیا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

وہ ایک سادہ لوح اور مجھ سے بھی زیادہ مفلوک الحال سا دیہاتی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ پھیلی ہوئی سی تھیں۔ اس نے ایک نظر پولیس والے کی طرف دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ منہ سے وہ کچھ نہ بولا۔ شاید وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں پولیس والا اسے میرا ساتھی مسافر نہ سمجھ لے۔

پولیس والے کے ایک ہاتھ میں تھری ناٹ تھری کی پرانی سی رائفل تھی جس کے دستے پر میل جمی ہوئی تھی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے اشارہ کیا اور نہایت حقارت سے بولا۔ "او ڈیرے' نیچے آجاؤ۔"

بیشتر مسافر گردنیں موڑے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ بعض صورت حال سے بالکل لاتعلق نظر آنے کی کوشش کررہے تھے۔ اگلا دروازہ دوسرا پولیس والا روکے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک میلی اور پرانی سی تھری ناٹ تھری تھی۔ گوکہ دونوں میں سے کسی رائفل کا رخ میری طرف نہیں تھا لیکن دونوں پولیس والے گویا انہیں استعمال کرنے کے لیے بالکل مستعد تھے۔

میں نے صرف ایک لمحے کے لیے صورت حال پر غور کیا۔ میں نے تو چاہا کہ یکدم اچھل کر پولیس والے کو دروازے سے دھکیل کر اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر دوڑتا ہوا چھلاوے کی طرح غائب ہوجاؤں لیکن پھر میں نے یہ ارادہ ملتوی کردیا۔ کئی باتیں یکدم میرے ذہن میں آگئی تھیں۔

ایک تو وردی کا احترام غالب آگیا تھا' دوسرے یہ خیال آیا کہ اگلے دروازے پر کھڑا ہوا کانسٹیبل میری رسائی سے بہت دور تھا اور میرے بھاگنے کی صورت میں اسے رائفل استعمال کرنے کی مہلت مل سکتی تھی۔ تھری ناٹ تھری لاکھ فرسودہ گن سہی لیکن بہرحال خطرناک تھی۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ فی الحال مجھ میں سواری کو چھوڑ کر' منہ اٹھا کر اجنبی ویرانوں میں بھٹکتے بھاگنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں جب تک کہیں سستانے کے لیے نہیں رکا تھا تب تک ویرانوں میں مسلسل دوڑتا بھی رہا تھا' راستے میں آنے والی رکاوٹوں اور مصیبتوں سے بھی نمٹتا رہا تھا لیکن اب کچھ آرام کرکے اعصاب گویا یکدم ہی ڈھیلے پڑ گئے تھے۔

آخر کار میں نے پولیس والے کے حکم کی تعمیل کا فیصلہ کیا۔ کلاشنکوف گود سے اٹھاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ جونہی میں نے کلاشنکوف کو ہاتھ لگایا' دونوں کانسٹیبلوں نے تھری ناٹ تھری رائفلوں کا رخ میری طرف کردیا۔ میں نے اس لمحے محسوس کیا' بس میں گہرا سکوت طاری تھا۔ اس کا گھڑگھڑاتا اور کھڑکھڑاتا انجن بھی خاموش ہوچکا تھا اور باہر شور مچاتے ٹھیلے والے اور خوانچے والوں نے بھی سردست آوازیں لگانا بند کردی تھیں۔

کانسٹیبل الٹی چھلانگ لگا کر بس سے اتر کر کھڑا ہوگیا اور رائفل سے میرا نشانہ لیتے ہوئے چیخا۔ "کلاشنکوف باہر پھینک دو۔"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں نے اس پر برسٹ مارنے کی کوشش کی تھی اور اس نے کمال مہارت سے اپنے آپ کو بچایا تھا۔ میرا چونکہ اس پر گولی (و) کیا' ہاتھ چلانے کا بھی قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا اس لیے میں نے کلاشنکوف بے نیازی سے باہر پھینک دی۔ وہ اس پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ تھری ناٹ تھری کا رخ اس نے بدستور میری طرف رکھا۔

میں بس سے اتر آیا اور تب میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے کانسٹیبل کو بس کے دروازے سے نیچے پٹخ کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ بس کے پیچھے عین قریب نہایت پرانی سی ایک جیپ کھڑی تھی۔ اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر بھی ایک کانسٹیبل موجود تھا۔

بونٹ کے قریب ذرا کھلتی ہوئی رنگت کا ایک میانہ قامت اور ذرا اسمارٹ سا پولیس والا کھڑا تھا جو اے ایس آئی معلوم ہوتا تھا۔ وہ پیتل کے فریم کا تاریک چشمہ لگائے ہوئے تھا اور اس کے ہاتھ میں بھاری پولیس ریوالور تھا جس کا رخ بس کے دروازے کی طرف تھا۔

اس نے غالباً سن لیا تھا کہ پولیس والا بس سے کسی کو اتار رہا تھا اور کلاشکوف پھینکنے کا حکم دے رہا تھا چنانچہ وہ پہلے ہی استقبال کے لیے تیار ہوگیا تھا۔ مجھے چونکہ معلوم نہیں تھا کہ باہر مزید پولیس والے موجود ہیں اس لیے عین ممکن تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش کرتا اور دروازے سے باہر آتے ہی اچانک گولی کا نشانہ بن جاتا۔

کانسٹیبل نے تھری ناٹ تھری سے مجھے جیپ کی طرف بڑھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے قطعاً کوئی مزاحمت نہیں کی تھی لیکن کانسٹیبل نے تھری ناٹ تھری کی زد پر مجھے یوں اے ایس آئی کے سامنے پیش کیا جیسے میں زبردست پولیس مقابلے کے بعد اس کے قابو میں آیا تھا۔

نوجوان اے ایس آئی تن کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے باوجود وہ قد میں مجھ سے کافی چھوٹا نظر آرہا تھا اور میرے خیال میں یہ بات اسے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ غیر محسوس سے انداز میں اس نے پنجوں کے بل بھی کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن اس سے بھی کوئی خاص فرق نہ پڑا اور شاید اسے خود بھی اپنی یہ حرکت کچھ مضحکہ خیز سی لگی۔ میں اس کے سامنے سیدھا کھڑا تھا اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

معلوم نہیں کیوں وہ پہلے ہی بہت غصے میں دکھائی دے رہا تھا جیسے اس کی اور میری کوئی پرانی دشمنی چلی آرہی ہو۔ اس کے نتھنے پھول پچک رہے تھے۔

"کون ہو تم؟" اس کے لہجے میں رعونت بھی تھی' حقارت بھی۔۔۔ اور کسی بے عنوان بغض کی پھنکار بھی۔ سوال اس نے سندھی میں کیا تھا۔

"مسافر۔۔۔" میں نے دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"مسافر کا کوئی نام بھی ہوتا ہے۔" وہ ریوالور اونچا کرتے ہوئے درشت لہجے میں بولا۔ وہ ٹریگر دبانے کا سخت شوقین معلوم ہوتا تھا اور اس وقت شاید بڑی مشکل سے خود کو ٹریگر دبانے سے باز رکھے ہوئے تھا۔ اسی قسم کے لوگوں کے لیے انگریزی میں "ٹریگر ہیپی" کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی۔ وہ لوگ جو ذرا ذرا سی بات پر ٹریگر دبانے میں خوشی محسوس کرتے تھے۔

ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہتھیار کا ہونا بڑا خطرناک ہوتا ہے اور اس شخص کے ہاتھ میں تو نہ صرف ہتھیار تھا بلکہ اس کے جسم پر وردی بھی تھی اور اس کے پیچھے پولیس کے لامحدود اختیارات بھی۔۔۔۔ میں نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ مجھے اس کے سامنے ذرا چوکنا ہو کر کھڑا ہونا چاہیے۔ وہ ریوالور سے عین میرے دل کا نشانہ لیے ہوئے تھا۔

"میں نے تم سے تمہارا نام پوچھا ہے۔" وہ مجھے خاموش پاکر گرجا۔

"افضل خان۔۔۔۔" میں نے اب بھی دھیمے لہجے میں جواب دیا۔

دوسرا کانسٹیبل جو بس کے اگلے دروازے میں کھڑا تھا' میری پھینکی ہوئی کلاشنکوف اٹھا کے آگے آگیا تھا۔ وہ کافی سانولا اور مضحکہ خیز سی شخصیت کا مالک تھا۔ توند باہر کو نکلی ہوئی تھی' پتلون نیچے کھسکی جارہی تھی۔ اس کا چہرہ چھوٹا اور مونچھیں بڑی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اس قسم کے پولیس والے صرف بعض ٹی وی پروگراموں میں مزاح پیدا کرنے کے لیے دکھائے جاتے ہیں لیکن اب احساس ہوا کہ کبھی کبھی حقیقی زندگی میں بھی اس قسم کی صورتیں نظر آجاتی ہیں۔

وہ کانسٹیبل میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اے ایس آئی سے مخاطب ہوا۔ "سائیں! منھجے خیال میں تہ ہی دھاڑیل آھے۔"

(جناب! میرے خیال میں تو یہ ڈاکو ہے)

اے ایس آئی نے سندھی میں ہی اسے ڈانٹا۔ "تم چپ رہو۔۔۔ میں نے تم سے رائے مانگی ہے کیا؟"

وہ ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں کندھے اچکا کر اور مونچھیں پھڑپھڑا کر رہ گیا۔ اے ایس آئی کلاشنکوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اس کے بارے میں کچھ بتاؤ۔۔۔ کہاں سے آئی تمہارے پاس؟"

"ایک ڈاکو سے چھینی ہے۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا کہنے۔۔۔!" اس نے استہزائیہ لہجے میں کہا پھر انتہائی حقارت سے میرے سراپے پر نظر ڈالی۔ بعض لوگوں کو اس کام میں بڑا کمال حاصل ہوتا ہے۔ وہ خود پست قامت اور کمزور ہوتے ہوئے بھی اپنے سے کہیں زیادہ جسیم اور طاقتور انسانوں کا کچھ اسی طرح جائزہ لیتے ہیں جیسے ہاتھی' چوہے کو دیکھ رہا ہو۔ ان کے پاس خود کو بڑا محسوس کرنے کے لیے کوئی اور طاقت ہوتی ہے۔

اس کے لہجے میں اس کی نظروں سے بھی زیادہ حقارت سمٹ آئی۔ "بہت بڑے شیر جوان ہو تم! ڈاکوؤں سے کلاشنکوفیں چھینتے پھرتے ہو۔ ماشاءاللہ۔۔۔! اب ہماری تو کوئی ضرورت ہی نہیں رہ گئی۔۔۔ بس جہاں سے بھی ڈاکوؤں کے حملے کی خبر آئے گی' تمہیں بھیج دیا کریں گے۔ سب ڈاکوؤں سے کلاشنکوفیں چھین کر لے آیا کرنا۔"

میں کہنا چاہتا تھا۔ "ہاں میرے بھائی! تم لوگوں کو اپنے وسائل اور اختیارات کم ہونے کا شکوہ رہتا ہے۔ اکثر یہی رونا روتے رہتے ہو۔ پولیس کے پاس یہ نہیں ہے..... وہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ ڈاکوؤں کے مقابلے میں بے بس ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہی ناکافی وسائل اور اختیارات تم عام آدمیوں کو دے دو تو وہ ڈاکوؤں کو ان کے بلوں سے نکال لائیں یا انہیں ٹھکانے لگا دیں۔ بات وسائل کی نہیں، نیت اور عزم کی ہوتی ہے۔ پہلے تو نیت صحیح اور عزم پختہ ہو، وسائل کا سوال تو بعد میں آتا ہے۔ جب عمل اور کردار دونوں ہی ٹھیک نہ ہوں تو پھر خواہ وسائل کے پہاڑ جمع کر لیے جائیں، وہ بے کار ہوں گے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بعض جگہ پولیس کی نفری اور وسائل میں اضافہ ہوتا ہے تو وہاں جرائم کم ہونے کے بجائے اور بڑھ جاتے ہیں۔"

لیکن یہ موقع اے ایس آئی کو اس قسم کا لیکچر پلانے کے لیے موزوں نہیں تھا۔ اس لیے میں خاموش رہا۔ وہ یک دم گرجا "اُلو کے پٹھے! سیدھی طرح بتا..... اس کا لائسنس ہے تمہارے پاس؟"

میں نے بدستور سادگی سے کہا "میں نے ڈاکو کی تلاشی تو لی تھی لیکن مجھے اس کی جیب میں کسی بھی قسم کا کوئی لائسنس نہیں ملا ورنہ ضرور لے آتا۔"

اے ایس آئی نے دانت پیسے اور تاریک چشمہ اُتار لیا۔ شاید وہ مجھے دکھانا چاہتا تھا کہ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا۔ وہ اب بولا تو اس کا لہجہ پُرسکون تھا لیکن اس کی تہ میں غیظ و غضب کروٹیں لے رہا تھا۔ "تم بہت بڑے فنکار بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ تم سے ذرا چوکی پر چل کر ہی سوال جواب کریں گے۔ چلو بیٹھو جیپ میں۔" اس نے ریوالور سے اشارہ کیا۔

میں نے بھاگ جانے کے امکانات پر ایک لمحے کے لیے غور کیا۔ میرے سامنے کھلا میدان تھا جس میں کہیں کہیں درختوں کے جھنڈ نظر آ رہے تھے۔ عقب میں سڑک تھی۔ دائیں ہاتھ پر بہت دور کچھ کچے پکے مکان دکھائی دے رہے تھے۔ بائیں ہاتھ پر جیپ کے عقب میں کافی فاصلے پر کھیت پھیلے ہوئے تھے۔

بھاگنا مجھے کچھ زیادہ مشکل محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ دونوں کانسٹیبل تو مجھے ڈھیلے ہی معلوم ہوتے تھے۔ مجھے اُمید تھی کہ میں ان کے فائروں کی زد میں آنے سے بچ جاؤں گا لیکن اے ایس آئی پھرتیلا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گو کہ صرف ریوالور تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ میرے لیے کانسٹیبلوں کی تھری ناٹ تھری سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

اس کے علاوہ وہ لوگ جیپ میں میرا تعاقب بھی کر سکتے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے کلاشنکوف اتنی آسانی سے پھینک دینے پر افسوس بھی ہوا لیکن میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ اگر کلاشنکوف میرے ہاتھ میں بھی ہوتی تب بھی مجھے پولیس والوں کو کوئی سا گولی مارنا تھی۔ اس کام کے لیے میں نے کبھی بھی اپنے آپ کو ذہنی طور پر آمادہ محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ جیسے بھی تھے، بہرحال ہمارے ملک کے پولیس والے تھے۔

میں چاہتا تھا کہ کم از کم اپنی ذات کی حد تک وردی کے احترام کی روایت قائم رکھنے کی کوشش کروں۔ میں نے دوسرے ملکوں میں دیکھا تھا کہ پولیس ایک محدود دائرے میں رہ کر کام کرتی تھی۔ اس سے باہر جاتی تھی تو اس کی شامت آ جاتی تھی۔ عوام کو زیادہ حقوق حاصل تھے اور انہیں اپنے حقوق کو استعمال کرنے کا شعور بھی تھا۔ ہر جگہ ان کی شنوائی بھی تھی۔ اس کے باوجود کسی پولیس والے کو مارنے یا قتل کرنے کا تصور کوئی شریف آدمی تو کیا، بڑے سے بڑا بدمعاش بھی نہیں کر سکتا تھا۔ میں سوچتا تھا، ہمارے ہاں بھی احترام کی کوئی ایسی ہی فضا بن جائے۔ ہم بھی وردی کا احترام کریں، وردی بھی ہمارا احترام کرے۔ میرے ان گنت خوابوں میں سے یہ بھی ایک خواب تھا۔

میں نے بھاگنے یا پولیس والوں کو کوئی گزند پہنچانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ گو مجھے اس جگہ کا نام معلوم نہیں تھا لیکن میں نے سوچا، یہاں کے تھانے کی بھی شکل دیکھ ہی لی جائے۔ تجربات میں اضافہ ہوگا۔ آگے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ بعض اوقات لوگ توقعات کے بالکل برعکس بھی نکل آتے ہیں۔ مجھے کئی ایسے پولیس والوں سے زندگی میں واسطہ پڑا تھا جنہیں میں بہت بُرا آدمی سمجھتا تھا لیکن وہ بہت اچھے ثابت ہوئے تھے۔

میں کانسٹیبلوں کے نرغے میں نہایت شریفانہ انداز میں جیپ میں جا بیٹھا۔ جیپ میں پچھلی سیٹیں آمنے سامنے تھیں۔ اے ایس آئی عین میرے سامنے آ بیٹھا۔ وہ پُرخیال انداز میں مسلسل میری طرف دیکھے جا رہا تھا اور دھیرے دھیرے اپنی خوبصورت سی مونچھوں کو بل دیے جا رہا تھا۔

جیپ مجھے لے کر آبادی کی طرف روانہ ہو گئی۔ قسمت میرے ساتھ یہ بھی عجیب ہی مذاق کر رہی تھی۔ کنھ کوٹ میں بھی ایک نواب کے آدمی ماکھو چاچڑ نامی ڈاکو سمجھ کر پکڑ کر لے گئے لیکن انہیں میرے ڈاکو ہونے پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہیں غلط فہمی تھی کہ میں نے ان کے ایک نوابزادے کے قتل میں حصہ لیا تھا۔ ان کے پاس تو ماکھو چاچڑ کی تصویر بھی موجود تھی اور یہ ستم ظریفانہ قسم کا اتفاق تھا کہ میں نے اپنے بچاؤ کے لیے اور اپنے آپ کو ناقابلِ شناخت بنانے کے لیے جس میک اپ کا سہارا رکھا تھا وہی میرے لیے اُلٹا مصیبت بن گیا تھا۔ اس کی وجہ سے میری شکل ماکھو چاچڑ سے مل گئی تھی۔

اب پولیس والوں نے مجھے ڈاکو سمجھ کر پکڑ لیا تھا جبکہ جنگلوں، ویرانوں، شہر اور دیہات میں کسی نہ کسی روپ میں آ رہے تھے۔ اب تو میں بھی سنجیدگی سے سوچ رہا تھا کہ کچھ عرصے آزمائشی طور پر ڈاکو بن جانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ اس میں کیا کیا دشواریاں ہیں اور کیا کیا "سہولتیں" میسر ہیں۔ میں

کچھ عرصے کے لیے اس معاملے میں تو اپنے آپ کو آزما ہی لیا تھا کہ میں انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں، جنگل میں، دیہات میں، ہمدردوں کے درمیان اور دشمنوں کے گھیرے میں کسی نہ کسی طرح وقت گزار ہی سکتا تھا۔ اپنی بقا کی جنگ لڑ سکتا تھا۔ وہ بھولی بسری سخت جانی ابھی مجھ میں موجود تھی جو کسی زمانے میں میرا کُل سرمایہ ہوا کرتی تھی۔

جیپ مجھے لیے آبادی کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ وہ اچھا خاصا قصبہ معلوم ہوتا تھا۔ مکانات کافی پیچھے رہ گئے تب بھی کہیں تھانے کی صورت دکھائی نہ دی۔ جیپ کچے میدان میں دھول اُڑاتی چلی جا رہی تھی۔

آبادی کافی پیچھے رہ گئی تو جیپ درختوں کے ایک بڑے سے جھنڈ کی طرف مڑ گئی۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا کہ درختوں کے اس جھنڈ کے درمیان نہایت پُرانا سا ایک نیم پختہ مکان موجود تھا جو پہلی نظر میں آسیب زدہ معلوم ہوتا تھا۔ صرف اس کے زنگ خوردہ گیٹ پر تھوڑے سے حصے میں لال اور نیلا رنگ موجود تھا جو پولیس کی نشانی تھا۔ اسی حصے پر سفیدے سے ٹیڑھے میڑھے الفاظ میں لکھا تھا "تھانہ جمرال"

یہ کچھ عجیب پُراسرار سا تھانہ تھا۔ آبادی سے دور، درختوں کے جھنڈ کے درمیان اس آسیب زدہ سے مکان کو ایک نظر دیکھ کر تو کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہ تھانہ ہے۔ ایک لمحے کے لیے البتہ مجھے یہ گمان ضرور گزرا کہ کہیں یہ تھانہ اور پولیس والے جعلی تو نہیں ہیں؟ ہمارے ہاں جعلسازوں نے نہ جانے کس کس کام میں ہاتھ ڈالا ہوا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اس حد تک بھی آ گئے ہوں۔ ان دور افتادہ علاقوں میں جہاں قصبوں اور دیہات کے نام بھی اس قدر غیر معروف تھے، اس قسم کی جعلسازیوں کے پکڑے جانے کے لیے بھی ایک مدت درکار تھی۔

ڈرائیونگ کرنے والے کانسٹیبل نے جیپ گیٹ کے قریب لے جا کر روکی اور وہ لوگ مجھے گھیرے میں لیے اُتر آئے۔ گیٹ اندر سے بند تھا۔ ایک کانسٹیبل نے اسے بُری طرح دھڑدھڑایا۔ چند لمحے بعد ایک عجیب و غریب شخصیت نے گیٹ کھولا۔ وہ سیاہ فام، کبڑا اور گنجا تھا۔ اس کے جسم پر میلی چکٹ دھوتی اور واسکٹ تھی۔ اس کی گول گول آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ تھیں لیکن یہ انگارے نمی میں ڈوبے ہوئے تھے اور ان کے گوشوں میں کیچڑ جما ہوا تھا۔ یہ آنکھیں نہ جانے کون کون سی ذہنی اور جسمانی بیماریوں کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی اور وہ دھوئیں کے مرغولے چھوڑ رہا تھا جس کی بو بتا رہی تھی کہ اس کی سگریٹ چرس سے بھری ہوئی تھی۔ وہ پست قامت اور گینڈے کی طرح گٹھا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اے ایس آئی کو دیکھ کر بھی وہ بے تکلفی سے چرس بھری سگریٹ کا کش لے رہا تھا۔

حالانکہ اس نے گیٹ کھولنے میں تاخیر نہیں کی تھی لیکن جیپ ڈرائیو کر کے آنے والے کانسٹیبل نے اس کے سر پر ایک دھول رسید کرتے ہوئے کہا "ابے کہیں مر گیا تھا کیا...." جملے کا اختتام اس نے ایک موٹی سی گالی پر کیا۔

گنجا سا وہ شخص جسے دیکھ کر نہ جانے کیوں جلاد کا تصور ذہن میں آتا تھا، ذرا لڑکھڑا گیا۔ اس نے اپنی چندیا سہلائی، ناگواری سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا لیکن کوئی جواب دینے کی زحمت نہیں کی اور گیٹ بند کر کے دیوار کے قریب پڑی بینچ پر جا بیٹھا۔

سامنے ہی سلاخوں والا ایک دروازہ نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک کشادہ کمرے کا دروازہ تھا۔ ہم اس کمرے میں پہنچے تو عین وسط میں ایک کانسٹیبل یا شاید ہیڈ کانسٹیبل دونوں پاؤں میز پر رکھے، کرسی پر نیم دراز، منہ کھولے خراٹے لیتا نظر آیا۔ اس کے پیروں کے قریب ایک رجسٹر کھلا پڑا تھا۔ ایک حوالدار کونے میں کھڑا لوہے کی الماری سے کچھ نکال رہا تھا۔

اے ایس آئی کو دیکھ کر اس نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں سیلوٹ کیا اور میز کے قریب آ کر یک دم ہیڈ کانسٹیبل کے پاؤں میز سے نیچے دھکیل دیے۔ ہیڈ کانسٹیبل ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھا اور کرسی سے گرتے گرتے بچا۔ آنکھیں مل کر اس نے بیزاری سے اے ایس آئی کو سیلوٹ کیا۔ اے ایس آئی نے کسی کے سیلوٹ کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔

حوالدار نے میز پر بیٹھ کر رجسٹر اپنے سامنے سیدھا کر لیا۔ وہ الماری سے کوئی پوٹلی نکال کر لایا تھا جو اس نے جلدی سے میز کی دراز میں رکھ دی۔ اے ایس آئی نے اپنی دانست میں مجھے زور سے میز کی طرف دھکا دینے کی کوشش کی لیکن میں اس کی طرف سے بے خبر نہیں تھا۔ اس کا دھکا مجھے اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکا۔

اس کی برہمی شاید کچھ اور بڑھ گئی لیکن وہ اسے ضبط کرتے ہوئے حوالدار سے مخاطب ہوا۔ "اس لعنتی کی تلاشی لو۔"

حوالدار مستعدی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ دونوں کانسٹیبل اپنی "بادشاہی" میں آ جانے کے باوجود مجھ پر رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ میری ایک جیب میں ریوالور تھا اور دوسری جیب میں ڈاکوؤں کی جیبوں سے نکالی ہوئی رقم..... میری جیب سے یہ دونوں چیزیں پولیس نے نکال لیں۔ میں پھر خالی کا خالی رہ گیا۔

حوالدار نے فاتحانہ انداز میں رقم اور ریوالور اے ایس آئی کے سامنے میز پر رکھ دیا۔ انداز کچھ ایسا ہی فاتحانہ اور داد طلب تھا جیسے کوئی مصور مہینوں کی محنت سے کوئی شاہکار تخلیق کر کے کسی فن شناس کی خدمت میں پیش کر رہا ہو اور اپنے فن کا صلہ پانے کا منتظر ہو۔

اے ایس آئی ریوالور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے طنزیہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "یہ بھی تم نے ڈاکوؤں سے چھینا ہوگا؟"

"ڈاکوؤں کو بے ہوش کرنے کے بعد ان کی جیب سے نکالا

تھا۔"میں نے معمولی سی تصیح کی پھر ان کے پوچھنے سے پہلے ہی مزید بتایا "اور یہ رقم بھی میں نے ڈاکوؤں کی جیب سے نکالی تھی۔"

"اب ہم بھی تمہارے اندر سے بہت کچھ نکالیں گے بچو!" اے ایس آئی مونچھ کو بل دے کر سہلاتے ہوئے بولا۔ اس کے لہجے میں بڑے خطرناک عزائم بول رہے تھے۔ میں فیصلہ نہیں کرسکا تھا کہ وہ میری بات کو جھوٹ سمجھ کر مجھے سزا دینے کے ارادے کا اظہار کررہا تھا یا اسے ڈاکوؤں کی شان میں میری گستاخی پر غصہ آرہا تھا۔

پھر وہ کانسٹیبلوں سے مخاطب ہوا۔ "اسے لاک اپ میں ڈالو۔ رات کو اس سے "تفتیش" کریں گے۔ تم سب تیار رہنا۔ ذرا تگڑا جانور ہے....." اس نے ایک بار پھر میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ اس کی آنکھوں میں وہی نفرت موجود تھی جو رشک، حسد اور نہ جانے کس کس طرح کی تشنہ ..... تمناؤں کی پیداوار ہوتی ہے۔

وہ الفاظ کو چباتے ہوئے بولا "ایک آدھ آدمی اس سے تفتیش کے لیے کافی نہیں رہے گا۔ تم سب جوان تیار رہنا۔ آج رات جشن رہے گا۔ سب دل بھر کے تفتیش کرنا۔ بھلو جمعدار سے کہنا کہ ذرا اچھی طرح تیار رہے۔ ابھی دن میں تو ذرا میں مصروف ہوں اور اس سے تفتیش اپنی نگرانی میں کراؤں گا۔ فی الحال تو میں وڈیرا صاحب کے کام سے گیا تھا۔ یہ تو یونہی راستے میں بس میں سے ہاتھ لگ گیا....."

میں اس کی باتیں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ بھلو جمعدار غالباً وہی آسیبی شخصیت تھی جس نے گیٹ کھولا تھا۔ میں شاید اے ایس آئی کی باتوں میں کچھ زیادہ اُلجھ گیا تھا۔ میں اس وقت چونکا جب ایک کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر پھرتی سے مجھے ہتھ کڑی لگا دی۔ میرے خیال میں یہ کچھ اچھا نہیں ہوا تھا لیکن میں نے تن بہ تقدیر رہتے ہوئے اب بھی ہاتھ پاؤں ہلانے کا ارادہ ملتوی رکھا۔ یہ تو میں نے دیکھ ہی لیا تھا کہ میرے بارے میں کسی بھی قسم کا اندراج کیے بغیر، کوئی پرچا کاٹے بغیر نہ صرف مجھے لاک اپ میں ڈالا جارہا تھا بلکہ رات کو مجھ سے "تفتیش" کرنے کے لیے جتنا بھی عملہ میسر تھا، ان سب کو تیار رہنے کا حکم دیا جارہا تھا اور اس کارروائی کو جشن کا نام دیا جارہا تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا، اس تھانے میں ابھی اور کیا کیا "کارنامے" انجام دیے جاتے تھے۔

مجھے ہتھکڑی لگا کر چابیوں کا گچھا کانسٹیبل نے بیلٹ میں لٹکا لیا۔ میری جیبوں سے برآمد ہونے والا ریوالور اور رقم حوالدار نے اطمینان سے اپنی دراز میں ڈال لی۔ دو کانسٹیبل مجھے اپنی رائفلوں سے ٹھوکے دیتے اندر لے چلے۔

مکان خاصا وسیع تھا لیکن بالکل خالی خالی سا لگ رہا تھا۔ عملہ بھی بہت کم تھا اور فرنیچر بھی۔ دو کانسٹیبل رائفلیں لیے میرے پیچھے آرہے تھے اور دو میرے دائیں بائیں تھے۔ لگتا تھا کہ وہاں کا کُل عملہ مجھ سے ہی نمٹنے میں لگا ہوا تھا۔

وہ مجھے ہال کے پیچھے ہی واقع ایک کمرے تک لائے۔ کمرا بھی کیا تھا، بس ایک کچی کوٹھری ہی تھی جس میں سلاخ دار دروازہ لگا ہوا تھا۔ اس دروازے کا تالا کھول کر مجھے اندر دھکیل دیا گیا۔

میں نے کوٹھڑی کا جائزہ لیا۔ اس کا فرش اور دیواریں کچی تھیں۔ دیواروں سے مٹی جھڑ رہی تھی۔ اندر عجیب سی سیلن اور تعفن پھیلا ہوا تھا۔ دو مفلوک الحال سے نوجوان دیواروں سے ٹیک لگائے حسرت و یاس اور بے چارگی کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ ایک ادھیڑ عمر شخص فرش پر بے حال سا لیٹا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر نیل نظر آرہے تھے۔ دونوں آنکھوں کے گرد بھی ورم اور نیلاہٹ تھی۔

وہ تینوں عام اور سیدھے سادے سے دیہاتی معلوم ہوتے تھے لیکن ایک چوتھا شخص جو کونے میں اکڑوں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا، ذرا بدمعاش معلوم ہوتا تھا۔ وہ سانولا اور جسیم تھا۔ اس نے گہری اور دلچسپی آمیز نظروں سے میرا جائزہ لیا لیکن نہ تو کچھ بولا اور نہ ہی اپنی جگہ سے ہلا، اسی طرح انہماک سے بیٹھا بیڑی پیتا رہا۔

لیکن میں اس کوٹھڑی میں جس شخص کو دیکھ کر در حقیقت چونکا تھا، وہ اوندھا پڑا تھا اور ساکت تھا۔ وہ لہو اور غلاظت میں لتھڑا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر ایک مختصر سی دھوتی کے سوا کچھ نہیں تھا اور اس کے جسم کے جو حصے نظر آرہے تھے ان کی حالت ناقابل بیان تھی۔ اس کی حالت مجھ جیسے مضبوط اعصاب کے انسان کے بھی رونگٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی تھی۔ دونوں جوان بھی خوفزدہ سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

مجھے ایک نظر میں ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ مردہ تھا۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں تھا کہ وہ اس تفتیش کا شاہکار تھا جو ہمارے بہت سے تھانوں میں اکثر جاری رہتی ہے۔ شاید دوسرے زندہ حوالاتیوں کو عبرت دلانے کے لیے اسے اس حالت میں اسی کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا تھا۔

میں ایک موہوم سی اُمید کے سہارے اس کے قریب بیٹھ گیا کہ شاید اس میں زندگی کی کوئی رمق موجود ہو۔ ہتھکڑیوں کی وجہ سے مجھے بیک وقت دونوں ہاتھ اس کی طرف بڑھانے پڑے لیکن اس سے پہلے کہ میں اسے چھوتا، دیوار کے سہارے بیٹھے ہوئے دونوں نوجوانوں میں سے ایک بے تابی سے بولا "اسے مت چھونا۔"

مجھے اس کے لہجے کی بے تابی پر حیرت ہوئی۔ میں نے پلٹ کر دھیمے لہجے میں پوچھا "کیوں؟"

نوجوان چہرے مہرے سے سیدھا سادا اور ان پڑھ نظر آتا تھا لیکن اس نے عجیب بات کی۔ کرب زدہ لہجے میں بولا "اس نے اتنی اذیتیں برداشت کی ہیں کہ شاید اب اس کے بے جان جسم کو بھی چھونے سے اذیت محسوس ہو۔"

میں نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے۔ نوجوان سسکی سی لے کر بولا "ویسے بھی جب یہ مرچکا ہے تو اسے ہلانے جلانے سے کیا فائدہ؟"

"یہ تمہارا ساتھی تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ ہمیں تو معلوم بھی نہیں، یہ کون ہے..... لیکن کئی راتوں سے ہم برابر والے کمرے سے اس کی چیخیں سُن رہے تھے۔" اس نے افسردگی سے جواب دیا۔

وہ دونوں نوجوان مضمحل اور خوفزدہ ضرور تھے لیکن ابھی "تفتیش" کی زد میں آئے ہوئے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا "تم دونوں کیسے بچے ہوئے ہو؟"

اس نے زمین پر مردہ پڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ابھی وہ اس کے ساتھ مصروف تھے۔ انہیں اُمید نہیں تھی کہ یہ مرجائے گا۔ ان کا خیال ہے کہ اتنی خوفناک اذیتیں سہنے کے بعد بھی اسے زندہ رہنا چاہیے تھا۔ اب وہ اس کا بندوبست کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ وہ اسے کسی پولیس مقابلے میں ہلاک دکھائیں گے۔ پتا نہیں کون کون سی وارداتیں جن کا کوئی سراغ نہیں ملا ہوگا وہ اس کے کھاتے میں ڈالیں گے، پھر ذرا فارغ ہوں گے تو ہماری باری آئے گی۔"

"تمہیں کس الزام میں پکڑا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی انہوں نے فیصلہ نہیں کیا کہ ہم پر کون کون سا الزام ڈالا جائے۔ ویسے ہمارا قصور یہ ہے کہ ہم نے وڈیرا سائیں کا کہنا ماننے سے انکار کیا تھا اور اس سے جھگڑا کیا تھا۔ بہت لمبا قصہ ہے۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہ زبردستی ہمیں ایک ناجائز کام میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے انکار کردیا اور جب ہمارے ساتھ سختی کی گئی تو ہم نے جھگڑا کیا جس کے نتیجے میں ہم دونوں یہاں ہیں اور آئندہ نہ جانے کہاں ہوں گے۔"

پھر اس نے دوسرے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا "ہم دونوں بھائی ہیں۔ ہمارا دنیا میں ایک دوسرے کے سوا کوئی نہیں ہے۔"

میں نے ایک بار پھر مردہ شخص کی طرف دیکھا۔ اس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا ہوا تھا اور دوسرا رخسار جو مجھے نظر آرہا تھا، وہ چرا ہوا تھا۔ شاید دوسرا رخسار بھی چرا ہوا ہی ہو۔ اس کے علاوہ بھی صرف چہرے ہی چہرے پر نہ جانے کس کس ستم گری کے نشانات نظر آرہے تھے۔ باقی جسم کا حال دیکھنے کو تو میرا دل ہی نہیں مان رہا تھا۔

انسان کا انسان پر اس طرح تشدد کرنا آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ انسان کو چوہے کی طرح بے بس کرکے، اپنے شکنجے میں جکڑ کے یہ دیکھنا کہ کون کون سے طریقوں سے اسے زیادہ سے زیادہ دیر زندہ رکھتے ہوئے زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچائی جاسکتی ہے..... جبکہ اس انسان کا قصور بھی کوئی خاص نہ ہو..... اس کے پیچھے یقیناً بہت ہی گنجلک قسم کی نفسیاتی گرہیں کام کرتی ہیں۔

ان نفسیاتی پیچیدگیوں کے بارے میں غور کرنا تو ماہرین نفسیات کا کام ہے۔ میں تو صرف یہ سوچتا ہوں کہ اس قسم کے لوگوں کو معاشرے میں چھوڑ دینا..... اور وہ بھی بہت سی طاقت یا اختیارات دے کر چھوڑ دینا، کثیر تعداد میں پاگل کتّوں کو کھلا چھوڑ دینے سے زیادہ خطرناک تھا لیکن میرے یہ سب کچھ سوچنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ جن کے سوچنے سے فرق پڑ سکتا تھا، ان کے پاس سوچنے کی فرصت نہیں تھی۔

میرے ذہن میں جب اس قسم کے خیالات کا ہجوم ہوتا تھا تو میرے اندر ہی اندر، وجود کے کسی گوشے سے ایک شعلہ سا لپکتا تھا جو چند لمحوں میں ہی ہر مسامِ جاں کو لپیٹ میں لے لیتا تھا۔ ظلم اور زیادتیاں کرنے والے کے ساتھ کچھ بھی ہوتے دیکھ کر مجھ پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ جو دوسروں کے ساتھ جیسا کرتا تھا اس کے ساتھ ویسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ میرا نظریۂ حیات تھا۔ لیکن بے قصور، معمولی قصوروار اور کمزور و بے بس کو اس قسم کے انجام سے دوچار دیکھ کر میرا ذہن دیوانگی کی سرحدوں کو چھونے لگتا تھا، میرا تخیل کسی اور ہی دنیا کی طرف سفر کرنے لگتا تھا۔

میں اپنی سوچوں کی شدت کو ذرا کم کرنے کے لیے اس شخص کی طرف متوجہ ہوگیا جو کونے میں بیٹھا بڑے اطمینان سے اب نئی بیڑی سُلگا رہا تھا۔

"تم کس سلسلے میں اندر ہوئے ہو بھائی؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

وہ پُرخیال نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ایک لمحے کے لیے خاموش رہا گویا فیصلہ کررہا ہو کہ جواب دینے کی زحمت کی جائے یا نہیں۔ پھر اس نے مجھے جواب سے نوازنے کا فیصلہ کیا اور بولا "میرا تو تین سو دو کا کیس ہے۔ میں نے ایک آدمی کو چھری ماری تھی۔" پھر اس نے گویا مجھے تسلی دی "لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اپنا تو ادھر آنا جانا لگا ہی رہتا ہے۔" اس کے لہجے میں بڑی بے نیازی تھی۔

اتنا اندازہ تو مجھے اس کی صورت دیکھ کر ہی ہوگیا تھا کہ جیل، تھانہ کچہری اور حوالات اس کے لیے نئی چیزیں نہیں تھیں۔ شاید اسی لیے وہاں سب سے زیادہ آرام میں وہی نظر آرہا تھا۔ میں اب مردہ شخص کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کے بغیر ہی مجھے اپنے دل میں اٹھتے ہوئے اُبال سے خوف آرہا تھا۔ میں اس اُبال کو قابو میں رکھتے ہوئے ہی اس سے کوئی کام لینا چاہتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ اُبال بے قابو ہو اور میں کچھ زیادہ ہی تباہی پھیلا بیٹھوں۔ اس صورت میں مجھے فائدے کے بجائے کوئی نقصان بھی پہنچ سکتا تھا۔

وردی کا احترام میرے خیال میں کافی ہوچکا تھا۔ ایک کوٹھڑی پر مشتمل اس حوالات کا منظر دیکھنے اور یہاں کے حالات سے آگاہ ہونے کے بعد میرے نظریات کچھ متزلزل سے ہوگئے تھے۔ ویسے بھی اے ایس آئی نے مجھے تگڑا شکار قرار دے دیا تھا اور مجھ سے "تفتیش" کے لیے پورے عملے کو تیار رہنے کا حکم دیا تھا۔ اس سے

مجھے اپنے مستقبل کا اندازہ لگا لینا چاہیے تھا۔

اب مجھے اپنے ہاتھوں میں لگی ہتھکڑیوں کو دیکھ کر افسوس ہو رہا تھا۔ مجھے کانسٹیبل کو اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگانے کا موقع نہیں دینا چاہیے تھا اور اسی وقت کچھ کر گزرنا چاہیے تھا۔ میں نے اپنے لیے دشواری پیدا کر لی تھی۔ پھر میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ ہر مسئلے کا کچھ نہ کچھ حل تو ضرور ہوتا ہے۔ کبھی کبھی تھوڑا سا انتظار کرنے سے بھی مسئلے کا حل نکل آتا ہے۔

خوش قسمتی سے مجھے کچھ زیادہ انتظار بھی نہیں کرنا پڑا۔ میرے مسئلے کا حل خود ہی چلتا ہوا حوالات کے قریب آگیا۔ یہ وہی کانسٹیبل تھا جس کی بیلٹ میں چابیوں کا گچھا بندھا ہوا تھا۔

اس دوران آوازوں سے مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اے ایس آئی اور وہ کانسٹیبل دوبارہ باہر جا چکے تھے جو مجھے لے کر آئے تھے۔ اس پُراسرار سے تھانے میں دوبارہ پُراسرار سا سکوت چھا چکا تھا۔ اب شاید وہاں صرف دو تین افراد ہی رہ گئے تھے۔

کانسٹیبل اس نام نہاد سی حوالات کے دروازے پر آن رکا۔ کونے میں بیٹھا ہوا بدمعاش اسے دیکھ کر فوراً اٹھا اور دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے سلاخوں کے درمیان منہ پھنسا لیا۔ کانسٹیبل رازدارانہ انداز میں اس سے کچھ کھسر پھسر کرنے لگا۔

میں بھی آہستگی سے اُٹھا اور سلاخوں والے دروازے کے قریب جا پہنچا۔ کانسٹیبل نے اپنی رازدارانہ گفتگو روک کر خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھا اور کھردرے لہجے میں بولا۔ "اوئے! تم کیا بیچ میں گھُس رہے ہو۔ چلو پیچھے ہٹو...... بات کرنے دو......" ساتھ ہی اس نے مجھے ایک موٹی سی گالی دی۔

میں نے دل ہی دل میں گالی اس کے کھاتے میں لکھ لی اور بظاہر سعادت مندی سے پیچھے ہٹ گیا۔ ان کی کھسر پھسر مختصر ہی تھی۔ چند لمحے بعد کانسٹیبل اثبات میں سر ہلاتے ہوئے واپس جانے لگا تو میں جلدی سے دوبارہ آگے بڑھ آیا۔

"سنتری بادشاہ! ہماری بھی ایک عرض سُنتے جائیں۔" میں نے لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ سانولا سا بدمعاش اس وقت تک دوبارہ کونے میں جا بیٹھا تھا اور ایک بار پھر کالے انجن کی طرح بیڑی کا دھواں چھوڑنے لگا تھا۔ جب سے میں اسے دیکھ رہا تھا وہ بہت ہی انہماک سے بیڑی پی رہا تھا۔ بظاہر وہ پُرسکون تھا لیکن اس کے اندر یقیناً کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ وہ کسی چکر میں تھا اور اس کانسٹیبل سے یقیناً اس کا کوئی گٹھ جوڑ تھا جس کے پاس حوالات اور ہتھکڑیوں وغیرہ کی چابیاں تھیں۔

میری درخواست سُن کر کانسٹیبل نے شک زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور دور ہی سے کہا "بولو...... کیا بات ہے؟"

میں نے ایک بار پھر اپنے لہجے میں ان گنت التجائیں سموتے ہوئے کہا "ذرا قریب آکر سُنیں، راز کی بات ہے...... اور آپ کے فائدے کی بھی ہے۔"

"فائدہ" ہماری قومی کمزوری ہے۔ کوئی بھی ہمیں کسی بھی قسم کا فائدہ پہنچانے کی بات کرے ہم سر کے بل دوڑے اس کے پاس چلے جاتے ہیں۔ وہ بھی میرے قریب آگیا۔ اس کے چہرے پر ناگواری اور شک کی شکنیں برقرار رہیں، لیکن وہ اپنے قدم نہ روک سکا۔ اسے یہ اطمینان تو تھا کہ میرے دونوں ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے۔

میں نظروں ہی نظروں میں پیمائش کر چکا تھا۔ دونوں ہتھکڑیوں کے درمیان زنجیر زیادہ لمبی نہیں تھی۔ میرے دونوں ہاتھ بیک وقت دو سلاخوں کے درمیان سے نکل بھی نہیں سکتے تھے۔ میں تین سلاخوں کے درمیان سے دونوں ہاتھ تھوڑے سے باہر نکال سکتا تھا۔ اس صورت میں درمیانی سلاخ میں میری ہتھکڑی کی زنجیر پھنس جاتی لیکن میں اپنا مقصد بہرحال حاصل کر سکتا تھا۔ بشرطیکہ وہ گردن سلاخوں کے کافی قریب لے آتا۔

میرا اشارہ پا کر اس نے اسی طرح سر سلاخوں کے قریب کر لیا جس طرح بدمعاش کی بات سُنتے وقت کیا تھا۔ میں اس کی گردن دبوچنے میں جتنی بھی پھرتی دکھا سکتا تھا وہ میں نے دکھائی۔ اس کی گردن موٹی تھی لیکن اتنی بھی موٹی نہیں تھی کہ میرے دونوں ہاتھوں میں آنے کے بعد اپنی بقا کی جدوجہد جاری رکھ سکتی۔

گردن میرے ہاتھوں کے شکنجے میں آتے ہی وہ بُری طرح تڑپا لیکن اس کا سر اور چہرہ جو سلاخوں سے ٹک چکا تھا، وہاں سے ہل نہ سکا۔ اس نے میرے بازوؤں کو نوچنے کھسوٹنے اور پھر کندھے سے اپنی رائفل اُتارنے کی کوشش کی لیکن یہ سب کوششیں فضول تھیں۔ وہ بہت تڑپا، بہت پھڑکا لیکن اس کی گردن جہاں تھی وہیں رہی۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے اُبل آئی تھیں۔ بالآخر اس کا جسم ڈھیلا پڑ گیا اور پھر ساکت ہو گیا۔

اس کے چہرے پر نسیں ڈوریوں کے جال کی طرح اُبھر آئی تھیں اور سانولا چہرہ بالکل ہی تاریک پڑ گیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ مر چکا تھا یا ابھی اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی تھی۔ میرا مقصد اسے ساکت دیکھنا تھا اور وہ ساکت ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے گرا۔ یہ پہلی آواز تھی جو اس دوران اُبھری تھی ورنہ میں نے اس کے حلق سے ہلکی سی خرخراہٹ بھی نکلنے نہیں دی تھی۔

لیکن جب وہ گرا تب مجھے احساس ہوا کہ اس کی گردن نہیں چھوڑنی چاہیے تھی کیونکہ جس طرح وہ گرا تھا، اس کی بیلٹ میں پھنسا ہوا چابیوں کا گچھا میرے ہاتھوں کی رسائی سے دور چلا گیا تھا۔ میں ہتھکڑیوں کی وجہ سے اپنا کوئی سا بھی ہاتھ چابیوں تک نہیں پہنچا سکتا تھا۔

میں نے پلٹ کر دیکھا۔ دونوں شریف بھائی ہی نہیں، بدمعاش بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور بیڑی پینا بھول گیا تھا۔ دونوں بھائی پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ چوتھا شخص اُٹھنے کے قابل ہی نہیں تھا اس لیے وہ بدستور لاش کے قریب چت پڑا تھا۔ مرنے والا تو مر کر اذیتوں سے نجات پا گیا تھا لیکن دوسرا شخص ابھی اذیتوں کے انگاروں پر سسک رہا تھا۔

دونوں بھائیوں میں سے ایک سرسراتی سی آواز میں بولا "یہ تم نے کیا کیا؟"

میرے سوا کوٹھری میں کسی کے ہاتھوں میں ہتھکڑی نہیں تھی۔ میں نے قدرے برہمی سے کہا "سوالات بعد میں کرنا، جلدی سے سلاخوں کے درمیان سے ہاتھ گزار کر اس کی بیلٹ سے چابیاں نکالو۔" میں نے باہر پڑے کانسٹیبل کی طرف اشارہ کیا۔ ایک تو اس تیدی نوجوان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہیں تھیں، دوسرے وہ دُبلا پتلا تھا۔ اس کا ہاتھ سلاخوں سے باہر دور تک جا سکتا تھا۔

"نہیں سائیں! میں یہ کام نہیں کروں گا۔" وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا "ہم پر تو پولیس پہلے ہی پتا نہیں کون کون سا ملبہ ڈالنے والی ہے، یہ چکر بھی ہمارے کھاتے میں پڑ گیا تو پولیس سات نسلوں تک ہمارا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔"

مجھے غصہ تو بہت آیا لیکن پھر ترس بھی آگیا۔ دونوں بھائی تھر تھر کانپ رہے تھے۔ وہ کچھ زیادہ ہی شریف معلوم ہوتے تھے۔ معلوم نہیں وڈیرا سائیں سے کیسے لڑ لیے تھے۔ میں نے بدمعاش کی طرف دیکھا۔ اس نے بھی ایک لمحے کے لیے ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔ عجیب ستم ظریفی تھی۔ ایک ہاتھ کے فاصلے پر آزادی کا پروانہ پڑا تھا لیکن کوئی اسے اُٹھانے کے لیے تیار نہیں تھا۔

بڑے کمرے سے حوالدار کے کھٹر پٹر کرنے اور بھلو جمعدار سے باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ کسی بھی لمحے اس طرف آنکلتا۔ اس کے بعد مجھے اپنے انجام کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں رہنا چاہیے تھا۔ خوش قسمتی بھی ہر وقت انسان کا ساتھ نہیں دیتی۔

لیکن بدمعاش صرف ایک لمحے کے لیے تذبذب کا شکار رہا۔ اس نے فیصلے پر پہنچنے میں دیر نہیں لگائی۔ سر جھٹک کر، بیڑی پھینک کر وہ تیزی سے آگے آیا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس نے ہاتھ سلاخوں سے باہر نکال کر کانسٹیبل کی بیلٹ میں پھنسایا اور اسے سلاخوں کے قریب گھسیٹ لیا۔ اس کے بعد اس نے نہایت اطمینان سے چابیوں کا گچھا نکال کر پہلے میری ہتھکڑیاں کھولیں پھر حوالات کا تالا کھول دیا۔

وہ خود کوٹھری سے نکل کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ فرش پر پڑا ہوا شخص تو چلنے کے قابل نہیں تھا۔ میں نے شریف بھائیوں کی جوڑی سے کہا "آؤ میرے ساتھ...... میں تمہیں تھانے سے باہر لے چلتا ہوں۔ اس کے بعد جدھر تمہارا جی چاہے بھاگ جانا۔"

ان میں سے جو بھائی مجھ سے باتیں کر رہا تھا، ہاتھ جوڑتے ہوئے بے چارگی سے بولا "ہماری بھاگنے کی ہمت نہیں پڑ رہی سائیں! سب الزامات ہم پر آجائیں گے۔ ہمیں آپ یہیں رہنے دیں۔ ہم بھاگ بھی گئے تو پولیس ہمیں ڈھونڈ نکالے گی۔"

بحث کا وقت نہیں تھا۔ میں نے انہیں ان کے حال پر چھوڑا اور بلی کی طرح دبے قدموں کوٹھری سے نکلا۔ بدمعاش ابھی تک باہر ہی کھڑا تھا۔ میں نے حیرت سے کہا "تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو؟"

وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "سائیں! باہر جانے کا راستہ ایک ہی ہے اور اُدھر حوالدار موجود ہے۔ شاید ایک آدھ کانسٹیبل بھی ہو۔ وہ مجھے گولی مار دیں گے۔ آپ نے جہاں اتنا کیا ہے وہاں آگے کا راستہ بھی آپ ہی طے کرا دیں۔ میں آپ کے پیچھے پیچھے ہوں۔" اس وقت وہ بدمعاش نہیں، خاصا مسکین آدمی لگ رہا تھا لیکن اس میں کم از کم پیچھے چلنے کی ہمت تو تھی۔ یہی غنیمت تھا۔ بے چارے شریف آدمی میں اتنی ہمت بھی نہیں ہوتی۔

ہتھکڑی میرے ہاتھ میں تھی۔ میں دبے قدموں ہال کی طرف بڑھا۔ درمیانی دروازہ کھُلا ہی تھا۔ میں نے نہایت محتاط انداز میں اس دروازے سے جھانکا لیکن اس احتیاط کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ حوالدار لوہے کی الماری کے قریب کھڑا پہلے ہی اس دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے شبہ ہو گیا تھا کہ حوالات کی طرف کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ کان لگائے کچھ سُننے کی کوشش کر رہا تھا اور ساتھ ہی کن انکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

مجھے دروازے سے جھانکتے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور حلق سے ہلکی سی ایک چیخ نکل گئی۔ کرسی پر اس کا ہولسٹر لٹکا ہوا تھا جس میں ریوالور موجود تھا۔ وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔ حوالدار نے ابھی کرسی کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ میں نے ہتھکڑی گھما کر اس کی کھوپڑی پر رسید کی۔ وہ ایڑیوں کے بل مشینی گڈے کے سے انداز میں گھوما اور اوندھے منہ فرش پر گر کر ساکت ہو گیا۔

میں ایک لمحے کے لیے اس پر جھک گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں وار ناکافی ثابت نہ ہوا ہو اور وہ اُٹھ نہ جائے لیکن اس کی حالت دیکھ کر مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ مر ہی چکا تھا۔ اچانک میں نے بدمعاش کی چیخ سُنی۔ "سائیں ہوشیار......"

میں اپنی جگہ سے ہٹتے ہوئے تیزی سے پلٹا۔ اپنی جگہ سے ہٹنا میرے کام آگیا کیونکہ عین اس جگہ جہاں میں ایک لمحہ پہلے کھڑا تھا، ایک موٹی سی لاٹھی جس کے سرے پر لوہا چڑھا ہوا تھا، ٹھک سے زمین پر پڑی۔ وہ بھلو جمعدار تھا جس نے نہایت خاموشی سے اگلے دروازے سے آکر حملہ کرنے میں بڑی ہوشیاری اور جرأت دکھائی تھی۔

لمبی سی وہ ٹھوس لاٹھی شاید میری کھوپڑی پر پڑی ہوتی لیکن بدمعاش کا بروقت مجھے ہوشیار کر دینا کارآمد رہا تھا۔ شاید اسی لیے کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی کھوٹا سکہ بھی کام آجاتا ہے۔

میں نے بھلو جمعدار کو لاٹھی دوبارہ ہوا میں بلند کرنے کا موقع نہیں دیا۔ لاٹھی کا سرا ابھی زمین پر ہی تھا جب میں نے زور سے

اس پر پاؤں مارا۔ لاٹھی بھلو جمعدار کے ہاتھ سے نکل گئی۔ وہ اتنا ڈھیلا آدمی نہیں تھا جتنا بظاہر نظر آتا تھا۔ انتہائی پھرتی سے پلٹ کر اس نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میرا ہاتھ گھوما اور ہتھکڑی نے اسے بھی اپنی زد میں لے لیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی گنجی چندیا کو چھپاتے ہوئے دروازے کے قریب ہی لڑھک گیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کی چندیا خون سے تر ہونے لگی۔ وہ سکڑ سمٹ کر بالکل گٹھڑی سی بن کر رہ گیا اور خفیف سا ایک جھٹکا لے کر اسی حالت میں ساکت ہوگیا۔

بدمعاش میرے عقب میں نہایت اطمینان سے بغلوں میں ہاتھ دیے کھڑا تھا۔ اس نے اس دوران انگلی بھی نہیں ہلائی تھی۔ وہ آگے آگے مجھے گویا اپنے باڈی گارڈ کے طور پر لیے چل رہا تھا۔ تاہم مجھے اس کی یہ "آرام طلبی" بُری نہیں لگی۔ اس کا یہی ایک کام کافی تھا کہ اس نے بھلو جمعدار کے حملے سے مجھے بروقت خبردار کردیا تھا۔ باقی رہا ہاتھ پاؤں ہلانے کا مسئلہ...... تو میں اپنے لیے راستہ صاف کرتا ہوا چل ہی رہا تھا۔ اگر وہ بھی میری آڑ لیے چلا آرہا تھا تو اس میں میرا کچھ نہیں جارہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ میں ڈاکو سے چھینی ہوئی کلاشنکوف بھی ساتھ لے لوں لیکن وہ کمرے میں کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ حوالدار نے نہ جانے کہاں رکھ دی تھی۔ میں نے اس کی تلاش میں وقت ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میں جس طرح کی بھگدڑ میں پڑا ہوا تھا اس میں کلاشنکوف کو اُٹھائے پھرنا اپنی جگہ ایک مصیبت تھا۔ میرا ریوالور بھی حوالدار کی دراز میں تھا اور دراز کو تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے اس کے چکر میں پڑنے کی کوشش نہیں کی اور کرسی کے پشتے پر لٹکے ہوئے ہولسٹر سے ہی ریوالور نکال کر جیب میں ڈال لیا۔

اس ساری کارروائی میں بمشکل چند سیکنڈ صرف ہوئے تھے۔ میں نے فوراً ہی بیرونی دروازے کی طرف چھلانگ لگائی۔ احاطے میں ہمیں کوئی دکھائی نہ دیا۔ میں نے تیزی سے گیٹ کھولا۔ اسی لمحے ایک سائیکل کھڑکھڑاتی ہوئی گیٹ پر آکر رکی اور ایک کانسٹبل اس پر سے اُترتا دکھائی دیا۔ وہ کہیں باہر سے آرہا تھا۔

میں تو اس کے لیے اجنبی تھا کیونکہ میری "گرفتاری" اس کی عدم موجودگی میں عمل میں آئی تھی لیکن بدمعاش کو وہ یقیناً اچھی طرح پہچانتا تھا اور اسے باہر جاتے دیکھنے کی بھی یقیناً اسے توقع نہیں تھی کیونکہ اس کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور وہ سائیکل سے اُترتے اُترتے لڑکھڑا گیا تھا۔

میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا کہ اسے بھی "بہ قائمی ہوش و حواس" چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیا جاسکتا۔ اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا۔ شاید وہ بہ آواز بلند تھانے میں سے کسی کو پکارنا چاہتا تھا لیکن اس سے پہلے کہ اس کے حلق سے کوئی آواز برآمد ہوتی، میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی کنپٹی پر نپا تلا سا گھونسا رسید کیا۔ اس کے لیے وہ ایک گھونسا ہی کافی ثابت ہوا۔ وہ اُچھل کر کافی دور جا کر گرا اور وہاں سے اُٹھ نہیں سکا۔ وہیں ساکت ہوگیا۔

بدمعاش صورت سا شخص ہاتھ جوڑ کر بولا "سائیں! آپ بڑے بادشاہ آدمی ہیں...... اللہ نے آپ کو شیر جیسی طاقت اور دریا ہی حوصلہ دیا ہے۔ دل چاہتا ہے میں آپ کے ساتھ چلوں...... آپ کی غلامی کروں...... آپ کی چاکری کرکے شاید میں بھی کسی قابل ہوجاتا لیکن میری کچھ مجبوریاں ہیں۔ مجھے کچھ ضروری کام کرنے ہیں۔ وہ کام کیے بغیر میں اس علاقے سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ میں اب اجازت چاہوں گا۔"

"میں تمہیں اپنے ساتھ لے جا بھی نہیں سکتا میرے چاندا!" میں نے نہایت شیریں لہجے میں کہا "میری تو اپنی بڑی مجبوریاں ہیں۔"

وہ مجھے کوئی بہت بڑا بدمعاش سمجھ رہا تھا اور میری شاگردی میں کچھ بننا چاہتا تھا۔ شاید اسے ابھی اس حقیقت کا ادراک نہیں ہوا تھا کہ بدمعاش تو درحقیقت بہت کمزور اور بزدل ہوتا ہے۔ صرف لوگوں پر اس کی جو دھاک بیٹھی ہوتی ہے، اس نے اپنی جو دہشت پھیلا رکھی ہوتی ہے وہی اس کی اصل طاقت ہوتی ہے۔ جس روز اس کی ہوا اکھڑ جائے اس روز وہ زہر نکلے سانپ کی طرح ہوجاتا ہے۔

کانسٹیبل کی سائیکل ایک طرف گری پڑی تھی۔ بدمعاش اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "اجازت ہو تو میں یہ سائیکل لے جاؤں؟"

"ضرور...... بلکہ تم چاہو تو سائیکل کے مالک کو بھی اُٹھا کرلے جاؤ۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ تو جہاں پڑا ہے وہیں ٹھیک ہے سائیں!" وہ مسکراتے ہوئے بولا اور سائیکل کی طرف بڑھا لیکن پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا، پلٹ کر اس نے میرے دونوں ہاتھ تھام کر چومے، آنکھوں سے لگائے پھر ہاتھ جوڑ کر عقیدت بھرے لہجے میں بولا "سائیں! میری دعا ہے کہ زندگی میں پھر کبھی آپ سے ضرور ملاقات ہو لیکن وہ تھانے، کچہری، حوالات یا جیل میں نہ ہو۔"

پھر اس نے سائیکل اُٹھائی اور اس پر بیٹھ کر تیزی سے پیڈل کھڑکھڑاتا ہوا ایک طرف روانہ ہوگیا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ سائیکل خود میرے بھی کام آسکتی تھی لیکن پھر یہی سوچا کہ مجھے سائیکل چلانے اور دوڑنے میں تقریباً ایک ہی جتنی مشقت محسوس ہوتی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لی اور دوسری سمت میں دوڑ لگادی۔

میں سڑک ہی کی طرف جارہا تھا لیکن اس مقام پر پہنچنا نہیں چاہتا تھا جہاں سے مجھے پکڑا گیا تھا۔ وہ خاصی بارونق جگہ تھی اور وہاں بسوں کا اسٹاپ بھی تھا۔ میں اس سے ایک آدھ میل آگے

کہیں جا کر سڑک پر نکلنا چاہتا تھا۔ میں اس وقت کسی سواری کی ضرورت تو محسوس کررہا تھا لیکن ایسی سواری میں نہیں چاہتا تھا جس میں خود مشقت کرنی پڑے۔

درختوں کے جھنڈ سے نکل کر میں نے اپنی سمت متعین کرلی تھی اور میدانی علاقے میں دوڑا جارہا تھا۔ علاقہ کچھ ایسا ہموار بھی نہیں تھا۔ کہیں جھاڑیاں، کہیں درخت اور کہیں گڑھے بھی تھے۔ ان سے بچتے ہوئے میں نے دوڑ جاری رکھی لیکن اب میں خود محسوس کررہا تھا کہ میری رفتار میں وہ تیزی اور مستعدی نہیں تھی۔ اس وقت دھوپ ڈھلنے لگی تھی۔ میں کچھ کھانے پینے اور آرام کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس کررہا تھا لیکن یہ چیزیں گویا فی الحال تو میرے نصیب میں نہیں تھیں۔

میں ابھی چند فرلانگ ہی دوڑ پایا تھا اور بہت دور مجھے سڑک کے آثار دکھائی دینے لگے تھے لیکن میں نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش نہیں کی۔ میں سڑک سے بہت دور رہتے ہوئے ہی دوڑتا رہا لیکن میری کوشش یہی تھی کہ سڑک میری نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ میرے بائیں طرف کھیت نظر آنے لگے تھے لیکن میں ان سے بھی دور ہی رہنے کی کوشش کررہا تھا۔

مزید آدھا گھنٹا دوڑنے کے بعد میں نے سڑک کا رُخ کرنے کا فیصلہ کیا۔ میرے خیال میں اب سڑک کی طرف جانے میں زیادہ خطرہ نہیں تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ایک درخت کی آڑ میں رُک جانا پڑا۔ سڑک پر اچانک ہی مجھے ایک جیپ نمودار ہوتی دکھائی دی تھی۔ فاصلہ کافی تھا اور جیپ مجھے محض ایک بڑے کھلونے کی طرح دکھائی دے رہی تھی لیکن میں نے آنکھیں سکیڑ کر بغور دیکھا تو میرا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا۔ وہ پولیس ہی کی جیپ تھی۔ یقیناً وہی تھی جس میں سواری کا مجھے شرف حاصل ہوچکا تھا۔

اس میں سوار پولیس والوں کو اتنی دور سے پہچاننا تو مشکل تھا لیکن میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ وہی لوگ تھے جو مجھے بس سے اُتار کر لے گئے تھے۔ وہ شاید کہیں دور سے آرہے تھے اور اب آبادی کی طرف جارہے تھے۔ جیپ سڑک پر ہی رہی، کچے میں نہیں آئی۔ مسلسل دوڑنے کی وجہ سے میرا دل پہلے ہی تیز دھڑک رہا تھا۔ اس لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ جیپ کو دیکھ کر میری دھڑکنیں تیز ہوئی تھیں یا نہیں۔

میں درخت کے عقب میں ہی رہا، حتیٰ کہ جیپ میری نظر سے اوجھل ہوگئی لیکن میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ اب ان لوگوں کا تھانے پہنچنا اور صورتِ حال سے آگاہ ہونا زیادہ دیر کی بات نہیں تھی۔ میں نے سڑک کی طرف جانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور ایک بار پھر کچے ہی میں بھاگنے لگا۔ کھیتوں کا سلسلہ اب کچھ پھیل گیا تھا اور وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں رہے تھے۔ اب زمین تھور زدہ نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید اس لیے زیرِ کاشت رقبے کا پھیلاؤ بڑھتا جارہا تھا۔

ایک جگہ کچھ فاصلے پر مجھے کھیتوں میں کچھ لوگ کام کرتے بھی دکھائی دیے لیکن انہوں نے میری طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں دی۔ تقریباً ایک فرلانگ آگے جا کر میں ایک برساتی نالے کی کچی پُلیا پر چڑھ کر دوسری طرف اُترنے لگا تو نشیب میں مجھے ایک تانگا کھڑا دکھائی دیا۔ تانگے میں کوئی نہیں تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی تو کچھ دور جھاڑیوں کے جھنڈ میں ایک شخص کا سر دکھائی دیا۔ کوچبان غالباً جھاڑیوں کو باتھ روم کے طور پر استعمال کررہا تھا۔ مجھ پر تھکن کا غلبہ تھا۔ دل بے ایمان ہونے لگا۔ مجھے اچھا تو نہیں لگ رہا تھا کہ ایک غریب تانگے والے کا تانگا لے کر بھاگ جاؤں لیکن ایک طرف تو مسلسل بھاگتے رہنا اب میرے بس سے باہر ہوتا جارہا تھا، دوسرے میں نے جیپ کو واپس تھانے کی طرف جاتے دیکھ لیا تھا۔

میں تھک کر کہیں بیٹھنے کا بھی متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ کہیں بیٹھ کر ستانا مجھے مہنگا پڑ سکتا تھا۔ تانگے میں بیٹھ کر میرا سفر بھی جاری رہ سکتا تھا اور کچھ دیر مجھے دوڑنے سے نجات ملتی تو وہ میرے لیے ستانے ہی کے مترادف ہوتا۔ میں نے سوچا کہ چار چھ میل دور جا کر تانگا چھوڑ دوں گا، ایک آدھ دن بعد شاید مالک کو مل ہی جائے۔

میں اُچھل کر اچانک تانگے میں جا بیٹھا۔ چابک بھی تانگے ہی میں موجود تھا۔ لگام کو زوردار جھٹکا دیتے ہی میں نے گھوڑے کو زوردار چابک رسید کیا۔ گھوڑا کوئی خاص تگڑا نہیں تھا۔ اس کی پسلیاں نمایاں تو نہیں تھیں لیکن گنی جاسکتی تھیں۔ اسے یقیناً اندازہ ہوگیا تھا کہ تانگے میں بیٹھنے والا اس کا مالک نہیں تھا کیونکہ لگام میرے ہاتھ میں آتے ہی وہ بُری طرح ہنہنایا تھا لیکن چابک کھاتے ہی وہ ہڑبڑا کر دوڑا اور پھر دوڑتا ہی چلا گیا۔

کوچبان کو میں نے کافی دور تک گرتے پڑتے، چیختے چلاتے اور اپنی شلوار میں اُلجھ کر گرتے اور پھر اُٹھ کر پیچھے آتے دیکھا۔ بالآخر وہ تھک کر پیچھے رہ گیا۔ میں نے گھوڑے کو زیادہ سے زیادہ تیز بھگانے کے لیے دو چار چابک رسید کیے لیکن ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھا۔ ساتھ ہی میں لگام کو بار بار جھٹکے دے رہا تھا۔ گھوڑے میں اگر جان ہو تو عام طور پر یہی طریقے ایکسیلیٹر کا کام دیتے ہیں لیکن وہ گھوڑا پہلے ہی اپنی بساط سے بڑھ کر تیز بھاگ رہا تھا۔

راستہ ناہموار تھا اور اس قابل نہیں تھا کہ اس پر تانگا اس رفتار سے دوڑایا جاتا لیکن میں اگر تانگے کو تیز نہ دوڑاتا تو میرا اس غریب کوچبان کو اس کے تانگے سے محروم کرنا بے مقصد ہی ہوجاتا۔ چنانچہ جس حد تک بھی ممکن تھا، میں اسے تیز دوڑانے کی کوشش کررہا تھا۔

اس کے انجر پنجر پہلے ہی بُری طرح ہلے ہوئے تھے، اب تو اس کی ہر چیز اس بُری طرح ہل رہی تھی کہ مجھے خود کو سنبھالنا مشکل محسوس ہورہا تھا اور تانگے کے ساتھ مجھے خود اپنے انجر پنجر بھی ہلتے

محسوس ہو رہے تھے۔ میں نے تانگے میں بیٹھ کر ستانے کا جو تصور کیا تھا' وہ اب مضحکہ خیز ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اس وقت میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ راستے میں اتنے نشیب و فراز اور جھاڑیاں وغیرہ تھیں۔ یہ خیال بھی نہیں آیا تھا کہ مرسڈیز اور بیسیوں سال پرانے تانگے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ تانگے سے واسطہ برسوں بعد پڑا تھا۔ اس کی خصوصیات ذہن سے محو سی ہو گئی تھیں۔

ایک زیادہ ہی گہرے گڑھے سے اُچھل کر اور ترچھا ہو کر تانگا باہر آیا تو لکڑی کی ایک پٹی جو بہت دیر سے سیٹوں کے نیچے کھڑکھڑا رہی تھی' بالآخر نکل کر نیچے جا گری۔ اس کے پیچھے پیچھے ٹین کا ایک ڈبا لڑھکتا اور کھڑکھڑاتا ہوا نیچے جا پڑا۔ میں نے سنبھلنے کے لیے دائیں طرف کے ایک تختے کو پکڑا تو اتنے زور کا جھٹکا لگا کہ تختہ اکھڑ کر میرے ہاتھ میں آگیا۔ میں نے اسے اندر ہی سیٹوں کے نیچے پھینک دیا لیکن چند لمحے بعد وہ بھی باہر جا گرا۔

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اگر اب چیزیں ٹوٹ ٹوٹ کر گرنا شروع ہو گئیں تو کہیں آخر میں صرف میں ہی لگاموں کے سہارے گھسٹتا نہ رہ جاؤں' تانگا غائب ہی ہو جائے لیکن غنیمت رہا کہ ایسا نہیں ہوا۔ تانگے کے ہچکولے تو مزید بڑھ گئے کیونکہ اس کے انجر پنجر لمحہ بہ لمحہ مزید ڈھیلے ہوتے جا رہے تھے لیکن وہ صحیح سلامت رہا اور بالآخر سڑک پر پہنچ ہی گیا۔

سڑک بھی گو کہ سڑک کے نام پر محض ایک دھبا ہی تھی لیکن جس راستے سے میں گزر کر آ رہا تھا اس سے بہرحال بہتر تھی۔ یہاں پہنچ کر مجھے...... اور شاید گھوڑے کو بھی کچھ سکون کی سانس آئی لیکن یہ سکون کی سانس گھوڑے کو کچھ سست آگئی۔ اس کی رفتار کم ہو گئی۔ ابھی وہ بمشکل ایک میل ہی دوڑا تھا لیکن جان توڑ کر اندھا دھند دوڑا تھا شاید اسی لیے بے چارے کا ابھی سے تیل نکل گیا تھا۔ میں نے بادلِ نخواستہ اسے دو تین چابک اور رسید کیے تب اس نے دوبارہ کچھ رفتار پکڑی۔

تانگے کو دھچکے لگنے ذرا کم ہوئے' میرے پسینے میں بھیگے ہوئے جسم کو خنک ہوا لگی تو طبیعت میں ذرا فرحت آئی۔ بُری طرح کھڑکھڑاتا ہوا وہ تانگا تھوڑی دیر بعد مجھے مرسڈیز سے بہتر محسوس ہونے لگا۔

اس تانگے پر میرا پانچ چھ میل کا سفر بہ خیر و عافیت طے ہو گیا۔ اس دوران کئی گاڑیاں' سائیکلیں' تانگے اور بیل گاڑیاں میرے قریب سے گزریں مگر کسی مسافر نے میری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ حتیٰ کہ ایک موٹر سائیکل پر دو باوردی پولیس والے بھی میرے قریب سے گزرے لیکن انہوں نے بھی میری طرف ایک آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔

تانگا کھڑکھڑاتا ہوا نامعلوم منزلوں کی طرف بڑھتا رہا۔ میں اب پُرسکون تھا اور اتنے سے سفر کے بعد ہی خود کو خطرے کی حدود سے باہر محسوس کر رہا تھا۔ تاہم تھوڑی تھوڑی دیر بعد مڑ کر ضرور دیکھ لیتا تھا کہ پولیس کی جیپ میرے تعاقب میں تو نہیں آ رہی لیکن ابھی تک کوئی میرے تعاقب میں آتا دکھائی نہیں دیا تھا۔

اس دوران سڑک بتدریج خراب سے خراب تر ہوتی گئی تھی۔ تانگا پھر سے بُری طرح ہچکولے کھانے لگا تھا اور گھوڑے میں بھی اب بالکل ہی دم خم نہیں رہا تھا۔ اب تو وہ بے چارہ چابک کھا کر بھی اپنی رفتار بڑھانے پر قادر نہیں رہا تھا۔ اس لیے میں نے اسے چابک مارنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس نے میرا جتنا ساتھ دیا تھا وہی کافی تھا۔

اس دوران مجھے سڑک سے کافی دور بائیں ہاتھ پر کافی طویل و عریض رقبے میں پھیلے ہوئے کھیتوں کے عقب میں کسی بستی کے آثار نظر آنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کچھ اور آگے جانے کے بعد تانگے کو کچے میں اُتاروں گا اور اس بستی کا رُخ کروں گا۔ وہ چھوٹا سا کوئی گاؤں معلوم ہوتا تھا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ تانگے کو ایک زوردار جھٹکا لگا اور وہ یک دم ہی گویا ایک طرف کو گر گیا۔ میں نے اگر تانگے کا اگلا تختہ مضبوطی سے نہ پکڑ لیا ہوتا تو میں تانگے سے باہر جا گرتا۔ میں جب اس جھٹکے سے سنبھلا تو احساس ہوا کہ تانگا اب بھی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ سڑک پر گھسٹ رہا تھا لیکن اس کا ایک پہیہ نکل کر لہراتا ہوا آگے چلا جا رہا تھا۔ شاید اسے کسی نامعلوم منزل پر پہنچنے کی کچھ زیادہ ہی جلدی تھی۔

ایک پہیہ نکل جانے کی وجہ سے تانگا بالکل ہی ترچھا ہو گیا تھا اور سڑک پر رگڑ کھا رہا تھا۔ گھوڑے کے لیے اب اسے کھینچنا دشوار تھا لیکن وہ گویا اب اپنی ہی دُھن میں کسی نہ کسی طرح اسے گھسیٹتا لیے جا رہا تھا۔ اس کی حالت دمے کے مریض جیسی تھی۔ گردن زور زور سے ہلاتے ہوئے بُری طرح ہانپ رہا تھا۔

تانگے کا رُخ خود بخود تھوڑا سا بدل گیا تھا اور وہ کچے میں اُترنے لگا تھا۔ میں اسے کچے میں اور دور تک لے گیا پھر میں نے اسے ایک درخت کے نیچے روک لیا۔ دوسرا پہیہ کافی آگے جا کر گر گیا تھا۔ میں اسے بھی اٹھا لایا اور تانگے کے سہارے کھڑا کر دیا۔ اس کے بعد میں نے دل ہی دل میں گھوڑے کا شکریہ ادا کیا' اسے خدا حافظ کہا اور بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے اُمید تھی کہ تانگے والا اگر کسی اور سواری میں بیٹھ کر میرے تعاقب میں روانہ ہوا ہو گا تو شاید اسے آج ہی اس کا تانگا مل جائے۔

میں ابھی گھوڑے کو ہانپتا چھوڑ کر چند قدم ہی آگے گیا تھا کہ عقب سے ایک لرزتی آواز سُنائی دی۔ "بیٹا! بات سُنو۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا' جھریوں زدہ چہرے والی ایک دبلی پتلی' عمر رسیدہ عورت سر پر لکڑیوں کا بڑا سا گٹھڑ اٹھائے چلی آ رہی تھی۔ اس عمر میں اتنا وزن اُٹھا کے چلنا کسی کے لیے بھی آسان نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بھی یقیناً دقت محسوس کر رہی تھی۔ اس کے چہرے کی جھریوں کے درمیان پسینے کی لکیریں بہہ رہی تھیں لیکن اس کی چال

سے کچھ زیادہ نقاہت اور کمزوری عیاں نہیں تھی۔ وہ خاصی مستعدی سے قدم اُٹھاتی چلی آ رہی تھی۔ تاہم میں دل ہی دل میں اس پر ترس کھائے بغیر نہ رہ سکا۔ انسان کو کم از کم عمر کے اس حصے میں تو اس قسم کی مشقتوں سے نجات مل جانی چاہیے۔

میں سمجھا' وہ مجھ سے درخواست کرے گی کہ میں اس کا لکڑیوں کا گٹھڑ اٹھا کر اس کے گھر پہنچا دوں۔ میں اس پر نظر پڑتے ہی ذہنی طور پر اس کام کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ میں اس کے کہنے سے پہلے ہی اس کے سر سے لکڑیوں کا گٹھڑ لے کر اس کے گھر پہنچانے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

لیکن بڑھیا قریب آ کر مجھ سے اس قسم کی کوئی درخواست کرنے کے بجائے ہمدردانہ لہجے میں بولی "تمہارا تانگا ٹوٹ گیا ہے تو تم میرے ساتھ قادر کے گھر چلو۔ وہ ہمارے گاؤں کا بہت اچھا بڑھئی ہے۔ تمہارا تانگا بالکل ٹھیک کر دے گا...." بات کرتے ہوئے وہ بغور میری صورت دیکھ رہی تھی۔ "تم یہاں اجنبی دکھائی دیتے ہو۔ آؤ میں تمہیں قادر کے گھر لے چلتی ہوں۔" ایک ہاتھ سے اس نے لکڑی کا گٹھڑ سنبھال رکھا تھا' دوسرے ہاتھ سے اس نے بڑی اپنائیت سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اس کے استخوانی ہاتھ میں مشقت کا کھردرا پن اور سختی تھی۔

میں نے نرمی سے اس کے ہاتھ سے ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا "نہیں اماں جی! اس کی ضرورت نہیں۔ یہ تانگا میرے دوست کا ہے۔ آج شام یا کل تک وہ یہاں پہنچ جائے گا اور خود ہی اس کی مرمت کرا لے گا۔ میرے پاس تو اس کی مرمت کرانے کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں۔" اپنی جیب خالی ہونے کا تذکرہ میں روانی میں ہی کر گیا۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

بڑھیا ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہاں کس لیے آئے ہو؟"

"میں یہاں نہیں آیا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا "تانگا ٹوٹ جانے کی وجہ سے رکنا پڑ گیا ہے۔ مسافر سمجھ لیجیے۔ مجھے آگے جانا ہے۔ کام کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں۔"

وہ میرے ساتھ ساتھ چلنے لگی تھی لیکن گردن موڑے بدستور میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی دھندلائی ہوئی آنکھیں میرے چہرے پر نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔ میں غیر ارادی طور پر گاؤں کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں نے اپنی ذات کی طرف سے اس کا دھیان ہٹانے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "لائیے...... یہ لکڑیاں میں آپ کے گھر پہنچا دوں۔"

"نہیں..... نہیں..... اس کی ضرورت نہیں۔" وہ جلدی سے کچھ دور ہٹ گئی۔ "میں خود ہی لے جاؤں گی یہ لکڑیاں۔"

مجھے شبہ ہوا کہ شاید میرے خالی جیب ہونے کا سُن کر وہ ڈر گئی ہے۔ میں نے جلدی سے کہا "میں آپ سے اس کام کی کوئی مزدوری نہیں مانگوں گا۔"

"یہ بات نہیں ہے بیٹا!" وہ ملائمت سے بولی "مجھے معلوم ہے تم مزدوری لینے کے لیے یہ بات نہیں کہہ رہے۔ مجھ غریب سے تم مزدوری بھی کیا لو گے.... اور یہ لکڑیاں ہیں بھی کتنے کی....! مجھے معلوم ہے تم مجھ پر ترس کھا کر میرا بوجھ اٹھانا چاہتے ہو لیکن میں یہ بوجھ تمہیں دینا نہیں چاہتی۔ پتا نہیں کتنے برسوں سے میں یہ اور اس قسم کی دوسری مشقتیں کر رہی ہوں۔ ان مشقتوں کی وجہ سے ہی میں چل رہی' پھر رہی ہوں۔ جس روز یہ مشقت چھوڑ دوں گی' بستر پر گر جاؤں گی اور پھر سسک سسک کر مروں گی کیونکہ میں اس دنیا میں اکیلی ہوں۔ مجھے تو کوئی پانی کا گلاس دینے والا بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس مشین کو چلتے ہی رہنے دو۔ ویسے بھی تم تو صرف ایک دن میرا بوجھ بٹا جاؤ گے' بہت زیادہ ہوا تو دو دن میری مدد کر دو گے.... اس کے بعد کیا ہو گا؟ اپنی زندگی کی گاڑی مجھے خود ہی کھینچنے دو۔"

وہ بے پناہ روانی سے یہ سب کچھ کہتی چلی گئی۔ میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا عزم اور حوصلہ قابلِ تعریف تھا۔ اس کی بھویں تک سفید تھیں اور چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا تھا لیکن سر پر وزن ہونے کے باوجود اس کی کمر میں خم نہیں تھا۔ شاید وہ قوتِ ارادی کے سہارے اس طرح تن کر چل رہی تھی۔ اس کا جسم اتنا مضبوط نہیں تھا جتنی اس کی قوتِ ارادی مضبوط معلوم ہوتی تھی۔ وقت کے ہاتھوں اس کے وجود کی عمارت کھنڈر ہو رہی تھی لیکن بنیادوں میں ابھی انا' خودداری اور خود اعتمادی کا کنکریٹ موجود تھا۔

اپنی باتوں سے وہ مجھے اور بھی اچھی لگنے لگی۔ میں اس کے سر سے لکڑیوں کا گٹھڑ لینے کے لیے اصرار کرنے لگا۔ میرا بچپن حالانکہ غربت و افلاس کے اسی طرح کے روایتی تماشے دیکھتے گزرا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی اور افسوس بھی ہوتا تھا کہ آج بھی محض اپنا چولہا روشن کرنے کے لیے ہمارے ہاں اس عمر میں لوگوں کو نہ جانے کہاں کہاں سے لکڑیاں چُن کر لانی پڑتی تھیں۔ پیاس بُجھانے کے لیے عورتوں کو میلوں دور سے گھڑے سر پر رکھ کر لانا پڑتے تھے۔ میرا بچپن برسوں پہلے کی بات تھی۔ مجھے حیرت اس بات پر ہوتی تھی کہ کیا اتنے برسوں میں معاشرے نے ایک انچ فاصلہ بھی طے نہیں کیا تھا؟ کیا معاشرہ آج بھی وہیں کھڑا تھا جہاں میں نے اسے برسوں پہلے دیکھا تھا؟

مجھ جیسے کچھ لوگوں کے گھروں میں اگر دولت آگئی تھی تو کیا ہوا تھا۔ مجموعی طور پر تو نظارے وہی کے وہی تھے' مسائل وہی کے وہی تھے۔ بلکہ شاید اور زیادہ گنجلک اور زیادہ خوفناک ہو گئے تھے۔ ترقی اسے تو نہیں کہتے۔

میرے اصرار پر بڑھیا مجبور ہو گئی۔ بلکہ مجبور کیا ہوئی' میں نے

گٹھڑ اس کے سر سے تقریباً کھینچ ہی لیا۔ ہم باتیں کرتے چلے جا رہے تھے۔ زیادہ تر وہی بول رہی تھی اور بہت تیزی سے بول رہی تھی۔ اس نے میرے بارے میں بھی بہت سے سوالات کیے۔ میں نے گول مول جوابات دے کر اسے مطمئن کرنے اور کچھ بہلانے کی کوشش کی۔

ہم بہت دیر تک چلتے رہے۔ پہلے اس نے کھیتوں کے ساتھ ساتھ پگڈنڈی پر خاصا فاصلہ طے کیا۔ پھر گاؤں کی طرف مڑی لیکن گاؤں میں داخل نہیں ہوئی۔ باہر ہی باہر سے گزرتی چلی گئی۔ میں منتظر تھا کہ وہ کسی گلی، کسی گھر میں داخل ہو گی لیکن وہ چلتی ہی جا رہی تھی۔ حتیٰ کہ گاؤں کا آخری مکان بھی پیچھے رہ گیا۔

ایک جگہ کنویں کے قریب میں نے چھوٹی سی مسجد دیکھی۔ ہم اس سے بھی آگے گزر گئے۔ اور درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب میں پہنچے۔ وہاں مجھے گاؤں سے الگ تھلگ ایک کچا مکان نظر آیا۔

"یہ ہے میرا گھر....." وہ مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے گہری سانس لے کر بولی۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

"تم اتنی دور سے لکڑیاں اکٹھی کر کے لاتی ہو اماں جی؟" میں نے کہا۔

"ہاں..... تم حیران کیوں ہو رہے ہو؟" اس نے گویا میری حیرت پر حیرت زدہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے... اگر تم کوشش کرو تو تمہیں ضرورت کے مطابق تو شاید لکڑیاں یہاں آس پاس سے بھی مل سکتی ہیں۔" میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"یہاں زمین کی صرف یہ..... چھوٹی سی پٹی میری ہے جس پر مکان بنا ہوا ہے۔ باقی ساری زمین رئیس کی ہے۔ میں اس پر سے کوئی چیز نہیں لے سکتی۔ میں زمیندار سے درخواست کروں تو شاید وہ اجازت دے بھی دے لیکن میں کسی بھی چیز کے لیے کسی کی منت کرنا نہیں چاہتی۔ میں جان بوجھ کر اتنی دور جاتی ہوں۔ جہاں میں جاتی ہوں وہاں مجھ پر کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ لکڑیاں بھی سمیٹ کر لا سکتی ہوں، سبزیاں بھی توڑ کر لا سکتی ہوں، اپنی بکری کے لیے گھاس بھی کاٹ کر لا سکتی ہوں..... اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس بہانے میں مشقت کرتی ہوں۔ میں نے تمہیں بتایا نا کہ مشقت میری زندگی ہے۔"

ہم مکان میں داخل ہوئے۔ چھوٹے سے صحن میں شہتوت کے درخت تلے ایک صحت مند بکری بندھی ہوئی تھی۔ ایک طرف چارپائی پڑی تھی، الگنی پر کپڑے لہرا رہے تھے۔ مکان ایک بڑے سے کمرے اور صحن پر ہی مشتمل تھا لیکن اس میں قدم رکھتے ہی مجھے ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اپنے گاؤں میں لوٹ آیا تھا۔ شاید میرے لاشعور میں بچپن کی یادوں کے خزانے میں ایسے بہت سے مکانوں کی تصویریں محفوظ تھیں۔

میں نے ایک اور نقطۂ نظر سے بھی غور کیا تھا۔ یہ مکان اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بھی اس وقت بہت اہم تھا۔ یہ عام گزر گاہوں سے بالکل ہٹ کر تھا۔ کسی کی نظر میں نہیں آ سکتا تھا۔ اس کی موجودگی سے واقف کوئی شخص بطورِ خاص ہی اس طرف آ کر اسے دیکھ سکتا تھا ورنہ ایک طرح سے یہ "نا موجود" ہی تھا۔

وہ مکان میرے لیے بہت اچھی پناہ گاہ ثابت ہو سکتا تھا اور بڑھیا مجھے اپنے ہاں مہمان ٹھہرانے پر تلی ہوئی بھی تھی۔ مجھے اگر ایک رات بھی آرام سے یہاں گزارنے کا موقع مل جاتا تو میرے لیے بہت تھا۔ تازہ دم ہو کر میں کسی طرف بھی نکل سکتا تھا۔ ویسے بھی اب رات سر پر ہی آ گئی تھی۔ میں نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد بڑھیا کی دعوت قبول کر لی اور صحن میں پڑی چارپائی پر ڈھیر ہو گیا۔

وہ آگ جلا کر کھانا تیار کرنے لگی۔ اس کی حرکات و سکنات میں پھرتی تھی لیکن کام کے ساتھ ساتھ اس کی زبان بھی مسلسل چل رہی تھی۔ مدتوں تنہا رہنے والوں کے سینے میں عموماً ان کہی باتوں کا سمندر مقید رہتا ہے جو بہہ نکلنے کے لیے راستہ تلاش کرتا ہے۔ کوئی سامع میسّر آتے ہی یہ سمندر روانی سے بہہ نکلتا ہے یا پھر شاید بڑھیا فطرتاً ہی باتونی تھی لیکن اب میرا دھیان اس کی باتوں کی طرف کم ہی تھا۔ ویسے بھی زیادہ تر وہ فضول باتیں ہی کر رہی تھی۔

میں اپنے خیالات میں اُلجھا ہوا تھا اور کچھ سست بھی پڑ گیا تھا۔ آرام کے لیے جگہ میسّر تھی تو یکدم ہی حواس ڈھیلے پڑ گئے تھے۔ لکڑیوں کے دھویں کے ساتھ ساتھ صحن میں پہلے سالن اور پھر روٹی کی خوشبو اُبھری تو آنتیں جو بھوک سے کلبلاتے ہوئے بالآخر سو گئی تھیں، ایک بار پھر جاگ اُٹھیں۔

"یہیں آ جاؤ....." بڑھیا نے پہلی روٹی اُتارتے ہوئے مجھے چولھے کے قریب بلایا "میں روٹیاں اُتارتی جاؤں گی، تم گرم گرم کھاتے جانا..... مجھے معلوم ہے تم بہت بھوکے ہو۔"

میں اس کے پاس جا بیٹھا۔ اس نے ایک بہت بڑے پیالے میں شوربے والا آلو گوشت ڈالا تھا جس سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور ڈلیا میں اس نے پھولی پھولی سی جو روٹی توے سے اُتار کر رکھی تھی وہ بھی جہازی سائز کی تھی۔ بڑھیا کو یقیناً میری بھوک کی شدت کا ہی نہیں بلکہ اس کی "وسعت" کا بھی اندازہ تھا۔

میری والدہ کا انتقال ہوا تو میں بہت ہی چھوٹا تھا۔ میرے ذہن میں ان کی کوئی ایسی یاد محفوظ نہیں تھی کہ انہوں نے اس طرح چولھے کے قریب بیٹھ کر تازہ تازہ روٹیاں توے سے اُتار کر مجھے کھلائی ہوں لیکن میں چشمِ تصور سے دیکھتا تھا کہ اگر ماں زندہ ہوتی اور میں گاؤں میں ہوتا تو گھر میں شاید روزانہ کچھ اسی قسم کا منظر ہوا کرتا۔ میں کھاتا جا رہا تھا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتا جا رہا تھا کہ اس نے نہ صرف مجھے ایک عمدہ پناہ گاہ تک پہنچا دیا تھا بلکہ کچھ دیر کے لیے اس تصور سے بھی لذت اندوز ہونے کا موقع دیا تھا جس کا میری زندگی میں کوئی گزر نہیں تھا۔

بڑھیا کا دنیا میں کوئی نہیں تھا اور وہ ایک غریب عورت ہی تھی تاہم اس کے گھر میں کھانے پینے کی چیزوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ اس عمر میں بھی وہ باقاعدگی سے کھیتوں میں کام کرنے جاتی تھی اور جو مزدوری ملتی تھی اس سے گزراوقات کرتی تھی۔ شام کو کھیتوں سے واپس آتے وقت وہ ضرورت کی کسی نہ کسی چیز کا گٹھڑ بنا کر سر پہ لاد کر لے آتی تھی۔

کھانے کے بعد اس نے مجھے بکری کے دودھ کی چائے بھی بنا کر پلائی جو شاید عام حالات میں مجھے اچھی نہ لگتی لیکن اس وقت بڑی لذیذ لگی۔ پیٹ بھرتے ہی مجھے گندم کا خمار چڑھنے لگا۔ تھکن اور درماندگی ویسے ہی کچھ کم نہیں تھی۔

بڑھیا میری صورت دیکھتے ہوئے بولی "تم بہت بُری طرح تھکے ہوئے ہو۔ چلو..... اندر چل کر سو جاؤ۔"

اندر کمرے میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں لیکن بستر صرف ایک پر تھا۔ اس نے لوہے کے ایک ٹرنک سے فوراً دری چادر، تکیہ وغیرہ نکالا اور دوسری چارپائی پر صاف ستھرا بستر لگا دیا۔ لالٹین کی بتی اس نے نیچی کردی۔ کمرے میں زیرو کے بلب جیسی روشنی رہ گئی۔

وہ نہایت مشفقانہ لہجے میں بولی "تم آرام سے سو جاؤ، میں ذرا برتن وغیرہ دھولوں اور کچھ دوسرے ضروری کام نمٹالوں۔"

اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس کا اس وقت مجھے لوری دینے کو بھی جی چاہ رہا تھا۔ اگر میں چھوٹا ہوتا تو شاید وہ یہ بھی کر گزرتی۔ بستر پر لیٹتے ہی میری تھکی ہوئی ہڈیوں میں آرام و سکون کی ایسی لہر اتر آئی کہ ایک لمحے کے لیے تو وہ گھر مجھے جنت محسوس ہوا۔

صحن سے بڑھیا کے کام کرنے کی ہلکی پھلکی کھٹر پٹر میں صرف چند لمحے ہی سن سکا، اس کے بعد دنیا مافیا سے بے خبر ہوگیا۔ مجھے اندازہ نہیں کہ میں کتنی دیر سویا تھا۔ جو حالت میری تھی اس میں انسان پوری رات بھی سوئے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ چند منٹ سویا ہے۔ اس حالت میں آسانی سے آنکھ کھلنا بھی کسی معجزے سے کم نہیں ہوتا۔

میرے لیے یہ معجزہ نہ جانے کس طرح ممکن ہوا کہ اس حالت میں بھی اچانک ہی میری آنکھ کھل گئی۔ اسے آپ میری خوش فہمی سمجھیں یا کچھ اور..... لیکن میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ کبھی کبھی مجھے اپنے اندر کسی حِس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا جو چھٹی سے بھی آگے کی کوئی چیز معلوم ہوتی تھی۔ حالانکہ ویسے تو چھٹی حِس ہی ایک فرضی چیز ہے لیکن میں اپنی اس حِس کو ساتویں حِس کہا کرتا تھا۔

شاید وہ اس ساتویں حِس کا ہی کمال تھا کہ اس وقت میری آنکھ کھل گئی۔ چھٹی حِس تو مجھے اس نیند سے یوں اچانک جگانے میں کامیاب نہیں ہوسکتی تھی۔ اس قدر گہری نیند میں تو شاید چھٹی حِس بھی انسان کے ساتھ ہی سو جاتی ہوگی۔ میرا خیال ہے میں نے نیند کے دوران کوئی خواب نہیں دیکھا تھا لیکن آنکھ کھلتے ہی مجھے ڈر ہوا کہ شاید میں کوئی بھیانک خواب دیکھ رہا تھا۔

بڑھیا مجھ پر جھکی ہوئی تھی لیکن اس کا ہاتھ ہوا میں اُٹھا ہوا اور اس ہاتھ میں تقریباً ایک فٹ لمبی خوفناک سی چھری تھی۔ پالش شدہ چھری نہیں تھی لالٹین کی مدھم روشنی میں چمک نہیں رہی تھی لیکن اس کی دھار کی طرف کا کچھ حصہ ضرور جھلملا رہا تھا۔ وہ کچھ اس قسم کی چھری تھی جیسی ہمارے ہاں قصائی عموماً بکری وغیرہ ذبح کرنے میں استعمال کرتے ہیں۔

اس مدھم روشنی میں چھری سے زیادہ خوفناک بڑھیا کا چہرہ نظر آرہا تھا۔ جھریوں بھرا وہ چہرہ اس وقت مسخ شدہ دکھائی دے رہا تھا۔ اسے شاید نفرت نے مسخ کردیا تھا۔ وہ چہرہ جس پر میں نے ممتا کا نور اور شفقت کے اُجالے دیکھے تھے، اس وقت نفرتوں کی شدت سے تاریک تھا اور اتنا خوفناک دکھائی دے رہا تھا کہ اس پر اچانک نظر پڑنے پر کسی کی چیخ بھی نکل سکتی تھی۔

اس نے آستینیں چڑھا رکھی تھیں اور اس کا استخوانی بازو اس وقت تیزی سے نیچے آنے لگا تھا جب میری آنکھ کھلی۔ میرا ہاتھ شاید اضطراری طور پر ہی اُٹھا تھا اور میں نے یک دم اس کی کلائی پکڑلی۔ اگر میری آنکھ کھلنے میں یا مجھے اس کا بازو پکڑنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو شاید وہ چھری میرے سینے میں اُتر چکی ہوتی۔

جب میں نے اس کا بازو پکڑا اس وقت چھری کی نوک میرے سینے سے بمشکل تین انچ دور تھی۔ اس کا استخوانی بازو جتنا کمزور نظر آتا تھا۔ درحقیقت اتنا کمزور نہیں تھا۔ اس نے پوری کوشش کی کہ کسی طرح باقی تین انچ کا وہ فاصلہ بھی طے ہو جائے۔

دوسرے ہی لمحے وہ کسی چڑیل کی طرح اچھل کر چارپائی پر چڑھ گئی اور اس نے چھری کو نیچے لانے کے لیے پورے جسم کی طاقت صرف کردی۔ اور یہ طاقت کچھ کم نہیں تھی۔ شاید یہ نفرت کی طاقت تھی۔ جس طرح محبت میں بڑی طاقت ہوتی ہے اسی طرح نفرت میں بھی بڑی طاقت ہوتی ہے۔ شاید فرق صرف یہ ہے کہ ایک طاقت مثبت ہوتی ہے اور دوسری ... ایک کسی کو ساتھ ملاتی ہے، دوسری کسی کو دور دھکیلتی ہے۔

اس نے جب دیکھا کہ وہ چھری میرے سینے میں نہیں اُتار سکی تو اس نے چھری کو ہاتھ ہی میں گھماتے ہوئے میرے بازو کو زخمی کرنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کی یہ کوشش بھی ناکام بنا دی۔ میں اس کا یہ روپ دیکھ کر اس قدر حیرت زدہ تھا کہ غیر ارادی طور پر میں نے اپنا دفاع تو کرلیا تھا لیکن ابھی تک کوئی ... کارروائی نہیں کی تھی۔ میں نے تو اپنی جگہ سے اٹھنے کی بھی کوشش نہیں کی تھی۔ ابھی تک چت ہی لیٹا ہوا تھا۔ میرے لیے میرا تصور ٹوٹنے کا صدمہ خاصا شدید تھا۔

بڑھیا ایک بلا کی طرح میرے سینے پر چڑھ گئی تھی۔ وہ تڑپ رہی تھی، مچل رہی تھی، زور آزمائی کررہی تھی اور چھری سے کسی نہ کسی طرح مجھے گزند پہنچانے کی کوشش کررہی تھی۔

پھر اچانک ہی اس نے چیخنا بھی شروع کردیا۔ "تم میرے بیٹے کے قاتل ہو..... تم میرے بیٹے کے قاتل ہو..... میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گی....."

یہ ایک نئی افتاد تھی۔ فوری طور پر تو مجھے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ مکان آبادی سے خاصا دور تھا اور اس کا شور شرابا رات کو اس وقت مشکل سے ہی کسی کو متوجہ کرسکتا تھا۔ مجھے تو یہی اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کی کرخت آواز ایک ہجوم جمع کرلے گی اور میں عجیب مشکل میں پھنس جاؤں گا۔ رات کے سناٹے میں اس کی آواز ویسے بھی کچھ زیادہ ہی کرخت، تیز اور آسیبی سی محسوس ہو رہی تھی۔

اس کا نہ جانے وہ کون سا بیٹا تھا جس کا اس نے مجھے قاتل بنا دیا تھا۔ میں نے شاید اسے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا ہو۔ اس کے شور مچانے پر مجھے حرکت میں آنا پڑا۔ میں نے اس کی کلائی پر صرف ہاتھ کی گرفت سخت کی۔ چھری اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے اس کی سوکھی سی گردن دبوچی اور رات کے سکوت کو مرتعش کرتی ہوئی اس کی کرخت آواز بند ہوگئی۔

میں اب بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس پر میرا سخت ہاتھ پڑے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ بڑھیا مر مرا جائے۔ تاہم وہ میرے لیے مصیبت بن گئی تھی۔ اب بھی میرے سینے پر اُچھل رہی تھی۔ دم گھٹنے کے باعث وہ بُری طرح مچلنے لگی تھی۔ میں نے اسے اُچھال کر پرے دور پھینک دیا۔ وہ دیوار کے قریب جاکر گری اور وہیں ساکت ہوگئی۔ اس کی آنکھیں بند ہوچکی تھیں۔

میں سر جھٹک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور قریب جاکر دیکھنے لگا کہ کہیں اس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے تو بند نہیں ہوگئیں لیکن اس کی سانس چل رہی تھی بلکہ وہ سوئی ہوئی بلی کی طرح خرخرا رہی تھی۔

میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا۔ میرے خیال میں اب میرا وہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں تھا۔ یہ ٹھکانا بھی مجھے راس نہیں آیا تھا۔ میں نے اسے بھی خدا حافظ کہا اور باہر آگیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ سپیدۂ سحر نمودار ہورہا تھا۔ بڑھیا نے بھی بڑا کرم کیا تھا کہ مجھے چند گھنٹے سونے کا موقع دے دیا تھا اور اپنا ڈراما علی الصباح شروع کیا تھا۔

مکان سے نکل کر میں نے چاروں طرف دیکھا۔ دیہاتی علاقوں میں عموماً منہ اندھیرے ہی آمد و رفت شروع ہوجاتی ہے لیکن وہاں ابھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں ..... مڑ کر احتیاط سے مکان کا دروازہ بند کرنے لگا۔ میں کنڈی بھی چڑھانے ہی لگا تھا لیکن پھر ارادہ ملتوی کردیا۔ مجھے خیال آگیا تھا کہ کہیں بڑھیا ہوش میں آنے کے بعد چیختی چلاتی ہی نہ رہ جائے اور اُدھر سے کسی کا گزر ہی نہ ہو جو باہر سے کنڈی کھول دے۔

میں دروازہ بند کرکے پلٹا ہی تھا کہ درختوں کے عقب سے ایک شخص نمودار ہوتا دکھائی دیا۔ درختوں نے اس مقام پر پگڈنڈی کے قریب ایک موڑ سا بنا دیا تھا اور وہ شخص اس موڑ پر ہی نمودار ہوا تھا۔ اس نے مجھے بڑھیا کے گھر کا دروازہ بند کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ ٹھٹک گیا۔

وہ غالباً مسجد سے نکلا تھا اور گاؤں کی طرف واپس جانے کے بجائے چہل قدمی یا کسی کام کے ارادے سے اِدھر آرہا تھا۔ صبح کا اُجالا اس حد تک پھیل چکا تھا کہ میں اسے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر، باریش شخص تھا۔ اس کے سر پر ٹوپی اور ہاتھ میں تسبیح تھی۔ شلوار ٹخنوں سے اونچی تھی۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی طمانیت تھی جو آج کے دور میں چہروں پر ذرا کم ہی دیکھنے میں آتی ہے۔

اس کی صورت دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ مجھ سے کوئی نہ کوئی سوال ضرور کرے گا اور مجھے خواہ مخواہ وضاحتوں میں اُلجھنا پڑے گا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے خیال آیا کہ فوراً دوسری طرف جست لگاؤں اور ملگجے اندھیرے میں دوڑتا ہوا اس کی نظروں سے اوجھل ہوجاؤں لیکن فوراً ہی مجھے خیال آیا کہ وہ ایک شریف آدمی تھا اور میں نے بھی کوئی جرم نہیں کیا تھا تو خواہ مخواہ مجھے خود کو اس کی نظر میں مشکوک بنا کر بھاگنے کی کیا ضرورت تھی۔

"تم کون ہو بھائی.....؟ کیا روشن بی بی کے مہمان ہو؟" اس نے نہایت محبت سے پوچھا۔

"اچھا..... تو اس بڑھیا کا نام روشن بی بی تھا جو مجھے موت کی تاریکیوں سے روشناس کرانے لگی تھی۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ میں نے اس کے ساتھ اس کے گھر میں خاصا وقت گزارا تھا لیکن مجھے اس کا نام معلوم ہی نہیں تھا۔

تسبیح والا باریش شخص ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ دل ہی دل میں وہ مجھ پر چور ہونے کا شبہ کررہا تھا لیکن بعض لوگ اتنے مہرباں، نرم خو اور نیک دل ہوتے ہیں کہ وہ بلا تحقیق چور کو بھی اس کے منہ پر چور نہیں کہہ سکتے۔ وہ پہلے مجھے بولنے کا موقع دینا اور پھر کوئی نتیجہ اخذ کرنا چاہتا تھا۔

میں نے ایک لمحے کے اندر اندر فیصلہ کیا کہ اس شخص کے سامنے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ صاف، سیدھی اور سچی بات کردینا سب سے بہتر تھا۔ اس میں سب سے کم اُلجھنیں تھیں۔

"میں ایک مسافر ہوں بھائی..... اور کچھ پریشان حال بھی ہوں....." میں نے ملائمت سے کہا۔ اس سے آگے میں نے اسے کل شام سے اب تک کا قصہ سُنا دیا کہ کس طرح بڑھیا سے ملاقات ہوئی تھی، کس طرح اس نے مجھے مہمان رکھا تھا اور پھر چند منٹ پہلے کیا ہوا تھا۔

میں خاموش ہوا تو اس نے گہری سانس لے کر "استغفراللہ" کہا اور قریب آکر مشفقانہ انداز میں میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولا

"اللہ نے بڑا کرم کیا کہ تمہاری جان بچ گئی۔ آؤ ذرا دیکھ لیں' روشن بی بی کو کچھ زیادہ چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی۔"

میں دوبارہ بڑھیا کے مکان میں جانا نہیں چاہ رہا تھا لیکن اس نے اتنی محبت سے اصرار کیا تھا کہ میں چلا گیا۔ بڑھیا وہیں فرش پر پڑی تھی جہاں میں نے اسے چھوڑا تھا لیکن اب وہ کسمسا رہی تھی۔ شاید ہوش میں آرہی تھی۔ اس شخص کی فرمائش پر میں نے اسے اُٹھا کر چارپائی پر ڈال دیا۔

"ٹھیک ہے.... فکر کی کوئی بات نہیں..... میرا خیال ہے یہ جلد ہی ہوش میں آجائے گی اور اس وقت تمہیں اس کے سامنے نہیں ہونا چاہیے۔ آؤ' تم میرے ساتھ آؤ۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

"کہاں؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"میرے گھر.... اور کہاں؟" وہ نہایت اطمینان سے بولا۔ گویا یہ بات مجھے پہلے ہی سمجھ لینی چاہیے تھی۔

مجھے متذبذب دیکھ کر وہ بولا "بھئی تم مسافر ہو..... پریشان حال ہو..... میرا خیال ہے تمہاری جیب میں کوئی روپیہ پیسہ بھی نہیں ہے۔ جب یہ باتیں ہمیں معلوم ہو ہی گئی ہیں تو پھر ہم تمہیں اس طرح تو نہیں جانے دے سکتے۔ یہ مسلمانوں..... اور خاص طور پر ہم سندھیوں کی روایات کے خلاف ہے۔ اب تم میرے مہمان ہو۔ میرے ساتھ میرے گھر چلو۔ ہم سے تمہاری جو بھی خدمت ہو سکے گی' کریں گے۔"

میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی۔ ایک جگہ سے بے ٹھکانہ ہوتے ہی قدرت نے فوراً دوسرا بندوبست کردیا تھا لیکن اسی لمحے میرے ذہن میں ایک اور خیال نے سر اُبھارا۔ میں تو روشن بی بی کی بھی شکل' صورت اور انداز و اطوار سے متاثر ہو کر' اس کی آنکھوں میں ممتا کی پرچھائیاں دیکھ کر اس کے ساتھ آیا تھا لیکن اس نے عجیب ہی پلٹا کھایا تھا۔ کہیں اس اجنبی کے روشن روشن چہرے کے پیچھے بھی کوئی اور ہی قصہ تو میرا منتظر نہیں تھا؟

یہ سوچنے کے باوجود میں ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد اس شخص کے ساتھ روانہ ہوگیا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ جس راستے پر میں نکلا ہوا تھا اور جس قسم کی زندگی میں جان بوجھ کر فی الحال اپنائے ہوئے تھا' اس میں مجھے قدم قدم پر ہر قسم کے اندیشوں' دشواریوں اور صعوبتوں کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔

باہر آکر وہ شخص اسی راستے پر واپس چل پڑا جس سے میں نے اسے آتے دیکھا تھا۔ اس نے غالباً آگے جانے کا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔ چند لمحے وہ خاموشی سے تسبیح پڑھتا چلتا رہا۔ پھر تسبیح ختم کر کے اس نے جیب میں ڈالی' اپنے سراپا پر پھونک ماری اور گویا کسی دوسری دنیا سے واپس آتے ہوئے بولا "میرا نام دُر محمد ہے۔ میری اس گاؤں میں کپڑے کی دکان ہے۔"

میں بھی ایک کاروباری آدمی ہوں..... کچھ خطرناک لوگوں کی دشمنی کی لپیٹ میں آگیا ہوں..... مجھے اچانک ہی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا پڑا....." گول مول انداز میں یہ تقریباً سچ ہی تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ "خطرناک لوگوں" کا ذکر سن کر اگر اسے بدکنا ہے تو ابھی بدک جائے' مجھے گھر تک لے جا کر میزبانی کی زحمت نہ اُٹھائے۔

اس نے اپنی گھنی بھوئیں اُچکاتے ہوئے میری طرف دیکھا اور گویا منتظر رہا کہ میں مزید کچھ بولوں لیکن میں خاموش رہا۔ اس نے بھی مجھے مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اتنا ضرور کہا "میرا خیال ہے جتنا تم نے مناسب سمجھا ہے' مجھے بتا دیا ہے۔"

"جی ہاں۔" میں نے اختصار سے کہا۔

"بتانے کو اور کچھ نہیں ہے؟" اس نے ملائمت سے پوچھا۔ یہ گویا ایک مشفقانہ درخواست تھی کہ اور کچھ بتانا ہے تو بتادو لیکن میرے خیال میں فی الحال اتنا ہی کافی تھا۔

"جی نہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے......" وہ گہری سانس لے کر بولا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ کی ذات بہت بڑی ہے..... بڑی قدرت' بڑی رحمت والی ہے۔ اگر تم نے کسی کے ساتھ کوئی ظلم نہیں کیا تو انشاء اللہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔"

مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کے چہرے پر پریشانی کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی وہ اپنی پیشکش پر پچھتا دکھائی دے رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "اس بڑھیا۔ یہ مطلب ہے روشن بی بی کا چکر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ یہ رات اسے کیا ہوگیا تھا؟"

وہ کندھے پر پڑا رومال چہرے پر پھیرتے ہوئے بولا "روشن بی بی بھی اس دنیا میں بکھری ہوئی لاتعداد کہانیوں میں سے ایک چھوٹی سی کہانی ہے۔ یہ جوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تھی۔ اس کا ایک ہی بیٹا تھا۔ اس نے محنت مزدوری کر کے بڑی مشکلوں سے اسے پالا پوسا۔ گاؤں کے کئی مرد اس سے شادی کرنا چاہتے تھے مگر اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ اس کا بیٹا بڑا گبھرو جوان تھا......"

دُر محمد نے تنقیدی سے انداز میں میرا سرتاپا جائزہ لیا اور تشبیہ دی۔ "کچھ کچھ تم جیسا ہی تھا وہ..... وہ بھی ہاری تھا۔ کھیتوں میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ ہمارا گاؤں ایک بہت اچھا' پُرسکون گاؤں ہے۔ یہاں کسی بھی قسم کے چکر نہیں ہیں۔ سیاست کا زیادہ زور نہیں ہے۔ ہمارا رئیس بھی اچھا آدمی ہے۔ لوگوں کا خیال کرتا ہے' دکھ سکھ میں کام آتا ہے۔ یہاں غربت تو ضرور ہے لیکن بے سکونی نہیں ہے......"

میرے خیال میں وہ ایک آئیڈیل گاؤں کا نقشہ کھینچ رہا تھا۔

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "لیکن روشن بی بی کے بیٹے کو شہر جانے کا شوق چڑھ گیا تھا جس طرح گاؤں کے اکثر لڑکوں کو چڑھ جاتا ہے۔ وہ سمجھتے ہیں' ہر دیہاتی کے لیے شہر میں ایک حسین زندگی انتظار کررہی ہوتی ہے۔ اکبر بھی شہر چلا گیا۔ اکبر' روشن بی بی کے بیٹے کا نام تھا۔ وہ پہلے حیدر آباد گیا۔ پھر سنا ہے کہ کراچی چلا گیا تھا۔ دولت وغیرہ تو وہ کچھ نہیں کما سکا تھا۔ میرا مطلب ہے..... ہم نے روشن بی بی کے گھر میں تو خوش حالی کے کوئی آثار نہیں دیکھے۔ اکبر کی زندگی بھی شہر جا کر معلوم نہیں حسین ہوئی یا نہیں' البتہ یہ ضرور ہوا کہ ڈھائی تین سال بعد وہ واپس آیا تو اس کی شکل پہچانی نہیں جارہی تھی۔ سوکھ کر کانٹا ہوگیا تھا اور کالا بھجنگ نظر آرہا تھا۔ شاید اسے کوئی لت لگ گئی تھی۔ ممکن ہے کوئی بیماری لگ گئی ہو۔ مجھے صحیح معلوم نہیں ہے' کسی کو بھی صحیح معلوم نہیں کیونکہ واپس آنے کے بعد وہ گاؤں کے کسی آدمی سے نہیں ملا۔ اس نے گھر میں ہی منہ چھپالیا تھا۔ گھر سے نکلتا ہی نہیں تھا۔ ممکن ہے وہ واپس آنا بھی نہ چاہتا ہو۔ کسی مجبوری میں آیا ہو......"

راستے میں ایک کتا دُم ہلاتا ہوا ہمارے پیچھے چلنے لگا۔ دُر محمد نے اسے ہشکارا اور اصل بات ادھوری چھوڑ کر بولا "اس کتے کے سامنے میں نے صرف دو تین مرتبہ کھانے کو کچھ پھینکا ہے لیکن یہ جہاں بھی مجھے دیکھ لیتا ہے' دُم ہلاتا ہوا پیچھے ہولیتا ہے۔ میں ڈرتا ہوں' کہیں مجھے منہ نہ لگادے' کپڑے ناپاک نہ کردے۔ اس ڈر سے میں نے عرصہ ہوا اس کے سامنے روٹی یا بوٹی پھینکنا چھوڑ دی ہے لیکن یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ہم تو اپنے رب کے اس کتے جتنے بھی شکر گزار نہیں ہیں۔"

"بے شک۔" میں نے اس کی تائید میں سر ہلایا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد پوچھا "وہ اکبر کا کیا ہوا؟"

"ہاں....." اسے اصل موضوع یاد آیا تو وہ کچھ اور تاسف سے بولا "ایک شخص کہیں سے اکبر کو ڈھونڈتا ہوا اور اس کے بارے میں پوچھتا پاچھتا یہاں آیا۔ اکبر کے گھر پہنچا۔ رات کو وہیں ٹھہرا۔ صبح روشن بی بی بیدار ہوئی تو اکبر اس حالت میں پڑا تھا کہ اس کی گردن آدھی سے زیادہ کٹی ہوئی تھی اور چھری اس کے پاس ہی تکیے پر رکھی ہوئی تھی۔ اجنبی غائب تھا۔ نہ تو اس کا کچھ پتا چلا اور نہ ہی اصل بات کا کچھ سر پیر کسی کی سمجھ میں آیا۔"

اس نے میری طرف دیکھا۔ میری آنکھوں میں شاید اب بھی یہ سوال ہی نظر آیا ہوگا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اس کے بعد سے روشن بی بی کے دماغ میں تھوڑا سا فرق آگیا ہے۔ کافی عرصہ تو یہ عالم رہا کہ گاؤں میں وہ کسی بھی اجنبی کو دیکھ لیتی تھی تو اس کا گریبان پکڑ کر چیخنے لگتی تھی۔ "تو میرے بیٹے کا قاتل ہے..... تو میرے بیٹے کا قاتل ہے۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔" ظاہر ہے' لوگ بیچ بچاؤ کرا دیتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں کوئی اجنبی ویسے بھی کبھی کبھار ہی آتا ہے۔ عام حالات میں وہ بالکل ٹھیک ٹھاک رہتی تھی۔ اس لیے کبھی کسی نے اس کا کوئی اور بندوبست کرنے کے بارے میں نہیں سوچا۔ جس طرح تم بتا رہے ہو' اس طرح کی کوشش اس نے پہلی بار کی ہے۔"

"انتقام کی خواہش میں اب عقل کا بھی دخل ہوگیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اس نے سوچا ہوگا' ہر بار لوگ بیچ بچاؤ کرا کے قاتل کو چھڑا دیتے ہیں۔ اس بار ذرا تدبیر سے کام لینا چاہیے۔"

"بے چاری.....!" دُر محمد متاسفانہ انداز میں بولا۔ "اللہ تعالیٰ اس پر اپنا رحم فرمائے۔"

ہم اب گاؤں کی گلیوں سے گزر رہے تھے۔ اِکا دُکا لوگ گلیوں میں آتے جاتے دکھائی دینے لگے تھے۔ ہر کوئی دُر محمد کو سلام کر کے گزرتا تھا اور متجسس سی نظروں سے میری طرف دیکھتا تھا۔ مجھے کچھ اُلجھن سی ہونے لگی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ جلد از جلد دُر محمد کا گھر آجائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس گاؤں میں زیادہ لوگ میری اجنبی صورت دیکھیں۔ یہ گاؤں جرال سے زیادہ دور نہیں تھا جہاں میں تھانے میں خاصی مار دھاڑ کر کے بھاگا تھا۔ میرے حساب سے تو پولیس کی تلاش کا دائرہ کم از کم یہاں تک تو کافی دیر پہلے ہی پھیل جانا چاہیے تھا۔ اگر پولیس اب تک میری تلاش میں یہاں نہیں پہنچی تھی تو یہ محض میری خوش قسمتی تھی۔ خوش قسمتی اور بدقسمتی دونوں میرے ساتھ ساتھ سفر کررہی تھیں' لیکن شاید یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ خوش قسمتی اور بدقسمتی ہمیشہ ہی انسان کے ساتھ اکٹھی سفر کرتی ہیں۔ کبھی ایک کا اثر بڑھ جاتا ہے' کبھی دوسری کا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد دُر محمد بولا "ویسے روشن بی بی ہے بڑی خوددار عورت۔ کبھی کسی سے مدد نہیں مانگتی' کبھی کسی کے سامنے اپنے اکیلے پن' بے چارگی یا بے بسی کا رونا نہیں روتی۔ سر جھکا کر کام کرتی ہے اور اپنی دنیا میں مگن رہتی ہے۔ کوئی اس کی مدد کرنے کی کوشش کرے تو ناراض ہوتی ہے۔ کہتی ہے' تم مجھے محتاج سمجھتے ہو۔ میں اللہ کے سوا کسی کی محتاج نہیں۔' اگر لوگ روشن بی بی کی طرح سوچنے لگیں تو معاشرے میں فساد بڑا کم ہوجائے۔ یہاں تو لوگ زمانے بھر کی آسائشیں میسر ہوتے ہوئے بھی مظلوم اور مدد کے طالب بنے رہتے ہیں۔"

"ہاں..... یہ بات تو ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ اس نے میرے دل کی بات کی تھی۔

بالآخر وہ ایک ٹیڑھی لیکن کشادہ سی گلی کے وسط میں جا رکا اور ایک مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ ہے میرا غریب خانہ۔"

اس کے مکان کے سامنے نیم کا ایک گھنا درخت موجود تھا

جس کے نیچے گائے بندھی ہوئی تھی۔ مکان نیم پختہ تھا اور اس کا چوبی دروازہ اچھا خاصا لمبا چوڑا تھا۔ اندر لے جاکر اس نے مجھے اوطاق میں بٹھایا جہاں چند کرسیاں اور ایک چوبی تخت موجود تھا جس پر بستر لگا ہوا تھا۔ اندر کے کسی کمرے سے کسی عورت کے تلاوت کرنے کی نہایت دھیمی سی آواز سُنائی دے رہی تھی۔

کچھ دیر بعد دُر محمد نے مجھے اپنے بیٹے سے ملوایا۔ وہ بیس بائیس برس کا نوجوان تھا۔ اس کے چہرے پر بھی داڑھی تھی۔ سر پر ٹوپی' شلوار ٹخنوں سے اونچی اور ماتھے پر محراب نظر آرہی تھی۔ دُر محمد نے بتایا کہ بیٹا اس کے ساتھ دکان پر بیٹھتا تھا اور مسجد میں شام کو بچّوں کو بلا تنخواہ قرآن بھی پڑھاتا تھا۔ اس سے چھوٹی دُر محمد کی دو بیٹیاں تھیں۔ وہ بھی کم عمری سے ہی نماز روزے کی پابند تھیں۔

"ماشاء اللہ آپ کا پورا گھرانہ مذہب کے بہت گہرے رنگ میں رنگا ہوا ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔

"گہرا رنگ اسے نہیں کہتے افضل بھائی!" اس نے نفی میں سرہلاتے ہوئے تصحیح کی "گہرا رنگ تو خوش نصیبوں پر ہی چڑھتا ہے۔ وہ اللہ کے بہت ہی پیارے بندے ہوتے ہیں۔ ہم تو صرف عام سے مسلمان ہیں۔ بنیادی ارکان کی پابندی کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ بھی پتا نہیں صحیح طور پر ادا ہو رہے ہیں یا نہیں۔ بہر حال اللہ بڑا غفور الرّحیم ہے۔ شاید ہم جیسے گناہ گاروں کو بھی بخش دے۔"

میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ وہ خود کو گناہ گاروں میں شمار کر رہا تھا۔ اس حساب سے مجھ جیسوں کا شمار تو نہ جانے کن لوگوں میں ہونا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد دُر محمد بولا۔ "اصل میں تو ہم سب کو کم از کم ایسا ہونا چاہیے تھا جیسے ہم ہیں لیکن چونکہ اکثریت ایسی نہیں ہے اس لیے آج کی دنیا میں ہم جیسے لوگ عجوبہ لگتے ہیں حالانکہ ہم میں عجوبے والی کوئی بات نہیں۔"

پھر وہ مسکراکر اٹھتے ہوئے بولا "میں زیادہ ایسی باتیں کرکے تمہیں بور نہیں کروں گا۔ کہیں تم سمجھو کہ میں نے تبلیغ شروع کردی ہے۔ میں تمہارے لیے ناشتا لاتا ہوں۔"

ہم نے اکٹھے بیٹھ کر نہایت پُرتکلف ناشتا کیا۔ دیسی گھی کے گرم گرم پراٹھے' دیسی انڈے' سالن' لسی' مکھن اور دوسری کئی چیزیں تھیں۔ اس پُرتکلف ناشتے پر میں نے بلا تکلف ہاتھ صاف کیا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے کھاتے دیکھ کر شاید دُر محمد میری میزبانی کا خیال دل سے نکال دے لیکن اس کی پیشانی پر شکن تک نہیں آئی۔

ناشتے کے بعد دُر محمد بولا "میں اب دکان پر جارہا ہوں۔ تم آرام کرو۔ دوپہر کے کھانے پر تم سے ملاقات ہوگی۔"

"آرام تو میں رات بھر کرچکا ہوں۔ اب میں اپنے آپ کو تھکا ہوا محسوس نہیں کررہا۔" میں نے کہا۔ "گھر میں کوئی محنت مشقت کا کام ہو تو مجھے بتا جاؤ۔ میں بڑی آسانی سے کرسکتا ہوں۔ کوئی چیز توڑنی ہو' کوئی بنانی ہو۔ بے شک مزدوروں والا کام ہو' میں کرلوں گا۔ میں اس میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا۔ تم بھی تکلف محسوس نہ کرو۔"

وہ مربیانہ انداز میں مسکرایا۔ "میں سمجھ گیا' تم اپنے آپ کو مجھ پر بوجھ محسوس کررہے ہو۔ تم یہاں رہنے اور کھانے پینے کا صلہ چکانا چاہتے ہو۔ مجھے تمہاری بات سُن کر افسوس ہوا ہے۔ تم میرے مہمان ہو۔ مہمان بوجھ نہیں ہوتا اور مہمان اگر گھر میں رہتا ہے' کھاتا پیتا ہے تو اس کے بدلے اس سے مزدوری نہیں کرائی جاتی۔" اس کی مسکراہٹ میں افسردگی تھی اور اس کے لہجے سے واقعی دکھ نمایاں تھا۔

میں نے جلدی سے کہا "اگر تمہیں میری بات سے رنج پہنچا ہے تو میں معافی چاہتا ہوں۔ میں نے یہ بات کسی خاص خیال کے تحت نہیں کہی تھی۔ تم میرا سراپا دیکھ رہے ہو نا؟ اچھا بھلا سوا چھ فٹ کا جوان ہوں۔ اس قد کاٹھ اور جان کے ساتھ فارغ بیٹھے ہوئے مجھے عجیب لگتا ہے۔ میں خود اپنی نظر میں شرمندہ ہونے لگتا ہوں۔ دل چاہتا ہے ہر وقت مصروف رہوں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے لیکن ایک آدھ دن بعد آرام سے بیٹھ کر اس موضوع پر بات کریں گے بلکہ میں تو کہتا ہوں 'ابھی تم تین چار دن آرام کرو' اپنے حالات پر غور کرو پھر کسی وقت فرصت میں بیٹھ کر مجھے بتانا تمہارا کیا پروگرام ہے' تم کیا چاہتے ہو۔ جلدی کی والی کوئی بات نہیں۔ تم دُر محمد کے مہمان ہو۔ اللہ نے دُر محمد کو بلّی بھی دیا ہے اور رزق بھی۔ تم یہاں رہ کر میرا کچھ نہیں کھارہے' اپنے مقدر کا کھارہے ہو۔"

وہ میرا کندھا تھپتھپا کر رخصت ہوگیا۔ میں وہاں بیٹھا حیرت سے سوچتا رہ گیا' کیا واقعی ابھی دنیا میں اس طرح کے لوگ موجود ہیں؟ کیا ابھی تک اس طرح کے خیالات کے ساتھ لوگ زندگی گزار رہے ہیں؟ میں ایسے شخص کے گھر میں مہمان بیٹھا ہوا تھا لیکن مجھے اس کے وجود پر یقین نہیں آرہا تھا۔ وہ خواب و خیال کی دنیا کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

لیکن پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اسی رنگا رنگی کا نام دنیا تھا۔ دنیا میں ہر رنگ کا انسان موجود تھا اور شاید یہ اچھے لوگوں ہی کے اعمال کا نتیجہ تھا کہ یہ زمین اپنی بُرائیوں اور خباثتوں' ظالموں اور فسادیوں کا بوجھ اُٹھائے ہوئے لشتم پشتم اپنی گردش میں مصروف تھی ورنہ شاید اپنا توازن کھو کر اب تک کسی دوسرے سیارے سے ٹکرا چکی ہوتی.... اور اس حادثے کا نام ہی شاید قیامت ہوتا۔

میں تخت پر لگے آرام دہ بستر پر دراز ہوگیا اور نہ جانے کس وقت میری آنکھ لگ گئی۔ شاید ابھی میرے جسم کو واقعی مزید آرام کی ضرورت تھی۔ دوپہر کو دُر محمد نے ہی آکر مجھے جگایا۔ اس کا بیٹا کھانا کھا کر دکان پر چلا گیا تھا اور وہ گھر آگیا تھا۔ وہ ایک تھیلے میں

اپنے ساتھ ایک نہایت معقول قسم کا نیا سلا ہوا شلوار قمیص بھی لایا تھا جو گویا خاص طور پر میری ہی جسامت کے شخص کے لیے سیا گیا تھا۔

دُر محمد بولا "میری دکان کے تھڑے پر ایک نوجوان درزی مشین لے کر بیٹھتا ہے۔ بعض لوگ میری دکان سے کپڑا خریدتے ہیں اور وہیں کے وہیں سلنے کے لیے دے دیتے ہیں۔ بڑا اچھا کاریگر ہے وہ لڑکا۔ میں نے صرف اسے اندازاً تمہارا ناپ بتایا اور دیکھو.... دو ڈھائی گھنٹے کے اندر اندر اس نے اچھا خاصا جوڑا سی دیا۔"

"لیکن آپ نے یہ تکلیف کیوں کی بھائی در محمد؟" میں نے قدرے شرمندگی سے کہا۔

"تم نے اپنے کپڑوں کی حالت دیکھی ہے؟" اس نے اپنائیت بھرے انداز میں مجھے ہلکا سا ڈانٹا تو میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میں جن حالات سے گزر کر آرہا تھا' ان کے بعد تو میرے جسم پر چیتھڑے جھولنے چاہیے تھے لیکن غنیمت تھا کہ چیتھڑے جھولنے میں ابھی کچھ کسر باقی تھی۔ لیکن حالت ظاہر ہے خاصی شرمناک تھی۔

اوطاق کے سامنے ہی ڈیوڑھی کے دوسری طرف غسل خانہ موجود تھا جس میں ہینڈ پمپ لگا ہوا تھا۔ دُر محمد کے اصرار کرنے پر میں وہاں جاکر تازہ تازہ پانی سے نہا کر نئے کپڑے پہن کر نکلا اور شاندار کھانا کھانے کے بعد گاؤ تکیے کے سہارے' تخت پر لگے بستر پر بیٹھا تو میں نے اپنے آپ کو اچھا بھلا بادشاہ سلامت محسوس کیا۔ میں نے گویا کوئی نیا جنم لیا تھا۔ ذہن پر ایک عجیب سرور سا طاری ہونے لگا۔

دُر محمد میری کایا پلٹنے کے بعد ایک بار پھر دکان پر چلا گیا۔ مجھے لیٹنے کے سوا کوئی کام نہیں سوجھ رہا تھا۔ میں گاؤ تکیے پر سر رکھ کر لیٹنے لگا تو مجھے قمیص کی جیب میں کچھ کھڑکھڑاہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ جیب میں سو سو کے دو نئے نوٹ موجود تھے۔ میں دیر تک انہیں ہاتھ میں لیے دیکھتا رہا اور میرے دل کو جیسے کچھ ہونے لگا۔ دُر محمد نے ان کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ وہ شاید انسان کے روپ میں کوئی فرشتہ تھا جسے قدرت نے میری مدد کے لیے بھیجا تھا۔ گو کہ میں گناہ گار اس قابل نہیں تھا۔

میں دیر تک گم صم سا بیٹھا رہا۔ دُر محمد نے مجھ سے میرے حالات نہیں پوچھے تھے لیکن کہا تھا کہ مجھے اپنے حالات پر غور کرنا چاہیے۔ سو میں اپنے حالات پر غور کرتا رہا۔ میں نے دل ہی دل میں کئی فیصلے کیے جن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مجھے دو تین دن تو... دُر محمد کی میزبانی سے استفادہ کرنا چاہیے اور سُن گُن لینی چاہیے کہ اس علاقے میں پولیس مجھے تلاش تو نہیں کررہی؟ اگر راستے صاف محسوس ہوں تو پھر مجھے یہاں سے نکل لینا چاہیے۔

لیکن انسان کے فیصلے اکثر دھرے رہ جاتے ہیں!

مغرب کے کافی دیر بعد دُر محمد گھر آیا تو اس کے چہرے سے

پریشانی ہویدا تھی۔ گو کہ وہ اسے چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک موڑھے پر بیٹھتے ہوئے بولا "افضل خان! یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں گھر سے رخصت کرنا چاہتا ہوں لیکن میں تمہیں خبردار کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ آج شام مغرب کی نماز سے واپس آتے وقت چائے خانے پر میں نے چھ سات خطرناک سی شکلوں والے آدمیوں کو دیکھا۔ کلاشنکوفیں ان کے پاس تھیں۔ مجھے ان کی باتیں بھی سُننے کا اتفاق ہوا۔ ان کا دھیان میری طرف نہیں گیا۔ وہ ایک شخص کو تلاش کر رہے تھے اور معلومات کر رہے تھے کہ وہ اس گاؤں میں تو نہیں آیا۔ انہیں جس حلیے کے شخص کی تلاش تھی وہ تم ہو۔ وہ صرف حلیہ ہی نہیں' افضل خان نام بھی بتا رہے تھے۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ دُر محمد بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "وہ کیٹی مراد سے آئے ہیں۔ رئیس مراد کے آدمی ہیں۔ تمہارا کھوج لگاتے ہوئے آئے ہیں اور انہیں کافی حد تک یقین ہے کہ تم اس گاؤں میں داخل ہوئے ہو۔"

اس نے ٹوپی کے اوپر اپنی پگڑی درست کرتے ہوئے گہری سانس لی۔ "کچھ لوگوں نے تمہیں میرے ساتھ آتے دیکھا ہے۔ اس گاؤں میں کسی اجنبی کا آنا ایک خبر ہوتی ہے۔ جلد یا بدیر وہ یہاں تک آ پہنچیں گے۔"

میں جمرال کے تھانے سے جو ریوالور اُٹھا کر بھاگا تھا وہ اس وقت میرے نیفے میں اڑسا ہوا تھا۔ میں قمیص کے اوپر سے ہی اس پر ہاتھ پھیر کر اس کی موجودگی کا اطمینان کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "میں اب چلتا ہوں بھائی دُر محمد! زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ تمہاری محبت اور تمہارا احسان مجھے یاد رہے گا۔"

اس نے مصافحہ نہیں کیا اور ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے تیزی سے بولا "میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم یہ مت سمجھنا' میں تمہیں جانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں... اور سچے دل سے کہہ رہا ہوں..... محض رسمی طور پر نہیں کہہ رہا ہوں کہ اگر تم نے کوئی جرم نہیں کیا تو اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھو اور جب تک جی چاہے یا جب تک حالات اجازت دیں یہیں رہو۔ اگر کچھ لوگ کلاشنکوفیں اُٹھائے آ گئے ہیں تو کیا ہوا۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ اللہ اپنا کرم کرے گا۔"

"نہیں دُر محمد! تم ہیرا آدمی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم مصیبت میں پڑو۔ تم نے جو کچھ کر دیا میرے لیے وہی بہت ہے۔ میں اپنی مرضی سے جا رہا ہوں۔ خود میرے اپنے حق میں بھی یہی بہتر ہے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

دل ہی دل میں مجھے کچھ حیرت بھی تھی کہ پولیس تو مجھے تلاش کرتی ہوئی یہاں تک نہیں پہنچی تھی لیکن دلبر خان کے آدمی پہنچ گئے تھے۔ شاید دلبر خان بھی ان کے ساتھ تھا۔

دُر محمد ایک لمحے متذبذب سے انداز میں کھڑا رہا پھر بجھے بجھے سے لہجے میں بولا "یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟"

"فی الحال تو آخری ہی ہے۔ آگے جو اللہ کو منظور۔" میں نے اس سے اجازت چاہی۔

"اچھا....." وہ پگڑی درست کرتے ہوئے بولا "تم نے اگر جانے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو میں تمہیں نہیں روک سکتا لیکن اگر میرے لائق کوئی اور خدمت ہے تو بتاؤ' میں پوری کوشش کروں گا....."

"بس کرو بھائی دُر محمد! اب مجھے اپنے احسان کے بوجھ سے بالکل ہی زمین میں گاڑنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے اسے سینے سے لگا لیا اور فرطِ جذبات میں بے اختیار تھوڑا سا بھینچ دیا۔ وہ بھاری بھرکم اور مضبوط جُثے کا آدمی تھا لیکن یکدم اس کے حلق سے گھٹی گھٹی سی چیخ نکل گئی۔

میں نے جلدی سے اسے چھوڑ دیا۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا "تم نے تو پسلیاں ہی توڑ ڈالیں۔ ہم جیسے سیدھے سادے لوگوں پر ہاتھ ذرا ہلکا ہی رکھا کرو۔"

"معافی چاہتا ہوں بھائی!" میں نے دلی طور پر معذرت کی۔ "ہاتھ تو ہلکا ہی رکھا تھا۔"

اس کی سانس اعتدال پر آئی تو بولا "آؤ میں تمہیں باہر تک چھوڑ آؤں۔"

وہ پریشان ضرور تھا لیکن خوفزدہ نہیں تھا مگر دوسرے ہی لمحے اس کا بیٹا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ کافی خوفزدہ نظر آ رہا تھا۔ وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں باپ سے مخاطب ہوا۔ "میں نے ابھی اچانک دوسرے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے چار آدمی کلاشنکوفیں لیے کھڑے ہیں اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے ہیں۔"

دُر محمد اب بھی خوفزدہ نہیں ہوا۔ اس نے زیرِ لب شاید کوئی آیت پڑھی پھر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے تیزی سے بولا "میرے مکان میں پچھلا دروازہ بھی ہے۔ آؤ..... اِدھر سے نکل جاؤ۔"

وہ مجھے لیے تیزی سے ڈیوڑھی کے راستے اندر پہنچا۔ اس کی بیوی اور بیٹیاں صحن میں بیٹھی کچھ کام کر رہی تھیں۔ وہ اچانک ہمیں دیکھ کر کچھ گڑبڑا سی گئیں لیکن دُر محمد ان سے کچھ کہے بغیر مجھے ساتھ لیے صحن عبور کر کے دو کمروں کے درمیان بنے ہوئے ایک تنگ سے راستے کی طرف بڑھا۔ اس تنگ سی راہداری کے اختتام پر لکڑی کا ایک چھوٹا سا دروازہ تھا۔ دُر محمد نے پہلے خود دروازہ کھول کر باہر گلی میں جھانکا اور گویا مجھے سگنل دیا۔ "کوئی نہیں ہے۔ نکل جاؤ۔" یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ میں پچھلی گلی میں نکل آیا۔ دروازہ آہستگی سے میرے عقب میں بند ہو گیا۔ درحقیقت میں اور دُر محمد نے کافی وقت باتوں میں ضائع کر دیا تھا۔ مجھے اس کی دلبر خان کے آدمیوں کے بارے میں اطلاع ملتے ہی نکل جانا چاہیے

تھا۔ لیکن اس نیک دل شخص سے کچھ کہے سُنے بغیر یک دم ہی رسی تڑا کر بھی تو بھاگا نہیں جا سکتا تھا۔

اس تاخیر کا احساس مجھے اس وقت ہوا جب میں نے گلی کے بائیں سرے کی طرف دو قدم بڑھائے۔ تیسرا قدم بڑھانے کی نوبت نہیں آئی۔ اسی لمحے گلی کے سرے پر دو سائے نمودار ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں کلاشنکوفیں بھی مجھے نظر آ گئیں۔ اسی لمحے کسی مکان کی کھڑکی سے دُھندلی سی روشنی ان میں سے ایک کے چہرے پر پڑی اور میں نے اسے پہچان لیا۔ میرے جسم میں خفیف سی سنسنی دوڑ گئی۔ وہ محبت علی تھا۔

انہوں نے بھی یقیناً مجھے دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ کلاشنکوفیں سیدھی کرنے ہی لگے تھے۔ زندگی یا موت کے انتخاب کے لیے وہ ایک فیصلہ کن لمحہ تھا۔ میرے پاس شاید ایک سیکنڈ یا اس سے بھی کم وقت تھا۔ اگر میں پلٹ کر بھاگتا تو یقیناً وہ دونوں برسٹ مارتے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔

ریوالور میرے ہاتھ میں آ چکا تھا۔ تمام تر عجلت کے باوجود میں نے نہایت ٹھنڈے دل سے دو فائر کیے۔ دونوں کے لیے ایک ایک گولی ہی کافی رہی۔ میں نے دونوں کو اچھل کر گرتے دیکھا۔ جو کام میں کیٹی مراد میں ادھورا چھوڑ آیا تھا' وہ گویا اب پورا ہوتا دکھائی دیا۔

جس طرف وہ دونوں گرے تھے اب اسی طرف جانا مناسب نہیں تھا۔ میں مشینی سے انداز میں گلی کے دوسرے سرے کی طرف گھوما اور نہایت بروقت ہی گھوما کیونکہ عین اسی لمحے اُدھر سے بھی دو کلاشنکوف بردار نمودار ہوتے دکھائی دیے۔ وہ تو کلاشنکوفیں سیدھی بھی کیے ہوئے تھے لیکن اس سے پہلے کہ وہ صورتِ حال کو سمجھتے اور ان کی انگلیاں ٹریگر دباتیں' میرے ریوالور سے تقریباً ایک ساتھ ہی نکلنے والی دو گولیاں ان کا بھی لہو چاٹ گئیں۔ وہ دونوں ہی اوندھے منہ گرے۔ شاید اس لیے کہ دونوں بہت تیزی میں تھے۔

مجھے خوشی تھی کہ میرا نشانہ بے خطا رہا تھا۔ ایک گولی بھی ضائع نہیں گئی تھی۔ مجھے بڑی کفایت شعاری سے کام لینا تھا۔ ریوالور میں صرف چھ گولیاں تھیں۔ اس سے زیادہ تو نہیں ہو سکتی تھیں اور اسے ری لوڈ کرنے کے لیے میرے پاس فاضل گولیاں نہیں تھیں۔ ان چھ گولیوں میں سے چار خرچ ہو چکی تھیں۔

بہرحال ریوالور سے صرف چار فائروں میں چار کلاشنکوف برداروں کو ڈھیر کر دینا کوئی بُری کارکردگی نہیں تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو اور اس ریوالور کو شاباش دی۔ مجھے اس ریوالور کی طرف سے ڈر ہی تھا۔ وہ پولیس والے کا ریوالور تھا۔ دھوکا بھی دے سکتا تھا۔ بعض پولیس والوں کے اسلحے کی برسوں استعمال کی نوبت نہیں آتی تھی اور اسے زنگ لگ جاتا تھا۔

میں اس ریوالور کو دُر محمد کی بیٹھک میں آرام کے دوران چیک تو کر چکا تھا۔ ریوالور لوکل میڈ نہیں تھا۔ اعشاریہ چار پانچ کا عمدہ کولٹ تھا ورنہ سرکاری لوگوں کے پاس عموماً لوکل ہوتے ہیں۔ تاہم میں اس کی طرف سے زیادہ مطمئن نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں نے زندگی اور موت کے فیصلہ کن لمحات میں خدا کی ذات کے بعد اس پر انحصار کیا تھا۔ اس نے مجھے دھوکا تو نہیں دیا تھا لیکن کم بخت کی گرج کچھ زیادہ ہی تھی۔

اس نے گویا اس پُرسکون گلی میں تمام مکانوں کے درو دیوار ہلا دیے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ دوسری طرف کی گلی میں بھی مسلح آدمی موجود ہوں گے اور وہ اب اِدھر ہی دوڑے آ رہے ہوں گے۔ ایک جگہ جہاں تاریکی ذرا گہری تھی' میں وہاں دیوار سے چپک گیا لیکن اسی لمحے ایک کتّے نے زیادہ بہتر سمت میں میری رہنمائی کی۔

درحقیقت وہ فائروں کے دھماکوں سے خوفزدہ ہو کر دُم دبا کر بھاگا تھا اور شاید گھبراہٹ میں بھونکنا یا چیاؤں چیاؤں کرنا بھی بھول گیا تھا۔ میں نے دیکھا' وہ مکانوں کی سامنے والی قطار میں ایک مقام پر دو مکانوں کے درمیان گھُسا اور غائب ہو گیا۔

وہاں بھی تاریکی زیادہ تھی' اسی لیے میں ابھی دیکھ نہیں سکا تھا کہ مکانوں کے درمیان وہاں تھوڑی سی جگہ خالی تھی۔ اب کتّے کے اِدھر بھاگنے سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ تنگ سی ایک دراڑ نما گلی تھی جس سے ایک وقت میں شاید ایک آدمی ہی گزر سکتا تھا۔ میں نے مزید کلاشنکوف برداروں کی آمد کا انتظار نہیں کیا اور کتّے کے پیچھے پیچھے اسی طرف لپک پڑا۔

اس تنگ سی گلی نے مجھے دوسری طرف ایک کشادہ گلی میں پہنچا دیا جہاں ایک کھلی سی جگہ پر کئی بھینسیں بندھی ہوئی تھیں جو غالباً دھماکوں کی بازگشت پر گردنیں اونچی کر کے متفکرانہ سے انداز میں کان ہلا رہی تھیں۔ اس وقت تک کچھ لوگ بھی خوفزدہ سے انداز میں گھروں سے جھانکنے لگے تھے لیکن باہر گلی میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔

میں کسی کی پروا کیے بغیر بھینسوں سے کترا کر نکلتا ہوا ایک طرف کو بھاگا۔ میں ایک اور کشادہ گلی میں جا پہنچا جہاں مکان ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے نہیں تھے۔ نہ جانے کیوں بیچ بیچ میں کافی جگہ خالی تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے رُکا۔ میں اس سمت میں بھاگنا چاہتا تھا جدھر سے میں گاؤں سے باہر نکل جاتا۔

اچانک میرے عقب میں کہیں کلاشنکوف گرجی۔ معلوم نہیں انہوں نے کس پر گولیاں چلائی تھیں۔ شاید یونہی وحشت پھیلانے

کے لیے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ اس وقت تک میں ایک سمت منتخب کرکے دوڑ پڑا تھا۔ ریوالور ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔

چند سیکنڈ بعد ہی میں ایک گلی کے سرے پر پہنچا تو سامنے ہی مجھے کھلا میدان سا نظر آیا۔ اس گلی کے کونے پر خوب روشنی تھی۔ دراصل اس کونے پر ایک چائے خانہ تھا جس کے سامنے لکڑی کی بینچیں دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ دیہہ کے چھپر ریستوران سے کافی ملتا جلتا تھا۔

فائرنگ کی آوازیں پوری شدت کے ساتھ تو نہیں' البتہ کسی نہ کسی حد تک یہاں بھی پہنچ چکی تھیں کیونکہ یہاں سکوت پھیلا ہوا تھا۔ یہاں سکوت ہونا نہیں چاہیے تھا کیونکہ کافی لوگ موجود تھے۔ کچھ دیر پہلے تک وہ یقیناً خوش گپیوں میں مصروف تھے لیکن اب سر اُٹھائے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

اسی لمحے میدان کی طرف سے ایک نوعمر لڑکا چم چم کرتی ایک نئی موٹر سائیکل پر بیٹھا' نہایت کم رفتار سے اسے چلاتا ہوا ایک بینچ کے قریب آکر رکا۔ وہ خود بھی صاف ستھرے لباس میں تھا اور خوب کنگھی پٹی کرکے نکلا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ موٹر سائیکل اسے اسی روز ملی ہو اور وہ چائے خانے پر اپنے دوستوں کو دکھانے لایا ہو۔

اچانک کلاشنکوف ایک بار پھر گرجی۔ اب بھی اس کی آواز قریب سے ہی آئی تھی۔ اگر وہ لوگ میرے تعاقب میں آرہے تھے تو یہ کام یقیناً میرے حق میں بہت اچھا کر رہے تھے کہ اپنی آمد کی اطلاع دیتے آرہے تھے جس طرح پولیس والے خوب سائرن بجاتے' کرّوفر سے آتے ہیں اور راستے بھر گویا مجرموں کو خبردار کرتے رہتے ہیں کہ وہ اپنی حفاظت اور فرار کا کوئی معقول بندوبست کرلیں۔ اس کے باوجود اگر وہ نہ بھاگ پائیں تو یہ ان کی نالائقی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد پولیس کو بادلِ نخواستہ ان نالائقوں کو پکڑنا ہی پڑتا ہے۔

نئی موٹر سائیکل والا لڑکا بھی چائے خانے پر آکر رک تو گیا تھا لیکن قدرے خوفزدہ تھا اور اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ میں اندھیرے میں تھا۔ مجھے ابھی کوئی بھی نہیں دیکھ پایا تھا۔

میں نے اس ایک لمحے میں جو فیصلہ کیا وہ مجھے اچھا تو نہیں لگا لیکن مجبوری آن پڑی تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آرہا تھا۔ میں نے یکدم اندھیرے سے نکل کر لمبے لمبے دو تین ڈگ بھر کر' لڑکے کے قریب پہنچ کر ریوالور اس کی پسلیوں پر رکھ دیا اور نیچی آواز میں حکم دیا۔ "موٹر سائیکل چھوڑ دو۔"

میں نے پوری کوشش کی تھی کہ میرا لہجہ ایک خطرناک شخص کا لہجہ محسوس ہو جو اپنے حکم کی تعمیل نہ ہونے پر قتل بھی کرسکتا تھا حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ لڑکے کی آنکھیں خوف سے پھیل گئیں لیکن وہ موٹر سائیکل چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ شاید اس کی آرزو بڑے جتن سے پوری ہوئی تھی اور شاید موٹر سائیکل پر وہ اس کا پہلا ہی دن تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس نے ہینڈل زیادہ سختی سے پکڑلیا تھا۔ تاہم اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی۔

دو تین قیمتی سیکنڈ ضائع ہوچکے تھے۔ میں نے ایک ہاتھ سے ہینڈل پکڑتے ہوئے ریوالور زیادہ سختی سے اس کی پسلیوں میں چبھویا۔ اس نے ہینڈل چھوڑ دیا لیکن موٹر سائیکل سے نہیں اُترا۔ تب میں نے محسوس کیا کہ درحقیقت اس کے جسم سے یکدم جان سی نکل گئی تھی۔ اس میں موٹر سائیکل سے اُترنے کی بھی سکت نہیں تھی۔

میں نے اسے ہلکا سا دھکا دیا تو وہ کچھ دور کچی زمین پر جاگرا۔ میں نے ریوالور دانتوں میں دباتے ہوئے موٹر سائیکل سنبھالی۔ موٹر سائیکل ابھی اسٹارٹ ہی تھی۔ میں نے اسے دائرے میں گھمایا اور اندازاً سڑک کی طرف روانہ ہوگیا۔ کسی نے مجھے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ میں کھٹ کھٹ گیئر بدلتا اور رفتار بڑھاتا چند سیکنڈ میں ہی چائے خانے سے دور نکل آیا۔

میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ کچھ دیر بعد میں اندھیرے میں ذرا سڑک تک آپہنچا۔ سڑک پر پہنچتے ہی میں نے موٹر سائیکل کو اس کی انتہائی رفتار سے دوڑانے کی کوشش کی۔ وہ بہت کم طاقت کے انجن کی موٹر سائیکل تھی لیکن وہ سڑک بھی کچھ ایسی شاندار نہیں تھی۔ اس پر جابجا گڑھے تھے' کہیں عجیب و غریب قسم کے اُبھار تھے اور کہیں سے وہ شکستہ تھی۔ اس کے علاوہ میرے لیے وہ سڑک اجنبی بھی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا اس میں کہاں موڑ آجائے' کہاں کوئی رکاوٹ ہو۔ اس صورت میں اتنی ہلکی موٹر سائیکل کو بھی پوری رفتار سے دوڑانا کم خطرناک نہیں تھا۔ کہیں بھی کوئی چیز میرے لڑھکنے کا باعث بن سکتی تھی جس کے نتیجے میں کھوپڑی بھی پاش پاش ہوسکتی تھی اور ہاتھ پاؤں بھی ٹوٹ سکتے تھے۔ لیکن میں تن بہ تقدیر چلا جارہا تھا۔

کئی بار میں نے مڑ کر دیکھا لیکن کوئی گاڑی اپنے تعاقب میں آتی دکھائی نہ دی۔ ویسے بھی سڑک پر کوئی ٹریفک نہیں تھا۔ صبح ہی دُرِ محمد نے گفتگو کے دوران بتایا تھا کہ ان علاقوں میں سرِشام سڑکوں پر ٹریفک بند ہوجاتا تھا۔

مطمئن ہوکر میں نے رفتار ذرا کم کرلی۔ اس رفتار سے چند منٹ کے سفر کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میں خطرے کی حدود سے نکل آیا تھا لیکن عین اس وقت جب یہ خیال میرے ذہن میں آیا' مجھے موٹر سائیکل کے عقب نما آئینے میں دو روشن نقطے سے نمودار ہوتے دکھائی دیے۔

میں نے مڑ کر دیکھا' وہ دو ہیڈ لائٹس تھیں اور جس تیزی سے وہ بڑی ہوتی دکھائی دے رہی تھیں اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی گاڑی بہت تیز رفتاری سے میرے تعاقب میں چلی آرہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر موٹر سائیکل کی رفتار بڑھائی اور چند لمحے بعد مڑ کر دیکھا۔ ہیڈ لائٹس کچھ اور قریب آچکی تھیں۔ اب میں انہیں پہچان بھی سکتا تھا۔ وہ یقیناً کسی جیپ کی ہیڈ لائٹس تھیں۔ میں اس سڑک پر' اس موٹر سائیکل پر تیز رفتاری کے معاملے میں جیپ کو شکست نہیں دے سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے ایک بار پھر گردن گھما کر دیکھا۔ جیپ کچھ اور قریب آچکی تھی۔ اب تو میں موٹر سائیکل کے ساتھ ساتھ اس کے انجن کی خفیف سی گھرگھراہٹ بھی سُن سکتا تھا۔ پھر ایک دھماکا سنائی دیا جو اس ویرانے میں' اس سکوتِ شب میں بہت بلند محسوس ہوا۔ اس کے بعد پے در پے دو اور دھماکے ہوئے۔

دراصل رائفل سے فائر کیے جارہے تھے لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ جیپ اور موٹر سائیکل' دونوں ہی چیزیں متحرک ہونے اور فاصلہ اب بھی اچھا خاصا ہونے کی وجہ سے گولیاں میرے دائیں بائیں سے گزر گئی تھیں۔ موٹر سائیکل کی ہیڈ لائٹ کی روشنی سڑک پر لہرا رہی تھی اور ٹیل لائٹ بھی روشن تھی۔ انہی دو چیزوں کو ٹارگٹ بناتے ہوئے وہ فائر کر رہے تھے۔ ان کے پاس یقیناً کلاشنکوفوں کے علاوہ رائفلیں بھی تھیں۔ اب تو جیپ سے کافی پیچھے ایک اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس بھی نظر آنے لگی تھیں۔

میرے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ تن بہ تقدیر ہوکر ہیڈ لائٹ آف کرکے کچے میں اتر جاؤں۔ ہیڈ لائٹ کے ساتھ ہی ٹیل لائٹ بھی آف ہوجاتی۔ اس کے بعد ان کے لیے یہ تعین کرنا مشکل ہوجاتا کہ میں کدھر گیا؟ میری خوش قسمتی تھی کہ اب بھی سڑک کے دونوں طرف ناہموار لیکن میدانی سا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ فی الحال میرے اور تعاقب کرنے والی گاڑیوں کے درمیان اتنا فاصلہ ضرور تھا کہ اگر میں اچانک ہی اندھیرے کی آغوش میں اُتر جاتا تو ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا کہ وہ کس سمت میں میرا

تعاقب جاری رکھیں۔

میں نے سوچ بچار میں، زیادہ وقت ضائع نہیں کیا۔ زندگی تو ہر طرح سے خطرے ہی میں تھی۔ اسی اثنا میں دو فائر مزید ہوئے۔ ایک گولی تو میرے بالوں کو تقریباً چھوتی ہوئی ہی گزر گئی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے موٹر سائیکل کی ہیڈلائٹ آف کردی۔ انہیں یہ گمان بھی گزر سکتا تھا کہ ان کا فائر کارگر ہوگیا ہے اور میں موٹر سائیکل سمیت سڑک پر گر گیا ہوں، گرنے کی وجہ سے موٹر سائیکل کی لائٹ بجھ گئی ہے۔

اسی اُمید کے ساتھ میں نے موٹر سائیکل کچے میں اُتار لی اور سڑک سے بالکل ہی مختلف سمت میں موڑلی۔ موٹر سائیکل ہچکولے کھاتی ہوئی بڑھتی چلی گئی۔ ایک اچھی بات یہ تھی کہ موٹر سائیکل نئی ہونے کی وجہ سے اس کے انجن کی آواز برائے نام تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر راستہ دیکھنے کی کوشش کررہا تھا کہ کہیں ایسی چیز سے نہ ٹکرا جاؤں جو میرے لیے خطرناک ثابت ہو۔ راستے کا کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہورہا تھا لیکن اندھیرے میں اس ناہموار کچے علاقے میں اس رفتار سے موٹر سائیکل پر نہیں جانا چاہیے تھا جس رفتار سے اس وقت میں جارہا تھا۔

میں نے کئی بار مڑ کر بھی دیکھا۔ سڑک کافی پیچھے رہ گئی تھی لیکن اس پر متحرک، دو گاڑیوں کی ہیڈلائٹس مجھے نظر آرہی تھیں لیکن کبھی زاویہ ایسا ہوجاتا کہ وہ میری نظر سے اوجھل ہوجاتیں۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اس مقام سے آگے نکل گئی تھیں جہاں سے میں کچے میں مڑا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اندھا دھند چلے جارہے تھے۔ اگر وہ یہ بھی سمجھ رہے تھے کہ میں گولی کھا کر کہیں لڑھک گیا ہوں تب بھی انہیں صحیح اندازہ نہیں تھا کہ مجھے کہاں تلاش کرنا چاہیے۔

مجھے اُمید تھی کہ کافی آگے جاکر انہیں احساس ہوگا کہ ان کا شکار تو سڑک پر کہیں گرا ہوا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے بعد شاید وہ سوچیں گے کہ میں کچے میں سڑک کے دائیں یا بائیں کچھ دور جا گرا ہوں گا۔ شاید وہ گاڑیاں واپس موڑ کر ہیڈلائٹس کی مدد سے مجھے سڑک کے آس پاس تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

ظاہر ہے سڑک کے آس پاس میں کہیں بھی انہیں نہیں مل سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کے بعد ان کے لیے بڑی اُلجھن کھڑی ہوجائے گی۔ اس وقت تک میں اور دور نکل چکا ہوں گا۔ ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوجائے گا کہ اس بیکراں ویرانے میں میں نے کس طرف کا رخ کیا ہوگا؟

گویا میں انہیں ڈاج دینے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ یہ صرف اس لیے ممکن ہوسکا تھا کہ میں نے ہیڈلائٹ آف کرکے اپنی زندگی کے لیے خطرہ مول لیا تھا۔ اگر میں ہیڈلائٹ آن رکھتا تو مجھے راستہ دیکھنے اور نشیب و فراز سے خبردار رہنے کی تو سہولت رہتی لیکن وہ آسیب کی طرح میرے پیچھے لگے رہتے اور جلد یا بدیر آخر کار مجھ تک آن پہنچتے۔ اب انہیں یہ یقین آنے میں بڑی دیر لگنا تھی، میں نے ہیڈلائٹ آف کرکے کچے میں اُترنے کی جرات کی ہوگی۔

یہ سب کچھ سوچنے کے بعد مجھے کچھ اطمینان ہوگیا اور میں۔ رفتار کچھ کم کرلی تاکہ حادثہ پیش آنے کا امکان ذرا کم ہوجائے مجھے اب خاطر خواہ مہلت میسّر آچکی تھی۔ اب مجھے صرف یہ دیکھ تھا کہ قسمت کہاں تک میرا ساتھ دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سفر تھا بہت دشوار۔

کبھی موٹر سائیکل اچانک کسی گڑھے میں گر کر بری طرح اُچھلتی اور میں گرتے گرتے بچتا۔ کبھی اتنا بڑا گڑھا آجاتا کہ موٹر سائیکل اس میں اُتر ہی جاتی اور مشکل سے باہر آتی۔ کبھی اچانک ہی کوئی تودا سامنے آجاتا اور اس سے ٹکرانے سے بچنے کے لیے مجھے اچانک ہی ہینڈل گھمانا پڑتا۔ اس طرح بھی میں گرتے گرتے بچتا۔ کسی گڑھے میں برساتی پانی موجود ہوتا اور چھینٹے اُڑتے تو مجھے اپنی ٹانگیں بھیگتی محسوس ہوتیں۔ کہیں زمین نرم اور ریتیلی ہوتی جس میں موٹر سائیکل کی رفتار بالکل کم کرنا پڑتی۔

غرضیکہ بالکل ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے میں موٹر سائیکل پر سفر نہیں کررہا تھا بلکہ سرکس میں کرتب دکھا رہا تھا۔ موٹر سائیکل کا تو نہیں کیا حال تھا، لیکن مجھے اپنا انجر پنجر ہلتا محسوس ہورہا تھا۔ دماغ کی چولیں بھی گویا ہل گئی تھیں۔ اچھی بات یہ تھی کہ موٹر سائیکل ساتھ دیے جارہی تھی اور جو خواری میں برداشت کررہا تھا وہ فائدہ مند ثابت ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

یعنی مجھے اپنے عقب میں اب گاڑیوں کی ہیڈلائٹس کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میں سڑک سے بہت دور نکل آیا تھا اور گاڑیاں بھی اب مجھ سے کہیں بہت زیادہ فاصلے پر تھیں۔ اس کے باوجود میں نے موٹر سائیکل کی ہیڈلائٹ آن کرنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ البتہ اب میں ذرا اور کم رفتار سے، ذرا محتاط انداز میں سفر کرنے لگا۔

میں تقریباً ایک گھنٹا محوِ سفر رہا۔ پھر اندھیرے میں میرے سامنے ذرا اور گہرے اندھیرے کی ایک دیوار سی آگئی۔ قریب پہنچ کر میں نے دیکھا، وہ ایک نہر کا پشتہ تھا۔ میں نے موٹر سائیکل کو کچی مٹی کے پشتے پر چڑھانے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اسے نیچے چھوڑ کر خود پشتے پر چڑھ کر دیکھا۔

نہر زیادہ چوڑی نہیں تھی لیکن ظاہر ہے میں موٹر سائیکل سمیت تو نہر پار نہیں کرسکتا تھا۔ جہاں تک نظر کام کررہی تھی وہاں تک کوئی پُل وغیرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ چنانچہ میں نے ایک بار پھر موٹر سائیکل پر بیٹھ کر نہر کے متوازی سفر شروع کردیا۔ اب میری سمت بدل گئی اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ سمت بدلنا میرے لیے فائدہ مند ثابت ہوگا یا نقصان دہ؟

آدھے پونے گھنٹے کے سفر کے بعد آباد زمینوں یعنی کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اس کا مطلب تھا، اب کوئی نہ کوئی آبادی بھی

قریب ہی تھی۔ میں کھیتوں کے درمیان پگڈنڈیوں پر سفر کرتا رہا۔ جلد ہی مجھے تاریکی میں ڈوبا ہوا ایک گاؤں دکھائی دیا لیکن میں نے ادھر کا رخ نہیں کیا بلکہ سیدھا ہی نکلتا چلا گیا۔ گاؤں کی طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ اِکّا دُکّا کتا کہیں کہیں کھیتوں کے درمیان بھی موجود تھا۔ ان میں سے ایک تو میرے پیچھے بھی لپکا لیکن کچھ دیر کے تعاقب کے بعد پیچھا چھوڑ گیا۔

میں نے ابھی تک ہیڈلائٹ روشن نہیں کی تھی اور گاؤں میں بھی محض احتیاطاً نہیں رکا تھا۔ میری کوشش یہی تھی کہ تعاقب کرنے والوں سے زیادہ سے زیادہ دور نکل جاؤں۔ اب سمت تبدیل ہونے کے بعد مجھے یہ بھی خطرہ تھا کہ جو سڑک میں نے چھوڑی تھی، اگر اس میں زیادہ پیچ و خم ہوئے تو کہیں میں دوبارہ اسی پر نہ پہنچ جاؤں، اسی سے جڑی ہوئی کسی اور سڑک پر نہ جانکلوں جس پر دلبر خان اور اس کے آدمی بھی محوِ سفر ہوں۔

کھیتوں کے ایک طویل سلسلے کے بعد ایک گاؤں اور آیا لیکن میں اس کے بھی قریب سے گزرتا چلا گیا۔ اس سے چند میل آگے پہنچا تو موٹر سائیکل میں پٹرول ختم ہوگیا۔ وہ ریزرو پر لگ گئی اور دوبارہ چل تو پڑی لیکن اب اس کے انجن سے دُھواں اٹھتا محسوس ہورہا تھا۔ ظاہر ہے جس قسم کا سفر میں اس پر کررہا تھا وہ اس کے لیے موزوں نہیں تھی تاہم اس نے میرا بڑا ساتھ دیا تھا۔ اب مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ ریزرو پر مزید کتنے میل چل سکے گی۔ چنانچہ ایک لمحے کے لیے میں اُلجھن میں پڑگیا کہ کیا مجھے اس گاؤں کی طرف لوٹ جانا چاہیے جسے میں پیچھے چھوڑ آیا تھا؟

اندیشہ تھا کہ آگے چل کر کسی ویرانے میں ریزرو پٹرول ختم نہ ہوجائے۔ اس لیے عقل کا تقاضا تو یہی تھا کہ میں اسی گاؤں کی طرف لوٹ جاتا جس سے میں ابھی زیادہ دور نہیں آیا تھا لیکن بعض معاملات میں، میں عقل سے زیادہ اپنی حسّیات پر بھروسا کرتا ہوں میری حسّیات نہ جانے کیوں ابھی کچھ مطمئن نہیں تھیں۔ میں اپنے آپ کو ابھی خطرے سے محفوظ محسوس نہیں کررہا تھا۔ میرے اندر کوئی موہوم سی آواز کہہ رہی تھی "ابھی چلتے رہو..... ابھی چلتے رہو۔"

اندر کی یہ آواز گوکہ بالکل موہوم تھی لیکن میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا اور موٹر سائیکل واپس نہیں گھمائی البتہ اب میں نے اس حد تک خطرہ ضرور مول لیا کہ ہیڈلائٹ آن کرلی۔ اس سے سفر میں بڑی آسانی ہوگئی۔

لیکن اس سہولت سے میں زیادہ دیر تک استفادہ نہ کرسکا۔ میں نے مزید پندرہ بیس میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ پٹرول ختم ہوگیا۔ اب موٹر سائیکل بیکار تھی اور وہی ہوا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ آس پاس آبادی کے کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ نظر کی رسائی سے دور اندھیرے میں کیا کچھ تھا، اس کے بارے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔

بہرحال اب پچھتانا فضول تھا۔ وہ میرا اپنا فیصلہ تھا۔ میں نے موٹر سائیکل وہیں چھوڑی اور پیدل آگے روانہ ہوگیا۔ دوڑنے کی اب ضرورت نہیں تھی۔ میں محض تیز تیز چلنے پر اکتفا کررہا تھا۔ کم از کم اجالا پھیلنے تک تو میرا اسی رفتار سے چلنے کا ارادہ تھا۔ اس کے بعد مجھے ازسرِنو سمت کا تعین کرنا تھا۔

لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مجھے چلتے ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ میں نے اپنے آپ کو ایک ایسے مقام پر پایا جہاں سامنے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ درخت زیادہ گنجان نہیں تھے۔ وہ کوئی چھوٹا موٹا جنگل سا معلوم ہوتا تھا لیکن میں نے اس میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی۔ میں باہر ہی باہر اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

میں نے جنگل کے گرد گھومنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ جہاں درختوں کا سلسلہ ختم ہوا وہاں بھی میں سیدھا ہی چلتا رہا۔ رات کے اس سکوت میں، ان اجنبی اور ان دیکھے ویرانوں میں، ایک بے سمت اور بے منزل مسافر کے طور پر چلنا بھی عجیب ہی تجربہ تھا۔ مجھے اس تجربے سے گزرتے کافی دیر ہوگئی تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ اب میں کسی آبادی تک پہنچ جاؤں اور مجھے کوئی پناہ گاہ میسّر آجائے۔ اب مجھے یہ اطمینان تو ہوچکا تھا کہ میں دلبر خان اور اس کے آدمیوں کی رسائی سے بہت دور نکل آیا تھا اور اب میرا ان سے سامنا ہونے کا امکان بہت کم تھا۔

اس سمت میں سفر کرنا میرے حق میں بہتر ثابت ہوا۔ جلد ہی میں نے اپنے آپ کو سڑک پر پایا۔ یہ بھی تنگ سی ہی سڑک تھی لیکن اس کی حالت اس سے بہتر تھی جس پر میں اس سے پہلے سفر کرچکا تھا۔ معلوم نہیں یہ اسی سڑک کا کوئی حصہ تھا یا یہ کوئی دوسری سڑک تھی۔ اس کے دونوں طرف کہیں کہیں بے ترتیب سے درخت بھی نظر آرہے تھے۔

میں نے اس کے کنارے کھڑے ہوکر دائیں بائیں نظر دوڑائی

تو بائیں طرف بہت دور کہیں مجھے روشنی کے آثار نظر آئے۔ میں نے اس طرف چلنا شروع کر دیا۔

وہ جگہ میرے اندازے سے زیادہ دور تھی تاہم مجھے بھی کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا چلتا رہا۔ رفتہ رفتہ وہ جگہ میری نظر میں واضح ہوتی چلی گئی۔ وہ ایک خاصا بڑا چھپر ریستوران تھا جس کے سامنے بڑی بڑی اور بھاری چارپائیاں' بینچیں اور بے ہنگم میزیں بکھری ہوئی تھیں۔

چاروں طرف بانسوں پر چند ٹیوب لائٹس روشن نظر آ رہی تھیں جو غالباً جنریٹر سے منسلک تھیں۔ خاصے فاصلے پر ہی مجھے انجن کی سی ہلکی سی گھر گھراہٹ سُنائی دی تھی۔ وہ جگہ خاص طور پر ٹرک ڈرائیوروں کی پسندیدہ معلوم ہوتی تھی کیونکہ چھپر کے آس پاس صرف چند ٹرک ہی کھڑے نظر آ رہے تھے۔ دو چار افراد چارپائیوں پر لیٹے اور دو چار اِدھر اُدھر آتے جاتے دکھائی دے رہے تھے تاہم کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اِدھر اُدھر آتے جاتے آدمیوں کی حرکات و سکنات میں بھی ایک مخصوص سی کاہلی کی جھلک تھی جو رات بھر جاگنے والوں میں رات کے پچھلے پہر دیکھنے میں آتی ہے۔ رات کے سکوت اور خاموشی نے ماحول کو اپنی آغوش میں لیا ہوا تھا۔

میں روشنی کی رسائی سے دور ہی رک گیا لیکن ایک ایسے زاویے پر پہنچ گیا تھا جہاں سے میں بہتر طور پر چھپر ریستوران کا جائزہ لے سکتا تھا لیکن مجھے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کیونکہ میں اندھیرے میں تھا۔

ابھی میں صحیح طور پر جائزہ نہیں لے پایا تھا کہ ایک لمبی چوڑی چارپائی سے میں نے تین افراد کو اُٹھتے دیکھا۔ ان میں سے ایک نے قریب کھڑے ہوئے ایک بیرے کو کچھ ادائیگی کی اور وہ باتیں کرتے ہوئے ٹہلنے کے سے انداز میں ایک ٹرک کے قریب آ گئے جو چھپر کے ایک طرف اندھیرے میں کھڑا تھا لیکن میں کسی حد تک اس کا جائزہ لے سکتا تھا۔ اس پر ترپال تنی ہوئی تھی۔

ان میں سے دو افراد ٹرک کے اگلے حصے (کیب) میں سوار ہو گئے۔ تیسرا کیب کی چھت پر چڑھ گیا جہاں تابوت جیسا ایک خانہ سا بنا ہوتا ہے جس میں عموماً کلینر سوتا ہے۔ وہ غالباً کلینر ہی تھا۔ اوپر پہنچتے ہی وہ غالباً اس حصے میں لیٹ گیا تھا کیونکہ فوراً ہی مجھے اس کا ہیولا نظر آنا بند ہو گیا تھا۔

چند لمحے بعد خوفناک سی غراہٹ کے ساتھ ٹرک کا انجن جاگ اُٹھا۔ اس کی ہیڈ لائٹس اور ٹیل لائٹس بھی روشن ہو گئیں۔ ٹرک والے یقیناً اس اڈے پر کھانے پینے اور ستانے کے بعد اپنے سفر پر روانہ ہو رہے تھے۔ اسی لمحے میں نے انتہائی عجلت میں ایک فیصلہ کیا۔

ٹرک تو وہاں ابھی کئی اور کھڑے تھے لیکن کسی کی روانگی کے آثار نہیں تھے۔ اس کے علاوہ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں وہاں جا کر سیدھے سادے طریقے سے کسی ٹرک والے سے لفٹ کی درخواست کروں گا تو کوئی مجھے نہیں بٹھائے گا۔ اس علاقے کے حالات کچھ ایسے تھے کہ لوگ اپنے سائے سے بھی بدکتے تھے۔ شاہراہوں پر تو دن کی روشنی میں کوئی کسی پر بھروسا نہیں کرتا تھا۔ رات کے پچھلے پہر اس ویرانے میں اچانک ہی کسی نامعلوم سمت سے نمودار ہونے والے اجنبی کو کون اپنے ٹرک میں بٹھا سکتا تھا۔

اس کے علاوہ کسی اور ٹرک کے روانہ ہونے کی نوبت نہ جانے کب آتی۔ اس ٹرک کی لائٹس آن ہونے کے بعد مجھے کچھ اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے پچھلے حصے میں تھوڑی بہت جگہ خالی تھی۔ میں نے فوری طور پر یہی فیصلہ کیا تھا کہ آنکھ بچا کر مجھے اس میں سوار ہو جانا چاہیے۔ راستے میں اپنے نکتۂ نظر سے میں کوئی مناسب جگہ دیکھ کر اُتر سکتا تھا۔

ابھی ٹرک وہیں کھڑا گھر گھر کر رہا تھا۔ میں اندھیرے ہی میں رہتے ہوئے تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ اندھیرے میں اس کی ٹیل لائٹس کی سرخ سرخ روشنی بھی خاصی تیز محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے عقبی حصے کے قریب پہنچ کر میں رکوع کی سی حالت میں آ گیا تاکہ اگر کیبن کی چھت پر لیٹا ہوا کلینر گردن اونچی کر کے اِدھر اُدھر دیکھ بھی رہا ہو تو میں اس کی نظر میں نہ آؤں۔

قریب پہنچ کر تصدیق ہو گئی کہ ٹرک کے پچھلے حصے میں کچھ جگہ خالی تھی اور اس پر جن رسیوں سے ترپال بندھی ہوئی تھی ان کے درمیان بھی اتنا فاصلہ موجود تھا کہ میں ذرا آڑا ترچھا ہوتے ہوئے ٹرک میں داخل ہو سکتا تھا۔ اسی لمحے ٹرک نے رینگنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچ بچار میں مزید ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور لپک کر ٹرک کے پیچھے لٹک گیا۔

ٹرک نیم دائرے میں گھوم کر سڑک کی طرف آ رہا تھا۔ اس سے پہلے کہ اس کے پچھلے حصے کا رخ ریستوران کی روشنیوں کی طرف ہوتا' میں اس کے اندر پہنچ چکا تھا۔ ٹرک میں ترپال کے نیچے اتنی جگہ موجود تھی کہ کلینر کی طرح میں بھی آرام سے لیٹ سکتا تھا... اور میں نے یہی کیا۔ یعنی آرام سے لیٹ گیا۔

ٹرک میں پھلوں کی پیٹیاں لدی ہوئی تھیں اور پھلوں کی خوشبو بھی آ رہی تھی لیکن اس میں اس طرح کی گندگی نہیں تھی جیسی عموماً ٹرکوں میں.... اور خصوصاً پھلوں کی باربرداری کرنے والے ٹرکوں میں نظر آتی ہے۔ فرش بھی صاف ستھرا تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ میں کسی مستطیل صندوق میں لیٹا ہوا تھا۔ پچھلے حصے میں ہونے کی وجہ سے جھٹکے ذرا زیادہ لگ رہے تھے لیکن یہ ان جھٹکوں کے مقابلے میں کچھ نہیں تھے جو میں اب تک برداشت کر چکا تھا۔

نامعلوم منزلوں کی طرف میرا سفر جاری تھا۔ وقت اب تیزی سے گزرتا محسوس ہو رہا تھا۔ مجھے خوشی یہ تھی کہ میں مسلسل حرکت میں تھا۔ انسان حرکت میں رہے تبھی زندگی کا احساس رہتا ہے۔ وہاں لیٹے لیٹے مجھے کچھ گمان سا گزرا کہ شاید میں اس مسلسل بھاگ

دوڑ' افراتفری' موت و حیات کی کشمکش اور صعوبتوں سے لاشعوری طور پر کچھ لطف اندوز ہو رہا تھا۔ شاید مہم پسندی میری فطرت کی بنیادوں میں کہیں بیٹھی ہوئی تھی۔ شاید خطرہ پسندی میری طبیعت کا ایک حصہ تھی لیکن یہ لاشعوری رجحانات میری مصروفیات میں کچھ دب کر رہ گئے تھے.... بلکہ شاید دبے نہیں تھے' ہر دور میں ہی کسی نہ کسی انداز میں ان کی تسکین کا سامنا ہوتا رہا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد تھا' میں نے کبھی پُرسکون زندگی تو گزاری ہی نہیں تھی۔ مجھے یکساں اور سپاٹ انداز میں زیادہ دن گزارنے کا تو کبھی موقع ہی نہیں ملا تھا۔

اس لیے شاید میں سطحی طور پر تو پُرسکون زندگی گزارنا پسند کرتا تھا لیکن میرے اندر گہرائی میں کہیں کوئی پارہ صفت' سیلانی اور دشواریوں کی طلب رکھنے والا شخص چھپا ہوا تھا جو لاشعوری طور پر خود قدم قدم پر اپنے آپ کو آزمانا چاہتا تھا' ہر گھڑی اپنی صلاحیتوں کا امتحان لینا چاہتا تھا۔ شاید اس میں اس کے لیے کوئی لطف' کوئی لذت پنہاں تھی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ موجودہ حالات میں' میں اتنا زیادہ پریشان نہیں تھا جتنا کہ ان حالات میں ایک عام شخص کو ہونا چاہیے تھا۔

جس طرح میں خود کو بھٹکا رہا تھا اس میں قدم قدم پر ایک نئی دشواری سامنے آتی تھی' ہر روز گویا زندگی کا ڈھب بدل جاتا تھا' ہر موڑ پر ایک نئی ہی مصیبت منتظر ہوتی تھی۔ اسی لیے شاید تھوڑے ہی دنوں میں مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے گھر سے نکلے ایک زمانہ بیت گیا تھا۔ شاید میں مدتوں سے یونہی گمنام اور بے حیثیت تھا۔ گمنام اور بے حیثیت رہتے ہوئے اپنے مسائل کو حل کرنا اور مصائب کا سامنا کرنا ایک الگ ہی ہنر ہے۔

آپ شہر کے ممتاز شخص ہوں' آپ کے پیچھے دولت اور اثر و رسوخ کی طاقت ہو' آپ کے اشارے پر حرکت میں آ جانے والے بہت سے باصلاحیت اور وفادار لوگ موجود ہوں' آپ شاندار کوٹھی میں رہتے ہوں' عالی شان آفس میں بیٹھتے ہوں' آپ کے ایک ٹیلی فون پر بڑے بڑے کام ہو جاتے ہوں تو اس میں آپ کا کوئی خاص کمال نہیں ہوتا۔

آپ کی صلاحیتوں کی آزمائش اسی وقت ہوتی ہے جب آپ ایک گمنام اور بے حیثیت شخص ہوتے ہیں' آپ کے جسم پر پھٹے پُرانے کپڑے ہوتے ہیں' موت ہر روز نہ جانے کتنی بار عقاب کی طرح آپ پر جھپٹتی ہے لیکن آپ ہر بار اسے جُل دے جاتے ہیں۔ اپنی اپنی جگہ بڑی طاقت رکھنے والے لوگ آپ کے خون کے پیاسے ہوتے ہیں لیکن آپ انہیں اِدھر سے اُدھر نچاتے پھرتے ہیں۔ تبھی پتا چلتا ہے کہ آپ میں واقعی کچھ صلاحیت ہے' آپ زندگی کا ہنر جانتے ہیں۔

شاید میں انہی سوچوں' انہی محسوسات سے لذت اندوز ہو رہا تھا لیکن پھر اس گھوں گھوں کرتے ٹرک میں لیٹے لیٹے میرے ذہن میں ایک اور خیال نے سر اُبھارا۔ کہیں میں لاشعوری طور پر اپنے ایک نوعیت کے حالات سے فرار حاصل کرنے کے لیے دوسری نوعیت کے حالات میں پناہ تو تلاش نہیں کر رہا تھا؟

مجھے بھولنا نہیں چاہیے تھا کہ میں تو ریڈ ڈاٹ کی نظروں سے غائب ہونے کے لیے اپنے شہر سے بھاگا تھا جو کوئی آسان کام نہیں تھا کیونکہ محسوس کچھ ایسا ہی ہوتا تھا جیسے ریڈ ڈاٹ کی نظریں زمین کی تہوں میں بھی اپنے مطلوبہ انسان کو تلاش کر سکتی تھیں۔ تاہم ابھی تک آثار یہی بتا رہے تھے کہ میں انہیں ڈاج دینے میں کامیاب ہو چکا تھا' ان کی نظر سے اوجھل ہو چکا تھا' دنیا کی بھیڑ میں غائب ہو چکا تھا۔

شاید ان سے نمٹنا میرے لیے زیادہ دشوار' زیادہ خوفناک کام تھا اس لیے اس کے مقابلے میں' میں نے ان دشواریوں' ان صعوبتوں کا انتخاب کر لیا تھا جن سے میں گزر رہا تھا۔ یہ گویا ایک طرح کا فرار تھا' ایک قسم کا اعترافِ شکست تھا۔

مجھے یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ میں اپنے انتہائی قیمتی اور جاں نثار ساتھیوں کو ان کے رحم و کرم پر چھوڑ آیا تھا۔ مجھے خصوصاً راحیلہ اور ٹونی کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا جنہوں نے خاص طور پر میری خاطر اپنے آپ کو قربانی کے بکرے بنا لیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ میں یہ باتیں بھولا نہیں تھا۔ زندگی خواہ کتنی ہی منتشر گزر رہی تھی' روز و شب خواہ کتنے ہی دشوار تھے لیکن میں نے بارہا ان کے بارے میں سوچا تھا۔ تاہم میں نے اسی خیال سے کچھ اطمینان محسوس کیا تھا کہ وہ سب میری ہی طرح حالات سے نمٹنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے کسی کی بھی ذات کو اصل خطرہ لاحق نہیں تھا۔ ریڈ ڈاٹ کا اصل معتوب صرف میں ہی تھا۔ وہ غیر ضروری کاموں میں اُلجھنے اور بے مقصد اپنی توانائیاں ضائع کرنے والے لوگ نہیں تھے۔

مجھے یقین تھا کہ ان کی توجہ صرف اور صرف مجھے تلاش کرنے

پر مرکوز رہی ہوگی۔ میرے ایک ساتھی صفدر نے خود ہی بے پناہ اصرار کر کے میرے لیے قربانی کا بہت ہی خاص الخاص بکرا بننے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی شخصیت مجھ سے کافی ملتی جلتی تھی۔ میک اپ مین انوار کی مدد سے میں اسے اپنا ڈپلیکیٹ بنا کر چھوڑ تو آیا تھا لیکن اس کوشش کا شاید کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا تھا کیونکہ جب میں فرار ہوا تو میری شکل اور حلیہ وغیرہ سب کچھ تبدیل شدہ ہونے کے باوجود ریڈ ڈاٹ کے موت کے ہرکاروں نے بہت دور تک میرا ہی تعاقب کیا تھا۔

موت کے وہ ہرکارے جو غوطہ خوروں کے سے لباس میں کمر پر کوئی مختصر سی مشین باندھے اُڑتے ہوئے آئے تھے' انہوں نے لاہور سے بہت دور بھی مجھے تلاش کر لیا تھا اور وقتی طور پر شاید انہیں اطمینان بھی ہو گیا تھا کہ وہ مجھے ہلاک کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں لیکن مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر انہوں نے تحقیق کر لی ہوگی کہ میں مرا نہیں تھا اور نہ ہی وہ ڈپلیکیٹ وغیرہ جیسی چیزوں سے بے وقوف بننے والے تھے لیکن اتنا ضرور تھا کہ فی الحال وہ میرا سُراغ کھو چکے تھے۔ میرے وجود کے ساتھ شاید اب کوئی ایسی چیز نہیں رہی تھی جو میرے بارے میں ان کی رہنمائی کرتی تھی۔

یہ سب کچھ سوچ کر ہی میں اپنے آپ کو ان اجنبی اور دور افتادہ علاقوں میں گُم کیے ہوئے تھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کے بارے میں زیادہ تشویش نہیں تھی۔ اس وقت بھی ٹرک میں لیٹے لیٹے میں نے یہ سب کچھ سوچا اور اپنے آپ کو سمجھایا کہ فی الحال مجھے صرف درپیش حالات کے بار۔۔۔ میں سوچنا چاہیے تھا۔

کافی دیر تک سفر بہ خیر و عافیت جاری رہا۔ میں ٹرک کے پچھلے تختے اور پھلوں کی پیٹیوں کے بالترتیب انبار کے درمیان لیٹا ہوا تھا۔ میرے اوپر ترپال کی ترچھی چھت تھی۔ بڑی محفوظ سی جگہ تھی۔ ٹرک بھی کچھ ایسی یکساں رفتار اور گھوں گھوں کی ایسی مسلسل آواز کے ساتھ رواں دواں تھا کہ مجھے اونگھ سی آنے لگی۔ شاید کچھ دیر کے لیے میرا ذہن غنودگی سے مغلوب بھی ہو گیا تھا۔

دوبارہ میرا ذہن مستعد ہوا تو میں نے ٹرک سے ذرا جھانک کر دیکھا۔ ابھی صبح صادق کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ اچانک ہی ٹرک کی رفتار کم ہو گئی اور وہ تھوڑا سا کچے میں اُترنے لگا۔ اس کے دوسری طرف مجھے روشنی بھی لہراتی دکھائی دی۔ غالباً مخالف سمت سے کوئی دوسری گاڑی آ رہی تھی۔ ٹرک اسے راستہ دے رہا تھا۔

لیکن پھر ٹرک پوری طرح ہی کچے میں اُتر کر رک گیا اور آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ مخالف سمت سے آنے والی گاڑی ٹرک کے قریب ہی آن رکی تھی۔ کسی نے بہ آواز بلند کچھ کہا۔ ٹرک کی گھرگھراہٹ میں' میں الفاظ نہ سمجھ سکا لیکن دوسرے ہی لمحے ٹرک کا انجن بند کر دیا گیا۔

میں نے کیب کی چھت پر بھی ہلکی سی آوازیں سُنیں جن سے اندازہ ہوا کہ کلینر اٹھ بیٹھا تھا اور کیب کی چھت سے اُتر رہا تھا۔ میں یہی سمجھا کہ شاید گشتی پولیس کی کوئی گاڑی اس سڑک پر آنکلی ہے اور انہوں نے کاغذات وغیرہ دیکھنے کے چکر میں ٹرک کو روک لیا ہے۔ ایسے موقعوں پر عام طور پر کچھ اور ہی قسم کے "باتصویر کاغذات" دیکھنے کے بعد معاملہ رفع دفع ہو جاتا ہے اور ڈرائیور کو پروانۂ راہداری مل جاتا ہے۔

لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے نیچی آواز میں کسی کو بولتے سنا۔ وہ نہ تو آواز سے پولیس والا معلوم ہوتا تھا اور نہ ہی اس نے بات پولیس والوں جیسی کی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "منیر خان! ٹرک آگے مت لے کر جانا۔ آگے رینجرز نے روڈ بلاک کر رکھا ہے۔ شاید اس ٹرک کی مخبری ہو گئی ہے۔"

"اوئے خانہ خراب! مروا دیا.... اب کیا ہوگا؟" کوئی تیزی سے بولا۔ وہ غالباً منیر خان تھا۔

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم نے ہر مسئلے کا حل تلاش کر رکھا ہے" پہلی آواز نے کہا۔ وہ آواز بالکل پُرسکون تھی "تم ابھی اس کام میں نئے ہو اس لیے پریشان ہو گئے ہو لیکن ہمارے ہوتے ہوئے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جہاں سے انہوں نے روڈ بلاک کیا ہے اس کے دوسری طرف سے ایک خالی ٹرک آ رہا ہے۔ دو چار منٹ میں وہ یہاں پہنچ جائے گا۔ صرف اسلحے کی پیٹیاں اس میں لاد دو۔ وہ واپس شیراز کے اڈے پر چلا جائے گا۔ ہم کل پرسوں یا پھر کسی اور وقت اسے یہاں سے گزاریں گے۔ تم صرف فروٹ لے کر اپنا سفر جاری رکھو۔ رینجرز کو تلاشی لینے دو۔ وہ سمجھیں گے' انہیں غلط خبر ملی تھی لیکن اگر تم اس موڑ سے نہ گزرے تو وہ پٹرولنگ کرتے ہوئے اس روڈ پر آ جائیں گے اور بہت دور تک تمہارے ٹرک کو ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔"

"لیکن اسلحے کی پیٹیاں تو فروٹ کی پیٹیوں کے بالکل بیچ میں اور کافی نیچے چھپی ہوئی ہیں" یہ منیر خان کی آواز تھی "سارا مال اُتارنا پڑے گا' یہ کام دو چار منٹ میں تو نہیں ہو سکتا۔"

"کوئی بات نہیں" پُرسکون آواز نے جواب دیا "دو چار منٹ نہ سہی' دس پندرہ منٹ میں کام ہو جائے گا۔ دو آدمی تمہارے پاس ہیں' دو آدمی میرے پاس بھی ہیں۔ سب مل کر کام کرتے ہیں۔ ویسے اگر رینجرز اس ٹرک کا انتظار کرتے کرتے ادھر چل بھی پڑے تو ہم نے راستے میں انہیں اُلجھانے کا بندوبست کر رکھا ہے۔ ہم اب اس میدان کے پُرانے کھلاڑی ہو چکے ہیں۔ ہمیں جو کام کرنا ہوتا ہے ہر حال میں کرتے ہیں۔ ان چھوٹی موٹی رکاوٹوں سے ہمارے کام نہیں رک سکتے۔"

میں نے ٹرک کی سائڈ کی دیوار سے ذرا سا سر نکال کر... حتی الامکان احتیاط سے اس طرف دیکھا جدھر سے آوازیں آ رہی تھیں۔ ادھر کئی آدمی کھڑے تھے۔ تین تو غالباً اس ٹرک سے ہی

اُترے تھے جس پر میں چُھپا ہوا تھا۔ ایک دو شاید اس گاڑی سے اُترے تھے جو مخالف سمت سے آئی تھی۔

اس گاڑی کو دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے جسم میں سنسنی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی۔ میں جب لاہور سے فرار ہوا تھا اور راستے میں کافی پریشانیاں اُٹھانے کے بعد ایک بس میں بیٹھ کر لاری اڈے پہنچا تھا تو میں نے اڈے کے باہر' سڑک کے دوسری طرف ایک سیاہ مرسیڈیز کھڑی دیکھی تھی۔ اس کے شیشے بھی تاریک تھے۔ اس میں کوئی بیٹھا نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ بس ویران سڑک پر دھندلی روشنی میں ایک طرف کو کھڑی تھی لیکن نہ جانے کیوں بے حد پُراسرار' بے حد خطرناک محسوس ہوئی تھی۔ کسی عفریت کی طرح۔

اس وقت میری حسیات شاید کچھ زیادہ ہی کام کر رہی تھیں' ان میں ضرورت سے زیادہ تیکھا پن آ چکا تھا' اس لیے مجھے وہ گاڑی محض ایک بے جان یا مشینی ذریعۂ آمد و رفت نہیں بلکہ ایک خاص سانچے میں ڈھلی ہوئی شخصیت یا مخلوق محسوس ہوئی تھی۔ شاید اس گاڑی کا تعلق کسی بہت ہی خطرناک معاملے سے تھا اور میری کوئی حس اس کے بارے میں مجھے سگنل دے رہی تھی۔ بہرحال.... زندگی میں کبھی کسی گاڑی کو دیکھ کر میرے جسم میں اس طرح سنسنی نہیں دوڑی تھی۔ مرسیڈیز میرے پاس بھی تھی اور میری پسندیدہ ترین گاڑی تھی لیکن کبھی کسی مرسیڈیز کو دیکھ کر میں اس طرح مضطرب نہیں ہوا تھا۔

قابل ذکر بات یہ تھی کہ اس وقت بھی ٹرک کے پاس بالکل ویسی ہی ایک سیاہ مرسیڈیز کھڑی تھی۔ اس کے بھی شیشے تاریک تھے اور ٹرک کی چھوٹی بتیوں کی مدھم روشنی میں وہ اور بھی زیادہ سیاہ اور بھی زیادہ پُراسرار لگ رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ میں نے پنجاب کے علاقے میں جو سیاہ مرسیڈیز دیکھی تھی اس پر لاہور کی نمبر پلیٹ تھی اور اس وقت اندرون سندھ کے اس علاقے میں جو یہ مرسیڈیز دیکھ رہا تھا اس پر کراچی کی نمبر پلیٹ تھی۔

مرسیڈیز کے چاروں دروازے بند تھے اور کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے ایک احساس یہ بھی تھا کہ گاڑی سے اُتر کر بات کرنے والے قطعی غیر اہم لوگ تھے۔ اصل اہم شخصیت گاڑی میں ہی موجود تھی اور ٹرک والوں کو شاید اس کی موجودگی کا احساس بھی نہیں تھا لیکن مجھے اتنی دور بیٹھ کر بھی' صحیح طور پر کچھ دیکھے بغیر ہی نہ جانے کیوں یہ سب کچھ محسوس ہو رہا تھا۔ بعض محسوسات ایسے ہوتے ہیں جن کے بارے میں کوئی جواز یا دلیل پیش نہیں کی جا سکتی۔ خصوصاً میرے معاملے میں تو بارہا ایسا ہو چکا تھا۔

لیکن اس وقت درحقیقت میں ان مسائل پر غور کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میرے لیے تو سب سے اہم اور قابلِ غور مسئلہ وہ تھا جو ان لوگوں کی گفتگو کے نتیجے میں سامنے آیا تھا۔ ثابت ہوا تھا کہ اس سواری کو بھی زیادہ دیر استعمال کرنا میرے نصیب میں نہیں تھا۔ وہ لوگ اس ٹرک میں سے کچھ پیٹیاں اُتار کر دوسرے ٹرک میں لادنے کا فیصلہ کر چکے تھے اور اسی دوسرے ٹرک کا انتظار کر رہے تھے۔ مجھے اب اس ٹرک سے اُتر کر کھسک لینا چاہیے تھا۔

اسلحے کی اسمگلنگ اور نقل و حرکت میرے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا' ہمارے ہاں پچاسوں ایسی قوتیں کام کر رہی تھیں جو ملک کو اسلحہ خانہ بنانے پر تُلی ہوئی تھیں۔ لوگ ہر وقت بارود کے ڈھیر پر بیٹھے رہیں' گھروں میں کھانے کو نہ ہو لیکن اسلحے کے انبار ضرور ہوں اور ہر لحہ ایسے شوشے بھی چھوڑے جاتے رہیں جن کی بنیاد پر اس اسلحے سے لوگ ایک دوسرے کو فنا کرنے میں بالکل نہ ہچکچائیں۔

لیکن نہ جانے کیوں اس سیاہ مرسیڈیز کی موجودگی مجھے احساس دلا رہی تھی کہ معاملہ اس سے بھی کچھ آگے کا تھا۔ اس کی جڑیں کچھ اور بھی گہری' کچھ اور بھی گنجلک تھیں۔ میرا جی چاہا کہ ٹرک سے اُتر کر کسی طرح آگے جاؤں اور رینجرز کو صورتِ حال سے خبردار کروں لیکن ظاہر ہے یہ کام میرے لیے تقریباً ناممکن تھا اور ایک لمحے بعد تو بالکل ہی ناممکن ہو گیا جب گاڑی سے اُترے ہوئے شخص نے ٹرک ڈرائیور کو حکم دیا "تم ٹرک ادھر درختوں کے پیچھے لے جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ ٹہلنے کے سے انداز میں ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف آنے لگا۔ ٹرک کے حرکت میں آنے کے بعد بھی اس کے پچھلے حصے کا رخ ان لوگوں کی طرف ہو سکتا تھا۔ تب میرا اُترنا بہت مشکل ہو جاتا۔ میں ان کی نظر میں آئے بغیر نہیں اُتر سکتا تھا چنانچہ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور دوسرے ہی لمحے نہایت تیزی سے ٹرک سے اُتر گیا۔

میں نے پوری کوشش کی تھی کہ ذرا سی بھی آواز پیدا نہ ہونے پائے اور میں اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی رہا تھا۔ میرا ارادہ تھا کہ جس تیزی سے میں اُترا تھا اسی تیزی سے ٹرک کے نیچے گھس جاؤں گا اور اس کے اسٹارٹ ہوتے ہی اس طرف کو رینگ جاؤں گا جدھر زیادہ اندھیرا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت تک اگر کوئی پیچھے آ بھی گیا تو اس کا دھیان ٹرک کی طرف ہی رہے گا' نظر ذرا اونچی ہی رہے گی اور میں سینے کے بل رینگتا ہوا کچھ دور نکل جاؤں گا۔ جہاں میں اپنے آپ کو ذرا محفوظ محسوس کرتا وہاں سے اٹھ کر دوڑنا شروع کر سکتا تھا۔

لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ میری بدقسمتی یہ رہی کہ ٹرک سے نیچے پاؤں رکھتے ہی بڑا سا ایک پتھر اپنی جگہ سے اچھا خاصا ہل گیا۔ ٹرک کچے میں ذرا ترچھا کھڑا تھا اور میرا پاؤں اس پتھر پر پڑ گیا تھا۔ میں نے تو اپنا توازن نہیں کھویا لیکن وہ پتھر ذرا لڑھک کر ایک اور پتھر سے ٹکرا گیا۔

نہایت خفیف سی آواز پیدا ہوئی۔ اگر اس وقت ٹرک

اسٹارٹ ہوتا تو وہ آواز اس میں دب جاتی' کسی کو ذرا بھی پتا نہ چلتا لیکن اس لمحے وہاں مکمل سکوت تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس آواز نے ان سب کو ٹرک کے پچھلے حصے کی طرف متوجہ کرلیا ہوگا چنانچہ میں ٹرک کے نیچے گھسنے کے بجائے پنجوں کے بل رکوع کی سی حالت میں گہرے اندھیرے کی طرف دوڑا جہاں درختوں کی موجودگی کے آثار بھی دکھائی دے رہے تھے۔

"کون ہے؟" کوئی شاید بُری طرح چونکتے ہوئے تقریباً چلا اُٹھا۔ یہ غالباً اسی کی آواز تھی جو اب تک ٹرک ڈرا ...رسے باتیں کرتا رہا تھا لیکن شاید حیرت کے جھٹکے' ہیجان اور اضطراب کے باعث پھٹ سی گئی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے ایک فائر ہوا۔ آواز زیادہ بلند نہیں تھی۔ فائر یقیناً کم کیلیبر کے کسی پسٹل سے کیا گیا تھا۔ اس عجلت میں بھی شاید انہوں نے خیال رکھا تھا کہ ہتھیار وہ استعمال کیا جائے جس کا دھماکا زیادہ زوردار نہ ہو۔ اس ایک لمحے میں' میں کافی آگے پہنچ چکا تھا۔

گولی نہ جانے کہاں سے گزری تھی لیکن ایک بات طے تھی کہ انہیں معلوم ہوگیا تھا' کوئی ٹرک سے اُتر کر اس طرف بھاگا تھا جدھر چھدرے چھدرے درختوں کا سلسلہ پھیلا ہوا تھا۔ عقب سے مجھے کسی کی گھٹی گھٹی اور دور ہوتی ہوئی آواز سنائی دی "سرچ لائٹ نکالو۔ جلدی کرو۔"

اس کا مطلب تھا' وہ میری تلاش سے باز رہنے والے نہیں تھے اور سرچ لائٹ تو میرے لیے موت کا پیغام ثابت ہوسکتی تھی۔ تاہم میں درختوں کے درمیان دوڑتا چلا گیا۔ درختوں کا سلسلہ طویل نہیں تھا۔ چند لمحے بعد میں ایسی جگہ پہنچ گیا جس سے آگے اِکادُکا ہی درخت تھے۔

اسی وقت میں نے اپنے عقب میں سرچ لائٹ روشن ہوتے دیکھی لیکن اس کا رخ دوسری طرف تھا۔ اگر اس کا رخ میری طرف ہوتا تب بھی شاید اس کی روشنی مجھ تک نہ پہنچتی۔ میں کافی دور نکل آیا تھا اور وہ غالباً بیٹری سے چلنے والی سرچ لائٹ تھی۔ اس کی رسائی بہت دور تک نہیں تھی۔

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھا۔ اس علاقے میں زیادہ دور تک دوڑنا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ سرچ لائٹ ان کے پاس تھی۔ اگر وہ ذرا بھی ہوشیار ہوتے تو جلد مجھے تلاش کرسکتے تھے۔ روشنی تیزی سے اِدھر اُدھر لہراتی ہوئی میری طرف بڑھ رہی تھی۔

بھاگتے ہوئے شخص کے بارے میں' تعاقب کرنے والوں کو بہت کم ہی یہ گمان گزرتا ہے کہ وہ راستے میں کسی درخت پر چڑھ گیا ہوگا۔ یہ ایک بہت ہی باریک سا نفسیاتی نکتہ تھا اور میں کسی بھی جگہ سے فرار کے سلسلے میں انسانی نفسیات کے مختلف پہلوؤں سے استفادہ کرنے سے نہیں چوکتا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اچانک راستے میں درخت پر چڑھ جانا کئی بار میرے کام آچکا تھا لیکن اس کے ضروری تھا کہ انسان کو گلہری کی طرح تیزی سے درخت پر چڑھنے میں مہارت حاصل ہو۔

مجھے یہ مہارت حاصل تھی۔ میں نے ایک بار پھر اسی تدبیر سے کام لینے اور اسی انداز میں قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔ ایک درخت مجھے کافی تناور اور گھنا دکھائی دیا۔ میں تیزی سے اسی پر چڑھ کر ٹہنیوں کے درمیان چھپ کر بیٹھ گیا۔ جب تک روشنی قریب آئی' شاخیں اور پتے دوبارہ ساکت ہوچکے تھے۔ میرے درخت پر چڑھنے سے تھوڑی سی ہلچل برپا ہوئی تھی وہ ختم ہوچکی تھی۔

وہ لوگ سرچ لائٹ اِدھر اُدھر گھماتے نہایت محتاط انداز میں چلے آرہے تھے۔ تعداد میں وہ چار تھے اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں کوئی نہ کوئی گن تھی۔ وہ عین میرے نیچے سے گزرتے آگے بڑھتے چلے گئے لیکن چند قدم آگے جاکر وہ رک گئے۔ سرچ لائٹ چند لمحے تک ناہموار میدانی علاقے میں گردش کرتی رہی۔

"غائب ہوگیا ...کا بچہ!" بالآخر ان میں سے ایک بولا۔ وہی تھا جس کی آواز اب تک سب سے زیادہ سنائی دیتی رہی تھی۔ اس خطاب پر ایک بار تو دل چاہا کہ نیچے اُتر پڑوں اور ان سے دو ہاتھ کرنے کی کوشش کر ہی ڈالوں۔ اس وقت ان کی پشت اسی درخت کی طرف تھی جس پر میں چھپا ہوا تھا۔ میں اگر خاموشی سے درخت سے اُترنے یا یکدم چھلانگ لگانے اور اچانک ان پر جھپٹ پڑنے میں کامیاب ہوجاتا تو ان میں سے کسی سے بھی صرف ایک گن چھین کر باقی سے نمٹ سکتا تھا۔

لیکن میں نے اپنے آپ کو اس ارادے پر عمل درآمد سے باز رکھا اور اپنے دماغ کو بھی ٹھنڈا ہی رکھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ میں ان لوگوں سے اس حد تک خوف زدہ تھا کہ مجھ میں کوئی قدم اُٹھانے کی جرأت ہی نہیں تھی۔ بلکہ مجھے صرف اور صرف اس سیاہ مرسیڈیز کے تصور نے محتاط رہنے پر مجبور کیا تھا جو ڈیڑھ فرلانگ پیچھے سڑک کے قریب کھڑی تھی۔

"آخر وہ تھا کون؟" ایک اور آواز اُبھری۔ آواز بلند تھی لیکن انداز خودکلامی کا ہی تھا۔

جواب میں ایک لمحے کے لیے خاموشی رہی پھر کوئی بولا "کوئی چور اچکا ہوگا یا کوئی مفرور مجرم۔ کسی سے بچنے کے لیے ٹرک میں چھپ کر بھاگ رہا ہوگا۔ سرکاری آدمی... یا کوئی اور اہم آدمی نہیں ہوسکتا... وہ لوگ اتنی زحمت نہیں اٹھاتے۔"

وہ واپس پلٹ پڑے لیکن درختوں کے درمیان اب بھی نیم دلی سے مجھے تلاش کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ ہر طرف سرچ لائٹ سے روشنی ڈال رہے تھے۔ بالآخر وہ اس درخت سے جس پر میں چھپا ہوا تھا' ذرا ہی دور ایک دوسرے درخت کے نیچے آن رکے۔

"اب کیا کرنا چاہیے؟" سب سے زیادہ بولنے والے نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کیا۔

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سب ابھی تک گردنیں گھما گھما کر اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ میری حیثیت اس وقت گویا سلیمانی ٹوپی رکھنے والے کی سی تھی۔ یعنی میں تو ان کی تمام حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا لیکن وہ مجھے نہیں دیکھ سکتے تھے۔ وہ سب غالباً واپس جانا چاہتے تھے لیکن اُلجھن میں تھے۔

ان کی اُلجھن جلد ہی رفع ہوگئی۔ ہلکی سی ایک بیپ سنائی دی۔ یہ شاید کسی ٹرانسیٹر یا واکی ٹاکی کا سگنل تھا۔ میں نے زیادہ باتیں کرنے والے کو جو غالباً انچارج کی سی حیثیت رکھتا تھا' اپنے لباس میں سے واکی ٹاکی نما ایک آلہ نکالتے دیکھا لیکن وہ سائز میں واکی ٹاکی سے کچھ چھوٹا تھا۔ اس نے کوئی بٹن دبایا اور دوسرے ہی لمحے جو آواز اُبھری اس سے مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ واکی ٹاکی نہیں' نہایت عمدہ قسم کا کوئی ٹرانسیٹر ہی تھا۔ واکی ٹاکی پر ایک مخصوص سی گونج سنائی دیتی ہے اور آواز اتنی صاف نہیں ہوتی جتنی اس پر تھی۔

کوئی بھاری اور گونجیلی آواز میں' انگریزی میں پوچھ رہا تھا "وہ ملا یا نہیں؟" وہ کسی انگریزی داں یا انگریزی گو پاکستانی کا لہجہ نہیں تھا۔ وہ خالصتاً کوئی برٹش ہی معلوم ہوتا تھا۔

"نہیں سر! وہ غائب ہوگیا ہے" انچارج ٹائپ شخصیت نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

"احمقو! تو پھر تم وہاں کیا کررہے ہو؟" ٹرانسیٹر پر غراہٹ اُبھری "خالی ٹرک آگیا ہے۔ جلدی واپس آؤ اور لوڈنگ اَن لوڈنگ کا کام کراؤ۔"

"...اور سر... وہ شخص ...!" انچارج نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"جہنم میں ڈالو اس کو۔ کوئی چور اُچکا ہوگا۔ جب کوئی آئے گا تو دیکھا جائے گا۔ تم واپس آجاؤ اور اپنا کام کرو" انگریز کی نہایت تحکمانہ آواز اُبھری۔

انچارج نے ٹرانسیٹر آف کیا' جیب میں ڈالا اور سب کو واپس چلنے کا اشارہ کیا۔ سرچ لائٹ غالباً ٹرک ڈرائیور کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے اسے بھی آف کرلیا اور میں نے اندھیرے میں ان کے قدموں کی واپس جانے کی آوازیں سُنیں۔

میں جس دوشاخے پر بیٹھا تھا' وہیں ساکت رہا۔ ٹرانسیٹر پر سنائی دینے والی آواز نے مجھے مضطرب کردیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا' کیا یہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی چکر تھا؟ لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو مسترد کردیا۔ ایک بار پھر میں نے اپنے آپ کو یہی سوچنے پر مجبور پایا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کی سرگرمیاں اس سے کہیں زیادہ اونچے درجے کی تھیں۔

اسلحے کی اسمگلنگ اور اس کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی یہ ہمارے ہاں دہشت گردوں کی ایک عام سی سرگرمی بن گئی تھی۔ ریڈ ڈاٹ کو جہاں تک میں دیکھ سکا تھا' سمجھ سکا تھا' اس حساب سے اس قسم کے کام اس کے شایانِ شان نہیں تھے۔ عام قسم کے اسلحے کی تو شاید ان کی نظر میں کوئی وقعت بھی نہیں تھی۔

ہمارے لوگوں کو آپس میں لڑوانے کے لیے البتہ وہ عام قسم کا اسلحہ اِدھر اُدھر پھیلانا بھی چاہتے تو شاید یہ ان کے لیے بائیں ہاتھ کا کام ہوتا۔ اس کے لیے انہیں اتنا تردد اُٹھانے اور رینجرز سے ڈرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس قسم کے مسائل کے سلسلے میں ان کے وسائل تقریباً طلسماتی سے تھے۔ اس کے علاوہ نہ جانے کہاں کہاں ان کے مہرے موجود تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ اسلحے کی نقل و حمل کے بے پناہ پھیلے ہوئے سلسلے کا جو یہ چھوٹا سا ٹریلر اتفاقاً میں نے دیکھا تھا' یہ کسی اور ہی طاقت کی سرگرمی کا ایک حصہ تھا۔ شاید کسی غیر ملکی ایجنسی کی نوازشات کی ایک کڑی...؟

اس احساس سے مجھے جھرجھری سی آگئی کہ آخر کتنی قوتیں ہمارے اس ترقی پذیر' نامستحکم' کمزور اور انتشار زدہ ملک کی جڑیں کاٹنے میں لگی ہوئی تھیں؟ اپنوں کی مہربانیاں اس کے علاوہ تھیں۔ اس کے باوجود ملک قائم تھا تو یہ اللہ کا نہایت ہی خاص کرم تھا۔

دو تین منٹ تک میں وہیں بیٹھا سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میرا کچھ نہ کچھ کرنے کو جی چاہ رہا تھا لیکن آخر کار میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس سلسلے میں میں کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا' سواری نہیں تھی' رابطے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

ایک اور مایوس کُن خیال بھی میرے دل میں جاگزیں تھا۔ اسلحے کی یہ کھیپ پھلوں کی پیٹیوں کے درمیان چھپی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا' یہ زیادہ بڑی کھیپ نہیں تھی۔ بالفرض میں کسی طرح اس کھیپ کو پکڑوانے میں کامیاب بھی ہوجاتا تو کیا اس سے کوئی خاص فرق پڑسکتا تھا؟ میں نے تو سنا تھا کہ اسلحے کے پورے ٹرک کے ٹرک اِدھر سے اُدھر' اُدھر سے اِدھر ہورہے تھے۔ اس سلسلے کو روکنے اور اس کی جڑیں تلاش کرنے کے لیے تو بہت بڑے پیمانے پر منظم کوششوں اور بہت ہی بڑے منصوبوں کی ضرورت تھی جن کی امید ذرا کم ہی تھی۔

انہی سوچوں میں اُلجھا میں درخت سے اترنے لگا۔ درخت سے اترنا' اس پر چڑھنے کی نسبت زیادہ مشکل اور مہارت طلب کام ہوتا ہے۔ تاریکی کی وجہ سے میرے لیے دشواری کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ بہرحال میں سب سے نیچے والی شاخ پر پہنچ گیا تھا جس سے میرا ارادہ براہ راست نیچے چھلانگ لگانے کا تھا لیکن اس شاخ پر میرا توازن ذرا بگڑ گیا۔

سہارے کے لیے میں نے اندھا دھند ہاتھ مار کر ایک شاخ کو پکڑا اور یوں میں نے اپنی شامت کو دعوت دے دی۔ اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ میں ویسے ہی زمین پر گر جاتا۔ اس سے شاید مجھے کوئی خاص نقصان نہ پہنچتا۔ غضب یہ ہوا کہ جس شاخ کو میں نے

پکڑا وہ بہت بُری طرح مڑی اور ٹوٹ گئی۔

میں زیادہ بُری طرح نیچے گرا اور میرے ٹخنے سے درد کی ایک لہر اُبھر کر اس طرح ران تک پھیلی گویا کسی نے کند خنجر ٹخنے کے قریب گھونپا ہو اور اسے کھینچتا ہوا ران تک لے گیا ہو۔ میں نے سختی سے دانت بھینچ کر اپنے آپ کو کراہنے سے باز رکھا لیکن اصل مصیبت یہ نہیں تھی، اصل مصیبت اس کے فوراً بعد نازل ہوئی۔

میں ابھی زمین سے اُٹھ نہیں پایا تھا کہ میں نے بھنبھناہٹ کی تیز آواز سُنی جو تیزی سے میرے قریب آرہی تھی۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ جو شاخ میرے ہاتھ میں آکر ٹوٹی تھی اس کے کسی حصے پر شاید شہد کا چھتا تھا جو اس جھٹکے سے اتھل پتھل ہو کر رہ گیا تھا۔ میرا درخت پر چڑھنا تو برداشت کرلیا گیا تھا لیکن مکھیوں کی راجدھانی میں اس حد تک دخل اندازی برداشت نہیں کی جاسکتی تھی۔

میرے پاؤں میں شاید موچ آئی تھی لیکن میں اس تکلیف کو بھول گیا۔ ویسے بھی موچ ابھی تازہ تھی۔ ابھی اس کی خوفناکی واضح نہیں ہوئی تھی لیکن چھتے کی تمام مکھیوں کے مجھ پر ٹوٹ پڑنے کا تصور اتنا ہولناک تھا کہ میں موچ کو بھولتے ہوئے بجلی کی سی تیزی سے اُٹھ کھڑا ہوا اور ریس کے اس گھوڑے کی طرح دوڑا جس کے اسٹال کا گیٹ اسی لمحے کھولا گیا ہو۔

لاتعداد شہد کی مکھیوں کے ڈنک مارنے کی اذیت تو ناقابلِ بیان ہی ہے لیکن ایک اہم بات یہ تھی کہ اس کے نتیجے میں انسان کی موت بھی واقع ہوسکتی ہے۔ چلئے انسان زندہ بھی رہ جائے لیکن اس کا حشر کیا ہوتا ہے، اس کا تصور شاید آپ نہ کرسکیں۔ آپ صرف اس کی ظاہری حالت کا ہی تصور کرلیجئے۔ وہ تصور بھی میرے رونگٹے کھڑے کردینے کے لیے کافی تھا۔ میں یہ بھی نہیں بھول سکتا تھا کہ اس وقت میں بے یارومددگار ایک ویرانے میں بھٹک رہا تھا جہاں دور دور تک طبی امداد جیسی کسی چیز کا تصور نہیں کیا جاسکتا تھا۔

اس ویرانے میں ایک طرف میرے انجانے دشمن موجود تھے جو میرے خون کے پیاسے تھے۔ میری حالت خواہ کچھ بھی ہوتی، وہ مجھے ڈاکٹر کے پاس پہنچانے کے بجائے اللہ میاں کے پاس پہنچانے میں مستعدی دکھاتے۔

یہی سب سوچیں تھیں جو بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکیں اور جنہوں نے مجھے پاؤں کی تکلیف کو بھول کر بگٹٹ دوڑنے پر مجبور کیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے پاؤں پر کیا گزر رہی تھی۔ مجھے یہ احساس بھی نہیں رہا تھا کہ وہ پاؤں میرے جسم کے ساتھ بھی تھا یا نہیں؟ مجھے بس یہ احساس تھا کہ میں اندھا دھند دوڑ رہا تھا۔

لیکن اس دوران میری گردن میں دو تین ڈنک اُتر چکے تھے۔ مجھے گردن پر مکھیوں کی موجودگی کا احساس ہوا تھا اور میں نے فوراً ہاتھ مار کر انہیں مسل کر پھینک دیا تھا لیکن وہ اپنا کام دکھا چکی تھیں اور مکھی جب غضبناک ہوتی ہے تو شاید اس کے ڈنک میں زہر بھی بڑھ جاتا ہے۔ میری گردن میں گویا بیک وقت زہر کے دو تین انجکشن لگادیے گئے تھے۔

اس سے زیادہ پریشان کُن بات یہ تھی کہ تیز بھنبھناہٹ میرے تعاقب میں تھی۔ یہ بھنبھناہٹ ریموٹ کنٹرول سے چلنے والے کسی چھوٹے موٹے کھلونا جہاز کی آواز سے مشابہ تھی۔ میں دیوانوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ مجھے اس بات کی بھی پروا نہیں رہی تھی کہ میں کسی پتھر، کسی ٹیلے سے ٹکرا کر یا کسی جھاڑی میں اُلجھ کر بہت بری طرح گر بھی سکتا تھا۔ میں اس خطرے کو خاطر میں لائے بغیر دوڑا جارہا تھا لیکن میرے اور بھنبھناہٹ کے درمیان گویا فاصلہ بڑھ ہی نہیں رہا تھا۔ بھنبھناہٹ نہایت مستقل مزاجی سے کسی آسیب کی طرح میرے تعاقب میں تھی۔

میں نے گاؤں میں پرورش پائی تھی۔ مجھے معلوم تھا، شہد کی مکھیاں اگر کسی کے بارے میں یہ محسوس کرلیں کہ اس نے ان کے چھتے پر حملہ کیا تھا تو وہ پاتال تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ میں ٹرک، اسلحہ، سیاہ مرسیڈیز سب کچھ بھول گیا اور میں نے اپنی تمام توانائی دوڑنے کے لیے مجتمع کرلی۔

میں زیادہ سے زیادہ تیز دوڑنے کی کوشش کررہا تھا لیکن میرا خیال ہے، میرا دایاں پاؤں میرا ساتھ صحیح طور پر نہیں دے رہا تھا۔ میں زبردستی اس سے کام لے رہا تھا۔ اب تو درد ایک تواتر اور تسلسل سے میرے ٹخنے میں دانت گاڑ رہا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میری ٹانگ بے کار ہوئی جارہی تھی۔ میں یہ بھی محسوس کررہا تھا کہ اس حالت میں مسلسل دوڑنا میرے لیے ٹھیک نہیں تھا لیکن میرے لیے یہ غلطی کیے جانے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

یہ بھی غنیمت تھا کہ مکھیاں زیادہ تیز اُڑنے والی مخلوق نہیں تھیں۔ دوسرے اس وقت ہوا بھی مخالف تھی جس سے انہیں یقیناً مزاحمت کا سامنا تھا۔ آخرکار آوازوں سے اندازہ ہونے لگا کہ ان کے اور میرے درمیان فاصلہ بڑھتا جارہا تھا لیکن وہ میرا پیچھا چھوڑنے پر تیار معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ آخر میں اس پاؤں کے ساتھ کہاں تک بھاگ سکتا تھا جس کے بارے میں مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہورہا تھا جیسے کوئی درندہ اسے اپنے جبڑے سے مسلسل چبا رہا تھا۔ اس حالت میں بھی میں یقیناً ایک طویل فاصلہ طے کرچکا تھا۔

باَلآخر میرے سامنے ایک پشتہ سا آگیا۔ پانی کی مدھم سی سرسراہٹ بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ یقیناً کوئی نہر تھی۔ معلوم نہیں وہی نہر تھی جس کے قریب میں ایک مرتبہ پہلے بھی پہنچا تھا یا کوئی دوسری تھی۔ امکان تو یہ بھی تھا کہ وہی نہر بل کھاتی یہاں سے بھی گزر رہی ہو۔

بھنبھناہٹ کی مدھم سی آواز بتارہی تھی کہ شہد کی مکھیاں اب بھی میرے تعاقب میں آرہی تھیں۔ نہر کی موجودگی کے آثار محسوس کرتے ہی میرے ذہن میں ایک تدبیر آئی تھی لیکن پشتے پر چڑھنا مجھے پہاڑ پر چڑھنے کے برابر لگ رہا تھا حالانکہ پشتے کی اونچائی زیادہ نہیں تھی۔ میں ایک لمحے کے لیے رُکنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔

کچی مٹی میں پاؤں کسی نہ کسی طرح جما کر میں پشتے پر چڑھ ہی گیا اور ایک گہری سانس لے کر میں نے نہر میں چھلانگ لگادی۔ سانس روک کر میں پانی کی سطح سے نیچے چلا گیا اور پھر نیچے ہی رہتے ہوئے دوسرے کنارے کی طرف تیرنے لگا۔ وہ کافی بڑی نہر معلوم ہوتی تھی۔ پانی خاصا گہرا تھا۔ میں کوشش کررہا تھا کہ زیادہ گہرائی میں ہی رہوں تاکہ میرے متحرک ہونے کی کوئی نشانی سطحِ آب پر نظر نہ آسکے۔

چند لمحوں بعد مجھے پانی کی گہرائی کم ہونے کا اندازہ ہوا۔ اس کا مطلب تھا کہ میں دوسرے کنارے کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن میں نے پانی سے سر نہیں نکالا۔ میں زیادہ سے زیادہ دیر تک پانی میں غائب ہی رہنا چاہتا تھا۔ یہ مکھیوں کو غچا دینے کی ایک کوشش تھی۔ اللہ کی ہر مخلوق کے پاس دماغ ہوتا ہے اور وہ یقیناً اپنے اپنے حساب سے، اپنے اپنے انداز میں سوچتی بھی ہوگی۔

میرا خیال تھا کہ مکھیاں شاید یہ محسوس کرلیں کہ میں ڈوب گیا ہوں۔ میں نے گاؤں میں لڑکپن میں اسی قسم کی صورتِ حال کا شکار ہونے والے دو تین لڑکوں سے سُنا تھا کہ انہوں نے یہی تدبیر کی تھی اور مکھیاں جلد ہی ان کا پیچھا چھوڑ کر واپس ہوگئی تھیں۔

میں یوگا وغیرہ کی مشقوں اور اپنی دیگر ورزشوں کی وجہ سے بہت دیر تک سانس روکنے پر قادر تھا لیکن اس وقت بہت دور سے اور وہ بھی موچ زدہ پاؤں کے ساتھ دوڑ کر آنے کی وجہ سے میری سانس پہلے ہی پھولی ہوئی تھی۔ تاہم میں نے ہمت نہیں ہاری اور کئی منٹ تک سانس روکے رکھی۔ حتیٰ کہ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ سانس ہمیشہ کے لیے ہی سینے میں نہ اٹک جائے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے سر ذرا پانی سے نکالا۔ ارادہ یہی تھا کہ اگر اب بھی اوپر مکھیوں کی بھنبھناہٹ سنائی دی تو جتنی بھی طویل سانس لے سکا، لے کر غڑپ سے دوبارہ سطحِ آب سے نیچے ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد بار بار یہی کرتا رہوں گا۔ آخر مکھیاں کب تک اوپر منڈلائیں گی۔ تھک ہار کر چلی ہی جائیں گی۔

لیکن پانی سے سر نکالنے کے بعد مجھے پانی ہی کی مدھم سی سرسراہٹ کے سوا کچھ سنائی نہ دیا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ مکھیوں نے جلد ہی میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔

میں نے دو تین گہری گہری سانسیں لیں۔ اس وقت تک سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ نہر کا دوسرا کنارہ سامنے ہی نظر آرہا تھا۔ محض چند فٹ کا فاصلہ تھا لیکن مصیبت سر سے کیا ٹلی، یکدم ہی گویا ہمت سی ٹوٹ گئی۔ پاؤں کی تکلیف یک لخت ہی ناقابلِ برداشت سی ہوگئی۔ مشینی انداز میں دوڑتے دوڑتے اچانک ٹھنڈے پانی میں کود پڑنا گویا اس نادیدہ خنجر کی دھار کو تیز کرنے کا باعث بن گیا تھا جو بار بار میرے ٹخنے میں اُتر رہا تھا۔ دائیں پاؤں کو حرکت دینا میرے لیے ایک مصیبت بن گیا تھا۔

بڑی مشکلوں سے میں کسی نہ کسی طرح کچھ تیرتا، کچھ گھسٹتا دوسرے کنارے تک پہنچا۔ اس کے بعد پشتے پر چڑھنے اور دوسری طرف اُترنے کی مہم درپیش تھی۔ میں نے شاید کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ زندگی میں یہ کام کبھی انسان کے لیے اتنے مشکل بھی ہوسکتے تھے۔

میں نے تقریباً ایک ٹانگ ہی کے سہارے لنگڑاتے ہوئے وہ پہاڑ سر کیا۔ پشتے سے اُتر کر لنگڑاتے ہوئے ہی میں نے تھوڑا سا فاصلہ طے کیا۔ دائیں پاؤں کو تو زمین پر محض ٹکانا بھی دوبھر ہوتا جارہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسے بس ہوا میں معلق رکھوں۔ ذرا سی حرکت بھی نہ دوں اور اس پر ذرا بھی وزن ڈال کر چلنے کی کوشش کرنا تو ایک قیامت تھا۔

جلد ہی مجھے ایک سوکھا اور ٹنڈ منڈ سا درخت نظر آیا۔ میں اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور ہانپنے لگا۔ دور کہیں سے اکا دکا پرندوں کی چہچہاہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ کپڑے بھیگے ہونے کی وجہ سے ہوا ٹھنڈی لگ رہی تھی۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید وہ مقام، وہ سماں، وہ وقت مجھے بہت اچھا لگتا۔ میں فضا میں رچی ہوئی تازگی اور اچھوتے پن سے محظوظ ہوتا لیکن اس وقت مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

میرے کانوں میں شاں شاں سی ہورہی تھی حالانکہ وہاں تیز ہوا نہیں چل رہی تھی۔ میں نے اب دانت مستقل بھینچ رکھے تھے کیونکہ ٹخنے میں اٹھنے والی ہر ٹیس اب گویا میری پسلیوں تک پہنچ رہی تھی۔

جلد ہی پرندوں کی چہچہاہٹ بھی معدوم ہوگئی اور ساتھ ہی دھیرے دھیرے چاروں طرف اُجالا پھیل گیا۔ پرندے وہاں دو چار ہی تھے اور شاید وہ بھی رزق کی تلاش میں اس ماحول کی وسعتوں میں بکھر گئے تھے۔

میں نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے چاروں طرف دیکھا۔ ایک نم آلود سا صحرا میرے اردگرد پھیلا ہوا تھا۔ شاید اسے صحرا کہنا زیادہ درست نہیں تھا کیونکہ اس میں کہیں کہیں درخت اور جھاڑیاں بھی نظر آرہی تھیں لیکن زمین ریتلی ہی تھی اور تاحدِ نظر ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میری دائیں ٹانگ کا ٹخنے کے اردگرد کا کافی حصہ سوج چکا تھا اور اس میں سرخی بھی تھی۔ گردن میں بھی اذیت ناک لہریں سی دوڑ رہی تھیں۔ میں نے گردن پر ہاتھ پھیر کر دیکھا تو وہ مجھے اپنی گردن کے بجائے کسی بھینسے کی گردن محسوس ہوئی۔

چند منٹ بعد میں دانت پر دانت جمائے ایک بار پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی منتشر ہوتی ہوئی قوتِ ارادی کو جمع کیا اور صرف ایک ٹانگ کے سہارے چلنے کی کوشش کی لیکن دوسرا پاؤں بہرحال زمین

پر نکانا پڑتا تھا اور لازماً اس پر ذرا سا دباؤ تو آہی جاتا تھا۔ یہ دباؤ آجانا قیامت سے کم نہیں تھا۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو یقیناً چیخیں مارنے لگتا۔

میں نے صرف بائیں ٹانگ پر اُچھل اُچھل کر بھی چلنے کی کوشش کی لیکن اس طرح دائیں ٹانگ کو جو جھٹکا سا لگتا تھا اور اس میں جو دھمک سی ہوتی تھی وہ بھی ٹخنے کی تکلیف کو اسی طرح بڑھادیتی تھی جیسے کوئی تازہ زخم پر ریتی رگڑ رہا ہو۔

پندرہ بیس قدم کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میری ہمت جواب دے گئی اور میں ایک دوسرے درخت کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ میں دمے کے مریض کی طرح ہانپ رہا تھا اور میرے کپڑوں کی نمی میں میرے پسینے کی نمی بھی شامل ہوگئی تھی۔

میں نے زندگی میں بارہا موچ کا تذکرہ سُنا تھا' کئی لوگوں کو موچ آتے دیکھی بھی تھی۔ میری نظر میں یہ ایک معمولی سی حادثاتی چیز تھی۔ میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ موچ اتنی خوفناک بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ شاید میں نے موچ آنے کے بعد دیوانہ وار دوڑ کر ایک خطرناک غلطی کی تھی لیکن اگر میں یہ غلطی نہ کرتا تب بھی شاید میرا کچھ ایسا ہی... یا اس سے بھی بُرا حشر ہوتا۔

میں بہت دیر تک وہیں بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ اس صحرائی سے علاقے میں تیز دھوپ پھیل گئی۔ اس دوران میرے ٹخنے اور گردن کا ورم مزید بڑھ چکا تھا۔ پاؤں کسی چھوٹے موٹے ہاتھی کے پاؤں کی سی صورت اختیار کرتا جارہا تھا۔ مجھے کچھ کچھ حرارت بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ چہرہ کچھ زیادہ ہی تپ رہا تھا۔ دھوپ مجھے بہت بُری طرح لگ رہی تھی اور جس درخت کے سہارے میں بیٹھا تھا وہ کچھ زیادہ سایہ دار نہیں تھا۔

بھوک کا عفریت بھی معدے میں پنجے گاڑنے لگا تھا۔ عام حالات میں اپنی جسامت کے اعتبار سے میری بھوک کچھ زیادہ نہیں تھی۔ مجھے زیادہ کھانے والوں میں ہرگز شمار نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن جب سے میرے روزوشب میں جنگل خواری کا دخل زیادہ ہوا تھا تب سے میری بھوک کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ جسم ہروقت مشقت ہی میں رہتا تھا۔ ویسے بھی میں نے محسوس کیا تھا کہ غریبی میں انسان کو بھوک زیادہ لگتی ہے۔ کل دوپہر میں نے دُرمحمد کے ہاں ڈٹ کر کھانا کھایا تھا۔ رات کا کھانا کھانا نصیب نہیں ہوسکا تھا اور اس کے گھر سے نکل کر بھاگنا پڑا تھا۔ لیکن اس وقت حالت کچھ ایسی ہی تھی جیسے گزشتہ کئی روز سے میں نے کچھ بھی نہ کھایا ہو۔ صرف رات کا ہی فاقہ گزرا تھا اور اب ناشتے کا وقت تھا لیکن دیگر تکلیفوں کے ساتھ ساتھ بھوک بھی ناقابلِ برداشت ہونے لگی تھی۔ حالانکہ میرا خیال تھا' تکلیف کے عالم میں انسان کی بھوک مرجاتی ہے لیکن یہاں تو بھوک خود مرنے کے بجائے مجھے مارے ڈال رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے بیٹھنا بھی بُرا محسوس ہونے لگا اور میں اسی درخت کے نیچے لیٹ گیا۔ میرا لباس اب سوکھ چکا تھا لیکن مجھے تیز بخار محسوس ہونے لگا تھا۔ ٹخنہ اور اس کے آس پاس کا حصہ سوج کر کُپّا ہوچکا تھا۔ گردن میں بھی تکلیف تھی اور شاید..... یہ ورم چہرے تک آپہنچا تھا۔ میں اپنے تپتے ہوئے چہرے میں بھی ایک عجیب سا بھاری پن محسوس کررہا تھا۔

لیٹ کر میرے جسم کا بیشتر حصہ دھوپ میں آگیا جو مجھے بہت بُری لگ رہی تھی لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اٹھ کر کسی زیادہ سایہ دار درخت تک چلا جاتا۔ کچھ دیر بعد میرے ذہن پر غنودگی سی طاری ہونے لگی لیکن یہ وہ غنودگی نہیں تھی جو انسان آرام کے وقت محسوس کرتا ہے۔ درحقیقت میرے حواس شکست کھارہے تھے۔ بالآخر جسم وجاں کی ساری مضبوطی جواب دینے لگی تھی۔

وہ قلعہ جو اب تک تقریباً ناقابلِ شکست سا محسوس ہوتا تھا' گویا دھیرے دھیرے زمیں بوس ہونے لگا تھا۔ بالآخر اس کے درودیوار لرزنے لگے تھے۔ اندر ہی اندر جو تصور مجھے سب سے مزیادہ دہشت زدہ کررہا تھا وہ یہ تھا کہ یہاں دوردور تک کوئی مددمیسّر آنے کے آثار نہیں تھے۔

اس طرف سے شاید کسی انسان کا گزر ہوتا ہی نہیں تھا۔ تھوڑی بہت آمدورفت اگر رہی بھی ہوگی تو غالباً نہر کے دوسری طرف کے علاقے تک ہی محدود تھی جہاں سے میں افراتفری میں گزر آیا تھا اور نہر بھی عبور کر آیا تھا۔ اس طرف تو سڑک بھی زیادہ دور نہیں تھی لیکن میں تو اب دوقدم بھی نہیں چل سکتا تھا۔ نہرپار کرنے اور سڑک تک پہنچنے کا تصور کس طرح کرتا؟

میں نے غیرارادی سے انداز میں آنکھیں بند کرلیں۔ میرا ذہن آسمان اور زمین کے درمیان کسی تاریک سے خلا میں ہلکورے لینے لگا۔ ایک سوال لاشعور کے نہاں خانوں میں کنکھجورے کی طرح رینگ رہا تھا "کیا میں اسی طرح یہاں پڑا... اسی بے بسی کے عالم میں..... بھوک پیاس اور تکلیف سے مرجاؤں گا؟"

اس سوال کے ساتھ ہی بہت سے دھندلے لیکن لرزہ خیز تصورات چلے آرہے تھے۔ شاید میری لاش بھی دریافت نہیں کی جاسکے گی۔ گِدھ اس پر سے گوشت نوچ لیں گے۔ اس کے بعد اگر ڈھانچا کسی کو پڑا مل بھی گیا تو اسے بھلا کون پہچانے گا؟

تقدیر کی اس ستم ظریفی پر میرا ہنسنے کو جی چاہا لیکن مجھ میں ہنسنے کی سکت نہیں تھی۔ البتہ اندر ہی اندر شاید میں ہنسا تھا۔ میں نے زندگی میں کئی ایسے سورماؤں کو ذلت کی موت مارا تھا جو اپنے آپ کو بہت طاقتور' بہت بارسوخ اور ناقابلِ شکست سمجھتے تھے۔ میں نے ریڈ ڈاٹ جیسی مافوق الفطرت سے ذرائع رکھنے والی تنظیم کی بڑی بہت شاندار پیش کش قبول نہیں کی تھی' اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوا تھا' اس سے ٹکر لے لی تھی۔ ابھی تین رات پہلے ہی میں نے ایک درندہ نما انسان ہوشو خان کو موت کے گھاٹ

اُتارا تھا۔ گزشتہ دنوں میں ہی میں نہ جانے کتنے اسلحہ برداروں کو جل دیتا' کسی کو مارتا' کسی کو پٹختا کتنا طویل سفر طے کرچکا تھا۔ لاہور اور کراچی میں میرے کتنے ہی جاں نثار موجود تھے جو میرے پسینے کی جگہ اپنا خون بہانے کے لیے تیار رہتے تھے اور اس وقت بھی شاید میرے حصے کی لڑائی لڑ رہے تھے۔

لیکن یہ سب کس لیے تھا؟ اس کا حاصل..... اس کا انجام کیا تھا؟ صرف یہ کہ میں اس صحرا میں آن گروں اور بے بسی سے ایک درخت کے نیچے لیٹ کر موت کا انتظار کروں؟ وہ بھی ٹانگ میں صرف موچ آجانے کی وجہ سے۔ وہ خداداد قوت جس پر کبھی کبھی مجھے خود بھی حیرت ہوتی تھی' صرف ایک موچ کی وجہ سے بے مصرف ہوکر رہ گئی تھی۔

انسان کی بنائی ہوئی مشینوں میں تو کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا۔ محض بڑی کا ایک حقیر سا تار ٹوٹ جانے سے سیکڑوں ہارس پاور کا ٹرک کھڑا رہ جاتا تھا۔ کسی دیوہیکل مشین کے معمولی سے پرزے کا کوئی ذرا سا کنارا ٹوٹ جانے سے مشین کھڑی کی کھڑی رہ جاتی تھی۔ ٹنوں لوہے کا محض ایک بے مصرف انبار بن کر رہ جاتی تھی۔

لیکن کیا خدا کی بنائی ہوئی مشین میں بھی ایسا ہوتا تھا؟ خدا نے تو اپنی مشین میں بڑے متبادل رکھے تھے۔ ایک پرزہ ذرا گڑبڑ کرنے لگا تو فوراً دوسرا پرزہ اس کی مدد کرنے لگا۔ ایک چیز کمزور پڑی تو فوراً دوسری نے سہارا دے دیا۔ اسی لیے تو انسان اچھی خاصی خرابیوں کو ایک عرصے تک برداشت کرتا چلا جاتا تھا۔ بہت ہی سنگین مسائل آکر ایک دوسرے میں اُلجھ جاتے تھے تب جاکر یہ عظیم مشینری ناکارہ ہوتی تھی۔

شاید قدرت اس بے بسی' اس بے کسی سے مجھے کچھ سمجھانا چاہتی تھی۔ یکدم ہی مجھے اس طرح جس شکست خوردگی نے گھیرا تھا' اس میں اوپر والے کی کوئی مصلحت تھی۔ میرا ذہن تاریک خلا میں ہلکورے ضرور لے رہا تھا لیکن ناکارہ نہیں ہوا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ تاریک خلا جس میں میرا ذہن ہلکورے لے رہا تھا' درحقیقت مایوسی کا خلا تھا۔

مایوسی تو مرتے ہوئے انسان کو کچھ اور جلدی ماردیتی ہے۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ مجھے اس تاریکی میں بھی امید کی کرن تلاش کرنی چاہیے۔ مایوسی کو تو ویسے بھی میرے مالک نے کفر قرار دیا تھا۔ جس رب نے بڑے بڑے مشکل مواقع پر نہایت عجیب اور ناقابلِ یقین انداز میں میری مدد کی تھی وہ اب بھی میری مدد کرنے سے قاصر تو نہیں تھا۔ اس کے قبضۂ قدرت سے تو کچھ بھی باہر نہیں تھا۔

یہ سب کچھ سوچتے ہوئے میرا دل ایک نئے اور انوکھے گداز سے آشنا ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے لیکن میں نے رخساروں پر ہاتھ پھیرا تو وہ خشک تھے۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو معمولی سی نمی کا احساس ہوا لیکن آنکھیں اس کے باوجود جل رہی تھیں۔ شاید صرف دل رو رہا تھا۔ میری نظر دھندلا رہی تھی۔ اردگرد کا منظراب مجھے صاف دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

میں نے دوبارہ آنکھیں بند کرلیں اور جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میں اپنی ٹانگ میں اُٹھتی ہوئی درد کی خوفناک لہروں اور اپنے جسم سے پھوٹتی تپش کی طرف سے دھیان ہٹانے کی کوشش کررہا تھا۔ ابھی میں نے مایوسی کے اندھیروں میں امید کی کرن تلاش کرنے کی صرف کوشش ہی کی تھی' ذہن کو اس طرف راغب ہی کیا تھا اور فوراً ہی میرے دل کو قرار سا آگیا تھا۔ جسمانی تکلیف اپنی جگہ برقرار تھی بلکہ شاید اس میں اضافہ ہوچکا تھا لیکن اسے برداشت کرنے کا حوصلہ مجھ میں اب کچھ بڑھ گیا تھا۔

بہت دیر تک میں ساکت لیٹا رہا۔ اسی عالم میں شاید میں کچھ دیر کے لیے دنیا ومافیہا سے بے خبر بھی ہوگیا تھا۔ معلوم نہیں وہ غشی تھی یا مجھے نیند آگئی تھی۔ آخر میں رات بھر کا جاگا ہوا بھی تو تھا۔

اچانک میں چونکا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ کوئی مجھے بلا رہا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ پہلے تو مجھے اپنے قریب دھندلی پرچھائیوں کے سوا کچھ نظر نہ آیا لیکن جلد ہی یہ دھندلاہٹ دور ہوگئی۔

میں نے دیکھا' ایک شخص اکڑوں بیٹھا مجھے ہلا رہا تھا۔ اس کے عقب میں ایک سفید گھوڑا کھڑا دُم ہلا رہا تھا۔ اس پر زین کسی ہوئی تھی۔ میں اس وقت اپنے آپ کو کسی تنور کے دہانے پر لیٹا محسوس کررہا تھا لیکن اس شخص کو دیکھ کر میری رگ وپے میں معمولی سی ٹھنڈک اُتر آئی۔ اس ویرانے میں کم ازکم ایک انسان کی صورت تو نظر آئی تھی ورنہ مجھے تو یہاں اس کا امکان ہی نظر نہیں آرہا تھا۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ میرا دوست ثابت ہونے والا تھا یا دشمن؟ وہ میرے لیے کوئی زحمت اٹھانے کا ارادہ رکھتا تھا یا محض تجسس سے مجبور ہوکر رک گیا تھا اور میری چائیں کر معذرت کرکے آگے بڑھنے والا تھا؟ ان سب سوالوں سے قطع نظر میرے لیے اتنی سی بات ہی طمانیت کا باعث تھی کہ وہ مجھے دیکھ کر گھوڑے سے اُتر آیا تھا۔

اس لمحے میں نے فیصلہ کیا کہ اب بہت ہوچکی تھی۔ میرا یوں پاگلوں کی طرح بھاگے پھرنا کوئی دانش مندانہ عمل نہیں تھا۔ ایڈونچر بھی اب بہت ہوچکا تھا اور جن مصلحتوں کے تحت میں نے گمنام اور بے حیثیت ہوکر اپنے آپ کو وطن کی بیکراں فضاؤں میں گم کرنے کی کوشش کی تھی' اب انہیں ترک کردینا ہی بہتر تھا۔ جب میرا ایمان تھا کہ زندگی اور موت خدا کے ہاتھ میں تھی تو میں ریڈ ڈاٹ سے چھپتا کیوں پھر رہا تھا؟

میں نے فیصلہ کیا کہ اگر اس شخص نے میری مدد کی اور میں اپنی اس تکلیف سے نکل آیا' زندہ بچ گیا تو لاہور لوٹ جاؤں گا جہاں شاید میرے ساتھی بھی میری ہی طرح زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہوں۔ مجھے ان کی خبر لینی چاہیے تھی۔ جو ہوگا' دیکھا جائے

گا۔ صرف ایک لمحے میں یہ سب خیالات میرے ذہن میں آئے۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ میں اس شخص کے سامنے زیادہ شکست خوردہ، زیادہ اذیت زدہ، زیادہ بکھرا بکھرا نظر نہیں آنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوا یا نہیں بہرحال اس شخص کے چہرے پر فکر مندی برقرار رہی۔ مجھے آنکھیں کھولتے دیکھ کر بھی اس کی فکرمندی کم نہیں ہوئی تھی۔

میں اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے حواس کافی حد تک صحیح کام کر رہے تھے۔ یہ احساس میرے لیے کچھ اطمینان بخش تھا۔ وہ ایک صحت مند اور وجیہہ شخص تھا۔ عمر تقریباً میرے برابر ہی رہی ہوگی۔ جسامت میں بھی شاید وہ مجھ سے کچھ ہی کم رہا ہو لیکن اس کی رنگت سانولی تھی اور پیٹ بھی ذرا نکلا ہوا تھا۔ گھنی اور اوپر کو اٹھی ہوئی مونچھیں اس کے چہرے پر جچ رہی تھیں۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس نے زمانے کی سختیاں مردانہ وار جھیلی تھیں۔ وہ گہرے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کی پگڑی تھی۔

اس نے مجھ سے یہ نہیں پوچھا کہ میں کون تھا، کہاں سے آیا تھا اور کیونکر اس حال کو پہنچا تھا۔ شاید اس نے اپنے تجسس پر قابو رکھا تھا اور یہی سوچا تھا کہ مجھے سوالات کی نہیں، مدد کی ضرورت تھی۔ اس کے ہاتھ میں پانی کی مخصوص سی بوتل تھی جو عموماً صحراؤں میں سفر کرنے والے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔

بوتل میرے منہ سے لگانے کے لیے اس نے زمین پر بیٹھتے ہوئے میرا سر اپنے زانو پر رکھنے کی کوشش کی لیکن میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ میری حالت اتنی خراب بھی نہیں" مجھے خود اپنی آواز نحیف محسوس ہوئی۔ میری حالت شاید اس سے زیادہ خراب تھی جتنی نظر آ رہی تھی لیکن میرا ذہن ابھی تک اپنی بے بسی اور معذوری سے سمجھوتا نہیں کر سکا تھا۔ ایسی بے بسی اور معذوری مجھ پر زندگی میں کبھی آئی بھی نہیں تھی۔

تھوڑی سی کوشش سے میں اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن کوشش کر رہا تھا کہ مجھے اپنے موچ زدہ ٹخنے کو کم سے کم حرکت دینی پڑے۔ ٹخنہ کیا تھا گویا ایک بہت بڑا پھوڑا تھا۔ ذرا سی حرکت اس میں اٹھتی ہوئی ٹیسوں کو خوف ناک بنا دیتی تھی۔

اس نے بوتل میرے ہونٹوں سے لگائی اور میں نے آب حیات کے چند گھونٹ حلق سے اتارے۔ جسم میں نئی زندگی کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے بوتل کو ڈھکنا لگا کر گھوڑے کے پہلو میں لٹکایا اور دوبارہ میری طرف پلٹا۔ اب بھی اس نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا بلکہ کسی ماہر ڈاکٹر یا سرجن کی طرح میرا معائنہ کرنے لگا۔

اس نے میری متورم گردن کو انگلیوں سے دبا کر دیکھا۔ میں نے اف نہیں کی۔ اس کے بعد اس کی نظر میرے متورم ٹخنے پر آ ٹکی۔ اس نے اسے بھی انگلیوں سے دبایا تو میں بے اختیار کراہ اٹھا۔

اس نے ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور فیصلہ کن لہجے میں بولا "تمہاری گردن پر تو شہد کی مکھیوں نے کاٹا ہے لیکن تمہارے ٹخنے میں بہت بری موچ آئی ہے جسے تم نے دوڑ بھاگ کر اور بھی بگاڑ لیا ہے۔"

میں اس کی ماہرانہ، پُراعتماد اور "درست" رائے سن کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کافی سلجھا ہوا اور خوش حال دکھائی دیتا تھا لیکن بہرحال دیہاتی ہی معلوم ہوتا تھا مگر اس کا مجھے چیک کر کے رائے دینے کا انداز کسی ماہر سرجن یا ڈاکٹر ہی جیسا تھا۔ بلکہ ماہر ڈاکٹر اور سرجن بھی عموماً یقین سے کوئی رائے نہیں دیتے۔ ابتدائی معائنے کے بعد تو ان کی ہر بات "شاید" سے ہی شروع ہوتی ہے یا پھر وہ بھاری بھرکم طبی اصطلاحوں سے مریض کو مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس نے تو بالکل سیدھی سچی اور دوٹوک بات کر دی تھی۔ مجھے یاد آیا، تھوڑا عرصہ پہلے ہی زندگی کے اسی ہنگامہ خیز سفر میں بلال شیدی نامی ایک کردار مجھ سے ٹکرایا تھا جسے میں دیر تک محض ایک ان پڑھ، خونخوار قبائلی سمجھتا رہا تھا۔

بعد میں پتا چلا تھا کہ قبائلی تو وہ بے شک تھا لیکن کبھی میڈیکل اسٹوڈنٹ بھی رہا تھا۔ اب اس اجنبی کی بات سن کر مجھے شبہ سا ہوا کہ کہیں یہ بھی ویسا ہی معاملہ تو نہیں تھا؟ کہیں اس شخص کا بھی میڈیکل لائن سے کوئی تعلق تو نہیں تھا؟

"تم ڈاکٹر ہو؟" میں نے درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

وہ تمسخرانہ سے انداز میں ہنسا "کیا اتنی سی بات بتانے کے لیے ڈاکٹر ہونا ضروری ہے؟"

"بعض اوقات تو خود ڈاکٹر بھی اتنی سی بات نہیں بتا سکتے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"ڈاکٹروں نے وہ سبق نہیں سیکھے ہوتے نا.... جو دریاؤں، پہاڑوں اور جنگلوں کے درمیان ایک آزاد پنچھی کی طرح رہنے والے انسان سیکھتے ہیں" وہ چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے گہری سانس لے کر بولا "حادثے اور طرح طرح کی تکلیفیں انسان کو ذرا اور طرح کا ڈاکٹر بنا دیتی ہیں۔ اس کی آنکھیں ایکسرے کا کام دیتی ہیں اور کسی کے درد سے کراہنے کی آواز اس کے لیے ٹیسٹ رپورٹ بن جاتی ہے۔"

اس کی باتوں نے مجھے چونکا دیا۔ تکلیف کا احساس کچھ کم ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں ہلکی سی سرخی اور اضطراب تھا۔ اس کے سانولے مگر پرکشش چہرے پر بھی ہلکا سا کھنچاؤ تھا۔ وہ جیسے کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولا "آؤ میرا سہارا لے کر گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ میرا گھر یہاں سے کافی دور ہے اور میں گھر پہنچ کر ہی تمہاری کوئی مدد کر سکتا ہوں۔"

"تم نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، کس طرح اس حال کو پہنچا ہوں؟" میں نے کہا۔ اسے یقیناً یہ اندازہ بھی ہوگیا تھا کہ میں اس کی زبان بولنے والا نہیں تھا لیکن اس نے اس پر آشوب دور میں بھی اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ میں اس کے لیے قطعی اجنبی تھا لیکن وہ صرف میری تکلیف دیکھ کر کچھ پوچھے بغیر مجھے اپنے گھر لے جانے پر تیار ہوگیا تھا۔

"پوچھ لیں گے.... پوچھ لیں گے.... سب کچھ پوچھ لیں گے" وہ بے پروائی سے بولا "پوچھ کچھ بھی اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔ یہ کچھ پوچھنے پاچھنے کا وقت نہیں ہے۔ میں نے بس یہ اطمینان کرلیا ہے کہ تم میرے دشمن نہیں ہو۔ میں صرف دشمنوں کا دشمن ہوں لیکن دشمن بھی اگر مجھے اس حالت میں ملتا جس میں تم پڑے تھے تو شاید میں اسے انگلی نہ لگاتا.... اور کوئی بعید نہیں تھا کہ میں اپنے دل کو اس کی مدد پر بھی آمادہ کرلیتا۔"

اس نے سہارا دے کر مجھے اُٹھایا۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک مضبوط اور سخت جان شخص تھا۔ میں صرف ایک پاؤں پر وزن ڈالتے ہوئے اُٹھا اور دوسرا پاؤں زمین پر ٹکائے بغیر اس کی گردن میں بازو ڈال کر سیدھا کھڑا ہوا۔ وہ گھوڑے کو قریب لے آیا تھا۔ میں نے بایاں پاؤں رکاب میں ٹکایا اور اس نے مجھے تقریباً اٹھا کر گھوڑے پر سوار کرایا۔

ہلنے جلنے سے میرے ٹخنے میں پھر تکلیف شروع ہوگئی تھی۔ جسم بخار سے بھی تپ رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ گھوڑے پر اوندھا لیٹ جاؤں۔ میں نے بہ مشکل خود کو اس سے باز رکھا۔ مجھے بٹھانے کے بعد وہ ایک لمحے کھڑا کچھ سوچتا رہا۔ زین پر ہم دونوں کے بیٹھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ وہ میرے پیچھے زین سے پیچھے ہی بیٹھ گیا۔ وہ ماہر گھڑ سوار معلوم ہوتا تھا۔ زین کے بغیر بھی سفر کرنا شاید اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔

"یہ گھوڑا شاندار بھی ہے اور جاندار بھی" وہ خود ہی اپنے گھوڑے کی تعریف کرنے لگا۔ بہرحال اس کی تعریف مبالغے یا خوش فہمی پر مبنی نہیں تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن ہم دونوں تگڑے جوان ہیں۔ ہمارا ایک ساتھ اس گھوڑے پر چڑھ بیٹھنا زیادتی ہی ہے۔ خیر.... میں اسے تیز دوڑانے کی کوشش نہیں کروں گا۔ تیز دوڑنے سے ویسے بھی تمہیں تکلیف ہوگی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہیں۔ ذرا دیر سے گھر پہنچیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ گھر پہنچ تو جائیں گے، یہی بڑی بات ہے" میں نے نقاہت سے کہا اور ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ معلوم نہیں میں اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوسکا یا نہیں۔

گھوڑا دُلکی چلنے لگا۔ ان معمولی جھٹکوں سے بھی میری ٹانگ میں تکلیف بڑھنے لگی لیکن میں دانت بھینچے اسے برداشت کرتا رہا۔ یہی کیا کم تھا کہ کوئی میری مدد کے لیے آن تو پہنچا تھا۔ اس احساس سے ہی جسم میں کچھ جان سی آگئی تھی اور دم توڑتی ہوئی قوت برداشت کو سنبھالا مل گیا تھا ورنہ میں نے تو خواب کے سے عالم میں گدھوں کو اپنا جسم بھی نوچتے دیکھ لیا تھا۔

گھوڑا کچھ دیر یکساں رفتار سے چلتا رہا تو گویا میرے پاؤں کی تکلیف کا بھی ایک ردھم سا بن گیا۔ ایک بار پھر گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح درد کی خنجر زنی جاری تھی لیکن کچھ دیر تکلیف یکساں انداز میں جاری رہے تو گویا انسان اس کا عادی سا ہونے لگتا ہے۔

میں نے ہمت کرکے دھیرے دھیرے اپنا جبڑا ڈھیلا کیا اور پوچھا "کیا یہاں آس پاس کوئی ڈاکٹر نہیں ہے؟"

"ڈاکٹر....!" اس نے یوں دُہرایا گویا اسے مجھ سے اس سوال کی قطعاً توقع نہیں تھی۔ پھر وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسا اور بولا "نہر کے اس طرف پچیس تیس میل کا علاقہ ایسا ہے کہ کوئی کتا بھی یہاں سے نہیں گزرتا۔ آبادی تو اس سے بھی زیادہ دور دور تک نہیں ہے۔ تم ڈاکٹر کی بات کررہے ہو، شکر کرو کہ میرا بھی ادھر سے گزر ہوگیا۔ یہ محض ایک اتفاق ہے ورنہ میں بھی اس طرف آتا نہیں ہوں۔"

مجھے یاد آیا کہ میں نے مایوسی کے عالم میں آنکھیں بند کرتے وقت جب امید کی کوئی کرن تلاش کرنے کی کوشش کی تھی تو میرے ذہن میں صرف رب کا تصور تھا اور امیدوں کو حقیقت میں بدلنے کی قدرت رب کریم سے زیادہ کون رکھتا ہے؟ یہ شخص اگر کہیں اور بھی جارہا تھا تو یقیناً اللہ نے اس کا رخ اس طرف موڑ دیا ہوگا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا "لیکن تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہارا مسئلہ زیادہ سنگین نہیں۔ تمہارے لیے تو میں ہی بطور ڈاکٹر کافی ثابت ہوں گا۔ لیکن ابھی تمہیں اس کا اندازہ نہیں ہوسکتا۔ تمہیں میرے گھر پہنچ کر ہی پتا چلے گا۔"

"کچھ کچھ اندازہ تو ہوچکا ہے" میں نے کہا۔ مجھے اس کی "تشخیص" یاد آگئی تھی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تم نے تو فی الحال میرے بارے میں کچھ پوچھنا ضروری نہیں سمجھا لیکن مجھے تو اپنے بارے میں کچھ بتادو۔ تم کون ہو.... تمہارا نام کیا ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر کھنچاؤ کچھ بڑھ گیا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا اور کہیں دور دیکھ رہا تھا۔ لگام میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے زین کا پچھلا حصہ پکڑے بیٹھا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے میرے سوال کا جواب دیا "نام میرا روحیل خان ہے۔ میں چھوٹا سا ایک زمیندار ہوں۔ بہت ہی چھوٹا سا" اس نے ہاتھ آگے لاکر انگلی اور انگوٹھے سے کچھ ایسا اشارہ کیا جیسے کسی کیڑے مکوڑے کا سائز بتانے کی کوشش کررہا ہو "یہاں سے چند میل دور بائیس ایکڑ زمین ہے میری۔"

میرا سر چکرا رہا تھا اور مجھے بار بار اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ گھوڑے سے نیچے نہ گر جاؤں لیکن میں کسی نہ کسی طرح خود کو سنبھالے بیٹھا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو باتوں میں مصروف رکھنے کے لیے اردگرد کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "یہاں کتنی ویرانی ہے! میں نے بہت سی ایسی جگہیں دیکھی ہیں جہاں انسان نہیں ہوتے لیکن وہاں اتنی ویرانی کا احساس نہیں ہوا۔"

"ہاں۔ بہت سی جگہیں ہوتی ہیں جہاں انسان نہیں ہوتے مگر وہ آباد لگتی ہیں۔ بہت سی جگہیں ہوتی ہیں جہاں انسانوں کا ہجوم ہوتا ہے مگر پھر بھی وہ ویران لگتی ہیں اور بہت سی جگہیں ہوتی ہیں جہاں انسان بھی نہیں ہوتے اور ویرانی بھی ذرے ذرے سے ٹپکتی ہے۔ یہ انہی جگہوں میں سے ایک ہے" اس نے اردگرد اشارہ کیا پھر گہری سانس لے کر بولا "وہ تمہارے اردو کے ایک شاعر نے کہا ہے...."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "یہ تم نے اردو کے شاعر کو میرا شاعر کیوں بنادیا؟ ہر زبان کے شاعر ہم سب کے شاعر ہیں۔ شاہ لطیف صرف تمہارے شاعر نہیں، ہم سب کے شاعر ہیں... بلکہ پوری دنیا کے شاعر ہیں۔ شاعر، ادیب اور دانشور تو وہ لوگ ہیں جو پوری دنیا کے انسانوں کو تسبیح کے دانوں کی طرح ایک لڑی میں پرونے کی باتیں کرتے رہے ہیں۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہا پھر نہ جانے کیوں دھیرے سے ہنسا اور بولا "بہت خوشی ہوئی تمہارے منہ سے یہ باتیں سُن کر۔ بہت مدت بعد کسی کے منہ سے اس طرح کی بات سننے کو ملی ہے۔ آج کل ایسی باتوں کا زمانہ نہیں رہا۔ یہ پُرانے وقتوں کی باتیں ہیں جب شاعر، ادیب اور دانشور پوری انسانیت کے نمائندے ہوا کرتے تھے۔ اب پوری دنیا کے تو کیا، پورے ملک کے انسانوں کو بھی ایک لڑی میں پرونے والے شاعر، ادیب اور دانشور شاید شرم سے منہ چھپا کر کسی اور طرف کو نکل گئے ہیں، مر کھپ گئے ہیں یا کہیں سہمے بیٹھے ہیں۔ اب تو اس طبقے نے بھی اپنی اپنی ڈیڑھ ڈیڑھ دانے کی لڑی پرونے کو ہی بہت بڑا اور عظیم کام سمجھ لیا ہے۔ مذہب کے ٹھیکے دار بھی پہلے تو صرف مذہبی عقائد کی بنیاد پر ہی ڈیڑھ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے بیٹھے تھے اب انہوں نے زبان کی بنیاد پر بھی انسانوں کو تقسیم کرنے کی خدمت اپنے ذمے لے لی ہے۔"

میں نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سُلگ رہی تھیں۔ میں نے دھیرے سے کہا "تم کافی پڑھے لکھے لگتے ہو۔"

وہ گویا چونک کر کسی دنیا سے واپس آتے ہوئے بولا "اس بات کو جانے دو۔ کچھ انسان ان پڑھ ہوتے ہوئے بھی بڑی بات کرسکتے ہیں اور کچھ عالم فاضل اور دانشور ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ چھوٹی بات ہی کرتے ہیں۔ پڑھے لکھے ہونا اب اس بات کی ضمانت نہیں رہا کہ انسان کا ذہن بھی وسیع ہوگا۔ وہ زمانہ گیا جب تعلیم، تعلیم ہوتی تھی اور انسان کے ذہن کو وسعت دیتی تھی۔ اب تو تعلیم حاصل کرنے کے طریقے بھی بدل گئے ہیں اور مصرف بھی۔ یہ بڑی لمبی بحث ہے، اسے جانے دو۔"

"ہر بحث بڑی لمبی ہوتی ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اس لیے میں کوشش کرتا ہوں کہ بحث میں نہ اُلجھوں لیکن نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کبھی نہ کبھی بحث میں اُلجھ ہی جاتا ہے۔"

"بحث بری چیز نہیں ہے، انسانی زندگی کا ایک حصہ ہے۔ اس سے کم علم لوگوں کے علم میں اضافہ ہوتا ہے، ذہن کے بند دریچے کھلتے ہیں۔ بشرطیکہ انسان دوسرے کی بات سننے، سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی خواہش رکھتا ہو لیکن اب کوئی ایسی خواہش رکھتا ہی نہیں۔ بحث اور مکالمہ اب ختم ہوچکا ہے کیونکہ یہ دورِ جہالت ہے۔ انسان کو خوش فہمی ہے کہ اس نے بڑی ترقی کرلی ہے لیکن درحقیقت وہ پیچھے جارہا ہے۔ لوگوں کے ہاتھ میں وہ چیز آگئی ہے جسے وہ سب سے بڑی دلیل سمجھتے ہیں۔"

"وہ کیا؟" میں نے ایک بار پھر گردن ترچھی کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک ماؤزر تھا "یہ ہے آج کے دور کی سب سے بڑی دلیل۔"

"تم نے بھی یہی دلیل اپنالی؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "تم تو ذرا دوسری طرح کی باتیں کررہے تھے۔ میں تو سمجھا تھا...."

"بے فکر رہو۔ یہ دلیل تم جیسے انسانوں کے لیے نہیں ہے جو کھلا اور کشادہ ذہن لے کر زندگی کے راستے پر چل رہے ہیں۔" اس نے گویا مجھے تسلی دی "لیکن مجھے مجبوراً اس طرح کی دلیلیں ساتھ رکھنا پڑتی ہیں۔ میں بڑے پُرخطر علاقے میں رہ رہا ہوں اور بڑی پُرخطر زندگی بسر کررہا ہوں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "وہ شاعر والی اور اس علاقے والی بات بیچ میں ہی رہ گئی۔"

"ہاں...." وہ ماؤزر دوبارہ قمیص کے نیچے چھپاتے ہوئے بولا "تم نے ویرانی کی بات کی تھی تو مجھے ایک مصرع یاد آگیا تھا۔ بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ رنگ صرف آسمان ہی نہیں بدلتا، زمین بھی بدلتی ہے۔ یہ زمین جو تم دیکھ رہے ہو.... زیادہ پُرانی بات نہیں، یہ بڑی زرخیز ہوا کرتی تھی۔ شاعر نے تو آسماں کے رنگ بدلنے کی جو بات کی تھی، اس سے مراد زمانے کے تغیرات تھے لیکن میں جو زمین کے رنگ بدلنے کی بات کررہا ہوں وہ صرف شاعرانہ رنگ میں نہیں کررہا۔ اس زمین کا رنگ محاورتاً نہیں، سچ مچ بدل گیا ہے۔"

"کیوں؟" میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کبھی یہاں دو چھوٹے چھوٹے قبیلے آباد تھے جو کتوں کی طرح آپس میں لڑتے رہتے تھے حالانکہ اصلاً اور نسلاً وہ ایک ہی تھے لیکن نہ جانے کب اور کس طرح ان کی شاخیں جدا ہوگئی تھیں۔ اس کے بعد سے انہیں گویا ایک دوسرے سے لڑنے کے سوا دنیا میں کوئی کام نہیں رہا تھا۔ نہ جانے کون کون انہیں آکر جھگڑاتا اور

سمجھا تا بجھاتا۔ غربت اور فاقہ کشی نے یہاں ڈیرے ڈال لیے۔ چار دن امن رہتا پھر وہی خونریزی۔ جن کے دل میں خونریزی دیکھنے اور سہنے کی تاب نہ رہی وہ رات کی تاریکی میں دھیرے دھیرے یہاں سے کوچ کر گئے۔ اس وقت اس علاقے سے یہ نہر بھی نہیں گزرتی تھی' اس کے باوجود زمین زرخیز تھی۔ پھر نہر بھی آگئی لیکن زمین بنجر اور ریتلی ہوتی گئی۔ شاید یہ اس انسانی خون کا اثر تھا جو خواہ مخواہ بہایا گیا تھا اور برسوں اس مٹی میں جذب ہوتا رہا تھا۔ اس مٹی کو شاید اتنا پانی نہیں ملا تھا جتنا اسے لہو پلایا گیا تھا۔ آخر کار سب کچھ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد سے اس علاقے کو آباد کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکی۔ حتیٰ کہ وہ سردار بھی علاقہ چھوڑ کر چلے گئے جن کے حکم پر لوگ کتوں کی طرح لڑتے رہتے تھے۔ سنا ہے ان دونوں سرداروں کا انجام بھی بہت برا ہوا تھا۔ دونوں خود اپنی اولادوں کے ہاتھوں کتے کی موت مرے تھے۔ شاید اس لیے کہ ان کی گردنوں پر بہت سے بے گناہوں کا خون تھا۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "حیرت ہے! اس مقام کو دیکھ کر ذرا بھی احساس نہیں ہوتا کہ یہاں کبھی کوئی آبادی تھی ورنہ اُجڑنے والی آبادیوں کے بھی کچھ نہ کچھ آثار صدیوں تک باقی رہتے ہیں۔"

"یہی تو غور کرنے والی باتیں ہیں۔ یہ تو پھر بھی ایک پرانی' کچی اور قبائلی آبادی تھی' مجھے یقین ہے جہاں ظلم' زیادتی اور بے گناہوں کا خون بہنے کا سلسلہ حد سے بڑھ جائے گا وہاں خواہ کنکریٹ اور فولاد کی فلک بوس عمارتیں بھی ہوں' شاید دیکھتے ہی دیکھتے وہ اس طرح اُجڑ جائیں' صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں کہ آثارِ قدیمہ کے ماہرین کو ان کا نشانہ بھی نہ ملے۔ قدرت بہت برداشت کرتی ہے' انسان کو بڑی ڈھیل دیتی ہے لیکن اگر وہ جلال میں آجائے تو پھر کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "دنیا میں جہاں جہاں بھی لوگ کتوں کی طرح لڑتے رہتے ہیں' میرا دل چاہتا ہے ان سب کو لا کر یہ جگہ دکھاؤں۔ یہاں اب وہ جانور بھی دکھائی نہیں دیتے جو عموماً صحراؤں اور ویرانوں میں پائے جاتے ہیں۔ پرندے بھی اِکا دُکا ہی نظر آتے ہیں۔ وہ بھی شاید بھٹکتے ہوئے آجاتے ہیں... تمہاری طرح۔"

میں تکلیف کے باوجود مسکرا دیا۔ مجھے خوشی تھی کہ مدد کے لیے آدمی بھی میسر آیا تھا تو ذرا ڈھنگ کا۔ اس سے کم از کم بات چیت تو کی جا سکتی تھی۔ جاہل نہیں تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "ہمیں کتنی دور جانا ہے؟"

"بس دو میل اور" اس نے یوں وثوق سے جواب دیا گویا فاصلہ اس نے بالکل ٹھیک ٹھیک ناپ رکھا تھا "شکر کرو کہ ویرانے کا زیادہ بڑا حصہ تو اس طرف رہ گیا تھا" اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

دو میل کا وہ سفر مجھے بے حد طویل محسوس ہوا۔ کئی بار ایسا لگا جیسے مجھ پر پھر غشی چھانے لگی ہے لیکن عقب سے روحیل خان مجھے ذرا بھی ڈھیلا پڑتے دیکھتا تو اس کے مضبوط بازو مجھے سہارا دیتے۔ وہ میری پیٹھ تھپکتا' لفظوں سے میری ہمت بندھاتا اور مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں لگانے کی کوشش کرتا۔

زمین کا ریتلا پن اب ختم ہو چکا تھا اور اب وہ ویسی ہی دکھائی دینے لگی تھی جیسی عموماً زرعی زمین ہوتی ہے لیکن کھیت وہاں اب بھی دکھائی نہیں دے رہے تھے البتہ ایک بہت بڑے رقبے پر گھاس اُگی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اسی گھاس کے درمیان سے ایک نہایت تنگ سی پگڈنڈی پر سفر کرتے بالآخر ہم گویا اچانک ہی ایک مکان کے سامنے جا پہنچے۔

مکان چھوٹا مگر تقریباً پختہ ہی تھا۔ پکی اینٹوں اور لکڑی کی بلیوں وغیرہ سے بنا ہوا تھا۔ گاؤں دیہات میں ایسے مکانوں کو پختہ ہی کہا جاتا ہے۔ تین طرف سے وہ مکان درختوں میں گھرا ہوا تھا اور سامنے ایک بہت بڑی جگہ گویا صحن کے طور پر چھوڑ دی گئی تھی جس کے اردگرد باڑھ لگی ہوئی تھی۔ لکڑی کی بلیوں سے بنی ہوئی اس باڑھ میں چھوٹا سا ایک چوبی گیٹ بھی تھا جسے تالا لگا ہوا تھا۔ مکان کے سامنے ہی کچھ فاصلہ چھوڑ کر کھیت پھیلے ہوئے تھے جن میں گنے کی فصل سر اُٹھاتی دکھائی دے رہی تھی۔

ان کھیتوں کا سلسلہ زیادہ طویل نہیں تھا۔ روحیل خان کی بائیس ایکڑ زمین یقیناً یہی تھی اور بارانی معلوم ہوتی تھی۔ مکان کی باڑھ کے اندر چند مویشیوں کے سوا اور کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔

دور دور تک کوئی آبادی بھی نظر نہیں آرہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ روحیل خان کی زمین کے اردگرد کی زمین بھی حالانکہ کارآمد معلوم ہوتی تھی لیکن اس پر گھاس پھونس کے سوا کچھ نہیں تھا۔ صرف روحیل خان کی زمین بہت عمدہ حالت میں نظر آرہی تھی اور ظاہر ہوتا تھا کہ اس پر کھیتی باڑی باقاعدگی سے ہوتی تھی۔

میرے اور روحیل خان کے سوا وہاں بھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہاں ویرانی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وہاں کی خاموشی اور سناٹے میں ایک عجیب سا سکون تھا۔

"تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟" میں نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ اور یہ بڑا دل گردے کا کام ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ وہ گھوڑے سے اُتر چکا تھا۔ اس نے مجھے بھی تقریباً اپنے اوپر لاد کر ہی گھوڑے سے اُتارا اور سہارا دے کر اندر لے جاتے ہوئے بولا "یہاں قریب ہی ایک گاؤں ہے.... ڈیرہ حسام خان۔ کھیتی باڑی کے سلسلے میں کبھی مدد کی ضرورت ہوتی ہے تو دیہاڑی پر وہاں سے دو چار آدمی لے آتا ہوں۔ کام ختم ہوتا ہے تو انہیں رخصت کر دیتا ہوں۔ میں یہاں اکیلا ہی رہنا پسند کرتا ہوں۔ یہ دنیا کے جھمیلوں سے الگ تھلگ میری جنت ہے۔ میں تنہا رہنے کا عادی ہو گیا ہوں۔ زیادہ لوگوں کے سامنے جاتے ہوئے مجھے وحشت ہوتی ہے۔"

چوبی گیٹ کا تالا کھولتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر بولا۔ "تمہیں سچی بات بتاؤں.... مجھے زیادہ تر انسان اچھے نہیں لگتے۔ ہر ایک کی شکل پر کسی نہ کسی طرح کی خباثت لکھی نظر آتی ہے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ میں انسانوں کے درمیان رہا تو کہیں اپنی نفرت سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی حرکت شروع نہ کروں جو مجھے قانون کا مجرم یا لوگوں کی نظر میں ذلیل نہ بنا دے۔ اس لیے احتیاطاً بھی میں نے دنیا سے کنارا کر لیا ہے۔ میرے اور دنیا والوں کے... دونوں ہی کے حق میں یہ بہتر ہے" وہ عجیب سے انداز میں ہنسا "بھیڑیے عام طور پر غول کی صورت میں پھرتے ہیں لیکن کوئی کوئی بھیڑیا تنہا رہنے کا بھی عادی ہو جاتا ہے پھر وہ زندگی بھر تنہا ہی رہتا ہے۔"

"لیکن تم میں تو بہت بھیڑیوں والی کوئی خصوصیت دکھائی نہیں دیتی۔" میں نے نحیف آواز میں کہا "تم تو مجھے ایک رحم دل اور مہربان انسان معلوم ہوتے ہو۔ اگر تم رحم دل اور مہربان نہ ہوتے تو مجھے وہاں بے ہوش پڑا دیکھ کر کیوں رُکتے اور اٹھا کر یہاں اپنی جنت میں کیوں لاتے جہاں تم تنہا رہنا پسند کرتے ہو؟"

"نہیں.... میں اتنا رحمدل اور مہربان بھی نہیں ہوں" وہ سر جھٹک کر بولا "میں تو یونہی غیر ارادی سے انداز میں تمہارے پاس رُک گیا تھا۔ پھر میں نے غور سے دیکھا تو مجھے تمہارے چہرے پر کسی قسم کی خباثت دکھائی نہیں دی۔ میں نے سوچا... چلو' بہت مدت ہو گئی ہے کسی کی مدد کیے ہوئے۔ ذرا اس کی مدد کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ پتا نہیں کیوں میرے دل نے کہا کہ مجھے تمہاری ذات سے کوئی فائدہ پہنچے گا' نقصان نہیں۔ بس یوں ذرا دل کا کہنا مان لیا۔ اور کوئی خاص بات نہیں۔ ویسے میں نے برسوں سے کسی کی کوئی خاص مدد نہیں کی ہے۔"

وہ بہت صاف گو بھی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے مکان کا تالا کھولا تو اندر ایک اور چھوٹا صحن نظر آیا جس میں چاروں طرف پھول اور پودے لگے ہوئے تھے۔ یہیں مختلف گوشوں میں کچن اور غسل خانہ وغیرہ بنا ہوا تھا۔

آگے بڑھ کر اس نے ایک اور دروازہ کھولا۔ وہ ایک خاصا طویل و عریض' ہال نما کمرا تھا۔ اس میں کرسیاں' پلنگ' الماریاں.... ضرورت کی تقریباً سبھی چیزیں موجود تھیں۔ دیوار پر ایک کلاشنکوف بھی لٹکی ہوئی تھی۔ تپائی پر بغیر ہولسٹر کے ایک لمبی نال والا ہیرنا ریوالور بھی رکھا تھا۔ کمرے میں بڑی سی ایک فاضل چارپائی بھی تھی جو دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔

اس نے نہایت احتیاط سے مجھے پلنگ پر بچھے ہوئے صاف ستھرے پلنگ پر لٹا دیا اور مجھے یوں لگا جیسے میں جنت کے کسی گوشے میں پہنچ گیا ہوں۔ تکلیفیں اپنی جگہ برقرار تھیں لیکن ان کے ساتھ ساتھ بے پناہ راحت کا بھی احساس ہوا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ اسی لمحے میرا ذہن گویا غوطہ سا کھا گیا۔ چند لمحے کے لیے میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو روحیل خان ایک گیلے تولیے سے میرا منہ پونچھ رہا تھا۔ مجھے خود بھی احساس تھا کہ میں چند لمحے کے لیے گردوپیش سے بے خبر ہو گیا تھا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو روحیل خان بولا "تم زبردستی جاگنے کی کوشش مت کرو۔ اگر نیند یا غشی تمہارے ذہن پر غلبہ پا رہی ہے تو مزاحمت مت کرو۔ ویسے بھی کچھ دیر بعد میں تمہیں نیند کا انجکشن دوں گا۔"

"انجکشن دو گے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ میں تو اگر ضروری سمجھتا تو تمہاری چھوٹی موٹی سرجری بھی کر ڈالتا لیکن میرا خیال ہے فی الحال اس کی ضرورت نہیں ہے" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

چہرہ پونچھنے کے بعد اس نے گیلے تولیے سے میرا متورم پاؤں بھی صاف کرنا شروع کیا۔ تولیے کی ہلکی سی رگڑ بھی میرے لیے اذیت ناک تھی۔ میں نے سختی سے دانت بھینچ لیے۔ پاؤں صاف ہو چکا تو اس نے جا کر لوہے کی ایک الماری کھولی۔ مجھے ایک بار پھر حیرت کا جھٹکا لگا۔ الماری کیا' اچھا بھلا میڈیکل اسٹور تھی۔ میں دور سے بھی دیکھ سکتا تھا کہ اس کے خانے مختلف دواؤں اور دیگر طبی لوازمات سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک کریم کی ٹیوب لیے وہ دوبارہ پلنگ پر آبیٹھا۔

"تمہارے پاس تو دواؤں کا اچھا بھلا اسٹاک موجود ہے" میں نے کہا۔

"میں نے بتایا نا کہ اس ویرانے میں اکیلے رہنا کوئی آسان کام نہیں۔ انسان کو کسی بھی وقت' کسی بھی دوا کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ کوئی ایمرجنسی پڑ سکتی ہے۔ کوئی چھوٹی موٹی تکلیف بھی انسان کو بے بس کر دے تو وہ یہاں پڑا پڑا مر سکتا ہے۔ اس لیے میں نے بہت کچھ سیکھا ہوا ہے اور بہت سی چیزوں کا بندوبست رکھا ہوا ہے۔ میں خود اپنے آپ کو بھی انجکشن لگا لیتا ہوں" روحیل خان نے بتایا۔

اس نے بہت سی کریم میرے متورم پاؤں پر لگا کر مالش کرنا شروع کی۔ پہلے تو اس کے ہاتھ کے نرم دباؤ سے بھی تکلیف ہوئی لیکن جوں جوں کریم ورم زدہ حصوں میں جذب ہوتی گئی' تکلیف کچھ کم ہوتی گئی۔ کچھ دیر پہلے وہ کہہ رہا تھا کہ اسے انسان کچھ زیادہ اچھے نہیں لگتے اور وہ کچھ زیادہ رحم دل یا انسان دوست نہیں ہے لیکن جس انہماک اور محبت سے وہ یہ کام کر رہا تھا اس طرح کوئی معقول معاوضہ لینے والا ڈسپنسر یا نرس بھی نہیں کر سکتی تھی۔ یہ بھی

قدرت کا عجیب تماشا تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کے ہاتھوں سے میری بھرپور مدد کروا رہی تھی جو خود اپنے منہ سے کہہ رہا تھا کہ وہ رحم دل اور مہربان نہیں تھا۔

مالش سے فارغ ہو کر وہ باہر جا کر ہینڈ پمپ پر ہاتھ دھو کر آیا اور ڈسٹلڈ واٹر ملا کر میرے لیے ایک انجکشن تیار کرنے لگا۔ نہایت مہارت سے اس نے مجھے انجکشن لگایا۔ اور اپنی کارروائی پر گویا نہایت اطمینان محسوس کرتے ہوئے بولا "یہ انجکشن بخار کے لیے تھا۔ اب میں اپنے اور تمہارے لیے کچھ کھانے پینے کا بندوبست کرتا ہوں۔ اس کے بعد میں تمہیں نیند کا انجکشن دوں گا تاکہ تم لمبی نیند لے سکو۔ کل ہی تم اپنے آپ کو بہت بہتر محسوس کرو گے۔"

اس نے میرے لیے مرغی کی یخنی تک تیار کر ڈالی۔ کھانا اس نے ہلکا پھلکا بنایا تھا جو طبّی لحاظ سے میرے لیے بہتر تھا۔ میں اپنے آپ کو واقعی ایک ماہر اور مخلص ڈاکٹر کے زیرِ نگرانی محسوس کر رہا تھا۔ کھانا اور یخنی وغیرہ پیٹ میں گئی تو میرے مضمحل وجود میں توانائی کی لہر سی دوڑ گئی۔ میں اس سے کچھ دیر اور باتیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے مجھے اس کا موقع نہیں دیا اور نیند کا انجکشن لگا دیا۔ چند منٹ بعد ہی میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوب گیا لیکن یہ تاریکیاں اپنے دامن میں گویا راحت کا احساس لیے آئی تھیں۔

دوسرے روز دن چڑھے میری آنکھ کھلی تو مجھے بخار محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ میرے پاؤں کی تکلیف بھی اب قابلِ برداشت ہو چکی تھی۔ روحیل خان اس وقت باہر صحن میں کسی کام میں مصروف تھا۔ اپنی کل اور آج کی حالت کے بارے میں سوچتے ہوئے تشکر کے احساس سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بات بہت چھوٹی تھی لیکن موت مجھے گویا چھو کر گزر گئی تھی۔

روحیل خان اندر آیا تو اس نے مجھے بیدار پاتے ہی ایک بار پھر پہلا کام یہ کیا کہ میرے پاؤں پر کریم کی مالش کی، مجھے انجکشن لگایا پھر ناشتا بنایا۔ میری طرف سے مطمئن ہونے اور مجھے آرام سے لٹانے کے بعد وہ زمین پر چلا گیا۔ دوپہر تک وہ مصروف رہا، واپس آیا تو مشقت کے پسینے میں شرابور تھا لیکن اس نے میری دوا دارو میں ایک لمحے کی تاخیر نہیں کی۔ ایک بار پھر میری مالش کی۔ چند گولیاں کھانے کو دیں۔ کھانے وغیرہ کے بعد کچھ دیر آرام کر کے وہ دوبارہ زمین پر چلا گیا۔

تین دن اسی طرح گزرے۔ اس نے نہایت باقاعدگی اور توجہ سے میرا علاج کیا۔ ہر طرح سے میری خدمت کی۔ مجھے جس طرح کی بھی مدد کی ضرورت تھی، وہ اس نے مجھے فراہم کی۔ ظاہر ہے، میں ایک طرح سے معذور ہی تھا لیکن وہ میرے کسی بھی کام میں ذرا بھی نہیں ہچکچایا۔ اس کی پیشانی پر کبھی شکن نہیں آئی۔ حد تو یہ تھی کہ مجھے اس سے کسی کام کے لیے کہنا نہیں پڑتا تھا۔ اسے گویا خود بخود معلوم ہو جاتا تھا کہ کس وقت میری ضرورت کیا تھی۔

میں نے اس سے ممنونیت کا ایک لفظ نہیں کہا تھا، وہ اس کا موقع ہی نہیں دیتا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ میں اس کی نوازشوں کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا۔

اس کے پاس تمام ضروری اوزار موجود تھے۔ اس نے مجھے گزارے لائق ایک بیساکھی بھی تیار کر دی تھی لیکن ابھی مجھے بیساکھی کے سہارے بھی چلنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ میں محسوس کرنے لگا تھا کہ بیساکھی کے سہارے میں چل سکتا تھا لیکن جب میں نے چلنے کی کوشش کی تو وہ چلا اٹھا اور بیساکھی اس نے میرے ہاتھ سے چھین لی۔

"احمق....." اس نے مجھے ڈانٹا "تمہیں معلوم ہے کہ موچ آنے کے فوراً بعد زور و شور سے دوڑنے کی وجہ سے تمہاری لگمنٹ..... جسے دو ہڈیوں کو جوڑنے والی تار بھی کہہ سکتے ہیں.. بُری طرح خراب ہو چکی ہو گی۔ اسے ٹھیک ہونے کے لیے وقت دو۔ ایک شدید بے احتیاطی تو کر چکے ہو۔ اب دوسری بھی کرو گے تو عمر بھر کے لیے نقص بیٹھ جائے گا۔ پھر شاید آپریشن کرانے سے بھی مسئلہ حل نہ ہو۔"

"آپریشن بھی کرایا تو تم ہی سے کراؤں گا۔ تم سے اچھا سرجن مجھے کہاں ملے گا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں" وہ سنجیدگی سے بولا "لیکن اگر تم نے میری ہدایات پر عمل نہ کیا تو میں درانتی سے تمہارا آپریشن کروں گا۔"

"تمہارے ہاتھ سے مجھے وہ بھی قبول ہو گا" میں نے کہا۔

وہ بیساکھی میرے بستر سے دور، دیوار کے سہارے کھڑی کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھ کر ایک بیڑی سلگانے لگا۔ میں نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ویسے روحیل خان! تم مانو یا نہ مانو لیکن تمہارا میڈیکل کی لائن سے کوئی تعلق ہے ضرور۔"

"ہاں۔ اتنا تعلق تو ہے کہ زندگی میں کئی بار مجھے ڈاکٹروں سے واسطہ پڑا ہے۔ انہوں نے جس مسئلے میں میرا جو علاج کیا میں نے اسے یاد رکھا۔ پھر ضرورتاً بھی کچھ سیکھا، کچھ معلومات کیں، کچھ کتابیں پڑھیں۔ غیر مستند ڈاکٹر بننا اتنا مشکل نہیں ہے۔"

"تمہارے جتنی معلومات اگر کسی کے پاس ہوں تو گاؤں دیہات میں وہ کلینک کھول کر بیٹھ جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں نے بھی کھولا ہوا ہے" وہ الماری کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "لیکن صرف اپنے لیے۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "روحیل خان! ایک بات سچ سچ بتاؤ، تم نے شادی کیوں نہیں کی؟"

"شادی.....!" اس نے یوں چونک کر میری طرف دیکھا گویا اسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

پھر جیسے اس پر کسی اضطراب نے حملہ کیا اور وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر دیکھتے ہوئے وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا "باہر

کیسا سکوت چھایا ہوا ہے۔ اس سے بھی گہرا سکوت میرے دل کی دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ سکوت، ہوش سنبھالنے کے بعد سے میرے ساتھ ہے۔ دل کی رہ گزر یونہی سنسان پڑی ہے۔ کچھ پتا نہیں چلتا کہ کس انجانی، اَن دیکھی ہستی کا انتظار ہے۔"

پھر اچانک وہ میری طرف مڑا اور بولا "لیکن معلوم نہیں تم میری بات سمجھ سکو گے یا نہیں۔ شاید تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو جنہیں اپنے ہر سوال کا سیدھا سادا جواب چاہیے ہوتا ہے۔"

"نہیں۔ میں ایسا نا سمجھ بھی نہیں" میں نے کہا "اور جو بات تم کر رہے ہو وہ کچھ ایسی انوکھی بھی نہیں۔ اس دنیا میں نہ جانے کتنے لوگ ہیں جن کے دل کی رہ گزر یونہی سنسان رہتی ہے۔ وہ شادیاں بھی کر لیتے ہیں اور یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ انہیں جس انجانی، اَن دیکھی ہستی کا انتظار تھا وہ ان کی زندگی میں آ گئی ہے لیکن کچھ عرصے بعد پتا چلتا ہے وہ تو محض دھوکا تھا۔ یوں انتظار ہمیشہ انتظار ہی رہتا ہے۔ ذہن میں جو ایک خلا ہوتا ہے وہ کبھی بھرنے نہیں پاتا۔"

وہ ذرا گرم جوشی سے بولا "تم..... تم یقیناً بات سمجھ سکتے ہو۔ تم سے بات کی جا سکتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ اس اَن دیکھی، انجانی ہستی کا انتظار کروں گا اور دھوکا نہیں کھاؤں گا۔ میرے ذہن کے کسی کونے میں چھپا ہوا امید کا فرشتہ کہتا ہے کہ وہ نامعلوم ہستی ایک دن ضرور آئے گی۔ ناامیدی کا شیطان مجھے بھی ڈراتا ہے کہ خوابوں کی تعبیریں اس دنیا میں کہاں ملتی ہیں۔ یہ انتظار، یہ تشنگی تو شاید لحد تک ساتھ جائے گی لیکن میں اس شیطان کی بات نہیں سنتا۔ میں کہتا ہوں، میں اس انتظار اور تشنگی کو سینے سے لگائے ہی جی لوں گا۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یار! تم تو اچھے بھلے افسانہ نگار ہو سکتے تھے۔ اور اگر یہ الفاظ تم نے کہیں سے پڑھ کر یاد کیے ہیں تب بھی تم ایک اچھے صداکار اور اداکار تو کہلا ہی سکتے ہو۔ تم نے ان مکالموں کی ادائیگی بہت خوب صورتی سے کی ہے۔"

"میں نے یہ الفاظ کہیں پڑھ کر یاد نہیں کیے" وہ خفیف سی ناگواری سے بولا "اور تم تو یہ بات مذاق میں کر رہے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ افسانہ نگار..... اداکار..... صداکار..... یا کچھ اور۔ یہ محض ایک اتفاق تھا کہ میں کاشتکار بن گیا۔ جب میں طالب علم تھا....."

وہ یکدم ہی خاموش ہو گیا۔ اسے گویا اچانک ہی احساس ہوا تھا کہ وہ گفتگو کی روانی میں کچھ دور نکل گیا تھا۔ کسی ایسی سمت میں بھٹک گیا تھا جدھر جانے کا اس کا ارادہ نہیں تھا۔ اس کا چہرہ یکدم سپاٹ سا ہو گیا۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "تو میرا خیال درست تھا۔ تم طالب علم بھی رہے ہو۔"

"ہاں۔ ظاہر ہے..... اسکول تک تو اکثر ہی لوگوں نے پڑھا ہوتا ہے" وہ بے پروائی سے بولا۔

"نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم نے اسکول سے آگے تک پڑھا ہے" نہ چاہتے ہوئے بھی میرے لہجے میں ہلکا سا اصرار شامل ہو گیا۔

"کوئی کسی کے خیالات اور اندازوں پر پابندی نہیں لگا سکتا" وہ بے پروائی سے کندھے اچکا کر بولا "تم مجھے پی ایچ ڈی سمجھنا چاہتے تو سمجھتے رہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے ہائی اسکول سے نکال دیا گیا تھا اور اس طرح نکال دیا گیا تھا کہ کسی اور اسکول میں بھی تین سال تک داخلہ نہیں مل سکتا تھا....."

اس وقت کو یاد کرتے ہوئے اس کے کھنچے کھنچے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہونے لگی "میں شروع ہی سے ذرا تنومند اور غصیلا تھا۔ ہمارے انگلش کے ٹیچر بہت مارتے تھے۔ بات بات پر بید سے کھال ادھیڑ کر رکھ دیتے تھے۔ ایک بار میں نے ان کے قتل کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ شہر سے ایک لمبا سا چاقو بھی خرید لیا تھا۔ کئی دن تک اسے چھپائے پھرتا رہا۔ آخر ایک روز وہ ٹیچرز روم میں اکیلے بیٹھے مل گئے....."

اس کی مسکراہٹ نمایاں ہوتی گئی۔ وہ لڑکپن کے دور میں واپس پہنچ گیا تھا۔ اب وہ کھڑکی کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "میں نے دبے قدموں کمرے میں گھس کر چاقو نکال کر پیچھے سے ٹیچر پر حملہ کرنا چاہا لیکن وہ بروقت خبردار ہو گئے۔ وہ بھی باڈی بلڈر ٹائپ تھے۔ بڑی باقاعدگی سے ورزش کرتے تھے اور نہر کے کنارے کئی میل دوڑ لگاتے تھے۔ وہ ذرا بھی نہیں گھبرائے۔ انہوں نے میری کلائی پکڑ کر مجھے قابو میں کر لیا۔ چاقو چھین لیا اور بید سے وہ پٹائی لگائی کہ ہڈیاں تک چٹخ گئیں پھر انہوں نے مجھے تین سال کے لیے اسکول سے نکلوا کر دم لیا۔ ظاہر ہے تین سال بعد ہم جیسے دیہاتیوں کی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ جڑنے کا امکان ذرا کم ہی ہوتا ہے۔"

پھر وہ ایک گہری سانس لے کر متاسفانہ سے انداز میں بولا "میرے ساتھ اچھا ہوا یا بُرا لیکن ایک بات طے ہے کہ اس دور میں قصبوں اور دیہات تک کے اسکولوں میں بڑا ڈسپلن تھا، بڑا رعب تھا استاد کا۔ بڑے بڑے پھنّے خان طالب علموں کی روح فنا ہوتی تھی استاد سے۔ کالجوں تک میں لڑکے سر جھکا کر رہتے تھے اور واقعی طالب علم معلوم ہوتے تھے، غنڈے نظر نہیں آتے تھے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ سیاست دانوں کے منحوس پنجے درس گاہوں میں زیادہ گہرے نہیں گڑے تھے اور سیاسی جماعتوں نے اپنے اپنے تعصب کا زہر اتنے بڑے پیمانے پر تعلیمی اداروں میں نہیں پھیلایا تھا۔ بس کبھی کبھار مجھ جیسا ہی کوئی ایک آدھ بدنصیب صحیح راستے سے بھٹکتا تھا اور وہ بھی دل ہی دل میں اپنے کردار پر شرمندہ ہوتا تھا۔ اب تو دہشت گردوں کی پوری کھیپ کی کھیپ برآمد ہوئی ہے اور اپنی دہشت گردی پر فخر کرتی ہے۔ تعلیمی اداروں

میں دہشت گرد سینہ تان کر گھومتے ہیں اور شریف طالب علم کان دبائے' سر جھکائے ان کی نظر سے بچتے پھرتے ہیں۔"

"تم بھی صحیح راستے سے بھٹکے تو نہیں۔ زیادہ تعلیم نہیں حاصل کر سکے تو کیا ہوا۔ تم معاشرے کے لیے ناسور تو نہیں بنے ہوئے ہو۔ الگ تھلگ اس ویرانے میں اپنی تھوڑی سی زمین سنبھالے بیٹھے ہو۔ محنت مشقت کرتے ہو اور حلال کی کھاتے ہو۔ یہ تو بہت اچھی زندگی ہے۔ اسے صحیح راہ سے بھٹکنا تو نہیں کہتے۔"

"ہاں.... شاید" وہ مبہم سے لہجے میں بولا اور ایک بار پھر میری طرف سے منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا "لیکن میں بہت سی متضاد کیفیتوں کے درمیان پھنسا ہوا انسان ہوں۔ میں آج تک خود اپنے آپ کو نہیں سمجھ سکا۔"

"اپنے آپ کو سمجھنے میں زیادہ مغز نہیں کھپانا چاہیے۔ یہ بڑا مشکل کام ہے۔" میں نے مشورہ دیا۔

وہ دھیمے لہجے میں بولا "ایک طرف مجھے یہ جگہ اور یہاں کی ویرانی بہت اچھی لگتی ہے۔ تم نے محسوس کیا ہے' یہاں کی مٹی میں ایک عجیب سوندھی سوندھی سی خوشبو رچی ہوئی ہے؟"

"ہاں۔ جس دھرتی سے محبت کرنے لگو وہ دھرتی خوشبو دینے لگتی ہے۔ جن انسانوں سے محبت کرو وہ انسان خوشبو دینے لگتے ہیں۔ یہ دراصل محبت کی خوشبو ہوتی ہے" میں نے کہا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ اس خوشبو نے مجھے اپنا اسیر کیا ہوا ہے جو میں اس ویرانے میں پڑا جوانی کی راتیں گنوا رہا ہوں۔ یہ چھوٹا سا مکان.... یہ تھوڑی سی زمین.... پرانا ٹریکٹر.... چند مویشی.... بس یہی میری جنت ہے لیکن کبھی کبھی میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ میرے خواب نہیں ہیں یہ میری امیدوں' آرزوؤں کا حاصل نہیں ہے۔ میرے خواب تو اس سے بہت مختلف ہیں۔"

گزشتہ تین دنوں میں پہلی بار ہمارے درمیان تفصیلی بات ہو رہی تھی۔ وہ کچھ کھل رہا تھا۔ ان تین دنوں میں مجھے بھی آج ہی اپنی طبیعت بہت بہتر محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں بھی گفتگو میں دلچسپی محسوس کر رہا تھا۔

"مثلاً.... کیا ہیں تمہارے خواب؟" میں نے پوچھا۔ وہ بدستور میری طرف پیٹھ کیے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ دھیمے لہجے میں بولا "چوڑی چکلی.... چمکتی دمکتی شاہراہوں والا کوئی شہر.... اس کے کسی صاف ستھرے پُرسکون علاقے میں شان سے سر اٹھائے کھڑا ہوا کوئی عالی شان سا مکان۔ غیر ملکی ساز و سامان سے آراستہ و پیراستہ خواب گاہیں.... کھڑکیوں پر پھیلے ہوئے بھاری ریشمی پردے.... بیش قیمت ساٹن میں لپٹے ہوئے مرمریں بدن.... ائیرکنڈیشنر کی خنک سرسراہٹ.... ٹیلی فون کی گھنٹی.... مترنم ہنسی.... شائستہ لفظوں کے موتی.... امپورٹڈ پرفیومز.... جھلملاتی کاریں۔ یہ ہیں میرے خواب۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور قدرے حیرت سے بولا "تم ہنسے نہیں مجھ پر؟"

"نہیں۔ اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے" میں نے آہستگی سے کہا "خواب تو خواب ہوتے ہیں۔ ان پر کسی کا کیا زور۔"

میں اس سے تو یہ کہہ رہا تھا لیکن میں کچھ حیران ضرور تھا۔ جو چیزیں اس کے خوابوں کا درجہ رکھتی تھیں' میرا وہ اوڑھنا بچھونا تھیں لیکن میں اپنے آپ کو ان سے اکتایا اکتایا محسوس کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی مجھے فاقہ مستی کی زندگی بہت یاد آتی تھی۔ لگتا ہی تھا کہ اس وقت زیادہ بے فکری تھی' دل میں زیادہ ترنگ تھی۔

عام کاروباری لوگوں کی طرح پریشان تو میں اب بھی نہیں تھا۔ دولت اپنے ساتھ جو مسائل لے کر آتی ہے میں نے انہیں قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا اور بڑی کوششوں سے انہیں خود سے دور رکھا تھا۔ سب سے بڑی چیز جس نے مجھے سکون میں رکھا تھا۔ یہ تھی کہ میں دولت کماتا ضرور تھا لیکن اس پر جان نہیں دیتا تھا' اس کی فکر میں مرتا نہیں تھا۔ اس کے باوجود میں محسوس کرتا تھا کہ میں فاقہ مستی کے زمانے جتنا پُرسکون نہیں تھا' دل میں اتنی ترنگ بھی کبھار ہی محسوس ہوتی تھی۔ میں اب بھی ایسی جگہوں پر رہ کر خوشی' سکون اور طمانیت محسوس کرتا تھا جیسی جگہ پر روحیل خان رہ رہا تھا۔ مجھے اب بھی ایسی زندگی زیادہ دلچسپ اور پُرکشش لگتی تھی جیسی روحیل خان گزار رہا تھا۔

لیکن روحیل خان کے خواب دوسرے تھے۔ مجھے اسی بوالعجبی پر حیرت ہو رہی تھی۔ انسان کو جو کچھ حاصل ہوتا ہے وہ اس پر کبھی خوش نہیں رہتا' کبھی شاکر نہیں رہتا' کبھی قناعت نہیں کرتا۔ ہمیشہ کسی اور ہی سمت میں دیکھتا رہتا ہے۔ روحیل خان بھی اور ہی طرح کے خوابوں کا قیدی تھا۔

میرے نہ ہنسنے سے حوصلہ پا کر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "لیکن مسئلہ پھر وہی متضاد کیفیات کا آجاتا ہے۔ میں کئی بار شہروں میں بھی گیا ہوں۔ سکھر' نواب شاہ' حیدر آباد... حتیٰ کہ کراچی تک بھی ہو آیا ہوں لیکن ہر جگہ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہوا جیسے سانس تک لینے میں دقت ہو رہی ہو۔ ہوا گندی گندی اور گاڑھی گاڑھی سی لگتی تھی۔ سانس لینے میں گویا زور لگانا پڑتا تھا اور ہوا گویا پھیپھڑوں میں اٹک جاتی تھی۔ پھیپھڑوں کو چھیلتی ہوا باہر آتی تھی۔ یوں سمجھو' شہر کی ہوا سے میرے پھیپھڑوں کو بدہضمی ہونے لگتی تھی..." وہ دھیرے سے ہنسا۔

پھر اس نے کھڑکی میں سر اونچا کرتے ہوئے گہری سانس لی۔ گویا ساری ہوا پھیپھڑوں میں بھر لینا چاہتا تھا۔ طمانیت کی گہری سانس لے کر وہ بولا "یہاں کی بات ہی اور ہے۔ یہاں سانس لینا بھی فرحت بخش کام محسوس ہوتا ہے۔ تھکے ہوئے جسم میں نئی زندگی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہ علاقہ ہے بھی بڑا خوب صورت لیکن یہاں خوب

صورتی کسی ایک جگہ جمع نہیں ہے' بکھری پڑی ہے۔ یہاں تمہیں کہیں میلوں تک صحرا صحرا سا دکھائی دے گا' کہیں زرعی زمینیں اور لہلہاتی فصلیں دکھائی دیں گی' کہیں ایسی چٹانیں بھی ملیں گی جن پر سبزے کا نام ونشان نہیں ہوگا اور کہیں سرسبز چراگاہیں اور جنگل بھی ملیں گے جن میں سے بعض اتنے گھنے ہیں کہ سورج کی کرنیں بھی زمین تک مشکل سے پہنچتی ہیں۔ ایک عجیب سی وسعت اور رنگا رنگی ہے اس علاقے میں۔ کہیں یہ علاقہ دیہی لگتا ہے' کہیں پہاڑی اور کہیں صحرائی۔ آبادیوں میں اچھا خاصا شہری رنگ بھی جھلکتا ہے۔ یعنی یہاں ہر رنگ موجود ہے۔ کبھی کبھی میں یونہی میلوں تک اِدھر اُدھر گھوڑا دوڑاتا پھرتا ہوں اور اپنے آپ کو ایک آزاد پنچھی محسوس کرتا ہوں۔ میں چمکتے دمکتے شہروں کے خواب تو دیکھتا ہوں لیکن اس علاقے کو چھوڑ کر جانا بھی مجھے بہت مشکل کام محسوس ہوتا ہے۔"

"اس جگہ کا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کس جگہ کا؟" اس نے چونک کر پوچھا۔ وہ باتوں کی روانی میں گویا کہیں اور ہی پہنچا ہوا تھا۔

"اسی جگہ کا.... جہاں تمہاری یہ زمین اور مکان ہے؟"

"سرکاری کاغذات میں یہ ڈیرہ حسام خان ہی کا ایک گوٹھ ہے۔ اس کا نام نہیں' نمبر ہے۔ لیکن عملاً اس کا ڈیرہ حسام خان سے کوئی تعلق نہیں۔ فاصلہ بھی کافی ہے۔ ویسے یہ جگہ بنی کہلاتی ہے۔ حالانکہ "بنی" کا مطلب صرف زمین ہے۔ یہاں کے موسموں میں بھی بڑی شدت ہے۔ گرمی پڑتی ہے تو جسم وجاں کو جھلسا کر رکھ دیتی ہے اور سردی پڑتی ہے تو اچھا بھلا برفانی علاقہ لگنے لگتا ہے۔ مجھے موسموں کی یہ شدت بھی پسند ہے۔ شاید میں فطرتاً شدت پسند ہوں۔"

"تمہاری زمین کے چاروں طرف جو یہ اتنی بہت سی زمین بیکار پڑی ہوئی ہے' یہ کس کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"پان امریکن ائرلائن میں کوئی کیپٹن صاحب ہیں۔ پاکستانی ہیں مگر شاید بہت اچھے ہواباز ہوں گے جو پان امریکن میں پہنچے ہوئے ہیں۔ کراچی میں رہتے ہیں۔ بہت امیر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ پتا نہیں ان کو کس طرح یہ زمین الاٹ ہوگئی ہے حالانکہ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتے ہیں جنہیں زمین کی نہ کوئی خاص ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی قدر۔ یہ بارانی زمین ہے۔ اسے آباد کرنے کے لیے بڑی محنت کی ضرورت ہے جو کیپٹن صاحب نہیں کرسکتے۔ وہ تو ملک میں رہتے ہی بہت کم ہیں' لیکن وہ کسی کو ٹھیکے پر بھی نہیں دیتے۔ کہتے ہیں' لوگ قبضہ کرلیں گے۔ حالانکہ قبضے کا امکان اب بھی موجود ہے۔ ڈیرہ حسام خان کے ایک رئیس کی نظر اس زمین پر ہے۔ کیپٹن صاحب البتہ مجھے یہ زمین شاید ٹھیکے پر دینے کے لیے تیار ہوجائیں لیکن میں لینے میں دلچسپی نہیں رکھتا۔"

"کیوں؟" میں نے جاننا چاہا۔

"میں نے کہا نا کہ میں تنہا بھیڑیا ہوں۔ لون ولف۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "میں اگر اتنی بڑی زمین سنبھالنا چاہوں گا تو مجھے اپنی تنہائی کی قربانی دینا پڑے گی' لوگوں کو یہاں آباد کرنا پڑے گا۔ لاکھوں روپیہ اس زمین پر لگانا پڑے گا جو فی الحال میرے پاس نہیں ہے۔ بہت محنت کرنا پڑے گی اس زمین پر۔ کئی سال بعد جاکر اس محنت اور سرمایہ کاری کا پھل کھانا نصیب ہوگا۔ کون جانے کہ کئی سال بعد میں یہاں ہوں گا بھی یا نہیں۔ ویسے بھی اب کیپٹن صاحب یہاں مچھلیوں' مرغیوں' بھیڑوں اور نہ جانے کن کن جانوروں کا فارم بنانے کا منصوبہ بنا رہے ہیں۔ پان امریکن میں نوکری کرکے وہ کچھ امریکی سے ہوگئے ہیں۔ امریکی قسم کے منصوبے بناتے ہیں۔"

"کیا تم اپنی اس پُرسکون جنت کو چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ میں ایک ایسا شخص ہوں جو خود بھی اپنے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کرسکتا" وہ مبہم لہجے میں بولا "اس زمین سے کچھ زیادہ آمدنی بھی نہیں ہے۔ میرے شادی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری بیوی ایک عام سے دیہاتی کاشتکار کی بیوی کی طرح میرا ہاتھ بٹاتی مرجائے اور میرے بچے دنیا کی آسائشوں کو ترستے ہوئے پرورش پائیں۔ میں اپنی بیوی کو ملکہ اور اپنے بچوں کو شہزادے بنا کر رکھنا چاہتا ہوں۔ میرے خواب ذرا اونچے ہیں۔"

"خواب سبھی کے اونچے ہوتے ہیں لیکن تعبیروں کے انتظار میں جوانی تو نہیں گنوائی جاسکتی نا۔ یہ کم بخت تو لوٹ کر نہیں آتی" میں نے ایک عجیب سی دوستانہ ہمدردی سے مغلوب ہوکر کہا۔ میں اس وقت "خود را فضیحت دیگراں نصیحت" کا بہت عمدہ مظاہرہ کر رہا تھا۔ مجھے تو خوابوں کی تعبیریں بھی میسّر تھیں لیکن میں نے خود ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔

"ہاں.... شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔ میری عمر پینتیس سال ہے۔ اکثر و بیشتر مجھ پر ایسی راتیں آتی ہیں جب سوتے میں اچانک آنکھ کھل جاتی ہے۔ جسم پسینے میں تر ہوتا ہے مگر گلا خشک۔ ہر مسام جاں سے آگ پھوٹتی ہے۔ میں اُٹھ کر کورے مٹکے سے ٹھنڈے پانی کے کئی گلاس پیتا ہوں مگر بدن کا دوزخ ٹھنڈا نہیں ہوتا" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"ظاہر ہے.... وہ تو ہوگا۔ اس میں تو کوئی تعجب کی بات نہیں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"لیکن شادی کے معاملے میں خوابوں خیالوں اور اپنی تمناؤں کے علاوہ بھی کئی مسئلے ہیں۔ یہ علاقہ فصلوں کے معاملے میں بھی کچھ زیادہ زرخیز نہیں اور چاند چہروں' ستارہ آنکھوں کے معاملے میں بھی خاصا بنجر ہے پھر مجھ جیسے چھڑے چھانٹ کے لیے کون شادی کی کوشش کرے؟ اب میں خود تو کسی شریف آدمی کو راستے میں روک کر نہیں کہہ سکتا کہ جناب میں آپ کی صاحب زادی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے" میں نے تسلیم کیا "میرا خیال ہے ایسے کسی گھرانے تک تمہاری رسائی ہی نہیں ہوئی ورنہ شاید کوئی خود ہی اس معاملے کی ابتدا کردیتا اور تمہارا کام آسان کردیتا۔"

"شاید" اس نے کہا اور میرے قریب کرسی پر آبیٹھا پھر نئی سگریٹ سُلگاتے ہوئے بولا "تم سناؤ.... تمہارے بیوی بچے کہاں ہیں ...ل خان؟"

مجھے ہلکا سا دھچکا لگا۔ مجھے پہلے ہی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ میں اگر اس موضوع کو چھیڑوں گا تو مجھے بھی اس قسم کے کسی سوال کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔

"میرے بیوی بچے...؟ معلوم نہیں کہاں ہیں" میں نے آہستگی سے کہا۔

"کیا مطلب؟ کیا تمہیں معلوم نہیں' تم انہیں کہاں چھوڑ کر آئے تھے؟"

"کہیں بھی نہیں" میں نے سادگی سے جواب دیا "میں نے ابھی تک انہیں دیکھا ہی نہیں۔"

اس نے چارپائی پر ہاتھ مارتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگایا "اچھا.... میں سمجھ گیا۔ یعنی جناب خود بھی ابھی ہمارے ہی جیسے ہیں اور بڑے مدبّر اور بزرگ بن کر ہم کو نصیحتوں سے نواز رہے تھے۔"

میں نے مسکینی سے سر جھکالیا۔ بالآخر میرے دوسروں کو نصیحت اور خود کو فضیحت' والے معاملے کا پول کھل ہی گیا تھا۔

وہ عجب بے نیاز سا آدمی تھا۔ اس نے ابھی تک میرے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ اسے اپنا نام بھی میں نے ضرورتاً خود ہی بتایا تھا۔ آج ذرا باتیں چل نکلی تھیں اور بے تکلفی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے خود ہی کہا "تم نے میرے بارے میں کچھ پوچھا نہیں؟" "میں منتظر تھا کہ تمہاری طبیعت بہتر ہوگی تو خود ہی بتادو گے۔ اب بھی منتظر ہوں۔" وہ بولا۔

میں نے اسے اپنے بارے میں کافی حد تک صحیح بتادیا۔ میں نے بتایا کہ میں لاہور کا ایک تاجر اور کچھ خطرناک لوگوں سے دشمنی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے مجھے بھاگنا پڑا تھا۔ لاہور سے فرار نکل جانے اور گمنامی اختیار کرنے کی کوششوں میں' میں بڑی مشکلات کا شکار ہوگیا تھا۔

خطرناک لوگوں کا ذکر آیا تو وہ سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا "اس خادم کو ان کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ان کی خطرناکی کا کچھ بندوبست کردیتے ہیں۔ تمہارے اس خادم کی بھی کچھ لوگوں سے سلام دُعا ہے۔ اب تم کو دوست کہہ دیا ہے' سمجھ لیا ہے تو ضرورت پڑنے پر تمہارے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتا ہوں۔"

"نہیں.... بس اب اس کی ضرورت نہیں" میں نے بے پروائی سے کہا "بس میرا پاؤں ٹھیک ہوجائے تو میں واپس چلا جاؤں گا۔ میرا خیال ہے اب وہ مسئلہ حل ہو ہی جائے گا' کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔"

"کوئی صورت نہ نکلے تو اپنے اس خادم کو ضرور یاد کرکے دیکھ لینا" وہ بولا۔

"تمہارے احسان کے بوجھ تلے تو میں پہلے ہی دبا ہوا ہوں۔ سوچتا ہوں کیسے اُتاروں گا" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔

"کیا ہر احسان اُتارنا ضروری ہوتا ہے؟" اس نے تیکھے لہجے میں کہا "کچھ احسانوں کو سنبھال کر بھی رکھ لینا چاہیے۔ کبھی کبھار کسی کا ممنون رہنے میں بھی ایک لذت محسوس ہوتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو تم" میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تم جتنے گہرے آدمی ہو' اتنے گہرے لگتے نہیں ہو۔"

"اکثر گہرے آدمی ایسے ہی ہوتے ہیں۔ جو گہرے نظر آتے ہیں وہ دراصل گہرے نہیں ہوتے" وہ مسکرایا "خیر.... ان باتوں کو چھوڑو۔ تمہاری داستانِ غم خاصی دلچسپ ہے۔ تم اسے جاری رکھو' ویسے برسبیلِ تذکرہ ایک بات اور بتادوں' میں ابھی تک خود نہیں سمجھ سکا کہ میں تمہیں بے ہوش پڑے دیکھ کر کیوں رُک گیا تھا۔ میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ میں کوئی خاص رحم دل آدمی نہیں ہوں۔ زندگی میں کئی بار ایسا بھی ہوا ہے کہ راستے میں لاش پڑی دیکھی اور پھلانگ کر آگئے۔ یہ بھی جاننے کی کوشش نہیں کی کہ مرنے والا کون تھا' کیسے مرا؟ گھر آکر اس کے بارے میں سوچا تک نہیں۔"

"بس.... یہ اوپر والے کے فیصلے ہوتے ہیں کہ کہاں کس کے پاؤں میں زنجیر ڈالنی ہے اور کہاں کس کو چلتے رکھنا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اچھا.... خیر.... تم بتا رہے تھے کہ تم بس میں بیٹھ کر کتنہ کوٹ پہنچے..." وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "اس کے بعد کیا ہوا؟"

جب میں نے اسے بتایا کہ کس طرح چند قبائلیوں نے مجھے ماکھو چاچڑ ڈاکو سمجھ کر پکڑلیا تھا اور کس طرح وہ یقین کیے بیٹھے تھے کہ میں نے ان کے ایک سردار زادے کے قتل میں حصہ لیا تھا' تو روحیل خان کو گویا حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ وہ یکدم سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ اسے گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"کیا کہا تم نے....؟" اس نے تصدیق چاہی "انہوں نے تمہیں ماکھو چاچڑ سمجھ کر پکڑلیا تھا؟ ماکھو چاچڑ ڈاکو....؟"

"ہاں۔ وہ تو یہی کہہ رہے تھے" میں نے کہا۔

"لیکن وہ کس بنیاد پر تمہیں ڈاکو سمجھ رہے تھے؟ کیا ثبوت تھا ان کے پاس؟"

"ان کے پاس دُھندلی سی ایک تصویر تھی۔ انہوں نے اس

سے میری شکل ملائی تھی" میں نے بتایا۔
"کیا واقعی تمہاری شکل اس سے ملتی تھی؟" اس نے گہری دلچسپی سے پوچھا۔
"اس وقت ملتی تھی" میں نے جواب دیا۔
"اس وقت ملتی تھی؟ کیا مطلب ....؟ کیا اب تمہاری شکل بدل گئی ہے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔
"ہاں۔ کسی حد تک" میں نے جواب دیا "میں اپنی دانست میں بڑا بندوبست کرکے چلا تھا۔ اپنے خطرناک دشمنوں سے بچنے کے لیے میں نے تھوڑا بہت میک اپ کا سہارا لے رکھا تھا۔ اس وقت میری شکل میں کچھ تبدیلیاں آچکی تھیں۔ بدقسمتی سے انہی تبدیلیوں کی وجہ سے دُھندلا سا وہ فوٹو مجھ سے بہت ملتا جلتا نظر آرہا تھا۔ شاید میک اپ مین نے کبھی کہیں ماکھو چاچڑ کی تصویر دیکھی ہو اور اس کے لاشعور میں رہ گئی ہو۔ غیر ارادی طور پر اس نے میرا ویسا ہی میک اپ کردیا ہو۔ اپنی دانست میں تو اس نے مجھے دودھ والا بنانے کی کوشش کی تھی۔ ویسے میک اپ بہت عمدہ تھا۔"
"پھر بھی ... کس قسم کا میک اپ تھا؟ کیا تبدیلیاں تھیں تمہارے چہرے میں؟" اس نے جاننا چاہا۔ وہ اب جیسے دنیا کی ہر بات بھول گیا تھا۔ مجھے اس کی دلچسپی اور حیرت غیر معمولی لگ رہی تھی۔
میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی کہ میک اپ سے میری شکل میں کیا ہلکی پھلکی تبدیلیاں اور اضافے کیے گئے تھے' اس وقت میری شکل کیسی لگ رہی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ اس بات کو کافی دن گزر چکے تھے اور اس دوران مجھے مسلسل دشواریوں ہی کا سامنا رہا تھا' مجھے کہیں بھی صحیح معنوں میں آرام اور احتیاط سے بیٹھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ اس لیے میرا میک اپ اپنی معیاد سے پہلے ہی ختم ہوچکا تھا۔
وہ آنکھیں سکیڑے پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اس کے باوجود ان لوگوں کو تمہیں ماکھو چاچڑ نہیں سمجھنا چاہیے تھا" یہ بات سُن کر اس کی تو گویا حیرت ہی دور ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ مجھے اس کے اس قدر حیران ہونے کی توقع نہیں تھی۔
"کیوں .... کیا تم ماکھو چاچڑ کو جانتے ہو؟ اس کی شکل ویسی نہیں تھی جیسی میں نے بتانے کی کوشش کی ہے؟" میں نے پوچھا۔
"یہ بات نہیں ہے" وہ تیزی سے بولا "ماکھو چاچڑ کو تو میں نہیں جانتا لیکن تمہیں تو ان تین دنوں میں ہی اچھی طرح جان گیا ہوں۔ خیر.... جاننے کی بات بھی چھوڑو۔ تم شکل سے ہی ڈاکو نہیں لگتے۔ میک اپ کی جو تبدیلیاں تم بتارہے ہو ان کے باوجود تم میرے اندازے کے مطابق ڈاکو نہیں لگ سکتے تھے۔ میں نے جب تمہیں ویرانے میں بے ہوش پڑے دیکھا اس وقت بھی حالانکہ مصیبتوں

اس وقت بھی نہیں لگ رہے تھے۔ میں نے تو ایک نظر دیکھتے ہی اندازہ کرلیا تھا کہ تم کوئی شریف آدمی ہو اور تمہارا تعلق شہر سے ہے۔"
"تمہاری بات اور ہے" میں نے کہا "تم دیہاتی ہو۔ اس ویرانے میں زندگی گزار رہے ہو اس کے باوجود شہریوں سے زیادہ مہذب' پڑھے لکھے اور سمجھدار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ وہ کرخت قسم کے قبائلی تھے جنہوں نے مجھے پکڑا تھا۔ وہ دوسرے کی بات سُننے کے تو عادی ہی معلوم نہیں ہوتے تھے۔"
پھر میں نے طویل سانس لے کر گاؤ تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "ویسے مجھے تمہاری اس بات سے اتفاق نہیں ہے کہ شکل وصورت سے کسی کے ڈاکو ہونے یا نہ ہونے کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ ڈاکو کا وہ تصور تو اب صرف فلموں اور پُرانی طرز کے قصے کہانیوں میں رہ گیا ہے کہ وہ کالے کپڑوں میں ہو' گھوڑے پر سوار ہو' چہرے پر ڈھاٹا بندھا ہو اور ہاتھ میں توڑے دار بندوق ہو۔ اب تو دور دراز دیہاتوں میں بھی ڈاکو بہترین اور جدید قسم کی جیپوں میں آتے ہیں' ان کے پاس جدید ترین رائفلیں' مشین گنیں' گرینیڈ اور بعض اوقات راکٹ لانچر تک ہوتے ہیں۔ بلکہ پولیس اکثر ... رونی پائی جاتی ہے کہ ان کے پاس وہ جدید وسائل نہیں ہیں جو ڈاکوؤں کے پاس موجود ہیں۔ اس لیے ان سے نمٹنا مشکل ہورہا ہے۔"
وہ خاموشی سے بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کے علاوہ ڈاکو بہت بدلے ہوئے روپ میں بھی ہوسکتے ہیں۔ میرے ایک جاننے والے چھوٹے موٹے بزنس مین ہیں۔ کراچی میں گلشن اقبال میں رہتے ہیں۔ ایک بار بتارہے تھے کہ سال ڈیڑھ سال سے ان کے برابر والے بنگلے میں کرائے پر ایک فیملی آکر رہنے لگی۔ اس میں دو تین مرد تھے' نہایت شریف' نہایت امن پسند۔ بزنس مین کی فیملی سے ان کے تعلقات بھی ہوگئے۔ ایک کے گھر میں اچھے کھانے پک رہے ہیں تو ٹرے سج کر دوسرے کے گھر میں جارہی ہے۔ تحائف کا تبادلہ ہورہا ہے۔ عید بقرعید پر چیزیں بھیجی جارہی ہیں۔ ایک رات پولیس نے بنگلے کے گرد مورچہ بندی کرکے چھاپا مارا اور تب بے چارے ہمارے بزنس مین دوست کو پتا چلا کہ اس فیملی کے مرد کافی اونچے درجے کے ڈاکو تھے۔ قتل اور ڈاکوں کی کم از کم پچیس وارداتوں میں پولیس کو مطلوب تھے۔ بے چارے بزنس مین کے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور کافی عرصے تک کھڑے ہی رہے۔"
وہ دلچسپی آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کہا "لہٰذا برادرِ عزیز! یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ ڈاکو کیسے ہوسکتے ہیں اور کیسے نہیں۔ زمانہ بہت ترقی کرگیا ہے۔ کسی کی بھی اصلیت جاننا بہت مشکل ہے۔"

...نارہے تھے' کیا وہ پکڑے گئے تھے؟"
"نہیں۔ نہ جانے کس وقت وہ پورے کا پورا خاندان غائب ہوچکا تھا۔ سجا سجایا گھر خالی چھوڑ گئے تھے۔ پولیس خواہ مخواہ گھنٹوں مورچہ بندیاں اور ناکا بندیاں کرتی رہی۔ اندر کوئی بھی نہیں تھا۔ ویسے ٹی وی چل رہا تھا۔ کچن میں چولہے جل رہے تھے۔"
"جس طرح پولیس کو ان کی موجودگی کی مخبری ہوئی تھی اسی طرح انہیں بھی پولیس کے چھاپے کی مخبری ہوگئی ہوگی۔ صرف پولیس کا ہی نہیں' ڈاکوؤں کا بھی مخبری کا نظام کام کرتا ہے۔ دونوں کے نظاموں میں مقابلہ چلتا رہتا ہے۔ کبھی کسی کا نظام سبقت لے جاتا ہے' کبھی کسی کا" وہ مربیانہ انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "یہ بتاؤ وہاں سے ڈکیتیوں کا کچھ مال بھی برآمد ہوا تھا یا نہیں؟"
"نہیں۔ وہاں نقدی زیور کچھ نہیں تھا۔ بھولے سے کہیں سو روپے بھی چھوڑ کر نہیں گئے تھے وہ" میں نے جواب دیا۔
"ضروری نہیں ہے" وہ منہ بنا کر بولا "ممکن ہے انہیں بہت کچھ چھوڑ کر جانا پڑا ہو لیکن کاغذات میں اس کا ذکر نہ آیا ہو۔"
میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ واقعہ میرے کسی شناسا بزنس مین کے پڑوس کا نہیں بلکہ کراچی میں میرے اپنے ہوٹل کے جنرل منیجر کے پڑوس کا تھا۔ میں نے ابھی روحیل خان کو اپنی اصل شخصیت کے بارے میں بتانا بہتر نہیں سمجھا تھا اور اپنے آپ کو چھوٹا موٹا تاجر ظاہر کرنا ہی مناسب سمجھا تھا۔
"خطرناک لوگوں" سے اپنی دشمنی کی بات کرتے وقت بھی میں نے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں اشارہ تک نہیں دیا تھا۔ ان باتوں کی تفصیلات میں جانا بے کار تھا۔ میں اس وقت روحیل خان کی لاعلمی اور سادگی سے محظوظ بھی ہوا تھا جب اس نے ان خطرناک لوگوں کے سلسلے میں اپنی مدد کی پیش کی تھی۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ جن لوگوں سے میرا ٹکراؤ تھا ان کے سامنے روحیل خان یا اس کے وہ شناسا جنہیں وہ "خطرناک" سمجھتا تھا' تنکوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ ان سب باتوں میں اُلجھنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے معاملات اور بات چیت کو زیادہ سے زیادہ سادہ اور عام فہم رکھنے کی کوشش کی تھی۔ میں ہر جگہ اپنے اصل مسائل کے بارے میں گاتے پھرنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا اور یہ بات میرے لیے خطرناک بھی ثابت ہوسکتی تھی۔
روحیل خان بیڑی کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا "... لیکن تمہیں ایک بات بتادوں۔ زمانہ خواہ کہیں سے کہیں پہنچ گیا ہے لیکن کسی بھی طبقے کا اپنی روایات سے ایک نفسیاتی سا تعلق بن جاتا ہے جسے وہ توڑ نہیں سکتا۔ مثلاً ڈاکو آج بھی کالے رنگ کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور ترجیح دیتے ہیں۔ چاہے وہ جیپ میں ڈاکا مارنے جائیں یا پجارو میں۔ عموماً ان کی گاڑی سیاہ یا کسی دوسرے گہرے رنگ کی ہوگی۔ کپڑے بھی سیاہ یا پھر کسی اور گہرے رنگ کے ہوں گے۔ ڈھاٹا بھی اکثر باندھا جاتا ہے۔ ظاہر ہے ڈاکوؤں کے لیے ان چیزوں کی افادیت آج بھی قائم ہے۔ کالی گاڑیوں اور لباس کی وجہ سے انہیں رات کے اندھیرے میں غائب ہونے میں مدد ملتی ہے۔ ڈھاٹے سے اصل شکل چھپی رہتی ہے۔ یہ ایک الگ معاملہ ہے کہ بے شمار عوامل نے ڈاکوؤں کو اب بے خوف بنادیا ہے۔ انہیں اپنی شکل ظاہر ہوجانے کی بھی کوئی پروا نہیں ہوتی لیکن پھر بھی ان کی اکثریت یہی سوچتی ہے کہ اصل شکل چھپی ہی رہے تو کیا حرج ہے؟ کبھی کبھی یہ احتیاط بہت فائدہ دے جاتی ہے۔"
"تمہیں تو ڈاکوؤں کی نفسیات اور ان کی سوچ سے کافی آگاہی حاصل ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"میں جس علاقے میں رہتا ہوں یہاں ڈاکوؤں سے اکثر واسطہ پڑتا رہتا ہے" وہ سنجیدگی سے بولا "بعض اوقات تو ہمیں ان کے سامنے بالکل مسکین اور ان کے ہمدرد بن کر بھی رہنا پڑتا ہے کیونکہ فی الحال مجھ جیسے لوگوں کو انہی علاقوں میں کہیں نہ کہیں رہنا ہے۔ میں تمہیں ایک بات اور بتادوں۔ یہاں اب بھی گھڑ سوار ڈاکو ہی زیادہ پائے جاتے ہیں کیونکہ ضرورت پڑنے پر انہیں جس طرح کے ... اور جنگلوں میں روپوش ہونا پڑتا ہے وہاں گھوڑے ہی زیادہ کارآمد رہتے ہیں۔ گاڑیاں تیز رفتار ضرور ہوتی ہیں اور ان کے بہت سے فائدے ہیں لیکن ساتھ ہی ان کے بہت سے مسائل بھی ہوتے ہیں۔"
میں نے اثبات میں سرہلایا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "بلکہ میں تمہیں خبردار کرنے والا تھا۔ دو چار دن میں ذرا تم کسی مدد اور سہارے کے بغیر چلنے کے قابل ہوجاؤ تو شاید مجھے ڈیرہ حسام خان جانا پڑے اور ایک آدھ رات کے لیے شاید مجھے وہیں رُکنا پڑے۔ اس دوران تم ذرا ہوشیار رہنا۔ کبھی کبھار کچھ ڈاکو بھٹکتے بھٹکاتے اس طرف بھی آنکلتے ہیں۔ ویسے تو خیر یہاں کیا رکھا ہے جو وہ لے جائیں گے لیکن کبھی کبھار ڈاکو جنگلی جانوروں کی طرح محض شرارتاً بھی راستے میں آنے والی چیزوں کو اُجاڑتے چلے جاتے ہیں۔ تمہیں میری عدم موجودگی میں ڈاکوؤں سے .... اور ان کے اس موڈ سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی۔ ویسے تو اس علاقے کے بیشتر ڈاکوؤں کو میرے اور میرے اس ڈیرے کے بارے میں ساری معلومات حاصل ہیں۔ وہ ادھر کا رُخ کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے لیکن کچھ بعید نہیں کہ کوئی اکیلا دُکیلا نیا فنکار.... یا نئے فنکاروں کا کوئی ٹولہ اس طرف آنکلے۔"
"تم فکر نہ کرو۔" میں نے غیر ارادی طور پر بے پروائی سے کہا "ویسے تمہارے خیال میں مجھے کتنے دن یہاں ٹھہرنا پڑے گا؟"
"جب تک تم اپنے دونوں پیروں پر صحیح طرح دوڑنے بھاگنے اور اُچھلنے کودنے کے قابل نہ ہوجاؤ اس وقت تک تمہیں یہاں سے ہلنے کے بارے میں بھی نہیں سوچنا چاہیے۔ اس کے بعد کا قیام تمہاری مرضی پر منحصر ہوگا۔ تم چاہو تو ہمیشہ بھی یہاں رہ سکتے ہو'

غریب خانہ حاضر ہے لیکن آثار بتا رہے ہیں کہ اس ویرانے میں تمہارا دل نہیں لگے گا۔ شہری آدمی یہاں صرف مجبوری میں ہی رہ سکتا ہے' خوشی سے نہیں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب تمہیں کیا بتاؤں کہ میرا تو اس سے بھی زیادہ کسی دوردراز مقام پر.... قطب شمالی یا قطب جنوبی قسم کی جگہ پر رہنے کو جی چاہتا ہے لیکن اب جان بہت بکھیڑوں میں پھنس چکی ہے۔"

"بیشتر لوگوں کے ساتھ ایسی ہی مجبوریاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے وہ کہیں رہتے ہیں گو کہ ان کا دل کہیں اور رہنے کو چاہتا ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

پھر اس نے وال کلاک پر نظر ڈالی۔ رات کے صرف آٹھ بجے تھے لیکن وہ چونکتے ہوئے بولا "بہت رات بیت گئی بھئی' اب سو جانا چاہیے۔ لاؤ میں تمہاری ٹانگ پر دوا کی مالش کردوں۔ اس کے بعد اپنی گولیاں اور کیپسول کھاؤ اور آرام سے سو جاؤ۔"

اس ویرانے میں آٹھ بجے واقعی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آدھی رات بیت چکی تھی۔ میں نے اپنے ٹخنے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "تم کریم کی ٹیوب مجھے دے دو۔ اب تو میں خود بھی مالش کرسکتا ہوں۔ اب ورم بھی کم ہوگیا ہے اور تکلیف بھی قابلِ برداشت ہوگئی ہے۔"

وہ ٹیوب لا کر مجھے دیتے ہوئے بولا "دل تو چاہ رہا تھا کہ تمہاری باقی داستانِ غم بھی آج ہی سنتا لیکن مجھے صبح منہ اندھیرے اٹھنا ہوتا ہے اس لیے باقی کل سنیں گے۔"

"داستانِ غم قسطوں ہی میں سنی چاہیے۔ یکمشت سننے سے خواہ مخواہ سننے والے کا دل بھی غم زدہ ہو جاتا ہے" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

وہ میرے بالکل قریب کھڑا تھا۔ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گہری سنجیدگی سے بولا "ویسے استاد....! آدمی تم بھی اس سے زیادہ گہرے ہو جتنے نظر آتے ہو۔"

"تمہیں یہ شبہ کیونکر ہوا؟" میں نے استہزائیہ سے انداز میں پوچھا۔

"تمہاری آنکھیں بتاتی ہیں کہ تم کوئی چھوٹے آدمی نہیں ہو" وہ پلک جھپکائے بغیر بولا۔

"آنکھیں....!" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا "یار! جب میں ایک نوعمر لڑکا تھا' اپنے گاؤں میں آوارہ گھومتا تھا' میرے جوتوں کے تلووں میں سوراخ ہوتے تھے اور جیب میں ایک اٹھنی بھی نہیں ہوتی تھی' آنکھیں تو میری اس وقت بھی یہی تھیں۔"

"ٹھیک ہے... لیکن وقت اور حالات کے ساتھ انسان کے چہرے اور آنکھوں میں... بلکہ پورے وجود میں ہی کچھ خاص قسم کی تبدیلیاں آتی چلی جاتی ہیں جنہیں وہ خود بھی محسوس نہیں کرسکتا مگر دیکھنے والی آنکھ انہیں دیکھ سکتی ہے۔"

"چلو خیر...." میں نے بے پروائی سے کہا "چند دن مزید ساتھ رہیں گے تو شاید ہم ایک دوسرے کی شخصیت کی گہرائی ناپنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"شاید" اس نے مبہم لہجے میں کہا اور مجھے دوا دے کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ اس نے میرے دل میں کچھ کھٹکا سا پیدا کردیا تھا۔ شاید اسے میری کہانی پر پوری طرح یقین نہیں تھا حالانکہ اس میں کوئی ایسا جھوٹ بھی نہیں تھا۔ میں نے صرف اتنا ہی کیا تھا کہ اپنی حیثیت اور حقائق کی سنگینی کو بہت کم کرکے بیان کیا تھا۔

بہرحال روحیل خان کے رویّے میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور نہ ہی اس کا خلوص کم ہوتا دکھائی دیا۔ دو تین دن مزید گزرے تو میری محتاجی خاصی کم ہوگئی۔ اب میں کسی سہارے کے بغیر چل پھر سکتا تھا۔ پاؤں پر پورا وزن نہیں آتا تھا اور میں تیز تیز نہیں چل سکتا تھا لیکن پہلے دن کے مقابلے میں زمین آسمان کا فرق تھا مگر روحیل خان اب بھی میرا ہر کام خود کرنے اور ضرورت کے وقت میری خدمت میں حاضر رہنے کی پوری پوری کوشش کرتا تھا۔ اس نے مجھے سختی سے ہدایت کی تھی کہ میں صرف ہلکی پھلکی ورزش کے طور پر چلوں' بلا ضرورت چل پھر کر اپنے ٹھیک ہوتے ہوئے پاؤں کو خراب کرنے کی کوشش نہ کروں۔

مجھے اس حد تک تندرست ہوتے دیکھ کر وہ گویا مطمئن ہو کر ایک شام ڈیرہ حسام خان چلا گیا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اسے کچھ کام بھی تھے اور کچھ سودا سلف بھی لانا تھا' کچھ لوگوں سے ملاقات بھی کرنا تھی اس لیے وہ دوسرے روز دن چڑھے ہی واپس آسکے گا۔ مجھے گمان گزرا کہ جن لوگوں سے اسے ملاقات کرنا تھی' ان میں شاید چلمن سے جھانکنے والی کوئی دلربا' کوئی خوش ادا بھی ہو لیکن میں نے اس خیال کا اظہار نہیں کیا۔ کسی کی نجی زندگی کو کریدنا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ میں نے سوچا تھا کہ وہ مناسب سمجھے گا تو خود ہی کچھ بتا دے گا۔

وہ کلاشنکوف اور ریوالور اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ماؤزر میرے سرہانے چھوڑ گیا تھا اور مجھے ہوشیار رہنے کی تلقین کرگیا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں اس کی تلقین سے پہلے بھی ہوشیار ہی رہتا تھا۔ میرا پاؤں ٹھیک نہیں تھا لیکن میں ضرورت پڑتے ہی دوڑ کر پوزیشن لینے کے لیے تیار رہتا تھا۔ اب تو خیر میرا پاؤں بہت بہتر تھا۔ مجھے کافی اطمینان تھا۔

روحیل خان دوسرے روز شام کو ہی واپس آیا۔ وہ بہت تھکا ماندہ اور مضمحل لگ رہا تھا لیکن نہانے اور میرے ہاتھ کی بنی چائے پینے کے بعد وہ تازہ دم نظر آنے لگا لیکن اس کی آنکھوں میں گلابی ڈورے بدستور تیر رہے تھے جو اس کی شب بیداری کی چغلی کھا رہے تھے۔ اس روز وہ سرِ شام ہی سو گیا۔

چار دن اور گزر گئے۔ میں ہلکا ہلکا دوڑنے کے قابل ہو گیا تھا۔ تیز دوڑنے کی کوشش کرتا تھا تو ٹخنے میں درد کی لہر سی اٹھتی تھی۔

روحیل خان کی طرف سے ابھی مجھے تیز دوڑنے کی ممانعت تھی۔ اس نے میرا علاج واقعی عمدگی سے کیا تھا اور میری بے صبری کو ڈانٹ ڈپٹ کے ذریعے کنٹرول میں رکھا تھا۔ وہ میرے لیے کسی اچھے ڈاکٹر کا متبادل ہی ثابت ہوا تھا۔

میں نے اس حد تک ٹھیک ہوتے ہی محاورتاً رختِ سفر باندھنے کی کوشش کی تھی کیونکہ حقیقتاً تو میرے پاس ایسا کوئی رختِ سفر تھا ہی نہیں جسے باندھنے کی ضرورت پیش آتی لیکن روحیل نے مجھے ڈانٹ کر بٹھا دیا "یہ فیصلہ میں کروں گا کہ تمہیں کب جانا چاہیے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہیں پھر دوڑنے بھاگنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے اور اس چکر میں تمہارا پاؤں دوبارہ خراب ہوسکتا ہے۔"

"لیکن ڈاکٹر صاحب! آپ کا مریض اب بالکل ٹھیک ہے" میں نے اصرار کیا "اپنے پورے دو پیروں پر کھڑا ہو چکا ہے۔"

"پورے دو نہیں' پونے دو پیروں پر کھڑا ہے" وہ سنجیدگی سے بولا "بھئی اگر تم عمر بھر کے لیے ٹانگ میں نقص بٹھانا چاہتے ہو اور بے شمار سرجنوں کے ہاتھوں اپنی درگت بنوانا چاہتے ہو تو تمہاری مرضی۔"

میں اس کے خلوص کے سامنے مزید اصرار نہ کرسکا۔ آج کے دور میں کون کسی اجنبی کے لیے اتنا تردّد کرتا ہے اور کون کسی کو ذمے داری بنا کر سر پر بٹھاتا ہے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بہت دھیمے لہجے میں بولا "تمہیں روکنے میں تمہاری بھلائی کے علاوہ میری غرض بھی پوشیدہ ہے۔ تمہیں آئے چند دن گزرے ہیں لیکن لگتا ہے تمہارے ساتھ رہتے ایک مدت گزر گئی ہے۔ جگری دوست لگنے لگے ہو تم۔ تمہاری وجہ سے اب یہاں زیادہ دل لگنے لگا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندر ہی اندر میں بھی تنہائی سے اکتا رہا ہوں لیکن شاید اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہوں کہ یہ تنہائی مجھے بہت پسند ہے۔"

اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پر ہلکی سی افسردگی تھی۔ اس لمحے وہ مجھے بڑا قابلِ رحم محسوس ہوا۔ دنیا واقعی ایک گورکھ دھندا ہے۔ دنیا کے ہنگاموں سے دور رہنے والا بھی خوش نہیں' دنیا کے ہنگاموں کے درمیان رہنے والا بھی خوش نہیں' تنہا بھی خوش نہیں' انسانوں کے ہجوم میں گھرا ہوا بھی خوش نہیں' تہی دست بھی خوش نہیں' دولت کے انبار سمیٹنے والا بھی خوش نہیں۔ تو پھر خوش کون ہے؟ خوشی کہاں ہے؟ یہ ایک عجیب بھید ہے جس کے کھلنے کے انتظار میں زندگی بیت جاتی ہے۔

اس شام روحیل پھر ڈیرہ حسام خان چلا گیا۔ اس بار بھی وہ دوسرے روز سہ پہر کو واپس آیا۔ پہلے کی طرح اس بار بھی وہ تھکا ماندہ اور چپ چپ دکھائی دے رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ ڈیرہ حسام جا کر اسے آرام کرنا نصیب نہیں ہوتا تھا۔

تین دن مزید گزر گئے تو میں نے دوپہر کے کھانے کے بعد کہا "اب میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اب مجھے اجازت دو روحیل خان! زندگی رہی تو میں پھر کبھی تمہارے پاس ضرور آؤں گا اور تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔"

"ضرور.... ضرور... لیکن میں اپنے ڈھور ڈنگر ساتھ لے کر چلوں گا۔ میرے پیچھے کون ان کا خیال رکھے گا؟ یہ تو بھوکے مر جائیں گے" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تم سمجھ رہے ہو میں اس بات سے ڈر جاؤں گا اور تمہاری میزبانی کا خیال دل سے نکال دوں گا؟ ہرگز نہیں برادرِ عزیز! ہم نے تو اونٹوں والوں سے یاری کرنے سے پہلے ہی اپنے دروازے اونچے رکھے ہوئے ہیں۔ تم بھی آنا' اپنے ڈھور ڈنگروں کو بھی لانا۔ تم ذرا مجھے گردش سے نکل جانے دو۔ تمہارے ڈھور ڈنگروں سمیت تمہیں جہاز چارٹر کرکے بلوالوں گا۔ میں صرف تمہارا ہی نہیں' تمہاری گائے بھینس تک کا ممنون ہوں۔ میں نے ان کا بہت دودھ پیا ہے.... اور ان مرغیوں کو بھی میں نہیں بھول سکتا جنہیں تم اور میں ذبح کر کر کے چٹ کر گئے" میرا لہجہ مغموم ہوگیا۔

"بے چاریاں۔" اس نے بھی ٹھنڈی سانس لی "اب کیا ہوسکتا ہے۔ جانے والے لوٹ کر نہیں آیا کرتے۔ خاص طور پر.... پیٹ میں جانے والے تو بالکل ہی لوٹ کر نہیں آتے۔"

پھر وہ ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "اچھا یار.... سچ سچ بتاؤ.... کیا واقعی اب تمہارے ٹخنے میں ذرا بھی درد نہیں ہے؟"

"بالکل نہیں" میں نے سچائی سے جواب دیا "تم چاہو تو مجھے کہیں لے جا کر میرے ٹخنے کا ایکسرے کروا کے دیکھ لو۔ بالکل ٹھیک آئے گا۔"

"کہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟ اتنی بڑی ایکسرے مشین تمہارے سامنے جو کھڑی ہے" اس نے اپنی طرف اشارہ کیا۔ پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔

اس وقت ہم اس کے باڑے کے جنگلے سے باہر کھڑے تھے۔ وہ کئی سو قدم کے فاصلے پر موجود ایک درخت کو نظروں ہی نظروں میں منتخب کرتے ہوئے بولا "اچھا... ایسا کرو... تم ذرا کم رفتار سے دوڑتے ہوئے اس درخت تک جاؤ اور تیز دوڑتے ہوئے واپس آؤ۔ واپسی میں تم جتنا بھی تیز دوڑ سکو' دوڑنا۔"

"یہ کون سا مشکل کام ہے" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ مجھے اس کی ہدایات پر عمل کرنے میں لطف آرہا تھا۔ وہ باقاعدہ ڈاکٹر تھا یا نہیں' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں رہی تھی۔ میرے لیے وہ معالج ہی تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ تمام تر خلوص کے ساتھ میرے پاؤں کو مکمل طور پر ٹھیک دیکھنا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

میں اس درخت تک گیا اور ایک منٹ سے بھی کم وقت میں واپس آگیا۔ وہ بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا' وہ میرے چہرے پر درد یا تکلیف کی کوئی علامت تلاش کررہا تھا لیکن مجھے واقعی کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی تھی' اسے علامت کہاں سے

نظر آئی۔

"وری گڈ" اس نے قدرے طمانیت سے سرہلایا "لیکن ابھی تمہارے اور ٹیسٹ بھی باقی ہیں۔ اب ذرا پنجوں کے بل جتنا بھی اونچا اُچھل سکتے ہو' اُچھل کر دکھاؤ۔"

میں نے اس کی اس ہدایت پر بھی عمل کیا۔ میں گویا اس وقت ایک طالب علم تھا اور اپنے پی ٹی کے ٹیچر کی ہدایات پر عمل کر رہا تھا۔ میں پنجوں کے بل اس کی توقع سے زیادہ اونچا اچھلنے لگا۔ اس کی نظر میرے چہرے پر گڑی ہوئی تھی۔ میرے چہرے پر تکلیف کی کوئی رمق نہ پاکر اسے شاید خوشی کے ساتھ ساتھ ہلکی سی مایوسی بھی ہوئی۔ یہ غالباً اپنا اندازہ غلط ثابت ہونے کی مایوسی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میرا پاؤں ٹھیک ہونے میں ابھی کچھ نہ کچھ کسر باقی تھی۔

"اب تم ایک اور مشکل کام کر کے دکھاؤ" اس نے مزید فرمائش کی "ذرا دیکھیں تم اپنی ٹانگ کو لڑائی بھڑائی میں بھی استعمال کرنے کے قابل ہو گئے ہو یا نہیں۔"

وہ دونوں بازو ذرا پھیلاتے ہوئے اس طرح تھوڑا سا جھک گیا جیسے کوئی ماہر لڑاکا کسی شخص کے چاقو کے وار سے بچنے کے لیے مستعد ہو رہا ہو۔ وہ پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے نیم دائرے میں حرکت کرتے ہوئے بولا "اب تم یہی ٹانگ مجھے رسید کر کے دکھاؤ جس میں تکلیف تھی۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں ڈاکٹر صاحب! یہ گستاخی میں کس طرح کر سکتا ہوں؟" میں نے احتجاج کیا۔

"یہ گستاخی نہیں ہوگی۔ ڈاکٹر صاحب خود حکم دے رہے ہیں" وہ بولا۔

"یہ فزیو تھراپی کی کون سی قسم ہے ڈاکٹر صاحب؟" میں نے معصومیت سے پوچھا "میں نے علاج کے بعد آج تک کسی ڈاکٹر کو مریض سے یہ فرمائش کرتے نہیں سُنا کہ وہ اسے لات رسید کرے۔"

"یہ مریض بھی ذرا مختلف ہے اور ڈاکٹر بھی.." اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا "چلو..... لات رسید کرو۔ اس خوش فہمی میں مت رہو کہ وہ لات واقعی مجھے لگ جائے گی۔ میں اپنا بچاؤ کروں گا۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب" اگر آپ مجھے گدھا سمجھتے ہیں اور دولتی چلوا کر میرا ٹیسٹ لینا چاہتے ہیں تو آپ کی مرضی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"دولتی نہیں' صرف ایک لتی" اس نے تصحیح کی۔

میں بھی اس کے سامنے اس طرح نیم دائرے میں گھومنے لگا جیسے لات مارنے کے لیے مناسب موقع تلاش کر رہا تھا۔ اس کا خیال یہی تھا کہ میں اسے پیٹ یا سینے پر لات رسید کرنے کی کوشش کروں گا اور وہ نہایت آسانی سے اس سے بچ جائے گا لیکن میں نے ایڑی کے بل گھوم کر اچانک ہی اسے لات رسید کی لیکن یہ جوڈو کا وار "چاپ سوئی" تھا۔ لات اسے سامنے لگنے کے بجائے کمر پر لگی تھی۔

میں نے وار نہایت ہلکا ہی کیا تھا لیکن وہ اوندھے منہ گر پڑا۔ کپڑے جھاڑتا ہوا جب وہ اُٹھا تو اس کے چہرے پر ہلکی سی خجالت تھی لیکن وہ میرا کندھا تھپکتے ہوئے بولا "مجھے تو پہلے ہی معلوم تھا۔ آدمی تم خطرناک ہو۔"

"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں ڈاکٹر صاحب! ویسے میں نے ہاتھ..... میرا مطلب ہے لات ہلکی ہی رکھی تھی" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

"لات زوردار بھی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی۔ جس لات کو انسان نے خود دعوت دی ہو اسے صبر شکر کے ساتھ کھا لینا چاہیے" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "مجھے تو خوشی یہ ہے کہ تمہارا پاؤں اب واقعی ٹھیک ہو چکا ہے۔ اس کا مطلب ہے' میں نے ایک اور کیس کامیابی سے ہینڈل کر لیا ہے۔ کچھ ہی عرصہ پہلے میں نے ایک اور مشکل کیس کامیابی سے ہینڈل کیا تھا۔ ایک شخص کو سانپ کاٹ گیا تھا۔ میں نے خود ہی اس کا علاج کیا۔ معمولی سی سرجری بھی کی۔ چونکہ فوراً ہی پتا چل گیا تھا کہ اس شخص کو سانپ نے کاٹا ہے اس لیے میری احتیاطی تدابیر اور علاج سے ہی کام چل گیا۔ اسے اسپتال نہیں لے جانا پڑا۔ چند دن میں ٹھیک ٹھاک ہو گیا۔"

"کون تھا وہ شخص؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"میں خود" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

میری آنکھوں میں بے یقینی سی دیکھ کر اس نے جوتا اُتار کر مجھے اپنا پاؤں دکھایا جس پر سانپ نے کاٹا تھا۔ اب اس پر صرف دو نقطوں جیسے باریک سے نشانات باقی تھے جن کے درمیان چھوٹا سا ایک کراس لگا ہوا تھا۔

"بہت سے سانپوں کے زہر سے انسان نہیں مرتا' ان کی دہشت سے مر جاتا ہے" وہ دوبارہ جوتے پہنتے ہوئے بولا۔

"تم اب بھی چاہو تو پیشہ بدل سکتے ہو۔ گاؤں میں تو تم چاہو تو سول سرجن کہلا سکتے ہو۔ مستقبل کافی روشن ہوگا اس پیشے میں تمہارا۔" میں نے کہا۔

"ذرا تم جیسے اور اپنے جیسے مریضوں پر مزید کچھ "ہاتھ صاف" کر لوں پھر سوچیں گے" اس نے اطمینان سے جواب دیا "فی الحال تو ڈیرہ حسام خان میں ایک جعلی ڈاکٹر مریضوں پر ہاتھ صاف کر رہا ہے۔ صحیح معنوں میں "پریکٹس" کر رہا ہے۔ کسی زمانے میں شہر میں کسی ڈاکٹر کے پاس کام کر چکا ہے۔"

"ڈسپنسر رہا ہوگا؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ڈسپنسر ہوتا تب بھی غنیمت تھا۔ وہ تو کسی ڈاکٹر کے ہاں چپڑاسی قسم کی چیز تھا' صفائی وغیرہ کرتا تھا۔ اسے صرف تین چار گولیوں اور تین چار کیپسولوں کے نام معلوم ہیں۔ وہی مرتبانوں میں بھرے بیٹھا رہتا ہے۔ سارا دن نہایت سنجیدگی سے مریضوں کو حکم دیتا رہتا ہے۔ تم لال کیپسول اور پیلی گولیاں تین مرتبہ کھانا۔ کسی کو ہدایت کرے گا' تم ہرے کیپسول اور نیلی گولیاں لیتے رہو۔ میرا خیال ہے اسے نام بھی صحیح طرح معلوم نہیں لیکن دوائیں چونکہ سبھی بنیادی طور پر اینٹی بائیوٹک' پین کلر اور ٹرنکولائزر ہیں اس لیے اکثر امراض میں کام کر جاتی ہیں۔ لوگ اس کے بڑے معتقد ہیں۔"

"کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچا؟" میں نے پوچھا۔

"یقیناً پہنچتا ہوگا لیکن دیہاتی بے چارے سخت جان ہوتے ہیں۔ لوٹ پوٹ کر ٹھیک ہو ہی جاتے ہیں۔ معاملہ زیادہ بگڑ جائے تو اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر بستر بوریا اٹھا کر شہر چل دیتے ہیں اور کسی اسپتال میں داخلہ ملنے کے انتظار میں فٹ پاتھ پر لیٹے رہتے ہیں۔" روحیل نے جواب دیا۔

"اس قسم کے ڈاکٹروں کو کبھی کوئی ہیلتھ انسپکٹر وغیرہ چیک کرنے نہیں آتا؟" میں نے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔ میں نے تو کبھی دیکھا یا سُنا نہیں۔ بہرحال میں چونکہ اتفاق سے اس کے بیک گراؤنڈ سے واقف ہوں اس لیے میری بڑی خاطر تواضع کرتا ہے اور اکیلے میں میرے آگے ہاتھ باندھتا رہتا ہے کہ میں اس کا پول نہ کھولوں۔ کبھی کبھی مجھ سے معلومات بھی حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ دواؤں کے بارے میں میری معلومات اس سے زیادہ ہیں۔ میں اسے ڈراتا بھی رہتا ہوں کہ گاؤں والے قبائلی سے لوگ ہیں۔ جس روز بھی اس کے غلط علاج سے اچانک کوئی مر گیا اور گاؤں والوں کے دماغ میں بھی یہ بات آگئی کہ وہ اس کے غلط علاج کی وجہ سے مرا ہے تو وہ بڑی دھوم دھام سے "ڈاکٹر صاحب" کا بھی جنازہ نکال دیں گے۔"

ہم باڑے کے گرد ٹہلتے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ بالآخر میں نے کہا "کیا خیال ہے روحیل خان..... میں آج روانہ ہو جاؤں؟"

"مجھے معلوم ہے تم جانے کے لیے بے چین ہو لیکن ایک دو دن اور ٹھہر جاؤ۔ مجھے آج بھی گاؤں جانا ہے۔ میرے پیچھے تم یہاں موجود رہو تو اچھا ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ گاؤں کے کسی آدمی کا بندوبست کر کے آؤں۔ اب میں کہیں جاتا ہوں تو مجھے آدمی کی کمی محسوس ہوتی ہے جسے میں یہاں چھوڑ کر جا سکوں۔ چند دن پہلے کوئی میری گائے اور بھینس دونوں چُرا کر لے گیا تھا حالانکہ اس سے پہلے کبھی میرے ہاں چوری نہیں ہوئی۔"

"ہر چیز کا کوئی نہ کوئی پہلا دن تو ہوتا ہی ہے" میں نے کہا۔ میں نے یہ سوچ کر اس کی فرمائش رد نہیں کی کہ جہاں اتنے دن گزر چکے تھے' وہاں مزید ایک دو دن سے کیا فرق پڑتا تھا۔ حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ میں جانے کے لیے بے قرار تھا بلکہ پچھلی مرتبہ ہی جب وہ گاؤں گیا ہوا تھا تو میرا جی چاہا تھا کہ اس کی عدم موجودگی میں چپکے سے کھسک جاؤں تاکہ اس کے اصرار کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

لیکن پھر مجھے خود ہی یہ خیال اچھا محسوس نہ ہوا۔ میرا دل نہ

مانا کہ اپنے محسن سے صحیح طور پر اجازت لیے بغیر' اس کی عدم موجودگی میں چوروں کی طرح چلا جاؤں۔ ایک خیال یہ بھی آیا تھا کہ اگر میری روانگی کے بعد وہاں کوئی چوری ہو گئی تو وہ میرے ہی کھاتے میں جائے گی' روحیل مجھے کس قدر گھٹیا انسان تصور کرے گا' اس خیال سے ہی مجھے جھرجھری سی آگئی تھی۔

ہم مکان میں واپس آئے تو روحیل نے ایک الماری سے بڑا سا ایک نقشہ نکال کر میرے سامنے پھیلایا۔ نقشہ بوسیدہ مگر کافی تفصیلی سا تھا۔ اسے شاید کسی ماہر نقشہ نویس نے تو نہیں' کسی عام شخص نے ہی بنایا تھا لیکن رہنمائی کے لیے وہ معقول ہی لگتا تھا۔ اس کے ایک کونے میں نہایت باریک الفاظ میں کچھ ہدایات بھی درج تھیں۔

"یہ تمہارا بنایا ہوا نقشہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ ایک ایسے شخص کا بنایا ہوا ہے جو اس قسم کے کاموں میں مجھ سے کہیں زیادہ ماہر تھا لیکن اب وہ بے چارہ اس دنیا میں نہیں ہے" روحیل نے جواب دیا۔

"یہ غالباً اسی علاقے کا نقشہ ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ اور یہ میں تحفتاً تمہیں پیش کر رہا ہوں" وہ نقشے پر جھکتے ہوئے بولا "تم نے اپنی جو داستان غریب حمزہ مجھے سُنائی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تک تم بغیر سوچے سمجھے' منہ اُٹھائے اِدھر سے اُدھر بھاگتے رہے جو ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ اس وقت تم زندہ سلامت نظر آ رہے ہو۔"

"مجھے سوچنے سمجھنے کی مہلت ہی کہاں ملی۔ ایک کے بعد دوسری اُفتاد پڑتی رہی میرے سر پر" میں نے گویا عذر پیش کیا۔

"میرا خیال ہے اب بھی تم سر جھکا کر' لوگوں کی توجہ سے... حتی الامکان بچتے ہوئے اور اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے واپس جانے کی کوشش کرو گے تاکہ اندازہ ہوتا رہے کہ کہاں تمہارے لیے کتنے خطرات موجود ہیں؟" اس نے تصدیق چاہی۔ وہ میرے حالات کو کافی حد تک سمجھ رہا تھا۔

میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بولا "اس صورت میں یہ نقشہ تمہارے بہت کام آئے گا۔ اجنبی علاقوں میں انسان پر اُفتاد تو کوئی بھی پڑ سکتی ہے.... اور حالات جب پہلے ہی خراب ہوں تو خواہ مخواہ کی مصیبتیں بھی راستے میں آتی رہتی ہیں۔ آئندہ اگر تم پر کوئی اُفتاد بھی پڑے تو اس نقشے کو دیکھنا مت بھولنا۔ اس پر نظر دوڑانے کے لیے ضرور کسی نہ کسی طرح وقت نکال لینا۔ اس سے تم دو ڈھائی سو میل کے دائرے میں پھیلے ہوئے علاقے کو اچھی طرح سمجھ سکو گے اور کسی بھی سمت میں جب تم کسی شہر کی طرف نکلنا چاہو گے تو تمہیں شہر کا انتخاب کرنے میں بھی مدد ملے گی کہ اس وقت کون سا شہر قریب پڑے گا اور اس کے لیے ٹرین' بس یا کون سی سواری دستیاب ہوگی۔ اگر تمہیں اس قسم کے نقشوں کی تھوڑی سی بھی

سمجھ بوجھ ہے تو اس سے تمہیں بہت رہنمائی مل سکتی ہے۔"

میں اسے بتا نہیں سکتا تھا کہ کسی زمانے میں اسی قسم کے نقشوں سے ہم نے کتنا استفادہ کیا تھا۔ اس کے بجائے میں نے کہا "لیکن تمہیں بھی تو اس کی ضرورت ہوگی؟"

"مجھے...؟" وہ ہنسا "میرے تو دل پر چھپا ہوا ہے یہ نقشہ۔ بلکہ صرف یہی نہیں.... اس سے دور دراز کے علاقوں کے پیچ و خم بھی میرے دل پر نقش ہیں۔ مجھے تو یہ بھی یاد ہے کہ ان علاقوں کی کس پگڈنڈی میں کتنے گڑھے ہیں۔ ایک عرصہ گزر گیا ہے اس قسم کے نقشوں کی ضرورت سے بے نیاز ہوئے۔"

مجھے نقشے پر سرسری نظر ڈالتے ہی وہ سارا دیہی علاقہ کافی حد تک سمجھ میں آنے لگا تھا لیکن روحیل خان موٹی موٹی باتیں سمجھانے لگا تو وہ میں نے توجہ سے سُنیں۔

پھر وہ ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے بولا "یہاں.... ڈیرہ حسام خان تک تو پرسوں میں تمہیں چھوڑنے تمہارے ساتھ چلوں گا۔ یہاں سے تمہیں جامی نگریا حاصل آباد.... جہاں کی بس میں کہو گے' اس میں بٹھا دوں گا۔ آگے تمہاری مرضی ہوگی' جو روٹ چاہو اختیار کر لینا" اس نے نقشے میں مجھے وہ دونوں مقامات بھی دکھا دیے۔

"لیکن اگر تم آج شام ہی ڈیرہ حسام جا رہے ہو تو مجھے بھی ساتھ کیوں نہیں لے جاتے؟ مجھے آج ہی سی آف کر دینا۔ کل تم تھکے ہارے آؤ گے۔ پرسوں دوبارہ مجھے چھوڑنے جاؤ گے" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

وہ گویا تحمل سے مسکرایا اور بولا "نہیں۔ آج تو میرا اکیلے ہی جانا ضروری ہے۔ دوسری بات میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ اب میں اس جگہ کو ایسے ہی چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ تیسری بات یہ کہ ڈیرہ حسام سے بس سروس سرِشام ہی بند ہو جاتی ہے۔"

شاید وہ اپنی کسی نجی مصروفیت کی وجہ سے فی الحال مجھے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے بھی اصرار نہیں کیا۔ شام ہوئی تو وہ رخصت ہو گیا۔

میں رات کا کھانا کھا کر دیر تک باہر اندھیرے اور سناٹے میں ٹہلتا رہا۔ میں سوچ رہا تھا' شاید یہ اس جگہ میری آخری رات ہو۔ میں یہاں کی فرحت بخش ہوا کو جی بھر کے پھیپھڑوں میں جذب کر لینا چاہتا تھا اور یہاں کے سکوت سے بہت سی سرگوشیاں کرنا چاہتا تھا۔ یہاں کی فضا میں بظاہر کوئی دلکشی نہیں تھی' یہاں کوئی رنگینی نہیں تھی' ویسی سہولتیں اور آسائشیں نہیں تھیں جو شہروں میں ہوتی ہیں لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ میں مدتوں اس جگہ کو بھول نہیں پاؤں گا۔ یہاں مجھے پناہ اور آرام میسر آیا تھا۔ میں نیم جاں یہاں آیا تھا اور تندرست ہو کر جا رہا تھا۔ افراد ہوں یا مقامات جو بھی ہم پر مہربان ہوتے ہیں وہی یاد رہ جاتے ہیں' دل میں بس جاتے ہیں۔

میں دیر تک باہر ٹہلتا رہا پھر اندر آ کر سو گیا۔ رات کے پچھلے پہر آنکھ کھل گئی۔ پھر دوبارہ نیند آنے کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو میں اُٹھ بیٹھا۔ کمرے میں لالٹین لٹکی ہوئی تھی جس کی لو نیچی تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں' میں نے وال کلاک کے چمکیلے ڈائل پر نظر ڈالی۔ ابھی چار بھی نہیں بجے تھے۔ سورج طلوع ہونے میں کافی وقت تھا۔

مزید چند منٹ تک مجھے نیند نہ آئی تو میں ایک بار پھر اُٹھ کر باہر آ گیا۔ اگر نیند آنے کے آثار نہیں ہوتے تھے تو میرے لیے بستر پر لیٹے رہنا دشوار ہوتا تھا اور اس وقت تو طبیعت میں کچھ بے چینی بھی تھی جس کی وجہ سمجھنے سے میں قاصر تھا۔

باہر وہی تاریکی' وہی سکوت اور مدھم ہوا کی وہی سرسراہٹ میری منتظر تھی جس میں پہلے بھی میں خاصا وقت گزار کر گیا تھا۔ اب خنکی بڑھ چکی تھی لیکن مجھے بھلی لگ رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں کوئی تارا ٹمٹما رہا تھا۔

میں باڑے میں پڑی ایک بینچ پر بیٹھ گیا اور اپنے حالات کے بارے میں سوچنے لگا۔ اب یہاں سے میری روانگی کا وقت قریب آ رہا تھا۔ شاید طبیعت میں اسی لیے اضطراب تھا۔ مجھے اپنے بارے میں' اپنے مستقبل کے بارے میں کچھ فیصلے کرنے تھے جبکہ میرا ذہن بہت اُلجھا ہوا تھا۔ میری عدم موجودگی میں لاہور میں نہ جانے کیا ہوا تھا؟ میں نے اب تک کچھ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور مجھے اس کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔

مجھے اس سلسلے میں کچھ جاننے کی زیادہ خواہش بھی نہیں تھی۔ میں اپنی روپوشی کو صحیح معنوں میں روپوشی بنانا چاہتا تھا۔ میں اس دنیا سے واقعی بالکل کٹ کر رہنا چاہتا تھا جہاں ریڈ ڈاٹ نے میرا سکون تباہ کر کے رکھ دیا تھا اور بڑی محنت سے میری آرگنائز کی ہوئی ہر چیز کو تہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا۔ میں واقعی چاہتا تھا کہ مجھے اس دنیا کی کوئی بھی اچھی بُری خبر سُننے کو نہ ملے۔

اب میرا واپس جانے کا ارادہ بن رہا تھا تو وہ تجسّس جسے میں نے سُلایا ہوا تھا اور بُھلایا ہوا تھا' جاگ اُٹھا تھا۔ شاید میرے اضطراب کی وجہ بھی یہی تھی کہ میں بہت کچھ جاننا چاہتا تھا تاکہ اپنے آئندہ کے اقدامات کے بارے میں کچھ فیصلے کر سکوں۔ یا پھر کوئی اور بات تھی جسے میں سمجھنے سے قاصر تھا۔

میں اپنے اضطراب کی جڑیں تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ دھیمی ہوا کے دوش پر آنے والی کچھ خفیف سی آوازیں سُن کر چونک اُٹھا۔ کچی زمین پر بہت دور سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سُننا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن ایک تو میری سماعت جو پہلے ہی کافی حسّاس تھی' ان دور اُفتادہ علاقوں میں گھومتے پھرتے کچھ اور حسّاس ہو چکی تھی۔ دوسرے اس وقت چاروں طرف غضب کا سکوت پھیلا ہوا تھا۔ کوئی جھینگر بھی نہیں بول رہا تھا۔

وہ گھوڑے کی ٹاپوں ہی کی آواز معلوم ہوتی تھی جو دھیرے

دھیرے قریب آرہی تھی۔ روحیل خان نے تو خود ہی بڑے وثوق سے بتایا تھا کہ دوپہر سے پہلے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تھا۔ تو پھر یہ کون ہوسکتا تھا؟ روحیل نے بتایا تھا کہ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا ڈاکو بھی اس طرف آنکلتا تھا۔ وہ جتنی مرتبہ بھی ڈیرہ حسام گیا تھا' ماؤزر میرے سپرد کرگیا تھا جسے احتیاطاً میں سرہانے رکھتا تھا۔

میں دوڑ کر اندر گیا اور جلدی سے تکیے کے نیچے سے ماؤزر نکال لایا اور مویشیوں کو چارہ ڈالنے والی کھرلی کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔

چند منٹ بعد میرے سامنے ملگجے آسمان کے پس منظر میں ایک گھوڑے کا ہیولا نمودار ہوا۔ اس کی پشت پر بھی کچھ تھا ضرور لیکن اسے گھڑسوار نہیں کہا جاسکتا تھا۔ کوئی بوری سی لدی ہوئی تھی۔

میں منتظر رہا۔ دھیرے دھیرے ہیولا واضح ہوتا گیا۔ گھوڑا مکان کی سمت میں ہی آرہا تھا اور بہت کم رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ مکان کے قریب پہنچنے تک اس کی رفتار کچھ اور کم ہوگئی۔ اب میں دیکھ سکتا تھا کہ گھوڑے کی پشت پر کوئی شخص ایک بازو گھوڑے کی گردن میں حمائل کیے اوندھا لیٹا تھا لیکن وہ روحیل نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ روحیل کا گھوڑا سفید تھا جبکہ یہ گھوڑا گہرے رنگ کا معلوم ہوتا تھا۔

"خبردار! وہیں رُک جاؤ" میں نے للکارا۔

سوار یقیناً ہوش میں تھا کیونکہ میں نے اس کا دوسرا بازو حرکت میں آتے دیکھا۔ اس نے لگامیں کھینچ کر گھوڑے کو روک لیا۔ وہ میری گن کی زد پر تھا۔

"کون ہو تم؟" میں نے قدرے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

سوار گھوڑے پر سیدھا ہوکر بیٹھ گیا اور آواز کی سمت دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک مجھے نہیں دیکھ پایا تھا۔ میں اب بھی کھرلی کی اوٹ میں ہی تھا۔ مکان کے چاروں طرف لکڑی کا مضبوط جنگلا موجود تھا۔ باڑے اور مکان دونوں کے گرد یہ ایک حفاظتی فصیل کا کام دیتا تھا۔ اس کے دروازے میں اس وقت تالا پڑا ہوا تھا۔ سوار جنگلے سے باہر ہی تھا۔

بالآخر وہ بول اٹھا لیکن اس کی آواز کراہ سے مشابہ تھی۔ "افضل یار! دروازہ کھولو... مجھے اندر آنے دو... میں بڑی تکلیف میں ہوں۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ روحیل تھا۔ شاید اسے کوئی حادثہ پیش آگیا تھا۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ ماؤزر میں نے نیفے میں اڑس لیا۔ چابیوں کا گچھا میری جیب میں موجود تھا۔ تالا کھول کر میں تیزی سے باہر گھوڑے کے قریب پہنچا۔ وہ واقعی روحیل کا سفید گھوڑا نہیں تھا۔ کم از کم میں نے وہ گھوڑا اس سے پہلے وہاں نہیں دیکھا تھا۔ وہ سیاہ چمکیلے رنگ کا ایک خوب صورت اور توانا گھوڑا تھا۔ روحیل کے سفید گھوڑے سے بھی زیادہ توانا اور خوب صورت۔

روحیل دانت بھینچتے ہوئے کراہا پھر بولا "بہت تکلیف ہورہی ہے۔"

"ہوا کیا ہے؟" میں نے اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔ اس نے سنسنی سے انداز میں لگام کو ہاتھ میں جکڑا ہوا تھا۔

"میری ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی ہے" الفاظ گویا اس کے دانتوں سے رگڑ کھاتے ہوئے برآمد ہورہے تھے۔

"کیسے؟" میں نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

"گھوڑا بہت تیز رفتاری سے دوڑتے دوڑتے ٹھوکر کھاکر... گر پڑا تھا... اور میری ٹانگ اس کے نیچے آگئی تھی..." اس نے کراہتے ہوئے بتایا "لیکن افضل یار...! خدا کے لیے فی الحال سوال جواب چھوڑو... اور مجھے اندر لے چلو... گھوڑے سے اُتارو..." وہ یقیناً بڑی مشکل سے تکلیف ضبط کررہا تھا۔

"کون سی ٹانگ ٹوٹی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بائیں" اس نے جواب دیا۔

میں اس کے گھوڑے کی لگام تھام کر اندر لے آیا اور اسے اس طرح پشت پر لاد کر گھوڑے سے اُتارا کہ اس کی مجروح ٹانگ کو ذرا سا بھی دھچکا نہ لگے۔ یہ خاصا مشکل کام تھا۔ میں اسے کمرے میں لے گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ روحیل خان کا حلیہ بھی بدلا ہوا تھا۔

وہ گھر سے گیا تھا تو نہ صرف اس کا گھوڑا سفید تھا بلکہ اس کی شلوار قمیص بھی موتیا سے رنگ کی تھی لیکن اب اس کے جسم پر چمڑے کی سیاہ جیکٹ' پینٹ اور شرٹ تھی۔ تینوں چیزیں سیاہ رنگ کی تھیں۔ پیروں میں شکاریوں جیسے فل بوٹ تھے اور ڈھیلی ڈھالی پتلون کے پائنچے اس نے بوٹوں ہی میں اڑس رکھے تھے۔ بس ایک سیاہ نقاب کی کمی تھی ورنہ وہ مکمل طور پر پرانی میکسیکن اور ویسٹرن فلموں کا ڈاکو معلوم ہوتا۔

اس کے کپڑے پسینے میں بھیگے ہوئے تھے۔ پتلون تو مٹی میں بھی لتھڑی ہوئی تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے اسے آرام دہ بستر پر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں بند کرکے گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ اس کے سانولے چہرے پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں۔

کئی منٹ میں نہایت آہستگی سے میں نے اس کے جوتے اُتارے۔ مجھے معلوم تھا' ذرا بھی ہلنے جلنے سے اس کی تکلیف میں اضافہ ہوگا۔ پھر میں نے اس کی مضروب ٹانگ کا پائنچا اوپر چڑھا کر معائنہ کیا۔ پنڈلی کی ہڈی بلاشبہ ٹوٹ چکی تھی لیکن غنیمت تھا کہ گوشت نہیں پھٹا تھا۔ ٹانگ میں خم ضرور نظر آرہا تھا لیکن کھال سلامت تھی۔

وہ کراہتے ہوئے تیز سرگوشی کے سے انداز میں بولا "کمپاؤنڈ فریکچر نہیں ہے... سمپل فریکچر ہے" وہ خود بھی اپنا معائنہ کرنے کی کوشش کررہا تھا لیکن باربار تکلیف سے آنکھیں بند کرلیتا تھا۔

اسی عالم میں وہ کراہتے ہوئے اٹک اٹک کر بولا "ہڈی ٹوٹے زیادہ دیر نہیں گزری... ابھی یہ آسانی سے جُڑ جائے گی... لیکن یہ کام میں اپنے ہاتھوں سے نہیں کرسکتا۔ پہلے تم دواؤں والی الماری سے چند ضروری چیزیں اور دوائیں نکال لاؤ پھر جس طرح میں کہوں اس طرح کرتے جاؤ۔ یہ کام تمہارے ہاتھ سے ہوگا تو میں تکلیف برداشت کرجاؤں گا۔ میں اپنے ہاتھ سے ہڈی صحیح نہیں بٹھا سکوں گا۔"

اس کی ہدایات کے مطابق میں الماری سے لکڑی کی چند پٹیاں' پٹیوں کے رول اور دوائیں نکال لایا۔ ایک دیسی سے تیل کی شیشی تھی۔ اس نے ہدایت کی کہ پہلے میں وہ نہایت آہستگی سے اس کی پوری پنڈلی پر مل دوں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ تیل ہڈی جوڑنے کے معاملے میں انگریزی دواؤں سے بہتر تھا۔

مالش کرنے کے بعد اس نے مجھے صبر آزما مرحلہ شروع کرنے کا حکم دیا اور اشارے سے بتایا کہ کس طرح میں اس کی خم کھائی ہوئی ٹانگ کو دھیرے دھیرے سیدھا کرنے کی کوشش کروں۔ میں نے اس کی ہدایت پر عمل شروع کیا تو اس نے دانت سختی سے بھینچ لیے اور اس کے چہرے پر پسینہ یوں پھوٹنے لگا گویا کوئی بھیگی ہوئی روئی کو دھیرے دھیرے دبا رہا ہو لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ قوت برداشت اس میں بھی بلا کی تھی۔

بالآخر وہ ہاتھ اُٹھاتے ہوئے گھٹی گھٹی آواز میں بولا "بس... ہڈی بیٹھ گئی ہے..." پھر اس نے اشارے سے بتایا "اس پر یہاں یہاں لکڑی کی پٹیاں رکھو اور... بینڈیج نہایت احتیاط سے... اس حد تک کس کر باندھ دو کہ دوران خون نہ رکنے پائے... بہت سی پٹیاں لپیٹ دو..."

میں نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ بڑے صبر آزما انداز میں کام ختم ہوا۔ بینڈیج کی کئی تہیں جمانے اور گرہیں لگانے کے بعد میں نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چند لمحے بعد اس نے آنکھیں کھولیں اور مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اسے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔

"سمجھو... یہ دیسی قسم کا پلستر چڑھ گیا ہے... انشاء اللہ بارہ پندرہ دن میں ہڈی جڑ جائے گی" وہ اٹک اٹک کر بولا "اب مجھے انفیکشن سے بچانے اور درد کم کرنے کے لیے کچھ گولیاں دے دو..."

اس نے گولیوں کے نام مجھے بتائے۔ میں نے پانی کے گلاس کے ساتھ وہ گولیاں اسے دے دیں۔ گولیوں نے ظاہر ہے فوری طور پر تو اثر شروع نہیں کیا تھا لیکن نفسیاتی طور پر اسے سکون مل گیا اور اس کے اذیت زدہ چہرے پر تھوڑی سی طمانیت آگئی لیکن میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور ظاہر تھا' میری آنکھوں میں سوالات تھے۔

لیکن وہ میرے سوالات سے نظر چُراتے ہوئے گویا کان لگا کر کچھ سُننے کی کوشش کرنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ اندر ہی اندر وہ خوف زدہ اور پریشان تھا۔ ٹانگ کے مسئلے اور تکلیف نے کچھ دیر کے لیے اس کی توجہ کسی اصل مسئلے کی طرف سے ہٹادی تھی لیکن اب ٹانگ کے بارے میں ذرا طمانیت میسر آتے ہی اس کے ذہن میں وہ مسئلہ اُبھر آیا تھا۔

"بات کیا ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"تمہیں کوئی آواز تو سُنائی نہیں دے رہی؟" اس کی آواز غیر ارادی سے انداز میں رازدارانہ سرگوشی میں ڈھل گئی حالانکہ آس پاس کوئی اور سُننے والا موجود نہیں تھا۔

میں نے کان لگا کر سُننے کی کوشش کی۔ مجھے اندازہ تھا کہ روحیل نے بھی کچھ کم ویرانوں کی خاک نہیں چھانی تھی۔ حسیں یقیناً اس کی بھی تیز تھیں' لیکن اسے میرے بارے میں بھی بہت سے اندازے ہوچکے تھے۔ وہ مجھ سے تصدیق چاہتا تھا۔ میں کوئی آواز تو نہ سُن سکا لیکن میری نامعلوم حس بتا رہی تھی کہ وہاں سے دور کہیں کوئی ہلچل ضرور تھی۔ شاید میری اسی حس نے کچھ دیر پہلے مجھے مضطرب کررکھا تھا۔ یہ حس شاید مجھے آگاہ کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ کہیں کچھ گڑبڑ تھی' روحیل کے ساتھ کچھ ہورہا تھا لیکن ظاہر تھا کہ حس کے پیغامات اتنے واضح نہیں تھے۔ میں انہیں صاف طور پر نہیں سمجھ سکتا تھا۔

"نہیں۔ مجھے کوئی آواز سُنائی نہیں دے رہی" میں نے گہری نظروں سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔

میری تصدیق سے شاید اسے ذرا اطمینان ہوا۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے گاؤ تکیے اور پلنگ کے سرہانے والے تختے سے ٹیک لگا لیا۔ اب وہ مجھ سے نظر چرا رہا تھا۔

میں نے ایک کپڑے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "کیا اب بھی تم مجھے اصل کہانی نہیں سُناؤ گے روحیل خان؟"

وہ بہت دھیمے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تمہارا ذہن یقیناً بہت سے تانے بانے بُن رہا ہوگا۔ کاش میں نے تمہیں آج دوپہر ہی جانے دیا ہوتا... لیکن نہیں... تمہارا رکنا شاید میرے حق میں بہتر ہی تھا۔ اگر تم اس وقت یہاں موجود نہ ہوتے تو یہ کام کون کرتا..." اس نے ٹانگ پر لپٹی پٹیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ایک بار پھر اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن تکلیف سے اس کے چہرے کے عضلات کھنچ کر رہ گئے۔ تکلیف کی لہر ذرا ڈھلی تو وہ بولا "کیا تمہارا حقیقت جاننا بہت ضروری ہے؟"

"ہاں۔ شاید اس کے بعد میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا "میں سچائی کو پسند کرتا ہوں۔ خصوصاً وہ لوگ جنہیں میں دوست سمجھتا ہوں اور جو مجھے دوست کہتے ہیں' اگر وہ بھی میرے ساتھ سچ نہ بولیں تو مجھے بڑا غصہ آتا ہے۔ میرا ان

کی کوئی مدد کرنے کو قطعاً دل نہیں چاہتا.... اور میرا خیال ہے تمہیں اس وقت مدد کی سخت ضرورت ہے۔"

"ہاں" اس نے تسلیم کیا "لیکن مجھے ڈر ہے' اگر میں نے تمہیں حقیقت بتادی تو تم میری مدد کرنا تو در کنار' کہیں مجھے دوست سمجھنے کا فیصلہ بھی واپس نہ لے لو۔"

"ایسا نہیں ہوگا۔ حقیقت خواہ کتنی بھی تلخ اور بد صورت ہے لیکن تم اسے بیان کردو۔ گو کہ تم نے اس میں تاخیر کردی ہے لیکن اب بھی وقت ہے' اب بھی سچ بول دوگے تو میرے دل سے ہر بدگمانی دور ہوجائے گی اور تم میری نظر میں اچھے ہی رہو گے۔"

"اچھا رہنا تو مشکل ہے..." وہ گہری سانس لے کر بولا "لیکن میں بہرحال حقیقت بیان کردیتا ہوں تمہیں اندازہ ہو ہی گیا ہوگا کہ میں ایک ڈاکو ہوں۔"

"مجھے صرف شبہ ہو رہا تھا لیکن میں دل ہی دل میں اسے جھٹلانے کی کوشش کر رہا تھا" میں نے جواب دیا۔

"تم نے کہا ہے حقیقت خواہ کتنی بھی تلخ اور بد صورت ہو' میں اسے بیان کردوں" اس نے گویا مجھے یاد دلایا "ایک گروہ سے میرا تعلق ہے لیکن میں نے اپنی یہ آزاد حیثیت اور چھوٹے سے زمیندار والا روپ بھی برقرار رکھا ہوا ہے۔ میرا اصل روپ یہی تھا' ڈاکو میں بعد میں بنا تھا۔ وہ ایک الگ اور طویل کہانی ہے' اس وقت نہیں سنائی جاسکتی تاہم میں یہ اعتراف ضرور کروں گا کہ مجھے ڈاکو بنانے میں ظالم معاشرے وغیرہ کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔ میرے ساتھ کسی نے کوئی ایسے ظلم و ستم نہیں کیے تھے کہ میں تنگ آکر ڈاکو بن جاتا۔ بس... میں اکیلا تھا... نا سمجھ تھا.... مجھ سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں... کچھ غلط لوگوں سے آشنائی ہوئی... کچھ خواب ذہن میں شروع سے بیٹھے ہوئے تھے جن کی تعبیریں ملنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا.... یہ ساری باتیں یکجا ہوگئیں اور میں دھیرے دھیرے ایک ایسے راستے پر چل پڑا جس میں میرے خیال میں طاقت اور دولت میری منتظر تھی۔ یہ بھی ایک خواب ہی تھا۔ دھوکا ہی تھا... جس سطح کا میں ڈاکو بن گیا وہ معمولی نہیں تھی... اس کے باوجود میرے پاس زیادہ دولت جمع نہیں ہوسکی۔ وہ ایک جگہ محفوظ ہے۔ میں اس کے مزید بڑھنے کے انتظار میں تھا۔ میرا خیال تھا' ایک نہ ایک دن میرے پاس اتنی دولت ہوجائے گی جتنی میں چاہتا ہوں۔ اس کے بعد میں یہ لائن چھوڑ دوں گا..."

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا "یہ ایک ناقابلِ یقین سی بات ہے کہ زیادہ تر ڈاکوؤں کے پاس اتنی دولت نہیں ہوتی جتنی لوگ سمجھتے ہیں۔ کیوں نہیں ہوتی؟ یہ ایک الگ کہانی ہے۔ فی الحال ہم اس پر بھی بات نہیں کرسکتے۔"

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ نظر جھکاتے ہوئے بولا "تمہیں یہ جان کر صدمہ ہوا ہے نا کہ میں ایک ڈاکو ہوں؟"

"ہاں" میں نے اعتراف کیا "جس طرح جنگلوں میں کہیں کہیں بڑے خوب صورت اور نفیس پھول کھلے نظر آتے ہیں' میں یہی سمجھا تھا کہ اتفاق سے مجھے بھی اس ویرانے میں ایک نمایاں ذہین' پڑھا لکھا' سلجھا ہوا' نفیس اور شائستہ انسان مل گیا ہے۔"

"کیا محض اس انکشاف سے میری یہ سب خوبیاں ختم ہوگئیں کہ میں ایک ڈاکو ہوں؟" اس نے افسردگی سے میری طرف دیکھا۔

"یہ تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن میرے تصورات کو شدید دھچکا ضرور لگا ہے۔ لیکن خیر... تم پوری بات ضرور سناؤ۔" میں نے کہا۔

"اس سے پہلے بھی میں تمہارے سامنے دو مرتبہ ڈیرہ حسام گیا تھا تو دو چھوٹے موٹے ڈاکوں میں ہی حصہ لینے گیا تھا۔ ڈیرہ حسام کے قریب ہی ہمارا ایک اڈا ہے۔ میں وہاں لباس اور گھوڑا تبدیل کرتا تھا.... یا اگر کسی دوسری سواری میں بیٹھ کر جانا بہتر ہوتا تھا تو اس میں بیٹھتے تھے۔ کام سے فارغ ہوکر میں اپنا حصہ لے کر' اسے ایک خاص جگہ پر پہنچا کر' حلیہ تبدیل کرکے یہاں پہنچ جاتا تھا۔ میں جب اکیلا ہوتا تھا تب بھی کبھی اس حلئے میں یہاں نہیں آیا۔ میں نے اپنی دونوں شخصیتوں کو الگ رکھنے کی ہمیشہ ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن کوئی بھی راز ہمیشہ راز نہیں رہتا..."

اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے ہونٹ بھنچ کر رہ گئے۔ پھر وہ آنکھیں کھولتے ہوئے بولا "کیا عجیب اتفاق ہے کہ یہ راز کھلنا بھی تھا تو تمہارے سامنے...... اور وہ بھی عین اس وقت جب تم جانے کی تیاری کر رہے تھے..." پھر وہ آہستگی سے سرہلاتے ہوئے بولا "لیکن شاید یہ بھی اچھا ہی ہوا۔"

"آج کیا ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہائی وے پر ہم ایک بس کو روک کر مسافروں کو لوٹ رہے تھے کہ اتفاقاً پولیس ادھر آنکلی...." اس کی آواز کچھ اور نیچی ہوگئی "وہ ہائی وے کا وہ حصہ تھا جو جائی نگر والے جنگل کے قریب سے گزرتا ہے۔ وہاں میلوں تک کوئی تھانہ' کوئی پولیس چوکی نہیں۔ پولیس کی آمد کا وہاں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ مہینے میں ایک آدھ مرتبہ اگر کبھی گشتی پولیس والے گزرتے بھی ہیں تو وہ عموماً بڑی پک اپ یا جیپ میں ہوتے ہیں لیکن یہ پولیس والے گھوڑوں پر تھے اور ہمیں ان کی آمد کی کوئی اطلاع نہیں تھی۔

پولیس کو اگر کہیں آنا ہوتا ہے تو عام طور پر ہمیں اس کی اطلاع ہوتی ہے۔ گھڑ سوار پولیس ویسے بھی صرف اس وقت آتی ہے جب انہیں جنگل میں کسی مہم پر جانا ہوتا ہے۔ وہ معلوم نہیں کس چکر میں جا رہے تھے۔ وہ ان کی عمل داری بھی نہیں تھی۔ پولیس والے تو اپنی عملداری میں بھی کوئی واردات ہوتے دیکھ کر اکثر نظر چرا جاتے ہیں۔ واردات ہوچکنے کے بعد ذرا تیاریوں اور تزک و احتشام سے آتے ہیں۔ ہم نے اس دوران ایک پرائیویٹ گاڑی بھی روک لی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے ایک فائر کردیا۔ بس اس کے بعد ہنگامہ شروع ہوگیا...."

اب اس کے لہجے سے شرمندگی کا تاثر بھی کم ہوگیا تھا

اور تکلیف کی جھلک بھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ہم نے بس اور پرائیویٹ وین کے مسافروں کو گاڑیوں سے اُتار لیا تھا۔ انہیں کلاشنکوفوں اور ریوالوروں سے کور کرکے مال جمع کر رہے تھے۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی فائر کرنے کی جرأت کرے گا۔ ہمیں اس ڈرائیور کے پاس ریوالور نظر بھی نہیں آیا تھا۔ اس نے شاید پولیس کو آتے دیکھ لیا تھا اس لیے اسے شہ مل گئی تھی۔

ہنگامہ شروع ہونے کے بعد ہم نے بھی پولیس والوں کو دیکھ لیا۔ وہ تعداد میں پندرہ سولہ ہوں گے اور جو اُن کی قیادت کر رہا تھا وہ یقیناً انسپکٹر تھا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں اسے اچھی طرح دیکھا تھا۔ موٹی موٹی مونچھوں والا ایک بارعب گورا چٹا شخص تھا۔ معلوم نہیں کس علاقے کے تھانے سے اس کا تعلق تھا۔ وہ اس علاقے کا آدمی معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس واردات میں کود پڑا ورنہ ہوتا تو یہ ہے کہ ان علاقوں میں کہیں کہیں جو پولیس چوکیاں ہیں ان میں سے کسی چوکی پر اگر کوئی مرتا کھپتا کسی واردات کی خبر لے کر بھی جائے تو پولیس والے دو دن تو یہی طے کرنے میں گزار دیتے ہیں کہ وہ علاقہ کس چوکی کی حدود میں آتا ہے۔"

یہ باتیں میرے لیے نئی نہیں تھیں۔ اب تو شاید یہ باتیں ہمارے ہاں آنے والے غیر ملکیوں کے لیے بھی نئی نہیں رہیں۔ راحیل خان چہرے سے پسینہ پونچھنے کے بعد ایک بار پھر گویا کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ سکوتِ آخر شب اسی طرح برقرار تھا۔

قدرے مطمئن ہوکر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "خیر... سارا معاملہ بھگدڑ اور افراتفری میں خراب ہوگیا۔ ہم سب تتر بتر ہوگئے۔ جس کا جدھر منہ اٹھا' بھاگ نکلا لیکن پولیس والوں نے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا۔ عجیب بات یہ تھی کہ ڈیرہ حسام خان کی طرف جانے والے راستوں پر رینجرز کی گاڑیاں گشت کر رہی تھیں۔ ہمارے کئی ساتھی... اور میں خود ان کے ہتھے چڑھتے چڑھتے بچے۔ شاید یہ کوئی اور ہی آپریشن یا اسی قسم کا کوئی دوسرا سلسلہ تھا جس کی زد میں اتفاقاً ہم آگئے تھے۔"

"ہر خباثت میں مبتلا انسانوں پر ایک نہ ایک وقت تو ایسا آتا ہی ہے" میں نے ملائمت سے کہا۔

"میرا خیال تھا کہ میں وہ وقت آنے سے پہلے اس دلدل سے نکل جاؤں گا۔ خیر... باقی لوگوں کا تو مجھے معلوم نہیں کہ بعد میں کیا ہوا لیکن میرے پیچھے تو وہی انسپکٹر بھوت کی طرح لگ گیا تھا۔ اس کے ساتھ شاید ایک سپاہی بھی تھا۔ وہ اس علاقے سے واقف معلوم ہوتے ہیں۔ بہت دیر وہ میرے تعاقب میں رہے لیکن آخر کار میں اسے ڈاج دینے میں کامیاب ہوگیا اور وہ بہت پیچھے رہ گئے لیکن پھر میرا گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ شکر ہے گھوڑے کی کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی ورنہ میں اس سواری سے بھی محروم ہوجاتا اور وہیں پڑا رہ جاتا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ میں ڈیرہ حسام خان کی طرف بھی نہیں جاسکتا تھا۔ وہاں فی الحال خطرہ زیادہ تھا۔ مجھے فوری طبی امداد کی بھی ضرورت تھی چنانچہ میرے لیے یہاں آنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا لیکن مجھے معلوم ہے جلد یا بدیر وہ اس طرف آئیں گے ضرور۔ اس پورے علاقے میں میرے ڈیرے کے علاوہ کوئی ایسی مناسب جگہ نظر نہیں آتی جہاں کوئی ڈاکو چھپ سکے..."

"واردات تو ناکام ہی رہی ہوگی؟ تمہارے پاس لوٹ کا مال تو نہیں ہے نا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ میرے پاس کچھ نہیں ہے" اس نے کمزور سی آواز میں جواب دیا۔

"کوئی مسافر ہلاک یا زخمی تو نہیں ہوا؟"

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا" وہ ہچکچاہٹ سے بولا "گولیاں تو وہاں کافی چلیں۔ ڈرائیور کا گولی چلانا بارش کا پہلا قطرہ ثابت ہوا۔ روشنی وہاں نہ ہونے کے برابر تھی اور فائرنگ شروع ہوتے ہی ہم لوگوں نے ٹارچیں وغیرہ بجھادی تھیں۔ پولیس نے بھی فائرنگ شروع کردی تھی۔ سب کو جان بچانے کی فکر پڑگئی تھی۔ شکر ہے تھانیدار میرا چہرہ نہیں دیکھ سکا۔ میرے چہرے پر ڈھاٹا تھا۔ انسپکٹر میرے تعاقب میں چلا تو اسے دور رکھنے کے لیے بھی مجھے کافی فائرنگ کرنا پڑی۔ حتیٰ کہ میرے پاس میگزین بھی ختم ہوگیا اور کچھ دور آنے کے بعد کلاشنکوف بھی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ میں اسے

اُٹھانے کے لیے بھی نہیں رکا۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن میرا ذہن کہیں اور تھا۔ میں چشم تصور سے اس ساری صورت حال کو دیکھنے کی کوشش کررہا تھا جس سے وہ گزر کر آرہا تھا۔ اس نے پہلو بدلنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں بے اختیار کراہ اُٹھا۔

درد کی لہر ذرا دبی تو وہ ایک بار پھر چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا "میں نے اس انسپکٹر کو آج پہلی بار دیکھا ہے لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ کوئی بہت ہی مختلف قسم کا پولیس آفیسر ہے۔ مجھے یقین ہے' وہ قبر تک میرا پیچھا نہیں چھوڑے گا۔"

"مجھے یقین تو نہیں ہے لیکن بہرحال دنیا میں انہونیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ بعض انتہائی بدنام محکموں میں انتہائی فرض شناس لوگ بھی موجود ہیں جو بعض اوقات ناقابل یقین مثالیں قائم کرجاتے ہیں" میں نے کہا۔

"میرا دل کہتا ہے وہ آفیسر انہی میں سے ایک ہے۔ اس نے موت کی پروا کیے بغیر میرا تعاقب جاری رکھا تھا۔ وہ انتہائی نڈر اور جان پر کھیل جانے والا شخص معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہاں تک ضرور آن پہنچے گا.... اور میں اس حال میں ہوں..." اس نے پٹیوں میں لپٹی ٹانگ کی طرف اشارہ کیا۔

"پھر...؟" میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن پھر اس نے گویا ارادہ ملتوی کردیا۔ اس کے چہرے پر زردی سی چھانے لگی۔

"تم جو کہنا چاہتے ہو کہہ ڈالو' ارادہ ملتوی مت کرو" میں نے کہا۔

"نہیں" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولا "تم مجھے خود غرض سمجھوگے۔ اس سے بہتر ہے' میں گرفتاری اور موت کے خطرے کو ہی قبول کرلوں۔"

"تم بولو تو سہی..." میں نے اصرار کیا۔

"میں تم پر اپنا کوئی احسان نہیں سمجھتا اور نہ اس کا بدلہ چاہتا ہوں۔" میرے بہت اصرار پر وہ ہچکچاتے ہوئے بولا "بلکہ میں تم سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا تم مجھ پر ایک احسان کرسکتے ہو؟"

"میں اگر تمہارے کسی کام آسکا تو ضرور آؤں گا" میں نے کہا "لیکن جیسا کہ تم کہہ رہے ہو' وہ ایک فرض شناس آفیسر معلوم ہوتا ہے جو اپنی جان پر کھیل کر تمہارا تعاقب کررہا ہے۔ میں کسی فرض شناس آفیسر کو ہلاک نہیں کرسکتا۔"

"میں تمہیں اس کو قتل کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا" روحیل بولا "میں اسے صرف مس گائیڈ کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے میری شکل تو دیکھی نہیں ہے۔ اس کی نظریں صرف سیاہ گھوڑے پر سوار ایک سیاہ پوش کو تلاش کررہی ہیں۔ اگر تم میرے یہ کپڑے پہن کر میرے سیاہ گھوڑے پر سوار ہوکر عین اس وقت یہاں سے نکلو جب وہ قریب پہنچنے والا ہو تو وہ تمہارے پیچھے لگ جائے گا..."

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر وہ یہاں آئے گا بھی... تو ایک معذور کو لیٹا ہوا دیکھے گا۔ میں اسے بتاؤں گا کہ میں تو دو دن سے یہاں صاحب فراش ہوں۔ ایک نوکر میری دیکھ بھال کررہا ہے جو اس وقت گاؤں گیا ہوا ہے' صبح آجائے گا۔ میں اسے یہ بھی بتاؤں گا کہ ڈاکو یہاں آیا تھا لیکن یہاں چھپنے کی کوئی مناسب جگہ نہ دیکھ کر میری جان چھوڑ کر آگے روانہ ہوگیا۔ مجھے یقین ہے' وہ گھوڑے کے سموں کے نشانات دیکھتا ہوا تمہارے تعاقب میں روانہ ہوجائے گا۔"

"اس کے بعد کیا ہوگا؟" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"تم ایک آدھ دن اسے اِدھر اُدھر گھمانے پھرانے کے بعد بچا دے کر یہاں واپس بھی آسکتے ہو یا کسی اور طرف بھی نکل سکتے ہو۔ وہ نقشہ تو میں تمہیں دے ہی چکا ہوں۔ اگر تم محسوس کرو کہ تمہاری واپسی یا کسی محفوظ مقام کی طرف نکلنا مشکل ہورہا ہے اور خطرہ تمہارے قریب پہنچ رہا ہے تو اس سڑک کی طرف نکلنے کی کوشش کرنا جو ہائی وے سے حاصل آباد کی طرف جاتی ہے۔ اس سڑک پر حاصل آباد اور ڈیرہ حسام کے درمیان ایک جگہ ہے جسے "جانو" کا اڈا کہتے ہیں۔ وہ ایک طرح سے ریستوران بھی ہے۔ ٹرکوں کا اڈا بھی ہے اور ڈرائیوروں کے لیے وہاں ایک بڑے سے کچے ہال میں مسافر خانہ ٹائپ جگہ بھی بنی ہوئی ہے۔ جانو اس اڈے کا مالک ہے۔ کبھی کبھار ہمارے گروہ کے آدمی اس کے ہاں پناہ لیتے رہتے ہیں۔ وہ ہمارا خیال کرتا ہے۔ میرا نام لے کر تم اس کے پاس پناہ لے سکتے ہو۔ اگر تم ضرورت محسوس کرو تو اس کے ہاں چلے جانا۔ ہوسکتا ہے اس کے ہاں تمہارے لیے اس گھوڑے اور سیاہ لباس سے چھٹکارا پانے کا بھی بندوبست ہوجائے۔ اس سے کہہ دینا' تم میرے خاص آدمی ہو۔ ایک طرح کے پارٹنر۔"

میں نے غیر ارادی طور پر آہستگی سے اثبات میں سرہلا دیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا کچھ سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے میں تمہیں ایک اور ضروری بات بتادوں... اب تم سے کوئی بھی بات راز رکھنے کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔"

"ہاں۔ میرے دل پر کوئی اور خراش ڈالنی ہے تو ڈال لو" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بات یہ ہے کہ... ماکھو چاچڑ دراصل میں ہی ہوں" اس نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا۔

مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرے سر پر کچھ رسید کردیا تھا!

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ "تم مجھ سے مذاق تو نہیں کررہے؟"

...ں نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ کرب ... انداز میں کھنچ کر رہ گئے۔ وہ ذرا پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ...نہ تو موقع ہے اور نہ ہی اس وقت مجھ میں مذاق کی سکت

...لیکن تم ماکھو چاچڑ کیسے ہوسکتے ہو؟" میں نے غیر ارادی سے ... کہا۔ شاید وہ میری خود کلامی تھی۔ اپنا سوال مجھے خود بھی ...الگا۔

...یہ تو مجھے نہیں معلوم کہ میں کیسے ہو سکتا ہوں لیکن میں ...وہ بولا۔ "ایک بات اور بھی بتادوں۔ ماکھو چاچڑ درحقیقت ...نی کردار ہے۔ اس نام کا کوئی ڈاکو موجود نہیں۔ میں نے ہی ...کوؤں کی دُنیا میں اس نام سے مشہور کر رکھا ہے۔ وہ میرا ...بھی جانتے ہیں لیکن اسے تو تقریباً بھولے ہی رہتے ہیں۔ ...کھو ہی کے نام سے پکارتے ہیں۔ پولیس والوں کے لیے بھی ...ا پہچانا ہے لیکن بس نام کے سوا انہیں کچھ معلوم نہیں۔"

...لیکن پھر وہ تصویر کس شخص کی تھی جس کے ساتھ قبائلیوں ...صورت ملائی تھی اور مجھے پکڑ کر لے گئے تھے؟ وہ اسے ...کہہ رہے تھے اور اس وقت میرے میک اپ کی وجہ سے ...مجھ سے مل بھی رہی تھی لیکن درحقیقت وہ نہ میری تصویر ...ہی تمہاری ہوسکتی تھی" میں نے اس وقت گویا ایک نئے ...رے اس کی صورت کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ میں نے جو ...ئلیوں کے پاس دیکھی تھی' اس میں روحیل خان عرف ماکھو ...ا بھی شباہت نہیں تھی۔

...نہیں کوئی غلط فہمی ہوگئی ہوگی۔" وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ ...تصویر دیکھ کر کسی نے ان سے کہہ دیا ہوگا کہ یہ ماکھو چاچڑ ...ت کہنے والا ان لوگوں کی نظر میں مستند آدمی ہوگا اس ...میں بند کرکے ماکھو چاچڑ کو تلاش کررہے ہوں گے۔"

...ب اتفاق ہے...!" میں نے سر جھٹک کر کہا۔ "بلکہ اتفاق ...ہے۔ میری مدد کو بھی تمہیں ہی پہنچنا تھا۔"

...دنیا اتفاق در اتفاق کی لامتناہی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ...بولا۔ "لیکن اب میں نے تم سے مدد کی جو درخواست کی ...تم اس مدد کا جواب تو نہیں سمجھوگے؟ یہ تو محسوس نہیں ...میں نے تمہاری مدد کچھ اسی طرح کی تھی جیسے کسی کو چند ...لیے قرض دیا جاتا ہے؟ اِدھر چند دن گزرے اور اُدھر ...تقاضا ہوگیا؟"

...کہا۔ میں ایسا ہرگز نہیں سمجھوں گا۔" میں نے اسے یقین ...

...ا میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

...ن ہے۔ تمہیں قسم کھانے کی ضرورت نہیں۔" میں

نے کہا۔ "یہ محض اتفاق ہے... اور تم خود ہی کہہ چکے ہو' یہ دنیا اتفاق در اتفاق کی لامتناہی بھول بھلیوں میں بھٹک رہی ہے۔"

"نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میری زندگی کچھ زیادہ طویل نہیں ہوگی لیکن بہرحال... جب تک بھی زندہ رہا' آپ کا احسان مند رہوں گا۔" پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ ذرا چونکتے ہوئے بولا۔ "ابھی آپ نے تصدیق تو کی ہی نہیں ہے کہ آپ میری مدد کریں گے بھی یا نہیں۔ میں نے خود بہ خود ہی آپ کا جواب اثبات میں فرض کرلیا ہے۔"

اچھے بھلے دوستانہ اور بے تکلفانہ انداز میں بات کرتے کرتے نہ جانے کیوں یکدم ہی اس کے دل میں میرا احترام اُمنڈ آیا تھا اور اس نے مجھے "آپ جناب" سے مخاطب کرنا شروع کردیا تھا۔ میں اس تبدیلی کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

میں نے کہا۔ "دوستوں کو دوستوں پر ایسا ہی مان ہونا چاہیے۔ انہیں پہلے ہی سے یقین ہونا چاہیے کہ وہ جب دوست سے کچھ مانگیں گے تو اس کا جواب اثبات میں ہوگا۔ تمہاری تو خیر اب بات ہی کچھ اور ہوگئی ہے لیکن اگر تم میرے لیے اجنبی بھی ہوتے اور اس حالت میں مجھ سے مدد کی درخواست کرتے جس حالت میں تم اس وقت پڑے ہو تو میں ضرور تمہاری مدد کرتا۔"

"لیکن جس مدد کی میں درخواست کررہا ہوں اس میں جان کا بھی خطرہ ہے۔" اس نے گویا مجھے احساس دلایا۔

"کوئی بات نہیں۔ کئی بار تمہارے اس خادم نے اجنبیوں کے لیے بھی جان کو خطرے میں ڈالا ہے۔ تمہاری فرمائش کوئی بڑی فرمائش نہیں۔" میں نے کہا۔

"افضل بھائی! آپ واقعی کچھ عجیب سے آدمی ہیں" وہ گردن ذرا ترچھی کیے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ عجیب تو میں ہوں۔" میں نے بلا تامل کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسا مگر پھر کراہ کر رہ گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ٹوٹی ہوئی ٹانگ کی تمام تر تکلیف کے باوجود اب اس کے اعصاب کچھ ڈھیلے پڑرہے تھے۔ یہ جواب اثبات میں پاکر یقیناً اسے بڑا اطمینان حاصل ہوا تھا۔ میں جو کہنا چاہتا تھا' میرے خیال میں اس کا مناسب موقع یہی تھا۔

"لیکن میں ایک شرط پر تمہاری تجویز پر عمل کروں گا" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟" وہ چونکا۔

"وہ یہ کہ اگر تم اس چکر سے بہ خیروعافیت نکل آئے اور تمہاری ٹانگ بھی ٹھیک ہوگئی تو پھر خواہ میں واپس آؤں یا نہ آؤں لیکن تم ڈاکا زنی چھوڑ دوگے۔ ماکھو چاچڑ کا کردار تخلیق بھی تم نے کیا تھا' اب تم خود ہی اسے کہیں دفن بھی کردینا۔" میں نے کہا۔

"اوہ" اس نے گہری سانس لی جیسے اسے اس سے زیادہ مشکل

فرمائش کی توقع تھی۔ "آپ کو یہ سن کر شاید حیرت ہوگی کہ ایک بار تو پولیس بھی ماکھو چاچڑ کو دفن کر چکی ہے۔ آپ مجھ سے اس کی صرف فرضی تدفین کی فرمائش کر رہے ہیں' پولیس نے تو اسے سچ مچ دفن کر دیا تھا۔"

"کیا مطلب؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"انہوں نے بہت سے حل نہ ہونے والے کیس ماکھو چاچڑ کے کھاتے میں ڈال رکھے تھے۔ پھر ایک روز پولیس مقابلے میں نہ جانے کون بدنصیب ان کے ہاتھوں مر گیا۔ معلوم نہیں پولیس مقابلے میں مرا تھا یا کوئی اور چکر تھا۔ ان لوگوں سے کچھ بعید نہیں ہوتا۔ بہرحال انہوں نے اس ڈاکو کو..... یا جو کوئی بھی وہ تھا..... اسے ماکھو چاچڑ قرار دے کر دفن کر دیا۔ انعامات اور سرٹیفکیٹ بھی وصول کر لیے۔ وہ تو بعد میں اس بے چارے کے لواحقین نے کچھ ہمت کر لی اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ تب اس معاملے کی نئے سرے سے تفتیش ہوئی اور بڑے ڈھکے چھپے سے انداز میں تسلیم کر لیا گیا کہ وہ ماکھو چاچڑ نہیں تھا۔ ماکھو چاچڑ کے بارے میں درحقیقت پولیس کو بھی کچھ معلوم نہیں۔ بس یہ ایک نام ہے جو گردش کر رہا ہے۔" اس نے بتایا۔

"لیکن تم اس کے نام پر بھی مٹی ڈال دو گے اور اس کے کاموں پر بھی۔" میں نے کہا۔ "قدرت نے تمہیں اتنی خوبصورت زندگی دی ہے' تمہارے پاس تھوڑی سی زمین ہے' ذاتی مکان ہے' قابل رشک جوانی ہے اور تم دنیا کے ذلیل قسم کے ہنگاموں سے دور اس گوشۂ عافیت میں بیٹھے ہو۔ تم چاہو تو اس زندگی کو اور خوبصورت بنا سکتے ہو۔ اسے بدصورتیوں کے جہنم میں مت پھینکو۔ تم خود ہی کہہ چکے ہو کہ ڈاکوؤں کے پاس زیادہ دولت بھی نہیں ہوتی۔ تو پھر کس لیے کر رہے ہو یہ سب کچھ؟"

"میں مختصراً آپ کو بتا چکا ہوں کہ بہت سے عوامل تھے جنہوں نے مجھے اس چکر میں پھنسا دیا۔ میرے خواب تھے..... غلط صحبت تھی..... کچھ لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں استعمال ہو گیا..... میری ناسمجھی تھی..... اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ تفصیل میں جانے کا اب وقت بھی نہیں ہے اور فائدہ بھی کچھ نہیں۔" وہ بہت دھیمی آواز میں بولا۔

"تفصیل میں جانے کی ضرورت بھی نہیں۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے۔" میں نے کہا۔ "یہ صرف تمہاری نہیں' بے شمار بدنصیبوں کی کہانی ہے۔"

"بہرحال..... ان میں سے کچھ عوامل اب بھی ایسے ہیں جو مجھے ماکھو چاچڑ سے دوبارہ خالص روحیل خان بننے نہیں دیں گے۔ یہ چیز ان کے مفاد میں نہیں ہوگی۔ وہ مجھے اس کی سزا دیں گے' میری زندگی اجیرن بنا دیں گے۔"

"اس کے باوجود تمہیں یہ کام کرنا ہوگا۔" میں نے اصرار کیا۔

"میں آپ کی فرمائش سے بھی پہلے خود اس موضوع پر سوچ رہا تھا' اس سلسلے میں غور کر رہا تھا۔ میں اس کردار سے اور اس اعمال سے جان چھڑانا چاہتا ہوں لیکن یہ لعنت کے طوق کی طرح میرے گلے میں پڑ گیا ہے۔"

"لعنت کے اس طوق کو تم خود ہی گلے سے اتار سکتے ہو اور آکر نہیں اتارے گا۔" میں نے کہا۔

"اس صورت میں یہ جگہ..... جسے آپ گوشۂ عافیت جنت وغیرہ قرار دے رہے ہیں' یہی میرے لیے جہنم بن جائے گی۔ آپ کی فرمائش پوری کرنے کے لیے مجھے یہ سب کچھ چھوڑ کر کہیں غائب ہونا پڑے گا' پاتال میں اترنا پڑے گا جہاں کوئی شکاری کتا میری بو سونگھتا ہوا نہ پہنچ سکے۔" وہ بولا۔

"کوئی بات نہیں' یہ بھی کر گزرنا۔ جب انسان کسی بھی سے ذلت اور برائی کی دلدل میں جا دھنستا ہے تو دوبارہ اجالے/سچائی تک پہنچنے کے لیے اسے کچھ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ کبھی یہ قیمت بہت زیادہ بھی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی ادائیگی نقد جان کی صورت میں بھی ادا کرنی پڑتی ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں اگر انسان ایک بار سچے دل سے صرف عزم کر لے تو یہ سودا مہنگا نظر آتا ہے اور نہ ہی مشکل۔ بعض اوقات کوئی اور امداد بھی میسر آ جاتی ہے اور سب کام آسان ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ذرا توقف کے بعد کہا۔ "ابھی وقت ہے' ابھی تم یہ مرحلہ نسبتاً آسانی سے سر کر سکتے ہو کیونکہ تمہارے بیوی بچے نہیں ہیں۔ ابھی تمہارے پیروں میں بھاری زنجیر نہیں ہے۔ ابھی تمہارے لیے بھاگنا پھر بھی کچھ آسان ہے۔ انتظار مت کرو۔ دلدل تو آخر دلدل ہے' تمہیں بالآخر نگل جائے گی۔"

دفعتاً وہ مسکرایا۔ اپنی تمام تر تکلیف کے باوجود وہ مسکرانے میں کامیاب ہو گیا۔

"میں آپ کو ایک بات بتاؤں..... آپ یقین کریں گے؟" اس نے پوچھا۔

"میں پہلے بھی تمہاری ہر بات پر یقین کرتا آیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"نہیں۔ اب بات اور ہے۔ اب میری زندگی میں کوئی راز نہیں ہے۔ کم از کم آپ کے لیے۔" وہ بولا۔ "آپ یقین کریں' آپ کی نصیحت سے پہلے میں خود بھی سوچ رہا تھا کہ مجھے ماکھو چاچڑ کو الوداع کہہ دینا چاہیے لیکن مجھے یہ کام بہت مشکل نظر آ رہا تھا۔ آپ کی باتیں سننے کے بعد کچھ آسان محسوس ہونے لگا ہے۔"

"تو پھر وعدہ.....؟"

"ہاں..... وعدہ ہے۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہاتھ تپ رہا تھا۔ کچھ

نہیں محسوس ہو رہی تھی۔

"ٹھیک ہے....." میں نے کہا۔ "میں تمہارے محلے میں یہاں چلا جاتا ہوں لیکن اس حالت میں تمہارا خیال کون رکھے گا؟"

"اتفاق سے میں مہم پر روانہ ہونے سے پہلے ہی ڈیرہ حسام میں ایک شخص سے بات کر چکا تھا۔ وہ صبح یہاں پہنچ جائے گا۔ وہ پہلے بھی میرے لیے ہاری کے طور پر کام کرتا رہا ہے۔ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہ سب کچھ سنبھال لے گا۔ میری سب سے بڑی فکر یہ لگتا ہے کہ وہ انسپکٹر یہاں ضرور پہنچے گا۔ میرا اس سے پیچھا چھوٹ جائے تو باقی سب مسائل سے میں نمٹ لوں گا۔"

وہ تھوڑی کھجاتے ہوئے پر خیال لہجے میں بولا۔ "میں چاہتا ہوں آپ اس وقت یہاں سے روانہ ہوں جب اس کے گھوڑے کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں تاکہ وہ میرے پاس زیادہ نہ ٹھہرے۔ جتنا زیادہ ٹھہرے گا اتنے ہی اس کے ذہن میں شکوک پیدا ہوں گے۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "بس تم نے تجویز پیش کر دی ہے' اس پر عمل درآمد ہو جائے گا۔ میں انسپکٹر کو اپنے پیچھے لگا لے جاؤں گا۔ ضرورت پڑنے پر اس سے نمٹ بھی لوں گا لیکن مجھے تمہاری طرف سے تشویش رہے گی۔ اس معذوری کی حالت میں تم اس ویرانے میں اکیلے پڑے ہوگے۔"

"آپ قطعاً پریشان نہ ہوں۔ وہ شخص کل علی الصباح یہاں پہنچ جائے گا۔ اسے یقینی طور پر آنا ہے۔" وہ بولا۔

"اسے تو معلوم نہیں ہے کہ یہاں کیا صورت حال ہو چکی ہے۔ ہو سکتا ہے وہ آنے میں سستی کر جائے۔" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"نہیں۔ اسے ضرور آنا ہے۔" وہ وثوق سے بولا "یہ اس کی ڈیوٹی ہے۔ اسی یقین کی بنیاد پر تو یہ تجویز میرے ذہن میں آئی ورنہ میں اتنا خطرہ کہاں مول لے سکتا تھا۔ صرف چند گھنٹوں کی بات ہے۔ اس سے ملتی جلتی صورت حال سے میں اس سے پہلے بھی گزر چکا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ تم مطمئن ہو تو میں بھی مطمئن ہو جاتا ہوں۔ لاؤ اب یہ سیاہ کپڑے اور پگڑی وغیرہ اتار دو۔ میں تمہیں کچھ اور پہنا دوں۔" میں نے کہا۔

یہ مشکل مرحلہ تھا لیکن بہرحال سر ہو گیا۔ میں نے کان لگا کر آہٹ لینے کی کوشش کی۔ ٹاپوں کی آواز اب تک سنائی نہیں دی تھی۔ میں نے کہا۔ "شاید اس انسپکٹر نے تمہارے تعاقب کا ارادہ ہی ترک کر دیا ہو۔ ہم خواہ مخواہ فکر میں گھلے ہو رہے ہیں۔"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "میں اسے جانتا نہیں ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ پاتال تک میرا پیچھا کرے گا۔ میں نے صرف ایک لمحے کے لیے ٹارچ کی تیز روشنی میں اس کی

آنکھوں میں جھانکا تھا۔ اس کی آنکھیں اس شیر کی آنکھیں تھیں جس کے ہاتھوں سے اس کا شکار نکلا جا رہا ہو۔"

"ہاتھوں سے نہیں..... پنجوں سے....." میں نے تصحیح کی۔

وہ کراہنے کے سے انداز میں ہنسا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر اس کے ریوالور میں گولیاں ختم نہ ہو گئی ہوتیں تو وہ میری زندگی کا آخری لمحہ ہوتا۔"

"لیکن تمہارے پاس تو کلاشنکوف تھی۔ تم نے اسے کیوں نہیں مارا؟" میں نے سوال کیا۔

"اسی بات پر میں حیران ہوں..... ابھی تک حیران ہوں۔" وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ "اس ایک لمحے کے لیے میں گویا بالکل خالی الذہن سا ہو گیا تھا۔ میں بالکل فیصلہ نہیں کر سکا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے پتا چلا کہ وہ اندھیرے میں غائب ہو چکا تھا۔ مجھے بھی فوراً ٹارچ بجھانا پڑی ورنہ دوسرے پولیس والوں کی رائفلوں سے نکلی ہوئی گولیاں مجھے چھلنی کر جاتیں۔"

"شاید اس کے بارے میں تمہارا اندازہ درست ہی ہو۔ شاید وہ واقعی ایک دیانتدار آفیسر ہو۔ اسی وجہ سے اس پر اوپر والے کی نظر کرم ہو جو اسے بچا کر لے گئی ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وجہ کچھ بھی ہو بہرحال' ایک بات تو ظاہر ہے کہ یہ زندگی اور موت کا معاملہ بھی دیگر سارے معاملوں کی طرح اوپر والے ہی کے ہاتھ میں ہے۔ ابھی اس کا تمہارے ہاتھ سے یا تمہارا اس کے ہاتھ سے مرنا شاید اس کو منظور نہیں تھا۔"

"لیکن یہ میں جانتا ہوں کہ وہ یہاں آئے گا ضرور۔" روحیل خان وثوق سے بولا۔ "وہ تو خیر ویسے بھی گھاگ قسم کا پولیس آفیسر معلوم ہوتا ہے' نہ جانے کس کس سراغ کی مدد سے تعاقب کر رہا ہوگا لیکن ویسے بھی اس علاقے میں بھٹکتے ہوئے لوگ آخر کار یہاں تک ضرور پہنچتے ہیں۔ میری یہ کٹیا لوگوں کے لیے گویا بیکراں سمندر میں کھڑے ہوئے لائٹ ہاؤس کی طرح ہے۔"

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "مجھے معلوم تھا' اسے پہنچنے میں کچھ دیر لگے گی اسی لیے تو میں اتنے اطمینان سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ بے شک جان ہتھیلی پر لیے پھر رہا ہے لیکن احتیاط تو بہرحال کر رہا ہوگا۔ اس علاقے میں پولیس والے اول تو ڈاکوؤں کا تعاقب نہیں کرتے' اگر کرتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کسی بھی قدم پر موت ان پر جھپٹ سکتی ہے۔ آپ کو جتنا بھی وقت میسر ہے' اتنی دیر کے لئے ذرا اس نقشے پر ایک نظر ڈال لیں جو میں نے آپ کو دیا تھا۔ رات کے اندھیرے میں تو آپ کو کچھ خاص پتا نہیں چلے گا لیکن دن کی روشنی پھیلے تو آپ نشانیوں کی مدد سے ڈیرہ حسام پہنچنے کی کوشش کیجیے گا۔"

"میں اس نقشے کو بہت غور سے دیکھ چکا ہوں اور تقریباً ذہن نشین کر چکا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اس وقت تو خود کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

میں لوہے کی الماری میں لگے ہوئے بڑے سے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور بدلے ہوئے حُلیے میں اپنا جائزہ لینے لگا۔ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس اور لمبے جوتوں کے ساتھ میں نے چہرے پر ڈھاٹا بھی باندھ لیا۔ اب روحیل خان کی جگہ میں خود ڈاکو لگ رہا تھا۔

روحیل خان بولا۔ "کلاشنکوف تو مجھ سے راستے میں گر چکی ہے، آپ ماؤزر لے جائیں۔"

"نہیں۔" میں نے ذرا سوچ کر جواب دیا۔ "میرے پاس ایک اچھا ریوالور اور کچھ فاضل گولیاں موجود ہیں۔ میں اپنے پاس صرف وہی رکھوں گا۔ ماؤزر کو لباس میں چھپانا ذرا مشکل ہوتا ہے۔" میں نقشہ اور ریوالور دونوں ہی چیزیں اپنے پاس رکھ چکا تھا۔

اچانک روحیل خان تیز سرگوشی میں بولا۔ "آپ نے سنا؟"

"یہاں سننے کو کیا رکھا ہے!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ ہوا کا ایک بھولا بھٹکا جھونکا اپنے دوش پر کچھ آہٹیں سی لایا تھا۔ پھر ہوا کا رخ بدل گیا اور وا ہمے جیسی آواز معدوم ہو گئی لیکن وہ اتنا پتا ضرور دے گئی تھی کہ کافی دور کوئی گھڑ سوار محوِ سفر تھا اور اس کا رخ غالباً اسی طرف تھا۔

روحیل خان کو اب انسپکٹر کی آمد پر خطرے سے زیادہ اپنا اندازہ صحیح ثابت ہونے پر فخر تھا۔ وہ داد طلب سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں نے کہا تھا نا......؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور کان لگا کر سننے کی کوشش کرتا رہا۔ ہوا کے ایک اور جھونکے کے ساتھ ٹاپوں کی نہایت ہلکی آواز گویا بھٹکتی ہوئی ہم تک پہنچی۔ آواز اب بھی اتنی مدھم تھی کہ عام آدمی شاید اسے نہ سُن پاتا لیکن میری اور روحیل خان کی سماعت جنگلوں ویرانوں سے بڑی مانوس تھی۔ میری طرح یقیناً اس نے بھی برگ و شجر تک کی سرگوشیاں سُنی ہوئی تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد روحیل خان بولا۔ "ہو سکتا ہے کچھ آگے آنے کے بعد وہ گھوڑا چھوڑ دے اور پیدل مکان کی طرف بڑھے۔ مکان کی روشنی تو اسے شاید نظر آہی چکی ہوگی۔" وہ بدستور سرگوشی میں بات کر رہا تھا حالانکہ آس پاس ہماری بات سننے والا کوئی موجود نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے... میں چلتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پہلے کچھ دیر مکان کے باہر چھپ کر صورت حال کا جائزہ لیتا ہوں پھر مناسب موقع دیکھ کر بظاہر مکان سے نکل کر بھاگوں گا۔"

میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ وہ ایک لمحے کے لیے میرا ہاتھ تھامے میری طرف دیکھتا رہ گیا پھر بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔ "میرا سگا بھائی بھی ہوتا تو شاید اس موقعے پر میرے کام نہ آتا۔"

"ان بیکار باتوں کو چھوڑو۔" میں نے کہا۔ "اور کام کی بات سُنو۔ ابھی تو مجھے کچھ اندازہ نہیں کہ کب تک ادھر اُدھر بھٹکتا رہوں لیکن کچھ عرصے کے بعد اگر کبھی تمہارا لاہور آنا ہو تو کسی بھی کاروباری شخص سے میرا اتا پتا معلوم کر کے آجانا لیکن ایک سی تصیح میں بھی کرنا چاہوں گا۔ میرا نام افضل خان نہیں، چوہدری ہے۔ کسی کاروباری آدمی سے چوہدری گروپ آف... کے دفاتر کا پتا پوچھ لینا۔"

وہ گہری نظر سے میری طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے... "میں نے کہا تھا نا کہ آپ اتنے معمولی آدمی نہیں ہیں جتنا ظاہر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"یہ تمہارا خیال ہے، تمہاری ذرّہ نوازی ہے لیکن میں آپ کو معمولی شخص ہی سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا اور ایک... اٹھائے کمرے سے نکل آیا۔ میں نے سفر کی تھوڑی بہت تیار... تھی۔ اس تھیلے میں دو تین چھوٹی موٹی چیزیں، اس روز کا... کھانا، پانی کی ایک بوتل اور کپڑوں کا ایک جوڑا تھا۔ روحیل... لباس تبدیل کرانے کے بعد میں نے یہ چیزیں تھیلے میں ڈا... تھیں۔ مجھے ان کی ضرورت پیش آسکتی تھی۔

اس وقت تک ٹاپوں کی آواز خاصی واضح سنائی دینے لگ... اور گھڑ سوار ایک نہیں، دو معلوم ہوتے تھے۔ مکان سے نکل... نے احتیاط سے دروازہ بند کیا اور اندھیرے میں بہت دور تک... کی کوشش کی لیکن مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔

دفعتاً ٹاپوں کی آواز معدوم ہو گئی۔ شاید گھڑ سوار کہیں را... کوئی اندازہ لگا رہے تھے یا کسی حکمتِ عملی پر غور کر رہے تھے۔ بات تو طے تھی کہ وہ جہاں کہیں بھی تھے، اب تک مکان کو... دیکھ چکے تھے اور منہ اٹھائے اس کے قریب آنے کے بجائے... محتاط انداز اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے۔

روحیل خان کا سیاہ گھوڑا باہر موجود تھا اور عقلمندی کا... کرتے ہوئے پانی کی ایک بڑی بالٹی خالی کر چکا تھا۔ اب مویشی... کھلی پر کھڑا گھاس پر منہ مار رہا تھا۔ غالباً وہ شکم سیر ہو چکا... جھرجھری سی لے کر اس نے مستعد انداز میں میری طرف دیکھا... میں نے قریب جا کر اسے چمکارا اور تھپکی دی۔ گھوڑے... میرے لیے پسندیدگی کا اظہار نہیں کیا لیکن بدکا بھی نہیں... گھوڑا بہت اڑتا تب بھی میں اسے قابو میں کر لیتا۔ گھوڑوں... میں کرنے میں مجھے خاصی مہارت حاصل تھی اور مجھے اس... بڑا لطف آتا تھا۔ لڑکپن میں بھی یہ میرے محبوب مشاغل... ایک مشغلہ تھا۔ کسی کا بھی گھوڑا ہاتھ آجاتا تھا تو میں اس... کی کوشش ضرور کرتا تھا، خواہ وہ کتنی ہی سرکشی دکھاتا... گھوڑوں کے مالکان خود بعض اوقات گھوڑوں کے بارے... سے مشورہ کرتے تھے جبکہ میرے پاس گھوڑا نہیں تھا۔

ایک مناسب لمحہ دیکھ کر میں اُچک کر اچانک ہی روحیل... کے سیاہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے اور تو کسی قسم کی... نہیں دکھائی لیکن قدرے مضطرب انداز میں ہنہنا اٹھا... رات کے گہرے سناٹے میں اس کے ہنہنانے کی آواز کچھ ا...

محسوس ہوئی جیسے کسی نے عین میرے قریب توپ داغ دی ہو۔ جو کوئی بھی اس طرف آرہا تھا، اس نے بھی یقیناً یہ آواز سن لی ہوگی۔

میں نے ایک خاص انداز میں تھپک کر اسے مزید ہنہنانے سے باز رکھا اور ایڑ لگائی۔ وہ ایک لمحے کے لیے مچلا لیکن پھر دوڑنے لگا۔ میں اسے جنگلے سے باہر لے آیا اور مکان کے گرد ایک چکر لگایا۔ میں چاہتا تھا، اس طرف آنے والے اگر پولیس انسپکٹر اور اس کا ساتھی ہی تھے تو وہ محسوس کرلیں کہ کوئی گھڑ سوار مکان سے نکل کر فرار ہوا ہے۔ وہ اندھیرے میں رائفل سے مجھ پر نشانہ آزمائی بھی کرسکتے تھے لیکن میں نے یہ خطرہ مول لے لیا تھا۔ تاہم احتیاطاً میں گھوڑے پر بالکل جُھک کر بیٹھا ہوا تھا۔

میں نے مکان کے گرد چکر کاٹ لیا، کسی طرف سے گولی نہیں آئی۔ میں نے گھوڑے کو اس طرف موڑ لیا جدھر مجھے نقشے کے حساب سے جانا چاہئے تھا۔ وہ اچھی نسل کا ایک سُبک بدن گھوڑا تھا۔ ابھی اس کے بدن سے پہلی ہی مشقت کا پسینہ خشک نہیں ہوا تھا لیکن اس نے دوبارہ تیز دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

خنک ہوا میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجا رہی تھی۔ میں شبِ تاریک کا سینہ چیرتا اپنی دانست میں ڈیرہ حسام کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ آسمان پر صرف چند ستارے جھلملا رہے تھے۔ ان سے مجھے سمت کے تعین میں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی لیکن میری کوشش تھی کہ مجھ سے کوئی غلطی سرزد نہ ہو۔ روحیل خان اس علاقے کے بارے میں مجھے بہت کچھ بتا چکا تھا۔ اس میں بیک وقت پہاڑی، صحرائی، دیہی علاقوں وغیرہ کی خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ یہاں اصل سمت سے بھٹک جانا میرے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں بھٹکتے بھٹکتے بھوک اور پیاس سے مر بھی سکتا تھا۔ ایک بار پہلے بھی ایسا ہونے ہی لگا تھا۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ روحیل خان اس طرف آنکلا تھا۔

چند منٹ بعد میں نے گھوڑے کو روک کر ہوا کی سرگوشیاں سننے کی کوشش کی۔ ٹاپوں کی آواز میرے تعاقب میں تھی اور فاصلہ اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتا تھا جتنا اس وقت تھا جب میں روحیل خان کے گھر سے روانہ ہوا تھا۔ اس پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس کا مطلب تھا، اگر وہ روحیل خان کے مکان پر رُکا بھی تھا تو اس نے وہاں چند لمحے سے زیادہ وقت صَرف نہیں کیا تھا۔ اس شخص کی تندہی مجھے کچھ عجیب لگ رہی تھی اور میں ایک بار پھر سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیا واقعی وہ پولیس والا تھا؟ اتنا پختہ ارادہ......؟ اتنی تندہی......؟ وہ محض گھوڑے پر بیٹھ کر بھوت کی طرح ایک نامعلوم ڈاکو کے پیچھے لگ گیا تھا اور پیچھا چھوڑتا نظر نہیں آرہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اب ہمارے ملک میں اس قسم کے پولیس والے نہیں پائے جاتے تھے۔

میں نے ایک بار پھر گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ ہوا ہو گیا۔ اب یہ بھی تصدیق ہو گئی تھی کہ میرے تعاقب میں آنے والا تنہا نہیں تھا۔ وہ کم از کم دو افراد تھے اور کوئی بعید نہیں تھا کہ ان کے پیچھے تیسرا بھی ہو۔ ٹاپوں کی ایک مُبہم سی آواز سے مجھے تیسرے گھڑ سوار کی موجودگی کا بھی شبہ ہو رہا تھا۔ بہرحال میرا پہلا مقصد تو حاصل ہو گیا تھا۔ میں نے انہیں اپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ روحیل خان کے سر سے خطرہ ٹل گیا تھا۔ اس کی ترکیب کارگر رہی تھی۔

میں حالات کی ستم ظریفی پر ایک بار پھر حیران تھا۔ میری زندگی تو ہر قدم پر اچانک ہی بڑے عجیب انداز میں پلٹا کھاتی تھی۔ ویسے تو کوئی بھی انسان یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ آئندہ لمحے اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آنے والا ہے لیکن میرے ساتھ تو زندگی کچھ زیادہ ہی مذاق کرتی ہے۔

کچھ دیر پہلے میں اطمینان سے روحیل خان کے گھر کے سامنے ٹہل رہا تھا اور دل کی اداسی سے کھیل رہا تھا تو میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ ایک عجیب ہی کہانی لے کر میرے سامنے آجائے گا اور کچھ دیر بعد میں ویرانے میں ایک نئے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔ وہ بھی اس طرح کہ میرے کندھوں پر کسی اور کی "کرنی" کا بوجھ ہوگا اور قانون کے محافظ مجھے کوئی اور سمجھ کر میرے تعاقب میں ہوں گے۔ خیر...... اب ان باتوں کے بارے میں سوچنے سے کوئی فائدہ نہیں تھا۔

زمین بتدریج کچھ سخت ہوتی جا رہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس پر گھوڑوں کے سُموں کے نشانات بھی رفتہ رفتہ غیر واضح ہوتے جا رہے ہوں گے لیکن اس فائدے کے ساتھ ہی یہ نقصان شروع ہو گیا تھا کہ ٹاپوں کی آواز واضح ہونے لگی تھی جو سائیں سائیں کرتے ان ویرانوں میں تعاقب کرنے والوں کو دور تک اپنا پتا دے سکتی تھی۔

اس دوران میں نے اپنے عقب میں بہت دور ایک مرتبہ روشنی کا دائرہ بھی نمودار ہوتے دیکھا۔ وہاں ٹارچ روشن کی گئی تھی جس کا رخ زمین کی طرف تھا۔ ٹارچ دوسرے ہی لمحے بُجھ گئی لیکن مجھے خیال آیا کہ اگر میرے پاس رائفل ہوتی تو میں اس روشنی کی مدد سے ہدف بنا کر فائر کر سکتا تھا لیکن فوراً میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو رد کر دیا۔

مجھے اس پولیس والے کو ہلاک نہیں، صرف مس گائڈ کرنا تھا، کچھ دیر دوڑائے رکھنے کے بعد اس سے پیچھا چھڑانا تھا۔ وہ بہرحال ایک نایاب پولیس والا تھا۔ اس محکمے میں اگر ایسے فرض شناس اور جفاکش لوگ موجود تھے تو انہیں زندہ رہنا چاہیے تھا۔ ان میں سے کسی کو کم از کم میرے ہاتھ سے نہیں مرنا چاہیے تھا۔ میں تو ان کا قدردان تھا۔ میری ان سے کوئی دشمنی نہیں تھی۔

میں تقریباً دو گھنٹے محوِ سفر رہا۔ اس دوران میرے تعاقب میں آنے والی آوازیں معدوم ہو چکی تھیں۔ شاید پولیس والوں نے میرے تعاقب کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا یا وہ دھوکا کھا کر کسی اور سمت

میں نکل گئے تھے۔ دونوں ہی صورتوں میں میرا مقصد حل ہو چکا تھا۔ میں انہیں نچا دینے' بھٹکانے یا مایوس کرنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

لیکن پھر مجھے محسوس ہوا کہ انہیں بھٹکاتے بھٹکاتے میں خود بھٹک گیا تھا۔ میں ایک ایسی جگہ پہنچ چکا تھا جہاں بُھربُھری سی پہاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان پر کہیں کہیں سبزے کی موجودگی کا بھی احساس ہو رہا تھا جبکہ نقشے کے حساب سے میرے راستے میں ایسا کوئی مقام نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہاں بعض جگہ بڑے بڑے گڑھے بھی موجود تھے جو برساتی پانی سے بھرے ہوئے تھے۔ دیکھے بھالے بغیر تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑانے پر یہ خطرناک بھی ثابت ہوسکتے تھے۔

مگر دوسرا مسئلہ یہ آن کھڑا ہوا تھا کہ گھوڑے کو تیز رفتاری سے دوڑانا ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ اس بے چارے کی بُری حالت تھی۔ آج ہی رات جب وہ روحیل خان کے پاس تھا تو نہ جانے کس رفتار سے...... اور کتنا دوڑ چکا تھا۔ ایک بار گر بھی چکا تھا۔ میں نے بھی اسے مسلسل اور تیز دوڑایا تھا۔ اب حالت یہ تھی کہ اس کا جسم بھیگ چکا تھا' اس کے نتھنوں سے گویا سانس نہیں' گرم دُھواں برآمد ہو رہا تھا اور وہ اپنے آپ کو تقریباً گھسیٹ رہا تھا۔

اسی دوران ادھورا سا چاند بھی بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور نقرئی چاندنی نے ویرانے کے چہرے پر غازہ سا مل دیا۔ میں نے آنکھوں سے دوربین کا کام لیتے ہوئے حتیٰ الامکان دور تک دیکھنے کی کوشش کی لیکن کہیں کوئی سایہ' کوئی ہیولا متحرک نظر نہ آیا۔ مجھے کچھ اطمینان ہو گیا۔ اگر میں بھٹک بھی گیا تھا تب بھی پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ نقشہ میرے پاس موجود تھا۔ دن کی روشنی میں' میں اس سے مدد اور رہنمائی حاصل کر سکتا تھا۔

فی الحال پولیس والوں نے میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ اب میرا پاگلوں کی طرح منہ اٹھائے بھاگتے رہنا ضروری نہیں تھا۔ گھوڑے سے اُتر کر میں نے اس کے مُنہ سے لگام نکال دی اور اسے اِدھر اُدھر گھومنے کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ واقعی کچھ اس طرح گردن ہلا ہلا کر ہانپ رہا تھا گویا اس کے پھیپھڑے پھٹنے کے قریب ہوں۔

جب وہ کچھ سستا چکا' پانی پی چکا اور گھاس میں تھوڑا بہت منہ مار چکا تو میں اس کی باگ تھام کر پیدل ہی ایک بُھربُھری پہاڑی پر چڑھنے لگا جو زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر آرام کرنا چاہتا تھا تاکہ تازہ دم ہو کر دن کی روشنی میں نئے سرے سے سفر کا آغاز کروں۔ میرا ارادہ قدرے بلندی پر جا کر لیٹنے کا تھا تاکہ نشیب کی طرف سے کوئی آنے سے فوراً دیکھا جا سکے۔

اوپر پہنچ کر میں نے گھوڑے کی زین سے بندھا ہوا تھیلا اتارا اور ایک صاف سی جگہ پر بیٹھ کر تھوڑی سی روکھی سوکھی کھا کر دو گھونٹ پانی پیا اور گھوڑے کی لگام اس کی اگلی ٹانگوں میں باندھ کر لیٹ گیا۔ سیر ہو کر کھانا میں نے اس لیے نہیں کھایا تھا کہ کہیں گہری نیند نہ سو جاؤں یا مجھ پر سستی طاری نہ ہو جائے۔ اس کے علاوہ میرا سفر کچھ طول بھی پکڑ سکتا تھا۔ تھوڑا سا جو کھانا پانی میرے پاس تھا اسے احتیاط سے ختم کرنا ہی بہتر تھا۔

میں نے کوشش کی کہ نیم بیداری کی سی حالت میں رہوں...... اور اس کوشش میں کامیاب بھی رہا۔ ایک بار ایک پرندے کی ہلکی سی پھڑپھڑاہٹ اور ایک بار ایک نیولے کے زمین کُریدنے کی آواز سُن کر میں اٹھ بیٹھا اور گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد مطمئن ہو کر دوبارہ لیٹ گیا۔

مجھے کافی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ انسپکٹر نے میرا پیچھا چھوڑ دیا تھا۔ فرض شناسی بھی آخر کہاں تک اس کا ساتھ دیتی۔ اس ویرانے میں گھوڑوں پر ڈاکوؤں کا تعاقب جاری رکھنے کے لیے جذبۂ فرض شناسی کے علاوہ بھی بہت سی چیزوں کی ضرورت تھی۔

موسم خنک ہی تھا اور نیم صحرائی سے علاقوں میں تو گرمیوں کی راتیں بھی خاصی سرد ہوتی ہیں۔ اس وقت بھی اچھی خاصی ٹھنڈ تھی لیکن چمڑے کی جیکٹ اور موٹی ڈینم کی جینز نے مجھے ٹھنڈ سے بچائے رکھا۔ صبح صادق کے آثار نمودار ہونے سے پہلے غیر ارادی طور پر مجھے گہری نیند آگئی۔

جب میری آنکھ کھلی تو چاروں طرف کُندنی دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور شاید دھوپ کی تپش محسوس کرتے ہوئے ہی میں بیدار ہوا تھا۔ گھوڑا میرے سرہانے ہی کھڑا تھا اور اب بالکل تازہ دم معلوم ہو رہا تھا۔ میں اس کی باگ تھامے ڈھلان سے اُتر آیا۔

ایک چھوٹے سے گڑھے میں مجھے بارش کا پانی کچھ صاف نظر آیا۔ اس سے میں نے ہاتھ منہ دھو لیا۔ رات کھانے میں نے چند نوالے ہی کھائے تھے۔ بھوک بھی لگ رہی تھی لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ ناشتا اور دوپہر کا کھانا اکٹھا ہی کھالوں گا کیونکہ میرا اندازہ تھا کہ مجھے خاصا لمبا سفر درپیش تھا۔ بھٹکنے کی وجہ سے میرا سفر طویل ہو گیا تھا۔ اب سفر کا صحیح سمت میں نئے سرے سے آغاز کرنے کے لیے میں نے اچھی طرح نقشہ دیکھا۔

کچھ مبہم سی نشانیوں سے اندازہ ہوا کہ میں اس وقت کہاں کھڑا تھا اور ڈیرہ حسام جانے کے لیے مجھے کون سی سمت اختیار کرنی چاہیے تھی۔ گھوڑے پر سوار ہو کر میں نے ایڑ لگائی اور وہ رفیق بے زباں ایک بار پھر مجھ گراں بار کو اٹھائے سُبک پنچھی کی طرح ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ چند سیکنڈ میں ہی گھوڑا...... نیم دائرے میں پہاڑی کے گرد گھوم گیا اور سورج میری پشت پر آگیا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے یوں لگا جیسے سورج چھلانگ لگا کر میرے سامنے آگیا تھا۔

میں نے گھوڑے کی لگام اتنے زور سے کھینچی کہ وہ غضبناک انداز میں ہنہنا کر پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا۔ پہاڑی کے گرد گھوم کر میں درحقیقت دو گھڑسواروں کے عین سامنے پہنچ گیا تھا جو نہایت صبر و سکون سے یقیناً میرے ہی انتظار میں کھڑے تھے۔

میں گھوڑے کی تیز رفتاری کے سبب یکدم ہی ان کے اتنا

قریب پہنچ گیا تھا کہ مجھے یہی محسوس ہوا تھا جیسے وہ زمین کا سینہ چیر کر طلسمی سے انداز میں میرے سامنے آن کھڑے ہوئے ہوں۔ حالانکہ وہ یقیناً پہاڑی کے گرد دوسری طرف سے گھوم کر میرے لیے ہی آرہے تھے اور میرے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سن کر گھات لگا کر کھڑے ہو گئے تھے کہ جب شکار خود ہی چلا آرہا تھا تو زحمت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں' جسے اپنی حسیات پر بڑا بھروسا تھا' ذرا سی بھی آواز نہیں سن سکا تھا۔ شاید انہوں نے اپنے گھوڑوں کے سُموں پر کپڑا لپیٹ لیا تھا۔

جس چیز کو دیکھ کر درحقیقت میری آنکھوں کے سامنے جھماکا ہوا وہ پولیس کی وردی تھی۔ میں ان کے اتنا قریب پہنچ گیا تھا کہ انسپکٹر کے چوڑے چکلے سینے پر آویزاں پتلی سی پٹی پر نام بھی صاف پڑھ سکتا تھا۔ ذرا لمبا سا نام تھا۔ رحیم گل خانزادہ۔

یہ یقیناً وہی انسپکٹر تھا جس کا روحیل خان نے ذکر کیا تھا۔ وہ تقریباً میری عمر ہی کا تھا لیکن میری ہی طرح اسے بھی نوجوانوں میں شمار کیا جاسکتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس کی شخصیت میں وہ کھلنڈرا پن نہیں تھا جو عموماً میری شخصیت سے جھلکتا تھا۔ میری شخصیت سے کھلنڈرا پن صرف اسی وقت مفقود ہوتا تھا جب میں واقعی سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کرتا تھا اور ایسا بہت کم ہوتا تھا۔

لیکن انسپکٹر رحیم گل خانزادہ انتہائی بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے دمکتے ہوئے سے سرخ و سپید چہرے پر موٹی موٹی سیاہ مونچھیں اوپر کو اٹھی ہوئی تھیں۔ آنکھوں پر سنہرے فریم کا تاریک چشمہ تھا۔ اس وقت بھی وہ یوں صاف ستھرا نظر آرہا تھا جیسے رات بھر دھول مٹی میں میرا تعاقب کرنے کے بجائے صبح گھر سے تیار ہو کر دفتر آیا ہو۔ معلوم نہیں اس نے کیونکر اپنا حلیہ اس حد تک درست رکھا تھا۔

اس کی شخصیت جتنی خوبصورت تھی' اتنا ہی بدصورت وہ ریوالور تھا جو اس کے ہاتھ میں دبا ہوا تھا اور جس کا رخ میری طرف تھا۔ اس کے ساتھ غالباً ایک ہیڈ کانسٹیبل تھا۔ وہ بھی دونوں ہاتھوں میں تھری ناٹ تھری کی رائفل تھامے' اس کا بٹ کندھے سے لگائے میرا نشانہ لیے ہوئے تھا۔ یہ سب کچھ بس میں نے اتنی ہی دیر میں دیکھا جتنی دیر میں بجلی کا کوندا لپکتا ہے اور معدوم ہو جاتا ہے۔

اسی لمحے میں نے گھوڑے کو گھمانے کے لیے لگام کو جھٹکا دیا۔ رحیم گل دہاڑا۔ "رک جاؤ۔"

میں بھلا کیسے رک سکتا تھا لیکن گھوڑے کے گھومتے گھومتے میں نے دیکھا کہ انسپکٹر کا اشارہ پا کر کانسٹیبل رائفل کا ٹریگر دبانے لگا تھا۔ حالانکہ ریوالور رحیم گل کے ہاتھ میں بھی تھا لیکن اس نے خود گولی چلانے کے بجائے اپنے ماتحت کو اشارہ کیا تھا۔

میں ان کے اتنے قریب تھا کہ نشانہ خطا جانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔ چنانچہ اس لمحے میں نے اپنی زندگی بھر کی مشاقی و مہارت کو کام میں لاتے ہوئے ٹریگر دبنے سے پہلے نہ صرف جیب سے ریوالور نکالا بلکہ گولی چلانے میں بھی پہل کر دی۔ ہیڈ کانسٹیبل کو میں نے اُلٹ کر گھوڑے سے گرتے دیکھا۔ گولی یقیناً اس کے سینے میں لگی تھی۔

رحیم گل فوراً اپنے گھوڑے پر جُھک گیا اور اسی عالم میں اس نے فائر کیا۔ میں اور میرا گھوڑا چونکہ اس وقت بھی متحرک تھے شاید اسی لیے نشانہ خطا گیا۔ گولی میرے کان کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔ یہ سب کچھ صرف اتنی سی دیر میں ہوا جتنی دیر میں گھوڑے نے واپسی کے لیے رخ موڑا۔ ایک ایک پل میں یہ سب کچھ رونما ہو رہا تھا لیکن مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے سلو موشن میں کوئی فلم چل رہی تھی۔

میں نے جواباً رحیم گل پر فائر نہیں کیا اور گھوڑے کو تیز دوڑانے کے لیے اس کی پسلیاں اپنی ٹانگوں سے پوری قوت سے رگڑ ڈالیں۔ گھوڑا کچھ اس انداز سے آگے بڑھا گویا وہ انسپکٹر رحیم گل کے ریوالور سے نکلی ہوئی گولی کو جا لے گا۔

جس حیرت انگیز انداز میں وہ تیز رفتاری سے دوڑتے دوڑتے یک لخت رکا تھا' جس تیزی سے گھوما تھا اور جس انداز میں اس نے دوسری سمت میں ابتدا ہی سے رفتار پکڑی تھی' وہ اسے ایک غیر معمولی گھوڑا ثابت کرنے کے لیے کافی تھی۔ موت کو اس طرح صرف چھو کر پلٹ آنے میں خدا کی مرضی اور میری پُھرتی کے علاوہ اس گھوڑے کے برق صفت ہونے کو بھی بڑا دخل تھا۔

رحیم گل میرے تعاقب میں نہیں آیا۔ شاید وہ ہیڈ کانسٹیبل کو دیکھنے بھالنے میں لگ گیا تھا جسے میرے ریوالور سے گولی لگی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ مر چکا ہو گا۔ اب میں اندھا دُھند گھوڑا دوڑا رہا تھا۔ سمت کا بھی مجھے کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ گھوڑا کچھ اس رفتار سے دوڑ رہا تھا کہ اردگرد کے ٹیلے یا اِکا دُکا درخت اور جھاڑیاں لپکتے جھپکتے سایوں کی طرح قریب سے گزرتے محسوس ہو رہے تھے۔

بہت دور نکل آنے کے بعد میں نے مُڑ کر دیکھا' کوئی میرے تعاقب میں نہیں آرہا تھا۔ تاہم میں نے گھوڑے کو اسی جوش و خروش سے دوڑنے دیا۔ مجھ پر ایک لمحے کے لیے جو ہیجانی سی کیفیت آئی تھی وہ گزر چکی تھی اور اب میں دوبارہ پُرسکون تھا۔ منطقی انداز میں سوچ سکتا تھا۔

چند لمحے پہلے جو کچھ ہوا' بالکل اضطراری اور غیر ارادی سے انداز میں ہوا تھا۔ میں نے اپنی دانست میں اپنے دفاع میں گولی چلائی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ رحیم گل اور ہیڈ کانسٹیبل میری آمد سے باخبر ہونے کے باوجود مجھ جتنی پھرتی نہیں دکھا سکے تھے لیکن یہ پُھرتی مجھے بہت مہنگی پڑی تھی۔

میں تو صرف روحیل خان سے پولیس کی توجہ ہٹانے کے لیے سیاہ پوش بنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں انہیں ڈاج دینے میں کامیاب ہو جاؤں گا' اگر ہمارے درمیان ٹکراؤ ہوا بھی تو دور دور سے ہو گا۔

دیر گولیوں کا تبادلہ ہوگا اور بالآخر میں انہیں چکر دے کر نکل
ں گا لیکن کچھ بھی اس طرح نہیں ہوا تھا جس طرح میں نے
تھا۔

اب ایک پولیس والا میرے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔ انسپکٹر
م گل واضح طور پر' نہایت قریب سے میری شکل دیکھ چکا تھا
نکہ جب میرا اس سے سامنا ہوا اس وقت میرے چہرے پر ڈھاٹا
ں تھا۔ میں تو نہایت مطمئن ہونے کے بعد ڈھاٹا اتار چکا تھا اور
ی تو وہ سیاہ کپڑا بھی بھگدڑ میں کہیں گر چکا تھا جس سے گزشتہ
ب میں ڈھاٹا باندھ کر چلا تھا۔

رحیم گل اور ہیڈ کانسٹیبل نے یقیناً اس وقت مجھے دور سے دیکھ
ہوگا جب میں پہاڑی پر سو رہا تھا اور دھوپ پھیل چکی تھی۔ وہ
کاٹ کر پہاڑی کے عقب سے غالباً کسی ایسی جگہ سے اوپر چڑھنا
ہے تھے کہ میں جاگ بھی جاؤں تو انہیں نہ دیکھ سکوں اور وہ
نک میرے سر پر پہنچ کر مجھے قابو کر لیں لیکن ہوا اس طرح بھی
ں تھا جس طرح انہوں نے سوچا تھا۔

بہر حال یہ اچھا نہیں ہوا تھا کہ رحیم گل سے اتنے قریب سے
را آمنا سامنا ہو گیا تھا۔ اب میں اس کی نظر میں صرف ایک ناکام
تی کے سلسلے کا مفرور مجرم یا ڈاکو نہیں رہا تھا بلکہ ایک پولیس
لے کا قاتل اور مزید نہ جانے کتنی جانیں لینے کا اہل قرار پا چکا
۔

پھر جس انداز میں' میں صرف ایک پل کے لئے اس کے
امنے اس کے ماتحت کو گولی کا نشانہ بنا کر نکل بھاگا تھا' اس سے
ں کی انا بھی مجروح ہوئی ہوگی۔ وہ جس قسم کا پولیس آفیسر معلوم
ورہا تھا' اس قسم کے پولیس والے کی انا مجروح ہونا کچھ اچھی بات
ہیں ہوتی۔ وہ میرے لیے درد سر ثابت ہو سکتا تھا۔

پہلے میں صرف روحیل خان کے لیے بھاگ رہا تھا' اب بھاگنا
یری ذاتی مجبوری ہو گیا تھا۔ اب تو میں گویا سچ مچ روحیل خان ہو چکا
ھا۔ روحیل خان کا کیا دھرا میرے کھاتے میں منتقل ہو چکا تھا۔
ہاں واردات ہوئی تھی وہاں کسی نے روحیل خان کا چہرہ نہیں
دیکھا تھا۔ وہاں دوسرے ڈاکوؤں کے ساتھ اس سیاہ پوش کو دیکھا
گیا تھا جو سیاہ گھوڑے پر سوار تھا اور جس کے چہرے پر بھی سیاہ
ڈھاٹا تھا۔

اب رحیم گل اسی سیاہ پوش کو بغیر ڈھاٹے کے' اپنی آنکھوں
کے سامنے مزید ایکشن میں دیکھ چکا تھا۔ یہ کچھ اچھا نہیں ہوا تھا
لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔
واپس جانا بھی اب میرے لیے ٹھیک نہیں تھا۔

اسی کشمکش میں' میں کئی میل کا فاصلہ طے کر گیا۔ بالآخر ایک
جگہ رک کر میں نے ہواؤں سے سن گن لینے کی کوشش کی لیکن کچھ
معلوم نہیں ہو سکا۔ اگر رحیم گل اب بھی میرے تعاقب میں تھا تو
اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز میری سماعت کے دائرے سے
باہر تھی۔

سونے پر سہاگا یہ ہوا تھا کہ زین سے بندھا ہوا میرا کپڑے کا وہ
دقیانوسی سا تھیلا بھی راستے میں کہیں گر گیا تھا جس میں میرا بچا کھچا
کھانا' کپڑے کا ایک جوڑا اور پانی کی بوتل تھی۔ اب میرے لیے
فوری طور پر اس سیاہ لباس سے چھٹکارا پانا بھی ممکن نہیں تھا جو مجھے
کسی کی بھی نظر میں مشکوک بنا سکتا تھا۔ رحیم گل کی نظر میں تو خیر
اب میرے لباس تبدیل کر لینے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

رات کی تاریکی میں سیاہ لباس بعض مخصوص حالات میں بڑا
بھلا لگتا ہے۔ اندھیرے میں مدغم ہو جانے میں بڑی مدد دیتا ہے لیکن
دن کے اجالے میں جسم پر الزام کی طرح چمکتا ہے۔ مجھے اب اس
لباس سے الجھن محسوس ہو رہی تھی لیکن فی الحال اس سے چھٹکارا
پانے کی کوئی صورت نہیں تھی۔

ایک جگہ جھاڑیوں کے قریب گھوڑا روک کر میں نے ایک بار
پھر جیب سے نقشہ نکالا۔ سورج ابھی سر پر نہیں آیا تھا۔ ابھی اسے
دیکھ کر اندازہ ہو سکتا تھا کہ مشرق کس طرف تھا۔ نقشے میں سمتوں
اور کچھ نشانیوں کی مدد سے مجھے اندازہ ہوا کہ اگر میں مشرق ہی کی
سمت میں سفر کروں تو مجھے ڈیرہ حسام سے حاصل آباد جانے والی اس
چھوٹی سڑک کی طرف جا نکلنا چاہیے جس پر جانو کا اڈا تھا۔ روحیل
نے کہا تھا کہ اگر میں زیادہ ہی خطرے میں گھر جاؤں یا مجھے کسی قسم کی
ضرورت ہو تو میں جانو کے پاس پہنچنے کی کوشش کروں' وہ میری مدد
کرے گا۔ اس سے کوئی بات چھپی ہوئی نہیں تھی۔

میرے خیال میں خطرے کا گدھ میرے سر پر اپنے پر پھیلا چکا
تھا' میرے آس پاس ہی پھڑپھڑا رہا تھا۔ اب میرا کسی ایسے ہی
ٹھکانے کی طرف رخ کرنا بہتر تھا جہاں سے تھوڑی بہت مدد کی امید
رکھی جا سکتی ہو۔ میں نے اپنا رخ صحیح طور پر مشرق کی طرف کر لیا
اور ہانپتے ہوئے گھوڑے کو ایک بار پھر دوڑانے لگا۔

میرا سفر مزید ایک گھنٹے جاری رہا۔ اس دوران ٹیلوں اور
بھر بھری پہاڑیوں کا سلسلہ بالکل ختم ہو گیا۔ اب میں ایک بار پھر
اجاڑ سے میدانی علاقے میں محو سفر تھا۔ یہاں کی زمین سخت اور
ناہموار تھی۔ یہاں صرف کہیں کہیں خاردار جھاڑیاں نظر آ رہی
تھیں جن کے درمیان نیولے دوڑتے پھر رہے تھے۔ ایک جگہ مجھے
دو خار پشت بھی نظر آئے۔

چند میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد چھدرے سے درختوں کا
سلسلہ شروع ہو گیا۔ یہ مختصر سا جنگل تھا۔ اس سے گزر کر مزید دو
ڈھائی میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد بالآخر وہ پگڈنڈی نظر آ ہی گئی
جس کی مجھے تلاش تھی۔ سمتوں کے حساب سے میرا اندازہ درست
ہی رہا تھا حالانکہ اس علاقے کی وسعتوں اور رنگا رنگی کو دیکھتے
ہوئے مجھے اپنے اندازے غلط ثابت ہونے کا خدشہ محسوس
ہو رہا تھا۔ محض سمت کے تعین سے کیا ہوتا ہے۔ ذرا سا ترچھا
ہو جانے سے انسان کہیں کا کہیں نکل سکتا ہے۔ وہ تو غنیمت تھا کہ

نقشہ اس علاقے کی مناسبت سے ہی بڑی محنت اور باریک بنی سے بنایا گیا تھا۔ اس میں بہت سی چیزوں کے لیے جو نشانیاں مقرر کردی گئی تھیں' روحیل سے انہیں سمجھ لینے کے بعد مجھے واقعی اس سے بڑی مدد مل رہی تھی۔

میں نے گھوڑا پگڈنڈی پر ڈال دیا اور اسے محض دُلکی چلنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اس بے چارے کی کچھ زیادہ ہی شامت آئی ہوئی تھی۔ وہ تو محض ایک "ہارس" تھا' اس کی جگہ کئی ہارس پاور کی کوئی مشینی سواری بھی ہوتی تو اب تک اس کا نہ جانے کیا حال ہوتا۔

پگڈنڈی کی حالت بتا رہی تھی کہ اس پر آمدورفت رہتی تھی۔ برسات کے دنوں میں اس پگڈنڈی پر سے گزرنے والے گھوڑوں اور دیگر مویشیوں کے سُموں اور کُھروں کے نشانات اب مٹی سخت ہوجانے کے بعد بدنما داغوں کی طرح چمک رہے تھے۔ پگڈنڈی نہ جانے کہاں سے شروع ہورہی تھی اور کہاں جارہی تھی۔ میں اس کے کسی درمیانی حصے پر پہنچا تھا۔ میں سڑک تلاش کرنے کے بجائے اسی پگڈنڈی پر سفر کرتے ہوئے' عقب سے جانو کے اڈے پر پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ پگڈنڈی شیطان کی آنت ثابت ہوئی۔ اس پر سفر کرتے کرتے دوپہر ڈھلنے لگی۔ دن میں اچھی خاصی گرمی بھی محسوس ہونے لگی تھی۔ اوپر سے مسلسل دھوپ میں سفر جاری تھا۔ بھوک پیاس سے بُرا حال تھا۔ پگڈنڈی کے دونوں طرف جھاڑ جھنکاڑ پھیلا ہوا تھا۔ کئی بار میں نے سوچا کہ اس جھاڑ جھنکاڑ کے قریب جو تھوڑا بہت سایہ میسر ہے' اس میں بیٹھ کر کچھ دیر سستالوں اور گھوڑے کو بھی سستانے کا موقع دوں لیکن نہ جانے کون سا احساس مجھے مسلسل حرکت میں رہنے پر مجبور کررہا تھا۔ کہیں رُکنے کو میرا دل نہیں مان رہا تھا۔

بالآخر وہ پگڈنڈی ختم ہوگئی یا یوں کہیے کہ ایک بہت بڑے میدان میں مدغم ہوگئی۔ اس میدان کے اختتام پر مجھے کچھ نیم پختہ کمرے سے بنے نظر آئے۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ میں جانو کے اڈے کے عقب میں پہنچ چکا تھا۔ یہ کمرے بڑے بڑے پولٹری شیڈز سے مشابہ تھے۔ دیواریں سرخ اینٹوں کی تھیں جن پر سیمنٹ یا پلستر وغیرہ نہیں تھا۔

ان کمروں کے دروازے وغیرہ دوسری طرف تھے جدھر سے چھوٹی سی لنک سڑک گزر رہی تھی۔ تاہم سڑک اور ان کمروں کے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ اڈے کے آس پاس بہت سے گھنے درخت تھے جن کے نیچے کئی ٹرک آڑے ترچھے کھڑے تھے۔ بہت سے درختوں نے کمروں پر بھی سایہ کیا ہوا تھا۔ ویرانوں میں اس قسم کے اڈے ایسے ہی لگتے ہیں جیسے صحرا میں نخلستان۔ ملک بھر میں آوارہ گردی کرنے والوں اور خصوصاً سڑکوں کے راستے سفر کرنے والوں کو ایسے اڈے اکثر نظر آتے ہیں۔

اڈے کے سامنے درختوں کے سائے میں لمبی چوڑی' بھاری بھرکم چارپائیاں پڑی تھیں۔ لکڑی کی چند بے ہنگم میزیں اور کرسیاں بھی موجود تھیں جن پر چند لوگ کھانا کھا رہے تھے یا چائے وغیرہ پی رہے تھے۔ ان کے سامنے کھانے کے برتنوں کے ساتھ جگ کی جگہ چھوٹے چھوٹے مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ اڈا کچھ کچھ دیہی کے چھپر ریستوران سے بھی مشابہ تھا لیکن اس کے مقابلے میں زیادہ لمبا چوڑا تھا۔ ویسے اس قسم کے سبھی اڈے ایک دوسرے سے مشابہ نظر آتے ہیں۔

اڈے کے سامنے پہنچ کر میں نے بھی گھوڑا ایک درخت کی شاخ سے باندھا اور ایک چارپائی پر جا بیٹھا۔ ایک جھونپڑا نما کمرے پر کسی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کا ٹوٹا پھوٹا اور دھندلا سا بورڈ بھی لٹکا ہوا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے یہ جگہ میری کئی بار کی دیکھی بھالی تھی لیکن مجھے معلوم تھا' یہ محض میرا فریبِ نظر تھا۔ بات بس وہی تھی کہ میں اپنی زندگی کی آوارہ گردیوں کے دوران ایسے بہت سے اڈے دیکھ چکا تھا۔

وہاں موجود تقریباً سبھی لوگوں نے کن انکھیوں سے' شک زدہ سے انداز میں میری طرف دیکھا۔ شاید اس کی وجہ میرا لباس تھا۔ حتیٰ کہ جو بیرا مجھ سے آرڈر لینے آیا' وہ بھی پہلے دور کھڑا چند لمحے میرا جائزہ لیتا رہا تھا۔ میں نے اسے کھانے کا آرڈر دیا۔ اس نے آرڈر تو لے لیا لیکن کچھ اس انداز میں واپس چلا گیا جیسے مجھ سے کوئی پرانی خفگی چلی آرہی تھی۔

کاؤنٹر پر واپس جاکر اس نے بہ آوازِ بلند باورچی کو میرے آرڈر سے مطلع کیا اور خود نیچی آواز میں کاؤنٹر والے سے کوئی بات کرنے لگا۔ کاؤنٹر والے نے بھی دور سے ہی دو تین مرتبہ سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا۔ حُلیہ تو میرا ڈاکوؤں والا تھا لیکن شخصیت کے اعتبار سے وہ شخص صحیح معنوں میں بھرپور قسم کا ڈاکو لگ رہا تھا۔

اس کا قد درمیانہ لیکن جسم گٹھا ہوا تھا۔ سیاہ گھنی داڑھی مونچھیں اور سر کے لمبے لمبے بال تیل سے چپڑے ہوئے تھے اور خوب چمک رہے تھے۔ انہیں بہت محنت سے کنگھی کیا گیا تھا۔ سرخ سرخ آنکھوں میں کچھ خونخواری سی تھی لیکن اس وقت کاروبار کے اڈے پر وہ گویا اس خونخواری کو دبائے بیٹھا تھا۔ اس کے کندھوں پر اجرک پڑی تھی اور مضبوط نظر آنے والے ہاتھ کی دو تین انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ مجھے شبہ گزرا کہ شاید وہی اس اڈے کا مالک جانو تھا تاہم مجھے اس کے بارے میں جاننے کی کوئی جلدی نہیں تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اطمینان سے کھانا کھالینا چاہیے پھر چائے پی کر تھکن اور درماندگی دور کرنے کے لیے کچھ دیر لیٹنا چاہیے۔ جب چارپائیاں میسر تھیں تو ان سے کچھ استفادہ کرہی لینا چاہیے تھا۔ اس کے بعد کچھ اور سوچنا چاہیے تھا۔

کھانے کے انتظار میں' میں نے اڈے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے آج تک اس طرح کے جتنے بھی اڈے دیکھے تھے وہ ان سب میں بڑا اور کافی "ترقی یافتہ" تھا۔ یہاں کافی رونق تھی۔ میں نے عقب سے اسے دیکھا تھا تو اس کی وسعت اور رونق کا اندازہ نہیں ہوا تھا۔

اڈے کے سامنے کافی بڑے رقبے کو ہموار کرکے اس پر چھڑکاؤ کیا گیا تھا۔ غالباً روزانہ کے چھڑکاؤ کی وجہ سے وہ زمین کافی پختہ ہوچکی تھی۔ ٹرکوں وغیرہ کی آمد و رفت سے دھول نہیں اُڑتی تھی۔ اردگرد لکڑی کی بلیوں اور خاردار تاروں سے باڑھ بھی بنائی گئی تھی اور اس میں اتنا بڑا دروازہ چھوڑا گیا تھا کہ ٹرک گزر سکیں۔ باڑھ کے ساتھ ساتھ پھولدار پودے تک موجود تھے۔ ٹرک وہاں کھڑے بھی تھے اور آمدورفت بھی جاری تھی مگر موبل آئل اور گریس کی سیاہی یا اس طرح کی کوئی اور گندگی پھیلی نظر نہیں آرہی تھی۔ مجموعی طور پر وہ بڑی ستھری اور کچھ "سُدھری سُدھری" سی جگہ دکھائی دے رہی تھی۔

"معیار" بھی یقیناً اس قسم کے اڈوں سے کافی اونچا تھا۔ لکڑی کی بے ہنگم میز کرسیاں تو کم ہی تھیں' زیادہ تر لوہے کی صاف ستھری کرسیاں اور ماربل کے ٹاپ والی میزیں تھیں۔ میدان میں دو ہینڈ پمپ لگے ہوئے تھے۔ باڑھ کے ساتھ گھڑونچی پر بہت سے گھڑوں کی قطار تھی۔ چارپائیوں پر لوگوں کی ٹولیاں کھانے پینے کے ساتھ ساتھ نہ صرف گپ شپ میں مشغول تھیں بلکہ ایک چارپائی پر تاش کی بازی بھی چل رہی تھی۔

بڑا سا جو شیڈ ایک طرح سے اصل ریستوران تھا' خوب طویل و عریض تھا۔ اس میں بھی کرسیاں میزیں لگی ہوئی تھیں۔ لطف کی بات یہ تھی کہ ایک طرف رنگین ٹی وی بھی لگا ہوا تھا جس پر وی سی آر کے ذریعے فلم چل رہی تھی۔ پاس ہی جنریٹر بھی رکھا نظر آرہا تھا جس سے یہ چیزیں چل رہی تھیں۔ کچھ لوگ دلچسپی سے فلم دیکھ رہے تھے۔ گویا جنگل میں منگل کا سماں تھا۔

جس شیڈ سے کچن کا کام لیا جارہا تھا اس کا بھی بیشتر حصہ باہر سے دکھائی دے رہا تھا۔ چولہوں پر دیگچے چڑھے ہوئے تھے۔ تین چار افراد وہاں مصروف تھے۔ دیگچوں سے چمچوں کے ٹکرانے کی ٹن ٹن کے ساتھ ان لوگوں اور بیروں وغیرہ کی بھانت بھانت کی آوازیں گونج رہی تھیں۔

وہ شیڈ جو ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر کا کام دیتا تھا' اس کی حالت بھی کافی بہتر نظر آرہی تھی۔ اندر ایک میز کرسی اور لوہے کی بڑی سی الماری نظر آرہی تھی۔ میز پر ایک شخص رجسٹروں پر جُھکا کام میں بھی مصروف دکھائی دے رہا تھا۔

یہاں مجموعی طور پر جتنے لوگ بھی موجود تھے وہ سب کے سب ٹرک ڈرائیور یا کلینز تو نہیں ہوسکتے تھے۔ بیشتر ڈرائیور اور کلینز تو اپنے حُلیے وغیرہ سے ہی پہچانے جارہے تھے۔ باقی لوگ نہ جانے کون تھے' کہاں سے آئے تھے کیونکہ روحیل خان سے مجھے جو معلومات حاصل ہوئی تھیں ان کے مطابق تو یہاں آس پاس کوئی بستی نہیں تھی اور بسیں یہاں رُکتی نہیں تھیں۔

حالانکہ اس قسم کے اڈوں پر بسیں رُکوانے کے لیے بڑی کوششیں' بڑے جتن ہوتے ہیں۔ اڈوں کے مالکان' بس ڈرائیوروں کو نذرانے پیش کرتے ہیں' مُفت ان کی خاطر تواضع کرتے ہیں تاکہ وہ وہاں بس روکنے کو اپنا معمول بنالیں لیکن روحیل خان نے مجھے بتایا تھا کہ جانو کے اڈے کا معاملہ اُلٹ ہی تھا۔ یہاں بسوں کو رُکنے سے منع کیا جاتا تھا۔ اگر کسی مجبوری کی وجہ سے کوئی قسمت کی ماری بس رک بھی جاتی تھی تو بادل نخواستہ اس کے مسافروں وغیرہ کی فرمائشیں پوری کی جاتی تھیں۔ یہ گویا ایک الگ ہی چھوٹی سی دنیا تھی جس کا نظام جانو اپنی مرضی سے چلاتا تھا۔

سوالات یا شاید واہمے اپنی جگہ تھے لیکن جانو کا اڈا بہرحال اس وقت میری منزل تھا۔ یہاں پہنچ کر مجھے کچھ نہ کچھ طمانیت کا احساس ضرور ہوا تھا۔ ویرانے میں زندگی کی علامتیں نظر آئی تھیں۔ فضا میں اشتہا انگیز خوشبوئیں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس وقت میرے لیے یہ جگہ ایک چھوٹی سی جنت سے کم نہیں تھی لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری آمد کے ساتھ ہی وہاں کی ہنگامہ خیزی کچھ کم ہوگئی تھی۔ آوازیں گویا کچھ مدھم پڑگئی تھیں لیکن میں نے اسے کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔ کسی دور افتادہ علاقے میں بہت ہی اجنبی سی کوئی شکل نظر آئے تو عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔

میں میز پر رکھے ہوئے چھوٹے سے گھڑے سے شیشے کے بڑے سے گلاس میں پانی انڈیل کر پینے لگا۔ کورے گھڑے کا معمولی ٹھنڈا پانی بھی اس وقت خوب ٹھنڈا لگا۔ دو تین گلاس حلق سے اُترے تو گویا آنکھوں کی دُھندلاہٹ دور ہوگئی اور زندگی ایک بار پھر کچھ خوبصورت نظر آنے لگی۔

چند لمحے بعد کھانا میرے سامنے آگیا۔ آرڈر لے جانے والا بیرا نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ کھانا لانے والا بیرا دوسرا تھا۔ میں ندیدوں کی طرح بُھنے ہوئے گوشت اور تندور سے نکلی ہوئی گرم گرم روٹی پر پل پڑا۔

گرم گرم روٹیاں آتی گئیں اور میں ان پر ہاتھ صاف کرتا گیا۔ خاصی دیر کے بعد میں نے ہاتھ روکا اور خود کو سمجھایا کہ اب ایسا بھی کیا ندیدہ پن۔ زندگی رہی تو آئندہ بھی کھانے کو ملے گا۔ کھانے کے بعد میں نے چائے کی چینک کا آرڈر دیا۔

الیمیوں والی اس گاڑھی گاڑھی چائے کی دوسری پیالی سے چسکیاں لیتے وقت میں بڑے سرور اور بڑی ترنگ میں تھا جب مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا لیکن یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہاں لوگوں کی آمدورفت جاری تھی مگر دوسرے ہی لمحے میری چارپائی کو خفیف سا جھٹکا لگا جیسے کوئی اس پر آن بیٹھا ہو۔

میں مُڑ کر دیکھنے میں خاطر خواہ پُھرتی کا مظاہرہ نہیں کرسکا اور اسی لمحے ایک ٹھوس سی چیز میری پسلیوں سے آلگی۔ مجھے کسی سے

پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کیا چیز تھی۔ وہ بلا شبہ گن کی نال تھی۔ میرے ہاتھ میں چائے کی پیالی تھی۔ میرا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک گیا۔ میں نے اسے ہونٹوں تک لانے کی کوشش نہیں کی۔

البتہ ایک لمحے کے لیے میں نے یہ ضرور سوچا کہ میرے پیچھے جو کوئی بھی تھا' گرم گرم چائے کی پیالی اس پر کھینچ ماروں۔ ایسے موقعوں پر بلا سوچے سمجھے' فوری طور پر کچھ کر گزرنا فائدہ مند بھی ثابت ہو سکتا ہے اور نقصان دہ بھی۔ اگر میرے پیچھے صرف ایک ہی شخص تھا تب بھی گرم گرم چائے منہ پر پڑتے ہی اس سے اضطراری طور پر ٹریگر دب سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اکیلا نہ ہو۔ اس صورت میں اس سے ٹریگر نہ بھی دبتا تو اس کا ساتھی گولی چلا سکتا تھا۔ انسان تذبذب میں رہے تو فیصلے کی گھڑی گزر جاتی ہے' ... میرے لیے بھی فیصلے کی گھڑی گزر گئی لیکن میں زیادہ پریشانی یا پچھتاوے کا شکار نہیں تھا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ میرے عقب میں کون تھا اور وہ کیا چاہتا تھا۔

"پی لو... پی لو... چائے تو پی لو۔" میرے عقب سے کھُردرے اور استہزائیہ لہجے میں کہا گیا۔ "ہو سکتا ہے یہ تمہاری زندگی کی آخری چائے ہو۔"

میں نے گویا اس نادیدہ دوست کے مشورے کو قابلِ قدر جانتے ہوئے پیالی ایک بار پھر منہ سے لگالی اور نہایت ہی آہستگی سے چسکیاں لینے لگا لیکن میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے پیچھے دیکھنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ وہ انسپکٹر رحیم گل خانزادہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بہرحال وہ جو کوئی بھی تھا' میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ اسے مجھ کو یکدم گن کی زد پر لینے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ البتہ انسپکٹر رحیم گل ایسا کرتا تو قابلِ فہم بات تھی۔

اسی دوران ایک شخص میرے عقب سے گھوم کر سامنے آیا لیکن اس دوران گن کی نال بدستور میری پسلیوں سے لگی رہی۔ میرے دونوں ہی اندازے درست نکلے تھے۔ میری پسلیوں پر گن رکھنے والا تنہا نہیں تھا اور وہ انسپکٹر رحیم گل نہیں تھا کیونکہ دوسرا شخص جو میرے سامنے آیا تھا وہ انسپکٹر رحیم گل کا ساتھی نہیں ہو سکتا تھا۔

پیچھے والے کو تو میں نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن سامنے آنے والے کو بھی نہ ہی دیکھتا تو اچھا ہوتا۔ وہ ڈھیلی ڈھالی نسواری قمیص شلوار میں تھا اور ایک قد آور شخص تھا۔ سر پر ذرا میلی سی پگڑی کس کر بندھی ہوئی تھی لیکن اس کے بال یقیناً بہت لمبے تھے اور ان کی لٹیں پگڑی کے 'دائرۂ اختیار' سے باہر جا رہی تھیں۔

داڑھی مونچھیں جھاڑ جھنکاڑ کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور پتا ہی نہیں چلتا تھا کہ داڑھی مونچھیں شروع کہاں سے ہو رہی تھیں اور ختم کہاں ہو رہی تھیں کیونکہ باقی چہرے کی رنگت بھی بالوں ہی کی طرح سیاہ تھی اور رہی سہی کسر چیچک کے سیاہ داغوں نے پوری کر دی تھی۔ اس چیچک زدہ' سیاہ چہرے پر اس کی سرخ آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

ہتھیاروں کا میری زندگی میں بھی کافی عمل دخل چلا آ رہا تھا لیکن اس شخص کے ہاتھ میں جدید ترین ساخت کا جو جرمن لیوگر مشین پسٹل نظر آ رہا تھا' اسے دیکھ کر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا۔ یہ گن میں نے بھی صرف دیکھی ہی تھی' کبھی استعمال نہیں کی تھی اور میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس جنگل بیابان میں مجھے ایک گنوار سے شخص کے ہاتھ میں وہ جدید اور مہنگی گن نظر آئے گی۔

اس نے مشین پسٹل کی نال میری پیشانی پر رکھ دی۔ اب ایک نہیں' دو گنیں میرے جسم سے چپکی ہوئی تھیں۔ اس کا دوسرا ہاتھ سیدھا اس جیب کی طرف بڑھا جس میں میرا ریوالور موجود تھا۔ اس کی مہارت قابلِ داد تھی۔ اس کی نظریں گویا ایکسرے تھیں۔ اسے یقینی طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ ہتھیار کس جیب میں تھا۔ دوسرے ہی لمحے ریوالور اس کے ہاتھ میں تھا۔ کسی اور جیب میں ہاتھ مارنے کی اس نے زحمت ہی نہیں کی۔

میری جیب سے جو ریوالور برآمد ہوا تھا وہ میں جبرال کے تھانے سے لے کر بھاگا تھا۔ وہ اعشاریہ چار پانچ کا ایک پرانا... بلکہ شاید انگریزوں کے زمانے کا کولٹ تھا۔ اس سیاہ رو شخص نے حقارت سے محض ایک ہی نظر اس کی طرف دیکھا اور مجھے شبہ ہوا کہ شاید وہ اسے کہیں دور پھینک دے گا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کسی معزز' آسودہ حال اور ناک چڑھے سے شخص نے غلطی سے کباڑی کے ٹھیلے سے کوئی بیکار سی چیز اٹھا لی ہو۔

تاہم اس نے ریوالور کو پھینکا نہیں۔ گویا ازراہِ کرم اسے اپنی ڈھیلی ڈھالی واسکٹ کی جیب میں رکھ لیا اور یوں اس کی عزت بڑھادی لیکن اس شخص کی مونچھوں میں خفیف سی حرکت ہوئی تھی جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ طنزیہ سے انداز میں مسکرایا تھا۔ ہونٹ تو اس کے نظر ہی نہیں آ رہے تھے۔

ان کے اس طرح آکر آسانی سے مجھے دبوچ لینے میں ایک تو میری سُستی کو دخل تھا' دوسرے وہ اس قسم کی کارروائیوں میں غیر معمولی طور پر ماہر بھی معلو ہوتے تھے۔ حالانکہ جو شخص میرے سامنے کھڑا تھا' ظاہری طور پر تو اس کو دیکھ کر یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی زندگی جنگلوں' پہاڑوں' بیابانوں میں گزری تھی اور وہ درندوں کی بیشتر خصوصیات اپنا چکا تھا لیکن عملی طور پر اس نے درندوں کی طرح اپنی جسمانی طاقت پر بھروسا نہیں کیا تھا۔ محسوس یہی ہوتا تھا کہ بیشتر شہری درندوں کی طرح اس کا انحصار بھی ہتھیار پر ہی زیادہ تھا۔

"کھڑے ہو جاؤ۔" عقب سے کھُردری آواز آئی اور گن کی نال میری پسلیوں میں زیادہ زور سے چبھوئی گئی۔

میں نے کافی سعادت مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی اس ہدایت پر بھی عمل کر ڈالا اور اٹھ کھڑا ہوا لیکن اس حکم کی تعمیل مجھے مہنگی پڑی۔ گن کی نال صرف ایک لمحے کے لیے میری پسلیوں سے ہٹی اور اسی ایک لمحے میں کسی نے عقب سے میرے بازو آہنی گرفت میں لیتے ہوئے میرے ہاتھوں میں کوئی پھندا سا ڈال دیا۔ میرے ہاتھ گویا پلک جھپکتے میں میری پشت پر باندھے جا چکے تھے۔

ایک لمحے کے لیے میرا دل ڈوب سا گیا۔ یہ کچھ اچھا نہیں ہوا تھا لیکن پھر میں نے دل ہی دل میں خود ہی اپنی ڈھارس بندھائی۔ گن فوراً ہی دوبارہ میری پسلیوں پر آ ٹکی تھی لیکن میرے سامنے کھڑے ہوئے سیاہ رو نے اپنے ساتھیوں کو مقامی زبان میں ہدایت کی کہ اب پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی' اب انہیں سامنے آجانا چاہیے تھا۔

میری پسلیوں سے گن کی نال ہٹ گئی اور میرے عقب سے دو افراد سامنے آگئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی۔ اسی گن کی نال اب تک میری پسلیوں پر ٹکی ہوئی تھی۔ جس شخص کے ہاتھ میں وہ گن تھی' وہ پستہ قد تھا اور اس کی جسامت بھی کوئی خاص نہیں تھی لیکن سفاکی میں وہ بھی اپنے شبِ دیجور قسم کے ساتھی سے کم معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے چہرے سے ایک عجیب قسم کی خونخواری ٹپک رہی تھی' جیسے وہ دنیا کی ہر مخلوق سے سخت ناراض ہو اور راہ میں آنے والی ہر چیز کے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہو۔ مختصر الوجود ہونے کے باوجود وہ ایک خطرناک شخص معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی تمام تر خطرناکی غالباً اسلحے کی مرہونِ منت تھی۔ اس کی رنگت گو کہ گندمی ہی تھی لیکن اپنے سیاہ رو ساتھی کے مقابلے میں تو اسے گورا ہی کہا جا سکتا تھا۔ اس کی صرف مونچھیں تھیں' داڑھی صاف تھی۔

تیسرا ساتھی مٹیالے سے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ وہ بھی میانہ قامت تھا لیکن گٹھے ہوئے جسم کا تھا۔ خصوصاً اس کے کندھے اس کی جسامت کے مقابلے میں بہت چوڑے تھے۔ اس کے کندھے پر کلاشنکوف تھی۔ میرے ہاتھوں میں پھُرتی سے پھندا ڈالنے کا کام غالباً اسی نے انجام دیا تھا۔ وہ گورا چٹا تھا لیکن شاید دھوپ میں زیادہ وقت گزرنے کی وجہ سے اس کی رنگت تانبے جیسی ہو گئی تھی۔ بال بھورے بھورے سے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی مختصری داڑھی مونچھ تھی۔

"کون ہو تم؟" شبِ دیجور نے گویا تفتیش کا آغاز کیا۔ عجیب کھڑکھڑاتی ہوئی سی آواز تھی اس کی... گویا کسی بدروح کے حلق سے برآمد ہو رہی ہو۔

"ایک مصیبت کا مارا..." میں نے جواب دیا۔

"مجھے تو تم خود مصیبت لگتے ہو۔ شاید ہمارے لیے مصیبت بن کر آئے ہو۔" وہ علاقائی زبان ہی بول رہا تھا لیکن لہجہ نہایت کھُردرا اور اکھڑا اکھڑا تھا۔ میں بھی اسی زبان میں جواب دینے کی کوشش کر رہا تھا۔

"میں تمہیں جانتا ہی نہیں' میں تمہارے لیے مصیبت کیوں بنوں گا؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"مصیبت بننے کے لیے جاننے والا ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ یہ تو ہم نے بھی دیکھ لیا ہے کہ تمہاری شکل اس علاقے میں نئی ہے' اسی لیے تو ہم ذرا تمہاری اصلیت معلوم کرنے آئے ہیں۔ تم یقیناً کسی خاص مقصد سے اِدھر گھوم رہے ہو۔" سیاہ رو بولا۔

"یقیناً میں اس علاقے میں نیا ہوں۔" میں نے تسلیم کیا۔ "اور میرا مقصد بھی خاص ہے... اور وہ یہ کہ میں کچھ دشمنوں سے جان بچانا چاہتا ہوں۔ اس لیے بھاگا پھر رہا ہوں۔"

"پرانی کہانی ہے۔" پستہ قد لیکن خونخوار سی صورت والے نے کہا۔

"جھوٹی' نئی کہانی سے بہرحال پرانی' سچی کہانی بہتر ہوتی ہے۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

سیاہ رو کو گویا میری یہ جرأت پسند نہیں آئی کہ میں ان لوگوں کے سامنے مسکرانے کی کوشش کروں۔ وہ بے تابی سے مشین پسٹل کو حرکت دیتے ہوئے اپنے ساتھی سے مخاطب ہوا۔ "میرا خیال ہے' یہ خفیہ پولیس کا ہی آدمی ہے۔ میں اس کو ٹھنڈا کر دیتا ہوں۔ تم دونوں لاش ادھر جنگل میں پھینک آنا۔ کچھ گیدڑوں کا دانا پانی چل جائے گا۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

"خیال تو میرا بھی یہی ہے۔" تانبے کی سی رنگت والا سرہلاتے ہوئے بولا۔

"بس تو پھر میں اس کو ٹھاہ کرتا ہوں۔" سیاہ رو نے کہا اور مشین پسٹل سے میرے دل کا نشانہ لیا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا۔ وہ مجھے ٹھکانے لگانے کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی بے تاب معلوم ہوتا تھا۔ میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ اگر میرا تعلق خفیہ پولیس سے تھا تب بھی انہیں مجھ پر اتنا برہم ہونے کی کیا ضرورت تھی کہ فوراً ہی ٹھکانے لگانے پر تل گئے تھے؟

تانبے جیسی رنگت والا ان میں زیادہ اہم آدمی معلوم ہوتا تھا۔ وہ نہایت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ اس میں خونخواری بھی کم تھی۔ وہ کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے تھوڑا بہت غور کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے پہلے تو سیاہ رو کی ہاں میں ہاں ملا دی تھی لیکن جب سیاہ رو نے گن سیدھی کرلی تو وہ گویا سوچ میں پڑ گیا۔

"ٹھہرو" اس نے سیاہ رو کی گن پر ہاتھ رکھ کر اس کا رخ نیچے کی طرف کر دیا۔ تاہم خونخوار شکل والا بدستور اسٹین گن مجھ پر تانے کھڑا تھا۔

تانبے جیسی رنگت والا میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گویا میرے خیالات پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔ "خفیہ پولیس والے اتنا بہروپ بدلنے اور یہاں تک آنے کی زحمت کہاں کرتے ہیں؟ اور اگر کریں بھی تو اکیلے دُکیلے نہیں پھرتے۔ اس کے علاوہ خفیہ پولیس والے اتنے خفیہ بھی نہیں ہوتے۔ وہ اگر کسی مہم پر نکلتے ہیں تو ہفتہ پہلے ہمیں خبر مل جاتی

ہے۔ اس کے علاوہ خفیہ پولیس کے آدمی کو تو ایسے حلیے میں ہونا چاہیے تھا کہ کسی کی نظر اس کی طرف نہ اٹھتی لیکن یہ تو دس میل دور سے نظر آنے والے حلیے میں آیا ہے۔"

وہ کافی حد تک دلیل پسند آدمی معلوم ہوتا تھا۔ دلیل دے بھی سکتا تھا، دلیل سُن بھی سکتا تھا اور یہ بات میرے لیے حیرت کا باعث تھی کیونکہ اب مجھے کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا تھا کہ وہ لوگ کون ہو سکتے تھے اور اس طبقے میں دلیل کا گزر ذرا کم ہی ہوتا ہے۔ حیرت کی بات تھی کہ میرے حلیے کی وجہ سے انہوں نے مجھے اپنے طبقے کا آدمی نہیں سمجھا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرا حلیہ مشرقی نہیں بلکہ کافی حد تک مغربی ڈاکو دس والا تھا۔

سیاہ رو بولا۔ "ہو سکتا ہے اسے ہیرو بننے کا شوق ہو اس لیے دماغ میں کوئی اسکیم لے کر پیدل چلا آیا ہو۔" اس نے ایک بار پھر مشین پسٹل سیدھا کیا۔ "بات کچھ بھی ہو، ہمیں بحث کی کیا ضرورت ہے۔ آدمی ہے تو مشکوک نا، بس اتنا ہی کافی ہے۔ اس کو ٹھنڈا کرو اور ٹھکانے لگاؤ۔"

وہ مجھے دھمکانے کے لیے ایکٹنگ نہیں کر رہا تھا۔ وہ حقیقتاً بندوق سے انسان کو ٹھنڈا کرنے کا بہت شوقین معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نہ جانے کتنے بے گناہوں کے خون سے لکھی ہوئی کہانیاں پڑھی جا سکتی تھیں۔

تانبے کی رنگت والے نے ایک بار پھر اس کے بے تاب ارادوں پر بند باندھ دیا۔ "ہمیں اتنی جلدی فیصلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ایک بار پھر اس سے پوچھ لیتے ہیں۔"

وہ دوبارہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ "کیوں جوان! سچ بولنے کا ارادہ ہے یا نہیں؟"

"مسئلہ سچ بولنے کا نہیں، مسئلہ تم دونوں کو یقین دلانے کا ہے۔" میں نے اپنی متانت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

میں سوچ رہا تھا، انہیں بتا دوں کہ میں جانو سے ملنے آیا ہوں لیکن اندیشہ یہ بھی تھا کہ کہیں وہ جانو کے دشمن یا مخالفین وغیرہ نہ ہوں اور مجھے اس کا ہمدرد یا ساتھی سمجھ کر ٹھنڈا نہ کر دیں۔ اس قسم کے لوگوں کا..... اور خود جانو جیسے انسانوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ میں کسی سے بھی ملا نہیں تھا، کسی کو جانتا نہیں تھا۔ میں یہاں کے معاملات کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتا تھا۔

تانبے کی سی رنگت والا محتاط لہجے میں بولا۔ "اچھا..... چلو یہ بتا دو کہ یہ لباس اور گھوڑا تمہارا اپنا ہی ہے یا کسی کو ٹھکانے لگا کر حاصل کیا ہے؟"

اس سوال پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کا مطلب تھا، وہ روحیل خان کو جانتے تھے اور اس حوالے سے بھی انہیں مجھ پر شک ہو رہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب تھوڑا بہت کُھل ہی جانا چاہیے تھا اور اس کے بعد ان کا ردِعمل دیکھنا چاہیے تھا۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہ لباس اور گھوڑا میں نے کسی کو ہلاک کر کے نہیں، اسے زندہ رکھنے کے لیے حاصل کیا ہے۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو اس وقت تک وہ موت کے راستے پر روانہ ہو چکا ہوتا۔ اسی نے مجھے تاکید کی تھی کہ اگر ضرورت پڑے تو میں جانو سے مل لوں۔ اسی لیے میں اس طرف آیا ہوں۔ یہ جانو ہی کا اڈا ہے نا؟"

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ "کس نے تاکید کی تھی؟ نام کیا تھا اس کا؟"

"یہ میں صرف جانو کو ہی بتا سکتا ہوں۔" میں نے انتہائی نرمی سے کہا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ میری بے خوفی بھی ان کی وحشی انا پر خراشیں ڈال رہی تھی۔ جن کی فطرت میں کرختگی اور سفاکی ہوتی ہے اور جو ہتھیاروں کے زور پر خود کو علاقے کا بادشاہ سمجھتے پھرتے ہیں، ان کے سامنے اگر بے خوفی سے بات کی جائے تو اس سے بھی ان کی بگڑی ہوئی انا مجروح ہوتی ہے۔ اسی لیے میں اپنے لہجے میں حتی الامکان نرمی..... بلکہ کسی حد تک عاجزی برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میرا جواب سُن کر ان کے چہروں کی کرختگی اور خونخواری میں اضافہ نہیں ہوا۔ اس سے مجھے کم از کم یہ اندازہ تو ہو گیا کہ وہ جانو کے مخالفین میں سے نہیں تھے۔ ایک لمحے کے سکوت کے بعد سیاہ رو کا مشین پسٹل میری پیشانی سے اور پستہ قد کی اسٹین گن میری پسلیوں سے ہٹ گئی۔

انہوں نے صرف ایک لمحے کے لیے آنکھوں ہی آنکھوں میں مشورہ کیا پھر تانبے کی سی رنگت والا بولا۔ "ٹھیک ہے، ہم تمہیں جانو کے پاس لے چلتے ہیں۔ تمہارے بارے میں فیصلہ وہی کرے گا۔"

اس کے لہجے سے تصدیق ہو رہی تھی کہ ان تینوں میں زیادہ بااختیار وہی تھا۔ سیاہ رو غالباً اشارہ پا کر صرف مار دھاڑ کرنے والا آدمی تھا۔ اس کی بالائی منزل تقریباً خالی ہی معلوم ہوتی تھی۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس ساری کارروائی کے دوران کسی نے ہماری طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔ اگر کسی نے دیکھا بھی تھا تو اس طرح لاتعلقی سے دیکھا تھا جیسے اس کے لیے ان باتوں کی کوئی اہمیت نہیں تھی یا پھر گویا اس کے سامنے کچھ ہو ہی نہیں رہا تھا۔ کوئی ذرا بھی چونکا نہیں تھا۔ اگر کوئی تاش کھیل رہا تھا تو ایک نظر مجھ پر ڈال کر دوبارہ پتوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اگر کوئی ٹیبل والا چائے کھانا لانے لے جانے میں مصروف تھا تو یہ سب کچھ دیکھ کر یوں اپنے کام میں مصروف رہا تھا جیسے یہ روز نظر آنے والا کوئی منظر تھا۔

میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا "میں کوئی سوال کرنے کی پوزیشن میں تو نہیں ہوں لیکن اگر بُرا محسوس نہ کرو تو بتا دو کہ تم لوگ کون ہو؟"

"ہم جانو ہی کے آدمی ہیں۔" تانبے کی سی رنگت والے کے لہجے میں اب نرمی آ گئی تھی لیکن سیاہ رو ابھی تک کسی ناراض بن مانس کی طرح میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے اپنے دل پسند کام سے باز رہنے کا افسوس تھا۔

"تو پھر مجھے اس طرح رسی سے جانوروں کی طرح باندھ کر لے جانا تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ کیا جانو کے آدمی ہمیشہ جانو کے مہمانوں کو اسی طرح اس کے سامنے لے جاتے ہیں؟" میں نے موقع ذرا مناسب پاتے ہی دوستانہ لہجہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔

"زیادہ خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" زیادہ خونخوار سا پستہ قد بول اٹھا۔ "یہ فیصلہ جانو خود کرتا ہے کہ کون اس کا مہمان ہے اور کون نہیں۔ بعض لوگ یہی سمجھ کر منہ اٹھا کر آ جاتے ہیں کہ وہ جانو کے مہمان ہیں لیکن انہیں بھی واپس جانا نصیب نہیں ہوتا۔"

"مہمان تو وہ بھی ہوئے نا.... ہمیشہ کے مہمان۔" میں نے بے خوفی کے اظہار کے لیے مسکراتے ہوئے کہا۔

ان میں سے کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سیاہ رو نے اپنا مشین پسٹل نیفے میں اُڑس لیا۔ خونخوار پستہ قد نے اپنی اسٹین گن کندھے پر لٹکالی۔ اب وہ میری طرف سے قدرے مطمئن ہو چکے تھے۔ تانبے کی سی رنگت والے نے بہ آواز بلند کاؤنٹر پر کھڑے شخص سے پوچھا۔ "کھوسہ! جانو کہاں ہے؟"

"ڈیرے پر۔" کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور ایک بیرے سے پیسے گننے لگا۔

ان تینوں نے ایک بار پھر مشورہ طلب سی نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد تانبے کی رنگت والا بولا۔ "چلو اسے ڈیرے پر ہی لے چلتے ہیں۔"

جہاں ہم کھڑے تھے وہ جانو کا اڈا تھا۔ جانو کا ڈیرا کہیں اور تھا۔ اڈے اور ڈیرے میں کیا فرق تھا، فی الحال میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

سیاہ رو نے نیم دلی سے سر ہلا کر آمادگی ظاہر کی۔ وہ اس قسم کی زحمت اٹھانے کے تصور سے خوش نظر نہیں آ رہا تھا۔ میرا گھوڑا کچھ دور ایک نیچے سے درخت کی شاخ سے بندھا پُرتشویش نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ سیاہ رو کو گویا یقینی طور پر یہ بھی معلوم تھا کہ وہ میرا ہی گھوڑا تھا۔ اس نے سیدھا اس کے قریب جا کر اس کی باگیں درخت کی شاخ سے کھول لیں اور اسے قریب لے آیا۔ گھوڑا بڑی سعادت مندی سے آ گیا۔ مجھے ان بدبختوں کے سامنے اس کی یہ سعادت مندی اچھی نہیں لگی۔

وہ تینوں مجھے اور میرے گھوڑے کو نرغے میں لیے اسی طرف چل دیے جدھر سے میں آیا تھا۔ اڈے پر بیٹھے ہوئے کسی بھی شخص کے چہرے پر اب بھی تشویش یا الجھن کی کوئی نشانی نظر نہیں آ رہی تھی۔ تیز، کرخت صورت اور خطرناک نظر آنے والے افراد بڑے اطمینان سے ایک شخص کے ہاتھ باندھ کر ان کے سامنے اٹھا کر لے جا رہے تھے اور وہ اسی طرح اطمینان سے کھانے پینے اور خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ انہوں نے صرف کن انکھیوں سے دیکھنے پر اکتفا کیا تھا۔

یہ میرے لیے نیا تجربہ نہیں تھا۔ اس مسئلے پر بھی میں بارہا غور کر چکا تھا کہ لوگوں نے اپنی اجتماعیت کی طاقت کھو دی تھی۔ محض دو چار اسلحہ بردار بہت بڑے ہجوم کے سامنے جو چاہتے تھے، کر گزرتے تھے۔ ہجوم ایک بہت بڑی طاقت ہوتا ہے لیکن ہجوم اپنی طاقت سے بے خبر، یہ تماشا دیکھتا رہتا تھا۔ اس وقت تو اڈے پر جو لوگ موجود تھے ان کے بارے میں مجھے ویسے بھی یقین نہیں تھا کہ عام، شریف اور بے ضرر سے شہری یا دیہاتی تھے۔ وہ خود بھی مجھے مشکوک سے ہی لگ رہے تھے۔

اڈے کے عقب میں پہنچ کر میں نے دیکھا، قدِ آدم گھاس کے قریب ان کے گھوڑے بندھے ہوئے تھے۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک جوہڑ میں مینڈک ٹراتے تھے اور ادھر ادھر چھلانگیں لگا رہے تھے۔ گھوڑے گھاس پر منہ مارنے کے بجائے دلچسپی آمیز نظروں سے مینڈکوں کو دیکھ رہے تھے۔

ان تینوں نے سہارا دے کر مجھے میرے گھوڑے پر بٹھایا۔ سیاہ رو نے اس کی لگام اپنی زین سے باندھ لی اور آگے آگے چل دیا۔ اس کے دونوں ساتھی میرے دائیں بائیں، گھوڑوں پر سوار چلے آ رہے تھے۔ میرے ہاتھ بدستور پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میں جس میدان سے گزر کر آیا تھا، ہم اسی میں چل رہے تھے لیکن سمت تبدیل ہو چکی تھی۔ ہم اس پگڈنڈی کی طرف نہیں جا رہے تھے جس سے میں آیا تھا۔

تقریباً ایک میل کا فاصلہ اسی ویرانے میں طے کرنے کے بعد انہوں نے گھوڑے روک لیے۔ سیاہ رو نے خونخوار پستہ قد کی طرف ایک سیاہ کپڑا اچھالا جو ابھی تک اس نے اپنی کمر کے گرد باندھا ہوا تھا۔

تانبے کی سی رنگت والے نے گویا وضاحت کی۔ "یہاں سے آگے ہم تمہیں آنکھوں پر کپڑا باندھ کر لے جائیں گے۔"

میں کوئی احتجاج کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا، خاموش رہا۔ خونخوار پستہ قد نے وہ کپڑا کس کر میری آنکھوں پر باندھ دیا اور سفر ایک بار پھر شروع ہو گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب انہوں نے جلدی جلدی دائیں بائیں مڑنا شروع کر دیا تھا۔ معلوم نہیں مجھے دھوکے میں رکھنے کے لیے خوامخواہ ادھر اُدھر مُڑ رہے تھے یا خاردار جھاڑیوں سے بچنے کے لیے۔ ورنہ وہاں کوئی سڑک یا پگڈنڈی تو تھی نہیں جس پر وہ ادھر اُدھر مُڑ رہے تھے۔ بہرحال میں ہر موڑ اور فاصلے کا اندازہ لگا کر اسے اپنی یادداشت میں محفوظ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہمیں کافی دیر سفر کرنا پڑا جبکہ اس دوران انہوں نے رفتار بھی تیز کرلی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ جانو کا ڈیرا وہاں سے اتنی دور ہوگا۔

خدا خدا کرکے وہ ایک جگہ رکے پھر انہوں نے میری آنکھوں سے کپڑا کھول دیا۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ ہم ایک گھنے جنگل میں کھڑے تھے لیکن سامنے ہی زمین کا ایک طویل و عریض ٹکڑا ایسا تھا جس پر سے غالباً درخت کاٹ دیے گئے تھے یا قدرتی طور پر ہی وہ جگہ خالی تھی۔ اس مستطیل قطعۂ زمین پر چوبی تختوں سے ہٹ کی سی ساخت کا ایک بہت بڑا اور بے حد مضبوط نظر آنے والا مکان تیار کیا گیا تھا۔ ہم اس مکان کے دروازے پر کھڑے تھے اور دروازہ بند تھا۔

سیاہ رو اب بھی خفگی آمیز سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے دونوں ساتھی گویا سوچ رہے تھے کہ دروازے پر دستک دی جائے یا نہیں۔ سیاہ رو ناگواری سے تانبے کی سی رنگت والے سے مخاطب ہوا۔ "تمہیں ابھی اس کی آنکھوں سے کپڑا نہیں کھولنا چاہیے تھا۔ اندر جاکر کھولنا چاہیے تھا۔"

"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" تانبے کی سی رنگت والے نے بے پروائی سے جواب دیا اور آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دی۔ یہ غالباً دستک دینے کا مخصوص انداز تھا۔

چند لمحے بعد دروازہ ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ کُھلا لیکن اس سے کسی انسانی چہرے کے بجائے گن کی نال نے باہر جھانکا۔ دھیرے دھیرے پوری اسٹین گن باہر آئی اور پھر اسے تھامنے والا شخص برآمد ہوا۔ وہ کسی ڈرم سے مشابہ تھا جسے ہاتھ پاؤں اور کھوپڑی لگا دی گئی ہو۔ اس کی آنکھیں غیر معمولی طور پر بڑی تھیں اور ان میں حد سے زیادہ وحشت تھی۔ وہ آنکھیں انسان کی نہیں، کسی اور ہی مخلوق کی معلوم ہوتی تھیں۔

ان تینوں کو تو اس نے نہایت سرسری نظروں سے دیکھا لیکن میرا بغور جائزہ لیا اور غالباً میرے ہاتھ بندھے ہوئے دیکھ کر اس نے گن پر اپنی گرفت ذرا ڈھیلی کرلی اور اسے زمین کی طرف جھکا لیا۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے تانبے کی سی رنگت والے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "کون ہے یہ پیرل؟"

اب مجھے معلوم ہوا کہ تانبے کی سی رنگت والے کا نام پیرل تھا۔ پیرل ذرا بے پروائی سے منہ بناتے ہوئے بولا۔ "ہم کو خبر ملی تھی کہ ایک مشکوک آدمی علاقے میں آیا ہے، اس کو جاکر پکڑا۔ یہ بولتا ہے میں جانو کا مہمان ہوں۔"

"نام کیا ہے تمہارا؟" ڈرم نما نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آواز بھی کچھ ایسی ہی تھی جیسے ایک ڈرم میں بہت سے پتھر ڈال کر ہلائے جارہے ہوں۔

"افضل خان۔" میں نے جواب دیا۔ "میں روحیل خان کا دوست اور پارٹنر ہوں۔"

ڈرم نما شخص اندر چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ دروازہ بند کرگیا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس نے مجھے گرفتار کرکے لانے والوں کے لیے بھی دروازہ نہیں کھولا تھا۔ پہلے اندر اجازت لینے گیا تھا۔ اس سے ڈسپلن کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا۔ کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا تھا کہ ڈسپلن اب صرف مختلف قسم کی مافیاؤں میں ہی باقی رہ گیا تھا۔

جلد ہی دروازہ دوبارہ کھل گیا اور ڈرم نما شخص برآمد ہوا۔ اس نے اسٹین گن سے اشارہ کیا۔ پستہ قد اور سیاہ رو نے مجھے سہارا دے کر گھوڑے سے اُتارا اور چاروں گھوڑے قریبی درختوں سے باندھ دیے۔ پھر وہ مجھے گھیرے میں لیے اس لمبے چوڑے چوبی مکان میں داخل ہوئے۔ اندر پہنچتے ہی مجھے اس مکان کی مضبوطی کا اندازہ ہوا۔ اس کی تعمیر میں جابجا موٹے موٹے شہتیر استعمال کیے گئے تھے اور وہ پائیداری میں سیمنٹ اور سریے سے بنے ہوئے مکانوں سے کم معلوم نہیں ہوتا تھا۔

بائیں طرف ایک اور دروازے سے گزر کر ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچے جہاں بہترین قسم کا فرنیچر سجا ہوا تھا لیکن اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ یہ انتظار گاہ یا ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔ یہاں بھی برقی بتیاں روشن تھیں اور کہیں دور سے سنائی دینے والی خفیف سی گھڑگھڑاہٹ بتا رہی تھی کہ یہ بھی جنریٹر کا کمال تھا۔

اس کمرے سے گزر کر ہم ایک طویل و عریض ہال میں داخل ہوئے جہاں اتنا دبیز قالین بچھا ہوا تھا کہ میرے جوتے اس میں دھنسنے لگے۔ اس کی نفاست دیکھتے ہوئے بے اختیار میرا جی چاہا کہ جوتے اتار دوں لیکن میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے اور کسی نے میرے مٹی میں لتھڑے ہوئے جوتوں کی طرف توجہ بھی نہیں دی تھی۔

دیواروں کے ساتھ نہایت نفیس قسم کے اور مخملیں پوشش والے صوفے بھی نظر آرہے تھے مگر ان کے آگے قالین پر موٹے موٹے گاؤ تکیے پڑے تھے اور ہال میں جو آٹھ دس افراد موجود تھے وہ انہی گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔

اس کمرے میں زیادہ سامان نہیں تھا مگر جتنا بھی تھا اس سے دولت کی چکاچوند عیاں تھی۔ چاروں کونوں میں آرائشی لائٹر نصب تھیں حتیٰ کہ وسط میں چھوٹا سا ایک فانوس بھی لٹکا ہوا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت کھونٹیوں پر جدید ساخت کی اسٹین گنیں، جی سیون، ایم پی فائیو اور کلاشنکوفیں لٹکی ہوئی تھیں۔

خوبصورت، پالش شدہ دیوار پر ان سیاہ گنوں کی موجودگی سے موت کی بدصورتی نمایاں ہوگئی تھی اور کمرا چھوٹا موٹا اسلحہ خانہ نظر آرہا تھا۔ کمرے میں جو آٹھ دس افراد موجود تھے وہ سب دائرے کی صورت میں بیٹھے تھے۔ وسط میں دسترخوان پر ولایتی وہسکی کی بوتلیں کھلی رکھی تھیں۔ گلاس تھے، بھنی ہوئی مرغیاں تھیں۔ ایک ڈونگے میں برف تک نظر آرہی تھی جو میرے خیال میں اس علاقے میں ناپید تھی۔ فضا مخمور سی تھی۔ دور چل رہا تھا۔

ان کی جسامت، شکل صورت اور رنگت ایک دوسرے سے مختلف تھی مگر کوئی نادیدہ سی چیز تھی جو انہیں ایک جماعت، ایک گروہ، ایک ٹولے کے لوگ ظاہر کرتی تھی۔ کوئی غیر مرئی ڈوری تھی جو اُن سب منکوں کو ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھی۔ ان سب کی حرکات و سکنات میں ایک عجیب شاہانہ قسم کی خود اعتمادی تھی۔

میں ان لوگوں کو، اس ٹھکانے کو دیکھ کر دم بخود تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ گھنے جنگلوں میں کوئی اس ٹھاٹ باٹ سے رہتا ہوگا۔ درختوں میں چُھپے اس خوبصورت مکان میں جدید اسلحہ کھلونوں کی طرح سجا ہوا تھا۔ یہ سب درحقیقت کیا تھا؟ کیا یہ سب لوگ واقعی صرف ڈاکو تھے؟ ان کی جڑیں کہاں تھیں؟ شاید دنیا اتنی سادہ نہیں رہی تھی جتنی میں سمجھتا آیا تھا۔ یا پھر شاید مجھ پر ہر قدم پر ایک نئی دنیا منکشف ہو رہی تھی۔

کیا جانو بھی کوئی ڈاکوؤں کا سردار، قسم کی چیز تھا؟ اس کا وہ بارونق اڈہ جہاں سے میں آرہا تھا، کیا وہ محض دکھاوے کی چیز تھی، ایک آڑ تھی؟ شاید اس سے بھی بہت سے مقاصد حاصل ہوتے تھے۔ جس طرح روحیل خان نے چھوٹی موٹی زمینداری کی آڑ لے رکھی تھی۔ یہ سب چیزیں بہت ہی کثیر المقاصد قسم کی تھیں۔

وقت، زمانے اور شاید کچھ نامعلوم افراد نے ڈاکوؤں کو بھی نہ جانے کیا کچھ سکھا دیا تھا۔ ترقی تو ساری دنیا ہی کر رہی تھی لیکن برائی کچھ زیادہ ہی ترقی کر رہی تھی، زیادہ جدت پذیر تھی۔ میرے ذہن میں ڈاکوؤں کے بارے میں ابھی تک جو تصورات تھے وہ اس وقت خاصے فرسودہ محسوس ہو رہے تھے۔ میرا خیال تھا، جنگلوں بیابانوں میں رہنے والے ڈاکو غاروں اور کچھاروں میں پناہ گزیں ہوتے ہوں گے، بڑی کٹھن زندگی گزارتے ہوں گے۔

ایک شخص کی طرف میری توجہ غیر ارادی طور پر مرکوز ہو کر رہ گئی۔ میرے خیال میں وہی جانو تھا۔ وہ سب سے الگ تھلگ، میرِ مجلس نظر آرہا تھا۔ اس کا لباس سب سے نفیس اور قیمتی تھا۔ اس کی پگڑی میں کلف لگا ہوا تھا۔ داڑھی میں شاید کنگھی کرکے بال سیٹ کرنے والا جل لگایا گیا تھا۔ داڑھی نہایت سلجھی، سنوری ہوئی اور لش لش کرتی نظر آرہی تھی۔

اس کی مونچھیں بچھو کی دُم کی طرح اوپر کو مُڑی ہوئی تھیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ اتنی موٹی دُم کسی انتہائی صحت مند بچھو کی بھی نہیں ہوسکتی تھی بلکہ اتنا موٹا تو کوئی بچھو خود بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

وہ عام سی شکل صورت کا ایک سانولا سا میانہ قامت شخص تھا لیکن اپنے رکھ رکھاؤ سے ایک طاقتور آدمی نظر آتا تھا۔ میری مُراد اس طاقت سے نہیں جو جسموں میں ہوتی ہے۔ اس کے پاس نامعلوم اختیارات کی کوئی بے عنوان قوت تھی۔

اس کی شخصیت میں سب سے نمایاں چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ حالانکہ وہ آنکھیں بہت چھوٹی لوور بٹنوں کی طرح کچھ گول گول سی تھیں لیکن ان میں سانپ کی آنکھوں جیسی کوئی پُراسرار، ساحرانہ سی قوت تھی اور سانپ ہی کی طرح وہ شاید پلک بھی نہیں جھپکتا تھا۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس نے ایک ٹُک میری طرف دیکھا اور میرے جسم میں ہلکی سی پھریری دوڑ گئی۔

"کبھی نام نہیں سنا تمہارا... اور نہ ہی کبھی روحیل خان نے ذکر کیا کہ اس کا ہمارے علاوہ بھی کوئی قریبی دوست اور پارٹنر موجود ہے۔" وہ بھاری اور گونجیلی آواز میں بولا۔ اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری رہا۔

"میں روحیل کے پاس کم ہی رہتا ہوں۔ چند دن پہلے ہی آیا ہوں۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "وہ گھوڑے سمیت گر گیا ہے۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ صورت حال ایسی تھی کہ میں اس کے پاس نہیں ٹھہر سکتا تھا...."

میں ابھی انہیں پوری بات بتانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انہیں خود کہاں تک معلومات حاصل تھیں اور روحیل خان کے ان سے تعلق کی نوعیت کیا تھی۔ میرا ان سے کہاں تک بات کرنا مناسب تھا اور کہاں سے خطرے کی حدود شروع ہوتی تھیں۔ ان معاملات پر روحیل خان سے تفصیل سے بات کرنے کی مہلت نہیں ملی تھی اور وہ خود بھی کچھ زیادہ نہیں کُھلا تھا۔ شاید بعض معاملات میں اس نے مجھے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت اس کی جسمانی اور ذہنی حالت بھی اس قابل نہیں تھی کہ وہ ہر بات مجھے تفصیل سے سمجھا سکتا۔ اس نے جتنی باتیں کرلی تھیں وہی غنیمت تھیں۔ اس کی جگہ اگر کوئی عام سا آدمی ہوتا تو اس حالت میں سوائے ہائے ہائے کرنے کے کچھ بھی نہیں کرسکتا تھا۔ وہ تو پھر بھی جسمانی اور اعصابی طور پر مضبوط انسان تھا کہ کافی صبر و سکون سے بہت سی باتیں کرگیا تھا اور ہائے دُہائی بالکل نہیں کی تھی۔

جانو نے روحیل خان کی ٹانگ ٹوٹنے کی اطلاع سُن کر بھوؤں کو صرف خفیف سی حرکت دینے پر اکتفا کیا۔ اس نے نہ تو کوئی تبصرہ کیا اور نہ ہی کچھ پوچھا۔ باقی لوگ اس طرح بے پروائی سے میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے گھر کے نوکر کسی مویشی کو تھان پر باندھنے کے لیے لائے ہوں۔ ڈرم نما شخص اسٹین گن ہاتھ میں لیے ہال کے دروازے پر جما کھڑا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد جانو نے پیرل کو مخاطب کیا۔ "اس کے ہاتھ کھول دو۔ تم نے سنا نہیں، یہ روحیل کا دوست اور پارٹنر ہے۔"

پیرل نے خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ جانو نے سیاہ رو کو مخاطب کیا۔ "خمیسو! تم نے اس کے ساتھ کوئی سختی تو نہیں کی؟ تم اس معاملے میں بہت جلد باز ہو۔"

اب مجھے معلوم ہوا کہ سیاہ رو کا نام خمیسو تھا۔ وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہ سائیں! پیرل نے مجھے روک دیا تھا۔"

"پیرل نے اچھا کیا۔ پیرل عقل والا ہے۔" جانو نے سر کو

خفیف سی حرکت دی۔ اس دوران پیرل میری کلائیوں کی بندشیں کھول چکا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ روحیل خان سے فرضی تعلق میرے کام آگیا تھا۔ کم از کم بندشوں سے تو نجات مل گئی تھی۔ میری کلائیوں پر گہرے نشان پڑ گئے تھے۔ کم بختوں نے ڈوری بہت سختی سے باندھی تھی۔

نمیسو، پیرل اور ان کا تیسرا خونخوار صورت ساتھی میرے ہاتھ کھولنے کے بعد باقی لوگوں کے ساتھ جا بیٹھے تھے اور اپنے لیے گلاسوں میں وھسکی انڈیلنے لگے تھے۔ کسی نے انہیں دعوت نہیں دی تھی اور نہ ہی انہوں نے کسی سے اجازت لینے کی زحمت کی تھی۔ سردار کا احترام وہاں یقیناً بے پناہ تھا لیکن شاید غیر ضروری تکلفات رائج نہیں تھے۔

میں نے چند لمحے اپنی کلائیوں پر مالش کرنے کے بعد جانو کی طرف دیکھا۔ اس کی سانپ جیسی آنکھیں بدستور میری جانب نگراں تھیں۔ ہاتھ کھلتے ہی میں نے خود کو آزاد محسوس کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اس سے نظر نہیں چرائی اور بدستور اس کی طرف دیکھتا رہا۔

اس نے ایک گھونٹ حلق میں انڈیلا اور آنکھوں سے قالین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "بیٹھ جاؤ۔"

میں ایک طرف جگہ خالی پا کر بیٹھ گیا۔ وہ سامنے رکھی بوتل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "پیو گے؟"

"شکریہ۔ میں پیتا نہیں ہوں۔" میں نے مہذبانہ لہجے میں کہا۔

"اوہ..... پارسا ہو!" اس کے لہجے میں ہلکا سا تمسخر بھی تھا اور بے یقینی بھی۔ میرے کچھ کہنے سے پیشتر وہ بولا۔ "لیکن کچھ کھا ضرور لو۔ جانو یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی اس کے ڈیرے پر آئے اور بغیر کچھ کھائے پیے چلا جائے۔ ہمیں تو دشمن کو بھی مارنا ہوتا ہے تو کھلا پلا کر مارتے ہیں۔"

اس پر سب نے ہم آہنگ ہو کر قہقہہ لگایا اور چوبی در و دیوار جھنجھنا اٹھے۔ میں کچھ کھانا بھی ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں تمہارے ہی اڈے پر ڈٹ کر کھانا کھا کر آیا ہوں اور اچھی بات یہ ہے کہ مجھے اس کے لیے کوئی ادائیگی بھی نہیں کرنی پڑی۔ بل ادا کرنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی تمہارے آدمی مجھے یہاں لے آئے۔"

"تو پھر تھوڑی سی مٹھائی ہی کھا لو۔ منہ میٹھا کر لو۔ تمہارے لیے بھی خوشی کا موقع ہے کہ تمہارے قدم جانو کے ڈیرے تک پہنچے ہیں۔ بہت ہی کم خوش نصیب ہیں جن کے قدم یہاں تک پہنچتے ہیں اور ہمارے لیے بھی خوشی کا موقع ہے کہ تم یہاں پہنچ گئے۔ ہم بھی روحیل خان کے بارے میں بڑی الجھن میں تھے کہ کیا کیا جائے۔ امید ہے تمہارے آنے سے ہماری الجھن دور ہو جائے گی۔" جانو نہایت ٹھہرے ٹھہرے انداز میں بولا۔

"کیسی الجھن؟" میں نے ذرا چونکتے ہوئے پوچھا۔

"ایسی کوئی خاص بات نہیں ہے، بعد میں بات کر لیں گے پہلے تم منہ میٹھا کرو۔" وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے گردن گھما کر پکارا۔ "سونیا!"

ہال کا دوسرا دروازہ جو اندر کی طرف کھلتا تھا، اس وقت بند تھا۔ ایک لمحے بعد اس کے عقب میں سینڈلوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ میرا خیال تھا کہ اس دروازے پر جو عورت نمودار ہوگی وہ انہی وحشیوں سے ملتی جلتی کوئی "سر جھاڑ منہ پھاڑ" قسم کی چیز ہوگی لیکن جب دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا تو ایک ثانیے کے لیے میری آنکھوں میں برق سی لہرا گئی۔

بات یہ نہیں تھی کہ وہ عورت بہت حسین تھی اور اس کی آمد سے چاند زمین پر اتر آیا تھا۔ وہ سانولی سی ایک ایسی عورت تھی جسے محض مُمرّو تاً خوش شکل کہا جا سکتا تھا لیکن کچھ چیزوں نے اسے شعلہ جوالہ بنا دیا تھا۔ اپنے انگ انگ پر کہیں اس کا اختیار اور کہیں بے اختیاری، اس کے خدوخال کا تناسب، اس کا پہناوا، یہ سب کچھ حشر خیز تھا۔ شکل صورت کچھ ایسی قیامت نہیں تھی۔

اس چھوٹی سی دنیا میں یوں تو ہر لمحے ایسے مناظر سامنے آ رہے تھے جو بظاہر معمولی لیکن درحقیقت چونکانے والے تھے مگر اس نئی حیرت نے رگ و پے میں سنسنی بھی دوڑا دی تھی۔ میری حیرت کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ عورت جدید ترین تراش خراش کا ایک سرخ بھڑکیلا اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔

اس کے بال بھورے، تراشیدہ اور انتہائی نرم تھے۔ اس کے سر کی ہر جنبش کے ساتھ ایک ریشمی آبشار کی طرح ادھر سے ادھر لہرا رہے تھے۔ پیروں میں اونچی ایڑی کے سرخ سینڈل تھے لیکن وہ جو اس عورت میں ہر قدم کے ساتھ دوسروں کے دلوں کو اتھل پتھل کرنے کی صلاحیت تھی، وہ ان سینڈلوں کی مرہونِ منت نہیں تھی۔ وہ قوت اس کے خدوخال، اس کے نشیب و فراز میں، کچھ یہاں کچھ وہاں پوشیدہ تھی۔ میں یہاں اس جنگل میں اس حلیے کی عورت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ ایک لمبے سے ہولڈر میں سگریٹ لگائے قطعی قلم، انداز میں لمبے لمبے کش لے رہی تھی۔

میں چونکہ دروازے کی سیدھ میں بیٹھا تھا شاید اس لیے اس کی نظر سب سے پہلے مجھ پر گئی۔ اس نے گہری نظر سے میرا سر تا پا جائزہ لیا پھر جانو کی طرف دیکھ کر قدرے نخریلے سے لہجے میں بولی۔ "کیا بات ہے؟"

"مہمان آیا ہے۔" جانو نے میری طرف اشارہ کیا۔ "کچھ کھانے پینے کو ہاں نہیں کرتا۔ کم سے کم اس کا منہ میٹھا کرانے کے لیے ہی کچھ لے آؤ۔"

جانو اس عورت سے ملائمت سے بات کرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ نہ جانے وہ اس کی بیوی تھی یا بیوی نما۔ وہ کوئی جواب دیے بغیر کھٹ کھٹ کرتی واپس چلی گئی۔ دروازہ وہ ایک جھٹکے سے

بند کر گئی تھی۔

جانو اور دوسرے لوگ باتوں میں مصروف ہو گئے لیکن اب وہ کسی عجیب ہی زبان میں باتیں کر رہے تھے جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں پاکستان کی تقریباً سبھی علاقائی زبانوں سے واقف تھا اور گزارے لائق بول بھی لیتا تھا۔ سمجھتا تو اچھی طرح تھا لیکن یہ زبان ان میں سے کوئی نہیں تھی۔ یہ بھی میرے لیے ایک نئی حیرت تھی۔ ان میں سے ایک دو نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا۔ شاید باتیں میرے ہی بارے میں ہو رہی تھیں۔

اسی دوران سونیا نامی وہ عورت ایک چھوٹی سی ٹرے میں مٹھائی کی پلیٹیں سجائے لے آئی۔ مٹھائی دیکھنے میں ہی عمدہ محسوس ہو رہی تھی لیکن میں مٹھائی کھانے کا کچھ ایسا شوقین نہیں تھا۔ مجھ جیسے تو کم از کم پچاس افراد کے لیے وہ مٹھائی کافی تھی۔ مجھے تو یہی دیکھ دیکھ کر حیرت ہوئے جا رہی تھی کہ اس جنگل میں انسانی ضرورت اور آسائش کی ہر چیز میسّر تھی۔ کم از کم اس ٹھکانے پر تو میسّر تھی۔

سونیا میرے سامنے ٹرے قالین پر رکھنے کے لیے جھکی تو میری آنکھوں کے سامنے گویا زمین و آسمان آن ملے۔ میں تھوک نگل کر رہ گیا اور اسی دوران منظر بدل گیا۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ ہولڈر بدستور دبا ہوا تھا۔ وہ سب لوگوں کے درمیان سے گزرتی ہوئی واپس چلی گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جانو کے سوا کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ رہا تھا۔ ان کے لیے یقیناً وہ محترم تھی۔ جبکہ خود جانو کی نظروں میں اس کے لیے زیادہ دلچسپی نہیں تھی جس سے مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید وہ اس کی بیوی ہی ہو۔ داشتہ کو انسان اس سے ذرا زیادہ دلچسپی سے دیکھتا ہے۔

میں نے جانو کی خوشنودی کے لئے تھوڑی سی مٹھائی کھا لی۔ اس قسم کے لوگوں کے دماغ میں کوئی نہ کوئی "ٹیڑھ" ضرور ہوتی ہے۔ کچھ پتا نہیں ہوتا، کس بات کا بُرا منا جائیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ وہاں بدمزگی شروع ہو جائے۔ اب اگر ماحول خوشگوار ہو چکا تھا تو اسے خوشگوار ہی رہنا چاہیے تھا۔ جب تک میرے بس میں تھا تب تک تو میں اسے خوشگوار رکھنے کی کوشش کر ہی سکتا تھا۔

میں نے مٹھائی سے ہاتھ کھینچ لیا تو جانو قدرے حیرت سے بولا۔ "بس؟ اتنے لمبے چوڑے جوان ہو، صرف اتنی سی مٹھائی کھائی ہے!"

"اس وقت طبیعت سیر ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

چند لمحے عجیب بوجھل سی خاموشی رہی۔ اس دوران ان لوگوں کا شغل جاری رہا۔ بالآخر جانو گہری سانس لے کر بولا۔ "اچھا..... تو روحیل خان نے تمہیں میرے پاس کیوں بھیجا ہے؟" گلاس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا مگر اب وہ پی نہیں رہا تھا۔

یہ تو ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ لوگ روحیل کے دوست تھے۔ میرے خیال میں ان لوگوں کو صحیح بات بتا دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں روحیل خان کا دوست تھا۔ گزشتہ رات روحیل خان ٹانگ تڑوا کر گھر پہنچا تھا اور میں نے اس کے کام آنے کے لیے اس کا بہروپ بھر کر انسپکٹر کو مس گائیڈ کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ حادثاتی سے انداز میں ایک ہیڈ کانسٹیبل میرے ہاتھوں قتل ہو چکا تھا۔

جانو نے بڑے تحمل اور توجہ سے میری باتیں سُنیں۔ میں خاموش ہوا تو اس کے ہونٹوں پر خفیف لیکن عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ پہلو بدلتے ہوئے وہ بولا۔ "واہ..... ! دوست ہو تو تم جیسا۔ بڑا کمال کیا تم نے!"

مجھے اس کا لہجہ کچھ استہزائیہ سا محسوس ہوا۔ ایک لمحے کے لیے میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔

دفعتاً وہ بالکل بدلے بدلے لہجے میں، سرسری سے انداز میں بولا۔ "تمہیں روحیل خان نے ڈکیتی کی کچھ تفصیل نہیں بتائی؟"

"کیسی تفصیل؟" میں نے جاننا چاہا۔

"یہی کہ اس میں کتنے آدمی مرے..... ان میں کتنے پولیس والے تھے اور کتنے مسافر وغیرہ.....؟ کتنے کا مال لوٹا گیا..... گروہ میں کون کون شامل تھا؟"

"نہیں۔ زیادہ تفصیل تو نہیں بتائی اس نے۔ تفصیل سے باتیں کرنے کا موقع بھی نہیں تھا۔ اس کی باتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ایک ناکام ڈکیتی تھی۔ کھیل بگڑ گیا تھا۔ ادھورے انداز میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگنا پڑا۔"

اس نے بڑے گمبھیر سے انداز میں ہنکارا بھرا اور پُرخیال سے انداز میں مونچھوں کو بل دیتے ہوئے سرخ سرخ آنکھوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ ابھی تک میں نے اسے شاذ و نادر ہی پلک جھپکاتے دیکھا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔ "میرا اندازہ غلط تھا یا روحیل خان کا بیان درست نہیں تھا؟"

"دونوں ہی باتیں تھیں۔" جانو کے پتلے پتلے ہونٹ سفاکانہ انداز میں کھنچ گئے۔ اس کے لہجے سے مجھے اپنے اعصاب میں خطرے کی سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور میرے ہاتھ پیروں میں مضطربانہ سا کھنچاؤ پیدا ہونے لگا۔

جانو گلاس قالین پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے بولا۔ "یہ درست ہے کہ پولیس اس ڈکیتی کے دوران اچانک ہی آ گئی تھی لیکن ہم چاہتے تو بڑی آسانی سے انہیں غچا دے کر نکل سکتے تھے۔ ان کا بھی مقابلے کا موڈ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ کسی اور مہم پر جا رہے تھے مگر روحیل خان نے اندھا دُھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ صرف اس لیے کہ ڈرائیور نے ایک فائر کر دیا تھا جس کی وجہ سے پولیس نے بھی گنیں سیدھی کرنی شروع کر دی تھیں....."

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا گویا اسے توقع ہو کہ میں کچھ بولوں گا لیکن میں خاموش رہا۔ وہ بولا "روحیل خان نے سب سے پہلے ڈرائیور اور کنڈکٹر کو قتل کیا پھر پولیس والوں پر بھی برسٹ مارا۔ معلوم نہیں کتنے مرے، کتنے زخمی ہوئے۔ روحیل نے مسافروں کے سلسلے میں بھی کوئی احتیاط نہیں کی۔ ان پر بھی اندھا دُھند فائرنگ کی حالانکہ ان سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔

ظاہر ہے اس کے بعد پولیس والوں کے لیے بھی اندھا دُھند فائرنگ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا تھا۔ وہ تو شکر ہے، ڈاکا ڈالنے والوں نے اپنے حواس بجا رکھے ورنہ ان میں سے بھی... کم ازکم آدھے تو کام آ ہی گئے ہوتے اور باقی آدھے زخمی ہو کر موت کی دعائیں مانگتے۔ یہ بھی شکر کا مقام ہے کہ پولیس والے روحیل یا کسی اور کی شکل نہیں دیکھ سکے تھے۔ سبھی نے ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے لیکن روحیل اس کے باوجود خاص طور پر ان کی نظر میں آ گیا تھا اور وہ اسے ہی سردار سمجھے تھے۔ انہوں نے اسے گھیر کر زندہ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ اسی کوشش میں انہوں نے اپنے دو تین آدمی اور مروا لیے۔

اس قسم کے کاموں میں یہ حساب تو نہیں رکھا جاتا کہ کس نے کتنوں کو مارا یا کس نے کیا غلطی کی، یا کام درحقیقت کس کی وجہ سے بگڑا۔ جب کوئی گروہ کسی واردات پر روانہ ہوتا ہے تو یہ خطرے مول لینے ہی پڑتے ہیں۔ کام تو کسی وقت بھی، کسی بھی وجہ سے بگڑ سکتا ہے لیکن روحیل خان نے تو کل رات حد ہی کر دی تھی۔ وہ تو جیسے پاگل ہو گیا تھا یا پھر بالکل بچہ بن گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سچ مچ کی واردات پر نہیں نکلا تھا، کسی فلم کی شوٹنگ کر رہا تھا۔ مجھے شک سا ہوتا ہے کہ کہیں وہ جان بوجھ کر تو ایسا نہیں کر رہا تھا؟ اس کے ذہن میں کوئی خاص منصوبہ تو نہیں تھا؟ وہ بہت تجربہ کار، بہت گھاگ آدمی ہے۔ اس طرح بدحواس نہیں ہو سکتا تھا۔

اگر اس نے تمہیں یہی بتایا ہے کہ وہ ٹارچ کی روشنی میں صرف ایک لمحے کے لیے انسپکٹر کی صورت دیکھ سکا تھا اور صرف یہ ایک جھلک دیکھ کر اس نے انسپکٹر کے بارے میں سارے اندازے لگا لیے تھے کہ وہ عزم کا بڑا پکا اور پاتال تک مجرموں کا پیچھا کرنے والا آدمی ہے، تو یہ سب باتیں بکواس ہیں۔ روحیل خان اس انسپکٹر کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ انسپکٹر کا نام واقعی رحیم گل خانزادہ ہے اور روحیل خان کو اس کے بارے میں اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ ایک مثالی آفیسر ہے۔ کبھی نہ بکنے والا، کبھی نہ جھکنے والا، بلا کا دلیر اور قبر تک مجرم کا پیچھا کرنے والا۔ یہ سب روحیل خان کے اندازے نہیں تھے۔ ایک سیکنڈ میں کوئی کسی کے بارے میں اتنے اندازے نہیں لگا سکتا۔ یہ سب باتیں روحیل خان کو اچھی طرح معلوم تھیں۔ انسپکٹر رحیم گل کی جھلک دیکھ لینے کے بعد ہی دراصل اس کی بوکھلاہٹ میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔

[illegible] ساتھیوں کے لیے بھی کوئی راستہ نہیں چھوڑا

تھا۔ صورت حال کو اس حد تک بگاڑ دیا تھا کہ اپنی اپنی جان بچانے کے لیے باقی لوگوں کو بھی اسی کی طرح اندھا دُھند سب کچھ کرنا پڑا۔ پولیس والوں میں سے شاید انسپکٹر رحیم گل اور اس کا ایک آدھ ساتھی ہی زندہ بچا تھا۔ دوسرے بھی معلوم نہیں کتنے لوگ مارے گئے۔ اخبار آئے گا تو صحیح پتا چلے گا۔ حالانکہ اس واردات میں ایک آدمی بھی مارے بغیر گزارا ہو سکتا تھا۔ مال تو سمیٹا جا چکا تھا۔ پولیس والوں اور دوسرے لوگوں کو صرف خوفزدہ کر کے وہاں سے نکل بھاگنے کی ضرورت تھی۔

بات یہ نہیں ہے کہ میں یا میرے یہ ساتھی.... میرے یہ دوست جو یہاں بیٹھے ہیں، بہت شریف لوگ ہیں اور ہمیں واردات میں مرنے والوں کا بہت افسوس ہے یا ہمارے دل خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم اس مقام سے اب بہت آگے نکل آئے ہیں لیکن اب بھی ہم اپنے لیے مفت کی مشکلات مول نہیں لیتے۔ جس ڈکیتی میں اتنی خونریزی ہو جائے وہ گلے پڑ جاتی ہے۔ روحیل خان اور اس کے ساتھیوں کا بھی سارا پروگرام دھرے کا دھرا رہ گیا۔ انہیں منہ اٹھا کر ادھر اُدھر بھاگنا پڑا۔ سب بکھر گئے لیکن انسپکٹر نے یقیناً روحیل خان کو نظر میں رکھ لیا تھا۔ وہ اسی کے تعاقب میں روانہ ہوا۔"

جانو کی یہ سب باتیں سُن کر میرے دل میں سناٹا سا پھیل گیا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں یہ یقین گھر کر چکا تھا کہ روحیل خان مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ گزشتہ چند دنوں کی رفاقت کے بعد ہی میں اسے اپنا دوست اور قریبی ساتھی محسوس کرنے لگا تھا۔ مجھے اپنے بارے میں نہ جانے کیوں کچھ ایسا گمان سا بھی تھا کہ میں انسانوں کے بارے میں اتنی آسانی سے دھوکا نہیں کھا سکتا لیکن اس مرتبہ کیا میں واقعی دھوکا کھا گیا تھا؟

میں نے سرِدست کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے خیال میں مجھے تفصیلات کا غبار بیٹھ جانے کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ میں نے بظاہر بالکل پُرسکون لہجے میں کہا۔ "تم تو یہ سب کچھ اس طرح بیان کر رہے ہو جیسے یہ تمہاری آنکھوں دیکھی بات ہے۔ تمہیں یہ سب کس طرح معلوم ہوا؟ یہ تو یہاں سے بہت دور کا واقعہ ہے اور ابھی اخباروں میں نہیں آیا۔"

"ہم اگر بے خبر ہوتے تو یہاں اتنے ٹھاٹ سے نہیں رہ سکتے تھے۔" وہ استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "ہم اپنے چاروں طرف سیکڑوں میل تک کے علاقوں کی خبر رکھتے ہیں۔ باخبر رہنا ہی ہمارے لیے زندگی ہے۔ بے خبری ہماری موت ہے۔ تم اس فکر میں مت پڑو کہ ہمیں یہ سب کچھ کیسے معلوم ہے۔ تم اپنی آمد کا مقصد بتاؤ۔ کیا روحیل خان نے تمہیں صرف یہی ہدایت کی تھی کہ تم اپنے آپ کو مصیبت میں محسوس کرو تو میرے پاس چلے آنا؟"

"ہاں۔ اس نے یہی کہا تھا۔" میں نے جواب دیا۔ "لیکن میرا تمہارے پاس آنے کا کوئی ایسا خاص ارادہ نہیں تھا۔ اگر یہ لوگ

مجھے نہ پکڑ لیتے تو شاید میری تم سے ملاقات نہ ہوتی....."

"یہ تو بہت بُرا ہوتا۔" جانو میری بات کاٹتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "ہم سے تمہاری ملاقات ہونا تو بہت ضروری تھا کیونکہ فی الحال ہم روحیل خان سے تو ملنے نہیں جا سکتے اور نہ ہی اس کی طرف اپنا کوئی آدمی بھیج سکتے ہیں۔ اس کی طرف جانے میں بڑا خطرہ ہے۔ وہ انسپکٹر رحیم گل کو تمہارے پیچھے لگا کر سمجھ رہا ہوگا کہ خطرہ اس کے سر سے ٹل گیا ہے لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔"

پھر وہ سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ "خیر.... چھوڑو ان باتوں کو.... فی الحال تم بتاؤ کیا چاہتے ہو؟"

"اگر مجھے دو جوڑے کپڑے اور اس کالے گھوڑے کے بجائے کسی اور رنگ کا گھوڑا مل جائے تو میرے لیے بڑی آسانی ہو جائے گی۔ اگر تم اسے اپنی توہین نہ سمجھو تو میں اس کے بدلے تھوڑی بہت رقم بھی تمہاری خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔ معمولی سی پونجی ہے میرے پاس۔"

"لباس اور گھوڑا بدلنے کا اب کیا فائدہ؟" جانو نے گویا میری کم عقلی پر ترس کھاتے ہوئے کہا۔ "تم خود ہی بتا چکے ہو کہ انسپکٹر رحیم گل سے اچانک تمہارا سامنا ہو گیا تھا اور وہ تمہاری صورت قریب سے دیکھ چکا ہے۔ رحیم گل کی آنکھیں کیمرا اور دماغ کمپیوٹر ہے۔ وہ ایک بار جو شکل دیکھ لے وہ اس کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہے۔ اس کی دوسری خوبی یہ ہے کہ وہ قاتلوں کا پاتال تک واقعی پیچھا کرتا ہے۔ جو علاقہ اس کی حدود میں نہیں آتا، وہاں بھی دخل اندازی کرتا ہے اور کسی نہ کسی طرح اس کا اختیار حاصل کر لیتا ہے۔ بس اس کے سامنے کوئی واردات ہو جائے، علاقہ خواہ کوئی بھی ہو، وہ پنجے جھاڑ کر پیچھے پڑ جاتا ہے۔ ہزاروں مربع میل میں پھیلے ہوئے اس علاقے میں وہ واحد چھوٹا سا آفیسر ہے جو آج تک کسی کے قابو میں نہیں آیا۔ ورنہ ہر آفیسر کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی ڈوری سے بندھا ہوا ہے۔"

پھر وہ ایک لمحے گویا کچھ سوچ کر بولا۔ "میرا خیال ہے، میں تمہیں انسپکٹر رحیم گل کے بارے میں مزید دو چار ضروری باتیں بتا دوں تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔ اس کا تعلق ایک کھاتے پیتے اور بارسوخ زمیندار گھرانے سے ہے مگر وہ صرف شوق میں یہ چھوٹی سی نوکری کر رہا ہے۔ یا پھر شاید ایڈونچر کے لیے۔ اس کے دماغ میں برائیوں کے خلاف جہاد وغیرہ کا بھی کچھ خنّاس ہے۔ اس طبقے کے لوگ اگر اس قسم کی نوکریوں میں آتے بھی ہیں تو صرف مال بنانے کے لیے آتے ہیں لیکن اس بدبخت کو مال بنانے کا بھی شوق نہیں ہے۔"

"اس قسم کے لوگ تو اب ہمارے ہاں ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ جو کچھ تم بتا رہے ہو اس سے تو وہ کسی الف لیلوی داستان کا کردار معلوم ہونے لگا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بس.... آج بھی کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کونے کھدرے میں ایسے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں اور سروائیو بھی کر جاتے ہیں۔" جانو کو گویا اس بات پر افسوس تھا۔ وہ بات چیت مقامی زبان میں کر رہا تھا لیکن بیچ میں انگریزی الفاظ بھی استعمال کرتا جا رہا تھا۔ مجھے پہلے ہی کچھ شبہ ہو رہا تھا کہ وہ کچھ پڑھا لکھا شخص تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "رحیم گل جیسے جیسے پنگے لیتا ہے اس حساب سے اسے اب تک مرچکنا چاہیے تھا۔ بہت عرصہ پہلے اس دنیا سے اس کا بستر بوریا گول ہو جانا چاہیے تھا مگر وہ زندہ ہے اور بڑی دلیری سے زندہ ہے۔ شاید قدرت اس پر مہربان ہے۔"

"یقیناً ہوگی۔" میں نے لقمہ دیا۔ "آخر قدرت کو بھی تو اپنے نظام کی حفاظت کرنی ہے۔"

جانو نے گہری نظر سے میری طرف دیکھتے ہوئے سلسلۂ کلام جوڑا "میرا اپنا خیال یہ ہے کہ ہمارے ہاں نوّے فیصد لوگ..... بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زیادہ لوگ کسی نہ کسی انداز میں اپنی اپنی جگہ لوٹ مار میں مصروف ہیں۔ جس کا جہاں، جس حیثیت میں، جس حد تک ہاتھ پڑ رہا ہے، وہ لوٹ مار کرنے کی اپنی سی کوشش کر رہا ہے اور اگر کسی کے ہاتھ میں اختیارات آ جائیں اور موقعے بھی میسّر ہوں، وہ تو دونوں ہاتھوں سے لُوٹتا ہے۔ غریب اور مڈل کلاسیا اس لیے لُوٹتا ہے کہ وہ بھوکا ہوتا ہے۔ اس میں کئی نسلوں سے دولت کی بھوک موجود ہوتی ہے اور دولت مند اس لیے لُوٹتا ہے کہ کئی نسلوں سے دولت کی ہوس اس کی فطرت میں شامل ہو چکی ہوتی ہے لیکن اس وقت مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے جب بیچ میں کوئی رحیم گل جیسا نمونہ نکل آتا ہے۔ دولت اور آسائشیں اس کے تعاقب میں ہوتی ہیں مگر وہ ان سے بھاگتا ہے۔ اپنے لیے تکلیفیں، مصیبتیں، پریشانیاں اور لوگوں کی ناراضگی مول لیتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اس کے لیے انہی چیزوں میں کوئی زبردست لذت پنہاں ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر اپنے گلاس میں سے آخری گھونٹ بھرنے کے بعد بولا۔ "تمہیں شاید حیرت ہو رہی ہوگی کہ میں تمہیں یہ سب کچھ اتنی تفصیل سے کیوں بتا رہا ہوں؟"

"ہاں، تھوڑی سی حیرت تو ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس لیے کہ تمہیں اچھی طرح اندازہ ہو جائے، اب تمہارا واسطہ کس قسم کے آدمی سے ہے۔" جانو سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اس کے قریب بیٹھا ہوا ایک کرخت صورت سا شخص اس کے لیے دوسری ڈرنک تیار کر رہا تھا۔ "اب تم رحیم گل کی نظر میں نہ صرف کئی پولیس والوں بلکہ دوسرے بھی کئی بے گناہ اور نہتے لوگوں کے قاتل ہو، ڈاکو ہو۔ اب تم اس کے لیے ایک چیلنج ہو اور چیلنج قبول کرنے میں رحیم گل کا جواب نہیں۔"

اس نے نئی ڈرنک سے ہلکی سی چسکی لی اور اپنے ساتھیوں کے چہروں پر ایک طائرانہ سی نظر ڈالی۔ ان سب کے ہاتھوں میں اب بھی گلاس تھے لیکن وہ ہمہ تن گوش تھے۔ پینے پلانے کا ان پر بہت

معمولی سا اثر دیکھنے میں آرہا تھا۔
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد جانو بولا۔ "ہم تک تو رحیم گل کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ اگر ہو بھی جائے تو ہم اس سے نمٹنے کی طاقت رکھتے ہیں لیکن تم کیا کرو گے؟ تمہیں یہ یقین رکھنا چاہیے کہ وہ تم تک پہنچے گا ضرور۔"
اس کی باتیں سُن کر میرے دل میں ایک لمحے کے لیے ہلکی سی کھدبد ضرور ہوئی لیکن پھر میں نے اپنے اندیشوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ زندگی اگر رحیم گل کے لیے ایڈونچر تھی تو میں بھی اسے ایڈونچر سمجھ کر ہی گزار رہا تھا۔ میری دعا تھی کہ وہ مجھے کسی موڑ پر مجبور نہ کردے کہ میں اسے کوئی گزند پہنچاؤں یا خدانخواستہ وہ میرے ہاتھوں مارا ہی جائے۔ اس قسم کے لوگ اب نایاب تھے' بیش بہا سرمایہ تھے۔ اس سرمائے کو ضائع نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مجھے تو اپنے ہاتھوں اس کے ساتھی ہیڈ کانسٹیبل کے مارے جانے کا ہی بڑا افسوس تھا۔ وہ ایک کٹھن مہم میں رحیم گل کے شانہ بہ شانہ تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ بھی ایک اچھا انسان رہا ہو۔
میں نے ہموار لہجے میں کہا۔ "تم اپنے آپ کو میرے ساتھ کیوں شمار کر رہے ہو؟ تم تک پہنچنے کی اسے کیا ضرورت پیش آسکتی ہے؟"
جانو کے ہونٹوں پر استہزائیہ سی مسکراہٹ کچھ واضح ہو گئی لیکن پھر یکایک ہی وہ مسکراہٹ اس طرح غائب ہو گئی جیسے کوئی قمقمہ بُجھ گیا ہو۔ اس کی آنکھوں میں سُلگتی ہوئی چنگاریوں کو گویا تیز ہوا مل گئی۔ ان آنکھوں میں اچانک ہی وحشت سی جاگ اٹھی۔
وہ یک دم بدلی بدلی اور کھرکھراتی سی آواز میں بولا۔ "تم واقعی اتنے معصوم ہو یا ہمیں یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تم کتنے اچھے اداکار ہو؟"
"میں کچھ سمجھا نہیں!" میں نے کہا۔ میں واقعی کچھ گڑبڑا سا گیا تھا۔
"تم ہمیں یہ یقین دلانے کی کوشش کر رہے ہو کہ روحیل خان نے تمہیں کچھ نہیں بتایا؟" وہ گویا اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے بولا۔
"میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ روحیل خان نے مجھے کچھ نہیں بتایا؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "اس نے مجھے جو کچھ بتایا تھا وہ میں نے تمہیں بتا دیا ہے۔"
اب گویا تحمل کا دامن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اب تک وہ جتنا پُرسکون نظر آرہا تھا' یکایک اتنی ہی بُری طرح بھڑک اٹھا۔ اس کی سانپ جیسی آنکھوں میں سرخ ڈورے تو پہلے ہی تیر رہے تھے' اب تو آنکھیں بالکل ہی لال انگارہ ہو گئیں اور وہ گھونسا ہوا میں لہرا کر بولا۔ "اب بکواس بند کرو اور مال نکالو۔ اِدھر اُدھر کی باتیں بہت ہو گئیں۔ یہ بتاؤ مال کہاں چھپا کر آئے ہو؟"
"مال؟" میں ہکا بکا رہ گیا۔
"ٹھیک ہے۔ اگر تم ایکٹنگ جاری رکھنے پر اتنے ہی بضد ہو تو میں تمہاری خوشی کے لیے وہ باتیں دُہرا دیتا ہوں جو تمہیں یقیناً معلوم ہوں گی۔" اس کا لہجہ بھی سانپ کی پھنکار سے مشابہ تھا۔ "جس گروہ نے بسوں پر ڈاکا ڈالا تھا وہ ہمارا ہی گروہ تھا اور اس کے تقریباً سب لوگ تمہارے سامنے بیٹھے ہیں۔ صرف میں اس واردات میں شامل نہیں تھا۔ روحیل ہمارا خاص آدمی ہے لیکن ہم نے اسے اس کے اپنے اسٹائل سے کام کرنے کی اجازت دی ہوئی تھی۔ یعنی بظاہر وہ چھوٹا سا زمیندار بن کر زندگی گزار رہا تھا لیکن ضرورت کے وقت ہمارے پاس پہنچ جاتا تھا اور ہر واردات میں حصہ لیتا تھا۔ بعض وارداتوں میں تو سردار وہی ہوتا تھا۔ میرے بعد سب سے زیادہ حصہ اسی کا ہوتا تھا۔"
میں خاموشی سے یہ سب کچھ سُن رہا تھا اور روحیل کا مخلص سا چہرہ میری نظروں میں گھوم رہا تھا۔ جانو بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اگر تم روحیل کے دوست اور پارٹنر ہو تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک نہایت دولت مند آدمی بن چکا ہے۔ اس وقت وہ بلاشبہ کروڑ پتی ہوگا....."
مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ اس ویرانے میں تنہا پڑا..... ایک عام دہقان کی سی زندگی گزارنے والا وہ شخص کروڑ پتی تھا؟
جانو کی بات جاری تھی۔ وہ کہہ رہا تھا "کل رات کی واردات ہماری بڑی وارداتوں میں سے ایک تھی۔ اس میں بہت مال ہاتھ آیا تھا۔ گڑبڑ شروع ہونے سے پہلے روحیل نے سارے مسافر مردوں اور عورتوں سے نقدی' زیورات وغیرہ چھین کر کینوس کے ایک تھیلے میں ڈال لیے تھے اور جس وقت وہ رحیم گل سے جان بچا کر بھاگا ہے اس وقت بھی تھیلا اسی کے پاس تھا' گھوڑے کی زین کے ساتھ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے بڑی حاضر دماغی اور پُھرتی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اگر اسے بھاگنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو وہ رحیم گل کے ہاتھوں مارا جاتا۔ اس کی خوش قسمتی ہے کہ رحیم گل کو نہ تو اس کی حقیقت معلوم ہے اور نہ ہی وہ اس کی شکل دیکھ سکا۔ روحیل خان کا ایک ڈاکو کی حیثیت سے پولیس کے پاس کہیں کوئی سراغ نہیں ہے۔ میرے ان ساتھیوں نے آکر مجھے تفصیلی رپورٹ دی۔ میں تو خوش تھا کہ روحیل خان اپنی جان اور مال بچا کر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا۔ اب تم آئے تو میں سمجھا تھا کہ روحیل خان نے اپنے حصے کا مال رکھ کر باقی مال تمہارے ہاتھ یہاں بھیجا ہو گا کیونکہ یہ سب لوگ اپنا اپنا حصہ وصول کرنے کے لیے بے تاب بیٹھے ہوئے ہیں۔" اس نے بازو پھیلا کر دیگر لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔
وہ سب ناگواری کے سے عالم میں میری طرف دیکھ رہے تھے۔
جانو نے بات جاری رکھی۔ "روحیل ہمارا بہت پرانا اور تجربہ کار ساتھی ہے۔ اسے معلوم ہے' حصوں کی تقسیم میں دیر نہیں کی جاتی کیونکہ ہم لوگوں کے حالات کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ صرف ہم لوگوں کے حصوں کا مسئلہ نہیں ہوتا' ایک دو جگہ پر اور بھی حصے جانے ضروری ہوتے ہیں۔ روحیل پر ایک مدت سے ہمیں

بڑا بھروسا رہا ہے کیونکہ وہ بہت ہی شاطر' بہت ہی تیز و طرار اور بہت ہی پُھرتیلا ساتھی تھا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ہمارے گروہ نے اسی کی وجہ سے بہت ترقی کی ہے لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ کچھ عرصے سے وہ کسی چکر میں تھا۔ الگ تھلگ ہی اپنی کوئی کھچڑی پکا رہا تھا۔ ال میں بھی مسلسل ڈنڈی مار رہا تھا لیکن میں ان سب باتوں کو نظر نداز کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایسی باتوں کی وجہ سے روحیل خان یسے ساتھی کو چھوڑا نہیں جا سکتا لیکن اب اس نے کچھ مشکوک ے انداز میں تمہیں بھیجا ہے۔ مال بھی تمہارے پاس نظر نہیں رہا۔ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ کوئی لمبا چکر چلا رہا ہے ور اس قسم کی حرکتیں میں بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔ رحیم گل یسے آدمی سے پنگا لے کر اس نے پہلے ہی گروہ کے لیے بہت بڑا طرہ کھڑا کر دیا ہے۔"
مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ روحیل خان جیسا سچا اور ھرا نظر آنے والا جوان پُرپیچ قسم کے سازشوں کے جال بھی بُن سکتا تھا لیکن اس دنیا میں ایک تو ویسے ہی کسی کے بارے میں یقین ے کچھ نہیں کہا جا سکتا' دوسرے جو لوگ دُہری زندگی گزارنے کی یت رکھتے ہیں ان پر بھروسا کرنا تو بہت ہی مشکل ہوتا ہے۔
تاہم میں اب بھی خاموش رہا۔ میں جانو کو زیادہ سے زیادہ لنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔ وہ جتنا بول رہا تھا' صورت حال اتنی ہی رے سامنے واضح ہو رہی تھی۔
جانو مجھے خاموش پا کر بولا۔ "مجھے اب بھی بڑی حد تک یقین کہ روحیل خان نے مال تمہارے ہاتھ ضرور بھیجا ہوگا لیکن ری نیت خراب ہو گئی ہے۔ اگر تمہاری نیت خراب ہو ہی گئی تو تمہیں اس علاقے کی طرف نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ تو شیروں کچھار ہے۔ یہاں آنے کے بعد تم ہمارے منہ کا نوالا چھین کر ہ لے جا سکتے۔"
"کتنا تھا لوٹ کا مال؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔
"کتنے معصوم بن کر پوچھ رہے ہو!" جانو استہزائیہ لہجے میں "لیکن خیر..... اگر تمہارے دل میں ہم سے چھیڑ خانی کرنے کا زیادہ ہی شوق پیدا ہو گیا ہے تو ہم تھوڑا بہت تمہارا ساتھ دے ہیں۔ تمہارے معصوم سوالوں کے جواب دے دیتے ہیں۔"
میں نے دیکھا' اس دوران جانو کے ساتھیوں میں سے کئی نے ردیواروں پر کھونٹیوں سے ٹنگی گنیں اتار لی تھیں اور انہیں س رکھ کر بیٹھ گئے تھے۔
جانو بولا۔ "تمہارے مخبر نے ہمارے لیے بہت اچھی بسیں منتخب کیں۔ آج کل ہائی وے پر چار چار چھ چھ بسیں قافلہ سا بنا کر سفر نے لگی ہیں۔ بھولے لوگ ہیں' وہ سمجھتے ہیں' قافلوں کو شاید لوٹا جا سکتا حالانکہ اس سے ہمارے لیے آسانی ہو گئی ہے۔ بہت سا شکار ہاتھ آجاتا ہے۔ بس ذرا بندوبست اچھا کر کے تا ہے۔ رات والی واردات میں آدھا تھیلا تو نوٹوں سے بھر گیا تھا اور زیادہ تر بڑے نوٹ تھے۔ دو تین کلو سونے کے زیور تھے اور کم از کم چار کلو سونا ٹکیوں کی شکل میں تھا۔ گھڑیاں وغیرہ اس کے علاوہ تھیں۔"
"ٹکیوں کی شکل میں سونا.....؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔
"ان میں سے ایک بس میں دو سُنار اکٹھے سفر کر رہے تھے۔ ٹکیوں کی شکل میں سونا وہ لے جا رہے تھے۔ سکھر سے خرید کر لائے تھے اور انہوں نے اسے سبزی کی ٹوکریوں میں سبزیوں تلے چُھپایا ہوا تھا۔ بہت عرصے بعد ہمارا اتنا اچھا ہاتھ پڑا تھا۔"
میں اس کی بات سُن رہا تھا لیکن میرا ذہن اب بھی روحیل خان میں ہی الجھا ہوا تھا۔ مجھے ابھی تک یقین نہیں آسکا تھا کہ اس نے اتنی محبت دکھانے کے بعد نہ صرف یکدم مجھ سے اتنا بہت سا جھوٹ بولا تھا بلکہ انتہائی شاطرانہ انداز میں مجھے کسی سازش میں بھی استعمال کر ڈالا تھا اور اس کے بعد سیدھا موت کے منہ میں بھیج دیا تھا۔ مجھے وہ اس قبیل کا آدمی لگا نہیں تھا۔ ابھی تک میری حیرت ہی دور نہیں ہو پا رہی تھی۔
بہت سی باتوں پر ماتم بھی کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ ماتم میں اپنی عقل پر بھی کر سکتا تھا اور زمانے کے تغیرات پر بھی۔ کیا عجیب بات تھی کہ ڈاکو میرے سامنے اتنے فخر سے اپنے ڈاکو ہونے کا اعلان کر رہے تھے' اتنے ٹھاٹ باٹ سے بیٹھے تھے اور میں ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ میں تو خیر ویسے ہی آج کل بُرا وقت گزار رہا تھا اور اپنی بقا کی جنگ لڑ رہا تھا لیکن ان کا تو شاید پولیس اور دوسرے ادارے بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ وہ کسی کی طرف سے بھی خوفزدہ نظر نہیں آتے تھے۔ مجھے یہ سُن کر بھی حیرت ہوئی تھی کہ ان کے ایسے مخبر بھی تھے جو انہیں اس قسم کی اطلاعات بھی دے سکتے تھے کہ ان کے لیے کون سی بسیں زیادہ 'بار آور' ثابت ہوں گی۔
"ہاں..... تو پھر بتاؤ نا..... مال ساتھ لائے ہو یا کہیں چھپا کر آئے ہو؟" جانو بے تابی سے بولا۔
"میں سچ کہہ رہا ہوں' میرے پاس کوئی مال وغیرہ نہیں ہے۔" میں نے اپنے دل پر لگنے والی فریب خوردگی کی تازہ خراش کی اذیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا۔ "یہ ساری کہانی میرے لیے نئی ہے۔ روحیل خان نے مجھے باتیں اس طرح نہیں بتائی تھیں۔"
"میں نہیں مان سکتا۔ تم اپنے آپ کو اس کا دوست اور پارٹنر کہہ رہے ہو' دوست اور پارٹنر کے ساتھ کوئی اتنی غلط بیانی نہیں کر سکتا۔" جانو ہوا میں ہاتھ جھٹک کر بولا۔
"تم تو دوست اور پارٹنر کی بات کر رہے ہو' اس دنیا میں تو بھائی بھائیوں کے ساتھ اس سے بُرا سلوک کر چکے ہیں' جن میں پیغمبروں کے بھائی بھی شامل ہیں۔ میں تو پھر بھی ایک گناہ گار سا انسان ہوں اور صرف دوست کے جھوٹ کے جال میں پھنسا ہوں۔" میں نے مسکرا کر ماحول کو خوشگوار رکھنے کی کوشش کرتے

ہوئے کہا۔

"مجھے فلسفہ نہیں' مال چاہیے۔" جانو نے ہاتھ پھیلایا حالانکہ وہ مجھ سے کافی فاصلے پر بیٹھا تھا اور کینوس کے جس تھیلے کا وہ ذکر کر رہا تھا' وہ یقیناً کافی بڑا رہا ہوگا لیکن جانو کا ہاتھ پھیلانے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں وہ تھیلا ابھی جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔

"کاش میں تمہیں اپنی بات کا یقین دلا سکتا۔" میں نے اپنے لہجے سے بے بسی ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔

جانو ان تینوں افراد کی طرف متوجہ ہوگیا جو مجھے لے کر آئے تھے۔ اس نے اس نوجوان کو مخاطب کیا جو عام سے قد کاٹھ کا مالک ہونے کے باوجود نہایت خونخوار صورت اور کچھ جنونی سا نظر آتا تھا۔ "مستی خان! تم لوگوں نے گھوڑے کا جائزہ لے لیا تھا؟ اس پر کوئی چیز لدی ہوئی تو نہیں تھی؟"

"نہیں جانو سائیں!" مستی خان نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر جواب دیا۔ "اس کے پاس صرف ایک ریوالور تھا' وہ ہم نے لے لیا۔ گھوڑے پر کچھ نہیں تھا۔" مستی خان کو اس وقت مے سے شغل کرنے کے باوجود مستی چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ معلوم نہیں کیوں وہ شروع سے ہی مجھے کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جیسے مجھ سے اس کی کوئی پرانی دشمنی چلی آرہی ہو۔ شاید وہ اپنے گروہ کے آدمیوں کے علاوہ باقی سب کو اسی طرح دیکھنے کا عادی تھا۔

"دیکھو میری جان......!" جانو سمجھانے والے انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا۔ "اب یا تو اصل بات مجھے بتا دو یا کہیں سے بھی مجھے مال پیدا کرکے دو۔ یہ سب لوگ اپنا اپنا حصہ لینے کے لیے بے چین ہیں اور خمیسو تو نہ جانے کیوں تمہارا پتا ہی صاف کردینے کے لیے بے چین ہے۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کئی بار اشارہ کرکے مجھ سے اجازت طلب کرچکا ہے۔"

خمیسو اس سیاہ رو کا نام تھا جو مار دھاڑ کا بہت شوقین معلوم ہوتا تھا۔ وہ انگارہ سی آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی قدرے پھیلی ہوئی مونچھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مجھے قتل کرنے کے تصور سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ گویا صرف مستی خان ہی نہیں بلکہ خمیسو بھی مجھ پر دانت کچکچا رہا تھا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "حقیقت یہ ہے جانو ڈیئر..... مجھے یہ ہدایت بھی روحیل خان نے ہی کی تھی کہ میں تمہارے سامنے اپنے آپ کو اس کا دوست اور پارٹنر ظاہر کروں ورنہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو اب تک اس کا دوست تو شمار کر رہا تھا لیکن تم جو کچھ کہہ رہے ہو' اگر وہ صحیح ہے اور روحیل خان نے واقعی مجھے اپنی کسی سازش میں استعمال کرنے کی کوشش کی ہے تو میں اس دوستی سے بھی دست بردار ہوتا ہوں۔ میری اس سے شناسائی صرف چند دن کی ہے اور میں یہ اعتراف کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتا کہ اس نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا تھا۔ اگر وہ میرے کام نہ آتا تو میں ویرانے میں بھوکا پیاسا پڑا مرجاتا۔ اس کا یہ احسان اتنا بڑا ہے کہ اس کے عوض میں روحیل خان کے لیے بڑی سے بڑی تکلیف اٹھانے کو تیار ہوں لیکن اس کے لیے اس گدھے نے طریقہ غلط اختیار کیا۔ وہ مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دیتا' میں اس کی خاطر اندھے کنویں میں بھی چھلانگ لگا سکتا تھا لیکن مجھے چکر دینے کی کوشش کرکے اس نے میری نظر میں اپنی عزت گنوائی ہے۔ میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں' میں کسی بھی معاملے میں اس کا پارٹنر وغیرہ نہیں ہوں۔ مجھے تو یہ بھی کل رات ہی معلوم ہوا ہے کہ وہ دراصل ڈاکو ہے۔"

جانو خاموشی سے..... لیکن برہمی آمیز سے انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے ذرا توقف کے بعد کہا "میں اس کا جتنا احسان مند تھا' اس کا ایک ثبوت یہ ہے کہ میں اس کی فرمائش پر ڈاکوؤں والے کپڑے پہن کر نکل کھڑا ہوا اور میں نے باقاعدہ کوشش کرکے انسپکٹر رحیم گل کو اپنے پیچھے لگا لیا۔"

"ہاں..... یہ تو روحیل خان نے بڑا کمال کا کام کیا۔ اسے معلوم تھا کہ رحیم گل جیسے بھوت سے پیچھا چھڑانے کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہیں تھا کہ اسے کسی اور راستے پر ڈالا جائے۔ رحیم گل اسے نہیں جانتا لیکن وہ رحیم گل کے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ شاید اس سے بھی زیادہ جانتا ہے جتنا میں نے تمہیں بتایا ہے......" جانو نے تفہیمی سے انداز میں سر ہلاتے ہوئے یہ سب کچھ کہا لیکن پھر وہ یکدم خاموش ہوگیا اور اس کی نظر ایک بار پھر بدل گئی۔ اس کا موڈ یک لخت پلٹا کھاتا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ قطعی بدلے بدلے سے لہجے میں بولا۔ "مجھے بار بار اپنا بیان بدلنے والے لوگ پسند نہیں ہیں۔ ظاہر ہے وہ لوگ جھوٹے ہی ہوتے ہیں جو کبھی کچھ کہتے ہیں اور کبھی کچھ۔ میں تمہیں صرف ایک موقع اور دے رہا ہوں۔ مجھے بتادو مال کہاں ہے؟ یہ میں آخری بار پوچھ رہا ہوں۔"

"اس سوال کا جواب تو روحیل خان ہی دے سکتا ہے۔" میں نے خاصی عاجزی سے کہا۔ "میرے پاس تو صرف چند سو روپے کی رقم ہے' وہ میں بلا حیل و حجت تمہاری خدمت میں پیش کرسکتا ہوں۔"

یہ کہتے ہوئے میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن میرا ہاتھ جیب سے باہر آنے سے پہلے جانو اس سیاہ رو خمیسو کو اشارہ کرچکا تھا اور وہ یوں اچھل کر میرے سامنے پہنچ چکا تھا جیسے کسی بچے کو اس کی مرغوب ترین چیز نظر آگئی ہو۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا تھا اور اسی پھرتی سے اس نے میری ٹھوڑی پر گھونسا رسید کیا۔ میں اچھل کر پیچھے جا گرا۔ وجہ صرف یہ رہی کہ اس وقت میرا ایک ہاتھ جیب میں تھا اور خمیسو کو چھلانگ لگا کر آگے آتے دیکھ کر میں نے اٹھنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت میں نہ تو صحیح طور پر بیٹھا تھا اور نہ ہی کھڑا تھا جب گھونسا میری ٹھوڑی پر پڑا۔ اسی لیے میں اتنی آسانی سے پیچھے جا گرا لیکن مجھے گرتے دیکھ کر صرف خمیسو کو ہی نہیں' گویا سب کو دلی اور روحانی مسرت ہوئی۔ وہ سب وحشیانہ انداز میں چیخ اٹھے۔

پھر وہ اس طرح پیچھے ہٹ کر دیواروں سے لگ کر بیٹھ گئے جیسے دو پہلوانوں کا دلچسپ مقابلہ دیکھنے کی توقع لیے اپنی نشستیں سنبھال رہے ہوں۔ یہ غنیمت تھا کہ وہ خمیسو کو تنہا ہی مجھ سے نمٹنے کا موقع دے رہے تھے' کوئی اور اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے نہیں اٹھا تھا۔

خمیسو کی گویا دل کی مراد بر آئی تھی۔ اس کے لیے یقیناً یہ ایک دلچسپ کام تھا اور وہ پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہوئے اسے انجام دینا چاہتا تھا۔ میرے گرنے سے تو شاید اس کی خود اعتمادی میں بہت ہی اضافہ ہوگیا تھا۔ اس دوران اس نے مجھے نہیں مارا بلکہ منتظر سے انداز میں کھڑا رہا۔

اس کے ہونٹ تو نظر نہیں آتے تھے' صرف اس کی مونچھوں کے پھیلاؤ سے پتا چلتا تھا کہ کس وقت وہ مسکراتا تھا اور کس وقت سنجیدہ ہوتا تھا۔ اس کی لال لال آنکھیں بھی اس کی مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دیتی تھیں۔ تاہم اس وقت وہ مسکرا رہا تھا۔

اس کا گھونسا بلاشبہ ایک ہتھوڑے کی طرح میری ٹھوڑی پر پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا دماغ ہل گیا تھا اور دانت بھی گویا منہ سے باہر آنے کو بے تاب ہوگئے تھے۔ گو کہ میں دوسرے لمحے ہی سنبھل گیا تھا لیکن نہایت آہستگی سے اٹھ کر اس کے قریب پہنچا۔ وہ قد میں مجھ سے اونچا نہیں تھا لیکن وہ جو پہاڑوں میں ایک خاموش سا تکبر اور نخوت ہوتی ہے' وہ اس کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ وہ میرے قد کاٹھ اور جسمانی ساخت کو قطعاً خاطر میں نہیں لا رہا تھا۔ اس کے سامنے گویا کوئی بچہ کھڑا تھا۔

میں اس کے سامنے جا کھڑا ہوا تب بھی اس نے مجھ پر حملہ نہیں کیا۔ وہ گویا مجھے پورا پورا موقع دے رہا تھا کہ میں بھی جواباً اس پر حملہ کرنے کی کوشش کروں۔ تاثرات کچھ ایسے ہی تھے جیسے بہ زبانِ خموشی کہہ رہا ہو۔ "آؤ چوہے! تم بھی اپنے دل کے ارمان نکال لو۔"

مجھے اس کا دجود نہیں' اس کی خود اعتمادی متاثر کن محسوس ہوئی۔ آدمی خواہ جسمانی طور پر دیو نہ ہو لیکن اگر اس میں ایک دیو کی سی خود اعتمادی موجود ہو تو کوئی بعید نہیں ہوتا کہ وہ دیو جیسا کوئی کارنامہ انجام دے جائے لیکن اس بدبخت کو یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے اندر کیسی آگ سمٹ آئی تھی۔ کس طرح میرا غیظ و غضب ایک نقطے پر مرکوز ہو رہا تھا۔

میں ان لوگوں کے ساتھ جتنی بھی محبت و ملائمت سے کام لے سکتا تھا' لے چکا تھا۔ شاید کسی کو بھی صحیح طور پر اندازہ نہ ہوسکا ہو کہ کب میرا ہاتھ حرکت میں آیا اور کب اس کے منہ پر گھونسا پڑا۔ مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ اس گھونسے کے پیچھے صرف میری ہی طاقت مرکوز تھی یا کوئی اور پُراسرار طاقت بھی سمٹ آئی تھی۔ جب مجھے کچھ زیادہ ہی توہین کا احساس ہوتا تھا تو پھر میرا جوابی حملہ کچھ ایسا ہی ہوا کرتا تھا۔

گھونسا اس کے منہ پر پڑا تو خود کو پہاڑ سمجھنے والا اپنی جگہ سے کم از کم ایک فٹ اونچا اچھلا اور یوں جا کر پچھلی دیوار سے ٹکرایا جیسے کسی نے ربڑ کے گڈے کو اٹھا کر دیوار پر دے مارا ہو۔ دیوار سے ٹکرا کر وہ مردہ چھپکلی کی طرح پٹ سے گرا اور وہیں ساکت ہوگیا۔ مجھے خود بھی ایک لمحے کے لیے یقین نہ آیا کہ میرے صرف ایک گھونسے نے یہ کام دکھا دیا تھا۔ اس طویل و عریض ہال میں موت کا سناٹا چھا گیا۔

بس وہ چند لمحے ہی سکوت میں گزرے' اس کے بعد تو ہال میں گویا بھونچال سا آگیا۔ وحشیوں کا وہ پورا غول ہی یک دم مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ صرف جانو الگ ہو کر ایک کونے میں کھڑا ہو کر گویا تماشا دیکھنے لگا' باقی سب مجھ پر پل پڑے لیکن میں ان کے قابو میں نہیں آیا۔

کسی کو میں نے ہوا میں اچھالا اور کسی کو ایسا گھونسا رسید کیا کہ وہ بری طرح ڈکراتا ہوا ڈھیر ہوا اور اپنے ہی ساتھیوں کے پیروں تلے کچلا جانے لگا۔ میں نے خونخوار سی صورت والے کو بھی اپنے اوپر جھپٹتے دیکھا لیکن اس میں جتنی تیزی' تندی اور خونخواری نظر آرہی تھی' اتنی ہی جلدی اس کی چھٹی ہوگئی۔ ایک ہی گھونسے میں اس کی شکل بدلتی ہوئی سی دکھائی دی۔ وہ ہجوم میں ایک طرف کو گرا اور پھر دکھائی نہیں دیا۔

میں گھونسے' لاتیں' ٹکریں سب کچھ چلا رہا تھا اور جس داؤ کا بھی موقع مل رہا تھا وہ استعمال کر رہا تھا۔ ہال میں چیخیں' غراہٹیں اور کراہیں ابھر رہی تھیں۔ گلاس ٹوٹ رہے تھے' بوتلیں لڑھک رہی تھیں۔ غنیمت تھا کہ ہال میں فرنیچر نہیں تھا ورنہ فرنیچر بھی ٹوٹتا اور اس کے ساتھ ہڈیاں بھی زیادہ تیزی سے ٹوٹتیں۔

مجھے خود بھی صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں کتنی تیزی سے چل رہے تھے۔ فوری طور پر تو میرے سامنے بس ایک ہی مقصد رہ گیا تھا' میں انہیں احساس دلانا چاہتا تھا کہ اگر میں ان کے سامنے اتنے تحمل' اتنی نرمی بلکہ عاجزی سے گفتگو کر رہا تھا تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ مجھے انسان کے بجائے کیڑا مکوڑا سمجھ لیا جاتا۔

مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ مجھ پر بھی گھونسے اور لاتیں وغیرہ برس رہی تھیں یا نہیں۔ اسی دوران میں نے ان میں سے کسی کو چھت کی طرف اچھالا۔ چھت ویسے بھی کچھ زیادہ اونچی نہیں تھی۔ وہ سیدھا چھت سے ہی جا ٹکرایا اور نیچے واپس آیا تو اپنے ساتھ فانوس بھی لے آیا۔ فانوس نیچے گر کر کچھ بکھر سا گیا۔

اس دوران ہال کا اندرونی دروازہ کھل چکا تھا۔ میں نے سونیا کو دروازے' کھڑے دیکھا۔ میں اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ سکا۔ ظاہر تھا اس وقت میں اس کی طرف ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھ

سکتا تھا تاہم اس ایک جھلک میں بھی میں نے اسے مسکراتے دیکھا۔ یقیناً وہ عام عورت نہیں تھی۔ درندوں کی اس کچھار میں رہنے والی عام عورت ہو بھی نہیں سکتی تھی۔ اگر وہ عام عورت ہوتی تو ہال میں برپا خوفناک ہنگامہ دیکھ کر رونے اور چیخیں مارنے لگتی۔

اس نے رونے اور چیخنے کے بجائے ایک ڈاکو کی کمر پر لات رسید کی جو پہلے ہی میری لات کھا کر دروازے تک چلا گیا تھا اور اگر سونیا بروقت اسے لات رسید کر کے دوبارہ آگے نہ پھینکتی تو وہ اُلٹے قدموں اس سے جا ٹکرایا ہوتا۔

میرے گرد بھیڑ چھٹ گئی۔ انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ سب مل کر بھی مجھے قابو میں نہیں کر سکتے تھے چنانچہ ان میں سے دو تین نے گنیں اٹھا لیں تاہم انہوں نے فائر کرنے کے بجائے انہیں نال کی طرف سے پکڑ کر ہتھوڑوں کی طرح استعمال کرنا چاہا۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ کسی بھی گن کا دستہ اگر میری کھوپڑی پر پڑ جاتا تو اسی لمحے ساری جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا۔

میں نے چند سیکنڈ ان واروں سے بھی نہ صرف اپنے آپ کو بچایا بلکہ ایک کی گھومتی ہوئی گن کا دستہ دوسرے کی کمر پر بھی پڑوا دیا۔ وہ بلبلا کر اوندھے منہ ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اگر میں پیچھے ہٹ کر دیوار سے نہ لگ گیا ہوتا تو تیسرے آدمی کی گھمائی ہوئی گن کا دستہ میری کھوپڑی کو کم از کم دو حصوں میں تو تقسیم کر ہی دیتا لیکن ادھر اس کی گن نیچے گئی اور اُدھر میں نے اس کی پسلیوں پر لات رسید کی۔ وہ تقریباً جانو کے قدموں میں جا گرا۔

دفعتاً جانو دہاڑا۔ "بند کرو یہ دھینگا مشتی۔"

اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اب تک وہ کوئی دلچسپ تماشا دیکھ رہا تھا لیکن چونکہ وہ ایک سنجیدہ و متین شخص تھا اس لیے تماشے کے بارے میں کھل کر اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکتا تھا لیکن اب تماشا اس کی مرضی کے بالکل برعکس رخ اختیار کر گیا تھا' اب اسے روکنا ضروری ہو گیا تھا۔

جو لوگ ابھی تک حرکت کرنے کے قابل تھے' وہ رک گئے۔ مجھے اپنے سامنے ہی ایک کلاشنکوف پڑی نظر آئی۔ میں اسے اٹھانے کے لیے جُھکا ہی تھا کہ جانو کی سرد آواز سنائی دی۔ "اب زیادہ ہوشیار بننے کی بھی ضرورت نہیں۔ میں نے اس لیے لڑائی بند نہیں کرائی ہے۔"

میں جھکتے جھکتے بروقت ہی رک گیا کیونکہ مجھے جانو کے ہاتھ میں ٹی ٹی نظر آ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر برہمی تھی۔ یہ برہمی شاید میرے لیے بھی تھی اور اپنے ساتھیوں کے لیے بھی لیکن اس کے عقب میں کھڑی سونیا میری طرف دیکھتے ہوئے دوستانہ سے انداز میں مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں کچھ مخمور سی تھیں اور ان کے گرد حلقے تھے۔ وہ اب بھی سگریٹ ہولڈر انگلیوں میں دبائے کھڑی تھی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے مجھے آنکھ ماری۔ میں گڑبڑا کر رہ گیا۔

میں نے اپنے چہرے سے کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا لیکن جانو کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی اس کے عقب میں موجود تھا۔ اس نے گردن ذرا ترچھی کر کے سونیا کی طرف دیکھا اور ناگواری سے حکم دیا۔ "تم یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو؟ اندر جاؤ....."

"شو ختم ہو گیا کیا؟" وہ اطمینان سے بولی۔

"شوکی بچی....!" جانو نے دانت پیسے۔ "میں کہتا ہوں اندر جاؤ۔"

وہ ذرا بھی مرعوب ہوئے بغیر اسے بھی آنکھ مار کر بولی۔ "میں تو کہتی ہوں' تم اب گروہ کی سرداری سے ریٹائرمنٹ لے لو اور اس جوان کو سردار بنا دو....." اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ اس کی انگلیوں میں ہیروں کی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ "اسے سردار بنا کر شاید تم زیادہ فائدے میں رہو۔ یہ تو پورا فلمی ہیرو ہے۔ ریڈی میڈ سردار ثابت ہوگا۔ اس پر محنت نہیں کرنی پڑے گی۔"

"ایک تو تمہیں موقع محل دیکھے بغیر ہر وقت بکواس کرنے کی عادت ہے۔" جانو برہمی سے بولا۔ "میں کہتا ہوں اندر جاؤ۔"

"جا رہی ہوں.... جا رہی ہوں۔" وہ ناک چڑھا کر بولی۔ "میں جانتی ہوں' مجھے تو اندر ہی پڑے پڑے گل سڑ کر مرنا ہے۔"

اس نے کھٹ سے دروازہ بند کر لیا۔ اس دوران جانو کے ایک آدمی نے میرے قریب پڑی ہوئی کلاشنکوف اور دوسری دو تین گنیں بھی اٹھا لی تھیں۔ اب کوئی گن میری رسائی میں نہیں تھی۔ کم از کم آسانی سے تو میرے ہاتھ نہیں لگ سکتی تھی۔ مجھے اپنے جسم میں کئی جگہ چوٹوں کا درد محسوس ہو رہا تھا۔ چہرے پر چپ چپاہٹ بھی محسوس ہوئی۔ ہاتھ پھیر کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ میرے نچلے ہونٹ سے خون رِس رہا تھا۔

جانو کے تین ساتھی بے ہوش تھے جنہیں ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اب مجھے صرف دروازے پر کھڑے ہوئے مڈرم نما شخص نے اپنی اسٹین گن سے کور کر رکھا تھا۔ دھینگا مشتی میں اس نے حصہ نہیں لیا تھا اور اپنے ساتھیوں کی دُرگت بنتے دیکھ کر بھی گولی نہیں چلائی تھی۔ تاہم اس کے چہرے سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ صرف جانو کے اشارے کا منتظر تھا ورنہ کب کا مجھے چھلنی کر چکا ہوتا۔

جانو نے ٹی ٹی دوبارہ اپنے لباس میں کہیں چھپا لیا تھا اور کسی پُر جلال لیکن متفکر شہنشاہ کی طرح کمر پر ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگا تھا۔ گمیسو اسی طرح بے حس و حرکت پڑا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں لیکن وہ ابھی تک کسمسایا بھی نہیں تھا۔ شاید دیوار سے ٹکرا کر اس کے سر میں کچھ زیادہ ہی چوٹ آ گئی تھی لیکن جانو کو اس کے یا اپنے کسی بھی بے ہوش ساتھی کے بارے میں شاید کوئی تشویش نہیں تھی۔

چند لمحے بعد جانو ٹہلتے ٹہلتے رک گیا اور پُرخیال انداز میں

میری طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ "مجھے لگتا ہے' تم سچ بول رہے ہو۔"

پھر وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔ "شاید روحیل خان نے اس شخص کو بھی اپنی سازش میں استعمال کیا ہے۔ اصل گڑبڑ وہی کر رہا ہے۔ مجھے پہلے ہی شک ہو رہا تھا کہ کچھ عرصے سے وہ کسی لمبے چکر میں ہے۔ شاید وہ ہم سب کو چونا لگا گیا ہے۔"

"ممکن ہے' مال کا تھیلا اس سے راستے میں کہیں گر گیا ہو؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔ میں اب بھی روحیل خان کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن یہ محض ایک رائے تھی۔ مجھے روحیل خان پر اندھا بھروسا نہیں رہا تھا۔

جانو عجیب سے انداز میں مسکرایا۔ "اس نے تمہیں مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور تم اب بھی اس کی پوزیشن صاف کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ بہت ہی سادہ آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

"شکر ہے تمہیں میری سادگی اور سچائی کا احساس تو ہوا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "تم پہلے بھی اتنی ہی معقولیت سے بات کر سکتے تھے۔ اتنی دھما چوکڑی مچانے اور اتنا ہنگامہ برپا کروانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"سچائی کو ذرا پرکھنا بھی پڑتا ہے نا۔" وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔ وہ بدبخت کچھ اذیت پسند معلوم ہوتا تھا۔ وہ گویا مجھ سمیت سب لوگوں کی حالت سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ "آدمی کے بارے میں اگر دل مان بھی رہا ہو کہ وہ سچ بول رہا ہے تب بھی ٹھونک بجا کر دیکھ لینے میں کیا حرج ہے؟"

"تمہارے خیالات پولیس والوں سے بہت ملتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "بعض اوقات انہیں بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملزم سچ بول رہا ہے' اس کے باوجود وہ اپنے عقوبت خانوں میں اس کا حشر خراب کرتے رہتے ہیں۔"

"چلو..... یہ بھی اچھی بات ہے کہ تمہیں پولیس والوں کی عادات کا اندازہ ہے۔ اب تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ جب تم انسپکٹر رحیم گل کے ہتھے چڑھو گے تو تمہارا کیا حشر ہوگا۔" جانو گویا اس وقت کا تصور کرتے ہوئے محظوظ ہو رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ "تم یہ احمقانہ خیال دل سے نکال دو کہ مال کا تھیلا روحیل خان سے کہیں گر گیا ہوگا۔ ڈاکوؤں کے ہتھیار گر جاتے ہیں' وہ جان دے دیتے ہیں لیکن مال کو گرنے نہیں دیتے۔ اگر کسی طرح ایسا ہو بھی جاتا تو روحیل خان سیدھے سادے طریقے سے ہمیں پیغام بھجوا سکتا تھا کہ ایسا ہو گیا ہے لیکن اسے معلوم ہے کہ اگر ایسا کوئی واقعہ ہو جائے تو ہم ڈاکو لوگ اپنے طور پر اس کی تحقیقات کرتے ہیں کہ واقعی ایسا ہوا ہے یا ہمارا کوئی ساتھی ہمیں چکر دینے کی کوشش کر رہا ہے۔ روحیل خان کے دل میں چور ہوگا اس لیے اس نے ایسا پیغام نہیں بھیجا۔"

پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ "خیر۔ اس معمے کو صرف روحیل خان ہی حل کر سکتا ہے لیکن فی الحال ہم اس کی طرف نہیں جا سکتے' اس میں بڑا خطرہ ہے۔ شاید اب تک علاقے میں پولیس ہی نہیں' رینجرز بھی پھیل چکے ہوں اور اگر روحیل خان کا ذہن سازش کے راستے پر چل ہی پڑا ہے تو شاید اس نے ہمارے لیے بھی کوئی بندوبست کیا ہو۔ ہمیں پھنسوانے یا مروانے کی کوئی ترکیب سوچ رکھی ہو۔ ابھی کچھ دن ہمیں اپنے اپنے بِل میں سر چھپا کر ہی رہنا ہوگا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور کچھ سوچ کر بڑی بے پروائی سے بولا۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی سیٹھ صاحب ملازمت کے کسی امیدوار کا رسمی سا انٹرویو لے کر فارغ ہوئے ہوں اور جان چھڑانے کے لیے کہہ رہے ہوں' اب تم جا سکتے ہو'۔

"یہ بات تم پہلے بھی کہہ سکتے تھے۔ اتنی مار پیٹ کرانا ضروری تھا؟" میں نے ناگواری سے کہا۔

"شکر کرو اب بھی کہہ رہا ہوں۔" وہ تُند لہجے میں بولا۔ "تم تو بہت ہی ناشکرے معلوم ہوتے ہو۔ اپنے پیروں پر چل کر صحیح سلامت جا رہے ہو۔ اس پر خدا کا شکر ادا نہیں کر رہے۔"

"خدا کا شکر تو میں ادا کر رہا ہوں۔ کاش تم نے ایسا سلوک کیا ہوتا کہ تمہارا شکریہ بھی ادا کر سکتا۔" میں نے کہا۔

"اتنے مشکوک نظر آنے کے باوجود اس ڈیرے سے زندہ جا رہے ہو..... تمہیں اندازہ ہی نہیں ہے کہ یہ کتنا زیادہ شکر کا مقام بھی ہے اور شکریے کا بھی۔" جانو غرایا۔

اسی دوران میری نظر اندرونی دروازے کی طرف گئی۔ میں نے دیکھا' سونیا ایک بار پھر دروازے پر کھڑی تھی۔ اب اس کا انداز ذرا مختلف تھا۔ سگریٹ ہولڈر اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دیے' گردن ٹیڑھی کیے کچھ اس طرح کھڑی تھی گویا کوئی بچی کلاس روم میں بلیک بورڈ پر لکھا ہوا سوال سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔

میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ ہمدردانہ سے انداز میں مسکرا دی۔ اس نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بڑی ادا سے میری طرف قدم بھی بڑھانے لگی۔ اس کی چال میں بڑا طلسماتی سا ردھم تھا جیسے وہ کسی ایسی موسیقی کی دُھن پر قدم اٹھا رہی ہو جو صرف اسے ہی سنائی دے رہی تھی۔

مگر دوسرے ہی لمحے مجھے کچھ یوں لگا جیسے اس کا تو اپنا وجود ہی مختلف سازوں کا ایک حسین مجموعہ تھا۔ ہر ساز کی اپنی ایک لے' اپنی ایک دُھن تھی جو ساز کی گرفت سے نکل کر الگ الگ سمتوں میں پرواز کر جانا چاہتی تھی مگر نہ جانے کون سی قوت ان ساری تھرکتی صداؤں کو ایک سراپا میں سمیٹے ہوئے تھی۔

قریب آ کر اس نے سب کی چُبھتی ہوئی نظروں کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنے اسکرٹ کی جیب سے ایک خوبصورت اور خوشبودار رومال نکالا اور میرا منہ پونچھنے لگی۔ میری قمیص کے بٹن ٹوٹ چکے تھے۔ ایک بٹن باقی تھا' وہ بھی لٹک رہا تھا۔ گریبان پھٹ چکا تھا لیکن سونیا نے میرا منہ پونچھنے کے بعد اس لٹکے ہوئے بٹن کی مدد سے ہی میرے گریبان کو کسی حد تک بند کرنے کی کوشش کی۔ یہ سارا عمل بے حد خوبصورت تھا۔

پھر وہ سر اٹھا کر نشیلی سی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم شہ زور ہی نہیں' خوش قسمت بھی ہو۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس وقت قریب ہی جنگل میں کہیں اس کی قبر کھُد رہی ہوتی لیکن ہوشیار رہنا' شاید جانو نے تمہارے لیے اس سے برا کوئی انجام سوچ رکھا ہو۔"

میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ جانو کے سامنے ہی مجھے جانو کے کمینے پن سے خبردار کر رہی تھی۔ وہ واقعی عجیب عورت تھی۔

جانو شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے دہاڑا۔ "اب بس بھی کر فلورنس نائٹ انگل کی اولاد..... اب کہیں اسے لٹا کر اس کی مرہم پٹی مت شروع کر دینا۔ کوئی بھی اچھا سا چہرہ دیکھتے ہی تمہاری ہمدردیاں جاگ اٹھتی ہیں۔ اپنے آپ میں رہا کرو ورنہ کھال کھینچ کر کسی درخت پر لٹکوا دوں گا۔"

میں اس کی زبان سے فلورنس نائٹ انگل کا نام صحیح تلفظ کے ساتھ سن کر چونکا۔ شبہ مجھے پہلے بھی ہو رہا تھا کہ وہ پڑھا لکھا شخص تھا' اب تو یقین سا ہونے لگا۔

سونیا نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے ظاہر کرنا چاہتی ہو کہ اسے جانو کی کوئی پروا نہیں لیکن اس کی آنکھوں میں لرزتی ہوئی کچھ پرچھائیاں بتا رہی تھیں کہ دل ہی دل میں وہ اس سے خوفزدہ ضرور تھی۔ اس نے برا سا منہ بنا کر "اونہہ!" کہتے ہوئے پاؤں پٹخا لیکن واپس دروازے پر چلی گئی۔ تاہم وہ اندر نہیں گئی' چوکھٹ سے لگ کر کھڑی ہو گئی۔

جانو برہمی سے میری طرف دیکھتے ہوئے گرجا۔ "اب دفع بھی ہو جاؤ یہاں سے۔ یہاں کھڑے کھڑے تم ہیرو نہیں بن جاؤ گے۔ اس عورت کے چکر میں نہ آنا۔ مردوں کو یونہی الّو بنانا اس کا مشغلہ ہے۔ یہ مت سمجھ لینا کہ سچ مچ تم پر فدا ہو گئی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ اگر سونیا سچ مچ بھی مجھ پر فدا ہو جاتی تو میرے لیے کیا فرق پڑتا تھا؟ میں تو اس وقت کچھ اور ہی طرح کے حالات میں پھنسا ہوا تھا۔ میری ضرورتیں کچھ اور ہی تھیں۔ زندگی کی کٹھنائیوں میں رومانس کے تصور کی سنسنی بھی کہیں کھو گئی تھی۔

جانو اب بغور میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ میرا چہرہ سپاٹ رہے۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ تیزی سے بولا۔ "اگر تم واقعی سچے ہو اور اس علاقے میں اجنبی ہو تو جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ کسی شہر کا رخ کرو ورنہ بے موت مارے جاؤ گے۔ رحیم گل جلد ہی کمک طلب کر کے اس علاقے کو کھنگال ڈالے گا' چاہے اس کام میں اسے مہینوں لگ جائیں۔ کوئی بعید نہیں کہ اب تک وہ کمک طلب بھی کر چکا ہو۔ وہ خود بھی کسی گروہ سے کم نہیں۔ وہ اکیلا ہی ایک پلٹن کے برابر ہے۔ اس سے نمٹنا تو صرف ہم جانتے ہیں۔ تم اس کی دسترس سے دور جانے کی فکر کرو۔ مجھے تم پر رحم آ گیا ہے اس لیے تمہاری جان بھی بخش دی ہے اور صحیح مشورہ بھی دے رہا ہوں۔"

حالانکہ اس وقت مجھے غصہ نہیں آ رہا تھا۔ میں اپنا غصہ ان لوگوں پر نکال چکا تھا لیکن نہ جانے کیوں غیر ارادی طور پر میرے منہ سے نکلا۔ "اپنے پاس ہی رکھو اپنا رحم بھی اور اپنا مشورہ بھی۔"

میں ان میں سے ہر ایک کی شکل بہت غور سے دیکھ چکا تھا اور میری آنکھیں کیمرے کی طرح وہ سب بے ہنگم سی شکلیں یادداشت کے انتہائی محفوظ خانوں میں ترتیب وار ڈالتی جا رہی تھیں۔ مجھے یقین تھا کہ میں ان میں سے کوئی سی بھی شکل کبھی نہیں بھولوں گا۔ محبت بھی بڑے کرشمے دکھاتی ہے اور نفرت بھی۔ محبت کے بنائے ہوئے نقوش بھی کبھی نہیں مٹتے اور نفرت کے بنائے ہوئے بھی۔ ان سب سے مجھے بڑی نفرت محسوس ہوئی تھی۔ وہ سب تمسخرانہ سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے اور شاید میرے مجبور غصے سے محظوظ ہو رہے تھے۔

میں تیزی سے مڑا اور دروازے کی طرف بڑھا لیکن ڈرم نما شخص اسٹین گن کا رخ میرے سینے کی طرف کیے میری راہ میں حائل تھا۔ عقب سے چار اور ڈاکو گنیں لیے میرے قریب آ گئے۔ ان میں سے ایک بولا۔ "ایسے نہیں میری جان! جیسے آئے ہو ویسے ہی جاؤ گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔"

وہ مجھے باہر لائے۔ تین آدمی مجھے گنوں کی زد پر لیے کھڑے رہے جبکہ ایک نے دوبارہ میرے ہاتھ پشت پر باندھ دیے اور میری آنکھوں پر سیاہ کپڑا بھی لپیٹ دیا گیا۔ سہارا دے کر مجھے گھوڑے پر بٹھایا گیا۔ چند لمحے بعد گھوڑا چل پڑا۔ میں دوسرے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز بھی سن رہا تھا۔ وہ چاروں ہی غالباً میرے ساتھ جا رہے تھے۔ پیرل' گمیسو اور مستی خان میں سے کوئی ان میں شامل نہیں تھا۔

اس بار سفر مجھے پہلے سے زیادہ طویل محسوس ہوا۔ خدا خدا کر کے ایک جگہ گھوڑا رکا اور انہوں نے میری آنکھوں سے کپڑا کھول دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے وہیں لے جا کر چھوڑیں گے جہاں سے لے کر آئے تھے۔ جانو کے اس اڈے سے میرے لیے حاصل آباد جانا آسان ہوتا لیکن وہ لوگ اب مجھے کہیں اور ہی لے آئے تھے۔

شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے اور اس دُھندلکے میں جہاں تک نظر کام کر رہی تھی' ویرانی ہی دکھائی دے رہی تھی۔ بہت دور کہیں چٹانوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ سورج تقریباً ڈوب

ہی چکا تھا تاہم ابھی شفق کی سرخی سے سمت کا اندازہ کرنا زیادہ مشکل نہیں تھا۔

میرے ساتھ آنے والے چاروں افراد کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ڈاکو تھے۔ وہ نہایت نفیس قسم کی شلوار قمیصوں میں تھے۔ پیروں میں شاندار جوتے تھے۔ عمدہ واسکٹیں زیب تن کیے ہوئے تھے۔ سروں پر کلف لگی سفید پگڑیاں تھیں۔ میرے ساتھ دھینگا مشتی میں ان کے حلیے ذرا خراب ہوئے تھے لیکن زیادہ میرا ہی حلیہ خراب ہوا تھا کیونکہ میں اکیلا تھا۔ تاہم وہ اب بھی معززین ہی نظر آرہے تھے جبکہ میں ڈاکو دکھائی دے رہا تھا۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں تھی۔ معاشرے کا چلن ہی کچھ ایسا ہو گیا تھا۔ ڈاکو معزز دکھائی دیتے تھے' شرفا چور چور سے نظر آتے تھے۔

جس نے میری آنکھوں سے کپڑا ہٹایا تھا' اس کا گھوڑا میرے گھوڑے سے تقریباً جڑا کھڑا تھا۔ وہ حقارت آمیز انداز میں میرے منہ پر طمانچہ رسید کرکے بولا۔ "جا اُڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیس ہوا بیگانہ۔ عیش کر پٹھے! تیری قسمت اچھی تھی۔"

میرے ہاتھ ابھی بندھے ہوئے تھے۔ میرے اندر بل کھاتے ہوئے نفرت کے آتش فشاں نے ایک مجبور سی کروٹ لی۔ میں نے طمانچہ مارنے والے کو موٹی سی گالی دیتے ہوئے کہا۔ "تم جیسے لوگوں کی پہچان یہی ہوتی ہے کہ وہ تعداد میں کہیں زیادہ ہوتے ہوئے' ہاتھوں میں اسلحہ رکھتے ہوئے بھی ایسے نہتے لوگوں کو مارتے ہیں جن کے ہاتھ تک بندھے ہوتے ہیں۔" یہ کہہ کر میں نے اس کے منہ پر تھوکنے کی بھی کوشش کی لیکن اس نے پھرتی سے سر جھکا کر اپنے آپ کو بچالیا۔

وہ سیدھا ہو کر سفاکانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ "ابھی تمہاری حسرت پوری کردیتا ہوں۔" اس نے پھرتی سے میرے ہاتھوں کی بندشیں کھول دیں اور بولا "تمہیں شاید اپنے بارے میں بہت خوش فہمی ہو گئی ہے۔ اس بے ہودہ بھگدڑ اور افراتفری میں ہم تمہیں بقابو میں نہیں کرسکے اور اتفاق سے ممیسو پر بھی تمہارا ذرا صحیح ہاتھ پڑ گیا لیکن میں ممیسو نہیں ہوں۔ یہاں ذرا کھلے میدان میں دیکھ لیتے ہیں تم کتنے پانی میں ہو۔"

"تم واقعی ممیسو نہیں ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے اسے نظروں ہی نظروں میں تولا۔ "وہ تو ایک گھونسا سہہ بھی گیا تھا' تم شاید وہ بھی نہ سہہ سکو۔ تم آٹھ دس کتے کے پلّے مل کر کچھ نہیں کرسکے' اب اکیلے تم کون سا پہاڑ توڑ لو گے؟"

میرے ہاتھ کھل چکے تھے' پاؤں پہلے ہی آزاد تھے اور جب میرے ہاتھ پاؤں کھلے ہوتے تھے تو میں آتشیں ہتھیاروں کے سامنے بھی اپنے آپ کو پُراعتماد محسوس کرتا تھا۔ گو ذہن کے کسی تاریک گوشے میں اندیشے تو موجود رہتے تھے لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ بعض اوقات کسی کی فرعونیت دیکھ کر میرے لیے خاموش رہنا مشکل ہو جاتا تھا۔ اپنے آپ پر ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بھی کچھ نہ کچھ کہہ جاتا تھا۔ میں پوری طرح چوکنا تھا کہ میرے الفاظ پر کسی کی غیرت یکایک کچھ زیادہ نہ جاگ اٹھے اور وہ اسٹین گن یا کلاشنکوف استعمال کرنے کا فیصلہ نہ کر ڈالے۔

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس کی وجہ مجھے بعد میں معلوم ہوئی۔ وہ اپنے سردار کے احکامات پر حرف بہ حرف عمل کرنے کے عادی تھے۔ میں نے جسے گالی دی تھی' وہ بھی جواباً مجھے اس سے موٹی گالی دے کر گھوڑے سے چھلانگ لگاتے ہوئے بولا "ذرا نیچے آ....."

میں گھوڑے سے اترنے لگا تو ایک اسٹین گن والے نے نال میرے سینے پر ٹکاتے ہوئے کہا۔ "بس... بس... زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔"

پھر وہ اسی گن کا رخ اپنے ساتھی کی طرف موڑتے ہوئے بولا۔ "رک جاؤ گلاب! جانو نے جتنا بولا ہے اتنا ہی کرو۔ اس سے کم نہ اس سے زیادہ۔ ہم میں سب سے زیادہ عقل والا وہی ہے' وہ بہتر سمجھتا ہے کہ ہمیں کس وقت کیا کرنا چاہیے۔ اگر اس آدمی کو مارنا ہوتا تو کیا وہ اپنے سامنے نہیں مروا سکتا تھا؟"

وہ شخص جسے گلاب کے نام سے مخاطب کیا گیا تھا' مجھے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوا گویا بادل نخواستہ اپنے گھوڑے پر جا بیٹھا۔ سردار کا نام سنتے ہی گویا اس کی عقل اور حواس دوبارہ اعتدال سے کام کرنے لگے تھے۔ ناموں کے سلسلے میں مجھے اکثر و بیشتر اپنی زندگی میں قدم قدم پر جو تضادات دیکھنے کا موقع ملتا تھا' وہ بھی اس کی ایک مثال تھا۔ نام اس کا گلاب تھا لیکن وہ سرتاپا ایک خاردار جھاڑی تھا' ببول تھا۔ وہ اور کچھ بھی ہو سکتا تھا' گلاب ہرگز نہیں ہو سکتا تھا۔ گلاب والی کوئی ایک خصوصیت بھی اسے چھو کر نہیں گزری تھی۔

وہ سانولا اور کرخت صورت تھا۔ اس کی آواز تک کھردری تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ تگڑا اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس نے اپنی جسمانی طاقت کے بل پر کچھ کارنامے بھی دکھائے ہوں جن کی وجہ سے وہ اپنے بارے میں گھمنڈ میں جتلا ہو۔ اس کی شخصیت میں کچھ کچھ روحیل خان کی جھلک تھی۔

جس گھڑ سوار نے گلاب کو زیادہ بھڑکنے سے روکا تھا' میں نے اس سے پوچھا۔ "اگر میں حاصل آباد جانا چاہوں تو مجھے کس سمت میں سفر کرنا چاہیے؟"

"اس سمت میں۔" اس نے انگلی سے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔ "ویسے ایک بات بتادوں۔ حاصل آباد جاکر بھی تمہیں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ جدھر دل چاہے' منہ اٹھا کر پھرتے رہو' تمہارے لیے ایک ہی بات ہے۔"

صاف ظاہر تھا کہ وہ میری رہنمائی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اس سے مزید کچھ نہ پوچھا۔ یہ بات بھی عجیب سی تھی کہ انہوں نے زیادہ تفصیل سے میری تلاشی نہیں لی تھی۔ نقشہ میری جیب میں

اب بھی موجود تھا لیکن میں ان کی موجودگی میں اسے کھول کر دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔

جب تک وہ رخصت ہوئے تب تک اندھیرا کچھ اور گہرا ہو چکا تھا۔ نقشہ دیکھنا تقریباً ناممکن ہو چکا تھا۔ اس کے رنگ بہت دھندلے اور حروف و نشانیاں بہت باریک تھیں۔ کوشش کی گئی تھی کہ اس کا سائز زیادہ بڑا نہ ہونے پائے اور اس میں زیادہ سے زیادہ علاقہ کور کرلیا جائے۔ وہ نقشوں والے مخصوص کاغذ پر بنا ہوا تھا اس لیے خاصا بوسیدہ ہونے کے باوجود ابھی پھٹا نہیں تھا۔

میں نے نقشے والی جیب کو تھپتھپایا اور گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ میری اور تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا' فی الحال میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ پہاڑیوں کی سمت میں ہی سفر کروں۔ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا لیکن سُرمئی آسمان کے پس منظر میں ان پہاڑیوں کے ہیولے مجھے اب بھی نظر آرہے تھے۔ پہاڑیوں میں عام طور پر کوئی نہ کوئی ایسی جگہ ل جاتی ہے جہاں موسم کی نامہربانیوں سے قدرے محفوظ رہتے ہوئے رات گزاری جاسکتی ہے۔ چنانچہ میں نے اسی سمت میں سفر جاری رکھا۔

میرے پہاڑیوں کے قریب پہنچنے تک ابتدائی تاریخوں کا چاند بھی نکل آیا۔ چاروں طرف نہایت معمولی سی روشنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا' پہاڑیاں تو سنگلاخ تھیں لیکن نیچے ارد گرد سبزہ موجود تھا۔ چھوٹی موٹی گھاٹیاں بھی تھیں جن میں بارش کا پانی جمع تھا۔ میں نے گھوڑے کی لگام نکال کر اسے کھلا چھوڑ دیا اور خود ایک کھائی کے کنارے بیٹھ کر ذرا "تفصیل" سے ہاتھ منہ دھونے لگا۔

میرا یہ ہاتھ منہ دھونا آدھا نہانے کے برابر تھا۔ پانی کی تاثیر بڑی فرحت بخش سی تھی۔ قدرت نے اپنے بعض جوہڑوں اور ری نالوں میں بھی نہ جانے کیا کیا خصوصیات سموئی ہوتی ہیں۔ ہاتھ نہ دھونے کے بعد میں نے اپنے آپ کو بے حد تازہ دم محسوس کیا۔ اب مجھے صرف اپنا سیاہ لباس گراں گزر رہا تھا لیکن فی الحال ے جسم پر چڑھائے رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

چند منٹ ادھر اُدھر گھومنے پھرنے کے بعد آخر کار مجھے شب ری کے لیے بھی ایک مناسب جگہ مل ہی گئی اور میں ایک پتھر ہانے رکھ کر لیٹ گیا۔ گھوڑا عموماً کھڑے کھڑے ہی سو جاتا ہے یکن میں نے اسے قریب ہی ایک ہموار جگہ پر بٹھالیا تھا۔ فی الحال گھوڑا میرے لیے بہت اہم تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رات کے کی پہر وہ یونہی منہ اٹھا کر کسی طرف نکل جائے۔ لگتا تو یہی تھا کہ وہ ب مجھ سے مانوس ہو چکا تھا لیکن حیوان بہرحال حیوان ہے۔ اس ے بارے میں یقین سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ ویسے بھی میں ں کا اصل مالک نہیں تھا۔ فی الحال وہ میرا جتنا ساتھ دے رہا تھا ا بڑا غنیمت تھا۔ پیدل تو بیکراں ویرانوں میں پھرتے پھرتے نہ نے میرا کیا حشر ہوتا۔

خلافِ توقع مجھے بڑی اچھی نیند آئی۔ شاید مشکلیں اتنی پڑ چکی تھیں کہ اب ان کے آسان ہونے کا مرحلہ شروع ہو گیا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا کہ شاید لاشعوری طور پر میں اس سارے سلسلے کو اپنے لیے مصیبت کے بجائے ایڈونچر محسوس کرتے ہوئے اس سے محظوظ ہو رہا تھا۔ شاید میں خود بھی ان 'مصائب' سے نکلنے کا کچھ زیادہ شدت سے خواہش مند نہیں تھا۔ یہ ایک عجیب ہی کیفیت تھی۔

صبح بیدار ہونے پر میں اپنے آپ کو بالکل چاق و چوبند محسوس کر رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے جو چوٹیں لگ چکی تھیں وہ ٹھنڈی ہونے کے بعد تکلیف دیں گی لیکن تکلیف اُلٹا کم ہو چکی تھی۔ کچھ کھانے کی طلب ضرور محسوس ہو رہی تھی لیکن بھوک اتنی نہیں تھی کہ میں بے چین ہو جاتا۔

میں ایک بار پھر منہ ہاتھ دھو کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ گھوڑا بھی تازہ دم نظر آرہا تھا۔ میرے تین طرف پہاڑیوں نے دائرہ سا بنایا ہوا تھا۔ چوتھی سمت میں گویا ویران' چٹیل اور نیم صحرائی میدانوں کی طرف جانے کے لیے دروازہ کھلا تھا۔

اب سورج نکل آیا تھا۔ مجھے ایک بار پھر نقشہ یاد آیا۔ میں نے گھوڑے پر بیٹھے ہی بیٹھے اسے جیب سے نکال کر پھیلایا۔ اس میں ایک نہیں بلکہ تین مقامات پر اس طرح نیم دائرے میں پہاڑیوں کی نشاندہی کی گئی تھی۔ اب میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں ان میں سے کس سلسلے کے پاس کھڑا تھا۔ جانو کے آدمیوں نے ایک طویل سفر کے دوران میری آنکھوں پر پٹی باندھ کر گویا مجھے بھٹکا دیا تھا۔ اگر تمام نشانیاں میری نظر سے گزرتی رہتیں تو میرے لیے یہ تعین کرنا مشکل نہ ہوتا کہ اس وقت میں کہاں کھڑا تھا۔

سورج کو دیکھ کر میں نے سمتوں کی مدد سے جگہ کا تعین کرنے کی کوشش کی۔ میں ڈیرہ حسام خان یا حاصل آباد جانا چاہتا تھا لیکن سمت کے بارے میں پُریقین نہیں تھا۔ میں دیر تک نقشے کو دیکھتا رہا۔ ایسا لگتا تھا کہ اب وہ بھی میرے لیے بیکار ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے کوئی مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں چاروں طرف دیکھا' سُرمئی پہاڑیوں کا جائزہ لیا مگر ہوا میں محوِ سفر چند پرندوں کے سوا مجھے کوئی بھی ذی روح دکھائی نہ دیا اور نہ ہی کہیں کسی کی موجودگی کے آثار نظر آئے لیکن میری رگ رگ میں ایک خفیف سا اضطراب بہرحال جاگ اٹھا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے بالکل پُرسکون ہو کر اپنی حسیات پر ذرا زیادہ بوجھ ڈالنے کی کوشش کی' انہیں کسی ایک نقطے پر مرکوز کرنا چاہا۔ تب مجھے ہوا کا سینہ دھڑکتا ہوا محسوس ہوا۔ شاید یہ کسی اور کے دل کی دھڑکن تھی جس کا ارتعاش ہوا کے سُبک خرام جھونکوں کی مدد سے مجھ تک پہنچ رہا تھا۔ میرے اعصاب شاید الیکٹرانک آلات کی طرح غیر مرئی سگنل وصول کر رہے تھے۔

میں اگر کہیں چھپنے یا آڑ لینے کی کوشش کرتا تو اس نامعلوم

انسان کو معلوم ہو جاتا کہ میں اس کی موجودگی سے آگاہ ہو چکا ہوں' پھر شاید وہ فوری طور پر ہی کچھ کر گزرتا۔ اگر میں اس کے نشانے پر تھا تو وہ بڑے اطمینان سے مجھے گولی مار سکتا تھا۔ میرے پاس تو اس وقت کوئی ہتھیار بھی نہیں تھا۔

اگر کوئی شخص واقعی کہیں موجود تھا تو نہ جانے وہ کس انتظار میں تھا۔ میں چند لمحے بالکل ساکت گھوڑے پر بیٹھا رہا۔ میرے اعصاب پر سخت تناؤ تھا۔ میں تو انسان تھا اور اپنی حسیات کو غیر معمولی سمجھتا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ اس وقت تو سگنل اس بے زبان گھوڑے کو بھی موصول ہو رہے تھے۔ یا پھر شاید وہ میرے ہی اعصاب کی کشیدگی تھی جو میرے لمس کے ساتھ اس کے بدن میں بھی سرایت کر گئی تھی۔ وہ بھی بالکل ساکت کھڑا تھا۔ دُم تک نہیں ہلا رہا تھا۔ اس کے کان بھی بالکل سیدھے اور ساکت تھے۔ وہ کان نہیں گویا دو چھوٹے چھوٹے انٹینا تھے جو کسی مدھم سے مدھم آواز کا سگنل ریسیو کرنے کے لئے تیار تھے۔

آخر کار یہ تناؤ' یہ کشیدگی' یہ سکوت میرے لیے ناقابلِ برداشت ہو گیا۔ میں نے تن بہ تقدیر ہو کر گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ وہ رفیقِ بے زبان یکدم کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ایک طرف روانہ ہو گیا۔ میں منتظر رہا کہ کسی سمت سے کوئی گولی آئے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ویرانے میں گھوڑے کی ٹاپوں کے سوا کوئی آواز نہ ابھری۔

آخر کار پہاڑیاں کافی پیچھے رہ گئیں۔ تقریباً ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے مُڑ کر دیکھا۔ اگر پہاڑیوں میں کہیں کوئی چھپا ہوا تھا تو اب تک اسے نکل آنا چاہیے تھا لیکن اپنے عقب میں مجھے اب بھی کوئی نظر نہ آیا۔ میں حیران تھا کہ کہیں اتنے مختصر سے عرصے میں صعوبتیں اٹھا کر میری حسیات ناقابلِ اعتبار تو نہیں ہو گئیں' کہیں مجھے دھوکا تو نہیں دینے لگیں' مجھ سے مذاق تو نہیں کرنے لگیں۔

جب مجھے اپنے سوالوں کا کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا تو میں نے بے مہریٔ وقت کی دھوپ میں سفر کرتے کرتے ایک بار پھر بے پروائی کی چادر اوڑھ لی۔ سورج سر پر آ گیا لیکن کسی آبادی کے آثار دکھائی نہ دیے۔ غنیمت تھا کہ موسم میں اتنی حدت نہیں تھی۔ خوشگوار اور خاصی تیز ہوا چل رہی تھی۔

اسی دوران ایک بار پھر اس احساس نے مجھے مضطرب کرنے کی کوشش کی کہ کسی نہ کسی سمت سے دو آنکھیں میری جانب نگراں تھیں لیکن جب میں نے رک کر چاروں طرف کا جائزہ لیا تو کہیں کسی کو موجود نہ پایا۔ آسیب اور بھوت پریت پر مجھے یقین نہیں تھا ورنہ شاید اسی جواز سے خود کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا۔

دن ڈھلنے لگا تو مجھے کچھ تشویش سی ہونے لگی کیونکہ ابھی تک کسی آبادی کی جھلک نظر نہیں آئی تھی۔ مجھے بھوک بھی ستانے لگی تھی۔ میں نے امید کے سہارے سفر جاری رکھا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی تھا کہ ابھی تک میرا کسی انسان سے سامنا نہیں ہوا تھا کیونکہ وہ انسان انسپکٹر رحیم گل بھی ہو سکتا تھا لیکن انسان کی شکل نظر نہ آنے کی وجہ سے میرا دل بھی گھبرانے سا لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے دنیا سے میرا رابطہ کٹ گیا تھا اور میں کسی اجنبی سیارے پر پھر رہا تھا۔

آخر کار سہ پہر کے قریب میں ایک جنگل تک جا پہنچا۔ ایک بار پھر میں نے نقشہ نکالا۔ اس میں جنگلات کے ایک بہت طویل سلسلے کے علاوہ چھوٹے موٹے کئی جنگلات کی نشاندہی کی گئی تھی۔ میں نے سمتوں اور فاصلے وغیرہ کی مدد سے تعین کرنے کی کوشش کی کہ یہ کون سا جنگل ہو سکتا تھا۔ اگر میرا اندازہ درست تھا تو اس جنگل کے پار آبادی ہونی چاہیے تھی۔ آخر کار میں اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہو گیا۔

شاید جنگل ایک لمبی سی پٹی کی صورت میں تھا۔ نقشے سے کچھ ایسا ہی ظاہر ہو رہا تھا اور مجھے اس کی لمبائی نہیں' چوڑائی عبور کرنا پڑی تھی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اس میں بھٹکا نہیں تھا۔ درخت چھدرے ہی تھے۔ صرف آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد میں دوبارہ کھلے میں پہنچ گیا۔

مزید ایک میل کا سفر کرتے ہی مجھے بہت دور تک ہرے بھرے کھیتوں کا سلسلہ پھیلا ہوا دکھائی دیا۔ انہی کے پس منظر میں کافی دور مجھے درختوں میں گھری ہوئی ایک حویلی کی جھلک بھی دکھائی دی۔ کھیتوں کے دوسری طرف کافی پیچھے ہٹ کر ایک گاؤں بھی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ کافی بڑا گاؤں معلوم ہوتا تھا۔ جہاں میں کھڑا تھا وہاں سے صحیح طور پر دیکھنا مشکل تھا کہ مکانات کا سلسلہ کہاں تک پھیلا ہوا تھا۔ اگر نقشے کی مدد سے میں صحیح سمجھ رہا تھا تو اس کا نام زرتاج نگر ہونا چاہیے تھا۔

حویلی سے کچھ اِدھر کھلے اور ہموار میدان میں کچھ لوگ کھڑے نظر آ رہے تھے۔ اگر یہ زمینیں کسی ایک ہی شخص کی ملکیت تھیں تو وہ یقیناً کافی بڑا زمیندار تھا۔ میں کچھ آگے بڑھا تو منظر کچھ اور واضح ہوا۔ میدان میں بارہ پندرہ افراد تماشائیوں کے سے انداز میں کھڑے تھے۔

ان کے سامنے ایک شخص کتھئی رنگ کے گھوڑے کی لگام پکڑے کھڑا تھا۔ گھوڑا ہر لمحے دو لمحے بعد غضبناک سے انداز میں ہنہنا کر دو ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کرتا تھا اور کبھی دولتی چلاتا تھا۔ وہ شخص اس کی لگام سے تقریباً لٹک کر اسے اپنی جگہ پر کھڑا رکھنے کی مسلسل کوشش کر رہا تھا۔ وہ غالباً اس پر سوار ہونا چاہتا تھا لیکن اسے نہ تو اس کا موقع مل رہا تھا اور نہ ہی شاید اس کی ہمت پڑ رہی تھی۔

ان سب سے ہٹ کر ایک طرف کو کوئی عورت کھڑی تھی۔ ایک تو اس کا رخ میری طرف نہیں تھا' دوسرے اس نے سر پر

اجرک نما ایک چادر لی ہوئی تھی جس کی وجہ سے میں اس کے چہرے کی صرف معمولی سی جھلک دیکھ پا رہا تھا اور اتنے فاصلے سے بھی نہ دیکھنے کے برابر تھی لیکن اس کے لباس کے رنگ بہت تیز اور بھڑکیلے تھے۔ اتنی دور سے بھی کپڑوں کی چمک دمک کا احساس ہو رہا تھا۔

کچھ مغلیہ سے اسٹائل کی لمبی سی گھیر دار قمیص تھی جس میں کئی رنگ نظر آ رہے تھے۔ سبز ساٹن کی شلوار تھی اور زری کے کام والے نہایت خوبصورت جوتے تھے جو دور سے ہی چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہ سرتاپا چمک دمک تھی۔

وہ یقیناً ایک دراز قد عورت تھی اور تن کر کھڑی ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی دراز قد لگ رہی تھی۔ وہ سب لوگ آپس میں کچھ باتیں بھی کر رہے تھے لیکن ہوا کے دوش پر مجھ تک محض ایک بے معنی اور مدھم سی بھنبھناہٹ ہی پہنچ رہی تھی۔ تماشائیوں کے سے انداز میں کھڑے مردوں میں سے مجھے دو کے پاس رائفلیں اور ایک کے پاس کلاشنکوف نظر آئی۔ کلاشنکوف ان دور اُفتادہ علاقوں میں بھی نہ جانے کس کس گوشے تک پہنچ چکی تھی۔

چند لمحے میں وہیں ایک درخت کی اوٹ میں گھوڑا روکے سوچتا رہا کہ مجھے ان کے قریب جانا چاہیے یا نہیں؟ اگر میں ان لوگوں کی نظر میں آئے بغیر گاؤں تک پہنچنا چاہتا تو مجھے بہت ہی طویل چکر کاٹنا پڑتا۔ پھر بھی امکان یہی تھا کہ دوسری طرف کھیتوں میں موجود لوگ مجھے دیکھ لیتے۔ گھوڑا ایک بار پھر نڈھال نظر آ رہا تھا۔ اسے مزید کئی میل کا چکر لگوانا زیادتی محسوس ہو رہا تھا۔

آخر کار میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ میں اتنی دیر سے آبادی اور انسانوں کی تلاش میں تھا۔ اب آبادی اور انسان نظر آ رہے تھے تو ان سے کترانے کی کیا تُک تھی؟ میں نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہ بے چارہ ہانپتا کانپتا ایک بار پھر پگڈنڈی پر آ گیا۔

چند لمحے بعد میں ان لوگوں کے قریب جا پہنچا۔ سب سے پہلے عورت نے گھوم کر میری طرف دیکھا اور میں نے بے اختیار گھوڑے کی لگام کھینچ لی۔ گھوڑا وہیں جم کر رہ گیا اور اس کے ساتھ لگا گویا میرا دل بھی ساکت ہو گیا' دھڑکنا بھول گیا۔ میں بالکل مبہوت سا ہو کر رہ گیا۔

وہ عورت تھی ہی ایسی...... !مبہوت کر دینے والی! مُڑ کر دیکھنے والوں کو پتھر بنا دینے والی!

اس کی ہوئی موٹی سیاہ' نشیلی سی آنکھوں میں شاید قدرتی کاجل کا بھرا تھا۔ ان آنکھوں میں ان سمندروں کا سا ٹھہراؤ تھا جن کے دروازوں پر طوفان دستک دے رہے ہوں۔ بے پروائی سے سر پر ڈالی ہوئی چادر تلے اس کے بال سیاہی کے آبشار کی طرح پھیلے ہوئے تھے اور ہوا کے دھیمے جھونکوں کے ساتھ اس آبشار میں لہریں سی پیدا ہوتی تھیں تو ڈوبتے سورج کی کُندنی کرنوں کی وجہ سے ان بالوں میں آئینے کی سی جھلملاہٹ پیدا ہوتی تھی اور معدوم ہو جاتی تھی۔

اس کی رنگت میں چاندنی اور گلاب گُندھے ہوئے تھے۔ اس کا قد چھ فٹ سے کچھ کم ہی رہا ہو گا اور اگر عورت کا قد اتنا ہو تو وہ کچھ زیادہ ہی دراز قد معلوم ہوتی ہے۔ وہ جیسے چمکتے دمکتے اور شوخ رنگوں کے لباس میں تھی' اگر وہ لباس کسی اور عورت پر ہوتا تو شاید وہ کچھ گنوار معلوم ہوتی لیکن اس پر وہ لباس کچھ اس طرح پھب رہا تھا جیسے وہ چیزیں بنی ہی صرف اسی کے لیے ہوں۔ بعض لوگوں کی شخصیت لباس کی وجہ سے نکھر آتی ہے اور بعض شخصیتوں کی وجہ سے لباس کو نکھار مل جاتا ہے۔

بظاہر وہ گلاب کی ڈالی کی طرح نازک اور لچکیلی نظر آتی تھی مگر نہ جانے کیوں اسے دیکھ کر یہ احساس بھی ہوتا تھا کہ ضرورت پڑنے پر وہ فولاد کی دیوار بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے زندگی میں دو یا تین عورتیں ہی ایسی دیکھی تھیں جنہیں بلا کی حسین کہا جا سکتا تھا۔ آج میری اس مختصر سی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی انفرادیت یہ تھی کہ اس کا حسن خالصتاً مشرقی تھا۔ میرا خیال تھا کہ اتنا بھرپور مشرقی حسن اب صرف پینٹنگز میں ہی باقی رہ گیا تھا۔ آج کے دور میں اگر قدرت نے کسی عورت کو بھرپور مشرقی حسن سے نوازا بھی ہوتا ہے تو وہ خود ہی اسے کوئی نہ کوئی مغربی رُخ دے لیتی ہے لیکن اس عورت نے اپنے حسن' اپنے پیکر' اپنے حُلیے' اپنے لباس میں کہیں بھی مغربیت کی ملاوٹ نہیں کی تھی۔ وہ سر سے پاؤں تک خالص اور شاہانہ مشرقی حسن کا شاہکار تھی۔

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی اور میرے خوابیدہ سمندروں میں جیسے جوار بھاٹا سا ہلچل مچانے لگا تھا۔ وہ کچھ ایسی تمکنت سے کھڑی تھی جیسے کوئی ملکہ اپنے دربار میں داخل ہوئی ہو لیکن سامنے ہی کسی اجنبی کو موجود پا کر اس کی چاند سی جبیں پر سوالیہ شکن ابھر آئی ہو۔ قصے کہانیوں میں شہزادیوں یا ملکاؤں کا ذکر پڑھ کر ذہن میں جو تصور ابھرتا ہے وہ اس پر پورا اترتی تھی۔ ٹی وی یا فلم والے اس تصور میں رنگ بھرنے کی اپنی سی جو کوششیں کرتے ہیں' وہ اس عورت کو دیکھنے کے بعد محض مذاق محسوس ہونے لگی تھیں۔ اس کے سر پر صرف ایک تاج کی کمی تھی ورنہ یہ گمان گزرتا کہ کوئی شہزادی تاریخ کے اوراق سے یا خوابوں کے جھروکوں سے نکل کر چپکے سے اس جہانِ خرابی میں چلی آئی ہے۔

وہ شخص جو گھوڑے کی لگام پکڑے اس سے زور آزمائی میں مصروف تھا' اس دوران میری آمد سے بے خبر رہا تھا۔ وہ جست لگا کر گھوڑے پر سوار تو ہو گیا لیکن سرکش اور طاقتور گھوڑے نے فوراً غضبناک انداز میں ہوا میں اچھل کر اور کئی بار دولتیاں چلانے کے بعد آخر کار اسے پشت سے نیچے پٹخ دیا لیکن آدمی بہرحال جاندار تھا۔ اس نے لگام نہیں چھوڑی۔ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا اور دوبارہ گھوڑے سے زور آزمائی کرنے لگا۔

مگر وہاں موجود مسلح افراد نہایت خاموشی سے مجھے گھیرے میں

لے چکے تھے۔ اب میں نے دیکھا' وہ تعداد میں چار تھے۔ ان میں سے دو کے پاس کلاشنکوفیں اور دو کے پاس چائنا کی رائفلیں تھیں۔ چاروں گنوں کا رخ میری طرف تھا اور وہ چاروں افراد گویا اس عورت کے لب ہلنے کے منتظر تھے جو اپنی لمبی لمبی' سیاہ گھنیری پلکوں کو حرکت کی زحمت دیے بغیر نہایت خاموشی سے' پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھے جا رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' میں نے مُربیّانہ سے لہجے میں کہا۔ "یہ کون احمق ہے جو گھوڑے کے رگ پٹھوں سے واقفیت حاصل کیے بغیر اسے زیر کرنے کی کوشش کر رہا ہے؟" میں نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو کچھ تو مشقت کے باعث اور کچھ شاید خجالت کی وجہ سے پسینے پسینے ہو رہا تھا مگر اڑیل گھوڑے کے ساتھ خود بھی بدستور اڑیل بنا ہوا تھا۔

میں نے اپنے اندازِ تخاطب سے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی کہ جو لوگ مجھے گھیرے میں لے کر گنوں کی زد پر لے چکے تھے' ان کی میری نظر میں کوئی اہمیت نہیں تھی۔

اس سرو قامت عورت نے اتنی دیر میں پہلی مرتبہ پلکیں جھپکائیں اور ان جھیل سی آنکھوں میں گویا لہریں پیدا ہوئیں جو فوراً ہی معدوم ہو گئیں۔ وہ بولی تو اس کی آواز میں آبشاروں کا سا ترنم بھی تھا اور بادِ سُبک خرام کا سا ٹھہراؤ بھی۔ اس نے بھی گویا باقی ہر چیز کو نظر انداز کر دیا اور اسی موضوع پر رہتے ہوئے بولی۔ "تم غالباً یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم اس گھوڑے سے بہتر طور پر نمٹ سکتے ہو؟"

وہ بدستور ایک ٹُک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظریں گویا پتھروں کو بھی شق کر سکتی تھیں۔ بہت انوکھی' بہت نایاب عورت تھی وہ..... معلوم نہیں اس اُجاڑ اور بے ہودہ سے علاقے میں کہاں سے آ گئی تھی۔

"آپ بالکل درست سمجھیں۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی اور اپنا لہجہ دانستہ طور پر مؤدبانہ رکھا۔ مجھے خوشی تھی کہ میں ان سوالوں سے کم از کم سرِدست تو بچ گیا تھا جن کا مجھے اندیشہ تھا۔ میرا لباس' میری آمد کا انداز' سب کچھ مشکوک تھا۔ میری صورت' میرا لہجہ اجنبی تھا۔ اگر مجھ سے پے درپے سوالات کیے جاتے تو یہ ایک فطری سی بات ہوتی لیکن میں کم از کم وقتی طور پر انہیں دوسری طرف اُلجھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"آؤ..... تم بھی اپنی حسرت نکال لو۔" عورت نے اشارہ کیا۔

میں نے گردن کو ذرا خم دیا اور گھوڑے سے اتر آیا۔ میں نے دیکھا' گھوڑے سے زور آمائی کرنے والا شخص خون آشام نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ گھوڑے سے زور آزمائی اس نے بند کر دی تھی تاہم لگام بدستور مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

اسی دوران گھوڑے نے بھی شاید یہ دیکھ کر کہ وہ شخص اس کی طرف متوجہ نہیں تھا' لگام کو مزید ایک زوردار جھٹکا دیا جس سے وہ مُنہ کے بل زمین پر جاتے جاتے بچا۔ اس کی خجالت کچھ اور بڑھ گئی۔ کوئی اور جگہ ہوتی تو شاید وہ گھوڑے پر چابکوں کی بارش کر دیتا۔

میں نے لگام اس کے ہاتھ سے نہیں لی بلکہ پہلے گھوڑے کے گرد ایک چکر لگایا۔ حیوان اتنے بے عقل نہیں ہوتے جتنا ہم انہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے زندگی میں یہ بھی ایک قیمتی تجربہ حاصل کیا تھا اور اکثر اس سے استفادہ کیا تھا۔ خاص طور پر میں نے سرکش گھوڑوں کو اچھا خاصا ذہین محسوس کیا تھا تاہم میں یہ فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ وہ ذہین ہونے کی وجہ سے سرکش ہوتے تھے یا سرکش ہونے کی وجہ سے ذہین ہوتے تھے۔

جس طرح بعض ذہین انسانوں میں بھی تمامتر ذہانت کے باوجود ایک طرح کی شیطانیت اور خباثت سی ہوتی ہے' اسی طرح سرکش گھوڑے میں بھی بے شمار خوبیوں کے ساتھ ساتھ تھوڑی سی خباثت ہوتی ہے۔ اگر ذہین انسان کی خباثت دب جائے اور وہ تعمیری راہ پر لگ جائے تو وہ بڑے روشن کارنامے انجام دے سکتا ہے ورنہ دنیا میں بڑا فساد مچاتا ہے۔ اسی طرح سرکش گھوڑے کی خباثت اگر دب جائے تو وہ بے مثال گھوڑا ثابت ہوتا ہے ورنہ انسانوں کی ہلاکت کا باعث بن سکتا ہے۔

اس گھوڑے نے گویا میرے عزائم کو سمجھتے ہوئے کئی بار مجھے بھی دولتی رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے نہایت آسانی سے خود کو بچاتے ہوئے اس کا معائنہ جاری رکھا۔

اسی طرح ایک چکر کے دوران اس کی گردن کے قریب پہنچ کر میں نے اس کی ایال ایک مٹھی میں جکڑتے ہوئے اچانک ہی زقند لگائی۔ دوسرے ہی لمحے میں اس پر سوار تھا اور لگام بھی میرے ہاتھ میں آ چکی تھی۔ گھوڑا بھی اسی لمحے پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو چکا تھا اور مجھے پیٹھ سے گرانے کے لیے جسم کو جھٹک رہا تھا لیکن افضل چوہدری نے ایک بار گھوڑے کی پشت پر سوار ہو کر اتنی آسانی سے گرنا نہیں سیکھا تھا۔

گھوڑا اب ہنہنانے کے بجائے گویا پھنکار رہا تھا مگر جب اس کے جبڑے چرنے کو ہوئے اور پسلیوں پر مخصوص ہُنرمندی کے ساتھ دوچار رگڑے لگے تو اس کے کس بل نکلنا شروع ہوئے۔ میں نے اس کی پسلیوں پر مختلف زاویوں سے دباؤ ڈالنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ ساتھ ہی میں اسے چمکارتا بھی جا رہا تھا۔

میں اس پر نرمی اور سختی' دونوں حربے بیک وقت استعمال کر رہا تھا۔ کچھ دیر تو لگی لیکن آخر کار اس نے چاروں کُھر زمین پر ٹکا ہی لیے اور اس کے انداز میں قدرے شکست خوردگی آ گئی۔ کچھ دور ایک شخص چابک لیے کھڑا تھا' میں نے اس سے چابک نہیں لیا۔ اس کے بجائے میں نے ایک ہاتھ سے لگام قابو میں رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اس کے کندھے کے جوڑ پر کراٹے کا ایک ہلکا سا وار کیا۔

گھوڑا تڑپ کر دوڑا لیکن وہ اب میرے قابو میں تھا۔ وہ سدھ ہوا تو تھا لیکن شاید کسی اور کا مطیع تھا۔ میں نے اسے طویل و عریض میدان میں تین چار چکر لگوانے اور اتنی ہی دوڑ بھاگ میں اس نے مجھ سے مصالحت کر لی۔

میں نے گھوڑا اس عورت کے سامنے لا روکا اور جست لگا کر نیچے آ گیا۔ رکاب میں پاؤں رکھنے کی میں نے زحمت نہیں کی تھی۔ عورت کے یاقوتی ہونٹوں پر اب تبسم کا ہلکا سا سراغ مل رہا تھا مگر اس کی آنکھیں گویا مسکرانے پر آمادہ نہیں تھیں۔ ان میں وہی پہلی سی سنجیدگی تھی۔ چاروں مسلح افراد نے ایک بار پھر مجھے گھیرے میں لے لیا تھا۔ میں ان کی طرف سے اب بھی بے پروا نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کون ہو تم؟" عورت نے پوچھا۔ اس کا لہجہ نامہربان نہیں تھا۔ آخر کار مجھے اس سوال کا سامنا کرنا ہی تھا۔

میں نے اس وقت روحیل خان والی حیثیت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تاہم میرا ارادہ تھا کہ میں اپنا نام روحیل خان نہیں بتاؤں گا۔

"ڈیرہ حسام خان کے قریبی علاقے کا ایک بہت چھوٹا سا..... بہت معمولی سا زمیندار ہوں۔ چند ایکڑ زمین ہے میری۔" میں نے جواب دیا۔ "اس وقت ذرا مصیبت میں گرفتار ہوں۔"

"ذرا.....؟" عورت نے دُہرایا اور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر روشن ہوتی گئی جیسے دھیرے دھیرے افق پر سورج طلوع ہو رہا ہو۔ وہ اس لفظ سے محظوظ ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ مزاح بھی رکھتی تھی۔ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولی۔ "تم شریف آدمی ہونے کا دعویٰ کر رہے ہو۔ ہم تو کچھ اور ہی سمجھ رہے تھے۔" اس کے لہجے میں شاہانہ تمکنت آ گئی۔

"کیا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

"تم اچھے بھلے' معقول قسم کے' تجربہ کار ڈاکو معلوم ہو رہے ہو۔" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ "صرف ایک نشانی تمہارے اندر ڈاکوؤں والی نہیں ہے۔"

"وہ کیا خاتون؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"تمہاری آنکھیں۔" اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ان آنکھوں سے واقعی تھوڑی بہت پریشانی جھلک رہی ہے اور پریشان ہونا شریف آدمیوں کی نشانی ہے۔"

"گویا آپ نے میری بات کا یقین کر لیا؟" میں نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

"ابھی سے نتائج پر پہنچنے کی کوشش مت کرو۔" اس نے جواب دیا۔

"بہرحال یہ بات طے ہے کہ آپ نے ڈاکوؤں کا تجزیہ خاصے قریب سے کیا ہے۔" میں نے کہا۔

"یقیناً..." اس نے بلا جھجک کہا۔ "ہمیں ان سے بہت واسطہ پڑا ہے۔"

"میں آپ کے متعلق کچھ جان سکتا ہوں؟" میں نے بدستور اپنا لہجہ مؤدبانہ رکھا۔

"میرا نام زرتاج ہے....." وہ گہری سانس لے کر بولی۔ اس کے سر پر تاج کی کمی تھی۔ یہ کمی اس کے نام سے پوری ہو گئی تھی۔ "میں بھی ایک چھوٹی سی زمیندار ہوں۔"

ڈھیلی ڈھالی' ریشمی قمیص میں اس کی گوری کلائی حرکت میں آئی۔ اس نے بے نیازی سے زمینوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ تھوڑی سی زمین میری ہے۔"

وہ تاحدِ نظر پھیلی ہوئی زمینوں کو' تھوڑی سی زمین' کہہ رہی تھی۔ بعض لوگوں کے تکبر کی کوئی حد نہیں ہوتی اور بعض لوگوں کی انکساری کی کوئی حد نہیں ہوتی۔

اچانک میں چونکا۔ مجھے نقشے میں دیکھا ہوا نام یاد آیا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گاؤں اور کھیتوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کہیں یہ زرتاج نگر تو نہیں ہے؟"

"ہاں....." اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ برقرار تھی۔ "کیا اس سے پہلے کبھی اس طرف آنا نہیں ہوا؟"

"نہیں..... یہ میری انتہائی بدنصیبی تھی کہ میں کبھی اِدھر نہیں آیا' آج راستہ بھول کر آ نکلا ہوں۔ اس طرح بھٹکنا بار بار نصیب ہو تو بہت اچھا ہو۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

اس نے گویا میرے الفاظ میں چھپے تاثر کو نظر انداز کر دیا اور نرماہٹ آمیز سی سنجیدگی سے بولی۔ "میری پیدائش سے پہلے اس گاؤں کا نام کچھ اور تھا۔ میں پیدا ہوئی تو والد مرحوم نے میرا نام زرتاج رکھا اور اس کے ساتھ ہی گاؤں کا نام بھی بدل کر زرتاج نگر رکھ دیا۔"

میرا خیال تھا کہ ایسی حشر بداماں عورت اور اس کے گاؤں دونوں ہی کو بہت مشہور ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں کا ماحول بتا رہا تھا کہ اس نے خود کو بہت محدود رکھا ہوا تھا۔ اس کی شہرت کی خوشبو شاید زیادہ دور تک نہیں پہنچی تھی۔ ویسے یہ ممکن نظر تو نہیں آتا تھا کہ اس پختہ عمر لڑکی نے ابھی تک کوئی قیامت نہ ڈھائی ہو' کسی افسانے کو اپنا پتا نہ دیا ہو' کسی دستِ طلب نے دیوانہ وار اس کا پیچھا نہ کیا ہو۔

جہاں ایک ایسی سراپا قیامت رہتی تھی' وہاں تو ہنگامے برپا ہونے چاہئیں تھے۔ یہاں اتنا سکوت' اتنا سکون' اتنا ٹھہراؤ کیونکر برقرار تھا۔

اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوتے دیکھ کر میں چونکا۔ مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے خیالوں میں گم ایک ٹُک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

زرتاج کھنک دار آواز میں بولی "تم نے اپنا نام نہیں بتایا۔"

"افضل خان۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"افضل خان....." اس نے پُرخیال انداز میں زیرِ لب دُہرایا اور اس لمحے مجھے اپنا یہ آدھا سچا' آدھا جھوٹا نام بے حد خوش بخت محسوس ہوا۔

"نام تو سنا ہوا نہیں لگتا۔" اس کی چاندی سی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئی تھیں۔

"آپ ناحق ذہن پر زور دے رہی ہیں۔ میں اتنا بڑا' اتنا اہم یا اتنا بدنام آدمی نہیں ہوں کہ مجھ سے پہلے میرے افسانے آپ تک پہنچ جاتے۔ میں تو ایک بہت ہی چھوٹا سا' غیر اہم اور بے ہُنر سا آدمی ہوں۔ کوئی خوبی نہیں ہے مجھ میں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اتنے یقین سے مت کہو۔ عین ممکن ہے' تم نے ابھی تک اپنے آپ کو دریافت نہ کیا ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولی مگر اب اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں۔

"یہ آپ کا حسنِ ظن ہے جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں۔" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔ "خوبصورت دل والے لوگ ہی دوسروں کے بارے میں خوش گماں ہوتے ہیں اور جن کی صورت کے ساتھ ساتھ دل بھی اچھا ہو' وہ لوگ ایسے بُرے وقتوں میں مشکل سے ہی ملتے ہیں۔"

وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے' شاہانہ تمکنت سے گردن اٹھائے بالکل سیدھی کھڑی تھی۔ پھر وہ یونہی ہاتھ پیچھے رکھے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگی لیکن نظر بدستور مجھ پر تھی۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا گویا وہ مجھے شروع سے آخر تک حرف بہ حرف پڑھ لینا چاہتی ہو تاکہ کہیں مفہوم و معنی میں دھوکا کھانے کا امکان نہ رہے۔

میں نے اندر ہی اندر ذرا بے چینی سی محسوس کرتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ رائفل بردار بدستور مجھ پر رائفلیں تانے کھڑے تھے لیکن ان کے کرخت چہرے ہر تاثر سے عاری تھے۔ وہ حکم کی تعمیل کرنے والے مشین نما انسان معلوم ہوتے تھے۔ اکثر بڑے لوگوں' زمینداروں' جاگیرداروں' سرمایہ داروں اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کی حفاظت کرنے والے کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔

باقی لوگوں کے چہروں پر زندگی کی چمک تو تھی مگر ایک عجیب سی مسکینی کی تہہ بھی جمی ہوئی تھی۔ ایسی مسکینی شاید پرانے زمانوں میں زر خرید غلاموں کے چہروں پر ہوتی ہوگی۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں اپنے طور پر کچھ سوچنے یا محسوس کرنے تک کی عادت نہیں رہی۔ یا پھر ان کے محسوسات ان کے ذہنوں سے چہروں تک نہیں آتے تھے۔ بات خواہ کچھ بھی تھی لیکن حقیقت یہی تھی کہ وہ کم از کم دیکھنے میں تو انسان کے بجائے گوشت پوست کے روبوٹ معلوم ہوتے تھے۔

ان میں سے صرف ایک ہی شخص کے چہرے پر آزادی اور خود مختاری کی جھلک تھی اور یہ وہی شخص تھا جس کے ہاتھ سے میں نے گھوڑے کی باگ لی تھی۔ وہ کینہ بھری نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ دنیا میں زیادہ تر لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ خود کوئی کام کر نہیں سکتے اور اگر کوئی دوسرا اسے عمدگی سے انجام دے تو وہ بھی ان کی نظر میں گردن زدنی قرار پاتا ہے۔

ٹہلتے ٹہلتے زرتاج رک گئی۔ اس کے ہر قدم کے ساتھ اب تک گویا ماحول بھی دھیرے دھیرے ہلکورے لے رہا تھا۔ اس کی سلطنتِ جاں کے نشیب و فراز میں سکوت آیا تو اس کے ساتھ ہی جیسے دھرتی کے سینے کا زیر و بم بھی تھم گیا۔

اس کی کھنک دار آواز نے ایک بار پھر میری سماعتوں کے دروازوں پر نقرئی گھنٹیاں بجائیں۔ وہ اپنے مخصوص ٹھہرے

لہجے میں کہہ رہی تھی۔ "فرض کرلو میں نے یقین کرلیا کہ تمہارا نام افضل خان ہے' تم ایک شریف آدمی ہو' چھوٹے موٹے زمیندار ہو اور کسی مصیبت میں پھنسے ہوئے ہو..... تو کیا میں مصیبت کی نوعیت پوچھ سکتی ہوں؟"

"فی الحال تو اسے مجھ تک ہی محدود رہنے دیجئے۔ شکر گزار رہوں گا۔" میں نے اردگرد کھڑے لوگوں پر نظر ڈال کر کہا۔ میں نے تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ میں اتنے لوگوں کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتا۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ سرِدست تو میں اسے تخلیئے میں بھی اصل بات بتانا نہیں چاہتا تھا۔ بشرطیکہ تخلیہ میسّر آنے کی نوبت آتی۔

وہ گویا میرا مطلب سمجھتے ہوئے بُرا منائے بغیر بولی "یہاں کس لیے آئے ہو؟"

"میں ارادتاً یہاں نہیں آیا' بھٹکتا ہوا آنکلا ہوں لیکن اب سوچ رہا ہوں کہ ایسا بھٹکنا تو کاش روز نصیب ہو۔" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر ایک نہایت خفیف سا رنگ آکر گزر گیا۔

لیکن قطعی غیر متزلزل سے لہجے میں وہ بولی۔ "بہت عام سی باتیں بہت سلیقے سے کرلیتے ہو۔ کہاں سے سیکھا یہ سلیقہ؟"

"بعض صورتیں پل بھر میں ہر چیز کا سلیقہ سکھا دیتی ہیں۔" میں نے بلا جھجک کہا۔ ماحول بتا رہا تھا کہ اس کے سامنے پہلی ملاقات پر اس قسم کی باتیں کرنے کی جرأت شاید ہی کسی نے کی ہو۔ یہ جرأت گردن بھی کٹوا سکتی تھی اور دل میں گھر بھی کرسکتی تھی۔ میں دونوں کے لیے تیار تھا۔

اس کا لہجہ بدستور کسی خاص تاثر سے عاری رہا۔ سرسری سے انداز میں وہ بولی "تو پھر اب کیا خیال ہے؟ بھٹکتے ہوئے اِدھر نکل آئے ہو۔ اب بھٹکتے ہوئے ہی کسی اور طرف کو نکل جاؤ۔"

"ہاں..... آخر کار تو شاید یہی کرنا پڑے گا۔" میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔ "لیکن کیا آپ کے ہاں مصیبت زدہ لوگوں یا بے سروسامان مسافروں کی تھوڑی بہت دلجوئی کرنے کی کوئی روایت موجود نہیں ہے؟"

"دلجوئی وغیرہ تو ذرا مشکل کام ہے۔" وہ مسکراتی آنکھوں کے ساتھ بولی۔ "کوئی مدد وغیرہ چاہیے تو بولو۔"

میرے جواب دینے سے پہلے اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی اُتر آئی اور وہ ذرا توقف سے بولی۔ "روایتیں تو ہماری بہت عظیم ہیں لیکن ہوا اکثر یہی ہے کہ مصیبت زدہ لوگوں اور بے سروساماں مسافروں کی مدد کرکے ہم نے اکثر نقصان ہی اٹھایا ہے۔"

پھر اس نے سر کو شاہانہ انداز میں خفیف سا جھٹکا دیا اور مزید بولی "خیر..... ان باتوں سے گھبرا کر ہم اپنی شاندار روایات نہیں چھوڑیں گے۔ تم بولو' تمہیں کیا مدد چاہیے؟"

میں نے ایک لمحے سوچا پھر ذرا متذبذب سے لہجے میں کہا "اگر مجھے اس کالے گھوڑے کے بدلے کوئی اور گھوڑا مل سکے..... اور ایک جوڑا کپڑوں کا مل جائے تو بہت شکر گزار رہوں گا۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے فوراً صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں کہا "اس گھوڑے میں کوئی عیب نہیں ہے۔ بہت اچھی نسل کا گھوڑا ہے۔ بس اس کا رنگ مجھے پسند نہیں ہے۔ مجبوری میں لے بیٹھا تھا۔ میں اس کے بدلے میں کوئی بھی گھوڑا لے لوں گا' خواہ وہ تین ٹانگوں پر ہی چلتا ہو۔"

اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہ بدستور ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے' میں اب اتنی کم عمر نظر نہیں آتی کہ مجھ سے اس طرح بات کی جائے جس طرح بچوں کو بہلانے کے لیے کی جاتی ہے۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا لیکن اس سے پہلے کہ میں کچھ بولتا' اس نے گویا ایک نئے زاویۂ نگاہ سے میری اور میرے گھوڑے کی طرف دیکھا پھر بات کو گھمائے پھرائے بغیر بالکل سیدھے اور دوٹوک انداز میں بولی۔ "قتل کرکے بھاگے ہو؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ اضطراری طور پر پولیس والے پر گولی چل جانے کی وجہ سے میں اپنے آپ کو قاتل تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھا۔

"کسی اور وجہ سے پولیس پیچھے لگی ہوئی ہے؟" زرتاج نے اسی پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ اس سے صرف گھوڑا اور لباس تبدیل کرنے کی بات کرنا ہی کافی ثابت ہوا تھا' باقی حقائق تک اس نے خود ہی جست لگالی تھی۔

"نہیں۔" میں نے اس بار بھی بلا تامل نفی میں گردن ہلادی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ انسپکٹر رحیم گل اب بھی میرے تعاقب میں لگا ہوا تھا یا نہیں۔ اس لیے میں نے شک کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خود ہی اپنے حق میں فیصلہ دے دیا تھا۔ ویسے بھی مجھے یہاں پہنچے دیر ہی کتنی ہوئی تھی۔ اتنی جلدی ہر بات پوری پوری سچائی کے ساتھ بتا دینا قرینِ مصلحت معلوم نہیں ہوتا تھا۔

"آپ میرے بارے میں شکوک و شبہات اور اندیشوں میں مبتلا نہ ہوں۔" میں نے اپنی وکالت کی۔ "میری مدد کرنے سے آپ کے لیے کوئی الجھن پیدا نہیں ہوگی۔"

"میں اُلجھن اور سُلجھن کے بارے میں نہیں سوچ رہی..... اور نہ ہی میں پریشان ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "ہم جب کسی کی مدد کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں تو اس کے نتائج کے لیے بھی تیار رہتے ہیں۔ میں دراصل کچھ اور سوچ رہی تھی....."

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئی پھر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ "میرا خیال ہے' تمہیں کام کی بھی ضرورت ہے اور پناہ کی بھی لیکن تم اس لیے درخواست نہیں کررہے ہو کہ تمہیں مشکوک سمجھ کر تمہاری درخواست قبول نہیں کی جائے گی۔ تم چاہتے ہو کہ بات کہہ کر گنوائی نہ جائے' تمہارے الفاظ بے آبرو نہ ہوں۔"

"آپ کا تجزیہ بالکل درست ہے۔" میں نے تحسین آمیز مگر قدرے شرمسار سے لہجے میں کہا۔ ایسی عورت کے سامنے انسان اپنی کم مائیگی' بے سروسامانی اور تہی دامنی پر شرمسار ہی ہوتا ہے۔ وہ ایسی عورت تھی جس کے سامنے کچھ بن کر جانے کو جی چاہتا ہے۔ ناکارہ' نکما اور مدد کا طالب ہو کر کھڑے ہونا اچھا نہیں لگتا تھا مگر فی الحال مصلحت اسی میں تھی۔

"گھوڑے سدھانے میں تم یقیناً ماہر ہو؟" وہ نیم سوالیہ لہجے میں بولی۔

"میں کوئی دعویٰ کرنا نہیں چاہتا لیکن اتنا ضرور ہے کہ آج تک مجھے کوئی ایسا گھوڑا نہیں ملا جو میرے اشاروں پر نہ چلا ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"کاشت کاری سے بھی ظاہر ہے واقف ہی ہوگے؟" وہ گویا میرا انٹرویو لے رہی تھی۔

"کاشت کاری تو جدی پشتی کام ہے۔ زمین کی رگ رگ سے واقف ہوں۔ ہمیشہ زمین سے ہی روزی کمائی ہے۔" میں تیزی سے کہتا چلا گیا۔ میں کوشش کر رہا تھا کہ کسی بھی بات کا جواب ہچکچاہٹ آمیز انداز میں نہ دوں۔

"یقیناً بندوق بھی تمہارے لیے کوئی نئی چیز نہیں ہوگی۔ ضرورت پڑنے پر ٹریگر تو بے دھڑک دبا ہی سکتے ہوگے؟" اس کا لہجہ اب بھی نیم سوالیہ ہی تھا۔ تاہم ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ ایک بار پھر طلوع ہونے لگی تھی۔

"بندوق سے بھی رشتہ بہت پرانا ہے۔ گولی کا جواب گولی سے دینے میں کبھی دیر نہیں کی۔ ہم جیسے لوگوں کے لیے اس کے سوا زندہ رہنے کا کوئی طریقہ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"زندگی کو..... اور زندگی گزارنے کے ہنر کو تم اچھی طرح سمجھتے ہو۔ تم ہر اعتبار سے ہمارے کام کے آدمی ہو۔ تم جیسا مزاج' انداز اور صلاحیتیں رکھنے والے شخص کی ہمیں ہمیشہ ہی ضرورت رہتی ہے....." وہ ایک بار پھر جیسے کسی سوچ میں اُلجھ کر خاموش ہوگئی۔

لیکن ایک لمحے بعد گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولی "تمہیں رہائش بھی مل جائے گی اور حسبِ خواہش کھانے' پہننے کو بھی۔ تھوڑی بہت تنخواہ بھی مل جائے گی لیکن شاید تمہیں یہ سودا مہنگا محسوس ہو۔" وہ ٹہلتے ٹہلتے ہی بات کر رہی تھی۔

"وہ کیوں؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس وقت مجھے رہائش اور کھانا پینا ہی کسی قیمت پر بھی مہنگا محسوس نہیں ہو رہا تھا جبکہ وہ تو تنخواہ کی بھی بات کر رہی تھی۔

"تمہیں محض یہ سوچ کر نہیں رہنا ہوگا کہ تم بس ایک کارندے ہو بلکہ جب بھی تم نے محسوس کیا کہ تمہیں اس پناہ گیری کی ضرورت نہیں تو تم ہاتھ جھاڑ کر آگے چل دو گے۔ ایسا نہیں ہوگا۔" آخری الفاظ پر اس کا لہجہ کچھ زیادہ ہی فیصلہ کن ہو گیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے رک کر اس نے شاید میرے چہرے پر کوئی ردِعمل تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن میری کوشش تھی کہ میرے چہرے سے ہلکے سے تجسس کے سوا کچھ ظاہر نہ ہونے پائے۔

وہ بات کے ساتھ ساتھ چہل قدمی کا سلسلہ جوڑتے ہوئے بولی۔ "تمہیں بالکل یہ محسوس کرتے ہوئے یہاں رہنا ہوگا جیسے یہ زمین تمہاری اپنی ہے۔ اس زمین کے سینے پر کھڑے ہو کر اگر کوئی اس زمین کے...... یہاں کے لوگوں کے...... یا میرے مفادات کے خلاف قدم اٹھانے لگے تو تمہیں اس کو روکنا ہوگا۔ اگر کوئی ہم پر اپنی طاقت کا رعب جمانے آئے تو اسے زبان' زورِ بازو سے یا گولی سے روکنا تمہارا اوّلین فرض ہوگا۔ ایسے کسی وقت پر شاید تمہیں یہ سودا مہنگا محسوس ہونے لگے۔" اس کے لہجے میں کچھ زیادہ ہی سنجیدگی تھی۔

مجھے معلوم تھا' زمینداری جتنی بڑی ہو' خطرات بھی اتنے ہی بڑے ہوتے ہیں۔ زمینداری اپنی جگہ ایک چھوٹی سی سلطنت ہوتی ہے اور جس طرح سلطنت میں محلاتی سازشیں ہوتی ہیں' جوڑ توڑ ہوتے ہیں' بیرونی حملے ہوتے ہیں اور کبھی کبھی کشت و خون ہوتا ہے' بالکل اسی طرح یہ سب کچھ زمینداریوں میں بھی حسبِ حیثیت ہوتا ہے۔

اگر زمینوں کی مالک ایک سراپا قیامت قسم کی لڑکی ہو تو ظاہر ہے خطرات اور بھی بڑھ جاتے ہیں لیکن اس نے جو بات کی تھی وہ مجھے خوفزدہ کرنے کے لیے نہیں بلکہ میری دلچسپی بڑھانے کے لیے کافی تھی۔ میں تو ان لوگوں میں سے تھا جو اس قسم کے حالات میں زبانی معاہدوں پر نگاہوں کی رضامندی سے دستخط کر دیتے ہیں۔

مجھے خوشی اس بات کی تھی کہ اس کے لہجے میں مجھ جیسے اجنبی کے لیے بھی اخلاص تھا اور اخلاص کی ایک نشانی یہ تھی کہ وہ مجھے اندھیرے میں نہیں رکھ رہی تھی۔ سارے امکانات اس نے صاف طور پر بیان کر دیے تھے۔

میں نے ایک ہی لمحے میں بہت کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ "بی بی! پہلی بات تو یہ کہ میں ان لوگوں میں سے ہوں جو اوّل تو سودا ہی نہیں کرتے...... اور اگر کر لیتے ہیں تو پھر سستا اور مہنگا نہیں دیکھتے۔ دوسری بات یہ کہ ہر وقت صرف اپنا ہی فائدہ دیکھتے ہوئے جینے میں کم از کم مجھ جیسے آدمی کے لیے کوئی ایسا خاص لطف بھی نہیں۔ میری عمر یا تجربہ اتنا تو نہیں کہ سیانوں جیسی باتیں کر سکوں لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ دنیا میں کسی کو اپنا بنا کر یا خود کسی کا بن کر جینے میں ہی بہتری ہے۔ جو دنیا میں کسی کا بھی نہیں' کسی سے بھی مخلص نہیں' جس کی نظر میں صرف اپنا آپ ہی ہوتا ہے' جو صرف اپنے لیے ہی جیتا ہے' کبھی کبھی اس کی زندگی بہت ہی قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔"

"باتیں تم بہت اچھی کر لیتے ہو لیکن خوش قسمتی یا بدقسمتی سے' بچپن ہی سے میری ذہنی ساخت ایسی رہی ہے کہ میں باتوں سے

کبھی متاثر نہیں ہوئی۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"میں یہ باتیں آپ کو متاثر کرنے کے لیے نہیں' اپنا تعارف کرانے کے لیے کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"بہرحال..... یہ فیصلہ بعد میں ہوگا کہ تم کیا ہو' کیسے ہو اور اپنے نظریات سے کس حد تک مخلص ہو۔ فی الحال تمہارے ذمے صرف گھوڑوں کو سدھانے کا کام ہوگا۔ ان کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے دوسرے لوگ موجود ہیں۔ میں گھوڑوں کی فارمنگ کرتی ہوں۔ میرے پاس گھوڑوں کا خاصا بڑا فارم ہے جس سے مجھے چھوٹی موٹی انڈسٹری جتنی کمائی ہوتی ہے۔ میرے پاس گھوڑے سدھانے والے دو آدمی تھے۔ ایک کو کسی مجبوری کی وجہ سے کہیں جانا پڑ گیا ہے۔ معلوم نہیں وہ واپس آ بھی سکے یا نہیں۔ دوسرا آدمی یہ ہے....." اس نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو میری آمد کے وقت گھوڑے سے اُلجھا ہوا تھا۔

"اس کا نام شیر محمد ہے۔" زرتاج بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "ہمارے ہاں گھوڑے سدھانے کا جتنا کام ہے وہ اس اکیلے آدمی کے بس کی بات نہیں ہے۔ ہمارا جو آدمی جا چکا ہے' اس کی رہائش فارم پر ہی تھی۔ وہ تمہیں مل جائے گی۔ فارم میرے مکان کے پیچھے ہے۔ بولو تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ارادے تو ان سے پوچھے جاتے ہیں جن کے سامنے کئی راستے ہوں۔ یہاں تو عالم یہ ہے کہ بس آنکھیں بند کر کے بے ارادہ' بے منزل سفر کر رہا تھا۔ راستے میں آپ فرشتۂ رحمت کی طرح مل گئیں۔ میں کوشش کروں گا کہ جو کچھ بھی میرے بس میں ہو وہ آپ کے لیے کر سکوں۔"

"سوچ لو۔ کام بہت مشکل اور مشقت طلب ہے۔"

"اب تو مشکلات اور مشقت میں ہی زندگی کا لطف آنے لگا ہے۔"

میرے جواب پر اس نے ہنکارہ بھرتے ہوئے قدرے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور آنکھ کے اشارے سے گویا "مجلس" برخاست کر دی۔ شیر محمد اور بندوق برداروں کے علاوہ باقی سب لوگ گاؤں کی طرف چل دیے۔ وہ سب لوگ اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پتلیاں معلوم ہوتے تھے۔ اتنی دیر سے میری وہاں موجودگی کے دوران کسی نے ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔

شیر محمد نے اب تک سرکش گھوڑے کی لگام تھامی ہوئی تھی اور گھوڑا اب اس کا کم از کم اتنا لحاظ ضرور کر رہا تھا کہ محض لگام پکڑے جانے پر اچھل کود نہیں کر رہا تھا۔ شیر محمد کی نظروں میں میرے لیے ناپسندیدگی تھی اور جو کام میرے ذمے زرتاج لگا رہی تھی' اس کے بعد تو یقیناً مجھے مستقل طور پر شیر محمد کی ناپسندیدگی ہی نہیں بلکہ شاید نفرت و رقابت کا سامنا کرنا تھا۔ چھوٹے ذہن کے لوگ اپنے سے بہتر تو کیا' اپنے جیسا کام کرنے والوں کو بھی برداشت نہیں کرتے۔

زرتاج اپنی حویلی کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "آؤ..... میں خود ہی تمہیں فارم دکھا دیتی ہوں۔ شیر محمد! تم بھی آؤ۔" بندوق بردار کچھ فاصلہ چھوڑ کر اس کے دائیں بائیں چلنے لگے۔

شیر محمد نے سرکش گھوڑے کی لگام تھامے ہمارے ساتھ چلنے کی کوشش کی لیکن گھوڑے نے اس کے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا۔ اس کے چاروں کھر گویا زمین میں گڑ گئے تھے۔ شیر محمد اسے اپنی جگہ سے ہلانے میں ناکام رہا۔

بالآخر میں نے کہا "تم میرے گھوڑے کی لگام تھام لو' اس کی لگام مجھے دے دو۔"

شیر محمد نے بادل نخواستہ میرے سیاہ گھوڑے کی لگام تھام لی جو درحقیقت میرا بھی نہیں تھا۔ یہ گھوڑا نئے حالات اور نئے لوگوں سے سمجھوتا کرنے میں دیر نہیں لگاتا تھا۔ چپ چاپ شیر محمد کے ساتھ چل دیا۔ سرکش گھوڑے نے بھی میری عزت رکھ لی اور جیسے ہی میں نے اس کی لگام تھام کے تنبیہہ کے سے انداز میں ذرا سا بل دیا' وہ فوراً میرے ساتھ چلنے لگا۔ زرتاج مُربیانہ سے انداز میں مسکرا دی۔

میں دانستہ طور پر زرتاج سے ایک قدم پیچھے رہتے ہوئے چلنے لگا۔ اس کے پیروں میں چاندی کی خوبصورت پازیب تھی۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ یونہی ہلکی سی چھن چھن کے ساتھ چلتی رہے' حتیٰ کہ ہم افق تک جا پہنچیں لیکن افسوس کہ یہ ممکن نہیں تھا۔ حقیقت کی دنیا میں تو قدم قدم پر رُکنا پڑتا ہے۔

زرتاج گویا دھول مٹی پر نہیں' فرشِ مخملیں پر چل رہی تھی یا پھر شاید وہ ہوا کے جھونکوں پر قدم رکھتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھی اور میرے محسوسات سے بے خبر' سرسری سے انداز میں باتیں بھی کرتی جا رہی تھی۔

"خاص خاص گھوڑوں کے ہم نے نام بھی رکھے ہوئے ہیں۔" وہ بتا رہی تھی۔ "یہ گھوڑا جس سے تمہیں آج سب سے پہلے واسطہ پڑا ہے' اس کا نام مختار ہے اور یہ واقعی اپنی مرضی کا

مختار ہے۔ ہمارا جو آدمی جا چکا ہے' اس گھوڑے کو اسی نے سدھایا تھا۔ اس کے بعد سے یہ کسی کے قابو میں نہیں آیا۔"

دفعتاً اس نے ایک لمحے کے لیے گردن گھماتے ہوئے پوچھا "فضل خان! سرکش گھوڑوں کو قابو میں کرنے کے لیے صرف طاقت کی ضرورت ہوتی ہے یا کچھ ہنرمندی بھی درکار ہوتی ہے؟"

اس نے سوال بالکل سرسری سے لہجے میں کیا تھا۔ انداز دوستانہ تھا۔ ایک نخوت زدہ یا جاگیردار مالکن اور ایک نئے بھرتی ہونے والے ملازم کے درمیان اس لہجے میں گفتگو ہونے کی مجھے توقع نہیں تھی۔ اس انداز میں گفتگو تو کافی پرانے شناساؤں کے درمیان ہوتی ہے۔

میرے خیال میں اسے اس سوال کے جواب کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے گھوڑوں کا فارم کھول رکھا تھا' نہ جانے کب سے گھوڑے پال رہی تھی اور نہ جانے کب سے گھوڑے سدھانے والے اس کے ملازم تھے۔ اسے یقیناً اتنے سادہ سے سوالوں کے جواب تو معلوم ہوں گے۔

کوئی بعید نہیں تھا' وہ خود بھی سرکش گھوڑوں کو قابو میں کرنے کی ماہر رہی ہو لیکن اسے بظاہر سادہ اور بے ہُنری عورت نظر آنا بہتر لگتا ہو۔ سوال کرنے کا مقصد یقیناً مجھے صرف یہ احساس دلانا تھا کہ اس نے مجھ پر اعتماد کرلیا ہے اور اس لہجے میں بات کرنے لگی ہے جس لہجے میں جانے پہچانے لوگوں سے کی جاتی ہے۔

میں کوئی پیشہ ور' گھوڑے سدھانے والا نہیں تھا۔ میں نے تو صرف ذاتی دلچسپی کی بنا پر بہت سے کاموں میں ٹانگ اڑا کر ان میں کچھ نہ کچھ دسترس حاصل کر رکھی تھی جو بعض اوقات پیشہ وروں سے زیادہ میرے کام آجاتی تھی۔ تاہم میں نے بھی ویسے ہی شناسائی آمیز مگر پیشہ وروں جیسے پُراعتماد لہجے میں جواب دیا۔ "دونوں ہی چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔"

"میں نے بھی یہی محسوس کیا ہے۔" اس نے اثبات میں سرہلایا پھر شیر محمد کی طرف اشارہ کرکے بولی "شیر محمد کے پاس ہُنر تو ہے' طاقت نہیں۔"

میرے خیال میں اس نے اچھا نہیں کیا تھا کہ شیر محمد کے منہ پر یہ بات کہہ دی تھی۔ اپنے عیبوں' خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کسے اچھی لگتی ہے؟ تاہم شیر محمد کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ بدستور نظر جھکائے ہمارے ساتھ چلتا رہا۔

باقی فاصلہ خاموشی سے طے ہوا۔ اس دوران میں نے دوسرے لوگوں کا بھی جائزہ لینے کی کوشش کی۔ ابھی تک تو مجھے زرتاج ہی کا جائزہ لینے سے فرصت نہیں ملی تھی۔ کلاشنکوفوں اور رائفلوں والے بدستور خاموشی اور لاتعلقی سے زرتاج کے دائیں بائیں چل رہے تھے۔ ان کا انداز پیشہ ور باڈی گارڈز کا تھا۔ اپنے دیہاتی حُلیے اور سیدھے' سپاٹ چہروں کی وجہ سے وہ زیادہ تیز و طرار نظر نہیں آتے تھے مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے کام میں یکتا بھی تھے اور بے جگر بھی۔

حویلی کے قریب سے گزرتے وقت میں اس کی وسعت دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ کم از کم تین ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے تین اطراف میں باغ تھا۔ بیرونی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی مگر اس پر خاردار تار لگے ہوئے تھے۔ بہت سے درخت ان خاردار تاروں کے درمیان سے جھانک رہے تھے۔

اصل عمارت زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی لیکن پختہ اور خوبصورت تھی۔ اس کے جو دروازے باہر سے نظر آرہے تھے وہ محرابی تھے اور اس حصے کی ساخت میں ہسپانوی طرز تعمیر کی جھلک تھی۔ حویلی کا بیرونی دروازہ خاصا اونچا' بھاری بھرکم اور کسی قلعے کے صدر دروازے سے مشابہ تھا۔

اس وقت وہ بلند و بالا چوبی گیٹ بند تھا اور باہر اس کے قریب ہی ایک بہت لمبی چوڑی' بھاری بھرکم چارپائی پڑی تھی جس کے پائے شہتیروں جیسے تھے۔ اس چارپائی پر بھی تین کلاشنکوف بردار بیٹھے حقہ پی رہے تھے اور شاید کسی خوش کُن موضوع پر گپ شپ بھی کررہے تھے مگر زرتاج کو دور سے ہی آتے دیکھ کر وہ حقہ چھوڑ کر' صورتیں سنجیدہ بنا کر' مؤدب سے ہوکر اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ مستعد انداز میں گنوں پر پہنچ گئے تھے۔

زرتاج نے حویلی کے سامنے سے گزرتے وقت بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور ہم دیوار کے سائے میں آگے بڑھتے چلے گئے۔ ہمیں حویلی کے برابر سے گزر کر عقب میں جانا پڑا۔ میں نے دیکھا کہ اُدھر ایک عقبی گیٹ بھی تھا جو مین گیٹ کی نسبت کافی چھوٹا تھا اور اس پر تالا بھی پڑا ہوا تھا مگر ایک مسلح محافظ یہاں بھی چارپائی ڈالے بیٹھا تھا۔

سامنے تقریباً ایک فرلانگ کے فاصلے پر بہت بڑے رقبے پر ایک اونچی مگر کچی چار دیواری پھیلی ہوئی تھی۔ اندر لکڑی کے تختوں کے مضبوط شیڈ نظر آرہے تھے۔ یہ یقیناً زرتاج کا گھوڑوں کا فارم تھا۔ اندر سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ حویلی کا عقبی گیٹ اور فارم کا گیٹ ایک دوسرے کی سیدھ میں تھے۔ حویلی کے عقبی گیٹ پر موجود محافظ' فارم کے گیٹ پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔

فارم کے اندر بھی درخت لہلہا رہے تھے اور باہر بھی اس کے اطراف میں دور تک سرسبز گھاس پھیلی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ شاید یہ حصہ گھوڑوں کے لیے چراگاہ کا کام دیتا تھا۔ لہلہاتے درخت' سبزہ' کشادگی' صاف صاف سی فضا اور بالکل فطری سے مناظر۔ یہ سب کچھ بہت بھلا لگ رہا تھا۔ اس ماحول میں مجھے کلاشنکوفوں اور رائفلوں کے سوا کوئی بھی چیز بدصورت نہیں لگ رہی تھی۔

فارم کے گیٹ پر پہنچ کر زرتاج رک گئی اور شیر محمد نے آگے بڑھ کر تالا کھولا پھر لوہے کی بھاری بھرکم زنجیر ہٹائی۔ گیٹ کھلنے پر

مجھے ایک بار پھر ایک چھوٹے سے جہانِ حیرت کا سامنا تھا۔ میں نے اس سے پہلے اتنے بہت سے خوبصورت اور رنگا رنگ گھوڑے کبھی ایک جگہ پر نہیں دیکھے تھے جتنے اس فارم میں موجود تھے۔

دیواروں کے ساتھ ساتھ چھوٹے چھوٹے' صاف ستھرے اسٹال بنے ہوئے تھے۔ ہر اسٹال میں ایک ایک گھوڑا تھان پر بندھا ہوا تھا۔ بیسیوں اسٹالز میں ایک سے ایک نفیس گھوڑا موجود تھا۔ گھوڑوں کے بچے بھی تھے۔ فارم کے وسط میں ایک بہت بڑا' اونچا اور پختہ حوض تھا جس میں صاف شفاف پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی کی موٹریں' پائپ وغیرہ بھی لگے ہوئے تھے۔ فارم میں بہت صفائی ستھرائی نظر آرہی تھی۔ ظاہر یہی ہوتا تھا کہ فارم کا نظام کافی سلیقے سے چلایا جارہا تھا۔

"یہ ہے میرا چھوٹا سا فارم۔" زرتاج بولی۔ "میری فارمنگ بہت اونچے پیمانے کی تو نہیں ہے پھر بھی یہاں بعض کمیاب نسلوں کے بھی چند گھوڑے موجود ہیں۔ ان تمام گھوڑوں میں سے بہت کم سدھے ہوئے ہیں۔ سدھے ہوئے گھوڑے بہت جلد بک جاتے ہیں۔"

"کون خریدتا ہے انہیں؟" میں نے پوچھا۔

"اردگرد کے علاقوں میں زمینداروں میں ابھی تک بجیرو کے ساتھ ساتھ اچھے گھوڑے رکھنے کا بھی ذوق موجود ہے۔ میں نے سنا ہے' میرے فارم سے گئے ہوئے بعض گھوڑے دوسرے ملکوں سے لائے گئے گھوڑوں کے شانہ بشانہ ریس کورس میں بھی دوڑ رہے ہیں۔ مجھے زیادہ صحیح طور پر معلوم نہیں کیونکہ میں یہیں اپنی دنیا میں مگن رہتی ہوں' کہیں آتی جاتی نہیں۔ میرا دل یہیں لگتا ہے۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "عام سے گھوڑوں کو ہم کاشتکاری اور بار برداری میں استعمال کرتے ہیں۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ ہماری زمین پر ٹریکٹر اور مصنوعی کھادیں کم سے کم استعمال ہوں۔ ہم ہل بھی زیادہ تر گھوڑوں کی مدد سے چلاتے ہیں اور ہمارے ہاں ان کی کارکردگی بیلوں سے بہتر رہی ہے۔"

"حیرت ہے!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آپ کی اتنی بڑی زمینداری میں مجھے واقعی ٹریکٹر اور دوسری مشینری بہت کم نظر آئی ہے۔ آپ کا زیادہ تر انحصار پرانے طور طریقوں پر ہی ہے؟"

"ہاں۔" اس نے بلا تامل کہا۔ "میں بہت فرسودہ سی لڑکی ہوں۔"

پھر وہ فارم میں داخل ہوگئی۔ باقی سب لوگوں کو اس نے دروازے پر ہی رُکنے کا اشارہ کردیا تھا۔ صرف ہم دونوں ہر گھوڑے کا جائزہ لینے کے سے انداز میں رک رک کر آگے بڑھتے جارہے تھے لیکن حقیقتاً ہم دونوں ہی کا دھیان گھوڑوں کی طرف نہیں' صرف ایک دوسرے کی باتوں میں تھا۔

وہ ایک افسانوی سی شخصیت تھی اور میں نہایت افسانوی سے ہی انداز میں [illegible]

برسوں کا دوست محسوس کررہا تھا۔ بات افسانوی سی ہونے کے باوجود انوکھی نہیں تھی۔ انسان کی زندگی ہے ہی کیا؟ محض ایک افسانہ ہی تو ہے لیکن زرتاج کے محسوسات کیا تھے؟ یہ میں یقین سے نہیں بتا سکتا تھا۔

وہ ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ "تمہیں یہ جان کر مایوسی نہیں ہوئی کہ میں ایک فرسودہ لڑکی ہوں؟"

"فی الحال میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ آپ کے بارے میں یہ جان کر خوش ہوسکوں کہ آپ بہت ماڈرن اور آزاد خیال ہیں یا یہ جان کر مایوس ہوسکوں کہ آپ بہت فرسودہ لڑکی ہیں۔" میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسی۔ "ویسے بعض لوگوں کو یہ جان کر مایوسی ہوتی ہے کہ میں ایک فرسودہ لڑکی ہوں حالانکہ میں آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی ہوں۔ یونیورسٹی میں ایک بار باتھ رومز کے کوریڈور میں ایک گورے نے مجھے دبوچ لیا حالانکہ آکسفورڈ کی اپنی روایات ہیں۔ وہاں پڑھنے والے نسبتاً نرم خُو اور مہذب ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی لڑکی پسند آجائے تو زبردستی اس کے گلے پڑنا ان کے نزدیک بھی کوئی معیوب یا زیادہ غیر مہذبانہ حرکت نہیں ہوتی۔ میں نے اسے بھی یہی بتانے کی کوشش کی تھی کہ میں بہت فرسودہ لڑکی ہوں لیکن اس نے میری ایک نہیں سُنی......"

"پھر کیا ہوا؟" میں اسے خاموش دیکھ کر اپنا تجسس نہ چھپا سکا۔

"ہونا کیا تھا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "مجھے گھونسا مار کر اس کے دو دانت توڑنے پڑے تھے۔ میرے پیروں میں فل بوٹ تھے۔ دو تین لاتیں میں نے اس کے پیٹ پر رسید کیں تو ساری وسکی باہر آگئی جو اسے بدمست بنائے ہوئے تھی۔ میری غلطی یہ تھی کہ میں اس وقت ان جیسے لباس میں تھی۔ شاید اس نے سمجھا تھا کہ میں لباس ان جیسا پہنے ہوئے ہوں تو میرے خیالات بھی ان جیسے ہی ہوگئے ہوں گے۔"

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا ذہن اسی انکشاف میں پھنسا ہوا تھا کہ وہ آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "بات بہت بڑھ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ انگریز بڑے انصاف پسند ہوتے ہیں لیکن کم از کم میرے معاملے میں انہوں نے ذرا سی بھی انصاف پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ خصوصاً اس لڑکے کے دانت توڑنے کا انہوں نے بہت بُرا منایا اور خاصے تعصب سے کام لیتے ہوئے مجھے ایک سال کے لیے یونیورسٹی سے نکال باہر کیا۔ میں واپس آگئی۔ ایک سال بعد میرا دوبارہ داخلہ لینے کو دل ہی نہیں چاہا۔"

وہ میری حیرت سے بے نیاز' میری طرف دیکھے بغیر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اسی ہموار لہجے میں سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ میں زیادہ مشینری بھی

منگوا سکتی ہوں' اپنی کھیتی باڑی کی رفتار تیز کر سکتی ہوں، زیادہ روپیہ کما سکتی ہوں مگر روپیہ پیسہ ہی تو زندگی کا مقصد نہیں ہے۔ میں اپنی جگہ بہت خوش ہوں' مطمئن ہوں۔ میرے ہاری بھی خوش ہیں۔ مجھ سے بھی...... اور میرے حالات سے بھی۔"

"بڑی عجیب سی بات ہے کہ انسان دولت کا مزہ چکھ چکا ہو اور اس کے سامنے مزید دولت پڑی ہو لیکن وہ ہاتھ بڑھا کر اسے نہ اٹھائے۔ ناقابلِ یقین سا لگتا ہے۔" میں نے اس کے نظریات کو ذرا بہتر طور پر جاننے کے لیے کہا۔

"دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں کہ تمہیں تمہاری مختصر سی زندگی میں ہر طرح کا انسان ٹکرائے۔ ہر انسان اپنی زندگی جس دائرے میں گزارتا ہے اور جو کچھ دیکھتا ہے' وہ سمجھتا ہے کہ بس یہی دنیا ہے اور یہی دنیا کے لوگ ہیں حالانکہ اس نے دنیا کا ایک گوشہ بھی نہیں دیکھا ہوتا۔"

"مان لیا۔" میں نے اثبات میں سرہلایا۔ "لیکن کیا مشینیں واقعی بری چیز ہیں؟"

"مشینیں اگر بری چیز نہیں ہیں تو کچھ زیادہ اچھی چیز بھی نہیں ہیں۔ زندگی میں مشینوں کا عمل دخل بڑھتا ہے تو انسانوں کا عمل دخل گھٹ جاتا ہے۔" وہ گہری سانس لے کر بولی اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس کی چادر کندھوں پر ڈھلک آئی تھی۔ اس کی زُلفیں کیا تھیں' سیاہ ریشم کا ایک آبشار تھا۔ اس نے بالوں میں ہاتھ پھیرا تو اس آبشار سے خوشبو سی پھوٹنے لگی۔

وہ میری طرف مُڑتے ہوئے بولی۔ "اچھا...... ایک بات بتاؤ۔ انسان نے وقت بچانے کے لیے مشینیں ایجاد کی تھیں لیکن آج انسان کے پاس وقت نہیں ہے۔ بتاؤ وہ وقت کہاں گیا جو اس نے مشینیں ایجاد کرکے بچایا تھا؟"

"معلوم نہیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔ یہ بہت تفصیل طلب موضوع تھا۔ میں اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔

زرتاج کھوئے کھوئے سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرے والد مرحوم ایک گمنام مگر بہت بڑے دانشور تھے۔ کوشش کرتے تو بڑا نام پا سکتے تھے۔ انہوں نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ ایک وقت آئے گا جب دنیا میں مشینیں زیادہ ہوں گی' انسان کم۔ انسان مشینوں کو اپنے اوپر اتنا مسلط کرلے گا کہ ان کے بغیر وہ ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکے گا۔ درحقیقت اس وقت انسان مشینوں پر نہیں بلکہ مشینیں انسان پر حکمرانی کر رہی ہوں گی اور انسان اپنی زندگی سے اتنا بیزار ہوگا کہ دیواروں سے سر ٹکرائے گا۔ طاقتور ترین خواب آور دوائیں کھا کر بھی اسے نیند نہیں آئے گی۔ وہ خوراک کم' دوائیں زیادہ کھائے گا۔ صرف مغربی ممالک میں ہی نہیں بلکہ جلد یا بدیر دنیا کے بیشتر ممالک میں ہر قوم اپنی تہذیب کے خنجر سے خودکشی کرلے گی۔ اس وقت لوگ فطری زندگی کی طرف واپس آنا چاہیں گے' سادہ زندگی کی طلب کریں گے۔ ایک کچا مکان' دو چار ایکڑ زمین' دو جوڑے کپڑے' ایک ہل' چند درخت اور صاف ہوا مانگیں گے مگر وہ انہیں نہیں مل سکے گی۔ آبادی اتنی بڑھ چکی ہوگی اور ہم ترقی کے راستے پر اتنا آگے جاچکے ہوں گے کہ واپسی کے راستے بند ہوچکے ہوں گے۔ دنیا کی حالت ایسی ہی ہوچکی ہوگی جیسے ایک خوبصورت تصویر بچوں کے ہاتھ میں دے دی گئی ہو اور انہوں نے اسے اس بُری طرح برباد کردیا ہو کہ اسے اصل شکل پر لانا بڑے سے بڑے مصور کے بھی بس میں نہ رہا ہو۔"

پھر وہ جُھرجُھری سی لے کر بولی۔ "میں اس وقت کو آنے سے تو نہیں روک سکتی لیکن میں اپنے بابا کے فلسفے کو تو زندہ رکھ سکتی ہوں اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ میں اس فلسفے کی روشنی میں زندگی گزارنے کی کوشش کروں۔ میں چاہتی ہوں' میرے اردگرد مشینیں کم سے کم ہوں اور انسان زیادہ سے زیادہ۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے ہاں ہر کام کے لیے کم سے کم معاوضے پر انسان مل جاتا ہے۔ چنانچہ یہاں کسی صاحبِ حیثیت کے لیے اپنے اردگرد زیادہ سے زیادہ انسان اکٹھے کرلینا زیادہ مشکل کام نہیں۔ میں انسانوں پر حکومت کرنا چاہتی ہوں' مشینوں پر نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے' آپ کے مزاج میں بہرحال حاکمیت پسندی ہے۔" میں بے اختیار کہہ گیا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے بغور میری طرف دیکھا اور بولی "ہاں۔ حاکمیت تو ہے میرے مزاج میں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ میں اندر سے بہت تنہا ہوں اور اپنے گرد زیادہ سے زیادہ بھیڑ بھاڑ دیکھ کر اپنے احساسِ تنہائی کو دھوکا دینا چاہتی ہوں۔"

پھر وہ گویا کوئی الزام اپنے سر سے ہٹانے کی کوشش میں جلدی سے بولی "یہ دونوں باتیں ہر انسان میں ہوسکتی ہیں۔ کہیں چھوٹی سطح پر اور کہیں بڑے پیمانے پر جس کا جہاں تک بس چلے' وہاں تک وہ اپنی حاکمیت چلائے بغیر نہیں رہتا۔ بہت مجبور اور نچلے درجے کا آدمی گھر میں بیوی بچوں پر ہی حکم چلا کر اس جذبے کی تسکین کا سامان کرلیتا ہے۔"

پھر وہ آسمان کی طرف دیکھ کر گویا شفق کی سرخی سے سحرزدہ سی ہوتے ہوئے بولی۔ "میں نہیں چاہتی کہ میرے گرد انسان کم ہوجائیں اور مشینوں کا شور بڑھ جائے۔ مشینیں زیادہ ہوجاتی ہیں تو انسان سے انسان کی وابستگی کم ہوجاتی ہے۔ میں ماحول کو اس کے اصل اور قدیم رنگ میں دیکھ کر لطف محسوس کرتی ہوں لیکن اس بات کو ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ ہر ایک اس سے انجوائے نہیں کرسکتا۔ جس طرح کلاسیکی موسیقی ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آتی اور اس سے ہر کوئی محظوظ نہیں ہوسکتا' اسی طرح فطری زندگی کی خوبصورتی اور دلکشی کو بھی ہر ایک نہیں سمجھ سکتا۔"

پھر وہ میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولی۔ "تم میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے ہو؟"

"جو آپ کے پاس کھڑے ہو کر بھی بور ہو' وہ دنیا کا نہایت بدنصیب انسان ہوگا۔" میں نے کہا۔

"اب میرے حسن کی تعریفیں نہ شروع کردینا۔ وہ میں زندگی میں بہت سن چکی ہوں اور مجھے بالکل اچھی نہیں لگتیں۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"شاید آپ دنیا کی پہلی خاتون ہیں جسے اپنے حسن کی تعریف سننا اچھا نہیں لگتا۔" میں نے کہا۔

"اس دنیا میں بہت کم تعریفی الفاظ سچے دل سے ادا کیے جاتے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ کمی خلوص کی ہوتی ہے۔" وہ بولی۔

"خیر... میں اگر خلوص اور سچے دل سے بھی تعریف کرنا چاہوں گا تب بھی اتنے پاگل پن کا ثبوت نہیں دوں گا کہ پہلی ہی ملاقات میں ایسی باتیں کرنے لگوں۔"

"یعنی آگے چل کر ارادہ ہے؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"مستقبل کا حال اوپر والا ہی بہتر جانتا ہے۔" میں نے درویشانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

وہ چادر کندھوں پر کچھ اور پھیلاتے ہوئے بولی۔ "میں شاید تمہیں باتونی لگوں لیکن میں پہلی ہی ملاقات میں ہر ایک سے اتنی زیادہ باتیں نہیں کرتی۔ آج شاید اس لیے کر رہی ہوں کہ مُدت بعد کوئی ایسا سامع میسر آیا ہے جو مشکوک سے حُلیے اور مشکوک سے انداز میں یہاں پہنچا ہے لیکن جس کی آنکھوں میں ذہانت کی چمک اور لہجے میں تہذیب کی جھلک ہے۔"

"اب مجھے ہوشیار ہوجانا چاہیے۔ اب تعریف آپ کر رہی ہیں۔" میں نے کہا۔

"یہ تعریف نہیں' صرف رواں تبصرہ ہے۔" پھر وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ "خیر...... چھوڑو ان باتوں کو۔ میں فطری خوبصورتیوں کی بات کر رہی تھی۔ جس طرح موسیقی میں بھی لوگ جدید دُھنوں کی تیزی' شور شرابے اور وقتی ہیجان خیزی سے متاثر ہو کر پاپ میوزک کو پسند کرنے لگتے ہیں مگر یہ پسندیدگی طویل عرصے کے لیے نہیں ہوتی' اسی طرح لوگ آج کل دنیا کے بڑے بڑے اور پُرآسائش شہروں میں جو زندگی بسر کر رہے ہیں وہ بھی گویا "پاپ" زندگی ہے لیکن یہ بہت طویل عرصے تک پاپولر نہیں رہے گی۔ میرے بابا اور ان جیسے دوسرے دانشوروں کی پیش گوئیاں درست ثابت ہوں گی۔ انسان اپنے اصل کی طرف واپس آنے کی کوشش ضرور کرے گا گو کہ اس کی یہ کوشش کامیاب نہیں ہوگی۔ وہ جدت اور فطرت' دونوں کے درمیان پھنس کر رہ جائے گا۔"

اس نے ایک بار پھر بغور میری طرف دیکھا اور بولی۔ "مجھے یقین ہے کہ میری باتیں تمہاری سمجھ میں آرہی ہیں۔"

"اگر آپ کو یہ یقین نہ ہوتا تو آپ یہ باتیں ہرگز نہ کرتیں۔"

"بے شک۔" اس نے تصدیق کی اور ایک بار پھر اسی موضوع پر آتے ہوئے بولی۔ "اگر تمہیں پڑھنے لکھنے کا تھوڑا بہت شوق رہا ہے تو شاید تمہیں معلوم ہو کہ مغرب میں تو اُلٹا سفر شروع

بھی ہو چکا ہے۔ پہلے وہاں بھی ہمارے ملک کے بیشتر حصوں کی طرح دیہات میں غریب کاشتکار وغیرہ رہا کرتے تھے اور شہروں کی فلک بوس، جگمگاتی عمارتوں اور چوڑی چکنی سڑکوں کو حسرت سے دیکھا کرتے تھے۔ اب لکھ پتی اور کروڑ پتی لوگ دیہاتوں کا رُخ کر رہے ہیں، فارمنگ کر رہے ہیں۔ لوگوں نے سب کچھ دیکھ لیا ہے اور بہت کثرت سے دیکھ لیا ہے۔ اب وہ ہر چیز سے اُکتا گئے ہیں۔ فطرت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔"

پھر وہ پانی کی ایک موٹر کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "مصنوعی آسائشوں کا آرام تو بہت ہے لیکن ان پر انحصار کرنے کی تکلیفیں بھی بہت ہیں۔ یہ موٹر پانی تو بہت تیزی سے اِدھر اُدھر کر دیتی ہے لیکن بجلی کے بغیر یہ بے کار ہے۔ اگست ۱۹۷۷ء میں پہلی بار پورے نیویارک کی بجلی فیل ہو گئی تھی تو اس مہذب شہر میں کیا کیا قیامتیں برپا ہوئی تھیں، تم ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان واقعات کے بارے میں ایک ضخیم کتاب بھی چھپی تھی۔ میرے پاس ہے۔ ضخیم ہونے کے باوجود وہ ان تمام واقعات کی محض ایک جھلک ہے لیکن اس جھلک سے بھی اندازہ ہو سکتا ہے کہ مصنوعی آسائشیں اور جدید ترین زندگی کی کشاکش انسان کو کہاں لے جا رہی ہے۔ انسان کے اندر کیسا کیسا درندہ چھپ کر بیٹھ گیا ہے جو موقع پاتے ہی نکل آتا ہے۔"

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس پسماندہ علاقے میں رہتے ہوئے وہ اپنے نظریات، رُجحانات اور ذوق کے اعتبار سے ایک بے مثل لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ میں اپنے آپ کو خوش قسمت محسوس کر رہا تھا کہ شکستہ حالی کے عالم میں بھٹکتے ہوئے ایسی شخصیت کی عملداری میں آنکلا تھا اور وہ مجھ پر مہربان بھی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے آپ کو فرسودہ لڑکی کہہ رہی تھی۔ شاید ازراہِ انکساری کہہ رہی تھی۔ میرے خیال میں تو وہ آنے والے زمانوں کی لڑکی تھی۔

اچانک ہی وہ بولی۔ "میں وہ کتاب تمہیں بھی دوں گی، ذرا پڑھنا۔"

اس نے میری شخصیت سے ایک آدھ پرت اتارنے کے لیے اچانک ہی ہاتھ مارا تھا۔ میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ "آپ نے کیونکر سمجھ لیا کہ میں انگریزی کتابیں پڑھ سکتا ہوں؟ میں اب اتنا بھی پڑھا لکھا نہیں ہوں۔ واجبی سی تعلیم ہے میری۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ اچھے لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع ملتا رہا ہے۔"

"اچھا.... کیا واقعی تم انگریزی نہیں پڑھ سکتے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"بہت معمولی حد تک پڑھ سکتا ہوں۔ باقاعدہ کتابیں وغیرہ نہیں پڑھ سکتا۔" میں نے جواب دیا۔

وہ گردن کو خفیف سا جھٹکا دے کر رہ گئی لیکن آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا وہ کہہ رہی تھی۔ 'تم کہتے ہو تو مان لیتی ہوں ورنہ میرے اندازے عموماً غلط نہیں ہوتے۔'

اس دوران ہم فارم کے دوسرے سرے پر پہنچ چکے تھے۔ یہاں پچھلی دیوار میں ایک راہداری سی نظر آ رہی تھی جس کے اختتام پر دروازہ تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ فارم سے منسلک، دو کمروں کا ایک چھوٹا سا سرونٹ کوارٹر ٹائپ مکان تھا۔ اس میں دو کمرے، اچھا بھلا صحن، ہینڈ پمپ والا باتھ روم اور باورچی خانہ وغیرہ تھا۔ مکان میں ضرورت کی ہر چیز بھی موجود تھی۔ اس کا ایک الگ دروازہ بھی تھا۔ باہر سے باہر بھی اس مکان میں آمدورفت رکھی جا سکتی تھی اور فارم کے اندر سے بھی۔

"یہاں قائم دین اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔" زرتاج نے بتایا۔ "قائم دین اس شخص کا نام ہے جس کا میں نے کچھ دیر پہلے ذکر کیا تھا کہ وہ ہمارے لیے گھوڑے سدھایا کرتا تھا اور اس فارم کا منیجر تھا۔ وہ کچھ نجی مجبوریوں کی وجہ سے یہاں سے بہت دور چلا گیا ہے۔ میرے پاس سمجھ دار اور زیادہ ہُنرمند لوگوں کی کمی ہے ورنہ شاید میں گھوڑوں کی فارمنگ کو بہت آگے لے جاتی اور کچھ دوسرے جانوروں کے بھی فارم بناتی لیکن اکیلی عورت اتنے زیادہ بکھیڑوں میں نہیں پڑ سکتی۔ میرے پاس ایسے لوگ کم ہیں جنہیں ایک بار کام شروع کر کے دے دیا جائے اور پھر ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔"

پھر اس نے گویا وضاحت کی۔ "میں زیادہ سے زیادہ دولت کے لالچ میں اپنے کام پھیلانا نہیں چاہتی۔ میں چاہتی ہوں، مجھے بے شک کوئی خاص منافع نہ ہو لیکن زیادہ سے زیادہ لوگ روزگار سے لگیں۔ میرے گاؤں میں، میری زمینوں پر زیادہ سے زیادہ رونق اور چہل پہل ہو۔ زندگی یہاں مختلف رنگوں میں، مختلف شکلوں میں زیادہ سے زیادہ پھلے پھولے۔ کہنے کو تو یہ ایک دیہی علاقہ ہو لیکن لوگ روزگار کی تلاش میں یہاں دور دور سے آئیں۔ میں اسے ایک ماڈل علاقہ بنانا چاہتی ہوں لیکن بہت سی مجبوریاں آڑے آ جاتی ہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر بولی۔ "میں ایک بار پھر تصدیق چاہوں گی کہ تم میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے؟"

"اور میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ آپ کی باتوں سے بور ہونا بڑی ہی بدنصیبی کی بات ہو گی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو یہ خواب و خیال اور افسانوں کی دنیا کی باتیں لگ رہی ہیں۔ آپ کی خواہش ہے کہ لوگ دور دور سے روزگار کی تلاش میں یہاں آئیں جبکہ ہمارے ہاں لوگوں کا بس نہیں چل رہا کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی اپنی گلیوں، محلّوں اور شہروں سے نکال باہر کریں۔"

"ہاں۔" اس کے چہرے پر افسردگی کی ایک لہر سی آ کر گزر گئی۔ "لوگ نظام کی خرابیوں کی سزا ایک دوسرے کو دینے پر تلے رہتے ہیں۔ لوگوں کو یہ نہیں معلوم کہ جہاں انسان ہوتے ہیں وہاں برکت ہوتی ہے۔ جہاں سے انسان کوچ کرنے لگتے ہیں وہ جگہیں رفتہ رفتہ اُجڑ جاتی ہیں۔"

پھر اس نے کندھے اُچکائے اور اس کے ہونٹوں پر وہ خفیف سی مسکراہٹ لوٹ آئی جو اس کی اُجلی اُجلی شخصیت کو کچھ اور اُجال دیتی تھی۔ "خیر.... یہ بتاؤ تمہارے لیے یہ مکان مناسب رہے گا؟"

"مناسب....؟" میں نے حیرت سے دُہرایا۔ "میرے لیے اس وقت یہ کسی پُر آسائش محل سے کم نہیں۔ اب میں محض لفظوں میں آپ کا شکریہ ادا کرتے رہنا نہیں چاہتا۔ اب میں آپ کے لیے کچھ کر کے دکھانا چاہتا ہوں۔"

"اس کے تمہیں بہت سے مواقع ملیں گے۔" وہ بولی۔ "اب میں چلتی ہوں۔ یہاں ضرورت کی زیادہ تر چیزیں موجود ہیں۔ دو ملازم دن بھر یہاں رہتے ہیں۔ رات کو گاؤں چلے جاتے ہیں۔ اس وقت وہ کسی کام سے گئے ہوئے ہیں۔ تمہیں جس چیز کی بھی ضرورت ہو، ان سے کہہ دینا۔ یہاں کا ہر کام، صفائی ستھرائی وغیرہ وہی کرتے ہیں۔ رفتہ رفتہ تم سارے ماحول سے آشنا ہو جاؤ گے۔ آمدورفت کے لیے یہاں ایک الگ گھوڑا اور بگھی بھی موجود ہے۔"

میں اس کے ساتھ ساتھ واپس فارم کے گیٹ تک آیا۔ اس وقت تک شیر محمد کسی نہ کسی طرح سرکش گھوڑے اور میرے سیاہ گھوڑے کو دو خالی اسٹالز میں باندھ چکا تھا۔ وہاں اور بھی کئی سیاہ گھوڑے موجود تھے۔ میرا گھوڑا بھی گویا انہی میں شامل ہو گیا تھا۔ اب اس کی کوئی الگ شناخت نہیں رہی تھی۔

زرتاج نے مجھے خدا حافظ کہا اور اپنے آدمیوں کے گھیرے میں اپنی حویلی کی طرف چل دی۔ میں دروازے پر کھڑا دیر تک سوچتا رہا کہ میری خواری دیکھ کر یقیناً خدا کو مجھ پر ترس آگیا تھا تبھی میرا ہر مسئلہ یوں بالکل غیر متوقع طور پر حل ہو گیا تھا۔

○☆○

میں نے دو دن وہاں بغیر کوئی کام کیے گزار دیے۔ میں تو دوسرے دن سے ہی کام شروع کرنا چاہتا تھا لیکن شیر محمد نے انتہائی ناگواری سے مجھے بتایا۔ "رئیسانی نے بولا ہے ابھی آرام کرو۔ تمہارے لیے جب کام شروع کرنا ضروری ہو گا ہم تمہیں بتا دیں گے۔"

رئیسانی سے مُراد زرتاج تھی۔ یہ بات صاف ظاہر تھی کہ شیر محمد مجھ پر زرتاج کی نوازشات سے خوش نہیں تھا اور اس نے یہ بات چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی تھی لیکن غنیمت یہ تھا کہ اس کی ناگواری اور ناخوشی صرف اس کے لہجے تک محدود تھی۔

ان دو دنوں کے دوران میں بہت محتاط رہا تھا۔ ہر آہٹ اور ہر شخص پر میری نظر رہی تھی۔ اس کے علاوہ میں وہاں کے ماحول کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید انسپکٹر رحیم گل اس طرف بھی آنکلے لیکن کم از کم ان دو دنوں میں تو وہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دیا تھا اور نہ ہی کسی ذریعے سے اس کی آمد کی اطلاع ملی تھی۔

اس دوران میرا حلیہ بھی بدل چکا تھا۔ پہلے ہی دن گاؤں سے ایک درزی آکر میرا ناپ لے گیا تھا اور دوسرے دن میرے لیے دو جوڑے سل کر آگئے تھے۔ درزی نے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ وہ پتلون بش شرٹ وغیرہ بھی سی سکتا ہے اور دو تین روز میں میرے لیے بقول اس کے "انگریجی اسٹائل" کے بھی دو تین جوڑے سی کر بھیجے گا۔

نیا لباس میسّر آتے ہی میں نے اپنے جسم سے آسیب کی طرح چمٹی ہوئی سیاہ پینٹ شرٹ کو محاورتاً نہیں، حقیقتاً چولہے میں جھونک دیا تھا۔ چمڑے کی جیکٹ کو البتہ میں نے جلانے کی کوشش نہیں کی۔ خواہ مخواہ اس کی بُو بہت دور تک پھیل جاتی۔ اس کے لیے مجھے اصطبل میں ایک نہایت مناسب گڑھا مل گیا اور میں نے اسے وہاں دفن کر دیا۔

صفائی ستھرائی وغیرہ کرنے والے دونوں ملازموں میں سے ایک میرے لیے کھانا پکا دیتا تھا۔ وہی سودا سلف بھی لاتا تھا۔ میں تو ان دو دنوں میں ایک بار پھر خود کو اچھا بھلا "صاحب" محسوس کرنے لگا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ زرتاج نے میرے لیے چند کتابیں بھی بھجوا دی تھیں۔ قابلِ غور بات یہ تھی کہ میرے یہ بتانے کے باوجود کہ میں انگریزی کتابیں نہیں پڑھ سکتا، ان میں دو تین انگریزی ویسٹرن ناول بھی شامل تھے۔ شاید اسے میری بات پر یقین نہیں آیا تھا اور شاید اس نے اِسی مناسبت سے ناول بھجوائے تھے کہ جب میں یہاں پہنچا تھا تو خود کسی ویسٹرن فلم کا کردار معلوم ہو رہا تھا۔

بہرحال میں نے یہ چیزیں میسّر آتے ہی دیسی قالب میں ڈھلنے میں دیر نہیں لگائی تھی۔ زرتاج کی بھیجی ہوئی کتابوں کے مطالعے میں بھی میں نے خاصا وقت گزار لیا تھا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھے لیٹا پڑھتا رہتا تھا۔ مجھے تو کچھ ایسا ہی محسوس ہونے لگا تھا جیسے میں اپنی کسی جنتِ گم گشتہ میں پہنچ گیا تھا۔

لیکن آرام کرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے "تھکا" دینے کے لیے دو دن کا "آرام" ہی کافی تھا۔ تیسرے دن آرام سے تنگ آکر میں نے خود ہی زرتاج کو پیغام بھجوایا کہ میں گھوڑوں کو سدھانے کا کام کرنا چاہتا ہوں، مجھے اجازت دی جائے۔

پیغام کے جواب میں شیر محمد میرے پاس آیا۔ آج اس کی آنکھوں میں کینہ نہیں، صرف سرد مہری تھی۔ اس کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ یہ امید بھی رکھی جا سکتی تھی کہ چند دن میں یہ سرد مہری اس کی آنکھوں سے رخصت ہو جائے گی لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ اس کی کینہ پروری لوٹ آتی۔ آدمی کینہ پرور ہی معلوم ہوتا تھا۔

اس کے دونوں کندھوں پر دو کلاشنکوفیں جھول رہی تھیں۔ ایک کلاشنکوف اتار کر اس نے بڑے اطمینان اور بے پروائی سے

فاضل میگزینوں سمیت میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "یہ رئیسانی نے تمہارے لیے بھیجی ہے۔ ہمارا علاقہ ذرا خطرناک ہی ہے۔ تمہیں اپنی اور اس جاگیر سے تعلق رکھنے والے ہر شخص کی حفاظت کے سلسلے میں چوکنا رہنا ہوگا۔ یہ مت سمجھنا کہ تمہیں صرف گھوڑوں کی ہنہناہٹ میں ہی مگن رہنا ہوگا۔"

"نہیں۔ مجھے اندازہ ہے کہ مجھے کچھ انسانوں کی ہنہناہٹ بھی سننا پڑے گی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

اس نے کڑی نظر سے مجھے گھورا لیکن میری بات کا کوئی جواب دیے بغیر بولا۔ "دو باتوں کا خیال رکھنا۔ ایک تو اس گن کے بل بوتے پر کوئی واردات نہ کر بیٹھنا۔ صرف اپنی رئیسانی جی، ان کی جاگیر، ان کے مال و دولت اور ان کے لوگوں کی حفاظت کے لیے یہ گن استعمال ہونی چاہیے۔ خاص طور پر یہ بات ذہن نشین کرلو کہ اس گن سے کسی پولیس والے پر کسی بھی حال میں گولی نہیں چلنی چاہیے......"

میں ذرا چونکا۔ شیر محمد بطورِ خاص مجھے یہ نصیحت کیوں کررہا تھا؟ میں نے اس کے چہرے پر اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس گن کا لائسنس نہیں ہے۔ یہاں موجود بہت کم اسلحے کا لائسنس ہے لیکن تم سے کوئی لائسنس کے بارے میں پوچھے گا بھی نہیں۔ ہمارے علاقے میں پولیس کا عمل دخل بہت کم ہے۔ یہاں کے زیادہ تر جھگڑے ہم خود ہی طے کرتے ہیں لیکن کبھی کبھی کسی خاص معاملے کی تفتیش یا کسی کا پیچھا کرتے ہوئے پولیس ادھر آنکلتی ہے۔ کبھی ناگوار حالات میں بھی ان سے سامنا ہوسکتا ہے لیکن جب تک رئیسانی کا حکم نہ ہو، ان سے پنگا نہیں لینا ہے۔"

میں نے گن چارپائی کے سہارے کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ "یہ احکامات واقعی رئیسانی کے ہیں یا تمہارے اپنے؟"

"بات رئیسانی کے دل کی ہے، صرف الفاظ میرے ہیں۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا۔

"میرا خیال ہے الفاظ سے ہی کافی فرق پڑگیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کیا میں شکل سے وارداتیا نظر آتا ہوں جو ان ہدایات کی ضرورت پیش آئی؟"

"شکل کا کیا ہے بھائی!" وہ بے رُخی سے بولا "شکل سے تو تم فلمی ہیرو لگتے ہو مگر اعمال شکل پر نہیں لکھے ہوتے..... اور پھر رئیسانی جی کا کیا ہے...... وہ بہت بڑی عورت ہیں مگر بہت ہی بھولی اور سادہ دل ہیں۔ کوئی ان سے ذرا میٹھی میٹھی باتیں کرلے، اس کے لیے مہربانیوں کے دریا بہا دیتی ہیں۔ اچھی باتیں ان کی کمزوری ہیں۔ ایک منٹ میں متاثر ہوجاتی ہیں۔"

"اچھا.....؟" میں نے دلچسپی سے کہا۔ "کیا اس سے پہلے بھی وہ لوگوں سے متاثر ہوتی رہی ہیں؟"

"بے شک لیکن اس طرح..... اور اتنی جلدی نہیں، جتنی جلدی تم پر مہربان ہوئی ہیں لیکن اس سے تم کسی غلط فہمی میں مبتلا نہیں ہوجانا۔ رئیسانی جی اپنی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے والے کی آنکھیں نکلوا کر پیروں تلے مسل سکتی ہیں۔ اگر وہ اس کام میں چُوک جائیں یا رحم کھا جائیں تو ہم خود ہی یہ خدمت انجام دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

"لاحول ولا......" میں نے بدمزگی سے کہا۔ "کیا کوئی اتنا بے وقوف اور احسان فراموش بھی ہوسکتا ہے کہ رئیسانی کی طرف میلی نظر سے دیکھے؟"

"ابھی تک ایسا ہوا تو نہیں لیکن وقت کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ ہم ہر طرح کے وقت کے لیے تیار رہتے ہیں۔" اس نے شاطرانہ لہجے میں کہا پھر اپنی مونچھ مروڑتے ہوئے بولا۔ "خیر...... چھوڑو ان باتوں کو۔ آؤ آج کام شروع کریں۔ شاید ہمیں بھی تم سے کوئی نئی چیز سیکھنے کا موقع ملے۔"

"یقیناً۔" میں نے ذرا بھی انکساری ظاہر کیے بغیر کہا۔ "اگر انسان میں سیکھنے کی صلاحیت ہو تو وہ ہر شخص سے ہی کچھ نہ کچھ سیکھ سکتا ہے۔"

ہم فارم پر آگئے۔ وہاں گھوڑوں کو سدھانے کا ضروری سامان موجود تھا۔ شیر محمد نے بتایا کہ کون کون سے گھوڑے سرکش تھے اور سدھے ہوئے نہیں تھے۔ ہم نے ان میں سے دو گھوڑے منتخب کیے اور باہر اسی میدان میں آگئے جہاں میں نے تین دن پہلے شیر محمد، زرتاج اور دوسرے لوگوں کو دیکھا تھا۔

وہاں تک پہنچنے کے لیے ہم حویلی کے قریب سے بھی گزرے۔ حویلی کے در و دیوار سکوت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ بہت دور کھیتوں میں مرد اور عورتیں کام کرتی نظر آرہی تھیں۔

"آج رئیسانی جی نظر نہیں آرہی ہیں۔" میں نے سرسری لہجے میں کہا۔

"رئیسانی جی تو اکثر ہی نظر نہیں آتیں۔" شیر محمد بولا۔ "وہ تو تمہاری خوش قسمتی تھی کہ اس روز وہ تمہیں نظر آگئیں۔ ان کا باہر چہل قدمی کا موڈ تھا۔ ورنہ وہ تو چہل قدمی بھی حویلی کے اندر ہی کرلیتی ہیں۔ ان کا تو یہ عالم ہے کہ سامنے زمینیں ہیں مگر وہ معائنے پر نہیں نکلتیں۔ کبھی کبھار یونہی سیر کرنے کے انداز میں ادھر نکل آتی ہیں۔ بعض لوگوں کی سستی اور غفلت پر انہیں سزا دینا تو درکنار، ڈانٹ ڈپٹ تک نہیں کرتیں۔ یوں پیار سے سمجھاتی ہیں جیسے سب ان کے عزیز رشتے دار ہیں۔"

پھر وہ گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ذرا دیکھو...... گاؤں چند قدم کے فاصلے پر ہے مگر وہ کبھی کبھار ہی ادھر جاتی ہیں۔ عجیب درویش قسم کی بی بی ہیں وہ۔ اپنے والد کے بالکل برعکس ہیں۔ وہ بڑے جاہ و جلال والے آدمی تھے۔ بہت ڈرتے تھے لوگ ان سے لیکن جب سے ان کا انتقال ہوا ہے اور رئیسانی جی نے ولایت سے آکر زمینوں کا انتظام سنبھالا ہے تب سے لوگ اپنے آپ کو بہت بے فکر محسوس کرنے لگے ہیں۔"

شیر محمد باتیں کرتے کرتے یک لخت خاموش ہوگیا جیسے اس کے ارادے کے بغیر گفتگو غلط نہج پر چلی گئی ہو اور اس قسم کی باتیں کرنا اس کے خیال میں مصلحت کے خلاف ہو۔ مجھے یاد آیا، زرتاج نے مجھے خود اپنے بارے میں بتایا تھا کہ وہ ایک حاکمیت پسند لڑکی تھی لیکن شیر محمد جو نقشہ کھینچ رہا تھا وہ کسی حاکمیت پسند انسان کی فطرت کا نقشہ نہیں تھا۔ حاکمیت پسند لوگوں کو تو اپنا حکم ماننے والوں کے ہجوم میں جانے اور اپنی حاکمیت کا اظہار کرنے کی بڑی عادت ہوتی ہے۔ ان کے اندازِ گفتگو میں ایک خاص نخوت ہوتی ہے۔ شیر محمد جن خصوصیات کا ذکر کررہا تھا وہ تو گوشہ نشین اور درویش صفت لوگوں میں پائی جاتی تھیں۔

عین ممکن تھا، زرتاج اپنی حویلی میں محدود رہتے ہوئے بس اس احساس سے ہی لطف اندوز ہوتی ہو کہ اسے اتنے لوگوں پر حاکمیت کا حق حاصل تھا لیکن وہ اس حق کو خواہ مخواہ استعمال کرتے پھرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی ہو۔ بہرحال میں نے شیر محمد کو زرتاج کے بارے میں کُریدنے کی کوشش نہیں کی۔ ایسی عجلت کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میرا فی الحال یہاں سے جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ اگر کچھ دن یہاں ٹکنا میرے نصیب میں تھا تو مجھے یقین تھا کہ رفتہ رفتہ ہر بات میرے علم میں آجائے گی۔

پہلے ہم دونوں نے مل کر ایک گھوڑے کی گردن میں اس طرح رسّے کا حلقہ ڈالا کہ وہ اس کے سینے پر پھنس گیا۔ اس کے عقب میں دو رسّوں کی مدد سے میں نے تختہ باندھا اور اس پر خود کھڑا ہوگیا۔ گھوڑا بہت سرکش تھا لیکن میں نے اس سے زور آزمائی نہیں کی۔ بہت پیار سے اسے چمکارا اور سہلایا تھا۔ شیر محمد نے رسّیوں کی مدد سے اس کی گردن قابو میں کی ہوئی تھی۔ میں نے شیر محمد کی مدد سے سُست روی سے گھوڑے کو آگے بڑھانا شروع کیا۔

گھوڑے نے میدان کے دو تین چکر تو آرام سے کاٹ لیے لیکن پھر وہ مضطرب ہونے لگا۔ طاقتور اور بغیر سدھا گھوڑا تھا۔ اپنی طاقت اور سرکشی دکھانے کے لیے بے چین تھا۔ شیر محمد کو بھی یقیناً اس بات کا اندازہ تھا۔ ایک موقعے پر اس نے جان بوجھ کر...... لیکن اس طرح کہ بظاہر وہ اتفاق نظر آئے..... رسّیوں پر اپنی گرفت ڈھیلی کرلی۔

گھوڑا بُری طرح بھڑکا اور بظاہر "غیرارادی" طور پر رسّیاں شیر محمد کے ہاتھ سے نکل گئیں۔ گھوڑا پہلے تو پچھلی دونوں ٹانگوں پر کھڑا ہوا پھر اس نے اگلی ٹانگیں زمین پر ٹکاتے ہی مجھے دولتی رسید کرنے کی کوشش کی لیکن میرے لیے یہ تماشے غیر متوقع نہیں تھے۔ میں تختے سے چھلانگ لگا کر ایک طرف ہوچکا تھا اور اس سے پہلے کہ گھوڑا بے تحاشا دوڑنا شروع کرتا، میں اس کی گردن کے قریب پہنچ کر شیر محمد کی چھوڑی ہوئی رسّیاں گرفت میں لے چکا تھا۔ گھوڑا کچھ دور تک مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتا لے گیا لیکن بالآخر میں نے اس کی گردن کے گرد رسّیوں کا پھندا سخت کرتے ہوئے اسے رُکنے پر مجبور کردیا۔

شیر محمد نے مجھے مروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس طرح اسے بیک وقت دو فائدے ہوتے۔ میں زخمی یا معذور ہو کر اس کے راستے سے ہٹ سکتا تھا اور گھوڑوں کے معاملے میں اس کی چوہدراہٹ بلا شرکتِ غیرے بحال ہوسکتی تھی۔ دوسرے اس لائن میں میری نالائقی ثابت ہوسکتی تھی۔ زرتاج کو یقین دلایا جاسکتا تھا کہ میرے دعوے محض لفاظی تھے۔

تاہم میں نے شیر محمد پر ظاہر نہیں کیا کہ میں اس کی حرکت کو محسوس کرچکا ہوں۔ میں نے بڑے اطمینان سے کہا۔ "گھوڑا بے شک طاقتور ہے لیکن اسے افضل خان کی طاقت کا اندازہ نہیں۔ انسان اور جانور، دونوں ہی اکثر افضل خان کی طاقت کا اندازہ لگانے میں غلطی کھا جاتے ہیں۔"

شیر محمد گم صُم سا کھڑا تھا۔ میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "اب تمہیں رسّیاں پکڑنے کی ضرورت نہیں۔ میں خود ہی اس گھوڑے سے نمٹ لوں گا۔ تم چاہو تو دوسرے گھوڑے کے ساتھ زور آزمائی شروع کردو۔"

میں نے دوبارہ گھوڑے کو آہستہ آہستہ چلانا شروع کردیا۔ اس کی سرکشی نہ جانے کیوں جلد ہی دب چکی تھی اور وہ ذرا دھیمے انداز میں چلنے لگا تھا۔ شیر محمد چند لمحے وہیں کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتا رہا پھر اس درخت کی طرف چل دیا جس کے ساتھ دوسرا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے کو ضروری بندشوں میں جکڑنے لگا۔ کچھ دیر بعد وہ کافی دور جاکر دوسرے گھوڑے کے ساتھ کھینچا تانی میں مصروف ہوگیا۔

گھوڑا کسی طرح اس کے قابو میں نہیں آرہا تھا لیکن شیر محمد میری نظر میں عزت رکھنے کی خاطر اپنی بساط سے بڑھ کر اس کے ساتھ زور آزمائی کررہا تھا۔ وہ گھوڑے سدھانے والا پیشہ ور آدمی تھا اور معلوم نہیں اس کام میں کتنا وقت گزار چکا تھا لیکن مجھے اس کے انداز و اطوار میں ذرا بھی ہُنرمندی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

دوپہر تک ہم گھوڑوں کے ساتھ جان مارتے رہے۔ غنیمت تھا کہ میں کسی بھی نئے یا پُرمشقت کام سے بور نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اس کام میں بھی دلچسپی محسوس کرنا شروع کردی۔ میں، شیر محمد اور گھوڑے، یعنی چاروں ہی اس طرح پسینے میں شرابور ہوگئے کہ پسینہ ہمارے جسموں سے ٹپک کر زمین میں جذب ہونے لگا۔

اسی اثنا میں ایک شخص حویلی کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ اس وقت تک میں گھوڑے پر زین کس چکا تھا اور اسے زین کا عادی بنا رہا تھا تاہم میں نے اس پر بیٹھنا شروع نہیں کیا تھا۔

نووارد میرے قریب آکر سپاٹ سے لہجے میں بولا "تمہیں رئیسانی جی نے حویلی میں بلایا ہے۔"

میں نے ایک بار پھر پیشانی سے پسینہ پونچھا اور گھوڑے کو باندھنے کے لیے درخت کی طرف چل دیا۔ میں شیر محمد کے قریب سے گزرا تو وہ پُرخیال انداز میں مونچھ کو بل دیتے ہوئے بولا

"قسمت بہت مہربان معلوم ہوتی ہے تم پر۔ بعض لوگ برسوں سے رئیسانی جی کے کارندے ہیں مگر انہیں آج تک حویلی میں جانے کا شرف حاصل نہیں ہوا۔"

اس کے لہجے میں طنز' ذومعنویت یا کسی اور تیکھے تاثر کی جھلک نہیں تھی۔ بس ایک طرح کی رشک آمیزی سی تھی۔ حالانکہ میری اپنی معلومات کے مطابق اس کا اپنا بھی بلا روک ٹوک حویلی میں آنا جانا تھا مگر شاید اسے یہ اعزاز میری طرح روزِ اوّل سے حاصل نہیں ہوا تھا۔

میں اس شخص کے پیچھے چل دیا۔ ناک کی سیدھ میں حویلی کا گیٹ نظر آرہا تھا۔ گیٹ کے قریب لمبی چوڑی چارپائی پر چار ہٹے کٹے محافظ بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ان کی گنیں قریب ہی چارپائی کے سہارے زمین پر ٹکی ہوئی تھیں۔ انہوں نے محض ایک نظر میری طرف دیکھا اور دوبارہ پتوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ان کے اطمینان کے لیے شاید یہی کافی تھا کہ حویلی کا ایک شخص میرے ساتھ تھا۔ میں اپنے رہنما کے ساتھ بغلی گیٹ سے گزر کر اندر پہنچ گیا۔

اندر پہنچ کر وہ شخص تو بغلی گیٹ بند کر کے مجھے وہیں چھوڑ کر دیوار کے ساتھ ساتھ ایک طرف کو چل دیا۔ سامنے ہی ایک ادھیڑ عمر' سنجیدہ صورت سی خادمہ کھڑی تھی۔ وہ بڑے شائستہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "آپ میرے ساتھ آیئے۔"

وہ اس کشادہ روش پر مُڑ گئی جو گیٹ سے اندر کی طرف جارہی تھی۔ یہاں فرش سرخ اینٹوں کا تھا۔ سرسبز گھاس کے بڑے بڑے قطعات' پھولدار پودوں کی کیاریاں اور ان سے ہٹ کر قطار در قطار سفیدے اور سرو کے درخت نظر آرہے تھے۔

حویلی کی چار دیواری میں داخل ہوتے ہی ایک عجیب سی فرحت کا احساس ہوا۔ محض ایک دیوار کے اس پار گویا ہوا ہی مختلف تھی۔ خنکی اور خوابناک سی خوشبو سے بوجھل ہوا۔ باہر کی تپتی دھوپ اور گھوڑے سے زور آزمائی کی مشقت نے میرے جسم میں گویا آگ سی لگا دی تھی۔ کنپٹیاں بُری طرح تپ رہی تھیں مگر اس خوبصورت راستے پر قدم رکھتے ہی گویا ہر مسامِ جاں میں ٹھنڈک سی اُترنے لگی اور پسینہ خشک ہوتا محسوس ہونے لگا۔

اس عورت کے پیچھے چلتا ہوا میں حویلی کی اصل عمارت تک پہنچا جو باغ کے عین وسط میں بالکل زرتاج ہی کی طرح ہلکی سی نخوت سے سر اٹھائے کھڑی تھی۔ سامنے ماربل کی چند سیڑھیاں تھیں اور بلندی پر جالی دار دروازہ نظر آرہا تھا۔ خادمہ میرے لیے مؤدبانہ انداز میں دروازہ کھولے کھڑی رہی۔ میں اندر قدم رکھ چکا تب اس نے دروازہ بند کیا۔

میں نے اپنے آپ کو ایک بہت بڑے گول کمرے میں پایا لیکن اس میں [illegible] نہیں تھی۔ یہاں روشنی بہت کم تھی۔ [illegible] جھلمل کرتا نظر آرہا تھا۔

سامنے کی دیوار میں محراب دار دروازے بھی نظر آرہے تھے جو غالباً دوسرے کمروں کے تھے اور اس وقت بند تھے۔ اس بڑے سے گول کمرے کا واحد مصرف بس یہی معلوم ہوتا تھا کہ یہاں سے سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں۔

خادمہ سیڑھیوں کی طرف ہی جارہی تھی۔ سیڑھیوں کے اختتام پر وہ ایک بھاری بھرکم چوبی دروازہ کھول کر جس طویل و عریض کمرے میں داخل ہوئی وہ ڈائننگ ہال معلوم ہوتا تھا۔ اس میں وکٹورین اسٹائل کی ایک بہت بڑی اور بھاری بھرکم میز موجود تھی جس کے گرد بیس بائیس یا شاید اس سے بھی زیادہ کرسیاں موجود تھیں۔ نہ جانے کب یہاں اتنے آدمیوں کے کھانا کھانے کی نوبت آتی تھی؟

اس ہال کے دوسرے سرے پر باریک پردہ اور نقلی موتیوں کی مالائیں جھول رہی تھیں۔ پردے کی تمام تر باریکی کے باوجود دوسری طرف کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ خادمہ ڈائننگ ہال میں ہی رک گئی اور اس لمبے چوڑے پردے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "رئیسانی جی اس طرف ہیں۔"

میں نے غیر ارادی طور پر کئی دن کی بڑھی ہوئی داڑھی اور بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیریں پھر گرد میں لتھڑے ہوئے اپنے جوتوں کی طرف دیکھا۔ کسی رشکِ غزالاں کے سامنے جانے کے لیے یہ کوئی معقول حلیہ نہیں تھا مگر مجبوری تھی۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور پردے کی طرف بڑھ گیا۔

پردے پر میں نے عین وسط میں ہاتھ مارا تو وہ گویا وہاں سے شق ہوگیا اور میں ایک لمحے کے لیے وہیں مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔ دوسری طرف بھی تقریباً اتنا ہی بڑا کمرا تھا مگر یہ کمرا ٹیرس سے مشابہ تھا۔ اس میں سامنے کی دیوار کی جگہ بڑی بڑی محرابیں بنی ہوئی تھیں اور ان محرابوں پر نفیس چقیں پڑی ہوئی تھیں۔ قدیم ہسپانوی اور مغلیہ طرزِ تعمیر کا امتزاج تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ ان چقوں کے پیچھے کھڑے ہو کر نہ صرف اس میدان کا جائزہ لیا جاسکتا تھا جہاں میں اور شیر محمد گھوڑے سدھا رہے تھے بلکہ کھیتوں میں بھی تاحدِ نظر دیکھا جاسکتا تھا۔ ایک محراب کے قریب وہ چق کی طرف منہ کیے کھڑی تھی۔ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن اسے یقیناً معلوم تھا کہ میں ٹیرس میں پہنچ چکا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ اپنی جاگیر کا جائزہ لینے کے لیے اسے باہر جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہیں کھڑے کھڑے گوشے گوشے کا معائنہ کرسکتی تھی اور اگر وہ دوربین استعمال کرتی تو گاؤں پر بھی نظر رکھ سکتی تھی۔ اس حویلی کے محل وقوع اور ساخت میں یقیناً بہت سی باتوں کا خیال رکھا گیا تھا۔

مجھے زرتاج کا حُلیہ دیکھ کر بھی جھٹکا لگا تھا۔ پہلی بار میں نے اسے دیکھا تھا تو وہ مشرقیت کا شاہکار تھی لیکن آج اس کی جون ہی بدلی ہوئی تھی۔ وہ اس وقت چست خاکی جینز میں تھی۔ پیروں میں فل بوٹ تھے۔ زُلفوں کی گھٹائیں جوڑے کی شکل میں سمٹی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک رنگین پی کیپ تھی۔

ٹیرس پر شیشے کی تپائی اور چار چھ کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک کرسی پر دور مار رائفل رکھی تھی جس پر دوربین بھی فٹ تھی۔ چقوں سے چھن چھن کر دھیمی دھیمی ہوا مجھ تک پہنچ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی ایک سحر انگیز سی خوشبو بھی۔ یہ کسی کلون وغیرہ کی خوشبو نہیں تھی۔ یہ خالصتاً اس کے اپنے وجود کی خوشبو تھی..... اور میں بدنصیب پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جن کا سراپا سات پردوں میں بھی قیامت برپا کرتا ہے۔ اس وقت شکاری لباس میں تو اس کا رُواں رُواں شکاری تھا۔

وہ آہستگی سے مُڑی۔ میری بصارت پر اس کا چہرہ دھیرے دھیرے گویا چاند کی طرح طلوع ہوا۔ وہ ہر رنگ' ہر روپ میں حسین تھی۔ وہ ان کمیاب عورتوں میں سے تھی جن کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کا کون سا روپ زیادہ حسین ہے۔

"آؤ..... بیٹھو۔" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ لہجے میں وہی جھیلوں کا سا ٹھہراؤ تھا اور حرکات و سکنات میں وہی ریشم کا سا لہراؤ۔

میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور آگے بڑھ کر ایک کرسی کے قریب کھڑا ہوگیا۔ وہ خود کھڑی تھی۔ میرا بھی بیٹھنے کو جی نہ مانا۔ ہمارے درمیان ایک کرسی کا فاصلہ تھا مگر اس کے وجود کے سورج کی نادیدہ شعاعیں مجھے جھلسائے دے رہی تھیں۔

"میں یہاں سے دیکھ رہی تھی....." اس نے چق کی طرف اشارہ کیا۔ "تم واقعی بڑی جانفشانی سے کام کرنے کے عادی معلوم ہوتے ہو۔"

"یہ آپ کا حُسنِ نظر ہے۔" میں نے اپنے لہجے میں حتیٰ الامکان انکساری سمونے کی کوشش کی۔ "میری محنت وصول ہوگئی۔ ان چند لفظوں کے سہارے میں اس سے بھی زیادہ محنت برسوں جاری رکھ سکتا ہوں۔"

کسی مصنوعی سرخی سے بے نیاز' اس کے یاقوتی ہونٹوں پر وہی مُبہم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی جسے کوئی بھی اپنی سمجھ کے مطابق معانی دے سکتا تھا لیکن میں فی الحال اسے کوئی معانی دیئے بغیر بھی اس کی خوبصورتی کو محسوس کرسکتا تھا۔

"مگر میں نے تمہاری محنت کی داد دینے کے لیے تمہیں یہاں نہیں بلایا۔" وہ ملائمت سے بولی۔ "دراصل میں نے بہتر سمجھا کہ تمہیں بھی بتاتی چلوں..... میں شکار پر جارہی ہوں۔ شاید دو چار راتوں کے لیے ہم لوگ جنگل میں کیمپ لگائیں لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ آج شام ہی لوٹ آئیں۔ یہ میرے موڈ پر منحصر ہے۔"

میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا اپنے اس پروگرام سے مجھے مطلع کرنا کیوں ضروری تھا؟ وہ گویا میرے خیالات پڑھتے ہوئے بولی۔ "تمہیں اس لیے بتا کر جارہی ہوں کہ کبھی کبھی میری عدم موجودگی میں یہاں نوواردوں سے کوئی اونچ نیچ بھی ہوجاتی ہے۔ بعد میں چاہے اس کی تلافی کے لیے میں کچھ بھی کرتی رہوں لیکن وہ سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے والی بات ہوتی ہے۔"

"میں سمجھا نہیں!" میں نے کہا۔

"دیکھو..... چھوٹی موٹی بیوروکریسی ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ میرے ہاں بھی موجود ہے۔ کبھی کبھی کوئی خاص اور سرچڑھا کارندہ اپنے اختیارات سے تجاوز کرجاتا ہے..... خاص طور پر میری عدم موجودگی میں کسی رقابت کے تحت کسی نووارد کے خلاف کوئی چھوٹی موٹی سازش کرجاتا ہے اور بعد میں معصوم بن جاتا ہے۔ صورتِ حال کچھ ایسی ہوتی ہے کہ اس کے خلاف کچھ ثابت بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کارندوں کو اس بات سے بھی بہرحال شہ ملتی ہے کہ میں ایک لڑکی ہوں اور پرانے کارندے بہرحال میرے لیے ناگزیر ہیں۔ اس خیال کے تحت کبھی کبھی میری غیر موجودگی میں وہ کوئی بدمعاشی کرگزرتے ہیں۔ ایسا شاذونادر ہی ہوتا ہے لیکن میں احتیاطاً تمہیں خبردار کررہی ہوں۔ تم اپنے اور میرے مفادات کی حفاظت کے سلسلے میں خود مختار ہو' کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانے میں تمہیں ہچکچانے کی ضرورت نہیں۔ بس یہ خیال رکھنا کہ میرے لیے کوئی پریشانی پیدا نہ ہو۔"

وہ گول مول سے انداز میں مجھے محتاط رہنے اور گردوپیش پر نظر رکھنے کی ہدایت کررہی تھی۔ اتنے کم وقت میں اس کا یوں مجھ پر اعتماد کرنا اور اپنے پرانے کارندوں کے مقابلے میں خود مختاری دینا میرے لیے گویا ایک اعزاز تھا۔

"میں آپ کا مطلب سمجھ گیا۔" میں نے کہا۔ "میں محتاط بھی رہوں گا اور آپ کے مفادات کا نگران بھی۔"

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے سرسری لہجے میں کہا۔ "آپ شکار کھیلنے کہاں جارہی ہیں؟ میرے خیال میں تو یہاں دور دور تک کوئی ایسا علاقہ نہیں جہاں قابلِ ذکر شکار پایا جاتا ہو۔"

"لگتا ہے اس علاقے کے بارے میں تمہیں کچھ زیادہ معلومات نہیں ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "شمال میں چند میل کے فاصلے پر پٹی کی سی شکل میں طویل جنگل پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کمیاب پرندے بھی پائے جاتے ہیں جن کی اسمگلنگ ہوتی ہے اور چھوٹے موٹے درندے بھی۔ لومڑیاں' گیدڑ اور جنگلی خرگوش بھی پائے جاتے ہیں۔ میرا شکار پر جانے کا اصل مقصد صرف خود کو متحرک رکھنا ہے۔ میں وقتاً فوقتاً اپنا امتحان لیتی رہتی ہوں کہ مشقت اٹھانے اور پُرخطر زندگی گزارنے کی بدستور عادی ہوں یا مجھ میں آرام طلبی آچلی ہے۔ جیسے ہی مجھے اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی پہلو سے روایتی زمیندارنی بننے لگی ہوں' میں فوراً اپنے اوپر کچھ نئی مشقتیں لاد لیتی ہوں۔"

"کیا آپ تنہا.....؟" میں نے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "میرے ساتھ سات آٹھ ملازم اور دو خادمائیں جارہی ہیں۔ میں اب اتنی بھی ایڈونچر پسند نہیں ہوں کہ اکیلی شکار پر چل دوں۔"

میں زیادہ دیر اس کی طرف دیکھنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا اس لیے چق کے پار دیکھنے لگا۔ بہت دور تک کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں بری طرح چونک اٹھا اور ایک کرسی کے پشتے پر میری گرفت غیرارادی طور پر مضبوط ہوگئی۔

چق کے پار منظر میں جو تبدیلی آئی تھی وہ مجھے بری طرح چونکا گئی تھی۔ تبدیلی یہ تھی کہ جس پگڈنڈی کے راستے میں اس علاقے میں پہنچا تھا' اسی پگڈنڈی پر دو گھڑسوار بڑے مطمئن انداز میں اپنے گھوڑوں کو دُلکی چلاتے ہوئے حویلی کی سمت آرہے تھے۔ فاصلہ کافی تھا لیکن میں انہیں پہچان سکتا تھا۔ میں انہیں ہزاروں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ بلکہ اگر وہ حدِ بصارت سے آگے ہوتے تو شاید تب بھی پہچان لیتا۔

وہ جانو اور غمیسو خان تھے!

جانو اس وقت بھی خاصا معزز آدمی نظر آرہا تھا جب میں نے اسے جنگل میں اس کے ڈاکوؤں والے مسکن پر دیکھا تھا مگر اب تو اور بھی زیادہ معزز دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے تن پر دھوپ میں چمکتا ہوا نہایت نفیس شلوار قمیص کا سوٹ اور شاندار واسکٹ تھی۔ سر پر کلف لگی' اونچے طرّے والی پگڑی تھی۔ کندھے پر سیاہ رنگ کی کوئی آٹومیٹک گن لٹکی ہوئی تھی۔ گھوڑا بھی نہایت شاہانہ قسم کا تھا۔

کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ ڈاکو تھا۔ بڑے ٹھسّے کا جاگیردار معلوم ہو رہا تھا لیکن ذرا پرانے وقت کا۔ اس دور کا' جب زمینداروں کو بیرونِ کے کو مپلیکس نے گرفت میں نہیں لیا تھا۔

غمیسو خان بھی نہایت اُجلے اور معززانہ لباس میں تھا لیکن اس کی صورت بہرحال ڈاکوؤں والی تھی۔ اس کا مسئلہ یہی تھا کہ اگر وہ کسی سلطنت کا والی ہوتا تب بھی ڈاکو ہی معلوم ہوتا۔ گو کہ اس میں حیرت کی کوئی بات بھی نہیں تھی۔ اکثر سلطنتوں کے والی ڈاکو ہی ہوتے ہیں مگر نظر نہیں آتے۔

زرتاج نے محسوس کرلیا تھا کہ میں کسی بات پر چونکا تھا اور میرے اعصاب میں یکایک تناؤ سا آگیا تھا۔ اس کی نظر نے میری نظر کا تعاقب کیا اور دونوں گھڑسوار اسے بھی نظر آگئے۔ وہ بھی چونکی لیکن اس کا چونکنا ذرا مختلف تھا۔

"ارے..... یہ تو جانو اور غمیسو خان ہیں۔" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔ لہجے میں ناپسندیدگی بس ایسی ہی تھی جیسے آپ تیار ہوکر گھر سے کہیں جانے لگے ہوں اور عین وقت پر کوئی ایسا مہمان آن پہنچا ہو جس سے ملاقات کا آپ کو قطعاً کوئی اشتیاق نہ ہو۔ میرے لیے یہ بھی کچھ کم حیرت کی بات نہیں تھی کہ زرتاج ان لوگوں کو جانتی تھی۔

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا اور بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا۔ "تم ان دونوں کو دیکھ کر مضطرب سے کیوں ہوگئے؟" انداز کتنا ہی سرسری سہی لیکن لہجے میں بہرحال تجسس چھپا ہوا تھا۔

میں یک دم گویا کشمکش میں پھنس گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مضطرب ہونے کا اقرار کروں یا انکار؟ اگر اقرار کروں تو کیا وجہ بتاؤں اور انکار کروں تو کس جواز کا سہارا لوں؟ فی الحال مجھے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے سامنے سچ بولنا مفید ثابت ہوگا یا نقصان دہ؟ معلوم نہیں جانو اور غمیسو سے اس کی شناسائی کی نوعیت کیا تھی؟

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "مجھے ان لوگوں سے واسطہ پڑ چکا ہے..... اور وہ کوئی خوشگوار واقعہ نہیں تھا۔"

اس نے تفہیمی انداز میں سرہلایا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ تفصیل جاننے کی خواہش مند تھی لیکن شاید وہ موقع اسے خود بھی مناسب نہیں لگ رہا تھا۔ وہ دوبارہ سامنے دیکھنے لگی۔ ڈاکو اور ڈاکوؤں کا سردار دونوں قریب آچکے تھے۔ جانو سر اٹھائے حویلی کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ فاصلہ گو اب بھی خاصا تھا لیکن میں اس کے چہرے پر مُسرت کی چمک دیکھ سکتا تھا۔

"آپ انہیں جانتی ہیں؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ دراصل میں یہ پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ انہیں کیسے جانتی تھی؟ لیکن یہ سوال مجھے کچھ موزوں نہ لگا اور زبان پر آتے آتے رہ گیا۔

"ہاں۔" اس نے مختصر جواب دیا۔ غالباً اس نے کسی قسم کی وضاحت کرنے یا اس شناسائی کا پس منظر بتانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

پھر وہ مُربیانہ انداز میں بولی۔ "اگر تمہاری ان سے کوئی دشمنی چل رہی ہے یا کسی اور وجہ سے تم ان سے خوفزدہ ہو تو میں جانو سے کہہ دوں گی کہ یہ ہمارا آدمی ہے۔ اس کے بعد وہ تمہارا پیچھا چھوڑ دیں گے۔ تمہیں ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"نہیں۔ میرے خیال میں اس کی کوئی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "اگر آپ ان کے سامنے سرے سے میرا تذکرہ ہی نہ کریں تو آپ کی نوازش ہوگی۔ میں ان سے خوفزدہ نہیں ہوں لیکن فی الحال کچھ مصلحتوں کی وجہ سے میں نہیں چاہتا کہ ان لوگوں کو میرے ٹھکانے کا پتا چلے یا وہ مجھے یہاں دیکھیں۔ کیا آپ ان سے ملیں گی؟ انہیں حویلی میں بلائیں گی؟"

"ہاں۔" اس نے گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔ "جانو آئے تو اس سے ملنا تو پڑتا ہی ہے۔ بہرحال..... اگر تم نے ان کا کوئی خاص نقصان نہیں کیا ہے تو تمہیں ان سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

اس دوران وہ دونوں حویلی کے گیٹ پر پہنچ چکے تھے لیکن اب ہم ان کو نہیں دیکھ سکتے تھے کیونکہ گیٹ اور دیوار اونچی تھی۔ وہ اس کی اوٹ میں تھے۔ تاہم ایک خادمہ ان کی آمد کی اطلاع لے آئی تھی اور یہ میرے لیے حیرت کی بات تھی کیونکہ میں نے نہ تو گیٹ کھلتے دیکھا تھا اور نہ کسی کو اندر آتے دیکھا تھا لیکن پھر ملازمہ کی بات سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ گیٹ پر انٹرکام موجود تھا اور ملازمہ کو ان لوگوں کی آمد کی اطلاع انٹرکام پر ملی تھی۔

"انہیں اوپر ہی لے آؤ۔" زرتاج نے خادمہ کو حکم دیا۔ "لیکن راستے میں باتوں باتوں میں انہیں جتا دینا کہ رئیسانی جی کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ شکار پر جانے والے نیچے ان کے انتظار میں کھڑے ہیں۔"

"بہت بہتر رئیسانی جی!" خادمہ نے سمجھ داری سے سرہلایا اور واپسی کے لیے مڑگئی۔ وقت کی کمی کا تاثر بھی زرتاج نے ملازمہ کی زبانی دینا چاہا تھا۔ کیا وہ خود یہ بات جانو سے کہنے کی جرأت نہیں رکھتی تھی؟ وہ ان سے خوفزدہ تھی یا ان سے اس کا مُروّت کا رشتہ تھا؟

میرے ذہن میں یہ سوالات ابھر رہے تھے لیکن فی الحال میرے لیے اس ضمن میں کوئی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ مجھے معلوم تھا..... اور کسی حد تک میں اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ چکا تھا کہ بعض بڑے زمیندار' ڈاکوؤں کی پشت پناہی کرتے تھے' بعض ان کو باقاعدہ "پالتے" تھے' بعض انہیں ممنون رکھتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے کام آتے تھے' وقت پڑنے پر ایک دوسرے کا سر بچاتے تھے۔ کیا زرتاج اور جانو کا تعلق بھی کچھ اسی قسم کا تھا؟ میرا دل اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔

اس دوران خادمہ گیٹ پر پہنچ چکی تھی۔ جانو اور غمیسو خان اندر آچکے تھے۔ ان کے گھوڑے باہر ہی رہ گئے تھے۔ درختوں کے درمیان پگڈنڈی پر وہ اس طرح اکڑتے ہوئے چل رہے تھے جیسے اپنی ہی جاگیر کے معائنے پر نکلے ہوں۔ جانو نے تو اس خوبصورت پگڈنڈی نما روش پر پڑے ہوئے اِکّا دُکّا چھوٹے چھوٹے پتھروں کو حقارت سے ٹھوکر بھی رسید کی۔

میں نے زرتاج کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ پسند ناپسند' خوف' مجبوری یا مصلحت۔ کوئی بھی تاثر مگر وہ چہرہ جس طرح حسن میں اپنی مثال آپ تھا اسی طرح اپنے ہر تاثر کی حفاظت کرنے میں بھی بے مثل تھا۔ اس کے بارے میں یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا کہ وہ کس وقت کیا سوچ رہی تھی۔ وہ جب تک خود ہی اپنی سوچ کا راز افشا نہ کرتی' اس کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا آسان نہیں تھا۔

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا کہ میرا کہاں چھپنا مناسب رہے گا۔ بچ جانے کا تو ایک ہی راستہ تھا۔ اگر میں اب سیڑھیاں اترتا تو یہ ممکن تھا کہ بیچ راستے میں میرا ان سے سامنا ہو جاتا۔ زرتاج میرا مطلب سمجھ کر ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "تم اس کمرے میں جاسکتے ہو۔ ظاہر ہے تم ان کا سامنا کرنا نہیں چاہو گے۔"

جس طرف وہ اشارہ کررہی تھی اُدھر ایک منقّش چوبی دروازہ تھا۔ اس کے قریب ہی دیوار سے لگی ہوئی ایک لمبی چوڑی چوبی الماری تھی جس کے دروازوں میں شیشے لگے ہوئے تھے۔ اندر بہت سے خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے میں ایک گن رکھی تھی۔

زرتاج نگر کی حدود میں داخل ہونے کے بعد مجھے قدم قدم پر اسلحہ دیکھنے کو مل رہا تھا۔ میں نے دور اُفتادہ دیہی علاقے زیادہ تو نہیں دیکھے تھے لیکن جتنے بھی دیکھے تھے ان میں اتنا اسلحہ نہیں دیکھا تھا۔ معلوم نہیں یہ اسلحہ کہاں سے آتا تھا؟ میں ابھی یہ سوال کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ ممکن تھا' زرتاج اس سوال کو ہی پسند نہ کرتی یا پھر اس کا جواب دینا پسند نہ کرتی۔ ایسے سوالوں سے پرہیز کرنا ہی بہتر تھا۔

زرتاج بولی۔ "میرے ہاں ٹھہرنے والے مہمان شاذونادر ہی آتے ہیں مگر اوپر کی یہ پوری منزل دراصل مہمان خانہ ہے۔ میں تمہیں جس کمرے میں جانے کے لیے کہہ رہی ہوں وہ مہمانوں کا بیڈ روم ہے۔ بائیں ہاتھ پر دوسرا بیڈ روم ہے۔ تم جس میں چاہو جاسکتے ہو' اِدھر کوئی نہیں آئے گا۔"

میں اسی طرف چل دیا جدھر اس نے پہلے اشارہ کیا تھا۔ اس وقت تک سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ میں نے کمرے میں داخل ہوکر دروازہ اس طرح بند کیا کہ ہلکی سی ایک جھری برقرار رہے۔ وہ تمام ضروری فرنیچر سے آراستہ ایک کشادہ بیڈ روم تھا مگر اس میں پھیلی ہوئی ہلکی سی بو بتا رہی تھی کہ اس کمرے کو عرصے سے کھولا نہیں گیا تھا۔ تاہم بو ناگوار نہیں تھی۔ اس بیڈ روم کی ایک بڑی سی کھڑکی بھی حویلی کے سامنے کے رُخ پر کھلتی تھی مگر اس وقت وہ بند تھی۔

میں دروازے کی جھری سے آنکھ لگا کر کھڑا ہوگیا۔ ایک لمحے بعد میں نے جانو اور غمیسو خان کو آگے پیچھے اس ٹیرس پر آتے دیکھا۔ جانو کی باچھیں کھلی جارہی تھیں جیسے کسی بداطوار شخص کے سامنے اس کی من پسند چیز مدّتوں بعد آئی ہو۔ اس کا ندیدہ پن دیدنی تھا۔ لگتا تھا اس کا بس نہیں چل رہا کہ آنکھوں ہی آنکھوں میں زرتاج کو کھا جائے۔

اس کی نظروں نے زرتاج کے سر سے پاؤں تک یوں ٹھہر ٹھہر کر سفر کیا تھا جیسے ہر نشیب و فراز اس کے قدموں کی زنجیر بنتا جارہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ وہ خاصا وجیہہ آدمی تھا لیکن اپنے تاثرات کی وجہ سے اس وقت بدصورت لگ رہا تھا..... یا شاید صرف مجھے لگ رہا تھا۔ غمیسو خان کے تاثرات بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے لیکن وہ شاید اپنے باس کی موجودگی میں رسمی طور پر تھوڑا بہت محتاط نظر آنے کی کوشش کررہا تھا۔

"کیا حال ہیں رئیسانی؟ بہت دن بعد تم سے ملاقات ہورہی

ہے۔" جانو کے لہجے میں بے تکلفی تھی۔ یہ بے تکلفی یک طرفہ ہی معلوم ہوتی تھی۔ اس کی باچھیں بدستور پھیلی ہوئی تھیں۔

"میرے وہ دن عام طور پر اچھے گزرتے ہیں جن میں تم سے ملاقات نہیں ہوتی۔" زرتاج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ تاہم اس نے چہرے سے ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا تھا۔

"تمہاری مذاق کی عادت نہیں گئی۔" جانو نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ "اور تم دنیا میں واحد ہستی ہو جس کا مذاق جانو برداشت کرتا ہے۔"

"میں تمہیں برداشت کرتی ہوں تو تمہیں کم از کم میرا مذاق تو برداشت کر ہی لینا چاہیے۔" زرتاج بدستور سنجیدہ تھی۔

جانو نے بلاوجہ ہی ایک اور اونچا قہقہہ لگایا پھر یک دم ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "نوکرانی نے بتایا تھا کہ تم شکار پر جانے کے لیے بالکل تیار کھڑی ہو۔ تمہیں شکار پر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے تو چاروں طرف شکار ہی شکار بکھرا ہوا ہے۔"

زرتاج ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے بلا تامل بولی۔ "اگر تمہارا اشارہ اپنی طرف ہے تو گزارش ہے کہ میں حرام جانوروں کا شکار نہیں کرتی۔"

جانو نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا۔ وہ برہم نہیں ہوا تھا اور نہ ہی یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے کھسیاہٹ چھپانے کے لیے قہقہہ لگایا تھا۔ کم از کم زرتاج کے معاملے میں وہ خاصا ڈھیٹ معلوم ہوتا تھا۔ کوئی اور اس قسم کی باتیں کرتا تو شاید جانو اسے گولیوں سے چھلنی کر دیتا۔

"بہت شریر ہوتی جا رہی ہو تم۔" بالآخر وہ بولا۔

"وہم ہے تمہارا۔ میں تو بہت سنجیدہ ہوں۔ ہمیشہ کی طرح۔" وہ واقعی گہری سنجیدگی سے بولی۔

"خیر چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا تمہارا آج ہی شکار پر جانا ضروری ہے؟"

"میں جب کوئی پروگرام بنا لوں تو عام طور پر اسے بدلا نہیں کرتی۔" زرتاج نے بے نیازی سے جواب دیا "لیکن تم بیٹھو۔ بتاؤ کیا کھاؤ پیو گے؟ تم چاہو تو میرے جانے کے بعد بھی یہاں ٹھہر سکتے ہو۔ کھانا وغیرہ کھا کر شام تک چلے جانا۔ اتنی دور سے آئے ہو' میں تمہاری تھوڑی بہت خاطر تواضع تو کر کے ہی جاؤں گی۔"

"خیر..... ہم تم سے اتنا دور بھی نہیں رہتے۔ جس شارٹ کٹ سے ہم آتے ہیں اس نے تو ہمارے اور تمہارے درمیان فاصلہ بہت کم کر دیا ہے لیکن افسوس کہ تم دلوں کے درمیان فاصلہ کم کرنے کی کوئی کوشش کامیاب نہیں ہونے دیتیں۔" جانو ایک کرسی پر کچھ پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"اچھا.....! تمہارے پاس دل بھی ہے؟ یہ میرے لیے نئی اطلاع ہے۔" زرتاج بولی۔

"بس..... تمہاری یہ بے نیازی کسی روز ہماری جان لے لے گی۔" جانو کسی ٹٹ پونجیا قسم کے فلمی ولن کے انداز میں بولا۔

"اس وقت تم کہاں سے آ رہے ہو؟" زرتاج نے گویا موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "اڈے سے..... یا کہیں اور سے؟"

"ہم اگر دور سے بھی آئے ہوتے تو کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ہم بہت دور تک مار کرنے کے عادی ہو گئے ہیں۔" وہ مسکرایا۔ "اب تمہیں جانے کے لیے تیار دیکھ لیا ہے تو ہم تمہارا زیادہ وقت نہیں لیں گے۔ ویسے تمہارے لیے ایک مشورہ ہے۔ اتنی جلدی جلدی شکار پر مت جایا کرو۔ حالات کا کیا بھروسا' خود اپنے آدمیوں کی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اوپر سے تم ایسی سراپا قیامت بن کر شکار پر جاتی ہو کہ خود تمہارے شکار ہو جانے کا سخت دھڑکا لگا رہتا ہے۔"

"میری فکر میں دُبلے ہونے کے لیے تم سے کس نے کہا ہے؟" زرتاج ملائمت سے بولی۔ "میں اپنی حفاظت کرنے کی پوری طرح اہل ہوں..... اور درحقیقت میں یہی دیکھنے کے لیے شکار پر جاتی ہوں کہ میری اس اہلیت میں کمی تو نہیں آ گئی؟ جو لوگ مجھے جانتے ہیں وہ میرے بارے میں نیت بدلنے سے پہلے کم از کم سو بار سوچیں گے..... اور اگر نہیں سوچیں گے تو خود ہی پچھتائیں گے۔" اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔

"ہاں..... یہ تو تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" جانو تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ وہ سر تو تائید میں ہلا رہا تھا لیکن اس کی مسکراہٹ استہزائیہ اور شرارت بھری تھی۔ "ویسے..... تنک مزاج تو تم ہمیشہ سے چلی آ رہی ہو لیکن آج لہجے میں ایک نیا تیکھا پن ہے۔ لگتا ہے ہماری پچھلی ملاقات سے اب تک کے دوران کوئی تبدیلی آ گئی ہے' کوئی بات ہوئی ہے۔"

"ہر چیز میں..... ہر ماحول میں..... ہر فرد میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں تو آتی رہتی ہیں۔ بعض اوقات ان تبدیلیوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ مجھے خود معلوم نہیں ہے کہ مجھ میں کوئی تبدیلی آئی ہے۔" زرتاج کے لہجے میں اب بھی ملائمت تھی۔

"ہاں..... تبدیلیاں تو آتی رہتی ہیں۔" جانو بدستور مسکرا رہا تھا۔ "لیکن تم میں نہ جانے وہ تبدیلی کب آئے گی جس کا ہمیں انتظار ہے۔ رئیسانی! میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں' اپنے بارے میں سوچو۔ عمر کا سنہرا دور جتنی تیزی سے گزرتا جا رہا ہے اس کا شاید تمہیں ابھی احساس نہ ہو لیکن ایک روز اچانک سر اٹھا کر دیکھو گی تو عمر کی ساری ریت مٹھی سے پھسل چکی ہو گی۔ تم اب پختہ عمر کو پہنچ چکی ہو' نوخیز یا کمسن نہیں رہیں۔ میرے بارے میں سوچنے پر آمادہ نہیں ہو لیکن کسی کے بارے میں تو سوچو۔ ہم بھی تو دیکھیں' آخر تمہاری نظر کہاں جا کر ٹھہرتی ہے۔ کسے تمہاری زندگی کا ساتھی بننے کا شرف حاصل ہوتا ہے۔"

"کیا تم اپنی بیسیوں مرتبہ کہی ہوئی یہی باتیں دُہرانے کے لیے اتنی دور سے آئے ہو؟" زرتاج کے لہجے کی ملائمت اب بھی برقرار تھی۔

"آج تمہیں یہ باتیں غیر اہم لگتی ہیں لیکن کل بہت اہم لگیں گی۔" جانو کی آنکھوں میں بھی اب سنجیدگی اترنے لگی تھی لیکن یہ سنجیدگی بھی درحقیقت رندگی ہی کی ایک شکل نظر آتی تھی۔

"ہمارے ہاں ایک یہ بڑی مشکل ہے....." زرتاج ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "کہ زندگی کسی کی ہوتی ہے مگر اسے بسر کرنے کی کوشش کوئی اور کرتا ہے۔ لیکن کم از کم تم تو میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ تمہیں ایسا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ تم میری زندگی مجھے ہی بسر کرنے دو۔ مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہے کہ کس وقت کیا کرنا چاہیے۔ میری بڑھتی عمر کی بھی تم فکر مت کرو۔ یہ بھی تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ مجھے کسی کا انتظار ہے۔"

"کون ہے آخر وہ؟" جانو نے گویا بہ مشکل اپنی جھنجلاہٹ کو دبایا تھا۔

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" زرتاج اطمینان سے بولی۔ "میں نے شاید اسے ابھی تک دیکھا نہیں ہے۔ یہ بات میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔"

"اور ابھی تک تم اسی بات پر قائم ہو؟" جانو حیرت سے بولا۔ "حالانکہ میں نے اسی وقت تمہیں سمجھایا تھا کہ ان افسانوی باتوں کو چھوڑو۔ ہم خوفناک حقیقتوں کے جنگل میں رہتے ہیں۔ یہ باتیں نیم تاریک اور بند کمروں میں رہنے والی سولہ سترہ سال کی ان مڈل کلاس لڑکیوں کے منہ سے اچھی لگتی ہیں جو زنانہ رسالوں میں افسانے پڑھتی ہیں' درد بھرے اشعار جمع کرتی ہیں اور ریڈیو پر فرمائشی نغمے سنتی ہیں۔ تم اس دنیا کی باسی نہیں ہو اور نہ ہی عمر کے اس دور میں ہو۔"

"یہ بھی تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ تمہارے پاس سوچنے کے لیے اور بہت سی باتیں ہونی چاہئیں۔ تمہارے اپنے یقیناً بہت سے مسائل ہوں گے' ان کے بارے میں سوچا کرو..... اور پھر تمہاری بیوی بھی تو ہے۔ اس کے بارے میں سوچا کرو۔"

"وہ تو خود ایک بہت بڑا مسئلہ ہے۔ اسی کی وجہ سے تو میں تمہارے بارے میں سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ اگر وہ کوئی ڈھنگ کی عورت ہوتی تو میں کسی اور کے بارے میں کیوں سوچتا؟" جانو بدمزگی سے بولا۔

"اگر خدانخواستہ تم مجھے حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤ تو کچھ عرصے بعد تم کسی تیسری عورت کے سامنے کھڑے یہی باتیں کہہ رہے ہو گے۔" زرتاج پیچتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں..... نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔" جانو پُرجوش لہجے میں بولا۔ اس کے دل میں گویا کوئی خفیف سی اُمید پیدا ہو چلی تھی۔ "تم جیسی لڑکی کے ہوتے ہوئے کون کمبخت کسی اور عورت کے بارے میں سوچ سکتا ہے؟ زندگی بھر نہیں سوچ سکتا۔" اس نے فیصلہ کن انداز میں نفی میں سر ہلایا۔

اس کی بھوکی نظریں اب بھی زرتاج کے سراپا پر گڑی ہوئی تھیں۔ اس کی نظریں' اس کی عامیانہ سی گفتگو نہ جانے کیوں میرے جسم و جاں میں شرارے سے دوڑا رہی تھی۔ وہ دونوں گویا تمیسو خان کی موجودگی سے بالکل ہی بے خبر تھے جو خاموش بیٹھا چمکتی آنکھوں سے دونوں کی طرف باری باری دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔ شاید وہ اس صورتِ حال سے' اس گفتگو سے بہت محظوظ ہو رہا تھا۔

"میں نے سنا ہے' سونیا بھی کبھی تمہارے خیال میں بڑے غضب کی عورت تھی۔ بہت بڑے باپ کی بیٹی ہے۔" زرتاج طنزیہ لہجے میں بولی۔

"اس میں کوئی شک نہیں مگر اس نے اپنے آپ کو تباہ کر لیا ہے۔" جانو پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ "ہمارا ان لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے جو دنیا بھر کی منشیات اِدھر سے اُدھر کرتے ہیں مگر ہم خود کبھی چکھتے بھی نہیں۔ ایک شراب کا شغل ضرور ہے مگر اسے بھی اپنی مجبوری نہیں بننے دیا۔ اگر میسّر نہیں آتی تو ہفتوں نہیں پیتے۔ مگر وہ عورت منشیات کی عادی ہو گئی ہے۔ اسے پیار سے بہت سمجھایا بُجھایا' کوئی اثر نہیں ہوا۔ مارا پیٹا بھی لیکن لگتا یہی ہے کہ وہ جان دے دے گی' نشہ نہیں چھوڑے گی۔ میں نے اس کی سپلائی بند کرا دی تو اس کی حالت غیر ہو گئی۔"

جانو نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور ذرا توقف کے بعد بولا "اندیشہ محسوس ہوتا ہے کہ نشہ پورا نہ ہوا تو وہ مر جائے گی اور میں اسے سسک سسک کر' تڑپ تڑپ کر مرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ جان بوجھ کر' دھیرے دھیرے خودکشی کر رہی ہے۔ اپنے آپ کو لذتوں اور اذیتوں کے درمیان مار رہی ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ مرنا گوارا کر لے گی لیکن اپنے آپ کو تبدیل نہیں کرے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ میرے ہاتھوں سے مرے یا میرے ہاں مرے۔ اس کے ساتھ بڑا اچھا وقت گزرا ہے..... اور پھر ان جنگلوں بیابانوں میں آدمی عورت کے بغیر رہ بھی تو نہیں سکتا نا اس لیے میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔"

"عورت تمہارے لیے کون سا مسئلہ ہے۔" زرتاج بولی۔ "تم تو جب چاہو کسی عورت کو اٹھا کر لا سکتے ہو۔"

"اٹھائی ہوئی عورت کی وہ بات نہیں ہوتی۔" جانو مونچھوں کو بل دیتے ہوئے مسکرایا۔ "تمہیں تو معلوم ہی ہے' سونیا اپنی خوشی سے میرے ساتھ آئی تھی۔ ہمارا باقاعدہ نکاح ہوا تھا۔ اس وقت وہ چیز ہی کچھ اور تھی۔ ایک ایسا سمندر تھی جس میں ان گنت طوفان مچل رہے تھے۔"

"اور اب وہ ٹھہرا ہوا جوہڑ ہے جس کی تہہ میں کیچڑ کے سوا کچھ نہیں۔ ہے نا؟" زرتاج نے طنزیہ سے لہجے میں پوچھا۔

جانو نے اس کے طنز سے شرمندہ ہوئے بغیر بلا تامل اثبات میں سر ہلا دیا اور مسرور سے لہجے میں بولا "تم بالکل ٹھیک سمجھی ہو۔"

"یہ میں نہیں سمجھی' میں تو تمہاری رائے بیان کر رہی ہوں۔" زرتاج جلدی سے بولی۔ "تم نے یہ تو فرض کرلیا کہ وہ سمندر سے جوہڑ بن چکی ہے لیکن کبھی تم نے یہ سوچنے کی زحمت کی کہ اس کے دل میں پچھتاووں کا کیسا سمندر موجزن ہوگا؟ تم نے اسے کیا دیا؟ ڈاکوؤں کا ایک ڈین...... چاروں طرف پھیلا ہوا جنگل...... چھاپوں اور آپریشن کا دھڑکا۔ یہی کچھ دیا ہے نا تم نے اسے؟"

جانو کے چہرے پر ذرا سرخی آگئی۔ وہ قدرے تند لہجے میں بولا "وہ جب بھاگ کر میرے ساتھ آرہی تھی اس وقت بھی اسے معلوم تھا کہ اس کا مقدر کیا ہوسکتا ہے۔ اب اس طرح ہر وقت ڈپریشن کی تصویر بنی رہنے کی کیا تک ہے؟ اسے معلوم ہے کہ مجھے اس طرح زندگی گزارنے والوں کو دیکھ دیکھ کر غصہ آتا ہے' اس کے باوجود وہ اپنے طور طریقے نہیں بدلتی۔ وہ پوری پوری کوشش کرتی ہے کہ کسی طرح میرے ہاتھوں ماری جائے۔ یہ میری وضع داری ہے کہ میں اسے جان سے مارنا تو درکنار' اس پر سختی بھی نہیں کرتا۔"

"بڑی مہربانی ہے تمہاری۔ میں اس کی طرف سے تمہارا شکریہ ادا کرتی ہوں۔" زرتاج اس پر طنز کرنے سے باز نہیں آرہی تھی۔ پھر وہ متاسفانہ سے انداز میں بولی "جانو! تمہارا مسئلہ یہ ہے کہ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود تم انسانی محسوسات سے محروم ہو۔ تمہارے اندر ایک درندے کی روح ہے۔"

میرے لیے یہ انکشاف زیادہ حیرت کا باعث نہیں تھا کہ جانو پڑھا لکھا تھا۔ مجھے اس کی تمام تر کرختگی اور درندگی کے باوجود شبہ ہو رہا تھا کہ وہ پڑھا لکھا تھا۔ عجیب اتفاق تھا کہ میرے بے گھر' بے در ہونے اور آوارہ و بے منزل پھرنے کے مختصر سے دور میں یہ دوسرا پڑھا لکھا ڈاکو تھا جو میرے سامنے آیا تھا۔ روحیل خان بھی زیادہ نہیں لیکن کچھ نہ کچھ پڑھا لکھا ضرور تھا۔ جانو مجھے اس سے زیادہ پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ساتھی البتہ پورے جاہل ہی لگتے تھے۔

جانو تیزی سے بولا۔ "درندے کی روح میرے اندر اس وقت بھی موجود تھی جب سونیا سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے جب زندگی بھر میرا ساتھ دینے کے عہد و پیماں کرتے ہوئے میرا ہاتھ تھاما تھا اور ہم شادی کے بندھن میں بندھے تھے' اس وقت بھی اسے معلوم تھا کہ میں اس معاشرے کا باغی ہوں۔ میں نے اس سوسائٹی پر' اس نظام پر' اس سارے سیٹ اپ پر لعنت بھیج دی ہے اور میں اپنی ایک الگ دنیا بسانے جا رہا ہوں۔ اسے بہت اچھی طرح اندازہ تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں اور وہ اس پر بہت خوش تھی۔"

"وہ اس کی بے وقوفی تھی' نوجوانی کا جوش و خروش تھا۔ وہ بھی اپنی دانست میں بہت بڑی انقلابی تھی۔ اس کی انقلابی روح نے اسے صحیح راستہ دکھانے کے بجائے راستے سے بھٹکا دیا۔" زرتاج کے لہجے میں تاسف تھا۔

"لیکن صورتِ حال کچھ ایسی افسوسناک بھی نہیں۔" جانو ٹھنڈے مشروب کا تیسرا گلاس خالی کرکے تپائی پر تقریباً پٹختے ہوئے بولا "انسان کا آئیڈیل خواہ کچھ بھی ہو...... اچھا یا برا...... اصل اہمیت اس بات کی ہوتی ہے کہ انسان اسے پانے میں کامیاب ہوجائے۔ انسان خواہ ڈاکو بنے لیکن ایک کامیاب ڈاکو بنے۔ اصل' اہم چیز کامیابی ہے۔ کامیابی کے بغیر نہ تو شریف آدمی کچھ ہے اور نہ ہی بدمعاش۔ اگر آپ کامیاب نہیں ہیں تو کسی شمار قطار میں نہیں ہیں۔ آپ چیونٹی سے بھی بدتر ہیں۔ کسی وقت بھی کوئی پاؤں آپ کو کچلتا ہوا گزر جائے گا......"

اس کی رنگت تانبے جیسی ہوگئی تھی اور باچھوں سے گویا کف بہنے کو بے تاب تھا۔ وہ اپنے لیے جگ سے خود ہی مزید شربت گلاس میں انڈیلنے لگا۔ وہ نہ جانے کیوں بار بار دانت پیس رہا تھا۔ وہ خاصا غصہ ور شخص معلوم ہوتا تھا۔ اس کے جبڑے اور بازوؤں کے عضلات مضطربانہ انداز میں مچل رہے تھے۔ ان عضلات سے اس کی مضبوطی اور طاقت کا اندازہ ہوتا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ زیادہ جوش و خروش میں آنے کے بعد اس کے لہجے سے وہ ڈاکوؤں والا کھردرا پن غائب ہوگیا تھا۔ گوکہ آواز اب بھی پھٹی پھٹی ہی تھی لیکن کافی حد تک مہذبانہ محسوس ہورہی تھی۔ وہ کوئی بگڑا ہوا مقرر معلوم ہو رہا تھا۔ بے حد پُرجوش اور جذباتی مقرر۔

وحشیوں کی طرح شربت کا چوتھا گلاس بھی خالی کرکے وہ تپائی پر پٹختے ہوئے بولا "سونیا کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ میں جو کچھ بھی ہوں' کم از کم اپنی جگہ کامیاب تو ہوں۔ بڑا ڈاکو بننا بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا بہت بڑا بزنس مین یا صنعت کار بننا۔ بعض بے چارے تو ڈاکو بننے کی حسرت لے کر' بڑے جھنجلا کر اٹھتے ہیں لیکن سپاہیوں کے آگے ہاتھ جوڑتے' تھانوں میں اپنی کھال نچواتے اور حوالات میں ایڑیاں رگڑتے مرجاتے ہیں۔"

"جب دونوں ہی کام یکساں مشکل تھے تو تم بزنس مین یا صنعت کار کیوں نہیں بن گئے؟" زرتاج کے لہجے میں دلچسپی کی جھلک تھی۔

"میرے لیے دوسرے تمام راستے بند کردیے گئے تھے۔ میرے پاس صرف فرار کا راستہ رہ گیا تھا۔" جانو اپنے لہجے کے جوش و خروش پر کچھ قابو پاتے ہوئے بولا۔ "ویسے بھی میری زندگی میں عجیب مقام آچکا تھا۔ میں نے بتایا نا کہ مجھے ساری سوسائٹی سے' سارے سیٹ اپ سے نفرت ہوگئی تھی۔ میں اس کچلے ہوئے معاشرے کا خوفزدہ فرد بن کر رہنا ہی نہیں چاہتا تھا۔"

زرتاج ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ جنگل کے قانون کے مطابق ہی رہنا ہے تو جنگل ہی میں کیوں نہ رہا

جائے۔ تم بزنس مین یا صنعت کار کی بات کرتی ہو۔ بڑے ٹھاٹ ہوتے ہیں ان لوگوں کے' سیکڑوں لوگوں پر حکمرانی کرتے ہیں' لمبی لمبی کاریں اور عالیشان مکان ہوتے ہیں ان لوگوں کے مگر دو ہزار تنخواہ پانے والے کسی سرکاری کارندے سے بے چاروں کی روح کانپتی رہتی ہے۔ تمہاری سوسائٹی میں بے ایمان نہیں ڈرتا' ایماندار زیادہ ڈرتا ہے۔ کیا فائدہ ایسی سوسائٹی میں رہنے کا جہاں ایمانداری کا کوئی صلہ نہیں۔ جن کے ہاتھ میں طاقت یا اختیار ہے' وہ جب جی چاہے آپ کو جھوٹا' بے ایمان' چور یا غدار قرار دے دیں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

زرتاج بدستور ملائمت سے بولی "جہاں تک ڈرنے کی بات ہے تو ڈرنے سے کہیں نجات نہیں۔ کیا تمہیں اب پولیس کا خوف لاحق نہیں رہتا؟"

"پولیس میرے نام سے کانپتی ہے۔ ان کے لیے میں صرف ایک ہوا' ایک ہیولا ہوں۔ "جانو ہوٹل والے" کی حیثیت سے مجھے سب جانتے ہیں لیکن راہول ڈاکو کی حیثیت سے مجھے کوئی نہیں جانتا۔ کسی کو نہیں معلوم کہ راہول اور جانو ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ راہول ان کے لیے بس ایک کردار ہے جس کی صورت انہوں نے نہیں دیکھی۔ ہم نے خود اس کردار کو مشہور کیا ہے۔ میرے گروہ کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں۔ میرے کسی آدمی کا حلیہ ان کے پاس نہیں۔"

"لیکن ہم جیسے کئی لوگوں کو تو یہ سب کچھ معلوم ہے۔" زرتاج بولی۔

"جنہیں یہ باتیں معلوم ہیں انہیں یہ بھی معلوم ہے کہ اس سلسلے میں زبان کھولنا یا مخبری کی کوشش کرنا ان کے حق میں کتنا برا ثابت ہوگا۔" جانو مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ سے اب بھی درندگی جھانک رہی تھی۔

اس کے اس انکشاف نے مجھے چونکا دیا تھا کہ ڈاکو کی حیثیت سے اس کی بھی عُرفیت کچھ اور تھی۔ یہی چکر روحیل خان نے چلایا ہوا تھا۔ کہیں یہ سبھی بڑے ڈاکوؤں کی ٹیکنیک تو نہیں تھی؟ کہیں اس طرح وہ ایک نام کی دہشت کو طویل عرصے تک تو استعمال نہیں کرتے تھے؟ اس طرح اگر اصل ڈاکو مارا بھی جاتا تب بھی کوئی اور اس عُرفیت کو استعمال کرتے ہوئے وہی دہشت' وہی خوف برقرار رکھ سکتا تھا۔ شاید تبھی ایک آدھ مرتبہ اس طرح کا کنفیوژن بھی پیدا ہوا تھا کہ پولیس نے اعلان کیا کہ اس نے مقابلے میں فلاں مشہور ڈاکو کو مار ڈالا لیکن بعد میں اس کی تردید سامنے آگئی اور پتا چلا کہ وہ ڈاکو تو زندہ ہے اور بدستور اپنی "عظیم الشان" سرگرمیوں میں مصروف ہے۔

عین ممکن تھا کہ یہ پولیس ہی کے چلائے ہوئے چکر ہوں۔ انہوں نے سوچا ہو کہ کسی نامعلوم بدنصیب پر فلاں مشہور ڈاکو کا لیبل لگا کر فی الحال تو شہرت' نیک نامی' انعامات اور سرٹیفکیٹ وغیرہ سمیٹ لیں' بعد میں دیکھا جائے گا۔

جانو نے زرتاج سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے گروہ کا اصول ہے کہ آخری گولی خود اپنے لیے بچا کر رکھو۔ اگر فرار کا کوئی راستہ نہ رہے تو آخری گولی اپنی کنپٹی میں اتار لو۔ زندگی جتنی بھی ہے اسے بے خوفی اور عیش و عشرت سے گزارو۔ پولیس کے ہتھے چڑھ کر اذیتیں اٹھانے کے مقابلے میں بہرحال موت کو ترجیح دو۔ میرے ساتھیوں نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ جتنے ساتھی بھی اب تک مرے ہیں' اپنی آخری گولی اپنے اوپر استعمال کرکے ہی مرے ہیں لیکن اخباروں کے لیے پولیس والوں نے لاش کے سرہانے کھڑے ہوکر' سینے تان کر گروپ فوٹو بنوایا اور خبریں یہی چھپیں کہ وہ پولیس مقابلے میں ہلاک ہوئے۔"

"خیر...... اب ایسا بھی نہیں ہے کہ پولیس کے ہاتھوں کوئی ڈاکو مرتا ہی نہیں ہے۔" زرتاج بولی۔

"خیر...... ایسی بات نہیں ہے۔" جانو نے تسلیم کیا۔ "پولیس' رینجرز اور دیگر فورسز کے ہاتھوں بھی ڈاکو مرتے ہیں لیکن میں صرف اپنی بات کر رہا ہوں۔ ہمارا گروہ اور ہمارے گروہ کے طور طریقے سب سے مختلف ہیں۔ اسی لیے کسی ایجنسی کے پاس بھی ہمارے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ہیں۔"

"تم اپنے طور طریقوں پر خواہ کتنے ہی خوش ہولو لیکن انجام تو ایک روز تمہارا بھی یہی ہوگا۔ تمہارے سرہانے بھی پولیس والے ایک نہ ایک روز کھڑے ہوکر' سینہ تان کر گروپ فوٹو کھنچوائیں گے۔ شاید اسی اندیشے نے رفتہ رفتہ خوفناک روپ دھار کر اسے نشے کی آغوش میں پناہ لینے پر مجبور کردیا ہو۔" زرتاج بولی۔

"یہ بات نہیں ہے۔" جانو نے مضطربانہ انداز میں نفی میں سرہلایا۔ "اس کی ٹوٹ پھوٹ کسی کی سمجھ میں نہیں آسکتی۔ تم خواہ مخواہ یہاں بیٹھ کر اندازے لگانے کی کوشش مت کرو۔ باقی رہی انجام کی بات۔ تو انجام سبھی کا موت ہے...... اور جب انسان مرچکتا ہے تو اس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی کہ وہ عزت کی موت مرا ہے یا ذلت کی؟ اصل اہمیت تو اس بات کی ہے کہ آپ نے زندگی کیسی گزاری ہے۔ سب سے قابلِ رحم زندگی اس شخص کی ہے جو کسی شمار قطار میں نہیں۔"

"اللہ تعالیٰ نے اتنی بڑی دنیا بنائی ہے۔ اس میں ان گنت انسان پیدا کیے ہیں۔ اگر سبھی شمار قطار میں آجائیں' سبھی قابلِ ذکر اور خاص لوگ بن جائیں تو پھر دنیا کی گاڑی کو آگے دھکیلنے کے لیے عام لوگ کہاں سے آئیں گے؟ دنیا کا اصل بوجھ تو عام لوگ اٹھاتے ہیں۔" زرتاج بولی۔

"خیر...... یہ ایک الگ اور طویل بحث ہے' میں اس میں نہیں پڑنا چاہتا۔" جانو بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولا "میں تو سونیا کی بات کرتا ہوں۔ اگر وہ سوچے تو اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے؟ بیسیوں شیر جیسے جوان ہیں جو اس کے سامنے نوکروں کی طرح

سر جھکائے کھڑے ہوتے ہیں۔ ضرورت کی زیادہ تر چیزیں وہ امپورٹڈ استعمال کرتی ہے۔ لاکھوں روپے کی جیولری اس کے پاس ہے۔ ان گنت ملبوسات ہیں۔ کسی بھی شہر کے کسی بھی شاندار علاقے کے مکان میں رہنے والی کوئی عورت جن چیزوں کی خواہش کر سکتی ہے اور جو کچھ اپنی ملکیت میں رکھ سکتی ہے' وہ سب سونیا کے پاس موجود ہے۔ طاقت اس کے پاس بونس کے طور پر موجود ہے۔"

"کون سی طاقت؟" زرتاج نے پوچھا۔

"میری طاقت اسی کی طاقت ہے نا۔" جانو نے وضاحت کی۔ "اگر کوئی اس کی طرف ترچھی نظر سے دیکھے تو اس کی آنکھیں نکالی جا سکتی ہیں۔ طاقت کا یہ احساس بہت بڑی نعمت ہے لیکن سونیا کو کسی چیز کی قدر نہیں۔" اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

زرتاج کچھ نہ بولی۔ وہ خاموشی سے پُرخیال انداز میں جانو کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے دونوں بازو وکٹورین اسٹائل کی بھاری بھرکم کرسی کے ہتھوں پر ٹکے ہوئے تھے۔ وہ اس ملکہ کی طرح سنجیدہ اور پُرتمکنت نظر آ رہی تھی جس کے دربار میں کوئی مقدمہ پیش کیا گیا ہو۔

جانو ذرا غصیلے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "فلموں میں عام طور پر جو ڈاکو دکھائے جاتے ہیں ان کے ڈین میں ایک رقاصہ ضرور موجود ہوتی ہے یا پھر ضرورت پڑنے پر سردار کی محبوبہ ہی رقاصہ کے فرائض انجام دیتی ہے۔ سونیا بالکل ویسی ہی عورت بن کر رہ گئی ہے۔ اس کے انداز و اطوار بالکل فلمی رقاصاؤں والے ہو گئے ہیں۔ اس کی حرکات و سکنات میں وہی بازاری پن آ گیا ہے۔ وہ لمبے ہولڈر میں چرس بھری سگریٹ لگائے جب اچانک سامنے آتی ہے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ ابھی طبلے پر تھاپ پڑے گی اور ابھی وہ ٹھمکا لگا کر ناچنا شروع کر دے گی۔ بالکل ولگر لگتی ہے۔"

"یہ ردِعمل ہے۔" زرتاج نے گویا کسی ماہر ڈاکٹر کی طرح مرض کی تشخیص کی۔ "وہ معاشرے سے کٹ گئی ہے۔ اس سے سماج چھن گیا ہے' وہ ماحول چھن گیا ہے جہاں اس کی جڑیں تھیں۔"

"انسان کی جڑیں صرف جنگل میں ہیں اور رفتہ رفتہ اسے واپس اسی طرف آنا پڑے گا۔" جانو نے بھی عجیب فلسفیانہ بات کر ڈالی۔ "شہری معاشرے کی حالت نہیں دیکھ رہیں تم؟ لوگ کسی نہ کسی ہوس میں کس طرح ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں' ایک دوسرے کو کچلتے ہوئے بھاگے جا رہے ہیں۔ سوسائٹی پر ایک عجیب سا جنون طاری ہے۔ ہر کوئی کسی نہ کسی جنون میں مبتلا ہے۔ کہیں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ جو لوگ جنون میں مبتلا نہیں ہیں ان کا سکون دوسرے جنونیوں نے غارت کر دیا ہے۔ کوئی اپنے آپ کو محفوظ محسوس نہیں کرتا۔ کیا اس سوسائٹی' اس معاشرے کو تم جنگل سے بہتر سمجھتی ہو؟"

زرتاج کچھ نہ بولی۔ اس کی طرف دیکھتے ہوئے مبہم سے انداز میں مسکراتی رہی۔ وہ مقررانہ انداز میں سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "معاشرہ اصل میں یہ ہے جو تم اور میں اپنی اپنی جگہ تشکیل دے رہے ہیں۔ ہم اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے اپنے انداز میں انسان کو اس کے اصل کی طرف واپس لا رہے ہیں۔ اگر ہم کافی عرصہ زندہ رہے تو لوگ دیکھیں گے کہ استحکام اور سکون صرف اور صرف اس معاشرے میں رہ جائے گا جو میں اور تم تخلیق کر رہے ہیں......"

پھر میں نے اسے ایک عمدہ سا سگار سُلگاتے دیکھا۔ سگار کا کش لے کر وہ بولا "باقی شہروں اور دیہاتوں سے میرا ڈاکوؤں کا ڈین بہتر ہے۔ ہم ڈاکوؤں کی کم از کم زبان تو ایک ہوتی ہے نا۔ زبان سے پھر جانا ہزار فسادوں کی جڑ ہے۔ ہم اگر کسی سیٹھ کو اغوا کرتے ہیں اور مطالبہ کرتے ہیں کہ دس لاکھ روپے ادا کر دیے جائیں تو رقم وصول پانے کے بعد ہم واقعی سیٹھ کو رہا کر دیتے ہیں۔ ہم زبان سے نہیں پھرتے' لالچ میں مبتلا نہیں ہوتے کہ سیٹھ تو کروڑوں کی اسامی ہے' اب اس سے کیوں نہ دس بیس لاکھ مزید اینٹھ لیے جائیں۔"

اس نے ایک اور گہرا کش لے کر بات جاری رکھی۔ "ہم کبھی اس طرح نہیں سوچتے۔ وعدہ بس وعدہ ہے۔ اس کے علاوہ ہم ڈاکو کبھی آپس میں ایک دوسرے کا خون نہیں بہاتے۔ ڈاکوؤں کا ایک گروہ کبھی دوسرے گروہ کا جانی دشمن نہیں ہوتا۔ ہم صرف مال و دولت لوٹتے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو مال و دولت کی حفاظت اپنی جان سے زیادہ کرتے ہیں اور اسی کی خاطر مزاحمت کرتے ہیں۔ ہم ڈاکوؤں کا اوّل تو دولت کے سوا کوئی نظریہ نہیں ہوتا لیکن اگر ہو بھی' تو ہم محض نظریاتی اختلاف کی بنا پر ایک دوسرے کو قتل نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے ہم تمہارے معاشرے کے معززین سے بہتر ہیں۔"

"اپنے آپ کو انسانیت کا نمائندہ قرار مت دو۔ ویسے بھی سبھی ڈاکو تو تمہارے جیسے نہیں ہوتے...... اور تم بھی کوئی ایسے سلطانہ ڈاکو نہیں ہو۔ اوّل درجے کے خبیث ہو تم......!" زرتاج مسکرائی۔

"عزت افزائی کا شکریہ۔" جانو بھی مسکرایا۔ "تمہارے منہ سے بُرا سُننا بھی بھلا ہی لگتا ہے۔"

زرتاج ہولے سے ہنسی۔ "ویسے تمہارا لیڈرانہ انداز ابھی تک نہیں گیا۔ اپنے مؤقف کے حق میں دلیلیں خوب دیتے ہو لیکن مصیبت یہ ہے کہ دلیلیں بھی اکثر بہت بڑا دھوکا ہی ہوتی ہیں۔ دنیا کے بُرے سے بُرے آدمی نے اپنی بڑی سے بڑی ذلالت کے حق میں بھی کچھ نہ کچھ متاثر کن دلیلیں گھڑ رکھی ہوتی ہیں اور لوگ بے چارے اپنا سر دُھنتے رہتے ہیں......"

دفعتاً اس نے اپنی سڈول' مرمریں کلائی پر بندھی سیاہ گھڑی میں وقت دیکھا۔ "تم نے مجھے باتوں میں خوب الجھایا۔ میرا ارادہ تمہاری خاطر صرف چند منٹ رکنے کا تھا۔"

"مزے کی بات یہ ہے کہ وہ بات رہ ہی گئی جس کی خاطر میں آیا ہوں۔ باقی دنیا بھر کی باتیں ہو گئیں۔" جانو بھی گھڑی دیکھ کر سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"یقیناً وہ کوئی خاص بات ہوگی جس کے لیے تم نے خود زحمت کی ہے۔"

"نہیں...... کوئی ایسی خاص بھی نہیں۔ خاص بات تو بس یہ ہے کہ اس بات کے بہانے سے تم سے ملاقات ہو گئی۔" ایک بار پھر جانو کے ہونٹوں پر وہی بھوکی مسکراہٹ لوٹ آئی جس کی وجہ سے وہ اچھلا بھلا وجیہہ ہونے کے باوجود نفرت انگیز نظر آتا تھا۔ یا شاید وہ صرف مجھے ہی ایسا نظر آ رہا تھا۔ شاید میں لاشعوری طور پر چاہتا تھا کہ وہ زرتاج کو ایسی نظروں سے نہ دیکھے۔

جانو نے بات جاری رکھی۔ "مسئلہ کوئی خاص تو نہیں لیکن آگے چل کر خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے اس لیے میں تمہیں خبردار کرنے آ گیا ہوں۔ پچھلے تین دن کے دوران تمہارے ہاں کوئی ایسا گھڑسوار تو نہیں پہنچا جس کا گھوڑا بھی سیاہ ہو اور لباس بھی؟"

"کیوں...... خیریت؟" زرتاج نے چونکے بغیر مسکراتے ہوئے کہا۔

"پہلے تم میرے سوال کا جواب دو۔" جانو اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ شاید حقیقت تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر اپنی سفاک نظروں سے زرتاج کو تلقین کر رہا تھا کہ وہ جھوٹ بولنے کی کوشش نہ کرے۔

"نہیں۔ میرے علم میں تو نہیں۔" زرتاج کے لہجے میں سرد مہری آ گئی۔ "ویسے گاؤں میں اور زمینوں پر بھی سب لوگوں کو سختی سے میری ہدایت ہے کہ ہمارے علاقے میں کوئی اجنبی داخل ہو تو فوراً اسے روک کر اس کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کی جائیں اور اگر اس کے بارے میں ذرا بھی بے اطمینانی ہو تو اسے میرے سامنے پیش کیا جائے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ تمہارے احکامات پر واقعی عمل ہوتا ہے؟ کہیں وہ گاؤں میں کسی کے گھر میں پناہ حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو گیا ہو؟" جانو بولا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" زرتاج کے لہجے میں اب بھی سرد مہری تھی۔ "مجھے یقین ہے کہ میرے احکامات پر اچھی طرح عمل ہوتا ہے۔ اگر وہ گاؤں میں کسی کے ہاں پناہ گزیں ہوتا تو مجھے ضرور اطلاع مل چکی ہوتی۔"

پھر ذرا توقف سے وہ بولی۔ "جس دن مجھے یہ شبہ ہوا کہ میرے احکامات پر عمل نہیں ہوتا اس دن میں اس گاؤں اور زمینوں کا نظام کسی اور کے سپرد کرنے کے بارے میں غور کروں گی۔ تم یہ بتاؤ کہ قصہ کیا ہے؟ تمہیں کس سلسلے میں اس سیاہ پوش کی تلاش ہے؟"

"مال کے سلسلے میں۔" جانو ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"میں سمجھی نہیں! ذرا وضاحت سے بات کرو۔"

"ہم سے بڑی زبردست حماقت ہوئی۔ وہ خود چل کر ہمارے ڈیرے پر آیا تھا' ہمارے قابو میں تھا لیکن ہماری عقلوں پر پردہ پڑ گیا۔ ہم نے وقتی طور پر اس کی بات کا یقین کر لیا اور اسے نکل جانے دیا۔ اب ہم پچھتا رہے ہیں۔"

"تم اب بھی پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔" زرتاج ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔" جانو سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے بولا "ہمارا ایک خاص آدمی تھا' روحیل خان۔ وہ ہر وقت ہمارے ساتھ نہیں رہتا تھا۔ اس نے بھی ایک چھوٹے سے شریف زمیندار کا روپ دھارا ہوا تھا لیکن جو تھوڑی سی زمین اس کے پاس تھی' وہ بھی درحقیقت اس کی نہیں تھی۔ وہ اس کے پاس کسی کی امانت تھی۔ بڑا باصلاحیت اور زبردست نوجوان تھا اس لیے گروہ میں اسے تقریباً میرے نائب کی حیثیت حاصل تھی......"

یہ انکشاف بھی میرے لیے چونکا دینے والا تھا کہ روحیل خان جو زمین سنبھالے ہوئے تھا وہ اس کی اپنی نہیں تھی۔ اس نے یہ بات مجھے نہیں بتائی تھی۔ آثار بتا رہے تھے کہ بہت سی ایسی باتیں سامنے آنے والی تھیں جو اس نے مجھے نہیں بتائی تھیں۔

"تین روز پہلے ہمارے گروہ نے ایک بہت بڑی واردات کی......" جانو کہہ رہا تھا۔ "اس واردات میں لوٹے ہوئے لاکھوں روپے اور لاکھوں کا مال روحیل خان کے پاس تھا۔ وہی اس واردات میں گروہ کی قیادت کر رہا تھا۔ اچانک ہی پولیس کی ایک پارٹی کسی اور چکر میں اس طرف آ نکلی۔ معاملہ بگڑ گیا۔ اگر میں اس واردات میں شامل ہوتا تو شاید گڑبڑ نہ ہوتی لیکن کسی وجہ سے نہیں جا سکا تھا۔ مجھے شبہ ہے کہ گڑبڑ بھی روحیل خان نے ہی جان بوجھ کر کی تھی۔ تمام ساتھی بچھڑ گئے۔ بہرحال ہمیں فکر نہیں تھی۔ ہمیں تو یہی اطمینان تھا کہ مال ہمارے بھروسے کے آدمی کے قبضے میں ہے۔"

اس نے سگار کا گہرا کش لیا اور اسے انگلیوں میں گھماتے ہوئے بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس سے اگلے روز روحیل خان والے حُلیے اور اسی کے لباس میں ایک اور شخص ہمارے علاقے میں پہنچا۔ وہ مجھے ڈھونڈ رہا تھا۔ اسے پکڑ کر میرے پاس پہنچایا گیا تو اس نے عجیب ہی کہانی سنائی کہ روحیل خان گھوڑے سے گر کر ٹانگ تُڑوا بیٹھا تھا اور بڑی مشکل سے اپنے ڈیرے تک پہنچا تھا۔ انسپکٹر رحیم گل اس کے تعاقب میں تھا۔ اس شخص نے اپنا نام افضل خان بتایا تھا۔ وہ اپنے آپ کو روحیل خان کا گہرا دوست اور "پارٹنر" بتا رہا تھا جبکہ ہم نے اس سے پہلے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔

اس نے بتایا کہ روحیل نے اس سے مدد کی درخواست کی تھی

اور تجویز یہ پیش کی تھی کہ وہ روحیل خان کا لباس پہن کر' اس کے گھوڑے پر بیٹھ کر انسپکٹر رحیم گل کو اپنے پیچھے لگا کر لے جائے۔ رحیم گل کو یقین ہو جائے گا کہ جو شخص اپنے گھر میں' ٹوٹی ہوئی ٹانگ لیے' پٹیاں لپیٹے پڑا تھا وہ تو کچھ دیر پہلے ڈاکا مارنے والا ڈاکو نہیں ہو سکتا۔ یعنی افضل خان اپنے دوست روحیل خان کے لیے ایثار کر رہا تھا۔ تم ہی بتاؤ' آج کل کوئی کسی کے لیے اس قسم کا ایثار کرتا ہے؟"

"تم ان باتوں کو چھوڑو' یہ انسانی احساسات کی باتیں ہیں اور تم احساسات سے عاری انسان ہو۔ تم اصل قصہ بیان کرو۔" زرتاج نے مشورہ دیا۔

"ہم یہ سمجھے کہ روحیل خان نے افضل خان کو لوٹ کا مال دے کر ہمارے پاس بھیجا ہوگا۔" جانو سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا۔ "لیکن اس نے بتایا کہ اس کے پاس تو کوئی مال وال نہیں تھا اور نہ ہی اسے مال کے بارے میں کچھ علم تھا بلکہ اس کا تو کہنا تھا کہ جب روحیل خان ٹوٹی ہوئی ٹانگ کے ساتھ اپنے ڈیرے پر پہنچا اس وقت بھی اس کے پاس کوئی مال وغیرہ نہیں تھا۔ اس بات پر تھوڑی بہت بک بک جھک جھک ہوئی لیکن آخر کار ہم نے افضل خان کی بات پر یقین کر لیا۔ ہم نے اسے جانے کی بھی اجازت دے دی۔ ہمارا خیال تھا کہ دو چار دن میں روحیل خان کے ڈیرے پر جائیں گے اور مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"تو کیا مسئلہ حل نہیں ہوا؟" زرتاج نے اسے خاموش دیکھ کر پوچھا۔

"مسئلہ تو اور بھی زیادہ پُراسرار اور تشویش ناک ہو گیا۔ کل ہم روحیل خان کے ڈیرے پر گئے تو پتا چلا' وہ غائب ہو چکا ہے۔ کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر اس کی ٹانگ واقعی ٹوٹی ہوئی تھی تو وہ کہاں غائب ہو گیا؟ کس نے اس کی مدد کی؟ ظاہر ہے کسی کی مدد کے بغیر تو وہ غائب نہیں ہو سکتا تھا۔ یا پھر اس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی نہیں تھی۔ ہم تک یہ جھوٹی اطلاع پہنچائی گئی تھی تاکہ ہم مطمئن ہو کر بیٹھے رہیں اور اس دوران روحیل خان کو غائب ہونے اور ان علاقوں سے بہت دور نکل جانے کا موقع مل جائے۔"

وہ خاموش ہو گیا اور کچھ اس طرح زرتاج کی طرف دیکھنے لگا جیسے وہ ان باتوں پر کوئی تبصرہ کرے گی لیکن وہ خاموش رہی۔ تب جانو کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا "اب سارا دارومدار اس شخص پر ہے جس نے اپنا نام افضل خان بتایا تھا اور جو ہماری حماقت کی وجہ سے ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب اس پر بسوں کے کئی مسافروں' کئی پولیس والوں اور خصوصاً ایک ہیڈ کانسٹیبل کے قتل کا الزام ہے۔ وہ ہیڈ کانسٹیبل' انسپکٹر رحیم گل کے ساتھ تھا۔ رحیم گل کی شہرت تو تم نے سنی ہی ہوگی۔ وہ بڑی کمبل قسم کی چیز ہے۔ وہ چاروں طرف افضل خان کی بُو سونگھتا پھر رہا ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ وہ کسی کے پیچھے لگ جائے تو پھر کسی قیمت پر اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔"

"ہاں۔" زرتاج مسکرائی۔ "وہ ان عجیب و غریب قسم کے افسروں میں سے ہے جو اب پولیس میں نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔"

"لیکن ہم چاہتے ہیں کہ افضل خان اس کے ہتھے چڑھنے سے پہلے ہمارے ہتھے چڑھے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا وہ کدھر نکل گیا۔ میرا اندازہ تو یہی تھا کہ وہ ادھر ہی آیا ہوگا اور کسی طرح پناہ لینے میں کامیاب ہو گیا ہوگا۔ میں تو بڑا خوش تھا کہ یہاں آتے ہی ہمارا مسئلہ حل ہو جائے گا' ہمیں جس کی تلاش ہے وہ ہمیں مل جائے گا لیکن تم نے تو ہماری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔" جانو پُرخیال انداز میں ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا۔

میں اپنی جگہ بُت بنا کھڑا تھا اور دروازے کی جھری سے آنکھ لگائے ٹیرس کا منظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے زرتاج کے چہرے پر کوئی ردِعمل تلاش کرنے کی کوشش کی۔ کیا اس نے جانو کی باتوں پر یقین کر لیا تھا؟ کیا میرے بارے میں اس کے دل میں بدگمانی آ چکی تھی؟ زرتاج کے چہرے سے میرے لیے ان باتوں کا اندازہ لگانا بہت مشکل تھا۔ کم از کم ایک بات تو میرے حق میں جا رہی تھی کہ زرتاج نے اپنے گھر میں تو کیا' اپنے گاؤں اور زمینوں کی حدود میں بھی میری موجودگی کا اعتراف نہیں کیا تھا۔ اب میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے مصلحتاً ایسا کیا تھا یا اس کے دل میں میرے لیے نرم گوشہ موجود تھا اور میرے بارے میں اس کی رائے یہی تھی کہ میں کوئی برا یا دھوکے باز شخص نہیں تھا؟

روحیل خان کے غائب ہونے کے انکشاف نے مجھے بھی اچھا خاصا چونکا دیا تھا۔ میں خود اسے گھر میں لٹا کر آیا تھا۔ اس کی ٹانگ کی ہڈی واقعی ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے خود اس پر پلستر نما بینڈیج کی تھی۔ اس نے ذکر تو کیا تھا کہ ڈیرہ حسام خان سے کوئی اس کے پاس آنے والا تھا۔ کیا اسی کی مدد سے وہ کہیں نکل گیا تھا؟

میرے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور مجھے یہ بھی یقین نہیں آ رہا تھا کہ روحیل خان نے واقعی مجھے قربانی کا بکرا بنایا تھا۔ وہ تو اتنی اچھی اچھی باتیں کرنے والا پُرخلوص سا نوجوان تھا۔ کیا میرے ساتھ وہی پرانی کہانی دُہرائی گئی تھی جس سے سبق ملتا ہے کہ کسی کی معصوم صورت دیکھ کر اور خلوص بھری باتیں سن کر دھوکا نہیں کھانا چاہیے؟ میرا دل اس بات کو نہیں مان رہا تھا۔ روحیل خان تو یاروں کا یار اور زبان پر جان دینے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ درپردہ وہ بے شک ڈاکو تھا اور اس نے میرے سامنے اس کا اعتراف بھی کر لیا تھا لیکن اس کی فطرت میں سازشیں اور کمینگی نظر نہیں آتی تھی۔

اس کے برعکس جانو اور خمیسو کی شکلیں ہی دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں غصہ آ رہا تھا۔ دونوں پورے صورت حرام نظر آتے

تھے۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنی رگ وپے میں آتش فشاں مچلتے محسوس ہو رہے تھے اور میرا ذکر آتے ہی ان کی آنکھوں میں بھی ایسی چمک آ گئی تھی جیسی کسی شکار کو دیکھ کر درندے کی آنکھوں میں آتی ہے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان کا شکار ان کی نظروں سے اوجھل تھا۔ شاید ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں چار قدم کے فاصلے پر ایک تاریک بیڈ روم میں کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

تاہم مجھے یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ اگر یہ منحوس کردار مجھ سے نہ ٹکرائے ہوتے تو شاید زرتاج سے بھی میری ملاقات نہ ہوتی...... اور یہ ایک بڑا نقصان ہوتا۔

زرتاج کی گفتگو سے جانو کی شخصیت بھی میری نظر میں کچھ اور واضح ہوئی تھی۔ مجھے یہ اندازہ تو پہلے ہی تھا کہ وہ کچھ پڑھا لکھا تھا لیکن اب یہ واضح ہوا تھا کہ اس کا اپنا ایک الگ ہی فلسفۂ حیات بھی تھا۔ وہ صحیح تھا یا غلط' یہ بعد کی بات تھی لیکن وہ کوئی اچھا آدمی بہرحال نہیں تھا۔ وہ ایک قابلِ نفرت کردار تھا اور مجھے اس سلسلے میں بھی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ اگر میں اس کے یا خمیسو کے ہتھے چڑھا تو وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنے کی کوشش کریں گے۔ میرے ذہن میں ایسے ہی ان گنت خیالات کا اژدہام تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد جانو بولا "خیر...... اگر وہ شخص ابھی تک یہاں نہیں پہنچا تو آئندہ کے لیے خیال رکھنا۔ ممکن ہے کسی دن وہ بھٹکتا بھٹکتا ادھر آ نکلے۔ اسے تمہارے علاقے میں پناہ نہیں ملنی چاہیے ورنہ یہ تمہارے حق میں بھی برا ثابت ہوگا اور ہمارے حق میں بھی۔"

"یہ فیصلہ کرنے کا اختیار فی الحال میرے پاس ہی رہنے دو کہ کس کے ساتھ مجھے کیا سلوک کرنا چاہیے۔" زرتاج سرد لہجے میں بولی۔

"میں کوئی ہدایت یا حکم نہیں دے رہا۔ یہ ایک دوستانہ مشورہ ہے۔ تم بہت ذہین ہو بلکہ کبھی کبھی تو مجھے دانشور لگتی ہو لیکن بہت نادان بھی ہو۔ تم جیسے لوگ کبھی کبھی اپنی سادگی اور معصومیت میں کوئی احمقانہ قدم اٹھا بیٹھتے ہیں جو اُن کی نظر میں بے حد عقلمندانہ ہوتا ہے۔" جانو ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں یہ کہتے ہوئے مسکرایا۔ "مجھ جیسا ہمدرد تمہیں ملے گا نہیں لیکن فی الحال تمہیں میری قدر نہیں ہے۔ خیر...... ایک نہ ایک دن قدر ہو ہی جائے گی۔ اسی آس پر ہم زندہ ہیں۔" اس نے ایک مصنوعی آہ بھری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر چق کے عقب سے باہر جھانکتے ہوئے بولا "ہم نے تمہارا بہت وقت لے لیا لیکن خیر...... ہمارا آنا تمہارے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوگا۔ ہم نے تمہیں ایک خطرے سے خبردار کر دیا ہے۔"

"شکریہ۔" زرتاج کے لہجے میں اب بھی سرد مہری تھی لیکن جانو کو شاید دوسرے کے لہجے سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی۔ وہ صرف اپنی بات کہنے سے غرض رکھتا تھا۔

زرتاج بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ جانو واپسی کے لیے مُڑتے ہوئے بولا۔ "تمہیں شکار پر جانے میں دیر نہیں ہو گئی؟"

"نہیں۔ آج تو شکار شروع کرنے کا ارادہ ہی نہیں تھا۔ آج تو جا کر صرف کیمپ لگانا تھا۔ کل سے ہی کچھ کریں گے۔ تم کیا اب واپس جا رہے ہو؟"

"نہیں۔ مجھے تو آج ایک اور زمیندار سے ملنے جانا ہے۔ اسے کچھ "سیاسی" مسائل درپیش ہیں۔" جانو استہزائیہ انداز میں ہنسا۔ "تمہیں معلوم ہے' آج کل بعض زمینداروں کے بعض سیاسی مسائل بھی ہم ڈاکو حل کرتے ہیں۔ یہاں سے میں اور خمیسو الگ ہو جائیں گے۔ خمیسو کو تمہارے گاؤں سے ہم سب لوگوں کے لیے کچھ شاپنگ کرنی ہے۔ زرتاج نگر کہنے کو گاؤں ہے مگر اس کی یہ بڑی خوبی ہے کہ یہاں ہر وہ چیز مل جاتی ہے جو شہروں میں مل سکتی ہے۔"

"میں نے اس کی ترقی کے لیے بہت کوششیں کی ہیں۔ ہر کام سرکار کے آسرے پر نہیں چھوڑا۔ خود بڑی بڑی رقمیں خرچ کی ہیں تاکہ یہاں کے لوگ کبھی شہروں کا رُخ کرنے کے بارے میں نہ سوچیں۔" زرتاج قدرے خوشگوار لہجے میں بولی۔

"تم ایک عجیب و غریب زمیندارنی ہو!" جانو عجیب سے انداز میں ہنسا۔ "اگر ملک میں تم جیسے طور طریقے آدھے زمیندار بھی اختیار کر لیں تو دیہاتی معاشرے کی حالت بدل جائے۔ دوسروں کی فلاح کے لیے اپنے پلّے سے دولت خرچ کرنا دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک کام ہے۔"

وہ دونوں اس پردے کے قریب پہنچ چکے تھے جو ڈائننگ ہال اور ٹیرس کے درمیان حائل تھا۔ زرتاج بولی۔ "میں تمہیں یہیں سے خدا حافظ کہوں گی۔ خادمہ تمہیں گیٹ تک چھوڑ آئے گی۔ مجھے اپنے آدمیوں کو کچھ ضروری ہدایات دینی ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ تکلفات کی کوئی ضرورت نہیں' پھر کبھی ملاقات ہوگی۔" جانو بے پروائی سے بولا لیکن پھر وہ ڈرامائی سے انداز میں گھومتے ہوئے زرتاج کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا دیا۔ "میں ایک بار پھر کہوں گا کہ تم دنیا بھر کے بارے میں سوچنا چھوڑ دو۔ کبھی اپنے بارے میں سوچو...... میرے بارے میں سوچو۔"

میں زرتاج کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اب اس کا چہرہ میری طرف نہیں تھا تاہم میں نے سپاٹ لہجے میں اسے کہتے سنا۔ "خدا حافظ۔" اس نے جانو کی بات کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔

جانو اور خمیسو خان آگے بڑھ گئے۔ چند لمحے بعد سیڑھیوں پر ان کے قدموں کی آوازیں معدوم ہو گئیں تو زرتاج پلٹی۔ دونوں ہاتھ بغلوں میں دبائے وہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ اس دروازے کی طرف بھی نہیں دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے میں موجود تھا۔

میں آہستگی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا اور مجرموں کی طرح اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری آنکھوں

میں جھانک رہی تھی۔ جیسے میری ذات کی کتاب کو آخری سطر تک پڑھ لینا چاہتی ہو۔

"کیا آپ نے اس کی باتوں کا یقین کرلیا؟" چند لمحے کے سکوت کے بعد میں نے پوچھا۔

"تمہیں کیونکر یہ خیال آیا؟" اس نے اُلٹا مجھ سے سوال کردیا۔ اس کے ہونٹوں پر دھیرے دھیرے مسکراہٹ واپس آرہی تھی اور آنکھوں سے دُھند چھٹ رہی تھی۔

"آپ یکایک کچھ فکر مند سی نظر آنے لگی ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں فکر مند نہیں ہوں' صرف سوچ رہی ہوں۔ تمہارے بارے میں نہیں' جانو کے بارے میں۔" وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی۔ "اس نے کہا تھا نا کہ میرے بارے میں سوچو۔ میں اس کے حکم کی تعمیل کررہی ہوں۔ گدھا کہیں کا!"

"اس کا مطلب ہے' جانو نے میرے بارے میں جو کچھ کہا اس پر آپ نے یقین نہیں کیا؟" میرے دل میں خوشی کی ایک لہر سی اٹھی۔ کیا اتنی جلدی وہ واقعی اس حد تک مجھ پر اعتماد کرنے لگی تھی؟

"کچھ سچ اس نے بولا ہے' کچھ سچ تم نے بولا ہے۔ کچھ باتیں اس نے چھپائی ہیں' کچھ باتیں تم نے چھپائی ہیں۔ اس کے سامنے بھی کچھ مصلحتیں ہیں' تمہارے سامنے بھی کچھ مصلحتیں ہوں گی۔ وہ بھی کچھ حقائق جاننا چاہتا ہے...... اور میرا خیال ہے تم بھی کچھ حقائق کی تلاش میں ہو۔" وہ قدرے بے نیازی سے بولی۔ "لیکن تم بطور انسان میری نظر میں ہر لحاظ سے اس سے بہتر اور قابلِ اعتبار ہو۔ اس کا کیا ہے' وہ تو اب مکمل طور پر ڈاکو بن چکا ہے۔ وہ جو اس کے اندر ایک سمجھدار اور تعلیم یافتہ انسان تھا' وہ اب کہیں گہرائی میں دفن ہوگیا ہے اس لیے اس کی بات کا میں زیادہ اعتبار نہیں کرتی۔"

"اگر میں آپ کو اپنے بارے میں سب کچھ بتا دوں تو آپ اعتبار کرلیں گی؟" میں نے پوچھا۔ اس کے رویّے کی وجہ سے گویا میرے سینے سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا۔

"بتا دینا' ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" وہ بے نیازی سے بولی۔

"بہرحال اتنا ضرور جان لیجیے کہ میں نے آپ سے جھوٹ صرف اس حد تک بولا تھا کہ میں اس علاقے کا ایک چھوٹا سا زمیندار ہوں۔ میں زمیندار نہیں ہوں۔ نہ چھوٹا اور نہ ہی بڑا۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "یہ اندازہ تو مجھے شروع ہی سے ہوگیا تھا۔ دور دور تک کے تمام چھوٹے بڑے زمینداروں کو میں جانتی ہوں اور وہ مجھے جانتے ہیں۔ حتیٰ کہ میں روحیل خان کو بھی جانتی ہوں۔"

مجھے ہلکا سا جھٹکا لگا۔ بہرحال میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اس کے علاوہ میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔ میں واقعی روحیل خان کی ایک مہربانی اور چند دن کی دوستی کے جواب میں اس کی خاطر ایثار کرنے لگا تھا۔ میں نے اس کے ڈاکوؤں والے کپڑے پہن کر واقعی انسپکٹر رحیم گل کو اپنے پیچھے لگا لیا تھا۔ راستے میں ایک ہیڈ کانسٹیبل میرے ہاتھوں قتل ہوگیا تھا لیکن وہ صرف ایک حادثہ تھا۔ میں اسے قتل کرنا ہرگز نہیں چاہتا تھا۔ میرے ہاتھوں اس کے مرنے کا مجھے افسوس ہے۔ اس کے علاوہ میرا کسی ڈکیتی' کسی قتل' کسی برائی' کسی واردات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

"صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ عجیب بے نیاز قسم کی لڑکی تھی۔ یا پھر شاید اسے اپنی مردم شناسی پر حد سے زیادہ اعتماد تھا۔

وہ اس وقت چق کے پار دیکھ رہی تھی۔ میں نے بھی گردن گھما کر دیکھا۔ حویلی کی روش پر جانو اور خمیسو خان گیٹ کی طرف جارہے تھے۔ ایک بار پھر میں اس صورتِ حال سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ جس کی تلاش میں وہ شکاری کتّوں کی طرح پھر رہے تھے وہ ٹیرس پر کھڑا انہیں دیکھ رہا تھا۔

پھر میں نے زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ نے تو ایک بھید کی طرح مجھے چھپا لیا لیکن آپ کے آدمی تو یقیناً انہیں میرے بارے میں بتا دیں گے۔"

"مجھے پہلے ہی کچھ اندیشہ تھا کہ شاید کوئی تمہاری تلاش میں یہاں آئے' اس لیے میں نے محض احتیاطاً اپنے آدمیوں کو ہدایت کردی تھی کہ وہ کسی سے تمہاری آمد کا ذکر نہ کریں۔ میرے آدمی میرے حکم کی صحیح طور پر تعمیل کرتے ہیں۔ ویسے بھی انہیں غیر ضروری باتیں کرنے کی عادت نہیں۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

اس کے جواب نے میرا بوجھ کچھ اور کم کردیا لیکن وہ گھوڑے سدھانے والا شیر محمد میرے ذہن میں کانٹے کی طرح چُبھ رہا تھا۔ یہ تو ممکن تھا کہ وہ پوری طرح زرتاج کا وفادار ہو لیکن وہ کچھ زیادہ خیر خواہ نہیں لگتا تھا۔

"آپ جانو کو خاصی اچھی طرح جانتی ہیں؟"

"ہاں۔ خاصی اچھی طرح۔" زرتاج نے کرسی سے اپنی رائفل اٹھا کر اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی۔ "اس نے جب نیا نیا اپنا گروہ تیار کیا تھا اور اس میں صرف چند ڈاکو شامل تھے تو اپنی ابتدائی وارداتوں میں اس نے ہمیں بھی شکار کرنے کی کوشش کی تھی۔ بڑے زور و شور سے اس نے حویلی پر ڈاکا ڈالا تھا۔ اس وقت پاپا زندہ تھے......" وہ گویا اس وقت کی یادوں میں اُلجھنے لگی۔

پھر خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "ہمارے آدمیوں نے اس کے گروہ کو مار بھگایا اور جانو کو قابو میں کرکے خوب پٹائی لگائی۔ یہ بہت گڑگڑایا' منتیں کیں اور اس دوران اس نے اپنی کچھ کہانی

بھی ہمیں سنا کر ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ہم پولیس کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ اس دوران یہ کسی طرح ہمیں جُل دے کر رسیاں کھلوا کر فرار ہوگیا۔"

اس نے متاسفانہ سے انداز میں گہری سانس لے کر بات جاری رکھی۔ "وہ اس کے اناڑی پن اور کم خباثت کا زمانہ تھا۔ وہ دوبارہ کسی کے ہتھے نہیں چڑھا۔ بعد میں تو رفتہ رفتہ وہ اتنا طاقتور ہوگیا کہ اب علاقے کے مجھ سے بھی کہیں بڑے بڑے اور طرّم خاں قسم کے زمیندار اس سے ڈرتے ہیں۔ بوقتِ ضرورت وہ اس سے مدد لیتے بھی ہیں اور اس کی مدد کرتے بھی ہیں۔ جانو بکواس کررہا تھا کہ پولیس کو اس کی دُہری شخصیت کا علم نہیں۔ وہ راہول ڈاکو کے نام سے مشہور ہے۔ پولیس کی فائلوں میں اس کا یہی نام درج ہے لیکن پولیس کو اچھی طرح معلوم ہے راہول ڈاکو کون ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اسے راہول ڈاکو کے نام سے مشہور کرنے اور ہوّا بنانے میں خود پولیس کا بڑا ہاتھ ہے۔ پولیس کو اس کے اصل اور خفیہ ٹھکانوں کا علم بھی نہیں ہے اور وہ اس پر ہاتھ ڈالنے سے گریز بھی کرتی ہے۔ اس کی بہت ہی گفتنی اور ناگفتنی وجوہات ہیں جن کا تم خود اندازہ لگا سکتے ہو۔"

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ "کیسی ستم ظریفی ہے کہ ہم اس کے بارے میں سب کچھ جانتے ہوئے اور اثر و رسوخ رکھتے ہوئے بھی اسے گرفتار نہیں کروا سکتے اور نہ ہی پولیس اسے گرفتار کرنا چاہتی ہے۔ غنیمت ہے کہ اس دوران ہم سے اس کی صلح ہوچکی تھی ورنہ ہم میں سے کوئی بھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا تھا لیکن سچی بات یہ ہے کہ اس سے ڈرتی میں بھی ہوں۔ اس کے پاس دہشت گردوں کی ایک اچھی بھلی فوج موجود ہے۔ اسلحے کے انبار ہیں۔ صحیح معنوں میں اس علاقے میں ہم دو ہی بڑی قوتیں ہیں۔ اگر خدانخواستہ کبھی ہم میں ٹکراؤ کی نوبت آگئی تو ہم دونوں ہی تباہ و برباد ہوجائیں گے۔ اسی لیے میں ایک حد تک اس کی لن ترانیاں بھی برداشت کرتی ہوں۔ ایک عرصے سے وہ مجھ پر عاشق چلا آرہا ہے۔ میں نے کبھی اس کی ہمت افزائی نہیں کی لیکن کبھی جوتے مار کر بھی گھر سے نہیں نکالا۔ حالانکہ دل میرا یہی چاہتا ہے۔"

"شاید اب آپ کی یہ خواہش پوری ہوجائے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنس دی جیسے مجھے سمجھانا چاہتی ہو۔ 'بچوں جیسی باتیں کرکے مجھے بہلانے کی کوشش نہ کرو۔' تاہم اس نے منہ سے کچھ نہیں کہا۔ میں بدستور مسکرا رہا تھا۔ میری چشمِ تصور کہیں اور تھی۔

بالآخر وہ خاموش نہ رہ سکی۔ اس نے گویا میری خوش فہمی دور کرنے کی کوشش کی۔ "اسے تھوڑا بہت جاننے والے اس کی طاقت کا اندازہ نہیں کرسکتے۔ اگر وہ ساری قوت جمع کرکے مقابلے بازی پر اتر آئے تو کوئی اچھا بھلا شہر اُجاڑ سکتا ہے۔"

"آخر پولیس اس پر ہاتھ کیوں نہیں ڈالتی؟"

"طاقت کے سامنے سب بے بس ہیں۔ دنیا میں آج بھی ہر جگہ' ہر خطے میں طاقت کا قانون چل رہا ہے۔ باقی سب دکھاوے ہیں' خوامخواہ کی خوش فہمیاں ہیں۔ پولیس والوں کے بھی بال بچے ہوتے ہیں۔ بوڑھے ماں باپ' بہن بھائی ہوتے ہیں اور ان سب کو اسی معاشرے میں کہیں نہ کہیں رہنا ہوتا ہے۔ اپنی اور بیوی بچوں کی زندگی...... بہنوں کی عزت...... بیوی کا مستقبل' ان سب چیزوں کے سامنے فرض وغیرہ کا فلسفہ دھرا رہ جاتا ہے۔ خصوصاً ایک ایسے معاشرے میں جہاں بیشتر عظیم روایات دم توڑ چکی ہوں۔ پھر جب پولیس والے یہ دیکھتے ہیں کہ اگر وہ فرض شناسی اور بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے' جان کی بازی لگا کر اس قسم کے خطرناک لوگوں کو پکڑتے بھی ہیں تو وہ عدالتی نظام کی پیچیدگیوں اور گواہوں کے چکر سے فائدہ اٹھاتے ہوئے صاف بچ نکلتے ہیں' تو ان کی اور بھی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ معاشرے کو پاک کرنے کا ان کا شوق دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بزدلی کا بھی مسئلہ ہے۔ بہت سے عام لوگوں کی طرح بہت سے پولیس والے بھی ایسے ہیں جو نہتے اور کمزور لوگوں کے سامنے شیر نظر آتے ہیں مگر ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے سامنے بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ وہ اپنی وردی کی طاقت کا بھرم رکھنا بھی بھول جاتے ہیں۔"

پھر وہ رائفل کو اُلٹتے پلٹتے ہوئے تلخ سے لہجے میں بولی۔ "ایک بار ایک ڈی ایس پی جانو کے پیچھے لگا تھا۔ وہ صرف جانو ہی کو نہیں' اس کے پورے گروہ کو ختم کرنا چاہتا تھا اور ان کے تمام خفیہ ٹھکانوں کا پتا چلانا چاہتا تھا۔ ڈی ایس پی کا نو دس سال کا بچہ ایک روز کھیلنے کے لیے گھر سے نکلا تو کچھ دیر بعد ایک دیوار کے پاس اس طرح پڑا پایا گیا کہ اس کی گردن اس کے تن سے جُدا تھی حالانکہ ڈی ایس پی کا وہ بنگلا ٹائپ مکان' پولیس کی ایک چھوٹی سی کالونی میں ہی تھا اور کالونی کے گیٹ پر پولیس والوں کا پہرہ رہتا تھا۔ کالونی کی چاردیواری بڑی محفوظ سمجھی جاتی تھی۔"

وہ ایک لمحے کے لیے مغموم سے انداز میں خاموش ہوگئی پھر گہری سانس لے کر بولی۔ "وہ لڑکا ڈی ایس پی کی اکلوتی اولاد تھا۔ اس کے قتل کے بعد ڈی ایس پی استعفا دے کر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ اس کے بعد سے اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔"

جانو کے لیے میرے دل میں نفرت کچھ اور بڑھ گئی تاہم میں نے اس کا اظہار کیے بغیر پُرسکون لہجے میں پوچھا "کیا وہ واقعی پڑھا لکھا ہے؟"

"ہاں بھئی۔ اچھا خاصا پڑھا لکھا ہے۔ اس نے صرف پاکستان میں ہی تعلیم حاصل نہیں کی بلکہ پڑھنے کے لیے باہر بھی گیا تھا۔ ہارورڈ یونیورسٹی سے لاء گریجویشن کرنے گیا تھا۔ قانون کی تعلیم تو وہ پوری نہیں کرسکا لیکن قانون کا سب سے بڑا دشمن ضرور بن گیا۔" رائفل دوبارہ کرسی پر رکھ کر وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"اپنی کہانی کچھ اس نے خود سنائی تھی اور کچھ اِدھر اُدھر سے تصدیق ہوئی ہے۔ وہ طالب علمی کے زمانے سے ہی لیڈر ٹائپ چیز تھا۔ مختلف پابندیوں کے خلاف اس کا ردِ عمل بہت شدید ہوتا تھا۔ خوشحال والدین کی اولاد تھا۔ باہر بھی جاتا رہتا تھا۔ سیاست میں بہت سرگرم تھا لیکن مزاج میں انتہا پسندی تھی۔ اس قسم کے نوجوانوں کو غیر ملکی ایجنسیاں اُچک لیتی ہیں۔ اس دوران اس کے والدین کا بھی انتقال ہوگیا جو اسے کچھ لگام دیے رکھتے تھے۔ کئی بار وہ گرفتار ہوا۔ اس پر بہت خطرناک قسم کے مقدمات تھے۔ ایک بار جیل توڑ کر بہت سے خطرناک مجرم فرار ہوگئے۔ ان میں وہ بھی شامل تھا۔ اس کے بعد وہ روپوش ہوگیا۔ دوبارہ سامنے آیا تو ڈاکو بن چکا تھا۔"

زرتاج نے ایک گہری سانس لی اور منہ پھیرتے ہوئے بولی۔ "اس کی روپوشی کے دوران ایک المیہ اور رونما ہوا جس نے نہ صرف اس کی زندگی کا رخ بدلنے میں اہم کردار ادا کیا بلکہ میرا خیال ہے اسی کی وجہ سے اس کی ذہنی حالت میں بھی کچھ فرق آگیا۔ وہ نارمل انسان نہیں ہے....."

زرتاج گویا اس المیے کے بارے میں بتانے کے لیے مناسب الفاظ تلاش کرنے لگی۔ ذرا توقف کے بعد بولی۔ "اس کی ایک بہن تھی۔ اس کی روپوشی کے دوران کچھ بدمعاشوں نے اسے اغوا کرلیا۔ سننے میں آیا کہ انہیں پولیس کی پشت پناہی حاصل تھی۔ واللہ علم بالصواب۔ بہرحال...... کچھ دن بعد وہ ایک مکان میں مُردہ پائی گئی۔ اس کی لاش ایک چھت سے بندھی رسّی کے پھندے میں جھول رہی تھی۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے خودکشی کی تھی۔ اس المیے کے ذمے دار گرفتار نہیں ہوسکے۔ شاید اس واقعے کی وجہ سے...... یا پھر دوسری کچھ وجوہات کی بنا پر جانو کو پولیس سے بڑی شدید نفرت ہے۔ کوئی پولیس والا اگر اس کے ہتھے چڑھ جائے اور موقع مناسب ہو تو اس کا بہت برا حشر کرتا ہے۔"

"اس کے ساتھ زیادتیاں ہوئی ہوں گی۔" میں نے کہا "لیکن اس کے ساتھ ہمدردی محسوس نہیں ہوتی۔ انسانوں کے ساتھ اس کا اپنا رویّہ کون سا اچھا ہے۔ یہ تو کوئی انصاف پسند بات نہیں ہے کہ آپ معاشرے اور نظام کی زیادتیوں کی سزا اپنے سامنے آنے والے ہر شخص کو دیتے رہیں۔ ممکن ہے وہ ایک اچھا انسان ہو جس کے ساتھ آپ ظلم کررہے ہوں۔ ممکن ہے وہ بھی آپ ہی کی طرح کوئی مظلوم ہو...... اور پھر مظلوموں کی کوئی ایک قسم تو نہیں ہوتی۔"

"ہر بدمعاش اور انتقام پسند کے پاس اپنے کچھ فلسفے، کچھ جواز ہوتے ہیں۔ اگر نہیں ہوتے تو وہ گھڑ لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ جس قسم کی زندگی جانو نے گزاری ہے اس کے بعد تو انسان کا مزاج ہی بدل جاتا ہے۔ اب اسے بالکل احساس نہیں ہوگا کہ وہ خود ظلم کی کتنی کہانیاں تخلیق کررہا ہے، ناانصافیوں کے کتنے بیج بو رہا ہے جو کبھی نہ کبھی تناور درخت بنیں گے۔ طاقت اصل میں چیز ہی کچھ ایسی ہے۔ طاقت ہاتھ میں آنے کے بعد احساس نہیں رہتا کہ انسان کس کے ساتھ کیا کررہا ہے۔" پھر وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ "خیر...... چھوڑو یہ باتیں۔ یہ بدبخت جانو بھی کیسا بے وقت آیا۔ مجھے روانہ ہونے میں خاصی دیر ہوگئی۔"

"لیکن اس کا ایک فائدہ ہوا کہ میرے بارے میں آپ کی معلومات میں اضافہ ہوگیا۔ کیا آپ میرے بارے میں جانو کی باتیں سننے کے بعد بھی مجھے یہاں چھوڑ کر جانے میں کوئی اندیشہ محسوس نہیں کررہیں؟" میں واقعی اس کے رویّے پر حیران تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی ان حالات میں بھی مجھ پر اس حد تک بھروسا کرسکتا تھا۔

"میں اگر کوئی اندیشہ محسوس کروں گی تو اس کا کوئی نہ کوئی بندوبست کردوں گی۔" وہ بلا تامل بولی۔ رائفل دوبارہ کرسی سے اٹھا کر اس نے کندھے پر لٹکالی۔

میں نے جلدی سے پوچھا۔ "جانو کا اصل نام کیا ہے؟ جانو تو اصل نام نہیں لگتا۔"

"اس کا اصل نام جانِ مُراد ہے۔" زرتاج نے جواب دیا۔ "اپنے آپ کو جانو کے نام سے بھی اس نے خود ہی مشہور کیا ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کے کسی بھی نام سے اس کے پڑھے لکھے ہونے کا احساس ہو۔ اسے اپنے پڑھے لکھوں والے بیک گراؤنڈ سے بھی نفرت ہوچکی ہے۔ وہ اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے...... بلکہ شاید پیچھا چھڑا ہی چکا ہے۔ اب کسے یاد رہ گیا ہے کہ وہ ایک پڑھا لکھا نوجوان ہے۔ اب تو یہ بات شاید اسے خود بھی یاد نہ ہو۔ اچھا...... میں اب چلتی ہوں۔ خدا حافظ۔"

میں اس کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اتر کر نیچے آیا اور ہم حویلی سے باہر آگئے۔ وہاں آٹھ دس افراد دو جیپوں اور ایک بجیرو کے ساتھ موجود تھے۔ ان میں ادھیڑ عمر کی دو لمبی تڑنگی مضبوط عورتیں بھی تھیں۔ جیپوں میں کچھ سامان لدا نظر آرہا تھا۔ سب مؤدبانہ انداز میں کھڑے تھے۔ ایک رائفل بردار نے جلدی سے آگے بڑھ کر بجیرو کا دروازہ کھولا۔

زرتاج نے اپنی رائفل بھی کندھے سے اتار کر اس شخص کو تھمائی اور کچھ اس طرح سیاہ بجیرو میں سوار ہوگئی جیسے کوئی مشاق گھڑسوار پلک جھپکتے میں اپنے گھوڑے پر جا بیٹھا ہو۔ کسی لمحے وہ فولادی لڑکی نظر آتی تھی اور کسی لمحے اس کے جسم میں شاخِ گل کی سی لچک نظر آتی تھی۔ گمان گزرتا تھا کہ شاید اس کے جسم میں ہڈیاں بھی بید مجنوں کی طرح لچکیلی ہیں۔ اس نے بجیرو میں ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ڈیش بورڈ پر پڑا ہوا خوبصورت سیاہ چشمہ اٹھا کر لگایا۔ اس کے ماہتاب چہرے پر گویا سیاہ بدلی آکر ٹھہر گئی۔

گردن گھما کر وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اگر تمہاری نشانے کی مشق چھوٹی ہوئی ہے تو اب شروع کرلو۔ شاید اگلی مرتبہ تمہیں بھی ہمارے ساتھ شکار پر جانا پڑے۔"

میں نے گردن کو خم دیا اور پیچھے ہٹ گیا۔ زرتاج کا اشارہ پاکر سب لوگ گاڑیوں میں سوار ہوگئے اور چند لمحے بعد تینوں گاڑیاں دھول اُڑاتی مشرق کی طرف روانہ ہوگئیں۔ میں کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔ حتیٰ کہ گاڑیاں میری نظر سے اوجھل ہوگئیں تب میں پلٹا۔

حویلی کے چوکیدار دوبارہ اپنی جہازی چارپائی پر بیٹھ چکے تھے اور اپنی گنیں انہوں نے چارپائی کے سہارے کھڑی کردی تھیں۔ ان میں سے ایک لحیم شحیم چوکیدار اپنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے گردن ترچھی کیے خاموشی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ ان لوگوں میں واقعی یہ خصوصیت موجود تھی کہ وہ غیر ضروری گفتگو نہیں کرتے تھے۔

شیر محمد آس پاس کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ دونوں گھوڑے بھی اس نے غالباً فارم میں لے جاکر باندھ دیے تھے۔ میں سُست روی سے فارم کی طرف چل دیا۔

گھوڑے فارم میں موجود تھے۔ شیر محمد البتہ وہاں نہیں تھا۔ شاید گاؤں چلا گیا تھا۔ فارم پر رہنے والے دونوں ملازموں میں سے بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ البتہ وہ میرے لیے کھانا تیار کرکے رکھ گئے تھے۔ میں نے ذرا عجلت کے سے عالم میں کھانا کھایا۔ کھانے میں کھچڑی بھی شامل تھی اور ایک کھچڑی میرے ذہن میں بھی پک رہی تھی۔

جانو کی باتیں میرے ذہن میں گونج رہی تھیں۔ اس نے کہا تھا کہ نمیسو خان گاؤں میں کچھ خریداری کرنے جارہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ نمیسو کو خاصی دیر گاؤں میں موجود رہنا تھا۔ شاید اسے شام ہی کو واپس جانا تھا۔ جانو کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ لوگ اپنے ڈیرے سے کسی شارٹ کٹ کے راستے یہاں آتے تھے۔ وہ شارٹ کٹ مجھے بھی معلوم ہونا چاہیے تھا۔ اس کے علاوہ اس روسیاہ نمیسو خان کے تصور سے رگ و پے میں اُبال سا آتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد میں چوبی الماری کے آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنی صورت کا جائزہ لینے لگا۔ شیو کئی دن کی بڑھی ہوئی تھی، بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں اسی حُلیے میں جانو کے اڈے پر گیا تھا۔ اگر میں شیو بنا لیتا، سر پہ پگڑی باندھ لیتا یا ٹوپی پہن لیتا اور تاریک شیشوں کی عینک لگا لیتا تو میری صورت کافی بدل جاتی۔ میں جانو اور اس کے ساتھیوں کے لیے ناقابلِ شناخت ہوسکتا تھا۔ اس سلسلے میں مجھے جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ اس سرونٹ کوارٹر میں دیگر سامان کے ساتھ پہلے سے موجود تھیں۔

میں نے جلدی جلدی شیو بنایا، غسل کیا، کپڑے بدلے پھر ایک اجرک لے کر اسے پگڑی کی طرح سر پر لپیٹا، سیاہ چشمہ لگایا اور ازسرِنو تنقیدی نظر سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔ پہلے کی نسبت میں واقعی ایک بدلی ہوئی شخصیت نظر آرہا تھا۔ اب میری شخصیت میں پہلے والے صاف ستھرے افضل چوہدری کی جھلک تھی۔ نمیسو کے لیے اب میں اجنبی ثابت ہوسکتا تھا۔ تھوڑا بہت خطرہ مول لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے کلاشنکوف کندھے پر لٹکائی۔ پنڈلی سے بندھا رہنے والا میرا مخصوص خنجر ابھی تک میرے پاس تھا۔ وہ میرا وفادار ساتھی ثابت ہوا تھا۔ میں مطمئن سے انداز میں اپنے سراپا پر ناقدانہ نظر ڈالتے ہوئے کمرے سے باہر آگیا۔ فارم کے گھوڑے میں سے میں نے ایک گھوڑا کھولا۔ یہ ایک توانا مگر نرم خو گھوڑا تھا۔ مجھ سے کچھ مانوس سا بھی نظر آنے لگا تھا۔ چند لمحے بعد میں گھوڑے پر بیٹھ کر گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا۔

گاؤں میرے اندازے سے کچھ بڑا ہی تھا۔ گاؤں کیا، اچھا بھلا قصبہ تھا۔ اس کا مین بازار بہت بڑا اور بارونق تھا۔ بازار کی سڑک پکی اور دُکانیں اچھی خاصی معقول تھیں۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز نظر آرہی تھی۔ دُکانوں پر ہجوم اور بازار میں گہما گہمی نظر آرہی تھی۔ شاید آس پاس کے چھوٹے گوٹھ دیہات کے لوگ بھی خریداری کرنے یہیں آتے تھے۔ زرتاج نگر کی صرف اپنی آبادی کی بدولت اتنی رونق نہیں ہوسکتی تھی۔ مجموعی طور پر مجھے اس بازار میں آسودہ حالی کی جھلک نظر آئی۔ زرتاج نگر یقیناً ایک خوشحال گاؤں تھا۔

میں اپنے سفید گھوڑے کی لگام تھامے ادھر اُدھر دیکھتا پیدل چلا جارہا تھا۔ بھیڑ بھاڑ میں کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی تھی۔ دُکاندار اپنی دُکانداری میں مصروف تھے اور خریداروں کو اپنی خریداری سے مطلب تھا۔ نمیسو خان کو تلاش کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ایک دُکان کے قریب مجھے بجلی کے کھمبے سے ایک گھوڑا بندھا نظر آیا۔ مجھے شبہ ہوا کہ وہ نمیسو خان کا گھوڑا تھا۔

میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا۔ قریب جاکر میں نے پہچان لیا، وہ نمیسو خان کا ہی گھوڑا تھا۔ ایک حجام کی دُکان کے قریب کھڑا تھا۔ میں دُکان کے کھلے دروازے کے سامنے سے گزرا تو آئینے کے سامنے اونچی سی ایک گدے دار کرسی پر نمیسو خان بیٹھا خط بنواتا نظر آیا۔ حجام بڑی محنت سے اس کے رُخِ روشن کو سنوارنے میں مصروف تھا۔ تاہم اس کا کام اب آخری مرحلے پر معلوم ہوتا تھا۔ میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دُکان میں جاؤں اور دُکاندار مجھے یاد رکھے۔

اس سے اگلی دُکان جوتوں کی تھی۔ کافی بڑی دُکان تھی۔ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ گاؤں میں واقع تھی۔ دُکان میں خریداروں کا ہجوم تھا۔ کچھ گاہک باہر بھی کھڑے ہوئے تھے۔ میں بھی ایک طرف کو کھڑا ہوگیا۔ کسی نے میری طرف توجہ نہیں دی۔ البتہ چند لمحے بعد ایک نوجوان نے گردن موڑتے ہوئے مقامی زبان میں کہا۔ "بھائی!

اس گھوڑے کو تو پیچھے کرلو۔ میرے کان میں باتیں کرنے کی کوشش کررہا ہے۔"

میں نے خاموشی سے گھوڑے کو پیچھے ہٹا لیا۔ تب وہ بولا۔ "اگر اس کو بازار سے باہر ہی باندھ آتے تو کیا برائی تھی؟ یہاں کوئی گدھے گھوڑوں کو چوری نہیں کرتا۔"

میں کہنے لگا تھا۔ ' بھائی! یہ ذرا جذباتی قسم کا گھوڑا ہے۔ چند لمحے کے لیے بھی مجھ سے جُدا رہنا پسند نہیں کرتا' لیکن میں نے اپنی زبان پر قابو رکھا۔ مجھے احساس تھا کہ یہ مذاق کا موقع نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ نوجوان ذرا باتونی معلوم ہوتا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ وہ کسی کے ساتھ باتوں میں اُلجھنے کا موقع تلاش کررہا تھا اور میں اس وقت کسی کے ساتھ باتوں میں اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں بازار کی بھیڑبھاڑ میں شامل ایک عام اور بے شناخت شخص ہی رہنا چاہتا تھا۔

کچھ دیر بعد نمیسو خان کا شب دیجور جیسا چہرہ حجام کی دُکان سے طلوع ہوا۔ اس نے اردگرد کوئی خاص توجہ دیے بغیر کھمبے سے اپنا گھوڑا کھولا اور اس کی لگام تھامے میرے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔

جانو نے زرتاج کو حویلی میں باتیں کرتے ہوئے بتایا تھا کہ نمیسو خان کو ضرورت کی بہت سی چیزیں خریدنی ہیں لیکن نہ تو اس کے پاس کوئی چیز نظر آرہی تھی اور نہ ہی وہ کسی چیز میں دلچسپی لیتا دکھائی دے رہا تھا۔ میں قدرے تیزی سے اس کے پیچھے چل دیا۔ اس وقت تک وہ بازار کے سرے پر پہنچ چکا تھا۔ وہ ابھی تک گھوڑے پر سوار نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کے برابر پہنچ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور میٹھی میٹھی سی آواز میں کہا "کیا حال ہے نمیسو خان؟"

نمیسو خان بری طرح چونک کر پلٹا۔ اس کا ہاتھ بے اختیار کندھے پر لٹکی ہوئی کلاشنکوف کی طرف بڑھا لیکن شاید یہ دیکھ کر اسے اطمینان ہوگیا کہ کسی بندوق کی نال اس کی طرف اٹھی ہوئی نہیں تھی اور اسے مخاطب کرنے والا تنہا ہی تھا۔ میں پوری پوری کوشش کررہا تھا کہ میری شکل پر مسکینی برستی نظر آئے لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب تھا۔

میں نے دوستانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اور اپنی آواز کو بدلنے کی پوری پوری کوشش کرتے ہوئے کہا "تم تو اس طرح گھبرا کر مڑے ہو جیسے یہاں کسی دشمن سے سامنا ہونے کی توقع تھی۔"

اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے شک زدہ سی نظروں سے مجھے گھورا اور ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا "دشمن اور موت کا کیا بھروسہ..... کہ کس وقت' کس جگہ اور کس روپ میں آ ٹکرائے۔"

آدمی بے وقوف سا تھا لیکن کبھی کبھی بے وقوف بھی کام کی بات کرجاتے ہیں۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ اندیشہ بھی محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھے پہچان تو نہیں گیا تھا؟ لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے اس خیال کو رد کردیا۔ وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ مجھے پہچان لیتا تو کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کرتا۔

میں نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "نمیسو خان! تم بڑے آدمی ہو اس لیے تم تو مجھے پہچانتے نہیں ہوگے لیکن میں تمہیں پہچانتا ہوں۔"

خوشامد عجب جادو اثر چیز ہے۔ عاقل اور احمق دونوں پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور دکھاتی ہے۔ کسی پر کم' کسی پر زیادہ۔ میں نے محسوس کیا کہ اپنے لیے "بڑے آدمی" کے الفاظ سن کر نمیسو خان کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑگئے۔ اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھادیا۔ اس کا ہاتھ بیلچے کی طرح چوڑا اور تقریباً ویسا ہی سخت تھا لیکن میں نے اسے احساس نہیں ہونے دیا کہ اس کا ہاتھ کسی کمزور ہاتھ میں گیا تھا۔

میں نے رخسار کھجانے کے بہانے اپنا چہرہ مزید چھپاتے ہوئے کہا "میں رئیسانی زرتاج کے ہاں گھوڑے سدھانے پر نوکر ہوں۔ اس کام پر لگے مجھے زیادہ دن نہیں گزرے۔ پہلے میں ان کی زمینوں پر ہاری تھا۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ زمین کاشت کرنا بڑی مشقت کا کام ہے لیکن اب اس سے بڑی مشقت گلے پڑگئی لیکن خیر..... پیٹ پالنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا ہے۔ ویسے بھی ہم تو رئیسانی کے غلام ہیں' جو حکم ملے گا اس کی تعمیل کرنی پڑے گی" میں کھوکھلے سے انداز میں ہنس دیا۔

میں اپنے آپ کو ایک ایسا شخص ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا جو اپنے حالات سے اندر ہی اندر ناخوش ہوتا ہے مگر کسی مجبوری' مصلحت یا اندیشوں کی وجہ سے اپنی ناخوشی کا اظہار کھل کر نہیں کرتا لیکن موقعے کا منتظر رہتا ہے کہ کوئی اس کی ہاں میں ہاں ملائے' اس کی تھوڑی سی ہمت افزائی کرے تو وہ اپنا دل کھول کر اس کے سامنے رکھ دے۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں اس کوڑھ مغز اور درندہ صفت شخص کے ذہن تک یہ تاثر پہنچانے میں کامیاب ہوسکتا تھا یا نہیں۔ بہرحال کوشش کرلینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"میں نے تو سنا تھا کہ قائم دین کے جانے کے بعد رئیسانی کو اس کام کے لیے کوئی آدمی نہیں مل رہا اور فی الحال سارا کام شیر محمد کے ذمے ہے" وہ شک زدہ سے لہجے میں بولا۔ حیرت کی بات تھی کہ وہ لوگ زرتاج کے معاملات سے اس حد تک واقف تھے!

"ہاں بھئی۔ کوئی باقاعدہ اور صحیح آدمی تو نہیں ملا" میں نے تسلیم کیا۔ "مجھے تو ویسے ہی پکڑ کر بیگار پر لگادیا ہے۔ کیونکہ مجھے تھوڑا بہت یہ کام آتا تھا لیکن یہ عارضی انتظام ہے۔ کوئی ٹھیک آدمی مل جائے گا تو ہمیں کان سے پکڑ کے کسی اور کام پر لگادیا جائے گا۔ ہمیں تو کوئی آدمیوں میں شمار بھی نہیں کرتا۔" میں نے مصنوعی آہ بھر کر کھوکھلا سا قہقہہ لگایا "ہمارا تو ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ آدمی کی تلاش تو ابھی جاری ہے۔"

"شیر محمد نے تمہارا ذکر نہیں کیا" نمیسو خان کے لہجے میں شک برقرار تھا۔ اس کی بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ شیر محمد سے بھی ان کی میل ملاقات رہتی تھی۔

"شیر محمد تو اپنے سوا کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں' وہ بھلا کسی سے میرا کیا ذکر کرے گا" میں نے بظاہر افسوس سے کہا۔

"ہاں..... یہ بات تو ہے" اس کے لہجے میں کچھ طمانیت آگئی۔ شاید وہ شیر محمد کو اچھی طرح جانتا تھا۔ اب تو وہ مسکرانے پر بھی کچھ کچھ آمادہ نظر آرہا تھا لیکن پھر وہ گویا مسکرانے کا ارادہ ملتوی کرتے ہوئے بولا "تم مجھے کیسے جانتے ہو..... اور کتنا جانتے ہو؟"

"بس تمہیں اور جانو کو رئیسانی کے پاس آتے جاتے دیکھا ہے۔ ایک بار رئیسانی کو تم لوگوں کے بارے میں کسی سے باتیں کرتے سنا تھا۔ اس کے علاوہ ادھر اُدھر سے کچھ باتیں سنی ہیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔

اس نے سانپ جیسی گول گول اور سرخ سرخ آنکھوں سے مجھے گھورا "تو پھر اب کیا چاہتے ہو؟"

"بات اصل میں بہت خاص ہے" میں نے ہاتھ ملتے ہوئے مضطربانہ انداز میں کہا اور خوف زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا "لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں لینے کے دینے نہ پڑجائیں۔ تم لوگوں کے مزاج کا کوئی پتا نہیں ہوتا۔ دل میں آئے تو کسی کو بادشاہ بنا سکتے ہو اور کھوپڑی گھوم جائے تو بادشاہ کو کنگال کرسکتے ہو' خون میں نہلا سکتے ہو۔ تم لوگوں سے بات کرتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے بابا۔"

اس کے چہرے کی کرختگی میں ایک بے وقوفانہ سی نخوت شامل ہوگئی۔ میں نے حکمتِ عملی کامیاب ہوتے دیکھ کر مزید اعتماد سے اداکاری کرتے ہوئے بات جاری رکھی۔ "میری بات تو معلوم نہیں تم مانو یا نہ مانو لیکن مجھے یہ ڈر ہے کہ کہیں تم بات اِدھر اُدھر نہ کردو۔ اگر تم نے یہ بات کسی سے کہہ دی تو میں بے موت مارا جاؤں گا۔ نہ اِدھر کا رہوں گا نہ اُدھر کا۔ میں چاہتا ہوں کہ اگر تم میری بات نہ مانو تب بھی اسے سینے میں ہی دفن رکھو۔ نہ تو میرا مذاق اُڑاؤ اور نہ ہی کبھی کسی سے اس کا ذکر کرو۔ میرا دل پہلے ہی بہت دُکھا ہوا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے ایک اور ناکامی' ایک اور صدمے کا سامنا کرنا پڑے۔"

اس کے چہرے پر ذرا الجھن کے آثار نظر آنے لگے۔ وہ حجام کی دُکان سے خط بنوا کر نکلا تھا لیکن اس کی داڑھی اب بھی جھاڑ جھنکاڑ ہی نظر آرہی تھی۔ حجام نے یقیناً اسے سلجھانے' سنوارنے کی کوشش کی تھی لیکن اسے کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ وہ داڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے اُکھڑے اُکھڑے سے لہجے میں بولا "ارے بابا..... بات کرو..... بات۔ ہم لوگ اتنا لمبا قصہ سننے کے عادی نہیں ہیں۔ کوئی فیصلہ کرنے والی بات ہے تو ہم ایک سیکنڈ میں فیصلہ کرتے ہیں" اس نے چٹکی بجائی "اِدھر بات اُدھر فیصلہ۔ تخت یا تختہ۔ زیادہ غور فکر کرنے کی ہم کو عادت نہیں ہے۔"

"تم اتنی بے فکری سے بھرے بازار میں کھڑے ہو کر بات کرسکتے ہو لیکن میں تو غریب آدمی ہوں نا۔ ڈرتا ہوں کہ اِدھر اُدھر سے گزرتے ہوئے کسی آدمی کے کان میں بات نہ پڑجائے" میں نے ایک بار پھر خوف زدہ سی نظروں سے چاروں طرف دیکھا۔

وہ گویا بیزار ہو کر میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "میرے ساتھ آؤ۔ شاہ جی کے چائے خانے پر چلتے ہیں۔ اس کا وہ جو پیچھے والا کمرا ہے نا..... ہمیں جب کوئی پرائیویٹ بات چیت کرنی ہوتی ہے تو اُدھر ہی بیٹھ کر کرتے ہیں۔"

میں نے ظاہر ہے شاہ جی کا چائے خانہ نہیں دیکھا تھا لیکن یہ لاعلمی ظاہر کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے طمانیت سے سرہلایا اور اس کے ساتھ ہولیا۔ بازار میں تھوڑا سا ہی مزید فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ دائیں طرف رک گیا۔ سامنے ایک بہت بڑا اور بارونق ریستوران سا نظر آرہا تھا۔ اس میں چائے کا کام ہی زیادہ پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔

کاؤنٹر پر ایک باریش مگر شاطر قسم کا شخص گلا سنبھالے بیٹھا تھا۔ اس نے باچھیں پھیلا کر نمیسو خان کا استقبال کیا لیکن نمیسو نے اس کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی اور مجھے ساتھ لیے میز کرسیوں کی قطاروں کے درمیان سے گزرتا چلا گیا۔

میزوں پر چائے کے برتن پھیلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں مکھیاں بھنبھنارہی تھیں۔ کچھ لوگ کھانا کھارہے تھے اور کچھ چائے نوشی کے شغل میں لگے ہوئے تھے۔ جوش و خروش سے گفت و شنید بھی جاری تھی۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ بیرے اپنی صدائیں بلند کررہے تھے۔ ہوا میں بیڑیوں اور سستی سگریٹوں کے دُھویں کی تلخ بُو چکرا رہی تھی۔

ہال کے اختتام پر بائیں ہاتھ پر کونے سے لکڑی کی سیڑھیاں ایک بالائی کمرے کی طرف جارہی تھیں جس کے دروازے پر موٹے سے کپڑے کا میلا پردہ جھول رہا تھا۔

نمیسو خان کچھ اس طرح سینہ تانے اور قدموں سے دھمک پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ریستوران میں داخل ہوا تھا جیسے وہ اس کا مفتوحہ علاقہ ہو اور کسی فلمی منظر کی طرح اس کے ہر قدم کے ساتھ پس منظر سے موسیقی ابھرنے لگے گی۔ سیڑھیوں پر بھی اس نے کچھ اسی طرح چڑھنا شروع کیا۔ ہم دونوں ہی غیر معمولی قد کاٹھ کے تھے۔ لکڑی کی سیڑھیاں لرزنے لگیں لیکن وہ بہرحال مضبوط تھیں۔ ہم دونوں کا بوجھ برداشت کرگئیں۔

ہم کچھ اس طرح اس کمرے میں داخل ہوئے جیسے مسافر سیڑھیاں چڑھ کر طیارے میں داخل ہوتے ہیں۔ فرق یہ تھا کہ جہاز کے دروازے میں پردہ نہیں ہوتا۔

کمرا خالی پڑا تھا لیکن اس میں زرد اور کمزور سی روشنی والا صرف ایک بلب جھول رہا تھا۔ اس بیمار روشنی میں ہم نے تین متوحش سے' مردانہ چہروں کو اپنی طرف تکتے پایا۔ وہ تین عام کرخت

صورت سے دیہاتی تھے جو اس کمرے میں پڑے ہوئے معمولی اور کہنہ سال قسم کے صوفوں پر پاؤں اوپر ٹکائے بیٹھے تھے۔

وہاں ایک چوتھا چہرہ بھی موجود تھا لیکن وہ نہ تو وحشت زدہ تھا اور نہ ہی مردانہ لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ وہ زنانہ چہرہ تھا۔ وہ درمیان کی چیز تھی۔ تیسری جنس کا وہ نمائندہ خاصا جسیم تھا۔ رنگت گہری سانولی تھی لیکن ہونٹوں پر اس نے بھڑکتے سرخ رنگ کی لپ اسٹک لگا رکھی تھی۔ حسب توفیق کچھ اور سنگھار بھی کر رکھا تھا۔ کانوں میں بڑے بڑے بُندے تھے اور کندھوں تک جھولتے، تیل میں لش لش کرتے بالوں میں پلاسٹک کا سرخ پھول بھی لگا رکھا تھا۔ لباس بھی اس کا کچھ نیم زنانہ اور نیم مردانہ قسم کا ہی تھا۔

ان کا انداز بتا رہا تھا کہ ہم ان کی خلوت میں مخل ہوئے تھے جس کا مجھے بلاشبہ افسوس تھا۔ تاہم وہ لوگ چوبی سیڑھیوں پر ہمارے قدموں کی دھڑ دھڑ سُن کر خبردار ہو گئے تھے اور اب دم بخود سے بیٹھے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ خمیسو خان کو دیکھ کر دیہاتیوں کا رنگ فق ہو گیا تھا۔ تیسری جنس البتہ بے خوفی سے بیٹھی تھی۔

بے چارے دیہاتیوں کی تفریحات ... اور اس میں ہم جیسے نامعقول لوگوں کا دخل در معقولات۔ میں کھسیانے سے انداز میں کھانس کر رہ گیا۔

خمیسو خان کی آنکھیں عام حالات میں بھی لہو رنگ رہتی تھیں اور جب وہ کسی کی طرف ایک ٹُک دیکھتا تھا تو اس سرخی میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اس وقت بھی وہ ان چاروں کو پلک جھپکائے بغیر گھور رہا تھا۔ بالآخر تینوں مرد گویا چونک کر زمانۂ حال میں واپس آئے اور اچھل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مجھے نہ جانے کیوں ان پر ترس آ رہا تھا۔

وہ اگر خمیسو خان کی اصلیت سے واقف نہیں تھے، انہیں اگر یہ بات معلوم نہیں تھی کہ خمیسو خان ڈاکو تھا، تب بھی ان پر خمیسو کی دہشت ضرور تھی۔ تبھی وہ اس انداز میں دروازے کی طرف کھسک رہے تھے۔ درمیانی مخلوق بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی لیکن اس نے دروازے کی طرف کھسکنا شروع نہیں کیا تھا۔

مردوں میں سے ایک نے دروازے کے قریب پہنچ کر گویا ہمت کر کے درمیانی مخلوق کو آواز دی "آؤ زیبا! چلیں۔"

زیبا...؟ یہ نام سن کر تو دل پر قیامت ہی گزر گئی۔ وہ اس کا سراپا... اور نام اس کا زیبا...! اس قسم کی ستم ظریفی پر سمجھ میں نہیں آتا کہ انسان ہنسے یا روئے۔ زیبا اگر اس مخلوق کو دیکھ لیتی اور سن لیتی کہ اسے کس نام سے پکارا جا رہا تھا تو شاید وہ اپنی زندگی اور اپنے نام کے بارے میں بہت سے اہم فیصلے کرنے کے بارے میں غور کرنے لگتی۔

درمیانی مخلوق نے اپنے مخصوص انداز میں تالی بجا کر ناک پر انگلی رکھتے ہوئے کہا "ارے آ رہی ہوں۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ خمیسو خان ہی آیا ہے، کوئی قیامت تو نہیں آئی۔"

اس نے اپنے پرانے سے سلیپر پہنے اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے خمیسو خان کے قریب ذرا رک کر اٹھلانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی یا بولا "اے کیسے ہو خمیسو خان! بڑے عرصے بعد دیدار ہوئے ہیں۔"

اِٹھلانے ہی اِٹھلانے میں اس نے خمیسو خان کے قریب ہونے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ خمیسو خان نے اس کے منہ پر تھپڑ رسید کر دیا۔ اپنے حساب سے اس نے تھپڑ زیادہ طاقت سے نہیں مارا تھا لیکن درمیانی مخلوق دیوار سے جا ٹکرائی اور فرش پر لڑھک گئی۔ اس دوران تینوں مرد تیزی سے سیڑھیاں اتر گئے۔ کسی نے بھی رک کر درمیانی مخلوق کو اٹھانے یا سہارا دینے کی ہمت نہیں کی تھی۔

وہ خود ہی گال سہلاتا ہوا اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور سرِدست وہ تالی بجانا بھول گیا تھا۔ گلوگیر آواز میں بولا "ہم پر ہاتھ اٹھانا اچھا نہیں ہوتا خمیسو خان! ہم تو اللہ میاں کی چڑیاں ہیں... اللہ تجھے ..." اس نے شاید کوئی بددعا دینا چاہی تھی لیکن خوف کے مارے جملہ مکمل نہ کر سکا اور تھل تھل کرتے سراپا کو سنبھالے سیڑھیوں کی طرف تقریباً لڑھک گیا۔

ان لوگوں کے خالی کیے ہوئے ڈھیلے ڈھالے سے صوفوں پر ہم پھیل کر بیٹھ گئے۔ فوراً ہی ایک بیرا وہاں آ کر تپائی کو مستعدی سے چمکانے لگا پھر غلامانہ سے انداز میں اس نے خمیسو خان سے آرڈر لیا۔ خمیسو نے کڑاہی گوشت اور نان وغیرہ کا آرڈر دیا تھا۔ اس ریستوران میں سب سے اچھا کھانا شاید یہی میسّر تھا۔

تخلیہ میسّر آ چکا تو خمیسو خان مونچھ کو بل دیتے ہوئے بولا "اب بولو کیا بات ہے؟ پرائیویٹ بات چیت کے لیے یہ جگہ بہترین ہے۔"

"کیا یہاں سب لوگوں کو معلوم ہے کہ تمہارا اصل کاروبار کیا ہے؟" میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ عام لوگوں کو تو... ہرگز معلوم نہیں لیکن انہیں یہ ضرور معلوم ہے کہ خمیسو خان کوئی خو[illegible] آدمی ہے۔ اس کے سامنے کوئی چوں کرے تو وہ زندگی سے محروم ہو جاتا ہے۔ کوئی دُکان دار ٹیڑھا ہونے کی کوشش کرے تو اس کی دُکان تہس نہس ہو جاتی ہے۔" پھر وہ آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولا "لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ ہمارا اصل کاروبار کیا ہے؟"

"میں نے بتایا نا کہ کچھ اُڑتی اُڑتی سی باتیں سُنی تھیں۔ کچھ میرے اپنے اندازے بھی تھے... اور پھر ایک مرتبہ میں نے رئیسانی کو بھی ایک بزرگ کے ساتھ کچھ گول مول سی باتیں کرتے سنا تھا۔ ان باتوں سے بھی میں نے کچھ نتیجہ نکالا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے، رئیسانی کو بھی سمجھانا پڑے گا کہ اسے

کسی سے بھی ہمارے بارے میں گول مول، ٹیڑھی ترچھی یا سیدھی، کسی بھی قسم کی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں" وہ غرایا۔

"خیر... اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا" میں نے اس پہلو سے اس کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی۔ "میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں کہ اگر مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہو جائے تو اِدھر اُدھر گاتا پھروں۔ ویسے بھی مجھے تو تم سے ایک کام ہے اور مجھے صرف اسی کام سے مطلب ہے۔ اگر میرا کام ہو جائے تو مجھے اور کسی بات کی پروا نہیں ہوگی۔"

"اور تمہارا کام کیا ہے؟" وہ مونچھ کو بل دیتے ہوئے مسکرایا۔

"صرف یہ کہ تم مجھے بھی اپنے ساتھیوں میں شامل کر لو" میں نے التجائیہ سے لہجے میں کہا "مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ تم جانو کے خاص الخاص آدمی ہو۔ اسی لیے اس کے ساتھ ہر وقت تم نظر آتے ہو۔ اگر تم جانو سے سفارش کرو گے تو وہ ضرور مجھے اپنے ساتھیوں میں شامل کر لے گا۔ ظاہر ہے وہ تمہاری بات تو نہیں ٹال سکتا۔"

وہ صوفے پر کچھ اور پھیل کر بیٹھ گیا۔ "بات کرنے کی تو کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں۔ اس قسم کے کاموں میں مَیں خود بھی فیصلہ کر سکتا ہوں لیکن سوال یہ ہے کہ ہم تمہیں کیوں اپنے ساتھیوں میں شامل کر لیں؟ ہمیں کیا ضرورت پڑی ہے؟ ہمارے پاس آدمی بہت ہیں۔ ہمیں فی الحال کسی کی ضرورت نہیں۔ ہمارا معاملہ کوئی فیکٹری، کارخانے والا تو نہیں ہے کہ بھرتی چل رہی ہے تو چلو تم بھی مزدوروں میں بھرتی ہو گئے۔"

میں نے اپنے چہرے سے مایوسی کا اظہار کرنے کی پوری پوری کوشش کی۔ وہ بغور میرا جائزہ لیتے ہوئے ذرا نرم لہجے میں بولا "کسی بھی نوکری پر لگنے کے لیے کسی نہ کسی قابلیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارے ساتھ شامل ہونے کے لیے بھی کچھ نہ کچھ قابلیت چاہیے۔ کبھی کوئی واردات کی ہے تم نے؟"

"واردات کی تو نہیں... کبھی موقع ہی نہیں ملا لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میرے اندر جذبہ بہت ہے۔ میں پتا نہیں کیا کچھ کر گزرنا چاہتا ہوں۔ اگر مجھے صرف ایک مضبوط گروہ کا سہارا مل جائے تو میں تباہی مچا دوں گا۔ میرا نشانہ بے خطا ہے، بازوؤں میں طاقت ہے اور دل رحم سے خالی ہے۔ میرے آگے پیچھے بھی کوئی نہیں ہے جو میرے پیروں کی زنجیر بنے گا۔ کیا میں اس مقصد کے لیے بہترین امیدوار نہیں ہوں، کیا میں ایک اچھا ڈاکو نہیں بن سکتا؟" مجھے یوں لگا جیسے میں کسی اچھی ساکھ کی فرم میں اچھے عہدے کے لیے درخواست لے کر آیا تھا اور اپنے آپ کو اس کا اہل ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"بات تو تمہاری ٹھیک ہے" وہ اپنا بڑا سا...... مگر عقل سے خالی سر سہلاتے ہوئے بولا "مگر ان سب باتوں کے ساتھ ساتھ ایک بڑا مسئلہ بھروسے اور اعتماد کا ہوتا ہے۔ تمہارے ہاتھ ابھی تک صاف ہیں۔ یہ کوئی اچھی نشانی نہیں۔ جن کے کھاتے میں چار چھ بڑی وارداتیں ہوتی ہیں ان کے لیے واپسی کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ وہ لوگ ہمارے لیے زیادہ بھروسے کے قابل ہوتے ہیں۔"

اس پہلو پر تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ مجھے اگر معلوم ہوتا کہ ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل ہونے کے لیے پہلے سے ہی وارداتیا ہونا بھی ایک اچھی کوالی فکیشن تھی تو میں چار چھ شاندار قسم کی وارداتیں اپنے ریکارڈ میں شامل کر لیتا۔ میری غیر تحریری درخواست برائے ملازمت ذرا زیادہ معتبر ہو جاتی۔

خمیسو خان بات جاری رکھتے ہوئے بولا "نئے نئے اور ذرا صاف ستھرے قسم کے لوگوں کے بارے میں خطرہ ہوتا ہے کہ اگر غلطی سے وہ کہیں پہلی ہی واردات میں پولیس وغیرہ کے ہتھے چڑھ گئے تو اپنی جان بچانے کے لیے کہیں کچھ بکنے نہ لگیں۔ یا وہ کسی کے ایجنٹ نہ ہوں، مخبری کے لیے نہ آئے ہوں۔ حالانکہ پولیس وغیرہ ہمارے لیے کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے لیکن کبھی کبھی کوئی سرپھرا قسم کا افسر علاقے میں آ جاتا ہے تو ہمیں ذرا دیکھ بھال کر اپنا کام کرنا پڑتا ہے۔"

"کوئی نیا ساتھی گروہ میں شامل کرتے وقت تھوڑا بہت خطرہ تو مول لینا ہی پڑتا ہوگا۔ تم لوگوں کے لیے ایسے خطروں کی بھلا کیا اہمیت ہے؟ ایک بار مجھ پر بھروسا کر کے تو دیکھو، میں بہت کام کا... اور بہت فرمانبردار آدمی ثابت ہوں گا۔ اس سے پہلے میں نے اکیلے اکیلے کبھی اس لیے واردات کرنے کی کوشش نہیں کی کہ میں اس لائن میں ذرا صحیح طریقے سے آنا چاہتا تھا۔ میں چھوٹی موٹی چوریاں کر کے یا دو چار فائر کر کے اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے یا پولیس کے ہتھے چڑھ کر چھتر کھانا نہیں چاہتا تھا۔ میرے ارادے ذرا اونچے ہیں۔ میں بڑے اور مضبوط لوگوں کے ساتھ مل کر کچھ بڑے کام کرنا چاہتا ہوں۔ میرے دل میں بڑے ارمان مچل رہے ہیں" میں نے گویا اسے اپنے بلند عزائم کا احساس دلانے کی کوشش کی۔

"تمہیں اتنی بے چینی کیوں ہے؟ کیا کچھ زیادتیاں وغیرہ ہوئی ہیں تمہارے ساتھ؟" اس کا لہجہ اب ذرا دوستانہ سا ہو چلا تھا۔

"یہ زندگی اپنی جگہ خود ایک زیادتی ہے" میں نے تلخی سے کہا "یہ بھی کوئی جینا ہے کہ عمر بھر گدھوں کی طرح مشقت کرتے رہو، کیڑے مکوڑوں کی طرح زندگی گزارتے رہو۔ کسی شمار میں نہ قطار میں۔ آخر کار ایک روز کسی جھونپڑی میں، ٹوٹی ہوئی چارپائی پر ایڑیاں رگڑتے مر جاؤ۔ اس ہونے یا نہ ہونے کا کیا فائدہ؟"

وہ دھیرے دھیرے مونچھ کو بل دیتے ہوئے پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنے لہجے کو زیادہ سے زیادہ متاثر کُن بنانے کی کوشش کرتے ہوئے بات جاری رکھی "میرے بہت سے خواب ہیں، اونچی اونچی خواہشیں ہیں۔ میں نے بہت سوچا ہے، بہت سر کھپایا ہے۔ مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر پانے اور اپنی

خواہشیں پوری کرنے کا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔ بہت سوچ سمجھ کر میں نے تم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں آج ہی تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔ میں بہت وقت ضائع کرچکا ہوں۔ نوجوانی تیزی سے گزرتی جارہی ہے۔ پکی عمر آگئی تو حوصلہ کچا ہوجائے گا۔ میں ابھی تک کچھ نہیں بنا سکا۔ صرف یہ کلاشنکوف اور پانچ چھ سو روپے میری کُل پونجی ہیں۔ کلاشنکوف بھی رئیسانی کی ہے' میری اپنی نہیں ہے۔ دو کوٹھریوں کا ایک مکان ہے میرے پاس۔ وہ بھی اپنا نہیں ہے۔ وہ رئیسانی کے کمدار کا ہے۔ میں جب اکیلے میں بیٹھ کر اپنے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے اپنے آپ سے شرم آتی ہے۔ کیا فائدہ ہے اس زندگی کا؟ اب تو اس حال میں مجھے ایک ایک لمحہ گزارنا مشکل ہورہا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس دوران کھانا آگیا اور ہم وحشیوں کی طرح کھانے پر ٹوٹ پڑے۔ حالانکہ میں گھر سے ہلکا پھلکا کھانا کھا کر چلا تھا لیکن اس وقت تازہ تازہ پکے ہوئے گوشت کی بڑی سی کڑاہی اور تندور سے نکلے ہوئے گرم گرم نان سامنے آئے تو ان کی خوشبو وغیرہ نے گویا ایک بار پھر بھوک جگادی اور میں نے خمیسو خان کا ساتھ دینے میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ کھانے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ خمیسو خان کسی نہ کسی فیصلے پر تو پہنچ چکا تھا لیکن مجھ پر اس کا اظہار نہیں کررہا تھا۔

ہم نے جو کھانا چٹ کیا وہ عام سے چھ سات افراد کے لیے کافی ہوتا۔ اس کے بعد ہم نے پانی کے دو جگ خالی کیے پھر دودھ پتی کا دور چلا۔ خمیسو خان کو گویا سرور سا آگیا۔ کچھ اور پھیل کر بیٹھتے ہوئے اس نے حسب عادت مونچھ کو بل دیتے ہوئے مجھے گھورا۔ اس کی آنکھوں کی سرخی کچھ اور گہری ہوچکی تھی۔ اس نے واسکٹ کی جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔ ایک بیڑی دانتوں میں دبا کر اس نے بنڈل میری طرف بڑھایا۔

"شکریہ۔ میں سگریٹ بیڑی نہیں پیتا" میں نے معذرت کی۔

"اچھا کرتے ہو" اس نے مربیانہ انداز میں سرہلایا "غریب آدمی کو ایسے شوق پالنے بھی نہیں چاہئیں لیکن ہمارے ساتھ رہوگے تو بہت کچھ پینے لگ جاؤگے۔"

"اگر ساتھ رہنا نصیب ہوا تب کی بات ہے نا" میں نے حسرت سے کہا۔

"کیوں نہیں رہوگے" اس نے کثیف دھواں ہوا میں اگلا "بس سمجھ لو کہ تم ہمارے گروہ میں شامل ہوگئے۔ خمیسو خان نے تمہیں انٹرویو میں پاس کردیا۔"

"لیکن جانو سے پوچھے بغیر تو یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی نا" میں نے شک کے پہلو کی طرف اشارہ کیا۔

"پہلے تم خود ہی کہہ رہے تھے کہ جانو میری بات نہیں ٹال سکتا" وہ غرایا "اب تمہیں اس میں شک محسوس ہونے لگا ہے کیا؟"

"نہیں۔ نہیں۔ شک کی تو کوئی بات نہیں" میں نے جلدی سے کہا "میں تو ویسے ہی تسلی کرنا چاہ رہا تھا۔"

وہ ذرا توقف سے بولا "لیکن میں جو تمہاری سفارش کروں گا' اس سے مجھے کیا فائدہ ہوگا؟"

"میں ایک معمولی سا... چھوٹا سا آدمی ہوں" میں نے عاجزی سے کہا۔ "میں اس قابل کہاں ہوں کہ تمہیں کوئی فائدہ پہنچاسکوں لیکن میرا وعدہ ہے کہ زندگی بھر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں گا۔ جانو سے .... اور گروہ سے زیادہ میری وفاداری تمہارے ساتھ ہوگی۔ میں ایک طرح سے تمہارا غلام بن کر رہوں گا۔ جو حکم کروگے' فوراً تعمیل کروں گا۔"

"بالکل ٹھیک" اس کے چہرے پر طمانیت جھلک آئی "مجھے گروہ میں ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے جسے میں اپنا خاص آدمی سمجھ سکوں۔ جس طرح تم نے مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی' میں بھی تم سے کوئی بات نہیں چھپاؤں گا۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت ہمیں گروہ میں دو تین جی دار اور شیر قسم کے جوانوں کی ضرورت ہے۔ پچھلے دو تین مہینوں میں ہمارے تین آدمی مارے جاچکے ہیں۔ حالانکہ ہمارا گروہ اتنا بڑا ہے کہ اس میں دو تین آدمیوں کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑنا چاہیے لیکن بات اصل میں یہ ہے کہ کام بھی بہت بڑھتا جارہا ہے۔ یہ وقت بھی ہم لوگوں کے لیے بہت اچھا ہے۔"

"اچھا ہے...؟" میں نے حیرت سے کہا "میرا تو خیال تھا کہ آج کل ڈاکوؤں پر سختی آئی ہوئی ہے۔"

"تھوڑے سے دنوں کے لیے آئی تھی' اب تو صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔ ہم بڑے مزے میں ہیں۔ ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ شہروں میں ہمارے بھائی بند سرگرم ہیں' ادھر جنگل دیہات میں ہمارا راج ہے۔ اوپر والوں کو آپس میں لڑنے سے فرصت نہیں ہے۔ ہماری طرف کسی کا دھیان نہیں ہے۔ ہمیں کوئی خاص تکلیف نہیں ہے لیکن شاید کچھ عرصے بعد ہم پر سختی کا دور آئے' اس لیے ہم جلدی جلدی بہت سا کام کرکے کچھ عرصے کے لیے اس طرح ہوجانا چاہتے ہیں جیسے ہمارا کہیں وجود ہی نہیں ہے' ہم سب مرکھپ چکے ہیں۔ حالات سازگار ہوتے ہی ہم سب اپنی اپنی کچھاروں سے دوبارہ سر نکال لیں گے۔ ویسے عین ممکن ہے' ہمارے لیے سختی کا دور نہ ہی آئے۔ ابھی ویسے ہی کچھ افواہیں سی سننے میں آرہی ہیں۔"

پھر اس نے بے پروائی سے سر جھٹکا "خیر۔ ہمیں ان باتوں کی پروا نہیں ہے۔ زیادہ فکر ہمیں تین چار زمینداروں کی ہے جو ہمارے ساتھ ٹیڑھے ہورہے ہیں۔ انہیں ہم نے ہی طاقتور بنایا' ہم نے ہی ان کے علاقوں میں ان کی دہشت بٹھائی۔ آج وہی ہم کو آنکھیں دکھا رہے ہیں۔ ان کو ذرا سیدھا کرنا ہے۔ ان کی طرف سے یہ بھی خطرہ ہے کہ اگر ہمارے خلاف کوئی بڑی کارروائی شروع

ہوئی تو یہی زمیندار جن کی ہم نے بڑی خدمت کی ہے' کہیں ہماری پیٹھ میں چھری نہ گھونپ دیں۔"

دفعتاً اس نے میری آنکھوں میں جھانکا اور ذرا سیدھا ہوتے ہوئے بولا "تمہیں سچی بات بتاؤں... حقیقت یہ ہے کہ تمہاری یہ رئیسانی بھی ہماری آنکھوں میں کھٹکتی ہے۔ حالانکہ اس نے ہمارے ساتھ کبھی کوئی برائی نہیں کی' بہت اچھی طرح پیش آتی ہے لیکن کم از کم مجھے یہ لڑکی بالکل اچھی نہیں لگتی۔ بس ہمارا جانو ہی اس کے عشق میں جلا ہے۔ برسوں ہوگئے ہیں جانو کو جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے ہوئے لیکن پڑھا لکھا ہے نا' اس لیے پڑھے لکھوں والی خو بُو ابھی تک نہیں گئی۔ پڑھے لکھوں کی طرح ہی شرافت سے عشق کیے جارہا ہے لیکن کب تک؟ ایک نہ ایک دن تو اس کے صبر کا پیمانہ بھی چھلک ہی جائے گا۔"

اس نے تپائی سے پلاسٹک کی ایک پلیٹ اٹھالی جس میں کھانے کے ساتھ سلاد وغیرہ آئی تھی۔ پلیٹ اپنے چوڑے چکلے ہاتھ پر رکھتے ہوئے وہ تیز و تند لہجے میں بولا "اگر جانو کی جگہ میں ہوتا تو اب تک اس عورت کو یوں توڑ مروڑ کر پھینک چکا ہوتا..." اس نے پلاسٹک کی پلیٹ ہاتھ میں چُرمُر کرکے حقارت سے ایک طرف پھینک دی۔

اس شخص پر مجھے پہلے ہی جتنا غصہ آرہا تھا' اتنا بہت کم لوگوں پر آتا تھا لیکن اب تو نہ جانے کیوں میری کنپٹیاں سُلگ اٹھیں۔ بہ مشکل میں نے اپنے آپ پر قابو رکھا اور نہ جانے کس طرح ستائشی انداز میں مسکراتا رہا۔ اس وقت تو مجھے یہی ظاہر کرنا تھا کہ وہ میرا ہیرو تھا' میرا آئیڈیل تھا۔

پھر وہ کچھ سوچ کر ذرا طمانیت سے سرہلاتے ہوئے بولا "خیر... اب جانو تمہاری رئیسانی پر پہلے جتنا مہربان نہیں رہا۔ کسی وقت بھی اس کی محبت کی گاڑی کو ریورس گیئر لگ سکتا ہے۔ اس نے شاید دیکھ لیا ہے کہ پتھر میں جونک نہیں لگ سکتی۔"

اچانک اسے گویا کوئی خیال آیا۔ وہ میری طرف جھکتے ہوئے بولا "اگر تمہیں ہم لوگوں میں شامل ہونا ہے تو تمہاری ہمدردیاں رئیسانی کے ساتھ ذرا بھی نہیں رہنی چاہئیں۔"

"میں اب اتنا بھی بچہ نہیں ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے کہ اگر آدمی کی تھوڑی بہت عزت ہوسکتی ہے تو وہ کسی ایک کا بن کر رہنے میں ہی ہوسکتی ہے۔"

"بالکل ٹھیک" اس نے دوبارہ ڈھیلے ڈھالے صوفے کے پشتے سے ٹیک لگالیا "ویسے تو ہمیں رئیسانی کے بارے میں ہر بات معلوم ہوتی رہتی ہے لیکن تم بہرحال اندر کے آدمی ہو' تم سے ہمیں بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوسکتی ہیں۔ تم رئیسانی کی نوکری مت چھوڑنا۔ بظاہر تم اسی طرح اس کے غلام بن کر اپنا وقت گزارتے رہنا۔ ہمیں جب تمہاری ضرورت ہوا کرے گی ہم تمہیں پیغام بھجوادیا کریں گے۔ ایک آدھ رات کے لیے کسی بہانے وہاں سے گول ہونا تمہارے لیے بالکل مشکل نہیں ہوگا۔ آئندہ تم وہاں ہمارے مخبر بن کر رہوگے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ویسے۔ آج کل کیا سبھی ڈاکو اسی طرح دُہری شخصیت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں؟ یعنی بظاہر ان کا روپ کچھ اور ہے' وہ کچھ اور کام کرتے ہیں لیکن راتوں کو اکٹھے ہوکر' منظم ہوکر ڈاکے مارتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

اس نے گویا میرے سوال سے محظوظ ہوتے ہوئے کھردرا سا قہقہہ لگایا پھر میرے گھٹنے پر ہاتھ مار کر ذرا رازدارانہ لہجے میں بولا "سب ڈاکو اتنے عقل مند نہیں ہیں۔ زیادہ تر بس.... نرے ڈاکو ہی ہیں۔ یہ صرف ہم جیسے کچھ ذہین ڈاکو ہیں جنہوں نے یہ طریقہ اپنایا ہے اور بہت ترقی کی ہے۔ ہم لوگ ہر لحاظ سے فائدے میں ہیں۔ ہماری دُہری دُہری... بلکہ ہم میں سے بعض کی تو تہری شخصیت ہے۔ ہمارے جائز اور قانونی کاروبار بھی ہیں۔ ایک حیثیت میں ہم پر برا وقت آجائے تو ہم اپنی دوسری حیثیت کے سائے میں پناہ لے سکتے ہیں۔ پولیس ہمارے بارے میں کبھی کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکتی کہ ہم کون ہیں' کیا ہیں۔ ہر جگہ ہمارے جاسوس اور مخبر موجود ہیں۔ ہمارے جیسا سسٹم کسی کا نہیں ہے۔ جانو کے بارے میں یہ بات بہرحال مجھے بھی ماننی پڑتی ہے کہ اس نے بڑے شاندار طریقے سے سارا سلسلہ سیٹ کررکھا ہے۔ ہم کبھی عام ڈاکوؤں کی طرح مارے مارے نہیں پھرتے۔"

میں خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں حیران ہورہا تھا۔ وہ اپنی مخصوص خباثت بھری مسکراہٹ کے ساتھ بولا "تم شاید سوچ بھی نہیں سکتے کہ کیسے کیسے لوگ ہمارے گروہ میں شامل ہونے یا ہمارے مددگار بننے کی درخواست لے کر آتے ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو مختلف محکموں میں... مختلف کوٹھیوں میں ... مختلف بنگلوں میں .... بعض بینکوں میں ... یا دوسری ایسی جگہوں پر بیٹھے ہیں جہاں بڑی بڑی رقموں کے لین دین ہوتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے چھوٹی موٹی خدمات انجام دیتے ہیں اور گھر بیٹھے بڑی بڑی رقمیں حاصل کرتے ہیں۔ ہم بظاہر بہت معمولی اور دیہاتی سے لوگ نظر آتے ہیں لیکن ہمارے پاس بڑی دولت ہے' بڑا اسلحہ ہے۔ ہمیں ان علاقوں میں گھومتے پھرتے دیکھ کر کوئی ہماری اصل طاقت کا اندازہ نہیں کرسکتا۔"

"میں تو بہت حقیر اور بے وقعت سا آدمی ہوں" میں نے گویا اپنی بے وقعتی پر شرمندہ ہوتے ہوئے کہا "میں تو شاید رئیسانی کے بارے میں تمہیں کوئی کام کی بات نہ بتاسکوں۔ وہ ہم جیسوں کو اپنے قریب کہاں آنے دیتی ہیں۔"

"تم اس کی فکر نہ کرو" خمیسو نے مجھے تسلی دی "تم سے کام لینا ہمارا کام ہے۔ تمہیں معلوم ہی نہیں کہ کون سی خبر ہمارے لیے اہم ہوگی اور کون سی بے کار۔ بس تم جو کچھ بھی دیکھا کرو' جو کچھ

بھی سنا کرو، ہمیں بتاتے رہا کرو۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم تمہیں وارداتوں پر بھی ساتھ لے جا کر تمہاری ٹریننگ شروع کرتے ہیں۔"

"تو کیا میں سمجھ لوں کہ تم نے مجھے اپنے ساتھیوں میں شامل کر لیا؟" میں نے گویا امید اور ناامیدی کے دوراہے پر حواس باختہ ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ روپے میں بارہ آنے تو تم اپنا مسئلہ حل ہی سمجھو، باقی چار آنے فیصلہ جانو کے ہاتھ میں ہے۔ آخر وہ سردار ہے لیکن تم خود بھی ایک بار پھر غور کر لو" اس کا لہجہ ناصحانہ سا ہو گیا۔

"اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہی تو میں نے تم سے بات کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔"

"ہمارے ساتھ شامل ہونے میں فائدے تو بہت ہیں۔ کافی روپیہ پیسہ تمہارے حصے میں آئے گا۔ انہی جنگلوں بیابانوں میں تمہیں ہر عیاشی بھی میسر ہوگی کیونکہ عیاشی کا تعلق روپے پیسے سے ہے۔ جہاں دولت ہے وہاں عیاشی ہے۔ جنگل میں بھی منگل ہے۔"

میں نہایت انہماک سے سب کچھ سنتے ہوئے سر ہلا رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر کبھی بہت برا وقت آجائے تب بھی تم اپنی جمع پونجی سمیٹ کر کسی شہر کا رخ کر سکتے ہو اور کسی زمیندار یا افسر وغیرہ کی مدد سے اپنی بلیک منی کو وہائٹ منی میں تبدیل کر کے کوئی کاروبار شروع کر سکتے ہو یا اپنی دولت کہیں انویسٹ کر سکتے ہو۔ اس کے بعد تم اور تمہاری آنے والی نسلیں عزت و آبرو سے زندگی گزار سکتی ہیں۔"

پھر وہ جیسے کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرایا "میں بہت سے ایسے لوگوں کو جانتا ہوں جو آج شہروں میں بڑے بڑے عہدوں پر ہیں یا بڑے بڑے کاروبار کر رہے ہیں یا پھر سیاست میں سرگرم عمل ہیں لیکن ان کے آباؤ اجداد ڈاکو تھے۔ ہماری لائن کے بعض بوڑھے اور قریب المرگ لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے تو بڑی دلچسپ، رنگین اور سنگین کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔"

"جن لوگوں کا تم ذکر کر رہے ہو کہ شہروں میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں، بڑے بڑے کاروبار کر رہے ہیں یا سیاست میں سرگرم ہیں، شاید اسی لیے ان میں آج بھی ڈاکوؤں والی خصوصیات پائی جاتی ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد ڈاکو تھے۔ میں اخبار پڑھتا ہوں تو یہی اندازہ ہوتا ہے" میں نے دانشورانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ویسے اُن کے آباؤ اجداد ان سے لاکھ درجے بہتر تھے" خمیسو خان اطمینان سے بولا۔ اس خر دماغ کے منہ سے میں نے پہلی بار ایک ایسی بات سنی تھی جس کی بنیاد بہت سی باریکیوں پر تھی۔

وہ سُلگتی بیڑی بے پروائی سے ایک طرف پھینک کر نئی بیڑی سُلگاتے ہوئے بولا "ہمارے گروہ میں شامل ہونے کا برا پہلو یہ ہے کہ تمہاری ساری امیدیں دھری کی دھری بھی رہ سکتی ہیں۔ عین ممکن ہے کہ تم پہلی ہی واردات پر نکلو اور کوئی آوارہ گولی تمہاری کھوپڑی سے گزر جائے۔ ہمارے بعض ساتھیوں کی لاشوں کو کفن بھی نصیب نہیں ہوتا۔"

"کسی بھی میدان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے خطرات تو مول لینے ہی پڑتے ہیں" میں نے ثابت قدمی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"ٹھیک ہے۔ تو پھر آؤ میرے ساتھ..." وہ یکدم ہی جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے تن و توش اور کاہلی آمیز موڈ کو دیکھتے ہوئے اس کا یوں یک لخت ہی اٹھ کھڑے ہونا ناقابلِ یقین تھا۔ اس کی پھرتی حیرت انگیز تھی۔ میں نے اس کی تقلید کی۔

چوبی سیڑھی ایک بار پھر ہمارے بوجھ تلے لرزی اور چرچرائی۔ ریستوران میں اب رونق بہت کم ہو چکی تھی۔ کاؤنٹر پر موجود شاطر صورت شخص نے ایک بار پھر خوشامدانہ انداز میں باچھیں پھیلائیں۔ خمیسو خان نے سو سو کے دو تین کڑکڑاتے ہوئے نوٹ اس کی طرف اچھالے... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ منہ پر مارنے کے انداز میں اس کی طرف پھینکے اور حساب کتاب پوچھے بغیر آگے بڑھتا چلا گیا۔

باہر آکر خمیسو خان نے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ مجھے اس کے تعاقب میں بہت تیز رفتاری سے گھوڑا دوڑانا پڑا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ کہاں جا رہا تھا لیکن اس کا یوں یکایک بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آجانا میرے لیے حیرت انگیز تھا۔

جلد ہی ہم زرتاج نگر کی حدود سے نکل آئے۔ بل کھاتی پگڈنڈی پر ویرانے میں ہمارے گھوڑے دُھول اُڑاتے چلے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد خمیسو نے گھوڑے کی رفتار بے حد کم کر دی۔ مجھے اتنا اندازہ بہرحال ہو گیا تھا کہ وہ جانو کے اڈے کی طرف واپس نہیں جا رہا تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں؟" بالآخر میں نے بہ آوازِ بلند پوچھ لیا۔

"تم گروہ میں شامل ہو سکو یا نہ ہو سکو...... لیکن جہاں ہم جا رہے ہیں اس جگہ کے بارے میں تمہیں کسی کے سامنے بھی زبان نہیں کھولنی ہے۔ میں نے تم پر اعتبار کر لیا ہے۔ اگر تم نے میرے اعتبار کو دھوکا دیا تو پھر تمہیں زمین پر نہیں، آسمان پر ہی پناہ ملے گی۔ خمیسو خان کی یہ بات یاد رکھنا" اس نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"میں اتنا بے وقوف نہیں ہوں خمیسو خان!" میں نے بالکل اسی طرح بے وقوف نہ ہونے کا دعوا کیا جس طرح دنیا کے اکثر بے وقوف کرتے ہیں۔

اس نے مطمئن انداز میں ایک بار پھر گھوڑے کی رفتار بڑھا دی۔

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگزشت ابھی جاری ہے۔ باقی واقعات ساتویں حصے میں پڑھیں۔

سرکش

7

محمود احمد مودی

سرکش/3

میں نمیسو خان کے پیچھے پیچھے گھوڑا دوڑاتا جارہا تھا۔ بل کھاتی پگڈنڈی بھی بالآخر ختم ہوگئی اور ہم ناہموار کچے علاقے میں سفر کرنے لگے۔ زرتاج کی زمینیں اب بہت پیچھے رہ گئی تھیں۔ ہم قدرے نشیبی سے علاقے کی طرف بڑھ رہے تھے۔

پھر مجھے سامنے بہت بڑے طول و عرض میں درخت پھیلے ہوئے نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دستِ قدرت نے خاص طور پر ایک محدود سے حصے میں بڑا باترتیب سا جنگل اُگا دیا تھا۔ حالانکہ جنگل میں ترتیب کا کیا کام؟ اردگرد نیم ریتیلا اور ناہموار میدان ہی تھا۔

اس باترتیب سے جنگل کو دیکھ کر کچھ شبہ سا گزرتا تھا کہ شاید اس کی تخم ریزی اور پرورش و پرداخت انسانی ہاتھوں ہی سے ہوئی تھی اور کسی خاص مقصد کے تحت برسوں کی منصوبہ بندی سے یہ جنگل اُگایا گیا تھا لیکن پھر میں نے خود ہی اپنے اس موہوم سے خیال کو رد کردیا۔ کسی کو اس ویرانے میں یہ زحمت اٹھانے کی بھلا کیا ضرورت تھی؟

کبھی کبھی ہوا کا تیز جھونکا آتا اور زمین سے مٹی اُڑاتا ہوا لے جاتا۔ اسی وجہ سے یہاں کسی کا نقشِ پا رہ جانے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ مجھے دھندلے دُھندلے کچھ ایسے نشانات نظر آرہے تھے جیسے کاریں یا ایسی ہی کچھ دوسری سواریاں ادھر سے گزرتی رہی ہوں۔ سواریاں یا تو اس مختصر جنگل کی طرف گئی تھیں یا ادھر سے آئی تھیں اور مختلف سمتوں میں گئی تھیں۔ سورج اب زوال پذیر تھا... اور اسی کی مدد سے میں نے اب تک کے سفر میں سمتوں کا کچھ تعین کرنے اور اسے ذہن میں رکھنے کی کوشش کی تھی تاکہ ضرورت پڑنے پر کبھی اپنے طور پر بھی ادھر آنے کی کوشش کرسکوں۔

اس مختصر سے جنگل کے قریب پہنچ کر ہم اس کے گرد چکر کاٹتے ہوئے دوسری طرف آگئے۔ یہاں ایک مقام پر جنگل میں داخل ہونے کے لیے بل کھاتا ایک راستہ موجود تھا.... لیکن اگر دور سے دیکھا جاتا تو یہ راستہ الگ سے دکھائی نہ دیتا حالانکہ اچھا خاصا کشادہ راستہ تھا۔

اس راستے پر ذرا دور چلنے کے بعد ہی گویا ہم بھی جنگل میں مدغم ہوگئے۔ اب کوئی جنگل سے کچھ دور کھڑا....ہو کر دیکھتا تو شاید ہم اسے نظر نہ آتے۔ مجھے ایک بار پھر شبہ سا ہوا کہ اس جنگل کی نشوونما میں انسان کی انجینئرنگ اور منصوبہ بندی شامل تھی۔ میرا خیال غلط بھی ہوسکتا تھا۔ دستِ قدرت نے بھی اس دنیا میں قدم قدم پر عجیب عجیب چیزیں تخلیق کررکھی ہیں اور ہر دور میں انسان انہیں نہ جانے کن کن اچھے اور بُرے مقاصد کے لیے استعمال کرتا رہا ہے۔

درختوں کے درمیان بل کھاتے اس راستے پر ہم نے تھوڑا فاصلہ مزید طے کیا تو اچانک ہی اپنے آپ کو کھلی جگہ میں کھڑے پایا۔ اسی دوران درختوں کے عقب سے دو افراد اچانک ہی نکل کر ہمارے سامنے آن کھڑے ہوئے۔ ان کے ہاتھوں میں دو رہار رائفلیں تھیں جن پر دوربینیں بھی فٹ تھیں۔ مجھے احساس ہوا کہ وہ دونوں کسی نہ کسی جگہ سے بہت دور سے ہی ہم کو آتے دیکھ چکے تھے۔

وہ دونوں لحیم شحیم اور چہرے سے ہی بدفطرت سے نظر آنے والے افراد تھے۔ ایک کے چہرے پر نمیسو خان ہی کی طرح جھاڑ جھنکار داڑھی تھی اور مونچھیں کچھ اس طرح اس میں گڈمڈ تھیں کہ دہن نظر ہی نہیں آرہا تھا۔ تاہم اس مقام پر ہلکی سی ہلچل ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ مسکرا رہا تھا۔

دوسرے کے کھُردرے چہرے پر صرف موٹی موٹی مونچھیں تھیں۔ وہ ہنسنے مسکرانے کا قطعاً عادی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں اور آنکھوں میں برہمی تھی۔ جیسے وہ ساری دنیا سے ناراض ہو۔ تاہم ان دونوں میں سے کسی کی بھی رائفل کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔

ان دونوں نے گہری نظروں سے صرف میرا جائزہ لیا لیکن کچھ بولے نہیں۔ نمیسو خان نے نہایت خفیف سے اشارے سے گویا جتایا کہ میں اس کے ساتھ تھا اور انہوں نے بھی نہایت خفیف سے اشارے سے ہی ہمیں آگے جانے کی اجازت دے دی۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ کوئی اجنبی اس جنگل میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

سامنے کسی پرانی اور نہایت طویل و عریض حویلی کا کھنڈر نظر آرہا تھا۔ کھنڈر بھی کیا تھا، محض چند ٹوٹی پھوٹی دیواریں اور ستون

تھے یا پھر ان کے درمیان ملبے کے بہت سے ڈھیر جو بارشوں اور موسم کے دوسرے تغیر و تبدل کے باعث چھوٹے بڑے ٹیلوں کی شکل اختیار کر گئے تھے۔

جنگل گویا اس طویل و عریض کھنڈر کے گرد فصیل کا کام دے رہا تھا۔ جنگل نے نہایت خوبصورتی سے اس کھنڈر کو اپنے درمیان چھپایا ہوا تھا۔ اس کھنڈر کے گرد بہت سی جگہ درختوں سے خالی بھی تھی اور اس جگہ میں چھ سات قیمتی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں پجیرو، مرسیڈیز اور اکارڈ جیسی گاڑیاں شامل تھیں۔ صرف ایک گاڑی ذرا کم قیمت تھی۔

ان پر دھول جمی ہوئی تھی لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی۔ دیہی علاقوں میں زمینداروں وغیرہ کی گاڑیوں پر عموماً اسی طرح دھول جمی رہتی ہے۔ کسی گاڑی میں کوئی آدمی نہیں تھا۔ درختوں کی اس لمبی چوڑی فصیل میں گھرے ہوئے اس کھنڈر کے پاس کھڑی وہ گاڑیاں عجیب لگ رہی تھیں۔ میں نے بنیادی طور پر سادہ مزاج رکھنے والے دیہاتی کی طرح اِدھر اُدھر دیکھ کر حیرت ظاہر کرنے کی اداکاری جاری رکھی۔ لیکن درحقیقت یہ خالص اداکاری بھی نہیں تھی۔ مجھے سچ مچ بھی کچھ حیرت تھی۔

غیسو خان نے مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور گھوڑے کو بے پروائی سے وہیں کھڑا چھوڑ کر کھنڈر کی طرف بڑھ گیا۔ میں نے بھی گھوڑے کو کہیں باندھے بغیر وہیں چھوڑا اور اس کے پیچھے لپکا۔ نہ جانے کیوں مجھے اپنے اعصاب میں ہلکی سی سرسراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

کھنڈر کے قریب پہنچ کر دیواروں کی ساخت سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی بہت ہی پرانی حویلی تھی اور کسی شاہی محل سے کم نہیں تھی۔ اس کا تعلق کسی ایسے دور سے تھا جب عموماً محلوں، قلعوں اور حویلیوں میں دیواروں پر رنگین تصویریں بنوانے کا بھی رواج تھا۔ امتدادِ زمانہ کے باوجود ان تصویروں کے رنگوں میں ابھی تک چمک باقی تھی لیکن دیواریں بری طرح شکست و ریخت کا شکار تھیں اور پلستر بھی جگہ جگہ سے جھڑ چکا تھا۔ اس لیے تصویروں کا بھی کوئی کوئی حصہ ہی باقی تھا جس سے سرسری نظر میں کوئی اندازہ لگانا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ کم از کم میرے لیے تو ناممکن ہی تھا۔

ملبے کے کئی اونچے نیچے ڈھیروں سے گزرنے کے بعد ہم ایک ایسی شکستہ دیوار کے قریب پہنچے جس کے عقب میں پتھر کی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ سیڑھیاں اتر کر ہم ایک راہداری میں پہنچے جس کے اختتام پر ایک لمبا چوڑا دروازہ نظر آ رہا تھا لیکن یہ دروازہ اس تباہ شدہ عمارت کا حصہ نہیں تھا۔

وہ جدید ساخت کا ایک مضبوط فلش ڈور تھا جس میں جدید ساخت کا ہی ایک فلش لاک اور ناب وغیرہ بھی موجود تھی۔ اوپر ملبے پر کھڑے ہونے والے کی نظر اس دروازے تک تو کیا، سیڑھیوں تک بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اوپر سے کچھ ایسا ہی لگتا تھا جیسے زمین میں کوئی گڑھا پڑ گیا ہو۔

غیسو خان نے نہایت مطمئن انداز میں جیب سے ایک سنہ[ری] چابی نکالی جس پر ایک نمبر کندہ تھا۔ اس چابی سے اس نے دروازے کا تالا کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی مجھے سامنے ایک چوڑا چکلا، سفا[ک] چہرہ نظر آیا جس کی رنگت تپے ہوئے تانبے جیسی تھی۔ وہ گ[ٹھے] ہوئے جسم کا ایک پستہ قد مگر گوریلے کی طرح مضبوط نظر آنے و[الا] شخص تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں میں سانپ کی آنکھوں جی[سی] چمک تھی۔

اس نے ایک ہاتھ میں کلاشنکوف کھلونے کی طرح اٹھائی ہو[ئی] تھی۔ غیسو خان کو دیکھ کر اس نے [ایک] گن بے پروائی سے جھکا لی۔ ا[س] کا سر اس کی جسامت کے مقابلے میں بہت چھوٹا تھا، گریبان کھلا اور اس کے سینے پر گوریلے کی طرح بال نظر آ رہے تھے۔

اس کے ہاتھ میں کلاشنکوف نہ ہوتی تب بھی ایک عام شخ[ص] اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو سکتا تھا۔ وہ کلین شیو تھا اور اس کا سُوجا سُوجا سا معلوم ہوتا تھا۔ بال بہت چھوٹے، چھدرے ا[ور] تاروں کی طرح کھڑے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہوشو خان یاد آ گیا۔ ہوشو خان جیسا گرانڈیل نہیں تھا لیکن اس کی شخصیت میں ہوش[و] کی جھلک تھی۔ بلکہ اس کی آنکھیں ہوشو خان کی نسبت ز[یادہ] خطرناک شخص کی آنکھیں تھیں۔

غیسو خان کو دیکھ کر اس کے پتھرائے ہوئے سے چہر[ے پر] مسکراہٹ کی صرف ایک رمق ابھری۔ غیسو نے اس سے ا[یک] لفظ بھی نہیں کہا۔ بس مشفقانہ سے انداز میں اس کا کندھا تھپک[ا اور] آگے بڑھ گیا۔ وہ ایک چھوٹا سا چوکور کمرا تھا جہاں وہ گوری[لا] شخص تعینات تھا۔

اس کے عقب میں زمین سے چھت تک ایک دیوار تھی[جس] میں ایک چوکور شگاف موجود تھا۔ اس شگاف کی وجہ سے ہی اندازہ ہوا کہ وہ دیوار بہت موٹی تھی۔ شگاف اتنا بڑا تھا کہ ا[یک] وقت میں صرف ایک شخص آسانی سے گزر سکتا تھا۔

غیسو خان کی رہنمائی میں اس شگاف سے گزرتے ہی یکدم گویا کسی دوسری دنیا میں پہنچ گیا۔ ہم ایک طویل و عریض [ہال] میں کھڑے تھے جس کا فرش ماربل کی ٹائیلوں کا تھا اور اس [کے] چاروں طرف اوپر نیچے دو منزلوں پر کمروں کی قطاریں نظر آ[رہی] تھیں۔ ان منزلوں کی اونچائی میزانائن فلور کی طرح کم تھی [لیکن] بہرحال وہ دو منزلیں تھیں اور یوں کمروں کی تعداد کافی زیادہ ہ[و گئی] تھی۔ کمروں کے دروازے بند تھے۔ بالائی منزل کے سامنے تنگ بالکونی بھی چاروں طرف موجود تھی۔

چھت اور فرش کے درمیان کئی موٹے موٹے ستون بھی آ رہے تھے۔ معلوم نہیں یہ اس تباہ شدہ قدیم عمارت کا تہ خانہ [تھا] جو اصل عمارت کے کم از کم آدھے حصے جتنا لمبا چوڑا تھا۔ عمارت کی نچلی منزل تھی جو حادثاتی طور پر یا وقت کے ساتھ ر[ف]ٹی میں دب کر محفوظ ہو گئی تھی جبکہ اوپر کی منزل رفتہ رفتہ منہدم ہو گئی تھی، بعد میں اس زیریں منزل کی مرمت اور تزئین کے بعد اسے ایک نئی شکل دے دی گئی تھی۔ اب یہ محل وقوع اور ساخت کے لحاظ سے گویا ایک چھوٹا سا محفوظ قلعہ تھا جو اول تو اس ویرانے میں زیرِ زمین اور دوم جنگل میں چھپا ہونے کی وجہ سے لوگوں کی نظروں سے محفوظ تھا۔

اس کے باوجود اس کی حفاظت کے انتظامات بھی موجود تھے جن کا اندازہ مجھے یہاں آتے وقت ہو گیا تھا۔ بالفرض محال کسی کی رسائی سیڑھیوں تک بھی ہو جاتی تب بھی اس ٹھکانے کو تباہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اگر کچھ لوگ یہاں قلعہ بند ہو کر بیٹھ جاتے تو انہیں نکالنا یا انہیں ہلاک کیے بغیر اس ٹھکانے پر کنٹرول حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔

جس کسی نے بھی اس جگہ کو کارآمد بنانے کی منصوبہ بندی کی تھی اس کی ذہانت کو داد دینی چاہیے تھی۔ افسوس کی بات صرف یہ تھی کہ وہ ذہانت یقیناً اچھے مقاصد میں استعمال نہیں ہو رہی تھی۔

یہاں بجلی بھی موجود تھی۔ جابجا قمقمے روشن تھے۔ اس کا انتظام تو شاید جنریٹرز کے ذریعے کر لیا گیا ہو لیکن ہوا کی آمد و رفت کا نہ جانے کیا انتظام تھا کہ یہاں گھٹن اور حبس محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ باہر سے یکدم یہاں آنے پر تو نہایت خوشگوار قسم کی خنکی محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی ایئر کنڈیشنگ سسٹم ہلکے درجے پر کام کر رہا ہو۔ زیرِ زمین جگہیں ویسے بھی نسبتاً ٹھنڈی ہی ہوتی ہیں۔

لیکن ان سب چیزوں میں سے کوئی بھی میرے لیے اس قدر حیران کن نہیں تھی جتنا یہاں کا ماحول باعثِ حیرت تھا۔ ان لامتناہی سے ویرانوں میں محض چند سیڑھیاں اتر کر اچانک ہی دوسری دنیا میں پہنچ جانے والا شخص پہلے تو یہی محسوس کرتا ہے کہ اس کی آنکھیں اسے دھوکا دے رہی ہیں، رنگین خواب دکھا رہی ہیں۔

انگریزی ویسٹرن فلموں میں پرانی طرز کے نائٹ کلبوں، سیلونوں وغیرہ کے ماحول کی جو جھلکیاں نظر آتی ہیں ان میں تصور کی مدد سے کچھ رنگ آمیزی کر لی جاتی تو یہاں کے ماحول کا نقشہ کھینچا جا سکتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں کے ماحول میں ذرا دیسی ٹچ شامل تھا۔ پہلی نظر میں یہ گمان بھی گزر سکتا تھا کہ شاید وہ کسی بڑے بجٹ کی فلم کا سیٹ لگا ہوا تھا اور شوٹنگ جاری تھی۔

ہال میں قطار در قطار چھوٹی چھوٹی خوبصورت میز کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر خالی تھیں لیکن کچھ پر لوگ موجود تھے۔ میرے لیے حیرت در حیرت کا سامان یہ تھا کہ ان افراد میں چار لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

مرد سبھی پکی عمروں کے تھے۔ ان کے چہروں اور لباسوں سے آسودہ حالی کی مخصوص چمک عیاں تھی۔ اپنے حلیوں اور رکھ رکھاؤ سے وہ زمیندار معلوم ہوتے تھے۔ لڑکیاں البتہ شہری علاقوں کی پیداوار معلوم ہوتی تھیں۔ کم از کم ان کے حلیے دیکھ کر تو یہی گمان گزرتا تھا لیکن ان کے چہروں پر دیہاتوں والی جوانی اور صحت مندی کی چمک موجود تھی۔ گو کہ یہ چمک رختِ سفر باندھ رہی تھی۔۔۔ اور زیادہ عرصے کی مہمان معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن بہرحال اس کی موجودگی خوشگوار تھی۔ ان کے لباس خاصے اچھے اور فیشن ایبل تھے۔ یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ یہ عورتیں انہی مردوں کے ساتھ آئی ہوئی تھیں یا ان کا تعلق اسی جگہ سے تھا۔

وہ سب تین تین چار چار کی ٹولیوں میں مختلف میزوں پر تاش کھیل رہے تھے۔ ان کے سامنے پلاسٹک کے ٹوکنوں کی چھوٹی چھوٹی ڈھیریاں تھیں۔ کھانے پینے کا شغل جاری تھا۔ ساتھ ساتھ سگرٹ بھی گردش میں تھے اور پلاسٹک کے ٹوکن یا چپس اِدھر سے اُدھر ہو رہے تھے۔

ہوا میں سگریٹوں کا دھواں اور وسکی وغیرہ کی بو چکرا رہی تھی۔ باتوں کی خفیف سی بھنبھناہٹ کے درمیان کبھی کوئی مخمور اور مترنم سا قہقہہ بھی سنائی دے جاتا۔ بیشتر میزیں ابھی خالی تھیں۔ محفل کا کاروبار شباب پر نہیں تھا، شاید ابھی اس کا وقت نہیں تھا۔

میزوں پر موجود افراد نے محض اک نگاہِ غلط انداز سے ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ اپنے اپنے شغل میں منہمک ہو گئے۔ میں غیسو خان کی رہنمائی میں میزوں کے درمیان سے گزرتا آگے بڑھا۔ مجھے یہ سب کچھ دیکھ کر حقیقت میں تھوڑی بہت حیرت کا احساس ضرور ہو رہا تھا اور اس وقت میرے لیے چہرے سے بھی تھوڑی بہت حیرت کا اظہار کرنا ہی بہتر تھا۔

میں اردگرد دیکھتے ہوئے تھوڑا سا ہونق نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا اور غیسو خان کن انکھیوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے یقیناً دل ہی دل میں میری کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ جن کمروں کے دروازے بند نظر آ رہے تھے ان کے مصرف کا اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں تھا۔ یہاں یقیناً ہر قسم کی عیاشیوں کا بندوبست تھا۔

اسی اثنا میں ایک لمبا تڑنگا شخص کندھے پر رومال ڈالے، بوتل اور گلاسوں سے سجی ایک ٹرے اٹھائے سامنے سے آتا دکھائی دیا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ وہاں ویٹر کے فرائض انجام دے رہا تھا۔ غیسو پر نظر پڑتے ہی وہ یکدم مؤدب سا ہو کر اس کے لیے راستہ چھوڑ کر ایک میز سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تاہم وہ کچھ بولا نہیں۔ حتیٰ کہ اس نے سلام دعا وغیرہ بھی نہیں کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ غیر ضروری گفتگو کے قائل نہیں تھے۔ مجموعی طور پر وہاں بڑا سکون تھا اور ہال میں موجود لوگ اس ٹھکانے پر یقیناً اپنے آپ کو بے حد محفوظ محسوس کر رہے ہوں گے۔ وہ تاش اور مے نوشی کے شغل کے علاوہ اپنی ساتھی لڑکیوں سے گاہے گاہے اس حد تک دراز دستی بھی کیے جا رہے تھے جو عام جگہوں پر، عام حالات میں قابلِ دست اندازیٔ پولیس بھی ہو سکتی تھی۔

لیکن اس کے ردِعمل کے طور پر مخمور سے قہقہوں کے سوا کچھ

سنائی نہیں دے رہا تھا۔ کوئی ہلڑ بازی، شور شرابا نہیں تھا۔ نہایت مہذبانہ، ماحول تھا۔ بظاہر ویٹر نظر آنے والے شخص کے قریب سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ اس کی واسکٹ کی جیب سے کسی گن کا دستہ جھانک رہا تھا۔

میزوں کا سلسلہ ختم ہوا تو ایک ستون کے قریب سے نمیسو دائیں طرف مُڑ گیا۔ سامنے ہی ایک بہت بڑا کاؤنٹر تھا۔ اس کے عقب میں مجھے جو بار نظر آیا تھا، اتنا بڑا بار میں نے اس سے پہلے کبھی حقیقی زندگی میں یا فلموں میں نہیں دیکھا تھا۔ چھت تک پہنچنے والے لمبے چوڑے شیلف، رنگا رنگ اور ایک سے ایک مہنگی ولایتی شرابوں کی بوتلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اتنی زیادہ بوتلوں کی موجودگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ یہاں طلبگاروں کو جام کے حساب سے نہیں، بوتل ہی کے حساب سے سپلائی جاری تھی۔

کاؤنٹر کے عقب میں ایک دراز قد اور وجیہہ نوجوان موجود تھا۔ وہ عمر میں مجھ سے چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ صاف ستھری شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ اگر وہ چند کتابیں یا فائل لیے یہاں کے بجائے کسی سڑک پر کھڑا ہوتا تو کالج یا یونیورسٹی کا طالب علم معلوم ہوتا۔ وہ یہاں کا پہلا شخص تھا جس کی طرف دیکھ کر نمیسو خان باقاعدہ مسکرایا۔ اس نوجوان سے نمیسو نے مصافحہ بھی کیا۔

نمیسو کا اشارہ پاکر میں بھی اس کے ساتھ .... کاؤنٹر کے عقب میں چلا گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے کافی کشادہ جگہ موجود تھی۔ وہاں چند کرسیاں بھی پڑی تھیں۔ نمیسو نے اپنی گن ایک کرسی کے سہارے کھڑی کی اور اسی کرسی پر اپنے مخصوص انداز میں پھیل کر بیٹھتے ہوئے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں دوسری کرسی پر بیٹھ چکا تو نمیسو بیڑی سلگانے لگا۔ میں نے غیر محسوس طور پر کاؤنٹر کے نیچے موجود بڑے بڑے شیلفوں کا جائزہ لیا۔ کئی شیلفوں میں تو چھوٹے بڑے کارٹن ٹھنسے ہوئے تھے جن کے بارے میں مجھے اندازہ نہیں ہوسکا کہ وہ کس چیز کے تھے۔ لیکن ایک چیز جسے عام طور پر چھپا کر رکھا جاتا ہے، وہ ایک شیلف میں بے پروائی سے بکھری ہوئی تھی۔ وہ چیز نقدی تھی!

وہ یقیناً کئی لاکھ روپے کی رقم تھی جو نئے اور پرانے نوٹوں کی گڈیوں کی صورت میں بے ترتیبی سے شیلف میں پڑی تھی۔ نمیسو نے بھی ایک نظر رقم کی طرف دیکھا اور طمانیت سے مسکرادیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک کچھ بڑھ گئی۔

ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر وہ شاہانہ انداز میں گردن ہلاتے ہوئے نوجوان سے مخاطب ہوا "کیسا جارہا ہے دھندا؟"

"فرسٹ کلاس۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"اور حالات کیسے ہیں؟"

"حالات بھی بالکل ٹھیک ہیں۔"

"کوئی پریشانی تو نہیں؟" نمیسو نے مونچھ کو بل دیتے ہوئے پوچھا۔

"تم جیسے مالکوں اور سرپرستوں کے ہوتے ہوئے ہمیں کیا پریشانی ہوسکتی ہے؟" نوجوان مسکرایا۔

یہاں میں ایک بار پھر وضاحت کرتا چلوں کہ ان علاقوں میں ہم سب کے درمیان گفتگو مقامی زبان میں ہی ہوتی تھی۔ میرے بارے میں یہ تو ظاہر ہو ہی جاتا تھا کہ میں غیر مقامی تھا لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ میں بھی مقامی زبان ہی بولنے کی کوشش کرتا تھا اور ہر دن گزرنے کے ساتھ نہایت تیزی سے اس پر حاوی ہوتا جارہا تھا..... لیکن بہتر یہی ہوگا کہ تمام مکالمے آپ اُردو میں پڑھیں تاکہ بات کا اصل مفہوم سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔ مقصد تو محض مفہوم ہی آپ تک پہنچانا ہے۔ زبان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ زبان تو محض رابطے کا ایک ذریعہ ہے۔ بہرحال اتنا ضرور ہے کہ کم از کم پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں میں سے جتنی بھی زیادہ سے زیادہ زبانیں آپ کو آتی ہوں، اتنا ہی اچھا ہے۔ ہر علاقے کے لوگوں سے گھلنے ملنے میں آسانی رہتی ہے۔ آپ جہاں بھی جاتے ہیں، جلد ہی اپنائیت بھرا ماحول تخلیق کرنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں۔

وہاں ملازم ٹائپ دو تین افراد اور بھی نظر آرہے تھے۔ ایک طرف ایک کھلا دروازہ نظر آرہا تھا۔ اس کے عقب سے بھنے ہوئے گوشت اور کھانے پینے کی دوسری چیزوں کی خوشبوئیں آرہی تھیں..... لیکن عجیب بات یہ تھی کہ کچن کا جو ایک مخصوص ساحبس اور تپش ہوتی ہے اس کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس بند جگہ میں ہوا کی آمدورفت کا یقیناً کوئی معقول ذریعہ موجود تھا۔

نمیسو خان نے گویا نوجوان کے جوابات سے مطمئن ہو کر بیڑی کا ایک گہرا کش لیا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا۔ "وزیر خان نے مال بھجوادیا تھا؟"

"جی ہاں۔ اس نے وعدے کے مطابق ڈلیوری دے دی ہے۔ حالانکہ سنا ہے، سرحد کے قریب سے اس کے ٹرک روانہ ہوئے تو پشاور کے راستے میں ہی پکڑے گئے تھے لیکن اس نے جس سے جو وعدہ کیا تھا، وہ پورا کردیا۔" نوجوان نے جواب دیا۔

"ان کاموں میں اس طرح تو ہوتا رہتا ہے۔" نمیسو بے پروائی سے مسکرایا۔ "ٹرک ورک تو پکڑے ہی جاتے ہیں مگر وزیر خان جیسے اچھے کاروباری لوگ اپنے وعدے پورے کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ نکال لیتے ہیں۔ ویسے بھی وزیر خان نے روسی اسلحے کے کاروبار میں بہت کمایا ہے۔ ایک دو ٹرک جانے سے اسے کیا فرق پڑتا ہے۔ ویسے آدمی وہ بہت سمجھدار اور بڑی پہنچ والا ہے۔ مجھے امید ہے جو ٹرک پکڑے گئے ہیں وہ بھی نکلوالے گا۔"

"اب تو ذرا مشکل ہی ہے۔ اخباروں میں خبریں وغیرہ آگئی ہیں۔" نوجوان نے محتاط سے لہجے میں کہا۔

نمیسو خان نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور اس کے بازو پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "طاہر شاہ! تم اب بھی کبھی کبھی پڑھے لکھوں والی..... میرا مطلب ہے بے وقوفوں والی باتیں کرجاتے ہو۔ اخباروں میں تو پتا نہیں کیا کیا خبریں آتی رہتی ہیں۔ اس سے کیا وہ کام رک جاتے ہیں جو دنیا میں ہو رہے ہیں؟ ارے بابا..... اخباروں کا کام شور مچانا ہے۔ وہ مچاتے رہتے ہیں۔ یعنی اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ دوسروں کو جو کرنا ہے وہ کرتے رہتے ہیں۔ سب اپنے اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کسی کی وجہ سے کسی کے کام میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر پڑتا ہے تو وہ خود ہی اس کو ٹھیک کرلیتا ہے۔ آج کل سب نے اپنے راستے کی رکاوٹ دور کرنا سیکھ لیا ہے۔ ہمارے ہاں ویسے بھی ہر رکاوٹ ہٹنے کے لیے ہی ہوتی ہے۔ ہر قانون ٹوٹنے کے لیے ہی بنتا ہے۔ توڑنے والے ہاتھ مضبوط ہونے چاہئیں۔ ہماری یا وزیر خان جیسے آدمیوں کی جڑیں جہاں جاکر ملتی ہیں وہاں اخباروں کی حیثیت ردی کے پلندوں سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سائیں!" طاہر شاہ نامی اس نوجوان نے پُرخیال انداز میں سرہلایا۔

"خیر..... چھوڑو ان باتوں کو..... یہ بتاؤ دس پیٹیاں آئی ہیں نا؟" نمیسو نے بے پروائی سے سر جھٹکتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں، مال تو پورا ہے۔ میں نے چیک کرلیا تھا۔ اس مرتبہ کلاشنکوف کا جو ماڈل آیا ہے وہ پہلے والی سے بہتر ہے۔" طاہر شاہ بولا۔

"ہر نئی چیز، پرانی سے بہتر ہوتی ہے۔ سوائے شراب کے۔" نمیسو نے ایک بار پھر مونچھ کو بل دیا۔

"لیکن اپنے ہاں تو اگر کوئی چیز پاپولر ہوجائے تو اس کا معیار گر جاتا ہے۔ صرف نام کے سہارے لوگوں کو لوٹنے کی کوشش شروع ہوجاتی ہے۔ یا پھر اس چیز کی چار چھ نقلیں سامنے آجاتی ہیں۔" طاہر شاہ بولا۔

"ہاں لیکن یہ بدبخت غیر مُسلم ایسا نہیں کرتے۔ ان کی کوئی چیز دُنیا میں مقبول ہوجائے تو یہ اسے کچھ اور بہتر بنا کر مارکیٹ میں لانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کے ہاں نقل بنانے کا اول تو سلسلہ ہی نہیں ہے اور اگر کوئی نقل بنا کر پکڑا جائے تو رشوت دے کر چھوٹ نہیں سکتا اور نہ ہی لوگوں کے ماہانہ وظیفے باندھ کر اپنا کاروبار جاری رکھ سکتا ہے۔ یہ بڑی خرابی ہے ان بے ایمانوں میں۔" نمیسو خان مسکرایا۔

طاہر شاہ بھی مسکرادیا۔ اس دوران وہ ہمارے لیے ٹھنڈی بیئر کے دو گلاس بھر چکا تھا۔ اسے مزید ٹھنڈی کرنے کے لیے اس نے اس میں برف بھی ڈالی تھی۔ اس ویرانے میں ضرورت کی ہر چیز ہی موجود تھی۔

نمیسو نے تو اس کے ہاتھ سے گلاس لے کر ہونٹوں سے لگالیا لیکن طاہر شاہ نے دوسرا گلاس میری طرف بڑھایا تو میں نے ہونق نظر آنے کی حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے نفی میں سرہلا کر کہا۔

"میں تو سادہ پانی پیوں گا۔"

نمیسو اپنا بیلچہ نما ہاتھ میرے گھٹنے پر مارتے ہوئے بولا "ابے اُلو! یہ سادہ پانی ہی ہے۔ ایسے ہی ذرا شو بنانے کے لیے فیکٹری والوں نے اس میں تھوڑا سا رنگ ڈال دیا ہے۔"

"نہیں۔ مجھے پتا ہے یہ بیئر ہے۔" میں نے اپنے آپ کو عقلمند ظاہر کرنے کی کوشش کی اور ساتھ ہی اصرار کیا۔ "میں تو سادہ پانی ہی پیوں گا۔"

طاہر شاہ نے سوالیہ نظروں سے نمیسو کی طرف دیکھا۔ نمیسو کندھے اُچکاتے ہوئے بولا "دے دو یار! اس بدنصیب کو سادہ پانی ہی دے دو۔ یہ ہمارا نیا رنگروٹ ہے۔ ویسے اس نے انٹرویو پاس کرلیا ہے۔" اس نے ہاتھ بڑھا کر طاہر شاہ سے دوسرا گلاس بھی لے لیا۔

طاہر شاہ نے ایک بڑے سے کولر سے پانی کا گلاس بھر کر مجھے دیا۔ پانی خوب ٹھنڈا تھا۔ وہ جگہ گویا جنگل میں منگل کی تصویر تھی۔ دولت میں واقعی بڑی طاقت ہے۔ دولت اپنی آسائشیں اپنے ساتھ کہیں بھی لے جاسکتی ہے۔

ایک گلاس خالی کرکے نمیسو خان نے طاہر شاہ کی طرف بڑھایا اور سوچ میں ڈوبے لہجے میں بولا "یہ ڈلیوری بڑے صحیح وقت پر آئی ہے۔ اسلحے کی ضرورت بڑھتی جارہی ہے۔ اگلی مرتبہ وزیر خان کو پیغام بھجوانا ہے کہ کچھ راکٹ لانچروں کا بندوبست کرے۔"

"کیا تم لوگ کسی سے جنگ لڑنے کی تیاری کررہے ہو؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

نمیسو خان نے اپنے مخصوص انداز میں قہقہہ لگایا جس میں

بھیڑیے کی سی غراہٹ نمایاں تھی پھر وہ آنکھیں سکیڑتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "ہم تو ہر وقت ہی حالتِ جنگ میں ہوتے ہیں میرے چاند! پولیس کے سر پھرے افسروں سے ..... رینجرز سے..... شریف شہریوں اور دیہاتیوں سے.... موٹی اسامیوں سے... بھیس بدل کر آنے والے دشمنوں سے... اور نہ جانے کس کس سے ہر وقت ہی ہماری جنگ جاری رہتی ہے۔"

"ہاں..... یہ تو ٹھیک ہے۔" میں نے سرہلا کر گویا اس کی دانشورانہ بات کی داد دی۔

چند لمحوں میں اس نے بیئر کا دوسرا گلاس بھی خالی کر دیا اور یکدم اٹھتے ہوئے طاہر شاہ سے مخاطب ہوا "آؤ..... ذرا مال تو دکھاؤ۔"

طاہر شاہ نے ایک اور شخص کو بلا کر کاؤنٹر پر کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ تمیسو خان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم بھی آؤ۔"

ہم گھوم کر کاؤنٹر کے بائیں طرف والی دیوار کے عقب میں پہنچے۔ اس طرف ایک تنگ گلی سی تھی جس کے اختتام پر ایک اونچا چوبی دروازہ تھا جو دیکھنے میں ہی بڑا مضبوط معلوم ہو رہا تھا۔

طاہر شاہ نے ایک بڑی سی چابی نکال کر اس کا تالا کھولا اور ہم اندر پہنچے۔ یہاں چاروں طرف بڑے بڑے کارٹن اور چوبی پیٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کمرے کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عیاشی اور قمار بازی کے کسی زیرِ زمین اڈے کا حصہ تھا۔ یہ بڑا سا کمرا کسی تاجر کا گودام معلوم ہوتا تھا۔

پیٹیاں چھت تک پہنچی ہوئی تھیں۔ ان میں سے بیشتر شاید شراب کی بوتلوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ان پر صرف شیشے کے سامان کا علامتی نشان یعنی جام نظر آ رہا تھا اور 'احتیاط سے ہینڈل کیجئے' کے الفاظ چھپے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں لکھا تھا۔ لکڑی کی کئی پیٹیاں تو غیر معمولی طور پر بڑی تھیں اور ٹین کی پٹیوں کی مدد سے بڑی مضبوطی سے بند تھیں۔ اسی کمرے میں ایک طرف مجھے اوپر نیچے چار جنریٹر رکھے نظر آئے..... لیکن وہ چل نہیں رہے تھے۔ شاید وہ فاضل تھے۔

ان کے قریب ہی کھردری لکڑی کی دس پیٹیاں رکھی تھیں۔ وہ بظاہر پھلوں کی پیٹیوں سے مشابہ تھیں لیکن ان سے کچھ بڑی اور بہتر کوالٹی کی نظر آ رہی تھیں۔ وہ بالکل نئی معلوم ہوتی تھیں۔ ان میں سے ایک کا اوپر کا تختہ کھولا جا چکا تھا اور وہ اس کے اوپر ہی رکھا تھا۔ اس طرف سے کاغذ کی کترن بھی جھانک رہی تھی۔ ان پیٹیوں پر نہ تو کوئی نشان تھا اور نہ ہی کچھ لکھا ہوا تھا تاہم وہ بالکل عام اور بے ضرر سی دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسی پیٹیاں بہت سی چیزوں کی نقل و حمل میں استعمال ہوتی تھیں۔

طاہر شاہ کھلی پیٹی کے پاس جا کر کا اکھڑا ہوا تختہ نیچے رکھ کر اس نے کترن میں ہاتھ مارا اور پولیتھین کے موٹے تھیلے میں لپٹی ہوئی ایک سیاہ کلاشنکوف نکالی۔ اسے تھیلے سے نکالتے ہوئے وہ بولا "باقی گنوں کی معمولی سی اسمبلنگ ہونی ہے۔ میں نے صرف یہ ایک ہی گن جوڑی تھی۔"

"آزما کر بھی دیکھی ہوگی؟" خمیسو نے ملائمت سے پوچھا۔

"ہاں" طاہر شاہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولا "تبھی تو اندازہ ہوا ہے کہ یہ ماڈل اس سے بہتر ہے جو ہمارے زیادہ استعمال میں رہا ہے۔"

سیاہ اسٹیل کی گنیں... خصوصاً جب وہ نئی ہوتی ہیں تو خاصی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں لیکن اگر انہیں ذرا غور سے دیکھا جائے تو ان میں ایک عجیب خوفناک سی بدصورتی نمایاں ہوتی محسوس ہوتی ہے۔ شاید یہ موت کی بدصورتی ہوتی ہے۔

میں اپنے ملک میں مختلف جگہوں پر اور مختلف موقعوں پر مختلف اتفاقات کے تحت جس طرح اسلحے کی ریل پیل دیکھ رہا تھا اور جیسی جیسی باتیں سننے میں آ رہی تھیں یا پہلے سے میرے علم میں تھیں' ان سے کچھ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہماری آدھی قوم حالتِ جنگ میں تھی..... لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر یہ جنگ کس کے خلاف تھی؟ کیا باقی آدھی قوم کے خلاف تھی؟

ایسا لگتا تھا جیسے ہر جگہ کسی نہ کسی روپ میں' کسی نہ کسی بہانے سے' کسی نہ کسی جواز کے ساتھ چھوٹی چھوٹی متوازی فوج تیار ہو رہی تھی۔ کہیں یہ فوج ڈاکوؤں کی صورت میں تھی' کہیں بڑے بڑے لوگوں کی ذاتی اور نجی فورس کی صورت میں.... کہیں ان کے محافظوں کی صورت میں.. کہیں قبیلوں کی صورت میں.... کہیں سیاسی پارٹیوں کے کسی وِنگ کی صورت میں.... کہیں ڈرگ مافیا کی صورت میں.... کہیں بدمعاشوں کے گروہوں کی صورت میں۔

یہ سب چھوٹی چھوٹی فوجیں نہایت منظم تھیں اور حیرت انگیز حد تک اپنے آپ کو مسلح کر چکی تھیں۔ کبھی کبھی میں گہرائی میں جا کر سوچتا تھا تو تشویش سے میری راتوں کی نیند حرام ہونے لگتی تھی کہ آخر یہ بڑے بڑے مسلح جتھے ملک کو کہاں لے جانا چاہتے تھے؟ ان کی موجودگی کا جواز کیا تھا؟ انہیں اس قدر منظم اور مسلح ہونے کی ضرورت کیا تھی؟

ایک آزاد ملک میں' اپنے ہی بھائیوں اور ہم وطنوں میں رہتے ہوئے یہ جتھے کیوں زیادہ سے زیادہ اسلحہ جمع کرنے کی دوڑ میں لگے ہوئے تھے؟ یہ صرف اپنے اعمال کا خوف تھا یا کچھ اور مقاصد کی تیاریاں تھیں؟ اربابِ اختیار نے کیوں اس طرف سے آنکھیں بند کر رکھی تھیں؟ آخر ہمارے ہاں قانون اس وقت ہی کیوں حرکت میں آتا تھا جب پانی سر سے گزر جاتا تھا؟ بلکہ صحیح معنوں میں تو اس وقت بھی حرکت میں نہیں آتا تھا... لنگڑے لولے انداز میں دو چار قدم اٹھا کر رہ جاتا تھا۔

اِدھر ان جتھوں کا جذبہ اور جوش و خروش دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان پر کسی نادیدہ دشمن ملک نے خدانخواستہ تسلط جما رکھا ہو' انہیں اپنا غلام بنا رکھا ہو اور وہ بڑے زبردست جذبۂ جہاد کے ساتھ غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے نہایت اعلیٰ درجے کے حُریت پسندوں کی طرح گوریلا جنگ میں مصروف ہوں یا پھر اس کی تیاریاں کر رہے ہوں۔ آخر یہ سب کیا مذاق تھا؟ ملک کے چپے چپے میں پھیلتے ہوئے یہ جتھے کیا کسی کی نظر میں کوئی مسئلہ نہیں تھے؟ آخر یہ سیلاب کہاں جا کر رکے گا؟ اسلحہ تیار کرنے والوں کو تو صرف منڈیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا ہم صرف منڈی بننے اور جنازے اٹھانے کے لیے رہ گئے تھے؟

طاہر شاہ اسلحے کے کسی سیلزمین کے سے انداز میں تمیسو کو بتا رہا تھا "یہ ماڈل صرف ہلکی مشین گن کے طور پر استعمال نہیں ہوتا' یہ رائفل کا کام بھی دے سکتا ہے۔ بڑی اچھی چیز بنائی ہے کمبختوں نے۔ اس میں چار قسم کی گولیاں استعمال ہو سکتی ہیں۔ ایک تو کم رینج کی گولیاں ہوتی ہیں جو قریب کے دشمن کے پرخچے اڑانے کے علاوہ راستے کی رکاوٹیں دور کرنے کے بھی کام آتی ہیں۔" پھر اس نے وضاحت کی "ان گولیوں کا اگر آپ ایک ہی لیول پر برسٹ ماریں تو وہ درخت کو کاٹ کر گرا سکتی ہیں۔ لوہے کے گیٹ وغیرہ توڑ سکتی ہیں۔ دوسری قسم کی گولیاں لمبی رینج کے لیے ہوتی ہیں۔ دور کے دشمن سے مقابلے کے لیے۔ تیسری قسم کی گولیاں تباہی پھیلانے کے ساتھ ساتھ زبردست قسم کی آواز بھی پیدا کرتی ہیں جسے سن کر اچھے بھلے سورماؤں کے دل بھی دہل جاتے ہیں....."

وہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرایا "سنا ہے پولیس والوں کو بھگانے کے لیے تو وہ آواز ہی کافی ثابت ہو رہی ہے۔ چوتھی قسم کی گولیاں میں نے آزما کر تو نہیں دیکھیں لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ وہ بھی بڑی ٹھیک ٹھاک اور کارآمد ہیں۔ وہ بورنگ والی ٹیکنیک سے نکلتی ہیں یعنی برمے کی طرح گھومتی ہوئی جاتی ہیں اور بڑی موٹی موٹی ٹھوس رکاوٹوں سے بھی گزر جاتی ہیں۔"

طاہر شاہ نے یہ سب کچھ بتا کر داد طلب سی نظروں سے تمیسو خان کی طرف دیکھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ گن اسی نے ایجاد کی ہو اور درحقیقت وہ ایک مہلک ہتھیار نہیں بلکہ بنی نوعِ انسان کے لیے بہت ہی فائدہ مند قسم کی سائنسی ایجاد ہو۔

"چیز تو واقعی کام کی ہے۔" تمیسو خان گن کو الٹتے پلٹتے ہوئے بولا "اپنے جانو کو نئی نئی چیزوں کی فوراً خبر ہو جاتی ہے اور وہ انہیں منگوانے میں بھی ذرا دیر نہیں کرتا۔ جس طرح دولت کماتا ہے اسی طرح خرچ بھی کرتا ہے۔ اس کی عقل کا کوئی جواب نہیں۔"

"اسی لیے تو وہ سردار ہے۔" طاہر شاہ متانت سے بولا۔ وہ اپنے لہجے اور اندازِ گفتگو سے پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا لیکن جہاں وہ موجود تھا اور جو کچھ کر رہا تھا اسے دیکھ کر فی الحال میں صرف حیران

ہی ہو سکتا تھا۔

نمیسو خان گن کا اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد گویا مطمئن ہو کر طاہر شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے۔ فی الحال تو اسے رکھو اور اس پیٹی کو بھی پیک کردو۔ میں جانو کو بتادوں گا کہ مال آگیا ہے۔ وہ خود ہی منگوانے کا بندوبست کرلے گا۔ ان کے ساتھ ایمونیشن تو ٹھیک ٹھاک آیا ہے نا؟"

"تین پیٹیاں ہیں۔" طاہر شاہ مطمئن لہجے میں بولا "اب تو ویسے بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ آدمی جوا ایسا مل گیا ہے۔ ادھر پیسے دو اور دوسرے دن ڈلیوری لے لو۔"

"بہت اچھے۔ بہت اچھے۔ جانو زندہ باد۔" نمیسو نے چھت کی طرف انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ طاہر شاہ نے مسکراتے ہوئے گن پیٹی میں واپس رکھ دی اور ہم دوبارہ کاؤنٹر کے پیچھے آگئے۔

طاہر شاہ جس شخص کو اپنی جگہ پر کھڑا کرکے گیا تھا وہ نہایت انہماک سے گلاس صاف کرکے ایک ٹرے میں سجا رہا تھا۔ وہ ہماری طرف نظر اٹھا کر دیکھے بغیر پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے یقیناً اپنے ہاتھ کی رسائی میں موجود رقم کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ کچن میں چلا گیا۔ ہم اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

طاہر شاہ نے نوٹوں کی گڈیاں کاؤنٹر کے نیچے سے نکال کر ترتیب سے ایک اخبار پر رکھنی شروع کیں۔ سلیقے سے سب گڈیاں کم سے کم جگہ میں رکھنے کے بعد اس نے پیکٹ بنایا اور اس پر اچھی طرح ڈوری لپیٹی۔ یہ پیکٹ اس نے یک شاپنگ بیگ میں ڈال کر اسے گرہ لگائی اور نمیسو خان کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "پانچ لاکھ ہیں۔"

نمیسو خان نے مطمئن انداز میں سرہلانے پر اکتفا کیا اور پیکٹ لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا۔ سلگتی بیڑی بے پروائی سے اپنی آہنی انگلیوں سے مسل کر پھینکتے ہوئے بولا "ابھی اسے یہیں رکھو۔ میں ذرا جانِ تمنا سے تو مل آؤں۔"

'جانِ تمنا' اس نے نہایت معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ تاہم دونوں کے چہروں پر سنجیدگی ہی طاری رہی تھی۔ طاہر شاہ نے رقم کا بنڈل اٹھا کر کاؤنٹر کے نیچے رکھ دیا پھر وہ جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکال کر نمیسو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا "اس پر حساب ہے۔ آپ چیک کرلیں۔"

نمیسو خان کاغذ کھول کر دیکھے بغیر اس کا ہاتھ پیچھے دھکیلتے ہوئے بولا "اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ تم اب ان لوگوں میں سے ہو جن سے حساب لیا جاتا ہے۔ اپنی ایمانداری کی وجہ سے بہت جلدی ہم لوگوں کی نظر میں بڑا مقام بنالیا ہے۔ ہم [illegible] قدر کرتے ہیں۔"

"آپ لوگوں کی مہربانی ہے۔" طاہر شاہ عجیب سے انداز میں [illegible] ایمانداروں کے قدردان ملے بھی تو کہاں ملے۔ میں باہر [illegible] انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گیا تھا۔"

نمیسو خان نے کو نجیا سا قہقہہ لگایا اور فضا میں ارتعاش سا پیدا ہوگیا۔ تاہم وہ طاہر شاہ کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اٹھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "آؤ تم کچھ دیر ہال میں لوگوں کے درمیان بیٹھو، کچھ پیو پلاؤ' کسی محبوب مٹخے کے ساتھ اچھا وقت گزارو، گپ شپ کرو۔ تمہارا کچھ خرچ نہیں ہوگا۔"

میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہال میں آگیا۔ یہاں اب بہت سے مردوں اور عورتوں کا اضافہ ہوگیا تھا۔ باتوں کی بھنبھناہٹ اور مترنم و مخمور قہقہوں کی کھنکھناہٹ کچھ بڑھ گئی تھی۔

ایک میز پر ایک لڑکی تنہا بیٹھی تھی۔ بنیادی طور پر وہ دیہاتی معلوم ہوتی تھی لیکن شہری سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ گھنگریالے بالوں کی لٹیں بے ترتیبی سے اس کے کندھوں اور کمر پر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی رنگت چنبیلی جیسی تھی اور اس میں موم کی سی دُھندلی چمک تھی جیسے وہ دھوپ اور روشنی میں بہت کم جاتی ہو۔ اپنی رنگت کی اس خفیف سی زردی کے باعث وہ کچھ بیمار بیمار سی لگ رہی تھی۔

اس کی موٹی موٹی آنکھیں بھی خوبصورت تھیں لیکن ان آنکھوں میں ہلکی سی نمی اور گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جس کے دُھوئیں کی بُو بتا رہی تھی کہ سگریٹ سادہ نہیں تھی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے سوتی لباس میں تھی مگر اس کے جسم کا خزانہ جو نہ جانے کب سے لُٹ رہا تھا' اس بے چارے چند گز کپڑے سے سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔

وہ لڑکی بیٹھی تو اس ہال میں تھی لیکن اس کا ذہن نہ جانے کہاں تھا۔ لمبی لمبی پلکیں اٹھا کر اس نے بے پروائی سے ہماری طرف دیکھا۔

"تم اس کے پاس بیٹھو۔" نمیسو نے گویا مجھے بہت اہم مشورہ دیا۔ "اس کا نام نوری ہے لیکن یہ وہ نوری نہیں ہے جس سے جام تماچی نے عشق کیا تھا۔ وہ بڑی شریف نوری تھی۔ یہ ذرا دوسری طرح کی نوری ہے۔ یہ شہر جاکر نورین بن گئی ہے۔ بڑے غضب کی عورت ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ اس دیہاتی لڑکی کے سامنے سفید چمڑی والی میمیں بھی کچھ نہیں۔ میں کسی اور سے ملنے جارہا ہوں ورنہ میں خود اس کی قربت کی چھاؤں میں بیٹھنا پسند کرتا۔"

اس کی بات سن کر بھی لڑکی کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔۔۔ پھر وہ بے پروائی سے دوسری طرف دیکھ کر سگریٹ کا کش لینے لگی۔

نمیسو خان نے میرا کندھا دباتے ہوئے مجھے اس کے مقابل بٹھادیا۔ اس نے اپنی بھوکی نظریں گویا بہ مشکل لڑکی کے وجود سے ہٹائیں اور ایک آنکھ دبا کر مسکراتے ہوئے بولا "بیرا آئے گا' جو کچھ کھانا' پینا ہو' بے دھڑک منگالینا۔ زندگی موت کا کچھ پتا نہیں۔ جو موقع میسر آتا ہے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤ۔"

میں نے ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں بیٹھ کر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا "میں تو صرف کولڈ ڈرنک پیوں گا۔"

"زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔" نمیسو نے جانے کیوں ایک بار پھر جتایا۔ شاید یہی ان کا فلسفۂ حیات تھا۔ "جو بھی کچھ میسّر ہو' سمیٹ لینا چاہیے۔ کہیں بعد میں صرف پچھتاوا نہ رہ جائے۔" ایسا لگتا تھا کہ صرف ڈاکوؤں کا ہی نہیں بلکہ ملک کی اسّی فیصد آبادی کا نظریۂ حیات آج کل یہی ہوگیا تھا جو نمیسو خان کہہ رہا تھا۔

"میں نے اب کسی بھی بات پر پچھتانا چھوڑ دیا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

تب لڑکی نے نہایت آہستگی سے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی کچھ گہری ہوچکی تھی۔ اس میں شاید کچھ شکستہ خوابوں کے خون کی سرخی بھی شامل تھی۔ اس کی سگریٹ تقریباً ختم ہوچکی تھی مگر وہ اسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس سے زیادہ سے زیادہ تسکین کشید کرنے کی کوشش کررہی تھی۔

نمیسو خان نے ہاتھ ہلایا اور دائیں طرف والی کمروں کی قطار کی طرف چل دیا۔ ایک ستون کے قریب بیرا ٹائپ ایک شخص کھڑا عقابی نظروں سے ہال کا جائزہ لے رہا تھا۔ نمیسو اس کے سامنے جارُکا۔ اس نے ذرا چونک کر نمیسو کو دیکھا اور ہڑبڑا کر یک دم مؤدب سا ہوگیا۔ نمیسو نے اس سے کچھ پوچھا۔ اس شخص نے ایک کمرے کے بند دروازے کی طرف اشارہ کیا۔

نمیسو خان نے جاکر اس کمرے کے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور میں نے ایک گوری چٹی قد آور' خوبصورت عورت کی جھلک دیکھی۔ وہ شاید نیند سے اٹھی تھی۔ اس کے بھورے بال منتشر تھے اور وہ گلابی رنگ کی ایک خوبصورت نائٹی میں تھی۔ یہ سب نظارے میرے لیے خاصے حیران کُن تھے۔ میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ اس ویرانے میں' زیرِ زمین مجھے یہ سب کچھ دیکھنے کو ملے گا۔

عورت' نمیسو کو دیکھ کر تھکے تھکے سے انداز میں مسکرائی۔ اس مسکراہٹ میں تھکن کے علاوہ شاید مجبوری بھی شامل تھی۔ نمیسو خان نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتا' مونچھ کو بل دیتا کمرے میں داخل ہوگیا اور کمرے کا دروازہ دوبارہ بند ہوگیا۔ میں نے زندگی میں بہت سے بھاری بھرکم افراد دیکھے تھے لیکن ان کے چلنے سے زمین میں دھمک محسوس نہیں ہوتی تھی۔۔۔۔ جبکہ نمیسو خان کچھ ایسا گرانڈیل بھی نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ جب وہ اپنے مخصوص نپے تلے انداز میں قدم اٹھاتا تھا تو زمین میں ہلکی سی دھمک ہوتی تھی۔ لگتا کچھ ایسا تھا جیسے اس کا ابلیسی سا وجود ٹھوس لوہے سے بنا ہوا تھا۔

چند لمحے تک اس کمرے کے بند دروازے کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد میں نے گردن سیدھی کی اور یہ دیکھ کر اطمینان کی سانس لی کہ لڑکی نے بالآخر سگریٹ کے اس ٹوٹے کا پیچھا چھوڑ دیا تھا جس کی لمبائی بہ مشکل ایک چوتھائی رہ گئی تھی۔ اگر وہ اب بھی اس سے سرور کشید کرنے کی کوششوں میں لگی رہتی تو شاید کچھ چنگاریاں ہی اس کی انگلیوں اور ہونٹوں کو جلاتی ہوئی اس کے حلق میں جاتیں۔

وہ انگلیاں ایک دوسری میں پھنسائے' کہنیاں میز پر ٹکائے ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ گول مٹول اور کلائیاں سڈول تھیں۔ ایک کلائی میں چاندی کا ایک ڈھیلا سا کنگن اٹکا ہوا تھا۔

"تو تمہارا نام نوری ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ درحقیقت میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا بات کروں۔

اس نے نہایت آہستگی سے پلکیں جھپکاتے ہوئے نفی میں سرہلایا اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی "نوری نہیں' نورین۔ نوری تو مدّت ہوئی مرچکی ہے۔"

اسی اثنا میں وہ بیرا نما شخصیت ہماری طرف آتی دکھائی دی جس سے چند لمحے پہلے نمیسو خان نے بات کی تھی۔ نورین گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آتے ہوئے سر جھٹک کر مشینی سے انداز میں بولی۔ "ہاں... بولو... کیا کھیلوگے... کیا کھاؤ گے' کیا پیو گے...؟ یا پھر ادھر چلنا ہے؟" اس نے کمروں کی طرف اشارہ کیا۔

"میں غریب سا آدمی ہوں۔" میں نے اپنے لہجے سے مسکینی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ "کھیلنے کھانے' پینے پلانے اور اس قسم کے کمروں کی طرف جانے کے شغل میری بساط سے باہر ہیں۔"

"تمہیں نمیسو خان یہاں بٹھا کر گیا ہے۔ تم اس وقت اپنے آپ کو بادشاہ سمجھو۔" وہ استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "تمہیں اپنی جیب اور اپنی حیثیت کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ صرف حکم کرو' ہر چیز اس میز پر پہنچ جائے گی۔ اور میں تو یہاں پہلے سے ہی موجود ہوں۔" اس نے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا۔ پھر ذرا توقف سے بولی "ویسے اتنی انکساری کی ضرورت نہیں۔ غریب آدمی کا بھلا یہاں کیا کام؟ یہ بہت مہنگی جگہ ہے۔"

اسی اثنا میں بیرا مؤدبانہ انداز میں ہماری میز کے قریب آکھڑا ہوا تھا لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے تمامتر مؤدبانہ انداز کے باوجود اسے صرف بیرا سمجھنا ذرا مشکل تھا۔ یقیناً وہ اور اس جیسے دوسرے تین چار افراد صرف بیرے نہیں تھے۔ ضرورت پڑنے پر محافظ یا لڑاکے بھی بن جاتے ہوں گے۔

"میرے لیے صرف کولڈ ڈرنک لے آؤ۔ ان خاتون کی مرضی انہی سے پوچھ لو۔" میں نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی نے بیزاری سے ہاتھ ہلا کر بیرے کو جانے کا اشارہ کردیا۔ میز پر اس کا پرس رکھا تھا۔ اس نے پرس کھول کر سگریٹ کا ایک پیکٹ نکالا اور نئی سگریٹ سُلگا کر ندیدے انداز میں طویل کش لے کر دُھواں میرے چہرے پر اُگل دیا۔

میں نے ناگواری محسوس کرتے ہوئے سانس روک لی۔ اس

پیکٹ میں شاید ساری سگریٹس پہلے ہی سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ عام سگریٹیں نہیں تھیں۔ کثیف اور بدبودار دھواں ہوا میں تحلیل ہوگیا تو میں نے دھیرے سے سانس لی۔

لڑکی نے ایک بار پھر گویا تصدیق چاہی "تمہیں کچھ پینا پلانا بھی نہیں ہے.... کھیلنا بھی نہیں ہے.... وہاں بھی نہیں جانا ہے۔" اس نے انگوٹھے سے کمروں کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں۔ یہ میرے شغل نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ مشینی سے انداز و اطوار اختیار کرنا میری عادت نہیں ہے۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"تم تو بہت ہی بیکار آدمی ہو۔ یہاں کس لیے آئے ہو.... جھک مارنے؟" اس نے جھلائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

زندگی کی حقیقتیں بڑی تلخ ہوتی ہیں۔ اگر ہم دونوں کسی افسانے کے کردار ہوتے تو وہ میری سادگی اور تعیشات سے میری بے نیازی دیکھ کر یقیناً بہت متاثر ہوتی۔ میں اس بھیڑ میں اسے ایک منفرد اور الگ تھلگ شخص نظر آتا اور وہ بڑے اشتیاق سے پوچھتی "آپ کون ہیں.... کہاں سے آئے ہیں.... آپ اب تک کہاں تھے....؟" وغیرہ وغیرہ۔

پھر اس پہلی ہی ملاقات میں، میں اس کے من مندر کا دیوتا بن جاتا.... لیکن حقیقی زندگی کے رنگ ڈھنگ کچھ اور ہی ہوتے ہیں۔ افسانہ آپ کے خوابوں کا دوسرا نام ہے۔ جبکہ حقیقی زندگی میں آپ کے خواب قدم قدم پر ٹوٹتے ہیں۔

نورین شاید انفرادیت، شرافت اور سادگی میں دلچسپی لینے کی حد سے بھی گزر چکی تھی۔ اس کی عمر کچھ ایسی زیادہ نہیں تھی لیکن شاید اس نے زندگی کو ہر پہلو سے برت لیا تھا اور ہر چیز سے اس کا اعتبار اٹھ چکا تھا "دو اور دو چار" کے علاوہ سب باتیں اس کے لیے بے معنی ہو چکی تھیں۔

یہاں کے ماحول نے میرے ذہن میں بے شمار اندیشوں، پُرپیچ سوالوں اور نہ جانے کیسے اُلجھے اُلجھے خیالات کی چبھن پیدا کردی تھی۔ اس چبھن سے نجات کے لیے میں نے گفتگو کے دامن میں پناہ تلاش کرنے کی کوشش کی۔

"تم کون ہو.... اور اس جگہ سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"سوالات کی یہاں کوئی گنجائش نہیں۔" اس نے قطعی رُکھائی سے کہا "اس چار دیواری میں سوالات کرنا سخت منع ہے۔ خصوصاً غیر ضروری سوالات۔ سوالات کرنے والے عموماً بے وقوف ہوتے ہیں۔ عقلمند لوگ سوال کیے بغیر سب کچھ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

ایک لمحے کے لیے میں دم بخود سا رہ گیا۔ پھر میں نے قدرے حیرت اور تاسف سے کہا "میں نے جو کچھ پوچھا کیا وہ غیر ضروری تھا؟"

"بالکل۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "مجھے بھی تو دیکھو۔ میں نے تمہارا نام تک نہیں پوچھا۔ میں تمہارے متعلق کچھ بھی نہیں جاننا چاہتی۔ پوچھنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ہم ایک دوسرے کے لیے ایسے ہی ہیں جیسے ٹرین میں بیٹھا ہوا مسافر اور راستے میں پٹڑی کے قریب کھڑا ایک درخت۔ شاید تم زندگی کی تیز رفتار ٹرین میں بیٹھے مسافر ہو اور میں باہر کھڑا درخت۔ یا پھر میں مسافر ہوں اور تم درخت.... بہرحال اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ قابلِ غور بات صرف یہ ہے کہ ہم صرف ایک پل کے لیے ایک دوسرے کے سامنے آئیں گے اور پھر ایک دوسرے کی نظر سے اوجھل ہو جائیں گے۔ تو پھر سوالوں میں اُلجھنے کی ضرورت کیا ہے؟ ٹرین میں بیٹھے مسافر درختوں سے یا درخت، مسافروں سے ان کے نام نہیں پوچھتے، ان کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔"

زندگی بعض لوگوں کے لیے بڑا سفاک استاد ثابت ہوتی ہے، بہت کم وقت میں انہیں جانے کیا کچھ سکھا جاتی ہے۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔ اس کے بھرے بھرے ہونٹ کچھ پیلے سے نظر آنے لگے۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "اگر تمہارا خیال ہے کہ میں نشے میں ہوں، اس لیے کچھ سوالوں کے جواب دے جاؤں گی.... تو تم غلطی پر ہو۔ میں نشے میں اور خواہ کچھ بھی کر گزروں لیکن سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی۔"

پھر وہ بیزاری آمیز سے انداز میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا اٹھنا بہرحال قیامت تھا۔ ایک لمحے کے لیے دل بے ایمان ہوا کہ میں بھی اس کا ہاتھ تھام کر کھڑا ہو جاؤں لیکن اسی ایک بے عنوان سی احتیاط نے دامن تھام لیا کہ یہ گھڑیاں کچھ ایسی سنہری بھی نہیں تھیں۔

وہ اپنا پرس اٹھاتے ہوئے صحیح طور پر میری طرف دیکھے بغیر بولی۔ "لگتا یہی ہے کہ تم اِدھر اُدھر کی باتوں کے علاوہ کچھ نہیں کرو گے۔ بالکل بیکار آدمی ہو تم۔"

وہ ایک ہاتھ میز پر رکھ کر ذرا جھکی اور نیچی آواز میں بولی۔ "میں بے شک سُست نظر آتی ہوں لیکن میں اتنی سُست نہیں ہوں۔ میں زندگی کے راستے پر بہت تیز چل رہی ہوں۔ بہت جلدی میں ہوں۔ جوانی بہت تیزی سے میری مٹھی سے نکلتی جارہی ہے اور میرے لیے اس کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی ہے۔ تم آرام سے بیٹھ کر کھیاں مارو۔ خدا حافظ۔"

وہ چلی تو اس کا انگ انگ گویا ہوا میں ہلکورے لے رہا تھا۔ وہ غالباً خاصی دور کسی میز پر جا بیٹھی لیکن وہ میز مجھے وہاں سے صحیح طور پر نظر نہیں آرہی تھی جہاں میں بیٹھا تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جہاں میں اپنا سا منہ لیے بیٹھا رہ گیا تھا۔

خاصی دیر تک میں یونہی ہونقوں کی طرح بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ بیرا میرے سامنے کولڈ ڈرنک کی بوتل رکھ کر چلا گیا۔ اردگرد اب بیشتر

میزیں بھر چکی تھیں۔ سب اپنے اپنے شغل میں لگے ہوئے تھے۔ ان میں نوجوان، ادھیڑ عمر اور بوڑھے سبھی تھے۔ ان میں سے کوئی کبھی کبھار گردن گھما کر میری طرف دیکھ لیتا تھا۔ ان کی نظریں بتاتی تھیں کہ انہیں یہاں میرے اجنبی ہونے کا احساس تھا۔ کمروں میں بھی مزید چند لوگوں کی آمدورفت نظر آئی تھی۔ کچھ مزید مہ رخوں کی موجودگی کا بھی علم ہوا۔ وہاں ہر طرح کی عیاشیوں کا سامان خاصے وسیع پیمانے پر موجود تھا۔ کیا ستم ظریفی تھی۔ شہروں میں قحبہ خانوں، قمار خانوں اور نائٹ کلبوں پر پابندی تھی لیکن جنگل میں ان سب کا کمپیکس موجود تھا۔

میز پر دو دن پرانا ایک غیر معروف سا علاقائی اخبار پڑا تھا۔ کم از کم میرے لیے وہ غیر معروف ہی تھا۔ میں نے اپنے آپ کو قدرے مضطرب محسوس کرتے ہوئے اس کی اوٹ میں پناہ لے لی۔ پہلے اور آخری صفحے پر اسی قسم کی خبریں تھیں جو برسوں سے چھپ رہی تھیں۔ بڑے لوگوں کے بیانات، فلاں کو فلاں غلط کام کی اجازت نہیں دی جائے گی اور فلاں کی منفی سرگرمیاں برداشت نہیں کی جائیں گی۔ ڈاکوؤں اور دہشت گردوں سے آہنی ہاتھ سے نمٹا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ سب کچھ میں ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے خوبصورت، پُرسکون اور محفوظ ٹھکانے پر بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ آہنی ہاتھ نہ جانے کہاں تھا اور کون سے ریشمی غلافوں میں چھپا ہوا تھا۔ میں اس ستم ظریفانہ صورتِ حال پر ہنسنا چاہتا تھا لیکن سینے میں صرف ایک ٹیس سی محسوس کر کے رہ گیا۔

کولڈ ڈرنک ختم کرنے کے بعد میں اطمینان سے اندرونی صفحات پر نظر دوڑانے لگا کیونکہ ممسو خان کی واپسی کے فی الحال آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ دفعتاً صفحے کے وسط میں چوطرفہ حاشیے میں چھپی ہوئی ایک تصویر پر میری نظر جم کر رہ گئی۔ بظاہر وہ ایک عام سا گروپ فوٹو تھا۔ نچلے طبقے کے کسی کنبے کا گروپ فوٹو لیکن اس میں کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی۔

اس اخبار کی چھپائی وغیرہ کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی لیکن عجیب اتفاق تھا کہ وہ تصویر نہایت صاف، واضح اور نمایاں چھپی ہوئی تھی۔

تصویر میں دائیں ہاتھ پر ایک باریش بوڑھا تھا۔ اس کا چہرہ بتاتا تھا کہ اس نے زندگی فقر و فاقے اور تنگدستی میں گزاری تھی لیکن قناعت اور شکر گزاری اس کی فطرت میں شامل رہی تھی مگر شاید اب وہ شکر گزاری اس کا ساتھ چھوڑ رہی تھی، رخصت ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ان گنت بددعائیں تھیں۔ وہ گویا کیمرے کی آنکھ کی طرف نہیں، پوری دنیا کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں پوری دنیا کے لیے نفرت تھی۔

اس کے قریب ہی ایک نوجوان لڑکی بیٹھی تھی جس کا چہرہ دوپٹے کے حلقے سے گھرا ہوا تھا۔ وہ ایک خوبصورت اور معصوم لڑکی تھی۔ وہ شاید تصویر کھنچوانا نہیں چاہتی تھی کیونکہ اس کا ایک ہاتھ مضطربانہ انداز میں اس کے کندھے تک پہنچا ہوا تھا جہاں اس نے اپنے دوپٹے کا ایک حصہ مٹھی میں جکڑا ہوا تھا۔ اسی ہچکچاہٹ اور اضطراب کے عالم میں کیمرے کی آنکھ نے اس کا عکس قید کرلیا تھا۔

مجھے کچھ دیر بعد اندازہ ہوا کہ اس کی ہچکچاہٹ کی وجہ غالباً یہ نہیں تھی کہ وہ بہت شرمیلی تھی بلکہ شاید اس کی عزتِ نفس اسے ڈسنے لگی تھی کہ اخبار میں اس کی تصویر آئے گی تو اس کی بے بسی، ناداری اور کسمپرسی یا اس کا نجی مسئلہ دنیا کے لیے ایک تماشا بنے گا۔ لوگ اس پر ترس کھائیں گے اور کچھ شاید اس کی محرومیوں سے بھی لذت اندوز ہوں گے۔ اس کی بڑی بڑی، وحشی آنکھوں میں اتھاہ غم بھی تھا، خجالت بھی اور شرمندگی بھی۔

لڑکی کے برابر دو چھوٹے چھوٹے بچے بیٹھے تھے۔ ان کی عمروں میں شاید ایک ڈیڑھ سال کا ہی فرق تھا۔ دونوں بچوں کے ہاتھ گود میں تھے اور وہ گردنیں ذرا ترچھی کیے معصوم اور حیران آنکھوں سے کیمرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کی تمام تر کم عمری، معصومیت اور حیرانی کے باوجود ایک تاثر ان کے چہروں پر بھی نمایاں تھا.... اور وہ تھا کوئی چیز چھن جانے کا تاثر۔ وہ محروم اور مظلوم بچوں کے چہرے تھے۔

ان کے پیچھے ایک فربہی مائل عورت سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ بھی دوپٹے کے حلقے میں گھرا ہوا تھا۔ سر جھکا ہونے کی وجہ سے چہرہ صحیح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن جتنا بھی نظر آرہا تھا، اس پُرحزن و ملال اور رنج و شکستگی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ اس کے وجود پر شاید افسردہ سوچوں کا بوجھ اتنا زیادہ تھا کہ اس سے سر اٹھائے نہیں اٹھ رہا تھا۔

گروپ فوٹوز میں عموماً چہرے اتنے واضح نظر نہیں آتے کہ ان کے پیچھے چھپے جذبوں کی کہانیاں پڑھی جاسکیں لیکن ایک تو اس گروپ فوٹو میں زیادہ افراد نہیں تھے، دوسرے اسے نمایاں کر کے چھاپا گیا تھا۔ شاید اس روز اخبار کے پاس فلیش کرنے کے لیے اس سے زیادہ اہم کوئی 'اسٹوری' نہیں تھی۔ ان چہروں کے بارے میں جو تاثر میں نے لیا تھا وہ بھی درحقیقت اسی وقت گہرا ہوا تھا جب میں نے اس تصویر سے متعلق تفصیلی خبر پڑھی تھی۔

جامی نگرانی چھوٹے سے قصبے سے نامہ نگار نے بڑے دل نشین انداز میں کہانی بنا کر بھیجی تھی۔ اس میں 'خبریت' کم تھی اور جذبات نگاری زیادہ۔ لیکن یہ حقیقی جذبات نگاری تھی.... اس میں کوئی انوکھی یا انہونی بات نہیں تھی۔ جن پر ایسے واقعات گزرتے ہیں، ان کا عالم عموماً یہی ہوتا ہے۔

وہ اخبار بے شک چھوٹا تھا اور اس واقعے کا تعلق بھی ایک قصبے سے تھا لیکن اس نامعلوم نامہ نگار کو یقیناً قلم سے اُنسیت تھی، ان کرداروں سے کچھ وابستگی تھی۔ لکھنے کا کچھ نہ کچھ سلیقہ تھا یا پھر شاید بات صرف اتنی تھی کہ اس کا احساس زندہ تھا اور اس نے

اس کنبے کا احوال لکھتے وقت صرف اخلاص سے کام لیا تھا۔ اس لیے اس تحریر اور تصویر میں اتنی تاثیر پیدا ہوگئی تھی کہ میں بار بار سب کچھ پڑھے جارہا تھا' بار بار تصویر کو دیکھے جارہا تھا۔ ورنہ اس سفاک دنیا کے نقطۂ نظر سے بات کچھ اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ آپ آئے دن اخبارات میں نہایت اختصار سے ایسے واقعات پڑھتے رہتے ہیں۔

یہ ڈکیتی کی اسی واردات کا شاخسانہ تھا جس سے میرا کوئی تعلق نہیں تھا مگر جس نے فی الحال مجھے زندگی کی ایک عجیب ہی ڈگر پر ڈال دیا تھا۔ ہائی وے پر بسیں لوٹے جانے کی یہ وہی واردات تھی جس میں جانو کے گروہ کے ساتھ روحیل خان بھی شامل تھا۔ اخبار میں جس کنبے کی تصویر تھی وہ ایک بس کے کنڈیکٹر کا تھا جو عینی شاہدوں کے مطابق ایک سیاہ پوش ڈاکو کی گولیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ وہ سیاہ پوش ڈاکو سیاہ رنگ ہی کے گھوڑے پر سوار تھا۔ سب سے زیادہ فائرنگ اسی نے کی تھی اور اسی کے ہاتھوں سب سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ ڈاکو روحیل خان ہی تھا لیکن یہ بات صرف چند افراد ہی کو معلوم تھی۔

نامہ نگار نے اس خبر میں یہی بتایا تھا کہ کنڈیکٹر کے قتل کے بعد اس کے لواحقین اور پسماندگان پر کیا گزر رہی تھی۔ تصویر میں جو بوڑھا نظر آرہا تھا وہ مقتول کنڈیکٹر کا باپ تھا۔ کنڈیکٹر اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور گھر کا واحد کفیل تھا۔ کئی سال بیروزگار رہنے کے بعد اسے چند ماہ پہلے ہی نوکری ملی تھی اور بدحال کنبے کی ساری توقعات اسی سے وابستہ ہوگئیں تھیں کہ اب وہ جوان بہن کے ہاتھ پیلے کرے گا' اپنے بچوں کو اسکول میں داخل کرائے گا اور اپنی بیوی کے وہ چند زیورات بھی بنوائے گا جو اس کی بیکاری کے دوران بک گئے تھے۔

بڑے میاں کے برابر بیٹھی ہوئی وحشی آنکھوں والی لڑکی کنڈیکٹر کی بہن تھی جس کے چہرے پر امیدوں کی پرچھائیاں دم توڑ چکی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ اس کا بھائی زندہ رہتا تب بھی اس کی ڈولی رخصت نہ کرپاتا۔ آخر وہ ایک بس کنڈیکٹر ہی تو تھا۔ کس کس کی مُرادیں' کس کس کے ارمان پورے کرسکتا تھا۔۔۔۔ لیکن گھر میں کم ازکم ... ایک فرد بھی روزگار سے لگا رہے تو سارے سادہ لوح اور افلاس زدہ کنبے کی آس امیدیں اسی کی ذات سے بندھی رہتی ہیں کہ آج نہیں تو کل اس کے دم سے یہ کام ہوجائے گا' وہ کام ہوجائے گا۔ سب کو زندہ رہنے کا ایک سہارا ملا رہتا ہے۔ امید کا یہ موہوم سہارا بُجھ جانا اُن سیدھے سادے لوگوں پر کیسی قیامت ڈھاتا ہوگا' یہ صرف وہی جان سکتے تھے۔

تصویر کھنچوانے میں اس لڑکی کا اضطراب' اس کی ہچکچاہٹ قابلِ فہم تھی۔ وہ غالباً ان پڑھ ہی تھی۔ دنیا اس نے یقیناً نہیں دیکھی ہوگی لیکن عزت نفس اور شعور اس کے پاس ضرور تھا۔ [illegible]

مجبوری کو تماشا بنانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھی کہ اس کے بوڑھے اور بیمار باپ کے کندھوں پر اس کا وجود ایک بوجھ ہے مگر لکھنے والوں کو لکھنے کے لیے۔۔۔۔ اور پڑھنے والوں کو پڑھنے کے لیے کہانیاں چاہئیں' افسانے چاہئیں' خبریں چاہئیں۔

لڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے دو معصوم بچوں کو صحیح طور پر تو اندازہ نہیں ہوگا کہ ان پر کیا قیامت گزر چکی تھی لیکن ان کی سوچوں کی چھوٹی سی دنیا میں بھی ہلچل تو یقیناً مچی تھی۔ اسی لیے تو ان کورے چہروں پر بھی محرومی کی ایک نادیدہ تحریر ابھر آئی تھی۔ ان کو بھی یقیناً احساس ہوچکا تھا کہ ان سے کوئی بیش قیمت چیز چھن چکی تھی۔ ان میں سے ایک بچہ تقریباً پانچ سال کا تھا اور دوسرا تقریباً چار سال کا۔ اس عمر میں ذہن کے ورق پر نقش بننے بگڑنے کا عمل تو شروع ہو ہی جاتا ہے۔

ان کے پیچھے جو بیوہ سر جھکائے کھڑی تھی' اس میں تو شاید طاقت ہی نہیں رہی تھی کہ کسی کو صحیح طور پر اپنا دکھ بتا سکے۔ اسی لیے اس کا سر تو شاید عمر بھر کے لیے شکست خوردہ سے انداز میں جھک گیا تھا۔ عورت کتنی بھی غریب ہو مگر شوہر زندہ ہو تو شاید اس خیال کے سہارے سر اونچا رکھتی ہے کہ اس کے سر پر تاج ہے مگر اس عورت کے سر کا تاج محض کسی کی دولت کی ہوس کا نشانہ بن کر موت کی تاریک وادی میں جاگرا تھا۔

ایک فرد کی ناگہانی موت سے پورا ایک خاندان برباد ہوجاتا ہے۔ مرنے والا اپنے پیچھے نہ جانے کتنی المناک کہانیاں' کتنے زندہ کرداروں کے ساتھ چھوڑ جاتا ہے مگر ہم روزانہ ایسے بیسیوں افراد کی ناگہانی موت کی خبریں اخباروں کے کونے کھدروں میں پڑھتے ہیں اور بے دلی سے اخبار ایک طرف پھینک کر ناشتا کرنے لگتے ہیں کہ کہیں چائے ٹھنڈی نہ ہوجائے' انڈا بدمزہ نہ ہوجائے۔ وہ کہانیاں نہ جانے کتنے برسوں تک اپنے انجام کی تلاش میں بھٹکتی رہتی ہیں لیکن ہم ان کے بارے میں نہیں سوچتے کیونکہ ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

کبھی کبھی یہ دنیا۔۔۔ اپنا آپ۔۔۔ گردوپیش کے لوگ۔۔۔ سب کچھ مجھے بہت عجیب لگنے لگتا تھا۔ عجیب نظام تھا۔۔۔ یا پھر شاید ہم لوگ ہی عجیب ہوگئے تھے۔

کبھی کبھی کوئی لمحہ' کوئی موڈ انسان کے لیے بہت خاص ہوتا ہے۔ میری نظریں مسلسل اس تصویر اور اسٹوری میں الجھی ہوئی تھیں۔ نامہ نگار نے لکھا تھا کہ قصبے میں شاید وہ واحد گھرانہ تھا جس کا مکان ذاتی نہیں تھا۔ مالک مکان پہلے ہی ان سے خوش نہیں تھا' اب کچھ اور خفا ہوگیا تھا۔

کچھ اور بھی قرض خواہ تھے جنہیں بہت تشویش تھی کہ اب کمانے والا نہیں رہا تو ان کی پھنسی ہوئی رقموں کا کیا بنے گا؟ رقمیں معمولی تھیں مگر جس کے پاس روپیا نہ ہو اس کے لیے کوئی رقم معمولی نہیں ہوتی۔

کنڈیکٹر کا باپ گُردے کی تکلیف میں مبتلا تھا۔ اس کی دوا دارو کا خرچ خاصا تھا مگر اب تو روٹی کے لالے پڑ گئے تھے' دوا کہاں سے آتی۔ چنانچہ رات کو بڑے میاں تکلیف کے باعث اونچی آواز میں کراہتے تھے تو پڑوسیوں کی نیند خراب ہوتی تھی۔

ایک آدھ کنڈیکٹر سے مجھے حال ہی میں پالا پڑا تھا۔ اس سے پہلے برسوں سے کسی کنڈیکٹر سے واسطہ نہیں پڑا تھا لیکن جب پڑتا تھا تب بھی وہ مجھے اچھے نہیں لگتے تھے۔ پیشہ بھی انسان کی ذات پر کچھ نہ کچھ اثرات ضرور مرتب کرتا ہے۔ کنڈیکٹروں پر ان کے پیشے کا نہ جانے کیوں یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ عجیب کھردرے سے انسان بن جاتے ہیں۔ یا پھر شاید وہ پہلے ہی سے ایسے ہوتے ہیں اور اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر اس پیشے کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ دن بھر نہ جانے کس کس مزاج کے لوگوں سے بک بک جھک جھک کرنے کی وجہ سے ان کے رویّے میں مستقل کھردرا پن آجاتا ہو۔

بات خواہ کچھ بھی تھی لیکن اس وقت میری زندگی بھر کی ناگواری نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ وہ نامعلوم اور ان دیکھا کنڈیکٹر مجھے اپنا کوئی قریبی دوست محسوس ہونے لگا۔ وہ ہمارے معاشرے کا ایک عام سا انسان تھا' اس کے پیچھے ایک عام سی کہانی تھی۔ آہیں' آنسوؤں اور مصائب کی کہانی لیکن اس وقت میری نظر میں وہ خاص انسان بن گیا تھا۔ اسے قتل کردیا گیا تھا' یہ اس پر تو ایک ظلم تھا ہی لیکن اس کے خاندان پر بھی بہت بڑا ظلم تھا۔ اس وقت میرے اندر شاید گداز کا موسم تھا۔ وہ ایک ساکت تصویر اور اخباری فیچر گویا مجھے ڈس گیا۔

میرے اندر کا موسم اتنا عجیب تھا کہ مجھے یہ بھی پتا نہ چلا کہ خمیسو خان کب آکر میرے عقب میں کھڑا ہوگیا۔ اس نے بھی محسوس کرلیا کہ میں اس نمایاں ترین تصویر اور رپورٹ میں اُلجھا ہوا تھا۔

میں اس وقت چونکا جب اس نے اخبار میرے ہاتھ سے اُچک لیا اور اسی رپورٹ پر نظر دوڑاتے ہوئے میرے سامنے آن بیٹھا۔ زیرلب بڑی روانی سے وہ پوری رپورٹ پڑھتا چلا گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ بھی کچھ نہ کچھ پڑھا لکھا ضرور تھا۔

پوری رپورٹ پڑھ کر اس نے بغور میری طرف دیکھا۔ میرے دل کی دھڑکن اور تیز ہوگئی۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ میں اس رپورٹ کو اتنی محویت سے کیوں پڑھ رہا تھا۔ پھر وہ اخبار میز پر پھیلا کر اس پر نظر جما کر بیٹھ گیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ اس گروپ فوٹو میں سے صرف اس لڑکی کے چہرے کو گھور رہا تھا۔

آخر اس کی سوچ اس کے ہونٹوں پر آگئی جو میرے اندازے سے بہت مختلف تھی۔ لڑکی کی تصویر پر انگلی رکھتے ہوئے وہ بولا "دانہ اچھا ہے۔۔۔ اور اس کے حالات بھی ہمارے حق میں بہت اچھے ہیں۔ ان حالات میں تو ہماری ایجنٹ جیماں اس لڑکی کو بڑی آسانی سے اس اڈے تک لاسکتی ہے اور ٹریننگ دے سکتی ہے۔" اس نے گردوپیش کی طرف اشارہ کیا۔

اس کا انداز خود کلامی کا تھا لیکن یہ چند الفاظ جب اپنے صحیح معانی اور مفہوم کے ساتھ میرے ذہن تک پہنچے تو میری روح کانپ اٹھی۔ گویا یہ لوگ بعض خاندانوں کو ایک انداز میں برباد کرنے کے بعد بھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ انہیں مزید برباد کرنے کا بھی نہ جانے کن کن طریقوں کا ان کے ہاں بندوبست تھا۔

ان کے تمام سلسلے بہت منظم تھے۔ ان کی کوئی جیماں نامی ایجنٹ بھی تھی جو نامساعد حالات میں گھری ہوئی مجبور لڑکیوں۔۔۔۔ یا پھر ان کے مطلوبہ رجحانات رکھنے والی لڑکیوں کو گھیر گھار کر اس قحبہ خانے تک لاتی تھی۔۔۔۔ پھر نہ جانے کس طرح انہیں خاص سانچے میں ڈھالا جاتا تھا۔

اس سارے عمل کے دوران اور اس کے بعد وہ نہ جانے کہاں رہتی تھیں۔ اپنے گھروں میں یا کہیں اور؟ وہ کس حد تک ان کے پنجوں میں جکڑی ہوتی تھیں؟ اس طرح کے بہت سے سوالات میرے ذہن میں چکرانے لگے تھے لیکن اتنی جلدی ہر سوال کا جواب نہیں مل سکتا تھا۔

میں ان سوالوں کو زبان پر آنے سے روکنے کی کوشش میں مصروف تھا جب خمیسو خان اخبار ایک طرف کھسکا کر اٹھتے ہوئے بولا "میں ذرا کاؤنٹر سے اپنی چیزیں لے آؤں پھر چلتے ہیں۔"

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ میں نے اخبار ایک بار پھر اپنی طرف کھسکا لیا۔ ایک بار پھر تصویر سے ہوتی ہوئی میری نظر اس رپورٹ کی آخری سطروں پر جا ٹکی۔ افسانہ نگاری کے سے رجحانات رکھنے والے اس نامہ نگار نے آخری سطروں میں لکھا تھا:

'۔۔۔۔ یہ شقی القلب ڈاکو' یہ انسان نما درندے محض رقم کی خاطر۔۔۔ اور بعض اوقات تو صرف دہشت پھیلانے کی غرض سے کسی کی زندگی کا چراغ گل کرتے وقت ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچتے کہ ان کی اس درندگی سے کتنے گھروں میں تاریکی پھیل جائے گی' کتنی زندگیاں برباد ہوجائیں گی۔

قدرت اور قانون' دونوں ہی انہیں ڈھیل دیتے ہیں۔ بہرحال کبھی نہ کبھی تو قدرت یا قانون کا ہاتھ انہیں گرفت میں لے ہی لیتا ہے۔ کنڈیکٹر عبدالرشید اور کئی بے گناہ مسافروں کو موت کے گھاٹ اتارنے والا ڈاکو نہ جانے کب اپنے انجام کو پہنچے۔۔۔۔ لیکن سردست تو لمحہ بہ لمحہ اندھیرے کی دلدل میں اترتے ہوئے یہ بے گناہ افراد یعنی کنڈیکٹر عبدالرشید کے یہ اہلِ خانہ جامی نگر کے میرانی پاڑے کے ایک پرانے سے مکان میں کسی معجزے کے منتظر ہیں جو ان کی زندگیوں سے اندھیرے سمیٹ سکے۔ وہ روشنی کی کسی کرن کے انتظار میں ہیں جو انہیں منزل کا کچھ پتا دے سکے۔۔۔۔'

یہ تمام الفاظ اور تفصیلات گویا میرے ذہن پر نقش ہوکر رہ گئی

تھیں۔

غیسو خان کے قدموں کی دھمک سُن کر میں نے اخبار ایک طرف کھسکا دیا۔ غیسو نے میز کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر تصویر کی طرف دیکھا۔ گھنے بالوں میں گھرے ہوئے اس کے ہونٹ ہوس زدہ سے انداز میں پھیل گئے، آنکھوں میں نشہ سا اُتر آیا۔ وہ جب سے کمرے سے واپس آیا تھا، بڑا آسودہ سا نظر آرہا تھا لیکن اب جیسے ایک بار پھر پیاسا پیاسا دکھائی دینے لگا۔ مجھے معلوم تھا تصویر میں اس کی نظر صرف لڑکی کے چہرے پر تھی۔

ایک بار پھر وہ خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔ "دانہ اچھا ہے......"

میرا دل چاہا کہ اسی وقت اس کی گردن دبوچ لوں اور اس وقت تک دباتا چلا جاؤں جب تک اس کی آنکھیں حلقوں سے باہر نکل کر اس کے چہرے پر نہ لٹک آئیں..... لیکن ایک بار پھر میں نے اپنے آپ پر ضبط کر لیا۔ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا اس کے لیے مجھے مناسب موقع کا انتظار کرنا چاہیے تھا۔ اس وقت تک میری معلومات میں مزید نہ جانے کتنا اضافہ ہو سکتا تھا۔

غیسو کے کندھے پر اب ایک چھوٹا سا سفری بیگ نظر آرہا تھا۔ اس میں یقیناً رقم کا پیکٹ اور شاید کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ وہ چلنے کے لیے تیار تھا۔ میں بھی انجھ کھڑا ہوا، یہ پوچھے بغیر کہ کہاں جانا تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ رقم پہنچانے اور اپنے دورے کی رپورٹ دینے جانو کے ڈیرے پر جائے گا جو ایک طرح سے ان کا ہیڈ کوارٹر تھا۔

غیسو ابھی ہال پر ایک الوداعی سی نظر ڈال رہا تھا کہ بالائی قطار کے ایک کمرے سے ایک گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ دروازہ بند ہونے کی وجہ سے وہ کچھ زیادہ ہی گھٹ کر رہ گئی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے دروازہ کھل گیا۔ بالائی کمروں کی جنگلے دار بالکونی سے میں اوپر کا منظر بہ آسانی دیکھ سکتا تھا۔

ایک عورت لڑکھڑاتی ہوئی کمرے سے نکلی۔ وہی چیخیں مار رہی تھی۔ وہ کچھ اچھی حالت میں نہیں تھی۔ اس کے جسم پر لباس نامکمل تھا لیکن اس وقت اسے لباس کی نہیں، شاید اپنی جان کی فکر تھی کیونکہ وہ بالکونی کے راستے سیڑھیوں کی طرف دوڑی آرہی تھی۔ بالائی کمرے صرف چند سیڑھیوں کی بلندی پر تھے۔

دوسرے ہی لمحے..... لمبا تڑنگا اور قدرے بھاری جسم کا ایک پختہ العمر مرد بھی لڑکھڑاتا ہوا کمرے سے برآمد ہوا۔ عورت کا دوپٹا اس کے ہاتھ میں تھا جس کا اس نے پھندا بنا رکھا تھا۔ وہ عورت غالباً اسی پھندے سے اپنی گردن آزاد کروا کر نکل کے بھاگی تھی کیونکہ اس کا ایک ہاتھ ابھی تک گردن پر تھا۔

مرد یقیناً نشے میں دُھت تھا۔ اسے یہ بھی اندازہ نہیں تھا کہ عورت سیڑھیوں کی طرف بھاگ چکی تھی۔ وہ اب بھی دوپٹے کا پھندا اس کے گلے میں ڈالنے کے لیے دونوں ہاتھ اونچے کیے اسے بالکونی میں تلاش کر رہا تھا۔

پھر وہ نشے میں تُتلاتی ہوئی سی زبان کے ساتھ موٹی موٹی گالیاں دیتے ہوئے گرجا۔ "کہاں گئی سالی..... میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا..... تجھے تو آج میں کُتوں کے آگے پھنکواؤں گا۔"

اس وقت تک عورت دھڑ دھڑ سیڑھیاں اتر کر نیچے آپہنچی تھی۔ ہم سیڑھیوں سے زیادہ دور نہیں تھے۔ عورت، غیسو خان ہی کی طرف لپکی آرہی تھی۔ دو ویٹر جو اس وقت ہال میں خدمات انجام دے رہے تھے، اپنی اپنی ٹرے میزوں پر رکھ کر اپنی جیبوں سے ٹی ٹی پسٹل نکال چکے تھے اور بالکل الرٹ تھے لیکن شاید وہ غیسو خان کے حکم کے منتظر تھے۔ اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔ خود غیسو خان بھی بالکل ساکت کھڑا عورت کو اپنی طرف آتے دیکھ رہا تھا۔ ہال میں سکوت چھا گیا تھا..... لیکن عورت، غیسو خان کے قریب پہنچ کر ایک بار پھر بدحواسی میں چیخی۔ "بچاؤ..... بچاؤ۔"

اس کے ساتھ ہی وہ نہ جانے کس چیز سے ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ وہ شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ مرد اس کے پیچھے آرہا تھا۔ اس نے مُڑ کر دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ گرتے ہی وہ زیادہ بدحواسی سے چیخی۔ "بچاؤ..... بچاؤ۔"

غیسو نے ہاتھ بڑھا کر اسے بازو سے پکڑا اور یوں اٹھا لیا جیسے وہ بڑے سائز کی گڑیا ہو۔ حالانکہ وہ ذرا بھاری تن و توش کی عورت تھی لیکن یہ بھاری پن مناسب جگہوں پر تھا اور اسے ایک الگ انداز کی خوبصورتی بخش رہا تھا۔ غیسو نے نہایت آہستگی سے اسے ایک کرسی پر بٹھاتے ہوئے ڈانٹا۔ "چیخو مت۔ تم تو اچھی بھلی حوصلے والی عورت ہو۔ یہ ایک دم تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" اس کا چہرہ قطعی پُرسکون تھا۔ سفری بیگ اس نے میز پر رکھ دیا تھا۔ اس کی نظر بالکونی کی طرف تھی۔

عورت ہانپتے ہوئے بولی۔ "عادل شاہ پاگل ہو گیا ہے شاید..... اس نے تو مجھے تقریباً مار ہی دیا تھا..... تم لوگوں کو شاید پتہ بھی نہ چلتا..... دوپٹے کا پھندا اس نے اچانک ہی میرے گلے میں ڈال دیا تھا......"

وہ ایک بار پھر اپنی گردن مسلنے لگی۔ میں نے دیکھا، اس کی مرمریں گردن پر سرخ حلقہ نمودار ہو چکا تھا۔

"بات کیا تھی؟" غیسو نے اس کی طرف دیکھے بغیر پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

عورت وحشت زدہ نظروں سے جنگلے کی طرف دیکھتے ہوئے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی۔ "بات معمولی سی تھی..... لیکن بتانے والی نہیں ہے..... وہ پہلے ہی سے پتا نہیں کس بات پر خار کھائے ہوئے تھا..... میرا ذرا سا انکار سُن کر آپے سے باہر ہو گیا..... اس نے دھوکے سے میرے گلے میں دوپٹا ڈال دیا تھا......"

اس دوران وہ شخص سیڑھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ جنگلے سے جھانک کر اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر نیچے دیکھا۔ اس کی نظریں چونکہ صرف عورت کو تلاش کر رہی تھیں، شاید اس لیے اسے صرف عورت ہی نظر آئی۔ اس کے دیکھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ اس نے غیسو خان کو نہیں دیکھا تھا..... اور یہ شاید اس کی بدقسمتی تھی!

وہ جنگلے پر جھکتے ہوئے ایک بار پھر گندی گالیاں دیتے ہوئے چلایا۔ "..... وہاں چھپی بیٹھی ہے..... ابھی تجھے ٹھیک کرتا ہوں..... تیری یہ جرأت....." وہ مغلظات بکتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

میں ایک ستون کے قریب ساکت کھڑا تھا۔ غیسو میری طرف مُڑتے ہوئے پُرسکون لہجے میں بولا۔ "دیکھ رہے ہو؟ نجی زندگی میں تمہارے معززین اور شرفا کی یہ حالت ہوتی ہے۔ کافی بڑا اور معزز زمیندار ہے یہ۔ علاقے میں بڑی عزت ہے اس کی۔ عادل شاہ..... اونہہ.....!" اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے اس نے حقارت سے فرش پر تھوک دیا ہو لیکن درحقیقت اس نے تھوکا نہیں تھا۔

میرا خیال تھا کہ عادل شاہ بہ خیروعافیت نیچے نہیں پہنچ سکے گا اور سیڑھیوں سے لڑھک جائے گا لیکن وہ جنگلا پکڑ کر سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔ اس کی حالت کو دیکھتے ہوئے اس کا سیڑھیوں سے اتر آنا کسی کارنامے سے کم نہیں تھا۔ غیسو نے اپنی جگہ سے قطعاً حرکت نہیں کی تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے وہیں کھڑا انتظار کر رہا تھا۔ اسے گویا یقین تھا کہ عادل شاہ سیدھا اسی کی طرف آئے گا۔

عادل شاہ لڑکھڑاتا ہوا واقعی اس کے قریب آپہنچا۔ بالکل اسی طرح جیسے مکھی بے خبری میں کھسکتی ہوئی مکڑی کے جال کے قریب جا پہنچتی ہے۔ اس بدبخت کی نظر ابھی تک غیسو پر نہیں پڑی تھی حالانکہ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر سامنے دیکھ رہا تھا لیکن اسے شاید عورت کے سوا کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

وہ کچھ اور قریب پہنچا تو غیسو خان کا بازو اچانک کچھ اس طرح حرکت میں آیا جیسے کسی مشین کا اسپرنگ ٹوٹ گیا ہو۔ اتنے زور کا تھپڑ عادل شاہ کے منہ پر پڑا کہ ہال میں فائر کی سی آواز گونج کر رہ گئی۔ وہ "اوغ" کی زوردار آواز کے ساتھ دور جا کر گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں ایک ہی تھپڑ میں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز تو نہیں کر گئی لیکن پھر میں نے اسے حرکت کرتے دیکھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کھل گئی تھیں اور ہونٹ خون میں لتھڑ گئے تھے۔

غیسو خان لمبا سا ڈگ بھر کر آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر خاموش غیظ و غضب کے آثار تھے۔ اس نے جھک کر اس اچھے بھلے ڈیل ڈول کے آدمی کو گردن سے پکڑ کر یوں ایک جھٹکے سے اٹھا لیا جیسے وہ سودے سلف کا کوئی چھوٹا موٹا تھیلا ہو۔

عادل شاہ کی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ اب غیسو خان کے چہرے سے بہ مشکل دو انچ دور تھا۔ اس کے حواس پہلے ہی ٹھکانے نہیں تھے، غیسو کے منہ توڑ قسم کے تھپڑ نے یقیناً اس کے حواس کچھ اور مختل کر دیے تھے لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس نے غیسو کو پہچان لیا تھا کیونکہ میں نے اس کے حلق سے خرخراہٹ کے سے انداز میں غیسو کا نام برآمد ہوتے ہوئے سنا تھا۔ گردن غیسو کی گرفت میں ہونے کی وجہ سے وہ صحیح طور پر بول نہیں پا رہا تھا۔

شاید وہ سانس بھی مشکل سے ہی لے پا رہا تھا کیونکہ اس کی آنکھیں لحظہ بہ لحظہ حلقوں سے نکلی آرہی تھیں۔ اس نے غیسو کی گرفت سے گردن چھڑانے کی کوشش کی لیکن یہ کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی چوزا چیل کے پنجوں سے گردن چھڑانے کی کوشش کر رہا ہو۔

غیسو نے اس کے دوسرے رخسار پر اُلٹے ہاتھ کا ایک اور تھپڑ رسید کیا..... پھر اس کی گردن چھوڑ دی۔ وہ ایک بار پھر گر پڑا۔ غیسو نے اس بار ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا ورنہ شاید وہ بے ہوش ہو گیا ہوتا۔

اس کا چہرہ خون میں کچھ اور لتھڑ گیا۔ اس نے سر کو جھٹک کر گویا اپنے حواس کچھ ٹھکانے لانے کی کوشش کی اور پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔ "خمیسو...... !تیری یہ جرأت.....!" اس کے ہونٹوں سے خون کے چھینٹے اڑے۔

خمیسو کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ اس نے آگے بڑھ کر عادل شاہ کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کی۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ اچھلا۔ خمیسو اس پر جھکتے ہوئے یکدم ہی چلایا۔ "ابے حرامزادو..... اتنی پیتے ہی کیوں ہو جتنی تم سے ہضم نہیں ہوتی؟"

اس نے ایک اور ٹھوکر عادل شاہ کے کولھے پر رسید کی۔ وہ درد سے بلبلاتے ہوئے چلایا۔ "خمیسو..... تو دو ٹکے کی عورت کے لیے عادل شاہ پر ہاتھ اٹھا رہا ہے۔" اسے گویا اس انہونی پر یقین نہیں آرہا تھا۔

خمیسو عجیب سے انداز میں مسکرایا اور جوتے سمیت اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر ذرا جھکتے ہوئے بولا۔ "بڑی غلط بات کر رہے ہو عادل شاہ! اس اڈے پر کوئی عورت دو ٹکے کی نہیں ہوتی۔ وہ جو بھی ہیں..... جیسی بھی ہیں...... اپنا کام کر رہی ہیں۔ تمہیں بھی صرف اپنے کام سے کام رکھنا چاہیے تھا۔ تم بھول گئے تھے کہ اس اڈے کا ڈسپلن کتنا سخت ہے۔ جیسا تماشا تم نے لگایا ہے اس پر تمہاری سزا تو زیادہ سخت ہونی چاہیے تھی۔ میں تم پر رحم کر رہا ہوں۔"

عادل شاہ کمزور آدمی نہیں تھا۔ نشے میں نہ ہوتا تو شاید وہ خمیسو خان سے تھوڑا بہت مقابلہ کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ کانپتی ٹانگوں سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسے گویا ابھی تک یقین نہیں آرہا تھا کہ خمیسو نے اس کے منہ پر تھپڑ لگائے تھے۔ وہ شاید ان لوگوں میں سے تھا جنہیں کسی کے ہاتھ سے بھی تھپڑ کھانا ایک ڈراؤنا خواب تو محسوس ہو سکتا تھا لیکن وہ یقین نہیں کر سکتے تھے کہ کسی نے حقیقت میں انہیں مارا تھا۔

"خمیسو..... خمیسو..... تو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا......؟" وہ اپنے چہرے سے خون پونچھ کر لتھڑے ہوئے ہاتھ کو بے یقینی سے دیکھتے ہوئے پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔

"ہاں۔ میں نے بڑی غلطی کی۔" خمیسو نہایت پُرسکون لہجے میں بولا۔ "یہ کام میرے شایانِ شان نہیں تھا۔ مجھے نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

اس نے اشارے سے ان دونوں قوی الجثہ نوجوانوں کو بلایا جو ہال میں ویٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ وہ پسٹل لیے الرٹ کھڑے تھے۔ اس کا اشارہ پاکر مستعدی سے قریب آگئے۔ خمیسو نے انہیں حکم دیا "اس کے منہ پر تھوکو۔"

دونوں نے نہایت سعادت مندی سے بیک وقت عادل شاہ کے منہ پر تھوک دیا۔ اب تو عادل شاہ کی حالت بہت ہی خراب ہوگئی۔ اس نے اپنی بچی کچی توانائی مجتمع کرتے ہوئے جھپٹ کر ایک ویٹر نوجوان سے پسٹل چھیننے کی کوشش کی لیکن وہ ان معاملات میں اتنا اناڑی نہیں تھا۔ اس نے جھکائی دے کر ہاتھ پیچھے کرلیا۔ عادل شاہ پسٹل کو چھو بھی نہ سکا۔

دوسرے نوجوان نے اس کی ٹھوڑی پر نپا تُلا گھونسا رسید کیا۔ وہ ایک بار پھر دھم سے گر پڑا۔ اب گویا اس میں دم خم ختم ہوگیا۔ وہ بے ہوش تو اب بھی نہیں ہوا تھا لیکن اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔

خمیسو نے دونوں نوجوانوں کو حکم دیا۔ "اسے ڈنڈا ڈولی کر کے باہر لے جاؤ۔ اس کی گاڑی میں ڈالو اور تم میں سے کوئی ایک گاڑی ڈرائیو کر کے اسے سڑک تک چھوڑ آئے۔ گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کر کے تم وہیں شادو گوٹھ سے اپنی کوئی گاڑی، جیپ یا گھوڑا لے کر واپس آجانا۔ اس میں ہمت ہوگی تو ڈرائیو کر کے گھر چلا جائے گا ورنہ کوئی اسے پہنچا دے گا۔ جو بھی اس کی قسمت میں ہوا وہ ہو جائے گا۔"

دونوں نوجوانوں نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور پسٹل جیبوں میں رکھتے ہوئے جھک کر یک دم ہی عادل شاہ کو نہایت مشاقی و مہارت سے ڈنڈا ڈولی کرتے ہوئے اٹھا لیا۔ اس نے مزاحمت نہیں کی لیکن خمیسو کی طرف دیکھ کر خرخراتی سی آواز میں بولا۔ "میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں خمیسو! میں یہ اڈا بند کرا دوں گا...... اور تمہیں بھی دیکھ لوں گا....."

خمیسو نے یک دم جھک کر اس کے گریبان کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے جھٹکا دیا اور بولا۔ "ضرور دیکھنا..... لیکن مجھے دیکھنے سے پہلے اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو ضرور دیکھ لینا۔ دو لڑکے ہیں..... اور ایک لڑکی ہے جس کی آنکھیں انگریزوں کی طرح نیلی ہیں۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟ تم انہیں زندہ دیکھنا چاہتے ہو نا؟ اس کے علاوہ تمہاری ایک چھوٹی بہن بھی ہے...... کراچی میں میڈیکل کالج میں پڑھتی ہے۔ ڈیفنس میں رشتے داروں کے ساتھ رہتی ہے۔ بنگلے کا نمبر بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ تمہاری اس کے بارے میں بھی یقیناً یہی خواہش ہوگی کہ وہ زندہ رہے..... اور عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہے..... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

عادل شاہ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ خمیسو اس کے گریبان کو ایک اور جھٹکا دے کر سانپ کے سے انداز میں پھنکارا۔ "ایک اور اہم بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا۔ ہمارے پاس تمہاری کچھ تصویریں ہیں۔ بہت قیمتی تصویریں ہیں۔ تم سیاست میں بھی تو منہ مارتے ہو نا؟ ابھی سیاست میں تمہارا کوئی مقام نہیں ہے...... لیکن اگر وہ تصویریں ہم نے کچھ خاص خاص جگہوں پر پہنچا دیں تو سیاست میں تمہارا مقام راتوں رات اتنا اونچا ہو جائے گا کہ تم خود بھی اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکو گے۔ کچھ سمجھ میں آیا؟"

عادل شاہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں۔ شاید اس میں اب آنکھیں کھلی رکھنے کی بھی سکت نہیں رہی تھی۔ خمیسو خان نے چٹکی بجائی۔ دونوں نوجوان عادل شاہ کو

[...]ئے اس موٹی سی دیوار کی طرف بڑھے جس میں مستطیل شگاف [...]ر آرہا تھا۔ گوریلا نما محافظ اس شگاف سے جھانک کر دلچسپی آمیز [...]از میں یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً خمیسو کو جیسے کچھ یاد آیا۔ اس نے ایک بار پھر نوجوانوں [...]رکنے کا اشارہ کیا اور آگے بڑھ کر عادل شاہ کی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ [...]ں کی واسکٹ کی جیب سے اس نے ویسی ہی ایک سنہری چابی نکالی [...]بی چابی سے وہ خود دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔ وہ چابی اس نے [...]نی جیب میں رکھ لی اور عادل شاہ پر جھکتے ہوئے بولا۔ "ہمیں معلوم [...]ہیں تھا کہ تم اتنے کم ظرف انسان ہو عادل شاہ! ہم تمہارے [...]ارے میں پیر حشمت علی سے بات کریں گے جس نے تمہیں ممبر [...]شپ دلائی تھی۔ کبھی کبھار ہی ہمیں تم جیسا گندہ ممبر ملتا ہے۔"

عادل شاہ کسمسایا لیکن تنومند نوجوانوں نے اسے دبوچا ہوا تھا۔ خمیسو پھنکارنے ہی کے سے انداز میں مزید بولا۔ "تم ہمارا سب سے اہم اصول بھی بھول گئے..... کہ جب تک ہمارے ساتھ رہو سچے دوستوں کی طرح رہو اور جب ساتھ چھوڑنا ہو تو خاموشی سے چابی واپس کر کے عزت داروں کی طرح رخصت ہو جاؤ۔ تماشا لگانے والوں کو تو ہم دنیا میں تماشا بنا دیتے ہیں۔"

اس نے ہاتھ پیچھے لے جا کر عادل شاہ کی کمر میں گھونسا رسید کیا۔ عادل شاہ تڑپ کر ایک لمحے کے لیے اوپر کو کمان کی طرح اٹھ کر رہ گیا۔ پھر ڈھیلا پڑ گیا۔ نوجوانوں نے اسے اپنی گرفت سے نکلنے نہیں دیا تھا۔ الوداعی گھونسا رسید کر کے خمیسو کو اطمینان ہوگیا اور اس نے نوجوانوں کو جانے کی اجازت دے دی۔

ہال میں بدستور سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کسی نے اپنی جگہ سے ہلنے اور اس کارروائی میں مداخلت کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ خمیسو میز پر واپس آگیا اور عورت سے مخاطب ہوا۔ "کمرے میں واپس جاؤ اور اپنی حالت ٹھیک کرو۔"

وہ عورت اٹھی اور واپس اوپر چل دی۔ اب اس کی حالت سنبھل چکی تھی۔ اندر سے ایک اور نوجوان نے ہال میں آکر ویٹر کے فرائض سنبھال لیے تھے۔ خمیسو نے اس سے اپنے لیے ٹھنڈی بیئر کا ایک گلاس منگوایا اور بیڑی سلگا کر بیٹھ گیا۔

اس نے مجھے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بولا۔ "سالے نے دماغ گرم کر دیا ہے۔ اب ذرا دماغ کو ٹھنڈا کرلیں تو پھر چلیں گے۔"

باقی سب لوگ بھی دھیرے دھیرے دوبارہ اپنے مشاغل کی طرف متوجہ ہو رہے تھے۔ کچھ کمروں کے دروازے بھی تھوڑے تھوڑے کھل چکے تھے اور ان سے مختلف چہرے جھانک رہے تھے۔ اب وہ دروازے بھی دوبارہ بند ہو رہے تھے۔ پُرسکون جھیل میں ذرا دیر کے لیے جو ہلچل پیدا ہوئی تھی وہ اب معدوم ہو رہی تھی۔

چند لمحے بعد بیئر کا سنسناتا ہوا سا گلاس آپہنچا۔ خمیسو خان نے نہایت اطمینان سے اسے ختم کیا۔ میں نے اس دوران ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس پیا۔ اس وقت تک ہال میں سب کچھ معمول پر آچکا تھا۔ بیئر کا گلاس ختم کر کے خمیسو کے شبِ تاریک سے چہرے پر کچھ رونق آگئی۔ اس نے بیڑی کو ایش ٹرے میں مسلا اور چلنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ سفری بیگ اٹھا کر اس نے کندھے پر لٹکا لیا۔

جس راستے سے ہم اندر آئے تھے اسی سے واپس باہر آئے۔ ہمارے گھوڑے وہیں موجود تھے جہاں ہم نے انہیں چھوڑا تھا۔ دو رائفل برداروں کو میں نے اب بھی درختوں کے درمیان ٹہلتے دیکھا لیکن یہ وہ نہیں تھے جنہیں میں پہلے دیکھ چکا تھا۔ معلوم نہیں یہاں کتنے افراد باری باری ڈیوٹی دیتے تھے۔ کھلی جگہ میں بہت سی گاڑیوں کا بھی اضافہ ہو چکا تھا۔

ہم واپس اسی طرف چل دیے جدھر سے آئے تھے۔ رات اپنا دامن پھیلا چکی تھی لیکن آسمان پر غریب کے لباس کی طرح ادھورا سا چاند موجود تھا۔ دھندلی دھندلی چاندنی میں خاصی دور تک کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا۔ خمیسو خان عجلت میں نہیں تھا۔ گھوڑے کو دُلکی چلا رہا تھا۔ میرے ذہن میں ان گنت سوالات ڈنک مار رہے تھے مگر میں پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ زیادہ متجسس نظر نہ آؤں۔ زیادہ متجسس نظر آنا مجھے مشکوک بنا سکتا تھا۔

لیکن چند لمحے بعد خمیسو گویا ایک انجانی سی مسرت محسوس کرتے ہوئے ایک نظر پیچھے دیکھ کر خود ہی فخر سے بولا۔ "کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہاں کوئی ایسا اڈا موجود ہے جس سے ہمیں لاکھوں روپے مہینے کی آمدنی ہے۔ وہ بھی لوٹ مار اور قتل و غارت کیے بغیر۔"

اس نے داد طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی تائید میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ "کسی علاقے کی پولیس کی حدود میں اس قسم کا اڈا بناؤ تو انہیں بھاری بھتا دینا پڑتا ہے۔ وہ ایک طرح کے پارٹنر ہو جاتے ہیں..... اور پارٹنر بھی خطرناک قسم کے۔ جیسے گھر کے بھیدی ہوتے ہیں جو کبھی کبھی لنکا ڈھا دیتے ہیں۔ ان پر زیادہ سختی آتی ہے تو کبھی کبھی وہ اپنی سرپرستی میں

کام کرنے والوں کو بھی قربانی کا مرغا بنا لیتے ہیں۔"

اس نے کھلی فضا میں غالباً آزادی کے احساس سے ایک گہری سانس لی اور مسرور لہجے میں بولا۔ "مگر یہاں بھتے وغیرہ کا کوئی چکر نہیں۔ ہر وقت پولیس کی تلوار بھی سر پر نہیں لٹکتی۔ زمین سرکار کی ہے لیکن یہاں مالک صرف ہم ہیں۔ یہاں کوئی آکر ہم سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی ادھر سے برسوں کسی عام اور ناواقف شخص کا گزر نہیں ہوتا۔ اگر ہو بھی تو لوگ دور ہی سے دیکھ کر اسے کوئی چھوٹا موٹا جنگل سمجھ کر کترا کر گزرتے ہیں۔"

"جگہ ویسے تم لوگوں کو خوب ملی ہے۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔ میں حد سے زیادہ خاموش رہ کر بھی خود کو مشکوک بنانا نہیں چاہتا تھا۔

"جگہیں تو دنیا کے کونے کونے میں نہ جانے کیسی کیسی موجود ہیں لیکن اصل کام تو کسی جگہ کو کار آمد بنانا اور اس کا انتظام بہترین طریقے سے چلانا ہوتا ہے۔ اس کے لیے بڑے دماغ کی ضرورت ہوتی ہے۔ دماغ کی۔" اس نے اپنی کنپٹی پر انگلی ماری۔

پھر اس کے لہجے میں عقیدت جھلک آئی۔ "اور دماغ اپنے جانو کے پاس بہت بڑا ہے۔ بڑے کمال کا دماغ دیا ہے اللہ نے اسے۔ اس کا نام سن کر لوگ سمجھتے ہیں کہ کوئی ان پڑھ' جٹ جاہل دیہاتی ہوگا لیکن وہ بہت پڑھا لکھا ہے۔"

پھر وہ بڑے مسرور سے انداز میں مسکرایا۔ اس کا ذہن گویا گزرے دنوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا۔ ایک لمحے خاموش رہ کر وہ بولا۔ "ان دنوں ہمارا گروہ زیادہ بڑا نہیں تھا اور ہمارے پاس دولت بھی زیادہ نہیں تھی جب ایک واردات سے واپس آتے وقت رات کی طوفانی بارش کے دوران اتفاق سے ہم نے اس کھنڈر کا تہ خانہ دریافت کر لیا تھا۔ اس وقت یہ اتنی اچھی حالت میں نہیں تھا لیکن بہت بڑا تھا اور اس کی بناوٹ بڑے کام کی تھی۔"

"واہ۔" میں نے خواہ مخواہ سرہلایا۔

"جانو کے ذہن میں اسی وقت اسے استعمال کرنے کا آئیڈیا آگیا تھا۔" فیسو فخریہ لہجے میں بولا۔ "اس وقت کھنڈر کے گرد زیادہ درخت بھی نہیں تھے۔ اس جنگل کو ہم نے بڑا کیا ہے۔ سیکڑوں مزید درخت اگائے ہیں۔ جس وقت جانو نے آئیڈیا دیا تھا اس وقت کسی کو بھی امید نہیں تھی کہ اس پر عمل ہو سکے گا۔"

"بڑی محنت کرنی پڑی ہوگی اس جگہ کو سیٹ کرنے میں۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"سارے کام ہم لوگوں نے خود اپنے ہاتھوں سے کیے ہیں۔ ہم میں سے ہر ایک کو کوئی نہ کوئی کام آتا ہے۔ اپنے خاص خاص ٹھکانوں پر اکثر کام ہم خود ہی کرتے ہیں۔ رازداری بھی رہتی ہے اور جن دنوں فرصت ہو ان دنوں وقت بھی اچھا کٹ جاتا ہے۔ اگر زیادہ ہی کسی کی ضرورت آن پڑے تو اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لاتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

پھر ایک لمحے کے لیے ادھر اُدھر دیکھ کر بولا۔ "جانو نے ہی یہ سارا سسٹم سیٹ کیا ہے..... لیکن یہاں آنے والوں کو یہ معلوم نہیں ہے کہ اس کے پیچھے جانو ہے۔ بہرحال ممبروں پر دہشت قائم ہے تاکہ وہ کبھی اس کا راز افشا کرنے یا اسے نقصان پہنچانے کے بارے میں نہ سوچیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک خود اپنی جگہ اچھا بھلا پھنے خان ہوتا ہے۔"

پھر اس نے اپنا گھوڑا میرے گھوڑے کے کچھ اور قریب لاتے ہوئے گویا میری معلومات میں اضافہ کیا۔ "اس کا نام "گولڈ کلب" ہے۔ یورپ' امریکا وغیرہ کے شہروں میں کئی کلب ہوتے ہیں لیکن اتنی رنگینیاں وہاں بھی نہیں ہوتیں جتنی جانو نے یہاں جمع کر دی ہیں۔"

"اچھا.....؟" میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

وہ سرہلا کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "بہت خاص خاص اور بھروسے کے آدمی چھننے کے بعد انہیں ممبرشپ دی جاتی ہے۔ اس کے بعد انہیں کلب کے دروازے کی چابی دے دی جاتی ہے۔ باہر کے ملکوں میں تو لونڈے لپاڑے اس قسم کے جو چھوٹے موٹے کلب بناتے ہیں' ان میں تو کوئی بھی چابی لے کر دروازہ کھول کر اندر آسکتا ہے لیکن ہمارے ہاں شرطیں ذرا اور سخت ہیں۔ پہرا اور چیکنگ بھی ہوتی ہے۔ ممبر اپنی چابی کسی اور کو نہیں دے سکتا۔ البتہ کسی کو ممبر بنانے کی سفارش کر سکتا ہے۔ اس کی سفارش پر اچھی طرح چھان پھٹک کرنے کے بعد ممبرشپ دی جاسکتی ہے۔"

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر وہ فخریہ سے انداز میں مسکرا پھر بولا۔ "گولڈ کی کلب کی ممبرشپ بہت مہنگی ہے۔ صرف ممبرشپ ہی نہیں..... اس کے بعد یہاں آنا جانا' اٹھنا بیٹھنا بھی بہت مہنگا ہے۔"

اس کے باوجود اچھے خاصے لوگ نظر آرہے تھے۔ اتنے زیادہ ممبر کیسے بن گئے؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

اس کے بلند آہنگ قہقہے سے فضا مرتعش ہو کر رہ گئی۔ "گناہ میں بڑی لذت اور کشش ہے نا۔ نیکی اور عبادت کی دعوت دینے والے اپنے ٹھکانوں پر ہر آرام مہیا کرتے ہیں۔ پنکھے لگاتے ہیں قالین بچھاتے ہیں۔ وہاں جانے میں کوئی ڈر' کوئی خوف بھی نہیں ہوتا بلکہ دیکھنے والوں کی نظر میں عزت بڑھتی ہے۔ اس کے باوجود وہاں کم لوگ جاتے ہیں لیکن چرس' ہیروئن اور بدکاری کے اڈوں پر لوگ کتوں کی طرح بُو سونگھتے ہوئے' لوگوں کی نظروں سے چھپ چھپاتے جوق در جوق پہنچ جاتے ہیں' خواہ اس کی کوئی پبلسٹی نہ ہو' راستہ کتنا ہی مشکل ہو اور خواہ وہ ٹھکانا کہیں دور دراز مقام پر گندے نالے یا کچرا گھر کی بغل میں واقع ہو۔ یہ تو پھر بھی بڑا محفل' آرام دہ اور پُرسکون جگہ ہے۔" اس نے پیچھے کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے باوجود ممبروں کی اتنی تعداد حیرت انگیز ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ کوئی پورے ممبر تو نہیں تھے۔" فیسو گویا میری حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنس کر بولا۔ "ایک وقت میں تو آدھے سے بھی کم ممبر موجود ہوتے ہیں۔ سارے تو ایک وقت میں جمع ہو ہی نہیں سکتے۔ کوئی کہیں ہوتا ہے کوئی کہیں۔ ہر ایک کی اپنی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔"

"پھر بھی اس ویرانے میں اتنے لوگ کہاں سے آجاتے ہیں؟ یہ کون لوگ ہیں؟" میں نے حیرت کا اظہار جاری رکھا جو کافی حد تک حقیقی ہی تھا۔

"تم شاید علاقے سے زیادہ اچھی طرح واقف نہیں ہو۔" وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "یہاں جتنے ویرانے نظر آتے ہیں اتنی ہی زرخیزی بھی ہے۔ اردگرد کے ساٹھ ستر میل کے علاقے میں چھوٹے بڑے زمیندار بکھرے ہوئے ہیں۔ اکثر زمینداروں کا کسی نہ کسی شہر میں بھی مکان' ٹھکانا اور دوسری جائیداد یا کاروبار اپنی اپنی حیثیت کے مطابق موجود ہوتا ہے۔"

میں نے اثبات میں سرہلایا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "ان شہروں میں جو بھی شغل میلے میسّر ہوں ان سے تو وہ لطف اٹھاتے ہی رہتے ہیں لیکن کچھ نہ کچھ عرصہ انہیں اپنی زمینوں پر' دیہاتوں میں بھی رہنا ہی پڑتا ہے۔ چھوٹے زمینداروں کو زیادہ رہنا پڑتا ہے اور ان جگہوں پر عیاشی یا تفریح کے کچھ زیادہ ذرائع میسّر نہیں ہوتے۔ سوائے اس کے..... کہ گھر میں بیٹھ کر پی پلا لی..... کسی ایسی ویسی..... یا کم حیثیت سی لڑکی پر ہاتھ ڈال لیا لیکن ظاہر ہے' ان چکروں میں ان کے لیے کوئی خاص لطف نہیں ہوتا' ایڈونچر نہیں ہوتا۔ ذرا اچھی قسم کی چیزوں تک ان کا ہاتھ نہیں پہنچتا..... پھر وہاں بیوی بچے بھی ہوتے ہیں' گاؤں دیہات کے لوگ بھی ہوتے ہیں۔ بعض کا پارسائی کا بھرم بھی ہوتا ہے۔ سو باتیں' سو مسائل ہوتے ہیں۔ گولڈ کی کلب ان کی رسائی سے زیادہ دور بھی نہیں ہے اور یہاں وہ دنیا کی ہر فکر سے بے نیاز ہو کر آتے ہیں۔"

میں نے ذرا حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے بارے میں میرے اندازے کافی تیزی سے تبدیل ہوتے جارہے تھے۔ اس کا باس تو جو کچھ تھا سو تھا' خود وہ بھی مجھے اتنا کوڑھ مغز' جاہل اور نرا جانور معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اسے تو انسانی نفسیات کی باریکیوں کا بھی علم تھا۔ یا پھر شاید ان لوگوں نے جانو کے زیرِ سایہ رہ کر ڈاکا زنی اور قتل و غارت کے علاوہ بھی بہت کچھ سیکھا تھا۔

اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "چھوٹے سے چھوٹے زمیندار کے پاس بھی کافی روپیا ہوتا ہے اور چونکہ ان لوگوں کو کمانے کے لیے خود اپنی جان نہیں کھپانی پڑتی' اس لیے ان کے پاس وقت بھی کافی ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ طبقہ سیاست میں زیادہ حصہ لیتا ہے اور کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتا۔ مجھے یقین ہے' یہ لوگ جو کچھ ہمارے اڈے پر لٹاتے ہیں' اس کی کسر کہیں نہ کہیں سے نکال لیتے ہوں گے۔"

پھر وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "خیر..... زمینداروں ہی کا کیا ذکر..... تاجر' صنعت کار' سرکاری اہل کار۔ کوئی بھی کم نہیں ہے۔ یہ سب لوگ ہم سے بڑے ڈاکو ہیں۔ ہمارا تو نام زیادہ بدنام ہے۔ زیادہ بڑے ڈاکو تو معزز لوگوں والے لباس پہن کر اچھے اچھے دفتروں میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بہرحال..... ہمارا واسطہ زیادہ تر زمینداروں سے ہے' اس لیے ہم انہی کی بات کرتے ہیں۔ ہم نے ان کے لیے ہر تفریح کا بندوبست کر رکھا ہے۔ ہر پندرہ دن بعد یہاں ایک زبردست فلور شو ہوتا ہے جو کسی زمانے میں بیروت کے نائٹ کلبوں میں اور آج کل یورپ وغیرہ میں ہونے والے فلور شو سے کم نہیں ہوتا۔"

اگر میں وہ ٹھکانا دیکھ کر نہ آرہا ہوتا تو شاید یہی سمجھتا کہ میں کسی تخیل پرست شخص کی باتیں سن رہا ہوں۔ چند لمحے گم صم رہنے کے بعد میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "ممبر بنانے کے لیے لوگوں تک رسائی کیسے ہوتی ہے؟"

"شروع میں ذرا مسئلہ تھا' اب تو خود ہی ایک بھیڑ کے پیچھے دوسری بھیڑ چلی آرہی ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "ویسے بھی جانو کو کسی بھی چیز کا نظام چلانے میں بڑی مہارت حاصل ہے۔ امریکا کے بدمعاشوں کے گروہوں سے وہ یہی سب سے بڑا کام سیکھ کر آیا ہے۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ وہ امریکا میں کئی سال رہ کر آیا ہے۔"

"نہیں۔ مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"وہ اس بات پر بہت خوش ہوتا ہے کہ یہاں معاوضے پر ہر کام کے لیے لوگ مل جاتے ہیں اور رشوت سے دنیا کا ہر جائز ناجائز کام ہو جاتا ہے۔ کسی بھی طبقے میں یا کسی بھی محکمے میں ہمارے ایجنٹ یا مخبر کے طور پر کام آنے والے دستیاب ہو جاتے ہیں۔ ان سے بڑی آسانی رہتی ہے۔ ہمارا بہت بڑا اور بہت زبردست نظام کام کر رہا ہے۔ ہم یونہی اتنے پھلتے پھولتے نہیں جا رہے ہیں۔"

"بہت خوب!" میں نے بھرپور ستائشی لہجے میں کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس وقت خیسو خان زیادہ سے زیادہ داد کا طالب تھا۔

وہ مسرور لہجے میں بولا۔ "بہت کم عرصے میں جانو نے بے مثال ترقی کی ہے۔ ابھی کل ہی کی بات لگتی ہے کہ اس نے ہم چند لوگوں کو ادھر اُدھر سے جمع کیا تھا۔ کوئی حوالات میں پڑا سڑ رہا تھا، کوئی فقیروں سے بدتر زندگی گزار رہا تھا، کسی کے پیچھے پولیس لگی ہوئی تھی اور کسی کے پیچھے دشمن۔ کوئی زندگی سے بیزار تھا اور کوئی معاشرے سے۔ آج ہمارا گروہ اتنا بڑا ہے کہ آدمیوں کی صحیح تعداد کا علم صرف جانو کو ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ہم ایک گروہ نہیں، ہم کئی گروہ ہیں جن کا آپس میں اتحاد ہے۔ اب ہم بہت طاقتور ہو چکے ہیں۔ ہمیں مٹانا آسان نہیں رہا...... جو ہمیں مٹانے کی کوشش کرے گا خود بھی بڑا نقصان اٹھائے گا۔"

اب ہم جس راستے پر جا رہے تھے وہ زرتاج نگر کی طرف نہیں جاتا تھا۔ میں بہت ذہن میں محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ شارٹ کٹ شروع ہو چکا تھا جس کے ذریعے جانو اور اس کے آدمی بہت کم وقت میں اپنے ڈیرے سے زرتاج نگر آ پہنچتے تھے۔ میرے لیے اس شارٹ کٹ کو یاد رکھنا بہت ضروری تھا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ سخت مٹی پر صرف ہمارے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیتی رہیں۔ پھر میں نے کسی سادہ لوح شخص کی طرح پُراشتیاق لہجے میں پوچھا "جانو تو بہت دولت مند آدمی ہوگا؟"

"بے شک۔ اس نے تو اب اپنی دولت مڈل ایسٹ کی طرف بھی منتقل کرنی شروع کر دی ہے۔" خیسو نے بلا تامل جواب دیا۔ "ابھی تو وہ اپنے گروہ کے لوگوں اور دوسرے کارندوں کو دل کھول کر حصہ دیتا ہے ورنہ اس کے پاس شاید اس سے زیادہ دولت ہوتی۔ بہرحال ہم لوگوں کے طور طریقوں یا رہن سہن سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ہم مالدار لوگ ہیں۔ ہمیں ظاہر کرنے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہمیں زندگی کی ہر ضرورت، ہر آسائش انہی جنگلوں، ویرانوں اور گاؤں دیہات میں میسّر ہے۔ عیش سے زندگی گزر رہی ہے، ہمیں اور کیا چاہیے؟"

"لیکن تم لوگ آمدورفت کے لیے زیادہ تر گھوڑے ہی کیوں استعمال کرتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہمیں زیادہ تر ایسے راستوں سے گزرنا پڑتا ہے جہاں گاڑیاں کام نہیں دیتیں۔ خاص طور پر جب اچانک بارش شروع ہو جائے۔" وہ بیڑی کا بنڈل نکالتے ہوئے بولا۔ "پٹرول بھی یہاں ہر جگہ دستیاب نہیں ہے۔ گھوڑوں کے استعمال کے بڑے فائدے ہیں۔ ویسے ہمارے پاس جیپیں، پجیرو، کاریں، موٹر سائیکلیں، ہر چیز موجود ہے۔ کمی کسی چیز کی نہیں ہے۔ جہاں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے...... یا جو ہم مناسب سمجھتے ہیں وہی چیز استعمال کرتے ہیں۔ گاڑیاں بعض اوقات تیز رفتاری سے فرار کروانے کے بجائے مروا بھی دیتی ہیں۔"

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ پھر ایک لمحے خاموش رہ کر پوچھا۔ "کیا خیال ہے...... جانو مجھے گروہ میں شامل کر لے گا؟"

"جانو کے بارے میں یقین سے تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔" اس نے گویا صاف گوئی سے کام لیا۔ "وہ موڈی آدمی ہے۔ کبھی کسی کو بڑے سے بڑے نقصان پر بھی معاف کر دیتا ہے اور کبھی چھوٹی سی غلطی پر کسی کو الٹا ٹانگ دیتا ہے لیکن اپنے لوگوں کے لیے بہرحال وہ دل کا بہت اچھا ہے۔ اگر کسی کے ساتھ زیادتی ہو بھی جاتی ہے تو بعد میں موڈ ٹھیک ہونے پر اس کی تلافی کر دیتا ہے، خوب نواز دیتا ہے۔ اسی لیے ہم سب اس کو پسند کرتے ہیں۔ کسی نئے آدمی کو لینے کے سلسلے میں بھی اس کا یہی حال ہے۔ کسی کو تو ایک نظر دیکھتے ہی ساتھی بنا لیتا ہے۔ کسی کو بہت عرصے لٹکاتا ہے، بہت آزماتا ہے۔"

میں نے منہ لٹکا لیا۔ گویا اس کے جواب سے مجھے کافی مایوسی ہوئی تھی۔ خیسو خان چلتے گھوڑے پر بیڑی کا گہرا کش لے کر ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولا۔ "لیکن تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔ میں نے تمہیں پاس کر دیا ہے۔ ہمیں آدمیوں کی بہرحال ضرورت ہے۔ ہمارا کام بہت پھیل رہا ہے۔ اغوا برائے تاوان کا دھندا بہت تیز جا رہا ہے۔ شہروں سے بڑے بڑے سیٹھ اٹھا کر لائے جا رہے ہیں۔ اس کام میں کافی آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے...... اور بڑے دل گردے والے آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ کبھی کبھی کسی سیٹھ کے اغوا پر بڑی سخت کارروائی شروع ہو جاتی ہے۔"

"دل گردے کی تو تم فکر ہی نہ کرو۔ جس کام پر بھی لگاؤ گے، جان لڑا دوں گا۔" میں نے خلوص سے کہا پھر دوستانہ سے انداز میں پوچھا۔ "سیٹھوں کو کہاں رکھا جاتا ہے؟"

"کوئی ایک جگہ تو نہیں ہے۔ مختلف حالات میں مختلف جگہیں ہوتی ہیں۔ اب جگہوں کے بارے میں پوچھنے مت بیٹھ جانا۔ ایک ہی وقت میں ساری باتیں تو نہیں بتائی جا سکتیں۔ جتنا کچھ میں نے تمہیں بتا دیا ہے اور دکھا دیا ہے وہی بہت ہے۔"

"ہاں۔ اس میں تو شک نہیں ہے یہ تو بڑی مہربانی ہے تمہاری۔"

[میں] نے عاجزی سے کہا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ بولا۔ "جس رفتار سے ہم نے [اب] کام شروع کیے ہیں ان حالات میں جانو جیسے آدمی کو اگر پانچ [س]ال اور مل گئے تو اس پورے صوبے میں اس کا راج ہوگا۔ اس کے حکم کے بغیر یہاں پتا بھی نہیں ہلے گا۔"

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میری رگ و پے میں سنسنی کی لہر سی دوڑ گئی۔ میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ محض لاف زنی نہیں کر رہا تھا۔ یہاں معاشرے اور نظام کے متوازی بظاہر خاموش سے انداز میں ایک اور ہی معاشرہ، ایک اور ہی نظام تشکیل پا رہا تھا اور کسی کو اس کا کوئی خاص احساس نہیں تھا کہ بگولے طوفان کس طرح بنتے ہیں اور جھونکے آندھیوں کی صورت کس طرح اختیار کرتے ہیں۔ کسی کو شاید مسئلے کی سنگینی کا احساس ہی نہیں تھا۔ شہر ہوں یا دیہات، ہر جگہ ہمیشہ ایسے لوگ کبھی نہ کبھی ایک سنگین مسئلہ بن جاتے ہیں جن کے ذہن میں یہ مجنونانہ خواہش سمائی ہوتی ہے کہ ان کے حکم کے بغیر کہیں پتا نہ ہلے۔ ایک وقت آتا ہے کہ ایسے لوگ سوسائٹی کے حلق میں چھچھوندر بن جاتے ہیں۔ سوسائٹی انہیں نہ تو نگل سکتی ہے اور نہ ہی اگل سکتی ہے۔

خیسو فخریہ لہجے میں بولا۔ "ابھی اصل مزے کی بات تو میں نے تمہیں بتائی ہی نہیں۔" اس نے سلگتی بیڑی ہوا میں اچھال کر قہقہہ لگایا۔ "یہ جو ہمارا گولڈ کی کلب ہے۔ یہ کسی قلعے سے کم نہیں ہے۔ اس پر قبضہ کرنا تو کیا...... اس تک پہنچنا ہی بڑا مشکل ہے لیکن اگر کبھی کسی طرح کوئی طاقت اس ٹھکانے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو بھی جائے تو اسے وہاں کچھ ایسے کاغذات اور دیگر ثبوت ملیں گے جن سے ظاہر ہوگا کہ اس اڈے کی مالکن تمہاری رئیسائی زرتاج ہے......"

ویرانے میں اس کا جناتی سا قہقہہ گونج کر رہ گیا۔ وہ مجھ پر یہ انکشاف کر کے گویا بہت محظوظ ہوا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے گھوڑے کی پشت پر لدی ہوئی برف کی ایک سِل بن کر رہ گیا تھا۔ میرا گھوڑا سیدھا جا رہا تھا لیکن میں گردن موڑے ایک ٹک خیسو خان کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کسی وجہ سے میرا گھوڑا ہنہنایا تو میں چونکا اور مجھے احساس ہوا کہ میرا اس قسم کا ردِ عمل ظاہر کرنا کچھ زیادہ مناسب نہیں تھا۔ میں نے جلدی سے اپنے چہرے پر مسکراہٹ سجالی۔

خیسو بولا۔ "خدانخواستہ اگر کبھی پولیس یا کوئی اور ایجنسی اس اڈے تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گئی تو اس کے پاس اخبارات کو دینے کے لیے بڑی رنگین...... بڑی سنگین اور بہت لمبی کہانی ہوگی جسے اخبارات ایک عرصے تک چھاپتے رہیں گے۔ سرخیاں لگیں گی۔ "بے مثل حسن کی مالک ایک بہت بڑی جاگیردارنی ایک انوکھا عشرت کدہ چلا رہی تھی" وہاں کیا کچھ ہوتا تھا، اخبار والے اس کی تفصیلات چٹخارے لے لے کر لکھیں گے اور پڑھنے والے اس سے

زیادہ چٹخارے لے لے کر پڑھیں گے۔ زرتاج کی اپنی شخصیت کچھ ایسی ہے کہ اس قسم کی کہانی اس سے وابستہ ہوگی تو اس کی سنسنی کئی گنا بڑھ جائے گی۔ کیا خیال ہے؟" اس نے داد طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہاں۔ یہ بات تو ہے۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے سر ہلایا۔ "جانو واقعی بہت ذہین آدمی ہے۔ اس کے زیرِ سایہ رہ کر انسان کچھ نہ کچھ بن سکتا ہے۔"

خیسو تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس کہانی پر لوگوں کو اس لیے بھی آسانی سے یقین آجائے گا کہ وہ زمین جس میں وہ اڈا بنایا گیا ہے، کسی زمانے میں زرتاج کے باپ ہی کی ملکیت تھی۔ ان کے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے حکومت نے زرعی اصلاحات کا کافی شور شرابا مچایا تھا۔ دولت والے چالاک تو بہت ہوتے ہیں، اپنی زمین بھلا کس نے چھوڑنی تھی؟ سب نے زمینیں بچانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ لیا تھا۔ اگر کسی نے تھوڑی بہت قربانی دی بھی تھی تو بنجر اور بے کار زمین کی دی تھی۔ زرتاج کے باپ نے بھی وہ بنجر اور بے کار زمین چھوڑ دی تھی اور زرعی اصلاحات کے ڈرامے میں تھوڑی سی نیک نامی کمالی تھی۔"

اب ہمارے گھوڑے ایک خاصے اونچے ٹیلے پر چڑھ رہے تھے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد وہ ایک لمحے کے توقف سے بولا۔

"ہمت لیے چوڑے علاقے میں صرف تمہاری رئیسانی ایسی ہے جس نے ہم سے کچھ زیادہ بنا کر نہیں رکھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے ہمیں کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ نقصان پہنچانے کی تو خیر اس کی کبھی ہمت ہی نہیں پڑی ہوگی لیکن اس نے کبھی ہمیں کوئی فائدہ بھی نہیں پہنچایا۔ یہ چیز ہماری نظر میں بہت کھٹکتی ہے کہ کوئی ہمیں فائدہ پہنچانے کی طاقت رکھتا ہو مگر نہ پہنچائے۔ میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا؟" وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"ہاں...... ہاں۔ کیوں نہیں۔" میں نے سمجھ داری سے سر ہلایا۔

"چنانچہ جب بھی جانو کے سر سے جاگیردارنی کے عشق کا بھوت اُتر گیا، ہم کسی نہ کسی چکر میں اسے بھی سیدھی کر دیں گے۔ ایک چھوٹا موٹا...... ہلکا پھلکا دھچکا تو ہم اسے کل بھی پہنچانے والے ہیں۔ تمہیں شاید اس کے بارے میں یہ سُن کر صدمہ ہو۔" اس کے چہرے پر خباثت بھری مسکراہٹ بدستور رقصاں تھی۔

"مجھے کیوں صدمہ ہوگا؟" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "مجھے اس سے ہمدردی ہوتی تو میں تمہارے گروہ میں بھرتی ہونے تمہارے پاس کیوں آتا؟ اسے ہم جیسے غریب غربا کی ہمدردی کی ضرورت بھی کیا ہے؟ ہماری اہمیت اس کے لیے گدھے گھوڑوں سے..... زیادہ تو نہیں۔"

پھر میں نے اپنے لہجے کے تجسس کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "کل اسے تم لوگ کیا جھٹکا دینے والے ہو؟"

"زرتاج نگر میں ایک ہی بینک ہے۔ تم نے تو دیکھا ہی ہوگا۔" وہ بڑی ترنگ میں بولا۔

"ہاں۔ دیکھا تو ہے لیکن کبھی وہاں پیسے رکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اتنے فالتو پیسے ہی نہیں ہوئے کبھی ہمارے پاس۔" میں نے مسکینی سے کہا۔

اس نے ایک بار پھر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ میں اسے زیادہ نہیں جانتا تھا۔ میرے اور اس کے درمیان صرف نفرت کا زہریلا رشتہ تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ اتنا خوش وہ کبھی کبھار ہی نظر آتا ہوگا جتنا آج نظر آ رہا تھا۔

"ہاں۔ بینک تم جیسوں کے لیے نہیں کھولے جاتے۔" اس نے گویا میری مسکینی سے محظوظ ہوتے ہوئے کہا۔ "تم تو کبھی اندر بھی نہیں گئے ہوگے؟"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "مجھے تو کبھی کسی نے اپنا چیک کیش کرانے یا رقم جمع کرانے بھی نہیں بھیجا۔"

میں نے آج ہی گاؤں کے بازار سے گزرتے وقت بینک کا بورڈ دیکھا تھا۔ اس وقت بینک بند تھا اور اس کے دروازے پر لوہے کی گرل مقفل تھی۔ وہ ایک ہی بڑے سے کمرے پر مشتمل معلوم ہوتا تھا۔

وہ ہنس کر بولا۔ "کنگالوں پر کون اعتبار کرتا ہے۔ خیر...... میں تمہیں یہ بتانے لگا تھا کہ اس بینک میں گاؤں والوں کی رقم کا تو زیادہ لین دین نہیں ہوتا۔ اصل میں بینک کی یہ شاخ صرف تمہاری رئیسانی کی خدمت کے لیے کھولی گئی ہے۔ زیادہ رقم اسی کی ہوتی ہے۔ اسی کا لین دین چلتا ہے۔ آج کل کٹائی کا زمانہ ہے۔ اس کی فصل کے ٹرک بھر بھر کر شہر جا رہے ہیں اور منڈی سے رقمیں آ رہی ہیں۔ بینک کی اس برانچ سے کیش روزانہ نیشنل بینک کو بھیجنے کی سہولت موجود نہیں ہے۔ پورے پندرہ دن بعد نیشنل بینک کی گاڑی کیش لینے آتی ہے۔ کل چودھواں دن ہے۔ یعنی کل بینک میں زیادہ سے زیادہ کیش موجود ہوگا۔"

"تو پھر......؟" میں نے بظاہر پُراشتیاق لہجے میں پوچھا۔

"کل دوپہر کے لیے ہم نے اپنے چار آدمیوں کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ ایک بجے جب عام لوگوں کے لیے لین دین بند ہو جائے اور بینک میں صرف عملے کے تین آدمی حساب کتاب میں مصروف ہوں تو انہیں کیش کے بوجھ سے نجات دلا دی جائے۔ خواہ مخواہ بے چاروں کو رقم سمیٹ سمیٹ کر رکھنی پڑتی ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"یعنی ڈاکے کا پروگرام ہے؟" میں نے بظاہر خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ فی الحال تم یہی لفظ استعمال کر سکتے ہو کیونکہ ابھی تم باقاعدہ طور پر گروہ میں شامل نہیں ہوئے ہو۔ ورنہ ہم تو ایسے موقعوں پر یہی کہتے ہیں کہ ذرا کیش کا بندوبست کرنے جا رہے ہیں۔" وہ خوش دلی سے بولا۔

پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔ ایک ہاتھ سے وہ اپنی ٹوپی درست کرتے ہوئے بولا۔ "میں ابھی جا کر جانو سے بات کروں گا۔ اگر اس نے اجازت دی تو کل والی اس واردات میں تمہیں بھی شامل کر لیں گے۔ اپنے گھر سے ہی کام شروع کر دو۔ بالکل سیدھا سادہ اور آسان سا کام ہے۔"

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر چٹکی بجائی۔ "یوں جاؤ گے اور یوں رقم سمیٹ کر لے آؤ گے تم لوگ۔ اس قسم کے کاموں میں ہمیں زیادہ کھاگ لوگوں کو بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اناڑیوں سے بھی کام چل جاتا ہے۔ کیا خیال ہے...... چلے جاؤ گے نا؟"

میں نے محسوس کیا کہ وہ میرے حوصلے یا میری وفاداری کا ہلکا سا امتحان لے رہا تھا کہ میں یک دم ڈاکا زنی میں کود پڑنے اور اپنے ہی علاقے سے آغاز کرنے کے لیے تیار ہوں یا نہیں؟

"میرا اپنا ہی گاؤں ہے..... کوئی مجھے پہچان تو نہیں لے گا؟" میں نے گویا اس کی تجویز کے سلسلے میں ذہنی طور پر نیم رضامند ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تم کافی سیدھے آدمی معلوم ہوتے ہو اور تمہاری یہی بات مجھے پسند بھی آئی ہے۔ سیدھے اور سچے سے آدمی اگر ڈاکو بننے پر

ٹل جائیں تو بڑے غضب کے ڈاکو ثابت ہوتے ہیں۔" وہ خوش دلی سے بولا۔ "بھئی تم سب لوگ ڈھاٹے وغیرہ باندھ کر جاؤ گے۔ ساری احتیاطیں جو اس قسم کے کاموں میں ضروری ہوتی ہیں وہ کرو گے۔ ہمیں منہ اٹھا کر دندناتے ہوئے جانے اور شیخی جھاڑنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ہمیں تو اپنے کام سے مطلب ہے۔ کام صحیح ہونا چاہیے اور مال ہمارے ہاتھ آنا چاہیے۔"

پھر وہ گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا۔ "تمام احتیاطوں کے باوجود اگر کبھی کسی واردات میں کوئی تمہارا یہ پیارا سا مکھڑا دیکھ بھی لے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ جب تم ہمارے زیرِ سایہ آجاؤ گے تو تمہیں اس قسم کی چھوٹی موٹی باتوں پر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

پھر اس نے گویا میری ڈیوٹی کی نوعیت کا بھی فیصلہ کردیا۔ "تم بینک کا دروازہ سنبھالنے کے لیے موزوں رہو گے۔ باہر سے کوئی بھی شخص کسی بھی صورت میں اندر نہ آنے پائے۔"

"بے فکر رہو! اگر میں دروازے پر جم کر کھڑا ہوگیا تو پھر کمان سے نکلا ہوا تیر یا گن سے نکلی ہوئی گولی بھی اندر نہیں آسکے گی۔" میں نے اسے اطمینان دلایا پھر گویا معاملے میں مزید دلچسپی ظاہر کرتے ہوئے پوچھا۔ "بینک میں کل کتنے آدمی ہوں گے؟"

"چار۔" غیسو نے جواب دیا۔ "موٹی توند والا تھل تھل کرتا سست اور ڈرپوک منیجر۔ ایک سوکھا سا کیشیئر۔ وہی کچھ تیز و طرار سا ہے۔ اس سے ذرا ہوشیار رہنے کی ضرورت ہوگی لیکن تمہیں نہیں۔ یہ ہمارے ان آدمیوں کی ذمے داری ہوگی جو اندر جائیں گے۔ ایک بے ضرر سا کلرک یا شاید اکاؤنٹنٹ ہے۔ ایک قریب المرگ قسم کا گن مین ہے جو توڑے دار بندوق سنبھالے ایک طرف بیٹھا اونگھتا رہتا ہے۔ چھوٹی موٹی برانچوں پر عام طور پر اسی قسم کے گن مین دیکھنے میں آتے ہیں جن کی بندوقیں شاید پہلی جنگِ عظیم کے زمانے کی ہوتی ہیں اور انہیں زنگ لگا ہوتا ہے۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے فائر کرنے کی کوشش کی تو بندوق پھٹ پڑے گی اور کسی دوسرے کو مارنے کے بجائے وہ خود ہی مارے جائیں گے۔ شاید اسی لیے بے چارے ڈاکے وغیرہ کی صورت میں فائر نہیں کرتے اور بڑی آسانی سے ڈاکوؤں کے قابو میں آجاتے ہیں۔ یہ صرف دکھانے کے دانت ہیں۔ وہ بھی کیڑا لگے ہوئے۔"

میں ہنس دیا۔ غیسو بولا۔ "بینک والے بالکل مطمئن اور بے فکر رہتے ہیں کیونکہ زرتاج نگر میں چھوٹے موٹے جھگڑوں کے سوا برسوں سے کوئی قابلِ ذکر واردات نہیں ہوئی۔ وہاں ہم ہی کوئی واردات کرسکتے تھے لیکن ہم نے اب تک اس گاؤں پر نظرِ کرم رکھی تھی لیکن اب وقت آگیا ہے کہ وہاں کی دولت میں سے بھی آٹھ دس لاکھ کا خراج وصول کرلیا جائے۔"

اس نے ایک اور بیڑی نکالی۔ گھوڑا روک کر اس نے بیڑی کو سلگایا کیونکہ ہوا اب کچھ تیز ہوگئی تھی۔ دور کہیں سے گیدڑوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ایک کش لے کر وہ گھوڑے کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "شاید تمہیں معلوم ہو، بینک کے دو دروازے ہیں۔ ایک پچھلی گلی میں کھلتا ہے۔ احتیاطاً ہمارا ایک آدمی اُدھر بھی کھڑا ہوگا۔ وہ گلی بہت چھوٹی اور گندی ہے ورنہ ہم جیپ بھی اِدھر ہی کھڑی کرتے۔ فرار کے لیے تم لوگ جیپ استعمال کرو گے۔ ایک آدمی ڈرائیونگ سیٹ پر ہی موجود رہے گا اور جیپ کو اسٹارٹ رکھے گا۔ دو آدمی اندر جائیں گے۔ پانچویں تم ہوگے جو دروازے پر رہو گے۔"

پھر اچانک ہی اس نے پوچھا۔ "تمہیں ڈرائیونگ آتی ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بولا۔ "لیکن اس واردات میں بہرحال وہی ڈرائیو کرے گا جس کی پہلے سے ڈیوٹی لگ چکی ہے۔ اسے ہی یہ بھی معلوم ہے کہ رقم کہاں لے کر جانی ہے۔ وہ رقم اڈے پر نہیں جائے گی۔"

پھر وہ کچھ سوچ کر بولا۔ "لیکن کسی ایمرجنسی کی صورت میں ڈرائیونگ کے لیے تمہاری ضرورت بھی پیش آسکتی ہے۔"

"میں تو ہر کام کے لیے حاضر ہوں۔" میں نے خلوص سے کہا۔ "بس مجھے موقع ملنا چاہیے۔"

"بس سمجھ لو تمہیں موقع مل گیا۔" وہ شاہانہ انداز میں بولا۔ اس نے اپنی حد تک تو گویا یقینی طور پر اس مہم کے سلسلے میں میرا "تقرر" کردیا تھا۔ اسی لیے وہ مجھے سب کچھ سمجھا رہا تھا اور ہدایات دے رہا تھا۔

میں نے قدرے ہچکچاہٹ سے کہا۔ "علاقہ تو میرا اپنا ہے...... لیکن چونکہ مجھے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا...... اور جتنا عرصہ بھی گزرا ہے وہ شریفانہ انداز میں ہی گزرا ہے، اس لیے مجھے پولیس وغیرہ کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں چنانچہ تم سے ہی پوچھ رہا ہوں کہ زرتاج نگر میں پولیس کی کیا پوزیشن ہے؟"

"کیوں...... کیا ڈر رہے ہو؟" غیسو نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ شاید اس کے ذہن میں یک دم اس اندیشے نے سر ابھارا تھا کہ میں بزدل تو ثابت نہیں ہوں گا۔

"ارے نہیں یار!" میں نے قہقہہ لگایا۔ "اب اس لائن میں رہنا ہے تو میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔"

"زرتاج نگر میں ایک تھانہ تو موجود ہے۔ وہ تو تم نے دیکھا ہی ہوگا؟" اس نے جاننا چاہا۔

"ہاں۔ باہر سے تو دیکھا ہے۔ شکر ہے اندر سے نہیں دیکھا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہاں اکثر صرف ایک انسپکٹر، ایک اے ایس آئی، ایک محرر اور دو کانسٹیبل بیٹھے تاش کھیلتے رہتے ہیں یا نذرانے میں آئی ہوئی مرغیاں بھون کر کھاتے رہتے ہیں۔ وہ بے چارے تو اس جگہ سے بڑے بیزار ہیں جہاں کوئی خاص واردات نہیں ہوتی۔ وہ تو بدمعاشی

کا رُجحان رکھنے والے کئی لوگوں کو تھپکی دے چکے ہیں کہ وہ کچھ ہمت پکڑیں اور غلط سلط دھندے شروع کریں مگر بڑا کام دکھانے یا غلط سلط دھندے شروع کرنے کی کسی کی ہمت ہی نہیں پڑتی۔ علاقے پر زرتاج کا کنٹرول کافی سخت ہے۔"

"ایسا کیوں ہے؟" میں نے بیزاری سے کہا۔ "میں اس کا کارندہ ہوتے ہوئے بھی اس بات کو نہیں سمجھ سکا کہ وہ عورت ہوکر بھی اتنا سخت کنٹرول قائم رکھنے میں کیسے کامیاب ہے؟ جبکہ وہ اپنی دہشت پھیلانے کے لیے کچھ خاص حرکتیں بھی نہیں کرتی۔ باہر بھی کم نکلتی ہے۔"

"بہت سادہ سی بات ہے۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟" غیسو نے پوچھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا تو وہ بولا۔ "وہ خود دیانتدار ہے اور دولت کی لالچی نہیں ہے۔ بس ان دو خصوصیات کی وجہ سے وہ علاقے پر اپنا سخت کنٹرول قائم رکھنے میں کامیاب ہے...... لیکن ایک بات طے ہے کہ ایک بار کوئی بڑی واردات ہوگئی اور اس کے ذمے دار لوگ پکڑے نہ گئے تو پھر سلسلہ شروع ہوجائے گا۔ جرم ایک ایسی کھیتی ہے کہ ایک بار کہیں اس کا بیج پڑ جائے تو بڑی تیزی سے پھلتی پھولتی ہے۔"

میں اس کی باتیں سن رہا تھا اور میرے تصور میں زرتاج کا چہرہ گھوم رہا تھا جس پر صرف طمانیت کی چاندنی تھی، اندیشوں کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی۔ اس بے چاری کو معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کے اردگرد کیسے فتنے جڑ پکڑ رہے تھے۔ کیسی کیسی بلائیں اپنے جال بُن رہی تھیں۔ وہ اپنے آئیڈیل ازم میں مگن اور اپنے معمولات میں منہمک تھی۔

غیسو کہہ رہا تھا۔ "تھانے والے خانہ پُری کریں گے۔ رئیسانی کا کوئی خاص اثر و رسوخ بھی نہیں ہے جو وہ زیادہ آگے جانے کی کوشش کرے۔"

"اس کا اثر و رسوخ نہیں ہے؟" میں نے حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔

"ایسا اثر و رسوخ نہیں ہے جو اس کے کام آسکے۔ بس دکھاوے ہی دکھاوے کا ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "اس نے کبھی اثر و رسوخ صحیح معنوں میں بڑھانے کی کوشش ہی نہیں کی ورنہ اس جیسی عورت تو نہ جانے کیا قیامت ڈھاتی۔ اس نے شاید اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ وہ سوچتی ہوگی کہ جب وہ کوئی غلط کام نہیں کرتی، کسی ہیرا پھیری میں ملوث نہیں، کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کرتی تو اسے آڑے وقت میں کام آنے والے لوگوں سے تعلقات بڑھانے کی کیا ضرورت ہے۔"

"ہاں...... اس طرح کی تو باتیں کرتے اسے میں نے بھی سنا ہے۔" میں نے سر ہلایا۔

"لیکن اسے نہیں معلوم کہ آج کل کے زمانے میں یہ فارمولے غلط ہوتے جارہے ہیں۔" وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "آج کل تو مجرموں کو اپنی حفاظت اور بچاؤ کے لیے اونچے لوگوں سے رابطے رکھنے پڑتے ہیں اور شریفوں کو اپنی شنوائی کے لیے۔ اگر شریف لوگوں کے صحیح جگہوں پر رابطے نہیں ہوں گے تو کوئی ان کی فریاد بھی نہیں سُنے گا۔ کیا سمجھے؟ میں غلط کہہ رہا ہوں کیا؟"

"سولہ آنے صحیح بات ہے۔" میں نے تائید میں سر ہلایا۔

"اگر زرتاج اس واردات کے...... یا آئندہ کی کسی بھی واردات کے سلسلے میں کچھ کرنے میں کامیاب بھی ہوگئی تو ہم اسے سنبھال لیں گے۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ دو چار وارداتوں کے بعد خود ہی تمہارا حوصلہ اتنا بڑھ جائے گا کہ تمہیں کسی مشورے اور تسلی کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

اب میرا یہ یقین پختہ ہوچکا تھا کہ وہ اتنا جاہل اور کوڑھ مغز نہیں تھا جتنا اپنے سراپا سے نظر آرہا تھا۔ جانو جیسے شاطر شخص نے یونہی تو اسے اپنا نائب نہیں بنا رکھا تھا۔ اس اعتبار سے گویا وہ اور بھی بڑی چیز تھا۔ عیار اور مکار لوگ جب خباثت کے راستے پر نکلتے ہیں تو بہت دور تک جاتے ہیں اور دنیا کو زیادہ آزار پہنچاتے ہیں۔ وہ زیادہ نت نئے ہتھکنڈوں سے دنیا کو ستاتے ہیں۔ ان کے ذہن سے کسی مثبت سوچ کا گزر نہیں ہوتا۔

دفعتاً وہ سامنے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہ سرکنڈوں کا جنگل سا نظر آرہا ہے نا...... اس کے پیچھے بہت بڑی دلدل ہے...... اور وہ بائیں ہاتھ پر اونچی اونچی پہاڑیاں ہیں۔ گھوڑوں کے لیے ان پر چڑھنا...... اور خاص طور پر تھکن کی حالت میں چڑھنا پھر دوسری طرف اترنا کافی مشکل ہے۔ اگر ہم ان کے گرد چکر کاٹ کر جائیں تو دسیوں میل کا فرق پڑ جائے گا اور اس طرف کا راستہ بھی بڑا ہی خراب ہے......"

سمتوں کے ساتھ میں نے یہ سب کچھ ذہن نشین کرتے ہوئے پوچھا۔ "تو پھر ہم اب کیا کریں گے؟"

"قدرت کا کمال دیکھو۔ سرکنڈوں کے جنگل اور پہاڑیوں کے درمیان یہاں سے تو کافی فاصلہ نظر آرہا ہے نا؟ لیکن آگے چل کر صرف ایک پٹی سی رہ جاتی ہے جو ٹھوس ہے۔ باقی سب دلدل ہے۔ تقریباً ایک میل تک وہ صرف اتنی چوڑی ہے کہ اس پر سے ایک گھوڑا گزر سکتا ہے۔ وہ بھی احتیاط کے ساتھ۔ اگر اس کا رخ ذرا سا بدلا تو سیدھا دلدل میں۔"

"اوہ...... !" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

"دلدل سے بہ خیر و عافیت گزرنے کا وہی ایک راستہ ہے۔ اس قسم کی بہت سی جگہیں ہیں جہاں سے گزرتے وقت تمہیں زیادہ صحیح طور پر سمجھ آجائے گی کہ ہم سواری کے لیے اکثر گھوڑے کیوں استعمال کرتے ہیں۔" وہ بولا۔

"میں پہلے ہی بہت اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"جہاں سے میں تمہیں بتاؤں گا وہاں سے تم میرے برابر چلنے کے بجائے بالکل میری سیدھ میں پیچھے پیچھے آؤ گے۔ اس پٹی پر چلنے کے دوران ہم آپس میں بات بھی نہیں کریں گے۔"

"بہت بہتر۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ ان کے اڈے اور زر تاج نگر کے درمیان شارٹ کٹ یہی تھا...... اور یہ ایک ایسا شارٹ کٹ تھا جس سے ان کے اپنے علاوہ کوئی استفادہ نہیں کر سکتا تھا۔

وہ شاید فطرت کے اس نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ "میری زندگی کا زیادہ تر حصہ ویرانوں' جنگلوں اور پہاڑیوں میں گزرا ہے۔ انسان کو زندگی کا سلیقہ یہیں آتا ہے۔ شہر کی سڑکوں پر نہیں...... لیکن اتنی زمین دیکھنے اور بڑی عجیب عجیب چیزوں کا نظارہ کرنے کے باوجود اس طرح تین چیزیں مجھے کہیں اکٹھی نظر نہیں آئیں۔ یعنی سرکنڈوں کا جنگل...... پہاڑ اور دلدل۔ جہاں پہاڑ ہوتے ہیں وہاں عموماً دور دور تک دلدل نہیں ہوتی۔"

پھر وہ جیسے کسی خیال سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔ "ان کے درمیان ٹھوس زمین کی جو پٹی ہے وہ تو بہت ہی کام کی چیز ہے۔ اگر تمہیں اس پٹی پر گھوڑا دوڑانے میں مہارت ہو تو تم اپنے تعاقب میں آنے والی پوری فوج کی فوج کو بھی دلدل میں دھنسا سکتے ہو۔ بہت دیر میں کسی کی سمجھ میں یہ بات آئے گی کہ تم کیسے صحیح سلامت گھوڑا دوڑائے جا رہے ہو اور تمہارے تعاقب میں آنے والے کیوں زمین میں غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ دلدل اور ٹھوس پٹی کے رنگ میں کوئی فرق نہیں۔ اس لیے کوئی ان کے درمیان امتیاز نہیں کر سکتا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ فخریہ سے لہجے میں بولا۔ "یہ گزرگاہ صرف ہماری دریافت ہے اور فی الحال صرف ہمارے ہی استعمال میں ہے۔"

بالآخر سرکنڈوں کے جنگل کے قریب سے گزرتے ہوئے ہم محفوظ پٹی پر جا پہنچے۔ وہاں سے میں دھندلی سی روشنی میں خیسو کے عین پیچھے احتیاط سے گھوڑے کو چلانے لگا۔ واقعی یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ پٹی کتنی چوڑی تھی۔ وہاں تاحدِ نظر زمین کا رنگ مٹیالا سا ہی تھا۔ کسی کو گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا کہ وہاں کوئی دلدل موجود تھی۔

میں راستے کے بارے میں پوری طرح چوکس تھا اور اپنی توجہ مکمل طور پر ادھر ہی رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن پھر بھی مختلف خیالات ذہن پر یلغار کیے ہوئے تھے۔ درحقیقت میں بے حد متفکر تھا۔

سچی بات یہ تھی کہ میں ذہن میں کوئی واضح منصوبہ لیے بغیر خیسو سے آن ملا تھا۔ میرے ذہن میں بس ایک دھندلا سا خاکہ تھا کہ اگر خیسو خان بے وقوف بن گیا تو میں اس کے ساتھ ان لوگوں کے اڈے تک جا پہنچوں گا اور ایک آدھ دن میں کوئی مناسب موقع پا کر ان کی غفلت کے کسی لمحے میں ان سب کو یا ان میں سے زیادہ سے زیادہ ڈاکوؤں کو موت کے گھاٹ اتار کر واپس بھاگ آؤں گا۔

لیکن اب مجھے اپنا یہ ارادہ بچکانہ سا لگ رہا تھا۔ میرے ذہن میں ان کے بارے میں یہی تصور تھا کہ وہ ڈاکوؤں کا کوئی چھوٹا موٹا گروہ تھا۔ میں نے جنگل میں جانو کی کمین گاہ پر جن آٹھ دس افراد کو دیکھا تھا اور جن کی صورتیں بھی ذہن میں محفوظ کر لی تھیں' میرے خیال میں گروہ کل انہی پر مشتمل تھا اور ان کا صفایا کرنے سے گروہ کا قلع قمع ہو سکتا تھا۔ میرے لیے چوہے بلی کا کھیل ختم ہو سکتا تھا اور کم از کم ایک طرف سے تو میں مطمئن اور بے فکر ہو سکتا تھا۔

لیکن خیسو خان کی باتوں نے میری آنکھیں کھول دی تھیں اور میری خوش فہمی دور کر دی تھی۔ وہ لوگ بظاہر تعداد میں تھوڑے اور معمولی ڈاکو ہی نظر آتے تھے لیکن درحقیقت وہ معمولی ڈاکو نہیں' اچھے بھلے دہشت گرد تھے اور مافیا کی طرح بڑے منظم اور مربوط انداز میں نہ جانے کہاں کہاں پھیلے ہوئے تھے۔ چار چھ کو مارنے سے گروہ مکمل طور پر ختم نہیں ہو سکتا تھا...... اور منہ اٹھا کر ان لوگوں میں جا گھسنا خود میرے لیے بھی خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ حد سے زیادہ خود اعتمادی میرے لیے نقصان دہ بھی ثابت ہو سکتی تھی۔ یہ اتنا آسان اور سیدھا سادہ معاملہ نہیں تھا۔ اس میں کچا قدم نہیں اٹھانا چاہیے تھا۔

خیسو تو نہایت سنجیدگی سے مجھے گروہ میں شامل کرنے کے لیے لے چلا تھا اور پرسوں سے شاید وہ لوگ مجھے "کام" پر بھی بھیج دیتے۔ کام بھی سب سے پہلے اپنی محسنہ ہی کے گھر میں نقب لگانے کا تھا لیکن میں اب محسوس کر رہا تھا کہ میرے لیے خیسو سے جان چھڑا کر واپس چلے جانا ہی بہتر تھا...... لیکن اس کے لیے کون سا طریقہ مناسب ہو سکتا تھا؟ میں اسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے خود اپنے لیے کوئی راہِ فرار نہیں چھوڑی تھی۔

بہرحال میں نے یہ ضرور محسوس کر لیا تھا کہ ان کے اڈے پر جانے سے میرے لیے کسی بھی طرح فی ا[illegible] واپس چلے جانا ہی بہتر تھا۔ خواہ اس کے لیے مجھے خیسو خان کو ٹھکانے ہی لگانا پڑتا۔ ویسے بھی میرا ارادہ اسے جہنم رسید کرنے کا ہی تھا لیکن اس کام کے لیے اب ان کے اڈے پر جانے اور کسی مناسب موقع کا انتظار کرنے کے بجائے اس ویرانے میں ہی کچھ کر گزرنا بہتر تھا۔ اس کام کے لیے مناسب ترین وقت تو یہی معلوم ہو رہا تھا جب وہ میری طرف پشت کیے سیدھا آگے چلا جا رہا تھا۔

اتنے قریبی ہدف کے لیے تو ریوالور ہی کافی تھا اور میں قمیص کے نیچے ریوالور چھپائے ہوئے تھا لیکن پھر میں نے مناسب یہی سمجھا کہ میں [illegible] ک پٹی خیسو کی رہنمائی میں ہی عبور کر جاؤں۔

یہاں فائر کرنے کا کوئی خطرناک ردِعمل بھی ظاہر ہو سکتا تھا۔ ابھی سفر باقی تھا اور اس سفر کے دوران اسے گولی مارنے کے بہت سے اچھے مواقع میسر آنے کی امید تھی۔

اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں مطمئن ہو گیا۔ اس شخص کو گولی مارنے کا تصور میرے لیے بڑا طمانیت بخش تھا۔

ایک میل کا وہ ٹکڑا مجھے بڑا طویل محسوس ہوا۔ بالآخر ایک جگہ رک کر خیسو نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مطمئن لہجے میں بولا۔ "اب تم میرے برابر آ سکتے ہو۔"

میں اپنا گھوڑا ذرا ڈرتے ڈرتے اس کے برابر لے گیا۔ اس پٹی اور دلدل کے درمیان اب بھی کوئی فرق ظاہر نہیں ہوا تھا' تاہم میں نے اس کی سیدھ ذہن نشین کر لی تھی۔

چند لمحے ہم خاموشی سے محوِ سفر رہے۔ بالآخر خیسو نے ہی سکوت توڑا۔ "کس خیال میں پھنسے ہوئے ہو؟"

"میرا ذہن پھر اس اڈے کی طرف چلا گیا تھا۔ "لولڈ کی کلب" کی طرف۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "جو لوگ وہاں ضرورت کی چیزیں وغیرہ پہنچاتے ہوں گے وہ بھی تو اس ٹھکانے سے واقف ہوں گے؟"

"وہاں کوئی بھی شخص کوئی چیز پہنچانے نہیں آتا۔ ہر چیز ہمارے آدمی اپنی گاڑیوں میں لے کر آتے ہیں۔ اگر کبھی ان کلاشنکوفوں کی طرح کوئی خاص کھیپ آئی ہو تو ان کے لیے الگ ٹھکانے ہیں۔ پہلے چیز وہاں آتی ہے' وہاں سے ہم کلب میں منتقل کرتے ہیں۔ کلب سے وہ چیزیں تقسیم ہو کر وہاں پہنچ جاتی ہیں جہاں ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں ہمارے انتظامات میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں۔ سب کام بڑے شاندار طریقے سے چل رہا ہے۔"

"بہت خوب!" میں نے ایک بار پھر مرعوبیت کا اظہار کیا۔

دفعتاً خیسو ادھر ادھر دیکھتے ہوئے بولا۔ "کچھ کھا پی لینا چاہیے اور تھوڑی دیر ستا لینا چاہیے۔ بڑی بھوک لگ رہی ہے۔"

"کھائیں گے کیا؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔ "ہمارے پاس کھانے کے لیے تو کچھ نہیں ہے۔"

"ایسی بات نہیں ہے۔" وہ مسکرایا۔ "مجھے معلوم تھا' راستے میں بھوک لگے گی۔ میں بندوبست کر کے چلا تھا۔" وہ گھوڑے سے اتر آیا۔

ایک صاف سی جگہ دیکھ کر خیسو نے چادر بچھائی اور اس پر بیٹھ کر اس بیگ میں سے ایک بڑا سا پیکٹ نکالا جس میں میرے خیال میں رقم کا پیکٹ بھی موجود تھا۔ اخباروں کی تہیں وغیرہ کھولنے کے بعد اس پیکٹ سے دو چرغے برآمد ہوئے۔ خیسو نے ایک چرغا کاغذ پر میرے سامنے رکھ دیا اور دوسرا خود وحشیانہ انداز میں ادھیڑتے ہوئے بولا۔ "داڑھ تو گرم ہو ہی جائے گی۔"

میں آہستگی سے مرغی کی ٹانگ چباتا رہا' خیسو کی طرف دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ مجھے فیصلہ کن قدم کب اٹھانا چاہیے۔ اب زیادہ تاخیر مناسب نہیں تھی۔

چرغا چٹ کر کے وہ کلاشنکوف ایک طرف رکھ کر لیٹتے ہوئے بولا۔ "ذرا کمر ہی سیدھی کر لیں۔" پھر اسے ہچکی آئی اور وہ مونچھوں کو بل دیتے ہوئے بولا۔ "یار...... ! وہ میرے گھوڑے کی زین سے پانی کی بوتل بندھی ہوئی ہے' وہ تو کھول لاؤ۔"

اس کا گھوڑا جھاڑیوں پر منہ مارتا ذرا دور چلا گیا تھا۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس کے قریب پہنچا اور پانی کی بوتل زین سے کھول کر جونہی مڑا' میری رگوں میں لہو منجمد سا ہو گیا۔

خیسو خان جسے میں نے ایک لمحے پہلے تکیے سے انداز میں بے پروائی سے لیٹے دیکھا تھا' وہ اب ایک گھٹنے کے بل کسی درندے کی طرح چوکنا کھڑا تھا۔ اس کی کلاشنکوف تو بدستور ایک طرف چادر پر ہی پڑی تھی لیکن اس کے ہاتھ میں ایک بدصورت سا ریوالور نظر آ رہا تھا جس کا رُخ میری ہی طرف تھا۔

میری کلاشنکوف بھی چادر پر ہی پڑی تھی۔ اضطراری طور پر میں نے قمیص کے نیچے چھپے ریوالور کی طرف ہاتھ بڑھانا چاہا لیکن خیسو فوراً بولا۔ "نا...... نا برخوردار...... ! خیسو خان کے سامنے اس قسم کی حماقت نہ کرنا۔ میرے نشانے کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں ہے۔ دیکھو...... میں ایک فائر کروں گا۔ اگر تم اپنی جگہ سے بال برابر بھی نہ ہلے تو گولی تمہارے بائیں کان کے پاس سے گزرے گی۔ بالکل پاس سے......"

میں اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔ اس ویرانے کے سناٹے میں فائر کا دھماکا خاصا خوفناک محسوس ہوا۔ گولی میرے بائیں کان کی لو کو تقریباً چھوتی ہوئی گزری۔

میرے تاثرات شاید کچھ اس قسم کے تھے کہ خیسو کو یقیناً بے تحاشا ہنسی آ رہی تھی لیکن وہ ایک مختصر قہقہے پر اکتفا کرتے ہوئے بولا۔ "کیا تم واقعی مجھے اتنا ہی احمق سمجھے تھے افضل خان؟"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے ابتدا ہی سے اسے ایک جاہل' احمق اور کوڑھ مغز سمجھا تھا مگر اب محسوس ہو رہا تھا کہ احمق وہ نہیں' میں تھا۔ اس کے بارے میں میری رائے تو کافی دیر پہلے سے بدل چکی تھی لیکن ابھی میں اس بدلی ہوئی رائے کی روشنی میں کوئی قدم اٹھانے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے پانسا پلٹ دیا۔

بہرحال...... جو غلطی سرزد ہونی تھی وہ تو اب ہو ہی چکی تھی۔ اس پر پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ انسان زندگی کے میدان میں خواہ کتنا ہی کامیاب ہو' یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کا اٹھایا ہوا ہر قدم ہی درست ثابت ہو گا۔

بعض اوقات برقی رو کا جھٹکا لگنے سے انسان کے اعصاب جھنجھنا اٹھتے ہیں لیکن وہ جھٹکا اس کے لیے مفید بھی ثابت ہوتا ہے۔ اس کی بہت سی خفیہ اور خفتہ صلاحیتیں بیدار ہو جاتی ہیں' اگر

جھٹکا مناسب وولٹیج کا ہو تو بعض اوقات اس سے فالج کے مریضوں کو بھی فائدہ ہو جاتا ہے اور دماغی مریضوں کی حالت بھی بہتر ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح تمیسو خان نے مجھے جو جھٹکا لگایا تھا وہ کچھ فائدہ مند بھی محسوس ہو رہا تھا۔

میرے اندر جو ایک درندہ سویا ہوا تھا' میں نے ایک جھٹکے سے اسے بیدار ہوتے ہوئے محسوس کیا۔ میں سرتاپا آنکھ بن گیا۔ بظاہر میں ساکت ہی رہا لیکن میرے اندر نہ جانے کتنی قوتیں متحرک ہو گئیں۔ صرف ایک ثانیے کے نہیے میں نے اپنے آپ کو خوفزدہ محسوس کیا تھا' لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خوف ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔

صرف یہ احساس رہ گیا تھا کہ میں اچانک ذرا مشکل صورتِ حال میں گرفتار ہو گیا تھا۔ جس طرح اچھے بھلے سمجھدار اور باصلاحیت شخص کا پاؤں بھی راہ چلتے وقت اچانک کسی گڑھے میں پھنس سکتا ہے' بالکل اسی طرح مجھ پر بھی ذرا مشکل آن پڑی تھی اور مجھے اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے اس سے نکلنا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ موت اور زندگی کے درمیان صرف بال جیسی باریک لکیر ہوتی ہے لیکن اس حدِ فاصل کے ایک طرف رہنا کوئی ایسا مشکل بھی نہیں۔ کم از کم مجھے اب بھی زندگی والی سائڈ پر ہی رہنا ناممکن محسوس نہیں ہو رہا تھا' لیکن اس کے لیے ضروری تھا کہ میں کوئی غلطی نہ کروں۔

میدان میں دُھندلی دُھندلی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ روشنی کچھ زیادہ نہیں تھی لیکن میں اس کی بھوؤں کی خفیف سی جنبش بھی صاف دیکھ رہا تھا اور غالباً یہی عالم اس کا تھا۔ ایک درندہ یقیناً اس کے اندر بھی رہتا تھا بلکہ وہ درندہ اس کے اندر تو کم ہی رہتا تھا' زیادہ تر باہر ہی جھانکتا رہتا تھا۔ اس وقت وہ درندہ بھی پوری طرح چوکس تھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ بھی مزید کچھ نہیں بولا تھا۔ اس کے چہرے سے مسکراہٹ کی نشانیاں غائب ہو چکی تھیں۔ چند لمحے ہم آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ساکت کھڑے رہے۔ درندوں کی بہت سی حسیات انسانوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ تمیسو نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ میرے اندر بھی کوئی درندہ بیدار ہوا ہے۔ ایک درندہ دوسرے درندے کی موجودگی کو فوراً محسوس کر لیتا ہے...... لیکن وہ شاید اس دوسرے درندے کو کوئی اہمیت دینے پر تیار نہیں تھا۔ اپنی فطرت سے مجبور تھا۔ اس کی سفاک آنکھوں میں تکبّر عود کر آیا۔

آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا وہ کہہ رہا تھا۔ ”مجھے معلوم ہے تمہارے اندر کوئی قوت بیدار ہوئی ہے لیکن اس کے باوجود تم کیا کر سکتے ہو؟ میرے لیے تمہاری حیثیت ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں۔ میں جب چاہوں گا تمہیں مسل دوں گا۔“

اس تصور سے وہ گویا محظوظ ہو رہا تھا۔ ریوالور کی نال میں خفیف سی جنبش ہوئی اور اس کے ساتھ ہی اس کی گھنی مونچھیں بھی ذرا پھیل گئیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ میری نظر ریوالور کی نال پر جمی ہوئی تھی اور میں نے ابھی تک پلک نہیں جھپکی تھی۔ اس نے یقیناً میری دونوں آنکھوں کے عین درمیان کا نشانہ لیا تھا۔ میں نے سانس روک لی اور ٹریگر پر اس کی انگلی کے بڑھتے ہوئے دباؤ کا اندازہ کرنے لگا۔

جھکائی دے کر گولی سے بچنے کے آرٹ میں ساری اہمیت وقت کے تعین کی ہوتی ہے۔ اگر ریوالور کی نال سے گولی برآمد ہونے کے بارے میں آپ کا اندازہ ذرا بھی غلط ہو گیا اور آپ ایک پل پہلے جھکائی دے گئے تو ایک ماہر نشانے باز کی گن کی نال بھی اسی لمحے جھک سکتی ہے اور آپ کی کوشش رائیگاں جا سکتی ہے۔ اگر آپ کو جھکائی دینے میں ایک پل کی تاخیر ہو گئی تب بھی آپ بچ نہیں سکتے۔

تمیسو خان کو شاید مجھ سے اندازے کی درستی کی توقع نہیں تھی۔ گولی چلی اور میں جھکائی دینے میں کامیاب رہا۔ میرے عضلات نے اس خفیف سی حرکت میں تقریباً گولی ہی کی رفتار سے میرا ساتھ دیا تھا۔ میدان میں فائر کی بازگشت گونجی لیکن اس میں میری چیخ یا کراہ شامل نہیں تھی۔

تمیسو بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔ ”تم نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔ یہ گولی تو صرف تمہارے بالوں کو چھوتی ہوئی گزرتی۔ میں تمہیں اتنی جلدی ہلاک کرنا نہیں چاہتا۔ تمہاری کھوپڑی یا دل میں اتارنے کے لیے تو میں صرف آخری گولی کام میں لاؤں گا۔ اس سے پہلے تو میں ایک ایک کر کے تمہارے دونوں بازوؤں میں.... پھر دونوں ٹانگوں میں.... اور پھر تمہارے پیٹ میں گولی ماروں گا۔ تمہیں شاید معلوم ہو کہ پیٹ میں گولی لگنے کے بعد موت بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔ میں تمہیں اذیت ہی کی موت مرتے دیکھنا چاہتا ہوں' آسان موت نہیں۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ موت جب تمہارے وجود کو سر سے پاؤں تک آری کی طرح چیرتی ہوئی گزرے گی تو تمہارے تاثرات کیا ہوں گے۔“

میری نظر اب بھی اس کی انگلی پر ہی جمی ہوئی تھی جو ٹریگر پر ٹکی ہوئی تھی۔ اگر اس نے دوسری گولی ضائع کرنے کے بعد اندھا دُھند بھی تیسرا چوتھا فائر کیا ہوتا تو میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔ گو کہ وہ محض ایک جُوا ہی ہوتا۔ ایسا جُوا جس میں بازی جیتنے کا امکان صرف ایک فیصد ہی تھا' لیکن بعض اوقات ایک فیصد ہی بہت کام آ جاتا ہے' ننانوے فیصد دھرے رہ جاتے ہیں۔

میرے ہونٹ غیر ارادی طور پر سختی سے بھنچے ہوئے تھے۔ میں نے قدرے کوشش سے انہیں حرکت میں لاتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری نکروہ آنکھوں نے تو نہ جانے کتنی مرتبہ دیکھا ہو گا یہ تماشا۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو تم نے ایسی ہی موت مارا ہو گا۔“

”بے شک۔“ وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی درندے کی خرخراہٹ سے مشابہ تھی۔ ”لیکن دوسروں کی بات اور تھی' تمہاری بات کچھ اور

ہے۔ تمہیں تڑپ تڑپ کر مرتے دیکھنا شاید میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہوگی۔ اسی لیے تو میں نے کلاشنکوف کے بجائے ریوالور اٹھایا ہے کہ کلاشنکوف کا اگر ہلکا پھلکا برسٹ بھی چل گیا تو کہیں تم فوراً نہ مرجاؤ۔"

شاید یہ قدرت کے نظام کا ایک حصہ ہے کہ بعض اوقات بے گناہوں کو متکبر اور خبیث قسم کے لوگوں کے ظلم و تشدد سے بچانے کے لیے وہ ان درندوں کے دماغ میں عجیب عجیب خناس پیدا کردیتی ہے۔ اگر ان کے دماغوں میں وہ خناس پیدا نہ ہوں تو شاید وہ چند سیکنڈ میں، بغیر کسی رکاوٹ اور مزاحمت کے اپنا کام کر گزریں۔

غمیسو خان کا مقصد بھی اگر صرف مجھے ہلاک کرنا ہوتا تو اس کا آسان ترین اور سیدھا سادہ راستہ یہی تھا کہ جب میری پشت اس کی طرف تھی، وہ کلاشنکوف اٹھا کر ایک برسٹ مارتا اور میرا قصہ تمام ہوجاتا لیکن قدرت نے اس کے دماغ میں ایک خناس ڈال دیا تھا۔ قدرت کے یہی اسرار و رموز ہوتے ہیں جن تک اکثر ہماری نظر نہیں جاتی۔

"مجھ پر اتنا غصہ کیوں ہے تمہیں؟" میں نے اس کی ٹریگر والی انگلی سے نظر ہٹائے بغیر پوچھا۔

"تم نے مجھے گھونسا مارا تھا... مجھے... یعنی غمیسو کو۔ جس پر آج تک کسی کو ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہیں ہوئی۔" اس کے منہ سے نکلنے والا ہر لفظ نفرت کے زہر میں بجھا ہوا تھا۔ "مجھے ایک گھونسے سے بے ہوش کرکے تم اپنے آپ کو بہت بڑا طرّم خان سمجھ رہے تھے؟ وہ ایک اتفاق تھا کہ میں بے ہوش ہوگیا تھا۔ کھوپڑی کے کسی نازک حصے پر ہاتھ پڑ گیا ہوگا... دوسرے میں اس کے لیے تیار نہیں تھا... مجھے تمہاری طرف سے جوابی حملے کا خطرہ ہی نہیں تھا... تم شکل سے بالکل مسکین لگ رہے تھے۔"

"میں مسکین لگ رہا تھا... اس کے باوجود تم سب ٹل کر میری ہڈیاں توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "تم لوگ اسی لیے تو مجھے زیادہ قابلِ نفرت لگے ہو کہ تمہارے ہاں مسکینوں سے وہ سلوک ہوتا ہے جو ظالموں سے ہونا چاہیے۔ ورنہ ڈاکو ہونے کی وجہ سے تم مجھے اتنے بُرے نہیں لگے تھے۔"

"مگر تم مسکین کہاں ہو؟ تم تو بڑی منحوس چیز ہو۔ میں نے تمہیں عام سا آدمی سمجھ کر سخت غلطی کی تھی۔" اس کے ہاتھ میں ریوالور ساکت تھا۔

"میں تو آج تک اپنے آپ کو عام سا آدمی ہی سمجھتا آیا ہوں" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔ "لیکن قدرت شاید فرعونوں کو ان کے انجام تک پہنچانے کے لیے عام آدمیوں کو خاص بنا دیتی ہے۔"

"میں نے تمہیں عام سا آدمی سمجھنے کی جو غلطی کی تھی اس پر میں حد سے زیادہ پچھتا رہا تھا۔ میں نے اپنی پیاری مرحوم ماں کی قسم کھائی ہوئی تھی کہ تمہیں ہر قیمت پر تلاش کرکے موت کے گھاٹ اتاروں گا۔" وہ بھی ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"ایک گھونسے پر اتنا غصہ؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس احساس سے مجھے حیرت ہوئی کہ میں اس صورت حال پر کچھ زیادہ فکر مند نہیں تھا۔

"ہاں۔ میں نے بتایا ناکہ اس سے پہلے کسی کو جرأت نہیں ہوئی تھی غمیسو خان پر ہاتھ اٹھانے کی۔" وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں پولیس کے ہتھے بھی چڑھا ہوں... جیل بھی گیا ہوں... جیل توڑ کر بھاگا تھا۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ ہم جیسے لوگ اگر پولیس کے قابو میں آجاتے ہیں تو ان کا کیا حشر ہوتا ہے لیکن یہ غمیسو خان کی دہشت تھی کہ تھانے میں... جیل میں... حوالات میں... کسی بڑے سے بڑے پھنّے خان نے بھی اسے انگلی تک نہیں لگائی تھی۔ مار پیٹ تو دور کی بات ہے، کسی نے آنکھ میں آنکھ ڈال کر بات بھی نہیں کی تھی۔"

اس نے ایک طویل سانس لی لیکن اس کے ریوالور والے ہاتھ میں جنبش نہیں ہوئی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں بھلا میں کیسے معاف کرسکتا تھا؟ جب تم خود بخود ہی مجھ سے آن ٹکرائے تو میں نے دل ہی دل میں بڑا شکر ادا کیا تھا کہ مجھے تم کو تلاش کرنے کی زحمت نہیں اٹھانی پڑی۔"

"یعنی تم نے مجھے شروع میں ہی پہچان لیا تھا؟" میں نے دوستانہ سے لہجے میں پوچھا۔

"بے شک۔" غمیسو نے جواب دیا۔

"اس کا مطلب ہے بعد کی سب باتیں تم مجھے بہلانے اور مجھ پر رُعب جمانے کے لیے کر رہے تھے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"نہیں۔ باتیں سب ٹھیک تھیں۔ میں نے تم سے ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں بولا، کوئی گپ نہیں ماری۔ سچ بول کر کسی کو بیوقوف بنانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ میں تمہیں ساتھ ساتھ لیے پھر رہا تھا، ہر بات بالکل ٹھیک ٹھیک بتا رہا تھا۔ میں دل ہی دل میں مزہ لے رہا تھا۔ تم سمجھ رہے تھے، میں تمہارے ہاتھوں بے وقوف بن رہا ہوں۔ میں مزے لے رہا تھا کہ کس طرح تمہیں ساتھ ساتھ لیے پھر رہا ہوں اور تمہیں شبہ تک نہیں کہ میرے روپ میں دراصل تمہاری موت تمہیں اپنے ساتھ لیے... پھر رہی ہے۔ میں نے سوچا تمہیں میرے ہاتھوں سے مرنا تو ہے ہی، کیوں نہ تمہیں اس دنیا سے رخصت کرنے سے پہلے اپنے اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ بتا دوں۔ بڑا لطف آرہا تھا وہ باتیں کرنے میں۔ ہمیں اپنے بارے میں باتیں کرنے کا موقع کہاں ملتا ہے۔"

ایک بار پھر وہ خرخرانے کے سے انداز میں ہنسا۔ "لیکن مجھے تمہاری بے وقوفی پر یقین نہیں آرہا۔ کیا تم واقعی یہ سمجھ رہے تھے کہ راہ چلتے جانو کے نائب کو پکڑ کر درخواست کروگے کہ وہ تمہیں گروہ میں شامل کرلے اور وہ تمہاری بات مان لے گا؟ تمہیں اس وقت بھی شک نہیں ہوا جب میں نے اس پہلی ہی ملاقات میں اتنے بڑے بڑے معاملات تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیے؟ چلو اُن باتوں کو بھی چھوڑو۔ تم نے اس پر بھی غور نہیں کیا کہ میں نے ابھی تک تمہارا نام بھی نہیں پوچھا تھا؟"

میں خاموش رہا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ مجھ سے حماقت سرزد ہوئی تھی لیکن کم از کم غمیسو کے سامنے اس کا اعتراف کرنا ضروری نہیں تھا۔

وہ ترحم آمیز سے انداز میں بولا۔ "ویسے تم کیا سوچ کر مجھ سے ملے تھے؟ تمہارے ذہن میں کوئی بات تو ہوگی؟"

"ہاں۔ میرا ارادہ تھا کہ تم سب کو ہلاک کردوں گا... ایسے ہی ویرانوں میں تمہاری قبریں بناؤں گا، ان کے سرہانے باقاعدہ کتبے نصب کروں گا اور سب سے اونچا کتبہ تمہاری قبر پر لگاؤں گا۔" میں نے سنجیدگی اور دیانتداری سے کہا۔

اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ فضا مرتعش ہوکر رہ گئی۔ وہ میری بات سے کچھ زیادہ ہی محظوظ ہوا۔ میں نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ "ابھی میں نے اپنا ارادہ ترک نہیں کیا ہے۔"

ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں پانی آنے لگا۔ میں دھندلی چاندنی میں اس کی آنکھوں میں نمی کی جھلملاہٹ دیکھ رہا تھا۔

"تم ڈاکو کیوں بنے تھے غمیسو خان؟" میں نے اچانک ہی دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"تاریخ میں نام پیدا کرنے کے لیے، بڑا آدمی کہلانے کے لیے، الیکشن لڑنے کے لیے۔" وہ استہزائیہ سے لہجے میں بولا پھر یکدم جیسے اسے غصہ آگیا۔ زمین پر پاؤں مارتے ہوئے بالکل بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔ "ابے گدھے! ظاہر ہے مجبوریوں کی وجہ سے بنا تھا۔ اس معاشرے نے بنایا تھا مجھے ڈاکو۔"

"بکواس ہے یہ۔ جھوٹ بولتے ہو تم۔" میں نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔ "اپنے گناہوں کا پشتارہ معاشرے کے کندھوں پر لادنے کا یہ بہت اچھا فارمولا ایجاد کر رکھا ہے تم لوگوں نے۔ تم جیسے لوگوں میں ڈاکو بننے کے جراثیم پہلے سے موجود ہوتے ہیں، تم صرف بہانے کی تلاش میں ہوتے ہو۔"

وہ خاموش رہا۔ میں نے تیزی سے کہا۔ "ہمارے ہاں زیادہ تر لوگوں نے وتیرہ بنا لیا ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی بہانہ گھڑ کر اپنے بے قصور ہم وطنوں، اپنے بھائیوں پر ظلم شروع کردیتے ہیں۔ کبھی شور برپا کیا کہ فلاں طبقے نے ہمارے حقوق دبا رکھے ہیں... اور اس کے ساتھ ہی مار کاٹ اور آتشزنی شروع کردی۔ کبھی نعرہ بلند ہوا فلاں لوگ ہماری حق تلفی کر رہے ہیں... اور اس کے ساتھ ہی بے گناہوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔ یہ مظلومیت کا ردِعمل نہیں، یہ صرف خباثت ہے۔ اگر کسی کو نظام سے شکایت بھی ہے تو نظام گلی محلوں میں رہنے والوں نے تو نہیں بنایا۔ پالیسیاں اور نظام تو اونچے اونچے دفتروں میں بنتا ہے۔ ان کا کوئی کچھ بگاڑ نہیں پاتا۔ عام لوگوں کو مارنا شروع کردیتے ہیں۔"

وہ ایک ٹک مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ "کیا یہ سیاسی تقریر کا موقع ہے؟"

"یہ سیاسی تقریر نہیں ہے، یہ تمہاری ہی کہانی ہے۔ تمہاری... اور تم جیسے بہت سے لٹیروں کی جو اندر سے ایک ہیں لیکن جنہوں نے اس سوسائٹی کو جہنم بنانے کے لیے مختلف لبادے اوڑھ رکھے ہیں، مختلف نعرے اپنا رکھے ہیں۔ اس دنیا میں خدا نے بھی انسانوں کو چھوٹا بڑا پیدا کیا ہے لیکن بعض کو جو کچھ ملتا ہے وہ اس پر قناعت نہیں کرتے، شکر نہیں کرتے۔ ان کی نظریں دوسروں کی طرف لگی رہتی ہیں۔ وہ ان سے سب کچھ چھین لینے کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ تم بھی انہی بے شمار لوگوں میں سے ہو۔ واردات کے طریقے الگ الگ ہیں۔ گالیاں دینے کے لیے بے چارہ معاشرہ رہ گیا ہے۔ کسی بھی قسم کی سیاست کی آڑ میں لوگوں کے گھر اجاڑنے والے تم جیسے ڈاکو... یا دوسرے دہشت گرد... درحقیقت تم سب ایک ہو۔"

وہ دھیرے دھیرے میرے قریب آرہا تھا۔ معلوم نہیں اس کا ارادہ کیا تھا لیکن میں نے بات جاری رکھی۔ "جو حقیقتاً مظلوم ہوتے ہیں وہ کچھ اور طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے دلوں میں درد اور سوز و گداز ہوتا ہے۔ وہ تم لوگوں کی طرح شقی القلب نہیں ہوتے۔ اگر اس نظام میں تمہارے ساتھ واقعی کوئی زیادتی ہوئی ہو تو تمہیں جاکر ان کا گریبان پکڑنا چاہیے جو اس نظام کی تخلیق کے ذمے دار ہیں لیکن ان سے تم کوئی انتقام نہیں لے پاتے، ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے کیونکہ ان کے گرد فصیلیں مضبوط ہیں۔ ان کی حفاظت کے لیے دنیا جہاں کے انتظامات موجود ہیں۔ تم بظاہر بہت غضب ناک اور بہت طاقتور نظر آتے ہو لیکن درحقیقت تم لوگ بہت کمزور اور بزدل ہو۔"

"وہ کیسے؟" غمیسو پھنکارا۔

"وہ اس طرح کہ تم لوگوں کے غیظ و غضب اور انتقام کا نشانہ بھی مجھ جیسے تنہا اور کمزور لوگ بنتے ہیں یا پھر تم رئیسانی زرتاج جیسے سیدھے سادے اور اصول پرست لوگوں کے خلاف سازشیں کرتے ہو، بے گناہ لوگوں کو لوٹنے کے درپے رہتے ہو۔ کبھی کسی بھی ایسے شخص کو... یا اس کے بچے کو اغوا کرلیتے ہو جس کے پاس تمہیں دینے کے لیے رقم ہو۔ خواہ وہ اس نے جائز طریقوں سے اور محنت ہی سے کمائی ہو۔ کبھی ان بسوں یا گاڑیوں کو لوٹ لیتے ہو جن میں بے قصور لوگ اپنی عمر بھر کی پونجی یا محنت کی کمائی سے بنائی ہوئی چیزیں لے کر نہ جانے کس کس ارادے سے کن کن منزلوں کی طرف جارہے ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض تمہارے ہاتھوں مارے بھی جاتے ہیں۔ تم گاؤں بھی اجاڑتے ہو تو بے گناہ لوگوں کے۔ یہ سب لوگ تمہارے مجرم تو نہیں ہیں۔ انہوں نے تو تمہارے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کی ہے۔ ان میں سے تو بہت سے خود مظلوم ہوتے ہیں۔ یہ اچھا انتقام ہے تم لوگوں کا۔ انتقام ہمیشہ ظالم سے لیا جاتا ہے۔ اگر تم لوگوں نے آج تک ایک بھی طاقتور،

ظالم، عیّار، مکّار اور صاحب اختیار سے انتقام لیا ہوتا تو میں تمہارے سامنے گردن جھکاتا، تمہیں خراج تحسین پیش کرتا، تم سے محبت کرتا۔"

"چــ۔۔۔ چــ۔۔۔ چچ۔۔۔" اس نے رُک کر متاسفانہ انداز میں سر ہلایا۔ اب وہ مجھ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ "یہ تو بہت برا ہوا شہنشاہِ معظم! ہم آپ کی محبت سے محروم ہوگئے۔ اب ہمارے لیے زندگی گزارنا ناممکن ہوجائے گا۔ موت ہمارا مقدر ہوگی۔ ہم پر رحم فرمایئے میرے آقا!" اس نے فلمی انداز میں گڑگڑاتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس پر ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اسے میرے خیالات، نظریات اور ان کی سچائی یا اخلاص سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

پھر یکدم اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا اور وہ بالکل بدلے ہوئے لہجے میں غرا کر بولا۔ "سن بے چوہے! میں چاہتا ہوں کہ مرتے وقت تم یہ خوش فہمی دل میں لے کر نہ جاؤ کہ تم زندہ رہ جاتے تو نہ جانے کون سا تیر مار لیتے۔ اگر میں تمہیں مزید دس سال بھی زندہ رہنے کا موقع دے دوں تب بھی تم اکیلے تو کیا، تم جیسے سو دو سو مل کر بھی ہم سب کی قبریں نہیں بنا سکتے۔ صرف ایسے خواب دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے تمہیں اپنے گروہ وغیرہ کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے، ہماری جڑیں اس سے زیادہ گہری ہیں۔"

"مجھے اس کی کوئی پروا نہیں۔" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"اب پروا کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں۔ اب موت جو تمہارا مقدر ہوچکی ہے...... لیکن زندگی کے آخری لمحوں میں تمہیں یہ پچھتاوا ضرور ہوگا کہ آخر قسمت نے تمہیں کیوں ہم سے لا ٹکرایا تھا۔"

"پچھتانا تو میں نے ایک عرصے سے چھوڑ دیا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تمہیں پچھتانے پر مجبور کردوں گا۔" وہ الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے پیٹ میں گولی مارنے کے بعد تمہارے قریب ہی بیٹھوں گا۔ جتنی دیر تم ہوش میں رہو گے، بہت تڑپو گے۔ میں تمہاری ہر سسکی، ہر کراہ، ہر فریاد سننا چاہتا ہوں۔"

متوقع لذت کے تصور سے اس کے ہونٹ بھینچ کر رہ گئے۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی تھا۔ وہ سخت اذیت پرست انسان تھا۔ درندے ایسے انسانوں سے بہتر ہوتے ہیں۔ وہ اذیت پرست نہیں ہوتے۔ وہ صرف زندگی، موت یا اپنی بقا کی جنگ لڑتے ہیں۔ اپنے حریف کو اذیتیں دے کر نہیں مارتے۔ کم از کم دانستہ طور پر وہ ایسا نہیں کرتے۔

اس بار اچانک ہی اس کے ریوالور کی نال جھکی اور میں اچانک ہی بجلی کی سی تیزی سے اچھلا۔ اس نے میری ٹانگ میں گولی مارنے کی کوشش کی تھی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں باتوں میں الجھا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو نہیں بچا سکوں گا۔

گولی کی بازگشت ختم ہونے کے بعد ایک لمحے کے لیے میدا[ن] میں گہرا سکوت چھا گیا۔ ہم دونوں بھی اپنی جگہ ساکت تھے۔ بالآخ[ر] اس نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور گہری سنجیدگی سے بولا۔ "تم [بلا]شبہ فنکار ہو۔ تمہارا زندہ رہنا ہمارے حق میں بالکل اچھا نہیں۔ خمیسو خان کی چلائی ہوئی گولی سے بچ جانے والا ہم سب کے لیے بہت بڑے خطرے کی گھنٹی ہے......"

بات کرتے کرتے ہی اس نے اچانک ایک اور فائر کیا۔ اب اس نے غالباً مجھے تڑپا تڑپا کر مارنے کا پروگرام ملتوی کردیا تھا کیونکہ اس بار اس نے جس لائن پر فائر کیا تھا اگر میں اس پر موجود رہتا تو گولی میری گردن سے گزر جاتی۔ لمحے کے صحیح تعیّن کے ساتھ ذرا سی جھکائی دیتے ہوئے میں بچ گیا لیکن وائلن کے تاروں کی طرح تنے ہوئے میرے اعصاب گویا ٹوٹنے کو تھے۔ مجھے احساس تھا کہ میرے جسم پر پسینے کی دھاریں رینگ رہی تھیں۔ یہ دھاریں میرے اعصاب میں اور بھی گدگدی سی کر رہی تھیں...... لیکن میں ان کی سرسراہٹ سے بے نیاز رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بہت دیر سے پلک بھی نہیں جھپکی تھی۔ اس وقت میں اپنی زندگی کی اہم ترین گنتی بھی کر رہا تھا۔ چار گولیاں ضائع ہوچکی تھیں۔

اس کے ریوالور میں صرف دو گولیاں باقی تھیں اور اب کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ میرے جسم کے کس حصے پر...... اور کس تد[بیر] سے گولی مارنے کی کوشش کرے گا لیکن اس میں کوئی شک نہیں تھ[ا] کہ اندر ہی اندر وہ نروس ہوچکا تھا۔ اس کی خود اعتمادی میں دراڑ پڑ چکی تھی لیکن اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ شاید اس کی کوشش تھی کہ اگر میں ریوالور سے خوفزدہ نہیں ہوسکا تھا تو کم از کم اس کے چہرے کی خونخواری سے ہی ڈر جاؤں۔

اب مسئلہ گویا یہ نہیں رہا تھا کہ اسے ریوالور کے استعمال میں کتنی مہارت حاصل تھی اور میں گولی سے بچنے کے آرٹ میں کتن[ا] ماہر تھا بلکہ اب یہ گویا اعصاب کی جنگ ہو کر رہ گئی تھی۔ اگر اس وقت میرے اعصاب مجھے دھوکا دے جاتے تو موت میرا مقدر تھی۔

اس عالم میں، میں مسکرا دیا۔ میری مسکراہٹ نے اس کی رگ و پے میں مقیّد غیظ و غضب کے بارود کو چنگاری دکھا دی۔ اس نے اپنے اعصاب پر کنٹرول کھو دیا۔ پانچواں فائر اس نے شدید جھنجلاہٹ میں کیا۔ جھنجلاہٹ میں چلائی گئی گولی سے بچنا میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔

اگر وہ چھٹی گولی بھی اسی جھنجلاہٹ میں ضائع کردیتا تو میرے حق میں اچھا ہوتا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا۔ اس کے ہونٹ اس طرح بھنچ گئے کہ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی مونچھوں کے درمیان غائب ہو کر رہ گئے۔

میرے جسم سے پسینہ بری طرح پھوٹ رہا تھا اور چند منٹ کی اس آزمائش نے میرے اعصاب چٹخا دیے تھے لیکن میں خمیسو کے

ریوالور پر نظر جمائے بدستور مسکرا رہا تھا اور پلک نہیں جھپک رہا تھا۔ خمیسو خان آخری گولی کو ہر حال میں صحیح استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس کی تمام تر توجہ اب اسی مسئلے پر مرتکز تھی۔

اس سے ایک غلطی ہوئی تھی کہ وہ جذبات کی شدت میں ذرا آگے آگیا تھا۔ وہ اپنی اور میری دونوں ہی کلاشنکوفیں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ اب وہ میرے اور کلاشنکوفوں کے تقریباً درمیان تھا۔ اس کا خالی ہاتھ غیر ارادی طور پر ہوا میں بلند ہوگیا تھا اور اس نے نیم دائرے میں کھسکنا شروع کردیا تھا۔

اپنی دانست میں وہ کسی بہتر زاویے کی تلاش میں تھا لیکن اس کی ہر کوشش فضول تھی کیونکہ میں نے بھی وہیں کھڑے کھڑے آہستگی سے گھومنا شروع کردیا تھا۔ یوں عملاً ہماری پوزیشن میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کی طرف اسی طرح دیکھ رہے تھے۔

اب میری زندگی اور موت کا دارومدار خدا کی مرضی کے بعد صرف اس بات پر تھا کہ وہ مجھے نچا دیتے ہوئے کتنی پھرتی سے فائر کرسکتا تھا اور میں کتنی تیزی سے گولی کے رُخ کو سمجھتے ہوئے اپنا بچاؤ کرسکتا تھا۔ میں نے اب سانس بھی روک لی تھی۔

چوہے بلی کا یہ کھیل چند لمحے سے زیادہ جاری نہیں رہا۔ اس نے اچانک ہی آخری داؤ کھیل لیا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے یہ داؤ بجلی کی سی تیزی سے کھیلا تھا۔ اس بار تو صاف طور پر ہی مجھے کسی غیبی قوت نے بچایا تھا۔ مجھے خود صحیح طور پر احساس نہیں تھا کہ میں کس طرح بروقت لائن آف فائر سے ہٹنے میں کامیاب ہوا تھا۔

آخری گولی اس نے میرے پیٹ میں اتارنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ میرے بازو کو چھوتی ہوئی گزری۔ مجھے اپنے بازو پر ہلکی سی تپش کا احساس ہوا۔

ریوالور اس نے وہیں ہاتھ سے چھوڑ دیا اور تیزی سے کلاشنکوف اٹھانے کے لیے پلٹا لیکن میں اسے اتنی آسانی سے کلاشنکوف اٹھانے کا موقع نہیں دے سکتا تھا۔ اسی ایک لمحے کے انتظار میں تو میں اتنی طویل آزمائش سے گزرا تھا۔ میں نے اپنا ریوالور بھی نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ میری قمیص کے نیچے سوتی واسکٹ کی جیب میں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اسے نکالنے میں زیادہ وقت صرف ہوگا۔ اس وقت ایک سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی بہت اہمیت تھی۔

میں نے ریوالور نکالنے کے بجائے اس پر زقند لگائی۔ اس وقت اس کا ہاتھ کلاشنکوف کو تقریباً چھو چکا تھا جب میں نے اس کندھے پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا...... اور ساتھ ہی کلاشنکوف کو ٹھوکر ماری۔ کلاشنکوف اس کی دسترس سے نکل گئی اور کراٹے کے وار سے وہ لڑکھڑا گیا مگر بلا کا سخت جان تھا۔ اس نے اُف تک نہ کی اور فوراً ہی میری کلاشنکوف کی طرف ہاتھ بڑھانے کی کوشش کی

لیکن اس وقت تک میں اس کی پسلیوں پر ٹھوکر رسید کرچکا تھا۔

وہ ایک بار پھر لڑکھڑایا اور درندے کی طرح غرایا۔ کلاشنکوف کا خیال اس نے چھوڑ دیا اور کسی عفریت کی طرح پلٹ کر مجھ پر جھپٹا۔ اب اس کے پاس کوئی حکمت عملی نہیں رہی تھی۔ شاید اس کے خیال میں اب سوچ سمجھ کر لڑنے کا وقت ہی نہیں رہا تھا۔ جبکہ میرے خیال میں ہوش و حواس کا قائم رہنا اور اعصاب کا قابو میں رہنا ہر حال میں ضروری تھا اور کسی بھی معرکے میں فیصلہ کن اہمیت اسی کی تھی۔

مجھے اس وقت حیرت ہوئی جب اس نے نہایت ہی احمقانہ انداز میں دونوں ہاتھوں سے میری گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میری گردن اس کے ہاتھوں میں آگئی تو وہ تیلی سی کسی خشک ٹہنی کی طرح اسے توڑ دے گا۔

میں نے اپنی گردن اس کی گرفت میں جانے سے بچانے کے لیے اس کے چہرے پر گھونسا رسید کیا۔ اس کی گردن ایک لمحے کے لیے ٹیڑھی ہوئی مگر فوراً ہی سنبھلتے ہوئے اس نے اپنا بن مانس کا سا بازو گھمایا۔ میں نے بازو پر ہی اس کا یہ وار روکا۔ اس کا بازو کسی شہتیر کی طرح میرے بازو سے ٹکرایا۔ اسی لمحے میں نے اس کے پیٹ میں لات رسید کی۔ یہ لات کھا کر بھی وہ صرف ذرا سا لڑکھڑایا

اور فوراً سنبھل گیا۔ وہ واقعی کسی جنگلی سانڈ سے کم نہیں تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے مجھ پر جست لگائی۔

میں اس کی طاقت سے مرعوب نہیں تھا لیکن فیصلہ کر چکا تھا کہ اس کی گرفت میں آنے سے بچا رہوں تو میرے حق میں اچھا ہوگا۔ میں نے جھکائی دے کر اپنے آپ کو بچایا۔ وہ اوندھے منہ زمین پر گرا اور میں نے اس کی پسلیوں میں ایک ٹھوکر رسید کی۔

اس کی پھرتی حیرت انگیز تھی۔ وہ مشینی انداز میں اچھل کر اٹھا۔ اس کی پگڑی کھل کر گر چکی تھی...... اور لمبے لمبے گھنگریالے بالوں کی لٹیں کندھوں پر پھیل چکی تھیں۔ چہرہ اور داڑھی کے بال مٹی میں لتھڑ چکے تھے۔ باچھوں سے بہتا ہوا کف بھی ان بالوں پر چمک رہا تھا۔ وہ سراپا وحشت تھا۔ بالکل زمانۂ غار کا انسان دکھائی دے رہا تھا۔

نہایت ہی غضبناک انداز میں بازو پھیلا کر وہ ایک بار پھر مجھ پر جھپٹا اور میں نے ایک بار پھر کامیابی سے جھکائی دیتے ہوئے اس کی کنپٹی پر گھونسا رسید کیا۔ وہ دوبارہ منہ کے بل زمین پر چلا گیا۔ اس بار وہ پہلے جیسی پھرتی سے نہیں اٹھ سکا...... لیکن میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے دبوچنے کی کوشش نہیں کی۔

اس بار وہ اٹھ کر پلٹا تو غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ یہی میں چاہتا تھا۔ زیادہ طاقتور لوگ جب غصے سے پاگل ہوتے تھے تو انہیں قابو میں کرنا آسان ہوتا تھا۔ وہ عجیب بے معنی سی آوازیں نکالتا ہوا مجھ پر حملہ آور ہوا لیکن اس بار اس نے پھر مجھ سے پیٹ پر لات کھائی۔ وہ دُہرا ہو گیا اور ایک بار پھر گرتے گرتے بچا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا' میری نظر ایک کلاشنکوف پر پڑی۔ وہ مجھ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔

میں نے جھپٹ کر کلاشنکوف اٹھائی لیکن وہ نال کی طرف سے میرے ہاتھ میں آئی۔ مجھے اس کو سیدھا کرنے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ غمیسو نے مجھے آن دبوچا تھا۔ اس نے مجھ سے کلاشنکوف چھیننے کی کوشش نہیں کی بلکہ عقب سے میری کمر کے گرد بازوؤں کا شکنجہ ڈال دیا۔ وہ واقعی آہنی شکنجہ تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرا جسم درمیان سے کچلا جائے گا۔ میں نے بہ مشکل ذرا ترچھا ہوتے ہوئے پوری قوت سے اس کی کھوپڑی پر رائفل کا بٹ مارا۔

اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور میں نے ایک جھٹکے سے اپنے آپ کو چھڑا کر کلاشنکوف کو ہتھوڑے کی طرح استعمال کرتے ہوئے اس کے سر پر دوسری اور پھر تیسری ضرب لگائی۔ وہ دائیں بائیں لہرایا لیکن اس کے زمین پر ڈھیر ہونے سے پہلے میں اس کی کھوپڑی پر نہ جانے کتنی ضربیں لگا چکا تھا۔ زندگی اور موت کی اس جنگ میں آخری لمحوں میں مجھے بھی اپنے ہاتھ پیروں پر کچھ اختیار سا نہیں رہا تھا۔

میں اس وقت اپنی مجنونانہ سی کیفیت سے باہر آیا جب میں نے اسے بے حس و حرکت اپنے سامنے پڑے دیکھا۔ اس کی کھوپڑی اگر لمبے' گھنے اور جھاڑ جھنکاڑ بالوں سے نہ ڈھکی ہوتی تو شاید اس وقت ٹوٹے ہوئے تربوز سے مشابہ نظر آتی۔ اس کا چہرہ اور گردن خون میں لتھڑ چکے تھے۔ شاید اس کے منہ اور ناک سے بھی خون اُبل رہا تھا۔

اس کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئی تھیں اور ان میں بھی خون بھرا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ میں موجود کلاشنکوف کا آہنی دستہ بھی خون میں لتھڑ چکا تھا۔ میں نے اسے غمیسو کی لاش کے قریب پھینک دیا اور مٹی کے ایک تودے پر بیٹھ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ بالآخر میں نے موت سے یہ معرکہ جیت لیا تھا۔ دھیرے دھیرے میری رگ و پے سے ہیجان رخصت ہو گیا اور چند منٹ بعد میں نے اپنے آپ کو دوبارہ پُرسکون محسوس کیا۔

دھندلی چاندنی میں اس ویرانے میں تودے پر بیٹھے ہوئے مجھے اپنا وجود کچھ عجیب عجیب سا لگ رہا تھا۔ چند لمحے پہلے وہاں دو انسان...... یا شاید دو درندے زندگی کی جنگ میں مصروف تھے۔ اب ان میں سے ایک باقی رہ گیا تھا۔ یہ لاکھوں سال پرانی کہانی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس تودے پر میری جگہ غمیسو خان بیٹھا ہوتا۔ تقدیر بھی کچھ کچھ ترازو ہی کی طرح ہوتی ہے۔ کبھی پلڑا اِدھر کو جھک گیا' کبھی اُدھر کو۔

بالآخر میں گہری سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ تھوڑی بہت احتیاطی تدابیر ہی اختیار کرنا بہتر تھا۔ میں نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک طرف مجھے گڑھے کی موجودگی کے آثار محسوس ہوئے۔ میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں پہنچ گیا۔ گڑھا واقعی موجود تھا اور میرے مقصد کے لیے کافی حد تک موزوں بھی تھا۔ اس کی تہ میں شاید کافی عرصہ پہلے کی بارش کا تھوڑا بہت پانی بھی موجود تھا۔

میں غمیسو کی لاش کو گھسیٹتا ہوا وہاں تک لے گیا۔ میں لاش کو آسانی سے اٹھا کر بھی لے جا سکتا تھا لیکن میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کا خون میرے کپڑوں پر لگے۔ خون دھیرے دھیرے جمنے لگا تھا۔ نخوت' تکبر اور اذیت پرستی کا وہ پیکر اب مٹی میں لتھڑا' زمین پر پڑا بے حد حقیر اور قابل رحم لگ رہا تھا۔ مجھے اب اس پر ترس آ رہا تھا۔ جی چاہ رہا تھا کہ باعزت طور پر اس کی تکفین اور تدفین کروں لیکن مجبوری تھی۔ سرِدست میں اسے اعزاز کے ساتھ دفنانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

میں نے اس کی لاش کو گڑھے میں دھکیل دیا۔ گڑھا اتنا لمبا نہیں تھا کہ لاش اس میں سیدھی لٹائی جا سکتی۔ وہ درمیان سے خم کھا گئی۔

"معاف کرنا غمیسو خان!" میں نے معذرت کی۔ "میں اس وقت تمہیں اس سے زیادہ آرام دہ قبر مہیا نہیں کر سکتا۔"

پھر میں نے اِدھر اُدھر سے مٹی کے چھوٹے بڑے ڈھیلے اور تودے اس گڑھے میں ڈالے۔ خون آلود کلاشنکوف بھی میں نے

اسی گڑھے میں پھینک دی۔ بڑی تدبیروں سے اِدھر اُدھر سے کچھ مٹی بھی گڑھے میں ڈالی۔ گڑھا بھر گیا اور لاش اچھی طرح چھپ گئی۔ مجھے امید تھی کہ ایک آدھ بارش یا چند راتوں کی اوس اس گڑھے کو ہموار کردے گی اور زمین میں یہ پیوند کاری نظر نہیں آئے گی...... پھر میں نے زمین پر وہ نشان بھی کافی حد تک خراب کردیا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں سے کوئی چیز گھسیٹ کر لے جائی گئی تھی۔

اس کام میں کافی دیر لگ گئی لیکن نتائج خاصے تسلی بخش تھے۔ میں ہاتھ پاؤں جھاڑ کر اس چادر پر آبیٹھا جس پر بیٹھ کر کچھ دیر پہلے میں نے اور غمیسو نے اکٹھے کھانا کھایا تھا۔ ابھی سے یہ بات کچھ پرانی پرانی سی لگنے لگی تھی۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ غمیسو خان کا گھوڑا بڑی خاموشی سے ایک طرف کھڑا اداس اداس سی آنکھوں سے میری ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ گھوڑا بہت ذہین جانور ہوتا ہے۔ خصوصاً وہ گھوڑا جو جنگلوں بیابانوں میں سرگرم رہنے والے لوگوں کے ساتھ پُرخطر زندگی گزارتا ہے۔

غمیسو کا گھوڑا کہیں بندھا ہوا نہیں تھا مگر اس نے بھاگنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ گھوڑا تنہا اپنے ٹھکانے پر واپس جاسکتا تھا اور اگر کوئی اس کے اشاروں کو سمجھتا تو وہ اسے یہاں تک لاسکتا تھا جہاں غمیسو خان دفن تھا۔ یہ کوئی خوش آئند بات نہیں تھی۔ میرے حق میں بہتر تو یہی تھا کہ میں اس گھوڑے کو بھی گولی مار دیتا۔

گھوڑا میری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ میرے خیالات پڑھ رہا تھا۔ اس حیوان کی موٹی موٹی آنکھوں میں مجھے انسان سے زیادہ فہم محسوس ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھ میں اس خوبصورت مگر بے زبان جانور کو مارنے کی ہمت نہیں تھی۔

میں نے آگے بڑھ کر اس کی زین کھول دی اور لگام اس کے جبڑوں سے نکال کر پھینک دی۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا۔ میں نے اس کی ایال پر ہاتھ پھیرا، گردن پر تھپکی دی تب بھی وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔

"جاؤ دوست! تمہاری مرضی ہے...... خواہ اپنے ٹھکانے کی طرف لوٹ جاؤ یا جنگلوں کا رخ کرلو۔ چاہو تو کسی کی رہنمائی کرتے ہوئے اسے غمیسو خان کی قبر تک لے آنا...... اور چاہو تو اس سارے تماشے کو بھول جانا۔ میری طرف سے تم آزاد ہو۔" میں نے اس کی کمر تھپکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

وہ ایک بار ہنہنایا۔ جیسے اس نے میری بات کا جواب دیا ہو...... پھر وہ دوڑتا ہوا ایک طرف کو چلا گیا۔ کم از کم اس وقت تو اس کا رخ ادھر نہیں تھا جس طرف کچھ دیر پہلے میں اور غمیسو خان محوِ سفر تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ فی الحال وہ اپنے ٹھکانے کی طرف نہیں جا رہا تھا۔

وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگیا تو میں چادر پر جا لیٹا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے، چت لیٹا میں دیر تک چاند کی طرف دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ زندگی مجھے کیا کیا تماشے دکھا رہی تھی۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ زیادہ سوچ بچار کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میری حالت پہاڑ سے اترتے ہوئے شخص کی سی تھی جس کی رفتار اس کے اپنے قابو میں نہیں رہتی۔ اس عالم میں اگر وہ رکنے کی کوشش کرتا ہے تو اوندھے منہ گرتا ہے۔

کچھ دیر سستانے کے بعد میں نے اٹھ کر وہ بیگ کھول کر دیکھا جو غمیسو اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ اس میں ایک شاپنگ بیگ موجود تھا جس میں نوٹوں کی کئی گڈیاں موجود تھیں۔ یہ وہی رقم تھی جو غمیسو 'گولڈ کی کلب' سے لے کر چلا تھا۔ میں نے وہ بیگ اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ لٹکایا، اپنی کلاشنکوف کندھے پر لٹکائی اور گھوڑے پر بیٹھ کر زرتاج نگر کی طرف واپس روانہ ہوگیا۔

میں گاؤں پہنچا تو صبح کاذب کا وقت تھا۔ ہر طرف سکوت اور سناٹے کا راج تھا۔ منہ اندھیرے کھیتوں کو جانے والے یا تہجد کے لیے مسجد کو جانے والے دیہاتی بھی ابھی بیدار نہیں ہوئے تھے۔ ادھر اُدھر پھرتے ہوئے چند آوارہ کُتے زندگی کا احساس دلا رہے تھے۔ اس بات پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ انہوں نے مجھے دیکھ کر صرف غرانے پر اکتفا کیا، ان میں سے کوئی بھونکا نہیں۔ شاید میں ان کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ چند دن میں ہی گاؤں کی باس میرے وجود میں رچ گئی تھی۔ یا پھر شاید وہ کُتے آوارہ ہونے کے باوجود سمجھ دار تھے۔ انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ مجھ پر بھونکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

مجھے گاؤں سے گزر کر ہی فارم کی طرف جانا پڑا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اس وقت حویلی کے محافظوں کی نظر میں آؤں...! اس لیے میں عقبی دروازے کی طرف سے فارم پر پہنچا تھا۔

میں عقبی دروازے کا تالا کھول رہا تھا جب بائیں طرف کچھ دور درختوں کے جھنڈ میں مجھے سرسراہٹ سی سنائی دی۔ میں لپک کر درختوں تک پہنچا اور اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا لیکن نہ تو کوئی دکھائی دیا اور نہ ہی کہیں حرکت کا احساس ہوا۔ شاید کوئی جانور تھا جو بھاگ چکا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کا تردد نہیں کیا۔ مجھ پر ایک عجیب کاہلی آمیز بے نیازی غالب آرہی تھی۔ اندر کوارٹر میں پہنچ کر میں بستر پر گرا اور چند لمحے بعد اپنے آپ کو دنیا کا سب سے آسودہ حال اور بے وسوسہ انسان محسوس کرتے ہوئے گہری نیند سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ کمرے کی سلاخ دار کھڑکی سے کنکنی دھوپ اندر آرہی تھی۔ میں نے سر کو کئی جھٹکے دے کر نیند کا خمار دور کرنے کی کوشش کی۔ گزشتہ رات کے واقعات مجھے خواب ہی محسوس ہو رہے تھے۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ سامنے عبدل نامی وہ شخص کھڑا

بلاضرورت اور بے وجہ دانت نکال رہا تھا جو میرے لیے کھانا وغیرہ پکانے اور باہر کے کام کاج پر مامور تھا۔ اصطبل کی صفائی اور گھوڑوں کو راتب وغیرہ دینے پر دوسرا شخص مامور تھا۔ عبدل کے پاس فارم اور میرے کوارٹر کی چابیاں ہوتی تھیں لیکن اس کمرے کی چابی نہیں تھی جس میں میرا زیادہ وقت گزرتا تھا اور جو خواب گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔

"آپ کا رات کا کھانا بھی اسی طرح رکھا ہوا ہے...... اور اب دن چڑھے تک آپ سو کر نہیں اٹھے تو میں نے سوچا، معلوم کرلوں کہ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے۔ آپ نے برا تو نہیں منایا سائیں؟" اس کا لہجہ پہلے کی نسبت زیادہ مؤدبانہ ہو چکا تھا۔ اس سے پہلے اس کا طرزِ عمل کچھ زیادہ مؤدبانہ نہیں رہا تھا۔ بلکہ جب میں پہلے دن یہاں آیا تھا تو اس نے مجھے کسی حد تک ناپسندیدگی ہی کی نظر سے دیکھا تھا۔ معلوم نہیں گزشتہ رات کے دوران کس وجہ سے اس کی نظر میں میری توقیر بڑھ گئی تھی۔

"نہیں...... میں نے بالکل برا نہیں منایا...... اور میری طبیعت بھی بالکل ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میں آپ کے لیے ناشتا تیار کروں؟" اس نے اپنے چوڑے چوڑے دانتوں پر ہونٹوں کا پردہ ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ ضرور۔" میں نے کہا۔ "میں اتنی دیر میں تیار ہوتا ہوں۔"

وہ باورچی خانے کی طرف چلا گیا اور میں غسل خانے کی طرف۔ کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے چھوٹے سے ٹیبل کلاک میں وقت دیکھا تھا۔ دس بجنے کو تھے۔ مجھے یقین تھا کہ آج زرتاج نگر کے بینک میں ڈاکا ضرور پڑے گا۔ جانو کے جن آدمیوں کی ڈیوٹی اس کام پر لگ چکی تھی، انہیں تو طے شدہ پروگرام کے مطابق اسے نمٹانے آنا ہی تھا۔ ایک بجے ڈاکا پڑنے کا امکان تھا۔

مجھے اب کئی معاملات میں اندازوں سے کام چلانا تھا۔ میرا ایک اندازہ یہ بھی تھا کہ غمیسو خان کی گمشدگی کو شاید تین چار روز تک تو تشویش کی نظر سے نہ دیکھا جائے اور یہ امکان تو شاید کافی دنوں تک کسی کو قابلِ قبول محسوس نہ ہو کہ وہ مر چکا ہوگا۔

مجھے زیادہ بہتر یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس بینک ڈکیتی کو میں خود ہی روکنے کی کوشش کروں۔ پولیس کے پاس جا کر خود مصیبت میں پھنسنے کا امکان تھا۔ غمیسو بتا چکا تھا کہ تھانے کی کُل نفری چار پانچ افراد پر مشتمل تھی۔ وہ خود بھی زنگ خوردہ تھے اور ان کے ہتھیار بھی۔ ان کا جانو کے آدمیوں کے سامنے رکنا ذرا مشکل ہی تھا جو بڑے خرانٹ دہشت گرد اور قاتل تھے اور جدید ترین اسلحے سے بھی لیس تھے۔ پولیس پر مجھے ویسے بھی زیادہ بھروسا نہیں تھا۔ معلوم نہیں اس مختصر سے عملے میں کون جانو کا زر خرید تھا۔

زرتاج خود گھر پر نہیں تھی۔ ویسے تو اس کی عدم موجودگی میں اس کا کمدار رب نواز تمام معاملات کو دیکھتا تھا۔ وہ حویلی میں ہی

ایک سرونٹ کوارٹر میں رہتا تھا اور شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ بڑے زمینداروں کے کمدار خود بہت بڑی چیز ہوتے ہیں۔ بہت مال بناتے ہیں اور بہت دور تک پھنکارتے پھرتے ہیں۔ ان کا بڑا دبدبہ اور رعب ہوتا ہے۔ مالک کے علاوہ شاذ و نادر ہی کسی کو ان کے سامنے دم مارنے کی جرأت ہوتی ہے۔

لیکن رب نواز اس قسم کا آدمی نہیں تھا۔ سر جھکا کر چلتا تھا اور اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ میں اسے بھی اس خطرے سے آگاہ کرسکتا تھا لیکن اس کی زبان پر یقیناً سب سے پہلا سوال یہی آتا کہ مجھے یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ میں فی الحال چھوٹے سے چھوٹے سوال سے بھی بچنا چاہتا تھا اور اپنی ذات کو ہر معاملے میں مکمل طور پر پس منظر میں رکھنا چاہتا تھا۔ میرے لیے پس منظر میں رہتے ہوئے ہی کچھ کرنا بہتر تھا۔

عبدل نے بھاری بھرکم اور جناتی قسم کا ناشتا مجھے کمرے میں ہی لا دیا۔ ناشتا کرکے میں نے غمیسو خان کا چھوڑا ہوا رقم کا بیگ الماری میں رکھ کر تالا لگایا اور کمرے سے نکلنے سے پہلے اپنے حلیے کو مبہم اور غیر واضح سا بنانے والی چند چیزیں ساتھ لے لیں۔ ابھی میں کمرے سے نکلا نہیں تھا کہ عبدل برتن اٹھانے آگیا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "سائیں! شیر محمد کا پیغام آیا تھا کہ آج وہ کام پر نہیں آسکیں گے۔ ان کی طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں خود بھی شاید گھوڑوں کو سدھانے کے لیے وقت نہ نکال سکوں۔ میں رئیسانی جی کے ہی ایک اور ضروری کام سے جا رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے سائیں! ویسے یہ جو اپنے شیر محمد صاحب ہیں نا...... ان کی طبیعت ان دنوں میں اکثر ہی خراب ہوتی ہے جب رئیسانی جی یہاں نہیں ہوتیں۔" عبدل معنی خیز انداز میں مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "سائیں رب نواز بھی انہیں کچھ نہیں کہتے۔"

وہ مجھے "ملازمتی سیاست" میں الجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا۔ "ان مسائل پر کبھی فرصت میں غور کریں گے۔"

میں نے فارم سے اپنا گھوڑا نکالا اور گاؤں کی طرف روانہ ہوگیا۔ کچھ دور پہنچ کر میں نے تاریک شیشوں والا چشمہ لگا لیا۔ سر پر اجرک پگڑی کے انداز میں لپٹی ہوئی تھی۔ گلے میں ریشمی مفلر بھی تھا۔

بازار میں سب سے بہتر عمارت بینک ہی کی تھی۔ دروازے سے لوہے کی گرل اس وقت ہٹی ہوئی تھی۔ دروازہ لکڑی کا تھا مگر اس میں شیشے کا پینل بھی لگا ہوا تھا۔ دروازہ تین سیڑھیوں کی بلندی پر تھا۔ سامنے کے رخ پر سلاخوں والی ایک کھڑکی بھی تھی جو اس وقت بند تھی۔

بینک کے دروازے پر باہر ہی ایک کرسی پر بوڑھا اور کمزور سا گن مین بیٹھا تھا۔ وہ ملیشیا کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی بے پروائی کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی انگریزوں کے زمانے کی توڑے دار بندوق بھی دیوار کے سہارے کھڑی کی ہوئی تھی۔ کارتوس کی پٹی کرسی کے پشتے پر لٹکی ہوئی تھی۔ شاید اسے خود بھی احساس تھا کہ بندوق اس کے ہاتھوں میں ہو یا دیوار کے سہارے کھڑی ہو' اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے خواہ مخواہ وزن اٹھا کر بیٹھنے کی کیا ضرورت تھی۔

وہ گرد و پیش سے بے نیاز بیٹھا' مہندی سے رنگی ہوئی سرخ مونچھوں کو بل دے رہا تھا اور نہ جانے کن تفکرات میں اُلجھا ہوا تھا۔ شاید اس کی ریٹائرمنٹ قریب تھی یا ویسے ہی رعایتی مُدت پوری کر رہا تھا۔

میں جب بینک کے سامنے سے گزرا تو میں نے رب نواز کو بینک سے نکلتے دیکھا۔ وہ ایک چرمی بیگ بغل میں دبائے ہوئے تھا۔ شاید رقم جمع کروا کے واپس جا رہا تھا۔ رب نواز ایک ادھیڑ عمر' بھاری بھرکم شخص تھا۔ بظاہر خاصا بارعب نظر آتا تھا لیکن میں نے اسے کسی پر رعب ڈالتے نہیں دیکھا تھا۔

گن مین نے ہڑبڑا کر اسے سلام کیا۔ رب نواز نے نیم توجہی سے جواب دیا اور اپنی شیشوں والی ٹوپی درست کرتا رخصت ہو گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

بازار کا چکر لگا کر واپس آتے وقت میں بینک سے کچھ دور ہی رک گیا۔ وہاں ایک گلی کے کونے پر کسی کی ٹوٹی پھوٹی سی بیل گاڑی کھڑی تھی۔ میں نے اس بیل گاڑی کے پہیّے سے اپنا گھوڑا باندھ دیا۔ یہاں دیوار کے ساتھ ایک چائے فروش ایسا ساوار لیے بیٹھا تھا جس کے نیچے کوئلوں والی انگیٹھی فِٹ تھی۔ وہ سبز چائے بیچ رہا تھا۔

میں نے اس سے ایک پیالی لی اور ایک طرف کھڑے ہو کر دھیرے دھیرے چسکیاں لینے لگا۔ میرے پاس ابھی خاصا وقت تھا۔ چائے والے کو بھی وہاں سے جانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ اِکّا دُکّا گاہک آئے جا رہے تھے۔

میری نظر غیر محسوس طور پر بینک ہی کا جائزہ لے رہی تھی۔ میں وہ جگہ بھی منتخب کر چکا تھا جہاں مجھے پوزیشن لینا تھی۔ بینک کے تقریباً سامنے دو عمارتوں کے درمیان ایک نہایت تنگ سی گلی تھی۔ بازار کے اس حصے میں زیادہ تر مکانات ہی تھے لیکن ان کے نیچے دُکانیں تھیں۔

جو گلی میں نے دیکھی تھی وہ درحقیقت دو اونچے مکانوں کے درمیان یونہی فالتو سی جگہ چھوٹی ہوئی تھی جہاں لوگوں نے کوڑا کرکٹ پھینکنا معمول بنا لیا تھا۔ مجبوری کی حالت میں اس راستے سے دوسری گلی میں پہنچا جا سکتا تھا۔ اس گلی میں روشنی کی رسائی بھی کم تھی۔ اگر میں اس سے زیادہ آگے نہ جاتا تو وہاں سے بینک پر بھی نظر رکھ سکتا تھا۔ اس کے لیے مجھے صرف کچرے کی بُو برداشت کرنا پڑتی۔ وہ اتنی تنگ گلی تھی کہ مجھ جیسی صحت کا آدمی ترچھا ہو کر ہی اس سے گزر سکتا تھا۔ سیدھا چلنے کی صورت میں شاید میرے کندھے دونوں طرف کی کُھردری اور کُہنہ سال دیواروں سے رگڑ کھاتے۔ بازار میں تھوڑی بہت چہل پہل ہونے کے باوجود اس قدر سکون تھا کہ کوئی تصور ہی نہیں کر سکتا تھا یہاں کوئی گڑبڑ ہونے والی تھی۔ ایک لمحے کے لئے تو میں نے بھی اپنے آپ کو خوش گمانی سے بہلانے کی کوشش کی کہ یہاں کچھ نہیں ہونا تھا...... لیکن میری نامعلوم حس کچھ اور ہی کہہ رہی تھی۔

میں نے جتنی دیر میں سبز چائے کی وہ پیالی ختم کی' اتنی دیر میں دو تین گاہک یکے بعد دیگرے آکر' چائے پی کر جا بھی چکے تھے۔ میں چائے کبھی کبھار ہی پیتا تھا لیکن اس روز وقت گزاری کی خاطر اس چائے والے سے دوسری پیالی بھی لے لی اور اپنی طلب کو برحق ثابت کرنے کے لیے مجھے اس کی چائے کی تعریف میں چند الفاظ بھی بولنا پڑے جنہیں سن کر وہ خوشی سے پھولا نہ سمایا۔ ایک بالٹی میں گدلے سے پانی میں پیالی دھوتے ہوئے وہ مجھے سبز چائے تیار کرنے کے نہایت نایاب اور خاندانی نسخوں سے آگاہ کرنے لگا مگر اب میری توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ دوسری پیالی ختم کر کے بازار کا ایک چکر اور لگاؤں گا۔ اگر اس کے بعد بھی وقت گزاری کا مسئلہ درپیش رہا تو حجام کی دکان میں گھس جاؤں گا جو قریب ہی واقع تھی۔ کل میں نے عیسو کو بھی اسی دُکان میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ حجام کے پاس جانے کا قائل تو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس دُکان میں اس کی موجودگی بھی آج کی ڈکیتی کے سلسلے ہی کی کوئی کڑی رہی ہو...

پچھلے چند دنوں میں میری داڑھی جتنی بھی بڑھی تھی وہ میرا قیمتی اثاثہ بن چکی تھی کیونکہ اس سے مجھے اپنا حُلیہ پہلے کی نسبت مختلف بنانے میں بہت مدد مل رہی تھی۔ چنانچہ اس سے محرومی کا فیصلہ تو میں ہرگز نہیں کر سکتا تھا۔ البتہ حجام سے خط بنوانے میں کچھ وقت ضائع کر سکتا تھا۔

میں ابھی اس مسئلے پر غور و خوض کر ہی رہا تھا کہ اچانک پیالی میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچی۔ دراصل بینک سے ایک شخص برآمد ہوا تھا اور اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔

وہ انسپکٹر رحیم گل تھا!

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خودنوشت

دہشت گرد

سلیم فاروقی

- وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔
- وقت کی راسیں تھامتے اس کے ہاتھ لہولہان ہو گئے تھے۔
- "سچی کہانیاں" کا ایک مقبول ترین ایڈونچر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

انسپکٹر رحیم گُل سادہ لباس میں تھا لیکن میں اسے ہزاروں کے مجمعے میں پہچان سکتا تھا اور شاید یہی معاملہ دوسری طرف بھی تھا' اس لیے میں نے فوراً دیوار کی طرف منہ کر لیا۔ رحیم گل نے اس طرف دیکھا ہی نہیں تھا جدھر میں کھڑا تھا۔ میری جب اس پر نظر پڑی اس وقت اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔

دوبارہ مُڑ کر اس کی طرف دیکھنا میں نے بہتر نہ سمجھا۔ اتنا ہی غنیمت تھا کہ اس کی مجھ پر نظر نہیں پڑی تھی۔ اب یہ کوئی اچھی بات نہ ہوتی کہ میں خود اسے اپنی طرف دیکھنے کی دعوت دیتا۔ یہ ایک عجیب ہی موقع تھا۔ میں اس سے الجھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ فضا میں پہلے ہی ایک خطرے کی آہٹیں ابھر رہی تھیں۔ رحیم گل کے معاملے میں میرا مسئلہ یہ تھا کہ میں اسے ہرگز ہلاک کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ایک چھوٹا مگر دیانت دار آفیسر تھا۔ دیانت دار اور دلیر آفیسر ہمارے معاشرے میں پہلے ہی تقریباً نایاب تھے۔ اس سے اچانک سامنا ہونے پر حیرت کے باعث ایک لمحے کے لیے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی۔

آخر وہ یہاں نظر ہی کیوں آیا تھا؟ کیا اسے یہاں میری موجودگی کا شُبہ ہوا تھا یا اسے یہاں میری آمد کا کوئی امکان نظر آیا تھا؟ کیا وہ میرا سراغ لگاتا ہوا یہاں تک آن پہنچا تھا یا پھر اسے ڈاکے کی مخبری ہو چکی تھی؟ مگر یہ تو اس کا علاقہ ہی نہیں تھا۔ وہ کیوں اتنی دردسری مول لیتا؟ پولیس والے تو اپنے علاقے کی وارداتوں کے سلسلے میں ہی کوئی زحمت کر لیں تو غنیمت ہوتا ہے۔ دوسرے اس وقت رحیم گل' ڈاکوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی بھی اعتبار سے تیار نظر نہیں آتا تھا۔

اچانک مجھے ایک اور عجیب سا خیال آیا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میں نے اس کی بے پناہ دیانت داری' دلیری اور کبھی نہ جھکنے' کبھی نہ بکنے کی جو باتیں سُنی تھیں وہ محض قصے کہانیاں تھیں' پروپیگنڈہ تھا؟ درحقیقت کہیں ڈکیتی کے اس منصوبے سے ہی تو اس کا کوئی تعلق نہیں تھا؟

سوالات' شُبہات اور امکانات کن کھجوروں کی طرح میرے ذہن سے چمٹے جا رہے تھے اور کسی بھی بات کا کوئی تسلی بخش جواب میرے پاس نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے تمام سوچوں کو ذہن سے جھٹک دیا۔ نہایت اطمینان سے چائے والے کو ادائیگی کی اور بے حد آہستگی سے گردن گھما کر بینک کی طرف دیکھا۔ رحیم گل جا چکا تھا۔ وہ بازار میں بھی کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اطمینان کی ایک طویل سانس لی اور اپنے گھٹیا سے

سیاہ چشمے کو ناک پر کچھ اور اچھی طرح جمالیا۔ ایک بار پھر محتاط انداز میں اِدھراُدھر کا جائزہ لے کر میں آگے چل دیا۔ اس بار میں نے یوں بازار کے سرے تک فاصلہ طے کیا جیسے مجھے کچھ خریدنا تھا لیکن اپنے مطلب کی چیز مجھے کہیں نظر نہیں آرہی تھی یا میں کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پارہا تھا۔ درحقیقت مجھے اس قسم کی اداکاری کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ وہاں کسی کی بھی توجہ میری طرف نہیں تھی لیکن میں محض احتیاطاً ایسا کررہا تھا۔

اِس چکر میں واپسی پر میں نے سوچا کہ ایک بار اس دراڑ نما گلی میں گھس کر بھی دیکھ لینا چاہیے جہاں مجھے پوزیشن لینا تھی۔ مجھے چند لمحے بعد اندازہ ہوا کہ میرا اس گلی میں گھُسنا کیسا بروقت تھا۔ شاید کسی غیبی ہاتھ نے مجھے اس گلی کی طرف دھکیلا تھا۔

گلی میں گھُستے ہی بدبو کے بھبکے نے میرا استقبال کیا۔ شاید آس پاس کے گھروں والے اس گلی میں کچرا پھینکتے تھے لیکن مجھے ناک بھوں چڑھانے کی مہلت نہیں ملی کیونکہ اپنے عقب میں بازار کی طرف سے مجھے کسی انجن کی گھرگھراہٹ سنائی دی تھی جو تیزی سے قریب آتی جارہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی کچھ گڑبڑ کا سا احساس ہوا۔

میں نے پلٹ کر محتاط انداز میں دراڑ نما گلی سے سر نکال کر دیکھا۔ سیاہ رنگ کی ایک جیپ کسی غضبناک درندے کی طرح غراتی ہوئی بازار میں چلی آرہی تھی۔ ڈرائیور سمیت اس کھُلی جیپ میں پانچ آدمی نظر آرہے تھے اور پانچوں کے چہروں پر ڈھاٹے تھے۔ کلاشنکوفیں انھوں نے ہاتھوں میں بلند کررکھی تھیں۔ وہ بڑے دھڑلّے سے بازار میں چلے آرہے تھے۔

پھر فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے مرتعش ہوگئی۔ انھوں نے غالباً لوگوں کو خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی تھی۔ ان کا مقصد پورا ہوگیا۔ لوگ خوف زدہ ہوکر اِدھراُدھر بھاگنے لگے۔ چند افراد دیواروں سے چپک کر کھڑے ہوگئے۔ بازار میں عورتیں اِکّادُکّا ہی تھیں۔ بچے والی ایک عورت کو میں نے دہشت زدہ ہوکر ایک دُکان میں گھستے دیکھا۔ ایک عورت میں شاید کہیں بھاگنے یا پناہ حاصل کرنے کی بھی سکت نہیں رہی۔ وہ ایک دُکان کی دیوار سے چپک کر اکڑوں بیٹھ گئی اور غالباً اپنی چیخیں روکنے کے لیے اس نے سختی سے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

چند لمحے پہلے میں نے بازار میں تین چار ایسے افراد کو بھی دیکھا تھا جن کے کندھوں پر کوئی نہ کوئی گن تھی لیکن اب وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دیے۔

میں نے سر پیچھے کیا اور مشینی سے انداز میں اپنے چہرے پر بھی اپنی اجرک کا ڈھاٹا باندھ لیا۔ کلاشنکوف کندھے سے اتار کر ہاتھوں میں تھام لی۔ میں ایک گھٹنے کے بل کھڑا ہوچکا تھا اور میری کلاشنکوف کی نال اس دراڑ نما گلی سے باہر جھانک رہی تھی مگر کسی کا دھیان میری طرف نہیں تھا۔

ڈاکوؤں کی جیپ عین بینک کے سامنے آن رکی تب بوڑھا گن مین ہڑبڑا کر اٹھا ورنہ شاید اس کا خیال تھا کہ جیپ میں آنے والوں کا ہدف کوئی اور ہے یا پھر شاید وہ ویسے ہی دہشت پھیلانے آئے ہیں' فائرنگ کرتے ہوئے گزر جائیں گے۔ اس نے جلدی سے اپنی پرانی سی شاٹ گن سنبھالی لیکن دوسرے ہی لمحے گولیوں کی تڑتڑاہٹ ابھری اور وہ بے چارہ سیڑھیوں سے نیچے لڑھک گیا۔

چار ڈاکو جیپ سے کود کر نیچے آگئے' پانچواں اسٹیئرنگ سنبھالے بیٹھا رہا۔ جیپ اسٹارٹ ہی رہی۔ ایک ڈاکو نے حقارت سے بوڑھے گن مین کی لاش کو ٹھوکر سے ایک طرف کیا۔ ان کا انداز بتا رہا تھا کہ اپنی راہ میں حائل ہونے والے کسی بھی شخص کو گولیوں سے چھلنی کرنے میں انہیں ذرا بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔

میں نے ایک لمحے انتظار کیا کہ وہ چاروں سیڑھیاں چڑھ چکیں۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ان میں سے کوئی جیپ کے عقب میں پناہ لینے میں کامیاب ہوجائے۔ میں مورچہ بندی اور زیادہ دیر کی لڑائی کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ مجھے اپنی ذات کو پوشیدہ ہی رکھنا تھا۔ مجھے تو چند لمحوں کے اندر اندر اپنا کام دکھا کر غائب ہوجانا تھا۔

ایک ڈاکو نے زوردار ٹھوکر مار کر بینک کا دروازہ کھولا اور دوسرا بازار کی طرف رخ کرتے ہوئے کلاشنکوف تان کر کھڑا ہی ہونے لگا تھا کہ میں نے پہلا برسٹ مارا۔ دروازے کو ٹھوکر مارنے والے ڈاکو کو اندر جانے کا موقع نہیں ملا۔ رائفل تان کر بارعب انداز میں کھڑے ہوئے ڈاکو کی حسرتیں بھی دل ہی میں رہ گئیں۔ ایک تو ہوا میں اچھلا اور سر کے بل سڑک پر آیا' دوسرا اپنا سینہ تھامے اس انداز میں سیڑھیوں سے لڑھکا جس انداز میں بوڑھا گن مین لڑھکا تھا۔

مجھے بوڑھے گن مین کی بے وجہ موت کا افسوس تھا۔ اگر میں نے ایک لمحے بھی انتظار نہ کیا ہوتا اور ڈاکوؤں کی جیپ رکتے ہی فائرنگ شروع کردی ہوتی تو شاید وہ مرنے سے بچ جاتا لیکن اس صورت میں بھی اس کے فائرنگ کی زد میں آنے کا امکان بہرحال موجود تھا۔

تیسرا ڈاکو کچھ پھرتیلا تھا۔ اس نے تیزی سے گھومتے ہوئے کچھ جھک کر اندھا دھند جوابی فائرنگ شروع کی لیکن اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ گولیاں کس طرف سے آئی تھیں۔ اس نے ایک اونچے مکان کی کھلی کھڑکی پر برسٹ مارا تھا۔ اسے یقیناً اُدھر سے فائرنگ کا شبہ ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ صحیح طور پر کچھ سمجھ سکتا' میری کلاشنکوف کی گولیوں نے اس کا لہو بھی چاٹ لیا۔

اسی دوران ڈرائیور نے اسٹیئرنگ وہیل چھوڑ کر اپنے قریب سے ہی ایک کلاشنکوف اٹھائی۔ اسے غالباً اندازہ ہوچکا تھا کہ گولیاں کہاں سے آئی تھیں لیکن اس کے اپنے سامنے ونڈ اسکرین تھی۔ اسے بچاتے ہوئے فائر کرنے کی غرض سے اسے کھڑا ہونا پڑا اور کھڑا ہونا اسے بہت مہنگا پڑا۔ اس کی کھوپڑی اور چہرے میں یقیناً

کئی سوراخ ہوئے ہوں گے۔ اگر اس کے سر اور چہرے پر ڈھاٹا نہ ہوتا تو شاید اس کی کھوپڑی کا بیشتر حصہ غائب ہی ہوجاتا۔ وہ پہلے سیٹ پر اور پھر اس سے نیچے لڑھک گیا۔

یہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہوا تھا جیسے کوئی انتہائی مختصر دورانیے کی ایکشن فلم بڑے زور و شور اور گھن گرج سے شروع ہوئی ہو لیکن اس کا انجام ٹھُس ہوکر رہ گیا ہو۔ سب کچھ جیسے پلک جھپکتے میں ختم ہوکر رہ گیا تھا اور بازار میں ایک لمحے کے لیے موت کا سا سکوت پھیل گیا تھا۔

پانچویں ڈھاٹا پوش نے لپک کر بینک میں گھُسنے کی کوشش کی۔ کسی غیرمتوقع صورت حال میں کوئی اچھی حکمتِ عملی اختیار کرنے کے معاملے میں وہ لوگ زیادہ ہوشیار معلوم نہیں ہوتے تھے۔ میرا اپنا اندازہ اور تجربہ یہی تھا کہ اس قسم کے ڈاکوؤں کی دہشت زیادہ ہوتی ہے اور اسی کا وہ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ عام لوگوں کا دہشت زدہ ہونا بھی بجا ہی ہوتا ہے کیونکہ یہ لوگ سامنے آنے والے کسی بھی شخص کو بلا ضرورت بھی چھلنی کردیتے ہیں۔

میں نے اسے بھی بینک میں داخل ہونے کا موقع نہیں دیا۔ وہ دروازے کے سامنے ہی ڈھیر ہوگیا لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے بینک کا دروازہ کھلتے دیکھا۔ ایک اور ڈھاٹا پوش اپنی دانست میں "محتاط" انداز میں باہر جھانک رہا تھا۔ اس کی کلاشنکوف کی نال متلاشی انداز میں اِدھراُدھر گھوم رہی تھی۔

میں نے کسی ڈاکو کو اندر جانے کا موقع نہیں دیا تھا۔ میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ آخر وہ بدبخت چھٹا ڈاکو اندر سے کیسے جھانک رہا تھا؟ مجھے امکان یہی نظر آیا کہ جب جیپ بازار میں داخل ہوئی ہوگی تو اس کے ساتھیوں نے اسے بازار کے سرے پر ہی اتار دیا ہوگا۔ اس کی ڈیوٹی بینک کا عقبی دروازہ سنبھالنے کی ہوگی لیکن وہ خلافِ توقع فائرنگ کی آواز سن کر اِدھر آگیا تھا۔ بینک میں یقیناً کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہیں کی ہوگی۔ اب وہ احمق دروازہ کھولے جھانک رہا تھا۔

لیکن احمق ہونے کے باوجود وہ یقیناً بے حد خوش قسمت تھا کیونکہ جب میں نے اسے ملکِ عدم کے راستے پر روانہ کرنے کے لیے ٹریگر دبایا تو معلوم ہوا کہ میری کلاشنکوف کا میگزین خالی ہوچکا تھا۔

اس ڈاکو نے کوئی فائر کرنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ اس نے اس لمحاتی سکوت کو غنیمت جانا۔ اسی طرح جھکے جھکے وہ تیزی سے سیڑھیاں اُتر کر جیپ میں گھُسا اور اسٹیئرنگ وہیل سنبھال کر تیزی اور مہارت سے جیپ وہاں سے نکال لے گیا۔ اپنے ساتھیوں کی لاشیں وہ بینک کے سامنے ہی پڑی چھوڑ گیا تھا۔ میرے کلاشنکوف ری لوڈ کرنے تک وہ جان بچا کر نکل چکا تھا۔ بلاشبہ وہ خوش قسمت تھا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے مجھے اس دراڑ نما گلی میں دیکھا تھا یا نہیں؟

بینک سے اور کوئی بھی باہر نہیں آیا۔ میرا اندازہ تھا کہ عملے کے لوگ اندر بیٹھے تھرتھر کانپ رہے ہوں گے۔ میں نے کلاشنکوف کندھے پر لٹکائی' چہرے سے ڈھاٹا ہٹا کر اجرک کندھوں پر ڈالی اور بازار میں نکل کر دیوار سے لگ کر یوں کھسکتا ہوا آگے بڑھا جیسے میں بھی اس ساری کارروائی سے خوف زدہ ہوجانے والا ایک عام سا آدمی تھا۔ کچھ آگے جانا میری مجبوری تھی کیونکہ میرا گھوڑا اُدھر بندھا ہوا تھا۔

بچے کھچے لوگوں میں سے زیادہ تر اِدھراُدھر کھسک رہے تھے۔ چند ایک ہمت کرکے اب جائے واردات کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ کسی کی توجہ میری طرف نہیں تھی۔ زیادہ تر لوگ لاشوں کی طرف یا پھر اس طرف دیکھ رہے تھے جدھر جیپ دھول اُڑاتی ہوئی غائب ہوئی تھی۔

کھمبے کے قریب پہنچ کر میں نے اپنا گھوڑا کھولا اور اس پر سوار ہوکر گھوم کر دوسری گلی کے راستے گاؤں سے واپس روانہ ہوگیا۔ اس گلی میں چند عورتیں دروازے ذرا سے کھول کر صورت حال جاننے کی کوشش کررہی تھیں۔ مجھے یقین تھا' انھوں نے مجھے بھی ایک خوف زدہ شخص ہی سمجھا ہوگا جو جلد از جلد اس ہنگامے سے دور نکل جانے کی کوشش کررہا تھا۔ میں کم از کم اداکاری تو ایسی ہی کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

آندھی اور طوفان کی طرح گھوڑا دوڑاتے ہوئے میں ایک بار پھر فارم پر پہنچا اور عقبی دروازے سے فارم میں داخل ہوا۔ اپنے گھوڑے کو اصطبل میں باندھ کر میں نے کلاشنکوف وغیرہ کمرے میں رکھی' کپڑے تبدیل کیے پھر ایک اور گھوڑا ہارس فارم سے نکال کر میدان کی طرف چل پڑا۔ اس گھوڑے کو میں ان دنوں سدھا رہا تھا۔

میدان میں پہنچ کر میں نے حقیقتاً گردوپیش سے اپنا دھیان بالکل ہٹا لیا اور یوں گھوڑے کو سدھانے میں مصروف ہوگیا جیسے دنیا کا سب سے ضروری کام یہی تھا اور میں گھنٹوں سے اسی کام میں مصروف تھا۔

سہ پہر تک میں اطمینان سے اپنے کام میں مصروف رہا۔ سہ پہر کے قریب عبدل نہ جانے کہاں سے دوڑا دوڑا میرے پاس آیا۔ اس کا چہرہ جوش و خروش سے تمتما رہا تھا۔ شاید اسے برسوں میں پہلی بار کسی کو سنانے کے لیے کوئی سنسنی خیز خبر میسر آئی تھی۔ اس کی باچھیں کھِلی جارہی تھیں۔

قریب آکر وہ بولا "معاف کرنا خان صاحب! آج تو میں نے آپ کے لیے دوپہر کا کھانا ہی نہیں پکایا۔ دراصل میں بازار گیا ہوا تھا اور وہاں جاکر ایسا پھنسا کہ اب واپس آیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے کھانے کی کوئی خاص ضرورت بھی محسوس نہیں ہوئی۔ صبح کی بچی کھچی کچھ چیزیں کھالی تھیں" میں نے اسے تسلی دی۔ "لیکن تم اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہو؟ تمہاری تو

پگڑی گری جارہی ہے۔"

"وہ۔۔۔ سائیں، میں گھبرایا ہوا نہیں ہوں" اس نے کھسیانا ہوکر جلدی سے پگڑی درست کی پھر قدرے سنبھل کر بولا "آپ نے کچھ سنا سائیں؟"

"نہیں۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"بہت خاص ہے سائیں!" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔

"تو پھر مجھے کہاں سے معلوم ہوگی" میں نے مایوسی سے کہا "مجھے ابھی یہاں کی خاص باتیں کون بتاتا ہے؟ میں ابھی یہاں نیا ہوں نا۔۔۔ اور پھر میں کوئی اہم آدمی بھی نہیں ہوں۔"

"نہیں جی۔۔۔ اہم تو آپ ضرور ہیں" عبدل نے گویا تسلی دی کہ مجھے دل چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ ہمت بندھانے والے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولا "رئیسانی جی نے سب کو خاص طور پر حکم دیا تھا کہ آپ کا بہت اچھی طرح خیال رکھیں اس لیے ہماری نظر میں تو آپ خاص آدمی ہوئے۔"

"خیر۔۔۔ تم وہ بات بتاؤ جو بتانے لگے تھے؟" میں نے کہا۔

اِدھر اُدھر دیکھ کر وہ آنکھیں پھیلاتے ہوئے بولا "سائیں! وہ بات یہ تھی کہ آج ہمارے گاؤں کے بینک پر ڈاکا پڑنے لگا تھا۔ بڑے خطرناک قسم کے پانچ ڈاکو آئے تھے اور آج رئیسانی جی کی فصلوں کا بہت روپیہ بینک میں تھا۔ وہ تو آج یقیناً ساری رقم لوٹ کرلے جاتے لیکن پتا نہیں کون شخص رحمت کا فرشتہ بن کر آگیا۔ اس نے پانچ ڈاکوؤں کو گولی ماردی۔ چھٹا جیپ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔"

"اچھا۔!" میں نے دل ہی دل میں اس کی باتوں سے محظوظ ہوتے ہوئے بظاہر حیرت سے کہا "کون تھا وہ نیک دل اور بہادر آدمی؟"

"یہی تو کمال ہے کہ اس کا کچھ پتا نہیں چلا" عبدل پُرجوش لہجے میں بولا "صرف ایک بُڑھیا نے اس کی جھلک دیکھی تھی جو اپنے چوبارے کی کھڑکی میں کھڑی تھی مگر اس کی نظر زیادہ اچھی نہیں ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ بھی ڈاکوؤں کی طرح ہی ڈھاٹا باندھے ہوئے تھا اور ایک تنگ سی گندی گلی سے گولیاں چلاتا نظر آیا تھا۔ مگر بڑھیا فائرنگ سے ڈر کر اندر جاکر چُھپ گئی تھی۔ سکون ہونے پر وہ دوبارہ کھڑکی میں آئی تو وہ شخص غائب ہوچکا تھا۔۔۔"

پھر عبدل نے خیال ظاہر کیا "ممکن ہے وہ بھی ڈاکوؤں ہی کا ساتھی رہا ہو لیکن کسی بات پر آخری وقت میں ڈاکوؤں سے اس کی بگڑ گئی ہو۔۔۔ جھگڑا ہوگیا ہو اور اس نے اپنے ساتھیوں پر ہی فائر کھول دیا ہو۔۔۔" وہ خاصا خطرناک خیال ظاہر کررہا تھا۔ معلوم نہیں کس نے اس کے دماغ میں یہ بات ڈالی تھی۔

"تم سے کس نے کہا کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھی بھی ہوسکتا تھا؟" میں نے گھوڑے کی گردن پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو میں خود سوچ رہا ہوں سائیں!" وہ ذرا فخریہ سے لہجے میں بولا "کوئی اور ایسی دلیری دکھاتا تو اسے پوشیدہ رہنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ تو رئیسانی جی سے انعام حاصل کرتا۔"

"دیکھو عبدل!" میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ہمدردانہ لہجے میں کہا "تم زیادہ سوچ بچار نہ کیا کرو۔ ننھا سا دماغ تمہارا خواہ مخواہ اتنا سوچنے میں خرچ ہوجائے گا۔"

"دیکھیں خان صاحب! میں اِدھر اُدھر کسی سے فالتو بات نہیں ہوں لیکن انسان کو سوچ بچار تو کرنی چاہیے نا" وہ ۔۔۔ سے لہجے میں بولا۔

"اچھا خیر۔۔۔" میں نے اس کا کندھا تھپکا "یہ بتاؤ پھر کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں صاحب! بس پانچ دس سیکنڈ میں ہی سب ہوگیا۔" وہ ابھی تک ہیجان زدہ لہجے میں ہی بات کررہا تھا "سائیں! اللہ نے بڑا کرم کیا کہ بینک لٹنے سے بچ گیا۔ بڑی چھیل گئی تھی۔ سارا گاؤں اِدھر جمع ہوگیا تھا۔ رب نواز اور کے دوسرے کئی آدمی اِدھر ہی تھے، وہ بھی موقعے پر پہنچ۔ پولیس کے جو چھ آدمی تھانے میں ہوتے ہیں، ان کی تو سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں۔ پھر حاصل آباد سے بھی کچھ پولیس آئی تھی۔ ڈاکوؤں کی لاشیں بھی وہی لے گئے ہیں۔ ابھی کچھ پتا نہیں چل رہا کہ وہ کس گروہ کے ڈاکو ہیں اور کس علاقے سے آئے۔

۔۔۔ تو ان کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں ۔۔۔س نے انہیں جہنم رسید کیا ہے۔"

"چلو خیر۔۔۔ اچھی بات یہ ہے کہ بینک لٹنے سے بچ گیا" میں نے ۔۔۔ا۔

"ہاں سائیں!" اس نے تائید میں سرہلایا "رئیسانی جی سُنیں ۔۔۔ی تو بہت خوش ہوں گی۔ بینک میں زیادہ روپیہ پیسہ ہمیشہ انہی کا ہوتا ہے لیکن شاید وہ فکرمند بھی ہوں کیونکہ اس سے پہلے کبھی ڈاکوؤں نے اِدھر کا رخ نہیں کیا تھا۔ یہاں آج تک اس قسم کی کوئی اردات نہیں ہوئی تھی۔"

میں نے دل ہی دل میں کہا 'ڈاکو تو کب سے اس بیرا ۔۔۔ی ۔۔۔ورت کے گرد سازشوں کے جال بُن رہے ہیں مگر اسے کچھ پتا ہی ۔۔۔ہیں۔ کسی روز اچانک ہی اس کا یہ گوشۂ عافیت شعلوں میں گھر گیا تو ۔۔۔ایداسے سنبھلنے کا بھی موقع نہ ملے۔'

تاہم عبدل سے میں نے کچھ نہیں کہا اور گھوڑے کی لگام پکڑ ۔۔۔کراسے واپس ہارس فارم میں لے آیا۔ میں جو کچھ معلوم کرنا چاہتا ۔۔۔ھا وہ مجھے معلوم ہوچکا تھا۔ اب مجھے خواہ مخواہ وہاں اپنے آپ کو ۔۔۔صروف ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف یہی جاننا ۔۔۔چاہتا تھا کہ میرے آنے کے بعد وہاں کیا ہوا تھا۔

دوسرے روز صبح ناشتے سے فارغ ہوکر میں نے عبدل سے کہا ۔۔۔میں ذرا ایک کام سے جارہا ہوں۔ شاید شام تک واپسی ہو۔ شیر ۔۔۔محمد آئے تو اس سے کہنا، اکیلا ہی کام کرتا رہے۔ جس گھوڑے کو ۔۔۔میں سدھار رہا تھا، اسے ہی سدھانے کی کوشش کرے۔"

"شیر محمد تو شاید آج نہ آئے" عبدل ٹھوڑی کھجاتے ہوئے ۔۔۔ولا۔

"کیوں۔۔۔ خیریت؟"

"یہی بات یہ ہے سائیں کہ اسے گھوڑے سدھانے سے کوئی ۔۔۔اص دلچسپی نہیں رہی۔ وہ تو بس ایسے ہی ٹائم پاس کررہا ہے۔ اس ۔۔۔کے خیال میں یہ بالکل بے کار اور جاہل آدمیوں کا کام ہے۔"

"یعنی ہم اس کی نظر میں بے کار اور جاہل آدمی ہوگئے؟" میں ۔۔۔نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ مجھے واقعی اس بات ۔۔۔پر غصہ نہیں آیا تھا بلکہ میں لطف اندوز ہوا تھا۔

عبدل بدستور ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا "سائیں! وہ تو خود بہت بڑا جاہل ہے لیکن اب میں کیا کروں۔۔۔ میں تو چھوٹا آدمی ہوں ۔۔۔سمجھیں تو اس سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جو کچھ وہ کہتا ہے، چپ ۔۔۔کرکے سن لیتا ہوں۔ بہرحال اس کا اب اس کام سے بالکل دل ۔۔۔اُکھڑ چکا ہے۔ اسی لیے وہ بہانے بہانے سے غوطے مارنے لگا ہے۔ آج کل وہ کمدار رب نواز صاحب کے پیچھے لگا ہوا ہے کہ اس کے ذمے کوئی اور کام لگا دیا جائے۔"

"چلو۔۔۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے" میں نے خوش دلی سے کہا "میرا سامنا کمدار صاحب سے ہوا تو میں بھی شیر محمد کی سفارش کروں گا کہ اس پڑھے لکھے انگریز کے ذمے واقعی کوئی اور ہی کام لگادیں۔ یہ کام تو میں اکیلا ہی کرلوں گا۔ جتنے گھوڑے اس وقت فارم میں موجود ہیں، ان کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں لیکن اس وقت میرے پہلے کے کچھ کام رُکے ہوئے ہیں، وہ نمٹ جائیں تو میں گھوڑوں کی طرف پوری توجہ دوں گا۔ جب میں اس کام میں پوری طرح لگوں گا تو گھوڑے مجھ سے پناہ مانگیں گے۔"

"ہاں سائیں! میرا خیال ہے، گھوڑوں کو اس بات کا اندازہ تو ہوچکا ہے" عبدل مسکراتے ہوئے بولا۔

"ہاں۔ یہ مذاق کی بات نہیں ہے" میں نے سنجیدگی سے اس کی تائید کی۔ "گھوڑا اچھا خاصا ذہین جانور ہے۔ بہت سی باتوں کا اندازہ کرلیتا ہے۔ اسی لیے تو گھوڑوں کو سدھانا میری نظر میں کوئی مشکل کام نہیں۔ البتہ گدھوں کو سدھانا بہت مشکل کام ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ" عبدل مسکراتے ہوئے سرہلا کر بولا اور صفائی کرنے فارم کی طرف چلا گیا۔

میں نے ایک سفری بیگ اٹھا کر بائیں کندھے پر اور کلاشنکوف دائیں کندھے پر لٹکائی، کمرے کو تالا لگایا اور عقبی راستے سے نکل کھڑا ہوا۔ بیگ میں سب سے اہم چیز اس رقم کا پیکٹ تھا جو گزشتہ روز ٹمیسو خان اپنے اڈے پر پہنچانے کے لیے روانہ ہوا تھا۔ اس میں سے کچھ رقم تو میں نے اپنے متوقع اور غیر متوقع اخراجات کے لیے رکھ لی تھی لیکن بیشتر رقم اب بھی پیکٹ میں موجود تھی جو کسی حرماں نصیب کے حالات بدلنے کے لیے کافی تھی۔

میں خاصا لمبا چکر کاٹ کر برساتی نالے پر پہنچا اور اس کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ میں حاصل آباد سے آنے والی بس پکڑنا چاہتا تھا لیکن گاؤں کے اڈے سے اس بس میں سوار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ بس یونہی معمولی سی احتیاط کے پیشِ نظر میں نہیں چاہتا تھا کہ مقامی لوگوں میں سے کوئی مجھے بس میں بیٹھ کر کہیں جاتے دیکھے۔ میں بس کو راستے ہی میں روک کر سوار ہونا چاہتا تھا۔

میں سمتوں کی مدد سے اندازاً اپنے مطلوبہ مقام کی طرف جارہا تھا۔ میں نے ذرائع آمدورفت کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرلی تھیں۔ حاصل آباد سے آنے والی ایک بس مختلف قصبوں اور دیہاتوں کے قریب سے گزرتی ہوئی جامی نگر تک جاتی تھی۔ جامی نگر اس کا آخری اسٹاپ تھا۔ خاصا طویل سفر تھا اس لیے میں گھوڑے پر نہیں جارہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ آج ہی اپنے ٹھکانے پر واپس بھی آجاؤں۔

برساتی نالے میں خاصا پانی موجود تھا۔ پہاڑی علاقوں کی طرح یہاں بھی کسی زمانے میں لوگوں نے کچھ ایسا انتظام کیا تھا کہ فاضل اور بے کار زمین میں بڑے بڑے گڑھے کھود کر بارش کے پانی کو محفوظ کرلیتے تھے۔ پھر اسے نالوں کے ذریعے اِدھر اُدھر پہنچاتے تھے مگر اب یہ علاقہ نہری نظام سے منسلک ہوچکا تھا اور بجلی بھی آچکی تھی اس لیے کہیں کہیں ٹیوب ویل بھی لگ گئے تھے۔ چنانچہ یہ

پرانا، ضمنی نظام متروک ہوچکا تھا لیکن ان گڑھوں اور نالوں میں اب بھی اکثر برساتی پانی جمع رہتا تھا اور ادھراُدھر آتے جاتے مویشیوں کے پینے میں کام آتا تھا۔

میں زرتاج کے بارے میں سوچتا ہوا نالے کے کنارے کنارے چلا جارہا تھا۔ میں اپنی دانست میں دل پھینک نہیں تھا۔ زندگی میں وہ کچھ دیکھ لیا تھا کہ دل تو مشکل سے ہی کسی پر آتا تھا اور میرا خیال تھا کہ مستقل طور پر تو میرا دل راحیلہ میں ہی اٹکا ہوا تھا کیونکہ وہ میرا لڑکپن کا خواب تھی لیکن نہ جانے کیوں زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر کوئی نہایت ہی غیر معمولی لڑکی نظر آہی جاتی تھی جو دل میں ایک بے عنوان سی خلش جگادیتی تھی۔

زرتاج یقیناً ایک غیر معمولی لڑکی تھی۔ اس کا اندازہ مجھے اسی دن ہوگیا تھا جس دن میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ آج کے دور میں اس قسم کی لڑکیاں خوابوں ہی کی دنیا میں ملتی ہیں لیکن میں اس کے بارے میں کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا، اپنے ذہن کو الجھانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ وہ کسی نشے کی طرح میرے حواس پر نہ چھا جائے۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے خواب کیا تھے، آئیڈیلز کیا تھے، اس کا مرکزِ نظر، اس کی سوچوں کا محور کیا ہوسکتا تھا؟ مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ میں اندازہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ میری سوچوں اور میرے حالات میں انتشار پہلے ہی کچھ کم نہیں تھا۔ میں اپنے ذہن کو مزید اُلجھانا نہیں چاہتا تھا۔ آخر انسان کتنے خوابوں کے خارزاروں میں اُلجھ سکتا تھا اور کتنے خوابوں کی تعبیر پاسکتا تھا؟

میں ایک معمولی، بے وقعت اور بے حیثیت شخص کے طور پر اس سے ملا تھا اور چاہتا تھا کہ اسی طرح رخصت ہوجاؤں۔ میں بھی چند روز بعد اسے بھول جاؤں، وہ بھی میرے بارے میں کچھ نہ سوچے لیکن نہ جانے کیا بات تھی، کسی نہ کسی بہانے اس کا خیال ذہن میں گھسا چلا آتا تھا۔ ان لمحات میں دل میں ایک عجیب سا گداز پیدا ہوجاتا تھا جو مجھے ڈرا دیتا تھا۔ اس طرح کا گداز کوئی اچھی علامت نہیں ہوتا۔

ایسے لمحات میں، میں اپنے آپ کو راحیلہ کے تصور میں الجھانے کی کوشش کرتا تھا جسے میں زندگی اور موت کی ایک عجیب جنگ لڑتے چھوڑ آیا تھا جس میں اسے صرف اپنے بارے میں ہی نہیں، اپنے تمام ساتھیوں کے بارے میں بھی فیصلے خود ہی کرنے تھے۔ وہ اس قسم کے معاملات میں صرف میری وجہ سے اُلجھی تھی ورنہ وہ تو کراچی میں اپنی چھوٹی سی ملازمت میں محدود مگر پُرسکون زندگی گزار رہی تھی۔ میں راحیلہ کے بارے میں سوچتا تو زرتاج کا تصور ذہن میں ذرا مدھم پڑجاتا لیکن محو نہیں ہوتا تھا۔ میں اسے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش جاری رکھتا مگر کپڑے کو گرد لگ جائے تو وہ بھی آسانی سے نہیں چھوٹتی۔ یہ تو پھر بھی ایک نایاب سی لڑکی کا خیال تھا!

میں انہی خیالات میں اُلجھا نالے کے کنارے کنارے برساتی جوہڑ کے قریب پہنچ گیا لیکن وہیں ٹھٹک کر رہ گیا۔ جو قریب ڈھلوان اور ریتلی سی زمین پر ایک پرانی جیپ ترچھی تھی۔ اس کے چاروں پہیئے پچکے ہوئے تھے۔ معلوم نہیں ہوچکے تھے یا ان میں سے ہوا نکلی ہوئی تھی۔ دراصل اس دیکھ کر ہی میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گیا تھا کیونکہ اس پلیٹ پر واضح حروف میں "پولیس" لکھا ہوا تھا مگر پولیس کی اس متروک سے انداز میں، ویرانے میں کیوں کھڑی ہوئی تھی

جیپ خالی تھی اور اردگرد بھی کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ نشیب میں تھا اور اس کے کنارے ڈھلوان تھے۔ پہلے میں کہ تھوڑا سا چکر کاٹ کر جیپ اور جوہڑ سے کترا کر اس جگ گزر جاؤں مگر پھر شاید تجسس نے حوصلہ بھی دلایا اور مجبور بھی میں جیپ کے قریب چلا گیا۔ اسی دوران میری نظر نشیب میں طرف گئی تو مجھے دوسری حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔

جوہڑ میں کافی پانی موجود تھا لیکن گدلا تھا اس لیے گہرائی کا اندازہ نہیں ہوسکتا تھا۔ جوہڑ کے کنارے نیم ڈھلوان زمین پر ایک شخص اوندھے منہ پڑا تھا۔ وہ شلوار قمیص واسکٹ میں تھا۔ سر سے پاؤں تک گندے پانی اور کیچڑ میں تھا۔ وہ یقیناً جوہڑ میں گرنے کے بعد باہر آیا تھا لیکن عجیب تھی کہ اس کے ہاتھ اس کی پشت پر بندھے ہوئے تھے اور میں بھی رسی کی بندشیں تھیں۔

وہ قطعی ساکت تھا۔ معلوم نہیں زندہ بھی تھا یا مرچکا پھر میں نے بغور دیکھا تو اس کے اوپری دھڑ میں موہوم سی نظر آئی جو نشاندہی کررہی تھی کہ وہ سانس لے رہا تھا۔ میں

اس کے قریب پہنچا اور ایک ہاتھ سے اپنی گن اور چادر سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے میں نے اسے سیدھا کردیا۔ دوسرے ہی لمحے میں غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گیا۔

اس کا چہرہ اور بال گو کہ کیچڑ میں لتھڑے ہوئے تھے پھر بھی اس شخص کو میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ انسپکٹر رحیم گل تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور سانسوں کی آمدورفت سُست تھی۔ کل میں نے اسے بڑے طمطراق سے، صاف ستھرے حُلیے میں بینک سے نکلتے دیکھا تھا۔ آج وہ اس حال میں پڑا تھا۔ معلوم نہیں کیا ماجرا تھا؟ جب وہ میرے تعاقب میں تھا تو وردی میں تھا اور گھوڑے پر تھا لیکن اب شلوار قمیص میں تھا اور قریب ہی اس کی سرکاری جیپ بھی کھڑی تھی۔ شاید اس نے کسی قریبی پولیس اسٹیشن پہنچ کر مدد حاصل کی تھی لیکن کیا اس نے میری...... یعنی اپنی دانست میں ایک خطرناک ڈاکو کی تلاش جاری رکھنے کے لیے مزید پولیس فورس کی مدد حاصل نہیں کی تھی؟ لگتا یہی تھا کہ وہ جو کچھ بھی کررہا تھا، اکیلا ہی کررہا تھا اور اکیلا ہی ہونے کی وجہ سے اس حال کو پہنچا تھا۔

ایک بار تو میں نے سوچا کہ اسے یونہی پڑا چھوڑ کر اپنی راہ لوں۔ اول تو مجھے اس صورت حال پر خوش ہونا چاہیے تھا کیونکہ کسی اور نے میرے حصے کا کام کردیا تھا۔ اسے یقیناً بہت زیادہ مارپیٹ کے بعد ہاتھ پاؤں باندھ کر جوہڑ میں پھینک دیا گیا تھا لیکن کسی نہ کسی طرح وہ گھسٹتا ہوا جوہڑ سے نکل آیا تھا۔ اس کی ٹانگیں اب بھی گھٹنوں تک پانی میں ہی تھیں۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ جسم اور چہرے پر کیچڑ کے باوجود ضربات کے نشان نظر آرہے تھے۔ پیشانی کی کھال پھٹی ہوئی تھی اور وہاں سے یقیناً کافی خون بہہ چکا تھا۔ چہرے پر نیل پڑے ہوئے تھے۔

بہت سے ملزمان کا تھانوں اور عقوبت خانوں میں دورانِ تفتیش یہی حال ہوتا تھا جو اس وقت انسپکٹر رحیم کا نظر آرہا تھا۔ وہ ایک سخت جان، مضبوط اور قد آور شخص تھا۔ یقیناً بے پناہ قوتِ برداشت کا مالک تھا۔ نہ جانے اس نے کتنی مارپیٹ برداشت کی تھی۔ اس وقت وہ نیم جاں نظر آرہا تھا۔

یہ بات یقینی تھی کہ اگر میں اسے یونہی چھوڑ کر آگے روانہ ہوجاتا تو وہ موت کے منہ میں چلا جاتا۔ لگتا یہی تھا کہ ادھر سے شاذونادر ہی کسی کا گزر ہوتا تھا۔ انسپکٹر رحیم گل تو خیر ایک اچھا آدمی تھا لیکن اس طرح بے بسی کے عالم میں کسی کو بھی مرتا چھوڑ کر آگے بڑھ جانا میری نظر میں مردانگی نہیں تھی۔ اگر مجھے یقینی طور پر معلوم ہوتا کہ وہ ایک کرپٹ اور کمزوروں پر ظلم کرنے والا پولیس آفیسر تھا تو میں دل میں ذرا سی بھی خلش محسوس کیے بغیر اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا۔

لیکن اب تک اس کے بارے میں جو شہادتیں ملی تھیں ان سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انہی پولیس آفیسرز میں سے ایک تھا جو اب نایاب ہوتے جارہے تھے۔ وہ اپنی عمل داری، اپنے علاقے سے کوسوں دور یہاں شاید میری تلاش میں...... یا پھر کسی اور جرم کی تفتیش میں مارا مارا پھر رہا تھا۔

مانا کہ یہ اس کے فرائض میں شامل تھا مگر اس دور میں اپنے فرائض کسے یاد رہ گئے تھے؟ ہر کوئی صرف حقوق کا طلب گار تھا۔ فرائض کے لیے جن کو سرکاری کرسیوں پر بٹھایا گیا تھا ان میں سے کچھ لوگوں کا تقریروں، تحریروں، رپورٹوں، فائلوں اور دستخطوں سے کام چل رہا تھا۔ کچھ صرف ڈنڈے سے کام چلا رہے تھے۔ رحیم گل بھی چاہتا تو آرام سے اپنے علاقے میں، اپنے تھانے میں بیٹھ کر حاکمی کرتا، موج اُڑاتا اور صرف رجسٹر کالے کرواتا مگر وہ جان ہتھیلی پر لیے پھرنے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی یہ ادا مجھے پسند آئی تھی۔ ایسے شخص کو اس عالم میں نہیں مرنا چاہیے تھا کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوں اور وہ گندے جوہڑ کے کنارے پڑا ہو۔

میں نے اس کی بندشیں کھولیں۔ قمیص کے نیچے اس کی کمر سے ہولسٹر بھی بندھا ہوا تھا مگر اس میں ریوالور نہیں تھا۔ میں اسے اٹھا کر جوہڑ سے کچھ دور ہموار زمین پر لے آیا۔ اس کے چہرے اور جسم پر لگی ہوئی کیچڑ خشک ہوچکی تھی۔ اسے جوہڑ سے باہر آئے یقیناً کافی دیر گزر چکی تھی۔ میں نے اسے کسی مجسمے کی طرح جھاڑا پونچھا، اس کا ناک منہ صاف کیا اور ہاتھ پیروں کی تھوڑی سی مالش کی کیونکہ اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سرد تھے۔

وہ بالکل بے دم لگ رہا تھا مگر ہاتھ پاؤں کی مالش کے دوران قطعی غیر متوقع طور پر وہ کسمسایا پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ پہلے پہل شاید وہ خالی الذہن سا رہا اور میری صورت اسے دھندلی نظر آئی کیونکہ اس نے کئی بار پلکیں جھپکائیں پھر دھیرے دھیرے اس کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نمودار ہوئی۔ اس نے بہ مشکل اپنے ہاتھ پیروں کو ذرا سی حرکت دی اور اٹھنے کی کوشش کی۔

میں اطمینان سے اس کی کوششوں کا جائزہ لیتا رہا۔ جب وہ اٹھنے میں ناکام رہا تو میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "آرام سے لیٹے رہو۔ تمہارے اٹھ کھڑے ہونے سے حالات میں کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔"

"تم کون ہو؟" اس نے نقاہت زدہ سی آواز میں پوچھا۔

مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی کہ اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ پگڑی، سیاہ چشمے اور بڑھی ہوئی شیو جیسی سادہ سی چیزوں نے میک اپ کی کمی پوری کردی تھی لیکن رحیم گل اپنی تمام تر شکستہ حالی کے باوجود جتنی توجہ سے میری طرف دیکھ رہا تھا اس سے اندیشہ محسوس ہورہا تھا کہ وہ مجھے پہچان ہی نہ جائے۔ میں نے گلے میں پڑی ہوئی اجرک کچھ اس طرح لپیٹی کہ اس کا کچھ حصہ چہرے کے سامنے بھی آگیا۔

"میں تو ایک راہ گیر ہوں" میں نے مُبہم جواب دیا پھر انجان بنتے ہوئے پوچھا "تم بتاؤ کون ہو؟ ادھر جو جیپ کھڑی ہے، کیا وہ تمہاری ہے؟ اس کی نمبر پلیٹ پر پولیس لکھا ہوا ہے۔"

"ہاں... میں پولیس انسپکٹر ہوں..." اس کی آواز سرگوشی سے کچھ ہی بلند تھی "لیکن... یہ میرا علاقہ نہیں ہے... میں ایک ضروری کام سے آیا ہوا تھا... آج صبح ادھر سے گزر رہا تھا کہ ڈاکوؤں سے سامنا ہوگیا... انہوں نے اچانک ہی مجھے گھیرلیا... وہ تعداد میں سات تھے... انہوں نے مجھے رائفلوں کے کندوں سے مارا... پھر ہاتھ پاؤں باندھ کر جوہڑ میں پھینک دیا... وہ گولی بھی مار سکتے تھے... لیکن وہ چاہتے تھے کہ میں زیادہ سے زیادہ تکلیف سے مروں... جب انہوں نے مجھے پانی میں پھینکا اس وقت میں بے ہوش تھا لیکن پانی میں گرتے ہی مجھے نہ جانے کیسے ہوش آگیا اور میں نے سانس روک لی... وہ سمجھے کہ میں ڈوب چکا ہوں... اس لیے وہ چلے گئے... ان کے جانے کے بعد میں کسی نہ کسی طرح گھسٹتا ہوا باہر آگیا..."

وہ ہانپنے کے سے انداز میں گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ میں نے تاسف زدہ لہجے میں کہا "اب ڈاکوؤں کی اتنی ہمت بڑھ گئی ہے کہ انہوں نے راہ چلتے ایک پولیس آفیسر پر بلاوجہ تشدد کرکے اور اپنی دانست میں اسے ہلاک کرنے کے لیے جوہڑ میں پھینک دیا۔ حالانکہ آپ نے ان کو گرفتار کرنے کی تو کوشش نہیں کی ہوگی؟"

"میں اگر خبردار ہوتا تو شاید کوئی کارروائی کرتا... کیونکہ میں اپنی عادت سے مجبور ہوں... مگر اس وقت تو میں کسی اور ہی خیال میں... اپنے دھیان میں جارہا تھا... انہوں نے اچانک ہی مجھے آن گھیرا تھا..." ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر اس نے قدرے گہری نظر سے میری طرف دیکھا اور خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے زخمی ہونٹ کھنچ کر رہ گئے۔

پھر وہ پہلے سے قدرے بہتر آواز میں بولا "جہاں تک ہمت کی بات ہے... ڈاکوؤں کی ہمت تو اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے... میں تو اکیلا تھا... انہیں موقع ملے تو وہ پولیس کی کسی بڑی پارٹی پر بھی حملہ کرسکتے ہیں... حوصلے تو شرفا کے پست ہوتے ہیں... اور مجھے اعتراف ہے کہ اس میں کسی حد تک ہم پولیس والوں کا قصور ہے... دوسرے بہت سے لوگ بھی ہیں... جن کا ہم پولیس والوں سے بھی زیادہ قصور ہے... بہرحال میں تو تلافی کی اپنی سی کوشش کررہا ہوں... میری زندگی تو تلافی ہی کے لیے وقف ہے... لیکن میں تنہا ہوں... بہت تنہا..."

اس نے ایک بار پھر مسکرانے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر، اس کی مسکراہٹ میں شکست خوردگی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ مجھے مزید اچھا لگا۔ اس حال میں اس طرح کی باتیں کرنا اور مسکرانے کی کوشش کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر اس شخص سے کبھی میرا مقابلہ آن پڑا اور وہ مجھے ہلاک کرنے پر بھی تل گیا تب بھی شاید میں جواباً اسے باز رکھنے کے سوا اس کے خلاف کچھ نہ کرسکوں۔

میں نے پگڑی درست کرتے ہوئے کہا "سادہ لباس میں... اپنے راستے پر جاتے ہوئے پولیس آفیسر پر اس طرح حملہ... اس طرح اسے جان سے مارنے کی کوشش... یہ معاملہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔"

وہ ٹانگوں کو حرکت دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "مجھے مارتے وقت وہ جو باتیں کررہے تھے ان سے مجھے کسی حد تک وجہ کا اندازہ ہوا ہے... اگر تم زرتاج نگر کے رہنے والے ہو تو شاید تمہیں معلوم ہو کہ کل وہاں کے بینک میں چند ڈاکو آئے تھے... اچانک کہیں سے فائرنگ ہوئی... وہ بینک لوٹنے میں کامیاب نہیں ہوسکے... پانچ ڈاکو مرگئے... ایک بھاگ گیا... بدقسمتی سے... اس واقعے سے کچھ دیر پہلے میں ایک اور کام سے اس بینک میں تھوڑی دیر کے لیے گیا تھا... ڈاکوؤں کو اس بات کی اطلاع ہوگئی... وہ سمجھے کہ مجھے کسی ذریعے سے مخبری ہوگئی تھی... اور میری ہی وجہ سے ڈکیتی ناکام ہوئی... انہوں نے مجھے کوئی وضاحت کرنے یا کسی سوال کا جواب دینے کی مہلت نہیں دی... لیکن اگر مجھے واقعی اس ڈکیتی کے بارے میں پہلے سے خبر مل جاتی تو چاہے مجھے اکیلے اسے روکنے کی کوشش کرنا پڑتی' میں ضرور کرتا... معلوم نہیں وہ کون نیک آدمی تھا جو پولیس کے حصے کا کام کرگیا۔"

میں اجرک کی اوٹ میں مسکرادیا۔ وہ میرے لیے "نیک آدمی" کے الفاظ استعمال کررہا تھا اور اسی "نیک آدمی" کو گرفتار کرنے کے لیے مارا مارا پھر رہا تھا۔ شاید اسے گمان بھی نہیں تھا کہ اس وقت وہ اسی نیک آدمی سے ہم کلام تھا۔

میں نے گفتگو کے اس پہلو سے کتراتے ہوئے پوچھا "ڈاکوؤں نے اگر آپ کو بے خبری میں گھیرا تھا... تو اس کا مطلب ہے وہ آپ کو پہچانتے تھے؟"

"ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ مجھے بہت اچھی طرح پہچانتے تھے... لیکن میں ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا... بہرحال کبھی نہ کبھی جان جاؤں گا... بشرطیکہ زندہ رہا... میں ضدی انسان ہوں..." اس کی آواز ٹوٹ رہی تھی مگر اندر سے پہلے ہی کی طرح مضبوط تھا۔ وہ زیادہ زخمی نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید اندرونی چوٹوں اور دیر تک بندھا پڑا رہنے کی وجہ سے اس کی حالت خراب تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں مگر وہ بار بار کوشش کرکے نہ صرف انہیں کھلی رکھ رہا تھا بلکہ بغور میری طرف دیکھنے کی کوشش بھی کیے جارہا تھا۔ دو ایک مرتبہ تو مجھے یہ اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ مجھ سے سیاہ چشمہ اتارنے اور چہرے کے سامنے سے اجرک ہٹانے کی بھی فرمائش نہ کردے۔

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا "میں ایک بہت ضروری کام سے جارہا تھا... بہت جلدی میں ہوں ورنہ تمہیں گھر لے چلتا۔ بہرحال میں تمہیں کسی ایسی جگہ پہنچانے کا بندوبست کرکے جاؤں گا جہاں تمہیں مدد میسر آسکے۔"

"تم مجھے صرف زرتاج نگر کے تھانے تک پہنچانے کا بندوبست کردو۔ بس تمہاری یہی مہربانی کافی ہوگی" وہ تھکے تھکے سے انداز میں آنکھیں بند کرتے ہوئے بولا۔

میں نے اسے کندھے پر اٹھایا اور ریتلی ڈھلوان زمین پر احتیاط سے پاؤں جما کر مزید اوپر آگیا۔ وہ ایک جسیم آدمی تھا اور اس وقت بے جان سے انداز میں میرے کندھے پر لدا ہوا تھا اس لیے اس کا وزن کچھ اور زیادہ محسوس ہورہا تھا۔ بے ہوش یا مُردہ شخص کو اٹھاکر چلنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ بہرحال میں اسے اٹھائے زرتاج نگر کی طرف واپس چل دیا۔

خوش قسمتی سے مجھے زیادہ دور تک نہیں چلنا پڑا۔ ابھی میں نے فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ بل کھاتی پگڈنڈی کے ایک طرف سے آتی ہوئی چوں چوں کی ہلکی سی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ میں نے گردن موڑ کر دیکھا۔ ڈگمگاتی سی ایک بیل گاڑی پگڈنڈی کی طرف چلی آرہی تھی۔

میں رک کر اس کا جائزہ لینے لگا۔ بیل گاڑی میں ایک بوڑھا جوڑا سوار تھا۔ مرد بیلوں کو ہانک رہا تھا اور عورت ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں قریب بیٹھی تھی مگر مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ دونوں کچھ سنبھل کر بیٹھ گئے۔

فاصلہ کچھ اور کم ہوا تو گاڑی کے پچھلے حصے میں دو بھری ہوئی بوریاں بھی لدی نظر آئیں۔ بڑے میاں نے اب شک زدہ سی نظروں سے میرا جائزہ لینا شروع کردیا کیونکہ میرے کندھے پر ایک شخص بے جان سے انداز میں لٹکا ہوا تھا۔

مجھے کچھ کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ بڑے میاں نے قریب پہنچ کر خود ہی متذبذب سے انداز میں گاڑی روک لی اور سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"آپ کہاں جارہے ہیں چاچا جی؟" میں نے نہایت نرمی سے پوچھا۔ میرے لہجے سے غالباً بڑے میاں کو کچھ حوصلہ ہوا پھر بھی انہوں نے مشورہ طلب سے انداز میں اپنی ہم سفر کی طرف دیکھا جس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے غیر ارادی سے انداز میں آدھا چہرہ چادر میں چھپالیا تھا۔ بڑے میاں گویا نظروں ہی نظروں میں اس سے اجازت طلب کررہے تھے کہ سوال کا جواب دیں یا نہ دیں۔

بیوی کی طرف سے کوئی واضح اشارہ نہ پاکر بڑے میاں دوبارہ میری طرف متوجہ ہوئے اور ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولے "زرتاج نگر جارہا ہوں۔"

میں نے اپنے کندھے پر لدے رحیم گل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ شخص پولیس انسپکٹر ہے۔ ڈاکوؤں نے اسے بے ہوش کرکے جوہڑ میں پھینک دیا تھا۔ آپ صرف اتنی تکلیف اٹھالیں کہ اسے اپنی بیل گاڑی میں ڈال کر لے جائیں اور زرتاج نگر کے تھانے پہنچادیں۔ بس آپ کو اور کچھ نہیں کرنا ہے۔ وہاں پولیس والے خود ہی اسے سنبھال لیں گے۔"

"تم بھی ساتھ چلوگے؟" بڑے میاں نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس وقت ایک بہت ضروری کام سے جارہا ہوں۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے ورنہ شاید میں اسے کندھے پر ہی لے جاتا" میں نے جواب دیا اور گردن ذرا ٹیڑھی کرکے رحیم گل کے چہرے کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔

بڑے میاں اپنی مختصر سی پگڑی درست کرتے ہوئے بولے "دیکھو برخوردار! تم زور آور آدمی لگتے ہو۔ کلاشنکوف بھی تمہارے پاس ہے۔ تم چاہو تو اس مرے ہوئے یا ادھ مرے آدمی کو زبردستی بھی میری گاڑی میں ڈال سکتے ہو لیکن تمہیں اس قسم کی بہانے بازی کی کیا ضرورت ہے؟ ہمیں کیوں کسی چکر میں پھنسانے کی کوشش کررہے ہو؟ اس سے جان چھڑانی ہے تو پگڈنڈی سے دور کہیں جھاڑیوں میں پھینک دو۔"

بڑے میاں اتنے سیدھے سادے نہیں تھے جتنے نظر آرہے تھے۔ میں ذرا شرمندہ سا ہوگیا کیونکہ انہوں نے مجھے جھوٹا سمجھا تھا۔ رحیم گل بدستور ڈھیلے ڈھالے انداز میں میرے کندھے پر لٹکا ہوا تھا۔ شاید وہ بے ہوش ہوچکا تھا اس لیے میری بات کی تصدیق نہیں کررہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں تذبذب میں پڑگیا کہ کیا کروں؟

اسی دوران بڑے میاں ذرا توقف کے بعد بولے "اگر میں تمہاری بات پر یقین بھی کرلوں کہ یہ پولیس انسپکٹر ہے... تب بھی اسے اس حالت میں تھانے پہنچانے کا تو مجھ میں حوصلہ نہیں ہے بیٹا! تھانے والے تو مجھے ہی دھرلیں گے۔ اگر یہ مُردہ نہیں ہے لیکن راستے میں اللہ کو پیارا ہوگیا تو میں بالکل ہی مارا جاؤں گا۔ ہم غریب لوگ ہیں... ہمیں معاف ہی رکھو۔"

اسی لمحے رحیم گل کسمسایا پھر نقاہت بھرے انداز میں میرے بازو پر کچھ سیدھا ہوتے ہوئے آہستگی سے آنکھیں کھول کر نہایت دھیمی آواز میں بڑے میاں سے مخاطب ہوا "گھبراؤ نہیں بابا! یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے' ٹھیک کہہ رہا ہے۔ تم مجھے لے چلو... تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی... بلکہ شاید کچھ انعام ہی مل جائے... اور اس کے علاوہ میں زندگی بھر تمہارا شکر گزار بھی رہوں گا... چاچا! ہمارا معاملہ 'بد اچھا بدنام برا' والا ہے۔ ہم پولیس والے اتنے برے نہیں ہیں جتنے بدنام ہیں..."

اب بڑے میاں کے کھسیانا ہونے کی باری تھی۔ انہوں نے اشارے سے رحیم گل کو گاڑی میں لٹانے کی اجازت دے دی۔ میں نے اسے بوریوں کے قریب لٹادیا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مضمحل سے انداز میں مسکرایا۔ اس مسکراہٹ میں تشکر کی آمیزش تھی۔

وہ نہایت دھیمی آواز میں بولا "میں تمہارا ابھی شکر گزار رہوں گا۔"

میں نے اسے خدا حافظ کہا اور بیل گاڑی سے اتر آیا۔ بڑے میاں کا شکریہ ادا کر کے میں تیزی سے واپس اسی طرف روانہ ہو گیا جدھر سے آیا تھا۔ میں عقل کی روشنی میں تو فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں نے رحیم گل کی جان بچا کر اپنے حق میں اچھا کیا تھا یا برا؟ لیکن میرا ضمیر مطمئن تھا۔ فی الحال میرے لیے یہی اطمینان کافی تھا۔ میں اب زیادہ دور کی سوچوں میں نہیں اُلجھتا تھا۔

سمتوں کی مدد سے سفر کرنے کے معاملے میں میرے اندازے ہمیشہ درست ہی رہتے تھے۔ میں سڑک پر اسی مقام پر پہنچ گیا جہاں پہنچنا چاہتا تھا۔ مجھے وہاں خاصی دیر انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار جامی نگر کی طرف جانے والی بس آتی دکھائی دی۔ بس کیا تھی، انسانوں کا ایک چھتہ تھا جو لڑھکتا چلا آ رہا تھا۔

بس قریب آئی تو پتا چلا کہ اس کے اندر بھی انسان بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے اور صرف محاورتاً ایسا نہیں تھا بلکہ حقیقتاً بس میں انسانوں کے ساتھ کئی بھیڑ بکریاں بھی موجود تھیں۔ مساوات کے زریں اصولوں پر کچھ زیادہ ہی عمل کرتے ہوئے دو پایوں اور چوپایوں کو یکساں انداز میں ٹھونسا گیا تھا۔ بعض جگہ تو فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ انسان کون سا ہے اور بکرا کون سا۔ چھت پر بھی لوگ اپنی پوٹلیوں، صندوقوں اور دیگر ساز و سامان کے ساتھ موجود تھے۔ جہاں جہاں لٹکنے کی گنجائش تھی وہاں لٹکے ہوئے بھی تھے۔ بڑے شہروں میں رہنے والے سمجھتے ہیں کہ ان کے مسائل سے بڑھ کر کسی کے مسائل نہیں لیکن دیہی اور دور افتادہ علاقوں میں جا کر پتا چلتا ہے کہ انسان کس حال میں زندگی گزار رہے ہیں اور انہیں قدم قدم پر کن مسائل اور کن مصائب سے واسطہ پڑتا ہے۔

اس عبرتناک صورت حال کے باوجود ڈرائیور نے انتہائی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میرے ہاتھ ہلانے پر بس روک لی۔ مجھے اندازہ تھا کہ اگر میں نے یہ بس چھوڑ دی تو دوسری بس کے لیے شاید مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے انتظار کرنا پڑے چنانچہ کسی نہ کسی طرح پائیدان کے ایک کونے پر پاؤں پھنسا کر میں بھی لٹک ہی گیا۔ زیادہ فکر مجھے اس بات کی تھی کہ اس دھکم پیل میں کہیں رقم اِدھر اُدھر نہ ہو جائے۔ اس صورت میں تو ساری تگ و دو ہی بے کار چلی جاتی۔

چند ایک دیہات اور قصبے گزر چکے تو بس پر بوجھ کافی کم ہو گیا۔ میری حالت میں اتنی "ترقی" ہوئی کہ میں اندر پہنچ گیا اور ایک سیٹ کے پشتے کا سہارا لے کر قدرے باعزت انداز میں کھڑا ہو گیا۔ مزید ایک گھنٹے کے سفر کے بعد تو مجھے سیٹ بھی میسر آ گئی لیکن اس وقت تک میں جامی نگر کے قریب پہنچ چکا تھا۔

جامی نگر کے اسٹاپ پر میرے سوا کوئی نہیں اُترا۔ بس اپنے کسی ٹھکانے یا اڈے کی طرف روانہ ہو چکی تو میں نے سر جھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میں ریسلنگ کے کسی چھوٹے موٹے مقابلے میں حصہ لے کر رنگ سے باہر آیا تھا۔ جسم میں ابھی جھنجھناہٹ باقی تھی۔

غنیمت تھا کہ ایک طرف چھوٹا سا ایک ٹیڑھا میڑھا سائن بورڈ زمین میں گڑا ہوا تھا جس پر "جامی نگر ٹاؤن" لکھا ہوا تھا اور تیر کا نشان بھی بنا ہوا تھا۔ میں کچے میں اُتر کر لمبے لمبے ڈگ بھرتا اس طرف چل دیا۔ تین چار فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جامی نگر کے مکانات نظر آنے لگے۔

جامی نگر اچھا خاصا قصبہ معلوم ہوتا تھا اور اس کا مین بازار بھی بارونق تھا۔ میرانی پاڑے تک پہنچنے کے لیے مجھے ایک شخص سے ملاقات کرنا ہی پڑی۔ نہ جانے کیوں اس نے راستہ بتانے سے پہلے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ بہرحال اس نے راستہ مجھے سمجھا دیا۔ وہ تو میرے ساتھ چلنے پر بھی کمربستہ نظر آنے لگا تھا۔ میں نے بہ مشکل اسے باز رکھا۔

اس کے بعد مجھے میرانی پاڑے تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ وہ خاصے عُسرت زدہ سے مکانوں پر مشتمل ایک مختصر سی گلی تھی جس میں چار پانچ بچے کھیل رہے تھے۔

میں نے ان میں سے ایک کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے پوچھا "بیٹا! تمہیں معلوم ہے کنڈکٹر عبدالرشید کا گھر کون سا ہے؟"

لڑکا اپنے ساتھیوں کی نسبت ذرا بڑا تھا۔ دس بارہ سال کا ہو گا۔ وہ اخروٹوں سے کھیل رہے تھے۔ میرا سوال سن کر بڑا لڑکا کھیل کو بھول بھال کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے مستعدی سے بولا "جسے ڈاکوؤں نے قتل کر دیا تھا؟"

"ہاں" میں نے آہستگی سے جواب دیا۔

وہ چاروں بیک وقت مجھے گھر بتانے پر تُل گئے اور مجھے گویا گھیر گھار کر آگے چل دیے۔ ان سے پوچھ کر میں تو پھنس ہی گیا تھا۔

عبدالرشید کا مکان گلی میں دائیں ہاتھ پر آخر میں تھا۔ اس سے آگے گلی بند تھی۔ وہ نیچی سی دیواروں والا ایک نیم پختہ مکان تھا۔ دروازے پر ٹاٹ کا پردہ پڑا ہوا تھا جس کا نچلا حصہ تار تار تھا۔

مجھے دستک یا آواز دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تمام بچے دھڑ دھڑ کرتے دَرّانہ وار اندر گھس گئے اور چند سیکنڈ بعد اسی رفتار سے واپس آ گئے۔ وہ میرے گرد دائرہ بنا کر کھڑے ہو گئے اور بزرگانہ انداز میں میرا جائزہ لینے لگے۔

چند لمحے بعد ٹاٹ کا پردہ ذرا ایک طرف کو سرکا اور اس کے پیچھے عقب سے وہی موٹی موٹی آنکھیں طلوع ہوئیں جو کبھی بہت روشن رہی ہوں گی لیکن اب غم کے غبار سے دھندلائی ہوئی سی تھیں۔ وہ صبیح چہرہ جسے میں نے ایک چھوٹی سی اخباری تصویر کی صورت میں دیکھا تھا، اس وقت سیاہ چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ وہ ایک اداس چاند تھا جس کے گرد ماتمی بادلوں کا حلقہ تھا۔ ان افسردہ آنکھوں نے میرا سرتاپا جائزہ لیا اور ٹاٹ کے پردے پر مرمریں انگلیوں کی گرفت غیر ارادی طور پر سخت ہو گئی۔

"کیا بات ہے بھائی....؟ کون ہو تم؟" اس کے لب تھرتھرائے۔ "بھائی۔" اس لفظ کی حلاوت اور شیرینی میری رگ پے میں اتر گئی۔

میں نے ہچکچاہٹ سے ایک نظر بچوں کی طرف دیکھا جو یوں سر اٹھائے مجھے دیکھ رہے تھے جیسے کسی مینار پر کندہ، کسی اجنبی زبان کے الفاظ پڑھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

"میں ایک منٹ کے لیے اندر آ سکتا ہوں؟" میں نے اجازت طلب کی۔

ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر ہچکچاہٹ کے آثار دکھائی دیے پھر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "گھر میں اس وقت کوئی مرد نہیں ہے۔ تمہیں جو کہنا ہے یہیں کہہ دو۔"

"بچو! تم جا کر کھیلو۔ مجھے بہن سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں" میں نے بچوں کے لیڈر کو پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ان کے چہروں پر ناپسندیدگی اور ناگواری کے تاثرات ابھر آئے لیکن وہ باولِ ناخواستہ گلی کے اس سرے پر واپس چلے گئے جہاں وہ کچھ دیر پہلے اخروٹوں سے کھیل رہے تھے۔ ان کا لیڈر وہاں پہنچ کر بھی کن انکھیوں سے اِدھر ہی دیکھ رہا تھا۔

میں نے اپنے بیگ سے اس رقم کا پیکٹ نکالا جو غمیسو خان "گولڈی کلب" سے لے کر چلا تھا اور جو اسے ہلاک کرنے کے بعد میں نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اس میں اب بھی تقریباً پانچ لاکھ کی رقم موجود تھی۔

میں نے پیکٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "عبدالرشید نے یہ پیکٹ کسی کے پاس امانت رکھوایا ہوا تھا۔ اس شخص نے اخبار میں عبدالرشید کے قتل اور اس کے کنبے کے حالات کے بارے میں پڑھا تو میرے ہاتھ یہ چیز آپ لوگوں کے لئے بھجوائی ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اب جبکہ عبدالرشید اس دنیا میں موجود نہیں ہے تو آپ لوگ ہی اس کی امانت کے وارث ہیں۔ ویسے بھی عبدالرشید نے یہ آپ لوگوں کے لیے ہی رکھوائی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ کسی مناسب وقت پر لے جائے گا لیکن اس کی زندگی نے وفا نہیں کی۔"

لڑکی کا ہاتھ پیکٹ تھامنے کے لیے آگے نہیں بڑھا۔ "کیا ہے اس میں؟" اس کے لہجے میں ایک بے عنوان سا خوف تھا۔ "کیا نام ہے ان کا.... جنہوں نے یہ بھیجا ہے؟"

"انہوں نے اپنا نام بتانے سے منع کیا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ اس پیکٹ میں کیا ہے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا تھا کہ اس میں ایک ایسی چیز ہے جو آپ کے بہت کام آئے گی۔ یہ چیز صرف عبدالرشید کو واپس نہیں لا سکتی لیکن آپ کے باقی تمام مسائل حل کر دے گی۔ آپ اسے رکھ لیں۔"

عبدالرشید کا محض نام سن کر ہی لڑکی کی آنکھیں بھر آئی تھیں حالانکہ اس کے قتل کے بعد سے اب تک اس کا وقت یقیناً آنسو بہاتے ہی گزرا ہو گا لیکن آنسوؤں کے سوتے شاید خشک ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

وہ گلوگیر آواز میں بولی "جو چیز عبدالرشید کو.... میرے بھائی جان کو واپس نہیں لا سکتی وہ ہمارے کس کام کی۔"

"بہرحال یہ تم لوگوں کی امانت ہے، اسے رکھ تو لو" میں نے زور دیا۔

اس نے پیکٹ بے دلی سے تھام لیا اور ایک طرف ہٹتے ہوئے بولی "اندر آ جاؤ بھائی!" اب گویا اس نے مجھ پر اعتماد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"نہیں.... بس اب میرے اندر آنے کی ضرورت نہیں رہی۔ میں چلتا ہوں۔ خدا حافظ" میں نے کہا اور تیزی سے مُڑ کر واپس چل دیا۔ گلی کے موڑ پر پہنچ کر میں نے مُڑ کر دیکھا۔ وہ اداس آنکھیں ابھی تک میری جانب نگراں تھیں۔ اب ان آنکھوں میں اداسی کے ساتھ حیرت بھی جھلک رہی تھی۔

میں جس راستے سے آیا تھا، تیزی سے اسی راستے سے واپس چل دیا۔ ایک عجیب سی سرشاری، ایک عجیب سی خوشی کی خوشبو ہر مسامِ جاں سے روح کی گہرائی میں اتر آئی تھی۔ میں اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا اور اس وقت گویا چل نہیں رہا تھا، اُڑ رہا تھا۔ کسی کی مدد کرنے میں ایک عجیب ہی لذت پنہاں ہوتی ہے۔ کوئی اور خوشی اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتی۔ غمیسو خان والی رقم میں نے قبضے میں تو لے لی تھی لیکن اسے اپنے پاس رکھنے کو میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ وہ مجھے ایک بوجھ محسوس ہو رہی تھی۔

لیکن مسئلہ یہ ہے کہ رقم کیسی بھی ہو، پھینکی نہیں جاتی۔ میں شروع سے ہی سوچ میں تھا کہ اس رقم کا اچھا مصرف کیا ہونا چاہیے۔ یک دم مجھے کنڈکٹر عبدالرشید کا خیال آ گیا تھا۔ ڈکیتی کی جس واردات میں عبدالرشید مارا گیا تھا اس میں اور بھی کئی لوگ مارے گئے تھے۔ ان میں سے بھی کچھ یقیناً مدد کے مستحق ہوں گے لیکن میرے پاس ان میں سے کسی کا کوئی سراغ نہیں تھا۔ میرے سامنے صرف کنڈکٹر عبدالرشید کا تھوڑا بہت سراغ موجود تھا اور مجھے امید تھی کہ میں کوشش کروں تو اس کے گھر تک پہنچ جاؤں گا۔ وہ رقم یقیناً نہایت ہی ناجائز اور گھٹیا قسم کی کمائی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ رقم عبدالرشید کے پسماندگان یا اہلِ خانہ کو پہنچا کر مجھے ثواب ملے گا یا نہیں۔ میں گناہ و ثواب کے چکر میں تھا بھی نہیں۔ میں صرف یہی چاہتا تھا کہ فی الحال اس مصیبت زدہ کنبے کے مسائل حل ہو جائیں۔

میں تقریباً پہلے ہی کے سے انداز میں سفر کر کے رات گئے زرتاج نگر واپس پہنچ گیا۔ حالانکہ سفر طویل نہیں تھا لیکن اس میں وقت بہت ضائع ہوتا تھا۔

زرتاج نگر واپس پہنچ کر دوسرے روز سے میں اپنے کام میں

مصروف ہوگیا۔ تقریباً ایک ہفتہ اسی طرح گزر گیا لیکن ہفتے کے اختتام پر ایک شام گاؤں کے ایک چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے مجھے ایک ایسا جھٹکا لگا جس نے کافی دیر کے لیے میرے اعصاب شل کر دیے۔

بات کچھ بھی نہیں تھی۔ بس ایک اخباری خبر نظر سے گزری تھی۔ کاش میں نے وہ اخبار نہ دیکھا ہوتا۔ یہ وہی غیر معروف سا علاقائی اخبار تھا جو میں نے نمبر خان کے ساتھ ان کے خفیہ اڈے "کولڈ کی کلب" میں دیکھا تھا اور اس میں مقتول کنڈکٹر عبدالرشید کے اہلِ خانہ کے بارے میں فیچر پڑھا تھا۔

اس روز زرتاج نگر کے ایک چائے خانے میں بیٹھے بیٹھے مجھے اسی اخبار کا تازہ شمارہ میز پر پڑا ہوا نظر آیا تو میں نے غیر ارادی طور پر اٹھالیا اور اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ پچھلے صفحے پر چھوٹے سے ایک باکس میں اس روز بھی کنڈکٹر عبدالرشید کے اہلِ خانہ کے بارے میں ایک خبر موجود تھی جس نے مجھے ایک عجیب طرح کے ملال میں مبتلا کر دیا۔

نامہ نگار نے جامی نگر سے رپورٹ دی تھی کہ گزشتہ دنوں وہاں اپنی نوعیت کا عجیب ہی واقعہ پیش آیا۔ کوئی پُراسرار اجنبی مقتول کنڈکٹر عبدالرشید کے گھر پہنچا اور یہ کہہ کر پونے پانچ لاکھ کی رقم کا پیکٹ دے گیا کہ عبدالرشید نے وہ کسی کے پاس امانت رکھوایا ہوا تھا۔

خبر یہاں تک بھی ہوتی تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اصل جھٹکا مجھے اس سے آگے پڑھنے کے بعد لگا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ عبدالرشید کے اہل خانہ کو یہ معاملہ مشکوک معلوم ہوا تھا۔ بھلا ایک غریب کنڈکٹر کسی کے پاس پونے پانچ لاکھ روپے امانت کیسے رکھوا سکتا تھا؟ اگر وہ امانت بھی تھی تو یقیناً کسی اور کی ہوگی.... عبدالرشید کی نہیں۔

چنانچہ عبدالرشید کے بیمار باپ نے وہ رقم ٹاؤن کمیٹی کے چیئرمین صاحب کی خدمت میں لے جا کر پیش کر دی تھی جو کوئی حاجی صاحب تھے۔ وہ نہایت دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے علاقے کے تحصیل دار صاحب کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لے گئے تھے۔ انہوں نے بھی نہایت دیانت داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے سرکاری تحویل میں لے لیا تھا اور علاقے کے صحافیوں کو فخر سے یہ بات بتا دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر کچھ دنوں تک اس رقم کا کوئی دعوے دار سامنے نہ آیا تو وہ اس میں سے عبدالرشید کے اہل خانہ کو پچیس ہزار روپے بطور انعام دینے کے بارے میں "غور" کریں گے۔

پوری خبر پڑھ کر میں نے اخبار میز پر واپس پھینک دیا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔ غلطی میری ہی تھی۔ شاید میں نے ان لوگوں کی مدد کرنے کے لیے صحیح راستہ اختیار نہیں کیا تھا۔ مجھے اپنی کاروباری زندگی میں بھی تجربہ ہو چکا تھا' مجھے اس کو یاد رکھنا چاہیے تھا کہ بعض اوقات حد سے زیادہ غریب اور مصیبت زدہ لوگوں کو زیادہ بڑی امداد "ہضم" بھی نہیں ہوتی۔ مجھے کنڈکٹر کے گھر والوں کی مدد بیس پچیس ہزار روپے سے ہی کرنی چاہیے تھی اور اگر بڑی رقم انہیں پہنچانی تھی تو صحیح طور پر بات کر کے' انہیں ذہنی طور پر مطمئن کر کے پہنچانی چاہیے تھی۔ میرا یہ اندازہ غلط نکلا تھا کہ وہ اسے "امدادِ غیبی" سمجھ کر چپکے سے رکھ لیں گے۔

حرام کی رقم گویا حرام راستے ہی چلی گئی تھی۔ کافی دیر تک میں اسی طرح تاسف کے عالم میں بیٹھا رہا لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ اب اس کی تلافی کا کوئی طریقہ کم از کم میرے لیے قابلِ عمل نہیں تھا اس لیے میں نے اس بات کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو سمجھایا کہ اگر ان لوگوں کے مقدر میں مدد تھی ہی نہیں تو میں کیا کر سکتا تھا۔ پھر میں نے دودھ پتی کی ایک چینک منگوا کر "غلط غلط" کرنے کی کوشش کی اور شام ڈھلے اٹھ کر اپنے ٹھکانے پر واپس آگیا۔

اس ہفتے میں اس کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر واقعہ پیش نہیں آیا۔ حویلی اور زرتاج کی زمینوں پر کام کرنے والے بیشتر لوگ اب مجھے تھوڑا بہت جاننے لگے تھے۔ گو میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ ان کی نظر میں غیر نمایاں اور بے شناخت ہی رہوں۔

شیر محمد نے اس دوران اپنی ڈیوٹی کہیں اور لگوالی تھی۔ غالباً اسے میرے ساتھ کام کرنا گوارا ہی نہیں رہا تھا لیکن میرا دل کہتا تھا کہ اس کے اس اقدام میں کوئی اور بھی مصلحت پنہاں تھی۔ ادھر زرتاج ابھی تک شکار سے واپس نہیں آئی تھی۔ رب نواز اسے بینک پر ناکام ڈکیتی کے بارے میں بتانے کے لیے بے چین تھا۔

اسے کافی حد تک اندازہ تھا کہ شکار پر جانے والوں نے جنگلوں میں کہاں کہاں کیمپ لگائے ہوں گے اور کس سمت میں ان کا سفر جاری ہوگا۔ وہ چاہتا تو آدمی بھیج کر ان کا پتا کرا سکتا تھا اور زرتاج کو وہیں یہ خبر پہنچوا سکتا تھا مگر شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ زرتاج کی تفریح میں خلل پڑے۔

اسی دوران مجھے باتوں باتوں میں رب نواز سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جانو اپنے چار ساتھیوں کے ہمراہ زرتاج سے ملنے آیا تھا۔ اس نے اپنی آمد کا مقصد نہیں بتایا تھا لیکن وہ سخت غصے میں معلوم ہوتا تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ زرتاج ابھی شکار سے واپس نہیں آئی تھی تو وہ مزید ایک منٹ بھی رکے بغیر واپس روانہ ہو گیا تاہم یہ کہہ گیا تھا کہ چند دن بعد وہ دوبارہ آئے گا اور اس وقت تک زرتاج شکار سے واپس آچکی ہو تو اس کے حق میں بہتر ہوگا۔ رب نواز نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ اس کے لہجے میں دھمکی سی پوشیدہ تھی لیکن وہ اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔

مجھے پتا نہیں چل سکا تھا کہ جانو کس وقت آیا تھا اور کب واپس گیا تھا حالانکہ میں جس میدان گھوڑے سدھاتا تھا وہاں تقریباً چاروں طرف سے ہی آنے جانے والے لوگ دکھائی دیتے

تھے۔ شاید وہ کسی ایسے وقت آیا تھا جب میں کھانا کھانے اپنے کمرے میں گیا تھا۔ شاید یہ ہم دونوں ہی کے حق میں اچھا ہوا تھا کہ ہمارا ایک دوسرے سے سامنا نہیں ہوا تھا۔

بہرحال میں نے اس سلسلے میں رب نواز سے زیادہ کچھ پوچھنے کی کوشش نہیں کی تھی مُبادا وہ میری طرف سے شک میں پڑ جائے کہ آخر اس کارندے کو جانو کی آمد وغیرہ سے اتنی دلچسپی کیوں تھی۔ میرے حساب سے روز و شب سکون سے ہی گزر رہے تھے لیکن وہی میری نامعلوم سی حس کبھی کبھی میرے اعصاب پر ہولے ہولے دستک دینے لگتی تھی۔ گھڑی کی ٹک ٹک کی طرح!

خطرے کا احساس تو محض ایک احساس ہی ہوتا ہے' اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا مگر مجھے یوں لگتا جیسے خطرہ کوئی جسم اوڑھ کر آس پاس کہیں رات کے اندھیرے میں ٹہل رہا ہے' میری گھات میں ہے۔ میں نے اپنے کمرے میں رات کو زیرو کا بلب روشن رکھنے کا انتظام کیا تھا لیکن ایسے لمحوں میں' میں وہ بلب بھی بجھا دیتا تھا اور اندھیرے میں کسی درندے کی طرح چوکنا ہو کر بیٹھ جاتا۔ اندھیرے میں' میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتا لیکن یونہی بہت دیر گزر جاتی' کچھ بھی نہ ہوتا۔ میرے کشیدہ اعصاب بالآخر ڈھیلے پڑ جاتے اور میں دوبارہ سو جاتا۔

میں زرتاج کی واپسی کا منتظر تھا۔ میں اب یہاں سے رخصت ہونا چاہتا تھا۔ میرے پاس اب کچھ رقم بھی موجود تھی۔ میں ستا بھی چکا تھا۔ ایک آدھ کار آمد قسم کا ہتھیار بھی یہاں سے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ میرے یہاں سے جانے کا ارادہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ زرتاج کو دیکھ کر میرے سینے میں کوئی خلش سی سر ابھارنے لگتی تھی۔ معلوم نہیں یہ کس محرومی کی خلش تھی۔ میں اس سلسلے میں اپنے تحت الشعور یا لاشعور کو کُریدنا نہیں چاہتا تھا۔ ذہن کی بھول بھلیاں عجیب ہوتی ہیں۔ آپ یونہی اِدھر اُدھر اندھیرے میں ٹاک ٹوئیاں مارنے بیٹھیں تو نہ جانے کیا کیا نکلتا چلا جائے۔

میں یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ یہ بے عنوان سی خلش کچھ اور زور پکڑے' کچھ اور گہری ہو۔ یا محض خلش نہ رہے' کچھ اور بن جائے۔ ان سب تغیرات سے بہت پہلے میں یہاں سے رخصت ہو جانا چاہتا تھا۔ مجھے راحیلہ اور اپنے دوسرے ساتھیوں کی بھی یاد ستا رہی تھی۔ وہ لوگ نہ جانے کس حال میں تھے۔ معلوم نہیں میرے غائب ہونے کے بعد ریڈ ڈاٹ نے ان کا پیچھا چھوڑ دیا تھا یا نہیں؟

سب باتیں صحیح طور پر تو لاہور جا کر ہی معلوم ہو سکتی تھیں لیکن میں فی الحال سیدھا لاہور جانا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سوچا تھا کہ پہلے کراچی جا کر فون اور دیگر ذرائع سے لاہور کی صورت حال جاننے کی کوشش کروں گا۔ کراچی میں صرف شفیع شاہ اور دو تین دوسرے ساتھی میرے تمام غیر کاروباری معاملات سے واقف تھے اور وہ سب اس وقت تک لاہور ہی میں تھے جب میں لاہور سے فرار ہوا تھا۔ میں نے ہی سب ساتھیوں کو وہاں جمع کیا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کراچی میں ان افراد کی عدم موجودگی میں اور کسی کو بھی علم نہیں ہوگا کہ میں یا میرے قریبی ساتھی کن حالات سے دوچار تھے۔

فی الحال مسئلہ یہ تھا کہ میں زرتاج کو مطلع کیے بغیر یہاں سے رخصت ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے محض ایک نظر مجھ پر ڈال کر جس خلوص سے مجھ پر بھروسا کیا تھا' جس طرح آنکھیں بند کر کے مجھے یہاں پناہ دی تھی' جس طرح میرا ہر مسئلہ چٹکی بجاتے میں حل کیا تھا' جس طرح پورا ہارس فارم میرے سپرد کر کے یہاں سے چلی گئی تھی' اس کے بعد اسے اطلاع تک دیے بغیر منہ چھپا کر یہاں سے رخصت ہو جانے پر میرا دل آمادہ نہیں تھا۔ اس طرح بہت سی ناکردہ خطائیں بھی میرے کھاتے میں پڑ سکتی تھیں۔

زرتاج پورے دس دن بعد واپس آئی۔ اس کی واپسی کی بھی میں نے صرف خبر ہی سنی' اسے واپس آتے نہیں دیکھا۔ وہ رات میں کسی وقت آئی تھی۔ دوسرے دن سے حویلی میں لوگوں کی آمد و رفت بے پناہ بڑھ گئی۔ لوگ بڑے پُرجوش انداز میں اندر جاتے اور مستعدی سے واپس آتے دکھائی دیتے۔

اتنے دنوں میں زرتاج کی عدم موجودگی میں جو کچھ ہوا تھا' شاید اس کی رپورٹیں دی جا رہی تھیں اور جو کچھ نہیں ہو سکا تھا' اس کے لیے احکامات لیے جا رہے تھے۔ غرضیکہ بڑی سرگرمی نظر آرہی تھی لیکن مجھ سے کسی نے کچھ نہیں کہا تھا۔ زرتاج کا کوئی پیغام مجھے نہیں ملا تھا اور نہ ہی اس نے مجھے طلب کیا تھا۔

البتہ اس دوران رب نواز کچھ رقم مجھے دے گیا تھا۔ اس نے صرف اتنا کہا تھا "تمہیں ضرورت ہوگی.... رکھ لو" یہ کہہ کر وہ عجلت میں رخصت ہو گیا تھا۔ اس نے یہ بھی وضاحت نہیں کی تھی کہ یہ میری تنخواہ تھی یا کچھ اور۔ اگر تنخواہ تھی تو کس حساب سے کیونکہ ابھی تو مجھے وہاں ایک مہینہ بھی نہیں ہوا تھا جبکہ رقم خاصی تھی۔ کم از کم گھوڑے سدھانے والے کو چند دن کی اتنی تنخواہ تو نہیں دی جا سکتی تھی۔

زرتاج کو واپس آئے جب پورے چار دن گزر گئے اور میں نے اس کی جھلک تک نہیں دیکھی' نہ ہی اس دوران اس کا کوئی پیغام ملا تو میں نے اپنے آپ کو خود اپنی ہی نظر میں خاصا بے وقعت محسوس کیا۔ میرے خیال میں ابھی اس کی نظر میں میری اتنی وقعت نہیں تھی جتنی میں سمجھنے لگا تھا۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو تسلی دی کہ میرے حق میں یہ اچھا ہی تھا۔

پانچویں دن جب سورج ڈھل رہا تھا اور میں میدان میں بیک وقت دو گھوڑوں کو سدھا رہا تھا تو ایک شخص حویلی کی طرف سے آتا دکھائی دیا۔ گویا ابھی اندھیرا گہرا نہیں ہوا تھا لیکن میرے اندر شام اُتر آئی تھی۔ ایک اداس شام.... نہ جانے کیوں اچانک ہی میں

اپنے آپ کو بے حد تنہا' بے حد افسردہ محسوس کرنے لگا تھا۔

وہ شخص قریب آکر بولا "خان صاحب! آپ کو رئیسانی جی نے یاد کیا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے میرے اندر پھیلے ہوئے سناٹے میں نقرئی سی گھنٹیاں بجیں۔ پھر میں نے اپنا جائزہ لیا تو یہ گھنٹیاں خاموش ہو گئیں۔ میرے پاؤں مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے' جسم پسینے میں تر تھا اس لیے کپڑے کہیں کہیں جسم سے چپکے ہوئے تھے اور اگر میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ سکتا تو یقیناً اس پر گرد کی تہ کے ساتھ مشقت کی درماندگی ہی نظر آتی۔ بال بھی یقیناً بکھرے ہوئے ہی تھے۔

عجیب اتفاق تھا کہ مجھے ابھی تک زرتاج کے سامنے جانے کا جتنی مرتبہ بھی موقع ملا تھا' ایسے ہی حال میں ملا تھا۔ یہ کچھ بے ہودہ سا ہی اتفاق تھا۔ پھر میں نے اس تاسف کو خود ہی ذہن سے جھٹک دیا۔ بھلا مجھے کسی بہتر حال میں اس کے سامنے جانے کی ضرورت بھی کیا تھی؟

میں اس شخص کی رہنمائی میں حویلی میں پہنچا۔ اس بار زرتاج مجھے نچلی منزل پر ہی ملی۔ اصل نشست گاہ نچلی منزل پر ہی تھی۔ یہ پرانی طرز پر آراستہ وپیراستہ ایک طویل وعریض کمرا تھا۔ رومن تاریخ کے پس منظر میں بننے والی انگریزی فلموں میں اس قسم کی آرائش نظر آتی تھی۔

نوکر مجھے دروازے تک چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ میں اپنے لتھڑے ہوئے پیروں کا خیال ذہن سے جھٹک نہ سکا اور چوکھٹ کے قریب پڑے ہوئے چھوٹے سے غالیچے پر ہی رک گیا۔ کمرے میں اتنا خوب صورت اور صاف ستھرا قالین بچھا ہوا تھا کہ اس پر گندے پاؤں رکھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔

زرتاج شاید میری ہچکچاہٹ کی وجہ سمجھ گئی تھی۔ کمرے کے دوسرے سرے سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہی آواز جسے سن کر سماعت میں پھول سے کھل جاتے تھے۔

"بلا جھجک چلے آؤ" وہ کہہ رہی تھی "میرے قالین میری زمین کی مٹی سے زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ یہاں میرے قریب آجاؤ۔ مجھے تم سے بہت ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

تب میں آگے چلا گیا اور اس صوفے کے قریب پہنچ گیا جو اس کے دائیں ہاتھ پر رکھا تھا۔ اب میں نے سر اٹھا کر صحیح طور پر اس کی طرف دیکھا۔ میں اندیشہ محسوس کرنے لگا تھا کہ ہر وہ لمحہ میرے ذہن میں مقیّد ہو جائے گا جب بھی میں اس کی طرف دیکھوں گا۔ میں اپنے ذہن کے کشکول میں ایسی یادوں کے موتی جمع کرنا نہیں چاہتا تھا۔

وہ کھدر کے مردانہ شلوار قمیص میں تھی۔ لمبے ریشمی بالوں کو قابو میں رکھنے کے لیے ان کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ پیروں میں کینوس کے جوتے تھے۔ پندرہ دن جنگل میں رہنے سے اس کی رنگت کی چاندنی میں جو ہلکا سا سانولا پن آیا تھا اس کے اثرات ابھی باقی تھے اور اس خفیف سی تبدیلی نے اسے مزید دلکش بنا دیا تھا۔

وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو ہر روپ میں دلکش لگتی ہیں' جن پر ہر چیز سجتی ہے۔ وہ نوجوان یا نوخیز نہیں تھی لیکن جب خاموش بیٹھی ہوتی تھی تو اس کی آنکھوں میں بچپن کی معصومیت ہلکورے لیتی نظر آتی تھی لیکن جونہی وہ بولنے کے لیے ہونٹ ہلاتی تھی' وہ معصومیت کہیں پس منظر میں چلی جاتی تھی اور وہ نمایاں سمجھدار' نہایت سنجیدہ نظر آنے لگتی تھی۔

"بیٹھ جاؤ افضل خان!" اس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ میں بیٹھ چکا تو اس نے خلیق میزبانوں کی طرح پوچھا "کیا کچھ پیو گے؟"

"میں تو صحرا کا اونٹ ہوں' جو ملے کھا پی لیتا ہوں اور نہ ملے تو کئی کئی دن کھائے پیے بغیر نکال لیتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے رسیلے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ درحقیقت ہنسی تھی جس کا اس نے نہ جانے کیوں گلا گھونٹ دیا مگر اس کی چمک ایک لمحے کے لیے آنکھوں میں باقی رہ گئی تھی۔

وہ خوش دلی سے بولی "اب یہاں ایسی بھی کوئی آفت نہیں آ ہوئی ہے کہ کئی کئی دن کھائے پیے بغیر گزارنے پڑیں اور نہ ہی صحرا میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ بلا تکلف بتاؤ۔"

میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا "پینے کے لیے کوئی ٹھنڈی سی چیز منگوا دیجیے۔ گلا خشک ہو رہا ہے۔"

میں اسے بتا نہیں سکا کہ یہ صرف مشقت اور دھوپ کی تمازت کا اثر نہیں تھا کہ گلا خشک ہو رہا تھا بلکہ یہ اس کی قربت کی حرارت کا بھی نتیجہ تھا۔

"تمہیں اور تو کچھ پینے پلانے کا شوق نہیں ہے؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"اور کچھ...؟ کیا مطلب؟" میں بالکل انجان بن گیا۔

"یہی کوئی بیئر... وسکی... وائن وغیرہ....." اس نے پلک جھپکائے بغیر پوچھا۔

"یہ تو شاید آپ شرابوں کے نام لے رہی ہیں..." میں نے آنکھیں ذرا پھیلاتے ہوئے کہا "توبہ کریں جی... میں تو سیدھا سادا' ان پڑھ سا... غریب سا... پینڈو آدمی ہوں۔ اس قسم کے مہنگے اور بے کار شوق پالنے کے بارے میں' میں نے کبھی نہیں سوچا۔"

"اچھا... واقعی؟" وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی۔ نہ جانے کیا تلاش کر رہی تھی۔ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ برقرار تھی۔

"جی ہاں" میں نے مسکینی سے سرہلایا۔ اس نے ایک طویل سانس لی' آواز دے کر ملازمہ کو بلایا اور کولڈ ڈرنکس وغیرہ منگوائیں۔

ٹھنڈے کا دور چل چکا تو وہ گویا کسی غیر اہم سے واقعے کا تذکرہ چھیڑتے ہوئے سرسری سے لہجے میں بولی "تمہیں معلوم ہی ہوگا... بینک پر ڈاکا ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی؟"

"جی ہاں۔ پتا چلا تھا۔ لیکن ڈاکو بہت نقصان میں رہے" میں نے کہا۔

"میں بہت خوش قسمت ہوں" وہ مسرور انداز میں دھیرے سے ہنسی۔ "میرے علاقے میں کبھی کبھار ہی کسی بڑی واردات کی کوشش ہوتی ہے اور اس کا انجام کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ کوئی نہ کوئی اتفاق ایسا ہو جاتا ہے کہ واردات خود مجرموں پر الٹ جاتی ہے یا مجھے کسی ایسے ذریعے سے کوئی مدد میسّر آجاتی ہے جس کے بارے میں' میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ بہرحال میں نقصان سے بچ جاتی ہوں۔"

"شاید یہ آپ کی نیک نیّتی کا ثمر ہے" میں نے کہا۔

"شاید..." اس نے مبہم سے لہجے میں کہا۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے' ہاتھ گود میں رکھ کر وہ پُرخیال سے انداز میں ایک لمحے انہیں دیکھتی رہی پھر سر اٹھائے بغیر بولی "میں نے اُڑتی اُڑتی سی خبر سُنی ہے کہ ڈاکوؤں کی طرح وہ بھی کوئی ڈھاٹا پوش ہی تھا جس نے ڈاکوؤں کو گولیاں ماریں اور چھلاوے کی طرح غائب ہو گیا۔ صرف ایک بُڑھیا نے اس کی جھلک دیکھی تھی..." اس نے سر اٹھا کر ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکا لیکن مزید کچھ نہیں بولی۔

"چلیں... وہ جو کوئی بھی تھا' ہمارے حق میں تو اچھا ہی کر گیا" میں نے گویا اس پہلو کو غیر اہم سمجھتے ہوئے کہا۔

"کسی تعلق' کسی خاص جذبے یا کسی ذاتی غرض کے بغیر کون ایسا قدم اٹھا سکتا ہے؟ اس کے علاوہ اس کام کے لیے بڑے حوصلے کی بھی ضرورت تھی۔ یہ کسی عام آدمی کا کام نہیں ہو سکتا" وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی۔ میں نے پلک نہیں جھپکائی۔

چند لمحے بعد اس نے خود ہی نظر چُرالی اور ذرا بدلے ہوئے لہجے میں بولی "بینک کی یہ برانچ زیادہ تر میرے کیش پر ہی چل رہی ہے لیکن اس کے لٹنے سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ نقصان کا ذمے دار تو بینک ہی ہوتا لیکن ظاہر ہے' اس قسم کے واقعات کے اثرات اچھے نہیں ہوتے۔ ایک بار کوئی بھی واردات ہو جائے تو مجرموں کے حوصلے بڑھ جاتے ہیں۔ ایک کے بعد ایک چیز کی باری آتی چلی جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ نوبت یہاں تک بھی پہنچ سکتی ہے کہ گلی گلی' گھر گھر ڈاکے پڑنے لگیں۔ میں اسی بات کی قائل ہوں کہ واردات کو کامیاب ہونے سے روکا جائے۔ بعد میں بیٹھ کر لکیر پیٹنے کا کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہوتا۔ اس قسم کی وارداتوں سے لوگوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوتا ہے... اور یہ میں کسی قیمت پر نہیں چاہتی۔ اس لیے میں اس نامعلوم شخص کی بہت ممنون ہوں۔"

میں نے اپنے دل میں خوشی کی ایک دھیمی سی لہر ابھرتے محسوس کی۔ اچانک وہ ذرا بلند آواز میں بولی "میں دونوں ہی فریقوں کے بارے میں اُلجھن میں ہوں۔ اس شخص کے بارے میں تو خوشگوار حیرت اپنی جگہ ہے جس نے ڈاکوؤں کو مارا لیکن میں ڈاکوؤں کے بارے میں بھی پریشان ہوں کہ وہ کس گروہ کے تھے؟ کس علاقے کے تھے؟ اس قسم کی کوشش میرے لیے اور میرے اس گوشۂ عافیت کے لیے کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ تمہیں کچھ اندازہ ہے کہ ڈاکوؤں کا تعلق کس گروہ سے ہو سکتا ہے؟"

"میں... میں کیا کہہ سکتا ہوں..." میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "میں تو ابھی علاقے کے شرفا کو اچھی طرح نہیں جانتا' ڈاکوؤں کے گروہوں کے بارے میں مجھے کیا معلومات ہو سکتی ہیں؟"

درحقیقت میں یہ کہتے کہتے رہ گیا تھا کہ جانو کے علاوہ بھلا وہ کس کے آدمی ہو سکتے تھے لیکن فوراً ہی میں نے فیصلہ کیا تھا کہ ابھی ان معاملات میں میرا اظہار خیال مناسب نہیں تھا۔ پہلے مجھے وہ سب کچھ سُن لینا چاہیے تھا جو زرتاج کہنا چاہتی تھی۔

وہ ایک بار پھر میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے روشن انداز میں مسکرائی اور شگفتہ لہجے میں بولی "کچھ زیادہ ہی محتاط بن رہے ہو۔ بالکل ڈپلومیٹ معلوم ہو رہے ہو۔"

میں نے ایک بار پھر مسکراہٹ کی آڑ میں پناہ لی "میں تو ایک معمولی سا آدمی... ایک غیر اہم سا کارندہ ہوں رئیسانی جی! میں اس قسم کے معاملات میں کیا رائے ظاہر کر سکتا ہوں؟"

اس بار وہ کھل کر ہنسی۔ میں نے پہلی بار اسے قہقہہ لگاتے سُنا۔ کمرا گویا عجیب برقی سی لہروں سے بھر گیا۔ یہ کسی بے عنوان مُسرت کی لہریں تھیں۔ مُسرت کی شعاعوں کی طرح میرے وجود میں بھی جذب ہونے لگیں۔

"ہاں..." وہ سرہلاتے ہوئے بولی "مجھے کچھ کچھ اندازہ ہوتا جا رہا ہے کہ تم کتنے معمولی اور کتنے غیر اہم آدمی ہو... اور ہاں... اگر تم دوسروں کی طرح مجھے رئیسانی جی نہ کہا کرو تو مجھے خوشی ہوگی۔ تم مجھے صرف زرتاج کہہ سکتے ہو۔"

"لیکن یہ اچھا معلوم نہیں ہوگا" میں نے کہا۔

"اگر یہ مجھے اچھا معلوم ہوگا تو پھر یہاں اور کون ایسا موجود ہے جسے بُرا محسوس ہوگا؟" اس نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہ آزاد اور خود مختار تھی' کون اس کے معاملات میں دخل دے سکتا تھا؟

اچانک وہ اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہوئے بولی "کیا یہ بات کچھ عجیب نہیں کہ ڈکیتی کی اس ناکام کوشش کے دوسرے ہی دن جانو اپنے چار آدمیوں کے ساتھ بہت غصے میں یہاں آیا تھا لیکن میں یہاں موجود نہیں تھی۔ وہ رب نواز سے کوئی خاص بات کیے بغیر محض دو چار پھنکاریں مار کر چلا گیا۔ کل رات وہ اپنے چھ

ساتھیوں کے ہمراہ ایک بار پھر آیا......"

میں چونکا۔ مجھے اس کی آمد کا علم نہیں ہوسکا تھا۔ میں نے اضطراری انداز میں اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا "آپ سے ملاقات ہوئی؟"

"ظاہر ہے" وہ بولی "اور یہ ملاقات مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ معلوم ہوتی ہے۔ میں نے جانو کو کبھی اتنے غصے میں نہیں دیکھا۔ اس بار تو وہ جیسے کچھ کرنے کا ارادہ لے کر آئے تھے لیکن شاید کسی مصلحت کے تحت واپس چلے گئے۔ وہ جیپوں میں آئے تھے۔ بہت سی کلاشنکوفیں ان کے پاس تھیں۔ جیپوں میں شاید گرنیڈ وغیرہ بھی موجود تھے.... اور یہ صرف نمونہ تھا۔ وہ مجھے صرف ٹریلر دکھانے اور بتانے آئے تھے کہ اصل فلم کسی وقت بھی چل سکتی ہے۔"

"تو کیا اس نے تسلیم کرلیا کہ بینک پر ڈاکا ڈالنے والے اسی کے آدمی تھے؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"نہیں۔ اس نے سوچا ہوگا کہ اب اس بات کے اعتراف کی کیا ضرورت ہے۔ اس کے غیظ و غضب کی ایک اور وجہ بھی تھی۔" اس نے پُرخیال انداز میں ہاتھ مسلے۔ اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر بیک وقت گداز کا بھی احساس ہوتا تھا اور مضبوطی کا بھی۔

"کیسی وجہ؟" میں نے اپنے اضطراب کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"اس کا ایک نہایت قریبی ساتھی تھا نا.... خمیسو خان... اسے تم جانو کا دایاں ہاتھ کہہ لو.... نائب کہہ لو.... نمبر ٹو کہہ لو۔ تم نے اسے دیکھا ہی تھا۔ پچھلی مرتبہ تمہاری موجودگی میں جب جانو مجھ سے ملنے آیا تھا تو تم چھپ کر انہیں دیکھ ہی رہے تھے۔ وہ جو شکل سے ہی انتہائی خبیث اور خطرناک لگ رہا تھا.... وہ خمیسو خان تھا..."

"ہاں۔ مجھے یاد ہے" میں نے سرہلایا۔ مجھے اُلجھن ہورہی تھی کہ وہ بہت رُک رُک کر، ٹھہر ٹھہر کر بات کررہی تھی لیکن میں اپنی بے چینی اور اضطراب کو چھپائے ہوئے تھا۔

"جانو بتارہا تھا کہ خمیسو خان خاصی بڑی رقم سمیت پُراسرار انداز میں غائب ہوگیا ہے" زرتاج گہری سانس لے کر بولی "آخری بار اسے غیر واضح سے حُلیے والے ایک شخص کے ساتھ دیکھا گیا تھا۔ ایسا حُلیہ جو نہ جانے کتنے لوگوں پر فٹ آسکتا ہے۔ کچھ دنوں کی بڑھی ہوئی داڑھی مونچھیں.... سر پر اجرک کی پگڑی.... آنکھوں پر سیاہ چشمہ.... یہ حُلیہ تو کسی بھی شخص کا ہوسکتا ہے۔ دو ایک نشانیاں ہیں جنہیں کسی حد تک امتیازی سمجھا جاسکتا ہے لیکن ان سے بھی کوئی خاص مدد نہیں مل سکتی۔ ایک تو یہ کہ اس شخص کی رنگت سرخ و سپید تھی، دوسرے اس کا قد کاٹھ غیر معمولی تھا..."

اس نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر گہری نظر سے میرا جائزہ لیا۔ میں کسی مجرم کی طرح ساکت بیٹھا رہا۔ اگر میں اس وقت زرتاج کی توجہ اپنی طرف سے ہٹانے کی کوشش کرتا تو شاید اپنے آپ کو اور بھی زیادہ مشکوک بنالیتا۔

وہ گویا کسی خیال کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے مسکرائی اور بے پروائی سے بولی "ان دو نشانیوں کی بنیاد پر بھی کسی پر انگلی نہیں رکھی جاسکتی.... اور میرے خیال میں یہ بھی ایک اچھی ہی بات ہے۔ بہرحال جانو نے جو "تفتیش" کی ہے اس کی بنیاد پر اس کا دعوا ہے کہ اس حُلیے کا کوئی آدمی زمینوں پر.... فارم پر یا کسی اور جگہ.... یہیں کہیں، آس پاس ہی موجود ہے اور مجھے اس کے بارے میں معلوم ہے لیکن میں چھپارہی ہوں۔ بلکہ میں نے ہی اس شخص کو پناہ دے رکھی ہے۔"

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟"

"ظاہر ہے میں نے اس سے انکار کیا۔ حقیقت یہی ہے کہ میں ایسے کسی شخص سے واقف نہیں ہوں جس نے خمیسو کو غائب کردیا ہے لیکن وہ بدستور آگ بگولا رہا۔ اس دوران میں نے بڑے تحمل سے بات کرتے ہوئے اسے کُریدنے کی کوشش کی کہ بینک پر ڈاکا ڈالنے کے لیے آنے والے اور جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والے ڈاکو کون ہوسکتے ہیں؟ اس سلسلے میں وہ کوئی جواب دینے کے بجائے مزید برہم ہوگیا جیسے میں نے اس کا کوئی زخم چھیڑ دیا ہو۔ اس نے بڑی لمبی چوڑی باتیں کیں۔ میں انہیں دُہرا نہیں سکتی۔"

"شاید آپ مجھے بتانا مناسب نہیں سمجھتیں؟" میں نے آہستگی سے کہا۔

"یہ بات نہیں ہے۔ اگر میں تم سے بات کرنا ٹھیک نہ سمجھتی تو ان میں سے کوئی بھی بات نہ کرتی جو میں نے اب تک کی ہیں۔ اس طرح تمہیں اپنے پاس بلا کر ہی نہ بٹھاتی۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں سب سے آخر میں اطمینان سے بلایا ہے کہ مجھے تم سے ساری ہی ضروری باتیں کرنا تھیں" وہ تیزی سے بولی "جانو کی باتوں کی تفصیل میں اس لیے نہیں دُہرارہی کہ وہ محض ایک جاہل آدمی کی خرافات کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ مختصراً تمہیں بتادیتی ہوں۔ میرے بارے میں عزائم تو ایک عرصے سے اس کے دل میں پل رہے ہیں، یہ تو تمہیں معلوم ہو ہی چکا ہے۔ اب اس آتش فشاں کو پھٹ پڑنے کے بہانے میسّر آرہے ہیں۔ جلد یا بدیر ایک نہ ایک دن بہرحال یہی کچھ ہونا تھا۔ اس نے ایک بار پھر مجھے مشورہ دیا کہ مجھے اپنی اوقات میں رہنا چاہیے، اس سے بناکر رکھنی چاہیے، اپنی جوانی کو یوں فضولیات میں نہیں گنوانا چاہیے۔ وغیرہ وغیرہ..."

اس نے اپنی قمیص کا دامن اپنے گھٹنوں پر پھیلایا اور نظر جھکاتے ہوئے استہزائیہ سے انداز میں بولی "ایک تو اس بے چارے کو میری جوانی کی بہت فکر لاحق رہتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دنیا میں وہی ایک خوبرو، جواں مرد اور طاقتور انسان ہے جس کی نوازشات کی بدولت میری جوانی گل و گلزار ہوسکتی ہے.... گدھا کہیں کا!"

مجھے زرتاج کا جواب سن کر خوشی بھی ہوئی لیکن جانو کی باتوں کا تصور کرکے میری کنپٹیاں تپنے لگیں تاہم میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان ہموار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "کیا دھمکیاں دے رہا تھا وہ؟"

"یہی کہ وہ جب چاہے زرتاج نگر کو خاکستر کرسکتا ہے، حویلی کو زمیں بوس کرسکتا ہے اور مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے جاسکتا ہے۔ یہ اس کی مہربانی ہے کہ میرا یہ مختصر سا علاقہ گوشۂ عافیت بنا ہوا ہے ورنہ یہاں بھی بہت سے دوسرے علاقوں کی طرح یہی عالم ہوتا کہ لوگ اپنے گھربار اور مویشی تک چھوڑ کر ہجرت کرجاتے۔ اسی قسم کی نہ جانے کتنی باتیں جو وہ اس سے پہلے ذرا نرم لہجے میں، ذرا ملائم الفاظ میں کرتا آرہا تھا، اس بار اس نے سخت اور صاف لہجے میں کیں۔ اس نے اب کرخت اور دوٹوک الفاظ میں اپنے عزائم کا اظہار کردیا ہے۔"

"کیا آپ کے خیال میں وہ اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کی طاقت رکھتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے ایک لمحے سوچا پھر اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولی "ہاں۔ کافی حد تک۔"

"آپ اس کی حقیقت جانتے ہوئے بھی اس کے خلاف پولیس کی مدد حاصل نہیں کرسکتیں؟" اس سوال کی گہرائی میں میری حیرت بھی پنہاں تھی۔

"ان علاقوں کی پولیس تو ان کے سامنے جانے کے تصور سے بھی تھر تھر کانپتی ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"علاقے کے دوسرے زمینداروں کے ساتھ مل کر جانو کا کچھ بندوبست نہیں کیا جاسکتا؟" میں نے اپنی کنپٹیوں میں تپش محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"بہت سے بڑے زمیندار خود بڑے بڑے ڈاکوؤں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ اپنی دانست میں وہ اپنی طاقت اور دولت بڑھا رہے ہیں لیکن انہیں معلوم نہیں کہ وہ اپنی آنے والی نسلوں کے لیے ایک جہنم تیار کررہے ہیں جس میں خود ان کے اپنے بچے بھی ایک نہ ایک دن جلیں گے۔ بڑے زمیندار اور بڑے ڈاکو، دونوں طبقے ایک دوسرے کی ملی بھگت سے بڑے بڑے دھندے کرتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دیتے ہیں..."

اس کے چاند چہرے کو کرب نے گہنا دیا۔ افسردہ سے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولی "ڈاکو آئے دن جن شریف اور دولت مند شہریوں یا دیہاتیوں کو اغوا کرکے جو بڑی بڑی رقمیں تاوان کے طور پر وصول کرتے ہیں، ان زمینداروں سمیت ان میں نہ جانے کتنے طبقوں کا حصہ ہوتا ہے۔ اسلحے اور منشیات کی تجارت ہے... اور نہ جانے کیا کچھ ہے۔ شہروں میں رہنے والے اپنے رونے روتے رہتے ہیں۔ انہیں کچھ اندازہ نہیں کہ ان علاقوں میں لاقانونیت کا کیسا بازار گرم ہے۔ حالات کے تیور دیکھ کر مجھے لگتا ہے، اگر ان چیزوں کی طرف سنجیدگی اور خلوص سے توجہ نہ دی گئی اور سب اپنی اپنی ہی لوٹ مار میں لگے رہے تو ایک عجیب سا غدر برپا ہوجائے گا۔ جنگلوں میں آگ پھیلے گی تو شہر کی بلند و بالا عمارتوں تک بھی جائے گی مگر مجھے لگتا ہے کہ کسی کو ہم جیسوں کی بات سُننے کی فرصت نہیں ہے۔"

"شہر ہوں یا دیہات.... بات تو ایک ہی ملک کی ہے۔ ہم سب ایک ان دیکھی سی ڈور میں بندھے ہیں۔ ایک ہی زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ کوئی بھی کڑی کمزور ہوگی، نقصان باقی کڑیوں کو بھی پہنچے گا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا، یہ باتیں ہم کس کو جاکر سمجھائیں۔ نہ عوام سُننے کو تیار ہیں اور نہ ہی خواص۔ سب اپنے اپنے گلے شکووں، لڑائی جھگڑوں، چھینا جھپٹی اور کھینچا تانی میں لگے ہوئے ہیں۔ معقولیت کی بات پر تو کوئی کان ہی نہیں دھرتا" وہ مایوسی سے بولی "تمہیں شاید یقین نہ آئے ڈاکوؤں اور مختلف قسم کے گروہ بازوں کے حوصلے یہاں تک بڑھ چکے ہیں اور وہ اتنے منظم ہوچکے ہیں کہ اغوا کے سلسلے میں تاوان بینک ڈرافٹ تک کی صورت میں وصول کیے جانے لگے ہیں۔ دھاندلی اور لاقانونیت نہ جانے کہاں تک جائے گی۔ ڈاکو، زمینداروں کے ساتھ مل کر اپنی دولت کو "وہائٹ" کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہ دولت مختلف جائز کاروباروں میں انویسٹ کی جارہی ہے۔ شہروں اور قصبوں میں جائیدادیں بن رہی ہیں، عمارتیں تعمیر ہورہی ہیں، پیٹرول پمپ کُھل رہے ہیں، پلازا بن رہے ہیں۔"

"چلیں.... ترقی تو ہورہی ہے" میں نے مسکراتے ہوئے اس کے تفکرات کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کی۔

"یہ وہ ترقی ہے جو رفتہ رفتہ ہمارے معاشرے اور اس کی تمام اچھی قدروں کو کھا جائے گی۔" وہ بدستور افسردگی سے بولی "لوٹ مار، افراتفری، پیسے کے لیے ایک دوسرے کی گردن کاٹنا ہمارا کلچر بن جائے گا۔"

"یعنی آپ کے خیال میں صورت حال بہت مایوس کُن ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ کسی کے تصور سے بھی زیادہ۔ لیکن عوام اور خواص سب نے اس طرف سے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ کوئی اپنی روش ترک کرنے پر آمادہ نہیں" وہ بولی "لیکن کیا تم بھی مایوس ہو؟"

"میں مایوس نہیں ہوں۔ میرے سینے میں کوئی آگ بھڑک رہی ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے لگتا ہے کہ اضطراب کی یہ آگ مجھے جلا کر راکھ کردے گی" میں نے کہا۔

"مایوسی کی موت مرنے سے تو بہتر یہی ہے کہ انسان اپنے ہی اضطراب کی آگ میں پروانے کی طرح جل مرے۔ یہ موت خواہ آج بے مقصد نظر آئے لیکن آنے والے کسی دور میں ضرور اس کے اثرات مُرتب ہوں گے" وہ یقین سے بولی۔

"کیا حالات اتنے ہی خراب ہیں جو آپ اتنی مایوسی کی باتیں کررہی ہیں؟" میں نے جاننا چاہا۔

"میں فضا میں طوفان کی بُو سونگھ رہی ہوں۔ کسی وقت کچھ بھی ہوسکتا ہے" اس نے گویا مجھے جھوٹی امید دلانا بہتر نہ سمجھا "جانو سے اپنی گفتگو کا کلا ئمکس تو میں نے تمہیں سنایا ہی نہیں۔ اس نے فوری طور پر مجھ سے پچاس لاکھ روپے کا مطالبہ کیا تھا۔"

"وہ کس لیے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ لوگ اب اس منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ ان کے لیے کسی بھی مطالبے کی کوئی وجہ بتانا ضروری نہیں رہا" اس نے وال کلاک کی طرف دیکھا اور بولی "جانو نے مجھے جو مہلت دی تھی اسے بھی ختم ہوئے بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں۔ مجھے پچاس لاکھ روپیہ اس کے ایک ٹھکانے پر پہنچانا تھا لیکن میں نے نہیں پہنچایا۔"

وہ گہری سانس لے کر اٹھی اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ پردہ ذرا سا سرکا کر وہ باہر دیکھنے لگی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ دھیمے لہجے میں بولی "یہ بھی گویا ایک طرح کا تاوان تھا۔ کچھ ایسے نقصانات کا معاوضہ جن کا ذمے دار وہ مجھے سمجھ رہا تھا لیکن زبان سے ان کا ذکر بھی نہیں کررہا تھا۔ بات رقم کی نہیں ہے، میں چاہوں تو پچاس لاکھ اسے دے بھی سکتی ہوں...... اور ایک بار میں نے ایسا سوچا بھی تھا لیکن پھر میں نے فوراً ہی اپنے اس خیال کو رد کردیا۔ اسے ایک بار رقم دے دینا مسئلے کا حل نہیں تھا۔ یہ تو ایک طرح سے صرف پہلی قسط ہوتی۔ اس کے بعد تو مطالبے پر مطالبہ چلا آتا۔ حرام خوردں میں ایک یہ بھی بڑی منحوس عادت ہوتی ہے کہ کوئی ایک بار ان کا مطالبہ پورا کردے تو وہ اسے سونے کا انڈا دینے والی مرغی سمجھ لیتے ہیں اور کبھی کبھار تو مرغی کو ہی ذبح کرنے پر تل جاتے ہیں..... اور پھر یہ تو صرف رقم کا مطالبہ تھا، یہ پورا ہوجاتا تو شاید کل کو مجھے اس کے کسی اور مطالبے کے سامنے بھی جھکنا پڑتا۔ ویسے بھی میں عورت سہی... لیکن میری غیرت یہ قبول نہیں کرتی کہ میں کسی کی خراج گزار بنوں۔"

اس کے لہجے میں بے پناہ مضبوطی تھی۔ اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور اس لمحے وہ مجھے بہت بلند قامت نظر آئی۔ کسی پہاڑ کی چوٹی پر ایستادہ کسی پُرشکوہ اور عظیم الشان مجسمے کی طرح۔

"کیا میں نے غلط کیا؟" اس کی آواز مجھے سرگوشی سے مشابہ محسوس ہوئی۔

"ہرگز نہیں" میں نے بھی اسی جیسے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

یک دم اسے گویا بے پناہ طمانیت حاصل ہوگئی۔ گہری سانس لے کر وہ آسودہ سے لہجے میں بولی "اس وقت مجھے ایک ایسی ہی ٹھوس "نہیں" کی ضرورت تھی۔"

اس کے ہونٹوں پر وہ دلکش مسکراہٹ لوٹ آئی جو دیکھنے والوں کو یقیناً اپنا دیوانہ بنالیتی ہوگی... میں نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا "آپ نے جانو کا مطالبہ پورا نہیں کیا.... بارہ گھنٹے گزر چکے ہیں.... کیا اس کا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا؟"

"ممکن ہے ردِعمل ذرا ٹھہر کر سامنے آئے لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ اس بار جو کچھ بھی ہوگا، بہت شدید ہوگا۔ میں اپنے آپ کو بہت تنہا تنہا سا محسوس کررہی تھی اسی لیے میں نے خاص طور پر تمہیں بُلوایا ہے۔ یہ ایک ایسا احساسِ تنہائی تھا جو شاید دس بیس کلاشنکوف برداروں کو بُلا کر اپنے اردگرد کھڑا لینے سے بھی دور نہ ہوتا۔ کبھی کبھی میں محسوس کرتی ہوں کہ محض کلاشنکوفیں کسی کی حفاظت نہیں کرسکتیں۔"

"آپ کا خیال ٹھیک ہے" میں نے کسی وضاحت کے بغیر کہا "اور آپ نے ایک بے عنوان احساسِ تنہائی کے لمحوں میں مجھے بُلایا.... یہ میرے لیے ایک اعزاز سے کم نہیں۔ آپ ہرگز پریشان نہ ہوں۔ جانو اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے کہ آپ جیسے وسائل اور آپ جیسا بے داغ کردار رکھنے والی لڑکی اس کی طرف سے پریشان ہو۔ اس کا جو بھی ردِعمل ہوگا دیکھا جائے گا۔ میں ایک حقیر سا آدمی ہوں لیکن جس قابل بھی ہوں، اپنی جان کے نذرانے کے ساتھ حاضر ہوں۔"

وہ ایک لمحے کے لیے گویا کھو سی گئی۔ ایک ٹُک میری طرف دیکھتی رہی پھر یک دم گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آتے ہوئے خوش گوار لہجے میں بولی "اب میں تمہیں ایک اور مزے کی بات بتاتی ہوں۔ دو دن پہلے یہاں حاصل آباد کا ایک پولیس انسپکٹر بھی آیا تھا۔ اس کا نام رحیم گل تھا۔"

اس نے خاموش ہوکر گویا میرے ردِعمل کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس وقت مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا لیکن میں نے بہ مشکل اپنے آپ کو کوئی ردِعمل ظاہر کرنے سے باز رکھا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "مجھے یہ بات کچھ عجیب سی لگی کہ رحیم گل کو بھی غیر واضح سے حُلیے والے اس شخص کی تلاش تھی جس کا میں ذکر کرچکی ہوں۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ شخص ایک زبردست ڈاکو ہے.... ایک کنڈکٹر اور کئی مسافروں کے قتل کے علاوہ ایک ہیڈ کانسٹیبل پر قاتلانہ حملے کا مجرم ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل خوش قسمتی سے جان بر ہوگیا ورنہ اس کے ہلاک ہونے میں بھی کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی...."

میں نے یہ سُن کر ذرا غیر محسوس طور پر اطمینان کی سانس لی کہ جس ہیڈ کانسٹیبل پر میں نے اضطراری انداز میں گولی چلائی تھی وہ بچ گیا تھا۔ درحقیقت وہی میرا واحد جرم تھا اور وہ بھی میرے نقطۂ نظر سے جرم نہیں، اپنے دفاع کی ایک کوشش تھی۔ اگر میں نے اضطراری انداز میں گولی نہ چلائی ہوتی تو وہ ہیڈ کانسٹیبل یقیناً مجھے گولی ماردیتا۔ جبکہ میں مجرم نہیں تھا۔ لیکن اخبار میں یہی خبر آتی "خطرناک ڈاکو پولیس مقابلے میں ہلاک...."

زرتاج کہہ رہی تھی "رحیم گل جائے واردات سے ہی اس نوجوان کے تعاقب میں تھا۔ جائے واردات سے میلوں دور رحیم گل کا اس نوجوان سے سامنا ہوا۔ اس وقت وہ ڈاکوؤں والے حُلیے میں ہی تھا۔ اس نے ہیڈ کانسٹیبل کو گولی ماری اور ایک بار پھر بھاگ نکلا۔ رحیم گل نے جوں توں زخمی ہیڈ کانسٹیبل کو ایک اسپتال پہنچایا اور ڈاکو کا سراغ کھودیا لیکن اس نے دوبارہ اندازاً اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کی...."

میں بڑی توجہ سے رحیم گل کی سرگزشت زرتاج کی زبانی سن رہا تھا۔ اس نے بدستور میری طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی "رحیم گل کو امکان نظر آیا کہ شاید اس ڈاکو نے یہاں.... زرتاج نگر میں پناہ حاصل کرلی ہو۔ رحیم گل ادھراُدھر پھرتا رہا اور پھر اس کا اندازہ درست ثابت ہوگیا۔ اسے زرتاج نگر کے نواح میں ویسے ہی غیر واضح سے حُلیے میں وہ ڈاکو دکھائی دیا جیسے حُلیے میں وہ شخص تھا جس کے ساتھ نمیسو خان کو آخری مرتبہ دیکھا گیا تھا لیکن اس مرتبہ رحیم گل کا اس سے سامنا نہایت عجیب حالات میں ہوا۔ رحیم گل کچھ ڈاکوؤں کے غیظ وغضب کا نشانہ بن کر زخمی حالت میں جوہڑ کے کنارے ویرانے میں پڑا تھا اور موت کا منتظر تھا جب وہی ڈاکو وہاں آن پہنچا اور اس بار اس نے رحیم گل کی جان بچائی...."

میں دم بخود بیٹھا تھا۔ زرتاج نے ایک بار پھر گویا نظروں ہی نظروں میں مجھے ٹٹولنے کی کوشش کی۔ میں نے پوری پوری کوشش کی کہ میرے چہرے سے فطری سی دلچسپی کے علاوہ کسی تاثر کا اظہار نہ ہونے پائے۔

زرتاج سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "کافی دیر تک رحیم گل نے اسے نہیں پہچانا لیکن جب وہ رخصت ہونے لگا تب اس نے پہچان لیا لیکن ظاہر ہے اس وقت رحیم گل اس حالت میں نہیں تھا کہ اسے گرفتار کرسکتا۔ گرفتار کرنا تو دور کی بات ہے، وہ اس سے کچھ پوچھ بھی نہیں سکا۔ وہاں سے اس کے لیے حیرت کا بھی ایک نیا باب کھل گیا۔ اس سے یہ معما حل نہیں ہورہا تھا کہ ایک بار سامنا ہوا تو اس ڈاکو نے اس کے ساتھی ہیڈ کانسٹیبل پر گولی چلادی اور دوسری بار سامنا ہوا تو اس نے نہایت بے بسی کے عالم میں پڑے ہوئے انسپکٹر کو موت کے منہ سے نکالا...."

اب میں اسے کیا بتاتا کہ اس میں مُعمے والی کوئی بات نہیں تھی۔ پہلی بار اس "ڈاکو" کو اس لیے گولی چلانا پڑی تھی کہ اسے اپنی جان بچانی تھی اور دوسری بار اس نے اس لیے رحیم گل کی جان بچائی تھی کہ رحیم گل اس کی جان لینے یا اسے گرفتار کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا اور اس نے اس لیے بھی رحیم گل کی مدد کی تھی کہ وہ درحقیقت ڈاکو نہیں تھا، اس کی رحیم گل سے کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ وہ تو رحیم گل کے مثالی کردار کے بارے میں سُن سُن کر غائبانہ طور پر اس کا قدردان بن چکا تھا مگر فی الحال میں یہ باتیں نہ تو زرتاج کو بتا سکتا تھا اور نہ ہی رحیم گل کو۔ میں دم بخود بیٹھا تھا۔ میرے لیے یہ انکشاف بڑی حیرت کا باعث تھا کہ رحیم گل نے بالآخر اس وقت مجھے پہچان لیا تھا جب میں نے اسے بیل گاڑی میں لٹایا تھا۔

زرتاج بولی "لیکن اس خوشگوار حیرت کے باوجود انسپکٹر رحیم گل کے عزائم میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ اس مُعمے کو بھی حل کرنا چاہتا ہے لیکن ہر حال میں اس ڈاکو کو بھی گرفتار کرنا چاہتا ہے۔ اس کا خیال بھی یہی تھا کہ وہ یہیں کہیں آس پاس پناہ گزیں ہے۔ وہ اسے تلاش کرنا چاہتا تھا۔ زمینوں، حویلی اور فارم وغیرہ پر کام کرنے والے تمام لوگوں کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ گویا ایک غیر رسمی شناختی پریڈ کرانا چاہتا تھا۔"

"پھر آپ نے کیا جواب دیا؟" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"میں نے اسے اس کی اجازت نہیں دی" زرتاج نے اطمینان سے جواب دیا "پہلے میں نے اسے نرمی سے یہی سمجھایا کہ یہ علاقہ اس کی عمل داری میں نہیں ہے اور اس کے پاس تلاشی کا وارنٹ بھی نہیں ہے۔ جواباً اس نے مجھے قانونی دفعات کے ساتھ سمجھایا کہ بعض مخصوص حالات کے تحت کوئی بھی علاقہ کسی بھی علاقے کی پولیس کی عمل داری میں آجاتا ہے اور وہاں اگر وہ خود نہیں تو اس علاقے کی پولیس کے تعاون سے کسی بھی جرم کی تفتیش کے سلسلے میں کارروائی کرسکتا ہے۔ وارنٹ بھی کوئی مسئلہ نہیں ہے، وہ ایک آدھ دن میں کوئی بھی وارنٹ لے کر آسکتا ہے لیکن اسے اندیشہ ہے کہ اس دوران اس کا مطلوبہ آدمی غائب کرویا جائے گا۔ مختصراً یہ کہ آخر میں مجھے اس کے ساتھ سخت رویّہ اختیار کرنا پڑا۔ وہ ذرا مختلف قسم کا پولیس والا ہے۔"

"اس کے باوجود آپ کہتی ہیں کہ پولیس، ڈاکوؤں کے سامنے جاتے ہوئے تھرتھر کانپتی ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"رحیم گل نے اس علاقے میں زیادہ عرصہ نہیں گزارا ہے۔ اس کے تجربات محدود ہیں۔ اس کی سروس بھی زیادہ پرانی نہیں۔ نو آموز آفیسر ہے۔ ابھی اسے ڈاکوؤں کے مضبوط گروہوں سے واسطہ نہیں پڑا اور شاید اسے خود بھی حالات کا صحیح طور پر اندازہ نہیں ہے۔ اس کے آفیسر اور ماتحت دونوں ہی شاید اس سے تنگ ہوں اس لیے اسے موقع دے رکھا ہو کہ وہ منہ اٹھائے اِدھراُدھر پھرتا رہے اور یونہی کسی روز کام آجائے۔ اگر اس کی زندگی کچھ لمبی ہوئی تو کچھ عرصے میں یقیناً بہت کچھ سمجھ جائے گا۔ اس کے بعد شاید وہ بھی اپنے محکمے کے دوسرے بہت سے لوگوں جیسا ہوجائے۔"

"بہرحال... آپ نے اسے واپس بھیج دیا؟" میں نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ وہ چلا گیا لیکن ظاہر ہے کافی ناخوش تھا" زرتاج نے جواب دیا۔

"اس ایک نامعلوم شخص... اس غیر واضح حُلیے والے نوجوان کی وجہ سے آپ کے لیے کچھ زیادہ ہی مشکلیں کھڑی نہیں ہو رہیں؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"وہ مشکلیں جن کا سبب جانو ہے' وہ تو مجھ پر ہر حال میں پڑنی ہی تھیں۔ یہ تلوار تو بہت عرصے سے میرے سر پر لٹک رہی تھی۔ سمجھوتا مجھے نہ پہلے کرنا تھا اور نہ ہی اب کرنا ہے۔ چنانچہ میں اس معاملے کو ذرا مختلف زاویے سے دیکھ رہی ہوں۔ شاید قدرت نے اس نامعلوم شخص کو میرا بوجھ کم کرنے اور میرے شانہ بہ شانہ کھڑا ہونے کے لیے بھیجا ہو۔ شاید اس کے بارے میں جو باتیں مجھ تک پہنچ رہی ہیں' اس کی اصلیت ان سے بہت مختلف ہو' اصل بات کچھ اور ہی ہو۔"

وہ بیٹھ چکی تھی اور بظاہر پُرسکون تھی لیکن اس کے اندر یقیناً اضطراب مؤجزن تھا اس لیے وہ ایک بار پھر اٹھ کھڑی ہوئی اور کمر پر ہاتھ باندھ کر ٹہلنے لگی۔

ایک لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد وہ بولی "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ وہ نامعلوم شخص... وہ غیر واضح حُلیے والا نوجوان آکر مجھ سے مل ہی نہیں رہا' مجھے ساری حقیقت بتا ہی نہیں رہا۔ میں صرف موہوم سے اندازوں کی بنیاد پر مہلک خطرات مول لیے جا رہی ہوں لیکن میں کب تک ایسا کر سکتی ہوں؟ مبہم چیزوں کے لیے انسان کب تک جبر سہہ سکتا ہے؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں نئے سرے سے غور کرنے اور اپنے لیے کوئی محفوظ راستہ تلاش کرنے پر مجبور ہو جاؤں۔"

چند لمحے کمرے میں بوجھل سکوت طاری رہا۔ وہ بدستور ٹہل رہی تھی لیکن میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ میرے ذہن میں تلاطم سا برپا تھا۔ بالآخر میں نے گہری سانس لی۔ میرے خیال میں اب وقت آ گیا تھا کہ میں اسے اپنے بارے میں کچھ نہ کچھ بتا دیتا۔ یہ ہم دونوں ہی کے حق میں بہتر تھا۔

"آپ بیٹھ جائیے..." میں نے نیچی آواز میں کہا "بات شاید ذرا لمبی ہو جائے... لیکن میں آپ کو اپنے بارے میں تقریباً سب کچھ بتا ہی دیتا ہوں۔"

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا' مسکرائی اور اپنی شاہانہ سی کرسی پر شاہانہ سے انداز میں آن بیٹھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے دوبارہ سر اٹھایا۔ وہ ایک ٹک میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے کہا "میرے خیال میں یہ بتانے کی تو ضرورت نہیں رہی کہ وہ نامعلوم شخص جس کی بیک وقت پولیس اور ڈاکوؤں کے سردار' دونوں کو تلاش ہے' وہ میں ہی ہوں۔"

"میں سمجھ تو چکی تھی لیکن میں تمہارے منہ سے سننا چاہتی تھی" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر تم کب تک اس حقیقت کو پوشیدہ رکھو گے۔"

"میں شاید اب بھی اپنے منہ سے اس کا اعتراف نہ کرتا کیونکہ اب میں یہاں سے جا ہی رہا تھا۔ میں آج کل میں یہاں سے جانے کے لیے آپ سے اجازت طلب کرنے ہی والا تھا۔"

اس کے ماہ تاب چہرے پر ایک رنگ بدلی کی طرح آ کر گزر گیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "لیکن اب میں نے آپ کی باتیں سُنیں... کچھ میری معلومات میں اضافہ ہوا اور میں نے سوچا کہ آپ کو الجھن میں چھوڑ کر جانا مناسب نہیں۔ آپ کو یہ تو یقین ہے نا کہ میں مجرم نہیں ہوں؟"

"اگر مجھے یقین نہ ہوتا تو میں تمہیں کبھی اس حد تک تحفظ نہ دیتی۔ یہ یقین تو مجھے پہلی بار تمہاری صورت دیکھتے ہی ہو گیا تھا۔ پہلی نظر میں ہی تم پر بھروسا کرنے کو جی چاہنے لگا تھا" وہ بلا تامل بولی۔

"بہت شکریہ۔ یہ میرے لیے ایک اعزاز ہے" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔

"میرے دل نے کہا تھا کہ اگر میں تمہارے ساتھ کوئی بھلائی کروں گی تو تم اس کا صلہ مجھے برائی کی صورت میں ہرگز نہیں دو گے" وہ وثوق سے بولی۔

"آپ کی مردم شناسی پر مجھے حیرت ہے۔ میں جتنے دن بھی یہاں رہا ہوں' آپ کے مفادات کی حفاظت کی تگ و دو میں ہی لگا رہا ہوں" میں نے کہا۔

"اس کا اندازہ تو مجھے اسی بات سے ہو گیا ہے کہ کس طرح تم نے بینک کو لٹنے سے بچایا اور اس کے باوجود اس بات کو... اپنی ذات کو راز میں رکھتے رہے۔ ایک عام آدمی میں اتنا ظرف کہاں ہوتا ہے" وہ شیریں لہجے میں بولی۔

"آپ کو یہ بھی یقین ہے نا کہ میں ایک شریف آدمی ہوں؟" میں نے اس سے مزید تصدیق چاہی۔

"ہاں" وہ پُرخیال لہجے میں بولی "لیکن تم کوئی عام قسم کے شریف آدمی نہیں ہو۔ کچھ الگ ہی طرح کے شریف آدمی ہو... اور تم یقیناً اس طبقے کے فرد بھی نہیں ہو جس طبقے کے بننے کی کوشش کر رہے ہو لیکن تم میں یقیناً ہر طبقے میں گھل مل جانے' ہر مشقت اور صعوبت سہہ جانے کی صلاحیت ہے۔"

"شکریہ" میں نے ہولے سے ہنس کر کہا "لگتا ہے آپ تو میری شخصیت کی تہ تک پہنچتی جا رہی ہیں اور یہ بات مجھے بڑی خطرناک لگتی ہے کہ کوئی میری شخصیت کی تہ کو پہنچنے لگا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ مجھے مکمل طور پر بوجھ لیا جائے۔ مجھے خود اپنے آپ کو مکمل طور پر جاننے سے خوف آتا ہے۔"

"میرا خیال ہے' یہ محض تم بن رہے ہو... مجھے ادھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھانے کی کوشش کر رہے ہو..." وہ آنکھوں کے راستے گویا میری شخصیت کی گہرائیوں میں اُترنے کی کوشش جاری رکھتے ہوئے بولی "تمہاری شخصیت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ تمہیں مکمل طور پر بوجھ لیے جانے اور اپنے آپ کو مکمل طور پر جاننے سے

خوف آئے۔ بہرحال تم ٹکڑوں میں بات کرنے کے بجائے مسلسل اور پوری بات کیوں نہیں کرتے؟"

چنانچہ میں نے پوری بات کر ڈالی لیکن درحقیقت وہ بھی پوری نہیں تھی۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ میں درحقیقت کون تھا۔ بس اپنا اصل نام پورا بتا دیا' یہ بتا دیا کہ میں ایک چھوٹا موٹا بزنس مین تھا۔ کچھ انتہائی خطرناک لوگوں کی دشمنی کی وجہ سے مجھے بھاگنا پڑا تھا اور حالات نے مجھے روحیل خان سے لا ٹکرایا تھا۔ وہاں سے میں نے باقی تمام باتیں اسے سچ سچ بتا دی تھیں۔ روحیل خان سے ملاقات کے بعد سے اب تک مجھے جو بھی واقعات پیش آئے تھے وہ سب میں نے بلا کم و کاست اسے سنا دیے۔

اس کے چہرے پر کئی بار تغیر آیا لیکن وہ درمیان میں کچھ نہ بولی' نہایت صبر و سکون سے اس نے سب کچھ سنا۔ میں نے اسے ڈاکوؤں کے "گولڈ کی کلب" کے بارے میں بھی بتا دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ اگر کبھی پولیس یا کوئی اور ایجنسی اس کلب کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو بھی گئی تو وہاں سے کچھ ایسے کاغذات یا کچھ ایسے جعلی ثبوت برآمد ہوں گے جن سے وہ کلب اس کی ملکیت ظاہر ہو گا۔ یہ سن کر تو اس کی رنگت ایک لمحے کے لیے پھیکی پڑ گئی لیکن بظاہر وہ پُرسکون ہی رہی۔

"... اور اب میں آپ کے سامنے ہوں اور آپ سے اجازت چاہتا ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو جتنی بھی زحمت ہوئی ہو اس کے لیے میں تہ دل سے معذرت خواہ ہوں" میں نے دونوں ہاتھ پھیلا کر گردن کو خم دیتے ہوئے کہا۔

"اب اتنا بھی رسمی ہونے کی ضرورت نہیں" وہ جرأت مندی سے مسکرائی "اب جبکہ تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ میں کس قسم کے حالات میں گھری ہوئی ہوں... تو تم مجھے چھوڑ کر چلے جاؤ گے؟"

"مجھے اندازہ ہے کہ آپ ایک مضبوط لڑکی ہیں۔ آپ کے پاس ہمت و سائل ہیں۔ آپ ان حالات سے آسانی سے نمٹ لیں گی" میں نے کہا۔

"نمٹ تو شاید لوں گی لیکن آسانی سے نہیں" اس نے پُرخیال انداز میں ٹھوڑی مسلتے ہوئے آہستگی سے کہا "بے شک میرے پاس وسائل موجود ہیں لیکن سب سے بڑا مسئلہ تو یہی ہے کہ میں لڑکی ہوں۔ لوگ مجھے لڑکی ہونے کی سزا دینا چاہتے ہیں..."

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ وہ انگلی اٹھاتے ہوئے بولی "اور ہاں... تم ہرگز یہ مت سمجھنا کہ تمہاری وجہ سے مجھے کوئی زحمت ہوئی ہو گی یا میرے لیے کوئی مصیبت کھڑی ہوئی ہو گی۔ عین ممکن ہے' تمہاری وجہ سے تو میری کوئی مصیبت ٹل گئی ہو۔ میرا اصل مسئلہ تو جانو ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس سے کیسے نجات حاصل کروں۔ یہ مردود کسی بھوت کی طرح میرے پیچھے لگ گیا ہے۔"

"اور یہ لاتوں کا بھوت ہے' باتوں سے نہیں مانے گا" میں نے کہا۔

"میں خون خرابہ نہیں چاہتی۔ ایک انسانی جان کا نقصان بھی میری نظر میں ناقابلِ تلافی ہے۔ میں اپنے گاؤں کو ایک مثالی گاؤں بنانا چاہتی تھی۔ میرے خواب بہت اونچے تھے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے جانو جیسی بلاؤں سے واسطہ پڑے گا۔ میرے خوابوں میں اس کی گنجائش نہیں تھی۔ میں اپنے آپ کو ابھی تک ذہنی طور پر ان لوگوں سے اُلجھنے کے لیے تیار نہیں کر سکی۔"

"اس دنیا میں قدم قدم پر جانو جیسی بلائیں موجود ہیں۔ کہیں کسی روپ میں' کہیں کسی روپ میں۔ یہ دنیا آئیڈیلسٹ لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی خوش قسمتی ہے کہ جس قسم کی آپ لڑکی ہیں... اور جس پوزیشن میں ہیں... اس میں آپ کو صرف ایک بلا سے ہی واسطہ پڑا ہے۔ بات صرف وہی ہے کہ آپ نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو اس بلا سے نمٹنے کے لیے تیار نہیں کیا۔ جس دن آپ ذہنی طور پر تیار ہو گئیں' اس دن نمٹ لیں گی۔"

"عجیب بات یہ ہے کہ میں اس سے خوف زدہ بھی نہیں ہوں" وہ اُلجھن آمیز سے لہجے میں بولی۔

"مجھے معلوم ہے" میں نے اثبات میں سر ہلایا "یہ بس ایک گریز... ایک جھجک ہے جو طاقتور شرفا میں پائی جاتی ہے۔ کمزور شرفا میں تو باقاعدہ خوف پایا جاتا ہے۔"

"تم نے جانے کا فیصلہ کیوں کر لیا ہے؟" اس نے اچانک ہی پوچھا۔

"میں اپنے کچھ ہمدرد اور جاں نثار قسم کے دوستوں کو ان خطرناک لوگوں سے برسرِپیکار چھوڑ آیا تھا جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں پیش منظر سے ہٹ جاؤں گا تو کم از کم کچھ عرصے کے لیے ضرور سکون ہو جائے گا۔ میں نے ان لوگوں کو یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی تھی کہ میں آخری جھڑپ میں ہلاک ہو چکا ہوں۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ میری یہ کوشش کس حد تک کامیاب رہی کیونکہ اس کے بعد میں صحیح معنوں میں روپوش ہو گیا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کسی بھی ذریعے سے رابطہ کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کی لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ میری یہ حکمتِ عملی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔"

"میرے خیال میں تو اچھی تھی" وہ بلا تامل بولی "میں تمہارے حالات سے پوری طرح اب بھی واقف نہیں ہو سکی اور میں تمہیں زیادہ کُریدنا بھی نہیں چاہتی۔ جتنا تم نے بتا دیا' اتنا ہی کافی ہے۔ ظاہر ہے تمہاری کچھ مجبوریاں یا مصلحتیں ہوں گی... لیکن میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم نے جو کچھ کیا' اچھا کیا۔ شاید اس طرح تمہارے سر سے کوئی مصیبت ٹل گئی ہو لیکن اب تم اپنے ساتھیوں کے پاس واپس جانا چاہتے ہو... کیا تمہارے خیال میں حالات تبدیل ہو گئے ہوں گے؟"

"میں فوری طور پر ان کے پاس واپس نہیں جاؤں گا۔ پہلے میں

ذرا دور ہی رہ کر ان کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں گا۔ پہلے میں کراچی جاؤں گا۔ وہاں سے اپنے کچھ رابطے بحال کرنے کی کوشش کروں گا" میں نے بتایا۔

"اب تم سے تعارف ہوا.... تم نے اپنے بارے میں تھوڑا بہت بتایا تو ساتھ ہی تم چل دیے" وہ مبہم سے انداز میں مسکرائی۔

"زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی" میں نے کہا۔

"شاید..." اس نے بے یقینی سے کہا۔ اس نے یہ شکوہ نہیں کیا کہ میں نے تو اسے اپنے کاروبار' اپنے ٹھکانے' اپنی رہائش وغیرہ کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ کوئی فون نمبر نہیں دیا تھا۔ رابطے کا کوئی طریقہ تجویز نہیں کیا تھا تو پھر ملاقات یا رابطے کا کیا امکان ہوسکتا تھا؟ محض اتفاقاً ہی ملاقات ہوسکتی تھی.... اور اتفاقات کا کیا ہے.... ہونے لگیں تو آئے دن ہوسکتے ہیں.... نہ ہوں تو زندگی بھر نہ ہوں۔ میں خود ہی چاہتا تو اس سے رابطہ کرسکتا تھا لیکن اس نے اس موضوع پر کوئی بات نہیں کی تھی۔ وہ بہت سمجھدار تھی۔ اس سے زیادہ کچھ پوچھنا نہیں چاہتی تھی جتنا میں بتانا چاہتا تھا۔

اِدھر میرا عجب ہی معاملہ تھا۔ میں محسوس کررہا تھا کہ وہ میرے حواس پر حملہ آور ہورہی تھی۔ بلاشبہ وہ دل ودماغ پر چھا جانے والی لڑکی تھی۔ بہت تیز نشے کی طرح حواس کو تسخیر کرلینے والی۔ اسی لیے میں اس سے خوف زدہ ہوگیا تھا۔ جلد ازجلد اس سے دور چلا جانا چاہتا تھا۔ اس کے طلسم سے نکلنے کا شاید یہی ایک طریقہ تھا۔

معلوم نہیں اسے خود احساس بھی تھا یا نہیں کہ اس کی شخصیت' اس کا وجود مجھ جیسے لوگوں پر کیا قیامت ڈھاسکتا تھا؟ میرا خیال تھا کہ احساس تو یقیناً ہوگا۔ حسن والے اپنے حسن کی تباہ خیزیوں سے بہت اچھی طرح واقف ہوتے ہیں لیکن اس کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ محض حسین نہیں تھی اور میں صرف حسن سے متاثر ہونے والوں میں سے تھا بھی نہیں۔ وہ تو کئی پہلوؤں سے ایک غیر معمولی اور نایاب لڑکی تھی۔ راحیلہ کی طرح۔

بہت سے معاملات میں وہ راحیلہ سے بہت مختلف تھی۔ ظاہر ہے وہ اپنی جگہ ایک منفرد شخصیت تھی۔ یہ انفرادیت اسے میری نظر میں اور بھی زیادہ دلکش بناتی تھی لیکن مسئلہ یہی تھا کہ صرف راحیلہ کا خیال مجھے زرتاج کے بارے میں سوچنے سے باز رکھتا تھا۔ میں اگر بے اختیاری میں کبھی زرتاج کے بارے میں سوچتا بھی تھا تو اپنے آپ کو راحیلہ کا مجرم محسوس کرتا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ راحیلہ کا مجھ سے کوئی عہدوپیماں نہیں تھا' اقرار نہیں تھا۔ وہ تو صحیح طور پر کبھی کوئی بات مان کر ہی نہیں دیتی تھی۔ کئی بار وہ نہایت سنجیدگی سے مجھے مشورہ دے چکی تھی کہ میں کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کرلوں..... اور میرا یہ حال تھا کہ اگر میں نے ایک اچھی لڑکی دیکھ بھی لی تھی تو راحیلہ ہی کے تصور کی وجہ سے اس لڑکی کے سامنے اپنے آپ کو مجرم مجرم سا محسوس کرتا تھا۔ عجیب ہی صورت حال میں گرفتار تھا میں بھی! اس لیے میں نے جان بوجھ کر زرتاج کو اپنا کوئی پتا' فون نمبر یا رابطے کا ذریعہ نہیں بتایا تھا۔ شعوری طور پر تو میری کوشش یہی تھی کہ ایک بار اس کے ہاں سے رخصت ہونے کے بعد آئندہ میری اس سے ملاقات نہ ہو لیکن لاشعوری طور پر میں کیا چاہتا تھا.....؟ یہ ابھی مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

میں زرتاج کی آواز سن کر اپنے خیالات سے چونکا۔ وہ پوچھ رہی تھی "مجھے بتاؤ..... میں تمہارے لیے کیا کرسکتی ہوں؟"

"آپ نے جو کچھ کردیا' میں زندگی بھر اسی کا احسان نہیں چکا سکتا۔"

"اب شرمندہ مت کرو" وہ سچ مچ خجالت زدہ سی ہوکر بولی "میں نے تم سے تمہارے شایانِ شان کوئی سلوک نہیں کیا۔ میں یہ تو سمجھ گئی تھی کہ تم جو کچھ اپنے آپ کو ظاہر کررہے ہو وہ نہیں ہو لیکن میں تمہارے بارے میں کوئی واضح فیصلہ بھی نہیں کرپارہی تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں نے آنکھیں بند کرکے تم پر اعتماد کرلیا تھا۔"

"یہی تو وہ احسان ہے جس کا میں بدلہ نہیں چکا سکتا" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "اب آپ مجھ پر صرف اتنا احسان اور کیجیے کہ مجھے کسی ایسے قریبی قصبے یا شہر پہنچانے کا بندوبست کردیجیے جہاں سے میں ڈائرکٹ یا مرحلے وار' بس یا ٹرین کے ذریعے کراچی پہنچ سکوں۔"

"تمہیں کراچی بھی پہنچوادیں گے' ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "دن کا انتظار تو کرلو۔ ابھی تو رات ہے۔ چاہو تو تمہیں بہیر دمیں ارائیں روڈ بھجوادیا جائے گا۔ پانچ چھ گھنٹے کا سفر ہے۔ وہاں سے جہاز کے ذریعے کراچی چلے جانا۔"

"نہیں۔" میں نے نفی میں سرہلایا۔ "میں بالکل عام اور گمنام سا آدمی بن کر رات کے اندھیروں میں ہی' عوامی طریقوں سے سفر کرنا چاہتا ہوں۔"

وہ پہلو بدلتے ہوئے دھیرے سے ہنس کر بولی "ویسے تم نے عام آدمی بننے میں بھی حد ہی کردی.... اور کچھ نہیں تو گھوڑے سدھانے والے ہی بن گئے۔ اب اس وقت کوئی تمہیں اس طرح دھول پسینے میں لتھڑا ہوا دیکھے.... تمہارے ہاتھ میں یہ لگام' یہ چابک دیکھے تو واقعی تمہیں جدی پشتی کوچبان یا گھوڑے سدھانے والا سمجھے گا۔"

"بس.... فوری طور پر جس کا موقع نظر آیا' وہ بن گیا۔ جب میں یہاں پہنچا تو گھوڑا آپ کے آدمی کے قابو میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے سوچا' چلو یہی کرکے دکھادیتے ہیں۔ پھر فیصلہ کیا کہ چلو بہروپ اپنے اوپر لاد لیا جائے...." پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ویسے... آپ کو شاید یقین نہ آئے کہ میں نے زندگی میں کبھی کوئی گھوڑا نہیں سدھایا۔"

"اوہ.... نو..." حیرت سے اس کی خوبصورت آنکھیں پھیل گئیں۔

"لیکن بچپن میں' میں نے اپنے گاؤں میں کچھ لوگوں کو بہت سے گھوڑے سدھاتے دیکھا تھا۔ میں بہت غور سے وہ منظر دیکھا کرتا تھا۔ وہ ساری باتیں میرے ذہن میں نقش تھیں۔"

"پھر بھی..... بڑی حیرت کی بات ہے...." اس نے گردن ہلائی۔ وہ شاید مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بغیر بلائے ایک ملازمہ نہایت گھبرائے ہوئے انداز میں کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

دو قدم آگے آکر وہ گرتے گرتے بچی اور ہاتھ باندھ کر بوکھلائے ہوئے لہجے میں بولی "رئیسانی جی! جانو دھاڑیل اپنے چار پانچ آدمیوں کے ساتھ سیدھا اندر گھسا چلا آرہا ہے... اسے گیٹ پر بھی کسی نے نہیں روکا.... پتا نہیں کیا بات ہے.... ایسا لگتا ہے جیسے گیٹ پر کوئی موجود ہی نہیں ہے...."

زرتاج اچھل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اس کا چہرہ خوف سے زرد نہیں بلکہ برہمی سے سرخ ہوگیا تھا۔ اس نے فوری طور پر ملازمہ کو حکم دیا "تم بھاگ جاؤ اور کہیں چھپ جاؤ..."

"اور میرے بارے میں کسی کو کچھ مت بتانا۔" میں نے ٹکڑا لگایا۔ اس وقت تک میں اچھل کر صوفے کے پیچھے پہنچ چکا تھا۔ صوفوں کے پیچھے چاروں طرف اوپر سے نیچے تک دیواروں کو بھاری دبیز' ریشمی پردوں نے ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے ان پردوں کے پیچھے پناہ لی۔ میں اپنے ساتھ گھوڑے کی لگام اور چابک پردے کے پیچھے لانا نہیں بھولا تھا۔ اگر ان میں سے ایک بھی چیز صوفے پر رہ جاتی تو وہاں میری موجودگی کا راز کھل جاتا۔

ملازمہ گرتی پڑتی کمرے سے بھاگ گئی اور میں پردے کے پیچھے چھپ گیا۔ اس میں بہ مشکل چند سیکنڈ ہی لگے تھے۔ اس دوران باہر برآمدے کی ماربل کی ٹائیلوں پر کئی افراد کے بھاری قدموں کی ٹھک ٹھک اور دھم دھم سنائی دینے لگی۔ زرتاج دونوں ہاتھ کمر پر رکھے تنی کھڑی تھی۔ اس نے اپنی جگہ سے ہلنے کی شاید ضرورت نہیں سمجھی تھی یا اس کے خیال میں کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کرنا مناسب نہیں تھا۔

وہ کوئی ہتھیار وغیرہ لینے کے لیے نہیں لپکی تھی۔ شاید ڈرائنگ روم میں کوئی ہتھیار موجود نہیں تھا۔ حویلی کے اردگرد چونکہ مسلح محافظ تعینات رہتے تھے شاید اس لیے زرتاج اطمینان سے ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے زندگی میں یہی تجربہ حاصل ہوا تھا کہ انسان کو خواہ کتنے ہی مسلح محافظ میسّر ہوں لیکن اپنے خود بھی ہر وقت' کسی بھی قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

جانو چار مسلح آدمیوں کے ساتھ جس طرح کمرے میں داخل ہوا اس طرح شاید پرانے زمانے میں جنگجو اور سفاک بادشاہ بھی اپنے مفتوحہ علاقوں میں داخل نہیں ہوتے ہوں گے۔ اس کی گردن متکبرانہ انداز میں اکڑی ہوئی تھی اور چہرے پر خونخواری تھی۔ میں دو پردوں کے درمیان بال جیسی باریک جھری سے صورت حال کا جائزہ لے رہا تھا اور اپنے اعصاب کو پُرسکون رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس وقت اپنے آپ کو پُرسکون رکھنا نہایت ضروری تھا۔

جانو اور اس کے ساتھی ڈاکو اس وقت خاصے معززانہ لباس میں تھے۔ چاروں ڈاکوؤں نے جانو کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور وہ شکار پر نکلے ہوئے درندوں کی طرح چوکنے نظر آرہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے وقت بھی ان چاروں کا رخ مختلف سمتوں میں تھا۔ وہ اس طرح جانو کو اپنے حلقے میں لیے آرہے تھے جیسے اسے کسی دشمن کے نرغے سے نکال کر لے جارہے ہوں۔ ان کی نظریں بتا رہی تھیں کہ انہیں کسی کی تلاش تھی۔ وہ اس کمرے میں زرتاج کے علاوہ بھی کسی کی موجودگی کی توقع لیے آرہے تھے یا پھر شاید وہ حد سے زیادہ محتاط تھے۔ آخر وہ زرتاج کی حویلی میں گھسے چلے آرہے تھے۔ کہیں غیر متوقع طور پر کسی سے بھی ان کا سامنا ہوسکتا تھا۔ ان کا انداز بتاتا تھا کہ وہ ہر طرح کی صورت حال کے لیے تیار تھے۔

جانو عین زرتاج کے سامنے پہنچ کر ایک جھٹکے سے رک گیا۔ اس نے خباثت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے زرتاج کی ٹھوڑی کو ہاتھ لگانے کی کوشش کی لیکن زرتاج نے اس کا ہاتھ بری طرح جھٹک دیا اور حیرت انگیز خونخواری کے ساتھ بولی "اپنا ہاتھ پیچھے رکھو کسی نامعلوم بھنگی کی اولاد!"

جانو کے تاثرات ایک دم بدل گئے۔ اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اس کی کلاشنکوف اس کے کندھے پر تھی۔ اس کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا لیکن نہ جانے کیا سوچ کر وہ کلاشنکوف کندھے سے اتارتے اتارتے رہ گیا۔ اس کے چاروں ساتھیوں نے اپنی کلاشنکوفوں کا رخ زرتاج کی طرف کرلیا تھا لیکن زرتاج کے چہرے پر خوف کے بجائے غیظ و غضب ہی نمایاں رہا۔ چاروں ڈاکو ٹریگر دبانے کے لیے گویا جانو کے اشارے کے منتظر تھے لیکن جانو نے انہیں ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا بلکہ ایک ٹک زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے خطرناک حد تک پُرسکون لہجے میں بولا "میں حد سے زیادہ بدتمیزی برداشت نہیں کرتا۔"

"تم تو حد سے زیادہ کی بات کررہے ہو..... میں تو معمولی بدتمیزی بھی برداشت نہیں کرتی۔" زرتاج ترکی بہ ترکی بولی۔

"لیکن اب تمہارے لیے نہ جانے کیا کچھ برداشت کرنے کا وقت آگیا ہے۔ ہم تمہیں جتنی ڈھیل دے سکتے تھے' دے چکے۔ اس وقت میں تم سے صرف پچاس لاکھ روپے لینے آیا ہوں' باقی باتیں بعد میں ہوں گی۔"

"کون سے پچاس لاکھ روپے؟ یہ رقم تمہارے نامعلوم باپ نے میرے پاس امانتاً رکھوائی تھی یا مجھے قرض دی تھی؟" زرتاج نے اسی بے خوفی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پلک جھپکائے بغیر

پوچھا۔ میں دل ہی دل میں اس کی بے خوفی اور جرأت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ گو کہ ابھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا' اس کی یہ جرأت اسے اور مجھے کیا کچھ دکھانے والی تھی۔

"زرتاج....!" جانو یک دم دہاڑا۔ اس کی مٹھیاں تشنج کے انداز میں بھنچ گئیں اور چہرہ لال بھبھوکا ہو گیا لیکن اس سے آگے وہ ایک لفظ نہ بولا۔ چند لمحے کے لیے اپنی جگہ ساکت ہی ہو گیا۔ کمرے میں بوجھل خاموشی چھا گئی لیکن یہ سکوت جانو کی چیخ و پکار سے زیادہ خطرناک محسوس ہو رہا تھا۔ وقت گویا اپنی جگہ ٹھہر گیا تھا۔

جانو دوبارہ بولا تو اس کا لہجہ حیرت انگیز طور پر پُرسکون تھا۔

"....تو تم نے پچاس لاکھ کا بندوبست کر کے نہیں رکھا۔ مجھے تم سے یہی امید تھی۔ مجھے معلوم ہے تم بہت ضدی لڑکی ہو۔ تم اپنی ضد کی آگ میں اپنا سب کچھ جلا کر خاک کر لوگی۔ مجھے معلوم تھا' تمہارا جواب کچھ اسی قسم کا ہوگا اس لیے میں پہلے ہی سب بندوبست کر کے چلا تھا۔"

"تمہیں اندر کس نے آنے دیا؟" زرتاج کے غیظ و غضب اور جاہ و جلال میں کمی نہیں آئی تھی۔

"شاید تم ان مسلح گارڈز کے بارے میں سوچ کر پریشان ہو رہی ہو جن میں سے کچھ گیٹ پر پڑے اینڈتے رہتے ہیں اور کچھ حویلی کے گرد گشت کرتے رہتے ہیں...." جانو استہزائیہ لہجے میں بولا "وہ سب اس وقت آرام کی نیند سو رہے ہیں۔"

مجھے خفیف سا جھٹکا لگا۔ کیا ان سب کو مار دیا گیا تھا؟ لیکن میں نے ایک بھی گولی چلنے کی آواز نہیں سنی تھی۔ میرے ذہن میں جو سوال ابھرا تھا وہ زرتاج کی زبان پر آ گیا۔

"کیا تم نے ان سب کو مار دیا؟" اس نے غضبناک لہجے میں پوچھا۔

"میں نے کہا نا کہ وہ سب آرام سے سو رہے ہیں۔ تم چاہو تو انہیں مُردہ بھی سمجھ سکتی ہو کیونکہ میرے خیال میں سوئے ہوئے اور مُردہ انسان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔" جانو نے غیر واضح سا جواب دیا پھر وہ سر جھٹک کر بولا۔ "تم یہ سوال جواب چھوڑو' میں یہاں سوالوں کے جواب دینے نہیں آیا۔ مجھے ہر حال میں دو چیزیں چاہئیں۔ پچاس لاکھ روپیہ اور افضل خان۔"

میرے اعصاب کچھ اور تن گئے۔ اس کا مطلب تھا' اسے میرے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ زرتاج نے ایک لمحے کے لیے اپنے غیظ و غضب کو بھول کر ذرا حیرت کی اداکاری کی۔ "کون افضل خان؟"

"تم اتنی جلدی بھولنے والی لڑکی نہیں ہو۔ میں نے پچھلی ہی ملاقات میں تو ذکر کیا تھا کہ اس نام کا ایک شخص کس طرح غلطی سے ہمارے ہاتھوں سے نکل گیا ہے۔" جانو بولا "اب تمہیں اتنا بننے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہو چکا ہے' تم نے اسے گھوڑے سدھانے پر ملازم رکھا ہے۔ ہم تو اس سرونٹ کوارٹر کو بھی کھنگال آئے ہیں جو تم نے اسے رہنے کے لیے دیا ہوا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے تم نے کچھ دیر پہلے اسے 'شرف ملاقات بخشنے' کے لیے بلایا تھا۔ لہٰذا اسے حویلی میں ہی کہیں ہونا چاہیے۔ جلدی بتاؤ' تم نے اسے کہاں چھپایا ہے۔ ہمارے پاس اتنی بڑی حویلی کو کھنگالنے کا وقت نہیں ہے۔"

زرتاج نے حقارت بھرے انداز میں اس کی طرف دیکھا اور بولی "ابھی میری نظر میں تم کوئی ایسی توپ چیز نہیں ہوئے کہ تمہارے ڈر سے میں کسی کو اِدھر اُدھر چھپانے لگوں۔ میں تو اب تک تم سے خواہ مخواہ کے ٹکراؤ سے بچنے کے لیے تمہارے ساتھ اخلاق سے پیش آ رہی ہوں لیکن اب تم بالکل ہی سر پر چڑھ آئے ہو تو ٹھیک ہے.... اخلاق وخلاق رہا ایک طرف.... اب تم سے بندوق کی زبان میں ہی بات ہوگی۔ تم نے اب میرے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا۔ تم خون بہتے دیکھنا چاہتے ہو تو چلو یونہی سہی...."

جانو گویا اس کی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے دھیرے سے ہنسا اور از سرِنو اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "لباس میں اگر اِدھر اُدھر کوئی چھوٹا موٹا پستول وغیرہ چھپا رکھا ہے تو اسے نکالنے کی کوشش نہ کرنا' جسم چھلنی ہو جائے گا.... اور فی الحال میں اس حسین جسم کو چھلنی ہوتے دیکھنا نہیں چاہتا۔"

"تم صرف حویلی کے محافظوں کو مار کر یا بے ہوش کر کے رہے ہو کہ زرتاج نگر مسلح مردوں سے خالی ہو گیا؟" زرتاج بولی' اگر زندہ واپس جانا چاہتے ہو تو اب بھی چلے جاؤ اور آئندہ کبھی نہ آنا۔ میں تمہاری اس گستاخی کو معاف کر دوں گی۔"

جانو نے ٹھنڈی سانس لی۔ "رسّی جل جاتی ہے مگر اس کا بل نہیں جاتا۔ تم تو ابھی جلی بھی نہیں ہو۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کیسے تمہارا بل نکالوں.... کیسے تمہیں سمجھاؤں کہ اس وقت تم زندگی کے ایک انتہائی خطرناک دوراہے پر کھڑی ہو...."

پھر وہ گویا انتہائی تحمل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے "تم کہہ رہی ہو میں نے تمہارے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑا' بالکل غلط ہے۔ حالانکہ میں تم سے انتہائی تنگ آیا ہوا ہوں۔ تمہاری وجہ سے مجھے جتنا نقصان پہنچا ہے اور تم بار بار میری بے عزتی کر رہی ہو.... جتنی ضد دکھا رہی ہو.... اگر تمہاری جگہ اور ہوتا تو میں اس کا نام و نشان مٹا چکا ہوتا...."

"اتنے تکبر کا کلمہ مت بولو۔" تاج اس کی بات ہوئے بولی "نام و نشان مٹانے کی طاقت اللہ نے صرف اپنے رکھی ہے۔ قبرستان ایسے لوگوں کی قبروں سے بھرے پڑے جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں نہ جانے کس کس کا نام مٹانے کی کوشش کی۔ آج کوئی ان کا نام تک نہیں جانتا۔"

"وعظ بند کرو اور زیادہ مُلّانی بننے کی کوشش مت کرو۔" نرمی سے بولا "جو بات میں کہہ رہا ہوں اس پر توجہ دو۔ میں

بھی تمہارے لیے راستہ چھوڑا ہوا ہے۔ کسی بھی شکل میں پچاس لاکھ روپیہ مجھے دے دو۔ جتنی نقد رقم ہے وہ دے دو۔ زیور.... پرائز بانڈ.... اور کوئی قیمتی چیز.... بھی قابلِ قبول ہوگی۔ بس پچاس لاکھ کا حساب پورا کر دو اور افضل خان کو میرے حوالے کر دو۔ میرا تمہارا جھگڑا یہیں ختم ہو جائے گا۔ میں پُرامن طور پر واپس چلا جاؤں گا۔"

"تاوان نہ میرے باپ نے کبھی دیا تھا اور نہ کبھی میں دوں گی۔ میں پچاس لاکھ روپیہ غریبوں کی مدد اور فلاح کے لیے خرچ کر سکتی ہوں' ایک ڈاکو اور دہشت گرد کو نہیں دے سکتی جس کے پاس پہلے ہی حرام کی دولت کے انبار موجود ہیں۔" زرتاج فیصلہ کن لہجے میں بولی "میں تمہیں تاوان دے کر تمہاری بگڑی ہوئی عادتوں کو مزید بگاڑنا نہیں چاہتی۔ بھیڑیے کو ایک بار جہاں سے شکار مل جائے وہ بار بار پلٹ کر وہاں آتا ہے۔"

"میں تمہارے حسن کے دیدار کے لیے.... تم سے ملاقات کے لیے تو آتا رہوں گا.... لیکن کوئی مطالبہ لے کر نہیں آؤں گا.... یہ میرا وعدہ ہے۔" جانو کے لہجے میں خاصی ملائمت آ گئی۔

"میں آئندہ زرتاج نگر اور اس حویلی کے آس پاس تمہاری صورت دیکھنا نہیں چاہتی۔" زرتاج نفرت سے بولی۔

"تم پچاس لاکھ روپیہ اور افضل خان مجھے دے دو تو اس سلسلے میں بھی غور کیا جا سکتا ہے لیکن میں کوئی وعدہ نہیں کروں گا۔ میں تمہارا سچا عاشق ہوں۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر پھر چلا آؤں گا۔"

جانو کا لہجہ اب خاصا بدل چکا تھا۔

"تمہاری یہ باتیں سُن سُن کر تو مجھے اُبکائی آنے لگی ہے۔ مجھے نہ تمہارے کسی وعدے کا اعتبار ہے اور نہ ہی کسی اور بات کا۔ آج اس بات کا فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ آئندہ تم زرتاج نگر کی حدود میں قدم نہیں رکھو گے۔" زرتاج کے لہجے میں اب بھی کوئی لچک نہیں تھی۔

"تم مجھے اپنی شرائط بتا رہی ہو؟ تم مجھے حکم دینا چاہتی ہو؟" جانو کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسے گویا اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں کیونکہ اس وقت تم میری جاگیر کی حدود میں.... میری حویلی میں کھڑے ہو۔" وہ بدستور رُعب اور دبدبے سے بولی۔

"لیکن.... میری جان....! میں نے ایک اہم بات تمہیں ابھی تک نہیں بتائی...." جانو نہایت ملائمت سے بولا لیکن اس ملائمت کی تہ میں سفاکی چھپی ہوئی تھی۔ "میرا خیال ہے اب میں تمہیں وہ بات بتا ہی دوں تو بہتر ہوگا۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہے کہ میرا گروہ کافی بڑا ہے اور آج میں پورے گروہ کے ساتھ اس خاص مہم پر نکلا ہوں۔ میرا پورا گروہ ایک ساتھ کسی خاص موقعے پر ہی نکلتا ہے۔ اس وقت تمہاری حویلی اور تمہارا گاؤں خاص خاص زاویوں سے میرے آدمیوں کے گھیرے میں ہے۔ تم ضدی بھی ہو اور شاید تم میری بات کو اتنی اہمیت بھی نہیں دو گی جتنی دینی چاہیے۔ بہرحال میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ تمہارے پاس صرف پانچ منٹ کی مہلت ہے...."

اس نے گھڑی دیکھی اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "ٹھیک پانچ منٹ بعد میں سگنل دے دوں گا۔ تمہاری حویلی اور تمہارا گاؤں ایسی تباہی کی لپیٹ میں آ جائے گا جس کا تم نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔ اب تم مجھے آخری جواب دے دو...."

اس نے جیب سے موبائل فون نما کوئی چیز نکالی لیکن وہ موبائل فون نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ موبائل فون اس علاقے میں کام نہیں کرتا تھا۔ وہ غالباً واکی ٹاکی سیٹ تھا۔ وہ اسے ہاتھ میں ذرا اونچا کرتے ہوئے بولا "میں اس پر صرف دو لفظ بولوں گا اور آپریشن شروع ہو جائے گا۔ بولو کیا کہتی ہو؟"

زرتاج نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے کھڑی تھی۔ میرے مساموں سے پسینہ پھوٹ پڑا تھا۔ میں اس وقت بالکل نہتا تھا اور جانو کے ساتھی کلاشنکوفیں سیدھی کیے کمرے کے چاروں کونوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ میں اگر اچانک پردے کے عقب سے نکل کر ان پر چھلانگ لگاتا تب بھی شاید ان میں سے ایک یا دو کو دبوچتے ہوئے ڈھیر ہوتا۔ اس دوران اگر ان کی اپنی گنیں چل جاتیں تب بھی میرے لیے موت کا خطرہ تھا اور اسی دوران باقی دونوں تینوں افراد بھی آسانی سے مجھے چھلنی کر سکتے تھے۔ وہ بالکل ہی ناکارہ اور سُست تو یقیناً نہیں تھے۔ اصل مسئلہ یہ تھا کہ میرے اور ان کے درمیان آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا اور اس وقت ایک ایک انچ فاصلے کی بڑی اہمیت تھی۔ اگر میں ان کے بالکل قریب ہوتا تو میری پھرتی میرے کام آ جاتی اور میں پلک جھپکتے میں ان میں سے کسی کی گن چھینتے ہوئے باقی لوگوں سے پہلے کم از کم ایک برسٹ تو مار ہی سکتا تھا لیکن اس صورت میں بھی میرے لیے زرتاج کو بچانا بڑا نازک مسئلہ ہوتا۔ بے بسی کے احساس سے میرے اعصاب چٹخنے لگے۔

دفعتاً ایک شخص نہایت خاموشی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں بھی کلاشنکوف تھی۔ اسے دیکھ کر میرے دل میں امید کی ایک کرن لہرائی۔ وہ عبدل تھا جو سرونٹ کوارٹر میں میرا کھانا وغیرہ پکانے پر مامور تھا۔ وہ اس وقت بالکل بدلا ہوا انسان نظر آ رہا تھا۔ یہ وہ مسکین اور بُدھو سا عبدل نہیں تھا جسے میں اب تک دیکھتا آیا تھا۔ وہ تو اس وقت لومڑی سے زیادہ عیار و مکار نظر آ رہا تھا۔

جس خاموشی سے وہ کمرے میں داخل ہوا تھا' میرا خیال تھا' وہ تو نقشہ ہی بدل دے گا' بازی پلٹ دے گا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ ان چاروں ڈاکوؤں کی نظر میں آئے بغیر تو وہ کمرے میں داخل ہو ہی نہیں سکتا تھا اور وہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد چند قدم آگے بھی آ چکا تھا لیکن ڈاکوؤں میں سے کسی

نے اس پر گولی نہیں چلائی تھی اور نہ ہی عبدل کی کلاشنکوف کا رخ ڈاکوؤں کی طرف تھا۔ ظاہر ہے' اس کا مطلب تو کچھ اور تھا۔

دوسرے ہی لمحے یہ مطلب واضح بھی ہوگیا جب عبدل نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں جانو کو مخاطب کیا "سائیں! میں نے تمام نوکروں اور نوکرانیوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا ہے لیکن افضل خان حویلی میں کہیں نہیں ہے... اور وہ واپس بھی نہیں گیا ہے...."

وہ پانچوں یک لخت پہلے سے زیادہ چوکنے ہوگئے اور جانو سہلاتے ہوئے بولا "اس کا مطلب ہے وہ اسی کمرے میں ہے..."

وہ اپنی جگہ ساکت ہوگئے۔ صرف ان کی آنکھیں متحرک تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کی نظریں شکاری باز کی طرح کمرے میں موجود ہر چیز کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کمرے میں وکٹورین اسٹائل کا بہت سا بھاری بھرکم فرنیچر موجود تھا۔ تقریباً ہر چیز کے پیچھے ہی کوئی آسانی سے چھپ سکتا تھا لیکن میں فرنیچر سے بھی ذرا پیچھے پردے کے عقب میں تھا۔ دو پردوں کے کناروں کو میں نے صرف چٹکی سے تھاما ہوا تھا اور بال برابر جھری کو ذرا بھی کشادہ نہیں ہونے دیا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ ایک کلاشنکوف بردار کی نظر عین اسی مقام پر آکر ٹھہر گئی تھی۔

لیکن عین اسی لمحے زرتاج کی تاسف زدہ آواز ابھری۔ "عبدل.... کیا واقعی تم....!" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ شاید بے یقینی کی شدت کی وجہ سے الفاظ اس کے ہونٹوں پر دم توڑ گئے تھے۔ اس کے لہجے میں سسکی سی پنہاں تھی۔ شاید اسے زندگی میں پہلی بار کسی کی غداری کے صدمے سے واسطہ پڑا تھا۔

عبدل نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جانو فاتحانہ لہجے میں بولا "ہاں... عبدل ہمارا آدمی ہے۔ اسی کی وجہ سے تو حویلی کے محافظوں کو قابو میں کرنا ہمارے لیے ممکن ہوا ورنہ یہ کام کافی مشکل تھا۔"

عبدل نہایت ڈھٹائی سے زرتاج کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ مجھ سمیت ایک لمحے کے لیے شاید سبھی عبدل کی طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ میں بھی صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا کہ زرتاج نے کب اور کہاں سے چھوٹا سا وہ چپٹا پستول نکالا تھا۔ میں تو فائر کی ہلکی سی آواز سن کر اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

اسی لمحے عبدل پٹ سے فرش پر گرا۔ گولی عین اس کے سینے پر دل کے مقام پر لگی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرتی یا پستول کا رخ کسی اور کی طرف کرتی' جانو نے بجلی کی سی تیزی سے اس کی کلائی پر ٹھوکر ماری۔ اس کے پیروں میں بھاری بوٹ تھے۔ پستول زرتاج کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس کا بازو بے جان سے انداز میں جھول گیا۔ اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید کراہ کر بازو تھام کر بیٹھ جاتی لیکن اس نے اُف تک نہ کی۔ البتہ شاید اسے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ پستول نکالنے میں تو کامیاب ہوگئی تھی لیکن اس سے مزید کام نہیں لے سکی۔ عبدل کے ہاتھ سے کلاشنکوف چھوٹ گئی تھی اور وہ چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔ شاید اسے آخری سانس لینے تک یقین نہیں آیا تھا کہ اسے گولی لگ چکی تھی۔

"آخر تم ایک خطرناک قدم اٹھانے سے باز نہیں رہ سکیں۔" جانو بوجھل آواز میں بولا "اس حرکت میں تمہاری جان بھی جا سکتی تھی۔ میرے آدمیوں نے احتیاط برتی ہے۔"

"بڑا احسان ہے ان کا۔" زرتاج زہرخند کے ساتھ بولی "مجھے تو خوشی یہ ہے کہ میری کوشش رائیگاں نہیں گئی۔ آستین کے سانپ کو پہلے مارنا ضروری تھا۔ سامنے کھڑے ہوئے دشمن کا معاملہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"تم بہت خطرناک لڑکی ہو۔" جانو کے چہرے پر اب شیطانی سی مسکراہٹ نمودار ہو رہی تھی۔ "اب تمہیں مزید تنہا نہیں رہنا چاہیے۔ میں اب تمہارے سامنے دو کے بجائے تین راستے رکھ رہا ہوں۔ تم مجھے پچاس لاکھ کی ادائیگی کر دو یا پھر تم مجھے شوہر کے طور پر قبول کر لو.... میرا جب دل چاہے گا میں یہاں آجایا کروں گا اور جتنے دن چاہوں یہاں قیام کیا کروں گا.... ورنہ آج پھر اپنی اس بادشاہی کی تباہی کے لیے تیار ہو جاؤ...."

"تم اس رشتے کو شادی جیسا مقدس نام کیوں دے رہے ہو۔ سیدھی طرح کہو نا کہ تم مجھے داشتہ رکھنا چاہتے ہو...." زرتاج کے چہرے پر سرخی بڑھ رہی تھی۔

"تم جو چاہے سمجھ لو... بہرحال میں تو اس بندھن کو شریفانہ اور معززانہ شکل دینے کے لیے تیار ہوں...." جانو اس کے کچھ اور قریب آگیا۔

"بہت اونچے خواب دیکھتے ہو تم...." زرتاج گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی "تم میرے شوہر بننا چاہتے ہو' میں تو تمہیں زرتاج نگر میں گٹروں کی صفائی کے لیے بھی ملازم نہ رکھوں۔ اس کے لیے بھی میں کوئی تھوڑا بہت باکردار آدمی مقرر کرنا پسند کروں گی۔"

"اونچے خواب میں نہیں' تم دیکھتی ہو اسی لیے اب تک تنہا زندگی گزار رہی ہو۔ آخر میں تمہارا شوہر کیوں نہیں بن سکتا؟" جانو گویا تحمل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "کیا خرابی ہے مجھ میں؟ پڑھا لکھا ہوں.... دولت مند ہوں... بہت دور تک میری دہشت پھیلی ہوئی ہے... تمہیں ہر طرح سے خوش رکھ سکتا ہوں۔ تمہیں اور کیا چاہیے؟"

"پڑھ لکھ کر بھی اگر آدمی کو یہی کچھ بننا ہو جو تم بنے ہو تو پھر ان پڑھ تم سے لاکھ درجے بہتر ہیں۔" زرتاج نے جواب دیا۔

"اچھا.... اب باتیں بہت ہو چکیں۔ تم ہمارا مزید وقت ضائع نہ کرو۔ بات کو کسی کنارے لگاؤ...." پھر جیسے وہ کچھ سوچ کر بولا "میرے خیال میں تو سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ تم ہی میرے ساتھ چلو۔ اس طرح کسی کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ سب سکھ میں رہیں گے۔"

"کہاں لے چلو گے مجھے؟" زرتاج نے نہایت رسان سے پوچھا لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس کے چہرے کی سرخی بڑھتی ہی جارہی تھی۔

"تمہیں اس سلسلے میں کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہت ٹھکانے ہیں میرے۔" جانو شاہانہ انداز میں بولا "تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"کتنا خیال ہے تمہیں میرے آرام کا۔" زرتاج زہریلے لہجے میں بولی۔ اس کی آواز سانپ کی پھنکار سے مشابہ ہوتی جارہی تھی۔ لیکن جانو کو شاید اس کا احساس نہیں تھا۔ وہ زرتاج کی کلائی پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "آؤ میری جان! باتیں چھوڑو اور میرے ساتھ چلو...."

زرتاج اسے کلائی تھامنے کا موقع دیے بغیر ایڑی کے بل گھومی۔ دوسرے ہی لمحے جانو کے جبڑے پر ایسی لات پڑی کہ میرے اندازے کے مطابق اس کا جبڑا چٹخ گیا ہوگا یا اپنی جگہ سے ہل گیا ہوگا۔ وہ بری طرح لڑکھڑایا۔

اس لڑکی کو واقعی اپنی جان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ جانو کے ساتھیوں کا غیظ و غضب سے برا حال ہوگیا۔ یکدم انہوں نے زرتاج کے گرد گھیرا تنگ کرلیا اور ان چاروں کی کلاشنکوفوں کا رخ زرتاج کی طرف ہوگیا لیکن شاید وہ سردار کے اشارے کے بغیر ٹریگر نہیں دبا سکتے تھے۔ کم از کم زرتاج کو گولیوں سے چھلنی نہیں کرسکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کا سردار اس مجسم شعلے کو زندہ ہی قابو میں کرنے کے لیے کس طرح تڑپ رہا تھا۔ اس لیے وہ اب بھی ٹریگر دباتے دباتے رہ گئے لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ وہ خود پر مشکل سے قابو رکھے ہوئے تھے۔

تاہم زرتاج نے اپنی جان پر کھیل کر مجھے وہ موقع فراہم کر دیا تھا جس کا میں منتظر تھا۔ میں یہی چاہتا تھا کہ خواہ ایک لمحے کے لیے ہی سہی لیکن کلاشنکوفوں کا رخ کسی ایک طرف ہی ہو جائے۔ میرے لیے سب سے زیادہ وہ کلاشنکوف خطرناک تھی جس کا رخ ہی اس پردے کی طرف تھا جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ گو کہ اس کلاشنکوف والے ڈاکو کو یہ معلوم نہیں تھا لیکن جونہی میں پردہ ہٹاتا' ٹریگر دب سکتا تھا۔ اب کم از کم ایک آدھ لمحے کے لیے یہ خطرہ ٹل گیا تھا۔

زرتاج نے جانو کو کرانے کا جو داؤ دکھایا تھا اس سے سنبھلنے کے لیے اسے کئی سیکنڈ درکار تھے۔ وہ تو آدمی مضبوط تھا ورنہ شاید ڈھیر ہو چکا ہوتا۔ میں اسی لمحے پردے دونوں طرف ہٹا کر صوفے کے اوپر سے چھلانگ لگا چکا تھا جب کلاشنکوفوں کا رخ زرتاج کی طرف ہوا تھا۔

میں نے اس کلاشنکوف پر چھلانگ لگائی تھی جو عبدل کے ہاتھ سے نکلی تھی۔ اسے کسی نے اٹھانے کی زحمت نہیں کی تھی اور وہ مجھ سے قریب تھی۔ ڈاکوؤں کو فوراً ہی معلوم ہوگیا تھا کہ پردوں کے عقب سے کوئی 'چیز' تقریباً اڑتی ہوئی نکلی تھی لیکن اس سے پہلے کہ وہ میری طرف مڑتے اور مجھے صحیح طور پر دیکھ پاتے' میں کلاشنکوف اٹھاتے ہوئے کچھ اور آگے لڑھک چکا تھا۔

اب چاروں ہی ڈاکو بیک وقت میری طرف گھومے۔ میں نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ ان میں سے دو میری گن کی زد میں آچکے تھے۔ میں نے لیٹے ہی لیٹے برسٹ مارا۔ اگر مجھے ایک ثانیے کی تاخیر ہو جاتی تو وہ دونوں برسٹ مار چکے ہوتے۔ وہ دونوں آڑے ترچھے ڈھیر ہوگئے۔

باقی دونوں صرف اس لیے گولی چلانے میں ایک لمحے کے لیے جھجک گئے کہ ان کے اپنے ساتھی ان کی زد میں تھے۔ ان کی تو وہ رکاوٹ دور ہوگئی کیونکہ ان کے وہ دونوں ساتھی ڈھیر ہوگئے تھے لیکن میں اندھا دھند دوسرا برسٹ نہ مار سکا کیونکہ اس طرف زرتاج کے بھی گولیوں کی زد میں آنے کا اندیشہ تھا۔

میں نے باقی دنوں ڈاکوؤں کی متوقع فائرنگ سے بچنے کے لیے دوسری طرف لوٹ لگائی۔ اسی دوران زرتاج نے ایک اہم کام کر دکھایا۔ اس نے ایک ڈاکو کی کمر پر اتنے زور کی لات رسید کی کہ وہ قربانی کے بکرے کی طرح عین میرے سامنے آگیا۔ اس دوران اس کی کلاشنکوف نے گولیاں اگلیں لیکن گن کا رخ فرش کی طرف ہو چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ہلکا سا برسٹ مارا اور وہ بھی ڈھیر ہوگیا۔

اس کے ساتھ ہی میں لوٹ لگا کر ایک بار پھر اپنی جگہ سے ہٹ گیا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ میں اتنی پھرتی دکھانے میں کامیاب ہوگیا تھا کیونکہ جونہی میں اس جگہ سے ہٹا' وہاں برسٹ پڑا۔ میں بال بال بچا تھا۔ دوسری بار میں گن سیدھی نہیں کرسکا تھا کہ چوتھے ڈاکو نے گن کا رخ بدل لیا۔ اس بار یقیناً میں گولیوں کا نشانہ بن گیا ہوتا کیونکہ میں بروقت اپنی گن کو فائرنگ پوزیشن میں نہیں لا سکا تھا۔

اسی لمحے زرتاج کی ٹانگ ایک بار پھر حرکت میں آئی۔ اس نے نہایت حاضر دماغی کا مظاہرہ کیا تھا کہ ڈاکو کی کلائی پر اس طرح لات رسید کی تھی کہ کلاشنکوف اوپر کی طرف اچھلی۔ وہ گولیاں جو شاید میرے جسم میں پیوست ہوتیں' چھت میں لگیں۔ ایک فانوس کا تھوڑا سا حصہ ان کی زد میں آیا۔ کچھ پلستر اور شیشے کی کچھ کرچیاں نیچے گریں۔ تقریباً ان کے ساتھ ہی ڈاکو بھی فرش پر گرا کیونکہ اس دوران میں برسٹ مارنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

جانو کی طرف سے میں اس دوران اس لیے تین چار سیکنڈ بے فکر رہا تھا کہ جب زرتاج نے اس کے جبڑے پر لات رسید کی تھی تو اس کے لڑکھڑانے کے دوران اس کے کندھے سے گن گر چکی تھی۔ میں نے یہ خیال تو رکھا کہ اس دوران وہ گن اٹھانے کے لیے نہیں جھکا تھا۔ بازی یوں یکدم الٹتی دیکھ کر وہ شاید بدحواس ہوگیا تھا۔

لیکن جب تک میں چوتھے ڈاکو سے نمٹنے میں کامیاب ہوا'

اس دوران وہ سنبھل کر ایک کام دکھانے میں ضرور کامیاب ہوگیا۔ زرتاج جس نے اپنی حاضر دماغی سے مجھے تو چوتھے ڈاکو کی فائرنگ سے بچالیا تھا' وہ خود اپنا خیال نہ رکھ سکی۔ وہ عین جانو کے سامنے آگئی۔

جانو نے لپک کر اس کی گردن بازو کے شکنجے میں کستے ہوئے اور اس کا بازو مروڑ کر پُشت پر لاتے ہوئے اسے قابو میں کرلیا۔ اس نے زرتاج کو اپنی ڈھال بنالیا تھا۔ میں اس پر گولی نہیں چلا سکتا تھا۔ اگر اس کے جبڑے پر پڑنے والی لات نے اس کا دماغ نہ ہلایا ہوتا تو شاید اس دوران وہ کوئی اور خطرناک کام دکھا چکا ہوتا۔ آدمی وہ بہرحال خاصا خطرناک اور طاقتور تھا۔

"گن پھینک دو... ورنہ میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا...." وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں چلّایا۔ مجھے اندازہ ہوچکا تھا کہ زرتاج آسانی سے اس کے قابو میں آنے والی چیز نہیں تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ بہت بری طرح پھنس گئی تھی اور اس کے شکنجے میں آگئی تھی۔ سرِدست تو وہ بے بس ہی معلوم ہو رہی تھی۔ جانو نے اپنی دھمکی سچ کر دکھانے کے لیے زرتاج کے گلے پر بازو کا دباؤ کچھ بڑھا دیا۔ زرتاج کی آنکھیں حلقوں سے باہر آنے لگیں۔

میں نے گن فوراً پھینک دی اور آہستگی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ جانو کی آنکھوں میں وحشت تھی جو اس کی بدحواسی کی نشاندہی کرتی تھی۔ میں نے اپنی مُرتعش سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "جس پر قربان ہوئے جارہے تھے' اسی کو ڈھال بنالیا... لعنت ہے تمہاری زندگی پر....."

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جذباتی باتوں میں اُلجھنے کا قائل معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ بدستور زرتاج کو ڈھال بنائے ذرا سا گھومتے ہوئے دھیرے دھیرے دروازے کی طرف کھسکنے لگا۔ عجیب بات تھی کہ کمرے میں کئی کلاشنکوفیں بکھری ہوئی تھیں اور کسی طرف ایک پستول بھی پڑا تھا لیکن ہم میں سے کوئی ان میں سے ایک گن بھی نہیں اٹھا سکتا تھا۔

"تمہارا خیال ہے' تم اسی طرح زرتاج کو ڈھال بنائے اتنی بڑی حویلی میں سے زندہ سلامت گزر جاؤ گے؟" میں نے اپنی دانست میں اسے باتوں میں لگا کر اس کے ساتھ ساتھ دھیرے دھیرے خود بھی دروازے کی طرف کھسکنے کی کوشش کی لیکن اسے اس کا احساس ہوگیا۔

وہ اسی وحشت زدہ انداز میں پھٹی پھٹی سی آواز میں چلّایا۔ "تم آگے مت بڑھو.... وہیں کھڑے رہو.... ورنہ...." اس نے زرتاج کی گردن کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ زرتاج اس عالم میں بھی یقیناً پوری کوشش کررہی تھی کہ اس کے چہرے سے اذیّت کا اظہار نہ ہونے پائے لیکن میرے لیے اس کی کیفیت کا اندازہ کرنا مشکل نہ تھا۔ جانو نے اسے تقریباً میری ہی تکنیک سے دبوچ رکھا تھا اسی لیے وہ بے بس نظر آرہی تھی۔

میں اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔ جانو کا واکی ٹاکی بھی گر گیا تھا لیکن اس نے اسے بھی اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میری نظراس پر جمی ہوئی تھی اور میں کوشش کررہا تھا کہ پلک بھی نہ جھپکوں۔ اس قسم کی صورت حال میں اگر کوئی موقع میسّر آتا بھی ہے تو وہ بس کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے کہ پلک جھپکتے میں ہی کچھ کرکے دکھانا ہوتا ہے۔

جانو لاشوں سے بچتا ہوا دروازے کی طرف کھسکتا جارہا تھا۔ اگر کمرا اتنا طویل و عریض نہ ہوتا تو شاید کسی لاش میں ہی اس کا پاؤں اُلجھنے کی امید رکھی جاسکتی۔

وہ اس وقت دروازے کے کافی قریب پہنچ چکا تھا جب قسمت نے مجھے وہ موقع فراہم کیا جس کی امید لیے میں اس پر نظر جمائے کھڑا تھا۔ مجھے بھی نہیں معلوم تھا اور جانو نے بھی یقیناً نہیں دیکھا تھا کہ عبدل جب گولی کھا کر گرا تھا تو اس کی پگڑی سر سے اتر گئی تھی اور کھل کر ذرا دور تک پھیل گئی تھی۔

جانو کا پاؤں نہایت معمولی حد تک اس میں اُلجھا لیکن وہ چونکہ وحشت زدہ تھا' ایک لمحے کے لیے ٹھٹک سا گیا اور شاید اسی لمحے زرتاج کی گردن پر اس کے بازو کا شکنجہ ذرا ڈھیلا پڑ گیا۔ زرتاج نے اس موقعے سے فائدہ اٹھانے میں کمزوری نہیں دکھائی۔ اس نے ذرا سا جھکتے ہوئے یکدم جانو جیسے بھیم تحیم شخص کو پشت پر اٹھاتے ہوئے سامنے کی طرف اچھال دیا۔

جانو لاشوں کے درمیان دبیز قالین پر آکر گرا۔ میں نے فوراً اس پر چھلانگ لگائی۔ اس کوشش میں مجھے چوٹ بھی لگی کیونکہ اس نے اسی لمحے گھٹنے موڑ لیے تھے اور میں گھٹنوں پر ہی گرا تھا لیکن میں نے چوٹ کی پروا نہیں کی اور اس کی گردن دبوچنے کی کوشش کی۔

میں اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ اس نے مجھے گھٹنوں پر اچھال دیا لیکن میں دور جاکر نہیں گرا' اس کے قریب ہی لُڑھک گیا۔ ہم دونوں بیک وقت ہی اٹھے۔ شاید یہ جانو کی غلطی تھی کہ وہ ایک کلاشنکوف اٹھانے کے لیے لپکا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی۔ جس نفرت سے میں نے اسے وہ ٹھوکر رسید کی اس سے میرے خیال میں اس کی ایک آدھ پسلی تو ٹوٹ کر پھیپھڑے میں گھس جانی چاہیے تھی۔

جسیم ہونے کے باوجود وہ اس ٹھوکر سے خاصا اچھلا اور کچھ دور جاگرا لیکن زخمی چیتے کی طرح فوراً ہی تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ بدبخت عیاش اور شرابی ہونے کے باوجود خاصا طاقتور اور پھرتیلا تھا۔ اس بار وہ کوئی گن اٹھانے کے لیے نہیں جھپٹا بلکہ کسی غضبناک سانڈ کی طرح اس نے مجھے ٹکر رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں نے جھکائی دے کر بچتے ہوئے اس کی پیٹھ پر لات رسید کی۔

وہ اپنی جھونک میں ایک صوفے سے جا ٹکرایا۔ صوفہ نہایت وزنی ہونے کے باوجود اُلٹ گیا اور اس نے میرا کام کافی آسان کر دیا کیونکہ جانو کے جسم کا کچھ حصہ اس کے نیچے دب گیا۔ گوکہ وہ جسم کو جھٹک کر کافی تیزی سے اس کے نیچے سے نکل آیا تھا لیکن اس وقت تک میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ وہ پہلی سی پھُرتی کا مظاہرہ نہ کرسکا۔ میں نے اس کے منہ پر پوری قوت سے گھونسا رسید کیا۔

اگر زرتاج کی لات سے کوئی کسر رہ گئی تھی تو میرے گھونسے سے پوری ہوجانی چاہیے تھی اور اس کا جبڑا کم از کم اب تو ٹوٹ جانا چاہیے تھا۔ وہ اسی اُلٹے ہوئے صوفے پر سے اُلٹ کر دوسری طرف واپس جاگرا۔ میرا خیال تھا' وہ اب نہیں اٹھے گا لیکن وہ بدبخت پھر اٹھ کھڑا ہوا البتہ اب اس کے حواس یقیناً مختل ہوچکے تھے کیونکہ اب اس کے اٹھنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے اسے کچھ نظر نہ آرہا ہو۔

میں صوفے کو پھلانگ کر دوبارہ اس کے سر پر پہنچ چکا تھا۔ اس نے اناڑیوں کی طرح دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر گویا مجھے روکنے کی کوشش کی۔ میں نے جھک کر یک دم ہی اسے دونوں ہاتھوں پر اٹھالیا۔ اب تک میں نے اپنی حرکات و سکنات پر پوری طرح قابو رکھا تھا اور اپنے اوسان مجتمع رکھتے ہوئے نہایت نپے تلے انداز میں ہر کام کیا تھا لیکن اس لمحے یک لخت ہی گویا مجھے اپنے آپ پر اختیار نہ رہا۔ میرے اندر گویا غیظ و غضب کا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا۔

میں نے پہلی بار جب اسے دیکھا تھا اور اس نے میرے ساتھ جو سلوک کرایا تھا' اس وقت سے اب تک میرے دل میں قطرہ قطرہ جو نفرت جمع ہو رہی تھی وہ گویا پٹرول کا ذخیرہ بن گئی اور اسی لمحے اسے گویا کسی نادیدہ ہاتھ نے تیلی دکھادی۔ ایک لمحے کے لیے میں اپنے ہوش و حواس میں نہ رہا۔ میں نے اسے یونہی اٹھائے اٹھائے گھمایا اور کسی چھوٹے موٹے شہتیر کی طرح دیوار پر دے مارا۔

وہ دھم سے نیچے گرا۔ ذبح ہونے والی مرغی کی طرح ایک لمحے کے لیے پھڑکا اور ساکت ہوگیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میں نے اسے دیوار پر نہیں' ایک کھڑکی میں دے مارا تھا۔ وہی کھڑکی جس میں کچھ دیر پہلے زرتاج کھڑی باہر دیکھ رہی تھی۔ اس کھڑکی میں موٹی موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور جانو سر کے بل ان سلاخوں سے جاکر ٹکرایا تھا۔ اس کی کھوپڑی کسی تربوز کی طرح چیخ گئی تھی اور دو تین جگہ سے پچک گئی تھی۔ گاڑھا گاڑھا مواد آمیز سا خون اس کے بالوں کے درمیان سے پھسلتا باہر آنے لگا تھا۔

میں نے گھوم کر زرتاج کی طرف دیکھا۔ وہ ابھی تک ایک ہاتھ سے اپنی گردن مسل رہی تھی اور دوسرے بازو کو جھٹکے دے رہی تھی۔ اس کی گردن سرخ اور چہرہ کچھ متورم سا نظر آرہا تھا۔ میں لپک کر اس کے پاس پہنچا۔

"تم ٹھیک تو ہو نا؟" میں نے اس کا بازو تھامتے ہوئے تشویش سے پوچھا۔

"ہاں.... ٹھیک ہی ہوں...." اس نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں جواب دیا اور مسکرانے کی کوشش کی۔ "البتہ میرا یہ بازو چند سیکنڈ اور اس کی گرفت میں رہتا تو شاید میرا کندھا اتر جاتا۔" وہ بازو کو بدستور جھٹکے دیتے ہوئے بولی۔ "اور شاید گردن کا منکا بھی ٹوٹ جاتا۔"

پھر وہ گہری سانس لے کر آگے بڑھتی ہوئی بولی "کیا یہ خبیث مرگیا؟"

"اگر اب بھی نہ مرا ہو تو میں اسے کوئی مافوق الفطرت مخلوق ہی سمجھوں گا۔" میں نے کہا۔

ہم دونوں جانو کے قریب آکھڑے ہوئے جو قالین پر چت پڑا تھا۔ اس کی شکل بری طرح مسخ ہوگئی تھی۔ وہ کافی ڈراؤنا لگ رہا تھا حالانکہ خوش شکل آدمی تھا۔ اس کے نتھنوں سے بھی خون بہہ رہا تھا اور کھوپڑی تو پوری ہی سرخ سے ملغوبے میں لتھڑ چکی تھی۔ اس کا سینہ ساکت دکھائی دے رہا تھا۔ سانسوں کے زیر و بم کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔

"میرا اسے چھونے کو دل نہیں چاہ رہا.... ورنہ میں اس کی نبض دیکھنے یا دل کی دھڑکن سننے کی کوشش کرتی..." ایک لمحے کی خاموشی کے بعد زرتاج بولی۔ اس کے لہجے میں اب بھی نفرت تھی۔ "لیکن.... میرا خیال ہے یہ مر ہی چکا ہے...." جانو کی موت کے بعد بھی زرتاج کے لہجے میں نفرت کم نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں۔" میں نے بھی جانو کو چھوئے بغیر وثوق سے جواب دیا "یہ واقعی مرچکا ہے۔"

تب گویا زرتاج پر یکدم ہی تھکن نے غلبہ پالیا۔ وہ قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھ گئی اور تھکے تھکے سے انداز میں پشتے سے ٹیک لگالیا۔ کمرا عجیب ہی منظر پیش کررہا تھا۔ پانچ لاشیں ادھر اُدھر آڑی ترچھی پڑی تھیں' جگہ جگہ خون پھیلا نظر آرہا تھا۔ گوکہ قالین رنگین اور دبیز تھا' خون اس میں تیزی سے جذب ہوچکا تھا' اس کے باوجود گہرے گہرے گیلے داغ نظر آرہے تھے۔

میں بھی زرتاج کے قریب جا بیٹھا۔ چند لمحے کے لیے میرے اعصاب کو بھی سکون کی ضرورت تھی۔ زرتاج گہری سانس لے کر بولی "حد سے زیادہ فرعونیت پر اُتر آنے والوں کی کہانی کبھی کبھی یوں صرف چند لمحوں میں ختم ہوجاتی ہے۔"

"ہاں.... لیکن باقی فرعون اس سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

دفعتاً اس نے گردن موڑ کر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اب وہ گویا ایک نئے ہی زاویۂ نظر سے میرا جائزہ لے رہی تھی۔ پھر وہ دھیمی سی آواز میں بولی۔ "تم یقیناً ایک غیر معمولی شخص ہو۔ تمہارے اندر بھی کوئی شیطانی روح مقید ہے۔"

"شیطانی....؟" میں نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ "یہ شبہ آپ کو کیونکر ہوا؟"

"جس سفاکی سے تم نے جانو کو اٹھا کر ایک کھلونے کی طرح

ایک کھڑکی سے دے مارا' مجھے اس پر یقین نہیں آرہا۔ اس وقت میں نے ایک لمحے کے لیے تمہارا چہرہ دیکھا تھا۔ میں نے زندگی میں ایسی سفاکی شاید کسی انسان کے چہرے پر نہیں دیکھی.....'' اس نے خفیف سی جھرجھری لی۔

فرعونوں سے نمٹنے کے لیے ایسی ہی سفاکی کی ضرورت ہوتی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''جس کے دل میں فرعونوں کے لیے بھی نرم گوشہ ہوگا' وہ طاقت ور ہونے کے باوجود اس سے نہیں نمٹ سکتا.....''

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میرے اندر جو روح مقیّد ہے' اسے آپ شیطانی ہرگز نہیں کہہ سکتیں۔ وہ تو ایک شریف روح ہے۔ اس سے آج تک کسی شریف آدمی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔''

''لیکن فرعون صفت لوگ ضرور انجام کو پہنچے ہیں؟'' اس نے تصدیق چاہی۔

''ہاں۔'' میں نے انکار نہیں کیا۔

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر بولی۔ ''ٹھیک ہے..... میں اپنے وہ 'شیطانی روح' والے الفاظ واپس لیتی ہوں۔''

''شکریہ۔'' میں نے گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے نہایت شائستگی سے کہا۔

اچانک وہ چونکی اور جھرجھری سی لے کر یکدم اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''اف..... خدایا.....! ہم تو یوں آرام سے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے ہیں گویا پکنک پر آئے ہوئے ہیں۔ ہمیں حویلی کے محافظوں کی خبر لینی چاہیے۔ معلوم نہیں وہ زندہ بھی ہیں یا مر گئے..... اور ہاں..... جانو نے کہا تھا کہ اس کے آدمیوں نے حویلی کو بھی گھیرے میں لے رکھا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے اس کی بات کا کچھ زیادہ یقین نہیں لیکن ہمیں بہرحال محتاط رہنا چاہیے۔ اگر باہر واقعی آدمی موجود ہیں تو فائرنگ کی آوازیں یقیناً ان تک پہنچ چکی ہوں گی اور وہ صورت حال کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔''

زرتاج نے جھک کر ایک کلاشنکوف اٹھالی۔ میں نے دوسرے ڈاکو کی گن اٹھالی اور اٹھ کھڑا ہوا۔

''اس وقت اگر ہمارے پاس دور مار رائفلیں موجود ہوتیں تو اچھا تھا۔'' میں نے کہا۔

''میرے پاس تہ خانے میں چند رائفلیں موجود ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔'' وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

''اس طرح یکدم منہ اٹھا کر باہر نہ نکلیں.....'' میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے روک لیا۔ ''اور پہلے اس کمرے کی بتیاں بجھا دیں۔''

وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹکی پھر اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ اندھیرے میں ہم دونوں شانہ بشانہ کمرے کے دروازے تک پہنچے

''رکوع کی سی حالت میں چوکھٹ سے لگ کر باہر نکلیں اور نکلتے ہی پہلے چند لمحے کے لیے دیوار سے لگ کر صورت حال کا جائزہ لیں۔'' میں نے سرگوشی میں اسے ہدایت کی۔

یہ احتیاط ہمارے کام آگئی اور یہ بھی ہماری خوش قسمتی ہی تھی کہ ہم بڑے صحیح وقت پر کمرے سے نکل آئے تھے۔ اگر ہم صرف چند لمحے وہیں بیٹھے رہتے تو نہ جانے ہمارا کیا انجام ہوتا۔

باہر نکلتے ہی ہم کمرے کی دیوار سے چپک گئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے زرتاج میری ہدایت کے بغیر ہی گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی تقلید کی۔ میں نے بھی ملگجے اندھیرے میں چند سائے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ لیے تھے۔ میں اور زرتاج اس وقت برآمدے میں تھے جو ذرا اونچا تھا۔ دو سیڑھیاں چڑھ کر اس میں قدم رکھا جاتا تھا۔

اس وقت حویلی کی شاید سبھی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ ہر طرف پُراسرار' ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا جو اپنے دامن میں نہ جانے کیا کچھ چھپائے ہوئے تھا۔ نشیب میں وہ سات آٹھ سائے تھے جو آہستگی سے کمرے کی طرف بڑھ رہے تھے لیکن کمرے کی بتیاں بجھنے کے بعد شاید انہیں کسی گڑبڑ کا احساس ہوگیا تھا۔ انہوں نے بکھرنا شروع کردیا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب وہ سیدھے دروازے کی طرف آنے کے بجائے چاروں طرف سے کمرے کو گھیرے میں لینا چاہتے تھے۔

''کیا یہ آپ کے آدمی ہیں؟'' میں نے سرگوشی میں زرتاج سے پوچھا۔

''نہیں۔ میں ہیولے دیکھ کر ہی بتا سکتی ہوں کہ یہ میرے آدمی نہیں ہیں۔ ویسے بھی انہیں اس طرح کمرے کی طرف بڑھنے کی کیا ضرورت تھی؟'' زرتاج نے سرگوشی میں ہی جواب دیا۔

''تو پھر بے دریغ انہیں اُڑا دینا چاہیے۔'' میں نے بلا تامل کہا۔ ''اگر یہ حویلی میں اِدھر اُدھر بکھر گئے اور اِدھر اُدھر عمارت کی آڑ لے کر مورچہ بند ہوگئے تو ہمارے لیے ان سے نمٹنا مشکل ہوجائے گا۔''

سائے رکوع کی سی حالت میں اِدھر اُدھر بڑھ رہے تھے۔ میری اور زرتاج کی کلاشنکوفیں بیک وقت گرجیں اور یہ سائے تقریباً ایک ساتھ ہی اِدھر اُدھر لڑھک گئے۔ کوئی ہوا میں اچھلا' کوئی لہرایا اور کوئی جہاں کا تہاں ڈھیر ہوگیا۔ فضا میں گھُٹی گھُٹی دو تین چیخیں بھی ابھریں۔ اس کے بعد گہرا سکوت چھا گیا۔ موت جیسے بار بار اس خوب صورت حویلی میں بھیانک قہقہہ بلند کرتی تھی' کچھ لوگوں کا لہو چاٹتی تھی اور اس کے بعد سکوت چھا جاتا تھا۔

''کیا یہ سب مر گئے ہوں گے؟'' زرتاج نے عجیب سادگی اور معصومیت سے پوچھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا کہ جیسے ہم نے کلاشنکوفوں سے گولیاں نہیں برسائی تھیں' کھلونے چلائے تھے۔

''انشاء اللہ۔'' میں نے خلوص سے جواب دیا۔

کافی دیر تک ہم دبکے رہے لیکن ہمیں کہیں اور کسی قسم کی نقل و حرکت کے آثار دکھائی نہیں دیے۔ ہم نے برآمدے کے کونے سے جھانک کر اِدھر اُدھر دیکھا' ہر طرف سکوت تھا۔

''میرا خیال ہے' اب ادھر کی بتیاں روشن کردی جائیں۔'' زرتاج مشورہ طلب انداز میں بولی۔

''نہیں۔'' میں نے اسے روکا۔ ''اندھیرے میں ہی باہر چل کر دیکھتے ہیں کہ کیا صورت حال ہے۔''

وہاں اندھیرا کچھ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں آسانی سے کافی دور تک کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ مجھے روشنی کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ میں اس سے گہرے اندھیرے میں بھی خاصی دور تک کی چیزیں دیکھ لیتا تھا اور اندھیرے میں ہی اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتا تھا۔ کسی خطرناک صورت حال میں روشنی میں پہنچتے ہی مجھے کچھ ایسا احساس ہوتا تھا جیسے میں کسی کے لیے آسان ہدف بن گیا ہوں۔

برآمدے سے نیچے اترنے سے پہلے ہم نے احتیاطاً کمروں کے گرد ایک چکر لگایا تاکہ چاروں طرف کا کچھ اور بہتر طور پر جائزہ لے سکیں۔ اسی دوران ایک کمرے سے گھگھیاہٹ آمیز سی کچھ گھُٹی گھُٹی آوازیں سنائی دیں۔ باہر سے اس کمرے کے بولٹ چڑھے ہوئے تھے۔

زرتاج اس کے سامنے رکتے ہوئے بولی۔ ''اس میں یقیناً گھریلو ملازم اور ملازمائیں بند ہیں۔''

اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا تو کمرے میں بیک وقت کئی خوفزدہ سی آوازیں بلند ہوئیں۔ کمرے کے اندر بھی اندھیرا ہی تھا۔

''ڈرو مت۔ یہ میں ہوں۔'' زرتاج نے کمرے میں جھانکتے ہوئے نہایت نیچی آواز میں کہا۔ وہ کمرا چھوٹا سا تھا لیکن اس میں بہت سے افراد بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔

''رئیسانی جی! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے آپ خیریت سے ہیں.....'' کسی عمر رسیدہ مرد نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''یہ سب کیا ہورہا ہے؟''

''کچھ نہیں..... بس ذرا حویلی میں کچھ ڈاکو گھس آئے تھے..... وہ سب مارے جاچکے ہیں۔'' زرتاج نے بے پروائی سے جواب دیا۔ ''تم لوگ اپنے اپنے ٹھکانے پر جاؤ۔ ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ جس جس کو جو ہتھیار مل سکے وہ اپنے ساتھ رکھے..... اور ہاں..... خیال رہے..... ڈرائنگ روم میں اور باغیچے کے قریب احاطے میں کچھ لاشیں بکھری پڑی ہیں..... فی الحال کوئی انہیں ہاتھ نہ لگائے۔''

''رئیسانی جی! ہمیں تو عبدل نے دھوکے سے یہاں لا کر بند کردیا تھا۔'' ایک اور شخص نے گویا صفائی پیش کی۔

''کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں۔'' زرتاج نے گویا انہیں

تسلی دی۔ "عبدل بھی مردکا ہے۔" پھر آگے بڑھنے سے پہلے وہ بولی۔ "کوئی بتی نہ جلائے ٹارچیں وغیرہ تلاش کرو۔ اگر زیادہ ہی ضرورت پڑے تو ان سے کام چلانے کی کوشش کرنا۔ میں اور افضل خان حالات کا جائزہ لینے باہر جا رہے ہیں۔"

ہم دروازہ کھلا چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف چل دیے۔ راستے میں زرتاج بولی۔ "یہ سب بے چارے گھریلو قسم کے کام کاج کرنے والے سیدھے سادے لوگ ہیں۔ انہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ڈاکو اس حویلی میں بھی گھس سکتے ہیں۔"

ہم ابھی سیڑھیوں سے اترے ہی تھے کہ دور کہیں یکدم خوفناک فائرنگ شروع ہو گئی۔ ہم دونوں ہی ٹھٹک کر رہ گئے۔

"یہ آوازیں تو گاؤں کی طرف سے آرہی ہیں۔" زرتاج بولی لیکن اس کے لہجے میں کچھ زیادہ تشویش نہیں تھی۔

"میرا خیال ہے جانو ٹھیک ہی کہہ رہا تھا....." میں نے کہا۔ "اس نے حویلی کے باہر بھی آدمی کھڑے کیے ہوئے تھے اور شاید گاؤں کو بھی کچھ لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ انہیں چونکہ بہت دیر سے سگنل نہیں ملا اور انہوں نے حویلی کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں بھی سنی ہوں گی۔ انہوں نے اندازہ لگایا ہو گا کہ حویلی میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے لہٰذا انہوں نے اب جانو کے بغیر ہی گاؤں پر حملہ کر دیا ہے....."

"تمہارا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔" زرتاج بولی۔

"ہمیں جلدی ان کی مدد کو پہنچنا چاہیے.... ڈاکو کہیں بے گناہ اور سیدھے سادے، نہتے دیہاتیوں کا قتلِ عام نہ شروع کر دیں۔ ہم جس حد تک بھی انہیں روک سکتے ہوں، چل کر روکنے کی کوشش کریں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

زرتاج غالباً میرے لہجے کی تشویش کو محسوس کرتے ہوئے بولی۔ "تمہیں زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ڈاکو نہ تو آسانی سے گاؤں میں گھس سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی بڑی کارروائی کر سکتے ہیں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے جانو کے تیور دیکھتے ہوئے کافی عرصے سے خطرہ تھا کہ گاؤں میں بھی اس قسم کی کوئی صورت حال پیش آسکتی ہے اور ڈاکو عام طور پر وار کرنے..... کسی بستی والوں کو ستانے یا انتقام لینے کے لیے یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں کہ شب خون مارنے کے انداز میں حملہ کرتے ہیں..... گھروں اور کھلیانوں کو آگ لگاتے ہیں، لوگوں کو قتل کرتے ہیں۔ کئی دیہات اور قصبوں وغیرہ میں ایسا ہو چکا ہے۔ چنانچہ میں نے احتیاطاً نہایت خاموشی سے گاؤں کی حفاظت کا ایک نظام ترتیب دیا تھا۔ گاؤں میں چاروں طرف چند خاص خاص مکانات منتخب کیے گئے تھے جن کی چھتوں پر مورچے بھی لگے ہوئے ہیں اور وہاں کے مردوں کو اسلحہ بھی فراہم کیا گیا تھا۔ وہ لوگ باری باری، ایک ایک رات چھت پر پہرا دیتے ہیں اور ارد گرد نقل و

حرکت پر نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا آج ڈاکوؤں کو منہ توڑ جواب ملے گا اور وہ گاؤں میں داخل نہیں ہو سکیں گے۔ جو لوگ پہرے پر ہوں گے وہ تو مقابلہ کر ہی رہے ہوں گے لیکن جن لوگوں کی آج پہرے کی باری نہیں ہو گی وہ بھی مکانوں کے اندر ہی اندر ان کی مدد کو پہنچ جائیں گے....."

پھر وہ ایک لمحے کے لیے کان لگا کر سننے کے بعد بولی۔ "ذرا غور سے سنو..... تمہیں اندازہ ہو جائے گا کہ فائرنگ دو طرفہ ہو رہی ہے۔"

"ہاں..... مجھے اندازہ ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔ "کتنے افسوس کی بات ہے، ہم اپنے ہی ملک میں بعض مقامات پر تو گویا حالتِ جنگ میں زندگی گزار رہے ہیں۔"

"اس میں کیا شک ہے۔" ایک لمحے کے لیے اس کے لہجے میں بھی افسردگی جھلک آئی لیکن پھر وہ سر جھٹکتے ہوئے بولی۔ "بہرحال..... ہم ان کی مدد کے لیے ضرور چلیں گے۔ مجھے امید ہے کہ ہم دونوں کے جانے سے کافی فرق پڑ جائے گا۔"

"یقیناً۔" میں نے وثوق سے کہا۔ "لیکن کم از کم دو عدد دور مار رائفلیں اور کافی مقدار میں ایمونیشن ضرور ساتھ لے لیں۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میرے ساتھ آؤ....." وہ تیزی سے واپس پلٹی۔ ہم دوبارہ برآمدے میں آئے اور ایک راہداری میں دوڑتے ہوئے عمارت کی پچھلی طرف پہنچے۔ یہاں ایک جگہ سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔

ہم تیزی سے نیچے پہنچے۔ تہ خانے میں پہنچ کر زرتاج نے بتی جلائی۔ وہ ایک طویل و عریض تہ خانہ تھا اور پورا کا پورا مختلف قسم کے ساز و سامان سے بھرا ہوا تھا۔ اس کے ایک حصے میں گویا اسلحے کا "شعبہ" قائم تھا۔ اس طرف شیلفوں میں کئی طرح کی عمدہ گنیں بھری ہوئی تھیں۔ ایمونیشن کے کارٹن موجود تھے۔ ایک شیلف میں نیاموں سمیت کچھ خنجر بھی تھے۔ حتیٰ کہ ایک الماری میں کچھ تلواریں بھی لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ شاید پرانے وقتوں کی یادگاریں تھیں۔

ہم نے دو لمبی رینج کی رائفلیں منتخب کیں۔ ایک بیگ کو جھاڑ کر جلدی جلدی اس میں کچھ تیار میگزین اور گولیاں بھریں اور دوڑتے ہوئے واپس آئے۔ زرتاج لمبے چوڑے ڈرائیو وے میں کھڑی ایک سیاہ پجیرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس میں چلتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے....." میں نے سر ہلایا۔ "آپ ڈرائیو کریں اور ہیڈ لائٹس آف ہی رہنے دیں۔ جو پگڈنڈی عام طور پر آمد و رفت کے لیے استعمال ہوتی ہے اس راستے سے مت چلیے گا، جدھر سے میں کہوں اُدھر سے چلیے گا۔"

"یس سر!" اس نے ایک لمحے کے لیے رک کر باقاعدہ مجھے سیلوٹ کیا۔ "اس وقت کمانڈنگ آفیسر آپ ہیں۔ میں آپ کی ہدایات پر عمل کروں گی۔ علاقہ میرا ہے لیکن بہتر جرنیل آپ ہیں۔"

میں نے مسکرانا چاہا لیکن مسکرا نہ سکا۔ فائرنگ کی آوازوں سے بدستور سکوتِ شب درہم برہم تھا۔ ہمارے پاس جو دو کلاشنکوفیں پہلے سے موجود تھیں ہم نے وہ بھی گاڑی میں رکھ لیں۔ زرتاج نے بڑا سا ایک خنجر بھی ساتھ لے لیا تھا۔ زرتاج نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم ہیڈ لائٹس آن کیے بغیر حویلی سے باہر آگئے۔ بلند و بالا چوبی گیٹ کھلا پڑا تھا۔

باہر گیٹ کے قریب لمبی چوڑی، بھاری بھرکم چارپائی پر چاروں گارڈ اوندھے سیدھے پڑے تھے۔ زرتاج نے گاڑی چارپائی کے قریب روک لی اور اتر گئی۔ میں بھی اس کے ساتھ اتر گیا اور محافظوں کا جائزہ لینے لگا۔ وہ بے ہوش تھے لیکن زندہ تھے۔ ان کی گنیں غائب تھیں۔ چارپائی کے قریب ہی ایک تپائی پر چائے کے برتن بکھرے ہوئے تھے۔ بے ہوشی کے بعد محافظوں کے ہاتھ پاؤں بھی باندھ دیے گئے تھے۔ جانو کے لیے یہ خدمت عبدل نے انجام دی تھی۔

زرتاج نے خنجر سے ان کی بندشیں کاٹ دیں۔ وہ چار محافظ تو اسی چارپائی پر گیٹ کے پاس ہی موجود رہتے تھے۔ دو تین محافظ اور بھی تھے جو حویلی کے گرد گشت کرتے رہتے تھے۔ ان میں سے کبھی کوئی آرام کے لیے چلا جاتا اور کبھی کوئی۔ بہرحال چار پانچ افراد تقریباً ہر وقت ڈیوٹی پر موجود رہتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ باقی دو تین بھی حویلی کی دیواروں کے آس پاس ہی کہیں لڑھکے پڑے ہوں گے۔

"شکر ہے ان منحوسوں نے اس عالم میں انہیں ہلاک نہیں کیا۔" زرتاج ان سب کو وہیں چھوڑ کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے بولی۔

"اس کا ارادہ پہلے آپ سے جواب لینے کا تھا۔" میں نے اسے یاد دلایا۔ "یہ یقین ہونے کے بعد..... کہ آپ اس کا کوئی مطالبہ نہیں مانیں گی..... وہ کشت و خون کا بازار گرم کر دیتا۔ اس کے اندر کا درندہ آج پوری طرح بیدار تھا۔"

"حد سے زیادہ تند خو درندے اکثر اسی طرح موت کے گڑھے میں جاگرتے ہیں۔" وہ بے پروائی سے بولی۔ "وہ مجھے شاید کوئی گائے بھینس سمجھتا تھا کہ جب جی چاہے گا' رسّی گلے میں ڈال کر کھینچتا ہوا لے جائے گا۔ میں ہی اس علاقے میں اس کے راستے میں سب سے بڑی دیوار بھی تھی ورنہ باقی سب زمینداروں میں سے کچھ کو تو اس نے نکیل ڈال رکھی تھی اور کچھ سے گٹھ جوڑ کر رکھا تھا۔ اب وہ مجھے سرنگوں کرنا چاہتا تھا۔"

"بے چارے کی بازی بالکل ہی اُلٹ گئی۔" میں نے کہا۔ "ادھر اس کے ساتھیوں نے بھی گاؤں کو بالکل مفتوحہ علاقہ سمجھ کر گھسنے کی کوشش کی ہوگی تو گولیوں نے ان کا استقبال کیا ہوگا۔"

"شکر ہے میں نے رات کی چوکیداری کے اس منصوبے کی خبر عام نہیں ہونے دی تھی۔ عبدل کو تو بالکل پتا نہیں تھا ورنہ یہ اطلاع بھی بانو کو پہنچ چکی ہوتی۔" زرتاج بولی۔ وہ ایک پرچھائیں کی طرح میرے برابر بیٹھی تھی اور ہم گھنے درختوں کے درمیان ایک اور ہی ناہموار راستے سے گاؤں کی طرف جارہے تھے۔ میری کوشش تھی کہ کسی بھی کمین گاہ میں موجود کوئی بھی ڈاکو ہماری گاڑی کو آتے نہ دیکھ سکے۔ ویسے اس کا خطرہ کم ہی تھا کیونکہ گاڑی کا رنگ سیاہ تھا اور وہ اندھیرے میں تو کچھ فاصلے سے مشکل سے ہی نظر آسکتی تھی۔ اس کے انجن کی آواز بھی برائے نام تھی۔ فائرنگ کی آواز لحظہ بہ لحظہ قریب آتی جارہی تھی۔

درختوں کا سلسلہ ختم ہونے لگا تو میں نے کہا۔ "بس..... گاڑی یہیں روک دیجئے۔ باقی فاصلہ ہم پیدل طے کریں گے۔ اس دوران شاید کچھ اندازہ ہوجائے کہ ڈاکو کہاں کہاں چھپے ہوئے ہیں۔"

زرتاج نے گاڑی روکی ہی تھی کہ ایک زوردار چھناکا ہوا اور زرتاج یکدم مجھ پر آن گری۔

میں نے بوکھلا کر اندھیرے میں زرتاج کو ٹٹولا لیکن وہ میرا ہاتھ ہٹاتے ہوئے جلدی سے بولی۔ "بس..... بس۔ میں ٹھیک ہوں۔"

میں نے اطمینان کی طویل سانس لی۔ گولی اسے نہیں لگی تھی۔ اس نے چند سیکنڈ مزید انتظار کیا اور جب دوسری گولی نہیں آئی تو وہ پیچھے ہٹ کر بیٹھ گئی۔ میں اس وقت ٹارچ روشن کرنے کا رسک نہیں لے سکتا تھا کیونکہ پہلی گولی تو شاید "آوارہ" تھی۔ یونہی بھٹک کر ادھر آنکلی تھی لیکن روشنی دیکھ کر دوسری گولی کوئی نشانہ باندھ کر بھی چلا سکتا تھا۔

میں نے اندھیرے میں اتنا ضرور دیکھ لیا کہ ونڈ اسکرین کے ایک کونے میں سوراخ ہوچکا تھا اور کافی بڑے حصے میں مکڑی کا جالا سا پھیل گیا تھا تاہم پوری ونڈ اسکرین نہیں ٹوٹی تھی۔ گولی شاید زرتاج کے کندھے پر سے ہوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ وہ اپنی گود میں ہاتھ مار کر کچھ جھاڑنے لگی۔ شاید کچھ

کرچیاں اس کی گود میں آن گری تھیں۔

چند لمحے ہم دونوں ساکت رہے لیکن ہماری سمت میں مزید کوئی فائر نہیں ہوا۔ گاؤں کی طرف سے البتہ دو طرفہ فائرنگ کی آوازیں اسی طرح سنائی دے رہی تھیں۔ میں اور زرتاج دور مار رائفلیں ہاتھ میں لیے اور ایک ایک بیگ کندھے سے لٹکائے پجیرو سے اتر آئے۔ خاصا فاصلہ ہم نے کمانڈوز کی طرح رکوع کی سی حالت میں طے کیا اور ایک کچی دیوار تک جاپہنچے۔

وہ درحقیقت ایک بہت بڑے باغ کی چار دیواری تھی۔ ہمیں اندازہ ہوچکا تھا کہ ڈاکو اس باغ میں مورچہ بند تھے۔ وہ یقیناً بڑے اچھے اور طے شدہ منصوبے کے تحت آئے تھے اور "جنگی" حکمتِ عملی کے اعتبار سے انہوں نے بہت اچھی جگہ منتخب کی تھی۔ باغ میں وہ یقیناً چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے۔ شاید درختوں پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ یوں گاؤں کا بیشتر حصہ ان کی فائرنگ کی زد پر تھا جبکہ وہ خود گویا بنے بنائے مورچوں میں تھے۔

میں نے چند لمحے فائرنگ کی آوازیں سن کر کچھ اندازے قائم کیے اور نیچی آواز میں زرتاج سے کہا۔ "میں زمین پر بیٹھتا ہوں' تم میرے کندھوں پر چڑھ کر اس دیوار سے اندر کود جاؤ۔"

"اس دیوار پر چڑھنے کے لیے مجھے تمہارے کندھوں پر چڑھنے کی ضرورت نہیں۔" وہ اطمینان سے بولی۔ اس نے اپنی گن اور بیگ مجھے تھمایا اور بازو اونچے کرکے ہاتھ دیوار پر جمائے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے جسم نے ناگن کی طرح بل کھایا اور ایک بندریا کی سی پھرتی سے وہ دیوار پر چڑھ گئی۔ گو کہ اس کے لیے میرے ذہن میں آنے والی یہ دونوں تشبیہات مجھے قطعاً اچھی نہیں لگی تھیں۔ وہ نہ تو ناگن کی طرح زہریلی تھی اور نہ ہی بندریا کی طرح مضحکہ خیز لیکن صرف لچک اور پھرتی اس میں ان دونوں جیسی نظر آئی تھی۔

دیوار پر بیٹھ کر اس نے جھک کر مجھ سے گنیں اور بیگ لیے۔ دوسرے ہی لمحے میں بھی دیوار پر چڑھ گیا۔ ہم بہ خیروعافیت باغ میں کودنے میں کامیاب ہوگئے۔ کسی گولی نے ہمارا استقبال نہیں کیا۔ گو کہ گاؤں کی سمت میں فائرنگ بدستور جاری تھی۔

ہم عقب سے باغ میں داخل ہوئے تھے اور دیوار سے لگ کر بیٹھ گئے تھے۔ زرتاج نیچی آواز میں بولی۔ "میں اس طرف جاتی ہوں..... تم اس طرف جاؤ..... قسمت میں ہوا تو دروازے کی طرف ہم پھر آن ملیں گے....."

اس کا مقصد تھا کہ ہم دونوں دائیں بائیں طرف سے باغ کے گرد ہوتے ہوئے جتنے بھی ڈاکوؤں کو تلاش کرکے

ہلاک کرسکیں' کردیں اور بتدریج آگے بڑھتے رہیں حتیٰ کہ باغ کے گیٹ کی طرف ہم ایک دوسرے کے سامنے آجائیں لیکن فی الحال اسے محض ایک خواب یا تمنا بھی کہا جاسکتا تھا کیونکہ راستے میں خود ہمارے مارے جانے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ ہم کسی درخت کو مورچہ نہیں بنا سکتے تھے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس درخت پر ڈاکو موجود ہیں یا کہاں درختوں کے درمیان کوئی مورچہ بند ہو۔

اس تجویز کا ایک اچھا پہلو یہ تھا کہ اگر ہم دونوں کمانڈوز کے مخصوص انداز میں تیزی سے فائرنگ کرتے اور گرینڈ پھینکتے ہوئے ساتھ ہی نہایت پھرتی سے پوزیشن بدلتے ہوئے اپنے آپ کو بچا کر آگے بڑھ سکتے تو ڈاکوؤں کو یہ تاثر مل سکتا تھا کہ انہیں گھیرے میں لینے کے لیے کچھ لوگ یا پولیس فورس وغیرہ باغ میں گھس گئی ہے۔ ادھر انہیں جانو کی طرف سے کوئی سگنل نہیں ملا تھا۔ وہ بوکھلاہٹ کا شکار ہوسکتے تھے۔

اس روشن پہلو کے باوجود میں نے اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور کہا۔ "ہم اکٹھے ہی رہیں گے..... خواہ زندہ رہیں یا مرجائیں۔"

اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ باغ میں تاریکی ذرا گہری محسوس ہورہی تھی۔ مجھے بھی دور تک کی چیزیں دیکھنے میں دقت پیش آنے لگی تھی لیکن میں کم از کم اس کا چہرہ..... اس کی آنکھیں تو اچھی طرح دیکھ ہی سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے روشنی سی آئی اور معدوم ہوگئی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آپ کا میرے ساتھ رہنا اس لیے ضروری ہے کہ اس باغ کے راستوں سے آپ زیادہ

www.paksociety.com

اچھی طرح واقف ہیں اور میرا خیال ہے لڑائی کی ٹیکنک میں آپ سے بہتر جانتا ہوں۔"

"ممکن ہے یہ محض تمہارا خیال ہی ہو۔ حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو۔" وہ مسکرائی۔ ان حالات میں بھی وہ وحشت زدہ نہیں تھی۔ انسان کو آدھی فتح تو اسی طرح حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے اعصاب شکست نہ کھائیں۔

"بعض اوقات خیال' حقیقت سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔" میں نے بھی مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ اس نے دوسری طرف جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور ہم دونوں دیوار سے لگ کر کھسکنے لگے۔

فائروں کی آوازوں سے مجھے اب کافی حد تک اندازہ ہونے لگا تھا کہ ڈاکو کہاں کہاں موجود تھے لیکن درختوں کے جھنڈ میں سے انہیں نکالنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کوشش میں خود ہماری موجودگی ظاہر ہو سکتی تھی اور ہم فی الحال کسی محفوظ پوزیشن پر نہیں تھے۔

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا اور میں نے باغ کے ایک حصے میں ایک ثانئے کے لیے روشنی کا جھماکا دیکھا۔ ہم کچھ اور نیچے ہو کر دیوار کی جڑ میں دبک گئے۔ پے در پے دو تین اور ایسے ہی دھماکے ہوئے۔ فائرنگ کی آواز ان میں دب کر رہ گئی۔

"یہ تو گرینڈ استعمال ہو رہے ہیں!" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"ہاں۔ میرے گاؤں کے لوگ استعمال کر رہے ہیں۔" زرتاج اطمینان سے بولی۔ "ڈاکوؤں کی دہشت گردیوں نے انہیں بھی پورا پورا کمانڈو بنا دیا ہے۔ حالانکہ ہمارا گاؤں آج تک محفوظ ہی چلا آ رہا تھا لیکن دہشت گردیوں کے قصے بہرحال سنتے آ رہے تھے۔ اچھا ہی ہوا کہ میں نے ان لوگوں کو اس قسم کی صورت حال کے لیے تیار رکھا تھا۔ تم دیکھ رہے ہو؟ حملہ بالکل اسی طرح ہوا ہے جیسے دشمن ملک کی فوج چڑھائی کرنے کے لیے آئی ہو۔"

اسی دوران گاؤں کی طرف سے فائرنگ کی آوازیں مجھے قریب آتی محسوس ہونے لگیں تھیں۔ زرتاج بولی۔ "گاؤں والے پیش قدمی کر رہے ہیں۔" تب مجھے معلوم ہوا کہ اندازے لگانے میں زرتاج بھی کچھ ایسی اناڑی نہیں تھی۔ ہم خاصا آگے پہنچ چکے تھے لیکن ابھی تک ہم نے ایک بھی فائر نہیں کیا تھا۔

ہم ایک لمحے کے لیے رکے تو زرتاج سرگوشی میں بولی۔ "ذرا آگے مالی کا کمرا ہے۔ اس کی ساخت کچھ ایسی ہے کہ وہ بہت اچھا مورچہ ثابت ہو سکتا ہے۔ دعا کرو کہ ہم خیریت سے اس تک پہنچ جائیں۔" اس بار میں گولیوں کی تڑتڑاہٹ کے درمیان اس کی سرگوشی بہ مشکل سن پایا۔ جب سے باغ میں گرینڈ آ کر گرے تھے' مجھے باغ میں کچھ ہلچل کا سا احساس ہو رہا تھا۔ میں درختوں کے درمیان کچھ دیکھ تو نہیں پا رہا لیکن محسوس کر رہا تھا کہ وہاں کچھ بھاگ دوڑ سی شروع ہو چکی تھی۔

اچانک زرتاج کا گرم و گداز ہاتھ مضطربانہ انداز میں میرے ہاتھ پر آ ٹکا اور وہ مجھے ایک طرف متوجہ کرتے ہوئے بولی۔ "وہ دیکھ رہے ہو؟"

میں نے اس کے اشارے کی سمت میں دیکھا۔ اد... ایک کمرے کا ہیولا نظر آ رہا تھا جس کے آس پاس شاید... باڑھ وغیرہ بھی تھی۔ وہ بولی۔ "یہی مالی کا وہ کمرا ہے جسے... مورچہ بنانے کی بات کر رہی تھی۔"

لیکن اب یقیناً اس کا اشارہ کمرے کی طرف نہیں... کی چھت کی طرف تھا جس پر چند ہیولے متحرک نظر آ رہے تھے۔ ان ہیولوں کے درمیان ایک غیر متحرک چیز بھی دکھائی دے رہی تھی۔ انسانی ہیولے تین ٹانگوں والی اس چیز کو سیٹ کر رہے تھے۔

"تمہیں اندازہ ہوا وہ کیا ہے؟" زرتاج نے پوچھا۔

"ہاں۔ راکٹ لانچر ہے۔ آخر وہ گاؤں والوں کے گرینڈز کا جواب تو دیں گے۔" میں نے کہا۔ میں اندھیرے میں ان ہیولوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور مجھے کچھ عرصہ... ایک دور دراز مقام پر دیکھا ہوا تقریباً ایسا ہی ایک منظر یاد... تھا جب بلوچستان کے قریب سندھ کے ایک دور افتادہ مقام... ڈاکوؤں نے اسی طرح ایک مکان کے گرد محاصرہ ڈالا ہوا تھا... تب بھی میں نے اسی طرح ایک پہاڑی پر راکٹ لانچر کا... نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ بعض ڈاکو تو لانچر کے لیے تپائی بھی فٹ کرنے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ وہ لانچر کندھے... رکھ کر ہی راکٹ فائر کر دیتے تھے۔

"یہ تو بہت دور دور تک تباہی پھیلائیں گے۔" زر... مضطربانہ انداز میں بولی۔

"قدرت نے ہمیں بروقت ہی یہاں بھیجا ہے۔"... نے کہنیوں کے بل لیٹتے ہوئے کہا۔ "اور ہم یہاں ان... کارروائیوں کا صرف معائنہ کرنے نہیں آئے۔"

اس نے بھی میری تقلید کی۔ کمرے کی چھت زیادہ... نہیں تھی۔ سینے کے بل لیٹنے کے باوجود ہیولے ہماری نظر... رہے۔ اس سے پہلے کہ وہ راکٹ فائر کرتے' ہماری را... نے گولیاں اگلیں اور وہ چاروں کمرے کی چ... سے لڑھک پڑے۔ اس کے سا... ہم نے بھی تیزی... لڑھک کر اپنی پوزیشن بدل لی ا... کے کچھ فر... ہو گئے۔ جہاں ہم ایک لمحہ پہلے ... ماں بھی کوئی

نہیں آئی۔ کمرے کی چھت پر موجود ڈاکوؤں کو تو یقیناً پتا نہیں چلا ہو گا کہ موت نے کس سمت سے انہیں آن دبوچا تھا لیکن باغ میں موجود ڈاکوؤں کو بھی شاید کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا۔ انہیں غالباً یہی اطمینان تھا کہ اس وقت باغ پر ان کا قبضہ تھا۔ کوئی اور باغ میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا تاہم انہیں یہ ضرور معلوم ہو گیا تھا کہ کمرے کی چھت پر کوئی گڑبڑ ہوئی تھی کیونکہ میں نے کچھ ہی دور درختوں کے درمیان عقب سے کسی کے کودنے کی آواز سنی پھر اچانک ہی دو سیاہ پوش' درختوں کے درمیان سے بھاگتے ہوئے باہر آئے۔

ان کی یہ حرکت قطعی اضطراری اور بے وقوفانہ تھی۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ وہ اس طرح اندھا دھند دوڑتے ہوئے نکلے تھے کہ ہم بھی فوری ردِ عمل پر مجبور ہو گئے ورنہ شاید وہ انجانے میں ہمارے سروں پر ہی آن پہنچتے۔ میں نے اور زرتاج نے بیک وقت فائر کیا' وہ دونوں بھی ڈھیر ہو گئے۔

ہم نے تیزی سے پھر پوزیشن بدلی اور کمرے کے مزید قریب ہو گئے۔ وہیں باغبانی میں کام آنے والی بہت سی چیزیں زمین پر پڑی تھیں۔ ہم نے ان کی آڑ لینے کی کوشش کی۔ ہمیں اپنے تھیلے ساتھ رکھنے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی لیکن ہم انہیں چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ ان میں فاضل میگزین اور گرینڈ تھے جن کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ مقابلہ طول کھینچ سکتا تھا۔ ڈاکو تو اس بے دردی سے ایمونیشن ضائع کر رہے تھے گویا ان کے پاس ٹرکوں کے حساب سے موجود تھا۔

میں یکدم کمرے کے قریب جانا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ شاید کوئی ڈاکو کمرے کے اندر بھی موجود ہو۔ اس دوران ہم چند بوریوں کے قریب پہنچ چکے تھے جن سے بو آ رہی تھی۔ شاید وہ کھاد کی بوریاں تھیں۔ میں نے انہیں مورچہ بنانے کے ارادے سے ان کی آڑ میں ہونا چاہا تو اچانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میری ٹانگ پکڑنے کی کوشش کی ہو۔

میں اچھل کر ایک طرف ہٹا اور زمین کی طرف فائر کرتے کرتے رہ گیا۔ بوریوں کی آڑ میں ایک شخص آڑا ترچھا نظر آیا لیکن فوراً ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ زندہ نہیں تھا۔ اس کا بازو ایک طرف کو پھیلا ہوا تھا اور میرا پاؤں اس میں الجھ گیا تھا۔

پھر مجھے اپنے پیروں تلے خون کی چپچپاہٹ محسوس ہوئی۔ اس دوران زرتاج بھی لاش کے قریب پہنچ چکی تھی۔ اس نے اندھیرے میں جھک کر اس کا جائزہ لیا اور بے اختیار اس کے ہونٹوں سے دبی دبی سی سسکی نکلی۔

"یہ ہمارا مالی تھا۔" اس نے سرگوشی میں بتایا۔ اس کی نیچی آواز میں بھی مجھے غیظ و غضب کی لہر مچلتی محسوس ہوئی۔ "ان کتّوں نے اس بے چارے بے ضرر سے آدمی کو بھی مار ڈالا... اتنا شریف... نمازی اور پرہیزگار شخص تھا... اپنی بیوی بچوں کے ساتھ یہاں رہتا تھا... معلوم نہیں ان بے چاروں کا کیا بنا ہو گا..."

اس سوال کا جواب بھی ہمیں چند سیکنڈ بعد ہی مل گیا۔ دیوار کے ساتھ تین لاشیں اور پڑی تھیں۔ ایک عورت تھی اور دو نو عمر لڑکے۔ میرے دل میں بھی تاسف کی ایک لہر ابھری۔ کسی شریف اور بے ضرر انسان کا بے جواز اور ظالمانہ قتل ہمیشہ میرے دل میں ایک چبھن اور اضطراب سا پیدا کر دیتا تھا۔

زرتاج بھی اب گویا بپھر چکی تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ گن لیے درختوں کے درمیان جا گھستی اور چاروں طرف گولیوں کی بوچھاڑ کر دیتی لیکن ظاہر تھا کہ اس موقعے پر یہ محض ایک حماقت ہوتی۔

اس دوران درختوں میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کو معلوم ہو چکا تھا کہ مالی کی کوٹھڑی کی سمت میں گڑبڑ ہو چکی تھی۔ اس طرف گولیوں کے برسٹ پڑنے لگے تھے۔ میں اور زرتاج جلدی سے کوٹھڑی کی آڑ میں ہو گئے۔ کوٹھڑی کیا تھی' اچھا خاصا پکا کمرا تھا اور اس وقت ایک بہت عمدہ مورچہ ثابت ہو سکتا تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ مورچے کی آڑ میں ہمارے دبکے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا اور ڈاکو ہماری نظروں سے اوجھل تھے۔

اچانک مجھے درختوں کے درمیان کچھ سائے متحرک نظر آئے۔ میری نظر جو اندھیرے میں بھی کافی بہتر طور پر کام کرتی تھی' اس موقعے پر میرے بہت کام آ رہی تھی۔ میں نے رائفل استعمال کرنے میں تاخیر نہیں کی۔ درختوں کے درمیان کہیں غراہٹ آمیز سی ایک چیخ ابھری۔ میری چلائی ہوئی گولیاں کسی نہ کسی حد تک کارآمد رہی تھیں۔

اس دوران دو تین گرینڈ اور باغ میں پھٹے۔ باہر سے فائرنگ کی آواز بھی قریب آتی جا رہی تھی۔ تڑتڑاہٹ کے درمیان جو بھی ذرا ذرا سا وقفہ آتا تھا اس میں مجھے زرتاج کی دھیمی سی آواز سنائی دے جاتی تھی۔ وہ خوش ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "گاؤں والے پیش قدمی کر رہے ہیں۔ آج کی رات ڈاکوؤں پر بھاری ہو گی۔ زرتاج نگر کا رخ کر کے انہوں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حماقت کی ہے..."

ایک گرینڈ ہم سے کچھ دور ہی درختوں کے درمیان گر کر پھٹا اور روشنی کا جھماکا سا ہوا۔ اب میں نے پہلی بار ڈاکوؤں میں سے کسی کی آواز سنی۔ وہ چیخ کر کسی سے کچھ کہہ رہا

اب تک ان کا سکوت قائم تھا۔ ان کا بول اٹھنا ان کی بوکھلاہٹ کی نشانی تھی۔ الفاظ پوری طرح تو میری سمجھ میں نہ آئے لیکن اندازہ ہوگیا کہ وہ راکٹ لانچر والوں کے بارے میں پوچھ رہا تھا کہ انہوں نے ابھی تک راکٹ کیوں فائر نہیں کیا تھا۔ جواب میں کسی نے چیخ کر غالباً اسے یہ بتایا کہ ادھر گڑبڑ ہوچکی تھی۔ یہ آواز زیادہ دور سے نہیں آئی تھی۔ میں نے اندازاً آواز پر فائر کیے۔ ایک لمحے کے لیے ڈاؤں کی طرف سے فائرنگ گویا بالکل ہی تھم گئی۔ ان کا جانی نقصان بڑھتا جارہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مالی کے کمرے کی سمت میں برسٹ آیا۔ ہم سے کچھ دور ایک ٹوٹے ہوئے درخت کا تنا پڑا تھا۔ میں نے اس میں بھی گولیاں پیوست ہونے کی آواز سنی۔

اس کے فوراً بعد مجھے دائیں طرف کافی دور سے پے در پے کئی دھماکے سنائی دیے پھر دیوار کا ایک حصہ نیچے آن گرا۔ ایک لمحے کی تاخیر سے میری سمجھ میں آیا کہ باغ کا دروازہ گرینڈ مار کر توڑا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ ڈاکوؤں کی فائرنگ کے باوجود محض اپنے دفاع کے لیے گھروں کی چھتوں تک محدود نہیں رہے تھے۔ نہ جانے کس طرح وہ باغ کے قریب آتے جارہے تھے۔ تاہم اگر وہ گیٹ کے راستے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے تو یہ ان کی حماقت ہوتی کیونکہ ملگجے اندھیرے میں وہ شگاف کسی حد تک نظر آرہا تھا جو لکڑی کا گیٹ گرنے سے پیدا ہوا تھا۔ غنیمت تھا کہ گیٹ نے آگ نہیں پکڑی تھی۔ اگر وہ لوگ اس شگاف سے داخل ہونے کی کوشش کرتے تو ان کے ہیولے ڈاکوؤں کی نظر میں آسکتے تھے۔

کسی نے گیٹ سے داخل ہونے کی کوشش نہیں کی لیکن فائرنگ کی آوازیں اس طرف سے بہرحال آتی رہیں۔ ایک گرینڈ اور مالی کے کمرے سے ذرا ہی فاصلے پر آکر پھٹا۔ اس کے دھماکے سے تو کمرے کی دیوار سے کچھ مٹی جھڑ کر ہمارے اوپر گری۔

زرتاج خوش ہوتے ہوئے بولی۔ "سلیم کی ٹریننگ کام آرہی ہے۔ مجھے امید ہے ہمارے آدمی ڈاکوؤں کو باغ میں گھیر لیں گے اور انہیں ماریں گے۔"

"یہ سلیم کون ہے؟"

"ایک ریٹائرڈ میجر۔" زرتاج نے جواب دیا۔ "میں نے گاؤں کو ڈاکوؤں سے بچانے کے لیے رات کی چوکیداری کی جو اسکیم شروع کرا رکھی تھی وہ اس کا انچارج ہے۔ آدمیوں کو ٹریننگ بھی اسی نے دی ہے۔ وہی ٹریننگ تو اس وقت کام

کہا۔ "گرینڈ اب ہمارے بھی قریب آکر گر رہے ہیں۔ ایک آدھ گرینڈ ذرا اور ادھر کو آن گرا تو اپنا کام تمام ہوجائے گا۔"

"ہاں۔۔۔" اس نے بے آواز سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ان بے چاروں کو کیا معلوم کہ میں بھی باغ میں آن گھسی ہوں۔"

"واقعی۔ میرے ہونے نہ ہونے سے تو کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن آپ کے احترام میں شاید وہ کچھ محتاط ہوجاتے۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں نہیں چاہتی کہ وہ محتاط ہوں۔ یہ موقع محتاط ہونے کا نہیں ہے۔ اگر انہیں یہاں میری موجودگی کا علم ہوجائے اور وہ محتاط ہوجائیں تو ان کا اور ہمارا کام تمام سمجھو۔" وہ بولی۔

"میں تو اب بھی کم از کم اپنا کام تمام ہی سمجھ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ کے گاؤں والوں کے حوصلے اتنے بلند ہیں اور وہ دفاع کے بجائے ڈاکوؤں کو کرمارنے کے لیے نکل کھڑے ہوں گے تو ہم بھی یہاں آنے کے بجائے ان سے ملنے کی کوشش کرتے تاکہ انہیں مدد ملتا۔ اب انہیں بھی ہم سے کوئی خاص مدد نہیں مل رہی۔ ہم دونوں برسرپیکار فریقوں کے درمیان پھنس گئے ہیں۔"

"خیر اب ایسی بھی بات نہیں ہے۔" وہ بولی۔ "ہمارا یہاں آنے کا فائدہ تو بہت ہوا ہے۔ ہم بہت بروقت یہاں پہنچے تھے۔ آتے ہی ہم نے راکٹ لانچر استعمال کرنے والوں کو ٹھکانے لگا دیا، یہی بہت اہم کام تھا۔ گاؤں والوں کے باغ سے دور رہتے ہوئے یہ کام کرنا بہت مشکل تھا اور ڈاکو چند راکٹ فائر کرنے میں کامیاب ہوجاتے تو گاؤں والوں کی پیش قدمی کی ہمت ہی نہ پڑتی۔ ان کے لیے اپنے گھر بچانا ہی مشکل ہوجاتا۔ نہ جانے کتنے لوگ مرتے اور مکان تباہ ہوتے۔ اس کے علاوہ ہم نے دو تین ڈاکوؤں کو بھی ہلاک کیا ہے۔ تھوڑی سی دیر میں گاؤں والوں کا اتنا ہاتھ تو بٹا دیا ہے۔ یہ کیا کم ہے؟"

"رپورٹ تو ہمت افزا ہے آپ کی۔" میں نے بیگ سے ایک گرینڈ نکالتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں ذرا اس سے ایکشن چاہتا تھا۔"

"جتنا کچھ ڈاکوؤں کے ساتھ ہوچکا ہے میرے لیے بہت امید افزا ہے۔ آدمی تو انہی کے مارے جارہے ہیں۔ سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ وہ منحوس جانو مارا جاچکا ہے۔ اس کا گروہ اس علاقے میں سب سے بڑا تھا۔ آج کی رات ان کی طاقت ٹوٹ جائے تو اس علاقے سے ایک ہم

"آپ طاقت ٹوٹنے کی بات کر رہی ہیں۔۔۔ میرا خیال ہے، آج کی رات یہ گروہ ختم ہوجائے گا۔" میں نے اعتماد سے کہا۔ اس اعتماد کی بنیاد کیا تھی، یہ فی الحال مجھے خود بھی معلوم نہیں تھا۔

"خدا تمہاری زبان مبارک کرے۔" وہ بولی۔

میں نے ایک گرینڈ کی پن نکال کر اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔ "جس وقت میں گرینڈ پھینکوں، عین اسی وقت آپ کو یہ گرینڈ پوری قوت سے اس سمت میں پھینکنا ہے۔" میں نے اشارے سے اسے سمجھایا۔

"گویا ہمیں ڈاکوؤں کو اپنی موجودگی کا پوری طرح یقین دلا دینا چاہیے؟" اس نے نیم سوالیہ انداز میں کہا۔

"انہیں ہماری موجودگی کا علم تو ہوچکا ہے۔ وہ دوسری طرف الجھے ہوئے ہیں اس لیے ہماری طرف بھرپور حملہ نہیں کر رہے ہیں۔ اب ہمیں ان کو یہ تاثر دینا ہے کہ یہاں کئی افراد موجود ہیں۔ تابڑ توڑ ان پر گرینڈ پھینکنے ہیں، خواہ چند سیکنڈ میں ہی ہمارے پاس گرینڈ ختم ہوجائیں۔ اس کے ساتھ ہی فائرنگ بھی کرنی ہے۔ اس مورچے سے پورا پورا فائدہ اٹھانا ہے۔ اس طرح گاؤں سے جو لوگ باغ کو گھیرے میں لے رہے ہیں انہیں بھی اندازہ ہوجائے گا کہ اندر ان کا ساتھ دینے والے کچھ لوگ موجود ہیں۔ دوسرے ڈاکوؤں پر دو طرف سے دباؤ پڑے گا۔ ہمیں کسی طرح ان کو ان درختوں کے درمیان سے نکالنا ہے۔ درخت ان کے لیے بہت اچھی پناہ گاہ بن گئے ہیں۔"

وہ میرا منصوبہ سمجھ گئی۔ میری طرح اس نے بھی بیک وقت دونوں ہاتھوں میں پن نکلے ہوئے دو گرینڈ سنبھال لیے۔ رائفلیں ہم نے زمین پر رکھ دی تھیں۔ میرے اشارہ کرنے سے پہلے وہ بولی۔ "اگر جواباً انہوں نے بھی گرینڈ استعمال کیے تو کیا ہوگا؟ ہم تو محدود سی جگہ میں پھنسے ہوئے ہیں۔ یہ کمرا بھی ٹوٹ کر ہم پر گر سکتا ہے۔"

"میں اتنی دیر سے یہی اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرا خیال ہے ان کے پاس گرینڈ نہیں ہیں ورنہ وہ اب تک ضرور استعمال کرتے۔ بلکہ انہیں اندازہ ہوچکا ہے، گاؤں والے دیوار کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ ڈاکو شاید راکٹ لانچر پر ہی تکیہ کیے ہوئے تھے اور وہ ان کے لیے بیکار ہوگیا ہے۔"

زرتاج نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے فائرنگ کی آوازوں سے اندازے قائم کیے تھے کہ درختوں کے درمیان ڈاکو کہاں کہاں موجود تھے۔ گرینڈ پھینکنے کے لیے میں نے ایسی ہی چند جگہیں منتخب کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے زرتاج کو بھی اشاروں کے ساتھ انہی جگہوں کے بارے میں بتایا تھا۔

وہ میرا مقصد یقیناً اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

ہم نے نہایت تیزی سے یکے بعد دیگرے چار گرینڈ پھینکے اور ان کے دھماکوں کا ارتعاش ختم ہونے سے پہلے مختلف سمتوں میں چند راؤنڈ فائر کیے۔ درختوں کے درمیان مجھے کچھ ہلچل کا احساس ہوا پھر ہماری طرف بھی فائرنگ ہونے لگی لیکن وہ نہایت معمولی تھی۔ پکے کمرے کی آڑ میسر ہونے کی وجہ سے ہمیں اس کی کوئی خاص پروانہ تھی۔

اچانک مجھے باغ کی دوسری دیوار کی طرف سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ تب میری سمجھ میں آیا کہ گاؤں والوں نے کیا ہوشیاری دکھائی تھی۔ انہوں نے ڈاکوؤں کی توجہ گیٹ کی طرف مبذول رکھی تھی لیکن درحقیقت کچھ لوگ بغلی دیوار سے باغ میں آکودے تھے۔ اب ڈاکوؤں پر ایک طرف سے ہم حملہ کر رہے تھے اور دوسری طرف سے گاؤں والے۔

ڈاکوؤں کے خوابوں کی تعبیر بالکل الٹی نکلی تھی۔ انہوں نے یقیناً یہ سوچا ہوگا کہ وہ باغ میں مورچہ بند ہوکر پہلے گاؤں پر فائرنگ کرکے اور راکٹ برسا کر لوگوں کو خوفزدہ کرکے گھروں میں دبکنے پر مجبور کریں گے۔ اس طرح وہ خود بھی جوابی حملے سے محفوظ رہیں گے۔ اس کے بعد وہ گلی کوچوں میں گھس کر تباہی پھیلا دیں گے، مکانوں کو آگ لگا دیں گے۔ جو سامنے آئے گا اسے ہلاک کردیں گے اور جو ہاتھ لگے گا وہ لوٹ لیں گے۔ ان علاقوں میں ڈاکو عموماً اسی طرح تباہی پھیلاتے تھے۔ خصوصاً جس گاؤں میں وہ جذبۂ انتقام کے ساتھ داخل ہوتے تھے وہاں وہ چنگیزی اور تاتاری دور کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ان لوگوں کے گاؤں میں گھسنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وہ خود مصیبت میں گھر گئے تھے۔ یہ وقت وقت کی بات تھی۔

ادھر ہم نے اپنی حکمتِ عملی کے مطابق اپنا اسلحہ استعمال کیا اور ادھر باغ کی پرلی دیوار کی طرف سے بھی دباؤ بڑھتا چلا گیا۔ مزید چند گرینڈ استعمال ہوئے۔ حتیٰ کہ مجھے اندیشہ محسوس ہونے لگا کہ باغ میں آگ نہ لگ جائے۔ زیادہ ہریالی اور نمی کے باعث ابھی تک باغ میں آگ لگی تو نہیں تھی لیکن کئی بار ایسے آثار دکھائی ضرور دیے تھے۔

جلد ہی ڈاکوؤں نے اس احساس کو بھی شاید خیرباد کہہ دیا کہ درختوں کے درمیان وہ زیادہ محفوظ تھے۔ میں نے چند ہیولوں کو درختوں سے نکل کر رکوع کی سی حالت میں باغ کی عقبی دیوار کی طرف دوڑتے دیکھا۔ میری نظر اتفاقاً ہی اس طرف چلی گئی تھی ورنہ میں اس وقت دوسری طرف متوجہ تھا۔ زرتاج اس وقت کمرے کے دوسرے کونے پر تھی۔

میں لڑھک کر اس کے قریب پہنچا اور اسے ا

کی طرف متوجہ کیا جدھر بندوق بردار ہیولے تیزی سے دیوار پر چڑھنے لگے تھے۔ ہم ان سب کو گولیوں کا نشانہ بنانے میں کامیاب ہوگئے۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں دیوار کے آس پاس اندھیرے میں جہاں کہیں خفیف سی حرکت کا بھی شبہ ہوا وہاں ہم نے گولیاں برسائیں۔ مجھے اندازہ ہوا کہ جتنے ڈاکوؤں نے بھی بھاگنے کی کوشش کی تھی وہ سب کے سب مارے گئے تھے۔

ہم جس دیوار کی طرف تھے وہاں سے ہمیں گیٹ اور عقبی دیوار کا بیشتر حصہ سُرمئی آسمان کے پس منظر میں کسی نہ کسی حد تک دکھائی دے رہا تھا۔ اگر باغ کی دوسری بغلی دیوار یا کسی اور راستے سے گاؤں کے کچھ لوگ باغ میں داخل ہونے میں کامیاب ہو چکے تھے تو باقی حصوں پر ان کی نظر رہ سکتی تھی۔ اس طرح ڈاکوؤں میں سے اگر کچھ باقی بچ گئے تھے تو باغ ان کے لیے محفوظ مورچے کے بجائے چوہے دان بن چکا تھا۔ گاؤں والوں کی اور ہماری جرأت ہمارے کام آگئی تھی۔ اگر سب لوگ سہم کر گھروں میں دبک جاتے تو اس وقت ان کی وہی حالت ہوتی جو ڈاکوؤں کی تھی۔

یک دم باغ کے دوسری طرف سے بھی فائرنگ بند ہوگئی۔ باغ میں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ اس خاموشی میں موت کی سرگوشیاں رچی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے لوگوں نے غالباً ڈاکوؤں کے ردِعمل کا جائزہ لینے کے لیے اچانک فائرنگ بند کردی تھی۔ شاید وہ بھی جاننے کی کوشش کر رہے تھے کہ باغ میں کچھ ڈاکو باقی ہیں یا سب کا ہی صفایا ہو چکا ہے۔ انہیں یہ اندازہ تو یقیناً ہو گیا تھا کہ باغ میں دوسری طرف ان کا ساتھ دینے والے کچھ لوگ موجود تھے جن کی وجہ سے ان کا کام آسان ہو گیا تھا۔

سکوت کئی لمحوں پر پھیل گیا۔ درختوں کے درمیان سے کوئی فائر نہ ہوا۔ ابھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ڈاکو بھی کوئی چال چل رہے تھے یا واقعی کوئی ڈاکو زندہ نہیں بچا تھا۔ اُدھر گاؤں والوں کے سکوت سے کچھ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ صبح تک انتظار کرنے پر کمربستہ تھے۔ صبح کا اجالا پھیلنے پر یہ مقابلہ واضح صورت اختیار کر سکتا تھا۔ دونوں فریقوں کو ایک دوسرے کے مورچوں کا صحیح اندازہ ہو سکتا تھا لیکن دن کی روشنی میں گاؤں والوں کا جانی نقصان بڑھ بھی سکتا تھا۔

آخر کار گاؤں والوں نے خطرہ مول لینے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ میں نے بہت دور باغ کے ایک گوشے میں دو تین ٹارچیں روشن ہوتے دیکھیں۔ وہ یقیناً طاقتور ٹارچیں تھیں۔ میں نے ان کی روشنی درختوں کے درمیان بھی دور تک پہنچتے دیکھی لیکن ٹارچیں صرف ایک لمحے کے لیے روشن ہوئی تھیں۔ روشن کرنے والوں نے یقیناً انہیں بجھا کر فوراً ہی

پوزیشن تبدیل کرلی تھی۔ تاہم ڈاکوؤں کی طرف سے تب بھی کوئی گولی نہ چلی۔

اس وقت تک زرتاج بھی بیگ سے ٹارچ نکال چکی تھی۔ وہ میری طرف مڑتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔ "میرا خیال ہے میں بھی اپنے لوگوں کو یہاں اپنی موجودگی کا سگنل دے ہی دوں۔ انہیں اگلا قدم اٹھانے میں آسانی رہے گی۔"

"ابھی چند لمحے اور ٹھہر جاؤ۔" میں نے مشورہ دیا۔

وہ چند لمحے ایک عجیب قسم کے تناؤ میں گزرے۔ ہم دونوں دیوار کے ساتھ چپکے نہایت آہستگی سے گردن گھماتے ہوئے جہاں تک نظر جا سکتی تھی، کسی متحرک ہیولے کو تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کہیں کوئی چیز حرکت کرتی دکھائی نہ دی۔ اتنے زبردست ہنگامے اور گھن گرج کے بعد یک دم ہی ہر طرف موت کا سکوت پھیل گیا تھا۔ فضا میں خون اور بارود کی بو محسوس ہو رہی تھی۔

بالآخر زرتاج نے ایک لمحے کے لیے ٹارچ روشن کی اور فوراً ہی بجھا کر کمرے کی آڑ میں ہوگئی۔ درختوں کے درمیان تب بھی سکوت ہی رہا۔ کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا۔

"میرا خیال ہے معرکہ ختم ہو چکا ہے۔ ڈاکوؤں کا صفایا ہوگیا ہے۔" زرتاج سرگوشی میں بولی۔

"لگتا یہی ہے۔" میں نے تائید کی۔ زرتاج نے ایک بار پھر روشنی کا سگنل دیا۔ اس بار باغ کے ایک حصے سے روشنی ہی کے سگنل کی صورت میں جواب ملا۔ مزید چند لمحوں انتظار کے بعد ان لوگوں کو بھی حوصلہ ہوا اور کسی نے چیخ کر پوچھا۔ "اِدھر کون ہے۔"

"میں ہوں ..... زرتاج ...!" زرتاج نے چیخ کر جواب دیا۔

دوسری طرف وہی پہلا سا سکوت چھا گیا۔ ان لوگوں کو شاید اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا کہ اس معرکے کے دوران زرتاج باغ میں گھسی ہوئی تھی۔ انہوں نے مزید کچھ لمحے انتظار کیا۔ بالآخر وہ جن گوشوں میں زمین یا دیوار سے چپکے ہوئے تھے، وہاں سے نکلنے لگے۔ میں نے ایک طرف چند ہیولوں کو اپنی طرف آتے دیکھا۔

ان میں سے ایک نے احتیاطاً اندھیرے میں ہانک لگائی۔ "گولی مت چلائیے گا ....."

پھر دھیرے دھیرے اِدھر اُدھر سے اندھیرے کی آغوش سے بہت سے لوگ نکل آئے۔ ان کے پاس مختلف ہتھیار تھیں۔ انہوں نے ٹارچیں روشن کیں اور کمرے کے پاس ہم دونوں کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ میری تو انہیں کوئی خاص پروا نہیں تھی لیکن زرتاج کو بخیروعافیت دیکھ کر ان کی جان میں جان آئی۔

بڑی عمر کا ایک قد آور اور صحت مند شخص آگے بڑھتے ہوئے بولا۔ "آپ کو اپنی جان کو خطرے میں ڈالنے کی کیا ضرورت تھی رئیسانی جی؟ ہم لوگ جو موجود تھے۔ خادموں کے ہوتے ہوئے مالکوں کو بندوق اٹھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"صرف خادم ہی مالکوں کے محافظ نہیں ہوتے، مالک بھی خادموں کے محافظ ہوتے ہیں۔ جب تک دونوں میں شانہ بہ شانہ لڑنے کی اہلیت نہ ہو، دونوں ہی خطرے میں رہتے ہیں۔" زرتاج نے جواب دیا۔ "ویسے بھی اگر میں یہاں نہ آتی تب بھی خطرہ تو میرے گھر ہی پہنچ چکا تھا۔ تم لوگوں کو تو معلوم بھی نہیں ہوگا کہ جانو ہمارے ایک غدار ملازم کی مدد سے تمام محافظوں کو بے ہوش کر کے حویلی میں آن گھسا تھا۔ اس نے تو مجھے یرغمال بنا لیا تھا ....."

پھر اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "اگر یہ صاحب ہمارے ساتھ نہ ہوتے تو شاید آج کے معرکے کا نتیجہ بہت مختلف ہوتا۔"

ان میں سے بیشتر نے حیرت سے میری طرف اور پھر رئیسانی کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے گھوڑے سدھانے والے کی حیثیت سے جانتے تھے۔ انہیں شاید اس بات پر حیرت تھی کہ زرتاج میرے لیے "صاحب" کا لفظ استعمال کر رہی تھی۔

زرتاج بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "جتنی بھی ٹارچیں تم لوگوں کے پاس ہیں وہ سب روشن کر کے ٹولیوں میں پورے باغ میں پھیل جاؤ اور جائزہ لو کہ کیا صورت حال ہے۔ محسوس تو یہی ہو رہا ہے کہ سب ڈاکو کتّے کی موت مارے جا چکے ہیں۔ پولیس وغیرہ کے حصے کا کام ہم لوگوں نے انجام دے دیا ہے۔"

"ان علاقوں میں اگر دو چار جگہ بھی ڈاکوؤں کو اس قسم کے ردِعمل کا سامنا کرنا پڑ جائے تو مجھے امید ہے کہ ان کا زور ٹوٹ جائے۔" ان میں سے ایک شخص بولا۔

بڑی عمر کا قد آور اور صحت مند شخص جس کے بارے میں مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ ریٹائرڈ میجر سلیم تھا، ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ایسا ہونا بہت مشکل ہے کیونکہ ہر گاؤں زرتاج نگر نہیں ہوتا۔"

ہم سب لوگ ٹارچیں لے کر ٹولیوں کی صورت میں باغ میں بکھر گئے۔ باغ میں واقعی میدانِ کارزار کا سا سماں تھا۔ ہینڈ گرینیڈز نے کافی تباہی پھیلائی تھی۔ میں ڈاکوؤں کی تعداد دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اتنے بہت سے ڈاکو ہم لوگوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ بعض لاشوں کے چہرے مسخ ہو گئے تھے اور بعض کے اعضا الگ ہو گئے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ اس پیمانے پر ڈاکوؤں کی ہلاکت

میں ہماری حکمتِ عملی کے علاوہ کسی غیبی امداد کو بھی دخل تھا۔

اپنے اس "سروے" کے دوران بھی ہم ذرا محتاط ہی رہے۔ اندیشہ تھا کہ کوئی ڈاکو زندہ نہ ہو اور کہیں چھپا ہوا نہ ہو۔ ہم پر اچانک ہی گولیوں کی بوچھاڑ بھی ہو سکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ مجھے اس پر بھی حیرت ہوئی۔ ڈاکوؤں کا قطعی غیر متوقع طور پر صفایا ہو گیا تھا۔

لاشیں جہاں جہاں تھیں اور جس حالت میں تھیں، ہم نے انہیں اسی طرح وہیں رہنے دیا۔ بالآخر ایک جگہ رکتے ہوئے میں نے زرتاج سے کہا۔ "آج کی رات ہمارے لیے بہت مبارک رہی ہے۔ ہمارے دو تین آدمی کام ضرور آئے ہیں لیکن اس قربانی کے بعد ایک بہت بڑے فتنے کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا لیکن میرے خیال میں ابھی کچھ کام باقی ہے۔ اس وقت ہمارا لہو گرم ہے اور ہمارے سر پر خون سوار ہے۔ لگے ہاتھوں وہ کام بھی نمٹا لیا جائے تو آپ کے حق میں بہت اچھا ہوگا۔"

"کیا مطلب؟" زرتاج چونکتے ہوئے بولی۔

"میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ان لوگوں نے ایک ویرانے میں زیرِ زمین "گولڈ کی کلب" بنایا ہوا ہے جہاں خاصی شرمناک اور خاصی خطرناک سرگرمیاں جاری ہیں۔ اگر کبھی وہ کلب کسی کی گرفت میں آیا تو اس کی مالک آپ ظاہر ہوں گی۔ ویسے بھی وہ جہاں واقع ہے وہ زمین کبھی آپ کے والد کی ہی ملکیت ہوا کرتی تھی۔"

"ہاں۔" وہ پُرخیال انداز میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "یہ بات تو فی الحال اس ہنگامۂ اجل میں میرے ذہن سے نکلی ہوئی تھی۔"

"یہاں اگر خوش قسمتی سے دن چڑھے تک پولیس پہنچنے میں کامیاب ہو گئی تو اس سے نمٹنے اور تمام حالات بتانے کا کام آپ کمدار وغیرہ کے سپرد کر دیں۔ ہم یہاں سے آٹھ دس منتخب آدمیوں کو لے کر چلتے ہیں اور "گولڈ کی کلب" والا قضیہ بھی نمٹا آتے ہیں ورنہ کل کلاں کو وہ بھی آپ کے لیے پریشانی کا باعث بن سکتا ہے۔"

"یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" وہ نیم رضامندی سے بولی۔

"آج ہماری خوش قسمتی سے جانو اور اس کے گروہ کے بیشتر آدمیوں کا خاتمہ ہو گیا ہے تو اس کی باقیات کا بھی خاتمہ ہو جانا چاہیے۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم رات کی تاریکی میں ہی وہاں پہنچ جائیں تو شاید ان سے نمٹنے میں آسانی رہے کیونکہ وہ محفوظ جگہ میں ہوں گے اور ہمیں کھلے میدان سے ۔۔۔ھنا ہوگا۔ ہمارے لیے خطرات زیادہ ہوں گے۔"

"محفوظ مقامات پر تو یہ لوگ بھی تھے۔" زرتاج اردگرد بکھری ہوئی لاشوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "انہیں دہشت گردی کا تجربہ بھی زیادہ تھا اس کے باوجود قدرت نے ہماری مدد کی۔"

"اسی امید کے سہارے تو میں آپ کو مزید قدم بڑھانے کے لیے کہہ رہا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ اوپر والا زیادتی سہنے والوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں بھی قدرت ہماری مدد کرے گی۔ ان لوگوں کو جتنی ڈھیل ملنا تھی، مل چکی۔ کچھ لوگوں کے لیے یومِ حساب ذرا دیر سے آتا ہے مگر آتا ضرور ہے۔۔۔ بلکہ ان لوگوں کے لیے تو شبِ حساب آئی ہے۔"

اس دوران گویا پورا گاؤں باغ کی طرف اُمڈ آیا تھا۔ کمدار وغیرہ بھی آ چکے تھے۔ لوگ مختلف ہتھیار، لالٹینیں، ٹارچیں، کلہاڑیاں، ڈنڈے اور نہ جانے کیا کچھ اٹھائے ہوئے تھے مگر اب ان کا سامنا کرنے کے لیے لاشوں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔

زرتاج نے کمدار اور دوسرے دو تین لوگوں کو تمام صورتِ حال سمجھا کر مختلف کام ان کے ذمے لگائے۔ میجر سلیم کو بھی اس نے وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے خیال میں وہاں اس کی زیادہ ضرورت تھی۔ البتہ جن لوگوں نے باغ میں چھپے ہوئے ڈاکوؤں کے خلاف کمانڈو ایکشن کی طرز پر کارروائی کی تھی، ان میں سے دس افراد کو زرتاج نے اپنے ساتھ لے جانے کے لیے منتخب کر لیا۔ ہم نے تیزی سے کچھ تیاریاں کیں اور دو گاڑیوں میں روانہ ہو گئے۔

میں، زرتاج اور تین دوسرے افراد پجیرو میں تھے۔ باقی لوگ ایک چھوٹے ٹرک جیسی پک اپ میں تھے۔ گاڑی زرتاج ڈرائیو کر رہی تھی اور میں اپنی یادداشت کے سہارے اس کی رہنمائی کر رہا تھا۔ آسمان پر اِکا دُکا تاروں کی موجودگی کی وجہ سے اندھیرا اتنا گہرا نہیں تھا جتنا عموماً ویرانوں میں ہوتا ہے۔

میں صرف ایک بار گولڈ کی کلب تک گیا تھا لیکن یادداشت نے میرا ساتھ دیا اور آثار بتانے لگے کہ میں صحیح سمت میں جا رہا تھا۔ جنگل بیابان میں کوئی ایسی خاص چیزیں تو موجود نہیں تھیں جن کی نشانیاں مقرر کی جا سکتیں پھر بھی میں درختوں اور ٹیلوں وغیرہ کو دیکھ کر ایک غیر واضح سی مانوسیت کے سہارے زرتاج کی رہنمائی کرتا جا رہا تھا۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ زرتاج کو خود یاد نہیں تھا کہ اس کے مرحوم باپ کی وہ زمین کس طرف ہوا کرتی تھی۔

جب مجھے احساس ہوا کہ ہم مطلوبہ مقام کے بہت

قریب پہنچ چکے ہیں تو میں نے دونوں گاڑیوں کی ہیڈلائٹس آف کروا دیں۔ کلب کے گرد میں نے ایک چھوٹا سا جنگل دیکھا تھا۔ ہلکے اندھیرے میں مجھے اس کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ انجن کی خفیف سی آواز ان مسلح محافظوں تک نہ پہنچ جائے جو درختوں کے درمیان گشت کرتے رہتے تھے۔

میری ہدایت پر گاڑیاں وہیں چھوڑ دی گئیں اور ہم خاصے بڑے دائرے میں بکھر کر پیدل آگے بڑھے۔ اس وقت تک صبحِ کاذب کے آثار بھی نمودار ہونے لگے تھے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ درختوں کے عقب میں موجود لوگ ہمارے ہیولے دیکھ سکتے ہیں لیکن خطرہ مول لیے بغیر چارہ نہیں تھا۔ ہم سینے کے بل رینگ کر اتنا فاصلہ طے نہیں کر سکتے تھے۔

فضا کا سکوت کسی بھی لمحے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے مرتعش ہو سکتا تھا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ وقت اور جگہ ایسی تھی کہ وہاں گہرا سکوت ہی ہونا چاہیے تھا لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا کہ سکوتِ شب کی چادر کچھ زیادہ ہی دبیز تھی۔ یہ سکوت غیر معمولی تھا۔

درختوں کے بالکل قریب پہنچ کر میں نے سوچا کہیں وہ لوگ گھات لگائے انتظار نہ کر رہے ہوں کہ ہم بالکل ہی قریب پہنچ جائیں تب وہ ہمیں گولیوں سے بھون ڈالیں۔ میں نے سب کو اشارہ کیا اور ہم سینے کے بل لیٹ کر اپنی اپنی گنیں سنبھالے رینگنے لگے۔

ہم نے بلاوجہ یہ مشقت اٹھائی۔ ہم درختوں کے دائرے میں داخل ہونے والے راستے سے بہ خیر و عافیت اندر پہنچ گئے، ایک بھی گولی نہ چلی لیکن اس سے ہم بے فکر اور پُرسکون ہونے کے بجائے مزید مضطرب ہو گئے۔ بالآخر میرا اشارہ پا کر ایک ایک کر کے سب اٹھ کھڑے ہوئے اور رکوع کی سی حالت میں ہم لوگ اس مختصر سے جنگل کے وسط میں واقع کھنڈر کی طرف بڑھے۔

چند لمحے بعد میں نے محسوس کیا کہ ہم خواہ مخواہ ہی اس احتیاط پسندی میں پھنسے ہوئے تھے۔ وہاں تو کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ اگر درختوں میں بھی کچھ لوگ چھپے ہوتے تو اب تک وہ اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتے تھے۔ ہمارے کھنڈر تک پہنچنے کے دوران درختوں میں چھپا ہوا کوئی ایک شخص بھی کلاشنکوف وغیرہ سے نہایت آسانی سے ہمارا خاتمہ کر سکتا تھا لیکن ابھی تک کوئی فائر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ سکوت گویا کچھ اور گہرا ہو گیا تھا۔

تاہم میرے اشارے پر سب لوگوں نے اپنا محتاط انداز برقرار رکھا۔ ہم چاروں طرف نظر رکھے ہوئے تھے اور کھنڈر کی دیواروں کے درمیان سے ہوتے ہوئے ملبے پر چڑھ کر اس مستطیل شگاف تک پہنچے جس کی گہرائی میں فولادی دروازہ موجود تھا۔ اس وقت وہاں کوئی محافظ نہیں تھا۔ تاہم میں نے پانچ افراد کو اس شگاف کے گرد کھڑا کیا۔ زرتاج، میں اور باقی افراد یکے بعد دیگرے شگاف میں اترے۔

میں جب پچھلی مرتبہ تمیسو خان کے ساتھ یہاں آیا تھا تو میں نے ایک خاص انداز میں لیور کے ذریعے محافظ کو یہ دروازہ کھولتے دیکھا تھا۔ اسی طریقے سے میں نے بھی وہ فولادی دروازہ کھول لیا۔ اس میں کوئی خاص دشواری پیش نہیں آئی۔

اس سے آگے ایک اور بھاری بھرکم، مضبوط چوبی دروازہ ہمارا منتظر تھا۔ یہ دروازہ اس طلائی چابی سے کھلتا تھا جو ممبروں کے پاس ہوتی تھی۔ میں نے ایسے ہی کسی موقعے کے لیے وہ چابی خاص طور پر اپنے پاس محفوظ رکھی تھی جو تمیسو خان کو ہلاک کرنے کے بعد اس کی جیب سے نکالی تھی۔ اس چابی سے دروازہ کھول کر دبے قدموں مزید چند سیڑھیاں اتر کر ہم نیچے پہنچے۔

تہہ خانے میں گہری تاریکی تھی۔ ہم سب چند لمحے اپنی اپنی کلاشنکوفوں اور رائفلوں کے رخ مختلف سمتوں میں کیے دم سادھے کھڑے رہے لیکن کلب میں بدستور گہرا سکوت چھایا رہا۔ بالآخر ہم نے ٹارچیں روشن کریں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔

زرتاج حیرت سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے واقعی یہ ایک دنیائے حیرت تھی۔ اسے شاید ابھی تک یقین نہیں آیا تھا کہ اس ویرانے میں زیرِ زمین ایک باقاعدہ کلب موجود تھا۔ ٹارچوں کی روشنی میں ہم سب کلب کا جائزہ لے رہے تھے۔

اچانک کہیں کھٹکا سا ہوا۔ ہم نے فوراً ٹارچیں بجھا دیں اور سینے کے بل فرش پر لیٹ گئے۔ دوسرے ہی لمحے رات کے سکوت میں در و دیوار میں خفیف سا ارتعاش محسوس ہوا۔ کہیں دور شاید کوئی مشین اسٹارٹ ہوئی تھی۔ اس کے فوراً بعد ہی ہال میں تیز روشنی پھیل گئی۔ ہمارا سینے کے بل فرش پر لیٹے ہونا یک دم ہی کچھ مضحکہ خیز سا محسوس ہونے لگا۔ ہماری گنوں کی نالیں اِدھر اُدھر گھوم رہی تھیں لیکن ہمارے سامنے کوئی نہیں تھا جسے ہم نشانہ بناتے۔

پھر بلندی پر کہیں ایک آسیبی سا قہقہہ سنائی دیا۔ آواز نسوانی تھی۔ اس ہال کے تین اطراف میں بلندی پر سینما کی گیلری کی طرز پر کمرے سے ہی کمرے بنے ہوئے تھے۔ آواز انہی میں سے ایک کمرے سے ابھری تھی۔ ہم سب کی گنوں کا رخ اسی طرف ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے کھسکتے ہوئے پیچھے راہداری میں گھسنے کی کوشش کی لیکن ہم سب ایک ساتھ

اس میں نہیں گھس سکتے تھے۔

اس کا مطلب تھا کہ اگر اس وقت بلندی پر کوئی خود کسی محفوظ چیز کی آڑ میں رہتے ہوئے ہمیں نشانہ بنانا چاہتا تو آسانی سے بنا سکتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو میری دھڑکنیں بھی تیز ہو گئیں۔ باقی لوگوں کا نہ جانے کیا حال تھا۔

کلب کی ویرانی کا ایک جواز میری سمجھ میں آیا تھا جس کے بعد میں مطمئن ہو چکا تھا۔ میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس کلب کو چلانے والے تمام لوگ بھی حقیقت میں چونکہ ڈاکو ہی تھے اس لیے آج زرتاج نگر پر حملے میں شامل ہونے کے لیے گئے ہوئے تھے کیونکہ یہ ان کا ایک بہت ہی خاص مشن تھا۔ امکان یہی تھا کہ اس میں حصہ لینے کے لیے گروہ کا ہر رکن پہنچا ہوگا۔ زرتاج نگر میں جتنے ڈاکو مارے گئے تھے، شاید اس میں "گولڈ کی کلب" کو چلانے والے تمام ڈاکو بھی شامل تھے۔

اب میرا یہ خیال غلط ثابت ہوتا نظر آرہا تھا۔ شاید یہاں کچھ لوگ موجود تھے اور ہم غلط فہمی میں مبتلا ہو کر ایک قسم کے ٹریپ میں آن پھنسے تھے۔ بلندی پر ایک کمرے کا دروازہ جھٹکے سے کھلا اور ایک عورت بالکونی کے جنگلے پر آن کھڑی ہوئی۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا لیکن سردست یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ میں نے کوئی مشین سی اسٹارٹ ہونے کی جو دھیمی آواز سنی تھی وہ جنریٹر کی تھی۔ جنریٹر غالباً اسی عورت نے اسٹارٹ کیا تھا۔

وہ بڑی بے خوفی سے جنگلے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ ہمیں اوندھا لیٹے اور گنیں اونچی کیے دیکھ کر اس نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے ایک بار پھر بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ اس کا انداز اب بھی کچھ ہذیانی اور کچھ آسیبی سا تھا۔ شاید اسے ہماری حالت بہت مضحکہ خیز لگی تھی۔ وہ ہنس ہنس کر دہری ہوئی جا رہی تھی۔

جب وہ ذرا سیدھی ہوئی اور اس نے چہرے سے ہاتھ ہٹایا تو مجھے اس کی صورت شناسا سی لگی۔ دوسرے ہی لمحے مجھے یاد آگیا کہ جب میں تمیسو خان کے ساتھ یہاں آیا تھا تو اس نے مجھے اس عورت کی میز پر بٹھایا تھا اور بہ صد اصرار عیاشی کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس عورت کا نام کبھی نوری ہوا کرتا تھا لیکن اس نے کافی عرصہ شہر میں گزارا تھا جہاں وہ نوری سے نورین ہو گئی تھی۔ اس کا انداز بتا رہا تھا کہ اس وقت وہ نشے میں تھی۔

وہ جس کمرے سے برآمد ہوئی تھی اس میں اور کسی کی موجودگی تو ظاہر نہیں ہو رہی تھی لیکن کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ باقی کمروں کے بند دروازوں کے پیچھے کیا تھا یا کون چھپا ہوا تھا۔

میرے ساتھ آئے ہوئے افراد میں سے دو آدمی اچانک اٹھے اور میرے یا زرتاج کے حکم کا انتظار کیے بغیر ہی دوڑتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے اور تین تین سیڑھیاں ایک ساتھ پھلانگتے ہوئے نہایت تیزی سے اوپر جا پہنچے۔ چند سیکنڈ بعد ہی وہ اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر قابو میں کیے کافی بے دردی سے کھینچتے ہوئے نیچے لے آئے۔ اس دوران کسی اور کمرے کا دروازہ نہیں کھلا۔ ان پر کسی نے فائر نہیں کیا۔ میری جان میں جان آئی۔ مجھے خود سے زیادہ ان کی فکر لاحق ہو گئی تھی کیونکہ وہ بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھا کر دوڑ پڑے تھے۔

نوری عرف نورین گو کہ مزاحمت نہیں کر رہی تھی لیکن وہ لوگ اسے تقریباً گھسیٹتے ہوئے ہی لائے تھے۔ اس کے پیروں سے جوتیاں اتر گئی تھیں۔ زرتاج کے آدمیوں نے اس کے بازو بھی موڑے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے۔ اس وقت تک ہم لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ کلب میں اس وقت اس عورت کے سوا کوئی نہیں تھا۔

"اسے چھوڑ دو۔" میں نے مضطربانہ لہجے میں کہا۔ زرتاج کے آدمیوں نے میرے حکم کی تعمیل کی۔

نوری عرف نورین بہ مشکل سیدھی کھڑی ہو کر اپنے بازوؤں کو جھٹکے دیتے ہوئے استہزائیہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ "معلوم نہیں ہم جیسے لوگوں کو نیکی کا صلہ بھی کیوں ایسا ملتا ہے......"

معلوم نہیں کیوں مجھے اس کے اس طرح بے رحمانہ انداز میں کھینچ کر لائے جانے پر افسوس ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر معذرت خواہانہ انداز میں اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ "میں تم سے معافی چاہتا ہوں۔ دراصل ہمارے آدمیوں سے صرف گھبراہٹ میں یہ حرکت سرزد ہوئی ہے۔ ہم تمہیں کوئی تکلیف پہنچانا نہیں چاہتے تھے......"

اس نے گویا قدرے چونک کر میری طرف دیکھا اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے بولی۔ "تم تو وہی ہو جسے اس شام تمیسو خان نے میری میز پر لا کر بٹھایا تھا......"

اس سے آگے وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہاں...... ہاں، میں وہی ہوں۔"

"مجھے اس وقت ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ایک شریف آدمی ہو...... اور اب تم نے مجھ سے معذرت چاہی ہے...... یہ بھی تمہاری شرافت کی دلیل ہے۔" اس نے زرتاج سمیت باقی لوگوں کی طرف بازو لہراتے ہوئے اشارہ کیا۔ "ان لوگوں کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتی...... لیکن مجھے خوشی ہے

کہ تم میرے ہاتھوں مرنے سے بچ گئے۔ تم سب کی زندگی میرے ہاتھ میں تھی...... میرے ایک اشارے پر تم سب کے پرخچے اڑ سکتے تھے...... لیکن میں نے اپنے آپ کو ہاتھ ہلانے سے باز رکھا۔ اس کا صلہ مجھے یہ ملا......" اس نے ایک بار پھر اپنے بازوؤں کو جھٹکا دیا جنہیں کافی بری طرح موڑا گیا تھا۔

میں نے اس کا مطلب پوری طرح سمجھے بغیر کہا۔ "میں ایک بار پھر ان لوگوں کی طرف سے تم سے معافی چاہتا ہوں۔ تم خود ہی کہہ چکی ہو کہ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ امید ہے کہ تم ایک شریف آدمی کی معذرت قبول کرو گی۔"

اس نے ایک بار پھر بغور میری طرف دیکھا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے۔ اچانک وہ میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔ "سگریٹ ہو گی تمہارے پاس؟"

"نہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "میں اتنا شریف آدمی ہوں کہ سگریٹ بھی نہیں پیتا۔ ویسے بھی تمہارا سادہ سگریٹ سے کیا بھلا ہونا تھا۔ تم تو کچھ اور طرح کی سگریٹ پینے کی عادی ہو۔"

"اس وقت تو کسی بھی قسم کی سگریٹ کی طلب ہو رہی ہے...... میرا پیکٹ اوپر رہ گیا ہے۔" وہ مڑ کر کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں ابھی منگوا دیتا ہوں......" میں نے ایک شخص کو اشارہ کیا۔ وہ چہرے پر قدرے ناگواری کے تاثرات لیے اوپر چلا گیا۔ شاید وہ دل میں سوچ رہا تھا کہ ہم ایک قیامت خیز ہنگامے سے گزر کر آرہے ہیں، یہاں بھی ہمیں نہ جانے کیا حالات پیش آنے والے تھے اور مجھے دشمن کے اڈے پر موجود ایک مشکوک قسم کی عورت کی سگریٹ کی فرمائش پوری کرنے کی فکر پڑی ہوئی ہے۔ مجھے احساس تھا کہ زرتاج بھی عجیب سی نظروں سے کبھی میری طرف اور کبھی نورین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے ملائمت سے نورین سے پوچھا۔ "تم یہاں اکیلی ہو؟"

"ہاں۔ کاش تم بھی اکیلے آئے ہوتے!" وہ آنکھ مارتے ہوئے مسکرائی۔ مجھے کسی نیک پروین قسم کی لڑکی کی طرح اپنے کانوں کی لویں تپتی محسوس ہوئیں۔ میں نے کھسیانے سے انداز میں زرتاج کی طرف دیکھا۔ وہ ایک ٹک نورین کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اسی لمحے نورین بھی زرتاج کی طرف متوجہ ہوئی اور سرتاپا اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "یہ بیگم صاحبہ کون ہیں؟"

حالانکہ اس وقت ہم خاصے برے حال میں تھے۔ سر

سے پاؤں تک پسینے اور مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ پھر بھی زرتاج کی شخصیت سے ایک شان جھلک رہی تھی۔ شاید اسی لیے نورین نے اس کے لیے "بیگم صاحبہ" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

"تم اسے چھوڑو۔۔۔۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "یہ بتاؤ کہ تمہارے ایک اشارے پر ہمارے پرخچے کیسے اڑ سکتے تھے؟"

"یہ جاننے کے لیے تمہیں میرے ساتھ اس کلب سے باہر کچھ دور چلنا پڑے گا۔" وہ بے نیازی سے بولی۔ اس دوران ہمارا آدمی اوپر کے کمرے سے اس کی مخصوص سگریٹوں کا پیکٹ اور لائٹر لے آیا تھا۔ اس نے مُرتعش انگلیوں سے ایک سگریٹ سلگا کر گہرا کش لیا۔ اس کے چہرے پر کچھ طمانیت سی پھیل گئی۔ اس نے دُھوئیں کا ایک کثیف مرغولا ہوا میں چھوڑا تو زرتاج ایک قدم پیچھے ہٹ گئی تاہم اس نے اپنے چہرے سے ناگواری ظاہر نہیں ہونے دی۔ میں نے ہیروئن کے نشے کے عادی تو کئی افراد دیکھے تھے جن کا نشہ ٹوٹنے لگتا تھا تو ان کی حالت غیر ہو جاتی تھی لیکن نورین اس لحاظ سے کچھ عجیب نشے باز تھی کہ اسے چرس کا نشہ بھی کچھ اسی شدت سے ستاتا تھا اور معلوم یہی ہوتا تھا کہ وہ تقریباً ہر وقت ہی نشے میں رہنا چاہتی ہے۔

"ٹھیک ہے۔۔۔۔" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔ "ہم تمہارے ساتھ چلیں گے۔ اس سے پہلے ہم ذرا یہاں کا جائزہ لے لیں۔"

"یہاں اب جائزہ لینے کو کیا رکھا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"کیا مطلب۔۔۔۔؟ کیا اب یہاں کوئی خاص، قابلِ ذکر چیز نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہر شخص کا نقطۂ نظر مختلف ہوتا ہے۔ معلوم نہیں، اب تمہاری نظر میں کون سی چیز خاص اور قابلِ ذکر ہو۔" وہ بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "ورنہ یہاں خاص اور قابلِ ذکر چیز تو میں بھی ہوں۔" وہ ایک بار پھر مخمور سے انداز میں مسکرائی۔ معلوم نہیں اس وقت اتنے لوگوں۔۔۔۔ اور خصوصاً زرتاج کی موجودگی میں وہ بار بار کیوں اس طرح قربان جانے والے انداز میں مسکرائے جا رہی تھی ورنہ جب خمیسو خان نے مجھے اس کی میز پر بٹھایا تھا، اس وقت تو وہ ہر بات بڑے سپاٹ اور کاروباری انداز میں کر رہی تھی۔

"تم چیز نہیں۔۔۔۔ تم ایک بہت اچھی عورت ہو۔" میں نے اسے بچوں کی طرح چمکارتے ہوئے کہا۔ "تم ادھر ایک میز پر بیٹھ جاؤ۔ ہم چند منٹ میں واپس آتے ہیں۔"

وہ ایک میز پر جا بیٹھی۔ میرے کہے بغیر ہی ہمارے ساتھیوں میں سے ایک کلاشنکوف بردار اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔ میں زرتاج اور دوسرے لوگوں کو لے کر آگے بڑھا۔ پورے زیرِ زمین کلب میں بتیاں روشن ہو چکی تھیں۔ میں انہیں کلب کا ہر گوشہ دکھانے لگا۔ اس وقت گو کہ وہاں وہ رونق میلہ نہیں تھا جسے دیکھ کر شاید انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آتا۔ اس کے باوجود ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی جا رہی تھیں۔ انہوں نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ اس ویرانے میں زیرِ زمین ایسی بھی کوئی عمارت موجود تھی جس میں عیاشی کے تمام لوازمات سجے ہوئے تھے۔ شراب کا ذخیرہ دیکھ کر ہی زرتاج کی رنگت متغیر ہو گئی۔

پھر اس کا ذہن شاید دوبارہ نورین کی طرف چلا گیا۔ وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولی۔ "یہ عورت کون ہے؟"

"انہی ان گنت بدنصیب عورتوں میں سے ایک۔۔۔۔ جو ستاروں پر کمند ڈالنے نکلتی ہیں اور دلدلوں میں جا گرتی ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "آپ کو اندازہ ہو ہی گیا ہوگا۔"

"ہاں۔۔۔۔ اندازہ تو ہو گیا ہے۔" اس نے سر ہلایا۔

"کچھ عورتیں تو خود بھٹکتی بھٹکاتی ان منزلوں پر پہنچی ہوں گی لیکن اس گروہ نے ایسے چکر بھی چلائے ہوئے تھے کہ مجبور، بے سہارا یا ضرورت مند عورتوں کو بھی گھیر گھار کر ان راستوں پر لایا جاتا تھا اور جو کسی نہ کسی طرح ان کے ہتھے چڑھ جاتی تھیں، ان کا حشر تو آپ سوچ ہی سکتی ہیں کیا ہوتا ہوگا۔" میں نے کہا۔ زرتاج نے متاسفانہ سے انداز میں سر ہلایا۔

بلندی پر جو کمرے واقع تھے وہ کسی معقول ہوٹل کے کمروں کی طرز پر آراستہ تھے۔ میں زرتاج کو ان کمروں میں بھی لے گیا جہاں میں نے اسلحے کی پیٹیاں دیکھی تھیں۔ پیٹیاں اب بھی وہاں موجود تھیں لیکن خالی تھیں۔ ہم نے بہت تیزی سے سب جگہوں کی تلاشی لی لیکن ہمیں وہاں کوئی فائل یا کاغذات وغیرہ نہیں ملے۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت اس جگہ کو بالکل خالی کر دیا گیا تھا۔

ہم واپس آئے تو نورین اسی میز پر بیٹھی مخمور انداز میں مسکرا رہی تھی۔ وہ میرے پوچھنے سے پہلے ہی بولی۔ "یہاں سے بہت سی چیزیں جانو نے منگوا لی تھیں۔ اگر تمہیں کسی خاص چیز کی تلاش تھی تو تمہیں مایوسی ہوگی۔"

"نہیں۔۔۔۔ ہم تو ویسے ہی ذرا اس جگہ کا جائزہ لے رہے تھے۔ جانو کی کاوشوں کی داد دے رہے تھے۔ زندگی میں اتنی محنت کرنے والے اور ایسے ایسے "شاندار" پروجیکٹس تخلیق کرنے والے لوگ روز روز تھوڑا ہی پیدا ہوتے ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا۔ "تم ہمیں کیا بتانے اور دکھانے والی تھیں؟"

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

ہم اس کے ساتھ ہو لیے اور جس راستے سے آئے تھے اسی راستے سے باہر آ گئے۔ کھنڈر کے گرد درختوں کا دائرہ خاصے بڑے حصے میں پھیلا ہوا تھا۔ نورین کی رہنمائی میں ہم اس مختصر جنگل سے نکل کر ایک طرف بڑھے۔ تب میں نے دیکھا، اس سمت میں ایک جھونپڑی سی نظر آ رہی تھی۔ اس وقت تک صبح صادق کے آثار نمودار ہونے لگے تھے۔ اندھیرے میں روشنی کی آمیزش بڑھ گئی تھی۔

ہم کچھ اور آگے بڑھے تو اندازہ ہوا کہ وہ جھونپڑی نہیں، ایک چوبی کیبن تھا جس کے اردگرد خودرو جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ نورین سب سے آگے چل رہی تھی۔ اس کے پیچھے ہمارے آدمی تھے۔ انہوں نے غیر محسوس سے انداز میں اسے اپنی گنوں کی زد پر لیا ہوا تھا۔ میں اور زرتاج سب سے پیچھے تھے۔

زرتاج سرگوشی میں بولی۔ "یہ ہمیں کسی جال میں پھنسانے کے لیے تو نہیں لے جا رہی؟"

"جال میں پھنسانے کے لیے تو وہ تہہ خانہ ہی سب سے اچھی جگہ تھی جہاں سے ہم آ رہے ہیں۔ یہ کیبن تو ویران ہی معلوم ہو رہا ہے۔ بہرحال۔۔۔۔۔ اگر کوئی جال بھی ہوا تو دیکھا جائے گا۔ ہم سب الرٹ تو ہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔

کیبن کے قریب پہنچ کر نورین نے فلمی بدمعاشوں والے اسٹائل میں لات مار کر اس کا دروازہ کھولا۔ میں گو کہ دور کھڑا تھا اور کیبن کے اندر تاریکی تھی لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ کیبن میں کوئی موجود نہیں تھا۔ اس وقت شاید میرے ساتھ ساتھ زرتاج کو بھی حیرت ہوئی جب نورین نے کیبن میں داخل ہو کر کوئی سوئچ آن کیا اور وہاں بتی روشن ہو گئی۔ اندر لوہے کی ایک چارپائی اور ایک تپائی نظر آ رہی تھی۔

میں اور زرتاج بھی آگے بڑھ کر کیبن میں داخل ہو گئے۔ وہ کچھ اسی قسم کا کیبن تھا جیسے بعض مقامات پر چوکیداروں یا گیٹ کیپروں کے کیبن ہوتے ہیں۔ اس میں بے سروسامانی کچھ زیادہ تھی۔ تپائی پر ریڈیو نما کوئی چیز رکھی ہوئی تھی۔ وہ وائرلیس بھی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وائر اس میں موجود تھی۔ پتلی سی ایک تار اس سے منسلک تھی جو کیبن کے ایک کونے میں جا کر غائب ہو گئی تھی۔

"واہ۔۔۔۔! اس ویرانے میں تم لوگوں نے بجلی کا خوب بندوبست کر رکھا ہے۔" میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اس کیبن سے بھی زیرِ زمین تار اس تہہ خانے تک جا رہی ہے۔ وہیں کے جنریٹرز سے سلسلہ جڑا ہوا ہے۔" نورین نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "لیکن میں تمہیں ایک دوسرا سلسلہ دکھانے کے لیے لائی ہوں۔ یہ جو تم میز پر ریڈیو سا رکھا دیکھ رہے ہو۔۔۔۔ مجھے اس کا صرف ایک بٹن دبانا تھا اور پورا تہہ خانہ بھک سے اُڑ جاتا۔ مجھے بٹن اس وقت دبانا تھا جب تم سب لوگ اندر جا چکے تھے۔ تہہ خانے کے ساتھ ہی تم لوگوں کے بھی پرخچے اُڑ جاتے۔"

"لیکن تم خود بھی تو وہیں موجود تھیں۔ ساتھ تمہارے بھی تو پرخچے اُڑ جاتے۔" میں نے کہا۔

"احمق! اگر مجھے اس پروگرام پر عمل کرنا ہوتا تو پھر میں وہاں کیوں موجود ہوتی۔ میں تو یہیں اس آلے کے پاس ہی موجود رہتی۔ تم لوگوں کے آنے سے پہلے میں یہیں موجود تھی۔ میں نے بہت دور سے تم لوگوں کی آمد کے آثار محسوس کر لیے تھے۔ مجھے تم لوگوں کی گاڑیوں کے ہیولے حرکت کرتے دکھائی دیے تھے۔ اسی وقت میں جلدی سے جا کر تہہ خانے میں چھپ گئی تھی۔ کاش میرے پاس میک اپ وغیرہ کا سامان ہوتا تو میں چڑیل بن کر تم لوگوں کو ڈراتی۔ آج میرا کسی سے مذاق کرنے کو جی چاہ رہا تھا۔ برسوں گزر گئے ہیں کہ میں نے کسی سے کوئی مذاق نہیں کیا۔"

"اس مذاق میں تمہاری جان بھی جا سکتی تھی۔" میں نے کہا۔

"جان۔۔۔۔!" اس نے استہزائیہ سے انداز میں قہقہہ لگایا۔ "یہاں جان تو بغیر مذاق کے بھی جا سکتی ہے۔"

"تمہاری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ پوری بات بتاؤ۔۔۔۔" میں نے کہا۔

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بیزاری سے بولی۔ "بات کچھ بھی نہیں ہے۔ بس جانو کی طرف سے کچھ احکامات آئے تھے۔ سب لوگ ہنگامی طور پر یہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ بہت سا سامان بھی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ مجھے اس کیبن میں موجود رہنے کا حکم ملا تھا۔ اس کے علاوہ حکم یہ تھا کہ میں چاروں طرف نظر رکھوں۔ اس کیبن سے دور دور تک کا منظر نظر آتا ہے۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ اگر میں کچھ لوگوں کو کلب کی طرف آتے دیکھوں اور مجھے اندازہ ہو جائے کہ وہ کلب میں داخل ہو چکے ہوں گے تو میں اس بٹن کو دبا دوں۔" اس نے ریڈیو نما چیز کے ایک بٹن کی طرف اشارہ کیا۔ وہ یقیناً تہہ خانے میں نصب کسی ڈائنامائٹ کو ڈیٹونیٹ کرنے کا آلہ تھا۔

میرے لیے جانو یا اس کے گروہ کا یہ اندیشہ باعثِ حیرت تھا کہ کچھ لوگ یہاں پہنچ بھی سکتے تھے۔ انہوں نے یقیناً اس بات کا امکان محسوس کر لیا تھا۔ جانو کو یہ اطلاع تو مل ہی گئی ہوگی کہ خمیسو خان یہاں سے ایک اجنبی کے ساتھ روانہ ہوا تھا جس کے بعد وہ راستے ہی میں رقم سمیت غائب ہو گیا تھا۔ اس سے ہی اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا ہوگا۔

انہوں نے ایسے انتظامات کر رکھے تھے کہ اگر کبھی پولیس وغیرہ کی اس اڈے تک رسائی ہو تو زرتاج اس کی مالک ظاہر ہو لیکن آج انہوں نے اس عشرت کدے کو خالی کر دیا تھا۔ اسلحہ وغیرہ بھی یہاں سے ہٹا دیا تھا اور یہ انتظام بھی کر گئے تھے کہ اگر کچھ لوگ اس ٹھکانے تک پہنچتے دکھائی دیں تو ان لوگوں سمیت اس اڈے کو

دھماکے سے اُڑا دیا جائے۔ اس میں یقیناً جانو کی کچھ اور مصلحت رہی ہوگی لیکن اب جانو اس دنیا میں نہیں تھا اور شاید اس کے بیشتر ساتھی بھی ٹھکانے لگ چکے تھے اس لیے اس مصلحت کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتا سکتا تھا' صرف اندازے قائم کیے جا سکتے تھے۔

میں نے نورین کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "تم نے احکامات پر عمل کیوں نہیں کیا؟ یہ بٹن دبانے کے لیے یہاں موجود کیوں نہیں رہیں؟"

"یہ تو مجھے خود بھی نہیں معلوم۔" وہ بے نیازی سے کندھے اُچکاتے ہوئے بولی۔ "بس...... میرا دل نہیں چاہا۔ حالانکہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم لوگ کون ہو۔ میرے لیے تم اندھیرے میں حرکت کرتے ہوئے محض چند سائے تھے۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں نے تمہیں زندہ چھوڑ دیا تو تم لوگ میرے ساتھ دشمنوں کا سا سلوک بھی کر سکتے ہو۔ اس کے باوجود میں نے بٹن دبانے کا ارادہ نہیں کیا اور خود کلب میں جا کر چھپ کر بیٹھ گئی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ اس حکم عدولی پر جانو میرا نہ جانے کیا حشر کرے۔ اس کے باوجود میں اپنے آپ کو بٹن دبانے پر آمادہ نہ کر سکی۔"

"جانو کا تو اپنا حشر بہت خراب ہو چکا ہے۔" میں نے اسے بتا دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا۔

"کیا ہوا اسے؟" نورین نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ بس وہ مر چکا ہے۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کُتے کی موت مر چکا ہے۔" زرتاج نے گویا تصحیح کی۔

"اوہ......" نورین نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے سیٹی بجائی۔ "ان علاقوں میں دور دور تک رہنے والوں کے لیے یہ اس سال کی سب سے بڑی خبر ہے۔"

"میرا خیال ہے اس کا پورا گروہ بھی جہنم رسید ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔" نورین کی مخمور آنکھیں پھیل گئیں لیکن دوسرے ہی لمحے وہ طمانیت کی گہری سانس لیتے ہوئے بولی۔ "چلو...... اب کم از کم میں اس کے عتاب سے تو بچی رہوں گی۔ میں نے تم لوگوں کو مرنے سے بچا تو لیا تھا لیکن اب دل ہی دل میں ڈر بھی رہی تھی کہ یہ نیکی مجھے مہنگی پڑے گی۔ زندگی میں پہلی بار اتنی بڑی نیکی کی تھی۔ میری زندگی میں تو چھوٹی موٹی نیکیوں کا گزر بھی کم ہی رہا ہے۔"

"تمہاری یہ نیکی رائیگاں نہیں جائے گی۔" میں نے کہا اور آگے بڑھ کر ریڈیو نما آلے کا وہ سرخ بٹن دبا دیا جس کی طرف چند لمحے پہلے نورین نے اشارہ کیا تھا۔ اس طرح اچانک کسی کو بھی مجھ سے اس حرکت کی توقع نہیں تھی۔ یک دم زوردار دھماکا ہوا اور زمین لرز کر رہ گئی۔ دھماکا چونکہ زیرِ زمین ہوا تھا اس لیے اس کی آواز تو ایسی نہیں تھی کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوتے لیکن اس کی دھمک اور گونج اتنی تھی کہ باہر کھڑے ہوئے دو افراد میں سے دو اوندھے منہ گر پڑے۔

"یہ تم نے کیا کیا؟" زرتاج سنبھلتے ہوئے بولی۔

"کیا اس جگہ کا کوئی اور مصرف تھا آپ کے ذہن میں؟" میں نے معصوم بنتے ہوئے پوچھا۔ وہ گویا لاجواب سی ہو گئی۔

میں نے کیبن سے نکل کر دیکھا' درختوں کے درمیان سے اس طرح دھواں بلند ہوتا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی چھوٹا موٹا آتش فشاں پھٹا ہو۔

میں نے رائفل کندھے پر لٹکا کر گویا کسی چھوٹے موٹے کام سے فارغ ہو کر ہاتھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ "چلیے اب واپس چلتے ہیں۔" میں نے نورین کو بھی چلنے کا اشارہ کیا۔

"مجھے ساتھ لے جا کر کیا کرو گے؟" وہ ہچکچاتے ہو [illegible]

"تمہارا بھی کوئی نہ کوئی مصرف نکال ہی لیں [illegible] تم لو تو سہی۔" میں نے جواب دیا۔ وہ گویا بادل نخواستہ ہمارے ساتھ ہو لی۔

راستے میں وہ بولی۔ "تم لوگ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"زرتاج نگر۔" میں نے جواب دیا۔

اچانک وہ چونکی اور زرتاج کی طرف گویا ایک نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھتے ہوئے بولی "کہیں آپ رئیسانی زرتاج تو نہیں ہیں؟"

زرتاج تو کچھ نہ بولی۔ اس کی طرف سے میں نے جواب دیا۔

"ہاں۔ یہ رئیسانی زرتاج ہی ہیں۔ تمہیں یقین نہیں آ رہا کیا؟"

"ہاں۔ مجھے واقعی یقین نہیں آ رہا کہ اتنی بڑی زمیندارنی خود بھی بندوق اٹھا کر اس طرح مٹی اور پسینے میں لتھڑی اپنے دشمنوں اور ڈاکوؤں سے نمٹنے کے لیے نکل سکتی ہے۔" بے یقینی اس کے چہرے سے ظاہر تھی۔ "میں نے تو یہی دیکھا ہے کہ اس طرح کے لوگ صاف ستھرے' اُجلے اُجلے کپڑے پہن کر اپنے عالیشان ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر احکامات صادر کرنا جانتے ہیں اور ان کے احکامات پر لوگ ایک دوسرے کو جانوروں کی طرح بھنبھوڑتے اور ایک دوسرے کی بوٹیاں نوچتے مر جاتے ہیں۔"

زرتاج اب بھی خاموش تھی۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کہا۔ "دنیا میں ہر طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔" پھر میں نے زرتاج کو مخاطب کرتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کی۔ "بعض کام کتنے مشکل نظر آتے ہیں لیکن کتنی آسانی سے ہو جاتے ہیں۔ آج کی رات گو کہ بہت بھاری گزری ہے لیکن کم از کم میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سر سے اتنے بڑے بڑے بوجھ ہٹ جائیں گے۔ جانو کے گروہ کا خاتمہ بھی ہو جائے گا اور اس کا یہ خطرناک ٹھکانا بھی تباہ ہو جائے گا۔"

"امدادِ غیبی اسی کو کہتے ہیں۔" زرتاج مدھم سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

اس وقت تک ہم لوگ گھنے درختوں کی اس پٹی تک پہنچ چکے ، جو دائرے کی سی صورت میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے درمیان ، بدستور دھواں اٹھتا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم اس طرف پہنچے ھر اس دائرے میں داخل ہونے کا راستہ بنا ہوا تھا۔ اس راستے پہنچ کر ہم نے دیکھا' درختوں کے درمیان کھنڈر کا بیشتر حصہ اب ل ہی تباہ ہو چکا تھا۔ وہاں ایک بڑا سا گڑھا پڑ گیا تھا جس سے واں اور پھڑپھڑاتے ہوئے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا ا کہ زمین شق ہو گئی تھی اور زیرِ زمین کوئی آتش فشاں پھٹ گیا ا۔ گو کہ اوپر سے زمین زیادہ نہیں پھٹی تھی اور شعلے بھی زیادہ بلند تے نظر نہیں آ رہے تھے لیکن تپش ہم لوگوں تک پہنچ رہی تھی۔ مین میں پیدا ہونے والے شگاف سے بار بار کثیف دھوئیں کے غولے باہر آنے لگتے تھے اور کبھی کبھی ہلکی سی گڑگڑاہٹ بھی نائی دے رہی تھی۔

چند لمحے تک خاموشی سے یہ نظارہ دیکھنے کے بعد ہم لوگ اس طرف واپس چل دیے جدھر ہم اپنی گاڑیاں چھوڑ کر آئے تھے۔ اس وقت تک صبح کا اجالا پھیل چکا تھا۔ اب ویرانہ بھی خوبصورت اور پُرسکون لگ رہا تھا۔ کہیں کہیں جھاڑ جھنکاڑ اور درخت نظر آ رہے تھے مگر اس وقت وہ بھی نکھرے نکھرے دکھائی دے رہے تھے۔ شاید ہمارے اندر کا موسم بدل چکا تھا۔ کم از کم میں اس وقت خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ رات بھر کی اعصابی کشیدگی کے بعد اب صبح کی تازہ ہوا میں سکون کی سانس لینے کا موقع ملا تھا۔ ہم سب نے رائفلیں وغیرہ کندھوں پر لٹکالی تھیں۔

دوسرے ہی لمحے مجھے معلوم ہوا کہ سکون میری قسمت میں زیادہ دیر کے لیے نہیں تھا۔ پرندہ جہاں ایک لمحے کے لیے غافل ہوتا ہے' عموماً صیاد وہیں چھپا ہوتا ہے۔ ہم گاڑیوں کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ایک کھردری سی آواز سنائی دی۔ "ہینڈز اپ!"

میں نے رائفل کندھے سے اتارنے کے لیے تیزی سے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ فائر کی آواز گونجی اور گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری۔ دونوں گاڑیوں کے عقب سے گنوں کی نالیں جھانک رہی تھیں۔ ہم نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آہستگی سے ہاتھ اٹھا دیے۔ گاڑیوں کے عقب سے دو مرد اور ایک عورت نکل آئی۔ پہلی نظر میں تو عورت بھی مرد ہی دکھائی دی تھی۔

میں نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ وہ جانو کی بیوی تھی...... بلکہ بیوہ سونیا تھی لیکن اس وقت وہ ویسٹرن فلموں کا کوئی کردار معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ اس نے راکیل ویلچ کو کسی فلم میں اس حلیے میں دیکھا تھا۔ وہ [illegible] جیسی جینز اور جیکٹ میں تھی۔ پیروں میں فل بوٹ تھے۔ سر پر صرف فلیٹ ہیٹ کی کمی تھی۔ اس کی جگہ وہ کھلاڑیوں جیسی پی کیپ پہنے ہوئے تھی۔ اس کی کمر کے گرد گولیوں کی پٹی لپٹی ہوئی تھی اور ہاتھ میں لمبی نال اور لمبی ہی رینج کا ایک نہایت خطرناک بیریٹا پسٹل تھا۔

پی کیپ کے نیچے اس کے ریشمی تراشیدہ بال ہوا کے جھونکوں کے ساتھ ہلکورے سے لے رہے تھے۔ اس وقت شاید وہ کافی خوبصورت اور پُرکشش نظر آتی لیکن غیظ و غضب سے اس کا چہرہ کچھ بگڑا ہوا سا تھا۔ دو مرد جو اس کے ساتھ تھے' ان پر نظر ڈالتے ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ڈاکو تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ جانو کے گروہ کا مکمل خاتمہ نہیں ہوا تھا۔ ابھی اس کی نہ جانے کتنی نشانیاں باقی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ سونیا کو دیکھتے ہی نورین کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

سونیا بھی غضبناک نظروں سے اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر وہ دانت پیس کر بولی۔ "غدار کہیں کی! تجھے جو آرڈر ملا تھا تو نے اس پر عمل نہیں کیا اور ان کے ساتھ چل دی۔ تیرا کیا خیال ہے' ان کے ساتھ جا کر تو ملکۂ عالیہ بن جائے گی؟"

"میڈم! میں نے تو حکم پر عمل کیا تھا...... لیکن یہ لوگ بچ گئے......" نورین نے ہکلاتے ہوئے جھوٹ بولنے کی کوشش کی۔

"بکواس مت کرو۔" سونیا گرجی۔ "میں اتنی بے وقوف بھی نہیں ہوں کہ تم لوگوں کے چہرے دیکھ کر جھوٹ سچ کا فرق بھی نہ سمجھ سکوں......" دوسرے ہی لمحے دھماکا ہوا اور نورین ڈھیر ہو گئی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہی محسوس ہوا جیسے کسی نے میرے دل پر گولی ماری ہو۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ سونیا گولی چلانے میں اتنی تیزی دکھائے گی۔ اس نے تو ویسٹرن فلموں کی ہیروئنوں کو بھی مات کر دیا تھا۔

نورین اوندھے منہ گری تھی اور گرتے ہی ساکت ہو گئی تھی۔ اس کی پشت پر کندھے کے نیچے سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے خون اُبل رہا تھا۔ گولی یقیناً اس کے دل سے گزر گئی تھی۔ میں نے اس پر جھکنے کی کوشش کی لیکن سونیا خطرناک انداز میں پستول کو حرکت دیتے ہوئے بولی۔ "تم بالکل سیدھے اور ساکت کھڑے رہو ورنہ تمہارا بھی یہی انجام ہوگا حالانکہ تمہارے لیے میرے دل میں نرم گوشہ موجود ہے۔ گو مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ میرا شوہر اور گروہ کے زیادہ تر لوگ تمہاری وجہ سے مارے جا چکے ہیں لیکن شاید میں تمہیں معاف کر دوں۔ شرط صرف یہی ہے کہ میرے سامنے ہیرو بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

میں ساکت ہو چکا تھا لیکن اسے یقیناً اندازہ نہیں تھا کہ میرے دل میں کیسا شعلہ سا بھڑک اٹھا تھا۔ نورین بلاشبہ ہماری محسنہ تھی۔ اس نے موقع حاصل ہوتے ہوئے بھی ہماری ہلاکت کا سامان نہیں کیا تھا۔ ہم جس وقت تہ خانے میں تھے' ہمیں گمان تک نہیں تھا کہ محض ایک بٹن دبانے سے ہمارے پرخچے بھی اُڑ سکتے تھے۔ نہ جانے اس کی کس سوچ نے ہمیں دوسری زندگی دی تھی اور اسے ہمارے سامنے کسی حقیر جانور کی طرح مار دیا گیا تھا۔ یہ حقیقت میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی لیکن میں اپنے سینے میں امنڈتے ہوئے غیظ و غضب کو دبائے بظاہر بالکل پُرسکون کھڑا تھا۔ میں نے کن انکھیوں سے زرتاج کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور

وہ ایک ٹک سونیا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سونیا کے دونوں ساتھی ڈاکوؤں نے ہمیں کور کیا ہوا تھا اور وہ پلک نہیں جھپک رہے تھے۔

سونیا حقارت آمیز نظروں سے زرتاج کا سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "تم یقیناً زرتاج ہو...... میں نے تمہیں دیکھا نہیں تھا لیکن جانو کی زبانی تمہاری باتیں سُن سُن کر اندازہ ہوچکا تھا کہ تم کیسی عورت ہوگی۔ تمہارے عشق میں پاگل تھا وہ...... تمہارے ہی ہاتھوں انجام کو پہنچ گیا......"

"میں ابھی تک سمجھ نہیں سکی کہ تم کیا کہنا چاہتی ہو؟" زرتاج نہایت پُرسکون لہجے میں بولی۔

"میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ جانو کو مار کر تم یہ مت سمجھ لینا کہ تمہیں اس علاقے میں دشمنوں سے نجات مل گئی......" سونیا تند لہجے میں بولی۔ "اب میں تمہیں پاکستانی پھولن دیوی بن کر دکھاؤں گی...... لیکن نہیں...... تم بھلا یہ سب کیسے دیکھ سکو گی۔ سب سے پہلے تو میں تم ہی کو ہلاک کروں گی۔ ابھی اور اسی وقت۔"

زرتاج بے ساختہ ہنس دی لیکن فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "میں نے تو سنا تھا کہ تم خاصی پڑھی لکھی عورت ہو......"

"اس میں کیا شک ہے۔" سونیا اس کی بات کاٹتے ہوئے تیزی سے بولی۔

"اس کے باوجود تم نے اتنے گھٹیا آئیڈیل بنا رکھے ہیں۔" زرتاج حقارت سے بولی۔ "پھولن دیوی بننا چاہتی ہو تم۔ لعنت ہے تم پر۔"

میری توقع کے برعکس سونیا نے لعنت کا زیادہ برا نہیں منایا تاہم کشیدہ سے لہجے میں بولی۔ "تم جیسے لوگوں نے اور تمہاری اس سوسائٹی نے اس کے علاوہ میرے لیے راستہ ہی کون سا چھوڑا ہے۔"

زرتاج نے میری طرف دیکھا اور ایک طویل سانس لی۔ "وہی معاشرے کا رونا......! دنیا کے زیادہ تر بُرے لوگوں نے اپنی خباثتوں کا جواز گھڑنے کے لیے یہ اچھا افسانہ تراش رکھا ہے۔ بہت کم لوگوں کو بُرا بنانے میں معاشرے یا حالات کا ہاتھ ہوتا ہے لیکن الاپنے کے لیے سب کو یہی راگ مل جاتا ہے۔"

نظریہ تو میرا اپنا بھی یہی تھا تاہم میں خاموش رہا۔ سونیا پر زرتاج کی بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ کھردرے لہجے میں بولی۔ "بکواس بند کرو...... اور تم سب اپنے اپنے ہتھیار سامنے پھینک دو۔"

زرتاج اس کا حکم ان سُنا کرتے ہوئے بولی۔ "میں چاہتی ہوں، تمہیں مجھ جیسے لوگوں اور اس معاشرے سے شکایت نہ رہے۔ میں تمہیں موقع دیتی ہوں کہ تم اب بھی پھولن دیوی بننے کا خیال دل سے نکال دو۔ تم میرے ساتھ چلو۔ تمہیں باعزت زندگی گزارنے کے لیے جو بھی مدد درکار ہوگی وہ میں فراہم کروں گی۔ تم ذرا دبنگ قسم کی عورت معلوم ہوتی ہو۔ میں تمہیں اپنی زمینوں کی منیجر بنا دوں گی۔ میں چاہتی ہوں، عورتیں اس قسم کے کاموں میں بھی آگے آئیں۔ یہ پہلی مثال ہوگی کہ ایک بڑی زمیندارنی کی زمینوں کی منیجر بھی عورت ہوگی۔"

"مجھے چارہ مت ڈالو۔ مجھے معلوم ہے، تم اس قسم کے خواب دکھا کر مجھے لے جاکر پولیس کے حوالے کردو گی۔ جانو کی بیوی اور اس کی شریکِ کار کی حیثیت سے میں بھی پولیس کو مطلوب ہوں۔" سونیا منہ بنا کر بولی۔

"میں اتنی چھوٹی عورت نہیں ہوں کہ جان بچانے کے خوف سے جھوٹ بولنے لگوں، جھوٹے وعدے کرنے لگوں۔ میں تو ان لوگوں میں سے ہوں جو وعدہ نبھانے کے لیے جان بھی دے دیتے ہیں۔ تمہیں پولیس سے بچانے کی ذمے داری بھی میں لیتی ہوں۔ اب تمہیں کیا اعتراض ہے؟ میں نے تو سنا تھا کہ تم اپنے شوہر کے ڈاکو ہونے سے بیزار ہو...... تم اس دلدل میں آکر پھنس گئی تھیں...... یہ تمہارے آئیڈیلز نہیں تھے...... وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اب تم خود ڈاکو بننے نکل کھڑی ہوئی ہو۔"

"جانو ڈاکو تھا یا دہشت گرد، وہ بہرحال میرا شوہر تھا۔ میں اسے ہلاک کرنے والوں کو معاف نہیں کرسکتی۔ میرے ہاتھ اس سے پہلے بھی خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ اب یہ غدار بھی میرے ہاتھوں ماری جاچکی ہے......" اس نے نورین کی لاش کی طرف اشارہ کیا۔ "اب تم لوگوں کو بھی زندہ چھوڑنے کا میرا ارادہ نہیں ہے۔ ظاہر ہے اس کے بعد میرے سامنے واپسی کا راستہ نہیں رہے گا۔"

"فی الحال تو راستہ موجود ہے لیکن اپنے لیے راستے تم خود بند کررہی ہو۔" زرتاج بولی۔

"ان دو آدمیوں کے علاوہ بھی ابھی کچھ آدمی میرے ساتھ ہیں جو اپنی جان پر کھیل کر مجھے اپنی سردارنی سمجھ کر جانو کی چھوڑی ہوئی بادشاہت کی حفاظت کی کوشش کررہے ہیں۔ میں انہیں مرنے کے لیے چھوڑ کر تمہارے سائے میں پناہ نہیں لے سکتی۔ یہ میرے لیے جانیں دینے والے لوگ ہیں۔ میں بھی ان کی خاطر جان دے سکتی ہوں۔"

"دیکھا...... میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ اصل میں تم جیسے لوگوں کا خمیر ہی خراب ہوتا ہے۔ معاشرے اور حالات کے تو صرف بہانے ہوتے ہیں۔ صرف بُرے لوگ ہی بُرے لوگوں کے لیے جان دینے کو تیار رہتے ہیں۔" زرتاج بولی۔

سونیا کے ساتھی ڈاکوؤں میں سے ایک بے تابی سے کلاشنکوف کو حرکت دیتے ہوئے ہم پر سے نظر ہٹائے بغیر سونیا سے مخاطب ہوا۔ "میڈم! اس قصے کو جلدی ختم کریں۔ ابھی ہمیں اڈے پر واپس جاکر بہت سے کام نمٹانے ہیں۔"

سونیا اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ کے اشارے سے اسے گویا تسلی دیتے ہوئے بولی۔ "غم نہ کرو۔ میں بات ان سے کررہی ہوں لیکن میرا دماغ دوسری طرف بھی کام کررہا ہے۔ ہمارا بڑا نقصان ہوا ہے۔ سارا نقصان تو پورا نہیں ہوسکتا لیکن اگر ہم زرتاج کو ساتھ لے چلیں تو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پورا ہوجائے گا۔"

شاید ایسے ہی موقعوں کے لیے کہا گیا ہے کہ لالچ بُری بلا ہے۔ سونیا کے جو عزائم نظر آرہے تھے، اگر وہ ان پر قائم رہتی تو ہماری جانوں کو شدید خطرہ لاحق تھا۔ گنیں اب بھی ہمارے کندھوں پر تھیں لیکن جس طرح سونیا اور اس کے ساتھیوں نے ہمیں کور کیا ہوا تھا اور جس طرح ہم پر نظر رکھی ہوئی تھی، ہمارے لیے گنیں کندھوں سے اتارنا، سیدھی کرنا اور فائر کرنا تقریباً ناممکن نظر آرہا تھا۔ یہ معمولی سا کام ایک طویل اور پیچیدہ عمل نظر آرہا تھا لیکن اگر سونیا صرف زرتاج کو بھی زندہ لے جانے کے چکر میں پڑ گئی تھی تو ہمارے لیے امید کی کوئی کرن نظر آنے کا امکان پیدا ہوگیا تھا۔

سونیا کی نظر زرتاج پر ہی مرکوز رہی لیکن وہ پسٹل کی خفیف سی جنبش سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اگر تم یہ آدمی مجھے دے دو تو میں واقعی تمہیں پاکستانی پھولن دیوی بن کر دکھا دوں گی۔"

زرتاج ناگواری سے بولی۔ "یہ آدمی کوئی ٹھیلے پر رکھا ہوا امرود نہیں ہے کہ میں اٹھا کر تمہیں دے دوں۔ تم اس آدمی سے خود ہی کیوں نہیں پوچھ لیتیں کہ یہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے یا نہیں...... اور تمہیں پھولن دیوی بنانے کے "عظیم کارِ خیر" میں تمہارا ہاتھ بٹانا چاہتا ہے یا نہیں۔"

"مجھے لگتا ہے کہ یہ تمہارے جادو میں پھنسا ہوا ہے اس لیے تم سے ہی پوچھ رہی ہوں۔" سونیا بولی۔ "اسے جب میں نے پہلی بار اپنے اڈے پر جانو کے روبرو دیکھا تھا اور ہمارے آدمیوں نے اسے مارنے پیٹنے کی کوشش میں اس کے ہاتھوں مار کھائی تھی، اس وقت ہی نہ جانے کیوں میرے دل نے کہہ دیا تھا کہ یہ شخص جانو اور اس کے گروہ کی تباہی کا سبب بنے گا۔"

"اس کے باوجود تم اسے ساتھ لے جانا چاہتی ہو؟" زرتاج چُبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"ہاں۔ میرے خیال میں یہ من موجی ہے۔ اس کی کوئی منزل نہیں ہے۔ اسے اپنا فائدہ نظر آئے یا کسی طرف اس کا دل پلٹ جائے تو یہ کسی کا بھی ساتھی بن سکتا ہے......"

اس الو کی پٹھی نے میرے بارے میں بہت ہی غلط اندازہ قائم کیا تھا۔ تاہم میں خاموش ہی رہا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں اس کی باتوں سے لطف اندوز ہوتا۔ اچانک اس نے براہِ راست میری آنکھوں میں جھانکا اور دو ٹوک لہجے میں بولی۔ "میں تمہیں بچے کھچے گروہ کا سردار اور اپنا مالک و مختار تسلیم کرسکتی ہوں...... تم نے جو کچھ بھی کیا وہ سب معاف کرسکتی ہوں۔ ہماری طرف آجاؤ...... زرتاج بے شک ایک دولت مند زمیندارنی ہے لیکن ہمارے پاس بھی کافی دولت موجود ہے۔ تم میرے ساتھ مل جاؤ تو ہم اس گروہ کو شاید پہلے سے بھی بڑا کرلیں...... زیادہ مضبوط، زیادہ طاقتور بنالیں۔ زرتاج کے ساتھ رہ کر تمہیں کیا ملے گا؟ اگر اس نے تم سے شادی کر بھی لی ہوتی تو تمہاری عمر اس کی جوتیاں سیدھی کرتے ہی گزرتی...... اور اب تو اس کا بھی کوئی امکان نہیں...... کیونکہ تمہاری زندگیاں اب میرے ہاتھ میں ہیں......"

جب کوئی یہ کہتا ہے کہ فلاں کی زندگی اس کے ہاتھ میں ہے، تو مجھے بڑا عجیب لگتا ہے۔ نہ جانے کیوں اسی لمحے مجھے یقین ہوجاتا ہے کہ اس کی اپنی زندگی انجام کے قریب پہنچ چکی ہے۔

میں نے زرتاج کی طرف دیکھے بغیر محسوس کیا کہ شاید اس کا چہرہ سرخ ہورہا تھا۔ وہ گھٹے گھٹے لیکن برہم سے لہجے میں بولی۔ "تم اب حد سے زیادہ ہی بکواس کررہی ہو۔ افضل خان سے میرا کوئی معاشقہ نہیں چل رہا...... ہم شادی کی تیاریاں ہرگز نہیں کر رہے...... اور اگر ایسی کوئی بات ہوتی تب بھی میں اس طرح سرِراہ کھڑے ہوکر اسے ڈسکس کرنا ہرگز پسند نہیں کرتی۔ تمہیں افضل خان سے جو بھی پوچھنا ہے ویسے ہی پوچھ لو۔ اتنی بکواس اور دلیل بازی کی کیا ضرورت ہے؟"

سونیا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ بھی نشے کی عادی تھی۔ اس وقت بھی مجھے پنک میں لگتی تھی لیکن اسے اپنے اوپر خوب قابو تھا۔ تاہم نشے نے اس کے ذہن کو متاثر ضرور کیا تھا۔ اس کی باتوں میں کچھ نہ کچھ سنکی پن کی جھلک ضرور تھی۔

میں نے اپنی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک پیدا کرنے کی کوشش کی گویا میں دل ہی دل میں اس کی تجویز پر غور کرنے لگا تھا۔ سونیا کی نظر اب مجھ پر تھی۔ وہ پسٹل کو خفیف سی جنبش دیتے ہوئے بولی۔ "کیا کہتے ہو؟"

"کیا اس قسم کی باتوں کا جواب بندوق کی نوک پر لیا جاتا ہے؟" میں نے اتنی دیر میں پہلی بار زبان کھولی۔

"مجبوری ہے...... فی الحال تو تم پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔" سونیا نے کندھے اچکائے لیکن میں نے محسوس کیا کہ اس کے چہرے پر وحشت و درندگی کافی حد تک کم ہوچکی تھی۔

"اگر اب بھروسا کرنا مشکل ہے تو پھر آگے چل کر بھی مشکل ہی ہوگا۔" میں نے گویا بات ختم کرنے کی کوشش کی لیکن اب وہ بات ختم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے یقیناً میری آنکھوں میں دلچسپی کی چمک دیکھ لی تھی۔

"خیر...... ہم دیکھیں گے اس سلسلے میں کیا ہوسکتا ہے...... فی الحال تم سب اپنی گنیں اپنے سامنے ذرا دور پھینک دو۔" سونیا نے شاہانہ انداز میں حکم دیا۔

مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ اب وہ کم از کم مجھے اور زرتاج کو زندہ ساتھ لے جانے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہوچکی تھی۔ میں چاہتا تو اس کی پیشکش قبول کرنے کا ڈراما رچا سکتا تھا اور ان کے خفیہ اڈے تک پہنچ کر ان کے بچے کھچے گروہ کا بھی خاتمہ کرنے کی کوئی تدبیر کرسکتا تھا لیکن میں اب کسی لمبے چکر میں پڑنے کے لیے تیار

نہیں تھا۔ میں اس علاقے میں کچھ زیادہ ہی اُلجھتا جا رہا تھا۔ میں تو شاید کئی دن پہلے یہاں سے نکل جاتا لیکن حالات عجیب سے عجیب تر رخ اختیار کیے جا رہے تھے۔ اب میں ان حالات میں مزید اُلجھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ مجھے جو کچھ بھی کرنا تھا' فوری طور پر کرنا تھا۔

زرتاج سے گویا میرا کچھ ذہنی رابطہ سا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ میں جو کچھ سوچ رہا ہوں' جو کچھ کرنے لگا ہوں' زرتاج کو اس کا اندازہ ہے اور وہ اس میں میرا ساتھ دے گی۔

ہم نے اپنی اپنی گنیں اتارنے کے لیے ہاتھ کندھوں کی طرف بڑھائے۔ ہمارے آدمی ہم سے ذرا پیچھے تھے اور ایک دوسرے کے زیادہ قریب نہیں تھے۔ گو کہ میں مُڑ کر ان کی طرف دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے کسی حد تک ان کی پوزیشن کا اندازہ تھا۔ ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید وہ خاطر خواہ پھُرتی کا مظاہرہ کر سکیں۔ تعداد بہرحال ہماری زیادہ تھی۔ ہم سونیا اور اس کے ساتھیوں کو کنفیوژ کر سکتے تھے۔

جونہی ہمارے ہاتھ کندھوں کی طرف بڑھے' سونیا اور اس کے ساتھی کچھ اور مستعد ہو گئے۔ ٹریگرز پر ان کی انگلیوں کا دباؤ بڑھ گیا۔ سونیا نے تو پسٹل دونوں ہاتھوں سے تھام لیا تھا اور اس کا نشانہ میں تھا۔ زیادہ نشہ کرنے والوں کی آنکھیں عموماً دُھندلائی دُھندلائی سی رہتی ہیں لیکن اس کی آنکھوں میں اس وقت سانپ کی سی چمک تھی۔

"نہایت آہستگی سے گنیں کندھے سے اتارنا...... ذرا بھی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا...... یہ تمہاری زندگی اور موت کا سوال ہے....." سونیا نے خبردار کیا۔

کندھوں سے گنیں اتارنے تک ہم نے اس کی ہدایت پر عمل کیا یعنی ہاتھوں کو نہایت آہستگی سے حرکت دی۔ پھر بظاہر ہم گنیں اپنے سامنے پھینکنے لگے اور اسی لمحے ہمارے ہاتھوں نے تقریباً یکساں انداز میں حرکت کی۔ میں نے اپنی گن سونیا کے منہ پر دے ماری تھی اور زرتاج نے اس کے ساتھی کے منہ پر پھینکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ہم نے زمین پر گرتے ہوئے لوٹ لگائی تھی۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ فضا میں گونجی۔ ہمارا صرف ایک آدمی خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ کر سکا۔ وہ کندھے سے گن اتارنے اور گر کر لوٹ لگاتے ہوئے برسٹ مارنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس برسٹ نے سونیا کے دونوں ہی آدمیوں کا بیک وقت کام تمام کر دیا لیکن اس دوران ہمارا ایک آدمی بھی کام آ گیا۔ باقی اتفاقاً ہی بچ گئے۔ قسمت ان پر مہربان تھی۔

سونیا نے مزید فائر کرنے کے بجائے پلٹ کر بھاگنے کی کوشش کی تاکہ ہماری رسائی سے نکل جائے۔ چند قدم ہٹ کر وہ ہمیں دوبارہ نشانہ بنانے کی کوشش کر سکتی تھی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس وقت تک اس کی ٹانگ میری رسائی میں آ چکی تھی۔ میں نے ٹانگ پکڑ کر کھینچ لی۔

وہ گر پڑی لیکن گرتے گرتے بھی اس نے پلٹ کر فائر کیا۔ گولی میرے سر سے ذرا بلندی سے ہی گزر گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے گولی چلانے کا موقع نہیں دیا۔ میں اچھل کر اس پر جا گرا اور اس کا پسٹل والا بازو میرے ہاتھ میں آ گیا۔ میں نے اسے کسی درخت کی ٹہنی کی طرح مروڑ کر رکھ دیا۔ اس کے حلق سے ذبح کیے ہوئے بکرے کی سی آواز نکلی۔ شاید اس کا بازو جوڑ پر سے ہی اکھڑ گیا تھا۔

پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں نے جھپٹ کر اسے اٹھا لیا۔ اس آخری لمحے میں' میں نے اس کے چہرے پر بے پناہ دہشت اور بے یقینی دیکھی لیکن میں نے وہ لمحہ سوچ بچار میں ضائع نہیں کیا۔ میں نے اسی کے پستول کی گولی اس کے سینے میں اتار دی۔ گولی بالکل اسی طرح عین اس کے دل سے گزر گئی جس طرح نورین کے دل سے گزری تھی۔ یہ میرا اندازہ تھا اور ان معاملات میں میرے اندازے شاذونادر ہی غلط ہوتے تھے۔ وہ گولی بھی اس کے پسٹل کی آخری گولی تھی۔ میں نے دوبارہ ٹریگر دبایا تو صرف کلک کی آواز سنائی دی۔

میں آہستگی سے گھوما۔ وہ جگہ اب کچھ اچھا منظر پیش نہیں کر رہی تھی۔ ایک لمحے پہلے تک جہاں زمین بے داغ تھی اب وہاں خون پھیلا ہوا تھا اور دھیرے دھیرے جذب بھی ہو رہا تھا۔ اس زمین پر شاید بہت ہی منحوس قدموں کی آمدورفت رہی تھی جو خون کی پیاسی ہو گئی تھی ورنہ زمین ایسی ہوتی نہیں...... وہ تو اپنی کوکھ سے انسان کے لیے رزق اور دولت اگلتی ہے۔

زرتاج میرے برابر آن کھڑی ہوئی تھی۔ وہ متاسفانہ سی نظروں سے سونیا کی لاش کو دیکھتے ہوئے بولی۔ "یہ عورت تھی...... اور ذرا مختلف قسم کی عورت تھی...... لیکن تم نے اسے ہلاک کرنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا۔"

میں نے نورین کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ بھی عورت تھی...... اور ہماری محسنہ تھی۔ سونیا نے بھی اسے ہلاک کرنے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا تھا۔"

"اوہ......" زرتاج نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے صرف اتنا ہی کہا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "اس کے علاوہ...... اگر میں ایک لمحہ تامل کرتا تو شاید سونیا کی جگہ میری لاش پڑی ہوتی۔"

"اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟" زرتاج ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ "ہماری گاڑیوں میں ان سب لاشوں کو لے جانے کی گنجائش نہیں۔"

"گاڑی تو شاید ان لوگوں کی بھی کہیں آس پاس ہی موجود ہوگی۔" میں نے کہا۔ "لیکن ہمیں لاشوں کو نہیں چھیڑنا چاہیے۔ کچھ کام پولیس کے لیے بھی چھوڑ دینا چاہیے۔"

ہم نے کچھ دور تک اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھا۔ ہمیں ایک جگہ درختوں کے ایک جھنڈ کے عقب میں ایک جیپ کھڑی نظر آئی۔ جس وقت ہم لوگ گولڈ کلب کی تباہی کے نظارے میں محو تھے' شاید اس وقت سونیا اور اس کے ساتھی اس جیپ میں یہاں پہنچے تھے۔ میں نے اس جیپ کی تلاشی لی لیکن اس میں کوئی خاص چیز نہیں تھی۔ ہم نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور اپنی دو گاڑیوں میں بیٹھ کر واپس روانہ ہو گئے۔

ہم زرتاج گھر واپس پہنچے تو ایک پولیس پارٹی وہاں پہنچی ہوئی تھی۔ ایک ڈی ایس پی ان کی قیادت کر رہا تھا۔ پولیس گاؤں کے ان لوگوں میں سے چند کے بیانات قلمبند کر رہی تھی جنہوں نے ڈاکوؤں سے مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ کمدار ان سے نمٹ رہا تھا۔ پولیس کا سامنا ہونے سے پہلے ہی زرتاج کو ان کے بارے میں تمام اطلاعات مل گئیں۔ وہ ابھی باغ میں ہی تھے۔

جو شخص ان کے بارے میں اطلاع لے کر آیا تھا' زرتاج نے اس سے کہا۔ "ٹھیک ہے.... انہیں اپنا کام کرنے دو۔ میں اس وقت سخت تھکی ہوئی ہوں۔ حویلی میں جا رہی ہوں۔ پہلے میں ذرا ستا لوں اور اپنا حُلیہ تھوڑا بہت ٹھیک کر لوں' اس کے بعد ڈی ایس پی صاحب کو میرے پاس لے کر آنا۔"

"ٹھیک ہے رئیسانی جی!" وہ شخص ہاتھ باندھ کر بولا اور زرتاج نے چیرو کا رخ حویلی کی طرف موڑ دیا۔

حویلی میں نچلی منزل پر تینوں لاشیں اسی طرح پڑی تھیں۔ زرتاج نے اپنے آدمیوں کو مختلف کام سنبھالنے کے سلسلے میں ہدایات دیں اور میرے ساتھ اوپر کی منزل پر آ گئی۔ مجھے اوپر کی منزل کے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر وہ چند ہی منٹ میں لباس تبدیل کر کے اور اپنا حُلیہ کافی حد تک درست کر کے واپس آ گئی۔ اس کام میں اتنی پھرتی دکھا کر اس نے گویا عورتوں کی روایت کو توڑ دیا تھا۔

میں اس وقت اسی بالکونی میں چق کے پیچھے کھڑا تھا جہاں سے میں نے کچھ دن پہلے جانو اور خمیسو خان وغیرہ کی آمد کا نظارہ کیا تھا۔ مجھے یقین کرنا مشکل محسوس ہو رہا تھا کہ اب ان لوگوں کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب یہاں میرا کام بھی ختم ہو چکا تھا۔ قدرت مجھ سے جو کام لینا چاہتی تھی' لے چکی تھی۔ اب مجھے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ مجھے پولیس کی نظر میں آنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس سے میرے لیے اُلجھنیں کھڑی ہو سکتی تھیں اور میرے یہاں سے نکلنے کے پروگرام میں تاخیر ہو سکتی تھی۔

زرتاج تھکے تھکے سے انداز میں ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ میں نے رائفل اس کے صوفے کے سہارے کھڑی کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے' میرے رخصت ہونے کے لیے یہی وقت مناسب ہے۔ میں پولیس کے چکروں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ میں خاموشی سے رخصت ہو جاتا ہوں۔ آپ جس طرح مناسب سمجھیں پولیس کو کہانی سنا دیجیے گا۔"

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "اب ایسی بھی کیا آفت آ رہی ہے؟ یہ کون سا وقت ڈھونڈا ہے تم نے رخصت ہونے کا؟ ہم اتنی خطرناک صورت حال سے گزرے ہیں۔ تم کم از کم ایک آدھ دن تو ستا لو۔ پولیس کی تم فکر مت کرو۔ ان سے میں نمٹ لوں گی۔ اب میں اتنی بھی گئی گزری نہیں ہوں۔ شرافت اور امن سے رہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میرا یہاں کوئی دبدبہ نہیں ہے۔"

"نہیں...... یہ مسئلہ نہیں ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے ہی...... نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ میں یہاں مزید ایک آدھ گھنٹا بھی رُکوں گا تو مزید اُلجھتا چلا جاؤں گا۔ اب میرا چلے جانا ہی بہتر ہے....."

تھوڑی سی بحث و تمحیص کے بعد بالآخر اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی اور بولی۔ "کم از کم اپنا حُلیہ تو کچھ ٹھیک کرتے جاؤ..... میں تمہارے لیے کسی ڈھنگ کے لباس کا تو فوری طور پر بندوبست نہیں کر سکتی لیکن کم از کم صاف شلوار قمیص مہیا کر سکتی ہوں....."

اس نے ملازمہ کو ذرا بڑے سائز کی ایک شلوار اور قمیص کا انتظام کرنے کے لیے کہا۔ میری حالت اس وقت واقعی خانہ بدوشوں سے بدتر تھی۔ میں جب لباس تبدیل کر کے اور زرتاج ہی کی طرح اپنے آپ کو تھوڑا بہت "جھاڑ پونچھ" کر دوبارہ اس کے سامنے آیا تو وہ کسی سوچ میں ڈوبی بیٹھی تھی۔

میری آہٹ سن کر سر اٹھاتے ہوئے بولی۔ "سفر کے لیے تمہیں کچھ رقم کی بھی تو ضرورت ہو گی؟"

"میں نے کچھ انتظام کر رکھا ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ نے مجھے جو سرونٹ کوارٹر دے رکھا ہے' وہاں ایک الماری میں' میں نے کچھ رقم چھپائی ہوئی ہے۔"

"اسے تو بھول جاؤ۔" زرتاج وثوق سے بولی۔ "تمہیں یاد نہیں' عبدل جو وہاں تمہارا کھانا وغیرہ پکاتا تھا' غدار تھا...... جانو کا ایجنٹ تھا..... جب وہ اور جانو وغیرہ حویلی میں گھسے تھے تو وہ خود اپنے منہ سے کہہ رہا تھا کہ وہ تمہارے کمرے کی اچھی طرح تلاشی لے چکے تھے۔ جب ڈاکو بہت اچھی طرح تلاشی لے چکے ہوں تو تمہیں وہاں رقم محفوظ رہ جانے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔"

اس کی بات معقول تھی۔ میں تذبذب کے سے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ وہ اٹھی اور ملحقہ کمرے میں چلی گئی۔ چند لمحے بعد وہ واپس آئی اور نوٹوں کی ایک گڈی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ "یہ رکھ لو..... گھر میں اس وقت زیادہ کیش نہیں ہے۔ تم آج کا دن رُکتے تو جتنی رقم کا چاہتے' بندوبست ہو سکتا تھا۔"

وہ بڑے نوٹوں کی سربمہر گڈی تھی۔ ایک لاکھ روپیا تھا۔ میں نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔ "آپ اسے کم سمجھ رہی ہیں؟ میرے لیے تو یہ بہت زیادہ ہے۔ میں اتنی رقم کا کیا کروں گا؟ مجھے

کون سا جہاز سے سفر کرنا ہے اور فائیو اسٹار ہوٹلوں میں ٹھہرنا ہے۔ میں تو آج کل صحیح معنوں میں عوامی زندگی گزار رہا ہوں اور لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ مجھے تو پانچ دس ہزار روپیا دے دیجئے۔ میرے لیے بہت ہوگا۔ کافی دن عیش و عشرت سے گزر جائیں گے۔"

"مذاق مت کرو۔ مجھے معلوم ہے' یہ رقم تمہارے لیے نہایت معمولی ہے لیکن تم اسے بوجھ سمجھ کر قبول نہیں کر رہے۔ خدا کے لیے اسے بوجھ مت سمجھو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تم خود مجھ پر کتنے بڑے احسانات کا بوجھ چھوڑ کر جا رہے ہو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"میں نے اگر کوئی اچھا کام کیا ہے تو اسے خود پر احسان مت سمجھیں۔ یہ سب کچھ بس خود بخود ہوتا چلا گیا۔ جہاں تک رقم کا تعلق ہے تو ان دنوں میرے لیے بڑی سے بڑی رقم بھی حقیر سی ہو کر رہ گئی ہے۔ میں جن حالات سے گزر رہا ہوں ان میں کئی بار مجھے احساس ہوا کہ بعض اوقات نوٹوں کی گڈیاں انسان کے لیے ردی کاغذ کے پرزوں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں......" میں نے کہا تاہم اس کے اصرار پر مجھے وہ گڈی اپنی واسکٹ کی جیب میں رکھنا پڑی۔

"میں نے ملازمہ کی زبانی پیغام بھجوا دیا ہے....." زرتاج بولی۔ "حویلی کے باہر ڈرائیور آچکا ہوگا۔ وہ پجیرو میں تمہیں بس اڈے تک لے جائے گا۔ بس سے تم ڈہرکی چلے جانا اور وہاں سے کراچی جانے کے لیے کوئی بھی ٹرین پکڑ لینا۔"

"میں آپ کی عنایات کو ہمیشہ یاد رکھوں گا۔" میں نے کہا۔

"پھر کب ملاقات ہونے کی امید رکھی جائے؟" اس نے منہ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ میں نے اس کے لہجے میں افسردگی کی جھلک محسوس کی۔

"زندگی رہے تو ملاقات کی امید رہتی ہی ہے۔" میں نے کہا۔ اس نے شکوہ نہیں کیا کہ میں نے اسے اپنا کوئی ایڈریس نہیں دیا تھا۔ اس نے مانگا بھی نہیں تھا۔ ادھر انا تھی اور ادھر ایک بے وجہ سی احتیاط۔

میں نیچے آگیا' ابھی تک گیٹ پر گارڈز اپنی ڈیوٹی پر واپس نہیں آسکے تھے اور گیٹ کھلا ہی تھا۔ میں حویلی کی بالکونی کے نیچے سے نکل کر برآمدے کی سیڑھیاں اتر کر گیٹ کی طرف بڑھا۔ ابھی میں دو تین قدم ہی آگے بڑھا تھا کہ ایک باوردی پولیس والا ہچکچاہٹ آمیز سے انداز میں اندر داخل ہوا۔ کسی طرف سے ایک ملازمہ اسے روکنے کے لیے آگے بڑھی لیکن اسی لمحے اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔

ایک لمحے کے لیے ہم دونوں ساکت رہ گئے۔ اس نے مجھے اور میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ انسپکٹر رحیم گل تھا اور حویلی کی طرف غالباً تنہا ہی آیا تھا۔ نہایت پھرتی سے اس نے ریوالور نکال کر مجھ پر تان لیا۔ میں اس وقت بالکل نہتا تھا۔ میں نے پلٹ کر بھاگنے یا ادھر ادھر ہونے کی کوشش نہیں کی۔

"تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ اس وقت تک وہ طویل و عریض احاطے کے وسط میں [illegible] چکا تھا۔

"میں اس وقت خود اپنے علاوہ کسی کے ساتھ نہیں چل سکتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ درحقیقت میں ایسی کسی صورت حال کے اندیشے کی وجہ سے یہاں مزید نہیں رک [illegible] تھا لیکن اس قسم کی صورت حال پھر بھی میرے سامنے آہی گئی تھی۔

"میں ہر حال میں تمہیں ساتھ لے کر جاؤں گا۔" وہ ضدی انسانوں کے سے انداز میں بولا۔ معلوم نہیں وہ اکیلا کس چکر میں حویلی کی طرف نکل آیا تھا۔ باقی پولیس والے شاید ابھی باغ اور گاؤں میں ہی اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ رحیم گل ان کے ساتھ نہیں بلکہ الگ ہی اپنے طور پر آیا ہو۔ احاطے میں اس وقت بھی کئی لاشیں پڑی تھیں اور رحیم گل کے تیور کچھ ایسے تھے جیسے وہ ان میں ایک اور لاش کا اضافہ کرنا چاہتا ہو۔

"آخر تم کیوں مجھے ساتھ لے جانے پر تلے ہوئے ہو؟" میں نے ملامت سے پوچھا۔

"کیونکہ تم ایک خطرناک مجرم ہو۔ قتل اور ڈکیتی کی کئی وارداتوں میں مجھے مطلوب ہو۔" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"تمہیں یا قانون کو؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ایک ہی بات ہے۔" وہ بولا۔ حالانکہ اس بدبخت کو معلوم ہو چکا تھا کہ میں نے اس کی جان بچائی تھی۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں اپنے خیال پر اڑا ہوا تھا۔

"میں مجرم نہیں ہوں..... نہ ہی میں نے کسی بے گناہ کو قتل کیا ہے اور نہ ہی میں نے کوئی ڈاکا ڈالا ہے۔" میں نے ملامت سے کہا۔ "مجھے جانے دو۔"

"اگر یہ باتیں اتنی ہی آسانی اور سادگی سے طے ہو جایا کرتیں تو پھر پولیس اور عدالتوں وغیرہ کی کیا ضرورت تھی۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"تمہیں یقین ہے کہ میں ایک خطرناک مجرم ہوں؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے پوچھا۔ وہ کچھ گڑبڑا گیا۔

"میرے یقین کو چھوڑو۔ فیصلہ عدالت میں ہوگا۔ میرا کام تمہیں گرفتار کرکے عدالت میں پیش کرنا ہے۔ واقعاتی اور ظاہری شہادتیں تمہارے خلاف ہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔

"بعض اوقات انسان کی آنکھیں اسے دھوکا دیتی ہیں اور تم بھی بہرحال ایک انسان ہو۔" میں نے کہا۔ "کچھ وقت ضرور [illegible] لیکن حقائق بہرحال تمہارے علم میں آجائیں گے۔ فی الحال مجھے جانے دو۔ میں یہاں الجھنا نہیں چاہتا......" میں نے چلنے کے لیے قدم بڑھایا۔ میری نظر اس کی اس انگلی پر جمی ہوئی تھی جو ٹریگر پر تھا۔ ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا۔

اچانک ایک فائر ہوا۔ مجھے جھٹکا سا لگا لیکن پھر احساس ہوا کہ گولی مجھے نہیں لگی تھی۔ فائر رحیم گل نے نہیں کیا تھا بلکہ اس کے ہاتھ سے تو ریوالور نکل کر دور جا گرا تھا۔ میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ بالکونی کی جق اٹھی ہوئی تھی۔ زرتاج رائفل لیے بالکونی میں کھڑی تھی۔ میں دل ہی دل میں اس کے نشانے کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ رحیم گل کبھی اپنے خالی ہاتھ کی طرف اور کبھی زرتاج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کا ہاتھ زخمی نہیں ہوا تھا۔

"اسے جانے دو رحیم گل!" زرتاج بلند لیکن پُرسکون آواز میں بولی۔ "یہ تمہارا مطلوبہ آدمی نہیں ہے۔ اس نے تو الٹا تمہاری جان بچائی تھی۔ یہ ایثار کا قیدی ہے۔ اس نے بڑے افسانوی انداز میں کسی کے لیے ایثار کرنے کی کوشش کی تھی اور تمہاری نظر میں مجرم بن گیا۔ میں تمہیں اس کی پوری کہانی سنا دوں گی لیکن فی الحال اسے جانے دو۔"

"کہانیاں بعد میں سُنی جاتی رہیں گی اور ان کی حقیقت کا بھی پتا چل جائے گا لیکن فی الحال میں اس کو گرفتار کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔" رحیم گل بلند آواز میں بولا۔ وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔ اس سے جو کچھ کہا جا رہا تھا' اگر وہ کسی حد تک اس کی صداقت کا قائل تھا تب بھی کارروائی وہ اپنی مرضی کے مطابق ہی کرنا چاہتا تھا۔ معلوم نہیں وہ کسے مطمئن کرنا چاہتا تھا۔ قانون کو' اپنی انا کو یا اپنی شکی طبیعت کو؟

"اسے خواہ مخواہ اپنی انا کا مسئلہ مت بناؤ رحیم گل! میرا مہمان جانا چاہتا ہے تو اسے جانے دو۔ یہ تو تم پولیس والوں پر بھی بہت سے احسانات کر کے جا رہا ہے۔ تمہارے حصے کا بہت سا کام نمٹا کر جا رہا ہے جو شاید تم جیسے بہت سے آفیسرل کر زندگی بھر میں بھی نہ نمٹا پاتے۔" زرتاج جذبات میں آ کر ایسی بات کر گئی جو میرے خیال میں غیر ضروری ہی تھی۔

رحیم گل چونکا۔ اسے یقیناً یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہو گا کہ گزشتہ رات زرتاج نگر میں کیسی خونریزی ہوئی تھی۔ یہ زرتاج نگر والوں کی خوش قسمتی تھی کہ خون ڈاکوؤں کا بہا تھا۔ اگر ڈاکو اپنی حکمتِ عملی میں کامیاب ہو جاتے تو صورت حال اس کے بالکل اُلٹ ہوتی۔ گاؤں والوں کا تو صرف جانی ہی نہیں' مالی نقصان بھی بے اندازہ ہوتا۔ نہ جانے کتنے گھروں کو آگ لگتی اور کیا کچھ اُجڑتا۔

رحیم گل سر کو خفیف سی حرکت دیتے ہوئے بولا۔ "اس صورت حال میں تو اس شخص کا یہاں رکنا اور بھی ضروری ہے۔ ہمیں اس سے بہت کچھ پوچھنا ہو گا۔"

"تمہیں جو کچھ پوچھنا ہو گا وہ مجھ سے پوچھ لینا۔ میں جواب دوں گی۔ اس کے بعد مجھے بھی پولیس کے محکمے سے بہت سے سوالات کرنے ہیں۔ ہو سکے تو تم بھی ان کے جواب دینے کی کوشش کرنا۔" زرتاج بولی۔

میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ رحیم گل نے بازو پھیلا کر راستہ روک لیا۔ زرتاج نے دوسرا فائر کیا۔ اس کی ٹوپی جا گری۔ زرتاج سرد لہجے میں بولی۔ "میں اس ٹوپی کی توہین نہیں چاہتی تھی لیکن تم مجھے مجبور کر رہے ہو۔ دوسری گولی ای ایک انچ نیچے بھی آ سکتی ہے۔"

رحیم گل اپنی جگہ ساکت ہو گیا لیکن اسی بے خوف لہجے بولا۔ "آپ سرکاری کام میں مداخلت اور ایک پولیس افسر قاتلانہ حملے کی مُرتکب ہو رہی ہیں رئیسانی! آپ کو اس کے سامنا کرنا ہو گا۔"

"میں اپنی نرم مزاجی کو بالائے طاق رکھنے پہ مجبور ہو گئی انسپکٹر! اب میں بھی تیار ہوں اور تم بھی یہ دیکھنے کے لیے تیار کہ کس کو کن نتائج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔" زرتاج کے لہجے پہلی بار میں نے فولاد کی سی سختی محسوس کی۔ پھر وہ مجھ سے مخا ہوئی۔ "تم جاؤ افضل خان! میں اور رحیم گل ایک دوسرے نمٹتے رہیں گے۔"

رحیم گل قدم بڑھاتے ہوئے بولا۔ "رئیسانی! آپ چا مجھے گولی مار دیں۔ میں خالی ہاتھ ہی اس شخص کو روکنے کی کو کروں گا۔"

"تم افضل خان کو روکو گے؟" زرتاج نے استہزائیہ سا لگایا۔ "یہ تمہارے بس کی بات نہیں ہے رحیم گل! یہ بالکل اید ہے جیسے کوئی بچہ کسی بپھرے ہوئے ہاتھی کا راستہ روکنے کی کرے۔ اگر تمہیں راستہ روکنے کا اتنا ہی شوق ہے تو ان ڈاکو اور دہشت گردوں کا راستہ روکا ہوتا جنہوں نے پچھلی رات زر نگر پر دھاوا بولا تھا۔"

"اگر مجھے بروقت اطلاع مل جاتی تو میں ان کا راستہ روک کوشش بھی ضرور کرتا۔" رحیم گل نے پُروقار لہجے میں کہا پھر طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "میں اس کو بھی ڈاکو ہی سمجھ کر کا راستہ روک رہا ہوں۔"

"اس وقت مجھے تم میں اور عام سے پولیس والوں میں فرق نظر نہیں آ رہا۔" زرتاج نے متاسفانہ سے لہجے میں کہا۔

رحیم گل کو نہیں معلوم تھا کہ دو گرانڈیل افراد اس کے میں پہنچ چکے تھے۔ وہ دبے قدموں آگے بڑھے اور غالباً زرتاج اشارہ پا کر انہوں نے اچانک رحیم گل کو دبوچ لیا۔ انہوں نے گل کے دونوں بازو اور گردن قابو میں کر لی۔ وہ گھٹی گھٹی سی میں چیختا رہا اور اپنے مؤقف کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کرتا میں نے پلٹ کر اشارے سے زرتاج کا شکریہ ادا کیا اور رحیم بڑے پیار سے خدا حافظ کہہ کر نکل آیا۔ مجھے امید تھی کہ زر اس سے اچھی طرح نمٹ لے گی۔ وہ اپنی طاقت استعمال کر اُتر آئی تھی۔ اب اس کے لیے اس قسم کے مسائل کی کوئی نہیں رہی تھی۔

حویلی کے باہر دیوار کی اوٹ میں ڈرائیور ہیبڈ لیے کھڑا تھا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور کچھ دیر کے سفر کے بعد ہم اس سڑک آن پہنچے جو آگے جا کر ہائی وے سے ملتی تھی۔ جب تک بس نہیں آگئی اور ڈرائیور نے اسے روک کر مجھے اس میں سیٹ نہیں دلا دی تب تک وہ وہیں کھڑا رہا۔

بس سے میں ڈہرکی پہنچا۔ ڈہرکی کے ریلوے اسٹیشن پر مجھے دو ڈھائی گھنٹے انتظار کرنا پڑا۔ بالآخر ایک ٹرین آئی جو کراچی جا رہی تھی لیکن اس کی وہی حالت تھی جو عموماً ہمارے ہاں ٹرینوں کی ہوتی ہے۔ کہیں مسافر ایک دوسرے سے گتھم گتھا تھے اور کہیں سامان ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ چڑھنے والے کون تھے اور اترنے والے کون۔ جو لوگ ٹرین کے اندر تھے' ان میں سے بیشتر کی کوشش تھی کہ کوئی سوار نہ ہونے پائے۔ انہوں نے دروازے بند کر رکھے تھے کیونکہ اندر تِل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔

بالآخر میں نے ریلوے کے ایک "اعلا افسر" یعنی قُلی کی خدمات حاصل کیں جس نے معقول "حق الخدمت" کے عوض مجھے ان مسائل سے نجات دلائی اور سلیپر میں ایک سیٹ مہیا کی۔ ٹرین چلنے تک میں چوکنا ہی رہا لیکن مجھے اسٹیشن پر کوئی بھی عام شخص یا پولیس والا ایسا دکھائی نہیں دیا جس کے بارے میں مجھے شبہ ہوتا کہ وہ میرے تعاقب میں وہاں آیا ہو گا۔ ٹرین چل پڑی تو میں ذرا بے فکر ہو کر اپنی سیٹ پر نیم دراز ہو گیا۔ گزشتہ شام سے میں مسلسل معرکہ آرائی میں اُلجھا ہوا تھا۔ اب حالتِ سفر میں آرام میسر آیا تھا۔

کسی وجہ سے اس روز تمام ٹرینیں بہت تاخیر سے کراچی پہنچ رہی تھیں۔ میں جس ٹرین میں تھا' وہ بھی اپنے اصل وقت سے کہیں بعد میں' رات گئے کراچی پہنچی۔ اس وقت تک میرا حُلیہ دوبارہ بہت خراب ہو چکا تھا۔ شیو تو پہلے ہی بڑھی ہوئی تھی جو تقریباً داڑھی کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ بال منتشر تھے اور مٹی میں اَٹے ہوئے تھے۔ سفر کے دوران شلوار قمیص میں بری طرح شکنیں پڑ چکی تھیں اور راستے میں اس قدر مٹی اور گرمی تھی کہ وہ کپڑے ایک ماہ پہلے کے پہنے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے پلیٹ فارم پر اترنے کے بعد سوچنا شروع کر دیا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ اس سے پہلے میں نے اس موضوع پر غور کرنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ میں نے چند ہی لمحوں میں فیصلہ کر لیا کہ مجھے ایک عام آدمی کی حیثیت سے اپنے ہی فائیو اسٹار ہوٹل میں چلے جانا چاہیے۔

باہر آ کر ٹیکسی میں بیٹھ کر جب میں نے ڈرائیور کو مطلوبہ ہوٹل چلنے کے لیے کہا تو اس نے مُڑ کر ذرا غور سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ حلیے سے ایک پریشان حال اور بے سرو سامان دیہاتی نظر آنے والا شخص فائیو اسٹار ہوٹل کا رخ کس لیے کر رہا ہے؟ پھر اس نے گویا دل ہی دل میں اپنے آپ کو کسی جواز سے مطمئن کرتے ہوئے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

ہوٹل کے دروازے پر اتر کر میں نے اسے بھاری ٹپ دی تو اس کی باچھیں کھل گئیں اور اسے شاید اطمینان بھی ہو گیا کہ مسافر خواہ "پینڈو" اور بدحال تھا مگر اس کے پاس روپیا بہرحال موجود تھا۔

ہوٹل کا دربان جو ہر آتے جاتے کو دیکھ کر باچھیں پھیلا کر دروازہ کھولتا تھا' مجھے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر گویا شش و پنج میں پڑ گیا کہ دروازہ کھولے یا نہ کھولے۔ میں نے اس کی الجھن دور کر دی اور خود ہی دروازہ کھول کر اندر جا پہنچا۔

فائیو اسٹار ہوٹلوں میں عموماً رات کو دن سے زیادہ رونق ہوتی ہے لیکن اس رات وہاں خاص رونق نظر نہیں آ رہی تھی۔ لابی اور لاؤنج خالی پڑا تھا۔ دائیں ہاتھ پر کافی بار میں بھی صرف دو تین نوجوان جوڑے سرگوشیوں میں مصروف تھے۔ ریسپشن پر صرف ایک ہی کلرک موجود تھا اور وہ بھی اونگھ رہا تھا۔

میری آہٹ سن کر اس نے سر اٹھایا اور ذرا چونک کر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ شاید اس کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک مفلوک الحال' میلا کچیلا' دیہاتی سا شخص منہ اٹھائے فائیو اسٹار ہوٹل میں کیوں گھسا چلا آ رہا تھا۔ اس وقت اگر کوئی میری طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے یہ بتانے کی کوشش کرتا کہ یہ میلا کچیلا' دیہاتی سا شخص اس ہوٹل کا مالک ہے تو شاید وہ اسے ایک بچگانہ مذاق سمجھتا۔ ویسے بھی وہ مجھے کوئی نیا ہی ری سپشنسٹ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سامنے تو اگر میں "صحیح" حلیے میں بھی جاتا تو اس کے لیے اجنبی ہوتا۔ بلکہ ایک اسی پر کیا موقوف' ہوٹل کا بیشتر عملہ مجھے صورت سے نہیں پہچانتا تھا۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر جب میں نے ہوٹل میں قیام کا ارادہ ظاہر کیا اور اپنے لیے ایک لگژری سوئٹ طلب کیا تو استقبالیہ کلرک کچھ پریشان ہو گیا۔ شاید وہ مجھے سوئٹ تو کیا' سنگل کمرا بھی دینے سے انکار کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح ایسا کرے۔ محض ظاہری حُلیے کی بنیاد پر کسی کو کمرا دینے سے انکار کرنا ہوٹلوں کی روایات کے خلاف تھا۔

اس نے بادلِ نخواستہ کارڈ میرے سامنے رکھ دیا۔ میں نے جان بوجھ کر نہایت کم پڑھے لکھے افراد کی طرح اس سے پوچھ پوچھ کر اسے اُردو میں پُر کرنا شروع کیا۔ خانہ پُری مکمل کر کے میں نے اس طرح گہری سانس لی گویا کوئی بہت کٹھن مرحلہ سر کر لیا ہو۔ پھر میں نے چاروں طرف سر گھما کر چمکتے دمکتے در و دیوار' جھلملاتے فرش اور جگمگاتے فانوسوں کا جائزہ لیا اور کچھ مرعوبیت' کچھ طمانیت سے سر ہلایا' گویا میں اپنے خوابوں کی سرزمین پر پہنچ گیا تھا۔

استقبالیہ کلرک نے غالباً مجھے مزید مرعوب کرنے کے لیے انگریزی میں پوچھا۔ "آپ کے پاس کوئی سامان وغیرہ نہیں ہے؟"

اس کے لہجے میں بظاہر ملائمت تھی لیکن درحقیقت اس کا لہجہ چبھتا ہوا سا تھا۔

"ہیں جی...... ؟ کیا فرمایا؟" میں نے ہونقوں کی طرح پوچھا۔ حالانکہ میرا اس قسم کی اداکاری کا کوئی ارادہ نہیں تھا لیکن اس صورت حال سے میں خواہ مخواہ ہی کچھ لطف اندوز ہونے لگا تھا اور میں نے ان کی توقعات کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیا تھا۔

"میں نے پوچھا تھا کہ آپ کے پاس کچھ سامان وغیرہ نہیں ہے؟" کلرک نے اپنے سوال کا ترجمہ کیا۔

"سامان......؟" میں نے اپنے اردگرد دیکھا گویا اس سے پہلے میں نے اس پہلو پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ میرے پاس کچھ سامان بھی ہونا چاہیے تھا۔ "سامان فی الحال تو نہیں ہے جی...... لیکن یہ کون سا مسئلہ ہے...... سامان بھی آجائے گا۔"

میں نے لفٹ کی طرف سے ایک دراز قد سفید فام غیر ملکی کو کاؤنٹر کی طرف آتے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ مجھے اپنے ڈرامے کو طول نہیں دینا چاہیے۔ کہیں خواہ مخواہ لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول ہونے لگے۔ پہلے ہی ایک ویٹر ایک طرف دیوار کے سہارے کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔

"آپ کب تک ٹھہریں گے؟" کلرک نے کارڈ کے اندراجات میں اس سوال کا جواب لکھا ہونے کے باوجود مجھ سے پوچھا۔ شاید دل ہی دل میں وہ دعاگو تھا کہ میرا قیام مختصر سے مختصر ہو۔ غیر ملکی اپنے کمرے کی چابی کلرک کو دے کر دروازے کی طرف بڑھ چکا تو میں نے کہا۔ "ہفتہ دس دن...... اس سے زیادہ بھی ہو سکتا ہے اور کم بھی......" میں نے محسوس کیا کہ غیر ملکی نے بھی جاتے جاتے مڑ کر ایک نظر میری طرف دیکھا تھا۔

کلرک کچھ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "آپ کو کم از کم پچیس ہزار روپے ایڈوانس جمع کرانے ہوں گے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ فائیو اسٹار ہوٹلوں کی روایات سے انحراف کر رہا تھا اور ریلوے اسٹیشن یا لاری اڈے پر واقع ہوٹلوں کی طرح ایڈوانس مانگ رہا تھا حالانکہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں اپنے معزز گاہکوں پر اعتبار کرنے کا "رسک" لیا جاتا ہے۔ انہیں زیادہ تر مہمانوں کے ساتھ میزبانی کی اعلیٰ ترین روایات کا مظاہرہ کرنا پڑتا ہے لیکن کلرک یقیناً مجھے ذرا الگ ہی "کیس" سمجھ کر ڈیل کر رہا تھا۔

میں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور جیب سے کچھ نوٹ نکال کر پچیس ہزار گن کر اس کے سامنے رکھ دیے۔ تب اس نے کچھ اطمینان کی سانس لی اور غالباً یقین کر لیا کہ میرا حلیہ خواہ کیسا ہی سہی لیکن میں کنگال نہیں ہوں۔

اس نے اشارے سے ویٹر کو بلایا اور چابی اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ "صاحب کو اوپر پہنچاؤ۔"

ویٹر مجھے ادائیگی کرتے دیکھ چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ نیم دلی سے میرے ساتھ روانہ ہوا۔ لفٹ میں بھی میں دیہاتیوں حیران سا ہو کر ادھر ادھر دیکھتا رہا گویا پہلی بار لفٹ میں سوار ہوا حالانکہ میں مزید اداکاری کا ارادہ ترک کر چکا تھا لیکن نہ کیوں مجھے ویٹر کو عجیب سی نظروں سے اپنی طرف دیکھتے پا کر سا آرہا تھا۔

پانچویں منزل پر مجھے لگژری سوئٹ میں پہنچا کر اس میری آنے والی نسلوں پر احسان کرتے ہوئے مجھے سمجھا کوشش کی کہ کسی چیز کو کس طرح استعمال کرنا ہوگا، فون سروس والوں سے کس طرح رابطہ کرنا ہوگا...... وغیرہ وغیرہ میں آنکھیں پھیلائے، سر ہلاتے ہوئے گویا اس کی باتیں نشین کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ وہ رخصت ہونے لگا تو میں نہایت مؤدبانہ انداز میں سو روپے ٹپ پیش کی تب اس کا خاصا بدل گیا۔ اس کی پیشانی سے شکنیں دور ہو گئیں اور اس لہجے میں جو ہلکی سی کاٹ تھی وہ معدوم ہو گئی۔ وہ کافی مؤدب آنے لگا۔ پیسے میں واقعی بڑا جادو ہے۔

وہ رخصت ہو چکا تو میں نے چند سیکنڈ بعد دروازے کی آئی سے آنکھ لگا کر باہر دیکھا۔ میرا سوئٹ لفٹ کے قریب ویٹر ابھی لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اسی اثنا میں دوسری سے ایک اور ویٹر ٹرے ہاتھ پر اٹھائے آگیا۔ دونوں باتیں لگے۔ میرے کمرے سے نکلنے والا ویٹر نوجوان تھا، دوسرا ذرا بڑا کا تھا۔ نوجوان ویٹر بار بار میرے ہی کمرے کی طرف دیکھ رہا مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے ہی بارے میں بات کر رہا تھا لیکن ساؤنڈ پروف ہونے کی وجہ سے آواز اندر نہیں آرہی تھی نے بے آواز طریقے سے دروازہ نہایت ذرا سا کھول کر اس کان لگایا تو آوازیں سنائی دینے لگیں۔

نوجوان ویٹر کہہ رہا تھا۔ "...... اللہ کی شان ہے! ایسے لوگ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں آنے لگے ہیں۔ بس اب میں تمہیں بتاؤں کہ کیسا حلیہ تھا...... بالکل ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی کھیتوں میں کام کرتے کرتے یکدم منہ اٹھا کر ادھر بھاگ آیا ہو......"

پھر ذرا رازدارانہ انداز میں بولا۔ "لیکن یار! پیسے اس کے پاس ضرور ہیں۔ کھلے دل سے خرچ کر رہا ہے۔"

"کوئی نو دولتیا ہوگا۔" بڑی عمر کے ویٹر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

"لیکن نو دولتیے تو اپنا حلیہ وغیرہ اچھے سے اچھا بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔" نوجوان ویٹر بولا۔ "یہ آدمی تو مٹی میں اٹا ہوا تھا...... کپڑے مڑے تڑے تھے...... سر پہ خاک پڑی ہوئی تھی۔ شاید بے چارے کو منہ دھوئے بھی ہفتہ دس دن گزر چکے ہیں۔"

"تو پھر کہیں کوئی ڈاکو نہ ہو۔" بڑی عمر کا ویٹر دور کی کوڑی لایا۔

"لگتا تو نہیں ہے۔" نوجوان ویٹر بولا۔ "لیکن بھئی آج کل کسی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ خیر...... ڈاکو بھی ہو تو ہمیں کیا۔ ان معاملات کو ہوٹل والے جانیں۔ ہمیں تو ہماری ٹپ ملتی رہنی چاہیے۔ ہمارے لیے تو وہی اچھا آدمی ہے جو ہمیں ٹپ دے...... اور دل کھول کر دے۔"

اسی دوران لفٹ آگئی اور وہ دونوں اس میں گھس گئے۔ میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر واپس آیا اور بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ میں ایک خاصا طویل عرصہ جنگلوں بیابانوں میں جس قسم کی صعوبتیں اٹھاتے گزار کر آیا تھا اس کے بعد فائیو اسٹار ہوٹل کے لگژری سوئٹ کی آرام دہ اور پرتعیش چیزیں عجیب لگ رہی تھیں لیکن مجھے اس ماحول سے مانوس ہوتے بھی دیر نہ لگی اور چند لمحے بعد ہی میں سب کچھ بھول بھال کر گھوڑے بیچ کر سو گیا۔

دوسری صبح میں نے ڈٹ کر ناشتا کرنے کے بعد اپنی حالت ٹھیک کرنے کی مہم شروع کی۔ سب سے پہلے کلفٹن جا کر ایک فیشن ایبل شاپنگ سینٹر سے اپنے لیے کچھ ڈھنگ کے کپڑے خریدے پھر ہوٹل کی باربر شاپ میں شیو بنوائی، بال ترشوائے اور ایک نہایت طویل، پُراہتمام غسل کے بعد نئے لباس میں آئینے کے سامنے کھڑا ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے میں نے ایک نیا جنم لیا ہو۔ مجھے کچھ یقین نہیں آرہا تھا کہ میں واقعی شہر واپس پہنچ گیا ہوں۔ میں اپنے لیے ایک سیاہ چشمہ اور خوبصورت سا فیلٹ ہیٹ بھی لے آیا تھا۔

میں نے اپنی شخصیت میں ان دونوں چیزوں کا اضافہ کر کے نئے سرے سے اپنا جائزہ لیا۔ بعض انگریزی فلموں میں ذرا بارعب قسم کے گروہ باز یا نائٹ کلبوں کے جوان مضبوط قسم کے مالک دکھائے جاتے ہیں، میں کچھ اسی قسم کی چیز دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے اس قسم کی ڈرامے بازی سے بدمزگی ہی محسوس ہوتی تھی لیکن فی الحال اس طرح کے چھوٹے موٹے سہارے لیے رکھنا بہتر تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہوٹل میں کوئی مجھے پہچانے۔ ہوٹل میں قیام کرنے والوں کو جس اسٹاف سے زیادہ تر واسطہ پڑتا ہے یا سامنا ہوتا رہتا ہے، وہ لوگ تو ویسے بھی مجھے نہیں پہچانتے تھے۔ میرے لیے بھی بیشتر شکلیں اجنبی ہی تھیں۔ خاص خاص عہدوں پر کام کرنے والے لوگ مجھے پہچانتے تھے۔ ان سے سامنا ہونے کا امکان کم ہی تھا۔ ہوٹل کے کارڈ میں، میں نے اپنا نام ایم۔ ایف خان درج کرایا تھا۔

دوبارہ باہر نکلنے سے پہلے میں نے ٹیلی فون پر رابطوں کی کوششیں شروع کیں۔ میں نے اپنے مقامی آفس فون کیا اور شفیع شاہ وغیرہ کے بارے میں جاننے کی کوشش کی۔ پتا چلا کہ وہ لاہور رہی میں تھے۔ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے لیکن لاہور میں بھی ان کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کسی کا ان سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔

کراچی آفس میں صرف چند ہی ساتھی "دی سرکل" میں شامل تھے۔ باقی، دفتر میں کام کرنے والے عام سے لوگ تھے۔ انہیں "دی سرکل" یا ہماری چند ڈھکی چھپی مصروفیات کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ اس لئے میں نے انہیں مزید کریدنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اپنا نام بتایا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ شہر میں کوئی بھی میری موجودگی سے آگاہ ہو۔ میرے لئے یہ اطلاع ذرا تشویشناک تھی کہ شفیع شاہ وغیرہ ابھی تک لاہور سے واپس نہیں آئے تھے اور نہ ہی وہاں ان کا کچھ پتا تھا۔

ہوٹل کے کمرے سے براہ راست لاہور فون بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے آپریٹر کے توسط سے لاہور کے چند نمبروں پر بات کرنے کی کوشش کی۔ یہ نمبر ٹونی، راحیلہ اور شبیر شیخ وغیرہ کے تھے۔ آپریٹر بے چارے نے اپنی سی بہت کوشش کی لیکن ہر نمبر پر ہر بار کوشش کے باوجود کامیابی نہ ہوئی اور وہ یہی جواب دیتا رہا۔ "نو رسپانس سر!"

میرے حواس میں کچھ ٹھنڈک سی آن بسی اور میں ریسیور رکھ کر چند لمحے کے لیے ساکت بیٹھا رہ گیا۔ میں فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ مجھے لاہور جانا چاہیے یا نہیں؟ میں کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ میرے اعصاب پر کچھ سستی سی چھا رہی تھی۔ جنگلوں اور دیہات میں مارا مارا پھرنے کے دوران میں شکار پر نکلے ہوئے درندے کی طرح چاق و چوبند اور مستعد رہا تھا لیکن شہر کی پرتعیش رہائش نے مجھے فوراً ہی سُست کر دیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ تعیشات، یہ طرز زندگی میرے لیے نیا تو نہیں تھا۔ میں تو برسوں سے ان کا عادی تھا اور میں نے کبھی اپنے آپ کو اس طرح سُست محسوس نہیں کیا تھا۔ کہیں یہ ساتھیوں سے رابطہ نہ ہو سکنے کا اثر تو نہیں تھا؟ شاید یہ میرے لیے ایک ایسی بری خبر تھی جس کی میں توقع نہیں کر رہا تھا لیکن اس سے پہلے تو میں نے ہمیشہ یہی محسوس کیا تھا کہ میں بحران کا آدمی تھا یعنی بحران کے دوران میں زیادہ مستعد رہتا تھا اور میری صلاحیتیں زیادہ ابھر کر سامنے آتی تھیں۔ میں اپنے آپ کو زیادہ پُراعتماد محسوس کرتا تھا لیکن اس وقت نہ جانے کیوں بدخبری کے آثار محسوس کرتے ہی میرے اعصاب پر تھکن سی سوار ہو گئی تھی۔

میں نے روم سروس کو فون پر بلیک کافی کا آرڈر دیا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ہمارے کچھ غیر کاروباری سے ٹھکانے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ بذات خود ان ٹھکانوں پر جا کر اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کروں۔ میری اسی اُدھیڑ بُن کے دوران ویٹر کافی لے کر آگیا۔ یہ وہ ویٹر نہیں تھا جو گزشتہ رات مجھے کمرے میں چھوڑ گیا تھا لیکن یہ بھی صبح مجھے برے حال میں دیکھ چکا تھا اس لیے اس وقت دیکھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا بلکہ پہلے تو وہ مجھے اس سوئٹ میں ٹھہرے ہوئے شخص کا کوئی ملاقاتی سمجھا۔

مجھے پہچان لینے کے بعد اس نے صرف خوشگوار سی حیرت کا اظہار کیا، کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اپنے انداز و اطوار کی وجہ سے میں ویٹروں کی نظر میں آرہا تھا۔ مجھے اس حد تک بھی کسی کی نظر میں آنے سے بچنا چاہیے

تھا۔

گرم گرم کافی حلق سے اُتری تو ذہن کی یخ بستگی کچھ کم ہوئی۔ میں کسی فیصلے پر تو نہ پہنچ سکا لیکن اپنے سوئٹ سے ضرور نکل کھڑا ہوا۔ مجھے کمرے میں بیٹھے بیٹھے کچھ وحشت سی ہونے لگی تھی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے ان خنک ہواؤں اور بند کمروں سے نکل کر سوچ بچار کرنا چاہیے۔

میں سوئٹ سے نکل کر لفٹ کے انتظار میں کھڑا تھا کہ ایک کونے سے داؤد چوہدری برآمد ہوا۔ وہ میرے ہوٹل کا سیکیورٹی انچارج تھا۔ اس وقت وہ غالباً غیر محسوس سے انداز میں گشت پر تھا۔ میں نے جلدی سے منہ پھیرنے کی کوشش کی لیکن اس نے مجھے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔ وہ مجھے بہت اچھی طرح پہچانتا تھا۔

"سر! آپ یہاں.....؟" وہ تیزی سے میری طرف لپکا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور جب وہ قریب آگیا تو نہایت نیچی آواز میں کہا۔ "مجھے اصل نام سے مخاطب کرنے اور زیادہ مؤدب نظر آنے کی ضرورت نہیں۔ محض رسمی سا ملاقاتی نظر آنے کی کوشش کرو۔ مجھے صرف خان صاحب کے نام سے مخاطب کر سکتے ہو۔"

"کیوں سر.....؟ خیریت تو ہے؟" وہ ذرا چونکا پھر اس نے غیر ارادی طور پر یوں ادھر ادھر دیکھا جیسے اسے توقع ہو کہ ہمارا کوئی دشمن آس پاس ہی کھڑا ہوگا۔

"ہاں..... بہ ظاہر خیریت ہی ہے..... لیکن شاید کچھ اتنی خیریت بھی نہیں ہے۔" میں نے مبہم لہجے میں کہا۔ "میں یہاں ایک عام مہمان کی حیثیت سے ٹھہرا ہوا ہوں۔"

"سر..... اپنے ہی ہوٹل میں.....؟" وہ ہکلایا۔

میں نے سخت نظروں سے اسے گھورا۔ "میں نے تمہیں احتیاط برتنے کی ہدایت کی تھی لیکن تم اس ہدایت پر بالکل عمل نہیں کر رہے۔"

"آئی ایم سوری سر!" اس نے جلدی سے اپنے تاثرات بدلنے کی کوشش کی۔

"میں نے "سر" وغیرہ سے بھی پرہیز کرنے کے لیے کہا ہے۔" میں نے یاد دلایا۔

"جی..... جی..... خان صاحب" وہ ہکلایا۔ "پھر بھی..... آپ کچھ تو بتائیں..... کیا چکر ہے؟ میرے لائق کوئی خدمت؟" اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے ہاؤزر کے دستے پر تھا۔

"نہیں..... خدمت وغیرہ تو کچھ نہیں ہے۔ بس تم یہاں میری موجودگی کو راز رکھنے کی کوشش کرنا۔ جوش میں آکر اسٹاف کو مت بتا دینا کہ چوہدری صاحب یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں۔" میں نے ہدایت کی۔

عین اسی لمحے لفٹ ہمارے سامنے آکر رکی۔ کسی طلسمی دروازے کی طرح خاموشی سے دونوں پٹ ایک دوسرے سے جدا ہوئے اور ایک تنہا لڑکی اس چوکور قفس میں کھڑی دکھائی [دی]۔ ایک دُبلی پتلی، لمبی سی سفید فام لڑکی تھی۔ مغربی لڑکیاں [...] ورزشیں کرکے اپنے آپ کو دُبلے پن کی اس سطح پر لے جا[تی ہیں] جہاں سے بدنمائی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

وہ لڑکی ابھی اس سطح پر نہیں پہنچی تھی۔ اسے خوبصور[ت] کہا جا سکتا تھا۔ وہ کسی نفیس مگر موٹے سے نیوی بلیو کپڑے سے اسکرٹ میں تھی جو اس پر نہ جانے کیوں بہت جچ رہا تھا [...] کے بال عجیب رنگ کے تھے۔ چاندی اور سونے کا ملا جلا سا [...] اور اس میں چمک آئینے جیسی تھی۔ ہونٹ بھرے بھرے [...] رخساروں کی ہڈیاں کچھ زیادہ ہی ابھری ہوئی تھیں۔

سب سے عجیب اس کی آنکھیں تھیں۔ پہلی نظر میں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی آنکھوں کا کوئی رنگ ہی نہیں تھا [...] شیشے کی دو شفاف مصنوعی آنکھیں اس کے چہرے پر جڑی [...] لیکن ذرا توجہ سے دیکھنے پر پتا چلتا تھا کہ اس کی آنکھیں نہایت [...] اور شفاف نیلے رنگ کی تھیں۔ آسیبی اور خوفناک قسم کی ا[نگریزی] فلموں میں بعض کرداروں کو ڈراؤنا بنانے کے لیے ان کی آنکھ[وں] کچھ اسی قسم کے رنگ کی دکھائی جاتی ہیں یا اچانک ان کی آنکھ[وں] کا رنگ تبدیل ہوتے دکھایا جاتا ہے۔

تاہم اس لڑکی کی شخصیت کا تاثر آسیبی یا ایسا خطرناک [نہیں] تھا۔ اس میں بہرحال ایک خوش شکل لڑکی والی کشش موجود [تھی] اور وہ لفٹ کی عقبی دیوار سے چپکی بالکل سیدھی کھڑی تھی۔ لف[ٹ کا] دروازہ کھلتے ہی میں نے اسے ایک ٹک اپنی طرف دیکھتے پایا۔ و[ہ لمحہ] گویا بہت طویل ہوگیا۔ لڑکی پلک جھپکائے بغیر لفٹ سے باہر [نکلی] اور چند قدم چل کر راہداری میں دائیں طرف مڑ گئی۔

"یہ لڑکی کون تھی؟" میں نے داؤد چوہدری سے پوچھا۔

"معلوم نہیں سر.....! ہوٹل کی کوئی گیسٹ ہوگی....." وہ گڑبڑا کر بولا۔ "معلومات کروں اس کے بارے میں؟"

"نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے خدا حافظ [کہا] اور لفٹ کے ذریعے نیچے آگیا۔ میں کچھ دیر ہوٹل کے آس پاس [...] فٹ پاتھ پر ٹہلتا رہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے مقا[بلے] میں میرے ساتھیوں کی جدوجہد کس مرحلے میں تھی اور وہ خود کہا[ں] تھے لیکن مجھے یہ اندیشہ ضرور تھا کہ شاید ریڈ ڈاٹ اب بھی کرا[چی] اور لاہور میں ان تمام ٹھکانوں کی نگرانی کر رہی ہو جن سے میرا تعلق تھا۔ نگرانی کرنے کا بھی ان کا اپنا ہی انداز تھا۔ عجیب و غریب اور ناقابل یقین سے وسائل ان کے پاس موجود تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کہاں سے کوئی غیبی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہو۔ میں ذرا ایک جائزہ لینے کے لیے ہوٹل سے نکلا تھا کہ گردو پیش کے بارے میں میرے محسوسات کیا کہتے ہیں۔

میں ٹہلتا ہوا خاصی دور تک چلا گیا اور چند منٹ بعد لوٹ آیا۔ مجھے کسی گڑبڑ کا احساس قطعاً نہیں ہوا۔ میری حسیات میں کوئی ہلچل [نہیں] ہوئی تاہم ذہن کے کسی تاریک گوشے میں اضطراب کی [...] نہایت خفیف سی لہر کروٹیں لے رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ [...] کی اچانک تبدیلی تھی۔ میں اندرون ملک کے جن دور افتادہ [...] میں وقت گزار کر آرہا تھا وہاں کم از کم ریڈ ڈاٹ کی حد تک [...] خطرے کا احساس نہیں رہا تھا۔ وہاں خطرات کی نوعیت بدل [...] تھی۔ وہاں مجھے جن خطرات کا سامنا کرنا پڑا تھا وہ مجھے زیادہ اہم [...] نہیں ہوئے تھے لیکن ریڈ ڈاٹ کی بات کچھ اور تھی۔

[...] کچھ دیر بعد میں ہوٹل واپس آگیا۔ گو کہ مجھے کسی گڑبڑ کا کوئی احساس نہیں ہوا تھا، اس کے باوجود میں نے اپنے دو ایک [...] ٹھکانوں پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ میں ہوٹل کے کافی بار [میں] جا بیٹھا۔ کافی میں پی چکا تھا۔ اب طبیعت میں سُستی اور [...] نہیں تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے جوس کا آرڈر دیا [...] تازہ اخبار کی اوٹ سے غیر محسوس طور پر اردگرد کا جائزہ لینے [...]

اچانک اخبار کے اوپر سے میری نظر انہی شفاف آنکھوں پر [...]۔ آسیبی سی آنکھوں والی وہ لڑکی ایک ٹک میری ہی طرف دیکھ [رہی] تھی۔ مجھے یاد پڑتا تھا کہ ایک لمحہ پہلے وہ اس کرسی پر موجود [نہیں] تھی اور چند منٹ پہلے میں نے اسے پانچویں منزل پر جاتے [دیکھا] تھا۔ لیکن خیر..... یہ کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں تھی۔ عین [ممکن] تھا، وہ ابھی آکر بیٹھی ہو۔

میرا اس سے سامنا چند لمحوں کے لیے ہوا تھا لیکن میں نے [محسو]س کیا تھا کہ وہ شاید پلکیں بہت کم جھپکتی تھی۔ اب اس کی [تصد]یق کے لیے میں نے بھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھنا شروع [کیا]۔ میرے اس طرح دیکھنے پر عام طور پر مرد بھی نظر چُرا لیتے تھے [لیکن] اس نے نظر چُرانا تو درکنار، پلک تک نہیں جھپکی۔ اس کا [اند]از کچھ غیر فطری سا تھا۔ میری رگ و پے میں ایک سرد سی لہر دوڑ [گئی]۔ انتہائی بری شہرت رکھنے والے کسی خطرناک اور بدشکل [بدمع]اش کو دیکھ کر بھی میرے جسم میں کبھی اس طرح سرد لہر نہیں [دوڑ]ی تھی۔ وہ تو ایک اچھی خاصی خوبصورت لڑکی تھی لیکن لگتا [...] تھا کہ اس میں واقعی کوئی آسیبی سی خصوصیت موجود تھی۔ [اچا]نک اس کے سامنے ایک ویٹر آگیا۔ تب میں نے اس کی طرف [سے] نظر ہٹا لینا ہی بہتر سمجھا اور اخبار کی اوٹ میں پناہ لے لی۔

اس قسم کے ہوٹلوں میں جس طبقے کی نشست و برخاست ہوتی [...] ہے اس میں کسی لڑکی سے تعارف حاصل کرنا کوئی ایسا مسئلہ نہیں [...]۔ مغربی تہذیب نے ہمارے ہاں بھی بہت سے خوبصورت اور [...] تکلفات یا حجابات ختم کر دیے ہیں۔ دولت کی فراوانی نے ہمیں [...] سی رسوم اور حدود و قیود سے بے نیاز کر دیا ہے۔ پھر وہ لڑکی تو [...] ایک سفید فام تھی۔ اس کی تہذیب و معاشرت میں تو کوئی [...] رکاوٹ ہی نہیں تھی۔ کوئی بھی اس کی میز پر جا کر اپنا تعارف کرا [...] سکتا تھا اور اس کے تعارف کی فرمائش کر سکتا تھا۔ میں ایسا شرمیلا بھی نہیں تھا کہ مجھے اس سلسلے میں کوئی ہچکچاہٹ ہوتی۔ اس کے باوجود میں اٹھ کر اس کی میز پر نہیں جا سکا۔ حالانکہ میرا دل چاہ رہا تھا، مجھے اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے۔

چند لمحے بعد دوسرا ویٹر میرے لیے جوس لے کر آیا۔ میں نے اخبار چہرے کے سامنے سے ہٹایا تو وہ لڑکی اس نشست سے غائب تھی۔ میں نے نہایت آہستگی سے، غیر محسوس سے انداز میں سر گھماتے ہوئے پورے کافی بار کا جائزہ لیا۔ وہ مجھے کہیں دکھائی نہ دی اور نہ ہی لاؤنج وغیرہ کی طرف جاتی نظر آئی۔ میرے دل میں بے عنوان سی خلش اور اضطراب کچھ بڑھ گیا۔ تاہم بظاہر میں سکون سے بیٹھا جوس کی چسکیاں لیتا رہا۔

وہ دن میں نے جوں توں ہوٹل میں گزارا۔ وہ لڑکی مجھے کافی بار میں نظر آنے کے بعد کہیں نظر نہیں آئی اور نہ ہی کوئی خاص واقعہ پیش آیا۔ رات کو میں سونے کے لیے لیٹا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اس لڑکی کو خواب میں دیکھوں گا۔

میں نے خواب میں دیکھا کہ وہ نوکیلی ایڑی والے سینڈل پہنے میرے سینے پر کھڑی تھی اور اس کا وزن شاید کسی پہاڑ کے برابر تھا۔ وہ گویا گوشت پوست کی لڑکی نہیں، کسی انتہائی وزنی دھات سے بنا ہوا کوئی ٹھوس مجسمہ تھا۔ میری سانس سینے میں رُکی جا رہی تھی۔ مجھے حیرت تھی کہ اس کے سینڈلوں کی نوکیلی ایڑیاں میرے سینے میں کیوں نہیں اُتر گئی تھیں!

وہ سر ذرا جھکائے میری آنکھوں میں جھانک رہی تھی اور مجھے یوں لگ رہا تھا گویا وہ ہزاروں فٹ کی بلندی سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اس کے باوجود اس کی شکل نہ جانے کیوں بہت خوفناک لگ رہی تھی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے چہرے کی طرف پھیلائے ہوئے تھے۔ مخروطی انگلیوں والے یہ ہاتھ اس وقت نہ جانے کیوں عقاب کے پنجوں کی طرح بدصورت دکھائی دے رہے تھے اور ناخنوں کے سِروں سے دودھیا دُھواں بل کھاتا فضا میں بلند ہو رہا تھا۔

اچانک لڑکی نے کرخت اور ڈراؤنی آواز میں ایک طویل قہقہہ لگایا جس سے مجھے اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ بالکل کسی ہارر فلم کا سا منظر تھا۔ اس قہقہے کی وجہ سے میری آنکھ کھل گئی۔ خواب میں بھی انسان کو یہ احساس تو نہیں ہوتا کہ وہ خواب دیکھ رہا ہے۔ مجھے بھی یہ احساس نہیں تھا لیکن آنکھ کھلنے کے بعد بھی میرا یہ احساس برقرار رہا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن سینے پر وہی لڑکی نظر آتی رہی جس کا وزن پہاڑ کے برابر محسوس ہو رہا تھا۔ گویا خواب کا تسلسل ابھی قائم تھا۔

میں نے اپنی تمام تر توانائی مجتمع کرکے ہلنے کی کوشش کی۔ جونہی میں ذرا سا ہلنے میں کامیاب ہوا، خواب کا تسلسل ٹوٹ گیا۔ لڑکی یک دم غائب ہوگئی اور میں ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے ملگجے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے

میں میرے سوا کوئی نہیں تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے ایک عجیب سی بُو کا احساس ہوا۔ مجھے فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ کمرے میں کوئی گیس بھر رہی تھی اور اسی کی وجہ سے میرے حواس پر دُھندلاہٹ سی چھانے لگی تھی۔ اس اعتبار سے وہ ڈراؤنا خواب میرے حق میں بہت اچھا ثابت ہوا تھا کہ اس کی وجہ سے میں اٹھ کر بیٹھ گیا تھا ورنہ شاید میں سوتا ہی رہ جاتا اور میری عارضی نیند ابدی نیند میں تبدیل ہوجاتی۔

میں نے فوراً سانس روک لی۔ میں اسی روز بازار سے چھوٹا سا ایک نیا سفری بیگ لایا تھا۔ میں نے اسے بھی وہیں چھوڑ دیا۔ اپنی بچی ہوئی رقم البتہ اندرونی جیب میں ڈال لی۔ میں شب خوابی کا کوئی لباس اپنی شاپنگ کے دوران خرید کر نہیں لایا تھا اور خطرے کے لاشعوری سے احساس کے تحت پینٹ شرٹ میں ہی سویا تھا۔

سانس روکنے کے بارے میں مجھے کوئی تشویش نہیں تھی۔ یوگا کی مشقیں میرے بہت کام آئی تھیں۔ میں بہت دیر تک سانس روک سکتا تھا۔ عین ممکن تھا کہ مجھے دوبارہ اس کمرے میں آنے کا موقع نہ ملتا اس لیے میں ذرا اطمینان سے اس پر الوداعی نظر ڈال کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اس وقت میرے ذہن پر نیند کا خمار اور گیس کے اثرات کافی حد تک کم ہوچکے تھے۔ میں اپنے آپ کو چوکنا محسوس کر رہا تھا۔

جب دروازے پر پہنچ کر میں نے ناب گھما کر دروازہ کھولنا چاہا تو میرا اطمینان رخصت ہوگیا۔ ناب بالکل جام تھی اور ذرا بھی نہیں گھوم رہی تھی۔ دروازہ نیچے سے تقریباً ائرٹائٹ تھا۔ شاید چابی کے سوراخ کے ذریعے ہی کمرے میں گیس بھری گئی تھی اور پھر اس میں کوئی خاص سیال انڈیل کر اسے جام کردیا گیا تھا۔ گویا میرے لیے ایک کشادہ' آراستہ و پیراستہ' آرام دہ قبر تیار کردی گئی تھی۔ اٹیچڈ باتھ اور دوال ٹو وال کارپٹ والی قبر۔

اس قسم کی کسی کوشش کا مطلب یہی تھا کہ ریڈ ڈاٹ ابھی تک کراچی میں بھی میری تلاش کے سلسلے میں سرگرم تھی اور یہاں پہنچتے ہی مجھے ان کی نظروں میں آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ لاہور میں شاید صورت حال اس سے زیادہ خراب ہو۔ میرے لیے یہی تشویش کچھ کم نہیں تھی کہ ریڈ ڈاٹ کا مسئلہ ابھی جوں کا توں برقرار تھا لیکن فی الحال کمرے سے نکلنے کا مسئلہ اس سے بھی زیادہ تشویش ناک تھا۔

میں نے کافی پیچھے ہٹ کر دوڑ کر دروازے پر کندھے سے ٹکر رسید کی۔ ہلکی سی دھمک کے ساتھ کمرے کی دیوار تک لرز گئی لیکن دروازہ جوں کا توں قائم رہا۔ دروازہ ٹھوس اور مضبوط تھا لیکن اس سے زیادہ اہم بات یہ تھی کہ وہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ اگر میں اس پر باہر سے ٹکر رسید کرتا تو صرف تالا ہی رکاوٹ ہوتا لیکن اب تالے کے ساتھ ساتھ پوری چوکھٹ بھی رکاوٹ تھی کیونکہ باہر کی طرف دروازہ اس میں پھنستا تھا۔

دوسری ٹکر کے بعد ہی میں نے محسوس کرلیا کہ یہ صرف ا... آپ کو تھکانے والی بات تھی اور اس کوشش میں میرے ... سانس روکنا بہت مشکل ہوا جا رہا تھا۔ میں نے فون پر کسی سے ... کرکے مدد حاصل کرنا چاہی لیکن فون ڈیڈ پڑا تھا۔ یہ میرے لیے ... حیرت کی بات تھی کیونکہ ہوٹل کے کمروں میں استعمال ہونے ... فون کی تاریں باہر تو نظر نہیں آتیں جنہیں کاٹ دیا جائے۔

اب میرے جسم سے ٹھنڈا ٹھنڈا پسینہ پھوٹ پڑا۔ مجھے ... سے خوف نہیں آتا تھا۔ بے بسی میرے لیے موت سے ز... خوفناک تھی۔ میں نے کسی کار آمد چیز کی تلاش میں کمرے ... چاروں طرف نظر دوڑائی۔ میرے مطلب کی کوئی چیز نہیں نظ... آئی۔ میں ابھی تک اپنی سانس روکنے میں کامیاب تھا لیکن ... آخر کب تک میرا ساتھ دے سکتی تھی۔

میں نے ایک موہوم سی امید کے سہارے باتھ روم کا در... کھول کر وحشت زدہ انداز میں ادھر اُدھر دیکھا۔ ایک کیبنٹ اوپر سے مجھے ایک نوکیلی سی چیز جھانکتی نظر آئی۔ میں نے جلدی اوپر ہاتھ مارا اور وہ چیز میرے ہاتھ میں آگئی۔ اگر میں نے سانس روک رکھی ہوتی تو شاید اس وقت میں اطمینان کی گہری سانس بغیر نہ رہ سکتا۔ وہ چیز گویا کسی دستِ غیبی نے خاص طور پر میر... کے لیے وہاں رکھی تھی۔

بظاہر وہ ایک حقیر سی چیز تھی۔ عام حالات میں ہمیں ا... اہمیت کا قطعاً اندازہ نہیں ہوسکتا۔ اس کے بارے میں کسی محسوسات کم از کم ویسے نہیں ہوسکتے جیسے اس وقت میرے تھے۔

وہ ذرا بڑے سائز کا ایک پرانا سا اسکریو ڈرائیور تھا جس کا دستہ تھوڑا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ باتھ روم کی فینسی لائٹس بالکل نئی آرہی تھیں۔ شاید حال ہی میں تبدیل کی گئی تھیں اور الیکٹریشن وہ اسکریو ڈرائیور وہاں بھول گیا تھا یا بے کار سمجھ کر بوجھ کر چھوڑ گیا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں اس کی موجودگی کا منظر کچھ اور رہا ہو۔ بہرحال مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ م... لیے تو اس کا میسر آجانا ہی کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

میں لپک کر دروازے تک پہنچا۔ باہر کی طرف سے نا... ساخت میں مضبوطی کا زیادہ بندوبست کیا گیا ہوگا لیکن اند... طرف فولاد کی صرف ایک پلیٹ تھی۔ اس کے چاروں ... کھولنے میں مجھے کچھ وقت پیش آئی لیکن پھر بھی شاید میں نے ... کم سے کم وقت میں کھولنے کا ایک ریکارڈ قائم کیا۔

اس کے نیچے لکڑی کا ایک مختصر سا ٹکڑا تھا جو نا... "زبان" یا لیچ (LATCH) کو روکے ہوئے تھا۔ میں نے ا... ڈرائیور ہی کے ذریعے اسے توڑ ڈالا۔ اسکریو ڈرائیور اس میں ... کر ایک جھٹکا دینا ہی کافی ثابت ہوا۔ "کڑرڑ" کی ہلکی سی آوا... ساتھ مسئلہ حل ہوگیا۔

اب میں دروازہ کھول سکتا تھا لیکن میں نے اسے ...

...ت نہیں کی۔ میں ابھی کچھ دیر اور سانس روک سکتا تھا۔ میں نے ...ن دیر مزید انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ باہر کوئی موجود ...ر تو اسے یہ تاثر ملے کہ بالآخر میری جدوجہد دم توڑ چکی تھی اور ...یس مجھ پر اثر کر چکی تھی۔ میں یہ بھی دیکھنا چاہتا تھا کہ اس دوران ...وئی کمرے میں داخل ہونے کی کوشش تو نہیں کرتا۔

میں دروازے کے عقب میں مزید دو ڈھائی منٹ دیوار سے ...پکا کھڑا رہا لیکن کسی نے کمرے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں ...ی اور نہ ہی باہر کوئی آواز سنائی دی۔ سکوت کے وہ لمحے اعصاب ...شکن تھے۔

آخر کار میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ صرف اتنا کھولا کہ ناک باہر نکال سکوں۔ میرے پھیپھڑوں میں اب سانس کو مزید روکنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔ میں نے نہایت آہستگی سے اپنے پھیپھڑوں میں مقید ہوا یا کاربن ڈائی آکسائیڈ خارج کی۔ اس وقت آہستگی سے اس ہوا کو خارج کرنا بھی ایک صبر آزما کام تھا۔ پھیپھڑے گویا پھٹ پڑنے کو تھے لیکن میں نے اپنی سانس کی آمد و رفت کی آواز پیدا نہ ہونے دی۔

جب تک میری ناک دروازے اور چوکھٹ کے درمیان رہی تب تک خیریت رہی' جونہی میں نے گردن باہر نکالی "ٹھک" کی ایک ہلکی سی آواز سنائی دی۔ میں کچھ دیکھنے سے پہلے ہی اضطراری طور پر گردن نیچے کر چکا تھا۔ یہ حرکت میرے کام آگئی۔ کوئی چیز میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری لیکن وہ گولی یقیناً نہیں تھی اور نہ ہی "ٹھک" کی وہ آواز سائلنسر والے کسی پسٹل وغیرہ کی تھی۔

میں نے چھوٹے چاقو کے پھل جیسی کسی چیز کی جھلک دیکھی جو دروازے کی چوکھٹ میں پیوست ہوچکی تھی لیکن میں صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا کہ وہ کیا چیز تھی کیونکہ اس وقت میں کمرے سے نکل چکا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ دروازے کے دائیں بائیں دونوں طرف دو افراد دیوار سے چپکے ہوئے تھے۔ اگر میں ان سے بچ کر لفٹ کی طرف بھاگنے کی کوشش کرتا تو ان دونوں کے پاس جو بھی ہتھیار موجود تھے' وہ انہیں استعمال کرسکتے تھے۔ ان سے الجھنے میں بھی جان کا خطرہ تھا لیکن اس طرح بھاگنے میں زیادہ خطرہ تھا۔ اس لیے دروازے سے نکلتے ہی میں لفٹ کی طرف بھاگنے کے بجائے دائیں طرف والے شخص کی طرف لپکا۔

میں اس وقت اتنی تیزی میں تھا کہ چیزیں مجھے بالکل اسی طرح دکھائی دے رہی تھیں جیسے چلتی ٹرین سے دکھائی دیتی ہیں۔ مجھے وہ شخص سیاہ پوش دکھائی دیا تھا۔ بعد میں اندازہ ہوا کہ وہ گہرے رنگ کے سوٹ میں تھا اور... سیاہ فام تھا۔ اس کے ہاتھ میں ذرا بڑے پسٹل سے مشابہ کوئی چیز تھی جس کی نال عام پسٹل سے کہیں زیادہ موٹی تھی۔ اس نے یقیناً اسی چیز سے مجھ پر فائر کیا تھا اور اس سے جو کچھ بھی نکلا تھا وہ یقیناً میری کھوپڑی سے اسی طرح گزر جاتا جیسے مکھن سے بلیڈ۔ کیونکہ میں نے اسے لکڑی کی چوکھٹ میں اسی طرح پیوست ہو کر غائب ہوتے دیکھا تھا۔ اس ہتھیار کی ایک بڑی خوبی تو یہی تھی کہ اس سے ہلکی سی "ٹھک" کے علاوہ کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کرپاتا' میری ٹھوکر اس کے ہاتھ پر پڑی۔ وہ چیز اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں جا گری۔ میں چونکہ اس کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا اس لیے دوسرا شخص فائر کرنے سے باز رہا۔ ویسے مجھے اس وقت تک صحیح طور پر معلوم بھی نہیں تھا کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار وغیرہ موجود تھا یا نہیں۔

سیاہ فام نے پسٹل نما چیز ہاتھ سے نکل جانے کے فوراً بعد ایک طرف کو ہٹتے ہوئے جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں نے اس کی گردن پر کراٹے کا ہاتھ رسید کیا اور فوراً ہی اس کی اوٹ میں ہونے کی کوشش کی تاکہ اس کے ساتھی کے حملے کے سامنے اسے ہی ڈھال بنا سکوں لیکن جونہی میں اسے اپنے سامنے لاتے ہوئے تیزی سے گھوما تو میں حیرت سے گرتے گرتے بچا۔ اس کا دوسرا ساتھی غائب ہوچکا تھا۔

اس کا غائب ہونا اس کی موجودگی سے زیادہ خطرناک محسوس ہوا۔ میں نے سیاہ فام کا سر دیوار سے ٹکرا دیا۔ کچھ اسی قسم کی آواز پیدا ہوئی جیسے میں نے لوہے کا گولا دیوار سے ٹکرا دیا ہو۔ نہ جانے وہ کس کے کمرے کی دیوار تھی۔ اس سے پہلے میں اپنے کمرے میں دو مرتبہ کندھے سے دروازے پر ٹکر رسید کرچکا تھا' اس سے بھی اچھی خاصی دھمک پیدا ہوئی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کوئی کسی کمرے کا دروازہ کھول کر نہ جھانکنے لگے اور خوفزدہ ہوکر چیخنے نہ لگے۔ اس طرح مدد میسر آنے کے بجائے میرے حق میں صورتِ حال خراب ہوسکتی تھی۔

سیاہ فام قالین پر ڈھیر ہوگیا اور میں نے لفٹ کی طرف چھلانگ لگائی۔ وہ لمحاتی سا سکوت مجھے بتا رہا تھا کہ کچھ ہونے والا تھا۔ مجھے جلد از جلد وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا۔ خوش قسمتی سے لفٹ اسی فلور پر موجود تھی اور اس میں کوئی نہیں تھا۔ وہ ایک تیز رفتار لفٹ تھی لیکن اس وقت مجھے اس کی رفتار بہت کم محسوس ہوئی۔ تاہم میں خیریت سے نیچے پہنچ گیا۔

لاؤنج میں کوئی نہیں تھا۔ ریسپشن پر ایک کلرک سُست انداز میں بیٹھا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ شاید وہ سمجھا کہ میں اس کی طرف آرہا ہوں لیکن میں بیرونی دروازے کی طرف نکلتا چلا گیا۔ میرے اعصاب تاروں کی طرح تنے ہوئے تھے۔ ہر قدم پر مجھے دھڑکا سا محسوس ہو رہا تھا کہ کسی کونے کھدرے سے کوئی عجیب سی چیز میرے لیے موت کی پیامبر بن کر نہ نکل آئے۔

دربان نے میرے لیے دروازہ کھولتے ہوئے قدرے تجسس سے میری طرف دیکھا۔ وہ رات کا پچھلا پہر تھا۔ تاہم مجھے جاتے

دیکھ کر اس کے چہرے پر کچھ زیادہ حیرت نہیں تھی۔ ہوٹلوں میں دن رات لوگوں کا آنا جانا لگا ہی رہتا ہے لیکن ان آنے جانے والوں کے طور طریقے اور انداز ذرا مختلف ہوتا ہے۔ میرا رخصت ہونے کا انداز کچھ اور تھا۔

میں صحیح سلامت ہوٹل سے باہر بھی آگیا۔ شاید میرا تعاقب کرنے والے ابھی نیچے نہیں پہنچ سکے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ ابھی مجھے اوپر ہی تلاش کیا جارہا ہو۔ شاید انہیں توقع نہ رہی ہو کہ میں اتنی جلدی ہوٹل چھوڑ بھاگوں گا۔ بہرحال میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کے لیے تیار نہیں تھا کہ مجھے تلاش نہیں کیا جارہا ہوگا۔

ہوٹل کی حدود سے باہر سڑک کے کنارے ایک ٹیکسی کھڑی تھی مگر اس کا ڈرائیور سیٹ پر اس طرح لیٹا ہوا تھا کہ اس کی ٹانگیں کھڑکی سے نکلی ہوئی تھیں۔ سڑک پر ٹریفک برائے نام تھا۔ بعض سڑکوں سے ٹرکوں کو صرف رات میں گزرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ شاید اس لیے اِکا دُکا ٹرک ہی گزرتے دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر میں ڈرائیور کو جھنجھوڑ کر جگاؤں گا تو اس کے حواس صحیح طور پر بیدار ہونے اور اسے یہ سمجھنے میں کئی لمحے لگیں گے کہ میں مسافر تھا اور کہیں جانا چاہتا تھا۔ اس کے بعد بھی ممکن تھا کہ وہ غنودگی زدہ ذہن کے ساتھ ہی گاڑی چلاتا۔ چنانچہ میں نے اس چکر میں پڑنے کا تکلف ہی نہیں کیا۔ میں نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور دوسرے ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑ کر اسے سیٹ سے ذرا اوپر اٹھاتے ہوئے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔

مجھے امید تھی کہ چابیاں اس کی قمیص کی سامنے والی جیب میں ہوں گی۔ میں نے اس جیب میں ہاتھ مارا۔ میرا اندازہ درست ہی تھا۔ چابیاں فوراً ہی میرے ہاتھ میں آگئیں۔ میں نے خود ہی ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اس طرح آگے بڑھائی کہ کار چیزنگ کے فلمی منظر کی طرح اس کے ٹائر بری طرح چرچرا اٹھے۔

جس وقت تک ڈرائیور پوری طرح ہوش میں آکر سیدھا ہوکر بیٹھا، اس وقت تک ہم ہوٹل سے کافی دور نکل آئے تھے۔ میری نظر عقب نما آئینے پر تھی۔ جب میں موڑ مُڑ رہا تھا تو مجھے عقب نما آئینے میں ایک گاڑی کی ہیڈلائٹس کی نہایت تیز چمک دکھائی دی۔ گاڑی ہوٹل کے پارکنگ لاٹ سے نکل کر سڑک پر مُڑ رہی تھی۔ اسی دوران میں نے موڑ عبور کرلیا۔ میں اس کی صرف ایک جھلک ہی دیکھ پایا۔

اس دوران ڈرائیور سنبھل چکا تھا۔ وہ قدرے خوفزدہ لہجے میں بولا۔ "صاب! تم کو گاڑی چاہیے تو لے جاؤ..... مگر ام کو تو ادھر چھوڑ دو۔"

اسے اتنا خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ اس پوزیشن میں تھا کہ چاہتا تو کسی ہتھیار وغیرہ کا سہارا لیتے ہوئے مجھے دھمکانے کی کوشش کرسکتا تھا لیکن شاید وہ اچانک افتاد سے خوفزدہ ہوگیا تھا۔

میں نے گاڑی کی رفتار کچھ اور بڑھاتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "آرام سے بیٹھے رہو۔ مجھے نہ تمہاری ضرورت ہے نہ تمہاری گاڑی کی..... بس تھوڑی دیر کی بات ہے..... میں تمہیں تمہاری گاڑی سمیت چھوڑ دوں گا۔"

اسے شاید کچھ اطمینان ہوا۔ مزید کچھ نہ بولا لیکن اس کی جگہ اس کی گاڑی نے بولنا شروع کردیا۔ وہ کچھ زیادہ اچھی حالت کی گاڑی نہیں تھی۔ میں نے رفتار بڑھائی تو اس کی نہ جانے کیا کیا چیزیں کھڑکھڑانے لگیں۔ سڑکیں خالی ہونے کا یہ فائدہ تو تھا کہ میں اس پرانی سی گاڑی کو بھی کافی رفتار سے بھگا سکتا تھا لیکن ساتھ ہی یہ مشکل بھی تھی کہ خالی سڑک پر کسی کو ڈاج دینا زیادہ مشکل تھا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے ابتدا ہی میں کافی دور نکل آنے کا موقع مل گیا تھا۔ جب تک مجھے دوبارہ وہی ہیڈلائٹس عقب نما آئینے میں دکھائی دیں تب تک میں ایک اور موڑ پر پہنچ چکا تھا۔ میری چونکہ کوئی خاص منزل نہیں تھی اس لیے میں نے تعاقب کرنے والوں کو کنفیوژ کرنے کے لیے یہی ٹیکنک اپنائی کہ میری سائڈ پر جو بھی موڑ آتا گیا میں اسی طرف گاڑی موڑتا چلا گیا۔

جس انداز میں میں موڑ کاٹ رہا تھا اس سے ڈرائیور بدحواس ہورہا تھا اور اس کی گاڑی نہ جانے کس کس انداز سے صدائے احتجاج بلند کررہی تھی۔ اس کھٹارا گاڑی کو اس طرح استعمال کرنا بھی اپنی قسمت کو کچھ زیادہ ہی آزمانے والی بات تھی تاہم گاڑی نے..... یا پھر شاید قسمت نے مجھے دھوکا نہیں دیا۔

مسلسل زگ زیگ کرتے کرتے بالآخر میں نے محسوس کیا کہ عقب نما آئینے میں وہ ہیڈلائٹس نظر آنا بند ہوچکی تھیں۔ میں اس دوران ایک تنگ مگر ٹوٹے سڑک پر پہنچ چکا تھا۔ پھر ایک چھوٹے سے راؤنڈ اباؤٹ کے قریب سے گزر کر اچانک ہی میں نے خود کو کینٹ اسٹیشن کے سامنے پایا۔

میں نے عین سیڑھیوں کے سامنے ٹیکسی لے جا روکی۔ رات کے اس پہر بھی ایک پولیس والا سیٹی بجاتا ٹیکسی کی طرف لپکا۔ ڈرائیور کو ایک مصیبت سے تو نجات ملتی نظر آئی لیکن ساتھ ہی دوسری مصیبت اپنی طرف لپکتی نظر آئی اور وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا۔ "مروا دیا..... میرے پاس تو اس کو دینے کے لیے بھی کچھ نہیں ہے..... اب تو شاید چالان ہی ہوجائے....."

میرے پاس اس وقت کوئی چھوٹا نوٹ نہیں تھا۔ میں نے ہزار کا نوٹ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے کہا۔ "بے فکر رہو..... میں مفت کی سواری نہیں ہوں..... ایسا مسافر تمہیں روز روز نہیں ملے گا جو گاڑی خود ہی چلا کر بھی لائے اور یہاں تک ہزار روپیہ کرایہ بھی دے۔ اس پولیس والے سے اب خود ہی نمٹتے رہنا....."

یہ کہتے ہوئے میں ٹیکسی سے اتر چکا تھا۔ ڈرائیور کو دم بخود چھوڑ کر میں سیڑھیوں کی طرف بھاگا۔ اس وقت تک مجھے مزید کوئی گاڑی

اسٹیشن کی طرف آتی دکھائی نہیں دی تھی لیکن میں اسی طرح تقریباً دوڑتا ہوا پلیٹ فارم پر آگیا جیسے مجھے کوئی گاڑی پکڑنی تھی لیکن پلیٹ فارم پر دائیں طرف کچھ دور تک چلنے کے بعد میں یک دم ہی بائیں طرف بنے ہوئے سیکنڈ کلاس کے ایک نئے ویٹنگ روم کی طرف مُڑ گیا۔

اس ویٹنگ روم سے گزر کر میں دوبارہ باہر آگیا لیکن اب میں مرکزی دروازے سے کافی دور تھا اور یہاں اسٹیشن کی سیڑھیوں سے لے کر فٹ پاتھ تک خاصی بھیڑ بھاڑ تھی۔ سڑک پر مختلف سواریاں بھی موجود تھیں حتیٰ کہ دو بگھیاں بھی نظر آرہی تھیں۔ میں تیزی سے اس ساری بھیڑ بھاڑ سے گزرتا اور اپنے چاروں طرف غیر محسوس طور پر نظر رکھے آگے بڑھتا چلا گیا۔

عوامی قسم کے ریستورانوں پر ناشتے کی تیاریاں شروع ہوچکی تھیں۔ برتن اور کڑاہیاں کھنک رہی تھیں۔ ویٹروں کی بھانت بھانت کی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ فٹ پاتھ پر پڑی میزوں پر بھی کافی لوگ نظر آنے لگے تھے۔ میں ان کے درمیان سے گزرتا اسٹیشن کی قریبی گلیوں میں جا گھسا جہاں نچلے درجے کے کئی ہوٹل موجود تھے۔ یہ ذرا بہتر قسم کے..... بلکہ شاید خاصے معززانہ مسافر خانے تھے۔

میں آنکھیں تقریباً بند کرکے اور قسمت پر تکیہ کرکے ایک ہوٹل میں گھس گیا۔ ریسپشن پر ایک نوجوان بیٹھا قرآن پاک کی تلاوت کررہا تھا۔ اس نے مجھے ذرا انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ میں ذرا ایک طرف کو ہوکر کھڑا ہوگیا تاکہ باہر سے مجھے نہ دیکھا جاسکے۔ ریسپشن پر چاروں طرف مقدس مقامات کی فریم شدہ تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ میں سانس درست کرتے ہوئے سوچنے لگا کہ شاید میں کچھ ٹھیک جگہ پر ہی پہنچ گیا تھا۔ شاید میرے لیے یہاں پناہ اور حفظ داماں ہو۔

کلرک باریش نوجوان تھا۔ اس نے رکوع ختم کرکے قرآن پاک کو بوسہ دے کر ایک شیلف میں رکھا اور مہذبانہ لہجے میں بولا۔ "فرمایئے؟"

میں نے اسے بتایا کہ مجھے کمرا چاہیے۔ اس نے مجھے اپنے ہوٹل کے آداب کے بارے میں ایک مختصر سا لیکچر دیا کہ کمرا تو مجھے مل جائے گا لیکن میں وہاں کوئی بدمعاشی، کوئی غلط سلط حرکت کرنے کی کوشش نہ کروں اور ہوٹل کے واجبات ادا کیے بغیر بھاگنے کا خیال دل میں نہ لاؤں ورنہ میرے حق میں بہت بری ہوگی۔ میں نے نہایت سعادت مندی سے وعدہ کیا کہ میں اس قسم کی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کروں گا۔ اس نے واضح کیا کہ زمانہ خواہ کہیں بھی پہنچ چکا تھا اور دنیا میں خواہ کچھ بھی ہورہا تھا لیکن وہ کاروبار میں اعلیٰ روایات برقرار رکھنے کے لیے کوشاں تھا اور اپنے اصولوں پر قائم تھا۔ میں نے مختصر الفاظ میں اسے خراجِ تحسین پیش کیا۔ میں یہ جان کر حیران رہ گیا کہ وہ خود اس ہوٹل کا مالک تھا لیکن بوقتِ ضرورت اپنے ہوٹل میں ویٹر کے طور پر بھی خدمات انجام دیتا تھا۔

چند منٹ بعد میں اس ہوٹل کے نہایت چھوٹے سے بیڈ پر لیٹا حالات کے تغیر پر غور کررہا تھا۔ کچھ دیر پہلے میں اپنے فائیو اسٹار ہوٹل کے عالیشان لگژری سوئٹ میں لیٹا تھا اور اب اس ڈربا نما کمرے میں موجود تھا لیکن یہاں میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کررہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ میرا تعاقب کرنے والے اگر اسٹیشن کے سامنے کھڑی ٹیکسی تک پہنچنے میں کامیاب ہو بھی گئے تو وہ یہی سمجھیں گے کہ میں نے اندر جاکر کسی ٹرین کے ذریعے فرار ہونے کی کوشش کی ہوگی۔ اگر انہوں نے ڈرائیور سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تب بھی انہیں یہی پتا چلے گا کہ میں اندر گیا تھا۔ اپنے آپ کو یہ اطمینان دلا کر میں سوگیا تاکہ میری نیند میں جو کمی رہ گئی تھی وہ پوری ہوسکے۔

دوپہر کے بعد اٹھ کر میں نے کمرے ہی میں کھانا منگوایا۔ اس ہوٹل کے کمروں میں فون نہیں تھا۔ ہر فلور پر صرف سننے کے لیے فون کی ایک ایکسٹینشن رکھی تھی۔ فون کرنے کے لیے مجھے نیچے استقبالیہ کاؤنٹر پر جانا پڑا۔ ڈائریکٹری دیکھ کر میں نے ایک ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کیا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ لاہور پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ اگر کراچی میں میرے پہنچنے کے ایک رات بعد ہی ریڈ ڈاٹ کو میری موجودگی کا علم ہوگیا تھا تو پھر میرے لیے کراچی اور لاہور میں یکساں ہی خطرات تھے۔ لاہور میں کم از کم میں اپنے ساتھیوں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرسکتا تھا۔

میری خوش قسمتی تھی کہ جس پہلے ٹریول ایجنٹ سے میرا رابطہ ہوا، اسی نے مجھے رات کی ایک فلائٹ میں ٹکٹ دینے کا وعدہ کرلیا۔ وہ مجھے میرے پتے پر بھی ٹکٹ بھجوا سکتا تھا لیکن میں نے احتیاطاً اس سے یہی کہا کہ میں فلائٹ سے ڈیڑھ دو گھنٹا پہلے اس کے ہاں سے ٹکٹ لے کر ائرپورٹ چلا جاؤں گا۔

باقی وقت میں نے ایک قیدی کی طرح اس ہوٹل میں گزارا اور شام کا اندھیرا ہونے پر ہوٹل سے نکلا۔ ایک ٹیکسی پکڑ کر میں ٹریول ایجنسی پہنچا۔ دفتر میں بھورے بالوں والی ایک میک اپ زدہ لڑکی چند ٹکٹیں لیے مسافروں کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اس سے اپنا ٹکٹ لے کر ادائیگی کرکے میں اپنی روکی ہوئی ٹیکسی میں بیٹھ کر ائرپورٹ کی طرف روانہ ہوا۔

میں تمام راستے چوکنا رہا لیکن مجھے کسی گاڑی پر یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ میرا تعاقب کررہی تھی۔ مجھے اطمینان ہونے لگا لیکن میری قسمت میں زیادہ دیر کے لیے اطمینان نہیں تھا۔ گاڑی ابھی ٹرمینل کے قریب نہیں پہنچی تھی کہ میری نظر انکوائری بوتھ کی طرف چلی گئی۔ حالانکہ وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی اور فاصلہ بھی خاصا تھا، اس کے باوجود میں نے بوتھ کے قریب کھڑی شخصیت کو پہچان لیا۔ وہ وہی آسیبی آنکھوں والی لڑکی تھی۔ وہ شولڈر بیگ لٹکائے

بوتھ کے قریب ایک مجسمے کی طرح کھڑی تھی۔ ٹرمینل پر اگر کوئی مکمل تاریک گوشہ ہوتا تو شاید وہ وہاں کھڑی ہوتی۔ جہاں وہ کھڑی تھی وہاں سب سے کم روشنی تھی۔

"گاڑی روک دو اور ہیڈ لائٹس آف کردو۔" میں نے ڈرائیور کو ہدایت کی۔ اس نے گاڑی روک لی لیکن کچھ پریشان سا ہوگیا۔ ہیڈ لائٹس مجھے خود ہاتھ بڑھا کر آف کرنا پڑیں۔

میں اسے محض اتفاق نہیں سمجھ سکتا تھا کہ وہ آسیبی آنکھوں والی لڑکی اس وقت ائرپورٹ پر موجود تھی۔ یقیناً ائرپورٹ کی نگرانی ہورہی تھی اور وہ لڑکی وہاں تنہا نہیں تھی۔ اس پُرہجوم مقام پر اس کے ساتھی نہ جانے کہاں کہاں بکھرے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا طریقۂ واردات بھی کچھ انوکھا ہی ہوتا تھا۔

صرف ایک لمحہ سوچنے کے بعد میں نے واپس ہولینے کا فیصلہ کیا لیکن ڈرائیور اگر ون وے کی پابندی کرتے ہوئے واپس مُڑنا چاہتا تو اسے ٹرمینل کے قریب جا کر راؤنڈ اباؤٹ کے گرد چکر کاٹ کر دوسری سڑک پر آنا پڑتا۔ ٹرمینل کے سامنے تیز چمکیلی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں ٹیکسی کو وہاں تک لے جانے اور واپس گھمانے کا رسک نہیں لے سکتا تھا۔

"گاڑی واپس موڑ لو۔" میں نے ڈرائیور سے کہا۔ "یہیں سے گھما لو۔"

"کیوں مروائیں گے صاحب! یہ ون وے ہے۔" ڈرائیور کراہا۔

"ادھر اندھیرا ہے اور ٹریفک سارجنٹ ٹرمینل کے پاس کھڑا ہے۔ اگر کوئی ادھر آیا تو میں خود اس سے نمٹ لوں گا۔ میں جس طرح کہہ رہا ہوں اسی طرح کرو۔ تمہیں بہت اچھی دہاڑی ملے گی۔" میں نے کہا۔ تب وہ خطرہ مول لینے پر آمادہ ہوا اور اندھیرے میں ہیڈلائٹس آن کیے بغیر اس نے گاڑی واپس موڑی۔ کچھ دور پہنچ کر اسے درمیان میں راستہ میسر آگیا اور وہ دوسری طرف ہوگیا۔ میں گردن گھمائے پیچھے دیکھ رہا تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد ڈرائیور بولا۔ "صاحب جی! اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو ایک بات پوچھوں؟"

"ضرور پوچھو بھائی! میں آج کل کسی بھی بات کا برا منانے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ کیا کوئی سیاسی شخصیت ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"اللہ نہ کرے۔ تمہیں یہ شبہ کیونکر ہوا؟" میں نے جلدی سے سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ مجھے کافی حد تک یقین ہوچکا تھا کہ کوئی گاڑی میرا تعاقب نہیں کررہی تھی۔

"صاحب! میں نے دوسرے ڈرائیوروں سے سنا ہے..... اور مجھے خود بھی دو تین بار تجربہ ہوا ہے کہ بعض سیاسی شخصیتیں اسی طرح بھاگم بھاگ ائرپورٹ پہنچتی ہیں لیکن وہاں انہیں معلوم نہیں کیا نظر آتا ہے کہ ایک دم فلائٹ چھوڑ کر واپس بھاگ لیتے ہیں۔"

ڈرائیور بولا۔ وہ کافی ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔

"دراصل وہ سیاسی کم..... اور "سیاہ سی" شخصیات زیادہ ہوتی ہیں لیکن میں نہ سیاسی شخصیت ہوں اور نہ سیاہ سی۔ میں تو ایک شریف آدمی ہوں۔ کچھ مجبوریوں کی وجہ سے مجھے ائرپورٹ سے واپس آنا پڑا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ کندھے اچکا کر رہ گیا۔ شارع فیصل پر کافی آگے آجانے کے بعد ایک بار پھر میرے سامنے یہ سوال آن کھڑا ہوا کہ مجھے کہاں جانا چاہیے۔ کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے میں نے خواہ مخواہ ٹیکسی کو ادھر ادھر گھمانا شروع کردیا۔

اس وقت میں ڈیفنس کی ایک گلی سے گزر رہا تھا جب میری نظر ایک جانے پہچانے بنگلے پر پڑی۔ وہ ذرا مختلف اور منفرد ڈیزائن کا ایک خوبصورت بنگلا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی مجھے یاد آگیا کہ وہ سیٹھ رمضان کا بنگلا تھا۔ سیٹھ رمضان کسی زمانے میں ہوٹل میں میرا پارٹنر تھا۔ بعد میں میں نے اس کی خواہش پر اس کے حصے کے شیئرز خرید کر اسے الگ کردیا تھا لیکن اس سے دوستی برقرار تھی۔ یارباش آدمی تھا۔ ذرا الگ ہی قسم کی طبیعت پائی تھی۔ مدت ہوئی اس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ کام بھی آسکتا تھا۔

کچھ آگے جاکر میں نے ٹیکسی رکوائی اور ڈرائیور کو فراخ دلی سے ادائیگی کرکے رخصت کیا اور ایک دوسری گلی میں گھس کر ذرا گھوم کر واپس سیٹھ رمضان کے بنگلے تک آیا۔ ٹیکسی جاچکی تھی۔ گلی سے اکادُکا کاریں گزر رہی تھیں اور نہ جانے کیوں مجھے ہر کار کچھ پُراسرار سی لگ رہی تھی۔ اس گلی کا ماحول بھی کچھ پُراسرار سا ہی تھا۔ روشنی بہت کم تھی اور چاروں طرف عجیب سا سناٹا چھایا ہوا تھا۔ بڑے بڑے محل نما مکانات اپنی تمام تر خوبصورتی کے باوجود ویران ویران سے لگ رہے تھے۔

میں نے کال بیل بجائی تو ایک شخص نے بلند و بالا گیٹ کی مخصوص جھری سے میرا جائزہ لیا، نام پوچھا، پھر گیٹ کھولا۔ وہ مسلح گارڈ تھا اور چھوٹے سے گیسٹ ہاؤس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس نے مجھے گیسٹ ہاؤس میں بٹھایا اور انٹرکام پر سیٹھ رمضان کو اطلاع دی کہ کوئی افضل چوہدری صاحب اس سے ملنا چاہتے ہیں۔

چند لمحے بعد سیٹھ رمضان اس عالم میں ماربل کے خوبصورت فرش پر دوڑتا ہوا آتا دکھائی دیا کہ اس کے جسم پر صرف ایک ڈھیلی ڈھالی سی بنیان اور دھوتی تھی۔ اس کے پیروں میں چپل تک نہیں تھی البتہ ہاتھ میں لوٹا ضرور تھا جس سے پانی کی دھار وقفے وقفے سے بہتی آرہی تھی۔ اس وقت کوئی اسے دیکھتا تو شاید یہی سمجھتا کہ وہ گھر کا کوئی بدحواس قسم کا نوکر ہوگا۔ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ اس محل نما بنگلے اور اس جیسی کئی دوسری املاک اور کاروبار وغیرہ کا مالک تھا۔ اس کی تعلیم بھی واجبی تھی! دراندازو اطوار ان پڑھوں والے ہی تھے۔ اس کے باوجود اس کے بہت سے کاموں میں بڑا سلیقہ نظر آتا تھا۔ بڑے بڑے پڑھے لکھے جغادری قسم کے لوگوں

حتیٰ کہ غیرملکیوں تک سے اس کے مراسم تھے۔

مجھے دیکھ کر اس نے لوٹا لان پر پھینک دیا اور اچھل کر مجھ سے آن لپٹا۔ اپنے استخوانی بازوؤں سے وہ مجھے جھنجھوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "چوہدری! میرے یار..... تم کہاں مرگئے تھے؟ اتنے عرصے سے تمہاری شکل نہیں دیکھی..... کبھی فون تک نہیں کیا تم نے..... میں نے کئی بار فون کیا تو تمہارا کچھ پتا نہیں چلا۔"

"میں تقریباً مر ہی گیا تھا رمضانی یار!" میں نے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔ "بس یوں سمجھو کہ دوسری زندگی ملی ہے تو تم سے ملنے آگیا ہوں۔ بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔"

وہ رنڈوا تھا۔ اس کی شاید ایک شادی شدہ بیٹی اور بیٹا اس بنگلے میں اس کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ مجھے اپنے شاندار بیڈ روم میں لے گیا۔ نوکروں کو اس نے میری خاطر تواضع کے لیے دوڑانا شروع کردیا تھا۔ کمرا بند کرکے وہ ایک صوفے پر اکڑوں بیٹھ چکا تو اس کی فرمائش پر میں نے اپنی داستان غم شروع کی۔ میں نے اسے اختصار کے ساتھ لیکن تمام واقعات صحیح طور پر سنا دیے۔ میں نے اسے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بھی صحیح بتا دیا۔ اس کے ہوش اُڑ گئے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ رنگت زرد پڑ گئی۔

بنیادی طور پر وہ ایک ڈرپوک آدمی تھا۔ جن دنوں اسمگلنگ کے دھندوں میں ملوث تھا ان دنوں بھی ایک طرف تو اچھے خاصے خطرناک معاملات میں ہاتھ ڈالتا رہتا تھا لیکن دوسری طرف اس کے ڈرپوک ہونے کا یہ عالم تھا کہ وقت بے وقت کال بیل بج اٹھتی تھی تو بیڈ کے نیچے گھس جاتا تھا۔ اس کی شخصیت میں یہ ایک عجیب تضاد تھا۔

بہت دیر تک ہم ان حالات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ بالآخر وہ بولا۔ "چوہدری یار! میرا مشورہ تو یہی ہے کہ کچھ دنوں کے لیے تم ادھر ادھر ہوجاؤ۔ اپنے ہی کسی ٹرالر وغیرہ کے ذریعے مڈل ایسٹ کی طرف نکل جاؤ۔"

"ٹرالر یا لانچ کے ذریعے میں جانا نہیں چاہتا۔ انہیں اکثر کوسٹ گارڈ والے روک لیتے ہیں کیونکہ ان ریاستوں کی طرف انسانوں کی اسمگلنگ انہی کے ذریعے ہوتی ہے۔ میں خود بھی یہاں آنے سے ذرا دیر پہلے یہی سوچ رہا تھا کہ کچھ دنوں کے لیے باہر ہی نکل جاؤں لیکن کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ اس وقت میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ جعلی پاسپورٹ پر بھی میں سفر کرنا نہیں چاہتا..... بلکہ کسی سیدھے راستے سے تو سفر کرنا ہی نہیں چاہتا۔ میرا خیال ہے باہر جانے کے جتنے بھی ذرائع ہیں ان کی نگرانی ہورہی ہوگی۔"

وہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں ڈوبا رہا پھر بولا۔ "ایک ترکیب ہے..... میں تمہارا ایک بندوبست کرسکتا ہوں..... بلکہ اس طرح تم میرے ایک جاننے والے انگریز کی بھی کچھ مدد کرسکو گے۔ وہ بے چارہ لندن میں بہت پریشان بیٹھا ہے۔ اس نے کل ہی مجھے فون کیا تھا اور مدد کی درخواست کی تھی۔ میں نے اس کی مدد کا وعدہ بھی کرلیا تھا لیکن ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اس کی کیا مدد کروں۔"

"تمہارا خیال ہے کہ میں..... یعنی ایک ایسا شخص جو خود جان بچانے کے لیے بھاگا پھر رہا ہے، وہ اس کی مدد کرسکے گا؟" میں نے سیٹھ رمضان کو گھورا۔

"چوہدری یار! تمہاری بات کچھ اور ہے۔" اس نے پیار سے میرا بازو تھپتھپایا۔ "تم تو ڈوبتے ڈوبتے بھی دو چار کو ڈوبنے سے بچا سکتے ہو۔"

"مکھن مت لگاؤ۔ یہ بتاؤ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟" میں نے کہا۔

وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔ "میں جس انگریز دوست کا ذکر کررہا ہوں اس سے پرانی اور خاندانی دوستی چلی آرہی ہے۔ اس کا باپ میرے باپ کا دوست تھا۔ پارٹیشن سے پہلے اس کا باپ بمبئی میں ہائی کمشنر تھا۔ ظاہر ہے اس زمانے میں اس عہدے کا انگریز بڑی توپ چیز تھا۔ سچی بات ہے، ہمارے خاندان میں دولت داخل ہی اس وقت ہوئی تھی جب اس انگریز نے میرے باپ کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ اس سے پہلے میرا باپ پیتل کی تھالیوں پر نقش و نگار بنانے کا کام کرتا تھا۔ بس کسی طرح ہمارے ابا جان کی اس انگریز کے بنگلے میں رسائی ہوگئی تھی۔ اس کے بعد ہمارے دن پھرنے شروع ہوگئے تھے....."

"یہ پرانے قصے چھوڑو..... اب کا قصہ بتاؤ۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہی بتانے لگا تھا۔ اس کے بیٹے چارلس سے میرے بھی مراسم چلے آرہے ہیں۔ اس نے مجھے فون پر بتایا ہے کہ اس کی بیٹی کیتھرین ایک بحری جہاز پر سفر کررہی ہے جو اس وقت کراچی کی بندرگاہ پر لنگرانداز ہے۔ جہاز گو کہ باربرداری کا ہے مگر اس قسم کے جہازوں میں سے ہے جو باربرداری کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی بہانے ہر بندرگاہ سے دو چار مسافر بھی اٹھا لیتے ہیں اور کم کرائے میں ایک سے دوسرے ملک پہنچا دیتے ہیں۔ چارلس کو پتا چلا ہے کہ اس کی بیٹی منشیات کے دھندے میں ملوث ہے اور اس کی جان کو خطرہ ہے۔ وہ شاید ترکی جارہی ہے۔ وہ ایک معزز خاندان کی لڑکی ہے۔ اس کا باپ اس لیے بھی کسی سے مدد طلب نہیں کرسکتا کہ کہیں اس کی بیٹی کے منشیات کے دھندے میں ملوث ہونے کا معاملہ سامنے نہ آجائے۔ اس صورت میں بیٹی بچ بھی گئی تو انہیں انگلینڈ میں سخت سزاؤں کا سامنا کرنا پڑے گا اور رسوائی الگ ہوگی۔ تمہیں معلوم ہی ہے، مغرب کے والدین اپنی اولاد کو دی ہوئی آزادیوں کی سزا کس کس طرح بھگت رہے ہیں۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تم چاہتے ہو کہ ان کے حصے کی کچھ سزائیں میں بھگتوں؟"

"یار! تمہیں بھی تو فرار کا مسئلہ درپیش ہے۔ میں تمہیں اس جہاز پر سوار کرانے کا بندوبست کردیتا ہوں۔ بس تم راستے میں ذرا دیکھ لینا کہ مسئلہ کیا ہے۔ البتہ اس لونڈیا سے عشق لڑانے مت بیٹھ جانا۔ میں نے اسے دیکھا تو نہیں کہ کیسی ہے لیکن اگر خوبصورت ہوئی تو تم پھسل مت جانا۔ مجھے معلوم ہے تم کفرانِ نعمت نہیں کرتے۔ حسن والے مہربان نظر آئیں تو فوراً دل کے دروازے، کھڑکیاں اور روشن دان وغیرہ کھول دیتے ہو۔"

"کیوں..... اس لڑکی کو عشق سے پرہیز ہے کیا؟ یا اس کی نظر میں منشیات کا دھندا عشق کے دھندے سے زیادہ بہتر اور معززانہ ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں یار! میں تو اس لیے منع کر رہا ہوں کہ تم کہیں کسی اور خطرناک چکر میں نہ پھنس جاؤ۔ تم تو پہلے ہی ریڈ ڈاٹ کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو۔ تمہیں معلوم ہے ڈرگز کے دھندے میں بھی کچھ اسی قسم کی بڑی بڑی سینڈیکیٹس کام کر رہی ہیں۔ اب تو ایک نہیں، بیسیوں مافیائیں ہیں۔ تم بس شرافت سے صرف اپنی جان بچانے سے غرض رکھنا۔"

"ٹھیک ہے حاجی رمضان صاحب! میں آپ کے قیمتی مشوروں پر دل و جان سے عمل کروں گا۔" میں نے کہا۔ "ویسے یہ تمہیں محض غلط فہمی ہے کہ میں ہر اچھی صورت دیکھ کر عاشق ہو جاتا ہوں یا مہربان چہرے کے سامنے دیدہ و دل فرشِ راہ کردیتا ہوں۔ ہم پیار اسی سے کرتے ہیں جو پیار کے قابل ہوتا ہے۔"

"اچھا..... مجھے یہ گاڑھی اردو کی مار مارنے کی کوشش مت کرو اور نہ ہی گاڑھی اردو میں پتلے فلمی گانے مکس کرو۔ یہ بتاؤ تم جانے کے لیے تیار ہو؟" سیٹھ رمضان نے پوچھا۔

"ہاں یار..... میں سوچ رہا ہوں چند دن کے لیے ادھر اُدھر ہو ہی جاؤں....." میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "تم اس دوران میرے ساتھیوں کا پتا کرنے اور انہیں کسی ٹھکانے پر جمع کرنے کی کوشش کرنا....."

میں اسے سمجھانے لگا کہ وہ کس طرح میرے ساتھیوں سے رابطہ کرنے کی کوشش کرسکتا ہے۔ وہ سر ہلاتا رہا۔ بظاہر وہ غبی نظر آتا تھا لیکن درحقیقت غبی نہیں تھا۔

یہ باتیں ختم ہوچکیں تو میں نے پوچھا۔ "اس جہاز پر سوار ہونے کے لیے مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

"آج آدھی رات کو ہی یہ جہاز روانہ ہوجائے گا۔ تمہیں فوری طور پر کلفٹن جاکر ایک چھپر ہوٹل میں عاشق بھٹی نامی ایک شخص سے ملنا ہوگا۔ اس چھپر ہوٹل میں تلی ہوئی مچھلی وغیرہ فروخت ہوتی ہے۔ تم آرام سے جاکر ایک گاہک کی طرح بیٹھ جانا اور میرا لکھا ہوا ایک پرچا عاشق بھٹی کو دینا۔ وہاں کسی بھی ویٹر سے پوچھنا، وہ تمہیں عاشق بھٹی سے ملوا دے گا....."

سیٹھ رمضان نے جلدی سے نوکر سے ایک رائٹنگ پیڈ اور قلم منگوایا لیکن جب اس نے پرچا میرے حوالے کیا تو میں اس کی صورت دیکھنے لگا۔ اس پر صرف چند آڑی ترچھی لکیریں سی کھنچی ہوئی تھیں۔

"تم اس چکر میں مت پڑو کہ یہ کیا ہے۔ یہ ایک مکمل پیغام ہے۔" سیٹھ رمضان بولا۔ "تم چاہو تو اسی جہاز سے گھومتے گھامتے واپس بھی آسکتے ہو۔ آتے ہی مجھ سے فون پر رابطہ کرنا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس طرح ایک تیر سے دو شکار ہو رہے ہیں۔ جب سے چارلس کا فون آیا تھا میں پریشان تھا کہ کیا کروں۔ خود جانے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی، کسی دوسرے پر مجھے بھروسا نہیں تھا کہ وہ مسئلے کو صحیح طور پر ہینڈل کرسکے گا۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا۔ "اچھا یہ بتاؤ تمہیں کتنی رقم کی ضرورت ہے؟"

میں نے اپنی ذرا پھولی ہوئی جیب کی طرف اشارہ کیا۔ "میرے پاس ابھی اچھی خاصی رقم موجود ہے۔"

اس نے مجھے تاریک شیشوں والی ایک گاڑی میں مسلح گارڈ کے ساتھ کلفٹن کی طرف روانہ کردیا۔ ڈرائیور نے مجھے ساحل سے کافی دور ہی اتار دیا۔ ابھی کلفٹن پر تفریح کے لیے آنے والوں کا رش تھا۔ پلے لینڈ کے اس رش سے گزر کر میں اس طرف آیا جدھر مچھلی کی دکانیں تھیں۔ ہوا میں مچھلی اور تیل کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔

میں نے مطلوبہ دُکان کا بورڈ دور سے دیکھ لیا اور اس کی طرف بڑھا۔ دُکان کے بڑے سے چھپر تلے بڑا ہجوم تھا۔ پہلے مجھے حیرت ہوئی کہ کیا مچھلی پر اس قدر رش لگا ہوا تھا؟ کیا یہاں بہت ہی اچھی مچھلی ملتی تھی جو لوگ اس طرح ٹوٹے پڑ رہے تھے؟

لیکن قریب جاکر اندازہ ہوا کہ وہ ہجوم مچھلی خریدنے والوں کا نہیں تھا۔ وہاں کچھ گڑبڑ معلوم ہوتی تھی۔ میں بھیڑ کو چیرتا ہوا آگے پہنچا تو مجھے جھٹکا سا لگا۔ ہجوم کے درمیان ریتلی زمین پر ایک شخص اس طرح پڑا تھا کہ اس کی گردن تن سے بالکل ہی جدا تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کسی جلاد نے چند لمحے پہلے ہی اس کا سر قلم کیا تھا۔ گاڑھا گاڑھا خون ریت میں جذب ہوچکا تھا۔

"کون ہے یہ بدنصیب؟" میں نے غیرارادی طور پر خود کلامی کے سے انداز میں پوچھا۔

ویٹر نما ایک شخصیت نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا اور گویا مجھ پر ترس کھاتے ہوئے میرے سوال کا جواب دے دیا۔ "اس کا نام عاشق بھٹی تھا.....!"

میں نے بغور اس شخص کی طرف دیکھا جو اس چھپر نما ریستوران کا ویٹر معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں گندی سی ایک زنگ آلود ٹرے بھی تھی۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ وہ مجھ سے مذاق کر رہا تھا۔ کیا یہ ضروری تھا کہ عاشق بھٹی کو عین اس وقت قتل کیا جاتا جب میں اس سے ملنے کے لیے پہنچنے والا تھا؟

پھر مجھے احساس ہوا کہ ویٹر اور میں تو ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ وہ بھلا مجھ سے مذاق کیوں کر کرسکتا تھا؟ اگر وہ کہہ رہا تھا کہ مقتول عاشق بھٹی تھا..... تو پھر وہ یقیناً عاشق بھٹی ہی ہوگا۔ میرے سامنے اب سوال یہ آن کھڑا ہوا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں تو ناک کی سیدھ میں عاشق بھٹی سے ملنے کے لیے دوڑا چلا آرہا تھا اور عاشق بھٹی یہاں سربُریدہ پڑا تھا۔

ماحول پر ایک عجیب سوگوار سا سکوت چھایا ہوا تھا۔ باتوں کی وہ پُرجوش سی بھنبھناہٹ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی جو ایسے موقعوں پر عموماً سننے میں آتی ہے۔ واردات یا حادثے کے بارے میں ہر شخص حسب توفیق اظہار خیال کرتا ہے لیکن وہاں سب خاموش تھے۔ بیشتر چہروں سے ایک بے عنوان سا خوف جھانک رہا تھا اور شاید اسی خوف نے ان کی زبانیں بند کر رکھی تھیں۔

واردات سے پہلے اگر وہاں مچھلی کھانے کے کچھ شائقین موجود تھے تو وہ یقیناً کھسک چکے تھے۔ یہ بھیڑ انہی لوگوں کی معلوم ہوتی تھی جن کا اس جگہ سے کوئی نہ کوئی تعلق تھا۔ میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کسی نادیدہ قوت کو یہ علم کس طرح ہوسکتا تھا کہ میں عاشق بھٹی سے ملنے آرہا تھا؟ اگر علم ہو بھی گیا تھا تو اسے ملاقات سے قبل ہی ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے میری موجودگی میں بھی قتل کیا جاسکتا تھا..... یا کم از کم کوشش ضرور کی جاسکتی تھی۔ بلکہ ان کا اصل نشانہ تو میں تھا۔ مجھ پر قاتلانہ حملہ ہوتا تو بات کچھ سمجھ میں آتی تھی۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ میرے اب تک کے ریکارڈ کے پیشِ نظر یہ بات میرے دشمنوں کی سمجھ میں آگئی ہو کہ قدرت فی الحال مجھ پر مہربان تھی۔ ان کی تمام تر طاقت اور تمام تر سائنسی وسائل کے باوجود میں ان کے ہر حملے سے بچ نکلتا تھا۔ ان کی ہر کوشش اب تک ناکام رہی تھی۔ انہوں نے سوچا ہو کہ اب بھی اگر میری موجودگی میں عاشق بھٹی کا صفایا کرنے کی کوشش کی گئی تو میں شاید اپنے ساتھ ساتھ اسے بھی بچانے میں کامیاب ہوجاؤں اس لیے پہلے اس کا پتا تو صاف کردیا جائے، بعد میں مجھ سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ بھی تھا کہ خطرہ ٹلا نہیں تھا۔ آس پاس ہی کہیں موجود تھا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں چاروں طرف کا جائزہ لیا لیکن کوئی شخص مجھے بطورِ خاص اپنی طرف متوجہ دکھائی نہیں دیا اور نہ ہی کوئی مشکوک محسوس ہوا۔ اگر کوئی نادیدہ سی آنکھ بھی میری طرف دیکھ رہی ہوتی تو شاید میری کوئی نامعلوم حس مجھے خبردار کردیتی لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ شاید میں غلط سوچ رہا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ عاشق بھٹی کو میری ہی وجہ سے قتل کیا گیا ہو۔ معلوم نہیں وہ کس قسم کا آدمی رہا ہو۔ کس قسم کے لوگوں سے اس کا تعلق رہا ہو۔ کن کن چکروں میں ملوث رہا ہو۔ مجھے میرے دوست سیٹھ رمضان نے اس کے پاس بھیجا تھا لیکن سیٹھ رمضان خود اپنی جگہ ایک شاہکار چیز تھا۔ اس کے تو ہر طرح کے لوگوں سے تعلقات تھے۔ اور بہت قریبی تعلقات تھے۔ آدمی وہ بہرحال کام کا تھا۔

ان خیالات کی روشنی میں تو امکان یہی نظر آتا تھا کہ شاید عاشق بھٹی اپنے ہی کسی چکر میں مارا گیا ہو اور یہ محض ایک اتفاق تھا کہ عین اس وقت میں اس سے ملنے آپہنچا تھا۔ یہ سب کچھ میں نے غالباً دو چار سیکنڈ میں ہی سوچا اور اپنے قریب کھڑی ہوئی اس ویٹر نما شخصیت سے سرگوشی میں پوچھا۔ "اسے کس نے اور کس طرح قتل کیا؟"

ویٹر نے پہلے شک زدہ سی نظروں سے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ میں اس کے بیان کو گواہی کے طور پر تو استعمال نہیں کروں گا۔ پھر وہ شاید کچھ اطمینان محسوس کرتے ہوئے سرگوشی میں ہی بولا۔ "کچھ پتا ہی نہیں چلا بھائی۔ بھٹی صاحب وہاں ایک کونے میں آرام سے میز پر بیٹھے کولڈ ڈرنک پی رہے تھے....." اس نے آنکھوں سے چھپر کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا جہاں ایک کرسی اُلٹی پڑی تھی۔

ویٹر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "کسی کا دھیان اس طرف نہیں تھا۔ بھٹی صاحب کافی دیر سے بیٹھے تھے۔ شاید کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اچانک ہی کسی نے چیخ ماری۔ وہ کوئی عورت تھی۔ وہ چیخ

رہی تھی۔ 'ارے اس آدمی کو تو دیکھو... اس کی گردن کس نے کاٹ دی...' ہم نے مُڑ کر دیکھا تو بھٹی صاحب اس طرح یہاں پڑے ہوئے تھے۔"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ اس مختصر سے ہجوم میں کوئی عورت نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے جلدی سے پوچھا۔ "وہ عورت کہاں گئی؟ کیسی تھی وہ؟"

ویٹر نے ایک بار پھر عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شاید میرا تجسس مجھے اس کی نظر میں مشکوک بنا رہا تھا۔ تاہم اس نے ازراہِ کرم جواب دے ہی دیا "موٹی سی عورت تھی... بچوں کے ساتھ تھی... شوہر بھی ٹیکسی سے اُتر کر پیچھے پیچھے آرہا تھا۔ شاید وہ لوگ مچھلی کھانے آرہے تھے مگر یہاں یہ معاملہ دیکھ کر اُلٹے قدموں کھسک لیے۔"

"اوہ...." میں نے متاسفانہ سے لہجے میں کہا۔

اسی لمحے کسی نے ذرا تیز سی سرگوشی میں کہا۔ "پولیس آرہی ہے۔"

میں نے پلٹ کر دیکھا' موبائل پولیس کی ایک نیلی گاڑی ایک موڑ سے ریت اُڑاتی آرہی تھی۔ ایک پولیس والا گاڑی میں نصب شدہ مشین گن پر کھڑا تھا۔ گاڑی ابھی خاصی دور تھی۔ بھیڑ یکدم ہی کائی کی طرح پھٹ گئی۔ میں خود بھی وہاں سے کھسک جانے والوں میں شامل تھا۔ میں چھپر کے گرد گھوم کر دوسری طرف پہنچ گیا۔ ادھر چھپروں کی دوسری قطار موجود تھی۔ میں اس سے بھی آگے نکل گیا۔ میں واقعی بڑی اُلجھن میں پھنس گیا تھا۔ سیٹھ رمضان کی گاڑی بھی مجھے اتار کر واپس جاچکی تھی۔

میں ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ ٹیکسی پکڑ کر دوبارہ سیٹھ رمضان کے پاس جاؤں اور اس سے مشورہ کروں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے' دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ ایک پیلی ٹیکسی میرے تعاقب میں رینگتی چلی آرہی ہے۔ میں اس وقت ٹوٹے پھوٹے فٹ پاتھ پر تیز تیز قدموں سے چلا جارہا تھا۔ میں نے گردن ذرا سی گھما کر کن انکھیوں سے اس کی جھلک دیکھی تھی۔

پہلے تو میں یہی سمجھا کہ شاید وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ میں نے کسی بہتر اور اہم چیز کے بارے میں سوچا ہوتا تو شاید وہ بھی مجھے مل گئی ہوتی۔ میں نے صرف ٹیکسی کے بارے میں سوچا تھا۔ وہی میرے پیچھے کھنچی چلی آرہی تھی۔ شاید ٹیلی پیتھی واقعی کوئی چیز تھی اور اس کے ذریعے میرا رابطہ ٹیکسی ڈرائیور سے ہوگیا تھا۔ میرے ذہن کی آوارہ لہریں اس کے ذہن سے جا ٹکرائی تھیں' اسے معلوم ہوگیا تھا کہ مجھے اس وقت ٹیکسی کی ضرورت ہے اور وہ بے چارہ میرے پیچھے پیچھے چلا آیا تھا۔ یا پھر یہ محض ایک اتفاق تھا کہ جس وقت میں ٹیکسی کے بارے میں سوچ رہا تھا' کوئی ٹیکسی والا ٹیکسی خالی ہونے کی وجہ سے...... اور خصوصاً مجھے تیز تیز چلتے دیکھ کر میرے پیچھے آگیا تھا۔

دفعتاً مجھے کچھ خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے خاصا فاصلہ طے کرلیا تھا لیکن اس نے ابھی تک گاڑی میرے برابر لاکر نہیں پوچھا تھا کہ مجھے ٹیکسی کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اگر ٹیکسی ڈرائیور اس طرح پوچھنا اپنی شان کے خلاف سمجھے تب بھی گاڑی قریب سے گزارتے ہوئے کم از کم سوالیہ سی نظروں سے دیکھ تو لیتا ہے لیکن اس نے یہ زحمت بھی نہیں کی تھی۔

میں نے غیرارادی طور پر سانس روک لی۔ وہاں بائیں ہاتھ پر فٹ پاتھ سے نیچے ریت پر چند چھوٹی موٹی چیزیں سجائے ایک شخص ایئر گن سے نشانے لگوا رہا تھا اور ایک کے بدلے دس روپے دینے کا اعلان کر رہا تھا۔ یہ غریبانہ قسم کا جوا تھا۔ قوم میں چونکہ پلک جھپکتے میں ایک کے بدلے دس حاصل کرنے کا بڑا رجحان پایا جاتا ہے اس لیے اس کے پاس شائقین کا ایک ہجوم تھا۔

اس ہجوم کے پاس رک کر میں یک دم گھوم گیا۔ میرا خیال تھا کہ اگر کوئی مجھے گولی مارنے کی فکر میں تھا تو شاید ہجوم کی وجہ سے ایک لمحے کے لیے ہچکچا جائے۔ حالانکہ یہ بھی محض میری خوش فہمی تھی۔ مارنے والے محض اس لیے نہیں رُکتے کہ ان کے شکار کے علاوہ کچھ بے گناہ بھی مارے جائیں گے بلکہ اب تو شکار نہ بھی موجود ہو تب بھی بے گناہوں کے ہجوم کا شکار کھیلا جاتا ہے۔ اس کے مقاصد ذرا اور طرح کے ہوتے ہیں۔

میں تقریباً اس ہجوم میں جا گھسا تھا جو ایک کے دس بنانے کے لیے بے چین تھا۔ ایک کے دس ان میں سے شاید ہی کسی خوش نصیب کو ملتے۔ نشانے کی وجہ سے تو نہیں البتہ تُکے کی وجہ سے شاید مل جاتے کیونکہ مجھے معلوم تھا' ایئر گن کی نال میں نہایت معمولی سا خم ہوگا جس کی وجہ سے صحیح نشانہ لگ ہی نہیں سکتا تھا۔ ہجوم میں سے بھی شاید بہت سے لوگوں کو یہ بات معلوم ہو لیکن ایک کے دس مل جانے کی امید بڑی ظالم ہوتی ہے۔ بڑے بڑے سمجھ دار لوگوں کو نہ جانے کہاں کہاں کھینچ لے جاتی ہے۔

میرے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں اور میں کچھ بھی کر گزرنے کے لیے تیار تھا لیکن کچھ بھی کرنے کی نوبت نہیں آئی۔ ٹیکسی فٹ پاتھ کے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ صرف ایک لمحے کے لیے روشنی ڈرائیور کے چہرے پر پڑی۔ چہرہ سوکھا اور ستا ہوا سا تھا۔ اس کے باوجود کسی ورزشی انسان کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ اوپر کو اٹھی ہوئی موٹی موٹی نوکیلی مونچھوں نے اس چہرے کو تھوڑا سا رعب دار بنا دیا تھا۔

اصلی حیرت مجھے یہ دیکھ کر ہوئی کہ جس وقت وہ میرے سامنے سے گزرا اس وقت وہ موبائل فون کان سے لگائے ہوئے تھا۔ اس نے بغور میری طرف دیکھا لیکن گاڑی بدستور رینگتی رہی۔ میں جہاں کھڑا تھا وہاں روشنی بہت کم تھی۔ نشانہ بازی کرانے والے کے پاس ایک پیٹرومکس لیمپ روشن تھا لیکن اس کی روشنی گویا ہجوم کے دائرے میں مقید تھی۔ فٹ پاتھ پر کچھ اور لوگ بھی جارہے تھے۔ سب کا رخ پلے لینڈ کی طرف معلوم ہوتا تھا۔

میرے عقب میں ریت پر بھی بہت سے لوگ ہیولوں کی طرح رواں دواں تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے انہی ہیولوں کے درمیان کہیں موت بھی اپنا تاریک وجود لیے رینگ رہی تھی۔ میرے حواس کی گھڑی دھیرے دھیرے ٹِک ٹِک کر رہی تھی۔ کہیں دور سے خطرے کا کوئی نہایت مدھم سا سگنل موصول ہورہا تھا لیکن آنکھیں دیکھنے سے قاصر تھیں اور کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ خطرہ تھا کہاں۔

وہ ٹیکسی ڈرائیور موبائل فون پر بات کرتے ہوئے اتنے غور سے میری طرف دیکھتا کیوں گزرا تھا؟ اول تو ایک ڈرائیور کے پاس موبائل فون ہونا ہی خاصی حیرت کی بات تھی لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ آدھی سے زیادہ پیلی ٹیکسیاں بھی تو خوش حال طبقہ لے اُڑا تھا۔ ہم حکومتوں کو تو بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں لیکن اپنے گریبان میں جھانک کر نہیں دیکھتے۔ حکومتیں بھی تو آخر ہم میں سے ہی ہوتی ہیں۔ سرکار تو اپنی جگہ ہے' عوام بھی تو بے ایمانی کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ ضرورت مندوں کے لیے جس اسکیم کا بھی کبھی خدا خدا کرکے اعلان ہوتا ہے' اس پر بھی غیر مستحق طبقہ ہی ٹوٹ پڑتا ہے۔ زیادہ تر ضرورت مند تو بے چارے قطاروں میں پیچھے ہی کھڑے رہ جاتے ہیں۔ اس کا کیا علاج ہو؟ قوم کو قوم بننے کے لیے جس کردار کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہمارے پاس نظر نہیں آتا۔ ذرا سا فائدہ دیکھ کر ہم سب کچھ بھول بھال کر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بھوکوں کے حصے کی روٹی بھی وہی کھا جاتے ہیں جنہیں پہلے سے زیادہ کھا کھا کر بدہضمی ہوتی ہے۔

ٹیکسی ڈرائیور کے بارے میں سوچتے ہوئے میرے خیالات کی رو بھٹکنے لگی تھی۔ شاید وہ ٹیکسی ڈرائیور نہیں' کوئی خوشحال کاروباری شخص ہی رہا ہو۔ ٹیکسی اس نے ایک فاضل گاڑی کے طور پر رکھی ہو۔ ٹیکسی زیادہ دور نہیں گئی تھی۔ دفعتاً میں نے اس کی ریورس کی بتی روشن ہوتے دیکھی۔ وہ واپس آرہی تھی۔ ون وے کی وجہ سے اس شخص نے ٹیکسی واپس نہیں گھمائی تھی بلکہ ریورس گیئر میں لا رہا تھا۔

میں ملگجے اندھیرے میں کھلے میدان کی طرف کچھ اور آگے چلا گیا۔ میرے جوتے ریت میں دھنسے جارہے تھے۔ فٹ پاتھ کے ساتھ ساتھ آگے اور بھی کھیل تماشے ہورہے تھے۔ سب میں کچھ لگانے اور زیادہ کمانے کا چکر تھا۔ سب کے سامنے کچھ نہ کچھ لوگ موجود تھے۔ یہاں شاید کسی کو علم بھی نہیں تھا کہ اس جگہ سے کچھ ہی دور ایک شخص قتل ہوچکا تھا۔

ٹیکسی ان سب کھیل تماشوں کے سامنے سے ہوتی ہوئی وہیں آن رُکی جہاں ڈرائیور نے مجھے بغور دیکھا تھا۔ میں ہجوم کی آڑ میں کچھ اور آگے چلا گیا۔ اب میں گھرے اندھیرے میں تھا۔ ڈرائیور ٹیکسی سے اُتر آیا اور ہجوم کا جائزہ لینے لگا۔ وہ واقعی دراز قد اور ورزشی جسم کا مالک تھا۔ ڈھیلے ڈھالے سوٹ میں بھی اس کے ورزشی جسم کے عضلات نمایاں محسوس ہورہے تھے۔ اس نے شاید چوڑی چھاتی کی نمائش کے لیے جان بوجھ کر ٹائی نہیں لگائی تھی۔ گریبان کھلا تھا۔ گلے میں سونے کی موٹی چین چمک رہی تھی۔

اس کی نظریں نہایت مضطربانہ انداز میں اِدھر اُدھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ یقیناً مجھے تلاش کر رہا تھا لیکن وہ شاید اس تلاش کو خطرناک بھی محسوس کر رہا تھا۔ اس کے چہرے سے کچھ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے میری طرح اسے بھی آس پاس کسی خطرے کی موجودگی کا احساس ہو۔ میں اس کی طرف سے خطرہ محسوس نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنے ورزشی جسم کے باوجود مجھے اپنے لیے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہورہا تھا۔ مجھے تو کسی اور ہی نادیدہ خطرے کا احساس تھا لیکن وہ شاید مجھے ہی خطرہ محسوس کر رہا تھا۔ اس کے باوجود میری تلاش میں تھا۔

اسے شاید یہ احساس تھا کہ میں فٹ پاتھ پر ساحل کی طرف واپس نہیں گیا ہوں بلکہ وسیع ریتلے میدان میں اسی طرف نکل گیا ہوں جدھر اندھیرا پھیلا ہوا تھا کیونکہ ہجوم کا جائزہ لینے کے بعد وہ اسی طرف آرہا تھا۔ میں تیزی سے کچھ اور آگے رینگ گیا۔

یہاں غالباً کسی پرانی عمارت کو گرا کر اس کا بیشتر ملبہ بھی اٹھایا جاچکا تھا لیکن ٹوٹے پھوٹے پلرز کے کچھ ٹکڑے اب بھی سر اٹھائے کھڑے تھے جن سے موٹے موٹے اور مُڑے تُڑے سریے نکلے ہوئے تھے۔ میں ایسے ہی ایک ٹوٹے ہوئے پلر کی اوٹ میں سُکڑ سمٹ کر بیٹھ گیا۔ میں اندھیرے میں ان چیزوں کو کافی حد تک صاف طور پر دیکھ سکتا تھا لیکن اس شخص کو شاید کچھ دیکھنے میں دقت پیش آرہی تھی۔

وہ تھوڑا آگے آکر ہی رک چکا تھا۔ میں اس کے تاثرات تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اس کی حرکات و سکنات سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ الجھن زدہ انداز میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ بالآخر وہ سیدھا اسی طرف آنے لگا جدھر میں گھات لگائے اس کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ معلوم نہیں اس کی قسمت ہی اسے گھیر کر لارہی تھی یا اس کی بھی کسی حس نے اسے احساس دلایا تھا کہ میں اس طرف موجود تھا۔

اس کا موبائل فون اس کے ہاتھ میں تھا لیکن وہ چند قدم اور آگے آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ موبائل فون نہیں' سائلنسر لگا ہوا ریوالور تھا۔ میرا ایک طویل سانس لینے کو جی چاہا لیکن میں نے اُلٹا سانس روک لی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر اسے ریوالور لے کر میری تلاش میں نکلنا ہی تھا تو پہلے وہ میری طرف دیکھ کر گزرتا کیوں چلا گیا تھا؟

وہ ٹوٹے ہوئے ایک اور پلر کے قریب آن رُکا۔ اس نے صرف ایک لمحے رک کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر شاید وہ مایوس ہوکر واپس جانے کے لیے مُڑا تھا لیکن اسی لمحے میں نے عقب سے اس

پر چھلانگ لگائی۔ دوسرے ہی لمحے اس کا ریوالور والا بازو میرے ایک ہاتھ کی گرفت میں اور گردن دوسرے بازو کے شکنجے میں تھی۔ اس کا دوسرا بازو بھی میرے اسی بازو کے حلقے میں پھنس چکا تھا جس کو عقب سے لاتے ہوئے میں نے اس کا ریوالور والا ہاتھ پکڑا تھا۔

اس نے طاقت آزمانا چاہی' ریوالور والے ہاتھ کو موڑتے ہوئے پیچھے کی طرف فائر کرنا چاہا لیکن افضل چوہدری کے شکنجے میں حرکت کرنا کچھ ایسا آسان بھی نہیں تھا۔ اس لمحے اسے یقیناً احساس ہوا ہوگا کہ اس کی ورزشیں اس کے کچھ کام نہیں آئی تھیں۔ اس کی کلائی پر میرے ہاتھ کا شکنجہ اور گردن پر میرے بازو کا شکنجہ سخت تر ہوتا گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ ریوالور پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی تھی۔

"ریوالور چھوڑ دو میری جان..... ورنہ گردن ٹوٹ جائے گی۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔

اس نے بات نہ مانی۔ ابھی اپنی طاقت سے اس کی کچھ امیدیں وابستہ تھیں۔ اپنی دانست میں اس نے مجھے کمر پر سے اٹھاتے ہوئے آگے پھینکنے کی کوشش کی لیکن میں جب بھی کسی تھوڑے بہت طاقت ور شخص کو اس طرح دبوچتا تھا تو مجھے پہلے ہی اندیشہ رہتا تھا کہ وہ مجھے اس طرح اٹھا کر پھینکنے کی کوشش کرے گا لہٰذا میں پہلے ہی اس کا "بندوبست" رکھتا تھا' اس کے لیے تیار رہتا تھا۔ میرے پاؤں گویا زمین میں ہی گڑے رہتے تھے۔

"تمہیں اپنی گردن تڑوانے کی بہت جلدی ہے۔" میں نے سرگوشی میں کہا۔ اس کی زور آزمائی کے باعث اس کی گردن پر دباؤ خود بخود کچھ اور بڑھ چکا تھا۔ میں نے اس کی کلائی پر بھی ہاتھ کا شکنجہ مزید سخت کردیا۔ بالآخر اس نے ریوالور چھوڑ ہی دیا۔

میں نے اس کی پیٹھ پر گھٹنا رسید کرتے ہوئے اسے آگے پھینکا اور جھپٹ کر اس کا ریوالور اٹھا لیا۔ میں اس کے ساتھ زیادہ دھینگا مشتی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ گو کہ یہاں اندھیرا تھا لیکن کچھ دور کھیل تماشوں میں مشغول لوگ زیادہ اٹھا پٹخ کی صورت میں اس طرف متوجہ ہوسکتے تھے۔ فی الحال تو کسی کو کچھ پتا نہیں تھا کہ وہاں سے کچھ دور' جھاڑ جھنکاڑ کے دوسری طرف اندھیرے میں کیا ہو رہا تھا۔

وہ شخص ملبے پر جا گرا اور فوری طور پر نہیں اٹھ سکا۔ چند لمحے گردن شکنجے میں رہنے سے اس کے کس بل نکل گئے تھے۔ وہ ایک ہاتھ سے گردن پکڑے گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ پھر وہ یک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"خیال رکھنا..... تم اپنے ہی ریوالور کی زد پر ہو۔" میں نے اسے خبردار کیا۔ مبادا اندھیرے میں وہ ابھی صحیح طور پر نہیں دیکھ پا رہا ہو' ابھی اس کے حواس ٹھکانے پر نہ آئے ہوں۔

اس نے کبڑا سا ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میری طرف دیکھا اور بدستور گردن سہلاتے ہوئے جھٹکے دار سے لہجے میں بولا۔ "ارے..... آپ افضل چوہدری تو نہیں.....؟ میں تو آپ کو تلاش کر رہا تھا..." الفاظ گویا اس کے حلق سے رگڑ کھاتے ہوئے نکل رہے تھے۔ اگر وہ ذرا جاندار آدمی نہ ہوتا تو ابھی کچھ دیر زمین پر لیٹا رہتا۔

اب مجھے جھٹکا لگنے کی باری تھی۔ وہ میرا نام جانتا تھا لیکن کس حیثیت سے؟ دوست کی حیثیت سے یا دشمن کی حیثیت سے؟

میں نے ملائمت سے کہا۔ "یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ تم مجھے ڈھونڈ رہے تھے۔ سائلنسر لگا ریوالور ہاتھ میں لے کر۔"

"اوہ..... اب میں سمجھا....." وہ گویا کھانسی کی آواز دبانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ریوالور کی وجہ سے آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے لیکن یہ ریوالور آپ کے لیے نہیں تھا..... یہ تو کسی اور خطرے کا سامنا کرنے کے لیے تھا۔ آپ کو تو میں آپ کی مدد کرنے کے لیے ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے سیٹھ رمضان کی طرف سے آپ کے لیے حکم ملا تھا....."

"اوہ....." اب میں بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ بات کچھ اور ہی تھی۔ میرا ریوالور والا ہاتھ جھک گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا' معذرت خواہانہ سے انداز میں اس کی کمر تھپکی دی اور کہا۔ "محض غلط فہمی میں تمہاری جان بھی جاسکتی تھی۔ تم ذرا اور زور آزمائی کرتے تو تمہاری گردن ٹوٹ سکتی تھی۔"

"سر! جان تو اب بھی جاسکتی ہے۔ موت یہیں کہیں نہ جانے کس روپ میں گھوم رہی ہو۔" وہ سیدھا ہو کر اندھیرے میں ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔

"کمال ہے!" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "میں تو سمجھا تھا کہ موت صرف میرے تعاقب میں ہے لیکن یہاں تو تم بھی موت سے بھاگتے پھر رہے ہو۔ تم کس چکر میں اس حال کو پہنچے ہو؟"

"یہ پوری کائنات ہی چکر میں ہے سر۔ آپ کو معلوم ہے؟ سب سیارے ایک دوسرے کے گرد چکرا رہے ہیں۔ لگتا یہی ہے کہ کائنات کے سب جاندار بھی ہر وقت کسی نہ کسی چیز کے گرد چکرا رہے ہوتے ہیں۔ ہم سب کسی نہ کسی چکر میں ہیں۔ یہ دنیا قدرت کی بڑی عجیب تماشہ گاہ ہے۔" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں تیزی سے کہتا چلا گیا۔

"بہت خوب۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "پہلی بار تم جیسا باڈی بلڈر قسم کا فلسفی دیکھا ہے۔"

"یہ فلسفہ نہیں سر! زندگی کی ایک سیدھی سادی سی حقیقت ہے۔" وہ جھک کر زمین پر کچھ تلاش کرنے لگا۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میرا موبائل فون کہیں گر گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ وہاں ابھی تک مسمار شدہ عمارت کا کچھ ملبہ باقی تھا جس پر وہ جا کر گرا تھا۔ وہ اس طرف جا کر فون تلاش کرنے لگا اور چند سیکنڈ بعد لوٹ آیا۔ اس کا ٹیلی فون سیٹ مل گیا تھا۔ وہ اسے جیب میں رکھنے کے بعد میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میرا ریوالور بھی دے دیجیے۔"

"اسے ابھی میرے پاس ہی رہنے دو۔" میں نے اس کا ریوالور اپنی جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"اوہ..... ابھی آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں۔" وہ قدرے حیرت سے بولا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے بے پروائی سے کندھے اُچکا دیے۔ "خیر..... جیسے آپ کی مرضی۔ ہمیں تو سیٹھ رمضان کا حکم ملا ہے کہ آپ کی کچھ مدد کرنی ہے۔ سو ہم کردیں گے۔ ہمارا کام صرف اتنا ہی ہے۔ آپ ہم پر اعتبار نہیں کرنا چاہتے تو نہ سہی۔" پھر وہ فٹ پاتھ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ "میرے ساتھ آئیے۔"

میں خاموشی سے اس کے ساتھ چل دیا۔ ملگجے اندھیرے میں پہنچ کر میں نے پوچھا۔ "میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ کیا چکر ہے۔ مجھے تو عاشق بھٹی سے ملنے بھیجا گیا تھا لیکن میں یہاں پہنچا تو وہ قتل ہو چکا تھا..... اور اب تم مجھے ڈھونڈتے ہوئے مجھ سے آن ٹکرائے۔"

"یہ ایک نہیں' بہت سے چکر ہیں اور ایک دوسرے میں گڈمڈ ہیں۔ ساری باتیں بتائی بھی نہیں جاسکتیں اور بتانے کا وقت بھی نہیں ہے۔ آپ کو یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت بھی نہیں..... کیونکہ آپ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ دھیمی آواز میں بولا۔ "آپ بس اتنا سمجھ لیں کہ ہم سیٹھ رمضان کے ماضی کے دوستوں میں سے ہیں۔ سیٹھ رمضان پہلے بھی محتاط آدمی تھا' اب اور بھی زیادہ محتاط ہوگیا ہے۔ ہم سے موبائل فون تک پر بھی رابطہ نہیں رکھتا۔ اسے ڈر رہتا ہے کہ کہیں ہم میں سے کسی کا فون ٹیپ نہ ہوتا ہو۔ اسی لیے اس نے آپ کو عاشق بھٹی کے نام رقعہ دے کر بھیجا تھا....."

میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے یہ بات بھی معلوم تھی کہ مجھے عاشق بھٹی کے نام رقعہ دے کر بھیجا گیا تھا۔ تاہم میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس نے بات جاری رکھی۔ "اتفاق کی بات ہے کہ جس وقت آپ یہاں پہنچے تو ہم جن بہت سے چکروں میں اُلجھے ہوئے ہیں' ان میں سے ایک چکر نے عاشق بھٹی کی جان لے لی تھی۔ میں اس وقت قریب ہی موجود تھا۔ مجھے اسی لمحے عاشق بھٹی کے قتل کی اطلاع مل گئی تھی۔ یہ بھی محض ایک اتفاق ہے کہ میں اس وقت سیٹھ رمضان کو فون کرنے لگا تھا ورنہ ہم بھی عموماً اسے فون نہیں کرتے۔ کوئی ضرورت پڑتی ہے تو آدمی اس کے پاس بھیجتے ہیں لیکن اس وقت کچھ فارن ایکسچینج کا معاملہ تھا..... ایمرجنسی تھی۔ میں نے موبائل فون پر اس سے رابطہ کیا اور بات کرتے وقت اسے یہ بھی بتا دیا کہ عاشق بھٹی چند سیکنڈ پہلے قتل ہو چکا ہے۔ اس خبر سے اسے افسوس تو ہوا لیکن افسوس سے زیادہ پریشانی ہوئی۔ اس نے بتایا کہ وہ تو اپنے ایک جگری یار کو عاشق بھٹی سے ملنے کے لیے روانہ کر چکا ہے۔ وہ پہلے ہی کچھ چکروں میں پھنسا ہوا ہے' کہیں مزید کسی چکر میں نہ پھنس جائے یا منہ اٹھا کر اِدھر اُدھر نہ نکل جائے۔ اسے امید تھی کہ شاید ابھی وہ دوست یہیں کہیں ہو۔ اس نے میری ڈیوٹی لگائی کہ میں فوراً اسے تلاش کروں۔ حلیہ وغیرہ اس نے سب مجھے بتا دیا تھا۔ وہ دوست آپ تھے۔"

اس وقت تک ہم اس کی ٹیکسی کے قریب پہنچ چکے تھے۔ اس نے غیر محسوس سے انداز میں چاروں طرف کا جائزہ لیا اور دروازہ کھول کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے بظاہر پُرسکون انداز میں گاڑی اسٹارٹ کی لیکن اس کی انگلیوں میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ بے ہنگم اور بے ترتیب انداز میں پیدل چلتے ہوئے لوگوں کے درمیان سے گاڑی نکالتے ہوئے وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر قدرے رشک آمیز سے لہجے میں بولا۔ "آپ یقیناً سیٹھ رمضان کے قریبی دوست ہوں گے۔ وہ آپ کے لیے بہت پریشان تھا۔"

"ہاں..... بڑی گہری دوستی رہی ہے اس سے۔" میں نے مبہم لہجے میں کہا اور وضاحت کی ضرورت نہیں سمجھی۔

"اس نے جس انداز میں آپ کو تلاش کرنے کا حکم دیا اس کی وجہ سے مجھے یہاں رُکنا پڑا ورنہ عاشق بھٹی کے قتل کے بعد میں فوراً یہاں سے کھسکنے..... بلکہ کچھ دن کے لیے روپوش ہونے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔" اس نے بتایا۔

"اب تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"جو پروگرام طے ہے اس کے مطابق آپ کو بھجوانے کا بندوبست کرنا ہے۔ آپ مجھے عاشق بھٹی کا متبادل سمجھیے۔ بس یوں سمجھیے کہ آپ کے لیے تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ بیچ میں یونہی تھوڑی سی پریشانی ہوگئی۔" اس نے جواب دیا۔

دفعتاً اس کے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے جیب سے فون نکالا اور ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے فون پر بات کرنے لگا۔ وہ ایک ایسی زبان میں بات کر رہا تھا جو میرے لیے اجنبی تھی۔ اس کے باوجود میں اس کا مفہوم سمجھ رہا تھا۔ فون سیٹھ رمضان کا تھا اور وہ میرے بارے میں پوچھ رہا تھا۔ وہ شخص اسے بتا رہا تھا کہ میں اسے مل گیا ہوں۔ وہ غالباً اس تھوڑی سی کشمکش کا بھی تذکرہ کر

رہا تھا جو تمہارے درمیان ہوئی تھی۔ پھر اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ "سیٹھ تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔"

میں نے سیٹ اس سے لے کر ہیلو کہا تو سیٹھ رمضان سیدھی سادی اُردو میں بولا۔ "معاف کرنا چوہدری یار! تمہیں تھوڑی تکلیف اٹھانی پڑی۔"

"تکلیف مجھے نہیں، تمہارے اس مہرباں کو اٹھانی پڑی۔" میں نے اطمینان سے کہا۔ "ایک میرے پہنچنے سے پہلے ہی مارا جا چکا تھا' دوسرا میرے ہاتھوں مارا جاتا۔ بعد میں اصل بات پتا چلتی تو اس غلط فہمی پر زندگی بھر افسوس رہتا۔" میں نے کن انکھیوں سے اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے کچھ تکلیف کے سے آثار ابھر آئے تھے لیکن فوراً ہی اس کے تاثرات معمول پر آ گئے۔

"خیر..... اب جس طرح یہ بتائے اس طرح کرنا۔ تم آرام سے نکل جاؤ گے۔ تمہیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔" سیٹھ رمضان بولا۔

"میں تو پہلے بھی پریشان نہیں تھا۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔ "ویسے بھی جس کے لیے تم جیسے پریشان ہونے والے دوست موجود ہوں اسے خود پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟"

"خیر..... ذرا ہوشیار رہنا۔ اس وقت تم دُہرے خطرات کی زد میں ہو۔ ایک تو وہ خطرات ہیں جو تمہیں تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ دوسرے وہ خطرات ہیں جو اِن لوگوں کو عموماً لاحق رہتے ہیں جن کے پاس میں نے تمہیں بھیجا ہے۔"

"کوئی بات نہیں' اب خطرات میرے معمول میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"ہو سکے تو اسی جہاز سے واپس آجانا۔ میں کوشش کروں گا کہ واپسی تک تمہارے لیے یہاں خطرات کچھ کم ہو چکے ہوں یا کوئی خوشخبری تمہاری منتظر ہو۔ میں یہاں تمہارے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق تمہارے لیے کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم وہاں جہاز پر اس لڑکی کے لیے کچھ کرنے کی کوشش کرنا جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا....." وہ اپنے انگریز دوست چارلس کی بیٹی کیتھرین کا ذکر کر رہا تھا۔

"تم فکر مت کرو۔ فی الحال گو کہ میں خود مدد کے قابل ہوں لیکن مجھ سے اس کی جو بھی مدد ہو سکی ضرور کروں گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"میں فون پر زیادہ باتیں نہیں کر سکتا۔ اس حد تک بے احتیاطی بھی تمہاری وجہ سے کی ہے۔ اچھا خدا حافظ۔" اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے فون اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص کو واپس کر دیا۔

اس وقت تک اس نے ٹیکسی کیسینو کے سامنے جا روکی تھی جس کی نامکمل عمارت برسوں تک ویران پڑی رہی تھی۔ حال ہی میں ایک پارٹی نے اس میں بچوں کے لیے پلے لینڈ کھولا تھا۔ کم زمانے میں' میں خود لاہور میں اس قسم کی عمارتیں بنوانے کے بارے میں سوچا کرتا تھا۔ یہ کراچی میں ہوٹل بنوانے سے پہلے کی بات تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ اس میں کیسینو ہوتا۔ اس میں کسی اور طرح کی تفریح گاہ بنائی جا سکتی تھی لیکن اس عمارت کا حشر دیکھ کر نہ جانے کیوں میری ہمت نہیں پڑی۔

اس شخص نے ٹیکسی چار دیواری سے باہر ہی چھوڑ دی اور ہم پُل سے مشابہ راستے پر چلتے ہوئے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ دائیں بائیں دونوں طرف کھیل کود کی مشینوں پر بچوں اور ان کے والدین کا ہجوم تھا۔ تیز بھنبھناہٹ سے مشابہ شور سنائی دے رہا تھا۔ وہ درمیانی راستے پر چلتے ہوئے بولا۔ "یہاں ایک ریستوران بھی ہے۔ وہاں بیٹھ کر اطمینان سے بات کریں گے۔"

ہم دوسری طرف عمارت کے ٹیرس نما حصے پر پہنچے جہاں سے سمندر کا نظارہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ یہاں اوسط درجے کا ایک ریستوران بنایا گیا تھا۔ ریستوران میں بھی خاصی بھیڑ بھاڑ تھی لیکن خوش قسمتی سے ہمیں ٹیرس کے ایک کونے پر الگ تھلگ سی ایک میز خالی مل گئی۔ شاید میرے ساتھی کو ایسی ہی کسی میز کی تلاش تھی۔ وہاں روشنی کم تھی۔ معلوم نہیں وہ میز رومانس اور تخلیے کے متلاشی جوڑوں کی نظر سے کیسے بچ گئی تھی۔

ہم وہاں جا بیٹھے اور اس نے گرد و پیش کا جائزہ لینے کے بعد نم آلود ہوا میں ایک گہری سانس لی۔ اب وہ یقیناً خود کو خاصا مطمئن محسوس کر رہا تھا۔ ایک ویٹر نہایت مستعدی سے ہمارے سر پر آن کھڑا ہوا۔ اس شخص نے میرے مشورے سے اسے کچھ سینڈوچز اور کافی کا آرڈر دیا۔

ویٹر کے جانے کے بعد وہ بولا۔ "وہ رقعہ آپ مجھے دے دیجئے جو سیٹھ رمضان نے آپ کو عاشق بھٹی کے نام دیا تھا۔"

میں نے جیب سے وہ مُڑا تُڑا رقعہ نکال کر اسے دے دیا۔ اس نے اسے اپنے سامنے میز پر رکھ کر نہایت احتیاط سے اس کی ہر شکن دور کی اور جھک کر انہماک سے اس تحریر کو پڑھنے لگا جو میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ وہ آڑی ترچھی لکیریں گویا اس کے لیے کوئی معمّا نہیں تھیں۔

رقعہ حفاظت سے تہہ کر کے جیب میں رکھتے ہوئے وہ سر ہلا کر بولا۔ "اچھا..... تو آپ کو "پیرا ماؤنٹ" پر جانا ہے۔"

"پیرا ماؤنٹ.....؟" میں نے دُہرایا۔

"یہ اس جہاز کا نام ہے جس پر سیٹھ صاحب آپ کو بھیجنا چاہتے ہیں۔ اس پر تو کیتھرین بھی موجود ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟ کیا تمہیں رمضان نے بتایا ہے؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ مجھے سیٹھ رمضان نے نہیں بتایا لیکن ہمیں ویسے ہی کراچی سے روانہ ہونے والے ہر جہاز' ہر لانچ' حتیٰ کہ فشنگ ٹرالر تک کے بارے میں ضروری باتیں معلوم ہوتی ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ کیتھرین کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سیٹھ صاحب نے آپ کو نہیں بتایا؟"

"نہیں۔" میں نے جھوٹ بولا۔

"ڈرگ مافیا کی کیریئر تھی لیکن یہ کنفرم نہیں ہے کہ آج کل بھی کام کر رہی ہے یا نہیں۔ میں تو سمجھا تھا' شاید سیٹھ صاحب آپ کو اسی کی وجہ سے اس جہاز پر بھیج رہے ہوں ورنہ یہ جہاز اس قابل تو نہیں ہے کہ آپ اس پر جائیں۔ آپ کے لیے اس سے اچھا بندوبست بھی ہو سکتا تھا۔ رقم تو خیر اتنی ہی خرچ ہونی تھی۔" وہ بولا۔

"دراصل میں جلدی میں ہوں' زیادہ نخرے بازیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جو مل جائے غنیمت ہے۔ میں تو فشنگ ٹرالر تک میں جانے کے لیے تیار تھا لیکن اس میں خطرات ذرا زیادہ تھے۔ ویسے یہ پیرا ماؤنٹ کس قسم کا جہاز ہے؟"

"چھوٹا سا مال بردار جہاز ہے۔ اس کو چار چھ مسافر بھی لے جانے کی اجازت ملی ہوئی ہے۔ عملے نے اس کو ذرا اور طرح کا سائیڈ بزنس بنا لیا ہے۔"

"کس قسم کا مال لے جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تیل کے لیے کھدائی میں استعمال ہونے والی بھاری مشینری۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا اس کی آڑ میں اور کیا کچھ لے جاتا ہو۔ افغانستان میں روسی جو اسلحہ چھوڑ گئے تھے اس میں سے جو ہمارے ہاں بکنے سے رہ گیا تھا' میں نے سنا ہے اس جہاز نے اس کے بھی دو ایک پھیرے لگائے تھے۔"

"کیا کبھی ڈرگز کے سلسلے میں بھی اس کے استعمال ہونے کی خبریں سُنی گئی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ترکی کے راستے تو ڈرگز کا ٹریفک پہلے بھی رواں دواں تھا لیکن روس کی ریاستوں کی خود مختاری کے بعد گویا مزید سرحدیں کھلتی جا رہی ہیں۔ بے ضرر سامان اسمگل کرنے والوں کو ہی نہیں بلکہ ڈرگ مافیا کو بھی نئے روٹ' نئے نئے کیریئر مل رہے ہیں۔ کوئی بعید نہیں یہ جہاز بھی استعمال ہوا ہو لیکن اس کی شہرت بری نہیں ہے۔ اس پر کبھی چھاپا نہیں پڑا۔"

"کہیں اب نہ پڑ جائے۔ میں جو اس پر جا رہا ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "آج کل میرے ستارے ذرا گردش میں ہیں۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہوگا۔" وہ وثوق سے بولا۔ "جہاز صرف استنبول تک ہی تو جا رہا ہے۔ ابھی تک تو اس کے بارے میں کوئی غلط خبر نہیں آئی۔ امید ہے استنبول تک بھی خیریت سے ہی پہنچ جائے گا۔ ہماری اطلاع کے مطابق تو اس پر کچھ نہیں ہے۔"

میں ابھی تک اس شخص کی حیثیت کا تعین نہیں کر سکا تھا کہ وہ خود کیا تھا۔ اسی دوران ویٹر اسنیکس وغیرہ لے آیا اس لیے میں اس سے کچھ پوچھتے پوچھتے رک گیا۔ ویسے بھی یہ پوچھنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خود کیا تھا۔

میں نے سینڈوچز کی ایک پلیٹ اس کی طرف کھسکائی تو وہ بولا۔ "میں قطعاً کچھ نہیں کھاؤں گا۔ میرا بالکل دل نہیں چاہ رہا۔ یہ تو میں نے آپ کے لیے منگایا ہے۔ آپ کھائیں..... میں اس دوران آپ کا کام کرتا ہوں۔"

میں نے بہت اصرار کیا لیکن اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ "میرا کام" کرنے سے اس کی مُراد کیا تھی۔ یہ بات کچھ دیر بعد میری سمجھ میں آئی۔ اس نے کوٹ کی اندرونی جیب سے نہایت چھوٹے سائز کے بریف کیس سے مشابہ ایک چرمی تھیلی نکالی جیسی عموماً لوگ اپنی چھوٹی موٹی چیزیں رکھنے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ہاتھ میں لٹکائے رکھتے ہیں۔

وہ تھیلی میز پر رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ شاید دنیا کا مختصر ترین دفتر ہے لیکن بہت ہی اہم کام میں استعمال ہوتا ہے۔"

اس نے تھیلی کی زپ کھول کر چھوٹے سائز کی چند چھپی ہوئی پرچیاں سی نکالیں پھر دو تین مہریں اور اِنک پیڈ نکالا۔ قلم ہاتھ میں لے کر ایک پرچی سامنے رکھ کر وہ نیچی آواز میں بولا۔ "آپ کس نام سے سفر کرنا چاہتے ہیں؟"

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا۔ "بس مجھے چوہدری سے خان بنا دو۔ یعنی افضل خان۔" کافی دنوں سے میں یہی نام استعمال کر رہا تھا۔ اپنے نام میں معمولی سی ہیرا پھیری سے ہی کام چلا رہا تھا۔ ابھی تک مجھے نام بدلنے کی کوئی خاص ضرورت پیش بھی نہیں آئی تھی۔ میرے خیال میں یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں تھا۔ زیادہ مشہور اور عوامی قسم کی شخصیات کو ایسے حالات میں نام کے بارے میں زیادہ محتاط

ہونا پڑتا ہے۔ میں تو خاصا گمنام آدمی تھا۔

اس نے جھک کر پرچی پر کچھ خانہ پُری کی' اس پر باقاعدہ دو مُہریں لگائیں اور انہیں خشک کرنے کے لیے پھونک مار کر پرچی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "اسے اپنی واپسی تک سنبھال کر رکھیے گا۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"اسے اپنا پاسپورٹ سمجھ لیجیے..... ویزا سمجھ لیجیے..... پروانۂ راہداری سمجھ لیجیے۔ جہاز کے کیپٹن کو یہ دکھانے کے بعد آپ مکمل طور پر اس کی ذمے داری ہوں گے۔ کوئی آپ کو نہیں پکڑ سکتا۔ ضرورت پڑنے پر وہ آپ کو اپنے عملے کا رکن بھی بنا سکتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے پرچی تہہ کر کے جیب میں رکھ لی اور ایک لمحے کے لیے خاموش سا بیٹھا رہ گیا۔ یہ تو صرف ایک نمونہ تھا۔ ملک سے بھاگنے کے اور نہ جانے کیا کیا طریقے ہیں۔ اسی لیے تو خطرناک مجرم' دہشت گرد' اسمگلر راتوں رات فرار ہو جاتے ہیں' کوئی انہیں روک نہیں پاتا۔ بعض تو خفیہ طریقوں اور خفیہ راستوں سے بھی جانے کی زحمت نہیں کرتے۔ پاسپورٹ ویزے پر جاتے ہیں۔ کتنے ہی ملکوں میں انہیں نہ جانے کتنی طرح کے ویزے اور دوسرے کاغذات مل جاتے ہیں۔ مشکلات تو صرف شرفا کے لیے ہیں۔

میں نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "اس کے لیے مجھے کچھ ادائیگی کرنی ہے؟"

وہ مغموم سے انداز میں مسکرایا۔ "ہمارا حساب کتاب سیٹھ رمضان کے ساتھ چلتا ہے۔ البتہ جہاز کے کیپٹن سے آپ کو خود نمٹنا پڑے گا۔ آپ یہاں سے سیدھے بندرگاہ چلے جائیے گا۔ برتھ نمبر میں ابھی آپ کو فون پر معلوم کر کے بتا دیتا ہوں....." اس نے پیار سے اپنے موبائل فون کو تھپتھپایا اور ایک بار پھر فلسفیانہ سے لہجے میں بولا۔ "اس قسم کی تمام الیکٹرانک اور دوسری سائنسی ایجادات کا شرفا کو اتنا فائدہ نہیں ہوتا جتنا ہم جیسے لوگوں کو ہوتا ہے۔ ہمارے ناجائز دھندوں میں کچھ اور تیزی آ جاتی ہے۔ ہمارے لیے بڑی آسانیاں ہو جاتی ہیں۔"

"مجھے ابھی تک تمہارا نام نہیں معلوم۔" میں نے کہا۔ بالآخر میں نے یہی سوچا تھا کہ کم از کم نام پوچھ لینے میں تو کوئی حرج نہیں۔

"آصف بھٹی۔" اس نے نہایت دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"آصف بھٹی.....؟" میں نے غیر ارادی طور پر دُہرایا۔ "کیا عاشق بھٹی سے تمہارا کوئی.....؟" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"جی۔ وہ میرا سگا بھائی تھا۔" اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ افسردگی سے مسکرایا اور بولا۔ "اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

میں خاموش رہا۔ وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔ "آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ اُدھر میرا بھائی قتل ہو گیا ہے اور میں یہاں بڑا دھندا کر رہا ہوں۔ مجبوری ہے..... اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ آپ کی مدد کرنا بھی ضروری تھا۔ سیٹھ رمضان کا حکم تھا اور آپ بھی مشکل میں تھے۔ اس کام کو ایک دن کے لیے ٹالا نہیں جا سکتا تھا۔ دوسری طرف بھی مجبوری تھی کہ میں فی الحال بھائی کی لاش کے پاس پھٹک بھی نہیں سکتا تھا لیکن خیر..... کوئی بات نہیں..... دیکھا جائے گا....."

اس نے بظاہر بے پروائی سے کندھے اچکائے لیکن ایک لمحے کے لیے اس کا چہرہ پتھرا سا گیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا گلے میں پھنسی ہوئی کوئی چیز نگلتے ہوئے بولا۔ "شکر ہے' لاشیں اذیت محسوس نہیں کرتیں۔ عاشق کی لاش کو ضابطے کی کارروائیوں سے گزر لینے دیں..... پھر موقع مناسب دیکھ کر جا کر لاش حاصل کر لوں گا..... پھر موقع مناسب دیکھ کر ذرا ان کی طرف بھی رخ کروں گا جنہوں نے میرے شیر جیسے بھائی کی لاش گرائی ہے۔ شاید ان کے سامنے میری حیثیت وہی ہو جو ہاتھی کے سامنے چیونٹی کی ہوتی ہے لیکن کبھی کبھی چیونٹی بھی ہاتھی کو بلبلانے پر مجبور کر دیتی ہے۔"

"اگر میں یہاں رکتا تو شاید تمہاری کچھ مدد کر سکتا لیکن میں کچھ عجیب ہی حالات کا شکار ہوں۔ میں یہاں رکنے کا رسک نہیں لے سکتا۔" میں نے ہمدردانہ انداز میں اس کا مضبوط ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"ارے نہیں بھئی....." وہ کھوکھلے سے انداز میں ہنسا مگر ہنسی کسی درندے کی غراہٹ سے مشابہ تھی۔ "آپ ہمارے لیے پریشان نہ ہوں۔ آپ اپنی فکر کریں۔ زندگی رہی تو شاید آپ سے دوبارہ ملاقات ہو۔ اگر اس وقت مجھے مدد کی ضرورت ہوئی تو دیجیے گا....."

پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں آپ کو اپنی ٹیکسی میں چھوڑ آتا لیکن وہ گاڑی اب کچھ مشکوک ہو چکی ہے۔ آپ دوسری ٹیکسی میں جائیں..... ویسے بھی آپ کا اکیلے ہی جانا بہتر ہے۔ اب آپ روانہ ہو ہی جائیں۔ آپ کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ جہاز آدھی رات کے قریب روانہ ہو جائے گا۔"

"ٹھیک ہے..... میں چلتا ہوں۔ تم نے میری جو مدد کی ہے اس کے لیے میں ہمیشہ تمہارا شکر گزار رہوں گا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"معذرت خواہ ہوں کہ میں آپ کو خدا حافظ کہنے کے لیے نہیں اٹھ سکتا۔ اٹھوں گا تو میرے چہرے پر روشنی پڑے گی۔ کچھ دیر یہاں نیم تاریکی میں ہی بیٹھنا چاہتا ہوں۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میں اس سے ہاتھ ملا کر سر جھکائے' اپنے لمبے قد کو گویا

چھوٹا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میزوں کے درمیان سے گزرتا واپس پلے لینڈ کے درمیانی راستے پر آ گیا۔ اس راستے سے گزر کر میں پلے لینڈ کے دروازے پر پہنچا تو اچانک مجھے یاد آیا' میں نے آصف بھٹی سے یہ تو پوچھا ہی نہیں تھا کہ پیراماؤنٹ کون سی برتھ پر کھڑا ہو گا۔

میں ایک لمحے تذبذب کے سے عالم میں کھڑا رہا۔ والدین اور بچے میرے دائیں بائیں رگڑ کھاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ بالآخر میں نے یہی فیصلہ کیا کہ تھوڑی سی زحمت کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ مجھے واپس جا کر برتھ نمبر پوچھ ہی لینا چاہیے تھا۔ یہ چھوٹی سی زحمت مجھے خاصی بڑی زحمت سے بچا سکتی تھی۔

میں واپس روانہ ہوا اور ایک بار پھر ریستوران میں جا پہنچا۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا تھا کہ آصف بھٹی ابھی اسی کونے میں ملگجے اندھیرے میں اپنی کرسی پر موجود تھا۔ میں نے اس کے قریب پہنچ کر جھکتے ہوئے نیچی آواز میں کہا۔ "یار' تم نے مجھے برتھ نمبر تو بتائی ہی نہیں۔"

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ وہ کچھ غیر فطری سے انداز میں ساکت تھا اور اس کی گردن ایک طرف کو ذرا جھکی ہوئی تھی۔ میں نے ذرا غور سے اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کی آنکھیں کھلی ضرور تھیں مگر ان سے زندگی رخصت ہو چکی تھی۔

اس کے ہونٹوں پر افسردہ سی مسکراہٹ تک اسی طرح منجمد ہو کر رہ گئی تھی جس طرح میں نے رخصت ہوتے وقت دیکھی تھی۔ کرسی کا پُشتہ جس سے وہ ٹیک لگائے ہوئے تھا' نیم دائرے کی طرح گولائی لیے ہوئے تھا اس لیے آصف کا مُردہ جسم اس کے درمیان ہی ٹکا رہ گیا تھا' کرسی سے لڑھکا نہیں تھا۔ مجھے اس کی قمیص پر عین دل کے مقام پر وہ دھبا بھی نظر آ چکا تھا جو دھیرے دھیرے پھیل رہا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں وہ سیاہ سا نظر آ رہا تھا مگر حقیقت میں سرخ ہو گا۔ گولی یقیناً اس کے دل سے گزر گئی تھی۔

اچھا ہوا میں نے اس کا کندھا پکڑ کر نہیں ہلایا تھا ورنہ شاید وہ کرسی سے لڑھک ہی گیا ہوتا۔ اردگرد اسی طرح باتوں کی بھنبھناہٹ اور قہقہوں کی دبی دبی سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پلے لینڈ کے بڑے بڑے مشینی کھلونوں میں سے بعض کی مدھم سی آوازیں یہاں پہنچ رہی تھیں۔

اگر کسی نے گولی چلنے کی آواز سنی ہوتی تو یقیناً وہاں ہلچل ہوتی۔ بیشتر لوگ کھسک چکے ہوتے اور کچھ آصف کی میز کے گرد جمع ہو چکے ہوتے لیکن وہاں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ سب کچھ اسی طرح تھا جس طرح میں چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا' گولی سائلنسر لگے ریوالور سے چلائی گئی تھی اور آصف بھٹی کا سائلنسر لگا ریوالور میری جیب میں موجود تھا جو شاید وہ اپنی پریشانی میں مجھ سے واپس لینا بھول گیا تھا اور مجھے بھی اسے واپس کرنے کا خیال نہیں آیا تھا۔

میرے جسم میں خفیف سی سرد لہر دوڑ گئی۔ بیک وقت کئی اندیشے میرے ذہن میں آئے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے محسوس ہوا کہ ابھی میرے عقب سے آواز آئے گی۔ "ہینڈز اپ۔" میں مُڑ کر دیکھوں گا تو کوئی پولیس پارٹی میرا راستہ روکے کھڑی ہو گی۔ سب سے آگے جو پولیس آفیسر ہو گا اس کے ہاتھ میں ریوالور یا کوئی دوسری گن ہو گی جس کا رخ میری طرف ہو گا۔ پھر میری جیب سے سائلنسر لگا ریوالور بھی برآمد کر لیا جائے گا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس میں پہلے ہی سے ایک آدھ گولی کم ہوتی۔ گویا قاتل رنگے ہاتھوں گرفتار کر لیا جاتا۔

دوسرا امکان یہ بھی موجود تھا کہ کسی بھی لمحے عقب سے گولی میرے جسم میں بھی پیوست ہو سکتی تھی۔ اس احساس سے میرے اعصاب تن گئے۔ ایک لمحے کے لیے تو میرے ہاتھ غیر ارادی طور پر خالی کرسی کے پشتے پر سختی سے جم گئے۔ میرے لیے مُڑ کر دیکھنا دشوار ہو گیا۔ بڑی مشکل سے میں آہستگی سے گھوما۔

کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔ کم از کم بظاہر تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔ میزوں پر جتنے بھی لوگ موجود تھے ان میں سے ہر ایک اپنی بات میں' اپنی ذات میں یا اپنی کھانے میں مگن تھا۔ مدھم روشنی میں سب اپنے اپنے شغل میں لگے ہوئے تھے۔ شاید وہ شخص اب وہاں موجود نہیں تھا جو آصف کے لیے اجل کا پیامبر بنا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے اُلجھن میں پڑ گیا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ آصف کو یوں چھوڑ کر جانا مجھے اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا لیکن جلد ہی میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ اگر مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع میسر تھا تو نکل ہی لینا چاہیے تھا۔ میں خاموشی سے واپس روانہ ہو گیا۔ میزوں کے درمیان سے گزرتے وقت ہر لمحے مجھے یہی اندیشہ محسوس ہوتا رہا کہ کوئی ویٹر عقب سے چیخے گا۔ "ارے..... اس آدمی کو پکڑو..... یہ اپنے ساتھی کو گولی مار کر بھاگ رہا ہے۔" لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ ایسا نہیں ہوا۔

نیچے پہنچ کر میں نے ایک ٹیکسی ڈرائیور کو منہ مانگے کرائے پر ہامی بھر کر بندرگاہ چلنے کے لیے کہا۔ بندرگاہ پہنچ کر اب مجھے خود ہی معلوم کرنا تھا کہ پیراماؤنٹ کس برتھ پر کھڑا تھا۔ تمام راستے میں مُڑ مُڑ کر دیکھتا رہا۔ مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی کہ میرا تعاقب نہیں کیا جا رہا تھا۔ آصف کی صورت بار بار میری نظروں میں پھرتی رہی۔ چند لمحے پہلے وہ زندہ سلامت مجھ سے بات کر رہا تھا۔ مجھے "پروانۂ راہداری" تیار کر کے دے رہا تھا اور بھائی کے قتل کا انتقام لینے کا عزم ظاہر کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد اس کا جسم روح سے خالی تھا۔ زندگی اور موت کے درمیان حائل لکیر کچھ زیادہ ہی باریک تھی۔

بندرگاہ پہنچ کر مجھے پیراماؤنٹ کو تلاش کرنے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آئی۔ کسی جہاز کے سیلر نے میری رہنمائی کر دی۔ پیراماؤنٹ دو نمبر برتھ پر کھڑا تھا۔ مجھے زیادہ چلنا نہیں پڑا۔ برتھ

سے ایک چوبی پُل جہاز تک پہنچا ہوا تھا۔ اس پُل کے اختتام پر تقریباً پچپن کی عمر کا ایک بھاری بھرکم شخص کھڑا تھا۔

وہ سفید فام تھا لیکن سمندری ہواؤں' تیز دھوپ اور موسمی تغیر و تبدل نے یقیناً اس کے چہرے کی سفیدی کو بہت متاثر کیا تھا۔ اب اسے سفید فاموں میں شمار کرنا ذرا مشکل ہی محسوس ہوتا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچا تو میرے کچھ بولنے سے پہلے اس نے خود ہی پوچھ لیا۔ "کس سے ملنا ہے؟"

"جہاز کے کیپٹن سے۔" میں نے جواب دیا اور اسی لمحے مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ وہ یقیناً کیپٹن ہی تھا۔ اس کے جسم پر کیپٹن کی وردی تھی اور سینے پر کیپٹن کا بیج بھی آویزاں تھا۔ اسے یقیناً صدمہ ہوا تھا کہ میں نے اسے کیپٹن کی حیثیت سے نہیں پہچانا تھا۔ اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے غم ناک سا ہو گیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ دونوں طرف کے جنگلوں پر رکھے کھڑا تھا گویا اسے پہلے ہی کسی کی آمد کی توقع رہی ہو اور وہ اس کا راستہ روکنے کے لیے کھڑا ہو۔

"میں ہی کیپٹن ہوں۔" اس نے گویا میری بینائی پر شک کرتے ہوئے کہا۔ وہ جھٹکے دار لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔ لگتا یہی تھا کہ انگریزی اس کی مادری زبان نہیں تھی۔ "میرا نام گوئز ہے۔"

میں نے معذرت خواہانہ سے انداز میں اس سے مصافحہ کیا اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ اس کا تعلق کس ملک سے تھا۔ مجھے آم کھانے سے مطلب تھا' پیڑ گننے سے نہیں۔ اس نے نیم خوابیدہ سی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے نیم بیزاری سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ کیا تھا گویا لکڑی کا ایک موٹا سا بے جان ٹکڑا تھا۔

میں نے جلدی سے جیب سے پرچی نکال کر اس کی خدمت میں پیش کی۔ اس نے پہلے پرچی کو اور پھر مجھے بغور دیکھا۔ اسے گویا یقین نہیں آ رہا تھا کہ عین آخری لمحوں میں بھی اس کے جہاز پر سفر کرنے کا کوئی خواہش مند پہنچ سکتا تھا۔

"ہمارا یہ مال بردار جہاز کافی چھوٹا ہے۔ زیادہ تر ہم ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک سامان پہنچاتے ہیں۔ ہمارے پاس مسافروں کو لے جانے کے لیے زیادہ جگہ نہیں ہے۔" اس نے واضح کیا۔

میں جہاز کا جائزہ تو چوبی پُل پر چڑھنے سے پہلے ہی لے چکا تھا۔ وہ مین لوڈنگ ایریا سے کافی ہٹ کر کھڑا تھا۔ تقریباً دو سو فٹ لمبے اس زنگ خوردہ سے جہاز کی حالت بتا رہی تھی کہ اس پر کچھ زیادہ توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ کیپٹن گوئز کے چہرے سے کچھ یوں لگتا تھا جیسے اسے دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔

"مجھے تو بتایا گیا تھا کہ آپ کو مجھے لے جانے میں کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"میں اعتراض نہیں کر رہا۔" وہ بے دلی سے بولا۔ "میں تو یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اس جہاز پر تم کچھ زیادہ آرام دہ سفر کی توقع مت رکھنا۔ یہ کوئی پُرتعیش اور مسافر بردار جہاز نہیں

ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ میں یہاں عیش و آرام کی تلاش میں نہیں آیا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "عیش و آرام تو زندگی میں بہت دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ میرے لیے ذرا بے آرامی اٹھانے کے دن ہیں۔ مجھے بہرحال استنبول جانا ہے۔"

"ہوائی جہاز سے تم چند گھنٹوں میں وہاں پہنچ سکتے ہو۔ اس جہاز پر تم نہ جانے کب تک خوار ہوتے رہو۔ ہمیں استنبول پہنچنے میں کئی دن لگ جائیں گے۔" وہ پوری طرح میری ہمت شکنی پر تُلا ہوا تھا یا پھر شاید میرا حوصلہ آزما رہا تھا۔

"میں ذرا سمندر کی سیر کرنا چاہتا ہوں اور مجھے استنبول پہنچنے کی کچھ ایسی جلدی بھی نہیں ہے۔ تم صرف یہ بتاؤ کہ ایک طرف کا کرایہ کتنا ہو گا؟"

اس نے جو کرایہ بتایا وہ کم از کم اس وقت میرے ہوش اُڑا دینے کے لیے کافی تھا۔ سیٹھ رمضان نے تو کہا تھا کہ وہ لوگ کم کرائے پر مسافر لے جاتے ہیں لیکن وہ کرایہ ہوائی ٹکٹ سے بھی کم از کم چار گُنا زیادہ تھا لیکن ایک لحاظ سے شاید سیٹھ رمضان نے ٹھیک کہا تھا۔ اگر میں قتل و غارت گری برپا کرانے' اسمگلنگ کے دھندوں میں ملوث رہنے یا کچھ اور خطرناک قسم کی سرگرمیوں میں مصروف رہنے کے بعد قانون کے شکنجے سے بچنے کے لیے ملک سے بھاگ رہا ہوتا تو شاید یہ کرایہ مجھے زیادہ محسوس نہ ہوتا۔ عام حالات میں بھی شاید یہ مجھے گراں نہ گزرتا بشرطیکہ میرا اپنا پیسہ میرے استعمال میں ہوتا۔ میرے پاس تو فی الحال زرتاج کی دی ہوئی رقم چل رہی تھی۔ سیٹھ رمضان نے مجھ سے پوچھا تھا کہ رقم کی ضرورت تو نہیں۔ میں نے کچھ زیادہ ہی خود اعتمادی اور زعم میں انکار کر دیا تھا۔ اب میں سوچ رہا تھا کہ میں نے خواہ مخواہ ہی انکار کیا۔ اگر اس حساب سے اخراجات ہونے تھے تو مجھے رقم لے ہی لینی چاہیے تھی۔

بہرحال ابھی کچھ ایسی تشویش کی بات بھی نہیں تھی۔ کیپٹن گوئز کو تو میں آسانی سے ادائیگی کر سکتا تھا۔ بلکہ اگر راستے میں میری زیادہ کھال نہ کھینچی جاتی تو میں واپسی کا کرایہ بھی دے سکتا تھا۔ میں نے چہرے سے تکلیف کا اظہار نہیں ہونے دیا اور نہ ہی سودے بازی کی کوشش کی بلکہ رقم گن کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

اس کے چہرے کی مُردنی میں کچھ کمی آ گئی۔ رقم اپنی بڑی سی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے مجھے اپنے جہاز کے بارے میں مزید معلومات مُہیا کرتے ہوئے کہا۔ "ہمارا جہاز پاناما میں رجسٹرڈ ہے اور ہمارا کریو صرف نو افراد پر مشتمل ہے۔ ہمارے پاس چار فاضل کیبن ہیں جن میں سے دو اس وقت بھرے ہوئے ہیں' دو خالی ہیں۔ کھانا وہی ملے گا جو کریو کے لیے پکتا ہے اور زیادہ تر تمہیں کریو کے ساتھ ہی کھانا پڑے گا اور اخراجات کی ادائیگی روز کے روز کرنی ہو گی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تم کیش ساتھ لائے ہو۔ میں کریڈٹ کارڈ یا ٹریولرز چیک وغیرہ قبول نہیں کرتا۔ تم آئے بھی اچھے وقت پر ہو۔ جہاز روانہ ہی ہونے والا ہے۔"

عین اسی وقت میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بالائی عرشے کے بنگلے سے ایک لڑکی جھانک رہی تھی۔ وہ ایک خوبصورت سفید فام لڑکی تھی۔ اس کے سنہرے تراشیدہ بال ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اس کے چہرے کے گرد ہلکورے لے رہے تھے۔ وہ بغور میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بلندی زیادہ نہیں تھی۔ میں اس کی آنکھوں کا رنگ تک دیکھ سکتا تھا۔ نیلی شفاف آنکھیں تھیں اور ان آنکھوں میں شک کی پرچھائیاں تھیں۔ ایک لمحے کے لیے تو میرا دل گویا دھڑکنا بھول گیا تھا کیونکہ مجھے گمان گزرا تھا' شاید وہ وہی آسیبی سی آنکھوں والی لڑکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے میری غلط فہمی دور ہو گئی۔ یہ وہ لڑکی نہیں تھی اور اس کی شخصیت کا تاثر آسیبی سا ہرگز نہیں تھا۔

"خوش آمدید سر! رات بڑی خوشگوار ہے...... آسمان پر چاند بھی نکلا ہوا ہے....." دفعتاً کسی نے قریب ہی سے ذرا شکستہ سی انگریزی میں لیکن کچھ چبھتے ہوئے سے لہجے میں کہا۔

میں نے اوپر سے نظر ہٹا کر دیکھا۔ اسی دوران پکی رنگت کا ایک جوان العمر شخص ہمارے قریب آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ ذرا میلی سی سفید یونیفارم میں تھا۔ پیروں میں سفید کینوس کے جوتے تھے۔ شاید وہ کچھ دبے قدموں آیا تھا جو مجھے اس کی آہٹ سنائی نہیں دی تھی۔ ویسے بھی وہ ہلکے جسم کا تھا۔

اس نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ دُبلا پتلا ہونے کے باوجود اس کے ہاتھ میں مضبوطی تھی۔ لہجے اور نقوش سے' وہ یونانی نسل کا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے دوبارہ آسمان کی طرف دیکھا۔ ابتدائی تاریخوں کا دھندلا سا چاند کسی قدیم جھومر کی طرح آسمان کی تاریک پیشانی پر آویزاں تھا مگر شاید اس سیاہ فام نوجوان کا اشارہ اس کی طرف نہیں' چاندنی چہرے کی طرف تھا۔

اسے نہ جانے کس طرح معلوم ہو چکا تھا کہ میں جہاز پر سوار ہونے کے لیے آیا تھا جو وہ مجھے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ وہ شاید منتظر تھا کہ میں اس سے اپنا تعارف کراؤں گا لیکن میں نے اس کی زحمت نہیں کی۔ میرا ذہن اس لڑکی میں اُلجھا ہوا تھا جو اوپر بنگلے سے جھانک رہی تھی۔ یقیناً وہی کیتھرین تھی۔ کیا میں جہاز پر قدم رکھتے ہی اس کی نظر میں مشکوک ہو گیا تھا؟ وہ کچھ عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھے اس سے راہ و رسم بڑھانے میں دقت پیش آئے گی۔ حالانکہ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کام میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی کیونکہ وہ ایک مغربی لڑکی تھی۔

میں نے بھی صرف اس کی ایک جھلک ہی دیکھی تھی لیکن مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ڈرگ مافیا کی کیریئر بھی ہو سکتی تھی۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک معزز گھرانے کی وضعدار لڑکی تھی۔ خود کو لیے دیے رکھتی تھی لیکن پھر میں نے سوچا' اس میں حیرت کی

کوئی بات نہیں تھی۔ بیشتر کالے دھندے کرنے والوں کی صورت سے اندازہ لگانا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے کہ ان کے کرتوت کیا ہیں بلکہ بعض تو ایسی پارساؤں والی شخصیت بنا لیتے ہیں کہ ان کی طرف انگلی اٹھانے سے پہلے کسی کو سو مرتبہ سوچنا پڑتا ہے۔

میں نے دوبارہ اوپر دیکھا تو کیتھرین غائب ہو چکی تھی۔ پکی رنگت والا نوجوان بولا۔ ”آیئے میں آپ کو آپ کے کیبن تک چھوڑ آؤں۔“

میں خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔ میں ایک تہی دست مسافر تھا۔ میرے پاس کوئی رختِ سفر نہیں تھا۔ وہ مجھے جس کیبن میں لے گیا وہ بظاہر عملے ہی کے کسی فرد کا کیبن معلوم ہوتا تھا۔ اس میں دیوار گیر بستر کے نیچے کچھ اوزار بھی پڑے تھے۔

”کسی چیز کی ضرورت ہو تو آپ کو خود باہر آنے کی تکلیف کرنا ہوگی۔“ پکی رنگت کے نوجوان نے ”گزارے لائق“ انگریزی میں کہا اور رخصت ہو گیا۔ شاید اسے میری خاموشی اچھی نہیں لگی تھی۔

دروازہ بند ہوتے ہی میں دیوار گیر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ میں اس وقت بری طرح تھکا ہوا تھا۔ ہر بات کو بھول جانا چاہتا تھا۔ بستر پر گرنے کے شاید چند سیکنڈ بعد ہی میں سو گیا۔ عام حالات میں شاید وہ بے ہودہ سا دیوار گیر بستر مجھے اپنی جسامت کے حساب سے بہت چھوٹا اور ناکافی محسوس ہوتا لیکن اس وقت مجھے اس پر گر کر کچھ ہوش نہ رہا۔

جہاز کی تیز وسل سے میری آنکھ کھلی۔ کیبن گو کہ چاروں طرف سے بند تھا جس طرح عموماً جہازوں کے کیبن ہوتے ہیں لیکن آواز گویا اس میں بلا رکاوٹ آرہی تھی۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ میں بہ مشکل تین گھنٹے سویا تھا لیکن خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ اتنی نیند بھی میرے لیے کافی ثابت ہوئی تھی۔

میں کیبن سے نکل آیا اور ریلنگ پر جا کھڑا ہوا۔ برتھ سے جہاز کی بندشیں کھولی جا چکی تھیں اور جہاز اپنے وقت سے قدرے تاخیر کے ساتھ روانہ ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ جہاز بندرگاہ سے دور ہونے لگا۔ اس وقت کیتھرین یا کوئی اور مسافر کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ بالآخر جہاز بحیرۂ عرب کے کھلے پانیوں میں نکل آیا تو میں بالائی عرشے پر چلا گیا۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ کیپٹن گوئز اس وقت بھی وھیل روم کے بجائے آرام سے عرشے پر بیٹھا ہوا تھا۔ عملے کا ایک اور فرد بھی اس کے ساتھ تھا۔ گوئز جس سگار کے کش لے رہا تھا اس کی بو کھلی فضا میں بھی نہایت تیز اور ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔

”آیئے مسٹر افضل خان!“ کیپٹن گوئز کے لہجے میں اب معمولی سی گرم جوشی تھی۔ اس نے مجھے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ کرسیوں کے پائے اسکریوز کے ذریعے عرشے کے فرش سے جُڑے ہوئے تھے۔

میں بیٹھ چکا تو کیپٹن گوئز عملے کے آدمی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ میرا فرسٹ میٹ جنتر ہے۔“

میں مسکرا دیا۔ جنتر ایک عجیب نام تھا۔ ایک پاکستانی کے ذہن میں اس کے ساتھ لفظ ”منتر“ آنا لازمی تھا لیکن ان بے چاروں کو شاید معلوم نہیں تھا کہ ہمارے ہاں یہ بھی کوئی اصطلاح تھی۔ جنتر بھی دُبلا پتلا ہی تھا۔ وہ سفید فام تھا لیکن عرشے پر کم روشنی میں بھی اس کی رنگت کی زردی نمایاں تھی۔ رنگت کی یہ زردی بیماروں والی تھی۔ تاہم اس سے مصافحہ کرتے وقت اندازہ ہوا کہ ہاتھ اس کے بھی مضبوط تھے۔

”ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں مسٹر کان!“ جنتر نے رسمی سے لہجے میں کہا۔ انگریزی میں بات کرتے وقت اس نے مجھے ’خان‘ سے ’کان‘ بنا دیا تھا۔ لہجے سے وہ جرمن معلوم ہوتا تھا۔ وہ مزید رسمیات نبھاتے ہوئے بولا۔ ”آج کی رات بڑی خوش گوار ہے۔ آسمان پر تارے چمک رہے ہیں۔“

بحری جہاز والے شاید آسمان کی طرف کچھ زیادہ ہی دیکھتے تھے اور انہیں آسمان پر چاند ستاروں کا بہت خیال رہتا تھا۔ کیپٹن گوئز نے سگار کا گہرا کش لیا تو اس کے سگار کا سرا دہک اٹھا۔ میں نے باری باری ان دونوں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”مجھے تو کافی دنوں سے زمین نے ہی کچھ ایسا اُلجھایا ہوا ہے کہ آسمان کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہیں ملی۔“

پھر میں نے گویا اس کا دل رکھنے کو کھلے آسمان کی طرف دیکھا۔ تاروں بھرا آسمان واقعی بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ نیچے سمندر پُرسکون تھا۔ جہاز پانی کو چیرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا اس لیے آس پاس تھوڑی دور تک تو تلاطم سا محسوس ہو رہا تھا لیکن اس سے آگے سکوت ہی تھا۔ کہیں کہیں پانی سیال چاندی کی طرح چمک اٹھتا تھا۔

”سمندر پُرسکون ہو تو کتنا خوبصورت لگتا ہے اور بپھرا ہو تو کتنا خوفناک۔“ میں نے ایک گہری سانس لے کر مرطوب ہوا کو رگ و پے میں سموتے ہوئے کہا۔

”اگر آپ غور کریں تو آپ کو قدرت کی بنائی ہوئی ہر چیز کا یہی حساب نظر آئے گا مسٹر افضل خان!“ عجیب بات تھی کہ وہ میرے نام کا صحیح تلفظ ادا کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ ”شکر ہے اس خطے میں زیادہ بارشیں نہیں ہوتیں۔ ہمارے سفر کسی نہ کسی حد تک شیڈول کے مطابق ہو جاتے ہیں۔“

جنتر اٹھتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں بولا۔ ”میں ذرا وھیل ہاؤس میں جا رہا ہوں۔“

وہ جا چکا تو میں نے کہا۔ ”لگتا ہے تمہارے جہاز کے عملے میں ہر ملک کا آدمی شامل ہے۔“

”جہازوں پر عموماً ایسا ہی ہوتا ہے۔“ کیپٹن گوئز سگار کی راکھ جھاڑتے ہوئے بولا۔ ”جہاز بین الاقوامی بھائی چارے کا چلتا پھرتا

نمونہ ہوتے ہیں۔ عجیب بات ہے کہ لوگ غیروں کے جہازوں پہ...... غیروں کے ساحلوں پہ...... غیروں کے ملکوں میں تو مل جُل کر رہ لیتے ہیں لیکن اپنے ملک میں، اپنے بھائیوں اور اپنے ہم وطنوں سے جانوروں کی طرح لڑتے رہتے ہیں۔“

میں خاموش رہا۔ میرے لیے خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ شاید اس نے یہ جوتا میرے ہی منہ پر مارا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا۔

”ویسے اس جہاز پر صرف میں اور جنتر ہی یورپین ہیں، باقی سات افغانی اور بنگلہ دیشی ہیں۔ افغانستان کا تو تمہیں علم ہی ہوگا کہ کوئی ساحل اسے نہیں لگتا اس لیے اس کی زیادہ تر تجارت تمہارے ہی ملک کے راستے ہوتی ہے۔ وہاں کے لوگوں کو سمندر میں بڑی کشش محسوس ہوتی ہے، کھنچے چلے آتے ہیں اور آج کل تو ویسے ہی وہاں کے حالات بڑے خراب ہیں۔ پہلے وہ روسیوں کے خلاف جہاد کر رہے تھے، آج کل ایک دوسرے کے خلاف ”جہاد“ میں مصروف ہیں۔ بنگلہ دیش کی حالت بھی پتلی ہے۔ پہلے ان لوگوں کو شکوہ تھا کہ تم لوگ ان کا استحصال کر رہے ہو۔ اب پتا نہیں کون ان کا استحصال کر رہا ہے۔ اب وہاں پہلے سے زیادہ غربت، پہلے سے زیادہ بے روزگاری، پہلے سے زیادہ مہنگائی ہے۔ ہمیں کبھی وہاں لنگر انداز ہونا پڑتا ہے تو بڑے تکلیف دہ مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ بہت سے ہُنرمند نوجوان آتے ہیں جو صرف روٹی اور کپڑے کے عوض جہاز پر کام کرنے اور ہمارے ساتھ چلنے کے لیے منتیں کرتے ہیں۔“ اب میں اسے کیا بتاتا کہ اب وہی لوگ اور ان کی اولادیں یہاں خانساماں گیری اور معمولی گھریلو نوکریاں کرنے چلی آرہی تھیں جنہیں کل سونار بنگلہ کا خواب دکھایا گیا تھا اور جو مغربی پاکستان والوں کی لاشیں گرا رہے تھے۔

میں خاموش ہی رہا۔ وہ کمبخت خطّے کے حالات کے بارے میں کافی کچھ جانتا تھا۔ میں اس قسم کے تکلیف دہ موضوعات پر بات چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ بات بہت دور نکل جاتی ہے۔ زخم تازہ ہوتے ہیں۔ میں نے بات بدلنے کی ایک دھیمی سی کوشش کی۔ ”موسم خوشگوار ہو تو تمہیں بحری سفر ایک دلچسپ تفریح محسوس ہوتا ہوگا؟“

”زندگی سمندری سفر میں گزر گئی......“ وہ کندھے اُچکا کر بولا۔ ”اب اس میں کم از کم میرے لیے تفریح والی کوئی بات نہیں رہی۔ بعض اوقات خوشگوار موسموں میں بھی بڑے مسائل کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پچھلے دنوں سمندر پُرسکون تھے مگر خلیج میں جنگ جاری تھی۔ ہمیں خلیج میں کئی جگہ امریکیوں نے روکا اور ہمارے جہاز پر لد کر اِدھر سے اُدھر جاتے رہے۔ جنگی سامان بھی ڈھوتے رہے۔ شکر ہے جنگ جلد ختم ہو گئی۔ اس سفر سے واپسی پر مجھے نیا فرسٹ میٹ بھی بھرتی کرنا ہے کیونکہ جنتر نے مجھے دیانت داری سے بتا دیا ہے کہ وہ بیمار ہے۔“

”اوہ...... کیا ہوا اسے؟“ میں نے رسماً پوچھا۔

کیپٹن گوئز ایک لمحے خاموش رہا پھر بولا۔ ”وہ ایڈز کی ابتدائی اسٹیج پر ہے۔ اگر مجھے یہ بات پہلے معلوم ہوتی تو میں اس سفر پر بھی اسے ساتھ لے کر نہ آتا۔“

”یہ تو بڑی موذی بیماری ہے۔“ میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔

”اس میں کیا شک ہے۔ خدا جنتر پر رحم کرے۔ اسے تو کوئی معیوب عادت بھی نہیں تھی۔ نہ جانے اسے کہاں سے اور کیسے لگ گئی یہ بیماری۔ بعض اوقات ڈاکٹروں کی تھیوریاں بھی غلط ثابت ہو جاتی ہیں۔“ کیپٹن متاسفانہ لہجے میں بولا۔

”بعض اوقات نہیں...... بلکہ اکثر اوقات غلط ہی ثابت ہوتی ہیں لیکن ہم اس وقت تک آنکھیں بند کر کے ان پر یقین کیے رکھتے ہیں جب تک وہ خود ان کی تردید نہیں کر دیتے یا ان میں تصحیح نہیں کر لیتے۔ ہمارے لیے یقین کرنے کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”شاید تم صحیح کہہ رہے ہو۔“ وہ مسکرایا۔ مجھے خوشی تھی کہ اس نے جس رُکھائی سے میرا استقبال کیا تھا، اب اس کا رویّہ اس کی نسبت بہت بہتر نظر آرہا تھا۔ وہ خاصی بے تکلفی سے گفتگو کر رہا تھا۔

میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے کہا۔ ”مجھے باقی دو مسافروں کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ ابھی تک میں نے انہیں دیکھا نہیں۔“

”کیا بتاؤں...... میں خود ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ ”ویسے بھی ہمارے جہاز پر سفر کرنے والے اس بات کو زیادہ پسند نہیں کرتے کہ ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کی جائے۔ بہرحال مجھے اتنا معلوم ہے کہ ان میں سے ایک نوجوان انگریز لڑکی ہے۔ دوسرا مسافر فرانسیسی مرد ہے۔ شاید صبح ناشتے پر تمہاری ان سے ملاقات ہو۔“

اس نے سگار کا ٹوٹا سمندر میں پھینک دیا اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ”اس جہاز پر مسافروں کو لے کر جانا ہے تو جھنجھٹ ہی...... خواہ ان کے پاس پورے سفری کاغذات بھی موجود ہوں...... لیکن کیا کریں...... ساری دنیا میں، ہر طبقے میں موقعے سے فائدہ اٹھانے اور فاضل دولت کمانے کی دوڑ لگی ہے۔ میں اور میرا عملہ بھی اسی لیے سارے خطرات مول لیتے ہیں۔ میری تو ویسے بھی ریٹائرمنٹ قریب ہے۔ میں چاہتا ہوں، زندگی سمندروں میں دھکے کھاتے گزر گئی، کم از کم بڑھاپا تو کسی اچھی سی جگہ پر عیش سے گزر جائے اور اولادیں بھی یہ نہ کہیں کہ بُڈھا مرنے سے پہلے کافی کچھ چھوڑ گیا۔ گو کہ اولاد سے شکرگزاری کی کوئی امید تو نہیں ہے۔ خصوصاً ہم یورپین لوگوں کے ہاں۔“

”اب تو مشرق میں بھی یہی حال ہے۔“ میں نے کہا۔

”بہرحال جنتر مسافروں کے آرام اور ضروریات کا خیال رکھتا ہے۔“ کیپٹن گوئز نے گویا مجھے مطلع کیا۔ ”ہم کوشش تو کرتے ہیں

کہ انہیں مسافر جہاز جیسا آرام مہیّا کرسکیں لیکن اگر کوئی زحمت ہو تو اس کے لیے پیشگی معذرت۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اب میں بھی وھیل ہاؤس میں جاتا ہوں۔"

میں بھی اپنے کیبن میں جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ کیبن میں پہنچ کر کچھ دیر کی کوشش کے بعد میں سونے میں کامیاب ہو ہی گیا لیکن صبح بہت جلد میری آنکھ کھل گئی۔ سمندر پُرسکون ہونے کے باوجود مجھے بحری سفر کچھ اچھا محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ باہر سے کچھ خفیف سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میں نے دروازہ کھول کر جھانکا۔ وہی بنگلہ دیشی جو مجھے گزشتہ رات کیبن تک چھوڑ گیا تھا' کیبنوں کے سامنے ڈیک پر پوچا لگا رہا تھا۔ اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور سیاہی مائل ہونٹوں کے درمیان اس کے پیلے دانت چمک اٹھے۔

"تمہارا نام کیا ہے برادر؟" میں نے انگریزی میں پوچھا۔

"عبدل۔" اس نے جواب دیا۔

"عبدل! کیا ناشتا تیار ہوگیا ہے؟" میں نے پوچھا اور باہر آگیا۔

"جلدی ہو جائے گا۔ ٹھیک سات بجے ناشتا میس میں لگا دیا جائے گا۔" عبدل نے جواب دیا۔

"ہیلو مسٹر....!" دفعتاً عقب سے ایک مردانہ لیکن نہایت ملائم سی آواز سنائی دی۔ "تم پاکستانی ہو نا؟"

میں نے پلٹ کر دیکھا' جنگلا جہاں ذرا گولائی میں گھوم رہا تھا وہاں ایک سفید فام' دراز قد ادھیڑ عمر شخص کھڑا تھا۔ اس کے بالوں میں سفیدی کی جھلک تھی۔ وہ گلے میں دوربین لٹکائے ہوئے تھا۔ ہاتھ میں کوئی البم سا تھا۔

"جی ہاں' میں پاکستانی ہوں۔" میں نے اس کا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد کہا۔ "آپ کی تعریف؟"

"میں پیری کلاکر ہوں۔ فرانس کے شہر مارسلز سے میرا تعلق ہے۔" وہ آگے آکر مصافحہ کرتے ہوئے بولا۔ "کیا پیرا ماؤنٹ میں یہ تمہارا پہلا سفر ہے؟"

"ہاں۔ تم کیا اکثر اس پر سفر کرتے رہتے ہو؟" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ "اس سے پہلے میں نے صرف دو مرتبہ سفر کیا ہے۔"

معلوم نہیں اسے دو مرتبہ بھی مسافر جہازوں کو چھوڑ کر اس جہاز سے سفر کرنے کی کیا ضرورت پیش آئی تھی؟ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں وہ بھی ڈرگ مافیا کا آدمی تو نہیں تھا؟

"یہ تم دوربین سے کیا دیکھ رہے ہو؟" میں نے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"ساحلی اور سمندری پرندے۔" اس نے جواب دیا اور ہاتھ میں پکڑی ہوئی بڑی سی البم نما کتاب بلند کرکے مجھے دکھانے لگا۔ وہ پرندوں کے بارے میں کوئی فرانسیسی کتاب معلوم ہوتی تھی۔ پیری کلاکر بات انگریزی ہی میں کر رہا تھا اور حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کی انگریزی میں فرانسیسی کی کوئی جھلک نہیں تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "اس سفر کے دوران جہاز ساحلوں سے زیادہ دور نہیں جاتا۔ خصوصاً بحیرۂ احمر سے گزرتے وقت...... چنانچہ ساحلی پرندوں کے مشاہدے کے لیے یہ بہترین موقع ہوتا ہے۔"

اس نے دوربین مجھے تھما دی۔ میں اسے آنکھوں سے لگا کر فوکس کرکے دیکھنے لگا۔ وہ یقیناً ایک طاقتور دوربین تھی۔ بہت دور اُفق پر کچھ پرندے اُڑتے دکھائی دے رہے تھے۔ کلاکر مجھے ان کی قسموں اور نسلوں کے درمیان باریک باریک سا فرق سمجھانے لگا جس سے مجھے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میرے خیال میں تو پرندے بس پرندے تھے..... اور کچھ نہیں۔ انہیں قدرت کی دوسری ان گنت اور رنگارنگ خوبصورت مخلوقات کی طرح دیکھ کر لطف اندوز ہونا چاہیے تھا۔ ان کے بارے میں باریکیوں پر غور کرنا سائنس دانوں کا کام تھا۔

میں کلاکر کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکالتے ہوئے دوربین کو آہستگی سے ادھر اُدھر گھما رہا تھا کہ اچانک غیر ارادی طور پر دوربین کا رخ کافی نیچے کی طرف ہوگیا۔ یوں تو سمندر میں دور دور تین چار چھوٹے بڑے جہاز رواں تھے جو دوربین کے بغیر بھی دکھائی دے رہے تھے لیکن اس طرح وہ محض بڑے بڑے کھلونے ہی دکھائی دے رہے تھے۔

اب دوربین کے ذریعے ان میں سے ایک اچانک ہی میری نظر میں آیا تو کچھ یوں لگا جیسے میں اچانک چھلانگ لگا کر اس کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ جہاز نہیں' ایک بڑا سا خوبصورت اسٹیمر تھا۔ اس میں اصل ڈیک کے علاوہ ایک چھوٹا سا بیضوی ڈیک بنا ہوا تھا جس کے گرد جنگلا تھا۔ یہ ڈیک سب سے اونچا تھا اور اس پر گھٹنوں تک اونچی چست نیلی جینز اور نارنجی بلاؤز میں ایک لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے سنہرے بال تیز ہوا میں لہرا رہے تھے۔ وہ گلے میں نیلا اسکارف باندھے ہوئے تھی۔ ابھرتے سورج کی کندنی کرنوں میں اس کا وجود کسی پہاڑ کی چوٹی پر استادہ حسین مجسمے کی طرح چمک رہا تھا۔

وہ بھی آنکھوں سے دوربین لگائے ایک اور جہاز کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اچانک ہی اس نے آنکھوں سے دوربین ہٹائی۔ گو کہ وہ دوسرے جہاز کی طرف دیکھ رہی تھی لیکن زاویہ کچھ ایسا تھا کہ میں اس کی آنکھیں دیکھ سکتا تھا۔ دوربین میرے ہاتھ سے چھوٹتے چھوٹتے بچی اور میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ وہی بے رنگ اور آسیبی سی آنکھوں والی لڑکی تھی۔

میرا خیال تھا کہ مجھے اپنے اعصاب پر بڑا قابو رہتا تھا لیکن اس لمحے مجھے اپنے اعصاب مُرتعش محسوس ہوئے۔ بعض اوقات کسی بہت بڑے بدمعاش اور پھنّے خاں قسم کی شخصیت کا وہ تاثر

نہیں ہوتا تھا جو کسی نرم و نازک قسم کی شخصیت کا ہوتا ہے۔ خوف سے زیادہ میرے اعصاب درحقیقت حیرت کے حملے سے مُرتعش ہوئے تھے۔

آخر یہ لڑکی تھی کیا بلا؟ کیا وہ واقعی کوئی آسیبی قسم کی چیز تھی؟ میں جہاں بھی جاتا تھا' آخر وہ کس طرح آس پاس ہی کہیں نہ کہیں دکھائی دے جاتی تھی؟ کیا وہ میری بُو سونگھتی ہوئی میرے تعاقب میں چلی آرہی تھی؟ کیا اس کا واقعی ریڈ ڈاٹ سے کوئی تعلق تھا یا یہ کوئی اور چکر تھا؟ بیچ میں اس نے یقیناً بہت دیر کے لیے میرا سراغ کھو دیا تھا۔ اب وہ دوبارہ میرے پاس کس طرح پہنچ گئی تھی؟ کیا اس نے مجھے تلاش کرلیا تھا؟

اس کے انداز سے لگتا تو یہی تھا کہ ابھی اس نے مجھے نہیں دیکھا تھا لیکن کیا اب میں پورے سفر کے دوران اس کی نظروں سے محفوظ رہ سکتا تھا؟ اگر اس نے مجھے دیکھ لیا تو اس کے بعد کیا ہوگا؟ یہ اور اسی قسم کے دوسرے بیسیوں سوالات میرے ذہن میں ابھرے اور یک لخت ہی انہوں نے میرے ذہن میں اتنا ہیجان برپا کیا کہ میرا جی چاہا' سمندر میں چھلانگ لگا دوں اور تیرتا ہوا اس تک جا پہنچوں۔ اسے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالوں اور اپنے تمام سوالات کے جوابات اُگلوانے کی کوشش کروں۔

تاہم میرا ردِعمل میری خواہشات کے بالکل مختلف تھا۔ زندگی میں اکثر ہوتا یہی ہے۔ انسان کا دل کچھ اور چاہ رہا ہوتا ہے مگر وہ کر کچھ اور رہا ہوتا ہے۔ میں بھی سمندر میں چھلانگ لگانے کے بجائے موٹے سے گول پائپ کی آڑ میں ہوگیا۔ دوربین میں نے بہ دستور آنکھوں سے لگائے رکھی۔ لڑکی بھی دوربین دوبارہ آنکھوں سے لگا چکی تھی لیکن اب اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ اب کسی اور ہی سمت میں دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ میرے کیبن سے نکلنے سے پہلے ہمارے جہاز کا جائزہ لے چکی تھی۔ اس اسٹیمر پر اس کے سوا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پیری کلاکر کا لیکچر جاری تھا۔ "یہ پرندے جو تم دیکھ رہے ہو' یہ گل نہیں بلکہ "ٹرن" کہلاتے ہیں۔ گل ان ایشیائی علاقوں میں بہت کم پائے جاتے ہیں...."

میں اس کی باتیں ایک کان سے سن کر دوسرے سے نکال رہا تھا۔ اس احمق کو نہیں معلوم تھا کہ میں اس وقت کون سا پرندہ دیکھ رہا تھا۔ اس نے یہ بھی نہیں دیکھا تھا کہ اس وقت دوربین کا رخ اس طرف تھا ہی نہیں جہاں اُفق پر پرندے دوربین کے بغیر محض نقطوں کی طرح متحرک نظر آرہے تھے۔

دفعتاً لڑکی نے دوربین آنکھوں سے ہٹا کر کندھے پر لٹکالی اور لوہے کی بل کھاتی ہوئی تنگ سی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔ اس کے اترنے کا نظارہ خاصا دلفریب تھا۔ اگر میں اس کے بارے میں اس بُری طرح اُلجھن کا شکار نہ ہوتا تو یقیناً اس نظارے سے خاصا لطف اندوز ہوتا۔

نیچے اتر کر وہ کہیں غائب ہوگئی۔ میں نے اس اسٹیمر کا جائزہ لیا۔ وہ سفید رنگ کا نہایت صاف ستھرا اسٹیمر تھا۔ اسٹیمر بڑی پرانی چیز ہے مگر وہ جدید دور کی چیز نظر آرہا تھا۔ اس کی جو سائڈ مجھے نظر آرہی تھی اس پر دائرے میں صرف "ایس ٹی 117" لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے "ایس ٹی" سے کیا مراد تھی؟

میں کچھ دیر دوربین آنکھوں سے لگائے کھڑا رہا لیکن لڑکی دوبارہ دکھائی نہ دی۔ کلاکر کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ "لگتا ہے آپ کو بھی پرندوں سے خاصی دلچسپی ہے۔"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ مجھے پرندوں سے کیسی اور کتنی دلچسپی تھی۔ شاید وہ بے چارہ مجھے اپنا ہم ذوق سمجھنے کے باوجود کچھ بے چین ہوگیا تھا کیونکہ میں اس کی دوربین سے چپک کر ہی رہ گیا تھا۔ جونہی میں نے دوربین آنکھوں سے ہٹائی' اس نے جلدی سے اسے لینے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

دفعتاً ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا۔ کہیں کلاکر اس لڑکی کا ساتھی تو نہیں تھا؟ کہیں اس نے جان بوجھ کر تو عین اس وقت مجھے دوربین نہیں تھمائی تھی؟ کہیں وہ مجھے دکھانا تو نہیں چاہتا تھا کہ میں خواہ کچھ بھی کرلیتا' کسی طرف بھی نکل لیتا لیکن ان کی رسائی سے دور نہیں تھا؟

میں نے گہری نظر سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا لیکن وہ مجھے ایک عام سے سیاح اور آوارہ گرد کا چہرہ ہی دکھائی دیا۔ اس پر مکاری اور سازشیت کی کوئی جھلک مجھے دکھائی نہیں دی۔ میں نے بے خیالی کے سے عالم میں دوربین اسے تھما دی۔ وہ اسے چمڑے کے کیس میں ڈالتے ہوئے بولا۔ "تم ناشتا کرنے نیچے نہیں چلو گے؟"

"عبدل بتا رہا تھا کہ ناشتا سات بجے لگے گا۔"

"سات تو تقریباً بج ہی چکے ہیں۔" وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولا۔

میں اس کے ساتھ نیچے میس میں آگیا۔ وہ بھی شاید کوئی بڑا کیبن ہی تھا جسے میس کی شکل دے دی گئی تھی۔ اس کا بیشتر حصہ ایک ڈائننگ ٹیبل نے گھیر رکھا تھا جو زیادہ بڑی نہیں تھی۔ چھ چھ کرسیاں اس کے دونوں طرف اور ایک ایک کرسی اس کے سروں پر تھی۔ کیپٹن گونزا عملے کے دو آدمیوں کے ساتھ وہاں پہلے ہی سے موجود تھا۔ خانساماں افغان معلوم ہوتا تھا۔ اس نے ناشتے کے لیے کچھ مشرقی اور کچھ مغربی چیزیں میز پر سجا دیں۔ ان میں سے ایک آدھ کے بارے میں تو میں اندازہ بھی نہیں لگا سکا تھا کہ وہ کیا تھی۔ میں نے انہیں چھیڑنے یا ان کے بارے میں کچھ پوچھنے کی کوشش ہی نہیں کی اور آملیٹ سلائس' کافی وغیرہ پر مشتمل سیدھا سادا ناشتا کرنے لگا۔

میں نے ابھی ناشتا ختم نہیں کیا تھا جب میس کا دروازہ کُھلا اور کیتھرین اندر داخل ہوئی۔ میرا ذہن آسیبی آنکھوں والی لڑکی میں کچھ ایسا اُلجھا ہوا تھا کہ کیتھرین کو میں بھول ہی گیا تھا۔ یہ دیکھ کر

مجھے حیرت کا ایک خفیف سا جھٹکا لگا کہ کیتھرین ساری میں تھی۔ وہ ایک سروقد اور متناسب الاعضا لڑکی تھی۔ بے پناہ خوبصورت تھی۔ مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ اس قبیل کی سفید فام لڑکی ساری میں اس سے زیادہ قیامت ڈھا سکتی تھی جتنی وہ مغربی لباسوں میں ڈھاتی ہوگی۔

سونے پر سُہاگا...... یا پھر شاید سُہاگے پر سونا یہ تھا کہ پاکستانی لڑکیوں ہی کی طرح وہ سونے کا سیٹ بھی پہنے ہوئے تھی۔ بڑے بڑے جُھمکے اس کے کانوں میں کچھ زیادہ ہی ہلکورے لے رہے تھے۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا حالانکہ اس نے کمرے میں داخل ہونے کے بعد بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔

کیا اس نے یہ اہتمام خاص طور پر کیا تھا؟ کیا اس کے پاس اور بھی پاکستانی ملبوسات و زیورات وغیرہ موجود تھے؟ کیا اس کا کوئی خاص مقصد تھا؟ اس نے گزشتہ رات مجھے جہاز پر سوار ہوتے تو دیکھ لیا تھا اور اسے یہ اندازہ بھی یقیناً ہوگیا ہوگا کہ میں پاکستانی ہوں۔ کیا اس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے پاکستانی روپ دھارا تھا؟

اپنی یہ سوچ مجھے خوش فہمی پر مبنی محسوس ہوئی۔ اگر وہ ایک بار بھی پاکستان آچکی تھی تو اسے معلوم ہونا چاہیے تھا کہ ہمارے ہاں تو کسی کی طرف متوجہ ہونے کے لیے اس کا صرف لڑکی ہونا ہی کافی ہوتا تھا۔ صورت شکل کا سوال تو بعد میں آتا تھا...... اور اگر لڑکی نہ صرف خوبصورت بلکہ سفید فام بھی ہو تو اچھے بھلے معززین کی آنکھیں حلقوں سے باہر آجاتی تھیں۔ اس کے لیے پاکستانی لباس کے تکلف کی کیا ضرورت تھی؟ ہم پاکستانیوں کو خود اپنے لباس سے ذرا کم ہی دلچسپی تھی۔ سفید فام لڑکیاں ہمیں ان کے اپنے لباسوں میں ہی زیادہ اچھی لگتی تھیں...... بلکہ سچی بات تو یہ تھی کہ درمیان میں لباس کا عمل دخل جتنا کم ہوتا دلچسپیاں اتنی ہی زیادہ ہوسکتی تھیں۔

فرنچ شیفون کی گہری نیلی ساری میں اس کا مرمریں وجود جس طرح مقید تھا اور ہر قدم پر اس کے خدوخال میں جو لچک، جو لہراؤ پیدا ہو رہا تھا اس پر بہت سے شاعر شعر کہتے کہتے دم توڑ سکتے تھے۔

اس نے میری طرف...... بلکہ کیپٹن گونزے کے سوا کسی کی طرف بھی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا اور میرا خیال تھا کہ اسی طرح وہ میز پر آبیٹھے گی، کیپٹن کے سوا کسی سے بات نہیں کرے گی اور یونہی ناشتا کرکے رخصت ہوجائے گی لیکن ہوا یہ کہ کیپٹن گونزا اسے دیکھتے ہی احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی تین افراد بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب اگر صرف میں بیٹھا رہتا تو کچھ معیوب لگتا چنانچہ میں بھی اٹھ ہی کھڑا ہوا۔

کیپٹن گونزے ہمیں ایک دوسرے سے متعارف کرانے لگا۔ "یہ مس کیتھرین چارلس ہیں...... یہ ہمارے دوسرے مسافر مسٹر پیری کلاکر ہیں...... مارسلز، فرانس سے ان کا تعلق ہے...... اور یہ مسٹر افضل خان ہیں...... یہ کراچی سے سوار ہوئے ہیں......"

اس نے باری باری ہم دونوں سے ہاتھ ملایا اور وہی رٹا ہوا جملہ ادا کیا۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر کلاکر اور مسٹر خان! آپ لوگ تشریف رکھیے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری آمد کی وجہ سے سب کے ناشتے میں خلل پڑ جائے گا......" وہ ایک وضعدار انسان کی طرح حقیقتاً شرمندہ نظر آرہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔ اس جیسی لڑکی کے ہاتھ کا اتنا سرد ہونا کچھ اچھا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بھی ایک عجیب سی سرد مہری تھی گو کہ وہ گرم جوشی اور خوش خلقی کا اظہار کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی۔

اس کی عمر چھبیس اور تیس کے درمیان کہیں تھی۔ چہرے مُہرے اور شخصیت کے اعتبار سے وہ بے عیب حسن کی مالک تھی لیکن اس کی آنکھوں کے گرد حلقے تھے جنہیں اس نے ہلکے میک اپ میں چھپانے کی کوشش کی تھی۔ معلوم نہیں یہ حلقے تفکرات کی پیداوار تھے، شب بیداریوں کا نتیجہ تھے یا صحت کی کسی خرابی کی علامت تھے۔ حلقے یوں تو کسی کے چہرے پر بھی اچھے نہیں لگتے لیکن اس کے چہرے پر کچھ زیادہ ہی بُرے لگ رہے تھے۔ شاید اس لیے کہ اس کے چہرے یا سراپا میں، اضمحلال، تھکن یا خرابیٔ صحت کی کوئی علامت نہیں تھی۔ دل چاہا کہ کسی جادوئی عمل سے اس بے عیب چہرے کی یہ خامی فوراً دور کردوں۔

اس کی آمد سے کمرا کچھ روشن روشن سا ہوگیا۔ ادھیڑ عمر کلاکر کی بھی باچھیں کھل گئیں اور اس نے فوراً کیتھرین کا انٹرویو شروع کردیا کہ وہ کیوں سمندری سفر کر رہی تھی اور کیسا محسوس کر رہی تھی۔

"مجھے ویسے ہی سمندری سفر کا شوق ہے۔ مجھے یہ خوبصورت اور دھیما دھیما ایڈونچر محسوس ہوتا ہے......" وہ صاف اور شستہ قسم کی انگریزی میں بات کر رہی تھی ورنہ آج کل تو انگریز بھی دیگر معاملات کی طرح زبان میں بھی اپنی روایت پرستی اور وضعداری بھول چکے ہیں۔ وہ بھی امریکیوں کی طرح منہ اور لہجہ بگاڑ بگاڑ کر انگریزی بولنے لگے ہیں۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "میں کسی سے ملنے استنبول جارہی ہوں۔ ممکن ہے میں وہیں رہ جاؤں۔ ویسے میرا گھر انگلینڈ کے شہر ریڈنگ میں ہے۔ ہوائی سفر مجھے پسند نہیں ہے اور ٹرین کے ذریعے میں ایران کے راستے جانا نہیں چاہتی تھی۔ پروگرام بھی اچانک ہی بنا تھا۔ سمندری سفر میں بھی میں عام مسافر جہاز کی بھیڑ بھاڑ کا سامنا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لہٰذا مجھے صرف یہی جہاز مناسب نظر آیا......"

میں سوچ رہا تھا، شاید وہ ایران کے راستے سے اس لیے گزرنا نہ چاہتی ہو کہ ایران میں منشیات کے سلسلے میں سزائیں بہت سخت ہوچکی تھیں اور عام مسافر جہاز کی بھیڑ بھاڑ سے بچنے کا مقصد یہ

کہ اس کی شخصیت اور سرگرمیاں زیادہ لوگوں کی نظر میں نہ آنے پائیں۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ دلکش انداز میں مسکراتے ہوئے کلاکر سے مخاطب ہوئی۔ "آپ بھی تو اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔"

"میں ایک سابق مجسٹریٹ ہوں اور تعطیلات گزارنے نکلا ہوا ہوں۔" پیری کلاکر باچھیں کھلاتے ہوئے بولا۔ "ساحلی پرندے میری کمزوری ہیں۔ میں نت نئے پرندوں کے مشاہدے اور مطالعے کے لیے سفر کرتا رہتا ہوں۔ جس روٹ سے یہ جہاز سفر کرتا ہے اس سے کوئی مسافر جہاز نہیں گزرتا اور میرے مقصد کے لیے یہ روٹ سب سے زیادہ مناسب تھا۔"

"...... اور آپ مسٹر خان؟" اس نے صراحی دار گردن کو خم دیتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں کراچی میں رہا تو میرا انجام کچھ اچھا نہیں ہوگا۔" میں نے نہایت دیانت داری سے جواب دیا۔ "اس لیے میں بھاگ کھڑا ہوا۔ پہلا جہاز ہی میرے ہاتھ لگا اور میں اسی پر سوار ہوگیا۔"

ایک لمحے کے لیے کھانے کے کمرے میں سکوت چھا گیا۔ سب ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ کیپٹن گونزے کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی تاہم مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ میں نے گویا انہیں تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "لیکن آپ لوگ اطمینان رکھیے...... میں کوئی مفرور مجرم نہیں ہوں۔ میں ایک شریف اور معزز آدمی ہوں۔ میری وجہ سے آپ لوگوں کو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔"

انہیں اس تسلی اور یقین دہانی کی غالباً کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سب اپنے مسائل خود حل کرنے اور اپنی پریشانیاں خود دور کرنے کے پوری طرح اہل معلوم ہوتے تھے تاہم سب گویا میرا دل رکھنے کو مسکرا دیے۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "میرا مقصد صرف جان بچا کر بھاگنا ہی نہیں تھا بلکہ میں نے سوچا کہ اس بہانے دنیا کی سیاحت بھی کرلی جائے ورنہ چُھپنے کے لیے تو کراچی بھی کچھ چھوٹا شہر نہیں تھا۔ ہزاروں مفرور مجرم وہاں چُھپے ہوئے ہیں جنہیں کوئی تلاش نہیں کرپاتا۔ ایک میں بھی روپوش ہوسکتا تھا جبکہ میں تو مجرم بھی نہیں تھا لیکن میں نے سوچا، موقع اچھا ہے...... یوں تو زندگی کی مصروفیتیں موقع ہی نہیں دیں گی۔ اس طرح ہی کچھ سیاحت ہوجائے گی۔"

"اس کے لیے تم نے بڑا سُست طریقہ اختیار کیا ہے۔" کیپٹن گونزے پُرسکون لہجے میں بولا۔ "بحیرۂ احمر اور نہر سوئز کے راستے استنبول تقریباً چار ہزار میل کے فاصلے پر ہے۔ اگر قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور موسم خوش گوار رہا تو ہم ایک دن میں زیادہ سے زیادہ چھ سو میل کا فاصلہ طے کرپائیں گے۔ اس طرح ہمیں اس سفر میں تقریباً ایک ہفتہ لگ جائے گا۔"

"میں تمہیں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ مجھے کوئی جلدی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ وہ عجیب کیپٹن تھا۔ ایک طرف سائڈ بزنس کے طور پر زیادہ رقم کمانے کی فکر میں بھی رہتا تھا اور دوسری طرف اپنے جہاز سے سفر کرنے کے منفی پہلو بھی بتاتا رہتا تھا۔

کیتھرین مسکراتے ہوئے بولی۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی جلدی میں نہیں ہے۔ ہم سب بڑے پُرسکون...... بڑے پُرامن لوگ ہیں...... اور ایسا ہی پُرسکون سا جہاز ہمیں مل گیا ہے۔"

اسی قسم کی گپ شپ میں ناشتا ہوگیا۔ سب سے پہلے کیتھرین ہی نے اجازت چاہی اور اٹھ کر چل دی۔ میں بھی تقریباً اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ میں اس سے مزید بات چیت کے لیے موقعے کی تلاش میں تھا۔ وہ ڈیک کی طرف جارہی تھی۔ میں نے بظاہر یونہی بے مقصد سے انداز میں اس کے ساتھ چلتے ہوئے سرسری لہجے میں کہا۔ "تم پاکستانی لباس اور زیور میں بہت اچھی لگ رہی ہو۔"

"پاکستانی لباس......؟" وہ ذرا چونکی۔ اس نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی اور سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "اوہ...... ہاں...... یہ لباس پاکستان میں بھی پہنا جاتا ہے۔ ویسے میں نے اسے انڈین سمجھ کر پہنا ہوا ہے۔ بہرحال...... تعریف کا شکریہ۔" وہ گویا محض اخلاقاً مسکرائی۔

"تم کبھی پاکستان گئی ہو؟ میرا مطلب ہے، بندرگاہ سے آگے...... کسی شہر وغیرہ میں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں...... لیکن اب شاید جانا ہو......" وہ مُبہم لہجے میں بولی۔ شاید وہ ابھی کچھ اور کہتی لیکن اسی لمحے ایک طرف سے جہاز کا فرسٹ میٹ جنتر نکل آیا۔ وہ یقیناً اس سے پہلے ہی سے متعارف تھا۔ وہ اس سے گپ شپ کرنے لگا۔ ہم تینوں ہی ڈیک پر جا پہنچے۔ کیتھرین نے جنتر سے بھی کچھ زیادہ بات چیت نہیں کی اور ایک کرسی پر سورج کی طرف منہ کرکے بیٹھ گئی۔ وہ شاید دھوپ سینکنا چاہتی تھی۔ پھر اس نے گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر یوں آنکھیں بند کرلیں گویا وہ اب کسی سے بات نہ کرنا چاہتی ہو اور محفل برخاست ہوچکی ہو۔ اب خواہ مخواہ کباب ہونے کا کوئی فائدہ نہیں تھا چنانچہ میں جنتر کو اس کے پاس بیٹھا چھوڑ کر واپس آگیا البتہ ایک لمحے کے لیے نہ جانے کیوں میرا کیتھرین کو جنتر کے بارے میں کہنے کو جی چاہا۔ "خاتون! ذرا ہوشیار رہنا...... یہ ایڈز کا مریض ہے۔"

ظاہر ہے میں یہ کہہ نہیں سکتا تھا اس لیے خاموشی سے اپنے کیبن میں آگیا۔

البتہ ...ز کے دوسرے روز مجھے کیتھرین سے کچھ بات چیت کا موقع ملا۔ اس وقت ہم عمان کی سمندری حدود سے گزر رہے تھے۔ میں کیبن سے نکل کر ڈیک پر آیا تو میں نے اسے ریلنگ کے

قریب کھڑے پایا۔ اس نے خود ہی بات چیت کا آغاز کیا۔ "یہ عمان ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت چھوٹا سا ملک معلوم ہوتا ہے۔ اس کے ارد گرد تو صحرا کے سوا کچھ نہیں ہے۔" اس نے تبصرہ کیا۔

"ہاں۔ لیکن خوش حال ریاست ہے۔ بیشتر عرب ملکوں کی طرح اس کا انحصار بھی تیل کی کمائی پر ہے۔" میں نے اپنی دانست میں اس کی معلومات میں اضافہ کرنے کی کوشش کی۔

اس نے یوں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا گویا کوئی بزرگ کسی بچے کی ہمت افزائی کے لیے مسکرایا ہو۔ آج وہ سیدھی طرح انگریز بن گئی تھی۔ کل والے پاکستانی تکلفات کی کوئی جھلک اس کے جسم پر نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ ڈھیلی ڈھالی سفید اسپورٹس شرٹ اور نیکر میں تھی۔ پیروں میں کینوس شوز تھے اور سر پر بڑے سے چھجے والا ہیٹ۔ آج وہ ایک انگریز سیاح لگ رہی تھی۔

"مسٹر کان! آپ کرتے کیا ہیں؟" اچانک اس نے پوچھا۔

"میں چھوٹا سا بزنس مین ہوں۔ لاہور اور کراچی دونوں شہروں میں میرا تھوڑا تھوڑا بزنس ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"جب انڈیا تقسیم نہیں ہوا تھا..... تمہارا پاکستان نہیں بنا تھا..... میں نے سنا ہے اس وقت میرے دادا بمبئی میں ہائی کمشنر تھے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔ "اس وقت سے اب تک انڈیا اور پاکستان دونوں جگہ بہت سے افراد سے ہمارے........ خاندانی مراسم چلے آرہے ہیں۔ میرا خیال ہے 'ایشیائی بڑے تعلقات نبھانے والے لوگ ہوتے ہیں اور ہم انگریز بھی کافی وضعدار ہیں۔ خصوصاً جن انگریزوں نے غیر منقسم ہندوستان میں طویل وقت گزارا تھا' ان میں اس مٹی اور یہاں کی روایات کی بھی کچھ خوشبو رچ گئی تھی۔"

"اب تک ان روایات کی خوشبو یقیناً مٹ چکی ہوگی۔ نئی نسل کو بھلا وہ باتیں کہاں معلوم ہوں گی..... اور اگر معلوم بھی ہوں گی تو انہیں ان کی کیا پروا ہوگی۔ یہ بڑا ظالم' بڑا ہنگامہ پرور دور ہے۔ آج کی خباثتوں نے مغرب تو مغرب....... مشرق کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ سب قدریں ٹوٹتی جارہی ہیں۔ سب کچھ تباہ ہوتا جارہا ہے۔ ہر طرف کسی نہ کسی طرح کی وحشت اور جنون کا دور دورہ ہے۔ دولت کی دوڑ ہے۔ دولت کے لیے لوگ سب کچھ کر گزرنے کو تیار ہیں......"

اس کی نیلی آنکھیں جھیل کی طرح پُرسکون رہیں۔ میں بغور اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن اس کے چہرے پر کوئی تغیر نمودار نہ ہوا۔ نہایت دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولی۔ "مسٹر کان! آپ نوجوان ہیں لیکن بوڑھوں جیسی باتیں کرتے ہیں۔ میری اگر کبھی اپنے پاپا سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ بھی اسی قسم کی مایوس کن باتیں لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔"

"دراصل..... زندگی کے سفر میں نہ جانے کس موڑ پر میرے اندر کوئی بوڑھی روح حلول کر گئی تھی۔ اب اسے باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ویسے بھی عمر کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ انسان کو ہر عمر میں ہی اچھی روایات اور اچھی قدروں کی پاس داری کرنی چاہیے۔ ہم اب بھی اس دنیا کو خوبصورت بنا سکتے ہیں۔ اب بھی ایک اچھی زندگی کا خواب پورا کرسکتے ہیں بشرطیکہ ہم ان لوگوں کی باتوں پر کان دھرنا چھوڑ دیں جن کا پیشہ دوسروں کو بہکانا' اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرنا اور اپنی خواہشات کا ایندھن بنانا ہے۔ ایسے لوگ ہمیں زندگی میں کسی بھی موڑ پر' کسی بھی روپ میں مل سکتے ہیں۔"

"میرے پاپا بھی جب مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو تمہیں معلوم ہے میں ان سے کیا کہتی ہوں مسٹر کان؟" وہ کچھ زیادہ واضح مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" میں نے اعتماد سے کہا۔ "تم کہتی ہوگی' میں بچی نہیں ہوں پاپا! میں اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔ یہی کہتی ہو نا تم؟"

"بالکل۔" اس نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "لیکن تمہیں کیسے معلوم؟"

"مجھے تو یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے پاپا جواب میں کیا کہتے ہوں گے۔" میں نے اسی اعتماد سے کہا۔ "وہ کہتے ہوں گے' ہر عمر کے انسان کے اندر ایک چھوٹا..... نا سمجھ اور بے وقوف بچہ چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ شکاری اور خبیث قسم کے لوگوں کو اسی بچے کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ اس کے ذریعے انسان سے عجیب عجیب کام کراتے ہیں۔ اسی لیے تو دنیا میں بعض اوقات اچھی بھلی عمروں کے لوگ جو جو کام کرتے نظر آتے ہیں' انہیں دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ کچھ اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہوں گے تمہارے پاپا۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا؟"

"واقعی۔" وہ آنکھیں کچھ اور پھیلاتے ہوئے بولی۔ "وہ کچھ اسی قسم کی باتیں کرتے ہیں لیکن تمہیں کیسے معلوم ہوا مسٹر کان؟"

"کچھ تو میں نجومی ہوں اور کچھ میرا دنیا بھر کے دردمند انسانوں سے ذہنی رابطہ ہے۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

وہ ڈیک پر رکھے ہوئے چھوٹے سے بیگ سے ایک ضخیم کتاب نکال کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اب اس کا کچھ پڑھنے کا موڈ تھا۔ میں کتاب کا نام پڑھ کر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ خاصا لمبا سا نام تھا اور اس کا ترجمہ کچھ یوں بنتا تھا۔ "مشرقِ وسطیٰ کے معاملات پر تیل کے اثرات کی تاریخ۔"

کیا وہ واقعی اس قسم کی کتابیں پڑھتی تھی یا یہ محض دکھاوا تھا؟ میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ بعض لوگوں میں یہ نفسیاتی بیماری ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے بھاری بھرکم قسم کی کتابیں اٹھائے پھرتے ہیں اور ذرا موقع پاتے ہی...... بلکہ بعض

اوقات تو زبردستی موقع نکال کر انہیں کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔

میں نے جنگلے سے ٹیک لگا کر اس کی طرف رخ کرتے ہوئے کہا۔ "تم خود بھی تو خاصی سنجیدہ لڑکی ہو۔ اس قسم کی عالمانہ کتابیں پڑھتی ہو۔" میں نے اس کی کتاب کی طرف اشارہ کیا۔

"انسان والدین سے خواہ کتنا ہی باغی کیوں نہ ہو جائے' ان کے کچھ نہ کچھ اثرات تو آ ہی جاتے ہیں۔" وہ ہیٹ کا چھجا اونچا کرتے ہوئے بولی۔ "میرے دادا سول سروس میں تھے...... والد لندن میں بیورو کریٹ تھے...... عالمی حالات کے بارے میں جاننے کا کچھ نہ کچھ شوق تو مجھ میں بھی آنا ہی تھا۔"

اگر اس قسم کی لڑکی واقعی ڈرگز کے دھندے میں ملوث تھی تو یہ بڑے ہی افسوس کی بات تھی۔ آخر اس کاروبار کو کس حد تک پھیلنا تھا؟ کہیں دنیا میں قیامت اسی دھندے کے ذریعے تو نہیں آنی تھی؟ قیامت کا ایک روپ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ دنیا کی بیشتر آبادی میں سے کوئی منشیات تیار کرنے والا ہو' کوئی پھیلانے والا' کوئی بیچنے والا' کوئی خریدنے والا اور کوئی استعمال کرنے والا۔ کچھ لوگ منشیات کی وجہ سے...... اور کچھ ہولناک بیماریوں کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر رہے ہوں...... یہ بھی تو ایک قیامت ہی تھی۔

تاہم میں ابھی تک کیتھرین کے بارے میں صحیح طور پر کوئی بھی اندازہ نہیں لگا سکا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ اس جہاز پر اس کے سفر کا مقصد کیا تھا۔ وہ بہت گہری لڑکی تھی۔ وہ کتاب کھول کر بظاہر اس کے مطالعے میں کھو گئی تھی۔ یہ گویا میرے لیے واضح اشارہ تھا کہ وہ مزید بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں وہاں سے چلا آیا۔

میں نے جہاز کے مختلف گوشوں میں کھڑے ہو کر اس سفید اسٹیمر کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی جس پر میں نے آسمانی آنکھوں والی لڑکی کو دیکھا تھا لیکن پھر وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا۔ کیا وہ کسی اور سمت نکل گیا تھا یا پیچھے رہ گیا تھا؟ اگر اس لڑکی کو واقعی میری تلاش تھی تو اس نے کس طرح یقین کر لیا تھا کہ میں ارد گرد نظر آنے والے کسی جہاز پر نہیں ہوں؟

ان سوالوں میں سے فی الحال کسی کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے پرندے دیکھنے کے بہانے پیری کلاکر سے دوربین لے کر بھی اس اسٹیمر کو تلاش کیا لیکن وہ دوربین سے بھی مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں نے باقی وقت کلاکر کے ساتھ ہی پرندوں کے بارے میں اس کے ایڈونچر سننے میں گزارا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ پرندوں کے بارے میں واقعی میری معلومات میں خاصا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

تیسرے روز جب کہ جہاز عرب ریاستوں کے گرد گھومتا ہوا بحیرۂ احمر میں داخل ہونے والا تھا' ایک طرف سے فشنگ کا ایک چھوٹا ٹرالر جہاز کے بالکل قریب آ گیا۔ میں اس وقت ریلنگ پر ہی کھڑا تھا۔ میں چوکنا ہو گیا لیکن اس میں سے کسی نے آنکھ اٹھا کر میری طرف نہیں دیکھا اور نہ ہی جہاز کے عملے میں سے کسی نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں وہاں سے ہٹ جاؤں۔

بظاہر تو ایسا معلوم نہیں ہو رہا تھا کہ ان کے درمیان کوئی لین دین ہو رہا تھا۔ فرسٹ میٹ جنتر نیچے کھڑا ان سے کچھ باتیں کر رہا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس طرح دن کی روشنی میں علی الاعلان ان کے درمیان مال اور رقم کا تبادلہ ہوگا۔ میں اوپر کھڑا دیکھتا رہا۔ ان کے درمیان کوئی لین دین نہیں ہوا اور چند منٹ بعد ٹرالر روانہ ہو کر چلا گیا۔

جنتر اوپر آ گیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "یہ لوگ کون تھے اور کس لیے آئے تھے؟"

"ماہی گیر تھے۔ مچھلیاں ہمارے ہاتھ فروخت کرنا چاہتے تھے لیکن ان کے پاس مال اچھا نہیں تھا اور قیمت بھی زیادہ مانگ رہے تھے۔ ان سے عبدل ہی صحیح طرح نمٹتا ہے۔" جنتر نے جواب دیا۔

اسی روز کچھ دیر بعد ایک اور فشنگ ٹرالر' جہاز کے قریب آیا اور گویا وہی منظر دُہرایا گیا۔ عبدل رسّے کی سیڑھی کے ذریعے ٹرالر پر گیا۔ اس بار وہ واپس آیا تو اس کے کندھے پر مچھلیوں کی باسکٹ لدی ہوئی تھی۔ جہاز پر آ کر وہ باسکٹ خانساماں کے حوالے کرتے ہوئے بولا۔ "مچھلیاں اچھی ہیں...... تازہ بھی ہیں اور سستی بھی ہیں۔"

خانساماں نے باسکٹ کھول کر اس میں جھانکا۔ باسکٹ میں دس بڑی بڑی مچھلیاں موجود تھیں۔ خانساماں نے ان میں سے ایک کو نکال کر گویا ہاتھوں ہی ہاتھوں میں تولا اور معنی خیز سے انداز میں مسکرا دیا پھر وہ باسکٹ اٹھا کر کچن میں لے گیا۔

میرے ذہن میں شکوک کا سنپولیا رینگنے لگا تھا۔ اس کے بعد میں موقعے کی تلاش میں رہا لیکن افغان خانساماں مجھے زیادہ دیر کے لیے کچن سے اِدھر اُدھر ہوتا دکھائی نہ دیا۔ وہ اگر کچن سے نکلا بھی تو بہت ہی تھوڑی دیر کے لیے...... اور آس پاس ہی کہیں موجود رہا۔ وہ ایپرن باندھے ہوئے تھا اور پچھلے تین دنوں کی نسبت کچھ زیادہ مستعد نظر آ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج اس نے سہ پہر سے ہی رات کے کھانے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔

بالآخر میں نے اسے انجن روم کی طرف جاتے دیکھا۔ اس نے ایپرن اتارا ہوا تھا۔ شاید وہ کیپٹن گومز سے ملاقات کے لیے جا رہا تھا۔ میں نے رسک لینے کا فیصلہ کر لیا اور ریلنگ سے پنجوں کے بل تقریباً دوڑتا ہوا سیڑھیوں تک پہنچا اور دو چھلانگوں میں سیڑھیاں اتر کر کچن میں جا پہنچا۔

کچن کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر اچھا دھچکا لگا کہ ہم ایسے کچن میں پکائے جانے والے کھانے کھا رہے تھے۔ بس ذرا برتن پونچھ پانچھ کر ظاہری طور پر صاف کر کے ہمارے سامنے سجا دیے جاتے تھے جیسا کہ نچلے درجے کے ہوٹلوں میں ہوتا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے اس کوفت کو ذہن سے جھٹک دیا۔ پچھلا کچھ عرصہ جس طرح گزر چکا تھا اس میں' میں نہ جانے کیا کچھ برداشت کر چکا تھا۔ اس کچن کی حالت تو پھر بھی غنیمت تھی۔

مجھے وہ مچھلیاں تلاش کرنے کے لیے کسی فریزر وغیرہ میں جھانکنا نہیں پڑا۔ وہ کوکنگ رینج کے قریب ماربل کے کاؤنٹر پر نہایت قرینے سے اور ترتیب سے رکھی تھیں۔ میں نے ان میں سے ایک مچھلی کو دو انگلیوں سے پکڑ کر اٹھا کر دیکھا۔ اس کا پیٹ چاک تھا۔ پھر میں نے جھک کر دیکھا تو سبھی مچھلیوں کے پیٹ چاک نظر آئے۔ انہیں خوب صاف کر کے رکھا گیا تھا۔ میں یہ اندازہ نہیں کر سکا کہ مچھلیوں کے پیٹ تازہ چاک کیے گئے تھے یا پہلے سے چاک شدہ تھے' ٹانکوں وغیرہ کے ذریعے بند تھے اور اب صرف ٹانکے کھولے گئے تھے۔

میں نے ٹانکوں کے نشانات تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے نظر نہیں آئے۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ ایک بار پھر میرا یہ شبہ قوی ہونے لگا کہ مچھلیوں کے پیٹ میں کچھ آیا تھا۔ میں نے خانساماں کو کچن سے باہر کچھ لے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ اگر کچھ آیا تھا تو کیا وہ کچن میں ہی چھپایا گیا تھا؟

بظاہر وہ زیادہ لمبا چوڑا کچن نہیں تھا لیکن اگر عجلت کے عالم میں کوئی نامعلوم چیز تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی تو بڑی دشواری پیش آ سکتی تھی۔ اس میں چیزیں رکھنے کی گنجائش تو کافی تھی۔ بہت سی کیبنٹس تھیں۔ فریج اور فریزر تھے۔ کوکنگ رینج تھی۔ سامان رکھنے کی اور کئی چیزیں تھیں۔

میں نے حتیٰ الامکان تیزی سے کئی چیزوں میں جھانکنے کی کوشش کی لیکن میں کوئی مشکوک چیز تلاش نہیں کر سکا۔ میں تو ابھی صحیح طرح کچن ہی کی تلاشی نہیں لے پا رہا تھا اور اگر وہ چیز کچن سے باہر جا چکی تھی پھر تو اسے تلاش کرنا کم از کم اکیلے آدمی کے لیے تو تقریباً ناممکن ہی تھا۔ اتنا بڑا جہاز تھا۔ اس میں تو اچھے بھلے حجم کی چیزوں کو چھپانے کے لیے اتنی بہت سی جگہیں تھیں۔ مختصر حجم کی چیز کا تو مسئلہ ہی کچھ نہیں تھا۔

اس تمام افراتفری کے دوران ایک اور خیال بھی میرے ذہن میں گردش کیے جا رہا تھا۔ جس وقت وہ ٹرالر' جہاز پر مچھلیاں دینے آیا تھا' اس وقت ہم عرب ریاستوں کی حدود میں تھے۔ عرب ریاستوں میں تو ہیروئن اندر لانے کی کوشش کی جاتی تھی اور عرب ممالک اپنے سخت قوانین اور سخت رویّے کی وجہ سے اس یلغار کو حتیٰ الامکان روکے ہوئے تھے لیکن یہاں سے ہیروئن کا ٹریفک باہر کی طرف جانے کا کوئی سلسلہ ابھی تک کم از کم میرے علم میں تو نہیں آیا تھا۔ تو پھر یہ کیا چکر تھا؟ کہیں میں خواہ مخواہ ہی شکوک اور واہموں کا شکار تو نہیں ہو رہا تھا؟

میں ایک بار پھر مچھلیوں کی طرف پلٹ آیا۔ میں نے دو تین دوسری مچھلیاں بھی اٹھا کر دیکھیں۔ سب کے پیٹ یکساں انداز میں چاک تھے۔ اچانک مجھے اپنے عقب میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں تیزی سے گھوما۔ افغان خانساماں دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ اس وقت کچھ زیادہ ہی سرخ نظر آ رہا تھا اور آنکھیں نفرت سے دہک رہی تھیں۔

عجیب بات یہ تھی کہ اس کے ہاتھ میں گوشت کاٹنے کا بھاری چاپر تھا۔ چاپر اسٹیل کا تھا اور اس وقت دھوپ میں چمک رہا تھا۔ مجھے اپنی جلد کے نیچے سرسراہٹ سی محسوس ہوئی۔ لگتا تھا کہ عقب سے مجھ پر نظر پڑتے ہی خانساماں کافی جلال میں آ گیا تھا اور شاید اس نے بہ مشکل اپنے آپ کو چاپر کے استعمال سے باز رکھا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں تیزی سے نہ گھومتا اور مزید ایک آدھ لمحے اس کی آمد سے بے خبر رہتا تو وہ چاپر استعمال کر ہی گزرتا۔

خانساماں خواہ کہیں بھی ملازمت کریں' عام طور پر وہ کچن کو اپنی ذاتی جائیداد سمجھتے ہیں اور بلا اجازت وہاں کسی کی دخل اندازی کو بہت بُرا محسوس کرتے ہیں۔ ان کی اس نفسیات کا مجھے احساس تھا اور اس وقت تو میں ویسے ہی کچھ مشکوک نظر آ رہا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود مجھے خانساماں کا اس طرح حد سے زیادہ جلال میں آ جانا کچھ غیر فطری سا محسوس ہوا۔

میں نے مچھلی احتیاط سے کاؤنٹر پر واپس رکھتے ہوئے مسکرا کر ہموار لہجے میں کہا۔ "دراصل کافی پینے کا موڈ ہو رہا تھا...... تم کہیں نظر نہیں آئے...... میں نے سوچا' خود ہی بنانے کی کوشش کی جائے......" خانساماں کو اپنا مقصد سمجھانے کے لیے اس سے آسان انگریزی میں بات کرنا پڑی تھی۔ کچھ ایسی ہی انگریزی میں وہ جواب دیتا تھا۔

"کیا آپ کوئی نئی قسم کی کافی بنانے لگے تھے مسٹر افضل خان؟ کوئی ایسی کافی جس میں مچھلی بھی ڈلتی ہے؟" اس نے گویا ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے پوچھا۔ ویسے اس نے بہت تیزی سے اپنے جلال پر قابو پا لیا تھا۔

"نہیں...... نہیں......" میں نے گویا اس کی بات کو مذاق سمجھتے ہوئے اس پر ذرا ہنسنے کی کوشش کی۔ "مچھلیاں تو میں ویسے ہی دیکھنے لگا تھا...... کسی اچھی نسل کی معلوم ہوتی ہیں...... رات کے کھانے میں شاید مچھلی ہی ملے گی؟"

"صرف رات کے کھانے پر ہی نہیں...... بلکہ اب تو اکثر مچھلی ہی کھانے کو ملے گی......" اس کا چہرہ بہت تیزی سے اعتدال پر آ رہا تھا۔ تاہم اس کا لہجہ اب بھی چبھتا ہوا ہی تھا۔ "اس مچھلی کو آپ کے پاکستان میں ہیرا کہا جاتا ہے اور انگریزی میں ریڈ ہیرنگ...... اور کچھ جاننا چاہتے ہیں آپ؟"

"نہیں...... نہیں۔ میں جان کر کیا کروں گا۔ میں تو آم کھانے سے غرض رکھتا ہوں' پیڑ گننے سے نہیں۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"پیڑ گننے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے البتہ پیڑ کاٹنے سے انسان کو بچنا چاہیے۔" وہ مُربیانہ سے لہجے میں بولا اور معنی خیز سے انداز

میں چاپر کی دھار دیکھنے لگا۔ وہ انگلی چاپر کی دھار پر پھیر رہا تھا لیکن اس کی نظر مجھ پر تھی۔ وہ مضبوط قد کاٹھ کا آدمی تھا۔ عمر پینتیس اور چالیس کے درمیان تھی۔ باریش تھا۔ اس کی داڑھی اور آنکھوں کا رنگ بھورا تھا اور یکساں معلوم ہوتا تھا۔

"تم نے سب مچھلیوں کے پیٹ چاک کردیے ہیں۔" میں نے مچھلیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حتی الامکان سادگی سے کہا۔

اس نے ٹٹولنے والی نظروں سے مجھے دیکھا اور بالآخر سادگی سے ہی جواب دینے کا فیصلہ کیا۔ "ابھی تو میں ان کے قتلے بھی بناؤں گا۔ فریزر میں تو یہ اچھی طرح صاف کرکے اور کاٹ کر ہی رکھی جائیں گی۔"

"ہاں...... یہ بات تو ہے۔" میں نے جلدی سے سر ہلایا۔

دفعتاً وہ امریکیوں کی طرح کندھے اچکا کر اور گہری سانس لے کر بولا۔ "اگر آپ کو کافی پینی ہے تو آپ چل کر میس میں بیٹھیں، میں آپ کے لیے کافی بنا کر لاتا ہوں۔"

میس، کچن سے ملحق ہی تھا۔ میں میس میں آکر بیٹھ گیا۔ وہ دو تین منٹ میں ہی میرے لیے کافی بنا کر لے آیا جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ وہ کافی میرے سامنے رکھنے کے بعد بھی چند لمحے وہیں کھڑا رہا گویا دیکھنا چاہتا ہو کہ میں کافی پیتا ہوں یا نہیں؟ سچی بات یہ تھی کہ فی الحال میرا اس کی لائی ہوئی کافی پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ ابھی اس بدبخت کے دل میں غیظ و غضب کا طوفان کم نہ ہوا ہو، کافی میں کچھ ملا لایا ہو جس کے نتیجے میں میری لاش سمندر کی مچھلیوں کے ڈنر میں بھی کام آسکتی تھی۔

میں نے یہی ظاہر کیا جیسے میں کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا اور بے خیالی میں مگ کو میز پر گھما تو رہا تھا لیکن ہونٹوں سے نہیں لگا رہا تھا۔ آخر وہ کچن میں چلا گیا۔ کچن کی بھی ایک کھڑکی میس میں کھلتی تھی جو پینٹری کا کام دیتی تھی۔ میں نے اس کھڑکی سے جونہی اس کی پشت میس کی طرف ہوتے دیکھی، جلدی سے دبے قدموں اٹھ کر کافی واش بیسن میں الٹ دی۔ اس کے بعد میں چند منٹ تک وہیں بیٹھا کافی کی چسکیاں لینے کی اداکاری کرتا رہا۔

آخر کار میں مگ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ خانساماں نے مجھے لڑکھڑائے بغیر، ٹھیک ٹھاک حالت میں جاتے دیکھ کر بھی کسی تاثر کا اظہار نہیں کیا۔ عین ممکن تھا، اس نے کافی میں کچھ نہ ملایا ہو۔ مجھے خواہ مخواہ ہی شک ہوا ہو۔ مجھے احساس ہو رہا تھا کہ محض معمولی سے شبہے کی بنیاد پر وہ اتنی جلدی مجھے ہلاک کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔

اس روز میں نے صبح سے کیتھرین کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید اس نے ناشتا بھی اپنے کیبن میں منگوایا تھا۔ میں ابھی تک اس کے بارے میں کچھ معلوم نہیں کرسکا تھا کہ وہ ڈرگز کے دھندے میں کس طرح ملوث تھی؟ آیا وہ خود کچھ لے کر جارہی تھی یا مال جہاز میں لدا ہوا تھا اور وہ ڈرگ مافیا کی طرف سے نگراں کے طور پر کھیپ کے ساتھ سفر کررہی تھی؟

اس شام جب کیتھرین اور کلاکر اپنے کیبنوں سے باہر تھے تو میں نے اپنے کیبن کی چابی ان کے تالوں میں آزما کر دیکھی اور مجھ پر یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ ایک ہی چابی سے چاروں مسافر کیبنوں کے تالے نہایت آسانی سے کھل سکتے تھے۔ چاروں کے تالے بالکل ایک ہی جیسے تھے۔ اس وقت چونکہ اندیشہ تھا کہ کیتھرین اور کلاکر کسی لمحے بھی اپنے کیبن کی طرف واپس آسکتے تھے اس لیے میں نے کسی کے بھی کیبن میں گھسنے کی کوشش نہیں کی۔ میں نے یہی سوچا کہ اگر ضرورت پڑی تو کوئی اور مناسب موقع دیکھ کر گھس جاؤں گا۔ اب تو "کھل جا سم سم" کا طلسم میرے پاس چابی کی شکل میں موجود تھا۔

سفر کے چوتھے روز میں بیدار ہو کر کیبن سے نکلا تو دیکھا کہ ہم بحیرۂ احمر میں داخل ہوچکے تھے اور شمال مغرب کی سمت میں سفر کر رہے تھے۔ ناشتے کے بعد عملے کے دو آدمیوں نے اعلان کیا کہ وہ تیراکی کے لیے سمندر میں اتر رہے تھے۔ کیتھرین بھی فوراً ان کے ساتھ تیراکی کے لیے تیار ہوگئی۔ شاید وہ اس "خشک" سے "سمندری" سفر میں جہاز تک محدود رہ کر بور ہوگئی تھی اور اب کوئی شغل میلہ ڈھونڈ رہی تھی۔

ربڑ کی ایک کشتی اور رسّے کی سیڑھی سمندر میں اتاری جارہی تھی۔ کلاکر جلدی سے اپنے کیبن میں جاکر اپنا کیمرا نکال لایا اور بولا۔ "میں کشتی میں بیٹھ کر فوٹوگرافی کروں گا۔"

کیتھرین سوئمنگ سوٹ پہن چکی تھی۔ قیامتیں کچھ اور نمایاں ہوچکی تھیں۔ دل تو میرا بھی چاہ رہا تھا کہ کیپٹن گوئز سے تیراکی کا لباس مستعار لے کر بحیرۂ احمر کو بحرِ عشق تصور کرتے ہوئے کیتھرین کے ساتھ کود پڑوں اور اسے اپنی تیراکی کے کچھ کمالات دکھا دوں لیکن کئی طرح کی سوچوں نے میرے قدم روک لیے۔ ایک تو یہ خیال آگیا کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ میں اسے متاثر کرنے کی بچکانہ یا کچھ کچھ فلمی سی کوشش کررہا ہوں۔ دوسرے مجھے بحیرۂ احمر کا پانی اس قابل نہیں لگ رہا تھا کہ اس میں تیراکی کی جاتی۔

تیسری اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اگر وہ لوگ نیچے جارہے تھے تو میرے لیے یہ کیتھرین اور کلاکر کے کیبنوں کی تلاشی لینے کا بہترین موقع تھا۔ معلوم نہیں ایسا موقع پھر ہاتھ آتا یا نہیں۔ میں محض ذرا سے شغل کے لیے خود ان کے ساتھ سمندر میں اتر کر اس موقع کو ضائع نہیں کرسکتا تھا۔

تاہم میں نے رسماً کیتھرین سے کہا۔ "میرا خیال ہے، تمہیں یہاں تیراکی نہیں کرنی چاہیے۔ سمندر کا پانی اچھا معلوم نہیں ہورہا۔ شاید تمہارے جسم کو نقصان دے۔"

وہ مُڑ کر میری طرف دیکھتے ہوئے خاصے ہوشربا سے انداز میں مسکرائی اور بڑے میٹھے لہجے میں بولی۔ "اگر اس وقت پاپا یہاں ہوتے تو یقیناً ایسی ہی کوئی بات کرتے۔ آخر تمہیں اس عمر میں پاپا بننے کا اتنا شوق کیوں ہے؟"

'لعنت ہو مجھ پر......!" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ "بعض اوقات رسمی بات کرنا بھی مہنگا پڑ جاتا ہے۔ کس بدبخت کو اس عمر میں تم جیسی لڑکی کا پاپا بننے کا شوق ہوگا؟'

پھر میرے ذہن میں ایک اور شبہے نے سر ابھارا۔ میں اس سے پہلے بھی غیر ارادی سے انداز میں کئی موقعوں پر اس کے ساتھ مُربیانہ، ہمدردانہ اور کچھ مشفقانہ سا رویہ اختیار کرچکا تھا۔ نصیحتیں کرچکا تھا، مشورے دے چکا تھا۔ کہیں اسے اندازہ تو نہیں ہوگیا تھا کہ میں کسی خاص مقصد سے جہاز پر سوار ہوا تھا جس کا تعلق اس کی ذات سے تھا؟ میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے بزرگی کا کوٹہ کچھ کم کردینا چاہیے۔

وہ لوگ رسّے کی سیڑھی کے ذریعے سمندر میں اتر چکے تو میں آنکھ بچا کر پہلے کیتھرین کے کیبن تک پہنچا۔ چابی سے اس کے کیبن کا تالا بالکل اسی طرح کھل گیا جس طرح میرے اپنے کیبن کا کھلتا تھا۔ اندر پہنچ کر میں نے دیکھا، اس کا کیبن بالکل میرے ہی کیبن جیسا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عبدل یا جنتر اس کے کیبن کی صفائی ستھرائی وغیرہ کا بہت خیال رکھ رہے تھے جبکہ میرے کیبن کی طرف کسی نے توجہ دینے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس کے بستر کی چادر بدلی ہوئی تھی۔ کمبل بھی صاف ستھرا تھا۔ فرش بھی صاف تھا جبکہ میرے کیبن کی حالت کچھ ایسی ہی تھی جیسے میں کرایہ دیے بغیر سفر کررہا تھا اور جہاز کا عملہ مجھ سے خفا تھا۔ میں نے اس تضاد پر اپنے آپ کو زیادہ غمناک نہیں ہونے دیا۔ آخر وہ کیتھرین تھی اور میں افضل چوہدری...... فرق صاف ظاہر تھا۔

کیتھرین کا بیشتر سامان دو سوٹ کیسوں میں تھا۔ میں نے تیزی سے ان کی تلاشی لے ڈالی۔ ان میں عام استعمال کے کپڑے تھے۔ وہ ساری بھی تھی جو میں دیکھ چکا تھا۔ اس کے علاوہ شلوار قمیص بھی تھی۔ زیادہ تر ملبوسات مغربی ہی تھے۔ چمڑے کے ایک چھوٹے بیگ میں میک اپ کی کٹ اور کلون وغیرہ تھے۔ انگریزی کی کچھ سنجیدہ کتابیں تھیں۔

ایک اور چمڑی بیگ میں مختلف وٹامنز کی گولیوں کی بڑی بڑی پوری بارہ شیشیاں تھیں۔ گویا موصوفہ اپنی صحت کی طرف سے غافل نہیں تھیں۔ ایک اور چھوٹے بیگ میں اس کا پاسپورٹ اور ویزے وغیرہ تھے۔ فی الحال اس نے صرف ترکی جانے کا ذکر کیا تھا لیکن اس کے پاس کئی یورپی ممالک کے ویزے بھی موجود تھے۔ چھوٹی سی دیوار گیر الماری میں کچھ اور ملبوسات موجود تھے۔ اس بے کیف سے سفر میں بھی وہ صبح شام لباس تبدیل کرتی تھی۔ ننھے سے باتھ روم میں بھی استعمال کی کچھ چیزیں موجود تھیں۔

کسی بھی قسم کی منشیات کا ابھی تک مجھے کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ میں دوبارہ اس کے سامان کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے وٹامنز کی گولیوں کی شیشیوں میں سے ایک کا ڈھکنا کھولا اور ایک گولی ہتھیلی پر نکال کر دیکھی۔ نارنجی سے رنگ کی وہ گولی وٹامنز ہی کی دکھائی دے رہی تھی۔ میں چند لمحے یوں اسے الٹ پلٹ کر متوقع سی نظروں سے دیکھتا رہا جیسے وہ بول پڑے گی اور خود ہی اپنے بارے میں کچھ بتا دے گی۔ آخر کار میں نے کیتھرین کی ہر چیز پہلے جیسی حالت میں رکھ دی اور اس احتیاط کے ساتھ کیبن سے نکل آیا کہ کوئی مجھے دیکھ نہ پائے۔

ریلنگ پر پہنچ کر میں نے جھانک کر دیکھا۔ کیتھرین اور عملے کے دو آدمی ابھی تیراکی میں مشغول تھے۔ عملے کے لوگ تھوڑی بہت اٹکھیلیاں بھی کررہے تھے۔ کیتھرین برا نہیں منا رہی تھی بلکہ ان کی شرارتوں میں ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے عام لباس کے ساتھ ساتھ سنجیدگی کا بوجھل لبادہ بھی کچھ دیر کے لیے اتار کر کہیں ٹانگ دیا تھا۔ کلاکر ربڑ کی کشتی میں بیٹھا مختلف زاویوں سے ان لوگوں کی تصویریں اتار رہا تھا۔ ان لوگوں کی کیا...... زیادہ تر کیتھرین ہی کی اتار رہا تھا اور کیتھرین بھی کسی جل پری کی طرح مچل مچل کر مختلف پوز دے رہی تھی۔

وہ بدبخت کلاکر مفت میں ہی ایسے حسین نظارے کیمرے کی آنکھ سے محفوظ کررہا تھا۔ اپنے ملک میں شاید ہزاروں فرانک خرچ کرکے بھی وہ ایسی حسین لڑکی سے اس قسم کی ماڈلنگ نہیں کرا سکتا تھا۔ میرے سینے پر ایک آدھ سانپ نے لوٹنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے تھپکی دے کر سُلا دیا اور ان سب کو گھورتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر دل ہی دل میں کہا۔ 'ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... تم مزے کرو بدبختو! میں اپنے یار سیٹھ رمضان سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کی کوشش کررہا ہوں۔'

میں ایک بار پھر کیبنوں کی طرف پلٹ آیا۔ اس مرتبہ میں نے کلاکر کے کیبن پر قسمت آزمائی کی۔ تالا تو میں پہلے بھی کھول کر دیکھ چکا تھا۔ اس بار اندر بھی جا پہنچا۔ کلاکر کے کیبن میں بھی کپڑے اور مسافرت کا دوسرا سامان موجود تھا۔ پرندوں کے بارے میں چھ سات باتصویر کتابیں تھیں۔ کیمرے سے متعلقہ کچھ دوسری چیزیں تھیں۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اس جہاز پر اپنی موجودگی کا جو مقصد بیان کیا تھا وہ درست ہی تھا۔ اس کے سامان میں بھی کوئی ایسا سراغ موجود نہیں تھا جس سے اس کا ڈرگ مافیا سے کوئی تعلق نظر آتا۔

میں واپس ڈیک پر آگیا۔ لگتا یہی تھا کہ میں نے ان دونوں کیبنوں کی تلاشی لے کر وقت ہی ضائع کیا تھا۔ وقت ضائع کرنے کے اور بھی بہتر طریقے ہوسکتے تھے جن میں وقت کم از کم اس بیہودہ انداز میں تو ضائع نہیں ہوتا۔ وقت ضائع ہی کرنا تھا تو میں بھی کیتھرین کے ساتھ سمندر میں اتر کر ضائع کرسکتا تھا۔ انسان کو وقت ضائع کرنے میں بھی کوئی "سلیقہ" ہونا چاہیے۔

دل ہی دل میں اپنے آپ کو جھاڑتے پلاتے وقت اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ ایک چوتھا کیبن بھی تو تھا جس کی میں نے تلاشی

نہیں لی تھی۔ وہ کیبن خالی تھا۔ جہاز پر اور کوئی ضرورت مند مسافر نہیں تھا جسے وہ کیبن الاٹ کیا جاتا۔ میں نے سوچا' جہاں اتنا وقت برباد ہو چکا تھا' اسی بے ہودہ کام میں تھوڑا سا مزید وقت برباد کر لیا جائے تاکہ دل میں کوئی خلش نہ رہ جائے۔

چوتھا کیبن ایک کونے میں تھا۔ اس کا تالا کھولنے میں بھی مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ میرا خیال تھا کہ اس میں مجھے جو دیوار گیر بیڈ نظر آئے گا اس پر کوئی بستر یا چادر وغیرہ نہیں ہوگی لیکن مجھے وہاں نہ صرف بستر لگا ہوا دکھائی دیا بلکہ ویسا ہی کمبل بھی پھیلا نظر آیا جیسا ہم تینوں مسافروں کو دیا گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں نے سانس روک لی۔ کمبل بستر پر یونہی نہیں پڑا تھا بلکہ کسی کے جسم پر تھا یعنی کوئی کمبل لپیٹے لیٹا ہوا تھا۔ میں اندر پہنچ چکا تھا۔ میں نے واپس نکل بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ یہ حرکت شاید زیادہ غلط ہوتی۔ فی الحال تو میں کوئی بہانہ کر کے جان چھڑا سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں تھا کہ مجھے حیرت کا خاصا زوردار جھٹکا لگا تھا۔ میں جو کچھ دیکھ رہا تھا' اس کا مطلب یہی تھا کہ جہاز پر چوتھا مسافر بھی سفر کر رہا تھا مگر جہاز کے عملے نے اس بات کو خفیہ رکھا تھا اور وہ شخص بھی چوبیس گھنٹے شاید کیبن ہی میں رہتا تھا اس لیے اب تک دوسروں کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔

میں نے اپنے عقب میں دروازہ آہستگی سے بند کر دیا۔ تالے کی ہلکی سی کلک کے بعد بھی جب اس شخص نے حرکت نہ کی تو میں نے ایک قدم آگے بڑھایا۔ وہ بدستور ساکت رہا۔ بالآخر ایک خفیف سا شبہ محسوس کرتے ہوئے میں نے آگے بڑھ کر آہستگی سے اس کے اوپر سے کمبل اٹھایا۔ وہ کوئی مسافر نہیں' عملے کا آدمی عبدل تھا اور وہ مُردہ تھا۔ کسی نے اسے ذبح کر دیا تھا۔ اس کی گردن آدھی سے زیادہ کٹی ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میں اسی حالت میں کھڑا رہ گیا۔ کئی مناظر کسی تیز رفتار فلم کی طرح میری آنکھوں میں گھوم گئے۔ کراچی میں کلفٹن کے ساحل کے قریب دیکھی ہوئی عاشق بھٹی کی لاش...... اس کی گردن تو تن سے بالکل ہی جُدا کر دی گئی تھی۔

پھر افغان خانساماں فہمید کی صورت میری نظروں میں ابھری۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب وہ اسٹیل کا چمکتا ہوا تیز دھار چاپر لیے میرے عقب میں کھڑا تھا لیکن جس وقت میں نے کلفٹن پر عاشق بھٹی کی لاش دیکھی تھی اس وقت خانساماں فہمید تو وہاں سے میلوں دور بندرگاہ پر اپنے جہاز پیراماؤنٹ پر موجود ہوگا...... مگر یہ کچھ ایسا ضروری بھی نہیں تھا۔ میں بھی تو اس وقت پیراماؤنٹ سے میلوں دور کلفٹن پر موجود تھا لیکن بعد میں آصف بھٹی سے جھڑپ اور پھر مذاکرات سے بھی فارغ ہو کر کلفٹن سے بندرگاہ پر کھڑے ہوئے "پیراماؤنٹ" تک پہنچ گیا تھا۔ جس طرح ٹیکسی سے میں آسکتا تھا اسی طرح کوئی اور بھی تو آسکتا تھا۔

......تو کیا یہ فہمید کا کام تھا؟ لیکن فہمید کو اپنے ہی ایک ساتھی کارکن کو قتل کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟ پھر مجھے احساس ہوا کہ یہ وہاں کھڑے ہو کر اس قسم کے سوالوں پر غور کرنے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے عبدل کی لاش کو کمبل سے ڈھانپ دیا۔

مسئلہ یہ تھا کہ میں کیپٹن گوئز کو بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ میں کیبنوں کی تلاشی لیتا پھر رہا تھا اور مجھے عبدل کی لاش مل گئی تھی۔ یہ بھی درست نہیں تھا کہ میں اسی طرح کیبن کو تالا لگا کر چلا جاتا اور اپنی زبان بند رکھتا۔ کیبن واقعی خالی اور مقفل تھا۔ شاید کئی دن تک عبدل کی لاش دریافت نہ کی جاسکتی۔ اس قسم کے کیبنز میں سے تو لاش سڑنے کے بعد بھی باہر والوں کو سڑاند کا احساس شاید بہت تاخیر سے ہوتا۔ قاتل کا مقصد بھی شاید یہی تھا۔ اس نے لاش اسی لیے اس خالی کیبن میں ڈال کر اسے مقفل کر دیا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تاخیر سے اس کا پتا چلے۔ اس دوران شاید وہ غائب بھی ہو جاتا۔

دوسرے ہی لمحے میں فیصلے پر پہنچ گیا۔ مجھے ایک درمیانی راستہ سوجھ گیا تھا۔ مجھے سامنے آنے کی ضرورت بھی نہیں تھی اور عبدل کی لاش کی طرف اشارہ بھی دیا جاسکتا تھا۔ میں نے کیبن کا دروازہ پورا کھول دیا اور خود وہاں سے کھسک آیا۔ مجھے یقین تھا کہ جلد ہی کوئی وہاں سے گزرے گا تو اندر جھانک کر ضرور دیکھے گا کہ دروازہ کیوں کھلا تھا۔ اس کے بعد لاش کی موجودگی راز نہیں رہ سکتی تھی۔

میں انجن روم کے قریب جہاز کے پُل نما حصے پر پہنچ گیا جہاں کیپٹن گوئز موجود تھا۔ میں نے اس سے گپ شپ کرتے ہوئے دیوار پر آویزاں چارٹ کی طرف دیکھا جس میں ظاہر کیا گیا تھا کہ جہاز کس رفتار سے سفر کرتے ہوئے کب کس مقام پر پہنچا تھا۔

"ہم نے خاصی تیز رفتاری سے سفر کیا ہے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں۔ موسم خراب نہیں ہوا اس لیے ہم اچھی رفتار برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔" کیپٹن گوئز نے گردن ہلائی۔ "ان دنوں بحیرۂ احمر بھی پُرسکون رہتا ہے۔"

ہمیں اسی طرح گپ شپ کرتے ہوئے تین چار منٹ گزرے تھے کہ فرسٹ میٹ جنتر بوکھلایا ہوا وہاں پہنچا اور گوئز سے مخاطب ہوا۔ "کیپٹن! بہت بری خبر ہے۔ عبدل مارا گیا ہے۔"

"مارا گیا ہے؟" کیپٹن نے حیرت سے دُہرایا۔ "ہم کیا اس وقت میدانِ جنگ میں ہیں جو وہ لڑتے ہوئے مارا گیا ہے؟"

"میرا مطلب ہے اسے کسی نے قتل کر دیا ہے۔" جنتر گڑبڑا کر بولا۔ "کسی نے اس کا گلا کاٹ دیا ہے۔ فتاح تیراکی کر کے واپس آرہا تھا تو اس نے خالی کیبن کا دروازہ کھلا دیکھا۔ اس نے اندر جھانکا تو برتھ پر کوئی لیٹا نظر آیا۔ وہ اندر گیا تو اسے عبدل مُردہ پڑا ملا۔" فتاح بھی افغانی تھا اور جہاز پر غالباً سیلر تھا۔

"تم وھیل سنبھالو۔ میں ذرا جا کر دیکھتا ہوں۔" کیپٹن گوئز نے جنتر کو حکم دیا۔

میں بھی بظاہر تجسس سے مغلوب ہو کر اس کے پیچھے پیچھے لپکا۔ خالی کیبن کے دروازے پر کئی افراد جمع تھے۔ ان میں کیتھرین بھی شامل تھی۔

"کیا ہوا؟" میں نے معصوم بنتے ہوئے کیتھرین سے پوچھا۔

"کریو کے ایک آدمی عبدل کو کسی نے قتل کر دیا ہے...... بے چارہ......! نوجوان ہی تھا......!" وہ افسوس سے بولی۔

"یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے بھی تاسف زدہ لہجے میں کہا۔

کیپٹن گوئز موٹا سا سگار دانتوں میں دبائے بالکل فلمی جاسوسوں کی طرح لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ اسے یقیناً عبدل کی موت سے دھچکا لگا تھا لیکن وہ غمزدہ نظر آنے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کا سراغرساں نظر آنے کی بھی پوری پوری کوشش کر رہا تھا حالانکہ مجھے اندازہ تھا کہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔

چند لمحے بعد میں ریلنگ کی طرف چل دیا۔ میں نے دیکھا' کیتھرین بھی میرے پیچھے آرہی تھی۔ وہ ابھی تیراکی کے لباس میں ہی تھی لیکن اس کے اوپر اس نے ایک سفید اسپورٹس شرٹ پہن لی تھی جس کے بٹن کھلے تھے۔ اس کے بے ترتیب بالوں میں ابھی نمی تھی اور کچھ لٹیں اس کی پیشانی اور رخساروں سے چپکی ہوئی تھیں۔ میں اسے آتے ہوئے دیکھ کر رک گیا۔

قریب پہنچ کر وہ دھیمے لیکن کچھ بدلے بدلے سے لہجے میں بولی۔ "ڈیئر افضل چوہدری......! میرا خیال ہے' اب تم اپنی ڈرامے بازی بند کر دو۔"

اس نے مجھے مسٹر کان یا افضل کان کے بجائے 'افضل چوہدری' کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ یعنی وہ میرے اصل نام سے واقف تھی۔ میں بھونچکا رہ گیا پھر میں نے سنبھل کر کہا "میرا نام افضل چوہدری نہیں' افضل خان ہے۔"

"خواہ مخواہ کیوں اپنا سر نیم بدلنے کا تکلف کر رکھا ہے؟ اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ بس ویسے ہی تمہارے دل کو تسلی رہتی ہوگی کہ تم نے اپنا نام بدل رکھا ہے۔ بہرحال مجھے معلوم ہے تمہیں میرے والد نے میرے پیچھے لگایا ہوگا۔ انہوں نے شاید کراچی میں سیٹھ رمضان سے رابطہ کیا ہوگا اور سیٹھ رمضان نے میری نگرانی کے لیے تمہارا انتخاب کیا ہوگا۔" وہ اطمینان سے بولی۔

ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو بڑا کھسیانا محسوس کیا۔ واقعی میرا سارا ڈراما دھرا کا دھرا رہ گیا تھا۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھا۔ ہیری کلارک دو قدم کے فاصلے پر ہی موجود تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں کہا "میں ابھی تم سے بات نہیں کر سکتا۔ رات کے کھانے کے بعد جہاز کے پچھلے حصے میں فین ٹیل کے قریب مجھ سے ملنا پھر اطمینان سے بات کریں گے۔"

اس نے بے پروائی سے کندھے اُچکا دیے اور واپس کیبن کی طرف چلی گئی جہاں کیپٹن گوئز اپنے عملے سے تبادلۂ خیال کر رہا تھا۔

قتل اپنی جگہ تھا لیکن پیٹ بہرحال کھانے کو مانگتا تھا اس لیے اس شام بھی حسبِ معمول کھانے کا بندوبست ہوا۔ کھانے کے دوران اس بات پر بحث ہوتی رہی کہ کیا قتل کی رپورٹ درج کرانے اور تفتیش کے لیے جہاز کو کسی قریبی بندرگاہ پر روکا جائے؟

کیپٹن کا کہنا تھا کہ قتل کی واردات بین الاقوامی سمندری حدود میں ہوئی تھی اس لیے ہمارا ایتھوپیا یا یمن کی بندرگاہ پر رُکنا ضروری نہیں تھا۔ اس وقت ہمارے دائیں بائیں یہی دو ممالک تھے۔ میں تو بغیر کاغذات کے سفر کر رہا تھا اور حالات پہلے ہی میرے کچھ زیادہ حق میں نہیں تھے۔ میں تو خدا سے چاہتا تھا کہ ہم کسی قسم کی پولیس کارروائی میں ملوث نہ ہوں لیکن میں نے محسوس کیا کہ باقی دونوں مسافروں اور بیشتر عملے کی بھی دلی خواہش یہی تھی کہ انہیں کم از کم ایتھوپیا یا یمن کی پولیس کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

آخر کار سارا معاملہ' ساری ذمے داری اور فیصلے کا اختیار کیپٹن گوئز پر چھوڑ دیا گیا جس کے بعد یقیناً سب نے اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ کیپٹن نے حکم دیا کہ لاش کو برف میں محفوظ کر دیا جائے' جہاز کے ترکی یعنی اپنی منزل پر پہنچنے کے بعد ہی پولیس کو اس معاملے کی اطلاع دی جائے گی۔ مجھ سمیت غالباً سبھی نے سکون کی سانس لی۔

کھانے کے بعد میں ٹہلتا ہوا جہاز کے عقب میں' باہر کو نکلے ہوئے گول حصے میں چلا گیا جو فین ٹیل کہلاتا تھا۔ کچھ دیر بعد کیتھرین بھی آن پہنچی۔

وہ گویا کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "تم یقیناً تڑپ رہے ہوگے...... کسمسا رہے ہوگے کہ میں نے تمہیں پہچان لیا؟"

"نہیں۔ اس قسم کی بیماریاں مجھے لاحق نہیں ہیں۔" میں نے خشک لہجے میں کہا۔ "میں نہ تڑپا ہوں اور نہ کسمسایا ہوں۔ تھوڑا سا تجسس ضرور ہے... اور وہ فطری سی بات ہے۔ ٹھیک ہے... تم نے یہ اندازہ تو لگا لیا کہ کراچی میں تمہارے والد کا دوست سیٹھ رمضان موجود ہے۔ تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تمہارے والد تمہارے بارے میں پریشان ہیں۔ انہوں نے شاید سیٹھ رمضان سے رابطہ کیا ہو اور سیٹھ رمضان نے کسی کو بھیج دیا ہو۔ یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ انسان خیالوں کے گھوڑے دوڑا سکتا ہے اور کبھی کبھی وہ گھوڑے صحیح سمت میں بھی دوڑ پڑتے ہیں لیکن تھوڑی بہت حیرت مجھے اس پر ہے کہ تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا...... یعنی صحیح نام؟"

"محض اتفاقاً..." وہ اطمینان سے بولی۔ "میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا کہ میں پاکستان نہیں گئی ہوں۔ میں پاکستان' انڈیا اور بنگلہ دیش' تینوں ملکوں سے گھومتی ہوئی آرہی ہوں۔ مجھے ان ملکوں میں کئی کام بھی تھے۔ مجھے سیٹھ رمضان کو دیکھنے کا بڑا تجسس تھا' لیکن میں اپنی اصل حیثیت میں اس سے ملنا نہیں چاہتی تھی۔ مجھے

معلوم تھا کہ اگر میرے فکر مند پاپا اسے میرے بارے میں مطلع کر چکے ہوں گے تو وہ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ جائے گا اس لیے میں اس سے ملی ضرور.... لیکن کیتھرین کی حیثیت سے نہیں۔" وہ گویا اس ملاقات کے تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے مسکرادی۔

"تو پھر کس حیثیت سے ملیں؟" میں نے ملگجی روشنی میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ایک غیر ملکی نامہ نگار کی حیثیت سے۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "میں بظاہر اتفاقاً ایک ہوٹل میں اس سے ٹکرا گئی...."

"کون سے ہوٹل میں؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔ اس نے ہوٹل کا نام بتایا۔ وہ میرا ہی ہوٹل تھا۔ تاہم میں نے کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اسے بتایا کہ اس ہوٹل کا بے سروساماں' بے گھر اور بے در مالک اس کے سامنے کھڑا تھا۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس سیٹھ رمضان کا وہ ذکر کر رہی تھی' وہ بھی ابتدا میں اس ہوٹل میں پارٹنر تھا۔

وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "میں اس کے بارے میں تمام ضروری معلومات حاصل کیے ہوئے تھی اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت وہ اس ہوٹل میں موجود ہوگا۔ میں اتفاقاً... میرا مطلب ہے بظاہر اتفاقاً اس سے جا ٹکرائی۔ میں نے اس سے اپنا تعارف ڈیلی "سن" کی نمائندہ خصوصی سوزن فورڈ کے نام سے کرایا جو میری تھوڑی بہت شناسا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے موضوع پر ایک بہت ضخیم قسم کی رپورٹ تیار کر رہی ہوں جو پہلے اخبار میں قسط وار اور پھر کتابی شکل میں چھپے گی۔ یہ بڑا سنجیدہ اور اہم کام ہے' مجھے اس سلسلے میں اس کی طرف سے کچھ مدد مل سکے تو میں ہمیشہ شکر گزار رہوں گی...."

وہ ذرا ہنسی اور ایک لمحے کے توقف سے بولی "ویسے سیٹھ رمضان ہے بہت دلچسپ آدمی۔ سب سے پہلے تو معذرت کرنے لگا کہ دنیا کی آبادی بڑھانے میں اس کا ہرگز کوئی قصور نہیں' اس کی تو صرف ایک ہی بیٹی ہے اور بے چاری اس کی بیوی نے بھی اس معاملے میں یہاں تک اس کا ساتھ دیا کہ جوانی میں ہی دنیا سے رخصت ہوگئی کہ کہیں دنیا کی آبادی بڑھانے کے سلسلے میں اس سے کوئی بھول چوک نہ ہو جائے....."

مجھے یقین آگیا کہ وہ سیٹھ رمضان سے مل چکی تھی۔ سیٹھ رمضان اسی قسم کی باتیں کرتا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "بہرحال وہ بے چارہ فوراً میری مدد پر کمربستہ ہوگیا اور سب سے پہلے اس نے مجھے اپنے گھر کھانے پر مدعو کر ڈالا۔ میں اس کے ہاں پہنچی تو وہ نیا سوٹ پہن کر بڑے اہتمام سے بیٹھا ہوا تھا۔ خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہیں ٹک رہے تھے کہ ایک غیر ملکی جرنلسٹ اس کے ہاں آئی ہوئی تھی....."

بیمار وہ یقیناً تھوڑا سا مبالغے سے کام لے رہی تھی یا پھر اس نے سیٹھ رمضان کے انداز و اطوار سے کوئی غلط تاثر لیا تھا۔ دولت مند ہونے کے باوجود سیٹھ رمضان کو پبلسٹی کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا۔ اس کی فطرت میں بھی شہرت پسندی نہیں تھی اور ویسے بھی وہ اس خاص طبقے میں سے تھا جو احتیاطاً اور مصلحتاً بھی شہرت سے دور بھاگتا ہے۔ اس جیسے لوگ سر جھکا کر اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ اسے ملکی یا غیر ملکی پریس والوں سے ملنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا۔ البتہ خوبصورت اور سفید چمڑی والی لڑکی کو دیکھ کر ذرا ریشہ خطمی ہو رہا ہو تو بات اور تھی۔ اس بدنصیب کو کیا معلوم تھا کہ وہ اس کے دوست کی بیٹی ہے۔ وہی بیٹی جس کی بہتری کے غم میں وہ بھی دبلا ہو رہا تھا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تم مغربی لوگوں میں ایک یہ بھی بڑی خرابی ہوتی ہے کہ جھوٹ بول کر ہم بے چارے سیدھے سادے مشرقی لوگوں سے اپنا کام نکال لیتے ہو۔ ہم اپنے آپ کو ہر طرح سے قربانی کا بکرا بنا کر پیش کر دیتے ہیں اور تم لوگ بعد میں ہم پر ہنستے ہو' ہماری سادگی کا مذاق اڑاتے ہو۔"

"میں مذاق نہیں اُڑا رہی' میں تو صرف تھوڑا سا لطف اندوز ہو رہی ہوں۔" وہ جلدی سے بولی "وہ خاصا دلچسپ آدمی ہے۔ مجھے تو حیرت ہو رہی تھی کہ اس جیسے آدمی کی میرے پاپا جیسے نہایت سنجیدہ اور بارعب آدمی سے کس طرح دوستی ہوگئی...."

"سیٹھ رمضان کی ہر طرح کے آدمیوں سے دوستی ہے اور اس کی دوستیاں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں۔" میں نے کہا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ سیٹھ رمضان جتنا سادہ لوح... بلکہ بے وقوف نظر آتا ہے' اتنا بے وقوف ہے نہیں۔ اکثر اوقات یہی پتا چلانا مشکل ہوتا تھا کہ وہ بے وقوف بنا رہا تھا یا بن رہا تھا۔

کیتھرین ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "بہرحال.... اس نے مجھ اکیلی کے لیے بہت ہی پُرتکلف کھانے کا اہتمام کر رکھا تھا۔ کھانے سے پہلے اس نے مجھے اپنا پورا بنگلا دکھایا۔ بہت شاندار بنگلا تھا...."

"یہ سب باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اصل بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ تمہیں میرے صحیح نام کا کیسے پتا چلا؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"وہی تو بتانے لگی تھی۔ اب میں اسی طرف آرہی تھی۔ وہ مجھے اپنا شاندار گھر دکھا رہا تھا تو ظاہر ہے اسٹڈی میں بھی لے گیا۔ تمہارے ہاں دولت مند لوگوں کو خواہ لکھنے پڑھنے کا شوق بالکل نہ ہو لیکن گھر میں شاندار اسٹڈی ضرور ہوتی ہے۔ اس اسٹڈی کی ایک اہم بات یہ تھی کہ اس کی ایک دیوار پر تمہاری تصویر لگی ہوئی تھی۔ بڑی سی.... رنگین.... فریم شدہ تصویر۔"

"میری تصویر....؟" میں نے بے یقینی سے کہا پھر بے اختیار اُردو میں کہا "ابے مروا دیا بد بخت!"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے ہنسی اور بولی۔ "میں شاید یہی سمجھتی کہ وہ اس کا کوئی بیٹا ہوگا مگر وہ مجھے بتا چکا تھا کہ اس کا کوئی بیٹا نہیں تھا۔ اس لیے میں نے اس سے پوچھ لیا تھا کہ وہ کس کی تصویر

ہے' اس نے بڑے فخر سے بتایا تھا کہ وہ اس کے عزیز ترین دوست کی تصویر ہے۔ جس پر مجھے حیرت بھی ہوئی تھی کیونکہ سیٹھ رمضان اور تصویر والے شخص کی عمر میں بہت فرق تھا۔ پھر میں نے سوچا' شاید وہ اس دوست کی جوانی کی تصویر ہوگی۔ اس نے خود ہی مجھے تمہارا نام بتایا اور بڑی تعریفیں کرنے لگا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی نظر میں تمہاری حیثیت ایک ہیرو کی سی تھی۔ شاید تم اس کا آئیڈیل ہو۔"

پھر وہ ذرا شوخ سی نظروں سے گویا از سرِ نو میرا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ "تم میں ہیروز والی کوئی بات نظر تو نہیں آتی۔"

"ہوتی تو نظر آتی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں تو بڑا مسکین سا آدمی ہوں۔ اس گدھے سیٹھ رمضان کو اظہار عقیدت کے لیے اور کوئی تصویر نہیں ملی ہوگی۔ چُغد نے اٹھا کر میری تصویر ٹانگ دی ہوگی۔ یہ بات مجھے تو معلوم ہی نہیں تھی ورنہ تصویر کی جگہ میں اسے ٹانگ دیتا۔ خیر.... اب کیا ہو سکتا ہے۔ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔"

"میں نے تمہیں جہاز پر قدم رکھتے ہی پہچان لیا تھا۔" وہ بولی۔

"اس کا مطلب ہے تم اداکارہ اچھی ہو۔" میں نے کہا۔

"انجان بنی رہنے کی اداکاری اچھی کی تھی تم نے۔"

"تعریف کا شکریہ۔" وہ مسکرائی اور ایک لمحے کے توقف سے بولی "ویسے میں نے سیٹھ رمضان سے کچھ زیادہ جھوٹ نہیں بولا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ میں دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے بارے میں بہت سنجیدہ تحقیقی کام کر رہی ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ میں ڈیلی "سن" کی نمائندہ نہیں ہوں اور میرا نام سوزن نہیں ہے۔ یہ کام میں ایک تحقیقی ادارے کے لیے کر رہی ہوں۔"

میں ایک بار پھر اُلجھن کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اتنی معزز فیملی سے تعلق رکھنے والی.... اتنی سنجیدہ نظر آنے والی.... پڑھی لکھی دکھائی دینے والی.... اور بہت زیادہ پڑھے لکھوں جیسے کام کرنے والی لڑکی کیا واقعی ڈرگ مافیا کی آلۂ کار تھی؟

میں سوچ رہا تھا کہ میری شخصیت تو اس پر کھل ہی چکی تھی' اب اس سے کھل کر ہی بات کرلینی چاہیے تھی۔ ویسے تو سیدھے سبھاؤ پوچھنے پر کوئی اپنی زندگی کے راز اگل نہیں دیا کرتا لیکن جب وہ جہاز پر میری موجودگی کا مقصد سمجھ ہی چکی تھی تو پھر سیدھی طرح بات کرنے میں بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ شاید بات کچھ آگے بڑھتی۔ شاید اصل بات کی طرف کوئی اشارہ ملتا۔ شاید کوئی اندازہ قائم کرنے میں مدد ملتی۔

اصل موضوع پر آنے سے پہلے میں نے خواہ مخواہ جھرجھری سی لے کر کہا۔ "ہمیں اس طرح ہنس ہنس کر باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ ہمیں تھوڑا بہت تو سوگوار نظر آنا چاہیے۔ اس جہاز پر ایک لاش موجود ہے۔"

"صرف لاش ہی نہیں.... ایک قاتل بھی۔" اس نے تصحیح کی۔

"ہاں۔ ایک قاتل بھی۔" میں نے تسلیم کیا۔ "میرا خیال ہے' قاتل کے سوا باقی سب یہی سوچ رہے ہوں گے کہ قاتل کون ہو سکتا ہے۔ جہاز کے کریو میں اب آٹھ آدمی رہ گئے ہیں۔ ان کے علاوہ ہم تین مسافر ہیں۔ یعنی مشتبہ افراد کی کُل تعداد گیارہ ہے۔"

"آخر کسی کو اسے قتل کرنے کی ضرورت کیا تھی؟" کیتھرین نے سوال کیا۔

"میرا خیال تھا کہ تم اس موضوع پر کچھ روشنی ڈال سکو گی۔"

"میں.....؟" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "تمہیں یہ خیال کیونکر آیا؟"

"بس ویسے ہی... کبھی کبھی مجھے عجیب عجیب خیال آتے رہتے ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان میں سے بعض درست بھی ثابت ہوتے ہیں" میں نے بظاہر بے نیازی سے کہا۔

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے ایک لمحے مجھے گھورتی رہی پھر ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ "مسٹر چوہدری! کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم اس جہاز پر کیا کر رہے ہو؟"

"کیا واقعی تمہیں یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُلٹا اسی سے سوال کیا۔ "تمہیں اچھی طرح معلوم ہے' تمہارے والد تمہارے بارے میں بہت پریشان ہیں۔ تمہارا اندازہ صحیح ہے کہ انہوں نے فون پر سیٹھ رمضان سے مدد کی درخواست کی تھی۔ تمہارے معاشرے میں اولاد کے اٹھارہ سال کی ہونے کے بعد .... بلکہ اب تو اس سے پہلے بھی والدین انہیں کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ حتیٰ کہ اگر وہ تباہی کے گڑھے میں گر رہے ہوں تب بھی انہیں نہیں روک سکتے۔ اولاد ہر کام یہی سمجھ کر کرتی ہے کہ اس سے زیادہ عقلمندی کا کام کوئی ہو نہیں سکتا۔ بعض اوقات جھنجلا کر بھی اپنے آپ کو تباہ کرنے والے کام کرتی ہے اور اس کے لیے بیسیوں جواز گھڑ لیتی ہے۔"

"محترم واعظ چوہدری صاحب! تمہیں جو کچھ کہنا ہے' سیدھے اور صاف طریقے سے کہو۔ ناصحانہ قسم کی تقریر مت کرو۔" وہ ملائمت سے بولی۔

"نوجوان نسل نصیحت سے کتنا بھاگتی ہے..." میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "سیدھی' سچی اور صاف بات یہ ہے کیتھرین ڈیئر.... کہ تمہارے والد کا خیال ہے کہ تم ڈرگز کے دھندے میں پڑ گئی ہو اور اس کی وجہ سے کسی مصیبت میں پھنسنے والی ہو۔"

اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں لیکن وہ کچھ نہ بولی۔ اس نے مجھے بولنے کا موقع دیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "کوئی بعید نہیں کہ یہ بات درست ہو۔ میں اس جہاز پر سوار ہونے کے سلسلے میں جن دو آدمیوں سے ملا' پہلے وہ دونوں یکے بعد دیگرے قتل کر دیے گئے اور اب عبدل قتل کر دیا گیا ہے۔ یہ مجھے ڈرگ مافیا کا کام معلوم ہوتا ہے۔ کراچی کے ساحل پر میں جن دو افراد

سے ملا تھا انہیں اس جہاز پر تمہاری موجودگی کا علم تھا۔"

"کون تھے وہ؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"عاشق بھٹی اور آصف بھٹی۔ وہ دونوں سگے بھائی تھے۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ دونوں مارے جاچکے ہیں؟" اس نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں... اور اس کا مطلب ہے، تم انہیں جانتی ہو۔ کون تھے وہ...؟ اور انہیں کس نے ہلاک کیا؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"کوئی کسی کے بارے میں کچھ پوچھ لے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ میں کسی بھٹی وغیرہ کو نہیں جانتی اور مجھے نہیں معلوم کہ انہیں یا عبدل کو کس نے اور کیوں قتل کیا؟" وہ بیزاری سے بولی۔

"شاید وہ کوئی اہم بات جان گئے تھے اور اس سلسلے میں ان کے زبان کھولنے کا خطرہ تھا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "خیر... ان باتوں کو چھوڑو۔ ہم صرف تمہاری بات کرتے ہیں۔ تم کس چکر میں پھنسی ہوئی ہو؟ اگر تمہیں مدد کی ضرورت ہو تو میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں۔"

وہ تمسخرانہ سے لہجے میں بولی۔ "میں کسی چکر میں پھنسی ہوئی نہیں ہوں ڈیئر افضل چوہدری! کم از کم منشیات کے چکر میں تو ہرگز نہیں پھنسی ہوں۔ ابھی مجھے اس قسم کے ایڈونچر میں ٹانگ اڑانے یا زیادہ دولت کمانے کا جنون نہیں چڑھا۔ میں اپنی زندگی سے بہت مطمئن ہوں اور بڑے مزے میں ہوں۔ میرے والد کو میرے بارے میں فکرمند رہنے کی عادت ہے۔ وہ تھوڑے تھوڑے سے نفسیاتی مریض ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سیٹھ رمضان نے ان کی باتوں کا صحیح تاثر نہ لیا ہو۔"

"اس قسم کے جہاز اکثر ہیروئن لے کر یورپ کی طرف جاتے ہیں۔ کہیں تم اس قسم کی کسی کھیپ کی نگرانی تو نہیں کررہیں؟" میں نے ہمت نہیں ہاری تھی اور سیدھے سادے انداز میں براہِ راست اس سے ہر بات پوچھے جارہا تھا۔

"میں ابھی اتنے اہم عہدے پر فائز نہیں ہوئی اور میں نے زندگی میں کبھی ہیروئن نہیں دیکھی۔" وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنس کر بولی پھر اس نے یوں میرا گال تھپتھپایا جیسے کسی بچے کو بہلانے کی کوشش کررہی ہو۔ "آخر تم اپنے کام سے کام کیوں نہیں رکھتے؟ دوسروں کے معاملات میں ٹانگ اڑانے سے بعض اوقات ٹانگ ٹوٹ جاتی ہے۔"

"ٹانگ کیا بعض اوقات تو گردن بھی ٹوٹ جاتی ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن میں جو کچھ پوچھ رہا ہوں، اپنا کام سمجھ کر ہی پوچھ رہا ہوں۔ ایک تو تم خود دیکھ کر آچکی ہو کہ سیٹھ رمضان میرا کیسا دوست ہے۔ اس نے میری ڈیوٹی لگائی ہے کہ تمہارا خیال رکھوں۔ اب تم خود ہی بتاؤ، میں اس کا کہا کیسے ٹال سکتا ہوں؟ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ تمہیں دیکھنے کے بعد خواہ مخواہ ہی تمہارا خیال رکھنے کو جی چاہنے لگا ہے۔"

"بس... بس رومینٹک ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر گویا مجھے روکا۔ حالانکہ میں اس کی طرف بڑھ نہیں رہا تھا۔ میں تو اپنی جگہ کھڑا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بڑی ان رومینٹک لڑکی ہوں۔"

"یہ کیسے ہوسکتا ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "اگر تم لڑکی ہو تو پھر ان رومینٹک نہیں ہوسکتیں۔ خیر... یہ معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ یہ بتاؤ تم پاکستان، بنگلہ دیش اور انڈیا میں کیا کرتی پھر رہی تھیں؟"

"میں نے بتایا نا کہ میں بڑھتی ہوئی آبادی کے بارے میں تحقیقی کام کررہی ہوں۔ ان تین ملکوں میں جائے بغیر تو اس موضوع پر کوئی مشاہدہ مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ خدا کی پناہ... کس بری طرح ان ملکوں کی آبادیوں میں اضافہ ہو رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھروں میں بھیڑ بکریوں کی طرح انسان بھرے ہوئے ہیں۔ کیڑے مکوڑوں کی طرح سڑکوں پر رینگ رہے ہیں۔ بنگلہ دیش میں میں نے دیکھا، ایک ایک جھونپڑی میں ایک ایک جوڑے کے بارہ بارہ بچے ہیں اور کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ انڈیا کے تمام بڑے شہروں میں مجموعی طور پر کروڑوں انسان فٹ پاتھوں پر رہ رہے ہیں۔ وہیں شادی بیاہ ہو رہے ہیں... بچوں کو جنم دیا جارہا ہے۔ لوگ گندے جوہڑوں کا پانی پی رہے ہیں۔ بعض جگہوں کے حالات دیکھ کر تو مجھے رات کو اپنے ہوٹل کے کمرے میں نیند نہیں آئی۔"

"درست ہے..." میں نے تسلیم کیا "اس خطے کے حالات لرزہ خیز ہیں لیکن جنت تو مغربی ممالک بھی نہیں ہیں۔ ان کے بھی بے شمار حصے ایسے ہیں جہاں کے حالات دیکھ کر راتوں کی نیند اُڑ سکتی ہے لیکن ایشیائی ملکوں کی آبادی کے بارے میں تم مغرب والوں کی تشویش دیکھ کر مجھے کچھ شک سا ہونے لگتا ہے۔ سفید فام قومیں تو غرض کے بغیر دنیا کا کوئی کام نہیں کرتیں۔ تم لوگ جس طرح آبادی کو کنٹرول کرنے کے سلسلے میں ان ملکوں کے لیے پریشان رہتے ہو، امداد دینے کے لیے بھی تیار رہتے ہو، اس سے کیا واقعی تمہیں ان ملکوں کی بہتری مطلوب ہے یا اس کے پیچھے کوئی خوف کارفرما ہے؟"

"خوف؟ ہمیں کیا خوف لاحق ہوسکتا ہے؟" وہ تیزی سے بولی "جس رفتار سے بنگلہ دیش جیسے چھوٹے سے ملک کی آبادی بڑھ رہی ہے... اندازہ یہی ہے کہ ۲۰۰۵ء میں وہاں کی آبادی امریکا سے زیادہ ہوجائے گی لیکن اس سے امریکا کی صحت پر کیا اثر پڑ جائے گا؟ مفلوک الحال لوگوں کی آبادیاں بڑھنے سے سُپرپاورز کی صحت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ ہم صرف فلاحی نقطۂ نظر سے اس کے بارے میں متفکر ہیں۔" اس کا لہجہ خاصا دانشورانہ اور مدبرانہ ہوگیا۔

"بہت خوب... بہت خوب۔" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا "اچھا یہ بتاؤ، تم نے سفر کے لیے اسی جہاز کا انتخاب کیوں کیا؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔" وہ اطمینان سے بولی۔ "میں کراچی میں تھی تو میں نے کچھ لوگوں کو باتیں کرتے سنا تھا کہ اس [illegible] کے جہازوں پر انسان زیادہ سکون سے سفر کرسکتا ہے۔ چیکنگ [illegible] زیادہ سخت نہیں ہوتی۔"

"تمہیں چیکنگ سے کیا خوف تھا؟ میرا خیال ہے، تمہارے پاس تو پاسپورٹ ویزا وغیرہ سب کچھ ہوگا۔" میں نے یہ ظاہر نہیں کیا کہ میں یہ چیزیں اس کے سامان میں دیکھ چکا تھا۔

"ہاں۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔ مجھے چیکنگ کا کوئی خوف نہیں تھا۔ وہ تو میں ویسے ہی لوگوں سے سُنی ہوئی بات بتا رہی ہوں۔ مجھے تو صرف سکون کی تلاش تھی۔ یہ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں۔ مجھے پتا چلا کہ کراچی پورٹ پر یہ جہاز کھڑا ہے جس پر افغانستان سے تیل کی کھدائی کی مشینری خشکی کے راستے لاکر لادی جارہی ہے۔ میں نے سوچا، استنبول جانے کے لیے یہ روٹ ٹھیک رہے گا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ کچھ جھوٹ، کچھ سچ بول رہی تھی لیکن میرے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں تھا جس سے میں اس کے جھوٹ سچ کو الگ کرسکتا۔ میں نے اس کی باتوں پر کسی شبے کا اظہار کیے بغیر پوچھا "تم بتا رہی تھیں کہ ترکی میں تم کسی سے ملنے جارہی ہو جس کے بعد شاید تم ترکی میں ہی رہ جاؤ۔ اگر تم اسے زیادہ ذاتی سوال نہ سمجھو تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ وہ کون ہے؟"

وہ ایک بار پھر گویا میری کسی نامعلوم کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہنسی۔ شاید اس کا اب بھی یہی خیال تھا کہ میں اندر سے بہت پریشان اور بے چین ہوں۔ حالانکہ میری کم از کم فی الحال یہ کیفیت نہیں تھی۔ ہنسی تھمی تو وہ بولی "میری بات سن کر تم سمجھے ہوگے کہ شاید ترکی میں میرا کوئی بوائے فرینڈ میرا انتظار کررہا ہوگا جس سے ملاقات کے بعد میں مستقبل کا پروگرام طے کروں گی اور شاید ترکی میں ہی رہ جاؤں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ استنبول میں میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں بلکہ میرے والد ہی میرا انتظار کررہے ہیں۔ وہ وہاں کسی نیم سرکاری مشن پر آئے ہوئے ہیں۔ میرے وہاں پہنچنے تک وہ فارغ ہوچکے ہوں گے۔ وہاں سے شاید ہم دونوں آگے یورپ تک جائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ مزید کچھ عرصہ ترکی میں گزارنے کے بعد انگلینڈ واپس چلے جائیں۔ ابھی میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔"

"لیکن سیٹھ رمضان نے تو مجھے بتایا تھا کہ تمہارے والد نے اسے انگلینڈ سے فون کیا تھا۔" میں نے کہا۔

"وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہوگا۔ اس وقت وہ انگلینڈ ہی میں ہوں گے۔ وہ بھی ملک در ملک گھومتے رہتے ہیں۔ فرق [illegible] ہے کہ وہ سرکاری یا نیم سرکاری دوروں پر ہوتے ہیں۔ وہ ریٹائر ہوچکے ہیں لیکن حکومت کو اب بھی ان کی خدمات کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔"

"وہ کہیں اسپائی تو نہیں ہیں؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ "سُنا ہے، ایجنٹ عملی طور پر کبھی ریٹائر نہیں ہوتے۔"

"نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ خوش دلی سے ہنسی۔ "وہ ایجنٹ وغیرہ ہرگز نہیں ہیں۔ وہ تو سیدھے سادے، شریف سے آدمی ہیں البتہ سفارتی معاملات کے بڑے ماہر ہیں اس لیے حکومت کو اکثر ان کی خدمات کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔"

میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس روپ میں بھی نہ جانے کتنے لوگ اسپائی کے طور پر کام کرچکے تھے۔ بظاہر وہ سفارتی معاملات کے ماہر سمجھے جاتے تھے اور سفارتی شعبوں سے ہی متعلق ہوتے تھے لیکن درحقیقت اسپائی ہوتے تھے۔ کہیں باپ بیٹی دونوں ہی تو شاہکار قسم کی چیز نہیں تھے اور دنیا بھر میں گل کھلاتے تو نہیں پھر رہے تھے؟ ممکن تھا، دونوں کو ایک دوسرے کی لائن ناپسند رہی ہو اور دونوں ایک دوسرے کو اپنی اپنی لائن پر لانے کے لیے کوشاں ہوں۔

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا، فرسٹ میٹ جنتر نے ہمیں وہاں کھڑے دیکھ لیا اور ٹہلتا ہوا ہماری طرف آگیا۔

"آج کی رات خوشگوار ہے۔ شکر ہے گرمی نہیں ہے۔" اس نے حسبِ معمول موسم سے بات شروع کی۔

"جہاز جب استنبول پہنچے گا تو کیا ہوگا؟" کیتھرین نے اس سے پوچھا "کیا ہم سب کو پوچھ گچھ کے لیے روکا جائے گا؟" چہرے سے وہ خواہ کتنی ہی بے فکر نظر آرہی تھی لیکن مجھے نہ جانے کیوں محسوس ہو رہا تھا کہ اندر ہی اندر وہ فکرمند ضرور تھی۔ آخر اسے کیا فکر تھی؟ فکرمند تو مجھے ہونا چاہیے تھا جس کے پاس پاسپورٹ تک نہیں تھا۔

"ہاں۔ میرا خیال ہے پوچھ گچھ تو ہوگی۔" جنتر متذبذب لہجے میں بولا "ویسے مجھے صحیح طور پر معلوم نہیں ہے۔ میں نے جتنے بھی جہازوں پر ملازمت کی ہے، ان میں سے کسی پر کبھی قتل کی کوئی واردات نہیں ہوئی۔ بہرحال کیپٹن گوئز کا خیال ہے کہ استنبول چونکہ دارالخلافہ ہے، وہاں کچھ زیادہ ہی افسران موجود ہوں گے اس لیے وہاں زیادہ اُلجھن پیش آنے کا اندیشہ ہے۔ استنبول سے پہلے ہمیں بودرم کی بندرگاہ پر رکنا ہے۔ وہ چھوٹی جگہ ہے۔ کیپٹن نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم وہاں قتل کی رپورٹ درج کرادیں گے۔"

پھر اس نے خاص طور پر گویا میری معلومات کے لیے بتایا۔

"یہ جزیرہ رہوڈز سے ذرا آگے ایجین ہی کی ایک بندرگاہ ہے۔ ہمیں کچھ سامان وہاں بھی اتارنا ہے۔"

"میں تو اپنے کیبن میں جارہی ہوں۔" کیتھرین تھکے تھکے سے انداز میں انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔ "صبح تم دونوں سے ملاقات ہوگی۔"

میں بھی جلد ہی اپنے کیبن میں لوٹ آیا۔ میں نے محسوس کیا کہ جہاز پر ایک قاتل کی موجودگی کے احساس نے عملے تک کو

خوفزدہ کر دیا تھا۔ ڈیک پر کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میں بھی جلد ہی سونے کے لیے لیٹ گیا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک ہی چابی سب کیبنز میں لگتی تھی۔ میں نے اٹھ کر احتیاطاً ایک کرسی دروازے کے ہینڈل کے نیچے پھنسادی۔

سفر کی پانچویں صبح ناشتے کی میز پر کیپٹن گوئز نے اعلان کیا کہ وہ جہاز کی رفتار بڑھا رہا ہے تاکہ مقررہ شیڈول سے کئی گھنٹے پہلے ہم اسی شام نہر سوئز میں داخل ہو جائیں۔ جہاز پر ایک لاش کی موجودگی کے باعث یا پھر شاید کسی اور وجہ سے وہ کچھ مضطرب نظر آرہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ جلد از جلد کسی بندرگاہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔ شاید بندرگاہ پر وہ کچھ تحفظ محسوس کرتا تھا۔

اس وقت ہم بحیرۂ احمر کے وسط میں سفر کر رہے تھے۔ پیری کلاکر کو شکوہ تھا کہ دونوں طرف ساحل اتنی دور تھا کہ اسے پرندے دیکھنے کو نہیں مل رہے تھے۔ ویسے وہ شخص صحیح معنوں میں اپنے شوق کے ساتھ مخلص تھا۔ سب اپنے اپنے تفکرات میں اُلجھے ہوئے تھے لیکن اسے پرندوں کی پڑی ہوئی تھی۔

کیتھرین کافی تاخیر سے ناشتے کے لیے میس میں آئی اور اس نے ناشتا بھی صحیح طور پر نہیں کیا۔ وہ کچھ پریشان معلوم ہوتی تھی۔ میں نے پہلی بار اسے پریشان دیکھا تھا۔ اتنی پریشان میں نے اسے اس وقت بھی نہیں دیکھا تھا جب عبدل کی لاش دریافت کی گئی تھی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ صحیح طور پر سو بھی نہیں سکی تھی۔

میں ناشتا کر چکا تھا اس لیے میں اٹھ کر جانے لگا تو وہ ایک لمحے کے لیے میرے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ "ڈیک پر ذرا میرا انتظار کرنا، میں کافی پی کر آرہی ہوں۔ مجھے تم سے بات کرنی ہے۔" اس نے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں یہ بات کی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ڈیک پر آگیا۔

کچھ دیر کے بعد وہ بھی ڈیک پر آپہنچی۔ اس وقت وہ ٹریک سوٹ میں تھی۔ میں اسے اس ٹریک سوٹ میں اس سے پہلے روزانہ علی الصباح ڈیک پر جوگنگ کرتے دیکھ چکا تھا لیکن آج گویا وہ جوگنگ کو بھول گئی تھی۔

"کیا بات ہے.... کیوں اتنی پریشان نظر آرہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ذرا میرے کیبن میں چلو، میں تمہیں ایک چیز دکھانا چاہتی ہوں۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھ کر قدرے متوحش لہجے میں کہا۔ اس لمحے وہ مجھے ایسی لڑکی دکھائی دی جس کا واقعی منشیات کی اسمگلنگ وغیرہ سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے خیال آیا، کہیں کسی نے اس کی لاعلمی میں اسے منشیات لے جانے کے لیے تو استعمال نہیں کر لیا تھا۔ عین ممکن تھا، کسی نے اس کے سامان میں ہیروئن یا کوکین چھپادی ہو۔ اسے علم نہ ہو اور اب اچانک اس نے اتفاقاً وہ چیز دریافت کر لی ہو اسی لیے خوفزدہ نظر آرہی ہو لیکن

پھر مجھے یاد آیا کہ میں خود اس کے سامان کی نہایت باریک بینی سے تلاشی لے چکا تھا۔ اگر مجھے کچھ نہیں ملا تھا تو اسے بھی ملنا مشکل ہی تھا۔

بہرحال میں خاموشی سے اس کے پیچھے چل دیا۔ اپنے کیبن کا تالا کھول کر وہ سیدھی دیوار گیر بستر کے پاس پہنچی۔ اس نے بستر سے کمبل اور چادریں ہٹادیں۔ نیچے فوم کا گدا تھا اور اس پر عنابی رنگ کا ایک بڑا سا خشک دھبا نظر آرہا تھا۔ مجھے فوری طور پر اندازہ ہو گیا کہ وہ خشک شدہ خون کا داغ تھا۔

"تمہیں یہ کب نظر آیا؟" میں نے پوچھا۔

"آج صبح۔" اس نے جواب دیا۔ "رات مجھے صحیح طور پر نیند نہیں آئی۔ میں کچھ زیادہ ہی کروٹیں بدلتی رہی۔ گدے سے چادر ہٹ گئی اور آج صبح میری اس داغ پر نظر پڑی۔ میرا خیال ہے، عبدل کو میرے کیبن میں قتل کیا گیا تھا۔"

"لگتا تو یہی ہے۔" میں نے اس کی تائید کی "تمہارے کیبن سے کوئی چیز غائب تو نہیں ہے؟"

"اگر غائب بھی ہوگی تو ابھی مجھے اس کا علم نہیں ہو سکا۔ میرا خیال ہے میں اپنے سامان کا جائزہ لے لوں۔"

وہ سامان کا جائزہ لینے لگی لیکن پھر یک دم ہی اسے نہ جانے کیا خیال آیا کہ ایک کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ سسکیوں کے درمیان وہ بولی۔ "میرے تو اس تصور سے رونگٹے کھڑے ہو رہے ہیں کہ میں رات بھر اس بیڈ پر سوتی رہی جس پر ایک شخص کو ذبح کیا گیا تھا۔"

"جو ہو چکا، اب اس کے بارے میں سوچ سوچ کر رونا بیکار ہے۔" میں نے کچھ مشفقانہ سے انداز میں اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی پریشانی کی وجہ محض یہ احساس نہیں تھا کہ وہ لاعلمی میں رات بھر اس بیڈ پر لیٹی رہی تھی جس پر کسی شخص کو ذبح کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کی پریشانی کی وجہ کچھ اور بھی تھی، کوئی اور خیال بھی اسے ستا رہا تھا۔

"میرا خیال ہے، تم واقعی کسی مشکل میں ہو۔ تمہارے والد کا خیال صحیح تھا۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

"مشکل...؟ ویسے تو کوئی مشکل نہیں ہے..." وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ "بس مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں نے اس جہاز پر سوار ہو کر غلطی کی ہے۔ یہ کچھ عجیب.... پُراسرار سا جہاز ہے۔ معلوم نہیں اس پر کیا ہو رہا ہے۔"

"ویسے تو کوئی خاص بات نہیں ہے۔ بس ایک قتل ہو گیا ہے جس کے سلسلے میں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ البتہ اگر کوئی اور پریشانی ہے تو بتاؤ۔"

"خدا نہ کرے کہ مجھے کوئی اور پریشانی ہو" وہ رونا بھول کر جلدی سے بولی۔

"میرا خیال ہے، کل تک سب لوگ پُرسکون ہو جائیں گے۔"

نے کہا۔ "کیپٹن گوئز بتا رہا تھا کہ آج رات ہم نہر سوئز سے گزر جائیں گے اور کل پُرسکون سمندر میں ہوں گے۔ سمندر پُرسکون ہو تو مسافر بھی پُرسکون ہو جاتے ہیں۔"

میں مزید چند منٹ اسے تسلیاں دے کر باہر آگیا۔ اس روز گویا سب ایک دوسرے کا سامنا کرنے سے کترا رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عملے سمیت ہر شخص کو دوسرے پر قاتل ہونے کا شبہ تھا۔ کیتھرین اور کلاکر دونوں اپنے اپنے کیبن تک محدود ہو کر رہ گئے۔ مجھے حیرت تھی کہ اب تو کلاکر بھی پرندوں کا نظارہ کرنا بھول گیا تھا۔ اس روز اس مقام پر بھی ماہی گیروں کی ایک لانچ مچھلی فروخت کرنے کے لیے جہاز کے قریب آئی لیکن اسے نہایت بے رُخی سے جواب دے دیا گیا۔

اس سے پہلے میں محسوس کر رہا تھا کہ میں جدھر بھی جاتا تھا، نامعلوم افراد کی نظریں میرا تعاقب کرتی تھیں لیکن آج گویا وہ بھی مجھ پر نظر رکھنا بھول گیا تھا۔ میں موقع مناسب دیکھ کر ڈیک کے نیچے چلا گیا۔ بظاہر میں انجن روم کی طرف جا رہا تھا لیکن راستے میں، میں اس حصے کی طرف مُڑ گیا جس میں سامان لادا جاتا تھا۔ جہاز کے خانے کا بہت بڑا حصہ اسی مقصد کے لیے وقف تھا۔

جہازوں کے ان حصوں میں منوں کیا ٹنوں کے حساب سے بھی کوئی چیز اسمگل کی جاسکتی ہے۔ یہ جہاز گو کہ زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن اس میں بھی بہت گنجائش تھی۔ اس بڑے ہال نما حصے میں لکڑی کی بڑی بڑی مضبوط پیٹیاں بھری ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک پیٹی کو اپنی جگہ سے ہلانا شاید آٹھ دس آدمیوں کے بھی بس کی بات نہیں تھی۔ وہ بھاری مشینری ہی کی پیٹیاں معلوم ہوتی تھیں جنہیں لوہے کی پٹیوں کی مدد سے پیک کیا گیا تھا۔ ان پیٹیوں کو کھول کر دیکھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔

تاہم میرے لیے حیرت کی بات یہ تھی کہ تیل کی کھدائی کے لیے استعمال ہونے والی مشینری افغانستان سے آرہی تھی جبکہ افغانستان میں میری معلومات کے مطابق تیل نہیں پایا جاتا تھا۔

میں ڈیک کی طرف واپس جا رہا تھا تو راستے میں مجھے کیپٹن گوئز مل گیا۔ میں اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ "تم نے بتایا تھا کہ تیل کی کھدائی کی مشینری افغانستان سے آئی ہے لیکن افغانستان میں تو تیل نہیں پایا جاتا۔"

"بے شک۔" کیپٹن نے تسلیم کیا۔ "اسی لیے تو انہیں اس مشینری کی ضرورت نہیں ہے۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے انہوں نے کسی امید کے سہارے یہ مشینری خریدی ہوگی لیکن جنگ کے بعد سے اب تک وہاں صرف عوام کا تیل نکلا ہے۔ زمین سے کہیں تیل برآمد نہیں ہو سکا اور جس حساب سے اس سرزمین پر خون بہا ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ اب وہاں کھدائی ہو تو کہیں زمین سے خون کے چشمے ہی نہ اُبل پڑیں۔ اب تو خیر ویسے ہی انہیں کھدائی کی فرصت نہیں۔ پورا ملک توپوں وغیرہ کے گولوں اور بموں سے کھدا پڑا ہے۔ اوپر سے معاشی حالت تباہ ہے چنانچہ انہوں نے یہ مشینری ترکی کے ہاتھ بیچ دی ہے جہاں تیل موجود ہے۔"

مزید چند منٹ اس سے بات چیت میں گزرے پھر میں اپنے کیبن کی طرف واپس آگیا اور آرام کرنے لگا۔ سفر کا اختتام قریب تھا اور ابھی تک میں کیتھرین کے مسئلے کے بارے میں کچھ نہیں جان سکا تھا تاہم میں کچھ اندازے قائم کرنے کی بساط بھر کوشش کر رہا تھا۔

دوسرے روز علی الصباح جہاز نہر سوئز سے نکل آیا اور کھلے سمندر میں داخل ہوا۔ میں اپنے کیبن سے نکل کر ریلنگ پر جا کھڑا ہوا۔ تھوڑی دیر میں یکے بعد دیگرے کیتھرین اور کلاکر بھی اپنے کیبنوں سے نکل آئے اور طلوع آفتاب کا نظارہ کرنے لگے۔ کیتھرین آج بھی جوگنگ نہیں کر رہی تھی تاہم اب اس کی طبیعت کچھ بہتر نظر آرہی تھی۔ کلاکر بھی شاید اس تصور سے کچھ مطمئن نظر آرہا تھا کہ وہ لوگ اپنی منزل کے قریب پہنچ رہے تھے۔ سفر ان کے طے شدہ شیڈول سے پہلے ہی ختم ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔

ناشتے کی میز پر کیپٹن گوئز نے اعلان کیا۔ "ہم لوگ آدھی رات کے قریب.... یعنی شیڈول سے بارہ گھنٹے پہلے بودرم پہنچ جائیں گے۔ اگر سمندر کا اتار چڑھاؤ ٹھیک ہوا تو ہمیں فوراً برتھ مل جائے گی اور ہم علی الصباح وہاں سامان اتارنا شروع کر دیں گے۔ اس دوران میں عبدل کے قتل کے سلسلے میں حکام سے نمٹ لوں گا۔ میرا خیال ہے، وہ پوچھ گچھ تو سب سے کریں گے لیکن امید ہے ہم لیٹ ہوئے بغیر آگے روانہ ہو جائیں گے۔"

جب دوسرے لوگ ہماری طرف متوجہ نہیں تھے تو میں نے نیچی آواز میں کیپٹن سے پوچھا۔ "میرا کیا بنے گا؟ میرے پاس تو پاسپورٹ تک نہیں ہے۔ مجھے تو فوراً مشکوک سمجھ لیا جائے گا۔"

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے دوستانہ انداز میں مجھے تسلی دی۔ "میں نے تم سے اتنی رقم تمہیں اس قسم کی پریشانیوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ہی لی ہے۔ تمہیں سامنے آنے کی ضرورت ہی نہیں۔ میں کسی سے ذکر ہی نہیں کروں گا کہ تم بھی جہاز پر موجود ہو۔ اتنے بڑے جہاز پر چھپے رہنا کوئی مشکل مسئلہ نہیں۔"

"اگر کسی نے میری موجودگی کی مخبری کر دی؟" میں نے پوچھا۔

"میرے کریو میں سے تو کوئی ایسا نہیں کر سکتا۔ باقی صرف دو مسافر رہ جاتے ہیں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلے گا کہ تم سے پوچھ گچھ ہوئی ہے یا نہیں۔ وہ یہی سمجھیں گے کہ جس عمل سے وہ گزرے ہیں، اسی سے تم بھی گزرے ہو۔" اس نے اطمینان دلایا۔ میں نے سوچا، وہ جہاز کا کیپٹن تھا۔ اگر وہ میرے بارے میں فکرمند نہیں تھا تو مجھے فکرمند ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا۔

کیپٹن گوئز کا خیال تھا کہ کھلے سمندر میں آکر سفر زیادہ پُرسکون

گزرے گا لیکن اس کی یہ توقع پوری نہ ہوئی۔ سمندر پُرسکون نہیں تھا۔ تلاطم کی وجہ سے دوپہر تک کیتھرین کی طبیعت اتنی خراب ہوئی کہ اس نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا۔ اسے ایک آدھ قے ہوئی اور اس کے بعد بھی اُبکائیاں آتی رہیں۔ شام تک کلاکر کی رنگت بھی زرد نظر آنے لگی۔

مجھے اس دوران جنتر نظر آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا تجربہ کیا کہتا ہے، سمندر کب تک اس طرح رہے گا؟ بے چارے مسافروں کی حالت خراب ہو رہی ہے۔"

"تم تو بالکل ٹھیک نظر آرہے ہو۔" وہ میرے سوال کا جواب دینے سے پہلے مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں تو ذرا ڈھیٹ اور سخت جان واقع ہوا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "میری بات چھوڑو۔ میں تو کیتھرین اور کلاکر کی بات کر رہا ہوں۔"

"سورج غروب ہونے تک وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ہمارے حساب سے تو سمندر پُرسکون ہی ہے۔ یہ تلاطم تو کچھ بھی نہیں ہے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

اس کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔ شام کے سائے گہرے ہونے لگے تو ہوا کے تھپیڑے دھیمے پڑ گئے اور سمندر کو گویا قرار سا آنے لگا۔ ہلکی ہوا کے مدّھم جھونکے گویا اسے تھپکیاں دے کر سُلانے لگے اور اس کے ساتھ ہی کیتھرین اور کلاکر کی طبیعت بھی سنبھلنے لگی۔ تنہائی کے خوف سے وہ اپنے کیبن میں بھی نہیں جا رہے تھے۔ مُبادا ان کی طبیعت خراب ہو اور کسی کو پتا بھی نہ چلے۔ اس لیے وہ ڈیک پر ہی موجود تھے تاکہ آتے جاتے لوگوں کی نظر میں رہیں اور مدد کی ضرورت ہو تو وہ آسانی سے کسی کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں۔

کیتھرین کی حالت بہتر دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا لیکن ساتھ ہی ایک اور اضطراب سا لاحق ہو گیا۔ میں ریلنگ کے پاس کھڑا اُفق کی طرف دیکھ رہا تھا جب مجھے شبہ ہوا کہ میں نے کسی بڑے جنگی جہاز کا ہیولا اپنے جہاز کی طرف بڑھتے دیکھا ہے۔ میں اسے زیادہ واضح طور پر نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس وقت تک سورج مکمل طور پر ڈوب چکا تھا اور اُفق پر بہت تیزی سے اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں اسی سمت میں دیکھتا رہا لیکن جب اندھیرا گہرا ہو گیا تب بھی مجھے کسی جہاز کی روشنیاں نظر نہ آئیں۔ بالآخر میں نے یہ سوچ کر اس کا خیال ذہن سے جھٹک دیا کہ شاید وہ جہاز کسی اور سمت میں سفر کر رہا ہو۔

رات کو دس بجے کے قریب میں جہاز کے فین ٹیل والے حصے میں کھڑا تھا کہ کیتھرین بھی ٹہلتی ہوئی ادھر آ نکلی۔

"اب تمہاری طبیعت کیسی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب تو میں بالکل ٹھیک ہوں۔ اسی لیے تو گھوم پھر رہی ہوں۔ یہ دھیمی خُنک ہوا بہت بھلی لگ رہی ہے۔" اس نے سر اٹھا کر ایک گہری سانس لی اور بولی "سمندری سفر کے لیے مجھ میں زیادہ قوتِ

برداشت نہیں ہے۔"

"اس کے باوجود تم ٹرین یا ہوائی جہاز سے سفر کرنا پسند نہ کرتیں۔ ویسے تم انڈیا اور بنگلہ دیش وغیرہ کیسے گئی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے ہوائی جہاز سے سفر کیا تھا۔" اس نے قدرے شرمیلے سے انداز میں اقرار کیا۔ "لیکن یہ حقیقت ہے کہ مجھے ہوائی سفر اچھا نہیں لگتا۔ صرف مجبوری میں کرتی ہوں۔ پھر میری ملاقات جنتر سے ہوئی۔ اس نے اپنے جہاز کا ذکر کیا اور میں نے محسوس کیا کہ میرے سفر کے لیے یہ ٹھیک رہے گا۔"

"جنتر سے تمہاری ملاقات کہاں ہوئی تھی؟" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"بمبئی کے قریب واقع ایک ریسرچ لیبارٹری میں۔" اس نے جواب دیا۔ "بعض شعبوں میں انڈین سائنس داں بڑا زبردست کام کر رہے ہیں۔"

"تم کس سلسلے میں ان کا کام دیکھنے چلی گئی تھیں؟" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"میں بڑھتی ہوئی آبادی کے موضوع پر جو تحقیقی کام کر رہی ہوں اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ برتھ کنٹرول کی دوائیں بھی اس سلسلے کا ایک موضوع ہیں۔ انڈین سائنس داں اس میدان میں بڑی محنت کر رہے ہیں۔ میں ذرا ان کے کام کا جائزہ لینے گئی تھی۔" اس نے اطمینان سے بتایا۔

"ریسرچ لیبارٹریز کے کام تو عام طور پر خاصے خفیہ قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ ہر ایرے غیرے کو تو اپنے ہاں نہیں گھسنے دیتے۔" میں نے کہا۔

"میں کوئی ایرا غیرا تو نہیں ہوں۔" وہ گویا بُرا مناتے ہوئے بولی۔ "میرے پاس ایک بین الاقوامی ادارے کا تعارفی خط ہے۔ میں اسی ادارے کے لیے کام کر رہی ہوں۔ دنیا میں جہاں بھی کام ہو رہا ہو گا، وہاں مجھے خوش آمدید کہا جائے گا اور جہاں تک اس ادارے کے..... یا ان کے ملک کے قوانین اجازت دیں

ہی ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کریں گے۔"

"بہت خوب۔" میں نے سر ہلایا۔ "لیکن جنتر وہاں کیا کر رہا تھا؟ کیا وہ بھی کوئی ریسرچ اسکالر ہے؟ وقت گزاری کے لیے وہ ملازمت کر رہا ہے؟"

"یہ تو میں نے اس سے نہیں پوچھا۔" اس نے گویا میرے طنزیہ لہجے پر دھیان دیے بغیر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "مجھے اس وقت..... بلکہ ابھی تک خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اب تم نے بات کی ہے تو خیال آیا ہے....."

اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا کیونکہ میں جہاز کے برج کی طرف دیکھنے لگا تھا جس پر مجھے دو تین افراد کے دوڑنے کی آواز سنائی دی تھی۔ دفعتاً ہمارے جہاز سے تقریباً ایک میل آگے یکے بعد دیگرے دو چیزیں دھماکے سے پھٹیں اور ایک دو سیکنڈ کے لیے سمندر کا بہت بڑا حصہ روشنی میں نہا گیا۔ پھر وہ روشنی معدوم ہو گئی۔

"یہ کیا تھا؟" میں نے چیخ کر پوچھا۔

کیپٹن گوئز پائلٹ ہاؤس سے باہر آیا اور برج سے جھانکتے ہوئے بولا۔ "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ترکی کے ایک جنگی جہاز نے ہمیں خبردار کرنے کے لیے دو فائر کیے ہیں۔ کچھ لوگ جہاز پر آرہے ہیں۔" پھر اس نے مجھے مخاطب کیا۔ "مسٹر خان! تم ذرا اوپر آجاؤ۔ مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"یہ آدھی رات کو ہمارے جہاز پر کون لوگ آرہے ہیں؟" کیتھرین خوفزدہ سے لہجے میں بولی۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"مجھے خود نہیں معلوم۔" میں نے جواب دیا۔ "میں ذرا کیپٹن گوئز کی بات سن کر آتا ہوں۔"

وہ میرا بازو تھامتے ہوئے بولی۔ "مت جاؤ۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" میں اس کی سہمی ہوئی سانسوں کی حرارت اپنے سینے پر محسوس کر سکتا تھا۔ میرا گریبان کھلا تھا۔

"تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ میں ابھی آیا۔ تم یہیں ٹھہرو۔ اگر مجھے دیر لگی تو میں تمہیں بھی وہیں بلا لوں گا۔" میں نے اس کے گداز کندھے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

میں دوڑتا ہوا پائلٹ ہاؤس میں پہنچا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ کیپٹن گوئز کچھ ایسا پریشان دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں حسبِ معمول موٹا سا سگار دبا ہوا تھا۔

وہ اندرونی کیبن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "وہاں تین چار یونیفارم لٹکے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جو تمہیں اپنے لیے مناسب نظر آئے وہ پہن لو۔ اب تم اس جہاز کے سی مین ہو۔ اب تم جس سے بھی بات کرو گے اسی حیثیت سے کرو گے۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں تاخیر نہیں کی اور اندر جا کر انتہائی پھرتی سے یونیفارم اور دوسرے جوتے پہن کر آگیا۔ ٹوپی سر پر جماتے ہوئے میں واپس کیتھرین کی طرف جانے لگا تو کیپٹن بولا "میں کوشش کروں گا کہ کوئی تمہاری طرف متوجہ نہ ہو اور تم سے زیادہ پوچھ گچھ نہ کی جائے۔ تم خود بھی کوشش کرنا کہ بلا ضرورت کسی کی نظر میں نہ آؤ۔"

"اوکے کیپٹن!" میں نے اسے سیلوٹ کیا اور پائلٹ روم سے نکل آیا۔ اس وقت تک جہاز کی سرچ لائٹس روشن کی جا چکی تھیں۔ میں نے دیکھا، ربڑ کی دو کشتیاں جہاز کے اسٹار بورڈ کی طرف چلی آرہی تھیں۔

کیتھرین مجھے یونیفارم میں دیکھ کر حیرانی سے بولی۔ "یہ اتنی سی دیر میں تمہاری کایا کیسے پلٹ گئی؟"

"دراصل میں کریو کا ہی آدمی ہوں....." میں نے ذرا شرمیلے سے لہجے میں کہا۔ "لیکن میں چھٹی پر تھا اس لیے عام مسافر کی حیثیت سے ہی سفر کر رہا تھا۔ اب چونکہ کچھ ایمرجنسی نظر آرہی ہے اس لیے کیپٹن نے کہا کہ چھٹی وغیرہ کو بھول جاؤ اور فوراً اپنی ڈیوٹی سنبھال لو۔ برائے مہربانی تم بھی اب مجھے سی مین ہی سمجھنا۔ بھول جانا کہ میں مسافر کی حیثیت سے سفر کر رہا تھا۔"

اس کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اس نے میری بات کا یقین تو نہیں کیا تھا لیکن امید نظر آرہی تھی کہ وہ میرا ساتھ دے گی اور بھانڈا نہیں پھوڑے گی۔ شاید اس میں اسے اپنا بھی کچھ بھلا نظر آرہا ہو۔

پلاسٹک کی جو دو کشتیاں جہاز کی طرف چلی آرہی تھیں، ان میں چھ چھ سیاہ پوش سے افراد موجود تھے۔ دفعتاً ایک طرف سے افغان خانساماں فہمید برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسے کیپٹن یا کسی اور نے کوئی قدم اٹھانے کا حکم نہیں دیا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ اپنے طور پر ہی کوئی کارنامہ دکھانے پر تُلا ہوا تھا۔

اس نے رائفل کندھے سے لگائی اور فائر کرنے ہی والا تھا کہ میں نے تیزی سے آگے بڑھ کر اس کی نال کا رخ اوپر کی طرف کر دیا۔ غنیمت رہا کہ اس نے ٹریگر دبایا نہیں ورنہ شاید ہوائی فائر کی

آواز سن کر بھی آنے والے لوگ یہی سمجھتے کہ ان پر حملہ کر دیا گیا ہے۔

خانساماں فہمید برہمی کے عالم میں میری طرف گھوما لیکن عین اسی لمحے پیری کلاکر روشنی میں آگیا۔ اس کے ہاتھ میں بھاری مشین پسٹل تھا جس کا رخ فہمید کی طرف تھا۔

"گن پھینک دو۔" اس نے فہمید کو حکم دیا۔ "جہاز اس وقت ٹرکش نیوی اور ڈرگ انفورس منٹ ایجنسی کے گھیرے میں ہے۔"

پھر میں نے دیکھا' دھڑا دھڑ بہت سے لوگ جہاز پر چڑھے آرہے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔

خانساماں فہمید اب بھی رائفل پھینکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ جنونی اور خردماغ سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ اس کی رائفل کی نال ابھی تک میرے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ایک موہوم سے اندیشے کے تحت رائفل چھوڑی نہیں تھی۔ اس شخص کا کچھ بھروسا نہیں تھا کہ کوئی ایسی حماقت کر گزرتا جو سب کے لیے مصیبت بن جاتی۔

اس گدھے نے مجھ سے زور آزمائی کی کوشش کی اور ایک جھٹکا دے کر رائفل کی نال میری گرفت سے نکال لینا چاہی۔ میں نے محسوس کیا' اب موقع تھا کہ اسے اپنے زورِ بازو کی ایک آدھ جھلک دکھادی جاتی۔ اس کے جھٹکا دینے سے تو رائفل کی نال میرے ہاتھ سے نہ نکل سکی لیکن میں نے اسی طرح نال پکڑے پکڑے اسے ایک جھٹکا دیا تو وہ دور جاگرا۔ رائفل اس کے ہاتھ سے میرے ہاتھ میں آگئی اور اس کا سر ڈیک کے جنگلے سے جا ٹکرایا۔ اگر جنگلا نہ ہوتا تو شاید وہ پھسلتا ہوا سیدھا سمندر میں جاگرتا۔ اس کی اکڑفوں کافی حد تک نکل گئی اور وہ وہیں پڑا رہ گیا۔ میں نے رائفل ایک محفوظ کونے میں پھینک دی۔

پیری کلاکر کو میری یہ حرکت یقیناً پسند آئی تھی۔ اس نے میری کمر پر ہلکی سی تھپکی دی۔ میں نے فہمید سے رائفل چھین کر گویا کلاکر سے تعاون کیا تھا۔ کلاکر کی شخصیت میں تبدیلی نے خود مجھے حیران کردیا تھا۔ اس نے اعلان کیا تھا کہ جہاز ٹرکش نیوی اور ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی کے گھیرے میں تھا لیکن خود پیری کلاکر کون تھا؟

مجھے اس سے یہ پوچھنے کا موقع نہ مل سکا کیونکہ اس دوران گہرے رنگ کے لباسوں میں بہت سے مسلح افراد جہاز پر چڑھ آئے تھے۔ وہ نہایت پھرتی سے جہاز کے مختلف حصوں میں اس طرح بکھر گئے کہ جہاز کے ایک ایک کونے پر نظر رکھی جاسکے۔ وہ اپنے کام میں بہت ماہر معلوم ہوتے تھے تاہم ان کا رویّہ جارحانہ نہیں تھا۔ انہوں نے کسی شخص پر بندوق نہیں تانی تھی۔ فی الحال انہیں گویا عملے وغیرہ سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں جہاز کی تلاشی لینے سے زیادہ دلچسپی تھی۔

میں نے ایک دراز قد سفید فام کو ایک خطرناک گن اٹھا[ئے] ڈیک پر آتے دیکھا۔ یہ گن "ایم اے سی ٹین" یا "میک ٹم[ن]" کہلاتی تھی اور کسی زمانے میں امریکی فوجیوں کے استعمال میں ر[ہی] تھی۔ وہ شخص بھی امریکی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بہ آواز[بلند] اعلان کیا "میرا نام میک نیل ہے اور میں امریکی ڈرگ انفور[سمنٹ] ایجنسی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں چھاپے کی اس مہم کا نگرا[ں] ہوں۔ ہمیں صرف جہاز کی تلاشی سے دلچسپی ہے۔ اگر کچھ برآ[مد نہ] ہوا تو کسی کو کوئی تکلیف نہیں دی جائے گی۔ زحمت کے لی[ے] پیشگی معذرت خواہ ہوں۔"

کیپٹن گوئز نے نرم سے لہجے میں احتجاج کیا "تم لوگ کم از [کم] ہمارے بندرگاہ پر پہنچنے کا انتظار تو کرسکتے تھے خواہ اس دورا[ن] ہمارے جہاز کو حراست میں لے کر ساتھ ساتھ سفر کرتے۔"

"ہم پچھلے ماہ ایک چوٹ کھا چکے ہیں" میک نیل نے اطمینا[ن] سے جواب دیا۔ "ایک جہاز کو ہم نے حراست میں لیا تھا اور ا[س] کے ساتھ ساتھ بندرگاہ تک گئے تھے لیکن اس کا عملہ ہمیں ڈچ[ہ] دے گیا۔ راستے میں آنکھ بچا کر اس نے اپنا مال سمندر میں کہیں پھینک دیا۔"

"ہمارے جہاز پر تیل کی کھدائی کے سلسلے میں استعمال ہو[نے] والی مشینری کے سوا کچھ نہیں ہے" کیپٹن گوئز نے اسے یقین دلا[نے] کی کوشش کی۔

میک نیل نے اپنی گن بے پروائی سے بغل میں دبالی۔ شا[ید] اس نے دیکھ لیا تھا کہ جہاز پر کوئی ان سے الجھنے کے موڈ میں نہ[یں] تھا۔ صرف خانساماں فہمید نے تھوڑی سی تیزی دکھائی تھی اور ا[سے] میں نے ہی لٹادیا تھا اور میرے جسم پر عملے کی وردی تھی۔ جس [سے] ظاہر ہوتا تھا کہ جہاز کا عملہ مزاحمت نہیں کرنا چاہتا تھا۔

میک نیل اپنے آدمیوں کو مختلف احکامات دینے کے بعد پیری [کلا]کر کی طرف مڑا اور بولا "تم نے کیا دریافت کیا؟"

"کچھ بھی نہیں" پیری کلاکر نے قدرے مایوسی سے جواب دیا [البتہ] دو دن پہلے ان کے عملے کے ایک آدمی کی گردن کاٹ دی گئی [تھ]ی۔ کیپٹن نے ابھی تک کہیں اس واقعے کی رپورٹ درج نہیں کرائی۔"

"واقعے کے وقت ہم لوگ بین الاقوامی سمندری حدود میں تھے" کیپٹن گوئز فوراً پُراحتجاج سے لہجے میں بولا "میں کسی بندرگاہ پر پہنچنے کا انتظار کررہا تھا۔ بندرگاہ پر پہنچتے ہی میں اس واقعے کی رپورٹ کرتا۔"

میک نیل نے قتل کا تذکرہ سن کر کوئی خاص ردِّعمل ظاہر نہیں کیا۔ لگتا تھا کہ اسے اپنے مشن کے علاوہ کسی بات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ وہ کیپٹن گوئز سے مخاطب ہوا "ہم خاص طور پر جہاز کے اس حصے کی تلاشی لینا چاہتے ہیں جہاں لنگر کی زنجیریں رکھی جاتی ہیں۔ پچھلے دنوں ہمیں ایک جہاز کے اس حصے میں سے مارفیا کی تیاری میں استعمال ہونے والا بنیادی کیمیکل دو ٹن کی مقدار میں ملا تھا۔"

"تم جس حصے کی چاہو تلاشی لے لو۔ تمہیں اس جہاز پر کچھ نہیں ملے گا۔" کیپٹن گوئز ناگواری سے بولا۔

میک نیل اور پیری کلاکر ایک طرف کو چلے گئے۔ شاید وہ تخلیے میں کوئی بات کرنا چاہتے تھے۔ چند لمحے بعد ہی وہ واپس آگئے۔ تب میں میک نیل سے مخاطب ہوئے بغیر نہ رہ سکا "یہ امریکیوں کو ترکی کی سمندری حدود میں چھاپے وغیرہ مارنے کا اختیار کب سے مل گیا ہے؟"

میک نیل نے جواب دینے سے پہلے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ شاید اسے عملے کے کسی آدمی سے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی۔ عملے کو تو شاید یہ سوال کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ان لوگوں کو یقیناً اس کا پس منظر معلوم ہوگا۔

تاہم میک نیل بڑے تحمل سے بولا "ڈرگ انفورسمنٹ ایجنسی' امریکی ادارہ ہے لیکن پچھلے ایک سال سے منشیات کی اسمگلنگ روکنے کی غرض سے ٹرکش پولیس کے ساتھ مل کر کام کررہا ہے۔ ہم یورپ اور امریکا کی طرف منشیات کی اسمگلنگ کے دو بڑے روٹ بند کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس سمندری روٹ پر کئی بار ہم نے بہت بڑی مقدار میں منشیات پکڑی ہیں۔ منشیات کی سب سے زیادہ اسمگلنگ اس وقت سمندری راستوں سے اور خصوصاً بحری جہازوں سے ہو رہی ہے۔"

پھر جیسے اسے کوئی خیال آیا۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر بغور مجھے دیکھا اور بولا "اگر تم واقعی عملے کے آدمی ہو تو تمہیں یہ باتیں معلوم ہونی چاہئیں تھیں۔ سچ سچ بتاؤ تم کون ہو؟" اس کا ہاتھ اپنی گن پر

مجھے جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ پیری کلاکر اس کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہوئے خوش گوار لہجے میں بولا "یہ کوئی پاکستانی ہے۔ بغیر کاغذات سفر کررہا ہے لیکن اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہے۔ شاید پاکستان میں کوئی چھوٹی موٹی حرکت کرکے بھاگا ہے لیکن ہمارے نقطۂ نظر سے مشکوک نہیں ہے۔ البتہ کیپٹن نے شاید اس بے چارے کو ہمارے شک و شبے سے بچانے کے لیے وردی پہنادی ہے۔"

اس نے گویا میرے بارے میں اپنے باس کو مختصر لیکن مکمل رپورٹ دے دی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے اپنے آپ پر اور کیپٹن گوئز پر ترس آیا۔ بے چارے نے خواہ مخواہ ہی مجھے یونیفارم پہنانے کا تردد کیا تھا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ چھاپا مارنے والوں کا ایک ایجنٹ تو ہمارے ساتھ ہی سفر کررہا تھا اور بظاہر بڑی معصومیت سے پرندوں کا شوقین' ایک بے ضرر سا سیّاح بنا ہوا تھا۔

میک نیل نے بھی میرے بغیر کاغذات ہونے کو گویا قطعاً اہمیت نہ دی۔ یہ اس کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کا مسئلہ شاید صرف منشیات تلاش کرنا تھا۔ اس کے سوا وہ کسی معاملے میں ٹانگ اڑانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ سرہلاتے ہوئے تفہیمی انداز میں مجھ سے مخاطب ہوا "شاید تم نوکری کی تلاش میں یورپ وغیرہ کی طرف نکل رہے ہو؟"

"نہیں۔ میں تو ڈرگ مافیا کا آدمی ہوں" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

میک نیل اور پیری کلاکر دونوں خوش دلی سے ہنسے۔ کلاکر بولا "ڈرگ مافیا کے آدمی بغیر کاغذات کے سفر نہیں کرتے۔ دو چار پاسپورٹ اور دس بیس ویزے تو ان کی جیبوں میں فالتو پڑے رہتے ہیں۔" پھر وہ میک نیل کو بتانے لگا "یہ نوکری کی تلاش میں نہیں جارہا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ چھوٹا موٹا بزنس مین ہے.... اور میرا خیال ہے سچ ہی کہہ رہا تھا۔"

میک نیل نے بے پروائی سے کندھے اچکائے گویا کہہ رہا ہو "ہمیں ان باتوں سے کوئی غرض نہیں۔"

وہ تلاشی کے کام کی نگرانی کرنے لگا۔ وہ تقریباً چالیس کی عمر کا آدمی تھا اور لگتا تھا اس کی عمر انہی کاموں میں گزری تھی۔ وہ سبھی لوگ تلاشی کے کام میں بہت ماہر معلوم ہوتے تھے۔ اس کے باوجود اس کام میں بہت دیر لگ گئی۔ آخر کار وہ بحری جہاز تھا۔ خواہ چھوٹا ہی تھا لیکن اس کی ہر چیز کو چیک کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کام میں صبح کے چار بج گئے۔ ہمارے کیبنوں کی بھی تلاشی لی گئی۔ ایک بات البتہ مجھے کچھ حیرت انگیز لگی کہ میک نیل یا اس کے کسی آدمی نے کیپٹن سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ اس سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ کیبنوں کی تلاشی بھی وہ یہ جانے اور پوچھے بغیر لیتے چلے گئے تھے کہ کون سا کیبن کس کا تھا؟ شاید کلاکر انہیں بہت کچھ بتا چکا تھا۔

بالآخر وہ لوگ مایوس ہو گئے اور تلاشی کا کام بند کر دیا گیا۔ کیپٹن گوئز ایک بار پھر ڈیک پر آ کھڑا ہوا اور سگار سلگاتے ہوئے بولا "میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میرے جہاز پر کچھ نہیں ہے لیکن تم لوگوں نے میری بات کا یقین نہیں کیا اور خواہ مخواہ اتنا وقت ضائع کیا۔ اس بار شاید کسی نے غلط مخبری کر دی ہے۔"

"کچھ نہیں ملا تم لوگوں کو؟" میں نے نیچی آواز میں میک نیل سے پوچھا جو اس وقت ایک ہاتھ میں گن اور ایک میں سلگتی سگریٹ لیے کھڑا تھا۔

"نہیں۔" اس نے فراخ دلی سے اعتراف کیا پھر دوستانہ لہجے میں بولا "میں نے تو مشینری کا بھی ہر کریٹ کھلوا کر دیکھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر منشیات نہیں تو شاید افغانستان سے روسی اسلحہ ہی جا رہا ہو لیکن جہاز میں واقعی کچھ نہیں ہے" وہ گویا کسی سے بھی کوئی بات چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ٹرکش نیوی کے جو آدمی تھے وہ ان تمام چیزوں کو پہلے جیسی حالت میں لانے کی کوشش کر رہے تھے جنہیں انہوں نے کھول ڈالا تھا۔ امریکی ان کی مدد کر رہے تھے لیکن جہاز کا عملہ ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ لوگ خود اپنے سامان کو ہاتھ نہیں لگا رہے تھے۔ ان سب کے چہروں پر ناگواری تھی اور وہ گویا بہ زبان خاموشی کہہ رہے تھے "تم لوگوں نے ہی ہر چیز کھولی ہے' اب خود ہی بند کرو۔"

اسی چکر میں سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا۔ اچھا خاصا اُجالا پھیل چکا تو دور سے ایک لانچ جہازوں کی طرف آتی دکھائی دی۔ اس پر ترکی کا پرچم لہرا رہا تھا۔ وہ قریب آئی تو اندازہ ہوا کہ وہ ٹرکش کوسٹ گارڈ کی لانچ تھی لیکن اس سے بھی ایک ادھیڑ عمر سفید فام شخص اتر کر ربر کی کشتی میں سوار ہوا اور ہمارے جہاز کی طرف آنے لگا۔

کیتھرین اس وقت میرے قریب ہی ڈیک پر کھڑی تھی۔ اس نے ایک طویل سانس لی اور شکست خوردہ سے انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ میرے پاپا ہیں۔ انہیں ہر بات کی خبر ہو جاتی ہے۔ مجھے تو اندیشہ ہے کہ کہیں اس جہاز پر چھاپا بھی انہوں نے ہی نہ ڈلوایا ہو۔"

"وہ کیوں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"مجھے سُدھارنے کے لیے" وہ تلخی سے بولی "معلوم نہیں کیوں انہیں وہم ہو گیا ہے کہ میں ڈرگز کے دھندے میں ملوث ہوں۔ یہ وہم تو اپنی جگہ ہے۔ ویسے بھی وہ مجھے اپنی مرضی کی زندگی گزارتے دیکھ ہی نہیں سکتے۔ انہیں اپنی روایات اور نیک نامی اتنی عزیز ہے کہ میری اصلاح کی خاطر وہ مجھے جیل بھجوانے سے بھی گریز نہیں کریں گے۔"

ادھیڑ عمر چارلس جہاز پر آ گیا۔ اس نے سب سے پہلے میک نیل کو تلاش کر کے اسے ایک خط دیا۔ وہ کوئی سرکاری خط معلوم ہوتا تھا کیونکہ اسے پڑھتے ہی میک نیل کے رویے میں اس کے لیے بے حد احترام آ گیا۔ وہ خود اسے ساتھ لیے اوپر کیتھرین کے پاس آیا اور گردن کو خم دیتے ہوئے بولا "اپنی بیٹی سے پوچھ لیجیے۔ ہم نے انہیں کوئی زحمت نہیں ہونے دی۔ اور اگر آپ پہلے آ جاتے تو ہم ان کے سامان کی تلاشی بھی نہ لیتے۔"

"بہت خوب!" میں نے دل ہی دل میں سوچا "ایسی لڑکی تو واقعی ڈرگ مافیا کے لیے بے حد کارآمد ثابت ہو سکتی تھی جس کے باپ کا دوسرے ملکوں میں بھی اتنا اثر و رسوخ تھا۔ منشیات کی روک تھام کے سلسلے میں امریکا کی پالیسی نہایت سخت تھی۔ اس کے باوجود وہیں کے ڈرگ انفورسمنٹ کے ادارے کا نمائندہ اس سے کہہ رہا تھا کہ اگر وہ پہلے آن پہنچتا تو اس کی بیٹی کے سامان کی تلاشی بھی نہ لی جاتی۔ کیتھرین تو اپنے باپ کے اس اثر و رسوخ سے بہت فائدہ اٹھا سکتی تھی لیکن لگتا یہی تھا کہ فی الحال کیتھرین کو اس اثر و رسوخ کی ضرورت نہیں تھی یا پھر باپ بیٹی کے درمیان جذباتی خلیج اتنی وسیع تھی کہ وہ باپ کا کسی قسم کا احسان نہیں لینا چاہتی تھی اور الٹا اس کی طرف سے غلط فہمیوں میں مبتلا تھی۔

چارلس بے تابی سے کیتھرین کی طرف بڑھا لیکن کیتھرین نے منہ پھیر لیا۔ چارلس نے اسے گلے لگانا چاہا تو اس نے چارلس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ وہ حیرانی اور رنجیدگی سے بولا "یہ تم کیا کر رہی ہو کیتھی! میں تو تمہاری خاطر استنبول سے بھاگا بھاگا آیا ہوں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ اس جہاز کو راستے میں روک لیا گیا ہے۔ میں نے آدھی رات کو گورنر کو اٹھا کر اس سے سفارشی خط لیا اور یہاں بھی ریڈیو پر پیغام بھجوایا کہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہونے دی جائے۔ اور الٹا مجھ سے ناراض ہو رہی ہو۔"

"آپ کو اس تردّد کی کیا ضرورت تھی؟" کیتھرین بدستور تلخی سے بولی "مجھے ویسے بھی یہاں کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا لیکن میرا خیال ہے آپ کے دل کو اطمینان نہیں ہو رہا ہو گا۔ یہ چھاپا یقیناً آپ نے ہی ڈلوایا ہو گا۔"

"احمقوں والی باتیں نہ کرو۔" چارلس تیزی سے بولا "میں اس جہاز کو تمہاری وجہ سے چھاپے سے بچانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن امریکی سفارت خانے کا دباؤ بہت زیادہ تھا بلکہ میں اپنی کوششوں کی وجہ سے ان کی نظر میں بھی مشکوک ہو رہا تھا۔ میں اپنی نیک نامی داؤ پر لگا رہا تھا۔ اس کا تم مجھے یہ صلہ دے رہی ہو!"

"آپ کی خاندانی ساکھ۔۔۔ عزت۔۔۔ نیک نامی۔۔۔ میں تنگ آ گئی ہوں یہ الفاظ سنتے سنتے" کیتھرین پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی "آپ میرا پیچھا چھوڑ کیوں نہیں دیتے تاکہ آپ کی نیک نامی پر کوئی حرف نہ آئے؟ آپ مجھے میرے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟ مجھے آزادی کی زندگی کیوں نہیں گزارنے دیتے؟"

"خدا کی پناہ کیتھی!" چارلس کی آنکھیں پھیل گئیں "اٹھارہ سال کی عمر کے بعد سے تم شاید کبھی پورا ایک ہفتہ بھی گھر نہیں رہیں۔ جہاں تمہارا دل چاہتا ہے پھرتی ہو۔ جس سے چاہتی ہو دوستی کرتی ہو' جسے چاہتی ہو چھوڑ دیتی ہو۔ جس کام کو دل چاہتا ہے وہ کرتی ہو۔ اس سے زیادہ کیا آزادی چاہتی ہو تم۔۔۔؟"

"میں چاہتی ہوں آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں" کیتھرین بلا تامل بولی "میری عمر کی اولادوں کے بارے میں والدین کو علم بھی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں ہیں' کس حال میں ہیں لیکن آپ ہیں کہ میرے بارے میں پل پل کی خبر رکھتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصے میں لوگوں کو فون کر کر کے کہتے رہتے ہیں کہ کیتھرین کا خیال رکھنا۔ لوگوں کو سائے کی طرح میرے پیچھے لگا دیتے ہیں۔"

چارلس کے چہرے پر اذیت کے آثار ابھر آئے۔ شاید اب اسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ میں بھی اپنی جگہ دم بہ خود کھڑا تھا۔ مشرق اور مغرب میں واقعی بہت فرق تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بہت دور تھے۔ مغربی معاشرے نے اپنی اولاد' اپنی عورت کو اس کی من چاہی آزادی دے کر کیا پایا تھا؟ یہ ایک اندھا بھی دیکھ سکتا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں کچھ لوگ ان کی اس آزادی پر رشک کرتے ہیں اور ان کی تقلید کی کوشش کرتے ہیں۔

آخر چارلس شکست خوردہ سے لہجے میں بولا "ٹھیک ہے۔۔۔ صرف اس بار تم میرے ساتھ چلو۔ ہم بیٹھ کر آخری مرتبہ تفصیل سے بات کریں گے۔ اس کے بعد تم جس طرح چاہو زندگی گزارنا۔ جس ڈگر پر چاہے چلنا۔ میں قطعاً کوئی روک ٹوک نہیں کروں گا۔ اگر تم یہی چاہو گی کہ میں تم سے کوئی تعلق نہ رکھوں' تمہاری بالکل کوئی خیر خبر نہ لوں تو میں ایسا ہی کروں گا۔ میں تمہاری طرف سے صبر کر لوں گا۔ میری طرف سے تمہیں کوئی شکایت نہیں ہو گی۔ فی الحال تم میرے ساتھ چلو۔"

کیتھرین نے گویا بادل ناخواستہ اس کی التجا قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ وہ سامان لینے اپنے کیبن میں چلی گئی۔ کیپٹن گوئز نے عملے کے ایک آدمی کو اشارہ کیا۔ وہ کیتھرین کے پیچھے پیچھے کیبن میں چلا گیا۔ ادھر نیوی کے جنگی جہاز کے قریب کوسٹ گارڈ کی لانچ' چارلس کے انتظار میں ادھر اُدھر ہلکورے لے رہی تھی۔

چند منٹ بعد کیتھرین کیبن سے برآمد ہوئی۔ عملے کا آدمی سامان اٹھائے اس کے پیچھے تھا۔ اسی دوران میں نے جہاز کے فرسٹ میٹ جنتر کو بالائی عرشے سے نیچے آتے دیکھا۔ وہ غالباً کیتھرین سے الوداعی ملاقات کے لیے آ رہا تھا۔ کیتھرین اسے دیکھ کر رُک گئی اور وہ قریب آیا تو مصافحے کے لیے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی "خدا حافظ جنتر! میں پاپا کے ساتھ جا رہی ہوں۔ مجھے افسوس ہے میں تمہارے۔۔۔"

وہ نہ جانے کیا کہنا چاہتی تھی۔ اس کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ جنتر نے اس کا مصافحے کے لیے بڑھا ہوا ہاتھ پکڑ کر اچانک اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔ مجھ سمیت شاید کسی کو بھی اس سے اس حرکت کی اور اتنی پھرتی دکھانے کی توقع نہیں تھی۔ اس نے یکدم ہی کیتھرین کو ایک بازو کے حلقے میں جکڑ لیا تھا اور اسے اپنی ڈھال بنا لیا تھا۔ اس کے دوسرے ہاتھ میں نہ جانے کہاں سے ایک نہایت چمکیلے پھل والا چاقو آ گیا تھا جسے اس نے کیتھرین کے مرمریں گلے پر ٹکا دیا تھا۔ چاقو کی دھار کو محض دیکھنے پر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ اگر کیتھرین نے ذرا بھی ہلنے جلنے کی کوشش کی تو اس کا مرمریں گلا کٹ جائے گا۔

"کوئی مجھے روکنے کی کوشش نہ کرے ورنہ یہ لڑکی ماری جائے گی۔" جنتر چیخا پھر اس نے میک نیل کے ساتھ آئے ہوئے ٹرکش نیوی کے کمانڈر کو مخاطب کیا "کوسٹ گارڈ کی لانچ پر جو دو آدمی موجود ہیں انہیں بھی یہیں بلوا لو۔ وہ لانچ میں لے جاؤں گا۔ لڑکی میرے ساتھ جائے گی۔"

میک نیل بھی دم بخود رہ گیا تھا۔ اس کی گن بغل میں دبی ہوئی تھی۔ تاہم اس نے عقلمندی کا مظاہرہ کیا کہ اسے بغل سے نکالنے کی کوشش نہیں کی۔ جنتر کی نظر انہی لوگوں پر تھی جن کے پاس اسلحہ نظر آ رہا تھا۔ وہ خود ایک محفوظ گوشے میں تھا اور کیتھرین کو ڈھال بنا کر اور بھی زیادہ محفوظ ہو گیا تھا۔ سب کے ہتھیار بیکار ہو کر رہ گئے تھے کیونکہ کیتھرین کی زندگی کو شدید خطرہ تھا۔

"احمق مت بنو۔۔۔ تم لانچ لے کر نہیں جا سکو گے" میک نیل نے ہونٹوں کے گوشے سے سگریٹ نکالے بغیر تحمل سے کہا "لڑکی کو چھوڑ دو۔"

"میں لڑکی کو بھی لے جاؤں گا۔۔۔ اس کے سامان کو بھی۔۔۔ اور لانچ کو بھی۔" جنتر وحشت کے عالم میں بولا "کوئی میرا راستہ روکنے کی کوشش نہ کرے" اس پر کچھ خفیف سا جنون طاری تھا۔ مجھے وہ اب تک ایک بے ضرر سا آدمی لگا تھا لیکن یکدم ہی اس میں گویا کوئی شیطانی روح حلول کر گئی تھی۔

صرف میں جہاں کھڑا تھا وہاں سے زاویہ کچھ ایسا تھا کہ میں جنتر کی کنپٹی کا نشانہ لے سکتا تھا اور اس کی متحرک و مضطرب نظر میری طرف زیادہ گھومی بھی نہیں تھی۔ اسے یقیناً یہ اطمینان تھا

کہ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میرا ہاتھ نہایت آہستگی سے رینگتا ہوا بش کوٹ کے نیچے جارہا تھا۔ "داشتہ آید بکار" والا محاورہ اس وقت مجھے بہت ہی درست محسوس ہورہا تھا۔ سائیلنسر لگا وہ ریوالور جو آصف بھٹی سے جھڑپ میں میرے ہاتھ لگا تھا اور جسے وہ بعد میں واپس لینا بھول گیا تھا' اس وقت میری بیلٹ میں اڑسا ہوا تھا۔

"لانچ کے آدمیوں کو یہاں بلاؤ..." جنٹر چیخا "ورنہ میں اس لڑکی کو ماردوں گا.... مجھے تو ویسے بھی مرہی جانا ہے... میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا.... خواہ پانچ دس آدمیوں کو مار کر مرجاؤں... جلدی کرو۔"

وہ اس سے آگے بھی شاید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میرے ریوالور نے اسے مہلت نہ دی۔ "ٹھک" کی نہایت ہلکی سی آواز کے ساتھ ریوالور سے گولی نکلی اور نہایت صفائی سے اس کی کنپٹی میں اترگئی۔ وہ دھم سے زریں عرشے پر گرا اور اس کے ساتھ ساتھ کیتھرین بھی گرتے گرتے بچی۔ ایک لمحے کے لیے کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا ہوا تھا اگر میں کچھ اور پھرتی کا مظاہرہ کرتا اور ریوالور کو دوبارہ چھپالیتا تو شاید سب لوگوں کو یہ جاننے میں دِقت پیش آتی کہ گولی کس نے چلائی تھی لیکن میرے ریوالور جیب میں رکھنے سے پہلے میک نیل کی نظر مجھ پر پڑگئی پھر کیتھرین نے بھی اپنا گلا مسلتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ وہ سخت دہشت زدہ نظر آرہی تھی۔ چند سیکنڈ کے اس تجربے نے اسے ساری چوکڑی بھلادی تھی۔ جس باپ پر وہ چند لمحے پہلے گرج برس رہی تھی اب اسی کے سینے سے جالگی۔ انسان کتنا ہی باغی' کتنا ہی جابر' کتنا ہی سرکش ہوجائے' جذباتی سہاروں کی ضرورت باقی رہتی ہے لیکن کبھی کبھی اسے اس کا احساس تاخیر سے ہوتا ہے۔

میک نیل نے گہری سانس لے کر میری طرف پُرخیال نظروں سے دیکھا لیکن فوری طور پر وہ کچھ نہ بولا بلکہ سگریٹ کا کش لینے لگا۔ چارلس کیتھرین کو سنبھالتے ہوئے میرے قریب آکر بولا "میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں برخوردار! تم نے میری بیٹی کو بچانے کے لیے اپنے ہی عملے کے ایک ساتھی کو ہلاک کردیا۔"

کیتھرین باپ سے الگ ہوتے ہوئے بولی "اس کا جہاز کے عملے سے کوئی تعلق نہیں ہے پاپا! یہ جعلی سی مین ہے۔"

"تو پھر یہ کون ہے؟" چارلس نے حیرت سے پوچھا۔ میرے جسم پر بہرحال اسی جہاز کے سی مین کی وردی تھی۔

"آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہ آپ کے دوست رمضان کا بھیجا ہوا آدمی ہے۔ اس کا نام افضل چوہدری ہے۔ آپ کو میری بہت فکر تھی نا.... یہ میرا خیال رکھنے کے لیے اس جہاز پر سوار ہوا تھا" کیتھرین کے لہجے میں اب بھی ہلکا سا تیکھا پن تھا۔

"اوہ.... بہت خوب.... بہت خوب" چارلس نے جوشیلے انداز میں مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بڑھایا "رمضان بڑا لاجواب آدمی ہے۔ اس سے جو کام کہو وہ کرتا ضرور ہے۔ مجھے تم سے مل کر بڑی خوشی ہوئی مسٹر افضل چوہدری! تم نے واقعی میری بیٹی کا خیال رکھا۔ صحیح معنوں میں اسے خطرے سے بچایا۔ میں اگر ترکی میں ایک ضروری کام کے سلسلے میں نہ پھنسا ہوتا تو خود پاکستان آتا اور کیتھرین کے ساتھ سفر کرتا لیکن پرسوں تک صورت حال ایسی تھی کہ میں ایک گھنٹے کے لیے بھی استنبول سے نہیں نکل سکتا تھا۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے ملائمت سے کہا "مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے کسی کام آسکا۔ سچی بات یہ ہے کہ سیٹھ رمضان نے مجھے دھکے دے کر اس جہاز پر بھیجا تھا۔"

اس دوران میک نیل آگے بڑھ کر جنٹر کے قریب بیٹھ گیا تھا اور اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ غالباً یہ دیکھنے کی کوشش کررہا تھا کہ کنپٹی میں گولی اترنے کے باوجود اس میں کوئی سانس تو باقی نہیں۔

"یہ مرچکا ہے" اس نے سر اٹھاتے ہوئے اعلان کیا۔ میں نے دل ہی دل میں کہا "یہ جاننے کے لیے مجھے اس کا معائنہ کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں یہیں کھڑے کھڑے بتاسکتا تھا کہ یہ مرچکا ہے" تاہم یہ بات میں نے منہ سے نہیں کہی۔

میک نیل میرے قریب آکر گویا ایک نئے زاویے سے میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "تم نے یکدم ایک انتہائی قدم اٹھایا۔ لیکن میرا خیال ہے اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا... اس شخص نے ہم سب کو بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا..."

اس کا انداز خودکلامی کا سا تھا پھر وہ ایک نظر جنٹر کی لاش کی طرف دیکھ کر بولا "اس کے مرجانے سے ایک مسئلہ حل طلب رہ گیا۔ اب ہم یہ نہیں جان سکیں گے کہ آخر اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ یہ کیتھرین کو اس طرح خنجر کی نوک پر ساتھ کیوں لے جانا چاہتا تھا؟"

"میں بھلا کیا کہہ سکتا ہوں!" میں نے امریکیوں کے انداز میں کندھے اچکائے "میں باریکیوں میں جانے کا عادی نہیں ہوں اور یہ باریکیوں میں جانے کا وقت بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک خطرناک صورت حال دیکھی اور فوری طور پر مجھے اس کا جو حل نظر آیا میں نے اس پر عمل کرڈالا۔"

"تم اس پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہو کیتھرین؟" اس نے کیتھرین کی طرف مڑتے ہوئے کچھ اس طرح پوچھا' جیسے وہ کیتھرین کو برسوں سے جانتا تھا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں...." کیتھرین بے نیازی سے بولی "ہمسفر کے دوران میرا رویّہ اس سے خاصا دوستانہ رہا تھا۔ میں اسے محض ایک مہذب انسان سمجھ کر اچھی طرح پیش آرہی تھی۔ میری اس سے ملاقات جہاز سے باہر بمبئی میں ہوئی تھی۔ مجھے اندیشہ ہے میرے اچھے رویّے کی وجہ سے کہیں یہ مجھ پر عاشق نہ ہوگیا ہو اور اب مجھے جاتے دیکھ کر یکدم ہی اس کے ذہن نے پلٹا کھایا ہو۔ مجھے روکنے کا اسے اس کے سوا کوئی طریقہ نظر نہ آیا ہو۔ ویسے مجھے لگتا ہے کہ اس کی کھوپڑی کا کوئی پُرزہ ڈھیلا ضرور تھا۔"

میک نیل پُرخیال انداز میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ وہ اس امکان پر غور کرنے کے لیے تو تیار تھا لیکن میرا خیال تھا کہ بات اس کے دل کو نہیں لگی تھی' تاہم وہ خاموش رہا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "میرا دل کہہ رہا ہے کہ عبدل کو بھی جنٹر نے ہی قتل کیا تھا... اور آلۂ قتل شاید چاقو ہی رہا ہو" میں نے چوبی فرش پر پڑے جھلمل جھلمل کرتے چاقو کی طرف اشارہ کیا "شاید اس کا کسی لیبارٹری وغیرہ میں تجزیہ کرنے پر عبدل کے خون کے ذرّات مل جائیں۔"

میک نیل نے آگے بڑھ کر رومال کی مدد سے چاقو اٹھالیا اور اسے رومال ہی میں لپیٹ کر جیب میں ڈالتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "تم تو کہہ رہے تھے کہ تم باریکیوں میں جانے کے عادی نہیں۔ یہ تو خاصی باریک بات کی ہے تم نے۔"

"کوئی بھی شخص جس نے دو چار جاسوسی کہانیاں پڑھی ہوں۔ ایسی بات کرسکتا ہے۔ یہ کچھ ایسی زیادہ باریک بات نہیں۔ البتہ آدمی کی عقل ہی کچھ زیادہ موٹی ہو تو بات دوسری ہے" میں نے ملائمت سے کہا۔

کیپٹن گومز آگے آتے ہوئے بولا "جنٹر نے جو حرکت کی ہے اس کے بعد تو مجھے بھی یقین ہوچلا ہے کہ عبدل کو اسی نے قتل کیا تھا۔ ممکن ہے یہ کسی قسم کے جنون کا شکار ہوگیا ہو۔ جنون کے آثار کچھ نمایاں تو نہیں تھے لیکن اس کی اندرونی کیفیات کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ وہ ایڈز کا شکار تھا۔ ممکن ہے اپنے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا ذہن کسی قسم کے خلجان کا شکار ہوگیا ہو۔"

"اگر یہ ایڈز کا شکار تھا تو پھر تمہاری بات درست ہوسکتی ہے" میک نیل نے اثبات میں سرہلایا "بہرحال.... ہمیں ان واقعات سے کوئی مطلب نہیں۔ بندرگاہ پر تم جس طرح چاہو ان واقعات کی رپورٹ کرسکتے ہو۔ ہمارا کام اب ختم ہوگیا' ہم جارہے ہیں۔"

چارلس بولا "میں بھی کیتھرین کو لے کر لانچ پر ہی استنبول جارہا ہوں کیونکہ جہاز کو تو بودرم کی بندرگاہ پر.... اور پھر استنبول پہنچتے پہنچتے بہت وقت لگ جائے گا...." پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوا "اور تم بھی میرے ساتھ چلو گے مسٹر چوہدری! تم اب میرے مہمان ہو۔ گو کہ میں خود کسی اور کا مہمان ہوں۔"

"میرے پاس پاسپورٹ وغیرہ نہیں ہے مسٹر چارلس" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ یہ بات اب چونکہ سبھی کو معلوم ہوچکی تھی اس لیے اب اسے چھپانے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔

"کوئی بات نہیں۔ اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا" چارلس بے پروائی سے بولا "ہمیں ایسے راستے سے جانا بھی نہیں ہے جہاں پاسپورٹ وغیرہ دیکھے جاتے ہیں۔ استنبول پہنچ کر میں تمہارے لیے پاسپورٹ وغیرہ کا بھی بندوبست کردوں گا۔ تم چلو تو سہی۔ تم میرے محسن ہو لیکن تم سے بہت ہی نامناسب حالات میں ملاقات ہوئی ہے۔ میں نہیں چاہتا' تم یہیں ہم سے جُدا ہوجاؤ۔"

میں نے کیتھرین کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تاثرات سے عاری تھا۔ کچھ کہا نہیں جاسکتا تھا کہ باپ کا اصرار اس کے لیے خوشی کا باعث تھا یا خفگی کا؟ بہرحال میرے لیے یہ ایک معقول پناہ حاصل کرنے کا عمدہ موقع تھا۔ میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اسے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ چارلس بین الاقوامی طور پر اثر ورسوخ رکھنے والا آدمی تھا۔ اس کے ساتھ رہ کر میرے بہت سے مسائل حل ہوسکتے تھے اس لیے میں نے آمادگی سے سرہلاتے ہوئے کہا "ٹھیک ہے.... جیسے آپ کی مرضی۔ ویسے میں آپ کو کوئی زحمت نہیں دینا چاہتا تھا۔"

"بھئی ایک تو تم پاکستانی لوگ وضع داری اور تکلف میں بہت پھنسے رہتے ہو" چارلس اپنی تمام تر متانت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے بے تکلفی سے میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "بس اب فضول باتیں چھوڑو اور ہمارے ساتھ چلو۔"

کیپٹن گومز مضطربانہ انداز میں سگار انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا "اور اگر مجھے پولیس کو رپورٹ کرنے کے سلسلے میں مسٹر افضل چوہدری کی گواہی کی یا بیان کی ضرورت پڑگئی تو...؟"

"تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم استنبول میں کہیں غائب نہیں ہوجائیں گے" چارلس بولا "میں وہاں برطانوی سفیر کا مہمان ہوں اور اس کی سرکاری رہائش گاہ میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ یہ اس کا کارڈ ہے.... تم کسی بھی وقت کوئی بھی ضرورت پڑنے پر اس ایڈریس یا فون نمبرز پر مجھ سے رابطہ کرسکتے ہو" اس نے جیب سے ایک کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ کارڈ دیکھ کر کیپٹن گومز مطمئن نظر آنے لگا۔

چارلس اور کیتھرین ریلنگ کے اس حصے کی طرف بڑھ رہے تھے جہاں رسّے کی سیڑھی لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے بھی ان کے ساتھ قدم بڑھایا تو کیپٹن گومز میری آستین پکڑ کر ہلاتے ہوئے بولا "ہماری یونیفارم تو اتارتے جاؤ۔"

"اوہ!" میں نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی "میں تو بھول ہی گیا تھا۔" پھر میں نے چارلس سے کہا "آپ لوگ چلیں۔ میں کپڑے بدل کر لانچ پر پہنچتا ہوں۔"

وہ لوگ آگے بڑھ گئے اور میں پائلٹ روم کے اندرونی حصے میں جاپہنچا جہاں میں نے اپنا سفاری سوٹ چھوڑا تھا۔ میں لباس تبدیل کرکے باہر آیا اور اس جگہ سے گزرا جہاں چند منٹ پہلے خوب بھیڑ بھاڑ تھی۔ اب وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ صرف جنٹر کی لاش پڑی تھی۔ فی الحال اسے اٹھایا نہیں گیا تھا اور کسی نے اس کے پاس رکنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

میں لاش کے پاس سے گزرنے لگا تو ایک تختے کے نیچے مجھے کچھ پڑا نظر آیا۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ وہاں روشنی کم تھی لیکن میں نے دیکھ لیا' یہ وہی ضخیم کتاب تھی جو میں نے کئی بار

کیتھرین کے ہاتھوں میں دیکھی تھی "مشرق وسطیٰ کے معاملات پر تیل کے اثرات کی تاریخ۔"

لمبے سے عنوان کی یہ کتاب شاید اس وقت بھی کیتھرین کے پاس تھی جب جنتر نے اچانک اسے دبوچ کر یرغمال بنالیا تھا۔ کشمکش میں شاید کتاب نیچے گر گئی تھی اور کیتھرین کو اس کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔ وہ کچھ ایسی جگہ جاکر گری تھی جہاں نظروں سے اوجھل رہی تھی۔ میں اس ارادے سے اسے اٹھائے لے چلا کہ جاکر کیتھرین کو دے دوں گا۔

ذرا زیادہ روشنی میں آکر میں نے یونہی سرسری سے انداز میں اس کے ورق پلٹے تو کوئی چیز میری نظر میں کھٹکی۔ کتاب کے وسط میں کچھ اوراق مجھے باقی کتاب سے کچھ مختلف محسوس ہوئے۔ یوں تو یہ کوئی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ بہت سی کتابوں میں تصویروں یا اہم دستاویزات کے عکس وغیرہ پر مشتمل صفحات الگ سے بائنڈ کئے جاتے ہیں اور وہ باقی کتاب سے مختلف محسوس ہوتے ہیں لیکن ان صفحات پر سرسری نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہوگیا کہ ان کا کتاب سے بالکل ہی کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ کمپیوٹر پر چھپی ہوئی کوئی رپورٹ تھی جس کے کاغذ نہایت صفائی سے تراش کر کتاب کے کچھ صفحات نکال کر ان کی جگہ فٹ کئے گئے تھے۔

میں وہاں کھڑے ہوکر ان کا مکمل جائزہ نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے جلدی سے وہ صفحات کتاب سے اکھاڑ کر تہ کرکے جیب میں رکھ لیے اور ذرا پیچھے جاکر کتاب ایک ایسی جگہ سے جہاز کے نچلے حصے میں پھینک دی جہاں مجھے کوئی یہ حرکت کرتے نہیں دیکھ سکتا تھا پھر میں گھوم کر اس طرف آگیا جہاں رسّی کی سیڑھی لٹکی ہوئی تھی۔ سیڑھی سے اتر کر میں لانچ میں پہنچا جہاں چارلس اور کیتھرین میرے منتظر تھے۔ چند منٹ بعد کوسٹ گارڈ کی لانچ ہمیں لے کر استنبول کی طرف روانہ ہوگئی۔ کیتھرین کو ابھی تک احساس نہیں ہوا تھا کہ اس کی کتاب کہیں گر چکی تھی۔

○☆○

استنبول میں چارلس واقعی برطانوی سفیر کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا ورنہ مجھے نہ جانے کیوں وہاں پہنچنے تک اس معاملے میں کچھ شک تھا۔ وہ ایک طویل و عریض دو منزلہ بنگلا تھا جس کی بالائی منزل مکمل طور پر مہمان خانہ تھی۔ اس میں کئی بیڈ رومز اور ضرورت کی تمام چیزوں کے علاوہ ایک نہایت پرتعیش کچن بھی موجود تھا۔ جس علاقے میں بنگلا واقع تھا اس میں اسلام آباد کی جھلک تھی۔ چارلس کے انداز و اطوار وہاں کچھ ایسے ہی تھے جیسے وہ اپنے ہی گھر میں ہو اور کسی حد تک یہ بات درست ہی تھی۔ وہ تو خیر بہت "پہنچی ہوئی" شخصیت تھا لیکن زیادہ تر ملکوں کے عام باشندے بھی اپنے سفارت خانے اور اس سے متعلق چیزوں کو دیارِ غیر میں اپنے گھر ہی کی طرح محسوس کرتے ہیں۔

مجھے وہاں الگ بیڈ روم مل گیا۔ عمدہ کھانا اور ضرورت کی ہر چیز میسر آگئی۔ حتیٰ کہ چارلس نے میرے لیے ایک تقریباً نئے سوٹ کا بھی بندوبست کردیا جو میرے جسم پر میرا اپنا ہی لگنے لگا۔ گھر میں موجود بٹلر اور دیگر دو تین ملازمین چارلس کے اشارے پر ہر کام کررہے تھے۔ سفیر سے ملاقات نہیں ہوسکی اور چارلس گویا اس کی کوئی ضرورت بھی محسوس نہیں کررہا تھا۔ سفیر اس وقت استنبول میں موجود ہی نہیں تھا، وہ کہیں اور گیا ہوا تھا۔

شام ڈھلے چارلس مجھ سے معذرت کرکے کسی کام سے روانہ ہوگیا۔ کیتھرین گویا اس کے جانے ہی کی منتظر تھی۔ اس کے جاتے ہی اس نے اپنے لیے ٹیکسی منگوائی اور وہ بھی کہیں روانہ ہوگئی۔ دونوں باپ بیٹی نے مجھے تو کیا، ایک دوسرے کو بھی بتانا ضروری نہیں سمجھا تھا کہ وہ کہاں جارہے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے اطمینان کی سانس لی اور اپنے کمرے میں لیٹ کر ان اوراق کا مطالعہ کرنے لگا جو میں نے کیتھرین کی کتاب میں سے اکھاڑے تھے۔ انہیں میں نے ابھی تک بہت چھپا چھپا کر، بہت سنبھال سنبھال کر رکھا تھا۔

وہ واقعی کمپیوٹر پر تیار شدہ ایک رپورٹ تھی۔ زیادہ طویل نہیں تھی، میں نے اسے دو مرتبہ پڑھا اور میرے رگ و پے میں تھوڑی دیر کے لیے خفیف سی سنسنی دوڑ گئی۔ اس میں لمبی لمبی کئی طبّی اصطلاحیں تھیں جو میری سمجھ میں نہیں آئیں لیکن جو بات سمجھنے کی تھی وہ ذہن پر ذرا زور دینے سے میری سمجھ میں آگئی۔ کڑیاں مل گئیں اور میں دیر تک سوچوں میں کھویا رہا۔

بالآخر میں اپنے کمرے سے نکلا۔ میرے دائیں ہاتھ پر چارلس کا کمرا تھا اور بائیں ہاتھ پر کیتھرین کا۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اس فلور پر کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہم تینوں کے سوا کسی کمرے میں کوئی مہمان ٹھہرا ہوا نہیں تھا۔ میں نے کیتھرین کے کمرے میں پہنچ کر دروازے کی ناب پر قسمت آزمائی کی۔ اس کا دروازہ مقفل تھا۔ کھڑکی بھی اندر سے مضبوطی سے بند تھی۔

میں کھڑکی کو ذرا ٹھونک بجاکر دیکھ ہی رہا تھا اور اسے کھولنے کی کوئی ترکیب سوچ رہا تھا کہ مجھے احساس ہوا کوئی عقب سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں تیزی سے گھوما۔ ذرا فاصلے پر، سیڑھیوں کے قریب بٹلر کھڑا عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ یقیناً سوچ رہا تھا کہ مہمانوں کے اس مہمان نے آتے ہی کیا حرکتیں شروع کردی تھیں۔ وہ یقیناً ابھی سیڑھیوں سے اوپر آیا تھا کیونکہ ایک لمحے پہلے تک وہ وہاں موجود نہیں تھا۔

بٹلر ترک تھا لیکن انگریزی روانی سے بولتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوچکا تھا کہ میں پاکستانی تھا۔ پاکستانیوں کا امیج ویسے تو دوسرے ملکوں میں کچھ اچھا نہیں۔ بے چارے ترک باشندے پاکستانیوں کو "برادر ملک" کے شہری قرار دے کر تھوڑی بہت محبت کا اظہار کرتے تھے۔ میرا خیال تھا کہ مجھے چوروں جیسی حرکت کرتے دیکھ کر بٹلر کے دل میں اگر پاکستانی برادر کے لیے کوئی تھوڑی

بہت محبت موجود بھی تھی تو اس کی بنیادیں خطرناک حد تک لرز گئی ہوں گی۔

میں نے پوری کوشش کی کہ میرے چہرے سے خجالت کا اظہار نہ ہونے پائے۔ نہایت متانت سے چلتا ہوا میں اس تک پہنچا۔ خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "میری ایک کتاب کیتھرین کے پاس رہ گئی ہے۔ میں اب فارغ بیٹھا بور ہورہا تھا۔ سوچا ذرا پڑھ لوں... لیکن اس کا کمرا مقفل ہے۔ تمہارے پاس اس کی چابی ہوگی؟" میں نے یہ ظاہر کرنے کی پوری کوشش کی تھی کہ میرے دل میں چور نہیں تھا۔

اس نے نفی میں سرہلایا اور بولا "چابیاں دروازوں ہی میں لگی رہتی ہیں۔ اگر ڈپلیکیٹ ہوں گی بھی.... تو ان کے بارے میں باس کو ہی کچھ پتا ہوگا۔"

"اوہ...." میں نے قدرے مایوسی سے کہا "تو پھر تم ہی مجھے کوئی انگریزی اخبار یا رسالہ وغیرہ لادو۔ ترکی تو مجھے پڑھنی نہیں آتی۔"

اس نے اثبات میں سرہلایا اور نیچے چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ کئی انگریزی رسالے لیے واپس آگیا۔ میں نے چہرے سے خوشی کا اظہار کیا، اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے کی طرف واپس چل دیا۔ وہ کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "سر! میں یہ کہنے آیا تھا کہ اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو انٹرکام پر کہہ دیجیے گا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے میں گھس کر دروازہ بند کرکے گہری سانس لی۔

میں نے رسالوں کو ایک طرف پھینکا اور کھڑکی کی جھری سے راہداری میں جھانکا۔ بٹلر واپس جاچکا تھا۔ تاہم میں نے دوبارہ باہر آنے میں عجلت سے کام نہیں لیا۔ معلوم نہیں میں بٹلر کی نظر میں اپنی تھوڑی بہت عزت بحال کرانے میں کامیاب ہوا تھا یا نہیں۔ بہرحال چند منٹ بعد میں نے باتھ روم سے ایک بلیڈ لیا اور دوبارہ کمرے سے نکل آیا۔

اس بار میں نے سیڑھیوں سے نیچے دور تک جھانک لیا۔ سردست کسی کی آمد کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ میں کیتھرین کے کمرے میں گھسنے کے سلسلے میں تاخیر اس لیے نہیں کرنا چاہتا تھا کہ اس کی واپسی کے بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ جلد ہی واپس آجاتی۔ اس کام کو کل پر ڈالنے کی صورت میں یہ بھی امکان تھا کہ وہ چیز مجھے اس کے کمرے میں نہ ملتی جس کی مجھے تلاش تھی۔ اس کے غائب ہونے کا اندیشہ تو اب بھی تھا لیکن مجھے کسی حد تک اطمینان اس لیے تھا کہ میں نے کیتھرین کو گھر سے تقریباً خالی ہاتھ ہی رخصت ہوتے دیکھا تھا۔ اس وقت اس کے ہاتھ میں پرس کے سوا کچھ نہیں تھا۔

میں نے دروازے کے تالے پر جھک کر بلیڈ کو کھڑے رخ سے تالے کی جھری میں داخل کیا اور اس کی مدد سے تالے کے لیچ LATCH کو اندر گھسانے کی کوشش کی۔ پہلی کوشش میں تو بلیڈ ٹوٹتے ٹوٹتے بچا۔ غنیمت تھا کہ تالا نیا نہیں تھا۔ کافی گھِسا ہوا تھا۔ میری دوسری کوشش کامیاب ہوگئی۔ جلدی سے اندر داخل ہوکر میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ اپنے عقب میں بند کیا اور اندھیرے میں گہری سانس لی۔

چند لمحے بعد میری آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئیں۔ ویسے بھی راہداری میں روشنی ہونے کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا گہرا نہیں تھا۔ میں بتیاں روشن کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ بٹلر ایک بار پھر اوپر آجاتا اور کیتھرین کے کمرے میں روشنی دیکھ کر پریشان ہوجاتا کہ آخر میں کس چکر میں تھا؟

کیتھرین کا سامان اب وارڈ روب میں منتقل ہوچکا تھا۔ میں نے تیزی سے اس کے سامان کی تلاشی لی۔ ڈریسنگ ٹیبل کو کھنگالا لیکن وہ چیز وہاں نہیں تھی جس کی مجھے تلاش تھی۔ چمڑے کا وہ تھیلا جس میں، میں نے جہاز کے سفر کے دوران وٹامنز کی گولیوں کی شیشیاں دیکھی تھیں، خالی پڑا تھا۔

مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ شاید میں صحیح طور پر دیکھ نہیں سکا تھا اور کیتھرین وہ شیشیاں آج ہی باہر لے گئی تھی تاہم ایک موہوم سی امید لیے میں باتھ روم میں جا پہنچا اور میڈیسن کیبنٹ کو کھول کر دیکھا۔ کیبنٹ کے ایک خانے میں وہ شیشیاں قرینے اور ترتیب سے سجی ہوئی تھیں۔ میں بے اختیار طمانیت کی گہری سانس لے کر رہ گیا۔

میں نے جلدی سے وہ شیشیاں نہایت حفاظت سے چمڑے کے تھیلے میں بھریں اور باقی ہر چیز کو جوں کا توں چھوڑ کر نہایت محتاط طریقے سے اپنے کمرے میں واپس جا پہنچا۔

میرے کمرے میں بھی کوئی ایسی محفوظ جگہ نہیں تھی جہاں میں ان شیشیوں کو چھپا کر مطمئن ہوجاتا۔ بہرحال میں نے اپنے باتھ روم میں جاکر فلش کی ٹینکی کا پانی بہادیا اور والو بند کرکے مزید پانی اندر جانے سے روک دیا پھر ایک بڑا اسکریو کھول کر میں نے ٹینکی کا ڈھکن کھولا اور شیشیاں ٹینکی میں اوپر تلے رکھ دیں۔ فی الحال آسانی سے مجھے یہی ذرا محفوظ جگہ میسر تھی۔ ٹینکی بند کرکے میں آرام سے کمرے میں آکر لیٹ گیا اور بٹلر کے دیئے ہوئے رسالوں کی ورق گردانی کرنے لگا۔

رات کے کھانے پر بھی میں، چارلس اور کیتھرین یکجا نہ ہوسکے۔ میں نے کافی دیر ان کا انتظار کرنے کے بعد بالآخر کھانا کھالیا۔ میں ابھی کھانے کی میز سے اٹھا نہیں تھا کہ چارلس آپہنچا۔ لباس تبدیل کرکے وہ میرے ساتھ آبیٹھا۔ رات کے تقریباً گیارہ بج رہے تھے۔ کیتھرین اب بھی واپس نہیں آئی تھی لیکن اب چارلس کو گویا اس کے بارے میں کوئی تشویش نہیں تھی۔ اس کی تشویش شاید صرف اس وقت تک کے لیے تھی جب تک وہ جہاز پر تھی۔

چارلس ایک بار پھر میرا شکریہ ادا کرنے لگا کہ میں نے اس کی خاطر بڑی زحمت اٹھائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی بیٹی اگر

ڈرگز کے دھندے میں ملوث رہی بھی تھی تو اب شاید اس سے نکل آئی تھی۔ اسے امید تھی کہ یورپ کے سفر کے بعد وہ اسے سمجھا بجھا کر اپنے ساتھ گھر لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ میں اس کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ میں نے اس پر اپنی اس رائے کا اظہار نہیں کیا کہ ڈرگز کے دھندے میں ایک بار ملوث ہونے کے بعد' چاہتے ہوئے بھی کسی کا اس سے نکلنا تقریباً ناممکن ہی تھا۔ میں چارلس کی امیدوں کو ناامیدی اور دل شکستگی میں بدلنا نہیں چاہتا تھا۔ آخر وہ ایک باپ تھا۔ اپنی بیٹی کی تمام تر سرکشی کے باوجود اور اپنے مغربی معاشرے کی روایات کے برعکس وہ اب بھی بیٹی کی طرف سے لاتعلقی اور بے حسی اختیار کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

وہ کھانا کھا چکا تو میں اسے شب بخیر کہہ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ میرا خیال ہے' میں بحری جہاز کی کئی دن کی بے آرامی سے کافی تھکا ہوا تھا اس لیے کچھ زیادہ ہی گہری نیند سو گیا۔ مجھے پتا نہیں چلا کہ کیتھرین کس وقت واپس آئی تھی لیکن میری اس سے اسی رات اپنے ہی کمرے میں ملاقات ہوگئی لیکن افسوس کہ یہ کوئی محبت بھری یا رومان پرور ملاقات نہیں تھی۔

وہ کمبخت میری کنپٹی پر پستول ٹکائے میرے بیڈ کے پاس ہی کھڑی تھی۔ درحقیقت میری آنکھ کمرے کی لائٹ آن ہونے اور کنپٹی پر پستول کی نال کے لمس سے ہی کھلی تھی۔ کیتھرین کی بلوری آنکھیں اس وقت شعلے اگل رہی تھیں۔ اتنی شائستہ' نرم خو' مہذب اور خوش اطوار لڑکی کو اس قدر غصے میں دیکھنا میرے لیے ایک عجیب تجربہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ زیادہ غصے میں تو کبھی آتی ہی نہیں ہوگی۔ وہ ایک نہایت خوب صورت نائٹی میں تھی اور اس کے وجود سے مسحور کن خوشبو پھوٹ رہی تھی لیکن افسوس کہ اس وقت اسے نائٹی میں دیکھ کر بھی لطف اندوز نہیں ہوا جا سکتا تھا اور اس کے وجود سے پھوٹتی ہوئی خوشبو کو اپنے ہر مشام جاں میں اتارنے کی کوشش بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے تاثرات کچھ ایسے ہی خطرناک تھے۔

اس ایک لمحے میں مجھے یہ خیال بھی آیا کہ وہ اتنے پُرامن اور خاموش طریقے سے میرے کمرے میں کیسے آن پہنچی تھی کہ میری نیند میں ذرا بھی خلل نہیں پڑا تھا جبکہ میری گہری نیند بھی کچھ زیادہ گہری نہیں ہوتی تھی؟ پھر میں نے سوچا کہ جب میں ذرا سی بھی کھڑ پڑ کیے بغیر اس کے مقفل کمرے میں جا سکتا تھا تو وہ میرے کمرے میں کیوں نہیں آسکتی تھی۔ آخر وہ بھی تو نہ جانے کون کون سے تجربے دامن میں سمیٹے دنیا میں گھوم رہی تھی۔

بحری جہاز پر سفر کے دوران جب میں نے اس کے سامان کی تلاشی لی تھی تو مجھے اس میں کوئی پستول وغیرہ نظر نہیں آیا تھا۔ شاید اس وقت وہ بھی میری طرح اسے لباس کے اندر کہیں ہر وقت اپنے وجود سے چپکائے پھرتی ہو۔ یا پھر آج سے پہلے وہ جس آوارہ گردی یا مہم پر نکلی ہوئی تھی اس کے دوران بہت سی چیزوں کے

انتظامات کر کے آئی ہو۔

حالانکہ میں نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش نہیں کی تھی' صرف حیرت سے آنکھیں پٹ پٹانے پر اکتفا کیا تھا اس کے باوجود اس نے مجھے خبردار کرنا ضروری سمجھا "اٹھنے کی کوشش مت کرنا۔ شیشیاں کہاں ہیں؟" اس کی آواز ناگن کی پھنکار سے مشابہ تھی۔

"شیشیاں.... کون سی شیشیاں؟" میں نے معصوم بننے کی کوشش کی حالانکہ مجھے خود بھی معلوم تھا کہ میری یہ کوشش فضول تھی لیکن میں سوچنے کے لیے دو چار سیکنڈ کی مہلت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس کے تاثرات بہت خطرناک نظر آرہے تھے۔ اچانک کوئی حرکت کرنا میرے حق میں مہلک ثابت ہو سکتا تھا۔ ابھی میں اس لڑکی کو پوری طرح نہیں جان سکا تھا۔

"میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کرنے کے بعد بھی شیشیاں ڈھونڈ لوں گی لیکن میں تمہاری جان لینا یا زیادہ زحمت اٹھانا نہیں چاہتی۔ مجھے ان دونوں کاموں پر مجبور مت کرو۔" اس کی آواز اب بھی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی لیکن یہ سرگوشی گویا سماعت کو کھرچتی ہوئی گزر رہی تھی۔

"مجھے تو اس کمرے میں کچھ شیشیاں ڈریسنگ ٹیبل پر... اور کچھ باتھ روم میں میڈیسن کیبنٹ میں رکھی ہوئی ملی تھیں۔ ان کے سوا تو مجھے کسی شیشی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں" میں نے نہایت ڈھٹائی سے اپنی مصنوعی معصومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں صرف تین تک گنوں گی...." اس نے سفاک لہجے میں صرف اتنا کہا اور گنتی شروع کرنے سے پہلے ہی ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ بڑھ گیا۔

"تمہارے پاپا تمہارے ہاتھوں میرے مرنے کا بہت برا منائیں گے" میں نے تیزی سے کہا۔

"جہنم میں گئے پاپا!" وہ غصے سے بولی۔

"ابھی تو نہیں گئے۔ شاید مرنے کے بعد جائیں" میں نے معصومیت سے کہا۔

"بکو مت" اس نے جھلا کر کہا اور گنتی شروع کی "ایک..."

"ٹھہرو۔" میں نے بظاہر گھبراتے ہوئے کہا "آخر وہ کون سی شیشیاں ہیں جن کے لیے تم میرے پیچھے پڑ گئی ہو۔ خدا کے لیے کچھ بتاؤ تو سہی... کوئی اشارہ تو دو۔ شاید تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔"

"مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔ مجھے باتوں میں لگانے کی کوشش مت کرو" وہ ذرا ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "ان شیشیوں کے راز سے تمہارے سوا کوئی واقف نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں...؟ کیا میں نے شیشیوں کے معاملے میں کوئی خاص تعلیم حاصل کی ہے؟" میں نے ایک بار پھر اسے معصومیت سے چڑانے کی کوشش کی۔ حقیقت یہی تھی کہ میں اسے باتوں میں لگانے کی کوشش [illegible]

تھی۔

"مجھے شروع ہی سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم ایک خطرناک آدمی ہو۔ مجھے تمہاری طرف سے ہوشیار رہنا چاہیے تھا۔ زیادہ محتاط رہنا چاہیے تھا۔ تم یقیناً وہ نہیں ہو جو نظر آتے ہو" وہ ناگواری سے بولی۔

"آج کے دور کا المیہ یہی ہے کیتھی ڈارلنگ!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "زیادہ تر لوگ وہ نہیں ہیں جو نظر آتے ہیں' تم بھی انہی میں شامل ہو۔"

اب میں اسے کیا بتاتا کہ شیشیوں کے راز سے آگاہ ہونے میں میری "خطرناکی" کو کوئی دخل نہیں تھا۔ اگر اتفاق سے کیتھرین کی وہ گری ہوئی کتاب مجھے نہ ملتی اور اس میں جڑے ہوئے وہ اوراق میری نظر میں نہ آتے تو شاید بات میری سمجھ میں نہ آتی۔ میرا ذہن اتنی دور تک نہیں جا سکتا تھا۔ پوری بات تو ان اوراق میں بھی نہیں تھی لیکن کچھ ایسی کڑیاں ضرور مل گئی تھیں جن کی مدد سے میں نے پوری بات سمجھ لی تھی۔ کیتھرین کو شاید ابھی تک کتاب کی گمشدگی کا علم نہیں تھا یا پھر وہ سمجھ رہی تھی کہ کتاب بھی میں نے ہی پار کی ہوگی اور اس کے بعد ہی مجھے شیشیوں کی اہمیت کا اندازہ ہوا ہوگا۔

وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولی "اگر تم نے ان شیشیوں کو گھر سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے تو تمہارے ساتھ ساتھ یہ میرے حق میں بھی بہت برا ہوگا۔ اس صورت میں تمہیں ہلاک کرنے کا بھی مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"مجھے ہلاک کرنے کا تو تمہیں کسی بھی صورت میں کوئی فائدہ نہیں ہوگا" میں نے جلدی سے کہا۔

"لیکن تم یہ مت سمجھنا کہ اس بہانے تم جان بچا سکو گے۔ اگر تم یہ کہو گے کہ تم نے شیشیاں کہیں باہر منتقل کر دی ہیں اور وہ تمہیں ساتھ لے جائے بغیر نہیں مل سکتیں تو میں تمہیں ساتھ لے کر نہیں چل دوں گی۔ میں شیشیوں کی طرف سے صبر کر لوں گی اور اپنا دل ٹھنڈا کرنے کے لیے تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کر دوں گی لیکن اگر تم شیشیاں یہیں کہیں سے برآمد کر کے میرے حوالے کر دو تو تمہاری جان بچ سکتی ہے۔" اس نے اب گویا اپنے غصے پر قابو پا لیا تھا۔

میں نے بظاہر ایک لمحے اس کی پیشکش پر غور کیا پھر سنجیدگی سے کہا "ٹھیک ہے.... میں شیشیاں تمہیں دیتا ہوں۔ مجھے اٹھنے دو۔ پستول میری کنپٹی سے ہٹاؤ۔"

"پستول تمہاری کنپٹی سے ہی لگا رہے گا۔ کوئی حماقت نہ کرنا" وہ اب اس کیتھرین سے بہت مختلف لگ رہی تھی جسے میں نے جہاز پر دیکھا تھا۔

"تم بہت سنگدل ہو۔ اردو کے کسی شاعر کی محبوبہ سے بھی زیادہ" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میری سنگدلی کا کوئی نمونہ تو ابھی تم نے دیکھا ہی نہیں۔"

اب اس کے یاقوتی ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی تھی پھر اس نے ہدایت کی "نہایت آہستگی سے اٹھنا۔ ایک بار پھر خبردار کر رہی ہوں' کوئی حماقت نہ کرنا۔ تمہارے ساتھ اتنی نرمی صرف اس لیے کر رہی ہوں کہ تم نے جہاز پر میری جان بچائی تھی۔"

میں نے اتنا وقت بکواس میں اس لیے ضائع نہیں کیا تھا کہ اس کی ہدایات پر عمل کرتا۔ میں باتوں باتوں میں اس کے اعصاب کو ذرا معمول پر لانا چاہتا تھا۔ ہیجان زدہ انسان کسی بھی لمحے ٹریگر دبا سکتا ہے۔ اس سلسلے میں دوسرے انسان کے اندازے غلط ہو سکتے ہیں لیکن جب انسان کے اعصاب اس کے قابو میں ہوں تو پھر دوسرے کو اس کے بارے میں اندازے لگانے میں آسانی رہتی ہے۔

میں نے بظاہر اٹھنے کے لیے بازوؤں کو خفیف سی حرکت دی۔ اس کے بعد یقیناً اس کی بھی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ کس طرح میرا ہاتھ اس کی کلائی تک پہنچا اور کس طرح میں نے اس کا پستول والا ہاتھ اونچا کر دیا۔ اس نے ٹریگر دبانے میں ایک لمحہ بھی تامل نہیں کیا۔ اضطراری سے انداز میں ٹریگر دبا دیا لیکن اس کا ہاتھ بہت اونچا ہو چکا تھا۔ گولی نے فانوس کے کچھ حصے کی کرچیاں بکھیر دیں جو میرے اوپر ہی آکر گریں۔

دوسرے ہی لمحے میں کیتھرین کو بیڈ کی ایک طرف سے اٹھا کر دوسری طرف اچھال چکا تھا۔ اسمارٹ لڑکیاں اس لحاظ سے بھی اچھی ہوتی ہیں کہ انہیں ایک بازو پر اٹھا کر پھینکنا آسان ہوتا ہے لیکن میرا اندازہ تھوڑا سا غلط ہو گیا۔ وہ دوسری طرف کی دیوار سے جا ٹکرائی۔ اچھی خاصی دھمک محسوس ہوئی۔

فائر کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی لیکن اس دھمک سے میں ڈر گیا کہ کہیں اس کی کھوپڑی وغیرہ نہ چٹخ گئی ہو لیکن اس کی سخت جانی نے مجھے حیران کر دیا۔ وہ تڑپ کر اٹھی۔ پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھپٹی لیکن اس وقت تک میں بستر پر لوٹ کر اس پستول پر گر چکا تھا۔

وہ میرے اوپر گری اور اس بدبخت نے فوراً ہی کچکچا کر میری ناک چبانے کی کوشش کی۔ یہ ایک انتہائی غیر رومانوی.... بلکہ غیر نسوانی اور تقریباً غیر انسانی حرکت تھی۔ میرے خیال میں اب وہ کراٹے کے ایک آدھ ہلکے سے ہاتھ کی مستحق ہو چکی تھی جو میں نے بلا تامل اس کی کنپٹی پر رسید کر دیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک طرف کو لڑھک گئی۔

میں ایک گہری سانس لیتے ہوئے گھٹنوں کے بل اس پر جھک گیا اور جائزہ لینے لگا کہ اس دلکش وجود میں کچھ ٹوٹ پھوٹ تو نہیں ہوئی تھی۔ دفعتاً میں اپنے عقب میں ایک تشویش زدہ آواز سن کر پلٹا "یہ کیا ہنگامہ ہے.... یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

وہ چارلس تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ اس کا ایک ہاتھ نائٹ گاؤن کی جیب میں تھا اور دوسرے ہاتھ میں ایک ریوالور

نظر آرہا تھا جس کا رخ میری طرف تھا لیکن اس کا انداز دشمنوں والا نہیں تھا۔ ریوالور اس نے گویا محض احتیاطاً تھاما ہوا تھا۔ وہ تذبذب میں تھا اگر اس وقت میں اپنے کمرے کے بجائے کیتھرین کے کمرے میں ہوتا اور اس طرح اس پر جھکا ہوتا تو شاید وہ کچھ اور سمجھتا۔

وہ کچھ آگے آگیا۔ کیتھرین کو بے جان سے انداز میں چاروں خانے چت پڑے دیکھ کر اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ وحشت زدہ سے انداز میں بولا "کیا تم نے اسے مار ڈالا؟ میں نے فائر کی آواز سنی تھی۔"

"میں ابھی اتنا بدذوق نہیں ہوا کہ کیتھرین جیسی خوب صورت لڑکیوں کو ہلاک کرنے لگوں۔ مجبوری آن پڑے تو بات دوسری ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "فی الحال تو میں خود اس کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا ہوں۔"

"کیا واقعی؟" وہ بے یقینی سے بولا "لیکن اسے تم کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت آن پڑی۔ تم تو اس کے محسن ہو۔"

"یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے؟" میں نے ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر خالص اردو کا مصرع پڑھا۔ میرا خیال تھا چارلس اردو نہیں سمجھتا ہوگا لیکن اس وقت مجھے حیرت کا اچھا خاصا جھٹکا لگا جب چارلس الجھن آمیز لہجے میں اردو میں ہی بولا "یہ تمہارے اور کیتھرین کے درمیان کیا کوئی وفا اور بے وفائی کا بھی سلسلہ چل نکلا ہے؟ کیا چند دن کے بحری سفر کے دوران تم کیتھرین کو۔۔۔ یا کیتھرین تمہیں۔۔۔ یا تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے؟" اس کا اردو کا لہجہ بھی اچھا خاصا معقول تھا۔

"نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے" میں نے گڑبڑا کر جلدی سے کہا "وہ تو میں ایک طرح کی مثال دے رہا تھا کہ اس دنیا میں بعض اوقات نیکی کا کچھ اچھا صلہ نہیں ملتا۔"

"اوہ۔۔۔" اس نے سر ہلایا اور ریوالور گاؤن کی جیب میں رکھ لیا۔

"میرا خیال ہے آپ اچھی خاصی اردو بول اور سمجھ لیتے ہیں مسٹر چارلس!" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ اچھی خاصی" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تصدیق کی۔

تاہم میں نے واپس انگریزی ہی کی طرف آتے ہوئے کہا "آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے مسٹر چارلس؟ آپ کافی پریشان نظر آرہے ہیں۔"

"کیا مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے؟ رات کے دو بجے میری بیٹی ایک اجنبی کے کمرے میں بے ہوش پڑی ہے۔۔۔ یہاں ایک فائر بھی ہوا ہے۔۔۔ اٹھا پٹخ کی آوازیں بھی سنائی دی تھیں۔ آخر یہ سب کیا ہے؟"

"اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں" میں نے ایک بار پھر اردو میں کہا۔

"کس طرح کے کاموں میں؟" اس نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"بات ذرا لمبی ہے۔ آپ بیٹھ جایئے نا مسٹر چارلس" میں نے فوراً انگریزی کی طرف الٹی چھلانگ لگاتے ہوئے کہا۔ وہ گویا بادل ناخواستہ کاؤچ پر بیٹھ چکا تو میں نے کہا "اگر آپ برا نہ منائیں تو میں آپ کی بیٹی کو اٹھا کر بیڈ پر لٹا دوں؟"

"اس میں برا منانے کی کیا بات ہے؟" وہ قدرے حیرت سے بولا۔ آخر وہ انگریز تھا۔ اپنی تمام تر وضعداری کے باوجود ان تکلفات کا عادی نہیں تھا۔ میں نے کیتھرین کو گود میں اٹھا کر بیڈ پر لٹایا اور اس کا سر اس طرح تکیوں پر ٹکا دیا کہ وہ نیم درازی حالت میں آگئی۔

میں نے پلٹتے ہوئے کہا "مسٹر چارلس! اگر آپ برا نہ منائیں تو میں آپ کی بیٹی کے ہاتھ باندھ دوں؟"

"آخر تم کیا کر رہے ہو؟" وہ یکدم جھنجلا اٹھا "میرے برا منانے کو جہنم میں ڈالو۔ تمہیں جو کچھ کرنا ہے کرو لیکن خدا کے لیے مجھے جلدی بتاؤ یہ کیا قصہ ہے؟"

"میں صرف اس لیے اس کے ہاتھ باندھنے کی اجازت طلب کر رہا ہوں کہ آپ تو نارزن نہیں ہیں لیکن آپ کی بیٹی نارزن کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہوش میں آتے ہی یہ پھر ہنگامہ کرنا نہ شروع کردے۔ پُرسکون ماحول میں بات چیت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ جب یہ ہوش میں آئے تو اس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ ٹھیک ہے، باندھ دو" چارلس نے ہاتھ ہلایا۔

میں نے وارڈ روب میں سے ایک ٹائی نکالی جو نہ جانے کس کی تھی۔ میں نے کیتھرین کے ہاتھ زیادہ سختی سے تو نہیں لیکن اس طرح باندھ دیے کہ وہ خود کسی طرح بھی نہ کھول سکے پھر میں باتھ روم میں جا کر وٹامنز کی وہ تمام شیشیاں نکال لایا جو میں نے فلش کی ٹینکی میں چھپا رکھی تھیں۔ میں نے انہیں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر سجا دیا پھر میں نے بیڈ روم فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی اور چھینٹوں سے کیتھرین کا چہرہ بھگو ڈالا۔

"یہ کیا تماشا ہے؟ یہ تم اتنی بہت سی وٹامنز کی شیشیاں کیوں نکال لائے ہو؟ یہ کس کی ہیں؟" چارلس اس دوران پوچھ رہا تھا۔

"یہ آپ کی بیٹی کی ہیں۔ انہی کے لیے سارا ہنگامہ ہو رہا تھا۔ انہی کے لیے یہ مجھے مارنے پر تل گئی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"کیوں۔۔۔؟ کیا دنیا وٹامنز کے بحران سے دوچار ہونے والی تھی جو کیتھرین نے ایک ساتھ اتنی شیشیاں جمع کر رکھی تھیں؟ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے یہ وٹامنز کی کچھ اتنی زیادہ شوقین تو نہیں تھی؟" چارلس بولا۔

اس دوران کیتھرین کسمسانے لگی تھی۔ میں نے اس کے چہرے پر کچھ اور چھینٹے مارے تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میری

توقع کے عین مطابق اس نے سب سے پہلے اپنے ہاتھوں کو حرکت میں لانے کی کوشش کی لیکن وہ بندھے ہوئے تھے۔ وہ بل کھا کر رہ گئی۔ شاید وہ مجھے لات ہی رسید کردیتی لیکن میں دور ہٹ چکا تھا۔ بے شک وہ ایک حسین لات تھی لیکن اس وقت میں حسین لات بھی کھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔

دفعتاً اس کی نظر اپنے باپ پر پڑی اور اس نے ایک لتی یا دولتی چلانے کا ارادہ ملتوی کردیا اور تھکے تھکے انداز میں تکیوں سے ٹیک لگالی۔

میں نے سائیڈ ٹیبل پر رکھی شیشیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تمہیں انہی کی تلاش تھی نا؟"

اس نے ادھر دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں صرف ایک لمحے کے لیے ہلکی سی چمک نمودار ہوئی اور معدوم ہوگئی۔ میں نے چارلس کو مخاطب کیا "آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ وٹامنز کی گولیاں نہیں ہیں۔"

"تو پھر کیا یہ گولیوں کی شکل میں ہیروئن یا کوکین ہے؟" چارلس کے چہرے پر پھیلی ہوئی فکرمندی بڑھ گئی۔ اس کی رنگت میں زردی جھلک رہی تھی۔

"نہیں۔ یہ ہیروئن یا کوکین بھی نہیں ہے" میں نے جواب دیا "اس حجم میں یہ ان سے بھی زیادہ منافع بخش چیز ہے اور اس پر وہ قوانین بھی لاگو نہیں ہوتے۔"

"پہیلیاں مت بجھواؤ۔ سیدھی طرح بتاؤ، یہ کیا چکر ہے؟" چارلس الجھن زدہ لہجے میں بولا۔ میں نے کیتھرین کی طرف دیکھا۔ وہ قہر آلود نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے دوبارہ چارلس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "میں یقینی طور پر تو نہیں کہہ سکتا لیکن مجھے شبہ ہے کہ آپ کی بیٹی ڈرگز کے دھندے میں ملوث رہی ہے۔۔۔ اور شاید اب بھی ہو کیونکہ اس کے انداز و اطوار میں ایک "ڈرگ کیریئر" کی تمام خصوصیات نظر آئی ہیں۔"

"زیادہ بکواس مت کرو خبیث۔۔۔ مردود" کیتھرین میری بات کاٹتے ہوئے غرائی "تم سمجھ رہے ہو اس طرح کی باتیں کرکے تم میرے باپ کی نظر میں ہیرو بن جاؤ گے یا وہ تمہیں کسی جاسوس کی اولاد سمجھنے لگیں گے۔"

میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا اور چارلس ہی کو مخاطب کیا "میں خوب صورت خواتین پر زیادہ سختی کا قائل نہیں ہوں لیکن اگر آپ برا نہ منائیں تو اس اندازِ گفتگو پر آپ کی بیٹی کو ایک آدھ ہاتھ اور رسید کردوں؟"

"نہیں۔۔۔ نہیں۔۔۔" چارلس بوکھلا کر جلدی سے بولا "میرا خیال ہے پہلے بھی تم نے اسے کوئی ہاتھ ہی رسید کیا تھا جس کی وجہ سے یہ بے ہوش ہوئی تھی۔ میں نہیں چاہتا کہ یہ دوبارہ بے ہوش ہو۔ تم اسے ہوش میں رہنے دو اور بات جاری رکھو۔ یہ جو بکواس کرتی ہے اسے کرنے دو۔"

"اچھا۔۔۔ آپ کہتے ہیں تو میں صبر کرلیتا ہوں ورنہ میرے ہاتھ میں خاصی کھجلی ہو رہی ہے" میں نے اپنے ہاتھ کا جائزہ لیتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں یہ کہنے لگا تھا کہ آپ کی بیٹی نے اپنے لیے ایک نیا سائیڈ بزنس بھی تلاش کرلیا ہے۔ ہر گزادھر اُدھر لے جانے کا سلسلہ بھی شاید ابھی جاری ہو لیکن یہ سائیڈ بزنس شاید اس سے بھی زیادہ منافع بخش ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سائیڈ بزنس خالصتاً آپ کی بیٹی کا اپنا ہی ہے یا اس کے پیچھے بھی کوئی سینڈیکیٹ کام کر رہی ہے۔ کیونکہ آج کل دنیا کے جس دھندے میں بھی خوب دولت نظر آتی ہے۔ کوئی نہ کوئی مافیا جلدی سے آکر اسے جھپٹ لیتی ہے اور اس دھندے کو کنٹرول کرلیتی ہے۔ اسے خود چلانے لگتی ہے۔ ان دھندوں میں دور حاضر کی سیاست بھی شامل ہے۔ یعنی وہ دھندا جس میں دنیا کی سب سے زیادہ دولت ملوث ہوتی ہے۔ اب اسے بھی مختلف قسم کی مافیائیں کنٹرول کرنے لگی ہیں اور دنیا کے سیدھے سادے، بے خبر اور کم علم عوام کو اندازہ ہی نہیں ہے کہ اس کے نتائج کتنے ہولناک نکلیں گے۔ مافیاؤں کے پاس پہلے سیاسی طاقت نہیں ہوتی تھی۔ ان کی حیثیت بہرحال مجرموں کی رہتی تھی لیکن اب وہ یہ طاقت بھی حاصل کر رہی ہیں۔ اس میں سب سے زیادہ دولت کے علاوہ ان کے لیے تحفظ اور سلامتی بھی ہے مگر میں شاید اپنے موضوع سے بہت دور نکل گیا۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے" چارلس خشک لہجے میں بولا۔

"دراصل میں اس قسم کے سب موضوعات کی جڑیں کسی نہ کسی انداز میں ایک دوسرے سے جڑی ہوتی ہیں" میں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا "بہرحال میں آپ کی بیٹی کے سائیڈ بزنس کی بات کر رہا تھا۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ فی الحال اس کے پیچھے کوئی سینڈیکیٹ یا مافیا کام نہیں کر رہی ہوگی کیونکہ میرا اندازہ ہے ابھی یہ بڑے پیمانے پر نہیں پھیلا۔ ابھی اس کا منافع آپ کی ہونہار، لائق اور باصلاحیت بیٹی کی جیب میں ہی جا رہا ہوگا۔ قصہ دراصل یہ ہے کہ انڈیا کے کچھ سائنس دانوں نے جڑی بوٹیوں کی مدد سے ایڈز کا علاج دریافت کرلیا ہے۔۔۔ کم از کم ان کا دعویٰ یہی ہے۔۔۔ اور شاید ان کی تیار کردہ دوا کامیاب بھی جا رہی ہے کیونکہ کچھ خفیہ اعداد و شمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ڈیمانڈ روز بہ روز بڑھ رہی ہے۔"

چارلس ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ میں نے ایک نظر کیتھرین کی طرف دیکھا۔ اب اس کی تیزی، تندی اور سرکشی دم توڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مُردنی چھانے لگی تھی۔ غالباً اب جاکر اسے یقین ہوا تھا کہ اس کا "راز" راز نہیں رہا تھا۔

میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلسلۂ کلام جوڑا "مسئلہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں انڈیا کے جن سائنس دانوں نے تحقیق کی ہے ان کی نیت خراب ہوگئی ہے۔ ایشیائی ممالک میں اکثر

معاملات میں نیتیں خراب ہونے کا رُجحان ویسے بھی کچھ زیادہ ہی تیزی سے بڑھتا جا رہا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انڈین سائنس دانوں نے اس ریسرچ کے سلسلے میں لیبارٹریز اور وسائل تو سرکاری استعمال کیے ہوں لیکن ریسرچ انہوں نے اپنا ذاتی کام سمجھ کر کی ہو اور اب وہ اپنی اس دریافت سے خوب دولت کمانا چاہتے ہوں۔ انہوں نے سوچا ہو کہ اس فارمولے کے عام ہونے سے پہلے پہلے وہ جتنا کچھ سمیٹ سکتے ہوں، سمیٹ لیں..... یہ بھی ممکن ہے کہ وہ فارمولا کبھی عام نہ ہونے پائے کیونکہ خفیہ رپورٹ سے کچھ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ جڑی بُوٹیاں صرف انڈیا میں پائی جاتی ہیں اور شاید صرف انہی سائنس دانوں کی ان تک رسائی ہے جنہوں نے دوا تیار کی ہے۔ بہرحال... قصہ مختصر یہ ہے کہ ان سائنس دانوں نے اپنی اس دریافت کو قطعی خفیہ رکھا ہے۔ وہ اس دریافت کو دنیا کے سامنے رکھ کر.... اور اسے عام کر کے انسانیت کی خدمت کرنے یا سائنس کی دنیا میں اپنا نام امر کرنے کے چکر میں نہیں پڑے۔ انہوں نے کچھ رابطے تلاش کیے جن کے ذریعے ان کی تیار کردہ دوا کو خفیہ طور پر فروخت کیا جا سکے۔ اس کے لیے ایک نہایت محدود سی بلیک مارکیٹ تیار کی جا سکے۔ میرا خیال ہے انہوں نے ایسے لوگوں کو اپنے کام کے لیے موزوں سمجھا ہوگا جو کسی نہ کسی انداز میں ذرا اونچے پیمانے پر منشیات کے دھندے میں ملوث رہے ہوں۔ انہوں نے دو چار ہی ایسے لوگ تلاش کیے ہوں گے۔ آپ کی ہونہار بیٹی ان میں سے ایک ہے....“

چارلس کے چہرے پر ذرا تکلیف کے آثار ابھرے شاید میرا طنزیہ لہجہ اسے نشتر کی طرح چُبھ رہا تھا۔ میں ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا پھر میں نے ذرا ملائمت سے کہا ”میں یہ بات محض طنزاً نہیں کہہ رہا ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کیتھرین ایک نہایت باصلاحیت لڑکی ہے لیکن یہ انہی بدقسمت انسانوں میں سے ہے جن کی صلاحیتیں منفی کاموں میں استعمال ہونے لگتی ہیں۔ جو زندگی کے کسی موڑ پر بھٹک کر ایسے راستوں کی طرف جا نکلتے ہیں جو انہیں بہت روشن، بہت فائدہ مند نظر آتے ہیں لیکن ان پر چل کر یہ کسی منزل پر پہنچنے کے بجائے اندھیروں میں کھو جاتے ہیں اور زندگی کے سفر میں آخر کار بالکل تہی دست رہ جاتے ہیں۔“

کیتھرین نے بیزاری سے میری طرف دیکھا اور تھکے تھکے انداز میں تکیے سے ٹیک لگالی پھر وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولی ”تم نے ٹھیک کہا تھا۔ زندگی کے کسی موڑ پر تمہارے وجود میں کوئی بوڑھی روح حلول کر گئی تھی۔“

”ہاں۔ لیکن اس بوڑھی روح نے مجھے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ غلط کیا ہے اور صحیح کیا۔ میں اپنی زندگی کو جھوٹی مسرتوں، جھوٹی کامیابیوں اور جھوٹی تسکین کے پیچھے بھاگنے میں ضائع نہیں کر رہا۔ تم جیسے لوگوں کو ایک نہ ایک دن ضرور احساس ہوتا ہے کہ زندگی وہ نہیں تھی جو تم لوگوں نے گزاری لیکن اس وقت بہت تاخیر ہو چکی ہوتی ہے۔“

پھر میں نے چارلس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا ”تمہیں انڈین سائنس دانوں کی تیار کردہ دوا کے بارے میں بتایا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہی ہوگا کہ دنیا بھر میں ایڈز کا علاج دریافت کرنے کے لیے زبردست کوششیں ہو رہی ہیں اگر انڈین سائنس دان یہ اعلان کر دیتے کہ انہوں نے اس مرض کے لیے دوا تیار کر لی ہے تو انہیں اس کو تجربات کے لیے عالمی لیبارٹریز میں پیش کرنا پڑتا جس کے بعد رفتہ رفتہ یہ عام ہو جاتی۔ اس صورت میں بھی انہیں اور ان کے ملک کو بہت فائدے پہنچتے لیکن انہوں نے ان فائدوں کو بعد کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ فی الحال وہ اس کی بلیک مارکیٹ سے جو کچھ کما سکتے ہیں وہ کما رہے ہیں۔ وٹامنز کی گولیوں کی جو شیشیاں آپ سامنے رکھی دیکھ رہے ہیں یہ درحقیقت اسی دوا کی گولیاں ہیں۔ انہیں وٹامنز کی گولیوں کا ”بہروپ“ دیا گیا ہے اور شیشیوں پر وہی لیبل لگائے گئے ہیں....“

چارلس گویا اب ایک نئے زاویہ نظر سے، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ان شیشیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی ”انڈین سائنس دان اپنی دانست میں ان گولیوں کی معقول قیمت وصول کر رہے ہیں لیکن ان کے تصور میں بھی نہیں ہے کہ انہیں مارکیٹ کرنے والے، آگے ان کی کیا قیمت وصول کر رہے ہیں۔ یورپ اور امریکا وغیرہ میں ایڈز کے ایسے ایسے دولت مند مریض موجود ہیں جو اس دوا کی ایک خوراک یعنی ایک گولی کے لیے دو سو سے لے کر تین سو ڈالر تک آسانی سے ادا کر دیں گے۔ ان میں سے ہر شیشی میں تقریباً ڈھائی سو گولیاں موجود ہیں اور یہ بارہ شیشیاں ہیں۔ یعنی اس وقت تمہارے سامنے آٹھ دس لاکھ ڈالر کی رقم موجود ہے۔ دھندا برا نہیں ہے لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ انہیں مارکیٹ کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔“

چارلس نے تفہیمی انداز میں سر ہلاتے ہوئے دیوار سے ٹیک لگالی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا ”کیتھرین اس لیے بحری جہاز سے سفر کر رہی تھی کہ ائرپورٹس پر کسٹم والے زیادہ باریک بین ہوتے ہیں تاہم اس میں بھی زیادہ خطرہ نہیں تھا۔ اگر کیتھرین کی یہ چھوٹی سی کھیپ مشکوک بھی قرار پاتی تب بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ یہ گولیاں وٹامنز کی ثابت نہ ہوتیں، کسی نامعلوم دوا کی ثابت ہوتیں۔ جس کے لیے کیتھرین پر کوئی ذمے داری عائد نہ ہوتی۔ شیشیوں پر انڈیا کی کسی فارمیسی کا لیبل ہے۔ شاید اس کا کہیں وجود نہ ہو۔ ان ملکوں میں جعلسازی عام ہے۔ کیتھرین آرام سے کہہ سکتی تھی کہ اسے کسی نے وٹامنز کی جعلی گولیاں دے دی تھیں۔ کم از کم اس پر ہیروئن یا کوکین کی اسمگلنگ کا الزام تو نہیں آ سکتا تھا لیکن ایک قیمتی کھیپ ہاتھ سے جانے کا خطرہ بہرحال موجود تھا۔“

پھر مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے مزید کہا ”جہاز پر جنتر نامی جو

فرسٹ میٹ موجود تھا اسے بھی ان گولیوں کی بھنک پڑ چکی تھی۔ درحقیقت وہ ان کے چکر میں انڈیا کی متعلقہ لیبارٹری تک بھی جا پہنچا تھا کیونکہ وہ بھی ایڈز کا مریض تھا اور ابتدائی اسٹیج پر تھا۔ نہایت دل برداشتگی کے عالم میں وہ اس کا علاج تلاش کرتا پھر رہا تھا اور اس دوا کی محض اڑتی اڑتی سی خبر سن کر اس نے بڑی امیدیں باندھ لی تھیں لیکن لیبارٹری میں بیٹھے ہوئے گرگے ہر ایرے غیرے کو دوا نہیں دے سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اپنے خاص آدمیوں کو گو کہ وہ گولیاں سستے داموں دے رہے تھے لیکن جنتر وہ کم قیمت بھی افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بد عادات کی بنا پر وہ ایک قلاش آدمی تھا۔ اس میں مجرمانہ رجحانات بھی موجود تھے۔ اسے یہ ضرور اندازہ ہو گیا کہ کیتھرین اس دوا کی کھیپ لے کر روانہ ہو رہی تھی۔ وہ اس کے پیچھے لگ گیا۔ سفر کے دوران وہ یقیناً کیتھرین کے کیبن کی تلاشی لے رہا تھا اور شاید اس نے گولیاں تلاش کر کے ابھی اندازہ نہیں لگایا تھا کہ یہی اس کی مطلوبہ دوا تھی' اسی دوران عملے کا ایک بنگالی آدمی عبدل اس کے سر پر جا پہنچا۔ اس نے شاید جنتر کو رنگے ہاتھوں پکڑ لیا تھا۔ جہاز کے ایک آفیسر کے لیے یہ بڑی معیوب صورت حال تھی۔ جنتر نے گھبراہٹ میں اسے قتل کر دیا۔ بعد میں لاش خالی کیبن میں رکھ دی۔ اس کا ارادہ یہی ہو گا کہ موقع ملتے پر لاش سمندر میں پھینک دے' لیکن میری وجہ سے لاش دریافت ہو گئی پھر جب چھاپے کے وقت اس نے دیکھا کہ کیتھرین تو اس کے اندازے سے پہلے ہی رخصت ہو رہی ہے اور دوا گویا اس کے ہاتھ سے جا رہی ہے تو اس نے جان پر کھیل کر اسے یرغمال بنانے کی کوشش کی۔ اس نے شاید سوچ لیا تھا کہ اسے مرنا تو ویسے بھی ہے۔ لہٰذا دردناک موت مرنے کے بجائے ایک آخری کوشش کیوں نہ کر کے دیکھ لی جائے۔ اس کوشش میں وہ میرے ہاتھوں مارا گیا۔ اگر وہ عبدل کا قاتل نہ ہوتا تو شاید مجھے اس کے مرنے کا افسوس ہوتا اگر میں فوری قدم نہ اٹھاتا تو وہ کچھ بھی کر گزرتا۔"

چارلس جھرجھری سی لے کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا "میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ ہم تمہارے لیے اجنبی تھے لیکن تم نے ہمارے لیے اپنی جان خطرے میں ڈالی۔"

"بات دراصل یہ تھی کہ جس نے آپ لوگوں کی سفارش کی تھی وہ میرے لیے اجنبی نہیں تھا" میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تمہارا مطلب ہے سیٹھ رمضان۔۔۔؟" چارلس بولا۔

"ہاں" میں نے اثبات میں سر ہلایا "وہ خاصا بزدل اور نیم مزاحیہ سا شخص ہے لیکن میری خاطر وہ بھی اپنی جان خطرے میں ڈال سکتا ہے۔۔۔ بلکہ کوئی بعید نہیں' زیادہ ہی سنگین صورت حال میں وہ میرے لیے جان قربان بھی کر دے۔"

"مشرق میں بڑے عجیب عجیب کردار پائے جاتے ہیں" چارلس بولا۔

"ہر جگہ بڑے عجیب عجیب کردار پائے جاتے ہیں اور بڑے بڑے بدکردار بھی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"کیا میں تمام رات یونہی بندھے ہاتھوں کے ساتھ بیٹھی رہوں گی؟" کیتھرین منمنائی۔

"یہ کم از کم ہتھکڑی پہن کر کسی پولیس اسٹیشن کے تفتیشی کمرے میں بیٹھنے سے تو بہتر ہے" میں نے کہا۔

"میں نے کیا کیا ہے جو پولیس مجھے پکڑنے کی جرأت کرتی؟" وہ خونخوار بلی کی طرح غرائی' یکدم ہی اس کا لہجہ بدل گیا تھا۔

"میرا دل کہتا ہے کہ اگر تم کسی چکر میں پولیس کے ہتھے چڑھ گئیں تو تمہارا ماضی تمہارے لیے مصیبت بن جائے گا" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میرا خیال ہے تمہاری شہرت اب اس مقام پر آ رہی ہے کہ جس جہاز پر تم سفر کرو گی اس پر چھاپے پڑنے لگیں گے اور جلد ہی شاید وہ مقام بھی آ جائے کہ تمہارے باپ کا بین الاقوامی اثر و رسوخ بھی تمہارے کسی کام نہ آ سکے کیونکہ تمام ترقی یافتہ ممالک میں منشیات کے سلسلے میں پالیسیاں روز بروز سخت سے سخت ہوتی جا رہی ہیں۔ خصوصاً امریکا کا حال تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ کس طرح وہ۔۔۔ دوسرے ملکوں میں جا جا کر منشیات کے خلاف لڑ رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اس کے دل میں ان ملکوں کی محبت جوش مارنے لگی ہے بلکہ ظاہر ہے وجہ صرف یہی ہے کہ اس سیلاب نے اس کا اپنا برا حال کر دیا ہے۔ اس کے باقی سماجی مسائل تو اپنی جگہ ہیں لیکن اس مسئلے نے اسے سب سے زیادہ بدحواس کیا ہوا ہے۔ خیر۔ میں بھی کتنا بے وقوف ہوں جو تمہیں یہ باتیں بتا رہا ہوں۔ یہ باتیں تو تم مجھ سے بہتر جانتی ہو گی لیکن میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ انسان ان سب باتوں کا علم رکھتے ہوئے بھی تباہی کے راستوں پر کیوں چلتا رہتا ہے!"

چارلس بولا "ہر انسان کو یہ امید رہتی ہے کہ باقی سب لوگ تو فلاں فلاں وجہ سے پکڑے گئے لیکن میں نے چونکہ فلاں فلاں بندوبست کیا ہوا ہے اس لیے میں نہیں پکڑا جاؤں گا۔"

کیتھرین خاموش تھی۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ہماری باتیں سن بھی رہی تھی یا نہیں۔ نصیحتوں میں سب سے بڑی خرابی یہی ہوتی ہے کہ انسان انہیں ہزاروں مرتبہ سن چکا ہوتا ہے۔ اگر نصیحتوں سے دنیا ٹھیک ہو سکتی تو آج ساری دنیا ٹھیک ہو چکی ہوتی کیونکہ نصیحتیں ہزاروں سال سے کی جا رہی ہیں۔ مسئلہ یہی ہے کہ چوٹ کھائے بغیر چوٹ کی تکلیف کا اندازہ نہیں ہوتا۔

"اب تم اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتے ہو؟" چارلس نے پوچھا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہو سکا تھا میں نے آپ کو بتا دیا۔ آپ کی بیٹی کی جو مدد میں کر سکتا تھا وہ میں نے کر دی۔ جس نقصان سے اسے بچا سکتا تھا' بچا دیا۔ اب آپ جانیں اور آپ کی بیٹی" میں نے بے نیازی سے کہا۔

"یعنی تم پولیس کو میرے بارے میں مطلع نہیں کرو گے؟" کیتھرین نے گویا یکدم خوش ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے بارے میں کیا کیا جائے' یہ فیصلہ کرنا تمہارے باپ کا کام ہے۔ میں ایک اجنبی ملک میں ہوں۔ میں پرائے پھڈوں میں ٹانگ اڑانا نہیں چاہتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود اس وقت تمہارے باپ کی وجہ سے پولیس اور امیگریشن والوں کے ہتھے چڑھنے سے بچا ہوا ہوں۔ زیادہ خدائی فوجدار بننا میں افورڈ نہیں کر سکتا۔" میں نے صاف گوئی اور دیانت داری سے جواب دیا۔

"تم میری اس کھیپ پر بھی قبضہ کرنے کی کوشش نہیں کرو گے؟" کیتھرین نے گردن گھما کر آنکھوں سے شیشیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے کیا پڑی ہے ان پر قبضہ کرنے کی؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

کیتھرین نے گہری سانس لی۔ اس کے چہرے پر طمانیت پھیل گئی۔ اب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ میرے بارے میں اتنی بپھری ہوئی کیوں تھی۔ وہ میری طرف سے نہ جانے کیسے کیسے بے بنیاد اندیشوں میں الجھی ہوئی تھی۔ قصور اس کا بھی نہیں تھا۔ اس نے ایسی سوسائٹی میں پرورش پائی تھی جہاں مادی فائدے ہی سب کچھ تھے۔ اس کے بعد نہ جانے کب سے وہ ان حلقوں میں سرگرم تھی جہاں منافع بخش چیزوں یا دولت کے لیے ایک پل میں دوسرے کا گلا کاٹ دیا جاتا تھا۔ جہاں کسی کے راز سے آگاہ ہونے کے بعد اسے پوری طرح مٹھی میں جکڑنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس نے جب گولیاں اپنے کمرے سے غائب پائی ہوں گی تو اسے پہلا خیال یہی آیا ہو گا کہ میں نے وہ ہڑپ کرنے کی نیت سے چرائی ہیں۔

"اگر تم میرے بارے میں پولیس کو بھی مطلع کرنا نہیں چاہتے اور ان شیشیوں پر قبضہ بھی نہیں کرنا چاہتے تو تم نے مجھے باندھ کر کیوں بٹھایا ہوا ہے؟" کیتھرین نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"دھینگا مشتی سے بچنے کے لیے" میں نے سادگی سے جواب دیا "میں تمہارے وجود میں ٹوٹ پھوٹ دیکھنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے تو جہاز پر تمہیں ٹوٹ پھوٹ سے بچایا تھا۔"

"اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم نے صرف پاپا کے سامنے شرلاک ہومز بننے اور ڈرامے و نصیحت سے بھرپور تقریر کرنے کے لیے شیشیاں غائب کی ہیں تو میں مار دھاڑ کی کوشش نہ کرتی اور سعادت مندی سے آ کر بیٹھ جاتی بلکہ پاپا کو بھی پہلے ہی بلا لاتی اور دست بستہ تم سے درخواست کرتی کہ شیشیاں واپس دے دو" اب اس کے چہرے پر دھیرے دھیرے وہی مسکراہٹ واپس آ رہی تھی جو اسے بہت دلکش بناتی تھی۔

میں نے چارلس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ آپ کی بیٹی سدھرنے والی چیز نہیں ہے۔ آپ اسے مزید سمجھانے کی کوشش میں وقت ضائع مت کیجیے گا۔ اب آپ دونوں آرام سے جا کر سو جائیں۔ میں بھی چند گھنٹے اس آرام دہ بستر پر نیند کے مزے لینا چاہتا ہوں۔ باقی باتیں کل ہوں گی۔"

چارلس ایک ٹھنڈی سانس لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے کیتھرین کے ہاتھ کھول دیے۔ وہ کلائیاں سہلاتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بھرپور انداز میں مسکرائی اور باپ کی موجودگی کی پروا کیے بغیر انگلی سے میرا رخسار چھوتے ہوئے مخمور سے لہجے میں بولی "یو آر سو کیوٹ۔ (YOU ARE SO CUTE)"

پھر جیسے اسے کچھ یاد آ گیا۔ کنپٹی سہلاتے ہوئے بولی "لیکن تم نے ہاتھ بہت سخت مارا تھا۔ میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔"

"سخت مارا ہوتا تو تمہاری کھوپڑی چٹخ چکی ہوتی اور اس وقت تم یوں نہ چہک رہی ہوتیں" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

اس نے اپنی شیشیاں پیار بھرے انداز میں ایک ایک کر کے نہایت احتیاط سے اٹھائیں اور ایک تکیے کا غلاف اتار کر دھیرے دھیرے اس میں ڈالتے ہوئے چارلس کے اداس چہرے کی طرف دیکھ کر بولی "پاپا! آپ نے کبھی اپنی بیٹی کی صلاحیتوں کی قدر نہیں کی۔ کبھی میری کارکردگی پر خوش نہیں ہوئے۔ آپ کو کم از کم یہ سن کر تو خوش ہونا چاہیے کہ اس وقت سوئٹزر لینڈ میں ایک خفیہ اکاؤنٹ میں میرے نو ملین ڈالر جمع ہیں۔ اسپین کے شہر میڈرڈ میں میری ذاتی ولا ہے۔ پیرس میں ذاتی اپارٹمنٹ ہے۔ اور میں کچھ بھی نہیں کرتی۔۔۔ بس دنیا بھر میں گھومتی پھرتی ہوں۔ آپ بڑے ہی ناشکرے ہیں پاپا! آپ کو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی بیٹی نے اس نوجوانی میں اتنی دولت کمائی ہے جو آپ اتنے بڑے ڈپلومیٹ ہوتے ہوئے پوری زندگی میں نہیں کما سکے اور ابھی تو میرے سامنے نہ جانے کتنی عمر پڑی ہے۔"

نو ملین ڈالر۔۔۔ اسپین میں ولا اور پیرس میں اپارٹمنٹ کرن کا یقیناً چارلس کو جھٹکا لگا تھا لیکن اس کے چہرے پر ناگواری برقرار رہی۔ کیتھرین بات جاری رکھتے ہوئے بولی "اگر آپ مجھ سے نفرت کرنا۔۔۔ مجھے ہر وقت نصیحتیں کرنا چھوڑیں تو آپ بھی اس دولت سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔"

"میں لعنت بھیجتا ہوں ایسی گندی دولت پر۔۔۔ ڈرگ منی پر۔"

چارلس تیزی سے بولا "اور جہاں تک لطف اندوز ہونے کا سوال ہے تو تم اس دولت سے کتنا لطف اندوز ہو رہی ہو؟ دولت تو بینکوں میں پڑی ہے نا۔۔۔ تم تو محض چند کپڑے اٹھائے ادھر سے ادھر خانہ بدوشوں کی طرح پھر رہی ہو۔ یہ کام تو تم میرے وسائل سے بھی کر سکتی تھیں۔ رہنے کے لیے بھی ہمارے پاس لندن میں طویل و عریض حویلی نما آبائی مکان موجود ہے۔۔۔"

کیتھرین نے میری طرف دیکھ کر یوں ترحم لیکن استہزائیہ سا قہقہہ لگایا جیسے کہہ رہی ہو "اس خبطی بڈھے کی سمجھ میں میری بات نہیں آئے گی۔"

چارلس بولا "ایسے ہی کسی سفر کے دوران تم کسی ائرپورٹ یا

بندرگاہ پر زندہ کے بجائے مُردہ حالت میں اتروگی اور تمہاری ساری دولت خفیہ اکاؤنٹ میں پڑی رہ جائے گی۔"

"یہ تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس میں ایسی حیرت یا عبرت کی کیا بات ہے" کیتھرین بولی۔

"فرق صرف یہ ہے کہ جائز ذرائع سے دولت کمانے والوں کا ضمیر اس وقت بھی مطمئن ہوتا ہے جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو رہے ہوتے ہیں" چارلس بولا۔

"جائز ذرائع... ضمیر...!" کیتھرین استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ "پاپا میں آپ کو کیسے سمجھاؤں کہ آج کے دور میں یہ باتیں بے معنی ہو چکی ہیں۔"

"تم جیسے لوگوں کے لیے یہ باتیں ہر دور میں بے معنی رہی ہیں" چارلس شکست خوردہ سے انداز میں گہری سانس لے کر بولا "وہ لوگ ہی دوسرے ہوتے ہیں جن کے لیے یہ باتیں ہمیشہ سے بامعنی تھیں اور ہمیشہ بامعنی رہیں گی۔ چلو... آؤ اپنے اپنے کمرے میں چلیں۔ تمہارا ضمیر تو سو رہا ہے' اب تم بھی سو جاؤ۔"

کیتھرین نے بڑی ادا سے مسکرا کر تین انگلیاں ہلا کر مجھے گُڈ نائٹ کہا اور باپ کے ساتھ رخصت ہو گئی۔ میں نے لائٹ بجھائی اور دھم سے بستر پر گر گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن میں بھی کسی نے کوئی سوئچ آف کر دیا تھا۔ میں جلد ہی دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔

دوسرے روز تقریباً دوپہر کو ہم تینوں ناشتے کے لیے میز پر یکجا ہوئے۔ اتفاق سے تینوں ہی تقریباً ایک ساتھ تیار ہو کر ڈائننگ روم میں پہنچے تھے۔ کیتھرین اب بالکل تازہ دم نظر آ رہی تھی۔ وہ شوخ سرخ رنگ کے ایک عجیب سے لباس میں تھی اور پیرس کا کوئی ماڈل نظر آ رہی تھی۔ اس کا وجود غالباً فرانس ہی کی کسی بیش قیمت خوشبو میں نہایا ہوا تھا۔ اس خوشبو کے علاوہ اب دولت کی خوشبو بھی اس کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔ اب واقعی اس پر نظر ڈالتے ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ ایک دولت مند لڑکی تھی۔ اس نے سیّاحوں جیسے حُلیے کو فی الحال خیرباد کہہ دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی گویا اس کی حرکات و سکنات میں بھی تبدیلی آ گئی تھی۔ وہ واقعی بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔

میز پر بیٹھتے ہوئے وہ کنپٹی مسل کر دھیمے لہجے میں بولی "رات والی چوٹ خاصی تکلیف دینے لگی تھی۔ پین کلر کھا کر آئی ہوں۔"

"اگر میں نے اپنا دفاع کرنے میں پھرتی نہ دکھائی ہوتی تو اس وقت میری روح عالمِ بالا میں کہیں بھٹک رہی ہوتی۔ اسے تو کوئی پین کلر واپس بھی نہیں لا سکتا تھا۔ فی الحال تو بات پین کلر پر ہی ٹل گئی ہے ڈیئر کلر!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ دھیرے سے ہنس کر رہ گئی۔

ناشتا کرتے ہی چارلس میز سے اٹھ گیا۔ وہ چند لمحے کے لیے اپنے کمرے میں گیا پھر بریف کیس اٹھائے کمرے سے نکلا اور کچھ بتائے بغیر تیزی سے رخصت ہو گیا۔ وہ کچھ پریشان معلوم ہوتا تھا۔ اس کے ذہن پر کوئی بوجھ تھا اور میرا اندازہ تھا کہ یہ بوجھ اور پریشانی کیتھرین کے علاوہ تھی۔

میں اور کیتھرین ابھی ناشتے کی میز پر ہی موجود تھے۔ میں کافی دنوں بعد نہایت عمدہ کافی میسر آنے پر دھیرے دھیرے چسکیاں لیتے ہوئے لطف اندوز ہو رہا تھا جبکہ کیتھرین نے سگریٹ سلگالی تھی۔ اس سے پہلے میں نے اسے سگریٹ پیتے نہیں دیکھا تھا۔

دھوئیں کے لہروں کے عقب سے وہ نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ بظاہر وہ بالکل پُرسکون تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ اس کے ذہن میں کوئی کھچڑی سی پک رہی تھی۔ دفعتاً وہ بولی "جو لوگ تم سے زیادہ بے تکلف ہوں گے یا زیادہ قریب ہوں گے وہ تمہیں انی کہہ کر پکارتے ہوں گے؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا "لیکن تمہیں اچانک یہ پوچھنے کا خیال کیوں آ گیا؟"

"اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو میں بھی تمہیں انی کہہ کر پکاروں؟" اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

"اعتراض...؟" میں نے آنکھیں پٹ پٹائیں "یہ تو میرے لیے ایک اعزاز ہوگا" پھر میں نے خواب ناک سے لہجے میں کہا "کسی حسین لڑکی کے منہ سے انی کے نام سے پکارے جانا کتنا بھلا لگتا ہے۔"

"خواہ مخواہ دل پھینک نظر آنے کی کوشش مت کرو۔" وہ بدستور سنجیدگی سے بولی "مجھے اندازہ ہے کہ تم دل پھینک نہیں ہو۔"

"میرے بارے میں خواہ مخواہ اندازے وغیرہ قائم کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں تو بہت ہی "بے اندازہ" قسم کا شخص ہوں۔ میرے بارے میں اکثر لوگوں کے اندازے غلط ہو جاتے ہیں" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اچھا...!" اس نے بے یقینی سے آنکھیں پھیلائیں لیکن دوسرے ہی لمحے بے پروائی سے کندھے اچکاتے ہوئے بولی "خیر دیکھا جائے گا۔"

میں نے ذرا اس کی طرف جھکتے ہوئے کہا "لیکن تم اس قدر سنجیدہ اور تمیزدار کیسے ہو گئیں کہ مجھے انی کے نام سے پکارنے کے لیے بھی تمہیں اجازت لینے کی ضرورت آن پڑی؟"

"میں تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟" وہ بھی ذرا میری طرف کو جھکتے ہوئے نیچی آواز میں بولی۔

"ضرور... ضرور" میں نے گرم جوشی سے کہا۔

"میں اب سُدھرنا چاہتی ہوں لیکن میں جاننا چاہتی ہوں کہ سُدھر کر مجھے کیا ملے گا؟"

"سکون" میں نے بلا تامّل جواب دیا۔

"بس؟" اس نے مایوسی سے پوچھا۔

"گویا سکون کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں؟ لوگ تو اس کی خاطر اپنی ساری دولت لٹانے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں" میں نے کہا۔

وہ منہ بنا کر بولی "پتا نہیں تم کس دنیا کی بات کر رہے ہو۔ جنہیں سکون عزیز ہوتا ہے وہ دولت کے چکر میں پڑتے ہی نہیں... اور جب ایک بار انسان دولت کے چکر میں پڑ جاتا ہے تو پھر دولت کے سوا اسے کوئی چیز عزیز نہیں رہتی۔ تم اگر مجھے سُدھرتے دیکھنا چاہتے ہو تو سکون کے علاوہ مجھے کسی اور چیز کا بھی لالچ دو۔ مجھے بتاؤ کہ سکون کے علاوہ مجھے کیا ملے گا؟"

"میں کیا بتا سکتا ہوں..." میں نے ذرا گڑبڑا کر کہا "تم ہی بتا دو تم اور کیا حاصل کرنا چاہتی ہو؟"

"میں تمہیں حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ بتاؤ... کیا تم مجھے مل سکتے ہو؟" وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بلا ہچکچاہٹ بولی۔

مجھے خفیف سا جھٹکا لگا۔ میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ وہ مجھے خاموش دیکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنسی اور بولی "سٹی کیوں گم ہو گئی؟ کیا میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہیں حاصل کر سکوں؟"

میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "نہیں... تم تو اس سے کہیں زیادہ قابل ہو... دراصل میں ہی اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارا بن سکوں۔ میں تو بہت ہی معمولی' بہت ہی نالائق سا آدمی ہوں۔ تمہیں مجھ میں ایسی کیا خوبی نظر آ گئی؟"

اس نے بدمزگی سے منہ بنایا اور ہاتھ بڑھا کر میز پر ٹکا ہوا میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولی "یہ بلاوجہ کی افسانوی سی کسرِ نفسی سے کام لینا چھوڑ دو۔ میرا تمہارا ساتھ بے شک بہت مختصر رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ابھی میں نے تمہاری اصل شخصیت کی محض ایک جھلک ہی دیکھی ہے لیکن مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم کیا ہو..."

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "عزت افزائی کا بہت شکریہ۔ اگر تم مجھے کوئی "چیز" سمجھ رہی ہو تو یہ تمہارا حُسنِ نظر ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں تو خود کو بہت ہی معمولی' بہت ہی نکما سا انسان سمجھتا ہوں۔"

وہ میرے الفاظ پر توجہ دیے بغیر بولی "میں بہت سنجیدہ ہوں... بلکہ یوں کہو کہ میں زندگی میں پہلی بار سنجیدہ ہونے لگی ہوں۔ مجھے احساس ہوا ہے کہ میں واقعی بہت جلد تھک گئی ہوں۔ میں نے دنیا گھوم لی ہے۔ ہر خطرے سے کھیل کر دیکھ لیا ہے لیکن کسی کام میں کچھ نہیں رکھا۔ انسان اپنی زندگی' اپنی خواہشات کو جتنا بھی محدود رکھے اتنا ہی اچھا ہے۔ وہ اتنا ہی مزے میں رہتا ہے اور زندگی کی چھوٹی سے چھوٹی خوشیوں سے بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس کے ٹارگٹ جتنے بڑے ہوتے جاتے ہیں اتنا ہی اس کی زندگی سے خوشیاں رخصت ہوتی جاتی ہیں۔ اسے کچھ بھی پا لینے کی خوشی نہیں ہوتی۔"

"یہی تو میں اور تمہارے پاپا تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے" میں نے جلدی سے کہا۔

"جب میں سمجھنے لگی ہوں... جب میرے دل میں تمہاری قدر اور پاپا کی محبت بیدار ہوئی ہے تو تم کیوں دو ٹُلگا رہے ہو؟ تم کیوں پیچھے ہٹ رہے ہو؟" وہ میرا ہاتھ اپنے گداز ہاتھ میں مضبوطی سے تھامتے ہوئے بولی "میں اب سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر تم سے شادی کر کے کسی پُرسکون سے مقام پر گھر بسا کر بیٹھنا چاہتی ہوں۔ پاکستان... انگلینڈ... یا کوئی بھی اور ملک... جہاں تم کہو وہاں کسی پُرسکون اور خوب صورت سے شہر میں رہائش اختیار کر کے ہم اپنی جنّت تعمیر کرتے ہیں۔ زندگی کا ایک نیا دور شروع کرتے ہیں... بلکہ یوں کہو کہ اصل زندگی شروع کرتے ہیں۔ ہم یہ سمجھیں گے کہ اب تک تو ہم نے خود کو برباد ہی کیا تھا۔ زندگی کو ضائع ہی کیا تھا۔"

"یہی تو مسئلہ ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "سکون ہی تو میری زندگی میں نہیں ہے۔ میرے ساتھ رہ کر تو تمہاری زندگی میں اگر کوئی تھوڑا بہت سکون ہے بھی... تو وہ بھی برباد ہو جائے گا۔"

"کیوں... کیا تم بھی دولت کے چکر میں ہو؟" اس نے مجھے گھورا۔

"نہیں" میں نے بلا تامّل جواب دیا۔

"تو پھر تمہاری زندگی میں سکون کیوں نہیں ہے؟ تمہاری اب تک کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا جیسے صرف ناجائز دولت کے چکر میں رہنے والوں کی زندگی میں سکون نہیں ہوتا۔ باقی سب چین کی بانسری بجا رہے ہوتے ہیں۔"

"نہیں... یہ بات نہیں ہے..." میں نے گڑبڑاتے ہوئے کہا "آج کی زندگی میں ہر ایک کے لیے پریشانیاں اور مسائل تو ہوتے ہیں... لیکن میرا مقصد یہ تھا کہ زیادہ تر مسائل ہمارے اپنے پیدا کردہ ہوتے ہیں... ہماری خواہشات کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں... اگر ہم خواہشات پالنا یا انہیں زیادہ پھیلانا چھوڑ دیں تو مسائل کافی کم ہو سکتے ہیں... لیکن بعض اوقات خواہ مخواہ بھی مسائل ہمیں آن چمٹتے ہیں۔ کسی بیماری کے وائرس کی طرح ہم پر حملہ آور ہو جاتے ہیں۔ اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہوتا۔ ان کی مثال کچھ ایسی ہی ہوتی ہے کہ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ میری زندگی بھی کچھ ایسے ہی مسائل کا شکار ہے۔ میرے ساتھ رہ کر تم بھی پہلے سے زیادہ پریشان ہو جاؤ گی۔"

"اس کا مطلب ہے تمہارا پہلا فلسفہ غلط تھا۔ پریشانیاں کسی بھی حال میں انسان کا مقدّر ہو سکتی ہیں" وہ تیکھے لہجے میں بولی۔

"بے شک" میں نے تسلیم کر لینے میں ہی عافیت سمجھی۔

"چلو... میں ایک وفا شعار بیوی کی حیثیت سے ہر پریشانی میں بھی تمہارا ساتھ دوں گی۔ تمہیں کچھ اندازہ تو ہو گیا ہوگا۔ مزید اندازہ آگے چل کر ہو جائے گا... میں بہت باصلاحیت لڑکی ہوں۔

مجھے تم کسی بھی قسم کے حالات میں خود پر بوجھ محسوس نہیں کرو گے۔ میں تمہارے لیے سہارا ہی ثابت ہوں گی' بوجھ نہیں۔"

"مجھے اس میں کوئی شک نہیں کیتھرین!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "تم بلاشبہ بہت اچھی..... بہت باصلاحیت لڑکی ہو..... اور میں درحقیقت تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے مجھے اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کے قابل سمجھا لیکن میرے حالات کچھ ایسے ہیں کہ میں ابھی شادی نہیں کر سکتا۔"

"اگر انسان حالات میں الجھا رہے تو وہ زندگی بھر شادی نہیں کر سکتا۔ کوئی نہ کوئی الجھن' کوئی نہ کوئی پریشانی' کوئی نہ کوئی دشواری تو ہمیشہ ہی لاحق رہتی ہے۔ شادی تو ایک ایسا کام ہے کہ انسان جب سوچ لے کہ اسے کرنی ہے تو بس کر گزرے۔"

"میں ابھی خود کو اسی بات کا تو قائل نہیں کر پاتا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر اپنا گداز ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی "تم صرف جان چھڑانے کے لیے اتنی لمبی بحث وتمحیص کا سہارا لے رہے ہو حالانکہ میں دنیا کے کسی بھی خطے میں کسی بھی نوجوان پر اس طرح شادی کے لیے زور دیتی تو وہ خوشی سے اچھل پڑتا۔ خصوصاً جب میں کوئی شرط عائد نہ کرتی..... میری طرف سے کسی قسم کا کوئی مطالبہ نہ ہوتا اور اسے یہ بھی معلوم ہوتا کہ میں کتنی دولت مند ہوں۔"

"مجھے اس میں ہرگز شک نہیں کہ کوئی بھی نوجوان اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا کہ تم اسے اپنا شریکِ زندگی منتخب کرتیں" میں نے خلوص سے کہا "یہ محض میری بدقسمتی ہے کہ تم مجھے زندگی کے غلط موڑ پر..... یا پھر شاید غلط وقت پر ملی ہو۔ میں مجبور ہوں۔ تم سے شادی نہیں کر سکتا۔"

وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی "میں نے تو سنا تھا کہ مشرق میں صرف لڑکیاں مجبور ہوتی ہیں۔ آج پہلی بار ایک لمبے تڑنگے' آزاد اور خود مختار نوجوان کو مجبور دیکھا ہے۔"

"مجبور تو کوئی بھی ہو سکتا ہے۔ مجبوریوں کی الگ الگ نوعیتیں ہوتی ہیں" میں نے جواب دیا۔

"میں انتظار بھی کر سکتی ہوں۔ میں نے سنا ہے مشرقی لڑکیاں بڑی ایثار پسند اور صابر ہوتی ہیں۔ بعض لڑکیاں تو ساری عمر اپنے خوابوں کے شہزادے کے انتظار میں گزار دیتی ہیں۔ میں ایک مغربی لڑکی ہوتے ہوئے بھی تمہیں وفا شعاری اور ایثار کی مثال قائم کر کے دکھا سکتی ہوں۔"

"وفا مشرق یا مغرب کی میراث نہیں۔ وہ کہیں بھی پائی جا سکتی ہے۔ کہیں کم' کہیں زیادہ" میں نے مربیانہ لہجے میں کہا "اگر بے وفائی کو مغرب ہی کا تحفہ سمجھا جائے تو اب ہمارے ہاں بھی تمہاری سب برائیاں دھیرے دھیرے چلی آ رہی ہیں۔ مشرق اب وہ مشرق نہیں رہا۔ وہ وفا شعاریوں کے قصے' وہ ایثار کی باتیں' وہ عمر بھر انتظار کی باتیں' سب خواب وخیال ہوتی جا رہی ہیں۔ تو نہیں اور سہی کا زمانہ ہے۔ آج شادی' کل طلاق کا دور ہے۔ میں اپنی زندگی کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ کل کیا ہو گا؟ معلوم نہیں کل میں زندہ بھی ہوں گا یا نہیں۔ میں خواہ مخواہ تمہیں اپنے انتظار میں لٹکا کر تمہاری زندگی کے حسین اور سنہرے ماہ وسال ضائع نہیں کرانا چاہتا۔"

"یوں تو کسی کی بھی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں" وہ بولی "خصوصاً مجھ اور تم جیسے مہم پسندوں کی زندگی کا تو بالکل ہی کوئی بھروسا نہیں ہوتا لیکن اس اندیشے سے لوگ اپنے کام ترک نہیں کر دیتے' خواہشوں کو خیرباد نہیں کہہ دیتے..... بلکہ اس طرزِ زندگی میں تو لوگ خواہشوں کی تکمیل میں تیزی دکھانے لگتے ہیں۔ ہر خوشی کو جھپٹ لینے کی کوشش کرتے ہیں کہ نہ جانے کل موقع ملے یا نہیں۔ راہ چلتے شادی کر لیتے ہیں۔"

"اور راہ چلتے ہی طلاق ہو جاتی ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا "میں اس قسم کی شادی نہیں کرنا چاہتا۔"

"مجھ جیسی لڑکیوں کی جب کایا پلٹتی ہے تو وہ بڑی عجیب بیویاں ثابت ہوتی ہیں۔ شاید تمہارا کبھی مجھے چھوڑنے کو دل نہ چاہے۔"

اس لڑکی پر یکدم یہ عجیب ہی سنک سوار ہوئی تھی۔ وہ گویا مجھے قائل کرنے پر تلی ہوئی تھی۔

ادھر میرا یہ عالم تھا کہ میں اس سے شادی کے موضوع پر بات کر رہا تھا لیکن میرے ذہن میں بار بار راحیلہ کی تصویر ابھر رہی تھی۔ مجھ سے نہ جانے کس کس نے شادی کرنا چاہی تھی لیکن ایک میں تھا کہ اس بدبخت کی "ہاں" کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ ایک بے عنوان سی ندامت اور خجالت کے تحت "ہاں" نہیں کرتی تھی۔ خود کو سزا دے رہی تھی۔ ورنہ ویسے مجھ پر زندگی نچھاور کر رہی تھی۔ "جان دے دینا" محض لفظوں کی حد تک بہت آسان لگتا ہے لیکن درحقیقت یہ بڑا مشکل کام ہے۔ اس افسانوی جملے کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے اپنا لہو بہانا بڑے جگرے کا کام ہے لیکن مجھے معلوم تھا راحیلہ یہ کام کر سکتی تھی..... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کر رہی تھی۔

باقی آوارہ گردیاں اپنی جگہ تھیں لیکن شادی کا مسئلہ میرے خیال میں بڑا نازک تھا۔ میں راحیلہ کی "ہاں" کا انتظار کرنا چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا اس کی زندگی میں کوئی کمزور لمحہ ضرور آئے گا جب وہ اپنی ندامت' اپنی خجالت کو بھول جائے گی' اپنی خواہ مخواہ کی عذر بازی' انکار اور تکرار سے نکل آئے گی۔ اس کے اندر کوئی ایسی ہوک ضرور اٹھے گی جب وہ اچانک ہاں کر بیٹھے گی۔ میں اس لمحے کے انتظار میں تھا۔ یہ انتظار ہی ہر دوسری جگہ میرے منہ سے انکار نکلوا تا تھا۔

دفعتاً کیتھرین سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی اور گہری سنجیدگی سے بولی "میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں کچھ

دکھانا چاہتی ہوں۔"

اوپر اپنے بیڈ روم میں پہنچ کر اس نے دروازہ مقفل کر دیا اور پھر مجھ پر چودہ طبق روشن ہو گئے۔ مجھے اچانک ہی پتا چلا کہ وہ مجھے درحقیقت کچھ نہیں' صرف اپنا آپ دکھانا چاہتی تھی۔ کیا وہ اپنی ضد کی تنی ہی پکی تھی یا پھر اس کے عزائم کچھ اور تھے؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے تم اپنے آپ میں نہیں ہو۔ میں اپنے کمرے میں چلتا ہوں۔"

"ہاں..... میں اپنے آپ میں نہیں ہوں....." وہ مرمریں بانہیں میرے گلے میں حمائل کرتے ہوئے بولی "لیکن کیا تم واقعی اتنے احمق ہو کہ اس وقت اپنے کمرے میں جانا چاہتے ہو؟"

"وہ..... دراصل....." میں ہکلا کر رہ گیا۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ فطرت کے تقاضے اپنی جگہ تھے۔ میں کوئی مافوق الفطرت انسان نہیں تھا کہ اس کی حرکتوں سے متاثر نہ ہوتا لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں کوئی اندیشہ سا ڈنک مار رہا تھا "کیا وہ میرے ساتھ کسی قسم کا کھیل کھیل رہی تھی؟ کیا وہ مجھے کسی طرح بلیک میل کرنے کا کوئی بندوبست کر رہی تھی؟ یا وہ واقعی خواہشوں کے جنگل میں اتنا آگے نکل گئی تھی کہ ہر قیمت پر مجھے اپنا طلب گار بنا لینا چاہتی تھی؟"

مجھے وہ دکان دار یاد آ رہے تھے جو آپ کے ہاتھ اپنی پتلون بیچنے کے لیے بڑے اصرار سے کہتے ہیں "جناب! وہ کونے میں ڈریسنگ روم میں جا کر پہن کر دیکھ لیجیے..... بڑی لاجواب چیز ہے....." لیکن میرے خیال میں پتلون اور عورت میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

اندیشے' سوالات اور خیالات اپنی جگہ تھے' جذبات اپنی جگہ۔ میں نے اِدھر اُدھر کھسکنے کی کوششیں ترک کر دیں اور پیش قدمی کا جواب پیش قدمی سے دینے لگا۔ تب وہ مخمور سے انداز میں ہنسی اور بولی "تم نے صحیح کہا تھا' مغرب دھیرے دھیرے مشرق میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ تم مشرقی بھی کتنے بدمعاش ہو گئے ہو۔ عیاشی کا کوئی موقع ملے تو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے لیکن شادی کے نام پر بہانے گھڑنے لگتے ہو۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اس وقت کسی اور فضا میں پرواز کر رہا تھا۔ میں خوابوں کے جزیروں کے سفر پر تھا اور واپس آنا نہیں چاہتا تھا۔ تاہم اس کی بات سن کر اور اس کے لہجے کے طنز کو محسوس کرتے ہوئے مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ یکدم مجھے زور سے پرے دھکیل دے گی اور بالکل بدلے ہوئے لہجے میں کہے گی "دفع ہو جاؤ یہاں سے..... اور آئندہ میری طرف آنکھ اٹھا کے بھی مت دیکھنا۔"

تاہم ایسا نہیں ہوا۔ اس نے صرف طنز کا ہلکا سا نشتر چبھونے پر ہی اکتفا کیا لیکن چند لمحے بعد وہ بولی "میرا خیال ہے تمہیں ایک ضروری بات بتا دوں تو بہتر ہو گا۔"

"حیرت ہے..... تمہیں اس وقت بھی باتیں کرنے کا ہوش ہے؟" میں نے بدلی بدلی سی آواز میں کہا۔

"بات بہت ضروری ہے" وہ لڑکھڑاتی سی آواز میں بولی "میں ایڈز کی مریضہ ہوں۔"

"کیا.....؟" مجھے گویا کئی ہزار وولٹ کا جھٹکا لگا۔ جذبات کا سارا نشہ یک لخت اتر گیا۔ میں یوں کئی قدم پیچھے ہٹ گیا جیسے کسی نے مجھے دھکا دیا ہو۔ وہ ہنستے ہنستے دُہری سی ہو گئی۔

"دیکھا..... ایک لمحے میں کیسے ہوش میں آ گئے!" بالآخر وہ ہنسی روکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی حالانکہ وہ خود بھی اس طرح چاق وچوبند نظر آنے لگی تھی جیسے بے خودی اسے چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ معلوم نہیں وہ پہلے اداکاری کر رہی تھی یا اب اپنے آپ پر ایک ہی لمحے میں قابو پا لینے کا حیرت انگیز مظاہرہ کر رہی تھی۔ بہرحال اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اسے بار بار دوسرے کے ذہن کو جھٹکا لگانے کا فن خوب آتا تھا۔

"بات ہی ایسی ہے" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا "بہرحال میں تمہارا ازحد شکر گزار ہوں کہ بروقت تم نے یہ بات مجھے بتا دی..... ویسے..... جس طرح تمہیں یہ مرض کسی سے لگا ہو گا' کیا اسی طرح تم نے بھی یہ تحفہ آگے کچھ لوگوں تک پہنچایا ہے؟ دانستہ یا نادانستہ طور پر.....؟"

"اس معاملے کو راز ہی رہنے دو۔" وہ شریر سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی لیکن یہ اس سنسنی سے بہت مختلف تھی جو چند لمحے پہلے میرے رگ وپے میں دوڑ رہی تھی۔ میں گویا اپنی جھونک میں کسی بھیانک گڑھے کے عین کنارے پر پہنچ گیا تھا لیکن آخری لمحے پر کسی نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا تھا۔

میں نے ایک نئے زاویۂ نگاہ سے اس کا سر تاپا جائزہ لیتے ہوئے کہا "لیکن تم ایڈز کی مریضہ لگتی تو نہیں؟"

"ایڈز کے مریضوں کے کوئی سینگ تو نہیں نکل آتے" وہ بدستور شوخ لہجے میں بولی "حالت تو آخری اسٹیج پر جا کر بگڑتی ہے۔ میں تو ابھی ابتدائی اسٹیج پر ہوں۔"

"تمہیں پتا کیسے چلا؟"

"مجھے شبہ ہوا تھا۔ میں نے ٹیسٹ کرایا۔ ٹیسٹ سے یقینی طور پر معلوم ہو گیا" اس کا لہجہ بدستور شوخ وشگفتہ تھا۔ اس کے چہرے پر بھی اس انسان کی سی مایوسی و درماندگی کی کوئی پرچھائیں نہیں تھی جسے معلوم ہو کہ وہ ایک بھیانک' لاعلاج مرض میں مبتلا تھا اور دردناک موت دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔

اچانک میرا ذہن ایک امکان کی طرف گیا اور میری سمجھ میں آیا کہ اس کے اطمینان کی وجہ کیا ہو سکتی تھی۔ میں نے چونکتے ہوئے کہا "تمہارے پاس تو ایڈز کا علاج موجود ہے۔ کیا تم نے وہ گولیاں نہیں آزمائیں؟"

وہ ایک بار پھر شریر سے انداز میں ہنسی اور بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "اب میں تمہیں صحیح بات بتا ہی دوں۔ میں ایڈز میں مبتلا ضرور ہوئی تھی لیکن بہت جلد ہی مجھے پتا چل گیا۔ میں نے وہی گولیاں استعمال کی تھیں۔ میں بالکل صحت مند ہو گئی تھی۔ میں نے پچھلے دنوں اپنا ایچ آئی وی ٹیسٹ کرایا تھا۔ رزلٹ نیگیٹو نکلا تھا۔ اب میرے خون میں ایڈز کا وائرس نہیں پایا جاتا۔"

"چلو یہ تو اچھا ہوا" میں نے گہری سانس لی۔

"اب تو میں تمہارے قریب آسکتی ہوں نا؟" اس نے مسکراتے ہوئے آگے بڑھ کر ایک بار پھر میرے گلے میں بانہیں حمائل کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے نرمی سے اسے روک دیا۔

"دیکھو..." میں نے ملائمت سے کہا "جہاں تک انڈیا کی بنی ہوئی ان گولیوں کا تعلق ہے تو اپنے دل کو تسلی دینے یا ان کے ذریعے لاکھوں کروڑوں کا کاروبار کرنے کی حد تک تو وہ ٹھیک ہیں... ممکن ہے ان سے علاج ہو بھی جاتا ہو... انسان کی جان بچ جاتی ہو اور وہ طبعی عمر گزار لیتا ہو... لیکن میں محض ان کی بنیاد پر اپنے لیے رسک لینے کو تیار نہیں ہوں۔"

"اوہ... میرے خدا...!" وہ استہزائیہ سے انداز میں ہنسی "انسان کو زندگی کتنی پیاری ہوتی ہے۔"

"بے شک۔ انسان کو جان سے زیادہ کچھ پیارا نہیں... لیکن میں جان کے معاملے میں اس طرح بزدل نہیں جس طرح تم سمجھ رہی ہو۔ میں نے جان جانے کے تصور سے کبھی اپنے آپ کو خوف زدہ محسوس نہیں کیا۔ اگر کسی دشمن سے لڑتے ہوئے... یا کسی اصول کی خاطر لڑتے ہوئے جان جانے کا معاملہ ہو تو میں ایک لمحے کے لیے بھی خوف زدہ نہیں ہوں گا لیکن تین طرح کی موت سے مجھے بڑا خوف آتا ہے۔ ایک تو یہ کہ آپ بڑے اطمینان سے کہیں چلے جا رہے ہوں کہ اچانک کوئی آوارہ گولی آکر آپ کو لگ جائے اور آپ پٹ سے گر کر آوارہ کتے کی طرح مر جائیں۔ یہ ایک عجیب بے مصرف سی موت ہے۔ دوسرے یہ کہ آپ کسی گروہ کے قابو میں آجائیں اور وہ آپ کو یکدم مارنے کے بجائے اذیتیں دے دے کر زیادہ سے زیادہ دیر میں ہلاک کرے۔ یہ بھی ایک عجیب بے بسی، بے چارگی کی کربناک موت ہے۔ تیسرے یہ کہ آپ کسی ناقابلِ علاج اور غلیظ سی بیماری میں مبتلا ہو کر بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مریں۔ میں نے ہمیشہ خدا سے دعا کی ہے کہ وہ مجھے اس طرح کی موت سے بچائے۔ جس طرح انسان خدا سے ڈھنگ کی زندگی کی دعا کرتا ہے اس طرح موت بھی ڈھنگ کی مانگنی چاہیے۔ آگے جو اللہ کی مرضی..." میں نے گہری سانس لی۔

"واہ... واہ... بہت خوب!" کیتھرین نے تالی بجائی پھر بیڈ کے کنارے پر بیٹھتی ہوئی بولی "اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں تو تم سے مذاق کر رہی تھی۔ سرے سے ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے... تو...؟"

"تو میں یہ کہوں گا کہ یہ ایک نہایت ہی واہیات مذاق تھا اور بہت ہی غلط وقت پر کیا گیا تھا۔ اس نے میرے دل میں وہم کا بیج بو دیا ہے جو کسی طرح بھی میرے دل سے نہیں نکل سکتا" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

تب وہ نہ جانے کیوں ہنستے ہنستے بستر پر لوٹ پوٹ ہو گئی۔ میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا لیکن ایسا لگتا تھا کہ میری سنجیدگی دیکھ کر اسے زیادہ ہنسی آرہی تھی۔ اس کی ہنسی ذرا تھمی تو وہ ہانپنے کے سے انداز میں بولی "چلو... یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ تمہارے دل میں وہم بیٹھ گیا... لیکن پھر بھی... تم ذرا بچ کر رہنا... کیونکہ میرا دل تم پر آگیا ہے۔"

میں نے سر کھجاتے ہوئے منہ پھیر کر کہا "میں چلتا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھولتا، دروازے پر دستک ہوئی۔ کیتھرین نے اپنے لباس کی طرف لپکتے ہوئے بہ آواز بلند پوچھا "کون ہے؟"

"میں ہوں... چارلس" باہر سے آواز آئی۔

میں سٹپٹا گیا لیکن کیتھرین کو کوئی تشویش نہ ہوئی۔ وہ نہایت ہموار لہجے میں بولی "ایک منٹ پاپا..."

اب میرا دروازہ کھول کر باہر جانا مناسب نہیں تھا۔ میں وہیں حتی الامکان مدبّرانہ انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر کاؤچ پر بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا لی۔ کیتھرین نے صحیح حالت میں آنے میں بڑی پھرتی دکھائی اور دروازہ کھول دیا۔ چارلس بریف کیس اٹھائے کمرے میں آگیا۔ اس کے چہرے پر اب بھی پریشانی مترشح تھی۔ کمرے میں میری موجودگی کو اس نے قطعاً کوئی اہمیت نہیں دی اور نہ ہی غالباً اسے یہ گمان گزرا کہ اس کی آمد سے پہلے کمرے میں کوئی ڈراما جاری تھا بلکہ الٹا وہ ہیٹ اتار کر سر کھجاتے ہوئے ذرا اطمینان سے بولا "خدا کا شکر ہے کہ تم دونوں گھر پر موجود ہو۔ میں اس وقت خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہا تھا۔ مجھے ایک ضروری کام سے ایک بار پھر باہر جانا تھا لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے مجھ میں ہمت نہیں ہے۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، کیتھرین باپ کے قریب پہنچ کر محبت سے اس کے گلے میں بانہیں حمائل کرتے ہوئے بولی "بات کیا ہے پاپا؟ میں جب سے یہاں پہنچی ہوں آپ کو کچھ پریشان دیکھ رہی ہوں۔ لگتا ہے میرے علاوہ بھی کوئی آپ کے لیے پریشانی کا باعث ہے۔ کم از کم میری طرف سے تو اب آپ پریشان ہونا چھوڑ دیجیے۔ میرے علاوہ اگر آپ کو کوئی پریشانی لاحق ہے تو بتائیے۔"

چارلس نے آنکھیں پھاڑ کر بیٹی کی طرف دیکھا۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کیتھرین ہی تھی جو اس سے ایسے لہجے میں بات کر رہی تھی۔ وہ کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "میرے کان بج رہے ہیں یا واقعی تمہارے لہجے میں وہ اپنائیت اور شیرینی ہے جسے محسوس کرنے کے لیے میں ترس رہا تھا؟"

"اوہ... چھوڑیں پاپا! اولاد اپنی ضد یا مہم پسندی میں کتنا ہی آگے نکل جائے، والدین سے اس کا رشتہ ٹوٹ تو نہیں سکتا۔" وہ کاؤچ پر ہی اپنے پاپا کی بائیں طرف ٹک گئی۔ دائیں طرف میں تھا۔ چارلس کبھی اس کی طرف دیکھ رہا تھا کبھی میری طرف۔

کیتھرین نہایت سنجیدگی سے بات جاری رکھتے ہوئے بولی "ماں کی محبت سے تو میں برسوں پہلے ہی محروم ہو چکی تھی۔ میری خوش قسمتی تھی کہ مجھے آپ جیسا محبت کرنے والا باپ میسّر تھا ورنہ ہماری سوسائٹی میں تو اولاد کے جوان ہونے کے بعد اولاد کو ماں باپ کی اور ماں باپ کو اولاد کی پروا ہی نہیں ہوتی کہ وہ کہاں رہ رہے ہیں، کس حال میں ہیں۔ میں بدنصیب تھی جو آپ کی محبت سے استفادہ نہیں کر پا رہی تھی۔ مجھے اس کی قدر ہی نہیں تھی کہ یہ کیسی انمول چیز ہے لیکن اب مجھے احساس ہو گیا ہے۔ آپ سے لاتعلق ہو کر میں نے اپنی زندگی میں بہت بڑا خلا پیدا کر لیا تھا۔"

"خدایا...! میں کس طرح تیرا شکر ادا کروں؟" چارلس دونوں ہاتھ چھت کی طرف اٹھا کر خالصتاً شیکسپیئر کے ڈراموں والے انداز میں بولا پھر ایک بازو کے حلقے میں کیتھرین کو اپنے ساتھ چمٹا لیا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے رخساروں پر آنسو پھیل رہے تھے۔ یہ کمبخت گورے ویسے بہت بے حس سے لگتے ہیں، اپنے جذبات کے اظہار میں بخیل سے لگتے ہیں لیکن جب جذبات کے اظہار پر آتے ہیں تو پھر گرد و پیش کی پروا نہیں کرتے۔ کھل کر ہنستے ہیں، کھل کر روتے ہیں۔ ہر معاملے میں کھلّے ڈُلّے ہی نظر آتے ہیں۔ باپ بیٹی کے جذباتی سین میں، میں اپنے آپ کو قطعی فاضل اور کچھ کچھ چغد سا محسوس کر رہا تھا۔

میں اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اچانک چارلس کو جیسے کوئی خیال آیا۔ وہ کیتھرین کو خود سے علیحدہ کرتے ہوئے بولا "یہ انقلاب آیا کیسے؟"

کیتھرین کی آنکھوں میں بھی نمی تھی۔ معلوم نہیں اب بھی ڈراما کر رہی تھی یا واقعی سنجیدہ تھی۔ وہ آنسوؤں سے بھیگی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "پاپا! بعض پرانی کہانیوں میں آپ نے پڑھا ہو گا کہ کسی بگڑے ہوئے شخص کو کوئی بزرگ ملتا ہے اور وہ اپنی باتوں سے، اپنے عمل سے اس کی زندگی کا رخ بدل دیتا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کردار اور کرداروں کے انداز بدلتے رہتے ہیں لیکن کہانیاں اکثر دُہرائی جاتی ہیں پاپا! میری زندگی میں بھی ایک بزرگ گھس آیا ہے۔ لگتا یہی ہے کہ اس نے میری زندگی کا رخ یکسر بدل دیا ہے... اور اگر کوئی کسر رہ گئی ہے تو اسے بھی وہ پوری کر دے گا۔"

"بزرگ...؟ کون بزرگ؟" چارلس نے حیرت سے پوچھا۔

کیتھرین نے میری طرف اشارہ کیا۔ چارلس بھی بھیگی بھیگی آنکھوں کے ساتھ دھیرے سے ہنس دیا۔ "تم کیوں بے چارے

افضل چوہدری کو بزرگ بنا رہی ہو۔ یہ تو ابھی ادھیڑ عمر بھی نہیں ہے۔"

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ بزرگی کا تعلق عمر سے نہیں ہوتا۔" کیتھرین بولی۔ "بہرحال میں نے اچانک ہی اپنے طور طریقے اور اپنی زندگی کا انداز بدلنے کا فیصلہ کیا ہے لیکن مجھے اس میں کافی دشواری پیش آئے گی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں ڈرگز کی کیریئر رہی ہوں اور سائڈ میں اپنا دھندا بھی کرتی رہی تھی۔ میں کولمبیا کی ایک سینڈیکیٹ کے لیے کام کرتی رہی ہوں اور زیادہ تر کوکین بہاماز کے راستے کیلی فورنیا پہنچاتی رہی ہوں۔ کافی عرصے سے میں نے ان کے لیے کام بہت کم کر دیا ہے لیکن مجھے ان کے پیغام ملتے رہتے ہیں۔ اب میں انہیں مکمل طور پر چھوڑنے کا فیصلہ کر رہی ہوں لیکن لگتا ہے وہ مجھے نہیں چھوڑیں گے... اور وہ بہت خطرناک لوگ ہیں۔ بین الاقوامی طور پر خطرناک لوگ..." اس نے نہ جانے کیا تصور کرتے ہوئے جھرجھری سی لی۔

چارلس فوراً پُرجوش لہجے میں بولا "تم ان کی فکر مت کرو۔ مجھے معلوم ہے کولمبین مافیا کتنی طاقتور ہے۔ انہوں نے تو اردگرد کی چھوٹی حکومتوں کے سربراہوں تک کو اس دھندے میں ملوث کر لیا ہے۔ ججوں، صحافیوں اور ہر شعبۂ زندگی کے انتہائی بارسوخ لوگوں تک کو قتل کر چکے ہیں۔ میں ان کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں اور ان کی تمام تر خونخواری سے آگاہ ہوں۔ اس کے باوجود میں تمہیں اطمینان دلاتا ہوں کہ تمہیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اصل اہمیت تمہارے اپنے ارادے کی تھی اگر تم نے ان کے چنگل سے نکلنے کا ارادہ کر لیا ہے تو میں تمہاری ہر ممکن مدد کروں گا، تمہیں تحفظ فراہم کرنے کے لیے اپنا تمام تر اثر و رسوخ استعمال کروں گا۔ ڈرگز والوں کے خلاف مزاحمت کے لیے تو مجھے ہر طرح کی مدد میسر ہے، باقی معاملات میں خواہ میرا ہاتھ زیادہ دور تک نہ پڑتا ہو۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "میں اگرچہ ایک معمولی سا آدمی ہوں... اور خود تم سے بھی کچھ زیادہ خطرناک حالات کا شکار ہوں لیکن ایک اچھے مقصد کے لیے میں بھی تمہاری مدد کو حاضر ہوں۔ میں جس قابل بھی ہوں، تمہارے کام آنے کی کوشش کروں گا۔"

"مجھے معلوم ہے تم اس سے کہیں زیادہ "قابل" ہو جتنا نظر آتے ہو۔ معلوم نہیں کس مصلحت کے تحت تم نے انکسار کا لبادہ اوڑھا ہوا ہے۔" کیتھرین مسکراتے ہوئے بولی۔

"انکسار... اچھی چیز ہے۔ انسان اگر واقعی کسی قابل ہو تب بھی اسے انکسار سے ہی کام لینا چاہیے" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

چارلس بولا "خدا کا شکر ہے کہ کیتھرین کی طرف سے میرے ذہن پر جو بوجھ تھا وہ اتر گیا لیکن میرے ذہن پر ابھی ایک اور بوجھ بدستور موجود ہے جس نے مجھے پریشان کیا ہوا ہے۔ صرف اسی کی

وجہ سے میں ترکی میں پھنسا بیٹھا ہوں۔"
پھر اس نے بطور خاص مجھے مخاطب کیا "صرف اسی پریشانی کی وجہ سے میں کیتھرین کے پیچھے نہیں آسکا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ میرے نہ آنے کی وجہ سے اسے تمہاری رفاقت میسر آگئی جس کی وجہ سے مجھے اس کی زندگی کا رخ تبدیل ہوتا دکھائی دے رہا ہے۔ اب مجھے جو مسئلہ درپیش ہے۔۔۔ میرا دل کہتا ہے کہ اس کے سلسلے میں بھی تم میری کوئی نہ کوئی مدد ضرور کرسکتے ہو۔"
معلوم ہوتا تھا بے چارے چارلس پر میری کچھ زیادہ ہی دھاک بیٹھ گئی تھی حالانکہ میں نے تو اس کے سامنے کوئی ایسا خاص کارنامہ بھی انجام نہیں دیا تھا۔ وہ بڑی اپنائیت سے میرا گھٹنا تھپتھپاتے ہوئے بولا "تمہارے اندر طاقت اور ذہانت کا ایک عجیب امتزاج موجود ہے۔۔۔"
"اچھا۔۔۔؟ مجھے نہیں معلوم تھا" میں نے سادگی سے کہا۔
"اب زیادہ بنو مت۔" وہ گھٹنے سے میرے کندھے پر آگیا اور اسے زیادہ جوش و خروش سے تھپتھپاتے ہوئے بولا "معلوم نہیں کیوں میں تمہارے لیے اپنے دل میں بہت زیادہ اپنائیت محسوس کرنے لگا ہوں۔۔۔"
میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ عجیب صورتِ حال تھی۔ صرف بیٹی ہی نہیں' باپ بھی میرے لیے اپنے دل میں اپنائیت محسوس کرنے لگا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے اس پر خوش ہونا چاہیے تھا یا فکر مند؟
چارلس بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں تمہیں اس امید پر ایک اہم راز میں شریک کررہا ہوں کہ تم میری مدد ضرور کرو گے۔"
"پہلے پتا تو چلے مسئلہ کیا ہے؟" میں نے کہا۔ مجھے اس کی مدد کرنے میں بہرحال کوئی عذر نہیں تھا۔ فی الحال میرے پاس اپنے وقت کا کوئی اور مصرف نہیں تھا۔
"اس چھوٹے سے مسئلے نے برٹش اور ٹرکش' دونوں حکومتوں کی سیکرٹ سروس کو پریشان کررکھا ہے۔۔۔" چارلس کچھ سوچتے ہوئے بولا۔
میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "میں بے چارہ آپ کو اس قابل نظر آتا ہوں کہ جس مسئلے نے ایسے ملکوں کی سیکرٹ سروس کو پریشان کررکھا ہے' میں اس کے سلسلے میں کچھ کرسکوں؟" مجھے واقعی چارلس کا یہ خیال عجیب سا لگا تھا۔
"ہاں؟" وہ گہری سنجیدگی سے سرہلاتے ہوئے بولا "بعض اوقات بڑے بڑے ادارے اپنے روایتی طور طریقوں اور لگے بندھے فارمولوں کی وجہ سے وہ کام نہیں کرپاتے جو کوئی اکیلا شخص پھرتی سے حرکت میں آتے ہوئے' صورتِ حال کو صحیح طرح سمجھتے ہوئے' آگے بڑھ کر بہت کم وقت میں کرگزرتا ہے۔"
وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا۔ میں اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ کیتھرین بھی ہمہ تن گوش تھی۔ چارلس بولا "تمہیں شاید معلوم ہی ہوگا کہ تین دن بعد ہمارے ہاں سے لیڈی ڈائنا ترکی آرہی ہیں۔"
"نہیں' مجھے نہیں معلوم تھا" میں نے اعتراف کیا "میں نے ابھی تک کوئی ٹرکش یا انگریزی اخبار نہیں دیکھا تھا۔ ترکی تو پڑھنی ہی نہیں آتی تھی۔ میں تو یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا "زبان یار من ترکی و من ترکی نہ می دانم" میرا ذہن تو ابھی اپنے معاملات میں ہی الجھا ہوا تھا۔ باقی کسر کیتھرین نے پوری کردی تھی۔ اس نے اور بھی زیادہ الجھالیا تھا۔ مجھے بھلا لیڈی ڈائنا وغیرہ کے بارے میں خبریں پڑھنے اور پھر انہیں یاد رکھنے کا ہوش کہاں تھا۔
میں نے نیم سنجیدگی سے پوچھا "اکیلی ہی آرہی ہیں کیا؟ پرنس چارلس ساتھ نہیں آرہے؟"
"نہیں" چارلس نے ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا "پرنس چارلس کی جگہ غلام چارلس آیا ہوا ہے۔۔۔" اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر گردن کو خم دیا۔ "لیڈی بہرحال اکیلی ہی آرہی ہیں۔ ان کی کئی مصروفیات ہیں۔ ریڈ کراس کے ایک سیمینار میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شرکت کرنی ہے۔۔۔ سالویشن آرمی کے ایک مرکز کا افتتاح کرنا ہے۔۔۔ خواتین کے عالمی دن سے متعلق ایک کانفرنس کی صدارت کرنی ہے۔۔۔ اس کے علاوہ مجموعی طور پر ان کا یہ دورہ خیر سگالی کا دورہ ہے۔ گوکہ ان کی کوئی سرکاری حیثیت نہیں لیکن انہیں مکمل سرکاری پروٹوکول دیا جائے گا۔ ہمارے سفیر انہی انتظامات کے سلسلے میں مصروف ہیں اسی لیے دن میں یہاں نظر نہیں آتے۔ مسئلہ یہ آن پڑا ہے کہ۔۔۔" اس نے جملہ نامکمل چھوڑ کر گھڑی دیکھی۔
پھر کچھ سوچ کر وہ اٹھتے ہوئے بولا "اگر تم میرے ساتھ چلو تو بات خود بخود تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ میں اس وقت اسی سلسلے میں ایک جگہ جارہا ہوں۔"
میں نے صرف ایک لمحے سوچا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے لیے یہ ایک طرح کا شغل ہی تھا۔ وقت گزاری ہی وقت گزاری میں اگر میں چارلس کے کسی کام آجاتا تو اس میں کوئی حرج نہیں تھا۔
اسی لمحے کیتھرین بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی "میں بھی چلوں گی پاپا!"
چارلس نے گہری نظر سے بیٹی کی طرف دیکھا۔ ایک لمحے کے لیے وہ گویا الجھن میں پڑگیا پھر ملائمت سے بولا "بنی! جہاں ہم جارہے ہیں وہ جگہ ایک لڑکی کے لیے۔۔۔ خصوصاً ایک سفید فام اور ماڈرن لڑکی کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔"
"پاپا! میں ان لڑکیوں میں سے نہیں ہوں جنہیں کہیں جانے سے پہلے سوچنا پڑتا ہے کہ وہ جگہ ان کے لیے مناسب ہے یا نہیں۔۔۔ کیا آپ کو ابھی تک اس بات کا اندازہ نہیں ہوا؟" کیتھرین قدرے خفگی سے بولی "میں اس مختصر سی عمر میں دنیا کی نہ جانے کون کون سی اور کیسی کیسی جگہوں پر جاچکی ہوں۔"

چارلس گویا لاجواب سا ہوگیا اور ایک لمحے کی الجھن آمیزی خاموشی کے بعد بولا "مسئلہ رازداری کا بھی ہے۔۔۔ کیا میں تم پر اعتماد کرسکتا ہوں؟"
کیتھرین کو اس سوال سے گویا صحیح معنوں میں جھٹکا لگا۔ وہ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے مجروح سے لہجے میں بولی "آپ ایک اجنبی اور غیر ملکی پر اعتماد کرسکتے ہیں۔ اپنی بیٹی پر اعتماد نہیں کرسکتے؟"
"مجھے تمہارے ماضی۔۔۔ بلکہ تمہاری آج تک کی زندگی کی وجہ سے تم سے یہ سوال کرنے کی ضرورت پیش آئی ہے؟" چارلس ملائمت سے بولا۔
"آپ کو اس شخص کے ماضی کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟" کیتھرین ایک بار پھر میری طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولی "آپ کو صحیح طور پر معلوم ہے کہ یہ کون ہے اور کیوں ہم لوگوں کے ساتھ آن ملا ہے؟"
"مجھے سیٹھ رمضان فون پر اس کے بارے میں بتاچکا ہے۔۔۔ اور سیٹھ رمضان میرا قابلِ اعتماد دوست ہے" چارلس نے جواب دیا۔
"لیکن بیٹی آپ کے لیے قابلِ اعتماد نہیں ہے" کیتھرین تلخ لہجے میں بولی۔
"اگر تم ڈرگز کے دھندے میں ملوث نہ رہی ہوتیں تو میرے لیے دنیا میں تم سے زیادہ قابلِ اعتماد کوئی نہ ہوتا۔ یوں تو دنیا میں کوئی بھی انسان کسی بھی خاص وجہ کے بغیر ہی بے ضمیر ہوسکتا ہے لیکن ڈرگز کے دھندے سے وابستہ لوگوں کے ضمیر تو کچھ زیادہ ہی مُردہ ہوجاتے ہیں۔ ان پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا" چارلس صاف گوئی سے بولا حالانکہ انگریز ہونے کی حیثیت سے وہ میری نظر میں ایک جذباتی باپ تھا۔ انگریز۔۔۔ یا کسی اور سفید فام قوم میں اتنا جذباتی باپ میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا لیکن جہاں احتیاط کی ضرورت تھی وہاں احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑتا نظر نہیں آرہا تھا۔
"لیکن انسان کی ذات میں کبھی کبھی اچانک انقلاب بھی تو آجاتا ہے" کیتھرین اپنی بات منوانے پر تلی ہوئی تھی۔
"میں اچانک انقلابات پر کچھ زیادہ یقین نہیں رکھتا۔ لیکن۔۔۔ چلو تمہارے معاملے میں یقین کرلیتا ہوں" بالآخر چارلس نے ٹھنڈی سانس لے کر نہ جانے کیا سوچ کر یکدم ہی ہتھیار ڈال دیے۔
"او پاپا۔۔۔! آپ عظیم ہیں۔۔۔" کیتھرین نے اپنی خفگی بھول کر اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔
چارلس استہزائیہ انداز میں ہنس دیا "عظیم۔۔۔؟ بس۔۔۔ بس۔۔۔ مجھے مکھن لگانے کی ضرورت نہیں ہے۔ مکھن کے بغیر ہی میں نے تمہاری بات مان لی ہے۔ مجھے عظیم بنانے کی کوشش مت کرو۔ عظمت کے درجے بہت آگے سے شروع ہوتے ہیں۔ میں تو ایک سیدھا سادہ سا اصول پرست انسان ہوں۔"
اس دوران میں دوبارہ کاؤچ پر بیٹھ چکا تھا۔ چارلس نے میری طرف دیکھا تو میں نے کہا "ایک مدت کے بعد آپ دونوں باپ بیٹی کے درمیان فاصلے ختم ہوئے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے پھر فاصلے پیدا ہوجائیں۔ جس ضروری کام کا آپ ذکر کررہے ہیں' بہتر ہے اس کے لیے آپ دونوں ہی چلے جائیں۔ مجھے ساتھ نہ لے جائیں' میں یہیں ٹھیک ہوں۔"
کیتھرین باپ کی موجودگی کی پروا کیے بغیر مجھ پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولی "خفا ہوگئے؟ میں کوئی سچ مچ تمہاری طرف سے بدگمانی کا شکار تھوڑا ہی ہوں۔ میں تو پاپا سے اپنی بات منوانے کے لیے ذرا تمہاری آڑ لے رہی تھی" وہ شریر انداز میں مسکرا رہی تھی۔
"تم اگر میری طرف سے بدگمانی کا شکار بھی رہو تو میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مجھے کون سا تم سے کوئی سرٹیفکیٹ لینا ہے" میں نے بے نیازی سے کہا۔
وہ میرا بازو پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولی "چلو۔۔۔ اب اٹھ بھی جاؤ۔ زیادہ نخرے مت دکھاؤ۔ دو باتوں کی وجہ سے میں ذرا رکی ہوئی ہوں ورنہ ابھی کرائے کا ایک ہاتھ رسید کرتی۔"
"وہ دو باتیں کیا ہیں؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔
"ایک تو میں دل ہی دل میں تمہیں استاد تسلیم کرچکی ہوں۔ دوسرے مجھے اپنی زندگی عزیز ہے" وہ بدستور شوخی سے مسکراتے ہوئے بولی۔
"یہ تم نے بڑا عقلمندانہ فیصلہ کیا ہے" چارلس بیٹی کی کمر تھپکتے ہوئے بولا "افضل چوہدری کی شاگرد بن کر شاید تم کسی قابل ہوجاؤ۔۔۔ لیکن صرف دل ہی دل میں تسلیم کرنے سے تو کچھ نہیں ہوگا۔ تمہیں چاہیے کہ مشرقی اصولوں کے مطابق باقاعدہ کوئی رسم وغیرہ کا اہتمام کرکے اس کی شاگردی اختیار کرو۔"
"مجھے بانس پر چڑھا کر مروا نہ دینا مسٹر چارلس" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں تو ابھی خود طفلِ مکتب ہوں۔"
"اچھا اب اٹھ جاؤ۔ پہلے ہی باتوں میں بہت وقت ضائع ہوچکا ہے" چارلس ایک بار پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولا' مجھے اٹھنا ہی پڑا۔
ہم نیچے آئے تو وسیع ڈرائیو وے میں تاریک شیشوں والی ایک سیاہ مرسیڈیز گویا ہماری ہی منتظر تھی۔ ڈرائیور نے ہمیں دیکھتے ہی گاڑی کے دروازے کھولے اور ہمارے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کردی۔ ڈرائیور تُرک تھا اور چارلس نے ترکی میں ہی اس سے کچھ کہا تھا۔ اس نے سر کو خفیف سی جنبش دی اور گاڑی بنگلے سے باہر آگئی۔ کچھ دیر بعد وہ استنبول کی شاہراہوں پر فراٹے بھر رہی تھی۔
ہم چند ایسی مشہور اور تاریخی عمارات کے سامنے سے بھی گزرے جنہیں میں پہچانتا تھا۔ جلد ہی گاڑی شہر کے گنجان آباد علاقوں سے نکل آئی۔ میرے اندازے کے مطابق ہم شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے کی طرف جارہے تھے لیکن پھر ہم شہری

حدود کو عبور کر گئے۔ انجن کی نہایت خفیف سی آواز کے ساتھ گاڑی بدستور فراٹے بھرتی جارہی تھی۔

ہم تینوں سفر کے آغاز سے لے کر اب تک خاموش تھے۔ میں تو اس خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو رہا تھا لیکن کیتھرین آخر کار خاموش نہ رہ سکی اور تاریک شیشے کے عقب سے چٹیل میدان کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "ہم کہاں جارہے ہیں پاپا؟" دور دور تک کسی آبادی کا نشان نظر نہیں آرہا تھا۔

"دیکھتی رہو" چارلس نے اختصار سے جواب دیا۔ شاید وہ سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر شاید خیالات میں الجھا ہوا تھا۔ زیادہ بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ہم ہائی وے سے ایک سائڈ روڈ پر مڑ چکے تھے اور بتدریج بلندی کی طرف جارہے تھے پھر ہم قدرے نشیب میں پھیلے ہوئے ایک طویل جنگل کے قریب سے گزرے۔ میرے اندازے کے مطابق ہم استنبول سے نکل آنے کے بعد تقریباً چالیس میل کا فاصلہ طے کر چکے تھے۔ کیتھرین بے چینی سے پہلو بدل رہی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ وہ خشمگیں نظروں سے مجھے گھور کر رہ گئی۔

چند لمحے بعد گاڑی ایک پگڈنڈی پر مڑ گئی۔ وہ راستہ کسی گدھا گاڑی کے بھی شایان شان نہیں تھا جبکہ اس پر اتنی شاندار مرسیڈیز آگئی تھی لیکن ایک لحاظ سے اچھا بھی تھا کہ ہم اس شاندار مرسیڈیز میں سفر کر رہے تھے اگر کسی معمولی کھٹارا گاڑی میں ہوتے تو اس وقت ایک ایک فٹ اوپر اچھل رہے ہوتے۔ تمام تر سست رفتاری کے باوجود گاڑی اپنے عقب میں گرد و غبار کا ایک طوفان چھوڑتی جارہی تھی۔

بالآخر کیتھرین خاموش نہ رہ سکی۔ منہ بنا کر بولی "ایشیائی ممالک کے بعض حصے دیکھ کر تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے زمانۂ غار کے بعد سے وہاں کسی انسان نے قدم نہیں رکھا۔"

اب چارلس نے بھی ذرا زبان کھولی اور کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا "ہم جہاں جارہے ہیں وہ بستی بھی تمہیں زمانۂ غار کے انسانوں ہی کی محسوس ہوگی۔"

"ہم وہاں کیا کرنے جارہے ہیں؟" کیتھرین نے بے اختیار پوچھا۔

"یہ تمہیں وہیں چل کر معلوم ہوگا" چارلس نے فوراً ہی زبان بند کر لی۔

تقریباً دو میل کا فاصلہ اسی طرح ہچکولے کھاتے ہوئے طے کرنے کے بعد گاڑی رک گئی۔ آگے سڑک بالکل ہی اس قابل نہیں رہی تھی کہ گاڑی اس پر چل سکتی۔ پگڈنڈی یا سڑک، وہ جو بھی تھی صرف دو ڈھائی فٹ چوڑی رہ گئی تھی۔ اس کی ایک طرف نشیب تھا اور دوسری طرف کچی پہاڑی کی بلندی۔

چارلس گہری سانس لے کر بولا "اب ہمیں کچھ فاصلہ پیدل طے کرنا پڑے گا۔"

ہم تینوں گاڑی سے اتر آئے۔ چارلس نے ڈرائیور کو وہیں رہنے کی ہدایت کی اور ہم آگے چل دیے۔ پہاڑی کے گرد گھوم کر ہم دوسری طرف پہنچے تو ایک اور پہاڑی کے نشیب میں ایک بستی کے آثار دکھائی دیے۔ بستی پہاڑی کے پہلو میں تھی۔ جہاں ہم چل رہے تھے وہاں سے اس کا صرف تھوڑا سا حصہ نظر آرہا تھا۔

اس علاقے میں چلتے ہوئے مجھے اپنے ملک کے شمال مغربی سرحدی علاقوں کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ ہمارے ان علاقوں میں سبزہ اور خوب صورتی نظر آتی ہے جبکہ یہ علاقہ کافی حد تک بنجر ہی لگ رہا تھا۔ نشیب میں کہیں کہیں تھوڑا بہت سبزہ، درخت اور جھاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہیں بہت سے مویشی چر رہے تھے اور گویا اس سبزے کو بھی ختم کرنے کی مقدور بھر کوشش کر رہے تھے۔ ان مویشیوں کو چرانے والا کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

بل کھاتے راستے پر چلتے بالآخر ہم بستی کے قریب جا پہنچے۔ یہاں کے مکانوں کی ساخت بھی ہمارے پہاڑی علاقوں کے مکانوں سے کافی مختلف تھی۔ زیادہ تر مکان لکڑی کے تھے اور عجیب سی بات یہ تھی کہ تقریباً سبھی مکانوں میں باہر کی طرف سے تنگ سا ایک گول، بل کھاتا زینہ اوپر ضرور جارہا تھا۔ مکانوں کی ساخت جھونپڑیوں سے مشابہ تھی۔

"یہ ترکی کے ایک نہایت قدیم قبیلے کا گاؤں ہے" چارلس نے نیچی آواز میں مجھے اور کیتھرین کو بتایا۔

گاؤں میں بالکل ویرانی نظر آرہی تھی۔ اس کی وجہ ہمیں کچھ آگے جا کر معلوم ہوئی۔ گاؤں کے وسط میں ایک بڑا سا میدان تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاؤں کے تمام مرد، عورتیں اور بچے اس میدان کے گرد جمع تھے۔ بہت بڑا ہجوم نظر آرہا تھا لیکن میدان میں کیا ہو رہا تھا، یہ ہمیں فوری طور پر معلوم نہیں ہو سکا۔ جہاں تک ہم پہنچے تھے وہاں سے ہمیں پورا میدان نظر نہیں آرہا تھا۔

ہجوم میں زیادہ تر عورتوں نے سرخ اور سفید دھاریوں والے لمبے لمبے لبادے پہن رکھے تھے۔ سروں پر وہ سفید اسکارف باندھے ہوئے تھیں۔ مرد زیادہ تر لمبے لمبے اوور کوٹوں سے مشابہ چغوں میں تھے اور ان کے سروں پر فرکی وہ بڑی بڑی لمبی سی ٹوپیاں تھیں جو تصویروں میں قدیم انگریز فوجیوں کے سروں پر نظر آتی ہیں۔ برطانوی شاہی محل پر تعینات رہنے اور شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ چلنے والا فوجی دستہ اب بھی ویسی ہی وردی اور ٹوپی پہنتا ہے۔ اس ٹوپی کی وجہ سے کچھ ایسا تاثر پیدا ہو رہا تھا جیسے ہم کسی برفانی علاقے میں پہنچ گئے ہوں حالانکہ وہاں سردی کچھ ایسی خاص نہیں تھی۔ وہ لوگ نہایت انہماک سے کسی چیز کا نظارہ کر رہے تھے۔

ہم لوگ کچھ اور آگے پہنچے تو چلتے چلتے تماشائیوں کے درمیان سے بھاری بھرکم نیم عریاں سے جسموں کی جھلک دکھائی دی جو ایک دوسرے سے بری طرح الجھ رہے تھے۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ

میدان میں کسی قسم کی کشتی ہو رہی تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ میدان میں گہرا سکوت چھایا ہوا تھا۔ تماشائی کچھ عجیب غیر فطری سی خاموشی سے مقابلہ دیکھ رہے تھے۔ حالانکہ ان میں بچے بھی شامل تھے۔ وہ بھی کوئی آواز نہیں نکال رہے تھے اور کشتی لڑنے والوں کی بھی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

ہم ہجوم کے قریب پہنچے تو ہمیں ایک ایسی جگہ میسر آگئی جہاں سے ہم مقابلے کا نظارہ کر سکتے تھے۔ وہ واقعی کشتی تھی اور تقریباً فری اسٹائل ہی تھی لیکن اس میں اتنی خونخواری نہیں تھی جتنی مغربی مقابلوں میں ٹی وی پر نظر آتی ہے۔ وہ دونوں سانڈ کی طرح پلے ہوئے پہلوان تھے لیکن ان کے قد درمیانے ہی تھے۔ دونوں کے کندھے البتہ غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ جسم ورزشی تھے لیکن بیشتر مشرقی پہلوانوں کی طرح توندیں خاصی نکلی ہوئی تھیں۔

وہ چمڑے کی ڈھیلی ڈھالی سی پتلونوں میں تھے۔ ایک کا رنگ خاصا گورا تھا۔ دوسرے کی رنگت قدرے سانولی سی تھی۔ بظاہر وہ دونوں ہم پلہ ہی معلوم ہوتے تھے لیکن گورا پہلوان مکمل طور پر سانولے پر حاوی معلوم ہوتا تھا۔ سانولے کی حالت خاصی خراب تھی۔ گورا اسے اٹھا اٹھا کر پٹخ رہا تھا اور اس نے مقابلہ تقریباً ختم ہی کر دیا تھا اگر ان کے ہاں پن کرنے یا چت کرنے کا رواج تھا تو میرے خیال میں وہ اب ایسا کرنے ہی والا تھا۔ میرے خیال میں وہ اب کسی بھی لمحے اسے پن کر سکتا تھا لیکن اب شاید وہ محض لطف اندوز ہونے کے لیے اس کی بے رحمانہ طریقے سے پٹائی کر رہا تھا۔ گورا پہلوان شکل سے کچھ اذیت پسند معلوم ہوتا تھا یا پھر شاید وہ مجمع کو مرعوب کرنے کے لیے غیر ضروری مار پیٹ کر رہا تھا حالانکہ مجمع پہلے ہی کافی مرعوب نظر آرہا تھا۔

ہماری آمد پر کئی عورتوں اور مردوں نے مڑ کر ہماری طرف دیکھا پھر چند سیکنڈ میں گویا سب کو ہی پتا چل گیا کہ ان کے گاؤں میں کچھ اجنبی آئے ہوئے تھے۔ سب نے ہی باری باری مڑ کر دیکھا تاہم کسی نے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالا اور دوبارہ کشتی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ مردوں نے البتہ کچھ زیادہ دیر تک کیتھرین کی طرف دیکھا اور ان کی آنکھوں میں ایک خاص چمک ابھری۔ انہوں نے گویا بادلِ ناخواستہ کیتھرین کی طرف سے نظر ہٹائی تھی۔

چارلس کو یقیناً کشتی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ متلاشی سے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ہمیں ایک طرف کچھ جگہ میسر آگئی تھی اور ہم غیر ارادی سے انداز میں آگے پہنچ گئے تھے۔ مجھے یہ منظر دیکھ کر کینیڈا میں ہونے والی اپنی کشتی یاد آگئی تھی اور میرے رگ و پے میں خفیف سی سنسنی دوڑ گئی تھی۔ وہ ایک خونیں مقابلہ تھا۔ اس میں موت رنگ کے اندر ہی نہیں، رنگ کے باہر بھی میری گھات میں تھی۔

یہاں اس مقابلے میں بھی خون بہتا دکھائی دے رہا تھا۔ سانولے پہلوان کا چہرہ خون میں تر تھا۔ اس کی ناک، منہ اور پیشانی سے خون نکل رہا تھا۔ تاہم میرے والے مقابلے کی طرح یہ تاثر نہیں مل رہا تھا کہ اسے گھیر گھار کر مجمع کے سامنے ہلاک کرنے کی کوشش کی جارہی تھی۔

ہم آگے پہنچے تو اس کے چند سیکنڈ بعد ہی کشتی ختم ہوگئی۔ گورے پہلوان نے گویا ازراہِ کرم سانولے کو آخری بار زمین پر پٹخا اور پھر نہیں اٹھایا۔ اس نے اسے پن وغیرہ کرنے کی زحمت نہیں کی بلکہ اس طرح اس کے سینے پر پاؤں رکھ کر کھڑا ہو گیا جیسے کوئی شکاری شیر کو شکار کرنے کے بعد اس پر پاؤں رکھ کر تصویر کھنچوا رہا ہو۔

وہ صرف پسینے اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ کہیں سے زخمی نہیں تھا۔ چہرے سے پسینہ پونچھ کر اس نے فاتحانہ انداز میں ادھر ادھر گردن گھما کر تماشائیوں کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر خاصی درندگی تھی۔ سانولے پہلوان میں اٹھنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ لوگوں نے تالیاں بجانے کے بجائے اجتماعی طور پر گہری سانس لی جو شاید سب کے سینوں میں کئی لمحے سے مقید تھی۔ یہ طمانیت کی سانس معلوم ہوتی تھی۔ شاید سب ہی کو مقابلہ ختم ہوتے دیکھ کر اطمینان ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کے انداز میں ایک خفیف سی مایوسی بھی شامل تھی۔ گورا پہلوان بھی گو کہ انہی میں سے ایک تھا لیکن شاید وہ اسے پٹتے دیکھنا چاہتے تھے مگر نتیجہ ان کی توقعات کے خلاف نکلا تھا۔

فاتح پہلوان کی نظریں تماشائیوں پر سے ہوتی ہوئی ہم تینوں پر آٹھہریں پھر مجھے اور چارلس کو تو اس نے قطعاً نظر انداز کر دیا لیکن کیتھرین پر اس کی نظر جم کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں وحشیانہ چمک ابھر آئی۔ چارلس کی توجہ اس وقت کسی اور طرف تھی۔ میں پہلوان کی آنکھوں میں تغیر دیکھ رہا تھا۔ اس کا ذہن شاید ایک میدان سے دوسرے میدان کی طرف چھلانگ لگا چکا تھا۔

کیتھرین نے میری طرف کو ترچھی ہوتے ہوئے سرگوشی کی "مجھے یہ شخص سخت منحوس لگ رہا ہے۔"

پہلوان نے یقیناً محسوس کر لیا تھا کہ کیتھرین نے میرے کان میں اس کے بارے میں ہی کوئی بات کی تھی۔ اس کی وحشت کچھ اور بڑھ گئی۔ وہ ریڈ انڈین جنگجوؤں کے انداز میں آسمان کی طرف منہ کر کے گھونسوں سے اپنا سینہ پیٹنے لگا۔ اس کا سینہ غیر معمولی طور پر چوڑا تھا اور اس پر گوشت کی تہوں کے ابھار بھی غیر معمولی تھے۔ قد ذرا چھوٹا ہونے کی وجہ سے وہ مجموعی طور پر کچھ زیادہ ہی چوڑا چوڑا لگ رہا تھا۔

اس نے حلق سے ڈکرانے کی سی بے معنی آوازیں نکالیں پھر باڈی بلڈروں کے سے انداز میں پوز بنا بنا کر اپنے جسم کی نمائش کرنے لگا حالانکہ وہ اس حد تک نمائش کے قابل نہیں تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ صرف کیتھرین کو دکھانے کے لیے یہ سب کچھ کر رہا تھا اور ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

تماشائی اب ویسے بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ بیشتر کی توجہ کیتھرین کی طرف ہی تھی۔ اب مردوں سے زیادہ عورتیں کیتھرین کو تجسس اور اشتیاق سے دیکھ رہی تھیں۔ کیتھرین کا لباس کچھ مردانہ سا تھا۔ عورتیں شاید اس کی شخصیت کے ساتھ ساتھ اس کے لباس کا بھی بغور جائزہ لے رہی تھیں۔ بعض بچے کیتھرین کی طرف دیکھ کر منہ پر ہاتھ رکھ کر کھی کھی کر رہے تھے۔

چارلس اس صورتِ حال سے غالباً کچھ پریشان ہو گیا تھا لیکن کیتھرین کے سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ چند لمحے بعد صورتِ حال کچھ اور عجیب ہو گئی۔ فاتح پہلوان نے اچانک آگے بڑھ کر کیتھرین کی مرمریں کلائی پکڑ لی۔ اس کے ہاتھ بھی غیر معمولی طور پر بڑے تھے البتہ آنکھیں چھوٹے چھوٹے بٹنوں سے مشابہ تھیں لیکن ان آنکھوں میں خباثت تھی۔ اس طرح کی خباثت عام طور پر اپنی طاقت کے گھمنڈ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

"ہُوں... انگلش... امریکن...؟" وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔ وہ غالباً یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ کیتھرین انگریز تھی یا امریکی؟

کیتھرین نے اس کے سوال کا جواب دینے کی زحمت نہیں کی اور آہستگی سے اپنی کلائی چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی گرفت ایسی نہیں تھی جس سے یوں آرام سے کلائی چھڑائی جا سکتی۔

چارلس نے غالباً سوچا بھی نہیں تھا کہ کیتھرین کو ساتھ لانے کی وجہ سے اس قسم کی صورتِ حال پیدا ہو جائے گی۔ اس نے آگے بڑھ کر نہایت مہذبانہ لہجے میں پہلوان کو بتانے کی کوشش کی "ہم محترم سیو بک سے ملنے کے لیے آئے ہیں..."

پہلوان نے گویا اس کی بات ہی نہیں سنی اور نہ ہی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ کیتھرین کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے بولا "ہُو کم... یُو... آئی... ڈانس..."

وہ غالباً یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ وہ اور کیتھرین میدان میں ڈانس کریں۔ اس نے کیتھرین کو کھینچنے کے لیے ذرا قوت صرف کی تو کیتھرین کلائی چھڑائے بغیر ہی ایڑی کے بل گھومی اور اس کی لات پہلوان کے منہ پر پڑی۔ اس کی کلائی بھی چھوٹ گئی اور پہلوان میدان میں چت جا گرا۔

مجمع پہلے بھی تقریباً خاموش ہی تھا لیکن اب تو اسے گویا سانپ ہی سونگھ گیا۔ عورتیں تو کیا، مرد بھی پھٹی پھٹی آنکھوں سے کیتھرین کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایک دبلی پتلی اور نرم و نازک نظر آنے والی لڑکی نے پلک جھپکتے میں لٹو کی طرح گھوم کر محض ایک لات رسید کر کے ان کے فاتح پہلوان کو دور پھینک دیا تھا۔

پہلوان ذرا سنبھلا تو اٹھ کر مرکھنے سانڈ کی طرح کیتھی کی طرف لپکا۔ کیتھی کسی مستند بل فائٹر کی طرح اپنے دفاع کے لیے تیار تھی لیکن اسی لمحے چارلس بیچ میں آ گیا۔ جسمانی طور پر تو پہلوان کو روکنا یا اس کا کچھ بگاڑنا چارلس کے بس کی بات نہیں... شاید اسی لیے اس نے مجبوراً نہایت پھرتی سے پستول نکال لیا تھا۔

مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ پہلوان اسے پستول سمیت اٹھا کر کہیں ادھر اُدھر نہ پھینک دے۔ اس نے شفقتِ پدری کے تحت جوش میں آ کر خواہ مخواہ ہی پستول نکال کر سامنے آنے کی حماقت کی تھی۔ اس کی مدد الٹا کیتھرین کے لیے زحمت کا باعث بن سکتی تھی۔ کیتھرین غالباً اس کی دخل اندازی کے بغیر اپنا دفاع بہتر طور پر کر سکتی تھی۔

میں محاورتاً نہیں بلکہ حقیقتاً اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کے لیے ٹانگ کو حرکت دینے ہی لگا تھا کہ ہجوم میں سے کوئی چیخا۔ کسی ناقابلِ فہم زبان میں اس نے نہ جانے کیا کہا تھا کہ پہلوان کو گویا ائر پریشر بریک لگ گئے تھے۔ وہ یکدم ہی رک گیا تھا۔

دوسرے ہی لمحے چھریرے جسم کا ایک دراز قد شخص ہجوم کو چیرتا ہوا آگے آیا۔ اس کا لباس بھی گاؤں والوں سے تقریباً ملتا جلتا ہی تھا لیکن اس پر زری وغیرہ کا کچھ ایسا کام کیا گیا تھا کہ اس کا تاثر شاہانہ سا ہو گیا تھا۔ اس کی ٹوپی بھی ذرا مختلف تھی۔ اس پر بھی شاید سونے سے سجاوٹ کی گئی تھی جس کی وجہ سے وہ تاج سے مشابہ نظر آ رہی تھی۔

وہ گندمی سی رنگت کا ایک عام سا شخص تھا لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ اس کی شخصیت میں بھی ایک شاہانہ سا جلال موجود تھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا چنگاریاں سُلگ رہی تھیں۔ اس کی عمر چالیس کے قریب رہی ہوگی۔

قریب آ کر اس نے باری باری ہم تینوں کو گھورا۔ کیتھرین کو کچھ زیادہ گھورا۔ چارلس نے پستول جیب میں رکھ لیا اور ذرا خوش خلقی سے باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا "پاشا سیو بک...!"

تب مجھے معلوم ہوا کہ چند لمحے پہلے چارلس نے پہلوان کے سامنے اس شخص کا نام لیا تھا۔ وہ اسی سے ملنے یہاں آیا تھا لیکن "پاشا سیو بک" نے اس کی طرف ذرا بھی توجہ نہ دی اور تیز تیز لہجے میں پہلوان سے بات کرنے لگا۔ زبان ترکی ہی معلوم ہوتی تھی لیکن اس میں فارسی کی بھی آمیزش تھی۔

جواباً پہلوان بھی تیزی سے بولنے لگا۔ اس کے لہجے میں احترام تو تھا لیکن کچھ سرکشی بھی جھلک رہی تھی۔ ہجوم کچھ آگے کھسک آیا تھا اور دائرہ پہلے سے تنگ ہو گیا تھا۔ سب لوگ سیو بک اور پہلوان کے درمیان ہونے والی گفتگو سننے کے لیے سخت متجسس معلوم ہوتے تھے جبکہ وہ گفتگو ہم تینوں میں سے غالباً کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ چارلس نے ایک بار پھر مہذبانہ انداز میں اپنی موجودگی کا احساس دلانے کی کوشش کی "پاشا سیو بک! ہم آپ سے ملنے آئے ہیں..."

پاشا سیو بک نے اب بھی اسے لفٹ نہیں دی اور اس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ مزید کچھ دیر پہلوان سے تیز تیز لہجے میں گفتگو کرتا رہا۔ وہ غالباً یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی آمد سے قبل کیا ہوا تھا۔ وہ یقیناً ابھی وہاں پہنچا تھا۔

پاشا ... وہ چارلس کی طرف متوجہ ہوا اور اس وقت مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا جب میں نے اسے صاف، شستہ اور رواں انگریزی میں بات کرتے سنا۔ وہ کیتھرین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "کیا یہ درست ہے کہ تمہارے ساتھ آنے والی اس سفید فام لڑکی نے ہمارے پہلوانِ اعظم کو لات رسید کی؟"

"پاشا سیو بک! آپ کے پہلوانِ اعظم نے نہایت غیر مہذبانہ... بلکہ معذرت کے ساتھ میں تو یہ کہوں گا کہ نہایت بے ہودہ انداز میں میری بیٹی کا بازو کھینچتے ہوئے اسے اپنے ساتھ رقص پر مجبور کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس لیے میری بیٹی نے مجبوراً..."

"اچھا... تو یہ تمہاری بیٹی ہے؟" سیو بک نے ایک بار پھر سُلگتی ہی آنکھوں سے کیتھرین کی طرف دیکھتے ہوئے چارلس کی بات کاٹ دی۔

"جی ہاں پاشا سیو بک!" چارلس نے گویا کسی جرم کا اعتراف کیا۔

سیو بک خاصی گرج دار آواز میں بولا "پہلوانِ اعظم نے اگر تمہاری بیٹی کو اپنے ساتھ ناچنے کی دعوت دی تھی تو یہ اس کے لیے ایک اعزاز تھا۔ اسے تو اس اعزاز کو ٹھکرانے کی بھی جرأت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ چہ جائیکہ اس نے پہلوانِ اعظم کو لات رسید کر دی..."

میں خاموش کھڑا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ سیو بک اس قبیلے کا سردار معلوم ہوتا تھا۔ چارلس کے چہرے پر پریشانی کے آثار ابھر آئے تھے۔ وہ نہ جانے کس سلسلے میں سیو بک سے ملنے آیا تھا لیکن یہاں کچھ اور ہی چکر چل پڑا تھا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ہمارے اردگرد موجود ہجوم میں سے کئی مردوں کے ہاتھوں میں جدید ترین ساخت کی آٹومیٹک گنیں نظر آنے لگی تھیں جن کا رخ ہماری طرف تھا اور ہم لوگ پہلے ہی سے ان کے گھیرے میں تھے۔ شاید اس وقت چارلس سوچ رہا تھا کہ اس نے کیتھرین کو ساتھ لا کر بڑی حماقت کی تھی۔

سیو بک گویا اپنے لہجے کے غیظ و غضب پر قابو پاتے ہوئے ایک لمحے کے توقف کے بعد بولا "تم خواہ کوئی بھی ہو لیکن اس وقت ہمارے علاقے میں کھڑے ہو اس لیے تمہیں ہمارے علاقے کے قوانین کی پابندی کرنی پڑے گی۔ ہمارے قبیلے میں کوئی عورت کسی مرد پر ہاتھ اٹھانا تو درکنار، زبان سے بھی اس کی توہین نہیں کر سکتی۔ اب تمہاری بیٹی کو اپنی حرکت کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ اسے اس میدان میں آ کر سب کے سامنے پہلوانِ اعظم سے مار کھانا پڑے گی۔"

اس موقعے پر میں نے پہلی بار زبان کھولی "ہم تمہارے مہمان ہیں اور میرا خیال تھا کہ دنیا بھر کے قبائلی لوگوں میں مہمان نوازی کی کچھ نہ کچھ عمدہ روایات ضرور پائی جاتی ہیں..."

"مہمان نواز ہم بھی ہیں" سیو بک ایک بار پھر گرج اٹھا "لیکن قاعدے قانون پہلے آتے ہیں۔"

"میں پاکستانی مسلمان ہوں اور یہ دونوں انگریز باپ بیٹی کر چکن ہیں لیکن عورت کو مارنا ہم دونوں ہی کے معاشرے میں اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ اگر تمہارے پہلوانِ اعظم کو اپنی حرکت کے ردِعمل پر اتنی ہی توہین محسوس ہوئی ہے تو کیتھرین کی جگہ میں مار کھا لیتا ہوں۔ تمہارے پہلوان کو تو صرف اپنا غصہ ہی ٹھنڈا کرنا ہے۔ شاید وہ مجھے مار کر ہی ٹھنڈا ہو جائے۔"

کیتھرین نے عجیب والہانہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا۔ حیرت کی بات تھی کہ اس کے صبر و سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی "میں تمہیں استاد تسلیم کر چکی ہوں اور استاد کی باری بعد میں آتی ہے۔ پہلے اس پہلوانِ اعظم کو شاگرد سے تو نمٹ لینے دو۔"

سیو بک کی آنکھوں میں حیرت سی نمودار ہوئی۔ کیتھرین اس کی طرف مڑتے ہوئے بولی "میں مار کھانے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے اپنے دفاع کا اختیار تو ہوگا؟ آخر میں ایک کمزور اور ناتواں سی عورت ہوں۔ مجھے کم از کم اتنا حق تو ملنا چاہیے کہ پہلوانِ اعظم کے سامنے اپنی جان بچانے کی کوشش کر سکوں۔"

سیو بک نے ایک بار پھر اس کا سرتاپا جائزہ لیا اور پھر اپنے پہلوانِ اعظم کی طرف گھوم کر اسے اپنی زبان میں کیتھرین کی بات کا ترجمہ بتانے لگا۔ پہلوانِ اعظم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ غالباً موصوف نے سوچا تھا کہ ایک لات تو شاید اتفاقاً پڑ گئی تھی لیکن عورت آخر عورت تھی اور وہ پہلوانِ اعظم تھے۔ اس لیے عورت کو دفاع کا حق دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

سیو بک، کیتھرین کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "ہمارے قبیلے میں تو عورت کو دفاع وغیرہ کا حق نہیں ہوتا۔ اسے چھوٹی بدتمیزی پر گھر میں... اور بڑی بدتمیزی پر سب کے سامنے میدان میں کھڑے ہو کر مار کھانا پڑتی ہے لیکن تم چونکہ غیر ملکی ہو۔ تمہیں ہمارے رسم و رواج اور قوانین کا علم نہیں تھا اس لیے تمہیں دفاع کا حق دینے کی میں نے سفارش کی تھی جسے پہلوانِ اعظم نے مان لیا ہے۔ ہم پورے گاؤں کے سامنے پہلوانِ اعظم کا وقار مجروح ہوتے نہیں دیکھ سکتے اس لیے اب وہ جس طرح اور جتنی چاہیں گے، تمہیں مار لگائیں گے، تم جس طرح چاہو اپنا دفاع کر سکتی ہو... بلکہ پہلوانِ اعظم پر جوابی حملہ بھی کر سکتی ہو۔ تم زیادہ سے زیادہ جوڈو کراٹے جانتی ہو گی لیکن عورت آخر عورت ہوتی ہے۔ جوڈو کراٹے تمہیں نہیں بچا سکتے۔ تمہیں پہلوانِ اعظم کی طاقت کا اندازہ نہیں ہے۔"

میں نے ایک بار پھر آگے بڑھ کر دخل اندازی کی کوشش کی لیکن کیتھرین نے اس بار بھی میرے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر دھکیلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں کہہ چکی ہوں... پہلے شاگرد کو موقع دو۔ استاد کی خدمات کسی زیادہ بڑے موقعے کے لئے بچا کر رکھنی چاہئیں۔"

اس دوران سیو بک گردن گھما کر تماشائیوں کی طرف دیکھتے ہوئے انہیں ان کی زبان میں غالباً یہ بتانے لگا کہ ہم لوگوں کے درمیان کیا مکالمہ ہوا تھا۔ اس کی بات سن کر تقریباً تمام مرد کیتھرین

کی طرف استہزائیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے قہقہے لگانے لگے۔
عورتیں البتہ بالکل خاموش تھیں۔ ان کی آنکھوں میں رشک کے ساتھ ساتھ کسی اور جذبے کی بھی جھلک تھی۔ شاید وہ کیتھرین کی ذات سے کوئی اُمید وابستہ کررہی تھیں۔

تمام مردوں کو قہقہے لگاتے دیکھ کر پہلوانِ اعظم بھی سینے کو گھونسوں سے پیٹتے ہوئے آسمان کی طرف منہ کرکے ڈراؤنی سی آوازیں نکالنے لگا۔ وہ شاید یہ ظاہر کرنے کی کوشش کررہا تھا کہ وہ ہنس ہنس کر بے حال ہوا جارہا تھا۔ اس کی ہنسی کسی پہاڑی پر ڈرم لڑھکنے کی آواز سے مشابہ تھی۔

کیتھرین پہلوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سیو بک سے مخاطب ہوئی۔ "اس سے کہو بھینسے کی طرح ڈکرانا بند کرے اور میدان کے بیچ میں چلے۔"

سیو بک ناگواری سے بولا "زبان سنبھال کر بات کرو لڑکی! ہمارے ہاں عورتوں کو مردوں کے بارے میں اس طرح بدتمیزی سے بات کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ اس پر تمہاری سزا میں اضافہ ہوسکتا ہے۔"

"میں انگریز ہوں۔ مجھ پر اپنے اصول مسلط مت کرو" کیتھرین منہ بناکر بولی "میں تمہاری عورتوں کی طرح نہیں ہوں جنہیں شاید تم نے بھیڑ بکریوں کی طرح رکھا ہوا ہے۔"

"میں بتاچکا ہوں کہ اس وقت تم جہاں کھڑی ہو وہاں صرف ہمارے اصول اور ہمارے قوانین چلتے ہیں" سیو بک غرایا "تم انگریز ہو تو اپنی تہذیب اپنے پاس رکھو۔ جن عورتوں کو تم بھیڑ بکریاں سمجھ رہی ہو وہ تم سے اور تمہارے ملک کی عورتوں سے بہتر حال میں ہیں۔"

چارلس، کیتھرین کا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کھینچتے ہوئے نیچی لیکن مضطربانہ آواز میں بولا "فضول بحث میں.... اور اس مقابلے وغیرہ کے چکر میں مت پڑو۔ ہم یہاں اس قسم کی احمقانہ حرکتوں کے لیے نہیں آئے ہیں۔ تم پیچھے ہٹ جاؤ۔ میں ان لوگوں سے معافی مانگ لیتا ہوں۔"

سیو بک نے اس کی بات سن لی، وہ کیتھرین کے جواب دینے سے پہلے بولا "اب یہ مقابلہ ملتوی نہیں ہوسکتا۔ اب تمہیں معافی نہیں مل سکتی۔"

اس دوران تماشائیوں اور پہلوانِ اعظم کے قہقہے تھم چکے تھے۔ میدان میں ایک بار پھر گہرا سکوت چھاگیا تھا۔ چارلس ملتجیانہ لہجے میں سیو بک سے مخاطب ہوا "میں تو تم سے صرف اس خط کے بارے میں بات کرنے آیا تھا جو تم نے استنبول میں ہمارے سفارت خانے کو لکھا تھا۔ یہ یہاں کیا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ خدا کے لیے اسے روکو۔"

سیو بک کی آنکھوں میں یک لخت بلا کی سرد مہری در آئی۔ وہ چارلس کو گھورتے ہوئے بولا "کون سا خط! کیسا خط؟ میں نے کسی برطانوی سفارت خانے کو کوئی خط نہیں لکھا۔ میں کبھی کسی کو خط نہیں لکھتا۔"

"وہ فرانسیسی میں لکھا گیا تھا اور ہم پتا چلاچکے ہیں۔ وہ تم نے ہی لکھا تھا" چارلس ملائمت سے بولا "انکار مت کرو۔ میں تم سے بہت ہی ضروری باتیں کرنے آیا ہوں۔ تمہارا اس میں کوئی حرج نہیں۔ خدا کے لیے تم میرے چند ضروری سوالوں کا جواب دے دو اور اس احمقانہ سلسلے کو بند کرو۔ چلو.... کہیں چل کر بیٹھتے ہیں جہاں ہم اطمینان اور رازداری سے بات کرسکیں۔"

سیو بک چاروں طرف دیکھتے ہوئے بدستور سپاٹ لہجے میں بولا "میں حقِ میزبانی ضرور ادا کروں گا لیکن مجھ سے پہیلیاں بجھوانے کی کوشش مت کرو۔ مجھ سے ایسی باتوں کے بارے میں مت پوچھو جن کے سر پیر کا مجھے علم نہیں۔ رہا یہ مقابلہ، جسے تم احمقانہ سلسلہ کہہ رہے ہو، یہ اب نہیں ٹل سکتا۔ پہلوانِ اعظم ہمارے قبیلے کی ایک اہم ہستی ہے۔ ہم اس کی ناراضگی مول نہیں لے سکتے۔"

"میں خود بھی بہت اہم ہستی ہوں۔ میں بھی نہیں چاہتی یہ مقابلہ ٹلے" کیتھرین آگے بڑھتے ہوئے بولی۔ چارلس کھڑا بے بسی سے ہاتھ ملتا رہ گیا۔

سیو بک گویا اسے تسلی دینے کے لیے نیچی آواز میں بولا "میں تمہاری تشفی کے لیے ایک وعدہ کرسکتا ہوں اگر تمہاری بیٹی نے اس مقابلے میں اپنی برتری ثابت کردی تو میں تمہارے تمام سوالوں کے جواب دینے کی کوشش کروں گا۔ جس حد تک بھی مجھے معلوم ہوا اس حد تک ضرور بات کروں گا۔"

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ میدان کے وسط میں وہ کیتھرین اور پہلوانِ اعظم سے ذرا دور ریفری کے سے انداز میں کھڑا ہوگیا۔ پہلوانِ اعظم کے متورم سے ہونٹوں پر اس وقت ایک شیطانی سی مسکراہٹ تھی۔ کیتھرین ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

ہم چونکہ پہلوانِ اعظم کا دوسرے پہلوان کے ساتھ مقابلہ دیکھ نہیں سکے تھے اور اختتام پر پہنچے تھے اس لیے ہمیں اس کی طاقت اور لڑنے کے اسٹائل کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں تھا۔ میں خود بھی کیتھرین کے سلسلے میں ذرا تشویش کا شکار تھا۔

پہلوانِ اعظم نے اپنے ڈیل ڈول کے برعکس کافی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اچانک اچھل کر کیتھرین کو فلائنگ کک رسید کرنے کی کوشش کی لیکن کیتھرین نہایت پُرسکون انداز میں ایک طرف ہٹ گئی۔ پہلوانِ اعظم اپنی جھونک میں کولھے کے بل دھپ سے گرے۔ فلائنگ کک مار کر بھی انسان زمین پر ہی گرتا ہے لیکن کک خالی چلی جائے تو چوٹ زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

پہلوانِ اعظم کو اٹھنے میں ایک لمحے کی تاخیر ہوگئی۔ کیتھرین نے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر رسید کی جس نے اس کے بھینسے جیسے جثے کو بھی ایک فٹ اوپر اچھلنے پر مجبور کردیا۔ یہ آغاز دیکھ کر میرے دل کو کچھ اطمینان ہونے لگا۔ پہلوانِ اعظم میں یقیناً طاقت تو خاصی ہوگی لیکن وہ احمق تھا۔ اسے کیتھرین سے پہلی لات کھاکر ہی اس کی پھرتی کا اندازہ کرلینا چاہیے تھا۔ اگر وہ پھرتی میں کیتھرین کا

مقابلہ نہیں کرسکتا تھا تو پھر نہ جانے کیا سوچ کر اس نے کیتھرین کو چیلنج دیا تھا جبکہ وہ پہلے ہی ایک پہلوان سے مقابلہ کر کے یقیناً کچھ نہ کچھ تھکا ہوا تھا۔

وہ اچھل کر اٹھنے میں کامیاب ہوگیا اور اب ذرا احتیاط انداز میں آگے بڑھا۔ وہ دونوں نیم دائرے میں ایک دوسرے کے سامنے چکرانے لگے۔ اب وہ یقیناً کیتھرین کو دبوچنے کی فکر میں تھا۔ چند سیکنڈ میں ہی اس کی موٹی عقل میں یہ بات ضرور آگئی تھی کہ پھرتی کے معاملے میں شاید وہ کیتھرین کو شکست نہ دے سکے۔

وہ خود بھی جوڈو کراٹے سے واقف معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بھی کیتھرین کے انداز میں ایڑی کے بل گھوم کر کیتھرین کے منہ پر "چاپ سوئی" رسید کرنے کی کوشش کی لیکن کیتھرین اتنی آسانی سے مار کھانے والی معلوم نہیں ہوتی تھی۔ وہ نہ صرف تیزی سے جھکائی دے گئی بلکہ اسی دوران اس نے اس کی پسلیوں میں ایک اور لات رسید کردی۔

پہلوانِ اعظم بے اختیار ڈکرا اٹھا۔ اس کے پھیپھڑوں میں یقیناً خاصی اتھل پتھل ہوئی تھی۔ مجمع کو اب بالکل ہی سانپ سونگھ گیا تھا۔ سب دم سادھے کیتھرین ہی کو دیکھ رہے تھے اور انہیں گویا اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

آخر کار پہلوانِ اعظم کی وہی کیفیت ہوئی جو اس قسم کی صورتِ حال میں اس قسم کے لوگوں کی عموماً ہوتی ہے یعنی اس میں اگر رتی دو رتی عقل موجود تھی تو وہ بھی جلد ہی اس کا ساتھ چھوڑ گئی اور وہ اپنی طاقت کے وحشیانہ اظہار پر ہی اتر آیا۔ اس نے ایک بار پھر سینہ کوبی کی کوشش کی۔ اس کے خیال میں شاید یہ مخالف کو مرعوب کرنے کا کوئی بہت عمدہ حربہ تھا لیکن کیتھرین نے مرعوب ہونے کے بجائے اس کی اس مصروفیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک بار پھر اس کی کمر پر اس طرح گھوم کر لات رسید کی کہ وہ اوندھے منہ جا گرا۔

کیتھرین نے اس کے اٹھنے سے پہلے ہی اس کی کھوپڑی پر پے درپے کئی ٹھوکریں رسید کیں۔ وہ مشینی سے انداز میں حرکت کررہی تھی۔ اس کی حرکات میں جتنی پھرتی تھی، پہلوانِ اعظم اتنا ہی سست پڑ گیا۔ اس نے اٹھنے میں چند لمحے صرف کیے اور اس دوران اس کی پسلیوں پر بھی دو تین ٹھوکریں پڑ چکی تھیں۔

کیتھرین نے اب تک محض ٹانگوں سے ہی کام لیا تھا اور ٹھوکریں مار مار کر ہی اسے بے حال کردیا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگا کہ شاید وہ کراٹے کے خاص انداز میں کِک اور بیک کِک کے علاوہ خاص انداز میں ایسی ٹھوکریں ہی مارنے میں ماہر تھی جو ہڈیاں چٹخا دیتی ہیں اور انسان کے تمام اندرونی اعضا کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیتی ہیں لیکن چند سیکنڈ بعد ہی مجھے اندازہ ہوا کہ کیتھرین کی مہارت صرف یہیں تک محدود نہیں تھی۔

پہلوانِ اعظم نے ایک ثانئے کے لیے کیتھرین کو سامنے پاکر اس کی پیشانی پر کراٹے کی چاپ رسید کرنے کی کوشش کی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اگر کیتھرین اپنے آپ کو اس وار سے بچانے میں کامیاب نہ ہوتی تو صرف یہی اس کے لیے خاصا تباہ کن ثابت ہوتا۔ پہلوان نہ صرف جھونک میں ایک بار پھر لڑکھڑا گیا بلکہ اسے کیتھرین کا ایک اور تکلیف دہ وار سہنا پڑا۔ کیتھرین نے ہاتھ اکڑاتے ہوئے آہنی پنجے کی طرح اس کی توند میں گھونپ دیا۔ اگر اس کے پیٹ پر چربی کی موٹی تہیں نہ ہوتیں تو نوکیلے ناخنوں والا وہ ہاتھ شاید اس کی پشت تک ہی دھنس جاتا۔ تاہم اس نے جس طرح چیخ ماری اس سے اس کی تکلیف کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔

اس نے اپنے جہازی سے ہاتھوں میں کیتھرین کی مرمریں صراحی دار گردن دبوچنے کی کوشش کی۔ ایک ثانئے کے لیے میرا دل اچھل کر حلق میں آگیا جب میں نے دیکھا کہ وہ اپنی کوشش میں کامیاب ہوگیا تھا۔ کیتھرین کو پیچھے ہٹنے میں صرف ایک ثانئے کی تاخیر ہوگئی تھی۔ مجھے یوں لگا کہ اب تو یہ گردن ٹوٹ کر ہی ان جناتی ہاتھوں کی گرفت سے چھوٹے گی لیکن کیتھرین نے ایک ثانئے کی سستی دکھائی تھی دوسرے ہی لمحے اس کی تلافی کردی۔ اس نے پہلوان کی دونوں کلائیاں گرفت میں لیتے ہوئے اچھل کر اس کے سینے پر فلائنگ کِک کے انداز میں گھٹنے رسید کیے اور اس کی گرفت مضبوط ہونے سے پہلے ہی صاف نکل گئی۔

پہلوانِ اعظم کا چہرہ جس پر دوسرے پہلوان سے مقابلے کے دوران خراش تک نہیں آئی تھی اب خون میں لتھڑا ہوا نظر آرہا تھا حالانکہ کیتھرین نے اس کے چہرے پر کوئی وار نہیں کیا تھا۔ شاید وہ منہ کے بل کچھ زیادہ ہی زور سے گرا تھا۔ اس کی نکسیر بھی پھوٹ گئی تھی اور شاید پیشانی کی جلد، ہونٹ وغیرہ بھی پھٹ گئے تھے۔ چہرہ مٹی اور خون میں لتھڑ جانے کی وجہ سے وہ بہت خوفناک نظر آنے لگا تھا لیکن ایک لحاظ سے اس کی یہ حالت قابلِ رحم بھی تھی۔ کیتھرین گویا ایک چھلاوا تھی جو اس کی گرفت میں نہیں آرہی تھی۔

اس نے گویا اپنی بچی کھچی طاقت مجتمع کرتے ہوئے نہایت عجلت سے کیتھرین پر چھلانگ لگائی۔ اس وقت اس سے اتنی پھرتی کی توقع مجھے بھی نہیں تھی۔ کیتھرین اس کی گرفت میں آنے سے بال بال بچی۔ اس بار پہلوانِ اعظم کی گدی پر کراٹے کا ہاتھ پڑا۔ یہ ضرب اس کے لیے خطرناک ثابت ہوئی۔ وہ اوندھا گرا اور پھر نہیں اٹھا۔

کیتھرین مستعدی سے ذرا دور کھڑی اس کے اٹھنے کی منتظر رہی۔ اس بار اس نے اس کے ڈھیر ہونے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی اور اس حالت میں اس پر کوئی وار نہیں کیا۔ مجمع کو شاید ابھی پہلوانِ اعظم کے اٹھنے اور کوئی کرشمہ دکھانے کی امید تھی لیکن بے چارے پہلوانِ اعظم صاحب اوندھے ہی پڑے رہے۔ سانس کی آمد و رفت کے ساتھ پسلیوں کے زیر و بم کے سوا ان کے جسم میں حرکت کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے۔

بالآخر کیتھرین کو اندازہ ہوگیا کہ پہلوانِ اعظم اب نہیں

گے۔ وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے گہری سانس لے کر بہ آوازِ بلند سے مخاطب ہوئی "چلو۔۔۔ اب اپنے پہلوانِ اعظم کو اٹھوالو ں کی مالش، مرہم پٹی وغیرہ کا انتظام کرو اور ہوسکے تو اس پر غور کرنا کہ آئندہ اس کا پہلوانِ اعظم کا ٹائٹل برقرار رہنا یا نہیں؟"

سیوبک کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ وہ خاموشی کیتھرین کو تک رہا تھا۔ دفعتاً میدان تالیوں کے شور سے گونج میں نے اب تک بیک وقت ہر طرف نظر رکھنے کی کوشش کی میں نے دیکھا، تالیاں صرف عورتیں بجارہی تھیں اور ان چہرے کسی اندرونی جوش سے تمتما رہے تھے لیکن فوراً ہی ان مردوں نے خونخوار نظروں سے انہیں گھورا اور ان کے تالیاں تے ہوئے ہاتھ ساکت ہوگئے۔ چہروں سے مسکراہٹ غائب

ایک لمحے کے توقف سے کیتھرین بولی "یہ مر بھی سکتا تھا لیکن نے زیادہ بدمزگی سے بچنے کے لیے کافی احتیاط برتی ہے اگر اسے ت رہی تو میں آئندہ بھی کسی وقت اس سے مقابلے کے لیے ں ہوں۔"

سیوبک اب بھی خاموش رہا۔ کیتھرین میری اور چارلس کی ف واپس آگئی۔ چارلس کے چہرے کا اطمینان اس وقت دیدنی لیکن وہ اپنی خوشی اور جوش و خروش کو ایک سنجیدہ، مدبر اور متین سان کی طرح چھپانے کی پوری پوری کوشش کررہا تھا لیکن مجھے لگا تھا کہ اس وقت اس کی کیفیت اس باپ جیسی ہی تھی جس کی لاڈلے کسی عظیم الشان تقریب میں اسٹیج پر حیرت انگیز صلاحیتوں کا مظاہرہ کر کے کوئی بڑا انعام جیتا ہو جبکہ باپ کو اس سے پہلے علم نہ رہا ہو کہ اس کی اولاد میں ایسی صلاحیتیں بھی پائی جاتی تھیں۔

کیتھرین کو خراش تک نہیں آئی تھی لیکن چارلس اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھے بغیر نہ رہ سکا "تم ٹھیک تو ہو نہ؟"

کیتھرین کوئی جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھ کر ابرے سے ہنس دی اور داد طلب انداز میں بولی "میں نے شاگردی کا حق ادا کیا یا نہیں؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "خدا تم جیسی بنی بنائی شاگرد ہر کسی کو دے۔ فی الحال تو تم مجھے استاد نظر آرہی تھیں۔ معلوم نہیں تم نے کیوں خود کو میری شاگرد قرار دے دیا ہے۔ میں نے تو ابھی تک کوئی "استادی" نہیں دکھائی۔"

"میری نظریں چھپے ہوئے جوہر کو پہچان لیتی ہیں" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

سیوبک اس دوران اپنی زبان میں اپنے آدمیوں کو ہدایات دے رہا تھا کہ وہ پہلوانِ اعظم کو اٹھا کر لے جائیں۔ دوسرے پہلوان کو پہلے ہی اٹھا کر نہ جانے کہاں لے جایا جا چکا تھا۔

چارلس نے سیوبک کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا "تم اب ہمارے سوالوں کے جواب دو گے نا؟ میری بیٹی نے تمہارے پہلوانِ اعظم پر اپنی برتری ثابت کردی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ میں ضرور جواب دوں گا" سیوبک اس کی طرف گردن گھما کر ذرا برہمی سے بولا "ہم وعدے پورے کرنے والے لوگ ہیں" وہ ایک بار پھر گھوم کر اپنے آدمیوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ اس دوران ہجوم منتشر ہونے لگا تھا لیکن صرف عورتیں ہی نہیں، مرد بھی مڑ مڑ کر کیتھرین کو عجیب سی نظروں سے دیکھتے جارہے تھے۔

اسی اثنا میں ایک گدھا گاڑی وہاں لائی گئی جس میں صاف ستھرا گدا بچھا ہوا تھا۔ پہلوانِ اعظم کو اس میں لٹا دیا گیا اور گاڑی ایک طرف کو روانہ ہوگئی۔ شاید وہ اس گاؤں کی "ایمبولینس" تھی۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے گھروں کی طرف جارہے تھے۔

میں نے نیچی آواز میں کیتھرین سے کہا "تمہاری آج کی کارکردگی دیکھ کر تو یقین نہیں آرہا کہ تین روز پہلے تم بحری جہاز پر اتنی آسانی سے جنتر کے قابو میں آگئی تھیں۔"

"اس کی کئی وجوہات تھیں" کیتھرین مسکراتے ہوئے بولی "اس نے واقعی بالکل غیر متوقع طور پر پیچھے سے آکر میری شہ رگ پر خنجر رکھ دیا تھا۔۔۔ ذرا سی بھی حرکت میرے لیے مہلک ثابت ہوسکتی تھی۔ دوسرے وہاں جگہ بہت تنگ تھی۔ تیسرے جہاز پر چھاپا پڑا ہوا تھا۔ میرے دل میں چور تھا۔ میں کسی کے سامنے زیادہ نمایاں نہیں ہونا چاہتی تھی۔ ایک عام اور معمولی سی لڑکی ہی بنی رہنا چاہتی تھی۔ اس طرح کی کئی وجوہات تھیں جن کی بنا پر میں چند سیکنڈ کے اس واقعے میں بالکل ساکت ہوکر رہ گئی تھی۔ ویسے اگر تم جنتر کو ہلاک کرنے میں پھرتی نہ دکھاتے تو پھر شاید میں ہی کچھ کر گزرتی لیکن شاید میں بھی زخمی ہوجاتی۔"

بالآخر سیوبک ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "تم لوگ میرے ساتھ چلو۔"

ہم تینوں اس کے پیچھے چل دیے۔ وہ میدان عبور کر کے ایک ایسی گلی سے گزرا جو غالباً گاؤں کے مین بازار کی حیثیت رکھتی تھی۔ مزید کچھ فاصلہ طے کرنے اور دائیں بائیں مڑنے کے بعد مکانات کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب ہمارے سامنے ایک پہاڑی تھی جسے اوپر سے تراش کر اس پر مکان بنایا گیا تھا۔ یہ مکان بھی چوبی تھا لیکن نہایت شاندار نظر آرہا تھا۔ پہاڑی کو تراش کر مکان تک جانے کے لیے سیڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ جیل کی طرز پر مکان کے چاروں کونوں پر برجیاں بنائی گئی تھیں جن میں ایک ایک شخص مشین گن، اسٹینڈ پر فٹ کیے کھڑا تھا۔ چاروں گنوں کا رخ چاروں سمتوں میں تھا۔ مکان کیا تھا، اچھا بھلا چھوٹا موٹا چوبی محل تھا۔

ہمارے اوپر پہنچتے ہی ایک خادم نے دستک سے پہلے ہی لکڑی کا بڑا سا گیٹ کھول دیا۔ یہ شخص بھی مسلح نظر آرہا تھا لیکن خود سیوبک کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اس کے شاہانہ طرز کے بھاری بھرکم اور ڈھیلے ڈھالے لبادے میں کچھ پوشیدہ ہوسکتا تھا تاہم معلوم یہی ہوتا تھا کہ اسے خود اپنی

ذات سے زیادہ اپنے گھر اور اہلِ خانہ کی فکر تھی۔

سیوبک کی قلعہ میں ہم اندر پہنچے تو سامنے ہی طویل و عریض صحن نظر آیا۔ اس صحن میں ایک نہایت خوب صورت عورت ڈھیلے ڈھالے لیکن شاہانہ سے لباس میں ایک بچے کو گود میں لیے کھڑی تھی۔ پہلی نظر میں وہ عورت مجھے سفید فام معلوم ہوئی کیونکہ اس کی رنگت سرخ و سفید، آنکھیں نیلی، بال سنہرے لیکن مشرقی عورتوں کی طرح اتنے لمبے تھے کہ کولھوں سے بھی نیچے جا رہے تھے۔ وہ برہنہ سر تھی اور بال کھلے ہی تھے۔ دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہو گیا کہ وہ عورت بہرحال مشرقی ہی تھی۔ سیوبک نے اس سے کچھ نہیں کہا لیکن وہ ہم اجنبیوں کو دیکھتے ہی تیزی سے مڑی اور اندر کہیں چلی گئی۔

سیوبک نے ہمیں دائیں ہاتھ پر واقع ایک طویل و عریض نشست گاہ میں لا بٹھایا۔ اس میں بیش قیمت دبیز قالین، خوب صورت آرام دہ گاؤ تکیے وغیرہ تو موجود تھے لیکن جدید طرز کا نشست کا سامان وغیرہ نہیں تھا۔ دیواروں پر گنیں آویزاں تھیں۔ اس طرز کی نشست گاہیں ہمارے قبائلی علاقوں میں بھی ہوتی ہیں۔

سیوبک کسی خادم کو طلب کرنے کے بجائے ہمیں بٹھا کر باہر جاتے ہوئے بولا "میں مہمانداری کا کچھ بندوبست کرتا ہوں۔"

وہ جا چکا تو میں نے نیچی آواز میں چارلس سے کہا "اتنا تو مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ یہ اس قبیلے کا سردار ہے لیکن تم اس کے پاس کیوں آئے ہو؟"

"پہلے تو تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ یہ محض اس قبیلے کا سردار نہیں ہے اور اس کی زندگی صرف اس گاؤں تک محدود نہیں ہے...." چارلس آرام سے، پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ اب وہ بالکل پُرسکون نظر آ رہا تھا۔

"یہ تو خیر مجھے اندازہ ہے.... اس حیثیت کے لوگ قریبی شہروں تک بھی آتے جاتے رہتے ہیں" میں نے کہا۔

چارلس گویا میری بات سے محظوظ ہوتے ہوئے ہنسا "تم قریبی شہروں کی بات کر رہے ہو، وہ تو دور دراز ملکوں تک جاتا رہتا ہے۔"

"کیا کوئی کاروبار وغیرہ کرتا ہے؟" میں نے کچھ حقیقی، کچھ مصنوعی سادگی سے پوچھا۔

چارلس ایک بار پھر دھیرے سے ہنسا اور میری طرف جھکتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں بولا "تمہیں شاید یقین نہیں آئے گا.... وہ بہت اونچے درجے کا اُجرتی قاتل ہے...."

کیتھرین بھی ذرا باپ کی طرف جھک گئی تھی۔ اس نے ذرا چونک کر باپ کی طرف دیکھا۔ میں نے بغور چارلس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کتنے اونچے درجے کا؟"

"منسٹروں.... وزیروں اور سربراہانِ مملکت کو قتل کرتا ہے۔ بہت بھاری معاوضہ لیتا ہے۔ سی آئی اے، آنجہانی کے جی بی، موساد یا خاد وغیرہ کے کسی گھاگ اور تجربے کار ایجنٹ سے زیادہ

سردار ہے لیکن جب یہ یورپ، افریقہ یا مشرقِ وسطیٰ کے کسی ملک میں.... یا پھر امریکا، برطانیہ، جرمنی وغیرہ میں نظر آتا ہے تو کوئی اس پر قبائلی ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتا۔ دنیا کی کئی زبانیں روانی سے بولتا ہے اور دنیا کے کئی خاص شہروں میں اس کا بنگلا یا اپارٹمنٹ موجود ہے جس میں اس کی کوئی نہ کوئی داشتہ رہتی ہے۔ دنیا کی تقریباً ہر قوم کی عورت اس کی داشتاؤں میں شامل ہے یا شامل رہ چکی ہے۔"

"مسٹر چارلس! ایسا لگ رہا ہے جیسے تم مجھے کسی الف لیلوی کردار کے بارے میں بتا رہے ہو" میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

چارلس ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اب تو الف لیلہ بھی پرانی چیز ہو چکی ہے۔ دنیا کے گوشے گوشے میں ایک نئی الف لیلہ رقم کی جا رہی ہے۔ ہر نظامِ حکومت کی خامیوں یا مصلحتوں کی وجہ سے جگہ جگہ الف لیلوی کردار جنم لے چکے ہیں۔ جب ہم پہلی بار ان کے بارے میں جانتے ہیں، ان کے قریب جاتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ ہم بے یقینی سے سوچتے ہیں "اچھا.... کیا دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں؟ کیا دنیا میں ایسا بھی ہو رہا ہے؟" لیکن ہمارے یقین کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے؟ دنیا بہرحال الف لیلوی کرداروں سے بھری پڑی ہے۔"

"تم اس کے پاس کس لیے آئے ہو؟ کسی کو قتل کروانا ہے؟" میں نے پوچھا۔ وہ ایک سُپرپاور کا نمائندہ تھا اور بساط سے مُہرے ہٹاتے رہنا، ان کی جگہ نئے مُہرے جماتے رہنا سُپرپاورز کا مشغلہ ہے۔

"نہیں۔ قتل نہیں کرانا ہے.... بلکہ کسی کو قتل ہونے سے بچانا ہے" چارلس نے سرگوشی میں جواب دیا۔

"کسے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"لیڈی ڈائنا کو" اس نے جواب دیا۔

میں چند لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ بالآخر پوچھے بغیر نہ رہ سکا "اس خوب صورت اور بے ضرر عورت کو کون قتل کرانا چاہتا ہے؟ وہ تو سربراہِ مملکت بھی نہیں ہے.... سیاست سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔"

"اگر ہمیں یہ معلوم ہوتا کہ کون قتل کرانا چاہتا ہے تو ہمیں یہاں آنے کی ضرورت نہ پڑتی" چارلس گہری سانس لے کر بولا "ویسے ڈائنا سربراہِ مملکت نہ سہی.... سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہ سہی.... لیکن وہ ایک اہم شخصیت ہے۔ ایسی شخصیت کے پاس خواہ کوئی عہدہ نہ ہو، لیکن اس کا مقام، اس کی حیثیت کچھ ایسی ہے کہ اس کی زندگی یا موت دنیا کی سیاست پر اثر انداز ہو سکتی ہے۔"

"کیا لیڈی ڈائنا کو قتل کرنے کا کنٹریکٹ سیوبک کو ملا ہے؟" میں نے دریافت کیا لیکن اسی لمحے باہر آہٹ ابھری۔ شاید

چارلس سرگوشی میں بولا "تم خاموشی سے سب کچھ دیکھتے سنتے رہو۔ بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔"

چند سیکنڈ بعد سیوبک کمرے میں داخل ہوا۔ دو ملازم اس کے پیچھے ٹرے اٹھائے آ رہے تھے۔ ان میں شراب، وھسکی، بیئر وغیرہ کی بوتلیں، سوڈا، برف سب کچھ تھا۔

"میرے ہاں ہر مہمان کی تواضع اس کی معاشرت کے مطابق کی جاتی ہے" سیوبک بیٹھتے ہوئے بولا "پہلے مشروبات کا دور چلے گا۔"

چارلس نے اپنے لیے وھسکی کا ایک ہلکا پیگ تیار کیا اور کیتھرین نے اپنے لیے شیری پسند کی۔ میں ساکت بیٹھا رہا تو سیوبک نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"آپ کچھ نہیں لے رہے؟" اس نے انگریزی میں نہایت شائستگی سے پوچھا۔

"اگر زحمت نہ ہو تو میرے لیے شربتِ بنفشہ.... سکنجبین یا پھر لسی منگوا دیجیے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"کیا....؟ شربت....؟" سیوبک کے لیے شربتِ بنفشہ، سکنجبین اور لسی جیسے الفاظ دُہرانا مشکل تھا۔ وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"آپ کہہ رہے تھے کہ آپ کے ہاں ہر مہمان کی تواضع اس کی معاشرت کے مطابق کی جاتی ہے۔" میں نے معصومیت سے کہا اور بوتلوں کی طرف اشارہ کیا "میری معاشرت میں تو ان کی گنجائش نہیں ہے۔"

"اوہ.... میں سمجھا...." سیوبک سر ہلاتے ہوئے بولا "آپ پیتے نہیں ہیں۔ میں بھی نہیں پیتا ہوں۔"

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ چارلس نے اس کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا تھا، اس کے بعد یہ جاننا میرے لیے واقعی باعثِ حیرت تھا کہ وہ پیتا نہیں تھا پھر وہ میرے لیے ایک گلاس میں برف اور سوڈا ڈالتے ہوئے بولا "چلیں.... آپ صرف یہی پی لیں۔"

"آپ کہتے ہیں تو پی لیتا ہوں ویسے میری معاشرت میں تو یہ بھی شامل نہیں ہے" میں نے گلاس تھامتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

اب سیوبک بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔

چارلس نے سیوبک کو مخاطب کیا "تم مسٹر افضل چوہدری کی باتوں میں مت الجھو۔ یہ بہت سنجیدگی سے مذاق کرتے ہیں۔"

"میرے ساتھ ٹریجڈی یہی رہی ہے...." میں نے اپنے لہجے کو غمناک بناتے ہوئے کہا "جب بھی میں نے سنجیدگی سے بات کرنے کی کوشش کی، اسے مذاق سمجھ لیا گیا۔"

"خیر...." سیوبک نے کندھے اچکاتے ہوئے موضوع بدل دیا "مشروبات کے دور کے بعد کھانے کا سلسلہ ہو گا۔ بات پھر وہی معاشرت کی آجاتی ہے.... ہمارے ہاں سالم بکرے کے پیٹ میں چاول بھر کر اسے خاص مسالوں کے ساتھ روسٹ کیا جاتا ہے اور ساتھ ایک خاص طرح کی پھولی پھولی روٹی ہوتی ہے۔ اگر آپ لوگ پسند کریں تو وہ تقریباً تیار ہے، ورنہ پھیکے سیٹھے انگریزی کھانے بھی دستیاب ہو سکتے ہیں۔"

اس انداز میں بکرا ہمارے ہاں بھی قبائلی علاقوں میں روسٹ کیا جاتا تھا۔ میں نے اور چارلس نے اسی کے حق میں ووٹ دیا۔ کیتھرین نے کندھے اچکا کر ہماری تائید کر دی۔ اس کے خیال میں کھانا پینا اہم مسئلہ نہیں تھا۔

سیوبک بولا "کھانے پینے کا سلسلہ چلتا رہے گا.... لیکن میرا خیال ہے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہو جانی چاہئیں۔ مسٹر چارلس! آپ جو پوچھنا چاہتے ہیں، پوچھیے۔"

"چند دن پہلے استنبول میں برطانوی سفارت خانے کو ایک گمنام خط موصول ہوا جو فرانسیسی میں لکھا گیا تھا...." چارلس نے کہا اور خاموش ہو کر یوں سیوبک کے چہرے کا جائزہ لینے لگا گویا اس پر کوئی ردِعمل تلاش کر رہا ہو لیکن سیوبک کا چہرہ ہر تاثر سے عاری رہا۔

چارلس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اسکاٹ لینڈ یارڈ اور برطانوی سیکرٹ سروس اس خط کے بارے میں فوراً حرکت میں آئی۔ ان کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت تو موجود نہیں، لیکن باور کیا گیا ہے کہ وہ خط تم نے لکھا تھا۔"

"باور نہیں، تم لوگوں کو فرض کرنا چاہیے تھا" سیوبک نے تصحیح کی یا شاید مشورہ دیا۔ لہجہ نہایت نرم تھا۔

"چلو.... فی الحال ہم فرض کر لیتے ہیں کہ وہ خط تم نے لکھا تھا" چارلس نے بحث نہیں کی اور بات جاری رکھی "تم نے اس خط میں خبردار کیا تھا کہ لیڈی ڈائنا کا ترکی کا جو دورہ طے پا چکا ہے اور جس کا شیڈول بھی بن چکا ہے، اس کے دوران انہیں قتل کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تم نے یہ نہیں لکھا تھا کہ اس قسم کی شخصیت کو قتل کرنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ اگر اس کی پیشگی اطلاع موجود تھی تو اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ کسی جنونی کی حرکت بھی نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ جنونی یا اس قسم کے لوگ جن کے دماغ میں کوئی خناس ہوتا ہے وہ اچانک ہی ایسی کسی شخصیت پر حملہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"درست ہے" سیوبک آہستگی سے بولا۔

"برطانوی سیکرٹ سروس اور دیگر کئی ماہرین نے اس خط پر بہت غور کیا...." چارلس بات جاری رکھتے ہوئے بولا "بظاہر اس کے چند مقاصد ممکن نظر آتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ جب کوئی بڑی شخصیت کسی ملک کا دورہ کرتی ہے اور اس دوران اسے کوئی گزند پہنچ جاتا ہے تو سب سے پہلے دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ میزبان ملک پر الزام آتا ہے کہ اس کے سیکیورٹی کے انتظامات ناقص تھے۔ برطانیہ اور ترکی کے تعلقات اس وقت ویسے ہی ایک اہم دور سے گزر رہے ہیں...."

سیوبک خاموش رہا اور سوڈے کے گلاس کو انگلیوں میں گھماتا رہا۔ وہ کسی جھیل کی طرح پُرسکون تھا.... بلکہ جھیل کی سطح پر بھی ہوا سے خفیف سی لہریں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ سیوبک کے

www.paksociety.com

چہرے پر ذرا بھی ارتعاش نہیں تھا۔

"دوسرا مقصد شاہی خاندان کو ایک بڑے بحران سے دوچار کرنا بھی ہوسکتا ہے" چارلس سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولا "کیونکہ آج کل ویسے ہی عالمی پریس اور میڈیا میں پرنس چارلس اور لیڈی ڈائنا کے درمیان اختلافات کی خبریں گرم ہیں اور طلاق تک نوبت پہنچتی بتائی جارہی ہے اس لیے یہ شبہ بھی پیدا ہوسکتا ہے کہ کہیں شاہی خاندان نے خود ہی تو ڈائنا کو نہ مروایا ہو۔ شاہی خاندان کے وقار کو اس سے سخت دھچکا لگ سکتا ہے کیونکہ شاہی خاندان میں آج تک اس طرح کا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ شاہی خاندان آج کل ویسے بھی مختلف افواہوں کی کچھ زیادہ ہی زد میں ہے جن کے پیچھے کچھ مخصوص لابیاں کام کررہی ہیں۔ بہرحال ڈائنا عوامی سطح پر بھی خاصی مقبول شخصیت ہے۔ اس کے قتل پر برطانیہ میں خاصا شدید ردِعمل بھی مرتب ہوسکتا ہے جو ملک کو اپنی جگہ کچھ نئے مسائل سے دوچار کرسکتا ہے۔"

چارلس نے ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر گہری سانس لی "چنانچہ لیڈی ڈائنا پر قاتلانہ حملے کا امکان تو پایا جاتا ہے۔ اس لیے ہم نے اس خط کو دیوانے کی بڑ سمجھ کر نظرانداز نہیں کیا لیکن تحقیقات کے بعد ہماری سمجھ میں یہ نہیں آرہا کہ تم نے وہ خط کیوں لکھا؟"

"تم نے کیوں فرض کرلیا کہ وہ خط میں نے لکھا تھا؟" سیوبک نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

چارلس ملائمت سے بولا "دیکھو..... اگر ہم انجان اور معصوم بن کر گفتگو کریں گے تو بات آگے نہیں بڑھ سکے گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ تم دنیا کے ایک نہایت مہنگے اور اونچے درجے کے اُجرتی قاتل ہو۔ بہت ہی خاص الخاص شخصیتوں کو قتل کرنا تمہاری وجۂ شہرت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ تمہاری یہ شہرت صرف چند افراد تک محدود ہے۔ یہ بھی ایک الگ مسئلہ ہے کہ ایک تو ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے آج تک تمہارا کچھ نہیں بگاڑا جاسکا۔ دوسرے تم خود اپنی حفاظت کرنا بخوبی جانتے ہو۔ کوئی سیکرٹ ایجنٹ یا اسپائی کوشش بھی کرے تو شاید تمہیں ہلاک نہ کرسکے۔"

اس موقعے پر میں نے سیوبک کے پتلے پتلے سفاک ہونٹوں پر مسکراہٹ کی ایک رمق سی نمودار ہوتے محسوس کی۔

چارلس مربیانہ لہجے میں بولا "اس لیے اب اس بات کو جھٹلانا تو چھوڑ دو کہ وہ خط تم نے لکھا تھا۔ میری جیب میں کوئی ننھا سا ٹیپ ریکارڈر وغیرہ پوشیدہ نہیں ہے جس پر تمہارا یہ اعترافِ جرم ریکارڈ ہوجائے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تمہاری جیب میں کوئی ٹیپ ریکارڈر وغیرہ نہیں ہے" سیوبک اب ذرا مسکرایا "اگر مجھے اس قسم کا کوئی شبہ ہوتا تو تم لوگوں کی تلاشی لے کر اب تک وہ ٹیپ ریکارڈر برآمد کیا جاچکا ہوتا۔ بلکہ شاید ضائع بھی کیا جاچکا ہوتا۔"

"تو پھر تم کھل کر بات کیوں نہیں کررہے؟" چارلس بولا "تم نے تو کہا تھا کہ تم میرے ہر سوال کا جواب دوگے۔ تم تو پہلے ہی سوال کا جواب نہیں دے رہے۔"

"کبھی کبھی سوال خود اپنا جواب ہوتے ہیں" سیوبک نے یہ کہتے ہوئے گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔

چارلس پہلو بدل کر بولا "بہرحال..... ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ کنٹریکٹ تمہارے پاس آیا ہوگا۔ اس کے بغیر تم اس راز سے آگاہ نہیں ہوسکتے تھے۔ ہمیں اس سلسلے میں خبردار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ تم نے کنٹریکٹ واپس کردیا ہے۔ پہلا سوال تو یہی پیدا ہوتا ہے کہ تم نے کنٹریکٹ کیوں واپس کردیا؟ اگر واپس کرہی دیا تھا تو اس سلسلے میں ہمارے سفارت خانے کو کیوں خبردار کیا؟ یہ تو تم جیسے قاتلوں کی "اخلاقیات" کے خلاف ہے۔"

سیوبک چند لمحے گلاس کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے پُرخیال انداز میں اسی کو گھورتا رہا۔ کیتھرین اب آنکھوں میں ایک نئی دلچسپی لیے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بالآخر سیوبک نے شاید ذرا کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کرہی لیا۔ وہ چارلس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے نہایت ہی دھیمی آواز میں بولا "یہ درست ہے کہ کنٹریکٹ میرے پاس آیا تھا اور یہ بھی درست ہے کہ میں نے واپس کردیا تھا۔ تمہارے آدمیوں نے اندازے لگانے میں مہارت دکھائی ہے۔ مجھے تمہاری حکومت سے یہی امید تھی۔"

"کون لوگ کنٹریکٹ لے کر آئے تھے؟" چارلس نے پوچھا۔

"پانچ آدمیوں کا ایک گروپ تھا۔ وہ ایک چارٹرڈ طیارے میں آئے تھے" سیوبک نے جواب دیا۔

"میرے پوچھنے کا مطلب یہ تھا کہ ان کا تعلق کس ملک سے تھا؟" چارلس ملائمت سے بولا۔

"یہ میں نہیں جان سکا۔ اگر جان بھی لیتا تو تمہیں نہ بتاتا۔ اب تم مجھ سے کاروباری "اخلاقیات" کو اس حد تک بھی ترک کردینے کی توقع مت رکھو" سیوبک سپاٹ لہجے میں بولا۔

"انہوں نے تمہیں کتنا معاوضہ آفر کیا تھا..... یہ تو بتاسکتے ہو؟"

"ہاں۔ ایک ملین پاؤنڈ۔"

"ایک ملین پاؤنڈ.....!" چارلس نے حیرت سے دُہرایا۔

"یہ تو میں صرف نقد رقم کی بات بتارہا ہوں جو وہ ساتھ لے کر آئے تھے۔ یہ ایڈوانس تھا۔ کام ختم ہونے کے بعد مزید ایک ملین پاؤنڈ میرے سوئس اکاؤنٹ میں منتقل ہونا تھے" سیوبک مسکراتے ہوئے بولا۔

چند لمحے کے لیے کمرے میں سکوت چھاگیا!

سیوبک بغور چارلس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ چارلس کی پیشانی پر شکنیں تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ ہر سوال کرنے کے لیے نہایت احتیاط سے الفاظ کا انتخاب کررہا تھا اور اس سے بھی زیادہ احتیاط کے ساتھ سیوبک جواب دے رہا تھا۔ چارلس تو خیر ایک غیر رسمی قسم کا ڈپلومیٹ اور غیر روایتی قسم کا معاملہ ساز ہی تھا لیکن سیوبک بھی اس وقت اپنے اندازِ گفتگو سے کوئی ڈپلومیٹ ہی معلوم ہورہا تھا۔ جس سنجیدگی، متانت اور ادب و احترام سے دونوں کے درمیان گفتگو ہورہی تھی اس سے یہ گمان بھی نہیں گزرتا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک نہایت اونچے درجے کا پیشہ ور اُجرتی قاتل تھا۔

اس دور کا المیہ یہی ہے کہ اس میں قتل و غارت اور دہشت گردی وغیرہ ایک بڑی صنعت یا شاید بہت بڑے فن کا درجہ حاصل کرچکی ہے۔ اگر آپ چھوٹے موٹے آدمی ہیں اور غصے میں یا غلطی سے..... حتیٰ کہ کسی معقول وجہ کے تحت بھی کسی کو قتل کردیتے ہیں تو آپ قاتل ہیں، پولیس آپ کو پکڑنے کے لیے حسب مقدور کوششیں کرے گی اور اگر آپ اس کے ہتھے چڑھ گئے تو امید یہی ہے کہ آپ کا حشر خاصا عبرت ناک ہوگا لیکن اگر آپ اسی کام میں کمال حاصل کرلیتے ہیں، کسی بڑے مقام پر پہنچ جاتے ہیں، اسے صنعت کا درجہ دیتے ہیں، اس قابل ہوجاتے ہیں کہ آپ کے محض ایک اشارے پر کچھ سے کچھ ہوجاتا ہے تو پھر نہ جانے قاعدے قانون کہاں چلے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگ بعض اوقات خود آپ کو سہارا دے کر اونچے سنگھاسن پر بٹھاتے ہیں پھر نہایت ادب و احترام سے آپ سے مذاکرات کرتے ہیں۔ یہ تفاوت، یہ تضاد آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

لیڈی ڈائنا کو ہلاک کرنے کے لیے سیوبک کو دو ملین پاؤنڈ کی پیشکش ہوئی تھی۔ پاکستانی کرنسی میں یہ رقم سات کروڑ سے اوپر تھی لیکن مجھے رقم پر حیرت نہیں تھی۔ ایک سپرپاور کے شاہی خاندان کی ایک نہایت اہم اور ممتاز شخصیت کو قتل کرنے کا یہ معاوضہ بہت زیادہ نہیں تھا۔ پاکستان جیسے غریب ملک میں غریبوں کے ووٹوں سے منتخب ہونے والے کسی اسمبلی کے ممبر کو اِدھر سے اُدھر لڑھکنے، کسی معاملے میں "ہاں" کرنے یا کسی معاملے میں "نا" کرنے کا اتنا معاوضہ مل جاتا ہے۔

حیرت مجھے اس بات پر تھی کہ اس معاملے میں برطانوی حکومت کا ایک نمائندہ بیٹھا اس شخص سے نہایت دوستانہ ماحول

میں بات چیت کر رہا تھا جو لیڈی ڈائنا کا قاتل بھی ہو سکتا تھا۔ انہوں نے اس شخص کو بین الاقوامی قوانین کے تحت اپنے ہاں بلوانے یا اپنی کسی ایجنسی کے ذریعے اغوا کرانے اور اسکاٹ لینڈ وغیرہ میں اس سے تفتیش کرنے کے بجائے اس کے درِ دولت پر حاضر ہو کر معلومات حاصل کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر یہ کوئی پاکستانی معاملہ ہوتا اور کوئی پاکستانی نمائندہ اس قسم کے مذاکرات کر رہا ہوتا تو مجھے کوئی خاص حیرت نہ ہوتی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد چارلس گہری سانس لے کر بولا۔ "تم نے دو ملین پاؤنڈ کا یہ کنٹریکٹ ٹھکرا دیا؟"

"ہاں۔" سیوبک نے اختصار سے جواب دیا۔

"کیوں؟" چارلس نے جاننا چاہا۔

"میری مرضی۔" سیوبک کا جواب اب بھی مختصر تھا۔

چارلس نفی میں سر ہلاتے ہوئے ملائمت سے بولا۔ "میرا خیال ہے اس کا جواب اتنا سادہ نہیں ہو سکتا۔"

"شاید جواب مختصر ہونے کی وجہ سے تمہیں اتنا سادہ لگ رہا ہے۔" سیوبک مسکرایا۔ "اگر میں ذرا تفصیل سے جواب دوں گا تب بھی مفہوم یہی ہوگا۔"

"پھر بھی..... میں چاہتا ہوں تم ذرا کھل کر بات کرو۔" چارلس کے لہجے میں مہذبانہ اصرار تھا۔

"کھل کر تو میں نے آج تک اپنی بیوی سے بات نہیں کی۔"

"بیوی سے تو خواہ تم بالکل ہی بات مت کرو۔ مجھے اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ میں تو اپنی بات کر رہا ہوں۔" چارلس خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

سیوبک ایک لمحے کچھ سوچنے کے بعد بولا۔ "بس.... کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ ایک تو میں نے اس سے پہلے کسی عورت کو قتل نہیں کیا۔ دوسرے مجھے اس عورت کی اب تک کی زندگی میں کوئی زیادہ بڑی خباثت نظر نہیں آئی۔ کسی کی نجی زندگی سے میں کوئی مطلب نہیں رکھتا لیکن کسی بھی دوسرے زاویے سے یہ عورت کسی بھی اعتبار سے مجھے انسانیت کی مجرم نظر نہیں آئی۔"

"اوہو...." چارلس استہزائیہ انداز میں دھیرے سے ہنسا۔ "گویا تم بہت نیک قسم کے قاتل ہو۔ صرف ان لوگوں کو قتل کرتے ہو جو تمہیں انسانیت کے مجرم نظر آتے ہیں؟"

"نہیں.... ایسی بھی بات نہیں ہے۔" سیوبک ہلکی سی ناگواری سے بولا۔ "تاہم میں چونکہ ہر ایرے غیرے کو قتل کرتا نہیں پھرتا۔ میرا نشانہ بہت بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کے ماضی میں مجھے کچھ نہ کچھ گھناؤنا پن مل جاتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی غلطیاں بھی بڑی ہوتی ہیں..... یا یوں کہو کہ ان کی غلطیوں کے اثرات بہت بڑے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات ان کا ذرا سا غلط فیصلہ ہزاروں انسانوں کی زندگیاں برباد کر دیتا ہے۔ لاکھوں انسانوں کو زندہ درگور کر دیتا ہے یا انہیں اذیت ناک موت کی آغوش میں پہنچا دیتا ہے۔ کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں؟"

"نہیں، درست ہے۔" چارلس نے تسلیم کیا۔

"تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ آج کی دنیا میں جنہیں بڑے لوگ کہا جاتا ہے وہ کچھ ایسی مثالی زندگی گزار کر بڑے نہیں بنتے۔ نہ جانے کیا کیا جوڑ توڑ کرتے ہیں۔ ان کا اعمال نامہ نہ جانے کیسی کیسی خباثتوں سے بھرا ہوتا ہے۔ میں بے شک معاوضہ لے کر قتل کرتا ہوں اور اپنا مطلوبہ معاوضہ ملنے پر کسی کو بھی قتل کر سکتا ہوں لیکن پھر بھی اپنے دل کے اطمینان کے لیے اس کے اعمال نامے میں سے کوئی نہ کوئی جواز چن لیتا ہوں کہ فلاں شخص اس وقت بے شک بڑا نیک نام تھا، بڑے اونچے مقام پر فائز تھا، بے شمار لوگ اس کے نام کی مالا جپ رہے تھے لیکن اپنی فلاں حرکت کی وجہ سے وہ موت کا مستحق تھا، وہ انسانیت کا مجرم تھا، اسے تو بہت پہلے مر جانا چاہیے تھا اور بڑی عبرت ناک موت مرنا چاہیے تھا۔"

"بہت خوب۔ گویا تم بڑے باضمیر قسم کے قاتل ہو۔" چارلس کا لہجہ اب بھی قدرے استہزائیہ ہی تھا اور میرا خیال تھا سیوبک کو یہ بات کچھ ناگوار گزر رہی تھی۔

"نہیں۔ مجھے باضمیر ہونے کا دعویٰ نہیں۔" سیوبک ملائمت سے بولا۔ "میں اپنے آپ کو اس جواز سے صرف اس لیے مطمئن کرتا ہوں کہ رات کو آرام کی نیند سو سکوں۔ کوئی کنٹریکٹ پورا کرنے کے بعد بھی میرے ذہن پر کوئی بوجھ نہ ہو ورنہ اس قسم کے کام انسان خواہ کتنا ہی بھاری معاوضہ لے کر کرے اور اس کے اعصاب خواہ کتنے ہی مضبوط ہوں لیکن کبھی نہ کبھی وہ اندر سے ضرور چٹخنے لگتا ہے جبکہ میں بالکل مطمئن اور مسرور ہوں۔ میں نے کبھی اپنے آپ کو مضطرب یا پریشان محسوس نہیں کیا۔"

"لیڈی ڈائنا کو قتل کرنے کا تمہیں کوئی مضبوط جواز نہیں مل سکا؟" چارلس نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، میرے انکار کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی۔" سیوبک نے جواب دیا۔ "مجموعی طور پر بات صرف یہی ہے کہ میرا دل نہیں چاہا۔"

"چلو.... مان لیا...." چارلس نے سر ہلایا۔ "قصہ مختصر یہ کہ تم نے کنٹریکٹ واپس کر دیا لیکن تمہیں پھر بھی یہ یقین ہے کہ لیڈی کو ہلاک کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ تمہارا خیال ہے یہ پروگرام ملتوی نہیں ہوا؟"

"خیال نہیں.... بلکہ مجھے یقین ہے یہ پروگرام ملتوی نہیں ہوا۔ اسی لیے تو میں نے تمہارے سفارت خانے کو گمنام خط لکھ کر ٹِپ دینے کی کوشش کی تھی ورنہ مجھے اس زحمت کی کیا ضرورت تھی؟" سیوبک تیکھے لہجے میں بولا۔

"تم نے یہ زحمت کیوں اٹھائی؟" چارلس نے جاننا چاہا۔

"یونہی۔ میں نے سوچا اس عورت کو قتل نہیں ہونا چاہیے۔" سیوبک کندھے اچکا کر بولا۔ "میں نے اس سلسلے میں

تمہارے سفارت خانے کو ٹِپ دے کر اپنی زندگی اور اپنے کیریئر کے لیے بہت بڑا خطرہ مول لیا ہے کیونکہ جو لوگ میرے پاس کنٹریکٹ لے کر آئے تھے وہ اس بات کو ہرگز پسند نہیں کریں گے کہ ان کا منصوبہ ناکام ہو...... اور اگر منصوبہ ناکام ہوتا ہے تو سب سے پہلے ان کا شک مجھ پر جائے گا کیونکہ میرا انکار سننے کے بعد میرے ہی سامنے غیر ارادی طور پر ان میں سے ایک کے منہ سے نکل گیا تھا کہ 'پھر حمان سے بات کر لیتے ہیں' انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ انہیں اتنی بے صبری سے میرے سامنے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی لیکن میں انجان سا بنا رہا تھا جیسے میں نے یہ بات سنی ہی نہیں تھی۔"

"تمہارے تعاون کے لیے میں واقعی تہِ دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔" چارلس حقیقی ممنونیت سے بولا۔ "میں تم سے پوچھنے ہی والا تھا کہ تمہارے بعد کنٹریکٹ کس کے پاس گیا ہوگا؟ میں ابھی اس سوال کے لیے مناسب الفاظ ہی تلاش کر رہا تھا۔ مجھے زیادہ امید نہیں تھی کہ یہ بات تمہیں معلوم ہوگی.... اور اگر معلوم ہوگی تو تم مجھے بتانا پسند کرو گے یا نہیں؟ اچھا ہوا تم نے پوچھے بغیر ہی بتا دیا۔"

"جب میں نے تمہارے سفارت خانے کو خط لکھنے کی حماقت کر ہی ڈالی اور تم لوگوں کو معلوم ہو ہی گیا کہ خط میں نے لکھا تھا تو اب کوئی بھی بات چھپانے کا کوئی خاص فائدہ نہیں۔" سیوبک قدرے بے پروائی سے بولا۔

"اب تم خاصی سمجھ داری سے بات کر رہے ہو۔" چارلس کے لہجے میں اب اچھی خاصی محبت جھلکنے لگی تھی۔ "لیکن تم ہمارے سفارت خانے کو خط لکھنے کو حماقت مت قرار دو۔ میرے خیال میں تو تم نے زندگی میں پہلی بار ایک ڈھنگ کا کام کیا ہے۔ تم ہماری حکومت کی گڈ بکس میں آ گئے ہو۔"

چارلس نے گویا سیوبک کو خوشخبری سنائی تھی لیکن وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ "مجھے تمہاری حکومت کی گڈ بکس میں آ کر کیا ملے گا؟ میری حیثیت تو تبدیل نہیں ہو جائے گی۔ تمہارے ملک سمیت جن ملکوں کی خفیہ ایجنسیوں کے پاس میرا تھوڑا بہت ریکارڈ موجود ہے وہ تو جوں کا توں رہے گا۔ اس میں تو کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔"

"شاید۔" چارلس مبہم لہجے میں بولا۔ "لیکن ہم کم از کم یہ کوشش ضرور کریں گے کہ کنٹریکٹ واپس کرنے سے تمہارا جو نقصان ہوا ہے اس کی کچھ نہ کچھ تلافی ہو جائے۔"

چارلس کی دانست میں شاید یہ بھی سیوبک کے لیے ایک خوشخبری تھی لیکن سیوبک نے اس پر بھی کسی ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا۔ کم از کم خوشی تو ہرگز ظاہر نہیں کی۔ وہ منہ بناتے ہوئے بولا۔ "میں نے کنٹریکٹ واپس کر کے اور تمہاری حکومت کو ٹِپ آف کر کے اس سے زیادہ خطرہ مول لیا ہے جتنا مجھے کنٹریکٹ قبول کرنے کی صورت میں لاحق ہوتا۔ ظاہر ہے جو لوگ اس قسم کے کنٹریکٹ لے کر آتے ہیں وہ بھی معمولی لوگ نہیں ہوتے۔ ان کے پیچھے بھی کچھ طاقتیں کام کر رہی ہوتی ہیں۔"

"تم اس کی پروا مت کرو۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔" چارلس نے گویا اسے تسلی دی۔

"مجھے معلوم ہے۔ اسی اعتماد کے ساتھ تو میں زندہ ہوں۔" وہ ایک خاص قسم کی بے نیازانہ خود اعتمادی کے ساتھ بولا۔ مجھے اس کے انداز میں کسی حد تک تکبر کی جھلک بھی محسوس ہوئی۔ "مجھے خیر و عافیت کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے تمہاری حکومت کی مدد کی ضرورت نہیں۔"

"میں تمہیں مدد کی پیشکش کر بھی نہیں رہا۔" چارلس نے فوراً گویا اس کی خوش فہمی دور کی۔ "میں تو ویسے ہی تمہارے سابقہ ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے ایک اندازہ ظاہر کر رہا تھا۔ اچھا..... یہ بتاؤ..... تمہارے خیال میں کنٹریکٹ اب حمان ہی کے پاس ہے؟"

"مجھے کچھ ایسی ہی خبریں ملی ہیں۔ اور میرا خیال ہے وہ درست ہیں۔" سیوبک نے جواب دیا۔ "اب وہی لیڈی ڈائنا کو قتل کرنے کی کوشش کرے گا اور اس بات کا بہت زیادہ امکان ہے کہ وہ کامیاب ہو جائے۔ اس نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں چار چھ کنٹریکٹ ہی کیے ہیں اور سنا ہے وہ کسی میں ناکام نہیں رہا۔"

"اگر وہ لیڈی ڈائنا کو قتل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ ہمارے لیے بڑی شرم کا مقام ہوگا۔" چارلس بولا۔ "تم اسے روکنے میں ہماری کیا مدد کر سکتے ہو؟"

"میں.....؟" سیوبک نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔ "میں ایک اکیلا حقیر سا آدمی بھلا تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں؟"

"زیادہ کسرِ نفسی سے کام مت لو۔ ہمیں معلوم ہے تم کتنے حقیر ہو۔" چارلس بولا۔

"میری صلاحیتیں اور میری "خطرناکی" اپنی جگہ سہی.... لیکن فرد بہرحال فرد ہی ہوتا ہے اور حکومتیں بہرحال حکومتیں ہی ہوتی ہیں۔ تم ایک حکومت کے نمائندے ہو۔ حکومت بھی معمولی نہیں..... بلکہ ایسی حکومت جو کبھی تقریباً پوری دنیا پر قابض رہی ہے۔ جس کی حدود میں کبھی سورج ہی غروب نہیں ہوتا تھا۔" سیوبک خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"پرانی باتیں مت کرو۔ آج کے دور میں رہ کر بات کرو۔" چارلس ملائمت سے بولا۔

"آج بھی تمہارے ملک کا شمار سپر پاورز میں ہے۔ تمہارے پاس پولیس ہے..... ملٹری انٹیلی جنس ہے.... اسکاٹ لینڈ یارڈ ہے.... اسپیشل سیکرٹ سروس ہے۔ میرے تعاون کی تمہیں بھلا کیا ضرورت ہے؟"

"ہم اپنے سارے محکموں کو تو اٹھا کر یہاں نہیں لا سکتے۔ کسی

اہم شخصیت کے دورے کے موقع پر زیادہ سے زیادہ دو چار خاص خاص آدمی آجاتے ہیں۔ زیادہ تر تو میزبان ملک کے انتظامات پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے۔ ویسے بھی ہم شور شرابا نہیں چاہتے۔ اس سے بدنامی ہوتی ہے' اسکینڈل بنتے ہیں۔ پریس عجیب عجیب افسانے تراشنے لگتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو اور خطرہ بھی ٹل جائے۔ بس چند افراد اس معاملے سے آگاہ ہوں۔ اصل میں وہی اس معاملے کو سنبھالیں۔ باقی سب روایتی انتظامات معمول کے مطابق نظر آئیں۔ اس لیے میں تم سے مدد کی درخواست کر رہا ہوں۔"

"میں جو مدد کر سکتا تھا وہ میں نے کردی ہے۔ یعنی تمہارے سفارت خانے کو خط لکھ کر خبردار کر دیا ہے۔" سیوبک بولا۔

"وہ مدد تو اپنی جگہ ہے اور اس کے لیے ہم تمہارے جتنے شکر گزار ہیں اس کا اندازہ تمہیں جلد ہی ہو جائے گا لیکن اس کے علاوہ بھی تم ہماری خاصی مدد کر سکتے ہو۔" چارلس نے اصرار کیا۔

"میں تمہارے ساتھ استنبول نہیں جا سکتا۔" سیوبک بولا۔ "میں کبھی کسی ایسے پروگرام کے مطابق اس گاؤں سے باہر نہیں جاتا جس کا دوسروں کو علم ہو۔"

"ٹھیک ہے۔ تمہاری احتیاط پسندی میں ہی تمہاری بقا ہے۔ ورنہ اب تک تم مارے جا چکے ہوتے یا کسی حکومت کے ہتھے چڑھ چکے ہوتے لیکن فی الحال تم باہر بھی محفوظ ہو۔ یہ تو تمہارا اپنا گاؤں ہے اور تمہارے پیچھے ایک خطرناک جنگجو قبیلہ ہے۔ یقیناً یہاں تم اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس کرتے ہوگے لیکن میرے ساتھ چلتے وقت بھی تمہیں اندیشوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ میں اپنی مدد کے لیے تمہیں ساتھ لے جاؤں گا اور اس وعدے کے ساتھ لے جاؤں گا کہ کوئی حکومت تم پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش نہیں کرے گی۔ ویسے بھی کسی حکومت کو تم پر ہاتھ ڈالنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ تمہارے خلاف کہیں بھی کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ورنہ شاید اب تک تم پر ہاتھ ڈالا جا چکا ہوتا۔"

سیوبک کسی سوچ میں گم دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد چارلس بولا۔ "کیا سوچ رہے ہو؟ تمہیں میرے وعدے پر اعتبار کرنا چاہیے اور اپنے اس قلعے سے نکلنا چاہیے۔"

"اگر انگریزوں کے وعدے قابلِ اعتبار ہوتے تو ایک زمانے میں وہ پوری دنیا پر قبضہ نہ کر پاتے۔" سیوبک مسکراتے ہوئے بولا۔

"طنز و مزاح کو چھوڑو پیارے! انگریز اب ایسی بے کردار قوم بھی نہیں ہے جیسی تم سمجھ رہے ہو۔ اس لمبی بحث میں مت الجھو۔ فی الحال کام کی بات کرو۔ تمہیں لیڈی ڈائنا کے دورے کے موقع پر استنبول میں میرے ساتھ رہنا ہوگا۔"

"اچھا..... ٹھیک ہے..... میں آجاؤں گا لیکن مجھے قبیلے میں کچھ خاص لوگوں کو اس سلسلے میں آگاہ کرنا ہوگا....." سیوبک گویا یکدم ہی فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولا۔ "تاکہ اگر میرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو جائے تو وہ اس کا کچھ توڑ کر سکیں۔"

"کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔" چارلس نے ایک بار پھر اسے اطمینان دلایا۔ "جس طرح تمہاری نظر میں زبان اور وعدے کی کوئی اہمیت ہے' اس طرح میری نظر میں بھی ہے۔ تمہارے علاوہ مسٹر افضل چوہدری بھی میرے ساتھ ہوں گے۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا۔ "روایتی انتظامات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تم دونوں کو ساتھ لے کر میں ایک طرح سے بالکل غیر روایتی انتظام کر رہا ہوں۔ اب تم مجھے حمان کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ میں نے خفیہ محکموں کی جو فائلیں دیکھی ہیں ان میں مجھے اس شخص کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ملیں۔"

"ملیں گی بھی نہیں۔" سیوبک بولا۔ "وہ ایک افسانوی سا کردار ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ میرے ہم پیشہ لوگوں میں سے بھی کسی نے کبھی اسے دیکھا نہیں ہے لیکن اس کے بارے میں بہت سی باتیں ہمارے حلقوں میں مشہور ہیں۔ وہ شاید نسلاً یہودی ہے اور اسرائیلی فوج میں خدمات انجام دے چکا ہے لیکن یہ بات تصدیق شدہ نہیں ہے۔ اس کے بارے میں یقینی طور پر جو باتیں معلوم ہیں وہ بھی میں تمہیں بتا دیتا ہوں....." وہ پہلو بدلتے ہوئے ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر بولا۔ "اس کے بارے میں ایک بات تو طے ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے شکار کو کسی دھماکا خیز چیز سے قتل کرتا ہے۔ موقع کی مناسبت سے کسی بھی قسم کا کوئی بم استعمال کرتا ہے۔ دنیا میں ہزار ہا قسم کے بم ایجاد ہو چکے ہیں اور وہ ان سب پر اتھارٹی معلوم ہوتا ہے۔ ان ایجادات سے جتنا فائدہ وہ اُٹھاتا ہے اتنا شاید ہی کوئی اُٹھاتا ہو....."

وہ ایک بار پھر کسی سوچ میں الجھ گیا۔ شاید کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر پُرخیال انداز میں اپنی مونچھ کو بل دیتے ہوئے بولا۔ "اس کے بارے میں دوسری اہم بات یہ محسوس کی گئی ہے کہ وہ بڑا زبردست حسابی کتابی آدمی ہے۔ اپنی واردات کی تفصیلات وہ بڑے حساب کتاب سے طے کرتا ہے۔ گویا کمپیوٹر سے مدد لے رہا ہو۔ اس کی واردات کا انداز بتاتا ہے کہ اگر اس کے شکار کو اس کے اندازے کے مطابق کسی خاص مقام پر پہنچنے میں دو چار سیکنڈ دیر ہو جاتی تو اس کی واردات ناکام بھی ہو سکتی تھی لیکن وہ اندازہ ہی کسی ایسی چیز کے بارے میں لگاتا ہے جس میں تاخیر کا امکان ہی نہیں ہوتا۔"

"حمان کا کوئی اتا پتا.....؟" چارلس نے دریافت کیا۔

سیوبک مربیانہ انداز میں مسکرایا۔ "وہ میری طرح جڑوں اور بنیادوں والا آدمی نہیں ہے۔ وہ تو محض ایک چھلاوہ اور سایہ ہے۔"

"پھر بھی..... آخر لوگ اس سے رابطہ تو کرتے ہوں گے۔ وہ کتنی بھی اونچی چیز سہی..... لیکن بہرحال ہے تو اُجرتی قاتل۔ وہ محض افسانوی کردار بن کر تو نہیں رہ سکتا۔ اسے کنٹریکٹ کی

ضرورت تو پڑتی ہوگی اور کچھ طاقتوں کو اس کی خدمات کی ضرورت پڑتی ہوگی۔ رابطے کا کوئی طریقہ تو ہوتا ہوگا۔"

"یقیناً ہے۔ ایک ٹیلیفون نمبر کے بارے میں سُنا ہے کہ اس پر کچھ اشاراتی سے انداز میں پیغام چھوڑا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہ پیغام "سٹرانچ" کے لیے ہے۔ یہ بھی سُنا ہے کہ اس ٹیلی فون نمبر کا تعلق ایک صیہونی تنظیم کے ریٹائرڈ سربراہ سے ہے۔ حمان کے بارے میں کچھ علم نہیں ہوتا کہ وہ کس وقت کس ملک میں ہے لیکن پیغام بہرحال اس تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد کچھ لوگ کسی ایجنسی کے سے خفیہ انداز میں پیغام دینے والوں کے بارے میں تحقیقات کرتے ہیں کہ کیا وہ اپنے مقصد میں سنجیدہ ہیں۔ پھر بڑے گھماؤ پھراؤ کے بعد حمان ان سے خود رابطہ کرتا ہے اور کہیں ملاقات طے پاتی ہے۔ اس کام میں کئی دن لگ جاتے ہیں۔ تمہارے پاس اب اتنا وقت نہیں ہے..... اور اگر وقت ہوتا تب بھی شاید حمان تم سے نہ ملتا۔ کنٹریکٹ طے ہو جانے کے بعد تو وہ یقیناً تم سے نہ ملتا کیونکہ اسے معلوم ہو جاتا تم ایک غیر روایتی قسم کے برطانوی ڈپلومیٹ ہو۔ وہ سمجھ جاتا کہ تمہاری ملاقات کا مقصد کیا ہو سکتا ہے۔"

سیوبک یہ تفصیل بتا کر خاموش ہو گیا۔ چارلس بھی خاموش تھا اور کسی گہری سوچ میں تھا۔ میں نے سیوبک کی گفتگو کا ایک ایک لفظ نہایت توجہ سے سنا تھا لیکن بظاہر میں اس کی طرف کچھ زیادہ متوجہ نہیں تھا البتہ کیتھرین پوری طرح اس کی طرف متوجہ نظر آرہی تھی۔ وہ بھی اس بات چیت میں پوری دلچسپی لے رہی تھی اور میرا اندازہ تھا کہ سیوبک اس کی شخصیت میں خاص دلچسپی لے رہا تھا۔ اتنے سنجیدہ موضوع پر بات کرتے کرتے بھی بار بار اس کی نظریں کیتھرین کے سراپا سے اُلجھنے لگتی تھیں اور ان کی گہرائی میں گویا کچھ چنگاریاں سی سُلگنے لگتی تھیں۔

اس دوران ہمارے سامنے قالین پر لمبا چوڑا دسترخوان بچھا کر کھانا سجایا جانے لگا تھا۔ گو کہ ہمیں وہاں آئے کافی دیر ہو چکی تھی اس کے باوجود میرا خیال تھا کہ اتنی دیر میں بکرے کے پیٹ میں چاول بھر کر اسے روسٹ نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس سے پہلے کی تیاریاں بھی خاصا وقت لیتی تھیں مگر بکرا دسترخوان پر آچکا تھا۔ شاید اس کی تیاریاں پہلے ہی سے جاری تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک ٹرے میں بڑی بڑی چمکتی دمکتی چھریاں بھی سجا دی گئی تھیں۔ کھانے کے دیگر لوازمات بھی چلے آرہے تھے۔ تقریباً پورا کمرا ہی مختلف ڈشوں اور برتنوں وغیرہ سے بھر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہاں کم از کم پندرہ افراد کے اعزاز میں نہایت پُرتکلف ضیافت ہونے والی تھی۔

سیوبک کے اصرار پر بالآخر ہم دو زانو ہو کر کھانے کے لیے بیٹھے تو اس قدر اہتمام دیکھ کر کیتھرین کو ہنسی آئے جا رہی تھی۔ بکرے کو تو چھونے کے لیے تیار ہی نہیں تھی لیکن سیوبک کے حد سے زیادہ اصرار پر جب اس نے بڑی سی چھری اُٹھائی تو اسے کچھ زیادہ ہی ہنسی آنے لگی۔ بکرا بڑی سی طشتری میں ایک اسٹینڈ پر اس طرح رکھا تھا کہ اس کی چاروں ادھ کٹی ٹانگیں چھت کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"آخر تمہیں اتنی ہنسی کیوں آرہی ہے؟" سیوبک گہری سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے یہ سب کچھ فلمی منظر لگ رہا ہے۔" وہ ہنسی ضبط کرتے ہوئے بولی "مجھے کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے ہم سب اداکار ہیں اور کسی تاریخی قسم کی فلم کا سین شوٹ کرا رہے ہیں۔ پیٹ بھرنا تو بڑا سادہ سا عمل ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا لوگ اتنے لمبے چوڑے چکروں میں کیوں پڑتے ہیں۔"

"یوں تو زندگی گزارنا ہی بڑا سادہ سا عمل ہے خاتون!" سیوبک مربیانہ انداز میں بولا۔ "لیکن دنیا کے ننانوے فیصد لوگ بے شمار بکھیڑوں میں اُلجھے نظر آتے ہیں۔"

کیتھرین کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ خاموشی سے چھری سے بکرے کی ران سے گوشت کا ایک ٹکڑا اتارنے لگی۔ سیوبک بولا "زندگی اسی رنگا رنگی کا نام ہے۔ جو جس طرح زندگی گزار رہا ہے' گزارنے دو۔ ہر ایک کا اپنا ایک لائف اسٹائل ہے اور اسی سے دنیا دلچسپ نظر آتی ہے۔ اگر دنیا میں سب سیدھے سادے انداز میں زندگی گزارنے لگیں تو دنیا کیسی بے کیف نظر آنے لگے۔ اسکول' خانقاہ یا مدرسہ نظر آنے لگے۔"

اس کے بعد ہم خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔ چارلس بدستور سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے شاید سیوبک اور کیتھرین کی فلسفیانہ گفتگو بھی نہیں سُنی تھی۔ دفعتاً وہ سیوبک سے مخاطب ہوا۔ "میں ان تمام انتظامات کا جائزہ لے چکا ہوں جو لیڈی ڈائنا کے دورے کے سلسلے میں کیے جا رہے ہیں۔ مجھے ان کے درمیان کہیں کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ لیڈی پر کوئی قاتلانہ حملہ ہو سکتا ہے۔ سیکیورٹی کے سلسلے میں جو لوگ لیڈی کے قریب رہیں گے ان کا بھی مختصر ریکارڈ میں نے دیکھا ہے۔ سب پرانے لوگ ہیں۔ کوئی بکنے والا نہیں لگتا۔"

"اس دنیا میں کسی کے بکنے نہ بکنے کے بارے میں تمہیں کوئی بات وثوق سے نہیں کہنی چاہیے۔" سیوبک نے گویا اسے نصیحت کی۔ "سربراہانِ مملکت کے خصوصی باڈی گارڈز تک بک جاتے ہیں جنہیں برسوں کی چھان بین کے بعد رکھا جاتا ہے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "ویسے تمہیں کہاں سے حملے کا امکان نظر آتا ہے؟"

"میرے خیال میں کوشش اندر سے نہیں' باہر سے ہو سکتی ہے۔" چارلس بولا۔ "یعنی لیڈی کے گرد جو حفاظتی حلقہ ہوگا اس میں کچھ نہیں ہوگا۔ باہر سے کچھ ہوگا۔ حمان کا جو نقشہ تم نے کھینچا ہے اس سے مجھے لگتا ہے کہ وہ لیڈی کی آمد کے وقت ہی کچھ کرنے

کی کوشش کرے گا۔ ائرپورٹ سے لے کر صدارتی محل تک کے راستے میں کچھ کرنا کسی حد تک آسان ہوگا۔ اس سڑک پر ایک جگہ تعمیراتی کام ہو رہا ہے۔ سرتوڑ کوشش کی جارہی ہے کہ لیڈی کے دورے سے پہلے پہلے وہاں کام مکمل کرلیا جائے۔ اگر مکمل نہ ہوسکا تب بھی اس دن وہاں کام بند کردیا جائے گا جس روز لیڈی ڈائنا آرہی ہوں گی۔ اس مقام پر فی الحال سڑک بھی تنگ ہے۔ وہ جگہ میری نظر میں کھٹک رہی ہے لیکن میں نے سیکیورٹی والوں کو وہاں خصوصی توجہ دینے کی ہدایت کردی ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میں اس جگہ کا معائنہ کیے بغیر بھلا کیا رائے دے سکتا ہوں۔" سیوبک بولا۔ "میں تمہارے ساتھ استنبول چلوں گا اور ان تمام انتظامات کا جائزہ لوں گا۔ اس کے بعد ہی میں کچھ کہہ سکوں گا کہ کہاں کیا کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" چارلس بولا۔ "تم ہمارے ساتھ ہی استنبول چلنا۔"

اس کے بعد ہم خاموشی سے کھانا کھانے لگے۔

○☆○

سیوبک ہمارے ساتھ ہی استنبول آیا تھا اور برطانوی سفیر کے گھر میں ہی مہمان ٹھہرا تھا۔ اسی کی موجودگی میں اس رات پہلی بار میری بھی برطانوی سفیر سے ملاقات ہوئی۔ چارلس نے اسے تمام صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ سیوبک سے ملتے وقت برطانوی سفیر کے انداز میں کچھ زیادہ گرمجوشی نہیں تھی۔ شاید اسے یہ صورتِ حال کچھ پسند نہیں آئی تھی کہ ایک اُجرتی قاتل کے متوقع حملے سے بچنے کے لیے دوسرے اُجرتی قاتل کی خدمات حاصل کی جارہی تھیں اور اسے اپنے تمام سیکیورٹی کے انتظامات میں جھانکنے کا موقع دیا جارہا تھا۔ تاہم سفیر نے اپنی ناپسندیدگی کا واضح طور پر اظہار نہیں ہونے دیا۔ اس کے رویّے سے مجھے اندازہ ہوا کہ برطانوی حکومت کی نظر میں واقعی چارلس کی بڑی اہمیت تھی۔ چارلس کے کسی بھی فیصلے کے سامنے سفیر بھی کچھ نہیں بول رہا تھا۔

سیوبک ہمارے ساتھ استنبول پہنچا تو اس سیوبک سے قطعی مختلف نظر آرہا تھا جسے ہم نے اس کے گاؤں میں دیکھا تھا۔ وہ جدید فیشن کے سیاہ سوٹ میں تھا۔ سر پر سیاہ رنگ کا ہی فیلٹ ہیٹ تھا۔ ہاتھ میں بریف کیس اٹھائے ہوئے تھا۔ پہلی نظر میں وہ کوئی معزز بزنس مین یا کسی بڑی کمپنی کا ایگزیکٹو دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کی شخصیت میں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اسے ایک مشکوک انسان ظاہر کرتی تھی۔ شاید اعمال کے مطابق ہر انسان کی شخصیت میں کوئی نہ کوئی تاثر ضرور پیدا ہوجاتا ہے لیکن شاید ہر آنکھ اسے محسوس کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی اور ظاہری روپ سے دھوکا کھاجاتی ہے۔

اس روز تو ہم آرام کرنے کے سوا کچھ نہ کرسکے کیونکہ رات

گئے واپس پہنچے تھے۔ دوسرے دن چارلس نے ہم تینوں کو یعنی مجھے سیوبک اور کیتھرین کو سیکیورٹی کے انتظامات سے آگاہ کرنا شروع کیا پھر اہم افراد سے ملایا جو مختلف محکموں سے تعلق رکھتے تھے اور سیکیورٹی کے انتظامات کو کنٹرول کررہے تھے۔

صرف سیوبک نے ان سے چند سوالات کیے۔ میں اور کیتھرین خاموش ہی رہے۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں صرف چارلس کے اصرار پر ساتھ گھسٹتا پھر رہا تھا ورنہ میں اس معاملے میں خود کو قطعی غیر متعلق سا محسوس کررہا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی مجھے اس طرح کے کسی معاملے میں حصہ لینا پڑے گا۔ مجھے اس قسم کے معاملات کا کوئی تجربہ بھی نہیں تھا۔ میں تو بس ایک خاموش تماشائی کی طرح ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں چارلس مجھے اہمیت دیے جارہا تھا اور اکثر پہلوؤں پر مجھ سے رائے طلب کررہا تھا۔ میں محض کامن سینس کی بنیاد پر مختصر جواب دینے کی کوشش کررہا تھا۔ ہمارے پاس جائزہ وغیرہ لینے کے لیے وہی ایک دن تھا۔ اس سے اگلے روز لیڈی ڈائنا کو آنا تھا۔

آخر کار ہم ائرپورٹ سے ایوانِ صدر تک جانے والی سڑک کا جائزہ لینے کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم اسی سیاہ مرسیڈیز میں تھے جس میں سیوبک کے گاؤں گئے تھے۔ ہمارے پیچھے گہرے نیلے رنگ کی ایک اور بڑی سی گاڑی میں استنبول کا پولیس کمشنر اور ٹرکش انٹیلی جنس کا ایک آفیسر موجود تھا۔ وہ لوگ ضرورت پڑنے پر ہمیں سیکیورٹی کے انتظامات کے بارے میں کسی بھی قسم کی معلومات مہیا

سکتے تھے۔

ائرپورٹ پر ارائیول لاؤنج کا جو حصہ انتہائی اہم شخصیات کے مخصوص تھا وہاں سے باہر آنے کے لیے ایک سرنگ نما راستہ تا تھا جس میں سے گزر کر کوئی بھی وی آئی پی اس گاڑی تک تا تھا جو اس کے لیے مخصوص ہوتی تھی۔ اس سرنگ نما راستے دن جیسی روشنی رہتی تھی اور جب تک کسی وی آئی پی کی آمد نع نہیں ہوتی تھی تب تک وہ بند رہتا تھا۔ اس کے دونوں سروں وی آئی پی لاؤنج اور خارجی راستے پر اسٹیل کے مضبوط وازے تھے۔ جب یہ راستہ بند ہوتا تھا تب بھی اس کی نگرانی ی رہتی تھی۔

سیوبک نے اس راستے کا بھی ایک سرے سے دوسرے ے تک نہایت باریک بینی سے معائنہ کیا اور اسے تسلی بخش ار دے دیا۔ وہ نہ جانے کیوں اپنے اس نظریے پر مصر تھا کہ لیڈی ئنا پر اگر حملہ ہوا تو اس کی آمد سے لے کر صدارتی محل تک پہنچنے پھر وہاں سے اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس تک پہنچنے کے دوران ہوگا۔ اگر ں دوران کچھ نہ ہوسکا تو پھر لیڈی کے باقی تین دن کے قیام اور صروفیات میں اس کی ذات کو کوئی خاص خطرہ نہیں ہوگا حالانکہ یرے خیال میں ان مصروفیات کے دوران بھی کسی قاتل کو اپنا کام کھانے کے لیے کافی مواقع میسر تھے۔

ائرپورٹ سے ہم لوگ خاصی سست رفتاری سے ایوانِ صدر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں سیوبک کچھ نہیں بولا۔ بس خاموشی سے دونوں طرف کی عمارات اور خالی جگہوں کا گہری نظر سے جائزہ لیتا رہا۔ یہ کہنا بہت مشکل تھا کہ کس عمارت میں کس جگہ کوئی قاتل گھات لگا کر بیٹھ سکتا تھا۔ گو کہ وہ ایک چوڑی شاہراہ تھی اور دونوں طرف جتنی بھی اونچی عمارتیں موجود تھیں وہ سڑک سے کافی ہٹ کر تھیں۔

ان عمارتوں میں کئی ایسی جگہیں نظر آرہی تھیں جہاں کوئی قاتل ٹیلی اسکوپ اور دور مار رائفل لے کر گھات لگا کر بیٹھ سکتا تھا لیکن انٹیلی جنس والوں نے ہمیں بتایا تھا کہ ایسی بیشتر جگہوں کی نگرانی کی جارہی ہے۔

سیوبک اس پہلو کو اہمیت دینے کے لیے ہی تیار نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ حمان اس طرح دور مار رائفل لے کر گھات لگا کر بیٹھنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس میں کامیابی کا امکان بہت کم تھا کیونکہ لیڈی ڈائنا کو کسی کھلی گاڑی میں نہیں بلکہ تاریک شیشوں والی بند گاڑی میں سفر کرنا تھا۔ تاریک شیشوں والی ایسی گاڑی جو تیز رفتاری سے جارہی ہو اور جس میں چار پانچ افراد موجود ہوں، کسی ایک مخصوص انسان کو نشانہ بنانا تقریباً ناممکن تھا جبکہ حمان اوچھا وار کرنے والا قاتل نہیں تھا اور اس کے طریقۂ واردات میں رائفل بندوق کا عمل دخل بھی کم ہی ہوتا تھا۔ اس لیے سیوبک کسی اور ہی زاویۂ نظر سے سڑک کے دونوں اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ ٹرکش پولیس اور انٹیلی جنس والے بھی بہرحال بے وقوف نہیں تھے۔ وہ بھی ہر امکان کا جائزہ لے چکے تھے۔ راستے میں سیوبک کے ذہن میں جو بھی سوال اُبھرا اس نے چارلس سے اس کا جواب مانگا۔ اوّل تو چارلس خود ہی اتنا "ہوم ورک" کرچکا تھا کہ وہ بیشتر سوالوں کے جواب دے سکتا تھا لیکن اگر کوئی بات اسے معلوم نہیں ہوتی تھی تو وہ موبائل فون پر پیچھے گاڑی میں آنے والے آفیسرز سے پوچھتا تھا اور چلتے چلتے ہی اس کا جواب مل جاتا تھا۔

ایوانِ صدر اور اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس وغیرہ کا چکر لگا کر ہم احتیاطاً پرائم منسٹر ہاؤس تک بھی ہو آئے۔ لیڈی ڈائنا کو پروٹوکول کے مطابق وہاں تک بھی لے جایا جانا تھا۔ بالآخر ہم اسی سڑک پر دوسری لین سے واپس روانہ ہوئے اور وہاں آن رکے جہاں ایک فلائی اوور کی تعمیر کا کام زور و شور سے جاری تھا۔

سیوبک نے گاڑی ایک طرف محفوظ جگہ پر رکوائی اور گہری سانس لے کر چارلس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں تمہارے خیال سے متفق ہوں۔ یہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں قاتل کے گھات لگانے کا سب سے زیادہ امکان ہے۔"

چارلس نے قدرے فاتحانہ سی نظروں سے میری اور کیتھرین کی طرف دیکھا گویا کہہ رہا ہو 'آخر میرا بھی کچھ تجربہ ہے۔'

توڑ پھوڑ کی وجہ سے وہاں سڑک خاصی تنگ ہوچکی تھی۔ کہیں کھدائی ہوچکی تھی۔ کہیں بڑے بڑے مضبوط پلر سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ کہیں مٹی پھیلی ہوئی تھی۔ دور دور تک انواع و اقسام کی مشینری بکھری نظر آرہی تھی۔ پچاسوں افراد وہاں تندہی سے کام میں مصروف تھے۔ جو کمپنی فلائی اوور تعمیر کررہی تھی، ایک طرف اس کا سائٹ آفس بھی نظر آرہا تھا۔ پہلے سے موجود اونچی نیچی عمارتیں بھی پس منظر میں دکھائی دے رہی تھیں۔

چارلس بولا "کل یہاں کوئی کام نہیں ہو رہا ہوگا۔ دور دور تک صفائی ہوچکی ہوگی اور کوئی بھی مزدور، کارکن یا کمپنی کا کوئی بھی آدمی یہاں موجود نہیں ہوگا۔ ان کی جگہ چپے چپے پر پولیس تعینات ہوگی۔ وہ اس وقت انٹیلی جنس والوں کے تحت کام کررہے ہوں گے۔"

"وہ سب تو ٹھیک ہے.... لیکن ہم چاروں کو اپنی توجہ یہیں رکھنی چاہیے اور یہیں کہیں آس پاس ہی موجود رہنا چاہیے۔ باقی جگہیں سیکیورٹی والوں ہی کو سنبھالنے دو۔" سیوبک چاروں طرف کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ میں بھی وہاں کی ہر چیز کو بغور دیکھ رہا تھا اور گویا زندگی کا ایک نیا تجربہ حاصل کررہا تھا۔

چارلس میری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "تمہارا کیا خیال ہے افضل؟"

"میرے خیال میں سیوبک ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ سیوبک نے محض سرسری نظر سے میری طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ پھر وہ چارلس سے مخاطب ہوا۔ "ہمیں

کسی عمارت میں بلندی پر موجود رہنا چاہیے جہاں سے ہم چاروں طرف نظر رکھ سکیں بلکہ ہم میں سے دو افراد سڑک کے ایک طرف ہوں اور دو دوسری طرف ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔ ہمارے پاس دور مار رائفلیں بھی ہونی چاہئیں اور جدید واکی ٹاکی بھی۔ جن پر ہمارا چاروں کا بیک وقت ایک دوسرے سے رابطہ رہ سکے اور ہم پولیس کو بھی ہدایات دے سکیں۔"

"ٹھیک ہے' میں یہ سب انتظامات کرادوں گا۔" چارلس بلا تامل بولا۔ "لیکن میری سمجھ میں نہیں آرہا حمان کس سمت سے اور کس طرح حملہ کرے گا۔ وہ لانچر کے ذریعے راکٹ تو فائر کرنے سے رہا۔"

"اس سے یہ بھی بعید نہیں ہے۔" سیو بک بولا۔

"اس طرح تو وہ خود بھی بچ کر نہیں جاسکتا۔ کیا خطیر معاوضے کے لیے وہ جان بھی دے دے گا؟ اگر وہ زندہ ہی نہ رہا تو دولت اس کے کس کام کی؟" چارلس بولا۔

"اس بارے میں یقین سے کچھ مت کہو۔" سیو بک نے گویا مشورہ دیا۔ "وہ آج تک پکڑا نہیں جاسکا۔ اب تک کا ریکارڈ یہی بتاتا ہے کہ اپنا کام وہ خود ذاتی طور پر کرتا ہے' کسی پر بھروسا نہیں کرتا اور ہمیشہ جائے واردات کے آس پاس ہی کہیں موجود ہونے کے باوجود کبھی نہیں پکڑا جاسکا۔ چھلاوے کی طرح غائب ہوگیا۔ حمان محض ایک سائے کا نام ہے۔ فی الحال ہمیں بھی یہی فرض کرکے اپنا کام کرنا چاہیے۔"

"جیسے تم کہو گے ویسے انتظامات ہوجائیں گے۔" چارلس نے اسے یقین دلایا۔ "بس کوئی گڑبڑ نہیں ہونی چاہیے اور پریس کو ان معاملات کی بھنک نہیں پڑنی چاہیے ورنہ دنیا بھر کے اخبارات و رسائل اور ٹی وی چینلز کو ایک نیا موضوع مل جائے گا۔ بات کا بتنگڑ بن جائے گا۔ اس میں نئے نئے پہلو تلاش کرلیے جائیں گے۔ برطانوی حکومت اور شاہی خاندان کے لیے ایک نیا دردِ سر کھڑا ہوجائے گا۔"

"ہم سب مل کر کوشش کریں گے کہ ایسا نہ ہو۔" سیو بک کے لہجے میں خلوص تھا۔ "بہرحال ہمیں اس نکتے کو نہیں بھولنا چاہیے کہ حمان بموں کا اسپیشلسٹ ہے۔ وہ اپنے شکار کو ہمیشہ کسی نہ کسی قسم کے بم بلاسٹ کے ذریعے ہلاک کرتا ہے۔ اپنے گردوپیش پر نظر رکھتے وقت اس صورتِ حال کو ضرور ذہن میں رکھنا ہوگا۔"

سیو بک کی بتائی ہوئی یہ بات پہلے ہی سے میرے ذہن میں تھی۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ اس نے بتایا تھا حمان بڑا حسابی کتابی آدمی تھا۔ میں اس نقطۂ نظر سے بھی ہر چیز کو ذہن میں رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ گردوپیش کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد آخرکار ہم لوٹ آئے۔

شام کو میں اپنے کمرے میں تھا اور تازہ دم ہونے کے بعد بازار سے خریدا ہوا ایک نیا سوٹ زیب تن کیے ایک کرسی پر بیٹھا سوچ

رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ دفعتاً دروازے پر نہایت خفیف سی دستک ہوئی۔ کسی نے محض ایک انگلی سے' نہایت آہستگی سے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے میں نے محض احتیاطاً میجک آئی سے باہر جھانک کر دیکھ لیا۔ میرے خیال میں اس قسم کی رازدارانہ دستکیں زیادہ احتیاط کا تقاضا کرتی تھیں۔

میجک آئی سے جھانک کر میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ کیتھرین تھی۔ میں نے اس کے لیے دروازہ کھول دیا اور نہایت مؤدبانہ انداز میں ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ اس وقت چھریرے کیئر، فری قسم کے لباس میں تھی جو دیکھنے والوں کو اچھی بھلی آزمائش میں ڈال سکتا تھا۔ اس کی انگلیوں میں لمبی اور پتلی سی سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ میرے قریب سے گزرتے وقت اس نے شریر سے انداز میں میرے منہ پر دُھواں چھوڑا اور دھم سے بیڈ پر جاگری۔ میں باتکلف مہمانوں کی طرح ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"تمہیں معلوم ہے سیو بک آج شام میرے ساتھ ڈیٹ پر جانے کی فکر میں تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے پاپا کے ساتھ دھکا دیا ہے۔" اس نے گویا مجھے اطلاع دی۔

"تمہیں چلے جانا چاہیے تھا۔ اس میں کیا حرج تھا۔" میں نے نہایت ملائمت سے کہا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو؟" اس نے مجھے گھورا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور سادگی سے کہا۔ "ہاں... میرا خیال ہے میں ہی کہہ رہا ہوں۔ کمرے میں اور تو کوئی موجود نہیں ہے۔"

"تم بڑے ہی خبیث آدمی ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "کاش تم میرے لیے رقابت میں جتلا ہوسکتے!"

"تمہیں معلوم ہی ہے آج کل میرے حالات ٹھیک نہیں

ہیں۔ موقع محل دیکھ کر شاید کبھی شغل کے طور پر ہی رقابت میں جتلا ہوجاؤں لیکن فی الحال مجھ غریب کو ان چکروں میں پھنسانے کی کوشش مت کرو۔ پہلے چکر ہی ختم نہیں ہورہے۔"

وہ سگریٹ کا کش لیتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے سمجھانے والے انداز میں ایک بار پھر کہا۔ "تمہیں محترم سیو بک کے ساتھ چلے جانا چاہیے تھا۔ آخر وہ ایک عظیم شخصیت ہے۔ اس میں خرابی بس یہی ہے کہ تھوڑا سا شادی شدہ واقع ہوا ہے لیکن تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ میں تم سے سنجیدگی سے بات کررہی ہوں۔" وہ واقعی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ "پاپا اپنی دانست میں اس شخص کو شیشے میں اُتار کر ساتھ ساتھ لیے پھر رہے ہیں لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہہ رہا ہے کہ یہ شخص ہمارے لیے بڑی پریشانی کا باعث بنے گا۔ آخر وہ ہے تو اُجرتی قاتل....."

"اب کیا کیا جائے۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔ "مجھے تو لگ رہا ہے دنیا میں اُجرتی قاتلوں کی تعداد بہت ہی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ ان کے مقام' مرتبے اور واردات کے طریقے مختلف ہیں لیکن بنیادی طور پر وہ سب اُجرتی قاتل ہیں۔ لگتا ہے جلد ہی وہ وقت آجائے گا جب انہیں مقتول دستیاب نہیں ہوں گے۔ پھر اُجرتی قاتل ایک دوسرے کو ہی قتل کریں گے۔"

"فضول باتیں مت کرو۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی۔ "میں یہ کہہ رہی تھی..... تم نے اس شخص کی طرف غور سے دیکھا ہے؟ اس کی آنکھوں میں سانپ کی آنکھوں جیسی چمک ہے۔"

"ممکن ہے وہ سانپوں کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "یا پھر سالم سانپوں کا سوپ پیتا رہا ہو۔"

کیتھرین ایک ٹک مجھے گھورنے لگی پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "تمہارے اندر یہی بڑی خرابی ہے کہ جب تمہیں سنجیدہ ہونا چاہیے اس وقت تمہیں کامیڈی کا شوق چرانے لگتا ہے اور جب تمہیں ہنسنا کھیلنا چاہیے اس وقت گوتم بدھ بن کر بیٹھ جاتے ہو۔"

"یہ تم کہہ رہی ہو؟" میں نے کراہ کر کہا۔ "میں کوئی کامیڈین ہوں جو کامیڈی کروں گا؟ میرے خیال میں تو ہر موقع ہی نہایت سنجیدگی کا ہوتا ہے اور میں نہایت سنجیدہ و مدبر آدمی ہوں۔"

"واقعی۔" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر اثبات میں سر ہلایا۔ "دل تو چاہ رہا ہے اسی سنجیدگی سے تمہاری اس تیکھی ناک پر کراٹے کا ایک ہاتھ رسید کرکے اسے ہمیشہ کے لیے چپٹی کردوں لیکن کیا کروں تمہیں استاد تسلیم کرچکی ہوں اور استاد پر ہاتھ نہیں اُٹھانا چاہیے۔"

"اور اگر میری طرف سے اجازت ہو؟" میں نے کہا۔

"تب بھی مجھے اپنی جان عزیز رہے گی۔" وہ مسکرائی پھر وہ سیدھی ہوکر بیٹھتے ہوئے تکیہ گود میں رکھ کر بولی۔ "دیکھو..... خدا کے لیے سنجیدگی سے بات کرو..... کیا تمہیں واقعی اُمید ہے کہ سیو بک لیڈی ڈائنا والے معاملے میں ہماری مدد کررہا ہے؟ کہیں وہ خواہ مخواہ ہماری توجہ بٹاتا تو نہیں پھر رہا؟"

"بھاڑ میں جائے سیو بک اور لیڈی ڈائنا۔ مجھے ان دونوں سے بلکہ تمہارے پورے برطانیہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

"خدا کی پناہ!" اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ "اس طرح تو مت کہو۔ کم از کم لیڈی ڈائنا کے بارے میں تو مت کہو۔ وہ ہمارے ملک کی ہونے والی ملکہ ہے۔"

"ہوگی۔" میں نے بے نیازی سے کندھے اُچکائے۔ "میں تو اس دن کا منتظر ہوں جب دنیا میں ہر لڑکی شہزادیوں کی طرح اہم ہوگی اور ہر عورت کی اسی طرح حفاظت ہوگی جس طرح کسی ملکہ کی ہوتی ہے یا پھر شہزادیاں اور ملکائیں بھی اسی طرح پھرا کریں گی جس طرح عام لڑکیاں اور عورتیں پھرتی ہیں۔ تم خود ہی سوچو' یہ کوئی انصاف تو نہیں ہے ایک عورت کی حفاظت کے لیے زمین آسمان ایک کیے جارہے ہیں۔ دوسری طرف وہ پھول سی بچیاں ہوتی ہیں جنہیں درندے اٹھا کرلے جاتے ہیں اور بہیمانہ طریقے سے مسل کر پھینک دیتے ہیں۔ مزید ظلم یہ کہ وہ کبھی پکڑے بھی نہیں جاتے۔"

"اوہ میرے خدا.....!" کیتھرین نے پیشانی پر ہاتھ مارا۔ "تم بھی اس احمقانہ انقلاب کی آرزو میں گرفتار ہو۔ یہ جس کسی کا بھی خواب ہے' بالکل غلط ہے اور کبھی پورا نہیں ہوگا۔ خدا نے سب انسانوں کو برابر پیدا نہیں کیا لہٰذا کوئی اور انہیں کس طرح برابر لاسکتا ہے۔ اس بکواس کو چھوڑو اور سیو بک کے بارے میں سوچو۔"

"میں آج کل تم جیسی حسین اور مہربان لڑکی کے بارے میں نہیں سوچ پارہا۔ تم مجھے اس بدبخت کے بارے میں سوچنے کے لیے کہہ رہی ہو۔ مجھ پر اتنا ظلم مت کرو۔" میں نے کراہ کر کہا۔

"آج صبح تو تم لیڈی ڈائنا کے دورے میں اور باقی سب باتوں میں بڑی دلچسپی لیتے پھر رہے تھے۔" وہ حیرت سے بولی۔

"میں صرف پھر رہا تھا۔ دلچسپی لینا اور بات ہوتی ہے۔" میں نے تصحیح کی۔ "یوں تو میں کل بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گا اور مجھ سے جو مدد ہوسکی وہ بھی کروں گا۔ لیڈی ڈائنا پر قاتلانہ حملے کی اگر واقعی کوئی کوشش ہوتی نظر آئی تو اسے بھی ناکام بنانے کی اپنی سی کوشش کروں گا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مجھے اس معاملے سے واقعی کوئی دلچسپی ہے۔ یہ بس ایسے ہی ہے جیسے انسان چلتے چلتے سرِراہ کسی کو گرتے دیکھ کر اٹھنے کے لیے سہارا دے دیتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ اسے اس کے گرنے کے اسباب سے' اس واقعے سے یا اس شخص کی ذات سے کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔"

"تم عجیب آدمی ہو۔" کیتھرین منہ بنا کر بولی۔

"بے شک۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر تم غور سے دیکھو تو تمہیں دنیا کا ہر انسان عجیب نظر آئے گا۔ زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت

عجیب ضرور نظر آئے گا۔"
"میرا خیال ہے سیوبک تم سے بھی زیادہ عجیب انسان ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔
"ممکن ہے تمہارا خیال درست ہو۔" میں نے تسلیم کیا۔
"اگر میں سُدھرنے کا عزم نہ کر چکی ہوتی تو ضرور اس کی ذات میں اتنی ہی دلچسپی لینے کی کوشش کرتی جتنی وہ میری ذات میں لے رہا ہے۔" وہ بولی۔
"کیا تم واقعی سُدھر چکی ہو؟" میں نے پوچھا۔
"تمہیں ابھی اس میں شک ہے کیا؟" اس نے مجھے گھورا۔
"بس.... ویسے ہی... یقین سا نہیں آتا۔ اچانک ہی ہوا ہے نا یہ حادثہ۔" میں نے سر جھٹک کر کہا۔
"انسان کی زندگی میں بڑے انقلابات اچانک ہی آتے ہیں۔"
"اور اگر یہ انقلاب نہ آیا ہوتا تو تم کیوں سیوبک کی ذات میں دلچسپی لیتیں؟" میں نے جاننا چاہا۔
"وہ دلچسپی قطعی غیر جذباتی اور کاروباری ہوتی۔" کیتھرین بولی۔ "وہ میرے لیے اور ان سینڈی کیٹس کے لیے، جن سے میرا تعلق رہا ہے بڑے کام کا آدمی ثابت ہو سکتا تھا۔"
"کوئی بعید نہیں وہ پہلے ہی کسی سینڈیکیٹ کا آدمی ہو اور وہ بھی تم میں اسی نقطۂ نظر سے دلچسپی لے رہا ہو۔ یہ دنیا کلدخانۂ عجائب ہے۔ یہاں کبھی کبھی سانپ، سانپ کو بھی کاٹ لیتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔
"اس میں تو خیر کوئی حرج نہیں۔ زہر کسی کو بھی نہیں چڑھتا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں محسوس کرتی ہوں سیوبک کی دلچسپی دوسری قسم کی ہے۔ تمہیں معلوم ہے عورت ان باتوں کو اچھی طرح محسوس کر سکتی ہے۔"
"ہاں... بلکہ میرا خیال ہے عورت انہی باتوں کو اچھی طرح محسوس کر سکتی ہے۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔
کیتھرین ایک لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر مایوسی سے ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "اس وقت تم خباثت پر اُترے ہوئے ہو۔ کوئی بھی بات سیدھی طرح نہیں کرو گے۔" پھر وہ جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ "اچھا، سنجیدگی سے صرف یہ بتا دو، صبح تو تم ہمارے ساتھ چلو گے نا؟"
"ہاں، وہ تو میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔
"پاپا بے چارے تم پر بہت تکیہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ تم نے آج کے پورے سروے کے دوران کچھ زیادہ زبان نہیں کھولی۔"
"انسان کو زبان کے بجائے ہاتھ پاؤں زیادہ چلانے چاہئیں۔" میں نے مدبّرانہ انداز میں کہا۔
"یہ بات بھی تم صرف زبان سے ہی کہہ رہے ہو۔ تمہاری عملی زندگی سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔"
"بہت غلط اندازہ لگا رہی ہو میرے بارے میں۔" میں نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ "کیا تمہیں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ جب ہاتھ پاؤں چلانے کا موقع ہوتا ہے تو پھر مجھ سے بہتر کارکردگی دکھانے والا ذرا مشکل سے ہی ملتا ہے۔"
"بڑی خوش فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں؟"
"اگر یہ خوش فہمی ہے تو تم نے مجھے استاد کیوں مان لیا ہے؟" میں نے فوراً پوچھا۔
"یونہی... محبت میں آکر۔" وہ کندھے اُچکا کر بولی۔
"میں ابھی تمہیں دو چار ہاتھ دکھا دیتا ہوں جس کے بعد تم اپنی محبت واپس لینے پر مجبور ہو جاؤ گی۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔
"بس.... بس۔" وہ ہاتھ سے مجھے رکنے کا اشارہ کر کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔"
میں نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ جو تم پاپا کے مجھ پر تکیہ کرنے کی بات کر رہی تھیں تو مجھے لگتا ہے تمہارے پاپا کو لوگوں پر تکیہ کرنے کی خاصی عادت ہے۔ وہ تو سیوبک پر بھی کافی تکیہ کر رہے ہیں۔"
"اسی لیے تو تمہیں زیادہ ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ میں تم سے یہی تو کہنے آئی تھی۔ تم اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔
"میں تو صرف تمہاری باتوں کے جواب دے رہا تھا۔ اپنی طرف سے تو میں نے کچھ بھی نہیں کہا۔" میں نے کہا۔
"بہرحال.... کل ہوشیار رہنا۔" وہ رخصت ہوتے ہوئے بولی۔

O☆O

دوسرے روز ہم لوگ ائرپورٹ سے آنے والی سڑک کے قریب واقع ایک عمارت کی چھت پر موجود تھے۔ اس روز اتوار تھا۔ ترکی میں ہفتہ وار تعطیل اتوار کو ہوتی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف بیشتر عمارات کاروباری تھیں اور چھٹی ہونے کی وجہ سے خالی تھیں کیونکہ تمام دفاتر بند تھے۔ جن عمارات میں کچھ لوگ موجود بھی تھے، ان سے بھی معذرت کر کے انہیں چار گھنٹے کے لیے نکال دیا گیا تھا۔ تمام عمارتوں کے دروازے بند کر دیے گئے تھے۔
سڑک پر برائے نام ٹریفک تھا۔ کچھ دیر بعد یہ بھی رک جانا تھا۔ لیڈی ڈائنا کی فلائٹ گیارہ بجے پہنچنا تھی جبکہ ہم ائرپورٹ سے چار میل کے فاصلے پر تھے اور ہم صبح آٹھ بجے ہی اس جگہ پہنچ گئے تھے جہاں فلائی اوور تعمیر ہو رہا تھا۔
ایک بار پھر نئے سرے سے اس حصے کا تفصیلی جائزہ لیا گیا تھا۔ کنسٹرکشن کمپنی والوں نے اپنی تمام مشینری سڑک سے پیچھے ہٹا دی تھی۔ دونوں طرف کی سڑکیں اچھی طرح صاف کر دی گئی تھیں۔ سڑک کے کنارے کنارے کافی دور تک کمپنی نے لہریے دار ٹین کی دیوار کھڑی کر دی تھی تاکہ کاٹھ کباڑ زیادہ بکھرا ہوا دکھائی نہ

۔ اس حصے میں دونوں طرف حدِ رفتار چالیس کلومیٹر فی گھنٹا کے
نصب تھے۔ رکاوٹوں اور توڑ پھوڑ سے خبردار کرنے کے لیے دن
ھی سُرخ بتیاں گھوم رہی تھیں۔
سڑک کے کنارے موجود تمام مشینری کو پولیس اور انٹیلی
کے ماہرین نے ایک بار پھر چیک کیا تھا۔ کہیں کوئی مشکوک چیز
پائی گئی تھی۔ اس روز سائٹ پر کمپنی کا کوئی آدمی موجود نہیں
ان کا سائٹ آفس بھی بند تھا۔ ان کی جگہ چپّے چپّے پر پولیس
انٹیلی جنس کے آدمی پھیلے ہوئے تھے۔
طے یہ پایا تھا کہ میں، چارلس، سیوبک اور کیتھرین ایک ہی
رت کی چھت پر رہیں گے تاکہ ہمارے درمیان بہتر رابطہ رہ سکے
ضرورت پڑنے پر ہم فوری طور پر کوئی کارروائی کر سکیں۔ واکی
یا ریڈیو پر ایک دوسرے کو پیغام دینے میں وقت ضائع نہ ہو ورنہ
شتہ روز یہی طے ہوا تھا کہ ہم میں سے دو افراد سڑک کے ایک
ف کسی عمارت پر رہیں گے اور دو افراد دوسری طرف کی کسی
رت پر۔ بعد میں ہم نے محسوس کیا کہ ہمیں اپنی تمام تر توجہ
پورٹ سے آنے والی سائڈ پر ہی رکھنی چاہیے تھی۔ اس لین پر
زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں تھی جدھر سے ٹریفک ائرپورٹ کی
رف جاتا تھا کیونکہ اس پر تو ٹریفک بند ہو جانے سے ہی ہمارا دردِ
سر ختم ہو جاتا تھا۔
ہم لوگ چھت کی چھوٹی سی منڈیر کے عقب میں چھپے ہوئے
تھے۔ ہمارے پاس ٹیلی اسکوپک سائٹ والی رائفلیں تھیں تاہم
چارلس کے پاس رائفل کے بجائے صرف دوربین ہی تھی۔ اس کی
زیادہ بڑی ذمے داری ریڈیو پر ائرپورٹ سے رابطہ رکھنا تھا جہاں
سے ہمیں پل پل کی خبر مل رہی تھی۔ لیڈی ڈائنا کا خصوصی طیارہ
ائرپورٹ پر لینڈ کر چکا تھا اور اس وقت وہ پریس وغیرہ کے نمائندوں
سے باتیں کر رہی تھی۔ ہر رپورٹر اور کیمرا مین کو بڑی سخت چیکنگ
کے بعد ایک ایک کر کے اندر جانے دیا گیا تھا۔ فوٹو گرافروں اور ٹی وی
والوں کے کیمرے تک چیک کیے گئے تھے۔ فلیش لائٹس تک
اچھی طرح دیکھی گئی تھیں کہ ان میں کوئی دھماکا خیز مادہ نہ چھپایا گیا
ہو۔ چارلس اردگرد بکھرے ہوئے پولیس اور انٹیلی جنس کے
اہلکاروں سے بھی اسی ریڈیو پر فریکوئنسی بدل کر فوری طور پر رابطہ
کر سکتا تھا۔
میں دوربین چاروں طرف گھماتے ہوئے ایک ایک چیز کا
جائزہ لے رہا تھا۔ ماحول نہایت پُرسکون تھا اور ہر چیز اس ماحول کا
ایک ضروری حصہ محسوس ہو رہی تھی۔ کسی چیز کو دیکھ کر کسی گڑبڑ کا
احساس نہیں ہو رہا تھا۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے یہ تمام انتظامات
بالکل فضول محسوس ہوئے۔ جب ہر چیز چیک کی جا چکی تھی۔ کہیں
کوئی مشکوک چیز کم از کم اس رینج میں موجود نہیں تھی جو سڑک سے
گزرنے والی کسی چیز کو نقصان پہنچا سکتی، سڑک پر ٹریفک بھی رک چکا تھا،

ہم لوگ رائفلیں لیے چھت پر گھات لگائے کس کا انتظار کر رہے تھے؟ حمان ہیلی کاپٹر کے ذریعے اوپر سے تو نہیں آسکتا تھا۔ اگر اس وقت کسی پیشگی اطلاع کے بغیر کوئی ہیلی کاپٹر فضا میں نمودار ہوتا تو کوئی پوچھ گچھ کیے بغیر بلا تردّد اسے گرا دیا جاتا۔
میں رائفل کی دوربین کے ذریعے لہریے دار ٹین کی چادروں سے بنائی گئی اس دیوار کو دیکھ رہا تھا جس کے عقب میں ملبہ اور تعمیراتی مشینری وغیرہ دکھائی دے رہی تھی۔ اس دیوار میں ٹین کی سب سے پہلی چادر پر سفید پینٹ تھا جبکہ باقی چادریں بغیر پینٹ کی تھیں۔ اگر سفید پینٹ والی اس چادر میں لہریے نہ ہوتے تو وہ سینما کی اسکرین معلوم ہوتی۔
کیتھرین مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ وہ رائفل گود میں رکھے منڈیر کے ایک چوکور سوراخ سے جھانک رہی تھی۔ وہ گردن میری طرف گھماتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولی۔ "تم اس وقت کیا محسوس کر رہے ہو؟"
"میں عجیب سی متضاد کیفیت کا شکار ہوں۔" میں نے نیچی آواز میں جواب دیا۔ "مجھے سیوبک کی بات ٹھیک بھی محسوس ہوتی ہے کہ جو کچھ ہونا ہے وہ یہیں کہیں ہوگا لیکن میں اس سکوت کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے کہ اتنے انتظامات کی موجودگی میں کچھ ہونا بہت مشکل ہے مگر اس کے ساتھ ہی میری کوئی نامعلوم سی حس مجھے یہ احساس بھی دلا رہی ہے جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ فضا میں جیسے کسی شیطانی سی چیز کی موجودگی کے اثرات پھیلے ہوئے ہیں۔"
سیوبک عمارت کے دوسرے کونے پر تھا۔ وہ ہماری باتیں نہیں سُن سکتا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ دل و جان سے ہمارا ساتھ دے رہا تھا۔ میرے خیال میں تو حقیقت بھی یہی تھی۔ اس کا کیتھرین کے بارے میں زاویۂ نظر کچھ بھی ہو سکتا تھا لیکن کم از کم اس معاملے میں وہ بھی چارلس جتنا ہی تشویش زدہ تھا۔
چھت پر دو پولیس والے بھی سادہ لباس میں موجود تھے۔ وہ احتیاطاً عمارت کے عقب میں دور تک نظر آنے والی دوسری عمارات پر بھی نظر رکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کاغذی کپ میں مجھے اور کیتھرین کو تھرموس میں سے کافی لا کر دی۔ پھر وہ چارلس اور سیوبک کو کافی دینے چلا گیا۔
میں نے اپنے سامنے پھیلے ہوئے منظر سے نظر ہٹائے بغیر دو گھونٹ بھرے اور کپ ایک طرف رکھ دیا۔ کافی مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے ایک بار پھر دوربین آنکھوں سے لگائی۔ اس بار دوربین کا زاویہ ذرا اوپر تھا۔ تب میں نے دیکھا سڑک سے کچھ دور ایک بہت ہی بڑی کرین کھڑی تھی جو دوربین کے بغیر ہی بڑی نمایاں نظر آ رہی تھی۔ میں نے اسے کل بھی اسی طرح کھڑے دیکھا تھا۔
ہاتھی کی سونڈ کی طرح کرین کا بُوم فضا میں بلند تھا اور دور تک

ہوا تھا اور اس کا جو سرا ہوا میں بلند تھا اس پر بہت بڑا ہُک لٹکا ہوا تھا۔ یہ غیر معمولی طور پر بڑے سائز کی کرین تھی اور غالباً سیمنٹ کے بہت بڑے بڑے سلیب اُٹھانے میں زیادہ استعمال ہو رہی تھی۔

مجھے معلوم تھا دیگر مشینری کے ساتھ کرین کو بھی چیک کیا گیا تھا۔ اس وقت اس کی کیب یعنی وہ حصہ جس میں آپریٹر بیٹھتا تھا' خالی اور مقفل تھی۔ میں دوربین کو نہایت آہستگی سے حرکت دیتا رہا اور منظر گویا دھیرے دھیرے میری آنکھوں کے سامنے ہلکورے لیتا رہا۔ کرین کا بُوم درحقیقت سڑک کے اوپر معلق تھا اور اس کا ہُک بلندی پر تھا مگر سڑک کے درمیانی حصے کی عین سیدھ میں تھا۔

مجھے یہ بات کچھ اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ کل کرین کے بُوم کا رخ کسی اور طرف تھا۔ آج حالانکہ کرین کو کچھ پیچھے ہٹا کر کھڑا کیا گیا تھا لیکن اس کے بُوم کے معاملے میں کسی نے اناڑی پن کا ثبوت دیا تھا اور اسے سڑک کے اوپر ہی معلق رہنے دیا تھا۔ اس کی بلندی چونکہ کافی زیادہ تھی شاید اس لیے کسی کا اس طرف دھیان نہیں گیا تھا۔ اس میں ویسے کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ وہ بہرحال کرین تھی۔ کچے دھاگے سے بندھی ہوئی کوئی چیز تو نہیں تھی جو نیچے سے گزرتے ہوئے ٹریفک پر گر پڑتی۔

اسی دوران چارلس نے ہمیں بتایا کہ لیڈی ڈائنا کی گاڑی دیگر گاڑیوں کے جلو میں ائرپورٹ سے روانہ ہو چکی تھی گویا اس کے ہمارے سامنے سے گزرنے میں چار یا پانچ منٹ رہ گئے تھے۔ ریڈیو کی دھیمی دھیمی آواز مجھ تک بھی پہنچ رہی تھی لیکن الفاظ صحیح طور پر سمجھ میں نہیں آ رہے تھے۔

میری توجہ اب بھی منظر کی طرف تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ غیر ارادی طور پر میری نظر ٹین کی دیوار کے اس حصے پر جا رہی تھی جس پر سفید رنگ کیا گیا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ ٹکڑا میری نظر میں کھٹک رہا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ ٹین کی یہ دیوار کل بھی آدھی سے زیادہ بنی ہوئی تھی لیکن کل اس کے کسی حصے پر سفید رنگ نہیں تھا۔ رنگ کرنے کا کوئی مقصد بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس دیوار کا مقصد تو صرف مشینری اور ملبے کو آڑ میں چھپانا تھا' اگر اس میں خوبصورتی پیدا کرنا ہی مقصود ہوتا تو پوری دیوار پر سفید رنگ کیا جاتا۔ صرف پہلی چادر پر کیوں کیا گیا تھا؟

پھر میری دوربین دھیرے دھیرے گھومتی ہوئی کرین کے بُوم پر آ ٹھہری۔ اس وقت چارلس بتا رہا تھا۔ "لیڈی کی گاڑی دو منٹ اور چند سیکنڈ میں یہاں پہنچنے والی ہے....."

میں دوربین کے ذریعے' بُوم میں لٹکے ہوئے بڑے سے ہُک کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک ہی میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ وہ شے مجھے بے چین کیے ہوئے تھی وہ کسی ایسی بات کے بارے میں [illegible] سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بات کچھ تاخیر سے..... اور الساس سے [illegible] میری سمجھ میں آئی تھی لیکن وہ میری غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی۔ [illegible] مزید چند قیمتی سیکنڈ ضائع ہو گئے

میں کسی کو اس کے بارے میں بتا بھی نہ سکا۔

ویسے بھی جو بات میری سمجھ میں آئی تھی وہ چند سیکنڈ میں کسی کی سمجھ میں نہیں آ سکتی تھی۔ اگر وہ غلط فہمی تھی تب بھی اپنا وہم دور کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا لیکن اس کے لیے بجلی کی طرح حرکت میں آنے کی ضرورت تھی۔ وقت بہت کم تھا۔ گاڑیوں کا قافلہ وہاں پہنچنے ہی والا تھا۔

وہ چار منزلہ عمارت تھی۔ اس میں لفٹ نہیں تھی۔ ہنگامی ضرورت کے لیے ہم نے عمارت کی چھت سے ایک رسی نیچے لٹکا رکھی تھی جو ایک ستون سے بندھی ہوئی تھی۔ ہم سب کے ہاتھوں پر نائیلون کے خاص قسم کے دستانے تھے جو ہاتھوں کو چھلنے سے بچا سکتے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی ضرورت پڑنے پر نہایت تیزی سے رسی کے ذریعے نیچے جا سکتا تھا۔ سیڑھیوں سے جانے میں اس کے مقابلے میں زیادہ وقت صرف ہوتا۔

میں نے رائفل وہیں چھت پر پھینکی اور لپک کر منڈیر کے اس حصے پر پہنچا جہاں سے رسی نیچے جا رہی تھی۔ دوسرے ہی لمحے رسی پکڑ کر میں منڈیر پھلانگ چکا تھا اور تیزی سے نیچے جا رہا تھا۔ اوپر میں نے کیتھرین کی ہلکی سی چیخ سُنی۔ شاید اس نے مجھے پکارا تھا لیکن اس کے حلق سے چیخ کی سی آواز نکلی تھی۔

میں شاید دو تین سیکنڈ میں ہی نیچے پہنچ گیا تھا۔ نائیلون کے خاص قسم کے باریک جالی دار دستانوں نے میرے ہاتھوں کو رسی کی رگڑ سے محفوظ رکھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں سڑک کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ میں شاید کبھی اپنی جان بچانے کے لیے بھی اتنا تیز نہیں دوڑا تھا۔

میں نے صرف ایک بار گردن ذرا موڑ کر پیچھے دیکھا۔ کوئی میرے پیچھے نہیں آیا تھا۔ دوسرے لوگوں کی شاید سمجھ میں ہی نہیں آیا تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا تھا اس لیے انہوں نے اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہنا ہی بہتر سمجھا ہوگا۔ اس وقت سڑک' فٹ پاتھ' اس کے کنارے فاضل زمین کی چوڑائی اور سروس روڈ وغیرہ کو ملا کر جو فاصلہ بنتا تھا وہ مجھے میلوں پر محیط محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ اس وقت ٹریفک دونوں طرف کی سڑکوں پر بالکل بند ہو چکا تھا ورنہ میں بروقت انہیں پار نہیں کر سکتا تھا۔ اس وقت ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔

میں گویا ہوا کے دوش پر دوسری سڑک کے کنارے پہنچا۔ اس تیز رفتاری کا ایک فائدہ ہوا کہ میں آسانی سے ٹین کی دیوار کو پھلانگ گیا ورنہ شاید مجھے اس کو پار کرنے میں دشواری ہوتی۔ میں ملبے' سریے کے انباروں اور سیمنٹ کی سلیبوں کو پھلانگتا ہوا کرین تک پہنچا۔

میں نے اس کے دروازے کو صرف ایک جھٹکا دے کر دیکھا وہ مقفل تھا۔ اگر وہ مقفل نہ ہوتا تب بھی شاید مجھے کوئی خاص فائدہ نہ ہوتا کیونکہ کرین اسٹارٹ کرنے کے لیے چابی یقیناً اندر موجود

نہ تھی۔ اگر دروازہ مقفل نہ ہوتا اور چابی اندر موجود ہوتی تب تو میں کیب میں بیٹھ کر ہی اپنا کام کرنے کی کوشش کرتا۔

میں صرف بُوم کو گھما کر کسی اور طرف کر دیتا تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ اس کے لیے زیادہ مہارت کی ضرورت نہیں تھی۔ میں جوانی میں ایک تعمیراتی فرم میں کام کر چکا تھا۔ گو کہ میں وہاں ایک نام نہاد سا اکاؤنٹنٹ تھا لیکن ہر کام سیکھنے کی پرانی عادت کے تحت ہر چیز میں دخل دیتا رہتا تھا۔ اس زمانے میں وہاں جو کرین موجود تھی وہ بھی میری "دست برد" سے محفوظ نہیں رہی تھی تاہم وہ پرانے ماڈل کی ایک چھوٹی سی کھٹارا کرین تھی۔ اس وقت میرے سامنے جدید ماڈل کی ایک بہت بڑی کرین موجود تھی۔

میں نے دروازے پر زور آزمائی میں وقت ضائع نہیں کیا اور کرین پر چڑھ گیا۔ وہاں موجود تمام پولیس والوں نے اپنی رائفلوں کا رخ میری طرف کر لیا تھا لیکن وہ یقیناً یہ نہیں سمجھ پا رہے تھے کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور نہ ہی غالباً ان کی یہ سمجھ میں آ رہا تھا کہ میں کیا کرنا چاہ رہا تھا۔

وہ بہرحال مجھ پر فائر نہیں کر سکتے تھے کیونکہ صبح سے وہ مجھے یہاں حفاظتی انتظامات میں شریک دیکھ رہے تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں کسی نہ کسی حیثیت میں ان لوگوں میں شامل تھا جو ان انتظامات کو کنٹرول کر رہے تھے۔ انہیں یقیناً حیرت ہو رہی ہوگی کہ دور ایک عمارت کی چھت پر بیٹھے بٹھائے اچانک مجھے کیا ہوا تھا جو میں کسی خارش زدہ بندر کی طرح اُچھلتا کودتا یکدم کرین پر آ چڑھا تھا اور اب آسمان کی طرف اٹھتے ہوئے اس کے بازو پر چڑھا جا رہا تھا۔

کرین کے اس حصے میں لوہے کے پچاسوں چھوٹے بڑے گرڈر ایک دوسرے کو کراس کر رہے تھے۔ قینچیاں سی بنی ہوئی تھیں۔ وہ میرے لیے آہنی سیڑھی کا کام دے رہی تھیں۔ بُوم کے سرے پر پہنچ کر میں نے ایک لمحے کے لیے نیچے جھانکا تو ذرا سا خوف محسوس ہوا۔ میں سڑک کے عین اوپر تین چار منزلہ عمارت جتنی بلندی پر ہوا میں معلق تھا۔

میں نے فوراً نیچے کی طرف سے دھیان ہٹا لیا۔ کرین کا ہُک اب میرے ہاتھ سے دو تین فٹ کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ مجھے اپنے چاروں طرف بے پناہ سکوت کا احساس ہو رہا تھا لیکن اسی لمحے میری نظر اس سڑک کے ایک دور افتادہ حصے پر پڑی۔ کاروں کی ایک قطار بڑے سائز کے کھلونوں کی طرح رینگتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ یقیناً ائرپورٹ سے آتی ہوئی کاروں کا قافلہ تھا جو بل کھاتی سڑک پر بظاہر رینگتا دکھائی دے رہا تھا لیکن درحقیقت کاریں تیز رفتاری سے چلی آ رہی تھیں۔ پھر مجھے سائرن کی مدھم سی آواز بھی سنائی دی۔ ٹریفک پولیس کی دو موٹر سائیکلیں جلوس سے کچھ آگے آ رہی تھیں۔ وہ اب اس مقام سے زیادہ دور نہیں رہی تھیں۔

ایک ثانیے کے لیے مجھے اپنے اعصاب میں تھرتھراہٹ سی محسوس ہوئی۔ میں جو کچھ کر رہا تھا کیا وہ صحیح تھا یا میں محض اپنے آپ کو تمسخر اور تضحیک کا نشانہ بنوانے کا سامان کر رہا تھا؟ یہ سوال ایک بار پھر بجلی کے کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا لیکن میں نے فوراً ہی اس کا گلا گھونٹ دیا۔ اپنا شک دور کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

میں نے کرین کے بڑے سے ہُک کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اب تو ویسے بھی میں اسے صاف طور پر دیکھ سکتا تھا۔ میرا شبہ ٹھیک ہی معلوم ہوتا تھا۔ عام حالات میں اس ہُک کو ایک مضبوط ایکسل پر بڑے بڑے نٹ بولٹس وغیرہ کے ذریعے لٹکا ہونا چاہیے تھا کیونکہ اسی ہُک میں لوہے کی رسیاں وغیرہ ڈال کر بڑی سے بڑی وزنی چیزیں اٹھائی جاتی تھیں۔ نٹ بولٹ اور ایکسل وغیرہ اب بھی موجود تھے مگر اب وہ محض دکھاوے کے لیے تھے۔

اب ہُک درحقیقت ایک نازک کھانچے میں اٹکا ہوا تھا جو شاید پلاسٹک کا تھا اور درحقیقت یہ وہ ہُک ہی نہیں تھا جو کرین میں ہونا چاہیے تھا۔ یہ اس ہُک کی ایک کامیاب نقل تھی لیکن یہ سب کچھ دور سے دیکھنے پر محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ویسے بھی کرین کے اس آخری سرے تک اتنی باریکی سے دیکھنے کی ضرورت شاید کسی نے محسوس نہ کی ہو۔ میں بھی اگر دوربین سے نہایت آہستگی سے ایک ایک چیز کا جائزہ نہ لے رہا ہوتا تو شاید مجھے بھی فرق کا احساس نہ ہوتا۔ میں نے کل اتفاق سے کرین کے ہُک تک کو غور سے دیکھا تھا۔ وہ گہرے سیاہ رنگ کا تھا اور اس کی بناوٹ میں ظاہر ہے بڑی صفائی تھی۔

آج دوربین سے دیکھنے پر وہ مجھے ہلکے سرمئی رنگ کا دکھائی دیا تھا اور اس میں کہیں کہیں ناہمواری بھی تھی۔ اس کا بالائی حصہ تو لوہے کے گرڈرز کی آڑ میں چھپا ہوا تھا اس لیے جب میں نے عمارت کی چھت پر سے اسے دیکھا تھا تو مجھے معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ اس وقت وہ نٹ بولٹوں کے ذریعے صحیح طور پر پھنسا ہوا نہیں تھا۔ تاہم مجھے گڑبڑ کا شبہ ضرور ہو گیا تھا اور اب تصدیق ہو گئی تھی۔

مجھے احساس تھا کہ میرے چہرے سے پسینہ میرے بازوؤں پر ٹپک رہا تھا۔ اس ہُک کو ہاتھ لگانے کا نتیجہ کچھ بھی نکل سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے اس کے کھانچے سے نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ عین اسی وقت ایک گولی میری ناک کی نوک کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

میں بال بال بچ تو گیا تھا لیکن میری آنکھوں کے سامنے تارے ضرور ناچ گئے۔ میں نے عقلمندی اور بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی پُھرتی دکھا دی تھی جو مجھے مہنگی پڑ سکتی تھی۔ اس وقت میں کھلی فضا میں بلندی پر اٹکا ہوا ایک ساکت شکار تھا جس پر چاروں طرف سے کوئی بھی نشانے بازی کی مشق کر سکتا تھا۔

یوں تو اس وقت میرے چاروں طرف بہت سے لوگ موجود تھے جنہیں اصولاً میری حفاظت کرنی چاہیے تھی لیکن مجھے امید تھی کہ ان میں سے کوئی مجھے کسی سمت سے آنے والی ناگہانی

گولی سے بچا سکتا تھا کیونکہ فائر یقیناً سائیلنسر لگی رائفل سے ہوا تھا۔ جب تک ان لوگوں کو اندازہ ہوتا کہ فائر کس سمت سے ہو رہا تھا اس وقت تک میرا کام تمام بھی ہو سکتا تھا بلکہ عین ممکن تھا کہ میں پٹ سے نیچے جا گرتا تبھی ان لوگوں کو پتا چلتا کہ مجھ پر کوئی فائر بھی ہوا تھا۔

میں فوراً ہی بُوم کے گرڈرز پر چپک کر لیٹ گیا۔ اس دوران ایک اور گولی آہنی گرڈرز سے ٹکرا چکی تھی اور اس نے چنگاریاں پیدا کی تھیں۔ وہ گولی اچٹ کر بھی مجھے لگتی تو شاید مہلک ثابت ہوتی لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ وہ شاید نیچے کی طرف چلی گئی۔ تیسری گولی میرے بالوں کو چھوتی ہوئی گزری۔

یہ سب کچھ خوش قسمتی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ میں گرڈرز کے اوپر لیٹا ہونے کے باوجود گولیوں سے محفوظ نہیں تھا۔ فوراً ہی میں نے کروٹ سی لی اور چوڑے گرڈر کی آڑ میں دوسری طرف دونوں ہاتھوں اور پیروں کی مدد سے چپک گیا۔ اب میں موٹے آہنی گرڈرز کی آڑ میں تو ہو گیا تھا لیکن اگر میرے ہاتھ پیروں کی گرفت ڈھیلی پڑ جاتی یا میں اپنا وزن نہ سنبھال پاتا تو سیدھا سڑک پر جا گرتا اور میری ہڈیاں پسلیاں گوشت سب ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتا۔

اس عالم میں بھی میں بم کی طرف ہاتھ بڑھانے سے باز نہ رہا کیونکہ جان کی بازی تو لگ ہی چکی تھی، اب اصل مقصد بھی پورا ہونا چاہیے تھا ورنہ یہ ساری بھگدڑ فضول اور بے معنی ہو کر رہ جاتی۔ نامعلوم سمت سے مزید کوئی گولی نہیں آئی کیونکہ عمارت کی چھت پر موجود میرے ساتھیوں کو شاید اندازہ ہو گیا تھا کہ مجھ پر فائر ہوئے تھے اور انہوں نے فائروں کی سمت کا بھی اندازہ کر لیا تھا۔

انہوں نے شاید کچھ جوابی کارروائی کی تھی جس کی وجہ سے میری سمت میں مزید گولیاں نہیں آئی تھیں۔ میں نے دور کہیں شیشہ وغیرہ ٹوٹنے کی مدھم سی آوازیں سُنی تھیں۔ کیتھرین، سیوبک، چارلس اور چھت پر موجود پولیس کے دو آدمی جنہیں اس وقت میں اپنے ساتھی شمار کر رہا تھا، ان سب کے پاس بھی سائیلنسر والی رائفلیں تھیں۔ اس لیے مجھے جوابی فائرنگ کی باقاعدہ آوازیں سنائی نہیں دی تھیں۔ طے یہی پایا تھا کہ وہاں جو کچھ بھی ہونا تھا نہایت خاموشی سے ہونا تھا۔

میرا ہاتھ اس دوران بم تک پہنچ چکا تھا۔ میں اس وقت بہت مشکل میں تھا۔ کچھ اسی طرح لوہے کے گرڈر سے چمٹا ہوا تھا جس طرح بندر بعض اوقات کسی چیز سے خوفزدہ ہو کر درخت کی شاخ سے چمٹ جاتا ہے لیکن ایک انسان کے لیے ظاہر ہے یہ کوئی آسان کام نہیں تھا، خصوصاً جبکہ اسے کچھ اور بھی کرنا تھا۔

تاہم میں کھانچے سے بم نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ بم کو میں جہاں کہیں بھی پھینکوں گا، کچھ نہ کچھ تباہی پھیلے گی۔ اب تو یقینی طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اصل بم نہیں تھا۔ وہ لوہے کے بجائے پلاسٹک کا بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

سائٹ پر موجود پولیس والے گردنیں اٹھائے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان کے عقب میں کافی دور مجھے پانی کا ایک بہت بڑا ٹینک رکھا نظر آیا۔ وہ مال گاڑی کے ڈبے سے مشابہ، لوہے کا ایک بہت بڑا کنٹینر تھا جس میں پانی بھرا ہوا تھا۔ پانی غالباً کنسٹرکشن میں استعمال کے لیے وہاں رکھا گیا تھا۔

فاصلہ کافی تھا اور میں جس پوزیشن میں لٹکا ہوا تھا اس میں اس بم کو پانی کے اس ٹینکر تک پھینکنا بڑا مشکل کام تھا لیکن میں اسے مزید ایک سیکنڈ بھی ہاتھ میں رکھنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں ایک ہاتھ اور دونوں پیروں کی مدد سے گرڈر کے ساتھ چپک کر ایک ہاتھ سے وہ کام کر ہی گزرا۔ میں نے بم کو اندازاً پانی کے اس ٹینکر میں پھینکا لیکن مضحکہ خیز حالت میں ہونے کی وجہ سے نشانہ خطا ہو گیا۔

بم یوں تو واٹر ٹینک کے اندر ہی گیا لیکن اندر کی طرف دیوار کے کونے سے ٹکرا گیا۔ بس میں اتنا ہی دیکھ سکا۔ اس کے ساتھ ہی زبردست دھماکے اور روشنی کے نہایت تیز جھماکے کی وجہ سے میری آنکھیں ایک ثانئے کے لیے غیر ارادی طور پر بند ہو گئیں۔

میں نے دوبارہ آنکھیں کھولیں تو واٹر ٹینک وہاں سے غائب ہو چکا تھا۔ اس کی جگہ لوہے کے بڑے بڑے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے، دور دور تک کیچڑ سا پھیلا ہوا تھا اور ٹینک کی جگہ گڑھا سا پڑ گیا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق پانی کی وجہ سے اس دھماکے اور اس کی تباہی کی شدت بہت کم ہو گئی تھی۔ اگر بم کی ساخت کے اس بم کو اس کی اصل جگہ پر گر جانے کا موقع مل جاتا تو نہ جانے کتنی تباہی پھیلتی۔

تمام پولیس والے زمین پر لیٹ چکے تھے اور انہوں نے اپنی اپنی گنوں کے رخ اس طرف کر لیے تھے جدھر دھماکا ہوا تھا لیکن ظاہر ہے ادھر کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس پر وہ بندوق تان کر کسی کو کوئی فائدہ پہنچاتے۔ اس وقت مجھے ان کی حالت اپنے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز لگی۔

یہ سب کچھ درحقیقت ایک ڈیڑھ منٹ کے اندر اندر ہو گیا تھا۔ لہریے دار سڑک پر مجھے ٹریفک والوں کی موٹر سائیکلیں کافی قریب دکھائی دیں۔ ان کے سائرن تو صاف سنائی دینے لگے تھے۔ اسی لمحے کسی نے نیچے چیخ کر میرا نام لے کر پکارا۔

میں نے گردن گھما کر دیکھا۔ چارلس کرین کے قریب کھڑا تھا۔ میں تیزی سے نیچے اُتر آیا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میں کئی دنوں پر محیط ایک صبر آزما جدوجہد سے گزر کر آ رہا تھا لیکن درحقیقت اس عمارت کی چھت سے اُترنے اور اب کرین سے اُترنے کے دوران بمشکل ڈیڑھ منٹ کا وقفہ تھا جس کا اندازہ مجھے اپنی گھڑی دیکھ کر ہوا۔ جب ہم عمارت کی چھت پر تھے اور چارلس نے اعلان کیا تھا کہ کاروں کا قافلہ تقریباً ڈھائی منٹ بعد وہاں پہنچنے والا تھا اس

وقت میں نے گھڑی دیکھی تھی۔

چارلس کافی بوکھلایا ہوا لگ رہا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں مشین پسٹل تھا اور دوسرے میں ریڈیو..... جس کا ہیڈ فون اس کے گلے میں جھول رہا تھا۔ اس کے عقب میں دو سیکیورٹی آفیسر بھی دوڑے آ رہے تھے۔ وہ سب مشین گنیں اُٹھائے ہوئے تھے اور ان کا دوڑ کر آنے کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ کسی فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے آ رہے ہوں لیکن شاید غیر ارادی طور پر انہوں نے نشانہ میرا اور چارلس کا لیا ہوا تھا۔

”یہ دھماکا کیسا تھا؟“ چارلس وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ ”کیا میں قافلے کو روک دوں؟“ وہ ریڈیو منہ کے قریب لانے لگا۔

میں نے ہاتھ اُٹھا کر اسے روکا اور بے ترتیب سی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”اب قافلے کو روکنے کا کوئی فائدہ نہیں..... انہیں اب اسی روانی سے گزر جانے دو..... اب خطرہ ٹل چکا ہے۔“

میرے بات کرنے تک ٹریفک پولیس کی موٹر سائیکلیں اس مقام تک پہنچ چکی تھیں جہاں بورڈ لگا تھا۔ ”حدِ رفتار پچاس کلومیٹر فی گھنٹا۔“ یہ بورڈ غالباً عارضی طور پر فلائی اوور کی تعمیر کی وجہ سے لگایا گیا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ خود ٹریفک پولیس والوں نے اس وقت لیڈی ڈائنا جیسی شخصیت کی گاڑی کو پائلٹ کرتے وقت بھی اس ہدایت کا خیال رکھا اور موٹر سائیکلوں کی رفتار کم کر لی ورنہ وہ کچھ تیز رفتاری سے آ رہے تھے۔ انہیں دھماکا کسی نہ کسی حد تک سُنائی دیا ہو گا۔

انہوں نے چاروں طرف دیکھا لیکن انہیں چونکہ خطرے کا کوئی سگنل نہیں ملا تھا اور نہ ہی ریڈیو پر کوئی پیغام ملا تھا اس لیے وہ گزرتے چلے گئے۔ اس کے بعد دوسری گاڑیاں نمودار ہونا شروع ہوئیں۔ پولیس، اسپیشل سیکیورٹی، ملٹری انٹیلیجنس وغیرہ کی گاڑیاں گزریں۔ پھر تاریک شیشوں اور چھ دروازوں والی سیاہ مرسیڈیز گزری۔ اس میں یقیناً لیڈی ڈائنا اور ترک وزیرِ خارجہ موجود تھے۔

ہم ملبے، مشینری اور ٹین کی دیوار کی آڑ میں ساکت کھڑے رہے اور گاڑیوں کا قافلہ ایک مخصوص رفتار سے ہمارے سامنے سے گزرتا چلا گیا۔ جتنے حصے میں کنسٹرکشن جاری تھی، اس سے نکلنے کے بعد گاڑیوں کی رفتار تیز ہو گئی۔ گویا ان گاڑیوں نے بھی حدِ رفتار کی پابندی کی تھی۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اپنے ملک سے نکل کر ہر جگہ قانون کی پابندی نظر آتی تھی۔

بند گاڑیوں میں گزرنے والے ان لوگوں کو میل ڈیڑھ میل کے فاصلے سے دھماکا بھی سنائی نہیں دیا ہو گا اور نہ ہی یہ گمان گزرا ہو گا کہ انہیں اس مقام سے حفاظت سے گزارنے کے لیے کتنے لوگوں کی جان پر بنی ہوئی تھی اور کس نے کس طرح بروقت جان پر کھیل کر ایک عجیب و غریب متوقع حملے کو ناکام بنایا تھا۔

چند لمحے ہم سب ساکت کھڑے رہے۔ قافلہ گزر جانے کے بعد فضا میں ایک عجیب سا سکوت پھیل گیا تھا۔ اس دوران میرے اعصاب اور میری سانس معمول پر آ گئی۔ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں چارلس سے پوچھا۔ ”کیتھرین اور سیوبک کیا اسی عمارت کی چھت پر ہیں؟“

”نہیں...“ چارلس کی آواز ابھی تک مرتعش تھی۔ ”اس سے کافی پیچھے ایک اور عمارت تھی.. وہاں سے تم پر فائرنگ ہوئی تھی..... وہیں ایک کھڑکی میں کچھ حرکت نظر آئی..... کیتھرین نے اس پر فائرنگ کی..... اور اب وہ اس عمارت کی طرف بھاگے ہیں..... پولیس والے بھی ان کے ساتھ ہیں لیکن تم بتاؤ..... یہ کیا چکر تھا؟“

”چکر بعد میں سمجھتے رہنا، ہمیں ان کی مدد کے لیے جانا چاہیے۔“ میں نے تیزی سے کہا اور اپنے سامنے کھڑے سیکیورٹی آفیسر کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس سے کہو اپنی سب مشین گن مجھے دے دے۔“

چارلس نے سیکیورٹی آفیسر کو اشارہ کیا۔ اس نے بادلِ ناخواستہ اپنی سب مشین گن مجھے دے دی اور میں اسی سمت میں واپس دوڑ پڑا جدھر سے آیا تھا۔ ٹین کی دیوار میں سے کسی نے ایک چادر گرا دی تھی اور اب اس کے درمیان سے آنے جانے کا راستہ بن گیا تھا۔ میں ملبے پر سے چھلانگ لگا کر اس راستے سے ہوتا ہوا سڑک پار کرنے لگا۔

دو طرفہ سڑک عبور کرنے کے بعد میں نے مڑ کر دیکھا۔ چارلس گرتا پڑتا میرے پیچھے بھاگا آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ وہ سیکیورٹی آفیسر بھی تھا جس نے مجھے گن دی تھی۔ وہ کچھ اس طرح میرے پیچھے آ رہا تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ میں اس کی گن لے کر بھاگ جاؤں گا۔

چارلس کی وجہ سے مجھے اپنی رفتار کم کرنا پڑی۔ وہ میرے قریب پہنچا تو میں نے کہا۔ ”تم مجھے اشارے سے بتا دو وہ کس عمارت کی طرف گئے تھے۔“

اس نے ہانپتے ہوئے براؤن رنگ کی ایک عمارت کی طرف اشارہ کیا جو دیگر عمارتوں سے ہٹ کر کافی پیچھے واقع تھی۔ اتنی دور ہونے کی وجہ سے اسے زیادہ سخت سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے نگرانی میں بھی نہیں رکھا گیا تھا۔ میں نے چارلس کو اس کی طاقت کے مطابق دوڑنے کے لیے چھوڑا اور خود اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے اس عمارت تک پہنچا۔

وہ ایک ہائی رائز عمارت تھی۔ گیارہ بارہ منزلہ معلوم ہوتی تھی۔ میں نے اوپر تک نظر دوڑائی تو دو منزلوں پر بڑی بڑی کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹے نظر آئے۔ گہرے رنگ کے شیشے کے کچھ ٹکڑے مجھے نیچے بھی پڑے دکھائی دیے۔ عمارت کے گرد لوہے کا جنگلا تھا اور اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس عمارت کا رخ بظاہر سڑک کی طرف تھا لیکن اس میں داخلے کا راستہ پیچھے کی طرف سے

تھا۔

میں دوڑتا ہوا پیچھے پہنچا تو پتا چلا اس طرف عمارت کا خاصا بڑا کمپاؤنڈ تھا جو پارکنگ لاٹ کا کام بھی دیتا تھا۔ یہ عمارت بھی کاروباری مرکز معلوم ہوتی تھی کیونکہ اس روز چھٹی کی وجہ سے پارکنگ لاٹ تقریباً خالی نظر آ رہی تھی۔

دفعتاً میری نظر سیڑھیوں کی دیوار کے عقب میں مشکوک انداز میں ہلتی ہوئی ایک ٹوپی پر پڑی۔ اچھا ہوا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے اس پر فائر نہیں کر دیا۔ مجھے بروقت احساس ہو گیا تھا کہ وہ رنگ اور ساخت ترکش پولیس کی ٹوپی کی تھی۔

دوسرے ہی لمحے دیوار کے عقب سے ایک سر نمودار ہوا۔ یہ انہی پولیس والوں میں سے ایک تھا جو ہمارے ساتھ عمارت کی چھت پر تعینات تھے۔ وہ اپنی گن اٹھائے ہوئے تھا اور اس کی آنکھیں حیرت، خوف یا پھر کسی اور وجہ سے گول گول سی دکھائی دے رہی تھیں۔

"کیتھرین وغیرہ کہاں ہیں؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"وہ اس آدمی کی تلاش میں گئے ہیں، اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔" اس نے ٹوٹی پھوٹی سی انگریزی میں جواب دیا۔

"کس آدمی کا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"وہ اس عمارت میں چھپا ہوا تھا۔" اس نے لابی کی طرف اشارہ کیا۔

"اور تم یہاں چھپے کیا کر رہے ہو؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔ وہ مجھے اب کچھ ہونق سا لگ رہا تھا اور اس وقت کسی کا بھی ہونق پن میرے لیے ناقابلِ برداشت ہی تھا۔

"ہمارا ایک آدمی مر گیا ہے.... مجھے مس کیتھرین نے یہیں رکنے کے لیے کہا تھا۔" اس نے ہکلاتے ہوئے کہا اور لابی کے شیشے کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ دروازہ بھی ٹوٹا ہوا تھا۔ شیشے کے ٹکڑے ماربل کی سیڑھیوں پر بکھرے ہوئے تھے۔

میں نے سیڑھیاں چڑھ کر محتاط انداز میں دروازہ آہستگی سے کھولا جس کا صرف الومینیم کا فریم ہی باقی رہ گیا تھا۔ میں نے لابی میں جھانکا۔ سامنے ہی ماربل کے جھلملاتے فرش پر ایک باوردی پولیس والا اوندھا پڑا تھا۔ اس کا ایک رخسار تو فرش پر ٹکا ہوا تھا اور دوسرا رخسار غائب تھا۔ اس کی شکل ناقابلِ شناخت ہو چکی تھی۔ میں نے اندازاً ہی اسے پہچانا۔ اس کے جسم میں اور بھی کئی گولیاں پیوست تھیں۔ اس کے اردگرد خون پھیلا ہوا تھا۔ لابی میں مدھم سی روشنی تھی۔ اس روشنی میں فرش بھی جھلملا رہا تھا اور خون بھی۔

خون ابھی خشک ہونا بھی شروع نہیں ہوا تھا۔ عمارت میں بلا کا سکوت تھا۔ اندر جانا فضول تھا۔ اب شاید وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے پلٹ کر پولیس والے سے پوچھا۔ "کیتھرین اور سیوبک کس طرف گئے ہیں؟"

اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ "کیتھرین اس طرف گئی ہے...." پھر دوسری طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "سیوبک اس طرف گیا ہے۔"

"کیا وہ دو آدمیوں کے تعاقب میں گئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں.... آدمی تو شاید ایک ہی تھا...." وہ بے یقینی سے بولا۔ "شاید وہ اسے دو طرف سے گھیرنے کی کوشش کرنا چاہتے تھے۔ وہ شاید اس طرف بھاگا تھا.... میں صحیح طور پر کچھ دیکھ نہیں سکا۔" اس نے اٹک اٹک کر بتایا۔ اس کی ہر بات میں "شاید" شامل تھا۔

اس دوران چارلس اور سیکیورٹی آفیسر بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ سیکیورٹی آفیسر کے ہاتھ میں اب ایک پستل نظر آ رہا تھا۔ میں نے ان دونوں کو مختصر ترین الفاظ میں صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ چارلس ہانپتے ہوئے بولا۔ "اس کا مطلب ہے حمان اس عمارت میں چھپا ہوا تھا...."

"ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔" میں نے تیزی سے کہا۔ "وہ جو کوئی بھی تھا کیتھرین اور سیوبک اس کے تعاقب میں گئے ہیں۔ آپ یہیں ٹھہریں۔ زیادہ بھاگ دوڑ آپ کے بس کی بات نہیں۔ میں اور یہ آفیسر جا کر ان کی مدد کی کوشش کرتے ہیں۔"

چارلس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے سیکیورٹی آفیسر کو اشارہ کیا اور ہم دونوں گنیں سنبھالے آگے روانہ ہوئے۔ دوڑتے ہوئے ہم اس عمارت تک پہنچے جس کی طرف پولیس والے نے اشارہ کیا تھا۔ مین روڈ کے آس پاس تو ہمیں ویرانی ہی نظر آئی تھی لیکن اب چونکہ ہم مین روڈ سے کچھ دور نکل آئے تھے شاید اس لیے ہمیں ایک جگہ کچھ لوگوں کی شکلیں دکھائی دیں۔ وہ دو تین کی ٹولیوں کی صورت میں کونے کھدروں میں کھڑے تھے اور وحشت زدہ سی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ وہ شاید انہی عمارتوں میں رہتے تھے۔

سیکیورٹی آفیسر بھی میری طرح سادہ لباس میں تھا۔ ہمیں گنیں اٹھائے بھاگتے دیکھ کر وہ لوگ کچھ اور پریشان ہو گئے۔ اِدھر اُدھر بھاگ کر چھپنے کی کوشش کرنے لگے۔ میں نے بہ آوازِ بلند تیزی سے انگریزی میں کہا۔ "گھبرانے کی ضرورت نہیں.... ہم سرکاری لوگ ہیں.... آپ نے ایک مرد اور ایک عورت کو ادھر کہیں جاتے دیکھا ہے؟"

ان میں سے تین چار افراد ہچکچاہٹ آمیز انداز میں رک گئے۔ میں نے مختصراً انہیں کیتھرین اور سیوبک کے حلیے بتانے کی کوشش کی۔ سیکیورٹی آفیسر نے ترکی میں انہیں میرا مطلب سمجھانے میں میری مدد کی۔ تب ان میں سے ایک شخص نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا کہ انہوں نے آندھی طوفان کی طرح دو افراد کو ادھر جاتے تو دیکھا تھا۔ انہوں نے چند فائر بھی کیے تھے لیکن وہ دیکھ نہیں سکے تھے کہ ان کے حلیے کیا تھے اور شکلیں کیسی تھیں۔

مین روڈ کے آس پاس تو زیادہ تر کمرشل عمارتیں تھیں۔ بیچ میں کچھ جگہیں خالی بھی تھیں اور کچھ ان عمارتوں کی پارکنگ لاٹس کی وجہ سے کشادگی نظر آ رہی تھی لیکن ان کے عقب میں جہاں تک ہم پہنچ چکے تھے وہاں سے کچھ آگے رہائشی مکانات کا سلسلہ شروع ہو رہا تھا اور وہ خاصی گنجان آبادی نظر آ رہی تھی۔ جس شخص نے ہماری رہنمائی کی کوشش کی تھی اس نے انہی گلیوں کی طرف اشارہ کیا تھا لیکن وہ یقین سے نہیں بتا سکتا تھا کہ ان میں سے کون کس گلی میں گیا تھا۔

مجھے سیوبک کے بارے میں تو نہیں، البتہ کیتھرین کے بارے میں تشویش تھی۔ میرے خیال میں تو چارلس نے خواہ مخواہ ہی فخریہ جذبات سے مغلوب ہو کر کیتھرین کو اس آپریشن میں شامل کر لیا تھا ورنہ اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ حمان بلاشبہ نہایت پھرتیلا اور سفاک قاتل تھا۔ اس کا اندازہ مجھے چند لمحے پہلے اس عمارت میں پولیس والے کی لاش پڑی دیکھ کر ہوا تھا۔

وہ ایک بلند عمارت تھی اور اس میں آمدورفت کا ایک ہی دروازہ تھا۔ جس وقت کیتھرین، سیوبک اور دونوں پولیس والے اس عمارت تک پہنچے ہوں گے اس وقت تک حمان اندر ہی ہو گا۔ کیتھرین، سیوبک اور پولیس والے اب ایسے گئے گزرے لوگ بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ ایک پولیس والے کو چھلنی کر کے صاف نکل گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کا تعاقب بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ممکن ہے کیتھرین کو آتشیں ہتھیاروں کے ساتھ مار دھاڑ کا خاصا تجربہ ہو۔ پھر بھی میرے خیال میں اسے یوں منہ اٹھا کر حمان کے تعاقب میں نہیں جانا چاہیے تھا۔ ویسے ابھی تو یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ حمان ہی تھا۔

ہمیں کیتھرین اور سیوبک کی تلاش میں زیادہ دور تک نہیں جانا پڑا۔ ابھی ہم فیصلہ کر ہی رہے تھے، ہمیں کون سی گلیوں میں داخل ہونا چاہیے کہ کیتھرین اور سیوبک ہمیں ایک ہی گلی کے موڑ پر ایک ساتھ نمودار ہوتے دکھائی دیے۔ ان کی رائفلیں کندھوں پر تھیں اور منہ لٹکے ہوئے تھے۔ انہیں ایک نظر دیکھ کر ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ مایوس واپس آ رہے تھے۔ سیوبک اپنے ہاتھ میں نیلے سے رنگ کے کچھ کپڑے اٹھائے ہوئے تھا۔ کیتھرین کی ڈینم کی جیکٹ کندھے پر سے پھٹی ہوئی تھی۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ جینز مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی۔ سیوبک کا حال کچھ زیادہ خراب نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ قریب آن پہنچے تب بھی میں نے کچھ نہ پوچھا۔ منتظر انداز میں خاموش کھڑا رہا۔ بالآخر سیوبک بولا۔ "وہ نکل گیا۔"

"کیا وہ حمان ہی تھا؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"میں اس کی شکل نہیں دیکھ سکا.... اور اگر دیکھ بھی لیتا تب بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ میں نے اس سے پہلے بھی کبھی اس کی شکل نہیں دیکھی لیکن اس کے بارے میں جو قصے سُنے

ہیں اور جس طرح آج وہ نکلا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ حمان ہی تھا۔"

"یہ کیا اُٹھائے لا رہے ہو؟" میں نے اس کے ہاتھ میں موجود کپڑوں کی طرف اشارہ کیا جنہیں وہ کچھ اس طرح لٹکائے ہوئے تھا جیسے دھوبی کے ہاں لے جا رہا ہو۔

"یہ لفٹ بوائے کی وردی ہے۔" سیوبک نے بتایا۔ "وہ اس وردی میں تھا۔ اسی کی وجہ سے ہم ایک لمحے کے لیے دھوکا کھا گئے اور اس کے لیے وہ ایک لمحہ ہی کافی تھا۔ وہ اس احمق پولیس والے کو اُڑا کر نکل گیا جس نے عمارت میں گھسنے میں کچھ زیادہ ہی عجلت دکھائی تھی۔"

پھر وہ کچھ حسرت آمیز سی نظروں سے یونیفارم کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "یہ مجھے ایک عمارت کی چھت پر پڑا ہوا ملا۔ تبھی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نکل چکا ہے۔ اس یونیفارم کے نیچے وہ یقیناً دوسرے کپڑے پہنے ہوئے ہوگا۔"

"تو اب انہیں اُٹھائے کیوں چلے آ رہے ہو؟ ان کی جیبوں میں یقیناً کچھ نہیں ہوگا لیکن تسلی کے لیے ہاتھ مار کر دیکھ لو اور ایک طرف پھینک دو۔" میں نے کہا۔ "یہ کپڑے اب ہمیں حمان کا پتا بتانے سے تو رہے۔"

سیوبک نے چلتے چلتے یونیفارم کی جیبیں کھنگالیں۔ حسبِ توقع ان میں کچھ نہیں تھا۔ وہ بش کوٹ، ٹوپی اور پتلون تینوں چیزیں پھینکنے لگا تھا لیکن سیکیورٹی آفیسر ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ مجھے دے دیجیے۔ تفتیش میں کام آئیں گے۔"

سیوبک نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنی بیزاری چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "دے دو بھئی! لگتا ہے یہاں بھی سرکاری محکموں کو سانپ نکل جانے کے بعد لکیر پیٹنے کا شوق ہے۔"

ہم واپس وہاں پہنچے جہاں میں نے چارلس کو چھوڑا تھا۔ وہ دیوار کی آڑ میں پولیس والے کے پاس بیٹھا تھا اور ریڈیو پر مختلف لوگوں کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ اب وہاں کچھ اور لوگ بھی نظر آنے لگے تھے جو مختلف کونے کھدروں سے سہمے سہمے انداز میں جھانک رہے تھے۔ کافی لوگوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہاں کوئی گڑبڑ تھی۔

"میں ذرا اندر سے اس عمارت کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "کسی کو اندازہ ہے کہ حمان کون سی منزل پر موجود تھا؟"

"مجھے اندازہ ہے۔" کیتھرین بولی۔ "جب تم کرین پر چڑھ کر ہُک کی طرف ہاتھ بڑھا رہے تھے اور ہمیں اندازہ ہوا کہ تم پر فائر ہو رہے تھے تو ہم نے دوربین سے اِدھر اُدھر کا جائزہ لیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس عمارت کی ایک کھڑکی کے شیشے کے عقب میں کوئی موجود تھا۔ وہ پانچویں منزل کی کھڑکی تھی اور سب سے پہلے میں نے ہی اس پر فائرنگ کی تھی جس کے بعد یہاں سے فائرنگ رُک گئی تھی اور ہم بھاگ کر یہاں آئے تھے۔"

ہم ٹوٹے ہوئے شیشوں کا دروازہ کھول کر اندر پہنچے۔ لابی میں پولیس والے کی لاش اسی طرح اوندھی پڑی تھی۔ ہم لفٹ کی طرف بڑھے تو سیڑھیوں کی آڑ میں مجھے ایک گٹھڑی سی پڑی دکھائی دی۔ میں نے قریب جا کر دیکھا۔ وہ بھی ایک لاش تھی۔

وہ سادہ لباس میں ایک سیکیورٹی آفیسر تھا جسے محض احتیاطاً اس عمارت کے دروازے پر تعینات کیا گیا تھا ورنہ اس عمارت کو تو ان عمارتوں میں شمار ہی نہیں کیا گیا تھا جہاں سے کسی کارروائی کا اندیشہ تھا۔ اس آفیسر کی گردن میں تانبے کا ایک باریک سا تار پیوست تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں حلقوں سے اُبل آئی تھیں۔ اس کی لاش کو یقیناً دروازے کے قریب سے کھینچ کر سیڑھیوں کی آڑ میں ڈالا گیا تھا۔ اس آفیسر کے پاس غالباً صرف ایک پسٹل موجود تھا جو اس وقت بھی اس کے قریب ہی پڑا تھا۔

البتہ باوردی پولیس والے کے قریب ایک اوزی گن پڑی تھی جو یقیناً اس کی نہیں تھی۔ وہاں موجود پچاسوں لوگوں میں سے کسی کے پاس اوزی نہیں تھی۔ وہ یقیناً حمان کی تھی جسے وہ فرار ہوتے وقت وہیں پھینک گیا تھا۔

متاسفانہ سی کیفیت میں ہم لوگ لفٹ کے ذریعے پانچویں منزل پر پہنچے۔ ہمیں وہ کھڑکی تلاش نہیں کرنا پڑی جس کے پیچھے ہمارے اندازوں کے مطابق حمان موجود رہا ہوگا۔ لفٹ سے نکلتے ہی ہمیں وہ بڑی سی کھڑکی نظر آ گئی۔ اس کے تمام شیشے ٹوٹے ہوئے تھے۔ وہ درحقیقت راہداری کی کھڑکی تھی۔ اس وقت اس کے راستے ہوا فرفر اندر آ رہی تھی۔

مزید ثبوت ہمیں کھڑکی کے قریب پہنچ کر مل گیا۔ شیشوں کے ٹکڑوں کے قریب ہی ایک ٹیلی اسکوپک رائفل اور کیلکولیٹر سے مشابہ تقریباً ایک بالشت لمبا اور چار انگل چوڑا ایک ڈبا سا پڑا تھا۔ اسی ٹیلی اسکوپک رائفل سے حمان نے مجھ پر فائر کیے ہوں گے۔ یہ محض میری خوش قسمتی تھی کہ میں بال بال بچ گیا تھا۔

حمان کی دلیری اور خود اعتمادی قابلِ رشک تھی کہ جس چیز کی ضرورت جہاں ختم ہوتی نظر آئی تھی اسے وہیں پھینک گیا تھا۔ ٹیلی اسکوپک رائفل اس نے یہاں صرف دور کی فائرنگ کے لیے رکھی ہوگی۔ یہاں سے ہٹتے وقت وہ اسے یہیں چھوڑ گیا تھا۔ نیچے پولیس والے کو اوزی سے چھلنی کرنے کے بعد چونکہ اسے صرف نکل بھاگنے سے دلچسپی رہ گئی تھی اور وہ کسی سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اسے وہیں پھینک گیا تھا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس کا ٹکراؤ مسلح لوگوں سے تھا۔

ہمارے ہاتھوں پر چونکہ ابھی تک دستانے تھے اس لیے چارلس نے بلا تامل وہ کیلکولیٹر نما ڈبا اُٹھا لیا اور اسے اُلٹتے پلٹتے ہوئے بولا۔ "یہ کیلکولیٹر ہے یا ریموٹ کنٹرول؟"

"آپ کا دوسرا اندازہ صحیح ہوگا۔ میرے حساب سے اسے ریموٹ کنٹرول ہونا چاہیے۔" میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔ میں ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے اس دور افتادہ منظر کا جائزہ لے رہا تھا جس کا چند منٹ پہلے تک میں ایک حصہ تھا۔

بغیر دوربین کے بھی وہاں کی چیزیں صاف ہی دکھائی دے رہی تھیں۔ بس ذرا سائز اصل سے چھوٹے معلوم ہو رہے تھے۔ وہ ٹین کی چادروں کی لمبی سی دیوار.... ملبہ.... مشینری.... دو رویہ سڑک اور وہ کرین جس پر میرا چڑھنا اور اُترنا گویا تختۂ دار پر چڑھنے اور اترنے کے مترادف رہا تھا۔ دوربین کے ذریعے تو ان میں سے ہر چیز کو بہت صاف اور واضح دیکھا جا سکتا تھا۔

میں نے چارلس، کیتھرین اور سیوبک کو کھڑکی کے قریب آنے کا اشارہ کیا پھر بطورِ خاص چارلس کو مخاطب کیا "آپ اس چکر کے بارے میں جاننا چاہ رہے تھے۔ یہاں کھڑے ہو کر سارا چکر زیادہ بہتر طور پر آپ کی سمجھ میں آ سکے گا۔"

"کچھ کچھ تو میری سمجھ میں آ گیا ہے۔" چارلس بولا۔ "لیکن کچھ کڑیاں نہیں مل رہیں۔ ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ حمان بلا کا شاطر بھی ہے اور چھلاوے کی طرح پھرتیلا بھی۔ اس میں کوئی افسانہ طرازی شامل نہیں ہے۔ اس کا مجھے یقین آ گیا۔ اگر ہم اتنے افراد کی صلاحیتیں یکجا نہ ہوتیں تو وہ بہت آسانی سے اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا۔"

"بے شک۔ ایک باریک سے نکتے کی وجہ سے تو میں بھی اس کی ذہانت کا قائل ہو گیا ہوں لیکن نہ جانے کس معجزے کے تحت میری ذہانت اس حد تک بیدار ہو گئی کہ اچانک..... عین وقت پر ہی اس کا چکر میری سمجھ میں آ گیا۔"

قریب سے ہی کیتھرین نیچی آواز میں بولی۔ "میں نے تمہیں خواہ مخواہ ہی تو استاد تسلیم نہیں کیا ہے۔ تم خود بھی ایک غیر معمولی ذہین آدمی ہو لیکن انکساری کی وجہ سے نہ تو اس کا اظہار کرتے ہو اور نہ اس بات کو تسلیم کرتے ہو۔ بہرحال..... یہ بھی کوئی بُری بات نہیں ہے۔"

"میں اسی میں خوش ہوں کہ مجھے جو بھی مسئلہ درپیش ہوتا ہے وہ کسی نہ کسی طرح میری سمجھ میں آ جاتا ہے اور کسی نہ کسی طرح حل بھی ہو جاتا ہے۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ اپنے تجزیے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کہا پھر بہت دور نظر آنے والی ٹین کی لمبی سی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ "لہریے دار ٹین کی چادروں سے بنائی گئی اس دیوار کو دیکھ رہے ہیں آپ لوگ؟"

سب نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے کہا۔ "ان میں سے پہلے ٹکڑے پر سفید رنگ کیا گیا ہے۔ اگر آپ اسے دوربین سے دیکھیں تو لہروں سے قطع نظر وہ ٹکڑا آپ کو سینما کی اسکرین کی طرح دکھائی دے گا۔"

چارلس کے پاس اپنی دوربین ابھی تک موجود تھی۔ کیتھرین اور سیوبک اپنی رائفلوں پر لگی ہوئی دوربینوں کے ذریعے دیکھنے لگے۔ اب سڑک پر دونوں طرف ٹریفک بھی چل رہا تھا۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ائرپورٹ سے آنے والی ٹریفک کو اس دیوار کے سامنے سے گزرنا تھا اور ہر گاڑی سب سے پہلے اس سفید اسکرین کے سامنے سے ہی گزرتی۔ ٹھیک ہے نا؟"

"ہاں.... اس میں تو کوئی شک نہیں۔" چارلس دوربین آنکھوں سے ہٹائے بغیر بولا۔ "یہ دیوار کمپنی نے ضرور بنائی تھی لیکن اس ایک چادر پر یہ سفید رنگ انہوں نے یقیناً نہیں کیا ہوگا۔ یہ حمان نے یا تو خود کل شام کے بعد کسی وقت کیا ہوگا یا کمپنی کے کسی مزدور وغیرہ کو کچھ دے دلا کر کرایا ہوگا۔ کیونکہ کل صبح جب ہم نے اس جگہ کا معائنہ کیا تو اس چادر پر سفید رنگ نہیں تھا۔"

چارلس نے آنکھوں سے دوربین ہٹا کر اُلجھن آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "کسی نے بھی اس سفید ٹکڑے کی طرف توجہ نہیں دی لیکن یہ صبح سے میری نظر میں کھٹک رہا تھا۔ تاہم میں بھی آخری وقت تک اس کا مصرف نہیں سمجھ سکا لیکن میرے ذہن میں سیوبک کے وہ الفاظ مسلسل گونج رہے تھے کہ حمان دھماکا خیز اشیا کا اسپیشلسٹ اور بہت حسابی کتابی آدمی ہے۔ شاید اسی نکتے نے میری رہنمائی کی۔"

"کس طرح؟" سیوبک نے ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کوئی گہرے رنگ کی گاڑی اس سفید اسکرین کے سامنے سے گزرتی ہے تو بہت ہی نمایاں اور واضح نظر آتی ہے۔ عام طور پر نہایت اہم سرکاری مہمانوں کو سیاہ رنگ کی چھ دروازوں والی مرسیڈیز میں لایا جاتا ہے۔ لیڈی ڈائنا بھی ایسی ہی گاڑی میں تھیں۔ ٹین کی اس دیوار کے ایک سرے پر یہ سفید اسکرین تھی اور اس سے کچھ پہلے سڑک پر بورڈ لگا ہوا تھا۔ "حدِ رفتار پچاس کلومیٹر فی گھنٹہ" حمان کو معلوم تھا کہ وہاں پہنچ کر گاڑیوں کی رفتار اگر عین اس کے مطابق نہیں تو اس کے قریب قریب ضرور ہو جائے گی۔ دیوار کے دوسرے سرے پر بلندی پر کرین کا بُوم تھا جس میں سے اصل ہُک نکال دیا گیا تھا اور اس کی جگہ ایک اور ہُک ایک خاص کھانچے میں لٹکایا گیا تھا جو درحقیقت ہُک نہیں بلکہ ذرا سی ٹھیس لگنے پر پھٹ پڑنے والا تباہ کن بم تھا۔"

"میں سمجھ گئی..." کیتھرین جلدی سے بولی۔ "حمان نے اس دیوار کا فاصلہ ناپ لیا ہوگا۔ اس کے حساب کے مطابق ایک مخصوص رفتار سے آتی ہوئی گاڑی جب اس سفید اسکرین کے سامنے آتی تو وہ یہاں ریموٹ کنٹرول کا بٹن دبا تا جس سے وہ ہُک نما بم اس کھانچے سے نکل جاتا جو ریموٹ کنٹرول سے حرکت کر سکتا تھا۔ جس وقت ہُک نما بم نیچے پہنچتا عین اس وقت سیاہ مرسیڈیز اس کے نیچے پہنچ چکی ہوتی۔ یعنی ہُک عین اس مخصوص گاڑی پر ہی گرتا

اور اس کے پرخچے اُڑ جاتے۔ ناکامی کا کوئی امکان نہیں تھا۔"

"بے شک۔" میں نے تائید کی۔ "بلکہ اس بم نے پانی کے ٹینک میں گرنے کے باوجود جتنی تباہی پھیلائی ہے اس سے مجھے اندازہ ہوا ہے کہ اگر حمان کا اندازہ تھوڑا بہت غلط بھی ہو جاتا..... جس کی اس نے یقیناً گنجائش رکھی ہوگی۔۔۔ تب بھی سیاہ مرسیڈیز کو تو بہرحال تباہ کر ہی دیتا کیونکہ پاس چلتی ہوئی کم از کم تین گاڑیاں اس کی تباہ کاری کی زد میں آئی تھیں۔"

چارلس دم بخود کھڑا تھا۔ بیٹی بہرحال باپ سے زیادہ ذہین تھی۔ وہ باپ سے پہلے بات کو سمجھ گئی تھی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "یہ تیاریاں حمان کے لیے زیادہ مشکل بھی ثابت نہیں ہوئی ہوں گی۔ یہ ایک اوپن سائٹ تھی۔ اس نے اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھایا۔ مجھے یقین ہے کہ کل شام وہ کرین آپریٹر کے روپ میں سائٹ پر پہنچا ہوگا۔ کوئی بعید نہیں ہے اس نے کرین آپریٹر کو غائب بھی کر دیا ہو۔ بعد کی تحقیقات سے ایسی بہت سی باتوں کا صحیح پتا چلے گا۔ بہرحال اس روپ میں وہ اپنی تیاریاں کر کے چلا گیا ہوگا۔ تیاریاں زیادہ لمبی چوڑی بھی نہیں تھیں۔ اس نے اپنے کھڑے ہونے کے لیے بھی اس جگہ سے بہت پیچھے ہٹ کر جگہ منتخب کر لی تھی جہاں زیادہ سختی تھی اور زیادہ سیکیورٹی والے پھیلے ہوئے تھے۔"

چارلس جھرجھری سی لے کر بولا۔ "اور اگر یہ بات بروقت تمہاری سمجھ میں نہ آتی تو اس وقت ٹی وی اور ریڈیو کے بعض چینل نہایت جوش و خروش سے ایک افسوسناک خبر نشر کر رہے ہوتے۔"

"پوری بات تو فوری طور پر میری سمجھ میں بھی نہیں آئی تھی۔" میں نے کہا۔ "پہلے تو صرف سفید اسکرین میری نظر میں کھٹکی تھی۔ پھر میں نے دوربین سے کرین کا جائزہ لیتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے ہُک کی ساخت کچھ مختلف اور مشکوک سی تھی۔ یہ ایسی چیزیں تھیں جن تک کسی کا دھیان جانا مشکل ہی تھا۔ ان چیزوں کو دیکھتے ہوئے بھی لوگ نظرانداز کر جاتے ہیں۔ سیکیورٹی والوں نے دھماکا خیز مادے کی تلاش کے لیے آج بھی آلات کی مدد سے تمام مشینری کو چیک کیا تھا لیکن کرین کے ہُک تک جانے کا کسی کو خیال نہیں آیا تھا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد چارلس بولا۔ "حمان کی کوشش کو ناکام بنا دینا ہی ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔ ہمارا اصل مقصد تو پورا ہو گیا ہے..... لیکن پھر بھی حمان کے نکل جانے کا بڑا افسوس رہے گا۔ اس کی کسی واردات میں پہلی بار اس کی اپنی موجودگی کے اتنے واضح آثار نظر آئے تھے۔"

ہمارے قریب ہی کھڑا سیکیورٹی آفیسر بولا۔ "سیکرٹ سروس والوں نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ جس مکان کی چھت پر مسٹر سیوبک کو لفٹ بوائے کا یونیفارم پڑا ملا تھا اس سے آگے حمان کا سراغ لگانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اس کا تعاقب جاری رہے گا۔"

"وہ تو محض رسمی کارروائیاں ہوں گی۔" چارلس منہ بنا کر بولا۔ "وہ تو بس آج ہاتھ آجاتا تو آجاتا۔ اب اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب دوبارہ اس کے بارے میں کوئی خبر سننے کو ملے۔"

حمان کے نکل جانے کا مجھے بھی افسوس تھا۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ "اگر میں زیادہ ضروری کام پہلے نہ کرتا اور کرین پر چڑھ کر اس بم کو بروقت دور نہ پھینکتا تو شاید میں حمان کے تعاقب میں جا سکتا۔"

کیتھرین بولی۔ "لیکن اگر تم جا کر کرین پر نہ چڑھتے تو حمان کو تم پر فائر کرنے کی بھی ضرورت پیش نہ آتی اور ہم اس کی موجودگی سے ہی آگاہ نہ ہو سکتے۔ وہ تو اپنا کام کر کے خاموشی سے نکل جاتا۔"

"ہاں..... یہ بات تو ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔ "لیکن اگر کسی بھی طرح اس کے تعاقب کے لیے میں بھی تم دونوں کے ساتھ شریک ہو سکتا تو شاید وہ نکلنے نہ پاتا۔"

سیوبک ناگواری سے میری طرف دیکھتے ہوئے تیکھے لہجے میں بولا۔ "مسٹر چوہدری! آپ ہم سب کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ میں اور کیتھرین، حمان کا تعاقب کرنے کے اہل نہیں تھے اور ہماری نالائقی کی وجہ سے وہ نکل گیا۔"

"میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ دو سے تین افراد بہرحال بہتر ہوتے ہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"اب تو مجھے بھی افسوس ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ ہم بھی دیکھتے کہ تم کیا تیر چلاتے۔" سیوبک کے لہجے میں پہلے سے زیادہ تیکھا پن جھلک آیا۔

"یہ کیا حماقت ہے؟" چارلس نے بزرگانہ انداز میں ہم دونوں کو ڈانٹا۔ "تم نے تو بچوں کی طرح آپس میں اُلجھنا شروع کر دیا۔ اس معاملے میں تم دونوں ہی کا کردار بے حد اہم رہا ہے۔ میں تم دونوں ہی کا بے پناہ شکر گزار ہوں۔ حکومتِ برطانیہ کے نمائندے کی حیثیت سے میں پوری کوشش کروں گا کہ تم دونوں کا شکریہ ادا کرنے کے لیے مناسب ترین طریقہ اختیار کیا جا سکے۔"

سیوبک استہزائیہ سے انداز میں بولا۔ "کیا ستم ظریفی ہے؟ کبھی کبھی حکومتوں کو مجھ جیسے آدمیوں کی خدمات کی بھی ضرورت پڑ جاتی ہے اور وہ ان پر شکر گزاری کا اظہار بھی کرتی ہیں۔"

"ہاں....." چارلس ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "ڈاکے سے بچنے کے لیے کسی ڈاکو کے مشورے ہی زیادہ مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ میں نے یہ بات بزرگوں سے سنی تھی اور یہ کافی حد تک درست ثابت ہوئی۔"

اس کے بعد چارلس نے مختلف رسمی کارروائیاں پوری کیں۔ کچھ خاص خاص لوگوں کو ہدایات دیں۔ بیشتر لوگ وہاں سے رخصت ہو گئے اور چند منٹ بعد ماحول اس طرح معمول پر آگیا

جیسے وہاں کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

چارلس نے مجھے، سیوبک کو اور کیتھرین کو سیدھے گھر جانے کی ہدایت کی۔ اس نے زور دے کر خاص طور پر کہا کہ ہم اِدھر اُدھر کہیں اور جانے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ اسے خود نہ جانے کہاں سفیر کے پاس پہنچنا تھا جس کی طرف سے اسے ریڈیو پر پیغام ملا تھا۔

وہی مرسیڈیز ہمیں لے جانے کے لیے آگئی جس میں ہم سیوبک کے گاؤں گئے تھے۔ گھر پہنچ کر میں لباس تبدیل کر کے اور تازہ دم ہو کر بیٹھا ہی تھا کہ کیتھرین ایک بار پھر رازدارانہ سے انداز میں میرے کمرے میں آگئی۔

دروازہ بند کر کے اس نے خود ہی مقفل کر دیا اور میرے قریب ہی ایک آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے بغیر کسی تمہید کے نیچی آواز میں بولی۔ "تم ایک عجیب ہی آدمی ہو۔ معلوم نہیں کیوں مجھ سے آن ٹکرائے ہو۔"

"اس میں میرے ارادے کو قطعاً دخل نہیں تھا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "ویسے..... بائی دا وے..... اب مجھ سے کیا خطا ہو گئی ہے؟"

"اب جو بات بھی میرے ذہن پر بوجھ بن رہی ہے وہ میں تمہیں بتائے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"اب اس میں میرا کیا قصور؟" میں نے بے بسی سے کہا۔ "بہرحال تمہارے تازہ ترین بوجھ کی نوعیت کیا ہے؟"

"اس کا تعلق تمہاری ذات سے ہی ہے۔" وہ ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "ویسے اب اس کا تذکرہ کرنے کا کوئی خاص فائدہ تو نہیں ہے۔ پھر بھی میں نے مناسب سمجھا کہ تمہیں آگاہ کر دیا جائے۔ شاید اس سے آگاہ رہنا آئندہ تمہارے لیے مفید ثابت ہو۔ جب تم کرین پر لٹکے ہوئے تھے تو تم پر سائلنسر لگی رائفل سے فائر ہوا تھا اور خدا کا شکر ہے گولی تمہیں نہیں لگی تھی۔ اس کے باوجود مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم پر گولی چلائی گئی ہے اور فوراً ہی میں نے یہ بھی دیکھ لیا تھا کہ گولی کس عمارت کی کھڑکی سے چلائی گئی ہے حالانکہ مجھے ان معاملات میں اپنے بارے میں زیادہ خوش فہمی نہیں ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں کوئی عام لڑکی نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے میں تمہاری یا سیوبک کی برابری نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود سیوبک نے اس وقت ہم سب کو مس گائیڈ کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ایک اور عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ فائرنگ وہاں سے شروع ہوئی ہے۔ اس نے خود بھی بلاوجہ اسی سمت میں فائرنگ شروع کر دی تھی۔ پاپا اور سیکیورٹی والے بھی اُدھر ہی متوجہ ہو گئے تھے۔ جتنی دیر میں انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوتا اتنی دیر میں تمہارا کام تمام ہو سکتا تھا۔"

میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ "یعنی صرف تم اکیلی اصل عمارت کی طرف متوجہ رہی تھیں اور تم نے ہی اس کھڑکی پر فائرنگ کر کے مجھ پر ہونے والی فائرنگ کو روکا؟"

اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا۔ "اس کا مطلب ہے میں جو اس وقت زندہ سلامت بیٹھا نظر آرہا ہوں، خدا کے کرم کے علاوہ اس کا ایک سبب تم ہو؟"

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "لیکن میں تم پر احسان جتانے نہیں آئی ہوں۔ میں تو صرف اس حیرت کا اظہار کرنے آئی ہوں کہ آخر سیوبک کی اس حرکت کا کیا مقصد ہو سکتا تھا؟"

"شاید وہ بے چارہ تمہارے معاملے میں مجھے اپنا رقیب سمجھ رہا ہو اور یہ اس نے مجھے راستے سے ہٹانے کا بہترین طریقہ سوچا ہو۔ اس طرح میرا کام بھی تمام ہو جاتا اور اس پر کوئی الزام بھی نہ آتا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اس بے چارے کو کیا معلوم کہ تم تو مجھ سے جان چھڑانے کا بہانہ تلاش کرتے پھر رہے ہو۔" کیتھرین منہ بنا کر بولی۔ "بہرحال دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب ہم اس شخص کے تعاقب میں دوڑے جسے ہم حمان سمجھ رہے تھے تو سیوبک اس گلی میں گھسا جس میں ہم نے اسے غائب ہوتے دیکھا تھا اور مجھے اس نے عقبی گلی میں جانے کا حکم دیا کہ کہیں حمان اُدھر سے نہ نکل جائے۔ آگے سے وہ گلی بند تھی۔ اس لیے اس طرف سے اس کے فرار ہونے کا امکان ذرا کم ہی تھا۔ میں بے وقوفوں کی طرح پچھلی گلی میں دوڑتی پھرتی رہی۔ مجھے حمان کہیں سے فرار ہوتا دکھائی نہیں دیا۔ البتہ چند لمحے بعد سیوبک صاحب ایک مکان کی چھت سے پچھلی گلی میں کودے اور انہوں نے لفٹ بوائے والا وہ یونیفارم ہوا میں لہراتے ہوئے مجھے مطلع کیا کہ محترم حمان صاحب فرار ہو گئے ہیں اور محترم سیوبک صاحب ان کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکے۔"

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"کیا یہ عین ممکن نہیں کہ جس طرح اس نے حمان کو موقع دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ اس وقت تمہیں شوٹ کرنے میں کامیاب ہو جائے جب تم کرین پر لٹکے ہوئے تھے..... اسی طرح اس نے مجھے ٹرخا کر حمان کو نکل بھاگنے کا موقع بھی دے دیا ہو؟" کیتھرین بولی۔

"اگر تمہارا یہ خیال درست ہو تو تم اس سے کیا نتیجہ اخذ کرو گی؟"

"یہی کہ لیڈی ڈاکنا پر حملے کی سازش میں وہ بھی شریک تھا لیکن ہماری نظر میں نیک نام بننے اور ہماری تیاریوں کی خبر رکھنے کے لیے ہمارے ساتھ آن ملا تھا۔" وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی۔

میں خاموش رہا تو وہ زور دے کر بولی۔ "پاپا نے سیوبک پر اعتبار کر لیا ہے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا کہ ایک انٹرنیشنل قسم کے قاتل کو ہم سے یا ہماری حکومت سے کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے۔"

"پہلے شاید نہ رہی ہو۔ تمہیں دیکھنے کے بعد ہو گئی ہو۔" میں

نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہیں پھر بے وقت مذاق سوجھ رہا ہے۔ اس نے جس وقت ہمارے سفارت خانے کو اس سلسلے میں خط لکھا تھا اس وقت تک شاید اس نے خواب میں بھی مجھے نہ دیکھا ہو۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"خوابوں کی بات مت کرو۔ تمہیں کیا معلوم کہ اس کے خوابوں میں کیا کچھ آتا ہو اور کون کون آتا ہو۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"خدا کے لیے تم غیر سنجیدگی چھوڑ دو۔" کیتھرین گویا عاجز آکر بولی۔ "میں ایک گہری سازش کی بو سونگھ رہی ہوں اور تم میری بات پر کان ہی نہیں دھر رہے۔"

"یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے؟" میں نے تاسف زدہ لہجے میں کہا۔ "تم کبھی بھلی بے فکری سے گھوما کرتی تھیں۔ نہایت منافع بخش دھندے کیا کرتی تھیں۔ یکدم ہی گہری اور بین الاقوامی سازشوں کی بو سونگھنے کے چکر میں پڑ گئیں۔ خدا تمہارے حال پر رحم کرے۔ ادھر میرا یہ حال ہے کہ مجھے کسی بھی قسم کی سازشوں وغیرہ سے... فی الحال کوئی دلچسپی نہیں۔ کیونکہ کچھ سازشوں نے مجھے خود گھن چکر بنایا ہوا ہے لیکن فرض کرو میں سنجیدہ ہو بھی جاتا ہوں تو اب اس سے کیا حاصل ہوگا؟ سانپ تو نکل چکا ہے اب لکیر پیٹنے کا کیا فائدہ؟"

"ایک سانپ نکل چکا ہے۔" اس نے گویا تصحیح کی۔ "دوسرا سانپ شاید ابھی ہماری آستین میں ہی ہو۔ سیوبک ابھی ہمارے ساتھ ہی ہے۔ مجھے تو یہ بھی کسی سانپ سے کم نہیں لگتا۔"

"کافی ہینڈسم سانپ ہے۔" میں نے سرہلایا۔ اس نے مجھے گھورا تو میں نے جلدی سے کہا۔ "تمہیں اندیشہ ہے کہ سازش کی کوئی کڑی ابھی باقی ہے؟"

"ہاں۔" وہ زور دے کر بولی۔ "میں تم سے یہی کہنا چاہتی تھی کہ ابھی تم بے فکر نہ ہو جانا۔ ہوشیار رہنا۔"

"اُف خدایا!" میں نے بڑبڑانے کے سے انداز میں کہا۔ "میں کس کس کی طرف سے ہوشیار رہوں۔ اچھا... فرض کرو وہ اس سازش میں شریک بھی تھا تو اسے کیا ملا؟"

"ملا تو اس لیے نہیں کہ ان کی سازش ناکام ہو گئی۔ پھر بھی... کم از کم یہ فائدہ تو ہوا ہے کہ سیوبک ہماری گڈ بکس میں آگیا۔ ایک اجرتی قاتل ہوتے ہوئے بھی وہ میرے پاپا جیسے بارسوخ برطانوی کا دوست بن گیا۔ اگر سازش کامیاب ہو جاتی تب بھی وہ ہماری گڈ بکس میں ہی رہتا۔"

"تمہارے ذہن میں یہ خیال کیوں بیٹھ گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ان دو باتوں کی وجہ سے جو میں نے تمہیں بتائی ہیں۔ ایک تو سیوبک کا تمہیں مروانے کی کوشش کرنا۔ پھر مشکوک انداز میں آکر ہمیں حمان کے فرار کی خبر سنانا۔" کیتھرین پُر اعتماد لہجے میں بولی۔

"اہل" تاتلی کا بھائی ہوتا ہے۔ آج کل شرفا میں انتشار پایا جاتا ہے اور ٹھگوں میں بڑا اتحاد دیکھنے میں آتا ہے۔ شاید انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ اتحاد میں ہی ان کی بقا ہے۔ ممکن ہے سیوبک اور حمان نے اس مہم کے سلسلے میں دو نفری یونین بنالی ہو۔"

"تم اس سلسلے میں میری رائے جاننا چاہتی ہو؟"

"ظاہر ہے.... اور میں کس لیے اتنی بک بک کر رہی ہوں؟"

"میری رائے یہ ہے کہ تمہاری رائے کچھ زیادہ صحیح نہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"آج کی دنیا میں ہر انسان دوسرے انسان سے یہی کہتا پایا جاتا ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"تم نے میری رائے مانگی تھی سو میں نے دے دی۔" میں نے کندھے اُچکا کر کہا۔ "میرا خیال ہے سیوبک ہمیں یہ اطلاع دینے میں تو مخلص تھا کہ لیڈی ڈائنا پر قاتلانہ حملہ ہونے والا ہے۔ اس کے بعد جب ہم لوگ اس کے گاؤں گئے اور وہ ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوا اس وقت تک بھی اس کی نیت میں کوئی خاص خرابی نہیں تھی سوائے اس کے کہ وہ تمہاری شخصیت اور صلاحیتوں سے متاثر ہو کر تم پر عاشق ہو چکا تھا لیکن تم چونکہ جواباً اس کی طرف التفات کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھیں چنانچہ اس نے فرض کر لیا کہ اس کی وجہ میں ہوں۔ جوں ہی اس نے موقع دیکھا کہ مجھے راستے سے ہٹایا جا سکتا ہے' اس نے اس سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی۔ اس پر کوئی الزام بھی نہیں آسکتا تھا۔ میرے خیال میں تو معاملہ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔"

اس نے میری رائے سے کچھ زیادہ اتفاق نہیں کیا اور اصرار کرتی رہی کہ میں سیوبک کی طرف سے ہوشیار رہوں۔ آخر میں نے جھنجلا کر کہا۔ "میں اس قسم کے لوگوں کی طرف سے ہوشیار تو رہتا ہی ہوں لیکن اگر تمہاری نصیحت اور تاکید اسی طرح جاری رہی تو میں ابھی جا کر اس کی گردن توڑ دوں گا تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہو جائے۔"

"اس کی گردن توڑنا اتنا آسان نہیں ہوگا' یہ مجھے معلوم ہے۔" وہ منہ بنا کر بولی۔

"تم خواہ مخواہ مجھے کسی شریف آدمی کے قتل پر مت اُکساؤ۔"

"شریف آدمی......؟" وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بے آواز طریقے سے ہنسنے لگی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے گویا بُرا مناتے ہوئے کہا۔ "اتنی شرافت اور شائستگی سے عشق کرنے والے میرے خیال میں شریف آدمی ہی ہوتے ہیں۔"

"تو پھر تم خود کیوں "شریف آدمی" بننے کی کوشش نہیں کرتے؟" وہ شریر نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میں ابھی شرافت کے اس درجۂ کمال کو نہیں پہنچا کہ ایک لڑکی اور دنیا کے مختلف ممالک میں کئی داشتائیں رکھنے کے بعد بھی تم جیسی کسی لڑکی سے نہایت سنجیدگی سے عشق کرنے لگوں۔" میں نے مسکین سی شکل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"تم مجھے باتوں میں بہلانے کی کوشش کرتے ہو۔ مجھے لگتا ہے اصل چکر کچھ اور ہے۔ شاید تم پہلے ہی سے کسی کے عشق میں گرفتار ہو اور خالص مشرقی انداز میں اس عشق کی "لاج" رکھ رہے ہو۔ کوشش کر رہے ہو کہ کسی اور کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو۔" پھر وہ رازدارانہ سے انداز میں میری طرف جھکتے ہوئے بولی۔ "سچ سچ بتادو..... کیا وہ لڑکی بہت خوبصورت ہے جس سے تمہارے عہد و پیماں چل رہے ہیں؟"

"کون سی لڑکی؟ کیسے عہد و پیماں؟ کیوں دل کے زخموں کو چھیڑتی ہو۔ اپنی ایسی قسمت کہاں کہ کسی خوبصورت لڑکی سے عہد و پیماں ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"اپنی! تم اول درجے کے بدمعاش اور جھوٹے ہو۔" وہ مجھ سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"تعریف کا شکریہ..... لیکن میرا خیال ہے میں ابھی اس بلند مقام کو نہیں پہنچا۔" میں نے انکساری سے کہا۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی۔ کیتھرین نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ چارلس بریف کیس ہاتھ میں لیے کھڑا تھا۔ یہ حضرت بھی عجیب ہی بزرگوار تھے۔ موصوف جہاں کہیں بھی ہوتے تھے' غالباً انہیں احساس ہو جاتا تھا کہ ان کی بیٹی پر رومانوی جذبات غالب پا رہے ہیں اور وہ مجھ پر مہربان ہونے لگی ہے۔ وہ فوراً مجھے اس کے حسین "شر" سے بچانے کے لیے پہنچ جاتے تھے۔ میں سچ مچ ان کا شکرگزار تھا۔

چارلس ہیٹ اُتار کر' بریف کیس ایک طرف رکھ کر دھم سے کاؤچ پر گرتے ہوئے بولا۔ "میں جب راہداری میں داخل ہوا تو میں نے ایک سایہ اگلے کسی کمرے کی طرف غائب ہوتے دیکھا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ اس کمرے کے دروازے پر' کی ہول پر جھکا ہوا تھا۔"

"وہ سیوبک کے علاوہ بھلا کون ہو سکتا ہے۔" کیتھرین فوراً بولی۔ "اس فلور پر ہمارے علاوہ صرف وہی مقیم ہے لیکن یہاں آنے سے پہلے میں نے کی ہول کے ذریعے اس کے کمرے میں جھانک کر دیکھا تھا۔ اس وقت وہ سو رہا تھا۔"

"ہو سکتا ہے اسے پہلے ہی معلوم ہو گیا ہو کہ کوئی اس کے کمرے میں جھانکنے والا ہے۔ اس کی تسلی کے لیے وہ جلدی سے اسٹیج سجا کر سونے کا ڈراما کرنے لگا ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ویسے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ اس فلور پر سب ایک دوسرے کے کمروں میں جھانکتے پھر رہے ہیں۔ آخر پرائیویسی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

کیتھرین نے مجھے گھورا۔ چارلس کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "ہاں' ویسے بھی ہم چاروں اب ایک دوسرے کے

ساتھی بن چکے ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہیں رہنا چاہیے۔"

"آپ کی بیٹی کے خیالات سیوبک کے بارے میں بہت مختلف ہیں۔" میں نے کیتھرین کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ مجھے احساس تھا کہ وہ مجھے گھور رہی تھی۔ "اس کا خیال ہے کہ سیوبک بھی حمان کا ساتھی ہو سکتا ہے..."

میں نے اسے وہ تمام گفتگو سُنا دی جو میرے اور کیتھرین کے درمیان ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ اس سلسلے میں اپنی رائے بھی بے تکلفی سے ظاہر کر دی۔ چارلس نے اس کا قطعاً برا نہیں منایا بلکہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے تمہاری رائے درست معلوم ہوتی ہے۔ وہ شادی شدہ سہی، کتنی ہی عورتوں سے اس کا واسطہ سہی... لیکن بہرحال انسان ہے، مرد ہے.... کیتھرین پر کوئی بھی مرد عاشق ہو سکتا ہے...."

چارلس نہایت اطمینان سے بیٹی کے بارے میں اظہارِ خیال کر رہا تھا۔ اسے گویا اپنی بیٹی کی شخصیت کے اس کشش انگیز پہلو پر فخر تھا کہ اس پر کوئی بھی مرد عاشق ہو سکتا تھا۔ اس نے تو شاید مجھے بھی اپنی صاحبزادی کے عاشقوں میں شمار کر لیا تھا۔ فی الحال میں نے اس کی یہ غلط فہمی دور کرنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ اس نے میرے بارے میں ابھی کوئی اظہارِ خیال نہیں کیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "بہرحال میں اس بات کو بُرا نہیں سمجھتا اور نہ ہی فی الحال اسے اہمیت دینے کے لیے تیار ہوں۔ وہ گاؤں واپس جائے گا یا کسی نئے "کنٹریکٹ" میں مصروف ہو جائے گا تو سب کچھ بھول جائے گا۔" اس کے لہجے میں گویا تجربہ بول رہا تھا اور وہ اپنی جگہ نہایت مطمئن نظر آ رہا تھا۔

پھر وہ اُٹھتے ہوئے بولا۔ "میں تو اس وقت سیوبک سے ہی بات کرنے جا رہا ہوں۔ عملی طور پر اس کا کچھ شکریہ ادا کرنا ہے۔ میں اس لیے راستے میں رک گیا تھا کہ تم دونوں کو بھی ساتھ لے لوں۔"

میں اس کے ساتھ جانا نہیں چاہتا تھا لیکن نہ جانے کیوں چارلس مجھے ساتھ لے جانے پر تُلا ہوا تھا۔ کیتھرین بھی ساتھ جانے کی کچھ ایسی زیادہ خواہشمند معلوم نہیں ہوتی تھی لیکن ہم دونوں ہی کو جانا پڑا۔ ہم دُم چھلّوں کی طرح اس کے ساتھ ہو لیے۔

چارلس کی دستک کے جواب میں سیوبک نے آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا گویا وہ سوتے سے اٹھا ہو۔ کیتھرین نے یوں میری طرف دیکھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کہہ رہی ہو... "ذرا دیکھو تو... خبیث کیسی ایکٹنگ کر رہا ہے!"

چارلس نے اس سے معذرت کی کہ وہ اس کے آرام میں مخل ہوا تھا پھر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا "لیکن میرے پاس وقت کم ہے اور کام بہت سے نمٹانے ہیں اس لیے میں چلا آیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" سیوبک ذرا خشک لہجے میں بولا۔ اس کی آواز میں واقعی غنودگی کی جھلک نہیں تھی۔ اندر پہنچ کر چارلس نے بڑی احتیاط سے دروازہ بند کر دیا۔

ہم تینوں بیٹھ چکے تو چارلس بریف کیس گھٹنوں پر رکھتے ہوئے بولا۔ "سیوبک! میں بلا تمہید بات کروں گا۔ میں غیر رسمی طور پر اپنی حکومت کی طرف سے تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم نے نہ صرف ہمیں خبردار کیا بلکہ لیڈی ڈائنا کے قتل کی سازش کو ناکام بنانے میں عملی طور پر ہمارے ساتھ شریک رہے۔ تم نے دو ملین پاؤنڈ کی رقم کو بھی ٹھکرا دیا۔ یعنی مالی طور پر بھی ایک بڑا نقصان برداشت کیا۔ ہم صحیح طور پر تو تمہارے اس احسان کا بدلہ نہیں چکا سکتے لیکن تمہارے نقصان کی کچھ نہ کچھ تلافی کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

سیوبک بیڈ کے کنارے پر بیٹھا ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی شرٹ کا گریبان کھلا تھا۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ نہایت مضبوط ورزشی جسم کا مالک تھا مگر خاصا دُبلا اور ہلکا پھلکا نظر آتا تھا۔

چارلس نے بریف کیس کھولا اور میں ذرا چونکا۔ بریف کیس برطانوی کرنسی نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ چارلس بریف کیس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "میں یہ ایک ملین پاؤنڈ کی رقم تمہاری خدمت میں پیش کرتا ہوں۔"

سیوبک کے سپاٹ چہرے پر کوئی تاثر نہ اُبھرا اور نہ ہی اس نے بریف کیس لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ایک لمحے کے لیے کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ چارلس بریف کیس کچھ اور آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ "یہ لے لو نا......"

سیوبک کچھ بدلے بدلے اور مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ "محترم چارلس! مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ اسے آپ واپس رکھ لیں۔ البتہ اس کے بجائے اگر آپ مجھے کچھ اور عنایت فرما سکیں تو میں تا زندگی آپ کا شکر گزار رہوں گا۔"

"وہ کیا؟" چارلس نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

"آپ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں محترمہ کیتھرین صاحبہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اس کا لہجہ پہلے سے بھی زیادہ مؤدبانہ تھا اور وہ حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ چارلس گویا بھونچکا سا رہ گیا تھا اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا تھا۔ میں نے پوری پوری کوشش کی کہ کسی ردِ عمل کا اظہار نہ کروں اور دوسروں کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہوں۔ کیتھرین کے چہرے پر مجھے معمول سے کچھ زیادہ سرخی نمودار ہوتی دکھائی دی۔

آخر چارلس بولا۔ "تم واقعی سنجیدہ ہو یا یہ کسی قسم کا مذاق ہے؟ کوئی ڈراما وغیرہ بول رہے ہو؟"

"آپ اسے مذاق سمجھ رہے ہیں؟" سیوبک گویا گہری تکلیف محسوس کرتے ہوئے بولا۔ "میں زندگی میں کبھی اس سے زیادہ سنجیدہ نہیں ہوا۔ بلکہ میں سوچ رہا ہوں کہ زیادہ سنجیدگی کے اظہار کے لیے خالص اپنے قبائلی انداز میں آپ سے درخواست کروں۔"

وہ بیڈ سے اُتر آیا اور کچھ اس طرح ایک گھٹنے کے بل بیٹھ گیا جس طرح پُرانے رومن درباری اپنے شہنشاہ کو سلام کرنے کے لیے بیٹھتے تھے۔ اس نے چارلس کے ہاتھوں سے بریف کیس لے کر بند کر کے اسی کے پاس رکھ دیا اور نہایت احترام سے سر جھکاتے ہوئے پہلے چارلس کے دونوں پاؤں چھوئے۔ پھر اس کا ایک ہاتھ تھام کر دونوں آنکھوں سے لگا کر چوما اور اسی ہاتھ کو اپنے سینے سے لگا کر سر جھکاتے ہوئے نہایت عاجزانہ لہجے میں بولا۔ "محترم چارلس! میں اپنی درخواست دُہراتا ہوں اور آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کی بیٹی کو خوش رکھنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ اسے تمام نعمتیں اور آسائشیں بہم پہنچانے کے لیے جدوجہد کروں گا۔"

پھر وہ ذرا سیدھا ہوتے ہوئے بولا۔ "ہمارے قبیلے میں بڑے سے بڑا آدمی اس طرح کسی کی بیٹی سے شادی کی درخواست کرتا ہے۔ میں نے اپنے قبیلے کی یہ ابتدائی رسم ادا کر دی ہے۔ اب آپ مجھے کوئی وقت دے دیں تاکہ میں اپنے قبیلے کے دو تین بزرگوں کو لے کر آجاؤں اور ایک باضابطہ ملاقات میں شادی کی تاریخ طے پا جائے۔"

چارلس تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ "مجھے تم سے اس مسخرے پن کی توقع نہیں تھی سیوبک! ہم نہایت سنجیدہ ماحول میں نہایت سنجیدہ موضوع پر بات کر رہے تھے۔"

سیوبک کی آنکھیں چھلک گئیں۔ اسے گویا چارلس کے الفاظ سے ایک بار پھر سخت صدمہ پہنچا تھا۔ وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔ "مسٹر چارلس! ہم جب قبائلی انداز میں کوئی بات کرتے ہیں اور قبائلی انداز میں کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ہم بے حد سنجیدہ ہوتے ہیں۔ آپ اسے کوئی معمولی یا مذاق کی بات نہ سمجھیں کہ ایک قبیلے کا سردار...... اور وہ بھی سیوبک جیسا سردار آپ کی بیٹی سے محض دوستی یا وقت گزاری کا نہیں، بلکہ شادی کا خواہشمند ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ اس "اعزاز" کے ذکر پر کیتھرین کے چہرے کی سرخی بڑھ گئی لیکن اس نے اب بھی گفتگو میں کوئی مداخلت نہ کی۔ شاید فی الحال باپ ہی اس کے جذبات کی صحیح ترجمانی کر رہا تھا۔

چارلس اب گویا واقعی سیوبک کے لہجے کی سنجیدگی کو محسوس کرتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم تو پہلے ہی سے شادی شدہ ہو اور کئی ملکوں میں تمہاری داشتائیں بھی موجود ہیں۔"

سیوبک کے چہرے پر ایک لمحے کے لیے کھنچاؤ سا آگیا اور وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "داشتاؤں کی اس وقت کوئی بات نہیں ہو رہی۔ اس وقت صرف شادی کی [illegible] رہی ہے اس لیے تم صرف بیوی کا تذکرہ کر سکتے ہو۔ تمہیں میری پہلی بیوی کی موجودگی پر اعتراض نہیں ہونا چاہیے کیونکہ...."

جملہ ادھورا چھوڑ کر اس نے اپنی ڈھیلی ڈھالی قمیص اور پتلون کی جیبیں ٹٹولیں اور بالآخر مُڑا تُڑا سا ایک کاغذ نکال کر چارلس کی طرف بڑھا دیا۔ چارلس نے ہچکچاتے ہوئے کاغذ ہاتھ میں لیا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اس پر کسی ایسی زبان میں کچھ لکھا ہوا تھا جو میرے لیے بھی ناقابلِ فہم تھی۔

"یہ کیا ہے؟" چارلس نے اُکھڑے اُکھڑے سے لہجے میں پوچھا۔

"میری پہلی بیوی کی طرف سے شادی کا اجازت نامہ۔" وہ اطمینان سے بولا۔ "اس نے مجھے لکھ کر دے رکھا ہے کہ میں جب چاہوں، جہاں چاہوں اور جتنی چاہوں شادیاں کر سکتا ہوں، اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"بہت خوب۔ بہت خوب۔" چارلس زہریلے لہجے میں بولا لیکن وہ کچھ ایسی نظروں سے سیوبک کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے اسے اب بھی اُمید تھی کہ سیوبک کسی بھی لمحے کہہ دے گا، وہ تو مذاق کر رہا تھا لیکن چارلس کی یہ اُمید پوری نہ ہو سکی۔ سیوبک نہایت سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا گویا اس کے جواب کا منتظر ہو۔

آخر چارلس گہری سانس لے کر بولا۔ "بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم نے اپنی پہلی بیوی سے آئندہ شادیوں کی پیشگی اجازت لے رکھی ہے اور اس کی طرف سے "این او سی" ہر وقت جیب میں لیے پھرتے ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ تم آئندہ جو شادی کرو گے اس بیوی کی طرف سے بھی اس قسم کا اجازت نامہ ہر وقت تمہاری جیب میں پڑا رہا کرے گا۔ یہ سلسلہ غالباً تمہارے مرنے یا انتہائی ضعیف اور عمر رسیدہ ہو جانے تک چلتا رہے گا۔"

وہ بے پروائی سے کندھے اُچکاتے ہوئے بولا۔ "اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔ اگر حالات اجازت دیتے ہوں یا حالات کا تقاضا ہو اور انسان افورڈ بھی کر سکتا ہو تو اسے ایک سے زیادہ شادیاں کر لینی چاہئیں۔"

"لیکن ہمارے ہاں ایسا نہیں ہوتا سیوبک!" چارلس ذرا سخت لہجے میں بولا۔ "ہمارے ہاں نہ تو کوئی لڑکی پہلی بیوی کی موجودگی میں کسی مرد کی دوسری بیوی بننا پسند کرتی ہے اور نہ ہی قانوناً ایسا ہوتا ہے۔ اس لیے تم اس احمقانہ بحث کو یہیں ختم کر دو۔"

"تمہارے ہاں تو لڑکیاں بغیر شادی کے بھی مردوں کے ساتھ رہ رہی ہیں۔ غالباً تمیں چالیس فیصد جوڑے اسی طرح رہ رہے ہیں۔" سیوبک چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"بات شادی کی ہو رہی ہے اس لیے صرف شادی کے قوانین کا ذکر کرو۔" چارلس نے اسی لہجے میں کہا جس میں چند لمحے پہلے سیوبک نے بات کی تھی۔

"اگر تم چاہو تو میں اپنی پہلی بیوی کو طلاق بھی دے سکتا ہوں۔" سیوبک ملائمت سے بولا۔

"یہ اور بھی بُری بات ہوگی۔" چارلس بولا۔

"تم اپنی بیٹی سے تو کچھ پوچھ ہی نہیں رہے۔ خود ہی گفتگو کیے جا رہے ہو۔" سیبوبک، کیتھرین کی طرف دیکھے بغیر بولا۔

"میں اس لیے خود ہی ساری گفتگو کیے جا رہا ہوں کہ کیتھرین سے تمہیں کہیں اور زیادہ سخت و ناگوار جواب سُننے کو نہ ملے۔ میں تو پھر بھی بڑی عمر کا ایک جہاندیدہ آدمی ہوں۔ تحمل مزاجی کا مظاہرہ کر سکتا ہوں لیکن کیتھرین..." اس نے ٹھنڈی سانس لے کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"پھر بھی... ہمیں محترمہ کیتھرین سے ان کی مرضی تو معلوم کر لینی چاہیے۔" سیبوبک ایک بار پھر بڑے مؤدبانہ لہجے میں بولا اور اتنی دیر میں اس نے پہلی مرتبہ کیتھرین کی طرف دیکھا۔ اس کی سنجیدگی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ "آپ کیا کہتی ہیں محترمہ کیتھرین؟"

"میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں زبان کے بجائے ہاتھ... بلکہ لات سے جواب دوں۔" کیتھرین گہری سانس لے کر بولی۔ "اگر تم بُرا نہ مناؤ تو میں تمہارے منہ پر ایک لات رسید کر دوں؟ مجھے اُمید ہے یہ خاصا تسلی بخش جواب ثابت ہوگا۔"

سیبوبک کی رنگت متغیر ہوگئی۔ وہ گویا بڑی مشکل سے خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کو محتاط انداز میں بات کرنی چاہیے محترمہ کیتھرین! میں فی الحال اپنے قبیلے کے رسوم و رواج کے مطابق آپ سے بات کر رہا ہوں۔"

"بات تو میں احتیاط سے ہی کر رہی ہوں۔ البتہ لات کے استعمال میں شاید میں زیادہ احتیاط نہ کروں۔" کیتھرین اسے صحیح معنوں میں خار دلانے والے انداز میں بولی۔

اب سیبوبک میری طرف دیکھتے ہوئے شائستگی سے بولا۔ "کیا اس خاتون کے جارحانہ رویے کی وجہ تم ہو؟ کیا اس کے ساتھ تمہارا کوئی معاملہ چل رہا ہے؟ کیا شادی وغیرہ کا وعدہ ہو چکا ہے؟"

"اپنی ایسی قسمت کہاں کہ کوئی حسین لڑکی ہم سے شادی یا وغیرہ وغیرہ کرے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ویسے یہ پہلا اور آخری موقع ہے کہ میں اپنی نجی زندگی کے بارے میں کسی سوال کا جواب دے رہا ہوں۔ وہ بھی محض اس لیے کہ تمہیں کافی ذلیل ہوتے دیکھ کر مجھے ترس آ گیا ہے۔ براہِ کرم آئندہ مجھ سے میرے نجی معاملات کے بارے میں کوئی سوال نہ کرنا۔"

میرے اہانت آمیز لہجے کے باوجود محض میری زبانی یہ سُن کر سیبوبک کے چہرے پر کچھ طمانیت جھلک آئی کہ کیتھرین مجھ پر مہربان نہیں تھی۔ کیتھرین ترحم آمیز سی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "تم نے خواہ مخواہ بے چارے افضل چوہدری کو اپنا رقیب سمجھتے ہوئے مروانے کی کوشش کی تھی۔ تم پہلے ہی ہم سے پوچھ لیتے۔"

"تمہیں شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔" وہ نرمی سے بولا۔ "اگر میں افضل چوہدری کو مارنے یا مروانے کا ارادہ کر لوں گا تو پھر یہ اس طرح بیٹھا ہمارے ساتھ باتیں کرتا نظر نہیں آئے گا۔ اس کی گفت و شنید پھر عالمِ بالا پر روحوں سے ہی ہوگی۔" اس کا لہجہ نرم تھا مگر اس میں تکبر بول رہا تھا۔

متکبر لوگوں پر مجھے رحم آنے لگتا تھا۔ پہلے تو میرا اسے کوئی بھی جواب دینے کو جی نہ چاہا لیکن پھر میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔ "یہ بات میں پہلے بھی کئی لوگوں سے سُن چکا ہوں۔ میں تو اسی دنیا میں موجود ہوں لیکن ان کی شاید ہڈیاں بھی گل چکی ہوں۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور چارلس کی طرف دیکھ کر اُٹھتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے ہماری گفتگو کسی نتیجہ خیز موڑ پر پہنچتی نظر نہیں آ رہی۔ اس کے باوجود میں کل اپنے قبیلے کے تین چار بزرگوں اور تین چار دوسرے لوگوں کے ساتھ... یہاں آؤں گا۔ ہم ذرا مختلف ماحول میں بیٹھ کر بات کریں گے۔ شاید تم یا کیتھرین خود اپنی رائے بدل لو۔"

وہ اپنے کپڑے اور دو چار دوسری چیزیں ٹریولنگ بیگ میں ڈالنے لگا۔ اس کے لہجے میں ایک نہایت ہی ملائم سی دھمکی پنہاں تھی لیکن چارلس شاید اس پر دھیان دیے بغیر دوستانہ سے لہجے میں بولا۔ "کیا تم گاؤں واپس جا رہے ہو؟"

"ہاں۔" سیبوبک نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔" چارلس بولا۔ "تمہارا آج جانے کا پروگرام تو نہیں تھا۔"

"میں نے پروگرام بدل لیا ہے۔" وہ بے نیازی سے بولا۔ "میرے یہاں بے کار پڑے رہنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بہرحال... کل تم سے پھر ملاقات ہوگی۔"

"اگر کل بھی تم یہی باتیں کرنے کے لیے ملاقات کرنا چاہتے ہو تو میرے خیال میں تم خواہ مخواہ ہی ان نامعلوم بزرگوں اور دیگر لوگوں کو تکلیف دو گے۔ میرا جواب کل بھی یہی ہوگا۔ تمہیں معلوم ہے ہم مغربی لوگوں کے ہاں ویسے بھی اولاد کے بالغ ہونے کے بعد والدین کو ان پر کوئی اختیار نہیں رہتا۔ اگر کیتھرین راضی ہوتی تو میری ہاں یا نہ سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ مجھے تم کو یہ سب باتیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا کا کوئی گوشہ تمہارے لیے اجنبی نہیں ہے۔ ہر جگہ کے قوانین اور رسوم و رواج کے بارے میں تم جانتے ہو۔" چارلس کا انداز اب بھی سمجھانے والا اور صلح جویانہ تھا۔

"وہ سب اپنی جگہ ٹھیک ہے... سب کچھ مجھے معلوم ہے لیکن میں ایک کام سنجیدگی سے کرنا چاہتا ہوں۔ شادی بیاہ کا معاملہ ہمارے ہاں قبائلی طریقے سے ہی طے ہوتا ہے۔ سو میں اپنی رسمی کارروائی پوری کر رہا ہوں۔ تمہیں فیصلہ کرنے کا اختیار دے رہا ہوں۔ ورنہ یوں تو دنیا کے باقی معاملات ہم دنیا کے طور طریقوں کے مطابق کرتے ہی رہتے ہیں۔"

وہ گویا کچھ اس قسم کی بات کر رہا تھا کہ فی الحال تو وہ سیدھی انگلیوں سے گھی نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ چارلس اور کیتھرین کی بھلائی اسی میں تھی کہ اسی دوران اس کی بات مان لی جاتی ورنہ پھر وہ کوئی اور طریقہ آزمائے گا۔ اگر کیتھرین اس کے قبائلی یا "سنجیدہ" طریقے کے مطابق شادی پر آمادہ نہ ہوئی، کسی اور طرح بھی اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے اس کے "حرم" میں داخل ہونے کے لیے تیار نہ ہوئی تو پھر وہ کوئی اور تدبیر کرے گا۔ کم از کم مجھے تو اس کا مفہوم یہی محسوس ہوا۔

چارلس اگر اس کے اس مفہوم کو پہنچ بھی گیا تھا تب بھی اس نے گویا اسے کوئی اہمیت نہ دی اور دوستانہ ہی لہجے میں بولا۔ "تم واقعی یہ رقم نہیں لے رہے؟" اس نے بریف کیس کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے... میں نے دولت کی خاطر زندگی میں بہت کچھ کیا ہے لیکن انسان کی زندگی میں ہمیشہ دولت ہی سب کچھ نہیں رہتی۔ کبھی کبھی وہ دولت سے ہٹ کر بھی کچھ سوچنے لگتا ہے۔ اس کے دل میں کچھ اور تمنائیں بھی جاگ اُٹھتی ہیں۔ اگر تم کیتھرین کو مجھ سے شادی پر آمادہ کر سکو تو اس سے زیادہ رقم میں خود تمہاری یا کیتھرین کی خدمت میں پیش کر سکتا ہوں۔"

"ابھی میں نے بیٹی کو... یا میری بیٹی نے خود کو بیچنا شروع نہیں کیا۔" میں نے چارلس کے لہجے میں پہلی بار تلخی محسوس کی۔ "میرا خیال ہے تمہارا چلے جانا ہی بہتر ہے۔ براہِ کرم دوبارہ آنے یا کسی کو ساتھ لانے کی کوشش نہ کرنا۔ میں اب محسوس کر رہا ہوں کہ میں نے تمہارے پاس آ کر غلطی کی تھی۔"

"اگر تم میرے پاس نہ آتے تو یہ تمہاری اور بھی زیادہ بڑی غلطی ہوتی۔" سیبوبک بیگ کی زِپ بند کرتے ہوئے بولا۔ "تمہارے ملک اور تمہاری حکومت پر اس وقت تک ایک سانحہ گزر چکا ہوتا۔"

"تم نے صرف اس سانحے کی پیشگی نشاندہی کی لیکن اسے روکنے کا کریڈٹ اب تمہیں نہیں جاتا۔ اس کے باوجود میں تمہارا شکرگزار تھا اور اس شکرگزاری کا اپنا سا اظہار بھی کرنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن..." چارلس کندھے اُچکا کر رہ گیا۔

تاہم اس مرحلے پر بھی وہ اپنی وضع داری کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ سیبوبک بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھا تو چارلس بولا۔ "ایک منٹ ٹھہرو، میں انٹرکام پر ڈرائیور سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ تمہیں چھوڑ آئے گا۔"

"اس تکلف کی ضرورت نہیں۔" سیبوبک رُکھائی سے بولا۔ "میں نے فون کر دیا تھا۔ میرے لیے گاڑی آ چکی ہے۔ نیچے کھڑی ہے۔ تمہارے علاوہ بھی اس شہر میں میرے کچھ مہربان ہیں۔"

"اچھا... جیسے تمہاری مرضی۔" چارلس تحمل سے بولا۔

سیبوبک رخصت ہو گیا۔ چارلس اس کے ساتھ سیڑھیوں تک گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا اور تھکے تھکے انداز میں کاؤچ پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "کبھی کبھی حالات کی طرح انسان بھی اچانک ہی بدل جاتے ہیں۔"

پھر اس نے بغور اپنی بیٹی کی طرف دیکھا اور کسی تشویش زدہ نقاد کی طرح بولا۔ "تم جیسی بہت سی لڑکیوں تک اس کی رسائی ہے اور مزید بھی ہو سکتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا اسے تم میں ایسی کیا خاص بات نظر آ گئی ہے جو وہ پنجے جھاڑ کر تمہارے پیچھے پڑ گیا ہے۔"

میں اس موقع پر بھی اپنی رائے کا اظہار کیے بغیر نہ رہ سکا۔ "میرے خیال میں جب سیبوبک نے کیتھرین کو اپنے پہلوانِ اعظم کی دُرگت بناتے دیکھا اور پھر آج کے آپریشن میں حصہ لیتے دیکھا تو اس کے ذہن میں کچھ تحریک پیدا ہوئی۔ اسے کیتھرین کام کی لڑکی نظر آئی ہے۔ وہ شاید دل ہی دل میں کسی اور حساب سے پلاننگ کر رہا ہے۔ ازدواجی زندگی اس کی نظر میں نہیں ہے..." پھر میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کیتھرین کو مخاطب کیا۔ "اس کے باوجود تمہیں شکر کرنا چاہیے۔ ایسے عاشق ہر کسی کو کہاں میسر آتے ہیں۔ تمہیں اس کی قدر کرنی چاہیے۔ اتنی ضد کر رہا ہے بے چارا شادی کے لیے۔"

"اگر تم نے اسے میرا عاشق کہا تو میں پاپا کا بریف کیس تمہارے سر پر دے ماروں گی۔" اس نے آنکھیں نکالیں۔

"اور پاپا اس سلسلے میں اپنی بیٹی کی مدد کریں گے۔" چارلس خوش دلی سے بولا۔

"آپ میری کھوپڑی کے بارے میں بُرے بُرے منصوبے بنانا چھوڑیں اور سیبوبک کے بارے میں سوچیں۔" میں نے کہا۔ "وہ تو سنجیدگی سے اپنے قبیلے کے بزرگوں کو لینے چلا گیا ہے۔ کل آن پہنچا تو آپ کیا کریں گے؟ کہیں سفیر کے گھر پر تماشا نہ لگ جائے۔"

"دیکھا جائے گا..." چارلس کسی خاص تشویش کے بغیر بولا۔ "میں اس کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر لوں گا۔ یہ لوگ جب چاہتے ہیں خالص قبائلی بن جاتے ہیں اور جب چاہتے ہیں جدت طرازی میں پیرس اور لاس اینجلس والوں کے کان کترنے لگتے ہیں۔ خیر... ان باتوں کو چھوڑو۔ پہلے ہم ضروری باتیں کر لیں۔"

اس نے بریف کیس اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہارے لیے مجھے کل رقم کا بندوبست کرنا تھا لیکن سیبوبک چونکہ یہ رقم چھوڑ گیا ہے اس لیے اب اسے تم رکھ لو۔"

"کس سلسلے میں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اسے تم ایک طرح کا انعام سمجھ لو۔ سیبوبک نے ہماری تھوڑی سی مدد کی۔ ہم تو اسے بھی انعام سے نوازنا چاہ رہے تھے لیکن وہ کسی اور چکر میں پڑ گیا ہے۔ تم نے تو ہماری مدد کے سلسلے میں اپنی جان کو ہی خطرے میں ڈال لیا تھا۔ میں اپنی حکومت کی طرف سے تمہاری کچھ خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ جب دوسرے لوگ ہماری اہم شخصیات یا شاہی خاندان کے افراد کو مروانے کے لیے پیشہ ور

قاتلوں کو بڑی بڑی رقمیں دے سکتے ہیں تو کیا ہم ان لوگوں کی جان بچانے والوں کو تھوڑا بہت انعام بھی نہیں دے سکتے۔"

"بچانے والا تو صرف وہ ہے......" میں نے خالصتاً درویشانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائی۔ "میں نے تو یونہی معمولی سی کوشش کی تھی۔ میرے ذہن میں کسی انعام یا صلے کا تصور بھی نہیں تھا۔ میں تو یہ سب کچھ صرف شغل شغل میں کر رہا تھا۔ مجھے اس کا کوئی انعام یا معاوضہ نہیں چاہیے۔" میں نے بریف کیس کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا۔

"شغل شغل میں......؟" چارلس نے حیرت اور بے یقینی سے دُہرایا۔ اسے سیو بک کے رویّے نے تو حیران کیا ہی تھا لیکن اب میرا رویّہ شاید اس کے لیے اس سے بھی زیادہ حیرت کا باعث بن رہا تھا۔

میں نے اسے مزید تسلی دی۔ "بے فکر رہیں، میں آپ سے کسی اور صورت میں بھی اپنے تعاون کا صلہ طلب نہیں کروں گا۔"

"تم واقعی سنجیدہ ہو؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"میں اس وقت سیو بک سے بھی زیادہ سنجیدہ ہوں۔ وہ آپ سے رقم کی جگہ کچھ اور مانگنے میں سنجیدہ تھا۔ میں کچھ بھی نہ مانگنے میں سنجیدہ ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"تم کب مانگ رہے ہو۔ یہ رقم تو میں خود دے رہا ہوں۔ اپنی حکومت کے ایک خفیہ فنڈ سے میں نے اس کا بندوبست کرایا ہے۔ اگر سیو بک آج یہ رقم لے جاتا تو کل مجھے تمہارے لیے بندوبست کرنا تھا لیکن اب تم ہی رکھ لو۔ میں تم سے درخواست کر رہا ہوں۔"

"میں آپ سے درخواست کر رہا ہوں کہ اس موضوع کو یہیں ختم کر دیں۔ مجھے دوسری حکومتوں کے تو کیا، اپنی حکومت کے خفیہ فنڈز سے بھی اس انداز میں...... اور اس طرح کی رقمیں لینے کا تصور کبھی اچھا محسوس نہیں ہوا۔ میں کاروباری آدمی ہوں۔ مجھے بس کاروبار کے ذریعے ہی آتی ہوئی رقمیں اچھی لگتی ہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"عجیب آدمی ہو تم!" اس نے بریف کیس کاؤچ پر رکھ دیا۔

"یہ دنیا عجیب آدمیوں سے بھری پڑی ہے۔ سیو بک بھی عجیب آدمی تھا۔ وہ بھی رقم چھوڑ کر چلا گیا۔ حالانکہ وہ رقم کے لیے قتل کرتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اس کا مقصد تو کچھ اور تھا۔ وہ تو یقیناً کسی اور طرح یہ کسر پوری کرنے کی فکر میں تھا لیکن تمہارا سلسلہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" چارلس سر جھٹک کر بولا۔ "معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ دنیا کے تقریباً سبھی ملکوں میں عموماً...... اور چند مشرقی ملکوں میں خصوصاً ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جو اپنے بھائیوں کو اذیت کی موت مروانے کے لیے، ہنگامے کرانے کے لیے، گلی کوچوں میں آگ بھڑکانے کے لیے اور ملک کی جڑیں کاٹنے کے لیے نوٹوں سے بھرے بریف کیس دینے والوں کو ڈھونڈتے پھرتے ہیں اور پھر بھی نیک نام بنے رہتے ہیں۔"

"ہاں...... میں نے سوچا اس قسم کے لوگ تو بہت پائے جاتے ہیں۔ ایک آدھ ذرا کسی اور قسم کا بھی ہونا چاہیے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اصل مسئلہ یہ ہے کہ جن لوگوں میں اس قسم کی بے نیازی دکھانے کا حوصلہ ہوتا ہے وہ میری طرح گمنام رہتے ہیں۔"

چارلس نے اُداس سی نظروں سے بریف کیس کو دیکھا اور اسے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایک بڑی رقم کی اتنی بے قدری بھی ہو سکتی ہے۔"

کیتھرین مسکراتے ہوئے بولی۔ "آپ دل چھوٹا نہ کریں۔ اگر آپ کو اس رقم کے ٹھکرائے جانے کا اتنا ہی دکھ ہو رہا ہے تو لائیں، مجھے دے دیں۔ میں اسے نہایت عزت و احترام سے اپنے سوئس اکاؤنٹ میں جمع کرا دوں گی۔ آخر میں نے بھی تو آج کے آپریشن میں حصہ لیا ہے اور ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ میرے لیے تو کسی انعام کا ذکر ہی نہیں ہو رہا۔"

اس نے بریف کیس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن چارلس نے جلدی سے اسے اُٹھا لیا اور پیچھے ہٹتے ہوئے بولا۔ "یہ امانت ہے۔ جہاں خرچ کرنے کے لیے لائی گئی تھی اگر وہاں خرچ نہیں ہو سکی تو واپس جائے گی۔ تمہارے بارے میں تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔ اب اگر یہ رقم تمہیں دیتا ہوں تو یہ کہیں اقرباپروری ہی نہ ہو جائے۔ ویسے تم نے جو نکتہ اٹھایا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ میں اس کے بارے میں سوچوں گا اور خفیہ فنڈ کے ایک دو نگرانوں سے بھی مشورہ کروں گا تاکہ کل کلاں کو مجھ پر کوئی الزام نہ آسکے۔ میرے خلاف کوئی اسکینڈل نہ بن سکے۔ میں بہت بااختیار ہوں لیکن اپنی نظر میں سُرخرو رہنا چاہتا ہوں۔"

"چھوڑیں پاپا! میں تو مذاق کر رہی تھی۔ میں نے بھی افضل چوہدری کی طرح شغل شغل میں ہی اس آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ اس وقت تو ہمیں معلوم ہی نہیں تھا کہ اس کا کوئی صلہ یا انعام بھی ہو سکتا ہے۔ مجھ جیسی نکمّی اور نالائق بیٹی کی وجہ سے آپ کی نیک نامی ہو جائے، میرے لیے یہی بہت ہے۔" کیتھرین مسکراتے ہوئے بولی۔

"تعجب ہے!" چارلس نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ "تمہارے خیالات میں بھی افضل چوہدری جیسی درویشی آ گئی۔ مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا کہ تمہاری کایا پلٹ چکی ہے۔"

"یقین تو خود مجھے نہیں آ رہا ہے۔" کیتھرین ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

"چلو خیر... دیکھتے ہیں تم پر یہ رنگ کچا چڑھا ہے یا پکا۔" چارلس بولا۔ "مجھے اندیشہ ہے تمہارا یہ روپ عارضی نہ ہو۔"

"مجھے تو لگتا ہے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رنگ اور گہرا ہو گا۔" کیتھرین بولی۔ "لالچ اور چھوٹی چھوٹی خواہشوں کی غلامی سے آزاد ہو کر ایک عجیب سی بے خوفی اور ایڈونچر پسندی کی زندگی گزارنے میں ایک الگ ہی لطف ہے جس سے میں اب تک ناآشنا تھی۔ ایڈونچر پسندی میری زندگی میں پہلے بھی تھی لیکن وہ منفی قسم کی تھی۔"

"کاش اپنے بارے میں تمہارا اپنا یہ اندازہ درست ثابت ہو۔" چارلس ٹھنڈی سانس لے کر بولا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "تم بازار جا کر ایک اچھا سا ڈنر سوٹ خرید و اور آکر تیار ہو جاؤ۔ شام کو تمہیں میرے ساتھ ڈنر پر چلنا ہے جہاں میں تمہیں ہرہائی نس سے ملواؤں گا۔"

"آپ کا مطلب ہے لیڈی ڈائنا سے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" وہ کچھ اس طرح مسکرا رہا تھا جیسے میں یہ خبر سن کر خوشی سے اچھل پڑوں گا۔

"کس لیے ملوائیں گے آپ مجھے ان سے؟"

وہ ایک لمحے کے لیے حیران سا نظر آیا پھر بولا۔ "بس..... ویسے ہی کوئی خاص مقصد تو نہیں ہو گا ملاقات کا۔ فی الحال تو ہم ہرہائی نس کو یہ بھی نہیں بتا سکتے کہ ان پر قاتلانہ حملے کی کوشش ہوئی تھی جسے ناکام بنانے میں تم نے سب سے اہم کردار ادا کیا تھا۔ ہم نہیں چاہتے کہ پریس کو اس بات کی بھنک پڑے۔ اس بات کو راز ہی رکھا جائے گا۔ خود ہرہائی نس زبان کے معاملے میں زیادہ محتاط نہیں ہیں۔"

"مجھے تو اس طرح جا کر بے مقصد ان سے ملنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ "ایک آدھ منٹ کی اس قسم کی ملاقات کے لیے اتنا تردد کرنے کی کیا ضرورت ہے جس میں آپ ان خاتون کو غالباً صرف یہ بتائیں گے۔ ان سے ملیے..... یہ مسٹر افضل چوہدری ہیں..... یہ ایک پاکستانی بزنس مین ہیں۔ وہ خاتون مصنوعی خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے سرہلائیں گی اور ایک آدھ رسمی سا جملہ بول کر آگے بڑھ جائیں گی۔ مجھے اس قسم کی ملاقات کا کوئی شوق نہیں ہے۔"

"ہرہائی نس اب تمہارے ساتھ ڈیٹ پر جانے سے تو رہیں۔" چارلس جل کر بولا۔

"میں کب ایسی فرمائش کر رہا ہوں؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "مجھے ان سے کسی بھی قسم کی ملاقات کا کوئی شوق نہیں ہے۔ خصوصاً اس قسم کی پُرتکلف سرکاری درباری ملاقاتوں کے تو تصور سے ہی مجھے وحشت ہوتی ہے۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا لوگ کیوں اس قسم کی ملاقاتوں کے لیے مرے جاتے ہیں۔"

"افضل چوہدری! تم بہت ہی ٹیڑھے آدمی ہو۔" چارلس گہری سانس لے کر شکست خوردہ سے لہجے میں بولا۔

"میرے خیال میں تو میں بہت ہی سیدھا اور کھرا آدمی ہوں۔ اس لیے آج کے دور میں مِس فٹ نظر آتا ہوں۔ تاہم مجھے اس پر افسوس نہیں ہے۔ میری آپ سے دست بستہ یہی گزارش ہے کہ اپنی مصروفیات جاری رکھیے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

کیتھرین نہ جانے کیوں منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ میں نے اسی مؤدبانہ لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جب آپ کو لیڈی ڈائنا کے دورے کے مسائل سے فرصت مل جائے تو مجھے پاکستان واپس بھجوانے کا کوئی بندوبست کر دیجیے گا۔ آپ کی بڑی نوازش ہو گی۔ میں اب واپس جانا چاہتا ہوں۔"

"چلے جانا۔ یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔" وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولا۔ "بہرحال تم ڈنر میں نہیں جا رہے؟"

"نہیں۔ اس کے لیے تو میری معذرت ہی قبول فرمایئے۔" میں نے بدستور اپنا مؤدبانہ لہجہ برقرار رکھا۔ چارلس ایک لمحے مجھے گھورتا رہا۔ بالآخر اس نے مجھے میرے حال پر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر ہی لیا اور رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں نے کیتھرین سے کہا۔ "تمہارے پاپا نے تمہیں ڈنر میں چلنے کے لیے نہیں کہا۔"

"ہماری ایسی قسمت کہاں۔" کیتھرین ٹھنڈی سانس لے کر بولی مگر دوسرے ہی لمحے اس کا لہجہ بدل گیا۔ "میری اس ٹھنڈی سانس سے کسی غلط فہمی میں مبتلا مت ہو جانا۔ مجھے بھی اس خاتون سے اس قسم کی رسمی سی ملاقات کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اگر پاپا مجھے ڈنر میں چلنے کے لیے کہتے تو میرا جواب بھی کم و بیش وہی ہوتا جو تمہارا تھا۔"

"جس سے تمہارے پاپا یہ نتیجہ اخذ کرتے کہ ہم دونوں کے درمیان زبردست ذہنی ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔" میں نے کہا۔

"اور یہ تمہارے لیے زبردست خطرے کی علامت ہوتی۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

ہم چند منٹ اسی طرح گپ شپ کرتے رہے پھر ہم نے چارلس کو تیار ہو کر دوبارہ رخصت ہوتے دیکھا۔ بریف کیس اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

کیتھرین بولی۔ "پاپا! آپ کچھ زیادہ ہی بے پروا نہیں ہوتے جا رہے؟ اب آپ اتنی رقم سے بھرا بریف کیس یونہی ہاتھ میں لٹکائے گھومتے رہیں گے؟"

"یہاں آنے سے چند منٹ پہلے تک یہ رقم میرے بریف کیس میں نہیں تھی۔ اب چند منٹ بعد پھر یہ رقم اس بریف کیس میں نہیں ہو گی۔ اس لیے تمہیں تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔" چارلس بولا "ویسے بھی یہاں کی پولیس گو کہ زیادہ مستعد نہیں ہے لیکن پھر بھی یہاں جرائم کی شرح امریکا اور برطانیہ سے کچھ کم ہے۔ اس کے علاوہ تمہارے پاپا تھوڑے سے بوڑھے ضرور ہو گئے ہیں لیکن اتنے گئے گزرے نہیں ہیں کہ سڑکوں پر پھرنے

الے معمولی چور اچکے اور لٹیرے ان سے بریف کیس چھین کر لے سکیں۔"

چارلس رخصت ہو چکا تو کیتھرین گہری سانس لے کر کندھے چکاتے ہوئے بولی۔ "عجیب ہی چیز ہیں پاپا بھی!"

"بے شک!" میں نے بڑے خلوص سے سرہلاتے ہوئے تائید کی۔

○☆○

دوسرے روز بھی چارلس کی مصروفیت کچھ کم نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ لیڈی ڈائنا ابھی شہر میں موجود تھی اور شیڈول کے مطابق اس کی مصروفیات جاری تھیں۔ تاہم چارلس شام سے پہلے واپس آگیا تھا اور ہمارے ساتھ چائے پی رہا تھا۔ وہ اب خاصا مطمئن اور فارغ فارغ سا دکھائی دے رہا تھا۔ ہم اوپر کی منزل کے ڈائننگ روم میں ہی تھے۔ دفعتاً انٹرکام کا بزر بجا۔ بٹلر وہیں موجود تھا۔ اس نے انٹرکام پر بات کی۔

چند لمحے بات کرنے کے بعد بٹلر چارلس کی طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "سر! گیٹ ہاؤس سے سیکیورٹی گارڈ بول رہا ہے۔ کہہ رہا ہے دو قبائلی سے آدمی آئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ سیوبک کا کوئی ضروری پیغام لائے ہیں اور جلد از جلد آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ سیکیورٹی گارڈ پوچھ رہا ہے انہیں اندر آنے دیا جائے یا آپ گیٹ پر ہی جا کر ان سے بات کریں گے؟"

چارلس چائے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور بلا تامل بولا۔ "میں گیٹ پر ہی آکر ان سے بات کروں گا۔"

اس نے مجھے یا کیتھرین کو ساتھ چلنے کے لیے نہیں کہا تھا لیکن ہم خود ہی اُٹھ کر اس کے پیچھے چل دیے۔ نیچے کا بلند و بالا آہنی مین گیٹ الیکٹرانک سسٹم سے کھلتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اندر کی طرف چھوٹا سا گیٹ ہاؤس بنا ہوا تھا۔ باوردی سیکیورٹی گارڈ اسی میں کھڑا تھا۔ چارلس کا اشارہ پا کر اس نے بٹن دبا کر گیٹ کھولا۔ ہم چاہتے تو گیٹ ہاؤس کی چھوٹی سی کھڑکی سے جھانک کر بھی باہر دیکھ سکتے تھے لیکن چارلس نے اتنی احتیاط کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

گیٹ کھلا تو سامنے ہی ایک نئی لیکن گرد و غبار میں بری طرح اٹی ہوئی ایک بڑی اور ائرکنڈیشنڈ ڈاج پک اپ کھڑی دکھائی دی۔ قریب ہی دو قبائلی کھڑے کچھ پریشان سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ وہ ویسے ہی لباس میں تھے جیسا میں نے سیوبک کے گاؤں میں اکثر مردوں کو پہنے دیکھا تھا۔ سروں پر وہی پھولی پھولی سی ٹوپیاں تھیں۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر اور بھاری بھرکم تھا جبکہ دوسرا نوجوان اور چھریرے جسم کا تھا۔ ان کے تاثرات کچھ ایسے ہی تھے جیسے بے چارے سیدھے سادے دیہاتی شہر آکر پریشانی اُٹھاتے ہوئے کسی اجنبی ایڈریس پر پہنچے ہوں۔

"آپ محترم چارلس ہیں؟" ادھیڑ عمر نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں تصدیق چاہی۔ "ہمیں محترم چارلس کے علاوہ کسی سے بات نہیں کرنی ہے۔"

"میں ہی چارلس ہوں بھائی! مسئلہ کیا ہے؟"

میں اس دوران پک اپ کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ بڑی کیب اور پانچ سیٹوں والی مضبوط پک اپ تھی جو ناہموار اور پہاڑی راستوں پر بار برداری یا سفر کے لیے اچھی سمجھی جاتی ہے۔ اس میں کوئی اور شخص بیٹھا نظر نہیں آ رہا تھا۔

ادھیڑ عمر قبائلی نے اپنے لمبے سے چغے میں ہاتھ ڈال کر مڑا تڑا سا ایک پرچا نکالا اور چارلس کو تھما دیا۔ میں اور کیتھرین کچھ آگے بڑھ آئے۔ بال پوائنٹ سے غالباً خاصی عجلت میں انگریزی میں پیغام تحریر کیا گیا تھا۔ چارلس نیچی آواز میں پڑھنے لگا۔

محترم چارلس!

مجھے افسوس ہے کہ میری آپ کے پاس سے روانگی کچھ زیادہ خوشگوار حالات میں نہیں ہوئی تھی۔ میں حسب پروگرام تین بزرگوں کو ساتھ لے کر آپ سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا تھا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس طرح کے معاملات زبردستی طے نہیں کیے جاتے۔ میں شاید بزرگوں کے ساتھ راستے ہی سے واپس لوٹ جاتا لیکن اسی سفر کے دوران ایک جگہ مجھے حمان کی موجودگی کے شواہد ملے ہیں۔ کچھ خاص لوگوں کی زبانی اُڑتی اُڑتی سی خبریں بھی ملی ہیں کہ وہ جنگل میں چھپا بیٹھا ہے۔ میں اس کی گھات میں چھپ کر بیٹھ گیا ہوں۔ میرے خیال میں یہ معاملہ زیادہ اہم ہے۔ ہمیں اس کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ میرے لیے انا کا سوال ہے۔ آپ کے لیے بھی ہونا چاہیے۔ حمان کی انا کو بھی ٹھیس پہنچی ہے۔ وہ آئندہ کسی بھی وقت ہم سب کے لیے خطرہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر موقع مل رہا ہو تو ہمیں لگے ہاتھوں اس معاملے کو نمٹا ہی دینا چاہیے۔ میرے ساتھ کوئی خاص کام کا آدمی نہیں ہے اور میرے آدمی اس قسم کے کاموں میں کچھ زیادہ ماہر بھی نہیں ہیں۔ میرا خیال ہے حمان کے ساتھ بھی کچھ آدمی ہیں۔ اگر صرف آپ، مسٹر چوہدری اور کیتھرین میری مدد کے لیے پہنچ جائیں تو کافی ہو گا۔ میں آپ سے زیادہ دور نہیں ہوں۔ جلدی پہنچنے کی کوشش کیجیے گا۔

سیوبک"

تحریر سے تو ظاہر ہوتا تھا کہ پیغام خاصی عجلت میں گھسیٹا گیا تھا لیکن کچھ ایسا مختصر نہیں تھا۔ بات آسانی سے سمجھ میں آتی تھی۔ چارلس نے ان لوگوں کو اندر بلانے کا تکلف نہیں کیا اور ان سے کہا۔ "تم یہیں ٹھہرو، ہم چند منٹ میں آکر تمہارے ساتھ چلتے ہیں یا تمہیں کوئی جواب دیتے ہیں۔"

وہ دونوں قبائلیوں کو حیران پریشان سا چھوڑ کر دوبارہ اندر آگیا۔ گیٹ بند ہو گیا۔ چارلس نے ڈرائیو وے میں ہی رُک کر گویا کارنر میٹنگ منعقد کرتے ہوئے کہا۔ "یہ چال بھی ہو سکتی ہے لیکن ہمیں جانا ضرور چاہیے۔ وہ یہ نہ سمجھے کہ ہم ڈر کر دبک کر بیٹھ

گئے۔"

اس نے جواب طلب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے قدرے بے پروائی سے کہا۔ "میں تیار ہوں' مجھے تو ویسے بھی شاید خطرات مول لینے کا نشہ سا ہوتا جارہا ہے۔"

"میں بھی چلتی ہوں۔" کیتھرین بولی۔ "شاید اس نے جو لکھا ہے وہ سچ ہی ہو۔ ویسے بھی اس نے ہمیں اپنے گاؤں نہیں بُلایا ہے۔ اس کے گاؤں جانا ہمارے لیے زیادہ خطرناک ہوتا۔ جنگل میں اس نے پورے گاؤں کو تو بُلا کر نہیں بٹھالیا ہوگا۔ اصل جگہ کے قریب پہنچ کر ہم دیکھ بھال کر آگے بڑھیں گے۔ تھوڑے بہت قبائلیوں سے تو ہم نمٹ ہی لیں گے۔ ویسے مجھے تو زیادہ امکان یہی نظر آرہا ہے کہ اس کا دماغ ٹھکانے آگیا ہے اور اسے واقعی ہماری مدد کی ضرورت ہے۔ آگے ہماری قسمت ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے....." چارلس طمانیت سے بولا۔ "اس خط میں جس جنگل کا تذکرہ ہے وہ یقیناً وہی ہے جو سیوبک کے گاؤں کے راستے میں پڑتا ہے۔ میں احتیاطاً اس کے بارے میں چند خاص افراد کو بھی مطلع کردیتا ہوں کہ ہم اس طرف جارہے ہیں۔"

"چھوڑیں..... اب اتنا پریشان ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ سیوبک اور اس کے آدمی ایسے بھی نہیں ہیں کہ ہم ان سے نہ نمٹ سکیں۔" کیتھرین بے نیازی سے بولی۔

چارلس بغور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ "اب یکدم ہی اتنی اونچی ہواؤں میں اُڑنا بھی مت شروع کرو۔"

اوپر آکر ہم لوگوں نے چند ہتھیار ساتھ لیے جو چارلس ہی نے ہمیں مہیا کرر کھے تھے۔ ہم باہر آئے تو چارلس بولا۔ "تم لوگ نیچے چل کر گاڑی میں بیٹھو۔ میں چند سیکنڈ میں آتا ہوں۔"

"ہم اپنی گاڑی میں چلیں گے یا ان کے ساتھ انہی کی گاڑی میں بیٹھ جائیں؟" میں نے پوچھا۔

چارلس نے ایک لمحے سوچا پھر کہا۔ "انہی لوگوں کے ساتھ انہی کی گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔ دیکھا جائے گا۔"

ہم نیچے آگئے۔ وہ قبائلی باہر گاڑی کے پاس ہی کھڑے تھے۔ ہمارے پاس ہتھیار دیکھ کر انہوں نے کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ ان کے پاس بظاہر کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا۔ ہم گاڑی میں کیب کی پچھلی بڑی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ مجھے گاڑی میں بھی کوئی ہتھیار نظر نہ آیا۔ اتنا غیر مشکوک نظر آنا بھی مجھے کچھ مشکوک ہی لگ رہا تھا۔ نوجوان قبائلی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی اور ادھیڑ عمر اس کے برابر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بعد چارلس بھی آگیا اور گاڑی یوٹرن لے کر تیز رفتاری سے روانہ ہوگئی۔

راستے میں چارلس نے ادھیڑ عمر قبائلی سے پوچھا۔ "سیوبک کیا جنگل میں اکیلا ہے؟"

"نہیں..... دو آدمی اس کے ساتھ ہیں لیکن وہ کافی بوڑھے

ہیں۔" ادھیڑ عمر نے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں جواب دیا۔

"وہ جنگل میں کیا کررہے ہیں؟" چارلس نے پوچھا۔

"جنگل میں ایک جگہ ایک کنواں ہے..... اس کے قریب ایک کیبن بنا ہوا ہے۔ کافی پرانا معلوم ہوتا ہے۔ وہاں کچھ لوگوں کی موجودگی کے آثار نظر آرہے ہیں..... سیوبک کو کسی کی جھلک نظر آئی تھی۔ تب سے وہ اور دونوں بزرگ وہیں چھپے بیٹھے ہیں۔ انہوں نے موبائل فون پر کسی سے بات بھی کی ہے۔ ہم لوگ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہیں لیکن جنگل میں وہ کنواں اور کیبن دیکھ کر ہمیں بھی حیرت ہوئی۔ ہم نے اس سے پہلے وہ دونوں چیزیں وہاں نہیں دیکھی تھیں حالانکہ وہ نئی بھی نہیں ہیں۔ کنواں اور کیبن دونوں برسوں پُرانے معلوم ہوتے ہیں۔" ادھیڑ عمر نے اٹک اٹک کر یہ باتیں بتائیں۔

"سیوبک اور اس کے بزرگ ساتھیوں کے پاس کچھ اسلحہ وغیرہ موجود ہے؟" چارلس نے دریافت کیا۔

ادھیڑ عمر نے اثبات میں سر ہلایا اور کہا۔ "ماؤزر اور ٹی ٹی تو ہمارے پاس بھی ہیں لیکن سردار نے ابھی تک ہمیں کچھ کرنے کا حکم نہیں دیا۔ انہیں شاید آپ کا انتظار ہے۔"

شہری حدود سے نکلنے کے بعد تو چھوٹے سے ٹرک سے مشابہ وہ پک اپ طوفانی رفتار سے دوڑنے لگی اور پنیتیس کلومیٹر کا فاصلہ اس نے بہت ہی کم وقت میں طے کرلیا۔ اس دوران میں نے کئی بار

گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ اِکا دُکا گاڑیاں نظر آئیں لیکن کسی پر مجھے یہ شبہ نہ ہوسکا کہ وہ ہمارا تعاقب کررہی تھی۔

آخر کار وہ جنگل نظر آہی گیا جو ہم نے اس سے پہلے بھی سیوبک کے گاؤں جاتے وقت دور دور سے دیکھا تھا۔ جنگل ہائی وے سے بہت ہٹ کر تھا۔ پک اپ کچے میں اُتر گئی اور ناہموار میدانی علاقے میں ہچکولے کھاتی جنگل کی طرف بڑھنے لگی۔ جس طرف سے ہم جنگل کے قریب پہنچے اس طرف درخت گنجان نہیں تھے لیکن پک اپ اس طرف سے جنگل میں داخل نہیں ہوئی بلکہ درختوں کے قریب سے گزرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ کافی طویل چکر کاٹ کر آخر ہم جنگل کے اس طرف آپہنچے جدھر سے ہائی وے نظر نہیں آتا تھا۔

اس طرف سے پک اپ جنگل میں داخل ہوئی اور بہ مشکل ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد رک گئی کیونکہ آگے درخت بھی گنجان تھے اور راستہ بھی نہایت ناہموار تھا۔ وہ پہاڑی سا علاقہ معلوم ہوتا تھا جسے جنگل نے ڈھانپ رکھا تھا۔ جگہ جگہ مٹی کے بڑے بڑے تودے نظر آرہے تھے۔

نوجوان نے انجن کا سوئچ آف کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں سے ہمیں پیدل آگے چلنا پڑے گا۔"

اس نے پک اپ درختوں کے جھنڈ میں ایک ایسے مقام پر روکی تھی جہاں وہ تقریباً گیرج ہی کی طرح محفوظ تھی۔ ہم گاڑی سے اُتر آئے اور تینوں نے اپنے مشین پسٹل نکال لیے۔ نوجوان نے بڑی احتیاط سے گاڑی کے شیشے چڑھا کر اسے مقفل کیا اور ہم ان دونوں کی رہنمائی میں آگے بڑھنے لگے۔

جنگل میں بلا کا سناٹا تھا۔ یہاں کے پرندے بھی بڑے امن پسند معلوم ہوتے تھے۔ کہیں سے ان کی چوں چاں بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہمارے جوتوں تلے خشک پتے یا ٹوٹی ٹہنیاں چرچراتی تھیں تو ان کی آواز بھی بلند معلوم ہوتی تھی۔ گو کہ ہم بہت تیزی سے دائیں بائیں مڑتے جارہے تھے لیکن میں راستہ ذہن نشین کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ ہم ان دونوں قبائلیوں کی طرف سے پوری طرح مطمئن تو نہیں تھے لیکن ہم کسی قسم کی دھوکے بازی یا اچانک کچھ لوگوں کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ ان دونوں کے بارے میں ہمیں ایک بات خاصی تسلی بخش لگی تھی کہ انہوں نے کسی بھی بہانے سے ہمیں غیر مسلح کرنے کی کوشش نہیں کی تھی اور نہ ہی ہمارے ہتھیاروں پر کوئی خاص توجہ دی تھی۔ خود انہوں نے ابھی تک کوئی گن وغیرہ نہیں نکالی تھی۔ ان کے انداز و اطوار تو دوستوں والے ہی تھے۔ ہم تینوں ان کے پیچھے پیچھے شانہ بہ شانہ چل رہے تھے اور بیک وقت چاروں طرف نظر رکھنے کی کوشش کررہے تھے۔

اسی دوران ایک طرف سے ایک شخص ایک مگرے سے گدھے کو ہانکتا ہوا آتا دکھائی دیا۔ وہ گدھا کیا' تقریباً گھوڑا ہی تھا۔ اس پر لمبی سی ایک بوری لدی ہوئی تھی۔ کیتھرین نے اسے نشانے پر لے لیا تھا لیکن وہ گویا دنیا سے بے نیاز 'ٹخ ٹخ' کرتا ایک ٹیڑھی میڑھی چھڑی سے اپنے گدھے کو ہانکتا چلا آرہا تھا۔

وہ کوئی مفلوک الحال سا ترک دہقان معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ٹھوڑی پر مختصر سی داڑھی تھی۔ چہرہ پسینے اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ سر پر مختصر سی پگڑی تھی۔ عربوں جیسا اس کا ڈھیلا ڈھالا لبادہ بھی میلا اور مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ بے ہنگم سے جوتے خاصی شکستہ حالت میں تھے۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی لیکن کمر شاید افلاس کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔

وہ ہمارے دائیں طرف درختوں کے درمیان سے نمودار ہوا تھا اور کچھ فاصلے پر رہتے ہوئے درختوں ہی کے درمیان زگ زیگ کے سے انداز میں اسی طرف جارہا تھا جدھر ہم جارہے تھے۔ اس نے صرف ایک بار متجسس سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے دوبارہ منہ پھیر کر اس طرح اپنے گدھے کے پیچھے لنگڑاتا ہوا چلنے لگا جیسے اسے دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہ ہو۔ قدرے عجیب بات یہ تھی کہ اس کا گدھا آگے آگے چل رہا تھا اور وہ اس کے پیچھے تھا۔ شاید گدھا اس کی رہنمائی کررہا تھا۔ یہ کچھ ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ اس دنیا میں بہت سے گدھوں نے بے شمار انسانوں کی رہنمائی کا فریضہ سنبھالا ہوا ہے لیکن یہ گدھا چار ٹانگوں والا تھا۔ محسوس یہی ہوتا تھا کہ وہ اپنے پیچھے آنے والے کو منزل تک پہنچا ہی دے گا کیونکہ وہ راستے سے واقف معلوم ہوتا تھا۔ وہ گردن جھکائے دانشورانہ خاموشی اور سنجیدگی سے چلا جارہا تھا۔ وہ دنیا سے بے نیاز معلوم ہوتا تھا۔

ہماری رہنمائی کرنے والے قبائلیوں نے شاید محسوس کرلیا تھا کہ ہم گدھے والے کی طرف سے تشویش میں مبتلا ہوچکے ہیں اور الجھن سے اسی کی طرف دیکھے جارہے ہیں۔ کیتھرین کے پسٹل کا رخ تو بدستور اسی کی طرف تھا۔ ادھیڑ عمر قبائلی چلتے چلتے ہی ہماری طرف مڑتے ہوئے بولا۔ "اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں..... یہ ایک نیم پاگل سا آدمی ہے۔ جنگل میں ہی ایک جھونپڑی میں رہتا ہے..... بالکل بے ضرر سا شخص ہے۔"

کیتھرین نے مشین پسٹل کا رخ زمین کی طرف کرلیا۔ لیکن ہم اب بھی چاروں طرف دیکھتے ہوئے چل رہے تھے۔ ہمیں نہیں معلوم تھا کہ یہی ہماری غلطی تھی۔ ہم ہر طرف دیکھ رہے تھے سوائے اس طرف کے' جدھر دیکھنا ہمارے لیے سب سے زیادہ ضروری تھا۔ یعنی نیچے کی طرف۔

ہم درختوں کی گھنی شاخوں تک کا جائزہ لیتے جارہے تھے لیکن ہم نے زمین کی طرف دیکھنا زیادہ ضروری نہیں سمجھا تھا۔ اگر دیکھا بھی تھا تو راستے میں زیادہ تر ہمیں خشک پتے' ٹوٹی ہوئی چھوٹی موٹی ٹہنیاں اور گھاس پھونس ہی نظر آیا تھا۔ وہاں بھی ہمیں اپنے جوتوں تلے انہی چیزوں کی موجودگی کا احساس ہوا تھا جہاں ہم اچانک ہی

گویا غڑپ سے نیچے چلے گئے۔
ایک لمحے کے لیے تو میں بھی بدحواس سا ہو گیا اور فوری طور پر میری سمجھ میں نہ آیا کہ ہمارے ساتھ ہوا کیا تھا۔ بہت ہی زوردار سا جھٹکا لگا تھا اور ہم یکدم ہی اندھیرے میں اُتر گئے تھے۔ پھر مجھے اپنے اوپر کیتھرین کے لطیف وجود کا احساس ہوا لیکن اس وقت وہ بھی خاصی وزنی لگ رہی تھی۔
پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے نیچے کوئی کراہ رہا تھا۔ وہ چارلس تھا جو میرے نیچے دب گیا تھا۔ میں نے اس پر سے ہٹنے کی کوشش کی۔ اس دوران کیتھرین کا وزن خود بخود مجھ پر سے ہٹ گیا۔ تب میں نے دیکھا کہ وہاں اتنا بھی اندھیرا نہیں تھا جتنا مجھے فوری طور پر محسوس ہوا تھا۔
بات صرف اتنی تھی کہ ہم چلتے چلتے اچانک ہی کنوئیں سے مشابہ ایک گڑھے میں آن گرے تھے۔ وہ کافی گہرا گڑھا تھا لیکن اس کا قطر یا گولائی زیادہ نہیں تھی۔ اسے بھی یقیناً جنگل کی بیشتر زمین کی طرح خشک پتوں اور گھاس پھونس سے ڈھانپا گیا تھا۔ اگر ہم زمین کی طرف دیکھ رہے ہوتے تو شاید تب بھی سمجھ نہ پاتے کہ ہمارے پاؤں کسی گڑھے پر پڑنے والے تھے۔
یہ بڑی پرانی ٹیکنیک تھی۔ پرانے شکاریوں کا حربہ تھا جو وہ خطرناک درندوں کو شکار کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ بعض پرانے حربے نئے دور میں قطعی غیر متوقع لگتے ہیں۔ شاید اسی لیے کامیاب ہو جاتے ہیں۔
حیرت کی بات یہ تھی کہ ہمارے آگے آگے چلتے ہوئے دونوں قبائلی اس گڑھے میں نہیں گرے تھے لیکن ذرا سوچنے پر محسوس کیا جا سکتا تھا کہ اس میں کچھ ایسی حیرت کی بات بھی نہیں تھی۔ وہ یقیناً اس گڑھے کی موجودگی سے باخبر تھے اور اس سے بچ کر گزرے تھے۔ راستہ تنگ ہی تھا۔ ہم نے اگر انہیں تھوڑا بہت اِدھر اُدھر ہوتے دیکھا بھی تھا تو اس سے یقیناً کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا۔
ہمارے حواس بحال ہوئے تو ہم اٹھ کھڑے ہوئے۔ ہم تینوں کے کھڑے ہونے کے بعد گڑھے میں ہمارے اردگرد جگہ کم ہی بچی تھی۔ گڑھے کی تہ میں سیلن تھی اور وہاں ایک عجیب سی بو محسوس ہو رہی تھی حالانکہ گڑھا خالی ہی تھا۔ اس میں ہمارے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ہمارے ساتھ ہی البتہ کچھ گھاس پھونس اور خشک پتے ضرور اندر آگرے تھے۔
حواس ٹھکانے آتے ہی ہم تینوں نے بیک وقت ایک دوسرے سے یہی پوچھا کہ کسی کو زیادہ چوٹ تو نہیں آئی تھی۔ غنیمت تھا کہ تینوں کے ہاتھ پاؤں صحیح سلامت دکھائی دے رہے تھے۔ چھوٹی موٹی چوٹوں کی اس وقت ہمیں پروا نہیں تھی۔ ہتھیار ہمارے ہاتھوں سے چھوٹ گئے تھے جنہیں ہم نے فوراً اٹھایا اور گڑھے کے دہانے کی طرف دیکھا لیکن وہاں ہمیں کوئی سر دکھائی نہ دیا۔ کسی نے اندر جھانکنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ وہ یقیناً اتنے
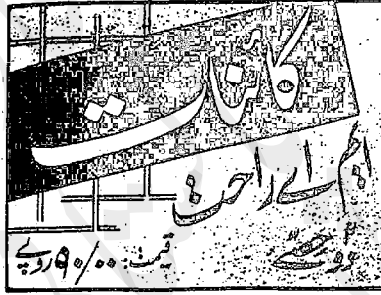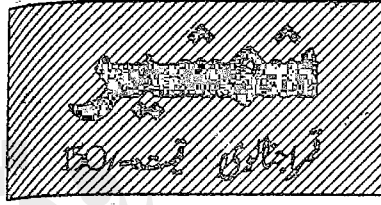
احمق نہیں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ گڑھے میں گرنے والوں کو اگر اب گڑھے کے دہانے پر کوئی کھوپڑی نظر آئی تو وہ اس میں سے گولی بھی گزار سکتے تھے۔ غیر ارادی طور پر ہم تینوں بھی اس خشک کنوئیں کی دیوار سے چپک گئے۔ کوئی اوپر سے ہم پر بھی گولیوں کی بوچھاڑ کر سکتا تھا اور ہم نہایت بے بسی کی موت مر سکتے تھے۔ وہ گہرا گڑھا ہم تینوں کی اجتماعی قبر بن سکتا تھا۔
تاہم ایسا نہیں ہوا۔ اوپر سے ادھیڑ عمر قبائلی کی آواز سنائی دی۔ وہ نہایت سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔ ”اوہ.... بڑا افسوس ہوا.... آپ لوگ گڑھے میں گر گئے۔ معلوم نہیں کس کمبخت نے یہاں یہ ٹریپ بنایا ہوا تھا۔ خیر.... آپ لوگ گھبرائیں نہیں۔ ہم ابھی آپ کو نکالنے کے لیے اپنے ساتھ کچھ لوگوں کو لے کر آتے ہیں۔“
انہیں یقیناً یہ توقع نہیں تھی کہ ہم ان کی اس ”مکارانہ معصومیت“ پر یقین کر سکتے تھے لیکن وہ غالباً اس کی پروا کیے بغیر اپنا کردار ادا کیے جا رہے تھے۔ دوسرے ہی لمحے اوپر سکوت چھا گیا۔ شاید وہ لوگ واقعی کہیں چلے گئے تھے۔ معلوم نہیں ان کے منصوبے کا اگلا مرحلہ کیا تھا۔
مجھے اس گدھے والے کے بارے میں سوچ کر بھی حیرت ہو رہی تھی۔ ہمیں گڑھے میں گرتے تو یقیناً اس نے بھی دیکھ لیا ہوگا لیکن کیا اس نے کوئی نوٹس نہیں لیا تھا؟ کیا وہ اسی طرح دنیا جہان سے بے نیاز اپنے راستے پر بڑھتا چلا گیا تھا؟ اس سے یہ بھی بعید تو نہیں تھا۔ وہ کچھ عجیب ہی مخلوق لگ رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اسے دونوں قبائلیوں نے ذرا دھمکا کر بھگا دیا ہو اور یہ بھی عین ممکن تھا کہ میں اس کے بارے میں خواہ مخواہ ہی خوش فہمی میں مبتلا رہا

ں۔
”اب کیا کرنا چاہیے؟“ کیتھرین سرگوشی میں بولی۔
”فوراً اس گڑھے سے نکلنا چاہیے۔ میرا خیال ہے وہ ہمیں چوہوں کی طرح قابو میں کرنے کا کوئی بندوبست کرنے گئے ہیں اور ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔
”یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ ہمیں اس گڑھے سے نکلنا چاہیے لیکن کیسے؟“ کیتھرین بولی۔ گڑھا تقریباً چودہ پندرہ فٹ گہرا تھا۔
”یہ کچھ اتنا زیادہ مشکل کام بھی نہیں۔“ میں نے اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”مسٹر چارلس! آپ میرے کندھوں پر اکڑوں سی حالت میں بیٹھ جائیے.... جلدی کیجیے.... مشین پسٹل وغیرہ لباس میں ہی چھپا لیجیے.... آپ کو اٹھتے وقت دونوں ہاتھ کنوئیں کی دیوار پر ٹکانا پڑیں گے....“
چارلس نے میری ہدایت پر عمل کرنے میں خاصی پھرتی دکھائی اور میرے کندھوں پر چڑھ بیٹھا۔ تب میں نے کیتھرین سے کہا۔ ”تم اب اپنے پاپا کے کندھوں پر چڑھ جاؤ لیکن گڑھے سے سر نکالتے وقت ذرا ہوشیار رہنا.... کوئی گولی بھی تمہارا استقبال کر سکتی ہے۔“
کیتھرین کسی بندر کی سی پھرتی سے.... بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بندریا کی سی پھرتی سے باپ کے کندھوں پر چڑھ گئی۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ میں بازیگروں جیسا طریقہ اختیار کرنا چاہتا تھا جس سے کم از کم سب سے اوپر والا فرد کچھ کوشش کر کے نکل سکتا تھا۔ خصوصاً کیتھرین کے لیے یہ زیادہ مشکل نہیں تھا۔ وہ عام سی لڑکی نہیں تھی۔ اس کے لیے تو شاید گڑھے کے کناروں تک ہاتھ پہنچ جانا ہی کافی ثابت ہوتا۔
ان دونوں باپ بیٹی کا بوجھ کندھوں پر لیے میں اپنی ٹانگوں کی مضبوطی اور طاقت کو آزماتے ہوئے دھیرے دھیرے اٹھا۔ یہ کام میرے لیے زیادہ مشکل ثابت نہیں ہوا۔ میرے کھڑے ہونے کے بعد چارلس بھی ہمت کر کے دیوار پر ہاتھ ٹکاتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اس کے لیے شاید اپنی سبک وجود بیٹی کا وزن بھی کافی تھا۔ تاہم یہ غنیمت تھا کہ اس نے توازن خراب نہیں ہونے دیا۔
اس کے کندھوں پر کیتھرین تو خاصی پھرتی سے کھڑی ہو گئی اور اس کے لیے نہ صرف ہاتھ گڑھے سے باہر لے جانا بلکہ سر بھی نکال لینا آسان ثابت ہوا۔ تاہم اس نے میری ہدایت کے مطابق نہایت آہستگی سے سر نکال کر پہلے چاروں طرف دیکھا پھر وہ سر نیچے جھکاتے ہوئے تیز سی سرگوشی میں بولی۔ ”فی الحال تو آس پاس کوئی نظر نہیں آ رہا۔“
”اللہ کا نام لے کر نکل جاؤ اور گڑھے کے کنارے پر لیٹ کر اپنے پاپا کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرو....“ میں نے کہا پھر چارلس کو سمجھایا کہ اسے کیتھرین کا ہاتھ یا اس کی لٹکائی ہوئی کوئی چیز تھام کر کنوئیں کی دیوار پر پاؤں ٹکاتے ہوئے اوپر چڑھنا تھا تاکہ کیتھرین کے لیے اسے باہر کھینچنا آسان ہو جائے۔ کنوئیں کی دیوار کچی اور ناہموار تھی۔ اس پر جگہ جگہ پاؤں مضبوطی سے ٹکایا جا سکتا تھا۔
کیتھرین ایک بار پھر بندریا کی سی پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گڑھے سے نکل گئی اور اس کے بعد بھی خیریت ہی رہی۔ کوئی ”دھماکا“ کوئی چیخ سنائی نہیں دی لیکن جب کیتھرین نے گڑھے کے کنارے لیٹ کر چارلس کا ہاتھ تھامنا چاہا تو وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کا ہاتھ چارلس کے ہاتھ تک نہیں پہنچ سکا تاہم اس نے جلدی سے ایک ٹوٹی ہوئی شاخ تلاش کر کے گڑھے میں لٹکائی اور درمیانی خلا پُر ہو گیا۔ چارلس نے شاخ پکڑی اور لرزاں و ترساں کسی طرح گڑھے سے نکل ہی گیا۔
اب صرف میرا مسئلہ باقی تھا اور میں کنوئیں کی تہ میں تھا۔ ان کے پاس کوئی ایسی رسی وغیرہ نہیں تھی جسے وہ نیچے لٹکا سکتے لیکن کیتھرین کو جتنا سہارا مل گیا تھا‘ اتنا ہی کافی تھا۔ وہ میرا مقصد سمجھ رہی تھی۔ اس کا ذہن اور جسم دونوں تیزی سے کام کر رہے تھے۔ وہ باپ کی مدد سے جلدی سے ایک درخت کی لمبی سی شاخ توڑ کر لائی۔
ان دونوں نے کنارے پر لیٹ کر شاخ گڑھے میں لٹکائی۔ خوش قسمتی سے میرا ہاتھ اس تک پہنچ گیا۔ میرے لیے اتنا ہی سہارا کافی تھا۔ میں نے گڑھے کی دیوار پر پاؤں جماتے ہوئے اس طرح چڑھنا شروع کیا کہ اپنا بیشتر وزن میں خود ہی سہار سکوں اور ان دونوں کو زیادہ دشواری نہ ہو۔ چند لمحے بعد میں بھی گڑھے سے باہر تھا۔
اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی اور باہر آنے کے بعد گویا یقین بھی نہیں آ رہا تھا کہ چند لمحے پہلے ہم خاصی مشکل میں گرفتار تھے۔ مشکل یہ تھی کہ اس قسم کے حالات میں اگر ذرا سی آسانی میسر آتی تھی تو وہ مجھے خالی از علت نہیں لگتی تھی۔
میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگر وہ قبائلی کسی کو بلا کر لانا ہی چاہتے تھے تو دونوں ہی کیوں چلے گئے تھے؟ ان میں سے ایک جا سکتا تھا اور دوسرا گڑھے کے قریب نگرانی کے لیے موجود رہ سکتا تھا۔ مجھے شبہ محسوس ہو رہا تھا کہ ان میں سے کوئی قریب ہی کہیں چھپا ہماری تمام حرکات و سکنات کا جائزہ نہ لے رہا ہو اور یہ سوچ کر لطف اندوز نہ ہو رہا ہو کہ کسی بھی لمحے ٹریگر دبا کر وہ ہماری ساری اُچھل کود یہیں روک دے گا‘ ہمیں ہمیشہ کے لیے ساکت کر دے گا۔
ہم تینوں نے تین مختلف سمتوں میں منہ کر لیے اور کندھے سے کندھا جوڑ لیا۔ اس طرح ہم تقریباً ہر طرف کا جائزہ لیتے ہوئے دھیرے دھیرے آگے بڑھنے لگے۔ جنگل کا سکوت برقرار رہا۔ کسی طرف سے کوئی گولی نہ آئی اور نہ ہی کسی نے ہمیں للکارا۔ وہ گدھے والا بھی ہمیں کہیں دکھائی نہ دیا۔ اگر وہ اپنے راستے پر ہی رواں رہا تھا تو اب اس کے نظر آنے کی امید بھی نہیں تھی کیونکہ ہم

انت میں اسی طرف واپس جا رہے تھے جدھر سے آئے تھے۔

جب کئی منٹ تک کچھ نہ ہوا تو ہمارے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تاہم کیتھرین کی حیرت اب بھی برقرار تھی کہ آخر وہ دونوں قبائلی کہاں غائب ہو گئے تھے۔ وہ تقریباً سرگوشی میں بولی۔
"میری تو سمجھ میں نہیں آیا آخر سیو بک کا پلان کیا تھا؟ وہ ہمیں کس طرح گھیرنا اور سزا دینا چاہتا تھا؟"

"فی الحال جسم کو حرکت میں رکھنا زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے دماغ پر زیادہ زور مت دو۔" میں نے مشورہ دیا۔

وہ شاید میرے مشورے کے بارے میں کوئی اظہارِ خیال کرنے والی تھی کہ اچانک کوئی چیز ہمارے قریب ہی گر کر پھٹی۔ دھماکا زیادہ زوردار نہیں تھا لیکن میں نے احتیاطاً تیزی سے زمین پر گرتے ہوئے اس طرف فائر بھی کر ڈالا جدھر سے میرے خیال میں وہ چیز پھینکی گئی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ میری چلائی ہوئی گولی کسی کو لگی تھی یا نہیں لیکن مجھے یہ احساس ضرور ہو گیا کہ میں نے زمین پر گر کر غلطی کی تھی۔ وہ کوئی گرینیڈ نہیں تھا جو ہمارے قریب پھٹا تھا۔ وہ بے ہوش کر دینے والی کسی نہایت ہی سریع الاثر گیس کا شیل تھا۔ اگر ہمیں ذرا بھی شبہ ہوتا کہ وہ اس قسم کی کسی گیس کا شیل ہو گا تو ہم تیزی سے اِدھر اُدھر بھاگ کر اس کے اثر سے بچنے کی کچھ کوشش کر سکتے تھے لیکن زمین پر گر کر ہم نے گویا فوراً ہی گیس کو سانس کے ذریعے جسم میں داخل کر لینے کا بندوبست کر لیا تھا۔

میں نے اور کیتھرین نے فوراً ہی اٹھ کر ایک طرف کو بھاگنے کی کوشش کی۔ اسے بھی یقیناً احساس ہو گیا تھا کہ وہ گیس کیسی تھی لیکن ہمیں تاخیر ہو چکی تھی۔ وہ چند سیکنڈ میں ہی وہ جتنی مقدار میں ہمارے پھیپھڑوں میں پہنچ چکی تھی اتنی ہی ہمارے اعصاب کو شل کر دینے کے لیے کافی تھی۔

کیتھرین مجھ سے بھی پہلے گر پڑی۔ میں نے دودھیا سے دھوئیں کے مرغولوں سے نکلنے کی کوشش کی لیکن ذہن اور جسم نے میرا ساتھ نہ دیا۔ میں لڑکھڑا کر گرا پھر مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔

میری آنکھ کھلی تب بھی مجھے اپنے گرد دودھیا دھواں ہی دکھائی دیا۔ میرا جسم گویا لوہے کی طرح بھاری ہو گیا تھا اور اپنی جگہ سے حرکت کے قابل نہیں رہا تھا لیکن زبان گویا دھنی ہوئی روئی کا گولا بن کر منہ میں پھنس گئی تھی۔ میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی بہت کوشش کی لیکن انہیں جنبش دینے میں بھی کامیاب نہ ہو سکا تاہم دودھیا دھواں رفتہ رفتہ تحلیل ہونے لگا۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ دودھیا دھواں میرے تخیل کی پیداوار تھا۔ درحقیقت دھواں وہاں موجود نہیں تھا لیکن میں نے بے ہوش ہوتے وقت آخری چیز وہ دھواں ہی دیکھی تھی شاید اسی لیے اب بھی مجھے وہی نظر آ رہا تھا۔ رفتہ رفتہ دھواں غائب ہو گیا اور اس کے درمیان سے مجھے ایک چہرہ نمودار ہوتا دکھائی دیا۔

چہرہ کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ میں نے اپنے مضمحل ذہن پر زور دیا تو یاد آیا کہ وہ سیو بک کا چہرہ تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرا رہا تھا۔ میری آنکھوں کی دھندلاہٹ کچھ اور کم ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ مسکرا نہیں رہا تھا بلکہ اس کے ہونٹ اذیت زدہ انداز میں کھنچے ہوئے تھے اور وہیں ساکت ہو کر رہ گئے تھے۔

پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کی آنکھیں زندگی کے نور سے خالی تھیں۔ میں نے آنکھیں ملنا چاہیں لیکن ہاتھوں کو حرکت نہ دے سکا تب مجھے احساس ہوا کہ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ میں نے آنکھوں کو زور سے بھینچ کر دوبارہ کھولا تو منظر مجھے کچھ اور صاف دکھائی دیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ میرے سامنے سیو بک مکمل حالت میں نہیں بیٹھا تھا۔

وہ صرف اس کا کٹا ہوا سر تھا جو لکڑی کے ایک تخت پر رکھا تھا۔ اس کا دھڑ غائب تھا۔ میں خود اس چوبی تخت کے قریب ہی زمین پر پڑا تھا۔ کیتھرین اور چارلس بھی میرے قریب ہی پڑے تھے لیکن وہ ابھی بے ہوش ہی تھے۔

تخت کے ایک طرف وہی مفلوک الحال دہقان کھڑا تھا جسے میں نے جنگل میں گدھے کو ہانکتے ہوئے جاتے دیکھا تھا لیکن اب وہ

ویسا مسکین اور مخبوط الحواس دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کے چہرے سے گویا کوئی کینچلی سی اُتر گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کسی سانپ کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے پیروں میں وہ لمبی سی بوری پڑی تھی جو ہم نے اسے گدھے پر لادے لے جاتے دیکھا تھا۔

اس وقت اس بوری کا منہ کھلا تھا۔ اس نے جھک کر بوری کے ایک کونے پر پاؤں رکھ کر دونوں ہاتھ اندر ڈال کر کچھ کھینچا۔ دوسرے ہی لمحے ایک انسانی دھڑ باہر آگیا۔ میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ سیبک کا دھڑ تھا۔ دہقان نے دھڑ بھی اُٹھا کر تخت پر ڈال دیا اور سیدھا کھڑا ہوگیا۔ اب اس کی کمر میں کوئی خم وغیرہ نظر نہیں آرہا تھا۔

"اسے..... اسے کس نے ہلاک کیا ہے؟" میں نے نحیف سی آواز میں پوچھا اور سیبک کی سربریدہ لاش کی طرف اشارہ کیا۔

"اسے اس کی حماقتوں نے ہلاک کیا ہے۔" دہقان نے صاف ستھری انگریزی میں کھنک دار لہجے میں جواب دیا۔

"تم..... تم کون ہو؟" میں بڑی دشواری سے اپنی زبان کو حرکت دے رہا تھا۔

"مجھے تم اپنا خادم ہی سمجھو۔ زیادہ تر لوگ مجھے حمان کے نام سے جانتے ہیں۔" اس نے سفّاکانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا۔

میرے جسم میں جو تھوڑی بہت جان آئی تھی وہ بھی گویا دوبارہ نکل گئی۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو اس امید سے بہلانے کی کوششیں کی کہ شاید یہ کوئی ڈراؤنا خواب تھا جسے جلد یا بدیر آخرکار ختم ہوجانا تھا لیکن دل بے ایمان اس بہلاوے میں نہ آیا۔ اندر ہی اندر کوئی سرگوشی کررہا تھا کہ حقیقت وہی تھی جو اس وقت میری آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔

اس شخص کو ہم نے جنگل میں اپنے متوازی چلتے دیکھا تھا اور اس وقت ہمیں گمان بھی نہیں گزرا تھا کہ وہ حمان تھا۔ اس کے گدھے پر جو لمبی سی بوری لدی ہوئی تھی اس میں سیبک کی سربریدہ لاش تھی جس کی اب وہ گویا نمائش کررہا تھا۔

سیبک خواہ کیسا ہی آدمی تھا اور گزشتہ روز اس کا رویّہ خواہ کیسا ہی رہا تھا اس کے باوجود اس وقت مجھے اس کا کٹا ہوا سر لکڑی کے تخت پر رکھا دیکھ کر صدمہ پہنچا تھا۔ وہ شخص جس نے نہ جانے کیسے کیسے مضبوط حفاظتی حصاروں میں رہنے والی ہستیوں کو راہِ عدم دکھائی تھی خود کیسی خاموشی سے دنیا سے رخصت ہوگیا تھا۔ حمان یقیناً اس کا استاد ثابت ہوا تھا۔ اس دنیا میں ہر سیر کے لیے سوا سیر موجود تھا۔

میں نے گہری نظر سے حمان کا جائزہ لیا۔ وہ ایک پست قامت شخص تھا اور عمر رسیدہ معلوم ہوتا تھا۔ شاید اس کی عمر چالیس کے قریب ہو لیکن وہ بہ مشکل تیس کا نظر آتا تھا۔ اس کی شخصیت میں

اس کے سوا کوئی بھی قابلِ ذکر خصوصیت نہیں تھی کہ چہرے مہرے اور آنکھوں سے وہ بے پناہ شاطر اور پُھرتیلا نظر آرہا تھا لیکن اپنی اس خصوصیت کو بھی شاید وہ ضرورت پڑنے پر نہایت کامیابی سے چُھپا لیتا تھا کیونکہ جب ہم نے اسے جنگل میں گدھا ہنکاتے آتے دیکھا تھا تو اس کے چہرے پر یا اس کی آنکھوں میں مکاری، خباثت یا بُرائی کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دی تھی۔ وہ واقعی ایک ست اور مسکین قسم کا مزدور دکھائی دیا تھا۔ شاید اس کی بے ضرر اور نہایت عام سی نظر آنے والی شخصیت ہی اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھی۔ وہ کہیں بھی عام آدمیوں کی بھیڑ میں اس طرح گم ہوسکتا تھا کہ شاید کوئی اس پر ایک نظر ڈالنے کے بعد دوسری نظر ڈالنے کی زحمت نہ کرتا۔

کیتھرین اور چارلس بھی دھیرے دھیرے ہوش میں آرہے تھے۔ میں کوشش کررہا تھا کہ اپنی جگہ ساکت لیٹا ہونے کے باوجود اپنی رگ وپے میں پھیلتی ہوئی یخ بستگی کسی طرح دور کرسکوں۔ حمان بلاشبہ اونچا فنکار تھا۔ وہ مجھ جیسے "شاک پروف" شخص کو بھی اچھا خاصا شاک پہنچانے میں کامیاب رہا تھا۔

اس کی فرنچ کٹ ڈاڑھی اور مونچھوں کے درمیان پتلے پتلے سفّاک ہونٹوں پر کھیلتی ہوئی خفیف سی مسکراہٹ بتارہی تھی کہ وہ خود بھی اس صورتِ حال سے خاصا لطف اندوز ہورہا تھا۔ مجھے مختلف قوموں کے افراد کو چہرے مہرے سے پہچاننے کا کوئی خاص تجربہ نہیں تھا۔ ویسے بھی بہت سی قوموں کے افراد کی شکلیں اور نین نقش آسانی سے ایک دوسرے میں گڈمڈ ہوسکتے ہیں۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے حمان کے چہرے میں ایک یہودی کی جھلک دکھائی دی۔ اس کی شکل وصورت کا مجموعی طور پر مجھ پر جو تاثر مرتب ہورہا تھا اسے میں "یہودیت" کے سوا کوئی نام نہیں دے سکا۔

وہ دونوں قبائلی جنہیں ہم سیبک کے آدمی سمجھے تھے، اس وقت کمرے کے دو مختلف گوشوں میں لکڑی کی ٹوٹی ہوئی چیئلوں پر بیٹھے تھے۔ دونوں کی گود میں گنیں تھیں۔ وہ بالکل بے پروا اور صورتِ حال سے کچھ لاتعلق سے نظر آرہے تھے۔ ہم اس وقت جس کمرے میں موجود تھے وہ غالباً کسی سالخوردہ چوبی کیبن کا حصہ تھا۔ اس کا فرش بھی لکڑی کے تختوں کا تھا جو جگہ جگہ سے کِل رہے تھے۔ کیبن کا دروازہ نیم شکستہ تھا لیکن بند تھا۔ وہاں گرمی یا گھٹن کا احساس نہیں ہورہا تھا۔ شاید یہ میرے اندر پھیلی ہوئی یخ بستگی کا کمال تھا۔

"تم یقیناً افضل چودھری ہو۔ مجھے تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔" وہ پہلے ہی کی طرح شستہ انگریزی میں کھنک دار لہجے میں بولا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ہماری ملاقات کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر پر ہورہی ہو اور وہ نہایت تہذیب وشائستگی سے اپنے جذبات کا اظہار کررہا ہو۔

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں اس وقت غیر محسوس طریقے سے یوگا کی مشق کے ذریعے اپنی کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے کی کوشش کررہا تھا۔ کیتھرین اور چارلس بھی ہوش میں آچکے تھے اور آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے۔ کیتھرین کی حالت بہرحال چارلس سے بہتر نظر آرہی تھی لیکن سیبک کی لاش دیکھ کر اسے بھی یقیناً زوردار جھٹکا لگا تھا حالانکہ گزشتہ روز سے تو وہ اس کی صورت دیکھنے کی بھی روادار نہیں رہی تھی۔

"تم..... تم حمان ہو؟" وہ پھنسی پھنسی سی آواز میں بولی۔

"بے شک خاتون! آپ نے ٹھیک پہچانا۔" حمان نہایت مؤدبانہ انداز میں سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا جھکتے ہوئے بولا۔

"سیبک تمہارے ہتھے کیسے چڑھ گیا؟" یہ سوال گویا قطعی غیرارادی طور پر یکدم کیتھرین کے ہونٹوں پر آگیا۔ اس کا لہجہ فی الحال کسی مریض کی کراہ سے مشابہ تھا۔ چارلس بھی ٹکر ٹکر چاروں طرف دیکھنے پر ہی اکتفا کیے ہوئے تھا۔

حمان نے کچھ اس طرح ہلکا سا قہقہہ لگایا کہ آواز اس کے حلق میں ہی گھومتی محسوس ہوئی۔ وہ گویا اس سوال سے..... یا پھر شاید اس صورتِ حال کو یاد کرکے لطف اندوز ہوا تھا جس میں سیبک اس کے ہتھے چڑھا تھا۔

"سیبک خود بخود میرے ہتھے نہیں چڑھا تھا خاتون!" اس نے اپنے مخصوص شائستہ انداز میں جواب دیا "اس کے لیے مجھے کچھ کوشش..... نہایت تیزی سے کچھ منصوبہ بندی کرنا پڑی تھی۔ ہر کام کو کرنے کے کئی طریقے ہوتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی طریقہ کارگر ہو ہی جاتا ہے۔ سیبک قبائلی آدمی تھا۔ میں نے اسے سزا دینے کے لیے بھی نہایت قدیم طریقہ ہی منتخب کیا۔ میں نے سوچا شاید اس طرح اس کی روح عالمِ بالا پر زیادہ مطمئن ومسرور رہے۔"

اس نے جھک کر تخت پر ذرا پیچھے کی طرف پڑی ہوئی کوئی چیز اُٹھائی۔ وہ چاپڑ سے مشابہ، چوڑے پھل کی نہایت بھاری بھرکم تلوار تھی۔ ایسی تلوار شاید پرانے وقتوں میں شاہی جلاد مجرموں کا سر قلم کرنے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس تلوار پر اب بھی خون لگا نظر آرہا تھا جو خشک ہوچکا تھا۔

وہ تلوار کو چہرے کے قریب لا کر بغور اس کا جائزہ لیتے ہوئے طمانیت سے مسکرایا لیکن پھر متاسفانہ سے انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "کم از کم سیبک کو اپنے ایک ہم پیشہ کے ساتھ ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"کیا نہیں کرنا چاہیے تھا؟" کیتھرین نے غیرارادی سے انداز میں پوچھا۔

حمان نے مغموم سے انداز میں سرہلایا گویا اسے اس سوال سے صدمہ پہنچا ہو۔ پھر وہ تلوار واپس تخت پر رکھتے ہوئے بولا "مس کیتھرین! اس حد تک مصنوعی سادگی، معصومیت اور بھولپن اچھا نہیں ہوتا۔ آپ لوگوں سے بہتر کون جانتا ہے کہ سیبک نے کیا کیا۔ میں اپنا کام کررہا تھا۔ آپ لوگوں کا تو مجھے رو کنے کی

کوشش کرنا سمجھ میں آتا ہے لیکن اس بدبخت سیوبک کو آپ کے ساتھ کندھے سے کندھا جوڑ کر کھڑے ہونے کی کیا پڑی تھی؟ مجھے یقین ہے کہ مسٹر چارلس یا کسی اور کو سیوبک نے ہی خبردار کیا ہوگا کہ لیڈی ڈائنا کے قتل کا کنٹریکٹ مجھے ملا ہے؟"

اس نے تصدیق طلب نظروں سے چارلس کی طرف دیکھا لیکن چارلس بدستور آنکھیں پٹ پٹاتا رہا۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اگر اس کے حواس صحیح طور پر کام کرنے بھی لگے تھے تو وہ اس کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے حمان بولا "یہ اپنے پیشے سے غداری تھی۔ سیوبک بے شک مجھے نہیں جانتا تھا، کبھی مجھ سے نہیں ملا تھا۔ ہمارا ایک دوسرے سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا لیکن اسے میرے پیشے کے بارے میں معلوم تھا۔ یوں ہم ایک ہی نادیدہ زنجیر میں بندھے ہوئے تھے۔ اس قسم کے پیشوں سے تعلق رکھنے والوں کی آنکھ میں ایک دوسرے کے لیے شرم و لحاظ ہونا چاہیے۔ وہ اگر ایک دوسرے کی مدد نہ کرسکیں تو کم از کم انہیں ایک دوسرے کی جڑیں نہیں کاٹنی چاہئیں۔"

حمان کا لہجہ اخلاقیات کے کسی مبلغ کا سا ہوگیا تھا۔ میں بس ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ کم بخت تھیٹر کا کوئی بہت منجھا ہوا اداکار معلوم ہوتا تھا اور یقیناً کافی ستم ظریف بھی واقع ہوا تھا۔

پھر وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا "اس سے پہلے میرا کوئی منصوبہ ناکام نہیں ہوا تھا۔ شاید اسی لیے مجھے ناکامی کا منہ دیکھنے کی عادت ہی نہیں رہی۔ کبھی اس امکان کو ذہن میں رکھنے کا بھی خیال نہیں آیا کہ میرا منصوبہ ناکام ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس اہم کنٹریکٹ میں ناکام رہنے کا صدمہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا مسٹر افضل چودھری! میری ساکھ تباہ ہوگئی۔ مستقبل تاریک ہوگیا۔ بہت ہی بڑی رقم صرف کرکے میں نے حال ہی میں ایک نیٹ ورک قائم کیا تھا۔ بہت بڑی انوسٹمنٹ کی تھی۔ مجھے دنیا کے مختلف گوشوں میں کئی بہت ہی اہم کنٹریکٹ ملنے کی اُمید تھی لیکن سب کچھ تباہ ہوگیا، سب کچھ ڈوب گیا مسٹر چودھری!"

دنیا واقعی بڑی ترقی کر رہی تھی۔ قتل و غارت بھی ایک کاروبار، ایک انڈسٹری بن گیا تھا۔ اس کے بھی پھلنے پھولنے اور "نیٹ ورک" قائم کرنے کے تذکرے سنجیدگی سے کیے جاتے تھے۔ اس میں "ساکھ" خراب ہونے کا افسوس کیا جا رہا تھا!

ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ ڈرامائی سے انداز میں سیوبک کے کٹے ہوئے سر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "میری تباہی کا اصل ذمے دار تو یہی شخص تھا۔" پھر اس کی انگلی ڈرامائی انداز میں ہی میری طرف گھوم گئی "لیکن اگر تم موجود نہ ہوتے تو سیوبک کی ساری کوششیں دھری کی دھری رہ جاتیں۔ تم نے عین آخری لمحوں میں اپنی جان پر کھیل کر میرے منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ تب سے میں حیران تھا کہ آخر تم کون ہو؟ دنیا کی کون سی خفیہ ایجنسی سے تمہارا تعلق ہے؟ پھر مجھے معلوم ہوا تم پاکستان کے ایک بزنس مین ہو تو میں اور بھی زیادہ حیران ہوا۔ بزنس مین تم جیسے تو نہیں ہوتے مسٹر چودھری!"

"شاید میں غلطی سے بزنس مین بن گیا ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا "تمہیں کس نے میرے بارے میں بتایا؟"

"سیوبک نے" اس نے اطمینان سے جواب دیا "وہ اور اس کے چند آدمی گاؤں سے آتے وقت میرے اور میرے آدمیوں کے ہتھے چڑھ گئے۔ میں اس کا حساب برابر کرنے کے لیے اس کی گھات میں تھا۔ میں حساب برابر کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ سیوبک نے زندگی کے آخری لمحوں میں مجھ سے بڑا تعاون کیا۔ اس کے لیے میں اس بے چارے کا شکرگزار رہوں گا۔ میں نے جو کچھ اس سے پوچھا۔ اس نے ٹھیک ٹھیک جواب دیا۔ تم لوگوں کے بارے میں جو کچھ بھی اسے معلوم تھا مجھے بتا دیا۔"

"وہ رقعہ بھی اسی نے لکھا ہوگا جو ہمیں یہاں لانے کا سبب بنا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"بے شک" حمان نے طمانیت سے سر ہلایا "میں کوئی جعلسازی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب سیوبک ہر طرح سے تعاون کر رہا تھا تو مجھے کوئی کچا کام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ زندگی کی آس بڑی بُری چیز ہوتی ہے مسٹر چودھری! جان بچ جانے کی آس پر انسان آخری لمحے تک ہر کام کرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ سیوبک کو بھی زندگی کے آخری لمحے تک آس رہی کہ شاید میں اسے چھوڑ دوں گا۔"

"تم نے اس کے آدمیوں کو بھی ہلاک کردیا؟" میں نے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ میں انہیں خاطر تواضع کے لیے ساتھ تو نہیں رکھ سکتا تھا۔ وہ یونہی بے وقوف سے قبائلی تھے۔ میرے لیے دشواریاں پیدا کرسکتے تھے۔" اس نے بے پروائی سے کہا پھر اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "یہ انہی کے لباس تو پہنے کھڑے ہیں۔ کچھ لوگ باہر بھی ہیں جو انہی کے لباسوں میں ہیں۔ سیوبک کا لباس میں خود پہننا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے ایک چرواہا مل گیا جس کے پاس ایک گدھا بھی تھا۔ مجھے اپنے کام کے لیے وہ... زیادہ موزوں نظر آیا۔"

"تم اونچے درجے کے قاتل کے بجائے نچلے درجے کے کوئی ڈرامے باز معلوم ہوتے ہو۔" میں نے اندر ہی اندر اپنے آپ کو پہلے کی طرح توانا محسوس کرتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر قدرے تکلیف کے آثار اُبھر آئے "تم مجھے ڈرامے باز ضرور کہو لیکن نچلے درجے کا مت کہو۔ میں اگر اعلیٰ درجے کا قاتل نہ ہوتا تو یقیناً اعلیٰ درجے کا اداکار یا ہدایت کار ہوتا۔"

میں نے لیٹے ہی لیٹے طویل و عریض کمرے میں نظر دوڑانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا "سیوبک کے آدمیوں کی لاشیں کہاں ہیں؟"

"وہ غیر اہم لاشیں تھیں۔ ہم نے انہیں جنگل میں اِدھر اُدھر پھینک دیا تھا۔ آخر درندوں اور پرندوں وغیرہ کو بھی تو پیٹ بھرنا ہے۔ سیوبک کی لاش البتہ اہم تھی۔ اسے میں خود اٹھائے پھر رہا تھا۔ کاش مجھے ریڈ انڈینز کی طرح کھوپڑی سکیڑنے کا نسخہ معلوم ہوتا تو میں ضرور اس کی کھوپڑی کو فتح کی یادگار کے طور پر اپنے پاس رکھتا۔"

"تمہارے بارے میں تمہارے ارادے کیا ہیں؟" میں نے پوچھا گو کہ مجھے امید نہیں تھی وہ اس سوال کا صحیح جواب دے گا لیکن اس سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ اس وقت اس کی خود اعتمادی حد سے بڑھی ہوئی تھی۔ وہ صورتِ حال سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ دوسری باتیں بھی کافی حد تک صحیح بتا رہا تھا۔ عین ممکن تھا اس سوال کا بھی صحیح جواب دے دیتا اور ہماری کیفیت سے مزید لطف اندوز ہوتا۔

میرے ہاتھ اور پاؤں دونوں ہی سختی سے بندھے ہوئے تھے اور میں خاصی تکلیف کی حالت میں ترچھا سا فرش پر پڑا تھا۔ ہاتھ پشت پر باندھے گئے تھے اور وہ میرے نیچے ہی تقریباً چھپے ہوئے تھے۔ کیتھرین اور چارلس کی حالت بھی مجھ سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی۔ چارلس کے چہرے سے تو تکلیف کے علاوہ مایوسی کا بھی اظہار ہو رہا تھا جبکہ کیتھرین کا چہرہ سپاٹ تھا۔ میں غیر محسوس طور پر زور آزمائی کرکے دیکھ چکا تھا۔ مجھے اپنے ہاتھوں کی بندشیں کھلتی یا ڈھیلی پڑتی محسوس نہیں ہوئی تھیں۔ زیادہ زور آزمائی کرنے پر شاید کوئی فرق پڑتا لیکن ان لوگوں کی آنکھوں کے سامنے میں پوری طرح زور آزمائی بھی نہیں کرسکتا تھا۔

اس کی آنکھوں میں سفاک سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور دھیرے دھیرے اس کے ہونٹوں تک آگئی۔ جواب دینے سے پہلے اس نے بطورِ خاص کیتھرین کا گہری نظروں سے سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ کچھ اس طرح آڑی ترچھی پڑی تھی کہ اس کے حسین نشیب و فراز کچھ اور نمایاں ہوگئے تھے۔ اوپر سے اس کا سُرخ بھڑکیلا لباس بھی کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ حالات کی سنگینی اپنی جگہ تھی اور اس کے سراپا کی حشر خیزی اپنی جگہ۔ اس شکستہ حالی میں بھی وہ کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ خصوصاً حمان کے لیے! کیونکہ وہ اس وقت ماسٹر آف سچویشن تھا۔ سب کچھ اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہر بات سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور مزید ہوسکتا تھا۔

وہ ایک انگلی سے دھیرے دھیرے ناک مسلتے ہوئے بولا "تم لوگوں کے بارے میں میں بڑی اُلجھن میں ہوں۔ ابھی تک میں فیصلہ نہیں کرپایا کہ تمہیں کس طرح ہلاک کیا جائے۔ گولی مار دینا کوئی بات نہ ہوگی۔ تلوار سے گردن قلم کرنے کا تجربہ میں سیوبک پر کرچکا ہوں۔ مسئلہ یہ بھی نہیں ہے کہ میں تم لوگوں کو بہت زیادہ اذیت دے کر ہلاک کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں ذاتی طور پر بیمار نہیں ہوں۔ بہت زیادہ اذیت پسند نہیں ہوں۔ خصوصاً اپنے قابو میں آئے ہوئے افراد کو زیادہ اذیتیں دینا میرا مشغلہ نہیں ہے لیکن میں چاہتا ہوں قتل کے طریقوں میں کچھ ورائٹی ہو، کچھ تنوع ہو۔ مشکل یہ ہے کہ یہاں ہمیں زیادہ سہولیات اور زیادہ ساز و سامان میسر نہیں ہے ورنہ تم لوگوں کو ٹھکانے لگانے کے کافی متنوع طریقے اختیار کیے جاسکتے تھے۔"

میں اس وقت اپنے آپ کو پُرسکون رکھنے اور رہائی کی کسی تدبیر کے سلسلے میں ذہن لڑانے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا لیکن اس لمحے میرا بڑی شدت سے دل چاہا کہ کسی معجزے کے تحت میرے ہاتھ پاؤں بندشوں سے آزاد ہوجائیں اور میں نتائج کی پروا کیے بغیر اس اُلو کے پٹھے پر ٹوٹ پڑوں اور اگر مرنا مقدر میں ہو تب بھی مرنے سے پہلے اس کی گردن توڑنے کی ایک بھرپور کوشش کرسکوں لیکن محض سوچنے اور خواہش کرنے سے بندشیں نہیں کھلتیں اور مجھ جیسے گناہ گار کو معجزوں کی امید بھی کم ہی رکھنی چاہیے تھی۔

حمان بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے ایک بار ایک دستاویزی فلم میں ایک شخص کو بجلی کی کرسی پر موت کی سزا پاتے دیکھا تھا۔ مجھے وہ منظر بہت دلچسپ لگا تھا۔ میرا دل چاہتا ہے کبھی میں خود اپنے ہاتھوں سے کسی کو بجلی کی کرسی پر بٹھا کر موت کی سزا دوں لیکن....." اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "افسوس اس جنگل میں تو بیٹھنے کے لیے عام کرسی بھی دستیاب نہیں، بجلی کی کرسی تو بہت دور کی بات ہے۔ کاش میں تمہارے مضبوط اور ورزشی جسم کو اور مس کیتھرین چارلس کے مرمریں پیکر کو تشنجی جھٹکوں کے ساتھ ٹیڑھا میڑھا ہوتے اور نیلا پڑتے دیکھ سکتا۔ کبھی کبھی فرصت میں بیٹھ کر آنکھیں بند کرکے یاد کرنے کے لیے یہ ایک عمدہ نظارہ ہوتا۔"

اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اذیت پسند نہیں تھا لیکن اس کے الفاظ کے پیچھے یقیناً ایک اذیت پسند بول رہا تھا تاہم وہ ذرا مختلف قسم کا اذیت پسند تھا۔ وہ متاسفانہ سے انداز میں دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا "اب تم ہی بتاؤ اس جنگل میں، اس بے سروسامانی کے عالم میں بھلا تم تینوں کو ہلاک کرنے کے سلسلے میں کیا ورائٹی پیدا کی جاسکتی ہے؟"

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بے بسی کا احساس کچھ بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "ویسے یہاں قریب ہی ایک کنواں موجود ہے۔ پہلے میں نے سوچا تھا تم تینوں کو رسی سے اُلٹا لٹکا کر باری باری کنوئیں میں اُتارا جائے لیکن کنواں کافی گہرا ہے۔ میں تم لوگوں کی کیفیت کچھ زیادہ صحیح طور پر نہیں دیکھ سکوں گا۔"

اس نے خاموش ہو کر گویا میرے تاثرات کا جائزہ لینے کی کوشش کی لیکن میرا اندازہ یہی تھا کہ میں اپنا چہرہ سپاٹ رکھنے میں کامیاب رہا تھا۔ کیتھرین نے بھی کسی تاثر کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا البتہ چارلس کے چہرے سے تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا لیکن یہ

تکلیف یقیناً حمان کے الفاظ کی وجہ سے نہیں تھی بلکہ وہ بندھے ہوئے ہاتھ پیروں کے ساتھ فرش پر پڑے پڑے زندگی سے بے زار ہو رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد حمان بولا "چنانچہ فی الحال میں نے نہایت قدیم اور نہایت سیدھے سادے طریقے پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یعنی نہایت معمولی سی رسی کا پھندا باری باری تم تینوں کے گلے میں ڈال کر تمہیں درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی جائے۔ تم لوگوں کو اپنی سزائے موت کے اس طریقے پر کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟"

اس کا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ فلاں سفر پہ جہاز کے بجائے ٹرین سے جانے پر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے؟ خبیث اپنی پوزیشن سے کچھ زیادہ ہی لطف اندوز ہو رہا تھا۔ لیڈی ڈائنا کو قتل کرنے کے سلسلے میں اس نے جس طرح زک اٹھائی تھی شاید اب اس کے جواب میں نفسیاتی طور پر بھی تسکین حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔

ہم تینوں میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حتیٰ کہ میں نے بھی اس کے بچگانہ اور احمقانہ سوال کے جواب میں کوئی اہانت آمیز بات کرکے اسے مزید چڑانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید میری طرح اس وقت کیتھرین اور چارلس کے ذہن بھی کہیں اور الجھے ہوئے تھے۔

سچی بات یہ تھی کہ پہلے مجھ پر کچھ مایوسی اور اضمحلال سا طاری ہونے لگا تھا گو کہ اس سے قبل بھی زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئے تھے جب مجھے زندگی سے مایوس ہو جانا چاہیے تھا لیکن میں نے مایوسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیا تھا اور کسی نہ کسی غیبی امداد کے یقین سے خود کو سنبھالے رکھا تھا اور شاید اس یقین ہی کا کرشمہ تھا کہ کسی نہ کسی بہانے صورتِ حال پلٹ جاتی تھی لیکن آج میں نے حقیقتاً اپنے آپ کو مجبور سا پایا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش بھی کی تھی کہ مایوس آدمی درحقیقت دُہری موت مرتا ہے' اسے گویا مرنے سے پہلے ہی موت آجاتی ہے۔ یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود میرے جسم میں جوش و خروش کی وہ لہر نہیں دوڑی تھی جو بساط کو اُلٹ دینے میں میری مدد کرتی تھی۔

مگر جب اس نے ہمیں رسی سے درخت میں لٹکا کر پھانسی دینے کی بات کی تو نہ جانے کیوں مجھے ایک عجیب سی خوشی کا احساس ہوا۔ مایوسی کی برف کچھ پگھلتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ اندھیرے میں کوئی کرن سی نظر آنے لگی۔ یہ بھی کوئی حیرت انگیز ہی تجربہ تھا۔ اس نے ہمیں کوئی خوش خبری تو نہیں سنائی تھی۔

اس سے پہلے میں یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ اسی بے بسی کے عالم میں ہماری کھوپڑیوں میں محض ایک ایک گولی اُتار کر ہمارا قصہ پاک کر دے گا لیکن بیشتر قاتل چونکہ فطری طور پر اذیت پسند ہوتے ہیں' لمبے چکروں میں پڑ جاتے ہیں۔ وہ بھی لمبے چکروں میں پڑ گیا تھا۔

ہمیں اس طرح پھانسی دینے کے لیے انہیں یقیناً کچھ تردد کرنا پڑتا۔ بے شک ہمارے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے لیکن ہم کوئی ننھے منے بے جان کھلونے بھی نہیں تھے جنہیں نہایت آسانی سے اٹھا کر درخت سے لٹکا دیا جاتا۔ اس حالت میں بھی تھوڑا بہت تو ہل جُل سکتے تھے۔ میں اگر مرنے سے پہلے ٹکر مار کر ان میں سے کسی کی نکسیر بھی پھوڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو بڑی طمانیت کے عالم میں اس دنیا سے رخصت ہوتا۔ میری خوشی کی وجہ محض اتنی سی تھی۔

اچانک باہر دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ حمان کے تاثرات یکدم ہی بدل گئے۔ ایک لمحہ پہلے تک وہ انتہائی مطمئن و مسرور نظر آ رہا تھا۔ اس کی خود اعتمادی کی کوئی انتہا نہیں تھی لیکن یکدم ہی وہ ایک فکر مند چوہا نظر آنے لگا۔

اس نے چیخ کر کسی کو پکارا اور کسی ناقابلِ فہم زبان میں کچھ پوچھا۔ ایک جھاڑ جھنکاڑ سے چہرے نے دروازے سے جھانکا اور اسی زبان میں کوئی جواب دیا جو کم از کم میرے لیے ناقابلِ فہم تھی۔ کمرے میں حمان کے دو آدمی موجود تھے وہ بھی اچھل کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔

جھاڑ جھنکاڑ چہرے کی بات سُنتے ہی وہ تینوں تیزی سے کمرے سے نکل گئے۔ انہوں نے ہمارے بارے میں مزید کوئی احتیاطی تدبیر کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ شاید اس لیے کہ ہم تو پہلے ہی سراپا "احتیاطی تدبیروں" میں ہی جکڑے ہوئے تھے۔ جن کے ہاتھ اور پاؤں رسیوں میں جکڑے ہوں' ان کے بارے میں مزید احتیاطی تدبیر کی کیا ضرورت تھی۔ حمان تو شاید ایک لمحے کے لیے ہمیں بھول ہی گیا تھا۔ وہ کچھ اس تیزی سے کمرے سے نکلا تھا جیسے کمان سے تیر نکلا ہو۔ اس کی پھُرتی پر میں قدرے حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔

دوسرے ہی لمحے باہر سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ میں نے گہری سانس لے کر چارلس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسی ہی چمک تھی جیسی چوری چھپے دودھ پی جانے کے بعد بلی کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔ وہ عمر میں مجھ سے خاصا بڑا تھا اور تمیں بتیس سال کی ایک لڑکی کا باپ تھا لیکن اب میں اس سے دوستانہ انداز میں ہی بات چیت کرنے لگا تھا۔ احترام اور تکلفات کو میں نے بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

"کیا بات ہے آنے سے پہلے کچھ کام دکھا آئے تھے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' آتے آتے میں نے ایک خاص آدمی کو بتا دیا تھا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ آتے وقت تم لوگوں کو سفیر کے مکان سے باہر بھیجنے کے بعد میں اندر ایک فون کرنے گیا تھا۔ کام کا آدمی ہے وہ شاید وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ یہاں پہنچ گیا ہے اور اس نے ہمارا سراغ بھی لگا لیا ہے۔"

"لیکن کیا اس نے آتے ہی اندھا دھند فائرنگ بھی شروع

دی ہے؟ اس طرح تو تمہارا وہ کام کا آدمی ہمارا کام تمام بھی کر سکتا ہے۔" میں نے فائرنگ کی آوازوں سے کچھ اندازے لگانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"نہیں نہیں' وہ بہت تجربہ کار آدمی ہے۔ جو کچھ کرے گا سوچ سمجھ کر کرے گا۔ مجھے اس پر بڑا بھروسا ہے۔" چارلس جو سب سے زیادہ پریشان تھا اب یک بیک ہی اس کے لہجے میں سب سے زیادہ طمانیت جھلکنے لگی تھی۔

"حضرات! کیا آپ دونوں براہِ مہربانی میری طرف کچھ توجہ فرمائیں گے؟" کیتھرین کی دھیمی سی آواز سنائی دی۔

میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اگر میں اس وقت فرش پر بندھا نہ پڑا ہوتا تو یقیناً حیرت سے اُچھل پڑتا۔ وہ تقریباً اسی پوزیشن میں پڑی تھی جس میں' میں نے اسے چند لمحے پہلے دیکھا تھا لیکن اب اس کا ایک بازو ہوا میں بلند تھا۔ بالکل اسی طرح جیسے کوئی ڈوبتا ہوا شخص کسی کو مدد کے لیے پکارنے اور اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یعنی اس نے اپنا ہاتھ بندشوں سے آزاد کرا لیا تھا۔

"اب وقت کیوں ضائع کر رہی ہو۔ جلدی سے میرے ہاتھ بھی کھولو۔" میں نے گویا تڑپ کر کہا۔ باہر گولیوں کی تڑتڑاہٹ تیز ہوتی جا رہی تھی۔

کیتھرین مسکراتے ہوئے پھُرتی سے اٹھ بیٹھی۔ ایک ہاتھ آزاد ہو جانے کی وجہ سے اس کے دوسرے ہاتھ پر رسی ڈھیلے ڈھالے انداز میں بندھی رہ گئی تھی۔ کیتھرین نے اسے اُتار پھینکا لیکن اس کے پاؤں اب بھی بندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اسے کچھ کھسک کر اور کچھ گھسٹ کر میرے قریب آنا پڑا۔

اس نے مجھے یوں دوسرے پہلو کے بل لڑھکا دیا جیسے قصائی بندھے ہوئے جانوروں کو ذبح کرتے وقت بے پروائی سے اِدھر اُدھر لڑھکا دیتے ہیں۔ وہ میری بندشوں سے الجھنے لگی تو میں نے پوچھا "تمہارا ہاتھ کیسے آزاد ہو گیا؟"

"شاید یہ صنفِ نازک ہونے کا ایک اور فائدہ تھا۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولی "شاید میرے ہاتھ ایسی سختی سے باندھے بھی نہیں گئے تھے جس سختی سے تمہارے باندھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ ضرورت پڑنے پر خواہ میں کتنی ہی سخت جان ثابت ہوں لیکن میرے ہاتھ پیروں میں جو لچک اور نرمی ہے وہ تمہارے ہاتھ پیروں میں نہیں ہو سکتی۔"

"اللہ نہ کرے۔" میں نے جلدی سے کہا۔

وہ گویا میری بات اَن سنی کرکے نہایت دھیمی آواز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "وہ منحوس چھوٹی نسل کا بکرا جب تم سے بک بک میں الجھا ہوا تھا اس تمام وقت میں' میں اپنے ہاتھ کو سکیڑ سکیڑ کر رسی کے پھندے سے نکالنے کی کوشش ہی کرتی رہی تھی۔ اس کوشش میں میرا ہاتھ چھل کر رہ گیا ہے۔"

"اس وقت جو کام تم نے دکھایا ہے اس میں تو اگر تمہارے ہاتھ کی کھال بھی اتر جاتی تو پروا نہیں تھی۔" میں نے دبے دبے جوش سے کہا۔

"ہاں' تمہیں بھلا کیوں پروا ہوتی۔ وہ تو میرے ہاتھ کی کھال ہوتی نا۔" وہ میری پسلیوں پر ہلکا سا گھونسا رسید کرکے بولی "تمہارے لیے خوش خبری یہ ہے کہ تمہارے ہاتھوں پر کچھ زیادہ ہی پیچیدہ اور زیادہ ہی سخت قسم کی گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ مجھ سے نہیں کھل رہیں۔ شاید وہ لوگ تم سے ہی سب سے زیادہ خوف زدہ تھے۔"

"انہیں نہیں معلوم تھا کہ اصل فتنہ تم ہو۔" میں نے کراہ کر کہا "اب باتیں مت کیے جاؤ۔ تخت پر سے وہ تلوار اٹھاؤ اور رسیاں کاٹ ڈالو۔"

تخت تک جانے کے لیے اسے کھلے دروازے کے سامنے سے گزرنا پڑتا۔ اس نے پہلے سر ذرا سا آگے بڑھا کر دروازے سے جھانکا پھر گھسٹتی ہوئی تخت تک چلی گئی۔ اس نے شاید باہر جھانک کر کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا تھا تاہم اس نے اب بھی اپنے پیروں کی بندشیں کھولنے میں وقت صرف نہیں کیا۔

تلوار تخت سے اٹھا کر وہ لڑھکتی ہوئی واپس آئی اور سرگوشی میں بولی "واہ کیا شاندار تلوار ہے۔ اسے ہاتھ میں لے کر تو خواہ مخواہ ہی کسی کی گردن قلم کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"واقعی کم ظرف کے ہاتھ میں ہتھیار خطرناک ہوتا ہے۔" میں نے افسوس زدہ لہجے میں کہا "کہیں رسیاں کاٹنے کے بجائے میری کلائیاں نہ کاٹ دینا۔"

میرا جملہ پورا ہونے تک وہ میری بندشیں کاٹ چکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے پیروں کی بندشیں کاٹ ڈالیں پھر وہ اپنے باپ کی طرف متوجہ ہوئی جو یقیناً بے تابی سے اس کا منتظر تھا۔ باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن اپنا کام کرنے میں کیتھرین نے کوئی تاخیر نہیں کی تھی۔ چند سیکنڈ میں اس نے چارلس کو بھی بندشوں سے نجات دلا دی تھی۔

میں اس دوران کلائیوں کو رگڑ کر خون کی گردش صحیح طور پر بحال کرچکا تھا' میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "لاؤ جلدی سے یہ تلوار مجھے دے دو۔ اس وقت ہمارے پاس اس کے سوا کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

وہ تلوار مجھے دیتے ہوئے بولی "لو' یہ اکلوتا ہتھیار بھی تم رکھ لو۔ سچ ہے مرد بڑے ہی خود غرض ہوتے ہیں۔"

"تمہیں تلوار کی کیا ضرورت ہے۔ تم تو نظروں کے تیر چلا کر ہی اپنا کام نکال سکتی ہو۔"

"نظروں کے تیر؟" اس نے حیرت سے دُہرایا۔ یہ خالص مشرقی اصطلاح شاید اس کی سمجھ میں نہیں آئی تھی۔ لیکن اب وضاحتوں کا وقت نہیں تھا۔ حرکت میں رہتے ہوئے ہم جتنی باتیں کیے جارہے تھے وہی کافی تھیں۔

میں تلوار لے کر باہر کا جائزہ لینے کے لیے دروازے سے باہر جھانکنے کے ارادے سے آگے بڑھا۔ ابھی میں ایک ادھ کھلے پٹ کے قریب ہی پہنچا تھا کہ یک لخت تھوڑے ہی فاصلے پر کہیں سے دروازے پر ہلکی مشین گن کا برسٹ پڑا۔ آدھے پٹ کے پرخچے اُڑ گئے اور میں فوراً ہی فرش پر اوندھا گر پڑا۔

سب مشین گن اس کے بعد بھی وقفے وقفے سے کئی بار گرجی لیکن اب اس کا رخ شاید کسی اور طرف ہوگیا تھا۔ عقب سے کیتھرین فرش پر رینگتی ہوئی میرے قریب آئی اور نیچی آواز میں بولی "اوندھے کیوں گر گئے میرے شیر؟ تلوار لے کر گولیوں کی بوچھاڑ میں نکل جاؤ اور کشتوں کے پشتے لگادو۔"

"خاموش رہو آستین کے سانپ کی مادہ!" میں نے نیچی آواز میں مصنوعی خفگی سے کہا "اگر تمہیں مجھ کو مروانے کا اتنا ہی شوق ہے تو ویسے ہی چیخ کر انہیں مطلع کردو کہ ہم آزاد ہوچکے ہیں۔"

"میں ایسا کر گزرتی لیکن اس صورت میں مجھے اور پاپا کو بھی تمہارے ساتھ مرنا پڑے گا۔ یہ مہنگا سودا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

اس لمحے اچانک ہی فائرنگ کا سلسلہ بند ہوگیا۔ پھر دوڑتے قدموں کی آواز دروازے کی طرف بڑھتی سنائی دی۔ میں تلوار سنبھال کر اُچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ میں شکستہ دروازے کی اوٹ میں تھا اور کسی شخص کے اندر داخل ہوتے ہی اس کی گردن اُڑا دینے کے لیے بالکل تیار تھا۔

ایک شخص بگولے کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ میں اس کی صرف جھلک ہی دیکھ سکا تاہم مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ حمان تھا۔ میں نے تیزی سے تلوار گھمائی۔ اس کی جگہ کوئی اور شخص ہوتا تو اس تیزی میں اندر آتے وقت اس غیر متوقع وار سے نہیں بچ سکتا تھا لیکن حمان کی پھرتی نے مجھے بھی حیران کردیا۔

اس نے جس تیزی سے گردن جھکائی اس سے یقیناً کوئی نہ کوئی ریکارڈ قائم ہوا ہوگا لیکن وار خالی نہیں گیا۔ حمان کے پیچھے کوئی اور بھی اندھا دُھند بھاگا آرہا تھا۔ حمان کی جگہ اس کی گردن اڑ گئی۔ زندگی میں پہلی بار میں نے اس طرح کسی شخص کو موت کے گھاٹ اُتارا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو بیسویں صدی کا کوئی جلاد محسوس کیا۔

اس شخص کی گردن کٹ کر دروازے کے قریب ہی گر گئی مگر اس کی سربریدہ لاش کچھ آگے جاکر گری۔ کمرے میں یکدم گویا کسی نے لہو سے بھرے مشکیزے کا منہ کھول کر چھڑکاؤ سا کردیا۔

اس دوران حمان جو اپنی جھونک میں آگے نکل چکا تھا گویا ایڑیوں کے بل گھوما۔ مجھے بروقت ہی اس کے ہاتھوں میں گن کی جھلک نظر آگئی۔ میں نے بھی اسی کی طرح پھرتی کا ریکارڈ قائم کرتے ہوئے خود کو فرش پر گرادیا۔ ورنہ گولیوں کی بوچھاڑ نے شاید میرا بالائی دھڑ چھلنی کردیا ہوتا۔

حمان کمرے سے بھاگا تھا تو ہم تینوں کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور ہم فرش پر پڑے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ اس وقت کیبن کو گھیرے میں لیا جاچکا تھا۔ حمان کے ساتھی شاید مارے جاچکے تھے اور وہ نکل بھاگنے کا ارادہ کرچکا تھا لیکن جانے سے پہلے ہم تینوں کا کام تمام کرنے آیا تھا۔

تاہم اس کے اعصاب کی مضبوطی کا اندازہ اس سے ہوتا تھا کہ کمرے میں گھستے ہی اس نے اپنے آپ کو تلوار کے قطعی غیر متوقع وار سے بچایا تھا اور پھر کمرے میں بازی پلٹی ہوئی دیکھ کر حیران ہونے یا صورتِ حال کو سمجھنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا تھا بلکہ فوراً ہی ایڑیوں کے بل گھوم کر مجھ پر برسٹ مارنے کی کوشش کی تھی۔ اپنی ظاہری شخصیت اور جسامت سے وہ ایک معمولی آدمی دکھائی دیتا تھا لیکن بلاشبہ وہ ایک چھلاوا تھا۔

میں نے فوراً ہی دوسری طرف کو لڑھک کر اس کے دوسرے متوقع برسٹ سے بچنے کی کوشش کی گو کہ اس وقت مجھے زندگی کی آس ذرا کم ہی رہ گئی تھی لیکن حمان کی گن کو دوبارہ گرجنا نصیب نہیں ہوسکا۔ میرا دوسری طرف کو لڑھکنا بیکار ہی رہا کیونکہ اسی لمحے میں نے دیکھا ایک گولا سا بڑی طاقت سے حمان کے منہ پر آکر لگا اور وہ بری طرح لڑکھڑا گیا۔

گن اس کے ہاتھوں سے چھوٹ گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے چہرے کی طرف اٹھ گئے۔ میں فوراً گن اٹھانے کے لیے جھپٹا اور اسی لمحے میں نے اس گولے کو لڑھکتے دیکھا جو حمان کے چہرے سے ٹکرایا تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ سیو بک کی کھوپڑی تھی۔

کیتھرین نے کمال حاضر دماغی کا ثبوت دیا تھا۔ اسے اور کچھ نہیں ملا تھا تو اس نے سیو بک کی کھوپڑی ہی اٹھا کر حمان کے منہ پر کھینچ ماری تھی اور اس وقت اس نے واقعی توپ کے گولے سے زیادہ اہم کام کیا تھا۔

میرا ہاتھ گن تک پہنچا ہی تھا کہ حمان نے اچانک کھڑکی سے باہر چھلانگ لگادی۔ نہ جانے کیوں اس نے کمرے میں مزید رکنے اور اپنی حیرت انگیز پھرتی سے مزید کوئی کام لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ باہر کی صورتِ حال اس کے حق میں نہیں تھی جس کا اندازہ مجھے بعد میں ہوا۔

کھڑکی زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن وہ گویا کسی پرندے کی طرح اڑتا ہوا اس سے نکل گیا۔ دوسرے ہی لمحے باہر ایک بار پھر کسی گن کی تڑتڑاہٹ ابھری اور میں سمجھا شاید اس کا کام تمام ہوگیا۔ کچھ دیر گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونجتی رہی پھر سکوت چھا گیا۔

میرا ہاتھ حمان کی چھوڑی ہوئی گن پر تھا لیکن میں اپنی جگہ ساکت ہوکر رہ گیا تھا۔ کھڑکی اور دروازے سے کئی آوارہ گولیاں اندر آئیں اور اِدھر اُدھر دیواروں میں پیوست ہوگئیں۔ کچھ گولیاں باہر کی طرف سے بھی چوبی دیواروں سے ٹکرائی تھیں جن کی وجہ سے کئی بار دیواریں ہلتی ہوئی سی محسوس ہوئی تھیں لیکن یہ دیواریں یقیناً کافی موٹی تھیں اس لیے گولیاں ان کے پار نہیں ہوئی تھیں لیکن کھڑکی اور دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے فی الحال کھڑے ہونے کا رسک نہیں لیا جاسکتا تھا۔ کیتھرین اور چارلس بھی زمین سے چپک کر رہ گئے تھے۔

کمرے میں اب ایک کے بجائے دو سربریدہ لاشیں پڑی تھیں۔ حمان کے ساتھی کا خون تو چوبی فرش پر کافی دور تک پھیل گیا تھا۔ میں نے جب حمان پر تلوار سے وار کیا تھا اور حمان کے بجائے اس کے ساتھی کا سر قلم ہوگیا تھا تو اس وقت تلوار دروازے میں گہری گڑ کر رہ گئی تھی۔ میں نے اسے وہیں چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اس کو نکالنے کی مہلت ہی نہیں ملی تھی۔ وہ اب بھی دروازے ہی میں پھنسی دھیرے دھیرے تھرتھرا رہی تھی۔

کئی لمحے کے سکوت کے بعد کیتھرین گھٹے گھٹے سے لہجے میں بولی "کیا اب ہم زندگی بھر یونہی کچھوؤں کی طرح زمین سے چپٹے لیٹے رہیں گے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے' ہمیں جان بچ جانے کی خوشی میں ڈانس کرتے ہوئے باہر نکل جانا چاہیے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

اس نے خوف ناک سی نظروں سے مجھے گھورا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہورہی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ چہرہ اور لباس جگہ جگہ سے مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ حالت میری بھی اس سے کچھ زیادہ مختلف نہیں تھی لیکن اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے ہنسی آگئی۔

"تم ان حالات میں بھی ہنس سکتے ہو؟" وہ غرائی "تم بھی حمان اور سیو بک سے کچھ کم نہیں ہو۔"

"میں ایک شریف آدمی ہوں۔ مجھے ان کرائے کے قاتلوں سے کیوں ملا رہی ہو۔" میں نے گویا بُرا مناتے ہوئے کہا "میں تو صرف تمہاری حالت دیکھ کر ہنس رہا تھا۔ پوری ملنگ لگ رہی ہو بلکہ ملنگنی کہنا چاہیے۔ سفید فام ملنگنی۔"

"یہ ملنگنی کیا بہت برا آدمی ہوتا ہے؟" اس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"ہوتا نہیں' ہوتی ہے۔ یوں سمجھ لو جس طرح تمہارے ہاں ہپی ہوا کرتے تھے اس سے کچھ ملتی جلتی چیزیں ہمارے ہاں ملنگ اور ملنگنی کہلاتی ہیں۔" میں نے حمان کی چھوڑی ہوئی گن اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔ وہ اُوزی تھی۔ اس سے پہلے بھی جب حمان اس مقام سے فرار ہوا تھا جہاں لیڈی ڈائنا کی کار کو دھماکے سے تباہ کرنے کی منصوبہ بندی کی گئی تھی تو ہمیں ایک عمارت میں حمان کی چھوڑی ہوئی ایسی ہی ایک اور اسرائیلی گن اُوزی ملی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ اس کی پسندیدہ گن تھی۔

میں دیوار کی طرف کھسکنے لگا تاکہ ذرا محفوظ گوشے میں جاکر کھڑا ہوسکوں لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے رک جانا پڑا۔ میگا فون پر کوئی آواز اُبھری تھی۔ کوئی انگریزی میں کہہ رہا تھا "مسٹر چارلس! اگر آپ بخیریت ہیں تو کیبن سے باہر آجائیں۔ یا ہمیں بہ آواز بلند بتائیں آپ کس حال میں ہیں۔ ہم کیبن کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں۔"

چارلس کی آنکھوں میں فاتحانہ سی چمک آگئی اور وہ اپنی تمام درماندگی اور بدحالی کو بھول کر اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ میری طرف دیکھ کر باچھیں کھلاتے ہوئے بولا "یہ میجر ولسن کی آواز تھی۔" انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میجر ولسن میرا کوئی بہت پرانا شناسا تھا جسے میں بھلا بیٹھا تھا اور چارلس مجھے اس کی یاد دلا رہا تھا۔

"یہ میجر ولسن کون ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"ایم آئی فائیو کا ایجنٹ ہے۔" اس نے اپنے کپڑوں سے گرد جھاڑتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا۔

"ایم آئی فائیو؟" میں نے حیرت سے دُہرایا "یہ کیا بلا ہے؟"

"برطانیہ کی ایک خفیہ ایجنسی۔" اس نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے جواب دیا۔

وہ کچھ اس طرح باہر نکلا جیسے خوب تیار ہوکر' بے داغ و بے شکن لباس زیب تن کرکے کسی تقریب میں شرکت کرنے جارہا ہو۔ ابھی اس نے دروازے سے باہر قدم ہی رکھا تھا کہ کسی طرف سے گولی چلی اور وہ پٹ سے واپس کمرے میں آگرا۔ وہ چت گرا تھا اور وہیں ساکت ہوگیا تھا۔ میرے دل کو شدید دھچکا لگا۔

"پاپا!" کیتھرین چیخی اور مزید کسی فائرنگ وغیرہ کی پروا کیے بغیر

اس پر جا گری اور اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ میں گھٹنوں کے بل اس کی طرف بڑھا اور دوسرے ہی لمحے گہری سانس لے کر رہ گیا۔ چارلس تو نہایت تیزی سے پلکیں جھپک رہا تھا۔

میں نے اس کا سرتاپا جائزہ لیا' کہیں کوئی زخم یا خون وغیرہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن کیتھرین صحیح طور پر اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے سینے پر سر رگڑے جا رہی تھی۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلاتے ہوئے کہا "آہ وزاری کی ضرورت نہیں۔ تمہارے پاپا صحیح سلامت ہیں۔"

اس نے چونک کر سیدھا ہوتے ہوئے آنکھیں پونچھ کر باپ کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ کیتھرین رونا دھونا بھول کر اس کا کندھا ہلاتے ہوئے بولی "کیا ہوا پاپا؟ آپ ٹھیک تو ہیں نا؟"

"میری ناک موجود ہے نا؟" چارلس کراہ کر بولا۔

"ہاں' موجود ہے۔ کیوں؟" کیتھرین آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی ناک کا جائزہ لیتے ہوئے بولی۔ چارلس نے خود بھی اپنی ناک پر ہاتھ پھیر کر گویا اس کی موجودگی کی تصدیق کی اور طویل سانس لے کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے کمرے میں گرتے ہی باہر دوبارہ فائرنگ شروع ہو گئی تھی جو ابھی جاری تھی۔

چارلس معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے گولی میری ناک کو چھوتی ہوئی گزری تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے چہرے پر لگی ہے۔"

"اوہ..... میرے خدا! پاپا! آپ نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔" کیتھرین قدرے بگڑ کر بولی۔ اس کے رخساروں پر لگی ہوئی مٹی کے درمیان آنسوؤں کی لکیریں نظر آ رہی تھیں۔

چارلس اطمینان سے بولا "جان نکلنے کی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی ہے کہ تم میرے لیے رو بھی سکتی ہو۔"

"یہ بات آپ مجھ سے ویسے بھی پوچھ سکتے تھے۔ مجھے اتنا بڑا جھٹکا دینے کی کیا ضرورت تھی؟" کیتھرین خفگی سے بولی۔

"میں تمہیں کوئی جھٹکا وغیرہ ہرگز نہیں دے رہا تھا۔" چارلس کراہ کر بولا "جھٹکا تو مجھے خود لگا تھا۔ مجھے واقعی یوں لگا تھا جیسے گولی میرے چہرے میں پیوست ہو گئی ہے۔ میں نے باقاعدہ اس کی تکلیف محسوس کی تھی۔"

ایک بار پھر میگا فون پر وہی آواز اُبھری "مسٹر چارلس! کیبن کے قریب ایک شخص چھپا ہوا تھا۔ وہ بھی مارا جا چکا ہے۔ آپ کیبن سے باہر آ جائیں تاکہ ہمیں اندازہ ہو سکے اندر کیا صورت حال ہے۔"

چارلس نے باری باری ہم دونوں کی طرف دیکھا اور سر سہلاتا ہوا یوں اٹھ کر باہر چل دیا جیسے کوئی زبردستی اسے کنوئیں میں دھکا دینے کے لیے کھینچے لیے جا رہا ہو۔ دروازے سے باہر قدم رکھتے ہی گیا۔ اس بار کسی گولی نے اس کا استقبال نہیں کیا۔

ایک لمحے کے سکوت کے بعد میگا فون پر وہی آواز ابھری "باقی لوگ بھی براہِ کرم کیبن سے باہر آ جائیں۔"

میں نے اُوزی وہیں دیوار کے ساتھ کھڑی کر دی کہ کہیں میرے ہاتھ میں گن دیکھ کر کسی کو غلط فہمی نہ ہو جائے۔ معلوم نہیں وہ لوگ مجھے پہچانتے بھی تھے یا نہیں؟ میں اور کیتھرین بھی محتاط انداز میں کیبن سے باہر آ گئے۔ کیبن سطح زمین سے تین چار فٹ کی بلندی پر تھا۔ تین چار سیڑھیاں مختصر سے پلیٹ فارم کے آگے موجود تھیں۔ دائیں ہاتھ پر ایک کنواں نظر آ رہا تھا جس پر پانی کھینچنے کے لیے چرخی بھی موجود تھی۔

صرف اس کیبن کے اردگرد کچھ دور تک زمین صاف تھی۔ اس سے آگے چاروں طرف گھنا جنگل تھا۔ کھلی جگہ میں مجھے کہیں کوئی لاش پڑی نظر نہ آئی۔ جنگل اتنا گھنا تھا کہ کچھ دور سے کسی کی نقل و حرکت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ جرائم پیشہ افراد کے لیے واقعی یہ بڑی عمدہ پناہ گاہ تھی۔

کچھ دیر بعد جنگل کے مختلف حصوں سے کچھ لوگ برآمد ہوئے۔ کچھ لوگ کیبن کے عقب سے بھی آئے تھے۔ ان میں سے صرف تین سفید فام تھے۔ باقی ترک ہی معلوم ہوتے تھے گو کہ ان کی رنگت بھی سفید فاموں سے کچھ کم سرخ و سفید نہیں تھی۔ وہ مختلف قسم کی خطرناک آٹومیٹک گنیں اٹھائے ہوئے تھے۔ ایک کے کندھے پر سب مشین گن بھی تھی۔ میرے لیے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ خاص تربیت یافتہ لوگ تھے اور انہوں نے کمانڈو ایکشن کے ذریعے حمان کے ساتھیوں کو ہلاک کیا تھا۔

حمان کے ساتھی خود بھی یقیناً کمانڈو ہی تھے لیکن وہ شاید اس خوش فہمی میں مارے گئے تھے کہ کوئی انہیں یہاں آ کر نہیں گھیر سکتا تھا۔

چاروں طرف سے جنگل سے برآمد ہونے والے لوگ ہمارے قریب آ گئے۔ مضبوط جسم کا ایک دراز قد' ادھیڑ عمر سفید فام شخص ان کا قائد معلوم ہوتا تھا۔ اس کی کمر سے ایک میگا فون بھی بندھا ہوا تھا۔ کچھ دیر پہلے ہم نے یقیناً اسی کی آواز سنی تھی۔ قریب آنے پر اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ چارلس نے صرف اسی سے میرا مختصر تعارف کرایا "یہ میجر ولسن ہیں" اس کے علاوہ اس نے مجھے اس کے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔

"خدا کا شکر ہے ہم آپ کو زندہ ان لوگوں کی گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو گئے۔" میجر ولسن مسرور لہجے میں بولا۔ اس کے بالوں میں دو تین پتے اٹکے نظر آ رہے تھے۔

"اس میں تمہارا کچھ ایسا کمال نہیں ہے۔" چارلس بولا "وہ تو شکر ہے کسی طرح کیتھرین کا ایک ہاتھ رسیوں سے آزاد ہو گیا اور اس کی وجہ سے ہم تینوں کے ہاتھ پاؤں کھل گئے ورنہ تمہیں کیبن

کے لیے دوبارہ بھاگا بھاگا کیبن میں آیا تھا۔" پھر چارلس نے مختصراً انہیں بتایا کہ ہم پر کیا گزری تھی۔ آخر میں وہ بولا "بہرحال پانسا تمہارے آنے سے ہی پلٹا۔ ورنہ ہمارا نہ جانے کیا حشر ہوتا۔"

"ہمیں تیاری کے لیے بہت کم وقت ملا۔ پھر بھی میرا خیال ہے ہماری کارکردگی مناسب ہی رہی۔" میجر ولسن نے کہا پھر وہ اپنے ترک ساتھیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "ترکش آرمی کے ان کمانڈوز نے بھی بڑے اچھے طریقے سے ہمارا ساتھ دیا۔ درحقیقت یہی لوگ اس جنگل سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے تعاون کے بغیر یہ آپریشن اتنے کم وقت میں اتنی کامیابی سے تکمیل تک پہنچانا بہت مشکل تھا۔ قابلِ داد بات یہ ہے کہ ہمارے کسی آدمی کو ایک گولی بھی نہیں لگی۔"

مزید کچھ دیر تک وہ وہیں کھڑے ایک دوسرے کی تعریف کرتے رہے۔ میں اور کیتھرین اس دوران بالکل خاموش رہے۔ بالآخر چارلس نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے وہ سوال کر ہی ڈالا جو کچھ دیر سے میری زبان پر مچل رہا تھا "کہیں کوئی لاش نظر نہیں آ رہی۔"

"لاشیں جنگل میں ہیں اور ہمیں اندازہ ہے کہاں کہاں بکھری ہوئی ہیں۔" میجر ولسن بولا "ہم ابھی ان کا جائزہ لیتے ہیں۔"

ہم ان کی رہنمائی میں جنگل میں بہت دور تک پھرے۔ ہمیں مختلف مقامات پر کل پانچ لاشیں ملیں۔ ان میں دو افراد وہ بھی تھے جو ہمیں سفیر کے گھر سے لے کر آئے تھے۔ کل تین افراد قبائلی لباس میں تھے جو انہوں نے یقیناً سیوبک کے ساتھیوں کے جسموں سے اتارے تھے۔ باقی دو افراد جینز جیکٹوں میں تھے۔ ایک کیبن میں میرے ہاتھوں تلوار سے مارا گیا تھا۔

حمان کا ایک ساتھی تو عجیب ہی انداز میں درخت میں اُلٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے پاؤں شاخوں میں کہیں پھنس گئے تھے۔ اس کی گن ابھی تک اس کے ہاتھوں میں ہی پھنسی ہوئی تھی۔ پہلی نظر میں تو یہی معلوم ہوتا تھا جیسے وہ شخص اُلٹا لٹک کر کسی کا نشانہ لے رہا تھا لیکن اس کے سر کے عین نیچے دائرے میں پھیلا ہوا بہت سا خون کچھ اور کہانی سنا رہا تھا۔ خون ابھی تک اس کے بالوں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہا تھا۔ یہ خاصا عبرت انگیز سا منظر تھا۔

یہ تو ابھی صرف حمان کے ساتھیوں کی لاشیں تھیں۔ ان لوگوں نے سیوبک کے کم از کم تین ساتھیوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔ اس کا مطلب تھا جنگل میں کہیں اور ان کی لاشیں بھی موجود تھیں۔ کرائے کے ان قاتلوں سیوبک اور حمان نے خواہ مخواہ ہی اتنے لوگوں کو مصیبت میں ڈالا تھا اور اتنی خون ریزی کرائی تھی۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو ہی نہیں خود کو بھی ہلاکت میں ڈالا تھا۔

لاشوں کو کسی نے نہیں چھیڑا۔ جب وہ لوگ اپنا جائزہ مکمل کر چکے تو میں نے کہا "ان میں حمان کی لاش نہیں ہے۔"

ترکش آرمی کا ایک کمانڈو اکھڑی اکھڑی سی انگریزی میں بولا "مجھے کچھ شبہ تو ہے کہ ایک شخص فرار ہونے میں کامیاب ہوا ہے۔ مجھے معلوم نہیں وہ کون تھا۔ وہ میرے ٹارگٹ پر تھا لیکن اس کی خوش قسمتی تھی کہ عین وقت پر میری گن کا کلپ خالی ہو گیا۔ مجھے کندھے سے دوسری لوڈڈ گن اتار کر سیدھی کرنے میں مشکل سے دو تین سیکنڈ لگے ہوں گے لیکن اس دوران وہ غائب ہو چکا تھا تاہم وہ چونکہ جنگل ہی میں اندر کی طرف بھاگا تھا اور خالی ہاتھ تھا اس لیے میرا خیال تھا کہ ہمارے کسی نہ کسی دوسرے ساتھی کے ہاتھوں ضرور مارا جائے گا۔"

میرے دل میں نہ جانے کیوں اس انکشاف سے خلش سی بیٹھ گئی کہ حمان جان بچا کر نکل جانے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن چارلس کو اس بات کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ وہ اسی پر بہت خوش تھا کہ ہم تینوں کی جان بچ گئی تھی' حمان کے تمام ساتھی مارے گئے تھے اور اسے نہ جانے کیسے کیسے عزائم کا اظہار کرتے کرتے اچانک دُم دبا کر بھاگنا پڑا تھا۔

میجر ولسن بولا "اگر ان میں سے حمان بھاگنے میں کامیاب ہو چکا ہے تو ہمیں اب بھی ہوشیار رہنا چاہیے۔ بے پروائی سے اِدھر اُدھر نہیں پھرنا چاہیے۔" وہ چوکنا سا ہو کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اپنے ساتھیوں کی نسبت وہ محتاط آدمی معلوم ہوتا تھا۔

چارلس بولا "اب تم ہوشیار رہو یا غافل' لیکن ہمیں واپس بھجوانے کا بندوبست کر دو۔ تمہارا کیا ارادہ ہے؟"

"میں ابھی میجر افنان کے ساتھ یہیں موجود رہوں گا۔" اس نے ترکش آرمی کے کمانڈوز میں سے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا جو صورت ہی سے نہایت جنگجو معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس نے بتایا "باقی لوگ واپس چلے جائیں گے۔ ہم ان لاشوں کے بارے میں کچھ تفتیش کریں گے۔ اچھی طرح ان کا معائنہ کریں گے۔ حمان اگر زندہ بچ گیا ہے تو یہ کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اس کا تعاقب جاری رہنا چاہیے۔ ابھی لیڈی ڈائنا کا مزید تین دن یہاں قیام رہے گا۔ وہ اس دوران کوئی اور کوشش نہ کر ڈالے۔ اس کے پاس وسائل اور ساتھی موجود ہیں اور ہماری معلومات اس کے بارے میں ناکافی ہیں۔"

اس نے اپنے ایک سفید فام ساتھی کو ہمارے بارے میں ہدایات دیں اور ہم اس کی رہنمائی میں ایک طرف روانہ ہو گئے۔ بیشتر افراد ہمارے ساتھ ہی چل دیئے تھے۔ سفید فام شخص درحقیقت ایک ترک کمانڈو کی مدد سے ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔

ہمیں جنگل میں کافی فاصلہ طے کرنا پڑا۔ جوں جوں ہم چلتے گئے درختوں کا سلسلہ چھدرا ہوتا گیا ورنہ جہاں سے ہم چلے تھے وہاں تو سورج کی روشنی بھی زمین تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔ ترک کمانڈو نہ جانے کن نشانیوں کے سہارے آگے بڑھ رہا تھا۔

خاصے طویل سفر کے بعد بالآخر ہم جنگل کے اس حصے میں آ پہنچے جہاں درخت اتنے چھدرے تھے کہ ان کے درمیان سے چھوٹی موٹی گاڑیاں لہراتی ہوئی گزر سکتی تھیں۔ یہاں دو بند جیپیں

درختوں کے درمیان آڑی ترچھی کھڑی تھیں۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کہا "ایسی ہی کسی جگہ پر وہ پک اپ بھی کھڑی تھی جس میں وہ لوگ ہمیں لے کر آئے تھے۔"

سفید فام کمانڈو بے پروائی سے بولا "وہ جگہ دیکھی جا چکی ہے' پک اپ قبضے میں لی جا چکی ہے۔ ہمارے دو ساتھی وہاں بھی تعینات تھے۔ جنگل میں ہمیں اور بھی کئی کام کی چیزیں ملی ہیں' بہت سا کام یہاں پولیس کو کرنا ہوگا۔"

ہم تینوں جس جیپ میں بیٹھے اس کی ڈرائیونگ سیٹ ایک ترک نے سنبھالی جبکہ دوسری گاڑی کو ڈرائیو کرنے کے لیے ایک سفید فام بیٹھا اور ہم تیز رفتاری سے واپس روانہ ہو گئے۔ ہائی وے وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

راستے میں چارلس میری طرف جھکتے ہوئے بولا "سیوبک کا مرنا ہمارے حق میں بہت بُرا ثابت ہوگا۔" اس کے چہرے پر تفکرات کے سائے تھے۔

اس کا اندازہ تو مجھے بھی تھا لیکن میں نے وضاحت کی خاطر پوچھا "وہ کیوں؟"

"وہ اُلّو کا پٹھا اپنے قبیلے کے دو تین بزرگوں کو لے کر "باضابطہ" طور پر کیتھرین کا رشتہ لینے آرہا تھا۔ اس کا مطلب ہے اس کے قبیلے کے خاص خاص لوگوں کو علم ہوگا کہ وہ کہاں جا رہا تھا۔ اب اگر اس کی موت کی خبر سامنے آتی ہے تو اس کے قبیلے والے فوراً یہی نتیجہ اخذ کریں گے کہ اسے ہم نے مروایا ہے۔ اگر اس کی لاش غائب کر دی گئی تب بھی وہ یہی نتیجہ اخذ کریں گے۔" وہ متفکرانہ سے انداز میں خاموش ہو گیا۔

"تو پھر؟" کیتھرین نے باپ کی طرف جھکتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ایک ہنگامہ برپا کر دیں گے۔ موٹے دماغ کے لوگ ہیں۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ ہمارے سفیر کی رہائش یا ہمارے سفارت خانے پر دھاوا بول دیں۔ چھوٹی موٹی جنگ کی سی کیفیت پیدا ہو جائے۔ اگر ترک حکومت نے سختی کی اور چند آدمی بھی مارے گئے تو شور برپا ہو جائے گا کہ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ ہمارے ہی مغربی ملکوں کے اخباری اور ٹی وی رپورٹر کیمرے اٹھا اٹھا کر بھاگے چلے آئیں گے اور دنیا کو بتائیں گے کہ کس طرح "معصوم و بے گناہ" قبائلیوں کو کچلا جا رہا ہے۔ مجھے صورتِ حال بہت ہی پیچیدہ ہوتی دکھائی دے رہی ہے۔"

"اب آپ کیا کریں گے؟" میں نے پوچھا۔ میرے خیال میں اس کے اندیشے بے بنیاد نہیں تھے۔

"میں آج رات اپنے سفیر' میجر ولسن اور ترک حکام کے ساتھ ایک میٹنگ رکھوں گا۔ اس میں فیصلہ کریں گے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔" چارلس سوچتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے تم دونوں کو اس سے پہلے ہی پس منظر میں چلے جانا چاہیے۔" اس نے میری اور کیتھرین کی طرف دیکھا "یہاں صرف میں موجود رہوں گا۔ ضروری نظر آیا تو میں بھی کھسک جاؤں گا۔ افضل! تم تو میرے خیال میں پاکستان ہی واپس چلے جاؤ اور کیتھرین تم اپنے پہلے پروگرام کے مطابق یورپ روانہ ہو جاؤ۔"

"میں تو خود فوری طور پر پاکستان جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا "میں تو خواہ مخواہ ہی یہاں عجیب و غریب حالات میں الجھتا جا رہا ہوں۔"

کیتھرین باپ سے مخاطب ہوئی "پہلے تو میرے مقاصد کچھ اور تھے۔ اب میری ترجیحات بدل چکی ہیں اور آپ بھی ساتھ نہیں ہوں گے۔ کیوں نہ میں بھی اِنہی کے ساتھ پاکستان چلی جاؤں؟"

وہ مجھ سے پوچھنے کے بجائے اپنے باپ سے پوچھ رہی تھی گویا صرف وہی اسے میرے ساتھ جانے یا نہ جانے.... کی اجازت دے سکتا تھا۔ اس میں میری اپنی مرضی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ پاکستان جائے۔ اس سے میرے لیے بہت سی دشواریاں پیدا ہو سکتی تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر چارلس نے اسے پاکستان جانے کی اجازت دے دی تو میں منع کر دوں گا۔

اس وقت میں نے خدا کا شکر ادا کیا جب چارلس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد کہہ دیا "نہیں' نہیں' تمہارا پاکستان جانا ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں اگر اپنے مزید کچھ کام نمٹانے ہیں تو فرانس یا اٹلی کی طرف نکل جاؤ ورنہ واپس لندن ہی چلی جاؤ اور اپنے باپ کے گھر کی طرف بھی تھوڑی سی توجہ دو جو تمہارے جانے کے بعد سے بالکل ہی اُجڑ کر رہ گیا ہے۔"

کیتھرین کا منہ لٹک گیا لیکن وہ گویا خود پر جبر کرتے ہوئے بولی "آپ کہتے ہیں تو چلی جاتی ہوں۔ مجھے اس وقت ذرا آپ کی فرمانبردار اور سعادت مند بیٹی بننے کا شوق چڑھا ہوا ہے۔ اس لیے آپ کی بات ماننی پڑے گی ورنہ میں ضرور پاکستان جاتی۔ بہرحال میں کبھی نہ کبھی جاؤں گی ضرور۔"

"ضرور جانا لیکن کسی معقول وجہ کے تحت جانا۔ زندگی کو یونہی بے مقصد اِدھر اُدھر گھوم پھر کر ضائع مت کرو۔" چارلس ناصحانہ انداز میں بولا "میرا اس وقت اطمینان کی گہری سانس لینے کو جی چاہ رہا تھا لیکن میں کیتھرین کو احساس نہیں دلانا چاہتا تھا کہ فی الحال اس سے جان چھوٹنے پر مجھے خوشی ہوئی تھی۔ کسی کی اس حد تک بھی دل شکنی اچھی نہیں تھی۔

"میں آج سیٹھ رمضان کو کراچی فون کرنا چاہتا ہوں۔ اس طرف سے گرین سگنل ملتے ہی میں کراچی روانہ ہو جاؤں گا۔ آپ میری جلد از جلد اس سے بات کرا دیں۔" میں نے چارلس سے درخواست کی۔

"یہ تو کوئی مسئلہ نہیں۔" چارلس دھیمے لہجے میں بولا "گھر جا کر میں سفیر کے خصوصی ٹیلی فون پر ابھی تمہاری سیٹھ رمضان سے بات کرا دیتا ہوں۔"

کچھ دیر بعد جیپ نے ہمیں برطانوی سفیر کے بنگلے کے سامنے

اتار دیا۔ چارلس نے ایک ٹرکش آفیسر سے کچھ دیر ذرا الگ کھڑے ہو کر باتیں کیں۔ شاید وہ آئندہ کا کوئی پروگرام طے کر رہے تھے۔ پھر دونوں گاڑیاں واپس روانہ ہو گئیں اور ہم اندر آگئے۔

چارلس بولا "تم شاور لے کر لباس تبدیل کر لو اور کچھ انسانی حلیے میں آجاؤ۔ میں بھی تب تک اپنی حالت درست کر کے کچھ ضروری ٹیلی فون کرتا ہوں پھر سیٹھ رمضان سے تمہاری بات کراتا ہوں۔"

میں نے اس کے مشورے پر عمل کیا لیکن سیٹھ رمضان سے بات ہونے کی نوبت رات کے کھانے کے کافی دیر بعد ہی آسکی کیونکہ اس دوران سفیر صاحب بھی گھر آگئے تھے اور چارلس اس کے ساتھ اسٹڈی میں بند ہو کر بہت دیر تک کچھ بات چیت کرتا رہا۔ اس دوران گھر کے ٹیلی فون بھی کافی مصروف رہے۔ پھر سفیر دوبارہ کہیں روانہ ہو گیا۔ گھر میں کچھ کھچڑی سی پک رہی تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لوگ سیوبک کے قبیلے کے ردِعمل کے سلسلے میں خاصے پریشان تھے۔

آخر کار چارلس نے مجھے اسٹڈی میں بلوا بھیجا۔ وہاں تین رنگ کے ٹیلی فون رکھے تھے۔ سرخ' سبز اور نیلا۔ چارلس نے سبز فون پر براہِ راست سیٹھ رمضان کا نمبر ملایا اور ریسیور مجھے تھما دیا۔ اس نے خود سیٹھ رمضان سے بات کرنے کی کوشش نہیں کی۔

"کون ہے بھئی؟" دوسری طرف سے سیٹھ رمضان قدرے بے زاری سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں خفیف سی یہ بے زاری اکثر ہی پائی جاتی تھی اور یہ مصنوعی ہوتی تھی۔

"میں ہوں افضل؟" میں نے آہستگی سے کہا۔

"افضل! تم کہاں ہو؟" اس نے فوراً تیزی سے پوچھا۔ اس کے لہجے سے بے زاری یکدم غائب ہو گئی اور میں نے چشمِ تصور سے دیکھا وہ گویا چوکنا ہو کر بیٹھ رہا تھا۔

"میں وہیں ہوں جہاں تم نے مجھے بھیجا تھا۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

"تم اپنا نمبر مجھے دو۔ کچھ دیر تک میں خود تمہیں فون کرتا ہوں۔ میں اس نمبر پر بات نہیں کر سکتا۔" سیٹھ رمضان قدرے مضطربانہ آواز میں بولا۔

میں نے نمبر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ٹیلی فون سیٹ پر کوئی نمبر نہیں تھا۔ میں نے چارلس سے نمبر پوچھا اور یہ بھی پوچھ لیا کہ سیٹھ رمضان کو یہ نمبر دینا مناسب تھا یا نہیں؟ اس نے سر کے اشارے سے اجازت دے دی اور نمبر بتا دیا۔ نمبر لیتے ہی سیٹھ رمضان نے فون بند کر دیا اور ہم وہیں بیٹھ کر اس کی کال کا انتظار کرنے لگے۔

سیٹھ رمضان کو اس نمبر پر کال ملوانے میں کچھ دیر لگ گئی۔ اس دوران چارلس بولا "اسے گمان بھی نہیں ہوگا کہ اس وقت میں بھی تمہارے پاس موجود ہوں...

سمجھ میں نہیں آیا۔"

مجھے نہیں معلوم تھا کہ چارلس کو سیٹھ رمضان کے ماضی اور حال کے چکروں کا کس حد تک علم تھا۔ میں نے گول مول سی بات کی "وہ میری ہی وجہ سے اتنا احتیاط کر رہا ہے۔"

آخر فون کی گھنٹی بجی۔ ریسیور میں نے ہی اٹھایا۔ دوسری طرف سیٹھ رمضان ہی تھا۔ وہ پہلے کی نسبت ذرا پُرسکون لہجے میں بولا "اپنے پرانے نمبروں کے بارے میں مجھے اطمینان نہیں ہے۔ مجھے صحیح طور پر معلوم تو نہیں ہے کہ وہ ٹیلی فون ٹیپ ہوتے ہیں یا نہیں لیکن پچھلے کچھ عرصے میں میرے کئی راز لیک آؤٹ ہوئے ہیں۔ اور تمہارا معاملہ تو بہت ہی نازک معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے میں زیادہ احتیاط کر رہا ہوں۔"

"یہ نمبر محفوظ ہے کیا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' یہ نمبر نوٹ کر لو اور آئندہ جب بھی بات کرنی ہو صرف اس نمبر پر کرنا۔ یہ ایک عجیب و غریب نمبر ہے۔ میں تمہیں اس پر فوری طور پر نہیں ملوں گا۔ اس پر پیغام چھوڑ کر پانچ دس منٹ بعد تمہیں دوبارہ فون کرنا ہوگا۔"

اس نے نمبر بتایا پھر بے تابی سے بولا "اچھا' یہ "ضروری بکواس" تو ہو گئی۔ تم اپنا حال احوال سناؤ۔ خیریت سے پہنچ گئے؟ اب کہاں ہو' کس حال میں ہو؟"

"میری داستانِ غریب حمزہ کافی لمبی ہے۔ اس کا خلاصہ بھی فون پر سنانا مشکل ہے۔ فی الحال میں نے صرف یہ جاننے کے لیے فون کیا ہے کہ میں نے ایک کام تمہارے سپرد کیا تھا۔ تمہیں میرے کچھ ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کرنا تھی۔ یہ بتاؤ اس میں کچھ کامیابی ہوئی یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں' تمہارے ایک ساتھی سے رابطہ ہوا ہے۔" وہ کچھ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا "اس کا نام سلیمان ہے۔ وہ لاہور سے آیا ہوا ہے اور تمہاری تلاش میں ہے۔ میں تو اسے نہیں پہچانتا تھا۔ میرا مطلب ہے اس کی اصل شکل میں بھی نہیں پہچانتا تھا لیکن اس نے مجھے پہچان لیا۔ اتفاقاً ہی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ کسی فلمی کیریکٹر کی طرح حلیہ بدلے تمہارے ہی ہوٹل میں بیٹھا ہوا تھا اور ایسے جاسوسی اسٹائل سے بڑے خفیہ طریقے سے مجھ سے ملا کہ میری روح فنا ہو گئی تھی۔ میں سمجھا تھا زیرو زیرو سیون مجھے کے جی بی کا ایجنٹ سمجھ کر اغوا کرنے آگیا ہے۔ اس میں صرف ایک کمی تھی جس کی وجہ سے وہ زیرو زیرو سیون معلوم نہیں ہو رہا تھا......"

وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"فضول باتیں کم کرو اور کام کی بات کرو۔" میں نے بے تابی سے کہا "مقصد یہ کہ تمہارا اس سے رابطہ ہو گیا؟"

"ہاں' تم نے جو فون نمبر دیئے تھے اور رابطے کے جو طریقے بتائے تھے ان میں سے کوئی کام نہیں آسکا بس سلیمان سے اتفاقاً رابطہ ہو گیا۔"

"تاہم میں کبھی پاکستان ضرور آؤں گی۔"

"میں تمہیں خوش آمدید کہوں گا۔" میں نے کہا اور وہ واپس اوپر جانے کے لیے مڑ گئی۔ میں اور چارلس گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر عام لباس میں ڈرائیور موجود تھا۔ گاڑی کوئی دوسری تھی۔ وہ سیاہ مرسیڈیز نہیں تھی جس میں ہم زیادہ تر سفر کرتے رہے تھے۔

چند لمحے بعد گاڑی سڑک پر فراٹے بھر رہی تھی۔ اس دوران بوجھل سی خاموشی طاری رہی۔ چارلس گویا کسی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ پھر وہ اچانک میری طرف مڑتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے میری بیٹی تمہیں پسند کرنے لگی ہے۔"

میں کہنا چاہتا تھا "تمہیں بہت دیر میں خیال آیا" اس کے بجائے میں نے کہا "یہ اس کا حسنِ نظر ہے ورنہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس جیسی لڑکی مجھے پسند کرے۔"

میری کوشش یہی ہوتی تھی کہ میری وجہ سے کسی کی دل شکنی نہ ہو، کسی کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ اچھا ہوا کہ چارلس نے اس موضوع پر مزید کچھ نہیں کہا۔ میری نظر عقب نما آئینے پر تھی۔ پھر میں نے ذرا گردن گھما کر دیکھا۔ ہمارے پیچھے کافی ٹریفک تھا لیکن میں نے چارلس سے کہا "ایک سفید گاڑی ہمارا تعاقب کر رہی ہے۔"

وہ اپنے خیالات سے چونکا اور گویا محظوظ ہوتے ہوئے بولا "تم اپنے گردوپیش سے خوب باخبر رہنے والے آدمی ہو۔ بہرحال اس گاڑی کے بارے میں تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ ٹرکش انٹیلی جنس کے لوگ ہیں۔ ہماری حفاظت کے لیے ہمارے ساتھ ہیں۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ پھر میں نے اس گاڑی کی طرف سے توجہ ہٹالی اور چارلس کے ساتھ باتوں میں لگ گیا۔ کچھ دیر بعد میں نے یونہی اپنی احتیاط پسندی سے مجبور ہو کر ایک بار پھر پیچھے دیکھا تو ٹریفک پولیس کی ایک موٹر سائیکل تیزی سے پیچھے آتی دکھائی دی۔

اس سڑک پر ٹریفک کم ہی تھا۔ دو چار گاڑیاں ہمارے پیچھے تھیں تاہم لگتا یہی تھا کہ وہ ٹریفک سارجنٹ ہمارے ہی پیچھے آرہا تھا۔ جب اس کے اور ہمارے درمیان کوئی دوسری گاڑی حائل نہ رہی تو اس نے ہوٹر بھی بجایا۔ تب ہمارے ڈرائیور کی سمجھ میں آیا کہ وہ ہمارے پیچھے آرہا تھا۔

اس نے رفتار کچھ کم کرلی لیکن وہ نہ کرتا تب بھی سارجنٹ اپنی بھاری بھرکم طاقتور موٹر سائیکل پر ہمارے قریب پہنچ ہی چکا تھا۔ اس نے گاڑی سڑک سے اتارنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے گاڑی کچے میں اتارلی اور ٹریفک سارجنٹ نے کسی فلمی ہیرو کے سے انداز میں موٹر سائیکل لہرا کر گاڑی کے عین سامنے لا روکی اور فوراً ہی

وہ زیادہ جسیم نہیں تھا اور وردی بھی اس کے جسم پر فٹ نہیں تھی۔ کچھ ڈھیلی ڈھالی لگ رہی تھی لیکن حرکات و سکنات سے بہرحال اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کے سر پر ہیلمٹ بھی تھا جسے اس نے اتارنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا تاریک چشمہ اس کے چہرے کی مناسبت سے کچھ بڑا لگ رہا تھا۔ ہم اس کی آنکھیں دیکھ تو نہیں سکتے تھے لیکن میرا اندازہ تھا کہ شاید ان آنکھوں میں خاصی رعونت پائی جاتی تھی۔ کم از کم اس کی چال تو یہی بتارہی تھی۔

ڈرائیور گاڑی سے نہیں اترا تھا، تاہم اس نے ایئرکنڈیشنر آن ہونے کے باوجود کھڑکی کا شیشہ نیچے کرلیا تھا۔ ٹریفک سارجنٹ نے کھڑکی پر جھکتے ہوئے ترکی میں حتی الامکان بارعب لہجے میں کچھ کہا۔ مجھے اتنا اندازہ ہوگیا کہ وہ اسے گاڑی سے نیچے اُترنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ اس کا انداز بعض پاکستانی ٹریفک سارجنٹوں کا سا تھا۔ میں نے سوچا آخر ترکی ہمارا برادر اسلامی ملک ہے۔ شاید کچھ جراثیم برادرانہ طور پر اُدھر چلے گئے ہوں۔

ہمارا ڈرائیور بھی غالباً کوئی عام ڈرائیور نہیں تھا۔ اس نے ٹریفک سارجنٹ کے حکم پر عمل درآمد کے بجائے جھلا کر تیزی سے ترکی میں کچھ کہا۔ اس نے غالباً یہی جاننا چاہا تھا کہ آخر سارجنٹ کیا چاہتا تھا۔ جواباً سارجنٹ نے بھی تیزی سے کچھ کہا۔ اس نے چونکہ اپنے ہیلمٹ کا اسٹرپ بھی نہیں کھولا تھا اور اس کی ٹھوڑی پر پلاسٹک کی ٹوپی سے چڑھی ہوئی تھی اس لیے اس کی آواز کچھ اس طرح نکل رہی تھی جیسے دانت بھینچ کر بول رہا ہو۔

مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ ڈرائیور سے کاغذات طلب کر رہا تھا اور ڈرائیور جاننا چاہ رہا تھا کہ آخر اس نے ایسی کیا غلطی کی تھی جو سارجنٹ اس کے تعاقب میں چلا آیا تھا؟

جواب میں سارجنٹ نے پہلے سے زیادہ سخت اور اہانت آمیز لہجے میں کچھ کہا۔ شاید اس نے کسی معمولی بات کو فوراً ہی انا کا مسئلہ بنالیا تھا جیسا کہ اس قسم کی صورت حال میں عموماً ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا چارلس کے چہرے پر سرخی نمودار ہو چکی تھی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سرخی بڑھ چکی تھی کیونکہ اس کی رنگت ویسے بھی سرخ ہی تھی۔

وہ دروازہ کھول کر اُتر گیا اور برہمی سے بولا "کیا بات ہے؟ تم کیوں ہمارے ڈرائیور کو پریشان کر رہے ہو؟"

حالانکہ وہ ترکی سمجھتا تھا اور روانی سے بول بھی سکتا تھا لیکن شاید جان بوجھ کر انگریزی میں بات کر رہا تھا اور اپنے آپ کو معاملے سے لاعلم بھی ظاہر کر رہا تھا۔ اس کا انداز ایک بارعب شخص کا تھا لیکن ٹریفک سارجنٹ اس کے رعب میں آئے بغیر پہلے سے زیادہ غصے سے بولا "تمہارے ڈرائیور نے ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کی ہے اور میرے ساتھ بدتمیزی بھی کی ہے۔ تم لوگوں کو پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔" اب وہ بھی انگریزی میں بات

"تمہارا دماغ صحیح ہے؟" چارلس نہایت متحمل مزاج شخص ہوتے ہوئے بھی برہمی سے تقریباً چیخ اٹھا "یہ ڈرائیور بیس سال سے استنبول کی سڑکوں پر گاڑی چلا رہا ہے، تم اسے ڈرائیونگ کے قوانین سکھانے آگئے ہو؟"

"بیس سال یا چالیس سال گاڑی چلانے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انسان کبھی ٹریفک قوانین نہیں توڑ سکتا۔" ٹریفک سارجنٹ غرایا اور چارلس کے مقابل آن کھڑا ہوا۔ اگر اس کا قد ذرا اونچا ہوتا تو شاید وہ اپنے ہیلمٹ کا چھجا چارلس کی پیشانی سے ملا دیتا۔

"میں اس کے ساتھ سفر کر رہا ہوں۔ میں بھی استنبول کے ٹریفک قوانین سے واقف ہوں۔ میں دیکھ رہا تھا، اس نے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کی۔" چارلس نے اسے ڈانٹا "تم خواہ مخواہ ہمیں مرعوب کرنے کی کوشش مت کرو۔"

"مرعوب تو تم مجھے کر رہے ہو۔ سرکاری کام میں مداخلت کر رہے ہو۔ تمہارے خلاف اس سلسلے میں بھی کارروائی ہوگی۔ تمہیں اب تو ضرور پولیس اسٹیشن چلنا پڑے گا۔" پولیس سارجنٹ قطعی غیر متزلزل لہجے میں بولا۔

"تم تو واقعی کوئی پاگل معلوم ہوتے ہو۔ لگتا ہے اس نوکری سے تمہارا دل بھر گیا ہے اور اب اسے لات مار کر تم جیل جانا چاہتے ہو۔" چارلس کے لہجے میں ہلکی سی خونخواری آگئی "میں نے پوری دنیا دیکھی ہے۔ ہر ملک میں سفر کیا ہے لیکن تم جیسا خردماغ پولیس والا آج تک نہیں دیکھا۔ میں تمہیں خبردار کر رہا ہوں کہ میں ایک بہت ہی اہم برطانوی ڈپلومیٹ ہوں اور نہایت اہم مشن پر یہاں آیا ہوا ہوں۔ میرے ایک اشارے پر تم نہ صرف نوکری سے برخاست ہوسکتے ہو بلکہ جیل بھی جاسکتے ہو۔ اس وقت میں ایک بہت ضروری کام سے جارہا ہوں اور مزید تاخیر کا متحمل نہیں ہوسکتا۔"

سارجنٹ نے استہزائیہ انداز میں ایک کھردرا سا قہقہہ لگایا "میں بھی کوئی عام پولیس والا نہیں ہوں۔ میرے عہدے پر نہ جانا۔ میں نے بڑے بڑے وزیروں سفیروں کو عدالت میں کھینچا ہے۔ یہ بھی اتفاق ہے کہ میں جس پر بھی ہاتھ ڈالتا ہوں وہ کوئی اونچی ہی چیز نکلتا ہے۔"

چارلس نے غالباً انٹیلی جنس والوں کی تلاش میں پیچھے نظر دوڑائی۔ ان کی گاڑی کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں تھا البتہ دوسری اِکا دُکا گاڑیاں ہمارے قریب سے گزر رہی تھیں۔ بعض کار نشین ہماری طرف دیکھتے ہوئے گزرے تھے لیکن کوئی رُکا نہیں تھا جیسا عموماً پاکستان میں ہوتا ہے۔

انٹیلی جنس والے اگر وہاں موجود ہوتے تو اب تک انہیں آگے آجانا چاہیے تھا اور چارلس کی حیثیت [illegible] چاہیے تھی لیکن میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ وہ ہمارے عقب میں موجود نہیں تھے۔ ان کی گاڑی اس دوران راستے میں کہیں غائب

ہو چکی تھی جب میری توجہ ان کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔

ان کی گاڑی غائب دیکھ کر چارلس کو قدرے حیرت ضرور ہوئی لیکن اس کی خوداعتمادی اور رعب میں کوئی فرق نہ آیا۔ تاہم اب وہ گویا اس کمبل نما سارجنٹ سے پیچھا چھڑانے کے لیے کچھ تحمل سے کام لیتے ہوئے ڈرائیور سے مخاطب ہوا "تمران! تم اسے کاغذات اور اپنا سفارت خانے کا کارڈ دکھا ہی دو۔ ہم سے غلطی ہوئی کہ ہم احتیاطاً اس وقت سفارت خانے کی نمبر پلیٹ والی گاڑی لے کر نہیں نکلے۔"

سارجنٹ نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا "اب کاغذات دکھانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ اب تو تمہیں پولیس اسٹیشن چلنا ہی پڑے گا۔ تم نے بدتمیزی کی ہے۔ سرکاری کام میں مداخلت کی ہے اور مجھے اپنی حیثیت سے مرعوب کرنے کی کوشش کی ہے۔ تمہارے خلاف کارروائی ضرور ہوگی۔"

چارلس نے غالباً بڑی مشکل سے اس وقت اپنی نرم مزاجی اور تحمل کو آواز دی تھی لیکن سارجنٹ کی بات سُن کر اس کا تحمل ایک بار پھر جواب دے گیا۔ میں نے پہلی بار اس کے منہ سے انگریزی کی ایک ہلکی پھلکی سی گالی سُنی پھر وہ غصے سے بولا "تم جیسے آفیسر کو تو اسی سڑک پر کھڑے کھڑے شوٹ کردینا چاہیے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن سارجنٹ کی پھرتی قابلِ داد تھی۔ اس نے ویسٹرن فلموں کے کسی فائٹر کی سی تیزی سے اپنے ہولسٹر سے ریوالور نکال لیا اور طنزیہ لہجے میں بولا "بہت خوب، بہت خوب! اب تم ایک آفیسر پر قاتلانہ حملہ بھی کرنے لگے تھے۔ تم اپنے جرائم کی فہرست کو لمبا کیے جارہے ہو۔ چلو بیٹھو گاڑی میں۔"

اس نے اپنے ریوالور کی نال چارلس کی پسلیوں پر ٹکادی اور اس کا ریوالور نہایت پھرتی سے اس کی جیب سے نکال لیا۔ میرا خیال ہے ایک لمحے کے لیے تو چارلس بھی پریشان ہوگیا تھا۔ اسے یقیناً جھنجلاہٹ بھی ہورہی تھی کہ اچھا بھلا اپنے راستے پر جاتے جاتے یہ کمبل کہاں سے آن چمٹا تھا۔ اب تو وہ اس جھنجلاہٹ کا اظہار بھی نہیں کرپارہا تھا۔

میں نہایت اطمینان سے بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار وغیرہ نہیں تھا کیونکہ مجھے کچھ دیر بعد جہاز پر سوار ہونا تھا۔ کوئی گن وغیرہ لے کر چلنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ ایئرپورٹ پر چیکنگ کے دوران وہ میرے لیے پریشانی کا باعث بن سکتی تھی۔

سارجنٹ نے ریوالور کی نوک سے چارلس کو گاڑی کی طرف دھکیلا۔ چارلس کا چہرہ کچھ زیادہ ہی سرخ ہوگیا۔ شاید کسی اجنبی ملک میں بھی اس کی اتنی بے عزتی کبھی نہیں ہوئی تھی لیکن اس نے ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہاتھ پاؤں چلانے والا آدمی بھی نہیں تھا۔ جو کچھ کرتا تھا گن کے ذریعے کرتا تھا اور اس

وقت گن اس کے پاس نہیں رہی تھی۔ ہیلمٹ اور بڑے سے تاریک چشمے کی وجہ سے سارجنٹ کے چہرے کا بیشتر حصہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن جتنا نظر آرہا تھا اس سے اندازہ ہورہا تھا کہ چارلس نے ذرا بھی اس کی مرضی کے خلاف حرکت کی تو وہ اسے شوٹ کرنے میں دریغ نہیں کرے گا۔ چارلس نے بھی شاید یہ محسوس کرلیا تھا اس لیے تمامتر برہمی کے باوجود اس نے مزاحمت نہیں کی۔ تاہم اس نے مڑ کر ایک نظر میری طرف ضرور دیکھا۔ شاید اسے حیرت تھی کہ میں اس معاملے میں بالکل مداخلت نہیں کررہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میرا ذہن اس وقت کسی اور زاویے سے اس مسئلے میں اُلجھا ہوا تھا۔

چارلس گاڑی میں بیٹھنے لگا تو میں اپنی طرف کا دروازہ کھول کر تیزی سے باہر پھسل گیا۔ دراصل وہ جس طرح بیٹھنے لگے تھے اس سے یہ ہوتا کہ چارلس میرے اور سارجنٹ کے درمیان پھنس جاتا۔ میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہ رہا تھا کہ سارجنٹ میرے اور چارلس کے درمیان آجائے۔

سارجنٹ نے اب تک گویا میری طرف توجہ نہیں دی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ وہ میری طرف سے پوری طرح ہوشیار تھا۔ میرے گاڑی سے باہر قدم رکھتے ہی اس کے دوسرے ریوالور کا رخ میری طرف ہوچکا تھا جو اس نے چارلس کی جیب سے نکالا تھا۔ اس کے اپنے ریوالور کی نال بدستور چارلس کی پسلیوں پر رہی تھی۔

"تم کہاں چل دیئے مسٹر؟" وہ بہ آواز بلند بولا "اگر تم نے بھاگنے کی کوشش کی تو یہاں تمہاری لاش پڑی نظر آئے گی۔"

"میں بھاگ تو نہیں رہا۔" میں نے دونوں ہاتھ اٹھاتے ہوئے سادگی سے کہا "میں تو گاڑی سے اُتر رہا تھا۔ مجھے آپ براہِ کرم یہیں چھوڑ دیں۔ میرا اس گاڑی سے کوئی تعلق نہیں۔ میں تو صرف ان صاحب کا مہمان ہوں لیکن مجھے ایک گھنٹے بعد فلائٹ پکڑنی ہے۔ اگر میں پولیس کے چکر میں پڑگیا تو مجھے دیر ہوجائے گی۔ میری فلائٹ نکل جائے گی۔"

"فلائٹ کے بچّے! چلو گاڑی میں بیٹھو۔ تم کون ہو اور اس گاڑی سے تمہارا کوئی تعلق ہے یا نہیں۔ یہ فیصلہ پولیس اسٹیشن چل کر ہوگا۔" سارجنٹ چیخا "تم سمجھ رہے ہو میں تمہیں یہاں چھوڑ کر چلا جاؤں گا؟"

"تمہاری بڑی مہربانی ہوگی آفیسر! مجھے یہیں چھوڑ دو۔ میں ٹیکسی سے چلا جاؤں گا۔" میں نے قدرے التجائیہ لہجے میں کہا "اس کے عوض میں تمہاری مناسب "خدمت" بھی کرسکتا ہوں۔" میں نے جیب کی طرف اشارہ کیا۔

"تم مجھے رشوت کی پیشکش کررہے ہو؟" اس کے لہجے میں کچھ اور برہمی آگئی "ایک اور جرم! چلو بیٹھو گاڑی میں۔" اس نے دوسرے ریوالور کی نال میری پسلیوں پر رکھ دی۔

میں نے اپنی صورت پر بے بسی طاری کرلی اور دروازہ کچھ اور کھول دیا۔ چارلس نے اس وقت ناراضگی میں وہی کیا جو میں چاہ رہا تھا۔ یعنی وہ پہلے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھ ہی غیرارادی طور پر سارجنٹ بھی بیٹھ گیا۔ اسے غالباً اطمینان ہوگیا تھا کہ میں بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا کیونکہ ان نے ہاتھ اونچا کرکے ریوالور کی نال بدستور میری پسلیوں پر ٹکائی ہوئی تھی۔

میں شکست خوردہ سے انداز میں اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میرا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ وہ ہم دونوں کے درمیان آگیا تھا۔ شاید اس نے بھی اس طرح بیٹھنے کو بہتر سمجھا ہو کیونکہ اس طرح وہ بیک وقت ہم دونوں کی پسلیوں پر ریوالور رکھ سکتا تھا۔

"ڈرائیور! سیدھے ہی چلو۔" اس نے ڈرائیور کو حکم دیا۔

ڈرائیور نے مڑ کر چارلس کی طرف اجازت طلب نظروں سے دیکھا۔ وہ گویا اب بھی صرف چارلس ہی کے حکم کی تعمیل کرنا چاہتا تھا۔ سارجنٹ نے اسے ڈانٹا "اس کی طرف کیا دیکھ رہے ہو سؤر! گاڑی چلاؤ۔"

ڈرائیور نے گردن گھما کر شعلہ بار نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن چارلس اب تحمل سے بولا "ڈرائیور! یہ نطفۂ ناتحقیق جس طرح کہہ رہا ہے اسی طرح کرو۔ اب ہمیں اس کا بندوبست کرکے ہی اپنے کام کے لیے جانا ہوگا۔ اس بدبخت کو نوکری سے برخاست ہونے اور جیل جانے کی اتنی ہی جلدی ہے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔"

ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھادی۔ سارجنٹ نے چارلس کے الفاظ پر کسی ردِعمل کا اظہار نہیں کیا۔ شاید اس لیے کہ اس کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ وہ ہمیں لے کر وہاں سے روانہ ہونا چاہتا تھا۔ ڈرائیور اس کی موٹر سائیکل کو بچاتے ہوئے گاڑی سڑک پر لایا۔ سارجنٹ نے اپنی موٹر سائیکل کو صحیح طرح کھڑی کرنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

سارجنٹ کی رہنمائی میں گاڑی چند منٹ میں ہی ایک ویران سڑک پر آپہنچی۔ تب چارلس نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے پوچھا "یہ تم ہمیں کون سے پولیس اسٹیشن لے جارہے ہو؟"

"میں تم لوگوں کو ہائی وے پولیس کے ہیڈکوارٹر لے جارہا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ اس وقت اس کی توجہ ایک لمحے کے لیے میری طرف سے ہٹ گئی تھی۔ شاید وہ میری طرف سے کچھ مطمئن ہوگیا تھا۔ مجھے وہ موقع اپنے لیے مناسب نظر آیا۔ میرے خیال میں اس کا ڈراما خاصا لمبا ہوچکا تھا۔ اب اسے کسی فیصلہ کن موڑ پر لانے کی کوشش کرہی لینی چاہیے تھی۔

میں نے بیک وقت اس کی دونوں کلائیوں پر ہاتھ ڈالا۔ میں نے خوب دیکھ بھال کر نپے تلے انداز میں ہاتھ ڈالا تھا۔ میری گرفت ویسی ہی رہی جیسی میں چاہتا تھا۔ میں نے یکدم اس کے دونوں ہاتھوں میں دبے ہوئے ریوالوروں کا رخ اوپر کی طرف کردیا۔

میں نے اس کے بارے میں دو اندازے لگائے تھے اور دونوں ہی درست نکلے۔ میرا ایک اندازہ تو یہ تھا کہ وہ زیادہ طاقتور آدمی نہیں تھا۔ دوسرے وہ اسلحے کے استعمال میں ذرا بھی دریغ کرنے والا نہیں تھا۔ چنانچہ ہوا یہ کہ اس کی کلائیاں میری گرفت میں آئیں تو میری مرضی کے خلاف بال برابر بھی نہیں ہل سکیں۔ لیکن اس نے فائر کرنے میں ایک ثانیے کی بھی تاخیر نہیں کی۔ میں چونکہ اس کی کلائیاں پکڑتے ہی اوپر کرچکا تھا اس لیے دونوں ریوالوروں سے نکلنے والی گولیاں گاڑی کی چھت میں پیوست ہوگئیں۔

ڈرائیور بیک وقت دو فائروں کی آواز سُن کر کچھ بوکھلا گیا۔ اسٹیئرنگ وھیل پر اس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے بہک گیا اور گاڑی لہرا کر کچے میں اُتر گئی۔ تاہم اس کی مہارت کام آئی۔ اس نے گاڑی کو اُلٹنے نہیں دیا اور نہ ہی بوکھلا کر گاڑی کو دوبارہ پکی سڑک پر چڑھانے میں جلدبازی دکھائی۔

ہم تینوں سمٹ کر ایک طرف کو ہوگئے۔ لیکن سارجنٹ کی کلائیوں پر میری گرفت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ دوسرے ہی لمحے میری گرفت اتنی سخت ہوچکی تھی کہ وہ دوسری مرتبہ ٹریگر بھی نہ دبا سکا۔ میں نے اسے اپنے اور چارلس کے درمیان اس طرح دبالیا تھا کہ وہ مزید کوئی حرکت بھی نہ کرسکا۔

میں نے اس کی کلائیوں پر اپنے ہاتھوں کے آہنی شکنجوں کا دباؤ اتنا بڑھایا کہ اس کے ہاتھوں سے دونوں ریوالور خودبخود نکل کر فرش پر گر پڑے۔ تب میں اس کے دونوں بازو موڑ کر اس کی پشت پر لے آیا۔

"پیارے! اب اگر تم نے ذرا بھی اُچھل کود کرنے کی کوشش کی تو دونوں بازو کندھوں سے نکل جائیں گے۔" میں نے نہایت ملائمت سے اسے خبردار کیا۔

چارلس نے دونوں ریوالور اٹھانے میں پھرتی دکھائی اور دانت پیس کر بولا "مسئلہ یہ ہے کہ میں انگریز ہوں اور بڑا خاندانی قسم کا آدمی ہوں۔ قانون کا محافظ کسی بھی ملک کا ہو میں اسے مارنے کا تصور نہیں کرسکتا۔ ورنہ دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ اس بدبخت کو دونوں ریوالوروں سے شوٹ کردوں۔"

"قانون کا محافظ!" میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا لیکن میری ہنسی کراہ سے مشابہ تھی "مسٹر چارلس! تم ابھی تک اسے قانون کا محافظ ہی سمجھ رہے ہو۔ اس جیسے لوگوں کی وجہ سے تو قانون کی حالت پتلی رہتی ہے۔"

"کیا مطلب؟" چارلس نے جھک کر صحیح طور پر اس کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

"یہ ہمارا پیارا دوست حمان ہے۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی اس سے دوبارہ ملاقات ہوجائے گی اور یہ تنہا ہی ہماری بغل میں آن گھسے گا۔" میں نے حمان کو قابو میں رکھتے ہوئے جواب دیا۔

"حمان!" چارلس بے اختیار چیخا۔ اگر وہ اس وقت بری طرح ایک طرف پھنسا نہ ہوتا تو شاید حیرت کے مارے اچھل کر گاڑی کی چھت سے جا ٹکراتا۔

"ہاں، پچھلی مرتبہ ہم نے اسے دیکھا تو اس کے چہرے پر فرنچ کٹ ڈاڑھی اور مونچھیں تھیں۔ اس وقت یہ کلین شیو ہے۔ ہیلمٹ اور بڑے تاریک چشمے نے بھی چہرے کا کافی حصہ چھپا رکھا ہے۔ شروع میں، میں بھی دھوکا کھا گیا تھا۔ اسے اپنی آواز حتیٰ کہ اپنی چال ڈھال بدلنے میں بھی کمال حاصل ہے۔ مجھے اس کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے۔"

"لیکن یہ بدبخت تمہاری صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کرے گا۔ حالانکہ اسے چاہیے یہ اب تمہیں استاد مان لے۔" چارلس بولا۔

ڈرائیور اس وقت تک پیچھے مڑ کر یہ دیکھ کر مطمئن ہوچکا تھا کہ وہ شخص ہمارے قابو میں تھا۔ دوسرے لفظوں میں صورتِ حال ہمارے قابو میں تھی۔ وہ گاڑی پکی سڑک پر لے آیا تھا اور نہایت سست رفتاری سے چلا رہا تھا۔ حمان کو یقین آگیا تھا کہ اس نے ذرا بھی زور آزمائی کی تو اس کے دونوں کندھوں کے جوڑ الگ ہوجائیں گے۔ اس لیے وہ ساکت ہوکر بیٹھ گیا تھا۔ سیٹ کے نیچے اس کی دونوں ٹانگیں بھی میں نے ایک ٹانگ کے نیچے پھنسالی تھیں۔

وہ پُرسکون لہجے میں بولا "ڈیئر چودھری! مجھے بھی پچھلی ملاقات میں اندازہ ہوگیا تھا کہ تم ایک طاقتور آدمی ہو لیکن میری غلطی یہ تھی کہ میں نے اس بات کو اہمیت نہیں دی تھی۔ میرا خیال تھا کہ آج کے دور میں جسمانی طاقت کی کوئی اہمیت نہیں۔ صرف ہتھیار اہم ہوتے ہیں لیکن آج مجھے احساس ہوا ہے کہ کبھی کبھی جسمانی طاقت بھی کام آجاتی ہے۔ میرے بازو شل ہوچکے ہیں اور ہاتھ ٹوٹے جارہے ہیں۔ میرے بازو چھوڑ دو۔ میں تمہارے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں کروں گا۔ میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔"

"سوری! میں تمہاری اس محبت بھری درخواست پر عمل نہیں کرسکتا۔ تم عمروعیار کے قبیلے سے معلوم ہوتے ہو۔ میں تمہاری درخواست پر عمل کرکے پچھتانا نہیں چاہتا۔"

"تم بہت ہی غیرمعیاری اور کمینے قسم کے دشمن ہو۔" وہ ہلکی سی کراہ کے ساتھ بولا "تم نے مجھے کب پہچانا؟"

"میں نے تمہیں جلد ہی پہچان لیا تھا لیکن اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ میں چاہتا تھا کہ تم پوری طرح مکڑی کے جال میں آن پھنسو۔" میں نے جواب دیا۔ "اس لیے میں نے اپنا رویّہ ایسا ہی رکھا جیسے میں تمہیں پولیس سارجنٹ ہی سمجھ رہا ہوں اور واقعی تم سے جان چھڑانے کی فکر میں ہوں۔"

"افسوس کہ مجھے تمہارے اس رویّے پر حقیقت کا گماں گزرا۔ میں تمہیں اپنے سے بڑا ایکٹر تسلیم کرتا ہوں۔ اب تو میرے بازو چھوڑ دو۔" وہ کراہا۔
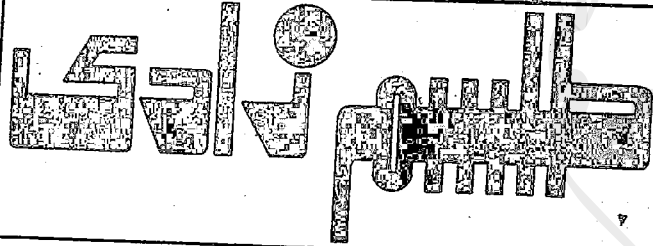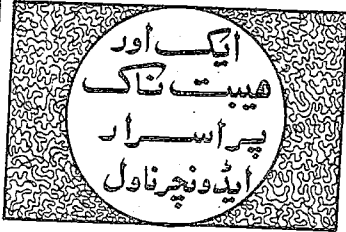
"مجھے خود کو ایکٹر تسلیم کرانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں۔ تم مجھے بازو چھوڑنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ میں تو ابھی مسٹر چارلس سے تمہاری ٹانگیں بھی بندھواؤں گا۔" میں نے کہا۔

"اگر یہ گڑبڑ کرے تو میں کم از کم اس کی دونوں ٹانگوں میں تو گولی مار سکتا ہوں نا؟" چارلس نے اجازت طلب انداز میں پوچھا۔

"نہیں نہیں' اب یہ اس طرح ہاتھ آگیا ہے تو میری کوشش یہی ہوگی کہ ہم اس کے جسم پر خراش تک ڈالے بغیر اسے ترکی کی حکومت کے حوالے کریں اور اگر تم چاہو تو اسے اسمگل کر کے برطانیہ بھی لے جاسکتے ہو۔ یہ تمہاری حکومت کا بھی مجرم ہے۔ وہاں اس کا جو مناسب سمجھو وہ حشر کر دینا۔ فی الحال میں اس کے ساتھ خون خرابا نہیں چاہتا۔ بشرطیکہ یہ مجھے اس پر مجبور نہ کردے۔"

"میرے بارے میں اتنے لمبے پروگرام مت بناؤ۔" حمان قدرے اطمینان سے بولا "تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ مجھے چھوڑ دو۔ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ میں اس قسم کی صورتِ حال کا پیشگی بندوبست کر کے چلا تھا۔"

"کیسا بندوبست؟" چارلس نے فوراً پوچھا۔

"یہ تو کچھ دیر تک تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ اس کا اطمینان مجھے کھٹک رہا تھا جس طرح شروع میں ہی اس کی وردی میری نظر میں کھٹکی تھی۔ مجھے فوراً ہی احساس ہوا تھا کہ وہ اس شخص کی اپنی وردی نہیں تھی اور اسی احساس نے مجھے اس کی طرف بہت غور سے دیکھنے پر مجبور کیا تھا۔ معلوم نہیں کس بے چارے ٹریفک سارجنٹ کی شامت آئی ہوگی جسے اس نے وردی اور موٹر سائیکل وغیرہ سے محروم کیا ہوگا۔ معلوم نہیں وہ اس وقت کہاں اور کس حال میں ہوگا۔

میں نے بے پروائی سے کہا "جس طرح ہم نے تمہیں دیکھ لیا ہے اس طرح تمہارے "بندوبست" کو بھی دیکھ لیں گے۔" میں مڑ کر دیکھ چکا تھا۔ ہمارے پیچھے کوئی گاڑی نہیں تھی۔ پھر میں نے چارلس سے پوچھا "کیا ہم کلچرل سینٹر کی طرف جارہے ہیں؟"

"نہیں" چارلس نے جواب دیا اور ڈرائیور سے کہا "گاڑی واپس موڑ دو۔"

گاڑی صحیح طور پر واپس موڑنے کی نوبت نہیں آئی۔ ڈرائیور ابھی پورا ٹرن نہیں لینے پایا تھا کہ سامنے سے گہرے سبز رنگ کی ایک گاڑی آندھی طوفان کی طرح نمودار ہوئی۔ اس کے بریک چرچرائے اور اس نے ترچھی ہو کر ہماری گاڑی کا راستہ روک لیا۔

میں اس کی کھڑکی سے ایک گن کی نال باہر آتے دیکھ چکا تھا اور زیادہ امکان یہی تھا کہ وہ سب مشین گن کی نال تھی۔ اسی طرف کی کھڑکی میں مجھے ڈاڑھی والے ایک شخص کی جھلک نظر آئی۔ گاڑی میں غالباً صرف دو ہی افراد موجود تھے۔ دوسرا ڈرائیو کر رہا تھا لیکن ان کی تعداد کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کیونکہ باقی تمام کھڑکیوں کے شیشے چڑھے ہوئے تھے اور ونڈ اسکرین سمیت تمام شیشے گہرے رنگ کے تھے۔

مجھے سامنے سے ایسی کسی گاڑی کے آنے کی توقع نہیں تھی۔ میں صرف یہی دیکھ کر مطمئن ہوگیا تھا کہ ہمارے تعاقب میں کوئی گاڑی نہیں تھی۔ تاہم میں اس گاڑی کی آمد کا انداز دیکھتے ہی کھٹک گیا تھا اور مجھے بروقت احساس ہوگیا تھا کہ وہ حمان کے ساتھیوں کی گاڑی ہوسکتی تھی۔

میرا ذہن اس وقت کمپیوٹر کی طرح کام کر رہا تھا۔ چارلس کے ہاتھوں میں دو ریوالور تھے لیکن اس قسم کے حالات میں مجھے اس سے کوئی خاص امید نہیں تھی جب بجلی کی سی تیزی سے کچھ کر گزرنے کی ضرورت ہوتی تھی۔ میرے لیے اس کے ہاتھ سے کم از کم ایک ریوالور لے لینا ضروری تھا لیکن اس کے لیے مجھے حمان کے بازو چھوڑنا پڑتے۔

میں نے سوچا کہ بازو چھوڑنے سے پہلے اس کے کندھوں کے جوڑ الگ ہی کردوں تاکہ وقتی طور پر کم از کم وہ تو معذور ہو جائے اور جو کچھ ہونے والا تھا اس میں کوئی خاص کردار نہ ادا کرسکے لیکن اس کا ذہن بھی یقیناً کمپیوٹر ہی کی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے تو یقیناً گاڑی کو دور سے دیکھتے ہی فیصلہ کرلیا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ میں تو شاید اس کے دو تین سیکنڈ بعد گاڑی کی طرف سے خبردار ہوسکا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں حمان کے بازوؤں پر دباؤ بڑھاتا اس نے گردن ٹیڑھی کر کے اس طرح میرے جبڑے پر ٹکر رسید کی کہ اس کے بازوؤں پر دباؤ بڑھنے نہیں پایا۔ اس کے سر پر ہیلمٹ تھا اور اس نے اس کا پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ٹکر گو کہ زوردار نہیں تھی لیکن اس سے اتنا ضرور ہوا کہ اس کا ایک بازو میری گرفت سے نکل گیا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے ہیلمٹ سے دوسری ٹکر رسید کی۔

اسی دوران اس گاڑی سے سب مشین گن کا برسٹ پڑا۔ مجھے اس کا پہلے ہی خطرہ تھا۔ میں دونوں سیٹوں کی درمیانی جگہ میں گھس چکا تھا۔ میں نے حمان کو چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ سب مشین گن سے برسٹ صرف گاڑی کے ٹائر ناکارہ کرنے کے لیے مارا گیا تھا۔ ان کا اپنا ساتھی گاڑی میں موجود تھا۔ وہ اندھا دُھند فائرنگ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

میں نے دیکھا حمان' چارلس کو دھکیلتا ہوا حیرت انگیز پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ دونوں ہی لڑھکتے ہوئے باہر جاگرے۔ میں نے بھی تیزی سے گاڑی سے نکل کر ان دونوں کے اوپر جاگرنا چاہا لیکن میرے قد کاٹھ کے لحاظ سے جگہ تنگ تھی۔ میں دونوں سیٹوں کے درمیان سے نکل کر دوسری طرف کے دروازے سے خاطر خواہ پھرتی سے باہر نہ پہنچ سکا۔ مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہوگئی لیکن یہ بھی درحقیقت قدرت نے میری مدد کی تھی۔ وہ ایک لمحے کی

تاخیر میرے لیے خوش قسمتی کا باعث رہی کیونکہ اس دوران چارلس نے بدحواس ہو کر حمان پر تواتر سے کئی فائر کر ڈالے تھے۔

حمان کو تو کوئی گولی نہ لگی کیونکہ میں نے اسے اُٹھ کر بھاگتے دیکھا تھا لیکن اگر میں اس دوران ان دونوں پر جاگرا ہوتا تو ایک آدھ گولی مجھے ضرور لگ جاتی۔ اسی دوران سب مشین گن سے ایک اور برسٹ مارا گیا لیکن مجھے گولیوں کے کسی چیز سے ٹکرانے یا کسی قسم کی ٹوٹ پھوٹ کی آوازیں سُنائی نہیں دیں جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ یہ محض ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے ہوائی فائرنگ کی گئی تھی۔

میں اس وقت تک بہرحال گاڑی سے نکل چکا تھا لیکن گاڑی کے بالکل ساتھ لگ کر سینے کے بل لیٹ چکا تھا۔ ہم تینوں گاڑی کے ایک طرف کے دروازے سے نکلے تھے۔ حمان کی مدد کے لیے آنے والی گاڑی دوسری طرف تھی۔ میں اسے دیکھ نہیں سکتا تھا لیکن مجھے اتنا اندازہ ہو گیا تھا کہ حمان دوڑ کر اس تک پہنچ چکا تھا حالانکہ چارلس نے اس پر ایک دو فائر مزید کیے تھے۔

اس بدحواسی میں بھی چارلس نے کم از کم یہ عقلمندی کی کہ اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا ورنہ شاید اس کی کھوپڑی اُڑ چکی ہوتی۔ گاڑی پر تیسرا برسٹ پڑا اور شیشے کی کرچیاں اڑنے کی آواز بھی سنائی دی۔ میں دل ہی دل میں ڈرائیور پر فاتحہ پڑھنے لگا تھا لیکن میں نے دیکھا اسی لمحے وہ بھی ہماری طرف کے اگلے دروازے سے باہر لڑھک آیا تھا اور صحیح سلامت نظر آرہا تھا۔ اس برسٹ سے وہ یقیناً بال بال بچا تھا۔

اسی اثنا میں شہر کی طرف سے سفید رنگ کی ایک گاڑی کچھ اسی انداز میں نمودار ہوئی جس طرح دوسری طرف سے گہرے رنگ کی گاڑی آئی تھی۔ شاید یہ وہی گاڑی تھی جس کے بارے میں چارلس نے مجھے بتایا تھا کہ اس میں ٹرکش انٹیلی جنس کے لوگ تھے۔ بقول اس کے وہ ہماری "حفاظت" پر مامور تھے۔ جتنے عمدہ طریقے سے انہوں نے ہماری "حفاظت" کی تھی اس پر انہیں کوئی تمغا وغیرہ ملنا چاہیے تھا۔ معلوم نہیں اتنی دیر وہ راستے میں کہاں اٹکے رہے تھے اور اب کس طرح ہمارا سراغ پاکر آرہے تھے۔

میں نے چارلس سے دونوں ریوالور چھینے۔ وہ اس دوران لڑھک کر میرے قریب آچکا تھا۔ میں نے گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر گاڑی کی آڑ سے ذرا سا سر نکال کر پوزیشن لیتے ہوئے گہرے رنگ کی گاڑی کو دیکھنا چاہا تو پتا چلا کہ وہ واپس جانے کے لیے ٹرن بھی لے چکی تھی۔ ٹائروں کی چرچراہٹ سنائی دی۔

اس کا پچھلا دروازہ کھلا تھا۔ حمان آدھا اندر تھا اور آدھا دروازے پر لٹکا ہوا تھا اور گاڑی کے ٹرن لینے کی وجہ سے جھول کر رہ گیا تھا۔ میں نے بیک وقت دونوں ریوالوروں سے اس پر فائر کیے مگر اس وقت تک وہ گاڑی میں گھس چکا تھا اور دروازہ بند ہو چکا تھا۔ شاید گولیاں گاڑی پر کہیں لگی ہوں لیکن میں اس کے بعد کچھ بھی نہیں دیکھ سکا کیونکہ میں فوراً ہی دوبارہ گاڑی کی آڑ میں ہو گیا تھا۔ میری توقع کے عین مطابق جواباً سب مشین گن کا برسٹ آیا تھا۔ گاڑی کی حالت کچھ اور تباہ ہو گئی۔

میرے اب مزید کوئی کوشش کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ دونوں ریوالور خالی ہو چکے تھے۔ سفید گاڑی طوفانی رفتار سے ہمارے قریب پہنچ چکی تھی لیکن اس کے ڈرائیور نے وہاں رکنے کے بجائے گہرے سبز رنگ کی گاڑی کا تعاقب کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ وہ تیزی سے ہمارے قریب سے گزرتی چلی گئی۔ میں نے اس کی ایک کھڑکی سے کسی کو سر نکالے ریوالور سے فائر کرتے دیکھا۔

میں اس وقت سبز گاڑی کو نہیں دیکھ پارہا تھا لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ کافی دور جاچکی تھی۔ دوسرے ہی لمحے ہلکی مشین گن کی تڑتڑاہٹ پھر گونجی۔ ایک ٹائر پھٹنے کا دھماکا سنائی دیا۔ اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں، چارلس اور ڈرائیور کچھ زیادہ ہی سکڑ سمٹ کر گاڑی کے عقب میں دبکے رہے۔ چند لمحے بعد آخر میں نے ذرا سر نکال کر سڑک کی طرف دیکھا اور مایوسی سے ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔

تقریباً سو ڈیڑھ سو گز آگے سڑک کے دوسری طرف نشیب میں وہ سفید گاڑی خطرناک حد تک ترچھی ہوئی کھڑی تھی۔ اس کے آگے ٹنڈ منڈ سا ایک درخت تھا۔ شاید وہ اس درخت سے ٹکرا چکی تھی۔ تاہم امید افزا بات یہ تھی کہ گاڑی کے دروازے کھلے تھے اور چار افراد قریب کھڑے چاروں طرف سے اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ سبز گاڑی کا دور دور تک کہیں پتا نہیں تھا۔

ایک لمحے کے لیے میری طبیعت میں ہلکا سا اضمحلال آگیا۔ یہ تمام معرکہ آرائی صرف چند سیکنڈ میں ختم ہوئی تھی۔ سب کچھ اس سے بھی کہیں زیادہ تیزی سے ہوا تھا جتنی تیزی سے کسی ایکشن فلم کے منظر میں ہوتا ہے۔ مجھے اس خیال سے ہلکی سی افسردگی کا احساس ہو رہا تھا کہ سب کچھ عجیب سے انداز میں شروع ہوا تھا اور عجیب سے انداز میں ہی ختم ہو گیا تھا۔

حمان کچھ عجیب بے وقوفانہ سے انداز میں ہی ہمارے قابو میں آگیا تھا۔ صورت حال مکمل طور پر ہمارے حق میں تھی۔ شاید حمان کی وردی میں کوئی حساس آلہ پوشیدہ رہا ہو جس کے ذریعے اس کے ساتھی کہیں سبز گاڑی میں بیٹھے ہماری گفتگو سُن رہے ہوں اور اسی لیے بروقت اس کی مدد کو آن پہنچے ہوں۔ یا پھر شاید سب کچھ کسی حد تک ان کی پلاننگ کے مطابق ہوا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ہم حمان کو قابو میں رکھنے میں ناکام رہے تھے اسی طرح وہ بھی ہمیں اغوا کر کے لے جانے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔

شاید سفید گاڑی کی آمد کا اس حد تک فائدہ ضرور ہوا تھا کہ حمان اور اس کے ساتھیوں نے فوری طور پر نکل جانے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ شاید وہ مزید رکتے اور اس مختصر سے معرکے کو فیصلہ کن بنانے کی کوشش کرتے۔ ہمیں ساتھ لے جانے یا وہیں ہلاک کرنے کی کوشش کرتے۔

میرے خیال میں اگر دو آدمی ایک سب مشین گن یا کچھ اور ہتھیاروں کے ساتھ حمان کی مدد کے لیے آن بھی پہنچے تھے تو یہ کوئی زیادہ اہم بات نہیں تھی۔ قابو میں آئے ہوئے شکار کو اس طرح ہمارے ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہیے تھا لیکن شاید میں خاطر خواہ پھرتی کا مظاہرہ نہیں کر سکا تھا۔ سچوئیشن سے صحیح طور پر نہیں نمٹ سکا تھا۔

پھر میں نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ قسمت ہمیشہ مثبت مقاصد رکھنے والوں پر ہی مہربان نہیں رہتی۔ کبھی کبھی وہ بُرے لوگوں پر بھی مہربان ہوتی ہے۔ شاید قدرت نے اپنے اسی عمل کو "ڈھیل دینا" قرار دیا ہے۔ اس میں قدرت کی نہ جانے کتنی مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ حمان میرے لیے اتنا اہم مسئلہ نہیں تھا۔ بلکہ وہ سرے سے میرا مسئلہ ہی نہیں تھا۔ مجھے اس میں اپنی ذہنی اور جسمانی توانائی صرف کرنے کی ضرورت نہیں تھی اور نہ ہی میرے غمزدہ ہونے کی کوئی تُک تھی۔ مجھے تو اب صرف یہی فکر کرنی چاہیے تھی کہ جلد از جلد اور بخیر و عافیت پاکستان روانہ ہو جاؤں۔

میں نے چارلس اور ڈرائیور کو بتایا کہ انہیں گاڑی کے عقب سے نکل آنا چاہیے۔ ہم تینوں تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے سفید گاڑی تک پہنچے۔ اس کا ایک ٹائر برسٹ ہو چکا تھا اور شاید اسی کی وجہ سے وہ لہرا کر نشیب میں اُتری تھی۔ گاڑی کی پوزیشن بتا رہی تھی کہ وہ اُلٹتے اُلٹتے بچی تھی کیونکہ اس وقت اس کی رفتار بہت تیز تھی۔

وہ چاروں افراد جو گاڑی کے گرد کھڑے تھے ان کے چہروں پر خفیف سی خجالت کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں بھاری سروس ریوالور تھا۔ باقی تینوں خالی ہاتھ نظر آرہے تھے۔

"کہاں مر گئے تھے تم لوگ؟" چارلس نے ریوالور والے کو مخاطب کیا۔ شاید میری سہولت کے لیے وہ ان سے انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

"اس خبیث ٹریفک سارجنٹ نے ہماری گاڑی کو اوورٹیک کرتے وقت عین قریب سے گولی مار کر ہماری گاڑی کا ایک ٹائر برسٹ کر دیا تھا۔" ریوالور والے نے بتایا "ہمیں وھیل بدلنے کے لیے رُکنا پڑا۔ اب یہ دوسرا ٹائر برسٹ ہو گیا ہے۔"

"تم وھیل بدلنے کے بجائے کوئی چلتی گاڑی نہیں پکڑ سکتے تھے؟" چارلس نے اب ذرا کم ناگواری سے پوچھا۔

"کسی کی نجی گاڑی چھیننا یا اسے زبردستی ساتھ لینا ہمارے خیال میں مناسب نہیں تھا۔" ریوالور والے نے جواب دیا۔

چارلس ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گیا پھر بولا "تم لوگوں کے پاس کچھ اسلحہ وغیرہ بھی تھا یا نہیں؟"

"گاڑی میں دو گنیں تھیں لیکن ہمیں ان کے استعمال کا موقع نہیں ملا۔" ریوالور والے کے لہجے میں رُکھائی آتی جارہی تھی۔

چارلس ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ آہ بھرنے کو تو میرا بھی جی چاہ رہا تھا۔ ٹرکش انٹیلی جنس کا حال بھی ہمارے ہاں کے خفیہ اداروں سے کچھ زیادہ اچھا نہیں تھا۔ ایک بار پھر میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ آخر وہ ہمارا "برادر" اسلامی ملک تھا۔ وہ لوگ تو پھر بھی گاڑی کا ٹائر بدل کر کسی نہ کسی طرح ہمارے اور اس گاڑی کے تعاقب میں آن پہنچے تھے جبکہ ہم نہ جانے کہاں سے کہاں نکل آئے تھے۔ ہمارے ہاں کے کسی خفیہ ادارے سے تو شاید یہ اُمید رکھنا بھی مشکل ہوتا۔

چارلس گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "اب ہم واپس کیسے جائیں گے؟ دونوں گاڑیاں بے کار ہو گئی ہیں۔ تمہارا اسپیئر وھیل پہلے ہی کام آچکا ہے۔" اس نے مضطرب انداز میں اِدھر اُدھر دیکھا "مجھے مسٹر چودھری کو کلچرل سینٹر پہنچانا تھا۔ ان کی فلائٹ میں زیادہ وقت نہیں ہے اور انہیں اس سے پہلے بہت سی تیاریاں بھی کرنا تھیں۔"

میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ایک سنسان سڑک تھی۔ ابھی تک وہاں سے کوئی اور گاڑی گزرتی دکھائی نہیں دی تھی۔ ہماری گاڑی کے تین ٹائر برسٹ ہو چکے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے قدرے مایوسی کا احساس ہوا۔ شاید میرا آج پاکستان پہنچنا قدرت کو منظور نہیں تھا۔

اچانک ہماری گاڑی کا ڈرائیور بولا "یہ دونوں گاڑیاں بے شک مختلف ہیں مگر کمپنی ایک ہی ہے۔ ان کے وھیلز کا سائز اور ساخت ایک ہی ہے۔ ہماری گاڑی کا جو ایک وھیل سلامت رہ گیا ہے میں اسے نکال لاتا ہوں تب تک تم لوگ یہ ناکارہ وھیل اُتارو۔ یہ گاڑی صحیح حالت میں ہے۔ ہم اپنی گاڑی کا وھیل اس میں لگا کر اسے لے جاتے ہیں۔"

"بالکل ٹھیک ہے، جلدی کرو۔" چارلس بولا۔

ڈرائیور دوڑتا ہوا واپس اپنی گاڑی تک گیا اور بڑی پھرتی سے وھیل نکال کر تیزی سے سڑک پر لڑھکاتا ہوا لے آیا۔ اس دوران انٹیلی جنس والوں کی سفید کار کا وھیل نکالا جا چکا تھا۔ سفید گاڑی درخت سے بھی ٹکرائی تھی لیکن یہ نہایت معمولی ٹکر تھی۔ فینڈر تھوڑا سا ٹیڑھا ہونے کے سوا اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا تھا۔

جلد ہی وھیل تبدیل ہو گیا اور سفید گاڑی ہمارے ڈرائیور نے سنبھال لی۔ حمان کی جگہ دو انٹیلی جنس والے ہمارے ساتھ ہو گئے۔ دو وہیں تباہ شدہ گاڑی کے پاس رک گئے۔ ہم نہایت تیز رفتاری سے واپس روانہ ہوئے۔ راستے میں کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔

کلچرل سینٹر کی عمارت خاصی بڑی اور خوب صورت تھی۔ ہسپانوی اور ترکی طرز تعمیر کا امتزاج اس حویلی نما عمارت کو منفرد

بنا رہا تھا۔ پرانی ہونے کی وجہ سے اس میں اس شان و شکوہ کی جھلک بھی تھی جو شاہانہ اور نیم شاہانہ قسم کی عمارتوں میں دکھائی دیتی ہے۔ پہلے شاید اس عمارت کا مصرف کچھ اور رہا ہو لیکن اب یہ کلچرل سینٹر کے طور پر استعمال ہو رہی تھی۔ اس کی چار دیواری میں ایک سرسبز اور طویل و عریض لان بھی موجود تھا جس پر اِدھر اُدھر مختلف عمروں کے مردوں اور عورتوں کی ٹولیاں بکھری ہوئی تھیں۔

میں چارلس کی رہنمائی میں شاہانہ طرز کے ایک بہت بڑے ہال میں پہنچا جہاں بڑی گہما گہمی نظر آرہی تھی۔ چاروں طرف کمروں کے دروازے تھے جن سے لوگ ہال میں آجا رہے تھے۔ ان میں عورتیں مرد سبھی تھے۔ ان میں سے بعض عجیب سے لباس میں تھے۔ لمبے لمبے بھاری بھرکم گاؤن جن پر نیچے کی طرف فری کی لمبی لمبی جھالریں لگی ہوئی تھیں۔ گلے میں موٹی موٹی مالائیں اور سر پہ ترکی ٹوپی' پیروں میں کچھ اس قسم کے لمبے لمبے جوتے جیسے عموماً برفانی علاقوں میں رہنے والے پہنتے تھے۔

ہال میں ایک طرف بہت سے بیگ رکھے تھے۔ ایک طرف کچھ لوگ مختلف قسم کے چمڑے کے کیسز اور کارٹنز وغیرہ میں موسیقی کے مختلف آلات پیک کر رہے تھے۔ شاید طائفے کی سفر کی تیاریاں آخری مراحل میں تھیں لیکن وہاں غالباً اس طائفے کے علاوہ بھی کچھ لوگوں کی مصروفیات جاری تھیں۔

چارلس کے ساتھ میں اوپر کی منزل پر ایک آفس نما کمرے میں پہنچا۔ یہاں بھی کئی افراد موجود تھے اور بڑی سرگرمی نظر آرہی تھی۔ سامنے ہی شیشے کے ایک کیبن میں تراشیدہ بھورے بالوں والی ایک لڑکی سر جھکائے تندہی سے کچھ ٹائپ کر رہی تھی۔ چارلس نے ایک شخص سے کسی کے بارے میں کچھ پوچھا۔ اس نے ایک شخص کی طرف اشارہ کردیا۔

سرخ و سپید سا وہ دُبلا پتلا نوجوان سوٹ میں تھا اور کسی دوسرے کی میز پر کونے میں ٹیلی فون کان سے لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر پسینے کے قطرے جھلملا رہے تھے۔ وہ بڑے زور شور سے کسی کے ساتھ بات چیت میں مصروف تھا اور بڑے تواتر سے ہاتھ بھی ہلائے جارہا تھا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہم اس تک پہنچے تو اس نے گفتگو ختم کرکے ریسیور رکھ دیا۔

وہ غالباً اٹھ کر تیزی سے کہیں جانے ہی لگا تھا کہ چارلس نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور اپنا تعارف کرایا۔ اس کا گویا صرف تعارف کرانا ہی کافی تھا۔ اس نے گرمجوشی سے چارلس سے مصافحہ کیا اور فوراً ہی میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "غالباً یہ مسٹر افضل چودھری ہیں؟" وہ فرانسیسی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا۔

چارلس نے اثبات میں سرہلایا اور مجھے بتایا "یہ صاحب ترکی کے اس ثقافتی طائفے کے منیجر ہیں جس میں تمہیں شامل ہوکر جانا ہے۔ ان کا نام کنعان ہے۔"

کنعان ٹشو پیپر سے اپنے چہرے سے پسینہ پونچھتے ہوئے بولا "عجیب اتفاق ہے کہ ان صاحب کو فواد الخالص کی جگہ جانا ہے اور آج فواد واقعی ہمارے ساتھ نہیں جاسکتا تھا۔ اسے بڑا شدید قسم کا فلو ہوا ہے۔ ڈاکٹر نے اسے کم از کم پانچ دن کے لیے بستر میں رہنے کی ہدایت کی ہے۔"

چارلس دھیرے سے ہنس دیا۔ کنعان براہِ راست مجھ سے مخاطب ہوا "ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ہماری پلاننگ تھوڑی سی غلط ہوگئی ہے جس کی وجہ سے بعض کام بڑے غلط وقت پر.... یعنی آخری لمحوں میں ہورہے ہیں۔ میں آپ کو اپنی ایک اسسٹنٹ کے حوالے کردیتا ہوں۔ وہ آپ کو سفر کے لیے تیار کرادے گی۔ ہمیں کاسٹیوم میں ہی جانا ہے۔ تھوڑا سا میک اپ بھی ہوگا۔"

"اوہ میرے خدا!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا "کیا میک اپ کے بغیر کام نہیں چل سکتا؟ یہ شوبزنس کے لوگوں والا میک اپ میں نے کبھی نہیں کیا۔"

"مسٹر چودھری! جب آپ ہمارے طائفے میں شامل ہوکر جارہے ہیں تو آپ کو طائفے کا ایک رکن ہی نظر آنا چاہیے۔ بلکہ آپ فواد الخالص کی جگہ جارہے ہیں تو آپ کو فواد ہی نظر آنا چاہیے۔" کنعان مضطربانہ لہجے میں بولا "ہم تھوڑی سی بے ایمانی کررہے ہیں تو اسے سلیقے سے کریں گے۔ بے ایمانی دور سے ہی بے ایمانی نظر نہیں آنی چاہیے۔"

میں نے کندھے اچکا دیئے۔ چارلس مجھے ہولے سے کہنی مار کر بولا "اس میں تمہارا ہی فائدہ ہے۔"

"ٹھیک ہے دوست! مجھے تو پاکستان جانا ہے۔ میرا خیال ہے موجودہ حالات میں مجھے زیادہ نخرے نہیں دکھانے چاہئیں۔ میں حاضر ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میرے ساتھ آیئے۔" کنعان میرا ہاتھ تھامتے ہوئے بولا۔

چارلس بولا "میں اب چلتا ہوں' اب یہاں میری کوئی ضرورت نہیں۔ میں نے اپنا کام کردیا ہے۔"

"مسٹر چارلس! میں حقیقتاً آپ کا تہ دل سے ممنون ہوں۔" میں نے سنجیدگی اور ادب سے کہا "آپ واقعی اس اجنبی ملک میں میرے بہت کام آئے ہیں۔ میں سوچتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ اگر آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو میں اس وقت کہاں ہوتا!"

"تم جہاں بھی ہوتے شاید اس سے زیادہ آرام سے ہوتے۔" چارلس مسکراتے ہوئے بولا "مجھے تو تم سے معذرت کرنا تھی اور تم میرا شکریہ ادا کررہے ہو۔ میری وجہ سے درحقیقت تمہیں بہت سی تکلیفیں اٹھانا پڑیں۔ میرے مسائل شیئر کرنا پڑے۔"

پھر اس نے کندھے اچکائے اور میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "بہرحال وقت گزر ہی جاتا ہے۔ یادیں رہ جاتی ہیں۔ ہمیں اتنی رسمی باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔ زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔"

"یقیناً" میں نے گرمجوشی سے اس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "آپ جب بھی پاکستان آئیں' مجھے ضرور اطلاع دیجئے گا۔ سیٹھ رمضان سے کہہ دیجئے گا۔ میں جہاں بھی ہوا' وہ آپ کا مجھ سے رابطہ کرادے گا۔"

میں نے دیکھا کنعان مضطربانہ انداز میں گھڑی دیکھ رہا تھا۔ میں نے چارلس کو خدا حافظ کہا اور کنعان کے ساتھ ہم دونوں نیچے آکر اپنے اپنے راستوں پر ہولیے۔ چارلس باہر کی طرف چل دیا اور کنعان مجھے ایک کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی لڑکی کے پاس لے آیا۔

وہ تیس سے اوپر کی ایک دُبلی پتلی لڑکی تھی۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی اور بال نہایت مختصر تھے۔ وہ نیلے اور گلابی' دو رنگے اسکرٹ میں تھی۔ کنعان نے اس سے میرا تعارف کرایا "یہ وہی افضل چودھری ہیں جن کے بارے میں ہمیں ہدایات ملی تھیں۔" پھر اس نے مجھے لڑکی کے بارے میں بتایا "یہ ریحا ہے۔ یہ آپ کو جانے کے لیے تیار کرے گی۔ آپ کو اس کی ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کرنا ہے۔"

وہ صرف اتنا کہہ کر واپس چل دیا اور ایک دروازہ کھول کر اس کے عقب میں غائب ہوگیا۔ میں نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں ہاتھ بغلوں میں دیئے' دروازے سے ٹیک لگائے کسی ناکام فلسفی کی طرح اداس اداس سی نظروں سے میرا سرتاپا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ گویا فیصلہ کرنے کی کوشش کررہی تھی کہ مجھے گفتگو کا شرف بخشے یا نہیں؟

تاہم جب وہ بولی تو اس کی آواز انتہائی دھیمی' شیریں اور لہجہ نہایت دوستانہ تھا "مسٹر چودھری! میرے خیال میں تمہیں سب سے پہلے غسل کی ضرورت ہے۔ لگتا ہے تم سوٹ پہن کر کھیتی باڑی کرتے رہے ہو۔"

تب پہلی بار مجھے احساس ہوا کہ میں مٹی میں لتھڑا ہوا تھا۔ قسمت ہی کچھ عجیب تھی کہ چند میل کا سفر بھی سکون سے طے نہیں ہوتا تھا۔ اب میں محترمہ ریحا کو کیا بتاتا کہ میرا زندہ سلامت کلچرل سینٹر پہنچ جانا بھی اوپر والے کی مہربانی ہی تھی ورنہ وہ مجھے جس غسل کا مشورہ دے رہی تھی وہ میرا غسلِ میت بھی ہوسکتا تھا۔

"کیا ہمارے پاس اتنا وقت ہے؟" میں نے اپنی حالت پر ذرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر پوچھا "مسٹر کنعان تو بہت عجلت میں معلوم ہوتے ہیں۔"

"وہ تو ہمیشہ اسی طرح عجلت میں ہوتے ہیں اور اسی طرح گھبرائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ ہمارے پاس بہت زیادہ وقت نہیں ہے لیکن اگر آپ ذرا مستعدی سے کام کریں تو ہم ذرا ڈھنگ سے تیار ہوکر جاسکتے ہیں۔ ویسے بھی ہم ثقافتی طائفہ لے کر جارہے ہیں' مہاجرین کا قافلہ نہیں۔" ریحا ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ وہ شستہ انگریزی میں بات کررہی تھی۔

تھی کہ وہاں اتنی بھی بھگدڑ نہیں مچی ہوئی تھی جتنی بظاہر نظر آرہی تھی۔ ریحا نے ایک شاندار باتھ روم تک میری رہنمائی کی جو تمام لوازمات سے آراستہ تھا۔

غسل کے بعد ریحا نے مجھے ویسا ہی لباس مہیا کیا جس میں وہاں کئی افراد پھرتے نظر آرہے تھے۔ وہی لمبا سا بھاری بھرکم چغا یا گاؤن۔ نیچے لمبے کرتے سے مشابہ قمیص' بھاری بھرکم جوتے اور ترکی ٹوپی۔ گلے میں مالائیں.... اور نہ جانے کیا کچھ۔

میں نے اس لباس میں خود کو کارٹون محسوس کیا لیکن ریحا میرا جائزہ لیتے ہوئے طمانیت سے سرہلا کر بولی "جچ رہے ہو' فواد الخالص سے زیادہ جچ رہے ہو۔"

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "اگر میرا دل رکھنے کو کہہ رہی ہو تب بھی میں اس پر خوش ہوں۔"

اس کے پھیکے سے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ اُبھری اور مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ ایک طرف کو چل دی۔ اس بار ہم جس کمرے میں پہنچے وہ ایک طویل و عریض میک اپ روم تھا۔ وہ غالباً ایک بہت بڑے تھیٹر کی میک اپ کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کافی تھا۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس عمارت میں ایک بہت بڑا آڈیٹوریم بھی موجود تھا جہاں تقریباً ہر روز کوئی نہ کوئی ڈراما یا کلچرل شو وغیرہ دکھایا جاتا تھا۔ وہ خالصتاً دفتری قسم کی عمارت نہیں تھی۔ وہاں فن و ثقافت کے شعبے سے متعلق تقریباً تمام ضروریات پوری کرنے کا انتظام تھا حتیٰ کہ دوسرے شہروں سے یا دوسرے ملکوں سے آنے والے فنکاروں کو بھی اگر کسی وجہ سے ہوٹل میں نہ ٹھہرایا جاسکتا تو یہاں ٹھہرایا جاسکتا تھا یہاں ان کے قیام و طعام کا معقول انتظام تھا۔

مجھے دیوار گیر آئینوں میں سے ایک کے سامنے اونچی کرسی پر بٹھادیا گیا اور ریحا کی ہدایت پر موٹی سی ایک خاتون نے مستعدی سے میرا میک اپ شروع کردیا۔ چھوٹے قد کی وہ گول مٹول سی عورت بہت ہنس مکھ معلوم ہوتی تھی لیکن اسے انگریزی نہیں آتی تھی۔ وہ ریحا سے صرف ترکی میں بات چیت کررہی تھی۔

مجھے باقاعدہ پیشہ ور ایکٹروں کی طرح بیٹھ کر میک اپ کرانا بہت عجیب لگ رہا تھا اور اس وقت تو میں بے اختیار کراہ کر رہ گیا جب میرے چہرے پر فوبانچو کٹ مونچھوں کا اضافہ ہوگیا۔ پھر میک اپ وومن نے ترکی ٹوپی میرے سر پر رکھ کر ذرا پیچھے ہٹ کر ناقدانہ نظروں سے میرا جائزہ لیا۔

میں نے بے چارگی سے ریحا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "ترکی ٹوپی کی حد تک تو معاملہ قابلِ برداشت تھا لیکن کیا یہ لٹکتی ہوئی مونچھیں بھی ضروری ہیں؟"

"مجبوری ہے۔" ریحا نے کندھے اُچکائے "فواد الخالص کی مونچھیں ہیں اور پاسپورٹ پر فی الحال اسی کی تصویر لگی ہے۔"

اور جسم ڈھیلا چھوڑ دیا۔ نیم وا آنکھوں سے آئینے میں اپنا جائزہ لیتے ہوئے مجھے کچھ یوں لگا جیسے میرے سامنے کوئی اجنبی بیٹھا ہو۔ اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ یہ سب کچھ تو میرے حق میں بہت ہی اچھا ہو رہا تھا۔ کوئی دوسرا تو مجھے کیا پہچانتا' محض چند چھوٹی چھوٹی تبدیلیوں سے میں خود اپنے لیے بھی ناقابلِ شناخت ہو چکا تھا۔

میں خود کوشش کرتا تو شاید اس اجنبی ملک میں مجھے اپنی شکل اور حلیہ تبدیل کرانے میں خاصی دشواری پیش آتی لیکن میرا یہ کام کسی فرمائش کے بغیر خود بہ خود ہی ہو گیا تھا۔ میرا اصل شکل میں پاکستان جانا شاید بہتر نہ ہوتا۔ اس قسم کے بہروپ میں جانا زیادہ بہتر تھا۔ یہ سوچ کر میں نے اطمینان کی سانس لی اور کرسی کے پشتے سے سر ٹکا کر پُرسکون انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔

ریحا فوراً ہی میرا کندھا ہلاتے ہوئے بولی "اب اٹھ جاؤ۔ یہ میک اپ روم کی کرسی ہے کوئی پنگوڑا نہیں جہاں لیٹ کر تم لوری سننے کی تیاری کر رہے ہو۔ تسوا کو ابھی کچھ دوسرے لوگوں کا میک اپ بھی کرنا ہے۔"

تب مجھے معلوم ہوا اس گول مٹول ہنس مکھ عورت کا نام تسوا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا "اصل میں میرے ساتھ معاملات کچھ اُلٹ پلٹ سے ہو گئے ہیں۔ جب میں شیر خوار تھا تو لوریوں کے بجائے کلاسیکل موسیقی سنا کرتا تھا۔ اب لوریاں سننے کو جی چاہنے لگا ہے۔"

میں نے تسوا کا شکریہ ادا کیا اور ایک بار پھر ریحا کے ساتھ ہو لیا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی ضد تھیں۔ ریحا لمبی اور بے پناہ دُبلی تھی۔ شاید حد سے زیادہ ڈائٹنگ کی ماری ہوئی تھی جبکہ تسوا پستہ قد اور ہر طرف سے گول مٹول تھی۔ ریحا کی سنجیدگی تقریباً افسردگی سے مشابہ تھی جبکہ تسوا کے ہونٹوں سے ہی نہیں بلکہ پھولے پھولے سرخ و سپید گالوں سے بھی گویا ہنسی پھوٹی پڑتی تھی۔

راستے میں ریحا بولی "تم اپنا سامان میرے حوالے کر دو۔"

"میرے پاس اس بریف کیس کے سوا کچھ نہیں ہے۔" میں نے اسے اپنا بریف کیس دکھایا جو کچھ زیادہ ہی "بریف" تھا۔

"تم کچھ لے کر تو نہیں جا رہے ہو؟" اس نے سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تم بہت اونچی سفارش پر ہمارے طائفے میں کسی اور کی جگہ شامل ہو کر جا رہے ہو۔ کہیں تم کوئی خاص قسم کے کیریئر وغیرہ تو نہیں ہو؟ ڈرگ مافیا کے آدمی تو نہیں ہو؟ براؤن شوگر وغیرہ تو لے کر نہیں جا رہے؟ میرا مطلب ہے ہیروئن وغیرہ؟" اس نے وضاحت کی۔

"اوہ" میں گہری سانس لے کر رہ گیا "آج کل میں واقعی خود کو کیریئر محسوس کر رہا ہوں لیکن وہ کیریئر نہیں' جو تم سمجھ رہی ہو۔ بلکہ [illegible]"

"بات کو مذاق میں مت ٹالو۔" اس کی سنجیدگی برقرار رہی "میں یہ بات تم سے صرف اپنی معلومات کے لیے پوچھ رہی ہوں۔ ظاہر ہے میں تمہیں روک تو نہیں سکتی۔"

"تمہیں واقعی اپنی معلومات میں اضافے کی کوشش کرنی چاہیے کیونکہ تمہاری معلومات بہت ہی ناقص ہیں۔ مجھ جیسا مسکین اور بے سروسامان آدمی تمہیں ڈرگ مافیا کا کیریئر نظر آ رہا ہے۔ خیر تمہارا بھی قصور نہیں۔ ڈرگ مافیا نے واقعی دنیا میں اپنے پنجے اتنے پھیلا لیے ہیں کہ ہر شخص کو اپنے ساتھ چلتے ہوئے شخص پر ڈرگ مافیا کے آدمی کا شک ہوتا ہے لیکن تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ترکی سے پاکستان کی طرف پاؤڈر لے کر کوئی ایسا شخص ہی جا سکتا ہے جس کا ذہنی توازن درست نہ ہو۔ یہ پاؤڈر لے کر جانے کا نہیں بلکہ لے کر آنے کا روٹ ہے۔" میں نے ملائمت سے اسے سمجھایا۔

"مجھے ان باتوں کا زیادہ علم نہیں ہے۔ میں نے تو احتیاطاً پوچھ لیا تھا۔" وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔

کچھ دیر بعد روانگی کا اعلان ہو گیا۔ بڑی سی ایک خوب صورت اور ائرکنڈیشنڈ کوچ ہمیں لینے آئی تھی۔ کچھ مزدور ٹائپ لوگوں نے ہمارا سامان اس پر لادا۔ کنعان' ریحا اور ایک تیسرے شخص نے فرداً فرداً ہم سب کا یوں معائنہ کیا جیسے اسکول میں بچوں کی انسپکشن ہو رہی ہو۔ پھر ہم قطار بنا کر کوچ میں سوار ہوئے۔ طائفے میں چار خوب صورت اور خوش ادا لڑکیاں بھی شامل تھیں۔

کوچ روانہ ہوئی تو سب آپس میں ہنسی مذاق اور چہلیں کر رہے تھے لیکن مجھ سے کوئی بات نہیں کر رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ان سب کو معلوم تھا' میں جعلی فواد الخالص تھا اور ترک نہیں تھا لیکن انہوں نے اس بات کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی اور نہ ہی کسی نے اس سلسلے میں مجھے کریدنے کی کوشش کی تھی۔

راستے میں لڑکیوں نے ڈف بجا بجا کر کچھ گانا شروع کر دیا۔ مرد بھی ان کا ساتھ دینے لگے۔ انہوں نے گویا راستے ہی میں اپنا ثقافتی شو شروع کر دیا تھا۔ ان کی موسیقی میں عربی موسیقی کی جھلک تھی اور ان میں سے بیشتر کے نام بھی عربی ہی معلوم ہوتے تھے۔

گانے کے درمیان ان سب کے قہقہے بھی گونجنے لگتے تھے۔ ائرکنڈیشنڈ کوچ کے شیشے بند ہونے کی وجہ سے غالباً زیادہ شور باہر نہیں جا رہا تھا۔ اس کے باوجود سگنل وغیرہ پر دوسری گاڑیوں کے لوگ ہماری گاڑی کی طرف متوجہ ہو جاتے تھے۔ مجھے یاد آیا کہ ہمارے ہاں اکثر براتیں اسی طرح سفر کے دوران بسوں یا ویگنوں میں گاتی بجاتی اپنی منزل کی طرف جاتی تھیں۔

آخرکار ہم لوگ ائرپورٹ جا پہنچے اور سرسری انداز میں ضابطے کی کارروائیوں سے گزرنے کے بعد ٹرکش ائرلائنز کے ایک جمبو جیٹ میں سوار ہو گئے۔ میرے خیال میں یہ ایک مشکل مرحلہ تھا لیکن میری توقعات سے کہیں زیادہ آسانی سے طے ہو گیا تھا۔

طیارے کے فضا میں بلند ہونے کے بعد جب اس کی پرواز ہموار ہو گئی تو میں نے بیلٹ کھول کر سیٹ کے پشتے سے سر ٹکا لیا اور آنکھیں بند کر کے جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ مجھے امید ہو چلی تھی کہ جس طرح استنبول کے ائرپورٹ پر طائفے کے ہمراہ جہاز میں سوار ہونا کوئی مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا اسی طرح اسلام آباد ائرپورٹ پر ان لوگوں کے ساتھ کسٹم اور امیگریشن وغیرہ سے نکلنا کوئی مسئلہ نہیں ہو گا۔

طمانیت کے اس احساس کے ساتھ میرے اعصاب پر ایک عجیب میٹھی میٹھی لذت آمیز سی تھکن چھا گئی۔ ایک مدت گزر گئی تھی کہ میں ایک لاانتہائی سے ہنگامہ خیز سفر میں تھا۔ یہ سفر گویا ختم ہونے ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ اس زنجیر کا سلسلہ کہیں ٹوٹتا ہی نہیں تھا۔ ایک کڑی کے بعد دوسری کڑی...

اب میں وطن واپس جا رہا تھا تو یکدم ہی گویا میرے دل میں آرام کی خواہش جاگ اُٹھی تھی۔ ایسا آرام جس میں اندیشے اور وسوسے اعصاب میں سرسراہٹ پیدا نہ کریں۔ نیند کی حالت میں بھی خطرات کے احساس سے رگ و پے میں سنسنی نہ دوڑتی ہو۔ لیکن ایسا ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ کہنے کو اب میں وطن واپس جا رہا تھا لیکن وہاں بھی نہ جانے کس طرح کے حالات میرے منتظر تھے۔

یہ سوچتے سوچتے میرا ذہن غنودگی میں ڈوب گیا۔

○☆○

طیارہ جب اسلام آباد ائرپورٹ پر اُترا تو رات کے نو بج رہے تھے۔ ائرپورٹ پر بڑی رونق اور چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ ہم کسی خصوصی طیارے میں نہیں آئے تھے۔ اس میں دوسرے عام مسافر بھی موجود تھے۔ پہلے انہیں نکل جانے کا موقع دیا گیا۔ بعد میں ہم ارائیول لاؤنج میں آئے جہاں وزارتِ ثقافت کا سیکریٹری لیول کا کوئی بیوروکریٹ طائفے کو ریسیو کرنے آیا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ اسٹاف کے کچھ لوگ اور چند پریس فوٹوگرافر وغیرہ موجود تھے۔

بڑی ترتیب اور سلیقے سے پروٹوکول کے مطابق تعارف وغیرہ کے مراحل طے ہونے لگے۔ مصافحے ہونے لگے۔ دھڑا دھڑ فلیش لائٹس کے جھماکے ہو رہے تھے۔ زیادہ تر کیمروں کا رخ طائفے میں شامل لڑکیوں کی طرف تھا جو بڑی من موہنی مسکراہٹ کے ساتھ ہر ایک سے جھک جھک کر مل رہی تھیں اور سمجھ میں نہ آنے والے جملوں پر بھی ہموار دانتوں کے موتی چمکا رہی تھیں۔

مجھے اس سارے سلسلے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لیکن دل ہی دل میں حالات کی اس ستم ظریفی پر ہنسی ضرور آ رہی تھی۔ میرا نہ جانے اپنے ملک کی ثقافت سے بھی کوئی حقیقی تعلق تھا یا نہیں لیکن میں اس وقت ایک دوسرے ملک کے ثقافتی طائفے میں شامل تھا۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ کوئی بھی شخص مجھ سے کوئی سوال نہ کرنے پائے کیونکہ میں ترکی میں جواب نہیں دے سکتا تھا جبکہ وہاں مترجم بھی موجود تھے۔

میری نظریں وہاں کسی شناسا صورت کو تلاش کر رہی تھیں۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں سیکیورٹی کے انتظامات تھے۔ غیر متعلق لوگوں کو ارائیول لاؤنج میں آنے سے روکنے کے لیے باہر پولیس وغیرہ موجود تھی۔ میں نے سوچا شاید باہر جاتے وقت میرا کوئی ساتھی نظر آئے۔

خدا خدا کر کے استقبال کے تکلفات ختم ہوئے اور ہم میزبان وفد کی رہنمائی میں باہر روانہ ہوئے۔ گاڑیوں کی طرف جاتے وقت میں نے راستے میں نظر آنے والے ہجوم کی طرف بار بار دیکھا لیکن مجھے کہیں کوئی شناسا چہرہ دکھائی نہ دیا۔ مجھے شبہ ہونے لگا کہ شاید چارلس' سیٹھ رمضان کو میرے صحیح پروگرام سے مطلع نہیں کر سکا تھا اور سیٹھ رمضان آگے وہ اطلاعات میرے ساتھی سلیمان تک نہیں پہنچا سکا تھا ورنہ شاید سلمان خود یا میرا کوئی اور ساتھی مجھے یہاں دکھائی دے ہی جاتا۔

ہم ائرپورٹ کی عمارت سے باہر پہنچ گئے اور میری متلاشی نظریں کسی ساتھی کو نہ پا سکیں حتیٰ کہ ہم ان گاڑیوں کی قطار تک جا پہنچے جو ہمیں لینے کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ یہاں کوئی ایک بڑی گاڑی نہیں تھی۔ کئی مرسیڈیز کاریں تھیں۔ میزبان اور مہمان سب ٹولیوں میں تقسیم ہو کر ان گاڑیوں میں بیٹھ گئے۔ میں مختلف اندیشوں اور وسوسوں میں گھرا اس قافلے کے ساتھ اسلام آباد ہوٹل پہنچ گیا جہاں کچھ دیر کی خانہ پُری کے بعد سب کو ان کے کمروں میں بھیج دیا گیا۔ میرے حق میں اچھا ہی تھا کہ مجھے سنگل بیڈ روم ملا تھا۔

کھانا ہم جہاز میں ہی کھا چکے تھے۔ کمرے میں پہنچنے کے بعد میں دیر تک کچھ لوگوں کو فون کرنے کے بارے میں سوچتا رہا لیکن اس ارادے پر عمل نہ کر سکا۔ میرے خاص ساتھیوں میں سے کسی کا یہاں ٹھکانا نہیں تھا۔ میرا بزنس آفس یہاں موجود تھا لیکن وہ اس وقت یقیناً بند تھا۔ اپنے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کے گھر کا فون نمبر بھی مجھے یاد تھا لیکن یہاں کے آفس والے بے ضرر سے لوگ تھے۔ انہیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ میں کیوں غائب تھا اور لاہور میں جو غیر معمولی واقعات پیش آئے تھے ان کا پس منظر کیا تھا۔ میرے لیے یہاں کے ریذیڈنٹ ڈائریکٹر کو اپنی موجودگی کی اطلاع دینا فضول تھا۔ میں نے کسی کو بھی فون نہ کیا اور سو گیا۔ میں نے کوئی بھی قدم اٹھانے کا فیصلہ صبح تک کے لیے ملتوی کر دیا۔

صبح مجھے اس اُلجھن میں نہیں پڑنا پڑا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ علی الصباح ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ درحقیقت اس گھنٹی نے ہی مجھے جگایا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر "ہیلو" کہا تو دوسری طرف سے ٹھہری ٹھہری آواز میں صرف اتنا کہا گیا "سر! باہر آ جایئے' میں آپ کا منتظر ہوں۔"

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس انتہائی مختصر ٹیلی فون کال نے مجھے اُلجھن اور تذبذب

سے نکال لیا۔ وہ سلیمان کی آواز تھی۔ اس کی کال کا مطلب یہ تھا کہ وہ میری آمد اور ہوٹل کے اس کمرے میں میری موجودگی سے واقف تھا۔

میرا میک اپ عمدہ تھا۔ کئی گھنٹے کے سفر اور رات کو بستر میں رہنے کے باوجود ذرا بھی خراب نہیں ہوا تھا۔ البتہ اب میں ثقافتی طائفے والوں کے حلیے میں باہر جانے اور اکیلا اِدھر اُدھر پھرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ لوگوں کی توجہ میری طرف مبذول کرانے کا سبب بنتا جبکہ مجھے لوگوں کی توجہ سے بچنا تھا۔

میں بریف کیس میں عام سی ایک پینٹ شرٹ، پی کیپ اور تاریک چشمہ رکھ کر لایا تھا۔ اس کے علاوہ چھوٹا سا ایک کیمرا بھی تھا۔ پینٹ شرٹ پہن کر، پی کیپ سر پر جما کر، تاریک چشمہ لگا کر میں نے کیمرا گلے میں لٹکایا اور ناقدانہ نظروں سے ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔۔۔۔ کوئی اچھا خاصا غور سے دیکھنے کے بعد بھی مجھے کوئی ترک، ایرانی یا عرب سیاح تو سمجھ سکتا تھا، افضل چودھری نہیں سمجھ سکتا تھا۔

میں نے ہوٹل کے کمرے کو الوداع کہا۔ عین ممکن تھا کہ میں اب یہاں واپس نہ آتا۔ میری جگہ اصل فواد الخالص کو بھیجنا اب چارلس کا دردِ سر تھا۔ میں لفٹ کے ذریعے نیچے آکر ہوٹل کی لابی سے نکلا تو یہ دیکھ کر قدرے حیرت ہوئی کہ ابھی صبح کا اجالا صحیح طور پر نہیں پھیلا تھا۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو ہوٹل کے آس پاس کوئی نظر نہ آیا۔ سردی اس وقت بہت زیادہ تھی۔ اردگرد کھڑے درخت بھی سردی سے ٹھٹھرتے محسوس ہو رہے تھے۔ کچھ دور فٹ پاتھ کے ساتھ ایک درخت کے نیچے ایک فقیر کھڑا ٹھٹھرتا نظر آیا۔ اس سے پہلے بھی میں بارہا اسلام آباد ہوٹل میں ٹھہرا تھا لیکن میں نے کبھی اس کے آس پاس فقیر منڈلاتے نہیں دیکھا۔ خصوصاً سویرے سویرے جبکہ اسے کوئی بھیک دینے والا بھی دور دور تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

چند ٹیکسیاں فٹ پاتھ کے ساتھ کھڑی تھیں اور ان کے ڈرائیور کھڑکیوں کے شیشے چڑھائے اندر لیٹے سو رہے تھے یا اونگھ رہے تھے۔ میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ٹہلنے کے سے انداز میں فٹ پاتھ پر چل دیا۔ عمر رسیدہ فقیر لنگڑاتا ہوا میرے قریب آگیا۔ اس کے جسم پر ایک پھٹا پرانا اوورکوٹ تھا۔ پیروں میں پھٹے ہوئے جوتے تھے۔ لمبے لمبے اُلجھے ہوئے سیاہ و سفید بالوں نے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا اور بے ترتیب ڈاڑھی مونچھوں میں مدغم ہو رہے تھے۔ اس کے چہرے کا بہت کم حصہ نظر آرہا تھا اور اسے بھی صحیح معنوں میں نظر آتا نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ اس پر بھی میل جما ہوا تھا۔۔۔۔ اس کے اوورکوٹ کی ایک آستین ڈھیلے ڈھالے انداز میں جھول رہی تھی جس سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ٹنڈا تھا۔

وہ لنگڑاتا ہوا میرے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "دے جا بابا اللہ کے نام پر۔۔۔۔ اللہ بچھڑے ہووں کو ملائے گا۔"

اس کی آواز گھٹی گھٹی سی تھی اور سردی سے کانپ رہی تھی۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھا لیکن وہ سلیمان نہیں ہو سکتا تھا، سلیمان ٹنڈا نہیں تھا۔

"تم نے مجھے بہت اچھی دُعا دی ہے بابا!" میں نے کہا "میرا دل چاہ رہا ہے تمہاری غربت ہمیشہ کے لیے دور کر دوں۔ میرے ساتھ آؤ۔"

میں نے اسے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور ایک ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ وہ جلدی سے بولا "اس ٹیکسی کو چھوڑیں جی۔ اس کا ڈرائیور بڑا بدمعاش ہے۔ جو ٹیکسی سب سے پیچھے کھڑی ہے اس میں بیٹھیں۔ اس کا ڈرائیور بہت اچھا آدمی ہے۔ میں ان سب کو اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"جس طرح تم کہو گے میں اسی طرح کروں گا بابا!" میں نے سعادت مندی سے کہا اور اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

فقیر نے آگے بڑھ کر خود ہی ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور پہلے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اس ٹیکسی کا ڈرائیور سویا ہوا نہیں تھا اور نہ ہی اونگھ رہا تھا۔ وہ مستعدی سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھالے بیٹھا تھا۔ وہ باریش تھا اور پٹھان معلوم ہوتا تھا۔ سر پر موٹی اونی ٹوپی تھی اور وہ گہرے رنگ کی گرم شال لپیٹے ہوئے تھا۔

"کدر چلنا اے صیب!" ڈرائیور نے کھردرے لہجے میں پوچھا۔

"کسی ایسے شاپنگ ایریا کی طرف چلو جہاں دُکانیں جلدی کھلتی ہوں۔" میں نے کہا "ان بابا جی کا حلیہ تبدیل کرنا ہے۔ میں چاہتا ہوں یہ صاف ستھرے کپڑے پہن کر نہا دھو کر ایک معزز اور آسودہ حال آدمی نظر آئیں۔ یہ مجھے اس حلیے میں اچھے نہیں لگ رہے۔"

"ڈرائیور نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور ہوٹل کے سامنے والی لائن سے نکال لایا پھر گردن گھمائے بغیر بولا "اس وقت تو کدر بی دُکان کُھلا نئیں ہوئے گا صیب! لیکن ام تم کو بازار چھوڑ دے گا۔"

"بکواس بند کرو اور اپنی اصل آواز میں صحیح طریقے سے بات کرو۔" میں نے یکدم ہی اسے ڈانٹ دیا۔

میں عقب سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ذرا اُچھل پڑا اور یکدم بدلی ہوئی آواز میں بولا "سر! آپ نے مجھے پہچان لیا؟"

"ابھی میرے ہوش و حواس اتنے خراب بھی نہیں ہوئے کہ میں اپنے جاں نثار ساتھیوں کو بھی نہ پہچان سکوں۔" میں نے کہا۔

اس نے بڑی کامیابی سے روپ بدلا ہوا تھا لیکن میں نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی اسے پہچان لیا تھا۔ وہ میرے خاص ساتھیوں میں سے ایک تھا۔ اس کا نام احمد تھا۔ اس کی اور آفتاب کی جوڑی ہوا کرتی تھی۔ آفتاب بھی میرا ایک خاص ساتھی تھا۔ دونوں دوست ہوا کرتے تھے اور اکٹھے رہتے تھے لیکن بدقسمتی سے آفتاب بلیک برڈ

کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ بلیک برڈ ایک خاص قسم کے چیمپینزی تھے جو ریڈ ڈاٹ نے پالے ہوئے تھے۔ مجھے اپنا ہر جاں نثار ساتھی بہت عزیز تھا۔ آفتاب کی موت نے میرے دل میں بھی گھاؤ ڈالا تھا لیکن احمد تو عرصے تک سنبھل نہیں سکا تھا۔ تاہم اسی واقعے نے اس کے دل میں آتشِ انتقام بھی تیز تر کر دی تھی۔

ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد میں نے بھکاری کا بھی زیادہ قریب سے اور زیادہ غور سے جائزہ لیا تھا۔ وہ سلیمان ہی تھا لیکن اس کا میک اپ بہت عمدہ تھا حالانکہ احمد کی ڈاڑھی اصلی تھی جو یقیناً اس نے میری عدم موجودگی میں بڑھائی تھی لیکن سلیمان کی مصنوعی ڈاڑھی اس سے بہتر معلوم ہو رہی تھی۔ مجھے اس کے مصنوعی ہونے کا یقین صرف اس لیے ہو سکا تھا کہ اس میں سفیدی غالب تھی جبکہ سلیمان بمشکل تیس سال کا نوجوان تھا۔

"سلیمان! تم البتہ چند سیکنڈ کے لیے مجھے بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔" میں نے بھکاری کی طرف مڑتے ہوئے کہا "خصوصاً اس بازو کی وجہ سے۔ جس سے تم اپنے آپ کو ٹنڈا ظاہر کر رہے ہو۔ یہ تم نے کیا ترکیب کی ہے؟ انسان اوورکوٹ کی آستین میں بھی بازو کو اس طرح تو دُہرا نہیں کر سکتا کہ وہ ٹنڈا نظر آئے۔"

گاڑی میں ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی۔ صرف انجن کی خفیف سی سرسراہٹ سنائی دے رہی تھی۔ آخرکار سلیمان نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور اپنی اصل آواز میں بولا "سر! یہ کوئی ترکیب وغیرہ نہیں ہے، میرا بازو واقعی کٹا ہوا ہے۔ میں سچ مچ کا ٹنڈا ہوں۔"

اس کے لہجے میں قطعاً کوئی تاسف وغیرہ نہیں تھا۔ اس نے نہایت شگفتہ لہجے میں مجھے یہ اطلاع دی تھی۔ میرے دل پر گھونسا سا لگا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میری زبان پتھرا سی گئی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہوں۔

سلیمان اپنی جھاڑ جھنکاڑ ڈاڑھی میں انگلیاں پھیرتے ہوئے ہنس کر بولا "سر! آپ تو اداس ہو گئے۔ اس میں اداسی کی کیا بات ہے۔ اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔"

"اتنی بے دردی سے اپنے بارے میں بات مت کرو۔ مجھے سنجیدگی سے بتاؤ۔ یہ کس طرح ہوا؟" میں نے کوشش کی کہ میرے لہجے میں ارتعاش نہ پیدا ہونے پائے۔

"چھوڑیں سر! آپ اتنی سی بات کو اتنی اہمیت کیوں دے رہے ہیں؟" وہ بے پروائی سے بولا "میرا بایاں بازو ہی تو کٹا ہے۔ دایاں تو اب بھی سلامت ہے۔ مجھے تو خوشی یہ ہے کہ میں اب بھی پہلے ہی کی طرح آپ کا دست و بازو ہوں۔ میں اب بھی ہر کام پہلے ہی کی طرح کر سکتا ہوں۔"

"میں نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ تمہاری کارکردگی میں کوئی فرق تو نہیں پڑ گیا۔" میں نے قدرے تیزی سے کہا "میں نے جو پوچھا تھا اس کا جواب دو۔ تمہارا بازو کیسے کٹ گیا؟ کس نے کاٹا؟"

تب وہ نظر جھکاتے ہوئے دھیمے سے لہجے میں بولا "سر آپ کو یاد ہوگا۔ ریڈ ڈاٹ کی ایک مخلوق اُڑتی ہوئی آتی تھی؟"

"ہاں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ میں اتنے لمبے عرصے غائب نہیں رہا ہوں کہ یہ سب باتیں بھول جاتا۔ اور نہ ہی میری یادداشت اتنی کمزور ہے۔ ریڈ ڈاٹ کی تو ہر بات ویسے بھی مجھے قبر میں جانے تک یاد رہے گی۔ اب تو اس کے سوا کوئی بات اتنی ضروری محسوس ہی نہیں ہوتی کہ اسے یاد رکھا جائے۔" میں تیزی سے یہ سب کچھ کہتا چلا گیا۔

"سر! وہ غوطہ خوروں جیسے لباس میں ہوتے تھے اور ان کی پشت پر ایک مختصر سا باکس ہوتا تھا۔ غالباً اسی میں وہ مشینری ہوتی تھی جس سے وہ اُڑتے تھے۔" سلیمان اب بھی مجھے گویا بھولی بسری باتیں یاد دلائے جا رہا تھا "اس کے علاوہ ان کے سینے پر بھی ایک باکس بندھا ہوتا تھا جن سے چھوٹی چھوٹی چمکیلی طشتریاں سی تیزی سے گھومتی اور اُڑتی ہوئی نکلتی تھیں جو ہر چیز میں سے گزر جاتی تھیں۔"

"اچھا۔۔۔۔" میں نے گہری سانس لے کر سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا لیا "تو تمہارا بازو ان میں سے کسی طشتری کے راستے میں آگیا تھا۔"

"جی سر!" اس کے لہجے میں اب بھی شگفتگی تھی "بازو بالکل اس طرح کٹ گیا تھا جیسے بلیڈ سے صابن کا کوئی پتلا سا تار۔"

پھر اس کی اُلجھی اُلجھی مونچھوں میں حرکت پیدا ہوئی۔ وہ مسکرایا تھا "ہر بات کا کوئی نہ کوئی روشن پہلو ہوتا ہے سر۔۔۔۔! جو بعض اوقات ہمیں نظر نہیں آتا۔ اب یہی دیکھ لیجیے کہ میرے معاملے میں بات صرف ایک بازو پر ٹل گئی۔ اس سے میرے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ وہ طشتری میرے سینے سے بھی گزر سکتی تھی۔ میرے دل کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی بھی نکل سکتی تھی۔ میں کم از کم زندہ تو ہوں اور ایک بار پھر آپ سے مل رہا ہوں۔ میرے لیے یہی بڑی خوشی کی بات ہے۔"

"بس سلیمان! اب میرا اتنا بھی دل رکھنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے دھیرے سے اس کا کندھا تھپک کر کہا۔

اسی لیے اس نے نہایت آہستگی سے مڑ کر دیکھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا، وہ اطمینان کر رہا تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہا؟ میں نے گردن گھما کر دیکھنے کی زحمت نہیں کی۔

اس نے مطمئن ہو کر اپنے کشکول میں سے بسکٹوں کا ایک مُڑا تڑا سا ڈبا اور ایسی ہی ایک آدھ دوسری چیز ایک طرف کو کھسکائی۔ ان کے نیچے ایک موبائل فون موجود تھا۔ اس نے کشکول گود میں رکھا ہوا تھا۔ موبائل فون اس میں سے نکالے بغیر اس نے نمبر پنچ کیا پھر فون اُٹھا کر کان سے لگایا۔

"سر!" وہ دوسری طرف سے کوئی آواز سُن کر مؤدبانہ لہجے میں

بولا "میں "اے ون" بول رہا ہوں۔ چودھری صاحب پہنچ گئے ہیں۔"

فون پر دوسری طرف سے خفیف سی آواز مجھے بھی سنائی دے رہی تھی لیکن میں نے الفاظ سمجھنے کے لیے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ مجھ پر اس وقت خفیف سی بے زاری کا دورہ پڑا تھا اور ذہن پر اس وقت کی کچھ یادوں کی یلغار بھی تھی جب میں لاہور سے فرار ہوا تھا سلیمان کو فون پر غالباً کچھ ہدایات دی جارہی تھیں۔

چند سیکنڈ بعد ہی اس نے "یس سر" کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا اور احمد کی طرف متوجہ ہوا جو ٹیکسی ڈرائیور کے فرائض انجام دے رہا تھا یا پھر شاید آج کل اس نے مستقلاً یہی روپ دھارا ہوا تھا۔

"تو اب تمہارے کوئی اور "سر" بھی ہوگئے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "یہ کون صاحب ہیں؟"

"سر! یہ ہمارے عارضی سر ہیں۔" سلیمان نے جواب دیا۔

"لیکن ہیں کون؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"یہ آپ کو جلد ہی ان سے ملنے کے بعد معلوم ہوجائے گا۔" سلیمان شریر سے لہجے میں بولا۔ وہ گویا سپنس پیدا کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"ٹھیک ہے..... تمہیں اگر ماسٹر آف سپنس بننے کے لیے یہی موقع مناسب لگ رہا ہے تو بن لو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

وہ احمد سے مخاطب ہوا "ہیڈ کوارٹر پہنچنے کی جلدی نہیں ہے۔ سر نے کچھ ٹھہر کر آنے کی ہدایت کی ہے۔ تم گاڑی اور بھی آہستہ چلاؤ۔ بلکہ چاہو تو گاڑی واپس گھما کر ایک دو میل کا فالتو چکر کاٹ لو۔"

اِدھر اُدھر گھومنے کے لیے چونکہ کوئی اور راستہ نہیں تھا اس لیے احمد نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے کی غرض سے گاڑی واپس موڑلی۔ اس سے پہلے میں نوٹ کرچکا تھا کہ گاڑی چکلالہ ائرپورٹ کی طرف جارہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "میں نے استنبول سے سیٹھ رمضان سے کراچی بات کی تھی۔ اس سے پتا چلا تھا کہ تم کراچی میں ہو۔ تم کیا میری آمد کا پروگرام معلوم ہونے کے بعد ہی یہاں پہنچے ہو؟"

"جی ہاں۔ میں اس وقت اتفاق سے کراچی میں تھا جب مجھے سیٹھ رمضان نظر آگیا اور میں اس سے مل بیٹھا۔ درحقیقت اب ہم لوگ چاہ ہی رہے تھے کہ آپ واپس آجائیں۔ ہم آپ کا سراغ لگانے کی کوشش کررہے تھے۔ میں اسی سلسلے میں کراچی گیا ہوا تھا۔ سیٹھ رمضان سے ملاقات بہت فائدہ مند ہی رہی۔ وہ بڑے کام کا آدمی ثابت ہوا۔ اس نے پرسوں کراچی میں مجھے آپ کے سارے پروگرام سے مطلع کردیا تھا۔ میں کل ہی اسلام آباد پہنچا ہوں۔ آپ کے پروگرام کا پتا چلتے ہی پہلی فلائٹ پکڑلی تھی۔"

"اسی حُلئے میں؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں سر!" وہ دھیرے سے ہنسا "یہ حُلیہ جہاز میں بیٹھنے کے لیے نہیں ہے۔ مجھے پورے جہاز کے مسافروں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کرنا تھا۔ اس وقت ہمیں دوسروں کی توجہ سے بچنے کی ضرورت ہے اس لیے ہم گلی کوچوں میں رینگتے ہوئے کیڑے بنے ہوئے ہیں جن کی طرف دیکھتے ہوئے بھی لوگ نہیں دیکھتے۔ یہ اچھا ہی ہوا کہ آپ کی فلائٹ اسلام آباد کی تھی۔ درحقیقت ہم سب ساتھی یہیں جمع ہیں۔"

"کیوں؟ یہاں جمع ہونے کی کیا ضرورت آن پڑی؟" میں نے دریافت کیا۔

وہ موبائل فون کو دوبارہ کشکول میں چُھپاتے ہوئے بولا "آپ کافی عرصے بعد واپس آئے ہیں سر! اس دوران یہاں بہت کچھ ہوچکا ہے۔ بہت سے انقلابات آئے ہیں۔ بہت سے تغیرات رونما ہوئے ہیں۔ آپ آہستہ آہستہ ہی ان کے بارے میں جان سکیں گے اور آپ کے لیے بہتر بھی یہی ہے کہ مرحلہ وار ان باتوں سے واقف ہوں۔"

"اوہ.....!" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ کھڑکی کے شیشے پر سردی کی وجہ سے معمولی سی دُھندلاہٹ پھیلی ہوئی تھی لیکن باہر اب صبح کا اُجالا نظر آنے لگا تھا۔ سڑک کے دونوں طرف صبح کی دھوپ دھیرے دھیرے اپنا کُندنی دامن پھیلانے لگی تھی۔ ماحول کی یخ بستگی کچھ دور ہوتی محسوس ہورہی تھی۔ لیکن میرے اندر جیسے ایک بے عنوان سی یخ بستگی دھیرے دھیرے قدم جمارہی تھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سلیمان بولا "سر! ایک بُری خبر البتہ میں آپ کو ابھی سُنادوں تو بہتر ہوگا....." اس نے یہ کہہ تو دیا لیکن اس سے آگے بولنے کا گویا اس کا حوصلہ نہیں پڑا۔

"کہو..... کہو....." میں نے مسکرانے کی کوشش کی "مجھے معلوم ہے یہاں کچھ اچھی خبریں میری منتظر نہیں ہیں لیکن میں نے ہر خبر سُننے کا حوصلہ اپنے اندر پیدا کرلیا ہے۔ تمہیں جو کچھ کہنا ہے کہہ ڈالو۔ مرحلوں وغیرہ کی پروا مت کرو۔"

"سر! صفدر مرچکا ہے۔ ہمیں افسوس ہے ہم اسے نہیں بچا سکے۔" سلیمان نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا۔

میرے اندر پھیلتی ہوئی یخ بستگی کچھ بڑھ گئی۔ ایک لمحے کے لیے میں شاید پھر قوتِ گویائی سے محروم ہوگیا تھا۔ خاموشی شاید گاڑی کے اندر ہی نہیں پھیلی تھی بلکہ میرے وجود میں بھی اُتر گئی تھی۔

ریڈ ڈاٹ سے میری آخری معرکہ آرائی لاہور میں وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب کے آبائی مکان سے شروع ہوئی تھی جس کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ جان بچانے کے لیے میرا کسی طرف کو نکل جانا اور روپوش ہوجانا ضروری ہوگیا تھا۔ ریڈ ڈاٹ والوں کو کچھ دیر مغالطے میں رکھنے اور مس گائیڈ کرنے کے لیے میں نے صفدر کو اپنی

جگہ لینے کے لیے تیار کیا تھا۔ اس کے قد کاٹھ اور شکل صورت میں میری شباہت تھی۔ انوار نامی ایک بہت اچھے میک اپ مین نے اس پر مزید محنت کرکے اسے بالکل میرا ہم شکل بنادیا تھا۔ میں اسے اپنی جگہ چھوڑ کر میک اپ مین کے گھر سے ہی ایک گوالے کے بہروپ میں نکل گیا تھا لیکن ریڈ ڈاٹ کے لوگوں نے بہت دور تک میرا تعاقب کیا تھا جس سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ میرا یہ بلف کامیاب نہیں رہا تھا۔ میرے خیال میں اس صورت میں تو صفدر کو کوئی گزند نہیں پہنچنی چاہیے تھی۔

سلیمان گویا میرے خیالات کو پڑھتے ہوئے بولا "ریڈ ڈاٹ والوں نے صرف چند لمحوں کے لیے دھوکا کھایا تھا کہ وہ آپ ہیں..... اور وہ چند لمحے صفدر کے لیے موت کا پیغام بن گئے۔ اس پر کسی ایسی گن سے فائر کیا گیا تھا کہ اس کا پورا وجود گویا جل کر کوئلہ ہوگیا تھا۔ ہم نے بڑی مشکل سے اس کی لاش کو بچایا لیکن جب تدفین کے لیے اسے غسل دیا جانے لگا تو لاش بالکل ریت کے بُت کی طرح بکھر گئی۔ بس یوں سمجھیے کہ ہم نے صفدر کی لاش کو نہیں بلکہ سیاہ ریت کی ایک ڈھیری کو دفن کیا۔"

وہ الفاظ نہیں، زہر کی بوندیں تھیں جو میرے لہو میں شامل ہورہی تھیں اور نس نس میں آگ سی لگارہی تھی۔ سلیمان گویا اس زہر کی اذیت کو کچھ کم کرنے کی غرض سے بولا "یہ مت سمجھیے گا کہ ہمارے پاس آپ کو سُنانے کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں ہے۔ اچھی خبریں بھی بہت سی ہیں ہماری قربانیاں ضائع نہیں گئیں۔"

احمد نے اس دوران ٹیکسی کو ایک بار پھر واپس موڑلیا تھا۔ ہم دوبارہ چکلالہ ائرپورٹ کی طرف جانے والی سڑک پر رواں تھے۔ جلد ہی ہم ایک ایسی جگہ جاپہنچے جہاں سڑک سے کافی دور کچے میں خانہ بدوشوں کی ایک بستی نظر آرہی تھی۔ اس سے کچھ اور پیچھے خاصے فاصلے پر غالباً کسی قسم کا تعمیراتی کام جاری تھا۔ بہت سے خیمے لگے نظر آرہے تھے۔ کچھ عارضی سے کمرے بھی تعمیر کیے گئے تھے۔ بھاری مشینری بھی اِدھر اُدھر کھڑی نظر آرہی تھی۔ بلڈوزر، ڈمپر، مکسر اور نہ جانے کیا کچھ تھا۔ کہیں کہیں غالباً کھدائی ہوچکی تھی۔ مٹی کے بہت بڑے بڑے انبار نظر آرہے تھے۔ پانی کے ٹینکر بھی کھڑے تھے۔ لگتا یہی تھا کہ کسی بہت بڑے پراجیکٹ پر کام ہورہا تھا۔ وہاں تک جانے کے لیے عارضی سی ایک نیم پختہ سڑک بھی بنائی گئی تھی جو خانہ بدوشوں کی بستی کے قریب سے ہوکر گزر رہی تھی۔

احمد نے گاڑی اسی سڑک پر موڑلی تھی۔ چند لمحے بعد ہم خانہ بدوشوں کی بستی کے قریب جاپہنچے۔ وہ خانہ بدوشوں کی ویسی ہی ایک بستی تھی جیسی عموماً شہروں کے گردونواح میں کہیں نظر آتی ہیں۔ بوسیدہ اور پیوند زدہ کپڑوں کے خیمے، ٹاٹ اور چٹائیوں کے بے ہنگم چھپر، چھوٹی موٹی جھونپڑیاں، غرضیکہ رہائش کے لیے وہاں کئی طرح کی چیزیں موجود تھیں لیکن سب کی سب انسان کی غربت و افلاس کی قابلِ رحم تصویریں تھیں۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ کروڑوں روپے مالیت کے پُرتعیش محلوں میں نامطمئن رہنے والا اور ہر وقت دولت کی چھین جھپٹ میں مصروف رہنے والا انسان کس کس حال میں زندہ رہ لیتا ہے۔ سروائیو کرجاتا ہے۔

احمد گاڑی کو جھونپڑیوں اور خیموں کے درمیان ہی تنگ اور ٹیڑھے میڑھے راستوں سے گزارتا آخرکار ایک جگہ جارکا تھا جہاں سامنے ہی لکڑی کے ایک بوسیدہ تخت پر چار پانچ مفلوک الحال افراد بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ کسی کے تن پر میلی لنگی اور پیوند زدہ شلوار تھی تو قمیص نہیں تھی، کوئی مختصر دھوتی اور واسکٹ میں تھا، کسی کے تن پر غالباً کسی کی اترن میں ملی ہوئی گھسی پٹی سی پتلون تھی جس میں بیلٹ کی جگہ ازاربند نظر آرہا تھا۔ کوئی کھیلتے وقت اپنے منہ سے مکھیاں اُڑا رہا تھا اور کوئی لمبے لمبے اُلجھے ہوئے بالوں سے بھرا سر کھجا رہا تھا۔

وہ ایک طرح کی بند گلی تھی۔ اس میں ایک طرف گڑھے میں گندا پانی کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی کچھ پھلوں کے چھلکے پڑے تھے جن پر مکھیاں بھنبھنارہی تھیں۔ ایک عورت چولی اور لہنگا پہنے پانی کا ایک کنستر اٹھائے ایک خیمے میں جارہی تھی۔

میں ابھی دُکھ کی دھند سے نہیں نکلا تھا۔ میں خدا کی اس بستی کا غور سے جائزہ تو لے رہا تھا لیکن ابھی تک میرے ذہن میں یہ سوال نہیں اُبھرا تھا کہ احمد اور سلیمان مجھے یہاں کیوں لائے تھے۔ شاید میں لاشعوری طور پر اس احساس سے مطمئن تھا کہ وہ یہاں آئے تھے تو کوئی مقصد تو ضرور رہا ہوگا۔

تاش کھیلتے ہوئے مرد گردنیں گھما کر ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان سب ہی کی آنکھیں چندھی چندھی سی لگ رہی تھیں۔ میرے ذہن پر جمی افسردگی کی دُھند سے کچھ بھولے بسرے مناظر جھانک رہے تھے۔ یہ ماحول، یہ خیمے، یہ بستی، یہ گردوپیش مجھے کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ کچھ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں یہاں پہلے بھی آچکا تھا۔ ان لوگوں کو پہلے بھی دیکھ چکا تھا۔ اس ماحول سے پہلے بھی گزر چکا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ درحقیقت میں اس سے ملتے جلتے ماحول میں اپنی نوجوانی کے کچھ دن گزار چکا تھا۔ اسی طرح خانہ بدوشوں کی ایک بستی ہوا کرتی تھی جس سے کچھ دور چھوٹی سی ایک کنسٹرکشن کمپنی نے ڈیرا ڈالا ہوا تھا۔ وہ کمپنی ایک پُل تعمیر کررہی تھی۔ میں اس کمپنی میں اکاؤنٹنٹ اور کیشئر ہوا کرتا تھا۔ خانہ بدوشوں کی بستی میں لالی رہتی تھی جو کمپنی کے مزدوروں کے ساتھ پتھر توڑتی تھی اور بعد میں ملک کی صفِ اوّل کی اداکارہ ستارہ بنی تھی اور.....! اس کے ساتھ ہی یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا جس میں دل کو گدگدانے والے لمحے بھی مقید تھے اور خون کے آنسو رلانے والے بھی..... میں نے احساس کے تھکے تھکے ہاتھوں سے لاشعور کا یہ دریچہ بند کردیا۔ یہ ایسی یادوں میں اُلجھنے کا وقت نہیں تھا اور نہ

ہی دل اس کے لیے آمادہ تھا۔

لکڑی کے تخت پر موجود افراد میں سے ایک نے اپنے پتّے رکھ دیے اور تخت سے اُتر آیا۔ وہ مختصر دھوتی اور پھٹی ہوئی واسکٹ میں تھا۔ اس کا رنگ گندمی تھا مگر اپنے دوسرے ساتھیوں میں وہ گورا لگ رہا تھا کیونکہ وہ سب سانولے تھے۔ وہ لمبا اور دبلا تھا مگر اس کا جسم ورزشی تھا۔ اس کی پھٹی ہوئی واسکٹ کے بٹن کُھلے تھے۔ دُبلے پتلے جسم میں بھی پٹھے پھڑکتے دکھائی دے رہے تھے۔

سلیمان ٹیکسی سے اتر کر میرے لیے دروازہ کھول کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے اتر کر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ بستی حیرت انگیز طور پر پُرسکون معلوم ہورہی تھی۔ چاروں طرف ایک عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گندمی رنگت والے دُبلے پتلے ادھیڑ عمر شخص نے آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ مضبوط تھا۔ اس کے پتلے پتلے ہونٹوں پر خفیف مگر پُراسرار سی مسکراہٹ تھی۔ اس کی گہری سیاہ آنکھیں اس مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں اور ہر تاثر سے عاری دکھائی دے رہی تھیں۔ اس کے سر پر مختصر سی پگڑی تھی اور کان پر بیڑی اٹکی ہوئی تھی۔ جس انداز سے وہ اٹھ کر آگے بڑھ کر مجھ سے مل رہا تھا اس سے میں یہی سمجھا کہ وہ اس بستی کا سردار یا اسی قسم کی کوئی اور معزز شخصیت ہوگی۔

احمد بھی ٹیکسی سے اتر کر میرے برابر آن کھڑا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوا "سر! آپ ان لوگوں سے ملیں۔ بات چیت کریں‘ گاڑی کی ضرورت ہو تو ان میں سے کسی سے بھی کہہ دیجئے گا۔ گاڑی حاضر کردی جائے گی۔ میں چلتا ہوں۔ میری اسلام آباد ہوٹل پر ڈیوٹی لگی ہوئی ہے۔"

"ڈیوٹی؟ کیسی ڈیوٹی؟" میں نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا تو وہ بڑا پُرانا ٹیکسی ڈرائیور معلوم ہورہا تھا۔

"سر! میں چند غیرملکیوں کی نگرانی کررہا ہوں جو وہاں مقیم ہیں۔" احمد نے جواب دیا۔

"تمہیں اس ڈیوٹی پر کس نے لگایا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سر! آپ یہاں بیٹھیں گے‘ باتیں کریں گے تو آپ کو سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔ میں اب چلتا ہوں۔" اس نے مجھے سیلوٹ کیا اور گاڑی بہ مشکل ریورس کرکے واپس روانہ ہوگیا۔

میرا ہاتھ ابھی تک اس سردار ٹائپ شخصیت کے ہاتھ میں تھا۔ کسی نے اس سے میرا تعارف نہیں کرایا تھا لیکن اس نے مجھے صحیح نام سے مخاطب کیا اور اس وقت مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا جب اس نے روانی سے انگریزی میں کہا "واپسی مبارک ہو مسٹر چودھری! آپ بڑے اچھے وقت پر آئے ہیں۔ ہم آپ کی آمد کے منتظر تھے۔"

"اچھا وقت....؟" میں نے اپنے گردوپیش پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا "کیا یہ سب اچھے وقت کی نشانیاں ہیں مسٹر....؟"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "ہاں مسٹر چودھری! اچھا وقت‘ اچھے ماحول اور اچھی چیزوں کا نام نہیں۔ اچھا وقت وہ ہوتا ہے جب حالات آپ کے حق میں اچھے ہوتے ہیں اور کسی کے آنے کا سب سے اچھا وقت وہ ہوتا ہے جب اس کی ضرورت محسوس کی جارہی ہوتی ہے۔"

وہ میرا ہاتھ تھامے مجھے ایک قریبی خیمے کی طرف لے چلا جو دوسرے خیموں کی نسبت بہتر حالت میں تھا اور بڑا بھی معلوم ہورہا تھا۔ خیمے میں داخل ہونے سے پہلے وہ رک کر مسکراتے ہوئے بولا "یہ بھی اچھا ہوا کہ آپ نے مجھے نہیں پہچانا مسٹر چودھری! یہ بھی میری کامیابی کی ایک چھوٹی سی دلیل ہے۔"

"نہیں اس وقت جبکہ آپ اس بات پر خوش ہورہے ہیں‘ میں نے آپ کو پہچان لیا نفیس صاحب!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

انہوں نے ایک اور ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ وہ اس وقت بہت خوش معلوم ہوتے تھے ورنہ وہ تو دھیما سا بھی قہقہہ لگانے والے آدمی نہیں تھے۔ نفیس صاحب ملک کی سب سے بڑی خفیہ ایجنسی کے سربراہ تھے۔ میں جب ریڈ ڈاٹ کی کہانی لے کر مجبوراً ان کے پاس گیا تھا تو ان کا ردِعمل کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں نے انہیں کوئی فرضی اور محیّر العقل کہانی سُنا کر ان کا قیمتی وقت ضائع کیا ہے۔ ایسی کہانی جو قطعی طور پر میرے تخیل کی پیداوار تھی۔

مجھے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی بقا کی اتنی فکر نہیں تھی لیکن مجھے جب تھوڑا بہت پتا چلا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے ہمارے ملک کو کیا کیا خطرات لاحق تھے تو میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے تھے حالانکہ وہ معلومات مکمل نہیں‘ محض جُزوی تھیں۔ وہ پوری فلم نہیں‘ صرف ٹریلر تھا لیکن اسے دیکھ کر ہی کم از کم ان لوگوں کی تو راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہوسکتا تھا جنہیں ملک سے ذرا سی بھی دلچسپی اور محبت تھی۔

نفیس صاحب نے میری خوب دل شکنی کی تھی اور مجھے مایوس کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی تھی لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری تھی اور انہیں قائل کرنے کی کوششیں جاری رکھی تھیں۔ میں ان کے پاس کافی بڑی سفارش کے ساتھ گیا تھا۔ ان پر کچھ دباؤ بھی تھا۔ آخرکار انہوں نے ملک کی دوسری دو خفیہ ایجنسیوں کے سربراہوں سمیت میرے ساتھ ایک میٹنگ رکھی تھی لیکن نتیجہ اس کا بھی ڈھاک کے تین پات والا ہی رہا تھا۔

تاہم رسمی طور پر انہوں نے دوسری دونوں ایجنسیوں کا بھی تعاون حاصل کرلیا تھا اور اس مقصد کے لیے جو ایک کمیٹی سی بنائی گئی تھی اس کے وہ خود انچارج تھے۔ یعنی رسمی طور پر ریڈ ڈاٹ کے سلسلے میں اگر کچھ کیا جاتا تو اس قسم کی تمام تر کارروائی انہی کی نگرانی میں‘ انہی کی منصوبہ بندی اور احکامات کے تحت ہوتی لیکن افسوس کی بات صرف یہ تھی کہ اس قسم کی کوئی کارروائی شروع ہونے کی نوبت ہی نہیں آسکی تھی۔ عین اس جگہ جہاں وہ "خفیہ" میٹنگ

منعقد ہورہی تھی‘ ایک گاڑی دھماکے سے اُڑ گئی تھی اور ان کا ایک آدمی مارا گیا‘ اس کے باوجود انہیں میری باتوں پر یقین نہیں آیا تھا اور وہ اپنے وسائل کو حرکت میں لاتے دکھائی نہیں دیے تھے۔ کم از کم اس وقت تک تو دکھائی نہیں دیے تھے جب تک میں اسلام آباد اور لاہور میں رہا تھا۔ اگر وہ میرا ساتھ دیتے تو شاید مجھے جان بچانے کے لیے دور دراز علاقوں کی طرف نہ بھاگنا پڑتا۔

مجھے ان کو پہچاننے میں ذرا سی تاخیر اس لیے ہوئی تھی کہ ان میں واقعی سر سے پاؤں تک ان کی اصل شخصیت کی کوئی معمولی سی جھلک بھی موجود نہیں تھی۔ وہ سرخ و سپید آدمی تھے لیکن اس وقت گندمی نظر آرہے تھے۔ ان کی آنکھیں نیلی تھیں لیکن اس وقت سیاہ نظر آرہی تھیں۔ پہلے وہ کلین شیو ہوا کرتے تھے لیکن اس وقت ان کی ڈاڑھی مونچھیں خوب بڑھی ہوئی تھیں۔ چال ڈھال‘ حرکات و سکنات سبھی کچھ بدلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ صرف نام کی حد تک ہی نہیں بلکہ واقعی ہر لحاظ سے ایک نفیس آدمی معلوم ہوتے تھے لیکن اس وقت کچھ ایسی کھردری اور کرخت شخصیت کے مالک نظر آرہے تھے جیسے پیدا ہی اس طبقے اور اس ماحول میں ہوئے ہوں۔

سچی بات تو یہ تھی کہ میں ایسے کسی مقام پر ان کی موجودگی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کیونکہ وہ ایک ایسے اہم شخص تھے جو پس پردہ رہتے ہوئے حکومتوں کو بنانے اور گرانے میں اہم کردار ادا کرسکتے تھے۔ وہ بے شک ایک خفیہ ایجنسی کے سربراہ تھے لیکن ان کی حیثیت ایک بہت بڑے اور نہایت طاقتور بیوروکریٹ ہی کی تھی۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اتنا بڑا بیوروکریٹ جو گھر اور دفتر دونوں جگہ بے پناہ آرام و آسائش کی زندگی گزارنے کا عادی تھا خانہ بدوشوں کی بستی میں ایک خانہ بدوش ہی کے روپ میں موجود ہوسکتا تھا۔ میں یہاں ان کی موجودگی کا تصور نہیں کرسکتا تھا۔ اس لیے بھی مجھے ان کو پہچاننے میں ذرا دیر لگی تھی۔ پھر بھی ان کے انداز سے یہی ظاہر تھا کہ میں نے انہیں ان کی توقع سے پہلے پہچان لیا تھا۔ شاید ان کا خیال تھا کہ میں ان کے انگریزی بولنے کے باوجود انہیں نہیں پہچان سکوں گا۔

"نفیس صاحب! آپ کا میک اپ بہت عمدہ ہے۔" میں نے خیمے میں داخل ہوتے ہوئے انہیں داد دی۔

"میک اپ سے زیادہ اہم وہ رویّہ ہوتا ہے جو آپ کسی شخصیت میں ڈھل جانے کے لیے اختیار کرتے ہیں۔" نفیس صاحب بولے "اگر آپ بوریاں ڈھونے والے مزدور بنے ہوں لیکن آپ کا رویّہ بوریاں ڈھونے والے مزدور جیسا نہ ہو تو میک اپ کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔"

"درست ہے" میں نے تسلیم کیا "اس صورت میں آپ کو میرے ساتھ انگریزی میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

"میرا تمہیں سسپنس میں مبتلا رکھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ میں تمہارے لیے خانہ بدوش نہیں بنا ہوں۔" نفیس صاحب نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

ان کا اس طرح مسکراہٹ اور خوش خلقی کے ساتھ مجھ سے بات کرنا بھی میرے لیے قدرے حیران کُن تھا کیونکہ ان سے میری آخری ملاقات تک ان کے رویّے میں سردمہری‘ رکھائی اور بے اعتباری برقرار تھی لیکن اب کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے ظاہری حلیے میں ہی نہیں‘ ان کے رویّے میں بھی انقلاب آچکا تھا۔

خیمے کے اندر کوئی نہیں تھا لیکن وہ لوگ جو باہر تخت پر بیٹھے نفیس صاحب کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے‘ اُٹھ کر ہمارے پیچھے پیچھے اندر آچکے تھے۔ خیمے میں سازوسامان ایک "اوسط درجے" کے خانہ بدوش سے بہتر تھا۔ قدرے صاف بستر‘ تقریباً صحیح سالم چارپائیاں‘ کھانا پکانے کے لیے مٹی کے تیل کا اسٹوو‘ برتن اور بیٹھنے کے لیے موڑھے وغیرہ موجود تھے۔ سامان اتنا اچھا بھی نہیں تھا کہ کوئی اسے ایک خانہ بدوش کے خیمے میں دیکھ کر شک میں پڑجاتا اور اتنا بُرا بھی نہیں تھا کہ اسے استعمال کرنا ایک مصیبت ہوتی۔

نفیس صاحب نے مجھے ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میرے مقابل بیٹھ گئے۔ ہمارے پیچھے پیچھے آنے والے تینوں افراد بھی خاموشی سے اِدھر اُدھر بیٹھ گئے۔ وہ سب ایک ٹک میری طرف دیکھ رہے تھے۔ گویا میں ان کی نظر میں کسی اور سیارے سے آنے والی مخلوق تھا۔

نفیس صاحب ان میں سے دو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "اگر تم ذرا ذہن پر زور دو تو شاید ان دو حضرات کو بھی پہچان لو۔"

میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور کہا "میں نے ذہن پر زور دیے بغیر ہی پہچان لیا ہے۔ یہ باقری صاحب اور شہریار صاحب ہیں۔"

یہ دونوں حضرات ملک کی باقی دو خفیہ ایجنسیوں کے سربراہ تھے لیکن ان کے حُلیے بھی بلاشبہ اتنی عمدگی سے بدلے ہوئے تھے کہ ان کے قریبی جاننے والے بھی انہیں مشکل سے ہی پہچان سکتے تھے۔ مجھے یاد تھا ان میں سے شہریار صاحب نہایت عمدہ قسم کے سگاروں کے رسیا تھے لیکن اب اس وقت وہ ایک بیڑی کا سرا مٹھی میں دبائے کش لے رہے تھے اور چٹکی بجا کر راکھ جھاڑ رہے تھے۔ ان کے جسم پر پھٹا ہوا کوٹ اور بوسیدہ شلوار تھی اور انہوں نے سر پر ایک میلا چکٹ مفلر باندھ رکھا تھا۔

میری بات سن کر ان دونوں حضرات نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ یوں اثبات میں سر ہلایا جیسے وہ ٹی وی کیمرے کے سامنے موجود کوئی مہمان تھے اور میں نے کمپیئر کے فرائض انجام دیتے ہوئے ان کا تعارف کرایا تھا۔

میں نے ایک چارپائی سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "مجھے خانہ بدوشوں کی اس بستی پر رشک آرہا ہے جس میں اتنے بڑے بڑے

لوگ ان جھلیوں میں موجود ہیں۔ میں تو اس قسم کی صورتِ حال کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔"

نفیس صاحب نے بھی اپنے کان پر سے بیڑی اُتار کر سُلگائی اور گہرا کش لے کر بولے "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ عام خانہ بدوشوں کی بستی نہیں ہے۔ یہ بستی ہم نے ہی بسائی ہے۔ ہم نے ہی اس میں حقیقت کا رنگ بھرا ہے لیکن درحقیقت اس میں کوئی حقیقی خانہ بدوش موجود نہیں۔ یہاں موجود سب لوگ ہماری ایجنسیوں کے آدمی ہیں۔"

"بہت خوب" میں نے سرہلایا "آپ نے اپنی دانست میں بڑی کامیابی سے اس بستی میں حقیقت کا رنگ بھرا ہے۔ بے شک اسے دیکھنے والا کوئی بھی شخص اس پر کسی قسم کا شبہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں اب غور کر رہا ہوں تو مجھے ایک کمی محسوس ہو رہی ہے۔"

نفیس صاحب نے بیڑی کا کش لیتے ہوئے سوالیہ انداز میں بھویں اچکائیں۔ میں نے اپنا تاریک چشمہ اتار کر اس کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا "مجھے اس بستی میں خیموں اور جھونپڑیوں کے سامنے ننگ دھڑنگ مفلوک الحال بچے کھیلتے نظر نہیں آئے جو شور مچاتے ہوئے ہماری ٹیکسی کے پیچھے بھاگتے اور اس کے بمپر وغیرہ پر لٹکنے کی کوشش کرتے۔"

نفیس صاحب نے ایک لمحے کے لیے ذرا زور سے آنکھیں بند کرلیں۔ شاید وہ اپنے سیاہ کونٹیکٹ لینز کی موجودگی کو محسوس کر رہے تھے۔ پھر وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولے "تمہارا مشاہدہ تیز ہے۔ بستی میں گھستے ہی تم نے ایک خامی نوٹ کرلی جسے کوئی اور شاید ہی محسوس کر سکے۔ بہرحال ایسی بات نہیں ہے کہ اس بستی میں بچے موجود ہی نہیں ہیں۔ ہم نے چند بچوں کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔ البتہ اس طرح بے حساب بچے نہیں ہیں جس طرح کسی خانہ بدوش بستی میں ہونے چاہئیں کیونکہ خانہ بدوش ... پلاننگ کے قائل نہیں ہوتے۔"

شہریار صاحب کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے "ویسے اس بستی میں عورتیں بھی کم ہی ہیں۔"

"کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس ویرانے میں یہ بستی بسانے کی آپ کو کیا ضرورت پیش آگئی؟" میں نے دل میں مچلتے ہوئے سوال کو آخر کار زبان پر لاتے ہوئے کہا۔

"یہ ضرورت ہمیں ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے پیش آئی ہے۔" نفیس صاحب نے بلا تامل جواب دیا۔

"ریڈ ڈاٹ؟" میں نے مصنوعی حیرت سے کہا "آپ کے فرمان کے مطابق تو اس قسم کی کسی تنظیم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ محض میرے تخیل کی پیداوار تھی۔ سائنس فکشن تھا۔ آپ اس کے لیے اتنے تردد میں کیونکر پڑ گئے؟"

میں نے ریڈ ڈاٹ کی وجہ سے جو تکلیفیں اٹھائی تھیں وہ تو اپنی جگہ تھیں لیکن نفیس صاحب کے رویے نے مجھے جو اذیت پہنچائی تھی اور ان کی بے اعتنائی کی وجہ سے میرے لیے جتنی دشواریاں پیدا ہوئی تھیں ان کی کچھ نہ کچھ تلخی شاید میرے لہجے میں جھلک آئی تھی لیکن اب تو نفیس صاحب گویا میری تلخی سے بھی لطف اندوز ہو رہے تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

پھر وہ نہایت تحمل اور سنجیدگی سے بولے "ڈیئر افضل چودھری! اس وقت کے اور اب کے حالات میں بہت فرق ہے۔ تمہاری غیر موجودگی میں بہت انقلابات آچکے ہیں۔ اس وقت.... جب تم ریڈ ڈاٹ کی کہانی لے کر ہمارے پاس آئے تھے اس وقت میرا اس سلسلے میں بے اعتباری کا مظاہرہ کرنا اور بظاہر تمہاری بات پر یقین نہ کرنا بھی ہماری حکمتِ عملی کا ایک حصہ تھا۔"

"کیا؟" میں نے بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" نفیس صاحب بدستور سنجیدہ تھے۔

اس دوران نفیس صاحب کے تیسرے ساتھی نے، جو میرے لیے اجنبی تھا، اسٹوو پر چائے تیار کرلی تھی اور نہایت سستے لیکن صاف ستھرے مگوں میں لاکر ہمارے سامنے رکھ دی تھی۔ نہ جانے کیوں اس خیمے کے ماحول میں ان مگوں سے اٹھتی ہوئی چائے کی مہک مجھے بہت بھلی محسوس ہوئی حالانکہ میں چائے وغیرہ کا کچھ ایسا شوقین نہیں تھا۔

نفیس صاحب اپنا مگ اُٹھا کر پُرخیال انداز میں اس میں جھانکتے ہوئے بولے "تم جب ریڈ ڈاٹ کی کہانی لے کر ہمارے پاس آئے تو درحقیقت وہ ہمارے لیے نئی نہیں تھی۔"

یہ میرے لیے ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا۔ وہ مجھے یکے بعد دیگرے حیرت کا نئے سے نیا جھٹکا دینے پر تُلے ہوئے تھے۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے "ہمیں سراغ مل چکا تھا کہ بہت سے غیر ملکی، جن میں اکثریت سفید فاموں کی تھی، نہ جانے کس کس حیثیت کی آڑ میں ہمارے ملک میں کچھ عجیب و غریب اور پُراسرار قسم کی سرگرمیوں میں مصروف تھے جنہوں نے اسپائی سرگرمیوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا لیکن ہمارے پاس کوئی ٹھوس تفصیلات نہیں تھیں۔ پہلی بار ہمارے پاس کچھ تفصیلات تم لے کر آئے تھے۔"

"جنہیں آپ نے جھٹلا دیا تھا۔" میں نے کہا۔

"ہم نے تمہاری ہی بھلائی کی خاطر ایسا کیا تھا۔" نفیس صاحب تحمل سے بولے۔

"میری بھلائی کی خاطر؟" میں نے ایک بار پھر بے یقینی سے ان کی طرف دیکھا۔

"ہاں، تمہارے ساتھ میٹنگ سے پہلے ہمیں یہ نہیں معلوم تھا کہ ان لوگوں کی باقاعدہ کوئی تنظیم ہے جس کا نام ریڈ ڈاٹ ہے اور جس نے دنیا کی تمام مافیاؤں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ان کے مقاصد اتنے اونچے ہیں اور وہ سائنسی طور پر اتنے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ یہ باتیں ہمیں پہلی بار تم سے ہی معلوم ہوئی تھیں کیونکہ تم اتفاق سے اور ان کی نظرِ عنایت سے ان کے انتہائی خفیہ ٹھکانوں کی سیر کر

آئے تھے لیکن افسوس کہ تم ان تک ہماری رہنمائی نہیں کر سکتے تھے۔"

"اگر میں دوبارہ ان ٹھکانوں تک پہنچنے کے قابل ہوتا تو میں خود ہی اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان سے نمٹنے کی اپنی سی کوئی تدبیر کرتا۔" میرے لہجے میں اب بھی غیر ارادی طور پر ہلکی سی تلخی تھی "میں آپ کے پاس اسی لیے تو دوڑا دوڑا آیا تھا اور آپ تک اسی لیے اتنی بڑی سفارش کے ساتھ اپروچ کیا تھا کہ آپ اتنی بڑی طاقت کے مالک ہیں، آپ کے پاس اتنے وسائل ہیں، آپ ان کا پتا چلائیں اور ان سے نمٹنے کی کوئی تدبیر کریں۔ یہ ملک و قوم کی سلامتی اور تحفظ کا مسئلہ تھا۔"

"درست ہے، ہم تمہارے اس جذبے کے ہمیشہ قدر دان رہیں گے۔ تم نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر ان لوگوں کی ہدایات کی خلاف ورزی کی تھی اور ہم سے رابطہ کرلیا تھا حالانکہ انہوں نے تمہیں بہت سختی سے اس قسم کی کسی کوشش سے منع کیا تھا۔" نفیس صاحب بولے۔

"میں بڑی اُمیدیں لے کر آپ کے پاس آیا تھا۔" میرے لہجے میں اب بھی کرب تھا۔

"ہمیں خوب اچھی طرح اندازہ ہے۔" نفیس صاحب نے تفہیمی انداز میں سرہلایا۔ "ہمیں یہ بھی اندازہ ہے کہ ہمارے رویے سے تمہارے دل پر کیا گزری ہوگی۔ تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو اتنی ہی حب الوطنی کو کافی سمجھ کر اس قسم کی کوششوں سے ہاتھ کھینچ لیتا اور اپنی جان کی فکر کرتا یا ہاتھ باندھ کر دوبارہ ریڈ ڈاٹ کے سامنے حاضر ہوجاتا اور انہوں نے جو پیشکشیں کی تھیں، جو لالچ دیے تھے، انہیں قبول کرلیتا۔ لوگ اس سے کہیں کم قیمتوں پر ملک دشمنوں کے ہاتھوں بک جاتے ہیں۔"

"اس کے باوجود آپ نے میرا ساتھ نہیں دیا۔ میں ابھی تک آپ کی اس مصلحت کو نہیں سمجھ سکا۔" میں نے کہا۔

"میں اسی طرف آنے کی کوشش کر رہا ہوں۔" انہوں نے چائے کی چسکی لی پھر گویا بیڑی کے کش سے خوب لطف اندوز ہوتے ہوئے بولے "یہ مسئلہ بہت اُلجھا ہوا تھا۔ ہم مسائل کو اس طرح نہیں دیکھ رہے تھے جس طرح تم دیکھ رہے تھے۔ ایک مسئلہ یہ تھا کہ ریڈ ڈاٹ والے خود تو بے حد منظم، طاقتور اور آنے والے زمانوں کی سائنسی ایجادات سے لیس تھے ہی.... لیکن ہمارے بھی نہ جانے کس کس محکمے میں کس کس شخص کو انہوں نے اس طرح خرید لیا تھا کہ اسے خود بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کس کے لیے کام کر رہا ہے اور جو خدمات وہ انجام دے رہا ہے وہ اس ملک و قوم کے لیے کتنی خطرناک ثابت ہوں گی۔"

"درست ہے" میں نے تسلیم کیا "ایسے دو چار افراد مختلف اتفاقات کے تحت مجھ سے بھی ٹکرائے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی زندہ نہیں بچا۔ کسی نہ کسی انداز میں وہ موت کا شکار ہوگیا۔"

"ہمارے ساتھ بھی یہی ہوا۔ نہایت خاموشی اور رازداری سے ہم نے کچھ لوگوں پر ہاتھ ڈالا لیکن وہ سب کے سب پُراسرار انداز میں مرگئے۔ بعض کے بارے میں تو یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل تھا کہ انہیں ہلاک کیا گیا تھا یا انہوں نے خودکشی کی تھی۔" نفیس صاحب یہ کہتے ہوئے ایک لمحے کے لیے متاسف نظر آنے لگے "ان میں ہمارے کئی بہت ہی محترم، بہت ہی قابلِ اعتبار اور ہماری دانست میں نہایت بے داغ ماضی رکھنے والے لوگ شامل تھے۔"

انہوں نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا پھر گہری سانس لے کر بولے "اس کے بعد ہمارے لیے یہ کہنا مشکل ہوگیا تھا کہ ہمارے دائیں یا بائیں ہاتھ پر جو شخص بیٹھا ہے وہ سو فیصد اور خالصتاً ہمارا اور اس ملک کا وفادار ہے۔ بِکا ہوا نہیں ہے۔ اس صورتِ حال نے ہمیں مفلوج کرکے رکھ دیا تھا۔ ہم کوئی بھی قدم اعتماد سے نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹا کام کرتے وقت بھی ہمیں یقین نہیں ہوتا تھا کہ ہم اسے پورا کرنے میں کامیاب ہوسکیں گے۔ اسی لیے ہم نے بظاہر تمہاری بات پر بالکل یقین نہیں کیا اور تم سے کوئی وعدہ تک نہیں کیا کہ ہم اس سلسلے میں کوئی رسمی کارروائی بھی کریں گے۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ اگر یہ بات ذرا بھی لیک آؤٹ ہوگئی کہ تمہیں ہمارا تعاون حاصل ہوچکا ہے تو تمہیں فوراً ہلاک کردیا جائے گا۔ ریڈ ڈاٹ اپنی ساری توجہ اسی بات پر مرکوز کردے گی۔ ہم نے اپنی دانست میں تمہارے لیے خطرات کم کرنے کی کوشش کی تھی اور اندر ہی اندر اس مہم کے سلسلے میں کام شروع کردیا تھا۔ سب سے پہلا ضروری کام تو یہ تھا کہ ہم نے اپنے ان خاص خاص ساتھیوں کا انتخاب شروع کیا جنہوں نے اپنے عمل سے ثابت کردیا تھا کہ وہ اپنے اپنے محکمے اور اس ملک کے ساتھ اتنے مخلص ہیں کہ وقت پڑنے پر اس کے لیے جان بھی دے سکتے ہیں۔"

"آپ کی اس عظیم الشان احتیاطی تدبیر کا مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ مجھے تو پھر بھی ان کے قہر و غضب کا نشانہ بننا پڑا اور پھر جان بچانے کے لیے بڑی تدبیروں کے ساتھ یہاں سے بہت دور جانا پڑا۔ روپوش ہونا پڑا۔" میں نے کہا۔

"خیر ہمیں یہ توقع نہیں تھی کہ تم اچانک اس طرح بھاگ نکلو گے اور غائب ہوجاؤ گے۔ ہم تمہاری حفاظت کے کچھ ایسے منصوبوں پر غور کر رہے تھے جن سے ہمارا یا حکومت کا کوئی تعلق نظر نہ آتا لیکن اسی دوران ریڈ ڈاٹ کھل کر تم پر حملہ آور ہوگئی۔ اس کے کچھ ہرکارے کھل کر سامنے آگئے۔ وزیرِ خارجہ حفیظ صاحب کے آبائی مکان پر لاہور میں تمہارا ان لوگوں سے جو معرکہ رہا اس میں تمہارا بچ نکلنا ایک معجزہ ہی تھا۔"

"بے گناہی کی بھی اپنی ایک طاقت ہوتی ہے۔ شاید وہی میرے کام آگئی۔" میں نے کہا "طاقتوروں کے لیے ہر بے گناہ کو یونہی محض اپنی حکم عدولی کی بنا پر ہلاک کرنا اتنا آسان ہوتا تو آج

دنیا کی آبادی بہت کم ہوتی اور قدم قدم پر ایک فرعون کا راج ہوتا۔"

"بے شک" نفیس صاحب نے سرہلایا "بہرحال ہم وہاں کے حالات سے بے خبر نہیں تھے۔ لاہور میں جو کچھ ہوا اس کی رپورٹ ہمیں فوراً ملی اور ہمارے آدمی ذرا تاخیر سے سہی' لیکن حرکت میں آگئے۔ ان واقعات کا ایک فائدہ ہوا کہ ہمیں پہلی بار صحیح معنوں میں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ کارآمد سراغ ملے اور ہم ان پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوئے۔"

"کیا؟" میں تقریباً اُچھل پڑا "آپ نے ریڈ ڈاٹ پر ہاتھ ڈال دیا؟"

"ہاں" نفیس صاحب نے خاصی طمانیت سے اثبات میں سر ہلایا "نہ صرف ہاتھ ڈال دیا بلکہ ہم نے ان کی کمر بھی توڑ دی ہے۔ اب وہ پہلے جیسی طاقتور تنظیم کے طور پر تو باقی نہیں رہی اور نہ ہی اس کے وہ بڑے بڑے منصوبے باقی رہے ہیں جن کے ذریعے وہ ہمارے ملک کو ایک تماشا گاہ اور تجربہ گاہ بنانے کی تیاریاں کر رہی تھی۔ اس کا زیادہ تر کریڈٹ تمہارے ساتھیوں..... خصوصاً اس لڑکی کو جاتا ہے جس کا نام راحیلہ ہے۔"

راحیلہ..... ! میرے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ میں نے جب اسلام آباد انٹرنیشنل ائرپورٹ پر قدم رکھا تھا تب سے میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا لیکن اس کا کوئی ذکر ہی نہیں آیا تھا۔ اس کے بارے میں مجھے ابھی تک کچھ معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا۔

نفیس صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے "مجھے تمہارے ساتھیوں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ احمد' سلیمان' منیر' مسعود' ٹونی' شبیر شیخ' حنیف خان' شفیع شاہ اور سردار علی وغیرہ کے بارے میں سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔ وہ تمہارے کاروباری ساتھی ہیں لیکن عام سے کاروباری آدمی نہیں ہیں۔ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ جاتے وقت تم راحیلہ کو انچارج بنا گئے تھے۔ اس نے سرداری کا حق ادا کر دیا۔ وہ بڑے ہی کمال کی چیز ہے۔"

"وہ ہے کہاں؟" میں نے بظاہر پُرسکون لہجے میں پوچھا۔ میں اپنے لہجے کے اضطراب کو چھپانے میں بہ مشکل کامیاب ہوا تھا۔

"تمہارے سب ساتھی یہیں اسلام آباد میں موجود ہیں۔ کافی عرصے سے وہ ایک طرح سے ہمارے ہی محکمے کے آدمیوں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہاں..... اسی بستی میں خانہ بدوشوں کے روپ میں موجود ہیں اور کچھ مختلف مقامات پر' مختلف بہروپوں میں' مختلف ڈیوٹیاں سرانجام دے رہے ہیں۔"

یہ سُن کر میرے دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ سلیمان کو ایک بازو سے محروم دیکھ کر اور صفدر کی موت کی خبر سُن کر میرے دل پر جو گھاؤ سا پڑا تھا اس کی اذیت میں ذرا کمی ہوئی ورنہ مجھے تو اپنے باقی ساتھیوں کے بارے میں بھی تشویش ہو چلی تھی۔

نفیس صاحب بولے "ریڈ ڈاٹ جیسی خطرناک طاقت سے ٹکراؤ میں تمہارے صرف ایک ساتھی کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے لیکن یہ ان لوگوں کے ہمارے ساتھ آملنے سے پہلے کی بات ہے۔ جب سے انہوں نے ہمارے ساتھ مل کر کام شروع کیا ہے' ان میں سے کسی کو کوئی خاص گزند نہیں پہنچی البتہ مختلف خطرناک کارروائیوں میں ہمارے کئی آدمی کام آچکے ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تمہارے آدمیوں نے ہمارے آدمیوں سے زیادہ باصلاحیت' معاملہ فہم اور ذہین ہونے کا ثبوت دیا۔ خصوصاً اس لڑکی کی صلاحیتیں دیکھ کر تو یقین نہیں آتا کہ وہ واقعی لڑکی ہے۔"

"اب صورتِ حال کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"صورتِ حال اب بھی کچھ عجیب ہی ہے۔" نفیس صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے "ریڈ ڈاٹ کچھ اس انداز میں ہمارے ملک میں بکھری ہوئی تھی اور اس کے زرخرید لوگ کچھ اس طرح مختلف محکموں میں سرایت کر چکے تھے کہ کسی ایک آپریشن کے ذریعے اس کا خاتمہ ممکن نہیں تھا۔ تعداد میں وہ سب لوگ مجموعی طور پر شاید چند ہزار سے زیادہ نہ ہوں لیکن ان کے پاس جیسی جیسی سائنسی ایجادات موجود تھیں ان کو دیکھتے ہوئے اندیشہ تھا کہ کسی براہ راست اور فیصلہ کُن تصادم میں وہ لوگ چند منٹ میں خدانخواستہ ہمارے ملک کو کھنڈر بنا سکتے تھے۔"

"اس خطرے سے تو میں بھی آپ کو آگاہ کر چکا تھا۔" میں نے یاد دلایا۔

"درست ہے لیکن اس کا صحیح اندازہ ہمیں کچھ چیزیں ہاتھ آنے کے بعد ہوا۔" نفیس صاحب بولے "ان کے اصل اور بڑے ٹھکانے ہمارے تین شہروں میں تھے۔ کراچی' لاہور اور اسلام آباد ..... لاہور میں تو باقاعدہ ان کی ایک زیرِ زمین دنیا آباد تھی۔ ایک الف لیلوی اور طلسماتی سی دنیا۔ جس کی تم سیر کر چکے تھے۔"

"کیا آپ اس زیرِ زمین دنیا تک پہنچ گئے؟" میں نے ان کی بات کاٹتے ہوئے بے تابی سے پوچھا۔

"ہاں" انہوں نے اثبات میں سرہلایا "یہی تو وہ سب سے بڑا کارنامہ تھا جو ہم تمہارے ساتھیوں اور خصوصاً اس لڑکی راحیلہ کی وجہ سے انجام دے سکے۔" پھر جیسے انہیں کچھ یاد آیا "ہاں ایک اور لڑکی نے اس ضمن میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ وہ انہی کے کیمپ کی لڑکی تھی لیکن اس نے گویا ان سے غداری کرتے ہوئے ہمارا ساتھ دیا۔ اگر وہ ہماری مدد نہ کرتی تو شاید ہمارا ریڈ ڈاٹ کی لاہور والی زیرِ زمین دنیا تک پہنچنا تقریباً ناممکن ہوتا اور اس پر قبضہ کرنے کے سلسلے میں تو بہت ہی خون ریزی ہوتی۔ نہ جانے کتنی جانیں ضائع ہوتیں۔ اس کی مدد اور راحیلہ کی کمانڈو کارروائیوں کی وجہ سے یہ کام آسان ہوا اور زیادہ جانی نقصان نہیں ہونے پایا۔ ان واقعات کی تفصیل تمہیں راحیلہ سے معلوم ہو جائے گی۔"

وہ جھرجھری سی لیتے ہوئے بولے "اب سوچتا ہوں تو واقعی ایسا لگتا ہے جیسے وہ سائنس فکشن پر مبنی کوئی خواب تھا جس سے ہم سب گزر رہے تھے۔ ہر لمحے یہی محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی آنکھ کھل

جائے گی اور سب کچھ غائب ہو جائے گا' جھوٹا ثابت ہوگا۔"

"وہ لڑکی کون تھی جس نے ان کے کیمپ میں ہوتے ہوئے آپ کی مدد کی؟" میں نے پوچھا "مجھے تو یہ ناممکن سی بات لگ رہی ہے۔"

"ایک لحاظ سے تم صحیح کہہ رہے ہو۔" نفیس صاحب نے تسلیم کیا۔ "ان کے کیمپ کا کوئی شخص تو غداری کا تصور نہیں کر سکتا لیکن وہ لڑکی دراصل بنیادی طور پر ان کی ساتھی نہیں تھی یعنی سفید فام نہیں تھی۔ وہ یہیں کی تھی۔ تم اسے جانتے ہو۔ وہ بھی تمہیں بہت اچھی طرح جانتی ہے۔ بلکہ شاید وہ تمہاری عقیدت مند ہے۔ کسی زمانے میں وہ پرنس تہمینہ کے نام سے انٹرکان میں ڈانس کیا کرتی تھی۔"

"اوہ!" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ درحقیقت ہنی کا ذکر کر رہے تھے جسے ریڈ ڈاٹ والوں نے برین واش کے ذریعے اپنے اشاروں پر ناچنے والی کٹھ پُتلی بنایا ہوا تھا لیکن ان کے سائنسی تجربات کے دوران شاید اس کے ذہن کے کچھ خلیے ان کی پسند کے سانچوں میں ڈھلنے سے بچ گئے تھے اس لیے اس نے پرنس تہمینہ کے روپ میں بھی میری مدد کی تھی جس کی وجہ سے وہ ریڈ ڈاٹ کے زیرِ عتاب آگئی تھی اور انہوں نے اسے غائب کر دیا تھا۔ اس کے بعد نہ جانے کس طرح اس نے ریڈ ڈاٹ کے خلاف آپریشن میں نفیس صاحب کے اور میرے ساتھیوں کی مدد کر ڈالی تھی۔ خیر یہ تفصیلات تو میں بعد میں معلوم کر سکتا تھا۔ فی الحال تو میں مختصراً سب کچھ جاننا چاہتا تھا۔

"میں سمجھ گیا آپ کس کا ذکر کر رہے ہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "بہرحال آپ لاہور والی زیرِ زمین دنیا تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے؟"

"ہاں" نفیس صاحب نے اثبات میں سرہلایا اور واسکٹ کی جیب سے ایک اور بیڑی نکال کر سُلگائی "وہ زیرِ زمین دنیا تباہ ہو چکی ہے۔ کچھ ہمارے ہاتھوں تباہ ہوئی' کچھ انہوں نے خود تباہ کر دی تاکہ چیزیں ہمارے ہاتھ نہ لگنے پائیں۔ اس کے باوجود بہت سی چیزیں ہمارے ہاتھ لگیں۔ بہت کچھ معلوم ہوا۔ بہت سے افراد ان کے بھی مارے گئے۔ اس کے بعد ہی ہمیں پتا چلا کہ کراچی میں ان کی اس قسم کی کوئی زیرِ زمین دنیا موجود نہیں ہے لیکن وہاں بہت سے اہم افراد موجود ہیں جو اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں۔ ابھی ہم انہیں تلاش نہیں کر سکے۔ ان تک نہیں پہنچ سکے۔ ہمیں پہلے اسلام آباد کی طرف توجہ دینی پڑی کیونکہ یہاں ان کی دوسری زیرِ زمین دنیا موجود ہے۔"

مجھے یاد آیا کہ ایک بار مجھے اسلام آباد کے نواحی علاقے سے اغوا کیا گیا تھا اور میری آنکھ ایک عجیب الف لیلوی اور طلسماتی سے ماحول میں کھلی تھی۔

نفیس صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے "درحقیقت ان کے یہاں والے ٹھکانے کی حیثیت وہی تھی جو انسانی جسم میں دماغ کی ہوتی ہے۔ سب کچھ یہیں سے کنٹرول ہوتا تھا۔ اہم احکامات یہیں سے جاری ہوتے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ شاید اب یہاں زیادہ افراد موجود نہ ہوں لیکن ان کے نیٹ ورک کو کنٹرول کرنے والے آلات... کوئی بہت بڑا کمپیوٹرائزڈ نظام اور کچھ بہت تباہ کُن قسم کی سائنسی ایجادات یہیں موجود ہیں جو محض کوئی ایک بٹن دبائے جانے کی منتظر ہیں جس کے بعد خوف ناک تباہی ہمارا مقدر ہو سکتی ہے۔"

"اب آپ اس زیرِ زمین دنیا کی تلاش میں یہاں پڑے ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہمیں لاہور میں کچھ انتہائی جدید کمپیوٹروں کے تیار کردہ نقشے اور دیگر تفصیلات وغیرہ ملی تھیں جن میں سے بیشتر ہمارے لیے ناقابلِ فہم تھیں۔ بہرحال ہمارے کئی شعبوں کے ماہرین نے ان پر سر کھپایا۔ کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی وہ زیرِ زمین دنیا اس علاقے میں آٹھ دس میل کے قطر میں کہیں موجود ہے۔ ہم کئی ایسے طریقوں سے.... کہ کسی کو شک نہ ہونے پائے اس علاقے کو کھنگال چکے ہیں۔ حسّاس آلات کے ذریعے کمپیوٹروں کے ذریعے گاڑیوں کے ذریعے جہازوں اور ہیلی کاپٹروں کے ذریعے چپّے چپّے کا جائزہ لے چکے ہیں لیکن ہمیں کسی زیرِ زمین دنیا کا سراغ نہیں ملا لیکن جو چیزیں ہمیں ملی تھیں ان کی مدد سے بہرحال ایک سمت کا تعین کرکے ہم کام کررہے ہیں۔ دیکھتے ہیں کہ کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔"

"مجھے تو یہاں کوئی کام ہوتا نظر نہیں آرہا۔" میں نے کہا۔

"کام یہاں نہیں ہورہا۔ تم نے شاید دیکھا ہو یہاں سے چند فرلانگ دور کنسٹرکشن کے لیے کیمپ لگے ہوئے ہیں۔ کھدائی وغیرہ ہورہی ہے' آج تو خیر چھٹی کا دن ہے۔ وہاں بھی تمہیں کام ہوتا نظر نہیں آرہا ہوگا۔ ہوا اصل میں یہ ہے کہ ہماری خوش قسمتی سے یہاں کچھ عرصہ پہلے ایک بہت بڑی واٹر سپلائی اسکیم پر کام شروع ہوا تھا۔ قریب ہی ایک جھیل واقع ہے۔ ہم جب ریڈ ڈاٹ کے چکر میں اس طرف متوجہ ہوئے تو ہم نے ترکیب یہ کی کہ رفتہ رفتہ کنسٹرکشن کمپنی کے تمام ملازمین کو ایک ایک کرکے ایک اور جگہ بھجوادیا گیا جہاں وہ ایک اور ٹھیکے پر کام کررہے ہیں۔ ان کے تمام بورڈ' مشینری وغیرہ اسی طرح یہاں موجود رہی۔ راتوں رات نہایت خاموشی سے صرف افراد تبدیل ہوتے رہے۔ کمپنی کے آدمیوں کی جگہ فورسز کے آدمیوں نے لے لی اور اسی دوران ہم نے یہاں یہ خانہ بدوشوں والی بستی تخلیق کر ڈالی۔ بظاہر ہم کہیں سے بیل گاڑیوں اور گدھوں پر سفر کرتے ہوئے یہاں آئے تھے اور یہ جگہ خالی دیکھ کر یہاں ڈیرے ڈال لئے تھے۔"

وہ کش لینے کو ایک لمحے کے لیے خاموش ہوئے تو میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "تدبیریں تو اچھی ہیں بشرطیکہ کامیاب ہوں۔"

نفیس صاحب بولے "اب صورتِ حال یہ ہے کہ بظاہر وہاں واٹر سپلائی اسکیم کا کام جاری ہے لیکن ساتھ ہی مخالف سمت میں ایک بڑی سرنگ بھی کھودی جارہی ہے۔ ہمیں شبہ ہے کہ شاید ریڈ ڈاٹ والوں نے اپنے زیرِ زمین قلعے کو اوپر سے سیل کردیا ہو۔ سطحِ زمین پر بظاہر اس کی موجودگی کا کوئی نشان نہ ہو۔ ممکن ہے وہاں کوئی ذی روح بھی موجود نہ ہو لیکن تباہ کن چیزیں موجود ہوں جنہیں کہیں اور سے کنٹرول کیا جاسکتا ہو۔ اس لیے ہم نہایت خاموشی اور رازداری سے وہاں تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی بعید نہیں ہے کہ زیرِ زمین قلعہ یہاں موجود ہو لیکن آمد ورفت کا راستہ انھوں نے کہیں بہت دور کھود نکالا ہو کیونکہ ہماری حکومتوں کی بے پروائی یا سیاسی مصلحتوں اور مجبوریوں کی وجہ سے دو تین مغربی ملکوں کے لوگ یہاں مختلف مقاصد کے تحت سروے وغیرہ کی آڑ میں بہت عرصہ ڈیرے ڈالے بیٹھے رہے ہیں۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ اس دوران وہ کیا کرتے رہے ہوں۔"

وہ خاموش ہوئے تو میں نے کہا "اب آپ لوگ غالباً مزدوری وغیرہ کے بہانے واٹر سپلائی اسکیم پر کام کرتے ہوں گے اور فورسز کے آدمیوں کے ساتھ کام کی نگرانی کرتے ہوں گے۔ آپ لوگ اچانک پیش آنے والی کسی بھی غیر متوقع صورتِ حال کے لیے تیار رہتے ہیں؟"

"ہاں' اپنے وسائل کے مطابق تو تیار رہتے ہیں۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔

اچانک سانولا سا ایک شخص اپنی پیوند زدہ قمیص کی آستین سے ناک پونچھتا ہوا خیمے میں داخل ہوا اور مؤدبانہ لہجے میں بولا "سر! میڈم آئی ہیں۔"

سب لوگ احتراماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دوسرے ہی لمحے ایک برقع پوش عورت خیمے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر پورا نقاب تھا لیکن خیمے میں داخل ہوتے وقت اس نے نقاب اُلٹ دیا۔

میں حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کا آدھا چہرہ بالکل سیاہ اور آدھا سرخ و سپید تھا۔ اور وہ بھی عمودی انداز میں۔ یعنی پیشانی کے درمیان سے لے کر نرخرے کے درمیان تک۔

اگر اس کا چہرہ افقی انداز میں' یعنی ایک کان کی لو سے لے کر دوسرے کان کی لو تک سیاہ ہوتا تو اسے بڑی آسانی سے آدھے نقاب میں چھپایا جاسکتا تھا لیکن وہ اوپر سے نیچے تک سیاہ تھا اور رنگوں کی اس تقسیم میں اتنی صفائی تھی گویا کسی مصور نے تصویر بنا کر باقاعدہ اسکیل رکھ کر تصویر کے آدھے چہرے میں سیاہ رنگ بھر دیا ہو۔

میں بھی غیر ارادی طور پر اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں اسے مخاطب کرنا چاہتا تھا' کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میری زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔

وہ راحیلہ تھی!

اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ بھی گویا اپنی جگہ بُت بن کر رہ گئی۔ ایک لمحے کے لیے خیمے کا ماحول گویا ساکت ہو کر رہ گیا۔ آخر کار راحیلہ نے ہی یہ سکوت توڑا "اپی... تم...!"

تب میں نے تھوک نگلتے ہوئے بہ مشکل کہا "یہ کیسا بے ہودہ قسم کا میک اپ ہے۔ آدھا چہرہ سیاہ' وہ بھی اوپر سے نیچے کی طرف۔"

خیمے میں دوبارہ سکوت چھا گیا۔ آخر راحیلہ نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور سر جھکاتے ہوئے آہستگی سے بولی "یہ میک اپ نہیں ہے۔"

میں نے حیرانی سے کہا "تو پھر یہ کیا ہے؟"

راحیلہ نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ بظاہر اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی لیکن اس کی آنکھوں میں خفیف سی اُداسی تیر رہی تھی۔ وہ بے پروائی سے بولی "شاید یہ قسمت کا لکھا ہے.... یا پھر شاید کچھ بھی نہیں ہے۔ تم اس کی فکر میں مت اُلجھو۔ اپنی سناؤ' تم ٹھیک تو ہونا؟ تم اچانک ہی بھاگے تھے۔ تمہیں زیادہ مصائب کا سامنا تو نہیں کرنا پڑا؟"

"میرے مصائب کو گولی مارو۔" میں نے تیزی سے کہا اور اٹھ کر اس کے سامنے جاکھڑا ہوا "میں اپنے مصائب کو بھول چکا ہوں۔ تم مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔ تم نے یہ اپنا چہرہ آدھا سیاہ آدھا سفید کیوں کررکھا ہے؟ اس میں کیا مصلحت ہے؟"

"یہ میں نے نہیں' کسی اور نے کیا ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

میں نے نفیس صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش رہے۔ ان کا چہرہ سپاٹ تھا۔ راحیلہ جلدی سے بولی "ان کی طرف مت دیکھو۔ یہ ان کا کام نہیں ہے۔ میں بتا تو چکی ہوں کہ یہ میک اَپ نہیں ہے۔"

"تو پھر یہ کس کا کام ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"بات ذرا لمبی ہے۔ آرام سے بیٹھ کر کریں گے۔ اتنی جلدی کیا ہے۔ تم اب دوبارہ بھاگنے کی تیاری تو نہیں کررہے؟" وہ اپنے لہجے میں پرانی شگفتگی لانے کی پوری کوشش کررہی تھی۔

"نہیں۔ میں اب ہرگز نہیں بھاگوں گا۔ خواہ جان ہی چلی جائے۔" میرا لہجہ غیر ارادی طور پر ہی فیصلہ کن ہوگیا "میرا خیال ہے میں نے پہلی مرتبہ ہی بھاگ کر غلطی کی تھی۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"نہیں۔ وہ بھگدڑ میں کیا گیا فیصلہ ٹھیک ہی تھا۔ اچھا ہوا تم پیش منظر سے ہٹ گئے ورنہ شاید حالات اور زیادہ خراب ہوتے۔ اب حالات بہت مختلف ہیں۔ اب تم آگئے ہو' یہ بہت اچھا ہوا ہے۔"

"خیر یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ تم اپنے چہرے سے یہ سیاہی صاف کیوں نہیں کردیتیں؟" میں نے کہا۔

"اگر ہوسکتی تو ضرور کردیتی۔" وہ مسکرائی۔

"کیا مطلب؟" میں نے بدستور ایک بے عنوان سا اضطراب محسوس کرتے ہوئے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ بدنامی کی کالک سے بھی زیادہ پکی سیاہی ہے۔ بدنامی کی کالک بھی وقت کے ساتھ ساتھ دور ہوجاتی ہے لیکن یہ کسی طرح نہیں اُتر سکتی۔"

وہ مسکرا کر گویا بات کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کررہی تھی لیکن میرے دل میں سناٹا پھیلتا چلا گیا۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کا چہرہ جو ایک منفرد حُسن کا حامل تھا' جو دیکھنے والوں کو ایک لمحے کے لیے مبہوت سا کردیتا تھا۔ اس وقت محض اس ایک تبدیلی سے نہایت مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ دیکھنے والے کو شاید یہی گماں گزرتا کہ وہ کسی قسم کا مذاق کررہی تھی جس طرح بعض بچے یا بڑے دوسروں کو ڈرانے کے لیے چہروں پر بھیانک ماسک لگالیتے ہیں۔ یہ خیال کسے آسکتا تھا کہ وہ کسی کے ساتھ مذاق نہیں کررہی تھی تقدیر خود اس کے ساتھ مذاق کررہی تھی۔

"تم مجھے بتاؤ تو سہی آخر یہ کس طرح ہوا ہے؟" میں نے پھنسی پھنسی سی آواز میں پوچھا۔

"یہ سب کچھ صحیح طور پر بتانے کے لیے خاصا وقت چاہیے۔ دوچار جملوں میں بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔" وہ یوں تحمل سے بولی گویا کسی ننھے بچے کو کسی ضد سے باز رکھنے کی کوشش کررہی ہو۔

"میں اتنا مصروف آدمی نہیں ہوں کہ تمہارے بارے میں کوئی اہم بات نہ سن سکوں۔ میں جب مصروف تھا تب بھی کم از کم تمہارے سامنے تو میری مصروفیات کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔" وہ خوش دلی سے مسکرائی "میں تو درحقیقت یہ چاہ رہی تھی کہ پہلے نفیس صاحب سے وہ ضروری بات کرلوں جس کے لیے میں یہاں آئی تھی۔ باقی باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ اس وقت تمہیں یہاں دیکھ کر مجھے زندگی کا ایک بڑا سرپرائز ملا ہے۔"

"کیا تمہیں میری آمد کی اطلاع نہیں تھی؟" میں نے پوچھا۔ اس نے نفی میں سرہلایا۔

"دوسرے ساتھیوں کو تھی۔" میں نے اسے بتادیا۔

"مجھے کسی نے نہیں بتایا۔" اس کے لہجے میں شکوہ نہیں تھا [illegible]

"حالات خواہ کچھ بھی ہوں' یہ لوگ سسپنس پیدا کرنے کی کوشش سے باز نہیں آتے۔"

پھر وہ نفیس صاحب کی طرف مُڑی اور گہری سنجیدگی سے بولی "سر! میں آپ سے ہنی کے بارے میں بات کرنے آئی تھی۔ کیا واقعی اسے امریکا یا کینیڈا لے جانا ممکن نہیں ہے؟ میں نے سنا ہے وہاں اس نوعیت کا آپریشن ممکن ہے۔ شاید اس کی جان بچائی جاسکے۔ انسانی ہمدردی تو اپنی جگہ ہے لیکن میں سوچتی ہوں اگر اس کی جان بچ جائے اور اس کا ذہن مکمل طور پر بیدار ہوجائے تو شاید وہ ہمیں ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ اور بھی بتاسکے۔ کسی مرتے ہوئے انسان کے بارے میں اس طرح خودغرضی سے سوچنا اچھا تو نہیں لگتا لیکن میں کچھ مجبوری کے سے عالم میں اس طرح سوچ رہی ہوں۔ ریڈ ڈاٹ کے خاتمے کے لیے ہم نے اپنا سب کچھ..... حتیٰ کہ اپنی زندگی بھی داؤ پر لگادی ہے اب اس آپریشن کو کسی نہ کسی طرح اختتام تک تو پہنچانا ہے۔"

اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں یہ سب کچھ کہا تھا۔ میرے لیے یہ اطلاع افسوس اور تشویش کا باعث تھی کہ ہنی کہیں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس کے بارے میں بجا طور پر کیچڑ میں کنول کی تشبیہ استعمال کی جاسکتی تھی لیکن بعض لوگ نہ جانے کیوں بدقسمتی کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا المیہ انہیں زندگی بھر اُلجھائے رکھتا ہے۔ وہ زندگی میں کئی بار بہت ہی نازک موقعوں پر میرے کام آئی تھی۔ میں اس کے بارے میں مزید جاننا چاہتا تھا لیکن اس وقت میں نے نفیس صاحب اور راحیلہ کی گفتگو میں مداخلت مناسب نہیں سمجھی۔

نفیس صاحب ایک لمحہ پُرخیال نظروں سے راحیلہ کی طرف دیکھتے رہے پھر اپنی پھٹی ہوئی میلی کچیلی روئی دار واسکٹ کے اندر ہاتھ ڈالتے ہوئے بولے "ویسے تو میں بھی پہلے ہی تمام ڈاکٹروں سے بات کرچکا ہوں لیکن تمہاری تسلی کے لیے ایک بار پھر سرجن کرنل رحمان سے بات کرکے دیکھ لیتا ہوں۔ اگر وہ اجازت نہیں دیتا تو پھر کوئی بھی اجازت نہیں دے سکتا۔ کرنل رحمان ہمارے ملک کے چند ایک قابل ترین نیورو سرجنز میں سے ایک ہے۔"

نفیس صاحب کا ہاتھ واسکٹ سے باہر آیا تو اس میں چھوٹا سا ایک خوب صورت موبائل فون تھا۔ انہوں نے سُلگتی ہوئی بیڑی ایک طرف پھینکی اور فون پر ایک نمبر پنچ کیا۔ اپنی پھٹی پرانی دھوتی کو سنبھالتے وہ ایک چارپائی پر بیٹھ گئے اور انہوں نے ہمیں بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اور راحیلہ موڑھوں پر بیٹھ گئے۔ راحیلہ ان کی طرف پُرامید سی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

سلسلہ ملنے پر نفیس صاحب نے بارُعب لہجے میں کہا "سرجن کرنل رحمان سے بات کراؤ۔"

[illegible]

رہا تھا جبکہ ان کا حُلیہ اور گردوپیش کوئی اور ہی تصویر پیش کررہا ... میں اس تضاد سے لطف اندوز ہوسکتا تھا بشرطیکہ اس وقت میرا ... کچھ غم ناک سے انکشافات میں نہ اُلجھا ہوتا۔

چند لمحے بعد نفیس صاحب کا رابطہ سرجن رحمان سے ہوگیا۔ چند منٹ باتیں کرتے رہے۔ آخرکار فون بند کرکے دوبارہ اپنی ... کٹ میں چھپاتے ہوئے بولے "سرجن رحمان بھی ہنی کو کہیں ... ل کرنے کے حق میں نہیں ہے' کسی دوسرے ملک لے جانا تو ... کنار وہ اسے ایک بستر سے دوسرے بستر پر منتقل کرنے کے حق میں ... ی نہیں ہے۔ وہ ویسے بھی اس کی زندگی کے بارے میں پُرامید ... نہیں ہے۔ اس کے خیال میں وہ ایک بجھتا ہوا چراغ ہے۔"

راحیلہ فون پر ان کی گفتگو کے دوران ہی یہ نتیجہ اخذ کرچکی ... ی۔ اس کے آدھے سیاہ' آدھے سفید چہرے پر مایوسی پھیل چکی ... ی۔ نفیس صاحب گویا اسے سمجھاتے ہوئے بولے "جو چیز ہمارے ... میں نہیں اس کے بارے میں تمہیں غمزدہ نہیں ہونا چاہیے۔"

"میں شاید غمزدہ نہیں' متفکر ہوں سر!" راحیلہ خیمے کے ... دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی ... مجھے کچھ اندیشہ محسوس ہورہا ہے کہ جس فتنے سے ہم نے ٹکرلی ... ی اگر جلد از جلد اس کا سر کچلنے میں کامیاب نہیں ہوسکے تو وہ ... ہیں دوبارہ ڈسے گا۔"

نفیس صاحب ٹھوڑی مسلتے ہوئے پُرخیال انداز میں اس کی ... طرف دیکھتے رہے۔ راحیلہ بولی "اس وقت ہمارے اردگرد ایک ... سکوت سا طاری ہے۔ کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آرہا۔ مجھے ... کچھ یوں لگ رہا ہے جیسے سانپ زخمی ہوکر بِل میں گھس گیا ہے اور ... دوبارہ حملہ آور ہونے کے لیے اپنی توانائیاں جمع کررہا ہے۔ یہ ... سکوت کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔"

"ہم اپنی سی کوشش کررہے ہیں۔" نفیس صاحب بولے ... "تمہیں معلوم ہے ہم نے بہت بڑی منصوبہ بندی کی ہے اور بہت ... ماہرین نہایت خاموشی سے اس میں لگا رکھے ہیں۔ تم اس منصوبہ ... ی کا ایک حصہ ہو۔ مجھے امید ہے کہ واٹر سپلائی کی آڑ میں جو ... سرنگ کھودی جارہی ہے وہ ہمیں ریڈ ڈاٹ کے زیرِزمین قلعے تک ... پہنچائے گی۔"

"لیکن ہمارے انتہائی جدید اور انتہائی حسّاس آلات نے بھی ... اس علاقے میں کہیں زیرِزمین کسی غیر معمولی چیز کی موجودگی کی ... نشاندہی نہیں کی ہے۔" راحیلہ بولی۔

"میں اس سے مایوس نہیں ہوں۔" نفیس صاحب بولے ... اس موضوع پر ایک میٹنگ میں ہم بات کرچکے ہیں۔ ہم سائنسی ... ایجادات میں ریڈ ڈاٹ کے مقابلے کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔ جن ... پیرفاموں نے یہ تنظیم بنائی ہے ان کے اپنے ملکوں میں بھی وہ ... ایجادات منظرِعام پر موجود نہیں ہیں جن سے انہوں نے ریڈ ڈاٹ ... [illegible]

ہیں۔ ممکن ہے ان کے زیرِزمین قلعے کے گرد بھی کچھ ایسے انتظامات موجود ہوں۔ کوئی ایسا غیرمرئی ہالہ موجود ہو جس کی وجہ سے ہمارے حسّاس آلات بھی اس کی موجودگی کی نشاندہی نہ کرسکتے ہوں۔ ہمیں ان کے کمپیوٹروں سے جو نقشے ملے تھے ان میں اس مخصوص ٹکڑے کی بہرحال کوئی اہمیت ظاہر کی گئی تھی جس کا صحیح مطلب ہم نہیں سمجھ سکے۔"

راحیلہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "یہ بھی ممکن ہے کہ جب ہمارے لوگ کھُدائی کرتے ہوئے واقعی اس زیرِزمین قلعے تک پہنچ جائیں تو اچانک کوئی زبردست تباہی شروع ہوجائے۔ ان کے حفاظتی انتظامات کچھ اس قسم کے ہوں کہ ہم یہ کارروائی کرکے پچھتانے پر مجبور نہ ہوجائیں؟"

"ہم تقریباً ایٹم بم کی سی تباہی کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہیں۔" نفیس صاحب نے پہلو بدلتے ہوئے جواب دیا "تم سے اب کوئی بات چھپی ہوئی تو نہیں ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے کہ کنسٹرکشن مشینری کی آڑ میں وہاں کیا کچھ موجود ہے اور پھر قدرے اطمینان کی بات یہ ہے کہ یہاں چاروں طرف کافی دور دور تک ویرانہ ہے۔ زیادہ جانی اور مالی نقصان کا امکان نہیں ہے۔"

راحیلہ خاموش رہی۔ ان کی گفتگو سے حالات کی تصویر میری نظر میں بھی واضح ہوتی جارہی تھی۔ اچانک نفیس صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے اور ایک گوشے میں بچھی ہوئی چٹائی کے پاس جابیٹھے۔ اس چٹائی پر چند گدڑیاں سی بھی لپٹی ہوئی رکھی تھیں۔ پُرانا سا ایک حُقّہ بھی رکھا تھا۔

انہوں نے وہ چیزیں ایک طرف کو کھسکائیں اور چٹائی کا کونا اُٹھا کر اس کے نیچے سے زرد رنگ کا ایک بڑا سا لفافہ نکالا۔ لفافہ راحیلہ کی طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولے "یہ وہی چند تصویریں ہیں جو ریڈ ڈاٹ کے کمپیوٹروں سے ہمارے ہاتھ لگی تھیں۔ انہیں تم سیکرٹ سروس والوں کو بھجوادینا۔ وہ انہیں اپنے خاص والٹ میں محفوظ کرادیں گے۔ پتا چلا ہے کہ یہ تصویریں کسی طرح بھی ہمارے ہاں پرنٹ نہیں ہوسکتیں۔ کسی بھی فوٹوگرافک پیپر پر ان کے پرنٹ نہیں نکل سکتے۔ یہ تصویریں کسی عجیب ہی میٹریل پر ہیں جو اُن کے کمپیوٹروں کے پرنٹرز میں استعمال ہوتا ہے۔"

راحیلہ یونہی سرسری سے انداز میں ان تصویروں کو لفافے سے نکال کر دیکھنے لگی۔ شاید وہ پہلے بھی انہیں دیکھ چکی تھی۔ وہ پلاسٹک کی ٹرانسپیرنٹ پلیٹ پر تھیں اور دونوں طرف سے دیکھی جاسکتی تھیں لیکن کچھ عجیب سی لگ رہی تھیں۔ وہ نہ تو کیمرے کی کھینچی ہوئی معلوم ہوتی تھیں اور نہ ہی ہاتھ کی بنی ہوئی وہ کسی عجیب ہی مشینی عمل کے ذریعے تیار شدہ لگتی تھیں۔

سائز میں وہ تقریباً عام کتاب کے برابر تھیں۔ راحیلہ انہیں تاش کے پتّوں کی طرح ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کررہی تھی۔ وہ کئی عورتوں اور مردوں کی تصویریں تھیں۔ وہ سب سفید

فام معلوم ہوتے تھے۔

"ان میں سے کچھ مر چکے ہیں اور کچھ کی ہمیں تلاش ہے۔" راحیلہ نے گویا میری معلومات کے لیے سرسری سے انداز میں بتایا۔

اچانک ایک تصویر میرے سامنے آئی۔ وہ اسے ایک سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے لگی تو میں نے غیر ارادی طور پر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا اور اجازت طلب نظروں سے نفیس صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر رازداری مانع نہ ہو تو میں اس تصویر کو ذرا غور سے دیکھ لوں؟"

نفیس صاحب دھیرے سے ہنس دیے "بڑی دیر میں تکلفات کا خیال آیا ڈیئر افضل چوہدری! ابھی تک تمہارے سامنے جو باتیں ہوتی رہی ہیں وہ سب ہی انتہائی رازداری کی تھیں۔ خانہ بدوشی کی آڑ میں ہمارا یہاں موجود ہونا ہی ایک اہم راز ہے۔ اب تم سے بھلا کون سی بات راز رہ گئی ہے۔ تمہیں تو خود اب بہت سے رازوں سے پردہ اُٹھانے میں ہمارا ساتھ دینا ہے۔"

میں نے چٹکی میں پکڑ کر راحیلہ کے ہاتھ سے ٹرانسپیرنسی نما وہ تصویر لے لی۔ شفاف پلاسٹک کی وہ شیٹ اس سیلوفین سے بھی پتلی معلوم ہوتی تھی جو ہمارے ہاں پیکٹوں وغیرہ پر چڑھی ہوتی ہے لیکن وہ فلم کے نیگیٹو کی طرح کراری تھی۔

وہ ایک عورت کی تصویر تھی۔ میں ایک ٹک اسے دیکھتا رہ گیا۔ تصویر میں گویا زندگی کے آثار موجود تھے اور وہ بھی جیسے ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میری رگ و پے میں خفیف سی سنسنی دوڑ گئی۔ اس عورت کی اصل شخصیت میں ہی نہیں اس کی شفاف سی تصویر میں بھی کوئی ایسی بات تھی جس سے جسم میں سرد سی لہر دوڑ جاتی تھی۔

وہ اسی عورت کی تصویر تھی جس کی آنکھوں کا کوئی رنگ تھا ضرور.... لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیا نام دیا جائے۔ کوئی رنگ رکھتے ہوئے بھی وہ آنکھیں گویا بے رنگ تھیں اور آسیبی سی معلوم ہوتی تھیں۔

راحیلہ کی خفیف سی ہنسی سُن کر میں چونکا۔ وہ شگفتہ لہجے میں بولی "لگتا ہے تصویر نے ہی ہپناٹائز کر دیا ہے۔ تصویر کو دیکھ کر ہی خود تصویر بن کر رہ گئے ہو۔ لگتا ہے جب اصل میں اس عورت کو دیکھا ہوگا تو پتھر کے ہو کر رہ گئے ہو گے۔"

اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ میں اس عورت کو دیکھ چکا ہوں۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا "کون ہے یہ عورت؟"

"پہلے تم بتاؤ۔ تم نے اسے کہاں دیکھا تھا؟" راحیلہ نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔ اس کے آدھے سیاہ، آدھے سفید چہرے پر مسکراہٹ بھی عجیب لگتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دو مختلف چہرے مسکرا رہے ہوں۔ جنہیں آدھا آدھا کاٹ کر جوڑ دیا گیا ہو۔

"میں جب لاہور سے بھاگا تھا تو ملک کے نہ جانے کون کون سے ایسے دور افتادہ علاقوں کی طرف نکل گیا تھا جو میں نے خواب میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ کچھ عرصے پہلے میں نے واپس آنے کی کوشش کی تھی اور کراچی پہنچا تھا۔ وہاں پہلی ہی رات میرے اپنے ہوٹل میں مجھ پر حملہ ہوا۔ اس وقت میں نے پہلی بار اس عورت کو وہیں ہوٹل میں دیکھا تھا۔" میں نے مختصراً بتایا۔

راحیلہ کے دو رنگے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی اُتر آئی۔ نفیس صاحب بھی چارپائی پر کچھ آگے کو جھک آئے۔

"پھر کیا ہوا؟" راحیلہ نے نہایت نیچی آواز میں پوچھا۔

"میں نے کراچی میں ٹکنا بہتر نہیں سمجھا۔ ساتھیوں میں سے بھی کسی سے رابطہ نہیں ہو سکا پھر صورتِ حال کچھ ایسی بنی کہ میں بحری جہاز کے ذریعے ترکی کی طرف نکل گیا۔ سفر کے ابتدائی دنوں میں اتفاقاً ہی میں دوربین کے ذریعے سمندر کا جائزہ لے رہا تھا۔ پرندوں کا شوقین ایک شخص مجھے پرندے دکھا رہا تھا کہ اچانک ایک اسٹیمر پر میں نے اس عورت کو دیکھا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ مجھے ہی تلاش کر رہی تھی لیکن پھر وہ اسٹیمر غائب ہو گیا۔"

"اس کے بعد تم نے اس عورت کو نہیں دیکھا؟" نفیس صاحب نے دریافت کیا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"ترکی میں بھی یہ عورت کہیں نظر نہیں آئی؟" نفیس صاحب نے جاننا چاہا۔ میں نے ایک بار پھر نفی میں سر ہلایا۔ خیمے میں گہرا سکوت چھا گیا۔

"میرے سوال کا جواب کسی نے نہیں دیا۔ یہ عورت کون ہے؟" میں نے اپنا سوال دُہرایا۔

"صحیح طور پر تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔" نفیس صاحب گہری سانس لے کر بولے "لیکن ان کے کمپیوٹروں سے ملنے والی معلومات کو ہم جس حد تک ڈی کوڈ کر سکے ہیں اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عورت کراچی میں ریڈ ڈاٹ کی کرتا دھرتا تھی اور شاید اب بھی ہے۔ یہ ریڈ ڈاٹ کی اہم ترین شخصیتوں میں سے ایک معلوم ہوتی ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ تنظیم میں اس کا نام، حیثیت یا عہدہ کیا ہے۔ ہم نے اسے "باس فور" فرض کر رکھا ہے۔ باس ون، باس ٹو اور باس تھری ہمارے آپریشن کے دوران مارے جا چکے ہیں۔ وہ تینوں مرد تھے۔ کراچی میں ریڈ ڈاٹ کی تمام سرگرمیوں کو غالباً یہی عورت کنٹرول کرتی ہے لیکن ہم اس کی جھلک بھی نہیں دیکھ سکے ہیں۔"

"شاید کبھی دیکھ ہی لیں اور وہ آپ کی زندگی کا عجیب تجربہ ہوگا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"بہر حال تمہاری بات سے ہمارے اندازوں کی کچھ تصدیق ہوتی ہے۔" نفیس صاحب بولے۔ راحیلہ مزید تصویریں دیکھنے لگی

ان میں ایڈم عرف ایڈی کی تصویر بھی تھی جو لاہور میں سب سے پہلے ریڈ ڈاٹ سے میرے رابطے کا ذریعہ بنا تھا۔

میں نے ایک بار پھر راحیلہ کا ہاتھ روکتے ہوئے کہا "اس شخص کے بارے میں کیا خبر ہے؟ زندہ ہے یا مر گیا؟"

"ہم نے اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے نہایت شریفانہ انداز میں خود کشی کر لی کیونکہ وہ پکڑے جانے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔" راحیلہ نے جواب دیا۔

"وہ کیوں؟" میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"کیونکہ وہ ہمارے ملک میں دُہری زندگی گزار رہا تھا۔ ایک نہایت طاقتور مغربی ملک جس کی ہم پر "نوازشات" کچھ زیادہ ہی ہیں اور برسوں سے جس سے ہمارا ایک "تعلقِ خاص" چلا آ رہا ہے۔ ایڈی ہمارے ہاں اس کا قونصل جنرل تھا لیکن اپنی شکل صورت میں تھوڑی سی تبدیلیوں کے ساتھ وہ ریڈ ڈاٹ کے خاص آدمی کا کردار بھی ادا کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ملک پر آنچ نہیں آنے دی۔ زندہ ہمارے ہاتھ نہیں آیا۔"

پھر راحیلہ خود ہی طنزیہ لہجے میں بولی "حالانکہ وہ زندہ بھی ہمارے ہاتھ آ جاتا تو ہم اس کا یا اس کے ملک کا کیا بگاڑ لیتے؟ ہمیں ایک جھڑکی پڑتی یا ایک دھمکی ملتی اور ہم فوراً دوبارہ ریت میں سر گھسا کر بیٹھ جاتے۔"

میں نے نفیس صاحب کی طرف دیکھا۔ انہوں نے نظر چُرا لی اور اپنی جیب سے ایک اور بیڑی نکال کر پُرخیال انداز میں اسے تکنے لگے۔

"شاید ایسے اور بھی کئی لوگ ہوں جو بظاہر اپنے ملکوں کے لیے یہاں سفارتی خدمات انجام دے رہے ہوں لیکن درحقیقت وہ ریڈ ڈاٹ کے ایجنٹ ہوں؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"بعض لوگوں کے بارے میں ہمیں یہی شبہ ہوا ہے لیکن وہ نہ تو زندہ حالت میں ہمارے ہاتھ لگ سکے اور نہ ہی ان کی لاشیں صحیح سلامت رہیں۔ وہ قطعی طور پر ناقابلِ شناخت ہو گئے تھے۔" راحیلہ نے جواب دیا۔

"کیا ہمارے پاس کوئی طریقہ نہیں کہ ہم ان ملکوں سے احتجاج کر سکیں؟" میں نے دل کے کسی گوشے میں بے بسی کا درد محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

"کریں گے، کچھ نہ کچھ کریں گے۔ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آپریشن کا بقیہ حصہ کچھ ایسے انداز میں مکمل کر سکیں کہ ہمارے پاس سفید فام قوموں کے سامنے احتجاج کرنے کے لیے بنیاد تیار ہو سکے۔" نفیس صاحب نے گویا مجھے تسلی دی۔

"احتجاج کرنے سے پہلے ہمیں احتجاج کے خوف ناک نتائج بھگتنے کے لیے بھی تیار رہنا ہوگا۔" راحیلہ زہریلے لہجے میں بولی "جرمِ ضعیفی بھی کیا جرم ہے!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئی۔

نفیس صاحب گویا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولے "تم یہ تصویریں لفافے میں ڈال لو اور بہت احتیاط سے لے کر جانا۔ سیکرٹ سروس والے ان کی کاپیاں کرنے کا کوئی طریقہ نکالیں گے اور وہ کاپیاں کئی شہروں میں ہماری مختلف خفیہ ایجنسیوں کو بھیجی جائیں گی۔"

راحیلہ نے تصویریں لفافے میں ڈال لیں اور جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بڑا سا سیاہ چشمہ لگانے کے بعد نقاب اس طرح چہرے پر لپیٹا کہ چہرہ پورا چُھپ کر رہ گیا۔ اب وہ بہت سخت پردہ نشین قسم کی خاتون دکھائی دینے لگی تھی۔ بعض خواتین اسی حُلیے میں ڈرائیونگ بھی کرتی دکھائی دیتی تھیں۔ وہ ہر حال میں سختی سے پردے کی پابندی کرتی تھیں اور اس میں فرق نہیں آنے دیتی تھیں لیکن راحیلہ کے بارے میں شاید کسی کو گمان بھی نہ گزرتا کہ اس کے اس طرح نظر آنے کی وجہ کچھ اور تھی۔

میں نے بھی اُٹھتے ہوئے کہا "میں راحیلہ کے ساتھ جاؤں گا۔ مجھے اس سے بہت سی ضروری باتیں کرنی ہیں۔"

راحیلہ کچھ نہ بولی۔ نفیس صاحب متذبذب دکھائی دینے لگے لیکن ایک لمحے بعد گویا فیصلے پر پہنچتے ہوئے بولے "ٹھیک ہے... فی الحال چلے جاؤ لیکن کل یہاں واپس پہنچ جانا اور یہیں رہنے کی تیاری کرکے آنا۔ خانہ بدوشوں والے حلیے میں ہی آنا۔ یہ بہروپ دھارنا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ راحیلہ سب بندوبست کردے گی۔"

"آپ پرانے اسکول آف تھاٹ کے نمائندے معلوم ہوتے ہیں۔ بھیس بدل کر اپنی کارروائیاں کرتے ہیں۔ مجھے ترکی میں بھی ایک ایسے کردار سے واسطہ پڑا تھا جو ہر پل ایک نیا بھیس بدلتا تھا حالانکہ سُنا ہے وہ دورِ جدید کا کوئی بہت اونچے درجے کا قاتل تھا۔" میں نے اپنا کیمرا گلے میں لٹکاتے ہوئے کہا۔

"کس کی بات کررہے ہو؟" نفیس صاحب کی آنکھوں میں دلچسپی کی چمک نمودار ہوئی۔

"میری معلومات کے مطابق اس کا نام حمان تھا۔ معلوم نہیں اصلی ہے یا فرضی۔ سُنا ہے وہ سربراہانِ مملکت اور تقریباً اسی درجے کی دوسری شخصیتوں کو قتل کرتا ہے۔" میں نے بے دلی سے بتایا۔

"اوہ...... حمان!" نفیس صاحب کی آنکھیں ذرا پھیل گئیں "تمہیں اس سے واسطہ پڑا تھا؟" انہیں گویا یقین نہیں آرہا تھا۔

"جی ہاں، اسے لیڈی ڈائنا کے دورۂ ترکی کے موقع پر اس کے قتل کا کنٹریکٹ ملا تھا۔ مجھے ایک ایسی برطانوی شخصیت کی رفاقت میسر آگئی تھی جس کی وجہ سے مجھے اس معاملے میں ٹانگ اڑانا پڑی اور حمان کنٹریکٹ پورا نہیں کرسکا۔ وہ مجھ سے بہت خفا تھا۔ اس نے بعد میں چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر دو مرتبہ مجھے قتل کرنے کی کوشش کی۔ قسمت ہی اچھی تھی کہ بچ کر آگیا ہوں لیکن کیا آپ اس شخص کو جانتے ہیں؟"

نفیس صاحب گویا کسی خیال سے چونکتے ہوئے بولے "ظاہر ہے ذاتی طور پر تو نہیں جانتا لیکن ملک کی ایک سب سے بڑی خفیہ ایجنسی کے سربراہ کی حیثیت سے میرے لیے اس کے بارے میں باخبر رہنا ضروری ہے۔ ہمارے پاس اس کے بارے میں ایک مختصر سی فائل موجود ہے لیکن مجھے یقین نہیں آرہا کہ تمہیں اس سے واسطہ پڑا اور تم اس سے بچ کر آگئے۔"

انہوں نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا اور کچھ رشک آمیز سے لہجے میں بولے "تم واقعی ایک خوش قسمت انسان ہو افضل چوہدری!"

نقاب پوش راحیلہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر بولی "صرف خوش قسمت نہیں، بے پناہ باصلاحیت بھی! آپ کو ابھی افضل چوہدری کی صلاحیتوں کا اندازہ نہیں ہے مسٹر نفیس!"

"مجھے اندازہ ہوچکا ہے۔" نفیس صاحب سرہلا کر بولے "بہت اچھی طرح اندازہ ہوچکا ہے۔ جس کے ساتھی اتنے باصلاحیت ہیں وہ خود......" انہوں نے مسکرا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا پھر میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولے "ویسے تم خود بھی تو پُرانے اسکول آف تھاٹ کے آدمی ہو۔ اس وقت بھی تم ہلکے پھلکے بہروپ میں ہو۔"

"جی ہاں، میں بھی پُرانے اسکول آف تھاٹ سے ہی وابستہ رہنا پسند کرتا ہوں۔ اکثر معاملات میں۔" میں نے تسلیم کیا "بہروپ بازی کا سہارا تو میں ایک عرصے سے لیتا آرہا ہوں۔ پُرانے طور طریقے میرے لیے ہمیشہ کارآمد ثابت ہوئے ہیں۔"

"کل بھی ذرا عمدہ طریقے سے بہروپ بدل کر آنا پھر ذرا آرام سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ آئندہ کے لائحۂ عمل میں تمہارے مشورے بھی شامل ہونے چاہئیں۔" نفیس صاحب بولے "کل یہاں تمہاری چند دوسرے ساتھیوں سے بھی ملاقات ہوجائے گی۔ اس وقت وہ کچھ دوسری جگہوں پر مختلف ڈیوٹیاں سنبھالے ہوئے ہیں۔"

میں انہیں خدا حافظ کہہ کر راحیلہ کے ساتھ باہر آیا تو میں نے دیکھا، لکڑی کے تخت پر ایک شخص سفید اوورآل پہنے اور اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکائے بیٹھا تھا۔ اس کے پاس سیاہ رنگ کا میڈیکل بیگ بھی تھا جس پر سفید دائرے میں سُرخ ہلال بنا ہوا تھا۔ وہ اپنا میڈیکل بیگ اُٹھا کر مؤدبانہ انداز میں راحیلہ کے پیچھے پیچھے آنے لگا۔

ہم بستی سے باہر آئے تو میں نے دیکھا، سڑک کے کنارے ایک سفید ویگن کھڑی تھی جس پر سرکاری سرپرستی میں چلنے والی فلاحی تنظیم کا نشان بنا ہوا تھا جو مختلف مواقعوں پر طبّی امداد فراہم کرتی تھی۔ جلی حروف میں تنظیم کا نام بھی لکھا ہوا تھا اور اس سے بھی زیادہ جلی حروف میں "گشتی شفاخانہ" لکھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس قسم کی گاڑیاں غریب بستیوں میں طبّی امداد فراہم کرنے جاتی رہتی تھیں۔

راحیلہ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔ جس شخص نے میڈیکل بیگ اُٹھایا ہوا تھا وہ گاڑی کے پچھلے حصے میں آبیٹھا۔ اس حصے میں دوسرا طبّی سازوسامان بھی رکھا دکھائی دے رہا تھا۔

راحیلہ تصویروں کا جو لفافہ نفیس صاحب سے لے کر آئی تھی وہ سیٹوں کے درمیان سے اس شخص کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "یہ لودھی صاحب کو پہنچا دینا۔"

میں نے مڑ کر اس شخص کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ گول مٹول سا تھا اور ناک پر موٹے شیشوں کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ وہ بالکل ہونق نظر آرہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے اپنا ایک مہرباں وسیم احمد یاد آگیا۔ وہ بھی کچھ ایسی ہی شخصیت اور ایسے ہی چہرے مہرے کا مالک تھا لیکن وہ نوجوان اور ذرا ہلکے جسم کا تھا جبکہ یہ شخص پختہ عمر کا تھا۔

اس نے لفافہ لے کر اپنا میڈیکل بیگ کھولا اور اسے اس میں رکھ لیا۔ میں نے دیکھا، اس کے میڈیکل بیگ میں طبّی امداد کا

سامان تو برائے نام ہی تھا، زیادہ جگہ چھوٹی نالی والی مگر خوفناک سی ایک گن نے گھیری ہوئی تھی۔ ایک خانے میں چھوٹا سا ایک پسٹل بھی رکھا نظر آرہا تھا۔ لفافہ رکھتے ہی اس نے جلدی سے میڈیکل بیگ بند کرلیا۔

میں نے دوبارہ ذرا غور سے اس شخص کی طرف دیکھا تو وہ مجھے پہلے جیسا ہونق دکھائی نہیں دیا۔ یوں لگا جیسے اس کے بارے میں میرا یہ تاثر محض نظر کا دھوکا تھا۔ راحیلہ نے ویگن اسٹارٹ کی اور اسے سڑک پر یوٹرن دے لیا۔ گاڑی کے شیشے ٹِنٹڈ تھے۔ باہر سے بہ آسانی اندر نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

"ہم کہاں جارہے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کاش ہمیں معلوم ہوتا!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اس دنیا میں ان گنت لوگ زندگی کے سفر پر نکلے ہوئے ہیں لیکن بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ کہاں جارہے ہیں۔"

میں نے اسے گھورا تو وہ معصومانہ لہجے میں بولی "کیسا ڈائیلاگ تھا؟ تم نے داد نہیں دی؟ کیا بالکل ہی بدذوق ہوکر واپس آئے ہو؟"

اس کے لہجے میں وہی پہلے والی راحیلہ بول رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ چہرے کی بربادی سے اس کے مزاج میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ وہ شگفتگی، وہ معصومیت کی تہ میں چھپا ہوا چلبلا پن برقرار تھا جبکہ اسے دیکھنے کے بعد سے میرے پہلو میں خلش کا خنجر سا پیوست تھا۔

"میں نے سنجیدگی سے پوچھا تھا۔"

"میں نے بھی کوئی مزاحیہ جواب تو نہیں دیا۔" وہ ڈرائیونگ پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے بولی۔ اب سڑک پر خاصا ٹریفک نظر آنے لگا تھا۔ گاڑی میں ایک لمحے سکوت رہا۔ میں گردن گھما کر پیچھے دیکھنے لگا۔ مجھے یہی اندازہ ہوا کہ کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں نہیں تھی۔

راحیلہ اس وقت میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی لیکن پھر بھی گویا میری حرکات و سکنات پر اس کی نظر تھی اور وہ میرا مقصد بھی سمجھ رہی تھی۔ وہ اطمینان سے بولی "میرا خیال ہے کوئی ہمارا تعاقب نہیں کررہا۔ ایسا لگتا ہے جیسے آج کل ریڈ ڈاٹ نے ہمیں ہر کام کرنے کے لیے بالکل آزاد چھوڑا ہوا ہے۔ نہ تعاقب، نہ مار دھاڑ، نہ ٹکراؤ۔ آج کل کچھ بھی نہیں ہورہا۔ کوئی مشکوک یا شناسا شکل بھی نظر نہیں آرہی۔ زندگی بہت پھیکی پھیکی سی ہوگئی ہے۔"

وہ بظاہر بالکل بے پروائی سے اتنی بڑی گاڑی کو کھلونے کی طرح ہینڈل کررہی تھی لیکن اس بے پروائی میں بھی بلا کی مشاقی تھی۔ مجھے برسوں پہلے کی وہ راحیلہ یاد آرہی تھی جس سے کراچی میں میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ جو اس وقت یونیورسٹی کی طالبہ تھی۔ جس کے ساتھ میں ایک پُرانی سی اسٹیشن ویگن میں پکنک منانے ہاکس بے گیا تھا۔ ان برسوں میں حالات کیا سے کیا ہوگئے تھے لیکن اس کی شخصیت، اس کا لب و لہجہ آج بھی وہی تھا۔ صرف اس چاند چہرے کو گرہن لگ گیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "بلکہ اب تو اس سکوت سے مجھے وحشت ہونے لگی ہے۔ ریڈ ڈاٹ کی طرف سے یہ خاموشی مجھے کسی طوفان کا پیش خیمہ لگتی ہے۔ یہ سکون مجھے مشکوک لگنے لگا ہے۔"

میں خاموش رہا تو وہ بولی "ارے اتنے خاموش کیوں ہو؟ ناراض ہوگئے کیا؟ بھئی تمہارا سوال اتنا اہم تو نہیں تھا۔ کوئی زمانہ تھا کہ میرے ساتھ جاتے وقت تم بالکل نہیں پوچھتے تھے کہ ہم کہاں جارہے ہیں۔ اہم بات صرف یہ ہوتی تھی کہ ہم ایک ساتھ جارہے ہوتے تھے۔ وقت وقت کی بات ہے!" اس نے بڑی کوشش سے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"بکواس مت کرو۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسی اور بولی "ناراض مت ہوو... اور کسی غمزدہ پہاڑی بکرے کی طرح منہ مت لٹکاؤ۔ چلو میں تمہیں بتادیتی ہوں۔ اس وقت ہم ہنی کے پاس جارہے ہیں۔ آج کل میرا زیادہ وقت اُدھر ہی میں گزرتا ہے۔ اسی لیے آج جب باہر نکلنے کا موقع ملا تھا اور پھر یہ خوشی بھی ملی تھی کہ تم سے ملاقات ہوگئی تو میں ذرا دل کا بوجھ کم کرنے کی کوشش کررہی تھی۔"

"ہنی کو کیا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"خود چل کر دیکھ لینا۔" وہ ملائمت سے بولی "شاید یہ اس کی کسی خاموش دعا کا نتیجہ ہے کہ تم یوں اچانک غیرمتوقع طور پر واپس آگئے ہو۔ ایک بار اس نے نیم بے ہوشی کے عالم میں تم سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔"

ایک عجیب سے احساس سے میری دھڑکنیں تیز ہوگئیں۔ اس کے بارے میں بھی یقیناً کوئی اچھی خبر میری منتظر نہیں تھی۔ اس سے میرا کوئی ایسا خاص تعلقِ خاطر تو نہیں تھا کہ وہ نیم بے ہوشی کے عالم میں مجھے یاد کرتی۔ اس کے آئینۂ دل میں تو کسی اور کی تصویر تھی۔ وہ کوئی الیکٹرانک انجینئر تھا جسے ریڈ ڈاٹ نے ذہنی و جسمانی طور پر اس طرح اپنا غلام بنالیا تھا کہ وہ ہنی کو پہچانتا بھی نہیں تھا لیکن ہنی کے دل میں اس اُمید کی شمع روشن تھی کہ ایک روز وہ اس کی طرف واپس آئے گا۔ اسے اپنا ماضی یاد آجائے گا۔

"ہنی کے دل میں شاید میرے لیے عقیدت یا اس سے ملتا جلتا کوئی جذبہ موجود ہے اور مجھے اس کی وجہ بھی معلوم نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ صفائیاں پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔" راحیلہ بولی اور شاید وہ پسِ نقاب مسکرائی تھی "اگر وہ تمہارے عشق میں بھی گرفتار ہوتی تب بھی مجھے نہ تو کوئی حیرت ہوتی اور نہ ہی کوئی شکایت۔ میرا تم پر کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔"

"یہی تو زندگی کا سب سے بڑا دکھ ہے کہ تمہارا مجھ پر کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کاش

کوئی دعویٰ ہوتا۔ میں کسی لڑکی کی طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھتا تو تم میرے بال نوچنے کی دھمکی دیتیں۔ کوئی لڑکی والہانہ انداز میں میرا ذکر کرتی تو تم اس کا منہ نوچنے کے بارے میں غور کرتیں۔ کاش اس قسم کی کوئی بات ہوتی۔ تمہاری یہ لاتعلقی میری زندگی کا سب سے بڑا روگ ہے۔"

"لاتعلقی تو نہیں ہے۔" وہ نیچی آواز میں بولی "تعلق تو بہت گہرا ہے۔" اس کے اور میرے سر کے درمیان محض چند انچ کا فاصلہ تھا لیکن ان سروں میں پلتی ہوئی سوچیں ایک لامتناہی خلیج کے دو کناروں کی طرح تھیں جو کبھی آپس میں نہیں مل سکتے تھے۔

"ہاں شاید تعلق تو بہت گہرا ہے لیکن اس کا کوئی عنوان نہیں ہے۔" میں نے کچھ اور آہستگی سے کہا۔ ویگن کے پچھلے حصے میں بیٹھا ہوا شخص ہماری گفتگو نہیں سُن سکتا تھا۔

وہ مجھ سے بھی زیادہ دھیمے لہجے میں بولی "وہ شعر سُنا ہے تم نے......؟

عشق کا ایک ہی عنواں ہو ضروری تو نہیں
ہر کوئی چاک گریباں ہو ضروری تو نہیں"

میں نے سڑک کو گھورتے ہوئے کہا "کاش زندگی صرف شعروں سے بہل سکتی...... بدل سکتی۔"

"تمہاری سوچ میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا "کیا اب بھی تم موقع ملتے ہی مجھ سے شادی کی فرمائش...... اور پھر اس کی تکرار کرنے لگو گے؟"

"ظاہر ہے" میں نے بلا تامل کہا "اب ایسا کیا ہو گیا ہے جو میرے خیالات تبدیل ہو جاتے؟"

وہ گیئر بدلتے ہوئے کچھ اور دھیمے لہجے میں بولی "شاید تم بھول گئے ہو کہ نقاب اور سیاہ چشمے کی آڑ میں چھپا ہوا یہ چہرہ آدھا سیاہ ہے۔ یہ ایک مضحکہ خیز تصویر ہے۔ میں تو اب چلتا پھرتا "بلیک اینڈ وہائٹ" تماشا ہوں۔"

"اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ چاند کو گرہن لگنے سے اس کی قدر و قیمت کم تو نہیں ہو جاتی۔" میں نے کہا۔

"یہ ایسا گرہن ہے جو شاید کبھی دور نہ ہو سکے۔" اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔

"کوئی بات نہیں۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے بدستور بے پروائی سے کہا۔ تب اس نے ایک ثانیے کے لیے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس وقت اس کے چہرے پر کیا تاثرات تھے یا اس کی آنکھیں کیا کہہ رہی تھیں لیکن اتنا ضرور ہوا کہ اس کے بعد ایک لمحے تک وہ بالکل خاموش رہی۔

پھر انجن کی سرسراہٹ کے درمیان اس کی سرگوشی مجھ تک پہنچی "کیا اس مضحکہ خیزی کے ساتھ تم زندگی گزار لو گے؟" اس نے انگلی سے اپنے مستور چہرے کی طرف اشارہ کیا۔

"تمہارے ساتھ میں ہر طرح سے زندگی گزار لوں گا۔ میرے جذبے کو لفظوں اور وعدوں کی سولی پر چڑھا کر مت پرکھو۔" میں نے کرب کی ایک خفیف سی لہر محسوس کرتے ہوئے کہا "اگر تمہارا جواب ہاں میں ہے تو بے شک ابھی گاڑی کا رُخ کسی نکاح خواں کے گھر کی طرف موڑ لو۔ تم کیا سمجھتی ہو میں زندگی کے ان نازک معاملات میں مذاق کرتا ہوں؟"

"تم بہت ہی ضدی آدمی ہو۔" اس نے بے آواز سی ہنسی میں بات اُڑانے کی کوشش کی "مجھے زچ مت کیا کرو۔ میں تمہیں بتا چکی ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کی کتاب میں سے شادی کا ورق پھاڑ دیا ہے۔"

"اس بات پر میرا دل چاہتا ہے میں تمہارا سر پھاڑ دوں۔" میں نے دانت پیس کر کہا "اب بھی وقت ہے۔ میری بات پر غور کرو اور گاڑی روک کر کسی راہ گیر سے پوچھ لو' قریب ترین مسجد کہاں ہے۔ شاید اس کے امام صاحب نکاح رجسٹرار بھی ہوں۔ ہنی کے پاس ہم نو بیاہتا میاں بیوی کی حیثیت سے پہنچیں۔"

"بکواس مت کرو۔ میرے برقعے کے اندر دو جیبیں ہیں اور ان دونوں میں ٹی ٹی موجود ہیں۔ مجھے اتنا تنگ مت کرو کہ میں تمہاری اس بغیر بھیجے والی کھوپڑی میں چند گولیاں اُتار دوں۔" اس نے مجھے ڈانٹا۔

"چلو یہی کر گزرو۔" میں نے ٹانگیں پسارتے ہوئے کہا "کچھ تو کرو۔ بات کو کسی کنارے تو لگاؤ۔ کہانی کو کسی انجام تک تو پہنچاؤ۔ آخر یہ بے ہنگم کہانی کب تک اپنے انجام کی تلاش میں بھٹکتی رہے گی۔"

"موت ہر کہانی کا انجام ہے۔ موت آئے گی تو خود بخود ساری کہانیاں ختم ہو جائیں گی اور ہماری زندگی کچھ ایسی ڈگر پر ہے جہاں قدم قدم پر موت کھڑی ہے۔"

"اسی لیے تو میں زیادہ اصرار کرتا ہوں۔ زندگی کا کوئی بھروسا نہیں۔ آخر ہمیں ایسی کیا مجبوری ہے جو ہم یہ حسرت لے کر اس دنیا سے رخصت ہوں؟" میں نے جلدی سے کہا۔

"جبکہ میں تمہیں یہ سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں کہ ایسی زندگی میں کوئی حسرت پالنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟"

"ہاں واقعی' کسی بھی بات کی کوئی ضرورت ہی نہیں۔ بس پاگل کُتے کی طرح اِدھر اُدھر دوڑتے رہو۔ آخر کار ایک دن کسی کے ہاتھوں گولی کھا کر چٹ سے گر کر مر جاؤ۔ بس یہی کُل زندگی ہے۔ یہ دنیا کے ننانوے فیصد لوگ تو پاگل ہیں جو محبت کرتے ہیں۔ شادی کرتے ہیں گھر بساتے ہیں۔"

"اور پھر سر پہ ہاتھ رکھ کے روتے ہیں۔" راحیلہ نے ٹکڑا لگایا پھر ایک لمحے کے توقف سے بولی "ہاں...... میری نظر میں وہ ایسے لوگ نہیں جن کی تقلید کی جائے۔ ویسے میں تمہارے حوصلے کی واقعی داد دیتی ہوں کہ تم ایک مضحکہ خیز چہرے والی عورت سے شادی کے لیے تیار ہو۔"

"مجھے تمہاری داد کی نہیں تمہاری "ہاں" کی ضرورت تھی۔" میں نے تاسف سے کہا۔

"وہ تم کبھی نہیں سن سکو گے۔ میں تمہیں پہلے بھی مشورہ دے چکی ہوں۔ اپنے لیے کوئی ڈھنگ کی لڑکی تلاش کرو اور اپنی زندگی کی یہ کمی بھی پوری کر ہی ڈالو جس نے تمہیں پریشان کر رکھا ہے۔" پھر وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی "اس موضوع پر اب مزید بات نہیں ہو گی۔ ہم اپنی منزل کے قریب پہنچ چکے ہیں۔"

میں نے ایک طویل سانس لے کر سیٹ سے ٹیک لگا لیا۔ تبدیلی اس کے چہرے میں آئی تھی۔ اس کے خیالات اور نظریات میں نہیں۔ بلکہ اس کی ضد شاید اپنی جگہ کچھ اور پکی ہو گئی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ خیال شاید کچھ اور مضبوط ہو گیا تھا کہ اب میں تو کیا کوئی اور بھی اگر اس سے شادی کرے گا تو اس پر ترس کھا کر کرے گا اور یہ بات اس کی اونچی انا کو منظور نہیں تھی۔ یہ خیال جب مبہم سے انداز میں اس کے ذہن میں موجود تھا' میں تب بھی اسے نہیں نکال سکا تھا۔ اب اگر یہ خیال اور بھی مضبوط ہو گیا تھا تو مجھے غالباً اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

چند لمحے بعد گاڑی ایک ذیلی سڑک پر مڑی جس پر دونوں طرف پھولدار پودوں سے آراستہ کیاریاں موجود تھیں۔ اس کے گیٹ پر پہنچ کر مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک مخصوص سرکاری اسپتال تھا۔ اس کے اندر بھی سرسبز درخت' پھول اور سبزہ اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ مریض کی آدھی بیماری تو اس ماحول میں کچھ دیر سانس لینے سے ہی ختم ہو سکتی تھی۔

راحیلہ نے ویگن ایک مخصوص پارکنگ لاٹ میں لے جا روکی اور اسے اسٹارٹ ہی چھوڑ کر اُتر گئی۔ مجھے بھی اس نے اُترنے کا اشارہ کیا۔ ڈاکٹر کے سے حُلیے والا وہ شخص جو معلوم نہیں ڈاکٹر تھا یا نہیں' آگے آ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ راحیلہ اس سے مخاطب ہوئی "تم گاڑی جلدی واپس لے آنا اور اسی پارکنگ لاٹ میں عین اسی جگہ پر چھوڑ دینا' چابیاں اندر ہی چھوڑ دینا اور اگر تمہیں مجھ سے کوئی کام نہ ہو تو پھر مجھ سے ملنے کی ضرورت نہیں۔"

اس شخص نے اثبات میں سرہلایا لیکن اس کا چہرہ بدستور پتھرایا ہوا سا رہا۔ اپنا میڈیکل بیگ اس نے برابر کی سیٹ پر رکھ لیا تھا۔ وہ گاڑی ریورس کر کے نہ جانے کہاں روانہ ہو گیا۔ میں راحیلہ کی رہنمائی میں آگے چل دیا۔

عمارتوں کے کئی بلاکس سے گزرنے کے بعد ہم ایک بلاک میں داخل ہوئے۔ اس کی پیشانی پر جلی سرخ حروف میں انگریزی میں "انتہائی نگہداشت کا وارڈ" لکھا نظر آ رہا تھا۔ سامنے ہی سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں لیکن ان کے قریب ایک چاق و چوبند باوردی اہلکار گن لیے کھڑا تھا۔ راحیلہ کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں شناسائی کا تاثر اُبھرا۔ غالباً اس کے مخصوص حُلیے کی وجہ سے وہ اسے پہچانتا تھا۔

اس کے باوجود راحیلہ نے اس کے قریب سے گزرتے وقت ایک کمپیوٹرائزڈ سا کارڈ نکال کر اسے دکھایا کیونکہ راحیلہ کا حُلیہ ہی میرے خیال میں اسے مشکوک بناتا تھا۔ اس حُلیے میں کوئی بھی عورت بلکہ ذرا کم تر قد کاٹھ کا کوئی مرد بھی وہاں داخل ہو سکتا تھا۔

باوردی شخص نے بڑے غور سے کارڈ چیک کیا حتیٰ کہ اس کے اُبھرے ہوئے حروف پر نہ جانے کیوں انگلی بھی پھیر کر دیکھی پھر مطمئن انداز میں سرہلا کر کارڈ واپس کرتے ہوئے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"یہ میرے ساتھ ہیں اور مجھ سے بھی زیادہ خاص آدمی ہیں۔" راحیلہ بولی۔ یہ کہتے ہوئے شاید وہ پسِ نقاب مسکرائی بھی تھی پھر وہ مجھے ساتھ آنے کا اشارہ کرتے ہوئے سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

پہلی منزل پر شیشے کا ایک اور دروازہ ہماری راہ میں حائل تھا اس دروازے پر کسی چھوٹے موٹے اہلکار کے بجائے ایک مسلح آفیسر تعینات تھا۔ اس نے بھی راحیلہ کا کارڈ دیکھا۔ میرے بارے میں یہاں بھی راحیلہ نے وہی جملہ دُہرایا جو وہ نیچے بھی بول چکی تھی۔ آفیسر نے خاموشی سے اس کے لیے دروازہ کھول دیا۔

اندر بائیں ہاتھ پر چھوٹا سا ایک آفس نما کمرا تھا جس کی آدھی دیواریں شیشے کی تھیں۔ اس میں ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں نظر آ رہی تھیں۔ وہ ایک روشن اسکرین پر کوئی ایکسرے لگائے غور سے دیکھ رہے تھے۔

دائیں ہاتھ پر راہداری میں شیشے کے تین کیبن سے نظر آ رہے تھے۔ ان تینوں میں مریض لیٹے نظر آ رہے تھے۔ تینوں کے جسم سینے تک سفید چادر سے ڈھکے نظر آ رہے تھے۔ پاس رکھی مختلف مشینوں کی نالیاں ان کے جسموں سے منسلک تھیں۔

راحیلہ آخری کیبن کے دروازے پر پہنچ کر رک گئی۔ وہاں ہر طرف دیواروں پر انگریزی میں مختلف ہدایات آویزاں تھیں۔ تھوکیے مت...... شور مت کیجیے...... کسی چیز کو ہاتھ مت لگایئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ وہاں روشنی بھی کم ہی تھی۔

"کیا یہ قرنطینہ ہے؟" میں نے شیشے کے کیبن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" راحیلہ نے نفی میں سرہلایا "یہ آئی سی یو کے عام کمرے ہیں۔" اس کی آواز بھی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

اسی اثنا میں نہ جانے کس طرف سے ایک نرس لپک کر ہمارے قریب آئی لیکن اس نے ہمیں روکنے یا ہدایات دینے کے بجائے مؤدبانہ انداز میں سلام کیا اور سرگوشی میں بولی "میڈم! مریضہ کی حالت اب کچھ بہتر ہے۔ آپ اس سے بات کرنا چاہیں گی؟ اس وقت اس کا آکسیجن ماسک بھی اُترا ہوا ہے اور ٹرینکولائزر کا اثر کم ہونے کے باوجود وہ زیادہ تکلیف میں نہیں

ہے۔"

"یہ تو تم نے بڑی خوشی کی خبر سنائی ماریا!" راحیلہ سرگوشی میں بولی "میری تو کوئی بات نہیں ہے۔ مجھے تو کبھی کبھار اس کی دو چار سرگوشیاں سننے کا موقع ملتا رہتا ہے لیکن یہ صاحب جو میرے ساتھ آئے ہیں، یہ اگر اس سے دو چار باتیں کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو بہت اچھا ہوگا۔ اس کی دماغی حالت کیسی ہے؟"

"کسی حد تک ٹھیک ہی معلوم ہوتی ہے۔ کم از کم اسے یہ یاد ہے کہ وہ اسپتال میں ہے اور اس نے یہ بھی محسوس کر لیا تھا کہ آپ اس کے پاس نہیں ہیں۔ اس نے آپ کے بارے میں پوچھا تھا۔" نرس نے جواب دیا۔

راحیلہ نے طمانیت سے سر ہلایا۔ نرس نے نہایت آہستگی سے کھٹکے دار دروازہ کھولا۔ میں نے راحیلہ کی تقلید میں جوتے باہر ہی اُتار دیے اور ننگے پاؤں شیشے کے کمرے میں داخل ہوا... اس کا فرش اتنا صاف تھا کہ اس پر بغیر جوتے کے بھی پاؤں رکھنا بُرا محسوس ہو رہا تھا۔

ہم دبے پاؤں سفید آہنی بیڈ کے قریب پہنچے۔ ہنی کا صرف چہرہ اور ایک ہاتھ سفید چادر سے باہر تھا۔ ہاتھ میں ڈرپ کی سوئی لگی ہوئی تھی۔ اس ہاتھ اور چہرے کو دیکھ کر مجھے جھرجھری سی آگئی۔ ہاتھ کیا تھا گویا کسی بڑے پرندے کا ٹیڑھا میڑا سا پنجا تھا۔ جس میں چند مُڑی تڑی ہڈیوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ چہرہ گویا کئی دن پرانی کسی لاش کا تھا جسے قبر سے نکال کر صاف کر کے پلنگ پر لٹا دیا گیا تھا۔

مجھے ہنی کی صورت اچھی طرح یاد تھی۔ وہ گوری چٹی یا بہت زیادہ خوب صورت لڑکی تو نہیں تھی لیکن اس کی شخصیت میں بلا کی کشش تھی۔ اس کی رنگت گندمی اور نقوش دلکش تھے لیکن اس وقت اس کا چہرہ محض چند اُبھری ہوئی ہڈیوں کا مجموعہ نظر آ رہا تھا جس پر کھال کی جگہ نیلے سے رنگ کی ایک جھلی چڑھی ہوئی تھی۔

میں نے جھک کر بہت قریب سے اسے دیکھا اور بڑی مشکل سے پہچانا۔ اس کے وجود کے کھنڈر میں شاید کہیں شناسائی کے کچھ موتی دفن تھے۔ میرے دل پر ایک اور چرکا لگا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا یہ وہی ہنی تھی جسے میں جانتا تھا۔

راحیلہ اس کے قریب کاؤچ پر بیٹھ گئی اور نہایت آہستگی سے اس کے بالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سرگوشی میں بولی "ہنی! میری جان، ذرا آنکھیں تو کھولو اور دیکھو کون آیا ہے۔" اس کے لہجے میں اس ماں کی سی ملائمت تھی جو اپنے برسوں کے بیمار بچے کو جگانے لگی ہو۔ ہنی نے آنکھیں نہیں کھولیں۔ اگر اس کے جسم پر ڈھکی ہوئی چادر میں نہایت خفیف سا زیر و بم نہ ہوتا تو یہ یقین کرنا بھی مشکل ہوتا کہ وہ زندہ تھی۔

ایک لمحے کے انتظار کے بعد راحیلہ آہستگی سے اس کا سر سہلاتے ہوئے بولی "ہنی! ذرا دیکھو تو افضل چوہدری آیا ہے۔ تم ایک بار اسے پوچھ رہی تھیں نا۔"

تب نہایت آہستگی سے جسم کے اس کھنڈر میں آنکھوں کے دریچے کھلے اور میرے دل پہ لگے ہوئے نئے چرکے کی اذیت کچھ اور بڑھ گئی۔ ان آنکھوں میں کوئی ویرانی سی ویرانی تھی! میں ایک بار پھر اس پر جھکا تو اس نے آہستگی سے دو تین مرتبہ پلکیں جھپکائیں۔ یہ خفیف سی حرکت زندگی کی علامت تھی پھر اس کی آنکھوں میں بھی زندگی کی رمق نظر آئی۔ شاید اب اسے میرا چہرہ صاف نظر آیا تھا۔

اس کے ہونٹوں میں ہلکی سی حرکت ہوئی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی تھی۔ اس کے بیڈ کے ایک طرف راحیلہ تھی۔ میں دوسری طرف بیٹھ گیا۔ اس کا لرزتا ہوا استخوانی سا دوسرا ہاتھ چادر کے نیچے سے باہر رینگ آیا۔ میں نے اسے تھام لیا۔ وہ گویا کسی مُردے کا ہاتھ تھا مگر بعض مُردے زندوں سے زیادہ زندگی کی علامت ہوتے ہیں اور بعض زندہ لوگ زندگی پر محض ایک تہمت ہی ہوتے ہیں۔ دیکھنے کی بات یہی ہوتی ہے کہ انسان کس طرح زندہ رہا اور اسے کس راہ میں موت آئی۔

اس کے ہونٹوں سے کچھ اس طرح آواز نکلی جیسے ان خزاں رسیدہ پتوں کے درمیان ہوا سرسرائی ہو جو ٹوٹ کر گرنے کے قریب ہوں "افضل! اچھا ہوا..... میرے مرنے سے پہلے تم آگئے۔ شاید اسی لیے سانس جسم میں اٹکی ہوئی تھی۔"

وہ خاموش ہوگئی۔ اتنا سا بولنا ہی گویا اس کے لیے ایک مشقت تھا۔ اس کی سانسیں کچھ تیز ہوتی محسوس ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر کچھ تکلیف کے سے آثار اُبھر آئے۔ راحیلہ جلدی سے بولی "ڈاکٹر یا نرس کو بُلاؤں؟" اس نے بیڈ کے پاس لگے ہوئے سرخ بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

ہنی نفی میں سر نہیں ہلا سکی کیونکہ اس کی گردن میں کالر تھا۔ معلوم نہیں اس کے لیے گردن ہلانا نقصان دہ تھا یا محض احتیاطاً یہ کالر پہنایا گیا تھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا التجا کی کہ اس کے لیے کسی کو نہ بلایا جائے۔ ایک لمحے بعد وہ سرگوشی میں بولی "ان ڈاکٹروں اور نرسوں وغیرہ نے تو مجھے زندہ رکھنے کی کوشش میں میری بچی کھچی زندگی اجیرن کر دی ہے۔"

وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔ اس کی آنکھیں سفید مصنوعی چھت کو تک رہی تھیں۔ چند لمحے کے سکوت کے بعد میں نے آہستگی سے اس کے کان کے قریب کہا "ہنی! تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھیں؟ کوئی خاص بات کرنا چاہتی تھیں؟"

"نہیں کوئی خاص بات تو نہیں تھی۔" اب اس کی سرگوشی آسانی سے سمجھ میں آ رہی تھی "میں بس یہ کہنا چاہتی تھی کہ میں نے تمہارے دوستوں نے اور دوسرے بہت سے لوگوں نے مل کر تمہارا کام کافی آسان کر دیا ہے۔ ریڈ ڈاٹ کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ لیکن تم اس فتنے کو جڑ سے ضرور ختم کرنا ورنہ تم تو کیا اس ملک میں کوئی بھی سکھ سے نہیں رہ سکے گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہے، کسی کو اندازہ نہیں ہے کہ یہ کیسا خوف ناک فتنہ ہے۔ یہ فتنہ میری ماں کو کھا گیا، میرے عدنان کو کھا گیا۔ مجھے کھا گیا اور نہ جانے کس کس کو کھا گیا۔ ان لوگوں کی صحیح تعداد کسی کو بھی معلوم نہیں جنہیں یہ اژدھا خاموشی سے کھا گیا۔ اس فتنے نے اس ملک کی بنیادوں میں بارود بچھا دیا ہے۔ تمہیں اس بارود کو بھی سمیٹنا ہے اور اس فتنے کا مکمل خاتمہ بھی کرنا ہے۔"

"تم اب اس حالت میں ان فکروں میں اپنے آپ کو اور اذیت مت دو۔" میں نے اپنی اذیت کو چھپاتے ہوئے اسے اذیت سے بچنے کی تلقین کی "تم یہ کام ہم پر چھوڑ دو۔ تمہیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ اس حالت میں تمہیں آرام کی تلقین کرنا بڑی مضحکہ خیز سی بات ہے پھر بھی میں یہی کہوں گا کہ تم اپنے ذہن کو کچھ آرام دینے کی کوشش کرو اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ تم کچھ مت سوچو۔" میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اسے اور کیا مشورہ دوں، کیا نصیحت کروں، اس کے لیے کیا کروں! میرا دل چاہ رہا تھا اسے بازوؤں پر اُٹھا کر ہوا میں اُڑتا ہوا پلک جھپکتے میں کسی ایسی جگہ لے جاؤں جہاں معجزے رونما ہوتے ہوں، جہاں بیماروں کو شفا ملتی ہو، لبِ گور انسانوں کو نئی زندگی ملتی ہو لیکن اسے ایسی کسی جگہ لے جانا میرے بس میں نہیں تھا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کر لیں پھر گویا بڑی مشکل سے انہیں کھولتے ہوئے بولی "میں نے تو خیر ان سے غداری کی تھی۔ میرا عدنان تو مکمل طور پر ان کا غلام بنا ہوا تھا۔ اسے انہوں نے صرف شک کی بنا پر میگنیٹرون شعاعوں سے جلا کر ہلاک کر دیا۔ بظاہر اس کا کچھ نہیں بگڑا تھا۔ وہ اسی طرح جیتا جاگتا دکھائی دے رہا تھا لیکن درحقیقت وہ کسی جانور کی طرح روسٹ ہو چکا تھا۔"

میں عدنان کو نہیں جانتا تھا لیکن ہنی نے ہی کافی عرصے پہلے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس کی لڑکپن کی محبت تھا۔ وہ بہت لائق الیکٹرانک انجینئر تھا۔ نہ جانے کب اور کس طرح ریڈ ڈاٹ کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ وہاں وہ ہنی کو بھی نہیں پہچانتا تھا، نہ جانے اس پر کیا گزری تھی لیکن ہنی اس معاملے میں افسانوی سی لڑکی تھی۔ وہ خواہ کیسے ہی ماحول میں رہی تھی اور زندگی میں کیسے ہی نشیب و فراز سے گزری تھی مگر اس شخص سے اس کا عشق ختم نہیں ہوا تھا۔ ناقابلِ یقین سی بات تھی کہ زندگی کا بیشتر حصہ طوائفانہ ماحول میں گزارنے کے باوجود وہ ایسا افسانوی سا عشق کرنے کی اہل تھی۔ مجھے ان لوگوں پر رشک آتا تھا جن سے کوئی ایسا لازوال عشق کرتا تھا۔

میں نے اس کے سرد استخوانی ہاتھ کو اپنے ہاتھ سے زندگی کی حرارت پہنچانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "ہنی! میری دوست۔ میری محسن! تم اطمینان رکھو۔ اب ان سے حساب ہوگا اور ہر چیز کا حساب ہوگا۔"

"مجھے تمہاری زبان سے صرف یہی سننے کے لیے تمہارا انتظار تھا۔ اب میں سکون سے مر سکوں گی۔"

اس نے طمانیت بھرے انداز میں آنکھیں بند کر لیں لیکن اس کی طمانیت گویا راحیلہ کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ وہ اس پر جھکتے ہوئے بے تابانہ سرگوشی میں بولی "ہنی، ہنی!" لیکن ہنی نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی آنکھیں کھولیں۔ راحیلہ اس کی نبض دیکھنے لگی پھر اس نے شیشے کی دیواروں سے باہر کھڑی نرس کو اشارہ کیا۔ وہ تیزی سے اندر آئی۔ اس نے ہنی کے جسم سے منسلک دو تین مشینوں کے ڈائلز پر لرزتی سوئیوں کو دیکھا اور جلدی سے اس کے منہ پر آکسیجن کا ماسک لگا دیا پھر اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں راحیلہ کو اشارہ کیا۔ راحیلہ مجھے ساتھ لے کر شیشے کے کیبن سے باہر آگئی۔

پھر ہم آئی سی یو سے بھی باہر آگئے اور ایک بالکونی میں جا کھڑے ہوئے۔ وہاں سے اسپتال کے ایک حصے کا سرسبز اور صاف ستھرا لان نظر آ رہا تھا۔ لان کے قریب ہی ایک وارڈ کے دروازے پر ایک ایمبولینس کھڑی تھی۔

چند لمحے کی بوجھل سی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "ہنی کا اس حالت کو پہنچنے کا اصل سبب کیا ہے؟"

"اس کے جسم میں چار گولیاں پیوست ہوئی تھیں۔" وہ افسردگی سے بولی "تین تو سرجری کے ذریعے نکال لی گئیں۔ چوتھی اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پیوست ہے۔ اس کی پوزیشن ایسی ہے کہ ماہر نیورو سرجنز کا خیال ہے، اسے چھیڑنے کی صورت میں فوری طور پر ہنی کی موت واقع ہو سکتی ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ باقی تینوں گولیاں نکالنے کے لیے ہنی کے جو آپریشن ہوئے، وہ بھی بہت ہی نازک قسم کے تھے۔ انہوں نے بھی اسے موت کے دہانے پر پہنچا دیا ہے۔ گولی کا زہر بھی اس کے جسم میں پھیل رہا ہے۔ کئی مرتبہ اس کا بلڈ ٹرانسفیوژن ہو چکا ہے۔ اس کے باوجود انفیکشن نہیں رک رہا۔ اس کا ذہن بھی کبھی کبھی بالکل جواب دے جاتا ہے۔ وہ بالکل ہی کوئی بات نہیں کر سکتی یا پھر خواب کے سے عالم میں کچھ بے ربط سی باتیں کرتی ہے۔ اس کے ذہن اور جسم پر جو کچھ گزر چکی ہے اس کے بعد اس نے جتنی باتیں کر لی ہیں وہ بھی غنیمت ہیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اصل المیہ یہ ہے کہ اسے ہماری ہی چلائی ہوئی گولیاں لگی ہیں۔"

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

وہ متاسفانہ سے انداز میں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "ریڈ ڈاٹ والوں نے اسے اس کی غداری کی یہ سزا دی کہ جب ہم ان کے زیرِ زمین ٹھکانے تک پہنچے اور ان کے ساتھ ہمارا معرکہ جاری تھا تو انہوں نے اسے گولیوں کی بارش میں دھکیل دیا۔ وہ بھی

اس عالم میں ہو کہ ہم اسے پہچان نہیں سکتے تھے۔ یہ تو معجزہ ہی ہے کہ گولیوں کی ایسی بوچھار میں یہ زندہ بچ گئی۔"

"تم خواہ اختصار سے ہی سہی لیکن مجھے سب کچھ بتاؤ۔ آخر یہ سب ہوا کس طرح؟" میں نے اُلجھن سے کہا۔

"یہاں کھڑے کھڑے یہ باتیں نہیں ہو سکتیں۔ آؤ گھر چلتے ہیں۔" وہ بولی۔

"گھر؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا "کیا یہاں تمہارا کوئی گھر بھی ہے؟"

"انسان جہاں بھی کچھ عرصے کے لیے رکتا ہے' وہاں رہنے کا کوئی ٹھکانا تو بنانا ہی پڑتا ہے۔ وہ انسان کا گھر ہی کہلائے گا۔ میرے خیال میں تو جہاں سر چھپانے کو جگہ مل جائے اسے گھر ہی سمجھنا چاہیے۔" اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور آئی سی یو سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دی۔

"تم بھی اچھی خاصی فلسفی ہوتی جا رہی ہو۔" میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ہر عمل کی بنیاد کسی نہ کسی فلسفے پر ہوتی ہے۔ اگر زندگی میں سے فلسفے کو بالکل ہی نکال دیا جائے تو یہ ایسی ہی رہ جائے گی جیسے رس کے بغیر گنا...... بالکل پھوکٹ۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی اور آہستگی سے سیڑھیاں اُترنے لگی۔

میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا مگر سیاہی میں لپٹی ہوئی ایک گول سی چیز کے سوا میرے سامنے کچھ نہیں تھا۔ کسی ایسے انسان سے بات کرنا ایک عجیب تجربہ ہوتا ہے جو آپ کے سامنے موجود ہو مگر آپ اس کا چہرہ نہ دیکھ سکتے ہوں۔ صرف آواز آپ تک پہنچ رہی ہو۔

"اس وقت تم سے بات کرتے ہوئے مجھے ریڈ ڈاٹ کے باس ون اور باس ٹو یاد آ رہے ہیں۔" میں نے کہا "ان کے کندھوں پر سر کی جگہ بڑا سا ایک سفید انڈا رکھا ہوتا تھا۔ اس میں سے آواز برآمد ہوتی تھی۔ کوئی چہرہ' کوئی تاثر نظر نہیں آتا تھا۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہارے کندھوں پر سفید کی جگہ سیاہ انڈا رکھا ہوا ہے اور یہ سائز میں اس سے کچھ چھوٹا ہے۔ نیز اس پر کوئی نمبر درج نہیں ہے اور یہ انڈے کی طرح ہموار نہیں ہے۔"

"تم نے خوب یاد دلایا۔ باس ون کی لاش بھی یہیں موجود ہے۔ اسے خاص طور پر کچھ لوگوں کے معائنے کے لیے اور غیر معینہ عرصے تک محفوظ رکھنے کے لیے یہاں لایا گیا تھا کیونکہ لاہور میں اس مقصد کے لیے زیادہ بہتر سہولتیں موجود نہیں تھیں۔ تم دیکھنا پسند کرو گے؟"

"ضرور" میں نے بلا تامل کہا۔

وہ سیڑھیاں اُتر کر آئی سی یو کے بیرونی دروازے سے نکلنے کے بعد بائیں طرف مڑ گئی۔ راستے میں وہ بولی "ہم نے ہنی کی بہت حفاظت کی ہے اور پوری کوشش کی ہے کہ اس کے زندہ بچ جانے کی خبر ریڈ ڈاٹ والوں تک نہ پہنچے۔ اس مقصد کے لیے ہم نے ہنی کی تدفین کا ڈراما بھی رچایا۔ خدا ہمیں معاف کرے۔ اس کے علاوہ ہم نے اخباروں میں چھوٹی سی خبر بھی چھپوائی کہ عالمی شہرت یافتہ ڈانسر پرنسس تمینہ پراسرار حالات میں انتقال کر گئیں۔ بظاہر یہی معلوم ہوا جیسے وہ خبر لیک آؤٹ ہو کر چھپی ہو۔ شاید ہماری یہ کوشش کامیاب رہی۔ وہ ہمارے ہاتھوں میں محفوظ رہی اور وقفے وقفے سے ہمیں اس سے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوتی رہیں۔"

"اب اس کا نہ تو یہاں پر آپریشن کا کوئی امکان ہے اور نہ ہی اسے باہر لے جایا جا سکتا ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی "تم سن ہی چکے ہو۔ وہ کسی بھی قسم کی نقل و حرکت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ خواہ اس میں کتنی ہی احتیاط برتی جائے۔ اب اس کے اسی حالت میں زیادہ سے زیادہ زندہ رہنے کا امکان ہے۔ ہماری کوئی بھی اور کوشش اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔"

اس وقت ہم ایک اور پارکنگ لاٹ سے گزر رہے تھے۔ میں نے غیر ارادی طور پر مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا "بے شک یہ خبر میرے لیے خوشی کا باعث ہے کہ ریڈ ڈاٹ کی کمر ٹوٹ چکی ہے لیکن اس کے ساتھ جتنی بُری خبریں سننے کو ملی ہیں۔ انہوں نے میرے سینے میں آگ سی دہکا دی ہے۔ صفدر مر چکا ہے۔ سلیمان کا بازو کٹ گیا ہے۔ تمہارا آدھا چہرہ سیاہ نظر آ رہا ہے۔ ہنی کی حالت قابلِ رحم ہے۔ بخدا میرا دل چاہ رہا ہے اس شہر کو آگ لگا دوں۔ شاید اس طرح میرے دل میں دہکتی ہوئی آگ کچھ ٹھنڈی ہو۔"

وہ ایک جھٹکے سے رک گئی اور اس نے تیزی سے گردن گھُما کر میری طرف دیکھا "یہ کیا احمقانہ بات کی ہے تم نے۔" وہ تیز سی سرگوشی میں بولی "اس میں شہر کا کیا قصور ہے جو اسے آگ لگا دی جائے؟ ویسے بھی شہروں کو آگ لگانے والے تو اس ملک میں بہت پڑے ہیں۔ ہم تو اس آگ کو بجھانے کی کوشش کر رہے ہیں جو ہمارے ان مہربان شہروں' بلکہ ہمارے اس پورے ملک کو لپیٹ میں لینے والی تھی جو ہماری پناہ گاہ ہے۔"

اس کی آواز نیچی تھی لیکن وہ ایک استاد کی طرح مجھے ڈانٹ رہی تھی "مجھے حیرت ہوئی ہے تمہارے منہ سے یہ الفاظ سُن کر۔ تم نے تو پیشہ ور دہشت گردوں کی سی بات کی ہے۔ ان پر اپنے اعمال کی بدولت بھی کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ شہروں کو آگ لگانے کی باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔ ہم پر تو اگر تھوڑی بہت تباہی آئی بھی ہے تو وہ اپنے اعمال کے باعث نہیں بلکہ ایک نیک مقصد کے لیے آئی ہے۔ ہمارے ساتھیوں سے کہیں زیادہ نفیس صاحب کے آدمی مرے ہیں۔ اس کے باوجود ہمیں یہ سودا مہنگا محسوس نہیں ہوا کیونکہ ہم ریڈ ڈاٹ کی کمر توڑنا تو درکنار' اس کا بال بیکا کرنے کا بھی تصور نہیں کر پا رہے تھے۔ یہ تو بس ایک معجزہ سا ہی ہو گیا۔"

پھر وہ آگے قدم بڑھاتے ہوئے قدرے ملائمت سے بولی "ویسے بھی آگ لگانا بہت آسان کام ہے۔ آگ بجھانا بہت مشکل ہے۔"

میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "شاید میں وہ نہیں کہہ پایا جو کہنا چاہ رہا تھا۔ دراصل ایک طویل عرصے سے میں ایک عجیب سی بے بسی کا شکار ہوں۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ میں کچھ کر گزروں۔ صورتِ حال فیصلہ کن ہو جائے۔ ہم اپنے معمولات کی دنیا میں لوٹ جائیں لیکن میرے وجود میں جو بھی تھوڑی بہت طاقت ہے۔ میرے دل میں جو لاوا اُبل رہا ہے اسے کوئی صحیح سمت نہیں مل رہی۔ کوئی راستہ نہیں مل رہا۔"

"ملے گا ضرور ملے گا۔" وہ بڑے تحمل اور وقار سے بولی "حالات اپنے منطقی انجام کی طرف جا رہے ہیں۔ اس جوش' جذبے اور طاقت کو بچا کر رکھو۔ یہ وحشت کوئی کارنامہ سرانجام دینے میں بڑی کام آتی ہے۔ بشرطیکہ کسی منفی راستے پر نہ پڑ جائے۔"

"ویسے بائی دا وے تم میں اتنی بزرگی کہاں سے آ گئی؟" میں نے کہا۔

"تم اگر غور کرو تو شاید تمہیں احساس ہو کہ مجھے لڑکپن سے ہی تمہارے مقابلے میں اپنے جذبات پر زیادہ قابو رہا ہے۔" وہ بدستور پُرسکون لہجے میں بولی۔ میں نے زبان سے تو نہیں کہا لیکن دل ہی دل میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔

اس دوران ہم ایک ایسی مستطیل عمارت کے سامنے پہنچ چکے تھے جس کی بیرونی دیوار سفید ماربل کی تھی۔ دروازہ شیشے اور المونیم کا تھا۔ اس بلاک کی پیشانی پر کوئی بورڈ وغیرہ نظر نہیں آ رہا تھا اور نہ ہی کچھ لکھا تھا۔ اندر بھی اندھیرا دکھائی دے رہا تھا لیکن اس کے دروازے پر ایک کے بجائے دو مسلح محافظ موجود تھے۔

وہ یقیناً راحیلہ کو پہچانتے تھے مگر انہوں نے اس کے لیے راستہ نہیں چھوڑا۔ راحیلہ نے انہیں وہ کمپیوٹرائزڈ کارڈ دکھایا جس پر اس کی ننھی سی تصویر چسپاں تھی۔ تب ان میں سے ایک نے واکی ٹاکی نکالا اور کسی کو اطلاع دی "میڈم آئی ہیں۔"

چند سیکنڈ بعد ہی سفید یونیفارم میں ایک ادھیڑ عمر اور گنجا سا شخص قدرے لنگڑاتا ہوا ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں راحیلہ کو سلام کیا اور ایک خوب صورت نقرئی چابی سے مقفل دروازہ کھولا۔ اندر قدم رکھنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مُردہ خانہ تھا۔ یہاں مُردے یقیناً ان گنت زندہ لوگوں سے زیادہ صاف ستھرے اور محفوظ ماحول میں رہ رہے تھے۔

گنجے نے لائٹس آن کر دیں اور دودھیا سی روشنی ہر طرف پھیل گئی۔ اندر کی فضا میں یخ بستگی تھی۔ میرے جسم میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ ہمارے سامنے ایک دیوار سی کھڑی تھی جس میں لاکرز کی طرح بڑے بڑے خانے نظر آ رہے تھے۔ ان پر نمبر پڑے ہوئے تھے۔

"نمبر گیارہ" راحیلہ نے اس دیوار کے قریب پہنچ کر کہا۔

گنجے نے گیارہ نمبر خانے کا ہینڈل پکڑ کر باہر کھینچا۔ لمبا سا ایک تابوت نما صندوق باہر آ گیا۔ اس میں اس طرح سفید بخارات اُٹھ رہے تھے جیسے فریزر میں اُٹھتے ہیں۔ درحقیقت وہ لمبوترے فریزر ہی تھے۔ ان میں لاشیں موجود تھیں۔

جو فریزر باہر آیا' اس میں موجود لاش پلاسٹک کے تھیلے میں لپٹی ہوئی تھی۔ صرف اس کا سر تھیلے سے باہر تھا۔ وہ یقیناً سفید فام تھا۔ اس وقت بھی اس کا چہرہ سفید ہی نظر آ رہا تھا لیکن یہ سفیدی کچھ اور طرح کی تھی۔ اس کا چہرہ پلاسٹر آف پیرس سے بنا دکھائی دے رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا اس کی لاش کب سے فریزر میں تھی۔ ممکن تھا اس کی یہ حالت فریزر میں رہنے ہی کی وجہ سے ہوئی ہو یا پھر شاید اس پر کچھ کیمیائی عمل بھی کیے گئے تھے۔

دوسری خاص بات اس کے چہرے میں بس یہی تھی کہ اس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح مڑی ہوئی تھی۔ اس کا منہ گو کہ کھُلا ہوا نہیں تھا اور نہ ہی اس سے نوکیلے دانت جھانک رہے تھے اس کے باوجود نہ جانے کیوں اس کے چہرے کا تاثر ڈریکولا جیسا تھا۔ اسے ذرا گہری نظر سے دیکھتے ہوئے یہی گمان گزرتا تھا کہ ڈریکولا حسبِ روایت دن میں میٹھی نیند سو رہا تھا اور رات ہوتے ہی وہ اُٹھ کھڑا ہو گا اور خون پینے کے لیے شکار کی تلاش میں نکل جائے گا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا "اس کا مطلب ہے اس کے سر کی جگہ وہ جو بڑا سا انڈا نظر آتا تھا وہ ماسک ہی تھا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔"

"ہاں' وہ ایک نہایت ہی عجیب اور پیچیدہ ساخت کا ماسک تھا۔" راحیلہ بولی "اس کی بیرونی سطح انڈے کے چھلکے ہی کی طرح تھی مگر اس میں انسانی جلد کی طرح مسام تھے اور ہوا اندر جانے کا نظام موجود تھا۔ ہوا کے ساتھ ہی آواز کی لہریں بھی جمع ہو کر اندر پہنچتی تھیں۔ نقاب پوش کی ناک کے دونوں نتھنوں کے قریب ہوائی نالیاں اور کانوں کے قریب ایئر فون موجود رہتے تھے۔ اس کے علاوہ اس سفید خول پر سامنے ہی جلی انداز میں "ایک" نمبر سیاہ رنگ میں لکھا نظر آتا تھا۔ اسی نمبر کے درمیان ننھا سا ایک عدسہ چھُپا ہوا تھا۔ اس عدسے کے ذریعے اس شخص کے سامنے پورا منظر رہتا تھا۔ اس خول کے اندر نہایت پیچیدہ قسم کا الیکٹرانک نظام پھیلا ہوا تھا۔ وہ ایک انوکھی اور انتہائی جدید چیز ضرور تھی لیکن کوئی طلسماتی قسم کی چیز بہرحال نہیں تھی۔"

"وہ ماسک اس وقت ہے کہاں؟" میں نے دریافت کیا۔

"مختلف لیبارٹریز میں معائنوں وغیرہ کے مراحل سے گزر رہا ہے۔" راحیلہ نے بتایا۔

"اس کا مقصد میری سمجھ میں اب بھی نہیں آیا۔ وہ شخص اس

ماسک کے بغیر بھی تو مجھ سے بات چیت کرسکتا تھا۔" میں نے کہا۔

"شاید اس میں کوئی ایسی مصلحت بھی ہو جسے ہم ابھی سمجھ نہ سکے ہوں۔ فی الحال میرا اندازہ تو یہی ہے کہ اس قسم کی تمام ڈرامے بازیوں کا سب سے بڑا مقصد تو سامنے والے کو مرعوب کرنا اور نفسیاتی طور پر ایک طرح سے اپنے ٹرانس میں لانا ہوتا تھا۔ مرعوب انسان کو اپنا آلۂ کار بنانا زیادہ آسان ہوتا ہے۔ صرف اس لیے بھی ان کے اکثر کاموں میں بہت زیادہ گھماؤ پھراؤ دیکھنے میں آتا تھا۔ سائنسی شعبدہ بازیوں کی مدد سے وہ اپنے آپ کو ایک مافوق الفطرت سی طاقت بنا کر پیش کرنا چاہتے تھے تاکہ لاشعوری طور پر ان کے شکار کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ وہ ناقابلِ شکست ہیں، چنانچہ وہ اپنی شناخت کو چھپانے کے لیے بھی بہت زیادہ ڈرامائی قسم کے طور طریقے اختیار کرتے تھے۔"

پھر راحیلہ مُردہ خانے کے اٹینڈنٹ کو فریزر بند کرنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی "اس کے علاوہ کسی بھی تنظیم کے طور طریقوں کے پیچھے اس شخصیت کی نفسیات بہت کام آتی ہے جو اصل میں اس تنظیم کی سربراہ ہوتی ہے جس کے ہاتھ میں ساری پاور اور تمام اختیارات ہوتے ہیں۔ تنظیم کے طور طریقوں میں اس کا عکس ضرور نظر آتا ہے۔ ہمارا اندازہ ہے کہ اس تنظیم کے پیچھے جو بھی شخصیت نمبر ون ہے، وہ یا تو خود سائنس داں ہے یا سائنس اس کی کمزوری ہے لیکن اس کی ذہنیت مافیائی ہے۔ فی الحال تو پانچ چھ سفید فام قومیں مل کر اس تنظیم کو بورڈ آف گورنرز کی طرح چلا رہی ہیں اور اس کے ذریعے دنیا پر اپنا تسلط قائم کرنے کی منصوبہ بندی کررہی ہیں لیکن ممکن ہے بعد میں تنظیم کو چلانے والی شخصیت اتنی طاقتور ہوجائے کہ وہ اکیلی ان پانچوں قوموں کو بھی انگلیوں پر نچانے لگے۔ شاید یہی قدرت کا انتقام ہو۔ یہی مکافاتِ عمل ہو۔"

پھر وہ ذرا آگے بڑھتے ہوئے بولی "ایک بات البتہ ہمیں تقریباً یقینی حد تک معلوم ہوچکی ہے اور وہ بڑی حیرت انگیز ہے۔"

"وہ کیا؟" میں نے فوراً پوچھا۔

"وہ شخصیت عورت ہے۔" راحیلہ میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ عین ممکن ہے وہ اس وقت پسِ نقاب مسکرائی بھی ہو۔

"عورت واقعی بڑی ترقی کرگئی ہے۔" میں نے اس ٹھنڈے ماحول میں مزید ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بعض لوگ کہتے ہیں عورت کو زندگی کے تمام معاملات میں مرد کے شانہ بہ شانہ چلنا چاہیے۔ میرا خیال ہے بعض معاملات میں تو وہ مرد کا شانہ توڑ کر آگے نکل گئی ہے۔"

"جیلس ہوگئے؟" راحیلہ نے ملائمت سے پوچھا۔

"بہت غلط سمجھ رہی ہو تم۔" میں نے مغموم انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھ میں جیلس ہونے کا.... خصوصاً عورت سے جیلس ہونے کا تو مادہ ہی نہیں ہے۔"

اس دوران اٹینڈنٹ نے راحیلہ کا اشارہ پاکر ایک اور فریزر کھول دیا تھا۔ اس میں ایک چمپینزی کی لاش تھی۔ ریڈ ڈاٹ کے اس طرح کے چمپینزیوں سے مجھے بارہا واسطہ پڑچکا تھا۔ انہوں نے میرا اور میرے دو تین ساتھیوں کا خوب ناک میں دم کیا تھا۔ میرا ایک ساتھی آفتاب ایسے چمپینزی کے ہاتھوں مارا بھی گیا تھا۔ چمپینزی نے ایک خون خوار درندے کی طرح اسے ادھیڑ کر رکھ دیا تھا جبکہ عام حالات میں ان چمپینزیوں میں انسانوں کی سی ذہانت کے مظاہرے دیکھنے میں آتے تھے۔ میں نے انہیں ہر کام انسانوں کی طرح کرتے دیکھا تھا۔ ریڈ ڈاٹ والے انہیں بلیک برڈ کہتے تھے۔

"ایسے کئی چمپینزی ریڈ ڈاٹ کے پاس موجود تھے۔" راحیلہ نے بتایا "ہمارے اور نفیس صاحب کے آدمیوں کے ہاتھوں پانچ تو مارے گئے تھے۔ شاید ابھی کچھ اور بھی باقی ہوں۔ ریڈ ڈاٹ والے شاید کسی خاص مقصد کے تحت ایسے چمپینزیوں کی بھی ایک کھیپ تیار کررہے تھے۔ ان کے دماغ کا کوئی بہت ہی نازک آپریشن کیا گیا تھا اور ہر ایک کے دماغ میں کچھ مائیکرو چپس ڈالے گئے تھے۔ ہمارے نیورو سرجنز ابھی تک اس آپریشن کی نوعیت کو نہیں سمجھ سکے۔"

"ان سلسلوں میں دماغ کھپانا میرے خیال میں اتنا ضروری نہیں۔" میں نے کہا "اصل مسئلہ تو اس فتنے کا خاتمہ ہے۔ مجھے اپنی واپسی پر جہاں کچھ صدمے اٹھانے پڑے ہیں وہاں یہ بہت بڑی خوش خبری ملی ہے کہ ان کا ایک زیرِ زمین قلعہ تباہ ہوگیا اور اتنے لوگ مارے گئے۔ میں نے تو اتنی کامیابی کا تصور نہیں کیا تھا۔ میرا حوصلہ بہت بڑھ گیا ہے۔ اب باقی کام بہت آسان محسوس ہونے لگا ہے۔ اب مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی کہ ان کے چمپینزی اتنے سمجھدار کیوں تھے۔ ان کے آدمی اُڑتے کس طرح تھے۔ وہ گول گول نقرئی پلیٹیں ہر چیز کو کس طرح چیرتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ یا ان کی دوسری بہت سی سائنسی شعبدے بازیوں کے فارمولے کیا تھے۔ ان چیزوں کی جو تھوڑی بہت مرعوبیت تھی اب تو وہ بھی ذہن سے نکل گئی ہے۔ میرا یہ یقین کچھ اور پختہ ہوگیا ہے کہ اگر ہم سچائی پر ہیں اور کسی اچھے مقصد کے لیے کام کررہے ہیں تو تمامتر کم مائیگی اور بے سروسامانی کے باوجود آخری فتح ہماری ہوگی، چاہے ان لوگوں کے پاس ان گنت سائنسی شعبدے ہوں، تباہ کن چیزیں ہوں اور خواہ وہ کتنے ہی منظم و ترقی یافتہ ہوں۔"

"میرے محسوسات بہت پہلے سے یہی ہیں۔ اسی لیے تو میں کبھی زیادہ پریشان اور فکرمند نہیں ہوتی۔ مجھے ایک عجیب سا اطمینانِ قلب حاصل ہے۔" راحیلہ بولی۔

پھر اس نے اٹینڈنٹ کو اشارہ کیا۔ اس نے فریزر بند کردیا۔ راحیلہ بولی "دو تین لاشیں اور بھی یہاں موجود ہیں لیکن وہ زیادہ اہم لوگوں کی نہیں ہیں۔ انہیں صرف مشاہدے اور تجزیے کے لیے یہاں محفوظ کیا گیا تھا کیونکہ ان میں سے بھی کسی کے دماغ پر اور کسی کے جسم پر کوئی حیرت انگیز اور ناقابلِ فہم سا آپریشن کیا گیا

ہے۔ مجھے ایک یہ بات بھی بہت عجیب سی لگی ہے کہ ریڈ ڈاٹ میں کئی بہت ہی کمال کے سرجن موجود تھے جو طلسماتی قسم کے آپریشن کرسکتے تھے۔ تنظیم میں انہیں بہت اہم مقام حاصل تھا۔ یہ بھی گویا ان کی حکمتِ عملی کا کوئی خاص حصہ تھا۔ معلوم نہیں مستقبل میں ان کا ان سرجنوں سے کیا کیا کام لینے کا ارادہ تھا۔"

"ان کے عزائم تو شاخ در شاخ پھیلے ہوئے جنگل کی طرح تھے۔ معلوم نہیں وہ کس کس محاذ پر کیا کیا کرنا چاہتے تھے۔" پھر میں نے گویا خود ہی اپنی خوش فہمی دور کرنے کی غرض سے کہا "ہم تو ان کے لیے اس طرح "تھے" کا صیغہ استعمال کررہے ہیں جیسے ان کا پوری طرح قلع قمع ہوگیا ہے۔ ابھی تو یہ تلوار ہمارے سر پر لٹک رہی ہے۔ میرا خیال ہے اس سانپ نے ایک شدید چوٹ کھانے کے بعد بِل میں سر چھپالیا ہے۔"

"ہم کسی خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہیں۔" راحیلہ بولی "بہرحال اب یہ امید ضرور ہے کہ جہاں اتنی کامیابی ہوئی ہے وہاں مزید کامیابی بھی حاصل ہوجائے گی۔"

ہم دونوں مُردہ خانے کے سرد ماحول سے نکل آئے۔ فریزروں سے باہر بھی وہاں اچھی خاصی ٹھنڈ تھی۔ باہر آکر حرارت کا احساس ہوا۔ میں راحیلہ کی رہنمائی میں ایک معقول قسم کے کوارٹر تک پہنچا جسے قدرے حسنِ ظن کے ساتھ بنگلا بھی کہا جاسکتا تھا۔ یہ بنگلہ اسپتال کی حدود میں ہی تھا۔ اس میں چھوٹا سا لان بھی تھا جس پر بڑے خوب صورت رنگا رنگ پھول کھلے تھے۔

پورچ میں داخل ہوتے ہوئے راحیلہ بولی "اصل میں یہ بنگلہ اسپتال کے ایک ڈاکٹر کو ملا ہوا ہے۔ وہ آج کل ایک لمبے کورس کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے اور میں یہاں پناہ گزیں ہوں۔"

لان کے ایک کونے میں ایک مالی بیٹھا کُھرپی سے کیاری درست کررہا تھا۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ میں نے راحیلہ کے ساتھ برآمدے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "لان کی حالت بتاتی ہے کہ مالی بہت محنتی ہے۔"

راحیلہ ہولے سے ہنس دی اور برآمدے میں رکتے ہوئے بولی "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ یہ مالی نہیں ہے۔ یہ میرا باڈی گارڈ ہے لیکن اس کی ڈیوٹی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب میں رات کو سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی جاتی ہوں۔ اس کے بعد یہ میرے گھر سے نکلنے تک گھر کے چاروں طرف بھوکے چیتے کی طرح چکر لگاتا ہے۔ فلسفہ اس کے پیچھے یہ ہے کہ جاگتے میں تو میں اپنی حفاظت خود اچھی طرح کرسکتی ہوں البتہ سوتا ہوا انسان مُردے برابر ہوتا ہے اسی لیے نفیس صاحب نے اس کی ڈیوٹی لگائی ہے کہ یہ اس دوران میری حفاظت کرے جب میں مُردے برابر ہوتی ہوں۔ حالانکہ میرا خیال ہے میں اس وقت بھی مُردے برابر ہرگز نہیں ہوتی۔"

ہم نے جب پہلے سے کُھلے گیٹ سے اندر قدم رکھا تھا مالی کو یقیناً اسی وقت ہماری آمد کا پتا چل گیا تھا لیکن وہ پوری طرح گردن گھما کر ہماری طرف دیکھنے کے بجائے محض ذرا سا ترچھا ہوکر نامحسوس سے انداز میں دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ وہ باریش معلوم ہوتا تھا۔ سر پر پرانے کپڑے کی مختصر سی پگڑی تھی۔ وہ غالباً نوجوان ہی تھا۔

راحیلہ اس کے بارے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "ویسے یہ ہے بڑے کمال کا آدمی! جنات کے قبیلے سے معلوم ہوتا ہے۔ رات بھر دو تین گنوں سے مسلح ہوکر پہرا دیتا ہے۔ دن میں بھی جب دیکھو اِدھر اُدھر کسی نہ کسی چیز میں ہاتھ مارتا پھرتا رہتا ہے۔ معلوم نہیں سوتا کس وقت ہے۔ میرا خیال ہے میں تمہیں اس سے ملوا ہی دوں تو بہتر ہوگا۔"

اب چونکہ آس پاس کوئی نظر نہیں آرہا تھا اس لیے راحیلہ تقریباً آنکھوں تک چڑھا ہوا نقاب ہٹاچکی تھی۔ بڑے بڑے تاریک شیشوں والا چشمہ البتہ ابھی ناک پر ٹکا ہوا تھا۔ اب اس کے چہرے کا صرف ایک چوتھائی حصہ سرخ و سفید دکھائی دے رہا تھا۔ گویا اب مضحکہ خیزی نے ایک اور زاویہ اختیار کرلیا تھا۔

راحیلہ نے بارعب لہجے میں پکارا "اے مالی! اِدھر آؤ۔"

وہ شخص جو راحیلہ ہی کے بیان کے مطابق محض شغل کے طور پر مالی کے کام سے دل بہلا رہا تھا، کُھرپی رکھ کر نہایت آہستگی سے اٹھ کر ہماری طرف گھوما۔ اس کی یہ آہستگی اس کی سست طبعی یا بے دلی کی نشاندہی نہیں کررہی تھی، اتنا مجھے اندازہ ہوگیا تھا۔ اس کا انداز درحقیقت کچھ ایسا تھا جیسے اسے پیچھے سے کسی شخص نے گن کی زد پر لے رکھا ہو اور وہ نہایت احتیاط سے حرکت کررہا ہو۔ پھر وہ نپے تلے انداز میں قدم اُٹھاتا قریب آگیا۔

وہ عین میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ہم دونوں چند سیکنڈ ایک دوسرے کو بغور دیکھتے رہے پھر یکدم بازو پھیلا کر بڑھے اور بغلگیر ہوگئے۔ اس کی ڈھیلی ڈھالی واسکٹ کی دونوں جیبوں میں یقیناً پسٹل موجود تھے جن کی چبھن میں نے اپنی پسلیوں پر محسوس کی۔ راحیلہ بڑی خوش دلی سے ہنس رہی تھی۔

ہم جب پُرجوش معانقہ کرچکے اور ایک دوسرے کی پسلیاں کڑا کڑا کر الگ ہوچکے تب بھی چند لمحے تک ایک عجیب سی خوشی کے ساتھ ایک دوسرے کا سراپا جائزہ لیتے رہے۔

راحیلہ بولی "کیسا لگا تمہیں ہمارا یہ مالی؟"

"تمہارے لیے بڑی خوشی اور فخر کا مقام ہے کہ تمہیں ایسے مالی کی خدمات حاصل ہیں۔" میں نے کہا۔

"مالی بھی ایسا جس کے لیے مال کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "یعنی مجھ غریب کو تو تنخواہ تک دینے کا تکلف نہیں کیا جاتا۔ حالانکہ ڈیوٹیاں بھی دو دو دیتا ہوں۔ دن میں مالی، رات میں گارڈ بلکہ کبھی کبھی تو مزدور کے فرائض بھی

انجام دینے پڑتے ہیں۔"

"شکوے گلے بعد میں ہوتے رہیں گے' اب تم دونوں اندر چلو۔" راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔

مالی جو درحقیقت ٹونی تھا' اپنے مٹی میں لتھڑے ہوئے ہاتھ واسکٹ پر رگڑ کر صاف کرتے ہوئے ہمارے ساتھ چل پڑا۔ راحیلہ اندرونی دروازے کا تالا کھولنے لگی تو ٹونی ڈور میٹ پر گرد آلود جوتے صاف کرتے ہوئے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "چلیں آپ کی آمد کی خوشی میں آج ہمیں بھی میڈم راحیلہ کے گھر میں داخل ہونے اور ان کے ہاتھوں سے اپنی کچھ خاطر تواضع کرانے کا موقع مل جائے گا ورنہ ہماری دوڑ تو سرونٹ کوارٹر سے لان تک ہی رہتی ہے یا پھر رات کو احمقوں کی طرح اس مکان کے گرد طواف کرتے رہتے ہیں۔"

"میرے ہاتھوں سے خاطر تواضع کرانے کی تم نے اچھی کہی۔" راحیلہ دونوں ہاتھ مسل کر ان پر پھونک مارتے ہوئے بولی "تم نے اگر اپنی اوقات بھولنے کی کوشش کی تو واقعی میں اپنے ہاتھوں سے تمہاری "خاطر تواضع" کروں گی۔" اس نے کراٹے کے اسٹائل میں اسے ہاتھ دکھایا۔

ٹونی میری طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "لگتا ہے آپ کی آمد سے بھی اپنی اوقات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔"

"اس پر مجھے بھی شرمندگی ہے۔" میں نے اپنا لہجہ حتی الامکان شرمسارانہ بناتے ہوئے کہا "مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میں اپنی عدم موجودگی میں اتنا ڈی گریڈ ہو چکا ہوں۔"

ہم اندر پہنچ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ چکے تو راحیلہ نے برقع اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔ اب میں نے صحیح طور پر اس کا جائزہ لیا۔ وہ یوں تو ٹھیک ٹھاک ہی دکھائی دے رہی تھی لیکن محض آدھا چہرہ سیاہ ہونے سے اس کی شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔ وہ کچھ عجیب عجیب سی لگنے لگی تھی۔

وہ جوتے اُتار کر دور پھینکتے ہوئے بولی "اِن! مذاق ایک طرف۔ اب تم سنجیدگی سے بتاؤ تم بالکل ٹھیک ہو نا؟ تمہیں زیادہ تکلیف تو اُٹھانا نہیں پڑی؟ ہم سب ساتھی گو کہ یہاں بہت بُری طرح اُلجھے ہوئے تھے لیکن ہمارے ذہن تم میں ہی الجھے ہوئے تھے۔ ہم سب تمہاری طرف سے زیادہ فکرمند تھے۔ ہمیں اپنی جانوں کی اتنی فکر نہیں تھی۔"

"ہاں سر! میڈم راحیلہ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ ہم اب واقعی سنجیدگی سے آپ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ ہنسی مذاق تو ہوتا ہی رہے گا۔" ٹونی واقعی سنجیدگی سے بولا "ویسے آپ کو صحیح سلامت اپنے سامنے دیکھ کر ہماری کھوئی ہوئی خوشیاں تو گویا واپس آ ہی گئی ہیں۔"

"تم لوگ میری عدم موجودگی میں خاصے تمیزدار سے ہو گئے دیکھ رہا ہوں سب ساتھیوں کے لہجے میں بڑا ادب احترام آگیا ہے۔ راحیلہ کو سب "میڈم یا میڈم راحیلہ" کہہ کر پکارنے لگے ہیں۔" میں نے قدرے حیرت کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔

"سر! ہم تو کیا انہیں تو اچھے بھلے سرکاری لوگ بھی میڈم کہنے لگے ہیں۔" ٹونی بولا "انہوں نے کارنامے ہی ایسے انجام دیئے ہیں۔ ہمیں تو یہاں باقاعدہ ایک طویل جنگ لڑنی پڑی تھی اور میڈم نے اس میں ایک جنرل کی سی مشاقی اور مہارت کا مظاہرہ کیا۔"

"یہ مظاہرہ اس لحاظ سے تو اسے مہنگا پڑ رہا ہے کہ ہر ایک نے اسے میڈم کہنا شروع کر دیا ہے۔" میں نے شرارت سے راحیلہ کی طرف دیکھا "نہ جانے کیوں میڈم کے القاب سے ذہن میں اچھی خاصی پکی عمر کی خرانٹ قسم کی عورت کا تصور ذہن میں آتا ہے۔"

"سر! آپ مذاق میں ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔ ہمیں بتائیں آپ پر کیا گزری!" ٹونی بولا۔

"مجھ پر جو گزری میں تم لوگوں کو دیکھ کر وہ سب بھول گیا ہوں۔ جس کے تم جیسے ساتھی موجود ہوں اسے دنیا میں ذرا بھی فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔ واپس آنے کے بعد میں تو یہی سوچ رہا ہوں کہ مجھے اس طرح منہ اُٹھا کر بھاگنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ حال میرا بھی تم لوگوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں رہا۔ جب سب دوست اکٹھے ہو کر بیٹھیں گے تو پھر یہ باتیں ہوتی رہیں گی۔ ابھی تو کئی ساتھیوں سے میری ملاقات نہیں ہوئی۔ منیر' مسعود' شفیع شاہ' شبیر شیخ' سردار علی اور حنیف کہاں ہیں؟" میں نے بھی ذرا اطمینان سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

راحیلہ بولی "وہ سب مختلف مقامات پر مختلف بہروپوں میں ڈیوٹی دے رہے ہیں جو بظاہر مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں لیکن ضروری ہیں۔ منیر اور مسعود تو وہیں خانہ بدوشوں کی بستی میں رہتے ہیں جہاں سے تم آرہے ہو لیکن اس وقت وہ کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ سلیمان بھی ٹنڈے فقیر کے روپ میں وہیں رہتا ہے۔ اسے جہاں جانے کا حکم ملتا ہے وہاں جا کر کھڑا ہو جاتا ہے اور بظاہر بھیک مانگتا رہتا ہے۔"

"اور اچھا خاصا دولت مند ہو چکا ہے۔" ٹونی نے لقمہ دیا "پچھلے دنوں اس کی ڈیوٹی سینٹرل بورڈ آف ریونیو کی عمارت کے قریب لگی تھی لیکن وہ جلد ہی وہاں سے بھاگ آیا تھا کہ کہیں اندر سے کوئی بڑا افسر اس سے انکم ٹیکس وصول کرنے نہ آجائے۔ وہ تو سنجیدگی سے اس کام کو نئے پیشے کے طور پر اختیار کرنے کی سوچ رہا ہے۔"

"بکواس مت کرو۔" راحیلہ نے اسے ڈانٹا پھر میری طرف دیکھ کر شکایتی سے لہجے میں بولی "جب سے ہم پر ذرا سخت وقت پڑا ہے یہ کچھ زیادہ ہی شوخ ہو گیا ہے۔ معلوم نہیں کیوں اس کی حس مزاح کچھ زیادہ ہی بیدار ہو گئی ہے ورنہ یہ اچھا خاصا سنجیدہ نوجوان ہوا کرتا تھا۔"

"مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں۔" ٹونی ٹھنڈی

سانس لے کر بولا۔

راحیلہ سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے بولی "احمد ٹیکسی چلاتا ہے۔"

"اس سے اور سلیمان سے تو میں مل چکا ہوں۔ مجھے ہوٹل سے احمد ہی اپنی ٹیکسی میں لے کر آیا تھا۔" میں نے بتایا۔

"وہ ٹیکسی لیے زیادہ تر اسلام آباد ہوٹل کے سامنے ہی کھڑا رہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ اسے صرف غیر ملکی مسافروں کو لانا لے جانا پڑے۔" راحیلہ نے بتایا "سردار علی غریب بستیوں میں جا کر بندر نچاتا ہے۔"

"کیا؟" میں تقریباً اچھل پڑا۔ سردار علی نام سے یہی لگتا تھا کہ وہ کوئی دیہاتی سا شخص ہو گا لیکن وہ ایک نفیس' ماڈرن اور خالصتاً شہری نوجوان تھا۔ چہرے مہرے اور شخصیت سے کسی آسودہ حال گھرانے کا لڑکا لگتا تھا۔ اس کی شخصیت ٹونی اور شفیع شاہ سے کچھ ملتی جلتی ہی تھی لیکن وہ ذرا زیادہ چوڑا چکلا اور قدرے بھاری جسم کا تھا۔ ٹونی اور شفیع شاہ کی طرح چھریرے جسم کا نہیں تھا۔ بہرحال میں اسے بندر نچانے والے کے روپ میں تو چشم تصور سے بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

راحیلہ میری حیرت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مسکرا کر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "شاید ریڈ ڈاٹ والوں کے مافوق الفطرت سے چمپینزیوں کو دیکھ کر نفیس صاحب کو خیال آیا کہ ان کی ایجنسی کے پاس بھی ایک تربیت یافتہ اور حیرت انگیز قسم کا بندر موجود ہے لیکن اس سے کام لینے کا چیلنج صرف سردار علی نے قبول کیا اور اب وہ بندر نچانے والے کے روپ میں دن بھر غریب بستیوں میں گھومتا ہے اور رات کو وہیں خانہ بدوشوں کی بستی میں آجاتا ہے۔"

"ایسی کون سی مہم پر ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"کسی ایجنسی کو یہ خبر ملی تھی کہ سرحدی علاقے کی طرف سے آنے والا روسی اسلحہ اب غریب بستیوں میں چھپایا جا رہا ہے۔ غیر ملکی طاقتوں نے ہمارے ہاں جو تخریب کار داخل کر رکھے ہیں یا جن جن مقامی لوگوں کو اپنا ایجنٹ بنا رکھا ہے۔ انہوں نے اب کچی آبادیوں میں اسلحہ ذخیرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ فروخت اور تقسیم کا کام اب وہاں سے ہو رہا ہے لیکن یہ بستیاں اتنی زیادہ تعداد میں' اتنے بے ہنگم طریقے سے پھیلی ہوئی ہیں کہ ان سب کی تلاشی لینا یا ان کے سلسلے میں کوئی صحیح آپریشن کرنا بہت مشکل ہے۔ بے گناہ لوگوں کے زیادہ مارے جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ دہشت گرد تو تربیت یافتہ ہوتے ہیں' وہ بے گناہوں کو مروانے کا بندوبست کر کے صاف نکل جاتے ہیں۔ کارروائی کرنے والوں کی بعد میں شامت آتی رہتی ہے۔ ان پر خوب لعن طعن ہوتی ہے۔"

"سردار علی اس سلسلے میں کیا کر رہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اسے ان بستیوں میں جس جگہ کے بارے میں شبہ ہوتا ہے کہ وہاں اسلحہ ذخیرہ کیا جاتا ہے' اس جگہ کا محل وقوع وہ بندر کو "ذہن نشین" کرا دیتا ہے' بعد میں بندر موقع پا کر اکیلا وہاں گھستا ہے۔ جگہ اگر دشوار گزار بھی ہو تو وہ بندر ہونے کی وجہ سے آسانی سے وہاں پہنچ جاتا ہے اور کوئی نہ کوئی ثبوت حاصل کر لاتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ کوئی ایسا ہتھیار یا ڈبا وغیرہ ہی اٹھا لاتا ہے جس سے یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ وہاں کوئی ذخیرہ موجود ہے پھر نفیس صاحب نہایت خاموشی سے وہاں چھاپا ڈلوانے کا بندوبست کرتے ہیں۔ اسلحے کے دو بڑے ذخیرے پکڑنے میں کامیابی ہو چکی ہے۔"

"کیا یہ بھی ریڈ ڈاٹ کا کام تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ اس کا ایک نہایت معمولی سا شعبہ تھا۔ وہ اس میں براہِ راست کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لیتی تھی۔ اس نے ہمارے گلی کوچوں میں خطرناک اسلحے کا سیلاب لانے کے لیے کچھ لوگوں کو خرید لیا تھا۔ بعد میں اسے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ تھوڑے سے پیسے کے لیے ہماری قوم اپنی جڑیں خود کاٹنے میں خود کفیل ہے۔ بہرحال نفیس صاحب لگے ہاتھوں جس جس طرف توجہ دی جا سکتی ہے دے رہے ہیں۔ جو کام نمٹ سکتا ہے' نمٹائے جا رہے ہیں لیکن ہر کام درحقیقت بہت مشکل ہے۔ صرف یہ اسلحے کا مسئلہ ہی حل ہوتا نظر نہیں آتا۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اتنا اسلحہ پھیلا دیا گیا ہے جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ بڑا ہی زود اثر زہر ہے جس سے قوموں کو کم سے کم وقت میں ہلاک کیا جا سکتا ہے۔ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ یہ قوم اسی اسلحے سے خودکشی کر لے گی۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ بولی "شفیع شاہ' شبیر شیخ اور حنیف قدرے معززانہ کام کر رہے ہیں۔ وہ کچھ غیر ملکیوں کی نگرانی کر رہے ہیں جو یہاں بہت ہی حساس اور اہم عہدوں پر کام کر رہے ہیں۔ نفیس صاحب ان کی نگرانی کے لیے سرکاری آدمیوں کو لگانا نہیں چاہتے تھے۔"

"کیا تم سب لوگ آج کل نفیس صاحب کی ماتحتی میں کام کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں" راحیلہ نے جواب دیا "اپنے آدمیوں کی انچارج تو میں ہی ہوں لیکن میں نے نفیس صاحب کی ماتحتی میں کام کرنا قبول کر لیا تھا۔ جب ہمیں معلوم ہوا تھا کہ درحقیقت وہ صرف دکھاوے کے لیے تم سے بے اعتنائی برت رہے تھے لیکن اصل میں وہ ہمارے ہمدرد بھی تھے اور ہماری خدمات کے معترف بھی۔ تو میں نے ان کے ساتھ کام کرنے کی پیشکش قبول کر لی تھی۔ وہ بہت بڑی طاقت ہیں۔ کم از کم ریڈ ڈاٹ کے معاملے میں ملک کی تینوں بڑی خفیہ ایجنسیوں کی سربراہی عارضی طور پر ان کے پاس ہے۔ اگر میں ان کا تعاون قبول نہ کرتی تو ریڈ ڈاٹ والے ہمیں چُن چُن کر مار ڈالتے۔"

"نفیس صاحب بلاشبہ بہت بڑی طاقت ہیں لیکن وہ جو سب سے بڑی طاقت اوپر موجود ہے اس کی خوشنودی کے بغیر کچھ ہونا

ناممکن ہے۔" میں نے علامتی طور پر چھت کی طرف لیکن درحقیقت آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

"وہی سب سے بڑی طاقت تو دراصل ہمیں دوسری چھوٹی چھوٹی طاقتوں کا تعاون مہیا کرتی ہے۔" راحیلہ مسکرا کر بولی "ہمارا کوئی بھی مسئلہ حل کرنے کے لیے وہ ہمیں ظاہری وسائل تو مہیا کرتی ہے نا۔"

"شکر ہے تم بھی بات کو سمجھتی ہو۔" میں نے طمانیت سے کہا "بہرحال نفیس صاحب نے ہمارے ساتھیوں کو عجیب ہی کاموں پر لگا رکھا ہے۔"

"بظاہر یہ کام کچھ حقیر اور مضحکہ خیز ہیں لیکن درحقیقت بہت اہم ہیں۔" راحیلہ بولی "جب سے ہمارا ریڈ ڈاٹ سے براہِ راست ٹکراؤ ہوا ہے' اس کے بعد سے بہت سے لوگ غائب ہوگئے ہیں۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ انہیں تلاش کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہمیں صحیح طور پر کچھ پتا نہیں چل رہا کہ کہاں کہاں ان کا کوئی آدمی موجود ہے اور وہ اپنی اپنی جگہ بیٹھا کیا جال بُن رہا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں روزانہ جائز اور ناجائز طریقوں سے ہمارے ملک میں جو غیر ملکی چلے آرہے ہیں ان میں سے کون کون بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کے ایجنٹ ہیں اور وہ کیا مقصد لے کر آرہے ہیں۔ ہم اور نفیس صاحب کے ہزاروں افراد پورے ملک میں پھیل کر اپنی دانست میں ان معاملات پر نظر رکھنے کی کوشش کررہے ہیں لیکن یہ کچھ ایسا ہی کام ہے جیسے سمندر کی تہہ میں اُتر کر چند مخصوص مچھلیوں کو تلاش کرنا۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم کامیاب ہوجائیں گے۔ جتنی محنت' لگن اور جذبات کی شدت کے ساتھ ہم لوگ اس کام میں لگے ہوئے ہیں اور ہم نے جو قربانیاں دی ہیں وہ ضرور رنگ لائیں گی۔" میں نے وثوق سے کہا پھر مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے گویا اپنے آپ سے کہا "معلوم نہیں نفیس صاحب کو اب بھی میری ان قربانیوں کا احساس ہے یا نہیں؟"

"بہت اچھی طرح احساس ہے۔" راحیلہ بولی "انہیں معلوم ہے ہمیں کروڑوں کا تو مالی نقصان ہی پہنچ چکا ہے' کاروبار تباہ ہورہا ہے۔ تمہارا عظیم الشان بنگلہ دھماکے سے اُڑا دیا گیا۔ ہمارے کتنے ہی دوستوں اور ہمدردوں کو جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔ خود ہمیں جو تکلیفیں اُٹھانا پڑیں ان کا کوئی شمار نہیں۔ نفیس صاحب کو ان سب کا احساس ہے۔ اس لیے تو اب ان کا رویّہ اتنا بدلا ہوا ہے' وہ ہمیں اپنے آدمیوں سے زیادہ عزت دیتے ہیں۔"

"مجھے واپس آکر یہی دیکھ کر سب سے زیادہ خوشی ہوئی ہے۔ مجھے تو ان کا دل جیتنا' ریڈ ڈاٹ سے مقابلہ کرنے سے زیادہ مشکل محسوس ہوتا تھا۔" میں نے کہا۔

"نہیں [illegible] کا بھی اندازہ ہوچکا ہے۔" راحیلہ [illegible] پر ہمیں اپنے ساتھ شامل کیا اور اس کے لیے نظام بھی تیار کیا' باقاعدہ اپنی اپنی حد بندیاں مقرر کیں تو انہوں نے ہمیں سرکاری خزانے سے باقاعدہ تنخواہیں' تمام الاؤنسز اور اخراجات وغیرہ بھی دلوانے کی پیشکش کی تھی لیکن ہم نے انکار کردیا اور انہیں بتایا کہ ہم اتنے گئے گزرے نہیں کہ سرکاری خزانے پر بوجھ بنیں یا سیکرٹ فنڈز وغیرہ اپنے اوپر خرچ کرائیں جبکہ ہمارا ان کا ساتھ بھی عارضی ہے۔ نہ جانے کب ہمارا کام ختم ہوجائے اور ہمارے راستے الگ الگ ہوجائیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "اپنی اپنی جگہ مختلف ڈیوٹیاں انجام دینے کے ساتھ ساتھ ہمیں کبھی کبھار اس مقام پر بھی جانا پڑتا ہے جہاں بظاہر واٹر سپلائی کا کام ہورہا ہے۔ اگر وہاں سرنگ کی کھدائی کامیاب ہوجاتی ہے اور کہیں ریڈ ڈاٹ کا زیرِزمین قلعہ نکل آتا ہے تو ہمیں اس کے ردِعمل کے لیے بھی تیار رہنا ہوگا۔ فی الحال تو ہم سب بظاہر مزدور وغیرہ کی حیثیت سے وہاں جاتے ہیں اور کام کا جائزہ لے کر اپنی اپنی رائے دیتے ہیں حالانکہ ہم نہ انجینئر ہیں' نہ الیکٹرانکس یا دوسرے علوم کے ماہر لیکن ہماری رائے کو بہرحال اہمیت دی جاتی ہے اور وہ ریکارڈ پر آتی ہے۔ اگر ہم کوئی مشورہ دیں تو اس پر عمل کیا جاتا ہے۔"

میں نے ذرا دلچسپی سے آگے کھسکتے ہوئے پوچھا "تم لوگ کس نتیجے پر پہنچے ہو۔ اس کھدائی کا کوئی نتیجہ نکلتا نظر آرہا ہے؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔" راحیلہ بولی "بہت ہی خاص قسم کے کمپیوٹرائزڈ مواد کی بنیاد پر فورسز کے بڑے خاص خاص انجینئروں وغیرہ کے مشوروں کے بعد یہ کام شروع کیا گیا ہے۔ شاید کوئی نتیجہ نکل ہی آئے۔ ہم تو بس ان کی مدد کے لیے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔"

اس دوران اسٹیل کی ایک بڑی سی ٹرالی پر اسپتال کے میس سے کھانا آگیا۔ ٹونی باہر جاکر برتنوں میں کھانا لانے کے بعد بولا "یہاں ہم غریبوں' خانہ بدوشوں کے لیے بہت اچھے انتظامات ہیں۔ بیٹھے بٹھائے کھانا مل جاتا ہے۔"

"تبھی اس کی طبیعت میں کچھ حرام خوری سی آتی جارہی ہے۔" راحیلہ کھانا میز پر لگاتے ہوئے بولی۔

کھانے کے دوران بھی باتیں ہوتی رہیں اور مجھے حالات سے زیادہ سے زیادہ آگاہی ہوتی رہی۔ اس دوران راحیلہ سیاہ چشمہ بھی اُتار چکی تھی اور میں نے کئی بار غیر محسوس سے انداز میں ذرا قریب سے اس کے چہرے کے سیاہ حصے کا جائزہ لیا تھا۔ اس کی جلد سفید حصے ہی کی طرح ہموار تھی لیکن اس میں تارکول کی سی چمک تھی۔

کھانے کے بعد راحیلہ برتن سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے ٹونی سے مخاطب ہوئی "اتنی دیر سے ہم لوگ باتیں کررہے ہیں' کھانا بھی کھالیا۔ بول بول کر دوبارہ گلا خشک ہوگیا لیکن تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ کچن میں جاکر کافی ہی بنالاؤ۔ باس کے لیے جان دینے کو تو تیار رہتے ہو۔ ان کی خاطر مدارات کے لیے کافی بنانے کی زحمت نہیں کرسکتے۔"

"یہ شعبہ خواتین کا ہے۔" ٹونی کاؤچ سے اُتر کر دیہاتیوں والے انداز میں قالین پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"جب تمہیں کوئی مقدروں کی ماری خاتونِ خانہ میسر آجائے گی تب یہ بات کرنا۔ فی الحال تو جاکر کافی بنالاؤ۔ کیونکہ یہاں کوئی خاتونِ خانہ نہیں ہے اور ہم سب کمانڈوز کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔" راحیلہ بولی۔

ٹونی نے پھر بھی اٹھنے میں مصنوعی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا تو راحیلہ پہلے سے زیادہ بارعب لہجے میں بولی "میں تمہیں کمانڈر ایس ٹی ایف ٹو کی حیثیت سے حکم دیتی ہوں کہ جاکر خود سمیت تینوں کے لیے کافی بنا کر لاؤ۔"

تب ٹونی کراہ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور چھت کی طرف دیکھ کر فریادی انداز میں بولا "اللہ میاں واقعی عورت کو اختیارات مت دیجیے گا۔ یہ تو معلوم نہیں مردوں کا کیا حال کرے گی۔ ذرا اندازہ لگائیے کافی بنوانے کے لیے کمانڈر ایس ٹی ایف ٹو کے اختیارات استعمال ہورہے ہیں۔ اللہ اللہ!"

"چھوٹی موٹی حیثیت میں تم مرد لوگ بے چاری عورت کی بات پر کان ہی کہاں دھرتے ہو۔" راحیلہ مسکراہٹ ضبط کرتے ہوئے بولی۔

ٹونی اپنی مختصر سی پگڑی کے درمیان سے سر کھجاتا کچن میں چلا گیا۔ میں نے راحیلہ سے پوچھا "یہ ایس ٹی ایف ٹو کیا بلا ہے بھئی؟"

"اسپیشل ٹاسک فورس نمبر دو۔" راحیلہ بولی "یعنی ہمارے ساتھیوں کا گروپ جس کی کمانڈر میں ہوں۔ ریڈ ڈاٹ کا قلع قمع کرنے کے لیے جو سرکاری مشنری حصہ لے رہی ہے وہ ایس ٹی ایف ون کہلاتی ہے۔ ہم لوگ ان کے سامنے اسی طرح ہیں جیسے پہاڑ کے سامنے چوہا لیکن فی الحال عارضی طور پر ہماری بھی ایک سرکاری حیثیت ہے۔ اب تم آگئے ہو تو شاید اپنے گروپ کے کمانڈر کے فرائض تمہیں سنبھالنے پڑیں۔"

"مجھے معاف ہی رکھو۔" میں نے جلدی سے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا "مجھے فی الحال حالات کے سر پیر کا صحیح طور پر پتا نہیں ہے۔ میں اس کمانڈری کا اہل نہیں ہوں۔ میں تو تمہارے ماتحت کے طور پر کام کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"ذمّے داریوں سے جان چھڑانا تمہیں خوب آگئی ہے۔" راحیلہ بولی۔

"فی الحال تو مجھے یہاں کوئی کام ہی نظر نہیں آرہا۔ وہ جو ایک کہاوت ہے نا کہ فلسفی اسے کہتے ہیں جو کسی تاریک کمرے میں وہ چوہا تلاش کررہا ہوتا ہے جو وہاں موجود نہیں ہوتا۔ مجھے اس وقت تم سب اسی قسم کے فلسفی لگ رہے ہو۔" میں نے اسے چڑانے کی کوشش کی۔

"تم واقعی نئے آئے ہوئے لگ رہے ہو۔ ابھی صورتِ حال تمہاری سمجھ میں نہیں آسکی۔ ہم اتنے احمق نہیں ہیں کہ محض اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کے لیے اتنا وقت اور انرجی ضائع کرتے پھریں۔ کام بہت سمتوں میں' بہت خاموشی سے ہورہا ہے اور اس کے نتائج یکدم سامنے آئیں گے۔"

"پہلے کا تو مجھے معلوم ہے کہ تم لوگ احمق نہیں تھے اور تمہیں اِدھر اُدھر ٹامک ٹوئیاں مارنے کی عادت نہیں تھی لیکن میں نے سوچا شاید سرکاری تحویل میں آنے کے بعد ایسے ہوگئے ہو۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"زیادہ طنز فرمانے کی ضرورت نہیں ورنہ ایسا گھونسا رسید کروں گی کہ یہ فوبانچو کٹ نقلی مونچھیں دانتوں سمیت معدے میں پہنچ جائیں گی۔" اس نے گھونسا ہوا میں لہرایا۔

"بس بس ہمیں اتنی جلدی اپنی اوقات پر آنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا "ذرا سنجیدگی سے یہ بتاؤ' نفیس صاحب سے یہ سب معاملات کب اور کس طرح طے پائے؟"

"یکدم ہی... اور بڑے طوفانی سے انداز میں۔" راحیلہ نے جواب دیا "ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا کہ نفیس صاحب ہماری نگرانی کرارہے تھے۔ ہمیں مشکوک سمجھ کر نہیں... بلکہ ہمارے ذریعے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں خبردار رہنے کے لیے۔"

پھر وہ اپنے تراشیدہ بالوں میں انگلیاں پھیر کر گہری سانس لے کر بولی "جب وزیرِخارجہ حفیظ صاحب کے آبائی مکان پر لاہور میں ہمارا ریڈ ڈاٹ سے ٹکراؤ ہوا اور تم حسبِ پروگرام روپوش ہونے کے لیے نکل گئے تھے تو تمہارے پیچھے نفیس صاحب کے آدمی ہماری مدد کے لیے آن پہنچے تھے۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اس کے بعد بالکل پاسا ہی پلٹ گیا تھا لیکن صورتِ حال بہت بدل ضرور گئی تھی۔ ایک جنگی ہیلی کاپٹر تک ہماری مدد کے لیے آن پہنچا تھا لیکن وہ مخلوق جو کمر پر کوئی مشینری وغیرہ باندھے اُڑتی پھر رہی تھی ان میں سے ایک نے اس ہیلی کاپٹر کو بھی فضا میں ہی دھماکے سے تباہ کردیا۔ تب نفیس صاحب کو اندازہ ہوا کہ ان کا سامنا واقعی کچھ خطرناک لوگوں سے تھا۔ وہ اس وقت لاہور میں ہی ایک کنٹرول روم میں بیٹھے تھے اور انہیں ایک ایک پل کی خبر مل رہی تھی لیکن ہمیں یہ بات معلوم نہیں تھی۔ بہت سے کمانڈو وہاں پہنچ چکے تھے اور ہم حیران تھے کہ وہ کون لوگ تھے جو ہماری مدد کرنے کی کوشش کررہے تھے۔"

میں حیرت سے راحیلہ کی باتیں سُن رہا تھا جو شاید ایک بار پھر اس وقت کے تصور میں کھوگئی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "اس روز ریڈ ڈاٹ نے ہمارا جلد از جلد صفایا کرنے کے لیے وہ اُڑنے والے آدمی کافی تعداد میں میدان میں جھونک دیے تھے۔"

"ان میں سے ایک نے تو سیکڑوں میل تک میرا پیچھا کیا تھا۔" میں نے اسے بتایا "پھر میں نے یونہی اندازاً ایک تدبیر کی۔ شاید اس کے بعد اس نے میرا سراغ کھودیا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ میری گھڑی میں کوئی ایسی چیز تھی جو اسے میرے بارے میں سگنل دے رہی تھی۔ میں نے گھڑی سے چھٹکارا حاصل کرلیا تھا۔"

"بہرحال رات ہونے تک تو وہ لوگ بڑی بڑی جناتی چمگادڑوں کی طرح اندھیرے میں آسمان سے اُتر آئے تھے اور عجیب و غریب قسم کی لائٹس کے ذریعے ہمیں تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ موت ان کے روپ میں ہمارے تعاقب میں تھی۔ ہم جگہ جگہ چھپتے پھر رہے تھے لیکن وہ ہر اس جگہ کو تباہ کردیتے تھے جہاں ہم پناہ لیتے تھے۔ اس دوران کئی کمانڈوز بھی مارے گئے۔ ہم سب بکھر گئے تھے اور میرا خیال ہے ہم اس روز کئی میل کے دائرے میں دوڑے ہوں گے۔"

"ایسے بھی تو بہت سے لوگ موجود تھے جو اُڑ نہیں سکتے تھے۔ وہ ابتدا ہی میں ہم پر حملہ آور ہوئے تھے۔ وہ حفیظ صاحب کو اُٹھا کر لے جانے یا پھر قتل کرنے کے لیے آئے تھے۔" میں نے یاد دلایا۔

"ان میں سے تو بیشتر شروع میں ہی مارے گئے تھے۔ انہیں تو ہم خاطر میں ہی نہیں لا رہے تھے۔ ہمارے لیے تو اصل مسئلہ وہ اُڑنے والے لوگ بنے ہوئے تھے۔ آخر نفیس صاحب خود فورسز کے خاص آدمیوں کی ایک ٹیم کے ساتھ وہاں پہنچے۔ انہوں نے تو ان لوگوں پر باقاعدہ بمباری تک کرانے کا بندوبست کرلیا تھا لیکن اس وقت تک شاید قدرت کو ہم پر ترس آگیا تھا۔" وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔

"کیا ہوا تھا؟" میں نے قدرے بے تابی سے پوچھا۔

"ان کے جسموں کے ساتھ جو بھی مشینریاں منسلک تھیں وہ کسی جگہ سے کمپیوٹر سے کنٹرول ہوتی تھیں۔ شاید ان کے کنٹرول میں ہی کہیں کوئی خرابی ہوگئی تھی جس کے نتیجے میں سبھی بیک وقت اُڑنے سے معذور ہوگئے۔ ان پر بہت ہیوی گنوں سے فائرنگ بھی کی گئی تھی۔ فائرنگ سے تو پھر بھی انہیں کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا لیکن اُڑنے سے معذور ہونے کے بعد ان میں سے کئی زندہ ہمارے اور نفیس صاحب کے آدمیوں کے قابو میں آگئے تھے۔ اس طرح اس معرکے کا تو گویا وہیں اختتام ہوگیا۔"

اس دوران ٹونی ایک ٹرے میں کافی کے مگ سجائے لے آیا اور تپائی پر رکھتے ہوئے بولا "غالباً اس رات کی کہانی چل رہی ہے جس رات ہمیں نئی زندگی ملی تھی؟"

"ایسی راتیں تو ہماری زندگی میں دو آئی تھیں۔ ان میں سے ایک کا ذکر ہو رہا ہے۔" راحیلہ بولی۔

کافی کی ایک چسکی لے کر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "نفیس صاحب نے ایک بڑی عقلمندی کی جس کی اہمیت کو شاید ہم نہ سمجھ پاتے۔ انہوں نے زندہ ہاتھ آجانے والے ان آدمیوں کو فوری طور پر ایک خصوصی طیارے کے ذریعے پشاور سے آگے کسی خفیہ مقام پر منتقل کرادیا۔ اس دوران انہوں نے مجھ سے میٹنگ کی اور پوچھا کہ یہ سارا کیا چکر تھا۔ میں نے انہیں سب کچھ بالکل سچ سچ بتادیا بلکہ ہلکی پھلکی لعن طعن بھی کی کہ جو' ان کے کرنے کے کام تھے وہ کام ہم کرتے پھر رہے تھے' ہمارے ساتھی مر رہے تھے' کاروبار تباہ ہو رہے تھے۔ میں نے تمہارے سلسلے میں بھی ان سے گلے شکوے کیے کہ انہوں نے تمہاری باتوں پر اعتبار نہیں کیا جس کی وجہ سے نوبت یہاں تک آئی اور آخر تمہیں بھی فرار ہونا پڑا۔ تب نفیس صاحب نے اپنا مؤقف بیان کیا اور بتایا کہ ان کی بے اعتنائی وغیرہ سب مصنوعی تھی۔ وہ بیک وقت کئی محاذوں پر بڑی کامیابی اور رازداری سے لڑ رہے تھے۔ انہوں نے فوری طور پر ہمیں بھی "غائب" کرادیا۔ ہم سب کو چھپنے کے لیے الگ الگ خفیہ ٹھکانے فراہم کیے۔ وہ ٹھکانے بھی ہم روز بدلتے رہتے تھے لیکن ہمارا اس دوران ایک دوسرے سے رابطہ رہا اور نفیس صاحب کے ساتھ مل کر ہم لائحہ عمل بھی طے کرتے رہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کرنا چاہیے۔"

"اس دوران ریڈ ڈاٹ کا کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا؟" میں نے پوچھا "اس کے کئی آدمی مارے گئے تھے اور کئی غائب ہوگئے تھے۔"

"میرا خیال ہے نفیس صاحب ہمیں صحیح طرح چھپانے میں کامیاب رہے تھے۔ اس دوران ہم اپنے اپنے گھروں اور دفتروں یا دوسرے ٹھکانوں کے قریب بھی نہیں پھٹکے تھے لیکن یہ اندازہ بہرحال ہو رہا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے نادیدہ سے ایجنٹ موت کے ہرکاروں کی طرح ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ کئی مشکوک افراد اس دوران نفیس صاحب کے آدمیوں کے ہتھے چڑھے لیکن ان کا یہ بڑا "کمال" تھا کہ تفتیش کے کسی بھی مرحلے تک پہنچنے سے پہلے ہی وہ کسی نہ کسی طرح خودکشی کرتے چلے گئے حالانکہ ان کی مکمل تلاشی لے کر انہیں کسی خفیہ مقام پر قید کیا جاتا تھا۔ بظاہر ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی تھی جس کے ذریعے وہ خودکشی کرسکتے۔ اس کے باوجود کسی کا جسم خشک مٹی کی طرح چٹخا ہوا ملتا......"

"وہی انداز جس میں ستارہ کی موت واقع ہوئی تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں بالکل وہی انداز۔" راحیلہ نے جواب دیا "لیکن یہ پتا نہیں چلتا تھا کہ زہر انہوں نے کب اور کس طرح استعمال کیا۔ کوئی ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود جاپانیوں کی ہاراکاری والے طریقے سے اپنی ہی زبان اپنے ہی حلق میں اُلٹ کر دم گھٹنے سے مرجاتا اور کسی کی تو موت کا سبب بھی معلوم کرنا مشکل ہوجاتا۔ اس طرح کئی آدمی نفیس صاحب کے آدمیوں کے ہتھے چڑھے لیکن اس کا قطعاً کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

اس نے دھیرے دھیرے کافی کی چند چسکیاں لیں۔ اس کی

...ریں اور مخروطی انگلیاں مگ کے بڑے سے ہینڈل پر سختی سے جمی ...ی تھیں۔ وہ بلاشبہ فولادی اعصاب کی مالک تھی۔ مجھے فخر تھا کہ ...ں جیسی لڑکی میری ساتھی تھی۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "ایک مرتبہ کے زوردار ...ر براہِ راست ٹکراؤ کے بعد صورتِ حال پھر پہلے ہی کی طرح ...وس کن ہوگئی تھی۔ نفیس صاحب کے ساتھ ہمارا باضابطہ طور پر ...تحاد ہوچکا تھا۔ تمام معاملات اور تفصیلات طے ہوگئی تھیں لیکن ...س اتحاد کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔"

"اُڑنے والے جو لوگ ہاتھ لگے تھے اور جنہیں نفیس ...احب نے پشاور کے قریب کسی خفیہ مقام پر بھجوادیا تھا ان سے ...بھی کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوسکی؟" میں نے پوچھا۔

"میں وہی بتانے لگی تھی۔" راحیلہ بولی "وہ بہت معمولی لوگ تھے اور ایک طرح سے قربانی کے بکروں کے طور پر استعمال ہو رہے تھے۔ سب ہمارے ہم وطن تھے۔ بہرحال نفیس صاحب کے آدمیوں کے جو بھی تفتیش وغیرہ کے طریقے ہوں گے وہ ان پر آزمائے جاتے رہے ہوں گے۔ کئی دن بعد آخرکار ان میں سے ایک نے زبان کھولی اور چند غیرملکیوں کے نام بتائے جن کے توسط سے انہیں بھاری بھاری رقمیں ملی تھیں اور رفتہ رفتہ انہیں مختلف کاموں کی تربیت دے کر ان میں اُلجھایا گیا تھا لیکن انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ اس سارے سلسلے کے پس پردہ اصل طاقت کس کی تھی اور اصل کھیل کیا چل رہا تھا۔ وہ بس بکاؤ قسم کے عناصر تھے۔ معلوم نہیں کیا کچھ کرچکے تھے۔ یہ عجیب بات تھی کہ گرفت میں آنے کے بعد وہ خودکشی نہیں کرسکتے تھے۔ معلوم نہیں کس طرح وہ اس "سہولت" سے محروم رہ گئے تھے۔"

"شاید ان کے پاس اہم معلومات نہیں تھیں اس لیے انہیں اس "سہولت" سے "آراستہ" کرنا ضروری نہ سمجھا گیا ہو یا پھر وہ اس لیے اس سہولت سے محروم رہ گئے ہوں کہ انہیں ہنگامی طور پر آنا پڑا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"خیر وجہ خواہ کچھ بھی رہی ہو بہرحال وہ زندہ رہے۔ البتہ "تفتیش" میں ان کی جو حالت ہوئی سو ہوئی۔ اس دوران احتیاطاً انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاتا رہا۔ شاید ان تمام قلعوں میں رکھا گیا جو تاریخ سے زیادہ تفتیش کے سلسلے میں مشہور ہیں۔"

"جن غیرملکیوں کے نام ان میں سے کسی نے بتائے تھے ان کے سلسلے میں کیا کیا گیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہ سب کے سب سفید فام تھے اور کسی نہ کسی سرکاری یا نیم سرکاری حیثیت میں یہاں موجود تھے تاہم بڑی احتیاط سے ان پر ہاتھ ڈالنے کا منصوبہ بنایا گیا لیکن پتا چلا کہ ان میں سے بیشتر غائب ہوچکے تھے۔ صرف دو افراد ہاتھ آئے۔ انہیں پکڑنے پر بھی فوراً احتجاج شروع ہوگیا۔ سفارتی تعلقات خراب ہونے لگے' حکومت

کے لیے مسائل کھڑے ہونے لگے۔ انجام خراب کرنے کی دھمکیاں ملنے لگیں۔ عجیب عجیب سازشیں شروع ہوگئیں۔ ہمارا پورا حکومتی ڈھانچا لرزنے لگا۔ نفیس صاحب پر چاروں طرف سے زبردست دباؤ تھا۔"

"اوہ..... میرے خدا!" میں بے اختیار ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ چھوٹے کمزور اور منتشر سے رہنے والے ملکوں کی بے بسی کی یہ بڑی پُرانی کہانی تھی۔

راحیلہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "تاہم نفیس صاحب نے ہوشیاری سے اپنا کام جاری رکھا۔ انہوں نے اس دباؤ کے سامنے ہتھیار نہیں ڈالے لیکن غیرضروری اکڑفوں کا مظاہرہ بھی نہیں کیا۔ وہ بڑی ڈپلومیسی سے چلتے رہے۔ اس دوران حالات نے ایک عجیب پلٹا کھایا۔ ہمیں ایک ایسے طریقے سے مدد میسر آئی جس کا ہمیں وہم و گمان بھی نہیں تھا۔"

وہ ایک لمحے کے لیے پُرخیال انداز میں اپنے کافی کے مگ کو دیکھتی رہی پھر بولی "ہنی عرف پرنسس تہمینہ کو تم ابھی بسترِ مرگ پر دیکھ کر آرہے ہو۔ تم نے اسے تندرستی اور صحت مندی کی حالت میں بھی دیکھا ہے۔"

"ہاں" میں نے اپنے دل میں افسردگی کی ایک لہر محسوس کرتے ہوئے کہا "لوگ فائیو اسٹار ہوٹل میں اس کا ڈانس دیکھ کر دیوانے ہوجاتے تھے۔"

"یہی ہنی ان دنوں ریڈ ڈاٹ کے پاس تھی اور کچھ دنوں کے لیے زیرِ عتاب رہنے کے بعد کسی نہ کسی طرح اپنا اعتماد کافی حد تک بحال کرا چکی تھی۔ ریڈ ڈاٹ والوں نے اسے ہمارے ہاں کی ایک بہت بڑی اور معروف سیاسی شخصیت کے پیچھے لگایا تھا۔ وہ شخصیت کچھ عرصے کے لیے ایک بہت بڑے عہدے پر فائز رہی تھی۔ اس دوران ایک نہایت اہم فائل ان صاحب کے سامنے سے گزری تھی جسے تم ہمارا ایک بڑا قومی راز بھی کہہ سکتے ہو۔ ہنی کو اس کے صرف چند اہم نکات معلوم کرنے کے لیے اس شخصیت کے پیچھے

لگایا گیا تھا۔ اسے کروڑوں روپے کی پیشکش کے اختیارات بھی دیے گئے تھے۔"

"کیا ہنی اس مشن میں کامیاب ہوگئی تھی؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

راحیلہ نے نفی میں سرہلایا "وہ محض دکھاوے کی حد تک یہ کام کررہی تھی۔ اس کی حقیقی دلچسپی اس میں نہیں تھی۔ دوسرے وہ شخصیت بھی کم از کم اس اہم قومی راز کے سلسلے میں اس کے قابو میں نہیں آنے والی تھی۔ تاہم اس نے دکھاوے کے لیے اس شخصیت تک رسائی حاصل کرلی تھی اور بظاہر اسے ڈھب پر لانے کی کوشش کررہی تھی لیکن اصل اہم بات یہ ہے کہ اس دوران اس نے ایک جگہ میری جھلک دیکھ لی۔ وہ مجھے تمہاری قریب ترین ساتھی کی حیثیت سے پہچانتی تھی اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ریڈ ڈاٹ کو جو نقصان پہنچا تھا اس میں، میں نے خاصا اہم کردار ادا کیا تھا۔ یہ معلومات بھی اسے ریڈ ڈاٹ میں ہونے کی وجہ سے ہی حاصل ہوئی تھیں۔ ریڈ ڈاٹ والوں کو جن لوگوں کی تلاش تھی، میں ان میں سرِفہرست تھی۔ ہنی کو بھی اس سلسلے میں میرے بارے میں فیڈ کیا گیا تھا کہ وہ اپنی دیگر سرگرمیاں جاری رکھتے ہوئے میرے بارے میں بھی خبردار رہے اور اگر میرا کوئی سراغ ملے تو فوراً ریڈ ڈاٹ کو مطلع کرے۔"

"لیکن وہ ایسا کرنے کے بجائے تم سے مل بیٹھی؟" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں، وہ جان کی بازی لگا کر ریڈ ڈاٹ کے خلاف ایک آخری داؤ کھیلنے کا فیصلہ کرچکی تھی۔ اس نے بڑی ہوشیاری سے چند منٹ کے لیے مجھ سے ملاقات کی اور ان چند منٹوں میں اتنی بہت سی معلومات میرے کانوں میں انڈیل دیں کہ میرے لیے ان کو سنبھالنا مشکل ہوگیا۔" وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگئی۔

ٹونی ہوا میں کسی غیرمرئی چیز کو گھورتے ہوئے بولا "یہ درحقیقت ہمارے لیے بہت بڑی امدادِ غیبی تھی۔ وہاں سے صحیح معنوں میں ہمیں پہلا "بریک تھرو" ملا۔ ورنہ ہم تو کیا نفیس صاحب کی بھی ساری فورس نہ جانے کب تک ٹامک ٹوئیاں مارتی رہتی۔"

راحیلہ بولی "ہنی نے مجھے بتایا کہ جہانگیر کے مقبرے سے تقریباً دو میل کے فاصلے پر ریڈ ڈاٹ کا زیرِ زمین قلعہ تھا۔ مختلف پوش علاقوں میں ان کے پاس کئی بنگلے بھی تھے جو مختلف مواقعوں پر مختلف مقاصد میں استعمال ہوتے تھے لیکن اصل اہمیت اس زیرِ زمین قلعے کی تھی۔ اس کے داخلے کا راستہ اور ہوا کا نظام وغیرہ اس سے بالکل الگ تھلگ ایک کھنڈر میں تھا جسے انہوں نے اپنے سائنسی شعبدوں سے اتنا زیادہ "آسیب زدہ" بنایا ہوا تھا کہ کوئی اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا تھا۔ اس کھنڈر سے جو راستہ زیرِ زمین قلعے تک جاتا تھا اسے تلاش کرنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔"

لاہور میں جن دنوں میری ریڈ ڈاٹ سے کشمکش چل رہی تھی ان دنوں ہی بہت سی باتوں کی وجہ سے مجھے اکثر شبہ ہوتا تھا کہ کہیں نہ کہیں ان کا کوئی بہت بڑا زیرِ زمین ٹھکانا ضرور موجود تھا لیکن پھر میں یہ سوچ کر خود ہی اپنے خیال کی تردید کردیتا تھا کہ جیمز بانڈ کے ناولوں اور عملی دنیا میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے تھا۔ اس زمانے میں تو چھوٹی موٹی دہشت گرد تنظیمیں بھی اپنے اپنے زیرِ اثر ملکوں میں کوٹھیاں بنگلے حاصل کرکے عام آبادیوں میں ہی اپنی سرگرمیوں میں مصروف رہتی تھیں اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہتی تھیں۔ ان حالات میں ریڈ ڈاٹ جیسی تنظیم کو... جو غالباً اپنی جڑ بنیاد اور اپنی سائنسی ترقی کے لحاظ سے دنیا کی سب سے طاقتور تنظیم تھی۔ اتنے کھڑاگ میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ لیکن اب راحیلہ کی باتوں سے ثابت ہورہا تھا کہ میرا شبہ درست ہی تھا۔

راحیلہ نے بات جاری رکھی "کھنڈر سے جو راستہ کنکریٹ کے اس قلعے تک جاتا تھا اس کے اختتام پر ایک کمپیوٹرائزڈ آہنی دروازہ تھا جس میں ایک کمپیوٹر کارڈ ڈالا جاتا تھا تو چند سیکنڈ بعد اس کا قفل کھلتا تھا لیکن یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ کوئی بھی کسی طرح وہ کارڈ حاصل کرکے اس دروازے کی سلاٹ میں ڈال دیتا کیونکہ اس پر اپنے انگوٹھے کا نشان بھی ایک خاص جگہ پر ثبت کرنا ہوتا تھا جو انسان کو ویسے نظر نہیں آتا تھا، اگر کمپیوٹر کے ریکارڈ میں انگوٹھے کا وہ نشان موجود ہوتا تھا تو دروازہ کھلتا تھا ورنہ نہیں۔"

"اگر کسی بھی انداز میں طاقت کے استعمال سے دروازہ کھولنے کی کوشش کی جاتی تو کیا ہوتا؟" میں نے پوچھا۔

"ان کا خودکار دفاعی نظام حرکت میں آجاتا جو کسی چھوٹی موٹی فوج کو تباہ کرنے کے لیے کافی تھا۔" راحیلہ نے جواب دیا "ہنی نے یہ بات مجھے اچھی طرح سمجھادی تھی کہ زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش نہ کی جائے۔ ایک بار دروازے ہی کے راستے اندر داخل ہوجائیں۔ اس کے بعد جو بھی مناسب سمجھیں وہ کریں یا جیسے بھی حالات ہوں اس کے مطابق حکمتِ عملی اختیار کریں۔ اس نے مجھے کارڈ پلاسٹک میں ملفوف کرکے دیا تھا اور اس پر اس کے انگوٹھے کا نشان پہلے ہی ثبت تھا۔ ہمیں اس نادیدہ نشان کی حفاظت کرنا تھی تاکہ وہ نہ تو خراب ہونے پائے اور نہ ہی اس کے ساتھ کسی اجنبی کی انگلیوں کے نشانات گڈمڈ ہوں۔"

راحیلہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوکر اپنا ہاتھ پھیلا کر گویا اپنی انگلیوں کے نشانات میں الجھنے لگی۔ ہم کافی ختم کرچکے تھے۔ ٹونی ٹرے اٹھا کر کچن کی طرف جاتے ہوئے بولا "میں ذرا باہر ہی جارہا ہوں۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو مجھے بلا لیجئے گا۔" اس کے چہرے پر اب گہری سنجیدگی تھی۔ ٹرے کچن میں رکھ کر وہ وہیں سے باہر چلا گیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد راحیلہ بولی "یوں ہنی کی بدولت ہمارے دو بڑے مسئلے قطعی غیرمتوقع طور پر حل ہوگئے۔ یعنی ایک تو

ان کے خفیہ ٹھکانے کا محلِ وقوع معلوم ہوگیا۔ دوسرے اس میں آسانی سے داخل ہونے کا ذریعہ ہاتھ آگیا۔ ہنی نے کسی طرح اس کارڈ کا ڈپلیکیٹ حاصل کیا تھا اور کوئی فیصلہ کن داؤ کھیلنے کے لیے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔ اسے دراصل تمہارا انتظار تھا۔ تم سے ملاقات کی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا اور اس کی چھٹی حس اسے خبردار کررہی تھی کہ وہ کسی برے انجام سے دوچار ہونے والی تھی۔ اس لیے وہ جلد کچھ کر گزرنا چاہتی تھی۔ اس نے مجھے تمہاری جانشین سمجھ کر تمام معلومات میری جھولی میں ڈال دیں۔"

راحیلہ کو جیسے یکدم کوئی خیال آیا۔ چونکتے ہوئے بولی "میں تمہیں نہایت اختصار سے سب کچھ بتارہی ہوں۔ کسی بھی بات کی تفصیل میں نہیں جارہی۔ اس کے باوجود اگر تم بور ہورہے ہو تو مجھے بتادو۔ یہ باتیں پھر کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔"

"بیکار باتیں مت کرو۔ جن چکروں نے ہماری زندگی خراب کررکھی ہے ان کے بارے میں سنتے ہوئے میں بور ہونے لگوں گا؟ یہ تو اشتیاق اور تجسس کی زیادتی کی وجہ سے اس وقت میں خلاصے پر اکتفا کررہا ہوں۔ بعد میں اگر آرام و سکون سے بیٹھنا نصیب ہوا اور ذرا زیادہ فرصت میسر آئی تو میں ہر بات پوری تفصیل سے سنوں گا۔" میں نے تیزی سے کہا۔

تب وہ صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی "ہنی سے میری ملاقات بھگدڑ کی سی حالت میں ہوئی تھی۔ خوف سے اس کے حواس ٹھکانے نہیں تھے لیکن اس نے مختصر وقت میں جو کچھ مجھے بتادیا وہ میری توقعات سے کہیں زیادہ تھا۔ خوشی اور ہیجان سے میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ میں بھاگی بھاگی نفیس صاحب کے پاس گئی۔ میرا خیال ہے اس دوران میں کچھ زیادہ محتاط نہیں رہ سکی اور ریڈ ڈاٹ والوں کی نظر میں آگئی۔"

"اوہ!" میں نہایت دھیمی آواز میں کراہ کر رہ گیا۔

"تاہم یہ اچھا ہوا کہ میں نے فوری طور پر وہ معلومات نفیس صاحب کو منتقل کردی تھیں اور وہ کمپیوٹرائزڈ کارڈ بھی ان کے سپرد کردیا تھا۔ انہوں نے ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور فوری طور پر آپریشن کے انتظامات کیے۔ منصوبہ ان کا یہی تھا کہ اس زیرِ زمین ٹھکانے پر قبضے کی کوشش کی جائے اور جتنے بھی زیادہ سے زیادہ لوگ زندہ ہاتھ آسکیں انہیں زندہ پکڑا جائے لیکن اگر اس میں ذرا بھی دشواری پیش آئے یا ان لوگوں کی طرف سے خطرناک ردِعمل ظاہر ہو تو پھر کسی بات کی پروا کیے بغیر سب کچھ تباہ کردیا جائے لیکن سب تیاریاں کرنے کے بعد جب انہوں نے مجھے بریف کرنے کے لیے میرے ٹھکانے پر تلاش کیا تو میں غائب تھی۔"

"تم کہاں چلی گئی تھیں؟" میں نے جاننا چاہا۔

"مجھے ریڈ ڈاٹ والوں نے اغوا کرلیا تھا۔" اس نے طویل سانس لے کر کہا۔

"اوہ نو" میرے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر بھینچ دیا "کیا انہوں نے تمہیں ٹارچر کیا؟"

"ابھی انہوں نے ہلکا پھلکا آغاز ہی کیا تھا۔ کرنٹ وغیرہ لگایا اور کچھ خاص قسم کی چیرپھاڑ کا ارادہ کررہے تھے لیکن انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس لیے میں بچ گئی۔ ان کے تو میرے بارے میں بہت لمبے پروگرام تھے۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ ان کے زیرِ زمین قلعے کے خلاف اسی رات آپریشن ہونے والا تھا۔ وہ تو میری برین واشنگ وغیرہ بھی کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔"

"انہوں نے تم سے کیا پوچھ گچھ کی؟"

"پوچھ گچھ کی بھی زیادہ جلدی نہیں تھی۔ ابتدائی طور پر وہ یہی جاننا چاہتے تھے کہ مجھے ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کیا معلومات حاصل تھیں اور میں نے انہیں کہاں تک پہنچایا تھا۔ میں ٹال مٹول کرتی رہی۔ انہیں الٹے سیدھے جواب دیتی رہی۔ ستم ظریفی یہ تھی کہ اس دوران ہنی بھی وہاں موجود تھی۔ بظاہر وہ سمندر کی طرح پرسکون تھی لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کی دلی کیفیت کیا ہوگی۔ اسے یقیناً خدشہ ہوگا کہ میں تشدد کی وجہ سے اس کا پول کھول دوں گی کہ اس نے ہمیں کچھ معلومات فراہم کی تھیں لیکن میں نے زبان بند رکھی۔ تاہم یہ ہم دونوں ہی کی خوش قسمتی تھی کہ ریڈ ڈاٹ والوں کو ہماری ملاقات کا علم نہیں تھا۔ ہمیں ملتے ہوئے دیکھ لیا گیا تھا البتہ انہیں یہ علم نہیں ہوسکا تھا کہ ہمارے درمیان کیا بات چیت ہوئی تھی۔ ہنی بھی ان کی نظر میں ایک بار پھر مشکوک ہوچکی تھی لیکن وہ بظاہر انجان بنے ہوئے تھے اور شاید ایک آدھ دن انتظار کرکے دیکھنا چاہتے تھے کہ حالات کیا رخ اختیار کرتے ہیں۔"

"اس دوران تم پر تشدد کا سلسلہ جاری رہا؟" میں نے مضطربانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں" اس نے نفی میں سرہلایا "میں نے بتایا ناکہ انہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ اسی دوران ایک شخص وہاں نمودار ہوا جہاں مجھے ایک عجیب و غریب سی کرسی پر باندھ کر بٹھایا گیا تھا۔ معلوم نہیں وہ شخص کہیں باہر سے آیا تھا یا پہلے سے وہیں موجود تھا۔ وہ ایک دبلا پتلا لمبے سے قد کا سفید فام تھا۔ جوان تھا مگر اس کی کمر میں بوڑھوں کی طرح خم تھا۔ نوکیلی سی ناک پر موٹے موٹے شیشوں کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ اس کا نام برنارڈ تھا اور وہ ایک سرجن تھا۔ ایک سرجن تو کرسچین برنارڈ تھا جس نے تبدیلیٔ قلب کا پہلا کامیاب آپریشن کرکے شہرت پائی تھی لیکن یہ کوئی اور برنارڈ تھا اور کچھ دوسری قسم کا سرجن تھا۔

"وہ لوگ کچھ دیر ایک کونے میں کھڑے کھسرپھسر کرتے رہے۔ پھر وہ سفید فام میرے قریب آیا جو اس وقت تک مجھ سے سوالات کرتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ تھی۔ وہاں موجود باقی لوگ بھی گویا کسی مذاق سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ مجھ سے پوچھ گچھ کرنے والا سفید فام بولا "ہم تمہیں دوسری سزائیں

بھی دیں گے لیکن زیادہ تر سزائیں ہمیں اس لیے پسند نہیں کہ ان کی تکلیف... ان کے نشانات اور ان کی اذیت ناک یادیں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دھندلی پڑ جاتی ہیں لیکن ہم تمہیں فی الحال ایک ایسی سزا دیے رہے ہیں جس کی نشانی تمہارے چہرے پر ہمیشہ موجود رہے گی۔"

"پھر مجھے ایک دوسرے کمرے میں لے جایا گیا جو باقاعدہ ایک نہایت جدید قسم کا آپریشن تھیٹر معلوم ہو رہا تھا۔ وہاں اس سرجن نے میرے چہرے پر ایک عجیب قسم کے مارکر سے سیدھی لکیر کھینچ کر گویا اسے دو حصوں میں تقسیم کیا پھر برش کی مدد سے اس پر نہ جانے کس کس طرح کے محلول چینٹ کیے جو اس وقت تک تو بے رنگ ہی دکھائی دے رہے تھے۔

"پھر میرے چہرے پر خلا بازوں کے ماسک جیسا ایک ماسک چڑھا دیا گیا۔ اس کے ساتھ بہت سی تاریں منسلک تھیں پھر کوئی سوئچ آن کیا گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے چہرے کے اس آدھے حصے میں مرچیں بھر دی گئی ہوں جس پر کئی طرح کے محلول لگائے گئے تھے۔

"میں تڑپنے لگی لیکن انہوں نے زیادہ اذیت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ فوری طور پر مجھے ایک انجکشن لگا دیا گیا جس کے لگتے لگتے ہی میں سو گئی۔ میری آنکھ کھلی تو میں ایک بار پھر اسی ہال نما کمرے میں تھی جہاں مجھے "آپریشن" سے پہلے رکھا گیا تھا۔

میرے چہرے پر ماسک وغیرہ کچھ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی تکلیف تھی۔ میرے آس پاس چند افراد موجود تھے۔ ایک تو وہی ڈاکٹر برنارڈ تھا۔ اس مردود کے چہرے پر کچھ ایسی طمانیت بھری مسکراہٹ تھی جیسے ایک مصور کوئی شاہکار تخلیق کرنے میں کامیاب ہو گیا ہو۔ وہ سفید فام بھی بہت خوش نظر آ رہا تھا جو مجھ سے پوچھ گچھ کرتا رہا تھا اور جس نے اپنی نگرانی میں مجھ پر کچھ دیر تشدد کرایا تھا۔ وہاں موجود لوگ اسے مسٹر کم کہہ کر پکار رہے تھے۔ ویسے میرا خیال ہے یہ سب ان کے اصل نام نہیں تھے۔

بہرحال میری کرسی کو ایک دیوار کے قریب دھکیل دیا گیا جس میں بڑا سا آئینہ لگا ہوا تھا۔ میں گردن سیدھی نہیں کر سکتی تھی۔ میری گردن میں بھی نائیلون کا ایک اسٹریپ بندھا ہوا تھا' تاہم میں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ سکتی تھی جو ایسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا اس وقت تم دیکھ رہے ہو۔ میں نے جو کچھ بھی محسوس کیا وہ ایک الگ مسئلہ تھا تاہم مجھے یہ یقین ہرگز نہیں تھا کہ میرا چہرہ مستقل طور پر ایسا ہو چکا تھا۔ مجھے یہ اندیشہ تو محسوس ہوا تھا کہ انہوں نے میرے آدھے چہرے کی جلد جلا دی تھی لیکن ذہن کے کسی گوشے میں یہ اُمید بھی بہرحال موجود تھی کہ اس کا کوئی نہ کوئی حل' کوئی نہ کوئی علاج موجود ہوگا۔

"کم نے دوسرے ہی لمحے یہ اُمید میرے دل سے نکال دی۔ وہ ہنستے ہوئے بولا "ہم تمہارے ساتھ مزید جو کچھ بھی کرنا چاہتے ہیں وہ ہمیں نہایت حقیر محسوس ہو رہا ہے۔ یہ سزا جو ہم نے فی الحال تمہیں دی ہے' اس وقت تمہیں زیادہ تکلیف دہ محسوس نہیں ہوئی ہوگی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تمہیں اس کی اذیت کا صحیح اندازہ ہوگا۔ اگر ہم نے تمہیں چھوڑ بھی دیا اور اس وقت جسمانی طور پر تمہاری حالت زیادہ عبرت ناک نہ بھی ہوئی تب بھی تمہارے لیے صرف یہی ایک سزا کافی ہوگی۔ ایک خوب صورت لڑکی کے لیے اس سے زیادہ تکلیف دہ سزا کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا چہرہ مضحکہ خیز بنا دیا جائے۔ وہ آسانی سے کہیں آ جا بھی نہ سکے۔ لوگوں میں اٹھ بیٹھ نہ سکے۔ صحیح معنوں میں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔"

"وہ سب اپنے اس مذاق پر بہت محظوظ ہو رہے تھے۔ کم نے گویا میری معلومات میں اضافہ کیا "دنیا کا کوئی ماہر ترین سرجن بھی نہ تو اب چہرے کے اس حصے کی گرافٹنگ کر سکتا ہے اور نہ ہی جلد کا کوئی بڑے سے بڑا ماہر اس کا رنگ تبدیل کر سکتا ہے۔ اس کا علاج صرف اور صرف ڈاکٹر برنارڈ کے پاس ہے اور ڈاکٹر برنارڈ ہمارے پاس ہے۔" راحیلہ میری طرف دیکھتے ہوئے عجیب سے انداز میں مسکرائی اور خاموش ہو گئی۔

"پھر کیا ہوا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "تم میرے چہرے کے بارے میں تفصیل جاننے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ کہانی تو یہیں ختم ہو گئی۔"

"کیا انہوں نے تمہیں رہا کر دیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں' وہ مجھ پر اتنے مہرباں نہیں تھے۔" راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی "ہوا یہ کہ اس رات پچھلے پہر تک میری تلاش میں ناکام رہنے کے بعد نفیس صاحب نے اپنے تیار کردہ پلان کے مطابق ریڈ ڈاٹ کے زیر زمین قلعے پر حملہ کر دیا۔ انہیں یہ شبہ تو تھا کہ ریڈ ڈاٹ نے مجھے اغوا کر لیا ہے لیکن یہ یقین نہیں تھا کہ میں اسی زیر زمین قلعے میں موجود تھی ورنہ شاید وہ مجھے بہ حفاظت بازیاب کرانے کے لیے کوئی حکمتِ عملی تیار کرنے کی کوشش کرتے جو تقریباً ناممکن سا ہی کام تھا۔ یہ تو بس میری قسمت ہی اچھی تھی کہ میں اس قسم کی کسی حکمتِ عملی کے بغیر بھی زندہ بچ گئی۔ نہ صرف زندہ بچ گئی بلکہ میں نے ان کی قیدی ہوتے ہوئے بھی انہی کے خلاف آپریشن میں حصہ لیا۔"

"مجھے تم سے یہی اُمید تھی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اُمیدیں وغیرہ تو سب دھری رہ جاتیں۔ وہ تو بس قسمت نے ساتھ دے دیا۔" راحیلہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "اس میں میری صلاحیتوں وغیرہ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ میں تو بدستور اس وہیل چیئر نما چیز پر بندھی ہوئی تھی۔ میرے ہاتھ پاؤں حتیٰ کہ گردن تک چمڑے کے یا پھر شاید نائیلون کے تسموں میں کسی ہوئی تھی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس وقت مجھ پر زندگی میں شاید پہلی بار مایوسی نے غلبہ پایا تھا۔ میں نہ صرف اپنی زندگی کی طرف سے مایوس ہو چکی تھی

بلکہ مجھے اپنا انجام بھی نہایت بھیانک نظر آ رہا تھا۔

"مجھے وہاں بے پناہ سردی لگ رہی تھی اور کسی نے میرے اوپر کمبل تک نہیں ڈالا تھا۔ وہ سب جیسے مجھے اس بڑے سے کمرے میں چھوڑ کر بھول گئے تھے۔ میں اس وقت خدا سے یہ دعا مانگ رہی تھی کہ مجھے کسی اذیت ناک انجام سے دوچار کرنے کے بجائے خاموشی سے موت دے دے۔

"اچانک گویا قیامت ٹوٹ پڑی۔ بے تحاشہ فائرنگ ہونے لگی۔ دھماکے گونجنے لگے۔ وہاں خنک ہوا کی سپلائی کا جو نظام موجود تھا وہ بھی جیسے یکدم ہی جواب دے گیا۔ گھٹن محسوس ہونے لگی اور ہر طرف بارود کی بو پھیلنے لگی۔ موت تو مجھے گویا سامنے ہی نظر آ رہی تھی لیکن میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکی کہ میں نے تو اللہ سے پُرسکون موت کی دعا کی تھی' یہ مجھے کس انداز میں موت آ رہی تھی؟

"مجھے بعد میں پتا چلا کہ نفیس صاحب خود اس کمپیوٹر کارڈ کے ذریعے دروازہ کھول کر اس قلعے میں داخل ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھیوں کی قیادت خود کر رہے تھے۔ روایتی افسروں کی طرح کسی محفوظ جگہ پر بیٹھ کر حکم نہیں چلا رہے تھے حالانکہ وہ انٹیلی جنس کے شعبے کے آدمی ہیں۔ میدانِ جنگ کے آدمی نہیں ہیں لیکن اس روز وہ سب مشین گن اٹھائے سب سے آگے تھے۔

"وہ ایک عجیب ساخت کا مکان تھا۔ اس کی دیواروں تک میں آلات نصب تھے اور وہاں کی ہر چیز کمپیوٹرائزڈ تھی۔ اس کی بعض دیواریں سیمنٹ اور اینٹوں وغیرہ کے بجائے پلاسٹک جیسے کسی میٹریل سے بنی ہوئی لگتی تھیں۔ جلد ہی وہ دیواریں ٹوٹنے لگیں اور ان میں سے دُھواں نکلنے لگا۔

"اس دوران ہنی دوڑتی ہوئی میرے کمرے میں آئی۔ وہ سخت وہشت زدہ تھی۔ وہ شاید مجھ سے کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اسے ایک لفظ بھی بولنے کا موقع نہیں ملا۔ دو تین آدمی عجیب ساخت کی گنیں لیے اس کے پیچھے تھے۔ ان میں سے ایک چیخ کر بولا "یہاں غدار صرف یہی ہو سکتی ہے۔ اسی کی وجہ سے کارڈ باہر گیا ہوگا۔ میں نے باس سے پہلے ہی کہا تھا اس پر بھروسا مت کرو۔"

دوسرا چیخ کر بولا "لیکن اسے مارو مت۔ اسے ہم انہی لوگوں کے سامنے اچانک پھینکیں گے۔ اسے انہی کی گولیوں کا نشانہ بننے دو۔"

"وہ اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے باہر لے گئے۔ میری طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ میں تو ویسے بھی بندھی پڑی تھی۔ انہوں نے اپنی دانست میں تو مجھے مرنے کے لیے ہی چھوڑ دیا تھا۔ میرے اردگرد قیامت کا شور جاری رہا۔ کہیں فلیش لائٹ کے سے جھماکے بھی ہو رہے تھے جس کی نیلگوں روشنی ایک ثانیے کے لیے کمرے میں پھیل جاتی تھی۔ پھر ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ آدھی چھت ٹوٹ کر ترچھی کمرے میں آن گری لیکن وہ تختے کی طرح

دیواروں کے درمیان پھنس گئی اور خدا کی قدرت دیکھو کہ میں جس حصے میں تھی اس طرف نہیں گری۔ مجھ پر وہ ایک سائبان کی طرح ترچھی کھڑی ہو گئی۔ اس میں پچھلے کنارے کی طرف سے آگ بھڑکنا شروع ہو چکی تھی۔ تپش اور گھٹن سے میں تقریباً بے ہوش ہونے والی تھی۔

"دفعتاً گول گول سی آنکھوں والا ایک شخص اندر آیا۔ میں اسے پہلے بھی وہاں دیکھ چکی تھی اور کوئی ہونق قسم کی چیز سمجھی تھی لیکن مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کوئی الیکٹرانک وزرڈ کوئی نہایت جینیئس قسم کی چیز تھا اور وہ ہنی ہی تھا' دراصل وہی ہنی کا محبوب عدنان تھا جسے معلوم نہیں کیوں وہاں مسٹر جے کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ وہ ہنی کو نہیں پہچانتا تھا اور نہ ہی اسے اپنے ماضی کے بارے میں کچھ یاد تھا۔ ممکن ہے کسی مصلحت کے تحت اس نے ایسا رویہ اختیار کر رکھا ہو۔ وہ ہر وقت کچھ وحشت زدہ سا دکھائی دیتا تھا جس کی وجہ سے اس کی آنکھیں گول گول سی معلوم ہوتی تھیں۔

"اس وقت وہ میرے لیے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا۔ اس نے کرسی کے پیچھے لگے ہوئے کچھ بٹن دبائے اور میری بندشیں کھل گئیں۔ اس کے پاس خوف ناک سی ایک گن تھی جو اس نے مجھے دے دی اور صرف ایک جملہ کہا "اگر یہاں سے جان بچا کر نکل سکتی ہو تو فوراً نکل جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ پٹ سے گرا اور مر گیا۔ تب میں نے دیکھا' اس کے سینے میں دو تین گولیاں پیوست تھیں' زندگی کے آخری چند لمحے اس نے میری زندگی بچانے میں صرف کر دیے اور اس طرح میرے کام آیا کہ میں اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔" وہ متاسفانہ سے انداز میں خاموش ہو گئی۔ ہر گزرتے ہوئے لمحے کے ساتھ میرے دل کا بوجھل پن بھی بڑھتا جا رہا تھا لیکن میں اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"پھر کیا ہوا؟" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا۔

"بس... میں بندشوں سے آزاد ہوئی اور گن میرے ہاتھ میں آئی تو گویا میرے جسم میں نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ میں نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا۔ وہ بلاشبہ ہمارے لیے قیامت کی سی رات تھی۔ نفیس صاحب کی کوشش تھی کہ وہاں سے کچھ لوگ زندہ ہاتھ آ جاتے لیکن انہوں نے مرنے یا مار دینے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ بے [illegible] خون ریزی ہوئی۔ نفیس صاحب کے بھی بہت سے آدمی مارے گئے۔ انہوں نے ہمارے ساتھیوں کو قربانی کا بکرا نہیں بنایا تھا۔ انہیں پیچھے رکھا تھا اور اپنے کمانڈوز کو آگے رکھا تھا۔ اس وقت تک ان کا خیال تھا کہ ان کے کمانڈوز ہمارے ساتھیوں سے [illegible] لڑاکے تھے۔"

"کیا اب ان کی رائے بدل چکی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرا خیال ہے دل ہی دل میں تو بدل چکی ہے۔ زبان سے انہوں نے کبھی کسی واضح رائے کا اظہار نہیں کیا۔" راحیلہ

جواب دیا "بہرحال ان کی حکمتِ عملی عمدہ تھی۔ جانی نقصان پھر بھی توقع سے کم ہوا۔ ریڈ ڈاٹ کے تو جتنے بھی لوگ وہاں موجود تھے سب مارے گئے۔ دراصل وہ حملہ ان کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ انہوں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی دروازہ کھول کر بھی اندر آسکتا تھا' اگر کوئی دیوار یا دروازہ توڑ کر اندر گھسنے کی کوشش کرتا تو خودبخود ان کا دفاعی نظام حرکت میں آجاتا اور انہیں خود بھی سنبھلنے کا موقع مل جاتا۔ اس صورت میں ان کا اپنا جانی نقصان بہت کم ہوتا۔ ہمارے بہت آدمی مارے جاتے۔ انہیں اپنے سائنسی شعبدوں کو استعمال کرنے کا بھی موقع نہیں ملا پھر بھی انہوں نے جو آتشیں ہتھیار استعمال کیے ہمارے ہتھیاروں کے مقابلے میں تو وہ بھی نہایت جدید اور خطرناک تھے۔"

"کیا وہ زیرِ زمین قلعہ مکمل طور پر تباہ ہوگیا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں مکمل طور پر تو نہیں۔" راحیلہ بولی "وہاں سے بہت سی کام کی چیزیں ہمارے ہاتھ لگیں۔ لوگ بہرحال سب مارے گئے۔ انہوں نے پکڑے جانے پر ... مرجانے کو ترجیح دی۔ نفیس صاحب کی نظر میں یہ ایک کامیاب آپریشن رہا۔"

"اور تمہاری نظر میں؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے کندھے اُچکائے اور طویل سانس لے کر بولی "میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکی۔ ایک لحاظ سے تو اچھا ہوا کہ ریڈ ڈاٹ کا ہم پر جو ہوّا سا بیٹھا ہوا تھا اور ہمیں وہ کوئی طلسماتی سی چیز لگتی تھی وہ تصور ٹوٹ گیا۔ ان کا ٹھکانا اس طرح تباہ ہونے اور اتنے لوگوں کے مارے جانے سے ہمارے حوصلے بڑھے۔ ہمیں یقین ہوگیا کہ وہ بھی قابلِ شکست ہیں ورنہ لاشعوری سے انداز میں شاید ہم سب یہ سوچتے تھے کہ وہ کوئی ناقابلِ شکست طاقت ہیں۔ ایک بات بہرحال طے ہے اگر نفیس صاحب مکمل طور پر اس کے لیے کمربستہ نہ ہوتے تو یہ کام بہت مشکل تھا۔ اس کے لیے بہت زیادہ وسائل اور بہت زیادہ مین پاور چاہیے تھی جو ہمارے پاس نہیں تھی۔ ہم شاید ایک ایک کرکے ان سے ٹکرا کر مرتے رہتے' تباہ ہوتے رہتے۔ ہم ان پر اتنا بڑا حملہ نہیں کرسکتے تھے' جتنے بڑے حملے کا انتظام نفیس صاحب نے کیا۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا ہمارے ہاں اتنے بہت سے غیر ملکی آکر زیرِ زمین قلعے تک تعمیر کرلیتے ہیں اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔" میں نے تعجب سے کہا۔

"ہمارا ملک تو ایک مدت سے انٹرنیشنل یتیم خانہ بنا ہوا ہے۔ جتنی تعداد میں غیر ملکی چاہیں یہاں آکر' جو دل چاہے کرتے رہتے ہیں۔ سفید فام قوموں کا تو ویسے ہی آج تک ہم پر تسلط ہے۔ انہیں تو جو کرنا ہوتا ہے دھونس سے کرتے ہیں۔ ویسے بھی وہ لوگ بہت مکار ہیں۔ کسی مشن' کسی اسٹڈی ٹور' آرکیالوجی کی کسی مہم یا ہماری ہی درخواست پر کیے گئے جیالوجیکل سروے وغیرہ کی آڑ میں نہ جانے کیا کچھ کرکے چلے جاتے ہیں۔ ہمیں کچھ پتا نہیں چلتا۔ ہم لوگ صرف اس وقت ہوش میں آنے کے عادی ہیں جب پانی سر سے اونچا ہوچکا ہوتا ہے۔ میں تو شکر کررہی ہوں کہ اب بھی ریڈ ڈاٹ کے بارے میں فیصلہ کن کارروائی ہوگئی اور ابھی مزید کارروائی جاری ہے اگر اب بھی اس سلسلے میں کچھ نہ ہوتا تو ہم کیا کرلیتے!"

میں اس کی تائید میں سرہلائے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میرے لیے ایک لحاظ سے یہ آپریشن مایوس کن رہا کیونکہ میرا چہرہ ایسا کا ایسا ہی رہ گیا۔ وہاں جو لوگ مارے گئے ان میں ڈاکٹر برنارڈ کی لاش نہیں تھی اور نہ ہی وہ زندہ ہاتھ آیا۔ وہ غالباً میرے چہرے پر اپنی کاریگری کا مظاہرہ کرنے کے بعد وہاں سے چلا گیا تھا۔ چنانچہ اب میری زندگی کی جو دیگر مصروفیات چل رہی ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں لیکن ان کے ساتھ ایک نئی اور اہم مصروفیت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ مجھے ڈاکٹر برنارڈ کو تلاش کرنا ہے ورنہ باقی زندگی میرا چہرہ ایسا ہی رہے گا۔"

پھر ذرا توقف سے وہ بولی "ویسے میں نے ایسے ہی چہرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرلیا ہے۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کرنے کی۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر برنارڈ اگر پاتال میں بھی اُتر گیا ہوگا تو میں تمہارے لیے اسے ڈھونڈ نکالوں گا۔"

"یہ کوئی ایسا اہم مسئلہ نہیں' اسے ذہن پر سوار مت کرو۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"زیادہ بے نیاز بننے کی کوشش مت کرو۔" میرے لہجے میں غیرارادی طور پر ہلکی سی اداسی ... آگئی "میری وجہ سے پہلے ہی تمہارا بہت کچھ چھن چکا ہے اور اب چہرہ بھی....." میری سانس بوجھل سی ہوگئی "وہ مردود ریڈ ڈاٹ والے ٹھیک کہہ رہے تھے ایک حسین لڑکی کے لیے اس کا چہرہ قدرت کا انعام بھی ہوتا ہے اور اس کا ایک اہم اثاثہ بھی۔ انہوں نے واقعی بڑی ستم ظریفانہ سفاکی کا مظاہرہ کیا ہے' پورا چہرہ سیاہ ہوتو مضحکہ خیزی کا پہلو نہیں نکلتا۔ ایسے چہرے کے ساتھ واقعی ایک لڑکی اس سوسائٹی میں کس طرح زندگی گزار سکتی ہے۔"

"میں گزار لوں گی۔ زندگی کچھ اتنی طویل بھی نہیں ہوتی جتنی محسوس ہوتی ہے۔" وہ بدستور بے پروائی سے بولی "اور خدا کے لیے تم میری خاطر اپنے آپ کو مجرم مجرم محسوس کرنا چھوڑ دو۔ یہ بات میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں۔ میری زندگی میں وہی کچھ ہوگا جو کاتبِ تقدیر نے لکھ دیا ہوگا۔ تم کسی بھی چیز کے ذمّے دار نہیں ہوگے۔"

"شکریہ' میرے ضمیر اور ذہن پر سے بوجھ کم کرنے کی اس مخلصانہ کوشش کا بہت شکریہ۔" میں نے کہا "بہرحال ڈاکٹر برنارڈ کو

تلاش کرنا صرف تمہاری ذمّے داری نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے' میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ میں اکیلی ہی اسے تلاش کررہی ہوں۔ تمام ساتھیوں نے بھی اس کام کو سرِفہرست رکھا ہوا ہے۔ اب تم آگئے ہو تو ظاہر ہے تم بھی اس مسئلے سے لاتعلق تو نہیں رہ سکتے۔ نفیس صاحب اور ان کے آدمیوں نے بھی ڈاکٹر برنارڈ کی تلاش کے کام کو فراموش نہیں کیا ہے۔ اس سلسلے میں ہر ممکن کوشش کی بھی جارہی ہے۔ ایک ایک سفید فام غیر ملکی کو چیک کیا جارہا ہے۔ اس کی شکل وشباہت سب کو ذہن نشین کرادی گئی ہے۔"

پھر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور بولی "میں اپنے آپ کو اس لیے بھی اسی چہرے کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے ذہنی طور پر تیار کررہی ہوں کہ اگر ڈاکٹر برنارڈ مل بھی گیا اور وہ میرا چہرہ ٹھیک کرنے پر تیار نہ ہوا تو کیا ہوگا؟"

"اس کا تو باپ بھی تیار ہوگا۔" میں نے بے ساختہ کہا "اس کے آباواجداد کی روحیں بھی آکر اس کے سامنے ہاتھ جوڑیں گی کہ اسے جو کچھ کہا جارہا ہے وہ ضرور کرے۔"

وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے ہنسی "اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ پہلے صرف یہ دعا کرو کہ برنارڈ مل جائے۔"

"مل جائے گا مل جائے گا۔" میں نے گویا اسے نہیں بلکہ خود کو یقین دلایا پھر پوچھا "لیکن اس سے پہلے کیا تم نے یہاں اپنی سی کوششیں کرکے نہیں دیکھیں؟ ہمارے ملک میں بھی تو جِلدی امراض کے بڑے بڑے ماہر پڑے ہیں۔"

"بہت سی کوششیں کی جاچکی ہیں۔ میں لاہور اور کراچی بھی ہو آئی ہوں' جلد کے بڑے بڑے ماہرین نے کچھ دوائیں آزمائیں جن سے کوئی فرق پڑنے کے بجائے اُلٹا تکلیف شروع ہوگئی اور سیاہ جلد پر مزید بدنمائی کے آثار پیدا ہونے لگے تو میں نے فوراً توبہ کرلی۔ کم ازکم اس وقت کوئی تکلیف تو نہیں ہے اور جلد بھی ہموار ہے۔" وہ اپنے چہرے کے سیاہ حصے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے مزید بتایا "جلد کے بے شمار ٹیسٹ بھی چند دنوں کے اندر اندر ہوچکے ہیں' جلد کے کچھ ذرّے کھرچ کر باہر کی کسی لیبارٹری میں بھی ٹیسٹ کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ وہاں سے بھی کوئی ہمت افزا جواب نہیں آیا۔ ماہرین کا خیال ہے کہ کسی حیرت انگیز طریقے سے الٹرا وائیولٹ شعاعیں اتنی طاقت کے ساتھ جلد میں جذب کردی گئی ہیں کہ جلد کے ذرات میں مستقل تبدیلی آگئی ہے لیکن میرا خیال ہے جس طرح ڈاکٹر برنارڈ نے کچھ فارمولوں کے تحت تھوڑی سی دیر میں یہ کام کیا تھا اسی طرح اس کے پاس انہیں بے اثر کرنے کا بھی کوئی فارمولا ہوگا۔ اس کا کوئی توڑ ہوگا۔"

"یقیناً" میں نے سرہلایا "یہ مسئلہ حل ہوجائے گا تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں فکرمند ہوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"چلو مان لیا تم فکرمند نہیں ہو لیکن میں ضرور فکرمند ہوں۔ یوں سمجھ لو کہ یہ تسلی میں خود کو دے رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

چند لمحوں کی بوجھل سی خاموشی کے بعد راحیلہ گہری سانس لے کر بولی "بہرحال یہ تھی میری داستانِ غم۔ تمہاری عدم موجودگی میں جو کچھ ہوا اب تم اس سے آگاہ ہوچکے ہو۔ اس کے بعد کے حالات تمہارے سامنے ہیں۔ اب تمہارا پروگرام کیا ہے؟"

"آج تو میں آرام کروں گا۔ میں بھی بڑی ذلت کے روزوشب گزار کر آرہا ہوں۔ نہ جانے کتنی راتیں ایسی گزری ہیں جب مجھے دو چار گھنٹے کے لیے بھی سونا نصیب نہیں ہوا اور پے درپے عجیب و غریب احمقانہ قسم کے حالات سے واسطہ پڑتا رہا۔ اگر تم اجازت دو گی تو ایک رات یہاں گزار لوں گا۔"

"مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔ اس مکان میں تین بیڈروم ہیں۔ ایک میں تم ڈیرا لگالینا جو روکھی سوکھی میسر ہوگی کھالینا۔" وہ کندھے اُچکا کر بے نیازی سے بولی۔

"بہت شکریہ میڈم! آپ نے اس خانہ بدوش کو پناہ عنایت فرمائی۔"

"یوں کہو کہ ایک خانہ بدوش نے دوسرے خانہ بدوش کو پناہ عنایت فرمائی ہے۔" راحیلہ نے تصحیح کی۔

میں نے اپنی واسکٹ اُتار کر ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے کہا "کل نفیس صاحب کی خدمت میں حاضری دینی ہے۔ دیکھیں' وہ میرے لیے کیا کام تجویز فرماتے ہیں۔ کہیں وہ مجھے ایک طوطا دے کر کسی فٹ پاتھ پر فال نکالنے کے لیے نہ بٹھادیں۔"

"یہ تو تمہارے لیے بہت ہی موزوں کام ہوگا۔ سب سے پہلے میری فال نکالنا۔" راحیلہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"تمہاری فال طوطا نہیں' اُلو صحیح طریقے سے نکالے گا۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"چلو پھر تو کام اور بھی آسان ہوجائے گا۔ یعنی تم خود ہی نکال لوگے۔" وہ مجھ سے بھی زیادہ سنجیدگی سے بولی۔

میں نے خون خوار نظروں سے اسے گھورا پھر دھیمے لہجے میں کہا "فال وال نکلوانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تمہارے حالات صرف ایک ہی صورت میں ٹھیک ہوسکتے ہیں اور وہ یہ کہ تم اللہ کے ایک نیک بندے سے شادی کرلو جس کا نام محمد افضل چوہدری ہے۔"

اب اس کی مجھے خونخوار نگاہوں سے گھورنے کی باری تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "اسے تم اللہ کا نیک بندہ کہہ رہے ہو؟"

"ہاں کیا بُرائی ہے اس میں؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"کوئی ایک بُرائی ہو تو بتاؤں۔" وہ بُرا سا منہ بنا کر بولی "اس سے تو اپنے حالات ہی نہیں سنبھلتے۔ اس کے ساتھ شادی کرکے

میرے حالات کیا ٹھیک ہوں گے۔"

"اصل میں اس کے اور تمہارے حالات بیک وقت اسی لیے تو خراب ہیں کہ تم دونوں کے ستارے الگ الگ سمتوں میں آوارہ پھر رہے ہیں' شادی ہوجائے گی تو ستارے مل جائیں گے اور دونوں کا صحیح سمت میں سفر شروع ہوجائے گا' حالات بالکل ٹھیک ٹھاک ہوجائیں گے۔" میں نے کہا۔

اس نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی "یہاں کوئی ایسی چیز بھی تو نہیں ہے جو اٹھا کر تمہارے سر پر مار سکوں۔"

"اس کی کیا ضرورت ہے تم حکم تو دو۔ جہاں کہو وہاں اپنا سر خود دے ماروں۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

وہ ایک لمحے خاموشی سے مجھے گھورتی رہی پھر اُلجھن زدہ سے لہجے میں سنجیدگی سے بولی "کیا مجھ سے شادی کا بھوت واقعی ابھی تک تمہارے سر سے نہیں اُترا؟"

"یہ بڑا ڈھیٹ' ضدی اور مستقل مزاج قسم کا بھوت ہے۔ یہ کبھی میرے سر سے نہیں اُترے گا۔ ایک نہ ایک روز میں تمہیں قائل کرکے چھوڑوں گا۔" میں نے غیر متزلزل لہجے میں کہا۔

"میرا مطلب ہے" اس نے اپنے چہرے کی طرف اشارہ کیا "کیا اس کے بعد بھی تم مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو؟"

"بالکل تیار ہوں اگر تمہیں کوئی شک ہے تو ابھی ٹونی کو بھیج کر کسی نکاح خواں کو بلوالو۔ سچائی کا اس سے بڑا کیا ثبوت ہوسکتا ہے؟ میں تو عملی آدمی ہوں' عملی بات کرتا ہوں۔ اب تو معاملہ اس لحاظ سے بہت اچھا ہے کہ لوگ میری بیگم کو دیکھیں گے تو کہیں گے' واقعی اب میں اپنے گھر میں سیاہ و سفید کا مالک ہوگیا ہوں۔"

وہ ایک بار پھر مجھے خاموشی سے گھورنے لگی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی تھی۔ آخر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تمہارا واقعی کوئی پُرزہ گرا ہوا ہے۔"

"نہیں پُرزہ نہیں گرا ہے۔ یہ مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "بہرحال بات خواہ کچھ بھی ہو لیکن تمہیں اب یہ یقین تو آجانا چاہیے کہ تمہیں مجھ جیسا مستقل مزاج عاشق دنیا میں کہیں نہیں مل سکتا۔ میں شوہر بھی ایسا ہی وفادار ثابت ہوں گا۔"

"مجھے عاشق کی ضرورت ہے نہ شوہر کی۔" وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی "آخر تم ہر تھوڑے عرصے بعد یہ بے ہودہ موضوع کیوں لے کر بیٹھ جاتے ہو؟"

"توبہ کرو.... توبہ۔" میں نے گال پیٹتے ہوئے کہا "اتنے ضروری اور اہم موضوع کو بے ہودہ کہتی ہو۔ اس دنیا میں اکثریت شادی شدہ لوگوں کی ہے' تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ وہ سب بے ہودہ زندگی گزار رہے ہیں؟"

"میں کیا کہہ رہی ہوں وہ خود اپنے بارے میں یہی کہتے ہیں۔" راحیلہ بُرا سا منہ بنا کر بولی "سال دو سال میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارتے ہیں تو سارا عشق ہوا ہوجاتا ہے۔ باقی صرف بک بک رہ جاتی ہے۔ جو کچھ جس طرح ہے اسے بس اسی طرح رہنے دو۔ اس خوب صورت تصویر کو خراب مت کرو۔"

اچانک باہر کسی کے باتیں کرنے کی آواز سُنائی دی۔ جواباً ٹونی کچھ کہہ رہا تھا۔ راحیلہ جلدی سے اٹھتے ہوئے بولی "میں دیکھتی ہوں۔"

اس نے کھڑکی کا پردہ ذرا ہٹا کر باہر دیکھا پھر جلدی سے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "یہ تو اسپتال سے کوئی آیا ہے۔"

میں بھی اٹھ کر اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک پہنچا۔ لان پر کوئی باوردی نوجوان کھڑا ٹونی سے بات کررہا تھا۔ وہ وارڈ بوائے معلوم ہوتا تھا۔ ٹونی بولا "میڈم! آپ فوراً اسپتال چلیں۔ ہنی کی طبیعت زیادہ خراب ہوگئی ہے۔"

راحیلہ جلدی سے اندر آئی اور ایک بار پھر اپنا چہرہ برقع کی نقاب اور چشمہ وغیرہ کے عقب میں چھپانے کا اہتمام کرنے لگی۔ اسی دوران فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ فون آئی سی یو سے تھا اور وہاں موجود ڈاکٹر راحیلہ کو ہنی کے بارے میں وہی اطلاع دے رہا تھا جو وارڈ بوائے لے کر آیا تھا۔

ٹونی وہیں رہا۔ میں اور راحیلہ بھاگم بھاگ آئی سی یو میں پہنچے۔ ہنی بالکل اسی طرح آنکھیں بند کیے سیدھی لیٹی تھی جس طرح ہم اسے بہت دیر پہلے چھوڑ کر گئے تھے۔ اس کے قریب دو ڈاکٹر اور دو نرسیں افسردہ انداز میں سر جھکائے کھڑی تھیں۔ اس کے جسم سے جو مشینیں تاروں اور نالیوں کے ذریعے منسلک تھیں۔ ان کے ڈائلوں پر سوئیاں ساکت ہوچکی تھیں۔ اس کے پاس پہنچتے ہی سب سے پہلے میں نے یہی بات نوٹ کی تھی۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔

ہمارے پہنچنے پر ایک ڈاکٹر نے تھکے تھکے سے انداز میں سر اُٹھایا اور راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "میڈم! ہمیں افسوس ہے ہم اسے نہیں بچا سکے۔"

"تمہارا کام صرف کوشش کرنا تھا سو تم کرتے رہے۔ بچانے والا تو کوئی اور تھا۔ اسے منظور ہوتا تو بچا لیتا۔" راحیلہ نہایت دھیمے لہجے میں بولی اور ہنی کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے چادر ذرا سی ہٹا کر ہنی کا استخوانی ہاتھ تھام لیا۔ اس ہاتھ میں بھی ڈرپ کی سوئی پیوست تھی۔

ڈاکٹر اور نرسیں کیبن سے باہر چلی گئیں۔ میں نے ہنی کے دوسری طرف بیٹھتے ہوئے اس کا دوسرا ہاتھ تھام لیا۔ وہ برف کی طرح سرد تھا اور نیلا پڑ چکا تھا۔ اس لمس کے ذریعے گویا موت کی یخ بستگی میرے رگ و پے میں بھی رینگنے لگی۔ میرے دل میں ہولناک سا سناٹا پھیل گیا۔ شدتِ غم سے میری یہی حالت ہوتی تھی۔ آنسو بہتے نہیں تھے' انگارے بن کر اندر ہی اندر دل کو جلاتے تھے۔ میں آہ و بکا نہیں کرتا تھا شاید اسی لیے میرے اندر ایک اذیت ناک سناٹا پھیل جاتا تھا۔

راحیلہ نے ایک ہاتھ سے اپنا تاریک چشمہ ذرا کھسکایا اور ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھنے لگی۔ میں نے ایک بار پھر ہنی کے چہرے پر نظریں جمادیں۔ وہ چہرہ پہلے بھی گویا ایک مُردے ہی کا چہرہ تھا۔ اب اس کی مُردنی میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تھا بلکہ اُلٹا اب تو اس چہرے پر طمانیت سی پھیل گئی تھی' شاید ایک لحاظ سے موت اس کے لیے خوش آئند ہی تھی۔ اسے نہ جانے کس کس اذیت سے چھٹکارا مل گیا تھا۔

کئی منٹ تک کیبن میں سناٹا چھایا رہا۔ یہ موت کا سناٹا تھا پھر راحیلہ سر اُٹھاتے ہوئے آنسوؤں سے بھیگی اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی "شاید تمہارے ہی انتظار میں اس کے سینے میں سانس اٹکی ہوئی تھی۔ تم سے اس کے ملنے کی خواہش یقیناً بڑی شدید تھی تبھی تم اچانک بالکل غیر متوقع طور پر چلے آئے۔ شاید اسی کی کوئی خاموش دعا تمہیں یہاں کھینچے لارہی تھی۔"

"شاید" میں نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا "لیکن افسوس کہ میں اس کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکا۔"

"اس کا تو مجھے بھی زندگی بھر افسوس رہے گا۔ میں بھی اس کے لیے کچھ نہیں کرسکی حالانکہ صرف اسی کی وجہ سے ہمارے لیے ریڈ ڈاٹ پر ہاتھ ڈالنا اور اتنی بڑی کارروائی کرنا ممکن ہوسکا۔ اس کے علاوہ اسی کے ماضی کے دوست عدنان کی وجہ سے میری جان بچی ورنہ شاید میں ریڈ ڈاٹ کے اسی زیرِ زمین قلعے میں بے بسی سے ایک وہیل چیئر پر بندھی' آگ اور دُھوئیں میں جل کر دم گھُٹ کر مرجاتی اور کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔ افسوس ہم اپنی اس محسنہ کو بچا نہیں سکے۔"

"اس نے زندگی میں بہت سے اچھے اچھے کام کیے۔ کاش یہ ایک خوش انجام لڑکی ہوتی!" میں نے اذیت سے کہا۔

"شاید دوسری دنیا میں یہ ایک خوش انجام لڑکی ہو۔" راحیلہ سسکی لینے کے سے انداز میں بولی پھر اس نے اپنے برقع کی کسی جیب سے موبائل فون نکالا اور نمبر ملا کر بات کرنے لگی۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہوگیا۔ وہ نفیس صاحب سے بات کررہی تھی۔ وہ انہیں ہنی کی موت کی اطلاع دے رہی تھی۔ انہوں نے غالباً اظہارِ افسوس کیا اور اسے کچھ ہدایات دیں۔ آخر وہ فون بند کرکے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آؤ چلتے ہیں" وہ بوجھل لہجے میں بولی "اسپتال والے اور نفیس صاحب کے آدمی اس کی تکفین اور تدفین کا انتظام کردیں گے۔ یہ کہانی ختم ہوگئی' ہم اب اسے کوئی اور انجام نہیں دے سکتے۔"

میں بادلِ نخواستہ اس کے ساتھ باہر آگیا۔ اس نے ڈاکٹروں اور نرسوں کو کچھ ہدایات دیں۔ آخرکار ہم آئی سی یو سے نکل آئے۔ اس وقت شام کے سرمئی سائے پھیلنے لگے تھے۔ اسپتال کا ماحول یوں بھی کچھ ایسا روح پرور نہیں ہوتا خواہ اسپتال کتنا ہی اعلیٰ درجے کا کیوں نہ ہو لیکن اس وقت تو جیسے واقعی وہاں در و دیوار پر اُداسی بال کھولے سو رہی تھی' کچھ دیر پہلے میں راحیلہ سے نوک جھونک سے محظوظ ہورہا تھا لیکن اب گویا یکدم ہی میرے اندر کا موسم بدل گیا تھا۔

راحیلہ کی حرکات و سکنات میں بھی اب تک جو مستعدی نظر آرہی تھی وہ اب مفقود تھی۔ وہ سر جھکائے کچھ ڈھیلے ڈھالے سے انداز میں چلتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی "حالانکہ یہ خبر ہمارے لیے کئی دن سے متوقع تھی۔ یہ کوئی اچانک رونما ہونے والا واقعہ نہیں ہے پھر بھی نہ جانے کیوں دل کو بڑا دھچکا لگا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ میرا اس وقت اپنے محسوسات کے اظہار کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "اب شاید میرے یہاں رہنے کی بھی ضرورت نہ رہے۔ میں صرف ہنی کی وجہ سے اسپتال میں ٹھہری ہوئی تھی اور ٹونی میری وجہ سے یہاں ڈیوٹی دے رہا تھا۔"

"تو پھر اب ہم کہاں جائیں گے؟" میں نے حلق میں پھیلی کوئی کڑواہٹ سی نگلتے ہوئے پوچھا۔

"آج کی رات تو یہیں گزارتے ہیں' دیکھتے ہیں صبح ہمیں کیا احکامات ملتے ہیں۔" پھر راحیلہ ذرا توقف سے بولی "ہم ابھی تک نفیس صاحب کی ماتحتی میں کام کررہے تھے لیکن اب تم آگئے ہو۔ تم چاہو تو ہم ان سے علیحدگی اختیار کرسکتے ہیں۔ لاتعلق ہوسکتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔ اس کی کیا ضرورت ہے!" میں نے تیزی سے کہا "میری تو ابھی سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ ہمیں کیا کرنا چاہیے۔ اگر ان جیسے وسائل اور اختیارات رکھنے والے آدمی کی سرپرستی میں کام کرکے ہم ریڈ ڈاٹ کے فتنے سے نمٹنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں تو ہمیں اور کیا چاہیے۔ یہ بھی طے ہے کہ اس مسئلے سے نمٹے بغیر ہم سکون سے زندگی نہیں گزار سکیں گے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا کہ ہمیں نفیس صاحب کی نظر میں یہ مقام حاصل ہوگیا ہے۔ کوئی وقت تھا کہ میں نے انہیں اپنی بات کا یقین دلانے اور ان کا ذرا سا تعاون حاصل کرنے کے لیے بڑے پاپڑ بیلے تھے' اگر مجھے ذرا بھی اندازہ ہوجاتا کہ اس وقت وہ ڈپلومیسی سے کام لے رہے تھے تو شاید مجھے فرار ہونے کی ضرورت نہ پڑتی۔"

"وہ بہت گہرے آدمی ہیں۔ ان کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ اب بھی میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ ہم پر اتنے ہی فدا ہیں جتنے بظاہر نظر آتے ہیں۔ میں خواہ مخواہ جذباتی ہوکر ان کے ساتھ رہنے کے حق میں نہیں ہوں۔ البتہ میرے خیال میں مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ان کے ساتھ رہیں۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا۔

اس دوران ہم گھر واپس پہنچ گئے جہاں ٹونی بے تابی سے ہمارا منتظر تھا۔ تاہم اس نے اپنے لہجے سے بے تابی کا اظہار نہیں ہونے دیا اور پُرسکون انداز میں پوچھا "کیا بات تھی؟"

"ہنی مرگئی ہے۔" راحیلہ نے نہایت دھیمی آواز میں اختصار

سے بتایا۔

وہ شاید ہماری صورت دیکھ کر ہی اس بات کا اندازہ کرچکا تھا۔ وہ کچھ بولا نہیں۔ خاموشی سے جاکرلان کے ایک کونے میں سرجھکا کر بیٹھ گیا۔ ہم میں ایک دوسرے سے رسمی جملے کہنے کی سکت نہیں تھی اور اس وقت ہم اپنے محسوسات بھی بیان کرنے کی اہلیت اپنے اندر نہیں پارہے تھے۔

وہ رات میں نے جوں توں وہاں گزاری۔ صبح میں راحیلہ اور ٹونی ناشتے کے بعد نفیس صاحب کو فون کرنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ خود انہی کا فون آگیا۔ انہوں نے راحیلہ اور ٹونی کو ابھی وہیں رہنے کا حکم دیا اور مجھ سے بات کرتے ہوئے کہنے لگے "چند منٹ میں احمد تمہیں لینے پہنچ رہا ہے۔ وہ تمہیں ایک جگہ لے جائے گا۔ وہاں تمہارا میک اپ وغیرہ ہوگا۔ تمہارا حُلیہ بالکل بدل جائے گا۔ اس کے بعد تم لفٹ لیتے ہوئے یا کچھ پیدل چلتے ہوئے خانہ بدوشوں والی بستی تک پہنچنے کی کوشش کرنا کیونکہ اس حُلیے میں تم ٹیکسی میں اتنا لمبا سفر کرتے ہوئے اچھے نہیں لگو گے۔ میں چاہتا ہوں کہ ہمارے اپنے آدمی بھی تمہیں دیکھیں تو تمہاری کوئی بات ان کی نظر میں نہ کھٹکے۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔" میں نے آہستگی سے کہا پھر ایک لمحے کے توقف سے پوچھا "ہنی کی تدفین کے بارے میں آپ نے کیا سوچا؟"

"وہ سب طے ہوچکا ہے۔ اس کی تدفین خاموشی سے ہوگی۔ ہمارے خود سامنے آنے اور اس واقعے کو نمایاں کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے ہم اس کے جنازے میں شرکت نہ کرسکیں لیکن اس سے ہمارے دلوں میں اس کا احترام اور محبت کم نہیں ہوگی۔ وہ نہایت عظیم لڑکی تھی ہم سب کی محسنہ تھی۔" پھر وہ راحیلہ سے بات کرنے لگے۔ چند لمحے بعد انہوں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

کچھ دیر بعد احمد اپنی ٹیکسی لیے آن پہنچا۔ اسے بھی ہنی کی موت کی خبر مل چکی تھی۔ وہ بھی افسردہ تھا۔ مجھے ٹیکسی میں بٹھا کر روانہ ہوتے ہوئے وہ بولا۔

"یہ منحوس ریڈ ڈاٹ بھی ہم پر خدا کا عذاب بن کر ہی نازل ہوئی ہے۔ اس نے ہمیں بڑے زخم لگائے ہیں' کاش کوئی ایسا طریقہ ہوتا کہ ہم اس سے تعلق اور ہمدردی رکھنے والے ہر انسان نما حیوان کو ایک جگہ جمع کرسکتے اور ان پر کوئی ایٹم بم گراسکتے۔"

"تم مطمئن رہو۔ ان پر قدرت کی ناراضگی کا ایٹم بم ضرور گرے گا۔ تمہاری خواہش سے ذرا مختلف انداز میں سہی لیکن وہ اپنے انجام کو ضرور پہنچنے والے ہیں اور وہ یقیناً عبرت ناک انجام ہوگا۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"خدا کرے آپ کی پیش گوئی حرف بہ حرف درست ثابت ہو۔" وہ شاید خواہش کی تمام تر شدتوں کے ساتھ بولا۔

چند منٹ بعد ٹیکسی چھوٹے سے ایک بنگلے میں داخل ہوئی جس پر روشیلا بیوٹی پارلر کا بڑا سا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کے حصے میں شاید واقعی بیوٹی پارلر رہا ہو لیکن احمد مجھے اپنے ساتھ بنگلے کے عقب میں لے گیا اور بے دھڑک ایک کمرے میں جا گھسا۔

وہ ایک معمولی سی نشست گاہ معلوم ہوتی تھی۔ احمد نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود دیوار پر لگے ہوئے سوئچ بورڈ پر ایک سوئچ دبایا۔ چند لمحے بعد کمرے کا اندرونی دروازہ کھلا اور ایک لمبی تڑنگی' گوری چٹی' بھاری بھرکم ادھیڑ عمر عورت کھٹ کھٹ کرتی اندر آئی۔ وہ کسی فلمی قسم کی "میڈم" کے انداز میں لمبے سے ہولڈر میں سگریٹ سُلگائے لمبے لمبے کش لے کر ناک سے دُھواں نکال رہی تھی۔ اگر وہ یہ حرکت نہ کررہی ہوتی تو خاصی معقول عورت نظر آتی۔

احمد اس سے مخاطب ہوا "آپ کو اطلاع تو مل ہی گئی ہوگی میڈم؟"

"ہاں' یہ آدمی ہے؟" اس نے نیم وا آنکھوں سے میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔ اس کا جائزہ لینے کا انداز بتارہا تھا کہ اس کی جوانی خاصی پُرپیچ گزری تھی بلکہ اب ادھیڑ عمری میں بھی اس کی زندگی کے راستے کچھ زیادہ سیدھے سادے نہیں تھے۔ میری روح کو ہلکی سی جھرجھری آگئی۔

"جی ہاں یہی آدمی ہے۔" احمد مسکراتے ہوئے بولا۔

تب وہ عورت میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی "چلو اندر چلو۔" انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کہہ رہی ہو "اندر چلو... ذرا دیکھتی ہوں تم کتنے پانی میں ہو۔"

تاہم اس کی پیشہ ورانہ سی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ میں اُٹھا تو وہ آنکھیں سکیڑ کر ذرا قریب سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولی "یہ تو پہلے ہی گیٹ اپ میں ہے۔"

"جی ہاں وہ تو ہے لیکن یہ گیٹ اپ کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" احمد ملائمت سے بولا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" اس نے مجھے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ احمد وہیں بیٹھا رہا اور میں اس کے ساتھ ایک بہت بڑے کمرے میں پہنچ گیا جو کسی بہت بڑے فلم اسٹوڈیو کا میک اپ روم معلوم ہوتا تھا۔ تاہم وہاں کا سازوسامان فلم اسٹوڈیو کے میک اپ روم سے کہیں زیادہ قیمتی اور معیاری معلوم ہوتا تھا۔

غنیمت ہی رہا کہ میڈم مجھے وہاں ایک کرسی پر بٹھا کر غائب ہوگئی اور جلد ہی دو سانولے سے نوجوان کمرے میں آگئے۔ وہ آپس میں بھائی یا کم از کم فرسٹ کزن ضرور معلوم ہورہے تھے۔ انہوں نے بہت تیزی سے میرا حُلیہ بدلنے کا کام شروع کردیا۔ ان کی تمام تر پھرتی کے باوجود کام مکمل ہونے میں ڈیڑھ دو گھنٹے لگ گئے۔

کام ختم ہونے کے بعد ہی میڈم دوبارہ کمرے میں آئی اور اس نے تنقیدی نظر سے میرا سرتاپا جائزہ لینے کے بعد مطمئن انداز میں سرہلا کر گویا مجھے جانے کے لیے "این او سی" دے دیا۔

میں خود بھی قدِ آدم آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر تھوڑا سا حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ میں اب گھنی داڑھی مونچھوں اور لمبے بالوں والا ایک پٹھان تھا۔ جس کے گال پر موٹا سا مسا تھا اور ناک کی ساخت بھی کچھ بدل چکی تھی۔ سر پر میلی سی سفید ٹوپی اور جسم پر ڈھیلا ڈھالا پُرانا سا معمولی شلوار قمیص تھا۔ پیروں میں پُرانے سے پشاوری چپل تھے۔ بس میرے کندھے پر ایک کدال کی کمی تھی اور میں پوری طرح ایک سیدھا سادہ ان پڑھ اور جفاکش مزدور نظر آتا۔

اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کمرے سے رخصت ہوتے وقت ایک کدال بھی میرے کندھے پر رکھ دی گئی اور یوں گویا یہ کمی بھی پوری کردی گئی۔ میں دوبارہ نشست گاہ میں پہنچا تو احمد مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا پھر ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "سر! یہ بڑی عجیب بات ہے کہ آپ تقریباً ہر گیٹ اپ میں جچ جاتے ہیں' جو بنتے ہیں وہی لگنے لگتے ہیں۔"

"کیا فائدہ ایسے گیٹ اپ کا۔ جس میں تم نے مجھے پہچان لیا۔" میں نے قدرے مایوسی سے کہا۔

"سر! اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے اور نہ ہی یہ آپ کے گیٹ اپ کی خرابی ہے۔" وہ جلدی سے بولا "میں نے آپ کو اس لیے پہچان لیا کہ مجھے چند منٹ پہلے معلوم ہوچکا تھا کہ آپ کس حُلیے میں آنے والے ہیں۔"

میڈم دوبارہ اس کمرے میں نہیں آئی اور میں احمد کے ساتھ باہر آگیا۔ احمد نے میرے لیے ٹیکسی کا دروازہ کھولا تو میں نے کہا "نفیس صاحب نے ہدایت کی تھی کہ میں ٹیکسی میں نہ بیٹھوں۔ میرے موجودہ حُلیے کے ساتھ یہ عجیب لگے گا۔"

"اب آٹھ دس میل دور آپ پیدل تو جانے سے رہے۔ میں آپ کو شہر سے باہر جانے والی سڑک پر چھوڑ دوں گا' چند فرلانگ پیدل چل کر آپ بستی تک پہنچ جایئے گا۔ مجھے یقین ہے کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کررہا جسے آپ کا ٹیکسی میں سفر کرنا عجیب لگے گا۔ ویسے بھی اس وقت ہم دونوں "بھائی بند" لگ رہے ہیں۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور ایک مزدور۔ دونوں دوست بھی تو ہوسکتے ہیں اور دوست' دوست کی ٹیکسی میں مفت سفر کرسکتا ہے۔"

میں بدستور ہچکچاہٹ کا شکار رہا تو احمد بولا "نفیس صاحب کی احتیاطیں بھی بعض اوقات میری سمجھ میں نہیں آتیں۔ بھئی اگر کوئی ہمیں نہیں دیکھ رہا ہے تو یہ سارا تردد فضول ہے اور اگر کوئی آنکھ ہمیں دیکھ رہی ہے جس سے ہم لاعلم ہیں تو اس کے لیے تو ہم پہلے ہی مشکوک ہیں۔ بلکہ اسے تو شاید معلوم ہی ہوگا کہ ہم کون ہیں۔ اس صورت میں بھی سارا تردد فضول ہے۔"

"اصل میں نفیس صاحب بے چارے اپنی سی احتیاط کررہے ہیں' صحیح جواز وغیرہ خود ان کی اپنی نظر میں بھی واضح نہیں ہیں۔ بہرحال وہ جو کچھ کررہے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ریڈ ڈاٹ سمجھ میں نہ آنے والی چیز ہے۔ میں بھی جن دنوں لاہور میں تھا تو بعض اوقات بڑا مطمئن ہوتا تھا کہ کوئی میرا تعاقب یا نگرانی نہیں کررہا لیکن چند گھنٹے بعد پتا چلتا تھا کہ انہیں نہ صرف میری نقل و حرکت کا علم ہوتا تھا بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ میری کس سے کیا بات ہوئی۔"

ذرا توقف کے بعد میں نے کہا "ویسے بھی جب انسان کسی کی ماتحتی قبول کرلے تو پھر اسے اس کا ہر حکم ماننا چاہیے لیکن خیر چلو تھوڑی سی بے احتیاطی کرلیتے ہیں۔ میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں لیکن شہر سے نکلتے ہی تم مجھے اُتار دینا باقی فاصلہ میں پیدل یا لفٹ لے کر طے کرلوں گا۔"

میں اگلی سیٹ پر اس کے برابر ہی بیٹھ گیا اور احمد نے گاڑی اس بنگلے کے پورچ سے نکال لی' روانہ ہوتے وقت ہم دونوں نے ہی غیر محسوس طور پر دور دور تک چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ مجھے یقین تھا کہ کوئی ہمارا تعاقب نہیں کررہا تھا اور احمد بھی اس سلسلے میں بدستور مطمئن تھا۔

ہم راستے میں اسلام آباد ہوٹل کے سامنے سے بھی گزرے' تب مجھے وہ ترک ثقافتی طائفہ یاد آیا جس کے ساتھ میں استنبول سے یہاں پہنچا تھا۔ ایک لمحے کے لیے میرا جی چاہا کہ جاکر ذرا ان لوگوں سے مل کر آؤں لیکن بروقت ہی مجھے یاد آگیا میرا حُلیہ ایسا نہیں تھا کہ میں اس قسم کی غیر ضروری حرکتیں کرتا پھرتا۔

"معلوم نہیں وہ ترک ثقافتی طائفہ اب بھی یہاں مقیم ہے یا نہیں!" میں نے مڑ کر ہوٹل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"جی ہاں فی الحال تو وہ لوگ یہیں ہیں۔" احمد نے بتایا "انہوں نے تو گزشتہ رات لیاقت ہال میں شو بھی پیش کیا ہے۔ آج رات یا کل صبح شاید وہ لوگ لاہور اور پھر وہاں سے کراچی روانہ ہوجائیں۔"

"آہ' کمبختوں نے میرے بغیر ہی ثقافتی شو کرلیا۔" میں نے کراہ کر کہا "میں ترکی میں نہ سہی لیکن ترکی کے بارے میں کم از کم فارسی میں تو ایک شعر گا کر سنا سکتا تھا۔"

"وہی والا' زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم؟" احمد نے ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔

"وہی وہی" میں نے جلدی سے سرہلایا۔

"حاضرین کو پہلی بار کسی ترک کی زبانی یہ شعر سننے کو ملتا' بڑے انڈے اور ٹماٹر پڑتے۔ اس کے علاوہ ریڈ ڈاٹ والوں کو آپ کو تلاش کرنے کی ضرورت نہ پڑتی۔" احمد ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔

میں نے ایک بار پھر مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا "ریڈ ڈاٹ والے تو گویا بالکل ہی کسی بِل میں گھُس کر بیٹھ گئے ہیں۔ یہ بات مجھے زیادہ تشویش میں مبتلا کررہی ہے۔ یہ سکون کسی طوفان کا پیش خیمہ ہے۔"

"اب تو ہم منتظر ہیں کہ جو طوفان آنا ہے آچکے' معاملہ کسی کنارے تو لگے۔ روز روز کی اس بک بک سے نجات ملے۔" احمد بے زاری سے بولا "کیا آپ کے محسوسات اس سے کچھ مختلف ہیں؟"

"نہیں، اب تو میں بھی یہی چاہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اسی طرح باتیں کرتے ہم اس موڑ تک پہنچ گئے جہاں سے [illegible] بستی کچی [illegible] ہے کیا ہم جیسے بھی ٹا [illegible] ۔ نفیس صاحب کو ہر گز معلوم نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے ان کی ہدایت کی خلاف ورزی کی ہے۔"

احمد قدرے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "سر! آپ اتنے تابع فرمان کب سے ہو گئے؟"

"آنکھ کی شرم بھی کوئی چیز ہے یار! آج کل وہ بے چارے ہم پر بہت مہربان ہیں۔ ہمیں بھی ان کی دل شکنی نہیں کرنی چاہیے۔" میں نے گاڑی سے اُترتے ہوئے کہا۔

احمد واپس جانے کے لیے گاڑی موڑنے لگا تو میں نے پوچھا "تمہارا اب کیا پروگرام ہے؟"

"میری ڈیوٹی تو مستقل طور پر اسلام آباد ہوٹل پر لگی ہوئی ہے جہاں آکر ٹھہرنے والے تمام غیرملکیوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا میری ذمے داری ہے۔ میرے علاوہ بھی نفیس صاحب کا ایک آدمی ویٹر کے طور پر اور ایک کسی اور ملازم کے روپ میں ہوٹل میں کام کررہا ہے۔" احمد نے بتایا اور روانہ ہو گیا۔

میں نے کدال کندھے پر رکھی اور آگے چل دیا۔ جعلی خانہ بدوشوں کی بستی ابھی کم از کم تین میل دور تھی۔ ہر گاڑی کی آواز سُن کر میں مڑکر دیکھتا اور لفٹ کے لیے ہاتھ دیتا۔ بیسیوں گاڑیاں گزر گئیں لیکن کسی کے ڈرائیور نے گاڑی روکنے کی زحمت نہیں کی۔ لگتا یہی تھا کہ اس علاقے میں لفٹ دینے کا رواج ذرا کم ہی تھا۔ خصوصاً ایک خستہ حال مزدور کو۔

چند فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد میں نے لفٹ کے لیے ہاتھ دینا ترک کردیا۔ تاہم ہر گاڑی کی آواز سُن کر گردن گھما کر نظروں میں ایک خاموش التجا کے لیے ڈرائیور کی طرف دیکھ ضرور لیتا تھا۔ اس سڑک سے گاڑیاں اِکّا دُکّا ہی گزرتی تھیں، آخر مجھے سلور کلر کی ایک خوب صورت گاڑی سست رفتاری سے عقب سے آتی دکھائی دی۔ میں نے اپنی ایکٹنگ میں حقیقت کا رنگ بھرنے کی کوشش جاری رکھی اور اس کے ڈرائیور کی طرف بھی لفٹ طلب نظروں سے دیکھا۔ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ میری اس ایکٹنگ کو کون دیکھ رہا تھا لیکن احتیاط بہرحال بہتر تھی۔

سلور کار کی گاڑی کو کوئی فیشن ایبل سا بوڑھا چلا رہا تھا۔ وہ سفید فام تو نہیں تھا لیکن غیرملکی ہی معلوم ہوتا تھا۔ اس کے سر اور داڑھی کے بال برف کی طرح سفید تھے۔ وہ ذرا گہرے رنگ کے شیشوں کی عینک لگائے ہوئے تھا۔ سیاہ کوٹ کے ساتھ اس نے بھڑکتے ہوئے سرخ رنگ کی شرٹ پر سفید ٹائی لگائی ہوئی تھی۔ وہ متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتا جارہا تھا۔ شاید علاقے کا جائزہ لے رہا تھا۔ یہ علاقہ ویران ہونے کے باوجود سرسبز اور خوب صورت تھا۔

پہلے تو وہ بھی آگے نکلتا چلا گیا لیکن پھر شاید اس کا جذبۂ ترحم بیدار ہوا اور اس کی گاڑی ریورس ہو کر آنے لگی۔ قریب پہنچ کر [illegible] انگریزی میں پوچھا "کدھر جانا ہے؟"

میں غیرارادی طور پر انگریزی میں اس کے سوال کا جواب دینے ہی لگا تھا کہ بروقت مجھے اپنی زبان کو بریک لگانے کا خیال آگیا۔ میں تو اس وقت ایک اَن پڑھ پٹھان مزدور تھا لیکن پریشانی کا مقام یہ تھا کہ مجھے ٹوٹے پھوٹے چند جملوں کے سوا پشتو بولنی بھی نہیں آتی تھی۔ میں نے اشاروں کی بین الاقوامی زبان تک ہی محدود رہنا بہتر سمجھا اور سادگی سے آنکھیں پھیلاتے ہوئے اشارے سے دریافت کیا کہ وہ کیا پوچھ رہا تھا۔

تب اس نے بھی اشارے سے پوچھا کہ میں کہاں جانا چاہتا تھا۔ میں نے اشارے سے بتایا کہ میں اسی سڑک پر کچھ آگے مزدوری کی تلاش میں جارہا تھا۔ اس نے مجھے پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

میں دیکھ چکا تھا کہ پچھلی سیٹ پر گھنی داڑھی مونچھوں اور لمبے لمبے بالوں والا ایک دُبلا پتلا سرخ و سپید نوجوان بیٹھا تھا۔ آنکھوں پر تاریک چشمہ تھا۔ وہ کچھ عجیب روٹھے روٹھے سے انداز میں بیٹھا تھا اور دوسری طرف کے شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس میں تجسس کا مادہ بھی بالکل نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر بھی میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے وہ پوری دنیا سے خفا بیٹھا ہو۔ میں یہی سمجھا کہ شاید وہ بڑے میاں کا بیٹا تھا۔

میں نے گاڑی میں بیٹھنے میں دیر نہیں لگائی۔ نوجوان نے تب بھی میری طرف نہیں دیکھا۔ بڑے میاں گو کہ جان چکے تھے میں انگریزی نہیں سمجھتا تھا اس کے باوجود انھوں نے شاید غیرارادی طور پر انگریزی میں وضاحت کی "اس نوجوان کو بھی میں نے لفٹ دی ہے۔ یہ چھ سات میل آگے اُترے گا۔"

میں انجان بنا بیٹھا رہا گویا اس کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آیا ہو۔ تاہم میں دل ہی دل میں نوجوان کے انداز پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ وہ کچھ اس طرح بیٹھا تھا گویا اس نے بڑے میاں سے لفٹ لے کر ان کی گزری ہوئی اور آنے والی سات پشتوں اور سات نسلوں پر احسان کیا ہو۔

بڑے میاں نے مڑکر میری طرف دیکھا۔ گہرے رنگ کے شیشوں کے عقب سے اس کی آنکھیں صاف دکھائی نہیں دے رہی تھیں لیکن مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے بہت غور سے میرا جائزہ لیا تھا۔ میری دھڑکن ذرا تیز ہو گئی لیکن میں ایک سادہ لوح اور انجان شخص کی طرح اپنے چہرے کو سپاٹ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سکون سے بیٹھا رہا۔

بوڑھا بولا "اس کدال کو تو نیچے رکھ دو۔" پھر اس نے اشارے سے مجھے اپنا مطلب سمجھایا۔ اس کے لہجے سے مجھے اس پر ایرانی ہونے کا شبہ ہوا۔

میں نے کدال کندھے سے اُتارلی لیکن نیچے پھر بھی نہیں رکھی بلکہ اپنے سینے سے لگا کر مٹھی میں فٹ کرلیا۔ گاڑی آگے بڑھ گئی تب اچانک ہی میری نامعلوم سی حِس مجھے اضطراب کا احساس دلانے لگی۔ میں اس کی وجہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ گاڑی کی رفتار اب بھی کچھ زیادہ نہیں تھی، نشیب میں کچی زمین چھدرے سبزے سے ڈھکی ہوئی تھی۔ میں چاہتا تو گاڑی سے چھلانگ لگا کر لڑھکنے کا خطرہ مول لے سکتا تھا لیکن فوری طور پر میرا دل اس قسم کی بدحواسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے بھی آمادہ نہ ہوسکا۔

میں نے محسوس کیا کہ بوڑھا عقب نما آئینے میں میرا جائزہ لے رہا تھا۔ میں ایک سادہ لوح انسان کی طرح ممنونیت سے مسکرانے کی کوشش کررہا تھا لیکن اس دوران میری رگ و پے میں دوڑتی ہوئی اضطراب کی لہریں کچھ تیز ہوچکی تھیں، بوڑھے نے کار کی رفتار کچھ بڑھادی۔

اچانک وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "پیارے اجنبی! میں نے تمہیں پہچانا تو نہیں لیکن مجھے کچھ شبہ ہورہا ہے۔ میں اس کی تصدیق کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے تمہارا میک اپ زیادہ اچھا نہیں ہے، مجھے دیکھو! میں نے اپنا میک اپ خود کیا ہوا ہے لیکن دیکھو کتنا عمدہ ہے۔ اگر تم وہی ہو جو میں تمہیں سمجھ رہا ہوں تب بھی مجھے یقین ہے کہ تم مجھے پہچان نہیں سکے ہو۔"

اچانک میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی یکدم ہی میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا تھا۔ میری رگ و پے میں دوڑتی ہوئی اضطراب کی لہریں گویا کسی ایک نقطے پر مرکوز ہوگئی تھیں۔ میں نے اسے پہچان لیا تھا لیکن ذرا تاخیر کے ساتھ۔

وہ حمان تھا!

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا، ایک لمحے کے لیے مجھے یہی گمان گزرا کہ میں خواب دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ یہاں کیونکر پہنچ گیا تھا؟ اور اگر پہنچ ہی گیا تھا تو کیا اس کا مجھ سے ٹکرانا ضروری تھا؟

وہ انسان نہیں کوئی بدروح معلوم ہوتا تھا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ میرا استنبول میں اس سے پیچھا چھوٹ گیا تھا لیکن وہ یہاں بھی آن پہنچا تھا۔ کس طرح آن پہنچا تھا؟ میں یہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ میں عقب نما آئینے میں اس کی صورت دیکھنے میں شاید کچھ زیادہ ہی محو ہوگیا تھا کیونکہ اس دوران ایک سخت سی چیز میری پسلیوں پر آن لگی۔

وہ نوجوان جو روٹھے روٹھے انداز میں کھڑکی کی طرف منہ کیے بیٹھا تھا، نہ جانے کس وقت میرے قریب کھسک آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں خوف ناک سی شکل کا ایک پستول تھا جس کی نال سے ہی گویا وہ میری پسلیوں میں سوراخ کرنے کی فکر میں تھا۔ تاہم اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس کا چہرہ بدستور پتھرایا ہوا سا تھا لیکن اب اس کی نظر مجھ پر جمی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں پر تاریک چشمے کے باوجود میں دیکھ سکتا تھا کہ وہ آنکھ نہیں جھپک رہا تھا۔

غیرارادی طور پر کدال پر میری گرفت سخت ہوگئی لیکن نوجوان نے اسے بھی محسوس کرلیا اور پستول کی نال پر دباؤ مزید بڑھا کر گویا مجھے اشارہ دیا کہ میں کدال کے دستے سے ہاتھ ہٹالوں۔ میں نے دستے سے ہاتھ ہٹالیے۔ مجھے تھوڑا سا اطمینان یہی تھا کہ شاید حمان سچ بول رہا تھا۔ ابھی وہ میرے بارے میں شک میں ہی تھا۔ اس نے یقینی طور پر مجھے نہیں پہچانا تھا۔

وہ بڑے اطمینان سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا "مجھے ایک شخص کی تلاش ہے۔ میں نے عہد کیا تھا کہ جہنم تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑوں گا۔ دو دن پہلے میرا اس سے آخری بار استنبول میں سامنا ہوا تھا۔ اس وقت مجھے جان بچا کر بھاگنا پڑا تھا۔ اس شخص کی وجہ سے میرے بڑے بڑے کام بھی خراب ہوئے اور مجھے ذلت بھی بہت اُٹھانی پڑی۔ میں خود اپنی نظر میں گرگیا۔"

میں نے عقب نما آئینے میں احمقوں کی طرح اس کی طرف دیکھنا جاری رکھا جیسے اس کی گفتگو کا ایک لفظ بھی میری سمجھ میں نہ آرہا ہو پھر میں نے یوں نوجوان کی طرف دیکھا جیسے میرے خیال میں حمان اس سے بات کررہا ہو لیکن اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہ سانپ کی طرح پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔

حمان نے بات جاری رکھی "مجھے اس شخص کا آخری سراغ یہ ملا تھا کہ میرے فرار ہونے کے بعد وہ استنبول کے سرکاری کلچرل سینٹر کی طرف گیا تھا۔ وہاں سے مجھے کچھ ایسی شہادتیں ملیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ترک ثقافتی طائفے میں شامل ہوکر یہاں آیا ہے۔ میں اس طائفے کے پیچھے پیچھے یہاں پہنچا۔ سب فنکاروں کو چیک کیا۔ وہ شخص ان میں نہیں ہے۔ میں اسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں اور کل شام سے کرائے کی اس کار میں اس کی تلاش میں سڑکوں کی خاک چھانتا پھر رہا ہوں۔ معلوم نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ مجھے یہیں کہیں مل جائے گا۔"

مجھے پشتو کے جتنے بھی ٹوٹے پھوٹے جملے آتے تھے، میں نے ان سب کو گڈمڈ کرکے تیزی سے بول ڈالا۔ انداز کچھ ایسا تھا جیسے میں قدرے غصے سے پوچھ رہا ہوں کہ آخر یہ کیا مذاق تھا اور وہ لوگ کیا چاہتے تھے؟

حمان کے کان پر گویا جوں تک نہیں رینگی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہارا قد کاٹھ وہی ہے، خدوخال وہی ہیں۔ جسمانی ساخت وہی ہے۔ آنکھیں بھی وہی لگ رہی ہیں۔ میری نظر میں تو اس شخص کا سراپا نقش ہوگیا ہے اور اس وقت تک نقش رہے گا جب تک اس سے میرا حساب برابر نہیں ہوجاتا۔ اوپر سے تم میک اپ میں ہو۔ اس ویرانے میں ایک شخص کا میک اپ کیے ہوئے پھرنا مجھے خالی از علت نظر نہیں آرہا۔ میں ذرا کسی مناسب مقام پر تمہیں میک اپ کے بغیر دیکھنا چاہتا ہوں۔ یا پھر چاہو تو تم مجھے اس زحمت سے بچالو۔ سیدھی طرح بتادو کہ تم افضل چوہدری ہو۔"

میں نے ایک بار پھر اپنی غلط سلط اور بے محل پشتو کا ملغوبہ

بناتے ہوئے ہاتھ نچایا۔ میں عموماً اپنے جھوٹ کو آخری وقت تک نبھانے کی کوشش کرتا تھا اس طرح مجھے سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کا موقع مل جاتا تھا۔ حمان نے یوں طویل سانس لی جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کی ضد کے سامنے بے بس ہو گیا ہو۔

اس دوران مجھ پر یہ انکشاف بھی ہوا کہ ہم خانہ بدوشوں کی بستی اور واٹر سپلائی اسکیم وغیرہ سے آگے نکل آئے تھے۔ بل کھاتی سڑک پہاڑیوں کی طرف جا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا' نفیس صاحب وہاں خیمے میں بیٹھے میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ انہیں گمان بھی نہیں ہوگا کہ ان کے سامنے والی سڑک سے کوئی مجھے گاڑی میں اغوا کر کے لیے جا رہا تھا۔ ان کے میک اپ نے مجھے مروا دیا تھا لیکن بات یہ تھی کہ میں میک اپ میں نہ ہوتا اور حمان سے میرا سامنا ہو جاتا تب بھی کچھ نہ کچھ تو ہونا ہی تھا۔ عین ممکن تھا وہ چلتی گاڑی سے مجھے گولی مار دیتا۔ جو کچھ ہو چکا تھا اس پر پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں تھا۔ جو کچھ ہونے والا تھا مجھے اس کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔ قسمت کے لکھے کا سامنا تو کرنا ہی تھا۔

گاڑی اب پہاڑی کے گرد چکر کاٹ کر کچے میں اُتر رہی تھی۔ حمان بولا "گویا تم یہ ماننے کے لیے تیار نہیں ہو کہ تم افضل چوہدری ہو؟"

میں نے ایک بار پھر برہمی سے تھوڑی سی بک بک کی لیکن حسب سابق حمان نے میرے جعلی احتجاج کو لفٹ نہیں کرائی اور ناہموار راستے پر احتیاط سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر تم افضل چوہدری ہی ہو جس کا مجھے نوے فیصد یقین ہے تو میں تمہیں دو خطرات کے بارے میں خبردار کر دوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ تم بہت اونچی چیز ہو لیکن حمان سے اونچی نہیں۔ اس لیے اب کوئی کرتب دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ یہ نوجوان جو تمہارے برابر بیٹھا ہے دنیا کے آٹھ دس سفاک ترین قاتلوں میں سے ایک ہے۔ اس کے سامنے قطعاً کوئی ہوشیاری مت دکھانا۔ یہ میرا ہوشیار ترین شاگرد ہے۔ دوسری بات یہ کہ میرا ہاتھ اس سوئچ کے بالکل قریب ہے جو ڈپر دینے کے کام آتا ہے۔"

گاڑی خفیف سے ہچکولے کھا رہی تھی جس کے ساتھ میری پسلیوں پر پستول کی نال رگڑ سی کھاتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری ایک آدھ پسلی پر سے تو کھال چھل چکی تھی' میں بالکل دروازے سے چپک چکا تھا۔ مزید کھسکنے کی جگہ نہیں تھی۔

حمان کہہ رہا تھا "تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ میں دھماکا خیز اشیا کا ماہر ہوں۔ میں نے کرائے کی اس کار میں بھی اپنا تھوڑا بہت کام دکھایا ہوا ہے۔ اگر میں ڈپر دینے والا سوئچ دبا دوں تو یہ کار دھماکے سے اڑ جائے گی اور اس کے ساتھ ہم سب بھی۔"

میں گو کہ اب بھی یہی ظاہر کرنے پر تلا ہوا تھا کہ اس کی کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی لیکن اس نے گویا فرض کر رکھا تھا کہ میں ہر بات سمجھ رہا تھا۔ اس نے وضاحت کی "ہم تو جان ہتھیلی پر ہی لیے پھرتے ہیں۔ شاید اسی لیے ہم جیسے لوگ زیادہ عرصے زندہ رہتے ہیں۔ اگر مجھے ذرا بھی خطرہ نظر آیا تو میں اس سوئچ کو دبانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ ہم تو مرہی جائیں گے لیکن ہمارے لیے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ تم بھی مر جاؤ گے۔"

اب میں خاموش رہا۔ میں نے اپنے چہرے پر بے بسی طاری کر لی تھی۔ سڑک بہت دور رہ گئی تھی اور ہم ایک پہاڑی کے عقب میں پہنچ گئے تھے۔ سڑک سے اِکا دُکا گاڑیوں میں گزرنے والے لوگوں کی نظر یہاں تک نہیں پہنچ سکتی تھی اور یہاں سے کوئی آواز بھی سڑک تک پہنچنا مشکل تھی۔ کوئی بڑا سا بم پھٹتا تب شاید آواز وہاں تک پہنچتی۔

حمان نے ایک جگہ جھاڑیوں کے قریب گاڑی روک لی۔ تب میں نے پہلی بار اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے نوجوان کی آواز سُنی۔ کسی بدروح کی سی کھرکھراتی ہوئی آواز تھی جیسے کسی زنگ آلود لوہے کو تیز دھار چھری سے کھرچا جا رہا ہو "جس طرح بیٹھے ہو اسی طرح آہستگی سے کھسک کر نیچے اُتر جاؤ۔ کدال کو ہاتھ لگانے کی ضرورت نہیں۔ جہاں گرتی ہے گرنے دو۔" اس نے حکم انگریزی میں دیا تھا۔

ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا' اب بھی انجان بنا رہوں جیسے اس کی بات میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن اس نے اشارے سے بھی اپنا مفہوم واضح کر دیا پھر میں نے بھی کار سے اُترنے کے موقعے کو غنیمت جانا۔ کھلی جگہ ویسے بھی مجھے قسمت آزمائی کے لیے بہتر محسوس ہوتی تھی۔ بند کار ایک خاصی خطرناک جگہ تھی۔ خصوصاً جبکہ ایک طرف سے پسلیوں پر پستول ٹکا ہوا تھا اور کوئی بعید نہیں تھا اس خبیث حمان کا دعویٰ درست ہی رہا ہو کہ ڈپر والا بٹن دبانے سے کار دھماکے سے اُڑ سکتی تھی۔ ایسے بدبخت قسم کے لوگوں سے کوئی بھی بات بعید نہیں ہوتی۔ اس قسم کے لوگ عموماً ابنارمل ہوتے ہیں۔

میں نے اپنی طرف کا دروازہ کھولا اور باہر پھسل گیا۔ کدال دروازے میں گر گئی۔ اس کا دستہ دروازے سے باہر معلق ہو گیا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس دوران پستول کی نال ایک لمحے کے لیے بھی میری پسلیوں سے نہیں ہٹی تھی۔ حمان کا وہ چیلا گویا میرے ساتھ ہی پھسلتا ہوا کار سے باہر آیا تھا۔ میں نے اسے کسی چیز کو پکڑتے یا سہارے کے لیے کسی چیز پر ہاتھ رکھتے نہیں دیکھا۔

حمان مجھ سے پہلے ہی گاڑی سے اُتر چکا تھا اور میں جب سیدھا کھڑا ہونے میں کامیاب ہوا تو میں نے اسے اپنے سامنے کھڑے پایا۔ وہ قد میں بہ مشکل میرے سینے تک پہنچتا تھا لیکن اس وقت اس کے ہاتھ میں لمبی سی نال کا ایک پستول تھا جس کی وجہ سے شاید وہ اپنے آپ کو مجھ سے کہیں زیادہ بلند قامت محسوس کر رہا تھا۔

اس دوران اس کے چیلے کے پستول کی نال میری کمر پر منتقل ہو چکی تھی۔ حمان نے پستول کی نال میرے سینے پر رکھ دی۔ یعنی اس وقت میں دو بہت بڑے' پیشہ ور قاتلوں اور ان کے نہایت

جدید پستولوں کے درمیان سینڈوچ بن چکا تھا۔ میں بہت گناہ گار سا آدمی ہوں' یقین کی دولت بڑے خاص اور نیک بندوں کے پاس ہوتی ہے۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں ہمیشہ ایک عجیب سی طمانیت میرے ساتھ رہی تھی۔ موت کے منہ میں بھی میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ میں کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کر رہا اس لیے کوئی غیبی طاقت ضرور میری حفاظت کرے گی۔

اس روز ایک لمحے کے لیے میرا یقین متزلزل سا ہو گیا۔ آخر کار میں ایک گناہ گار' دنیا دار آدمی تھا۔ میری بنیاد تو عام سی ہی تھی۔ میری بنیاد میں روحانی طاقت کا کنکریٹ تو نہیں تھا۔ یقین کا سہارا ہٹا تو ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آگیا۔

خوش قسمتی یہ تھی کہ مجھ پر یہ کمزوری صرف ایک لمحے کے لیے غالب آئی۔ وہ لمحہ آیا اور گزر گیا۔ ان دونوں کو تو یقیناً پتا نہیں چلا ہوگا کہ اس ایک لمحے میں میری روح پر کیسی طغیانی سی آکر گزر گئی لیکن دوسرے ہی لمحے میرے یقین کی طاقت پہلے سے زیادہ شدت سے عود کر آئی۔

شاید یہی وہ طاقت تھی جو صرف روح میں ہی نہیں' جسم میں بھی بجلیاں سی بھرے رکھتی تھی۔ حمان نے دائیں ہاتھ سے پستول میرے سینے پر رکھا ہوا تھا۔ بایاں ہاتھ اس نے میری داڑھی مونچھ نوچنے کے لیے بڑھایا۔

مجھے خود بھی اندازہ نہیں ہو سکا کہ میرے دونوں ہاتھ کس تیزی سے حرکت میں آئے۔ ایک ہاتھ حمان کی پستول والی کلائی پر نیچے سے اوپر کی طرف مارتے ہوئے میں نے دوسرے ہاتھ سے اس کے پیٹ میں اتنی قوت سے گھونسا رسید کیا کہ وہ فضا میں کم از کم دو فٹ اُچھلا۔

اس کے پستول سے فائر ہو چکا تھا لیکن گولی آسمان کی طرف گئی تھی اور اسی لمحے میں اپنے آپ کو زمین پر گرا چکا تھا۔ وقت کے تعین کے سلسلے میں میں نے جُوا ہی کھیلا تھا۔ جان کی بازی لگائی تھی۔ اسی لمحے پیچھے سے فائر ہوا تھا لیکن میں زمین پر گر چکا تھا۔ یہ سب کچھ تقریباً ایک ساتھ ہی ہوا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں یہ پھرتی دکھانے میں کیونکر کامیاب ہوا تھا۔ یہ کام اتنے ہی وقفے میں ہوا تھا جتنا ٹریگر دبانے اور گولی چلنے کے لیے درکار ہوتا ہے۔

قدرت نے عجیب ہی کام دکھایا۔ حمان کے چیلے نے جو گولی چلائی تھی' میں معجزاتی سے انداز میں اس کے سامنے سے ہٹ چکا تھا اور وہ گولی حمان کو لگ چکی تھی جو اس لمحے میرا گھونسا کھا کر ہوا میں اُچھلا تھا۔ تاہم اس وقت تک مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ حمان کو خود اس کے چیلے ہی کی چلائی ہوئی گولی لگ چکی تھی۔

مجھے اس وقت کچھ دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ بس اتنا احساس ضرور تھا کہ حمان میرے اندازے سے کچھ زیادہ ہی دور جا کر گرا تھا۔ حمان کا شاگرد اس وقت تک دوسرا فائر بھی کر چکا تھا لیکن میں اس کی ٹانگ کھینچ چکا تھا۔ دوسری گولی تو نہ جانے کس طرف گئی لیکن گرتے گرتے وہ تیسرا فائر بھی کر چکا تھا۔ گولی میرے کان کے قریب سے گزر کر غالباً زمین میں پیوست ہوئی۔

اس وقت تک اس کی ریوالور والی کلائی میری گرفت میں آچکی تھی اور یہ وہ موقع تھا جہاں سے جسمانی طاقت کا کام شروع ہوتا تھا۔ اس نے پستول کا رخ میری طرف کر کے فائر کرنے کی کوشش میں پستول خالی کر لیا۔ یہ اس کی غلطی تھی۔ اس دوران اس کا بازو مڑتا چلا گیا۔

دوسرے ہاتھ سے میں نے اسے قابو میں کیا ہوا تھا۔ وہ دُبلا پتلا ہونے کے باوجود عام نوجوانوں کی نسبت طاقتور اور مضبوط تھا لیکن میرے لیے نہیں۔ اس کا پستول خالی ہونے کے باوجود میں اس کا بازو موڑتا ہی چلا گیا حتیٰ کہ کڑک کی آواز آئی اور اس کا بازو کہنی سے الگ ہو گیا لیکن میں نوجوان کی قوتِ برداشت کی داد دیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس کے حلق سے چیخ نہیں نکلی۔ گھٹے گھٹے سے انداز میں وہ محض غرا کر رہ گیا۔

چند سیکنڈ کی اس کشمکش کے دوران بھی میں اس بات پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا کہ اب تک مجھے حمان کی طرف سے گولی کیوں نہیں لگی تھی۔ اس وقت تک مجھے نہیں معلوم تھا کہ اسے اس کے اپنے ہی چیلے کی گولی لگ چکی تھی۔ میں یہی سمجھ رہا تھا کہ شاید میرا گھونسا اس کے لیے زیادہ خطرناک ثابت ہوا تھا اور وہ کہیں بے ہوش پڑا تھا۔

میں نے چیلے کے لیے اتنی ہی سزا کو کافی سمجھا کہ اس کا بازو ٹوٹ چکا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر اٹھنے ہی لگا تھا کہ اس بدبخت کا بایاں ہاتھ تیزی سے کوٹ کی اندرونی جیب میں گیا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں ایک اور گن کی جھلک دیکھی۔ اس امکان کی طرف میرا ذہن گیا ہی نہیں تھا کہ اس کے پاس دوسری گن بھی ہو سکتی تھی۔

یہ اس کی بدنصیبی ہی تھی کہ اس نے دوسری گن نکالنے کی کوشش کر ڈالی تھی۔ میں نے تو اپنی دانست میں ضبط سے کام لیا تھا اور اسے زندہ رہنے کا موقع دیا تھا لیکن بعض باتیں موت کے ہرکاروں کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں اس وقت تک سیدھا کھڑا نہیں ہو پایا تھا جب میں نے اس کے ہاتھ میں کسی گن کی جھلک دیکھی۔

ہم اس وقت گاڑی کے قریب ہی تھے اور وہ دروازہ کُھلا تھا جس سے ہم باہر آئے تھے۔ کدال کا دستہ اس دروازے سے جھانک رہا تھا۔ پلک جھپکتے میں کدال میرے ہاتھ میں آئی اور اپنے آپ کو اس کے متوقع فائر سے بچاتے ہوئے میں نے ایک ہی ہاتھ سے کدال گھمائی۔

وہ شاید ایک بازو ٹوٹنے کی تکلیف کی وجہ سے دوسرے ہاتھ کو بھی صحیح طور پر استعمال نہیں کر سکا۔ گولی نہ جانے کس طرف گئی۔ اس وقت تک کدال کا پھل اس کی کھوپڑی میں پیوست ہو چکا تھا۔ میں نے کدال کو نکالنے کی کوشش کی تو اس کا سر کدال کے ساتھ

ہی اوپر اُٹھ آیا۔ میں نے کدال کو وہیں چھوڑ دیا۔ اس کے جسم کو تشنجی سے انداز میں دو تین جھٹکے لگے پھر وہ وہیں ساکت ہوگیا کدال اس کے سر میں پیوست تھی۔

اب میں نے حمان کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ وہ لڑھک کر قدرے نشیب میں جاگرا تھا اور ساکت پڑا تھا۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا' اس کے سینے سے بھل بھل خون بہہ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ شاید آخری سانسیں لے رہا تھا۔

میں اس کے قریب کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے' اچانک اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کی آنکھیں بھی لہو رنگ تھیں۔ میں اس کی صورت دیکھنے میں کچھ ایسا محو تھا کہ اس کے نہایت آہستگی سے ہلتے ہوئے ہاتھ کی طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا۔ شاید مجھے توقع نہیں تھی کہ آخری سانسیں لیتے ہوئے بھی کوئی اپنی زندگی کی بچی کھچی رمق کو فائر کرنے میں صرف کر سکتا تھا لیکن مجھے اس کی آنکھوں سے جھانکتی ہوئی نفرت سے اندازہ ہو جانا چاہیے تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس نفرت نے ہی مجھے مبہوت کردیا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ مرتے وقت بھی کسی کی آنکھوں میں نفرت کی یہ شدت نظر آسکتی تھی۔

میں اچانک ہی گویا کسی خواب سے چونکا۔ اس کا لرزتا ہوا ہاتھ سیدھا ہوچکا تھا اور اس میں پستول تھا۔ اگر میں نے بروقت اپنے آپ کو زمین پر نہ گرادیا ہوتا تو شاید گولی عین میرے چہرے پر لگتی۔ اس کی یہ حرکت کچھ ایسی ہی تھی جیسے شمع بجھنے سے پہلے آخری بار بھڑکی ہو۔

میں نے گرتے گرتے اس کے مصنوعی سفیدی سے سجے ہوئے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر اس کا سر کچھ اوپر اُٹھا کر زور سے زمین پر مارا اور وہ ساکت ہوگیا۔ اس کا پستول والا ہاتھ پہلے ہی زمین پر گر کر ساکت ہوچکا تھا۔ اس بار میں نے احتیاط برتی اور اُٹھنے سے پہلے اس کے ہاتھ سے پستول نکال لیا لیکن اب وہ واقعی ساکت ہوچکا تھا۔ اس کی نفرت بھری آنکھیں بند ہوچکی تھیں۔

آخر کار میں نے پستول اس کی لاش پر ہی پھینک دیا۔ چند لمحے میں وہیں کھڑا گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔ میرے ذہن میں چلتی ہوئی آندھیاں تھم گئی تھیں اور میرے اردگرد بھی گہرا سکوت طاری تھا۔ شاید یہ موت کا سکوت تھا۔

میں چند منٹ وہیں گم صم کھڑا رہا پھر بوجھل سے انداز میں قدم اُٹھاتا پہاڑی کے دوسری طرف سے گھوم کر سڑک کی طرف چل دیا' کچھ دیر بعد میں اسی سڑک کے کنارے کنارے پیدل خانہ بدوشوں کی بستی کی طرف جارہا تھا جس سے آیا تھا۔ اب میں نے لفٹ لینے کے لیے کسی کو ہاتھ نہیں دیا اور نہ ہی کسی گاڑی والے نے میری طرف توجہ دی۔

وقت کی رفتار کا کوئی احساس نہ رہا البتہ یہ احساس ضرور ہوا کہ جب میں خانہ بدوشوں کی بستی پہنچا تو پسینے میں شرابور تھا۔ میں جس گلی سے بستی میں داخل ہونے لگا' اس کے کونے پر دو مفلوک الحال آدمی زمین پر خانے بنائے چوسر کھیل رہے تھے۔ انہوں نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔

ان کے حُلیے گو کہ بہت بدلے ہوئے تھے لیکن میں نے انہیں پہچان لیا۔ وہ منیر اور مسعود تھے۔ انہوں نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں ان کے قریب نہیں رکا اور جان بوجھ کر چہرے پر اجنبیت لیے گزرتا چلا گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا میرا گیٹ اپ کتنا قابلِ بھروسا تھا میرے ساتھی بھی مجھے پہچانتے تھے یا نہیں؟

منیر اُٹھ کر تیزی سے میرے سامنے آگیا اور میرا راستہ تقریباً روکتے ہوئے بولا "کس سے ملنا ہے' کس کے پاس جارہے ہو؟"

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا "کسی طرح مجھے افضل چوہدری سے ملوادو۔ وہ اُلّو کی دُم نہ جانے کہاں غائب ہوگیا ہے۔"

وہ پلک جھپکائے بغیر چند لمحے میری طرف دیکھتا رہا پھر بے اختیارانہ سے انداز میں مجھ سے لپٹ گیا "سر آپ' مجھے پتا چلا تھا کہ آپ پہنچ چکے ہیں اور کل یہاں بھی آئے تھے۔ افسوس کل آپ سے ملاقات نہیں ہوسکی۔ آپ کو دیکھ کر اتنی خوشی ہورہی ہے کہ بتا نہیں سکتا۔ ویسے سچی بات یہ ہے کہ میں نے آپ کو بالکل نہیں پہچانا تھا۔"

پھر اس نے مجھ سے الگ ہوتے ہوئے مسعود کو پکارا "اوئے بینڈے! ذرا آکر دیکھ تو سہی کون آیا ہے۔"

تب مجھے معلوم ہوا کہ مسعود کا نام اس وقت بینڈا تھا۔ وہ بھی آکر مجھ سے ملا اور کچھ دیر ویسی ہی باتیں ہوتی رہیں جیسی عموماً ایک عرصے تک بچھڑے رہنے کے بعد ملنے والے دوستوں میں ہوتی ہیں پھر منیر کو جیسے کچھ یاد آیا۔ وہ چونکتے ہوئے بولا "آپ پہلے جلدی سے جاکر نفیس صاحب سے مل لیں۔ میرا خیال ہے وہ بہت دیر سے آپ کا انتظار کررہے ہیں لیکن ہمیں نہیں معلوم تھا آپ اس حُلیے میں یہاں پہنچیں گے۔"

میں نفیس صاحب کے خیمے میں پہنچا تو وہ واقعی بے تابی سے میرے منتظر تھے۔ چھوٹتے ہی بولے "کہاں رہ گئے تھے بھئی؟ میں تو تمہارے انتظار میں سوکھ گیا۔"

"یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں یہاں پہنچ گیا۔ ورنہ شاید آپ زندگی بھر ہی میرا انتظار کرتے رہتے۔" میں نے خیمے میں رکھی صراحی سے ایک بڑے سے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"کیا ہوا خیریت تو تھی؟" وہ کچھ چونکے۔

"آپ کی حکمتِ عملی نے تو مجھے مروادیا تھا۔" میں نے پانی پیٹ میں انڈیلنے کے بعد کہا "خدا کا شکر ہے کہ بچ کر آگیا لیکن بات

پھر وہی آتی ہے کہ قدرت جو کرتی ہے بہتر کرتی ہے اور میں قدرت کے کاموں پر حیران بھی بہت ہوں۔ شاید میں استنبول میں اس کام کو ادھورا چھوڑ آیا تھا جو قدرت کو مجھ سے یہاں مکمل کرانا تھا۔"

ہوگا اور میرے خیال میں بہتر یہی ہوگا کہ اس واقعے سے تمہارا کوئی تعلق نظر نہ آئے۔ اگر ایسی کوئی شہادت ہوئی تو ہمیں اس کو ختم کرنا ہوگا۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بولتے جارہے تھے۔

"مجھے خود اس واقعے کا کریڈٹ لینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا پھر انہیں تمام واقعہ سُنادیا۔

انہوں نے فوراً موبائل فون نکالا اور کچھ لوگوں کو ہدایات

"آخر ہوا کیا؟" نفیس صاحب بیڑی سُلگا کر میرے قریب آن بیٹھے۔

میرا ذہن اس وقت واقعی کہیں دور پہنچا ہوا تھا۔ مجھے ان کی آواز بھی دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ میری نظر میں ابھی تک حمان اور اس کے چیلے کی صورت گھوم رہی تھی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آج مجھے معلوم ہوا کہ کبھی کبھی صرف موت ہی انسان کا تعاقب نہیں کرتی' انسان خود بھی موت کا تعاقب کرتا ہے۔ حمان سے میری خواہ مخواہ کی کشمکش استنبول میں ختم ہو گئی تھی اور میں اسے زندہ سلامت چھوڑ کر آیا تھا۔ یہاں آکر میں گویا اس معاملے کو بھول ہی گیا تھا۔ حقیقت میں تو میری اس سے کوئی دشمنی نہیں تھی لیکن وہ بدبخت مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پیچھے پیچھے یہاں آن پہنچا۔ درحقیقت وہ اپنی موت کو ڈھونڈتا ہوا یہاں تک پہنچا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اتنی جلدی اس سے یہاں ملاقات ہو جائے گی۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ حمان تمہارے ہاتھوں مر چکا ہے؟" نفیس صاحب بے تابانہ انداز میں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"صرف حمان ہی نہیں اس کا ایک چیلا بھی۔ جس پر اسے بہت ناز تھا۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا۔

"مذاق مت کرو یار!" نفیس صاحب مجھے گھورتے ہوئے بولے "میں عمر میں بھی تم سے کافی بڑا ہوں اور ایک طرح سے کچھ عرصے کے لیے تمہارا افسر ہوں۔"

"آپ اسے مذاق کیوں سمجھ رہے ہیں؟" میں نے انہیں گھورا "میری تو اس وقت حس مزاح ہی سو چکی ہے۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔ تم اتنے اطمینان سے حمان کے مرنے کی بات کر رہے ہو۔ اس کو مارنے کے لیے کسی زمانے میں دنیا کی کئی مشہور خفیہ ایجنسیوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا مگر وہ خطرناک ترین ایجنٹوں سے بچ کر نکلتا رہا تھا۔"

"اس وقت اس کی موت نہیں لکھی ہوگی۔ جب موت لکھی ہوتی ہے تو ہاتھی چیونٹی کے ذریعے بھی مر سکتا ہے اور میں کچھ ایسی چیونٹی بھی نہیں ہوں۔ البتہ آپ جیسے لوگوں کے لیے ہم جیسے لوگوں کا معاملہ "گھر کی مرغی دال برابر" والا ہوتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"مجھے... مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا۔" نفیس صاحب خیمے میں ٹہلنے لگے "تم مجھے صحیح طرح بتاؤ۔ آخر یہ واقعہ کب کہاں اور کیسے پیش آیا؟"

"وہ تو میں بتا دیتا ہوں لیکن میری یہ سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"تم سمجھ نہیں رہے ہو' درحقیقت یہ بہت اہم واقعہ ہے۔ بین الاقوامی اہمیت کی خبر ہے۔ ہمیں ان کی لاشوں کو بھی قبضے میں کرنا دینے میں مصروف ہو گئے۔ ان کے انداز سے واقعی لگ رہا تھا کہ کوئی اہم واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ انہوں نے کئی افراد سے بات کی اور کافی دیر میں فارغ ہوئے۔ میں اس دوران ان کی صورت دیکھتا رہا اور بور ہوتا رہا۔

آخر کار انہوں نے فون کی جان چھوڑی تو میں نے کہا "میرا خیال ہے آپ نے مجھے کسی کام کے لیے ہی یہاں بُلایا ہوگا لیکن لگتا یہی ہے کہ وہ کام اب بیچ میں ہی رہ گیا ہے۔"

"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ وہ کام تو ہونا ہی ہے تاہم وہ کام کچھ ایسا خاص بھی نہیں ہے۔ دراصل میں تمہیں وہ سرنگ دکھانا چاہتا تھا جو ہم اپنی دانست میں نہایت رازداری سے کھود رہے ہیں۔ میں اس کے بارے میں تمہاری رائے لینا چاہتا ہوں۔" نفیس صاحب کچھ سوچتے ہوئے بولے۔

"میں کوئی انجینئر وغیرہ تو ہوں نہیں۔ میں بھلا کیا رائے دے سکتا ہوں!" میں نے حیرت سے کہا۔

"میں تم سے انجینئرنگ کے نکتہ نظر سے نہیں بلکہ کامن سینس کے نکتہ نظر سے رائے لینا چاہتا ہوں۔ انجینئر تو ہمارے پاس بہت ہیں اور وہ سب اس پراجیکٹ پر کام کر رہے ہیں لیکن وہ لوگ لکیر کے فقیر ہوتے ہیں۔ وہ صرف ٹیکنیکل رائے دے سکتے ہیں۔ اس رائے کے پیچھے کچھ ضروری محسوسات کام نہیں کر رہے ہوتے۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولے "کل شام رپورٹ آئی ہے کہ کچھ حساس آلات نشاندہی کر رہے ہیں کہ جس سمت میں کھدائی جاری ہے اس سمت میں کچھ ہی آگے کوئی ٹھوس چیز موجود ہے۔ زمین کی ساخت سے مختلف کوئی چیز...... میں نے کھدائی رکوا دی ہے۔ اب ہمیں ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر۔ بہت احتیاط سے اُٹھانا ہے۔ ہمیں ایسی ہی کسی خبر کا انتظار تھا۔"

"تو پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم پہلے میرے ساتھ چل کر سرنگ کا معائنہ تو کرو۔" نفیس صاحب اٹھتے ہوئے بولے۔

ہم دونوں خیمے سے نکلے اور بستی کی ٹیڑھی میڑھی گلیوں سے ہوتے ہوئے اس سمت میں روانہ ہو گئے جہاں بظاہر واٹر سپلائی اسکیم پر کام ہو رہا تھا اور دیوہیکل مشینیں متحرک نظر آرہی تھیں۔

زندگی کے اُونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگرانی ابھی جاری ہے باقی واقعات آٹھویں حصے میں پڑھیں۔

سرکش

8

محمود احمد مودی

واٹر سپلائی اسکیم پر کام تو جاری تھا مگر اس میں کچھ خاص تیزی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ مشینیں اور انسان، دونوں ہی سست رفتاری سے حرکت کر رہے تھے۔ بظاہر یہاں واٹر سپلائی ہی کی اسکیم پر کام ہو رہا تھا اور اس کے تمام لوازمات موجود تھے۔ سرنگ کی کھدائی اسی کی آڑ میں جاری تھی۔

ایک طرف بہت بڑی جھیل موجود تھی۔ قریب ہی شاید ایک سائفن تعمیر کیا جا چکا تھا جس میں موٹے موٹے پائپوں اور والوز وغیرہ کا جال پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔ بہت سی دوسری تعمیرات بھی نظر آ رہی تھیں۔ کچھ لوگ جو حلیے سے خانہ بدوش نظر آ رہے تھے وہاں مزدوروں کے طور پر کام کر رہے تھے۔ وہ غالباً نفیس صاحب ہی کی بسائی ہوئی بستی سے آئے تھے۔

ایک طرف مٹی کی ایک کافی اونچی دیوار دور تک جاتی دکھائی دے رہی تھی جیسے کسی دریا کے کنارے، سیلاب کے خطرے کے پیش نظر حفاظتی پشتہ تعمیر کیا گیا ہو حالانکہ وہاں کوئی دریا نہیں تھا۔ شاید یہ سرنگ اور دوسری چیزوں کی کھدائی سے نکلی ہوئی مٹی تھی اور اسے کسی خاص مقصد کے تحت پشتے کی سی شکل دی جا رہی تھی۔ اس دیوار کے قریب کئی بڑے بڑے خیمے لگے ہوئے تھے۔

ایک طرف کنکریٹ کے بہت سے پلرز کی قطار نظر آ رہی تھی۔ یہ پلرز زیادہ اونچے نہیں تھے مگر موٹے بہت تھے۔ ان میں سے ایک پلر پر خاکی ڈانگری اور نیلی پی کیپ میں ایک شخص کھڑا تھا جس کی بڑی بڑی جیبوں میں کئی اوزار اور آلات لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھوں میں ایک کلپ بورڈ اور ایک نقشہ تھا۔ پلر سے نیچے کھڑے ہوئے تین افراد سر اٹھائے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک تو خاصی پریشانی کے عالم میں سر کھجا رہا تھا۔ پلر پر چڑھا ہوا شخص سائٹ انجینئر یا سائٹ سپروائزر قسم کی چیز معلوم ہوتا تھا۔

نفیس صاحب کو دیکھ کر وہ پلر پر سے کودا اور ہمارے قریب آگیا۔ اس نے نفیس صاحب کو مؤدبانہ انداز میں سلام کیا۔ یہ ایک حماقت تھی۔ سلام کرنا تو خیر اپنی جگہ ٹھیک تھا لیکن اتنا مؤدبانہ انداز اختیار کرنا بڑی بے وقوفی کی بات تھی کیونکہ نفیس صاحب

اس وقت خانہ بدوشوں والے حُلئے میں تھے۔ یہ لوگ حُلئے تو بدل لیتے تھے' تمام لوازمات پورے کرلیتے تھے اور لمبے چوڑے کھڑاگ پھیلا لیتے تھے لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں اور باریکیوں کا خیال رکھنا کبھی کبھار بھول جاتے تھے۔ ایک سائٹ سپروائزر یا سائٹ انجینئر کا ایک خانہ بدوش کے سامنے مؤدب نظر آنا ایک عجیب ہی تماشا تھا۔ اگر واقعی کوئی غیبی آنکھ اس منظر کی نگرانی کررہی ہوتی تو متعجب ہوئے بغیر نہ رہ سکتی۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میرا اس قسم کی خامیوں پر خاموش رہنا ہی بہتر تھا۔

"ابصار کہاں ہے؟ ہم سائٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔" نفیس صاحب کے لہجے میں تحکم تھا۔ ایک خانہ بدوش کو اس تحکم سے بات کرتے دیکھ کر میں محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس شخص نے فوراً اپنی بیلٹ میں اڑسا ہوا واکی ٹاکی نکالا اور چند بٹن دبانے کے بعد بولا۔ "ابصار..... نفیس صاحب آئے ہیں۔ وہ سائٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

"میں آرہا ہوں۔" واکی ٹاکی پر آواز ابھری۔

چند لمحے بعد جھیل کے دوسری طرف سے ایک جیپ دھول اُڑاتی آتی دکھائی دی۔ سائٹن کی چار دیواری کے گرد چکر کاٹتی ہوئی وہ ہمارے قریب آرکی اور سانولا سا ایک ادھیڑ عمر ہینڈسم شخص اُتر کر ہماری طرف آگیا۔ اس کے سر پر بڑا سا فیلٹ ہیٹ اور آنکھوں پہ تاریک چشمہ تھا۔ گلے میں دوربین لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے انگریزوں کے انداز میں ہیٹ اُتار کر بہ زبانِ خموشی نفیس صاحب کو سلام کیا۔ نفیس صاحب نے بھی صرف سرہلا کر جواب دیا۔ اس نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم خاموشی سے اس کے پیچھے چل پڑے۔

اونچی نیچی زمین پر ادھوری تعمیرات کے درمیان سے ہوتے ہوئے ہم چند کمروں کی ایک قطار کے پاس پہنچے۔ یہ کمرے غالباً وہاں عارضی طور پر تعمیر کیے گئے تھے۔ ان کے سامنے سادہ لباس میں دو مسلح گارڈ تعینات تھے۔ انہوں نے آنکھیں سکیڑ کر ہم تینوں کی طرف دیکھنے پر اکتفا کیا۔ غنیمت تھا کہ انہوں نے نفیس صاحب کو سلیوٹ وغیرہ کرنے کی زحمت نہیں کی۔

ہم ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ ایک اچھے بھلے آفس کی طرح کا کمرا تھا جس میں ایک طرف نشست کے لیے کئی صوفے اور کرسیاں وغیرہ بھی پڑی تھیں۔ نفیس صاحب مجھے ایک صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "تمہیں ذرا سا انتظار کرنا پڑے گا۔"

میں اور فیلٹ ہیٹ والا شخص جس کا نام ابصار تھا' صوفوں پر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ درمیانی دیوار میں ایک دروازہ نظر آرہا تھا۔ نفیس صاحب نہایت آہستگی اور احتیاط سے اسے کھول کر برابر والے کمرے میں چلے گئے۔ میں کمرے کا..... اور پھر ابصار کا جائزہ لینے لگا۔ وہ انجینئر معلوم ہوتا تھا۔ ممکن ہے کچھ اور بھی رہا ہو۔ مجھے اس کی کارڈرائے کی پتلون کی دونوں پھولی پھولی جیبوں میں پستول کی موجودگی کا احساس ہو رہا تھا۔ وہ بھی خاموشی سے میرا جائزہ لے رہا تھا۔ یقیناً اسے بھی معلوم تھا کہ میں مزدور نہیں تھا۔

کمرے کی عقبی دیوار کے ساتھ لکڑی کے چند کارٹن تھے۔ ان پر کسی قسم کا کوئی نشان نہیں تھا لیکن میرے لیے کرنا مشکل نہیں تھا کہ ان میں اسلحہ تھا۔ میز پر نہایت پُرانی کا سیاہ رنگ کا ٹیلی فون سیٹ بھی موجود تھا۔ دفعتاً اس کی گھ شروع ہو گئی۔

چند لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد ابصار نے ریسیور اٹھایا ا نام بتانے کے بعد کئی بار صرف "یس سر..... یس سر" کہا اور رکھ دیا پھر اس نے ایک کاغذ پر کچھ لکھا اور واپس صوفے بیٹھا۔

چند سیکنڈ کے بعد درمیانی دروازہ کھلا اور نفیس صاحب میں آگئے لیکن اب ان کا حُلیہ بدلا ہوا تھا۔ پہلی نظر میں تو غوطہ خور دکھائی دیے۔ ان کے جسم پر جوگنگ سوٹ سے مشابہ رنگ کا لباس تھا اور سر پر ایک خاص قسم کا ہیلمٹ تھا۔ آگے موٹر سائیکل کی ہیڈلائٹ کی طرح ایک لائٹ لگی ہوئی اس ہیلمٹ کے ساتھ ماسک وغیرہ بھی منسلک تھا لیکن نفیس صاحب نے وہ چہرے سے ہٹایا ہوا تھا۔ ان کی کمر پر چھ ایک ٹینک بھی بندھا ہوا تھا جو غالباً آکسیجن کا تھا۔

"کیا ہم سمندر کی تہ میں جا رہے ہیں؟" میں نے حیرت پوچھا۔

"یہی سمجھ لو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ "اصل میں کے سطح زمین سے ہٹتے ہی اس کے لیے خطرات شروع ہو ہیں۔ سطح زمین پر جو خطرات ہوتے ہیں وہ تو اپنی جگہ ہو ہیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے انہوں نے بتایا۔ "پچھلے سرنگ کی کھدائی کے دوران سرنگ کی چھت کا کچھ حصہ بیٹھ اور مزدور وغیرہ اندر بند ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ہم لوگ احتیاط کرنے لگے ہیں۔ برابر کے کمرے میں ہر چیز موجود ہے بھی جاکر اپنے سائز کا کوئی حفاظتی سوٹ پہن لو اور ہیلمٹ چڑھالو۔"

اسی دوران ابصار نے اُٹھ کر وہ چٹ نفیس صاحب کو تھ جس پر اس نے ٹیلی فون سُننے کے بعد کوئی پیغام نوٹ کیا تھا۔ صاحب نے ایک نظر چٹ دیکھی اور سرہلا کر اسے پُرزے پُر کرکے ایک طرف پھینکتے ہوئے بولے۔ "ہنی کی تدفین ہے۔" ان کے لہجے میں صرف تاسف کی خفیف سی لہر تھی۔

مجھے خفیف سا دھچکا لگا۔ میں نے دوسرے کمرے کی ط جاتے جاتے رک کر کہا۔ "اس موقعے پر ہمیں موجود ہونا چا تھا۔"

"میں جذباتیت کو برا نہیں سمجھتا۔ مناسب حدود میں والی جذباتیت کا قدردان ہوں لیکن ہنی کی تدفین میں شریک کوئی جذباتی مسئلہ نہیں تھا۔ یہ کام باعزت طریقے سے.....

ی وراز داری سے ہو گیا' یہی بہتر ہے۔ اس موقعے پر زیادہ کا جمع نہ ہونا ہی بہتر تھا۔" نفیس صاحب نے مربیانہ انداز میں یا۔

ں خاموشی سے دوسرے کمرے میں چلا گیا اور ہنی کے تصور ن سے جھٹکنے کی کوشش کرنے لگا لیکن یہ ایک مشکل کام تھا۔ رگی میں کئی بار کسی نہ کسی عجیب موڑ پر ہی مجھ سے ٹکرائی تھی ہر بار یادوں کے عجیب ہی نقوش چھوڑ گئی تھی۔ اس کی تدفین ساتھ گویا ایک بے ربط سی کہانی ختم ہو گئی تھی۔

دوسرا کمرا عجیب سا تھا۔ اس میں ریڈی میڈ کپڑوں کی دکان یک کی طرح اسٹینڈز پر بہت سے ہینگروں میں اسی قسم کے لٹکے ہوئے تھے جیسا نفیس صاحب پہن کر گئے تھے۔ ایک ڈائننگ ٹیبل جیسی بڑی سی میزوں پر ہیلمٹ اور سلینڈر وغیرہ ے ہوئے تھے۔ اس کمرے میں ایک دیوار کے ساتھ شیلفوں میں اقسام کی آٹومیٹک گنیں لوڈڈ حالت میں رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں کر رکھنے کا تکلف نہیں کیا گیا تھا۔ ان میں ایک سے ایک ناک گن موجود تھی۔ اس کمرے کا اصل دروازہ لوہے کا تھا وہ اندر سے بند تھا۔

یہاں میں نے بھی نفیس صاحب کی طرح اپنا حُلیہ تبدیل کیا واپس آفس نما کمرے میں آگیا۔ نفیس صاحب نے میرا ہیلمٹ رہ ذرا صحیح طریقے سے ایڈجسٹ کیا اور ہم اس کمرے سے نکل ئے۔ ابصار نے اپنا حُلیہ نہیں بدلا تھا۔ میں نے یہی اندازہ لگایا کہ ید اسے ہمارے ساتھ نہیں جانا تھا۔

ہم ایک اور چار دیواری تک پہنچے۔ یہ کوئی شیڈ سا دکھائی دے تھا جس میں شاید کسی قسم کی مشینری نصب تھی۔ ابصار کے پاس بٹ کی چابی موجود تھی۔ اس نے تالا کھولا اور اندر پہنچ کر میں نے یکھا' وہاں کوئی خاص مشینری وغیرہ نظر نہیں آرہی تھی۔ صرف یوں کا جال سا پھیلا دکھائی دے رہا تھا۔

ہم ایک پختہ چبوترے کے قریب پہنچے۔ یہاں سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ قریب ہی ایک الماری نما حصے میں بہت سے ات اور کچھ واکی ٹاکی قسم کے سیٹ رکھے ہوئے تھے۔ نفیس احب نے ان میں سے ایک واکی ٹاکی اٹھالیا۔ ابصار بولا۔ "میں یں موجود رہوں گا۔ کوئی ضرورت ہو تو آپ مجھے بلا سکتے ہیں۔"

نفیس صاحب نے اثبات میں سرہلایا اور ان کا اشارہ پاکر ں نے ان کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اُتر گیا۔ چند لمحے بعد میں نے پنے آپ کو ایک کچی سرنگ میں کھڑے پایا۔ دیوار کے ساتھ ساتھ چند تاریں بھی آگے جا رہی تھیں۔ انہی تاروں کے درمیان موڑے تھوڑے فاصلے پر خاص ساخت کے کلپوں کے ذریعے بلب ولڈروں میں لٹکے ہوئے تھے۔ یعنی سرنگ میں روشنی کا انتظام تھا۔

جہاں ہم کھڑے تھے وہاں سے ایک اور راستہ کسی دوسری مت میں جا رہا تھا۔ نفیس صاحب اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے۔ "سرنگ کا اصل دہانہ اس طرف ہے۔ یہ ہم نے اپنی آمدورفت کے لیے ایک الگ راستہ بنایا ہے۔"

پھر انہوں نے تاروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "یہ تاریں مختلف آلات اور کمپیوٹروں وغیرہ سے منسلک ہیں۔ ان سے ذرا بچ کر چلنا۔"

سرنگ زیادہ کشادہ نہیں تھی۔ وہاں وہ مخصوص بو موجود تھی جو زیرِ زمین سیلن زدہ جگہوں پر ہوتی ہے۔ میرے جتنے قد کا آدمی وہاں صحیح طور پر سیدھا ہو کر نہیں چل سکتا تھا۔ مجھے گردن کو ذرا خم دے کر چلنا پڑ رہا تھا۔ اس طرح چلتے چلتے جلد ہی مجھے الجھن سی ہونے لگی۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ بس ایک سیدھی سرنگ تھی اور ہم اس میں چلے جا رہے تھے۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے کے باوجود مجھے وہاں کوئی قابلِ ذکر چیز نظر نہیں آئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ نفیس صاحب مجھے وہاں کیوں لائے تھے۔

وہاں روشنی کم از کم اتنی ضرور تھی کہ ہم آسانی سے چل سکتے تھے۔ اس کے باوجود نفیس صاحب نے اپنی "ہیڈلائٹ" روشن کرلی تھی اور ان کی ہدایت پر میں نے بھی ہیلمٹ میں لگی ہوئی لائٹ کا بٹن دبالیا تھا۔ ہوا کی وہاں کچھ ایسی خاص کمی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ دو مقامات پر سرنگ کا دہانہ کھلا تھا۔

جب ہمیں چلتے چلتے خاصی دیر ہو گئی تو میں نے قدرے بیزاری سے پوچھا۔ "نفیس صاحب! کیا یہ سرنگ افق کے پار جاکر نکلے گی؟"

"نہیں۔ اس سے ذرا پہلے۔" انہوں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ "بلکہ اس سرنگ کے ذریعے ہم نکل تو کہیں بھی نہیں سکیں گے۔ سرنگ تو آگے سے بند ہے اور ابھی آدھا فاصلہ بھی طے نہیں ہوا۔"

"خدا کی پناہ.....!" میں نے طویل سانس لی۔ "اتنی طویل سرنگ کھودنے پر تو خاصی محنت ہوئی ہوگی۔"

"سرنگ تیار کرنا تو زیادہ مشکل کام نہیں۔ آج کے دور میں مشینری وغیرہ نے یہ کام بہت آسان کردیے ہیں۔ اصل مشکل راز داری سے کام کرنے کی تھی۔"

"مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ یہ سرنگ کھودنے کا کوئی اور فائدہ ہوگا یا نہیں لیکن ایک فائدہ ضرور نظر آیا ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ کیا؟" نفیس صاحب رُک کر میری طرف مڑتے ہوئے بڑی دلچسپی سے بولے۔

"مجھے یہ پتا چل گیا ہے کہ سرنگ میں چلنا کتنا بور کام ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ہم دونوں کی لائٹ ایک دوسرے کے چہرے پر پڑ رہی تھی اور ہم اس سرنگ میں کھڑے کسی اور ہی دنیا کی مخلوق لگ رہے تھے۔ نفیس صاحب خشمگیں نظروں سے مجھے گھور کر رہ گئے۔ منہ سے کچھ نہیں بولے اور گھوم کر ایک بار پھر ناک کی سیدھ میں چلنے لگے۔ اس سرنگ میں ناک کی سیدھ میں چلنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں

تھا۔

اچانک نفیس صاحب بُری طرح اُچھل پڑے۔ ان کا سر بھی سرنگ کی چھت سے ذرا ہی نیچے تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ انہیں گردن کو خم دے کر نہیں چلنا پڑ رہا تھا۔ وہ قد میں مجھ سے کچھ ہی چھوٹے تھے۔ وہ بُری طرح اُچھلے تو ان کا سر زور سے سرنگ کی چھت سے ٹکرایا۔ غنیمت تھا کہ سرنگ کی چھت بھی سرنگ کی باقی گولائی کی طرح کچی ہی تھی ورنہ نفیس صاحب کو دن میں تارے نظر آجاتے۔

انہوں نے فوراً اپنے مخصوص لباس کی جیب سے گن نکال لی اور کسی ماہر کمانڈو کی طرح دیوار سے لگ کر ایک گھٹنے کے بل بیٹھنے لگے۔ اس وقت تک وہ چیز پُھدکتی ہوئی پیچھے جا چکی تھی جس نے انہیں ایکشن میں آنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ ذرا کھسیانے سے ہو کر سیدھے ہوگئے اور گن جیب میں رکھ کر میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ "یہ کمبخت چوہے بھی ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔"

"جی ہاں۔ یہ مخلوق تو بعض اوقات انسان کی قبر میں بھی منکر نکیر سے پہلے پہنچ جاتی ہے۔" میں نے سہلاتے ہوئے کہا۔

میں اس دوران ذرا بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوا تھا کیونکہ میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا' سرنگ کی چھت سے موٹا سا ایک چوہا نفیس صاحب پر گرا تھا۔ وہ غالباً ہمیں دور سے آتے دیکھ کر راہ فرار کی تلاش میں گولائی میں چڑھتا ہوا چھت پر پہنچ کر اُلٹا ہوگیا تھا اور نرم مٹی میں پنجوں کی گرفت برقرار نہیں رکھ سکا تھا۔

اس کے علاوہ کوئی خاص واقعہ پیش نہ آیا حتیٰ کہ سرنگ کے اختتام تک پہنچ گئے۔ یہ گویا ایک بند گلی تھی۔ ہمارے سامنے مٹی کی دیوار آگئی تھی۔ وہ تاریں جو سرنگ کے دہانے سے چلی آرہی تھیں' یہاں ان کے سِروں پر مختلف ساخت کے چھوٹے چھوٹے آلات منسلک تھے اور ان سب کا کچھ نہ کچھ حصہ پلگ کی طرح سامنے مٹی کی دیوار میں پیوست تھا۔

میں تمام راستے سرنگ کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ یہاں پہنچ کر بھی میں نے ہر کونے کھدرے کا غیر محسوس سے انداز میں جائزہ لے لیا تھا۔ نفیس صاحب متوقع سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

"کیا خیال ہے؟" آخر انہوں نے پوچھا۔

"بہت غور و خوض کے بعد میں ایک نتیجے پر پہنچا ہوں۔"

"کس نتیجے پر؟" نفیس صاحب نے نہایت اشتیاق سے پوچھا۔

"یہی کہ..... یہ واقعی ایک سرنگ ہے۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

نفیس صاحب کے تاثرات بدل گئے۔ انہوں نے کونٹیکٹ لینز کے ذریعے اپنی نیلی آنکھوں کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ اگر اس وقت ان کی آنکھوں کا اصل رنگ نظر آرہا ہوتا تو ان میں یقیناً زیادہ سرد مہری نظر آتی۔ تاہم جب وہ بولے تو ان کے لہجے میں کافی سرد مہری تھی۔

"ڈیئر افضل چوہدری! تمہیں شاید معلوم نہیں ۔ مذاق زیادہ پسند نہیں کرتا۔ خصوصاً ان معاملات میں جو زیادہ سنجیدگی کا تقاضا کرتے ہیں۔" وہ انگریزی میں بولے زیادہ سنجیدہ ہوتے تھے تو انگریزی بولنے لگتے تھے۔

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ ساتھ رہیں گے تو رفتہ رفتہ آپ مذاق کو پسند کرنے لگیں آپ کا مذاق..... یعنی ذوق اس معاملے میں کافی بلند ہو جس مزاح ترقی کر جائے گی۔ یوں زندگی آپ کے لیے ہو جائے گی۔" میں نے جان بوجھ کر اردو میں جو پُر معصومیت سے پوچھا۔ "آپ کہیں خانہ بدوشوں وا بھی زیادہ سنجیدہ ہونے پر انگریزی بولنا تو شروع نہیں کر د

وہ ایک لمحے مجھے گھورتے رہے پھر گویا اپنا دماغ ٹھنڈ کوشش کرتے ہوئے بولے۔ "میں احمق نہیں ہوں۔ سیکڑ مختلف قسم کے بہروپ دھار چکا ہوں۔ تم مجھے اِدھر اُدھر کی الجھانے کی کوشش چھوڑ دو اور اگر اس سرنگ کے با تمہاری کوئی رائے ہے تو وہ بتاؤ۔"

"مجھ سے بہتر رائے تو آپ کے کمپیوٹرز اور دوسر ظاہر کر چکے ہیں۔ میں اس سرنگ کو صرف دیکھنے کے رائے دے سکتا ہوں کہ یہ ایک سرنگ ہے اور بس.....! سنجیدگی سے کہا۔

"ان معاملات میں ہم جیسے لوگوں کی چھٹی حس بعض کمپیوٹروں اور دوسرے آلات سے زیادہ کارآمد ثابت ہے۔" نفیس صاحب بولے۔

"میری چھٹی حس کی رائے کا تو شاید آپ میری را زیادہ بُرا منا جائیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں..... نہیں۔ تم بولو تو سہی۔" انہوں نے گویا ہ بڑھائی۔

"میں صحیح طور پر تو نہیں کہہ سکتا کہ وہ میری چھٹی ساتویں....." میں نے بدستور سنجیدگی سے کہا۔ "بہرحال حس ہے جو مجھ سے کہہ رہی ہے کہ یہ سرنگ بلاوجہ ہی ہے۔ خوامخواہ ہی اتنی محنت کی گئی ہے اور اتنے وسائل گئے ہیں۔"

اس بار نفیس صاحب نے خاصے صبر و تحمل کا مظاہرہ کی افسرانہ شان جوش میں نہیں آئی اور وہ ملائمت سے "یہ تو تم نہیں کہہ سکتے۔ پہلی بات تو یہ کہ اس سرنگ کی بہت زیادہ محنت یا وسائل صرف نہیں ہوئے۔ واٹر سپلائی یہاں بن ہی رہی تھی۔ اس کی آڑ میں سرنگ کھود لی گئی کا کچھ نہ کچھ نتیجہ تو نکلا ہے۔ آلات نے نشاندہی کی ہے کہ زیادہ دو تین فٹ آگے کچھ موجود ہے۔"

"یہ بات شاید کسی اور طرح بھی معلوم ہو سکتی تھی۔

کہا۔

"ہم ہر طریقہ آزما چکے تھے۔ سطح زمین سے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔" نفیس صاحب ملائمت سے بولے۔ "جہاں ہم کھڑے ہیں' اس کے آس پاس اوپر سے تو بہت بڑے علاقے کو آلات وغیرہ سے چیک کیا گیا تھا۔ شاید آلات اس لیے بھی کوئی نشاندہی نہ کر سکے ہوں کہ یہاں جو کچھ بھی موجود ہے وہ کافی گہرائی میں ہے۔ اس وقت ہم کافی گہرائی میں کھڑے ہیں۔ یہ سرنگ ترچھی ہوتی ہوئی کافی گہرائی میں آگئی ہے۔"

"اس کا مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔ میں نے محسوس کر لیا تھا کہ ہم دھیرے دھیرے ڈھلان کی طرف جا رہے ہیں۔ حیرت ہے کہ اتنی گہرائی میں پانی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہاں پانی بہت زیادہ گہرائی میں ہے۔" نفیس صاحب نے بتایا۔ "جن لوگوں نے یہاں زیرِ زمین کچھ بنایا ہوگا انہوں نے یہ سب چیزیں تو دیکھی ہوں گی۔ سوائل ٹیسٹ وغیرہ کیا ہوگا۔"

"آپ اتنے پُرامید کیوں ہیں کہ یہاں انہی لوگوں کا بنایا ہوا کچھ موجود ہوگا؟ عین ممکن ہے آگے کوئی ٹھوس چٹان موجود ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہماری امیدوں پر اتنی بے دردی سے پانی پھیرنے کی کوشش تو نہ کرو۔" نفیس صاحب کا لہجہ اب خوشگوار ہو چکا تھا۔ شاید میری پیش گوئی پوری ہو رہی تھی یا پھر صحبت کا اثر ہو رہا تھا کہ وہ نہایت بوجھل معاملات پر بھی خوش دلی سے بات کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

پھر وہ دیوار میں پیوست آلات کو دیکھتے ہوئے بولے۔ "ہم تو یہاں تک پہنچنے کے بعد بڑے پُرامید ہو چکے ہیں۔ کم از کم محلِ وقوع کا تعین تو ہو چکا ہے کہ یہاں کچھ موجود ہے۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ اسے پوری طرح نظروں کے سامنے لانے کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے؟ آیا ہم اسی طرف سے کھدائی کا محیط بڑھائیں اور دیکھیں کہ ہمارے سامنے کیا آتا ہے۔ کوئی عقبی دیوار..... بغلی دیوار..... یا کوئی اور حصہ..... ایک طریقہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اگر یہ کوئی زیرِ زمین قلعہ ہے تو ہم اس میں داخلے کا اصل راستہ تلاش کرنے کی کوشش کریں..... لیکن اس میں ہمیں پہلے ہی ناکامی ہو چکی ہے۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ اس حصے کو طاقتور بم بلاسٹ کے ذریعے اُڑا دیا جائے لیکن اس پر ہم اس لیے عمل نہیں کر رہے کہ ہمیں یہ دیکھنے کا تجسس ہے کہ یہاں کیا کچھ موجود ہے۔ عین ممکن ہے یہاں سے بہت اہم معلومات حاصل ہوں یا کچھ اہم خبریں ہاتھ آئیں۔ کوئی بعید نہیں کہ اس مدفون قلعے میں بھی کچھ زندہ انسان یا کوئی اور مخلوق موجود ہو۔"

میں ان کی اُمید بھری تقریر سننے کے بعد ایک لمحے خاموشی سے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "ویسے تو میں دعاگو ہوں کہ آپ کی امیدیں بر آئیں لیکن مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ آپ کے ساتھ "کھودا پہاڑ نکلا چوہا" والا معاملہ نہ ہو۔ کھدائی کرتے کرتے آپ پہاڑ کے قریب آپہنچے ہوں اور چوہا پہلے ہی نکل کر بھاگ گیا ہو۔ وہی چوہا جو ہم دونوں کی ٹانگوں کے درمیان سے پُھدکتا ہوا بھاگا تھا۔"

وہ مجھے گھورنے لگے۔ میں نے گویا انہیں تسلی دی۔ "ویسے اطمینان کی بات یہ ہے کہ چوہا مرا ہوا نہیں تھا۔ اچھا خاصا صحت مند اور چلبلا چوہا تھا۔ کم از کم ایک کلو وزن تو ضرور رہا ہوگا اس کا..... کسی غریب گھرانے کی بلی کے برابر لگ رہا تھا۔ اگر پہاڑ کھودنے کے بعد چوہا بھی مُردہ ہو تو میرے خیال میں مایوسی زیادہ ہوتی ہوگی؟"

وہ ایک لمحے خاموش رہے پھر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولے۔ "میں سوچ رہا ہوں یہاں سے واپسی پر کم از کم دو دو کلو کے کئی صحت مند چوہے فرائی کروا کے تمہارے معدے میں ٹھنسوا دوں تاکہ تم اس محاورے سے صحیح طور پر مستفید ہو سکو۔"

"میری صحت ٹھیک ٹھاک ہے۔ مجھے اتنے زیادہ لحمیات کی ضرورت نہیں۔" میں نے گِھن کھائے بغیر اطمینان سے جواب دیا۔

"آؤ واپس چلتے ہیں۔" وہ سکڑ سمٹ کر میرے قریب سے گزر کر آگے بڑھتے ہوئے بولے۔ واپسی کے سفر میں بھی وہ مجھ سے آگے چل رہے تھے۔ کچھ فاصلہ ہم نے خاموشی سے طے کیا۔ انہیں بالکل ہی چُپ لگ گئی تھی۔

تب میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب تو آپ نے اوپر سطح زمین پر اس جگہ کا تعین کر لیا ہوگا جہاں آپ کے خیال میں وہ چیز موجود ہو سکتی ہے؟"

جواب دینے سے پہلے انہوں نے مڑ کر ایک نظر میری طرف دیکھا' گویا اطمینان کر رہے ہوں کہ میں ابھی تک غیر سنجیدہ تو نہیں ہوں۔ میری سنجیدگی سے شاید انہیں کچھ حوصلہ ہوا اور وہ نرم سے لہجے میں بولے۔ "ہاں جگہ کا تعین تو ہوگیا ہے لیکن ہم نے احتیاطاً اس پر کوئی نشان وغیرہ نہیں لگایا۔ اندازاً اور کچھ آلات سے پیمائش وغیرہ کے ذریعے ہم وہاں پہنچ جاتے ہیں۔"

"اگر زحمت نہ ہو تو میں اس جگہ کو دیکھنا چاہوں گا۔" میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔ مجھے اس معاملے میں دلچسپی لیتے دیکھ کر گویا ان کے دل میں کوئی اُمید جاگی تھی اور ان کا موڈ خوشگوار ہوگیا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ تقریباً شفقت سے بولے۔ "تم زحمت کی بات کر رہے ہو۔ ہم اس معاملے میں جان کی بازی لگائے بیٹھے ہیں۔"

"بُرا نہ منائیں تو ایک مشورہ دوں؟"

"ضرور ضرور۔" وہ رک کر ہمہ تن گوش ہوگئے۔

"جان کی بازی بھی ہنستے ہنستے ہی لگایا کریں۔ وہ بوجھل کام بھی ہلکے پھلکے محسوس ہوتے ہیں جو ہنسی ہنسی میں کیے جاتے ہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ گہری سانس لے کر بولے۔ "میرے اور تمہارے درمیان بہت سے فرق حائل ہیں۔ عمر کا فرق ہے.... طرز زندگی کا فرق ہے۔ تم نے کسی اور پوزیشن میں.... کسی اور طرح زندگی گزاری ہے.... میں نے کسی اور پوزیشن میں.... کچھ اور طرح سے روز و شب بتائے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ کہ ہر انسان اس دنیا میں اپنی ایک الگ فطرت لے کر آتا ہے۔ تم یہ توقع مت رکھو کہ میں تمہارے ساتھ رہوں گا تو تمہاری فطرت میں ڈھل جاؤں گا.... اور وہ بھی محض چند گھنٹوں' چند دنوں یا چند ہفتوں میں۔"

"بالکل ٹھیک ہے سر!" میں نے تسلیم کیا۔ "اس کا مطلب ہے میں بھی آپ کی فطرت میں نہیں ڈھل سکتا۔"

"میں تو اس کی توقع ہی نہیں رکھتا۔ میں تو یونہی بعض معاملات میں تم سے تھوڑا بہت سنجیدہ ہونے کی درخواست کرتا ہوں۔"

"میں بھی آپ سے فطرت بدلنے کے لیے نہیں کہتا۔ یونہی بس تھوڑا سا ہلکا پھلکا رہنے کی توقع کرتا ہوں۔ اگر آپ نہیں رہ سکتے تو آپ کی مرضی۔ میں اصرار نہیں کروں گا۔"

اچانک انہوں نے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ سرنگ میں یہ قہقہہ کچھ زیادہ ہی گونجیلا محسوس ہوا۔ کئی لمحے تک اس کی بازگشت سنائی دیتی رہی۔ وہ پلٹ کر میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولے۔ "میرا خیال ہے' ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں اور دونوں دراصل اپنے اپنے انداز میں ایک دوسرے کو چھیڑتے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہماری چھیڑ چھاڑ تھی۔ ہم اپنی اپنی عمر' طرز زندگی اور دیگر چیزوں کے فرق کے باوجود اچھے دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟"

"یقیناً۔ یہی محسوس کرنے کے بعد تو میں نے آپ سے چھیڑ چھاڑ شروع کی تھی۔ میں ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

باتوں باتوں میں ہم واپس سرنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ ابصار ایک مجسمے کی طرح وہاں استادہ تھا۔ نفیس صاحب نے دھیمے لہجے میں اس سے کہا۔ "ہم وہ خاص اسپاٹ دیکھنا چاہتے ہیں۔"

ابصار نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور ایک طرف کو چل دیا۔ ہم اس کے پیچھے چل دیے۔ وہ اپنی جیپ کی طرف جا رہا تھا۔ چند لمحوں بعد ہم اس کے ساتھ جیپ میں بیٹھے ایک طرف جا رہے تھے۔ وہاں کوئی حد بندی تو نہیں تھی لیکن جلد ہی میں نے محسوس کیا کہ ہم اس سائٹ کی حدود سے نکل آئے تھے جو واٹر سپلائی اسکیم کے لیے مخصوص تھی۔

ابصار کی جیپ میں کئی قسم کے آلات اور چھوٹی بڑی مشینیں وغیرہ موجود تھیں۔ اس چٹیل میدان میں جگہ کے تعین میں وہ غالباً کچھ آلات سے مدد بھی لے رہا تھا۔ آخر کار ایک جگہ دھچکے سے جیپ رک گئی۔

ابصار نے ہاتھ سے کوئی اشارہ نہیں کیا۔ صرف آنکھوں کے اشارے سے بتایا۔ "اگر زیر زمین کوئی خاص چیز موجود ہے تو وہ یہاں صرف سولہ مربع ایکڑ کے اندر اندر تقریباً ساٹھ فٹ گہرائی میں کہیں موجود ہے۔"

میں نے جیپ سے اتر کر دیکھا۔ وہ سخت اور ناہموار سی زمین تھی۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ برسوں سے وہاں کسی نے کدال تک نہیں چلائی تھی۔ اس حصے میں تو سبزہ بھی نہیں تھا' البتہ چار پانچ فرلانگ محیط کے دائرے کو چھوڑ کر چاروں طرف چھدری خودرو جھاڑیوں اور چھوٹے چھوٹے جنگلات کا سلسلہ پھیلا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ ان اطراف میں زمین اور بھی زیادہ ناہموار تھی۔ کہیں کہیں تو ٹیلے سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسی ٹھوس زمین کے نیچے کوئی قلعہ وغیرہ کیسے موجود ہو سکتا تھا جہاں زندہ سلامت انسان اور چمپینزی نہایت آرام و سکون سے رہتے تھے' سانس لیتے تھے۔ اگر یہ وہی جگہ تھی جہاں ایک بار مجھے اغوا کر کے لے جایا گیا تھا تو وہ [illegible] زمین پر موجود تعمیرات سے بھی زیادہ آرام دہ تھی۔ وہاں انہوں نے جو الف لیلوی ماحول تخلیق کیا ہوا تھا وہ تو اپنی جگہ تھا لیکن مجھے [illegible] وہاں کی فضا بھی بڑی خوشگوار محسوس ہوئی تھی۔ اگر وہ لوگ اسے چھوڑ کر جا چکے تھے اور یہ جگہ متروک ہو چکی تھی تب بھی ان کے رخصت ہونے کے ہی کچھ شواہد نظر آتے۔

میں بہت دیر تک گم صم چاروں طرف دیکھتا رہا پھر اچانک [illegible] میں نے نفیس صاحب سے کہا۔ "آپ نے اس جگہ کا فضائی سروے کیا ہے؟"

"ہاں۔" وہ ذرا چونکنے کے بعد سنبھلتے ہوئے بولے۔ "ارد گرد کئی میل کے علاقے میں کوئی قابل ذکر یا مشکوک چیز موجود نہیں ہے۔"

"کیا میرے لیے بھی چند منٹ کے فضائی سروے کا بندوبست ہو سکتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

نفیس صاحب نے جواب دینے سے پہلے گہری سانس لی۔ شاید وہ کہنا چاہتے تھے۔ "تم ہماری کہی ہوئی بات سے مطمئن کیوں نہیں ہوتے؟" لیکن اس کے بجائے وہ نہایت تحمل سے بولے۔ "ہاں.... کیوں نہیں.... یہ کون سا مشکل کام ہے۔"

ہم واپس جیپ میں آ بیٹھے۔ موبائل فون اس وقت بھی نفیس صاحب کے پاس موجود تھا۔ انہوں نے یکے بعد دیگرے دو تین افراد سے بات کی پھر فون بند کرتے ہوئے بولے۔ "ہیلی کاپٹر آدھے گھنٹے تک پہنچ جائے گا۔ تب تک ہم کچھ کھا لیں۔"

ان کی تجویز مناسب تھی۔ ان کے منہ سے کھانے کا ذکر سن کر مجھے بھی بھوک کا احساس ہوا اور یاد آیا کہ میں نے راحیلہ کی اسپتال والی قیام گاہ پر ناشتا بھی واجبی سا ہی کیا تھا۔ ہم واپس سائٹ پر آ گئے۔ وہاں کھانے کا انتظام تھا۔ باقاعدہ کینٹین موجود تھی۔ چند منٹ میں ہمارے لیے معقول قسم کا کھانا آ گیا اور چند منٹ میں ہی ہم نے اسے چٹ بھی کر ڈالا۔ ابصار کو اس دوران نفیس صاحب نے چھٹی دے دی تھی اور وہ غائب ہو گیا تھا۔

کھانا ہم نے اسی آفس نما کمرے میں کھایا تھا۔ وہ کمرا اس وقت بھی خالی تھا۔ نہ جانے اس میں کون بیٹھتا تھا۔ میں نے نفیس صاحب سے پوچھنا بھی ضروری نہ سمجھا۔ کھانے کے بعد ہم باہر آ کھڑے ہوئے۔ چند لمحے بعد ہی فضا میں ہلکی سی گڑگڑاہٹ ابھری اور ایک طرف سے سبز رنگ کا ایک ہیلی کاپٹر نمودار ہوتا دکھائی دیا۔

جلد ہی وہ سائٹ پر آ پہنچا۔ سائٹ پر ایک طرف ایک اونچا پختہ چبوترا موجود تھا۔ شاید وہ کسی زیر زمین ٹینک کی چھت رہی ہو۔ بہرحال اس وقت اس نے ہیلی پیڈ کا کام دیا اور ہیلی کاپٹر اس پر آن اترا۔ میں نفیس صاحب کے ساتھ ہیلی کاپٹر میں جا بیٹھا۔ اس میں صرف پائلٹ موجود تھا۔

میں اور نفیس صاحب پچھلی دو نشستوں پر تھے۔ ہم لائٹ والے ہیلمٹ تو اتار چکے تھے لیکن ہیلی کاپٹر میں ہمیں دوسرے ہیلمٹ پہننا پڑے اور حفاظتی بیلٹ بھی باندھنا پڑی۔ نفیس صاحب نے پائلٹ کو ہدایات دیں کہ اسے کتنی بلندی پر کن حدود میں پرواز کرنا تھی۔

چند لمحے بعد ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوا اور نیم دائرے میں گھوم کر کافی بلندی پر آنے کے بعد ہمارے مطلوبہ علاقے کی طرف پرواز کرنے لگا۔ ہم زیادہ بلندی پر نہیں تھے لیکن درخت اور جھاڑیاں کافی چھوٹی نظر آ رہی تھیں۔ میں نے کھڑکی کے قریب لٹکی ہوئی دوربین آنکھوں سے لگا لی۔ دونوں کھڑکیوں کے نچلی طرف افقی انداز میں بھی ایک لمبوترا سا شیشہ لگا ہوا تھا جس پر دوربین لگا کر ہم نہایت اچھے طریقے سے اس علاقے کا جائزہ لے سکتے تھے جس پر سے ہم گزر رہے تھے۔

میں جتنے علاقے کا جائزہ لینا چاہتا تھا اس کے لیے ہمیں دائرے میں سفر کرنا تھا۔ وہ واقعی ایک غیر آباد علاقہ تھا اور اس میں کوئی قابل ذکر چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ اونچی نیچی' ناہموار زمین' کہیں درختوں کے جھنڈ' کہیں جھاڑیاں اور کہیں برساتی پانی کے جوہڑ۔ بس یہی کچھ تھا۔

دائرے میں ہمارا سفر ختم ہونے سے پہلے ایک جگہ مجھے ایک صاف میدان سا نظر آیا۔ اس کے وسط میں ایک بہت بڑا جھونپڑا نما مکان موجود تھا۔ کسی نے بڑی سادگی اور فطری خوبصورتی کے ساتھ وہاں اپنے رہنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ پہلی ہی نظر میں جو بات مجھے ذرا عجیب لگی' وہ یہ تھی کہ لکڑی کی بلیوں' شاخوں' گھاس پھونس اور گارے سے بنا ہوا یہ جھونپڑا بہت بڑا تھا۔ کسی ہائی وے وغیرہ کے کنارے بنے ہوئے چھپر ریستوران بھی اتنے بڑے نہیں ہوتے تھے۔

قریب ہی درختوں کے نیچے کچھ مویشی بندھے ہوئے تھے۔ بائیں ہاتھ پر ایک کنواں نظر آ رہا تھا جس پر چرخی اور ڈول بندھا ہوا تھا۔ اس کنویں سے ایک باریش اور عمر رسیدہ مگر تندرست و توانا شخص پانی بھر کر جھونپڑا نما مکان کی طرف لے جا رہا تھا۔ طریقہ وہی پرانا تھا یعنی ایک موٹے ڈنڈے میں دو کنستر بندھے ہوئے تھے اور ڈنڈا اس کے کندھوں پر ٹکا ہوا تھا۔ مکان کے آس پاس کچھ اور بھی ایسے لوازمات موجود تھے جو ڈھور ڈنگر وغیرہ رکھنے والے دیہاتیوں کے مکانوں میں یا مکانوں کے آس پاس نظر آتے ہیں۔ وہ مکمل طور پر ایک دیہی مکان تھا۔ خاص بات صرف یہ تھی کہ وہ بہت بڑا تھا اور میلوں میں پھیلے ہوئے علاقے میں واحد مکان تھا۔

اس دوران ہیلی کاپٹر بہت آگے نکل چکا تھا۔ میں نے پائلٹ کو واپس اسی طرف چلنے کی ہدایت کی۔ ہیلی کاپٹر دائرے میں گھوم گیا۔ نفیس صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ "مجھے معلوم تھا کہ اس ویرانے میں یہ مکان تمہاری نظر میں کھٹکے گا لیکن ہم اسے چیک کر چکے ہیں۔ اس میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ یہ دو باپ بیٹے ہیں جو برسوں سے اسی جگہ اسی مکان میں رہ رہے ہیں۔ مویشی پالتے ہیں۔ ان کا دودھ نواحی بستیوں میں جا کر بیچ آتے ہیں۔ کوئی گائے وغیرہ بیمار ہو جائے تو اسے بھی ذبح کر کے بیچ آتے ہیں۔"

بوڑھا اس دوران پانی کے کنستر اندر لے جا چکا تھا۔ پہلی بار اوپر سے ہیلی کاپٹر گزرنے پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی لیکن اب غالباً دوبارہ آواز سننے پر وہ باہر آ گیا اور ہاتھ سے آنکھوں پر چھجا بنا کر اوپر دیکھنے لگا۔

میں نے پائلٹ سے کہا۔ "یہاں چکرانے کی ضرورت نہیں۔ کسی بھی طرف نکلتے چلو لیکن قریب ہی کہیں درختوں کی آڑ میں کوئی ہموار جگہ دیکھ کر لینڈ کرو۔ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کرو کہ ہماری توجہ اس مکان کی طرف نہیں' کہیں اور ہے۔"

پائلٹ نے مڑ کر ہاتھ کے اشارے سے بتایا کہ وہ میری بات سمجھ گیا تھا۔ میں ایک بار پھر کھڑکی کے نچلے شیشے پر دوربین ٹکا کر نیچے کا جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے آہستگی سے کہا۔ "مکان بہت بڑا ہے....!"

"بڈھے نے مفت کی زمین ماری ہوئی ہے اس لیے بے فکری سے لمبے چوڑے رقبے میں اپنا کھڑاگ پھیلا رکھا ہے۔ یہ سرکاری زمین ہے۔ جب بھی یہاں کوئی کام شروع ہوا اسے اٹھا دیا جائے گا۔" نفیس صاحب بولے۔

"ہمارے ہاں عام طور پر لوگ ویرانوں میں تنہا گھر بنا کر رہنا پسند نہیں کرتے۔" میں نے کہا۔ "اگر کوئی رہتا بھی ہے تو جلد ہی اس کی دیکھا دیکھی دوسرے گھر بھی آباد ہونے لگتے ہیں اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے اچھی بھلی کچی بستی تیار ہو جاتی ہے۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ یہ برسوں سے یہاں رہ رہا ہے۔ اس کے آس پاس کسی نے دوسرا گھر بنانا پسند نہیں کیا یا اس نے کسی کو گھر بنانے نہیں دیا؟"

"یہ تو نہیں کہا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کسی نے بنانا پسند ہی نہیں کیا ہوگا۔ یہ جگہ نواحی آبادیوں سے بھی کافی دور ہے۔ لوگ عموماً کچی بستیاں بھی شہروں کے اندر ہی یا ان کے آس پاس بسانے

کی کوشش کرتے ہیں۔ پیشہ ور زمین چور ایسی بستیاں آباد کراتے ہیں اور وہ ویرانوں کا رُخ نہیں کرتے۔ یہ باپ بیٹا یا تو تنہائی پسند ہیں یا پھر انہوں نے حساب کتاب لگایا ہوگا کہ اسلام آباد میں یا اس کے آس پاس کہیں بھی اتنی بڑی جگہ مفت میں یا سستے داموں نہیں ماری جاسکتی۔" نفیس صاحب کے پاس ہر بات کی وضاحت موجود تھی۔ "شدید سردی میں چونکہ انہیں اپنے مویشی اندر ہی باندھنا پڑتے ہیں۔ اس لیے بھی انہوں نے اپنا یہ چھپر نما گھر بڑا بنایا ہے۔ اصل میں یہ صرف باپ بیٹے کا نہیں' ان کی گائے بھینسوں کا بھی گھر ہے۔"

"ان کے گھر میں کوئی عورت نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔

"بوڑھے کا بیٹا بھی نظر نہیں آرہا۔" میں نے کافی آگے نکل آنے کے باوجود دوربین سے اس جگہ کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

"اندر ہوگا یا گھوڑا گاڑی لے کر کسی نواحی بستی میں گیا ہوگا۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔ دوربین ان کے پاس بھی موجود تھی۔ اس دوران بوڑھا شاید ہیلی کاپٹر کی طرف سے مطمئن ہوکر اندر جاچکا تھا۔

"یہاں کنواں بھی ہے اس کے برعکس جہاں آپ لوگوں نے سرنگ کھدوائی ہے وہاں ستر اسی فٹ کی گہرائی تک پانی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"یہ جگہ وہاں سے بہت دور ہے۔" نفیس صاحب بولے۔ "اور قدرت کا نظام تو کچھ ایسا ہے کہ زیر زمین پانی کی سطح کہیں کچھ ہے اور اس سے تھوڑے ہی فاصلے پر کچھ اور ہے۔"

پائلٹ اس دوران ہیلی کاپٹر کو گھما کر بڑی ہوشیاری سے ایک مناسب جگہ پر لینڈ کرچکا تھا۔ پائلٹ کو اب نفیس صاحب کے بجائے میں ہدایات دے رہا تھا۔ میں نے اسے وہیں ٹھہرنے کے لیے کہا۔ میں اور نفیس صاحب ہیلمٹ اُتار کر نیچے چھلانگ لگانے ہی لگے تھے کہ میں نے انہیں رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آپ کے پاس تو گن موجود ہے لیکن میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔ میرے لیے بھی کسی گن کا انتظام ہوسکتا ہے؟"

"کیوں نہیں۔" انہوں نے دروازے کے قریب ہی دیوار میں موجود ایک کمپارٹمنٹ کھولا اور سیاہ رنگ کا چمکتا ہوا ایک لوڈڈ ماؤزر میری طرف بڑھادیا۔ میں نے اسے جوگنگ سوٹ نما لباس کے اندر اڑس لیا۔ اس کا ابھار نظر آرہا تھا لیکن اس سلسلے میں اب کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔

ہم دونوں ہیلی کاپٹر سے کودے اور درختوں کی طرف چل دیے۔ نفیس صاحب بولے۔ "ایک بوڑھے گوالے اور اس کے مجنووی بیٹے کے لیے تم مسلح ہو کر جارہے ہو لیکن دنیا کے چند مشہور ترین اور سفاک ترین قاتلوں میں سے ایک سے تمہارا واسطہ پڑا تو تمہارے پاس کوئی گن نہیں تھی۔" ان کا اشارہ حمان کی طرف تھا جو اپنے چیلے سمیت آج ہی میرے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

"اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرا سامنا کس سے ہو والا ہے۔ اب تو میں ارادتاً ایک جگہ کی طرف جارہا ہوں۔ احت فرض ہے۔ جان پہلے بھی اوپر والے نے بچائی تھی۔ اب بھی بچائے گا۔"

انہوں نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "جوگ تم تو بہت سنجیدہ معلوم ہوتے ہو۔"

"آپ ہی تو مجھے سنجیدہ بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ مجھے لگتا اب میں سنجیدہ نظر آنے کی کوشش کروں گا تو آپ اس پر بھی خو نہیں ہوں گے۔" میں نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "بزرگوں نے کہا ہے... لوگ کسی حال میں خوش نہیں رہتے.... اور نہ ہی کس رہنے دیتے ہیں۔"

ہم اب درختوں کے درمیان سے گزر رہے تھے۔ ایک لمحے خاموشی کے بعد وہ بولے۔ "میرا تو خیال ہے تم وقت ضائع کر رہے ہو۔"

"زندگی میں بہت وقت ضائع کیا ہے۔ تھوڑا سا اور سہی میں نے بے نیازی سے جواب دیا پھر پوچھا۔ "اس جگہ کو.... ان باپ بیٹے کو آپ نے خود آکر دیکھا تھا یا کسی اور نے آکر چیک تھا؟"

"کسی اور نے آکر چیک کیا تھا۔ مجھے رپورٹ ملی تھی۔ میں دنوں بہت مصروف تھا۔ ہر جگہ خود نہیں جاسکتا تھا۔ ادھر حالات ایسے ہیں۔ زیادہ تر ہماری افرادی قوت اِدھر اُدھر بکھ ہوئی ہے۔ بہت کم لوگ میرے ساتھ ہیں۔ تمہارے آدمیوں کی سے کچھ آسانی ہوگئی ہے۔ اب ہم اپنی ایجنسیوں کی تمام مشینر تو اسی مسئلے میں نہیں اُلجھا سکتے تھے۔ دوسرے مسائل بھی بہت ہیں۔"

"عین ممکن ہے سب مسائل کی جڑ کسی ایک ہی جگہ ہ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بہرحال.... اس جگہ کے بارے آپ نے رپورٹ پر تکیہ کیا تھا؟"

"وہ ایک معتبر رپورٹ تھی۔ محض خانہ پُری کی چیز نہیں میرے ساتھ اس مہم میں جو لوگ ہیں وہ خانہ پُری والی رپور نہیں دیتے۔"

"خیر.... اب موقع ملا ہے تو خود چیک کرلینے میں کوئی نہیں۔" میں نے کہا۔ اس دوران ہم درختوں کے سلسلے سے آئے تھے۔ وہ چھپر نما مکان ابھی بہت دور تھا۔

"میں چاہتا ہوں ہم اس مکان کے عقب سے اس کے ق پہنچیں۔" میں نے کہا۔ اس کے لیے ہمیں اس مختصر جنگل میں تھوڑا سا چکر کاٹ کر اپنی سمت بدلنا پڑی۔

"اگر تمہارے شبہات..... جن کے بارے میں مجھے نہیں کہ وہ کیا ہیں.... غلط نکلے تو میں تم پر جرمانہ کروں گا۔" نفیس صاحب بولے۔

"میں آج کل بہت غریب ہوں۔ جان کا نذرانہ دے سکتا ہوں۔ جرمانہ نہیں دے سکتا۔ ہمارے ملک میں غریب بے چارے ہر ایک کے لیے جان کا نذرانہ دیتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"خیر۔ اب اتنا بھی جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری جان تو ہمارے لیے بہت اہم ہے۔ اس کا نذرانہ دینے کی ضرورت نہیں۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولے۔ "اب تو تم مجھے بھی اس معاملے کو اہمیت دینے پر مجبور کررہے ہو۔ اگر بات کچھ اتنی ہی خاص ہے تو اور آدمی بُلوا لیتے ہیں۔"

"اس کی ضرورت نہیں۔ میں ہنگامہ نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔ "سچی بات یہ ہے کہ مجھے خود بھی معلوم نہیں میں وہاں کیوں جارہا ہوں۔ کوئی خلش ہے جو اچانک پیدا ہوئی ہے اور مجھے اس جگہ کے بارے میں اطمینان کرنے پر مجبور کررہی ہے۔ جب یہ خلش پیدا ہوجاتی ہے تو مجھے سکون سے بیٹھنے نہیں دیتی۔"

ہم اس وقت کھلے میدان میں تھے اور مکان کے عقبی حصے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مکان میں اس طرف بھی دیوار میں ایک کھڑکی تھی لیکن وہ اس وقت بند نظر آرہی تھی۔ کچھ صحت مند مرغیاں تاروں سے بنے ہوئے جنگلے کے درمیان بھاگی پھر رہی تھیں۔ ایک مرغا اس ہلچل کا سبب تھا جو کچھ خاص عزائم کے تحت اپنے حرم میں بے چینی پھیلا رہا تھا۔

ہم محتاط بھی تھے اور بظاہر بے پروا نظر آنے کی بھی کوشش کررہے تھے۔ ہم مکان تک جا پہنچے اور کچھ بھی نہ ہوا۔ ہم ایک لمحے کے لیے رکے اور مکان کے قریب سے گزرتے ہوئے سامنے کی طرف جانے لگے۔ مرغے کو شاید اپنے حرم کے قریب ہماری آمد پر اعتراض تھا۔ اس نے بہت کرخت اور اونچی آواز میں کٹ کٹ کرنا شروع کردیا تھا۔

مجھے یوں لگا جیسے مرغے کا اس طرح کٹکٹانا کوئی سگنل تھا کیونکہ فوراً ہی مکان کے کونے پر دو گرانڈیل کُتے نمودار ہوئے۔ پہلی نظر میں تو وہ کُتوں کے بجائے درمیانی صحت کے گدھے معلوم ہوئے۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا جب میں ہیلی کاپٹر میں دوربین سے اس جگہ کا جائزہ لے رہا تھا تو کم از کم کھلی جگہ میں مجھے کہیں کوئی کُتا دکھائی نہیں دیا تھا۔ شاید وہ مکان کے اندر رہے ہوں لیکن ان کا اس طرح اچانک نکل آنا عجیب سی بات تھی۔

دوسری عجیب بات یہ تھی کہ وہ بہت تیزی سے دوڑتے ہوئے یکدم ہی سامنے آئے تھے اور اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ انہوں نے بھونکنا تو درکنار' حلق سے غراہٹ تک کی آواز نہیں نکالی تھی۔ شاید وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ جو برستے ہیں وہ گرجتے نہیں۔

مکان کے گرد لکڑی کی بلیوں کا جنگلا موجود تھا۔ دونوں نے نہایت ہی اتفاق اور یک جہتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بیک وقت یکساں زقند بھر کر اسے پھلانگا اور سیدھے ہم پر آئے۔ اتفاق اور یک جہتی شاید اب کُتوں میں آگئی تھی۔ انسانوں میں تو ختم ہوتی جارہی تھی۔

میں نے نہایت خوفناک' نوکیلے اور بڑے بڑے دانتوں سے بھرا ہوا ایک بڑا سا جبڑا اپنی گردن کی طرف بڑھتے دیکھا اور یکدم اپنے آپ کو زمین پر گرادیا۔ کتے نے گویا ہوا ہی میں اپنے آپ کو سکیڑ اور سمیٹ لیا تھا۔ وہ میرے سینے پر گرا اور ایک لمحے کے لیے تو میری پسلیاں ہل گئیں۔ یوں لگا جیسے کوئی چھوٹی موٹی چٹان میرے سینے پر آن گری تھی۔ وہ بہت ہی جسیم بلڈ ہاؤنڈ تھا۔

اس نے میری گردن جبڑے میں دبوچنے کے لیے سیدھی چھلانگ لگائی تھی۔ مجھے نفیس صاحب کا کچھ ہوش نہ رہا۔ میں بروقت ماؤزر نہ نکال سکا' تاہم میں دونوں بازوؤں پر کتے کو بہت دور تک اُچھالنے میں کامیاب ہوگیا۔ کتا فوراً پلٹا لیکن میں گویا تڑپ کر وہاں سے ہٹ چکا تھا۔

اس دوران فائر کی آواز گونجی تھی۔ غالباً نفیس صاحب اپنا پستول استعمال کرنے میں کامیاب ہوگئے تھے۔ فوراً ہی دوسرا بھی فائر ہوا لیکن میں ان کی طرف نہیں دیکھ سکا۔ میں اپنا ماؤزر نکالنے کی فکر میں تھا جو میرے بے ہودہ سوٹ میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ اس لمحے میں یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ آخر محض سرنگ میں جانے کے لیے نفیس صاحب نے وہ واہیات سوٹ مجھے کیوں پہنایا تھا؟

کُتے نے دوبارہ مجھ پر چھلانگ لگائی۔ اس وقت میں نے پہلی بار اس کے حلق سے خفیف سی غراہٹ سنی اور یہ غراہٹ رگوں میں لہو سرد کردینے کے لیے کافی تھی۔ میں نے پوری قوت سے اسے لات رسید کی۔ وہ ہوا میں اچھلا اور دور جاگرا لیکن ساتھ ہی میرا سوٹ اُدھڑتا چلا گیا۔

اس کے خوفناک پنجوں سے سوٹ کا اُدھڑنا میرے حق میں اچھا ثابت ہوا کیونکہ ماؤزر میرے ہاتھ میں آگیا اور جونہی کتا دوبارہ مجھ پر جھپٹا' میں نے اس پر اندھا دھند کئی گولیاں چلا دیں۔ وہ میرے اوپر سے ہوتا ہوا کچھ دور جاکر گرا اور دو تین بار پھڑک کر وہیں ساکت ہوگیا۔

ایک طویل سانس لے کر میں نے نفیس صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ گن ہاتھ میں لیے مستعد کھڑے تھے۔ وہ مجھ سے پہلے اپنے کُتے سے "فارغ" ہوگئے تھے لیکن میرے حصے میں آنے والے کُتے پر غالباً انہوں نے اس لیے گولی نہیں چلائی تھی کہ اس کوشش میں مجھے بھی گولی لگنے کا خطرہ تھا۔

میں نے دیکھا' انہوں نے جس کُتے کو دو گولیاں ماری تھیں وہ ابھی زندہ تھا۔ کبھی آنکھیں کھول رہا تھا' کبھی بند کررہا تھا۔ ان آنکھوں میں خون کی پیاس تھی۔ وہ اُٹھنے سے قاصر تھا لیکن پاؤں ہلا رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اچھل کر بیک وقت ہم دونوں کی گردن جبڑے میں دبوچ لیتا۔

میں نے نفیس صاحب کو مخاطب کیا۔ "اتنی کفایت شعاری کی کیا ضرورت ہے؟ ایک گولی اور مار کر اسے ٹھنڈا کیجیے۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ خود ہی ٹھنڈا ہو جائے گا۔" نفیس صاحب کندھے اچکا کر بے پروائی سے بولے۔

اچانک کسی کے رونے پیٹنے کی آواز بالکل اس طرح ابھری جیسے کسی ڈرامائی یا خوفناک منظر پر سینما ہال والوں نے اچانک فاضل اسپیکرز کا بٹن دبا دیا ہو۔ ہم دونوں نے بیک وقت گھوم کر دیکھا۔ گنیں دونوں کے ہاتھوں میں تھیں اور ہم فائر کرنے کے لیے بالکل تیار تھے لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

جدھر سے کتے آئے تھے اسی طرف سے وہی گرانڈیل اور تندرست و توانا بوڑھا روتا پیٹتا دوڑا آرہا تھا۔ حالانکہ وہ مکان کے سامنے کی طرف سے آرہا تھا لیکن اسے گویا علم ہو چکا تھا کہ اس کے کتے مر چکے تھے۔ وہ گھٹنوں کے بل دونوں کتوں کے درمیان تقریباً گر پڑا اور بین کرتے ہوئے کبھی ایک اور کبھی دوسرے کتے کو ہلا جلا کر دیکھنے لگا۔

دوسرا کتا جسے نفیس صاحب نے دو گولیاں ماری تھیں، گویا مالک کی آمد ہی کا منتظر تھا۔ اس نے کسی فلمی کردار کی طرح درد بھری نظروں سے مالک کی طرف دیکھا، باقاعدہ فلمی انداز میں ہی آخری ہچکی لی اور دم توڑ دیا۔ فلم میں مرنے والے کسی مظلوم کردار کی طرح گویا اس کی آنکھوں میں فریاد بھی تھی۔ "مالک! تم میرا انتقام لینا.....!"

بوڑھا دونوں سے باری باری لپٹ کر اور بھی زیادہ زور و شور سے بین کرنے لگا۔ میں ہی نہیں، نفیس صاحب بھی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ پھر بوڑھا اچانک ہی مڑا اور کھڑے ہو کر سر پر دوہتڑ مارتے ہوئے بولا۔ "اوئے ظالمو.....! ان معصوم بے زبانوں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا جو تم نے انہیں گولی مار دی؟ یہ تو مجھے اولاد سے زیادہ عزیز تھے۔ ان کی آنکھیں بھی نہیں کھلی تھیں جب میں نے انہیں پالنا شروع کیا تھا۔ خالص دودھ مکھن پلا پلا کر پالا تھا....."

مجھے یقین نہیں تھا کہ ان درندوں کو صرف دودھ مکھن پلا کر ہی پالا گیا تھا۔ ان میں تو جنگلی درندوں سے بھی زیادہ خونخواری تھی۔ لگتا یہی تھا کہ وہ ہر طرح کے گوشت اور خون کے ذائقے سے اچھی طرح واقف تھے جن میں شاید انسان کا خون اور گوشت بھی شامل تھا۔

نفیس صاحب بوڑھے کو گھورتے ہوئے بولے۔ "آنکھیں تو مجھے لگتا ہے ابھی تمہاری بھی نہیں کھلی ہیں..... وضع قطع سے تم اچھے خاصے پابند شریعت نظر آتے ہو..... اچھی بھلی داڑھی بھی ہے۔ سر پر ٹوپی بھی ہے۔ عمر بھی سمجھداری اور بزرگی کی ہے مگر کتوں سے اس طرح لپٹ لپٹ کر روتے ہو۔ انہیں اولاد سے زیادہ عزیز قرار دیتے ہو۔ تمہیں کچھ تو حیا آنی چاہیے۔ کتا ایک پلید جانور ہے۔"

بوڑھا باقاعدہ رو رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور کپڑوں پر کتوں کا کچھ خون بھی لگ چکا تھا۔ وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں..... مگر خونخوار انداز میں بولا۔ "اوئے، مجھے شریعت مت پڑھاؤ۔ مجھے معلوم ہے یہ پلید جانور ہے لیکن تم انسانوں سے اچھا ہے۔ وفادار تو ہے۔ انسانوں سے تنگ آکر تو میں نے اس ویرانے میں ڈیرا لگایا ہے لیکن تم لوگ یہاں بھی مجھے تنگ کرنے آجاتے ہو۔"

اس نے ایک بار پھر کتوں کی طرف دیکھ کر سسکی سی لی۔ "یہاں ہمیں اپنی حفاظت کا بندوبست تو کرنا پڑتا ہے۔ ورنہ تم جیسے لوگ تو ہمیں مار کر ہمارے مال مویشی کھول کر لے جائیں۔ یہ دونوں اپنی جان پر کھیل کر یہاں کی ہر چیز کی حفاظت کرتے تھے۔" اس نے ایک بار پھر وہی مضحکہ خیزیات دہرائی۔ "ان معصوم بے زبانوں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا!"

"بگاڑا تو واقعی کچھ نہیں تھا۔" نفیس صاحب ملائم لیکن زہریلے سے لہجے میں بولے۔ "بس ذرا نخرا چبانے لگے تھے۔ ہم سے بڑی گستاخی ہوئی کہ ہم نے انہیں اس کا موقع نہیں دیا۔ ہمیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ہم معذرت خواہ ہیں۔ اگر آپ کے پاس کچھ اور ایسے کتے موجود ہیں تو انہیں باہر بلایئے تاکہ ہم اپنی گردنوں کا نذرانہ ان کی خدمت میں پیش کریں۔"

"ایسے کتے روز روز نہیں، صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔" وہ ہاتھ نچاتے ہوئے چلایا۔

نفیس صاحب نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پر روتی ہے.....!"

بوڑھے کے دل کا غبار شاید کافی حد تک نکل گیا تھا۔ وہ آستین سے چہرہ پونچھ کر ذرا کم غضبناک لہجے میں بولا۔ "آخر تم لوگ چوروں کی طرح یہاں کیوں آرہے تھے؟ اگر تم سامنے سے آتے اور دور ہی سے آواز دے کر آتے تو یہ کتے تمہیں کچھ نہ کہتے۔" اس نے گویا اپنے غم پر قابو پانے کی کوشش شروع کر دی تھی۔

"ہم معافی چاہتے ہیں۔ ہمیں یہاں آمد کے آداب کا پتا نہیں تھا۔" میں نے خلوص سے کہا۔ اسے کوئی سنکی یا خبطی بوڑھا سمجھا جا سکتا تھا جو اپنا کوئی الگ ہی فلسفۂ حیات رکھتا تھا لیکن نہ جانے کیوں میرا اسے اس خانے میں فٹ کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔

"تم یہاں آئے کیوں ہو؟" بوڑھے نے خفگی زدہ لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔ "مجھے تم مشکوک لوگ لگتے ہو۔ تمہارے پاس پستولیں بھی ہیں۔ کیا چاہتے ہو تم لوگ؟"

"پستول وغیرہ تو ہمیں اپنی جان بچانے کے لیے نکالنے پڑے بڑے میاں!" نفیس صاحب نرم لہجے میں بولے۔ "ورنہ اس وقت تمہارے کتوں کی جگہ ہم پڑے ہوتے....."

"کاش ایسا ہی ہوا ہوتا!" بوڑھا ان کی بات کاٹ کر ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔ ابھی شاید اس کے دل میں ہمارے لیے نرم گوشہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

"اب ہم اتنے برے لوگ بھی نہیں ہیں۔" نفیس صاحب نرمی سے بولے۔ "سڑک پر ہماری گاڑی خراب ہو گئی تھی۔ ہم تو مدد کی تلاش میں اس طرف آرہے تھے۔"

بوڑھے کی نظروں میں نفرت اور بڑھ گئی۔ "سڑک یہاں سے ڈھائی تین میل دور ہے۔ اگر تم دونوں سڑک پر ہی ڈھائی تین میل چل لیتے تو تمہیں دس جگہ مدد میسر آجاتی... بلکہ چلنے کی بھی کیا ضرورت تھی۔ وہیں کھڑے رہتے تب بھی تمہیں ہر طرح کی مدد مل جاتی۔ تمہیں کیا الہام ہوا تھا کہ تمہیں اسی سمت میں چلنا چاہیے..... یہاں تمہیں ایک مکان مل جائے گا؟"

ہم دونوں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ کچھ اور جارحانہ لہجے میں بولا۔ "تم لوگ جھوٹے بھی ہو..... اور جھوٹا ہونا انسان کے برا ہونے کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے کہ تم لوگ اس ہیلی کاپٹر میں آئے ہو جو تھوڑی دیر پہلے اوپر چکر لگا رہا تھا۔"

میں اور نفیس صاحب ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر گہری سانس لے کر رہ گئے۔ میں نے ملائمت سے کہا۔ "چلو..... اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہمارا ہیلی کاپٹر بھی تو خراب ہو سکتا ہے۔"

بوڑھا برہمی سے بولا۔ "مجھے تو لگتا ہے نہ تمہاری گاڑی خراب ہے اور نہ ہی ہیلی کاپٹر۔ صرف تمہاری نیت خراب ہے۔ تم کسی چکر میں یہاں آئے ہو۔ صاف صاف بتا دو تم کیا چاہتے ہو؟"

وہ ہم سے ذرا بھی خوفزدہ نظر نہیں آرہا تھا لیکن مجھے اس کی یہ بے خوفی کچھ مصنوعی سی لگ رہی تھی۔ وہ ایک دیانتدار انسان کی سی بے خوفی کا اظہار کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو سوچتا ہے کہ اس نے کوئی غلط کام نہیں کیا تو اسے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں زیادہ تر شریف آدمی اس طرح نہیں سوچ پاتے۔ کچھ نہ کرنے والا زیادہ ڈرتا ہے۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ چلو... اندر بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں۔"

اسے میرا خلوص ذرا بھی نہیں بھایا۔ اس نے میرا ہاتھ جھٹک دیا اور رکھائی سے بولا۔ "مجھے کیا پڑی ہے تم لوگوں کو اندر لے جانے کی..... جو بات کرنی ہے یہیں کرو۔"

اس نے جس طرح میرا ہاتھ جھٹکا اس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ ایک طاقتور بوڑھا تھا۔ اس عمر کے کسی شخص میں اتنی طاقت و توانائی میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ صحت مندی پہلے ہی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ ایک لمحے کے لیے تو مجھے شبہ ہوا کہ کہیں اس کی سفید داڑھی مصنوعی تو نہیں تھی؟ شاید وہ کوئی جوان آدمی ہو۔ ہم خواہ مخواہ ہی اسے بوڑھا سمجھے جا رہے ہوں لیکن اس کے کندھے پر ہاتھ رکھنے کے بہانے میں نے نہایت قریب سے اس کی داڑھی کا بھی جائزہ لے لیا تھا۔ داڑھی اصلی ہی تھی۔

میں نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ "بزرگوار! آپ تو بہت ہی بداخلاق انسان ہیں۔ اس عمر میں انسان کو اتنا بداخلاق اور بددماغ نہیں ہونا چاہیے۔"

"تم نے موتی اور مکھن کو مارا ہے۔ میرا بس چلے تو میں لاٹھی مار کر تم دونوں کا بھیجا باہر نکال دوں۔ یہ تو میری مجبوری ہے کہ میں لاٹھی سے تمہارے سر توڑنے کے بجائے یہاں کھڑا تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ غریب آدمی ہوں نا..... غریب آدمی کے بدن میں جتنی بھی طاقت ہو..... وہ پھر بھی کمزور ہی ہوتا ہے..... اور پھر تمہارے ہاتھوں میں تو ہتھیار بھی ہیں۔" وہ کسی طرح ٹھنڈا ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

"اب غصہ تھوک بھی دو بڑے میاں!" نفیس صاحب بولے۔ "ہم تمہیں موتی اور مکھن کے بدلے دو بہت اعلیٰ نسل کے کتے دے دیں گے۔"

"تمہارا خیال ہے تمہارے دیے ہوئے کتے موتی اور مکھن کی جگہ لے لیں گے۔ جنہیں میں نے اولاد کی طرح پالا تھا؟" اس کے لہجے میں خونخواری کم نہیں ہوئی۔

نفیس صاحب غالباً اچانک ہی اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ بوڑھے کے ساتھ مغزماری فضول تھی اور شرافت و شائستگی کے مظاہرے سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا تھا۔ ان کے تاثرات ایک دم ہی بدل گئے۔ وہ ایک بالکل مختلف انسان نظر آنے لگے۔ پستول کی نال انہوں نے بوڑھے کی پسلیوں پر رکھ دی اور سانپ کی طرح پھنکارے۔ "بکواس بند کرو اور خاموشی سے اندر چلو۔"

بوڑھے کے چہرے پر اور آنکھوں میں تو نفرت کچھ گہری ہو گئی لیکن اس کی زبان بند ہو گئی۔ وہ مڑا اور مکان کے سامنے والے حصے کی طرف چل دیا۔ اس دوران نفیس صاحب نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ میرا لباس سینے پر سے پھٹ گیا تھا اور سینے پر خراشیں آگئی تھیں جن سے خون رس رہا تھا۔ نفیس صاحب قدرے تشویش سے بولے۔ "تمہیں کتے نے کہیں کاٹا تو نہیں؟ کہیں چودہ انجکشن لگوانے پڑیں۔"

"میرا خیال ہے..... نہیں کاٹا۔" میں نے اپنا سرسری سا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "کاٹ بھی لیتا تو مجھے زیادہ فکر نہ ہوتی۔ انسان کے کاٹے سے زیادہ ڈرنا چاہیے۔ مجھے زندگی میں کئی ایسے انسانوں سے واسطہ پڑا ہے کہ اگر وہ کسی کتے کو کاٹ لیتے تو کتے کو چالیس انجکشن لگوانے پڑتے۔"

بوڑھا اس موقعے پر ایک بار پھر بولے بغیر نہ رہ سکا۔ گردن ذرا سی گھماتے ہوئے بولا۔ "مجھے تو تم لوگ بھی انہی میں سے ایک لگتے ہو۔"

نفیس صاحب نے پستول کی نال اس کی پسلیوں میں بری طرح چبھوئی اور اسے دھکیلتے ہوئے بولے۔ "اگر اب تم نے زبان چلائی

تو میں یہ پستول تم پر خالی کردوں گا۔" ان کے لہجے میں خوفناک غراہٹ شامل تھی۔

ہم مکان کے کونے پر پہنچ چکے تھے۔ نفیس صاحب نے پہلے بوڑھے کو ذرا آگے دھکیلا پھر وہ اس کونے سے مڑے۔ میں بھی ماؤزر لیے کسی حملہ آور کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا لیکن ہم مکان کے سامنے کی طرف پہنچ گئے اور کسی نے ہم پر حملہ نہیں کیا۔ کسی طرف سے کوئی گولی نہیں آئی۔ صرف ان گایوں نے متجسس سی نظروں سے ہماری طرف دیکھا جو کافی دور درختوں کے نیچے بندھی ہوئی تھیں۔ منظر وہی تھا جو ہم پہلی کاپٹر میں دوربین کے ذریعے دیکھ چکے تھے۔

"تمہارا بیٹا کہاں ہے؟" نفیس صاحب نے پوچھا۔

"تو تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ میرا ایک بیٹا بھی ہے؟" بوڑھا زہریلے لہجے میں بولا۔

"میں نے جو سوال کیا ہے صرف اس کا جواب دو.... اور آئندہ بھی جو پوچھوں صرف اس کا جواب دینا۔" نفیس صاحب کا لہجہ خوفناک تھا۔ بوڑھے کو یقیناً یہ لہجہ خوفزدہ کر رہا تھا لیکن وہ بظاہر بے خوف ہی نظر آنے پر اُڑا ہوا تھا۔

"وہ ڈھوک کمالے گیا ہوا ہے۔" بوڑھا منہ بنا کر بولا۔ ڈھوک کمالے غالباً اسلام آباد یا راولپنڈی کی کسی نواحی بستی کا نام تھا۔

مکان تقریباً کچا اور اوپر سے چھپر نما ہی تھا لیکن ہمیں اب اندازہ ہوا کہ وہ کچھ ایسا ناپائیدار بھی نہیں تھا۔ اس کی دیواریں تقریباً تین چار فٹ کی اونچائی تک بہت موٹی تھیں اور گو کہ مٹی کی تھیں لیکن ایسی دیواریں بہت مضبوط ہوتی ہیں اور بعض معاملات میں تو پکی دیواروں سے زیادہ فائدہ مند ثابت ہوتی ہیں۔ مکان میں کافی لمبا چوڑا چوبی گیٹ بھی لگا ہوا تھا۔ جو دیکھنے میں ہی کافی مضبوط اور بھاری بھرکم لگ رہا تھا۔

ہم دونوں کسی حد تک بوڑھے کی آڑ میں تھے۔ میں چاروں طرف نظر رکھے ہوئے تھا۔ دور دور تک کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ مکان کے اندر بھی کوئی موجود تھا یا نہیں.... اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ گیٹ تھوڑا سا کھلا ہوا تھا۔ بوڑھا شاید مکان کے اندر سے ہی نکل کر ہماری طرف آیا تھا۔

نفیس صاحب نے پہلے بوڑھے ہی کو اندر دھکیلا اور میں نے یہ خیال رکھا کہ بوڑھا اندر گھستے ہی گیٹ بند کرنے کی کوشش نہ کرے۔ ہر طرف کا خیال رکھتے ہوئے ہم اندر داخل ہوئے۔ طائرانہ سی ایک نظر ڈالنے سے یہی اندازہ ہوا کہ اندر کوئی نہیں تھا۔

مکان کیا تھا بس ایک طویل و عریض ہال تھا جس میں دیہاتی رہن سہن کے اعتبار سے ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ حتیٰ کہ مویشیوں کا چارا کاٹنے کی مشین بھی اندر ہی رکھی ہوئی تھی اور ہال کی پچھلی دیوار کے ساتھ زمین کے ایک بہت بڑے حصے پر خشک گھاس بڑے قرینے سے تہ بہ تہ رکھی ہوئی تھی۔

اس کے علاوہ کہیں چارپائیاں تھیں۔ کہیں کنستر اور ڈرم تھے۔ کہیں چولہا اور کھانے پکانے کا سامان تھا۔ غرضیکہ ہر طرف سامان ہی سامان تھا لیکن گیٹ سے لے کر پچھلی دیوار کے سامنے بچی ہوئی اور چارے میں استعمال ہونے والی خشک گھاس تک پہنچنے کے لیے درمیانی راستہ بالکل خالی تھا اور یہ راستہ کافی چوڑا تھا۔

وہاں چارپائیاں اور کئی دوسری ایسی چیزیں موجود تھیں جن کے پیچھے کسی کے چھپے ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔ اس لیے میں اور نفیس صاحب دونوں ہی چند لمحے ساکت رہے اور کسی بھی طرف سے کسی حرکت کے منتظر رہے۔ اس دوران بوڑھا بھی ساکت رہا۔ وہ نہایت اعصاب شکن قسم کا سکوت تھا۔ بوڑھا بظاہر اب بھی برہمی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں خوف اور انتظار کی پرچھائیاں بھی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس خوف اور انتظار کی جڑیں کہاں تھیں؟

بالآخر سکوت بوڑھے ہی نے توڑا۔ وہ کھردرے لیکن پہلے سے کم جارحانہ لہجے میں بولا۔ "آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟ کس چیز کی تلاش ہے تمہیں؟"

"یہ تو ہمیں خود بھی معلوم نہیں۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔ اس وقت یقیناً بوڑھے کا بس نہیں چلا ورنہ وہ وہاں سے کم از کم کوئی ڈنڈا اٹھا کر ضرور میرے سر پر توڑ ڈالتا۔

غیر محسوس طور پر دانت پیسنے کے بعد اس نے ذرا تحمل اور رسان سے پوچھا۔ "تم لوگ کہیں اسمگلر تو نہیں ہو؟"

میں نے اس کے سوال کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "کیا اسمگلر بھی یہاں آتے رہے ہیں؟"

"ایک مرتبہ دو آدمی آئے تھے۔ ان کے آنے کا انداز بالکل تمہارے جیسا تھا اور وہ کچھ اسی انداز میں باتیں کر رہے تھے۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا چاہتے تھے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اس جگہ کو کسی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ مجھے بہت بڑی رقم ماہانہ دینے کی پیشکش کر رہے تھے۔" اس نے بتایا۔

"تم نے کیا جواب دیا؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"اگر مجھے ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنے کا لالچ ہو تو میں اس ویرانے میں نہ بیٹھا ہوتا۔ انسانوں کے درمیان رہ کر بھی ناجائز دھندے بڑی آسانی سے کیے جا سکتے ہیں..... بلکہ گنجان آباد علاقوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں تو ہر قسم کا ناجائز کام کرنا زیادہ آسان اور محفوظ ہے۔ بہرحال.... ان لوگوں نے آسانی سے میری جان نہیں چھوڑی تھی اور لگتا یہی ہے کہ تم لوگ بھی آسانی سے میری جان نہیں چھوڑو گے۔"

"بے شک" میں نے اس کی تائید کی۔

میں بظاہر اس کی طرف دیکھتے ہوئے اس سے سوالات کرتا رہا لیکن میں نے گرد و پیش کا ذرا اور تفصیل سے جائزہ لینے کی بھی کوشش کی تھی اور غالباً نفیس صاحب بھی اسی کوشش میں مصروف تھے۔ یہ ایک مشکل کام تھا کیونکہ اس بوڑھے کی طرف سے بھی خبردار رہنا نہایت ضروری تھا۔ اس کے تیور اور اس کا مضبوط سراپا بتاتا تھا کہ ذرا سا موقع پاتے ہی وہ حملہ کرنے سے نہیں چوکے گا۔

میں نے اپنے غیر محسوس جائزے کے دوران دیکھا کہ کُتر کاٹنے کی مشین بالکل نئی تھی۔ وہ ہاتھ سے چلانے والی ویسی ہی مشین تھی جیسی دیہات میں اکثر نظر آتی ہیں جن میں ہینڈل والا بڑا سا آہنی پہیا اور بڑا سا بلیڈ لگا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مشین سے ایک بار بھی کُتر نہیں کاٹا گیا تھا۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نفیس صاحب کو بوڑھے پر کڑی نظر رکھنے کا اشارہ کیا اور خود مشین کے پاس چلا گیا، تاہم میں نے بھی اس دوران بوڑھے پر نظر رکھی۔ مشین کے نیچے دور تک چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں جو خشک چارے کے انباروں تک چلی گئی تھیں۔

میں نے مشین پر ہاتھ پھیر کر بوڑھے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "بالکل نئی مشین ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ بوڑھے کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا تھا۔ وہ غیر مرتعش لہجے میں بولا۔ "ہاں... میرا بیٹا کل ہی خرید کر لایا ہے۔ پرانی بہت خراب ہو گئی تھی۔ ہم نے اسے کباڑی کے ہاتھ بیچ دیا۔"

میں نے اپنے مشین کے نیچے بچھی ہوئی چٹائیوں کو دیکھا۔ ننگی زمین سے وہ کچھ اونچی نظر آرہی تھیں جیسے ان کے نیچے زمین کی سطح اونچی ہو۔ میں نے مشین کو ایک ہاتھ سے ہلانے کی کوشش کی۔ اس قسم کی مشینیں خاصی بھاری ہوتی ہیں۔ ساری کی ساری لوہے سے بنی ہوتی ہیں لیکن اتنی بھی بھاری نہیں ہوتیں کہ مجھ جیسا آدمی انہیں ہلا نہ سکے۔ میں نے محسوس کیا جیسے اس مشین کے پائے چٹائی پر ٹکے نظر آرہے تھے لیکن درحقیقت چٹائی کے نیچے سے کوئی چیز ان میں پیوست تھی۔

بوڑھا تیزی سے بولا۔ "تم کیوں اسے ہلانے پر تُلے ہوئے ہو؟ میں نے اسے نیچے تختے میں فٹ کر رکھا ہے۔"

میرے رگ و پے میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ میں نے دیکھا، نفیس صاحب بھی تناؤ کا شکار نظر آرہے تھے۔ ان کی چھٹی حس نے شاید انہیں کوئی احساس دلایا تھا لیکن شاید بات کا سر پیر ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بات کا سر پیر مجھے بھی نہیں معلوم تھا مگر ایک نامعلوم حس کوئی سرگوشی کر رہی تھی۔ میں اس سرگوشی کا صحیح مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا مگر گویا اندھیرے میں اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

میں نے ہینڈل پکڑ کر مشین کا پہیا گھمانے کی کوشش کی لیکن اس میں چھوٹی سی ایک سلاخ اَڑی ہوئی تھی۔ یہ گویا مشین کو لاک کرنے کا ایک دیسی طریقہ تھا تاکہ بے خبری میں کسی کا ہاتھ وغیرہ نہ کٹ جائے۔ میں نے وہ سلاخ نکال دی اور ایک بازو سے پہیے کو گھمایا۔

اس مشین کو چلانے میں کافی زور لگتا ہے لیکن اس وقت مشین خالی تھی اور میں جسمانی طور پر عام آدمی بھی نہیں تھا، اس کے باوجود مجھے کافی طاقت صرف کرنا پڑی لیکن اس کا نتیجہ حیرت انگیز تھا۔ نفیس صاحب تو اچھل کر ایک طرف کو ہو گئے حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی، تاہم اچھی بات یہ تھی کہ انہوں نے بوڑھے کی پسلیوں سے پستول نہیں ہٹایا اور اس کی طرف سے بے خبر بھی نہیں ہوئے۔

مشین کا پہیا گھومنے کے ساتھ ساتھ کافی دور عقبی دیوار کے ساتھ تہ در تہ قرینے سے رکھے ہوئے خشک چارے کا لمبا چوڑا انبار یوں ایک طرف کو کھسکنے لگا تھا جیسے وہ کسی تختے پر رکھا ہوا تھا اور تختے کو کسی نے ایک طرف کھینچنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے نیچے ایک شگاف نمودار ہونا شروع ہوا۔

میں پہیے کو گھماتا چلا گیا۔ خشک چارے کا مستطیل انبار دیوار کے ساتھ ساتھ کھسکتا ہوا دوسرے کونے میں جا ٹکا۔ تب کُتر کی مشین کا پہیا گھومتے گھومتے رک گیا۔ میں نے زیادہ طاقت صرف کی مگر وہ مزید نہ گھوما۔ اس وقت تک عقبی دیوار کے قریب زمین میں بہت بڑا مستطیل شگاف نمودار ہو چکا تھا۔ وہ ایک پختہ ڈھلوان راستہ تھا جو نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔ اس کا دہانہ اتنا بڑا تھا کہ اگر گیٹ سے کوئی لمبی چوڑی گاڑی بھی مکان میں داخل ہوتی تو سیدھی اس دہانے میں داخل ہو کر ڈھلوان راستے پر جا سکتی تھی۔

نفیس صاحب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ بڑی مشکل میں پھنس گئے تھے۔ انہیں بوڑھے پر بھی نظر رکھنا تھی اور وہ نمودار ہونے والے اس راستے کو بھی صحیح طور دیکھنا چاہتے تھے۔ بوڑھے پر میں بھی نظر رکھے ہوئے تھا لیکن میں نے محسوس کر لیا تھا کہ یکدم ہی اس کی اکڑفوں رخصت ہو گئی تھی جیسے کسی غبارے سے ہوا نکل گئی ہو۔ زمین میں جب وہ شگاف نمودار ہوا اس وقت اس کے حلق سے عجیب سی آواز بھی نکلی تھی لیکن شاید وہ عقلمند تھا۔ اس نے ابھی تک مجھ پر یا نفیس صاحب پر حملہ کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اب تو خیر اس میں شاید دم خم ہی نہیں رہا تھا۔

"اوہ مائی گاڈ.....!" آخر نفیس صاحب بول اُٹھے۔ "یہ کیا ہے؟"

میں کہنا چاہتا تھا کہ میرے خیال میں یہ وہیں جانے کا راستہ تھا

جہاں تک پہنچنے کے لیے نفیس صاحب نے واٹر سپلائی اسکیم کی آڑ میں سرنگ کھدوانے کا بندوبست کیا تھا۔ بلاشبہ انہوں نے بڑا تردد کیا تھا جبکہ راستہ یہاں نہ جانے کب سے موجود تھا۔ بہرحال ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ خصوصاً اس بوڑھے کے سامنے۔

"میرا خیال ہے یہ کہیں جانے کا راستہ ہے۔" میں نے صرف اتنا کہا۔

میں اس وقت بوڑھے کی طرف واپس آرہا تھا۔ اچانک مجھے سامنے کھڑکی میں کوئی چیز نمودار ہوتی دکھائی دی۔ یہ کھڑکی لکڑی کی پتلی بلیوں سے بنی ہوئی تھی اور اس وقت کھلی تھی۔ ہم نے اندر آتے وقت گیٹ تو بند کر دیا تھا لیکن کھڑکی کی طرف شاید اس لیے زیادہ توجہ نہیں دی تھی کہ اس سے کوئی اندر نہیں آسکتا تھا۔

"نفیس صاحب.....!" میں انہیں زمین پر گرنے کا اشارہ کرتے ہوئے چیخ کر صرف اتنا ہی کہہ سکا کیونکہ ان کی پیٹھ کھڑکی کی طرف تھی لیکن انہوں نے میری بات سمجھنے اور اس پر عمل کرنے میں بڑی پھرتی دکھائی۔ وہ بھی فوراً ہی زمین پر گر گئے اور تیزی سے ایک طرف کو لڑھک گئے۔

وہ طویل و عریض ہال نما کمرا سب مشین گن کی گرج سے گونج اُٹھا۔ نہ جانے گولیاں کس کس چیز میں پیوست ہوئیں اور کس کس چیز کے پرخچے اُڑے۔ مجھے صرف یہ معلوم تھا کہ میں بچ گیا تھا جبکہ میرے خیال میں بوڑھے کو گولیوں سے بچاتے ہوئے برسٹ مارا گیا تھا لیکن وہ بھی ہماری طرح زمین پر گرنے اور گولیوں کی بوچھار سے بچنے کی کوشش میں خود ہی گولیوں کی زد میں آگیا۔

کھڑکی پر اس وقت تک جو ہیولا نمودار ہوا تھا اس نے فوراً ہی وہاں سے ہٹنے کی کوشش کی تھی لیکن میں بروقت اس کا نشانہ لینے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے ماؤزر نے کلپ کی بچی کھچی گولیاں اُگل دیں۔ کھڑکی میں لگی ہوئی لکڑی کی پتلی پتلی بلیاں جو سلاخوں کا کام دے رہی تھیں۔ ان میں سے ایک کے تو درمیان سے پرخچے اُڑ گئے۔ اسی لمحے باہر دھب سے کسی کے گرنے کی آواز آئی اور اس چند سیکنڈ کی گھن گرج کے بعد یکدم ہی چاروں طرف موت کا سکوت پھیل گیا۔

باہر مویشی جو اس اچانک گھن گرج کے ساتھ خوفزدہ سے انداز میں ڈکرائے تھے' وہ بھی یک لخت ہی خاموش ہو گئے۔ کمرے میں بارود کی بو پھیل چکی تھی۔ ایک لمحے کے لیے گویا میری رگوں میں لہو سرد ہو گیا تھا پھر مجھے احساس ہوا کہ میرا چہرہ پسینے میں تر تھا۔

پھر میں نے نہایت آہستگی سے نفیس صاحب کی تلاش میں گردن گھمائی۔ وہ ایک بڑی سی چارپائی کے نیچے پہنچ چکے تھے اور بالکل ساکت تھے لیکن پستول ان کے ہاتھ میں بلند تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ خیریت سے تھے ورنہ مجھے اندیشہ تھا کہ اچانک شروع ہونے اور ایک دم ہی ختم ہونے والی گولیوں کی بوچھار میں کوئی اچٹتی ہوئی گولی انہیں نہ لگ گئی ہو۔ وہ ایک ٹک کھڑکی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید انہیں اندیشہ تھا کہ کھڑکی میں کوئی ا ہیولا نمودار نہ ہو جائے۔ یہ اندیشہ مجھے بھی تھا لیکن میں نے تجسّ سے مجبور ہو کر ایک لمحے کے لیے کھڑکی سے نظر ہٹالی تھی۔

پھر میں نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔ وہ ہال کے عین درمیا راستے پر چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اس کی کھوپڑی کا ایک حہ ایک آنکھ سمیت اُڑ گیا تھا اور دوسری آنکھ کھلی رہ گئی تھی۔ اور وہ آنکھ چھت کو گھور رہی تھی اور کھوپڑی کا جتنا حصہ غائب تھا ا سے بھل بھل خون بہہ کر کچی زمین میں جذب ہو رہا تھا۔ اس میں شاید بھیجے کی سفیدی بھی شامل تھی۔ ایک گولی شاید اس کندھے میں بھی لگی تھی کیونکہ کندھے پر اس کا کرتا خون آلو تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ اگر وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلتا تو شاید ا کوئی گولی نہ لگتی۔ پہلے میرا اور اس کے فوراً بعد نفیس صاحہ خاتمہ ہوتا لیکن کمرے کا منظر دیکھ کر ایک بار پھر میرا یہ یقین ہو گیا کہ مارنا اور بچانا بے شک اس دنیا والوں کا کام نہیں ہے۔

نفیس صاحب کی گردن بھی نہایت آہستگی سے مشینی اندا گھومی۔ ہماری نظر ملی اور ہم نظروں ہی نظروں میں اشارہ دوبارہ لڑھکنے لگے۔ ہمارے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ نفیس صہ کھڑکی کی طرف چلے گئے اور میں گیٹ کی طرف۔

انہوں نے دیوار کے ساتھ چپک کر کئی منٹ میں' چیو رفتار سے اپنا سر اور پستول والا ہاتھ کھڑکی تک لا کر باہر جھا غالباً مطمئن ہو کر دیوار کے ساتھ کھسکتے ہوئے میری طرف لگے۔ کھڑکی انہوں نے بند کر دی تھی۔ وہ قریب آچکے تو ہم نے مل کر اس طرح آہستگی سے لوہے کا بولٹ ہٹا کر چوبی گیٹ کھولا کہ چاہتے تو فوراً ہی اسے دوبارہ بند کر کے بولٹ چڑھا سکتے تھے۔

ادھر سے جھانکنے پر بھی کوئی ردِ عمل نظر نہ آیا اور نہ کوئی نظر آیا۔ ہم باہر نکل کر احتیاطاً مکان کی دونوں بغلی سم جھانکنا چاہتے تھے۔ میں نے اشارے سے نفیس صاحب کو میرے ماؤزر کا کلپ خالی ہو چکا تھا۔ انہوں نے اطمینان۔ گریبان میں ہاتھ ڈالا اور کسی خفیہ جیب سے ایک بھرا نکال کر میری طرف بڑھا دیا حالانکہ ہیلی کاپٹر میں جب ا ماؤزر نکال کر مجھے دیا تھا تو میں نے انہیں فاضل کلپ نکا دیکھا تھا لیکن وہ میرے بعد چند سیکنڈ کی تاخیر سے ہیلی کودے تھے۔ شاید اس دوران انہوں نے مزید ایک احتیاطاً ساتھ رکھ لی تھی۔

میں نے ماؤزر کا کلپ بدلا اور ہم دونوں باہر نکل پھونک کر قدم رکھتے ہوئے مکان کے دونوں کونوں کی طرف ایک طرف نفیس صاحب جا رہے تھے اور دوسری طرف

ہوا تھا۔ اپنی طرف کے کونے پر پہنچ کر میں نے جھانکا۔ اس طرف اس شخص کی لاش پڑی ہوئی تھی جس نے کھڑکی سے اپنی دانست میں فرشتۂ اجل کو ہماری طرف روانہ کیا تھا۔ اس کی سب مشین گن اس کے قریب ہی پڑی تھی۔

نفیس صاحب نے دوسری طرف جھانکنے کے بعد مڑ کر اشارے سے مجھے بتایا کہ اس طرف کوئی نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہم دونوں نے اسی طرح الگ الگ سمتوں میں آگے بڑھتے ہوئے مکان کے گرد چکر مکمل کر لیا۔ ہم دونوں اس لاش کے قریب یکجا ہوئے جو کھڑکی کے پاس پڑی تھی۔

ظاہری حلیئے سے وہ ایک دیہاتی نوجوان معلوم ہوتا تھا لیکن میرے خیال میں وہ دیہاتی ہرگز نہیں تھا۔ میرے خیال میں تو وہ بوڑھا بھی دیہاتی نہیں تھا جو اندر مرا پڑا تھا۔ یہ نوجوان بھی اس بوڑھے ہی کی طرح تنومند تھا اور اس کا بیٹا ہی معلوم ہوتا تھا۔ معلوم نہیں اس دوران وہ کہیں چھپا رہا تھا یا کہیں سے آیا تھا اور صورتِ حال کا اندازہ کرنے کے بعد اس نے گھات لگائی تھی۔

نفیس صاحب بولے۔ "یہ بہت ہی بُرا ہوا کہ دونوں باپ بیٹے ہی مارے گئے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ رہ جاتا تو شاید ہمیں کچھ معلومات حاصل ہو جاتیں۔"

"چلیں اب معلومات کی طرف سے تو صبر کر لیں۔ یہ شکر کریں کہ ہماری محنت رائگاں نہیں گئی۔ یہاں کچھ نہ کچھ دریافت ہوا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ ایک بار پھر بے یقینی کے سے عالم میں چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "حیرت ہے! بڑے ہی عجیب طریقے سے یہاں گویا اتنا لمبا چوڑا سیٹ لگایا گیا ہے اور صرف یہ دو آدمی اس سیٹ کی نگرانی کر رہے تھے!"

"مجھے تو اس سیٹ میں..... یا اس سیٹ اپ میں بڑی ذہانت کی جھلک دکھائی دے رہی ہے۔ وہ لوگ انسان کی نفسیات سے کھیلتے ہیں۔ کوئی ایسی چیز تشکیل دیتے ہیں جو اس ماحول میں اجنبی ہوتے ہوئے بھی اجنبی دکھائی نہ دے۔ لوگ ایک نظر اسے دیکھ کر بے پروائی سے گزرتے رہیں یا اس کی موجودگی کے جواز سے مطمئن ہو جائیں۔ جس طرح آپ کے رپورٹ مرتب کرنے والے لوگ ہو گئے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

"تمہارے خیال میں اندر اسی راستے کا دہانہ نمودار ہوا ہے جس کی تلاش میں ہم پریشان رہے تھے؟" نفیس صاحب نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ میری نامعلوم حس تو یہی کہہ رہی ہے کہ ریڈ ڈاٹ کے اس قلعے تک تمام ٹریفک یہیں سے جاتا ہو گا۔ شاید میں نے بھی بے ہوشی کے عالم میں ایک بار اسی روٹ سے سفر کیا ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"تو پھر ہم اتنی بے پروائی سے کیوں کھڑے ہیں۔ ہم اس راستے کو کھلا چھوڑ کر آئے ہیں۔ کہیں نیچے سے کوئی آ نہ جائے۔" نفیس صاحب تیزی سے دروازے کی طرف مڑتے ہوئے بولے۔

میں نے فوری طور پر اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور ایک بار پھر جھک کر نوجوان کی لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے.... اب یہاں کوئی نہیں.... کوئی نہیں آئے گا۔"

نفیس صاحب جاتے جاتے پلٹ کر بولے "کیوں؟"

"نہ جانے کیوں اب مجھے یہاں زمین کے نیچے.... زمین کے اوپر ہر طرف سکوت ہی سکوت محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "اگر کوئی ردِ عمل ظاہر ہونا ہوتا تو شاید اب تک ظاہر ہو چکا ہوتا۔ یہ سیٹ اپ اوپر سے جتنا دقیانوسی نظر آرہا ہے' نیچے سے ایسا نہیں ہو گا۔ اس راستے کا دروازہ کھلتے ہی نیچے خبر ہو جاتی ہو گی اور شاید کچھ حفاظتی انتظامات بھی موجود ہوں لیکن ابھی تک چونکہ کچھ نہیں ہوا۔ اس لیے مجھے لگتا ہے کہ ریڈ ڈاٹ یہ ٹھکانا خالی کر گئی ہے۔"

میری چلائی ہوئی گولیاں نوجوان کے سینے اور چہرے پر لگی تھیں۔ اس کے زخموں سے ابھی تک خون رستا محسوس ہو رہا تھا۔ نفیس صاحب بے تابی سے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔ "پھر بھی.... چل کر اس راستے کو دیکھیں تو سہی۔"

میں نے اثبات میں سرہلایا لیکن جانے سے پہلے مُردہ نوجوان کی تلاش لی۔ میری توقع کے مطابق اس کی جیبوں میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے اس کی شناخت میں مدد ملتی' البتہ اس کی ایک جیب میں بڑی مالیت کے بہت سے نئے پُرانے بے ترتیب نوٹ موجود تھے۔ خاصی بڑی رقم تھی۔ وہ میں نے نفیس صاحب کے حوالے کر دی۔

نفیس صاحب احتیاط سے اسے ایک جیب میں رکھتے ہوئے بولے۔ "اسے شہادت کے طور پر محفوظ کرنا پڑے گا۔"

نوجوان کی دھوتی کے نیچے پنڈلی کے ساتھ مجھے چمڑے کی نیام بندھی دکھائی دی۔ اس میں سے خنجر کا دستہ جھانک رہا تھا۔ میں نے فنگر پرنٹس وغیرہ کی باریکیوں میں پڑے بغیر خنجر نیام سے کھینچ لیا۔ اس طرح کبھی میں بھی اپنے ساتھ مخصوص ساخت کا خنجر رکھتا تھا لیکن آج کل وہ میرے پاس نہیں تھا۔

وہ دو ڈھائی بالشت لمبا ایک جھلمل جھلمل کرتا خنجر تھا لیکن خاص بات یہ تھی کہ اسے گو کہ کسی چیز پر رگڑ کر صاف کیا گیا تھا اور اسے نیام میں بھی رگڑ لگ چکی تھی' اس کے باوجود اس کے کناروں پر تازہ خون کی ایک پتلی سی لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے ذرا تشویش سے نفیس صاحب کی طرف دیکھا لیکن وہ کندھے اُچکا کر رہ گئے۔

میں نے خنجر واپس مُردہ نوجوان کی نیام میں رکھ دیا اور نفیس صاحب کے ساتھ دوبارہ مکان میں داخل ہوا۔ زمین میں نمودار ہونے والا وہ بڑا سا دہانہ گویا سکوت کے عالم میں ہمارا انتظار

کر رہا تھا۔ ہم گنیں سنبھالے محتاط انداز میں اس کے قریب پہنچے۔

سامنے کچھ ایسا ڈھلوان فرش نظر آرہا تھا جیسے تہ خانے میں کوئی گیرج ہو۔ کچھ دور تک روشنی تھی۔ اس کے بعد کیا تھا یا راستہ کیسا تھا' یہ بتانا مشکل تھا کیونکہ قدرتی روشنی زیادہ آگے تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

نفیس صاحب یہ راستہ دریافت ہونے کے بعد سے بڑے پُرجوش نظر آرہے تھے لیکن میں ڈھلوان فرش پر قدم رکھنے لگا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ کر روک لیا۔ "میرا خیال ہے فی الحال تم اس راستے کو بند کرو۔ ہم کچھ اور لوگوں کو لے کر ذرا تیاریوں کے ساتھ آتے ہیں۔" وہ بولے۔

"فی الحال تو میں صرف یہ دیکھ رہا ہوں کہ شاید یہاں روشنی کا کوئی انتظام ہو۔" میں نے کہا۔ "میں زیادہ آگے نہیں جارہا۔"

میں نے ذرا آگے بڑھ کر دونوں طرف کی دیواروں پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ ایک جگہ خود ہی میرا ہاتھ کسی چپٹے سوئچ سے ٹکرایا اور محض ہاتھ لگنے سے ہی ہمارے سامنے تاحد نظر روشنی پھیل گئی۔ نفیس صاحب حیرت سے آنکھیں پٹ پٹا کر رہ گئے۔

ہم ایک نہایت صاف ستھری اور نہ جانے کتنی طویل سرنگ کے دہانے پر کھڑے تھے اور یہ ویسی کچی' ناہموار قسم کی سرنگ نہیں تھی جیسی نفیس صاحب نے اپنی دانست میں بڑے وسائل صرف کرکے کھدوائی تھی۔ یہ تو کسی ترقی یافتہ ملک کا ٹیوب ٹرین کا راستہ معلوم ہو رہا تھا۔ چھت میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر چوکور لائٹس نظر آرہی تھیں جنہوں نے پوری سرنگ میں دودھیا روشنی پھیلادی تھی۔ ایک ہی بٹن سے وہ تمام لائٹس روشن ہوگئی تھیں لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل تھا کہ راستہ کتنا لمبا تھا۔

"اف.... میرے خدا...." نفیس صاحب سرسراتی سی آواز میں بولے۔ "میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اس ویرانے میں کوئی ایسا راستہ موجود ہوگا۔"

"اس میں سے تو بیک وقت دو کاریں آرام سے گزر سکتی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اس سے آپ اندازہ لگالیں کہ آپ کی ایجنسیاں حالات سے کس قدر باخبر رہتی ہیں۔"

وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر رہ گئے۔ کچھ بولے نہیں۔ میں نے سرنگ میں زیادہ سے زیادہ دور تک دیکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اصل جگہ یقیناً زیر زمین ہے۔ ویسے ہی کسی کا اس کی طرف دھیان جانا تقریباً ناممکن ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اسے کسی کی نظر میں آنے سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کا راستہ کتنی دور سے نکالا ہے۔ آپ کی کھدوائی ہوئی سرنگ دوسری سمت سے شاید اس جگہ تک پہنچ رہی ہے۔ یہ سرنگ دوسری سمت سے جارہی ہے۔"

"ہاں.... یہ تو مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔" نفیس صاحب بولے۔ "آؤ.... اب چلتے ہیں۔ اس راستے کو بند کردیتے ہیں۔ جلد دوبارہ واپس آئیں گے۔"

میں نے ان کے مشورے پر عمل کرنا بہتر سمجھا۔ گو کہ فوری طور پر آگے جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ میں نے سرنگ کے دہا سے باہر آتے وقت اسی سوئچ کو دوبارہ چھوا۔ پوری سرنگ میں تاریکی پھیل گئی۔ اس راستے کو بند کرنا بالکل آسان ثابت ہوا۔ ہٹانے کی مشین کا پہیا میں نے الٹا گھمایا۔ سرنگ کا دہانہ بند ہوگیا میں نے مشین کے نیچے بھی بچھی ہوئی چٹائیوں میں سے ا کو ذرا سا اٹھا کر دیکھا۔ اس کے نیچے پختہ فرش تھا جس کے غالباً کوئی میکنزم کام کررہا تھا۔ ہال کے وسط میں زمین محض دکھاو کے لیے کچی چھوڑی گئی تھی۔ میں نے چٹائی چھوڑ دی اور بوڑ کی جیبوں کی تلاشی لینے لگا۔ اس کی جیبوں میں بھی رقم کے سوا نہیں تھا لیکن یہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا کہ اس کی شلوار کے میں ایک بہترین قسم کا مشین پسٹل اڑسا ہوا تھا۔ عجیب بات تھی اس نے نہ تو ہمارے سامنے آنے سے پہلے گھات لگا کر ہم پر کرنے کی کوشش کی تھی اور نہ ہی بعد میں موقع پا کر گن نکالنے کوشش کی تھی۔ شاید اس بے چارے کی مصلحت یا حکمت کچھ اور تھی لیکن ہو کچھ اور گیا تھا۔ میں نے نفیس صاحب پوچھ کر مشین پسٹل اس کے نیفے ہی میں اڑس دیا۔ ہم دو انسا اور دو کتوں کو مردہ حالت میں وہیں چھوڑ کر واپس روانہ ہوگئے۔

جب ہم پیدل مرتے کھپتے وہاں پہنچے جہاں ہیلی کاپٹر چھوڑا تھا یہ دیکھ کر ہمارا ٹھنکا کہ پائلٹ اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھا۔ صرف اس کا ہیلمٹ سیٹ پر رکھا تھا۔ پہلے تو ہم یہی سمجھے کہ انتظار طویل لمحات میں عموماً انسان کو وہ جو ایک انسانی ضرورت پیش آجاتی ہے جس کے تحت وہ ادھر ادھر آڑ تلاش کرتا پھرتا ہے' شا پائلٹ بھی اسی ضرورت کے تحت کہیں درختوں کے جھنڈ میں جھاڑیوں کے پیچھے چلا گیا ہے۔

ہم چند منٹ ہیلی کاپٹر کے پاس ہی کھڑے انتظار کرتے ر لیکن جب اس کی واپسی کے کوئی آثار دکھائی نہ دیے تو نفیس صاحب نے دونوں ہاتھوں سے بھونپو سا بنا کر اسے آوازیں بھی د مگر کسی طرف سے کوئی جواب نہ آیا۔ آخر ہم اسے تلاش کر مختصر سے جنگل کی طرف روانہ ہوئے۔

ہمیں اس کی تلاش میں زیادہ بھٹکنا نہیں پڑا۔ وہ ایک تنا درخت کی آڑ میں موجود تھا مگر اس عالم میں... کہ اس کی گردن آدھی سے زیادہ کٹی ہوئی تھی۔ کسی نے اسے نہایت مشاقی' مہار اور صفائی سے بکروں کی طرح ذبح کردیا تھا۔ بکرے کی اگر چارو ٹانگیں بندھی ہوں تب بھی اس کے ذبح ہونے کے بعد' مزاحمت کچھ نشانیاں نظر آتی ہیں لیکن وہاں تو مزاحمت کی کوئی معمولی نشانی بھی نہیں تھی۔

حالت یہی بتارہی تھی کہ وہ اپنی انسانی ضرورت کے تحت درخت کی اوٹ میں آیا تھا۔ حالانکہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔

ہیلی کاپٹر کے قریب بھی اپنی اس معمولی سی حاجت سے فارغ ہو سکتا تھا۔ اس ویرانے میں بھلا کون اسے دیکھ رہا تھا‘ کون اس پر معترض ہو سکتا تھا یا کون اسے شرمندہ کر سکتا تھا مگر جس طرح کتے کی فطرت ہے کہ اس کام کے لیے وہ کوئی کھمبا یا درخت تلاش کرتا ہے اس طرح انسان..... خصوصاً شرفا اس مقصد کے لیے آڑ تلاش کرتے ہیں۔ اس لیے پائلٹ بھی اتنا فاصلہ طے کر کے آیا تھا۔ یہاں کسی نے گھات لگا کر اسے ذبح کر دیا تھا۔

نفیس صاحب کے چہرے کے عضلات کھنچ گئے اور وہ مٹھیاں بھینچ کر رہ گئے پھر انہوں نے میری طرف دیکھا اور گھٹی گھٹی سی آواز میں بولے۔ ”اس غریب نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟“

”اس وقت تک تو ہم نے بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا جب ہم پر سب مشین گن سے برسٹ مارا جا رہا تھا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”آپ نے اس نوجوان کے خنجر پر تازہ خون کا نشان دیکھا تھا؟“

وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ ”اس وقت شاید میری طرح تمہیں بھی گماں تک نہیں گزرا ہو گا کہ وہ اس پائلٹ کا خون ہو سکتا تھا۔“

”جی ہاں۔“ میں نے تسلیم کیا۔ چند لمحے ہم افسردہ سے انداز میں پائلٹ کی لاش کے قریب کھڑے رہے پھر نفیس صاحب بولے۔

”آؤ..... ہم واپس جا کر ان لاشوں کو اٹھوانے اور اس زیر زمین راستے کا جائزہ لینے کے انتظامات کرتے ہیں۔ پائلٹ کی لاش کو بھی ہم خود نہیں اٹھائیں گے۔ اسے بھی صحیح انتظامات کے ساتھ ہی اُٹھایا جائے تو بہتر ہو گا۔“

”ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے کہا اور ان کے پیچھے پیچھے جنگل سے باہر آ گیا۔

راستے میں‘ میں نے کہا۔ ”آپ موبائل فون پر رابطہ کر کے بھی تو مطلوبہ افراد کو یہاں بُلوا سکتے ہیں۔“

”شاید انہیں صحیح جگہ پر پہنچنے میں دشواری ہو اور وقت ضائع ہو۔ ہم خود ہی جا کر انہیں اپنی رہنمائی میں لاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے ہماری عدم موجودگی میں یہاں کچھ نہیں ہو گا۔“ نفیس صاحب بولے۔

میں نے اپنی تجویز پر زور نہیں دیا اور ان کے ساتھ چلتا رہا۔ واپسی میں ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کے فرائض نفیس صاحب نے ہی انجام دیے۔ اب انہیں کچھ چُپ سی لگ گئی تھی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ آج کی دریافت کے بعد وہ اندر ہی اندر ہیجان زدہ تھے۔

جلد ہی ہم واٹر سپلائی سائٹ پر جا اُترے اور اس آفس میں چلے گئے جہاں صبح ہم نے اپنے حُلیے تبدیل کیے تھے۔ وہاں اب میز پر ایک شخص موجود تھا لیکن نفیس صاحب کو دیکھ کر وہ سلیوٹ کر کے کرسی چھوڑ کر اُٹھ گیا۔ وہ میز کے مقابل دوسری کرسی پر آ بیٹھا اور اصل کرسی پر بیٹھ کر نفیس صاحب نے میز پر رکھا ہوا فون سنبھال لیا۔ نفیس صاحب جب خانہ بدوشوں والے حُلیے میں نہیں تھے تو شاید یہ آفس انہی کے استعمال میں رہتا تھا اور وہ ٹیلیفو "ہاٹ لائن" قسم کی چیز تھی۔

انہوں نے فون پر صرف دو افراد سے بات کی اور انہیں دریافت ہونے والے راستے کے بارے میں مطلع کیا۔ اس میں انہوں نے میرا نام بھی لیا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ وہ کون تھے۔ اس کے بعد اپنے مطلب کے لوگ انہوں نے وہیں بیٹھے جمع کر لیے۔ ان میں دو تین انجینئر تھے۔ چند کمانڈو تھے۔ میرے ساتھی خانہ بدوشوں کی بستی میں موجود تھے انہیں بھی بُلا لیا گیا لاشیں اٹھوانے کے لیے بڑی ایمبولنس کا بھی انتظام کیا گیا تھا کے ساتھ اسٹاف بھی تھا۔

میرے ساتھیوں کو تو خاص طور پر اس لیے بھی ساتھ لیا کہ انہیں لاہور میں ریڈ ڈاٹ کے ایک زیر زمین قلعے پر حملہ حصہ لینے کا تجربہ حاصل تھا۔ نفیس صاحب تو راحیلہ کو بھی بُلا تُلے ہوئے تھے لیکن میں نے انہیں روک دیا اور سمجھا کوشش کی۔ ”میرے خیال میں تو ابھی اتنا ہجوم جمع کر ضرورت نہیں تھی۔ یہاں کے اور لاہور کے حالات میں فرق ابھی ہم صرف اس جگہ کا جائزہ لینے جا رہے ہیں۔ میرا خیال بعد میں بھی یہاں کوئی ایکشن نہیں ہو گا۔ ہم بغیر کسی مزاحمت اس قلعے میں داخل ہو جائیں گے۔ میرا دل کہتا ہے کہ وہ لوگ جگہ کو خالی کر گئے ہیں۔“

نفیس صاحب ٹھوڑی کھجاتے ہوئے ایک لمحے خاموشی میری طرف دیکھتے رہے پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ ”تمہار تمہیں بہت اہم باتیں بتاتا ہے۔“

”جی ہاں۔“ میں نے بلا تامل کہا۔ ”آپ کو اس میں کوئی ہے؟“

”نہیں مجھے اس پر رشک آتا ہے۔“ وہ ایک اور ٹھن سانس لے کر بولے۔ ”کاش میں بھی ایسے ہی دل کا مالک ہو تمہارا مطلب ہے کہ راحیلہ کو صرف اس وقت زحمت دی جا جب کسی ایکشن کا امکان ہو؟“

”زیادہ مناسب یہی ہے۔“ میں نے محتاط لہجے میں کہا۔

وہ ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بو "محسوس تو میں بھی یہی کچھ کر رہا ہوں جو تم کہہ رہے ہو لیکن ہی میں بے پناہ احتیاط پسند آدمی بھی ہوں۔ بے احتیاطی میں ہم بہت سے نقصانات اُٹھا چکے ہیں۔ اس لیے میں کوئی بھی ذ اُٹھاتے وقت کافی فاضل انتظامات کر لیتا ہوں۔“

”احتیاط ہی احتیاط میں آپ کا ڈراما کافی لمبا ہو جاتا ہے میں نے ذرا صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ”آپ نے ا بہت سے کھڑاگ پھیلائے جن کی میرے خیال میں کوئی خا ضرورت نہیں تھی۔ خصوصاً جبکہ ریڈ ڈاٹ پیش منظر سے غا

چکی تھی۔“

اس وقت کمرے میں صرف ہم دونوں ہی تھے۔ باقی لوگ انہ ہونے کی تیاریوں میں باہر مصروف تھے۔ اس لیے میں ذرا تکلفی سے بات کر رہا تھا۔ وہ بڑے تحمل سے میری تنقید اشت کرتے ہوئے بولے۔ ”ریڈ ڈاٹ اس لیے پیش منظر سے ب ہوئی ہے کہ اس پر کاری وار کرنے کے بعد ہم بھی پیش منظر غائب ہو چکے ہیں۔ انہیں یقیناً تشویش ہو گی کہ ہم کہاں ہیں‘ کیا رہے ہیں۔ اگر ہم سامنے رہتے تو ہمیں ان کے بارے میں کچھ معلوم کرنے میں زیادہ دشواری ہوتی۔ جانی نقصان زیادہ ہوتا۔ قدم قدم پر ہوشیار رہتے۔ میرے یہ اقدامات جنہیں تم ڈراما ی اور کھڑاگ کہہ رہے ہو‘ ان کا فائدہ یقیناً ہوا ہے لیکن تمہیں ی اس کا اندازہ نہیں۔ ہمارا اپنا ایک نظام خاموشی سے کام کر رہا ہے۔ معلومات جمع ہو رہی ہیں۔ سست رفتاری سے سہی..... لیکن اغ بہرحال سامنے آ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے جلد ہی وہ وقت ائے گا جب ہم مل جل کر یکدم ہی اس ناسور کو جڑ سے اُکھاڑ یکیں گے۔“

”آپ گفتگو بڑی امید افزا کرتے ہیں۔ آپ کی باتیں سن کر خوش ہو جاتا ہے اور نئے جوش و خروش سے ناک کی سیدھ میں رنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”یہی میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھی ہمیشہ پُرامید رہیں۔“ وہ پر ہاتھ مار کر بولے۔

اس دوران تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ چند گاڑیوں پر مشتمل با قاعدہ قافلہ اس طرف روانہ ہو گیا جہاں سے ہم آئے تھے۔ کاپٹر سے وہاں جانا کچھ اور بات تھی۔ بیکراں سمندر کی طرح لے ہوئے ویرانے میں صرف سمتوں کے سہارے وہاں پہنچنا ذرا ف مسئلہ تھا جبکہ اس ویرانے میں جگہ جگہ ٹیلے جلتے سے جنگل‘ اڑیاں وغیرہ ہمیں بھٹکانے کے لیے موجود تھیں۔ تاہم یہ ہماری ش قسمتی تھی کہ میں اور نفیس صاحب آپس میں مشورہ کرتے ے کسی خاص دشواری کے بغیر وہاں پہنچ گئے۔ میں‘ نفیس حب‘ منیر اور مسعود سب سے آگے جیپ میں تھے۔ ایمبولینس ب سے پیچھے تھی۔ بیچ میں مختلف گاڑیوں میں دوسرے لوگ تھے۔

مکان تک پہنچ کر ہم نے دیکھا‘ منظر بالکل ویسا ہی تھا جیسا ہم وڑ گئے تھے البتہ اب لاشوں پر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ ہم نے ے تینوں لاشیں اُٹھوائیں۔ پائلٹ کی لاش اُٹھوانے کے لیے ں ایک بار پھر جنگل کی طرف جانا پڑا تھا۔ اس وقت تک سورج ب ہونے کے آثار پیدا ہو چلے تھے۔

میں نے جلدی سے ایک بار پھر کُتر کاٹنے والی مشین کے یئے سرنگ کا دہانہ کھولا۔ اس میں اب بھی کوئی دشواری پیش ں آئی۔ دو کمانڈوز کو ہم نے دہانے پر تعینات کیا اور انہیں مختصراً جھایا کہ کسی ہنگامی صورتِ حال میں انہیں کیا کرنا ہو گا۔ وہ وہاں اسٹینڈ پر ایک مشین گن فٹ کر کے کھڑے ہو گئے۔ ایک کمانڈو ایسی ہی مشین گن کے ساتھ مکان کے دروازے پر تعینات تھا۔

میں‘ نفیس صاحب‘ منیر اور مسعود پہلے ہی کی طرح ایک جیپ میں سب سے آگے رہے اور چوپٹ کھلے ہوئے چوبی گیٹ سے گزر کر سرنگ میں داخل ہوئے۔ ابتدا میں راستہ کافی ڈھلوان تھا پھر تقریباً سیدھا ہو گیا۔ وہ ایک خوبصورت سرنگ تھی۔ ٹیوب ٹرین کی سرنگ تو تنگ و تاریک سی ہوتی ہے لیکن زیر زمین اسٹیشن کشادہ اور روشن ہوتا ہے۔ یہ ان کے درمیان کی چیز تھی۔ تنگی اور تاریکی کا احساس بالکل نہیں تھا۔ دو کاریں آسانی سے ایک دوسرے کے قریب سے گزر سکتی تھیں۔

ہمارے پیچھے ایک گاڑی میں تین انجینئر آ رہے تھے۔ دو کمانڈو ان کے ساتھ بھی تھے۔ ان کی اور ہماری گاڑی کے درمیان کافی فاصلہ تھا پھر مزید کچھ فاصلہ چھوڑ کر ایک گاڑی میں تین کمانڈو تھے۔ سب اسلحے سے لدے ہوئے تھے۔ ہم گویا واقعی کوئی قلعہ فتح کرنے جا رہے تھے۔ ہم نہایت محتاط انداز میں سست رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے۔ تینوں گاڑیوں میں ہنگامی حالات میں کام آنے والا دوسرا بہت سا سامان بھی تھا۔ وائرلیس کے ذریعے ہم سب کا آپس میں اور اوپر موجود لوگوں سے رابطہ قائم تھا۔

آخر کار ایک مقام پر پہنچ کر راستہ مزید کشادہ ہو گیا۔ یہاں سے گاڑیاں ٹرن ہو سکتی تھیں۔ سامنے ایک بلند و بالا دیوار نظر آ رہی تھی۔ یہاں پہنچ کر ہمارا سفر ختم ہو گیا۔ گاڑی نفیس صاحب ڈرائیو کر رہے تھے۔ چند لمحے ہم گاڑی ہی میں بیٹھے رہے اور کسی غیر متوقع صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے مستعد رہے لیکن کچھ بھی نہ ہوا۔ یہ ایک عجیب‘ بے ثمر قسم کا سسپنس تھا۔ تاہم اس جگہ کی ساخت اور محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ خوامخواہ ہی اعصاب میں بار بار تناؤ پیدا ہونے لگتا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ یہاں کے سکوت میں بھی کچھ خباثت سی پنہاں تھی۔

آخر کار دوسری گاڑیاں بھی ہمارے پیچھے آن رکیں۔ سب گاڑیوں سے اُتر آئے۔ نفیس صاحب کا اشارہ پا کر انجینئرز نے سامنے موجود سیاہ دیوار کا معائنہ شروع کیا۔ باقی لوگ ہتھیار تھامے مستعد کھڑے رہے۔ مختلف آلات کی مدد سے اس لمبی چوڑی دیوار کا معائنہ بہت دیر تک جاری رہا۔ اس دوران بہت تیز لائٹس دیوار پر مرکوز کر دی گئی تھیں جو ہم ساتھ لائے تھے۔

تینوں انجینئرز مختلف شعبوں سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت دیر تک معائنہ کرنے کے بعد بہت دیر تک ہی وہ لوگ آپس میں تبادلۂ خیال کرتے رہے حتیٰ کہ ہتھیار سنبھال کر الرٹ کھڑے ہوئے لوگوں کے جسم اکڑ گئے اور انہیں جماہیاں آنے لگیں۔ ان لوگوں میں‘ میں بھی شامل تھا۔ میں ویسے بھی آج صبح ہی سے بہت خوا چاہتا رہا تھا۔

آخر کار انجینئر حضرات نے گویا ہماری حالت پر رحم کھاتے

ہوئے سرگوشیوں میں جاری اپنا مذاکرہ ختم کیا ان میں سے ایک' سیاہ دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے نفیس صاحب کو بتانے لگا۔
"یہ کم از کم دو فٹ موٹی اسٹیل کی دیوار ہے اور اس کے پیچھے کنکریٹ کی موٹی فاؤنڈیشن ہے جس کی لمبائی چوڑائی کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ دیوار شٹر کا کام دیتی ہے اور غالباً کسی کمپیوٹر کنٹرولڈ میکنزم کے تحت کام کرتی ہے۔ اس نظام کا بٹن دبایا جاتا ہوگا تو یہ کنکریٹ کی فاؤنڈیشن میں اتر جاتی ہوگی اور راستہ کھل جاتا ہوگا۔ ممکن ہے اس سے آگے بھی کوئی دروازہ موجود ہو۔ اوپر بھی نہ جانے کتنی موٹائی میں کنکریٹ پھیلا ہوا ہے۔ اس میں سے غالباً لفٹ کے انداز میں لوہے کی رسیاں اس دیوار سے منسلک ہیں جن کے ذریعے یہ فاؤنڈیشن میں اترتی اور پھر اوپر اٹھائی جاتی ہوگی۔"
نفیس صاحب کا منہ کچھ لٹک گیا۔ "تمہارا مطلب ہے کہ اسے کسی طریقے سے کھولا نہیں جاسکتا؟" انہوں نے کسی امید کے سہارے پوچھا۔
تینوں انجینئروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ان کی ترجمانی کے فرائض انجام دینے والا نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "کھولنا تو دور کی بات ہے' اسے توڑنا بھی بہت مشکل ہے۔"
"تو پھر اندر جانے کی کیا صورت ہوسکتی ہے؟" نفیس صاحب نے جاننا چاہا۔
"ہمیں دھماکا خیز اشیا کے ماہرین کے ساتھ مل کر اس کے لیے لائحہ عمل طے کرنا پڑے گا۔ اسے ڈائنا میٹ سے اڑانے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ بہت طاقتور بلاسٹ ہوگا اور چونکہ یہ ایک بند جگہ ہے.... ممکن ہے سرنگ بیٹھ جائے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اوپر کی طرف زمین پھٹ جائے۔"
ہم سب لوگ جو قلعہ فتح کرنے آئے تھے' ٹھنڈے پڑ گئے۔ معاملہ کچھ آگے جا پڑا تھا۔ دیوار کے ایک کونے سے بہت موٹا سا سیاہ پائپ نکلا ہوا نظر آرہا تھا لیکن وہ مڑا ہوا تھا اور درحقیقت اس کا صرف مڑا ہوا حصہ ہی نظر آرہا تھا۔ وہ زمین کے اندر ہی نیچے کی طرف پیوست تھا اور نہ جانے کہاں جارہا تھا۔
"یہ کیا ہے؟" نفیس صاحب نے غالباً کسی موہوم سی امید کے سہارے پوچھا۔
"یہ غالباً ائرکنڈیشنگ کے نظام سے وابستہ ہے۔ اس کا سرا ضرور کسی کھلی جگہ میں جا کر نکلتا ہوگا لیکن کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کہاں؟ یہ ری انفورسڈ دھات کا پائپ معلوم ہوتا ہے اگر اسے کاٹنے میں کامیابی ہو بھی گئی تب بھی اس کے راستے تو مشکل سے کوئی بلی ہی اندر جاسکتی ہے اور وہ بھی یقیناً آگے جا کر مشینی گورکھ ایک دھندے میں پھنس جائے گی۔"
کرسی؟ پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔ "اس پائپ کے ٹمپریچر اصلا سے اندازہ ہوتا ہے کہ ائرکنڈیشنگ نظام ابھی تک کام کررہا ہے۔ اندر جنریٹرز بھی ہوں گے۔"

دوسرا انجینئر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بولا۔ "د جن سربراہان مملکت کو جان کا خطرہ ہوتا ہے وہ اپنے لیے بنواتے ہیں.... یہ اس سے ہزار گنا زیادہ بہتر اور محفوظ جگہ ہوتی ہے۔"
میرے خیال میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ کیسی لیلوی سی جگہ تھی۔ مجھے ایک بار اسلام آباد کے نواح میں ہوش کرکے اغوا کیا گیا تھا۔ جب میری آنکھ کھلی تھی تو میں آپ کو جس الف لیلوی سی جگہ پر پایا تھا' میرے خیال میں اسی کے دروازے پر کھڑے تھے۔ میں نے اس کا صرف ایک سا حصہ ہی دیکھا تھا۔ میں تو شاید کچھ کچھ اندازہ کر بھی سکتا کیسی جگہ تھی لیکن وہ لوگ محض اپنے علم کے سہارے اندازے نہیں لگا سکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ حیران تھے۔
نفیس صاحب الجھن زدہ لہجے میں بولے۔ "مجھے یقین کا نظام اس قسم کا ہوگا کہ اندر اگر کچھ لوگ موجود ہوتے ہماری آمد کی اطلاع ہوچکی ہوتی۔ اس صورت میں اب ردعمل ضرور سامنے آچکا ہوتا لیکن یہاں مکمل سکوت لگتا ہے اندر کوئی نہیں ہے۔"
اچانک وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولے۔ "تمہار کہتا ہے ڈیئر افضل؟"
"میرا دل بھی یہی کہتا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں دیا۔
نفیس صاحب انجینئر کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے "تمہارا اندازہ ہے کہ اندر کمپیوٹر کنٹرولڈ سسٹم موجود ہے چونکہ ٹیلی فون لائن موجود نہیں ہے اس لیے موڈیم کہیں باہر سے تو اس نظام کو کنٹرول نہیں کیا جاسکتا۔ وقت وہ لوگ ہمیشہ کے لیے اسے بند کر گئے ہیں؟"
"ضروری نہیں ہے۔" ایک انجینئر بولا۔ "وہ لوگ یافتہ معلوم ہوتے ہیں' ان کے لیے ٹیلیفون نیٹ ورک اپنے کمپیوٹرز کو کنٹرول کرنا مشکل نہیں۔ دوسرے یہ بھی ہے کہ ایک آدھ فرد ابھی تک اندر موجود ہو جسے اس لیے ہو کہ وہ آخری دم تک اس جگہ کو بچانے کی کوشش کرے۔"
مجھے اچانک ان چمپینزیوں کا خیال آیا جنہیں وہ لوگ کہتے تھے۔ وہ انسانوں کی سی سمجھ بوجھ رکھتے تھے۔ عین انہوں نے ان چمپینزیوں کو ایسے ہی مواقع پر استعمال کر تیار کیا ہو جہاں قربانی کے بکروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کے بجائے ویسا ہی کوئی چمپینزی اس وقت بھی اندر موجو اس جگہ کا مکمل کنٹرول سنبھالے ہوئے ہو۔ وہ لوگ ا آدمی کو بھی قربانی کا بکرا بنانے والے تو معلوم نہیں ہوتے
نفیس صاحب میری طرف مڑ کر ٹھنڈی سانس بولے۔ "ان کے لاہور والے زیر زمین ٹھکانے میں

آسان ثابت ہوا تھا۔ ایک تو اس کا دروازہ مختلف تھا۔ دوسرے اس کا کمپیوٹر کارڈ مل گیا تھا۔"
"عین ممکن ہے کہ اندر ویسا بھی ایک دروازہ موجود ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "یہ چونکہ ان کا ہیڈ آفس معلوم ہوتا ہے اس لیے یہاں زیادہ حفاظتی انتظامات موجود ہیں۔"
"اسی لیے تو میں اندر جانے کے لیے زیادہ بے تاب ہوں۔ لاہور والے ٹھکانے سے کافی کارآمد معلومات ہمارے ہاتھ لگی تھیں۔ شاید یہاں سے بھی بہت کچھ ہاتھ لگے۔" نفیس صاحب بولے۔
"یہ محض آپ کی خوش گمانی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہاں آپ کا "چھاپا" اچانک اور ان کے لیے قطعی غیر متوقع تھا اس لیے کچھ چیزیں آپ کو مل گئی تھیں۔ یہاں سے چونکہ وہ خبردار ہو کر غائب ہوئے ہیں اس لیے مجھے امید نہیں ہے کہ یہاں سے کچھ ہاتھ آئے گا۔"
"یہ تو مجھے بھی اندازہ ہے پھر بھی میں خوش گمان ہی رہنا چاہتا ہوں۔" نفیس صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔
"چلیں فی الحال تو اپنا جلوس لے کر واپس چلیں اور ماہرین کی مدد سے اس دروازے کو بلاسٹ کروانے کا بندوبست کریں۔" میں نے کہا۔ انہوں نے ایک لمحے کچھ سوچا۔ ان کے پاس میرے مشورے پر عمل کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ پورا قافلہ منہ لٹکائے واپس روانہ ہوگیا۔ باہر آکر اس راستے کا دروازہ بند کر دیا گیا لیکن مکان پر چار کمانڈو تعینات کردیے گئے۔ وہاں کافی مویشی موجود تھے۔ نفیس صاحب نے ایک شخص کو ان کا کچھ بندوبست کرنے کی ذمے داری سونپی اور ہم واپس روانہ ہوگئے۔
ہم لوگ پہلے سائٹ پر آئے۔ سائٹ سے سب ادھر ادھر بکھر گئے۔ گاڑیاں بھی غائب ہوگئیں۔ ہم چار افراد خانہ بدوشوں والی بستی میں واپس آگئے۔ یعنی میں' منیر' مسعود اور نفیس صاحب' جو دوبارہ اپنے غریبانہ حلیوں میں آچکے تھے۔ بستی میں کہیں خیموں میں لالٹینیں روشن تھیں اور کہیں پیٹرومیکس لیمپ روشن تھے۔ رات گہری ہوچکی تھی۔ اگر یہ اصل خانہ بدوشوں کی بستی ہوتی تو اس وقت اندھیرے میں ڈوب چکی ہوتی۔ اصل اور نقل میں باریک سے کچھ فرق تو نظر آہی جاتے ہیں۔
نفیس صاحب بولے۔ "تم بھی یہیں ٹھہرو گے نا؟ تمہارے لیے الگ خیمے کا بھی بندوبست ہوجائے گا۔"
وہ کچھ اس طرح مجھے تسلی دے رہے تھے گویا کسی فائیو اسٹار ہوٹل کا منیجر اطمینان دلا رہا ہو کہ اس کے پرانے شناسا کو ہوٹل میں لگژری سوئٹ بھی مل سکتا ہے۔
میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد کہا۔ "مجھے تو جانے ہی دیجیے۔ میں وہیں اسپتال میں راحیلہ والے مکان میں ٹھہر جاؤں گا۔ میں کئی ماہ خواری اٹھا چکا ہوں اور میرا خیال ہے میں خواری کے معاملے میں اوورڈوز ہوچکا ہوں۔ میں اب تھوڑا بہت سکون سے سونے کی کوشش کروں تو میرے حق میں شاید بہتر ہو۔ ویسے بھی میرے خیال میں یہاں رہنا کچھ ایسا ضروری نہیں۔ بلکہ یہ بستی ہی کچھ ایسی ضروری نہیں۔ کم از کم اب ضروری نہیں رہی۔"
"کیوں؟" نفیس صاحب نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔
"جن غیبی آنکھوں سے بچنے اور اپنی سرگرمیوں کو راز رکھنے کے لیے آپ اتنا تردد کررہے تھے' میرا خیال ہے آپ ان میں سے کسی کی نظر میں نہیں ہیں۔ اب تو ہم ان کے دو کارندوں کو ہلاک کرکے ان کے ٹھکانے تک ہو آئے ہیں۔ باقاعدہ جلوس کی شکل میں گئے تھے۔ اس کے باوجود کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فی الحال ان کی توجہ ہم سب کی طرف سے اور اپنے اس ٹھکانے کی طرف سے بھی ہٹی ہوئی ہے۔ شاید اس میں بھی کوئی مصلحت ہو۔" میں نے بلا تامل اپنی رائے کا اظہار کردیا۔
نفیس صاحب گہری سانس لے کر بولے۔ "میں بھی یہ سب کچھ محسوس کرچکا ہوں لیکن میں نے کہا نا کہ میں بہت زیادہ احتیاط پسند آدمی ہوں۔ اب تو یہ کھڑاگ پھیل چکا ہے۔ اب اسے سمیٹنے میں جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ ہم ریڈ ڈاٹ کے زیر زمین قلعے میں داخل ہوچکیں۔ اس کے بعد میں یہ سارا سلسلہ سمیٹ لوں گا۔"
"دروازہ بلاسٹ کرانے کا پروگرام کب ہے؟" میں نے پوچھا۔
"میں اس سلسلے میں صبح متعلقہ لوگوں سے بات کروں گا۔ جتنی جلد بھی انتظام ہوسکا اتنا ہی بہتر ہے۔ میں بھی جلد از جلد اس کام کو نمٹانا چاہتا ہوں۔ ہمارا اس میں بہت وقت ضائع ہوچکا ہے۔" نفیس صاحب بولے۔
"میرے اور آپ کے جو آدمی مختلف جگہوں اور مشکوک افراد کی نگرانی کررہے ہیں' انہیں مزید کچھ دنوں تک اس مقصد کے لیے تعینات رہنے دیجیے گا۔ شاید کوئی فائدہ ہوجائے۔" میں نے کہا۔
"میں نے یہی سوچا ہوا ہے۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔
گویا میرے اور ان کے خیالات میں ایک بار پھر اتفاق پایا گیا۔
"اس وقت بھی کچھ نہ کچھ معلومات جمع ہورہی ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں تشویش ہے کہ وہ لوگ بالکل ہی غائب ہوگئے ہیں۔ کسی خاص آدمی کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ابھی چونکہ ریڈ ڈاٹ کے فتنے کا پوری طرح خاتمہ نہیں ہوا۔ اس لیے میں چاہتا ہوں جو بھی مبہم سے سراغ موجود ہیں ہمارے آدمی ان پر کام کرتے رہیں۔"
"ٹھیک ہے۔ میں اب چلتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "جاتے جاتے ایک مشورہ مفت آپ کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں۔"
"کیا؟" نفیس صاحب نے قدرے دلچسپی سے پوچھا۔
"آپ کے آدمی رات کو بہت دیر تک جاگتے رہتے ہیں اور

اپنے خیموں میں چراغاں کیے رکھتے ہیں۔ خانہ بدوشوں کی بستیوں میں نہ تو لوگ اتنی دیر تک جاگتے ہیں اور نہ ہی ان کے ہاں اتنی لالٹینیں اور پٹرومیکس لیمپ روشن ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے بولے۔ "اچھا پوائنٹ ہے۔ میں ابھی سب کے لیے ہدایت جاری کراتا ہوں۔"

پھر انہیں جیسے کچھ یاد آیا اور مجھے خیمے سے باہر جاتے دیکھ کر بولے۔ "تم شہر جاؤ گے کیسے؟ اس وقت تو تمہیں سڑک پر کوئی گدھا بھی نہیں ملے گا جس پر بیٹھ کر جاسکو۔"

"اس مسئلے پر میں نے غور نہیں کیا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ میں پیدل ہی روانہ ہوجاتا۔" میں نے کہا۔

"تم نرے گھامڑ ہو۔" ان کا موڈ اب کافی خوشگوار ہوچکا تھا۔ میں پہلی بار انہیں اس لہجے میں بات کرتے سن رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ بیڑی سلگانے لگے۔ جتنی دیر سے میں ان کے ساتھ تھا' وہ میری ہی طرح مصروف تھے۔ کئی گھنٹے افراتفری اور ایکشن میں ہی گزرے تھے۔ اس دوران میں نے انہیں ایک بار بھی بیڑی پیتے نہیں دیکھا تھا لیکن خیمے میں آتے ہی انہوں نے بیڑی سلگالی تھی۔

ایک کش لے کر وہ بولے۔ "میں سائٹ سے ایک گاڑی سڑک پر بھجوا دیتا ہوں۔ تم بستی سے نکل کر سڑک پر پہنچو گے تو وہ تمہیں وہیں کھڑی ملے گی۔ اس قسم کی کسی بھی صورتِ حال کے لیے ہماری ایک گاڑی اسٹینڈ بائی رہتی ہے۔"

انہوں نے گدڑی کے نیچے سے ایک واکی ٹاکی نکالا اور کسی کو حکم دیا کہ وہ گاڑی لے کر اسی جگہ پر پہنچ جائے جس کے بارے میں اسے علم تھا۔ واکی ٹاکی بند کرکے وہ گدڑی کے نیچے گھسیڑتے ہوئے بولے۔ "اب تم ذرا آرام سے ٹہلتے ہوئے سڑک تک چلے جاؤ۔"

میں ان تینوں کو خدا حافظ اور شب بخیر کہہ کر وہاں سے نکل آیا۔ سڑک تک میں جان بوجھ کر ذرا سست رفتاری سے پہنچا۔ سامنے ہی سڑک کے کنارے ملگجے اندھیرے میں ایک سفید وین کھڑی تھی۔ میں اسے سائٹ پر دیکھ چکا تھا۔ اس لیے قریب جاکر بے فکری سے دروازہ کھول کر اس میں جا بیٹھا۔

"کہاں جانا ہے سر؟" ڈرائیور نے میری تمام تر مفلوک الحالی کے باوجود مجھے "سر" کہہ کر مخاطب کیا جس پر میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے اسے اسپتال کا نام بتایا اور اس نے آندھی طوفان کی سی رفتار سے گاڑی دوڑادی۔ سنسان سڑکوں سے گزرتے ہوئے ہم جلد ہی اسپتال پہنچ گئے۔ اس اسپتال کا ایک ہی گیٹ تھا۔ اس کے عقب سے سڑکیں شاخوں کی طرح پھوٹتی تھیں۔

بہت بڑا وہ گیٹ اس وقت بند تھا اور اس پر مسلح گارڈ تعینات تھے۔ ڈرائیور نے انہیں کوئی کارڈ دکھایا اور انہوں نے گیٹ کھول دیا۔ میرا حلیہ اس قسم کا تھا کہ اگر میں اکیلا وہاں پہنچتا اور پیدل گیٹ کی طرف بڑھتا تو وہ مجھے قریب بھی نہ پھٹکنے دیتے۔ مجھے یا راحیلہ کو اطلاع کرانی پڑتی اور اس حلیے میں یہ بھی ایک مشکل ہوتا۔ شاید مجھے کسی مناسب مقام سے دیوار پھاندنے کا ہنر ہی آ پڑتا۔

ڈرائیور مجھے مطلوبہ دروازے تک پہنچا کر فوراً ہی لوٹ گ میرے گیٹ تک پہنچنے سے پہلے ہی گیٹ کھل گیا۔ ٹونی میر استقبال کے لیے موجود تھا۔ اس نے دور ہی سے مجھے پہچان لیا ورنہ اس کے ہاتھ میں گن ہوتی۔ ہم ساتھیوں کا اب آ دوسرے کو کسی بھی حلیے میں دیکھنا غیر متوقع نہیں ہوتا تھا اس اس نے مجھ سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔ صرف کے تبادلے کے بعد میں نے احتیاطاً پوچھا۔ "راحیلہ تو سوگئی ہو گ

ٹونی نے گردن گھما کر ایک کھڑکی کی طرف دیکھا۔ شیشے عقب میں موٹا پردہ پھیلا ہوا تھا مگر روشنی کا احساس ہو رہا تھا ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "میڈم ابھی جاگ رہی ہیں۔ اگر م رہنا نصیب ہو تب بھی وہ رات کو بہت دیر سے سوتی ہیں۔"

"کیوں؟ کیا کرتی رہتی ہیں تمہاری میڈم؟" میں نے اندھیرے میں اسے گھورا۔

"انہیں پڑھنے کی بیماری ہوگئی ہے۔ رات کو وہ کافی دیر م نہ کریں تو انہیں نیند نہیں آتی۔" ٹونی نے جواب دیا۔ وہ مد سے اس وقت راحیلہ کے باڈی گارڈ کے فرائض انجام دے ر مگر مکان کی حدود سے باہر رہ کر۔

"اوہ.... حیرت ہے کہ اس کی زندگی میں مطالعے کی گن موجود ہے۔" میں نے دروازے پر پہنچ کر کال بیل کے بٹن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

ٹونی مجھے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "آپ کا بیل بیکار ہوگا۔ رات کے نو بجے کے بعد کوئی بھی بیل بجائے' د نہیں کھلے گا....."

"اوہ.... یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے سر کھجا کر کہا۔ "مے چھوڑ کر آیا ہوں۔ لگتا ہے اب مجھے تمہاری مالیوں والی کوٹھ سونا پڑے گا۔ اس کا مطلب ہے آج مقدر میں کوئی ڈھنگ کوئی ڈھنگ کا بستر ہی نہیں تھا۔ میں نے خوامخواہ ہی بھاگ کی۔"

"میں نے یہ تو نہیں کہا۔ ابھی آپ نے میری پوری بات سنی۔" ٹونی شریر سے انداز میں مسکرایا۔ "میرا مطلب ہے کے بعد جو بھی آئے گا اسے پہلے مجھ سے بات کرنی پڑے گی۔ مجھے معلوم ہے کہ کس مخصوص انداز میں بیل دی جائے گی دروازہ کھولیں گی۔"

"چلو بھئی.... تم ہی گھنٹی بجادو۔ تمہارا احسان ہوگا۔" پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

ٹونی نے آگے بڑھ کر عجیب ہی انداز میں گھنٹی بجائی

کانے کی دھن چھیڑ دی گئی ہو۔ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کمال ہوگیا بھئی! تم تو اچھے خاصے موسیقار ہوگئے ہو۔ کال بیل سے پیانو کا کام لے لیتے ہو۔ تمہیں تو اسٹیج پر اپنے فن کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔"

"یہ دنیا ایک اسٹیج ہی ہے سر..... اور میں اس پر اپنے فن کا مظاہرہ کررہا ہوں۔" وہ غمناک لہجے میں بولا۔

"زیادہ شیکسپیرین اسٹائل اختیار کرنے کی ضرورت نہیں۔ جذبات میں موج آجائے گی۔" میں نے کہا۔

اس لمحے برآمدے کی لائٹ آن ہوگئی اور پھر دروازہ کھل گیا۔ راحیلہ نائٹ گاؤن میں تھی مگر اس کے ہاتھ میں گن تھی اور دروازہ اس نے بڑی احتیاط سے کھولا تھا حالانکہ ٹونی نے "کھل جا سم سم" والی دھن بجائی تھی۔

راحیلہ نے سر سے پاؤں تک میرا جائزہ لیا پھر گہری سنجیدگی سے بولی۔ "معاف کرو بابا! یہ کوئی وقت ہے کسی شریف خاتون کا دروازہ کھٹکھٹانے کا؟"

اس نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اپنی کیچڑ میں لتھڑی ہوئی بھاری بھرکم پشاوری چپل دروازے میں پھنسادی اور دروازے کے ہینڈل پر مضبوطی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "ہم معاف کرنے والے فقیر نہیں ہیں بی بی..... خصوصاً شریف خواتین کو۔"

ٹونی واپس مڑتے ہوئے بولا۔ "میں چلتا ہوں۔ میں اپنی ڈیوٹی پر موجود ہوں اور احمقوں کی طرح مکان کے چکر لگا رہا ہوں۔" اس نے گویا راحیلہ کو مطلع کیا۔

"احمقوں کی طرح کیوں لگا رہے ہو؟ عقلمندوں کی طرح چکر لگاؤ" راحیلہ نے اسے ہدایت کی۔ "ویسے تم میری حفاظت کے فرائض کتنے عمدہ طریقے سے انجام دے رہے ہو۔ ایک مشٹنڈا غیر مرد دا میرے گھر میں گھسا چلا آرہا ہے اور تم کہہ رہے ہو میں مکان کے گرد چکر لگا رہا ہوں۔ تم میری حفاظت کررہے ہو یا مکان کی؟"

"اس "مشٹنڈے" کے آنے کے بعد آپ کی حفاظت خود بخود ہوجائے گی۔ میرے ذمے اب صرف مکان کی حفاظت رہ گئی ہے۔" ٹونی خفیف سی مسکراہٹ کے بعد بولا اور سیڑھیاں اتر کر لان کے اندھیرے میں غائب ہوگیا۔

راحیلہ نے ٹھنڈی سانس لی اور دروازہ بند کرنے کی مصنوعی کوشش ترک کردی۔ اس وقت اس کے چہرے پر عقب سے روشنی پڑ رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کا چہرہ آدھا سیاہ اور آدھا سفید نہیں' بلکہ اس پر شیڈ پڑ رہا تھا' کسی آرٹسٹ کے پین ورک سے بنائے ہوئے خوبصورت اسکیچ کی طرح۔

میں نے اندر پہنچ کر دروازہ بند کردیا اور خصوصی حفاظتی بولٹ بھی چڑھا دیا۔ پشاوری چپل اتار کر ایک طرف پھینکتے ہوئے میں نے لاؤنج میں ہی قالین پر گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز ہوکر کہا۔ "نفیس صاحب کے ساتھ کام کرنے سے تو بہتر ہے انسان کارپوریشن میں ملازمت کرلے۔"

"کون سی کارپوریشن؟" راحیلہ نے وضاحت چاہی۔

"وہی..... اپنی میونسپل کارپوریشن۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "انسان وہاں جمعدار کے طور پر بھرتی ہوجائے اور کوشش کرے کہ ریٹائرمنٹ سے پہلے پہلے ہیڈ جمعدار کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہوسکے۔"

"ہاں..... اپنی اوقات کے مطابق تم نے صحیح سوچا ہے۔" راحیلہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"اس میں کیا شک ہے۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن افسوس رہے گا کہ تم مجھ سے پہلے ہیڈ جمعدارنی کے عہدے پر فائز ہوگئیں۔"

"دیکھو..... ذاتیات پر حملہ کرنے کی نہیں ہو رہی۔ ورنہ میں بھی تمہاری ذاتیات پر حملہ کروں گی اور میں ذاتیات پر بھی گن سے حملہ کرتی ہوں۔" وہ گاؤن کی جیب سے دوبارہ گن نکالتے ہوئے بولی۔ "میں تمہاری کھوپڑی میں سوراخ کردوں گی اور میرے خیال میں کھوپڑی بھی ذاتیات میں شمار ہوتی ہے۔"

"اچھا..... خیر..... بکواس چھوڑو۔ یہ بتاؤ کیا کررہی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔ ایک ناول پڑھ رہی تھی۔" اس نے دوسرے ہاتھ میں دبایا ہوا ناول میری طرف اچھال دیا۔ وہ انگریزی کا ایک ضخیم اور سنسنی خیز قسم کا بیسٹ سیلر تھا۔

"اوہ..... میں سمجھا کوئی سنجیدہ کتاب پڑھ رہی تھیں۔" میں نے مایوسی سے کہا "شاید تمہیں پتا نہ چلا ہو لیکن اب تم بڑی ہوگئی ہو۔ سنجیدہ قسم کی کتابیں پڑھا کرو۔"

"میں ذرا جاننے کی کوشش کررہی تھی کہ تحریری سنسنی خیزی اور عملی سنسنی خیزی میں کیا فرق ہوتا ہے۔" وہ ذرا سنجیدگی سے بولی۔ "مجھے حیرت ہو رہی تھی' یہ مصنف لوگ کتنے مزے سے "ایکشن سے بھرپور" ہزاروں صفحات لکھتے چلے جاتے ہیں اور لوگ بھی کیا مزے سے پڑھتے چلے جاتے ہیں۔ کسی کو نہیں معلوم کہ چند منٹ کے ایکشن میں حصہ لینے والوں کی کس طرح چولیں ہل جاتی ہیں اور تھوڑے بہت ایکشن کے ساتھ زندگی گزارنا بھی بڑے مضبوط اعصاب کے لوگوں کا کام ہے۔"

"اتنے سنجیدہ موضوعات پر اتنے رنجیدہ انداز میں غور مت کیا کرو۔ سنا ہے تمہیں تو پہلے ہی بے خوابی کی شکایت ہوگئی ہے۔ راتوں کو دیر تک جاگتی رہتی ہو۔ اسپتال میں رہتی ہو اور تمہیں اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ کسی ڈاکٹر سے پاؤ ڈیڑھ پاؤ خواب آور گولیاں لے کر پھانک لیتیں۔"

"تمہیں اس دنیا میں میری موجودگی سے اتنی تکلیف ہے تو پھانک لیتی ہوں۔" وہ گن جیب میں رکھتے ہوئے بولی۔

"نہیں۔ میں تو اس لیے کہہ رہا تھا کہ اس سے کم مقدار کا تم پر اثر ہونا ذرا مشکل تھا۔ موٹی کھوپڑی والوں کو ذرا ہیوی ڈوز کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاؤ ڈیڑھ پاؤ گولیاں کھاتے ہیں تب ایک آدھ گھنٹا سوتے ہیں اور ایک آدھ خواب.... بلکہ خوابچہ نظر آتا ہے۔"

"ہمیں تو اب ایک ہی گولی چین کی نیند سلائے گی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "وہ ہے بندوق کی گولی۔"

"دل چھوٹا نہ کرو۔ وہ بھی نصیب ہو جائے گی۔"

"کئی بار نصیب ہوتے ہوتے رہ گئی ہے۔ تمہارا ساتھ میسر رہا تو گولیاں بہت۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "اب بکواس ہی کرتے رہو گے یا کوئی کام کی بات بھی کرو گے؟ میرا خیال ہے تمہیں ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ آفس تک رسائی کی کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی تبھی اِدھر اُدھر کی ہانکے جا رہے ہو۔"

"کیا مطلب؟" میں تقریباً اچھل پڑا۔ "تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ ہم ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ آفس تک پہنچ گئے تھے؟"

"اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے؟" وہ اطمینان سے بولی۔

"حیرت کی بات یہ ہے کہ تمام وقت نفیس صاحب تو میرے ساتھ تھے۔ میرے سامنے انہوں نے تمہیں فون نہیں کیا.... تو پھر تمہیں کس نے اطلاع دی؟"

"میں ان کی دستِ راست ہوں۔ مجھے ہر بات کی رپورٹ تو لازماً ملنا ہوتی ہے۔" وہ گویا میری حیرت سے محظوظ ہوتے ہوئے شرارتاً مسکرائی۔

"اچھی دستِ راست ہو جو گھر پر بیٹھی آرام کر رہی تھیں...." پھر میں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "اور یہ جو نفیس صاحب کا بایاں پاؤں ہے، یہ ان کے ساتھ گھسٹتا پھر رہا تھا۔"

"ہم نے بہت خواری اٹھائی ہے بھئی! اب تمہاری باری ہے۔" وہ اطمینان سے دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔ "آخر تم واپس آئے ہو، تمہاری خاطر تواضع کا بھی کوئی بندوبست ہونا چاہیے۔"

"مذاق چھوڑو بھئی..... سچ سچ بتاؤ۔ تمہیں کس نے رپورٹ دی؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نفیس صاحب نے ہی دی ہے.... اور کون دے سکتا تھا؟ ان کے علاوہ کسی کو اتنا اختیار نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"انہوں نے کس وقت اطلاع دی؟"

"ابھی چند منٹ پہلے... جب تم یہاں آنے کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔"

"حد ہو گئی بھئی!" میں نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ "جب انہیں معلوم تھا کہ میں یہاں آ رہا ہوں تو رپورٹ دینا ضروری تھی؟ میں تو دل ہی دل میں بچوں کی طرح خوش ہوتا آ رہا تھا کہ یہ خوشخبری خود تمہیں سناؤں گا۔ انہوں نے سارا سسپنس ہی ختم کر دیا۔ بڑے ہی سسپنس دشمن آدمی ہیں۔"

"انہیں سسپنس وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ وہ قاعدے ضابطے کے آدمی ہیں۔ اپنے مخصوص دفتری سے انداز میں کام کرتے ہیں، خواہ خانہ بدوشوں کی بستی میں رہ رہے ہوں۔ جب طے ہو گیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو ہر روز تمام حالات سے آگاہ رکھیں گے.... تو بس.... اس پر عمل ہو گا.... ان کے لیے یہ بات قطعاً اہم نہیں تھی کہ تم یہاں آ رہے تھے۔"

"انہوں نے تمہیں مکمل اور مفصل رپورٹ دے دی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں مجھے ہر بات معلوم ہے۔ میرا خیال ہے.... شاید کل پرسوں ہی اس دروازے کو بلاسٹ کرنے کے انتظامات مکمل ہو جائیں گے۔ خیر.... چھوڑو اس بکواس کو.... یہ مسئلے تو معلوم نہیں کب تک چلتے رہیں گے۔ یہ تو بتاؤ.... تم نے کچھ کھانا وغیرہ بھی کھایا ہے یا نہیں؟" وہ اپنا ناول مجھ سے واپس لے کر ایک طرف رکھتے ہوئے بولی۔

"کھانا.....؟" میں نے کراہ کر کہا۔ "ظالم لڑکی! یہ تم نے کن خوابیدہ زخموں کو بیدار کر دیا۔ خانہ بدوشوں والی بستی میں نفیس صاحب نے مجھے رات کے کھانے کی دعوت دی تھی لیکن میں نے یکایک اپنا اسٹینڈرڈ کچھ اونچا کر لیا اور دل میں سوچا کہ میں کسی ڈھنگ کی جگہ پر، کسی ڈھنگ کی لڑکی کے ساتھ بیٹھ کر ڈھنگ کا کھانا کھاؤں گا۔"

"تو پھر تم یہاں کیوں آ گئے؟" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ "یہ ایک اسپتال ہے۔ اس لحاظ سے اسے ڈھنگ کی جگہ نہیں کہا جا سکتا۔ نہ ہی یہاں کوئی ڈھنگ کی لڑکی موجود ہے اور جو موجود ہے وہ ڈھنگ کا کھانا بھی نہیں بنا سکتی۔"

"چلو کوئی بات نہیں۔ میں اپنا اسٹینڈرڈ کچھ نیچے لے آتا ہوں۔ جو کچھ بھی میسر آ جائے گا، صبر شکر سے کھا لوں گا۔ آخر قناعت بھی کوئی چیز ہے۔" میں نے خلوص سے کہا۔ "میرے لیے یہی خوشی کافی ہے کہ تم نے اعتراف کر لیا کہ تم ڈھنگ کی لڑکی نہیں ہو۔ ڈھنگ کی لڑکی ہوتیں تو اب تک مجھ جیسے کسی ڈھنگ کے آدمی کا گھر آباد کر چکی ہوتیں اور رائفلوں یا کلاشنکوفوں وغیرہ کے بجائے چمچوں اور کفگیروں وغیرہ سے کھیل رہی ہوتیں۔"

"شروع ہو گئی تمہاری بکواس۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "بہتر ہو گا کہ میں تمہارے منہ میں کچھ ٹھونس کر تمہاری زبان بند کرنے کی کوشش کروں۔"

وہ کچن میں چلی گئی اور میں باتھ روم میں چلا گیا۔ اس گھر میں گزارے لائق کچھ مردانہ کپڑے موجود تھے۔ راحیلہ نے مجھے ایک صاف ستھری شلوار قمیص دے دی تھی۔ جب تک میں شاور لے کر، اپنی حالت کچھ شریفانہ اور معززانہ بنا کر ڈائننگ روم میں پہنچا تب تک راحیلہ نے کچھ ریڈی میڈ قسم کا کھانا تیار کر کے میز پر سجا دیا تھا اور خود کافی پی رہی تھی۔

میں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے اسے ڈانٹا۔ "ایک تو تمہیں راتوں کو نیند نہیں آتی۔ اوپر سے رات گئے کافی پیتی ہو۔ تمہارا دماغ ٹھیک ہے؟"

"کس گدھے نے تم سے کہہ دیا کہ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی؟" اس نے مگ کے اوپر سے مجھے گھورا۔

"وہ گدھا باہر لان پر اس مکان کے اردگرد گھاس چرتا پھر رہا ہے لیکن اتفاق سے وہ چار ٹانگوں والا گدھا نہیں ہے اور شاید زمانے کے صدمات اٹھا اٹھا کر اس کی دُم بھی گھس گئی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس نے شاید خوامخواہ ہی تمہارے ذہن میں الٹے سیدھے خیالات ڈالنے کے لیے یہ شوشا چھوڑا ہے۔ میں کوئی فلمی ہیروئن نہیں ہوں جو ہیرو کے فراق میں راتوں کو جاگتی رہوں۔ میں اپنی مرضی سے جاگتی ہوں۔ ایک طویل مدت کے بعد آج کل پھر میرا کچھ نہ کچھ پڑھنے کو جی چاہنے لگا ہے اور رات کے سناٹے میں پڑھنے کا ذرا زیادہ لطف آتا ہے۔ جس قسم کی بے ہودہ زندگی ہم گزار رہے ہیں اس میں اگر اعصاب پر تناؤ ہوتا ہے تو رات کے مطالعے سے میں بالکل تازہ دم اور ہلکی پھلکی ہو جاتی ہوں۔ جب چاہتی ہوں سو جاتی ہوں۔ بلکہ بعض اوقات تو رات کو کافی میرے لیے ٹرنکولائزر کا کام دیتی ہے۔ اگر نیند نہیں بھی آ رہی ہوتی تو کافی پی کر آ جاتی ہے۔"

"خیر.... اس میں تمہارا قصور نہیں۔" میں نے متاسفانہ انداز میں سر ہلا کر کہا۔ "تم تو پیدائشی طور پر ہی اُلٹ پلٹ قسم کی چیز ہو۔"

پھر میں نے دوسرے سینڈوچ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ہنگامی طور پر بھی تم نے بڑے عمدہ سینڈوچ بنا لیے ہیں۔ اگر میں نے کبھی لاہور میں ہوٹل بنایا تو تمہیں ضرور شیف کے طور پر بھرتی کروں گا۔ گھر میں تو تم خانہ دار خاتون کے طور پر بھرتی ہونے کے لیے تیار نہیں ہو لیکن اس معززانہ پوسٹ کے لیے تو ہامی بھر لو گی نا؟"

"بندی اس اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے لائق بھی نہیں ہے۔ میری طرف سے پیشگی معذرت قبول فرمائیے محترم ٹائیکون صاحب!" اس نے کافی کا مگ میز پر رکھ کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے نہایت عاجزی سے کہا۔

"ویسے.... بائی دا وے..... تمہیں مجھ سے کھانے کے لیے پوچھنے کا خیال کس طرح آ گیا تھا؟"

"میری شامت نے دعوت دی تھی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے ساتھ نیکی کرنے کا انجام بُرا ہوتا ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ مجھے ہزاروں بار کے تجربات یاد نہیں رہے تھے۔ مجھے تمہارے چہرے پر بھوک لکھی نظر آئی تھی۔ اس لیے پوچھ لیا تھا۔"

"وہ محبت کی بھوک تھی نادان لڑکی! تمہیں کبھی احساسات کی زبان سمجھنا نہیں آئے گا۔" میں نے درد بھرے لہجے میں کہا۔

"میں اس کے لیے جلد ہی کوئی اچھی سی ہنٹ تھرو گائیڈ خریدنے کی کوشش کروں گی۔" اس نے خلوص سے وعدہ کیا اور کافی کا مگ ہونٹوں سے لگا لیا۔

میں اس وقت چوتھے سینڈوچ پر ہاتھ صاف کرنے میں مصروف تھا جب وہ کئی لمحوں کی خاموشی کے بعد عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ "اِنّی! ایک بات پوچھوں.... ایمانداری سے بتاؤ گے؟"

"نہیں۔ میں تو پیدائشی بے ایمان ہوں۔ بات کا جواب دینے میں بھی ڈنڈی ماروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"اِنّی! بخدا میں بالکل سنجیدہ ہوں۔"

میں نے ذرا چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "تم تو سنجیدہ سے زیادہ رنجیدہ نظر آ رہی ہو۔ خیر.... پوچھو کیا پوچھنا ہے فریادی! ما بدولت پوری دیانتداری سے جواب دینے کی کوشش کریں گے۔"

وہ میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "کیا تمہیں واقعی پہلے والی راحیلہ اور اب والی راحیلہ میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا؟ تمہیں میرا چہرہ بالکل عجیب نہیں لگتا؟"

"تمہیں میرے رویّے میں کوئی فرق محسوس ہوتا ہے؟" میں نے اُلٹا اُسی سے سوال کر دیا۔

"اپنا رویّہ ہمیشہ ایک جیسا رکھنا زیادہ مشکل کام نہیں ہے۔ یہ کام تو تم میرا دل رکھنے کے لیے بھی کر سکتے ہو۔" وہ بولی۔

"میں اتنا اچھا ایکٹر نہیں ہوں۔" میں نے اپنے لیے کافی انڈیلتے ہوئے کہا۔

"مجھے دل کی گہرائیوں کی بات بتاؤ۔ میرا چہرہ دیکھتے ہو تو کیا محسوس کرتے ہو؟" اس کے لہجے میں اصرار تھا۔

"یہی کہ چاند پر کوئی بدلی آ گئی ہے.... گزر جائے گی۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

وہ چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ کچھ کہنے کے لیے اس کے ہونٹ تھرتھرائے لیکن آواز نہیں نکلی۔ پھر اس نے گویا وہ بات کہنے کا ارادہ ہی ترک کر دیا اور سر جھٹک کر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ "فارگٹ اِٹ..... میں بھی کیا ذکر لے کر بیٹھ گئی۔"

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "راحیلہ ڈیئر! اب تم مجھے ایک بات ایمانداری سے بتاؤ۔ تم اپنی ذات پر یہ جبر کیوں کرتی ہو..... اور کب تک کرتی رہو گی؟"

"کون سا جبر؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"تم کچھ کہنا چاہتی ہو مگر نہیں کہتیں۔ کچھ کرنا چاہتی ہو مگر نہیں کرتیں۔ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ شاید تمہارے کانوں کو بھلا لگتا ہے لیکن تم اس کا اقرار نہیں کرتیں۔"

"بس.... ان باتوں کو یہیں ختم کردو۔ میں اس قسم کے موضوعات پر بات کرنا نہیں چاہتی۔ مجھے ایک مختصر سا سوال پوچھنا تھا۔ اس کا جواب مجھے مل گیا ہے۔ اب بات ختم۔" وہ مگ میز پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اب میں سونے جارہی ہوں۔ شب بخیر۔"

وہ اپنے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ میں نے جلدی سے بہ آواز بلند کہا۔ "تم ہمیشہ اپنے جذبات کا گلا گھونٹتی ہو اور میرے جذبات کو مجروح کرتی ہو۔ میں تمہیں بددعا دیتا ہوں۔ خدا کرے تمہیں کوئی بے سُرا مچھر رات بھر کاٹتا رہے اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو۔"

اس نے کمرے میں داخل ہو کر کھٹ سے دروازہ بند کرلیا اور بولٹ چڑھالیا۔ میں کافی ختم کرنے کے بعد بھی دیر تک وہیں بیٹھا رہا حتیٰ کہ مجھے غنودگی آنے لگی۔ تھکن اس قدر تھی کہ کافی بھی اسے دور کرنے میں ناکام رہی تھی اور غنودگی مجھ پر غلبہ پانے لگی تھی۔

راحیلہ کے کمرے کے دروازے کے نیچے روشنی کی باریک سی لکیر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ یقیناً اب تک جاگ رہی تھی۔ معلوم نہیں وہ اب تک ناول ہی پڑھ رہی تھی یا صحیفۂ دل کا کوئی ایسا ورق پڑھ رہی تھی جس پر محبتوں کے سودوزیاں اور زندگی کی ناآسودہ ساعتوں کا حساب درج تھا۔

آخر میں بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اس کے برابر والے کمرے میں سوتا تھا۔ میں جاکر بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ میں نے دروازہ بند ضرور کر دیا لیکن بولٹ چڑھانے کی زحمت نہیں کی۔ کمرے کی لائٹ آف تھی۔ میں نے اسے آف ہی رہنے دیا۔

میں ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھا تھا تو نیند سے آنکھیں بوجھل تھیں۔ لگتا تھا کسی بھی لمحے کرسی سے لڑھک جاؤں گا۔ اب آرام دہ بستر پر آکر لیٹا تو نیند یوں غائب جیسے آنکھوں سے رخصت ہوگئی حالانکہ ایسے ہی کسی صاف ستھرے اور آرام دہ بستر کی آرزو میں میں خانہ بدوشوں کی بستی سے بھاگا تھا۔

راحیلہ کے کمرے میں شاید ابھی تک لائٹ جل رہی تھی، شاید وہ روشنی میں جاگ رہی تھی اور میں اندھیرے میں جاگ رہا تھا۔ میرے اور اس کے کمرے کے درمیان صرف ایک دیوار تھی۔ میری اور اس کی زندگی..... میری اور اس کی سوچ کے درمیان بھی ایک غیر مرئی دیوار تھی۔ میں اکثر سوچتا تھا، معلوم نہیں یہ دیوار کبھی گرے گی یا نہیں؟

بہت دیر تک جاگتے رہنے کے بعد جلتی آنکھیں آخر کار تھک گئیں۔ غنودگی نے مجھ پر پلٹ کر حملہ کیا۔ میں نے گھڑی میں وقت دیکھنے کی زحمت تو نہیں کی لیکن میرا خیال ہے مجھے رات کے پچھلے پہر ہی نیند آئی تھی۔

سونے والے کی اگر اچانک آنکھ کھلے تو اسے احساس نہیں ہوتا کہ وہ کتنی دیر سویا تھا۔ خصوصاً میری جو حالت تھی اس میں تو اندازہ کرنا بہت ہی مشکل تھا۔ چنانچہ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے یہی لگا جیسے میں صرف چند منٹ سویا تھا۔ مجھے کسی آواز نے جگایا تھا اور مدہوشی کی سی نیند سے اس طرح اچانک جاگنے کے باوجود میں یکدم ہی چوکنا ہوگیا تھا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ جس آواز نے جگایا تھا وہ کچھ ایسی زیادہ خطرے کی علامت نہیں تھی۔ دروازے پر کوئی نہایت آہستگی سے ایک انگلی سے دستک دے رہا تھا جبکہ دروازہ غیر مقفل ہی تھا۔

"اِفی..... اِفی!" یہ آواز سرگوشی کی طرح میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ راحیلہ کی آواز تھی۔ میرا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔ کیا ہمارے کمروں کے درمیان کھڑی دیوار..... اور ہماری زندگیوں کے درمیان حائل غیر مرئی دیوار گر گئی تھی؟ کیا اس نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے کا ہوجانا چاہیے، ایک دوسرے کے وجود میں پناہ لے لینی چاہیے؟

"آجاؤ..... دروازہ کھلا ہے۔" میں نے کہا۔ میرے حلق سے عجیب سی آواز نکلی تھی۔ اس میں غنودگی کا خمار بھی تھا اور امید و بیم کی لرزش بھی۔ ان گنت تشنہ آرزوؤں کی پکار بھی تھی اور انتہائے اشتیاق کی تھرتھراہٹ بھی۔

"نہیں..... تم باہر آجاؤ۔ بہت ضروری بات ہے۔ نفیس صاحب کا فون ہے۔" راحیلہ کی آواز اب مجھے ذرا واضح سنائی دی اور میرے تصورات کی عمارت خاموشی سے زمیں بوس ہوگئی۔

"اللہ ان نفیس صاحب سے سمجھے۔" میں نے زیرِ لب کہا اور کمبل پھینک کر باہر آگیا۔

لاؤنج میں آکر مجھے پتا چلا کہ صبح ہوچکی تھی تاہم ابھی دھوپ نہیں پھیلی تھی۔ وہ گویا کہیں جانے کے لیے تیار کھڑی تھی اور بالکل تازہ دم نظر آرہی تھی۔ اس کے چہرے پر تھکن، اعصاب کشیدگی، شب بیداری کی کوئی علامت نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کے چہرے کے سیاہ حصے پر تو گویا اب تاثرات بھی کہیں تاریکی میں گم ہو جاتے تھے۔ صرف سفید حصے پر ہی تاثرات کا صحیح طور پر پتا چلتا تھا۔ ایک عجیب بات تھی۔

"نفیس صاحب پر صبح ہی صبح کیا مصیبت آن پڑی؟" میں نے کاٹ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔

"مصیبت صبح نہیں، رات میں پڑی تھی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ "شکر ہے پھر بھی خیریت ہی رہی۔ لو..... تم خود ان سے بات کرلو۔" اس نے موبائل فون مجھے تھمادیا۔ میں لاؤنج میں جا بیٹھا۔

نفیس صاحب نے مجھے راحیلہ سے یہ کہتے سُن لیا تھا کہ نفیس صاحب پر صبح ہی صبح کیا مصیبت آن پڑی۔ وہ میرے "ہیلو" کہتے ہی بولے۔ "برخوردار! جو مصیبت ہم پہ پڑنے لگی تھی وہ اگر صحیح طرح پڑجاتی تو اس وقت میں تم سے بات نہ کررہا ہوتا۔"

"ایسی کیا بات ہوگئی حضرت؟ رات تو میں آپ لوگوں کو ٹھیک ٹھاک اور بہ خیروعافیت چھوڑ کر آیا تھا۔" میں نے حیرت سے کہا مگر کہ نفیس صاحب کا لہجہ خوشگوار تھا مگر مجھے اندازہ ہوگیا کہ معاملہ کچھ سنجیدہ تھا۔

"مصیبت کو آتے کون سی دیر لگتی ہے۔ مصیبتیں تو اکثر شارٹ کٹ سے آتی ہیں۔" نفیس صاحب بولے۔ لہجہ بدستور خوشگوار تھا۔

"آخر ہوا کیا؟ کچھ بتائیے تو سہی۔" میں نے زور دے کر کہا۔

"اب تو انہونیاں ہونے لگی ہیں برادرم!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ وہ مجھے کسی بھی القاب سے مخاطب کرلیتے تھے۔ کبھی برخوردار، کبھی برادرم، کبھی بڑے تکلف سے مسٹر چوہدری، کبھی کہنے لگتے تھے اور کبھی بے تکلف دوستوں کی طرح اِفی یا افضل بھی کہہ لیتے تھے۔

"انہونیاں تو ہمارے ہاں ایک مدت سے ہو رہی ہیں۔ آپ تک اطلاع بہت دیر سے پہنچتی ہے۔" میں نے ان سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بلکہ بعض اوقات تو پہنچتی ہی نہیں۔" پھر میں نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ بول کہاں سے رہے ہیں؟ خانہ بدوشوں والی بستی سے؟"

"اب وہاں کوئی خانہ بدوشوں والی بستی نہیں رہی۔" انہوں نے غم ناک لہجے میں اطلاع دی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟" میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

"رات بستی پر بمباری ہوئی تھی۔" انہوں نے شرمسار سے لہجے میں بتایا۔

"کیا؟" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ "آپ کسی خطرناک سرحدی علاقے میں تو نہیں بیٹھے تھے۔ آپ پر کس کا جہاز بمباری کرگیا؟"

"یہ تو پتا ہی نہیں چلا۔ رات کی تاریکی میں ایک نامعلوم طیارہ آیا اور چند بم گرا کر غائب ہوگیا۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" میں نے اپنے اندر مچلتے ہوئے ایک بے عنوان سے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ "کیا اب اس طرح ہی ہوا کرے گا کہ ایک نامعلوم طیارہ آئے اور ایک دارالحکومت کے نواحی علاقے میں بمباری کرکے چلا جائے، کسی کو اس کے بارے میں کچھ پتا نہ چلے۔ کوئی اس کے بارے میں بروقت ہوشیار نہ ہو؟ اس نے کہاں سے سرحد عبور کی؟ ہمارا ریڈار سسٹم کیا کررہا تھا؟ کیا وہ کسی کی نظر میں نہیں آیا؟ اور اتنی ہی آسانی سے غائب بھی ہوگیا؟ مجھے یقین نہیں آرہا۔ یہ تو بڑی خطرناک علامت ہے۔"

"ہمیں اس پر تم سے زیادہ تشویش ہے۔" نفیس صاحب بولے۔ "اس کی مکمل تفتیش اور تحقیقات تو ہوگی..... بلکہ یوں سمجھو کہ شروع ہوچکی ہے لیکن فی الحال تو دوسرے مسائل ہیں۔"

"یہ بتائیے نقصان کیا کیا ہوا؟" میری مراد جانی نقصان سے تھی۔ میرا دل ذرا تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ہمارے بھی دو تین ساتھی وہاں تھے۔

"کوئی نقصان نہیں ہوا۔" نفیس صاحب اطمینان سے بولے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ راحیلہ بھی اطمینان سے سامنے ہی بیٹھی تھی۔ وہ یقیناً نفیس صاحب سے سب کچھ پہلے ہی پوچھ چکی تھی یا نفیس صاحب خود ہی اسے سب کچھ بتا چکے تھے۔

"تو پھر یہ کس قسم کی بمباری تھی؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اصل میں وہ اپنے ٹارگٹ کو ہٹ نہیں کرسکے لیکن ہمیں یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ ان کا ٹارگٹ ہماری بستی ہی تھی۔ کیسا عجیب اتفاق ہے کہ تم نے رات ہی ہمیں بتیاں کم جلانے اور جلد بجھانے کا مشورہ دیا تھا۔ میں نے فوراً ہی اس کے لیے ہدایت جاری کردی تھی۔ چند منٹ بعد ہی بستی اندھیرے میں ڈوب گئی تھی اور اس کے تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد بمباری ہوگئی لیکن وہ اندھیرے ہی کی وجہ سے صحیح ٹارگٹ پر بم نہیں گرا سکے۔ انہوں نے روشنی کا بم پھینکنے یا کسی اور طریقے سے علاقے پر روشنی پھیلانے کی کوشش نہیں کی۔ شاید وہ خود بھی روشنی کی زد میں آنے سے ڈر رہے تھے۔ انہوں نے عجلت میں بس چند بم گرائے اور غائب ہوگئے۔ ہم نے طیارے کی صرف آواز ہی سُنی تھی۔"

"بم کہاں گرے؟" میں نے دریافت کیا۔

"سائٹ اور بستی کے درمیان۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔ "کافی وزنی بم تھے۔ زمین میں خاصے بڑے اور گہرے گڑھے پڑے ہیں۔ سائٹ کو بھی کچھ نقصان پہنچا ہے۔ ہمیں تو یہی محسوس ہوا تھا جیسے بم بستی پر ہی گرے ہیں۔ سب بدحواس ہوگئے تھے۔ اگر ان میں سے دو بم بھی بستی پر گرجاتے تو ہمارا تو کام تمام ہوجاتا۔"

انہوں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر سنجیدگی سے بولے۔ "اب تو میں ہنس رہا ہوں لیکن اس وقت میں بھی حیران و پریشان ہوگیا تھا۔ ویسے خواہ ہم پر کتنے ہی زور و شور سے حملہ ہوجاتا، مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی لیکن طیارے کے ذریعے بم گرائے جانا میرے لیے بھی ناقابلِ یقین تھا۔"

پھر انہیں جیسے کچھ یاد آیا۔ "سائٹ پر تو بجلی موجود ہے اور وہاں رات کو کچھ نہ کچھ لائٹس جلتی رہتی ہیں لیکن ہماری قسمت اچھی تھی کہ اس وقت وہاں لائٹ گئی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی اس قسم کے بریک ڈاؤن زحمت کے بجائے رحمت کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ وہاں بھی کافی آدمی موجود ہیں..... شاید روشنیاں دیکھ کر طیارہ وہیں بم گرا دیتا۔ جانی اور مالی، دونوں طرح کا نقصان ہوتا۔ بہرحال..... تمام تر تاریکی کے باوجود طیارے نے اپنے ٹارگٹ کے کافی قریب بم گرائے۔"

"اب آپ کہاں ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہم ادھر اُدھر مختلف ٹھکانوں پر بکھر گئے ہیں۔ بستی ہم نے فوراً خالی کردی تھی۔ اپنی ضروری چیزیں وہاں سے ہٹالی تھیں۔" انہوں نے بتایا۔

"اتنی جلدی؟" مجھے کچھ حیرت ہوئی۔

"خانہ بدوشی کی زندگی میں یہی تو مزہ ہے۔ نہ گھر بساتے دیر لگتی ہے اور نہ ہی اُجاڑتے ہوئے زیادہ وقت صرف ہوتا ہے۔" وہ ہنس کر بولے۔ "مجھے تو اس تجربے میں اتنا لطف آیا ہے کہ سوچ رہا ہوں ہر سال ایک آدھ ماہ کی چھٹی لے کر خانہ بدوشی کی زندگی گزارا کروں۔"

"جی ہاں۔ بطور شغل تو آپ کو اس میں لطف آئے گا۔ اگر خدانخواستہ ایسی زندگی آپ کا مقدر ہوتی تو پھر آپ کے خیالات کافی مختلف ہوتے۔" میں نے ملائمت سے کہا پھر پوچھا۔ "میرے ساتھی منیر اور مسعود کہاں ہیں؟"

"ایک معقول فلیٹ میں منتقل ہوگئے ہیں۔ باقی لوگ بھی اپنے اپنے ٹھکانوں پر موجود ہیں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم سب کا بوقتِ ضرورت ایک دوسرے سے رابطہ رہے گا۔" انہوں نے گویا مجھے تسلی دی پھر بولے۔ "کل ہی ہم نے بے احتیاطی کی اور علی الاعلان ان کے زیرِ زمین ٹھکانے تک پہنچے۔ آج اس کا ردِ عمل سامنے آگیا۔ تم میری احتیاطوں کو کھڑاگ اور فضولیات کہہ رہے تھے۔ ایک ہی دن ہم نے اپنی ڈرامے بازی ترک کی۔ چند گھنٹے بعد نتیجہ سامنے آگیا۔"

"چلیں.... بات کسی کنارے تو لگی۔ اب جو بھی قدم اُٹھانا ہوگا، کھل کر اُٹھائیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں، اب تو یہی سوچا ہے۔" نفیس صاحب ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "آج کل میں دروازہ بلاسٹ کرانا ہے۔ اب یہ کام تمام تر تیاریوں اور حفاظتی انتظامات کے ساتھ علی الاعلان دن میں کرائیں گے۔ اب کم از کم یہ اطمینان ہوگیا ہے کہ کوئی چیز سامنے تو ہے۔"

"اس مکان پر تو کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی جہاں اس زیرِ زمین راستے کا دہانہ دریافت ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ وہاں سے کسی گڑبڑ کی خبر نہیں آئی۔ کمانڈوز وہاں تعینات ہیں۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔ "میں بلاسٹ کے انتظامات کرا رہا ہوں۔ جو بھی پروگرام طے ہوا، تمہیں اطلاع مل جائے گی۔ تم، راحیلہ اور ٹونی تینوں کو آنا ہوگا۔ فی الحال اس بمباری والے واقعے کے بارے میں تحقیقات کے سلسلے میں بھی میرے رابطے جاری ہیں۔"

"یہ خاصا تشویش ناک واقعہ ہے نفیس صاحب! اس کا مطلب ہے کل کلاں کو کوئی نامعلوم طیارہ دارالحکومت میں داخل ہو کر کسی اور اہم مقام یا عمارت پر بھی بمباری کر کے فرار ہو سکتا ہے۔"

"نہیں خیر.... یہ اتنا آسان کام نہیں ہے لیکن یہ واقعہ بہرحال کئی شعبوں اور فورسز کو مزید الرٹ کر دینے کے لیے کافی ہے۔ یہ معلوم کرنا بھی ضروری ہوگا کہ اس مقصد کے لیے کس ملک کا ہوائی اڈا استعمال کیا گیا۔" نفیس صاحب پُرخیال لہجے میں بولے۔

میں نے ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تو سوچیں، اگر میں نے آپ کو روشنیوں کے بارے میں خبردار نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟"

"مجھے تو تم بھی مشکوک لگنے لگے ہو۔" نفیس صاحب کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔ "کہیں تم دشمن کے ایجنٹ تو نہیں ہو؟ ہم ذات کے زیرِ زمین اڈے کی تلاش میں اتنے دنوں سے ٹاک ٹوئیاں مار رہے تھے۔ تم نہ جانے کہاں کہاں سے بھٹکتے بھٹکاتے اتنے عرصے بعد آئے اور تم نے ایک دن میں ہی اس کا سرا ڈھونڈ نکالا۔ رات تم نے بظاہر ایک خامی کی نشاندہی کی کہ خانہ بدوشوں کی بستیوں میں اتنی رات گئے تک.... اور اتنی تعداد میں بتیاں نہ جلتیں۔ اس کے چند گھنٹے بعد حملہ ہوگیا۔ ایسا لگتا ہے کہ تمہیں یہ بات پہلے ہی سے معلوم ہوتی ہے۔ تم دشمن کے ایجنٹ معلوم ہوتے ہو۔ مخبری کے لیے ہماری صفوں میں شامل ہوئے ہو۔ میں سوچ رہا ہوں تمہیں گرفتار کر کے کسی دور دراز مقام پر بھجوا دوں۔"

"یہ تو بہت ہی نیک خیال آیا ہے آپ کو۔" میں نے اطمینان کی سانس لے کر کہا۔ "آپ اگر مجھے کچھ زیادہ ہی دور بھجوا دیں تو میں آپ کا بہت ہی زیادہ ممنون ہوں گا.... بلکہ بہتر ہوگا کہ آپ مجھے کسی دوسرے سیارے پر ہی بھجوا دیں۔ اس سے تو میرا دل بھر گیا ہے مگر کسی ایسی سیارے پر بھجوائیے گا جہاں اچھی اچھی.... خوبصورت.... پیاری پیاری لڑکیاں ہوں۔ راحیلہ جیسی بلیک اینڈ وہائٹ لڑکیاں نہ ہوں۔"

راحیلہ فون کے قریب منہ لا کر زور سے بولی۔ "جی ہاں انہیں ایسے سیارے پر ضرور بھجوائیے گا۔ مجھے یقین ہے دوسرے سیارے کی لڑکیوں نے ہماری دنیا کا بن مانس نہیں دیکھا ہوگا۔ بہانے دیکھ لیں گی۔"

نفیس صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے۔ "بھئی یہ دوسرے کی کھنچائی تم براہِ راست کرتے رہنا۔ مجھے بیچ میں نہ کھینچو۔"

"ویسے میں آپ کو خبردار کر رہا ہوں کہ میں واقعی دشمن کا ایجنٹ ہوں۔" میں نے نفیس صاحب سے کہا۔ "اگلی مرتبہ آپ کو کوئی خبردار کرنے والی نہیں بلکہ مروا دینے والی اطلاع دوں گا تاکہ "ایجنٹی" کا حق تو ادا ہو سکے۔"

نفیس صاحب نے قہقہہ لگایا اور خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ میں نے فون بند کر کے راحیلہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بمباری سے تو نفیس صاحب کا موڈ کافی خوشگوار ہوگیا ہے۔ معلوم ہوتا تو میں پہلے ہی کسی طرح ان کے آس پاس دو چار بم گروا دیتا۔ وہ تو قہقہے لگانے لگے ہیں۔"

"میرا خیال ہے لاشعوری طور پر وہ خود بھی خانہ بدوشی کی زندگی سے چھٹکارا پا کر خوش ہیں۔ ان کا یہ آئیڈیا کچھ زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہوا تھا۔ مجھے تو شروع ہی سے اس آئیڈیے نے اپیل نہیں کیا تھا لیکن میں ان کے عہدے اور بزرگی کے خیال سے چُپ تھی۔" راحیلہ بولی۔

"اگر تمہیں میرے کسی آئیڈیے سے اتفاق نہ ہوتا تو تم نہ صرف آئیڈیے کے بلکہ میرے بھی بخیے اُدھیڑ ڈالتیں۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔ "کاش میرے سامنے بھی تم کسی خیال سے خاموش رہا کرتیں۔"

"جب تم ان کی عمر کو پہنچو گے تو میں تمہارے سامنے بھی خاموش رہا کروں گی۔ گو کہ تم ان جیسے کسی عہدے کے مالک نہیں ہوگے۔ اس وقت میں کم از کم اس خیال سے ہی خاموش رہا کروں گی کہ چلو.... جانے دو.... بے چارے بڑے میاں کا ذہنی توازن ہی ٹھیک نہیں ہے۔ ان سے کیا بحث کرنا۔"

"ویسے یہ تمہاری غلط فہمی ہے کہ میں اس وقت کسی بڑے عہدے پر فائز نہیں ہوں گا۔ میرے پاس اس وقت ایک بہت بڑا عہدہ ہوگا۔ تمہیں اس کا احترام ضرور کرنا ہوگا۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"کون سا عہدہ؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے شوہرِ نامدار کا عہدہ۔" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے کے سرخ و سفید حصے پر سرخی ذرا بڑھ گئی۔ اس نے ایک کشن اُٹھا کر مجھ پر پھینکا لیکن میں جھکائی دے کر بچ گیا۔ وہ خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ "اس انتظار میں کہیں جوانی نہ گزار دینا۔ میرا مخلصانہ اور مفلسانہ یعنی مفت مشورہ یہی ہے کہ جونہی کوئی ڈھنگ کی لڑکی ملے، شادی کر گزرنا۔"

"لڑکیاں تو بہت ملتی ہیں۔ کوئی راحیلہ نہیں ملتی۔"

"میں تمہارے لیے ناشتا لاتی ہوں۔" وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

"میں راحیلہ کی بات کر رہا تھا، تم ناشتا لینے چل دیں۔ بھلا ناشتے اور راحیلہ میں کیا قدرِ مشترک ہے؟" میں نے اس کے پیچھے لپکتے ہوئے کہا۔

"قدرِ مشترک بس یہی ہے کہ یہ ناشتا راحیلہ بنانے جا رہی ہے۔" وہ رک کر مڑتے ہوئے بولی۔ "اور تم سے درخواست ہے کہ تم یہیں بیٹھے رہو.... خوامخواہ کچن میں آ کر میرے سر پر کھڑے مت ہو جانا۔"

"میرا وعدہ ہے میں فرش پر ہی کھڑا رہوں گا۔" میں نے کہا۔ "سر پر کھڑے ہونے کی مجھے پریکٹس نہیں ہے۔"

"دیکھو.... مذاق کی بات نہیں ہے۔ تم یہیں بیٹھے رہو ورنہ میں فلائنگ کک مار دوں گی۔"

"آخر ایسا کون سا خفیہ قسم کا ناشتا بنانے جا رہی ہو کہ تمہیں میرا کچن میں کھڑے ہونا بھی گوارا نہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"بھئی میں.... خوامخواہ ڈسٹرب ہوتی ہوں۔ ناشتا ٹھیک سے نہیں بنے گا۔" وہ جھنجلا کر بولی۔

"اتنی سی بات پہ تم دولتیاں مارنے پہ تُلی ہوئی ہو؟" مجھے گویا اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔

"ہاں۔" اس نے پاؤں پٹخ کر جواب دیا۔

"مجھے اس پر بھی حیرت ہے کہ تم ڈسٹرب بھی ہوتی ہو۔"

"کیوں.... کیا میں انسان نہیں ہوں؟" اس نے جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

"میرا خیال تھا کہ تم انسان کے روپ میں کوئی فیمیل جن ہو۔" میں نے معصومیت سے کہا۔

"میں ایک انسان ہوں اور خالصتاً عورت ہوں۔ اگر تم نے مجھے اس مقام سے ہٹانے کی کوشش کی تو میں فرائنگ پین مار کر تمہاری کھوپڑی توڑ دوں گی۔" وہ ایک بار پھر کچن کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ "میرے پیچھے مت آنا۔"

میں نے اس کی ایک نہ سُنی اور کچن کے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ وہ گویا مجھے قطعی نظرانداز کرتے ہوئے ناشتا تیار کرنے میں مصروف ہوگئی۔ میں بغلوں میں ہاتھ دیے نہایت سعادت مندانہ انداز میں خاموشی سے کھڑا رہا۔ آخر وہ چُپ نہ رہ سکی۔ میری طرف مڑتے ہوئے بولی۔ "تمہیں کیا لڑکیوں کو کچن میں کام کرتے دیکھنے کا بہت شوق ہے؟"

"سب لڑکیوں کو نہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں جواب دیا۔ "بعض لڑکیاں تو پیدا ہی کچن میں کام کرنے کے لیے ہوتی ہیں۔ مجھے تو اس لڑکی کو دیکھنے کا شوق ہے جو خالی ہاتھ بھی مَردوں کی ہڈیاں توڑ سکتی ہے۔ خطرناک آتشیں اسلحہ ہاتھ میں ہو تو کشتوں کے پشتے لگا سکتی ہے۔ اور بوقتِ ضرورت کچن میں گھس کر بہت اچھا کھانا بھی پکا سکتی ہے۔"

"زیادہ مکھن لگانے کی ضرورت نہیں۔ اب مجھ پر اس قسم کی مسکا پالش کا اثر نہیں ہوتا۔" وہ منہ بنا کر بولی اور دوبارہ فرائنگ پین کی طرف متوجہ ہوگئی۔

"میں.... اور تمہیں مکھن لگاؤں؟" میں نے اپنے لہجے میں حقارت لانے کی پوری پوری کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میرا بس چلے تو میں تمہیں لوہے کے تاروں والے برش سے تارکول لگاؤں۔"

"جا اپنی حسرتوں پر آنسو بہا کے سو جا۔" وہ انڈا توڑتے ہوئے بولی۔

"یہ تم مجھ سے کہہ رہی ہو یا اس چوزے سے جسے اس انڈے سے نکلنا نصیب نہ ہو سکا؟" میں نے پوچھا۔

"جنم نہ لے سکنے والے چوزے سے اگر مجھے کچھ کہنا ہوتا تو یہ کہتی، حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔"

"اب تو میں بھی خود کو ایسا ہی کوئی غنچہ محسوس کرنے لگا ہوں۔" میں نے غمزدہ لہجے میں کہا۔

"تم غنچہ ہو؟" اس نے پلٹ کر مجھے گھورا۔ "تم تو پھول ہو۔

اور وہ بھی گو بھی کا۔" وہ دوبارہ کوکنگ رینج کی طرف گھوم گئی۔

"اللہ بے قدروں سے بھی کسی کا واسطہ نہ ڈالے۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

ناشتا تیار کر کے اس نے ٹونی کو بھی اندر بلا لیا۔ اس کے آنے سے پہلے وہ بولی۔ "ناشتا تو اسپتال کے میس سے بھی آتا ہے لیکن اس میں ابھی دیر ہے۔ مجھے اگر ان کے مقررہ اوقات سے پہلے بھوک لگتی ہے یا کسی چیز کی طلب ہوتی ہے تو میں ان کا انتظار نہیں کرتی۔"

"بہت اچھا کرتی ہو۔ ہر بے صبرے کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔

"میں بے صبری ہوں؟" اس نے ایک بار پھر مجھے گھورا اور جواب کا انتظار کیے بغیر بولی۔ "اچھا... ٹھیک ہے... جاؤ... جا کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھو اور آرام سے میس سے کھانا آنے کا انتظار کرو۔ یہ ناشتا میں نے صرف اپنے لیے بنایا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔ "میں تو صحرا کا اونٹ ہوں۔ کھانا میسر آجائے تو ڈٹ کر کھاتا ہوں۔ میسر نہ آئے تو دو تین دن آرام سے کچھ کھائے بغیر گزار سکتا ہوں۔ میس سے ناشتا آنے کا تھوڑی دیر انتظار کرنا میرے لیے کون سا مشکل کام ہے۔"

وہ ڈائننگ ٹیبل پر آبیٹھی اور اکیلی ناشتا کرنے لگی۔ میں اس کے مقابل دونوں کہنیاں میز پر ٹکا کر ایک ٹک اسے گھورنے لگا۔ نہایت سنجیدگی سے سر جھکائے اس نے چند نوالے چبائے۔ آخر سر اٹھا کر بولی۔ "یہ تم گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں تمہیں نظر لگا رہا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ندیدے کہیں کے...! لو... کھالو... ٹھونس لو تم بھی۔" وہ پلیٹیں میری طرف کھسکاتے ہوئے بولی۔ "مگر نظر مت لگاؤ۔"

میں نے جلدی سے پلیٹوں پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔

وہ دن تقریباً سہ پہر تک اسی طرح راحیلہ سے چھیڑ چھاڑ کرتے اور کچھ آرام کرتے گزرا۔ ایک مدت بعد اتنے خوشگوار انداز میں وقت گزارنے کا موقع ملا تھا۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وقت مجھ پر اتنا مہربان بھی ہو سکتا تھا۔ حتیٰ کہ دوپہر کا کھانا کھا کر میں کچھ دیر سونے کے ارادے سے بھی لیٹ گیا۔ یہ ایک ایسی عیاشی تھی جس کا میں نے عرصے سے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

اس بار مجھے راحیلہ نے ہی جگایا اور اس بار بھی اس کی وجہ نفیس صاحب کا ہی فون تھا لیکن ان سے میری بات نہیں ہوئی۔ راحیلہ نے جب مجھے جگایا تو وہ اپنے مخصوص "سیاہ پوش حسینہ" والے حلیے میں تیار کھڑی تھی۔

"نفیس صاحب کا فون آیا تھا..." اس نے بتایا۔ "میں نے تمہیں اس لیے نہیں جگایا کہ اس طرح تم چند منٹ اور آرام

کرلوگے۔ ویسے بھی وہ عجلت میں تھے۔ میں نے ہی ان سے بات کرلی۔ فوراً تیار ہو جاؤ۔ ہمیں چلنا ہے۔"

"کہاں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ میری غنودگی فو کافور ہو چکی تھی۔

"وہ جو منحوس دروازہ تم نے دریافت کیا ہے اسے بلا کرنے کے انتظامات مکمل ہو گئے ہیں۔ نفیس صاحب نے کہیں قریب ہی کیمپ لگایا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ بلاسٹ کے ہم سب وہاں موجود ہوں۔ اگر راستہ کھل گیا تو پھر ان کے سا ہی اندر جائیں گے۔ ان کے آدمی اس پورے علاقے کو رکھنے پر مامور ہوں گے اور اگر باہر سے کوئی خطرہ نظر آیا تو سے نمٹیں گے۔" راحیلہ نے بتایا۔

"چلو بھئی... اس کارِ خیر میں بھی حصہ لینا ہی پڑے گا۔ نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "میں ذرا منہ پر پانی کے د مارلوں۔"

"اس سے تم زیادہ حسین نہیں ہو جاؤ گے۔ وہی بن ما بن مانس ہی رہو گے۔" وہ زیرِ نقاب بولی۔

"یہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ چہرے پر پانی کے دو چھینٹے سے انسان حسین نہیں ہو جاتا۔ میں تو سستی اتارنے کے ذ کہہ رہا ہوں۔"

"سستی اتارنے کا بہترین طریقہ تو یہ ہے کہ مجھ سے ک ایک ڈنڈا کھالو۔" اس نے ہانک لگائی۔ میں اس وقت تک روم کے واش بیسن پر پہنچ چکا تھا۔ منہ دھو کر اور جوتے پہ اس کے ساتھ ہو لیا۔

وہی بڑی سی ویگن جس پر سرخ حروف میں ایک مش طبّی ادارے کا نام درج تھا' دروازے سے لگی کھڑی تھی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ میں اس کے برابر بیٹھا اور ٹو ہماری سیٹوں کے نیچے آٹومیٹک گنیں موجود تھیں۔ ویگن ت سے روانہ ہو گئی۔

راستے میں میں نے راحیلہ سے پوچھا۔ "تمہارے کیا ہمیں ریڈ ڈاٹ کے اس ٹھکانے پر کوئی ملے گا... یا چیزیں ہاتھ آسکیں گی؟"

"تم نے جو راستہ دریافت کیا ہے میں اس کے در کر سکی لیکن مجھے کچھ ایسا لگ رہا ہے کہ اب ہمیں وہار کوئی آدمی ملے گا اور نہ ہی کوئی کام کی چیز ہاتھ آسکے بلا تامل بولی۔

"مجھے بھی کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔" میں نے

"مجھے آپ دونوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے خو عقب سے ٹونی بولا۔

"اس وقت سنجیدہ مذاکرہ ہو رہا ہے۔ تم اس میں ک کر اسے ٹی وی کا مذاکرہ بنانے کی کوشش مت کرو۔" می

مسکرا کر اسے ڈانٹا۔

"دوسرا میں نے یہ رائے انتہائی سنجیدگی سے دی تھی۔" ٹونی احتجاجی لہجے میں بولا۔

راحیلہ اس کی طرف توجہ دیے بغیر بولی۔ "میرے خیال میں ریڈ ڈاٹ والوں کو بہت پہلے اندازہ ہو گیا تھا کہ ہم آخر کار کسی نہ کسی طرح ان کے ٹھکانے تک پہنچ ہی جائیں گے... اور کچھ نہیں تو شاید قسمت ہی ہمارا ساتھ دے دے۔ جس طرح ان کے لاہور والے ٹھکانے کے معاملے میں قسمت نے ہمارا ساتھ دیا تھا۔ یہ سوچ کر انہوں نے اس ٹھکانے کو پہلے ہی مکمل طور پر خالی کر دیا ہوگا۔"

"اس کے علاوہ ایک اور علامت سے بھی اس کی تصدیق ہوتی محسوس ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ "وہ یہ کہ ان کی طرف مکمل سکوت طاری تھا۔ کوئی کارروائی دیکھنے میں نہیں آرہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ بستر بوریا سمیٹ کر کہیں چلے گئے ہوں۔"

"یہ ضروری نہیں ہے۔" راحیلہ نے میری رائے سے اتفاق نہیں کیا۔ "ہو سکتا ہے ہم نفیس صاحب کی بہروپ بازیوں کی وجہ سے اب تک ان کی نظر سے بچے رہے ہوں۔ کل ہی انہیں کسی طرح پتا چلا ہوگا کہ خانہ بدوشوں کی بستی یا واٹر سپلائی اسکیم کی سائٹ سے کچھ لوگ ان کے ٹھکانے تک پہنچے تھے تو اسی رات اس کا ردِعمل سامنے آگیا۔ ان میں سے کسی ایک یا شاید دونوں ہی جگہوں پر بمباری کی کوشش کی گئی۔ ہماری قسمت اچھی تھی کہ یہ کوشش ناکام ہو گئی۔"

"انہیں پتا چلنے کا مسئلہ بھی عجیب ہے۔" میں نے کہا۔ "اس مکان پر جو دو آدمی موجود تھے... جو بظاہر باپ بیٹا معلوم ہوتے تھے... دونوں ہی ہمارے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں کسی کو کوئی پیغام دینے کا بھی موقع نہیں ملا تھا اور نہ ہی وہاں دور دور تک ہمیں دیکھنے والا کوئی اور شخص موجود تھا۔ اس کے باوجود ریڈ ڈاٹ والوں کو کیسے اطلاع مل گئی؟"

"اس قسم کے کمالات تو پہلے بھی ہوتے رہے ہیں۔" راحیلہ بولی۔ "ہم اسی نتیجے پر پہنچے تھے کہ مختلف جگہوں پر کسی نہ کسی شکل میں خفیہ آلات موجود ہوتے تھے جن کی وجہ سے انہیں تمام باتوں اور نقل و حرکت کا پتا چلتا رہتا تھا۔"

اس کی بات تقریباً درست ہی تھی۔ میرا ذہن ایک بار پھر اس سوال میں الجھ کر رہ گیا تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے ہاتھ کہاں تک پہنچے ہوئے تھے۔ "بمباری کا واقعہ بھی کافی حیران کن ہے۔" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں اس کے لیے کون سے پڑوسی ملک کا ہوائی اڈا استعمال کیا گیا ہوگا۔"

"کوئی بھی مخالف ملک ہمارے کسی بھی بدخواہ کو اس قسم کا تعاون فراہم کر سکتا ہے۔ ویسے بھی ان لوگوں کو سپر پاورز کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یہ ان کے اثر و رسوخ اور دباؤ کے ذریعے کسی بھی ملک سے کوئی کام لے سکتے ہیں۔ یہی سپر پاورز پڑوسیوں سے ہمارے تعلقات خوشگوار نہیں ہونے دیتیں۔ یہ کوئی ایسا کام نہیں تھا جس کے لیے ریڈ ڈاٹ جیسی تنظیم کو کوئی مشکل پیش آتی۔"

پھر راحیلہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "ویسے بھی تمہارے ذہن کی سوئی صرف اس نکتے پر نہیں اٹکنی چاہیے کہ اس کام کے لیے کسی پڑوسی ملک ہی کا ہوائی اڈا استعمال کیا گیا ہوگا۔ جب ہمارے ہاں اسلحے کے ٹرک کے ٹرک آکر گنجان آباد شہری علاقوں میں غائب ہو سکتے ہیں... پچاسوں تخریب کار اور دہشت گرد سرحدیں پار کر کے ملک میں غائب ہو سکتے ہیں اور انٹیلی جنس ایجنسیاں ان کے بارے میں رپورٹیں نشر کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتیں... بڑی طاقتوں کے ادارے ریسرچ اور جیالوجیکل سروے یا مختلف ٹھیکوں کی آڑ میں یہاں زیرِ زمین قلعے تعمیر کر کے چلے جاتے ہیں اور ہمیں کانوں کان خبر نہیں ہوتی تو پھر کوئی بعید نہیں کہ یہاں کہیں کوئی خفیہ ہوائی اڈا بھی موجود ہو جو نہ جانے کب سے کن مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا ہو۔"

اس کے دھیمے لہجے میں بے پناہ تاسف جھلک آیا۔ "یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے لیکن بہرحال ہم اس سے نظر نہیں چرا سکتے۔ قدرت نے نہایت طویل و عریض خطہ عطا کیا جس میں ہر طرح کی زمین' ہر طرح کا علاقہ ہر طرح کے موسم میسر تھے۔ بعض جگہیں تو بنی بنائی جنت تھیں لیکن افسوس کہ ہم اسے مزید خوبصورت بنانا تو درکنار' صحیح طور پر اس کی نگرانی اور دیکھ بھال بھی نہیں کر سکے۔ عین ہماری ناک کے نیچے نہ جانے کیا کچھ ہوتا رہتا ہے اور متعلقہ لوگ صرف اس وقت ہوش میں آتے ہیں جب پانی سر سے گزر چکا ہوتا ہے۔"

راحیلہ کی سنجیدگی نے مجھے بھی سنجیدہ کر دیا۔ ہم ان مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے خانہ بدوشوں کی بستی تک جا پہنچے لیکن وہ بستی اب بستی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی پیوند زدہ بے ہنگم خیموں اور ٹوٹے پھوٹے چھپروں پر مشتمل بستی کوئی بستی نہیں ہوتی لیکن انسانوں کے دم سے وہ بھی آباد لگتی ہے' بھلی لگتی ہے۔ اب انسان نہیں رہے تھے تو اجاڑ اور بدصورت لگ رہی تھی۔ ویرانی ایک عفریت کی طرح منہ کھولے کھڑی تھی۔ کچھ چھوٹے موٹے خیمے جو محض پھٹے ہوئے کپڑوں اور ڈنڈوں سے بنائے گئے تھے' زمیں بوس ہو چکے تھے۔ چیزیں گلیوں میں بکھری پڑی تھیں۔ چند کتے ادھر ادھر مختلف چیزوں کو سونگھتے پھر رہے تھے۔ کتے صرف آبادیوں ہی میں نہیں ہوتے' ویرانوں میں بھی نہ جانے کہاں سے پہنچ جاتے ہیں۔

بستی کی حالت دیکھ کر مجھے نہ جانے کیوں ہنسی آگئی۔ میں نے راحیلہ سے کہا۔ "نفیس صاحب اور ان کے آدمیوں نے اس طرح فرار ہو کر گویا اپنا پول خود کھول دیا ہے۔ انہوں نے گویا تسلیم کر لیا کہ وہ جعلی خانہ بدوش تھے۔"

"بمباری ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا پول تو کھل ہی چکا تھا۔" راحیلہ بولی۔ "اب اپنے بہروپ پر مصر رہنا بے وقوفی تھی۔"

"ہوسکتا ہے ابھی ریڈ ڈاٹ کو صرف شک ہی ہوا ہو لیکن ان لوگوں کے فرار نے ان کے شبے کی تصدیق کردی ہوگی۔" میں نے کہا۔

"احتیاط بہتر تھی۔" راحیلہ گاڑی کچے کی طرف موڑتے ہوئے بولی۔ "ویسے اگر یہاں اصلی خانہ بدوش ہوتے تو وہ بھی اتنے قریب بمباری ہونے پر بھاگ چکے ہوتے۔"

"لیکن اپنا آدھے سے زیادہ سامان چھوڑ کر نہ بھاگتے۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ "خیر.... اب اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ راستہ تو دریافت ہو ہی چکا ہے۔ اب تو کھل کر سامنے آنا ہی پڑتا۔"

"بعض اوقات تم خود ہی اپنی بات کی تردید کرنے لگتے ہو۔" راحیلہ بولی۔

"میں اصل میں بہ آواز بلند "سوچ" رہا ہوتا ہوں۔ متضاد قسم کے خیالات بھی ذہن میں آتے ہیں۔ سوچ بچار سے انسان کسی صحیح نتیجے پر پہنچ جاتا ہے۔" میں نے کہا۔

"گویا تم زیرِ تربیت فلسفی ہو۔" راحیلہ بولی۔

"نہیں۔ میں تو فارغ التحصیل فلسفی ہوں.... لیکن مسئلہ یہ ہے کہ زیرِ تربیت اور فارغ التحصیل.... دونوں قسم کے فلسفی ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

اس وقت ہم اس جگہ سے گزر رہے تھے جہاں بم گرے تھے۔ زمین میں کافی گہرے گڑھے پڑے تھے اور وہاں سے زمین جھلسی ہوئی تھی۔ تمام بم ایک سیدھ میں ہی گرے تھے۔ اب وہاں بہت سے مسلح افراد تعینات تھے۔ وہ باوردی نہیں تھے لیکن ان کی شخصیت بتا رہی تھی کہ وہ کون تھے۔ بموں کے ٹکڑے دور دور تک بکھرے ہوئے تھے۔

"اب یہ لوگ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" میں نے حیرت سے گویا خود سے سوال کیا۔

"یہ شاید ان گڑھوں کی حفاظت کر رہے ہیں۔" راحیلہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔ "یہ ہمارے ہاں کی پرانی روایت ہے۔ سانحے یا حادثے کی پیش بندی کوئی نہیں کرتا لیکن جب سانحہ رونما ہوجاتا ہے تو بعد میں وہاں بہت سے لوگ اسلحہ بارود لے کر ڈیرا ڈال کر بیٹھ جاتے ہیں اور اونگھتے رہتے ہیں۔"

"بعض اوقات اس لیے بھی ایسا ہوتا ہے کہ وہاں سے شہادتیں جمع کرنے کا کام ابھی باقی ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت کم ایسا ہوتا ہے۔" راحیلہ بولی۔ "اکثر اوقات تو کسی کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ ان لوگوں کو وہاں کیوں بٹھایا گیا ہے۔ بس یہ ایک روایت ہے جو آنکھیں بند کر کے نبھائی جاتی ہے۔"

اس وقت ہم ناہموار علاقے سے گزر رہے تھے۔ گاڑی ہچکولے کھاتی ہوئی جارہی تھی۔ میں نے راحیلہ سے پوچھا۔ "تمہیں اس جگہ کا اندازہ بھی ہے جہاں ہمیں پہنچنا ہے؟"

"ہاں۔ صحیح اندازہ کرنے کے لیے ہی تو میں خانہ بدوشوں کی بستی تک آئی ہوں اور یہاں سے سمت متعین کر کے چلی ہوں ورنہ بہت پہلے ہی کچے کی طرف مڑ گئی ہوتی۔"

وہاں متعین افراد ہماری گاڑی دیکھ کر چوکنا ہوگئے تھے لیکن ان میں سے کسی نے ہمیں رکنے کا اشارہ نہیں کیا۔ ویسے بھی ان کے اور ہمارے درمیان کافی فاصلہ تھا۔ طاقتور انجن والی گاڑی اونچے نیچے راستوں پر غراتی، ہچکولے کھاتی بڑھتی چلی گئی۔

اس قسم کے ویرانوں میں کسی سمت نما آلے کے بغیر یہ مشکل ہوتا ہے کہ آپ صحیح سمت میں جا رہے ہیں یا نہیں؟ لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ راحیلہ اسی سمت میں جارہی تھی جدھر ہم مکان کے اندر راستہ دریافت کیا تھا۔

وہاں تک پہنچنے سے بہت پہلے ہی ہمیں ویرانے میں بہت لوگ بکھرے ہوئے دکھائی دیے۔ سب کے سب مسلح تھے۔ وہ لباسوں میں تھے لیکن سب کے سروں پر ہیلمٹ تھے۔ کئی جگہوں مشین گنیں فٹ تھیں۔ مختلف مقامات پر کچھ ٹرک اور دوسری گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ کئی سبز جیپیں بھی تھیں۔ دور تک ایک خاص ترتیب سے جوان پوزیشنیں سنبھالے کھڑے تھے۔ تاہم زمین پر بہت دور تک خشک چونے سے کچھ لکیریں بھی کھنچی آرہی تھیں جیسے کچھ مخصوص جگہوں کی نشاندہی کی گئی ہو۔

بہت دور پس منظر میں وہ مکان بھی نظر آرہا تھا جہاں ہم گزرے روز آئے تھے اور جس میں زیرِ زمین راستے کا دہانہ موجود تھا۔ اس کے آس پاس تو کوئی نظر نہیں آرہا تھا لیکن کافی فاصلہ چھوڑ کر اسے کئی افراد نے گھیرے میں لیا ہوا تھا۔ دو مشین گنیں وہاں بھی فٹ تھیں۔ ممکن تھا مکان کے عقب میں کچھ اور لوگ یا مزید گنیں موجود رہی ہوں۔

ہم ابھی اس مقام سے دور ہی تھے کہ اچانک ایک سبز جیپ اسٹارٹ ہوئی اور تیزی سے ہماری طرف آنے لگی۔ اس میں بھاری گنیں لیے چار افراد موجود تھے۔

میں نے مسکراتے ہوئے راحیلہ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "نفیس صاحب نے تو یہاں پورا میدانِ جنگ کا سا نقشہ تخلیق کیا ہے۔"

"وہ ہر کام اسی طرح اہتمام سے کرتے ہیں۔" راحیلہ بولی۔

جیپ ڈرامائی انداز میں سامنے آرکی۔ اس نے ویگن کا راستہ روک لیا۔ چاروں افراد جیپ سے کود پڑے اور انہوں نے ویگن کو گھیر لیا۔ راحیلہ نے گاڑی سے اترنے کی زحمت نہیں کی۔ صرف اپنی طرف کی کھڑکی کا شیشہ اتار لیا۔ ایک نوجوان جو آفیسر معلوم ہوتا تھا، گن سنبھالے کھڑکی کے قریب آیا اور بہت غور سے راحیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "یور آئیڈنٹٹی پلیز...."

راحیلہ کے چہرے کا ذرا سا بھی حصہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے ایک کمپیوٹرائزڈ کارڈ نکال کر اس کے سامنے کردیا۔ اس پر راحیلہ کی تصویر موجود تھی لیکن آفیسر نے تصویر اس کی شکل سے ملانے کی فرمائش نہیں کی اور فوراً پیچھے ہٹ گیا۔ راحیلہ نے خود ہی اسے اشارے سے دوبارہ قریب بلایا اور پوچھا۔ "نفیس صاحب کہاں ہیں؟"

اس نے بہت دور کھڑے ہوئے سرخ رنگ کے ایک ٹریلر کی طرف اشارہ کیا اور شائستگی سے بولا۔ "وہ آپ کو اس میں ملیں گے اور شاید وہ آپ ہی کا انتظار کر رہے ہیں۔"

اس نے ہمارے بارے میں کچھ نہیں پوچھا۔ راحیلہ نے گاڑی آگے بڑھادی۔ سرخ ٹریلر مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ہم مستعد جوانوں کی قطار کے قریب سے گزرتے ہوئے سرخ ٹریلر تک جا پہنچے۔ راحیلہ نے گاڑی پارک کی، تب تک ٹریلر کا دروازہ کھل چکا تھا اور نفیس صاحب سامنے کھڑے نظر آرہے تھے لیکن اب وہ ایک قطعی بدلے ہوئے انسان نظر آرہے تھے۔ انہوں نے خانہ بدوشوں والی کینچلی اتار دی تھی اور اپنے اصل روپ میں آگئے تھے۔ اس وقت وہ گہرے سبز رنگ کے سفاری سوٹ میں تھے۔ دانتوں میں ان کا مخصوص شناختی نشان یعنی سگار دبا ہوا تھا۔ میں یہ تغیر، یہ انقلاب دیکھ کر مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔

وہ ٹریلر بھی بہت ہی خاص قسم کا تھا۔ سائز میں بہت بڑا تھا اور اس کے ساتھ جو انجن منسلک تھا وہ بھی کچھ خاص ہی قسم کا تھا۔ اس کی چھت پر ائرکنڈیشننگ سسٹم اور غالباً جنریٹر بھی نصب تھا۔ ٹریلر کی چھت پہ ڈش لگی نظر آرہی تھی۔ اس کے پچھلے حصے میں کھلے دروازے کے پیچھے سے کئی موٹی اور باریک تاریں اس مکان کی طرف جارہی تھیں جس میں زیرِ زمین راستے کا دہانہ تھا۔

ہم لوگ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ نفیس صاحب بے تابی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولے۔ "بھئی تم لوگ جلدی سے آجاؤ۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔"

"کیا ہم لوگ چاند کی سیر کو جارہے ہیں؟" میں نے قریب پہنچ کر پوچھا۔

"ہاں اگر بائی روڈ چاند کی سیر کو جایا جاسکتا ہے تو ہم تمہیں اس کے لیے بھی لے چلیں گے برخوردار!" نفیس صاحب کا موڈ خوشگوار معلوم ہوتا تھا۔

ہم ٹریلر کے اندر پہنچ گئے اور نفیس صاحب نے دروازہ بند کردیا۔ ٹریلر ائرکنڈیشنڈ تھا اور ٹی وی والوں کی او۔ بی وین سے مشابہ معلوم ہو رہا تھا جس میں وہ لوگ آؤٹ ڈور براڈ کاسٹنگ یا ریکارڈنگ کے لیے جاتے تھے۔ اس کی ایک دیوار کے ساتھ نہ جانے کیسی کیسی مشینیں اور آلات نصب تھے۔ ایک کاؤنٹر پر تین کمپیوٹرز کے مانیٹرز بھی نظر آرہے تھے۔ دونوں طرف ٹیلر کی لمبی دیواروں میں ٹنٹڈ گلاس کی مستطیل پٹیاں نصب تھیں جن سے باہر کا منظر اچھی طرح دیکھا جاسکتا تھا۔ انہی پٹیوں پر دو عدد دوربینیں بھی نصب تھیں جو مختلف زاویوں پر گھوم سکتی تھیں۔ راحیلہ نے بھی یہ ٹریلر غالباً پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ وہ بھی بڑی دلچسپی سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔

"آپ نے تو بہت جلدی بہت لمبے چوڑے انتظامات کر ڈالے۔" میں نے حقیقتاً ذرا حیرت سے کہا کیونکہ رات کے پچھلے پہر تو خانہ بدوشوں والی بستی اجڑی تھی۔ اس کے بعد سب لوگوں نے متبادل جگہوں پر پناہ بھی لی تھی۔ نفیس صاحب نے جون بھی بدلی تھی اور یہ سب کچھ بھی کیا تھا۔ دروازہ بلاسٹ کرنے اور اس کے ردِعمل سے نمٹنے کے انتظامات کافی تسلی بخش نظر آرہے تھے۔

پھر میں نے ٹریلر کے در و دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "اور یہ تو آپ نے اچھا بھلا سائنس فکشن فلموں والا سیٹ لگا رکھا ہے۔"

نفیس صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "میں نے سوچا ریڈ ڈاٹ والے تو ہمیں اپنی سائنسی ایجادات سے بہت مرعوب کرچکے ہیں۔ ہمارے پاس بھی غریبی دعوے کی جو دو چار چیزیں موجود ہیں انہیں ہم بھی کام میں لانے کی کوشش کریں۔"

ٹریلر میں نفیس صاحب کے علاوہ بھی دو افراد موجود تھے۔ ایک تو وہی انجینئر ابصار تھا جس سے میں پہلے بھی مل چکا تھا۔ دوسرا ایک عمر رسیدہ شخص تھا جو کچھ زیادہ ہی خاموش طبع معلوم ہوتا تھا۔ وہ اسٹول پر بیٹھا تھا اور مانیٹرز کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے محض ایک نظر ہماری طرف دیکھا اور دوبارہ اسکرینوں کا جائزہ لینے لگا جن پر کچھ ہندسے اور ننھی ننھی سی تصویریں ناچ رہی تھیں۔ نفیس صاحب نے بھی اس سے ہمارا تعارف کرانے کی زحمت نہیں کی۔

"بلاسٹ کے انتظامات مکمل ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔ "دروازے پر ڈائنامائٹ نصب کیے جاچکے ہیں۔ تمام تیاریاں مکمل ہیں۔ صرف سوئچ دبانے کی دیر ہے۔"

پھر نفیس صاحب خاص طور پر مجھ سے مخاطب ہوئے۔ "تمہارے ساتھی شفیع شاہ، حنیف اور سردار شیخ بھی آئے ہوئے ہیں۔"

"وہ کہاں ہیں؟" میں نے بے تابی سے پوچھا۔

"انہیں مکان کے عقب میں تعینات کیا گیا ہے لیکن تمہیں ابھی ان سے ملنے اور جذباتی سین تخلیق کرنے کی ضرورت نہیں۔" نفیس صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ "مصافحے معانقے کرنے، ایک دوسرے کی پسلیاں کڑکڑانے اور خیر و عافیت دریافت کرنے کے لیے بہت وقت پڑا ہے۔ پہلے تم پروگرام سُن لو۔"

"کیا یہاں کوئی تقریب ہو رہی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تقریب نہیں، تخریب کہو۔ تعمیری قسم کی تخریب.... یا یوں کہو کہ تخریب برائے تعمیر۔" نفیس صاحب بولے۔ "بلاسٹ کے

بعد ہم لوگ کچھ دیر انتظار کریں گے تاکہ سرنگ سے گیس وغیرہ نکل جائے اور اگر اس دوران کوئی ردِ عمل سامنے آنا ہو تو آجائے۔ اس کے بعد ہم چاروں یعنی میں 'تم' راحیلہ اور ٹونی ایک کھلی جیپ میں بیٹھ کر اسلحے کے ساتھ سرنگ میں داخل ہوں گے۔ ہمارے پیچھے دوسری جیپ میں شفیع شاہ' سردار شیخ' حنیف' منیر اور مسعود ہوں گے۔ ان کے پیچھے تیسری گاڑی میں خاص قسم کا عملہ اپنے ضروری سازوسامان کے ساتھ ہوگا۔ اگر بلاسٹ سے بہت زیادہ ملبہ گرا ہوگا' یا اس مقام پر سرنگ بیٹھ گئی ہوگی تو وہ عملہ راستہ صاف کرے گا۔ اس کے بعد ہماری دونوں گاڑیاں باری باری اندر داخل ہوں گی۔ باہر دوسرے لوگوں سے ہمارا رابطہ رہے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو ہم فوری طور پر کمک طلب کرلیں گے۔"

پھر انہوں نے شیشے کے پار ہمیں زمین پر چونے سے کھینچی ہوئی لکیریں دکھاتے ہوئے کہا۔ "وہ جو دو متوازی لکیریں مکان کی طرف سے آتی دکھائی دے رہی ہیں' وہ اس زیرِ زمین راستے کی نشاندہی کرتی ہیں جو مکان سے اس آہنی دروازے تک جارہا ہے اور وہ جو ایسی ہی دو لکیریں بہت دور سے آتی دکھائی دے رہی ہیں' وہ اس سرنگ کی نشاندہی کرتی ہیں جو ہم نے تیار کرائی تھیں اور ان دونوں کے سنگم پر جو ایک بہت بڑا مستطیل خانہ نظر آرہا ہے یہ اس زیرِ زمین ٹھکانے کی نشاندہی کرتا ہے۔ اس کی لمبائی چوڑائی کا تعین کچھ آلات کی مدد سے اور کچھ اندازے کیا گیا ہے لیکن یہ اندازے غلط بھی ہوسکتے ہیں۔"

ایک لمحے کے توقف سے نفیس صاحب بولے۔ "تم کچھ پوچھنا چاہو تو پوچھ سکتے ہو۔ کوئی تجویز پیش کرنا چاہو تو کرسکتے ہو۔"

"میں ایک ضروری سوال کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے ہاتھ ذرا اونچا کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں.... ہاں.... پوچھو۔" نفیس صاحب اشتیاق سے بولے۔

"ایک گلاس ٹھنڈا پانی مل جائے گا؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔ نفیس صاحب ایک لمحے کے لیے خاموشی سے مجھے گھورتے رہے پھر بولے۔ "بس... یہی تمہارا سوال ہے؟"

"یس سر! یہ بہت ضروری سوال ہے۔" میں نے مؤدبانہ لہجے میں کہا۔

انہوں نے ایک طویل سانس لی اور ایک کونے میں جاکر دیوار میں لگی ہوئی ایک چھوٹی سی کیبنٹ کو کھولا۔ وہ درحقیقت چھوٹا سا فریج تھا۔ اس میں سے پانی کی ایک بوتل اور دوسری کیبنٹ سے ایک گلاس نکال کر انہوں نے مجھے تھمادیا۔

میں نے بوتل خالی کرنے کے بعد راحیلہ سے پوچھا۔ "تم بھی پیوگی؟"

"میں تمہارا خون پیوں گی۔" راحیلہ نیچی آواز میں بولی۔

"میں نے تو سنا ہے ویمپائرز اپنا یہ شغل سورج ڈوبنے کے بعد شروع کرتی ہیں۔ تم نے دن دہاڑے ہی شروع کردیا؟" میں نے حیرت سے کہا۔

کنٹرول پینلز پر بیٹھے ہوئے عمر رسیدہ شخص نے مڑ کر مجھے گھور کر دیکھا پھر عجیب سی نظروں سے نفیس صاحب کی طرف۔ اسے غالباً میرا مذاق ناگوار گزر رہا تھا اور شاید اسے اس بات پر حیرت تھی کہ نفیس صاحب مذاق کس طرح برداشت کررہے تھے۔ اس سے پہلے کہ راحیلہ کچھ کہتی' نفیس صاحب تحکمانہ لہجے میں بولے۔ "افضل! اب مذاق بند کرو۔ یہ مذاق کا موقع نہیں ہے۔ بٹن دبانے لگے ہیں۔ تم تیار ہو؟"

ہم تینوں کے پاس گنیں اور فاضل کلپ وغیرہ موجود تھے۔ ٹریلر میں دیوار کے سہارے بھی کئی گنیں کھڑی تھیں۔ باہر ایک جیپ تیار کھڑی تھی۔ میدان میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پھیلے ہوئے پچاسوں جوان بھی مستعد نظر آرہے تھے۔ میرے خیال میں تیاریاں مکمل ہی تھیں۔

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی۔"

ہم سب اس وقت ایک صف میں کھڑے تھے اور شاید سب کے اعصاب پر تناؤ تھا۔ نفیس صاحب نے اس عمر رسیدہ شخص کو اشارہ کیا جو کنٹرول پینلز پر بیٹھا تھا۔ دیوار میں لگی ایک مشین میں چھوٹا سا ایک ہینڈل لگا ہوا تھا جیسا عموماً زیادہ طاقت کی برقی رو آن آف کرنے کے لیے ہوتا ہے۔

عمر رسیدہ شخص نے اس ہینڈل پر ہاتھ رکھ دیا اور بہ آواز بلند بولا۔ "ون..... ٹو..... تھری..."

تھری کہتے ہی اس نے ہینڈل کھینچ لیا۔ اس وقت میں نے غیر ارادی طور پر سانس روک لی تھی۔ دوسرے ہی لمحے زمین لرز اٹھی۔ زیرِ زمین یقیناً زوردار دھماکا ہوا تھا لیکن اس کی گونج اندر ہی اندر دب کر رہ گئی تھی۔ ویسے بھی اس وقت ہم بند ٹریلر میں کھڑے تھے۔ ہم تک آواز کچھ اور بھی کم ہوکر پہنچی تھی لیکن ہم زمین کے ارتعاش سے دھماکے کی شدت کو محسوس کرسکتے تھے۔

میں شیشے کے پار دیکھ رہا تھا کہ جن لوگوں نے دیہی طرز کے لمبے چوڑے مکان کو گھیرے میں لیا ہوا تھا' وہ اور زیادہ مستعد ہو گئے تھے۔ نفیس صاحب نے ہمیں جو بریفنگ دی تھی اس کے مطابق اب انتظار کا مرحلہ شروع ہو رہا تھا جس کے بعد ہمیں سرنگ میں داخل ہونے کے لیے روانہ ہونا تھا لیکن اس کی نوبت نہیں آسکی۔ دوسرے ہی لمحے ایک اور دھماکا ہوا اور جو اس دھماکے سے کہیں زیادہ شدید تھا۔ میں تو شاید یہی سمجھتا کہ یہ دھماکا بھی دروازے ہی کو اڑانے کے سلسلے کی ایک کڑی تھا لیکن فوراً ہی اندازہ ہوگیا کہ نفیس صاحب' انجینئر ابصار اور تیسرے عمر رسیدہ شخص کو اس دھماکے کی توقع نہیں تھی کیونکہ وہ تینوں بیک وقت اچھل پڑے تھے۔

یہ دھماکا اتنا شدید تھا کہ ٹریلر لرز کر رہ گیا تھا۔ میں نے با

تعینات جوانوں میں سے بعض کو گھٹنوں کے بل گرتے دیکھا۔ معلوم نہیں وہ دھماکے کی شدت سے غیر ارادی طور پر گرے تھے یا کسی نادیدہ خطرے کے خلاف پوزیشن لے رہے تھے۔ مجھے یہ دیکھنے کی مہلت نہیں مل سکی کیونکہ اسی لمحے چونے کی لکیروں سے بنے ہوئے مستطیل نشان کے درمیان زمین پھٹ گئی تھی اور اس میں سے کوئی چیز تیزی سے نکل کر ایک طرف کو پرواز کرتی محسوس ہوئی اور چشم زدن میں غائب ہوگئی۔

ہم صرف اتنا ہی دیکھ سکے کہ اس کا رنگ نقرئی تھا اور وہ اپنے پیچھے ایک نارنجی سا شعلہ چھوڑتی گئی تھی جو اس کے ساتھ ہی غائب ہوگیا تھا۔ عمر رسیدہ شخص اور نفیس صاحب ایک ٹک ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے جبکہ انجینئر ابصار غیر ارادی طور پر اس طرح شیشے کی پٹی سے باہر دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا جیسے گردن آگے کرنے سے اسے کوئی چھپا ہوا منظر نظر آجائے گا۔

"یہ کیا تھا؟" نفیس صاحب نے سرسراتی آواز میں پوچھا۔ مجھے یوں لگا جیسے ان کے لہجے میں کوئی خوف پنہاں تھا۔ شاید انہیں خود بھی اندازہ ہوچکا تھا کہ وہ کیا چیز تھی لیکن وہ اس کا اعتراف کرتے ہوئے ڈر رہے تھے۔ وہ کسی اور کے منہ سے اس کے بارے میں سُننا چاہتے تھے۔

میں نے پہلی مرتبہ عمر رسیدہ شخص کی آواز سُنی۔ وہ دہشت زدہ سے لہجے میں بولا۔ "یہ تو میزائل تھا!"

"میزائل....؟" نفیس صاحب کو گویا یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کے شبے کی تصدیق کی جارہی تھی۔ میں، راحیلہ اور ٹونی کرسیں مضبوطی سے پکڑے کھڑے تھے لیکن وہاں کون تھا جس پر ہم حملہ کرتے؟

"تمہیں کچھ اندازہ ہوا کہ اس کا رخ کس طرف تھا؟" نفیس صاحب نے تھوک نگل کر پوچھا۔

عمر رسیدہ شخص نے کمپیوٹرز کی اسکرینوں کی طرف دیکھا پھر نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں... لیکن مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا ہے کہ شاید اس کا رخ دارالحکومت کی طرف تھا۔"

"نہیں.... نہیں.... خدا نہ کرے۔" نفیس صاحب بڑبڑائے۔

اس وقت مجھے بھی اپنے دل کی دھڑکنیں کچھ تیز محسوس ہو رہی تھیں۔ کمپیوٹرز کی اسکرینوں پر اس وقت ٹیڑھی ترچھی لکیریں، لہریے، مختلف جیومیٹریکل فگرز اور ہندسے تیزی سے اُچھل کود رہے تھے۔ ٹریلر میں لگے ہوئے وائرلیس پر تیزی سے کوئی کچھ پوچھ رہا تھا۔ شاید وہ باہر سائٹ پر تعینات کسی افسر کی آواز تھی لیکن کسی کو اس کی بات کا جواب دینے کا ہوش نہیں تھا۔

اسی اثنا میں ایک اور زوردار دھماکا ہوا۔ یہ دھماکا پچھلے دونوں دھماکوں سے زیادہ شدید تھا۔ اس بار تو ٹریلر کھڑکھڑا کر رہ گیا جیسے کسی جناتی ہاتھ نے اسے دھکا دیا ہو۔ باہر چوکور خانے کے درمیان زمین میں جو شگاف پیدا ہوا تھا وہ اس دھماکے کے ساتھ کچھ اور بڑا ہوگیا

پھر یہ گڑھا گہرا ہونے لگا۔ کناروں سے مٹی تیزی سے اسی گ
میں گرنے لگی۔ یوں لگتا تھا کہ کئی ایکڑ رقبے میں زمین تیز
دھنس رہی تھی۔

نفیس صاحب نے وائرلیس پر چیخ کر غالباً باہر تعینات کما
ہدایت کی کہ وہ تمام جوانوں کو پیچھے ہٹالے، ہر جگہ گھیرا کشاد
جائے۔ زمین نہ جانے کہاں تک بیٹھ رہی تھی۔ زمین میں ج
تیزی سے وسیع ہو رہا تھا اس میں سے دُھوئیں اور گرد و غبا
بادل بلند ہو رہے تھے۔ دیہی طرز کا مکان وہاں سے کافی دور تھ
سرنگ کا دہانہ اس کے اندر تھا۔ اس مکان سے بھی دُھوئیں
مرغولے بلند ہو رہے تھے۔ باہر تعینات تمام لوگ اپنا حصا
کررہے تھے اور کافی تیزی سے پیچھے ہٹنے لگے تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" نفیس صاحب تقریباً چلا اٹھے۔
رسیدہ شخص سے مخاطب تھے۔

"م.... میری.... خود سمجھ میں نہیں آرہا...." وہ شخص
"میرا خیال ہے وہ زیرِ زمین قلعہ تباہ ہوگیا۔ سب کچھ تبا
ہے.... اسی لیے اب وہاں سے زمین دھنس رہی ہے لیکن ا
پہلے دھماکے سے زمین میں شگاف ہوا.... وہاں سے میزا
ہوا.... اس کے بعد دھماکے سے وہ جگہ تباہ ہوئی...."

اس نے تھوک نگلا اور متوحش سی نظروں سے باری با
سب کی طرف دیکھ کر بولا۔ "ہمارا اس دروازے کو بلاسٹ کر
ٹریگر دبانے کے مترادف ثابت ہوا.... شاید یہ سب چیزیں وہ
کے ذریعے پروگرامڈ حالت میں چھوڑ گئے تھے کہ جونہی دروا
بلاسٹ کرکے یا کسی اور طریقے سے کھولنے کی کوشش کی
پہلے چھت کی طرف دھماکے سے شگاف ہو.... وہاں سے میزا

ہو.... پھر دوسرے دھماکے سے پوری جگہ تباہ ہوجائے...."

وہ خاموش ہوگیا۔ مجھے اس شخص کا تجزیہ درست معلوم ہوتا تھا۔ زمین کے دھنسنے کا عمل اب رُک گیا تھا۔ اب وہاں بہت بڑا گڑھا نظر آرہا تھا جس سے گرد و غبار اور دُھواں اب بھی اٹھ رہا تھا۔ چونے کی لکیریں جو ایک مستطیل کی نشاندہی کررہی تھیں، اب غائب ہوچکی تھیں کیونکہ گڑھا ان حدود سے بڑھ گیا تھا۔ اس گڑھے میں مٹی کی تہوں کے نیچے اب یقیناً ریڈ ڈاٹ کے ہیڈکوارٹر کے ملبے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

ہماری اس کامیابی میں بھی ایک ہزیمت پوشیدہ تھی۔ وہ لوگ جاتے جاتے بھی ہمیں نہ صرف جھنجلاہٹ بلکہ شاید کسی بڑے نقصان سے بھی دوچار کرنے کا انتظام کرگئے تھے۔ میرے ذہن میں وہ میزائل کھٹک رہا تھا جو شگاف سے نکلنے کے بعد غائب ہوگیا تھا۔ اگر وہ واقعی میزائل تھا تو ہمیں معلوم ہونا چاہیے تھا کہ اس کا ٹارگٹ کہاں تھا؟

تین دھماکوں کے بعد فضا میں گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ کہیں سے کوئی ہلکی سی بھی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ یہ سکوت گویا ان دھماکوں کا ردِ عمل تھا۔ جتنے شدید دھماکے تھے اتنا ہی گہرا سکوت تھا مگر اس سکوت میں جیسے کوئی طوفان پوشیدہ تھا۔

آخر نفیس صاحب بولے۔ "باہر نکل کر ذرا اس گڑھے کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے؟"

سوال انہوں نے عمر رسیدہ شخص سے کیا تھا۔ وہ ایک لمحہ سوچنے کے بعد بولا۔ "ابھی ٹھہر جائیں۔ یہ بھی ان کی کوئی چال نہ ہو۔ ابھی کوئی اور دھماکا ہمارا منتظر نہ ہو۔"

نفیس صاحب باہر جاتے جاتے رُک گئے۔ تمام منظر گویا ساکت ہو کر رہ گیا تھا۔ عمر رسیدہ شخص کی بات درست ہی تھی کہ کوئی اور دھماکا ہمارا منتظر نہ ہو۔ دھماکا نہیں، بلکہ دھماکے ہمارے منتظر تھے۔

اچانک نفیس صاحب کے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ انہوں نے فون کان سے لگایا۔ حالانکہ میں ان کے قریب ہی کھڑا تھا لیکن میں کچھ سُن نہیں سکا، تاہم میں نے یہ ضرور محسوس کرلیا کہ ان کی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔

وہ چند لمحے خاموشی سے سُنتے رہے پھر یکدم چیخے "آپ لوگ کیا کررہے ہیں؟" ایک لمحہ خاموش رہنے کے بعد وہ بولے۔ "فورسز کے لوگوں کو طلب کریں۔ سول ڈیفنس.... فائر بریگیڈ.... سب کو طلب کریں.... ان کے علاوہ اُدھر جانے والے باقی ہر قسم کے ٹریفک کو رکوائیں.... تمام اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کرائیں۔ ہم بھی آرہے ہیں... ہاں.... میرے ساتھ کافی لوگ ہیں اور یہ سب الرٹ ہیں۔"

انہوں نے فون بند کردیا اور گلوگیر سی آواز میں بولے۔ "چک لالہ کے پرانے ہوائی اڈے کے قریب ہمارا ایک آرڈیننس ڈپو تھا۔

اس اسلحہ خانے میں آگ لگ گئی ہے۔ دھماکے ہو رہے ہیں.... بم اور پروجیکٹائل وغیرہ اڑ اُڑ کر قریبی بستیوں پر گر رہے ہیں۔ ایک قیامت برپا ہوچکی ہے.... میں نے سوچا بھی نہیں تھا...." ان کی آواز گویا حلق میں اٹک گئی۔

عمر رسیدہ شخص کراہنے کے سے انداز میں بولا۔ "ابھی تو اوجڑی کیمپ کے زخم مندمل نہیں ہوئے تھے کہ ایک اور.... اوہ نو.... نفیس صاحب! ہم اس سانحے کے متحمل نہیں ہوسکتے۔"

"لیکن سانحہ رونما ہوچکا ہے۔" نفیس صاحب مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

"سر! کیا آپ کے خیال میں وہ میزائل....؟" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا اور اپنا سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

"یقیناً" نفیس صاحب بلا تامل بولے۔ "یقیناً وہی میزائل جاکر اسلحہ خانے پر گرا ہے.... اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی... اوجڑی کیمپ والے سانحے کے بعد ہم بہت محتاط ہوچکے تھے۔ تمام ممکنہ احتیاطیں کی جارہی تھیں۔ ابھی کسی کو صحیح طور پر کچھ معلوم نہیں لیکن میرے خیال میں اور کوئی وجہ نہیں ہوسکتی۔"

وہ عمر رسیدہ شخص کی طرف مڑے۔ "عابد! تم یہیں رہو۔ ے
کچھ جوانوں کو بھی یہیں چھوڑ رہا ہوں۔ میری طرف سے آئن
ہدایات ملنے تک تم ان لوگوں کے ساتھ اس جگہ کی نگرانی کرو
میں کچھ خاص خاص لوگوں کو لے کر چک لالہ جا رہا ہوں۔"

میں، راحیلہ اور ٹونی ان کے پیچھے پیچھے ٹریلر سے نکلے اور قریب
کھڑی جیپ میں بیٹھے۔ انہوں نے بغور میری طرف دیکھا او
ڈرائیونگ سیٹ چھوڑتے ہوئے بولے۔ "میرا خیال ہے اس وقت
تمہارے اعصاب مجھ سے زیادہ پُرسکون ہیں۔ ڈرائیونگ تم کرو۔"

میں نے گن سیٹ کے نیچے رکھ دی اور ڈرائیونگ سیٹ
سنبھال لی۔ نفیس صاحب راحیلہ کی طرف مڑے اور بولے۔ "میر
خیال ہے تم اپنی وہی ویگن ساتھ لے لو۔ شاید وہ وہاں کام بھی
آجائے۔ اس میں سائرن اور فلیشر بھی ہے۔ ٹونی کو تم اپنے ساتھ
بٹھالو۔ ویگن تم ڈرائیو کرو۔ ہر حال میں ہمارے پیچھے رہنا۔"

راحیلہ نے اثبات میں سر ہلایا اور گن سنبھالے جیپ سے کو
گئی۔ ٹونی اس کے پیچھے تھا۔ وہ ویگن میں جا بیٹھے تو میں نے جیپ
تیزی سے آگے بڑھائی۔ نفیس صاحب بولے۔ "مکان کے پیچھے
سے شفیع شاہ اور اپنے دوسرے ساتھیوں کو ہمراہ لے لو۔"

ہم نے چلتی جیپ میں ہی ہدایات دیتے ہوئے ان ساتھیوں کو
جمع کیا۔ وہ بھی جیپوں ہی میں تھے۔ نفیس صاحب نے دوسرے چند
جوانوں کو بھی ساتھ لیا اور چند منٹ کے اندر اندر ہی چھ گاڑیوں پر
مشتمل ہمارا قافلہ آندھی طوفان کی طرح ہائی وے پر روانہ ہو گیا!

ہمیں چک لالہ پہنچنے سے پہلے ہی اندازہ ہونے لگا کہ کوئی
بڑی تباہی ہماری منتظر تھی۔ فائر بریگیڈ کی گاڑیاں اور ایمبولینس
اسلام آباد سے اس طرف روانہ ہو چکی تھیں۔ مجھے کم از کم اس
موقع پر یہ مستعدی دیکھ کر کچھ اطمینان ہوا ورنہ میرے علم میں کچھ
ایسے واقعات بھی آئے تھے جب کہیں کوئی ایمرجنسی پیش آرہی
تھی اور متعلقہ حکام یہی فیصلہ نہیں کرپارہے تھے کہ وہ جگہ مرکزی
حکومت کی حدود میں آتی تھی یا صوبائی حکومت کی حدود میں؟ یہ طے
ہونے کے بعد ہی فیصلہ ہو سکتا تھا کہ کون سے محکمے کو وہاں پہنچنا
چاہیے تھا۔

وہ گاڑیاں ہم سے آگے تھیں لیکن جلد ہی ہم نے انہیں پیچھے
چھوڑ دیا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس وقت ہائی وے پر ٹریفک
نہیں تھا۔ آرڈیننس ڈپو تک پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں تباہی کے آثار
نظر آنے لگے۔ پے درپے دھماکوں کی آوازیں سنائی دے رہی
تھیں۔ بہت سی چیزیں فضا میں اِدھر اُدھر اڑتی دکھائی دے رہی
تھیں۔ کوئی اپنے عقب میں شراروں کا ایک فوارہ چھوڑتی جارہی
تھی اور کسی کے ساتھ نارنجی شعلے کی دُم لگی ہوئی تھی۔

بظاہر یہ آتشبازی کا سا سماں تھا لیکن یہ شعلہ بردوش اور شرر
فشاں چیزیں آتشبازی کے سامان کی طرح معمولی نہیں تھیں کہ فضا

یں پھٹ کر معدوم ہو جاتیں۔ ان کی اصل تباہ کاری زمین پر گرنے
کے ساتھ شروع ہوتی تھی۔ وہ راکٹ اور پروجیکٹائل وغیرہ تھے
نہیں لانچر وغیرہ سے فائر نہیں کیا گیا تھا لیکن آتشزدگی کی وجہ سے
پش پیدا ہونے پر وہ خود بخود ہی الٹے سیدھے انداز میں مختلف
متوں میں اُڑنے لگے تھے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ ان میں میزائل
بھی رہے ہوں۔ اتنی تیز رفتار چیزوں کے بارے میں کوئی اندازہ لگانا
ت مشکل تھا۔ خصوصاً جبکہ خود بھی تیز رفتاری سے محوِ سفر تھے۔

پنڈی اور اسلام آباد کے درمیان ہائی وے کے دونوں طرف
یادہ تر علاقہ سرسبز تھا۔ اس علاقے میں کہیں کہیں دونوں شہروں
ی نواحی بستیاں اور گاؤں تھے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ آسمان پر
جو اجل کے آتشیں پیامبر اڑتے پھر رہے تھے، کہاں کہاں
یامت بن کر گزر رہے تھے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ ان میں سے کچھ
سلام آباد اور پنڈی کی حدود میں بھی جا کر گر رہے ہوں۔ ان کی کوئی
مت نہیں تھی۔ وہ چیزیں ہر طرف جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔
ں یہی دعا کر رہا تھا کہ وہ سب کی سب اِدھر اُدھر کہیں ویرانوں میں
اکر گریں۔ میری طرح شاید دوسرے لوگ بھی یہی دعا کر رہے
دل۔

ہم ڈپو کے قریب ممنوعہ علاقے میں داخل ہوئے تو بہت سی
جی گاڑیاں تیزی سے اِدھر اُدھر آتی جاتی دکھائی دیں۔ ڈپو کے گرد
ت بڑا علاقہ خالی تھا اور ڈپو کو کیموفلاج کرنے کے لیے اس کے
اروں طرف غالباً جنگل اگایا گیا تھا یا پھر جنگل پہلے سے موجود تھا۔
س کے درمیان کٹائی کر کے ڈپو کے لیے جگہ بنائی گئی تھی لیکن اس
قت وہ سارا علاقہ ایک بہت بڑے آتش کدے.... بلکہ جہنم
کدے کا منظر پیش کر رہا تھا۔

درختوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ ڈپو اب خفیہ نہیں رہا تھا۔
س کے مختلف حصے غالباً بیرکس کی شکل کے بنائے گئے تھے لیکن بیشتر
یرکس کے دھماکوں سے پرخچے اڑ چکے تھے۔ بعض مقامات سے شعلے
ور شرارے آسمان تک جاتے محسوس ہو رہے تھے۔ حتیٰ کہ زمین
یں بھی آگ لگی دکھائی دے رہی تھی۔

ڈپو کی طرف جانے والے راستے پر بہت سی گاڑیاں اور ٹرک
غیرہ کھڑے تھے۔ ان سب میں آگ لگی ہوئی تھی۔ بعض دھماکے
ے ہمارے سامنے پھٹیں اور ان کے مختلف حصے اِدھر اُدھر بکھر
گئے۔ ان حصوں سے بھی شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اسی راستے پر اور
س کے اطراف میں بہت سی لاشیں بھی بکھری نظر آرہی تھیں جن
یں سے شاید ہی کوئی قابلِ شناخت رہی ہو۔ ان میں سے بعض کوئلہ
ہو چکی تھیں، بعض جھلس چکی تھیں، بعض کے اعضا غائب تھے۔
کہیں صرف دھڑ پڑا تھا اور کہیں صرف سر۔ ان تمام لاشوں یا
اشوں کے ٹکڑوں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ فضا میں بارود کی بُو تو
اقابلِ برداشت تھی لیکن اس کے ساتھ ساتھ گوشت، لکڑی اور
جانے کیا کچھ جلنے کی بُو بھی پھیلی ہوئی تھی۔

وقفے وقفے سے جو آتشیں چیزیں فضا میں بلند ہو رہی تھیں وہ
تو نہ جانے کہاں کہاں جا کر گر رہی تھیں اور کس کس کے لیے پیغام
اجل لا رہی تھیں لیکن نہ جانے کیا کچھ اس طرح بھی پھٹ رہا تھا کہ
چند فرلانگ کے دائرے میں بھی بار بار آتشیں ہلچل پیدا ہو رہی تھی
اور اسی کی وجہ سے اسلحہ خانے کا ایک کے بعد دوسرا شعبہ لپیٹ
میں آتا جا رہا تھا۔

فائر بریگیڈ کی گاڑیاں بھی سائرن بجاتی وہاں پہنچنے لگی تھیں
لیکن جو منظر ہمارے سامنے تھا اس کے مقابلے میں فائر بریگیڈ کی
گاڑیاں بہت ہی حقیر نظر آرہی تھیں۔ جہنم کا دائرہ لحہ بہ لحہ پھیل
رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا کہ فائر بریگیڈ کی گاڑیوں سے اسے
بجھانے کی کوشش کرنا ایسے ہی ہوگا جیسے بھڑکتے ہوئے تندور میں
ڈراپر سے پانی کے چند قطرے ٹپکانا۔

ہماری گاڑیاں آگے پیچھے کافی دور ہی رک گئی تھیں لیکن وہاں
بھی ہم لوگ موت کی زد میں تھے کیونکہ ہمارے آس پاس بھی نہ
جانے کس کس ساخت کے بم وغیرہ آکر گر رہے تھے اور جگہ جگہ
گڑھے ڈال رہے تھے۔ ایک بار تو کسی شیل کے چند ٹکڑے اور کچھ
پتھر ہماری جیپ میں آکر گرے۔

فائر بریگیڈ کی دو گاڑیاں کچھ آگے چلی گئی تھیں لیکن غالباً ان
لوگوں کو بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے تھا۔
ان گاڑیوں سے چند فائرمین ہیلمٹ، جیکٹیں اور ماسک وغیرہ پہنے
اترے۔ جہاں ہم کھڑے تھے، تپش وہاں تک پہنچ رہی تھی۔ فائرمین
ہم سے بھی آگے تھے۔ وہ یقیناً ہم سے بھی زیادہ تپش کا مقابلہ
کر رہے تھے۔ اس سے آگے جاتے تو شاید وہ جھلسنے لگتے۔

وہ گاڑیوں سے پائپ وغیرہ اتارنے لگے۔ وہ اس مقام سے
اب بھی بہت دور تھے جسے اس جہنم کدے کا مرکز کہا جا سکتا تھا اور
جہاں سے موت کے آتشیں ہرکارے فضا میں بلند ہو رہے تھے۔
میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنی دور سے وہ اس جہنم کدے کو
سرد کرنے کے سلسلے میں کیا کر سکتے تھے؟ گاڑیاں اگر کافی پریشر سے
بھی پانی پھینکتیں تو زیادہ سے زیادہ اس کی رسائی جلتی ہوئی گاڑیوں
اور ان لاشوں تک ہو سکتی تھی جو کوئلہ بن چکی تھیں۔ بہرحال وہ
لوگ غالباً اپنی سی کوشش کرنا چاہتے تھے۔

اس دوران شام کا دھندلکا پھیلنے لگا تھا لیکن ایک بہت بڑے
حصے میں آتش رقصاں کی وجہ سے یہ دھندلکا اترنے نہیں پایا تھا۔
اس حصے میں نارنجی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ ہم لوگ وہاں پہنچ تو گئے
تھے لیکن شاید ہم میں سے کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ
اسے کیا کرنا چاہیے۔

اس اثنا میں وہاں دوسری گاڑیاں بھی پہنچنے لگی تھیں۔ راحیلہ
اور ٹونی وغیرہ اپنی گاڑیوں سے اتر کر ہمارے قریب آن کھڑے
ہوئے تھے۔ میں اور نفیس صاحب ابھی تک کھلی جیپ میں ہی بیٹھے
تھے۔ میرے ہاتھوں میں کچھ تکلیف سی ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ

غیرارادی طور پر میری گرفت نہ جانے کب سے جیپ کے اسٹیئرنگ وھیل پر بہت ہی سخت ہوچکی تھی جس پر کھردرے پلاسٹک کی موٹی تہ چڑھی ہوئی تھی۔

میں نے اسٹیئرنگ وھیل چھوڑ کر نفیس صاحب کی طرف دیکھا۔ وہ گویا بت بن گئے تھے۔ ان کی آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں۔ انہیں غالباً اسلحہ خانے میں موجود اسلحے کی تفصیلات کا علم تھا اس لیے وہ اس تباہی کا ہم سے بہتر اندازہ کرسکتے تھے اور تباہی ابھی رکی نہیں تھی۔ یہ ایک ایسی تباہی تھی جسے روکنا شاید کسی کے بھی بس میں نہیں تھا۔ فی الحال تو جتنے لوگ وہاں پہنچے تھے ان میں سے بیشتر بے بسی سے کھڑے تماشا ہی دیکھ رہے تھے۔ یہ بھی بہت بڑی بات تھی کہ وہ وہاں کھڑے تھے کیونکہ ہم سمیت جتنے لوگ وہاں موجود تھے وہ سب بھی موت کی زد میں تھے۔ کسی لمحے بھی ہم پر کوئی راکٹ وغیرہ آکر گر سکتا تھا۔ اس کے باوجود لوگ دم بخود کھڑے تھے۔ صرف کچھ لوگ تھے جو اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے نظر آرہے تھے۔ شاید وہ جہنم کدے کے قریب پہنچ کر اس تباہی کو مزید پھیلنے سے روکنے کی کوئی تدبیر کررہے تھے۔

انہی چند لمحوں کے دوران ایک اور خیال نے میرے ذہن میں سر ابھارا۔ اس قسم کی باتیں میں اکثر ہی سوچا کرتا تھا۔ دنیا کے ہر ملک میں بسنے والے ہر بے اختیار اور بااختیار شخص کو یہ بات اچھی طرح معلوم تھی کہ اگر سب قومیں جنگ و جدل ترک کردیں اور اسلحے کے انبار لگانا بند کردیں تو دنیا میں کوئی غریب' کوئی بے گھر' کوئی بے علاج اور کوئی بھوکا نہ رہے۔ اس کے باوجود اس کرہ ارض پر کتوں کی طرح لڑتے رہنا ہی انسان کی سب سے بڑی مصروفیت چلی آرہی تھی۔ بنی نوع انسان کو یہی سب سے بڑا پاگل پن لاحق تھا اور پوری دنیا اس معاملے میں اب اتنی آگے جاچکی تھی کہ کوئی پیچھے ہٹنے میں پہل کرنے پر تیار نہیں تھا۔

میں نے اس قسم کے خیالات سے ذہن ہٹانے کے لیے نفیس صاحب سے پوچھا۔ "ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

وہ گویا کسی بھیانک خواب سے چونکتے ہوئے میری طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے شاید میرا سوال سنا ہی نہیں تھا لیکن مجھے اپنا سوال دہرانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی لمحے دو گاڑیاں ہمارے قریب آکر رکیں۔ ایک سبز جیپ تھی اور دوسری سیاہ مرسڈیز۔

مرسڈیز کے دروازے بند رہے۔ کھڑکیوں کے شیشے بھی چڑھے رہے۔ جیپ سے ایک باوردی آفیسر اتر کر ہماری طرف آیا۔ وہ یقیناً نفیس صاحب کو پہچانتا تھا۔ اس نے باقی لوگوں کی طرف توجہ نہیں دی اور مؤدبانہ انداز میں نفیس صاحب کو سلام کرنے کے بعد بولا۔ "سر! آپ یہاں کھڑے ہوکر اپنی جان خطرے میں نہ ڈالیں۔ آپ اور آپ کے ساتھی یہاں کچھ نہیں کرسکتے۔"

[illegible]

کے سے انداز میں پوچھا۔ ان کی آواز دھماکوں اور دیگر آوا[illegible] کے درمیان بہ مشکل سنی جاسکتی تھی۔

باوردی آفیسر بولا۔ "سر! یہاں کچھ کرنے کے لیے خاص[illegible] کے ایکوپمنٹ..... خاص قسم کے سازوسامان کی ضرورت ہے۔ گاڑیاں اور ٹرک ضروری سامان اور تربیت یافتہ عملے کے [illegible] یہاں پہنچنے والے ہیں۔ تبھی کچھ کیا جاسکے گا۔ ہم کوشش کریں[illegible] کہ ڈپو کے کچھ حصوں کو بچایا جاسکے۔ اس دوران اگر آپ[illegible] کرنا ہی چاہتے ہیں تو آس پاس کی نواحی آبادیوں میں سے کس[illegible] چلے جائیں اور لوگوں کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کریں۔ و[illegible] علاقے میزائلوں اور راکٹوں کی زد میں آئے ہوئے ہیں....."

آفیسر نے ان آبادیوں کے نام بتائے اور بات جاری [illegible] ہوئے تیزی سے بولا۔ "ہمارے پاس ان علاقوں میں بھیجنے [illegible] فوری طور پر آدمی نہیں ہیں اور ہمیں اطلاع ملی ہے کہ وہ سا[illegible] قسم کے لوگ گھبراہٹ اور افراتفری میں زیادہ مارے جارہے [illegible] وہ سمجھ رہے ہیں کہ کسی دشمن ملک نے ہم پر حملہ کردیا ہے ا[illegible] اندر تک گھس آیا ہے۔ بم وغیرہ پنڈی اور اسلام آباد کی حد[illegible] بھی جاکر گر رہے ہیں لیکن وہاں صورتِ حال کو سنبھالنے [illegible] کافی لوگ موجود ہیں۔ آپ جلدی سے اپنے آدمیوں سمیت [illegible] قریبی بستی میں چلے جائیں۔ یہ کام آپ کے شایانِ شان ت[illegible] ہے لیکن یہ وقت بڑی آزمائش کا ہے۔"

"گولی مارو میری شان کو....." نفیس صاحب تیزی سے ب[illegible] "اس وقت کس کمبخت کو یاد رہ گیا ہے کہ کون سا کام شایانِ شان ہے اور کون سا نہیں....."

اچانک ایک زوردار دھماکا ہوا۔ دھماکے تو وہاں جاری [illegible] لیکن یہ دھماکا گویا قریب ہی ہوا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا [illegible] وقت ہم لوگ اپنی اپنی گاڑیوں سے اترے ہوئے تھے۔ و[illegible] شدید تھا کہ ہم غیرارادی طور پر منہ کے بل گر گئے اور یہ ہمار[illegible] میں اچھا ہوا کیونکہ اسی لمحے ہمارے اوپر سے لوہے کے بڑ[illegible] ٹکڑے اُڑتے ہوئے گزرے۔ اگر ہم کھڑے ہوتے تو [illegible] ٹکڑے ہمارے بالائی دھڑ کو چیرتے ہوئے گزر جاتے۔ ایک [illegible] نے ہماری جیپ کی ونڈ اسکرین توڑ ڈالی۔

میں نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا تو مجھے جھرجھری [illegible] فائر بریگیڈ کی وہ گاڑی جو سب سے آگے چلی گئی تھی اور [illegible] فائرمین پانی پھینکنے کی تیاریاں کررہے تھے اس کے پرخچے [illegible] تھے۔ صرف ڈھانچا آڑا ترچھا پڑا رہ گیا تھا۔ ٹائروں سے [illegible] بلند ہونے لگے تھے۔ اس کے مڑے تڑے فریم پر عملے [illegible] آدمی کا بالائی دھڑ اٹکا ہوا تھا جو ابھی پھڑک رہا تھا۔ اس [illegible] نچلا آدھا حصہ غائب تھا۔ جو فائرمین گاڑی سے اترے [illegible] لاشیں بھی اِدھر اُدھر پڑی تھیں۔ وہ بھی مکمل حالت [illegible]

[illegible]

باوردی آفیسر کہنیوں کے بل اٹھتے ہوئے مرتعش لہجے میں نفیس صاحب سے مخاطب ہوا۔ "سر! آپ جلد از جلد یہاں سے چلے جائیے..... یہاں بہت خطرہ ہے..... جب تک حفاظتی سازوسامان کے ساتھ لوگ یہاں نہیں پہنچ جاتے' آگے جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آپ جلد از جلد قریبی آبادی میں پہنچیں اور وہاں لوگوں کی جانیں بچانے کی کوشش کریں..... یہاں تو جتنا جانی نقصان ہونا تھا وہ ہوچکا ہے....."

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور رکوع کی سی حالت میں دوڑ کر سیاہ مرسڈیز تک پہنچا۔ اگلا دروازہ کھول کر اس نے سر اندر گھسا کر کچھ کہا اور دوسرے ہی لمحے جلدی سے دروازہ بند کردیا۔ مرسڈیز کے ٹائر چرچرائے اور وہ نیم دائرے میں گھوم کر تیز رفتاری سے واپس اسلام آباد کی طرف روانہ ہوگئی۔ آفیسر جیپ میں بیٹھا اور اسے موڑ کر درختوں کی طرف لے جانے لگا لیکن کچھ دور جاکر وہ گردن گھما کر نفیس صاحب کو تاکید کرنا نہیں بھولا۔

"سر..... پلیز ہری اپ..... گاڑیاں پیچھے ہٹالیں۔"

ہم سے پہلے فائر بریگیڈ کی گاڑیاں پیچھے ہٹ گئیں۔ نفیس صاحب نے ایک لمحے سوچنے کے بعد آفیسر کے مشورے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور ہمیں گاڑیوں میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک بار پھر ان کی رہنمائی میں ہماری گاڑیاں روانہ ہوگئیں۔

اس بار پنڈی کی ایک نواحی آبادی ہماری منزل تھی۔ وہ ایک اچھا خاصا قصبہ تھا۔ ہائی وے سے وہاں تک پہنچنے کا راستہ نیم پہاڑی تھا اور قصبہ چاروں طرف سے سبزہ زاروں میں گھرا ہوا تھا۔ عام حالات میں وہ یقیناً ایک جنت نظیر قصبہ رہا ہوگا لیکن اس وقت کسی حد تک جہنم کا نمونہ بنا ہوا تھا۔

بہت سے مکانوں میں آگ لگی ہوئی تھی اور گلی کوچوں میں ایک افراتفری برپا تھی۔ میرا خیال تھا کہ افراتفری صرف بڑے شہروں کی خصوصیت تھی اور ہنگامی حالات میں بڑے شہروں میں قیامت کا سماں نظر آتا تھا لیکن اس روز اندازہ ہوا کہ بدنظمی اور افراتفری ہمارا قومی شعار ہے۔ اس کے لیے چھوٹے بڑے شہر یا گاؤں دیہات کی تخصیص نہیں۔

قصبے کی آبادی کچھ ایسی زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی اور راستے بھی ٹیڑھے میڑھے یا تنگ نہیں تھے لیکن ہمارے لیے گاڑیاں لے کر گلیوں میں داخل ہونا مشکل ہوگیا کیونکہ گلیوں میں ایک ہنگامہ برپا تھا۔ مویشی بندشوں سے آزاد ہوکر اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے۔ انسان بھی مویشیوں ہی کے انداز میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے تھے اور ان سے ٹکرا رہے تھے۔ انسانوں کو بھی گویا علم نہیں تھا کہ انہیں کہاں جانا تھا۔ وہ کبھی ایک طرف بھاگتے تھے' کبھی دوسری طرف۔ دو تین بوڑھے افراد کو میں نے مویشیوں کے کھروں تلے کچلے جاتے دیکھا۔

ہم جب قصبے کی طرف آرہے تھے تو مجھے اندازہ ہوا تھا کہ کچھ

لوگ قصبے سے نکل بھی چکے تھے لیکن بدقسمتی سے وہ جس سمت میں پناہ کے لیے بھاگے وہاں بھی کوئی پروجیکٹائل آکر گرا۔ ان میں سے کچھ قصبے کی طرف واپس بھاگے اور کچھ نے بلندی کی طرف پھیلے ہوئے جنگل کا رخ کیا حالانکہ جنگل سے پہلے ہی دھواں بلند ہو رہا تھا۔

اس علاقے میں چاروں طرف ہی وقفے وقفے سے کچھ نہ کچھ آکر گر رہا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قصبے والوں کا ستارہ کچھ زیادہ ہی گردش میں تھا۔ کیونکہ قصبے پر زیادہ پروجیکٹائل آکر گر رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ دشمن کہیں بیٹھا آبادی کو نشانہ بنا رہا تھا۔ حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ پروجیکٹائل وغیرہ تو محض حرارت پاکر فائر ہو رہے تھے لیکن یہ عجیب اتفاق یا بدبختی تھی کہ ان میں سے بیشتر کا رخ آبادی کی طرف تھا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ایسے مکانوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تھا جن میں آگ لگ چکی تھی یا جن کا بیشتر حصہ منہدم ہوگیا تھا۔ ان میں نہ جانے کتنے لوگ مارے جاچکے تھے۔ ہم سب خود بھی موت کی زد میں تھے۔ یہ صرف قسمت کا سودا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس لمحے موت کا کوئی آتشیں ہرکارہ ہم پر آکر گرتا اور ہم میں سے کس کس کے پرخچے اُڑ جاتے۔

ہم نے طے کیا کہ ہم میں سے ہر فرد ایک ایک گلی میں داخل ہوگا اور ہم جتنے بھی زخمی یا مجبور اور معذور لوگوں کو لاکر گاڑیوں میں ڈال سکے' ڈالیں گے۔ گاڑیاں بھر کر ہم انہیں پنڈی لے جائیں گے کیونکہ یہاں تو دور دور تک کوئی محفوظ پناہ گاہ یا ایسی جگہ نظر نہیں

آ رہی تھی جہاں کسی کو لے جایا جا سکتا۔

ہم نے مختلف گلیوں کا رخ کیا۔ میں جس گلی میں داخل ہوا اس میں تین مکانوں کو آگ لگی ہوئی تھی۔ دو مکان مکمل طور پر زمیں بوس نظر آ رہے تھے۔ گلی میں بھگدڑ ذرا کم تھی۔ یہاں سے شاید بیشتر لوگ نکل چکے تھے۔ گلی میں ایک گدھا گاڑی اور ایک بیل گاڑی ایک دوسرے میں بری طرح پھنسی کھڑی تھیں۔ گدھا اور بیل مخالف سمتوں میں زور لگا رہے تھے لیکن اس سے دونوں گاڑیاں ایک دوسرے میں اور بھی زیادہ سختی سے پھنستی جا رہی تھیں۔ شاید اسی لیے ان کے سوار انہیں چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ ان میں کچھ سامان بھی پڑا نظر آ رہا تھا۔ ان گاڑیوں کی وجہ سے گلی بند ہو کر رہ گئی تھی۔

گلی میں جو چند لوگ مجھے بھاگتے دوڑتے دکھائی دیے ان کی طرف میں نے زیادہ توجہ نہیں دی۔ وہ صحیح سلامت تھے۔ اپنے بچاؤ کے لیے کچھ نہ کچھ کر سکتے تھے۔ میں ایسے لوگوں کی تلاش میں آگے بڑھا جو کسی مجبوری میں پھنسے ہوئے ہوں۔ راستے میں مجھے نالی کے قریب آٹھ دس سال کا ایک بچہ پڑا نظر آیا۔ وہ گویا کسی تکلیف سے دُہرا ہو رہا تھا لیکن قریب پہنچ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مردہ تھا۔ اس کی کنپٹی میں لوہے کا ایک ٹکڑا پیوست تھا اور سینگ کی طرح اس کا کچھ حصہ باہر ہی تھا۔

اس کی موت شاید لوہے کے اس ٹکڑے ہی کی وجہ سے واقع ہوئی ہو لیکن اسے یقیناً کئی انسان اور شاید ایک آدھ بیل گاڑی یا گدھا گاڑی بھی کچلتی ہوئی گزری تھی۔ اس کے ناک منہ سے بہتا ہوا خون نالی کے گندے پانی میں مل چکا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ پیٹ پر تھے اور آنکھیں حلقوں سے ابل آئی تھیں۔

وہ کسی قسم کی مدد سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ میں اسے چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ قصبے میں بجلی موجود تھی لیکن دور ہی سے ہمیں کئی جگہ بجلی کے تار ٹوٹ کر لٹکتے دکھائی دیے تھے۔ یہ الگ اپنی جگہ موت کے پیامبر تھے۔

ہم جب سڑکوں اور فٹ پاتھوں پر چل رہے ہوتے ہیں تو ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ موت ہمارے سروں پہ سایہ فگن ہوتی ہے یعنی ہمارے سروں پر بجلی کے ننگے تار تنے ہوتے ہیں جن میں ہزاروں وولٹ بجلی دوڑ رہی ہوتی ہے۔ کوئی بھی تار کسی بھی وجہ سے ٹوٹ کر کسی بھی انسان یا انسانوں پر گر سکتا ہے اور چشم زدن میں اسے موت کے منہ میں پہنچا سکتا ہے۔

ترقی یافتہ ملکوں میں قتل وغیرہ جیسے سنگین جرائم پر کسی شخص پر مقدمہ چلایا جاتا ہے' شہادتیں تلاش کی جاتی ہیں' ہزار طرح کے تردد کیے جاتے ہیں۔ پھر اسے بجلی کی کرسی پر بٹھانے کا "اہتمام" کیا جاتا ہے اور اب تو خیر اس کا بھی رواج ختم ہوتا جا رہا ہے۔ درندہ صفت مجرموں کو بھی سزائے موت دینا وہاں "ظالمانہ" سزا کہلاتی ہے لیکن ہمارے ہاں راہ چلتے بے گناہ' بے خبر اور بے قصور لوگوں کو کرسی کے بغیر ہی بجلی سے سزائے موت دینے کا معقول انتظام موجود ہے۔

قصبے میں بھی نہ جانے کہاں کہاں بجلی کی ٹوٹی ہوئی تاریں زمین تک پہنچ رہی ہوں اور نہ جانے ایسے کتنے لوگوں کی ہلاکت کا سبب بن چکی ہوں جو آسمان سے برستی ہوئی موت سے بچ چکے تھے۔ بہرحال تاریں ٹوٹ جانے کی وجہ سے گلیوں میں اندھیرا تھا لیکن مکانوں میں لگی ہوئی آگ اس اندھیرے کو دور کر رہی تھی۔

انہی شعلوں کی روشنی میں' میں آگے بڑھا تو مجھے گلی کے اینٹوں کے فرش پر ایک عمر رسیدہ عورت پڑی کراہتی نظر آئی۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اور کپڑے کیچڑ مٹی میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اسے بھی یقیناً کچھ لوگ کچلتے ہوئے گزرے تھے۔ وہ دونوں ہاتھ اندھوں کی طرح اینٹوں کے فرش پر مارتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور وہی سوال کیا جو عام طور پر ایسے موقعوں پر کیا جاتا ہے۔ "اماں.... تم ٹھیک تو ہو؟"

وہ بری طرح کراہتے ہوئے' بری طرح جل کر بولی۔ "ہاں بیٹا میں تو بالکل ٹھیک ہوں.... خوشی سے چھلانگیں لگا رہی ہوں۔ موقع ہی ایسا ہے.... سب لوگ بالکل ٹھیک ہیں' بڑے خوش ہیں خوشی کے مارے ہی تو اِدھر اُدھر بھاگے پھر رہے ہیں۔" آخر کا آواز اس کے گلے میں پھنس گئی تب وہ خاموش ہوئی۔

میں نے کھسیانا ہوتے ہوئے کہا۔ "میرا یہ مطلب نہیں تھا اماں جی.... !میں تو یہ پوچھنا چاہ رہا تھا کہ...." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ سچی بات یہ تھی کہ مجھے معلوم نہیں تھا میں کیا پوچھنا چاہ رہا تھا۔

اسی اثنا میں ایک باریش بوڑھا گرتا پڑتا مگر متلاشی سے انداز میں اِدھر اُدھر دیکھتا وہاں پہنچا۔ وہ غالباً آگے نکل گیا تھا اور پلٹ کر آیا تھا۔ وہ بھی زخمی حالت میں تھا اور کراہتا ہوا آ رہا تھا۔ شاید قوتِ ارادی کے سہارے بہ مشکل خود کو سنبھالے ہوئے تھا ورنہ کہیں ڈھیر ہو گیا ہوتا۔ اس کی نظر عورت پر پڑی تو گرتا پڑتا تیزی سے قریب آیا اور ذرا برہمی سے بولا۔ "صغراں کی ماں.... تو یہاں پڑی ہے.... مجھے تو آگے جا کر پتا چلا کہ تُو میرے ساتھ نہیں ہے...."

وہ یقیناً اس عورت کا شوہر تھا۔

عورت زخمی ہونے کے باوجود کراری آواز میں بولی۔ "تجھے میرے ہونے نہ ہونے کا ساری زندگی پتا نہیں چلا۔ اب بے خبر گیا تو کون سی حیرت کی بات ہے۔"

بوڑھے کو بھی' زخمی ہونے کے باوجود جلال آ گیا۔ اس نے بڑھیا کو موٹی سی گالی دی جسے سن کر ایک لمحے کے لیے تو میرے کانوں کی لویں بھی تپ اٹھیں۔ اس گالی میں معانی و مفہوم کے سلسلے میں کچھ نئے تجربات کیے گئے تھے۔ بوڑھے کے جتنے دانت سلامت یا نیم سلامت تھے وہ انہیں پیستے ہوئے بولا۔ "تو قبر میں بھی میرے ساتھ لڑنے سے باز نہ آنا.... یہ موقع ہے بکواس کرنے کا.... چل.... جلدی میرے ساتھ چل...."

اس نے بڑھیا کو سہارا دینے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں خود گر پڑا۔ میں نے دونوں کو سہارا دے کر اٹھایا اور کہا۔ "آپ دونوں میرے ساتھ چلیں۔"

"تم کون ہو؟" بوڑھے نے کراہتے اور کانپتے ہوئے میرا سرتاپا جائزہ لیا۔ وہ اس موقعے پر بھی تفتیش سے باز نہیں رہا تھا۔

"ہم چند لوگ آپ کے قصبے والوں کی مدد کے لیے آئے ہیں۔ قصبے سے باہر ہماری گاڑیاں کھڑی ہیں۔ چلیے میں آپ لوگوں کو وہاں لے چلتا ہوں۔" میں نے تیزی سے کہا۔

اسی لمحے قریب ہی کہیں ایک زوردار دھماکا ہوا اور زمین لرزتی محسوس ہوئی۔ ایک اور پروجیکٹائل' میزائل یا کوئی اور چیز قصبے پر آ کر گری تھی۔ شاید کہیں اور آگ لگی تھی۔ شاید کچھ اور منہدم ہوا تھا۔ شاید موت کا عقاب کچھ اور روحوں کو اچک لے گیا تھا۔

اس تازہ دھماکے نے بوڑھے اور بڑھیا کی بد دماغی یکدم دور کر دی۔ وہ تھر تھر کانپتے ہوئے بچوں کی طرح مجھ سے تقریباً چمٹ گئے اور میں انہیں دونوں بازوؤں سے سنبھالے اس طرف لے چلا جدھر سے آیا تھا۔

اچانک بڑھیا میرے بازو کا سہارا چھوڑنے کی کوشش کرتے ہوئے ہلکی سی چیخ کے ساتھ بولی۔ "اوئے صغراں کے ابا.... ہم صغراں کو تو وہیں چھوڑ آئے.... ہائے میری صغراں....!"

بوڑھا بھی رک گیا۔ اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے پتھرا سا گیا۔ وہ بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔ "وہ کہاں بچی ہو گی.... سارا مکان تو گر گیا ہے۔"

"پھر بھی.... ہمیں رکنا تو چاہیے تھا.... اسے دیکھنا.... تلاش کرنا چاہیے تھا.... لیکن ہم تو اسے بھول ہی گئے تھے.... کیسے ماں باپ ہیں ہم!" بڑھیا نے سسکی لی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو امنڈ کر اس کے زخمی چہرے پر پھسل آئے تھے اور یقیناً اس کے زخموں میں آگ لگا رہے تھے۔

"صغراں آپ کی بیٹی ہے؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

بڑھیا نے کراہتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور بولی۔ "ہاں.... وہ ہماری جوان بیٹی ہے.... تم نے ایسے ماں باپ نہیں دیکھے ہوں گے جو برے وقت میں اپنی اولاد کو چھوڑ کر بھاگ گئے ہوں۔"

"کوئی بات نہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔" میں نے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

بوڑھا جلدی سے بڑھیا سے مخاطب ہوا۔ "اور اسے یہ بھی تو بتاؤ کہ ہمارے دو شادی شدہ بیٹے ہمیں چھوڑ کر.... اپنی بیویوں کو ساتھ لے کر بھاگ گئے ہیں۔ بھاگتے وقت انہوں نے ہمیں آواز تک نہیں دی۔"

"دفع کرو انہیں.... مٹی ڈالو اس بات پر.... آؤ چل کر صغراں کو دیکھ کر آتے ہیں.... وہ زندہ بھی ہے یا...." بڑھیا نے ایک بار پھر سسکی سی لے کر بوڑھے کا ہاتھ پکڑ کر واپس پلٹنے کی کوشش کی لیکن اس کی ٹانگوں نے اس کا ساتھ نہ دیا اور وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ بوڑھا بھی اسے اٹھانے کی کوشش میں گر پڑا۔ میں نے انہیں سہارا دے کر دوبارہ اٹھایا اور ایک مکان کی دیوار تک لے گیا جو ابھی صحیح سلامت تھی۔

میں نے انہیں دیوار کے سہارے بٹھاتے ہوئے کہا۔ "آپ یہیں بیٹھیں۔ میں صغراں کو دیکھ کر آتا ہوں۔ آپ مجھے بتائیں آپ کا مکان کون سا ہے؟"

"اللہ تمہارا بھلا کرے بیٹا! کسی طرح میری بیٹی کو لے آؤ.... میں تو زندگی بھر کے لیے اس سے آنکھ ملانے کے قابل نہیں رہی۔" بڑھیا گڑگڑانے لگی پھر وہ مکانوں کی سامنے والی قطار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ "اس لائن میں کونے پر سب سے پہلا گھر ہمارا تھا.... ہم جب نکل رہے تھے اُس وقت اُس پر بم گرا ہے۔"

میں گلی کے سرے کی طرف دوڑا۔ اس طرف کئی مکان منہدم ہو چکے تھے۔ تین چار مکانوں میں آگ لگی ہوئی تھی جو تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ پورا قصبہ تباہی کی نذر ہونے والا تھا۔ گلی میں اب بھاگ دوڑ نظر نہیں آ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گلی خالی ہو چکی تھی۔ نفیس صاحب اور میرے ساتھی جن گلیوں میں گئے تھے' ان کا نہ جانے کیا حال تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہاں ایک قیامت برپا تھی جس میں اولاد والدین کو.... اور والدین اولاد کو بھول گئے تھے۔

میں سامنے والی قطار کے پہلے مکان تک پہنچا تو اس سے شعلے بلند ہوتے دکھائی دیے۔ مکان تقریباً منہدم ہو چکا تھا لیکن اس کا ایک آدھ کمرا سلامت دکھائی دے رہا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ وہ بالائی منزل کا کمرا تھا اور مکان کے ڈھیر ہونے کی وجہ سے وہ بھی نیچے آ گیا تھا مگر معمولی سی ٹوٹ پھوٹ کے ساتھ ترچھی حالت میں یوں ملبے پر ٹکا ہوا تھا جیسے کسی غیبی ہاتھ نے اسے سنبھال لیا ہو لیکن اس کے اردگرد بھی بہت سا ملبہ آن گرا تھا۔ منہدم مکان کے پچھلے حصے سے شعلے اور دھواں بلند ہو رہا تھا۔ مکان کافی بڑا تھا لیکن نیم پختہ تھا۔ اب تو محض ملبے کا بڑا سا ڈھیر ہی نظر آ رہا تھا لیکن اس کے بیشتر مکین شاید بروقت نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

میں نے ملبے پر چڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ملبے کے نیچے دبا ہوا مختلف ساز و سامان اِدھر اُدھر سے جھانک رہا تھا لیکن مجھے کہیں کسی انسانی جسم کی جھلک دکھائی نہیں دی۔ میں اس کمرے کے قریب پہنچا جو ترچھا ہو کر ملبے میں دھنسا ہوا تھا۔ اس کی ایک بند کھڑکی بند ہو کر چوکھٹ میں پھنس گئی تھی۔ میں اس میں جھانک نہیں سکتا تھا۔ اس کا دروازہ بھی بند تھا۔ میں نے ملبے پر چڑھ کر اسے ہلانے

کی کوشش کی لیکن وہ بھی چوکھٹ سمیت اپنے شگاف میں بری طرح پھنسا ہوا تھا اور اپنی جگہ سے جنبش نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس پر کچھ زیادہ زور آزمائی نہیں کی۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا کہ وہ کمرا بھی درحقیقت منہدم ہونے کو تھا لیکن عجیب و غریب انداز میں کسی خاص زاویے پر اس کی دیواروں اور چھت کا توازن قائم تھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ کسی قسم کی زور آزمائی یا قریب ہی ہونے والے کسی زوردار دھماکے کے ارتعاش سے وہ کمرا ریت کے گھروندے کی طرح بیٹھ سکتا تھا۔

میں گھوم کر کمرے کے دوسری طرف پہنچا۔ اس طرف بھی چھوٹی سی ایک روشن دان نما کھڑکی تھی جو نہ صرف اس وقت کھلی تھی بلکہ اس سے ایک وحشت زدہ چہرہ بھی جھانک رہا تھا۔ اس کھڑکی کا مصرف نہ جانے کیا تھا۔ وہ محض اتنی بڑی تھی کہ اس سے صرف سر ہی باہر نکالا جا سکتا تھا۔

وہ بڑی بڑی حیران سی آنکھوں والا ایک گورا چٹا چہرہ تھا لیکن اس وقت تمتمایا ہوا تھا۔ اس کی کشادہ پیشانی پر پسینہ چمک رہا تھا۔ ریشمی سیاہ بالوں کی ایک لٹ ایک رخسار سے چپکی ہوئی تھی اور دہکتے ہونٹوں کے عقب سے موتیوں جیسے دانت جھانک رہے تھے۔

یقیناً یہی صفراں تھی۔ اس کا صبیح چہرہ اس لیے تمتمایا ہوا تھا کہ اس طرف مکان کے ملبے سے اٹھتے ہوئے شعلے کمرے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں خود اپنے جسم پر کچھ ایسی تپش محسوس کر رہا تھا جیسے میں کسی تندور کے دہانے پر کھڑا تھا۔ تپش لحہ بہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔

لڑکی کی پوزیشن اس وقت چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہے کی سی تھی۔ وہ کمرا اس کے لیے قفس بن کر رہ گیا تھا۔ ورنہ اب تک وہ بھی یقیناً نکل کر جا چکی ہوتی۔ والدین بے شک اسے ساتھ لے جانا بھول گئے تھے لیکن وہ کوئی چھوٹی یا ناسمجھ بچی نہیں تھی کہ کمرے میں بیٹھی رہتی۔ اسے تو یقیناً جوانی کی حدود میں داخل ہوئے بھی مدت گزر چکی تھی۔ کمسن یا نوخیز لڑکی نہیں تھی۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان کہیں تھی۔

وہ دہشت زدہ نظروں سے اس اذیت ناک موت کی طرف دیکھ رہی تھی جو رقص کرتے شعلوں کی صورت میں اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ اس کے رخساروں پر آنسوؤں کی لکیریں خشک ہو چکی تھیں۔ وہ شاید اب بھی رونا چاہتی تھی لیکن دہشت کی زیادتی کے باعث آنسوؤں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

”تم جلدی سے دوسری کھڑکی کی طرف آؤ..... میں اسے توڑ کر تمہیں نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

وہ بدستور وحشی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی جیسے بات اس کی سمجھ میں نہ آئی ہو۔ میں نے احتیاطاً پنجابی میں چیخ کر اپنی بات دہرائی لیکن اس کا سر بدستور اس چوکور کھڑکی میں پھنسا رہا۔ اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔

اس دوران ہوا کے ایک تھپیڑے کے ساتھ شعلوں ک یکدم میری طرف کو ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے مجھے تندو پھینک دیا ہو۔ میں اچھل کر اس کمرے کی دیوار سے چپک گی میں وہ لڑکی پھنسی ہوئی تھی۔ پھر میں نے گردن موڑ کر دیکھا کہ پیچھے سے میرے کپڑوں نے تو آگ نہیں پکڑ لی تھی۔

میرا اندیشہ غلط تھا۔ کپڑے محفوظ ہی تھے۔ اس دوران تھپیڑا بھی گزر گیا تھا۔ شعلے دوبارہ آسمان ہی کی طرف لپکنے لگے یہ شعلے صرف ایک لمحے کے لیے میری طرف کو لپکے تھے او چھو نہیں پائے تھے لیکن ان کی تپش نے مجھے پریشان اور خو دیا تھا۔ میں سوچے بغیر نہیں رہ سکا کہ اگر اس معمولی سی د آگ کا یہ عالم تھا تو جہنم کی آگ کیا ہوگی؟

لڑکی کا چہرہ تپش سے عنابی سا ہو گیا تھا۔ میں نے چیخ ک سے کہا۔ ”بہری ہو گیا؟ تمہیں سنائی نہیں دیتا؟ میں تمہاری و اپنی جان مصیبت میں ڈال رہا ہوں اور تم گائے کی طرح بیا گردن نکالے کھڑی ہو۔ اپنی جگہ سے ہلو تو سہی.....“

اس کے آنسوؤں کے سوتے یقیناً خشک ہو چکے تھے مگر بے بسی سے اس کی آنکھوں سے ایک بار پھر آنسو امنڈ پڑ اس نے منہ کھول کر ”آ..... آ..... آں..... آع.....“ کی بے آوازیں نکالیں۔

مجھے جھٹکا سا لگا اور یکدم گویا اس آتش زدہ ماحول میرے ذہن پر برف کی بوچھاڑ سی ہو گئی۔ وہ صرف بہری ہ گونگی بھی تھی۔ اسی لمحے کہیں دور ایک اور دھماکا ہوا۔ گڑ سنائی دی اور میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ا جانے کا خوف نہیں تھا۔ یہ اس بے زبان وحشت زدہ ا چوہے کی طرح مارے جانے کا خوف تھا۔ مجھے اندیشہ محسو کہ اس گڑگڑاہٹ کے ارتعاش سے وہ کمرا بھی ملبے میں ہو جائے اور اس میں پھنسی ہوئی وہ معصوم صورت سی لڑ زدہ انداز میں دب کر نہ مر جائے۔

کمرا زمین بوس ہوتا تو میں خود بھی اس کی زد میں آسک اس اندیشے سے مجھے کوئی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ جب ڈھیر ہونے کی آواز سنائی نہ دی تو میں نے آنکھیں کھو آڑے ترچھے سے درودیوار کو قدرت کے دست غیبی نے اسی طرح عجیب و غریب سے انداز میں تھاما ہوا تھا۔

اب میں نے تیزی سے لڑکی کو ہاتھوں کے اشا سمجھایا کہ وہ بڑی کھڑکی کی طرف آجائے‘ میں اسے کوشش کرتا ہوں۔ وہ میرا مطلب سمجھ گئی۔ اس نے سر لیکن جلدی سے ہاتھ باہر نکالتے ہوئے مجھے اشارہ کیا کہ اندر کر کے کمرے کا جائزہ لے لوں۔

وہ خود ایک طرف کو کھسک گئی۔ میں نے سر کمرے ایک لمحے کے لیے مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اسی چھوٹی سی آگ کی روشنی اس کمرے میں پہنچ سکتی تھی جس میں‘ میں نے سر گھسیڑا تھا۔ تاہم دوسرے ہی لمحے مجھے اندھیرا ملگجا محسوس ہونے لگا اور کمرے کا منظر کافی حد تک دکھائی دینے لگا۔

وہ کمرا شاید فاضل سازوسامان رکھنے کے لیے استعمال ہوتا تھا اور لڑکی کو بھی شاید فاضل ہی سمجھ کر اس کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ چارپائیاں‘ لکڑی کے تخت‘ ٹرنک‘ پیٹیاں‘ گھڑونچیاں اور نہ جانے کیا کچھ اس کمرے میں بھرا ہوا تھا۔ اتنے سازوسامان کے ساتھ وہ لڑکی نہ جانے کس طرح وہاں رہتی تھی۔

اس وقت مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ دروازہ اور کھڑکی ترچھی ہو کر اپنی جگہ پھنس کر رہ گئی تھی بلکہ کمرے کے اندر بھی سارا کاٹھ کباڑ الٹ پلٹ ہو کر ایک دوسرے میں پھنس چکا تھا۔ دروازے اور کھڑکی کے پیچھے بھی سامان پھنسا ہوا تھا۔ یہی بڑی حیرت کی بات تھی کہ سامان کی اس الٹ پلٹ کے باوجود لڑکی صحیح سلامت دکھائی دے رہی تھی ورنہ اتنی بہت سی بے ہنگم چیزوں کے درمیان تو اس کا کچومر نکل سکتا تھا۔ شاید اسے کچھ چوٹیں آئی ہوں۔ جن کا فی الحال مجھے اندازہ نہیں ہو رہا تھا اور شاید فی الحال وہ قابلِ برداشت تھیں۔ وہ اشارے سے مجھے یہی دکھانا چاہتی تھی کہ ان سب چیزوں کی موجودگی میں وہ کس طرح دروازے یا دوسری کھڑکی تک پہنچ سکتی تھی؟ اس وقت بھی وہ ایک گھڑونچی میں دونوں پاؤں پھنسائے کھڑی تھی۔

میں نے اندازہ لگایا کہ کھڑکی تک پہنچنے کی نسبت دروازے تک پہنچنا کچھ آسان تھا۔ میں نے اشاروں سے اسے سمجھایا کہ وہ کسی نہ کسی طرح دروازے تک پہنچنے کی کوشش کرے‘ میں کسی نہ کسی طرح دروازہ کھولنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں ایک بار پھر ملبے کو پھلانگتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ دروازے کے اوپر دیوار میں چھت تک دراڑ نظر آ رہی تھی۔ دروازے کو چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا لیکن میں کوشش کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ ایک زندہ سلامت انسان کو دیکھنے کے بعد بے بسی کی موت مرنے کے لیے چھوڑ دینا میرے لیے بڑا مشکل کام تھا۔

لڑکی نے کم از کم اتنی عقلمندی ضرور کی کہ چند سیکنڈ بعد اندر سے دروازہ کھٹکھٹا کر مجھے احساس دلا دیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو چکی تھی۔ میرے کندھے پر اسٹین گن بھی لٹکی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اتار کر ایک طرف رکھا اور ملبے میں ایک مناسب جگہ پر پاؤں جما کر دروازے پر زور آزمائی شروع کی۔

زندگی میں بہت کم موقعوں پر مجھے اپنی پوری قوت صرف کرنے کی ضرورت پڑتی تھی لیکن اس وقت میں نے دروازے پر پوری قوت صرف کر دی۔ اگر اس کے پیچھے اتنا کاٹھ کباڑ مختلف زاویوں سے نہ پھنسا ہوتا تو شاید اس دروازے کو چوکھٹ سمیت اکھاڑنا بھی میرے لیے زیادہ مشکل نہ ہوتا لیکن اس وقت صورتِ حال ہی کچھ اور تھی۔

دانتوں پسینہ آنے والے محاورے کا صحیح مفہوم مجھے اس روز معلوم ہوا۔ بالآخر لکڑی کے بے ہنگم دروازے کا ایک موٹا پٹ پیچھے کھسکنا شروع ہوا۔ ایک اندیشہ مجھے یہ بھی تھا کہ کہیں لڑکی کے جسم کا کوئی حصہ دروازے اور کاٹھ کباڑ کے درمیان دبنا نہ شروع ہو جائے لیکن اندر سے اس کی کوئی آواز سنائی نہ دی تو میں نے دروازے پر قوت صرف کرنے کا عمل جاری رکھا۔

آخرکار دروازہ دو بالشت کے قریب کھل ہی گیا۔ اس دوران مجھ پر چھت کی طرف سے مٹی جھڑنے لگی تھی۔ کمرا کسی بھی لمحے ڈھیر ہو سکتا تھا۔ لڑکی کا تو جو حشر ہوتا سو ہوتا‘ ساتھ میری بھی ہڈی پسلی ایک ہو سکتی تھی اور جان کے لالے پڑ سکتے تھے۔ بہرحال میں نے سانس روک کر جدوجہد جاری رکھی۔

دروازے کے ساتھ ساتھ نہ جانے کیا کچھ پیچھے کھسکا تھا۔ آخر لڑکی نے دروازے سے سر نکالا لیکن وہ دروازے کے عقب میں کھڑی نہیں تھی بلکہ سازوسامان پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اسے تھوڑا سا اور آگے کھسکنے کا اشارہ کیا۔ اس کے بازو دروازے سے باہر آئے تو میں نے اس کی بغلوں میں ہاتھ دے کر اسے اونچائی پر سے باہر کھینچ لیا جس کے دوران اس کی چیخیں نکل گئیں۔ اسے یقیناً کچھ چوٹیں اور کچھ رگڑیں لگی تھیں۔ لباس بھی کہیں کہیں سے پھٹ گیا تھا لیکن کم از کم اسے بے بسی کے قفس سے نجات مل گئی تھی۔ وہ خود بھی زمین پر پاؤں ٹکتے ہی اپنی تکلیف کو بھول گئی۔

اُس کا چہرہ کھل اٹھا اور اس نے شکرگزارانہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ صرف نظروں ہی سے شکریہ ادا کر سکتی تھی۔ عام حالات میں شاید یہ خاموش تشکر کسی کے لفظی شکریے سے زیادہ دلکش و شیریں محسوس ہوتا لیکن اس وقت ذہن منتشر تھا اور حواس پر بڑا دباؤ تھا۔

میں نے اپنی گن اٹھائی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے بھاگا۔ مجھے ایک مبہم سا اندیشہ محسوس ہوا تھا۔ میرا اندیشہ درست ہی ثابت ہوا۔ ابھی میں نے ملبے کی بلندی سے لڑکی سمیت گلی میں چھلانگ ہی لگائی تھی کہ وہ کمرا بھی دھڑام سے بیٹھ گیا اور یوں پورا مکان ہی ملبے میں تبدیل ہو گیا۔

شاید قدرت کو صرف اس گونگی بہری لڑکی کو بچانا ہی مقصود تھا۔ صرف اس کی خاطر وہ کمرا اب تک گرنے سے بچا ہوا تھا۔ یہ قدرت کا بڑا فکر انگیز تماشا تھا لیکن یہ وقت غور و فکر کا نہیں تھا۔ گرد و غبار کے ایک بادل نے ہمارا تعاقب کیا اور مٹی کی دھانس میرے ناک میں چڑھ گئی۔ فضا میں بارود کی بُو پہلے ہی پھیلی ہوئی تھی۔

لڑکی لنگڑاتی ہوئی میرے ساتھ دوڑ رہی تھی۔ ہم چند قدم ہی دور گئے تھے کہ مجھے ایک اور نیم تباہ شدہ مکان کی طرف متوجہ ہو کر رکنا پڑا۔ وہ مکان..... یا یوں کہیے کہ مکان کی باقیات شعلوں میں

گھری ہوئی تھیں اور ان کے درمیان سے مجھے انسانی چیخیں سنائی دی تھیں۔ کوئی شخص مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

میں نے لڑکی کو اشارے سے سمجھایا کہ اس کے والدین اسی گلی میں آگے ایک جگہ بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے' وہ ان کے پاس چلی جائے اور تینوں ذرا دیر میرا انتظار کریں' میں ذرا اس شخص کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہوں جو آگ میں گھرا ہوا تھا۔

لڑکی کو یقیناً اس شخص کی چیخیں تو سنائی نہیں دے رہی تھیں لیکن وہ میرا مطلب سمجھ گئی اور آگے روانہ ہوگئی۔ میں آگ سے بچتے ہوئے اس مکان میں.... یا یوں کہئے کہ اس ملبے میں داخل ہوا لیکن جس تباہ شدہ کمرے میں وہ شخص پھنسا ہوا تھا وہ چاروں طرف سے آگ میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے دروازے اور کھڑکیوں نے بھی آگ پکڑلی تھی۔

اس کمرے کی آدھی سے زیادہ چھت گر چکی تھی۔ چھت گرنے کے وقت بھی شاید وہ شخص اسی گوشے میں تھا جدھر چھت کا کچھ حصہ محفوظ تھا۔ اسی لیے وہ بچ گیا تھا۔ شعلوں کی روشنی میں مجھے اندر کا منظر کافی حد تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ شخص مدد کے لیے چلا رہا تھا مگر ساتھ ہی ملبے میں دبی ہوئی بڑی سی کسی چیز کو کھینچنے کی بھی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے ایک لمحے کے اندر اندر صورتِ حال کا جائزہ لیا اگر میں صحیح طریقے سے ذرا لمبی چھلانگ لگانے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید ٹوٹی پھوٹی چیزوں سے ٹکرائے بغیر' کوئی چوٹ کھائے بغیر اور شعلوں سے محفوظ رہتے ہوئے اس شخص تک پہنچ سکتا تھا۔

ایک بار پھر مجھے گن کندھے سے اتار کر ایک طرف رکھنی پڑی اور مجھے افسوس ہونے لگا کہ میں خوامخواہ کیوں اس بوجھ کو کندھے پر لاد کر لایا تھا۔ میں یہاں لوگوں کی مدد کرنے کے لیے آرہا تھا۔ انہیں شوٹ کرنے کے لیے نہیں.... لیکن شاید اس وقت میرے لاشعور میں یہ خیال تھا کہ کبھی کبھی لوگوں کی مدد کے لیے جاتے وقت بھی بندوق کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔

میں نے جسم کو سکیڑتے ہوئے درندوں کے سے انداز میں چھلانگ لگائی اور "باب آتش" کے درمیان سے گزرتے ہوئے عین اس شخص کے سامنے جا کودنے میں کامیاب ہوگیا۔ خوفزدہ تو وہ پہلے ہی بہت تھا لیکن میرے اس طرح کودنے سے کچھ اور خوفزدہ ہوگیا۔ وہ کچھ بدلے ہوئے انداز میں پہلے سے زیادہ بری طرح چیخنے لگا جیسے میں اس کی مدد کے لیے نہیں بلکہ اسے قتل کرنے آیا تھا۔

وہ مدد کے لیے چیخ رہا تھا مگر اس قدر بدحواس تھا کہ شاید مجھے مکان کی طرف آتے نہیں دیکھ سکا تھا۔ میں یکدم اس کے سامنے کودا تو اس کی حالت خراب ہوگئی۔

وہ اوسط قد کاٹھ کا ایک مفلوک الحال شخص تھا۔ ادھیڑ عمر تھا مگر اس کی کمر نہایت عمر رسیدہ لوگوں کی طرح کچھ جھکی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے گوشوں میں پیلا کیچڑ چمک رہا تھا۔ آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ اس کی صحت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی تھی۔ ممکن بیمار ہو اور اسی وجہ سے مکان میں پھنسا رہ گیا ہو۔ اس تندرست اہلِ خانہ اسے چھوڑ چھاڑ کر بھاگ نکلے ہوں۔

"گھبراؤ مت..... میں تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے ہوں۔" میں نے اسے بہ آوازِ بلند تسلی دینے کی کوشش کی۔

اُس کی چیخیں یکدم رک گئیں۔ اس نے گویا سکون کی لی لیکن فوراً ہی پلٹ کر وہ اس چیز کو دوبارہ کھینچنے لگا جسے بچا کھینچنے میں جُتا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا وہ غالباً روئی کا بالشت بھر نہایت میلا کچیلا سا گدا تھا جو ایک پرانی سی مسہری پر بچھا ہوا تھا۔ چھت ٹوٹ کر مسہری اور دوسری چیزوں پر گری تھی۔ ٹوٹ گئی تھی اور گدا ملبے تلے دب کر دھول مٹی میں اٹ کر گندہ ہوگیا تھا۔ دونوں چیزیں آدھی سے زیادہ ملبے میں دبی تھیں۔ اس میلے کچیلے سے شخص کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت اس میلے کچیلے گدے پر لیٹا ہوا نہیں تھا جب چھت گری تھی وہ مدد کے لیے نہ چیخ رہا ہوتا اور میں اس کے انجام سے بے خبر یہاں سے گزرتا چلا جاتا۔

میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے نظروں ہی میں ناپ تول کا کام کرلیا تھا۔ اس شخص کی جسامت یا وزن زیادہ نہیں تھا۔

میں نے تیزی سے کہا۔ "تم میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ چاروں ہاتھ پیروں سے مضبوطی سے مجھے پکڑلو۔ میں تمہیں دروازے سے واپس اسی طرح چھلانگ لگانے کی کوشش جس طرح اندر آیا تھا۔ سمجھ گئے؟"

یہ ایک مشکل کام تھا لیکن فی الوقت مجھے اس کے چارہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اگر میں اس شخص کو اٹھا کر دروازے سے باہر پھینکتا تو اندیشہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو کسی حد تک بچا نہیں کر سکے گا اور ہڈی پسلی تڑوا بیٹھے گا۔ اس کے علاوہ اسے زیادہ دور نہ پھینک سکا تو وہ سیدھا آگ میں جا گرے دروازے کے سامنے بھی خاصی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے بہتر سمجھا کہ اسے پیٹھ پر لاد کر چھلانگ لگانے کا خطرہ مول لے لوں۔ کمرے میں حرارت ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی۔

میں اس شخص کو پیٹھ پر لادنے کے لیے اس کی طرف پشت کرکے جھک کر کھڑا ہوگیا لیکن جب مجھے اپنی پشت پر اُس کے کوئی آثار محسوس نہ ہوئے تو میں نے پلٹ کر دیکھا۔ بدستور اس میلے کچیلے گدے کے ساتھ زور آزمائی میں مصروف تھا اس نے شاید میری بات سنی ہی نہیں تھی اور بدستور گدا ملبے تلے سے نکالنے کی کوشش میں ہلکان ہوا جا رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو مجھے اتنا غصہ آیا کہ جی چاہا اسے آگ میں پھینک دوں یا اس کی کمر پہ ایسی لات رسید کروں کہ اس کے دو ٹکڑے ہو جائیں لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ

کہ جب انسان ہنگامی حالات میں دوسروں کی مدد کے لیے نکلتا ہے تو اسے اپنا دماغ بہت ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ چاروں طرف آگ لگی ہو تب بھی اس کا لہجہ شبنمی ہونا چاہیے۔ خدمتِ خلق کا اصل مزہ شاید تبھی آسکتا ہے۔

میں نے فوراً ہی اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے ملائمت سے کہا۔ "اے بھائی! اے بزرگوار... آخر تم اس گدڑی کے پیچھے کیوں مرے جا رہے ہو؟ جان بچانے کی فکر کرو۔ میں تمہیں اس سے اچھا.... نیا فوم کا گدا لے دوں گا..... بلکہ پورا بیڈ لے دوں گا..... ڈبل بیڈ لے دوں گا۔ یہاں سے تو نکلو۔ کیوں روسٹ ہونے پر تلے ہوئے ہو؟ اپنے ساتھ میرا بھی چرغا بنواؤ گے۔"

اس نے وحشت زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ وہ بس گدے کو کھینچے جا رہا تھا۔ وہ شاید تنویمی سی حالت میں تھا یا پھر اس پر دیوانگی سی طاری تھی۔

میرے خیال میں اسے اس کیفیت سے چونکانے کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کا کندھا پکڑ کر زور سے ہلایا اور چیخ کر کہا۔ "او خدا کے بندے! اس گدے کا پیچھا چھوڑ دے اور میری کمر سے چمٹ جا۔"

"کیسے چھوڑ دوں..... کیسے چھوڑ دوں اس گدے کو۔" اور گویا کوئی ڈراؤنا خواب دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس میں میری ساری عمر کی جمع پونجی ہے۔ معلوم نہیں کیا کیا بے ایمانیاں کرکے .... کیا کیا جھوٹ بول کے... اپنا پیٹ کاٹ کے... نہ جانے کتنے برسوں میں میں نے یہ سب کچھ جمع کیا ہے.... میں اسے کیسے چھوڑ جاؤں..."

اس کی گندی آنکھوں سے آنسو اس کے میل زدہ رخساروں پر بہنے لگے۔

ایک لمحے کے لیے گویا سارا منظر میری نظر میں ساکت ہوگیا۔ بھڑکتے ہوئے شعلے بھی ساکت ہوگئے۔ میں اس گندے سے انسان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ میں آج تک یہی سنتا آیا تھا اور اس سے متفق بھی تھا کہ جان سے زیادہ پیاری انسان کو کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اس قصبے میں داخل ہونے کے بعد میں اس کا سب سے بڑا ثبوت بھی دیکھ چکا تھا کہ اپنی جان بچانے کے لیے اولاد والدین کو چھوڑ کر بھاگ گئی تھی اور والدین اپنی گونگی بہری جوان بیٹی کو ساتھ لینا بھول گئے تھے.... لیکن اب میری آنکھیں ایک عجیب ہی منظر دیکھ رہی تھیں۔

روپیہ انسان کو جان سے زیادہ پیارا بھی ہو سکتا تھا' اس کا عملی مظاہرہ میں آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس شخص کا حلیہ ہی بتا رہا تھا کہ وہ کنجوسی و بخل کی نہایت کمیاب مثالوں میں سے ایک زندہ مثال تھا۔

ان گنت خیالات صرف ایک ثانیے کے اندر اندر میرے ذہن میں ہلچل مچا کر گزر گئے۔ فوراً ہی میں چونکا اور سر جھٹک کر میں نے پیچھے ہٹتے ہوئے برہمی سے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم اپنی عمر بھر کی اس پونجی کے ساتھ زندہ جل مرو۔ میں جا رہا ہوں۔"

اس کے حواس یک بیک ہی گویا بہت تیزی سے کام کرنے لگے۔ وہ بری طرح میری ٹانگوں سے لپٹ گیا اور آہ و زاری کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں..... نہیں..... خدا کے لیے مجھے یہاں سے ضرور نکالو..... لیکن میں اپنے اس گدے کے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتا..... کسی طرح اسے بھی نکال دو....." پھر وہ مجھے اللہ تعالیٰ اور اس کے تمام پیغمبروں کے واسطے دینے لگا۔

مجھے اس شخص سے گھن آرہی تھی۔ میں اس کی کوئی مدد نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ میں اسے زندگی بھر کے بخل اور کمینگی کی سزا ملتے دیکھنا چاہتا تھا۔ عین ممکن تھا جب آگ اس تک پہنچ جاتی' شعلے اس کے گندے وجود کو چاٹنے لگتے اور فضا میں اس کے بخل زدہ وجود کی چراند پھیلنے لگتی تو میں گلی میں کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھتا لیکن دوسرے ہی لمحے میرے ذہن نے پلٹا کھایا۔ ایک نیا زاویۂ خیال میرے سامنے آیا۔

مجھے بھلا اس شخص کو سزا دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اسے تو اللہ تعالیٰ خود سزا دے رہا تھا۔ اس کی زندگی ہی اس کے لیے سزا تھی۔ اس نے تو قدم قدم پر یہ سزا کاٹی تھی۔ وہ جب تک زندہ رہتا اسے یہ سزا کاٹنی تھی۔ وہ اس روپے کے لیے جان دینے کو تیار تھا جسے وہ خرچ نہیں کر سکتا۔ وہ اس رقم کے لیے مرا جا رہا تھا جس کا مالک ہوتے ہوئے بھی وہ اسے اپنی کوئی حسرت پوری کرنے کے لیے خرچ نہیں کر سکتا تھا۔ زندگی میں وہ نہ جانے کس چھوٹی چھوٹی سی چیز کے لیے ترستا تھا۔ رقم پاس ہوتے ہوئے بھی...!

میں بھلا اسے اس سے بڑی کیا سزا دے سکتا تھا؟ موت تو اس کے لیے اس سزا سے نجات تھی۔

"ٹھہرو' میں تمہارے اس گدے کو نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔

میں سر سے پاؤں تک پسینے میں تر تھا لیکن یہی پسینہ مجھے آگ کی تپش سے بچا رہا تھا۔ قدرت کی ہر تخلیق اپنی جگہ واقعی ایک شاہکار ہے۔ ہر جسم کو پیش آنے والے مسئلے کا حل کافی حد تک اسی جسم میں موجود ہوتا ہے۔ جب تک میرے جسم میں پسینہ بہانے کے لیے نمی موجود تھی تب تک میں تپش کی اذیت سے کافی حد تک بچا ہوا تھا۔

میں نے گدے میں اچھی طرح دونوں ہاتھ پھنسائے۔ گدا واقعی روئی کا تھا لیکن روئی اس میں بہت زیادہ بھری ہوئی تھی۔ ایک بار پھر میں نے اپنی غیر معمولی طاقت کو استعمال کیا۔ لہو گویا میرے چہرے اور بازوؤں میں سمٹ آیا۔

گدا نہ جانے کتنا پرانا تھا' چررر' کی آواز کے ساتھ اس کا کپڑا پھٹ گیا۔ کپڑا پھٹتے ہی روئی کی تہیں بھی درمیان سے ٹوٹ گئیں۔ روئی کی ان تہوں کے درمیان نئے پرانے چھوٹے بڑے نوٹوں کی تہ بچھی ہوئی تھی۔ گدا پھٹنے سے یکدم بہت سے نوٹ کمرے میں بکھر

گئے۔ وہ شخص دیوانوں کی طرح انہیں سمیٹنے لگا۔
غالباً بیشتر نوٹ ابھی روئی کی تہوں کے درمیان ہی تھے۔ صرف چند روز کی رقم اِدھر اُدھر بکھری تھی۔ اس میں بڑے نوٹ کم ہی تھے تاہم میرا اندازہ تھا کہ گدّے میں اچھی خاصی رقم موجود تھی۔
اس دوران آگ مزید پھیل چکی تھی۔ کمرے کے اس بچے کھچے حصے میں ٹھہرنا مزید دشوار ہوچکا تھا۔ ہوا تیز تھی اور اس کی وجہ سے آگ گویا ہر سمت میں تیزی سے پھیلتی جارہی تھی۔ جس طرف سے کمرا منہدم ہوچکا تھا اُدھر سے بھی آگ اندر آرہی تھی۔ اس کے علاوہ دروازے کھڑکیاں بھی بری طرح جل رہی تھیں۔ گویا اس جگہ سے نکلنے کا راستہ مسدود ہوتا جارہا تھا لیکن وہ شخص اپنے نوٹ اکٹھے کرنے میں لگا ہوا تھا اور اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ باچھوں سے تھوک بہہ رہا تھا۔
میں نے اسے زور سے جھنجھوڑ کر چاروں طرف پھیلی ہوئی آگ دکھانے کی کوشش کی اور چیخ کر کہا۔ "اگر تم نے ذرا بھی اور دیر کی تو ہم یہاں سے زندہ نہیں نکل سکیں گے۔ تمہیں نکلنا ہے تو نکلو ورنہ میں جارہا ہوں۔"
اب وہ شعلوں کو دیکھ کر دہشت زدہ ہوا لیکن اس کی جان رقم میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ میری کمر پر سوار تو ہوگیا لیکن بار بار اپنے نوٹوں کی طرف دیکھتا جارہا تھا اور اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکل رہی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں بھی نوٹ دبے ہوئے تھے جن کی وجہ سے وہ صحیح طور پر مجھے پکڑ نہیں پارہا تھا۔
میں نے کسی جناتی سائز کے مینڈک کی طرح لمبی چھلانگ لگائی اور ہم شعلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے باہر جاگرے۔ چھلانگ خاطر خواہ حد تک لمبی رہی تھی اور ہم دروازے کے سامنے کچھ دور تک بھڑکتے ہوئے شعلوں کو بھی پھلانگ گئے لیکن اس دوران اس کی مٹھیوں سے کچھ نوٹ نکل کر اُڑتے ہوئے آگ میں جاگرے۔
میرے پاؤں زمین پر لگے تو جھٹکے کی وجہ سے وہ شخص زمین پر جاگرا۔ اسے چوٹیں ضرور آئی ہوں گی لیکن کم از کم اس کی جان تو بچ گئی تھی۔ اسے چوٹوں کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ تڑپ کر اٹھ کھڑا ہوا اور جلدی سے پلٹ کر اپنی پونجی کی تباہی کا منظر دیکھنے لگا۔ نوٹ شعلوں کے درمیان پھڑپھڑاتے ہوئے زمین تک پہنچنے سے پہلے ہی خاک ہوئے جارہے تھے۔ ہوا کی وجہ سے کمرے میں بکھرے ہوئے نوٹ بھی اُڑ اُڑ کر شعلوں کی لپیٹ میں آنے لگے تھے۔ چند لمحوں کی بات اور تھی۔ روئی کے گدّے پر تو ایک چنگاری گرنے کی دیر تھی۔ اس کے بعد اس میں دبے ہوئے نوٹوں کو بھی آگ کی نذر ہی ہونا تھا۔ صرف چند نوٹ اس شخص کی مٹھی میں دبے رہ گئے تھے۔ زندگی بھر اس نے اپنے آپ پر جو ظلم روا رکھا ہوگا اس کا حاصل صرف یہ چند نوٹ تھے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی دولت کو نذرِ آتش ہوتے دیکھ رہا تھا۔

مجھے ایک بار پھر اس کو پکڑ کر جھنجھوڑنا پڑا۔ "تمہیں میر[ے] ساتھ چلنا ہے یا نہیں؟ میں تمہیں کسی محفوظ جگہ تک پہنچا دوں[گا] میرے پاس گاڑی ہے۔" میں نے تیزی سے کہا۔
اس نے خالی خالی نظروں سے میری طرف دیکھا اور بڑبڑا[نے] کے سے انداز میں بولا۔ "تم نے مجھے آگ کے گھیرے میں سے [نکال] دیا..... یہی کافی ہے..... اب میں خود ہی کہیں چلا جاؤں گا..... تمہ[یں] جلدی ہے تو تم جاؤ....."
وہ شاید اپنے آخری نوٹ تک کو جلتے دیکھنا چاہتا تھا۔ مم[کن] ہے یہ بھی خود اذیتی کی کوئی قسم ہو۔ اس دوران ہمارے سر[پر] تاریک آسمان پہ کوئی شعلہ سا لپکتا دکھائی دیا اور قریب ہی کہیں زوردار دھماکا سنائی دیا لیکن وہ محض جھرجھری سی لے کر رہ [گیا] خوفزدہ ہوکر میرے ساتھ چلنے کے لیے آمادہ نہیں ہوا۔
میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑا اور واپس روانہ ہو[گیا] میں نے اس کے لیے جتنا کردیا تھا اتنا ہی کافی تھا۔ اگر وہ مزید اذ[یت] سہنا چاہتا تھا تو اس کی مرضی۔ میں نے واپس جاتے وقت اِدھ[ر] تمام مکانوں میں جھانکا۔ کچھ تباہ شدہ تھے، کچھ نیم تباہ شدہ تھے [بعض] میں آگ لگی ہوئی تھی، کچھ کی طرف آگ بڑھ رہی تھی۔ [کچھ] مکان بہرحال سلامت تھے لیکن ان کے مکین بھی انہیں چھو[ڑ کر] بھاگ چکے تھے۔ دروازے کھلے پڑے تھے۔ بعض میں سامان جوں کا توں پڑا دکھائی دے رہا تھا۔
تباہ شدہ مکانوں کے ملبے تلے اگر لوگ دب چکے تھے تو ا[نہیں] تلاش کرنا یا ان کے لیے کچھ کرنا میرے لیے مشکل تھا۔ اس [کام] کے لیے ساز و سامان کی ضرورت تھی۔ اس سے قطع نظر مجھے ر[استے] میں کہیں کوئی مدد کا طالب دکھائی نہیں دیا۔ حتیٰ کہ میں اس مق[ام پر] پہنچا جہاں میں نے بوڑھے جوڑے کو چھوڑا تھا تو وہ بھی وہاں [سے جا چکے تھے] آئے۔ میں نے ان کی بیٹی صغراں کو ان کی طرف روانہ کیا تھا [لیکن] وہ بھی کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ میں اسے روانہ کر[کے] صرف چند منٹ بعد ہی یہاں آن پہنچا تھا لیکن بوڑھا جوڑا غا[لباً] کے پہنچ جانے کے بعد میرا انتظار نہیں کرسکا تھا اور وہ تینوں [وہاں] سے نکلنے کے لیے روانہ ہوگئے تھے۔
میرا یہاں آنے کا مقصد لوگوں کی مدد کرنا اور ان کو بچانے کی کوشش کرنا تھا لیکن میرا مشن کچھ عجیب ہی رہا تھ[ا] جس طرح خالی ہاتھ اور اکیلا آیا تھا اسی طرح واپس جارہا تھا [البتہ] کچھ عبرت انگیز تماشے ضرور دیکھ لیے تھے جن سے میری یادد[اشت کے] خزانے میں کچھ کار آمد اضافہ ہوگیا تھا۔
میں واپس قصبے سے باہر اس جگہ پہنچا جہاں ہم نے گ[اڑیاں] کھڑی کی تھیں تو ایک اور عبرت انگیز تماشا میرا منتظر تھا۔ وہ یہ [کہ] جن گاڑیوں کو ہم زخمیوں اور ضعیفوں کو محفوظ مقام تک [لے جانے] کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے ان میں زخمیوں یا ضعیفوں کو [تو] نہیں جگہ ملی تھی یا نہیں لیکن ٹھیک ٹھاک ہٹے کٹے لوگ ا[س]

[بُری] طرح لدے نظر آرہے تھے کہ وہ گاڑیوں کے بجائے شہد کے [چھتے] معلوم ہورہی تھیں۔
[گاڑیاں] جیپیں تو نظر ہی نہیں آرہی تھیں۔ ان کے ہر حصے پر لوگ [سوا]ر تھے۔ ان کا تو کوئی پہیہ تک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ راحیلہ کی [اسٹ]یشن ویگن میں لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے اور [زیا]دہ اس سے زیادہ اس کی چھت پر لدے ہوئے تھے۔ کچھ لوگ [ا]ن کے پچھلے بمپرز پر بھی چڑھ کر کھڑے ہوگئے تھے۔
کچھ زخمی اور ضعیف لوگ اِردگرد زمین پر آڑے ترچھے پڑے [کرا]ہ رہے تھے۔ انہیں غالباً نفیس صاحب، راحیلہ اور ہمارے [دوس]رے ساتھی اٹھا کر لائے تھے لیکن انہیں گاڑیوں میں ڈالنے کی [نوب]ت نہیں آسکی تھی۔ غالباً ان کی آمد سے پہلے ہی گاڑیوں پر [تندرست ب]ندوں کا قبضہ ہوچکا تھا اور وہ سب شور مچا رہے تھے کہ انہیں [جلد]از جلد کسی محفوظ مقام کی طرف لے جایا جائے۔
نفیس صاحب، ان کے ساتھی اور میرے ساتھی سب حیرت [س]ے ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا [کہ] انہیں کیا کرنا چاہیے۔ ایک لمحے کے لیے تو میں بھی دم بخود کھڑا [رہ گ]یا۔ ہماری قوم کا واقعی کچھ پتا نہیں چلتا۔ کبھی یہ اتنی ایثار پسند [نظ]ر آتی ہے کہ دوسروں کے لیے جان دے دیتی ہے، اپنے منہ کا [نوا]لہ بھی نکال کر دوسرے کو کھلا دیتی ہے اور ہنگامی حالات میں اتنی [منظ]م، اتنی بے خوف نظر آتی ہے کہ دیکھنے والا رشک کرے لیکن [کبھ]ی ہنگامی حالات کے دوران اتنی بد نظمی، اتنی ہڑبونگ اور اتنی [بے ب]اکانہ خود غرضی دیکھنے میں آتی ہے کہ دل اوبنے اور ڈوبنے لگتا [ہے]۔
اس جم غفیر کی بے وقوفی کا یہ عالم تھا کہ اس نے گاڑیوں کی [ڈرا]ئیونگ سیٹوں اور اسٹیئرنگ وھیلز تک پر قبضہ کرلیا تھا بلکہ [ڈر]ائیونگ سیٹ اور اسٹیئرنگ وھیل نظر ہی نہیں آرہے تھے۔ ان [پر] بھی نہ جانے کتنے لوگ لدے ہوئے تھے اور اس پر بھی ان کا [مط]البہ تھا کہ انہیں جلد از جلد کسی محفوظ مقام پر پہنچایا جائے۔ اسی [دو]ران آس پاس پے درپے تین چار دھماکے سنائی دیے تو ان کی [گھگ]ھی بندھ گئی لیکن وہ لوگ گاڑیوں سے نہیں اترے۔ جونہی [دھما]کے اور گڑگڑاہٹ معدوم ہوئی انہوں نے دوبارہ شور مچانا [شر]وع کردیا۔
"کیا مسئلہ ہے؟" میں نے قریب پہنچ کر نفیس صاحب سے [پو]چھا۔
"کیا تمہیں مسئلہ نظر نہیں آرہا؟" نفیس صاحب قدرے خفگی [سے] بولے۔ ان جیسا جہاندیدہ آدمی بھی اس وقت پریشان نظر آرہا [تھا]۔ راحیلہ ان کے قریب ہی کھڑی تھی۔
"مسئلہ تو مجھے نظر آرہا ہے۔ میں تو آپ لوگوں سے پوچھ رہا [تھا کہ] کیا آپ سب لوگ یونہی ہاتھ باندھ کر کھڑے رہیں گے؟" [میں] نے نیچی آواز میں لیکن قدرے ناگواری سے کہا۔

"تو پھر ہم کیا کریں؟" نفیس صاحب بولے۔
"کم از کم آپ جیسے آدمی کو تو یہ سوال نہیں کرنا چاہیے۔ آپ تو بڑی بڑی ہنگامہ خیز صورتِ حال میں ماسٹر آف دی سچویشن رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔
"اس وقت میرا ذہن کچھ صحیح طرح کام نہیں کررہا۔" انہوں نے اعتراف کیا۔ "بڑے بڑے دفاتر میں بیٹھ کر حکم چلانا اور بات ہے۔ خود اپنے سامنے کچھ ہوتے دیکھنا اور بات ہے۔"
"آپ لوگ کم از کم اپنی گنیں سیدھی کرلیں۔ بے ہنگم ہجوم کو حواس میں لانے کے لیے کبھی کبھی سختی ضروری ہوتی ہے۔ خواہ وہ سختی مصنوعی ہی ہو۔" میں نے نیچی آواز میں کہا۔
پھر میں نے ہجوم کی طرف مڑتے ہوئے گرج کر کہا۔ "یہ کیا ہنگامہ مچا رکھا ہے تم لوگوں نے؟ یہ گاڑیاں زخمیوں اور ضعیفوں کی مدد کے لیے آئی ہیں۔ تم لوگ تو ویسے بھی بھاگ دوڑ کر کہیں پناہ حاصل کرسکتے ہو۔ ان گاڑیوں میں صرف ان لوگوں کو بیٹھنے دو جو چل نہیں سکتے۔"
ان کا شور تو بند ہوگیا لیکن گاڑی سے کوئی شخص اترتا دکھائی نہ دیا۔ میں نے پہلے سے زیادہ برہمی سے چلّا کر کہا۔ "سب لوگ گاڑیوں سے اتر آئیں ورنہ ہم گولی چلا دیں گے۔"
میں نے ایک ہوائی برسٹ بھی مار دیا۔ میری تقلید میں نفیس صاحب اور دوسرے تین افراد نے بھی ہوائی برسٹ مار دیے۔ سب لوگ دھڑ دھڑ کرکے یوں گاڑیوں سے لڑھک پڑے گویا کسی نے آلوؤں کی بوریاں لڑھکادی ہوں۔ راحیلہ کی اسٹیشن ویگن میں کئی عورتیں بھی گھسی ہوئی تھیں۔ ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا کہ عورتوں کو گاڑی میں بیٹھا رہنے دیا جائے لیکن پھر خیال آیا کہ اس طرح وہ اپنے مردوں سے بچھڑ جائیں گی۔ اس سے قطع نظر بھی میں ترجیح زخمیوں ہی کو دینا چاہتا تھا۔ اس کے بعد اگر جگہ بچ جاتی تو عورتوں کو بٹھایا جاسکتا تھا۔
لوگ تتر بتر ہوگئے تو ہم نے زخمیوں کو گاڑیوں میں ڈالنا شروع کیا۔ ان میں سے بعض بے ہوش تھے۔ وہ گاڑیوں میں زیادہ جگہ گھیر رہے تھے۔ بعض زخمیوں کو بھی سیٹوں پر بٹھایا نہیں جاسکتا تھا۔ انہیں لٹانا ہی پڑ رہا تھا۔ اس طرح گاڑیوں میں کچھ زیادہ لوگ نہیں آسکے لیکن اس وقت تک فائر بریگیڈ کی دو گاڑیاں اور نجی فلاحی اداروں کی تین چار ایمبولینس وہاں آن پہنچیں۔ یوں مسئلہ کافی حد تک حل ہوگیا۔ زخمیوں کے لواحقین کو بھی گاڑیوں میں لفٹ مل گئی۔
اس دوران آسمان سے میزائلوں وغیرہ کی بارش کم ہوگئی تھی۔ اب وقفے وقفے سے کوئی دھماکا سنائی دیتا تھا۔ اس کے باوجود ہم نے راستے میں کئی جگہ یہ چیزیں گرتے دیکھیں۔ جگہ جگہ زمین میں گڑھے پڑ چکے تھے۔ بعض مقامات پر سڑک بھی بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی۔ ہم لوگ ایمبولینسوں کے پیچھے ہی چل رہے تھے۔ یہ

ہماری خوش قسمتی تھی کہ ہمارے قافلے میں سے کسی گاڑی پر کوئی میزائل وغیرہ نہیں گرا۔ ایک بار البتہ ہماری سب سے پچھلی گاڑی کے عین قریب کوئی چیز گر کر ایسے دھماکے سے پھٹی کہ میرے ہاتھ بھی اسٹیئرنگ وھیل پر لرز کر رہ گئے۔

وہ گاڑی ایک لمحے کے لیے دھول میں چھپ گئی۔ اس میں نفیس صاحب کے آدمی تھے۔ میں نے کھلی جیپ میں گردن گھما کر دیکھا اور مجھے اندیشہ محسوس بھی ہوا کہ سب سے پیچھے والی جیپ تباہ ہو چکی تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ گرد و غبار کے طوفان سے صحیح سلامت برآمد ہوتی دکھائی دے گئی۔ جیپ میں سوار افراد کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچی تھی۔

زخمیوں کو راولپنڈی کے ایک سرکاری اسپتال میں چھوڑ کر ہم دوبارہ اس قصبے میں پہنچے لیکن اب وہاں ہماری مدد کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی تھی۔ مختلف سرکاری اور فلاحی ادارے کچھ تاخیر سے سہی...... لیکن حرکت میں آچکے تھے۔ اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کردی گئی تھی اور متاثرہ علاقوں کی طرف مختلف گاڑیوں کی آمدورفت جاری تھی۔ آسمان سے برستی ہوئی چیزوں کا سلسلہ بھی رک چکا تھا۔ پریس، ٹی وی، ریڈیو کی گاڑیاں بھی مجھے حرکت میں نظر آئیں۔ بہرحال ہم اور نفیس صاحب وغیرہ بھی تمام رات اِدھر اُدھر پھرتے رہے اور جہاں بھی ہماری مدد کی ضرورت پڑی، حسب مقدور لوگوں کے کام آنے کی کوشش کرتے رہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے بلاشبہ وہ قیامت کی رات تھی۔

صبح تک حالات قابو میں آچکے تھے لیکن بہت زیادہ جانی و مالی نقصان ہو چکا تھا۔ کم و بیش ڈھائی سو افراد جاں بحق ہوئے تھے جن میں سے بہت سے تو اسلحے کے ڈپو میں ہی موجود تھے۔ بعض کی لاشوں کے تو ٹکڑے ہی ملے تھے، بعض کوئلہ ہو گئے تھے۔ مجموعی طور پر سات سو کے قریب افراد زخمی ہوئے تھے جن میں سے بعض کی حالت خراب تھی۔

مالی نقصانات کا ابھی کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکا تھا۔ شکر کا مقام یہ تھا کہ ڈپو کی آگ پر چند گھنٹے بعد قابو پالیا گیا تھا۔ کچھ لوگوں نے جان پر کھیل کر اس کے ایک بہت بڑے حصے کو بچا لیا تھا۔ اگر وہ حصہ بھی آگ پکڑ لیتا تو تباہی اس سے کہیں زیادہ ہوتی۔

یہ تمام خبریں ہمیں ریڈیو اور کچھ ٹیلی فون کالز کے ذریعے ملیں۔ زیادہ صحیح خبریں نفیس صاحب کے ذریعے مل رہی تھیں۔ صبح کے اخبارات میں بھی رات گئے تک کی خبریں شاملِ اشاعت تھیں لیکن ان میں سے بیشتر کو خبریں نہیں، محض قیاس آرائیاں ہی کہا جاسکتا تھا۔ حقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں تھی۔

دن چڑھے جب ہم نے محسوس کیا کہ اب ہمارا نفیس صاحب کے ساتھ رہنا ضروری نہیں رہا تھا تو ہم نے انہیں خدا حافظ کہا اور اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرح روانہ ہوئے۔ تھکن سے ہم سب کا برا حال تھا۔ نفیس صاحب کی حالت تو ہم سے بھی زیادہ خراب تھی۔

انہیں تھکن کے علاوہ یقیناً بہت سے تفکرات بھی لاحق وقت ہم انہیں خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوئے اس وق سیکریٹریٹ کے سامنے اپنی جیپ میں بیٹھے پھٹی پھٹی آنکھو میں نہ جانے کیا تک رہے تھے۔

میں راحیلہ کے ساتھ اسپتال والے بنگلے پر واپس دونوں اس قدر تھکے ہوئے اور اس قدر دل گرفتہ تھے ایک دوسرے سے کوئی بات تک نہیں کی اور نہ ہی کچھ کہ پہنچتے ہی ہم اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ میں تکیے میں لیٹ گیا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ معلوم نہ کا کیا حال تھا۔ کم از کم میرا تو یہ عالم تھا کہ گزشتہ روز کے تمام مناظر فلم کی طرح آنکھوں کے سامنے گھوم ر ان میں سے بہت سے مناظر بہت ہی رنجیدہ کردینے والے

بہرحال اس تمام تر رنجیدگی والی شکستگی کے باوجو کس وقت مجھے نیند آگئی۔ میری آنکھ کھلی تو شام کا اندھیر تھا۔ میں نے شاور لے کر لباس تبدیل کیا۔ اب میں ا تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ میں لاؤنج میں آیا تو راحیلہ وہا موجود تھی۔ وہ بھی بظاہر میری طرح تازہ دم نظر آرہی تھ نے محسوس کیا کہ ہمارے ذہنوں میں بدستور برف سی جمی وہ بھی چپ چپ سی تھی۔ میرا بھی بولنے کو دل نہیں چاہ ر

وہ خاموشی سے چائے بنا لائی اور ہم چسکیاں لینے۔ اخبارات بکھرے ہوئے تھے جن میں دو تین شام کے اخ شامل تھے۔ عام حالات میں یہاں کے شام کے اخبار چھپکے سے دکھائی دیتے تھے اور انہیں چھاپنے کا کوئی ج نہیں دیتا تھا لیکن آج انہیں چھاپنے کے لیے گویا بہت مواد مل گیا تھا۔ صبح کے اخبارات نے بھی ضمیمے شائع دی پر بھی خبروں میں سرفہرست وہی اسلحہ ڈپو والا واقعہ او جڑی کیمپ والے سانحے کی یاد تازہ کردی تھی جب ک کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اخباری خبروں اور بدستور قیاس آرائیاں جاری تھیں۔ ہر کوئی دور کی کوڑی مختلف سوالات اٹھائے جارہے تھے۔ مختلف مطالبات تھے۔

دھیرے دھیرے ہمارے ذہنوں سے برف کچھ پگھ دھیمے لہجے میں اس سانحے کے بارے میں باتیں کرنے اپنے کپ کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولی۔

"ہم نے تو ریڈ ڈاٹ کا صرف خالی اور ویران ہیڈ کیا...... ایک عمارت کو تباہ کیا...... بلکہ اسے بھی ہم۔ کیا...... وہ خود ہی اس کے تباہ ہونے کا بندوبست کر کے ہم نے تو صرف اس سے چھیڑ چھاڑ کرنے کی غلطی کی ا نتیجے میں ہمارے اتنے بہت سے ہنستے بستے گھر اجڑ گئے۔ ضائع ہو گئیں۔ گویا اس بار بھی وہ ہمیں ہماری ہی نظ

رت بنا گئے......"

"کوئی بات نہیں......" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "خون کا حساب تو سب کو دینا ہی پڑتا ہے۔ انہیں بھی دینا پڑے گا...... ہم یا والے تو اپنا الٹا سیدھا نظام چلاتے ہی رہتے ہیں...... اپنی قص عقل کے مطابق اپنے کام کرتے رہتے ہیں...... لیکن نہایت اموشی سے اس دنیا میں اوپر والے کا بھی ایک نظام کام کر رہا ہے۔ مجھے اس نظام پر زیادہ بھروسا ہے۔"

راحیلہ نے اپنے نم آلود بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے یب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ موبائل فون اس کے ریب ہی رکھا تھا۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ذرا نفیس صاحب کو فون تو کرو۔ معلوم کریں کہ تازہ ترین صورتِ حال کیا ہے۔"

راحیلہ نے نمبر پنچ کیا اور مختصر بات کرنے کے بعد فون بند کرتے ہوئے بولی۔

"وہ اس وقت میٹنگ میں ہیں۔ میٹنگ اختتام پر ہی ہے۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی وہ خود ہمیں فون کریں گے۔"

ہم نے وہ چند منٹ باتیں کرنے اور چائے پینے میں گزارے۔ حسب وعدہ نفیس صاحب کا فون آگیا۔ راحیلہ ان سے بات کرتے ہوئے بولی۔ "نہیں نہیں...... دراصل افضل آپ سے کرنا چاہ رہے تھے۔"

اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔ نفیس صاحب میری آواز سنتے ہی کراہنے کے سے انداز میں بولے۔ "ڈیئر افضل چوہدری! تم نے مجھے مروا دیا...... بالکل ہی مروا دیا۔"

"کیوں سر......؟ میں نے کیا کیا ہے؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہے چند منٹ پہلے میں جس میٹنگ میں تھا اس میں ملک کی اعلیٰ ترین مقتدر ہستیاں شریک تھیں......؟"

میرے لیے یہ کوئی حیرت انگیز خبر نہیں تھی بلکہ یہ تو سرے سے کوئی خبر ہی نہیں تھی۔ اس قسم کی کوئی میٹنگ میرے لیے متوقع تھی۔ نفیس صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے۔ "اگر تمہیں یہ معلوم نہیں تو کم از کم یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ میرا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جنہیں ہمارے ہاں "کنگ میکرز" کہا جاتا ہے۔"

"جی ہاں...... میں یہ بات بھولا نہیں ہوں۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

"اس کے باوجود میں اس منحوس ریڈ ڈاٹ کے چکر میں خانہ بدوش اور نہ جانے کیا کچھ بنا۔ فقیروں کی طرح پھرتا رہا۔" وہ بولے۔

"تو اس میں اس طرح رونے کی کیا بات ہے سر؟" میں نے ملائمت سے کہا۔ "یہ کام تو بہت سے بڑے بڑے لوگوں کو کرنا پڑ جاتا ہے۔ تبھی تو چچا غالب نے کہا تھا۔

بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اس طرح آپ نے بھی تھوڑا بہت تماشائے اہلِ کرم...... یا یوں کہیے کہ تماشائے اہلِ ستم دیکھ لیا...... لیکن یہ باتیں آپ کو اس وقت کیوں یاد آرہی ہیں؟"

"میں اصل بات کرنے سے پہلے تمہیں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ریڈ ڈاٹ کے چکر میں پڑنے کے بعد سے میری کیا کیا درگت بنی ہے۔ میں نے...... یعنی نفیس احمد خان نے بہ نفسِ نفیس کیا کیا مصیبتیں اور ذلتیں اٹھائی ہیں۔"

"بے شک......" میں نے تسلیم کیا۔ "مجھے وہ سب کچھ اچھی طرح یاد ہے سر! آپ صرف نام کی حد تک نہیں، عملی زندگی میں بھی ایک نفیس آدمی ہیں لیکن اس دوران آپ کی تمام تر نفاست دھری کی دھری رہ گئی تھی۔"

پھر میں نے بڑے ادب سے انہیں یاد دلایا۔ "مجھے یہ سب کچھ اس لیے بھی یاد ہے کہ خود میری اس سے بھی زیادہ بری درگت بنی ہے۔"

"لیکن تم کم از کم اس لحاظ سے خوش قسمت ہو کہ تم کوئی بڑے سرکاری افسر نہیں ہو۔ بڑے بڑے سنگین اور نازک معاملات میں کسی کو جواب دہ نہیں ہو۔" وہ تیزی سے بولے۔

"آہ...... یہ تو کسی کو بھی معلوم نہیں کہ درحقیقت کون خوش قسمت ہے سر! ہر شخص اپنی طرف نہیں بلکہ کسی اور ہی کی طرف دیکھ کر رشک کرتا ہے۔ بے شمار لوگ جو آپ کے عہدے کی طاقت اور اہمیت سے واقف ہیں، وہ آپ پر رشک کرتے ہوں گے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ۔

جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے

"بات کیا ہے؟ آپ کو کیا مشکل آن پڑی ہے؟"

"میرے زخموں پر شعر و شاعری کا مرہم رکھنے کی کوشش مت کرو۔ اس وقت اشعار یا مصرع میرے زخموں پر مرہم کا نہیں، نمک کا کام کر رہے ہیں۔" نفیس صاحب بدستور جھنجلائے ہوئے سے انداز میں بولے۔ "کبھی کبھی میں بھی اپنے آپ پر رشک کیا کرتا تھا لیکن آج کی میٹنگ کے دوران میرا استعفیٰ دینے کو دل چاہنے لگا تھا۔"

"کیوں سر؟ کیا بہت ڈانٹ پڑی ہے؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا۔

"ڈانٹ وغیرہ تو خیر ہمیں نہیں پڑتی...... لیکن کسی کا نظریں بدل لینا ہی ہمارے لیے ڈانٹ سے زیادہ سنگین ہوتا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔ "میرے پورے کیریئر کے دوران میرے ساتھ ایسا رویہ اختیار نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ اوجڑی کیمپ والے سانحے کے بعد بھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ متعلقہ محکموں کے پاس مناسب وضاحتیں موجود تھیں جنہیں قبول کرلیا گیا تھا۔"

"ایک ہی جیسے سانحے کا دوبارہ رونما ہونا یقیناً سوالات اور ناگواریوں کو جنم دیتا ہے سر! ویسے...... ذرا نچلی سطح پر تو ہمارے ہاں ایک جیسے سانحے دس دس مرتبہ بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔"

"میٹنگ اور فائلوں کی حد تک تو جوں رینگتی ہے۔" نفیس صاحب نے ایک طویل سانس لی۔ "بہرحال...... میں خوش ہوں کہ میری ریٹائرمنٹ میں صرف چند سال باقی ہیں۔"

"آپ پہلے آفیسر ہیں جنہیں میں ریٹائرمنٹ کے تصور سے خوش ہو کر بات کرتے سن رہا ہوں ورنہ ریٹائرمنٹ کے تصور سے تو لوگوں کی نیندیں اُڑ جاتی ہیں۔" میں نے کہا۔

"نہ صرف لوگوں کی...... بلکہ ان کی بیویوں کی بھی۔" نفیس صاحب بولے۔ "لیکن میرا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ میں آج بہت دل شکستہ ہوں۔ ہم جو کچھ بھی کر رہے تھے بہت نیک نیتی سے کر رہے تھے۔ اب ہمیں غیب کا علم تو نہیں تھا۔ ہمیں کیا معلوم تھا کہ ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ کوارٹر پر دھاوا بولنے کا ردِ عمل یہ ہوگا۔ میں چاہتا تو اپنے ساتھ دوسرے بہت سے لوگوں کو بھی اس المیے کا ذمے دار ٹھہرا سکتا تھا لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے اس معاملے میں کسی اور تک کوئی بات نہیں آنے دی۔ ان میں تم بھی شامل ہو۔"

"کیا مجھے بھی اس معاملے میں گھسیٹا جا سکتا تھا سر؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"یقیناً...... اور ایک سویلین کے طور پر تمہیں خاصی مشکل پیش آ سکتی تھی۔ تمہیں معلوم ہے کہ ہمارے ہاں کس طرح بات کا بتنگڑ بنتا ہے اور کس طرح بعض اوقات نیکی کرکے بھی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔" وہ بولے۔

"میں اس سے نہیں گھبراتا سر! یہ تکلیفیں عارضی ہوتی ہیں۔ آخری فتح بہرحال انہی کی ہوتی ہے جو نیک نیت ہوتے ہیں۔" میں نے وثوق سے کہا۔

"میں آپ سے متفق ہوں مولوی صاحب!" نفیس صاحب قدرے خوشگوار لہجے میں بولے۔

"بہرحال میں ان کوششوں کے لیے ہمیشہ آپ کا ممنون رہوں گا جو آپ میری ہمدردی میں میرے سامنے یا پیٹھ پیچھے کرتے رہتے ہیں۔" میں نے کہا۔ "اور کیا نئی تازہ خبر ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔ ان واقعات کی رپورٹ مرتب ہو رہی ہے۔ ریڈ ڈاٹ کے تباہ شدہ اڈے میں اترنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ کھدائی وغیرہ ہو رہی ہے لیکن وہاں ملبے اور تباہ شدہ چیزوں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا۔ دیگر زاویوں سے بھی کچھ تحقیقات وغیرہ ہو رہی ہیں لیکن فی الحال تمہیں سنانے کے لیے میرے پاس کوئی امید افزا خبر نہیں ہے۔ اس سانحے کے تین چار زخمی اور مر گئے ہیں یعنی ہمارے بہت سے اداروں پر عوامی ناگواری اور سوالات کا دباؤ کچھ بڑھ گیا ہے۔"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "چلیں...... انتظار ہیں۔ شاید کہیں سے کوئی اچھی خبر سننے کو ملے۔"

"میں تو اس وقت خود کو قریب المرگ محسوس کر رہا ہ[ا] نفیس صاحب ایک بار پھر کراہ اٹھے۔ "ایک تو آرام کا وقت ٹل رہا۔ دوسرے میں گویا کچھ غیر رسمی سے انداز میں ذرا زیرِ آ گیا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔" مَیں انہیں تسلی دی۔

ہاں...... ہونا تو چاہیے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے

"ہمارے لیے کیا حکم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تم لوگ فی الحال آرام کرو۔ جو جہاں ہے وہیں رہے بوقت ضرورت اس سے رابطہ قائم کیا جا سکے۔" نفیس صاحب کچھ سوچتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بولے۔ "ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ کوار[ٹر کا] معاملہ تو اختتام کو پہنچا۔ اب صرف ان کے آدمیوں کو تلاش ہے۔ اگر وہ لوگ ابھی تک ملک میں موجود ہیں تو کبھی نہ کبھی کسی طرح ان کا کوئی سراغ سامنے آتا رہے گا اور میرے محکمے لوگ ان سے نمٹتے رہیں گے۔ مشکوک غیر ملکیوں پر نظر رکھنے لیے میرے اور تمہارے جو آدمی کام کر رہے ہیں انہیں فی ا[لحال] اپنی اپنی ڈیوٹی پر رہنے دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم سب بھی دوسرے سے رابطہ رکھیں گے اور اگر کوئی نئی بات سامنے آ[ئی تو] ایک دوسرے کو مطلع کریں گے۔"

"ٹھیک ہے سر! جیسے آپ کی مرضی۔" میں نے سعادت م[ندی] سے کہا اور نفیس صاحب نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے فون بند کرکے راحیلہ کے قریب رکھ دیا اور نف[یس] صاحب سے جو گفتگو ہوئی تھی اس سے اسے بھی آگاہ کر دیا۔ افسردہ سی سانس لے کر بولی۔ "معلوم نہیں ہم اس فتنے کو جڑ [سے] ختم بھی کر سکیں گے یا نہیں۔"

"تم تو مجھے حوصلہ نہ ہارنے کا سبق دیا کرتی تھیں۔ یہ آج تم ا[س] لہجے سے اس کمرے میں مایوسی کے جراثیم کیوں پھیلا رہی ہو" میں نے اسے گھورا۔

"میں یہ بات مایوسی کے تحت نہیں کر رہی...... بلکہ تار[یخی] انداز میں ایک امکان ظاہر کر رہی ہوں۔ ریڈ ڈاٹ کے جو شیاط[ین] غائب ہو چکے ہیں، کیا معلوم اس وقت وہ ملک کے کسی گوشے [میں] آرام سے کہیں بیٹھے ریڈ ڈاٹ کو نئے سرے سے منظم کرنے [کی] منصوبہ بندی کر رہے ہوں۔ کوئی بعید نہیں ان کا کراچی میں بھی ک[وئی] اس قسم کا خفیہ اور زیرِ زمین ٹھکانا موجود ہو جیسا لاہور اور اسلا[م] آباد میں تھا۔"

"جو کچھ بھی ہوگا دیکھا جائے گا۔ پردۂ غیب سے کچھ نہ [کچھ] ظہور میں آئے گا...... اور جب ظہور میں آئے گا تو ہم بھی ایکش[ن]

میں آ جائیں گے لیکن فی الحال تو تم اپنے چہرے پر مایوسی کی تاریکی مت پھیلاؤ۔ اس پر جتنی تاریکی پھیلی ہوئی ہے اتنی ہی کافی ہے۔ اس میں مزید گنجائش نہیں ہے۔"

اس نے مجھے گھورا پھر سر جھٹک کر گویا اس موضوع سے پیچھا چھڑاتے ہوئے بولی۔ "اِنی! تمہیں یاد ہے ہم نے کل دوپہر سے کھانا نہیں کھایا ہے...... اور چائے پینے بیٹھ گئے۔"

"اف...... ! یہ تم نے کیا یاد دلا دیا؟" میں نے کراہ کر پیٹ پر ہاتھ رکھ لیا۔ "تم نے کھانے کا ذکر کیا اور فوراً بھوک لگنے لگی۔ ورنہ اس صحرائی اونٹ کا کھانے کے بغیر بھی آرام سے گزارا ہو رہا تھا۔"

"میری بھوک گو کہ افسردگی کی وجہ سے مر چکی ہے لیکن میں پھر بھی کچھ کھانا چاہتی ہوں۔ میس سے کھانا آنے میں تو کچھ دیر ہے لیکن میں انہیں فون کرکے پہلے ہی منگا لیتی ہوں۔"

وہ گھر کے عام فون پر میس والوں کو فون کرنے لگی۔ اس دوران اس کے موبائل فون کا بزر بج اٹھا۔ فون میں نے اٹھا لیا اور بٹن دبانے کے بعد "ہیلو" کہا تو دوسری طرف سے قدرے حیرت سے پوچھا گیا۔ "میڈم کہاں گئیں؟"

میں نے احمد کی آواز پہچان کر غم ناک سے لہجے میں کہا۔ "یار! تم لوگ تو میڈم سے بات کرنے کے بہت ہی عادی ہو گئے ہو۔ کبھی کبھی موسیو سے بھی بات کر لیا کرو۔ اس غربت اور بے سروسامانی کے باوجود موبائل فون موسیو کے پاس بھی ہے۔"

احمد نے میری آواز پہچان کر ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا۔ "سر! آپ شاید اسے جھوٹ یا مذاق سمجھیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس وقت میں آپ سے ہی بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ یہاں موجود ہوں گے۔"

"بہرحال مجھے یقین ہے کہ تم نہ تو مجھ سے جھوٹ بول سکتے ہو اور نہ ہی مذاق کر سکتے ہو۔ کہو...... کیا کہنا چاہتے ہو؟"

اس دوران راحیلہ دوسرے فون پر میس والوں کو کھانے کا کہہ چکی تھی اور ریسیور رکھ کر تجسس سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اندازہ لگانے کی کوششیں کر رہی تھی کہ اس کے فون پر میں نے کس سے بات شروع کر دی تھی۔ میرا اپنا فون اس وقت کمرے ہی میں پڑا تھا۔

احمد ذرا دھیمی آواز میں بولا۔ "سر! اصولاً تو مجھے اس کارروائی کی رپورٹ پہلے نفیس صاحب کو دینی چاہیے تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے خیال آیا کہ پہلے میں آپ کو اس سلسلے میں مطلع کروں۔ پھر آپ جو مشورہ دیں وہ کیا جائے۔"

"میرے آتے ہی بے ایمانی شروع ہو گئی۔ تم لوگوں کی نیت میں فتور آ گیا۔ تم نے نفیس صاحب کو بائی پاس کرنا شروع کر دیا۔" میں نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں سر! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو یونہی برسبیلِ تذکرہ بات کر رہا ہوں۔ آپ سمجھ لیجیے گا کہ آپ نے کوئی اُڑتی ہوئی سی بات طیور کی زبانی سنی ہوگی۔" اس کے لہجے میں بھی بلا کی سنجیدگی تھی۔

"قصہ کیا ہے؟"

"سر! آپ کو معلوم ہے میں چند مشکوک غیر ملکیوں کی نگرانی کر رہا ہوں۔ تین غیر ملکی ہیں۔ تینوں سفید فام ہیں......" احمد بتانے لگا۔ مجھے معلوم تھا وہ اسلام آباد ہوٹل کے سامنے ٹیکسی ڈرائیور کے روپ میں موجود رہتا تھا۔ سلیمان ٹنڈے فقیر کے بھیس میں اس کے آس پاس ہی مدد کے لیے موجود رہتا تھا۔

احمد بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ "یہ تینوں غیر ملکی اسلام آباد ہوٹل میں مقیم ہیں۔ آج ہوٹل میں ایک اور سفید فام پہنچا۔ ریڈ ڈاٹ کے لاہور والے اڈے سے ہمیں ان کے جن خاص خاص لوگوں کی کمپیوٹرائزڈ تصویریں ملی تھیں ان میں اس شخص کی تصویر بھی شامل تھی۔ میں اسے ہوٹل میں جاتے دیکھ کر ہوٹل کے دروازے سے ہی چپک کر کھڑا ہو گیا۔ یہ شخص کافی دیر اندر رہا۔ جب یہ واپس آیا تو ان سفید فاموں میں سے ایک اس کے ساتھ تھا جن کی ہم نگرانی کر رہے تھے۔"

"اس کا مطلب ہے تم ان گوروں کی نگرانی ٹھیک ہی کر رہے تھے۔"

"جی ہاں۔ اب تو یہ بات یقینی ہو گئی ہے کہ وہ واقعی مشکوک تھے۔ خیر...... تو میں بتا رہا تھا کہ نوواردو گورا اور پرانا گورا اکٹھے باہر آئے۔ پرانا گورا نووارد گورے کو صرف باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ میں جلدی سے ٹیکسی دروازے کے سامنے لے آیا اور نووارد گورا خوش قسمتی سے میری ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ میرا مطلب ہے یہ میری خوش قسمتی تھی...... اس کی نہیں۔"

"وضاحت کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا "اگر یہ اس کی خوش قسمتی ہوتی تو شاید اس وقت تم مجھے فون نہ کر رہے ہوتے۔"

"آپ ٹھیک سمجھے سر!" احمد ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ "ہم ان لوگوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مر گئے تھے جن کی کمپیوٹرائزڈ تصویریں ہمارے پاس تھیں۔ ان میں سے یہ پہلا شخص مجھے نظر آیا ہے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ اس وقت میری خوشی سے کیا حالت تھی جب یہ گوارا میری ٹیکسی میں بیٹھا۔"

"میں اندازہ کر سکتا ہوں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "تمہیں یہی محسوس ہو رہا ہوگا جیسے حسینۂ عالم نے تم سے شادی کے لیے ہامی بھر لی ہے۔"

"نہیں سر! حسینۂ عالم اگر مجھ سے شادی کرنے پر تل جاتی تو میں تو سخت پریشان ہو جاتا۔ مجھ میں اس قسم کی عظیم خواتین سے شادی کا حوصلہ کہاں ہے سر!" اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "میں تو بالکل اس طرح خوش ہوا تھا جس طرح سولہ سترہ سال کی عمر میں اُس وقت ہوا تھا جب میرے گاؤں کی ایک لڑکی نے چھت سے

ایک رومال میری طرف پھینکا تھا جس پر اس نے اپنے ہاتھ سے کڑھائی کی تھی......"

"اس پر ایک دل بنا ہوا ہوگا جس میں تیر پیوست ہوگا؟"

"یس سر! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" اس نے مصنوعی حیرت سے پوچھا۔

"تمہارے اور میرے لڑکپن کے زمانے میں یہ گاؤں کی لڑکیوں کا "ٹریڈ مارک" ہوا کرتا تھا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "بہر حال تم گاؤں کی لڑکیوں کو فی الحال گولی مارو اور اس گورے کا قصہ سناؤ۔"

"سر! اس گورے نے مجھ سے سیکٹر آئی کی طرف چلنے کے لیے کہا۔ میں نے ٹیکسی آگے بڑھائی اور ہوٹل سے کچھ دور لے جا کر ایک معمولی خرابی کا بہانہ کر کے وہاں روک لی جہاں سلیمان ٹنڈے فقیر کے روپ میں اچھی خاصی دیہاڑی بنا چکا تھا۔ میں نے سلیمان کو اشارہ کیا اور وہ بالکل اصلی فقیروں کی طرح گورے کی جان کو آگیا۔ اس نے کھڑکی سے کشکول اندر گھسیڑ کر گورے کی ناک سے لگا دیا۔ گورے نے حالانکہ پانچ ڈالر کا نوٹ اس کے کشکول میں ڈال دیا......"

"پورے پانچ ڈالر......؟" میں اس کی بات کاٹتے ہوئے تقریباً چلّا اٹھا۔ "گورے نے اسے پورے پانچ ڈالر کی ایڈ دے دی؟"

"یس سر! لیکن سلیمان نے پھر بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ بہ آواز بلند اردو، فارسی اور پشتو میں اس کی درازی عمر اور اس کے جائز ناجائز بچوں کی خوشحالی کی دعائیں کرتا رہا۔ میں نے دوبارہ ٹیکسی آگے بڑھائی تو سلیمان دروازہ کھول کر ٹیکسی میں گھس کر اس کے برابر بیٹھ گیا اور اس کی پسلیوں پر پستول رکھ دیا۔ میں نے ٹیکسی زناٹے سے آگے بڑھا دی۔"

"گورا اتنی آسانی سے اغوا ہو گیا؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"نہیں سر! اس نے راستے میں گڑبڑ کی کوشش کی تھی۔ سلیمان نے اسے گولی تو نہیں ماری البتہ کشکول اس کی کھوپڑی پر مار دیا۔"

"کشکول کھوپڑی پر مار دیا......؟" میں نے حیرت سے دہرایا۔ "کشکول تو ٹوٹ گیا ہوگا؟"

"نہیں سر!" احمد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "کشکول کہاں ٹوٹتا ہے۔ کشکول بڑی مضبوط چیز ہوتی ہے۔ گورے کی کھوپڑی البتہ شاید چٹخ گئی ہے۔ وہ بے ہوش ہو چکا ہے۔ ہم نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسے ڈکی میں ٹھونسا ہوا ہے......"

"احمق آدمی! کہیں وہ دم گھٹ کر مر نہ جائے۔" میں نے تیزی سے کہا۔

"نہیں سر! دشمنی اپنی جگہ ہے لیکن ہم اپنے شکار کو آکسیجن سپلائی کرنے کے معاملے میں اتنے کنجوس نہیں ہیں۔ ہم نے ایسا بندوبست رکھا ہے کہ ڈکی میں اس کا دم نہ گھٹنے پائے۔" احمد نے اطمینان سے جواب دیا۔

"تم لوگ اس وقت ہو کہاں......؟ بڑے اطمینان سے بات کر رہے ہو۔" میں نے ذرا حیرت سے کہا۔

"بس سر......! جب سے میں نے ٹیکسی ڈرائیوری اور سلیمان نے بھیک مانگنا شروع کیا ہے بڑا اطمینان قلب حاصل ہوا ہے۔" وہ درویشانہ لہجے میں بولا۔ "ویسے ہم اس وقت پشاور جانے والی سڑک کے کنارے ایک ویران سی جگہ پر جھاڑیوں کے قریب کھڑے ہیں۔ ہمارے لیے کیا حکم ہے؟"

"آس پاس کوئی نہیں ہے؟" میں نے یونہی اطمینان کرنا چاہا۔

"صرف ایک آوارہ قسم کا کتا ہے جو ایک درخت کے قریب ٹانگ اٹھائے......"

"بس...... بس۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں نے تم سے کتے بلیوں کی نجی مصروفیات کے بارے میں رپورٹ طلب نہیں کی۔ میں صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ تم کسی کی نظر میں تو نہیں آئے؟"

"نہیں سر! ہم نے نہایت احتیاط اور مشاقی سے تمام کارروائی کی تھی۔ ہم کسی بھی مرحلے پر کسی کی نظر میں نہیں آئے ہیں۔ گورے کو باندھ کر ڈکی میں منتقل کرنے کے لیے ہم ویرانے میں آگئے تھے۔ میں نفیس صاحب کو رپورٹ دینے ہی لگا تھا پھر اچانک نہ جانے کیوں میرا کچھ ارادہ بدل گیا۔ میں نے سوچا پہلے آپ سے یا میڈم سے بات کرلی جائے۔"

"تم نے اچھا کیا۔ نفیس صاحب کے حواس تو اس وقت ویسے بھی ٹھکانے نہیں ہوں گے۔ ہمیں اپنے طور پر بھی کچھ کرتے رہنا چاہیے۔ یہ شکار ان کے ہاتھ میں چلا گیا تو وہ اسے نہ جانے اپنے طور طریقوں کے مطابق کن لمبے چکروں میں ڈال دیں۔ تم ایک منٹ ہولڈ کرو۔ میں تمہاری میڈم سے مشورہ کر کے ابھی بتاتا ہوں کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے۔"

راحیلہ تجسس سے مجبور ہو کر میرے سر سے، سر تقریباً جوڑے اور دوسری طرف سے فون سے کان لگائے بیٹھی تھی۔ وہ تقریباً شروع سے ساری گفتگو سن چکی تھی اور اس کے بالوں کی مہک میرے حواس میں بس چکی تھی۔

وہ ذرا پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "تم نہایت ہی بے ہودہ آدمی ہو۔"

"تم بہت ہی مستقل مزاج لڑکی ہو۔ تم نے میرے بارے میں اپنی رائے ابھی تک نہیں بدلی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میں نے تمہاری عدم موجودگی میں بہ مشکل تمہارے آدمیوں کو یہ عادت ڈالی تھی کہ وہ سنجیدہ معاملات کو سنجیدگی سے لیں لیکن تم نے آتے ہی اپنی بے ہودگیاں شروع کر دیں اور وہ لوگ بھی

تمہاری ڈگر پر چل پڑے۔" وہ خفگی سے بولی۔ "اب یہ اتنا سنجیدہ معاملہ تھا لیکن تم دونوں اس کے بارے میں مسخروں کی طرح باتیں کرنے میں لگے ہوئے تھے۔"

"دل بہت اداس تھا۔ ہم اس طرح باتیں کر کے خود کو بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ بھی خود فریبی کا ایک انداز تھا۔" میں نے مسکین سی صورت بنا کر کہا۔

"مضبوط لوگوں کو خود فریبی کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے۔" وہ قدرے تحکمانہ لہجے میں بولی۔

فون پر دوسری طرف سے احمد کی منمناتی ہوئی آواز ابھری۔ "سر! آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں کہ میڈم ہماری گفتگو سن رہی ہیں۔"

"اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس قسم کی باتوں سے میڈم کے دل کا بوجھ بھی ہلکا ہوتا ہے۔ جب ان کا موڈ ہوتا ہے تو وہ بھی اسی قسم کی گفتگو فرماتی ہیں۔" میں نے احمد کو تسلی دی۔

"لیکن میں موقع محل ضرور دیکھتی ہوں۔" راحیلہ منہ بنا کر بولی۔

"اچھا...... خیر...... یہ ڈانٹ ڈپٹ چھوڑو اور بے چارے کو بتاؤ کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔"

راحیلہ نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر بولی۔ "میرا خیال ہے اس شکار کو یہیں منگوا لیتے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال بھلا تمہارے خیال سے مختلف کیسے ہو سکتا ہے۔ سوائے ایک معاملے کے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

راحیلہ فون میرے ہاتھ سے لیتے ہوئے بولی۔ "ٹھیک ہے احمد......! تم پارسل کو نہایت احتیاط سے پچھلے گیٹ سے میرے ہاں لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے میڈم! میں ابھی روانہ ہوتا ہوں۔" احمد مؤدبانہ لہجے میں بولا۔ اب میں اپنا سر راحیلہ کے قریب لا کر فون پر احمد کی آواز سن رہا تھا۔ احمد نے مزید کوئی بات نہیں کی اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

راحیلہ بھی فون بند کر چکی تو میں نے کہا۔ "نفیس صاحب کو پتا تو ضرور چل جائے گا کہ ہم نے بالا ہی بالا کچھ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان کا ردِ عمل کیا ہوگا؟"

"ان سے میں نمٹ لوں گی۔" راحیلہ بے پروائی سے بولی۔

"اس مکان میں کوئی تہ خانہ وغیرہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ کیوں؟" اس نے بھویں اچکائیں۔

"وہ جو گورے صاحب تشریف لا رہے ہیں وہ ہمارے عزیز دوست یا رشتے دار نہیں کہ ہم انہیں سامنے بٹھا کر چائے بسکٹ پیش کریں گے اور موصوف کو جو کچھ معلوم ہوگا وہ فرفر بتانا شروع کر دیں گے۔"

"تو پھر؟" راحیلہ انجان بننے پر تلی ہوئی تھی۔

"ظاہر ہے اس سے کچھ معلوم کرنے کے لیے اس پر سختی کرنی پڑے گی۔ سختی کریں گے تو امید ہے کہ وہ چیخ و پکار کرے گا۔ اس کا منہ بند بھی نہیں رکھا جاسکے گا کیونکہ وہ کسی وقت بھی زبان کھولنے کا فیصلہ کر سکتا ہے۔ ہم اس کی چیخ و پکار پڑوسیوں کو سنوانے کے متحمل تو نہیں ہو سکتے۔ یہ آبادی کے بیچوں بیچ کوئی تھانہ تو ہے نہیں کہ لوگ چیخ و پکار سننے کے عادی ہوں اور کان لپیٹ کر سوتے رہیں کہ "ڈرائنگ روم" میں کسی کی تفتیش ہو رہی ہوگی۔" میں نے کہا۔

وہ سوچتے ہوئے بولی۔ "یہ مکانات کافی بڑے ہیں اور ایک دوسرے سے کچھ فاصلے پر واقع ہیں۔ ویسے اس گھر میں ایک بڑا کمرا ہے۔ وہ اصل میں اسٹڈی یا لائبریری ہے جو اوپر کے بجائے نیچے بنائی گئی ہے۔ اس کا دروازہ وغیرہ بھی ساؤنڈ پروف ہے۔"

"بس...... پھر تو کام بن گیا...... اور بھلا کیا چاہیے۔ اس میں تو تفتیش کے عمدہ انتظامات موجود ہیں۔" میں نے کہا۔

"لیکن میں اپنے دشمن پر بھی تشدد پسند نہیں کرتی اور بیمار ذہنیت رکھنے والوں کے ہتھکنڈے ہیں۔" راحیلہ منہ بنا کر بولی۔

"میں خود ان ہتھکنڈوں کو پسند نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن کبھی مجبوراً گھٹیا لوگوں کے معاملے میں کام لینا پڑ جاتا ہے۔ اس میں بھی میری کوشش یہی ہوگی کہ کچھ کرنے سے زیادہ ڈرا دھمکا کر ہی کام چل جائے۔ گورے والوں کے خلاف میرے دل میں بڑی نفرت ہے۔ اس لیے میں قابو میں آئے ہوئے کسی بے بس شکار پر ٹارچر نہیں کروں گا۔ ایسے لوگوں سے بھی میں تو دوبدو مقابلے کا قائل ہوں جس میں "مارو یا مر جاؤ" والی صورتِ حال ہو۔"

"اس کا مطلب ہے تمہارے اندر قبائلی روح موجود ہے۔" راحیلہ بولی۔

"وہ تو سب کے اندر ہوتی ہے۔ کسی کی سوئی رہتی ہے، کسی کی ذرا مچلتی رہتی ہے۔ کسی کی قبائلی روح کو لیڈر کچھ کر دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں انسان قبیلوں ہی میں رہتا تھا۔ فطرت پر نہ جانے کب تک ان چیزوں کے اثرات رہیں۔" میں نے نہایت مدبرانہ انداز میں کہا۔

اس دوران باہر سے ٹونی نے اطلاع دی کہ میں تھا۔ راحیلہ بولی۔ "پارسل آنے سے پہلے کھانا کھا لینا چاہیے۔"

کھانے کے دوران میں نے ٹونی کو بتایا کہ ایک تھا جس سے تفتیش کے سلسلے میں کچھ محنت درکار ہے۔ میرے ساتھ رہنا تھا پھر میں نے راحیلہ سے کہا۔

منہ لٹکائے بیٹھی تھیں۔ تم نے دیکھا...... کبھی کبھی کس طرح آسمان سے اچانک کوئی اچھی خبر ٹپک پڑتی ہے۔"

"بے شک...... اور کبھی کبھی بیٹھے بٹھائے اچانک آسمان سے میزائل اور راکٹ بھی برسنے لگتے ہیں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

کھانا کھا کر میں نے اور ٹونی نے راحیلہ کی رہنمائی میں ڈین نما اسٹڈی میں جا کر کچھ تیاریاں کیں اور دوبارہ اوپر آ گئے۔ اس دوران احمد اور سلیمان آن پہنچے۔ ٹیکسی وہ پچھلے گیٹ سے مکان کے اندر لے آئے تھے۔ اسپتال میں بھی وہ پچھلے گیٹ سے داخل ہوئے تھے۔

ہم نے پچھلے برآمدے کی لائٹ بجھا دی اور احمد نے ڈکی کھول کر ہمیں پارسل کا دیدار کرایا۔ میں نے ملگجے اندھیرے میں غیر ملکی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "یہ تو ابھی تک بے ہوش ہے۔"

"ٹنڈا فقیر" سلیمان اپنا کشکول ہوا میں لہراتے ہوئے بولا۔ "سر! کسی فقیر نے...... اور وہ بھی کالے فقیر نے...... پہلی بار کسی گورے کے سر پر کشکول مارا تھا۔ چوٹ کے علاوہ دلی صدمے کی وجہ سے بھی اس کی بے ہوشی لمبی ہو رہی ہوگی۔"

"جتنی زیادہ دیر بے ہوش رہے گا ہوش میں آنے پر اتنی ہی زیادہ کمینگی کا مظاہرہ کرے گا۔" احمد نے کہا۔

ہم اسے بوری کی طرح اٹھا کر اندر لے آئے۔ راحیلہ نے روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "بالکل...... اس شخص کی تصویر ان کمپیوٹرائزڈ تصویروں میں شامل تو تھی۔"

"مجھے بھی یاد آ گیا ہے۔" میں نے تائید کی۔ وہ تصویریں تعداد میں صرف چھ تھیں اور میں نے انہیں صرف ایک مرتبہ دیکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ سامنا ہونے پر میں ان چھ کے چھ افراد کو پہچان سکتا تھا بشرطیکہ وہ اپنی اصل شکل میں ہوتے۔

"آپ کا کیا خیال تھا کہ ہم کسی غلط آدمی کو اٹھا لائیں گے؟" احمد گویا برا مناتے ہوئے بولا۔

"جب سے تم ٹیکسی ڈرائیور بنے ہو ہمیں تمہاری یادداشت پر زیادہ بھروسا نہیں رہا۔ تم کچھ بھی اٹھا کر لا سکتے ہو۔" راحیلہ منہ بنا کر بولی۔

"واقعی آج کل نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا۔" احمد ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"اچھا...... چلو اب اسے تہ خانے میں پہنچاؤ اور واپس جا کر سفید فام غیر ملکیوں کی نگرانی کرو۔ اگر یہ شخص ان میں سے کسی سے ملنے آیا تھا تو پھر وہ بھی ہمارا مطلوبہ آدمی ثابت ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے اسے بھی اٹھانا پڑ جائے۔ شاید اس سے بھی کوئی کام کی بات معلوم ہو سکے۔" راحیلہ کچھ سوچتے ہوئے بولی۔

"اگر آپ حکم دیں تو میں اپنی ٹیکسی میں بیٹھنے والے ہر سفید فام کو سلیمان کی مدد سے اٹھا کر یہاں لے آیا کروں؟" احمد بڑے مخلصانہ لہجے میں بولا۔

"ہمیں یہاں گوروں کا اچار نہیں ڈالنا ہے۔" راحیلہ نے جواب دیا۔

ہم گورے کو اٹھا کر زیرِ زمین اسٹڈی میں لے کر آئے اور بے ہوشی کے عالم میں ہی میں نے اسے لکڑی کی ایک سیدھے پشتے والی کرسی پر بٹھا کر اچھی طرح باندھ دیا۔ اس کی گردن ایک طرف کو ڈھلکی رہی۔ احمد اور سلیمان واپس چلے گئے۔ میں نے اور ٹونی نے سفید فام کو ہوش میں لانے کی تدبیریں شروع کر دیں۔ راحیلہ اوپر چلی گئی۔

سفید فام کو جلد ہی ہوش آ گیا۔ حواس ٹھکانے پر آتے ہی اس کی مجھ پر نظر پڑی اور سب سے پہلا جملہ اس کے منہ سے یہ نکلا۔ "حرامزادے! تم ابھی تک زندہ ہو......!"

میں نے اپنے آپ پر قابو رکھنے کی بہت کوشش کی لیکن میرا ہاتھ پھر بھی حرکت میں آ ہی گیا۔ اس نے میرے لیے باسٹرڈ کا لفظ استعمال کیا تھا اور اس کے لہجے میں میرے لیے بے پناہ نفرت و حقارت تھی۔ میری کھوپڑی گھوم گئی۔ گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ یہ گھونسا میں نے پوری طاقت سے نہیں مارا تھا۔ غصے کو بروقت کچھ نہ کچھ "بریک" لگ ہی گیا تھا لیکن وہ کرسی سمیت الٹ کر پیچھے جا گرا۔

ٹونی نے کرسی سیدھی کی تو پتا چلا کہ وہ دوبارہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ اسے ہوش میں لانے کی زیادہ کوششیں ٹونی نے ہی کی تھیں۔ میں نے معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا گویا میرا گھونسا سفید فام کو نہیں بلکہ ٹونی کو جا لگا ہو۔

"معاف کرنا یار! ہاتھ ذرا بے اختیار ہی گھوم گیا تھا۔"

"سر! میرا تو خیال تھا کہ آپ اس نطفۂ ناتحقیق کی گردن توڑ ڈالیں گے۔" ٹونی مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ نے تو اسے بخش دیا۔"

"بڑی مشکل سے ریڈ ڈاٹ کا ایک آدمی ہاتھ آیا ہے۔ ہم جذباتی ہو کر اسے ضائع کرنا افورڈ نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی...... بندھے ہوئے آدمی کو کیا مارنا۔ اگر اس سے معلومات نہ حاصل کرنی ہوتیں تو میں اتنے جھنجٹ میں نہ پڑتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ٹونی ایک بار پھر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے سر پر چونکہ پہلے ہی چوٹ لگی ہوئی تھی اور اب بھی کرسی گرنے کی وجہ سے اس کا سر فرش سے جا ٹکرایا تھا شاید اس لیے وہ اتنی جلدی دوبارہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

دوبارہ ہوش میں آنے پر بھی اس کی رعونت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ وہ نفرت و حقارت سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "ہم نے تمہارے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا تھا۔"

میں نے اپنا ذہن ٹھنڈا رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "سوال یہ نہیں ہے کہ تم نے میرے ساتھ کیا سلوک کیا تھا پیارے! سوال یہ ہے کہ تم نے اس ملک کے ساتھ کیا کیا...... اور مزید کیا کچھ کرنا چاہتے تھے۔"

"ہم سے اندازے کی غلطی ہوئی...... بھیانک غلطی......" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا۔ "ہمیں نہیں معلوم تھا کہ تم جیسے مشکوک ماضی رکھنے والے شخص کے سر پر ملک سے محبت کا بھوت سوار ہو جائے گا۔ جو کچھ ہم تمہیں دینا چاہتے تھے...... جو کچھ تمہارے لیے کرنا چاہتے تھے اس کا پچاسواں حصہ حاصل کرنے کے لیے بھی تمہارے ہاں کے وہ لوگ اپنا ضمیر ٹوکری میں ڈالتے پھرتے ہیں۔ جن کی حب الوطنی وغیرہ کے ترانے گلی گلی گائے جاتے ہیں اور جنہیں دیوتا کا درجہ دیا جاتا ہے۔"

"مجھے تمہارے اس دعوے سے اختلاف نہیں...... لیکن میں کیا کروں...... میرا سب پر زور نہیں چلتا...... میں سب کے دلوں کی کایا نہیں پلٹ سکتا۔ میں صرف اپنے آپ کو ہی غداری اور ضمیر فروشی سے بچا لوں تو بڑی بات ہو گی۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"نمک کی کان میں کب تک نمک ہونے سے بچو گے؟" وہ طنزیہ انداز میں مسکرا دیا۔

"مجھے نہیں معلوم...... لیکن میرا خیال ہے فولاد کو نمک بننے میں مدتیں ہی لگتی ہوں گی۔ یہ بھی ممکن ہے فولاد کبھی بھی نمک نہ بنتا ہو۔"

"وہ کیمیکل فارمولا مناسب ہو تو تمہارے ہاں کوئی بھی چیز کچھ بھی بن سکتی ہے۔" وہ زہریلے انداز میں مسکرایا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں بلا کی سرد مہری تھی۔ میں اس کی خود اعتمادی پر دل ہی دل میں حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔ مجھے پہچان کر اس نے گویا ابتدا ہی میں یہ اقرار کر لیا تھا کہ وہ ریڈ ڈاٹ کا آدمی تھا گو کہ میرے لیے اس کی صورت اجنبی تھی۔ اس کا سکون و اطمینان، بے خوفی اور نخوت بتا رہی تھی کہ وہ کوئی اہم آدمی تھا۔ ریڈ ڈاٹ میں وہ کوئی خاص مقام رکھتا تھا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ "بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہم دو مہذب اور بڑے آدمیوں کی طرح نہایت پُرسکون ماحول میں بیٹھے نہایت وقار، متانت اور بردباری سے گفتگو کر رہے ہیں۔ لیکن افسوس کہ مجھے ابھی تک تمہارا نام معلوم نہیں۔"

"تم مجھے مسٹر ایکس کہہ سکتے ہو۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

"آہ...... کتنا خوبصورت اور رومانوی نام ہے!" میں نے رشک بھرے لہجے میں کہا۔ "اگر تم شادی شدہ ہو تو تمہاری مسز کا نام یقیناً وائی ہو گا۔"

وہ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ وہ مضبوط جسم کا ایک دراز قد شخص تھا۔ میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔ "خیر...... نام سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ "مسٹر ایکس" سے بھی کام چل جائے گا۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ ریڈ ڈاٹ میں تمہاری حیثیت کیا ہے مسٹر ایکس؟"

"ریڈ ڈاٹ میں کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ سب کے ذمے کچھ کام ہوتے ہیں۔ ہر ایک اپنا اپنا کام کرتا ہے۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولا۔

"تمہارے ذمے کیا کام تھے مسٹر ایکس؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بہت لمبی بات ہے۔ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔"

"ہم اتنے بے سمجھ بھی نہیں ہیں۔ مسٹر ایکس!"

"اب ویسے بھی اس تذکرے کا کوئی فائدہ نہیں۔ بات پرانی ہو گئی ہے۔ فی الحال تو میرے ذمے کوئی کام نہیں۔ اگر آج تمہارے آدمیوں کے ہتھے نہ چڑھتا تو صبح تک ملک سے باہر ہوتا۔"

"قسمت اسے ہی کہتے ہیں مسٹر ایکس!" میں نے میٹھے لہجے میں کہا۔ "اس سے تمہیں یقین ہو جانا چاہیے کہ ڈوریاں صرف تم نہیں ہلاتے۔ ایک نادیدہ طاقت بھی کچھ ڈوریاں ہلاتی ہے اور جہاں تک بات کے نئی یا پرانی ہونے کا تعلق ہے تو اس کی فکر میں مت پڑو۔ جو پوچھا جا رہا ہے، صرف اس کا جواب دو۔"

"میں تمہاری کسی بات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں" وہ غرایا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ٹونی کی طرف دیکھا اور کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ "گورا آخر گورا ہوتا ہے۔ وہ کسی بات کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوتا جب کہ ہم کالے ان کے حکم پر ضمیر فروشی کے بھی پابند ہیں خواہ ہمارا ضمیر اس کی اجازت نہ دے۔ دنیا کا نظام کتنا عجیب ہو گیا ہے ٹونی!"

ٹونی آنکھیں سکیڑ کر بغور میری طرف دیکھتے ہوئے حیرت سے بولا۔ "سر! آپ کالے تو نہیں ہیں۔ اچھے بھلے سفید ہیں۔"

"سرخ و سفید تو تم بھی ہو لیکن افسوس کہ ہمارا شمار کالوں میں ہی ہوتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "گورے صاحب کا موڈ نہیں ہے کہ ہم کالوں کے سوالوں کا جواب دے۔ تمہارا کیا مشورہ ہے؟"

"گورے صاحب کے مزاج میں ذرا سردی ہے۔ میرا خیال ہے صاحب کو ذرا گرمی پہنچائی جائے۔" ٹونی بولا۔

مسٹر ایکس کے جوتے اور موزے ہم اس کی بے ہوشی کے دوران ہی اتار چکے تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے اس کی کرسی ترچھی کی اور ٹونی نے لائٹر جلا کر شعلہ اس کے تلوے کے نیچے کر دیا۔ اس نے سختی سے ہونٹ بھینچ لیے۔ اس کا چہرہ بھبھوکا ہوا اور پھر زرد پڑ گیا۔ چند سیکنڈ میں ہی پسینہ اس کے چہرے سے پھسل کر گریبان میں جانے لگا۔ کمرے میں گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی لیکن مسٹر ایکس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی

ابتدائی کوشش سے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ کوئی نازک مزاج شخص نہیں تھا۔ یقیناً بے پناہ قوتِ برداشت کا مالک تھا۔

جب مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کے تلوے میں چھوٹا سا گہرا گڑھا پڑ چکا ہو گا تو میں نے ٹونی کو اشارہ کیا۔ اس نے لائٹر اس کے پاؤں تلے سے ہٹا لیا۔ میں نے کرسی کے چاروں پائے فرش پر ٹکا دیے۔ مسٹر ایکس نے پاؤں پوری طرح فرش پر نہیں ٹکایا۔ صرف ایڑی ٹکائی۔ اس کی سانسوں کی آواز اب خرخراہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔

"میں نے چاہا تھا بات چیت نہایت پُرسکون اور محبت بھرے ماحول میں ہی ہو جاتی۔" میں نے تأسف سے کہا۔

پسینہ اس کی آنکھوں میں بھی جا رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر ہانپتے ہوئے بولا۔ "تم اپنے حق میں اچھا نہیں کر رہے ہو...... تمہارا انجام بہت عبرت ناک ہو گا...... قسمت ہمیشہ انسان کا ساتھ نہیں دیتی...... اگر تم اب تک زندہ ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم آئندہ بھی بچ جاؤ گے۔"

"میں اگر ریڈ ڈاٹ کے ہاتھوں نہ مارا گیا تب بھی میں کسی نہ کسی روز تو مر ہی جاؤں گا۔ میں اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے نہیں بھیجا گیا ہوں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

وہ ایک لمحے کے لیے دانت بھینچ کر خاموش رہا۔ پھر بولا۔ "لیکن موت موت میں فرق ہوتا ہے۔"

"بے شک......" میں نے تسلیم کیا۔ "اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ جو کچھ میں پوچھوں اس کا جواب دے دو۔ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ شاید ہم دونوں طبعی موت مرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ حالانکہ میں اب ریڈ ڈاٹ سے تعلق رکھنے والے کسی بھی شخص کو زندہ چھوڑنے کے حق میں نہیں ہوں لیکن کچھ کارآمد معلومات کے عوض میں تم سے تمہاری زندگی کا سودا کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ابھی وقت ہے۔ اپنے آپ کو اذیت میں مت ڈالو۔"

وہ گویا تحمل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "ہمارا نظام کچھ ایسا ہے کہ ہم میں سے کسی کے پاس کچھ زیادہ کارآمد معلومات نہیں ہوتیں۔ تم خواہ مخواہ مجھے ٹارچر کر کے اپنے گناہوں میں اضافہ کر رہے ہو۔ اپنے مستقبل کو زیادہ بھیانک بنا رہے ہو۔"

"تم جیسے فرشتہ صفت لوگوں کے منہ سے اپنے گناہوں کا ذکر سن کر میں واقعی تھر تھر کانپنے لگتا ہوں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ "میں خود بھی ٹارچر وغیرہ کے سلسلے کو طول دینا نہیں چاہتا۔ میں آمنے سامنے میز پر بیٹھ کر بات چیت کرنے کا قائل ہوں۔ "کالا آدمی" ہونے کے باوجود میں کافی مہذب ہوں۔ کیا تم بتانا پسند کرو گے کہ ریڈ ڈاٹ کے باقی لوگ آج کل کہاں ہیں؟"

"سب تمہارے ملک سے بھاگ چکے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہارا لہجہ تمہارے جھوٹ کی گواہی دے رہا ہے۔ اب تم نے مجھے غلط سلط جوابات دے کر ٹالنے کا سوچا ہے۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے ٹھہرے لہجے میں کہا۔

اس نے ایک لمحے کے لیے دانت بھینچ لیے گویا اپنے سوختہ پاؤں کی اذیت برداشت کرنے کی کوشش کر رہا ہو پھر استہزائیہ سے لہجے میں بولا۔ "گویا تم غیب دان اور روشن ضمیر بھی ہو۔ دلوں کا حال جان لیتے ہو۔"

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے پوچھا۔ "اچھا...... چلو...... یہ بتا دو کہ تم ہوٹل میں جس شخص سے ملنے گئے تھے اس کی ریڈ ڈاٹ میں کیا حیثیت ہے؟"

"کوئی حیثیت نہیں۔ وہ تو ریڈ ڈاٹ کے بارے میں کچھ جانتا تک نہیں۔" وہ تیزی سے بولا۔ ایک بار پھر اس کے لہجے میں جھوٹ تھا۔

میں نے ٹونی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "گورے صاحب کے اندر کی برف پگھلی نہیں ہے۔ انہیں تھوڑی سی حرارت اور پہنچاؤ۔"

ٹونی نے اس کے دوسرے تلوے کے نیچے لائٹر روشن کر دیا۔ اس بار اس کے حلق سے ہلکی سی چیخ نکلی لیکن اس نے جلد ہی اس کا گلا گھونٹ دیا اور ایک بار پھر سختی سے دانت بھینچ لیے۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ شاید وہ یوگا کے اصول پر اپنا ذہن کہیں اور لے جانے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اس اذیت سے لاتعلق ہو سکے۔ میں نے اس کے بال مٹھی میں جکڑتے ہوئے جھٹکا دیا۔ اسے آنکھیں کھولنا پڑیں اور اسی دنیا میں واپس آنا پڑا جہاں وہ "آتشِ زیرپا" تھا۔

اُس کی آنکھیں لال انگارہ ہو رہی تھیں۔ میں نے تقریباً سرگوشی میں کہا۔ "اب بھی وقت ہے مسٹر ایکس! بولنا شروع کر دو۔"

"میں...... میں...... تمہیں کیسے یقین دلاؤں...... کہ تم جو کچھ جاننا چاہ رہے ہو وہ مجھے معلوم نہیں ہے۔" اس کے حلق سے عجیب سی آواز نکلی۔ گوشت جلنے کی بُو تیز ہو گئی۔

"ٹونی!" میں نے سرد لہجے میں کہا۔ "لائٹر کا شعلہ اس وقت تک گورے صاحب کے پاؤں تلے رکھنا جب تک آر پار سوراخ نہ ہو جائے۔"

مسٹر ایکس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور گردن ڈھیلی پڑ گئی۔ اپنی قوتِ برداشت کا امتحان لیتے لیتے وہ ایک بار پھر بے ہوش ہو گیا تھا۔ شاید یہ اس کے سر کی چوٹوں کا بھی اثر تھا۔ میں نے ٹونی کو اشارہ کیا۔ اس نے لائٹر اس کے پاؤں کے نیچے سے ہٹا لیا۔ میں نے کرسی زمین پر ٹکا دی اور مسٹر ایکس کے بال چھوڑ دیے۔ اس کی گردن نہایت ڈھیلے ڈھالے انداز میں ایک طرف کو ڈھلک گئی۔

اسی دوران راحیلہ سیڑھیوں سے اتر کر نیچے آتی دکھائی دی۔ وہ ایک بار پھر لباس تبدیل کر چکی تھی۔ اب وہ سیاہ پینٹ اور سفید

اسپورٹس شرٹ میں تھی۔ سر پر پی کیپ تھی جس کا چھجا اس نے کافی جھکا رکھا تھا۔ گلے میں مفلر اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ چہرے کا کچھ حصہ چھپ گیا تھا۔ پیشانی ٹوپی کے چھجے کی وجہ سے چھپ گئی تھی۔ اس طرح اس نے شعوری یا لاشعوری طور پر اپنے چہرے کا دو رنگا پن چھپانے کی کوشش جاری رکھی تھی۔

کمرے میں آکر اس نے گوشت جلنے کی بُو محسوس کرتے ہوئے مفلر ناک پر کچھ اور اوپر کیا۔ "کیا خبر ہے؟" وہ ناگواری سے بولی۔

"کوئی خبر نہیں۔ اس قسم کے معاملات میں اتنی آسانی سے خبریں نہیں ملا کرتیں۔" میں نے کہا۔

"تم دونوں گھٹیا درجے کے گردہ بازوں' جرائم پیشہ لوگوں اور دہشت گردوں کی طرح اس پر اپنے ہتھکنڈے آزما رہے ہو؟"

"ابھی تو ایک ہی ہتھکنڈا آزمایا ہے۔ اس دوران یہ دو مرتبہ بے ہوش ہو چکا ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تو ایک بار پھر یہی کہوں گی کہ تم فضول کوششوں میں لگے ہوئے ہو۔ اس سے دو ٹوک بات کرو۔ کچھ بتاتا ہے تو ٹھیک ہے ورنہ گولی مار کر ایک طرف پھینکو۔" وہ بیزاری سے بولی۔

"کوشش کر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔" میں نے کہا۔

ہم تینوں ایک میز کے قریب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کمرے میں نہ جانے کیوں افسردگی سی پھیلی ہوئی تھی۔ راحیلہ کسی گہری سوچ میں تھی۔ دفعتاً وہ بولی۔ "اپنی! اگر تم اجازت دو تو تھوڑا سا ڈراما رچا کر دیکھ لیتے ہیں۔ ایک طرح کا نفسیاتی حربہ سمجھ لو۔ شاید کام بن جائے۔ تم دونوں کو ذرا اچھی طرح ایکٹنگ اور صداکاری کرنی پڑے گی۔ باقی تمام انتظامات میں کرا دیتی ہوں۔"

"تم جو بھی کرنا چاہو ضرور کرو۔ میری اجازت کی ضرورت نہیں۔ میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا نہیں چاہتا۔" میں نے کہا۔

راحیلہ نے اسکیم مجھے بتائی۔ میں نے چند سیکنڈ اس پر غور کرنے کے بعد کہا۔ "مسٹر ایکس کی فطرت کے بارے میں اب تک مجھے جو اندازہ ہوا ہے اس کی روشنی میں مجھے اس تدبیر کے بارے میں بھی زیادہ خوش فہمی تو نہیں ہے لیکن میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ کوشش کر دیکھنے میں کوئی حرج نہیں۔"

"تو پھر جلدی سے میرے ساتھ آؤ۔ مسٹر ایکس کے ہوش میں آنے سے پہلے ہمیں تمام انتظامات کر لینے چاہئیں۔ ہمیں تمام ضروری سامان اور جگہ تو مل جائے گی لیکن انتظامات ہمیں خود ہی کرنے ہوں گے۔" راحیلہ اٹھتے ہوئے بولی۔

ہم نے مسٹر ایکس کو وہیں کرسی پر بندھا رہنے دیا اور کمرے کی لائٹ آف کر دی۔ دروازہ مقفل کر کے ہم اوپر آگئے۔ راحیلہ نے فون پر اسپتال کے ڈائریکٹر سے رابطہ کر کے ایک کمرے کو استعمال کرنے کی اجازت لی اور ہم تینوں وہاں جا کر تمام ضروری انتظامات کر کے واپس آگئے۔

اسٹڈی میں جا کر ہم نے مسٹر ایکس کو دیکھا۔ وہ ابھی تک بے ہوش تھا۔ ہم نے جلدی سے اسے اٹھا کر ایک گاڑی میں لاد اس خاص کمرے میں پہنچا دیا۔ جہاں ہمارے مختصر سے ڈرا تیاریاں مکمل تھیں۔

اس بار مسٹر ایکس کو ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو آ تھیٹر میں پایا۔ اس کے جسم پر صرف انڈرویئر تھا اور وہ آ ٹیبل پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نائیلون کے تسمو بندھے ہوئے تھے۔ میز کے عین اوپر چھت میں آپریشن تھی مخصوص بڑی بڑی دودھیا لائٹس آن تھیں۔ تھوڑے سے فا ساتھ آپریشن تھیٹر کے دیگر تمام لوازمات بھی موجود تھے۔

ہم تینوں مسٹر ایکس کی میز کے پاس موجود تھے لیکن اس ہم سفید لبادوں میں تھے۔ سروں پر سفید ٹوپیاں اور چہروں ماسک تھے۔ ہمارے چہروں پر ایک اضافی چیز بھی تھی جو سرجن چہروں پر نہیں ہوتی یعنی ہم تینوں نے بڑے بڑے تاریک چ لگائے ہوئے تھے۔ یوں ہمارے چہرے مکمل طور پر چھپ لیکن ہم سرجنوں کے بجائے انسانی روپ میں موت کے دکھائی دے رہے تھے۔

ہم نے وہ احتیاطیں نہیں کی تھیں جو آپریشن تھیٹر میں ہونے کے لیے ضروری ہوتی ہیں اور ہم یہاں بہت سی ایس بھی لے آئے تھے جو جراثیم پھیلانے کا سبب بن سکتی تھی ہمارا کام ختم ہونے کے بعد آپریشن تھیٹر کو جراثیم سے پاک تھا۔ اسی لیے اسے استعمال کرنے کی خصوصی اجازت لی گئی آپریٹنگ ٹیبل کے پاس پہیوں والی ایک خاص میز زنگ آلود آری' گھاس اور جھاڑیاں کاٹنے کی ایک بڑی دو تین کھرپیاں' دو تین ہتھوڑیاں' چند بڑی کیلیں اور ایس دوسری چیزیں موجود تھیں جو مالی' لوہار۔۔ یا بڑھئی کے پیشے سکتی تھیں مگر کسی آپریشن تھیٹر میں ان کی موجودگی کا تصور نہیں کیا جا سکتا تھا۔

مسٹر ایکس جب گردن گھما کر چاروں طرف کا جائزہ لے اور اس کی سمجھ میں آگیا کہ وہ کسی آپریشن تھیٹر میں تھا تو اس اٹھنے کی کوشش کی لیکن پھر اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ آپریٹنگ کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف اور الم کے ساتھ ساتھ بے عنوان سے خوف کی پرچھائیاں ابھر آئیں بظاہر اس نے بے خوف ہی نظر آنے کی کوشش جاری رکھی۔

فلموں اور ڈراموں میں کسی چڑیل یا جادوگرنی وغیرہ کے کر کے ساتھ جس قسم کی آواز ریکارڈ کی جاتی ہے ویسی ہی منحو کھردری اور کھرکھراتی آواز میں راحیلہ بولی۔ "خدا کا شکر تمہیں ہوش آگیا مسٹر ایکس! ہم تو تمہاری طرف سے تشویش مبتلا ہو گئے تھے۔ پورے تین دن بعد ہوش آیا ہے تمہیں۔" نے دیوار پر آویزاں کیلنڈر کی طرف اشارہ کیا جس پر تین دن کی تاریخ ظاہر کی گئی تھی۔

راحیلہ نہایت کامیابی سے اسی بدلی ہوئی آواز میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "تمہیں ہوش میں لانے کے لیے ہمیں بڑے جتن کرنے پڑے۔ پرانا جوتا سنگھانا پڑا...... بھینسوں کے باڑوں کا پرانا گوبر سنگھانا پڑا۔ گندے نالوں کے پانی کے چھینٹے تمہارے منہ پر مارنے پڑے......"

مسٹر ایکس یقیناً محسوس کر سکتا تھا کہ اس وقت اس کا چہرہ گیلا تھا۔ وہ کسمساتے ہوئے ذرا تشویش سے بولا۔ "کیا بکواس ہے...... تم لوگ کون ہو...... اور یہ یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

راحیلہ نے گردن ذرا میری طرف گھمائی اور اسی کھرکھراتی آواز میں بولی۔ "لگتا ہے مریض کے حواس ابھی ٹھکانے نہیں آئے۔ ذرا تھوڑا سا جوتا اور سنگھاؤ۔"

میں نے سعادت مندی سے ایک پھٹا پرانا جوتا فرش سے اٹھا کر مسٹر ایکس کی ناک کے قریب کر دیا۔ اس نے چہرہ دور لے جانے کی حتی الامکان کوشش کی لیکن اس حالت میں وہ گردن کو کہاں تک موڑ سکتا تھا۔

"تم لوگ پاگل تو نہیں ہو؟" بالآخر وہ ہانپتے ہوئے چیخا۔

"پاگل......؟" راحیلہ نے حیرت سے دہرایا۔ "تم ہمیں پاگل کہہ رہے ہو؟ لگتا ہے تین دن کی بے ہوشی کے دوران تمہارے ذہن پر بڑے برے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ احمق کہیں کے! ہم تینوں ملک کے معروف سرجن ہیں لیکن افسوس کہ آج کل ہماری ڈیوٹی بھائی پھیرو کے اس اسپتال میں لگی ہوئی ہے، تمہیں اسلام آباد سے یہاں لایا گیا ہے۔ اسلام آباد کے کسی اسپتال میں تمہارے لیے جگہ نہیں تھی اور تمہاری حالت لمحہ بہ لمحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ تمہاری بے ہوشی طویل ہوتی جا رہی تھی......"

"مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم لوگ خواہ مخواہ مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش مت کرو۔" وہ پھٹی پھٹی سی آواز میں بولا۔ "تمہارے ساتھیوں نے صرف میرے پاؤں لائٹر سے جلا دیے تھے۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں ہوا ہے...... ہاں...... سر پر چوٹ لگی تھی...... لیکن میں ٹھیک ہو جاؤں گا۔ تم لوگ اپنا یہ مذاق بند کرو۔"

"سر پہ چوٹ لگی تھی......!" میں نے اسکی بات کاٹتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا اور اس کے سر پر ابھرے ہوئے گومڑ کو بے دردی سے دبایا۔ وہ بے پناہ قوت برداشت کا مالک ہونے کے باوجود بے اختیار ہولے سے چیخ اٹھا۔ میں نے دوبارہ اس کے گومڑ کو دباتے ہوئے بدلی بدلی بھاری آواز میں اسے ڈانٹا۔ "چیخو مت۔ یہ میں تمہارے دماغ کا ایکسرے لے رہا ہوں۔ میرا خیال ہے اسی چوٹ نے تمہارے دماغ پر برا اثر ڈالا ہے۔ تم بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو۔ فی الحال تو ہم تمہارے دونوں پیروں کے آپریشن کی تیاری کر رہے تھے لیکن میرا خیال ہے ساتھ ساتھ تمہارے دماغ کا بھی آپریشن کرنا پڑے گا......"

مسٹر ایکس نے تھوک نگلا۔ میں نے باقاعدہ "ٹچ" کی آواز سنی۔ وہ نروس سے انداز میں ہنسا۔ "بہت ہی بھو[illegible] کر رہے ہو تم لوگ......" وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولا۔ [illegible] ذہنی طور پر بیمار ہو۔ تم لوگوں کی حس مزاح بہت ہی گھ[illegible] بہرحال...... مذاق بہت ہو چکا۔ اب مجھے ان بندشوں [illegible] دلاؤ۔ میرے پیروں میں بہت تکلیف ہے۔"

"پہلے ہم تمہارے پیروں ہی کا تو آپریشن کریں گے۔[illegible] چڑیل کی طرح چہکی۔ "تمہارے پیروں میں بری طرح انفیک[illegible] ہے۔ گنگرین کا خطرہ ہے۔ تمہاری جان بچانے کے [illegible] تمہارے دونوں پاؤں کاٹنے پڑیں گے۔"

"میرا خیال ہے آپریشن شروع کیا جائے۔" میں [illegible] کاٹنے کی زنگ آلود آری اٹھاتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کر رہے ہو؟" وہ چلایا۔

"آپریشن شروع کر رہا ہوں۔ تمہارے دونوں پاؤ[illegible] فریضہ میرے سپرد ہے۔ میں پاؤں کاٹنے کا اسپیشلس[illegible] ہمارے ہاں اردو میں اسے "پایا اسپیشلسٹ" اور [illegible] "کھروڑا اسپیشلسٹ کہا جاتا ہے۔" میں نے آری اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔

"اور میں کھوپڑی کا آپریشن کرتی ہوں۔" را[illegible] "تمہارے ہاں یہ آپریشن کرنے والے کو نیورو سرجن کہ[illegible] ہمارے ہاں بھی پڑھا لکھا طبقہ تو ہمیں اسی نام سے پکارتا[illegible] پڑھے لکھے اور جاہل لوگ عموماً ہمیں "کھوپڑی توڑ" ہیں......"

اس نے ایک زنبور، چھینی اور ہتھوڑی وغیرہ اٹھا ک[illegible] کو دکھائی۔ "میں ان سے اپنا کام کرتی ہوں۔ یہ میرے آلات ہیں۔"

"اور میں پیٹ وغیرہ...... یعنی جسم کے درمی[illegible] سرجری کا ماہر ہوں۔" ٹونی منمنایا۔ "آنتیں، او[illegible] پھیپھڑے، گردے...... غرضیکہ میں ہر چیز کی مرمت کر[illegible] مجھے بتایا گیا ہے کہ تمہاری یہ سب چیزیں مرمت ہونے[illegible] تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ سب ٹھیک ہو جا[illegible] پیٹ میں صرف ایک بڑا سا گول سوراخ کرتا ہوں ا[illegible] راستے سب چیزیں نکال لیتا ہوں پھر اطمینان سے [illegible] مرمت کرتا ہوں۔ دو تین دن میں سب چیزیں ٹھیک [illegible] واپس ڈال دیتا ہوں اور مضبوط ڈوری سے سلائی [illegible] مریض کی کوئی تکلیف باقی نہیں رہتی۔"

پھر اس نے لمبا سا ایک زنبور اور درانتی مسٹر ایک[illegible] ہوئے کہا۔ "اس زنبور سے میں تمہارے پیٹ کی تھو[illegible] پکڑ کر اوپر اٹھاؤں گا پھر اس درانتی سے اسے کاٹ [illegible] نہایت عمدہ قسم کا گول سوراخ تیار ہو جائے گا......"

مسٹر ایکس ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت میرے اندازے کے مطابق دل ہی دل میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے صرف ڈرانے کی کوششیں کی جا رہی تھیں اور یہ سلسلہ بہرحال ختم ہو جانا تھا۔ ٹونی خاموش ہوا تو راحیلہ معذرت خواہانہ لہجے میں مسٹر ایکس سے مخاطب ہوئی۔ "ہمیں احساس ہے کہ ہمارے آلاتِ جراحی نئے زمانے کے معیار کے مطابق نہیں ہیں لیکن کیا کریں...... مجبوری ہے۔ ہم ایک پسماندہ ملک کے باشندے ہیں اور اس وقت تو ہم اپنے ملک کے بھی پسماندہ ترین علاقوں میں سے ایک میں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان علاقوں میں سرجری کے لیے یہی آلات استعمال ہوتے ہیں۔"

ٹونی منمنایا۔ "اب ہم باتیں ہی کرتے رہیں گے یا کچھ کام بھی کریں گے؟ کم از کم مجھے تو اپنا آپریشن شروع کرنے دیں۔ مجھے تو مریض کا پیٹ کھول کر ساری چیزیں ٹھیک کرنی ہیں۔ آپ دیکھ نہیں رہے...... اس بے چارے کی حالت کتنی خراب ہے۔ گیس اس کے دل اور پھیپھڑوں سے ہوتی ہوئی دماغ کو چڑھی جا رہی ہے۔ دل کے تین والو بھی بند معلوم ہوتے ہیں جو مجھے ڈرل مشین سے کھولنے پڑیں گے......"

"بکواس مت کرو۔" میں نے اسے ڈانٹا۔ "پہلے میں اس کے پائے...... میرا مطلب ہے پاؤں کاٹوں گا۔ دیکھ نہیں رہے۔ اس کے پیروں میں زیادہ تکلیف ہے۔ تین دن کی بے ہوشی میں اس کے زخم گنگرین بن گئے ہیں۔ اگر جلد از جلد اس کے پاؤں الگ نہ کیے گئے تو یہ مر جائے گا۔" میں آری لے کر اس کے پیروں کے قریب پہنچ گیا۔

راحیلہ ہاتھ بڑھا کر مجھے روکتے ہوئے بولی۔ "اگر تم نے اس کے آپریشن میں جلدی کی تو یہ ویسے بھی مر جائے گا۔ تمہیں یاد نہیں...... پاگل خانے جانے سے پہلے بھی تم میں یہی سب سے بڑی خرابی تھی۔ فیس بٹورنے کے لیے آپریشن میں بہت جلدی کرتے تھے۔ نزلہ زکام کے مریضوں کا بھی آپریشن کر ڈالتے تھے۔ یاد ہے...... ایک بار تو تم نے جلدی میں ایکسیڈنٹ کے ایک مریض کی بائیں ٹانگ کاٹ دی تھی جب کہ اس کی دائیں ٹانگ کا آپریشن ہونا تھا۔ مجھے لگتا ہے چار سال پاگل خانے میں گزارنے کے بعد بھی تمہاری حالت میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ مجھے تو تمہارا ذہنی توازن اب بھی خراب لگتا ہے۔"

"تمہیں بھی تو سفارش کے ذریعے پاگل خانے سے نکلوایا گیا ہے۔ تم کون سا ٹھیک ہو گئی ہو......" میں نے لڑاکا عورتوں کی طرح ہاتھ نچا کر کہا۔ "پاگل خانے جانے سے پہلے تم لیڈی ہیلتھ وزیٹر ہوا کرتی تھیں۔ اب تم دماغ کے آپریشن کرنے لگی ہو۔ کم سے کم میری سینیارٹی کا ہی خیال کرو۔ پہلے مجھے آپریشن کرنے دو۔"

"کیا میں تم لوگوں کو نظر نہیں آ رہا ہوں؟" ٹونی گویا خفا ہو کر چلایا۔ "تم سب سے پہلے مجھے فارغ ہونے دو۔ مجھے دوسرے اسپتالوں میں بھی کئی آپریشن مکمل کرنے جانا ہے۔ میں بہت سے مریضوں کو ادھورے آپریشن کر کے میزوں پر لٹا کر آیا ہوں۔ کسی کے گردے باہر ہیں۔ کسی کے پھیپھڑے نکلے ہوئے ہیں۔ ابھی مجھے جا کر ان کی سلائی بھی کرنی ہے۔ میں بہت جلدی میں ہوں۔"

"زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے گھونسا دکھایا۔ "ایک تو ہم نے تمہیں مالی سے سرجن بنا دیا ہے، اوپر سے نخرے دکھاتے ہو۔ تمہاری باری ہم دونوں کے بعد آئے گی۔ پہلے میں آپریشن کروں گا۔"

"پہلے میں......" راحیلہ چڑیلوں کی سی آواز میں چلائی۔

ہم اپنے اپنے اوزار لہرانے اور چیخنے چلانے لگے۔ مسٹر ایکس آنکھیں پھاڑے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تھا کہ وہ ہماری حرکتوں اور باتوں کو مذاق سمجھے یا پاگل پن؟ شاید اسے یہ شبہ ہو چلا تھا کہ اسے تین پاگلوں کے حوالے کر دیا گیا تھا۔

"خاموش......!" آخر میں نے ہاتھ اٹھا کر چلا کر کہا۔ "اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ہم تینوں بیک وقت آپریشن شروع کر دیں۔"

"بالکل ٹھیک۔" ٹونی اور راحیلہ نے اوزار ہوا میں لہراتے ہوئے نعرہ لگایا پھر ہم تینوں مسٹر ایکس پر جھک گئے۔ میں نے اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر اس پر آہستہ آہستہ آری چلانا شروع کر دی۔ ٹونی نے زنبور سے اس کے پیٹ کی کھال پکڑ کر اونچی کی اور آزمائشی انداز میں اس پر درانتی چلانے لگا۔ راحیلہ نے اس کی کھوپڑی پر چھینی رکھ کر پرُخیال انداز میں ہولے ہولے ضربیں لگانا شروع کر دیں۔

اس کی جلد تینوں جگہ سے اچھی خاصی کٹ گئی۔ خون بہنے لگا۔ ہماری سنجیدگی اور انہماک نے اسے چوکڑی بھلا دی۔ وہ وحشت زدہ ہو کر چیخنے لگا۔

"ٹھہرو...... رکو...... میری بات سنو...... خدا کے لیے......"

ہم نے ہاتھ روک لیے۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ "مجھے افضل چوہدری نے تم لوگوں کے سپرد کیا ہے؟"

"افضل چوہدری......؟" میں نے حیرانی سے دہرایا۔ "معلوم نہیں...... ہمیں اس کا نام معلوم نہیں...... اس نے کہا تھا وہ تمہارا دوست ہے اور تمہارے چند ضروری قسم کے آپریشن ہونے ہیں......"

"کیا تم لوگ واقعی پاگل ہو؟" وہ اذیت زدہ لہجے میں بولا۔

"پاگل......؟ پاگل ہو گے تم خود...... پاگل ہو گا تمہارا باپ"...... میں نے گویا بری طرح خفا ہو کر کہا۔

"خدا کے لیے تم افضل چوہدری کو میرے پاس بھیجو...... میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں...... دیکھو میرے زخموں سے خون بہہ رہا ہے...... تم نے ان زنگ آلود چیزوں سے میرے جسم میں اور

بھی انفیکشن پھیلا دی ہوگی......" وہ رو دینے والے لہجے میں بولا۔ اس کی قوت برداشت اور حد سے زیادہ خوداعتمادی جواب دے گئی تھی۔ یہی ہم چاہتے تھے۔ وہ جس مضبوط خول میں بند تھا' ہم اس میں صرف ایک سوراخ کرنا چاہتے تھے۔

پروگرام کے مطابق عین اس وقت کمرے میں فون کی گھنٹی بجی۔ ہم نے فون بھی کمرے میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ چند لمحے میں نے کوئی بات سننے کی اداکاری کی حالانکہ دوسری طرف سے کوئی آواز نہیں آرہی تھی' پھر میں نے ریسیور رکھ دیا اور اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ ہم ایک لفظ کہے بغیر سر جھکائے ایک دوسرے کے آگے پیچھے قطار کی سی صورت میں باہر کو چل دیے۔ یک دم ہی جیسے ہمارا جوش و خروش جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"تم لوگ افضل چوہدری کو میرے پاس بھیجو گے یا نہیں......؟" عقب سے مسٹر ایکس چیخا۔

ہم میں سے کسی نے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر چلایا۔ "خدا کے لیے کسی ڈاکٹر کو تو بھیج دو...... میرے زخموں میں انفیکشن......"

ہم نے گویا اس کی بات سنی ہی نہیں اور آپریشن تھیٹر سے باہر آگئے۔ ملحقہ کمرے میں جا کر ہم نے وہ چیزیں اتار دیں... جنہوں نے ہمیں سر سے پاؤں تک چھپا رکھا تھا پھر ہم نے اپنے حلیے کچھ اور درست کیے۔ اس کے بعد بھی ہم آپریشن تھیٹر میں واپس نہیں گئے۔ ہم چاہتے تھے مسٹر ایکس کچھ دیر اور تشویش و پریشانی میں مبتلا رہے۔

مجھے اندازہ تھا کہ اس کے زخم مہلک نہیں تھے اور خون کچھ ایسا زیادہ نہیں بہہ رہا تھا۔ فی الحال اس کی حالت قطعاً تشویش ناک نہیں تھی۔ اس کا علاج آسانی سے ہو سکتا تھا۔

چند لمحے بعد میں اور راحیلہ دوبارہ آپریشن تھیٹر میں داخل ہوئے۔ ٹونی کو ہم نے باہر ہی چھوڑ دیا تھا۔ اندر جانے سے پہلے ہم نے قدِ آدم آئینے میں اپنا اچھی طرح جائزہ لیا تھا۔ ہماری شخصیتوں کا تاثر اب قطعی مختلف تھا۔ مسٹر ایکس کو شبہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کچھ دیر پہلے ہم ہی اس کی دُرگت بنا رہے تھے۔ ہم اپنے چہروں پر بلا کی سنجیدگی طاری کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہے تھے۔

مسٹر ایکس مجھے دیکھتے ہی پھٹی پھٹی سی آواز میں چلا اٹھا "افضل چوہدری! تم بلاشبہ ذہنی طور پر ایک بیمار آدمی ہو۔"

"بے شک" میں نے سعادت مندی سے تسلیم کیا۔

میرے اس سیدھے سادے اعتراف پر وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑا گیا۔ اس کی شاید سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مزید کیا کہے لیکن ذرا توقف کے بعد وہ کراہتے ہوئے بولا۔ "تم نے اپنے آدمیوں سے میرے ساتھ جو سلوک کرایا ہے اس کا تمہیں ایک نہ ایک روز حساب دینا پڑے گا...... بہت زیادہ سود کے ساتھ۔"

"وہ میرے آدمی نہیں تھے" میں نے نرم لہجے میں کہا "اسپتال میں ذہنی مریضوں کا وارڈ بھی ہے۔ وہ تین افراد فرمائش پر وہاں سے مستعار لیے گئے تھے۔ وہ بہت شارٹ دوبارہ بھی آسکتے ہیں۔ تم بتاؤ...... تمہارا اب کیا ارادہ ہے؟"

"تم جس طرح کی معلومات حاصل کرنا چاہ رہے ہو وہ فراہم کرنا واقعی میرے بس کی بات نہیں ہے..." وہ بے چارگی سے بولا۔ "یقین کرو...... مجھے واقعی معلوم نہیں ہے کہ ریڈ ڈاٹ کے باس اس وقت کہاں ہیں۔ اگر حالات معمول پر ہوتے تب تو شاید کچھ پتا بھی ہوتا لیکن اس وقت بالکل معلوم نہیں ہے۔"

"ہوٹل میں جس سفید فام سے تم ملنے آئے تھے وہ کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ انڈیا میں ہمارے سفارت خانے میں فرسٹ اتاشی ہے آج کل یہاں آیا ہوا ہے۔ وہ بعض اوقات ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے سلسلے میں ہنگامی موقعوں پر ہمیں جعلی کاغذات فراہم کرنے کے انتظامات کرتا ہے لیکن اسے ریڈ ڈاٹ کے پورے سیٹ اپ کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ وہ ایک طرح کا اسپائی ہے۔"

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی مسٹر ایکس؟" میں نے مایوسی سے کہا۔ "ہم نے تم پر بڑی محنت کی ہے۔ اس کے صلے میں ہمیں تو کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہو سکی ہے۔"

"اب بھلا میں کیا کر سکتا ہوں...... " وہ رو دینے والی آواز میں بولا۔

"تمہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا چاہیے۔ تمہاری لاعلمی کے بعد تمہاری ذات میں میری دلچسپی بالکل ختم ہو گئی ہے" میں نے بیزاری سے کہا "اب مجھے سوچنا پڑے گا کہ تمہارے لیے دوبارہ ذہنی مریضوں کو مستعار لیا جائے اور انہیں شغل میلہ کرنے کا موقع دیا جائے یا تمہارے لیے آسان سی موت کا بندوبست کیا جائے۔ یعنی گولی مار کر کہیں پھنکوا دیا جائے۔"

میں نے پیشانی مسلتے ہوئے سوچنے کی اداکاری کی۔ یہ طے تھی کہ مسٹر ایکس کی اکڑفوں ختم ہو چکی تھی۔ اب اس کی ... مجھے حقیقی معلوم ہو رہی تھی۔

"اچھا...... تم اپنا اصلی نام ہی بتا دو۔ "مسٹر ایکس" سے کام نہیں چلے گا۔" میں نے کہا۔

"میرا نام فارول ہے...... فارول شرٹن" وہ بلا تامل بولا۔ اس کے لہجے سے مجھے مزید اندازہ ہوا کہ اسے جو کچھ معلوم تھا وہ بتانے کے لیے اب وہ پوری طرح تیار تھا۔

راحیلہ اب تک میری آڑ میں کھڑی تھی۔ فارول غالباً اس کا پورا چہرہ نہیں دیکھ پایا تھا لیکن اس لمحے راحیلہ بے خیالی میں شاید کچھ مضطرب ہو کر آگے آگئی۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن فارول کو بُری طرح چونکتے دیکھ کر وہ اپنی بات بھول گئی۔

فارول اس کا چہرہ دیکھ کر بُری طرح چونکا تھا۔ میرے خیال میں اس کا ردِ عمل کچھ ایسا غیر متوقع نہیں تھا۔ راحیلہ کے چہرے پر اب تک کسی کی بھی نظر پڑتی تو وہ اسی طرح چونکتا۔

میرے کان اس وقت کھڑے ہوئے جب میں نے فارول کو کہتے سنا "تم راحیلہ ہو نا......؟ افضل کی دوست؟" وہ ایک ٹک راحیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

راحیلہ کے بجائے میں نے جواب دیا "ہاں...... یہ راحیلہ ہے۔ میری دوست۔ تم اسے دیکھ کر کیوں اتنے پریشان ہو رہے ہو؟"

"میں غائبانہ طور پر اسے جانتا ہوں۔ مجھے اس کے بارے میں رپورٹ ملی تھی۔ اس کا چہرہ ڈاکٹر برنارڈ نے ایسا بنایا تھا نا؟" وہ گویا اپنی تکالیف کو کسی حد تک بھول گیا تھا۔

"ہاں۔ یہ اس مردود کی علمی قابلیت کا ایک نمونہ ہے" میں نے نفرت سے کہا۔

"کیا تم نہیں چاہو گے کہ اس لڑکی کا چہرہ ٹھیک ہو جائے؟" فارول تیزی سے بولا۔ اسے گویا اُمید کی کوئی کرن دکھائی دینے لگی تھی۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔" میں نے کہا "کیا تم اس سلسلے میں کچھ کر سکتے ہو؟"

"میں تو کچھ نہیں کر سکتا...... بلکہ شاید دنیا میں کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا" وہ تھوک نگل کر بولا "یہ چہرہ ڈاکٹر برنارڈ نے بگاڑا ہے۔ صرف وہی اسے ٹھیک کر سکتا ہے...... لیکن میں تمہیں بتا سکتا ہوں کہ ڈاکٹر برنارڈ کہاں مل سکتا ہے۔ میرے ساتھ سودا کرو۔ میں تمہیں برنارڈ کے بارے میں بتاتا ہوں۔ تم مجھے چھوڑ دو۔"

میں نے قہقہہ لگایا۔ راحیلہ بھی مسکرا دی اور شگفتہ لہجے میں بولی۔ "ڈیئر مسٹر فارول! یہ مت فرض کرو کہ میں اپنے چہرے کا یہ نقص دور کرانے کے لیے مری جا رہی ہوں یا افضل اسے صحیح حالت میں دیکھنے کے لیے مرا جا رہا ہے۔"

"ہم بے شک اس خواہش میں مرے نہیں جا رہے ہیں لیکن خواہش بہرحال ضرور ہے" میں نے نرمی سے کہا "ہم ڈاکٹر برنارڈ کو تلاش ضرور کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کے لیے تم سے سودے بازی نہیں ہو سکتی۔ تم سودے بازی کی پوزیشن میں نہیں ہو۔ اس کے باوجود تم اس سلسلے میں زبان کھول کر فائدے میں رہو گے۔"

"کیا فائدہ ہو گا مجھے؟" وہ کسمساتے ہوئے بولا۔

"تمہیں ان تکالیف سے نجات مل جائے گی جن میں تم اس وقت گرفتار ہو۔ جس قسم کے علاج کی ضرورت ہو گی وہ تمہیں میسر آجائے گا۔ تمہاری ہر ضرورت کا خیال رکھا جائے گا۔ اس وقت تک تم یہاں مہمان کی سی حیثیت سے رہو گے۔ جب تک ڈاکٹر برنارڈ ہمارے ہاتھ نہیں آجاتا۔"

پھر میں نے خود ہی اپنے مطالبے میں ترمیم کرلی "بلکہ میں تمہارے لیے شرط کچھ اور نرم کر دیتا ہوں۔ ڈاکٹر برنارڈ ہمارے ہاتھ آئے یا نہ آئے یہ ہماری قسمت ہے۔ تمہیں صرف اتنا خیال رکھنا ہے کہ جو معلومات بھی ہمیں فراہم کرو وہ درست ہونی چاہئیں۔ اگر تمہاری بتائی ہوئی ہر بات درست نکلی تو پھر خواہ ڈاکٹر برنارڈ ہمارے ہاتھ آئے یا نہ آئے۔ ہم تمہیں رہا کر دیں گے لیکن اس کے لیے شرط یہ ہوگی کہ تم فوراً ملک چھوڑ دو۔"

"مجھے منظور ہے" وہ جلدی سے بولا۔

"جب تک تمہاری فراہم کی ہوئی معلومات کی تصدیق نہیں ہو جاتی تب تک تم ہمارے پاس یرغمال رہو گے" میں نے کہا "اس دوران تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

"ٹھیک ہے" وہ ایک لمحے سوچنے کے بعد بولا "مجھے جو کچھ معلوم ہے وہ میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ کراچی کے قریب ایک جزیرہ ہے..." اس نے جزیرے کا نام بتایا۔

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔ میں نے وہ جزیرہ دیکھا ہوا ہے۔"

"اس جزیرے کی ایک بہت معروف شخصیت ہے قاسم بجلی..." فارول بولا۔

یہ نام میرے لیے کچھ مانوس تھا۔ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا "یہ شخص تو غالباً ایک بہت بڑا اسمگلر ہے۔ کئی بار مختلف شبہات کی بنا پر اس کے خلاف کارروائی شروع ہوئی لیکن ہر بار نہ جانے کیوں اور کس طرح ٹھپ ہو کر رہ گئی۔ تم اسی قاسم بجلی کا تو ذکر نہیں کر رہے؟"

"ہاں۔ تم ٹھیک سمجھے ہو۔ کیا تم اسے جانتے ہو؟" فارول بولا۔

"نہیں۔ میں اسے نہیں جانتا۔ میں نے کبھی اسے دیکھا بھی نہیں۔ صرف اس کے تذکرے سُنے ہیں۔ معلوم نہیں ان میں سے کتنی باتیں صحیح ہوں گی اور کتنی غلط۔ بہرحال.... لگتا یہی ہے کہ وہ اچھی شہرت کا مالک نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"درست ہے" فارول بولا "کراچی کے کئی مہنگے اور پوش علاقوں ڈیفنس، کلفٹن اور پی ای سی ایچ ایس وغیرہ میں اس کے بنگلے ہیں لیکن اس کا اصل گھر جزیرے پر ہی ہے۔ زیادہ تر وہ وہیں پایا جاتا ہے۔"

"تمہیں وہ کیوں یاد آگیا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"ڈاکٹر برنارڈ آج کل اس کے مہمان کی حیثیت سے یا تو جزیرے والے مکان میں موجود ہوگا یا پھر ایک آدھ دن میں وہاں پہنچنے والا ہوگا۔" فارول نے جواب دیا "پھر وہیں سے وہ قاسم بجلی ہی کی کسی لانچ کے ذریعے دبئی وغیرہ ہوتا ہوا انگلینڈ یا امریکا کی طرف نکل جائے گا۔"

"ریڈ ڈاٹ کے ایک خاص آدمی کا ایک نامی اسمگلر سے کیا تعلق ہے؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں... لیکن تمہارے ملک کے تمام بڑے اور خاص شہروں میں ہر قبیل کے چیدہ چیدہ لوگوں سے ہمارے مراسم رہے ہیں" فارول نے جواب دیا "مجھے جو معلوم تھا وہ میں نے تمہیں بتادیا۔ ڈاکٹر برنارڈ تک پہنچنا اور اسے قابو میں کرنا اب تمہارا کام ہے۔"

"تم نے مجھے کچھ اُلجھن میں ڈال دیا..." میں نے لوہے کے ایک اسٹول پر بیٹھتے ہوئے کہا "قاسم بجلی جیسے لوگوں کے گھروں میں دوستانہ طور پر داخل ہونا ایک مشکل کام ہے۔ کسی سرکاری ادارے کے ذریعے میں اس کے ہاں چھاپا مارنے کے انداز میں کوئی کارروائی کرانا نہیں چاہتا۔ اس میں ناکامی کا زیادہ خطرہ ہے۔ اگر ڈاکٹر برنارڈ وہاں ابھی پہنچا نہیں ہوگا تو پھر وہ اس جگہ کے قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔"

فارول کچھ سوچتے ہوئے بولا "تم دوستانہ طور پر قاسم بجلی کے گھر میں داخل ہوسکتے ہو۔ تجویز میں پیش کردیتا ہوں۔ اس کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار تم پر اور تمہاری قسمت پر ہے۔ یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ تمہارے ملک کے تمام خاص خاص شہروں میں ریڈ ڈاٹ کے ہمدرد موجود ہیں...."

میں اس بات کا اصل مقصد سمجھ گیا تھا۔ انہوں نے ہر شہر میں ایسے بہت سے لوگوں کو ہمدرد اور آلۂ کار بنا رکھا تھا جن کے کردار مشکوک تھے، ذرائع آمدنی اور پیشے مشکوک تھے اور جو اپنی اغراض کی خاطر ملک کو کسی بھی قسم کا نقصان پہنچا سکتے تھے، کچھ بھی کرسکتے تھے۔ ایسے لوگوں کو خاص طور پر منتخب کیا جاتا ہوگا جو اپنی پوزیشن یا عہدے سے ریڈ ڈاٹ کو فائدہ پہنچا سکتے ہوں گے یا پھر جن کے پاس دولت، وسائل اور "بدمعاشی" کی طاقت ہوتی ہوگی۔

فارول بات جاری رکھتے ہوئے بولا "تمہارے آدمیوں جب کوئی ایسے کسی آدمی کے پاس جاتا ہے اور اسے مدد کی ہوتی ہے تو وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ وہ "آر ایکس تھری"۔ کے بعد وہ جو بھی مسئلہ بیان کرتا ہے دوسرا شخص اسے حل پوری پوری کوشش کرتا ہے۔ تم بھی چاہو تو قاسم بجلی کرکے کہہ سکتے ہو کہ تم "آر ایکس تھری" ہو۔ تم اس مہمان کے طور پر قیام کرنے کی فرمائش کرسکتے ہو۔ اس اسے اپنا کوئی مسئلہ بتاسکتے ہو اور مدد کی درخواست کرسکتے دوران دیکھ لینا کہ ڈاکٹر برنارڈ اس کے ہاں موجود ہے یا نہیں اس سلسلے میں تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ میں تمہیں قاسم بج خاص ٹیلی فون نمبر دے دیتا ہوں جس پر اس سے براہِ راس ہوجائے گا۔ اس کے کسی چمچے یا سیکریٹری وغیرہ کی رکاوٹ نہیں آئے گی۔"

"ٹھیک ہے... تم وہ نمبر تو مجھے دو۔ میں ذرا غور کروں سلسلے میں کیا کرنا چاہیے" میں نے کہا۔

اس نے نمبر زبانی ہی مجھے بتادیا جو میں نے نوٹ ک کراہتے ہوئے بولا "اب تو مجھے یہاں سے نکالو اور میر معالجے کی کچھ فکر کرو۔"

"ضرور.... ضرور.... اب تمہارے بارے میں ہر بات میں ہی کروں گا۔ تم ہر فکر سے بے نیاز ہوجاؤ" میں نے ا دی اور اس کی بندشیں کھول دیں۔ وہ بالکل نڈھال نظر آر اتنا مضبوط شخص ثابت نہیں ہوا تھا۔ جتنا میں سمجھ رہا تھا۔

راحیلہ نے ایک ڈاکٹر کو بُلوا کر اس کے لیے مرہم پٹی و انتظامات کرائے۔ ٹونی کو میں نے مسلح حالت میں ہر وقت طرح اس کے ساتھ رہنے کی ہدایت کی۔ میں نے منیر اور بھی اس کی نگرانی کے لیے طلب کرلیا۔ میں نے انہیں فارول کو ایک قیدی ہی کی حیثیت سے رکھنا ہے لیکن ا تکلیف نہیں ہونی چاہیے ... اور اسے اس طرح رکھنا ہے کا خیال بھی اس کے دل میں نہ آئے۔ اس کے علاوہ نفیس کو ہرگز معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ کہ ریڈ ڈاٹ کا کوئی آد تحویل میں ہے۔

ان تمام انتظامات کے ساتھ فارول کو بنگلے کے تہ خا پہنچانے کے بعد میں اور راحیلہ ایک بار پھر ڈائننگ رو آبیٹھے۔ راحیلہ بغور میری طرف دیکھتے ہوئی بولی "کیا سو ہو؟"

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مجھے فوری طور پر کراچی روانہ چاہیے۔ کہیں ڈاکٹر برنارڈ نکل نہ جائے" میں نے جواب دیا ذہن تیزی سے کام کررہا تھا۔

"تم میری خاطر اس معاملے کو اتنی اہمیت مت دو اور لیے کوئی خطرہ مول مت لو۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"اوہو..." میں نے استہزائیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تکلف برت رہی ہو۔ تمہاری خاطر خطرہ مول نہ لوں تو پھر کس کی طر لوں؟ کسی آوارہ گائے، بھینس یا بکری وغیرہ کی خاطر لے ؟"

"میں اس وقت بالکل سنجیدہ ہوں" وہ بولی۔

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ شکل پر پورے بارہ بجے ہوئے ایک تو انسان کی شکل دو رنگی ہو۔ اوپر سے اس پر بارہ بجے ے ہوں۔ یہ تو بڑا ہی مہیب نظارہ ہے۔ میں تمہیں پہلے بھی رہ دے چکا ہوں کہ اپنی شکل پر بارہ مت بجنے دیا کرو۔ زیادہ سے دہ پونے بارہ تک بھی معاملہ قابلِ برداشت رہتا ہے۔" میں نے ا۔

میں اس کے چہرے کے دو رنگے پن کا خواہ کتنا بھی مذاق لیتا لیکن اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار نہیں ہوتے ے اسے معلوم تھا کہ میں صرف اسے چھیڑنے اور چڑانے کے ایسا کرتا تھا۔ حقیقتاً اس کا مذاق اُڑانا مقصود نہیں ہوتا تھا۔ وقت بھی اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نہیں اُبھرے اس کی سنجیدگی برقرار رہی۔

"اگر تمہارا جانا اتنا ہی ضروری ہے تو کیا تم نفیس صاحب کو اع دے کر نہیں جاسکتے؟" وہ بولی۔

"مزید وقت ضائع ہوگا۔ وہ نہ جانے کس طرح اس معاملے کو ل کرنا چاہیں گے۔ کہیں میرے اور ان کے درمیان اختلافِ ے نہ پیدا ہوجائے۔ اس وقت ویسے بھی وہ سرکاری پیچیدگیوں پھنسے ہوئے ہیں... بلکہ مجھے تو ڈر ہے ان کی وجہ سے میں بھی ی سرکاری پیچیدگی میں نہ پھنس جاؤں اور یہیں بیٹھا نہ رہ ں۔ بڑی مشکل سے یہ بریک تھرو ملا ہے" میں نے تیزی سے ا۔

وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے اس کا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا "میں وہاں جاکر نفیس صاحب کو فون کردوں گا مجھے بزنس کی کوئی بہت بڑی ایمرجنسی آن پڑی ہے۔ دو چار دن ں واپس آجاؤں گا۔ تم خطرہ مول لینے کی جو بات کررہی ہو وہ کل احمقانہ ہے۔ ہماری زندگی میں فی الحال خطرات کے سوا ہے کیا؟ جن جن خطرات کے ساتھ ہم سر پھوڑ چکے ہیں۔ ان سے کر اب ہمیں کون سے خطرات سے واسطہ پڑسکتا ہے؟"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی" بالآخر وہ بولی۔ مجھے یوں لگا ے وہ شروع سے اصل میں یہی بات کرنا چاہتی تھی۔

میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جلدی سے بولی شاید تم سوچ رہے ہو کہ میرا ساتھ جانا تمہارے لیے اُلجھن کا باعث بنے گا.... تو میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ ایسا ہرگز نہیں گا۔ میں تمہارے ساتھ جزیرے پر نہیں جاؤں گی بلکہ ہم دونوں الگ رہتے ہوئے جزیرے پر پہنچیں گے اور میں دور دور سے تم پر اور قاسم بجلی کے مکان پر نظر رکھوں گی۔ میرا اپنے ساتھیوں سے رابطہ رہے گا۔ اگر ضرورت پڑی تو میں فوراً انہیں طلب کرلوں گی یا پھر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ میں جزیرے پر قدم ہی نہ رکھوں بلکہ سمندر میں تمہارے فشنگ کے جو ٹرالر چل رہے ہیں ان میں سے کسی ٹرالر پر رہتے ہوئے دور سے جزیرے پر نظر رکھوں اور موبائل فون یا وائرلیس کے ذریعے تم سے رابطہ رکھوں۔"

"اس کام کے لیے میں نے شفیع شاہ کو ساتھ لے جانے کا سوچا ہے۔ وہ سمندر اور جزیروں سے بہت بہتر طور پر واقف ہے۔ تم نفیس صاحب سے نمٹنے کے لیے یہیں موجود رہو۔ شفیع شاہ چونکہ بزنس کے سلسلے میں کراچی میں میرا ریذیڈنٹ ڈائریکٹر بھی ہے اس لیے اسے ساتھ لے جانے کا معقول جواز بھی نظر آتا ہے۔ نفیس صاحب زیادہ چوں چراں نہیں کریں گے اور شک میں بھی نہیں پڑیں گے۔ تمہارا یہاں رہنا مجھے زیادہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ یہاں کے معاملات کو تم جتنا بہتر سنبھال سکتی ہو کوئی اور نہیں سنبھال سکتا۔ ویسے بھی نفیس صاحب نے تمہیں یہاں ہماری ٹیم کا انچارج بنایا ہوا ہے۔ میرے ساتھ ساتھ انچارج کا بھی غائب ہوجانا ٹھیک نہیں ہے۔"

میں نے یہ سب کچھ نہایت ٹھہرے لہجے میں سنجیدگی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ بات اس کی سمجھ میں آگئی۔ ایک گہری سانس لے کر اس نے ہتھیار ڈالنے کے سے انداز میں کہا "اچھا.... جیسے تمہاری مرضی۔"

"وِری گُڈ" میں نے چٹکی بجاتے ہوئے کہا "تم اسی طرح اچھی بچی بن کر رہا کرو۔ میں تمہیں ٹافیاں لا کر دیا کروں گا۔ اب تم فوراً موبائل فون پر.... یا جس طریقے سے بھی ممکن ہو، شفیع شاہ سے رابطہ کرو۔ اسے فوراً یہاں بلواؤ تاکہ وہ اپنا حلیہ وغیرہ درست کرلے اور میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوجائے۔ پتا نہیں کہاں بندر نچاتا پھر رہا ہوگا.... بلکہ کوئی بعید نہیں بندر اسے نچا رہے

ہوں۔ آج کل بندر بھی تو بہت ہوشیار ہو گئے ہیں۔ شاید انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ڈارون کے دعوے کے مطابق وہ ہمارے آباواجداد ہیں۔"

وہ ذرا پیچھے کھسک کر موبائل فون پر شفیع شاہ سے رابطہ کرنے لگی۔ میں نے دوسرے عام فون پر اپنے ٹریول ایجنٹ سے رابطہ کیا جو میری کاروباری مصروفیات کے دنوں میں میرے تمام سفری مسائل حل کرتا تھا۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ حیران رہ گیا اور شکوہ آمیز سے انداز میں بولا "سر! آپ کہاں غائب ہو گئے تھے؟ آپ نے تو ہمیں زحمت دینا بالکل ہی چھوڑ دیا۔ کیا کسی اور ٹریول ایجنسی کی خدمات حاصل کر لی ہیں؟"

"نہیں بھائی!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں نے ذرائع آمدورفت ہی ایسے اختیار کر لیے تھے جن کے لیے کسی ٹریول ایجنسی کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ مثلاً گدھا گاڑی... بیل گاڑی... سائیکل... اور زیادہ ہی جلدی میں ہوا تو موٹر سائیکل وغیرہ۔"

ٹریول ایجنسی کے مالک نے ایک طویل اور گونجیلا قہقہہ لگایا "سر! بات کو مذاق میں ٹالنا کوئی آپ سے سیکھے... لیکن اتنا ضرور ہے کہ مذاق آپ ستھرا کرتے ہیں۔"

"بس... بس۔ اپنا یہ کاروباری برانڈ کا مکھن کسی دوسرے کلائنٹ کے لیے سنبھال کر رکھو اور میرے لیے کراچی جانے والی کسی بھی ائرلائن کی پہلی پرواز میں دو سیٹوں کا بندوبست کر دو۔"

"رش بہت ہے سر! لیکن بندوبست ہو جائے گا۔ یہ تو معمولی کام ہے۔ ہمیں کوئی بڑا کام بتایا کریں" وہ بے پروائی سے بولا۔

"بڑا کام بھی بتائیں گے کبھی... اور دعا کریں گے کہ اس وقت تم منہ چھپاتے نہ پھرو" میں نے گہری سانس لے کر کہا "فی الحال میں یہ بتا دوں کہ میں ٹکٹ لینے تمہارے دفتر بھی نہیں آ سکتا اور کسی آدمی کو بھی نہیں بھیج سکتا۔"

"یہ بھی کوئی پرابلم نہیں ہے" وہ بولا "آپ ائرپورٹ پہنچ جائیں۔ ڈیپارچر لاؤنج کے دروازے پر آپ کو ہمارا آدمی ٹکٹ لیے مل جائے گا۔ پندرہ منٹ بعد میں آپ کو فون کر کے فلائٹ کے بارے میں بتا سکوں گا۔ آپ مجھے اپنا نمبر دے دیں۔"

میں نے اسے نمبر دے دیا اور فون بند کر دیا۔ اس وقت تک راحیلہ بھی شفیع شاہ سے بات کر چکی تھی۔

"شفیع کچھ دیر میں یہاں پہنچ جائے گا" راحیلہ نے بتایا۔

"میں اتنی دیر میں چند چیزیں بریف کیس میں ڈال لوں؟" میں نے کہا۔

.... اس طرح میں اور شفیع شاہ بڑی بھگدڑ کے عالم میں کراچی روانہ ہو گئے۔ ہم لوگ رات کے پچھلے پہر کراچی پہنچے۔ ڈیفنس میں شفیع شاہ کا بنگلا موجود تھا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ وہیں قیام کیا جائے کیونکہ ایک بار پہلے میرا اپنے ہی ہوٹل میں قیام کرنے [illegible] گوارا نہیں رہا تھا لیکن پھر میں نے سوچا "اب حالات [illegible] شاید اب ریڈ ڈاٹ والے میرے ہوٹل میں میری [illegible] ہوں۔

شفیع شاہ نے ائرپورٹ سے ہوٹل فون کر کے دو [illegible] بندوبست کر دیا تھا۔ ہمیں صرف چند گھنٹے آرام کرنا تھا [illegible] بجلی سے فون پر رابطہ کرنا چاہتا تھا۔ راستے میں میں [illegible] تمام حالات سے آگاہ کر دیا تھا۔ کراچی میں قیام کے [illegible] ایک دوسرے سے لاتعلق نظر آنا تھا۔ شفیع شاہ نے فو[illegible] کے تمام عملے کے لیے یہ ہدایت بھی جاری کرا دی [illegible] ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرے کہ وہ ہمیں پہچانتا ہے۔

صبح اُٹھ کر ناشتا کرنے اور تیار ہونے کے بعد میں [illegible] ٹیبل کے آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ میری دا[illegible] کافی بڑھی ہوئی تھیں اور میں نے ذرا فیشن ایبل سے [illegible] کی تراش خراش کرالی تھی۔ آنکھوں پر تاریک چشمے [illegible] تھا۔ ہیئر اسٹائل بھی بدلا ہوا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ کر[illegible] سرسری طور پر جاننے والے لوگ تو قریب سے دیکھ [illegible] پہچان سکتے تھے۔

اپنے حلیے کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد [illegible] بجلی سے فون پر رابطہ کیا۔ دوسری طرف سے ایک بارعب آواز سُنائی دی۔ اس آواز میں کسی فلمی کردا[illegible] آواز جیسا مصنوعی پن نہیں تھا لیکن نہ جانے کیوں [illegible] میرے ذہن میں تصور کسی ایسی ہی شخصیت کا اُبھرا۔

"قاسم بجلی...؟" میں نے تصدیق چاہی۔

وہ اسی بھاری اور بارعب آواز میں خلافِ تو[illegible] ستھری انگریزی میں بولا "بڑے عرصے بعد اس نمبر پر کو[illegible] سُن رہا ہوں۔ کون ہو تم... اور کس نے تمہیں یہ نمبر د[illegible]

"آر ایکس تھری" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے [illegible]

"اوہ...!" اس کی آواز تو ویسی ہی بھاری اور گو[illegible] لہجہ یکدم بدل گیا۔ اب وہ لہجہ ایک دوست، ایک ہمد[رد] شار کا تھا۔ "کیا مسئلہ ہے؟"

"فون پر نہیں بتا سکتا۔ ملنا چاہتا ہوں" میں نے کہا۔

"کیا مجھے خود آنا پڑے گا؟"

"بہتر یہی ہے" میں نے جواب دیا۔

"کہاں ہو؟"

میں نے ہوٹل کا نام بتایا تو وہ بولا "اتفاق سے [illegible] یہیں شہر والے آفس میں موجود ہوں۔ آدھے گھنٹے بعد [illegible] ٹھیک آدھے گھنٹے بعد تم ہوٹل کے دروازے سے نکل [کر] کنارے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو جاؤ اور مجھے اپنی کچھ نشا[نیاں] میں نے ذرا تفصیل سے اپنا حلیہ بتانا شروع کیا [illegible]

نشانیاں سُننے کے بعد بولا "بس... بس... اتنا ہی کافی ہے۔ تھوڑا بہت ہمارے اندازے لگانے کے لیے بھی چھوڑ دو" اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے شفیع شاہ کو صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کہا "تم بھی میرے رخصت ہوتے وقت ہوٹل سے باہر آ جانا اور ذرا قاسم بجلی وغیرہ کا جائزہ لے لینا۔ ہمارا تعاقب کرنے کی تو ضرورت نہیں۔ ہماری منزل بہرحال جزیرہ ہی ہو گا۔ تم وہیں پہنچ جانا اور دور دور سے حالات پر نظر رکھنا۔ کچھ ہتھیاروں کا بھی بندوبست رکھنا اور اپنے کچھ آدمیوں کو بھی اسٹینڈ بائی رکھنا۔ میں کوشش کروں گا کہ اگر کوئی ایمرجنسی ہوئی تو تمہیں موبائل فون پر اطلاع دے سکوں۔"

ٹھیک انتیس منٹ بعد میں ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑا تھا۔ اس کے ٹھیک ایک منٹ بعد سیاہ رنگ کے نئے ماڈل کی ایک چم چم کرتی پجیرو میرے قریب آ کر رُکی۔ اس کے شیشے تاریک تھے۔ اندر بیٹھے ہوئے افراد مجھے صرف ہیولوں کی طرح دکھائی دیے۔

فوراً ہی پچھلا دروازہ کھلا اور وہی بھاری گونجیلی آواز سُنائی دی جو میں فون پر سُن چکا تھا "بیٹھ جاؤ۔"

میں بلا تامل پچھلی سیٹ پر جا بیٹھا جس پر گھنی داڑھی مونچھوں والے دو مضبوط، جسیم اور سانولے کلاشنکوف بردار پہلے سے موجود تھے۔ قاسم بجلی خود آگے ڈرائیور کے برابر پسنجر سیٹ پر موجود تھا۔ گاڑی میں کسی نفیس سگار کے دھوئیں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو کسی نہایت اعلیٰ درجے کی کلون کی مہک میں مدغم ہو رہی تھی۔

قاسم بجلی ایک بھاری بھرکم، پختہ العمر، نیم گنجا شخص تھا۔ نہایت نفیس شلوار قمیص اور واسکٹ میں تھا۔ اس کی موٹی موٹی مونچھیں بچھو کی دُم کی طرح اوپر کو اُٹھی ہوئی تھیں۔ اس کا نام سُن کر کچھ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی گلی کوچے کا روایتی قسم کا بدمعاش یا چھوٹا موٹا دہشت گرد ہو گا لیکن اس کی شخصیت پر نظر پڑتے ہی اس کے بارے میں مجھے کچھ پوچھے بغیر ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ بہت اونچی چیز تھا۔ ظاہری شخصیت اور رکھ رکھاؤ سے وہ اسمگلر کے بجائے کوئی بہت بڑا جاگیردار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے دونوں مسلح محافظ سانپ جیسی گول گول آنکھوں سے مجھے گھور رہے تھے۔

میرے بیٹھتے ہی پجیرو آگے روانہ ہو گئی تھی۔ چند لمحے تک قاسم بجلی کچھ بھی نہ بولا اور نہ ہی اس نے صحیح طور پر میری طرف دیکھنے کی زحمت کی۔ کچھ آگے جا کر گاڑی ایک سگنل پر رُکی، تب قاسم بجلی نے پوری طرح گھوم کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں پر بھی سیاہ چشمہ تھا لیکن ہم دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں کی گہرائیوں میں جھانک سکتے تھے۔ اس وقت تک ایک مسلح محافظ قدرے ترچھا ہو کر بیٹھ چکا تھا۔ وہ پیچھے نظر رکھے ہوئے تھا کہ کوئی گاڑی ہمارا تعاقب تو نہیں کر رہی۔ میرا اندازہ تھا کہ قاسم بجلی کا ڈرائیور اور خود قاسم بجلی بھی مسلح تھا۔

دہشت گرد

"میں تمہارا نام نہیں پوچھوں گا۔ میرے لیے آر ایکس تھری ہی کافی ہے۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔ یہ درحقیقت نام جاننے کی اِن ڈائریکٹ فرمائش تھی۔

"میرا نام عارف ہے" میں نے کہا۔ شاید وہ منتظر تھا کہ میں مزید بھی کچھ کہوں گا لیکن میں نے اس سے آگے کچھ نہ کہا۔

وہ چند سیکنڈ خاموشی سے میری طرف دیکھتا رہا۔ میرے اندازے کے مطابق گاڑی اس دوران بے مقصد سڑکوں پر رواں تھی۔ قاسم بجلی نے سگار کا گہرا کش لے کر منہ پھیر کر دھواں دوسری طرف چھوڑا پھر دھیمی آواز میں بولا "کیا بتانا پسند کرو گے کہ تم کیا چاہتے ہو؟" وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

"یقیناً" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ بتائے بغیر تو چارہ ہی نہیں۔ میں چند دن تمہارے ہاں جزیرے پر مہمان رہنا چاہتا ہوں۔ اس کے بعد اگر ضروری ہوا تو میں تمہیں بتا دوں گا کہ مجھے کسی لانچ یا بحری جہاز وغیرہ کے ذریعے کسی خلیجی ملک کی طرف بھجوا دو... اور اگر خطرہ ٹل گیا تو میں یہیں لوٹ آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے... بالکل ٹھیک ہے... کوئی مسئلہ نہیں ہے" وہ اطمینان سے بولا۔ "جن کے ریفرنس سے تم آئے ہو وہ بہت بڑے لوگ ہیں۔ وہ تو دوسروں کے مسئلے حل کرتے ہیں لیکن وقت وقت کی بات ہے... آج کل وہ خود ذرا مشکل میں ہیں۔"

"یہی تو مسئلہ ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اس نے مزید کچھ نہ پوچھا۔ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ پجیرو میں بھی فون نصب تھا اور اس کے پاس ایک الگ موبائل فون بھی موجود تھا۔ اس نے گاڑی میں لگے ہوئے فون پر کسی سے رابطہ قائم کیا اور بولا "موٹر بوٹ کنارے پر لے آؤ۔ میرے ساتھ ایک مہمان آ رہا ہے۔" اب اس کا لہجہ بالکل بدل گیا تھا۔ وہ مچھیروں کے سے انداز میں بات کر رہا تھا۔

اس نے فون بند کر دیا اور گاڑی میں سکوت چھا گیا۔ انجن اور ائرکنڈیشنڈ کی سرسراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہم اس وقت کلفٹن کی طرف جانے والی سڑک پر تھے جس پر اس وقت ٹریفک برائے نام تھا اس لیے بھی شور محسوس نہیں ہو رہا

تھا ورنہ کراچی کے ٹریفک کا شور تو ائرکنڈیشنڈ اور ساؤنڈ پروف گاڑیوں کے اندر بھی کانوں کے پردے پھاڑنے کی کوشش کرتا تھا۔

چند سیکنڈ بعد ہی ڈرائیور نے گاڑی موڑلی۔ ڈرائیور بھی کچھ عجیب اور پُراسرار سا ہی تھا۔ قاسم بجلی نے ابھی تک اس سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا لیکن اسے شاید ہدایات کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ اسے اندازہ ہوجاتا تھا کہ کس وقت گاڑی کا رخ کس طرف کرنا ہے۔

چند منٹ بعد ہم گھوم پھر کر دوبارہ ہوٹل کے سامنے پہنچ گئے جہاں سے مجھے گاڑی میں بٹھایا گیا تھا۔ شفیع شاہ اب کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ یقیناً اپنا کام کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔

گاڑی ہوٹل کے سامنے سے گزرتی چلی گئی۔ جب ہم پی آئی ڈی سی ہاؤس سے آگے نکل آئے تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہم کیماڑی کی طرف جارہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں فارول نے مجھے "آر ایکس تھری" کوڈ کے ذریعے مروانے کا تو بندوبست نہیں کیا تھا؟ کہیں میں آنکھیں بند کرکے بھیڑیے کی کچھار میں تو نہیں جارہا تھا؟ میرے پاس اس وقت معمولی سا کوئی پستول یا ریوالور بھی نہیں تھا۔

پھر میں نے خود کو تسلی دی کہ یہ میری زندگی میں کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ میں اس طرح کا خطرہ مول لے رہا تھا۔ اس وقت، تو کم از کم یہی غنیمت تھا کہ فارول نے اگر مجھے یہاں بھیجا تھا تو وہ خود ضمانت کے طور پر میرے ساتھیوں کی تحویل میں موجود تھا۔ اگر اس نے مجھے پھنسوانے کا بندوبست کیا تھا تو اس کا اپنا انجام بھی کچھ اچھا نہیں ہوسکتا تھا۔

کچھ دیر بعد ہم کیماڑی جاپہنچے۔ میں قاسم بجلی کے ساتھ گاڑی سے اُتر آیا۔ دونوں مسلح محافظ ہمارے پیچھے تھے۔ کیماڑی پر موجود لانچوں والے جو ہر گاڑی سے اُترنے والوں کو گھیر لیتے تھے اور انہیں اپنی لانچ میں سیر کرانے کے لیے کھینچا تانی شروع کردیتے تھے۔ وہ سب قاسم بجلی کی گاڑی دیکھ کر ہی پیچھے ہٹ گئے تھے اور چند سیکنڈ میں غائب ہوگئے تھے۔ کوئی ہمارے قریب بھی نہیں پھٹکا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سیر کے لیے آئے ہوئے لوگ بھی احتیاطاً اِدھر اُدھر ہوگئے تھے۔ گویا انہیں بھی احساس ہوگیا تھا کہ قاسم بجلی اس قسم کی شخصیات میں سے تھا۔ جنہیں آتے دیکھ کر راستہ چھوڑ دینا چاہیے۔ جہاں بھیڑ نظر آئی وہ بھی ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی کائی کی طرح پھٹ گئی۔

ہم سمندر کے کنارے پہنچے تو مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کرائے پر چلنے والی تمام پُرانی پُرانی سی لانچیں بہت دور ہٹ کر کھڑی تھیں۔ سیڑھیوں کے قریب صرف ایک سفید رنگ کی نہایت خوب صورت اور جدید موٹر بوٹ موجود تھی جس کی پیشانی پر نیلے اور سُرخ حروف میں "پرنس" لکھا نظر آرہا تھا۔ یہ دو کیبن والی تقریباً چالیس فٹ لمبی ایک پُرتعیش موٹر بوٹ تھی۔ اس کے ڈیک پر بھی دو آدمی کلاشنکوف لیے کھڑے تھے۔ جس طرح اس وقت ساری بھاڑ چھٹی ہوئی تھی اور وہ اکیلی موٹر بوٹ جس طرح سیڑھیوں کے قریب فخر سے "سر اُٹھائے" کھڑی تھی اس سے وہ واقعی شہ... معلوم ہورہی تھی۔

سیڑھیوں پر سیاہ کائی اور لانچوں کے ڈیزل کی چکناہٹ جمی تھی۔ خاموشی سے سیڑھیاں اُتر کر ہم موٹر بوٹ میں کود گئے... میرے اندازوں سے زیادہ پُرتعیش بوٹ تھی۔ اس میں داخل... بالکل ایسا معلوم ہوا جیسے ہم کسی چھوٹے لیکن اعلیٰ درجے... اپارٹمنٹ میں پہنچ گئے تھے۔ اس میں امریکن طرز کا کچن بھی... قاسم بجلی شو آف کرنے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس... مجھے پوری بوٹ دکھانے یا فخر کا اظہار کرنے کی کوشش نہیں... تھی۔ میں نے خود ہی گھوم پھر کر اس کا جائزہ لیا تھا۔

"اچھی بوٹ ہے" میں نے پوری بوٹ میں گھوم پھر کر کے بعد تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"تانیا اور ثانیا کو یہ سُن کر خوشی ہوگی" قاسم بجلی مسکراتے ہوئے بولا۔

"تانیا اور ثانیا کون ہیں؟" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا۔

"میری بیٹیاں" اس کے لہجے میں قدرے فخر جھلک آیا... درحقیقت انہی کی بوٹ ہے۔ کھلے پانیوں میں تیز رفتاری سے چلانا اور اسکی اِنگ کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔"

"بہت خوب... بہت خوب" میں سرہلاتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ یہ سُن کر میری دھڑکنوں میں خفیف سا اضافہ ہوا... موصوف کی دو بیٹیاں تھیں اور وہ اسکی اِنگ بھی کرتی تھیں... ہی موقعوں پر میرے اندر کوئی گنگناتی سی آواز اُبھرتی تھی "وطن میں سب کچھ ہے پیارے!"

بوٹ روانہ ہونے لگی تو میں نے کچھ آگے کھلے پانی میں... فشنگ ٹرالر کو سست رفتاری سے تیرتے دیکھا۔ اس کی چھت... دوربین لیے کھڑا تھا اور بظاہر منوڑہ کی طرف دیکھ رہا تھا... اس کی طرف سے منہ پھیرلیا۔ شفیع شاہ بہت مستعد نوجوان... اس نے آج صبح اُٹھتے ہی فشنگ ہاربر پر پیغام بھجوادیا تھا... چڑھے میرے ٹرالروں میں سے ایک خالی ہوتا... چاہیے اور... کیماڑی کے آس پاس موجود رہنا چاہیے۔

"پرنس" کیماڑی سے نکلنے کے بعد تیز رفتاری سے ج... کی طرف روانہ ہوگئی اور چند منٹ بعد ہی ہم جزیرے پر... جہاں قاسم بجلی کا ذاتی بوٹ ہاؤس موجود تھا۔ بوٹ ہاؤس... سیڑھیاں چڑھ کر جزیرے پر قدم رکھتے ہوئے قاسم بجلی بولا... معنوں میں یہ جزیرہ نہیں ہے۔ خشکی سے ایک سڑک بھی یہاں... آتی ہے لیکن اس کے لیے بہت لمبا چکر کاٹنا پڑتا ہے۔ ویسے... کے راستے آنے کا ایک الگ ہی لطف ہے۔"

"اور جزیرے پر رہنے کا بھی ایک الگ ہی لطف ہے۔" میں نے کہا۔

"بے شک" اس نے بغور میری طرف دیکھا "شہر کے بہترین علاقوں میں میرے بنگلے موجود ہیں لیکن میں اب بھی اس پسماندہ جزیرے پر رہنا پسند کرتا ہوں۔ یہ میری ایک الگ تھلگ دنیا ہے۔ تمہیں یہاں کسی بھی سرکاری یا غیر سرکاری طاقت سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔"

ساحل پر اسے لینے کے لیے ایک دوسری پجیرو آئی ہوئی تھی حالانکہ وہاں سے اس کے مکان کا فاصلہ بہ مشکل چند فرلانگ کا تھا۔ جزیرہ بے شک پسماندہ تھا لیکن قاسم بجلی کا مکان کسی محل سے کم نہیں تھا۔ وہ ایک الگ تھلگ مسطح پہاڑی پر بنا ہوا تھا اور اس کے تین اطراف سے سمندر کا نظارہ کیا جاسکتا تھا۔ مکان کے ڈیزائن میں امریکا کے وہائٹ ہاؤس کی جھلک تھی اور اس کا رنگ بھی سفید تھا۔ مین گیٹ سے ایک ڈھلوان سڑک نیچے تک آرہی تھی۔

اس مکان کی طرف آتے وقت راستے میں جہاں جہاں سے قاسم بجلی کی گاڑی گزری، لوگ فوراً راستہ چھوڑ کر دیواروں سے لگ کر نظریں جھکا کر کھڑے ہوگئے۔ کوئی کار، گدھا گاڑی یا موٹر سائیکل پر تھا تو اس نے اپنی سواری ایک طرف کرکے روک لی۔ یہ واقعی قاسم بجلی کی اپنی ہی الگ تھلگ دنیا تھی۔

اس نے محسوس کرلیا کہ میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے مشاہدے میں محفوظ کرنے کی کوشش کررہا ہوں۔ مسکراتے ہوئے اس نے گویا وضاحت کی۔ "ہمارا خاندان اس جزیرے پر کئی نسلوں سے آباد ہے۔ سرکاری طور پر ہماری یہاں کوئی حیثیت نہیں اور نہ ہی سرکاری طور پر ہم کوئی مقام حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں لیکن عملی طور پر ہم یہاں کے حکمران ہیں۔"

اسے یہ بات مجھے بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے پہلے ہی اندازہ ہوچکا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے یاد پڑتا تھا کہ جس زمانے میں میں نے یہاں فشنگ کے ٹرالر خرید کر چھوڑے تھے اس وقت بھی میں نے قاسم بجلی کے تذکرے سُنے تھے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ ہمارے ٹرالروں میں سے کسی پر اس جزیرے کے ماہی گیر بھی کام کرتے ہوں۔ میں دل ہی دل میں دعا کررہا تھا کہ شفیع شاہ دور سے اس جزیرے اور قاسم بجلی کے محل نما مکان پر نظر رکھنے کے لیے جو ٹرالر لے کر آیا تھا اس میں جزیرے کا کوئی آدمی نہ ہو پھر مجھے اس خیال سے اطمینان ہوا کہ شفیع شاہ اس قسم کی باریکیوں کا خیال رکھنے والا آدمی تھا۔

پجیرو چڑھائی چڑھ کر طویل و عریض ڈرائیو وے میں جارُکی۔ مکان کے چاروں طرف جیسا لان پھیلا ہوا تھا ایسے خوب صورت لان میں نے بہت کم گھروں میں دیکھے تھے۔ سبز گھاس کے ہموار اور مخملیں تختوں کے درمیان رنگ برنگے پھولوں سے لدی ہوئی صاف ستھری کیاریاں تھیں جنہیں خاص شکلیں دی گئی تھیں اور پھولوں سے ڈیزائن بنائے گئے تھے۔ پہلی نظر میں تو یوں لگتا تھا گویا کسی کیلنڈر میں چھپی ہوئی خوب صورت تصویر کو بے پناہ بڑا کرکے اس میں زندگی کی تب و تاب اور تازگی بھردی گئی تھی۔

فطرت کے اس نظارے کی دلکشی اپنی جگہ تھی لیکن وہ چیز بھی کچھ کم دلچسپ نہیں تھی جو اس لان کے ایک سایہ دار گوشے میں اُچھل کود کررہی تھی۔ رنگ برنگے جوگنگ سوٹ اور جوگرز میں چھپی ہوئی اس مختصر الوجود ہستی کو پہلے میں لڑکا سمجھا تھا۔

چند قلابازیاں کھانے کے بعد اس نے ایک دم رُک کر دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے بائیں پیر کے اور بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے دائیں پیر کے انگوٹھے کو کئی بار تیزی سے چھُوا پھر سیدھے ہوکر اپنی کمر کو دائیں بائیں چند بل دیے جبکہ کمر پہلے ہی تقریباً معدوم تھی۔

جب اس کا چہرہ ایک لمحے کے لیے ساکت ہوا اور جھٹکے لیتے ہوئے مختصر تراشیدہ ریشمی بال ساکت ہوئے تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی تھی۔ وہ لان کے درمیان سے گزرتی ہوئی ماربل کی ایک روش پر جوگنگ کرتی ہوئی قریب آگئی۔ اب مجھے یقین کرنا ہی پڑا کہ وہ لڑکی تھی۔ اسے دور سے دیکھ کر... اور متحرک حالت میں دیکھ کر ہی یقین تو ہوجانا چاہیے تھا لیکن دراصل اس میں لڑکی ہونے کی نشانیاں ذرا کم ہی نمایاں تھیں۔

"ہائے ڈیڈ....!" وہ قریب آکر بھی ایک ہی جگہ کھڑے کھڑے جوگنگ کرتے ہوئے بولی۔ مخاطب وہ ڈیڈ سے تھی لیکن جائزہ میرا لے رہی تھی۔ سرتاپا تنقیدی جائزہ۔ اس کی ننھی سی ناک پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں شبنم کی طرح چمک رہی تھیں۔ اس کا نازک

نوخیز اور صبیح چھولان پر کھلے ہوئے بعض پھولوں سے ہی مشابہ تھا۔ چہرے پر معصومیت تھی لیکن اس کی شربتی آنکھیں اس معصومیت کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔

"ہائے تانی۔۔! میری چاند سی بیٹی کیسی ہے؟" قاسم بجلی اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولا۔ وہ صرف ایک لمحے کے لیے ساکت ہوئی تھی۔

"فائن ڈیڈ! یہ طوفانی قسم کا اجنبی کون ہے؟" اس نے اُچھل کود کا ہلکا پھلکا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے انگریزی میں پوچھا۔ میں قدرے حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ معلوم نہیں اسے میری شخصیت میں کون سا طوفان نظر آیا تھا اور کس زاویے سے نظر آیا تھا۔

"یہ عارف ہے تانی بیٹا!" قاسم بجلی نے بڑے پیار سے بتایا "کون ہے۔۔۔ یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم۔۔۔ لیکن ہمارا دوست ہے۔۔۔" پھر اس نے مجھے بتایا "یہ میری بڑی بیٹی تانیا ہے۔"

"ہائے۔۔۔ ہاؤ ڈو یو ڈو؟" اس نے اپنا مختصر سا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ میں نے گویا ایک مخملیں گلاب ہاتھ میں تھام لیا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اس گلاب میں حرارت تھی۔

"فائن۔۔۔ تھینک یو" میں نے اپنے چہرے پر بردباری طاری رکھنے کی کوشش کی۔

"ویلکم۔۔۔" اس نے دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی لیکن مجموعی طور پر اس کی شخصیت میں دلکشی کی کمی تھی۔ صرف خوب صورت ہونا کسی کے پُرکشش ہونے کی دلیل نہیں ہوتی۔

پہاڑی پر بنے ہوئے اس طویل و عریض مکان کے اندر ایک طرف پلرز کے اوپر ایک اور چھوٹا سا مکان بنا ہوا تھا۔ اس کے نیچے پلرز کے درمیان فاضل گاڑیوں کے لیے پارکنگ کی جگہ بنائی گئی تھی۔

قاسم بجلی اس مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "وہ انیکسی میرا اصل گیسٹ ہاؤس ہے۔ اس میں کچھ غیر ملکی مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ گو کہ ابھی اس میں مزید آٹھ دس افراد کے قیام کی گنجائش ہے لیکن تم پھر بھی میرے اصل گھر میں۔۔۔ میری فیملی کے ساتھ۔۔۔ کسی فاضل بیڈ روم میں ٹھہرو گے۔ ٹھیک ہے؟"

"بہت شکریہ۔ یہ گویا میرے لئے ایک اعزاز ہے۔ اس کے لیے میں ہمیشہ تمہارا شکر گزار رہوں گا۔" میں نے کہا۔

مکان کے ارد گرد اور گیٹ کے آس پاس کئی مسلح محافظ گھومتے پھرتے دکھائی دے رہے تھے۔ میں اس کے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر ہال سے گزر کر اندر پہنچا۔ وہ مجھے ایک پُرشکوہ اور عظیم الشان ڈرائنگ روم میں لے گیا۔ اس کی ایک کھڑکی سے بھی وہ انیکسی دکھائی دے رہی تھی۔

قاسم بجلی نے جب اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس میں کچھ غیر ملکی مہمان ٹھہرے ہوئے تھے تو میری دھڑکنیں کچھ تیز ہو گئی تھیں۔ کہیں وہ ریڈ ڈاٹ کے لوگ تو نہیں تھے؟ کہیں ان میں ڈاکٹر برنارڈ بھی تو شامل نہیں تھا؟ کہیں ان میں سے کوئی پہچانتا تو نہیں تھا؟ کہیں ان میں سے کوئی اس وقت انیکسی کی کسی کھڑکی سے میری طرف دیکھ تو نہیں رہا تھا؟ میں نے غیر ارادی طور پر گھنی لیکن مختصر داڑھی مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور سیاہ چشمہ درست کیا اور قدرے اطمینان محسوس کیا۔

ہم شاندار صوفوں میں دھنس کر بیٹھ چکے تو قاسم بجلی بولا "بتاؤ تمہاری کیا خاطر تواضع کی جائے۔۔؟ تم کچھ پینے پلانے کے شوقین ہو؟"

"ہاں۔۔۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"کیا پیو گے؟" اس نے شاہانہ انداز میں پوچھا۔

"ٹھنڈا پانی۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے ایک گونجیلا سا قہقہہ لگایا "میں سمجھا تھا تم دنیا کی نہایت مہنگی اور کمیاب شراب کا نام لینے والے ہو۔"

"پانی دنیا کی سب سے اچھی شراب ہے لیکن اس کی قدر صحراؤں میں بھٹکتے ہوئے وہ مسافر ہی جان سکتے ہیں جن کے مشکیزے خالی ہو چکے ہوں۔" میں نے کہا۔

"یوں تو ہر چیز کی قدر وہی جانتا ہے جو اس سے بُری طرح محروم ہو۔ جو نعمتیں انسان کی رسائی میں ہوتی ہیں ان کی قدر وہ نہیں جانتا" قاسم بجلی گہری سنجیدگی سے بولا "لیکن یہ اس قسم کی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے۔"

ایک باوردی ملازم دروازے پر حاضر ہو چکا تھا۔ اس نے اسے چائے اور لوازمات وغیرہ میز پر لگانے کا حکم دیا پھر میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "میں سمجھ گیا ہوں۔۔۔ تمہاری خاطر مدارات صرف اسی طرح کی چیزوں سے کی جا سکتی ہے۔ ویسے۔۔۔ بائی دا وے۔۔۔ یہ پرہیز عارضی ہے یا ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے؟"

"عارضی ہے" میں نے اسے ٹالنے کے لیے جواب دیا۔ وہ مجھے کریدنے کا کچھ زیادہ ہی خواہش مند نظر نہیں آ رہا تھا۔

کچھ دیر بعد جبکہ ہم اس کے طویل و عریض ڈائننگ روم میں شاندار ڈائننگ ٹیبل پر نہایت پُرتکلف چائے سے لطف اندوز ہو رہے تھے، تانیا کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ لباس تبدیل کر چکی تھی اور شاید شاور بھی لے چکی تھی۔ ڈائننگ روم میں اس کے داخل ہوتے ہی دلفریب خوشبو پھیل گئی۔

وہ بڑی تیزی سے چلی آ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی پھر باپ کی طرف دیکھ کر انگلیاں ہلاتے ہوئے بولی "ہائے ڈیڈ۔۔۔! مجھے نہیں معلوم تھا آپ مہمان کے ساتھ بیٹھے ہیں" اس نے بڑی ادا سے گردن کو خم دیتے ہوئے میری طرف اشارہ کیا "آپ کی تعریف؟" وہ اب بھی انگریزی میں ہی بات کر رہی تھی۔

"تمہاری یادداشت بہت کمزور معلوم ہوتی ہے" میں نے بے اختیار کہا "اس نوجوانی میں اتنی جلدی بھول جانے والی خاتون نے پہلی بار دیکھی ہے۔"

قاسم بجلی نے اپنے مخصوص انداز میں گونجیلا قہقہہ لگایا۔ تانیا اُلجھن سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ قاسم بجلی میز پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا۔ "مسٹر عارف! یہ تانیا نہیں ثانیا ہے۔ آپ تو خیر پہلی بار مل رہے ہیں۔ ان سے کئی کئی بار مل لینے والوں کو بھی اکثر یہی غلط فہمی ہوتی رہتی ہے۔ ابھی ایک منٹ پہلے تانیا سے کوئی بات کی۔۔۔ ایک منٹ بعد ثانیا سامنے آ گئی تو اس سے اس بات کا جواب مانگنے لگے۔ یہ دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔"

"او خدایا۔۔۔!" میں طویل سانس لے کر رہ گیا "شکر ہے ان کے ناموں میں ایک نقطے کا فرق ہے۔ شکل میں تو ایک نقطے کا فرق بھی نہیں ہے۔"

"نہیں۔ شکل میں بھی ایک نقطے کا فرق ہے" ثانیا ناک کے قریب رخسار پر انگلی رکھتے ہوئے مسکرا کر بولی "میرے یہاں تل ہے۔ تانیا کے نہیں ہے۔"

قاسم بجلی نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ فخریہ انداز میں کہا "میری بیٹیاں ذہانت میں یکساں ہیں۔"

"اور جسامت میں بھی" میں نے کہا۔

"بے شک" وہ مسرور لہجے میں بولا "تم نے اتنی مشابہت بہت کم جڑواں بہنوں یا بھائیوں میں دیکھی ہو گی۔"

"میں نے زندگی میں جڑواں بھائی بہنیں ہی کم دیکھی ہیں۔۔۔ بلکہ میرے خیال میں اس سے پہلے جتنے دیکھے ہیں فلموں میں ہی دیکھے ہیں جن میں ایک ہی ایکٹر یا ایکٹریس جڑواں بھائیوں یا بہنوں کا رول ادا کرتی ہیں۔"

"حقیقی زندگی میں کبھی کبھی فلمی اور افسانوی زندگی سے زیادہ حیرت انگیز اتفاقات رونما ہوتے ہیں" قاسم بجلی سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"بے شک" میں نے پُرزور انداز میں اس کی تائید کی "میں خود اس نظریے کا چلتا پھرتا ثبوت ہوں۔"

"اوہ۔۔۔" ثانیا نے اس طرح ادائے خاص سے آنکھیں پھیلائیں کہ وہ گول گول دکھائی دینے لگیں۔ وہ بلا جھجک میرے برابر والی کرسی پر آ بیٹھی اور میرے تاریک چشمے کے پار میری آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "اس کا مطلب ہے آپ نے ایک دلچسپ اور ہنگامہ خیز زندگی گزاری ہے؟"

"کسی حد تک!" میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے میری داستانِ حیات سُننے کی فرمائش کر بیٹھے۔

"اوف۔۔۔ لکی یو آر!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ تاہم وہ کسی قسم کی فرمائش کی طرف نہیں آئی البتہ ایک نظر باپ کی طرف دیکھنے کے بعد بولی "ہم اور تانیا بھی جب اسٹیٹس میں تھیں تو کافی دلچسپ اور ہیجان خیز زندگی گزار رہی تھیں حالانکہ ہم اسٹوڈنٹس تھیں اور وہاں اسٹوڈنٹس کی زندگی کافی خشک اور بے کیف ہوتی ہے۔ انہیں پڑھائی میں بہت زیادہ وقت گزارنا پڑتا ہے لیکن یہاں آنے کے بعد ہم فارغ ہونے کے باوجود کچھ نہیں کر پاتے۔ عجیب سست اور بیزار انداز میں رات دن گزارتے ہیں۔ شہر چلے جاتے ہیں تو وقت ذرا اچھا گزر جاتا ہے" وہ بالکل تانیا ہی کی طرح امریکی لہجے میں انگریزی میں بات کر رہی تھی۔

قاسم بجلی محبت سے بولا "بیٹا! میں نے تم سے کہا تو ہے دن میں بے شک شہر میں رہا کرو لیکن رات کو یہاں اپنے گھر آ جایا کرو" پھر وہ معنی خیز انداز میں بولا "جلد ہی میں تم دونوں بہنوں کے لیے ایسی مصروفیت کا بندوبست کروں گا کہ تمہیں سر کھجانے کی فرصت نہیں ملے گی۔"

پھر وہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے فخریہ انداز میں بولا "میری دونوں بیٹیاں اسٹیٹس سے بزنس ایڈمنسٹریشن میں ڈگری لے کر آئی ہیں" پھر وہ زور دیتے ہوئے بولا "ڈپلوما نہیں۔۔۔ ڈگری۔"

"بہت خوب" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا "انہیں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ اسٹیٹس سے اتنی اہم ڈگری لے کر آئی ہوں گی۔ یہ تو میٹرک کی بچیاں لگتی ہیں۔"

قاسم بجلی نے ایک بار پھر بڑے مسرور انداز میں قہقہہ لگایا "یہ دونوں بہنیں چینی اور جاپانی لڑکیوں کی طرح بڑی عمر چور ہیں۔"

ثانیا بالوں کو جھٹکتے ہوئے ترچھی نظروں سے باپ کی طرف دیکھ کر بولی۔ "چینی اور جاپانی لڑکیوں کی طرح نہیں ڈیڈی۔۔۔ بلکہ آپ کی طرح۔۔۔ آپ خود کو بھی تو دیکھیں۔ آپ کتنے عمر چور ہیں۔ آپ کو دیکھ کر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم دونوں بہنیں آپ کی دوسری بیوی کی اولاد ہیں۔۔۔ اور یہ کہ آپ کی پہلی بیوی سے ہم سے بھی بڑی عمر کی اولادیں ہیں؟"

قاسم بجلی نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ وہ کچھ زیادہ ہی خوش معلوم ہوتا تھا۔ ایک مونچھ کو بل دیتے ہوئے وہ بولا "ثانی۔۔۔ مائی ڈیئر۔۔۔! تمہیں اس موضوع پر بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔ یہ تو ہمارا فیملی سیکرٹ ہے۔"

اسی اثنا میں تانیا بھی آن پہنچی۔ وہ اب اُڑے اُڑے سے رنگ کی اسٹون واشڈ نیلی جینز اور ہلکی پھلکی سفید شرٹ میں تھی۔ وہ بھی چائے نوشی میں شریک ہو گئی۔ ہلکی پھلکی گپ شپ چلتی رہی پھر قاسم گھڑی دیکھتے ہوئے بولا "مجھے اب واپس شہر جانا ہے۔ میں رات گئے واپس آؤں گا۔ تم سے شاید کل صبح ہی ملاقات ہو۔"

پھر وہ اپنی بیٹیوں سے مخاطب ہوا "تم مسٹر عارف کا اچھی طرح خیال رکھنا۔۔۔ اور اگر یہ تمہارے بس کی بات نہ ہو تو انہیں نوکروں کے سپرد کر دینا لیکن پھر بھی گاہے بگاہے ان کی خیر و عافیت معلوم کرتی رہنا۔ انہیں کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ یہ ہمارے خاص مہمان ہیں۔ تم خود ان کی خیر خبر رکھو تو زیادہ بہتر ہو گا۔ جو بیڈ روم خالی پڑے ہیں ان میں سے جو مسٹر عارف کو پسند آئے وہ انہیں دے دینا۔"

پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ چٹکی بجاتے ہوئے بولا "لیکن اس سے پہلے تم دونوں میرے ساتھ ذرا اسٹڈی میں چلو۔ ماربل کی فیکٹری کے فنانشل معاملات کے بارے میں جو فائلیں میں نے تمہارے سپرد کی تھیں، تم نے ان کے بارے میں کیا سوچا' وہ ذرا مختصراً مجھے بتا دو اور فائلیں بھی واپس دے دو۔"

وہ معذرت خواہانہ لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوا "میں تمہارے سامنے کاروبار کے خشک مسائل چھیڑ کر تمہیں بور نہیں کرنا چاہتا۔ صرف چند منٹ کے لیے تانیا اور ثانیا کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔ اُمید ہے تم بُرا نہیں مناؤ گے۔"

"ہرگز نہیں۔" میں نے خلوص سے کہا۔

میں دل ہی دل میں فارول شرٹن کا شکریہ ادا کر رہا تھا جس نے مجھے "آر ایکس تھری" کی صورت میں گویا "کھل جا سم سم" کی قسم کا کوئی کوڈ ورڈ بتا دیا تھا جس سے میرے لیے پُرتعیش میزبانی کے دروازے کھلتے جا رہے تھے اور میزبانی بھی دو خوب صورت لڑکیوں کے سپرد کی جا رہی تھی۔ مانا کہ ان میں "نزاکت" کی ذرا کمی تھی لیکن بہرحال وہ لڑکیاں تھیں اور خوب صورت بھی تھیں۔ قدرت میری زندگی میں بڑا توازن رکھتی تھی۔ جہاں میرا قدم قدم پر ایک سے ایک بڑھ کر منحوس' مکروہ اور خطرناک مرد سے واسطہ پڑتا تھا' وہاں خوش شکل' خوش ادا اور کسی نہ کسی اعتبار سے منفرد خواتین سے بھی میری رسم و راہ پیدا ہوتی رہتی تھی۔

ان باپ بیٹیوں کے جاتے ہی بٹلر میرے سر پر آکر کھڑا ہو گیا "سر! آپ کو کچھ اور چاہیے؟" وہ نہایت مؤدبانہ انداز میں جھکتے ہوئے بولا۔ محض چائے کے لیے اتنا تکلف کیا گیا تھا کہ طویل و عریض ڈائننگ ٹیبل بھری پڑی تھی۔

میں نے ان چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "مجھے تو یہ سب کچھ بھی نہیں چاہیے۔ تم "کچھ اور" کی بات کر رہے ہو۔"

"سر! آپ کوئی اردو... سندھی... انگریزی... ملکی... غیر ملکی اخبار یا رسالہ پڑھنا پسند کریں گے؟"

میں نے اسے گھورا لیکن اس کا چہرہ ہر تاثر سے عاری تھا۔ وہ چہرے مہرے سے موٹے دماغ کا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

"نہیں" میں نے ایک لمحے کے توقف سے کہا "اس وقت مجھ پر جہالت کا دورہ پڑا ہوا ہے۔ میں کچھ پڑھنا نہیں چاہتا۔"

"جیسے آپ کی مرضی سر!" اس نے کندھے اُچکائے "میں نے سوچا شاید وقت گزاری کے لیے..." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور وہیں کھڑا رہا۔ شاید وہ نہیں چاہتا تھا کہ میں تنہا رہوں... یا مجھے تنہائی کا احساس ہو۔ ان دونوں باتوں میں خاصا فرق تھا۔ نہ جانے دونوں میں سے کون سی بات درست تھی۔

تانیا اور ثانیا نے واپسی میں خاصی دیر لگا دی لیکن جب وہ واپس آئیں تو خاصی خوش نظر آ رہی تھیں "ڈیڈی چلے گئے۔" انہوں نے گویا مجھے خوشخبری سُنائی۔ ان کے کمرے میں قدم رکھتے ہی بٹلر رخصت ہو گیا تھا۔

وہ میرے دائیں بائیں بیٹھ گئیں۔ دونوں کے وجود سے ایک جیسی مہک اُٹھ رہی تھی۔ کم بخت شاید کلون بھی ایک وقت میں ایک ہی استعمال کرتی تھیں۔

"مسٹر عارف! آپ کو اِسکی اِنگ آتی ہے؟" اچانک ثانیا نے پوچھا۔

"آتی تو ہے..." میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "لیکن میں ماہر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔"

"ماہر تو اس میں انسان پریکٹس سے ہی ہوتا ہے" ثانیا بولی۔ مجھے گردن گھما کر اس کی طرف دیکھنا پڑا۔ وہ بڑے ... اور ... سے انداز میں مسکرائی "بہرحال ہم آپ کو دو تین گُر ایسے بتائیں گے کہ آپ چند منٹ میں ہی خود کو زبردست ماہر محسوس کریں گے۔ آیئے... بوٹ کی سیر اور اِسکی اِنگ کے لیے چلتے ہیں۔ ہم دونوں یہاں کئی دن سے اتنے بور ہو رہے ہیں کہ خودکشی کو دل چاہ رہا ہے۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور اس نے ازراہِ اخلاق پوچھا "آپ تھکے ہوئے تو نہیں ہیں؟"

"مجھے تھکنے کی فرصت ہی نہیں ملتی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ہم اُٹھ کر باہر آ گئے۔ مجھے اب تک باپ بیٹیوں کے علاوہ گھر کا کوئی فرد دکھائی نہیں دیا تھا۔ ہم ڈرائیو وے میں آئے تو میری نظر ایک بار پھر انیکسی پر پڑی۔ اس کی کھڑکیاں گویا چند جناتی آنکھوں کی طرح دور سے مجھے گھور رہی تھیں۔

"قاسم صاحب بتا رہے تھے کہ انیکسی میں کچھ غیر ملکی مہمان ٹھہرے ہوئے ہیں۔ کون لوگ ہیں وہ؟" میں نے بظاہر سرسری لہجے میں پوچھا۔

تانیا اور ثانیا نے یوں انیکسی کی طرف دیکھا جیسے ابھی تک اس کی موجودگی سے ہی بے خبر تھیں پھر تانیا منہ بناتے ہوئے بولی "ہم نے چند گوروں کو ڈیڈی کے ساتھ ایک آدھ مرتبہ باہر آتے جاتے دیکھا ہے لیکن جاننے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کون ہیں؟ چھ سال اسٹیٹس میں گزار کر آئے ہیں۔ ہمیں گوروں سے کچھ زیادہ دلچسپی نہیں رہی۔ مولی اور شلغم جیسی پھیکی پھیکی رنگت دیکھ کر جی بھر گیا ہے۔"

"اور پھر وہ بڈھے بھی تو تھے۔" ثانیا نے ٹکڑا لگایا۔

"ہاں..." تانیا نے سر ہلایا "ایک تو گورے... اوپر سے بڈھے... ہمیں بھلا ان کے بارے میں جاننے کی کیا ضرورت تھی"

"بے شک... بے شک" میں نے سر ہلایا۔

"ہمیں تو کچھ عرصے سے سب چیزیں دیسی اچھی لگنے لگی ہیں۔ دیسی کھانے... دیسی چیزیں... اور دیسی بندے!" ثانیا کندھے اُچکا کر بولی۔

ان سے سوال کر کے بھی میری معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوا تھا۔ صرف ان کے "قابلِ قدر" نظریات سے ڈھیرے ڈھیرے آگاہی حاصل ہو رہی تھی۔

ڈرائیو وے میں اب وہ ٹیکیرو موجود نہیں تھی جس میں' میں قاسم بجلی کے ساتھ ساحل سے یہاں تک آیا تھا البتہ اس کی جگہ ایک مرسیڈیز کھڑی تھی۔ تانیا نے اس سیاہ مرسیڈیز کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ثانیا پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ آ بیٹھی۔

ڈرائیو وے میں کھڑے ہوئے دو مسلح گارڈز نے بھی خاموشی سے گاڑی میں ہمارے ساتھ بیٹھنے کی کوشش کی لیکن ثانیا نے انہیں ڈانٹ دیا "ہم ذرا سمندر کی سیر کو جا رہے ہیں۔ کیا ہمیں اب اپنی بادشاہی میں بھی گارڈز کی ضرورت ہوگی؟"

گاڑی میں بیٹھ کر ہم بوٹ ہاؤس تک پہنچے۔ وہاں "پرنس" اسی شان سے کھڑی تھی۔ دو مسلح محافظ بوٹ ہاؤس میں بھی موجود تھے۔ انہوں نے بھی ہمارے ساتھ "پرنس" میں سوار ہونے کی کوشش کی۔ انہیں بھی تانیا سے اسی طرح ڈانٹ سُننا پڑی جس طرح گھر پر موجود محافظوں نے سُنی تھی۔

بوٹ کے وہیل ہاؤس میں بوٹ کو چلانے والا باوردی نوجوان موجود تھا مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ تانیا اسے بھی بوٹ سے نہ اُتار دے لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس نے کشتی کی ناخدائی اسی کے ہاتھ میں رہنے دی اور اسے گہرے پانیوں کی طرف چلنے کا حکم دیا۔

ذرا سی کھلی جگہ میں پہنچ کر طاقتور بوٹ نے رفتار پکڑلی تو سمندر میں جھاگ کا طوفان چھوڑتی ہوئی چند منٹ میں کہیں سے کہیں پہنچی۔ کرائے کی لانچیں' منوڑہ نامی جزیرہ وغیرہ سب پیچھے رہ گیا۔ بہت دور ایک ٹرالر البتہ اب بھی نظر آ رہا تھا۔ وہ گویا ہمارے متوازن چل رہا تھا۔ فاصلہ اتنا تھا کہ وہ کسی حد تک کھلونا ہی نظر آ رہا تھا لیکن میں اسے پہچان سکتا تھا۔

اس وقت تک تانیا اور ثانیا کیبن میں جا کر لباس تبدیل کر آئی تھیں اور سوئمنگ کاسٹیوم میں تھیں۔ انہوں نے مجھے بھی ایک سوئمنگ ٹرنک دے دیا تھا۔ موٹر بوٹ میں انہوں نے نہ جانے کن کن چیزوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ اِسکی اِنگ کا سامان بھی موجود تھا۔

پہلے ان دونوں بہنوں نے باری باری اِسکی اِنگ کی۔ پانی میں وہ لڑکیوں کے بجائے ڈولفن مچھلیاں معلوم ہو رہی تھیں۔ اِسکی اِنگ اور تیراکی میں وہ واقعی بے پناہ ماہر تھیں۔ پانی کی اس مخلوق نے مجھے بھی اِسکی اِنگ پر مجبور کر دیا۔

میں پریکٹس میں نہیں تھا۔ میرے انداز پر ایک آدھ مرتبہ دونوں نے قہقہے بھی لگائے اور ایک بار تانیا نے خود وہیل روم میں جا کر بوٹ کی رفتار بھی خطرناک حد تک بڑھا دی لیکن میں نے اوسان خطا نہیں ہونے دیئے۔

آخر جب میں بوٹ میں واپس آیا تو وہ مجھے شاباش دیتے ہوئے بولیں "اناڑی ہو... مگر زیادہ نہیں۔"

اس وقت شام کا دُھندلکا نمودار ہونے لگا تھا۔ میں تقریباً ایک گھنٹا پانی میں رہا تھا۔ اب مجھے خنکی اور تھکن کا احساس ہونے لگا تھا۔ گزشتہ دو دن جیسے حالات میں گزرے تھے اور آرام کے لیے جتنا کم وقت مل رہا تھا اس کے اثرات کو میں اپنے جسم پر حاوی نہیں ہونے دے رہا تھا لیکن تھوڑا بہت احساس ہونے لگا تھا۔

میں ڈیک پر آ لیٹا۔ اس کے کچھ حصے پر کندنی دھوپ باقی تھی۔ بوٹ اس وقت سست رفتاری سے ایک بہت بڑے دائرے میں گھوم رہی تھی۔ سمندر پُرسکون تھا۔ تانیا اور ثانیا میرے دائیں بائیں آ بیٹھیں۔ تانیا کے ہاتھ میں لوشن کی بوتل تھی۔

"تھک گئے ہو..." وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مسکرا کر بولی۔ "لاؤ مساج کر دوں۔"

مجھ گناہ گار کو اس حسین پیشکش سے بھلا کیونکر انکار ہو سکتا تھا۔ وہ لوشن میرے کندھوں اور کمر پر پھیلا کر کسی ماہر مالشیے کی طرح مالش کرنے لگی۔ ثانیا اس سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئی۔

میں نے دزدیدہ نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک طرف بہت دور وہ ٹرالر کھلونے کی طرح نظر آ رہا تھا اور دوسری طرف اتنی ہی دور جزیرے کا مختصر سا حصہ دُھند میں لپٹا ہوا دکھائی دے رہا تھا جبکہ آس پاس کہیں دُھند نظر نہیں آ رہی تھی۔

کافی دیر بعد آخر کار میں نے بوجھل لہجے میں کہا "کیوں ایک غریب پاکستانی کو مروانے پر تُلی ہوئی ہو۔ یہ یورپ یا امریکا کا سمندر نہیں ہے۔ کوئی جہاز قریب سے گزرا تو ہمارے نظارے پر ٹکٹ لگ جائے گا۔ کوئی بعید نہیں کہیں دور سے کوئی زوم لینس لگا کر ہماری مووی بنانا شروع کر دے۔"

دونوں بیک وقت زور سے ہنسیں۔ اس وقت وہ خرخراتی بلیاں لگ رہی تھیں۔ ان کے چہروں سے جو بچپنا سا جھلکتا تھا اب اس کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ ثانیا خمار آلود سے لہجے میں بولی "ہاں... چلو... آؤ نیچے کیبن میں چلتے ہیں۔"

ہم نیچے کیبن میں آ گئے جہاں فرش سے جڑا ہوا خوب صورت آرام دہ ڈبل بیڈ موجود تھا۔

بہت دیر بعد تانیا نے کروٹ لیتے ہوئے سر اُٹھا کر کھڑکی سے باہر دیکھا اور بشاشت آمیز تھکن سے بوجھل لہجے میں بولی "غروبِ آفتاب کا نظارہ کتنا دلکش لگ رہا ہے۔"

ثانیا نے بھی سر اُٹھا کر کسی انجانے نشے سے بوجھل آنکھیں کھول کر کھڑکی سے باہر دیکھا اور بھاری آواز میں بولی "واقعی... دنیا کتنی خوب صورت ہے۔"

میں نے بھی لمبورنگ، ڈوبتے سورج کو دیکھا۔ اس قسم کے مناظر صرف کیلنڈروں پر نظر آتے ہیں۔ تانیا بولی "اب واپس چلنا چاہیے۔"

میں غروب آفتاب کا نظارہ کرتے ہوئے مبہوت سا تھا۔ تانیا مجھے کہنی مارتے ہوئے بولی "جانے سے پہلے تم ایک ڈبکی اور کیوں نہیں لگا لیتے؟ یہاں پانی کتنا صاف ہے۔"

"کیوں نہیں۔ میں خود یہی سوچ رہا تھا" میں نے چونکتے ہوئے کہا اور کاہلی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے باہر جا کر سمندر میں چھلانگ لگا دی۔ اس غسل میں جو لطف تھا وہ امپورٹڈ ٹائلوں اور جدید ترین سازوسامان سے سجے ہوئے کسی پُرتعیش باتھ روم میں میسر نہیں آسکتا تھا۔

بوٹ کا انجن بند کر دیا گیا تھا اور وہ بے آواز، قریب ہی ہلکورے لے رہی تھی۔ میں کئی منٹ تک ٹھنڈے پانی سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ سورج نے منہ چھپا لیا اور سطحِ آب پر ملگجا اندھیرا پھیل گیا۔

سورج نے تو صبح تک کے لیے غوطہ لگا لیا تھا۔ میں نے سوچا میں چند منٹ کے لیے غوطہ لگا لوں۔ میں نے سانس روکی اور زیرِ آب چلا گیا۔ زیرِ آب جانے سے انسان کے کان بند ہو جاتے ہیں تو ایک عجیب سے سکون کا احساس ہوتا ہے۔ میں گویا مراقبے میں جا کر ان لڑکیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ تین گھنٹے پہلے میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ وہ میرے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھیں اور.....!

میں نے دنیا دیکھی تھی۔ اونچے سے اونچے اور نچلے سے نچلے طبقے سے میرا واسطہ رہا تھا۔ بڑی بڑی آزاد خیال لڑکیوں سے بھی پالا پڑا تھا لیکن پیش قدمی میں جیسی امریکی تیزی ان جڑواں بہنوں نے دکھائی تھی وہ میرے تجربات میں خاصا یادگار اضافہ تھا۔ یہ محض مزاج کی آوارگی تھی یا اس کا کوئی خاص مقصد تھا.....؟ یا پھر دونوں ہی باتیں تھیں؟

مجھے پانی میں خفیف سی ہلچل کا احساس ہوا اور گہرائی میں ہونے کے باوجود ہلکی سی گھرگھراہٹ سُنائی دی لیکن میں نے اسے اہمیت نہ دی اور اپنی فلسفیانہ سوچ وبچار میں مشغول رہا۔ آخر جب یوگا کی مشق بھی جواب دینے لگی تو میں سانس لینے کے لیے سطحِ آب پر آیا تو سمندر کے سینے پر پھیلے ہوئے اندھیرے کے باوجود میرے سامنے چودہ طبق روشن ہو گئے۔

بوٹ مجھے چھوڑ کر روانہ ہو چکی تھی اور بہت دور پہنچ چکی تھی۔ اس کی جھلملاتی روشنی لحہ بہ لحہ مزید دور ہوتی جا رہی تھی۔ بہت دور اگر شفیع شاہ میرے ٹرالر پر موجود بھی تھا تو وہ دوربین کی مدد سے بھی مجھے یہاں سمندر میں ہاتھ پاؤں مارتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بوٹ کو صرف اس کی روشنیوں کی مدد سے دیکھ سکتا تھا۔ اسے واپس جاتے دیکھ کر وہ یقیناً یہی سمجھا تھا کہ میں بھی اس میں جا رہا ہوں۔

کیا اس بیکراں سمندر میں ڈوبنا میرا مقدر تھا؟ یہ سوچ جیسا اندھیرا میرے حواس پر بھی چھانے لگا!

دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو سنبھالا۔ یہ میرے مسئلے کا حل نہیں تھا۔ پانی میں دھیرے دھیرے ہاتھ مارتے ہوئے میں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا۔ ایک طرف دور جزیرے کی روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ اندھیرے کی صحیح اندازہ کرنا مشکل تھا کہ فاصلہ کتنا تھا۔

میرے سامنے ایک راستہ تو یہ تھا کہ جزیرے کی سمت تیرنا شروع کر دیتا۔ شاید وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا؟ یہ میری مضبوطی کا ایک کڑا امتحان ہوتا۔ اگر راستے میں میرا ساتھ میرے بازو جواب دے جاتے تو میرا انجام عبرت ناک ہوتا تھا۔ اس میں عبرت کا سب سے بڑا پہلو یہ ہوتا کہ میرے دوستوں میں سے تو کوئی اس حقیقت سے آگاہ ہی نہ ہو پاتا کہ درحقیقت میرا انجام ہوا کیا تھا؟

دوسری طرف وہ ٹرالر تھا جس پر شفیع شاہ موجود تھا۔ وہ جزیرے کی مخالف سمت میں تھا اور اس کی روشنیوں کی جھلملاہٹ سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بھی جزیرے سے کم فاصلے پر نہیں تھا۔ اس کے کیپٹن نے شاید انجن بند کر رکھا تھا۔ وہ نہایت آہستگی سے یونہی اِدھر اُدھر ہلکورے لے رہا تھا۔

میں حیران تھا کہ اگر شفیع شاہ نے "پرنس" نامی بوٹ کی روشنیاں دور جاتے دیکھ لی تھیں تو ابھی تک اس کے تعاقب میں کیوں روانہ نہیں ہوا تھا؟ ضروری نہیں تھا کہ اس کے روانہ ہونے سے مجھے مدد میسر آجاتی۔ ممکن تھا وہ اسی طرف سے گزرتا جدھر میں بھیگی بلی کی طرح تیر رہا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھ سے بہت دور سے گزر جاتا۔ سمندر کی بیکراں وسعتوں میں سمت وغیرہ کی کسی خاص پابندی کے بغیر سفر کرنے والوں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ محض ذرا سا رُخ موڑنے کی وجہ سے وہ کسی مخصوص جگہ سے کتنے فاصلے پر رہتے ہوئے گزرتے چلے جائیں۔ تاہم میرے لئے اُمید کی کرن تو پیدا ہو سکتی تھی۔

میں ابھی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ ٹرالر کی طرف تیرنا شروع کروں یا جزیرے کی طرف...؟ دفعتاً ٹرالر کی روشنیوں نے "جھرجھری" سی لی اور تیزی سے میری طرف بڑھنے لگیں۔ شفیع شاہ نے قدرے تاخیر سے "پرنس" کے تعاقب میں روانہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا اور میری خوش قسمتی تھی کہ وہ اسی طرف کو آرہا تھا جہاں میں دھیرے دھیرے تیر رہا تھا۔

میں نے ٹرالر کی طرف تیرنا شروع کر دیا تاکہ کم سے کم وقت میں ہم ایک دوسرے کے قریب پہنچ جائیں۔ ہمارے درمیان فاصلہ تیزی سے کم ہوتا گیا۔ مجھے اس کے انجن کی آواز صاف سنائی دینے لگی تھی پھر ملگجے آسمان کے پس منظر میں مجھے ٹرالر کے ڈیک پر شفیع شاہ کا ہیولا بھی دکھائی دے گیا۔ وہ اب بھی دوربین لئے کھڑا تھا۔ اگر یہ دوربین انفراریڈ ہوتی تو اچھا تھا۔ اس صورت میں شاید کچھ اور قریب آنے کے بعد وہ تاریکی کے باوجود مجھے دیکھ لیتا۔ فاصلہ زیادہ ہونے پر تو تاریکی میں انفراریڈ دوربین بھی کارآمد نہیں رہتی تھی۔ میں ٹرالر کی ہیڈلائٹ کی سیدھ میں رہنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ عین ممکن تھا تیز رفتاری کے باعث ٹرالر مجھ پر چڑھ دوڑتا۔

میں ابھی روشنی کی رسائی سے باہر ٹرالر سے کافی دور ہی تھا کہ شفیع شاہ نے غالباً پانی میں میری موجودگی کو محسوس کر لیا۔ اچانک ہی تیز روشنی مجھ پر پڑی۔ شفیع شاہ نے سرچ لائٹ روشن کی تھی۔ میری آنکھیں چندھیا گئیں لیکن میں نے سر پانی سے اوپر ہی رکھا تاکہ شفیع شاہ مجھے پہچان لے۔

میں نے بہ آوازِ بلند اسے کچھ کہتے سُنا۔ الفاظ میری سمجھ میں نہ آسکے۔ شاید وہ کیپٹن کو کچھ ہدایات دے رہا تھا۔ ٹرالر کا انجن بند ہو گیا لیکن وہ اپنے زور میں مجھ تک پہنچ گیا اور میرے گرد نیم دائرے میں گھوم کر ہلکورے لینے لگا۔ اس کی آمد کی وجہ سے میرے اردگرد پانی میں بھونچال سا آگیا تھا جو مجھے بھی اِدھر اُدھر اُ[...] تھا۔ سرچ لائٹ میرے ساتھ ساتھ گھوم رہی تھی۔

آخر کار میں ہاتھ پاؤں مار کر ٹرالر کے قریب پہنچنے میں [...] ہو گیا۔ شفیع شاہ نے رسّی کی سیڑھی لٹکا دی اور میں ٹرالر پر چ[...] میں محسوس کر رہا تھا کہ اس وقت میرا جسم سرد تھا۔ ہوا بھی تیز اور خنک تھی۔ میں سر جھکائے کھڑا اپنے جسم سے نچڑ[...] دیکھ رہا تھا جس کا دائرہ ڈیک پر پھیلتا جا رہا تھا۔

میں نے سر اُٹھایا تو شفیع شاہ ہونٹوں پر خفیف سی مُ[...] لئے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں ا[...] اپنے آپ کو زمانہ غار کا وہ انسان محسوس کر رہا تھا جس کا [...] کمزور تھا اور وہ اپنے غار کی طرف جانے کے بجائے سمند[...] گیا تھا۔

"خدا کا شکر ہے آپ زخمی نہیں ہیں۔" شفیع شاہ گہر[...] لے کر بولا "لیکن آپ کا اس طرح سمندر میں پایا جانا میری [...] میں نہیں آیا۔"

"تم نے وہ محاورہ سُنا ہے "چمڑی اور دودو؟" میں [...] نچوڑتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں سُنا تو ہے۔" وہ ذرا حیرانی سے بولا۔

"بس کبھی کبھی چمڑی اور دودو کھانے والے کا یہی ا[...] ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں اس حال م[...] طور پر اس لئے تمہارے سامنے آیا ہوں کہ تم مجھے دیکھ [...] طرح عبرت پکڑ سکو۔"

"سر! وہ مختصر الوجود سی لڑکیاں اتنی شہ زور تو نظر [...] تھیں کہ آپ کو اٹھا کر سمندر میں پھینک سکیں۔" شفیع [...] ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ برقرار رہی۔

"آہ!" میں نے کراہ کر کہا "تمہیں ابھی تک اندازہ [...] عورت کیسے کیسے شہ زوروں کو کہاں کہاں سے اُٹھا کر کہ[...] پھینک سکتی ہے اور وہ بھی ہاتھ ہلانے کی زحمت کئے بغیر۔"

اس دوران نیچے سے ایک شخص میرے لئے بڑا سا [...] آیا۔ اسے لپیٹ کر میں نے عرشے سے اُترتے ہوئے کہا [...] چلتے ہیں۔"

وہ میرے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اُترتے ہوئے بولا "م[...] رہا تھا کہ آپ بدستور "پرنس" پر ہی ہیں۔"

"اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں۔" میں نے کہا۔

"میں آپ کی اور ان دونوں لڑکیوں کی تمام نقل و [...] نظر رکھے ہوئے تھا۔" شفیع شاہ بولا۔

"تمام نقل و حرکت پر؟" میں نے چونکتے ہوئے ا[...] کاٹ کر پوچھا۔

وہ ذرا جھینپ کر بولا "میرا مطلب ہے جب تک آ[...] تھے اس وقت تک میں نے آپ لوگوں کی نقل و حرکت [...] رکھی۔ اس کے بعد آپ تینوں نیچے چلے گئے۔ پھر مجھے پتا [...] آپ کب پانی میں اُترے۔ شاید آپ بوٹ کے دوسری طرف سے اُترے تھے۔ یا پھر آپ کو پھینکا گیا تھا؟"

"نہیں، میں نے رضاکارانہ طور پر چھلانگ لگائی تھی۔ ایک طویل ڈبکی لگا کر سر پانی سے نکالا تو وہ مجھے چھوڑ کر بھاگ چکی تھیں۔ مجھے اس وقت شرم سے ڈوب مرنا چاہئے تھا لیکن میں تیرتا ہوا تمہارے پاس آگیا۔ ڈھٹائی اسی کا نام ہے۔"

ہم نیچے کیبن میں پہنچ چکے تھے۔ شفیع میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سنجیدگی سے بولا "یہ محض چنچل امیر زادیوں کی شرارت معلوم نہیں ہوتی۔ میرا خیال ہے یہ آپ کو نہایت صفائی سے نہایت غیر متشدّدانہ انداز میں قتل کرنے کی کوشش تھی۔"

"دلوں کے بھید اللہ جانتا ہے۔" میں نے درویشانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا "بہرحال ابھی بات ختم تو نہیں ہوئی۔ جو سوال تمہارے ذہن میں اُبھرا ہے یہ میرے ذہن میں بھی ڈنک مار رہا ہے۔ اس سوال کا جواب لینے کے لئے مجھے دوبارہ ان نوجوان معزز خواتین کے پاس جانا ہے۔"

میرے یہ کہنے سے پہلے ہی ٹرالر "پرنس" کے تعاقب میں روانہ ہو چکا تھا جس کی روشنیاں جزیرے کی روشنیوں کے قریب پہنچتی دکھائی دے رہی تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد شفیع شاہ نے پوچھا "بوٹ پر خطرے والی کوئی بات تو نہیں؟"

"ان چھوٹی چھوٹی لڑکیوں سے بڑا خطرہ اس بوٹ پر کوئی نہیں ہے۔ وہ مجھے جتنا نقصان پہنچا سکتی تھیں، پہنچا چکی ہیں۔ اب ذرا جا کر ان سے دو دو باتیں کرنی ہیں۔" میں نے کہا۔

"کیا آپ جزیرے پر بھی دوبارہ جائیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"میں حالات دیکھ کر فیصلہ کروں گا۔" میں نے جواب دیا "جانا تو پڑے گا۔ جزیرے پر میری آمد کا جو مقصد تھا ابھی تو اس کے پورے ہونے کے دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آئے۔"

"اگر جزیرے پر آپ اچانک کسی خطرے میں پھنس گئے تو میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم کنارے پر رہتے ہوئے کیا کر سکیں گے؟ میرا خیال ہے ہم لوگوں کو قاسم بجلی کے مکان کے آس پاس ہی موجود رہنا چاہئے۔" شفیع شاہ پُرخیال لہجے میں بولا۔

"ویسے تو وہ مکان بھی اتنا بڑا ہے کہ دس بیس آدمی اندر قتل ہو جائیں تو باہر والوں کو کانوں کان پتا نہیں چلے گا۔" میں نے ونڈ اسکرین کے پار جزیرے کی روشنیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اندر تو جو کچھ ہوگا اس سے مجھے خود ہی نمٹنا پڑے گا اور جو بھی خطرہ درپیش ہوگا اس کا سامنا کرنا پڑے گا۔ تم لوگوں کو تو میں نے محض دل کی تسلی کے لئے بُلایا ہوا ہے کہ اگر تم بروقت کچھ نہ کر سکو اور مجھے کچھ ہو جائے تو کم از کم بعد میں تو بدلہ لے سکو اور مجھ سے جو کام ادھورا رہ جائے اسے مکمل کر سکو۔"

"اگر آپ کو کچھ ہو گیا پھر تو سب کام بے معنی ہو جائیں گے سر!" شفیع شاہ دور اندھیرے میں کسی نامعلوم چیز کو گھورتے ہوئے بولا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے میرے دوست!" میں نے ایک بازو سے اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچتے ہوئے کہا "انسان جن سے محبت کرتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ وہ لوگ دنیا میں نہ رہے تو دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے گا کائنات کی گردش تھم جائے گی اور نہ جانے کیا کچھ ہو جائے گا۔ لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں ہوتا۔ دنیا کا نظام یونہی چلتا رہتا ہے۔ کسی کے جانے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کسی گھنے جنگل سے ایک پتا ٹوٹ کر گر جانے سے جنگل کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے مرنے سے نہ جانے کیا ہو جائے گا ان میں سے بیشتر خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔"

پھر میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "تم لوگ قاسم بجلی کے مکان کے قریب آنے کی کوشش مت کرنا۔ اس کی بہت سخت نگرانی ہوتی ہے۔ تم لوگ نظر میں آجاؤ گے اور قاسم بجلی ہوشیار ہو جائے گا اگر اسے میرے بارے میں کچھ شک ہے تب بھی فی الحال میں اسے تذبذب میں ہی رکھنا چاہتا ہوں۔ ابھی تو مجھے یہ دیکھنے کا موقع ہی نہیں مل سکا کہ اس کے ہاں کون کون مقیم ہے۔"

شفیع شاہ کچھ نہ بولا۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھا۔ اب جزیرے کی روشنیاں واضح دکھائی دینے لگی تھیں اور بوٹ ہاؤس بھی صاف نظر آرہا تھا۔ "پرنس" ابھی بوٹ ہاؤس میں ہی کھڑی تھی اور اس کی بتیاں روشن تھیں۔

"ایک منٹ کے لئے انجن بند کراؤ۔ میں یہیں اُتر جاتا ہوں۔" میں نے شفیع شاہ سے کہا "باقی فاصلہ میں تیرتے ہوئے طے کروں گا۔ سمندر میں اس ٹرالر کی موجودگی کی طرف ان کا دھیان نہ ہی جائے تو بہتر ہے۔"

کیپٹن کے پاس جا کر شفیع شاہ نے اسے انجن بند کرنے کا حکم دیا۔ ٹرالر کی رفتار یکدم کم ہو گئی۔ چند لمحے بعد میں نے شفیع شاہ کو خدا حافظ کہتے ہوئے ایک بار پھر پانی میں چھلانگ لگا دی اور بوٹ ہاؤس کی طرف تیرنے لگا۔ ٹرالر نے اپنا رُخ تھوڑا سا بدل لیا۔

بوٹ ہاؤس کے قریب پہنچ کر میں نے دیکھا، بوٹ کے صرف ڈیک پر ایک بتی روشن تھی باقی بوٹ میں تقریباً تاریکی ہی نظر آرہی تھی۔ بوٹ کو وہاں پہنچے کچھ زیادہ دیر نہیں گزری تھی لیکن شاید تانیا اور ثانیا بوٹ سے اُتر کر جزیرے پر جا چکی تھیں۔ تاہم میں نے بوٹ پر جھانک لینا بہتر سمجھا۔

میں نے پوری پوری کوشش کی کہ میرے تیرنے سے شڑاپ شڑاپ کی آوازیں پیدا نہ ہوں، تقریباً بے آواز طریقے سے تیرتا ہوا میں بوٹ ہاؤس میں داخل ہوا اور بوٹ کے عقبی حصے سے کسی نہ کسی طرح اس پر چڑھ گیا۔ اس کی بغلی گلی سے گزرتا ہوا میں اس کیبن تک پہنچا جو بیڈروم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اس کیبن کی چھوٹی سی بیضوی کھڑکی میں مجھے روشنی نظر آئی۔

نہایت محتاط انداز میں اس کھڑکی سے آنکھ لگا کر میں نے اندر جھانکا تو ایک لمحے کے لئے گویا میرا دماغ گھوم گیا "ایک انار سو

بیمار" والا محاورہ تو میں نے بارہا سنا تھا لیکن اس وقت "اندر ایک انار دو بیمار" والا معاملہ تھا۔

وہی سب کچھ جو کچھ دیر پہلے مجھ پر بیت چکی تھی اب اس موٹر بوٹ کے کیپٹن پر بیت رہی تھی۔ اس کی سفید وردی جس پر کہیں کہیں گریس کے دھبے تھے' ایک طرف پڑی تھی۔ وہ چھ فٹ سے بھی نکلتے ہوئے قد کا ایک تنومند اور مضبوط نوجوان تھا۔ اس کی رنگت گہری سانولی تھی۔ اس وقت اس کا آبنوسی جسم پسینے میں بھیگا ہوا تھا۔

میں تانیا اور ثانیا کی بھوک پر حیران تھا۔ وہ واقعی خونخوار بلیاں تھیں۔ اپنے آس پاس پائی جانے والی ہر چیز چٹ کر سکتی تھیں۔ معیار اور مرتبے کا خیال کئے بغیر۔ انہیں اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ بوٹ اس وقت بوٹ ہاؤس میں ہی کھڑی تھی۔ چند قدم دور ساحل پر ان کے باپ کے غلام نما ہرکارے ٹہلتے رہتے تھے۔

یوں تو بوٹ کا کیپٹن بھی ان کا ایک معمولی کارندہ ہی تھا۔ تانیا اور ثانیا خود ہی مجھے بتا چکی تھیں کہ انہیں اسٹیٹس سے آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن اگر ان کی برق رفتاری کا یہی عالم تھا تو نہ جانے ان کے محل نما مکان کے اندر اور آس پاس بکھرے رہنے والے کارندوں میں سے کون کون ان کی لامحدود عنایات سے فیض یاب ہو چکا تھا۔

میں نے کھڑکی سے نظر ہٹالی۔ بلا ضرورت کسی کی خلوت میں جھانکتے رہنا کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ میں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور نہایت صبر و سکون سے حالات "معمول" پر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ کیبن چاروں طرف سے بند تھا اس کے باوجود خفیف سی حیوانی آوازیں باہر سنائی دے رہی تھیں۔

آخر آوازیں تھم گئیں اور گہرا سکوت چھا گیا۔ میں نے مزید کچھ دیر انتظار کیا۔ سکوت برقرار رہا۔ صرف سمندر کی لہروں کا مخصوص شور ایک ردھم کے ساتھ سنائی دے رہا تھا۔ میں گھوم کر کیبن کے دروازے تک آیا۔ میں نے یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ دروازہ مقفل تھا یا نہیں۔ میں نے اس پر ایک زوردار لات رسید کی۔ میرے لاشعور کے کسی گوشے میں جھنجلاہٹ موجود تھی۔ دروازہ فوراً کھل گیا اور میں اندر جا پہنچا۔

وہ تینوں بیڈ کے بجائے فرش پر دراز تھے۔ مصری ممیوں کی طرح سیدھے سیدھے لیٹے ہوئے تھے لیکن زندہ تھے اور حنوط شدہ نہیں تھے۔ نوجوان کیپٹن ہڑبڑا کر اٹھا اور اپنی وردی کی طرف لپکا۔ تانیا اور ثانیا نے اس قسم کی کوئی زحمت کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی۔ انہوں نے کاہلی آمیز سے انداز میں نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ وہ دونوں واقعی اعلیٰ نسل کی کوئی ایسی بلیاں نظر آرہی تھیں جو گھر کا سارا دودھ پی گئی تھیں۔

"تم نے ابھی تک اسے سمندر میں ڈبکی لگانے نہیں بھیجا؟" میں نے نوجوان کیپٹن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تانیا اور ثانیا کو مخاطب کیا۔

دونوں نے کوئی جواب نہ دیا صرف مخمور اور تھکے تھ
انداز میں ہنس کر رہ گئیں۔ دونوں کی مرمریں انگلیوں میں
دبے ہوئے تھے اور کیبن میں چکراتے ہوئے دھوئیں کی بو
تھی کہ سگریٹ چرس کے بھرے ہوئے تھے۔ ہیروئن سے
ہوتے تو میں بو سے اندازہ بھی نہ لگا پاتا۔ لڑکیاں سمجھدار
جلدی مرنا نہیں چاہتی تھیں۔

وہ مجھے دیکھ کر ذرا بھی پریشان یا تشویش زدہ دکھائی نہیں
رہی تھیں۔ انہیں گویا یاد بھی نہیں رہا تھا کہ وہ مجھے مرنے
یہاں سے میلوں دور سمندر میں چھوڑ آئی تھیں۔ وہ ایک بار
سرتاپا جائزہ لے رہی تھیں اور ان کی آنکھوں میں ایک نئ
ابھر آئی تھی۔ ان کے کبھی مطمئن نہ ہوسکنے والے قیام
ذہنوں میں شاید پھر کوئی خیال جنم لے رہا تھا۔ میں کانپ کر رہ
خدایا.... رحم!

"یہ کیا بدتمیزی ہے!" میں ایک برہم' کھردری اور گر
آواز سن کر چونکا۔

میں نے گردن ذرا موڑ کر دیکھا۔ نوجوان کیپٹن مجھ
مخاطب تھا۔ وہ کھینچ تان کر کسی نہ کسی طرح وردی الٹی سیدھی
جسم پر ٹانک چکا تھا اور خشمگیں نظروں سے مجھے گھور رہا تھا۔
یقیناً کئی پہلوؤں سے اپنے جسم کی مضبوطی اور اپنے قد کاٹھ
تھا۔

اس کے باوجود میں اس کی جرأت پر حیران ہوئے بغیر
سکا۔ آخر وہ محض ایک نجی بوٹ کا کیپٹن تھا۔ پھر مجھے احساس
اسے اپنی اوقات بھولنے کا پورا پورا حق حاصل تھا۔ جس پ

کی بلیاں آخری حد تک مہربان تھیں اس کی خودی تو بلند ہونی ہی چاہئے تھی۔

میں نے اس کا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے سرد لہجے میں کہا "وردی پہن کر کچھ معزز نظر آنے لگے ہو مگر اتنے نہیں کہ مجھے تمیز سکھانے لگو۔"

"تمہیں جرأت کیسے ہوئی بیبیوں کی اجازت کے بغیر اس وقت اس کیبن میں گھسنے کی؟" وہ چیخا۔ وہ مٹھیاں بھینچے میرے سر پر چڑھا آرہا تھا۔ شاید وہ "بیبیوں" کے سامنے اپنی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا۔ انہیں مزید بھی کچھ کر کے دکھانا چاہتا تھا۔

"جاؤ وہیل روم میں جا کر انجن کا تیل وغیرہ چیک کرو۔" میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے پیار سے کہا "مجھے تمہاری "بیبیوں" سے کچھ پرائیویٹ بات چیت کرنی ہے۔"

"پرائیویٹ کا بچہ!" اس نے کچھ اور بھڑکتے ہوئے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ دوسرے ہی لمحے میرا نہایت نپا تلا اور "بھرپور" گھونسا اس کے منہ پر پڑا۔ کیبن کشادہ تھا مگر بہرحال بوٹ کا کیبن تھا۔ زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا۔ وہ اچھل کر ایک چوبی دیوار سے جا کر ٹکرایا اور دھپ سے فرش پر گرا۔

اس کے ذرا بھی سنبھلنے سے پہلے میں نے بجلی کی سی تیزی سے بڑھ کر اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا۔ وہ بری طرح تڑپا' مچلا اپنی گردن سے میرا پاؤں ہٹانے کے لئے دہرا ہو گیا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ وہ جتنا زور لگاتا تھا اتنا ہی اس کے نرخرے پر دباؤ بڑھتا گیا۔

اس کی آنکھیں حلقوں سے نکل آئیں۔ آخر کار اس نے میری ٹانگ چھوڑ دی اور بری طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میرے خیال میں اس کے لئے اتنا ہی کافی تھا۔ شاید اسے معلوم ہو گیا تھا کہ طاقت کسے کہتے تھے۔ میں نے اس کی گردن پر دباؤ ذرا کم کر دیا کہ کہیں وہ مر ہی نہ جائے۔

اس دوران وہ دونوں مردم خور بلیاں اٹھ بیٹھی تھیں اور ازراہِ کرم انہوں نے سوئمنگ کاسٹیوم کو شرفِ قبولیت بخشتے ہوئے اپنے جسموں پر سجا لیا تھا۔ وہ اپنے بازو گھٹنوں کے گرد حمائل کئے گویا ساحل کی ریت پر بیٹھی تھیں اور ان کے سامنے کوئی مداری دلچسپ تماشا پیش کر رہا تھا۔ ان کی انگلیوں میں بدستور سگریٹ سلگ رہے تھے۔

آخر کار تانیا منمنائی "چھوڑ دو بے چارے کو.... مر جائے گا اس کی بوڑھی ماں بددعائیں دے گی۔"

"لو تو چھوڑ دیتا ہوں۔" میں نے اس کی گردن سے پاؤں ہٹاتے ہوئے کہا "لیکن تم دونوں کے ہاتھوں مارا گیا تو اس کی ہونے والی بیوی بددعائیں دے گی۔"

وہ دونوں ہم آہنگ ہو کر ہنسیں۔ میں جب کیبن میں داخل ہوا تو ان کی آنکھیں دھندلائی ہوئی اور خواب زدہ سی تھیں لیکن اب ان میں لحظہ بہ لحظہ چمک بڑھتی جارہی تھی۔

کیپٹن اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اب مضمحل نظر آرہا تھا۔ اس کی اکڑفوں نکل گئی تھی۔ میرے بارے میں اس کی غلط فہمی دور ہو گئی تھی۔ ثانیا نے ایک شانِ بے نیازی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے مخاطب کیا "اصغر! جاؤ تم وہیل روم میں جاؤ۔ عارف صاحب اب بھی ہمارے معزز مہمان ہیں۔ تمہیں ان سے جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اصغر اپنی گردن مسلتا کیبن سے رخصت ہو گیا۔ اچھا ہوا ثانیا نے میرا نام لے لیا جو درحقیقت میرا نام نہیں تھا۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ اس وقت میرا نام عارف تھا۔

دونوں بہنیں اٹھ کر میرے دائیں بائیں آن کھڑی ہوئیں۔ دونوں نے میرا ایک ایک بازو تھام لیا۔ ان کے ہاتھ بری طرح تپ رہے تھے۔ ان کے مختصر وجود میں واقعی کبھی سرد نہ ہونے والے آتش فشاں مقید تھے۔

تانیا نے مجھے بیڈ پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اس بکرے کی طرح اکڑے اکڑے سے انداز میں بیڈ کے کنارے بیٹھ گیا جو کسی بھی لمحے رسی تڑا کر بھاگ جانے کے لئے تیار تھا۔ ثانیا نشیلی سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بڑے میٹھے لہجے میں بولی "مسٹر عارف! آپ یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"اڑ کر" میں نے معصومیت سے جواب دیا "میں وہاں گہرے پانی میں ڈوب رہا تھا اور مدد کے لئے چلا رہا تھا۔ اچانک ایک پری وہاں پہنچی۔ وہ تم دونوں سے ذرا زیادہ خوب صورت تھی لیکن کافی بیک ورڈ قسم کی پری تھی۔ سر سے پاؤں تک ڈھیلے ڈھالے لبادے میں تھی اور میرے زیادہ قریب بھی نہیں آئی۔ اسے مجھ پر ترس آگیا۔ اس کے پاس جادو کی چھڑی تھی۔ اس نے چھڑی گھمائی۔ میرے دونوں کندھوں پر پر نکل آئے اور میں اڑتا ہوا یہاں آگیا۔"

"ہیئر.... ہیئر.... وہاٹ این امیزنگ اسٹوری۔" دونوں بہنوں نے تالیاں بجائیں۔ ان کے ہونٹوں پر اب بھی مخمور سی مسکراہٹ تھی۔

"یہ کہانی نہیں' آپ بیتی ہے۔" میں نے گویا برا مناتے ہوئے کہا۔

"ہمارا مطلب وہی تھا۔ ہماری گرامر ذرا کمزور ہے۔" تانیا نے گویا معذرت کی۔

ثانیا میرے کندھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مایوسی سے بولی "لیکن اس وقت تو آپ کے پر نہیں ہیں۔"

"اس بوٹ پر قدم رکھتے ہی میرے پر ٹوٹ کر سمندر میں گر گئے تھے۔ شاید اس لئے کہ اب ان کی ضرورت نہیں رہی تھی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "پری تو میرے دم بھی اگانے پر تلی ہوئی تھی لیکن میں نے اسے منع کر دیا کہ اس کی ضرورت نہیں۔ دم کے بغیر تو کام چل جاتا ہے۔"

"بے شک' بے شک" تانیا نے مدبرانہ انداز میں سرہلایا۔

ایک لمحے عجیب سی خاموشی رہی پھر ثانیا گہری سانس لے کر بولی "مسٹر عارف! مذاق تو ہوچکا اور وہ ہمیں اچھا بھی لگا۔ لیکن اب سنجیدگی سے سچ سچ بتایئے آپ یہاں تک کیسے پہنچے؟"

"ظاہر ہے تیر کر پہنچا ہوں اور کس طرح پہنچ سکتا تھا؟" میں نے گویا جل کر جواب دیا "وہاں سمندر میں تو دور دور تک کوئی کشتی وغیرہ موجود نہیں تھی۔ میں بے بسی سے اپنے آپ کو ڈوبنے کے لئے تو چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے تیرنا شروع کردیا اور آخر کار یہاں پہنچ ہی گیا۔"

وہ دونوں ایک لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہیں جیسے دل ہی دل میں میری بات کی سچائی کا اندازہ کرنے کی کوشش کررہی ہوں پھر ثانیا گہری سانس لے کر بولی "مسٹر عارف! یُو آر رئیلی آ ونڈر فل مین!"

"وہ تو میں ہوں۔" میں نے انکسار... سے کام لئے بغیر کہا "اب مجھے بھی ایک سوال کا جواب چاہئے۔"

"ضرور... ضرور" ثانیا بڑے خلوص سے بولی۔

"تم دونوں نے مجھے ڈبو کر مارنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ کیا میں تمہاری بوٹ کے اس بانگڑو قسم کے کیپٹن سے بھی گیا گزرا تھا؟" میں نے باری باری انہیں گھورتے ہوئے پوچھا۔

"ہرگز نہیں عارف ڈارلنگ!" تانیا بڑے پیار سے بولی "تم تو اصغر سے کہیں زیادہ شاندار آدمی ہو۔ تمہارا اور اس کا کیا مقابلہ؟ وہ تو صرف آڑے وقت کا سہارا ہے۔"

"اور تم پر آڑا وقت غالباً بڑی جلدی جلدی آتا رہتا ہے؟"

دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا کر کندھے اُچکا کر رہ گئیں۔ میں نے اپنے لہجے میں ذرا سرد مہری لانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میرا سوال ابھی تک جواب کا منتظر ہے۔ تم دونوں نے مجھے ہلاک کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟"

دونوں بہنوں کی آنکھیں پھیل گئیں۔ تانیا حیرت سے بولی "کیا آپ واقعی سنجیدگی سے یہ سوال کررہے ہیں؟ میں تو سمجھی آپ مذاق میں پوچھ رہے ہیں۔ ہمیں بھلا آپ کو ہلاک کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ تو ہمارے معزز اور محترم مہمان ہیں۔ خصوصاً جس وقت ہم نے آپ کو پانی میں چھوڑا اس وقت تک تو آپ ہمیں بہت عزیز ہوچکے تھے۔"

"کیا آپ اپنی عزیز ہستیوں کو ہمیشہ شارک مچھلیوں وغیرہ کے سپرد کردیا کرتی ہیں؟" میں نے ملامت سے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے مسٹر عارف! آپ کو واقعی غلط فہمی ہوئی ہے۔" اس بار ترجمانی کے فرائض ثانیا نے سنبھال لئے "ہم نے آپ کو ڈوبنے کے لئے وہاں نہیں چھوڑا تھا۔ ہمیں معلوم تھا آپ ڈوبنے والی چیز نہیں ہیں۔ ہم آپ کی مضبوطی کو آزمانا چاہتے تھے۔ دیکھنا چاہتے تھے کہ آپ تیر کر یہاں تک پہنچ سکتے ہیں یا نہیں؟ ہمیں نوّے فیصد یقین تھا کہ آپ پہنچ سکتے ہیں۔ صرف دس فیصد شک تھا۔ اب آپ پہنچ گئے ہیں تو وہ دس فیصد شک بھی دور ہوگیا ہے۔"

"تو کیا اب مجھے کوئی ایوارڈ وغیرہ ملے گا؟" میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہم دونوں کیا کسی ایوارڈ سے کم ہیں عارف صاحب؟" ثانیا نے اپنی اور تانیا کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ دونوں ایوارڈ تو میں حاصل کرچکا ہوں۔"

"بعض ایوارڈ جتنی مرتبہ بھی ملیں' کم ہوتے ہیں۔ کیا آپ ابھی اس خیال سے متفق نہیں ہوئے عارف صاحب؟" تانیا نے لقمہ دیا اور ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ان ایوارڈز کی کیا وقعت ہوسکتی ہے جن سے گھر کے نوکر بھی کھلونوں کی طرح کھیلتے پھرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

پہلی مرتبہ میں نے دونوں بہنوں کے چہروں پر ایک عجیب سا تغیر آتے دیکھا پھر ثانیا کندھے اُچکاتے ہوئے بولی "ہم دونوں بہنیں طبقاتی امتیاز کی قائل نہیں ہیں۔ دل جس پر آگیا سو آگیا۔"

"یہ دل آنا نہیں کچھ اور ہے۔"

"چلئے کچھ اور سہی۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" ثانیا بولی۔

"دراصل آپ دونوں عظمتِ کردار کی ان بلندیوں پر فائز ہوچکی ہیں کہ اب آپ کے لئے کسی بھی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "اگر آپ کے والد صاحب کو پتا چل جائے کہ آپ کی بوٹ کا کیپٹن آپ کے لطف و کرم اور عنایات سے کس حد تک مستفید ہورہا ہے تو ان کا ردِّعمل کیا ہوگا؟"

"کوئی خاص نہیں۔" تانیا بے پروائی سے بولی "وہ کہیں گے کوئی بات نہیں' بچیاں ہیں۔ یہی تو ان کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں۔ نوجوانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ کھلے باغوں میں پروان چڑھنے والے درختوں کو ہوا تو لگتی ہی ہے۔ وہ کچھ اس قسم کی باتیں کریں گے۔ پھر یہ ذکر چھیڑنے والے سے پوچھیں گے کہ اسے ان کی بیٹیوں کی ٹوہ میں رہنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ اور یقین مانئے عارف صاحب! وہ اس بات کا بہت ہی زیادہ بُرا مناتے ہیں کہ کوئی ان کی یا ان کے گھر کے کسی فرد کی ٹوہ میں رہے۔ اس جزیرے کے آس پاس پائی جانے والی بے شمار مچھلیاں ان لوگوں کے گوشت پر پلی ہیں جنہیں ٹوہ میں رہنے کی بُری بیماری لاحق تھی۔"

"بس بس" میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا "دھمکیاں دینے کی ضرورت نہیں۔ میرا ان سے اس موضوع پر بات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میرے پاس اس قسم کے بے ہودہ موضوعات پر بات کرنے کے لئے وقت نہیں ہوتا۔ میں تو یونہی اپنی معلومات میں اضافے کے لئے پوچھ رہا تھا' اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ بعض والدین ذہنی طور پر کتنی ترقی کرگئے ہیں۔ آپ کے والدِ محترم کے افکار و خیالات سے آگہی حاصل کرکے جی خوش ہوا ہے۔"

میں نے مربیانہ انداز میں سرہلایا۔ وہ دونوں کھی کھی کرنے لگیں۔

پھر ثانیا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "ویسے عارف صاحب! آپ ہیں کچھ عجیب سے آدمی! میں آپ کو دیانتداری سے بتارہی ہوں کہ آپ کے بارے میں کوئی بات میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے لیکن میں اس کی نشاندہی نہیں کرسکتی کہ وہ کیا ہے۔ کاش آپ اپنی ذات کو پوری طرح ہم پر عیاں کرسکتے! کاش ہم دونوں بہنیں آپ کو بہتر طور پر جان سکتیں۔"

"یہ ایک بہت بڑا "کاش" ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

ثانیا اپنے تراشیدہ بالوں کو خفیف سے جھٹکے سے پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولی "خیر ہمیں اس پر کوئی تشویش یا پریشانی نہیں ہے کہ ہم آپ کو پوری طرح نہیں جانتیں۔ کسی کو جانے بغیر بھی اگر انسان کا مقصد پورا ہوتا رہے تو جاننے وانے کی کوئی ایسی خاص ضرورت نہیں رہتی۔"

"بے شک بے شک۔" میں نے پُرجوش انداز میں تائید میں سرہلایا "میں محسوس کررہا ہوں کہ اگر مجھے چند دن آپ جیسی عظیم ہستیوں کی صحبت میں رہنے کا موقع ملا تو میں بہت کچھ سیکھ سکوں گا۔"

"اس میں طنز کی کوئی بات نہیں ہے عارف صاحب!" تانیا سنجیدگی سے بولی "انسان اس دنیا میں واقعی ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھتا ہے۔ اچھے بُرے سب انسانوں سے کچھ نہ کچھ سیکھتا ہے۔"

ثانیا بولی "بہرحال ایک بات طے ہے ہم خواہ ابھی تک آپ کو جان نہیں سکے لیکن مان ضرور گئے ہیں۔ آپ تیر کے یہاں تک پہنچ گئے آپ ایک غیر معمولی انسان ہیں۔ ہمیں آپ کے غیر معمولی ہونے کا اندازہ تو پہلے ہی ہوگیا تھا لیکن اب یقین ہوگیا ہے۔ اور ہم دونوں بہنیں غیر معمولی انسانوں کی زبردست قدرداں ہیں۔"

"چلیے میں نے مان لیا۔ اب پروگرام کیا ہے؟ گھر واپس چلنا ہے یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ضرور چلنا ہے۔" تانیا کچھ اور قریب کھسکتے ہوئے بولی "لیکن کیوں نہ چلنے سے پہلے....." وہ معنی خیز انداز میں کھی کھی کرنے لگی۔ ثانیا بھی کچھ اور قریب کھسکتے ہوئے اس کی ہنسی میں شریک ہوگئی۔

حیرت سے واقعی میری کھوپڑی میں جھماکے سے ہونے لگے۔ میں نے باری باری ان دونوں کو گھورتے ہوئے کہا "تم دونوں واقعی غیر انسانی مخلوق ہو۔"

"ہمیں بھی یہی لگتا ہے۔" تانیا بولی پھر اس نے کندھے اُچکائے "لیکن کیا کریں کوئی مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ اب تو کچھ نہیں ہوسکتا۔ ہمیں جیسا بننا تھا بن چکیں۔"

ان کی مرمریں بانہوں کے حلقے تنگ ہونے لگے۔ میں نے خود پر قابو رکھتے ہوئے ذرا سختی سے انہیں دھکیلتے ہوئے کہا "تمہاری بوٹ کا کیپٹن اصغر خاصا لمبا تڑنگا اور مضبوط نوجوان ہے' تم دیکھ چکی ہو اس کے لئے میرا ایک گھونسا ہی کافی ثابت ہوا تھا۔"

"بے شک..... بے چارہ اصغر۔ تم نے اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔" تانیا ترحم آمیز لہجے میں بولی۔

"اگر ویسا ہی ایک ایک گھونسا تم دونوں کے منہ پر بھی پڑگیا تو تمہارا کیا حشر ہوگا؟" میں نے ملامت سے پوچھا۔

"اوہ نو" تانیا تیزی سے بولی۔ دونوں کی آنکھیں پھیل گئی تھیں "ہمیں آپ سے اس قدر بدذوقی اور بے ہودگی کی توقع نہیں ہے۔"

"میں اس سے زیادہ بدذوق اور بے ہودہ انسان ہوں۔" میں نے کہا۔

"آخر بات کیا ہے؟ کیا بہت دیر تک سمندر میں رہنے کی وجہ سے ٹھنڈ آپ کے دماغ پر چڑھ گئی ہے؟" ثانیا نے ملائمت سے پوچھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ٹھنڈ تو ابھی کسی طرف سے میرے پاس بھی نہیں پھٹکی ہے۔ بس ویسے ہی تم دونوں کی طرف سے دل کچھ کھٹا سا ہوگیا ہے۔" یہ بات تقریباً صحیح تھی۔ دونوں بہنوں کو گویا دھچکا سا لگا۔

تانیا دھیمے لہجے میں بولی "پہلی بار اپنی طرف سے اتنی جلدی کسی کا دل کھٹا ہوتے دیکھا ہے۔"

"ثانیا پہلے ہی کہہ چکی ہے کہ میں کچھ عجیب سا آدمی ہوں۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"میرا خیال ہے ہم جو آپ کو سمندر میں چھوڑ کر بھاگ آئی تھیں۔ آپ اس بات کا کچھ زیادہ ہی بُرا منا گئے ہیں۔" تانیا بولی۔

"ممکن ہے یہ بات بھی ہو۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" میں نے مبہم لہجے میں کہا "بہرحال انسان لاشعوری طور پر سوچنے پر مجبور تو ہوتا ہے کہ ایک بار وہ پٹڑی سے اُترا تو گہرے پانیوں میں آنکھ کھلی۔ دوسری بار پٹڑی سے اُترا تو کہیں قبر میں ہی نہ آنکھ کھلے۔ منکر نکیر گرز لئے سامنے ہی کھڑے ہوں۔ میرے گناہوں کی فہرست تو ویسے ہی کافی لمبی ہے۔"

"ہم سے زیادہ لمبی شاید نہ ہو۔" ثانیا بھرا ہوا ایک نیا سگریٹ سُلگا کر دھوئیں کا مرغولا میرے منہ پہ چھوڑتے ہوئے بولی۔

میں نے ہاتھ ہلا کر دھواں اپنے چہرے کے سامنے سے اُڑاتے ہوئے کہا "عین ممکن ہے! میں گناہوں کی فہرست کی طوالت کے سلسلے میں آپ جیسی عظیم خواتین سے مقابلہ نہیں کرنا چاہتا۔"

تانیا ٹھنڈی سانس لے کر بولی "بہرحال ہمیں افسوس ہے کہ ہم نے آپ کی تیراکی کی صلاحیتیں آزمانے کے شوق میں یا یوں کہیے کہ کسی حد تک مذاق ہی مذاق میں ایک شاندار آدمی کو ہاتھ سے

گنوادیا۔"

ثانیا اسے کہنی مار کر بولی "ایسا نہ کہو۔ ایسی مایوسی کی باتیں نہ کرو۔ تم تو ابھی سے فلم کو "دی اینڈ" لگا رہی ہو۔ ابھی تو عارف صاحب ہمارے مہمان ہیں۔ ابھی نہ جانے ان کا کتنے دن کا قیام ہو۔ انسان کے خیالات بدلتے کیا دیر لگتی ہے؟ عین ممکن ہے آج رات میں ہی خیالات بدل جائیں۔ رات بڑی ظالم چیز ہوتی ہے کیوں مسٹر عارف!" اس نے نہایت معصومیت سے میری طرف دیکھا۔

میں نے اسے گھورا تو وہ آنکھ مارتے ہوئے مسکرادی پھر یکدم سنجیدہ ہو کر اٹھتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے اب واقعی چلنا چاہئے۔"

تانیا نے دیوار پر آویزاں الیکٹرانک کلاک کی طرف دیکھا "اب تک تو یقیناً ڈیڈی بھی واپس آچکے ہوں گے۔"

کچھ دیر بعد ہم تینوں قدرے معززانہ حلیوں میں کیبن سے نکلے۔ اصغر کسی اُداس ریچھ کی طرح ریلنگ کے قریب کھڑا تھا۔ اس نے خونخوار نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے قریب سے گزرتے وقت اس کا کندھا تھپک دیا "بس بس، دل میں کینہ نہیں رکھتے۔ کینہ بُری چیز ہے۔"

تانیا اور ثانیا میرے ہاتھ پکڑ کر مجھے چوبی پُل کی طرف لے گئیں۔ پُل سے گزر کر ہم بوٹ ہاؤس سے نکلے اور کنارے پر آئے۔ سیاہ مرسیڈیز وہیں کھڑی تھی جہاں ہم نے اسے چھوڑا تھا۔ ساحل پر ویرانی پھیلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا جزیرے پر رات کا آنچل پھیلتے ہی لوگ گھروں کا رُخ کرتے تھے۔ پھر میری نظر کچھ دور ایک ٹیلے پر پڑی۔ چاندنی میں مجھے اس پر ایک ہیولا نظر آیا جو گن لئے کھڑا تھا۔ وہ غالباً بوٹ ہاؤس کی نگرانی پر مامور تھا۔

مرسیڈیز میں بیٹھ کر ہم ایک بار پھر اس محل نما مکان میں واپس آئے۔ جب تانیا اور ثانیا مجھے سمندر میں چھوڑ آئی تھیں تو مجھے یہی اندیشہ محسوس ہوا تھا کہ میں دوبارہ اس گھر تک نہیں پہنچ سکوں گا لیکن اب میں اس فاصلے کے بارے میں سوچ رہا تھا تو محسوس ہو رہا تھا کہ میرا تیر کر کنارے تک پہنچنا بھی کچھ ایسا ناممکن نہیں تھا۔ اگر شفیع شاہ ٹرالر لے کر میرے قریب نہ پہنچتا تب بھی شاید میں کسی نہ کسی طرح..... لشتم پشتم جزیرے تک پہنچ ہی جاتا۔

قاسم بجلی واقعی گھر پہنچ چکا تھا گو کہ مجھے بوٹ ہاؤس میں کوئی دوسری بوٹ کھڑی دکھائی نہیں دی تھی، وہ ہمارا ہی منتظر تھا۔ غنیمت تھا کہ اس نے ہماری تلاش میں کوئی آدمی بوٹ ہاؤس تک نہیں دوڑادیا تھا۔ معلوم نہیں وہ ہمیں کس حال میں پاتا۔ شاید تانیا اور ثانیا کے معاملے میں قاسم بجلی ذرا علیحدہ قسم کے "آداب پدری" سے اچھی طرح واقف تھا۔ پھر مجھے احساس ہوا کہ اگر وہ کسی آدمی کو بھیج بھی دیتا تو وہ منہ اٹھائے یکدم تو بوٹ کے کیبن تک آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔

"بھئی تم لوگوں نے بہت دیر لگادی۔" قاسم بجلی نے پیار بھرے انداز میں شکوہ کیا "میں نے اتنی لمبی تفریح کرنے کے لئے نہیں کہا تھا۔"

"کیا کریں ڈیڈی۔ واپس آنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔" تانیا کاہلی آمیز انداز میں انگڑائی لیتے ہوئے بولی۔

"کئی دن بعد سمندر کی سیر کے لئے گئے تھے نا" ثانیا نے لقمہ لگایا "بہت ہی لطف آیا۔ مسٹر عارف تو بہت دلچسپ آدمی ہیں۔ ہم نے ان کی کمپنی کو بہت انجوائے کیا۔ کافی دنوں بعد طبیعت میں کچھ تازگی آئی ہے۔"

"تم نے تو انجوائے کیا لیکن مسٹر عارف نے بھی انجوائے کیا نہیں؟" قاسم بجلی گویا خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولا۔

"میں نے ہی تو سب سے زیادہ انجوائے کیا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "بڑا دلچسپ سفر تھا۔ حتیٰ کہ بوٹ کے کیپٹن نے بھی انجوائے کیا۔"

تانیا اور ثانیا کے چہروں پر قطعاً کوئی تغیر نہ آیا۔ قاسم بجلی سر ہلاتے ہوئے بولا "اوہ اصغر کی بات کر رہے ہو؟ بہت اچھا نوجوان ہے، سعادت مند بھی ہے۔ زندہ دل بھی ہے اور دلیر بھی۔"

"بے شک" میں نے تائید میں سر ہلایا۔ میں اس کی تینوں خصوصیات کا عملی مظاہرہ دیکھ چکا تھا۔

"تم لوگوں کے انتظار میں، میں بھی بھوکا بیٹھا ہوں۔" قاسم بجلی ڈائننگ روم کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے گرجدار آواز میں بٹلر کو کھانا لگوانے کا حکم دیا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے ملازموں نے مشینی انداز میں طویل و عریض میز کو کھانوں سے بھر دیا۔ بہترین قسم کا سی فوڈ بھی نظر آرہا تھا۔ تمام کھانوں سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ کھانے والے صرف ہم چاروں تھے جبکہ اہتمام ایک چھوٹی موٹی برات کے کھانے کا سا تھا۔

میرے کچھ پوچھے بغیر ہی قاسم بجلی گویا وضاحت کرتے ہوئے بولا "یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ میری پہلی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ میری دوسری بیوی یعنی تانیا اور ثانیا کی ماں اپنے سوتیلے بیٹوں کے ساتھ یورپ گئی ہوئی ہے۔ اس لئے آج کل گھر میں ہم تینوں کے سوا کوئی نظر نہیں آرہا۔ صرف نوکر گھر کی رونق بڑھا رہے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ قاسم بجلی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "خدا کا شکر ہے میری بیوی کے ذہن میں سوتیلے پن والی کوئی بات نہیں۔ پہلی بیوی سے میری جو اولاد ہے ان سب سے بھی میری دوسری بیوی کی خوب بنتی ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ گاڑھی چھنتی ہے۔ سب مل جل کر رہتے ہیں اور بہت خوش رہتے ہیں۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" میں نے رسماً کہا "یہ ماحول ہر ایک کو میسر نہیں ہوتا۔"

"خصوصاً جہاں دولت ہو وہاں سگے سوتیلے کے جھگڑے زیادہ ہوتے ہیں۔" قاسم بجلی بولا "لیکن میرے ہاں ایسا نہیں ہے۔ دراصل میرے ہاں لوگ دولت کو اپنے لئے مصیبت اور سزا بنا لینے کی حماقت میں مبتلا نہیں ہے۔ میرے خاندان والوں میں چھوٹا بڑا ہر فرد دولت کو انجوائے کرنے کے فن سے آگاہ ہے۔"

"بہت خوب" میں نے سر ہلایا۔ پھر سرسری سے لہجے میں کہا "یہاں کھانے کا اتنا زیادہ اہتمام ہے۔ آپ نے اپنے انیکسی والے مہمانوں کو ہی بلا لیا ہوتا۔"

"میں نے بتایا نا کہ ان کے لئے انیکسی میں ہر چیز کا الگ انتظام ہے۔ وہاں الگ کچن ہے۔ الگ ملازمین ہیں۔ وہ لوگ میرے فیملی فرینڈ نہیں ہیں۔ صرف کاروباری شناسا ہیں۔ اس لئے میں انہیں صرف وہیں تک محدود رکھنا چاہتا ہوں۔ آپ کی بات اور ہے۔ جو شخص آر ایکس تھری کے حوالے سے میرے پاس آئے وہ ایک طرح سے میرا فیملی فرینڈ ہو جاتا ہے۔" قاسم بجلی نے وضاحت سے جواب دیا۔ میرے لئے خاموش رہنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ وہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دے رہا تھا۔ اس کے مہمانوں کا دیدار زمانۂ قدیم کی کسی مشرقی دُلہن کی رونمائی سے بھی زیادہ مشکل نظر آرہا تھا۔

"خیر کوئی بات نہیں بچو!" میں نے دل ہی دل میں کہا "کب تک انہیں میری نظر سے بچاؤ گے۔ تم سمجھ رہے ہو کہ اگر تم مجھے ان سے نہیں ملاؤ گے تو میں انہیں دیکھ ہی نہیں سکوں گا؟ یہ محض تمہاری خوش فہمی ہے۔"

کھانے کے بعد کافی کا دور چل رہا تھا کہ بٹلر نے قاسم بجلی کے قریب آکر جھک کر اس کے کان میں کچھ کہا۔ اپنی دانست میں اس نے رازداری برتنے کی کوشش کی تھی لیکن میں چونکہ اس کے قریب بیٹھا تھا اور میرے کان بھی اسی کی طرف لگے ہوئے تھے اس لئے کم از کم اتنا تو سن ہی لیا "مس فرحین آئی ہیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ قاسم بجلی کے چہرے پر یکدم ہی خاصا تغیر آگیا۔ اس سے پہلے وہ خواہ مصنوعی طور پر ہی سہی، لیکن اپنے آپ کو زندہ دل اور خوش مزاج ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ اب یکدم ہی اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی چھاگئی۔ اس نے کافی کا کپ بھی فوراً ہی میز پر رکھ دیا حالانکہ اس نے ابھی دو تین چسکیاں ہی لی تھیں۔

اس نے بہ آواز بلند کم از کم اتنا اعلان تو کر ہی دیا "میری ایک مہمان آئی ہے، مجھے کئی روز سے اس کا انتظار تھا۔ مجھے اس سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ تم لوگ اطمینان سے کافی پیو۔ میں چند منٹ میں حاضر ہوا۔" وہ تیزی سے ڈائننگ روم سے روانہ ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی تانیا چبھتے ہوئے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی "آپ نے ڈیڈی کو ہمارے اور اصغر کے بارے میں نہیں بتایا۔ یہ ارمان بھی نکال لیتے۔ آپ کے دل میں ٹھنڈ پڑ جاتی۔"

"میرے دل میں ایسی کوئی آگ نہیں لگی ہوئی تھی جسے بجھانے کے لئے مجھے جل ککڑ عورتوں کی طرح تمہارے ڈیڈی سے کوئی شکایت کرنا پڑتی۔" میں نے بے پروائی سے کہا اور ان کے سراپا کی طرف اشارہ کیا "یہ وجود بھی تمہارا اپنا ہے۔ جذبات بھی تمہارے اپنے ہیں۔ مرضی بھی تمہاری اپنی ہے۔ مجھ سمیت جسے چاہو مستفید کرتی پھرو، یہ تمہارا اپنا حوصلہ ہے۔ میں اتنا گدھا نہیں ہوں کہ اس قسم کے معاملات میں دخل اندازی کرتا پھروں۔"

"پھر تم پوچھ کیوں رہے تھے کہ یہ بات اگر ہمارے ڈیڈی کو معلوم ہو جائے تو ان کا ردِعمل کیا ہوگا؟" ثانیا نے جاننا چاہا۔

"محض اپنی معلومات میں اضافے کے لئے پوچھ رہا تھا اور اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تمہارا جواب درست تھا۔ تمہاری فیملی یقیناً کافی ترقی یافتہ ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"تم نے ڈیڈی کو اشارہ دینے کی کوشش تو کی تھی۔" تانیا بولی۔

"بے شک میں نے انہیں ٹٹولنے کی کوشش کی تھی کہ بیٹیوں کی مصروفیات کے بارے میں ان کے نظریات کیا ہیں۔" میں نے تسلیم کیا "اس مبہم اشارے سے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی کافی "براڈ مائنڈڈ" ڈیڈی ہیں۔"

"تمہیں اس طرح کے ڈیڈیوں سے مل کر خوشی نہیں ہوتی؟" تانیا مسکرائی۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔" میں نے متذبذب لہجے میں کہا "میں اس قسم کے معاملات میں متضاد کیفیات کا شکار رہتا ہوں۔ شاید مجھے خوشی بھی ہوتی ہے اور شاید مجھے افسوس بھی ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے زندگی کے بارے میں ابھی تمہارا کوئی واضح نظریہ نہیں ہے۔" ثانیا نے فیصلہ کُن لہجے میں کہا۔

"شاید" میں نے مبہم لہجے میں کہا "فی الحال میں کسی واضح نظریے کے بغیر ہی زندگی گزار رہا ہوں۔ میرے خیال میں کسی بے ہودہ نظریے کے ساتھ زندگی گزارنے کی نسبت بغیر نظریے کے زندگی گزارنا بہتر ہے۔"

ثانیا کافی کا کپ رکھ کر اٹھتے ہوئے بولی "بہرحال تم نظریے کے ساتھ زندگی گزارو یا نظریے کے بغیر یہ تمہاری مرضی ہے لیکن تم تفریح کے بغیر زندگی مت گزارنا۔ یہ ہمارا مشورہ ہے۔ اور تفریح کے لئے تمہیں ہم دونوں بہنوں سے بہتر ساتھی مشکل سے ہی ملیں گے۔"

"بے شک" میں نے ان کا دل رکھنے کے لئے کہا "تم دیکھ ہی چکی ہو کہ میں کوئی زاہد خشک یا پارسا بھی نہیں ہوں۔ میں نے تم دونوں کی فیاضیاں دیکھ کر منہ نہیں پھیرا۔"

"اسی پر تو ہم حیران ہیں۔" ثانیا بولی "اس وقت تو تم ہمیں خالص اپنے مطلب کے آدمی لگے تھے۔ بعد میں کچھ کنفیوژ کرنے لگے۔ بہرحال تم اپنی شخصیت کی تمامتر پیچیدگیوں کے ساتھ بھی ہمیں قبول ہو۔ ہمارے دوست ہی رہنا، ہمارے بزرگ بننے کی

کوشش مت کرنا۔"

"بہت بہتر۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔

ثانیا، تانیا کی طرف مڑتے ہوئے بولی "میں تو ہاٹ باتھ لینے جارہی ہوں ورنہ سمندر کا نمک جسم پر کانٹا رہے گا۔"

تانیا بولی "میں ذرا کافی ختم کرلوں۔ اس کے بعد میں عارف کو اس کا کمرا دکھاؤں گی پھر مجھے بھی ہاٹ باتھ لینا ہے۔"

"اس سے پہلے میں ذرا قاسم صاحب سے ایک ضروری بات کرلوں۔" میں نے جلدی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ کوئی مجھے روکتا، میں تیزی سے ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گیا۔ کسی کے مہمان کی موجودگی میں.... خصوصاً ایک خاتون مہمان کی موجودگی میں خواہ مخواہ اور بلا اجازت ڈرائنگ روم میں جا گھسنا کوئی معقول اور مہذبانہ حرکت نہیں تھی لیکن میں یہاں مکمل طور پر معقول اور مہذّب انسان بن کر رہنے کے لئے نہیں آیا تھا۔

مجھے دیکھنا تھا کہ قاسم بجلی کے ہاں کون کون مقیم تھا، کون اس سے ملنے آرہا تھا لیکن ابھی تک میں نہ تو کسی کو دیکھ سکا تھا اور نہ ہی کچھ معلوم کرسکا تھا۔ مس فرحین نامی اس نامعلوم لڑکی کی آمد کی اطلاع بٹلر نے قاسم بجلی کو خاصے رازدارانہ انداز میں دی تھی حالانکہ بظاہر اس کی کوئی خاص ضرورت نظر نہیں آرہی تھی۔ مجھے اس کا انداز مشکوک لگا تھا۔ ممکن تھا اس خاتون کو دیکھنے سے میری معلومات میں کچھ اضافہ ہوتا۔ اگر اس وقت بٹلر میرے سر پر سوار ہوتا تو یقیناً مجھے روکنے کی کوشش کرتا لیکن اس کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میں سیدھا ڈرائنگ روم میں جا گھسا۔

"معاف کیجئے گا قاسم صاحب۔" میں نے گویا اپنی دُھن میں کہا "مجھے آپ سے ایک بات پوچھنا تھی۔"

وہ اس وقت ایک خوب صورت خاتون کے عین قریب صوفے میں دھنسا ہوا تھا۔ وہ دونوں تقریباً سر جوڑے شاید کسی اہم مسئلے پر تبادلۂ خیال کررہے تھے۔ میری اچانک آمد پر یکدم گڑبڑا کر رہ گئے۔

مجھے گویا یکدم احساس سا ہوا کہ میں غلط وقت پر آیا تھا اور یہ میری ایک ناشائستہ حرکت تھی۔ میں نے اپنے چہرے پر خجالت کے آثار پیدا کرنے کی پوری پوری کوشش کی اور واپسی کے لئے مڑتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا کہ آپ اپنی مہمان سے ملنے کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ میں آپ سے بعد میں بات کرلوں گا۔"

قاسم بجلی کے چہرے پر صرف ایک لمحے کے لئے ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔ خلافِ توقع وہ دوسرے ہی لمحے مسکرا دیا اور خوشگوار لہجے میں بولا "اتنا شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں عارف صاحب! آپ تو اس طرح واپس بھاگے جارہے ہیں جیسے آپ نے ہمیں قابلِ اعتراض حالت میں دیکھ لیا ہو۔ ہم تو گفتگو بھی قابلِ اعتراض نہیں کررہے ہیں۔ ہمیں تو بہت مختصر اور شریفانہ سی بات چیت کرنا تھی جو ختم ہوچکی ہے۔ اب آپ اطمینان سے ہما[رے] پاس تشریف رکھ سکتے ہیں۔"

میں بظاہر قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ رُک گیا۔ اس [وقت] تک میں اس عورت کا مکمل جائزہ لے چکا تھا۔ وہ تیس سے ا[وپر] ایک سرو قد، خوب صورت اور سرخ و سپید عورت تھی۔ پاکس[تانی] معلوم ہوتی تھی لیکن اس کا لباس مغربی تھا۔ وہ گہرے نیلے [رنگ] کے جھلمل جھلمل کرتے اسکرٹ میں تھی۔ میک اَپ او[ر ہیئر] اسٹائل نہایت عمدہ تھا۔ اس پر کسی اعلیٰ درجے کے اور ذرا ج[ھوٹے قد] کے ماڈل کا گمان گزرتا تھا۔

عجیب بات یہ تھی کہ مجھے اس کی صورت شناسا لگ رہ[ی تھی] لیکن یاد نہیں آرہا تھا میں کب اور کہاں اس سے ملا تھا۔ مجھے [اپنی] یادداشت پر بڑا ناز تھا، میرے لئے یہ بڑے شرم کی بات تھی [کہ میں] کوئی بات بھول جاتا..... اور اگر میں اتنی خوب صورت لڑک[ی سے] مل کر بھول گیا تھا تو یہ میرے لئے اور بھی زیادہ شرم کی بات [تھی۔] صرف شرم کی بات ہی نہیں، بدذوقی کی بھی انتہا تھی۔

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ وہ بھی بغور میری [طرف] دیکھ رہی تھی گویا میرے بدلے ہوئے حلیے میں شناسائی کے [آثار] تلاش کررہی ہو۔ قاسم بجلی کی بات گویا اس نے سُنی ہی نہیں [تھی۔] تاہم قاسم بجلی کے اندازِ گفتگو سے مجھے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ [اس] سے اس کی کتنی بے تکلفی تھی۔

قاسم بجلی خوش دلی سے بولا "ایسا لگتا ہے تم دونوں [کے] درمیان کوئی "تیرِ نظر" قسم کی چیز چل گئی ہے۔"

میں نے یہ کہنا بہتر نہیں سمجھا کہ مجھے اس کی مہمان کی ص[ورت] کچھ شناسا لگ رہی تھی۔ لڑکی نے بھی ایسی کوئی بات نہیں کی۔ [قاسم] بجلی کے ریمارکس کا گویا اس پر قطعاً کوئی اثر نہیں ہورہا تھا یا [وہ] سُنی اَن سُنی کررہی تھی۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "ایک [خوب] صورت خاتون کا اتنا تو حق بنتا ہے کہ اسے کم از کم چند سیکنڈ [غور] سے دیکھا جائے۔"

لڑکی کے یاقوتی ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ نمودار ہوئی ا[ور وہ] کھنکتی سی آواز میں بولی "تعریف کا شکریہ۔"

اس سے مجھے یہ تو معلوم ہوگیا کہ وہ اُردو بولتی اور سمجھتی [تھی۔] غالباً پاکستانی ہی تھی۔ قاسم بجلی مجھے قریب آنے کا اشارہ [کرتے] ہوئے بولا "آیئے میں اپنی مہمان سے آپ کا تعارف کراؤں۔ آپ جی بھر کے ان کے حُسن کی تعریف کیجئے گا۔ مجھ سمیت ال[تعداد] حُسن کے قدرداں نہ جانے کہاں کہاں پھیلے ہوئے ہیں۔"

میں قریب چلا گیا۔ قاسم بجلی بولا "یہ مس فرحین ہیں۔"

اس نے پورا نام نہیں بتایا اور ایک لمحے توقف کیا گویا [میرے] تجسس سے لطف اندوز ہورہا ہو۔ اس لمحے مجھے یہ احساس ہو[ا کہ یہ] نام بھی میرے لئے شناسا تھا لیکن یاد اب بھی نہ آسکا کہ ا[سے] پہلے کہاں سنا تھا، کس سلسلے میں سنا تھا۔ فرحین اب بھی [پلکیں] جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کا چہرہ تقریباً سپاٹ ہی تھا۔

قاسم بجلی بولا "بجلی میرے نام کے ساتھ لگا ہوا ہے لیکن بجلی کہلانے کی اصل مستحق مس فرحین ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ یہ اپنے حُسن کی بجلیاں صرف امریکا میں گراتی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" میں نے خاصی دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"یہ امریکا کے بعض شہروں میں فلور شو پیش کرتی ہیں۔ اور ایسا پیش کرتی ہیں کہ امریکی بھی مُرغِ بسمل کی طرح لوٹنے لگتے ہیں۔" قاسم بجلی نے ٹھنڈی سانس لی۔

میرے دل کے کسی گوشے میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ کیا اب ہمارے ہاں ایسی باتوں پر فخر محسوس کرنے والے لوگ بھی واقعی پائے جانے لگے تھے؟ تاہم میں نے کسی جذباتی ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا۔

قاسم بجلی نے مسکراتے ہوئے بات جاری رکھی "مس فرحین وہاں صرف مس ایکس کے نام سے جانی جاتی ہیں۔"

"مناسب نام ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ایکس ٹائپ کاموں کے لئے "مس ایکس" نام بالکل ٹھیک ہے۔ اس سے امریکیوں کو یہ پتا نہیں چلتا ہوگا کہ آپ پاکستانی ہیں۔"

میں براہِ راست فرحین سے مخاطب ہوا تھا لیکن جواب قاسم نے دیا "انہیں تو سب سے زیادہ پتا ہے کہ مس ایکس پاکستانی ہے۔ یہی تو اس کی وجۂ شہرت ہے۔ ایک "مشرقی لڑکی" ہونے کی وجہ سے وہ اس کی ذات میں زیادہ کشش محسوس کرتے ہیں۔ انہیں یقین نہیں آتا کہ ایک مشرقی لڑکی وہ سب کچھ کرسکتی ہے جو فرحین کرتی ہے۔"

"واہ! پھر تو آپ وطن کا خوب نام روشن کررہی ہیں۔" میں نے ایک بار پھر براہِ راست فرحین کو مخاطب کیا اور کوشش کی کہ میرے لہجے میں طنز کا زہر زیادہ نہ شامل ہونے پائے۔

وہ میرے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے بیزاری سے بولی "عارف صاحب! خدا کے لئے اب مجھے نصیحتیں کرنے مت بیٹھ جایئے گا....."

"ہرگز نہیں۔ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے خلوص سے کہا "میں زندگی میں کم از کم یہ تجربہ تو حاصل کرہی چکا ہوں کہ نصیحت سے سب سے زیادہ وہی چڑتا ہے جسے نصیحت کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں نصیحت نہیں کرتا۔ کبھی کبھار صرف اپنے محسوسات کا تھوڑا بہت اظہار کرجاتا ہوں۔"

"عارف صاحب!" فرحین ایک ٹک میری طرف دیکھتے ہوئے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہر کردار کے پیچھے ایک کہانی ہوتی ہے۔ میرے پیچھے بھی ایک طویل کہانی ہے۔ جس میں اس سوال کا جواب موجود ہے کہ میں فلور شو.... یا اس کے علاوہ بھی جو کچھ کرتی ہوں وہ کیوں کرتی ہوں لیکن میں آپ کو وہ کہانی سنا کر بور نہیں کروں گی۔ یہ تو خیر ہماری پہلی ملاقات ہے۔ اگر دسویں بیسویں ملاقات بھی ہوتی تب بھی میں آپ کو وہ کہانی سنانے کی کوشش نہ کرتی۔ اب میں کہانی سنانے یا اپنے آپ کو جسٹی فائڈ ثابت کرنے کی منزل سے بھی گزر چکی ہوں۔"

"بہت خوب" میں نے بزرگانہ انداز میں سرہلایا۔

"لیکن میں آپ کو ایک دلچسپ بات بتانا چاہتی ہوں۔ میرے شو میں اکثر اب بھی امریکیوں سے زیادہ تعداد پاکستانیوں کی ہوتی ہے جن میں سے بیشتر نشے میں ہوتے ہیں۔ وہ پہلے نہایت دلچسپی، انہماک اور جوش و خروش سے میرا شو دیکھتے ہیں۔ پھر مجھے ڈیٹ پر چلنے کی دعوت دیتے ہیں اور جب میں شکریے کے ساتھ انکار کردیتی ہوں تو پھر مجھے نصیحت کرتے ہیں کہ جو کچھ میں کرتی ہوں وہ بہت بُرا ہے.... اور مجھے ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان لوگوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"بس یہی کہ وہ بے چارے بھی میری طرح کمزور قوتِ ارادی کے مالک اور خواہشوں کے غلام ہوں گے۔ اچھا بننے کو ان کا جی چاہتا ہوگا لیکن اچھا بننا ان کے بس کی بات نہیں ہوگی۔" میں نے جواب دیا۔

"آپ اگر اتنے اطمینان سے اعتراف کررہے ہیں کہ آپ کمزور قوتِ ارادی کے مالک اور خواہشوں کے غلام ہیں تو شاید حقیقت میں آپ ایسے نہ ہوں۔ آپ شاید ازراہِ انکسار، ایسا کہہ رہے ہوں لیکن میں جن لوگوں کا ذکر کررہی ہوں وہ آپ سے بدتر ہوتے ہیں۔ وہ صرف منافق ہوتے ہیں۔"

میں خاموش رہا تو فرحین گہری سانس لے کر بولی "میں تو جو ہوں سو ہوں۔ بہت گناہ گار ہوں۔ ناقابلِ اصلاح ہوں لیکن جو لوگ میرا شو دیکھنے آتے ہیں کیا ان کے لئے کوئی نصیحت نہیں؟"

"یقیناً ہوگی لیکن مسئلہ وہی ہوگا کہ انہیں بھی نصیحت سے نفرت ہوگی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

قاسم بجلی اس دوران سگار سُلگانے میں مصروف تھا۔ ایک طویل کش لے کر وہ بولا "بھئی یہ تم دونوں نے کیا بکواس شروع کردی۔ میرے گھر میں اس قسم کی بے ہودہ گفتگو کرنا منع ہے۔"

میں اور فرحین ہنس دیئے۔ فرحین بولی "آپ کو جس گفتگو سے دلچسپی تھی وہ تو ہوچکی۔"

قاسم بجلی مجھ سے مخاطب ہوا "میں تمہیں ایک اہم بات بتانے لگا تھا۔ تم نے بیچ میں اپنا فلسفیانہ اور صوفیانہ مذاکرہ شروع کردیا۔"

میں حیران تھا کہ ہمارے ہاں بعض لوگ عیش و نشاط، دولت اور بدمعاشی کے علاوہ کسی موضوع پر بات کرنے اور سوچنے تک کے روادار نہیں تھے۔ تاہم میں نے ملائمت سے کہا "مجھے افسوس

ہے کہ میں نے وہ اہم بات سننے میں تاخیر کی۔"

"وہ اہم بات یہ ہے کہ مس ایکس کچھ عرصے سے امریکا کے بجائے پاکستان میں بجلیاں گرا رہی ہیں۔" قاسم بجلی نے مسرور لہجے میں بتایا "ظاہر ہے انہیں یہاں اتنے وولٹ کی بجلیاں گرانے کی تو اجازت نہیں جتنے وولٹ کی یہ امریکا میں گراتی تھیں پھر بھی میں نے اپنا خصوصی اثرورسوخ استعمال کرتے ہوئے انہیں کافی آزادی دلوادی ہے۔"

"آزادی مبارک مس ایکس!" میں نے فرحین کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی سنجیدگی برقرار رہی۔

قاسم بجلی گویا اپنی دُھن میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "کراچی میں ایک تھری اسٹار ہوٹل ہوا کرتا تھا۔ شاید تمہیں اس کے بارے میں معلومات ہوں۔"

اس نے تھری اسٹار ہوٹل کا نام بتایا۔ مجھے اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات تھیں۔ اس کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ کسی زمانے میں اس کی حیثیت ہوٹل سے زیادہ ایک نائٹ کلب کی تھی پھر وقت اور حکومتوں کی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس پر زوال آگیا۔ پالیسیاں بدلیں تو اسے بھی اپنے انداز واطوار بدلنا پڑے۔ کسی نہ کسی طرح چلتا رہا۔ اسی دوران شہر میں کئی فور اسٹار اور فائیو اسٹار ہوٹلوں کا اضافہ ہوگیا۔ وہ ہوٹل بالکل ہی بیٹھ گیا تھا۔ اس کے بارے میں آخری خبر میں نے یہی سنی تھی کہ اس کے مالکان اس کے کمروں وغیرہ کو دفاتر اور شوروَمز میں تبدیل کرکے ماہانہ کرائے کی بنیاد پر اٹھانے کا پروگرام بنا رہے تھے۔

قاسم بجلی بات جاری رکھتے ہوئے بولا "مس ایکس آج کل اسی ہوٹل میں اپنا شو پیش کررہی ہیں اور اس ہوٹل کو ایک نئی زندگی مل گئی ہے۔ وہ بالکل ڈوب چکا تھا لیکن اب سب سے اوپر جگمگا رہا ہے۔ تھری اسٹار ہوکر بھی اس نے آمدنی میں فائیو اسٹارز کو پیچھے چھوڑا ہوا ہے۔ حالانکہ فی الحال تو ہم احتیاطاً مس ایکس کے شو کی پبلسٹی قطعاً نہیں کررہے۔ ماؤتھ پبلسٹی پر ہی یہ حال ہے کہ ٹکٹ بلیک ہورہے ہیں۔ ہوٹل میں قیام کرنے والوں کو بھی چونکہ کچھ خصوصی فوائد حاصل ہوتے ہیں اس لئے کمرے بھی بھرے رہتے ہیں اور مزید خواہش مندوں کی ایک لمبی ویٹنگ لسٹ ہروقت موجود رہتی ہے۔"

یہ سب کچھ بتاتے ہوئے قاسم بجلی کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔ میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا "ان سب باتوں پر آپ کیوں اتنے خوش نظر آرہے ہیں؟"

"میں اس لئے خوش ہوں کہ وہ ہوٹل دراصل میں نے خرید لیا ہے۔" اس نے وجہ بتادی "اسے فلاپ حالت میں خرید کر دوبارہ کامیاب میں نے ہی بنایا ہے۔ اس مقصد کے لئے میں نے خاص طور پر مس ایکس کو امریکا سے بلایا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نے اپنی آمد کا مقصد پورا کردیا۔" اس نے بڑی اپنائیت سے فرحین کا کندھا تھپتھپایا۔ فرحین کے چہرے پر ایک لمحے کے لئے خفیف تکلیف کے آثار نمودار ہوئے مگر قاسم نہیں دیکھ سکا۔

"اوہ... بڑا سسپنس پیدا کرنے کے بعد آپ نے یہ خبر سنا بہرحال... کامیابی مبارک ہو۔" میں نے مصنوعی خوشی کا ا کیا۔

"یہ میرا پہلا تجربہ نہیں ہے۔" قاسم نے ذرا ترنگ میں آکر "ڈوبے ہوئے اور تباہ شدہ پراجیکٹس کو خرید کر انہیں نئی زندگی میرا محبوب مشغلہ ہے۔"

"بہت اچھا اور تعمیری مشغلہ ہے۔ دراصل آپ کے پا اس کے لئے بہت سے وسائل اور بہت سی کارگر ترکیبیں موجود ہیں۔" میں نے سرہلایا "خصوصاً ایسی حسین ترکیبیں تو ہی کارگر رہتی ہیں۔" میں نے فرحین کی طرف اشارہ کیا۔

قاسم بجلی بولا "وہ جو مقولہ ہے نا... محبت اور جنگ میں جائز ہے۔ میں نے اس میں تھوڑا سا اضافہ کرلیا ہے کہ محبت، ج اور بزنس میں سب جائز ہے کیونکہ بزنس بھی میرے خیال میں طرح کی جنگ ہی ہے۔ یا پھر شاید ہر بزنس مین کا بزنس ہی اس محبت ہوتا ہے۔"

میں تو اس مقولے سے ہی متفق نہیں تھا کہ جنگ اور م میں سب کچھ جائز ہے۔ دنیا کے کسی بھی کام میں سب کچھ جائز ہو سکتا۔ ہونا بھی نہیں چاہئے۔ لیکن کیا کیا جائے... کچھ محاو اور مقولے لوگوں نے اپنی ضرورت اور فطرت کے تحت بھی ای کرلئے ہوں گے۔ اس کے علاوہ کچھ لوگ عورتوں کی دلالی کو "بزنس" سمجھتے تھے۔

میں خاموش رہا۔ فرحین اٹھتے ہوئے بولی "قاسم صاحب! اب چلتی ہوں۔" اس نے قاسم سے ہاتھ ملایا پھر میری طرف ہا بڑھاتے ہوئے بولی "آپ سے شاید پھر کبھی ملاقات ہو۔" وہ خو صورت ضرور تھی مگر اس کا ہاتھ برف کی طرح سرد تھا۔

قاسم اٹھتے ہوئے بولا "کیوں نہیں، کیوں نہیں۔ اگر عارف صاحب پاکستان میں رہے تو تمہارا شو ضرور دیکھنے آئیں گے۔"

"مجھے بڑی خوشی ہوگی۔" فرحین مسکرائی۔

قاسم میری طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ سے لہجے میں بو "میں ذرا فرحین کو گاڑی تک چھوڑ آؤں۔ اسے شہر واپس جا ہے۔"

میں سرہلا کر دوسرے دروازے سے ڈائننگ روم کی طرف بڑھا۔ اس دروازے سے ذرا آگے ہی مجھے تانیا کھڑی ملی۔ وہ کا آمیز سے انداز میں انگڑائی لیتے ہوئے نیم وا آنکھوں سے میر طرف دیکھ کر بولی "لڑکی ذرا بڑی عمر کی ہے لیکن خوب صورت ہے۔ شاید اسی لئے تم وہاں کمبل ہوکر رہ گئے تھے۔"

"میں بھلا کمبل کیسے ہوسکتا تھا۔ وہاں جناب لحاف یعنی تمہارے والد صاحب تشریف رکھتے تھے۔" میں نے اپنے لہجے میں

مایوسی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
تانیا غالباً میرے پیچھے پیچھے آکر ڈرائنگ روم میں جھانک چکی تھی اور شاید ہماری گفتگو بھی سنتی رہی تھی۔

"تم بڑے خبیث ہو۔" تانیا نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی "بہرحال ہمارے مہمان ہو۔ آؤ میں تمہیں تمہارا کمرا دکھادوں۔"

میں نے سعادت مندی سے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا "کیا یہ خوب صورت لڑکی اکثر تمہارے ڈیڈی سے ملنے آتی رہتی ہے؟"

"معلوم نہیں۔" وہ عدم دلچسپی سے بولی "ڈیڈی سے اس قبیل کی بہت سی لڑکیاں ملنے آتی اور جاتی رہتی ہیں۔"

"تمہارے ڈیڈی کو اچھی طرح معلوم ہے کہ کس طرح کے لوگوں سے میل ملاقات رکھنے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل ہوتے ہیں۔"

"تم ڈیڈی کے معاملات کو ڈیڈی کے ساتھ رہنے دو۔" وہ میرا بازو تھامتے ہوئے بولی "اور جب تک اس گھر میں ہو کم از کم تب تک تو صرف میرے اور ثانیا کے بارے میں سوچا کرو۔ اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ ویسے بھی مہمان پر میزبانوں کے کچھ حقوق ہوتے ہیں۔" وہ سیڑھیوں کی طرف بڑھتے ہوئے مسکرائی۔

"تمہیں اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں کہ میں اس لڑکی پر عاشق ہوگیا ہوں۔ میں تو صرف اس لئے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کررہا تھا کہ اس کی صورت مجھے کچھ شناسا سی لگی تھی لیکن مجھے یاد نہیں آرہا تھا میں نے اسے کب اور کہاں دیکھا تھا۔ حالانکہ میری یادداشت بہت اچھی ہے۔"

"اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ تمہیں اس کی صورت کچھ شناسا لگ رہی تھی لیکن شاید تم نے محض راہ چلتے ہی اسے دیکھا ہو اس لئے صحیح طور پر یاد نہ آرہا ہو۔ اگر تم نے ذرا بھی ایڈونچرس قسم کی زندگی گزاری ہے' دوسرے ملکوں میں بھی گھومنے پھرنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے اور میرے ڈیڈی جیسے دولت مندوں میں اُٹھنے بیٹھنے کے مواقع بھی ملتے رہے ہیں تو پھر اس قسم کی لڑکیوں سے نہ جانے کہاں کہاں تمہارا سامنا ہوتا رہا ہو۔ دنیا کے بڑے بڑے ہوٹلوں میں.... بڑے بڑے آدمیوں کے بنگلوں پر.... کسی کیسینو میں' کسی ساحل پر.... کسی فلائٹ پر.... غرضیکہ کسی بھی ایسی جگہ پر جہاں غریب غربا کا گزر نہیں ہوتا۔"

"اوہ!" میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔

وہ اوپر کی منزل پر پہنچ کر ایک کمرے کا دروازہ کھولتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے تم اس بیڈ روم میں ڈیرا ڈال لو۔" اس نے لائٹ آن کردی۔

وہ ایک طویل و عریض' آراستہ و پیراستہ اور پُرتعیش بیڈ روم تھا۔ تانیا ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "وارڈروب میں تمہیں ضرورت کے کچھ کپڑے.... سلیپنگ سُوٹ وغیرہ مل جائیں گے۔ جو مناسب نظر آئیں اور تمہیں فٹ آجائیں استعمال کرڈالنا۔"

پھر وہ ایک طویل سانس لے کر بولی "تمام کمروں میں انٹرکام بھی موجود ہے۔ میرا کمرا عین اس کمرے کے نیچے واقع ہے اور اس کے برابر میں ہی ثانیا کا کمرا ہے۔ ڈیڈی کی طرف سے کرا... کسی مہمان کو کمرا دینے کی اجازت نہیں ہے ورنہ ہم تمہیں اپنا پڑوسی بنانے میں زیادہ خوشی محسوس کرتیں۔ اب بھی کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ انٹرکام پر میرے کمرے کا نمبر سات اور ثانیا کے کمرے کا آٹھ ہے۔ یاد رہے گا نا؟" وہ...

"ایسے نمبروں کو بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

"اور لکی ایٹ بھی۔" اس نے گویا یاد دلایا۔ وہ دونوں کسی بھی معاملے میں شاید ایک دوسرے کے بغیر خود کو ادھورا محسوس کرتی تھیں۔

"یقیناً.... یقیناً لکی ایٹ بھی۔" میں نے سرہلایا۔

"شب بخیر۔" اس نے بوجھل آواز میں کہا اور ... شب بخیر کا ایک نقش ثبت کرکے رخصت ہوگئی۔ میں دروازہ بند کرتے ہوئے سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ ان دونوں بہنوں کے ہوتے ہوئے شب کا بخیر گزارنا کتنا صبر آزما کام تھا۔ ان کی موجودگی میں کسی کے لئے یہ یاد رکھنا بڑا مشکل ہوتا کہ وہ یہاں کس مشن پر ہے۔ کمرے میں منتقل ہوتے ہی سب سے پہلے باتھ روم میں ہاٹ باتھ لیا' کپڑے بدلے اور آکر بیڈ پر ڈھیر ہوگیا۔ ... سے میری آنکھیں بند ہوئی جارہی تھیں لیکن سونے سے پہلے میں نے سائڈ ٹیبل پر رکھے ہوئے الیکٹرانک کلاک میں تین بجے کا الارم لگادیا۔ مجھے امید تھی کہ تین گھنٹے بعد قاسم بجلی کے گھر میں مسلح محافظوں کے سوا سب سوچکے ہوں گے۔ میں "سب جگ سوئے ہم جاگیں" جیسی کچھ کوشش کرنا چاہتا تھا مگر مجھے تاروں سے نہیں' کچھ جیتے جاگتے کرداروں سے باتیں کرنا تھیں بشرطیکہ میں ان تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا۔ الارم لگانے کے بعد میں گھوڑے بیچ کرسوگیا۔ وہ گھوڑے جو میرے پاس تھے!

عام حالات میں شاید اتنی تھکن اور گہری نیند میں مجھے الارم بھی نہ جگاپاتا لیکن میں چونکہ ذہن میں ایک خلش لے کر سویا تھا اس لئے دھیمی اور مترنم آواز والے اس الارم پر ... سب سے پہلے میں نے نائٹ بلب کی مدھم روشنی میں ... اطمینان محسوس کیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ کوئی بھی ... استعمال کرکے میرے کمرے میں نہیں گھسا تھا۔ میرے ... بھی بندھے ہوئے نہیں تھے اور میں بالکل بہ خیروعافیت تھا۔ میں نے دبے قدموں دروازے تک جاکر بے

... دروازہ کھول کر باہر راہداری میں جھانکا۔ چھت کی فینسی لائٹ ... راہداری میں مدھم سی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ دائیں بائیں' ... دونوں طرف کوئی موجود نہیں تھا۔ میں نے دروازہ بند کردیا اور ... دوسری طرف جاکر کھڑکی ذرا سی کھول کر عقبی ٹیرس پر جھانکا۔ ادھر ... کوئی نہیں تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ کوئی ... کمرے میں نہیں تھا۔

تب میں نے اطمینان سے بیڈ پر بیٹھ کر اپنے موبائل فون پر ... شفیع شاہ کا نمبر پنچ کیا۔ میں دل ہی دل میں دعا کررہا تھا کہ موبائل ... جتنے فاصلے تک کارآمد تھا وہ اسی دائرے میں کہیں موجود ہو۔ ... پہلے ہی کراچی کے مرکز سے کافی دور تھے۔ اس وقت ایک لمحے ... کے لئے مجھے انٹرکام پر سات اور آٹھ نمبر دبانے کا بھی خیال آیا ... لیکن میں نے بہ مشکل خود کو باز رکھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ مجھے ... کتنی مہلت میسر تھی۔ میں خرافات میں وقت ضایع کرنے کا متحمل ... نہیں ہوسکتا تھا۔ گو کہ خرافات میں کشش بہت تھی۔ تانیا اور ثانیا ... نے صحیح کہا تھا۔ رات' تنہائی اور سناٹا بہت ظالم چیزیں تھیں لیکن ... میں اپنے آپ کو یہ سمجھانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ مجھے جو کام ... درپیش تھا وہ لمحاتی خواہشوں سے کہیں زیادہ اہم تھا۔

چند سیکنڈ بعد نمبر مل گیا اور شفیع شاہ کی دھیمی آواز سنائی دی ... "ہیلو؟"

"میں بول رہا ہوں۔" میں نے نام بتائے بغیر تقریباً سرگوشی کے انداز میں کہا۔

"یس سر؟" شفیع کے لہجے میں مستعدی آگئی۔

میں زبانی اسے قاسم بجلی کے گھر کا نقشہ جتنے بہتر طور پر سمجھا سکتا تھا' سمجھانے لگا پھر میں نے اسے بتایا "میں اب انیکسی میں جارہا ہوں' دیکھنے کی کوشش کروں گا کہ وہاں کون کون مقیم ہے۔ تم اس دوران ٹرالر جزیرے کے قریب ہی لے آؤ۔ سمندر ہی میں رہتے ہوئے تم جس حد تک اس مکان پر نظر رکھ سکو' رکھنا۔ اگر تمہیں کسی قسم کی گڑبڑ محسوس ہو تو تم مکان میں گھسنے کی کوشش بھی کرسکتے ہو لیکن اکیلے نہ گھسنا اور بہت ہوشیار رہنا۔ یہاں کئی مسلح گارڈ اصل عمارت کے چاروں طرف گشت کرتے رہتے ہیں۔"

شفیع شاہ دھیرے سے ہنسا۔ کچھ بولا نہیں۔

"مجھے معلوم ہے تم لوگ مسلح آدمیوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن میں تمہیں محتاط رہنے کی نصیحت کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس باپ کی طرح جسے معلوم ہے کہ اس کی اولاد جوان ہوچکی ہے اور اپنا بُرا بھلا خوب سمجھتی ہے لیکن وہ انہیں سنبھل کر چلنے کی تاکید کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"ہمیں اب بھی نصیحتوں کو سننا بھلا لگتا ہے سر! ہم بھی آپ کے بچے ہی ہیں۔ غلطی سے عمر میں تقریباً آپ کے برابر آگئے...." شفیع شاہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

"اس وقت تم کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ہم نے انجن بند کررکھا تھا اور لہریں دھیرے دھیرے ہمیں کیماڑی کی طرف لے جارہی تھیں لیکن آپ سے بات کرتے ہوئے میں نے آپ کی ہدایت ملتے ہی کیپٹن کو اشارہ کردیا تھا۔ انجن اسٹارٹ ہوچکا ہے اور ہم جزیرے کی طرف روانہ ہوچکے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"ٹھیک ہے۔ میں پانچ منٹ بعد اپنے کمرے سے نکلوں گا۔"

"بیسٹ آف لک" شفیع شاہ بولا اور میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

کچھ دیر تک میں بستر پر ہی بیٹھا سکوتِ شب کی سرگوشیاں سنتا رہا۔ اس دوران میری نظر انٹرکام پر جمی رہی۔ میں نے تو سات اور آٹھ نمبر کا بٹن نہیں دبایا تھا لیکن مجھے اندیشہ تھا کہیں میرے کمرے میں بزر نہ بج اٹھے لیکن ایسا نہیں ہوا۔ شاید تانیا اور ثانیا تھک ہار کرسوچکی تھیں۔

چند منٹ بعد میں دبے قدموں کمرے سے نکلا۔ سیڑھیوں کی طرف جانے کے بجائے میں کمرے کے گرد گھوم کر پچھلی طرف آگیا۔ سیڑھیوں سے نیچے جانے کی صورت میں محافظوں سے یا کسی اور سے سامنا ہونے کا زیادہ امکان تھا۔ میں جس طرف آیا تھا ادھر سے ایک فرنچ ڈور ٹیرس پر کھلتا تھا۔

اس دروازے کے راستے میں ٹیرس پر آیا اور نہایت محتاط انداز میں' میں نے ملگجے اندھیرے میں نیچے جھانک کر دیکھا۔ دیگر خالی جگہوں کے علاوہ اس عظیم الشان مکان میں چاروں طرف ایک کشادہ گلی سی موجود تھی جس کا فرش ماربل کا تھا۔ اس فرش پر کچھ ہی دور بے آواز قدموں سے ایک ہیولا جاتا دکھائی دیا۔ وہ میرے کمرے کے عقب سے گزر چکا تھا۔ اس کے کندھے پر گن اور سر پر ٹوپی تھی۔ وہ یقیناً گارڈ تھا۔ وہ لوگ مکان کے صرف سامنے کے حصوں میں نہیں' عقبی حصوں میں بھی گشت کرتے تھے۔

جونہی وہ گارڈ لان کے کونے پر نظر سے اوجھل ہوا' میں ٹیرس کی دیوار پر باہر کی طرف لٹک گیا۔ دیوار کے نیچے سے مجھے ایک ستون میسر آگیا جس کے سہارے پھسل کر میں ماربل کی روش پر پہنچ گیا اور لان کے کنارے کنارے رکوع کی سی حالت میں بے آواز قدموں سے دوڑتا ہوا اس کونے تک پہنچ گیا جہاں گارڈ میری نظر سے اوجھل ہوا تھا۔

یہاں سے انیکسی سامنے نظر آرہی تھی لیکن بیچ میں لان کا ایک بڑا حصہ تھا جس پر گلوبس کی دھندلی سی دودھیا روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں نے کونے سے جھانک کر دیکھا۔ کافی دور' لان کے دوسرے سرے پر مجھے دو گارڈ کھڑے نظر آئے۔ وہ شاید بہت نیچی آواز میں باتیں کررہے تھے۔ ان کی پشت میری طرف تھی۔

میں چاہتا تو ان کی توجہ دوسری طرف ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لان کے کنارے کنارے دوڑتا ہوا انیکسی تک پہنچ سکتا تھا

لیکن میں نے خطرہ مول نہیں لیا۔ میں ماربل کی روش عبور کرکے مکان کی بیرونی دیوار کے قریب چلا گیا۔ وہاں تک برائے نام روشنی پہنچ رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ لگ کر میں کھسکنے لگا۔

اسی دوران ایک گارڈ نے ذرا گردن گھما کر دیکھا۔ میں فوراً اپنی جگہ ساکت ہوگیا تاکہ دیوار ہی کا ایک حصہ نظر آؤں۔ گارڈ دوبارہ منہ پھیر کر اپنے ساتھی سے باتیں کرنے لگا۔ پھر وہ باتیں کرتے ہوئے دھیرے دھیرے ایک طرف بڑھنے لگے۔ جونہی وہ عمارت کی اوٹ میں میری نظر سے اوجھل ہوئے، میں نے انیکسی تک کا فاصلہ اس بلی کی طرح دوڑ کر طے کیا جسے کہیں دودھ رکھا نظر آگیا تھا۔

انیکسی کا فرنٹ، لان کی طرف پڑتا تھا۔ میں اس طرف سے اس میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ اس میں زیادہ خطرہ تھا۔ میں انیکسی کے عقب میں جا پہنچا۔ میری خوش قسمتی تھی کہ اس طرف بل کھاتا ہوا تنگ سا ایک گول زینہ موجود تھا جیسا عموماً بعض عمارتوں کی پچھلی طرف ہوتا ہے۔

نچلی منزل کی تمام عقبی کھڑکیاں مجھے بند ملیں اس لئے اسی گول زینے کے راستے مجھے بالائی منزل پر جانا پڑا۔ تنگ سی ایک بالکنی میں چلتے ہوئے میں نے یکے بعد دیگرے کئی کھڑکیوں پر قسمت آزمائی کی۔ آخرکار مجھے ایک ایسی کھڑکی مل ہی گئی جو اندر سے بند نہیں تھی۔ پوری انیکسی اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے کھڑکی ذرا سی کھول کر اندر جھانکا۔ کمرے میں مجھے کسی کی موجودگی کے آثار محسوس نہیں ہوئے۔ چند سیکنڈ بعد میری آنکھیں اس اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئیں۔ اندھیرا گہرا نہیں تھا۔ وہ ایک فرنشڈ بیڈ روم تھا لیکن اس میں کوئی موجود نہیں تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں سکڑ سمٹ کر کھڑکی کے راستے اندر کود گیا۔ مجھے انیکسی میں داخل ہونے کا راستہ مل گیا تھا۔ اب میرے لئے پوری انیکسی کا جائزہ لینا مشکل نہیں تھا۔ تقریباً سب کمروں کے دروازے مجھے غیر مقفل ملے اور یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ تمام کمرے خالی تھے۔ سب کمرے فرنشڈ تھے اور ان میں ضرورت کی تھوڑی بہت چیزیں موجود تھیں جس طرح میرے کمرے میں موجود تھیں لیکن کسی بھی کمرے میں ایسی کوئی نشانی نہیں تھی جس سے ظاہر ہوتا کہ وہاں کوئی مقیم تھا۔

مجھے کچھ یوں لگا جیسے جوش و خروش سے دوڑتے دوڑتے میں یکدم ہی کسی بلند جگہ سے گر پڑا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو میری ساری خود اعتمادی ہوا ہوگئی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں ایک جگہ ملگجے اندھیرے میں ستون کے سہارے کھڑا ہوگیا اور گہری گہری سانسیں لینے لگا۔

یکدم ہی بہت سے سوال سانپوں کی طرح پھنکارتے ہوئے میرے سامنے آن کھڑے ہوئے تھے اگر قاسم بجلی نے مجھے دوستوں میں شمار کیا تھا تو اس نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا کہ کچھ سفید فام مقیم تھے؟ یہ بات اس نے خود ہی بتائی تو اس سلسلے میں کوئی سوال بھی نہیں کیا تھا کہ وہ شک مجھے مس گائیڈ کرنے کی کوشش کرتا۔ اب تک اس کا ہرگز نہیں رہا تھا جس سے ذرا بھی شک کا اظہار ہوتا۔ کیا چکر تھا؟

فارول شرٹن کی طرف سے تو اسے کوئی اطلاع تھی۔ وہ اسلام آباد میں ہماری قید میں تھا۔ تو پھر کیا ایکس تھری" میں ہی کوئی گڑبڑ تھی؟ لیکن اگر قاسم بجلی سے کسی شک میں مبتلا ہوتا تو اب تک مجھے قابو کوشش کر چکا ہوتا۔ میں تو گویا شیر کے کچھار میں موجود دیر پہلے ہی میں دنیا و مافیہا سے بے خبر سویا ہوا تھا۔ آسانی سے قابو میں کرنے کا اس سے اچھا موقع کون سا بظاہر فارول شرٹن نے بھی مجھے چکر دینے کی کو تھی۔ اس نے تو صرف اتنا کہا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ بہار پہنچنے والا تھا۔ اس نے زیادہ آدمیوں کا بھی ذکر نہیں قاسم بجلی نے محض شغل کے طور پر تو جھوٹ نہیں انیکسی میں چند سفید فام ٹھہرے ہوئے تھے؟ بعض لو طور پر بھی چھوٹے موٹے جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔

میں جب کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا تو میں نے فیصلہ کیا مجھے اپنے کمرے میں چلنا چاہئے پھر فیصلہ کرنا چاہئے کیا کرنا بہتر تھا۔

میں جس راستے سے آیا تھا اسی راستے کی طرف ہوا۔ بالائی منزل کے اس مخصوص کمرے کی عقبی کھڑ میں تنگ بالکنی میں پہنچا اور دبے قدموں گول زینے

آخری سیڑھی سے اتر کر میں عمارت کے دوسر طرف جانے کے لئے مڑا ہی تھا کہ اچانک تیز روشن روشنی عقب سے پڑی تھی اور اس کے ساتھ ہی سا سے مشابہ ایک آواز ابھری "ہینڈز اَپ مائی ڈیئرینگ

آواز گو کہ بہت بدلی ہوئی تھی لیکن میں نے پہچا بجلی ہی کی آواز تھی۔ اس کے لہجے کی تبدیلی جسم مُنـ دینے کے لئے کافی تھی۔ اگر وہ اکیلا ہوتا تو شاید میں پلٹ کر کچھ کر گزرنے کا خطرہ مول لے لیتا لیکن روشن میرے دائیں بائیں لمبے لمبے کچھ سائے بھی ابھرے۔ مجھے خبردار کردیا تھا کہ میرے عقب میں قاسم بجلی گول زینہ جس کونے پر تھا اس طرف کی دیوار کے لوگ چھپے ہوئے تھے اور بڑی مشاقی و پھرتی سے دیوا نکل کر انہوں نے مجھے کوَر کیا تھا۔

میں آہستگی سے گھومنے لگا تو قاسم بجلی کی پھنکارتی زہریلی آواز سنائی دی "نہیں نہیں برخوردار! جہاں ہو

حالت میں ساکت رہو۔ پتھر کے بُت کی طرح! ورنہ چیتھڑے اُڑ جائیں گے۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کرنے میں عافیت جانی۔ ویسے بھی جھٹکا شدید تھا۔ مجھے اس سے سنبھلنے، کچھ سوچنے سمجھنے اور حالات کا جائزہ لینے کے لئے چند سیکنڈ درکار تھے۔ میں نے کن انکھیوں سے پیچھے دیکھنے کی کوشش کی۔ مجھے صرف ایک شخص نظر آیا جس کے ہاتھ میں سب مشین گن تھی۔

عقب سے کوئی اور شخص میرے قریب آیا۔ اس نے ترچھا رہتے ہوئے نہایت محتاط انداز میں میری تلاشی لی۔ میں نے یکدم اسے پکڑ کر ڈھال بنانے کے بارے میں سوچا لیکن یہ کام ذرا مشکل اور خطرناک نظر آیا۔ مجھے معلوم نہیں تھا باقی مسلح افراد کس کس پوزیشن پر تھے۔ تلاشی لینے والا بھی ان معاملات میں منجھا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اسے یقیناً پہلے ہی اندیشہ تھا کہ اسے ڈھال بنانے کی کوشش کی جاسکتی تھی۔ وہ بدکے بدکے سے انداز میں ذرا فاصلہ رکھتے ہوئے تلاشی لے رہا تھا۔ میں ابھی تک صحیح طور پر اس کی شکل نہیں دیکھ سکا تھا۔

اس نے بہ آواز بلند قاسم بجلی کو اطلاع دی "اس کے پاس کچھ نہیں ہے سر!"

"پھر تو ماننا پڑے گا کہ یہ ایک دلیر آدمی ہے۔" قاسم بجلی نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا "خالی ہاتھ شیر کے کچھار میں گھسنا ہر ایک کا کام نہیں ہے۔ جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔"

اس جملے پر میں چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے میرے بارے میں یعنی "مسٹر عارف" کے بارے میں کہاں سے کچھ سن لیا تھا؟

قاسم بجلی نے مجھے مخاطب کیا "اب تم ہماری طرف گھوم سکتے ہو لیکن نہایت آہستگی سے اور کوئی چالاکی دکھائے بغیر۔ اسی میں تمہاری بھلائی ہے۔ ہم فی الحال تمہاری دلیری اور پھرتی کا کوئی نمونہ دیکھنے کے موڈ میں نہیں ہیں۔"

میں نے ہاتھ بدستور بلند رکھے اور اس کی ہدایت کے مطابق آہستگی سے گھوما۔ صورتِ حال دیکھ کر میں نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے بغیر سوچے سمجھے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ اس کے نتیجے میں میرا جسم چھلنی ہونے کے امکانات کافی "روشن" تھے۔

قاسم بجلی کے دائیں بائیں چار آدمی فائرنگ اسکواڈ کے سے انداز میں سب مشین گنیں سنبھالے، ٹریگرز پر انگلیاں رکھے یوں کھڑے تھے گویا کسی بھی لمحے انہیں مجھ کو شوٹ کرنے کا سگنل ملنے والا ہو لیکن ان کے چہرے اس طرح سپاٹ اور تاثرات سے خالی نہیں تھے جس طرح عموماً فائرنگ اسکواڈ کے ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر تو اس طرح خشونت اور خونخواری تھی جیسے ان کی مجھ سے کوئی پرانی اور ذاتی دشمنی چلی آرہی ہو۔

ایک شخص طاقتور سرچ لائٹ سنبھالے کھڑا تھا جس کی روشنی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ چھٹا شخص وہ تھا جس نے میری

وہ سب سے ذرا ہٹ کر ایک الگ ہی زاویے سے مجھے کوَر کئے کھڑا تھا۔

ان کے علاوہ خود قاسم بجلی بھی تھا جو ایک اُوزی سنبھالے، ٹانگیں چوڑی کئے یوں ان کے درمیان فرش پر جما کھڑا تھا جیسے کسی نادیدہ طوفان کے سامنے دیوار بننے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس وقت وہ بہت مختلف قسم کا قاسم بجلی نظر آرہا تھا۔ جب سے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی، میں پہلی بار اسے تاریک چشمے کے بغیر دیکھ رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھیں بلاشبہ شیطان کی آنکھیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ بڑی عمر کا شخص تھا لیکن اس کی آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ مگر یہ صحت مندانہ چمک نہیں تھی۔ اس چمک کی وجہ سے ہی اس کی آنکھیں زیادہ شیطانی نظر آرہی تھیں۔ اس کے علاوہ اس تاثر میں کچھ دخل ان آنکھوں کی ساخت کا بھی تھا۔

اس کے ساتھ جو افراد تھے انہیں میں دن میں گارڈز کے طور پر مکان کے اردگرد گھومتے دیکھ چکا تھا لیکن اس وقت ان کے تاثرات جتنے بدلے ہوئے تھے ان کی وجہ سے ان کی شکلیں بھی کچھ مختلف دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ پہلے سے کہیں زیادہ مستعد بھی نظر آرہے تھے۔ وہ سب کچھ اس طرح مجھے کوَر کئے کھڑے تھے جیسے ان کے سامنے ایک فرد نہیں، پوری بٹالین موجود ہو۔

"تمہیں کس کی تلاش تھی افضل چوہدری؟" قاسم بجلی نے بڑی ملائمت سے پوچھا۔

یہ میرے لئے ایک نیا جھٹکا تھا کہ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے واقعی میرے پیروں تلے سے زمین کھینچنے کا پورا پورا بندوبست کر رکھا تھا تاہم میں نے بدحواس ہونے کے بجائے معصومیت کا مظاہرہ کرنے کی پوری پوری کوشش کی "تمہیں کس نے بتایا کہ میرا نام افضل چوہدری ہے؟"

"اس قسم کی باتیں لوگ آکر ہمیں نہیں بتاتے برخوردار!" وہ دھیمے لیکن زہریلے لہجے میں بولا "ہم خود ایسی باتوں کا علم رکھتے ہیں۔ کاروبار کی ظالم دنیا میں میرے بھی اَن گنت روز و شب گزرے ہیں میرے چاند! اگر میں اتنا ہی گدھا ہوتا تو اتنا دولت مند نہ ہوتا۔ ایک مچھیرے کا بیٹا ہوکر آج اس مقام پر نہ ہوتا جہاں تم مجھے دیکھ رہے ہو۔ میرے باپ کے پاس سر چھپانے کے لئے جھونپڑی بھی نہیں تھی۔ میں نے ایک ٹوٹی پھوٹی کشتی میں جنم لیا تھا۔ مچھلیاں جمع کرکے بیچنے والا ٹھیکیدار بھی میرے باپ کو غصے میں آکر لاتیں رسید کردیتا تھا۔ آج میرے ایک ٹیلی فون پر بڑے بڑے وزیر سفیر اپنی خواب گاہیں چھوڑ کر دوڑے چلے آتے ہیں۔"

میں خاموش رہا۔ اگر وہ اپنی "عظیم الشان" کامیابیوں پر روشنی ڈال کر تھوڑی سی خوشی محسوس کرنا چاہتا تھا تو اسے اس کا موقع دینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ میرا ذہن اس دوران کسی اور ٹریک پر تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ میں اپنے لئے کوئی حکمتِ عملی اختیار کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کیا کسی طرح میں ان میں سے

یہ کام ممکن نظر نہیں آرہا تھا۔ ان کے پاس خطرناک گنیں تھیں۔ ان کی تعداد چھ تھی اور کسی کی نظر ایک لمحے کے لئے مجھ پر سے نہیں ہٹ رہی تھی۔ کوئی فیصلہ کُن قدم اٹھانے میں موت کا پلڑا بھاری نظر آرہا تھا۔ میں ساکت رہا۔

قاسم بجلی ایک لمحے کے توقف سے بولا "میں نے ہر طرح کا بزنس کیا ہے۔ دنیا کا شاید ہی کوئی کام ہو جو میں نے نہ کیا ہو۔ شہر میں دو چھوٹے موٹے ہوٹل میرے بھی ہیں۔ میں اتنا بے خبر نہیں ہوں کہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل کے مالک اور ٹھیک ٹھاک قسم کے بزنس مین کو نہ پہچانوں۔ مانا کہ میرے دونوں ہوٹل تمہارے ہوٹل کے مقابلے میں کمتر ہیں لیکن میرے پاس دوسرے ایسے بہت سے اثاثے ہیں جن کی وجہ سے کاروبار کی دنیا میں میری اہمیت تم سے کہیں زیادہ ہے۔ تم کراچی میں رہتے بھی بہت کم ہو۔ اس کے باوجود میں تمہارے وجود سے کبھی لاعلم نہیں رہا۔ تم نے شاید کبھی مجھے دیکھا بھی نہ ہو۔ دیکھا ہو تو شاید کبھی میرے بارے میں جاننے کی کوشش نہ کی ہو لیکن میں نے تمہیں دیکھا ہوا بھی تھا' تمہارے بارے میں معلومات بھی رکھی تھیں اور تمہیں یاد بھی رکھا تھا۔ میں ایک باخبر بزنس مین ہوں ڈیئر افضل چوہدری!"

میرے خیال میں اسے جھٹلانے کی ایک آدھ کوشش اور کر لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے یہ اعتراف نہیں کیا تھا کہ اسے ریڈ ڈاٹ کے کسی شخص نے میرے بارے میں مطلع کیا تھا اگر اس کا یہ دعویٰ درست تھا کہ اس نے خود ہی ایک بزنس مین کی حیثیت سے مجھے پہچان لیا تھا تو یہ میری بدقسمتی ضرور تھی لیکن میرے لئے اس میں ذرا سے اطمینان کا پہلو بھی تھا کہ شاید ابھی وہ میری آمد کے اصل مقصد سے آگاہ نہیں تھا۔

میں نے ٹھہرے لہجے میں کہا "تمہاری تقریر بہت اچھی ہے لیکن میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میرا نام افضل چوہدری نہیں ہے اور نہ ہی میں کسی فائیو اسٹار ہوٹل وغیرہ کا مالک ہوں۔ ہوٹلنگ میری لائن ہی نہیں ہے۔ میں تو وہ کام کرتا تھا جو تمہارے بزنس کا بھی ایک بڑا حصہ ہے۔ یعنی اِدھر کا مال اُدھر کرنا۔ شاید میری شکل میں کسی افضل چوہدری کی شباہت موجود ہو لیکن میں اسے نہیں جانتا۔"

قاسم بجلی نے نہایت آہستگی سے نفی میں گردن ہلائی لیکن گن اس کے ہاتھوں میں بدستور ساکت تھی۔ وہ چٹان کی طرح اپنی جگہ جما کھڑا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ ایک بارُعب شخصیت کا مالک اور دبنگ آدمی تھا۔ اس کی گھنی مونچھوں کے نیچے خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"نہ..... میرے دوست نہ!" وہ کسی حد تک مشفقانہ سے لہجے میں بولا "میرے گھر میں پہلے ہی دو ہم شکل جڑواں بہنیں موجود ہیں۔ اب مجھے دو اور ہم شکل انسانوں کی کہانی سنانے کی کوشش نہ کرو۔ ایک گھر پہ اتنے زیادہ اتفاقات کا بوجھ نہیں لادا کرتے۔"

"فرض کرو میں افضل چوہدری بھی ہوں تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تمہاری نظر میں اہمیت تو صرف اس حوالے کی ہونی [illegible] جس کے ساتھ میں یہاں آیا ہوں۔ کوڈ ورڈ آر ایکس تھری [illegible] بعد تو تمہیں اس بات سے کوئی غرض ہی نہیں ہونی چاہئے [illegible] کون ہوں" میں نے اپنی دانست میں دلیل سے کام لینے کی کو[شش] کی۔

"ایسی بات نہیں ہے۔" اس نے گویا میری غلط فہمی [illegible] "انسان کی اصل شخصیت کی اہمیت تو ہر حال میں رہتی ہے [illegible] اہم نکتہ شاید تمہیں معلوم نہیں تھا کہ "آر ایکس تھری [illegible] حوالے سے آنے والوں کو اپنی اصل شخصیت چھپانے کی [illegible] نہیں رہتی خواہ وہ جیل توڑ کر بھاگ کر آئے ہوں۔ دوسری [illegible] یہ کہ اس کوڈ ورڈ کے ساتھ آنے والے کو چوروں کی طر[ح] [illegible] کے وقت میرے گھر میں جھانکتے پھرنے کی ضرورت نہیں [illegible] اسے خواہ کوئی بھی کام ہوتا کسی کی بھی تلاش ہوتی' وہ سید[ھا] [illegible] مجھ سے کہہ سکتا تھا۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر ٹھنڈی سا[نس] [illegible] "ڈیئر افضل چوہدری! بات صرف اتنی ہے کہ بات نہیں [illegible] میں نے تمہیں اسی وقت پہچان لیا تھا جب میں نے تمہیں [illegible] ہی ہوٹل کے سامنے سے گاڑی میں بٹھایا تھا اور میری کھوپڑ[ی] [illegible] وقت گھوم گئی تھی۔ میں چکرا کر رہ گیا تھا کہ تم جیسی صاف [illegible] شہرت رکھنے والے بزنس مین کو اس ریفرنس سے میرے پا[س] [illegible] کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی؟ پھر میں نے اپنے آپ [illegible] "پیارے قاسم بجلی! یہ دنیا ہے' یہاں کچھ پتا نہیں کون کس [illegible] ہے' میں تمہیں اپنے ساتھ تو لے آیا۔ نہایت محبت سے اپنے گھر میں بھی ٹھہرایا لیکن فوری طور پر اپنے کچھ خاص [illegible] سے رابطہ کیا اور انہیں تمہارے بارے میں مطلع کیا کہ [illegible] ریفرنس کے ساتھ میرے پاس آئے ہو' کہیں کوئی گڑبڑ تو نہ[یں] [illegible] تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ تم تو میرے دوستوں کو بہت ہی شد[ت] [illegible] مطلوب ہو۔ تمہارے ساتھ تو ان کا کوئی لمبا ہی چکر ہے۔ [illegible] نے خاص طور پر تمہیں ٹھہرانے کے لئے وہ بیڈ روم دلایا [illegible] سے نظر رکھی جاسکتی ہے۔ پہلی ہی رات تم چوروں کی سی [illegible] کرتے پکڑے گئے۔"

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے اندازہ ہو [illegible] اِدھر اُدھر کی ہانکنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ شاید قسمت نے [illegible] دیا تھا۔ شاید میں اپنی خوش قسمتی پر تکیہ کرنے کا عادی ہو [illegible] اس لئے فی الحال وہ میرا ساتھ چھوڑ گئی تھی۔

میرے تاثرات میں شاید کوئی تبدیلی آئی تھی جے [illegible] کرتے ہوئے قاسم بجلی ذرا طمانیت سے مسکرایا اور بو[لا] [illegible] سوال کی اب کوئی اہمیت تو نہیں رہی پھر بھی کیا تم بتانا پ[سند] [illegible] کہ اس وقت تمہیں کس کی تلاش تھی؟"

"تمہارے دوستوں کی۔" میں نے گویا اس کے سا[منے] [illegible] تسلیم کرتے ہوئے سچ بولنے کا فیصلہ کیا۔

"ان کے نام بتانا پسند کرو گے؟"

"نام مجھے معلوم نہیں ہیں۔"

"بہت خوب" اس نے سر ہلایا "تمہیں میرے "نامعلوم" دوستوں کی تلاش ہے' تمہیں کیسے معلوم تھا کہ ان سے میرے گھر میں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"خفیہ ایجنسیوں کو کچھ سراغ ملا تھا۔ انہوں نے مجھے یہاں بھیج دیا۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "مجھے مرعوب کرنے کی کوشش کر رہے ہو؟"

"مجھے اس کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے کندھے اُچکائے "مجھے معلوم ہے تم جیسے آدمی اس وقت تک کسی سے مرعوب نہیں ہوتے جب تک موت ان کا گلا نہیں دبوچ لیتی۔"

"ان کے پاس آدمی ختم ہو گئے تھے کیا؟ جو انہوں نے تمہیں بھیج دیا؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا پھر ایک لمحے کے توقف سے کہا "ویسے مجھے ذاتی طور پر بھی ڈاکٹر برنارڈ نامی ایک شخص کی تلاش تھی۔"

"ڈاکٹر برنارڈ؟" اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں "یہ نام کبھی سنا نہیں۔ اور نہ ہی اس نام کے کسی آدمی کا یہاں آنے کا پروگرام تھا۔"

"ہو سکتا ہے ابھی تم اسے نہ جانتے ہو۔ یہ بھی ممکن ہے تم اسے کسی اور نام سے جانتے ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔ گو کہ مجھے معلوم نہیں تھا وہ سچ بول رہا تھا یا محض بن رہا تھا۔

"خیر یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا۔ اس بدبخت کو نہیں معلوم تھا کہ میرے لئے یہ بات کتنی اہم تھی۔

اس کی نظریں صرف ایک ثانیے کے لئے اپنے ساتھیوں کی طرف گئیں جو بُت بنے کھڑے تھے۔ وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "یہیں کھڑے کھڑے تم سے بہت سی باتیں ہو گئیں۔ کچھ سچی' کچھ جھوٹی۔ لیکن یہ کوئی اچھی بات نہیں کہ ہم یہیں کھڑے باتیں کرتے رہیں۔ اب تم پہلے ہی کی طرح نہایت آہستگی سے گھوم جاؤ اور اسی طرف منہ کر لو جس طرف پہلے تھا۔"

اس کا مطلب تھا کہ ان کی طرف میری پشت ہو جاتی۔ میں نے حتی الامکان پُرسکون لہجے میں کہا "تم مجھے گولیاں مارنا چاہتے ہو تو سینے ہی پر مارو۔ میں پیٹھ پر گولی کھانا نہیں چاہتا۔"

اس نے ایک بار پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا "کسی فلمی ہیرو کی سی بچکانہ باتیں مت کرو اور نہ ہی محاوروں کے چکر میں پڑو۔ پیٹھ پر گولی کھانے والا ہر آدمی بزدل نہیں ہوتا۔ کبھی کبھی بڑے بڑے سُورماؤں کو پیٹھ پر گولی لگ جاتی ہے اور کبھی کبھی بڑے بڑے بزدل بھی اتفاق سے سینے پر گولی کھا کر مر جاتے ہیں۔ بہادری اور بزدلی کے اس ہکانے کو صرف محاورے کی حد تک ہی رہنے دو۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "ویسے بھی ہمارا اس وقت تک گولی چلانے کا ارادہ نہیں ہے جب تک تم میری ہدایات کی خلاف ورزی نہ کرو۔"

"تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"زیادہ دور نہیں۔" قاسم بجلی نے جواب دیا "میں تمہیں اپنے چند دوستوں سے ملوانا چاہتا ہوں۔ خوشگوار ماحول میں کچھ بات چیت ہو گی۔ کشتی کی سیر ہو گی۔ ویسے بھی تم نے کہا تھا کہ تم گلف کی کسی ریاست کی طرف نکلنا چاہتے ہو۔ شاید تمہیں گلف کی کسی ریاست کی طرف ہی بھیج دیا جائے۔"

"لیکن میرا پروگرام اب بدل گیا ہے۔" میں نے معصومیت سے کہا "میں اب مغرب کی طرف نکلنا چاہتا ہوں۔"

"کوئی بات نہیں ہم تمہیں مغرب' مشرق' شمال' جنوب جس طرف چاہو گے بھجوا دیں گے لیکن اب مزید بکواس نہ کرو۔ کہیں میرا پروگرام نہ بدل جائے اور میں ساری سمتیں چھوڑ کر تمہیں عالم بالا کی طرف بھجوانے کا فیصلہ کر لوں۔" وہ قدرے ناگواری سے بولا۔

میں قاسم بجلی کو باتوں میں لگا کر جتنی مہلت حاصل کر سکتا تھا' کر چکا تھا لیکن اس دوران مجھے کچھ کر گزرنے کے لئے کوئی لمحہ مناسب نظر نہیں آیا تھا۔ ان میں سے کوئی ایک لمحے کے لئے بھی غافل نہیں ہوا تھا۔ کسی نے کوئی حماقت نہیں کی تھی۔ ایسے موقعوں پر میں کسی کی طرف سے ذرا سی غلط حرکت کا منتظر رہتا تھا جو عموماً میرے لئے صورتِ حال کو اُلٹ دینے کا سبب بن جاتی تھی لیکن اس وقت تو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سب سے بڑی حماقت مجھ سے ہی سرزد ہو چکی تھی۔ کوئی اور ذرا سی بھی غلطی کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جس سے میں تھوڑا بہت فائدہ اٹھا سکتا۔

شفیع شاہ اگر کہیں ساحل کے آس پاس موجود تھا تو نہ جانے اسے اندازہ ہو رہا تھا یا نہیں کہ مکان میں کچھ گڑبڑ تھی؟ محل نما مکانوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات پڑوسیوں کو بھی پتا نہیں چلتا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ کسی کے حق میں یہ بات بہت اچھی ہوتی ہے کسی کے حق میں بہت بُری۔

میں آہستگی سے گھوم گیا تو قاسم کی آواز سنائی دی "اب آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ناک کی سیدھ میں چل پڑو۔"

میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے ابھی ایک قدم ہی اٹھایا تھا کہ میرے عقب میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔ کوئی میرے قریب آگیا تھا۔ میری دھڑکن ذرا تیز ہو گئی۔ نہ جانے وہ کیا کرنا چاہتا تھا۔ میرے اعصاب تن گئے لیکن اس نے صرف میری کمر پر گن کی نال ٹکانے پر اکتفا کیا۔

"چلتے رہو چلتے رہو۔" قاسم بجلی کی آواز آئی۔

میرے تنے ہوئے اعصاب نہ صرف کچھ ڈھیلے پڑ گئے بلکہ میرے دل میں خوشی کی ایک نہایت خفیف سی لہر بھی دوڑ گئی۔ مجھے اُمید کی ایک مدّھم سی کرن نظر آئی تھی۔ شاید یہی وہ حماقت تھی جس کا مجھے انتظار تھا۔ ان کے اور میرے درمیان اگر تھوڑا سا

فاصلہ برقرار رہتا تو میرے لئے زیادہ خطرہ تھا لیکن شاید ان سب کو مجھ سے ذرا دور رہتے ہوئے کچھ اطمینان نہیں تھا اور قاسم بجلی نے اپنے ایک آدمی کو میرے عین قریب بھیج ہی دیا تھا۔ نفسیاتی طور پر اس طرح شاید انسان زیادہ اطمینان محسوس کرتا ہے کہ اس کی گن کی نال اس کے شکار کی پشت پر ٹکی ہو۔

دھیرے دھیرے چلتا ہوا میں ایکسی کے کونے تک پہنچ گیا۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب قاسم بجلی مجھے دائیں طرف مڑنے کے لئے کہے گا۔ یہی وہ لمحہ تھا جب میں جان کا خطرہ مول لیتے ہوئے تھوڑی بہت اُمید کے سہارے ایک کوشش کر سکتا تھا۔ اگر میں انتہائی پھُرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گھوم کر اس شخص سے گن چھین سکتا جس نے نال میری پشت پر ٹکائی ہوئی تھی تو شاید میں اس کونے کی آڑ لینے میں کامیاب ہو جاتا۔ یہ کونا چند لمحے کے لئے میرا مورچا ثابت ہو سکتا تھا اور اس دوران میں بھاگنے اور کسی جگہ سے چہار دیواری پھلانگنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

اس کوشش میں بھی خطرات ہی خطرات تھے لیکن خطرات اب میرے لئے ویسے بھی کم نہیں تھے۔ چنانچہ میں نے یہ جُوا کھیل ڈالا۔ میں اچانک ہی بیٹھ گیا۔ اس قسم کی صورتِ حال کے لئے یہ ایک بڑا کارآمد داؤ تھا۔ گن کی نال نہ صرف میری کمر سے ہٹ گئی بلکہ میرے پیچھے آنے والا شخص میرے اوپر گرتے گرتے بچا۔

اس کی وجہ سے دوسرے لوگ فوری طور پر فائر نہ کر سکے۔ میں اس کی گن چھین کر اور اسے باقی لوگوں کی طرف اچھالتے ہوئے کونے کی آڑ میں۔ پہنچ گیا۔ یہ ایک بہت بڑی کامیابی تھی لیکن مجھے اس کا کوئی فائدہ نہ ہو سکا کیونکہ مجھے معلوم نہیں تھا اُس کونے کی آڑ میں پہلے ہی کوئی چھپا ہوا تھا۔ عقب سے کوئی ٹھوس چیز میری کھوپڑی پر پڑی اور میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے ستارے ناچ گئے۔ دوسرے ہی لمحے سارا منظر میری نظر سے غائب ہو گیا۔ صرف تاریکی رہ گئی۔

اس تاریکی میں بڑی راحت تھی۔ جب ذہن پر دباؤ حد سے زیادہ بڑھ جائے تو دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جانا ہی غنیمت لگتا ہے لیکن اس کے لئے کھوپڑی پر ہتھوڑا نہ پڑے تو یہ عمل زیادہ راحت بخش ہو۔

میں جب نامعلوم مُدّت تک گرد و پیش سے بے خبر رہنے کے بعد آگہی کی دنیا میں واپس آنے لگا تو مجھے کچھ یوں لگا جیسے یہ عمل کسی ٹھوس دیوار سے سر ٹکرانے کے مترادف تھا۔ میرے سر میں کچھ ایسی ہی دھمک ہو رہی تھی۔

پھر رفتہ رفتہ یہ دھمک کم ہوئی اور میں نے آنکھیں کھولیں تو اندازہ ہوا کہ میرا سر کسی چیز سے نہیں ٹکرا رہا تھا۔ میں تو شاید کسی آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ میرا ذہن گویا نہایت ہی آہستگی سے کسی تاریک دلدل سے باہر آ رہا تھا۔

کافی دیر بعد مجھے صحیح طور پر معلوم ہوا کہ میں کہاں تھا اور کس حال میں تھا۔ میں "پرنس" نامی موٹر بوٹ کے پچھلے حصے میں تھا۔

یہ حصہ کھلا تھا اور اس کے نچلے ڈیک پر میں ایک آرام کرسی پر نیم دراز تھا۔ مجھ پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ میرے سامنے نشیب میں ترتیب سے رکھی ہوئی کچھ کرسیوں پر چند سفید فام افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں سے دلچسپی عیاں تھی۔ انداز کچھ ایسا تھا گویا وہ اپنے سامنے اسٹیج پر پیش کیا جانے والا کوئی دلچسپ تماشا دیکھ رہے ہوں اور وہ "تماشا" میں تھا!

ان سفید فاموں کے پیچھے قاسم بجلی کھڑا تھا۔ اُس کے دائیں بائیں دو مسلح افراد تھے۔ اس وقت قاسم بجلی کے تاثرات کچھ زیادہ خوف ناک نہیں تھے۔ وہ ایک مہذب اور خوش مزاج شخص کی طرح مسکرا رہا تھا۔

میں نے کئی بار پلکیں جھپکائیں تو مجھے کچھ اور صاف نظر آنا شروع ہوا۔ تب مجھ پر انکشاف ہوا کہ میرے سامنے ذرا نشیب میں کرسیوں پر جو سات سفید فام بیٹھے تھے ان سب کا تعلق ریڈ ڈاٹ سے تھا۔ ان کی کمپیوٹرائزڈ تصویریں میں دیکھ چکا تھا۔

اُن میں سے ایک خاصا عمر رسیدہ تھا۔ اس سے تو ایک بار میری ملاقات بھی ہو چکی تھی۔ اسلام آباد کے نواح میں ایک بار مجھے اغوا کر کے ریڈ ڈاٹ کے ہیڈ کوارٹر لے جایا گیا تھا۔ اس وقت "باس ٹو" نے مجھ سے بہت اہم قسم کے "مذاکرات" کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس وقت یہ بوڑھا اور تقریباً اسی کی ایک ہم عمر عورت باس ٹو کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ تمام گفتگو باس ٹو نے کی تھی لیکن نہ جانے کیوں مجھے احساس ہوا تھا کہ بوڑھا جوڑا ریڈ ڈاٹ میں بہت اہم حیثیت کا مالک تھا۔ اب بوڑھا اکیلا نظر آ رہا تھا۔ شاید بُڑھیا اس سے بچھڑ چکی تھی۔

میں نے آرام کرسی سے اٹھنے کی کوشش کی تو احساس ہوا کہ میرے لئے حرکت کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ فوراً مجھے گمان گزرا کہ شاید میں رسیّوں کے ذریعے آرام کرسی سے بندھا ہوا تھا لیکن جب میں نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی تو مجھے کہیں کوئی بندش نظر نہ آئی۔ میں یہی سمجھا کہ شاید سر کی چوٹ نے میرے اعصاب پر کچھ ایسا اثر ڈالا تھا کہ جسم بے جان سا ہو کر رہ گیا تھا۔

اس کے باوجود میں نے حرکت کرنے کی کوشش کی لیکن میں بالکل اسی طرح کسمسا کر رہ گیا جیسے کچھ نادیدہ بندشوں میں جکڑا ہوا تھا۔ مجھے بے بسی سے کسمساتے دیکھ کر سفید فام بوڑھا گویا میرے خیالات پڑھتے ہوئے بولا "شاید تم سمجھ رہے ہو کہ سر کی چوٹ کی وجہ سے تمہارا یہ حال ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ ہم نے تمہیں ایک انجکشن لگایا ہے جس سے تمہاری طاقت سلب ہو کر رہ گئی ہے۔ خواہ مخواہ اپنے آپ سے زور آزمائی کر کے اپنے آپ کو تکلیف میں مت ڈالو۔ تم سے اب صبح تک ہلا نہیں جائے گا۔"

"بشرطیکہ تم صبح تک زندہ رہے۔" دوسرے سفید فام نے لقمہ دیا۔

میری روح پر ایک لمحے کے لئے مایوسی نے ڈنک مارا لیکن میں نے فوراً ہی اس طرف سے اپنا ذہن ہٹا لیا۔ زندگی اور موت کا مسئلہ جس کے اختیار میں تھا وہی اس سلسلے میں کچھ کر سکتا تھا۔ اور میں اس کی رضا میں راضی تھا۔

بوڑھا گویا کسی سوچ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا "کتنی عجیب بات ہے کہ جب ہم تمہیں ہلاک کرنا چاہتے تھے تو تم بچ کر نکل گئے۔ ہم تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے۔ اب جبکہ ہم نے تمہارا خیال چھوڑ دیا تھا اور بستر بوریا سمیٹ کر جا رہے تھے تو تم خود بخود ہمارے پاس چلے آئے اور وہ بھی ایک ایسی جگہ۔ جہاں ہم تمہاری آمد کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا اس حسین اتفاق کو ہم کیا نام دیں!"

میں نے کہنا چاہا "جو تمہارے لئے حسین اتفاق ہے وہ میرے لئے قسمت کی خرابی ہے۔" میں یہ بات کہہ نہ سکا۔ میں نے بولنا چاہا تو احساس ہوا کہ میری زبان بھی کچھ موٹی، بھاری اور مفلوج سی ہو گئی تھی۔ میں کوشش کرتا تو شاید بول سکتا تھا لیکن نہ جانے کیسی آواز نکلتی، کیسا تلفظ ہوتا۔

میں نے بولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور سانس روک لی۔ میں یوگا کی مشقوں کو کام میں لانا چاہتا تھا۔ اس وقت انجکشن کے اثر یا سر کی چوٹ کی وجہ سے میری جو کیفیت تھی اسے ٹھیک کرنے میں یوگا کی مشقیں میری تھوڑی بہت مدد تو کر ہی سکتی تھیں۔

میں دیکھ رہا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ ان لوگوں میں موجود نہیں تھا۔ ڈاکٹر برنارڈ کا جو حلیہ مجھے بتایا گیا تھا وہ ذرا الگ ہی قسم کا تھا اور میرے دل پر نقش تھا۔ مجھے امید تھی کہ وہ دس بیس آدمیوں میں تو الگ ہی نظر آتا ہوگا۔ میں ان سے پوچھنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کہاں تھا؟ میں ان سے صحیح جواب ملنے کی توقع تو رکھ ہی نہیں سکتا تھا۔

اس دوران مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ ہم ابھی بوٹ ہاؤس میں ہی موجود تھے۔ قاسم بجلی کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے بوڑھے سے مخاطب ہوا "مسٹر ڈی! میں نے ایک قیمتی تحفہ آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ ان چکروں میں پڑ کر میں تو ایک لمحے کے لئے بھی نہیں سو سکا۔"

"اب آپ اطمینان سے خواہ ایک ہفتے تک سوتے رہئے مسٹر بجلی! آپ نے ہمارے لئے جتنا بڑا کام کر دیا ہے اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے اور آپ کو شاید اس کی اہمیت کا اندازہ نہ ہو۔" عمر رسیدہ سفید فام بولا "ہم زندگی بھر آپ کے شکر گزار رہیں گے اور آپ کے اس تعاون کا بھی آپ کو معقول صلہ ملے گا۔"

"مجھ پر آپ کی نوازشات پہلے ہی کیا کم ہیں۔" قاسم بجلی نے اس کے سامنے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

عمر رسیدہ سفید فام نے ہاتھ ہلا کر گویا اسے جانے کی اجازت دے دی اور وہ اپنے مسلح آدمیوں کے ساتھ بوٹ کے اگلے حصے کی طرف چل دیا۔ میری نظریں اس کے تعاقب میں تھیں۔ تب ہی میں نے دیکھا کہ بوٹ کے دونوں پہلوؤں کے ساتھ راکٹ لانچر

فٹ تھے۔ یعنی انہوں نے بوٹ کو کسی ممکنہ حملے سے بچانے کا بھی بندوبست کر رکھا تھا۔ کیا ان راکٹ لانچرز کی موجودگی میں شفیع شاہ اپنا ٹرالر بوٹ کے قریب لانے کی حماقت کر سکتا تھا؟ اگر وہ بے خبری اور نادانستگی میں قریب آ بھی جاتا تو اس کا انجام کیا ہو سکتا تھا؟ ان سوالوں نے میری تشویش بڑھادی۔

مجھے قاسم بجلی کی مدھم سی آواز سنائی دے رہی تھی۔ شاید وہ جاتے جاتے بوٹ کے کیپٹن اصغر کو کچھ ہدایات دے رہا تھا پھر میں نے چوبی پُل پر ان کے بھاری قدموں کی آوازیں دور جاتے سنیں۔

تمام سفید فام بدستور نہایت انہماک سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ معلوم نہیں انہیں ایک شخص کو بے بسی سے اپنے سامنے پڑا' دیکھنے میں کیا لطف محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے چہروں پر اس قدر دلچسپی کے آثار تھے' شاید انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا یا پھر یہ ان کے کسی دیرینہ خواب کی تعبیر تھی۔

میں ان سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہتے تھے لیکن ابھی تک میں نے اپنے آپ کو اس سوال سے بھی باز رکھا تھا۔ یہ بھی میری زندگی کا ایک عجیب ہی تجربہ تھا کہ میں بالکل آزاد تھا' میرے ہاتھ پاؤں کچے دھاگے سے بھی بندھے ہوئے نہیں تھے لیکن میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اپنے چہرے پر بھنبھنانے والے مچھر بھی نہیں ہٹا سکتا تھا۔

ایسی بے بسی میں نے کبھی بندھے ہوئے ہاتھوں کے ساتھ بھی محسوس نہیں کی تھی۔ ہاتھ پاؤں اگر بندھے ہوتے تھے تب بھی یہ احساس تو رہتا تھا کہ میری جسمانی طاقت' جو مجھے اپنا سب سے بڑا سرمایہ محسوس ہوتی تھی' میرے ساتھ تھی۔ طاقت بندشوں میں جکڑی ہو تب بھی باعثِ اطمینان محسوس ہوتی ہے لیکن فالج زدہ جسم آزاد بھی ہو تو بوجھ ہوتا ہے۔

بہرحال میری سانسوں کی مشق غیر محسوس طور پر جاری تھی اور میں اندر ہی اندر اپنی حالت کچھ بہتر ہوتی محسوس کر رہا تھا۔ چند لمحے بعد بوٹ کا انجن اسٹارٹ ہوا اور وہ حرکت میں آگئی۔ بوٹ ہاؤس سے نکل کر تاریکی میں "پرنس" ایک سمت میں روانہ ہوگئی۔ میں سمندر میں دونوں طرف جہاں تک دیکھ سکتا تھا وہاں تک مجھے کوئی روشنی متحرک نظر نہ آئی۔ نہ جانے شفیع شاہ کہاں تھا؟ میں اسی امید سے دل کو سنبھالے ہوئے تھا کہ شاید وہ بتیاں بجھا کر کسی سمت سے ہمارے تعاقب میں آرہا تھا۔ میں تو اس وقت اچھی خاصی روشنی میں تھا اگر وہ کہیں دور سے دوربین کے ذریعے "پرنس" کا جائزہ لیتا تو شاید کسی زاویے سے مجھے بھی دیکھ لیتا لیکن مجھے آرام کرسی پر نیم دراز دیکھ کر شاید وہ یہی سمجھتا کہ میں بڑے مزے میں ہوں اور کسی تفریحی سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ معلوم نہیں اسے حالات کا اندازہ تھا یا نہیں؟ نہ جانے وہ سفید فاموں کو دیکھ پایا تھا یا نہیں؟

میرے ذہن میں ان سوالات کی کھچڑی پکتی رہی اور بوٹ گہرے پانیوں کی طرف بڑھتی رہی۔ تمام سفید فام بدستور نہایت صبر و سکون سے بیٹھے میری طرف دیکھے جا رہے تھے۔ میں [ان کی] مستقل مزاجی پر حیران تھا۔ ان کی آنکھوں میں اب بھی یو[نہی] برقرار تھی جیسے جلد ہی میں ان کی تفریحِ طبع کے لئے کسی او[ر] میں تبدیل ہونے والا تھا۔

آخر کار میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا "تم لوگ کس چیز کا [انتظار] کر رہے ہو؟"

مجھے خود اپنی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ میر[ی زبان] گویا خشک روئی کی ہو کر رہ گئی تھی اور تالو سے چپکی جا رہی تھی۔

سفید فام بوڑھا کچھ آگے جھکتے ہوئے بولا "ذرا زور سے [بولو] تمہاری آواز سنائی نہیں دے رہی۔"

میرے دوبارہ بولنے سے پہلے ایک نوجوان سفید فام بولا [یہ] عبرت کا مقام ہے۔ سنا ہے یہ شخص جناتی سی طاقت کا مالک [تھا]۔ گولیوں کی بوچھاڑ میں بھی بچ کر نکل جاتا تھا۔ دس دس آدمیو[ں کے] قابو میں نہیں آتا تھا۔ آج کیسا مُردہ چوہے کی طرح پڑا ہے!"

لہجہ ترحم آمیز بھی تھا اور استہزائیہ بھی۔

میں کہنا چاہتا تھا کہ اس میں بھلا ان کے کون سے کمال ک[ا دخل] تھا؟ مکاری اور دھوکے سے تو وہ کسی رستم زماں قسم کی شخصی[ت کو] بھی بے ہوش کر کے اسے کسی دوا کا انجکشن لگا کر بے بس [کر سکتے] تھے' مفلوج بنا سکتے تھے بلکہ اسی پر کیا موقوف تھا بے ہوشی [کی حالت] میں تو وہ اسے ذرا سے زہر کا انجکشن لگا کر بغیر کسی زحمت [کے] دنیا سے ہی رخصت کر سکتے تھے۔ یہ کوئی کارنامہ نہیں تھا جس [پر وہ] خوش ہو رہے تھے۔ تاہم میں نے یہ بات ان سے نہیں کہی[۔ اس] وقت میں وہ توانائی بھی ضرورت سے زیادہ خرچ نہیں کرنا چا[ہتا تھا] جو بولنے میں صَرف ہوئی تھی۔

تاہم میں نے اپنا سوال اپنی دانست میں چیخ کر دُہرایا "تم کس چیز کا انتظار کر رہے ہو۔ میرے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟" میری آواز ذرا بہتر تھی۔

بوڑھے نے طمانیت سے سر ہلایا اور کہا "ہاں' اب تمہ[اری] آواز آسانی سے ہم تک پہنچ رہی ہے۔ ہم تمہارے بولنے [کا] انتظار کر رہے تھے۔ اب تم نے بولنا شروع کر دیا ہے۔ ا[س کا] مطلب ہے تمہارا جسم تو اب بھی بے جان ہی ہو گا لیکن تمہ[اری] حسیات کچھ کام کرنے لگی ہیں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ شاید وہ مجھ سے کسی جواب کی توقع کر [رہا تھا] لیکن میں خاموش رہا۔ میں نے شاید پہلے ہی بول کر غلطی کی [تھی]۔ اسے صحیح اندازہ نہیں ہونا چاہئے تھا کہ کس وقت میری کیا کی[فیت] تھی۔ شاید انہیں مغالطے میں رکھنا ہی میرے حق میں بہتر تھا۔

سفید فام بوڑھے مسٹر ڈی نے سلسلۂ کلام جوڑا "اگر تمہ[اری] حسیات کچھ کام کرنے لگی ہیں تو ہمیں بھی اپنا کام شروع ک[رنا] چاہئے۔ ہم چاہتے تھے کہ جو کچھ ہم کریں' تم اس کی تکلیف محسوس کر سکو۔ ہم تمہیں قسطوں میں سمندر کے حوالے کرنا چا[ہتے] ہیں۔ پہلے ہم تمہارا ایک ہاتھ کاٹ کر سمندر میں پھینکیں گے۔

[تھوڑی د]یر بعد دوسرا ہاتھ کاٹ کر پھینکیں گے۔ یوں وقفے وقفے سے ہم تمہیں سمندر میں پھینک کر مچھلیوں کے لئے تھوڑی بہت خوراک کا بندوبست کریں گے اور دیکھیں گے کہ کس مرحلے تک تمہارے بچے کھچے وجود میں زندگی کی رمق باقی رہتی ہے۔ سب سے آخر میں ہم تمہارا سر سمندر میں پھینکیں گے اور یوں تمہیں الوداع کہیں گے۔ اس شغل میں ہمارا سفر بھی اچھے طریقے سے کٹ جائے گا۔ ہمارا سفر کا پروگرام تو طے ہی تھا لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ [جا]تے جاتے تم ہمارے ہاتھ آجاؤ گے اور یوں ہمارے سفر کا لطف [دو]بالا ہو جائے گا۔"

مسٹر ڈی خاموش ہو کر گویا میرے چہرے پر کوئی ردِعمل تلاش [ک]رنے لگا۔ میں نے کوشش کی کہ میرے چہرے سے کوئی ردِعمل [ظ]اہر نہ ہونے پائے۔ شاید اس وقت میں کوئی ردِعمل ظاہر کرنے [ک]ے قابل بھی نہیں تھا۔ میرے ذہن پر ابھی تک دھند سی چھائی ہوئی [تھی]۔

"تم لوگ بوٹ کے ذریعے کیوں جا رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔ [انہوں] نے مجھے کاٹنے پیٹنے کی جو بات کی تھی' میں نے گویا اسے قطعاً [کوئی] اہمیت نہیں دی تھی۔

میرے اس ردِعمل سے مسٹر ڈی کے چہرے پر ایک لمحے کے [لئے م]ایوسی کے آثار نمودار ہوئے لیکن پھر وہ مسکرا دیا اور بولا۔ [اس] موقع پر بھی تمہاری تجسس پسند طبیعت کو چین نہیں ہے۔ تم [سوال]ات سے باز نہیں آرہے۔ اگر سوال کرنا ہی ہے تو اپنی زندگی [اور م]وت کے بارے میں کرو۔"

"میری زندگی کو اگر تم نے اپنی دانست میں موت میں تبدیل [کرنے] کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اب سوالات کرنے کا کیا فائدہ؟" میں [نے کہا]۔

"جو سوال تم نے کیا ہے' فائدہ تو اس کا بھی کچھ نہیں ہے۔ [لیکن خیر]" مسٹر ڈی نے کندھے اچکائے "تمہاری تسلی کے لئے [بتا دیتا ہ]وں۔ تمہاری خفیہ ایجنسیاں تمام بحری اور ہوائی اڈوں کی [نگرانی] کر رہی ہیں۔ ہم چاہتے تو اپنے اپنے ملکوں کا اثر و رسوخ [استعمال] کر کے اس طرح واپس جا سکتے تھے کہ تمہارے اعلیٰ حکام [ہمیں] رخصت کرنے ہوائی اڈوں تک آتے لیکن ہمیں ہدایات [ہیں ک]ہ ہم ہمیشہ کی طرح گمنام اور روپوش ہی رہیں۔ اس طرح [ہد]ایات یہاں سے غائب ہو جائیں کہ کسی کو کانوں کان پتا نہ [چلے۔ ہ]م نہیں چاہتے تمہارے ہاں کے عام آدمی کو ہمارے بارے [میں کچھ] معلوم ہونے پائے۔ اس کے علاوہ دوسری بہت سی [وجوہ]ات بھی ہیں۔"

[میں] خاموش رہا۔ اس دوران میری سانس کی مشقیں جاری [تھیں۔ ان]کا صحیح طور پر استفادہ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ [یکس]وئی حاصل ہوتی۔ میں مراقبے کی سی کیفیت میں چلا جاتا [تو] مسٹر ڈی سے باتیں بھی کئے جا رہا تھا اور میری توجہ بھی [انہی] کی طرف تھی۔ اس کے باوجود میں نے محسوس کیا کہ

میری حالت کچھ بہتر ہوئی تھی۔ میں اب چاہتا تو شاید ہاتھ پیروں کو تھوڑی بہت حرکت دے سکتا تھا لیکن میں نے ایسی کوشش نہیں کی۔ میں قبل از وقت انہیں ہوشیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔

مسٹر ڈی نے ایک نوجوان سفید فام کو اشارہ کیا اور وہ اٹھ کر اندر چلا گیا۔ چند لمحے بعد وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں اسٹیل کا ایک بڑا سا' چمکتا ہوا چاپر تھا۔ وہ ایک دراز قد اور توانا نوجوان تھا۔ اس کے کرخت اور کھردرے چہرے پر کچھ ایسے ہی تاثرات تھے جیسے وہ میرے ٹکڑے کرنے کے تصور سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ اس کی شفاف نیلی آنکھوں میں بلا کی سفاکی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اسٹیج نما حصے پر چڑھ کر میرے قریب آتا' ایک پستہ قد سفید فام ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے چلا اٹھا "وہ کیا ہے؟"

سب نے بیک وقت گردنیں گھما کر اس طرف دیکھا جدھر پستہ قد نے اشارہ کیا تھا۔ مجھے امید کی ایک کرن نظر آئی کہ شاید شفیع شاہ ٹرالر لے کر آرہا تھا لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا' کیا وہ اتنا احمق ہو سکتا تھا کہ لائٹس وغیرہ آن رکھتے ہوئے اس بوٹ کے قریب آنے کی کوشش کرتا؟ مجھے امید نہیں تھی کہ وہ کسی زعم یا لاعلمی میں بھی ایسی حرکت کر سکتا تھا۔ یہ دلیری مہنگی پڑ سکتی تھی۔ بوٹ کے ایک حصے میں دونوں طرف دو راکٹ لانچر تو مجھے نظر آرہے تھے۔ دوسرے حصے میں کیا کچھ انتظامات تھے' ان کے بارے میں' میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ شفیع شاہ اور اس کے ساتھی اگر صحیح طور پر مسلح نہ ہوتے اور بھرپور انداز میں "پرنس" پر حملہ آور نہ ہوتے تو ٹرالر کو غرق کرنے کے لئے دو راکٹ لانچر ہی کافی تھے۔

سفید فاموں کی توجہ میری طرف سے ہٹی تو میں نے بھی گردن گھما کر اس طرف دیکھا جس طرف پستہ قد نے اشارہ کیا تھا۔ تیز روشنیوں کے ساتھ کوئی چیز تیزی سے بوٹ کے تعاقب میں آرہی تھی۔ ہیولے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی بحری جہاز تھا۔ اس کے عرشے پر سرچ لائٹس نصب تھیں اور ایک طاقتور بیضوی لائٹ' فلیشر کے انداز میں گردش کر رہی تھی۔

تمام سفید فام مضطربانہ انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ مسٹر ڈی گھُٹے گھُٹے سے انداز میں چیخا "یہ تو کوسٹ گارڈ کا جہاز ہے!"

ایک اور سفید فام چیخا "کیا ہمارے بارے میں مخبری ہو گئی ہے؟"

کسی کے پاس اس کے سوال کا جواب نہیں تھا۔ مسٹر ڈی نے ایک سفید فام کو حکم دیا "کیپٹن سے کہو کہ تمام لائٹس بجھا دے اور بوٹ کی رفتار جتنی بڑھا سکتا ہے' بڑھا دے۔"

وہ سفید فام دوڑتا ہوا کیبن کے گرد گھوم کر وہیل روم کی طرف چلا گیا۔ ایک ادھیڑ عمر سفید فام نے مسٹر ڈی کو مخاطب کیا۔ "ہمیں راکٹ فائر کرنے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔"

ڈی ایک لمحے سوچ کر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ہمیں کوسٹ گارڈ سے تصادم مول نہیں لینا چاہئے۔ یہاں سے چند میل

دور ایکسرسائز کے لئے نکلے ہوئے نیوی کے جہاز لنگر انداز ہیں۔ اگر سمندر میں ہنگامہ ہوا تو ہمارا سفر خطرے میں پڑ جائے گا۔ ہمیں خاموشی سے فرار ہونے کی کوشش کرنی چاہئے۔ کوسٹ گارڈ کے جہاز پر ویسے بھی تباہ کن گنیں موجود ہوں گی۔"

اس دوران تمام لائٹس آف ہوگئیں اور بوٹ نے جھرجھری سی لے کر گویا ایک نئی طاقت کے ساتھ سفر شروع کیا۔ اس کی رفتار چند سیکنڈ میں ہی تقریباً دگنی ہوگئی۔

بوٹ کے پچھلے حصے میں بھی گو کہ اندھیرا ہوگیا تھا لیکن میں ان لوگوں کو ہیولوں کی سی صورت میں دیکھ سکتا تھا۔ اس اندھیرے میں انجن کی خفیف سی گھرگھراہٹ کے دوران مسٹرڈی کی آواز ابھری۔ "البرٹ! اب ہم افضل چوہدری کے ٹکڑے کرنے کے متحمل تو نہیں ہوسکتے۔ تم صرف اس کی گردن تن سے جدا کرکے اسے سمندر میں پھینک دو۔ کوشش کرنا کہ بوٹ میں زیادہ خون نہ پھیلنے پائے۔ جتنا پھیلے' اسے بھی فوراً صاف کردینا۔ بوٹ میں اس شخص کی موجودگی کی کوئی نشانی باقی نہیں رہنی چاہئے۔"

دراز قد نوجوان چاپر لئے اچھل کر اسٹیج نما حصے پر چڑھ آیا۔ میں نے ملگجے اندھیرے میں بھی چاپر کی جھلملاہٹ محسوس کی لیکن اس سے پہلے کہ وہ میرے قریب پہنچتا' میں لڑھک کر بوٹ کی بغلی دیوار تک پہنچا اور دونوں ہاتھوں سے دیوار کو تھام کر اس کے اوپر سے ہوتا ہوا سمندر میں جاگرا۔

وہ فاصلہ بہ مشکل دو فٹ تھا جو میں نے لڑھک کر طے کیا تھا اور اسٹیج نما حصے سے وہ دیوار تقریباً ایک فٹ اونچی تھی جسے میں نے نہ جانے کس طرح پھلانگا تھا۔ میں اس کام میں خاطر خواہ پھرتی دکھانے میں کامیاب ہوگیا تھا اور چاپر والا نوجوان مجھے روک نہیں سکا تھا۔

اتنی دیر میں میرے جسم میں بس اتنی ہی جان آسکی تھی کہ میں یہ کام کر گزرا تھا۔ پانی میں گرتے ہی مجھے احساس ہوا کہ مجھ میں مزید کچھ کرنے کی سکت نہیں تھی۔ تیرنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ مجھے پہلے بھی اندیشہ تو تھا کہ شاید میں لڑھک کر پانی میں گرنے کے بعد ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکوں لیکن ایک موہوم سی امید کے سہارے میں نے وہاں پڑے پڑے چاپر سے گردن کٹوانے کی نسبت سمندر میں گرجانا بہتر سمجھا تھا خواہ ڈوب جانا ہی میرا مقدر ہوتا۔

پانی میں ہاتھ پاؤں ہلانا کچھ اور مشکل ہوتا ہے۔ میں نے بوٹ سے گرنے کے بعد فوری طور پر ہاتھ پاؤں ہلانے کی کوشش بھی نہیں کی۔ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ سطح آب سے کافی نیچے چلا جاؤں تاکہ اگر بوٹ سے مجھ پر فائر وغیرہ کیا جائے تو مجھے گولی لگنے کا کم سے کم امکان ہو۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ میں تو کچھ زیادہ ہی نیچے جارہا تھا۔ مجھے امید تھی کہ اس دوران بوٹ اپنی تیز رفتاری کے باعث کافی آگے نکل گئی ہوگی اس لئے میں نے ہاتھ پاؤں مار کر ذرا اوپر آنے کی کوشش کی۔ میرے ہاتھ پیروں نے معمولی سی حرکت کی لیکن یہ

حرکت مجھے اوپر لانے کے لئے تو کیا' ایک مقام پر رکھنے کے لئے ناکافی تھی۔ میں بدستور کسی ٹھوس مجسمے کی طرح نیچے ہی نیچے جا رہا تھا۔

جسم تو تاریک سمندر کی گہرائیوں میں اتر ہی رہا تھا' میرے ذہن پر بھی مایوسی کی دھند چھانے لگی۔ مجھے اپنا سانس روکنے میں بھی کچھ دشواری محسوس ہورہی تھی۔ جس دوا کا انجکشن مجھے دیا گیا تھا وہ یقیناً خاصی خطرناک تھی۔

میں اس تاریکی میں کہیں موت کی آہٹ سن رہا تھا۔ جس طرح شمع بجھنے سے پہلے بھڑکتی ہے' اس طرح مجھے بھی یکبارگی جوش سا آیا۔ مجھ میں توانائی کی جو رمق سی موجود تھی میں نے اسے کام میں لانے کی کوشش کی اور ایک عزم نو کے ساتھ ہاتھ پاؤں چلانے کی کوشش کی کہ کسی طرح نیچے جانے کے بجائے اوپر جاسکوں۔

میری اس جدوجہد کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ پانی میں معمولی ہلچل پیدا ہوئی اور میری نیچے جانے کی رفتار جو پہلے ہی قدرتی طور پر کچھ کم ہوچکی تھی' مزید کم ہوگئی۔ چند لمحے بعد میں ایک جگہ ساکت سا ہوگیا۔ میں اپنے جسم پر کچھ چیزوں کا لمس محسوس کررہا تھا۔ وہ مچھلیاں اور دوسری آبی مخلوقات تھیں جو مجھ سے ٹکرا رہی تھیں یا پھر شاید فی الحال صرف سونگھ رہی تھیں کہ اگر اس مخلوق نے مزاحمت نہ کی تو رات کے کھانے کے لئے مناسب رہے گی۔ انہیں معلوم ہوجاتا کہ مجھ میں مزاحمت کی جان نہیں تھی تو شاید ڈنر کا پروگرام کچھ جلدی ہی بنالیتیں۔

جب میرا نیچے جانے کا عمل رک گیا تو مجھے گمان گزرا کہ اب سمندر مجھے دوبارہ سطح کی طرف اچھال دے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ سمندر کو بھی شاید میرے مرنے کا انتظار تھا۔ جب پھیپھڑوں اور معدے وغیرہ میں پانی اچھی طرح بھر جاتا ہے' روح قفس عنصری سے پرواز کرجاتی ہے اور لاش پھول سی جاتی ہے سمندر بھی دھرتی کے اس بوجھ کو لوٹاتا ہے۔

میرے لئے سانس کو روکنا کچھ اور دشوار ہورہا تھا۔ بجھتی شمع ذرا اور بھڑکی۔ میں نے ایک بار پھر ہاتھ پاؤں چلائے۔ اس بار ہاتھ پیروں کو زیادہ تیزی سے حرکت دینے میں کامیاب ہوگیا لیکن شاید یہ میری جدوجہد نہیں تھی بلکہ دام مرگ میں پھنسا ہوا پرندہ بے بسی سے پھڑک رہا تھا۔

اچانک میرا ہاتھ کسی چیز سے ٹکرایا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ انسانی بازو تھا۔ اس لمحے میرا اپنے آپ پر ہنسنے کو جی چاہا۔ میرا خیال تھا کہ صرف صحرا ہی انسان کو سراب میں مبتلا کرتا ہے۔ پیاس سے مرتے ہوئے انسان کو لالچ دیتا ہے کہ کچھ آگے پانی ہے لیکن اب معلوم ہوا کہ سراب سمندروں میں بھی ہوتے ہیں۔ ڈوبتے ہوئے انسان کو گمان گزرتا ہے کہ اس کے قریب کوئی بازو حرکت کررہا ہے۔ شاید ہر ڈوبتے ہوئے انسان کو مرنے سے پہلے یہی دھوکا ہوتا ہو۔

دوسرے ہی لمحے مجھے احساس ہوا کہ شاید وہ دھوکا

کیونکہ جونہی میرا ہاتھ اس بازو سے ٹکرایا' وہ تیزی سے لہرایا جیسے اس سیال اندھیرے میں مجھے تلاش کررہا ہو۔ پھر میرا ہاتھ اس ہاتھ سے ٹکرایا اور اس نے یکدم میرے ہاتھ کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

تب مجھے احساس ہوا کہ وہ سیال اور سفاک اندھیرا جو مجھے نگل جانے کے لئے بے تاب تھا' میں اس میں اکیلا نہیں تھا۔ میرے قریب ہی ایک اور انسانی جسم بھی موجود تھا جس نے گویا مجھے "دریافت" کرلیا تھا اور اس کے ساتھ ہی وہ مچھلی کی طرح پھڑک اٹھا تھا۔

وہ جو کوئی بھی تھا اس نے مجھے گرفت میں لینے کی کوشش نہیں کی۔ صرف میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر لے جانے لگا۔ ڈوبتے انسان کو بچانے والے کے لئے سب سے بڑا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ ڈوبتا ہوا شخص اسے بُری طرح چمٹ جاتا ہے اور یوں بعض اوقات اپنے ساتھ اسے بھی لے ڈوبتا ہے۔ لیکن میں اس وقت غیر ارادی طور پر بھی ایسا نہیں کرسکتا تھا کیونکہ مجھ میں اتنی سکت ہی نہیں تھی اگر مجھ میں سکت ہوتی تو میں ڈوب نہ رہا ہوتا۔

میرے دھندلاتے ہوئے ذہن میں ایک لمحے کے لئے اس اندیشے نے بھی سر ابھارا کہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے اوپر لے جانے کی کوشش کرنے والا کہیں کوئی سفید فام ہی تو نہیں تھا جس نے مجھے سمندر میں لڑھکتے دیکھ کر میرے تعاقب میں چھلانگ لگادی تھی؟ وہ لوگ جس طرح میرے خون کے پیاسے تھے اور جس طرح مجھے عبرت ناک انجام سے دوچار کرنے کے جنون میں مبتلا تھے' اس کے پیش نظر تو یہ بھی کچھ بعید نہیں تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ کوسٹ گارڈ کے جہاز کو دیکھنے کے بعد وہ کچھ نہ کچھ بدحواس ضرور ہوگئے تھے۔ انہوں نے بوٹ کی رفتار بھی حتی الامکان بڑھوائی تھی اور لائٹس بھی آف کرادی تھیں۔ وہ ہر حال میں جہاز کو ڈاج دے کر نکل جانے کی فکر میں تھے۔ ان میں سے کوئی بھی میرے چکر میں الجھ کر وہیں سمندر میں غوطہ کھاتے رہنے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی انہیں یہ تو یقین ہوگا کہ سمندر میں لڑھکنے کے بعد بھی مجھ میں جان بچانے کی سکت تو نہیں تھی' ڈوبنے کے سوا میں کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ اس صورت میں انہیں بڑی طرف سے صبر آجانا چاہئے تھا۔ مقصد تو مجھے ہلاک کرنا ہی تھا۔

اس کا مطلب تھا کہ میری تلاش میں سمندر کی گہرائیوں میں ڈبکیاں لگانے والا وہ شخص میرا دشمن نہیں' دوست تھا۔ شاید شفیع شاہ آخر کار میری مدد کو آن پہنچا تھا۔ تاخیر گو کہ بہت ہوچکی تھی لیکن غنیمت تھا کہ وہ آتو گیا تھا۔

شاید اُسے محض میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر لے جانے میں دقت پیش آرہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مجھے خود بھی تھوڑے بہت ہاتھ پاؤں مارنے چاہئے تھے۔ بڑی کوشش سے میں ٹانگوں کو کچھ حرکت دینے میں کامیاب ہوا۔ اس سے مجھے اوپر کھینچنے والے کو کچھ آسانی ہوگئی اور میں ذرا تیزی سے اوپر جانے لگا۔

میں نے جس وقت سطح آب سے سر ابھارا' مجھے یوں لگا کہ اگر میں مزید چند سیکنڈ پانی میں رہتا اور سانس روکے رکھتا تو میرے پھیپھڑے پھٹ جاتے۔ میں سطح آب پر کیا آیا تھا گویا پانی کی ایک گہری قبر سے برآمد ہوا تھا اور مجھے ایک نئی زندگی ملی تھی۔

چند سیکنڈ تک تو مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔ پہلے ہی کی طرح آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھایا رہا۔ صرف یہ احساس ہوا کہ میرا سر پانی سے باہر آگیا تھا۔ میرے جسم کا تمام خون گویا کنپٹیوں میں جمع ہوگیا تھا اور میرے اردگرد آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کچھ دیر تک میں دریائی گھوڑے کی طرح شُوں شُوں کرتا رہا اور ناک منہ سے پانی کے چھینٹے اُڑاتا رہا۔

مجھے اوپر لانے والے نے اب ذرا بہتر طور پر مجھے سہارا دیا ہوا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ شفیع شاہ ہی تھا۔ میں خود بھی کوشش کررہا تھا کہ سطح آب پر شفیع شاہ کا سہارا لے کر تیرتا رہوں۔ اس دوران انجن کی گھرگھراہٹ قریب آنے لگی۔ پھر ایک بڑا سا ہیولا ہمارے قریب آگیا۔ وہ ہمارا ٹرالر تھا لیکن اس کی بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔

کسی نے رسّی کی سیڑھی اور ایک فاضل رسّی نیچے پھینکی۔ شفیع شاہ نے رسّی کا پھندا میرے سینے کے گرد' بازوؤں کے نیچے پھنسا دیا۔ ایک اور شخص ٹرالر سے اتر آیا۔ ان دونوں نے سہارا دے کر مجھے ٹرالر پر چڑھایا۔ ٹرالر کی ساخت عام موٹربوٹس سے کچھ مختلف ہوتی ہے۔ میں صرف چند لمحے اس کے سائڈ بورڈ پر چت لیٹا رہا اور گہری گہری سانسیں لیتا رہا۔

شفیع شاہ اس دوران میرے ہاتھ پاؤں سہلاتا رہا اور نیچی آواز میں پوچھتا رہا "سر! آپ ٹھیک تو ہیں۔ سر! آپ ٹھیک تو ہیں؟"

وہ خود بھی ہانپ رہا تھا اور اس کے بالوں سے پانی مجھ پر ٹپک رہا تھا۔ میں خاموش چت لیٹا آسمان کو تکتا رہا جس پر کہیں کہیں کوئی تارا جھلملا رہا تھا۔ شاید یہ امید کے تارے تھے جو کچھ دیر پہلے میری نظر سے اوجھل ہوگئے تھے۔ دنیا کو دوبارہ دیکھنا کتنا بھلا لگ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں تشکر کے آنسو آگئے۔ زندگی کی قدر تو مجھے پہلے بھی تھی۔ قدم قدم پر میں نے یہی محسوس کیا تھا کہ زندگی قدرت کا ایک انمول عطیہ تھی لیکن جس وقت انسان موت کو چُھو کر واپس آتا ہے یا موت انسان کو چُھو کر پلٹ جاتی ہے تب زندگی کی قدر و قیمت زیادہ واضح ہوجاتی ہے۔ اگر شفیع شاہ کچھ دیر اور مجھے تلاش کرنے میں ناکام رہتا تو شاید تاریک سمندر کی تہ میں میری زندگی کی شام ہوجاتی۔

"سر! آپ ٹھیک تو ہیں؟" شفیع شاہ نے ایک بار پھر ایک مشفق ماں کی طرح آہستگی سے مجھے ہلاتے جُلاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے ایک عزم نو کے ساتھ جواب دیا اور اس لمحے میں نے واقعی خود کو بہت بہتر محسوس کیا۔ لمبی لمبی سانسوں کے ساتھ تازہ ہوا گویا زندگی کی پیامبر بن کر

میرے پھیپھڑوں میں داخل ہو رہی تھی اور میرے رگ و پے میں توانائی کی لہریں دوڑا رہی تھی۔ میں جس صبر آزما مرحلے سے گزرا تھا شاید اس کا مجھے یہ فائدہ بھی ہوا تھا کہ میرے جسم سے کافی تیزی سے دوا کے اثرات ختم ہو رہے تھے۔

اس دوران میں نے محسوس کیا کہ ٹرالر کی رفتار بڑھ گئی تھی۔ میں شفیع شاہ کا سہارا لے کر اٹھ بیٹھا۔ وہ زیر لب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ میں نے ذرا توجہ سے سنا تو پتا چلا کہ وہ نہایت خشوع و خضوع سے خدا کا شکر ادا کر رہا تھا۔

"ہم کہاں جا رہے ہیں شفیع شاہ؟" میں نے تاریکی میں نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"سر! ہم "پرنس" کے تعاقب میں جا رہے ہیں لیکن ہم آپ کو ڈھونڈنے میں لگ گئے تھے۔ اس لئے اس سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ مجھے امید نہیں ہے کہ ہم اسے پکڑ سکیں گے۔ ٹرالر ویسے بھی تیز رفتاری میں اس قسم کی موٹر بوٹس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔" شفیع شاہ نے جواب دیا۔

"کوسٹ گارڈ کا ایک جہاز بھی تو آتا دکھائی دیا تھا..... اس کا کیا بنا؟" میں نے نقاہت زدہ لہجے میں پوچھا۔

میں غلط سمت میں دیکھ رہا تھا۔ شفیع شاہ نے آہستگی سے مجھے دوسری طرف گھمایا۔ ادھر بہت دور کچھ روشنیاں جھلملاتی دکھائی دے رہی تھیں۔

"وہ کوسٹ گارڈ کا جہاز ہے۔" شفیع شاہ بولا "وہ بھی "پرنس" کا تعاقب کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن مجھے یقین ہے وہ بھی رفتار میں اس طاقتور فینسی اور ہلکی پھلکی موٹر بوٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ میرا اندازہ ہے کہ موٹر بوٹ اسے جل دے کر نکل چکی ہے۔"

"لیکن..... یہ کوسٹ گارڈ کا جہاز اچانک اس طرف کیسے آنکلا تھا۔ اور اسے کیسے معلوم ہوا کہ سمندر کے اس حصے میں حالات کچھ مشکوک ہیں؟" میں نے الجھن سے پوچھا۔

"یہ میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا سر!" شفیع شاہ بولا۔

میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "تم کہاں رہ گئے تھے؟ بڑی تاخیر سے میری مدد کے لئے پہنچے؟"

"ہم جب ٹرالر میں قاسم بجلی کے گھر کے عین قریب منڈلا رہے تھے تو اچانک ہی ایک دوسری موٹر بوٹ اور دو چھوٹی لانچوں نے ہمیں گھیر لیا تھا۔ ان میں قاسم بجلی کے مسلح آدمی تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ فائرنگ کے تبادلے سے ہنگامہ برپا ہو اور مزید لوگ ادھر آجائیں۔ بس وہ چند لمحے کی ہچکچاہٹ ہمارے لئے نقصان دہ ثابت ہوئی۔ انہوں نے ہمیں قابو میں کر لیا۔" وہ خاموش ہو گیا۔

"پھر کیا ہوا؟" میں اب بے تابی محسوس کر سکتا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میری حالت مزید بہتر ہو رہی تھی۔

"اسی دوران ہم نے کچھ گاڑیاں قاسم بجلی کے گھر سے نکلتے اور بوٹ ہاؤس کی طرف جاتے دیکھیں۔ بہت دیر سے آپ کے بارے میں کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا اور نہ ہی یہ پتا چل رہا تھا کہ اس گھر کے اندر کیا ہو رہا تھا۔ ہمیں یرغمال بنانے والے ہمیں کسی اور جزیرے کی طرف لے جانے کی فکر میں تھے۔ بہرحال وہ تھے قاسم بجلی ہی کے آدمی۔ میں نے محسوس کیا کہ آپ کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہو چکی تھی۔ ہم نے مواقع پاتے ہی بساط الٹ دی۔ ان میں سے دو تین آدمی مارے گئے اور باقی بھاگ گئے۔ ہم بوٹ ہاؤس کی طرف آئے تو "پرنس" وہاں سے غائب تھی۔ ہم اس کی تلاش میں ادھر ادھر بھاگے۔ ہم اس وقت اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے جس وقت دوسری طرف سے کوسٹ گارڈ کا جہاز بھی نمودار ہو چکا تھا۔ پھر "پرنس" پر لائٹس آف ہو گئیں۔ جب ہم اس کے اور قریب پہنچے تو مجھے احساس ہوا کہ بوٹ پر سے کسی کو سمندر میں پھینکا گیا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ وہ آپ تھے۔"

"تمہارے دل نے ٹھیک کہا تھا لیکن مجھے پھینکا نہیں گیا تھا۔ میں خود گرا تھا۔" میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"بہرحال... سمندر کی وسعتوں اور اس اندھیرے میں کسی بھی بات کا صحیح پتا تو چل نہیں رہا تھا۔ یہ ساری بھاگ دوڑ اور معرکہ آرائی اندازوں پر ہو رہی تھی۔ ہم نے بھی اپنی لائٹس بجھائی ہوئی تھیں۔ بہرحال میں آپ کی تلاش میں کود پڑا۔ اس اندھیرے میں آپ کو تلاش کرنا سمندر میں پھینکا جانے والا کوئی سکہ تلاش کرنے کے مترادف تھا چونکہ آپ کے ذرا بھی ہاتھ پاؤں مارنے کے آثار دکھائی نہیں دیئے تھے اس لئے طرح طرح کے وسوسے میرے دل میں آرہے تھے۔"

"میں ہاتھ پاؤں مارنے کے قابل ہی نہیں تھا۔ انہوں نے میری بے ہوشی کے دوران مجھے کسی دوا کا انجکشن لگا دیا تھا جس نے مجھے ابھی تک ناکارہ بنا رکھا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

"اوہ.....!" شفیع شاہ گہری سانس لے کر رہ گیا "میں سمجھ رہا تھا کہ اگر سمندر میں گرنے والے آپ ہی ہیں تو آپ یقیناً کم از کم بے ہوش تو ضرور ہیں یا پھر شاید آپ کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں یا پھر....."

"یا پھر مجھے ہلاک کرنے کے بعد سمندر میں پھینکا گیا ہے۔" میں نے جملہ مکمل کیا۔ وہ خاموش رہا تو میں نے کہا "اس میں بس بال برابر کسر رہ گئی تھی ورنہ تمہیں میرا دھڑ کہیں اور، سر کہیں اور تلاش کرنا پڑتا۔ شاید دونوں ہی چیزیں تمہیں نہ ملتیں۔"

"ایسی بدفال منہ سے نہ نکالیں۔" شفیع شاہ دور جھلملاتی متحرک روشنیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ خنک ہوا ہمارے بھیگے جسموں میں پھریریاں دوڑاتی گزر رہی تھی۔ ہوائی شائیں شائیں اور انجن کی گھرگھراہٹ کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد شفیع شاہ بولا "لگتا ہے کوسٹ گارڈ کا جہاز "پرنس" کا سراغ کھو بیٹھا ہے اور اندھیرے میں ادھر ادھر ناک ٹوئیاں مار رہا ہے۔ جبکہ ہم تو اس سے بھی بہت پیچھے

ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے وہ لوگ نکل جائیں گے!" میرے حلق سے بے اختیار کراہ سی نکل گئی۔

"سر! آپ چاہتے ہیں وہ بھاگنے نہ پائیں؟" شفیع شاہ نے گویا تصدیق چاہی۔

"ظاہر ہے' اس کے علاوہ میں کیا چاہوں گا؟ ساری تکلیف اس لئے تو نہیں اٹھائی تھی کہ آخر میں یہ لوگ اطمینان سے رخصت ہو جائیں۔" مجھے اپنی بے بسی پر جھنجلاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

"سر! وہ لوگ اب زندہ تو ہاتھ نہیں آسکتے۔ آپ اجازت دیں تو انہیں اگلے جہاں پہنچایا جاسکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"سر! میں نے ایک کام آپ کی اجازت کے بغیر ہی کر ڈالا تھا۔ آپ سے اجازت لینے یا مشورہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔ آپ صرف یہ بتائیں کیا اُن کے بھاگ جانے کی نسبت اُن کا مرجانا بہتر نہیں ہے؟"

"یقیناً بہتر ہے۔"

"بس تو پھر ٹھیک ہے۔" شفیع شاہ نے چوبی نشست کے نیچے سے سیاہ رنگ کا ایک ریڈیو سا نکالا۔ اس کے ایک کونے سے اس نے کھینچ کر ایریل نکالا اور اسے ہوا میں بلند کرتے ہوئے ایک بٹن دبا دیا۔

بہت دور کہیں سے دھماکے کی ہلکی سی آواز سنائی دی۔ دھماکا یقیناً زوردار رہا ہوگا لیکن ہم تک اس کی آواز بہت ہلکی پہنچی تھی۔ فاصلہ بہت زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ میں نے تاریکی میں چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک جگہ مجھے پھلجھڑیاں سی چھوٹتی دکھائی دیں۔ پھر ننھے ننھے شعلوں کے بالائی سرے لہراتے دکھائی دیئے۔

بچپن میں جغرافیے میں زمین گول ہونے کے کچھ ثبوت پڑھے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ سمندر میں دور کی چیزوں کے صرف بالائی حصے دکھائی دیتے ہیں۔ اس وقت شاید یہی ہو رہا تھا۔ ہمیں منظر پورا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے شفیع شاہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "کیا تم نے "پرنس" کے کسی حصے میں ریڈیو کنٹرولڈ تارپیڈو فٹ کر دیا تھا؟"

"جی ہاں" شفیع شاہ نے آہستگی سے جواب دیا "مجھے ایک مناسب موقع نظر آگیا تھا۔ یہ قاسم بجلی کے آدمیوں کے ہتھے چڑھنے سے کچھ ہی دیر پہلے کی بات ہے۔ میں نے سوچا حفظِ ماتقدم کے طور پر کچھ کر دینا چاہئے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ یہ بوٹ کسی ایسے کام میں استعمال ہوگی جسے ہم ہوتے دیکھنا نہیں چاہیں گے لیکن شاید ہم اسے روکنے کی پوزیشن میں نہ ہوں۔ حالات نے ثابت کر دیا کہ میرا اندیشہ درست ہی تھا۔"

"چنانچہ تم نے موٹر بوٹ کو اس ریڈیو کنٹرولڈ تارپیڈو سے اُڑا دیا؟" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"آپ دیکھ رہے تھے سر کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا" شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"میرا خیال ہے بوٹ کے ساتھ ان سب لوگوں کے بھی پر اُڑ گئے ہوں گے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں' زیادہ امکان تو یہی ہے۔" شفیع شاہ نے جواب دیا! کچھ ٹیکنیکل اصطلاحیں استعمال کرنے کے بعد بولا "یہ تارپیڈو اوسط درجے کے ایک بحری جہاز کے پرخچے اڑا دینے کے لئے کافی تھا۔ تارپیڈو عام طور پر صرف بحری جہازوں کے پیندے میں سوراخ کرنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں لیکن یہ بہت مختلف قسم کا تارپیڈو تھا۔"

"تم لوگ اب مجھ سے بالا ہی بالا کام کرنے لگے ہو۔ باغی ہوتے جا رہے ہو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کچھ کچھ دہشت گرد بھی معلوم ہونے لگے ہو۔"

شفیع شاہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "سر! ان لوگوں سے دوسرے طریقوں سے کہاں نمٹا جاسکتا ہے۔" پھر اس نے سنجیدگی سے پوچھا "سر! آپ ناراض تو نہیں ہیں نا؟"

"تم ناراضگی کی بات کر رہے ہو شفیع شاہ.....!" میں نے آہ بھر کر کہا "مجھے تو افسوس ہو رہا ہے کہ یہ نیک کام میں اپنے ہاتھ سے کیوں نہیں کر سکا۔ یہ تو ہمارے غیر ملکی دشمن تھے۔ خود ہمارے اپنے بہت سے ہم وطن ایسے ہیں جن کے بارے میں میرا دل چاہتا ہے کہ انہیں کسی بہت بڑے بحری جہاز میں بھر کر سمندر میں کہیں بہت دور لے جا کر اس جہاز کو اسی طرح کسی بہت طاقتور ڈائنامیٹ سے اُڑا دوں اور اوپر سے احتیاطاً کسی ایسی دوا کا اسپرے بھی کرا دوں جس سے ان کے جراثیم دوبارہ ہمارے ملک تک نہ پہنچ سکیں۔ لیکن کیا کروں' ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے۔ تم نے جو کچھ کیا' اچھا کیا۔ کسی حد تک تو قصہ پاک ہوا۔"

دور جھلملاتی روشنیوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ کوسٹ گارڈ کا جہاز اب تک "پرنس" کے تعاقب میں غلط سمت میں سفر کر رہا تھا۔ اب جہاز پر موجود لوگوں نے شاید بہتر طور پر دھماکا سن لیا تھا اور بوٹ کے پرخچے اُڑنے کا منظر بھی دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ ہماری نسبت پھر بھی اس مقام سے زیادہ قریب تھے۔ اب جہاز کا رخ اسی طرف ہو گیا تھا جہاں پانی کی سطح پر کچھ شعلے رقصاں دکھائی دے رہے تھے۔ یہ پانی کے سینے پر آگ کا رقص تھا۔ ہمارا لانچ بھی حتی الامکان تیز رفتاری سے اس سمت میں رواں تھا۔

"کہیں یہ کوسٹ گارڈ کا جہاز بھی تمہاری ہی وجہ سے تو نہیں آیا ہے؟" میں نے اب ذرا سیدھا کھڑا ہوتے ہوئے شفیع شاہ کو اندھیرے میں گھورا۔ اب میں اپنے آپ کو اس قابل محسوس کر رہا تھا کہ اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکوں۔

"نہیں سر! اس جہاز پر آپ کو کچھ ایسے لوگ ملیں گے جنہیں دیکھ کر آپ حیران رہ جائیں گے۔"

"مثلاً؟"

"آہ..... اب مجھے زبان کھولنا ہی پڑے گی۔" شفیع شاہ کراہ کر بولا۔

"آپ سے بالا بالا تھوڑا سا کام راحیلہ نے بھی کیا ہے سر! وہ آج صبح کراچی پہنچ چکی تھی۔"

"اوہ!" میں نے گویا تکلیف کے عالم میں کہا "تم سب اب باغی ہوتے جا رہے ہو۔ میں "دی سرکل" کو توڑ دوں گا۔ جس کے جو دل میں آئے کرتے پھرنا۔"

شفیع شاہ میری مصنوعی خفگی سے متاثر ہونے کے بجائے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "سر! اپنا جھوٹ موٹ کا غصہ ذرا بچا کر رکھیے۔ ابھی تو میں آپ کو ایک اور "سونے پر سہاگا" قسم کی خبر سنانے والا ہوں۔"

"وہ کیا؟" میں نے گویا سہم کر پوچھا۔

"اس کے ساتھ نفیس صاحب بھی ہیں۔ راحیلہ اکیلی نہیں آئی ہے۔"

"مروا دیا۔" میں کراہ کر دوبارہ سائڈ بورڈ پر بیٹھ گیا گویا میری ٹانگوں سے جان نکل گئی ہو۔ میں صرف ایکٹنگ ہی نہیں کر رہا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ اس اطلاع سے مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

شفیع شاہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "کوسٹ گارڈ کے جہاز پر کوسٹ گارڈز والوں کے ساتھ دراصل راحیلہ اور نفیس صاحب ہی موجود ہیں۔ ممکن ہے نفیس صاحب کے ساتھ ان کے اپنے بھی کچھ آدمی موجود ہوں۔"

"راحیلہ کو تم نے بلوایا ہے؟" میں نے شفیع شاہ کو گھورا۔

"نہیں سر! مجھے تو اس کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ خود ہی آئی ہے۔ اسے تو معلوم ہی تھا کہ آپ اس جزیرے پر قاسم بجلی کے ہاں آرہے ہیں۔"

"اور وہ یہ بات نفیس صاحب کو بتائے بغیر نہیں رہ سکی۔" میں نے مصنوعی تاسف سے کہا "حالانکہ میں اپنی دانست میں نفیس صاحب سے چھپ کر اور بہانہ بنا کر یہاں آیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے راحیلہ اب کوئی بات ان حضرت کو بتائے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔"

"چلیں کوئی حرج نہیں سر! ان سے ہمیں کوئی مدد ہی ملتی ہے۔ ہماری طاقت ہی بڑھتی ہے۔" شفیع شاہ نے خوش دلی سے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"نفیس صاحب کے پاس کچھ زیادہ ہی پاور ہے پیارے! ہم جیسے چھوٹے موٹے لوگوں کو تو ان سے مدد لینا بھی مہنگا پڑتا ہے۔ ہم لوگ خاموشی سے اپنا کام کر گزرنے کے عادی ہیں۔ وہ دھوم دھڑکے سے آتے ہیں۔ اب یہی دیکھ لو۔ کوسٹ گارڈ کا جہاز لئے چلے آرہے ہیں۔ شکر ہے پورا بحری بیڑا لے کر نہیں آگئے۔"

"ان کی آمد سے فائدہ تو ہوا ہے سر!" شفیع شاہ مجھے قائل کرنے پر تلا ہوا تھا "انہی کی وجہ سے تو ریڈ ڈاٹ والوں نے تصادم مول لئے بغیر عجلت اور خاموشی سے نکل جانے کا فیصلہ کیا ورنہ جس طرح مجھے موقع پر پہنچنے میں تاخیر ہو گئی تھی' اگر وہ بھی نہ نمودار ہوتے تو ریڈ ڈاٹ والے تو آپ کی تکا بوٹی کر دیتے۔"

"لیکن اب بھی ریڈ ڈاٹ والوں کا صفایا تمہاری ہی کوششوں اور پیش بندی سے ہوا۔ اگر تم نے "پرنس" کے ساتھ محض احتیاطاً تارپیڈو فٹ نہ کیا ہوتا تو ہم سب ان کی تلاش میں ٹامک ٹوئیاں مارتے رہتے اور وہ صاف نکل جاتے۔" میں نے کہا۔

"چلیں' اسی طرح کام ہو جاتا ہے۔ کچھ فائدہ ہمیں نفیس صاحب کی طرف سے پہنچ جاتا ہے۔ کچھ کام ہم خود کر لیتے ہیں۔ اب تو مجھے حوصلہ ہونے لگا ہے کہ ہمارا یہ چھوٹا سا دوستوں اور خیر خواہوں کا گروپ "دی سرکل" بہت بڑے بڑے کام سرانجام دے سکتا ہے۔" شفیع شاہ بولا۔

"لگتا ہے تم لوگوں کی وجہ سے مجھے بھی نفیس صاحب کو برداشت کرنا پڑا کرے گا۔ میرے ساتھیوں میں ان کی لابی مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔" میں نے غم ناک لہجے میں کہا۔

شفیع شاہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا "سر! یہ تو ہماری خوش قسمتی ہے کہ ان جیسے آدمی کے ساتھ ہمارے ایسے تعلقات ہو گئے ہیں کہ وہ ہر مرحلے پر خود ہمارے شانہ بہ شانہ کھڑے ہونے کے لئے چلے آتے ہیں ورنہ ان کے تو محض ایک ٹیلی فون پر نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ اور ان کی صرف ایک نظرِ کرم کے لئے نہ جانے کیسے کیسے لوگ کیا کیا جتن کرتے ہیں۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے ان کا جغرافیہ مت بتاؤ۔ کسی زمانے میں' میں نے ان کے ساتھ بہت مغز ماری کی ہے۔ جب تک وہ ہم پر مہربان ہوئے تب تک ہمارا ملیدہ بن گیا۔" میں نے اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

شفیع شاہ مجھے سہارا دیتے ہوئے بولا "اب آپ کیسا محسوس کر رہے ہیں؟"

"کئی ماہ کا بیمار۔" میں نے جواب دیا "لیکن پھر بھی پہلے سے بہت بہتر ہوں۔ جب میں "پرنس" پر تھا اس وقت تو یہی محسوس ہو رہا تھا جیسے میرا انتقال پُرملال ہو چکا ہے لیکن کسی نامعلوم وجہ کے تحت ذہن کسی حد تک کام کئے جا رہا ہے۔"

"اگر آپ چاہیں تو میں آپ کو اندر لے چلوں۔ آپ آرام سے لیٹ جایئے۔"

"یہ لیٹنے کا وقت نہیں ہے پیارے!" میں نے صحیح طور پر کھڑا ہوتے ہوئے کہا "یہ خوش کن نظارہ دیکھنے کے لئے تو شاید میں بسترِ مرگ سے بھی اٹھ کھڑا ہوتا کہ بیک وقت ریڈ ڈاٹ کے سات خاص آدمی جہنم رسید ہو گئے ہیں۔"

"کیا ان لوگوں میں ڈاکٹر برنارڈ بھی شامل تھا؟" شفیع نے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا "قدرت شاید ہماری مزید مدد کرنا چاہتی ہو۔ شاید وہ ابھی ملک میں ہی موجود ہو۔ اگر وہ بھی اس بوٹ

میں ہوتا اور اس کے بھی پرخچے اڑ جاتے تو شاید مجھے زندگی بھر پچھتاوا رہتا۔ اب ایک آس رہے گی کہ وہ کبھی نہ کبھی ہاتھ لگ سکتا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے اس پُراسرار سی لڑکی کے بارے میں بھی تجسس رہے گا جس کی آنکھیں آسیبی قسم کی ہیں۔ معلوم نہیں وہ کون ہے اور کہاں غائب ہے۔ ریڈ ڈاٹ کے جن لوگوں کے بارے میں ہمیں علم تھا' ان میں سے اب صرف یہ دو ہی باقی رہ گئے ہیں جو ابھی ہمارے ہتھے نہیں چڑھے۔ اگر یہ دونوں بھی اپنے انجام کو پہنچ جائیں تو شاید ہم یہ کہہ سکیں کہ ریڈ ڈاٹ کا قلع قمع ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر برنارڈ کو انجام تک پہنچانے سے پہلے اس سے راحیلہ کا چہرہ بھی ٹھیک کرانا ہو گا۔"

اس دوران ہم اس مقام کے قریب پہنچ چکے تھے جہاں "پرنس" دھماکے سے تباہ ہوئی تھی۔ وہاں ابھی تک سمندر کے سینے پر شعلوں کا رقص جاری تھا۔ وہ بڑا ہی عجیب سماں تھا۔ واقعی ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سمندر میں آگ لگی ہوئی تھی۔ پانی سے شعلے اٹھ رہے تھے۔

دراصل پانی کی سطح پر بہت سا تیل پھیل گیا تھا جس نے آگ پکڑلی تھی۔ اس کے علاوہ بوٹ کے بعض ٹکڑوں میں بھی آگ لگی ہوئی تھی جو ابھی تک اِدھر اُدھر تیر رہے تھے۔ ان میں سے کچھ کے ساتھ شاید انسانی گوشت کے لوتھڑے بھی چپکے ہوئے تھے جو کوئلہ ہو چکے تھے اور فضا میں گوشت جلنے کی بُو بھی پھیلی ہوئی تھی۔

کوسٹ گارڈ کا جہاز ہم سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔ اس کا انجن بند تھا اور وہ ایک بہت بڑے دائرے میں اس جگہ کے گرد آہستگی سے گھوم رہا تھا جس میں بوٹ اور اس کے مسافروں کی باقیات تیر رہی تھیں۔ کوسٹ گارڈ کے جہاز کا کیپٹن غالباً محتاط تھا کہ وہ کسی شعلے کے قریب نہ آئے۔ مبادا جہاز کا کوئی حصہ آگ نہ پکڑ لے۔ تاہم جہاز کی سرچ لائٹس اب اس حصے پر مرکوز کر دی گئی تھیں اور کچھ شعلوں کی روشنی بھی تھی۔ ہر چیز صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ہمارے ٹرالر کا انجن بھی بند ہو چکا تھا۔

اس تیز روشنی میں' میں نے ایک عجیب ہی نظارہ دیکھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ رہا۔ مجھے یہی لگا کہ کوئی لاشعوری سی خواہش سراب کا لبادہ اوڑھ کر میری تھکی تھکی سی نظروں سے مذاق کر رہی تھی۔ میں نے آنکھیں مل کر دیکھا اور مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ میری نظر کا دھوکا نہیں تھا۔

ٹوٹا پھوٹا ایک خاصا بڑا تختہ پانی کی لہروں پر دھیرے دھیرے ہلکورے لیتا اِدھر اُدھر چکرا رہا تھا۔ اس پر گول سی کوئی چیز رکھی تھی۔ میرے دیکھتے ہی دیکھتے وہ تختہ گھوم گیا تب مجھے معلوم ہوا کہ وہ گول سی چیز کیا تھی۔ وہ مسٹر ڈی کا کٹا ہوا سر تھا۔

وہی مسٹر ڈی جنہوں نے میرے اعضا ایک ایک کر کے کاٹنے اور سمندر میں پھینکنے کا حکم دیا تھا۔ پھر جب بھگدڑ پڑی تھی تو انہوں نے چار پر سے صرف میری گردن قلم کرانے پر اکتفا کر لیا تھا۔ اس وقت بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جلاد کے فرائض انجام دینے والے نوجوان نے غلطی سے میرے بجائے ان کا سر قلم کر کے نہایت احتیاط سے تختے پر رکھ کر لہروں کے حوالے کر دیا تھا۔ میں دم بخود سا ہو کر رہ گیا۔ کئی لمحے تک مجھے کسی اور طرف دیکھنے کا خیال ہی نہ آیا۔

آخر کار تختہ لہروں کے دوش پر ایک بار پھر گھوم گیا اور مسٹر ڈی نے گویا میری طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس کے بعد بھی چند سیکنڈ تک اس کا چہرہ میری نظروں میں گھومتا رہا۔ اس کے چہرے پر خون اور تیل کے کچھ دھبے تھے' بال الجھے ہوئے تھے۔ سب سے عجیب وہ دہشت تھی جو شاید زندگی کے آخری لمحے میں اس کے چہرے پر منجمد ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور انہی پھٹی پھٹی سی آنکھوں سے گویا اب وہ بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید بعد از مرگ بھی وہ حیرت میں مبتلا تھا کہ یہ کیا تماشا تھا' کیا الٹ پھیر ہو گیا تھا کہ اس نے تو میری گردن قلم کرنے کا حکم دیا تھا' یہ اس کا اپنا سر تن سے جدا ہو کر کہاں تیرتا پھر رہا تھا؟

چند لمحے بعد میں جھرجھری سی لے کر چونکا۔ مجھے احساس ہوا کہ اب تو وہ چہرہ میری طرف نہیں تھا۔ اب میں صرف مسٹر ڈی کے سر کا پچھلا حصہ دیکھ سکتا تھا۔ جس میں شاید لوہے کا کوئی ٹکڑا پیوست تھا۔ میں نے اس سے نظر ہٹالی۔

کوسٹ گارڈ کا جہاز زیادہ بڑا نہیں تھا۔ اس کے عرشے پر مشین گنیں فٹ تھیں۔ جہاز اور ہمارا ٹرالر ایک دوسرے سے کافی دور رہتے ہوئے نیم دائرے میں ایک دوسرے کی مخالف سمت میں جا رہے تھے۔ یوں دونوں ایک دوسرے کے آگے پیچھے دائرے میں گھوم سکتے تھے۔ اب انجن اسٹارٹ کر لئے گئے تھے تاکہ پانی کا بہاؤ انہیں اِدھر اُدھر نہ لے جائے۔ میں نے دیکھا جہاز کی ریلنگ کے عقب میں کئی افراد کھڑے تھے۔ ان میں سے دو ہماری طرف دیکھ کر ہاتھ ہلا رہے تھے۔

وہ راحیلہ اور نفیس صاحب تھے۔ اب ہمارے ٹرالر پر بھی لائٹس آن ہو چکی تھیں۔ راحیلہ اپنے مخصوص حلئے میں تھی یعنی اُس کا پورا چہرہ اور سر برقع کی سیاہ نقاب اور گہرے رنگ کے گلاسز میں چھپا ہوا تھا۔ اب شاید اسے رات میں بھی ڈارک گلاسز کے ساتھ کوئی مہم انجام دینے میں دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ وہ دَورِ جدید کی کوئی خاتون بحری قزاق معلوم ہو رہی تھی۔ میں نے بھی تھکے تھکے سے انداز میں ہاتھ ہلایا۔ اس نے چیخ کر کچھ کہا جو فاصلے اور انجنوں کی گھڑگھڑاہٹ کی وجہ سے میری سمجھ میں نہیں آیا۔

تب نفیس صاحب گویا کچھ اٹھانے کے لئے جھکے۔ جب وہ دوبارہ سیدھے ہوئے تو ان کے ہاتھ میں ایک میگا فون تھا۔ وہ میگافون پر بولے "اب یہاں کچھ نہیں رکھا۔ قاسم بجلی کے گھر کی طرف واپس چلو۔ وہیں بات کریں گے۔"

شفیع شاہ نے اپنے کیپٹن کو اس ہدایت پر عمل کرنے کا حکم دیا اور ٹرالر مزید تھوڑا سا گھوم کر واپس روانہ ہو گیا۔ کوسٹ گارڈ کا جہاز اب ہمارے پیچھے آ رہا تھا۔

چند لمحے کی خاموشی کے بعد شفیع شاہ بولا "مجھے تو کچھ یوں لگ رہا ہے کہ ریڈ ڈاٹ والا باب بند ہو گیا ہے۔ ان لوگوں کا بیک وقت مارے جانا اس تنظیم کی شہ رگ کٹ جانے کے مترادف ہے۔ بیشتر لوگ پہلے ہی مارے جا چکے ہیں۔ ان کے اڈے بھی تباہ ہو چکے ہیں۔"

"بظاہر تو یہی لگ رہا ہے کہ ریڈ ڈاٹ والا باب بند ہو گیا ہے لیکن میں اس سلسلے میں زیادہ پُر یقین نہیں ہوں۔ مہلک بیماریوں کا زبردست علاج کرنے کے بعد لگتا تو یہی ہے کہ مکمل علاج ہو گیا ہے لیکن اس بیماری کے چند جراثیم بھی باقی رہ جائیں تو بیماری کسی وقت بھی عود کر آ سکتی ہے۔ یہی معاملہ اس طرح کی بہت بڑی' بہت طاقتور اور بین الاقوامی سازشی یا دہشت گرد تنظیموں کا ہوتا ہے۔ ان کے تھوڑے سے جراثیم باقی رہ جائیں اور جب تک ان کی اصل جڑ ختم نہ ہو تب تک ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں ان سے نجات مل گئی ہے۔"

شفیع شاہ پُرخیال انداز میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "بہرحال ہمارے لئے تو یہی بڑا اعزاز ہے کہ ہم نے ان سے ٹکر لی اور اس حد تک ان کا خاتمہ کر دیا۔ یہ سب صرف تم لوگوں کی وجہ سے ممکن ہوا۔ مجھے تو کچھ کرنا نہیں پڑا۔ یہ بلاشبہ تم لوگوں کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔"

"ہم آپ سے الگ تو نہیں ہیں سر!" شفیع شاہ فوراً بولا "ہم نے جو کچھ کیا یہ صرف آپ ہی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ اور پھر اس سلسلے میں سب سے زیادہ مصائب اور نقصانات بھی آپ ہی نے اٹھائے۔ اگر آپ ثابت قدم نہ رہتے اور آپ کی بدولت ہمیں اتنے وسائل اور تربیت وغیرہ حاصل نہ ہوتی تو ہم بھلا کیا کر سکتے تھے۔"

"مجھے خوشی یہ ہے کہ میرے گرد تم جیسے لوگوں کا حلقہ بن گیا ہے۔ ریڈ ڈاٹ درحقیقت تمام ترقی یافتہ ملکوں کا پروردہ فتنہ ہے۔ سپرپاورز ہمارے خلاف جو دوسری سازشیں' بدمعاشیاں' دھونس دھاندلی اور اقتصادی جکڑبندیاں کرتی رہتی ہیں وہ تو اپنی جگہ ہیں لیکن یہ انہوں نے ہم جیسی قوموں کو تباہ کرنے کا الگ ایک خفیہ جال بچھایا تھا جس سے بظاہر وہ تمام ممالک لاتعلق نظر آتے رہیں گے مگر درپردہ ریڈ ڈاٹ کو ان کی ہر طرح کی مدد حاصل رہے گی۔ انہوں نے شاید سوچا بھی نہیں تھا کہ اس پسماندہ قوم میں ہم جیسے چند سرپھرے ان کے لئے دردِ سر بن جائیں گے۔ ریڈ ڈاٹ صرف ہمارے ہاں ہی سرگرم نہیں تھی' انہوں نے اور بھی کئی ملکوں میں جڑیں پھیلائی ہوئی ہیں اور ان سب جگہوں پر حالات بہت ابتر ہیں۔"

اسی طرح باتیں کرتے ہم لوگ قاسم بجلی کے مکان کے قریب جا پہنچے۔ اس کا مکان ساحل سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن بوٹ ہاؤس اس نے نہ جانے کس مصلحت کے تحت مکان کے قریب نہیں بنوایا تھا حالانکہ اس طرف بھی کنارے کی طرف سمندر کا ایک حصہ کسی کھاڑی کی طرح گہرا تھا۔ جہاں ہمارا ٹرالر بھی کنارے تک جا سکتا تھا جبکہ زیادہ تر موٹر بوٹس تو ٹرالر سے بھی چھوٹی اور ہلکی ہوتی تھیں۔ ان کے لئے تو یہاں بھی آسانی سے بوٹ ہاؤس بن سکتا تھا۔

کوسٹ گارڈ کا جہاز البتہ کنارے تک نہیں آ سکا۔ اسے کچھ اور گہرے پانی میں ہی لنگر انداز ہونا پڑا۔ اس وقت سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا۔ راحیلہ' نفیس صاحب اور کوسٹ گارڈ کے دس جوان تین چھوٹی کشتیوں میں بیٹھ کر کنارے تک آئے۔ وہ سب کے سب مسلح تھے اور کمانڈو معلوم ہو رہے تھے۔

قاسم بجلی کا پہاڑی پر استادہ قلعہ نما مکان ملگجے اندھیرے میں لپٹا ہوا تھا۔ مکان کی طرف جانے والے راستے اور گیٹ پر بھی کوئی لائٹ آن نظر نہیں آ رہی تھی۔

راحیلہ اور نفیس صاحب نے پہلے میری اور شفیع شاہ کی خیروعافیت دریافت کی۔ نفیس صاحب کا موڈ خوشگوار ہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولے "تم تو مجھے گولی دے کر آ گئے تھے لیکن راحیلہ نے مجھے حالات سے آگاہ کرنا بہتر سمجھا۔"

"یہ لوگ اب مجھ سے زیادہ آپ کے ساتھی ہوتے جا رہے ہیں۔" میں نے غمزدہ لہجے میں کہا "لگتا ہے یہ لوگ بھی کوئی گریڈ' پنشن' گریجویٹی' ٹی اے ڈی اے اور دیگر مراعات وغیرہ حاصل کرنے کی فکر میں ہیں۔ اپنا بڑھاپا سنوار رہے ہیں۔"

"پہلے جوانی تو سنور جائے۔ بڑھاپا تو بعد کی بات ہے۔" راحیلہ گویا دانت پیس کر نیچی آواز میں بولی۔

"جوانی تو تمہاری اپنی ضد کی وجہ سے خراب ہو رہی ہے۔ ورنہ میں تو جوانی سنوارنے کی عمدہ تجاویز پیش کر چکا ہوں۔"

اس سے پہلے کہ راحیلہ کوئی دندان شکن جواب دیتی' نفیس صاحب ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولے "بہت اچھا موقع نکالا ہے تم دونوں نے اس قسم کی بکواس کرنے کا۔" پھر وہ مجھ سے مخاطب ہوئے "میں نے پوچھا تھا اب تمہاری حالت کیسی ہے؟"

میں مختصراً ان لوگوں کو حالات سے آگاہ کر چکا تھا۔ ان کے سوال کے جواب میں' میں نے کراہتے ہوئے کہا "اس وقت میری حالت اسّی سالہ بوڑھے کی سی ہے۔ میں آپ کے ساتھ تو چل سکتا ہوں لیکن مجھ سے کوئی توقع مت رکھیے گا۔ میں مکھی بھی نہیں مار سکتا۔"

"حالانکہ ساری عمر مکھیاں ہی ماری ہیں۔" راحیلہ نے لقمہ دیا۔

"مگر یہ ایک عجیب الخلقت مکھی میرے ہاتھ سے بچ گئی۔" میں نے راحیلہ کی طرف اشارہ کیا۔

نفیس صاحب نے حیرت سے ایک نظر میری طرف پھر راحیلہ کی طرف دیکھا اور بے یقینی سے بولے "تم لوگوں کو ایسے موقعوں پر بھی مذاق سوجھتا ہے؟"

"یہ مذاق نہیں ہے سر!" میں نے کراہ کر کہا "یہ ظالم زندگی کی

نہایت سنجیدہ حقیقتیں ہیں۔ خیر، آپ بتائیں۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟"

"اس وقت ہمیں سب سے پہلے تو قاسم بجلی کو گرفتار کرنا ہے۔ ریڈ ڈاٹ سے اس کا قریبی تعلق ثابت ہوگیا ہے۔ اس شخص پر ہاتھ ڈالنا بہت ضروری ہے۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔

"تو پھر چلیے۔ ہاتھ ڈالیے۔" میں نے آگے بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "خیال رکھیے گا ہاتھ پر کاٹ نہ لے۔"

ابھی ہم دس بارہ قدم ہی چلے تھے کہ خاموش فضا میں اچانک گولیوں کی تڑتڑاہٹ گونج اٹھی۔ ہم سب بیک وقت سینے کے بل گر پڑے۔ وہاں کچھ چھوٹے بڑے ٹیلے موجود تھے۔ زمین بھی کافی ناہموار تھی۔ ہر ایک نے کھسک کر ذرا آڑ میں ہونے کی کوشش کی۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہوگیا کہ چند گز آگے موجود درختوں کے جھنڈ سے برسٹ مارا گیا تھا لیکن ہمیں نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ ہوائی فائرنگ کی گئی تھی۔ فی الحال فائرنگ کا مقصد ہمیں خبردار کرنا یا پھر ہماری پیش قدمی روکنا تھا۔ فضا میں گویا ابھی تک گولیوں کی گونج باقی تھی۔

چند لمحے کے سکوت کے بعد نفیس صاحب نے میگا فون پر کہا۔ "اگر کسی نے مزید ایک گولی بھی چلائی تو اس کی زندگی کی ضمانت نہیں دی جاسکے گی اور جو زندہ بچا اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔"

اس دوران دوسرے افراد نے سینے کے بل کھسکتے ہوئے نیم دائرے میں پھیل کر درختوں کے جھنڈ کو گھیرے میں لینے کے لئے بڑھنا شروع کردیا تھا۔ نفیس صاحب کی آواز بارعب اور تاثرانگیز تھی۔ دوسری طرف چند لمحے سکوت ہی رہا پھر کسی نے کھردری، کرخت اور بلند آواز میں پوچھا "تم لوگ کون ہو اور کس لئے آئے ہو؟"

نفیس صاحب نے اپنا تعارف تو نہیں کرایا لیکن یہ بتادیا کہ ہم لوگ خفیہ ایجنسیوں اور کوسٹ گارڈ کے آدمی ہیں۔ دوسری طرف ایک بار پھر چند لمحے کے لئے سکوت چھا گیا پھر پوچھا گیا "تم نے یہ نہیں بتایا کہ تم کس لئے آئے ہو؟"

"ہمیں قاسم بجلی سے ملنا ہے۔" نفیس صاحب نے جواب دیا۔

"صرف ملنا ہے یا اسے گرفتار کرنا ہے؟" یہ آواز بلند جرح جاری تھی۔

"اس کا فیصلہ اس سے ملاقات کے بعد ہی کیا جائے گا۔" نفیس صاحب نے ڈپلومیٹک جواب دیا۔

چند لمحے بعد درختوں کے جھنڈ سے چار افراد نکل آئے۔ انہوں نے اپنی گنیں کندھوں پر لٹکائی ہوئی تھیں۔ ہم لوگ بھی محتاط انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے اور انہیں تقریباً گھیرے میں لے لیا۔

وہ چاروں مقامی تھے۔ چاروں گھنی داڑھی مونچھوں والے تھے۔ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیصوں میں تھے۔ سروں پر بڑی بڑی پگڑیاں تھیں۔ ان میں سے ایک ذرا پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا۔

وہ آگے بڑھتے ہوئے نفیس صاحب سے مخاطب ہوا "قاسم بجلی گھر پر نہیں ہے۔"

"اس کے باوجود میں اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔" نفیس صاحب نے بارعب لہجے میں کہا۔

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، کندھے اچکائے اور خاموشی سے گھوم کر ہمارے آگے آگے چل دیئے۔ ان کی رہنمائی میں ہم پہاڑی سے راستے پر چڑھ کر عظیم الشان مکان کے بلند و بالا گیٹ تک پہنچے جس کے عقب میں تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ روشنی صرف اتنی ہی تھی جتنی افق سے نمودار ہورہی تھی۔ مکان میں کوئی بتی روشن نہیں تھی۔ کوسٹ گارڈ کے آدمی کسی ہدایت کے بغیر ہی مکان کے چاروں کونوں پر پوزیشن سنبھالنے کے لئے چل دیئے تھے۔

کال بیل کا بٹن دبایا گیا۔ کال بیل گیٹ کے عقب میں ایک چھوٹے سے گیٹ ہاؤس میں بجی۔ چند لمحے بعد بغلی گیٹ کا ایک چھوٹا سا چوکور حصہ کھلا اور اس میں سے ایک خونخوار سا چہرہ نمودار ہوا۔

"کیا ہے؟" اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

اس لمحے مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے ساتھ آنے والے ملک کی نہایت اونچی اتھارٹیز کے نہایت بااختیار نمائندے نہیں بلکہ پیشہ ور بھکاری تھے اور ہم کسی بہت بڑے اسمگلر کے نہیں کسی بادشاہ سلامت کے محل سرا کے دروازے پر آن کھڑے ہوئے تھے۔

ہمارے ساتھ آنے والوں میں سے جو شخص ذرا پڑھا لکھا معلوم ہوتا تھا اس نے اندر سے جھانکنے والے کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ اندر سے جھانکنے والے کے چہرے پر خونخواری کچھ کم ہوئی لیکن وہ پہلے ہی جیسے درشت لہجے میں بولا "مالک نہیں ہیں۔ وہ رات کہیں چلے گئے ہیں۔"

"کہاں چلے گئے ہیں؟" نفیس صاحب نے خطرناک ملائمت سے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔" بے رخی سے جواب ملا۔

"گیٹ کھولو۔ ہم گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔" نفیس صاحب نے بدستور ملائمت سے کہا۔

"تلاشی کا وارنٹ ہے آپ کے پاس؟" خونخوار چہرے نے جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

آخرکار نفیس صاحب کو جلال آہی گیا جس کا مجھے انتظار تھا۔ انہوں نے میری توقع سے زیادہ تحمل اور بردباری کا مظاہرہ کیا تھا۔ اُن کا ہاتھ نہایت تیزی سے گھوما اور چوکور شگاف سے جھانکتے ہوئے چہرے پر تھپڑ نہیں، بلکہ ان کی گن کا بٹ پڑا۔ ضرب ایسی تھی کہ چہرہ واپس شگاف میں غائب ہوگیا۔ فوراً ہی دوسرا چہرہ نمودار ہوا لیکن اس پر خونخواری نہیں، تھوڑی سی گھبراہٹ تھی۔ نفیس صاحب گرجے "الو کا پٹھا! مجھ سے وارنٹ مانگتا ہے

ابے مردود! میں خود اتنا بڑا وارنٹ ہوں۔ چھ فٹ دو انچ کا وارنٹ۔ یہ تو اس خبیث کی خوش قسمتی ہے کہ میں خود اسے گرفتار کرنے اس کے دروازے تک آیا ہوں۔ اگر مجھے اس کے بارے میں پتا ہوتا تو میں کب کا اسے اٹھوا کر اپنے دفتر منگوا چکا ہوتا۔"

پھر وہ گیٹ پر لات مار کر پہلے سے زیادہ جلال سے چیخے "گیٹ کھولو۔"

ہماری رہنمائی کرنے والوں کا لیڈر چیخ چیخ کر اندر والوں کو صورتِ حال سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کوسٹ گارڈ وغیرہ کے آدمی گنیں سنبھالے الرٹ کھڑے تھے۔ شفیع شاہ اور راحیلہ بھی گنیں سنبھالے گویا کسی بھی صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھے۔ شفیع شاہ کے ساتھ ٹرالر سے بھی تین آدمی آئے تھے۔ وہ کچھ پیچھے درختوں کے عقب میں گنیں سنبھالے کھڑے تھے۔ میرے علاوہ باقی سب مسلح اور الرٹ تھے۔ میں گن کے بغیر کھڑا تھا' یہی غنیمت تھا۔ صحیح معنوں میں تو میں اس وقت اس قسم کی صورتِ حال میں ٹانگ اڑانے کے قابل ہی نہیں تھا۔

فضا میں زبردست تناؤ تھا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ مکان کے بلند حصوں سے شاید کچھ آنکھیں ہماری جانب نگراں تھیں اور شاید کونے کھدروں سے کچھ گنیں بھی جھانک رہی تھیں۔ ہم انہیں دیکھ نہیں سکتے تھے لیکن یہ احساس شاید سب کو تھا کہ کسی بھی لمحے کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ہم گویا بارود کے ڈھیر پر کھڑے تھے۔

تاہم خیریت ہی رہی۔ چند لمحے کی ردّ و قدح کے بعد گیٹ کھول دیا گیا۔ لائٹس آن ہو گئیں۔ سب لوگ مکان میں گھس آئے۔ چار افراد نے اس طرح چاروں کونوں میں پوزیشن سنبھال لی کہ کوئی مکان سے بھاگنے کی کوشش کرے تو نظر میں آئے۔ گیٹ کو اندر کی طرف سے مقفل کر دیا گیا۔

کوسٹ گارڈ کا ایک اعلیٰ آفیسر بھی ہمارے ساتھ تھا لیکن کارروائی نفیس صاحب ہی کی ہدایات کے مطابق ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ انیکسی کی طرف چلے گئے۔ اتنے بڑے مکان کی تلاشی لینا بھی کوئی آسان کام نہیں تھا۔

میں جب نفیس صاحب' شفیع شاہ اور راحیلہ وغیرہ کے ساتھ اندر پہنچا تو سب سے پہلے ہمارا سامنا تانیا اور ثانیا سے ہوا۔ وہ بیرونی ہال کے ایک ٹیرس نما حصے پر کھڑی تھیں اور یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ وہ شب خوابی کے لباس میں نہیں بلکہ نیلے رنگ کی ایک جیسی جینز اور جیکٹ میں تھیں۔ وہ دونوں ایک ٹک صرف مجھے گھور رہی تھیں اور باقی لوگوں کی موجودگی سے گویا بالکل بے خبر تھیں۔

میں نے اُن کے سامنے پہنچ کر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے ذرا بوکھلائے ہوئے سے انداز میں کہا "معاف کرنا' میں ذرا الٹے سیدھے چکروں میں پڑ گیا تھا۔ انٹر کام پر سات اور آٹھ نمبر کا بٹن نہیں دبا سکا۔ اگر اجازت ہو تو اب آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاؤں؟"

"کیوں نہیں۔" تانیا بلا تامل اپنے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "اب بھی کوئی ایسی تاخیر نہیں ہوئی۔ ہم کو وقت یا کمان سے نکلا ہوا تیر تھوڑا ہی ہیں جو پھر ہاتھ نہ آئیں۔ چشم ما روشن دل ما شاد۔"

میری کھوپڑی گھوم کر رہ گئی۔ ایک تو تانیا کا جواب ہی خلافِ توقع تھا۔ دوسرے اس وقت وہ امریکی لہجے میں انگریزی بولنے کے بجائے بامحاورہ اردو بول رہی تھی۔ میں نے سر کھجاتے ہوئے ذرا کھسیاہٹ سے نفیس صاحب اور راحیلہ کی طرف دیکھا۔ نفیس صاحب گویا ہماری باتوں پر دھیان دینے کے بجائے اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہے تھے اور راحیلہ کا چہرہ اس بری طرح چھپا ہوا تھا کہ اس کے تاثرات کے بارے میں کچھ کہنا مشکل تھا۔

ثانیا استہزائیہ سے لہجے میں بولی "بس مسٹر افضل چوہدری! آپ تو وہیں بُت بن کر رہ گئے۔ اتنی ہی ہمت تھی؟"

"وہ... وہ... دراصل اس وقت میرے بزرگ ساتھ ہیں" میں نے نفیس صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ذرا بوکھلاہٹ کی ایکٹنگ کی اور تھوک نگلا۔ ویسے اس ایکٹنگ میں کچھ حقیقت بھی تھی۔ اس کمبخت نے مجھے میرے اصل نام سے مخاطب کر کے واقعی تھوڑا سا بوکھلا دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ باپ نے انہیں بھی میری اصل شخصیت سے آگاہ کر دیا تھا یا پھر باپ بیٹیاں شروع ہی سے مجھے پہچان چکے تھے لیکن وہ بڑے فنکار تھے۔ انہوں نے آخر تک مجھے چکر دیئے رکھا۔

تانیا ٹھنڈی سانس لے کر جنگلے پر دوبارہ ہاتھ ٹکاتے ہوئے بولی "اچھا ہی ہوا کہ آپ ہمارے ساتھ کمرے میں چلنے کے لئے آمادہ نہیں ہوئے مسٹر چوہدری! آپ آمادہ بھی ہوتے تو شاید کسی اور خیال کی وجہ سے ہوتے۔ ہم آپ کو اس خیال سے نہیں بلا رہے تھے جس خیال سے پہلے دعوت دی تھی۔ اب تو ہم آپ کو اس لئے لے جانا چاہتے تھے کہ آپ کا قیمہ بنا کر اپنے کتوں کو کھلا سکیں۔ اس مقصد کے لئے ہمیں آپ جیسے کسی صحت مند گدھے کی ضرورت تھی۔"

"آپ کے کُتّے گدھوں کا قیمہ کھاتے ہیں؟" میں نے معصومیت اور حیرت سے کہا "عجیب خر پسند کُتّے ہیں!"

ثانیا جنگلے پر جھکتے ہوئے بولی "مسٹر چوہدری! ہمیں پہلے پتا تھا کہ آپ ایک بڑے بزنس مین ہونے کے ساتھ ساتھ سرکاری درباری قسم کی چیز ہیں۔ کوئی بہت اعلیٰ اور اونچے درجے کی "ناؤٹ" قسم کی مخلوق... آپ کی جڑیں کہیں نہ کہیں جا کر کی گلی سڑی جڑوں کے ساتھ گڈمڈ ہو رہی ہیں۔ اسی لئے ہم نے فرصت میں آپ کو سمندر میں غرق کرنے کی کوشش کی لیکن آپ بڑی ڈھیٹ چیز ہیں۔ پیچھے پیچھے چلے آئے۔"

میں نے سوچا وہ امریکا پلٹ تتلیاں اگر اچھی خاصی بامحاورہ اردو بولنے اور سمجھنے پر تلی ہوئی تھیں تو انہیں تھوڑی ترمیم کے ساتھ چچا غالب کا ایک شعر سنانے میں کوئی حرج

نہیں۔ میں نے پہلے سے زیادہ غم ناک لہجے میں کہا۔

"ہوئے "تم" مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کہیں جنازہ اٹھتا' نہ کہیں مزار ہوتا"

شعر ذرا وزن سے گر گیا ہے لیکن حال کے عین مطابق ہے۔"

"جنازہ تو آپ کا اب بھی نہیں اٹھے گا اور نہ ہی کہیں مزار ہو گا۔" تانیا جل کر بولی "آپ کی تو بوٹیاں ہوا میں اُڑیں گی اور چیل کوّے انہیں کھائیں گے۔"

"چھچھڑے شاید دو جڑواں بلّیوں کے حصے میں آئیں۔" میں نے آہ بھر کر کہا۔

نفیس صاحب اس دوران حیرانی سے کبھی میری طرف اور کبھی لڑکیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آخر کار ان کی قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ وہ پاؤں پٹخ کر چلّا اٹھے "افضل! یہ کیا بکواس ہے۔ تم تو ہر جگہ بے تکی ہانکنے بیٹھ جاتے ہو۔ حد ہو گئی اب شعر بھی پڑھے جا رہے ہیں۔"

نفیس صاحب بے شک دُبلے پتلے آدمی تھے لیکن ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا رعب تھا۔ خصوصاً جب وہ کسی بات پر برہم ہو کر گرج اٹھتے تھے تو کم از کم ایک لمحے کے لئے تو بڑی بڑی توپ چیزیں خاموش ہو جاتی تھیں۔ میں نے بظاہر ذرا سہم کر تانیا اور ثانیا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "دیکھا میں نے کہا تھا نا کہ بزرگ ساتھ ہیں اور یہ ہلکی پھلکی خرافات کا بھی بُرا مناتے ہیں۔"

دوسری طرف سے راحیلہ مجھے کہنی مار کر گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی "کتنا شوق ہے تمہیں ایسی لفنگی قسم کی لڑکیوں سے بے عزتی کرانے کا۔"

میں اس کی مردم شناسی.... یا یوں کہئے کہ لڑکی شناسی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے پہلی نظر میں ہی دیکھ لیا تھا کہ لڑکیاں لفنگی تھیں۔ ثانیا جنگلے پر ذرا جھکتے ہوئے بغور راحیلہ کی طرف دیکھ کر بولی "یہ نقاب پوش حسینہ کون ہے؟"

"حسینہ یہ پہلے تھی' اب صرف نقاب پوش ہے۔" میں نے بلدی سے کہا۔

راحیلہ کی گردن میری طرف گھوم گئی۔ اُس کی آنکھوں پر تاریک چشمہ تھا لیکن میں ان آنکھوں میں ناچتی ہوئی غیظ و غضب کی پرچھائیاں دیکھ سکتا تھا۔ اگر اس وقت نفیس صاحب ساتھ نہ ہوتے تو شاید وہ اپنی گن کا بٹ تو مجھے رسید کر ہی دیتی۔ اسے غصہ دلا کر مجھے بڑا لطف آتا تھا۔

شفیع شاہ اور دوسرے افراد اس دوران گھر کی تلاشی لینے کے لئے اِدھر اُدھر بکھر چکے تھے۔ صرف میں' راحیلہ اور نفیس صاحب ہال میں کھڑے تھے۔ مکان کے اصل رہائشی حصے سے باہر جانے کا مرکزی راستہ بھی یہی تھا۔

نفیس صاحب نے دونوں لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تیکھے لہجے میں مجھ سے پوچھا "یہ دونوں قاسم بجلی کی بیٹیاں ہیں؟"

"دعویٰ تو قاسم بجلی کا یہی ہے۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

نفیس صاحب براہِ راست ان سے مخاطب ہوئے "لڑکیو! تمہارا باپ کہاں ہے؟"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں تھیں۔ تانیا بے نیازی سے کندھے اچکا کر بولی "کم از کم یہاں تو نہیں ہیں جہاں آپ انہیں تلاش کر رہے ہیں۔"

"تو پھر کہاں ہے؟" نفیس صاحب نے تحمل سے پوچھا۔ ان کی نیلی آنکھیں اس وقت سلگتی سی محسوس ہو رہی تھیں۔ انہیں یقیناً قدم قدم پر اہانت کا احساس ہو رہا تھا۔ لیکن وہ حتی الامکان تحمل اور درگزر سے کام لے رہے تھے۔

"ہم بے چاریاں بھلا کیا کہہ سکتی ہیں۔" اس بار ثانیا نے جواب دیا "وہ مرضی کے مالک ہیں۔ ان کا جب اور جہاں دل چاہے چلے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اس وقت کراچی میں ہوں۔ ہو سکتا ہے انگلینڈ' فرانس یا اسٹیٹس روانہ ہو چکے ہوں۔"

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ قاسم بجلی ہمیں گھر پر نہیں مل سکے گا۔ اس کی انفارمیشن سروس یقیناً خفیہ ایجنسیوں سے بھی زیادہ تیز تھی۔ اسے بروقت اطلاع مل چکی تھی کہ سمندر میں گڑبڑ ہوئی تھی اور "پرنس" دھماکے سے اُڑ چکی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ تختہ اُلٹ چکا تھا۔ اس کے پاس صرف وسائل ہی نہیں تھے' وہ بلاشبہ ایک خوش قسمت انسان بھی تھا۔ اس کی پہلی خوش قسمتی تو یہی تھی کہ وہ خود اُس وقت "پرنس" پر موجود نہیں تھا جب وہ دھماکے سے تباہ ہوئی۔

نفیس صاحب اپنی جیکٹ کی بڑی سی جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے بولے "لڑکیو! تمہارا باپ اس جزیرے پر ہو سکتا ہے۔ کراچی میں ہو سکتا ہے۔ لیکن اتنی جلدی وہ انگلینڈ' فرانس یا اسٹیٹس روانہ نہیں ہو سکتا۔"

انہوں نے فون پر کوئی نمبر پنچ کیا اور سلسلہ ملنے پر بولے "نفیس اسپیکنگ۔ زیادہ امکان یہی ہے کہ وہ گھر پر موجود نہیں ہے۔ ابھی تلاشی مکمل نہیں ہوئی' بہرحال تم جزیرے سے کراچی کی طرف جانے والے خشکی کے راستے کی نگرانی کراؤ۔ کراچی سے باہر جانے والے راستوں کی نگرانی کراؤ اور ائرپورٹ کو کھنگالو۔ اگر ابھی وہ کسی جہاز میں نہ بیٹھا ہو لیکن ائرپورٹ پر موجود ہو تو اسے فوراً گرفتار کر لو۔ وہ ملک سے تو کیا شہر سے باہر بھی نہ جانے پائے۔ سمجھے؟"

انہوں نے فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ تانیا اور ثانیا نے ایک بار پھر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر اب بھی تشویش کے کوئی آثار نہیں تھے۔ تانیا ہموار لہجے میں بولی "اس سے پہلے بھی کئی بار ڈیڈی کو ملک سے باہر جانے سے روکنے کی کوششیں ہوئی ہیں۔ بڑی بھاگ دوڑ ہوئی ہے۔ ٹیلی فونوں پر بڑے احکامات

جاری ہوئے ہیں لیکن ڈیڈی اگر ضرورت محسوس کرتے ہیں تو وہ ضرور نکل جاتے ہیں۔ شاید وہ کسی کی نظر میں نہیں آتے۔ ان کے پاس الہ دین کا چراغ ہے۔"

نفیس صاحب دھیمے لہجے میں' انگریزی میں بولے "مجھے معلوم ہے۔ الہ دین کے اس چراغ کا دوسرا نام دولت' اثر ورسوخ اور صحیح جگہوں پر رابطہ ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس بار یہ چراغ اس کے کام نہیں آئے گا کیونکہ معاملہ اسمگلنگ وغیرہ سے کہیں سنگین ہے۔"

"اسمگلنگ..... وغیرہ؟" دونوں لڑکیوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر حیرت کی نہایت عمدہ اداکاری کی۔ "ڈیئر سر! کیا آپ یہ لفظ ہمارے ڈیڈی کے لئے استعمال کررہے ہیں؟" ثانیا نے سوال کیا۔

"نہیں۔ اپنے ڈیڈی کے لئے۔ جن کے انتقال کو تیرہ برس گزر چکے ہیں۔" نفیس صاحب جل کر بولے۔

"چلیں' پھر تو ٹھیک ہے۔" ثانیا طمانیت سے سرہلاتے ہوئے بولی "لیکن اگر آپ یہ لفظ میرے ڈیڈی کے بارے میں استعمال کرتے تو ہم دونوں بہنیں بہت زیادہ برا مناتیں۔ ہمارے ڈیڈی ایک بہت بڑے اور بہت معزز بزنس مین ہیں۔"

"اس ملک کی حالت جن لوگوں کی وجہ سے دن بہ دن پتلی ہوتی جارہی ہے ان میں ایک ٹولا تمہارے ڈیڈی جیسے "بڑے" اور "معزز" کاروباری لوگوں کا بھی ہے۔" نفیس صاحب گہری سانس لے کر بولے "بہرحال کبھی نہ کبھی ہر قسم کے برے لوگوں پر بھی کوئی نہ کوئی برا وقت آتا ہی ہے۔ میرا خیال ہے تمہارے ڈیڈی کا بھی بُرا وقت آگیا ہے۔ ہم انہیں کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"یہ تو دن چڑھے پتا چلے گا کہ بُرا وقت کس پر آیا ہے جب وکیلوں کا ایک پینل اعلیٰ عدالت میں قانونی چارہ جوئی شروع کرے گا اور کئی محکموں میں چند بڑے وزیروں کے ٹیلی فون موصول ہونا شروع ہوں گے۔" تانیا بولی۔

نفیس صاحب تکلیف کے سے عالم میں ہنسنے لگے پھر بولے۔ "تمہارے ہاں اکثر بڑے خبیثوں کے بچ نکلنے کا فارمولا یہی ہے لیکن کاش..... میں کسی طرح تمہیں یقین دلا سکتا کہ اس مرتبہ یہ فارمولا نہیں چلے گا۔"

"دیکھا جائے گا۔" تانیا نے بے پروائی سے کندھے اچکائے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ نفیس صاحب کون تھے۔ ان کا مقام کیا تھا اور اختیارات کیا تھے۔ انہوں نے جاننے کی کوشش بھی نہیں کی تھی اور غالباً فرض کرلیا تھا کہ وہ کوسٹ گارڈ' کسٹم یا سی آئی ڈی جیسے کسی محکمے کے کوئی افسر ہوں گے اور وہ بھی درمیانے درجے کے۔

نفیس صاحب راحیلہ سے مخاطب ہوئے "تم ان دونوں لڑکیوں پر نظر رکھو۔ ہوسکتا ہے انہیں بھی تفتیش میں شامل کرنا پڑے۔ میں اور افضل تلاشی لینے والوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں جلدی فارغ ہوسکیں۔"

راحیلہ نے اثبات میں سرہلایا اور نفیس صاحب بڑھنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولے "چلو کچھ رہنمائی کرو۔ گھر دیکھا ہوا ہوگا۔"

"میرا زیادہ وقت گھر کے بجائے گھر والوں کو دیکھنے میں ہوا ہے۔" میں نے کہا "بہرحال اب گھر کو بھی دیکھ لیتے ہیں

ہم نے راحیلہ اور دونوں لڑکیوں کو وہیں چھوڑا اور گئے۔ ہم تلاشی لینے والوں کے ساتھ جا ملے۔ جن کمروں کو جاچکا تھا انہیں بھی ہم نے دوبارہ دیکھ ڈالا۔ ایک ایک باتھ اس میں موجود ٹب تک کو کھنگالا۔ بیڈز کے نیچے جھانکا۔ الماریوں میں ہاتھ مارے۔ سرونٹ کوارٹرز کو چیک کیا۔ اس دوران لائن حاضر کیا جاچکا تھا۔ اس دوران انیکسی بھی مکمل ہوگئی۔ آخر کار سب لوگ منہ لٹکائے واپس آگئے میں تہ خانہ بھی موجود تھا۔ اسے بھی اچھی طرح کھنگال لیا قاسم بجلی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔

"بدبخت نکل ہی گیا۔" آخر کار نفیس صاحب کو تسلیم

"خواہ مخواہ ہی یہاں دھاوا بولا گیا۔" میں نے تاسف

"اگر ڈاکٹر برنارڈ کو کچھ تاخیر سے یہاں پہنچنا تھا تو اب وہ پہنچے گا۔ معلوم نہیں اب وہ ہمارے ہاتھ آئے گا بھی یا نہیں

"اگر قاسم بجلی ہاتھ آگیا تو شاید ڈاکٹر برنارڈ بھی ہاتھ آ بلکہ شاید ریڈ ڈاٹ کے کچھ اور بچے کھچے لوگ بھی ہاتھ آجا

نفیس صاحب نے گویا میری امید بندھائی پھر انہوں نے "ہم نے اسلام آباد ہوٹل سے تین غیرملکیوں کو بھی پکڑا ان کا ریڈ ڈاٹ سے کوئی گہرا تعلق ثابت نہیں ہورہا۔ وہ طرح کے "کنسلٹنٹ" تھے۔ بھاری معاوضہ پر وقتاً فوقتاً کچھ انجام دیا کرتے تھے لیکن انہیں ریڈ ڈاٹ کے اصل سیٹ اس کے مقاصد وغیرہ کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ ا خیال میں یہ بھی شاید سی آئی اے یا آنجہانی کے جی بی وغیرہ کوئی خفیہ ایجنسی تھی۔"

ہم واپس ہال میں آئے تو دیکھا وہاں راحیلہ اکیلی کھڑی تانیا اور ثانیا کہیں نظر نہیں آرہی تھیں۔ نفیس صاحب ذرا بولے "لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"میں نے انہیں اس کمرے میں لٹادیا ہے۔" راحیلہ سامنے ایک بند دروازے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

میں نے اور نفیس صاحب نے جلدی سے جاکر اس کمرے جھانکا۔ تانیا اور ثانیا واقعی ایک بیڈ پر پاس پاس چت لیٹی تھیں اور ان کی آنکھیں بند تھیں۔ نفیس صاحب ہچکچاہٹ انداز میں ان کے قریب جاتے ہوئے ذرا حیرت سے بولے واقعی سوگئیں؟"

"ان کا سونے کا پروگرام تو نہیں تھا۔ سُلانا پڑا ہے۔" راحیلہ بے نیازی سے بولی "میں نے انہیں تھوڑی سی خواب آور دوا دی ہے۔"

"کیا مطلب؟" نفیس صاحب نے پلٹ کر اسے گھورا لیکن میں اس کا مطلب بخوبی سمجھ گیا تھا۔ مجھے پہلے ہی اندیشہ تھا کہ ہماری عدم موجودگی میں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہوگی۔

"میں نے ان دونوں کی کنپٹی پر کراٹے کا ایک ایک ہلکا پھلکا ہاتھ رسید کیا ہے۔" راحیلہ نے نہایت اطمینان سے بتایا "کیونکہ ان کی زبان کسی طرح رکنے میں نہیں آرہی تھی۔ آپ کی موجودگی میں تو یہ پھر بھی کچھ معقول قسم کی گفتگو کررہی تھیں۔ آپ کے جانے کے بعد تو انہوں نے بہت ہی بے ہودہ قسم کی باتیں شروع کردی تھیں۔"

"مثلاً.....؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

راحیلہ میری طرف گھومی۔ اس کا چہرہ اب بھی مکمل طور پر چُھپا ہوا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ وہ گویا دانت پیس کر بولی "تمہارے ہی بارے میں سب سے زیادہ بکواس کررہی تھیں اور مجھ سے بھی تمہارے بارے میں کچھ ایسے سوالات شروع کردیئے تھے جنہیں میں سننا بھی گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ تم گو کہ ان کے باپ کو پکڑوانے آئے ہو۔ اس کے باوجود تمہاری طرف سے ان کا دل میلا نہیں ہے۔ لگتا ہے یکدم ہی تمہیں بہت پسند کرنے لگی ہیں۔ لیکن ان کی پسندیدگی کے پیمانے ذرا مختلف قسم کے ہیں۔"

میں نفیس صاحب کی طرف دیکھ کر سر کھجانے لگا۔ نفیس صاحب ذرا انجان بن کر تانیا اور ثانیا پر جھک کر ان کی نبض دیکھتے ہوئے بولے "پھر بھی تمہیں ان لڑکیوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک نہیں کرنا چاہئے تھا۔ یہ بڑی فسادی قسم کی لڑکیاں معلوم ہوتی ہیں۔ ایسی ہی لڑکیاں تو بات کا بتنگڑ بنادیتی ہیں اور اچھے بھلے محکموں کی نیک نامی پر بھی حرف آجاتا ہے۔"

"انہیں آپ لڑکیاں کہہ رہے ہیں؟" راحیلہ جارحانہ لہجے میں بولی "میرے خیال میں تو یہ گندگی کے دو ڈھیر ہیں۔ ایک خاص قسم کی جنونی لگتی ہیں۔ انہیں علاج کے لئے کسی نفسیاتی اسپتال میں داخل کرانا چاہئے۔"

"جس قسم کے ماحول میں اور جس قسم کی دولت سے انہوں نے پرورش پائی ہے اس میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔" نفیس صاحب بیڈ کے قریب سے ہٹتے ہوئے بولے "افضل بتارہا تھا ان کا زیادہ وقت اسٹیٹس میں گزرا ہے۔"

"اسٹیٹس میں تو میں بھی رہ کر آئی تھی۔ میں اور میرا بھائی بچپن ہی میں وہاں چلے گئے تھے۔ عمر کا سولھواں سال مجھے اسٹیٹس ہی میں لگا تھا۔ عمر کے چند انتہائی خطرناک سال میں نے وہاں گزارے تھے لیکن ایسی باتوں کا تو میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔"

"جس طرح انسانوں کی شکلیں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں اسی طرح سوچیں اور کردار بھی ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ بہرحال یہ دنیا ہے اور دنیا میں ہر رنگ' ہر ڈھنگ کا انسان موجود ہے۔" نفیس صاحب مسکرائے۔

میں نے ایک نظر تانیا' ثانیا کی طرف اور ایک نظر راحیلہ کی طرف دیکھ کر کہا "ان میں ذرا اور طرح کا مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ تم میں ذرا اور طرح کا مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔"

"تم اپنی چونچ بند رکھو ورنہ کھوپڑی توڑ دوں گی۔" راحیلہ گن اونچی کرتے ہوئے بولی "تم پر تو مجھے سب سے زیادہ غصہ آرہا ہے۔ کاش میں موٹا سا ایک ڈنڈا لے کر تمہاری ہڈی پسلی ایک کرسکتی۔"

"خدایا۔ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں اس وقت اکیلا نہیں ہوں۔" میں نے آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا "ورنہ میں تو اپنا دفاع بھی نہیں کرسکتا تھا۔ مجھ میں تو اس وقت صرف اتنی جان ہے کہ چل پھر رہا ہوں۔"

"موقع میسر ہوتا تو میں تم میں اتنی جان بھی نہ چھوڑتی۔ ہفتے دس دن کے لئے تو تمہیں بستر پر ہی لٹادیتی۔" راحیلہ دانت کچکچا کر بولی۔

میں نے نفیس صاحب کی طرف دیکھ کر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے پوچھا "آپ نے اس سے پہلے اتنی جلالی لڑکی دیکھی تھی؟"

نفیس صاحب دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولے "تم دونوں اپنی بکواس بند کرو اور میرے ساتھ آؤ۔"

ہم نے تانیا اور ثانیا کو اسی کمرے میں لیٹے چھوڑ دیا۔ ہمیں امید تھی کہ نوکر انہیں سنبھال لیں گے۔ انہیں کوئی خاص گزند نہیں پہنچی تھی۔

ہم باہر آگئے۔ ہمارے ساتھی لان پر جمع تھے۔ قاسم بجلی کے مسلح محافظ وغیرہ بیرونی دیوار کے قریب کھڑے تھے اور کینہ توز نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

نفیس صاحب آگے بڑھ کر ان سے مخاطب ہوئے "لگتا یہی ہے کہ قاسم بجلی کم از کم یہاں سے تو فرار ہوگیا ہے لیکن کوسٹ گارڈ کے آدمی بہرحال اس مکان کی نگرانی کریں گے۔ دن میں کسی وقت میرے محکمے کے آدمی آکر ان کی جگہ لے لیں گے۔ ہم جب تک مناسب سمجھیں گے مکان کو انڈر آبزرویشن رکھیں گے۔ تم میں سے کوئی بدمعاشی دکھانے کی کوشش نہ کرے ورنہ نتائج کا ذمے دار وہ خود ہوگا۔"

نفیس صاحب نے ایک لمحے توقف کیا۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ نفیس صاحب نے کوسٹ گارڈ کے آدمیوں کو ہدایات دیں پھر فون کرکے اپنے لئے گاڑی طلب کی اور ہم باہر آگئے۔ ہم سب گاڑی کے انتظار میں کھڑے تھے تو نفیس صاحب نے مجھ سے پوچھا "تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

"میں اب تک جتنی بکواس کرتا رہا ہوں اور جھکنے کی کوشش

کرتا رہا ہوں' اس سے آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔" میں نے قدرے سنجیدگی سے کہا "میری حالت اس وقت تباہ ہے۔ میں بڑی شدت سے آرام کی اور ایک عدد ڈاکٹر کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔ مجھے اور شفیع شاہ کو میرے ہوٹل پہنچا دیجئے۔ میں جی بھر کے آرام کروں گا۔ ایک دو دن تک تو میں کچھ سوچنا بھی نہیں چاہتا۔"

"بالکل ٹھیک ہے۔ تمہیں ایسا ہی کرنا چاہئے۔" نفیس صاحب نے سرہلایا "ایک دو دن تک تو میں خود بھی کراچی میں ہوں لیکن میں تمہارے ہوٹل میں نہیں ٹھہروں گا۔ کہیں اور ٹھہروں گا۔ قاسم بجلی کا معاملہ کچھ دوسرے لوگوں کے سپرد کر کے میں اسلام آباد واپس چلا جاؤں گا۔ بہرحال میرا تم سے رابطہ قائم رہے گا۔"

پھر وہ راحیلہ کی طرف متوجہ ہوئے "تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "میں بھی افضل کے ہوٹل میں ہی ٹھہر جاتی ہوں۔ شاید اس کے قریب رہ کر مجھے تیمارداری کے بہانے اسے زہر دینے کا موقع مل جائے۔"

نفیس صاحب مسکرائے اور گھڑی دیکھتے ہوئے بولے "ٹھیک ہے۔ پھر ہم لوگ ایک دو دن بعد ہی ایک دوسرے سے بات کر کے آئندہ کا کوئی مشترکہ پروگرام طے کریں گے۔"

کچھ دیر بعد ایک جیپ ہمیں لینے آپہنچی اور ہم خشکی کے راستے کراچی پہنچے۔ یہ راستہ زیادہ طویل تھا۔ جس وقت نفیس صاحب نے مجھے' راحیلہ کو اور شفیع شاہ کو میرے ہوٹل کے سامنے اتارا اس وقت دھوپ چڑھ چکی تھی۔ راحیلہ اور شفیع نے سہارا دے کر مجھے میرے سوئٹ میں پہنچایا۔

میں اب تک گویا صرف قوت ارادی کے سہارے خود کو گھسیٹے پھر رہا تھا۔ پرتعیش کمرے میں انتہائی آرام دہ بیڈ پر لیٹتے ہی جیسے گیئر میں چلتا ہوا انجن یکدم نیوٹرل ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ کو بالکل بے دم محسوس کیا۔ چند منٹ میں ہی ایک ڈاکٹر آن پہنچا جس نے میرا چیک اپ وغیرہ کرنے کے بعد ایک ڈرپ میں نہ جانے کون کون سے انجکشن ملا کر ڈرپ مجھے لگا دی۔ شاید اس میں کسی خواب آور دوا کا انجکشن بھی شامل تھا۔ کچھ دیر بعد ہی مجھے نیند آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو میں خود کو بہت بہتر اور تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔ میرے ذہن پر غنودگی کا خمار ضرور باقی تھا لیکن اس میں ایک مخصوص سی خوشگواری شامل تھی۔ وہ جو ایک بوجھل پن کی دھند سی چھائی ہوئی تھی وہ ہٹ گئی تھی لیکن ڈرپ مجھے بدستور لگی ہوئی تھی۔ اس کا اسٹینڈ قریب ہی کھڑا تھا۔

راحیلہ میرے بیڈ کے قریب ہی ایک صوفے پر بیٹھی کوئی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ وہ اب "نقاب پوش حسینہ" والے حلئے میں نہیں تھی اور اپنے آدھے سیاہ' آدھے سفید چہرے کے باوجود نہایت تازہ دم کھلی کھلی اور پرکشش نظر آرہی تھی۔ کمرے میں ایک دلفریب مہک پھیلی ہوئی تھی جو شاید اسی کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔ بند گلاس والی کھڑکی سے پردہ ہٹا ہوا تھا اور نیلگوں روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

میں چند لمحے راحیلہ کی طرف دیکھتا رہا اور آنکھیں رہا۔ اس نے مجھے بیدار ہوتے دیکھ لیا تھا لیکن فوری نہیں بولی اور رسالے کے ورق پلٹتی رہی۔ جب میں گھورتا رہا تو آخر اسے رسالہ بند کرنا ہی پڑا۔ اسے زور پٹختے ہوئے وہ بولی "یہ الوؤں کی طرح کیا دیکھے جا رہے ہو؟"

"میں تمہیں نہیں' ڈرپ کو دیکھ رہا ہوں۔" میں نے دیا "اس وقت ڈرپ تم سے زیادہ حسین لگ رہی ہے۔"

راحیلہ ترحم آمیز انداز میں گہری سانس لے کر رہ نے قدرے حیرت سے کہا "یہ ڈرپ ابھی تک ختم نہیں ہوئی؟"

"احمق کہیں کے! یہ پانچویں ڈرپ ہے۔" راحیلہ تمہیں ایک ہی ڈرپ لگی ہوتی تو اب تک تم بھوک سے ہوتے۔"

"میں کتنی دیر سوتا رہا ہوں؟"

"پورے چوبیس گھنٹے۔" راحیلہ نے جواب دیا۔ پھر پوچھا تمہاری حالت پہلے سے بہتر ہے یا دھکا اسٹارٹ ہی ہو؟"

"نہیں' اب میں سیلف اسٹارٹ ہو گیا ہوں۔" میں بایاں بازو ورزش کے انداز میں ہلاتے ہوئے کہا۔ دوسرے ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "ان چوبیس کے دوران قاسم بجلی کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں آئی؟"

"اس کے بارے میں تو اطلاع کل دوپہر ہی آگئی۔" راحیلہ بولی "اس کی تو وہی مثال ہوئی کہ بچہ بغل میں ڈھنڈ میں۔ نفیس صاحب اس کے لئے معلوم نہیں کہاں کہاں کے بند کراتے پھر رہے تھے جبکہ وہ اس دوران جزیرے پر ہی تھا۔"

"کیا واقعی؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا "کہاں سے طرح پکڑا گیا وہ؟"

"وہ جزیرے کے ایک چھپر ریستوران کے عقب میں بچھیرو میں بالکل تنہا موجود تھا۔ ایک گارڈ بھی اس کے ساتھ تھا۔" راحیلہ نے بتایا۔

"اس نے گرفتاری دینے میں کسی قسم کی مزاحمت نہیں میں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں۔ وہ مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں ہی کیونکہ اس کی کھوپڑی میں ایک گولی پیوست تھی اور اسے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔" راحیلہ نے اطمینان سے بتایا۔

میں گردن ٹیڑھی کئے راحیلہ کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ مجھے نہیں آرہا تھا کہ قاسم بجلی مر چکا تھا۔ وہ ایک طاقتور آدمی

طاقتور سے میری مراد جسمانی طور پر طاقتور ہونا نہیں ہے۔ وہ ایک طرح سے اپنے جزیرے کا بے تاج بادشاہ تھا۔ وہاں کے رہنے والے ابھی تک نیم قبائلی طرزِ زندگی کے عادی تھے اور قاسم بجلی گویا ان کا غیر رسمی سا سردار تھا۔

اس حیثیت سے قطع نظر بھی اس کے پاس کئی طرح کی طاقت تھی۔ دولت کی طاقت تھی' اثرورسوخ کی طاقت تھی۔ ریڈ ڈاٹ جیسی تنظیم کا تعاون اسے حاصل تھا۔ ان کے علاوہ بھی نہ جانے کیسے کیسے لوگوں کے ساتھ اس کے رابطے رہے ہوں گے۔ مسلح محافظوں کی ایک زنجیر اسے ہروقت اپنے حلقے میں رکھتی تھی۔ اس کے باوجود وہ یوں خاموشی سے جزیرے پر ہی مارا گیا تھا کہ ہمیں وہاں ہوتے ہوئے بھی کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔ یہ بڑا عبرت کا مقام تھا پھر مجھے خیال آیا کہ اس قسم کے کئی عبرت انگیز موڑ میری زندگی میں پہلے بھی آچکے تھے۔

"یہ تو بہت بُرا ہوا۔" میں نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے کہا۔

"یعنی ایک بُرا آدمی اپنے انجام کو پہنچ گیا تو یہ تمہارے خیال میں بہت بُرا ہوا؟" راحیلہ چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھے تو خود اپنے ہاتھوں سے اس بُرے آدمی کی گردن مروڑنے کی تمنا تھی لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ اکثر بُرے لوگ ہمیں کوئی خاص کام کی بات بتائے بغیر ہی اس دنیا سے رخصت ہوجاتے ہیں۔"

"کیا پوچھنا تھا تمہیں اس سے؟" راحیلہ استہزائیہ لہجے میں بولی۔

"یہی کہ چاند پر کدوؤں کی کاشت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ ٹمبکٹو میں آج کل ٹماٹروں کا کیا بھاؤ چل رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"لگے بے پر کی ہانکنے....!" راحیلہ نے آنکھیں نکالیں۔

"ظاہر ہے احمقانہ سوالات کے جوابات بھی احمقانہ ہی ہوسکتے ہیں۔ بے وقوف لڑکی! کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ قاسم بجلی کتنا اہم آدمی تھا اور اس سے کیا کچھ معلوم ہونے کی توقع رکھی جاسکتی تھی؟" میں نے ذرا جل کر کہا۔

"میں نے تو کسی بھی واقعے سے کسی بھی فرد سے.... کسی بھی قسم کی توقعات ہی رکھنی چھوڑ دی ہیں۔" وہ کندھے اچکا کر اطمینان سے بولی "اس لئے مجھے کسی بھی قسم کے نتائج پر کوئی خاص مایوسی نہیں ہوتی۔ انسان کو بس اپنا کام کرتے رہنا چاہئے۔ کسی نہ کسی زاویے سے سوچتے رہنا چاہئے۔ کسی نہ کسی راستے پر سفر جاری رکھنا چاہئے۔ ایک راستے پر رکاوٹ آگئی تو دوسرے راستے پر چل دیئے۔ امید کی ایک کرن معدوم ہوئی تو دوسری کرن کی تلاش میں نظر دوڑانے لگے۔ ایک دروازہ بند ہوا تو دوسرے کی تلاش شروع کردی۔"

"اپنی کھوپڑی ٹوٹ گئی تو کسی دوسرے کی کھوپڑی سے چلانے لگے۔" میں نے کچھ اور جل کر کہا "ماشاء اللہ! کیا خ... صورت فلسفۂ حیات ہے۔ راحیلہ مائی ڈیئر! اگر تمہارا یہی حال... بہت جلد تم احمقوں کی سردار کے عہدے پر فائز ہوجاؤ گی۔"

"نہیں.... میرا تمہیں اس عہدے سے ہٹانے کا کوئی ا... نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"تمہارے ارشاداتِ عالیہ باتوں کی حد تک تو اچھے ہیں۔ پر عمل ذرا مشکل ہوتا ہے۔ یہ کوئی کامیاب فلسفۂ حیات ن... ہے۔" میں نے کہا۔

"میں تو کہتی ہوں فلسفۂ حیات کو بھی گولی مارو۔ ایک ف... حیات ناکام ہو تو انسان کو فوراً دوسرا فلسفۂ حیات اختیار کر... چاہئے۔" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی۔

"یہ تم آج کیسی باتیں کررہی ہو؟" میں نے حیرت سے ا... طرف دیکھا۔ "مجھے تو تم سے خوف آنے لگا ہے۔ باتوں سے کچھ لگتا ہے جیسے تم سیاستداں ہوگئی ہو۔"

"چلو خیر یہی غنیمت ہے کہ تمہیں کسی سے خوف تو آیا۔" ہنستے ہوئے بولی۔

"پاگلوں سے تو انسان کو خوف زدہ ہی رہنا چاہئے۔ کیا پتا وقت کیا کر گزریں۔" میں نے کہا "خیر۔ یہ بیکار باتیں چھوڑو... ڈاکٹر اگر کہیں آس پاس دستیاب ہے تو اسے بُلا کر مجھے اس ڈر... سے نجات دلاؤ۔ میں یوں مریضوں کی طرح لیٹنا نہیں چاہتا۔"

"تو پھر تم کس طرح لیٹنا چاہتے ہو؟" راحیلہ نے حیرت... پوچھا "تم اس وقت مریض ہی ہو۔"

"مجھے خواہ مخواہ احساسِ کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش م... کرو۔" میں نے گویا بُرا مناتے ہوئے کہا "میں مریض وغیرہ ہ... نہیں ہوں۔ یہ ڈرپ ہٹواؤ۔ میں تمہیں ابھی چھلانگیں لگا... دکھا سکتا ہوں۔"

"وہ تو خیر مجھے یقین ہے کہ تم چھلانگیں لگا کر دکھا سکتے ہو۔ اس کے لئے تو شاید ڈرپ ہٹوانا بھی ضروری نہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم ڈرپ سمیت ہی چھلانگ لگانا نہ شروع کردو۔ آخر ایک بن مانس سے اور توقع بھی کیا رکھی جاسکتی ہے؟" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔

"اب اگر تم نے بکواس بند نہ کی تو میں ڈرپ اسٹینڈ پر سے کھینچ کر تمہارے سر پر دے ماروں گا۔" میں نے اسے گھورا "تمہارے حق میں بہتر یہی ہے کہ ڈاکٹر کو بُلوالو۔"

"کیا تم واقعی مزید ڈرپ لگوانا نہیں چاہتے؟" راحیلہ نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"بھئی مجھے ڈرپ کی کیا ضرورت ہے؟ میں خود کو بھلا چنگا محسوس کررہا ہوں اور پھر اس ڈرپ سے میرا بنے گا بھی کیا؟ اسے اُتار کر ایک طرف پھینکو اور میرے لئے تگڑا سا ناشتا منگواؤ۔" میں نے کسمساتے ہوئے کہا۔

وہ ڈاکٹر کو بُلانے کے بجائے خود ہی اُٹھ کر میری کلائی سے ٹیپ اُتارنے لگی تاکہ سوئی نس سے نکال سکے۔

"کیا تم خود ڈرپ ہٹاؤ گی؟" میں نے پریشانی کا اظہار کرنے کی کوشش کی "ڈاکٹر کو نہیں بُلاؤ گی؟"

"تم تو یوں پریشان ہورہے ہو جیسے یہ کوئی میجر آپریشن ہے۔" اس نے مجھے گھورا "یہ کون سا مشکل کام ہے۔"

اس نے سوئی میری نس سے کھینچ کر اسپرٹ کا پھاہا رکھتے ہوئے میرا بازو موڑ دیا۔ میں نے خواہ مخواہ کراہتے ہوئے کہا "کیا معلوم تھا کہ مجھے طبی معاملات میں بھی تمہارے سامنے تختۂ مشق بننا پڑے گا۔"

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تمہیں ڈرپ لگائی بھی میں نے ہی تھی۔" وہ ایک ٹرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی "ڈاکٹر صاحب تمام دوائیں وغیرہ یہاں چھوڑ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے فون پر ہدایات دے دی تھیں۔ یہ آخری ڈرپ میں نے ہی لگائی تھی۔ میں نے اس سے پہلے بھی زندگی میں کئی بار کئی لوگوں کو ڈرپ لگائی ہے۔"

"اوہ خدایا! میرے حال پر رحم کرنا۔" میں نے چھت کی طرف دیکھ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے اور کراہتے ہوئے اُٹھ بیٹھا "اچھا ہوا تم نے جلدی یہ ڈرپ اُتروادی۔ معلوم نہیں تم نے اس میں کیا ملا دیا ہو!"

"میری ایسی قسمت کہاں کہ مجھے اس میں کچھ ملانے کا موقع ملتا۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "ڈاکٹر صاحب اگر دواؤں کے ساتھ تھوڑا سا پوٹاشیم سائنائڈ بھی چھوڑ جاتے تو ضرور ڈرپ میں ملا دیتی۔"

"تم سے یہی اُمید ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ہوئے تم دوست جس کے' دشمن اس کا آسماں کیوں ہو' بہرحال اے دشمنِ جاں! دشمنی اپنی جگہ کم از کم ناشتے کا آرڈر تو دے دو۔"

"میں تمہاری نوکر نہیں ہوں۔ اب اُٹھ بیٹھے ہو تو خود ہی آرڈر دے دو۔" وہ بے نیازی سے کرسی پر بیٹھ کر دوبارہ رسالہ دیکھنے لگی۔

"ہاں بھئی.... تم نے تو مجھے ڈرپ لگائی اور اُتاری ہے۔ تم تو اب کوالیفائڈ ڈاکٹر ہوگئی ہو۔ تم بھلا اس قسم کے معمولی کام کیوں کرنے لگیں۔" میں نے غمزدہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا اور خود ہی ہوم سروس کو فون کرکے ناشتے کا آرڈر دیا۔

ناشتے کے انتظار کے دوران میں نے ایک ٹک راحیلہ کو گھورنا شروع کردیا۔ وہ بڑی بے نیاز بن کر بظاہر رسالے کے مطالعے میں مصروف نظر آنے کی کوشش کررہی تھی لیکن جلد ہی اسے اس سے توجہ ہٹانی پڑی۔

"کسی کو تنگ کرنے کا بہترین طریقہ شاید یہی ہے کہ اسے ایک ٹک گھورنا شروع کردو۔" آخرکار وہ سر اُٹھاتے ہوئے بولی "آخر کیا تکلیف ہے تمہیں؟ کسی ناراض نسل کے اُلو کی طرح کیوں گھورے جارہے ہو؟"

"میں تم سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اور تم رسالہ لے کر بیٹھ گئی ہو۔ یہ ایسے فضول فیشن میگزین پڑھنے کا وقت ہے؟ اس کے علاوہ میں یہ بھی پوچھنا چاہوں گا کہ یہ میرا کمرا ہے یا لائبریری؟" میں نے اسے ڈانٹنے کی کوشش کی۔

"اوہو....!" اس کی آنکھیں بُری طرح پھیل گئیں "باس بننے کی کوشش کررہے ہو؟"

"لاحول ولا...." میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا "باس بننے کا شوق کس کمبخت کو ہے۔ میں تو کچھ اور بننے کی کوشش کررہا تھا لیکن خیر چھوڑو.... تم ایک کوڑھ مغز لڑکی ہو۔ تمہاری سمجھ میں یہ باتیں کہاں آئیں گی۔" اب اس کے مجھے گھورنے کی باری تھی لیکن میں نے اس کی پروا کئے بغیر سنجیدگی سے کہا "میں تم سے ایک بات پوچھنا چاہتا تھا تمہارے خیال میں قاسم بجلی کو کس نے قتل کیا ہوگا؟"

"کاش یہ نیک کام میں نے کیا ہوتا!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے آنکھیں نکالیں "یہ سوال تمہیں مجھ سے کرنا چاہئے تھا؟"

"تم سے اس قسم کا سوال کرنا کسی نے خلافِ ضابطہ قرار دے دیا ہے کیا؟"

وہ نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے خاموشی سے مجھے گھورتی رہی تو میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا "ناراض کیوں ہوتی ہو' میں جاکر یہ سوال باتھ روم کی ٹونٹی سے پوچھ لیتا ہوں۔ شاید وہ بہتر جواب دے سکے۔"

"یقیناً" اس نے تائید میں سرہلایا "لیکن سوال کرنے سے پہلے دو مرتبہ زور زور سے ٹونٹی پر سر مارنا بلکہ ہوسکے تو تین چار مرتبہ مارنا.... جتنی زیادہ مرتبہ سر ٹونٹی سے ٹکراؤ گے اتنا ہی بہتر جواب ملے گا۔"

پھر وہ قدرے سنجیدگی سے بولی "احمق انسان! میں ایک گھنٹے سے بھی کم وقت اس جزیرے پر رہی ہوں۔ مجھے اس جزیرے کے

بارے میں ۔۔۔ اور قاسم بجلی کے ارد گرد پائے جانے والے لوگوں کے بارے میں قطعاً کوئی معلومات نہیں ہیں۔ میں بھلا کیسے کوئی اندازہ ظاہر کر سکتی ہوں کہ اسے کس نے قتل کیا ہوگا؟"

"تم صحیح کہہ رہی ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا "اس سوال کا تم سے بہتر جواب تو باتھ روم کی ٹونٹی دے سکتی ہے۔" پھر میں نے ذرا آنکھیں نکالیں "الّو کی دُم! میں تو اس لئے پوچھ رہا تھا کہ شاید میری بے ہوشی کے دوران کوئی نئی بات سامنے آئی ہو۔ نفیس صاحب خفیہ اداروں کے کچھ لوگوں کو وہاں چھوڑ کر آئے تھے۔ شاید ان کی طرف سے کوئی رپورٹ آئی ہو جس کی روشنی میں کوئی اندازہ قائم کیا جا سکتا ہو؟"

اس نے ٹھنڈی سانس لی "ہمارے خفیہ ادارے اتنی جلدی کوئی کام کی بات معلوم کرنے کے قابل ہوتے تو پھر بات ہی کیا تھی! پھر ہماری یہ درگت تھوڑا ہی بنتی جواب بن رہی ہے۔"

"یہ بھی تم صحیح کہہ رہی ہو۔" مجھے اس کی تائید میں سر ہلانا پڑا پھر مجھے قاسم بجلی کی بیٹیوں کا خیال آیا اور میں نے ذرا چونکتے ہوئے کہا "تانیا اور ثانیا کا تو بہت بُرا حال ہوگا باپ کی موت کی خبر سُن کر؟"

"بہت فکر ہے تمہیں ان دونوں کی؟" اس نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"مجھے تو تمہاری بھی بہت فکر ہے۔ بلکہ سب سے زیادہ فکر ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ کوئی سخت جواب دیتی' میں نے جلدی سے کہا "آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔ باپ خواہ کیسا ہی تھا اور لڑکیاں بھی خواہ کیسی ہی ہیں لیکن انہیں باپ کی اس طرح اچانک موت سے دھچکا تو زبردست لگا ہوگا؟"

"شاید" اس نے بے پروائی سے کندھے اچکائے "مجھے اس سلسلے میں صحیح طور پر تو کچھ معلوم نہیں ویسے میرا خیال ہے کہ وہ جذباتی دھچکے وغیرہ محسوس کرنے والی چیزیں نہیں ہیں۔ یا یوں کہنا چاہئے کہ ان کی جذباتیت کچھ اور طرح کی ہوتی ہوگی۔"

اس دوران ناشتا آگیا۔ راحیلہ نے اپنے لئے صرف کافی تیار کی۔ وہ ناشتا کر چکی تھی۔ ناشتے کے دوران میں نے اس سے پوچھا "نفیس صاحب سے رابطہ کیا؟"

"کئی بار" اس نے جواب دیا۔

"وہ کیا کر رہے ہیں؟"

"یہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "ویسے وہ آج رات اسلام آباد روانہ ہونا چاہتے ہیں۔ یہاں انہوں نے کچھ دوسرے لوگوں کی ڈیوٹیاں لگائی ہیں جو ریڈ ڈاٹ کے خاص آدمیوں اور قاسم بجلی کی موت کے بعد پیدا ہونے والے حالات پر نظر رکھیں گے اور بچے کھچے لوگوں کی تلاش کا کام جاری رکھیں گے۔"

"اوہ!" میں کراہ کر رہ گیا "تمہارا کیا پروگرام ہے؟ تم نفیس صاحب کے ساتھ اسلام آباد جاؤ گی؟"

"وہ تو یہی چاہتے ہیں۔" راحیلہ بولی "لیکن میرا ان کے ساتھ جانا بہت ضروری بھی نہیں ہے۔ میں اسی سلسلے میں مشورہ کرنے کے لئے تمہارے ہوش میں آنے کا انتظار کر رہی تھی۔"

"مجھے معلوم ہوتا تو میں ابھی مزید ہفتہ دس دن بے ہوش رہتا۔"

وہ ہاتھ اُٹھاتے ہوئے تیزی سے بولی "بس۔۔۔ بس اب پٹری سے اُترنے کی کوشش مت کرنا۔ بڑی مشکل سے سنجیدگی سے بات شروع ہوئی ہے تو اب ذرا سنجیدگی سے ہی بتادو۔ مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

"اب تم مجھ سے مشورہ کرنے لگی ہو؟" میں نے ذرا حیرت سے کہا "میرا تو خیال تھا کہ اب تم نے نفیس صاحب کے مشورے کے بغیر کوئی قدم اُٹھانا چھوڑ دیا ہے اور کوئی بات تم نفیس صاحب کو بتائے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ میں تمہیں بتا کر آیا کہ میں قاسم بجلی کے جزیرے پر جا رہا ہوں۔ تم نفیس صاحب کو ساتھ لئے میرے پیچھے چلی آئیں۔"

"اس بات پر تو تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے ناشکرے انسان! تم اُلٹا شکوہ کر رہے ہو!" وہ غصیلے لہجے میں بولی "اگر ہم بروقت نہ پہنچتے تو ریڈ ڈاٹ والے تمہاری تکا بوٹی کرکے مچھلیوں کو ڈنر کھلا چکے ہوتے۔"

"تمہارے پہنچنے سے میری جان بچنے میں کون سی مدد ملی؟" میں نے آنکھیں نکالیں "مجھے خود ہی تن بہ تقدیر ہو کر موٹر بوٹ سے سمندر میں لڑھکنا پڑا اور جب میں بے جان سی حالت میں ڈوب رہا تھا تو شفیع شاہ نے آکر مجھے نکالا جو اتفاقاً ہی مجھے تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اس میں تم لوگوں کا کیا کمال ہوا؟ اس مہم کی تمام تر کامیابی کا سہرا شفیع شاہ کے سر ہے۔"

"چلو تم اسی کے سر سہرا باندھ لو۔ مہندی کی رسم کرلو۔ اُبٹن لگالو لیکن مجھ سے یوں سوکنوں کی طرح مت لڑو۔ ہم سے غلطی ہوئی جو ہم تمہاری فکر میں بھاگے چلے آئے۔ آئندہ تم کسی گڑھے میں گر رہے ہوگے تو میں پیچھے سے آکر ایک لات رسید کرواں گی اور تمہارا کام آسان کردوں گی۔"

"لات ٹوٹ جائے گی۔" میں نے خبردار کیا۔

"اچھا اب بکواس ہی کئے جاؤ گے یا میرے اصل سوال کا جواب بھی دو گے؟ کیا میں نفیس صاحب کے ساتھ چلی جاؤں؟"

"مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" میں نے بظاہر جلے کٹے انداز میں کہا "اب تمہیں نفیس صاحب مل گئے ہیں۔ اب تو تم ہر کام انہی سے پوچھ کر' انہی کی مرضی کے مطابق کیا کرو۔"

"اب تم نے بزرگوں کو بھی رقیب سمجھنا شروع کردیا؟" اس نے حیرت سے کہا۔

"وہ اتنے بزرگ بھی نہیں ہیں۔ ابھی تو ان کی ریٹائرمنٹ میں بھی تین چار سال باقی ہیں جبکہ میں نے تو بعض بزرگوں کو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی دوسری تیسری یا چوتھی شادی کرتے دیکھا ہے۔"

اس نے متلاشی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا "اِنّی! اب میں واقعی کچھ اٹھا کر تمہاری کھوپڑی پر دے ماروں گی اور خواہ مخواہ وہ سارا بھوسا کمرے میں بکھر جائے گا جو اس کھوپڑی میں بھرا ہوا ہے؟" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے سنجیدگی سے کہا "دراصل میری زبان اس وقت تمہارے ساتھ بکواس بازی میں مصروف تھی لیکن میرا ذہن کسی اور ٹریک پر چل رہا تھا۔ میں یہی فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ تمہیں کیا مشورہ دیا جائے۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے کہ جب تمہاری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہوتی ہے تو عموماً تمہارا ذہن کسی اور ٹریک پر لڑھک رہا ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے بھی تم بڑی عجوبۂ روزگار قسم کی چیز ہو۔ میرا بس چلتا تو تمہیں زندہ ہی حنوط کروا کے کسی عجائب گھر میں رکھوا دیتی۔"

"میں اب بھی عجائب گھر میں ہی ہوں۔" میں نے ناشتے کا صفایا جاری رکھتے ہوئے جواب دیا "یہ دنیا کیا کسی عجائب گھر سے کم ہے؟ یہ بجائے خود ایک بیکراں قسم کا عجائب گھر ہے۔ اس سے پہلے کہ میں فلسفے کے ٹریک پر زیادہ دور تک لڑھک جاؤں' تمہیں اپنے گراں قدر مشورے سے نواز دیا جائے تو بہتر ہے۔"

دوسرے ہی لمحے میں نے گویا ارادہ بدل دیا اور کہا "لیکن سوال یہ ہے کہ تم میرے مشورے پر چلنے کے بجائے خود اپنی مرضی سے ہی کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر رہیں؟"

"فیصلہ تو میں اپنی ہی مرضی سے کروں گی۔" وہ اطمینان سے بولی "وہ تو میں یونہی تمہارا اور نفیس صاحب جیسے آدمیوں کا دل رکھنے کے لئے مشورہ لے لیتی ہوں۔"

"اب تم پٹری سے اُتر رہی ہو۔" میں نے ناشتے کی ٹرے ایک طرف ہٹاتے ہوئے اور کافی کے برتنوں کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولی "دراصل ریڈ ڈاٹ کا تو میرے خیال میں تقریباً خاتمہ ہو چکا ہے اس لئے میں اب نفیس صاحب کے ساتھ مزید گھسٹتے پھرنے کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کرتی۔"

"میرا خیال ہے فی الحال تو تم نفیس صاحب کے ساتھ اسلام آباد چلی جاؤ۔ وہاں اگر کچھ معاملات باقی ہیں تو انہیں نمٹا کر' اپنے ساتھیوں کو ان کے ٹھکانوں سے واپس بُلا کر' نفیس صاحب کو مطلع کرکے لاہور پہنچ جاؤ۔ میں بھی چند دنوں تک وہیں آجاؤں گا۔ مجھے اپنے کاروبار کو بھی دیکھنا ہے اور کسی اچھی سی کمپنی کو اپنے گھر کی نئے سرے سے تعمیر کا ٹھیکا بھی دینا ہے۔ اس طرح دربدر کب تک پھروں گا؟"

"تم اتنے دن یہاں کیا کرو گے؟" اس نے پوچھا۔

"میرے خیال میں ابھی ریڈ ڈاٹ کا صحیح معنوں میں خاتمہ نہیں ہوا۔ وہ جو ایک محاورہ ہے ناکہ ہاتھی نکل گیا مگر دُم پھنس گئی۔ میرے خیال میں کچھ ایسی ہی صورتِ حال ہے۔ ہاتھی مر گیا ہے مگر اس کی دُم زندہ ہے۔ جس طرح انسان کے جسم میں کسی مہلک چیز کا ایک آدھ ٹشو بھی سرجری کے بعد باقی رہ جائے تو وہ بیماری لوٹ کر آسکتی ہے' اسی طرح مجھے اندیشہ ہے کہ ریڈ ڈاٹ کا ایک آدھ شیطان بھی یہاں رہ گیا تو ریڈ ڈاٹ دوبارہ جنم لے سکتی ہے۔ یہ کینسر عود کر آسکتا ہے۔"

راحیلہ خاموش رہی۔ میں نے کافی کا ایک گھونٹ بھر کر بات جاری رکھی "سب سے زیادہ افسوس تو مجھے اس بات کا ہے کہ ڈاکٹر برنارڈ ہاتھ نہیں آیا۔ معلوم نہیں وہ کہاں ہوگا!"

"میں کہہ چکی ہوں کہ تمہیں میری وجہ سے ڈاکٹر برنارڈ کی فکر میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تو اب اس چہرے کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادی ہوتی جا رہی ہوں۔" راحیلہ بے پروائی سے بولی۔

"تمہارا کیا ہے تم تو کہہ دو گی کہ میں بغیر چہرے کے بھی گزارا کر سکتی ہوں' جس طرح کھوپڑی میں بھیجے کے بغیر گزارا کر رہی ہو لیکن دیکھو نا۔۔۔ انسان کی کھوپڑی میں بھیجا نہ ہو تو یہ بات کم از کم اس وقت تک تو چھپی ہی رہتی ہے جب تک وہ زبان نہیں کھولتا یا کوئی حرکت نہیں کرتا۔۔۔"

"لیکن بعض لوگ تو خاموش رہتے ہیں تب بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان کی کھوپڑی میں بھیجا نہیں ہے۔ تم اس کی ایک روشن اور تابندہ مثال ہو۔" وہ بظاہر گہری سنجیدگی سے بولی۔

"پھر بکواس شروع ہوگئی۔" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"اس کی ابتدا تم کرتے ہو۔" اس نے بھی جواباً آنکھیں نکالیں۔

"اچھا۔۔۔ سیز فائر" میں نے ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا "میں یہ کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کے علاوہ بھی مجھے ایک شخصیت کی فکر ہے۔"

"وہ کون؟"

"وہی آسیبی آنکھوں والی لڑکی جس کی کمپیوٹرائزڈ تصویر تم لوگوں کے پاس موجود تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"لڑکی کی فکر تو تمہیں ہمیشہ ہی لاحق ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ آسیبی آنکھوں والی ہی کیوں نہ ہو۔" راحیلہ منہ بنا کر بولی۔

"دیکھو ٹریک سے ہٹنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے خبردار کیا "اس میں میری دلچسپی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بھی ریڈ ڈاٹ میں خاصی اہمیت کی مالک معلوم ہوتی ہے۔ اسے بھی تلاش کرنا ضروری ہے۔"

"ممکن ہے یہ دونوں شخصیات اب ملک میں موجود نہ ہوں۔ ریڈ ڈاٹ کے کافی لوگ فرار بھی تو ہوئے ہیں۔ بلکہ چند ایسی' ہماری اپنی ملکی شخصیات بھی غائب ہوئی ہیں جو مختلف سرکاری عہدوں پر فائز تھیں مگر ریڈ ڈاٹ کی آلۂ کار بنی ہوئی تھیں۔" راحیلہ بولی۔

"بہرحال میں انہیں تلاش کرنے کی ایک کوشش اور کرنا چاہتا ہوں۔ کراچی میں ان کے پائے جانے کا زیادہ امکان ہے۔ میں ابھی کچھ دن اور یہاں رہوں گا۔ قاسم بجلی کے جزیرے کا بھی ایک

چکر اور لگاؤں گا۔"

"اس بہانے ان لڑکیوں کی دلجوئی بھی ہو جائے گی۔" راحیلہ نے لقمہ دیا۔

میں نے کافی کے مگ کے اوپر سے اسے گھورتے ہوئے کہا "میرا خیال تھا کہ تم رقابت میں مبتلا نہیں ہوتیں۔"

"میں رقابت کے نہیں... شرافت کے نکتۂ نظر سے بات کر رہی ہوں۔ شرفا بُرے وقت میں ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں' دلجوئی کرتے ہیں۔ تمہیں ضرور ان شریف لڑکیوں کے معزز باپ کے ناگہانی قتل پر ان کی دلجوئی کرنی چاہئے۔" وہ بظاہر بے پروائی سے بولی۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اس قسم کی لڑکیوں میں اگر میں دلچسپی لیتا بھی ہوں تو وہ دلچسپی بالکل عارضی نوعیت کی ہوتی ہے۔" میں نے گویا صفائی پیش کی۔

"مجھے کیوں بتا رہے ہو؟ میری طرف سے تو خواہ تم ان کے انتقال کے بعد بھی ان کی ذات میں دلچسپی لیتے رہنا۔ ان کا مزار تیار کروا کے خود مجاور بن کر بیٹھ جانا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔" وہ کندھے اُچکا کر بولی۔

"واہ... واہ...!" میں نے کافی کا مگ رکھ کر تالی بجائی "بیک وقت بے نیازی دکھانا اور جل جل کر کباب ہونا تو کوئی تم سے سیکھے۔"

"کباب ہوتا ہے میرا جوگر۔" اس نے پاؤں ذرا اونچا کر کے جوگر مجھے دکھایا "ویسے ایک بات ذرا سنجیدگی سے بتا دوں۔ ان لڑکیوں کے دو سوتیلے بھائی بھی آج کل میں یورپ سے واپس پہنچنے والے ہیں۔ یہ چاروں بہن بھائی غالباً تمہیں اپنے باپ کی موت کا ذمّے دار سمجھ رہے ہیں۔ اس لئے ان کی طرف سے ذرا محتاط رہنا۔ یہ مذاق نہیں ہے۔ میں واقعی تمہیں خبردار کر رہی ہوں۔"

"میں بھی سنجیدگی سے تمہارا شکریہ ادا کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

وہ کافی کا مگ خالی کر کے تپائی پر رکھتے ہوئے بولی "تو میں واقعی نفیس صاحب کے ساتھ اسلام آباد چلی جاؤں؟"

"ہاں" میں نے سوچتے ہوئے کہا "لیکن بس دو چار دن میں معاملات وائنڈ اپ کر کے لاہور پہنچ جاؤ۔ ریڈ ڈاٹ کے سلسلے میں اگر کوئی کام باقی بھی ہو تو وہ نفیس صاحب ہی کے سپرد کر دو۔ وہ جانیں اور ان کے آدمی۔ اتنے طاقتور ادارے ان کے احکامات پر چل رہے ہیں۔ اتنی مین پاور ہے ان کے ساتھ... اب انہیں ہی یہ معاملے سنبھالنے دو۔ ویسے بھی کام تو تقریباً ختم ہی ہو چکا ہے۔ ہماری اب ایسی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی۔"

راحیلہ خاموش رہی اور بغور میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے سلسلۂ کلام جوڑا "شفیع شاہ یہیں میرے ساتھ رہے گا۔ اگر میں جلد ... کا تب بھی تم لاہور پہنچتے ہی سب سے پہلے تو ذرا بزنس ... جہاں تک تمہاری "ناقص" عقل ساتھ دے۔ وہاں تک اس سے کام لینے کی کوشش کرنا اور دیکھنا کہ میری عدم موجودگی کی وجہ سے بزنس زیادہ بُرے حال میں تو نہیں؟ میرا فون پر تم سے رابطہ رہے گا۔"

پھر میں نے اسے لاہور کے ایک بہت بڑے آرکیٹیکٹ کا نام بتاتے ہوئے کہا "اگر مجھے کچھ زیادہ دن لگ جائیں تو تم وہاں ان آرکیٹیکٹ صاحب سے بات کر کے مکان کے نئے نقشے کی تیاری بھی شروع کرا دینا۔ انہیں سائٹ دکھا دینا اور ملبہ وہاں سے اُٹھوانے کا بھی بندوبست کر دینا۔ میرے آنے تک تمام متعلقہ لوگوں سے تمہیں ہی کام لینا ہو گا۔ اب ہمیں اپنی نارمل زندگی کی طرف واپس آنے کے لئے تیزی سے کام شروع کرنا ہو گا۔"

"نارمل زندگی...!" راحیلہ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے اسے گھورا۔

"ہم... اور نارمل زندگی...!" وہ ہنستے ہنستے یکدم سنجیدہ ہو کر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولی "تمہاری اس بات پر ہنسی آ گئی تھی۔ مجھے نہیں لگتا کہ نارمل زندگی ہمارے نصیب میں رہ گئی ہے۔"

"کیوں... ہم نے کیا قصور کیا ہے جو ہم نارمل زندگی نہیں گزار سکتے؟" میں نے خفگی سے پوچھا۔

"نارمل زندگی تو آج کل نارمل انسانوں کو نصیب نہیں ہو رہی۔ ہم تو نارمل انسان ہی نہیں ہیں۔ ہم بھلا نارمل زندگی گزارنے کی توقع کیسے رکھ سکتے ہیں؟" اس نے طویل سانس لی۔

"ہم جیسے بھی ہیں' ٹھیک ہی ہیں۔" میں نے سر جھٹک کر کہا "دل خراب کرنے والی باتیں زیادہ مت کیا کرو۔ دل خوش کرنے والی باتیں کیا کرو۔ آج شام تم نفیس صاحب کے ساتھ جا رہی ہو؟"

"اگر یہ تمہارے لئے دل خوش کرنے والی بات ہے تو چلی جاتی ہوں۔" وہ کندھے اچکا کر بولی۔

"میں غلطی سے دونوں باتیں ایک سانس میں کر بیٹھا۔ یہ سوال الگ تھا' اب خواہ مخواہ زبان پکڑنے کی کوشش مت کرو۔" میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔

"تمہاری زبان بھلا کون پکڑ سکتا ہے۔" وہ حسرت سے بولی "بہر حال میں آج شام جا رہی ہوں اور تمہاری ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کروں گی۔"

"شکر ہے تمہاری زبان سے یہ تو نکلا کہ تم کسی کی ہدایات پر عمل کرنے کی کوشش کرو گی ورنہ تم پر تو اکثر مجھے "باغی گوریلا" کا گمان گزرتا ہے۔"

وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی "نفیس صاحب کا فون اب تک آ جانا چاہئے تھا۔ مجھے ان کو بتانا پڑے گا کہ میں ان کے ساتھ چلنے کے لئے تیار رہوں۔"

"خوش ہو جائیں گے بے چارے۔" میں نے جدن...

راحیلہ نے ایک بار پھر خونخوار نظروں سے مجھے گھورا لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' اس کے موبائل فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔

...نے فوراً کہا "لو ابھی تم نے یاد ہی کیا تھا کہ ان کا فون آ گیا۔ ...کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتا۔"

"احمق ہیں آپ!" وہ فون اُٹھاتے ہوئے بولی "اسے وقت کی ...دی کہتے ہیں۔ انہوں نے اسی وقت فون کرنے کے لئے کہا ...۔"

اس نے فون کا بٹن دبایا اور اسے کان سے لگایا۔ میں نے بھی ...دی سے آگے جھک کر اس کے سر سے تقریباً سر جوڑ لیا تاکہ گفتگو ...سکوں اور اس بہانے اس کے وجود کی بھینی بھینی خوشبو سے ...ے حواس مہکا سکوں۔ دوسری طرف واقعی نفیس صاحب تھے۔ ...حیلہ کی آواز سنتے ہی انہوں نے سب سے پہلے میرے بارے میں ...چھا "افضل کو ہوش آ گیا؟"

"ہوش...؟" راحیلہ دانت پیس کر میرے بال کھینچ کر مجھے دور ...نے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولی "وہ بے ہوش ہی کب تھا؟ ...تو اپنی مہینوں کی نیند کی کمی پوری کر رہا تھا۔ مسلسل چوبیس گھنٹے ...نے کی عیاشی اس نے شاید آج تک نہیں کی تھی۔ موقع غنیمت ...کر اس نے اپنی حسرت نکالی ہے۔"

"یعنی اب وہ چلنگ رہا ہے۔ ٹھیک ٹھاک ہے؟" نفیس ...ب کے ذہن کا بوجھ گویا کچھ کم ہو گیا۔ ان کے لہجے میں شگفتگی ...ی۔

"وہ تو ٹھیک ٹھاک ہے لیکن اب آپ میری فکر کیجئے۔ میرے ...ے کسی نفسیاتی اسپتال میں بستر کا انتظام کیجئے۔ اسے ہوش میں ...ے مشکل سے آدھا گھنٹا ہوا ہے اور اس نے میرے دماغ کی ...یں ہلا کر رکھ دی ہیں۔" راحیلہ بولی۔

"کوئی بات نہیں۔ دماغ کی چولیں تو دوبارہ کسی جا سکتی ہیں۔ ...ے خوشی ہے کہ افضل کی حالت ٹھیک ٹھاک ہے۔ مجھے اس کے ...ے میں تشویش تھی۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولے۔

"آپ اس کے بارے میں پریشان نہ ہوا کریں۔ بڑی ڈھیٹ ...ہے۔ آپ کو ابھی تک اندازہ نہیں ہوا؟" راحیلہ بولی۔

نفیس صاحب ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولے "لگتا ہے وہ قریب ...کہیں بیٹھا تمہاری گفتگو سُن رہا ہے۔"

"کہاں سامنے ہی بیڈ پر بیٹھا کسی اداس لکڑ بگھّے کی طرح مجھے ...ور رہا ہے۔" راحیلہ نے جواب دیا حالانکہ میں اب بھی اس کے ...ے سر جوڑے ہوئے تھا۔

"تم نے اس سے آئندہ کے پروگرام کے بارے میں بات ...؟" نفیس صاحب نے پوچھا۔

"کہاں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گی لیکن وہ ابھی یہیں ...ہے گا۔"

"کیوں؟" نفیس صاحب نے ملائمت سے پوچھا۔

"ایک تو وہ ابھی اپنے آپ کو مکمل تندرست محسوس نہیں ...، دوسرے یہاں واقعی اس کے بزنس کے بعض معاملات ...الجھے ہوئے ہیں۔ اس کا چند دن یہاں قیام کچھ ضروری نظر آ رہا ہے۔" راحیلہ نے اطمینان سے جواب دیا "اس کے بعد آئندہ کا پروگرام طے کر لیں گے۔ جیسی بھی صورتِ حال ہوئی اس کے مطابق کچھ کر لیں گے۔ اس دوران آپ اس سے رابطہ رکھ سکتے ہیں۔ وہ یہیں اپنے ہوٹل میں ہی قیام کرے گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میری اس سے بات کراؤ۔" نفیس صاحب نے کہا۔

راحیلہ نے سر پیچھے ہٹا کر پہلے خشمگیں نظروں سے مجھے گھورا پھر فون مجھے تھما دیا۔ میں نے فون کان سے لگایا تو راحیلہ نے آہستگی سے سر میرے سر سے جوڑ لیا۔

نفیس صاحب میری خیر و عافیت دریافت کرنے اور رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد بولے "قاسم بجلی کی موت ابھی تک تو معمّا ہی بنی ہوئی ہے۔ بہرحال میں نے اس کی تفتیش سی آئی اے کے سپرد کر دی ہے۔ ہمارے آدمی ان سے رابطہ رکھیں گے اور اگر کوئی نئی بات سامنے آئی تو اس کی روشنی میں ضروری اقدامات کریں گے۔ ہمارے آدمی قاسم بجلی کے مکان اور اس کے اہلِ خانہ پر بھی نظر رکھیں گے۔"

"تاکہ کوئی ان کے ہاں آنے والا بھی ہو تو وہ ان کے قریب نہ پھٹکے اور کسی کی نظر میں نہ آئے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

وہ میرا مطلب سمجھ کر ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولے "نہیں نہیں' یہ رسمی نگرانی نہیں ہو گی۔ قاسم بجلی کے آدمیوں اور اس کی فیملی کو پتا نہیں چلے گا کہ ان کی نگرانی ہو رہی ہے۔ ان کے ٹیلی فون بھی ٹیپ ہوں گے۔"

"اچھا ہوا آپ نے بتا دیا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "میرا تو ان "عظیم" لڑکیوں یعنی تانیا اور ثانیا سے فون پر کچھ "دوستانہ" گفتگو کرنے کا ارادہ تھا۔ آپ خواہ مخواہ بعد میں ٹیپ سُنا کر شرمندہ کرتے رہتے۔"

"کیا تمہاری دوستانہ گفتگو بھی شرمسار کرنے والی ہوتی ہے؟" نفیس صاحب نے معصومانہ لہجے میں پوچھا۔

"بندہ بشر ہے کچھ پتا نہیں ہوتا زبان سے کیا نکل جائے۔ زبان ویسے بھی پھسلنے والی چیز ہے۔"

"بے شک" نفیس صاحب نے تائید کی "خصوصاً جب بات چیت تانیا اور ثانیا جیسی "عظیم" خواتین سے ہو رہی ہو تو زبان کے پیچھے پیچھے پورا انسان بھی پھسلتا ہوا نہ جانے کہاں سے کہاں تک جا سکتا ہے۔"

"واقعی یہ کی ہے آپ نے تجربہ کار انسانوں والی بات۔ اساتذہ آخر اساتذہ ہی ہوتے ہیں۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا۔

"بکواس بند کرو اور کام کی بات سُنو۔" وہ شاید کچھ جھینپ کر بولے "مجھے کچھ شبہ ہے کہ بزنس کا تو تمہارا بہانہ ہے۔ تم یہاں اپنے طور پر ریڈ ڈاٹ کی باقیات کے سلسلے میں ضرور ہاتھ پاؤں مارنے کی کوشش کرو گے۔ خصوصاً تمہیں ڈاکٹر برنارڈ کی تلاش

ہوگی۔"

میں خاموش رہا۔ حضرت بہرحال پہنچی ہوئی چیز تھے۔ ان کی بات کی تردید کرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولے "بزنس کے مسائل اگر تمہیں درپیش بھی ہوئے تو وہ تمہارے لئے ثانوی چیز ہوں گے۔ بہرحال میری ایک دو نصیحتیں یاد رکھنا۔ ایک تو اکیلے اکیلے.... اپنے طور پر کوئی بڑی مصیبت مول لینے کی کوشش مت کرنا۔ کوئی خاص بات سامنے آئے تو مجھے ضرور مطلع کردینا۔ اس کے علاوہ کراچی کے دو تین فون نمبر لکھ لو۔ یہ ایک ہی صاحب کے ہیں۔ انہیں تم صرف چشتی صاحب کے نام سے جان سکو گے اگر کبھی کسی مشکل میں پھنس جاؤ اور مجھ سے بھی بروقت رابطہ نہ ہوسکے تو ان سے ضرور رابطہ کرلینا۔ یہ میرے خاص ماتحتوں میں سے ایک ہیں اور بڑے کام کے آدمی ہیں۔"

"ضرور ضرور ایسے آدمی کا نمبر تو میں کسی نوٹ بک یا کاغذ پر لکھنے کے بجائے دل پر لکھ لوں گا۔ فی الحال کاغذ پر ہی لکھ لیتا ہوں۔" میں نے کہا اور ان کے بتائے ہوئے تینوں نمبر نوٹ کرلئے۔

نفیس صاحب بولے "انہیں تمہارے بارے میں سب کچھ معلوم ہے۔ میں انہیں ہدایات بھی دے جاؤں گا۔"

"بہت شکریہ نفیس صاحب! میں خواہ مخواہ کافی دنوں تک آپ کو بہت بُرا آدمی سمجھتا رہا۔ آپ تو بہت اچھے آدمی ہیں۔"

"اب میں جواباً تمہاری تعریف نہیں کروں گا۔ راحیلہ سے کہنا تیار رہے۔ شام چار بجے کے بعد کسی وقت بھی اس کا بُلاوا آسکتا ہے۔" نفیس صاحب بولے پھر انہوں نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔

مجھے راحیلہ کو ان کا پیغام دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ سُن ہی رہی تھی۔ اس نے سر پیچھے ہٹایا تو میں نے سونگھنے کے انداز میں گہری سانس لے کر کہا "کاش نفیس صاحب ابھی کچھ دیر اور گفتگو جاری رکھتے۔"

"کچھ اور جوئیں میرے سر میں منتقل ہوجاتیں۔" وہ بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

"میں نے آج تک کسی جُوں کے سر میں جُوئیں چلتی نہیں دیکھیں۔" میں نے کہا۔

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے تشویش زدہ انداز میں کہا "ناراض ہوگئیں کیا؟"

"مجھے ناراض ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ میں تمہیں ترکی بہ ترکی، اردو بہ اردو، دست بہ دست، گھونسا بہ گھونسا، ڈنڈا بہ ڈنڈا جواب دے سکتی ہوں۔ میں منہ بسور کر بیٹھنے والی یا روہانسی ہونے والی لڑکی نہیں ہوں۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ تم تو مجھ سے بھی زیادہ ڈھیٹ چیز ہو لیکن کہاں جارہی ہو؟"

"ہم خانہ بدوشوں کے پاس زیادہ سامان تو نہیں ہوتا لیکن جتنا ہے، اسے تو ذرا سنبھال لوں۔ میں چار بجے سے پہلے ہی جانے کے لئے تیار رہوں گی۔ تم بھی اس دوران شاور لے کر کچھ انسانوں والے حلیے میں آنے کی کوشش کرو۔ گو کہ تمہارے لئے یہ بہت مشکل کام.... کہ تم انسان نظر آؤ لیکن کوشش کرنا ہر انسان کا فرض ہے۔"

پھر وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "میں نے شیخ... کو تمہارے لئے کچھ ملبوسات کا انتظام کرنے کے لئے کہا تھا... نے کسی کو بازار بھیجا تھا۔ وہ آتا ہی ہوگا۔ کوئی ڈھنگ کا... سوٹ پہن کر بیٹھو۔ اس وقت تمہارا جو حُلیہ ہے اس میں اگر ہوٹل کے کسی سوپر کے سامنے بھی آگئے تو وہ تمہیں چور اچکا... کر دھکے دے کر باہر نکالنے کی کوشش کرے گا اور اگر تم نے یہ بتایا کہ تم اس ہوٹل کے مالک ہو تو وہ تمہیں پاگل خانے پہنچانے کی کوشش کرے گا۔"

میں نے اپنا جائزہ لیا۔ واقعی اس وقت میں کسی گندی... فیکٹری کا وہ مزدور نظر آرہا تھا جسے مالک نے اپنے گرگوں کے ہاتھوں پٹوا کر باہر پھنکوا دیا تھا اور رہی سہی کسر راستے میں کتوں نے اس کے پیچھے لگ کر پوری کردی تھی۔ میرا وجود واقعی اس ڈی لکس... میں اجنبی لگ رہا تھا لیکن میں اس تضاد سے محظوظ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "عجیب اتفاق ہے۔ میں اس سے پہلے بھی یہاں ایک مفلوک الحال دیہاتی کے حلیے میں قیام کر چکا ہوں۔ اس وقت کسی نے مجھے پہچانا ہی نہیں تھا اور کلرک مجھے کمرہ بھی دینے کے لئے تیار نہیں تھا۔ غنیمت یہ تھا کہ ان لوگوں کے منہ پر مارنے کے لئے میری جیبوں میں نوٹوں کی گڈیاں موجود تھیں۔"

راحیلہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں شاور لینے کے لئے باتھ روم میں گھس گیا۔ جب تک میں صاف ستھرا ہوکر اور اوپر کلون وغیرہ کا چھڑکاؤ کرکے باہر برآمد ہوا تب تک وارڈروب بھی کچھ آباد ہوچکی تھی۔ میں نے ایک عمدہ سا سوٹ منتخب کرکے پہنا جو ریڈی میڈ ہونے کے باوجود مجھے بالکل فٹ تھا۔ یہ غالباً راحیلہ کا کمال تھا۔ وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتی تھی۔

دروازہ کُھلا ہی تھا۔ چند لمحے بعد راحیلہ دستک دے کر اندر آئی تو میں سوئٹ کے ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھا تھا۔ وہ ٹھٹکنے کی اداکاری کرتے ہوئے انگریزی میں بولی "معاف کیجئے گا سر! یہاں ایک نہایت مفلوک الحال سا... گندا سا... چینڈو سا... بے ہودہ سا آدمی لیٹا ہوا تھا۔ اس کا نام افضل چوہدری تھا۔ آپ نے اسے دیکھا ہے؟"

"یس میم!" میں نے بڑے شائستہ انداز میں گردن کو خم دیتے ہوئے انگریزی میں ہی جواب دیا "کبھی اس دنیا میں صرف وہ میرا دوست تھا لیکن اب میں اسے بہت پیچھے چھوڑ آیا ہوں۔ ہاں کبھی کبھی زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر اس سے ملاقات ہوجاتی ہے، سلام دعا ہوتی ہے۔ وہ اپنی راہ چل دیتا ہے اور میں اپنی راہ ہولیتا ہوں۔ وہ ابھی ابھی مجھ سے مل کر رخصت ہوا ہے۔"

"بہت خوب پُرانے دوستوں سے ملتے رہنا چاہئے۔" راحیلہ نے سنجیدگی سے سرہلایا "آپ کی تعریف؟"

"اتفاق سے میرا نام بھی افضل چوہدری ہے۔" میں نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"ہیئر... ہیئر!" راحیلہ نے تالی بجائی "اداکاری بھی اچھی خاصی کرلیتے ہو۔"

"تم نے بھی تو حیرت کی بہت عمدہ اداکاری کی تھی۔" میں نے کہا۔

"حیرت تو مجھے واقعی ہوئی تھی۔ تم کچھ دیر پہلے والے افضل چوہدری تو قطعاً نہیں لگ رہے تھے۔" راحیلہ بولی۔

"اس میں میرا کوئی کمال نہیں راحیلہ ڈیئر! یہ صرف پیسے کا کمال ہے۔ پیسہ واقعی انسان کو کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے اور غربت اچھے بھلے انسان کو بھی ناقابلِ شناخت بنادیتی ہے۔ تم نے کبھی کوڑا چننے والے بچوں کو دیکھا ہے؟ کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ وہ گندگی اور میل کچیل میں لتھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے جسم پر غلیظ بدبودار لباس ہوتا ہے۔ ان میں سے بعض بچے اتنے خوب صورت ہوتے ہیں کہ اگر وہ صاف ستھرے ہوکر، شاندار لباس پہن کر سامنے آئیں تو ان کے چہروں پر نظر نہ ٹھہرے۔" میں نے جھرجھری سی لی "انتہا کی غربت اور انتہا کی مفلوک الحالی بڑی ظالم چیز ہے۔ اچھے بھلے انسان کی جڑ مار کر رکھ دیتی ہے۔ اس کے برعکس صاف ستھرے، فیشن ایبل لباس میں، دس بیس لاکھ کی گاڑی میں بیٹھا ہوا شوخ و طرار اور پُراعتماد بچہ انتہائی کم رو بھی ہو تو اچھا بھلا خوب صورت دکھائی دیتا ہے۔"

وہ مسکراتے ہوئے گہری نظر سے میری طرف دیکھ کر بولی "لیکن دیکھنے والے گدڑی میں لعل دیکھ لیتے ہیں۔"

"وہ اور بات ہے۔ میں ظاہری اور ابتدائی تاثر کی بات کررہا تھا۔" میں نے کہا اور گھڑی دیکھی "ابھی تو تمہارے جانے میں خاصا وقت ہے۔"

"تمہیں میری موجودگی سے پریشانی ہے تو ابھی چلی جاتی ہوں۔"

"کون بدبخت یہ چاہتا ہے!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کتنی مرتبہ تو تمہیں بتایا ہے کہ میں تمہیں زندگی بھر کے لئے گلے کا ہار بنانا چاہتا ہوں تم "ہاں" ہی نہیں کرتیں۔"

"ہاں کرنے کے کچھ عرصے بعد ہی میں تمہیں گلے کا ہار نہیں، گلے میں پڑا ہوا مُردہ سانپ لگنے لگوں گی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"بس؟ صرف اس خوف سے انکار کرتی رہتی ہو؟" میں نے آنکھیں پھیلائیں۔

"نہیں، یہ تو ہزاروں وجوہات میں سے ایک وجہ ہے۔" وہ بدستور مسکراتی رہی۔

"انسان جب کوئی کام کرنا نہیں چاہتا تو اس کے لئے ہزاروں وجوہات گھڑلیتا ہے اور جب کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے بھی ہزاروں جواز گھڑلیتا ہے۔ چاہے کام اچھا ہو یا بُرا۔ ساری بات بس انسان کے دل کی ہے۔ دل ٹھیک ہوجائے تو سب ٹھیک ہوجاتا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے انگلیوں پر گننے کے انداز میں تیار ہوکر بیٹھتے ہوئے کہا "اچھا فرض کرو تم کوئی امتحان دے رہی ہو۔ پیپر میں تم سے سوال کیا گیا ہے کہ افضل چوہدری سے شادی نہ کرنے کی صرف دس معقول وجوہات لکھئے.... تو تم کیا لکھو گی؟"

"ایک تو تم گھوم پھر کر اپنے اس پسندیدہ موضوع پر ضرور آجاتے ہو۔" وہ مصنوعی ناگواری سے پیشانی پر ہاتھ مار کر بولی "چلو ٹھیک ہے۔ مان لیا۔ میرے پاس ایک بھی معقول وجہ نہیں ہے لیکن اگر کسی کا شادی کرنے کو ہی دل نہیں چاہتا تو کیا اسے مجبور کرنا ضروری ہے؟"

"میں مجبور تھوڑا ہی کررہا ہوں۔ میں تمہیں منا رہا ہوں۔" میں نے سادگی سے کہا "اسے لڑکی کو شادی کے لئے راضی کرنے کا عمل کہتے ہیں۔"

"میں نہیں مانوں گی۔ تم میرا دماغ چاٹنا چھوڑ دو۔" وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

"بعض لوگ زندگی بھر صرف "میں نہ مانوں" کی گردان کرنے کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہرحال میں تو اصل میں یہ کہنے لگا تھا کہ ابھی تمہارے جانے میں خاصا وقت ہے۔ کیوں نہ میں واقعی اپنے بزنس کے تھوڑے سے معاملات دیکھ لوں۔ کم از کم اس ہوٹل کا ہی تھوڑا بہت حال چال پوچھ لوں۔ اب میں نے سوٹ بوٹ پہن لیا ہے تو خواہ مخواہ ہی آفس میں جاکر بیٹھنے کو دل چاہنے لگا ہے۔ آؤ نیچے ہوٹل کے آفس میں چلتے ہیں۔ میں ہوٹل کی حالت کا سرسری سا جائزہ ہی لے لوں۔"

"یعنی تم اب آفس میں بیٹھ کر فائلیں دیکھو گے اور میں احمقوں کی طرح تمہاری شکل دیکھوں گی؟"

"نہیں تم احمقوں کی طرح نہیں بلکہ پیار سے میری شکل دیکھنا۔" میں نے مشورہ دیا۔

"اِئی!" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی "میں اب واقعی کوئی چیز اُٹھا کر تمہارے سر پر دے ماروں گی۔"

"بھئی تم آخر کس قسم کی لڑکی ہو؟ نہ تم شادی کے لئے ہامی بھرتی ہو اور نہ ہی میں تنہائی میں بیٹھ کر تم سے رومینٹک گفتگو کرسکتا ہوں۔ حتیٰ کہ تمہیں پیار سے میری طرف صرف دیکھنا بھی گوارا

نہیں۔ ان حالات سے دل برداشتہ ہو کر اگر میں کاروبار کی طرف ذرا سی توجہ دینے کی بات کرتا ہوں تو اس سے بھی تم بور ہوتی ہو۔ بتاؤ آخر میں کیا کروں؟"

"چلو بابا... تم آفس ہی چلو۔" راحیلہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔

سوئٹ سے نکل کر لفٹ کی طرف جاتے ہوئے میں نے سنجیدگی سے اس سے کہا "ویسے تم بزنس میں اپنی دلچسپی بڑھانے کی کوشش کرو تاکہ اگر کبھی مجھے اِدھر اُدھر ہونا پڑے تو تم میرا بزنس سنبھال سکو۔ مجھے معلوم ہے تم بزنس سنبھال سکتی ہو۔"

"سنبھال سکنا اور بات ہے' دلچسپی لینا اور بات۔" وہ بولی "میں بزنس سنبھال سکتی ہوں لیکن اس میں دلچسپی نہیں لے سکتی۔ لاہور میں تمہاری عدم موجودگی میں چند دن کے لئے جب ریڈ ڈاٹ والا محاذ ٹھنڈا تھا تو میں نے تمہارے بزنس کی دیکھ بھال کی تھی۔ ایک اخلاقی یا دفتری فریضہ سمجھ کر میں سارے کام تو کر سکتی ہوں لیکن درحقیقت مجھے روپے پیسے کے چکروں اور کاروبار کے نشیب و فراز سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

میں نے لفٹ میں گھس کر بٹن دباتے ہوئے کہا "شادی سے تمہیں دلچسپی نہیں... کاروبار سے تمہیں دلچسپی نہیں... مجھ سے تمہیں دلچسپی نہیں... آخر تمہیں کس چیز سے دلچسپی ہے؟"

"میں نے یہ تو نہیں کہا کہ مجھے تم سے دلچسپی نہیں۔" وہ مسکرائی "دلچسپی تو بہت ہے' ویسے بھی تم بہت دلچسپ چیز ہو۔ میں تمہارا مشاہدہ اور مطالعہ کرتی رہتی ہوں لیکن ضروری تو نہیں کہ انسان جس چیز میں دلچسپی لے اس سے شادی بھی کر لے۔ دلچسپی تو انسان چڑیا گھر کے کسی بندر میں بھی لیتا ہے لیکن ضروری تو نہیں کہ اس سے وہ شادی بھی کر لے۔"

"تم مجھ میں دلچسپی مت لو' صرف شادی کر لو۔ دلچسپی تم چڑیا گھر کے کسی بندر میں ہی لیتی رہنا۔" میں نے مشورہ دیا۔

اس نے ٹھنڈی سانس لے کر لفٹ کی چھت کی طرف دیکھا اور گویا بے بسی سے کندھے اُچکا کر رہ گئی۔ وہ مزید کچھ نہ بولی حتیٰ کہ ہم آفس میں جا پہنچے۔ ایک خاص تراش خراش کا نفیس قسم کا برقع تو اس نے اوپر سے روانہ ہوتے وقت ہی لے لیا تھا۔ اب اس نے اپنے مخصوص انداز میں نقاب لپیٹ کر سیاہ چشمہ بھی لگا لیا تھا۔

ہوٹل میں ایک آفس صرف میرے لئے مخصوص تھا لیکن آج تک یہ زیادہ تر بند ہی رہا تھا۔ میرے اس آفس میں پہنچنے سے ہوٹل کے اسٹاف میں کچھ کھلبلی سی مچ گئی۔ میں نے جنرل منیجر اور اکاؤنٹس منیجر وغیرہ کو بلا کر حسابات کی فائنل رپورٹیں اور آڈٹ رپورٹیں وغیرہ دیکھیں۔ ان سے تمام ضروری معلومات حاصل کیں۔ اس دوران شفیع شاہ بھی آ پہنچا اور یہ ایک طرح کی غیر رسمی کاروباری میٹنگ سی ہو گئی۔

ہوٹل بہت اچھا بزنس تو نہیں کر رہا تھا لیکن حالت مایوس کن بھی نہیں تھی۔ میں نے شفیع شاہ سے کنسٹرکشن کے بزنس کے بارے میں معلومات کیں۔ ان کی حالت بھی تقریباً ہوٹل جیسی تھی۔ شہر کے حالات کی وجہ سے کنسٹرکشن کا بزنس بھی لیکن زیادہ بری حالت نہیں تھی۔ اس کام میں تو بینکوں قرضے بھی شامل تھے۔ ادائیگیوں کی صورتِ حال بری نہیں ہم نادہندگان میں شامل نہیں تھے۔

کافی دیر تک ان مسائل میں سر کھپانے کے بعد ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا۔ کھانے کے دوران میں نے شفیع "جزیرے پر قاسم بجلی کا مکان اور اس کے اہلِ خانہ کی نگرانی میں رہیں گے۔ میں چاہتا ہوں تم بھی اپنے لوگوں پر نظر رکھو اور اگر تمہیں کوئی کام کی بات معلوم فوری طور پر مجھے اطلاع دو۔ امید تو نہیں ہے کہ اب اس گھر کے قریب پھٹکنے کی کوشش کرے گا لیکن تم خاص کی تلاش کے سلسلے میں آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کرنا۔"

راحیلہ نہایت سنجیدگی سے شفیع شاہ کی طرف دیکھتے "عام حالات میں کیا تمہاری آنکھیں بند رہتی ہیں؟"

شفیع شاہ مسکرا دیا۔ میں نے راحیلہ کو خفگی سے گھور کہا "ہم اس وقت ذرا جاسوسانہ زبان میں بات کر ر اپنی چونچ بند رکھو یا اسے کھانا کھانے کے لئے استعمال"

میں نے دوبارہ شفیع شاہ کو مخاطب کیا "کراچی میں... یا بلکہ کسی بھی جگہ ڈاکٹر برنارڈ کی جھلک بھی نظر آ جائے تو کھیل کر بھی اسے قابو میں کرنا ہے۔"

"افضل بے چارے کو میرے چہرے کی بہت" راحیلہ نے شفیع شاہ کو بتایا۔

"ظاہر ہے۔" میں نے کہا "تمہارے بارے میں کرنی پڑتی ہے۔ تمہیں تو کارٹون بن کر پھرتے ہوئے نہیں ہوتی لیکن مجھے تم کو دیکھ دیکھ کر الجھن ہوتی ہے پوش حسینہ کے روپ میں گھومتی ہو تو بعض جگہوں پر لو مڑ کر دیکھتے ہیں اگر کھلا چہرہ لے کر گھومو گی تب اور بھی مڑ کر اور رک رک کر دیکھیں گے۔"

"لوگ تو اس وقت بھی مڑ مڑ کر میری طرف دیکھ میرا چہرہ ٹھیک تھا۔ تمہیں اس وقت پریشانی نہیں" راحیلہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

اس وقت ہم تینوں میرے سوئٹ میں واپس آ وہیں کھانا منگوا کر کھا رہے تھے۔

میں نے منہ بنا کر کہا "یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔ لوگ مڑ مڑ کر تمہاری طرف دیکھتے تھے۔ البتہ جب ساتھ ہوتا تھا تو کچھ خواتین ضرور مڑ مڑ کر دیکھ لیتی دراصل میری طرف دیکھتی تھیں۔"

"... اور حیرت سے سوچتی تھیں کہ یہ پہلوئے کہاں چلا جا رہا ہے۔" راحیلہ نے ٹکڑا لگایا۔

"اللہ رے خوش فہمی!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر متاسفانہ انداز میں سرہلایا۔ شفیع شاہ سر جھکائے' مسکراتے ہوئے خاموشی سے کھانا کھا رہا تھا۔

ہم ابھی خوش گپیوں اور کھانے میں ہی اُلجھے ہوئے تھے کہ راحیلہ کے لئے نفیس صاحب کا فون آگیا۔ انہوں نے پروگرام سے کچھ پہلے ہی پانچ بجے والی فلائٹ پکڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا چنانچہ راحیلہ کو تھوڑی دیر تک ائرپورٹ کے لئے روانہ ہوجانا چاہئے تھا۔ گاڑی اسے لینے کے لئے آنے والی تھی۔ نفیس صاحب نے مجھے اور شفیع شاہ کو ائرپورٹ آنے سے منع کیا تھا۔

راحیلہ فون بند کرکے ایک طرف رکھ کر اطمینان سے دوبارہ کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی "دیکھا! اس لئے میں نے وقت سے بہت پہلے ہی جانے کی تیاری کرلی تھی۔ نفیس صاحب کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ عام طور پر ان کے پروگراموں پر وقت سے پہلے ہی عمل درآمد شروع ہوجاتا ہے۔"

ہم نے کھانا تو کھالیا لیکن چائے یا کافی پینے کی نوبت نہیں آئی۔ نیچے استقبالیہ سے فون پر اطلاع آگئی کہ راحیلہ کو گاڑی لینے آگئی تھی۔ بیل بوائے اس کے کمرے سے اس کا چھوٹا سا بیگ اور بریف کیس اُٹھا کر نیچے چل دیا اور وہ یوں ہاتھ ہلا کر تیزی سے روانہ ہوگئی جیسے پڑوس میں کہیں جارہی ہو۔ ہم اسے سی آف کرنے نیچے بھی نہیں گئے۔ اس نے خود ہی اس تکلف سے منع کردیا۔

اس کے جانے کے چند لمحے بعد ہی شفیع شاہ بولا "سر! میں بھی چلتا ہوں۔ جزیرے پر جاکر صورتِ حال کا جائزہ لیتا ہوں۔ ہمارا ٹرالر تو جزیرے کے قریب ہی موجود ہے لیکن نگرانی کے لئے مجھے صحیح طور پر انتظامات کرنے ہوں گے۔"

میں نے سرہلا کر اسے اجازت دے دی۔ جاتے جاتے وہ رُک کر پلٹتے ہوئے بولا "سر! آپ نے مجھ سے رائے مانگی تو نہیں... لیکن میں خود ہی اپنی رائے کا اظہار کررہا ہوں۔ میرے خیال میں قاسم بجلی کو اس کے اپنے ہی کسی آدمی نے قتل کیا ہے۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ موقع بہت مناسب تھا۔ اس قسم کے لوگوں پر جب کوئی بُرا وقت آنے لگتا ہے تو انہیں سب سے زیادہ خطرہ اپنے ہی آدمیوں کی طرف سے ہوتا ہے۔"

"تمہیں یہ خیال کیونکر آیا؟" میں نے پوچھا۔

"اس کی لاش کے ساتھ کسی بھی گارڈ کا زندہ یا مُردہ نہ پایا جانا مجھے حیرت میں مبتلا کررہا ہے۔ مجھے یقین نہیں ہے کہ وہ کسی گارڈ کو ساتھ لئے بغیر فرار ہونے کے لئے روانہ ہوا ہوگا۔"

"دیکھتے ہیں سرکاری اداروں کی تحقیقات سے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اس کے بعد شاید ہم کوئی صحیح اندازہ لگانے کی پوزیشن میں ہوں۔" میں نے کہا اور وہ سرہلا کر رخصت ہوگیا۔

راحیلہ اور شفیع شاہ کے جانے کے بعد یکدم گویا میرے سوئٹ میں ہی نہیں' میرے وجود کے اندر بھی گہرا سناٹا چھا گیا۔ میں نے اچانک ہی اپنے آپ کو بہت تنہا' خالی خالی اور اُداس محسوس کیا۔ اتنے ہنگاموں سے گزرنے کے بعد یکدم ہی گویا مجھے دنیا میں کوئی مصروفیت نہیں رہی تھی۔ میں بہت دیر تک آنکھیں بند کئے صوفے پر بیٹھا رہا اور اندر ہی اندر اپنے آپ کو مجتمع کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک طویل عرصے کی ہنگامہ خیزی اور جاں گسل مصروفیات نے مجھے منتشر کرکے رکھ دیا تھا۔ اب میں چند دن نہایت سکون اور سست روی سے گزارنا چاہتا تھا۔ مجھے جو مصروفیات درپیش تھیں اور غیر متوقع طور پر سر اُٹھا سکتی تھیں' انہیں بھی میں نہایت دھیمے پن اور صبر و سکون سے نمٹانا چاہتا تھا۔

کافی دیر تک یونہی مراقبے کی سی حالت میں بیٹھے رہنے کے بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو اپنے آپ کو نہ جانے کیوں بہت تازہ دم محسوس کیا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ مزید تازہ دم ہونے کے لئے مجھے کافی بار میں جاکر کافی پینی چاہئے۔

میں ایک بار پھر لفٹ کے ذریعے نیچے آیا اور کافی بار کی طرف چل دیا۔ کافی بار کا باقاعدہ کوئی دروازہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے ایک طلائی جنگلا لگا ہوا تھا جس کے عقب میں مصنوعی پودوں کے طلائی گملے سجے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان اندر جانے کے لئے کچھ جگہ خالی تھی۔ درمیانی راستے پر سُرخ قالین بچھا ہوا تھا۔

میں اسی راستے پر کھڑا اپنے لئے کوئی میز منتخب کررہا تھا کہ اچانک مجھے احساس ہوا کوئی میری طرف دیکھ رہا ہے۔ کافی بار کی اس وقت بیشتر میزیں خالی تھیں۔ میں نے نہایت آہستگی سے گردن موڑ کر کونے کی ایک میز کی طرف دیکھا۔ وہاں روشنی کم تھی۔ اس کے باوجود میری آنکھیں گویا خیرہ ہوگئیں۔

جھلمل کرتے سُرخ لبادے میں وہ وہاں بڑی تمکنت سے ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھی تھی۔ اس کی مرمریں مخروطی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جس سے دُھوئیں کی لکیر بلند ہورہی تھی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی گویا میں سیدھا اسی کی میز پر پہنچوں گا۔ وہ جو بھی تھی' جیسی بھی تھی بہرحال ایک خوب صورت عورت تھی۔

میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا "برخوردار افضل چوہدری! اگر وہ اتنے اشتیاق سے تمہاری آمد کی منتظر ہے تو اس کی میز پر جانا تمہارا "اخلاقی" فرض ہے۔"

وہ فرحین عرف مس ایکس تھی جس سے میری ملاقات قاسم بجلی کے ہاں ہوئی تھی۔ اس کی شخصیت کی ایک خاص کشش تو جگہ تھی لیکن اس سے تو محض تجسس کے تحت بھی ملا جاسکتا تھا۔ میں نے جب اسے قاسم بجلی کے ہاں دیکھا تھا تو مجھے اس کی صورت کچھ مانوس سی محسوس ہوئی تھی اور مجھے ابھی تک یاد نہیں آیا تھا کہ میں نے اسے پہلے کہاں دیکھا تھا۔ اب بھی اسے دیکھ کر میرے ذہن میں بہت سے سوالات اُبھرے تھے۔ اس سے مل لینا ضروری تھا۔

وہ اپنی دانست میں ایک کونے میں تقریباً چھپی بیٹھی تھی۔ روشنی کی جگمگاہٹ بھی وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی لیکن کافی بار کی میزوں پر جتنے بھی مرد تھے' گردنیں موڑ موڑ کر اس کی طرف دیکھنے کی کوشش ضرور کررہے تھے شاید صرف وہی اپنی گردنوں کو قابو میں کئے بیٹھے تھے جن کی بیویاں ان کے ساتھ تھیں۔

میں نے ہونٹوں پر نہایت ملنسارانہ اور پُراشتیاق مسکراہٹ سجانے کی کوشش کی اور اس کے قریب جا پہنچا۔ اس نے اُٹھ کر میرا استقبال کیا اور گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ وہ جب بیٹھی تھی تب بھی قیامت ہی تھی اور اس کا اُٹھنا بھی قیامت سے کم نہیں تھا۔

"آپ سے دوبارہ مل کر خوشی ہوئی مس ایکس!" میں نے شائستگی سے کہا۔

"میرا نام فرحین ہے۔ آپ مجھے اسی نام سے مخاطب کیجئے۔ مس ایکس میرا کاروباری نام ہے۔" وہ دھیمے لیکن کھنک دار لہجے میں بولی۔ اس کی آواز بھی دل کو گدگدانے والی تھی "اور ہم ابتدا ہی سے ایک دوسرے کو "تم" کہہ کر مخاطب کریں تو گفتگو میں بوجھل پن نہیں رہے گا۔ تشریف رکھیے۔" اس نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

میں بیٹھ چکا تو اس نے انتہائی شیریں لہجے میں پوچھا "کیسے ہو افضل چوہدری؟"

انداز کچھ ایسا تھا جیسے میں اس کا برسوں پُرانا اور قریبی دوست تھا۔ میری کھوپڑی بھک سے اُڑ گئی۔ اس نے مجھے میرے اصل نام سے مخاطب کیا تھا جبکہ مجھے اس کی نظر میں عارف ہونا چاہئے تھا۔ قاسم بجلی نے اپنے گھر پر اس سے میرا تعارف عارف کے نام سے کرایا تھا۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے پُرسکون لہجے میں جواب دیا اور پوری پوری کوشش کی کہ میرے چہرے سے بھی حیرت ظاہر نہ ہونے پائے لیکن اس نے یقیناً محسوس کرلیا تھا کہ اندر ہی اندر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

ایک طویل کش لے کر ناک سے دُھواں نکالتے ہوئے وہ گویا میری کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے مترنم انداز میں ہنسی اور دھیمی آواز میں بولی "اپنی حیرت کو چھپانے کی کوشش کیوں کررہے ہو؟"

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ تب وہ ذرا آگے کو جھکتے ہوئے مخمور سرگوشی کے سے انداز میں بولی "لگتا ہے تم جلد بے تکلف ہونے والے مرد نہیں ہو افضل چوہدری!"

"کیا تمہیں جلد بے تکلف ہونے والے مرد اچھے لگتے ہیں فرحین؟" میں نے تاریک شیشوں کا چشمہ اُتار کر میز پر رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"اگر تم کوئی ناصحانہ جواب چاہتے ہو تو بس کہوں گی کہ مجھے تو اس قسم کے مرد اچھے نہیں لگتے لیکن کیا کروں... زندگی تو مَردوں کی اسی دنیا میں گزارنی ہے اور مرد ایک عورت کی ضروریاتِ زندگی میں شامل ہے۔ اس لئے میں یہ بھی نہیں کہتی کہ میں تو مرد کو قریب پھٹکنے بھی نہیں دیتی۔ تاہم میں یہ ضرور کہہ سکتی ہوں کہ میں اتنی آسانی سے رسائی میں آنے والی عورت بھی نہیں ہوں جتنی عموماً میری لائن کی عورتیں ہوتی ہیں۔"

"اور تمہاری لائن کیا ہے فرحین؟" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔

وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی۔ اچھی بات یہ تھی کہ اس کی ہنسی مصنوعی نہیں تھی۔ وہ کرسی آگے کھسکاتے ہوئے بولی "تمہیں قاسم بجلی نے بتایا تو تھا۔"

"اوہ" میں نے تفہیمی انداز میں سرہلایا "یعنی وہ تمہارا درست تعارف تھا۔ اس میں کوئی کمی بیشی...؟"

"کمی بیشی اگر ہو بھی سکتی ہے تو ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔" اس نے بے نیازی سے اپنے سڈول کندھے اُچکائے "اگر تم سے میل ملاقات رہی تو ممکن ہے تم مجھے اچھے لگنے لگو۔ تب ہم دونوں ہی اپنے اپنے تعارف میں کاٹ چھانٹ یا ترمیم اور اضافے وغیرہ پر غور کرسکیں گے۔"

"لیکن یہ سوال تو شاید میں اس وقت بھی کرسکتا ہوں کہ تم مجھے کس طرح جانتی ہو اور کس حد تک جانتی ہو؟" میں نے کہا۔

"میں صرف یہ جانتی ہوں کہ تم لاہور کے ایک بڑے بزنس مین ہو۔ تمہارے کئی بزنس ہیں۔ ... میں بھی اور کراچی میں بھی اور یہ ہوٹل بھی تمہارا ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں گہری سانس لے کر رہ گیا پھر میں نے اچانک پوچھا "کافی پیو گی؟"

اس نے ایک لمحے سوچا پھر کندھے اچکاتے ہوئے بولی "فی الحال کافی ہی پی لیتے ہیں۔" وہ کبھی انگریزی اور کبھی اردو میں بات کررہی تھی۔

میں نے ویٹر کو کافی کا آرڈر دیا اور اس کے جانے کے بعد کہا "مجھے تو اس ہوٹل کے ویٹر بھی نہیں پہچانتے کہ میں اس کا مالک ہوں لیکن تم نے مجھے پہچان لیا تو مجھے لگ رہا ہے کہ میں کافی جانی پہچانی شخصیت ہوتا جارہا ہوں۔ مجھے اس پر تشویش ہے۔"

"کیوں کیا تمہیں گمنام رہنا زیادہ اچھا لگتا ہے؟" وہ مسکرائی۔

میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "تمہیں قاسم بجلی نے میرے بارے میں بتایا تھا؟"

"نہیں" اس نے نفی میں سرہلایا اور اس کے شہد کی سی رنگت کے ریشمی بال ہلکورے لے کر رہ گئے "قاسم بجلی سے تمہاری عدم موجودگی میں تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ تم تو اچانک ہی ڈرائنگ روم میں آن ٹپکے تھے۔ اس کے بعد جو بھی گفتگو ہوئی تمہارے سامنے ہی ہوئی تھی اور پھر تمہارے سامنے ہی میں رخصت ہوگئی تھی۔ میں تمہیں اس سے پہلے سے جانتی تھی۔

سچی بات تو یہ ہے کہ جب قاسم بجلی نے عارف کے نام سے تمہارا تعارف کرایا تو مجھے حیرت کا زوردار جھٹکا لگا تھا۔"

"لیکن تم نہایت صفائی سے اپنی حیرت کو چھپا گئی تھیں۔"

"ہاں بالکل اسی طرح جس طرح چند لمحے پہلے تم نے اپنی حیرت کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا۔" اس نے جواب دیا "بلکہ میں نے تو شکر کیا تھا کہ میں اس سے پہلے ہی تمہیں تمہارے اصل نام سے مخاطب نہیں کر بیٹھی تھی۔"

"تم نے اپنی حیرت کو چھپانا کیوں بہتر سمجھا تھا؟"

"میں نے سوچا تم ایک بڑے بزنس مین ہو اور قاسم بجلی جیسے بدنام آدمی کے گھر میں فرضی نام سے موجود ہو۔ معلوم نہیں اس میں تمہاری کیا مصلحت ہوگی۔ میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ تمہاری اس مصلحت کو نقصان پہنچاؤں۔ آج کل بزنس اور بدمعاشیاں گڈمڈ ہو کر رہ گئی ہیں' کچھ پتا نہیں چلتا کون خالص بزنس مین ہے اور کون اس کی آڑ میں دوسرے دھندے کر رہا ہے۔ میں نے سوچا شاید تمہارا بھی کوئی ایسا ہی مسئلہ ہو۔ مجھے اس میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں صرف اپنے کام سے کام رکھتی ہوں۔ میں پہلے ہی خاصی خطرناک دنیا میں رہتی ہوں۔ غیر ضروری طور پر زبان کھول کر اپنے لئے مزید خطرات مول نہیں لیتی۔"

"بہت خوب... لیکن کیا تمہاری وہ رائے ابھی قائم ہے؟"

"کون سی رائے؟" اس کی پتلی تلی بھویں کمان بن گئیں۔

"وہی کہ شاید بزنس کی آڑ میں میرے بھی کچھ ایسے ویسے دھندے ہوں؟"

"نہیں بہت جلد میری رائے بدل چکی ہے۔ میں نے یہاں واپس پہنچتے ہی تجسس سے مجبور ہو کر تمہارے بارے میں اپنے کچھ ذرائع سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔ مجھے یہ جان کر ایک خوشگوار حیرت ہوئی کہ تمہاری شہرت بہت اچھی ہے۔ بہت کم لوگ تمہیں جانتے ہیں لیکن جتنے بھی جانتے ہیں وہ تمہارے بارے میں اچھی رائے رکھتے ہیں۔ تمہارے بارے میں کوئی مشکوک بات سُننے میں نہیں آئی۔ تمہیں ایک شریف آدمی سمجھا جاتا ہے۔"

"بہت افسوس ہوا یہ سُن کر۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کہیں میں شرافت کی اس منزل کو نہ پہنچ جاؤں کہ راہ چلتے خوب صورت خواتین مجھے دیکھ کر سروں پر دوپٹے درست کرلیا کریں اور جب میں قریب پہنچوں تو نظریں ادب سے جھکا کر کہا کریں "بھائی جان! السّلام علیکم!" تم نے مجھے تشویش میں مبتلا کردیا ہے۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی گویا نازک بلوری پیالوں میں تیرتے برف کے کیوبس کناروں سے ٹکرائے ہوں اور بہت ہی دھیمے جلترنگ بج اُٹھے ہوں۔

ہنسی تھمی تو وہ بولی "ڈرو مت تم پر وہ وقت آتا دکھائی نہیں دیتا۔"

"دلجوئی کا شکریہ۔" میں نے گردن کو خم دیا اور ایک خاموشی کے بعد اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا معلوم ہے قاسم بجلی مرچکا ہے؟"

"ہاں مجھے معلوم ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب

"تم پر اس کی موت کا کوئی اثر نظر نہیں آتا۔" میں ظاہر کیا۔

"اگر قاسم کے بجائے اسی طرح کہیں میں ماری جاچکی قاسم پر بھی اس کا کوئی خاص اثر نظر نہیں آتا۔ میں نے کہا جیسے لوگ ایک سفاک دنیا میں رہ رہے ہوتے ہیں۔" وہ ہم میں بولی۔

میں نے اثبات میں سرہلایا "میرا خیال ہے آج کل سفاک دنیا میں ہی رہ رہے ہیں۔ اچھا یہ بتاؤ تم یہاں کس سلسلے آرہی ہو؟ میرا مطلب ہے اس ہوٹل میں....؟"

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں یہیں مقیم اس نے ایک دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

"اوہ" میں نے آنکھیں پھیلائیں "مجھے نہیں معلوم کل میرے ہوٹل پر خوش قسمتی اس حد تک سایہ فگن ہے

"تم تو کراچی میں رہتے ہی کم ہو اور اگر رہتے بھی تو اتنے کھڑے ہونا یا بکنگ کا رجسٹر دیکھنا ایک مالک کے شایانِ ہوتا۔ اگر تم کبھی چند دن یہ تکلیف اٹھاؤ تو تمہیں معلوم ہو قسمتی کیسے کیسے حسین روپ میں تمہارے ہاں قیام کرتی اور ہوتی رہتی ہے۔"

"یعنی ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے۔" ٹھنڈی سانس لی اور اچانک ہی پوچھا "تم تو قاسم بجلی کی موت روشنی ڈال سکتی ہو؟"

"یہ اندھیروں کی باتیں ہیں' انہیں اندھیرے میں ہی ر ان پر روشنی ڈال کر تمہیں کیا مل جائے گا؟ بدصورتیاں ہی آئیں گی۔ ویسے بھی میں ایک معمولی عورت ہوں۔ میرا حیثیت کہاں کہ اتنے بڑے بڑے معاملات پر اظہارِ خیال کر اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔

"اب اتنی بھی انکساری اچھی نہیں۔ میرے خیال میں بھی عورت معمولی نہیں ہوتی اور تم تو معمولی ہو ہی نہیں سکتی اگر کسی شاہراہ کے پُل پر بیٹھی بھیک مانگ رہی ہوتیں تو معمولی نہ ہوتیں۔"

"بس بس" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولی "جھوٹی باتوں دل خوش کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں ان منزلوں سے گزر ہوں۔ میں اب ایسی باتوں سے خوش نہیں ہوتی۔"

"تم نے میری باتوں کو جھوٹ سمجھ کر میرا دل توڑ دیا میں نے مغموم لہجے میں کہا۔ "اس دنیا میں بے شک ان ایک جیسی باتیں کرتے ہوں لیکن ان میں سے ایک آد

ہے جو وہ باتیں سچے دل سے کر رہا ہوتا ہے۔"

"ان باتوں کو چھوڑو۔" وہ ہاتھ ہلاتے ہوئے بولی "قاسم بجلی کی بیچ میں ہی رہ گئی۔ یہ بھی تو ممکن ہے کہ تم نے ہی اسے انجام کو پہنچایا ہو۔ یا تمہارے اشارے پر یہ کام ہوا ہو؟ کیا یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس رات میں نے تمہیں اس کے گھر میں دیکھا' قاسم بجلی اس رات کی صبح دیکھنی نصیب نہیں ہوئی۔"

"یہ اتفاق ضرور ہے مگر بہت زیادہ عجیب نہیں۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا "یہ نیک کام میرے ہاتھوں انجام نہیں پایا۔ شاید یہ نیکی کسی بُرے آدمی کے حصے میں آگئی ہے۔ میں تو ابھی قاسم بجلی کو صحیح طور پر جان ہی نہیں سکا تھا کہ اس کے بارے میں کوئی اہم فیصلہ کرتا۔ میں تو کچھ اور لوگوں کے چکر میں اس کے ہاں گیا ہوا تھا۔"

"ٹھیک ہے مجھے تمہاری بات کا اعتبار آگیا۔" وہ مطمئن لہجے میں بولی۔

"عجیب عورت ہو' کسی بات کا اعتبار کرلیتی ہو' کسی کا نہیں کرتی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر پوچھا "قاسم بجلی نے جو نیا ہوا ہوٹل خریدا تھا اور جسے وہ تمہارے شو وغیرہ کے سہارے چلا کر کامیاب بنا چکا تھا۔ کیا اس میں تمہارا شو اب بھی جاری رہے گا؟"

"یقیناً" اس نے جواب دیا "میرا ایگریمنٹ قاسم بجلی کے ساتھ نہیں' اس کی کمپنی کے ساتھ ہے اور تمہیں معلوم ہے کمپنیوں کے کام تو ان کے مینجنگ ڈائریکٹرز یا ڈائریکٹرز وغیرہ کے انتقال کے بعد بھی چلتے رہتے ہیں۔ ابھی مزید ایک ماہ کا ایگریمنٹ ہے جس کے بعد میری مرضی ہوگی کہ اسے ری نیو کروں یا نہ کروں۔ اس ایگریمنٹ میں ہی مجھے فائیو اسٹار ہوٹل میں ٹھہرانے کی شرط بھی شامل تھی جس کے نتیجے میں' میں یہاں نظر آرہی ہوں ورنہ شاید اسی ہوٹل میں ہوتی جہاں اپنا شو پیش کر رہی ہوں۔" پھر گھڑی دیکھتے ہوئے بولی "مجھے تو آج بھی اپنا شو پیش کرنا ہے۔"

"کم از کم قاسم بجلی کے سوگ میں ہی ایک آدھ دن کے لئے ملتوی ہوجانا چاہئے تھا۔" میں نے کہا۔

"اب میں کیا کرسکتی ہوں۔" اس نے کندھے اچکائے "یہ تو انتظامیہ کا کام ہے۔ میرا خیال ہے وہ لوگ قاسم بجلی کی موت کی خبر پھیلانا نہیں چاہتے۔ ابھی تک یہ خبر کسی اخبار میں بھی نہیں آئی ہے۔"

اس دوران کافی آگئی تھی اور وہ کافی تیار کرنے لگی تھی۔ چند لمحے ہم خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتے رہے پھر وہ کپ رکھتے ہوئے بولی "تم آج میرا شو دیکھنے آؤ نا......" میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا تو وہ بولی "شاید تمہیں ان خرافات سے دلچسپی نہ ہو لیکن مزید میل ملاقات کا بہانہ ہی سہی۔"

اس نے قریب ہی دوسری کرسی پر رکھا ہوا اپنا ہینڈ بیگ اُٹھایا اور اس میں سے ایک سنہرا لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا "یہ ایک وی آئی پی کارڈ ہے اس پر دو افراد آسکتے ہیں لیکن اگر تم اکیلے ہی آؤ تو مجھے زیادہ خوشی ہوگی۔"

"میں ضرور آؤں گا۔" میں نے یکدم ہی فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا "مگر وہ بات بیچ میں ہی رہ گئی کہ تم مجھے کیسے جانتی ہو؟ اور میں تم سے یہی پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا میں بھی تمہیں جانتا ہوں؟ پہلی ملاقات پر ہی مجھے تمہاری صورت کچھ شناسا سی لگی تھی۔"

"اتنا بھی غنیمت ہے۔" وہ دھیرے سے ہنسی "ورنہ مجھے تو اُمید نہیں تھی کہ تمہارے ذہن کے کسی گوشے میں میری کوئی پرچھائیں موجود ہوگی۔"

"اس کا مطلب ہے ہم پہلے مل چکے ہیں؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یقیناً" اس نے جواب دیا "میری نظر میں تم بڑے آدمی تھے۔ میرے لئے وہ ملاقات اہم تھی۔ میں نے اسے یاد رکھا۔ تمہارے لئے اہم نہیں تھی تم نے یاد نہیں رکھا۔ اس موقعے پر ایک افسوس ناک واقعہ بھی پیش آیا تھا۔"

"کب کی بات کر رہی ہو؟" میں نے ذہن پر زور دیا "میری زندگی میں تو بے شمار افسوس ناک واقعات پیش آئے ہیں۔"

"بہت عرصے پہلے کی بات ہے۔ لاہور میں فلم پروڈیوسرز ایسوسی ایشن کے صدر سعید احمد سعید صاحب کے ہاں زبردست پارٹی تھی۔ میں نے وہاں گانا گایا تھا۔ میں ان دنوں بھی اسٹیٹس سے آئی ہوئی تھی۔"

میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا۔ ساری باتیں یکدم ہی مجھے یاد آگئیں۔ اسی تقریب میں ایک خوب صورت فلمی ایکسٹرا گرل نشاط کی لاش سوئمنگ پول سے برآمد ہوئی تھی جسے میری ایک محسن ہی نے مدد طلب کرنے کے لئے میرے پاس بھیجا تھا۔ وہ ایک الگ ہی کہانی تھی۔ بہرحال مجھے یاد آگیا' اس تقریب میں فرحین نے گانا سُنایا تھا اور بعد میں میرا اس سے تعارف بھی ہوا تھا۔

بلاشبہ اس کی آواز خوب صورت تھی اور وہ خود بھی اس وقت اب سے زیادہ خوب صورت تھی۔ عمر کے تین چار برسوں نے ہی اسے خاصا پامال کیا تھا۔ سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں وہ ایک نوخیز' اچھوتی اور شگفتہ و شاداب قسم کی چیز نظر آرہی تھی۔ اب وہ اس گجرے کی طرح کچھ پژمردہ سی تھی جو بستر کے سرہانے پڑا شبِ رفتہ کی نشانی معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ وہ نوجوانی میں بے حد خوب صورت بے حد بھرپور رہی تھی اس لئے اب بھی اپنی ہم عمر ہزاروں خواتین سے کہیں بہتر اور کہیں تازہ دم معلوم ہو رہی تھی۔ اس کے نشیب و فراز میں اگر کوئی تشنگی تھی تو وہ دور ہوچکی تھی اور اب وہ چھلکتا ہوا جام تھی۔

اس وقت مجھے فلم اسٹار ستارہ مرحومہ نے بتایا تھا کہ وہ ایک نہایت معزز گھرانے کی لڑکی تھی جو برسوں سے امریکا میں سیٹل تھا۔

میں کہے بغیر نہ رہ سکا "ہاں مجھے سب کچھ یاد آگیا۔ اس تقریب میں تم سے تعارف سے پہلے ہی کسی نے مجھے بتایا تھا کہ تم ایک معزز گھرانے کی لڑکی ہو۔"

"ٹھیک ہی بتایا تھا جس نے بھی بتایا تھا۔" وہ خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسی "وہ معزز گھرانا کب کا ختم ہو چکا ہے۔ اب تو بس میں ہوں اور میری رسوائیاں!"

قاسم بکلی کے ہاں بھی اس کی گفتگو میں مجھے تلخی کی آمیزش محسوس ہوئی تھی۔ میں خاموش اور منتظر رہا کہ شاید وہ اپنے بارے میں کچھ اور بتائے مگر وہ ایک نئی سگریٹ سلگا کر میرے منہ پر دھواں چھوڑتے ہوئے بولی "تو پھر تم میرے شو میں آ رہے ہو نا؟"

"یقیناً" میں نے جواب دیا پھر ایک لمحے کے توقف سے کہا "شو سے مجھے واقعی کوئی خاص دلچسپی نہیں لیکن تم سے مل کر کچھ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے کسی پرانے دوست سے ملاقات ہوگئی ہے۔ اس لئے بقول تمہارے مزید میل ملاقات کا بہانہ سمجھتے ہوئے آجاؤں گا۔ یہاں تمہارا کمرا نمبر کیا ہے؟ شاید میں تمہارے لئے کچھ بہتر خدمات کا بندوبست کرا سکوں۔"

"اب کوئی فائدہ نہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "یہ شام تمہارے ہوٹل میں میری آخری شام ہے۔ میرا سامان جا چکا ہے اور آج رات جب میں شو کے لئے تھری اسٹار ہوٹل جاؤں گی تو واپس یہاں نہیں آؤں گی۔"

"کیا مجھ سے ملاقات اتنی ہی ناخوشگوار ثابت ہوئی ہے کہ تم نے میرا ہوٹل ہی چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا؟" میں نے افسوس زدہ لہجے میں پوچھا۔

"ہرگز نہیں" وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی "تم سے ملاقات تو بہت ہی بروقت اور بہت ہی خوش آئند محسوس ہو رہی ہے۔ تم سے مل بیٹھنے سے پہلے میں اپنے آپ کو بہت تنہا تنہا سی محسوس کر رہی تھی۔ اب مجھے بھی کچھ ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے سرِ راہ چلتے چلتے کوئی بہت پرانا اور مخلص دوست بالکل غیر متوقع طور پر مل گیا ہے۔"

"کمال ہے!" میں نے نیم استہزائیہ لہجے میں کہا "ایک ایسی عورت جس کے ہر رات اس شہر میں سیکڑوں نئے چاہنے والے پیدا ہو رہے ہوں، کہ وہ اپنے آپ کو تنہا تنہا محسوس کر رہی تھی!"

"ایسی ہی عورتیں تو زیادہ تنہا ہوتی ہیں جن کے گرد زیادہ ہجوم ہوتا ہے۔" اس کے لہجے میں ایک عجیب بے ساختگی تھی "بس تمہارا ملنا غنیمت لگا ہے...... بھلا محسوس ہوا ہے۔"

"اس کے باوجود جا رہی ہو؟"

"وہ پروگرام پہلے سے طے تھا۔"

"کیا اب وہیں تھری اسٹار ہوٹل میں ہی ٹھہرو گی۔ جہاں پروگرام کرنی ہو؟"

"نہیں وہاں تو میرا ٹھہرنا بالکل ٹھیک نہیں ہے۔" اس نے جواب دیا "میں یہاں آنے کے چند دن بعد ہی کلفٹن میں ایک اپارٹمنٹ خرید چکی تھی جس کے لئے بیشتر رقم قاسم بکلی نے دی تھی۔ ہمارے تو بہت لمبے لمبے پروگرام تھے۔ معلوم نہیں ان میں سے کس پر عمل ہو سکے گا اور کس پر نہیں۔ بہرحال اس اپارٹمنٹ میں منتقل ہو رہی ہوں بلکہ یوں سمجھو کہ ہو چکی ہوں۔ چند گھنٹوں کے لئے تو میں وہاں کئی بار جا چکی ہوں" میں خاموش رہا تو وہ مسکراتے ہوئے خود ہی بولی "ایڈریس نہیں پوچھو گے؟"

"میں خاصا صابر آدمی ہوں۔" میں نے جواب دیا "سوال کرنے کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرتا ہوں اور سوالوں کے سلسلے میں سوچتا ہوں کہ وہ پوچھنے ہی نہ پڑیں تو اچھا ہے۔ خود بخود ان کے جواب مل جائیں۔"

وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی "تم بہت دلچسپ ہو افضل! تم سے پہلی ملاقات بہت مختصر ہوئی تھی اور وہ بھی بدقسمتی سے المناک سی صورت اختیار کر گئی تھی لیکن تب بھی میں نے تمہارے بارے میں سوچا تھا کہ تم ایسے ہی ہو گے۔"

"کیسے؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ایسے ہی جیسے تم ثابت ہو رہے ہو۔"

"اوہ شکر ہے میں ویسا ثابت نہیں ہوا۔" میں نے گہری سانس لی۔

"کیسا؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ایسا ویسا" میں نے جواب دیا۔

اس کی ہنسی کا سلسلہ کچھ دراز ہو گیا۔ ہنسی تھمی تو "لفظوں کا مداری پن بھی تمہیں آتا ہے۔"

"نہیں اب میں اتنا قابل بھی نہیں، وہ تو یونہی بھی میں سے بات نکل آئی ہے۔" میں نے کہا پھر اضافہ کیا "محض انکساری کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں۔"

"ایڈریس میں تمہیں اس وقت ہی بتاؤں گی جب دیکھنے آؤ گے۔" پھر وہ گھڑی دیکھتے ہوئے بولی "اگر تم اجازت دو تو میں کمرے میں جا کر شو کے لئے جانے کی تیاری کر لوں؟ لینے کے لئے آنے والی ہو گی۔"

"ضرور... ضرور" میں کہہ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس بار اس کا ہاتھ پہلے کی طرح نہیں تھا۔ وہ میزوں کے درمیان گزرگاہ کے سرخ قالین پر کافی سے باہر چلی گئی۔ حضرت جوش نے رقص کو اعضا کی شاعری کہا تھا مگر اس عورت کی چال بھی اعضا کی شاعری تھی۔ میں تھا کہ اس راستے کے آس پاس میزوں پر جو مرد موجود تھے ان کے دلوں کی دھڑکن چند لمحے کے لئے ضرور تیز ہوئی ہو گی۔ نہیں تھا عورتوں کے دلوں کی دھڑکن بھی تیز ہوئی ہو

سے!

فرحین نے مجھے جو کارڈ دیا تھا میں نے وہ لفافے سے نکال کر دیکھا۔ اس میں شو شروع ہونے کا وقت رات نو بجے کا تھا۔ ابھی میرے پاس خاصا وقت تھا۔ میں نے گرم گرم کافی کا ایک اور مگ معدے میں اُتار کر ایک بار پھر اور کی راہ لی۔ اپنے سوئٹ میں پہنچ کر میں نے ٹیلی فون سنبھال لیا۔ مجھے بہت سے لوگوں سے رابطے بحال کرنے تھے۔ فی الحال فون پر اس کام کی ابتدا کی جاسکتی تھی۔

○☆○

میں فرحین کے شو میں ذرا تاخیر سے پہنچا۔ تھری اسٹار ہوٹل میں اس قسم کے شوز اور ڈانس پارٹیوں وغیرہ کے لئے ایک ہال کو خاص طور پر "ڈسکوتھک" کی شکل دی گئی تھی اور وہ واقعی کسی مغربی ملک کا ڈسکوتھک معلوم ہوتا تھا۔ ایک عظیم الشان قسم کا اسٹیج اس میں ایک اضافی چیز تھا۔

میں جب وہاں پہنچا تو ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ میں جب نمبر کے ذریعے اپنی وی آئی پی سیٹ تلاش کرنے میں کامیاب ہوا تو پتا چلا کہ اس پر بھی ایک صاحب تشریف فرما تھے اور باقاعدہ جھوم رہے تھے۔ ہال میں سیٹوں تک رہنمائی کرنے کے لئے تو کوئی صاحب موجود نہیں تھے لیکن شاید میری خوش قسمتی تھی کہ اگلی قطار میں میری سیٹ نسبتاً ایک پرسکون سے گوشے میں دیوار کے قریب تھی اور اس کے ساتھ ہی چھوٹے سے کاؤنٹر پر گنجے سے ایک صاحب موجود تھے جو فلور منیجر معلوم ہوتے تھے۔ ہال کے مسائل کے سلسلے میں ان سے رجوع کیا جاسکتا تھا۔

میں نے ان سے رجوع کیا تو انہوں نے میری سیٹ فوراً ہی خالی کرادی۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں نے اسٹیج کا جائزہ لیا۔ مجھے یہ دیکھ کر ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ فرحین عرف مس ایکس گانا سُنا رہی تھی۔ گانے کے ساتھ ساتھ اس کا جسم شاخِ گل کی طرح ایک خاص ردھم سے بل کھا رہا تھا۔ تاہم وہ بے ہودگی نہیں پھیلا رہی تھی۔

اس کے جسم پر ایک نہایت خوب صورت، نفیس اور باریک لبادہ کچھ ایسی اپنائیت سے لپٹا ہوا تھا جیسے بارش میں بھیگا ہوا ہو۔ پاکستانی اور انڈین فلموں میں بعض اوقات کسی نہ کسی طرح موقع نکال کر ہیروئن کو بارش میں بھیگا دکھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ فرحین اس وقت کسی حد تک ویسی ہی نظر آرہی تھی مگر اس کی شخصیت میں زیادہ خوب صورتی، زیادہ لوچ، زیادہ گریس اور زیادہ شاعرانہ پن تھا۔ وہ خواہ کچھ بھی تھی اور کسی بھی حال کو پہنچ چکی تھی لیکن اس میں ایک "ٹچ آف کلاس" اب بھی موجود تھا۔ وہ اب بھی ہمارے ہاں کی فلمی ہیروئنوں سے بدرجہا بہتر تھی۔

گانا وہ انگریزی میں گا رہی تھی لیکن اس کی آواز میں مشرق والوں کا سا سوز تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ہال میں موجود لوگ اس کا گانا بھی شوق اور انہماک سے سُن رہے تھے۔ اسٹیج پر وہ کچھ اور بھی دراز قد لگ رہی تھی۔ موسیقی کا زیروبم، اس کا سوز اور اس کے وجود کا شاعرانہ لہراؤ۔ یہ ایک عجیب سماں تھا اور یقیناً لوگوں کو مسحور کررہا تھا۔ میرے اعصاب جو ایک سے زبردست کھینچا تانی کا شکار تھے دھیرے دھیرے گویا کسی زد میں آنے لگے۔

میری نشست خاصی اونچی تھی۔ فلور منیجر جو کافی گنجا تھا کم عمر کا نہیں تھا تقریباً میرے دائیں کندھے پر جھکا ہوا تھا۔ محسوس کررہا تھا کہ اس کی سانس تیز تیز چل رہی تھی۔ اس ہونٹ نیم وا تھے اور وہ ایک ٹک اسٹیج کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میں تقریباً سبھی کا یہی عالم تھا۔ کوئی ایک دوسرے سے بات کررہا تھا۔ سب اپنے اپنے تصور میں نہ جانے کہاں محوِ پرواز۔

اچانک ایک چھناکے سے گویا سازوں نے دم توڑ دیا اور پر لہراتی ہوئی خواب ناک سی روشنیاں غائب ہوگئیں۔ اسٹیج میں ڈوب گیا۔ ایک لمحے کی تاخیر سے حاضرین کو اندازہ ہوا کہ ختم ہوچکا تھا۔ تب ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔

میں سمجھا بس یہی کُل شو تھا۔ یہ تو کچھ ایسی چیز نہیں تھی کا قاسم بجلی نے نقشہ کھینچا تھا اور نہ ہی یہ شہر کے عیش کوش میں دھوم مچانے والی کوئی چیز تھی لیکن میری غلط فہمی جلد ہی ہوگئی۔ میرے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کی ایک وجہ شاید یہ بھی کہ میں نے کارڈ تفصیل سے نہیں پڑھا تھا۔

اسی اثنا میں دو لڑکیاں تقریباً رقصاں سے انداز میں جھلملاتا ہوا بینر لئے اسٹیج سے گزریں جس پر جلی حروف میں لکھا کہ مس ایکس چند منٹ بعد اپنے شو کا دوسرا آئٹم پیش کریں وہ لڑکیاں اور بینر اسپاٹ لائٹس کے دائروں میں تھا۔ وہ اسٹیج دائیں ونگ سے اسٹیج پر آکر دھیرے دھیرے بائیں ونگ کی طرف غائب ہوگئیں۔ ہال میں روشنیاں تیز ہوگئیں۔ ویٹرز بھی آگئے مشروبات وغیرہ کا دور چلنے لگا۔ میں نے دو تین ایسے صاحبان کو دیکھا جن کے ہونٹوں میں سگریٹیں لگی ہوئی تھیں مگر وہ انہیں بھولے ہوئے تھے۔ اب انہوں نے اپنی سگریٹیں سُلگا لیں۔

میں نے اپنے لئے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا اور سر اُٹھا کر دیکھا نیم گنجا فلور منیجر کچھ اس طرح داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا جیسے چند لمحے پہلے وہی اسٹیج پر گانا گا کر نیچے آیا ہو۔ اس کی چھوٹی سی میز پر رکھی ہوئی نیم پلیٹ کے مطابق اس کا نام انور تھا۔ داد کی مستحق گو کہ فرحین تھی لیکن فی الحال اس کا دل رکھنے کے لئے مجھے کہنا پڑا "واہ! کیا خوب صورت آواز تھی۔"

میں نے آواز کی تعریف کی تھی لیکن وہ اپنی چمکتی چندیا پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولا "واقعی صاحب! بڑی زبردست عورت ہے۔ اس کے ایک شو میں چار آئٹم ہوتے ہیں اور وہ ہر رات دو شو پیش کرتی ہے یعنی میں روزانہ اس کے چاروں آئٹم دو مرتبہ دیکھتا ہوں۔ کئی مہینوں سے دیکھ رہا ہوں لیکن ابھی تک میرا دل نہیں بھرا۔"

"بھرے گا بھی نہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بس دیکھتے رہنے سے دل کہاں بھرتا ہے۔"

اس کے حلق سے کچھ ایسی آواز نکلی جیسے وہ غرارے کررہا ہو۔ اسے ہنسی آئی تھی لیکن وہ اس ہنسی کو روکنے کی کوشش کررہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر ہال کا جائزہ لیا اور پوچھا "کیا روزانہ ہال یونہی کھچا کھچ بھرا ہوتا ہے؟"

"جی سر!" اس نے مسرور لہجے میں جواب دیا "شروع سے اسی طرح ہاؤس فل جارہا ہے۔ اب تو پندرہ پندرہ دن کی ایڈوانس بکنگ رہتی ہے۔ لوگ دیواروں کے ساتھ کھڑے ہوکر پروگرام دیکھنے کے لئے تیار رہتے ہیں لیکن ہم اس کی اجازت نہیں دیتے۔"

"بہت خوب" میں نے اس "قربانی" پر اسے داد دی۔

وہ میری طرف کو جھک کر بات جاری رکھتے ہوئے بولا "یہ سب اونچے طبقے کے لوگ ہیں سر! ایک ایک رات میں ہزاروں روپے خرچ کرنے والے۔"

"بے شک" میں نے اس کے دعوے کو درست تسلیم کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

اس دوران ایک کامیڈین اسٹیج پر آکر حاضرین کو محظوظ کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ گھسے پٹے لطیفے سُنا رہا تھا لیکن خود ہی مختلف کرداروں کی آوازیں نکال کر ان لطیفوں کو دلچسپ بنانے کی کوشش کررہا تھا۔ صرف چند افراد اس کی طرف متوجہ تھے اور ان لطیفوں پر ہنس رہے تھے۔ باقی سب شاید صرف مس ایکس کی وجہ سے آئے ہوئے تھے اور صاف طور پر اپنی دلچسپی صرف اسی کی ذات تک محدود رکھنے کا عہد کئے ہوئے تھے۔ آخرکار کامیڈین ایک مشہور گلوکار کی آواز کی نقل اُتارتے ہوئے ایک گانا سُنا کر رخصت ہوگیا۔

ہال کی روشنیاں ایک بار پھر مدھم ہوگئیں اور اسٹیج پر خواب ناک روشنیاں نمودار ہونے لگیں۔ دھیمی دھیمی موسیقی کی لہریں اُبھرنے لگیں۔ موسیقی تیز ہوتی گئی۔ آخر ایک چھناکے کے ساتھ ایک سمت سے اچانک فرحین اسٹیج پر کودی۔ اب اس کا حُلیہ، ہیئر اسٹائل سب کچھ بدلا ہوا تھا۔ اب وہ خود نہیں گا رہی تھی۔ ایک انگریزی گانے پر رقص کررہی تھی اور اپنے پچھلے آئٹم سے دو قدم آگے بڑھ گئی تھی۔

رفتہ رفتہ اس کے رقص میں تیزی آتی گئی اور شاید اس کے ساتھ ساتھ لوگوں کا دورانِ خون بھی تیز ہوتا گیا۔ جن میں، میں بھی شامل تھا۔ تاہم مجھ سمیت سب دم سادھے بیٹھے رہے۔ آخرکار چند منٹ کا یہ طلسم ٹوٹ گیا۔

ایک بار پھر بیچ میں چھوٹا سا ایک "ون مین شو" آگیا۔ اس بار ایک صاحب جادو کے کمالات دکھانے لگے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ مس ایکس کے پروگرام کا انداز ورائٹی شو والا تھا، اسی طرح تھوڑا تھوڑا وقفہ دے کر اس نے اپنے چار مختلف رقص پیش کئے اور ہر ایک میں درجہ بدرجہ آگے بڑھتی گئی۔ آخری رقص واقعی خاصا "صبر آزما" قسم کا تھا۔ اس "ثقافتی ترقی" سے گھبرا کر مجھے کئی بار پیشانی سے پسینہ پونچھنا پڑا۔

آخرکار پہلا شو ختم ہوگیا اور ایک گھنٹے کا وقفہ آگیا۔ اس شو کے تماشائی رخصت ہونے لگے۔ تاہم فلور منیجر انور نے بتایا کہ میرا وی آئی پی کارڈ دونوں شوز کے لئے کارآمد تھا۔ تاہم میرا وہاں مزید ٹھہرنے کا ارادہ نہیں تھا کیونکہ میری سیٹھ رمضان سے ملاقات طے تھی۔ وہ میرا بزرگ دوست تھا اور مجھ سے ملنے کے لئے بے قرار تھا۔ کافی دنوں سے ہم ایک دوسرے کو اپنے حالات سے آگاہ نہیں کرسکے تھے۔ میں فون پر اس سے پروگرام طے کرچکا تھا کہ رات کا کھانا ذرا تاخیر سے ہم اکٹھے اس کے گھر پر کھائیں گے۔

فرحین یقیناً اسٹیج سے مجھے دیکھ چکی تھی لیکن اس نے ابھی تک مجھے نہیں بُلایا تھا۔ میں بِن بُلائے جا کر اس کے سر پر سوار ہونا نہیں چاہتا تھا۔ اس قسم کے شو وغیرہ پیش کرنے والوں کی اسٹیج کے پیچھے عجیب ہی حالت اور عجیب ہی مصروفیات ہوتی ہیں۔ ان کی مرضی کے بغیر ان کے پاس جانا کچھ مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ عموماً وہ ڈسٹرب ہوتے ہیں۔ فرحین کو ابھی دوسرا شو بھی پیش کرنا تھا۔ ممکن تھا کہ ایک گھنٹے کے وقفے میں وہ آرام کرتی ہو۔

یہ سب کچھ سوچ کر میں اٹھنے ہی لگا تھا کہ سرخ کوٹ اور سیاہ بو والا ایک شخص میرے قریب آن رُکا۔ وہ ہیڈ ویٹر معلوم ہوتا تھا۔ اس نے جھک کر تقریباً سرگوشی میں پوچھا "آپ مسٹر افضل چوہدری ہیں؟"

"ہاں" میں نے غیر محسوس طور پر اس کا سراپا جائزہ لیتے ہوئے جواب دیا۔ مجھے شبہ ہوا تھا کہ اس کے یونیفارم کے کوٹ تلے بغلی ہولسٹر چھپا ہوا تھا۔

"براہِ کرم میرے پیچھے آیئے۔" اس نے کھردری سی انگریزی میں کہا۔

"کیوں؟" میں نے پوچھ لینا بہتر سمجھا۔

اس نے کچھ اس طرح میری طرف دیکھا جیسے اسے مجھ سے اس سوال کی توقع نہیں تھی اور محض اس سوال کی وجہ سے وہ مجھے ایک بے وقوف انسان سمجھنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ تاہم اس نے گویا ازراہ مہربانی مجھے بتایا "کوئی آپ کو بُلا رہا ہے۔"

فرحین کا نام اس نے اب بھی نہیں لیا تھا۔ بہرحال میں اٹھ کر اس کے پیچھے چل دیا۔ ہم بغلی راستے سے گھوم کر اسٹیج کے عقب میں پہنچے۔ ہال کی خوب صورتی اور شان و شوکت کا اس حصّے سے گویا کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہاں ایک لمبی سی راہداری تھی جس کے ایک طرف کمروں کی قطاریں تھیں۔ کمروں کے دروازوں پر میل کچیل کے دھبے تھے اور راہداری میں بچھا ہوا قالین قابلِ رحم حالت میں تھا۔ گھسے پٹے اس گرد آلود قالین میں جابجا سگریٹوں کے جلنے کے سوراخ تھے لیکن ایک اچھی بات یہ تھی کہ اس بے ہودہ

راہداری میں بہت اچھی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو کئی قسم کی خوشبوؤں کا مکسچر معلوم ہوتی تھی۔

وہ ضرورت سے زیادہ خود اعتماد شخص جو معلوم نہیں ہیڈ ویٹر تھا یا کچھ اور..... آخری دروازے کے سامنے جا رکا۔ اس دروازے اور دوسرے دروازوں میں اس کے سوا کوئی فرق نہیں تھا کہ اس پر سنہری رنگ کا ایک بڑا سا ستارہ چسپاں تھا۔ میرے رہنما نے دروازے پر دستک دی اور ساتھ ہی بلند آواز میں اطلاع دی "مس ایکس! یہ میں ہوں جمیل!"

"آجاؤ میں شریفانہ حلیے میں ہوں۔" فرحین کی آواز سنائی دی۔

"یہ تو بڑی مایوس کن خبر ہے کہ تم شریفانہ حلیے میں ہو۔" میں نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا اور اس نے ایک کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔

وہ اس وقت ایک بہت ہی گدیلے قسم کے صوفے پر نیم دراز تھی۔ کمرے کی ایک دیوار کے ساتھ بہت بڑی ڈریسنگ ٹیبل لگی ہوئی تھی۔ ایک میز اخبارات اور رسائل سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں زیادہ تر شو بزنس ہی سے متعلق معلوم ہوتے تھے کیونکہ ہر طرف سے بڑی بڑی رنگین تصویریں جھانک رہی تھیں۔ اس کی ڈریسنگ ٹیبل بھی متعلقہ سازوسامان سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ آئینے کے فریم میں بھی کچھ غیر ملکی اداکاراؤں اور گلوکاراؤں کی تصویریں اڑسی ہوئی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ کمرا پچاس ساٹھ سال پہلے کی انگریزی فلموں میں دکھائی جانے والی براڈوے کی کسی اداکارہ کا ڈریسنگ روم معلوم ہو رہا تھا۔

فرحین اس وقت سیاہ رنگ کے ایک لمبے سے گاؤن میں تھی جس نے اس کی سفید فاموں کی سی شخصیت کو اور نمایاں کر دیا تھا تاہم اس کے چہرے پر اسٹیج کا میک اپ اتنے قریب سے دیکھنے پر بھلا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ گہرے سُرخ رنگ کی لپ اسٹک البتہ اس کے ہونٹوں پر اچھی لگ رہی تھی۔ نیم وا سے وہ ہونٹ آتشیں دکھائی دے رہے تھے۔

"تمہارا بہت شکریہ جمیل!" اس نے مجھے ساتھ لانے والے شخص کی طرف دیکھ کر گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ یہ گویا اشارہ تھا کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں گردن کو خم دیا اور رخصت ہو گیا۔

فرحین نے اُٹھ کر کمرے کا دروازہ مقفل کیا اور میرا ہاتھ تھام کر صوفے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم مجھ جیسی عورت کے بُلانے پر چلے آئے۔"

"تم جیسی عورتوں کے بُلانے پر تو بڑے بڑے لوگ چلے آتے ہیں۔" میں نے صوفے میں دھنستے ہوئے کہا۔

"بڑے بڑے لوگ تو چلے آتے ہیں لیکن مجھے تمہارے آنے کی اُمید نہیں تھی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "حالانکہ بڑے آدمی تم بھی ہو لیکن تم ذرا مختلف قسم کے بڑے آدمی ہو' ذرا ہٹ کے۔"

میں نے محسوس کیا کہ وہ کسی اُلجھن میں تھی۔ اس کا ذہن جوڑ توڑ میں لگا ہوا تھا لیکن اس کا چہرہ ایک پُرسکون عورت کا تھا۔ اس قسم کی عورتیں درحقیقت ایک ہیجان خیز قسم کی زندگی گزارتی ہیں۔ ان کی زندگی کا ہر لمحہ تناؤ میں گزرتا ہے لیکن وہ اس کی عادی ہو جاتی ہیں۔ انہیں ظاہری طور پر ایک جھیل کی طرح پُرسکون نظر آنے میں مہارت حاصل ہو جاتی ہے۔

وہ گویا ازسرِنو میرا سراپا جائزہ لے رہی تھی اور پھر اندر ہی اندر کسی بات سے مطمئن ہو گئی' کسی نتیجے' کسی فیصلے پر پہنچ گئی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر تپائی سے ایک نقرئی سگریٹ کیس اٹھا کر ایک سگریٹ نکالی اور باکس میری طرف بڑھایا۔

"میں نے آج شام ہوٹل میں تمہیں بتایا تھا کہ میں سگریٹ نہیں پیتا۔" میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹا کر سگریٹ کا جائزہ لیا۔

"اوہ میں بھول گئی تھی۔"

اس سے پہلے کہ وہ باکس واپس رکھتی' میں نے ہاتھ بڑھا کر ایک سگریٹ نکالتے ہوئے کہا "لیکن جب کوئی خوب صورت عورت سگریٹ کی آفر کرے تو انکار کرنا انتہائی بدذوقی کی بات ہوتی ہے۔ آج ایک ہی دن میں دو مرتبہ تمہارے ہاتھ سے سگریٹ نہ لینا میری برداشت سے باہر ہے۔ میں یہ سگریٹ پی کر رہوں گا خواہ یہ میرے تابوت میں پہلی کیل ثابت ہو۔"

"ایسے کروڑوں سگریٹ مل کر بھی تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے۔" اس نے لائٹر سے میری سگریٹ کو شعلہ دکھایا۔ میں نے شعلے کے اوپر سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی بڑی بڑی نیلی آنکھیں بھی سفید فاموں کی طرح ہی شفاف تھیں۔ ان میں لائٹر کے شعلے کا عکس لرز رہا تھا۔ ان آنکھوں کی تہ میں شاید ایک مدت بعد ایک بے عنوان گرمجوشی کی لہر اُبھری تھی۔

"کیوں مجھ غریب کو خوش فہمی میں مبتلا کر کے مروانے پر تُلی ہوئی ہو۔" میں نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لے کر کہا۔

"نہیں میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تمہیں اطمینان دلا رہی ہوں کہ تم کم از کم سگریٹ سے نہیں مرو گے۔"

"چلو تم کہتی ہو تو مان لیتا ہوں۔"

ایک لمحے ہم دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے۔ پھر وہ اچانک ہی بولی "افضل چوہدری! مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"کیا مطلب؟" اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

"جب کوئی خوب صورت عورت اتنی محبت سے مجھ جیسے چغد کو ملنے کے لئے بُلاتی ہے تو عام طور پر اسے مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔" میں نے سادگی سے کہا۔

"ایسا مت کہو۔" وہ گویا تڑپ کر بولی "نہ تم چغد ہو اور نہ ہی میں نے تمہیں محض غرض کے تحت بُلایا ہے۔ مجھے ایک طاقتور آدمی کی مدد کی ضرورت ہے اور طاقت سے میری مراد جسمانی طاقت نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی ایسا شخص جس کا معاشرے میں کوئی مقام ہو۔ جو کسی سے ڈرتا نہ ہو جو بہت بارسوخ ہو اور جس کے سینے میں دل بھی ہو۔ ورنہ عام طور پر ایسے انسانوں کے سینوں میں دل کی جگہ پتھر کا ایک ٹکڑا رکھا ہوتا ہے۔"

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ مضطربانہ سے انداز میں بولی "میں بہت گناہ گار ہوں۔ خطا کار ہوں لیکن مجھے معلوم ہے تمہارا موڈ ہو تو تم گناہ گاروں اور خطا کاروں کے بھی کام آتے ہو۔ سعید صاحب کے ہاں پارٹی میں جو لڑکی سوئمنگ پول میں مُردہ پائی گئی تھی وہ بھی تم سے مدد طلب کرنے کے لئے پہنچی تھی۔ اس کے ہاتھ میں تمہارے نام ایک سفارشی رقعہ دبا ہوا تھا۔ وہ مدد میسر آنے سے پہلے ہی قتل کر دی گئی تھی لیکن مجھے معلوم ہے تم نے اس کے قاتل کو تلاش کیا تھا اور اپنے طور پر اسے انجام تک پہنچا دیا تھا۔ اتنی زحمت صرف کوئی صاحبِ دل ہی کر سکتا تھا۔"

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہے؟" میں نے اپنے آپ کو چونکنے سے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"مجھے معلوم ہے یہ تمہارا راز ہے لیکن تمہیں میری طرف سے کوئی خطرہ محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں تو خود تمہاری مدد کی طالب ہوں۔ ایک سوالی ہوں۔ میں چاہوں بھی تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ تم نے بہت "صاف ستھرا" کام کیا تھا۔ تم نے معروف فلمی مصنف نصیر نواز کو خودکشی کرا دی تھی۔ بعض راز کڑیاں جوڑنے سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔ میں نے جب اخبار میں نصیر نواز کی خودکشی کی خبر پڑھی تھی اور انڈسٹری میں اس کے بارے میں اُڑتی اُڑتی باتیں سنی تھیں تو مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس لڑکی کا قاتل وہی تھا اور اسے تم نے انجام تک پہنچایا تھا۔ خیر۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ گڑے مُردے اکھاڑنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو صرف اپنی بات کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے گھڑی دیکھی۔

میں نے اس کی بات کی تائید یا تردید نہیں کی تاہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکا کہ وہ خطرناک حد تک ذہین لڑکی تھی۔ اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "میرا تم سے دوستی اور ہمدردی کا کوئی رشتہ نہیں۔ اس کے باوجود میں نے نہ جانے کیوں تمہیں دوست اور ہمدرد سمجھتے ہوئے تکلیف دی ہے۔ مجھ جیسی عورتوں کے دوست اور ہمدرد بہت کم ہوتے ہیں بلکہ شاید ہوتے ہی نہیں۔" وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی۔

"تم کسی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"فی الحال تو نہیں" اس نے جواب دیا "لیکن پھنس سکتی ہوں اور بہت بڑی مصیبت میں پھنس سکتی ہوں۔ مجھے اسی سلسلے میں تمہاری مدد کی ضرورت ہے کہ تم مجھے مصیبت میں پھنسنے سے بچاؤ۔"

اس نے غیر ملکی سگریٹ کا کش لے کر دُھواں میرے منہ پر چھوڑا۔ میں خود اپنی سگریٹ کم پی رہا تھا وہ اپنی سگریٹ اس طرح مجھے زیادہ پلا رہی تھی اس کے نیم وا آتشیں ہونٹوں سے دھواں ہوا میں مدغم ہو چکا تو وہ بولی "تمہیں یہاں میرے پاس آتے ہوئے کسی نے دیکھا تو نہیں؟"

"مجھے اسٹیج کے بغلی حصے کی طرف مڑتے ہوئے تو کئی افراد نے دیکھا ہو گا لیکن تمہارے کمرے تک میرے آنے کا شاید صرف اسی شخص کو علم ہو جو مجھے بُلا کر لایا تھا۔"

"جمیل؟ اس کی کوئی بات نہیں۔ وہ میرا اپنا آدمی ہے۔ تم نے آتے وقت ہال میں خاص طور پر تو کسی شخص کو اپنی طرف متوجہ نہیں پایا تھا؟"

"میں نے توجہ نہیں دی۔" میں نے دیانتداری سے جواب دیا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں کسی پُراسرار معاملے کی طرف جا رہا تھا ورنہ ضرور توجہ دیتا۔"

وہ اُٹھ کر دروازے تک پہنچی۔ ناب کا کھٹکا دبا کر اس نے دروازے کو غیر مقفل کیا اور نہایت محتاط انداز میں آہستگی و خاموشی سے دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر راہداری میں جھانکا پھر شاید کچھ مطمئن ہو کر دوبارہ دروازہ مقفل کر کے واپس صوفے پر آن بیٹھی۔

وہ یقیناً کسی خوف کے سائے میں وقت گزار رہی تھی۔ اس کے باوجود اتنی خوش اور زندہ دل نظر آرہی تھی' یہ بڑی بات تھی۔

"مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں لیکن یہ جگہ اس کے لئے مناسب نہیں ہے۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولی "دو بجے میرا دوسرا شو ختم ہو جائے گا۔ کیا تین بجے تم میرے اپارٹمنٹ پر آسکتے ہو؟"

"آجاؤں گا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر تم رت جگا کرانے پر تُلی ہوئی ہو تو کر لیتے ہیں لیکن افسوس کہ بات وہ نہیں نکلی جو میں سمجھ رہا تھا۔"

"یعنی؟" اس نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو گیا تھا کہ تم مجھ پر عاشق ہو گئی ہو لیکن یہاں تو کام نکل آیا۔" میں نے پہلے سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لی۔

"میں تو یہی محسوس کر رہی ہوں کہ میں تم پر چاروں ہاتھ پاؤں سے عاشق ہوں لیکن بے چاری مجھ جیسی عورت کے عشق کی تمہاری نظر میں کیا اہمیت ہو سکتی ہے؟" اس کی آنکھوں میں افسردگی کی صرف ایک لہر سی آکر گزر گئی۔

"یہ تم بار بار اتنے ترحم آمیز انداز میں..... اور اتنی حقارت سے اپنا تذکرہ "مجھ جیسی عورت..... مجھ جیسی عورت" کہہ کر مت [illegible] ڈی گریڈ مت کئے جاؤ۔ اگر تم دل و جان سے اس پروفیشن میں [illegible]

ہوا تمہیں۔ تم ایک اچھی عورت ہو۔"

"دل رکھنے کو یہ باتیں اچھی ہیں۔" وہ افسردگی سے مسکرائی "لیکن مجھے معلوم ہے عملی زندگی میں یہ کچھ زیادہ وزن نہیں رکھتیں۔ تم مجھ سے عشق نہیں کرسکتے اور میں تم سے عشق کروں تو اس کی تمہاری نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہوسکتی۔"

"عشق کسی سے پوچھ گچھ کرنے اور اس کے بارے میں تحقیقات کرنے کے بعد نہیں ہوتا۔" میں نے کہا۔

"درست ہے۔ لیکن بعض اوقات کسی کے بارے میں پوچھ گچھ اور تحقیقات کرنے کے بعد عشق ٹھنڈا ضرور پڑجاتا ہے۔ بجائے اس کے کہ بعد میں کسی وقت تم مجھے میری اوقات یاد دلاؤ۔ میں خود ہی اپنی اوقات میں رہنے کی کوشش کررہی ہوں۔ میں خوش فہمیوں میں رہنے والی عورت نہیں ہوں۔ میں اپنا آپ تمہاری خدمت میں پیش کردوں۔ تمہارے قدموں میں گرادوں تب بھی میرے خیال میں یہ کوئی خاص بات نہیں ہوگی۔ مجھے معلوم ہے تم چاہو تو ہر رات مجھ جیسی ایک نئی عورت تک تمہاری رسائی ہوسکتی ہے۔"

"اوہ پلیز مجھے اتنا اونچا اُڑانے کی کوشش مت کرو۔" میں نے درخواست کی "میں نہ تو ایسا گلفام ہوں اور نہ ہی ایسا عیش کوش۔ یہ بھی مت بھولو کہ میں یورپ یا امریکا وغیرہ میں نہیں رہتا۔"

"اب یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔" وہ اپنے خوب صورت بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "جہاں دولت ہو وہاں یورپ اور امریکا خود چل کر آجاتے ہیں۔ اچھا ان فضول باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم میری مدد کرو گے نا؟"

"پہلے یہ تو بتاؤ کہ مسئلہ کیا ہے۔ تبھی تو میں کوئی صحیح جواب دے سکوں گا۔ کم از کم مسئلے کی نوعیت ہی کا اندازہ ہوجائے تاکہ تم سے دوبارہ ملاقات تک میں اس کے بارے میں کچھ سوچ بچار ہی کرلوں۔"

ایک لمحے کے لئے اس نے پُرخیال انداز میں نچلا ہونٹ دانتوں میں دبالیا لیکن پھر نفی میں سرہلاتے ہوئے بولی "میں تمہیں پوری بات بتانا چاہتی ہوں اور پوری بات سُنے بغیر میرا مؤقف تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔ تمہاری ہمدردیاں میرے ساتھ نہیں ہوں گی اور پوری بات سنانے کے لئے نہ تو ابھی میرے پاس وقت ہے اور نہ ہی یہ جگہ مناسب ہے۔ مجھے یہاں کی دیواروں پر بھی اعتبار نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے کندھے اچکائے۔

"تین سے چار بجے کے درمیان میرے اپارٹمنٹ پر آجاؤ۔" اس نے ایک بار پھر فرمائش کی۔

"وہ تو میں آجاؤں گا۔ سر کے بل آجاؤں گا لیکن بدقسمتی سے مجھے ابھی تک معلوم نہیں کہ تمہارا اپارٹمنٹ ہے کہاں؟"

"البرد ٹاورز کلفٹن" اس نے چند نشانیوں کی مدد سے مجھے اس کا محل وقوع سمجھایا جو نہایت آسانی سے میری سمجھ میں آگیا۔

"یہ بہت چھوٹا سا پراجیکٹ ہے۔" وہ بولی "بہت تھوڑے لیکن بڑے بڑے اور پُرتعیش اپارٹمنٹس پر مشتمل ہے۔ نہایت پُرسکون۔ بلکہ تقریباً ویران سا علاقہ ہے۔ میرے فلیٹ کا نمبر ڈی تھری ہے۔ تمہیں اس تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی کوئی تمہیں نہیں روکے گا۔ بس ایک بات کا خیال رکھنا کہ جب تم اس عمارت کے قریب پہنچو تو کوئی تمہارا تعاقب نہ کررہا ہو۔"

پھر اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں سے اپنا پرس نکالا اور اس میں سے ایک خوب صورت سی چابی نکال کر میری ہتھیلی پر رکھتے ہوئے بولی "یہ میرے اپارٹمنٹ کی چابی ہے اگر بالفرض میں موجود نہ ہوں۔ کسی وجہ سے مجھے وہاں پہنچنے میں دیر ہوجائے تو تم اطمینان سے دروازہ کھول کر اندر بیٹھ سکتے ہو۔ میرا انتظار کرسکتے ہو۔ اگر بلڈنگ کا مین گیٹ بند ہو اور کوئی چوکیدار وغیرہ موجود نہ ہو تو گیٹ کا تالا بھی تم اسی چابی سے کھول سکتے ہو۔"

میں نے ایک نظر چابی کو دیکھا اور اسے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھتے ہوئے کہا "تم چاہو تو میں تین چار بجے تک یہیں رُک سکتا ہوں۔ میرا ایک دوست کے ساتھ کھانے پر اپائنٹمنٹ ہے لیکن میں اسے کینسل کرسکتا ہوں۔"

"نہیں تم اپنا اپائنٹمنٹ ہرگز کینسل مت کرو۔ بلکہ اگر تمہاری کوئی مصروفیت نہیں ہے تب بھی تم اپنا یہ وقت یہاں سے کہیں دور رہ کر گزارو۔ میں نہیں چاہتی کہ تم میرے ساتھ دیکھے جاؤ یا اس کمرے میں دیر تک موجود رہو۔"

"اوہ ان ڈائریکٹ انداز میں جانے کے لئے کہہ رہی ہو؟" میں سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"یہ بات نہیں ہے۔" اس نے یکدم ایک بازو میرے گلے میں حمائل کرکے مجھے اٹھنے سے روک دیا "میرے ساتھ دیکھے جانے میں تمہارے اپنے لئے بھی خطرہ ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ خطرات تمہارے لئے کوئی معانی نہیں رکھتے۔ اسی لئے میں نے تم سے مدد بھی طلب کی ہے لیکن پھر بھی جتنی حد تک ممکن ہو احتیاط برت لی جائے تو بہتر ہے۔ دو چار دن میں شاید بات کسی کنارے لگ جائے پھر اتنی احتیاط کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

"تم تو الفریڈ ہچکاک کی شاگرد معلوم ہوتی ہو۔ کافی سسپنس پیدا کردیا ہے تم نے۔" میں نے ایک طویل وقفے کے بعد سگریٹ کا ہلکا سا کش لیتے ہوئے کہا "یہ بتاؤ تم خیریت سے گھر تو پہنچ جاؤ گی نا؟"

"اس کا خیال رکھنا بھی تمہاری ہی ذمے داری ہوگی۔" وہ شریر سے انداز میں مسکرائی۔

"وہ کس طرح؟" میں نے جاننا چاہا "تم سے دور رہ کر کیا میں کسی ریموٹ کنٹرول سسٹم کے ذریعے تمہاری حفاظت کا فریضہ انجام دوں گا؟"

"یہی سمجھ لو۔" وہ اسی طرح مسکراتے ہوئے ایک بار پھر اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل تک پہنچی۔ وہ مختصر سا فاصلہ بھی دلفریب انداز میں طے کرتی تھی۔ اس کی چال رقص سے کم نہیں تھی گوکہ اس میں تصنع یا ارادے کا دخل معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس بار اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی ایک مقفل دراز کھولی۔ اس میں سے چپٹا اور لمبوترا سا ایک پیکٹ نکالا جس پر سفید سادہ کاغذ لپٹا ہوا تھا۔ وہ ایک معمولی سا پارسل معلوم ہوتا تھا جو ایڈریس لکھے جانے کا منتظر تھا۔

پیکٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے وہ بولی "جب تک یہ پیکٹ تمہارے پاس محفوظ رہے گا میری جان کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ یہ ایک طرح سے میری سلامتی کی ضمانت ہے۔ میری انشورنس پالیسی ہے۔"

میں نے پیکٹ کو اُلٹ پلٹ کردیکھا تاہم پوری کوشش کی کہ میرے چہرے پر تجسس کی علامات نمودار نہ ہونے پائیں۔ پھر میں نے اسے کوٹ کی بڑی جیب میں ڈال لیا۔

"تم نے کوئی سوال نہیں کیا۔" وہ مسکرائی۔

"اب میں اتنا بھی کوڑھ مغز نہیں ہوں۔ تمہاری اتنی دیر کی گفتگو سے کم از کم یہ تو میری سمجھ میں آہی گیا ہے کہ اصل موضوع پر یہاں گفتگو نہیں ہوگی۔ اب میں سوال اس وقت ہی کروں گا جب تم چاہو گی۔" میں اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ میرے سامنے کھڑی دھیرے دھیرے اپنے ریشمی بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھتی رہی' مسکراتی رہی پھر بولی "بالکل صحیح فیصلہ کیا تم نے... ہر سوال صحیح وقت پر۔ اور صحیح جگہ پر اچھا لگتا ہے۔ جواب کے لئے انتظار کرنا بھی یقیناً تمہیں آتا ہے۔"

"میں بڑا صابر قسم کا آدمی ہوں۔ میرے والدین کو ابتدا میں اندازہ نہیں ہوسکا ورنہ شاید وہ میرا نام ہی افضل چوہدری کے بجائے صابر چوہدری رکھ دیتے۔"

وہ اب ذرا طمانیت سے مسکرائی۔ آگے بڑھ کر پنجوں کے بل کھڑے ہوکر اس نے بازو میرے گلے میں حمائل کردیے اور ایک سنسنی خیز لمحہ گزر جانے کے بعد بولی "میرے گھر آؤ گے نا؟" اس نے گویا کوئی باقاعدہ معاہدہ کرکے اس پر مہر تصدیق ثبت کرنے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے بازوؤں کے حلقے میں لینا چاہا تو وہ مچھلی کی طرح پھسل کر دور چلی گئی۔

"آؤ گے نا؟" اس نے اپنا سوال دُہرایا "صرف تین گھنٹے کی تو بات ہے۔"

"میں ضرور آؤں گا۔ خواہ مجھے وھیل چیئر پر ہی آنا پڑے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں سراپا انتظار رہوں گی۔" اس نے کہا۔ اس لمحے تپائی پر رکھے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ ایک لمحے کے توقف کے بعد وہ دیوار گیر کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "ہاں مجھے یاد ہے کہ مجھے دوسرا شو پیش کرنا ہے۔ ابھی خاصا وقت پڑا ہے۔ نہیں' میک اپ مین کو مت بھیجو۔ میں خود ہی تیار ہوجاؤں گی۔ میک اپ مین مجھے تیار کرانے میں زیادہ دیر لگاتا ہے۔ میں خود جلدی تیار ہوجاتی ہوں۔ ہاں میرا میک اپ کرتے وقت وہ بے چارہ خوابوں خیالوں میں نہ جانے کہاں پہنچا رہتا ہے۔ کیا؟ نہیں ابھی میرا معیار اتنا نہیں گرا۔" اس نے کھٹ سے فون بند کردیا۔

ایک بار پھر اس نے دروازہ کھول کر باہر راہداری میں جھانکا اور میری طرف مڑتے ہوئے سرگوشی میں بولی "اب تم جاسکتے ہو۔"

میں باہر آگیا۔ راہداری میں کوئی نہیں تھا۔ اس پر مجھے اطمینان کے بجائے کچھ تشویش سی محسوس ہوئی گوکہ یہ حصہ اسٹیج سے کافی دور تھا۔ پھر بھی میرے خیال میں یہاں اتنی ویرانی نہیں ہونی چاہئے تھی۔ یہاں کے اسٹیج پر خاصا گرما گرم پروگرام پیش کیا جاتا تھا اور اس پروگرام کی اسٹار یہاں موجود تھی۔ یہاں گہما گہمی نہ سہی' کچھ لوگوں کی آمد و رفت تو نظر آنی چاہئے تھی۔ پھر میں نے سوچا شاید فرحین نے ہی لوگوں کو ادھر آنے سے باز رکھنے کا کوئی بندوبست کررکھا ہو۔

میں ہال میں پہنچا تو دیکھا وہاں نئے لوگوں کی آمد شروع ہوچکی تھی شاید کچھ پرانے چہرے بھی ہال میں موجود تھے جنہیں میں پہلے شو کے دوران دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے غالباً دونوں شوز کے لئے بکنگ کرائی ہوئی تھی۔ وہ "فن" کے سچے قدردان معلوم ہوتے تھے۔ فلور منیجر از سرِنو مصروف ہوچکا تھا۔ میں دوسری طرف سے گزرتا چلا گیا کوئی میری طرف متوجہ نہیں تھا۔

واپسی پر میں لفٹ میں اکیلا تھا۔ اس وقت شاید صرف آنے والوں ہی کی لائن لگی ہوئی تھی۔ جانے والا کوئی نہیں تھا۔ نیچے پہنچ کر ہوٹل کے بند دروازوں سے نکل کر میں نے بڑی فرحت محسوس کی۔ ہوٹل میں حرارت' سگریٹوں کا دُھواں' کلونز کی بوجھل خوشبو اور گھٹن تھی۔ باہر خنکی' تازگی اور خوشگوار ہوا تھی۔

میں کچھ دیر ایک طرف کو کھڑا رہا اور غیر محسوس طور پر گردوپیش کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے وہاں کوئی غیر معمولی صورتِ حال نظر نہیں آئی۔ سوائے اس کے کہ رش تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ ہوٹل کی اصل پارکنگ لاٹ گوکہ عقب میں تھی لیکن چار دیواری کے اندر اس کے بغلی حصے اور ڈرائیو وے میں بھی گاڑیاں ہی گاڑیاں نظر آرہی تھیں۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب گاڑی نکالنے میں خاصی دقت ہوگی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب مجھے گاڑی نکالنے کی زحمت ہی نہیں کرنی پڑے گی۔

میں گھوم کر ہوٹل کی پچھلی طرف پہنچا۔ یہاں پوری پارکنگ لاٹ میں صرف ایک مریل سے بلب کی ناکافی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں ابھی گاڑی کی طرف بڑھا ہی تھا کہ ایک ستون کے عقب سے اچانک ہی ایک شخص نے نمودار ہوکر نہایت پھرتی سے میری کمر پر کسی گن کی نال رکھ دی۔

"کوئی اُلٹی سیدھی حرکت مت کیجئے گا چوہدری صاحب! میری

انگلی کو ٹریگر دبانے کی بہت جلدی رہتی ہے۔" وہ طنزیہ سے لہجے میں بولا۔

میں نے گہری سانس لی۔ وہ مجھے پہچانتا تھا۔ میں ابھی اس کا چہرہ صحیح طور پر نہیں دیکھ سکا تھا لیکن میرا خیال یہی تھا کہ وہ میرے لئے اجنبی تھا۔ معاملہ صرف اسی تک محدود نہیں رہا تھا۔ اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی ایک تیکیرو کی اوٹ سے ایک اور شخص نمودار ہوچکا تھا اور اس نے دوسری طرف سے گن میری پسلیوں پر رکھ دی تھی۔

"کیا چاہتے ہو؟" میں نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

"کچھ نہیں' بس ذرا سیر کے لئے چلتے ہیں۔ سیر کے لئے موسم بہت اچھا ہے۔" پہلے والے نے جواب دیا۔ اسی دوران دوسرے نے میری جیبوں وغیرہ پر ہاتھ مارنا شروع کردیا تھا۔ میری جیبوں میں پسٹل اور نیا پرس موجود تھا۔ دونوں چیزیں اس نے نکال لیں۔ کافی عرصے سے میں نے پرس میں رقم کے علاوہ کچھ رکھنا چھوڑ دیا تھا۔ آج کل تو میرے پاس ویسے ہی کچھ نہیں تھا۔ ان چیزوں کا بندوبست بھی شفیع شاہ اور راحیلہ نے کیا تھا تاکہ میں ذرا باعزت طور پر ادھر ادھر گھوم پھر سکوں۔ گاڑی بھی شفیع شاہ نے میرے مقامی آفس سے منگوا کر دی تھی لیکن شاید ان دو خبیث سے اجنبیوں کو میرا باعزت انداز میں گھومنا پھرنا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ مجھے پہلے ہی کی طرح تہی دست کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ دائیں طرف والے نے میرے ہاتھ سے موبائل فون بھی لے لیا تھا۔

ایک احتیاط البتہ میرے کام آگئی تھی۔ فرحین کا دیا ہوا پیکٹ میں نے لفٹ میں نیچے آنے کے دوران جیب سے نکال کر پتلون کی بیلٹ میں پیچھے کی طرف اڑس لیا تھا۔ میں اس وقت کمر پہ اس کی چبھن محسوس کررہا تھا لیکن میری تلاشی لینے والے کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچا تھا۔

میرے دائیں طرف والا کچھ آگے آگیا تھا۔ میں کن انکھیوں سے اس کا جائزہ لے سکتا تھا۔ وہ درمیانے قد کا تھا لیکن اس کے کندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے۔ اس کے بال پیشانی سے کافی اوپر جاکر شروع ہوتے تھے۔ سر کا اگلا حصہ جو بالوں سے محروم تھا اس کی جلد سفید سفید سی تھی اور مدھم روشنی میں بھی چمک رہی تھی۔ نہ جانے کیوں اس حصے کو دیکھ کر گھن سی آرہی تھی۔

تاہم اس کے بال لمبے اور سیاہ تھے۔ بُری طرح سر سے چپکے ہوئے تھے جیسے اس نے انہیں استری کررکھا ہو۔ ان میں تیل یا شاید کسی اسپرے کی چمک تھی۔ اس نے سر کو خفیف سی حرکت دی تو مجھے معلوم ہوا کہ موصوف نے لمبے بالوں کی پونی بھی باندھی ہوئی تھی۔ اس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح جھکی ہوئی تھی۔ پتلے پتلے نیم وا ہونٹ بھی سفید سے دکھائی دے رہے تھے اور ان سے بے پناہ سفاکی عیاں تھی۔ اس کی رنگت بیماروں کی سی تھی لیکن اس کی حرکات و سکنات اور جسمانی حالت بیماروں والی ہرگز نہیں تھی۔

اگر اسے کوئی بیماری تھی تو شاید وہ اس کے ذہن میں تھی۔

اس کی شکل دیکھتے ہی میرے ذہن میں ڈاکٹر برنارڈ کا تصور ابھرا جسے میں نے دیکھا نہیں تھا لیکن نہایت تفصیل سے اس کا حلیہ سننے کے بعد اس کی ایک تصوراتی سی شکل میرے ذہن میں نقش ہو گئی تھی لیکن یہ شخص نہ تو سفید فام تھا اور نہ ہی ڈاکٹر برنارڈ کی طرح پتلا اور لمبا دکھائی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر برنارڈ کی طرح اس کی کمر میں خم کے آثار تک نہیں تھے۔ اس کا سینہ تو باڈی بلڈروں کی طرح ابھرا ہوا تھا اور کندھے بھی انہی کی طرح چوڑے تھے۔ اس کی مڑی ہوئی ناک اور ہونٹوں کی ساخت ڈاکٹر برنارڈ جیسی تھی اس لئے اس کی شکل میں مجھے اپنے تصوراتی خاکے کی جھلک محسوس ہوئی تھی۔ میں نے اسے دل ہی دل میں فوراً "طوطے" کا نام دے دیا۔

دوسرا شخص نسبتاً دراز قد تھا۔ مجھ سے ذرا ہی نیچا تھا۔ وہ خاصا مضبوط معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی توند خاصی نمایاں تھی۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی۔ وہ قطعی عام اور غیر نمایاں سی شکل و صورت کا مالک تھا لیکن اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہی وحشت و خباثت تھی جو نہایت ہی مکروہ اور اذیت پرستانہ فطرت رکھنے والے جرائم پیشہ لوگوں کے چہروں پر نظر آتی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں اس کا نام "توند" رکھ دیا۔

طوطے نے بھی گن کی نال اب میری پسلیوں پر رکھ دی تھی۔ وہ اس پر دباؤ بڑھاتے ہوئے بولا "چلو دروازے کی طرف چلو۔" اس کا اشارہ پارکنگ لاٹ کے عقبی دروازے کی طرف تھا۔

میں نے دوستانہ لہجے میں کہا "یہ کیا سلسلہ ہے پیارے؟"

"ہم ذرا ایک پارٹی میں جارہے ہیں۔" طوطے نے جواب دیا۔ اس کے ہونٹ بدستور نیم وا تھے۔ شاید یہ اس کی مسکراہٹ تھی لیکن اس کی آنکھیں مسکراہٹ کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ سفاک لوگوں کی مسکراہٹ عموماً اسی قسم کی ہوتی ہے۔

میں نے آنکھوں سے اس کی گن... کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پُرسکون لہجے میں کہا "تمہارا دعوت نامہ ایسا ہے کہ اس کے سامنے انکار نہیں کیا جاسکتا لیکن...." میں نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی "کیا میرا حلیہ پارٹی میں جانے کے لئے مناسب ہے؟"

"نیا سوٹ تو پہن رکھا ہے۔ اور کیا شاہی لباس میں جاؤ گے؟" طوطا غرایا "ویسے بھی یہ کچھ زیادہ معزز لوگوں کی پارٹی نہیں ہے۔ جس حلیے میں بیٹھا' کھڑا یا لیٹا ہوا اسی حلیے میں آسکتا ہے۔"

اس نے گن کی نال سے ٹہوکا دیا اور میں دروازے کی طرف چل دیا۔ میری گاڑی ایک کونے میں کھڑی تھی۔ میں حسرت بھری نظر اس پر ڈال کر آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہم عقبی گلی میں آگئے جو اس وقت سنسان پڑی تھی۔ گلی کے کونے پر ایک سیاہ کار کھڑی تھی۔ غنیمت تھا کہ اسکے پاس مزید کوئی "سیاہ کار" نہیں "کھڑا" تھا۔

طوطے نے توند کو ڈرائیونگ سیٹ سنبھالنے کا اشارہ کیا اور خود پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے مجھے ریوالور سے دھکیلتے ہوئے

پچھلی سیٹ پر میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر آن بیٹھا۔ اب جبکہ توند نے اپنی گن جیب میں رکھ لی تھی اور اسٹیئرنگ وھیل سنبھال لیا تھا میرے قریب صرف ایک ہی آدمی اور ایک ہی ریوالور رہ گیا تھا۔ میں چاہتا تو دونوں حرکت میں آسکتا تھا اور تھوڑی بہت ہلچل شروع ہوسکتا تھا لیکن میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ چکر کیا تھا اور وہ لوگ درحقیقت کون تھے؟ اس لئے میں کافی حد تک سعادت مندی سے بیٹھا رہا اور میں نے انہیں اپنے اغوا کے منصوبے پر کامیابی سے عمل درآمد جاری رکھنے کا موقع دیا۔

"اس لڑکی نے تمہیں کیا بتایا ہے؟" طوطے نے پوچھا۔ وہ اب بھی اپنا ضرورت گن... کی نال میری پسلیوں میں چبھوئے جارہا تھا۔ اس کے لہجے سے تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے محض سوال برائے سوال کیا تھا ورنہ اسے جواب کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔

"لڑکی...؟ کون سی لڑکی؟" میں نے حیرت سے کہا "یہاں تو بہت دنوں سے کسی لڑکی سے بات کرنے کو دل ترس رہا ہے۔"

"چوہدری ڈیئر! زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔" طوطا زہریلے لہجے میں بولا "تم اتنے دولت مند آدمی ہو۔ تمہاری زندگی میں لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔"

ایسا لگتا تھا کہ اس کے لہجے میں کوئی ذاتی عناد بھی بول رہا تھا۔ بعض جرائم پیشہ لوگوں کی نظر صرف دولت مندوں کی دولت پر ہوتی ہے اور بعض ان کی دولت چھیننے کے ساتھ ساتھ انہیں نیچا دکھانا بھی ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں سے بعض کے ذہن میں اپنے پس منظر یا غربت کی وجہ سے کچھ ابال اٹھ رہا ہوتا ہے اور بعض کے ذہنوں میں کوئی اور طوفان سر اٹھاتا رہتا ہے۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ویسے فی الحال میں مس ایکس کی بات کررہا ہوں۔"

"اوہ" میں نے مایوسی سے کہا "وہ لڑکی کہاں ہے۔ وہ تو اچھی خاصی جہاندیدہ عورت ہے۔ سرد و گرم چشیدہ ہے۔"

"مجھے نے سوئے الفاظ مت بولو۔ میرے سوال کا جواب دو۔" طوطا غرایا۔

"سوال کیا تھا تمہارا؟ میں بھول گیا۔" میں نے سادگی سے کہا۔

اس نے ایک بار پھر گن کی نال میری پسلیوں پر رگڑی۔ اس کی حرکت سے زبانی چھیڑچھاڑ کچھ مہنگی پڑ رہی تھی۔ وہ گن سے گویا میری پسلیوں کی کھال اتارنے کے درپے تھا تاہم اس نے دانت پیستے ہوئے اپنا سوال دہرایا "میں پوچھ رہا تھا اس عورت نے تمہیں کیا کچھ بتایا ہے؟"

"عورتیں کب کسی کو کچھ بتاتی ہیں۔ وہ سب کچھ اپنے دل میں چھپا رکھتی ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ اس دوران گاڑی سڑک پر ٹائروں کی چرچراہٹ پیدا کرکے موڑ کاٹ کر ایک طرف روانہ ہوچکی تھی۔

اس نے کچھ دانت پیسے' کچھ میری پسلیوں کو پیسا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "کافی دن پہلے میں نے کسی سے سُنا تھا کہ تم بہت شوخ آدمی ہو چوہدری! لیکن یہ تمہاری شوخیوں کی آخری رات بھی ہوسکتی ہے۔"

"میں تو ہر رات یہی سمجھ کر گزارتا ہوں۔" میں نے بدستور پُرسکون لہجے میں کہا۔

گاڑی کے شیشے بند تھے اور وہ خاصی تیز رفتاری سے جارہی تھی۔ راستے میں دو ایک جگہ پولیس کی گشتی گاڑیاں بھی نظر آئیں لیکن کسی نے اس سیاہ کار کو رکنے کا اشارہ تک نہیں دیا۔ شاید وہ لوگ گاڑیوں کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ اگر اس میں صرف شرفا موجود ہوتے تو شاید انہیں روک لیا جاتا۔

طوطا شاید کسی مصلحت کے تحت اپنی برہمی پر قابو پانے کی کوشش کررہا تھا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ نسبتاً پرسکون اور ہموار لہجے میں بولا "تمہاری ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں؟"

"عجیب سوال ہے!" میں نے حیرت سے کہا "شاید مجھے اس لئے بھی تمہارے سوالات عجیب لگ رہے ہیں کہ ان کا کوئی خاص پس منظر ہے جو مجھے معلوم نہیں ہے۔ تم پہلے مجھے حالات سے آگاہ کیوں نہیں کرتے؟ پھر شاید میں تمہارے سوالوں کا کوئی صحیح جواب دے سکوں۔"

"مجھے اُلّو بنا کر مجھ سے کچھ معلوم کرنے کی کوشش مت کرو۔" وہ غرایا "تمہیں یقیناً پہلے ہی بہت کچھ معلوم ہوچکا ہے۔ اسی لئے میں تم سے پوچھ رہا ہوں کہ تمہاری ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں؟"

"یہ تو بڑا سیاسی سا سوال ہے' ایسے سوالوں کے ڈپلومیٹک جواب دینا ابھی میں سیکھ نہیں سکا۔ اگر میں یہ کہوں گا کہ میری ہمدردیاں اس ملک کے غریب عوام کے ساتھ ہیں۔ جو غریب ہونے کے ساتھ ساتھ بے وقوفی کی حد تک سادہ لوح بھی ہیں تو تم سمجھو گے میں سیاسی لیڈر بننے کی کوشش کررہا ہوں حالانکہ سیاسی لیڈر بھی عوام کو سادہ لوح اور بے وقوف نہیں کہتے کیونکہ اسی سادہ لوحی اور بے وقوفی پر ان کا سارا کاروبار چلتا ہے۔ وہ انہیں ذہین' دانشور اور ہمیشہ صحیح فیصلہ کرنے والا' کہہ کہہ کر بانس پر چڑھا کر رکھتے ہیں۔ اس لئے میں یہ جواب دینا نہیں چاہتا۔ چلو فی الحال گزارے کے لئے میں یہ کہہ دیتا ہوں کہ میری ہمدردیاں خوب صورت لڑکیوں کے ساتھ ہیں۔"

"خوب صورت لڑکیوں کو تمہاری ہمدردیوں کی ضرورت نہیں۔" وہ غرایا "ہمدردی کرنی ہے تو بدصورت لڑکیوں سے کرو۔"

"میں نے آج تک کسی لڑکی کو اپنے بارے میں کہتے نہیں سُنا کہ وہ بدصورت ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ تم مس ایکس کے پاس کیوں گئے تھے؟"

"کیا تمہیں معلوم نہیں کہ دولت مند لوگ عموماً اس قسم کی

لڑکیوں کے پاس کیوں جاتے ہیں؟" میں نے اسے بھی سوال ہی میں الجھانے کی کوشش کی۔ اس کے سوال پر مجھے تھوڑی سی حیرت بھی ہوئی تھی۔ فرحین بے چاری یہی سمجھ رہی تھی کہ مجھے اس کے پاس جاتے اور پھر وہاں سے نکلتے کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن یہاں مجھ سے اس کے بارے میں سوال جواب ہو رہے تھے۔

طوطے کو خاموش دیکھ کر میں نے جلدی سے مزید کہا "میں تو اس کے پاس خاصا لمبا پروگرام لے کر گیا تھا لیکن اس نے مجھے فی الحال صرف چند خوب صورت مسکراہٹوں پر ٹال دیا۔ لگتا ہے امیدواروں کی لائن کافی لمبی ہے۔"

میں اس دوران کار کے اندھیرے میں نہایت آہستگی سے ہاتھ پیچھے لے جا کر پیکٹ بیلٹ سے نکال چکا تھا اور اسے سیٹ میں اس جگہ ٹھونسنے کی کوشش کر رہا تھا جہاں پشت اور نچلا حصہ ملتے ہیں۔ عام حالات میں یہ ایک معمولی سا کام تھا لیکن اس وقت اسے انجام دینے میں مجھے محاورتاً دانتوں پسینہ آگیا تھا اور عملی طور پر میرا پورا وجود پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ میں اپنی پیشانی سے پسینے کے قطرے آنکھوں کی طرف پھسلتے محسوس کر رہا تھا۔

طوطا اچانک ہی اچھل کر ذرا پرے کھسک گیا لیکن اس کی گن کی نال میری پسلیوں پر ہی رہی۔ وہ شاید کچھ حرکت محسوس کر کے بری طرح چونکا تھا۔

"یہ تم کسمسا کیوں رہے ہو؟" وہ برہمی سے بولا۔

"ایک شریف اور معزز آدمی کو تم گن کے زور پر اغوا کر کے لے جا رہے ہو اور تم چاہتے ہو کہ وہ کسمسائے بھی نہیں؟" میں نے دردناک لہجے میں کہا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ میں اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ میں بیک سیٹ میں اڑس چکا تھا جہاں وہ کسی کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے اندیشہ تھا کہ شاید ایک بار پھر میری تفصیلی تلاشی لی جائے گی۔

اس نے ہاتھ بڑھا کر گاڑی کی روف لائٹ آن کر دی۔ میں اس وقت دونوں ہاتھ گود میں رکھے حتی الامکان معصوم سی شکل بنائے بیٹھا تھا۔ میں نے طوطے کو تسلی دینے کی کوشش کی "تم خواہ مخواہ وحشت زدہ ہو رہے ہو۔ میں نے تو ذرا جیب سے سگریٹ نکالنے کی کوشش کی تھی لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ میرے پاس تو سگریٹ ختم ہو چکی۔ اگر پیکٹ ہوتا بھی... تو شاید تم لوگ نکال چکے ہوتے۔"

"یقیناً" طوطے نے اپنے مخصوص زہریلے انداز میں جواب دیا "ہم تمہاری جیبوں میں تو کیا، تمہارے تن پر بھی کچھ نہیں چھوڑیں گے۔"

میرا اندیشہ کچھ درست ہی معلوم ہوتا تھا۔ وہ گہری نظر سے میرا جائزہ لیتے ہوئے بولا "تم اسموکر تو معلوم نہیں ہوتے۔"

"باقاعدہ اسموکر تو نہیں ہوں۔ کبھی کبھار پی لیتا ہوں۔ خاص طور پر جب نروس ہوتا ہوں تو سگریٹ کی طلب شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے۔" میں حتی الامکان ایک عام آدمی نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تو اس وقت تم نروس ہو؟" طوطے نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

"ظاہر ہے، ہر شریف آدمی اس طرح اغوا ہوتے وقت نروس تو ہوگا۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"کیا تم مجھے اتنا ہی گدھا سمجھتے ہو؟" اس نے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سوال کیا۔

میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ میں نہ تمہیں الو سمجھتا ہوں اور نہ گدھا۔ مجھے تو تم صرف طوطے نظر آ رہے ہو۔ تاہم میں نے اپنی سادگی برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "میں بھلا تمہیں گدھا کیوں سمجھنے لگا؟ ابھی تک تم نے مجھے دولتی رسید نہیں کی۔"

"نروس لوگوں کی زبان یوں قینچی کی طرح نہیں چلتی۔" طویل سانس لے کر بولا "بہرحال میں تمہیں سگریٹ پلا دیتا ہوں۔ کسی بھی قسم کے نشے کے لئے ترستے ہوئے لوگوں پر مجھے ترس آجاتا ہے۔"

اس نے میری پسلیوں سے گن ہٹائے بغیر اپنے خالی ہاتھ سے اپنی جیب ٹٹول کر ایک سگریٹ نکالی۔ پیکٹ جیب سے نکالے بغیر اس نے سگریٹ نکال لی تھی۔ سگریٹ اس نے میرے ہونٹوں میں پھنسا دی اور اسی ہاتھ سے لائٹر نکال کر اسے شعلہ دکھایا۔

"شکریہ" میں نے بادل نخواستہ ایک کش لیتے ہوئے کہا۔ خواہ مخواہ ہی میں نے اپنی شامت کو دعوت دی تھی۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں یہ دوسری سگریٹ پینا پڑ رہی تھی۔

میں نے اپنی پیشانی سے پسینہ پونچھا۔ طوطا بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ الجھن میں نظر آ رہا تھا۔ وہ گویا اپنی رائے پر نظر ثانی کرتے ہوئے بولا "تم تو واقعی نروس نظر آ رہے ہو۔ میں نے تو سنا تھا تم بڑی ہیرو قسم کی چیز ہو۔"

"کہاں سے سن لیا تم نے؟" میں نے کراہنے کے سے انداز میں کہا "میں تو یہاں کافی گمنام آدمی ہوں۔ تم تک میری شہرت کیسے پہنچ گئی؟ اور وہ بھی غلط سلط قسم کی شہرت؟"

"بس ہمارے کچھ ذرائع ہیں۔" اس نے اپنی سانپ جیسی آنکھوں میں پراسراریت لانے کی کوشش کی۔

"بہت ہی بے ہودہ ذرائع ہیں۔ ان پر بھروسا مت کرنا۔" میں نے مشورہ دیا۔

اس دوران گاڑی مختلف علاقوں سے ہوتی ہوئی میٹروپول کے پاس سے گزر کر کلفٹن کی طرف مڑ چکی تھی۔ ابھی وہ کسی اور طرف بھی مڑ سکتی تھی لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب وہ کلفٹن کی طرف ہی جا رہے تھے۔ یہاں سڑک پر روشنی کافی تھی۔ طوطے نے روف لائٹ بجھا دی۔ "توند" نہایت انہماک سے ڈرائیونگ کر رہا تھا اور اپنے گردوپیش سے گویا بالکل لاتعلق تھا۔

"تمہارے ذرائع بالکل ٹھیک ہیں۔ بے ہودہ اصل میں تم ہو۔" طوطا بولا۔

"تمہارے ہاتھ میں گن ہے۔ میں تمہاری بات کی تردید نہیں کر سکتا۔" میں نے بے چارگی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "ایجنڈا کیا ہے؟"

طوطا گویا کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے کھنکارنے کے سے انداز میں ہولے سے ہنسا "تمہیں تھوڑی سی تیراکی کرانے کا پروگرام ہے لیکن تمہیں پتا نہیں چلے گا کہ تم تیر رہے ہو یا ڈوب رہے ہو؟"

"اوہ میرے خدا!" میں نے آنکھیں پھیلائیں "تم لوگ مجھے سمندر میں پھینکنے جا رہے ہو؟"

"نہیں ہم تمہیں خیر سگالی مشن پر سمندر کی تہ کی طرف روانہ کرنا چاہتے ہیں۔ تم وہاں سے ہمیں رپورٹ بھیجا کرنا کہ سمندر میں تمہارے علاوہ کس کس مخلوق کا اضافہ ہوا ہے اور مچھلیاں کیا فیشن اپنا رہی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

توند نے پہلی بار گفتگو میں دخل دیا "نوزی! تم بے کار باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اس سے معلوم کرنے کی کوشش کرو کہ لڑکی نے اسے کیا بتایا ہے۔ باس کے نزدیک یہ بات بہت اہم ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔" طوطا غرایا "میں باس کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔ تم فی الحال خاموشی سے وہی کام کرو جو تمہارے سپرد ہے۔ اپنے ننھے سے ذہن کو اِدھر اُدھر اُلجھانے کی کوشش مت کرو۔ تمہیں نہیں معلوم کہ ہم جس شخص کو خوش قسمتی سے قابو میں کر کے لے جا رہے ہیں یہ مچھلی نہیں مگرمچھ ہے۔ یہ ہمیں کچھ نہیں بتائے گا۔ چنانچہ اس کے ساتھ مغز خوری سے بہتر ہے کچھ وقت ہلکی پھلکی باتوں میں ہی گزار لیا جائے۔ آخر میں اسے سمندر میں پھینکنے کے سوا ہم کچھ نہیں کر سکتے۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" میں نے اس شخص کی سی اداکاری کرنے کی کوشش کی جو اندر سے خوف زدہ ہو لیکن بے خوف نظر آنے کی کوشش کر رہا ہو "مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ لڑکی نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ اگر بتایا ہوتا تو میں اسے چھپانے کے لئے جان پر نہیں کھیل سکتا تھا۔ میں قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میری اس سے کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ میں تو اس سے صرف تھوڑی سی دل خوش کرنے والی باتیں کر کے واپس آ گیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ ملاقات مجھے اتنی مہنگی پڑے گی ورنہ میں تو اس کے قریب بھی نہیں پھٹکتا۔ اس شہر میں لڑکیوں کی کمی ہے کیا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے پیارے!" طوطا بولا "لیکن قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ تم اس کے پاس نہیں گئے تھے۔ اس نے اپنے ایک خاص چمچے جمیل کو تمہارے پاس بھیج کر تمہیں بلایا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا کوئی خاص مقصد تھا اور اس وقت اس کا ایک ہی خاص مقصد ہو سکتا تھا۔ اگر تم خود اس کے پاس گئے ہوتے تو شاید ہم یقین کر لیتے کہ تم صرف ٹھرک جھاڑ کر واپس آ گئے ہو گے۔"

"بلکہ پھر بھی یقین کرنا مشکل ہوتا۔" توند نے لقمہ دیا "یہ کوئی عام سیٹھ نہیں ہے۔"

طوطے نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تم لوگ واقعی اتنے غیر اہم سے کسی چکر میں مجھے ایک بے وقعت انسان کی طرح گولی مار کر سمندر میں پھینک دو گے؟"

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ یہ کوئی غیر اہم چکر ہے؟" طوطا غرایا۔

"ظاہر ہے جب مجھے اصل بات ہی معلوم نہیں ہے تو میں اس کی اہمیت کا اندازہ کس طرح کر سکتا ہوں؟ مجھے بہرحال یہ کوئی اتنا اہم معاملہ نہیں لگ رہا کہ اس کے لئے تم مجھ جیسے اہم آدمی کو یوں مار کر سمندر میں پھینک دو۔ کیا تمہیں میرے عوض کوئی بھاری تاوان وغیرہ بھی وصول کرنے کا خیال نہیں آ رہا؟ تم جانتے ہی ہو کہ میں ایک دولت مند آدمی ہوں۔"

"ہمیں لالچ دینے کی کوشش مت کرو۔" طوطے نے قہقہہ لگایا "ہمارے پاس لمبے چکروں میں اُلجھنے کے لئے وقت نہیں ہے۔ تم چاہتے ہو ہم ایسے چکروں میں پڑ جائیں جن میں ہمیں لینے کے دینے بھی پڑ سکتے ہیں۔"

"میں ویسے ہی سیدھے سادے انداز میں تمہیں بیس تیس لاکھ دے سکتا ہوں۔ میرا فون مجھے دو۔ میں ایک آدھ گھنٹے کے اندر اندر رقم منگوا دیتا ہوں۔ بیٹھے بٹھائے تمہیں اتنی رقم مل جائے تو مجھے چھوڑنے میں کیا حرج ہے؟"

"اس قسم کی کوئی ڈیل نہیں ہو رہی۔" طوطا مضبوط لہجے میں بولا۔

"نوزی!" توند کھنکار کر ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ نوزی غالباً طوطے کی عرفیت تھی۔ اس کا اصل نام نہ جانے کیا رہا ہو گا۔ توند نے اسے صرف مخاطب کیا تھا لیکن مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ وہ غالباً اپنے ساتھی کو مشورہ دینا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے بیس تیس لاکھ۔۔۔ بلکہ شاید اس سے کہیں زیادہ رقم حاصل کرنے کے بعد بھی مجھے ٹھکانے لگا سکتے تھے۔

طوطا بھی یقیناً اس کے کہے بغیر ہی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا لیکن وہ شاید اپنے نامعلوم باس کا بہت ہی وفادار اور اپنی نوکری کا پکا، اس کی سیدھ میں چلنے والا آدمی تھا۔ وہ آنکھیں بند کر کے صرف اس کے احکامات پر عمل کرتا تھا۔ "سائڈ بزنس" نہیں کرتا تھا۔ اپنے طور پر کسی چکر بازی میں نہیں پڑتا تھا۔ بہت ہی "دیانت دار بدمعاش" معلوم ہوتا تھا۔

ظاہر ہے میرا مقصد بھی ان سے کوئی سودے بازی وغیرہ ہرگز نہیں تھا۔ میں تو اتنی دیر سے محض اس لئے انہیں باتوں میں لگائے ہوئے تھا کہ ان کے اعصاب پر ہیجان اور تناؤ کی وجہ سے پڑنے والا دباؤ کم سے کم ہو جائے۔ ہیجان اور تناؤ کی کیفیت میں واقعی بدمعاشوں کی انگلیاں بہت جلدی ٹریگر دباتی ہیں۔ ان کے اعصاب پُرسکون کی حالت میں ہوں تو وہ ٹریگر دباتے وقت ایک آدھ لمحے کے لئے ہچکچا جاتے ہیں۔ ایک آدھ سیکنڈ کے لئے ان کا ذہن اپنے برے بھلے کے بارے میں سوچ لیتا ہے۔ میرے لئے وہ ایک آدھ لمحہ بیش اہم ہوتا تھا۔

نوزی نے پہلے سے زیادہ درشتی سے توند کو جھاڑا "میں نے تم سے کہا ہے خاموشی سے ڈرائیو کرو۔ اس کے چکر میں مت آؤ۔ تم سن ہی چکے ہو کہ یہ کوئی عام سیٹھ نہیں ہے۔ سیٹھ تو عام بھی ہو تو اتنے بن کر اس سے ہاتھ ملایا کرو۔ کوئی بعید نہیں کہ مصافحہ کرتے ہوئے ہی وہ تمہاری کھال کھینچ لے اور اس پر چار پیسے نفع کما لے۔ تم بیس تیس پچاس لاکھ کے خواب مت دیکھو۔ صرف سڑک پر نظر رکھو۔"

توند خاموش ہو گیا۔ اس نے یقیناً تصور ہی تصور میں نوٹوں کی گڈیوں کو الوداع کہہ دیا تھا۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم لوگ بہت ہی بے وقوف ہو۔ میں معقولیت اور خلوص سے جو بھی بات کئے جا رہا ہوں تم اسے رد کئے جا رہے ہو۔"

"ہاں ہم لوگ ایسے ہی ہیں۔" طوطا بے پروائی سے بولا "معقولیت اور خلوص نہ تو ہمیں چھو کر گزرا ہے اور نہ ہی ہمیں اس کی قدر ہے۔ بعض اوقات تو کوئی زیادہ ہی معقول اور زیادہ ہی مخلص بننے کی کوشش کرے تو ہم اسے زیادہ ہی جلدی ٹھکانے لگا دیتے ہیں۔"

اس دوران گاڑی کلفٹن پہنچ چکی تھی اور کیسینو کی طرف مڑ کر اس سے بھی آگے چلی جا رہی تھی۔ کیسینو جیسے تفریحی مقام پر بھی اس وقت سناٹا تھا۔ اس سے بہت آگے جا کر جہاں گاڑی کچے رستے پر اتری وہاں تو ہُو کا عالم طاری تھا۔ گاڑی سمندر کے عین قریب جا رکی۔

نوزی یا طوطے نے مجھے گن کی نال سے ٹھوکا دیا "چلو اُترو۔"

"فرض کرو میں اُترنے سے انکار کر دوں؟"

"تو پھر ہمیں یہ ناگوار فریضہ گاڑی کے اندر ہی انجام دینا پڑے گا۔" طوطے نے جواب دیا "یہ مت سمجھنا کہ ہمیں گاڑی گندی ہو جانے کی فکر ہو گی کیونکہ یہ گاڑی ہماری نہیں ہے۔"

"تم نے محض اتنے سے کام کے لئے اتنی دور آنے کی زحمت کیوں کی؟" میں نے حقیقتاً ذرا حیرت سے کہا "تم راستے میں کسی ویران مقام پر بھی میرا قصہ پاک کر سکتے تھے۔"

"ہم بڑے امن پسند لوگ ہیں۔ گھروں میں سوئے ہوئے لوگوں کی نیند خراب نہیں کرتے۔ کسی کو ڈسٹرب نہیں کرتے۔ شہر میں گندگی نہیں پھیلاتے کیونکہ وہاں پہلے ہی کافی گندگی ہوتی ہے۔ یہاں گولی مارنے کے بعد لاش کے ساتھ کوئی بھاری چیز باندھ کر ذرا آگے جا کر پھینک آتے ہیں تو عام طور پر لاش دریافت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ آخر تم ایک بڑے آدمی ہو۔ تمہارے لئے تھوڑا بہت اہتمام تو ہونا چاہئے تھا۔" طوطے نے وضاحت کی۔

"درست کہہ رہے ہو۔" میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دروازہ کھول کر اُترنے لگا۔

طوطا گن لئے میرے پیچھے تھا۔ اب وہ لوگ ہیجان زدہ نہیں رہے تھے جس کا فائدہ یہ ہوا کہ لاشعوری طور پر انہوں نے مجھے آسان شکار سمجھ لیا تھا حالانکہ وہ میرے بارے میں تھوڑے بہت خبردار بھی تھے۔ اب ان کی تھوڑی بہت لاشعوری بے پروائی اس بات سے ظاہر تھی کہ توند ڈرائیونگ سیٹ سے اُتر چکا تھا لیکن اس نے میری طرف کے دروازے پر آنے اور مجھے گن سے کور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ صرف طوطے کے ہاتھ میں گن تھی اور وہ میرے پیچھے پیچھے اس دروازے سے اُترنے کے لئے جھک کر آگے کھسک رہا تھا جس سے میں اُتر رہا تھا۔

میں اتنی دور تک اتنی سعادت مندی سے اس لئے چلا آیا تھا کہ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کسی کے سامنے پیش کرنے کے لئے لے جا رہے تھے۔ میں منتظر تھا کہ اس طرح بات کچھ سمجھ میں آئے گی۔ اس معمے کا کوئی سرا ہاتھ آئے گا لیکن وہ تو میرا پتا ہی صاف کرنے پر تُل گئے تھے اور مجھے اس کی وجہ تک معلوم نہیں ہو سکی تھی۔

گاڑی سے اُترتے وقت میں نے جُوا کھیلا۔ میں نے مڑ کر تو نہیں دیکھا کیونکہ اس سے طوطا چوکنا ہو سکتا تھا۔ اندازاً ہی میں نے گاڑی سے اُترنے کے بعد عین اس وقت زور سے دروازہ بند کر دیا جب میرے خیال میں طوطا سر نیچا کئے باہر آنے لگا تھا۔

میں نے ڈھب سے دروازہ زور سے اس کے سر سے ٹکرانے اور اس کے بے ساختہ چیخ اٹھنے کی آواز بیک وقت سنی۔ اس وقت تک میں دوڑ پڑا تھا۔ ریت پر دوڑنا بھی آسان کام نہیں تھا۔ ہر قدم پر زمین گویا پاؤں پکڑ لیتی تھی۔ ریت وہاں نرم تھی اور پاؤں اس میں دھنسے جا رہے تھے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے ناریل کے چند درختوں اور جھاڑیوں کا ایک جھنڈ سا ملگجے اندھیرے میں نظر آیا تھا۔

میں اُسی کی طرف دوڑا تھا۔ وہاں پہنچنے تک میری زندگی یا موت کا فیصلہ بھی ہو سکتا تھا۔ توند چونکہ گاڑی سے باہر تھا وہ فوری طور پر گن نکال کر فائر کر سکتا تھا۔ ملگجے اندھیرے میں وہ میرا ہیولا تو دیکھ ہی سکتا تھا لیکن شاید وہ طوطے کی فکر میں پڑ گیا تھا کیونکہ فوری طور پر کوئی گولی میرے تعاقب میں نہیں آئی تاہم میں ریت میں پاؤں دھنسنے کے باوجود زگ زیگ ہو کر بھاگنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ کسی بھی لمحے گولیاں متوقع تھیں۔

میرے جھنڈ تک پہنچنے سے پہلے ہی گولیوں کی تڑتڑاہٹ شروع ہو گئی۔ گولیاں سنسناتی ہوئی میرے اتنے قریب سے گزریں کہ میں

نے زگ زیگ ہونا بھی چھوڑ دیا اور اپنے آپ کو ریت پر گرا دیا۔ اس سے انہیں یہ غلط فہمی بھی ہو سکتی تھی کہ مجھے گولی لگ چکی ہے۔ جھنڈ صرف چند قدم کے فاصلے پر رہ گیا تھا۔ میں لڑھکتا ہوا درختوں تک جا پہنچا اور چاروں ہاتھوں پیروں کے بل چل کر تیزی سے ان کی اوٹ میں ہو گیا۔ کچھ گولیاں درختوں کے پتوں کو بھی اُڑاتی ہوئی لے گئیں۔ وہ جس طرح اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے اس سے لگتا تھا کہ انہوں نے انتہائی پھرتی سے اپنے ہتھیاروں کو... دوبارہ لوڈ بھی کر لیا تھا۔

اب وہ فائر کرنے میں محتاط ہو گئے تھے۔ میں نے طوطے کے چیخنے چلانے کی آوازیں سُنیں۔ وہ توند پر برس رہا تھا اور اسے احکامات دے رہا تھا۔ میں ایک لمحے ساکت رہا پھر درختوں کے عقب سے سر ذرا سا نکال کر دیکھا۔ نوزی اور توند دونوں جھنڈ کی طرف چلے آ رہے تھے۔ تلگجے اندھیرے میں وہ محض دھندلی پرچھائیاں دکھائی دے رہے تھے۔ تیز ہوا میں ان کے کپڑے پھڑپھڑا رہے تھے۔ میں کچھ اور پیچھے کھسک گیا۔

وہ دونوں جھنڈ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ نوزی بولا "تم اس طرف سے گھوم کر جاؤ۔ میں اس طرف سے جاتا ہوں۔ دیکھتے ہی گولی مار دینا۔ اس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

"اگر وہ بچ کر نکل گیا تو باس ہماری تکا بوٹی کرا دے گا نوزی!" توند نے بظاہر صرف ہانپتے ہوئے یہ بات کہی تھی لیکن مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ اندر ہی اندر رو رہا تھا۔

"وہ بچ کر نہیں جا سکتا۔" نوزی ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا۔ توند کے ساتھ ساتھ وہ گویا خود کو بھی یقین دلا رہا تھا۔

میں پتوں اور شاخوں کی کھڑکھڑاہٹ سن رہا تھا۔ وہ جھاڑیاں ہٹا ہٹا کر دیکھ رہے تھے گویا کسی مفرور خرگوش کو تلاش کر رہے ہوں۔ میں نے درختوں کے درمیان سے نہایت محتاط انداز میں جھانکا اور اندازہ لگایا کہ توند جلد میرے قریب پہنچنے والا تھا۔ میں کھسک کر ایک اور درخت کی اوٹ میں ہو گیا جہاں میں بہتر طور پر اس کا استقبال کر سکتا تھا۔ اب میں اپنی جگہ ساکت تھا اور کسی درندے کی طرح اس کا منتظر تھا۔ میں نے درخت کی اوٹ سے جھانکنے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اب وہ بھی میرا سر دیکھ سکتا تھا۔

میں سانس روکے اس کا منتظر تھا لیکن وہ میرے اندازے سے کچھ پہلے اچانک ہی میرے سامنے آ گیا۔ گو کہ اس کی نظر مجھ پر سیدھی پڑی تھی لیکن وہ میری طرف گھومنے ہی لگا تھا۔ مجھے فوراً اس پر چھلانگ لگانا پڑی۔ میں نے کوشش کی کہ تیزی سے اس کی گردن بازو کے شکنجے میں لے کر اسے چیخنے سے باز رکھوں لیکن مجھے ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ توند کے حلق سے چیخ نکل ہی گئی۔

میں نے اس کی گردن شکنجے میں تو جکڑ لی اور اسس کا گن والا ہاتھ بھی قابو میں کر لیا لیکن اس کا ساتھی بہر حال خبردار ہو چکا تھا۔ توند خود بھی خاصا جاندار تھا۔ اس نے مجھے اپنی کمر پر سے اُچھال کر آگے پھینکنے کی کوشش کی تھی جس کی اسے حسرت ہی رہ گئی۔ اسس کا گن والا بازو مروڑ کر اس کی پشت پر لا چکا تھا اور اسے ڈھال بنا چکا تھا۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر کہیں گر چکی تھی۔

دفعتاً جھاڑیوں میں شعلہ لپکا اور میری گرفت میں توند کو جھٹکا سا لگا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ اسی دوران ایک گولی میری گردن کے پاس سے گزر گئی۔ میں نے توند کو چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی میں خود بھی زمین پر گر گیا۔ میں زمین پر اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر اسس کی گن تلاش کرنے لگا۔

گن تو مجھے مل گئی لیکن اس وقت تک طوطا واپس بھاگ چکا تھا اور خاصی دور نکل گیا تھا۔ نہ جانے کیوں اس نے اچانک پسپائی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ مجھے اس سے یہ توقع نہیں تھی اس لئے مجھے اس کا تعاقب شروع کرنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس کے ہاتھوں اس کا اپنا ہی ساتھی مارا گیا تھا اور اس کا پستول میرے ہاتھ آ گیا ہو گا۔

میں نے اس پر اندھا دھند دو تین فائر کئے لیکن ابھی موت اس کی قسمت میں نہیں تھی۔ میں اس کے تعاقب میں دوڑا تو مجھے کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ کار کا ہیولا حرکت میں آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ریت اُڑاتی ہوئی آندھی طوفان کی طرح سڑک کی طرف روانہ ہو گئی۔ میں نے اضطراری انداز میں گولیاں برسائیں... لیکن اس کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کار تاریکی میں غائب ہو گئی اور میں بے وقوفوں کی طرح وہیں کھڑا رہ گیا۔

وہ بات جو میں اس بھگدڑ اور زندگی موت کی کشمکش میں بھول چکا تھا اچانک ہی مجھے یاد آئی اور ایک لمحے کے لئے میری تو گویا سے جان نکل گئی۔ وہ پیکٹ جو فرحین نے بڑے مان سے مجھے دیا تھا، جس کے بارے میں غالباً اس نے سوچا تھا کہ میں اس کی حفاظت سب سے بہتر طور پر کر سکوں گا، وہ اس گاڑی میں ہی رہ گیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اس کی زندگی کی ضمانت تھا، اس کی انشورنس کے مترادف تھا۔ اس کے خیال میں جب تک پیکٹ محفوظ رہتا اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اب میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ گاڑی کی سیٹ میں چھپا ہوا پیکٹ کب تک کسی کی نظر سے محفوظ رہ سکتا تھا۔

میں چند لمحے وہیں گم صم کھڑا رہا۔ آخر پلٹ کر توند کے پاس واپس آیا جو چاروں خانے چت پڑا تھا۔ میں نے جھک کر قریب سے اس کا جائزہ لیا۔ اس کی توند، جس کی وجہ سے میں نے دل ہی دل میں اس کا نام توند رکھا تھا، اب کافی نیچے چلی گئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو شاید یہ تھی کہ وہ چت پڑا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس توند میں ایک گولی پیوست ہو چکی تھی جس کے زخم سے ابھی تک بھل بھل خون بہہ رہا تھا۔

دوسری گولی اس کے سینے میں اُتری تھی۔ شاید سیدھی دل میں ہی اتری تھی اور اسی نے اس کا کام تمام کیا تھا۔ اگر وہ میری

نہ ہوتا یا طوطے کی گن بڑے کیلیبر کی ہوتی تو یہ گولیاں میرے جسم میں پیوست ہوتیں۔ میں نے توند کی نبض دیکھی۔ نبض ساکت ہو چکی تھی۔

میں چند لمحے وہیں کھڑا سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے، دور دور تک وہاں کسی ذی روح کا نام و نشان نہیں تھا اور سمندر کے شور کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آخر میں نے.... اسس کی گن رومال سے صاف کر کے اسے توند کے مردہ ہاتھ میں پھنسا دیا۔ وہ اس کی امانت تھی۔ میں نے اسے لوٹا دی اور بہ زبانِ خموشی اسے خدا حافظ کہہ کر سڑک کی طرف چل دیا۔

میں تقریباً آدھا گھنٹا پیدل چل کر کلفٹن کے پلے لینڈ وغیرہ تک پہنچا۔ ان دنوں تفریح گاہوں وغیرہ پر بھی پرانے معمولات کی نسبت بہت جلد سناٹا چھا جاتا تھا۔ شہر پر بدقسمتی سایہ فگن تھی۔ پلے لینڈ کے سامنے بھی ویرانی تھی۔ صرف ایک کھٹارا سی ٹیکسی ایک طرف کھڑی تھی اور اس کا ڈرائیور نہ جانے کس امید کے سہارے اگلی دونوں سیٹوں پر لیٹا اپنے سینے پر چھوٹا سا ایک ٹیپ ریکارڈر رکھے عطا اللہ عیسیٰ خیلوی کے گیتوں میں کھویا ہوا تھا۔ شاید ان گیتوں میں کھویا ہونے کی وجہ سے ہی اسے پتا نہیں چلا تھا کہ اس کے چاروں طرف کب سے سناٹا چھا چکا تھا۔

میری فرمائش پر اس نے ازراہِ کرم سوز و ساز کی دنیا سے باہر آنے اور مجھے ڈیفنس لے چلنے پر آمادگی ظاہر کر دی اور میں اس کھٹارے میں بیٹھ کر سیٹھ رمضان کے گھر جا پہنچا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ عالم یہ تھا کہ میری جیب میں ٹیکسی کا کرایہ ادا کرنے کے لئے پیسے نہیں تھے اور سیٹھ رمضان کے گیٹ پر تعینات نئے گارڈ مجھے اندر جانے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہیں تھے۔ اجازت دینا تو دور کی بات تھی وہ میری آمد کی اطلاع اندر پہنچانے کے روادار نہیں تھے۔ میری ٹیکسی رُکتے دیکھ کر ہی انہوں نے اپنی کلاشنکوفیں زیادہ مستعدی سے تھام لی تھیں۔

آخر کار مجھے ان کو تھوڑی سی جھاڑ پلانا پڑی۔ تب انہوں نے گیٹ ہاؤس کے انٹرکام سے چپکے چپکے غالباً سیٹھ رمضان کو یہی اطلاع دی کہ ایک مشکوک سی ٹیکسی میں ایک مشکوک سا آدمی آیا ہے جو اپنے آپ کو افضل چوہدری بتا رہا ہے۔ جواباً سیٹھ رمضان خود گیٹ پر چلا آیا۔ حیرت انگیز طور پر وہ اس وقت گاؤن میں تھا ورنہ گھر پر اکثر وہ دھوتی بنیان میں نظر آتا تھا۔

وہ دور ہی سے جلے بھنے لہجے میں بولا "مجھے معلوم تھا کہ جو آدمی مشکوک سے حلیے میں مشکوک سی ٹیکسی میں آئے گا جس کے بال اور کپڑے مٹی میں لتھڑے ہوئے ہوں گے وہ افضل چوہدری ہی ہو گا۔"

قریب آ کر وہ بولا "یار! تم کبھی میرے گھر صاف ستھرے اور معززانہ حلیے میں نہیں آ سکتے تاکہ میں اپنے اسٹاف کو یقین دلا سکوں کہ تم واقعی ایک بڑے سیٹھ ہو۔" اس نے مسلح گارڈز کی طرف اشارہ کیا "اب میں ان لوگوں کو تمہاری حیثیت کے بارے میں کچھ بتاؤں گا تو یہ بعد میں کسی کونے میں منہ چھپا کر کھی کھی کرتے رہیں گے۔ سمجھیں گے سیٹھ مذاق کر رہا تھا۔"

پھر اس نے آنکھیں سکیڑ کر باہر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو دیکھا اور دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "تمہاری جیب میں یقیناً کرایہ دینے کے لئے بھی پیسے نہیں ہوں گے؟"

"بالکل صحیح اندازہ لگایا تم نے۔" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "دوست شناسی اسی کو کہتے ہیں۔"

اس نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے مجھ سے کہا "دل تو چاہ رہا ہے تمہیں اسی ٹیکسی میں ڈال کر واپس بھجوا دوں اور اس ڈرائیور سے درخواست کروں کہ راستے میں تمہیں کسی گندے نالے میں پھینک دے۔"

"یہ خاصا مشکل کام ہے۔ سو روپے میں تو نہیں ہو گا۔" میں نے کہا۔

وہ مجھے گھورتا ہوا اندر جانے کے لئے مڑ گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر غصیلے لہجے میں بولا "یہ تمہارا آنے کا وقت ہے؟"

"نہیں یہ تو میرا جانے کا وقت تھا۔ عالمِ بالا کی طرف جانے کا وقت... پتا نہیں کیسے میری آئی ہوئی ٹل گئی۔" میں نے کپڑے جھاڑتے ہوئے کہا۔ سچی بات یہ تھی کہ ابھی تک مجھے اپنے کپڑے جھاڑنے کا بھی خیال نہیں آیا تھا۔

"تمہارے خیال میں تمہاری آئی ہوئی کب تک ٹلتی رہے گی؟" سیٹھ رمضان نے ہموار لہجے میں پوچھا گویا کسی کمپنی کے شیئرز کے بارے میں معلومات کر رہا ہو۔

"میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میرا خیال ہے ابھی تو مجھے یونہی دھوکا ہو رہا ہے۔ جب سچ مچ اوپر سے بُلاوا آیا ہو گا اس وقت موت کا فرشتہ بالکل نہیں ٹلے گا۔" میں نے جواب دیا۔

اس وقت تک ہم اس کے ڈائننگ روم میں پہنچ چکے تھے۔ شاندار ڈائننگ ٹیبل پر برتن سجے ہوئے تھے۔ سیٹھ رمضان وال کلاک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "کیا خیال ہے۔ رات کا کھانا اور ناشتا اکٹھا ہی منگوا لیا جائے؟"

"نہیں۔ اُمید پائی جاتی ہے کہ ناشتا میں ایک حسینہ کے ساتھ کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"اُمید ہے زندگی کا آخری کھانا بھی تم کسی حسینہ کے ساتھ ہی کھاؤ گے۔" اس نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے مجھے گھورا۔

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔" میں نے فوراً کہا۔

"اس حسینہ نے ہی کھانے میں زہر ملایا ہو گا۔" اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔

"کوئی بات نہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "حسینہ صحیح معنوں میں حسینہ ہو تو اس کے ہاتھوں سے زہر کھانے سے کس

کمبخت کو انکار ہو سکتا ہے۔"

وہ چند لمحے خاموشی سے مجھے گھورتے رہنے کے بعد یکدم پھٹ پڑنے والے انداز میں بولا "ابے گدھے! میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آخر تم نے رات کے کھانے پر پہنچنے میں اتنی دیر کیوں لگائی؟ میرا بٹلر اور کک تمہارے انتظار میں سوکھ کر چھوہارا بن گئے ہیں۔ میں خود بھی وفاشعار مشرقی بیوی کی طرح بھوکا بیٹھا انتظار کرتا رہا۔ تمہارے ہوٹل فون کر کر کے تھک گیا۔" میں نے اسے موبائل فون کا نمبر نہیں دیا تھا۔

"یہ بات تم سیدھے سادے انداز میں بھی پوچھ سکتے تھے۔ تم نے تو مجھے دیکھتے ہی لڑنا شروع کر دیا۔ مجھے تو تم وفاشعار مشرقی بیوی کے بجائے زبان دراز اور لڑاکا مغربی بیوی لگ رہے ہو اور وہ بھی عمر رسیدہ قسم کی۔"

"اس سے پہلے کہ میں زبان دراز، لڑاکا اور عمر رسیدہ مغربی بیوی کی طرح کوئی پلیٹ وغیرہ اُٹھا کر تمہاری کھوپڑی پر دے ماروں، تم نہایت اختصار سے مجھے بتادو کہ تم پر کون سی نئی افتاد پڑی... یا یہ کسی پُرانی افتاد ہی کی تازہ قسط تھی؟"

"پہلے کھانا کھلواؤ۔ پھر باتیں ہوں گی۔ کم از کم اس بات کی داد دو کہ میں ہر حال میں تمہارے ہاں پہنچ گیا ہوں۔ ایک لاش پھلانگ کر تمہارے ہاں کھانا کھانے پہنچا ہوں۔ اپنے اپائنٹمنٹ کا اتنا خیال رکھنے والا آدمی تم نے آج تک نہیں دیکھا ہوگا۔"

وہ ایک بار پھر مجھے گھورنے لگا۔ میں نے پیار سے کہا "بس بس زیادہ بارعب نظر آنے کی کوشش مت کرو۔ آنکھوں میں درد ہو جائے گا۔"

اس نے بٹلر اور کک کو کھانا لگانے کا حکم دیا۔ پُرتکلف کھانے اور کافی وغیرہ کے بعد سیٹھ رمضان مجھے اپنی اسٹڈی میں لے گیا اور ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا "اب میں مزید انتظار نہیں کر سکتا۔ کومے اور فل اسٹاپ وغیرہ کے بغیر مجھے اپنی نئی داستانِ غم سُنا ڈالو۔"

آخر میں نے کچھ اختصار سے اسے اپنی داستانِ غم سُنا ہی ڈالی۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر اپنی آرام دہ کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا "معلوم نہیں ابھی پچھلی مصیبتوں کا سلسلہ ختم ہوا ہے یا نہیں کہ تم نے یہ نیا سلسلہ شروع کر لیا۔" پھر وہ آنکھ مار کر میری طرف جھکتے ہوئے ذرا نیچی آواز میں بولا "ویسے حسینہ اس قابل بھی ہے یا نہیں کہ اس کے لئے اتنی مصیبت مول لی جائے۔"

"ابھی اس کی "قابلیت" کا صحیح اندازہ تو نہیں ہوا۔ بہرحال دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہے۔ عمر اچھی خاصی ہے۔ تیس پینتیس کے درمیان ہوگی اور اس کی عمر کا کافی حصہ آوارگیوں میں گزرا ہے مگر دیکھنے سے یہی لگتا ہے کہ اپنا بہت خیال رکھا ہے اس نے۔ پاکستانی ہے مگر انگریز لگتی ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بہتر ہے کہ اس میں انگریزوں والا پھیکا پن نہیں ہے۔"

"واہ!" وہ طویل سانس لے کر بولا "تم نے تو نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ تم نے تو مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں بھی کل ہی اگلے ایک ہفتے کے لئے اس کے شو کی بکنگ کرالوں۔ تم تو اس خاتون کے لئے بہت اچھے بکنگ ایجنٹ ثابت ہو سکتے ہو۔"

"زیادہ بکواس کی تو ایک ہی جھٹکے میں گردن ٹوٹ جائے گی۔" میں نے کھسیا کر کہا اور ہاتھ اس کی گردن کی طرف بڑھایا۔

"بس بس" وہ پیچھے ہٹتے ہوئے گردن بچا کر بولا "زیادہ جوش میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں کاروباری آدمی ہوں۔ سب سے پہلے ذہن ہر چیز کے کاروباری پہلو کی طرف جاتا ہے۔ ویسے میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ ایک آدھ دن میں اس کا شو دیکھنے جانا ہی پڑے گا۔"

"ٹکٹ نہیں مل رہا ہے۔ کئی کئی دن کی ایڈوانس بکنگ چل رہی ہے۔" میں نے کہا۔

وہ ہنسا اور دیر تک ہنستا ہی رہا پھر بولا "کافی بڑے ہو گئے مگر ابھی تک بچپنا نہیں گیا۔ اتنے عرصے کی یاری ہے اپنی۔ میری رگ رگ سے تم واقف ہو۔ میرے بارے میں ہر بات جانتے ہو۔ پھر بھی شاید کبھی کبھی بھول جاتے ہو کہ تمہارے اس بزرگ دوست کا شہر میں تھوڑا بہت اثر و رسوخ ہے۔ اگر تمہیں اس قسم کی لونڈیاں دوستی میں وی آئی پی کارڈ دے سکتی ہیں تو ہمارے دوسرے ذرائع ہیں۔ کہو تو اس کا پورا شو اپنے اس غریب خانے پر منگوالیں۔ دو چار دن اس ٹٹ پونجیا ہوٹل میں شو ہی نہ ہونے دیں۔ اب تو قاسم بجلی بھی ٹھکانے لگ چکا ہے۔ اس سے ٹکر لینے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ سیٹھ رمضان ایک بارسوخ مگر عجیب آدمی تھا۔ کبھی وہ بے پناہ دلیر اور کبھی بے حد ڈرپوک نظر آتا تھا۔ اپنے وسائل اور اثر و رسوخ کو استعمال کرنا بھی بھول جاتا تھا۔

میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اچھا خیر جو تمہارا دل چاہے کرتے رہنا۔ مس ایکس کے علاوہ بھی خواہ دو چار حسیناؤں کو جمع کر کے مجرا دیکھتے رہنا۔"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "اب میں اتنا بھی لالچی نہیں ہوں۔ میں اپنی بچی کھچی جوانی اس قسم کے بے ہودہ مشاغل میں برباد کرنا نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک ہے۔ جیسے تمہاری مرضی۔ فی الحال تم میرے لئے کچھ رقم کا بندوبست کرو اور اپنی کوئی چھوٹی موٹی گاڑی مجھے دے دو۔ میری گاڑی اسی بے ہودہ ہوٹل میں رہ گئی ہے۔"

"تمہیں ان چیزوں کی اس وقت کیا ضرورت آن پڑی؟ کیا تم کہیں جا رہے ہو؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"تم نے دیکھا نہیں کہ میں اپائنٹمنٹ کا کتنا خیال رکھنے والا آدمی ہوں۔ جب میں تم جیسے بے ہودہ اور ادھیڑ عمر مرد سے کیا ہوا وعدہ نبھانے کے لئے گولیوں کی بوچھاڑ میں لاش پھلانگتا ... تبھی ابھی ٹیکسی میں ... گرتا پڑتا پہنچ سکتا ہوں تو پھر ایک خوب صورت خاتون سے کیا ہوا وعدہ نبھانے سے کیسے باز رہ سکتا ہوں؟ میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر خدانخواستہ میری ٹانگ ٹوٹ گئی تب بھی میں ضرور آؤں گا خواہ مجھے وہیل چیئر پر ہی آنا پڑے۔"

"اوہ خدایا!" رمضان سیٹھ نے ایک لمحے کے لئے سر تھام لیا "تمہارے جذبات کا یہ عالم مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا۔ مجھے تمہاری فکر لاحق ہو گئی ہے افضل پیارے! تمہارا کیا بنے گا؟"

"میرا مقبرہ بنے گا اور تم اس کے نگران ہو گے۔" میں نے جواب دیا۔

"میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔ تم کچھ پلے بوائے سے نہیں ہو گئے ہو؟"

"کیوں مجھ پر الزام لگا رہے ہو یار!" میں نے مصنوعی خفگی سے کہا "میں تو یونہی کبھی کبھار بہتی گنگا دیکھ کر ہاتھ دھو لیتا ہوں۔ ویسے میں اس قسم کا آدمی نہیں ہوں اور نہ ہی اس قسم کی "گنگاؤں" کو پسند کرتا ہوں۔"

پھر میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا "کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ حالات کسی عورت کو کچھ بنا دیتے ہیں لیکن وہ دل کی بہت اچھی ہوتی ہے۔ جو عورتیں دل کی بہت اچھی ہوتی ہیں ان کے ساتھ میں بھی بہت اچھی طرح پیش آنے کی کوشش کرتا ہوں خواہ ان کے حالات کچھ بھی ہوں اور اس وقت وہ کسی بھی ڈگر پر جا رہی ہوں۔ ایسی عورتوں کے ساتھ بھی تھوڑی دیر دوستوں کی طرح رہنے میں کیا حرج ہے؟"

"حرج تو کچھ نہیں..." وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "بس کبھی کبھار کوئی ایسی عورت زیادہ ہی ایسی... یا پھر زیادہ ہی ویسی نکل آتی ہے اور آدمی کی گردن کا منکا ٹوٹ جاتا ہے اور تو کچھ نہیں ہوتا۔ "منکا" سمجھتے ہو نا؟"

"بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ کئی منکے توڑے بھی ہیں اور منکوں کی اس فہرست میں تمہارا منکا بھی شامل ہو سکتا ہے۔ اس لئے اب بکواس بند کرو اور اُٹھ کر اپنی کسی ایسی تجوری کا منہ کھولو جس میں تم اپنی بلیک منی چھپاتے ہو۔ اس میں سے ایک آدھ گڈی نکال کر میرے حوالے کرو۔ صبح کے تین بجے انسان بالکل خالی جیب کسی حسینہ سے ملنے جائے تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں دل انجانے اندیشوں سے نہ دھڑکتا رہے۔ اب اُٹھ جاؤ۔"

"دل دھڑکتا ہی رہے تو اچھا ہے۔ اگر دل نے دھڑکنا ہی بند کر دیا تو پھر کسی حسینہ سے ملنے جانے کا کیا فائدہ؟" سیٹھ رمضان اُٹھتے ہوئے بولا۔

اس نے اسٹڈی میں ہی موجود ایک چھوٹی سی تجوری کا خفیہ دروازہ کھولا اور کچھ رقم نکال کر میرے سامنے لا پھینکی "پچیس ہزار ہیں۔ صبح تک کا گزارا تو ہو جائے گا؟"

"گزارا ہونے پر آیا تو مہینے بھر کا بھی ہو سکتا ہے اگر راستے میں پھر کچھ اچکوں سے پالا پڑ گیا اور میں نے ہاتھ پاؤں ہلانے کی زحمت نہ کی تو صبح تک بھی گزارا ہونا مشکل ہے۔" میں نے رقم جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔

"لڑکی تو اچھی نہیں ہے نا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں نہیں اس کا مسئلہ روپے پیسے کا نہیں ہے۔ میرا مطلب ہے وہ کم از کم مجھے موٹی آسامی سمجھ کر مال توڑنے کے لئے مجھ سے نہیں ملی ہے۔ اسے کسی اور قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"جس کے لئے اس نے تمہیں رات کے تین بجے بُلایا ہے۔" سیٹھ رمضان نے تفہیمی انداز میں سرہلایا۔

"ابے نہیں یار!" میں نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے خالص عوامی انداز میں کہا "اسے کسی قسم کے تحفظ کی ضرورت ہے اور میں نے اسے پہلا تحفظ یہ دیا ہے کہ اس کا امانتاً دیا ہوا پیکٹ گنوا دیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ میرے پاس زیادہ محفوظ رہے گا۔ معلوم نہیں اس میں کیا تھا؟ اس نے اسے اپنی زندگی کی ضمانت قرار دیا تھا۔"

"گربہ کشتن روزِ اوّل" سیٹھ رمضان نے متانت سے کہا "تم نے اچھا کیا جو پہلے ہی دن اسے سبق سکھا دیا۔ آئندہ وہ تمہیں اس قسم کے فضول کاموں کی زحمت نہیں دے گی اور زندگی کے رومینٹک پہلوؤں کی طرف زیادہ توجہ دے گی۔ میرا تو تمہارے لئے سنہری مشورہ یہی ہے کہ ہر لڑکی پر پہلی ملاقات میں ہی واضح کر دیا کرو کہ عشق لڑانے اور عیش و نشاط سے کچھ وقت گزارنے کے علاوہ باقی ہر کام کے لئے تم سخت نااہل آدمی ہو۔ ورنہ ان لڑکیوں کا کوئی بھروسا نہیں کہ آدمی کو کس کس کام پر لگا دیں۔ میں نے ایک اچھے بھلے معزز آدمی کو دیکھا تھا۔ وہ اپنی پڑوسن کو دودھ اور دوسرا سودا سلف لا کر دیا کرتا تھا۔ اس کے بھانجے بھتیجوں کے نیپکن بدلا کرتا تھا اور افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ اس کی محبوبہ بھی نہیں تھی۔ صرف "متوقع محبوبہ" تھی۔"

"اچھا مزید بکواس پھر کبھی کرتے رہنا۔ میں نے تمہیں ایک اور کام بھی بتایا تھا۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

وہ میز کی درازوں میں ہاتھ مار کر ایک کی رنگ نکال کر اس کا معائنہ کرنے کے بعد میرے سامنے پھینکتے ہوئے بولا "میں تمہیں ایک پرانی ٹویوٹا دے رہا ہوں۔ فی الحال کوئی قیمتی کار نہیں دوں گا۔ تمہارا کوئی بھروسا نہیں ہے کہیں پھینک پھانک کر آ جاؤ گے۔"

"میرے لئے اس وقت یہ بھی رولز رائس سے کم نہیں۔ اس وقت تو میرا کام گدھا گاڑی سے بھی چل جاتا بشرطیکہ وہ کچھ تیز چلتی۔ تین بج چکے ہیں اب میں چلتا ہوں۔"

وہ اٹھ کر مجھے باہر تک چھوڑنے آیا۔ ڈرائیو وے کے ایک کونے میں ایک پرانی ٹویوٹا کھڑی تھی۔ یہ غنیمت تھا کہ اس کی بیٹری ڈاؤن نہیں تھی اور گاڑی بھی کچھ ایسی گئی گزری نہیں تھی۔ میں سیٹھ رمضان کو شب بخیر کہہ کر آندھی طوفان کی طرح کلفٹن کی

طرف روانہ ہوگیا۔

نشانیوں کی مدد سے مجھے مالبرو ٹاورز کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ بنگلوں اور فلیٹوں کے زیادہ گنجان آباد بلاکوں سے الگ تھلگ سی نو تعمیر شدہ عمارت تھی۔ شاید اس کے تمام فلیٹ ابھی آباد بھی نہیں ہوئے تھے۔ وہاں چوکیدار کی موجودگی کے آثار تو تھے لیکن وہ اس وقت نہ جانے کہاں تھا۔

گیٹ مقفل تھا لیکن فرحین کی دی ہوئی چابی جو خوش قسمتی سے بچ گئی تھی اور ابھی تک جیب کے ایک کونے میں پڑی تھی گیٹ کا تالا کھولنے میں کام آئی۔ وہ ایک خوب صورت اور سلیقے سے تعمیر شدہ عمارت تھی۔ نمبروں اور روشنیوں وغیرہ کے ذریعے ہر فلیٹ اور دیگر جگہوں کی طرف رہنمائی کا انتظام تھا۔ تھری ڈی تیسری منزل پر واقع تھا۔

میں نے فلیٹ پر پہنچ کر بیل دی۔ کوئی جواب نہ آیا۔ اس کا مطلب تھا فرحین ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ انتظار کرنا میرے لئے ایک مشکل کام تھا لیکن اب اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ میں نے ایک بار پھر فرحین کی دی ہوئی چابی استعمال کی اور اندر جا پہنچا۔

وال ٹو وال کارپٹ کے ساتھ وہ بہترین طریقے سے آراستہ ایک بڑا اپارٹمنٹ تھا۔ میرا ارادہ ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر فرحین کا انتظار کرنے کا تھا لیکن میں نے سوچا اس سے پہلے پورے اپارٹمنٹ کو ایک نظر دیکھ تو لینا چاہئے۔ میں ڈرائنگ روم میں جھانکتا ہوا لاؤنج سے گزر کر پہلے بیڈ روم کے دروازے پر پہنچا۔ اپارٹمنٹ پوری طرح فرنشڈ تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر دوسرے بیڈ روم کا دروازہ کھول کر جھانکا تو ڈبل بیڈ پر سرخ کمبل لپیٹے فرحین لیٹی نظر آئی۔ مجھے اس کو دیکھتے ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ فرحین تھی حالانکہ اس کا چہرہ کمبل میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے اسے پیروں سے پہچانا۔ اس کے سفید مرمریں پاؤں کمبل سے نکلے ہوئے تھے۔ مجھے یقین تھا کہ وہ خوب صورت پاؤں فرحین ہی کے تھے۔ قریب ہی بیڈ لیمپ روشن تھا۔ فرحین کا ایک ہاتھ بھی کمبل سے نکلا ہوا تھا۔

شاید وہ تھکی ہاری آکر بیڈ پر گرتے ہی سو گئی تھی۔ کال بیل اتنی مدھم اور مترنم تھی کہ گہری نیند سویا ہوا انسان اس کی آواز پر مشکل سے ہی بیدار ہو سکتا تھا۔ میں نے اطمینان کی سانس لی۔ مجھے اس کے انتظار میں احمقوں کی طرح تنہا اس اپارٹمنٹ میں بیٹھنا نہیں پڑا تھا۔

میں نے اپنی دانست میں شرارت کے طور پر چابی کی نوک آہستگی سے اس کے تلووں پر پھرائی۔ میں نے تین چار مرتبہ یہ عمل دُہرایا اگر وہ گہری نیند میں تھی تب بھی اسے تھوڑا بہت کسمسانا چاہئے تھا مگر اس کے وجود میں تو ذرا سی جنبش بھی نہیں ہوئی تھی۔

اچانک میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ میں نے آگے بڑھ کر آہستگی سے اس کے چہرے سے کمبل ہٹایا۔ ایک خوب صورت چہرے کے نیچے ایک ہنستا ہوا بدصورت زخم میرا منتظر تھا۔ میں اسے ہنستا ہوا زخم ہی کہہ سکتا تھا۔ فرحین کا گلا ایک کان سے دوسرے کان تک کٹا ہوا تھا اور زخم کسی کے بڑے سے دہن کی طرح کھلا ہوا تھا۔

میں ایک ہاتھ سے اسی طرح کمبل بلند کئے چند لمحے کے لئے ساکت ہو کر رہ گیا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اس کے پاؤں کیوں کچھ زیادہ ہی سفید نظر آرہے تھے۔ اس کا چہرہ بھی کچھ ایسا ہی سفید نظر آرہا تھا۔ اب درحقیقت اسے خوب صورت بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں ڈراؤنے انداز میں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ہونٹ نیم وا تھے۔ اب نہ تو ان پر لپ اسٹک تھی اور نہ ہی زندگی کا فطری رسیلا پن۔ اب ان ہونٹوں کے عقب سے جھانکتے ہوئے دانت بھی بھیانک معلوم ہو رہے تھے۔

زندگی اس کے وجود سے رخصت ہوئی تھی تو شاید ساری خوب صورتی بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ زندگی ہی درحقیقت خوب صورتی ہے اور خون زندگی کی علامت ہے۔ بشرطیکہ رگوں کے اندر ہی مقید رہے۔ بہتا خون تو موت کے سوا کچھ نہیں..... اور اس کا خون اس ہنستے زخم سے نکل نکل کر دبیز میٹرس میں جذب ہو چکا تھا۔ خون کی ایک موٹی تہ ابھی بستر کی چادر پر موجود تھی۔ سائڈ لیمپ کی روشنی میں خون کی یہ موٹی سی تہ سرخ چینٹ کی طرح چمک رہی تھی۔ اس کے خوب صورت بال کچھ اس طرح اُلجھے ہوئے تھے جیسے کسی نے انہیں بُری طرح مٹھی میں جکڑا تھا اور اس کا ایک ہاتھ اکڑی ہوئی سی حالت میں سینے پر ٹکا ہوا تھا۔

اداسی کی ایک عجیب سی لہر گویا میری آنکھوں کے راستے روح میں اُتر گئی۔ میں نے کمبل سے دوبارہ اس کے چہرے کو ڈھانپ دیا۔ شاید اس لئے کہ یہ منظر میرے لاشعور میں نہ بیٹھ جائے یا پھر شاید اس لئے کہ میں اس سے آنکھ نہیں ملا سکتا تھا حالانکہ اس کی آنکھیں زندگی سے خالی تھیں۔

میں اس کے قریب ہی ایک کاؤچ پر بیٹھ گیا اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا ذہن شل ہوا جا رہا تھا لیکن میں بہت کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ بہت سے سوالات مجھے ڈس رہے تھے۔ کیا میں ہی اس کی موت کا ذمّے دار تھا؟ کیا وہ صرف اس لئے ماری گئی تھی کہ میں اس کا دیا ہوا پیکٹ کھو چکا تھا؟ اس نے کہا تھا کہ وہ پیکٹ اس کی زندگی کی ضمانت تھا' جب تک پیکٹ میرے پاس محفوظ تھا اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔

کچھ دیر تک سوچتے رہنے کے بعد میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ اس کی موت کی وجہ محض یہ نہیں ہو سکتی تھی کہ پیکٹ میرے ہاتھ سے چلا گیا تھا۔ ابھی تک تو شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ پیکٹ میرے پاس تھا۔ اگر یہ معلوم بھی ہوتا تو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ پیکٹ میرے ہاتھ سے جا چکا تھا۔ میں نے وہ پیکٹ کسی کے حوالے نہیں کیا تھا۔ کسی نے مجھ سے چھینا نہیں تھا۔ میں نے وہ کار کی سیٹ میں چھپایا تھا۔ کسی کو اس کے بارے میں علم نہیں تھا اور کسی نے مجھ سے اس کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

میرے سامنے ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے؟ کافی دیر کی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے کم از کم اس واقعے کی اطلاع تو پولیس کو دے ہی دینی چاہئے تھی۔ اگر میں عام اور بے وسیلہ شہری ہوتا تو زیادہ امکان یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ مجھے ہی فرحین کے قتل کے شبہے میں دھر لیتی لیکن میں اپنے ساتھ ایسا نہیں ہونے دے سکتا تھا۔ لاہور میں ہی نہیں' کراچی میں بھی دو چار اچھے اور اعلیٰ پولیس آفیسر میرے شناسا تھے۔ پھر سیٹھ رمضان کے بہت سے کار آمد رابطے تھے۔ شفیع شاہ نے بھی یہاں مختلف شعبوں میں کام کے لوگوں تک رسائی رکھی تھی اور پھر اب تو نفیس صاحب مجھے چشتی صاحب کے فون نمبر دے کر گئے تھے جن کے بارے میں مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ بہت اونچے اور بہت کام کے آدمی تھے۔

میں کچھ دیر سوچتا رہا کہ ان میں سے کسے تکلیف دی جائے! وہ شرفا کے آرام کا وقت تھا۔ پہلے تو میں نے فیصلہ کیا کہ خود کو ہی تکلیف دی جائے اور اپنے ہی ذرائع کو استعمال کیا جائے لیکن پھر میں نے خود ہی اپنا فیصلہ بدل دیا اور سوچا کہ چشتی صاحب کو تکلیف دے کر دیکھنا چاہئے کہ وہ کس حد تک کام کے آدمی تھے۔

اپارٹمنٹ میں ٹیلی فون موجود تھا۔ اس وقت ایسے کسی آدمی کو فون کرنا خاصی بے ہودگی کی بات تھی لیکن ایسے ہی اوقات میں صحیح اندازہ بھی ہو سکتا تھا کہ اس قسم کی کسی شخصیت پر ہمارا کس حد تک اثر و رسوخ تھا۔ چند لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد آخر کار میں نے ان کا نمبر گھما ہی دیا۔

وہ چشتی صاحب کا پرائیویٹ نمبر تھا۔ حیرت انگیز طور پر دوسری طرف دو گھنٹیوں کے بعد ہی فون اٹھا لیا گیا۔ دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز بھاری اور گونجیلی ضرور تھی لیکن غنودگی زدہ ہرگز نہیں تھی۔ وہ خود چشتی صاحب ہی تھے۔

میں نے اپنا تعارف کرایا تو کسی حد تک گرمجوشی سے بولے "ہاں نفیس صاحب نے آپ کا غائبانہ تعارف کرایا تھا۔"

میں نے بے وقت زحمت دینے کی معذرت کی تو بولے "میں سو نہیں رہا تھا۔ حالات کچھ ایسے ہیں کہ اکثر سونے کا موقع دن میں ہی ملتا ہے۔ آپ فرمائیے مسئلہ کیا ہے؟"

وہ سمجھ گئے تھے کہ رات کے پچھلے پہر میں نے کسی مسئلے ہی کے سلسلے میں فون کیا ہوگا۔ میں نے اختصار سے انہیں صورتِ حال سمجھائی اور کہا "گزارش صرف اتنی ہے کہ یہاں جو بھی پولیس آفیسر آئے وہ فرحین کے قتل کے شبہے میں مجھ پر ہی ہاتھ ڈالنے اور کوئی اسکینڈل بنانے کی کوشش نہ کرے بلکہ سمجھداری سے تفتیش کرے۔ یہ کوئی سنگین معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کوئی لمبا چکر ہی نکل آئے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی چھوٹا چکر ہو لیکن کسی دوسرے بڑے چکر میں گڈمڈ ہو۔"

"ٹھیک ہے آپ کو فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے کو صحیح طرح ہینڈل کیا جائے گا۔" وہ کسی خاص جوش و خروش یا تشویش کے بغیر بولے "اس معاملے کا اگر قاسم بجلی کے معاملات سے گہرا تعلق نکل آیا تو پھر مجھے خود بھی اس میں دلچسپی لینی پڑے گی کیونکہ قاسم بجلی کے بارے میں اب فیڈرل گورنمنٹ بڑی سنجیدگی سے چھان بین کر رہی ہے۔ میں علاقے کے ایس پی کو فون کر رہا ہوں۔ اگر وہ خود جائے وقوعہ پر آیا تب بھی... اور اگر اس نے روٹین کے مطابق کسی کو بھیجا تب بھی آپ کو کوئی زحمت نہیں ہوگی۔ بس آپ تمام تفصیلات بالکل سچ سچ اسے بتا دیجئے گا۔"

"چشتی صاحب! میں تو ہر وقت سچ بولنے کے لئے تیار رہتا ہوں بشرطیکہ سچ کا کوئی قدر دان ملے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"آپ کو مایوسی نہیں ہوگی۔" وہ خوشگوار لہجے میں بولے "مجھے اس جگہ کا فون نمبر اور ایڈریس بتا دیجئے جہاں سے آپ بول رہے ہیں۔"

میں نے ایڈریس اور فون نمبر انہیں بتا دیا۔ انہوں نے شب بخیر کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ریسیور رکھنے کے بعد کچھ دیر میں ساکت بیٹھا اس سرخ کمبل کو گھورتا رہا جس کے نیچے ایک زندگی موت کی آغوش میں سو چکی تھی۔ میں فرحین کو اپنی آنکھوں سے مُردہ دیکھ چکا تھا اُس کے بارے میں چشتی صاحب سے بات کر چکا تھا لیکن اب بھی جیسے مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ ہنستا مسکراتا گلاب سا پیکر موت کے بدصورت' بے رحم اور سفّاک پنجوں میں مسلا جا چکا تھا۔

میں گویا اپنے آپ کو یقین دلانے کے لئے ایک بار پھر کمبل کا کونا اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ بے نور آنکھیں میری آمد میں تاخیر پر گویا مجھے الزام دے رہی تھیں اور میری ہی جانب نگراں تھیں۔ میں نے آہستگی سے انہیں بند کرنے کی کوشش کی لیکن وہ پوری طرح بند نہ ہوئیں۔ نیم وا رہیں۔ اس کا چہرہ برف کی طرح سرد تھا۔ وہی چہرہ جس کی حرارتوں اور نزاکتوں کو آج ہی کی شب میں نے بہت اچھی طرح محسوس کیا تھا۔ آج کی شب جو ابھی بیتی نہیں تھی۔ جسے ابھی سورج کا منہ دیکھنا نصیب نہیں ہوا تھا۔

کمبل مجھے بہت وزنی اور اپنا ہاتھ بہت کمزور محسوس ہونے لگا۔ میں نے کمبل چھوڑ دیا اور ایک بار پھر تھکے تھکے انداز میں کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ فرحین کی اور بستر کی حالت بتاتی تھی کہ اس نے زیادہ مزاحمت نہیں کی تھی۔ شاید زندگی کے آخری لمحوں میں بھی اسے یقین نہیں تھا کہ اسے قتل کیا جا رہا تھا۔

اس کے جسم پر نائٹ گاؤن تھا۔ یعنی گھر آنے کے بعد وہ لباس

تبدیل کرچکی تھی۔ اپارٹمنٹ میں زبردستی کسی کے داخل ہونے کے آثار نہیں تھے۔ اس کے قاتل نے جب اسے موت کی نیند سُلانے کا فیصلہ کیا اس وقت وہ غالباً بیڈ پر ہی دراز تھی۔ ان باتوں سے کچھ ایسا لگتا تھا کہ قاتل اس کا جاننے والا ہی تھا اور شاید وہ اس سے کوئی خاص خطرہ محسوس نہیں کررہی تھی۔ شاید کوئی دوست ہی دشمنِ جاں ثابت ہوا تھا۔

مجھے اب بھی پولیس کا انتظار کرنا تھا۔ یعنی میرے پاس کچھ وقت تھا۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھر کر بیٹھنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ میں نے سوچا اس وقت کو استعمال کرنے کی کوشش کرنی چاہئے' پولیس تو تفتیش کرتی ہی رہے گی لیکن مجھے بھی اپنے طور پر ایک بار غور سے ہر چیز کا جائزہ لے لینا چاہئے۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔ میں نے سراغرسی کی جو انگریزی اور اردو لاتعداد کہانیاں نوجوانی میں پڑھی تھیں' شاید میرے کسی کام آسکیں۔

چنانچہ میں نے ایک ہاتھ پر رومال لپیٹ کر نہایت احتیاط سے ایک سرے سے اپارٹمنٹ کی تلاشی لینا شروع کی اور ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر دیکھنا شروع کیا لیکن شاید میں اتنا خوش قسمت نہیں تھا جتنے کہانیوں کے سراغرساں ہوتے تھے۔ مجھے وہاں کوئی سراغ نہیں ملا یا پھر شاید کوئی سراغ وہاں موجود رہا ہو لیکن میں اسے سمجھنے سے قاصر رہا ہوں۔

اپارٹمنٹ فرنشڈ ضرور تھا اور اس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی لیکن آثار بتا رہے تھے کہ فرحین واقعی اس میں آج ہی منتقل ہوئی تھی۔ اس نے اپنے تین سوٹ کیسوں اور دو بڑے بڑے بیگوں میں سے صرف ایک سوٹ کیس اور ایک بیگ کھولا تھا۔ ان میں سے بھی پورے ملبوسات اور دوسری چیزیں اس نے وارڈ روب اور ڈریسنگ ٹیبل وغیرہ پر منتقل نہیں کی تھیں۔

میں نے اپنے کچھ پُرانے "فنون" کو کام میں لاتے ہوئے اس کے مقفل سوٹ کیسوں کو بھی کھول کر دیکھا لیکن مجھے کوئی ایسی چیز نظر نہ آئی جسے میں سراغ کہہ سکتا۔ تھک ہار کر میں نے اپنی کوششیں ترک کردیں۔ ایک اندیشہ مجھے یہ بھی تھا کہ میری ان عظیم سراغرسانہ کارروائیوں کے دوران ہی پولیس میرے سر پر نہ آن پہنچے۔ مجھے پہلے ہی اپنے آپ کو غیر مشکوک ثابت کرنے کے لئے سفارشوں کی ضرورت پڑ رہی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تقریباً سربریدہ لاش کے سرہانے میری موجودگی کے ساتھ ساتھ میرا اس طرح ہر چیز کو کھنگالتے پھرنا پولیس کے لئے ناقابلِ برداشت ہی ہوجائے اور میری تمام تر زوردار سفارش کے باوجود وہ مجھے شک کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہوجائیں۔

یہ سوچ کر میں ہر چیز کو پہلی سی حالت میں چھوڑ کر واپس کاؤچ پر جا بیٹھا اور اگلے چند لمحوں نے ثابت کردیا کہ میں نے یہ فیصلہ بروقت ہی کیا تھا کیونکہ چند لمحے بعد ہی کال بیل بج اُٹھی۔ میں نے اُٹھ کر راہداری میں جاکر دروازہ کھولا۔

میرے سامنے ایک دراز قد' اسمارٹ' نوجوان اور وجیہ پولیس آفیسر کھڑا تھا۔ ہماری پولیس میں ایسے آفیسر کم ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ عہدے کے لحاظ سے وہ صرف انسپکٹر تھا لیکن اس کی شخصیت میں خود اعتمادی کسی بہت بڑے پولیس آفیسر سے بھی زیادہ تھی۔

ہم دونوں چند لمحے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑے رہے پھر اس کی بارعب مونچھوں کے نیچے دھیرے دھیرے مسکراہٹ طلوع ہوئی اور وہ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے ہمیں ایک دوسرے سے اپنا تعارف کرانے کی ضرورت نہیں ہے مسٹر افضل چوہدری!"

"بے شک" میں نے اس کے مضبوط ہاتھ کو اپنی مضبوط گرفت میں لیتے ہوئے کہا "تمہارا خیال ٹھیک ہے انسپکٹر رحیم گل!"

یہ درست تھا کہ ہم دونوں ہی کو ایک دوسرے کو یہاں دیکھ کر خاصا زوردار جھٹکا لگا تھا لیکن دونوں ہی اپنی اپنی حیرت چھپا رہے تھے۔ وہ اندر آتے ہوئے انگریزی میں بولا "دنیا کتنی چھوٹی ہے' کتنی جلد انسانوں کا ایک دوسرے سے کہیں نہ کہیں دوبارہ سامنا ہوجاتا ہے۔"

انگریزی بولنا کوئی فخر کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی اپنے پولیس والے کو اتنی صاف ستھری انگریزی بولتے دیکھ کر کم از کم مجھے ایک خوشگوار حیرت ہوئی۔

اس کے پیچھے پیچھے ایک ایس آئی' ایک اے ایس آئی' ہیڈ کانسٹیبل' دو کانسٹیبل غرضیکہ تقریباً پورا تھانہ ہی چلا آیا۔ حالانکہ رحیم گل سب سے آگے تھا مگر وہ کچھ اس طرح بے پروائی سے اندر چلا آرہا تھا جیسے کسی دوست سے ملنے اس کے گھر آیا ہو لیکن اس کے ماتحت اس طرح رائفلیں سنبھالے چاروں طرف دیکھتے آرہے تھے جیسے انہیں فلیٹ میں گھستے ہی گھمسان کا رن پڑنے کی توقع رہی ہو۔

رحیم گل بظاہر بے پروائی سے چلا آرہا تھا لیکن اس کی عقابی نظریں بڑی مہارت سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھیں۔ میں نے اس کی رہنمائی نہیں کی لیکن وہ خود ہی اِدھر اُدھر جھانکتا سیدھا اسی بیڈ روم میں جا رکا جہاں لاش پڑی تھی۔ اس کے آدمیوں نے چاروں طرف یوں پوزیشنیں سنبھال لیں جیسے میں یا کوئی اور وہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرے گا حتیٰ کہ ایک سپاہی بالکونی میں بھی جا کھڑا ہوا کہ کہیں کوئی وہاں سے تین منزل نیچے چھلانگ نہ لگادے۔

رحیم گل نے لاش کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کی تمام تر توجہ اس وقت شاید میری طرف تھی۔ وہ ایک بار پھر گویا نئے زاویۂ نظر سے میرا سراپا جائزہ لیتے ہوئے بولا "عجیب بات ہے مسٹر افضل چوہدری! میری جب بھی آپ سے ملاقات ہوتی ہے مجھے

پُراسرار سے حالات میں ہوتی ہے۔ ایک بار آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ یہاں سے سیکڑوں میل دور ایک نہایت خوب صورت اور ساحرہ صفت جاگیردارنی کی زمینوں پر گھوڑے سدھانے والے ایک معمولی کارندے تھے' آج آپ سے ملاقات ہوئی ہے تو مجھے بہت "اوپر" سے بتایا گیا ہے کہ آپ بہت بڑے بزنس مین... بہت بڑے سیٹھ ہیں۔"

وہ میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ شاید کوئی جھوٹ تلاش کررہا تھا۔ میں نے نہایت سادگی اور انکساری سے کہا "بس اللہ کی دین ہے۔ کبھی کبھی انسان یونہی بیٹھے بٹھائے اچانک ترقی کرجاتا ہے۔"

اس کی نظر میرے چہرے پر گڑی رہی اور اس کے چہرے پر وہی سردمہری سی طاری رہی "یہ مذاق کا موقع نہیں ہے چوہدری صاحب! ہمیں ایک لاش کے سرہانے کھڑے ہوکر مذاق نہیں کرنا چاہئے۔"

"لاشیں دیکھنا آپ کے تو معمولات میں شامل ہوگا انسپکٹر رحیم گل! آپ تو محض رسماً سنجیدگی اختیار کرتے ہوں گے لیکن اس لاش نے میرے دل پر اس سے بھی بڑا زخم لگایا ہے جتنا اس کے اپنے گلے پر موجود ہے۔ آپ جس بات کو مذاق کہہ رہے ہیں وہ میں نے مذاق کے طور پر نہیں' جل کر کی ہے کیونکہ آپ نے آتے ہی غیرمتعلقہ باتیں شروع کردی ہیں جو شاید آپ کی عادت ہے یا پھر شاید آپ مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"میں بھلا آپ پر رعب کیسے ڈال سکتا ہوں۔" وہ تلخی سے مسکرایا "مجھے تو بہت اوپر سے... بطورِ خاص' ہدایات ملی ہیں کہ میں آپ پر رعب ڈالنے کی کوشش نہ کروں' اپنے حدود میں رہوں۔ جو کچھ آپ ارشاد فرمائیں اس پر آنکھیں بند کرکے یقین کرلوں۔"

"ایمانداری سے بتایئے انسپکٹر صاحب!" میں نے ملائمت سے کہا "کیا ہر دیانتدار' شریف اور سچ بولنے والے شہری کے سامنے ہر پولیس آفیسر کو ایسا ہی نہیں کرنا چاہئے؟"

"پولیس آفیسر کے لئے پہلے یہ یقین کرنا ضروری ہے کہ اس کے سامنے ایک دیانتدار' شریف اور سچ بولنے والا شہری موجود ہے۔" وہ بلا تأمل بولا۔

"اگر آپ کو بہت "اوپر" سے میرے بارے میں کچھ ہدایات ملی ہیں تو آپ کو یقین کرلینا چاہئے کہ ان کا کوئی پس منظر تو ضرور ہوگا۔ ان کو میرے بارے میں کوئی اطمینان تو ہوگا۔" میں نے کہا "یہاں تو کسی چھوٹے سے افسر کو کسی بات پر قائل کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر بہت اوپر والے کسی کی دیانتداری' شرافت اور سچائی کے قائل ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ اس بے چارے نے بہت ہی زیادہ قربانیاں دی ہوں گی۔"

وہ گویا میری دلیل سے لاجواب ہوکر ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگیا۔ مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ یہ سب باتیں کسی دلی پرخاش کے تحت نہیں' بلکہ ایک دیانتدار اور کھرے آفیسر کی حیثیت سے خود کو مطمئن کرنے کے لئے کررہا تھا ورنہ وہ میری فطرت اور اصلیت کو اچھی طرح جان چکا تھا۔ ہم دونوں کے دل میں ایک دوسرے کے لئے عزت اور قدر تھی لیکن دونوں ہی اس کا اعتراف نہیں کرتے تھے اور ایک دوسرے کے سامنے ذرا "کڑک" رہتے تھے۔

وہ خاموش رہا تو میں نے ذرا ملائمت سے کہا "تمہارا یہاں تو آنا بھی تو خاصا تعجب انگیز ہے۔ تم زرتاج نگر کے آس پاس ہی اندرون سندھ کے کسی علاقے میں ہوا کرتے تھے۔ یہاں کیسے آ گئے؟ تم پر کیا گزری؟"

میرے دوستانہ لہجے سے اس کے چہرے پر سردمہری اور درشتی قدرے کم ہوئی اور وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "میں نے خود اپنا تبادلہ یہاں کرالیا ہے۔ میں نے سوچا دیہاتوں کی تو بہت خاک پھانک لی۔ اب ذرا بڑے شہر کے پوش اور فیشن ایبل علاقے کی چمک دمک بھی دیکھ لی جائے۔"

"مگر میں نے تمہارے بارے میں اِدھراُدھر سے جو باتیں سنی تھیں ان سے تو کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے تمہیں دیہی زندگی سے پیار ہے اور تم وہاں کے سادہ لوح مفلوک الحال لوگوں کو ڈاکوؤں' بدطینت وڈیروں اور فرعون صفت پولیس افسروں وغیرہ کے جبر سے بچانے کی کوششوں میں اِدھراُدھر مارے پھرتے رہتے تھے۔"

اس کی مسکراہٹ ذرا واضح ہوگئی "سیدھے سادے دیہات سے اور دیہات کی مٹی سے میرا وہ لگاؤ' وہ عشق برقرار ہے۔ وہ ختم تو نہیں ہوا۔ زندگی کے راستے عارضی طور پر بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی یہاں... کبھی وہاں... دیہات سے میرا رشتہ کبھی نہیں ٹوٹ سکتا۔ میں کسی بھی وقت وہاں جاسکتا ہوں۔"

"تو پھر تمہارے یہاں آنے کی وجہ اتنی سرسری نہیں ہے جتنی تم بیان کررہے ہو۔" میں نے وثوق سے کہا "لیکن میرا تمہارا تعلق ایسا نہیں ہے کہ میں اصل وجہ جاننے پر اصرار کرسکوں۔"

اس کی خفیف سی مسکراہٹ ایک لمحے کے لئے گویا اس کے ہونٹوں پر منجمد ہوگئی۔ اسے شاید مجھ سے ایسی بات کی توقع نہ تھی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ سنبھلتے ہوئے بولا "تمہیں تو پولیس آفیسر ہونا چاہئے تھا۔"

"شکر ہے میں نہیں ہوں۔" میں نے فوراً کہا "یہ محکمے کے حق میں بھی اچھا ہوا اور میرے حق میں بھی۔"

"بہرحال مناسب وقت آنے پر میں تمہیں اصل وجہ بتادوں گا۔" وہ کمرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔

"یہ تو خاصا سیاسی بیان ہوا۔" میں نے کہا "عام طور پر لیڈر ارشاد فرمایا کرتے ہیں کہ مناسب وقت آنے پر میں تمام حقائق قوم کے سامنے رکھ دوں گا۔ یہ فیصلہ بھی ان کو خود ہی کرنا ہوتا ہے کہ مناسب وقت کون سا ہوگا۔ خیر یہ باتیں تو پھر کبھی ہوتی رہیں گی۔ فی الحال تم اس کام پر دھیان دو جس کے لئے آئے ہو۔"

اس نے کمبل اُٹھا کر آہستگی سے ایک طرف رکھ دیا اور خاموشی سے لاش کا سرتاپا معائنہ کیا۔ چند سیکنڈ میں ہی اس نے معائنہ ختم کرلیا اور اپنی ڈائری میں کچھ نوٹ کرتے ہوئے خود کلامی کے سے انداز میں بولا "مجرمانہ حملے... تشدد یا زیادہ مزاحمت کی کوئی نشانی نہیں ہے لگتا ہے قاتل مقتولہ کا جاننے والا تھا۔"

میں خاموش رہا۔ یہ امکان میرے ذہن میں بھی آچکا تھا۔ وہ میری طرف مڑتے ہوئے بولا "جب تم یہاں پہنچے تو لاش اسی حالت میں تھی۔" یہ سوال سے زیادہ محض ایک بیان تھا۔ میں نے اثبات میں سرہلادیا۔

"تم ایک سمجھدار آدمی ہو۔ تم نے یقیناً کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا ہوگا؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"بالکل نہیں۔" میں نے تھوڑا سا جھوٹ بولا۔

"تمہیں یقیناً ذرا بھی اندازہ نہیں ہوگا کہ یہ کس کا کام ہوسکتا ہے؟" اس نے گویا صرف رسمی کارروائی پوری کرنے کے لئے پوچھا۔

"اگر مجھے اندازہ ہوتا... یا میرے پاس باریک بینی سے تفتیش کرنے کا وقت ہوتا تو شاید تمہیں یہاں آنے کی زحمت نہ کرنی پڑتی۔" میں نے کہا۔

"مجھے اندازہ ہے۔" اس نے تفہیمی انداز میں سرہلایا "کہ اگر تمہیں معلوم ہوتا یہ قتل کس نے کیا ہے تو تم خود جاکر قاتل کا سرتن سے جدا کردیتے۔ تم میں یہی بڑی خرابی ہے کہ تم قانون ہاتھ میں لئے پھرتے ہو اور اپنا ہی ایک چھوٹا سا نظامِ انصاف قائم کرنے کی کوشش کرتے ہو۔"

"اور تمہارے محکمے میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ بدمعاش' ڈاکو' دہشت گرد قانون کو ہاتھ میں لئے رہیں تو تم کچھ نہیں کرسکتے لیکن ایک شریف آدمی کسی نیک مقصد کے لئے بھی قانون کو ہاتھ میں لینے لگے تو تم لوگ فوراً جاکر بڑی مضبوطی سے اس کا ہاتھ پکڑلیتے ہو۔" میں نے کہا۔

"میں اکیلا اور کمزور آدمی ہوں۔ پولیس کا محکمہ بہت بڑا ہے۔ میں سارے محکمے کے اعمال کی ذمّے داری نہیں لے سکتا۔ بہرحال میں قانون کی حکمرانی کے لئے لڑتا رہوں گا۔ خواہ کوئی مجھے پاگل کہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا تو انہوں نے اپنے طریقۂ کار کے مطابق تیزی سے اپنا اپنا کام شروع کردیا۔ اس کے ساتھ فنگر پرنٹس لینے والے دو آدمی بھی تھے۔ پورے اپارٹمنٹ کی تلاشی اور فنگر پرنٹس وغیرہ لینے کا کام شروع ہوگیا۔

انسپکٹر رحیم گل میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "مجھے فون پر تھوڑے بہت حالات بتائے گئے ہیں لیکن تم جو کچھ جانتے ہو وہ تفصیل سے مجھے بتادو۔ اس لڑکی سے تمہارا کیا تعلق تھا؟"

"ابھی کوئی تعلق استوار ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی۔" میں نے تأسف سے کہا اور جو کچھ بھی مجھے معلوم تھا وہ اسے بتادیا۔

"بہت خوب" اس نے سرہلایا "یہ تو اچھی خاصی جاسوسی کہانی ہے۔ میرا خیال ہے تم جہاں بھی جاتے ہو وہاں کچھ نہ کچھ عجیب و غریب واقعات کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔"

"عجیب و غریب واقعات کا سلسلہ تو پوری دنیا میں ہر جگہ' ہر وقت چلتا ہی رہتا ہے۔ میری بدقسمتی یہ ہے کہ میں ان میں سے بعض مقامات پر جاپہنچتا ہوں اور ان واقعات میں ملوث ہوجاتا ہوں۔ چین سے ٹک کر... منہ چھپا کر اپنے گھر میں نہیں بیٹھتا۔ بیٹھ بھی نہیں سکتا کیونکہ آج کل تو میرا کوئی گھر ہی نہیں ہے۔ جب گھر تھا تب بھی میرا زیادہ وقت آوارہ گردی میں ہی گزرتا تھا۔ میں شاید فطرتاً آوارہ گرد واقع ہوا ہوں۔"

"اس سارے سلسلے میں اس پیکٹ کی بڑی اہمیت ہے... اور وہ تم اس گاڑی میں رکھ کر ہاتھ سے گنوا چکے ہو۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

"میں تم سے اسی کے بارے میں بات کرنا چاہتا تھا۔" میں نے کہا "مجھے اس پیکٹ کے ہاتھ آنے کی اُمید ہے۔ وہ گاڑی چوری کی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ جلد یا بدیر اسے کہیں نہ کہیں چھوڑ دیں گے۔ خوش قسمتی سے مجھے اس کا نمبر یاد ہے۔ اس کا کلر' میک اور ماڈل وغیرہ بھی میں نے توجہ سے دیکھا تھا۔ تم اس کے بارے میں ریڈیو پر پیغام نشر کرادو۔ جونہی اس کے بارے میں کوئی اطلاع آئے' میں اور تم خود جاکر یا بھروسے کے کسی ایماندار آدمی کو بھیج کر سیٹ کے اس مخصوص حصّے میں پیکٹ کو تلاش کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں۔ اگر ہماری قسمت اچھی ہوئی تو شاید وہ ابھی تک وہیں محفوظ ہو۔"

اس نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر اثبات میں سرہلاتے ہوئے ایک اے ایس آئی کو بُلایا۔ میں نے گاڑی کے بارے میں اسے تفصیلات بتائیں اور وہ انہیں ایک کاغذ پر نوٹ کرکے اپنی گاڑی کے ریڈیو سے پیغام نشر کرانے کے لئے نیچے چلا گیا۔

رحیم گل بولا "میں یہاں نیا ہوں لیکن خوش قسمتی سے مجھے اپنے تھانے میں ایک بڑا تجربہ کار ماتحت مل گیا ہے اور میری اس سے بھی زیادہ خوش قسمتی یہ ہے کہ وہ مجھے پسند بھی کرتا ہے ورنہ پولیس کے محکمے میں ایک بڑی دشواری یہ بھی ہے کہ عموماً زیادہ دیانتدار اور ڈٹ کر کام کرنے والے پولیس آفیسرز کو ان کے اپنے ساتھی بھی زیادہ پسند نہیں کرتے۔ میرا وہ سینئر ماتحت اکثر معاملات میں بڑی مدد کرتا ہے۔ کراچی کے شرفا اور جرائم پیشہ... دونوں ہی قسم کے طبقات کے بارے میں اس کی بڑی معلومات ہیں۔ میں اسے بُلاتا ہوں۔ تم اسے ان دونوں آدمیوں کے حُلیے اور دوسری تفصیلات بتاؤ۔ شاید وہ ان کے بارے میں ہمیں کچھ بتاسکے۔"

"تم جیسے آدمیوں کو بھی ہر جگہ اپنے مطلب کا کوئی نہ کوئی

آدمی مل ہی جاتا ہے۔" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔
اس نے انگریزی کا ایک محاورہ استعمال کیا جس کا مفہوم تھا کہ جہاں خواہش موجود ہو وہاں کوئی نہ کوئی راستہ نکل ہی آتا ہے۔
پھر اس نے ایک کانسٹیبل کو حکم دیا "اکرم صاحب کو بلاؤ۔"
میں اور رحیم گل اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ باقی لوگ دوسرے کمروں میں مصروف تھے۔ چند لمحے بعد سانولا سا' میانہ قامت اور ادھیڑ عمر ایک شخص کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی ناک پر نظر کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ چہرے سے گہری سنجیدگی عیاں تھی۔ اگر وہ پولیس کی وردی میں نہ ہوتا تو ہرگز پولیس کا آدمی معلوم نہ ہوتا۔ کسی نجی دفتر کا شریف اور حلیم الطبع قسم کا کلرک معلوم ہوتا۔
"یہ سب انسپکٹر اکرم صاحب ہیں۔" رحیم گل نے مجھ سے اس کا تعارف کرایا۔ اس نے اپنے ماتحت کے نام کے ساتھ "صاحب" کا اضافہ کر کے اس کی عزت بڑھائی تھی۔ اس سے اس کی اپنی عزت میرے دل میں کچھ اور بڑھ گئی تھی۔
میں نے اکرم کو "طوطے" اور "توند" کا حلیہ اور ان کی حرکات و سکنات' اندازِ گفتگو وغیرہ کے بارے میں ہر بات تفصیل سے بتائی اور یہ بھی بتایا کہ توند نے طوطے کو کئی بار "نوزی" کہہ کر مخاطب کیا تھا۔
اکرم نے نہایت توجہ اور انہماک سے میری بات سنی پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "توند والے کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا جی... بہرحال اب تک اس کی لاش اٹھائی جا چکی ہوگی۔ اس کے بارے میں تحقیقات ہو جائیں گی البتہ دوسرے کے بارے میں مجھے یقین ہو گیا ہے کہ وہ نادر تھا جو اپنے ساتھیوں اور جرائم پیشہ حلقوں میں نوزی کے نام سے مشہور ہے۔"
"اس نوزی کا کچھ حدود اربعہ...؟" رحیم گل نے پوچھا۔
"کسی زمانے میں ایک بہت بڑے جیولر کا خاص ملازم تھا۔ بددیانتی کے الزام میں نکالا گیا تھا۔ اس کے بعد تیزی سے ترقی کرتا چلا گیا۔" اکرم نے بتایا۔
"بہت سے بددیانتوں نے ہمارے ہاں بڑی ترقی کی ہے۔" ... نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے لقمہ دیا۔
"جی ہاں' آپ کی بات بھی صحیح ہے لیکن اس وقت میری ... دوسری قسم کی ترقی سے ہے۔" اکرم بولا "نوزی بہت بڑا بدمعاش ڈاکو اور دہشت گرد بن چکا ہے۔"
"اس کے باوجود آزاد پھر رہا ہے!" میں نے حیرت اور تا... سے کہا۔
"جی ہاں" اکرم نے عینک کے عقب سے گہری نظر سے ... طرف دیکھا "اور اس سلسلے میں صرف پولیس کو کوسنے مت ... جائیے گا۔ پولیس بھی قصوروار ہے لیکن اس سوسائٹی کے بگ... کچھ ذمے داریاں خود سوسائٹی پر بھی عائد ہوتی ہیں۔ ہر ... بدمعاش اور دہشت گرد نے کسی نہ کسی پارٹی میں پناہ لے ...

...ہیں ہمارے عوام بڑے جوش و خروش اور محبت سے ووٹ دے ... کر اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں جہاں وہ اُچھل اُچھل کر' سینہ تان کر ... دوسرے کو نوچ کھسوٹ کر بتاتے رہتے ہیں کہ انہیں عوام کا ... اعتماد حاصل ہے۔ اس "اعتماد" کو ڈھال بنا کر وہ ملک کی ہر چیز کا تیا ... کرتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف مسئلہ یہ ہے کہ ہم جان ہتھیلی ... پر رکھ کر' خون پسینہ ایک کر کے خطرناک مجرموں کو عدالت میں پیش ... کر دیں تو اس کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ عدالتیں گواہ مانگتی ہیں۔ ... اپنی آنکھوں کے سامنے قتل و غارت ہوتے' ڈاکے پڑتے ... دیکھتے ہیں۔ مجرموں کو پہچانتے ہیں مگر کون ان کے خلاف عدالت ... میں جا کر گواہی دیتا ہے؟"
"آپ بھی اپنی جگہ صحیح کہہ رہے ہیں بھائی اور عوام بھی اپنی ... جگہ صحیح ہیں۔ انہیں معلوم ہے انہوں نے گواہی دی تو ان کا کیا حشر ... ہوگا۔ انہیں تحفظ دینے والا بھی تو کوئی نہیں ہے۔ عوام کو آج تک ... کسی بھی طرف سے احساسِ تحفظ نہیں ملا۔ بدمعاش سب سے ... زیادہ منظم ہیں۔ شرفا سب سے زیادہ غیر منظم ہیں۔" میں نے ... لمبی سانس لی "خیر یہ تو لمبی بحث ہے۔ آپ نادر عرف نوزی کے ... بارے میں بتا رہے تھے۔ کیا وہ کبھی پکڑا گیا؟"
"کئی مرتبہ" اکرم نے بتایا "ہر بار عدم ثبوت کی بنا پر بری ... ہوا۔ شاطر قسم کے وکیلوں کے کندھے سے کندھا جوڑ کر مسکراتا ... عدالت سے رخصت ہو گیا۔ ہم جیسے پولیس والے تو آج کل ... ہی نبھا رہے ہیں' یہی بڑا غنیمت ہے چوہدری صاحب! ہم لوگ تو ... دل شکستہ ہیں۔ اپنے آپ سے شرمندہ ہیں۔ آج کل صرف بے ... دلی سے نوکری کے ... مزے میں ہیں۔"
میں خاموش رہا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم سوسائٹی کے ... شور و غل اور ہاؤ ہو میں کسی کی صحیح بات بھی نہیں سنتے بلکہ اکثر ایسا ... ہوتا ہے کہ ہم دوسرے کی سنتے ہی نہیں۔ صرف اپنی ہانکتے ہیں... اگر دوسرے کی کسی طرح سن بھی لیتے ہیں تو مانتے نہیں۔ رحیم ... بغور میری طرف دیکھ رہا تھا۔
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے اکرم سے پوچھا "آپ کو ... اندازہ نہیں کہ نادر عرف نوزی کہاں مل سکتا ہے۔ یا کہاں سے ... اس کا کوئی سراغ ہاتھ آ سکتا ہے؟"
"نہیں" اکرم نے مایوسی سے نفی میں سر ہلایا "مختلف تھانوں ... اور عدالتوں کے کاغذات کے انبار میں اس کے بیسیوں پتے درج ... ہوں گے مگر وہ سب کے سب غلط اور فرضی ہوں گے۔ اس کا کوئی ... ٹھکانہ نہیں۔ اس کا کوئی سراغ ملنا تقریباً ناممکن ہے۔ یہ تو محض کوئی ... اتفاق ہی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی واردات کے دوران اچانک ہی ... ہمارے ہتھے چڑھ جائے۔"
... میں یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ نادر نوزی اپنی تازہ ترین واردات کے ... لئے مجھے گن پوائنٹ پر اغوا کر کے لے جاتے ہوئے دو ...

مرتبہ پولیس کی گشتی گاڑیوں کے سامنے سے گزرا لیکن اس وقت تو وہ اتفاقاً بھی پولیس کے ہتھے نہیں چڑھا۔ رحیم گل اور اکرم اس کے جواب میں کہہ سکتے تھے کہ گشت کے دوران پولیس کے سامنے سے تو ہزاروں گاڑیاں گزرتی ہیں۔ پولیس ہر گاڑی میں تو جھانک کر نہیں دیکھ سکتی کہ اس میں کیا ہو رہا ہے' کیا لے جایا جا رہا ہے۔ پولیس میں ایسے لوگوں کی تعداد شاید نہ ہونے کے برابر تھی جو کسی گاڑی کو دور سے دیکھ کر ہی کسی نامعلوم حس کی مدد سے فیصلہ کر سکتے تھے کہ اسے مشکوک سمجھا جائے یا غیر مشکوک؟
ابھی ہم تینوں خاموش ہی ہوئے تھے کہ ایک کانسٹیبل ایک دراز قد اور خوش پوش شخص کو ساتھ لئے اندر آ گیا۔ وہ تقریباً پینتیس کی عمر کا ایک خوش شکل شخص تھا۔ سوٹ میں تھا اور مع لوازمات کے تھا یعنی سر پر فیلٹ ہیٹ تک موجود تھا۔ لگتا تھا کہ وہ رات کے اس پہر بڑے اہتمام سے گھر سے نکلا تھا۔ وہ متجسس انداز میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ انسپکٹر رحیم گل کی طرف دیکھ کر بولا "خیریت تو ہے یہاں کیا ہوا ہے؟"
"جہاں پولیس موجود ہو وہاں خیریت ذرا کم ہی ہوتی ہے۔" رحیم گل بولا "آپ کی تعریف؟"
"آپ... آپ مجھے نہیں جانتے؟" نووارد نے کچھ اس طرح پوچھا جیسے اسے رحیم گل کے سوال سے دلی صدمہ پہنچا ہو۔
"اگر میں آپ کو جانتا ہوتا تو مجھے آپ سے یہ سوال کرنے کی ضرورت ہرگز پیش نہ آتی کہ آپ کون ہیں۔" انسپکٹر رحیم گل چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔
"مجھے اس لئے ذرا حیرت ہو رہی ہے کہ اس شہر کے اکثر پولیس افسران مجھے اچھی طرح پہچانتے ہیں۔" خوش پوش اجنبی قدرے شاطرانہ لہجے میں بولا۔
"کیوں' کیا آپ اشتہاری مجرم ہیں؟" رحیم گل نے ملائمت سے پوچھا۔
نووارد گویا زبردستی ہنسا لیکن اس کی ہنسی تقریباً بے آواز سی تھی جیسے سائلنسر لگا کر ہنس رہا ہو۔ پھر وہ اپنا فیلٹ ہیٹ درست کرتے ہوئے گہری نظر سے رحیم گل کی طرف دیکھ کر بولا "مذاق اچھا کر لیتے ہیں آپ.... ورنہ پولیس والوں میں بھلا حسِ مزاح کہاں ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے آپ یہاں نئے آئے ہیں ورنہ میں چاہے آپ سے واقف ہوتا یا نہ ہوتا لیکن آپ مجھ سے ضرور واقف ہوتے۔"
"واہ! یہ تو آپ نے اور بھی سسپنس پیدا کر دیا۔" رحیم گل پلک جھپکائے بغیر بولا "لگتا ہے آج کی رات سسپنس میں ہی گزرے گی۔"
"مجھے مشتاق مدثر کہتے ہیں۔" اجنبی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

رحیم گل اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظرانداز کرتے ہوئے بولا "اوہ آپ کو تو بہت بڑا کھلاڑی ہونا چاہئے‘ آپ کے نام میں تو ہمارے دو بڑے کرکٹرز کے نام یکجا ہو گئے ہیں۔"

مشتاق مدثر شاید اپنی کھسیاہٹ چھپانے کے لئے اپنے بڑھے ہوئے ہاتھ کو دوبارہ اپنے فیلٹ ہیٹ کی طرف لے گیا اور خواہ مخواہ ایک بار پھر اسے درست کرنے لگا "کھلاڑی تو شاید میں نہیں ہوں انسپکٹر صاحب لیکن کچھ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ کھلاڑیوں کی بھی تو قسمیں ہوتی ہیں نا۔" پھر اس نے اپنے مفہوم کو گویا تھوڑا سا چکر دیا "ہم تو لفظوں کے کھلاڑی ہیں جناب! ٹائپ رائٹر سامنے رکھ کر لفظوں سے کھیلتے ہیں۔ میں روزنامہ "مون" کا شوبزنس اور کلچرل رپورٹر ہوں۔ ہمارا اخبار انگریزی میں شام کا سب سے بڑا اخبار ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا فخر جھلک آیا۔

"بہت خوب۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" رحیم گل نے اب بھی اس سے ہاتھ ملائے بغیر کہا "یہاں آپ کی آمد شوبزنس کے سلسلے میں ہوئی ہے یا کلچر کے سلسلے میں؟"

"کچھ بھی سمجھ لیجئے۔" وہ بے پروائی سے بولا "مس فرحین شوبزنس کی نمائندگی بھی کرتی ہیں اور کلچر کی بھی...."

"کون سے کلچر کی؟" رحیم گل نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ملائمت سے پوچھا۔

"آف کورس.... مغربی کلچر کی۔ لیکن یہ کوئی ایسی معیوب بات نہیں... ان کی زندگی کا بیشتر حصہ امریکا میں گزرا ہے۔ اس لئے اگر وہ وہاں کی موجودہ معاشرت کی نمائندگی کرتی ہیں تو ہمیں اس پر زیادہ شرمندہ یا جزبز نہیں ہونا چاہئے۔" پھر ذرا توقف سے وہ بولا "میں اردو ٹھیک ٹھاک بول رہا ہوں نا...؟ بچپن ہی سے انگریزی میں لکھنے پڑھنے اور زیادہ تر انگریزی میں ہی بولنے کے باوجود مجھے اردو پر بھی اچھا خاصا عبور رہا ہے۔"

"یہ کچھ اتنی زیادہ حیرانی کی بات نہیں مسٹر مشتاق مدثر!" اب رحیم گل صاف ستھری اور درست انگریزی میں بولا "ہمارے ہاں انگریزی کے بہت سے بڑے صحافی اردو میں بھی اتنا ہی اچھا لکھتے اور بولتے ہیں جتنا انگریزی میں۔"

"بے شک بے شک" مشتاق مدثر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اچھا تو آپ مس فرحین سے ملنے آئے تھے؟" رحیم گل گویا اسے دوبارہ اصل موضوع پر لاتے ہوئے بولا۔

"میں یونہی ملنے نہیں آیا تھا۔ مس فرحین نے مجھے انٹرویو کے لئے وقت دیا تھا۔ ہماری ملاقات باقاعدہ طے تھی بلکہ مجھے افسوس ہے کہ میں کچھ لیٹ ہو گیا۔" اس نے گھڑی دیکھی۔

"کچھ نہیں آپ بہت..... بہت لیٹ ہو گئے مسٹر مشتاق مدثر۔"

"مجھے بھی یہی لگ رہا ہے۔ یہاں آپ لوگوں کی موجودگی کوئی اچھا شگون نہیں ہے۔ یہاں کوئی چوری تو نہیں ہو گئی۔ ڈاکا تو نہیں پڑ گیا؟" مشتاق نے قدرے تشویش سے پوچھا "آج کل اس علاقے میں چوری ڈکیتی کی وارداتیں بہت ہو رہی ہیں بلکہ اس علاقے میں کیا ہر علاقے میں ہی ہو رہی ہیں۔" اس کا ذہن شاید اب بھی قتل کے امکان کی طرف نہیں گیا تھا۔

"وہ تو آپ جان ہی لیں گے کہ یہاں کیا ہوا ہے۔ پہلے آپ یہ بتائیے کہ کیا مس فرحین نے آپ کو انٹرویو کے لئے صبح تین چار بجے کا وقت دیا ہوا تھا؟" رحیم گل نے وہ سوال کیا جو میرے ذہن میں بھی مچل رہا تھا۔

"اس میں اتنی حیرانی کی کیا بات ہے انسپکٹر رحیم گل صاحب؟" اس نے رحیم گل کے سینے پر لگے ہوئے بیج سے اس کا نام پڑھ لیا تھا "یہ شوبزنس کی دنیا ہے اس میں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔ خاص طور پر مس فرحین کی تو مصروفیات ہی ایسی تھیں کہ ان سے ایسا ہی کوئی وقت ملنے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ دن میں تو ان سے وقت مل ہی نہیں سکتا تھا اور میں چونکہ ایک عرصے سے شوبزنس کی صحافت میں ہوں اس لئے میں نے شوبزنس کے لوگوں کے ساتھ ایڈجسٹ کرنا سیکھ لیا ہے۔ کوئی مجھے انٹرویو کے لئے خواہ کوئی بھی وقت دے کسی بھی جگہ بلائے۔ میں ضرور پہنچ جاتا ہوں اور اس انٹرویو کے لئے پہنچنے کا تو مجھے بڑا ہی تجسس تھا کیونکہ مس فرحین نے کہا تھا‘ وہ اپنے انٹرویو میں کچھ اہم انکشافات بھی کریں گی۔ میں تو تصور ہی تصور میں دیکھتا آرہا تھا کہ ہمارا اخبار انگریزی ہونے کے باوجود مس فرحین کے دھماکے دار انٹرویو کی وجہ سے دھڑا دھڑ بک رہا ہے۔"

"کس قسم کے انکشافات؟ فرحین نے کچھ بتایا نہیں تھا؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔ انہوں نے اگر کچھ اشارے ہی دے دیئے ہوتے تو میں یہاں آنے سے پہلے ہی کوئی چھوٹی موٹی اسٹوری تو بنا کر آتا۔ پیشگی کچھ پبلسٹی ہو جاتی۔ باقی تفصیلات انٹرویو میں آجاتیں لیکن وہ ہوٹل میں یا کہیں اور کوئی بات کرنے کے لئے تیار ہی نہیں تھیں۔ تصویریں ہم ان کی بنوا چکے تھے۔ بڑی ہوش ربا قسم کی تصویریں ہیں۔ ان میں سے صرف چند ایک ہی چھپنے کی نوبت آسکے گی!" اس کے لہجے میں حسرت تھی لیکن پھر گویا اس نے اپنے آپ کو تسلی دی "لیکن خیر کوئی بات نہیں۔ مجھے اُمید ہے ان کا انٹرویو بھی کچھ کم دھماکا خیز نہیں ہوگا۔ اس قسم کی خواتین سے بڑی متنازعہ اور حیران کن باتیں سُننے کو ملتی ہیں۔ عام طور پر ان کے انٹرویوز پر بڑا ہنگامہ کھڑا ہوتا ہے اور اگر کوئی اچھا اسکینڈل ہاتھ آجائے تو اخبار کی اشاعت کہیں سے کہیں جا پہنچتی ہے۔ اس لئے میں بڑے زور و شور سے مس فرحین کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ بڑی مشکل سے وہ تفصیلی انٹرویو کے لئے رضامند ہوئی تھیں۔" وہ بڑے ادب و احترام سے فرحین کا ذکر کر رہا تھا۔

ایک لمحے کے لئے کمرے میں بوجھل سکوت چھا گیا۔ میں اور رحیم گل دونوں بغور اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ کچھ مضطرب سا ہو گیا۔ میں نے پہلی بار اسے مخاطب کیا "مجھے یاد پڑتا ہے میں نے آج رات تمہیں تھری اسٹار ہوٹل میں فرحین کے شو میں دیکھا تھا۔"

مشتاق مدثر کے پتلے پتلے ہونٹوں پر روح سے خالی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ گویا پہلی بار میری موجودگی کو محسوس کرتے ہوئے بولا "ہاں میں تو تقریباً ہر رات ہی ایسی کسی نہ کسی جگہ پر موجود ہوتا ہوں۔ یہ میرے پیشے کا حصہ ہے اور خاصا دلچسپ حصہ ہے۔ لیکن فرحین وہاں مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔"

پھر اس نے سرتاپا میرا جائزہ لیا اور پُرتجسس لہجے میں پوچھا "آپ کی تعریف؟"

"مجھے افضل چوہدری کہتے ہیں۔" میں نے ایک لمحے کے توقف کے بعد کہا۔

"چوہدری گروپ آف کمپنیز کے مالک افضل چوہدری تو نہیں؟" اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔ شاید اس کے کان کھڑے ہوئے تھے۔ شاید اسے کسی اسکینڈل کی بو محسوس ہوئی تھی۔

تاہم میں نے اسے اثبات میں جواب دینے میں کوئی حرج نہ سمجھا اور سرہلاتے ہوئے کہا "کاروباری میدان میں بھی آپ کی معلومات کافی وسیع معلوم ہوتی ہیں۔ مجھے کراچی میں ایک بزنس مین کی حیثیت سے.... بلکہ شاید کسی بھی حیثیت سے بہت کم لوگ جانتے ہیں۔"

"معلومات رکھنا بعض لوگوں کا مشغلہ ہوتا ہے۔ میں ان میں سے ایک ہوں۔" وہ اپنی اسی بے روح مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

رحیم گُل دلچسپی آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "آپ فرما رہے تھے کہ شہر کے بیشتر پولیس آفیسر آپ کو پہچانتے ہیں۔ کیا ان سے بھی آپ کی اکثر و بیشتر ملاقات رہتی ہے؟"

"بے شک" وہ بلا تامل بولا۔

"کیا پولیس بھی آپ کے نزدیک شوبزنس کا حصہ ہو گئی ہے؟" رحیم گُل نے ملائمت سے پوچھا لیکن اس کے اس ملائم لہجے میں ایک خاص قسم کا طنز ہوتا تھا۔

"جی ہاں" مشتاق نے بڑے اطمینان سے جواب دیا اور ایک بار پھر فلسفیانہ سے لہجے میں بولا "ہم سب اس سوسائٹی میں رہتے ہیں اور ہم سب ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔ کہیں نہ کہیں ہمارے کھانچے ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اسی لئے تو ہم سب صرف اس وقت تک آرام سے رہتے ہیں جب تک ہم سب ایک دوسرے کی بھلائی کا خیال رکھتے ہیں۔ جونہی ہم کسی دوسرے کی جڑیں کاٹنا شروع کرتے ہیں فوراً ہی ہمارے لئے بھی مسائل پیدا ہونے لگتے ہیں۔"

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "یہ تو آپ کے سوال کا

فلسفیانہ جواب تھا اور اس کا طنزیہ جواب یہ ہے کہ پولیس کا محکمہ اب واقعی شوبزنس ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ یعنی بس دکھاوا ہی دکھاوا...... اگر لفظی اعتبار سے بھی غور کریں تو اس میں شو اور بزنس دونوں نظر آتے ہیں۔ شو یہ صرف بڑے بڑے سرکاری لوگوں کی بڑھاتا رہتا ہے اور اپنے لئے اکثر بزنس میں مصروف رہتا ہے۔"

رحیم گُل گہری سانس لے کر بولا "ہم آپ کی لفاظی سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ مشتاق مدثر صاحب! آپ نے میرے مختصر سے سوال کے بڑے تفصیلی اور پہلودار جواب دے دیئے۔ کاش آپ اصلی اور سچا جواب بھی دے دیتے۔ مجھے اصل میں یہ سُن کر خاصی حیرت ہوئی ہے کہ شہر کے تقریباً سبھی پولیس آفیسر آپ کو جانتے ہیں۔ یہ دعویٰ تو شاید کوئی کرائم رپورٹر بھی نہ کرسکے جسے روزانہ پولیس والوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ آپ تو شوبزنس اور کلچر کے رپورٹر ہیں۔"

"اصل اور سچا جواب یہ ہے انسپکٹر صاحب...... کہ میں ہر شعبۂ زندگی میں کام کے لوگوں سے سلام دعا رکھتا ہوں۔ خود جاکر ان سے مل کر رسم و راہ پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ کیا معلوم انسان کو کس وقت، کس سے کام پڑجائے۔ لوگ پولیس والوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ نہ ان کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی۔ لیکن میرے خیال میں تو ان سے دوستی اچھی اور فائدہ مند ہوتی ہے۔ میری تو جن سے بھی دوستی رہی ہے ہمیشہ میرے بڑے کام آئے ہیں۔ میرے لئے تو آپ کی صورت بھی شناسا ہے۔ آپ نے بھی مجھے دیکھا ہوا ہے لیکن شاید بھول گئے... یا پھر آپ نے مجھے اہمیت نہیں دی ہوگی۔ میں نے آپ کو آپ کے علاقے کے ڈی ایس پی فاروق صاحب کے آفس میں دو تین مرتبہ دیکھا ہے۔ میں ان کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔"

"ممکن ہے آپ نے مجھے دیکھا ہو لیکن میں نے آپ کی طرف توجہ نہیں دی ہوگی۔ اگر میں آپ کی طرف توجہ سے دیکھتا تو آپ کی صورت ضرور میرے ذہن میں رہتی لیکن میں جب ڈی ایس پی صاحب کے پاس کسی کام سے جاتا ہوں تو میری توجہ صرف اسی کام کی طرف رہتی ہے۔" رحیم گُل نے بے نیازی سے کندھے اچکا کر کہا۔

"چلیے... خیر کوئی بات نہیں۔ اگر پہلے شناسائی نہیں تھی تو اب ہوگئی ہے اور اُمید ہے آئندہ یہ شناسائی دوستی میں بدل جائے گی۔" اس نے گویا ڈھیٹ بن کر ایک بار پھر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

"اتنے وثوق سے یہ بات مت کہیے۔" رحیم گُل انگریزی میں بولا تاہم اس بار اس نے مشتاق مدثر کا مصافحے کے لئے بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا لیکن انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے مصافحہ کرنے سے پہلے وہ دستانے پہننے کے بارے میں سوچ رہا ہو۔

مشتاق مدثر نے میری طرف بھی مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا "آپ سے مل کر بھی بہت خوشی ہوئی افضل چوہدری صاحب! میں غائبانہ طور پر آپ سے معمولی سا واقف تھا، ملنے کی آرزو تھی لیکن سچی بات ہے میرے ذہن میں آپ کا جو خاکہ تھا آپ اس سے بہت مختلف نکلے ہیں۔ انسپکٹر رحیم گل صاحب کی شخصیت اور اندازِ گفتگو بھی ہمارے روایتی پولیس افسروں سے بہت مختلف ہے۔ مجھے آپ دونوں ہی سے مل کر بہت خوشی اور ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی ہے۔"

اس کا لہجہ خوشامدانہ نہیں تھا لیکن میری جگہ کوئی اور ہوتا تو اس اندازِ گفتگو پر خوش ہو سکتا تھا۔ انسپکٹر رحیم گل بھی خوشامد یا اس سے ملتی جلتی گفتگو سے متاثر ہونے والا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔

مشتاق مدثر سے مصافحہ کرکے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ ایک مضبوط اور طاقتور آدمی تھا۔ یہ تو میں پہلی نظر میں ہی دیکھ چکا تھا کہ وہ دراز قد اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ پھر بھی مجھے اس کے اتنا مضبوط ہونے کی توقع نہیں تھی جتنا وہ مصافحے کے بعد محسوس ہوا تھا۔ میں نے زندگی میں پہلی بار اتنا مضبوط اور فٹ صحافی دیکھا تھا۔

وہ ایک بار پھر رحیم گُل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "اِدھر اُدھر کی باتیں تو بہت ہوگئیں۔ کیا اب میں جان سکتا ہوں کہ یہاں کیا ہورہا ہے؟ مس فرحین جیسی خاتون کے گھر میں رات کے پچھلے پہر کئی پولیس والوں اور ایک بڑے بزنس مین کا پایا جانا کوئی اچھی علامت نہیں ہے۔ مس فرحین کہاں ہیں؟"

رحیم گل نے گھڑی دیکھی پھر دروازے پر کھڑے ہوئے اے ایس آئی کی طرف دیکھا اور سنجیدگی سے کہا "اس وقت اس کی لاش ایمبولنس میں رکھ کر سرکاری اسپتال کے مُردہ خانے میں لے جائی جارہی ہے۔ راستے میں ہوگی۔"

مشتاق مدثر اپنا فیلٹ ہیٹ سر سے اُتار کر ہاتھ میں تھامے ہوئے تھا۔ یہ سُن کر ہیٹ اس کے ہاتھ سے گر پڑا اور آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے اضطراری سے انداز میں ہیٹ کو اُٹھایا، اسے جھاڑا اور مرتعش سی آواز میں کہا "لاش؟ مس فرحین کی لاش؟ تم مذاق تو نہیں کررہے انسپکٹر؟"

"میری ابھی آپ سے اتنی بے تکلفی نہیں ہوئی ہے کہ مذاق کرنے لگوں۔" رحیم گُل رکھائی سے بولا۔

"انہیں کس نے قتل کیا؟" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد مشتاق نے رنج میں ڈوبے لہجے میں پوچھا۔

"آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ انہیں قتل کیا گیا ہے؟ میں نے تو ابھی یہ نہیں کہا۔" رحیم گل نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بچوں جیسی باتیں نہ کرو انسپکٹر۔ تمہاری یہاں موجودگی اور تمہارے آدمیوں کی اتنی زیادہ سرگرمی بتارہی ہے کہ فرحین کو

طبعی موت نہیں آئی ہوگی۔" مشتاق مدثر ناگواری سے بولا "میرا ماتھا تو پہلے ہی ٹھنکا تھا لیکن میں سمجھا تھا شاید کوئی چوری ڈکیتی کا مسئلہ ہوگا۔ کس نے قتل کیا ہے انہیں؟" اس بار پوچھنے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے قاتل کا نام معلوم ہوتے ہی وہ خود تلوار ہاتھ میں لے کر نکل کھڑا ہوگا اور اس کا سر قلم کردے گا۔ سوال کرتے وقت اس نے ایک لمحے کے لئے شک زدہ سی نظروں سے میری طرف بھی دیکھا۔

رحیم گُل نہایت سنجیدگی سے بولا "فی الحال ہمیں تقریباً ایک لاکھ افراد پر فرحین کے قتل کا شبہ ہے۔ صبح تک شاید یہ تعداد کچھ کم ہوجائے۔"

مشتاق مدثر ایک لمحے اسے گھورتا رہا۔ رحیم گُل نے پلک نہیں جھپکی۔ آخر مشتاق اپنا فیلٹ ہیٹ سر پر رکھتے ہوئے بولا "اب میں چلتا ہوں۔ میرا خیال ہے مجھے یہاں کوئی ڈھنگ کی بات معلوم ہونے کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔"

"مجھ سے رابطہ رکھیے گا۔ مجھے کچھ معلوم ہوسکا تو ضرور آپ کو بتادوں گا۔ آپ خود فیصلہ کرلیجئے گا کہ ان میں سے کون سی بات ڈھنگ کی ہے۔" رحیم گل نہایت شیریں لہجے میں بولا۔

"میں تم سے نہیں، تمہارے افسرانِ اعلیٰ سے رابطہ رکھوں گا۔" مشتاق جانے کے لئے مڑتے ہوئے بولا۔

"یہ تو اور بھی بہتر ہوگا۔ وہ آپ کو زیادہ اعلیٰ قسم کی خبریں فراہم کرسکیں گے۔ ہم ادنیٰ آدمیوں سے تو ادنیٰ خبریں ہی مل سکتی ہیں۔" رحیم گل خوشگوار لہجے میں بولا۔

مشتاق مدثر کے جانے کے بعد میں نے رحیم گُل سے کہا "پولیس والوں کو تو صحافیوں سے بنا کر رکھنی چاہئے۔"

"یوں تو سبھی کو ایک دوسرے سے بنا کر رکھنی چاہئے لیکن کسی خوف کے تحت نہیں بلکہ صرف انسانی دوستی کے جذبے کے تحت۔ اکثر لوگ صرف اپنے اعمال پر پردہ ڈالے رکھنے کی غرض سے صحافیوں سے بنا کر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے زندگی کا اصول بنا رکھا ہے کہ کوئی غلط کام مت کرو اور کسی سے مت ڈرو۔ میں خوف کے تحت کسی کے ساتھ خوش خلقی سے پیش نہیں آسکتا۔ انسانیت کے ناتے سے پیش آسکتا ہوں۔ وہ بھی اس شرط پر کہ دوسرا بھی مجھ سے خوش خلقی سے پیش آرہا ہو۔ مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش نہ کررہا ہو اور ٹھیک آدمی ہو۔ ٹھیک آدمی کا مطلب سمجھتے ہیں نا آپ؟"

"بہت اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ بہرحال تمہاری شرائط بہت کڑی ہیں پیارے رحیم گُل!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تمہاری ہمیشہ لوگوں سے چخ چخ ہی چلے گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں اس کے لئے تیار رہوں بلکہ اب تو عادی ہوتا جارہا ہوں۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

اس دوران پولیس والوں نے وہاں اپنی ضابطے کی کارروائیاں اور ابتدائی تفتیش مکمل کرلی تھی۔ وہ رخصت ہونے کی تیاریاں کرنے لگے۔ سپیدۂ سحر نمودار ہوچکا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس گاڑی کے بارے میں کوئی اطلاع آنے تک رحیم گل کے ساتھ ہی رہوں جس میں پیکٹ رہ گیا تھا۔ رحیم گل کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ میں اس کے ساتھ پولیس اسٹیشن چلوں۔ فلیٹ کے دروازے پر ایک مسلح کانسٹبل بٹھادیا گیا اور میں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر پولیس کی گاڑیوں کے پیچھے پیچھے پولیس اسٹیشن جاپہنچا جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

وہاں پہنچتے ہی رحیم گل کے لئے گویا مصروفیات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ نئی وارداتوں کی اطلاعات آرہی تھیں۔ پُرانے سلسلوں میں کچھ لوگوں کو پکڑ کر لایا جارہا تھا۔ وہ بھی تھے جو کسی نئے یا پُرانے سلسلے میں اتفاقاً ہتھے چڑھ گئے تھے۔ غرضیکہ تھانے میں بہت ہی گہما گہمی تھی، ابھی صحیح معنوں میں دن نہیں چڑھا تھا اور یہ ایک پوش علاقے کا تھانہ تھا۔ جب یہاں "رونق" اور "گہما گہمی" کا یہ عالم تھا تو باقی علاقوں میں نہ جانے کیا صورتِ حال چل رہی ہوگی۔

رحیم گل خود تو اِدھر اُدھر مصروف ہوگیا لیکن اس نے ازراہِ کرم مجھے اپنے کمرے میں بٹھادیا اور کچھ دیر بعد میرے لئے خاصا معقول قسم کا ناشتا بھی بھجوادیا۔ اس جیسے آدمی کی طرف سے یہ سلوک بھی غنیمت تھا۔ اس دوران سب انسپکٹر اکرم کچھ دیر کے لئے میرے پاس بیٹھا جس کے بارے میں رحیم گل نے بتایا تھا کہ وہ ایک دیانت دار اور محنتی آدمی تھا۔

میں نے اس سے پوچھا "آپ لوگوں کے پاس نوزی کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے؟ اسے کھنگالا جائے تو شاید کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔"

"میں خود چلتا پھرتا ریکارڈ روم ہوں سر!" وہ بتانے لگا۔ "..... اس کے بارے میں موٹی موٹی باتیں تو میں نے آپ کو بتا ہی دی ہیں مزید بھی جو کچھ پوچھنا ہو، مجھ سے پوچھ لیجیے۔ مجھے معلوم ہوا تو ضرور بتادوں گا۔ ویسے شاید کسی ٹوٹے پھوٹے کمرے میں گرد و غبار اور پُرانی فائلوں کے انبار تلے دبی اس کے بارے میں بھی کوئی تفتیشی فائل پڑی ہو تو اسے نکالنا کارِ دارد ہوگا اور اس سے شاید ہی آپ کو کوئی مدد مل سکے۔ اب ہمارے ہاں وہ کمپیوٹرائزڈ نظام تو ہے نہیں کہ بٹن دبایا اور مجرم کی مختصر ہسٹری شیٹ نکل آئی۔ بٹن دبایا، اس کی انگلیوں کے نشانات نکل آئے۔ بٹن دبایا اور دیگر تمام ضروری معلومات سامنے آگئیں۔ یہاں تو بس جس طرح گزارا چلتا ہے وہ آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ ویسے آپ اس کے بارے میں کیا جاننا چاہ رہے ہیں؟"

"کوئی بھی ایسی بات جس سے اس تک پہنچنے میں کوئی مدد مل سکے۔" میں نے جواب دیا "آپ لوگ ایسے کسی مجرم تک پہنچنے کے لئے کیا طریقہ اختیار کرتے ہیں؟"

"کوئی سراغ موجود ہو تو ہم اس کے سہارے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ اللہ پر توکل کرکے اپنا کام کرتے رہتے ہیں۔ کبھی اچانک ہی وہ ہاتھ آجاتا ہے۔ جب اس کی تقدیر ہاری ہوتی ہے تو وہ کسی نہ کسی چکر میں' کسی بہانے ہمارے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ بات وہی ہے کہ اوپر والے کا بھی اپنا ایک نظام کام کررہا ہے۔ اس کے تحت ہر بُرا آدمی بہرحال ایک بار گرفت میں ضرور آتا ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ اب ہم سب کو اطمینان سے بیٹھ کر اس وقت کا انتظار کرنا چاہئے جب کہیں سے اچانک اس کے پکڑے جانے کی خبر آئے۔ خواہ اس میں دو چار سال لگ جائیں؟" میں نے ہموار لہجے میں پوچھا۔

"نہیں ہم اپنی سی کوشش تو کریں گے۔" اس نے گویا مجھے اطمینان دلایا "ذرا ہمیں سانس لینے کا موقع تو ملے۔ نوزی کا وہ ساتھی جو کلفٹن کے ساحل پر اس کے اپنے ہی ہاتھوں ہلاک ہوا ہے' اس کی شناخت ہوجائے تو شاید اس سے بھی کچھ مدد ملے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "آپ شاید اس لئے نوزی تک جلد از جلد پہنچنا چاہتے ہیں کہ وہ فرحین کا قاتل ہوسکتا ہے لیکن میرے خیال میں ایسا نہیں ہے۔ جو واقعات آپ نے انسپکٹر صاحب کو سُنائے ہیں اور فرحین کی موت کے وقت کے بارے میں میرا جو اندازہ ہے' اس حساب سے تو جب فرحین کو قتل کیا جارہا تھا' اس وقت نوزی اور اس کا ساتھی کلفٹن کے ساحل پر آپ سے اُلجھے ہوئے تھے۔"

میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ بات اس نے کام کی ہی کی تھی۔ یعنی وہ اتنا نکما نہیں تھا جتنا عموماً ہم اپنے پولیس والوں کو سمجھتے ہیں۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "نہیں میں اسے صرف فرحین کا قاتل سمجھ کر اس کی تلاش کے لئے بے چین نہیں ہوں۔ مجھے ویسے ہی اس پر خار آرہی ہے کاش آپ لوگوں کے پاس اس کا کوئی اتا پتا ہوتا۔"

"آخری بار وہ ایک کچی بستی کے ایک مکان میں پایا گیا تھا۔ جہاں اس نے اپنی کمین گاہ بنائی ہوئی تھی۔ اس کے بعد سے اس کے کسی مستقل ٹھکانے کا پتا نہیں چلا۔ اس وقت وہ ایک معمولی سا بدمعاش ہوا کرتا تھا۔ مار پیٹ' چوری چکاری' ہیرا پھیری اور چھوٹے موٹے ناجائز دھندوں تک ہی اس کی پہنچ تھی لیکن پھر بہت مختصر عرصے میں وہ بہت بڑا بدمعاش' قاتل اور دہشت گرد بن گیا۔" سب انسپکٹر اکرم نے دھیمے لہجے میں بتایا۔

"یہ انقلاب کیونکر رونما ہوا؟" میں نے تجسس سے پوچھا۔

"اسے منظم اور طاقتور لوگوں کی پشت پناہی میسر آگئی۔ بدمعاش صرف پشت پناہی کی وجہ سے بنتے ہیں ورنہ بدمعاش بذاتِ خود کچھ بھی نہیں ہوتے۔ وہ بہت بودے اور بہت معمولی لوگ ہوتے ہیں۔ صرف پشت پناہی انہیں دلیر بناتی ہے۔ اگر بدمعاش کی

پشت پناہی کرنے والے منظم طبقوں کا خوف نہ ہو تو کوئی بھی شریف آدمی کسی بدمعاش کا بھرکس نکال سکتا ہے۔" اکرم میرے ساتھ ناشتا کررہا تھا اور ساتھ ساتھ مجھے اپنے خیالات و تجربات سے مستفید کررہا تھا۔

اسی طرح باتیں ہوتی رہیں کمرے میں لوگ آتے اور جاتے رہے۔ خود اکرم بھی کئی بار باہر گیا اور لوٹ آیا۔ رحیم گل البتہ کافی طویل وقفے کے بعد گیارہ بجے کے قریب واپس آیا۔ اب وہ صبح جیسا تازہ دم اور شگفتہ مزاج نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں جو اس کے ذہنی تناؤ کی نشاندہی کررہی تھیں۔ وہ اکرم سے باتیں کرنے لگا اور ان باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ اسے بہت سے معاملات درپیش تھے جو اس کی نظر میں فرحین کے قتل کے معاملے سے زیادہ اہم تھے۔

آخر اسے میز پر بیٹھنا نصیب ہوا اور وہ میری طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں مسکرایا "گزشتہ رات سے اب تک مجھے سر کھجانا نصیب نہیں ہوا۔ پھر بھی آپ لوگ کہتے ہیں ہماری پولیس کام نہیں کرتی۔"

"صحیح معنوں میں کام کرنے والے آٹے میں نمک کے برابر ہیں نا۔ باقی سب نوکری نبھا رہے ہیں۔ وقت پورا کررہے ہیں۔" میں نے کہا' پھر پوچھا "اس کار کے بارے میں کوئی خبر آئی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ اسی لمحے اس کی میز پر رکھے ہوئے فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے چند لمحے بات کی پھر ریسیور رکھ کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "اگر آپ پہلے کار کے بارے میں پوچھ لیتے تو شاید وہ پہلے ہی مل جاتی۔ وہ شہر کی ایک مصروف سڑک کے کنارے کھڑی مل گئی ہے۔"

اکرم بولا "مجھے معلوم تھا وہ جلد ہی مل جائے گی اور کسی بارونق یا گنجان آباد اور تنگ و تاریک گلیوں والے علاقے کے قریب کھڑی ملے گی۔ نوزی چوری کی گاڑی زیادہ دیر استعمال میں نہیں رکھتا۔ اس کی احتیاطی تدبیریں اس کے بڑا کام آتی ہیں اور وہ عموماً بارونق یا گنجان علاقوں میں ہی غائب ہوتا ہے۔"

رحیم گل اس سے مخاطب ہوا "اس سے پہلے کہ وہ کار ہمارے دوسرے شعبے کے قبضے میں چلی جائے تم جاکر اس کی پچھلی سیٹ کے کھانچے میں سے وہ پیکٹ نکال لاؤ جس کا افضل صاحب نے ذکر کیا تھا۔ اس دوران' میں اور افضل صاحب یہاں بیٹھ کر دعا کریں گے کہ وہ پیکٹ ابھی تک وہیں موجود ہو۔"

"میں اکرم صاحب کے ساتھ چلا جاتا ہوں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

رحیم گل نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مسکراتے ہوئے بولا "آپ اطمینان سے بیٹھے رہیں افضل صاحب! پریشان نہ ہوں۔ اپنی پولیس پر اعتبار کرنا سیکھیں۔"

"بات اعتبار یا بے اعتباری کی نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "میں دراصل تجسس سے بے چین ہورہا تھا۔"

"پیکٹ تو بہرحال یہاں..... میرے سامنے آنے کے بعد ہی کھلے گا۔" رحیم گل نے فیصلہ سُنادیا۔

"اچھا... جیسے آپ لوگوں کی مرضی۔" میں نے کندھے اچکائے اور دوبارہ بیٹھ گیا۔ اکرم مستعدی سے وہاں سے رخصت ہوگیا۔ رحیم گل نے اپنے اور میرے لئے بلیک کافی منگوائی پھر گویا دوبارہ مجھے تسلی دیتے ہوئے بولا "میں نے پیکٹ لینے کے لئے بالکل صحیح آدمی کو بھیجا ہے۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے مختصراً کہا۔

رحیم گل کو کافی بھی سکون سے پینا نصیب نہیں ہوئی۔ منٹ منٹ بعد اس کے فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس کے قریب ہی فائلنگ کیبنٹ پر ایک وائرلیس بھی رکھا تھا۔ اس پر بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد پیغامات آرہے تھے۔ کافی ختم کرتے کرتے آخر اسے اُٹھنا ہی پڑ گیا۔

وہ ایک بار پھر ٹوپی سر پر رکھ کر وردی درست کرتے ہوئے بولا "میں پندرہ بیس منٹ میں حاضر ہوتا ہوں افضل صاحب! قریب ہی ایک بنگلے پر جارہا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر انتظار کی کوفت اُٹھانے لگا۔ اس نے واپس آنے میں پندرہ بیس منٹ سے زیادہ دیر لگادی۔ اس دوران اکرم لوٹ آیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور اس کے چہرے پر بھی کوئی ایسے تاثرات نہیں تھے جیسے کوئی اہم چیز پانے کے بعد ہوتے ہیں۔ میرا دل کچھ ڈوب سا گیا لیکن میز کے قریب آکر اکرم نے اپنی سرمئی جرسی کے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور بغل کی طرف سے سفید کاغذ میں لپٹا ہوا وہی پیکٹ نکال لیا جو میرے لئے جانا پہچانا تھا۔ اب وہ کچھ میلا میلا سا نظر آرہا تھا۔

"یہی ہے نا افضل صاحب؟" اس نے پیکٹ میز پر رکھتے ہوئے تصدیق چاہی۔

"ہاں یہی معلوم ہوتا ہے۔" میں نے قدرے بے تابی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن اکرم نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے روک دیا۔

"اس سے چھیڑ چھاڑ صاحب کے آنے کے بعد ہی ہوگی جناب!" اس کے لہجے میں قطعاً مروت نہیں تھی۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا اور اپنے تجسس کا گلا گھونٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے میں نے اپنے آپ کو اس ماحول سے اور تمام واقعات سے لاتعلق کرلیا۔

غنیمت رہا کہ اس کے بعد رحیم گل جلد ہی لوٹ آیا۔ اس کے چہرے سے بدمزگی عیاں تھی۔ اس نے ٹوپی اُتار کر زور سے میز پر پٹخی اور کرسی پر تقریباً ڈھیر ہوتے ہوئے بولا "میں سمجھتا تھا کہ ایک دیانتدار پولیس آفیسر کے لئے دیہات میں کام کرنا بہت دشوار ہے لیکن اب اندازہ ہوا کہ شہر میں اس سے زیادہ مشکل ہے۔"

"خیریت تو ہے؟ بات کیا ہے۔ بہت غصے میں نظر آرہے ہیں انسپکٹر صاحب؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ابھی ابھی مجھے رشوت دینے کی کوشش کی گئی ہے۔" وہ برہم لہجے میں بولا۔

"تو اس میں اتنے غصے کی کیا بات ہے؟ کہنے والے نے تو روٹین کا ایک کام کرنے کی کوشش کی ہوگی۔" پھر میں نے اسے چھیڑا "کہیں وہ معاملہ تو نہیں تھا کہ..... رشوت؟ اور وہ بھی اتنی تھوڑی؟"

"جی نہیں" وہ روٹھے ہوئے بچّے کی طرح خفگی سے مجھے گھورتے ہوئے بولا "بڑے نوٹوں سے بھرا ہوا بریف کیس تھا۔ آپ جیسا دولت میں کھیلنے والا بڑا سیٹھ بھی دیکھ لیتا تو ایک بار منہ میں پانی آجاتا۔"

"اور میں ایک طرف کو منہ کرکے اس پانی کی کُلی کردیتا۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

"کہنا آسان اور کرنا بہت مشکل ہوتا ہے افضل صاحب!"

"کوئی بڑا ہی معاملہ ہوگا؟" میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا "نوٹوں سے بھرے ہوئے بریف کیس بڑے ہی معاملات میں چلتے ہیں جن میں سیاسی لوگوں کی خرید و فروخت کا معاملہ بھی شامل ہے لیکن آپ بہرحال سیاسی آدمی نہیں ہیں۔"

مجھے اُمید نہیں تھی کہ وہ معاملہ مجھے بتائے گا۔ میں نے یونہی بات برائے بات کی تھی لیکن وہ بتانے لگا "ایک بہت بڑے سیٹھ نے ایک بہت بڑی سماجی شخصیت کو اس علاقے میں اپنا ایک بڑا سا بیش قیمت بنگلا دیا ہوا تھا کہ وہ اس میں اپنے مشہور فلاحی ٹرسٹ کی شاخ کھول لے لیکن گودام جو بنگلے کے تہ خانے میں تھا وہ سیٹھ صاحب نے اپنے پاس رکھا۔ بڑی سماجی شخصیت بہرحال پھر بھی بڑی خوش تھی اور اس نے بنگلے میں بڑی سی برانچ کھول لی تھی۔ اوپر فلاحی کام ہوتے رہے اور تہ خانے میں ایکسپورٹ کے مال کے کریٹوں میں ہیروئن پیک ہوتی رہی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ خوش تھے۔ گلشن کا کاروبار ہنسی خوشی چل رہا تھا کہ بیچ میں مجھ جیسا نامراد آگیا جسے مصیبتیں راہ چلتے آواز دے لیتی ہیں۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر اس نے آنکھیں مسلیں پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ایسے ہی ایک اتفاق کے تحت... جس طرح آج آپ سے ملاقات ہوئی ہے اسی طرح وہ معاملہ میرے علم میں آگیا۔ میں نے سیٹھ صاحب کے اثر و رسوخ کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اور اپنے افسروں کو ناراض کرتے ہوئے اس معاملے کو اُدھیڑ ڈالا۔ سب کچھ ٹھپ ہوگیا۔ سیٹھ صاحب فی الحال باہر بھاگے ہوئے ہیں، مجھ پر ہر طرف سے بڑا دباؤ ہے۔ وہ بڑی سماجی شخصیت مجھ پر اپنا سماجی دباؤ ڈال رہی ہے کہ اس معاملے میں خواہ مخواہ ان کا نام ملوث ہوگا اور بات نہ جانے کس طرح پبلک تک پہنچے، ان کی نیک نامی پر حرف آئے گا۔ سیٹھ صاحب کے نمائندے نے آج بڑی رقم کا بریف کیس مجھے تھمانے کی کوشش کی۔ میں چھوٹا سا افسر...... کتنی بڑی بڑی مشکلوں میں گھرا ہوا ہوں۔ آپ کو کچھ اندازہ ہے افضل صاحب؟"

"بہت اچھی طرح اندازہ ہے لیکن فی الحال اس چھوٹی سی مشکل کو دیکھ لیجئے جو آپ کی میز پر رکھی ہوئی ہے۔" میں نے پیکٹ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ابھی تک اسے درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا تھا۔

وہ کرسی پر کچھ آگے کو جھک آیا۔ آنکھیں سکیڑتے ہوئے اس نے پیکٹ کو چھڑی سے چھوا اور قدرے حیرت سے بولا "یہ ہے وہ پیکٹ؟"

اس کی حیرت بجا تھی۔ بظاہر وہ پیکٹ بہت حقیر دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو رحیم گل نے اکرم کو اشارہ کیا "اکرم صاحب! احتیاط سے اسے کھولیں۔ میں اور افضل صاحب مل کر دعا کرتے ہیں کہ یہ دھماکے سے نہ پھٹے یا اس میں سے زہریلی گیس خارج نہ ہو۔"

اکرم ہچکچاہٹ آمیز انداز میں پیکٹ اُٹھا کر گویا اپنے آپ کو یقین دلاتے ہوئے بولا "اس میں ایسی کوئی چیز تو نہیں ہونی چاہئے کیونکہ اس کے لئے قتل و غارت ہو رہی ہے۔ گولیاں چل رہی ہیں۔"

اس نے نہایت احتیاط سے ناخنوں سے پیکٹ کا کاغذ ہٹایا۔ اندر سے گتے کا ایک مضبوط ڈبا نکل آیا۔ اس ڈبے کو کھولا تو چمڑے کی ایک مستطیل تھیلی برآمد ہوئی جس میں بڑی نفیس زپ لگی ہوئی تھی۔ اکرم نے زپ کھول کر اس میں جھانکا۔ عینک کے پیچھے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے تھیلی رحیم گل کی میز پر اُلٹ دی۔ ہلکی سی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ مختلف سائز کے ہیرے میز کے شیشے پر بکھر گئے۔ سبھی ہیرے اچھے خاصے بڑے سائز کے تھے اور غالباً پوری تھیلی ہیروں سے بھری ہوئی تھی۔

"اوہ!" رحیم گل کے منہ سے بے اختیار نکلا اور نظر ہیروں پر جم کر رہ گئی لیکن ایک بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی کہ اس کی آنکھوں میں لالچ نہیں، حیرت تھی۔ میرے اندازے کے مطابق گری سے گری حالت میں بھی وہ ہیرے ایک کروڑ سے کم کے نہیں تھے اور شاید یہ قدرت کا ایک عجیب تماشا تھا کہ ساری مار دھاڑ ان کے لئے ہو رہی تھی تب بھی وہ مار دھاڑ کرنے والوں کے ہاتھ نہیں آئے تھے۔ اگر نوزی کو معلوم ہو جاتا کہ جس کار کو وہ سڑک کے کنارے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اسی کی ... کے کھانچے میں یہ ہیرے موجود تھے تو شاید وہ افسوس کے مارے خودکشی کر لیتا۔

چند لمحے کے سکوت کے بعد رحیم گل گہری سانس لے کر بولا "اب بات کچھ سمجھ میں آتی ہے۔ نوزی کسی زمانے میں بہت بڑے جیولرز کے ہاں ملازم تھا۔ بدعنوانی کے الزام میں نکالا گیا تھا اب وہ جس پیکٹ کے لئے مار دھاڑ کرتا پھر رہا تھا اس میں بہت سے ہیرے تھے۔ اب کچھ کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ نوزی تصویر میں کہاں فٹ بیٹھتا ہے۔"

"میرے خیال میں یہ اتنی پُرانی کہانی نہیں ہوسکتی۔" میں بھی ذرا اپنے ذہن کے کل پُرزوں کو ہلاتے ہوئے کہا "وہ جن جیولرز کے ہاں کام کرتا تھا اگر وہ وہاں سے اتنے ہیرے لے گیا تو وہ محض اسے نکالنے پر اکتفا نہ کرتے۔ وہ تو اس کی گردن دبا دیتے۔ اسے پاتال تک بھی نہ چھوڑتے۔ خصوصاً جبکہ اس وقت وہ اتنا بڑا بدمعاش بھی نہیں بنا تھا۔ یہ تو کوئی نئی کہانی معلوم ہوتی ہے جس میں کہیں فرحین بھی فٹ ہوتی ہے۔"

رحیم گل پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھتا رہا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے کہا "فی الحال تو یہ بھی یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ نوزی اس پیکٹ ہی کے چکر میں تھا کیونکہ اس نے مجھ سے کسی پیکٹ کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ اس نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ فرحین نے مجھے کوئی چیز دی تھی یا نہیں؟ وہ جاننا چاہتا تھا کہ فرحین نے مجھ سے کیا کہا تھا۔ مجھے کیا بتایا؟ نوزی نے ایک عجیب سا سوال یہ بھی کیا تھا کہ میری ہمدردیاں کس کے ساتھ ہیں؟ اس سوال کا مقصد تو میری سمجھ میں بالکل ہی نہیں آیا تھا۔ یہ سب باتیں میں آپ لوگوں کو بتا چکا ہوں۔ انہیں ذہن میں رکھتے ہوئے آپ لوگوں کو کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہئے۔"

میں نے مشورہ تو دے دیا لیکن ایک لمحے کے لئے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ رحیم گل بُرا ہی نہ منا جائے۔ سرکاری کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ عموماً خود کو عقلِ کُل سمجھتے ہیں۔ انہیں ان کے کام کے سلسلے میں مشورہ دیا جائے تو وہ اسے کام میں مداخلت تصور کرتے ہیں۔ رحیم گل تو ویسے بھی پولیس والا تھا تاہم یہ دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا کہ اس کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔ وہ پُرخیال انداز میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ اسی لمحے سب انسپکٹر اکرم نے اپنا منہ بند کر لیا جو ہیرے دیکھنے کے بعد سے اب تک کھلا ہوا تھا۔ جب وہ گاڑی سے پیکٹ نکال کر لا رہا ہوگا تو شاید اس نے سوچا بھی نہیں ہوگا کہ اس میں ایک کروڑ کے ہیرے موجود ہیں۔ شاید وہ اسے ہیروئن یا اسی قسم کی کسی دوسری چیز کا پیکٹ سمجھ رہا ہو۔

رحیم گل نے خود ہیرے سمیٹ کر دوبارہ تھیلی میں ڈالے اور پیکٹ کو تقریباً پہلے جیسی حالت پر لانے کی کوشش کرتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوا "آپ کو یقین ہے نا کہ فرحین نے آپ کو جو پیکٹ دیا تھا، وہ یہی تھا؟"

"ظاہر ہے ورنہ یہ میری بتائی ہوئی جگہ سے کیسے مل سکتا تھا۔" میں نے جواب دیا۔

رحیم گل نے سر ہلایا۔ ایک لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا "تھری اسٹار ہوٹل میں جب آپ شو کے بعد فرحین سے ملنے گئے تو آپ کو یقین ہے کہ کسی نے اس کمرے تک، آپ کا تعاقب نہیں کیا تھا؟"

"میں نے اس کا خیال رکھا تھا۔ میرا اندازہ تو یہی ہے کہ کسی نے میرا تعاقب نہیں کیا تھا۔ راہداری کافی لمبی تھی اگر کوئی میری نگرانی کر رہا ہوتا تو مجھے ضرور احساس ہو جاتا۔" میں نے جواب دیا۔

"اس کے باوجود جب نوزی اور اس کے ساتھی نے نیچے پارکنگ لاٹ میں آپ کو اغوا کیا تو انہیں معلوم تھا کہ آپ فرحین سے مل کر آ رہے ہیں؟" رحیم گل بولا۔

"ہاں" میں نے تسلیم کیا۔

"اس کا مطلب ہے جمیل نامی جو شخص فرحین کی طرف سے آپ کو بلانے کے لئے آیا تھا اور آپ کو اس کے پاس لے گیا تھا، وہ مشکوک ہے۔" رحیم گل بولا۔

"میں اس سلسلے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔" میں نے جواب دیا "فرحین نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ وہ اس کے بھروسے کا آدمی تھا۔"

"بھروسے کے آدمی ہی تو بعض اوقات مروا دیتے ہیں افضل صاحب۔" رحیم گل گہری سانس لے کر بولا "ہوسکتا ہے اسی نے فرحین کو ڈبل کراس کیا ہو۔ میرا خیال ہے میں آج کسی وقت اسے بلوالوں۔ اس سے تھوڑی بہت پوچھ گچھ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔"

میں کندھے اچکا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے اب معلوم ہو چکا تھا کہ پیکٹ میں کیا تھا۔ میرا تجسس اب ختم ہو چکا تھا۔ میں نے پیکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "یہ اب آپ کے پاس ہی رہے گا؟"

"ظاہر ہے، یہ میں آپ کو تو نہیں دے سکتا۔" رحیم گل نے جواب دیا۔

"میں نے کب مانگا ہے۔ مجھے ایسی چیزیں اپنے پاس رکھنے کا قطعاً کوئی شوق نہیں ہے۔ جن سے میرا کوئی تعلق نہ ہو۔" میں نے ناگواری سے کہا "میں تو صرف یہ جاننا چاہ رہا تھا کہ کہیں آپ اسے مال خانے وغیرہ میں تو جمع نہیں کرا دیں گے؟" میں نے ذرا ناگواری سے کہا۔

وہ میری ناگواری کو محسوس کرتے ہوئے ذرا معذرت خواہانہ لہجے میں بولا "میرا مقصد آپ پر بے اعتمادی کا اظہار کرنا نہیں تھا۔ میں تو ویسے ہی کہہ رہا تھا۔ میرا اسے مال خانے میں بھی جمع کرانے کا کوئی ارادہ نہیں کیونکہ پھر اس کا اللہ ہی حافظ ہوگا۔ میرے اور اکرم کے علاوہ کسی کے ہاتھ میں جانے کے بعد ان کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہوگا خواہ کتنے ہی قاعدوں اور ضابطوں کی پابندی کی جائے۔ اس لئے جب تک صحیح طور پر معلوم نہیں ہو جاتا کہ ان پر دراصل کس کا حق بنتا ہے تب تک یہ میرے پاس ہی محفوظ رہیں گے۔"

اس نے اٹھ کر پیکٹ لوہے کی ایک الماری میں رکھ کر اس دراز کو مقفل کر دیا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "خیال رکھیے گا۔ فی الحال اس کی حیثیت مقتولہ فرحین کی امانت کی ہے۔ اس نے یہ کہہ کر پیکٹ میری حفاظت میں دیا تھا کہ یہ اس کی زندگی کی ضمانت ہوگا۔ اس کی مراد غالباً یہی تھی کہ جب تک کوئی نامعلوم شخص یا اشخاص اس سے یہ پیکٹ حاصل نہیں کر لیں گے تب تک اسے قتل نہیں کریں گے لیکن افسوس کہ اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ میں فی الحال یہ ہیرے اسی کی امانت سمجھ کر رکھ رہا ہوں اور اگر یہ واقعی اس کی ملکیت ثابت ہوئے تو میں اس سے تعلق رکھنے والی کسی ایسی ہستی کو بھی تلاش کرنے کی کوشش کروں گا جو فرحین کے بعد ان ہیروں کی مستحق نظر آتی ہو۔ میں یہ امانت ضرور اس تک پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔"

میں مطمئن ہو کر تھانے سے نکل آیا اور سیٹھ رمضان کی دی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے ہوٹل کی طرف واپس روانہ ہوگیا۔ تمام راستے میں چاروں طرف کا جائزہ لیتا آیا کہ شاید کہیں نوزی کسی گاڑی میں جاتا نظر آجائے۔ شاید وہ میرا تعاقب کر رہا ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔

ہوٹل میں داخل ہو کر میں نے دیکھا لابی میں خلافِ معمول

کافی رونق نظر آرہی تھی۔ چند غیر ملکی دنیا جہان سے بے نیاز اِدھر اُدھر صوفوں پر بیٹھے اخباروں کے مطالعے میں غرق تھے۔ ایک سفید فام پختہ عمر شخص، کافی دور بیٹھی ایک سفید فام، سنہرے بالوں والی نوجوان لڑکی کی طرف بڑی میٹھی نظروں سے دیکھتے ہوئے مسکرا رہا تھا مگر وہ اسے قطعاً لفٹ نہیں کرا رہی تھی۔ لڑکی چست نیلی جینز اور ہوشربا قسم کی سُرخ جرسی میں تھی۔ وہ کسی اور خیال میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ پکی عمر کے اس مرد نے اگر قریب جاکر بھی اس سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش کی تو منہ کی کھائے گا۔

اپنے جیسے..... یعنی دیسی لوگوں کی بھی دو تین ٹولیاں اِدھر اُدھر موجود تھیں۔ کچھ نئے مہمان بھی آئے ہوئے تھے۔ کاؤنٹر پر ان کے ناموں وغیرہ کا اندراج ہو رہا تھا۔ کارڈ پُر کئے جا رہے تھے۔ میں یہ تمام سرگرمیاں دیکھتا ہوا لفٹ کی طرف بڑھنے لگا تھا کہ ایک کلرک کی نظر مجھ پر پڑ گئی جو شاید ازراہِ مہربانی مجھے ہوٹل کے مالک کی حیثیت سے پہچاننے لگا تھا۔ اس نے اشارے سے مجھے سلام کیا اور ساتھ ہی رُکنے کا اشارہ بھی کیا۔

میں اس کے قریب پہنچا تو وہ ایک طرف کو ہوتے ہوئے نیچی آواز میں بولا ”سر! ایک صاحب آپ کا پوچھتے ہوئے آئے تھے۔ آپ کا کمرا نمبر معلوم کر رہے تھے۔“

پہلے مجھے گماں گزرا کہ کہیں سیٹھ رمضان نہ آیا ہو لیکن پھر مجھے یاد آیا کہ اسے تو میرا کمرا نمبر وغیرہ سب معلوم تھا اور ہوٹل کا بیشتر عملہ اسے مجھ سے زیادہ جانتا تھا۔ اس کے لئے شاید کلرک ”ایک صاحب“ کے الفاظ استعمال نہ کرتا۔ سیدھی طرح سیٹھ رمضان کہتا۔

میں نے فوراً پوچھا ”تم نے بتا تو نہیں دیا؟“

”نہیں سر!“ اس نے جلدی سے نفی میں سرہلایا۔ گو کہ میں ہوٹل کے عملے کو اس سلسلے میں خاص طور پر کوئی ہدایت کرنا بھول گیا تھا لیکن کلرک عقلمند ہی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے قدرے اطمینان کی سانس لے کر کہا ”کون صاحب تھے؟ انہوں نے اپنا کچھ نام پتا نہیں بتایا؟“

”جی نہیں۔ مجھے تو نہیں بتایا لیکن وہ آپ کے لئے پیغام چھوڑ گئے ہیں۔ شاید اس میں لکھا ہو۔“ وہ اس وقت تک عقبی دیوار کی طرف مڑ چکا تھا جس میں چوبی خانے بنے ہوئے تھے اور ہر خانے پر نمبر موجود تھا۔ جس خانے پر میرا سوئٹ نمبر نظر آرہا تھا اس سے کلرک نے ایک لفافہ نکال کر میری طرف بڑھایا۔ وہ ہمارے ہی ہوٹل کا لفافہ تھا۔ اس پر بڑی عجلت میں میرا نام گھسیٹا گیا تھا۔ یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی کہ وہ ہمارے ہی ہوٹل کا لفافہ تھا۔ لابی میں ایک کونے میں چھوٹی سی ایک خوب صورت میز کرسی لگی ہوئی تھی جس پر مختلف خانوں میں ہوٹل کی اسٹیشنری موجود تھی۔ کوئی شخص ہوٹل میں مقیم مہمان کے نام کوئی پیغام چھوڑنا چاہتا تو اس سہولت کو استعمال کرسکتا تھا۔

میں نے لفافہ چاک کیا تو اس میں سے ہمارے ہی ہوٹل کی ایک چٹ برآمد ہوئی لیکن وہ سادہ تھی۔ میں نے اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس پر دونوں طرف کچھ نہیں لکھا تھا۔ صرف ہوٹل کا نام اور مونوگرام چھپا ہوا تھا۔

میں نے کلرک کے سامنے ہی لفافہ کھولا تھا اور وہ بھی دیکھ رہا تھا کہ چٹ سادہ تھی۔ وہ کچھ پریشان اور ندامت زدہ سا نظر آنے لگا۔ صفائی پیش کرنے کے سے انداز میں بولا ”سر! میں نے ان کو اس میز پر جاکر کچھ لکھتے تو دیکھا تھا۔“ اس نے دور کونے میں رکھی ہوئی میز کی طرف اشارہ کیا۔

”شاید آخری وقت میں اسے اپنے پیغام پر شرم آگئی ہو اور اس نے اس کی جگہ یہ سادہ چٹ رکھ دی ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”یا پھر شاید اسے ابھی تک بچپن کے مشغلے پسند ہوں اور اس نے غائب ہونے والی روشنائی سے پیغام لکھا ہو۔ میں کمرے میں جاکر اسے بلب سے حرارت پہنچا کر دیکھوں گا شاید پیغام نمودار ہو جائے۔“

مجھے مطمئن انداز میں مسکراتے دیکھ کر شاید کلرک کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی۔ تب میں نے اس سے پوچھا ”حلیہ کیا تھا شخص کا؟“

اس نے اٹک اٹک کر حلیہ بتانے کی کوشش کی اور کچھ دیر بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ نوزی کا حلیہ بیان کر رہا تھا۔ میرے جسم کے گویا جھرجھری لے کر بیدار ہو گئے۔ میں نے جلدی سے پوچھا ”لفافہ دینے کے بعد وہ شخص کہاں گیا؟“

”سر! یہ تو میں نہیں دیکھ سکا۔ میں مصروف ہو گیا تھا لیکن میرا خیال ہے وہ واپس ہی چلا گیا تھا۔“ کلرک کے لہجے میں ایک بار پھر گھبراہٹ جھلک آئی۔

”خیر کوئی بات نہیں۔ تم اپنا کام کرو۔“ میں نے اسے تسلی دی ”آئندہ اگر کوئی میرے بارے میں پوچھنے آئے اور تمہیں وہ ذرا بھی مشکوک لگے تو کم از کم نذیر چوہدری کو ضرور انٹرکام پر اطلاع کر دیا کرو۔“

نذیر چوہدری ہوٹل کا سکیورٹی انچارج تھا۔ کلرک نے اثبات میں سرہلایا اور میں لفٹ کی طرف چل دیا لیکن اب میں چوکنا تھا اور گردن گھمائے بغیر میری نظر چاروں طرف تھی۔ میں تمام شہر میں جس شخص کی تلاش میں نظر دوڑاتا آیا تھا وہ خود یہاں میری تلاش میں آیا تھا۔ وہ نہ صرف مجھے جانتا تھا بلکہ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ میں آج کل اپنے ہی ہوٹل میں مقیم تھا۔ اس کی دیدہ دلیری قابلِ داد..... یا پھر شاید قابلِ غور تھی۔ وہ نہ جانے کتنے تھانوں کو کن وارداتوں میں مطلوب تھا لیکن وہ نہ جانے شہر کے کون کون سے بارونق مقامات پر دندناتا پھر رہا تھا حتیٰ کہ ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی درشن دے گیا تھا۔ بلاشبہ ہم عجائبات کے دور میں داخل ہو چکے تھے۔

چھٹی منزل پر پہنچ کر میں نے لفٹ سے نکل کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ راہداری ویران نظر آرہی تھی۔ دبیز قالین پر بھی میں نہایت محتاط انداز میں قدم رکھتا ہوا اپنے کمرے کے دروازے تک پہنچا تاکہ ذرا سی بھی آہٹ پیدا نہ ہو۔ دروازے سے کان لگا کر میں نے چند سیکنڈ انتظار کیا کوئی آواز سُنائی نہ دی۔

پھر میں نے ناب کا معائنہ کیا کہ تالے سے چھیڑ چھاڑ تو نہیں کی گئی۔ تالا نہایت عمدہ قسم کا تھا اور اس پر چھیڑ چھاڑ کا کوئی نشان وغیرہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ پھر بھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا ”اساتذہ کرام“ کے لئے تالے پر کوئی نشان چھوڑے بغیر اسے کھول کر اندر داخل ہو جانا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

میں نے اپنی چابی سے تالا کھولا اور دروازے کو یکدم اندر دھکیل کر خود باہر ہی دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔ مجھے کچھ اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ شاید اندر کوئی ”مہربان“ میرے استقبال کے لئے موجود تھا لیکن کئی سیکنڈ تک انتظار کرنے کے بعد بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہ ہوا۔

آخر کار میں نے سر ذرا سا آگے کھسکا کر کمرے میں جھانکا۔ جو حصہ ڈرائنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا اس میں کوئی نہیں تھا۔ میں نے ذرا خطرہ مول لیتے ہوئے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ بلی کی طرح بے آواز قدموں سے پنجوں کے بل چلتے ہوئے میں نے ڈرائنگ روم عبور کیا۔

مجرموں کی دنیا میں نوزی یقیناً بہت بڑا بدمعاش اور دہشت گرد ہوگا لیکن میں اس طرح کے بدمعاشوں سے نمٹنے کے لئے ہوٹل کے سکیورٹی اسٹاف کی مدد لینا نہیں چاہتا تھا۔ میں اپنا یہ اعتماد اپنی نظر میں برقرار رکھنا چاہتا تھا کہ اس طرح کے بدمعاشوں سے نمٹنے کے لئے میں اکیلا ہی کافی تھا۔ اس وقت میں خالی ہاتھ تھا لیکن اس سے بھی میری خود اعتمادی میں کمی نہیں آئی تھی۔ درحقیقت مجھے اس کو خود اعتمادی کا نام نہیں دینا چاہئے تھا۔ میرا یہ اعتماد اصل میں کسی اور پر تھا جس نے میری تقدیر میں جو کچھ لکھ دیا تھا وہ اٹل تھا۔

میں نے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے درمیان موجود محرابی سے دروازے کی آڑ لے کر بیڈ روم میں جھانکا۔ میرے بیڈ کے قریب پڑے ہوئے ایک صوفے پر جمیل بیٹھا تھا۔ وہی جمیل جو تھری اسٹار ہوٹل میں فرحین کے شو کے اختتام پر مجھے بُلا کر فرحین کے پاس لے گیا تھا اور جو بقول فرحین اس کے بھروسے کا آدمی تھا۔

اس کے ہونٹوں پر عجیب سی مسکراہٹ منجمد تھی یا پھر شاید اس کے ہونٹ اس طرح کھنچ کر رہ گئے تھے۔ اس کی نظر دروازے پر ٹکی ہوئی تھی جیسے اسے کسی کا انتظار رہا ہو لیکن اس کی آنکھیں بے نور تھیں۔ اس کا گلا نہایت صفائی سے ایک کان سے دوسرے کان تک کٹا ہوا تھا۔ ایک اور ہنستا ہوا زخم میرا منتظر تھا۔ میں بوقتِ ضرورت بے حد سنگدل بھی ہو سکتا تھا لیکن اس لمحے میرے جسم میں خفیف سی جھرجھری آگئی۔ دروازہ میں نے نہایت آہستگی سے اپنے عقب میں بند کر دیا۔

کمرا خاصی ابتری کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل وغیرہ کی درازیں کُھلی پڑی تھیں۔ بیڈ کی میٹرس، تکیے اور صوفوں کے کشن وغیرہ کسی تیز دھار چیز سے کاٹ دیے گئے تھے اور ان کا فوم گویا کسی جنونی بندر نے اِدھر اُدھر بکھیر کر رکھ دیا تھا۔

میں نے متجسس ہو کر باتھ روم میں جھانکا۔ وہاں بھی کچھ ایسی ہی ابتری نظر آئی۔ کیبنٹ کھلی پڑی تھی۔ چیزیں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ تولیے بھی شیلف سے اٹھا کر نیچے پھینک دیے گئے تھے۔ حتیٰ کہ فلش کی ٹنکی بھی کھلی ہوئی تھی، یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کسی کو نہایت ہی شدت سے کسی چیز کی تلاش تھی جو یقیناً اسے یہاں نہیں ملی تھی۔

میں واپس بیڈ روم میں آکر چند لمحے جمیل کا جائزہ لیتا رہا۔ اس کا گلا اسی صوفے پر بیٹھے بیٹھے کاٹا گیا تھا اور اگر وہ تھوڑا بہت تڑپا تھا تو اس دوران اسے قابو میں رکھا گیا تھا کیونکہ خون صوفے پر زیادہ پھیلا ہوا نہیں تھا۔ زیادہ خون اس کے گریبان میں سے ہوتا ہوا تھوڑا بہت نیچے پہنچا تھا۔ معلوم نہیں جمیل نے کسی کو ڈبل کراس کیا تھا یا نہیں..... بہرحال میرے دل میں اس کے لئے تاسف کی لہر اُبھری تھی۔ ابھی میرے ذہن کے بعض گوشوں سے وہی افسردگی محو نہیں ہوئی تھی جو فرحین کی لاش دیکھ کر پیدا ہوئی تھی۔ مزید افسردگی میرے حواس کو کند کرسکتی تھی جبکہ میرا واسطہ یقیناً بڑے سفاک آدمی یا آدمیوں سے تھا۔ میرے لئے بالکل چاق و چوبند اور تمام ذہنی و جسمانی صلاحیتوں کے ساتھ مستعد رہنا ضروری تھا۔ ذرا حواس کے شل ہونے یا ذہن کے مضمحل ہونے کے نتیجے میں میرے گلے پر بھی ہنستا زخم نمودار ہو سکتا تھا۔

میں نے افسردگی کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے ٹیلی فون اُٹھایا اور سب سے پہلے رحیم گل سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے تھانے ہی میں مل گیا۔ اپنا نام بتا کر میں نے بلا تمہید پوچھا ”تم نے جمیل کو بُلوانے کے لئے اپنے آدمیوں کو تو نہیں بھیجا؟“

”ابھی کوئی آدمی فارغ ہی نہیں ہے لیکن گھنٹے آدھ گھنٹے تک میرا بھیجنے کا ارادہ تھا۔“ رحیم گل نے جواب دیا پھر پوچھا ”کیوں... کیا بات ہے؟“

”اب یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ میرے ہوٹل میں..... میرے کمرے میں موجود ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”بہت خوب... یہ تو بہت اچھا ہوا۔“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولا ”مجھے کسی کو بھیجنے اور اسے تلاش کرانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اسے وہیں روکے رکھیے گا۔ مجھے جلد ہی کچھ فرصت میسر آنے والی ہے۔ میں سیدھا آپ کی طرف آؤں گا۔ وہیں اس سے کچھ سوال جواب کرلوں گا۔ ضروری ہوا تو اسے تھانے لے آؤں گا۔ ورنہ وہیں سے وہیں اس کی جان چھوڑ دوں گا۔ میرے آنے

تک اسے کہیں جانے نہیں دیجئے گا۔ اب یہ آپ کی ذمے داری ہے۔"

میں نے گردن گھما کر جمیل کی طرف دیکھا اور کہا "مجھے یقین ہے کہ وہ بھاگنے یا کہیں جانے کی کوشش ہرگز نہیں کرے گا اگر وہ اپنی جگہ سے ذرا بھی ہلا تو اس کی گردن پیچھے کو لٹک جائے گی۔"

رحیم گل ایک لمحے کے لئے خاموش رہا پھر دھیمے لہجے میں بولا "وہ مرچکا ہے؟"

"مکمل طور پر۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ مائی گاڈ!" وہ گہری سانس لے کر رہ گیا "میں آرہا ہوں۔"

"تم کیا آکر اسے زندہ کرو گے؟" میں نے بے اختیار کہا۔

"یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔ افضل صاحب!" وہ گویا برا مناتے ہوئے بولا "یہ میرا کیس ہے اور مجھے اس کے سلسلے میں ہر موقعے پر پہنچنا پڑے گا۔ اس علاقے کا ایس ایچ او بھی میرے ساتھ ہوگا جس میں آپ کا ہوٹل واقع ہے۔"

"خدا کے لئے زیادہ بھیڑ بھاڑ لے کر مت آنا۔" میں نے جلدی سے کہا "آج کل ویسے ہی میرے ستارے گردش میں ہیں۔ اب مشکوک قسم کے لوگوں نے میرے صاف ستھرے ہوٹل میں آکر بھی مرنا شروع کردیا ہے۔ کہیں اس کا بزنس بھی چوپٹ نہ ہوجائے۔ اس سے پہلے یہاں اس قسم کا کوئی واقعہ رونما نہیں ہوا جس سے اس کی شہرت ذرا بھی داغدار ہوتی۔"

"میں کوشش کروں گا کہ اب بھی آپ کے پیارے ہوٹل کی شہرت پر حرف نہ آئے۔ میں حتی الامکان رازدارانہ انداز میں وہاں پہنچنے اور تمام کارروائیاں رازدارانہ انداز میں ہی انجام دینے کی کوشش کروں گا لیکن فی الحال میرے اور دوسرے ایس ایچ او کے لئے سادہ لباسوں میں پہنچنا ممکن نہیں ہوگا۔" وہ بولا۔

"چلو خیر تم جتنی احتیاط کرسکو گے میرے لئے اتنی ہی غنیمت ہوگی اور میں اس کے لئے تمہارا شکر گزار ہوں گا۔" میں نے حقیقی ممنونیت سے کہا۔

"یہ آپ کی کسر نفسی ہے افضل صاحب!" وہ شکر گزاری سے بولا "کہ آپ ہم جیسے چھوٹے افسروں سے اتنے انکسار سے پیش آنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ورنہ میرے اندازے کے مطابق جہاں تک آپ کی جڑیں پہنچی ہوئی ہیں وہاں تک رسائی رکھنے والے تو ہم جیسے افسروں کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔"

"دیانتدار افسروں کی میرے دل میں بڑی قدر ہے ڈیئر رحیم گل! وہ چھوٹے بھی ہوں تو مجھے بہت بڑے لگتے ہیں۔ آج کے دور میں اگر کوئی دیانتداری اور اونچے اصولوں پر قائم ہے تو وہ بلاشبہ جہاد کررہا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اسے کس طرح خراجِ تحسین پیش کروں۔" میں نے خلوصِ دل سے کہا۔

"بس بس افضل صاحب! مجھے زیادہ بانس پر نہ چڑھائیں۔ میں

تو صرف فرض ادا کررہا ہوں۔"

"یہی تو ایک کام ہے جو یہاں بہت کم لوگ کررہے ہیں۔" میں نے آہ بھر کر کہا "بیشتر لوگ یہاں صرف فرض ادا نہیں کررہے۔۔۔ باقی سب کچھ کررہے ہیں۔"

اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔

○☆○

معاملہ میری توقع سے کہیں زیادہ خاموشی سے نمٹ گیا لیکن یہ صرف رحیم گل کے تعاون کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ میرے ساتھ اس کا رویہ اب کافی حد تک دوستانہ تھا اور اس کی بڑی وجہ شاید صرف یہ تھی کہ اب اسے یقین آگیا تھا کہ میں کوئی غلط آدمی نہیں تھا۔

اسی رات میں ایک دوسرے سنگل بیڈ کمرے میں منتقل ہوگیا تھا۔ جمیل کی موت کے سلسلے میں کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ کمرے سے کوئی سراغ نہیں ملا تھا۔ بس یہ اندازہ ہوتا تھا کہ زرمین اور جمیل کا قاتل ایک ہی تھا۔ طریقۂ واردات بالکل یکساں اور نہایت ماہرانہ تھا۔

رحیم گل اپنے حساب سے تفتیش میں مصروف تھا لیکن میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ جب تک کوئی نئی بات سامنے نہ آئے، میں واقعی اپنے بزنس کی طرف تھوڑی سی توجہ دے لوں۔ اسی لئے دوسرے روز میں نے اپنے کراچی آفس کا بھی ایک چکر لگایا اور کئی گھنٹے وہاں گزارے۔ بہت سے معاملات کو دیکھا۔ بہت سے مسائل نمٹائے۔ اس کے بعد میں نے ہوٹل والے آفس میں ڈیرا ڈالا۔ اسی دوران سیٹھ رمضان بھی ملاقات کے لئے آپہنچا۔ اسے میں فون پر تمام حالات سے آگاہ کرچکا تھا اور اس نے مجھے خوب جھاڑ پلائی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ مجھ پر مصیبتیں آتی نہیں تھیں بلکہ میں خود دوڑ دوڑ کر مصیبتوں کا پیچھا کرتا تھا اور ہاتھ باندھ کر ان کی منت کرتا تھا کہ وہ میرے گلے پڑجائیں۔ میں نے اس کے خیال کی تردید نہیں کی تھی ورنہ وہ مجھے اور ڈانٹتا۔

اس نے مجھے آفس میں فائلوں اور کاغذات کے انبار کے عقب میں بیٹھے دیکھا تو اس کی باچھیں کھل گئیں۔ خوشی سے نہال ہوتے ہوئے بولا "بخدا ایک مدت کے بعد بزنس مین کے روپ میں دکھائی دیئے ہو تو روح کو تازگی ملی ہے ورنہ تم نے تو بالکل ہی لفنگوں تلنگوں والی زندگی اپنالی تھی۔ یہاں خون خرابا۔۔۔ وہاں مار دھاڑ۔۔۔ وہاں اغوا۔۔۔ یہاں دھماکے۔۔۔ اب میں ایک بار پھر تمہیں نصیحت۔۔۔ بلکہ وصیت کرنے کی کوشش کررہا ہوں کہ تم افضل چوہدری ہی رہو۔ ریمبو بننے کی کوشش مت کرو کیا سمجھے؟"

میں اس سے کہنا چاہتا تھا کہ مجھے ریمبو بننے کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا۔ میں کب بنتا تھا۔ حالات بنادیتے تھے لیکن مجھے معلوم تھا کہ سیٹھ رمضان میرے اس موقف کو تسلیم نہیں کرے گا اس لئے میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔

اس نے یہ انتظار نہیں کیا کہ میں اسے بیٹھنے کا اشارہ کروں۔ وہ ایک صوفے پر نیم دراز ہوگیا۔ پھر شاید اسے خیال آیا کہ ابھی بے تکلفی میں کچھ کمی تھی۔ اس نے جوتے، موزے اُتار کر ایک طرف اُچھالے اور پاؤں بھی صوفے پر رکھ لئے۔ وہ آج تھری پیس سوٹ میں تھا۔ کالر پر گلاب بھی لگایا ہوا تھا مگر شیو بڑھا ہوا تھا اور بال بکھرے ہوئے تھے۔

یہ سیٹھ رمضان کا اسٹائل تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آدمی کو پرفیکٹ نہیں نظر آنا چاہئے، کچھ نہ کچھ کمی ضرور چھوڑنی چاہئے۔ اگر اس کا شیو بنا ہوتا، بال سلیقے سے سنورے ہوتے، جسم پر اسی طرح عمدہ سوٹ ہوتا تو عین ممکن تھا وہ پیروں میں چپل پہن کر چلا آتا۔ اس کے ساتھ دو مسلح گارڈ بھی تھے جو لابی میں ہی دروازے سے خاصے فاصلے پر رُک گئے تھے۔

جوتے اُتارنے کے بعد سیٹھ رمضان گویا سکون کی سانس لے کر میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم نے اپنے گلے کی حفاظت کا بھی کوئی بندوبست کیا ہوا ہے یا نہیں؟"

"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔

"بھئی تمہارے جاننے والوں کے گلے اتنی تیزی سے کٹ رہے ہیں، پہلے اس حسینہ کا گلا کٹا جس کا شو دیکھنے کی ہمیں حسرت ہی رہ گئی۔ پھر ایک اور آدمی کا گلا کٹ گیا جو بے چارہ غلطی سے صرف ایک مرتبہ تم سے ملا تھا۔ لگتا ہے اب تو تم سے ملتے وقت اپنے گلے کی فکر کرنا پڑے گی۔ میں تو اسی لئے گارڈ ساتھ لایا ہوں۔ میں تو گلے پر لوہے کا خول بھی پہن کر آنے لگا تھا۔ پھر میں نے سوچا گردن اِدھر اُدھر گھما کر خوب صورت خواتین کو دیکھنے میں دقت ہوگی۔ اس لئے تھوڑا سا رسک لے لیا۔ بہرحال۔۔۔ انسان کو اپنے گلے کی حفاظت کرنی چاہئے لوگ ایسے آدمی کو دوست بنانا پسند نہیں کرتے جس کا گلا کٹا ہوا ہو۔ کیا خیال ہے؟"

"آج اتنا چہک کیوں رہے ہو؟" میں نے بدستور اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"ابھی بتاتا ہوں۔ پہلے کچھ کھانے پینے کو منگاؤ۔" وہ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولا "قسم سے تمہارے ہوٹل میں مجھے بالکل اپنے گھر جیسا آرام محسوس ہوتا ہے، کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ خواہ مخواہ اتنے بڑے بنگلے میں ڈھائی فیملی ممبرز اور پندرہ نوکروں کے ساتھ پڑا ہوا ہوں کیوں نہ اِدھر ہی آجاؤں۔"

"تو آجاؤ۔ کس نے منع کیا ہے؟" میں نے کہا۔

"لیکن یار جب تم یہاں نہیں ہوتے ہو تو پھر میرا یہاں بالکل دل نہیں لگتا۔" وہ سر کھجاتے ہوئے بولا۔

میں نے فون پر اس کے لئے کھانے پینے کا کچھ بندوبست کیا اور ریسیور رکھتے ہوئے کہا "ویسے یہ ہوٹل اب بھی تمہارا ہی ہے۔ کبھی تمہارا اس میں تقریباً چالیس فیصد حصہ تھا۔ تم نے خود ہی اپنا

پیسہ واپس لیا لیکن میری نظر میں تم اب بھی اس کے مالک ہو اور وہ بھی چالیس فیصد کے نہیں بلکہ پورے پورے مالک ہو۔ بولو تو ابھی یہ کرسی چھوڑ کر اُٹھ جاؤں؟"

"نہیں نہیں خدا کے لئے کرسی چھوڑ کر مت اُٹھنا۔" اس نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے "کرسی بڑی خراب چیز ہے۔ میں اس کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہتا۔ اسی لئے میں زیادہ تر صوفے پر ہی بیٹھنا پسند کرتا ہوں۔ میں تو اپنے آفس میں بھی زیادہ تر کام صوفے پر بیٹھ کر۔۔ بلکہ یوں کہو کہ صوفے پر لیٹ کر انجام دیتا ہوں۔"

"اس کی اصل وجہ مجھے معلوم ہے۔" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں نے تمہاری سیکریٹری کو دیکھا ہوا ہے تم نے خوب چھانٹ کر رکھی ہے تمہارے مطلب کی چیز ہے۔"

"اسے کہتے ہیں۔ گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا لیکن اس نے مجھے پٹڑی بدلنے سے باز رکھا "تمہاری جذباتی پیشکش کا شکریہ لیکن مجھے ہوٹل کا بزنس کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔ اسی لئے میں نے اپنا پیسہ نکال لیا تھا۔"

"مجھے یاد پڑتا ہے کہ وہی پیسہ تم نے یہاں سے بہت دور کسی نئے صنعتی علاقے میں کسی انڈسٹری میں لگایا تھا۔ وہ انڈسٹری کیسی جا رہی ہے؟ کیا اس میں ہوٹل سے زیادہ منافع ہے؟" میں نے پوچھا۔

"بہت زیادہ۔" وہ بڑے مسرور لہجے میں بولا۔

"کیا بنا رہے ہو؟"

"انگلینڈ کی ایک واشنگ مشین بنا رہا ہوں۔ وہی نام۔۔ وہی سب کچھ اور زوروں سے پبلسٹی کرتا ہوں۔ انگلینڈ ہی کی کہہ کر بیچ رہا ہوں۔ خوب بکتی ہے۔ ہم کو تو اس طرح کے تیز دھندوں میں مزہ آتا ہے۔ ہوٹل کا دھندا تو بہت ٹھنڈا ہے۔"

"زندگی میں کبھی کوئی ڈھنگ کا کام بھی کرلیا کرو۔ اپنا کوئی بزنس تو ایمانداری سے چلالو۔" میں نے کہا۔

"پاکستان میں بزنس اور ایمانداری ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے میرے چاند!" وہ ملائمت سے بولا۔

"بکواس مت کرو۔" میں نے اسے ڈانٹ پلائی۔ اس دوران ایک ویٹر ٹرے لے کر آگیا۔ میں نے سیٹھ رمضان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اس حرام خور کے سامنے رکھ دو۔"

ویٹر چلا گیا تو سیٹھ رمضان مظلومانہ سے لہجے میں بولا "یار۔۔۔ کم سے کم ویٹروں کے سامنے تو بے عزتی نہ کرو۔"

"تو کیا وزیروں کے سامنے کیا کروں؟" میں نے پوچھا۔

"ابے تو کیا بے عزتی کرنا ضروری ہے؟" وہ جھلا کر بولا "دوست' دوستوں کی عزت بڑھانے کے لئے ہوتے ہیں۔ بے عزتی کرنے کے لئے نہیں۔"

"تم عزت بڑھانے والا کوئی کام بھی تو کرو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "مجھ جیسے معزز آدمی سے دوستی رکھنی ہے تو تھوڑا سا ذرا معزز بننے کی کوشش کرو۔"

"کیا کہنے تمہاری عزت داری کے!" وہ سینڈوچ کے ایک نوالے کو کافی کے گھونٹ کے ساتھ حلق سے اُتارنے کے بعد بولا "تمہارے معزز ہونے کا ثبوت تو میں اپنی جیب میں لے کر پھر رہا ہوں۔" اس نے اپنے کوٹ کی بڑی سی جیب کو تھپتھپایا "تم پوچھ رہے تھے نا کہ آج میں اتنا چہک کیوں رہا ہوں۔ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ تمہاری عزت داری کا جو ثبوت میں جیب میں لئے لئے پھر رہا ہوں' اس کے بارے میں سوچ سوچ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ کسی نے تمہاری خوب ہی خبر لی ہے۔"

"کیا کہنا چاہ رہے ہو؟ کیا چھپا لائے ہو اپنی اس تھیلا نما جیب میں؟" میں نے ایک بار پھر سخت نگاہوں سے اسے گھورا۔

"لگتا ہے تم نے نہیں پڑھا ہے ورنہ اتنے مطمئن بیٹھے نظر نہ آتے۔ تھوڑے بہت بال ضرور نوچ رہے ہوتے۔ ورنہ کم از کم سانس ہی تیز تیز چل رہی ہوتی۔" وہ گویا کسی تصور سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"تم کچھ زیادہ ہی سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہو۔ اس کوشش میں کہیں مر مرا نہ جانا۔ دل تمہارا ویسے ہی کمزور ہے۔" میں نے کہا "جیب میں جو کچھ ہے' خاموشی سے نکال دو۔ ورنہ میں آفس کے ڈسپلن اور اپنی تمام تر سنجیدگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تمہاری اس بے ہنگم گردن پر کراٹے کا ایک آدھ ہاتھ رسید کردوں گا۔ تم جیسے آدمی کو اس جہانِ فانی سے کوچ کرانے کے لئے ایک آدھ ہاتھ ہی کافی ہوگا۔"

"ہاتھا پائی کی نہیں ہو رہی ہے بھئی۔" وہ جلدی سے ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے جیب سے ایک تراشیدہ اخبار نکال کر میری میز پر پھینک دیا اور ایک دوسری پلیٹ سے آسٹریلین سینڈوچ اٹھاتے ہوئے گنگنایا "ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا۔۔۔"

میں نے اخبار کی تہیں کھولیں۔ وہ انگریزی کے روزنامہ "مون" کا رنگین ایڈیشن تھا۔ مجھے فوراً مشتاق مدثر یاد آیا۔ جو اس اخبار کے شو بزنس اور کلچرل رپورٹر کی حیثیت سے فرحین کے اپارٹمنٹ پر ملا تھا۔ اخبار کا پہلا ہی رنگین صفحہ فرحین کی خوب صورت تصویروں سے سجا ہوا تھا۔ ان کے ساتھ ایک "چل رپورٹ" چھپی ہوئی تھی۔ رپورٹ "مسٹر ایم ایم" کی تھی جو ظاہر ہے مشتاق مدثر کے سوا کوئی نہیں تھا۔

میں نے آہستگی اور اطمینان سے رپورٹ پڑھنا شروع کی۔ اس کی ابتدائی سطروں میں ہی واضح کردیا گیا تھا کہ فرحین کی وہ خوب صورت تصویریں اس کے ایک خصوصی انٹرویو کے لئے کھینچی گئی تھیں جو لیا نہیں جاسکا تھا کیونکہ حسن اور زندگی سے بھرپور وہ لڑکی جو دو دن پہلے تک ذوقِ تماشا رکھنے والوں کے دلوں کو گرما رہی تھی

اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ اسے سفاکی سے قتل کردیا گیا تھا۔

رپورٹ کا انداز اخباری سے زیادہ افسانوی تھا۔ اس میں گویا بڑی کوشش سے لفاظی کی گئی تھی اور کہیں کہیں اس کا انداز ایک ذاتی غم ناک تاثر کا سا ہوگیا تھا۔ مسٹر ایم ایم نے نہایت تفصیل سے بتایا تھا کہ جب وہ حسبِ وعدہ فرحین کے دیئے ہوئے وقت پر اس کے اپارٹمنٹ میں پہنچے تو انہیں وہاں فرحین کی لاش کس حالت میں ملی' وہاں کون کون موجود تھا' پولیس کس طرح تفتیش کر رہی تھی۔

حالانکہ مجھے یاد تھا کہ جب مشتاق مدثر وہاں پہنچا تھا تو فرحین کی لاش ایمبولینس میں رکھ کر روانہ کی جاچکی تھی۔ بہرحال اس نے چونکہ آگے ذکر کردیا تھا کہ وہ سرکاری اسپتال کے مُردہ خانے بھی گیا تھا' اس لئے فرض کیا جاسکتا تھا کہ لاش کی حالت درحقیقت اس نے وہاں دیکھی ہوگی۔

بہرحال اس رپورٹ میں میرے لئے سب سے زیادہ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اپارٹمنٹ میں میری موجودگی کو بہت زیادہ اہمیت دی گئی تھی اور یہ بھی واضح کیا گیا تھا کہ میرے ساتھ پولیس کا رویّہ نہایت مؤدبانہ تھا۔ تفتیشی افسر مجھے تفتیش میں شامل کرنے کے بجائے مجھ سے مشورے کر رہا تھا۔

اس کے ساتھ ہی رپورٹ میں ڈیڑھ دو سال پُرانے ایک اور واقعے کا حوالہ دیا گیا تھا۔ جب اسی طرح ایک خوب صورت اور نوجوان ماڈل لڑکی کو سفاکی سے قتل کردیا گیا تھا۔ اس کا قاتل اتفاق سے پکڑا گیا تھا اور وہ شہر کا ایک بڑا سیٹھ تھا۔ درحقیقت مشتاق مدثر نے رپورٹ میں یہ اشارہ دینے کی پوری پوری کوشش کی تھی کہ فرحین کا قاتل میں ہی ہوسکتا تھا لیکن پولیس میرے اثر و رسوخ یا کسی اور وجہ سے نہ صرف مجھے نظرانداز کر رہی تھی بلکہ میری ہی مدد سے تحقیقات کا رُخ کسی اور طرف موڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ مشتاق نے "بچہ" بغل میں ڈھنڈورا شہر میں" کے مفہوم والے دو ایک محاورے بھی استعمال کئے تھے لیکن یہ سارا کام اس نے بچ بچا کر کیا تھا یعنی کچھ اس طرح کی زبان و بیان استعمال کی تھی کہ اس کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کی جاسکتی تھی اور اگر کی بھی جاتی تو اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا تھا۔ ایک خاص مزاج رکھنے والے گھاگ اور شاطر قسم کے صحافیوں کا یہی طریقۂ "واردات" ہوتا تھا۔

میں نے پوری توجہ اور انہماک سے رپورٹ پڑھنے کے بعد اخبار میز پر ایک طرف رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے سیٹھ رمضان کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا اکھڑ کر بولا "تم مسکرا رہے ہو؟"

"تمہارے خیال میں کیا مجھے دھاڑیں مار مار کر رونا چاہئے؟" میں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

"یہ آدمی تمہیں اس معاملے میں پھانسنے کی پوری پوری کوشش کر رہا ہے۔ تم اس سلسلے میں کچھ نہیں کروگے؟" اس نے گویا مجھے خبردار کرتے ہوئے پوچھا۔

"مجھے کیا کرنا چاہئے؟" میں نے اُلٹا اس سے سوال کیا۔

"میرا اندازہ ہے کہ ابھی یہ شخص اس سلسلے کو اور بھی آگے بڑھانے کی کوشش کرے گا۔ تمہیں سیدھے یا ٹیڑھے' کسی بھی طریقے سے اسے روکنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ یہ مجھے کوئی بلیک میلر قسم کا صحافی معلوم ہوتا ہے اُس قسم کے لوگ کبھی کبھی ہم جیسے کاروباری لوگوں کے لئے بڑا مسئلہ کھڑا کردیتے ہیں۔"

"کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہوگا۔ تم اطمینان رکھو۔ صحیح ہمیشہ صحیح رہتا ہے اور غلط ہمیشہ غلط۔" میں نے کہا "میں کبھی ایسے کسی جرم کے سلسلے میں پریشان نہیں ہوا جو میں نے نہیں کیا تھا۔"

"میں نے تو اکثر بے گناہوں کو بھی بڑی پریشانیاں اُٹھاتے دیکھا ہے۔" سیٹھ رمضان پہلو بدلتے ہوئے بولا۔

"وہ پریشانیاں عارضی ہوتی ہیں یا پھر شاید وہ کسی اور غلط عمل کی سزا ہوتی ہے جو انسان ماضی میں کبھی دانستہ یا نادانستہ کرچکا ہوتا ہے اور بھول چکا ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔

"اچھا بھائی! جیسے تمہاری مرضی۔ تم تو بہت ہی ٹیڑھی چیز ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر گویا مجھے میرے حال پر چھوڑتے ہوئے بولا۔

"زمانے میں یہی تو اُلٹ پھیر ہوگیا ہے میرے ادھیڑ عمر چاند! سیدھے لوگ دوسروں کو ٹیڑھے لگتے ہیں اور ٹیڑھے لوگ آسانی سے سمجھ میں آجاتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"میں تو اس لئے تم سے اس موضوع پر تبادلۂ خیال کرنے دوڑا دوڑا آیا تھا کہ اگر تم اس سلسلے میں کچھ نہیں کرنا چاہتے یا تمہارے پاس ان پھڈوں میں اُلجھنے کا وقت نہیں ہے تو مجھے حکم کرو۔ میں کچھ بندوبست کردیتا ہوں۔ مجھے سیدھے 'ٹیڑھے' ترچھے اور دوسرے کئی طریقوں سے اس قسم کے مسائل حل کرنے کا کافی تجربہ ہے۔" سیٹھ رمضان نے پیشکش کی۔

"نہیں نہیں۔ خدا کے لئے تم اس سلسلے میں کچھ مت کرنا۔" میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے "کہیں تم ایک مسئلہ حل کرتے کرتے میرے لئے کوئی دوسرا مسئلہ کھڑا کردو۔ جبکہ میری نظر میں تو یہ کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے جسے تم مسئلہ سمجھ رہے ہو۔ تم اس معاملے کو جوں کا توں رہنے دو۔ یہ خود ہی اپنے کسی منطقی انجام کو پہنچ جائے گا۔"

"ٹھیک ہے بابا۔ ٹھیک ہے۔" وہ ایک اور سینڈوچ کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بے پروائی سے بولا "تمہارے ہاں سینڈوچ اب کچھ ڈھنگ کے بننے لگے ہیں ورنہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بس ڈرامے بازی ہوتی ہے۔ موٹے موٹے انگریزی۔۔۔ فرانسیسی اور اطالوی نام۔۔۔ اندر کچھ نہیں۔ ٹھنڈی بدمزہ' باسی چیزیں لیکن تمہیں اسٹاف اچھا ملا ہوا ہے۔ ہوٹل کو اچھے طریقے سے چلا رہا ہے۔ تم واقعی ہو بڑے لکی آدمی۔"

"ہاں اس میں کیا شک ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔
مزید کچھ کھانے اور تھوڑی دیر گپ شپ کرنے کے بعد سیٹھ رمضان رخصت ہوگیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ایک بار پھر اخبار اُٹھالیا اور بغور فرحین کی تصویریں اور رپورٹ دیکھنے لگا۔ مشتاق مدثر نے مجھے گھیرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ میری تو اس سے وہ پہلی ملاقات تھی۔ اسے میری اور فرحین کی شناسائی یا عدم شناسائی کے بارے میں غالباً کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ وہ کیوں ایک نادیدہ پھندا تلاش کرکے اسے میری گردن میں فٹ کرنے کا خواہاں تھا؟ یہ خواہش اس کی تحریر سے جھلک رہی تھی۔

میں چند لمحے سوچتا رہا۔ آخر میں نے اخبار دوبارہ میز پر ایک طرف رکھ دیا اور ایک بار پھر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ میں شاید اپنے کام میں کچھ زیادہ ہی منہمک ہوگیا تھا اس لئے مجھے باہر کسی گڑبڑ کا احساس نہیں ہوسکا۔ میں اس وقت چونکا جب دروازہ اچانک کھٹاک سے کھلا۔ میرا ہاتھ فوراً کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف بڑھا جس میں اس وقت ایک مشین پسٹل موجود تھا لیکن میں نے اسے جیب سے نہیں نکالا۔ صرف میرا ہاتھ اس کے دستے پر جم کر رہ گیا۔

میں نے پسٹل نکالنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ اندر آنے والی محض ایک حواس باختہ لڑکی تھی اور اس کے پیچھے آنے والا ہوٹل ہی کا ایک سیکورٹی گارڈ تھا۔ لڑکی سیدھی میری میز کے قریب آرکی۔ سیکورٹی گارڈ نے اس کا بازو پکڑلیا اور میری طرف دیکھ کر معذرت خواہانہ انداز میں بولا "سر! میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی لیکن اس نے صرف آپ کے بارے میں پوچھا.... اور پھر اپنے لڑکی ہونے کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے مجھے دھکا دے کر سیدھی یہاں گھس آئی۔"

لڑکی بظاہر غیر مسلح ہی تھی اس لئے میں نے ہاتھ جیب سے نکال لیا اور گارڈ کو بھی اشارہ کیا "چھوڑ دو اسے۔"

وہ متوسط طبقے کی ایک معقول لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ خوش شکل تھی۔ بال تراشیدہ تھے تاہم اس وقت ذرا منتشر تھے۔ وہ جدید تراش خراش کی شلوار قمیص میں تھی۔ نیوی بلیو کلر کی ایک عمدہ جرسی بھی پہنے ہوئے تھی جس کی زپ کھلی ہوئی تھی گلے میں مختصر سا دوپٹا جھول رہا تھا۔ خدوخال دلکش تھے' عمر پچیس اور تیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرہ تمتما رہا تھا جیسے اس نے کچھ فاصلہ دوڑتے ہوئے طے کیا ہو۔

وہ سخت خوف زدہ معلوم ہوتی تھی۔ میز کے قریب رُک کر اس نے گہری سانس لے کر اپنی مرمریں اور مخروطی انگلیاں بالوں میں پھیریں تو میں نے دیکھا اس کے ہاتھ دھیرے دھیرے کانپ رہے تھے۔ تاہم وہ خود پر قابو پانے کی پوری پوری کوشش کررہی تھی۔ تھوک نگل کر وہ معذرت خواہانہ لہجے میں بولی "میں معافی چاہتی ہوں افضل صاحب!"

"کس بات کی؟" میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس طرح آپ کے آفس میں گھسے چلے آنے کی۔" لڑ مرتعش لہجے میں بولی "لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں آپ کو فون کرکے ملاقات کا وقت طے کرکے آتی۔" اس نے خوف زدہ سی نظروں سے شیشے کے دروازے سے باہر دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی سانس اب بھی تیز تیز چل رہی تھی۔

"کیا تمہارے پیچھے کوئی لگا ہوا ہے؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"بظاہر تو کوئی میرے پیچھے نہیں لگا ہوا ہے۔" وہ ذرا سنبھل کر بولی "لیکن مجھے محسوس یہی ہورہا ہے.... جیسے کوئی میرے تعاقب میں ہے۔ شاید موت میرے تعاقب میں ہے۔"

"موت بھی اکثر کسی نہ کسی روپ میں آتی ہے۔ تم نے اپنے تعاقب میں کسی کو نہیں دیکھا؟" میں نے ایک بار پھر تصدیق چاہی۔

اس نے نفی میں سرہلاتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری اور پھنسی پھنسی آواز میں بولی "ایک گلاس پانی مل جائے گا؟"

"پہلے تم بیٹھ جاؤ۔" میں نے ایک آرام دہ کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ وہ اس گدیلی کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔ شاید میں نے بروقت ہی اسے بیٹھنے کے لئے کہا تھا۔ اس کی ٹانگوں میں شاید مزید اپنا وزن سہارنے کی طاقت نہیں رہی تھی۔

میں نے گارڈ کو اشارہ کیا۔ اس نے کونے میں شیلف میں رکھے ہوئے چھوٹے سے فریج سے ٹھنڈے پانی کی بوتل نکال کر ایک گلاس اسے دیا۔ میں نے گارڈ سے کہا "اب تم جاسکتے ہو لیکن ذرا ہوشیار رہنا اور میرے آفس کے آس پاس ہی رہنا۔ کسی اور کو اس طرح اندر مت آنے دینا۔ خواہ وہ کوئی خاتون ہی ہو۔"

اس نے اثبات میں سرہلایا اور باہر چلا گیا۔ میں دوبارہ لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تو وہ گلاس خالی کرچکی تھی اور بوتل سے اپنے لئے مزید پانی انڈیل رہی تھی۔ وہ مزید پانی پی چکی اور چند گہری گہری سانسیں لے کر کافی حد تک پُرسکون نظر آنے لگی تو میں نے کہا "تم نے مجھے نام سے مخاطب کیا تھا لیکن مجھے یاد نہیں آرہا کہ میں پہلے کبھی تم سے ملا ہوں؟"

"ملے ہوتے تو شاید یاد آجاتا۔ آپ نے تو شاید اس سے پہلے مجھے دیکھا بھی نہیں۔ البتہ میں نے آپ کو دو دن پہلے ذرا فاصلے سے دیکھا تھا اور میں جمیل کی وجہ سے آپ سے غائبانہ طور پر واقف ہوئی تھی۔" اس کی آواز میں ابھی تک معمولی سی لرزش تھی۔

"جمیل؟" میرے کان کھڑے ہوئے "کون جمیل؟"

"تھری اسٹار ہوٹل کا ہیڈ ویٹر۔ وہی جو مس ایکس کا شو ختم ہونے پر آپ کو اس کے کمرے میں لے گیا تھا اور جس کی لاش آپ کے اس ہوٹل کے کسی کمرے میں پائی گئی تھی۔" اس سے مزید نہ بولا گیا۔ اس کے لہجے میں سسکی سی پنہاں تھی۔ اس نے سر

جھکالیا۔ وہ شاید پہلے بھی روتی رہی تھی اور اب بھی رونا چاہتی تھی مگر کسی نہ کسی طرح اپنے آنسو ضبط کر رہی تھی۔ وہ ذرا ہی سنبھل پائی تھی کہ پھر رُلانے والا موضوع چھڑ گیا تھا۔

مجھے فی الحال اس پر حیرت بھی تھی کہ اسے جمیل کی موت کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا۔ جمیل کے قتل کی خبر ابھی کسی اخبار میں نہیں آئی تھی۔ فرحین کے قتل کی خبر البتہ کافی نمایاں انداز میں تقریباً تمام اخبارات میں آچکی تھی۔ لڑکی خوب صورت تھی شوبزنس سے اس کا تھوڑا بہت تعلق تھا۔ اخبارات نے اپنا اپنا صفحہ سجانے کے لئے بھی اس کی اچھی سی تصویر کے ساتھ اس کے قتل کی خبر چھاپی تھی لیکن سب کا مضمون کم و بیش وہی تھا جو پولیس کی طرف سے جاری کیا گیا تھا۔ کسی کو اپنے طور پر کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا اور نہ ہی کسی نے قیاس آرائی کی کوشش کی تھی، کسی اخبار میں اس سلسلے میں میرا نام نہیں آیا تھا۔ صرف مشتاق مدثر کو یہ "اعزاز" حاصل تھا کہ وہ موقع واردات پر پہنچا تھا اور اس نے مجھے ملوث کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ایک خاص زاویے سے اسٹوری بنائی تھی۔

"تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ جمیل مر چکا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"کچھ دیر پہلے ہی اس کی لاش پوسٹ مارٹم سے فارغ ہو کر گھر پہنچی ہے۔" وہ بھرائی ہوئی سی آواز میں بولی "مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ اسے اور مس ایکس کو ایک ہی انداز میں قتل کیا گیا ہے، ان دونوں کے بعد اب میری باری ہے۔ میں اس وقت جمیل ہی کے گھر پر... اس کے گھر والوں کے ساتھ تھی جب اس کی لاش گھر پہنچی۔ اس کے قتل کی تھوڑی بہت تفصیل معلوم ہوتے ہی میں وہاں سے نکل بھاگی۔ مجھے یقین ہو گیا کہ اب میری باری آنے والی ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ اس وقت بھی کوئی میرے تعاقب میں ہو۔"

"اگر تم ذرا ربط اور ترتیب سے بات کرو تو شاید ہم دونوں کے حق میں بہتر ثابت ہو۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا "مجھے ابھی تک یہی معلوم نہیں کہ تمہارا نام کیا ہے۔ تم کون ہو اور جمیل سے تمہارا کیا رشتہ تھا؟"

"ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں صحیح طرح بات نہیں کر پا رہی ہوں۔" اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسالیں اور ایک لمحے خاموش رہنے کے بعد تھوک نگل کر بولی "میرا نام امبر ہے۔ میں تھری اسٹار ہوٹل میں استقبالیہ کلرک ہوں، یوں سمجھ لیں کہ میں ایک طرح سے جمیل کی غیر رسمی منگیتر... اس کی رازدار... اور کسی حد تک اس کی شریکِ کار بھی تھی۔"

"شریکِ کار؟" میں نے دُہرایا "کیا تم ہیڈ ویٹر کے فرائض ادا کرنے میں اس کا ہاتھ بٹاتی تھیں؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ٹشو پیپر سے آنکھیں پونچھیں جن میں بظاہر کوئی آنسو نہیں تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ آنسو پلکوں کے پیچھے کہیں مقید تھے اور باہر نکلنے کے لئے کوئی بہانہ ڈھونڈ رہے تھے۔

وہ سر جھکاتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولی "شاید آپ کو معلوم ہو کہ ہم جیسے بیشتر مڈل کلاسیے... بلکہ لوئر مڈل کلاسیے... اپنے مالی مسائل حل کرنے کے لئے، اپنا معیارِ زندگی بہتر بنانے کے لئے اور بعض اوقات اپنی ادھوری خواہشوں کی تکمیل کے لئے اپنی نوکری یا کاروبار کے علاوہ بھی اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں مارتے رہتے ہیں، فاضل آمدنی کا کوئی ذریعہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔"

"ہاں مجھے معلوم ہے اور میں یہ دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ یہ ایک تعمیری جذبہ ہے محنت کرنے والے میری نظر میں قابلِ قدر لوگ ہوتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"درست ہے لیکن کبھی کبھی اس محنت کا رُخ ذرا غلط بھی ہو جاتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کو بعض اوقات اس کا صحیح اندازہ بھی نہیں ہو پاتا۔ بظاہر کام بے ضرر سے نظر آتے ہیں اور ہم یہ نہیں سمجھ پاتے کہ آگے چل کر بات بہت سنگین بھی ہو سکتی ہے۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ نیکی کی طرح بُرائی بھی ایک چھوٹے سے بیج سے پھوٹتی ہے... پھلتی پھولتی ہے لیکن ابتدا میں بہت معمولی اور حقیر نظر آتی ہے۔" میں نے ہمدردانہ لہجے میں کہا۔ میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ میرے اندازِ گفتگو سے اسے حوصلہ مل سکے اور وہ کھل کر گفتگو کر سکے۔

"ہاں شاید کچھ ایسی ہی بات ہے اور پھر ہم دونوں تو کچھ ایسے اچھے ماحول میں کام بھی نہیں کر رہے تھے۔ ہمارے ہوٹل کا مالک... یعنی قاسم بجلی بھی کچھ ایسا اچھا یا نیک آدمی نہیں تھا۔ وہاں آنے والوں میں سے بھی بیشتر کچھ ایسے معزز یا بے داغ کردار کے مالک نہیں ہوتے تھے۔ بے داغ کردار کے مالک تو اب خیر ویسے بھی ہماری سوسائٹی میں شاید آٹے میں نمک سے بھی کم پائے جاتے ہیں۔ بہرحال ہمارے ہوٹل میں تو مشکوک اور ہر وقت کسی نہ کسی چکر میں رہنے والے لوگوں کا کچھ زیادہ ہی جمگھٹا رہتا ہے۔"

"کیا تم لوگ بھی کچھ ایسے لوگوں کے لئے کام کرنے لگے تھے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہی سمجھ لیجئے لیکن ہمارے خیال میں ہمارا کام نہ تو زیادہ بے ایمانی اور بددیانتی کا تھا اور نہ ہی ہم اس میں خطرناک حد تک ملوث تھے۔ معاوضہ اچھا مل جاتا تھا۔ ہمارے حالات کچھ بہتر ہو رہے تھے۔ ہم جلد ہی شادی کرنے والے تھے۔" وہ ایک بار پھر سسکی لے کر خاموش ہو گئی۔

"مجھے اپنے کام کی نوعیت اور دوسری باتیں جس حد تک تفصیل سے بتا سکتی ہو بتاؤ تاکہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ اس کے بعد یہ بھی بتا دو کہ مجھ سے تم کیا چاہتی ہو۔"

"میں سب کچھ بتا دوں گی۔ جو کچھ بھی مجھے معلوم ہے، سب کچھ بتا دوں گی لیکن خدا کے لئے مجھے مرنے سے بچا لیجئے۔" کسی نہ کسی طرح وہ ایک بار پھر خوف زدہ نظر آنے لگی۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے کہ میرا انجام بھی مس ایکس اور جمیل جیسا ہو گا۔ جمیل مجھے بتا کر آپ سے ملنے کے لئے یہاں آیا تھا۔ وہ بھی آپ سے مدد طلب کرنا چاہتا تھا لیکن شاید اسے آپ سے ملنا نصیب ہی نہیں ہوا۔"

"ہاں۔ میں نے اسے مُردہ ہی پایا تھا۔" میں نے جواب دیا "اگر میں کچھ پہلے پہنچ جاتا تو شاید ایسا نہ ہوتا۔"

"لیکن میں تو اب آپ کے سامنے... آپ کی پناہ میں پہنچ گئی ہوں۔ مجھے اس طرح مت مرنے دیجئے گا۔" اس کے لہجے میں ہزاروں التجائیں تھیں۔

"میں اپنی یا کسی کی بھی زندگی اور موت کے بارے میں کسی سے کوئی وعدہ کرنا تو اچھا نہیں سمجھتا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے پاس بیٹھ کر تم موت کا خوف اپنے دل سے نکال دو اور اطمینان سے بات کرو۔"

"قاسم بجلی خواہ کیسا بھی آدمی تھا لیکن وہ بطور باس بہت اچھا تھا۔ اس کی زندگی میں ہمیں اپنی حفاظت کے سلسلے میں کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن اس کی اچانک موت سے سب کچھ درہم برہم ہو گیا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ ہم کس کام کے سلسلے میں کس سے رجوع کریں اور کچھ پتا نہیں چل رہا کہ کون اب قاسم بجلی کا وفادار رہ گیا ہے اور کون اندر ہی اندر غدار بن چکا ہے۔ میں اور جمیل آپ کو زیادہ اچھی طرح نہیں جانتے تھے لیکن ہم نے محسوس کیا تھا کہ مس ایکس نے آپ پر آنکھیں بند کر کے بھروسا کیا تھا، اس لئے ہم نے سوچا ہم بھی آپ سے مدد طلب کریں۔"

"مجھے افسوس ہے کہ مجھ سے مدد طلب کرنے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوا۔" میں نے حقیقتاً ندامت سے کہا "فرحین نے مجھ سے مدد طلب کی اور ماری گئی۔ اب تم نے بتایا ہے کہ جمیل بھی مجھ سے مدد طلب کرنے کے ارادے سے آیا تھا لیکن مجھ سے ملاقات سے پہلے ہی وہ بھی ایک دردناک انجام سے دوچار ہوا۔ اس کے باوجود تم میرے پاس آگئیں۔ میں تمہاری ہمت کی داد دیتا ہوں۔"

"مجھے یقین ہے اگر میں آپ کے پاس نہ آتی تب بھی انجام تو بُرا ہی ہونا تھا۔ میں نے سوچا ایک کوشش کر کے دیکھ ہی لوں۔ شاید جان بچ ہی جائے۔ انسان کو جان بڑی پیاری ہوتی ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"یہ تو درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا "بہرحال اصل قصہ بتاؤ۔"

اصل موضوع پر آتے ہوئے وہ ایک لمحے کے لئے پھر ہچکچاہٹ کا شکار ہو گئی۔ تاہم قدرے توقف کے بعد اس نے بتانا شروع کیا "قاسم بجلی کے بیسیوں قسم کے دھندے تھے۔ کچھ کا شاید آپ کو علم ہو، کچھ کے بارے میں آپ کو اندازہ ہو گا لیکن چند سال سے اس نے ایک ایسا دھندا شروع کیا تھا جس کے بارے میں یہاں شاید کبھی کسی نے سوچا بھی نہ ہو۔ آپ کو شاید معلوم ہی ہو گا کہ مغربی ممالک میں چوری، نقب زنی، ڈکیتی اور لوٹ مار کی شرح بہت زیادہ ہے۔"

میں اس کی بات میں دخل دیے بغیر نہ رہ سکا "اب تو ہم بھی کم از کم ان معاملات میں کافی "ترقی یافتہ" ہوتے جا رہے ہیں۔ اچھے کاموں میں نہ سہی لیکن ان کاموں میں ہم ان کے ہم پلہ ہونے کی پوری پوری کوشش کر رہے ہیں۔"

"جی ہاں" اس نے تسلیم کیا "بلکہ اس قسم کے کاموں میں تو ہمارے "فنکار" ان کے بھی کان کترنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"ہمارے ہاں ایک ترقی یہ ہوئی ہے کہ قاتل ڈاکو لٹیرے سب کسی نہ کسی پارٹی میں گھس گئے ہیں۔ یوں یہ "عظیم" ہستیاں ہمارے ہاں سیاسی قوت بن گئی ہیں۔ انہیں سیاست کی چھتری میسر آگئی ہے۔ یوں ان کی طاقت کئی گنا بڑھ گئی ہے اور یہ زیادہ محفوظ ہو گئی ہیں جبکہ دیگر ممالک میں اگر بدمعاش منظم بھی ہیں تو وہ اپنی الگ سنڈیکیٹس کی صورت میں ہیں۔ انہیں بہرحال مجرم ہی سمجھا جاتا ہے اور قانون ہمیشہ ان کے تعاقب میں رہتا ہے۔ کم از کم سیاسی پارٹیوں میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہوتی اور سیاست ان کی ڈھال نہیں بنتی۔ لیڈر چاہیں بھی تو انہیں تحفظ فراہم نہیں کر سکتے۔ اس طرح ان کا اپنا سیاسی کیریئر خطرے میں پڑ جاتا ہے۔ یہاں حساب اس کے بالکل اُلٹ ہے۔"

"جی ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔" اس نے سر ہلایا۔

"لیکن میں نے شاید تمہیں موضوع سے بھٹکا دیا۔" میں نے کہا۔

"جی نہیں۔ جو کچھ میں بتانے والی تھی، ان سب باتوں کا ایک طرح سے اس سے گہرا تعلق بنتا ہے۔" وہ جلدی سے بولی "میں یہ کہنے لگی تھی کہ وہاں چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چوری کی چیزیں کھپانے کے لئے بڑی مارکیٹ موجود ہے۔ زیرِ زمین دنیا کے لوگ ہی یہ دھندے کرتے ہیں۔ چھوٹی موٹی چیزیں تو پان شاپس PAWN SHOPS پر ہی کھپ جاتی ہیں جو بظاہر پُرانی چیزوں کی خرید و فروخت اور انہیں رہن رکھنے کا کاروبار کرتی ہیں لیکن ان میں سے بیشتر کا اصلی دھندا چوری کی چیزوں کا ہی ہوتا ہے۔ بعض ایسے ایسے دکاندار یا ایجنٹ بھی موجود ہوتے ہیں جو لاکھوں کا مال اِدھر سے اُدھر کر دیتے ہیں لیکن پھر بھی وہاں زیادہ مہنگی چیزوں کو چوری کرنے کے بعد بڑے پیمانے پر اِدھر اُدھر کھپانے میں زیادہ دشواریاں پیش آنے لگی تھیں۔ اس سلسلے میں انشورنس کمپنیوں کی طرف سے پولیس اور دیگر محکموں پر دباؤ بہت بڑھ رہا تھا کیونکہ انشورنس کمپنیوں کو ہیروں اور بیش قیمت زیورات کی چوریوں کے سلسلے میں خاص طور پر بہت نقصان اُٹھانا پڑ رہا تھا اور یہ نقصان دن بہ دن بڑھتا جا رہا تھا۔

"اب وہاں اس سلسلے میں بہت سے اقدامات کئے جارہے تھے۔ دوسرے ان چیزوں کے زیادہ خریدار ملنا بھی دن بہ دن مسئلہ بنتا جارہا تھا۔ چنانچہ سنڈیکیٹس نے اس کاروبار کو نئے سرے سے ترتیب دیا۔ نئے انتظامات کئے اور بیش قیمت جواہرات کی کھپت کے لئے نئی مارکیٹیں تلاش کرلیں۔ یہ مارکیٹیں کچھ ترقی پزیر ممالک ہیں۔ چوری کے یہ ہیرے اور دیگر جواہرات اگر اصل مالیت سے آدھی قیمت پر بھی بک جاتے ہیں تب بھی ان میں سنڈیکیٹس کو بہت منافع ہوتا ہے۔ ان کے اپنے ملکوں میں ڈیلر یا ایجنٹ قسم کے دکاندار جنہیں FENCE کہا جاتا ہے' ان چیزوں کی اتنی بھی قیمت نہیں دیتے تھے۔ دن بہ دن ان میں رسک بڑھتا جارہا تھا اور ان کی قیمت فروخت گھٹتی جارہی تھی لیکن سنڈیکیٹس نے نہایت عمدگی سے متبادل انتظامات کرلئے اور ان کا منافع بھی بڑھ گیا۔ انہوں نے چھوٹے موٹے چوروں اور کبھی کبھار اکّا دُکّا واردات کرنے والوں سے بھی مال لے کر اپنے پاس جمع کرنا اور اپنی ہول سیل یعنی تھوک کی تجارت میں شامل کرنا شروع کردیا۔

"افضل صاحب! آپ ایک بڑے بزنس مین ہونے کے باوجود شاید تصور نہ کرسکیں کہ یہ کتنی بڑی تجارت ہے۔ اس کا ٹرن اوور کروڑوں اور اربوں میں ہے۔ ہر سینڈیکیٹ نے جس ملک کو اپنی مارکیٹ بنایا اس میں ایک دو بڑے اسمگلرز کو پکڑلیا اور انہیں ایک طرح سے اپنا ہول سیل ایجنٹ بنالیا۔ اسمگلرز کو بھی یہ گویا ایک نیا شعبہ مل گیا۔ ان کے پاس دولت بھی تھی اور دوسرے وسائل بھی۔ وہ مسروقہ ہیروں کی ایک پوری لاٹ خرید لیتے ہیں۔ پھر ان کے کھیپیے..... جو عام طور پر خوب صورت اور زرا جان پہچان رکھنے والی لڑکیاں ہوتی ہیں اس بڑی لاٹ کو کئی چھوٹی چھوٹی کھیپوں میں تقسیم کرکے کسی ترقی پزیر ملک میں لے آتی ہیں جسے انہوں نے اپنا گڑھ بنانا ہوتا ہے یا وہ پہلے ہی سے ان کا گڑھ ہوتا ہے۔

"یہاں ان کے لئے کئی طرح کی مارکیٹ موجود ہوتی ہے۔ کئی بڑے جیولرز ہوتے ہیں جو زیادہ تعداد میں یہ ہیرے خرید لیتے ہیں۔ بعض شوقین دولت مند بھی ہوتے ہیں جو ایک آدھ یا دو چار خرید لیتے ہیں۔ ان دولت مندوں میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ عام بزنس مین بھی... بلیک مارکیٹیے بھی... نو دولتیے بھی اور شو بزنس کے لوگ بھی۔ ان سب لوگوں کو یہ جواہرات اوپن مارکیٹ کی نسبت بہرحال کافی سستے پڑتے ہیں اور سستی چیز خریدنا ہمارے ہاں کے لوگوں کی کمزوری ہے خواہ وہ کہیں سے بھی آرہی ہو' کسی بھی ذریعے سے مل رہی ہو اور خریدنے والے کے پاس خواہ کتنی ہی دولت موجود ہو۔"

وہ خاموش ہوکر ایک بار پھر پانی پینے کے لئے رکی۔ شاید اس کا گلا خشک ہورہا تھا۔ میں دم بخود بیٹھا تھا۔ میں ایک ٹھیک ٹھاک بزنس مین تھا۔ عام بزنس مین کی نسبت میرے سامنے زندگی کے زیادہ پہلو بے نقاب رہتے تھے۔ میں مختلف کاموں کے سلسلے میں یا اتفاقات کے تحت دنیا کے مختلف گوشوں میں پھرتا بھی رہتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں بزنس کے علاوہ بھی دنیا کے معاملات سے بہت واقف تھا۔ اس کے باوجود بعض باتیں میرے لئے بھی انکشاف کا درجہ رکھتی تھیں اور مجھے بھی حیران کردیتی تھیں۔ امبر کی باتوں نے بھی اس وقت مجھے خاصا حیران کیا تھا۔ تاہم ذہن میں کچھ کڑیاں بھی ملنے لگی تھیں۔

"میں سمجھ گیا۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "قاسم بجلی ہیروں کی اس تجارت میں کسی سینڈیکیٹ کا ہول سیل ایجنٹ ہوگا؟"

"جی ہاں" امبر نے سرہلایا۔

"اور فرحین اس کے لئے دیگر خدمات انجام دینے کے ساتھ ساتھ ہیروں کی کھیپی کا کام بھی کررہی ہوگی؟"

"جی ہاں" اس نے ایک بار پھر اثبات میں سرہلایا۔

"تم اور جمیل اس میں کہاں فٹ ہوتے تھے؟" میں نے پوچھا۔

"ہم اونچے طبقے کے لوگوں میں ہیروں کے گاہک تلاش کرتے تھے۔ ہوٹل میں رہتے ہوئے جائزہ لیتے تھے کہ کون رعایتی داموں ہیرے خریدنے میں دلچسپی لے سکتا ہے اگر ہماری رہنمائی میں کوئی خرید و فروخت ہوتی تھی تو ہمیں اس پر تھوڑا سا کمیشن ملتا تھا جو ہم جیسے کم تنخواہ پانے والے چھوٹے ملازمین کے لئے یہ اتنا آمدنی بھی کافی تھی۔ یہ ایک معقول قسم کا پارٹ ٹائم کام تھا اور ہمارے خیال میں بہت زیادہ خطرناک بھی نہیں تھا۔"

"تو پھر اس میں قتل و غارت اور خوں ریزی کہاں سے آگئی؟ گردنیں کیوں کاٹی جانے لگیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے خیال میں اس کی بڑی وجہ قاسم بجلی کی موت ہے۔ جب وہ زندہ تھا تو ہر چیز کنٹرول میں تھی۔ سارا نظام صحیح طریقے سے چل رہا تھا۔ ایک مشینری تھی جس میں ہر پُرزہ اپنا اپنا کام انجام دے رہا تھا۔ اس کے مرتے ہی گویا لوٹ مار شروع ہوگئی ہے۔ جس کے ہاتھ میں جو کچھ تھا وہ اسے ہضم کرجانے کی فکر میں ہے اور آپ کو معلوم ہے جب پیسے کی لوٹ مار شروع ہوتی ہے تو پھر قتل و غارت بھی شروع ہوتی ہے لیکن اس میں جمیل جیسا چھوٹا اور بے ضرر کارکن یقیناً کسی غلط فہمی کی بنا پر مارا گیا ہے یا پھر اسے ان کی گستاخی کی سزا دی گئی ہے۔ انہی وجوہات کی بنا پر میرا بھی یہی حشر ہوسکتا ہے۔ میں محسوس کررہی ہوں کہ موت میرے تعاقب میں ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا' میں پناہ کے لئے کہاں جاؤں؟" وہ خاموش ہوگئی۔

ایک لمحے کے سکوت کے بعد میں نے کہا "پناہ کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ تم خوف اپنے دل سے نکال دو۔ اگر تمہارے گھر والے پریشان نہ ہوں تو تم اسی ہوٹل کے کسی کمرے میں رہ سکتی ہو۔ میں تمہاری حفاظت کا بندوبست بھی کردوں گا۔"

"میں صرف اپنی والدہ اور ایک بڑی بہن کے ساتھ رہتی ہوں جس کی ذہنی حالت صحیح نہیں ہے۔ میرے والد کا کافی عرصہ پہلے انتقال ہوچکا ہے۔" اس نے بتایا۔

"انہیں اطلاع کرادینا کہ تم چند دن کے لئے گھر سے باہر رہو گی۔ اگر تم ان کے لئے کوئی خطرہ محسوس کرو تو ان کی حفاظت کے لئے بھی میں ایک دو آدمی بھجوا سکتا ہوں۔" میں نے کہا "جب تک یہ گرد بیٹھ نہیں جاتی اور کوئی واضح صورت سامنے نہیں آتی تب تک میں تمہارے لئے ضروری حفاظتی انتظامات کرسکتا ہوں۔"

"میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔" وہ بے پناہ ممنونیت سے بولی۔

"جو باتیں تم نے مجھے بتائی ہیں۔ ان میں کئی پہلو تشنہ معلوم ہوتے ہیں۔ اس زنجیر کی کئی کڑیاں غائب معلوم ہوتی ہیں۔ تمہیں اس سلسلے میں کچھ اور بھی معلوم ہے؟"

"جی ہاں میں آپ کو وہی بتانے لگی تھی لیکن اس کے بعد بھی آپ کو شاید اس زنجیر کی کوئی کڑی غائب محسوس ہو۔" امبر بولی "قاسم بجلی خود تو چونکہ کبھی یہاں' کبھی کسی اور شہر... کبھی کسی اور ملک میں ہوتا تھا۔ ویسے بھی وہ خود ہیروں کی کھپت کے جھنجھٹ میں نہیں پڑسکتا تھا' اس لئے اس نے ایک شخص کو یہاں تمام معاملات کا انچارج اور نگران بنایا ہوا تھا۔ قاسم بجلی تو بس باہر سے لاٹ خرید کر قسطوں میں یہاں بھجوادیتا تھا۔ ہر قسط اس شخصیت کے پاس پہنچ جاتی تھی اور گویا خزانے میں جمع ہوجاتی تھی۔ وہ شخصیت خود بھی بہت بڑے پیمانے پر ہیرے کھپاتی تھی اور ہم جیسے چھوٹے موٹے کارندوں کو بھی اگر کسی متوقع گاہک کو ہیرے دکھانے... پسند کرانے ہوتے تھے تو ہم اسی شخصیت کو پیغام بھجواتے تھے۔ ہیرے مطلوبہ مقام پر پہنچ جاتے تھے۔ جو ہیرے بک نہیں پاتے تھے وہ بہ حفاظت اسی شخصیت کے پاس واپس پہنچ جاتے تھے لیکن یہ سارا نظام کچھ ایسا تھا جیسا اکثر ناجائز دھندوں کے سلسلے میں بعض جاسوسی یا جرم و سزا کی کہانیوں میں بیان کیا جاتا ہے یعنی وہ شخصیت مکمل طور پر پردے میں رہتی تھی۔ مجھے بھی نہیں معلوم کہ وہ شخصیت کون تھی۔ وہ شخص یا پھر شاید اس کا کوئی کارندہ خود ہی دوسرے تیسرے روز ہمیں فون کرکے معلوم کرتا رہتا تھا کہ کوئی آرڈر ہے یا نہیں۔"

"یہ تم نے دلچسپ بات بتائی ہے۔ کیا فرحین کو بھی اس شخصیت کا علم نہیں تھا؟" میں نے پوچھا۔

"میں یقین سے نہیں کہہ سکتی۔ شاید اسے علم رہا ہو لیکن اس نے کبھی بھی اس بات کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کچھ جانتی تھی۔ بہرحال وہ قاسم بجلی کی اہم ترین کارندہ تھی۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کیا کچھ جانتی ہو۔ مرنے سے ایک دن پہلے اس نے ایک خط لکھا تھا۔ وہ خط اس نے جمیل کے سپرد کیا تھا اور اسے ہدایت کی تھی کہ جس ہال میں وہ شو پیش کرتی ہے اس کی سیٹ نمبر تیرہ کے نیچے اڑس دے۔ فرحین' جمیل پر بہت بھروسا کرتی تھی اور مالی طور پر بھی اسے نوازتی رہتی تھی لیکن ان دنوں جمیل کے ذہن میں بھی معلوم نہیں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ وہ کچھ فکرمند بھی نظر آتا تھا لیکن اصل بات اس نے مجھے بھی نہیں بتائی تھی۔ مجھ سے وہ یہی کہتا تھا کہ چند دن ٹھہر جاؤ' پھر اس موضوع پر بات کریں گے۔ معلوم نہیں کیا سوچ کر اس نے وہ خط سیٹ نمبر تیرہ کے نیچے نہیں اڑسا بلکہ اپنے پاس ہی رکھ لیا اور دوسرے دن میرے سپرد کردیا کہ میں اسے حفاظت سے اپنے پاس رکھ لوں۔"

"کیا وہ اب بھی تمہارے پاس ہے؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"جی ہاں وہ میں ابھی آپ کو دیتی ہوں۔" وہ اپنا شولڈر بیگ کھولتے ہوئے بولی "میں نے اسے پڑھا ہے لیکن اس سے بھی پتا نہیں چلتا کہ وہ کس کے نام ہے۔ شاید آپ کو اس سے کچھ جاننے میں مدد مل سکے۔" اس نے بیگ سے خط نکال کر میری طرف بڑھادیا۔

میں نے خط پڑھنے سے پہلے پوچھا "جمیل نے یہ تو دیکھا ہوگا کہ تیرہ نمبر سیٹ پر کون آکر بیٹھا تھا۔ کیا اس نے تمہیں اس سلسلے میں کچھ بتایا؟"

"جی ہاں اس نے دو راتوں کے دوران اس سیٹ پر نظر رکھی تھی۔ دونوں راتوں میں دو مختلف افراد آکر اس سیٹ پر بیٹھے اور وہ دونوں جمیل کے لئے اجنبی تھے۔ جمیل ان کے بارے میں کچھ نہیں جان سکا کہ وہ کون تھے اور نہ ہی جمیل یہ دیکھ سکا کہ ان میں سے کسی نے سیٹ کے نیچے خط تلاش کرنے کی کوشش کی تھی یا نہیں۔"

میں نے خط کھول کر دیکھا۔ وہ انگریزی میں تھا۔ لکھا تھا۔

ڈیئر.....!

مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ تم کون ہو۔ اپنی بے وقوفی پر حیرت بھی ہورہی ہے۔ ہم ایک عرصے سے فون پر تمہاری آواز سُن رہے ہیں اور ایک دوسری حیثیت سے تم سے مل رہے ہیں لیکن ہمیں گمان تک نہ گزرا کہ دونوں شخصیتیں اصل میں ایک ہیں۔

مجھے اب معلوم ہے کہ میں فون پر تم سے کہاں رابطہ قائم کرسکتی ہوں لیکن میں ایسا نہیں کررہی ہوں۔ میں وہی پُرانا طریقہ اختیار کررہی ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ اگر کبھی ہنگامی طور پر تم تک کوئی پیغام پہنچانا مقصود ہو تو یہ طریقہ اختیار کیا جاسکتا ہے۔

میں ہنگامی طور پر تمہیں یہی بتانا چاہتی ہوں کہ قاسم بجلی کی موت سے سب کچھ بکھر کر رہ گیا ہے۔ اس قسم کے کاموں کا کوئی باضابطہ ریکارڈ یا لکھت پڑھت تو ہوتی نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا ہے کہ اشاراتی اور مبہم سی زبان میں نجی ڈائریوں میں اندراجات کرلئے جاتے ہیں۔ اس لئے میں تمہارے سامنے کوئی ٹھوس اور واضح قسم کا تحریری ثبوت تو پیش نہیں کرسکتی لیکن میں پہلے بھی تمہیں یقین دلانے کی کوشش کرچکی ہوں اور اب پھر

کررہی ہوں کہ وہ چھوٹی کھیپ قاسم بجلی نے مجھے دینے کا وعدہ کیا تھا۔ تمہیں نہیں معلوم کہ میں نے اس کے لئے کیا کیا خدمات انجام دی ہیں اور اس کے کیسے کیسے بڑے کام نکلوائے ہیں۔ جو اِدھر اُدھر اٹکے ہوئے تھے۔ اس کی طرف میرا بہت اُدھار نکلتا تھا۔ حساب بے باق کرنے کے لئے اس نے وہ چھوٹی کھیپ میرے نام کردی تھی۔ میں اب اسے اپنے پاس ہی رکھوں گی۔ قاسم کی موت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تم خواہ مخواہ اس پر جھپٹنے کی کوشش مت کرو۔ میں اتنی کمزور عورت نہیں ہوں ویسے بھی.... اب جبکہ تمہاری شخصیت ہم پر بے نقاب ہو چکی ہے تو یوں سمجھو کہ تم بھی خاصے کمزور ہو چکے ہو۔

میں وہ کھیپ تمہیں ہرگز نہیں دوں گی۔ وہ میرے لئے اس لحاظ سے بھی بہت اہم ہے کہ میں اس پر بہت انحصار کررہی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ اب جونہی میرے پاس یک مشت بڑی رقم آئے گی' میں اسے کہیں انویسٹ کرکے پُرسکون اور شریفانہ زندگی بسر کروں گی۔ میں ان تھرڈ کلاس اور بے ہودہ کاموں سے تنگ آچکی ہوں۔ خود اپنی نظر میں میری کوئی عزت نہیں رہی ہے لیکن میں بہرحال ایک پُرتعیش زندگی گزارنے کی عادی ہوں اس لئے مجھے شریفانہ زندگی گزارنے کے لئے بھی وسائل چاہئیں۔ اپارٹمنٹ میں خرید چکی ہوں۔ مزید رقم کا بندوبست ہوجائے تو اسے میں کہیں انویسٹ کردوں گی جس سے میرے لئے ایک معقول قسم کی مستقل آمدنی کا ذریعہ پیدا ہوجائے گا۔ ممکن ہے خود کو مصروف رکھنے کے لئے میں کوئی بزنس بھی کرلوں۔ یہ ایک اچھا اور تعمیری مقصد ہے۔ تم اس میں رکاوٹ نہ بنو۔ تم پہلے ہی کافی کما چکے ہو۔ آخر اتنی دولت کا تم کیا کروگے؟ اس کے علاوہ اگر تم فیئر گیم نہیں کروگے.... بے ایمانی کروگے تو قاسم بجلی کے آدمی بھی تمہیں نہیں چھوڑیں گے۔ ان میں سے بھی کسی نہ کسی کو یقیناً سارے حساب کتاب کا پتا ہوگا۔ لہٰذا میں تمہیں خبردار کررہی ہوں کہ وہ کھیپ زبردستی مجھ سے حاصل کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ تم نقصان میں رہوگے اور تمہاری شخصیت پر سے نقاب بھی اُتر جائے گا۔ (ایکس)

خط ختم کرنے کے بعد بھی میں کئی لمحے تک اسی پر نظر جمائے بیٹھا رہا۔ بات کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگی تھی۔ آخر میں نے خط تہ کرتے ہوئے پوچھا "کیا اسے میں اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟"

"یہ میں آپ ہی کو دینے کے لئے لائی تھی۔" وہ بولی "مجھے اس کا کیا کرنا ہے۔ مجھے تو اس وقت صرف تحفظ کی ضرورت ہے اور مجھ میں پولیس کے پاس جانے کی ہمت نہیں۔ میں قاسم بجلی کے کسی آدمی سے بھی مدد طلب کرنا نہیں چاہتی۔ میں اور جمیل صحیح معنوں میں قاسم بجلی کے ساتھی نہیں تھے۔ ہم تو اس ہوٹل میں پہلے سے ملازمت کررہے تھے۔ قاسم بجلی نے ہوٹل خریدا تو ہم اس کے ملازموں میں شامل ہوگئے۔ پھر کسی کے توسط سے ہیروں کے اس دھندے میں معمولی سا کام کرنے لگے ورنہ ہمارا قاسم بجلی یا اس کے آدمیوں سے کوئی گہرا تعلق نہیں تھا۔"

میں نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "فرحین کا قتل ہونا تو سمجھ میں آتا ہے۔ اس کے پاس کوئی کھیپ تھی جو یقیناً ہیروں ہی کی تھی اور وہ اسے اس پراسرار باس کے حوالے کرنا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن بے چارہ جمیل کیوں مارا گیا؟"

"فرحین اس پر بہت بھروسا کرتی تھی شاید یہی سمجھا گیا ہو کہ اسے ہیروں کے بارے میں کچھ معلوم ہوگا۔ شاید اسے بھی پُراسرار باس کی شخصیت کے بارے میں کچھ معلوم ہوگیا ہو۔" امبر بولی۔

"لیکن اس نے تمہیں اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا اور نہ ہی تمہیں خود کوئی اندازہ ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

اس نے نفی میں سرہلایا اور بولی "البتہ مجھے اتنا اندازہ ہوگیا ہے کہ ہیروں کی وہ کھیپ ابھی پُراسرار باس کے ہاتھ نہیں آسکی ورنہ شاید جمیل کے قتل کی نوبت نہ آتی۔ اسی لئے اب مجھے اپنی بھی جان کا خطرہ ہے۔ پُراسرار باس کو معلوم ہوگا کہ میں جمیل کی ہونے والی بیوی تھی۔ ہیروں کے دھندے میں ہم دونوں کسی نہ کسی انداز میں ملوث تھے اس لئے باس کا اگلا شکار میں ہوں گی۔ وہ شخص ہیروں کی تلاش اور اپنی شخصیت کو راز رکھنے کے لئے یقیناً دیوانہ ہورہا ہے۔"

"دولت کی ہوس انسان کو یونہی دیوانہ کردیتی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ دولت کے لالچ میں وہ لوگ عموماً زیادہ دیوانے ہوتے ہیں جن کے پاس پہلے ہی کافی دولت موجود ہوتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم نے اچھا کیا کہ مجھے نہ جانتے ہوئے بھی مجھ پر بھروسا کرنے کا جُوا کھیل لیا اور میرے پاس چلی آئیں ورنہ شاید ابھی بات بگڑتی ہی چلی جاتی۔ اب اس اُلجھی ہوئی ڈور کے سُلجھنے کی کچھ امید پیدا ہو چلی ہے۔"

پھر میں نے اسے نوزی کے ہاتھوں اپنے اغوا کا واقعہ سُنایا اور نوزی کا حُلیہ تفصیل سے بتانے کے بعد پوچھا "تم اس شخص کے بارے میں مجھے کچھ بتاسکتی ہو؟"

میں نے اسے نوزی کا نام یا عرفیت نہیں بتائی تھی لیکن وہ خود ہی بولی "یہ تو آپ شاید نوزی کی بات کررہے ہیں؟" اس کے چہرے پر ایک بار پھر خوف جھلک آیا جو گزشتہ چند لمحوں کے دوران کافی کم ہوگیا تھا۔

"ہاں کچھ خاص حلقوں میں وہ اسی نام سے جانا جاتا ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"اس کے بارے میں مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ وہ قاسم بجلی کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے اور بہت بڑا بدمعاش ہے۔ ہیروں کے دھندے میں بھی اس کا کردار کافی اہم تھا۔ شاید ہیرے زیادہ بڑے پیمانے پر کھپانے کا شعبہ اسی کے سپرد تھا۔ زیادہ تعداد میں ہیرے تو بڑے جیولرز ہی خرید سکتے تھے۔ شاید وہ ان سے معاملات کرتا تھا۔ تھوک یا پرچون.... دونوں سطحوں پر یہ دھندا

بہرحال کسی خاص لکھت پڑھت یا قانونی کارروائی کے بغیر ہی ہوتا تھا۔ اس لئے اگر کبھی کسی فریق کی نیت خراب ہوجاتی تھی' کوئی مال میں ہیرا پھیری کرنے یا ادائیگی میں گڑبڑ کرنے کی کوشش کرتا تھا تو نوزی ہی اسے سیدھا کرتا تھا لیکن یہ باتیں میں نے زیادہ تر جمیل سے سُنی تھیں۔ مجھے خود یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں ہے۔ میں نے نوزی کو صرف ایک بار قاسم بجلی کے ساتھ دیکھا تھا۔ مجھے اس سے خوف محسوس ہوا تھا۔"

"جو آدمی اپنے صرف ایک ساتھی کے ہمراہ مجھ پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت کرسکتا ہے اس سے ایک عام لڑکی کو تو خوف آنا ہی چاہئے تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "بہرحال تمہاری آمد میرے لئے بڑی کارآمد ثابت ہوئی ہے۔ بہت سی کام کی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تمہارے خیال میں کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ فرحین اور جمیل کو نوزی نے ہی قتل کیا ہو؟ جو شخص ہماری نظر میں پُراسرار باس ہے وہ درحقیقت نوزی ہی ہو؟ اس نے قاسم بجلی کی بغل میں رہتے ہوئے ہی دو روپ دھار رکھے ہوں؟"

امبر ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑگئی پھر ہچکچاتے ہوئے بولی "ممکن تو ہے لیکن یہ بات کچھ زیادہ دل کو نہیں لگتی۔ میں نے نوزی کے بارے میں جو باتیں سُنی ہیں اور ذاتی طور پر میرا اس کے بارے میں جو اندازہ ہے۔ اس سے تو یہی محسوس ہوتا ہے کہ وہ زیادہ "جاسوسی" قسم کے چکروں میں پڑنے والا شخص نہیں ہے۔ وہ تو دھڑلے سے بدمعاشی کرتا ہے۔ قاسم بجلی کے علاوہ بھی اسے نہ جانے کس کس کی پشت پناہی حاصل ہو۔ کئی مرتبہ پکڑا جاچکا ہے لیکن ثبوت اور گواہیاں نہ ہونے کی وجہ سے ہر بار رہا ہوجاتا ہے۔ اس لئے بھی اس کے حوصلے بہت بڑھے ہوئے ہیں۔ سُنا ہے پولیس اگر اسے پکڑتی بھی ہے تو بادلِ نخواستہ پکڑتی ہے کیونکہ اسے گرفتار کرنے والے پولیس آفیسر کی جان خطرے میں ہوتی ہے۔ جس عدالت میں اس کا مقدمہ پیش ہوتا ہے اس کے ججوں کو دھمکیاں ملنے لگتی ہیں۔ ایک آدھ بار اگر کسی گواہ نے اس کے خلاف پیش ہونے کی کوشش کی تو وہ ایسا غائب ہوا کہ اس کی لاش تک نہیں ملی۔ ایسے آدمی عموماً جو کچھ بھی کرتے ہیں دھڑلے سے کرتے ہیں۔ چہرے پر نقاب ڈال کر بدمعاشی دکھانے میں انہیں لطف نہیں آتا۔ ان کی نفسیات ہی شاید کچھ اس قسم کی بن جاتی ہے۔"

میں بغور امبر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ لڑکی ذہین معلوم ہوتی تھی۔ خوف کے ان لمحات میں بھی اس کا ذہن عمدگی سے کام کررہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی۔

"اس کے علاوہ وہ گن کے استعمال کا بہت شوقین معلوم ہوتا ہے۔ سُنا ہے فائر کرنے میں وہ ذرا دریغ نہیں کرتا۔ فرحین اور جمیل' دونوں کو گلا کاٹ کر ہلاک کیا گیا...." اس کی آواز ایک لمحے کے لئے مرتعش ہوئی لیکن وہ گویا فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پاکر بات جاری رکھتے ہوئے بولی "یہ نوزی کا طریقۂ واردات معلوم نہیں ہوتا لیکن یہ میری ذاتی رائے ہے' غلط بھی ہوسکتی ہے۔ میرا زیادہ وقت کچھ زیادہ اچھے لوگوں کے درمیان نہیں گزرا لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ میں بُرے لوگوں کے بارے میں بہت زیادہ جان گئی ہوں۔ کون یقین سے کہہ سکتا ہے کہ کس کی شخصیت کے کتنے پہلو ہوں۔" وہ اپنی رائے کا اظہار احتیاط سے کرنا چاہتی تھی۔ بہرحال اس کی بتائی ہوئی بیشتر باتیں توجہ طلب تھیں۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تمہارا مطلب ہے کہ نوزی ایک "ٹریگر ہیپی" بدمعاش ہے' فوراً گولی چلاتا ہے لیکن ضروری نہیں ہوتا کہ اس قسم کے "پہنچے ہوئے" بدمعاش ہر قتل گولی مار کر ہی کریں اور پھر نوزی کے بارے میں تو میں نے سُنا ہے وہ عام بدمعاش نہیں' ایک دہشت گرد بھی ہے۔ اس قسم کے لوگ کسی بھی موقعے پر ضرورت کے مطابق کوئی بھی طریقۂ واردات اختیار کرسکتے ہیں۔ فرحین اور جمیل کو میرے خیال میں اس لئے گلا کاٹ کر قتل کیا گیا کہ آس پاس کوئی فائر کی آواز سُن کر متوجہ نہ ہوسکے کیونکہ دونوں ہی جگہیں ایسی تھیں جہاں قاتل کا دیکھ لیا جانا اس کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ ضروری نہیں ہے کہ خنجر یا کسی اور تیز دھار آلے سے قتل کرنا اس کا اسٹائل ہی ہو۔"

"آپ ان معاملات کو مجھ سے بہتر سمجھ سکتے ہیں۔" وہ ایک بار پھر محتاط لہجے میں بولی۔

"لیکن اس وقت زیادہ رہنمائی مجھے تم سے ملی ہے۔" میں نے کہا "میں تمہاری رائے سے کافی حد تک متفق ہوں۔ نوزی' فرحین اور جمیل کا قاتل ہو بھی سکتا ہے اور نہیں بھی ہوسکتا۔ اگر وہ قاتل نہیں ہے تو پھر ہمارے سامنے سب سے اہم کام اس پُراسرار باس کو تلاش کرنا رہ جاتا ہے۔ باقی سوالوں کا جواب تو تمہاری آمد سے مل گیا ہے۔ تمہاری آمد سے پہلے میں زیادہ اندھیرے میں تھا۔"

"ہیروں کی جس کھیپ کے لئے موت کا یہ کھیل شروع ہوگیا ہے اس کے بارے میں آپ کو کچھ معلوم ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے؟" اس نے اچانک ہی پوچھا۔

میں نے اس کی بڑی بڑی.... خوب صورت مگر وحشت زدہ سی آنکھوں میں جھانکا۔ اس کی آنکھوں میں سادگی تھی۔ اس نے غالباً یہ سوال سادہ سے تجسس کے تحت ہی کیا تھا۔ مجھے یوں گہری نظر سے اپنی طرف دیکھتے پاکر وہ کچھ نروس سی ہوگئی۔ اپنی مرمریں انگلیاں مضطربانہ سے انداز میں بالوں میں پھیرتے ہوئے بولی "میں نے یہ سوال کرکے شاید خود کو مشکوک بنالیا ہے؟"

"نہیں" میں نے گہری سانس لے کر کہا "تمہارا یہ سوال کافی حد تک فطری تھا۔ تم نے شاید یہ اندازہ لگایا ہے کہ فرحین نے وہ کھیپ مجھے دے دی ہوگی اور وہ اس وقت میرے پاس ہوگی؟"

اس نے دھیرے سے اثبات میں سرہلایا۔

"لیکن ایسا نہیں ہے۔" میں نے کہا "ہیرے میرے پاس نہیں ہیں لیکن میری شدید خواہش ہے کہ ہیروں کی تلاش میں کوئی تم تک یا مجھ تک پہنچنے کی کوشش کرے۔ میں فرحین اور جمیل کے قاتل کو چھوڑوں گا نہیں۔ فرحین نے بڑے مان سے مجھ سے مدد طلب کی تھی اور تم بتا رہی ہو کہ جمیل بھی کچھ ایسے ہی ارادے سے میرے پاس پہنچا تھا۔ میں ان دونوں کی روحوں سے شرمندہ ہوں۔ یہ دونوں مجھے ایک عجیب سا پچھتاوا دے گئے ہیں۔"

وہ سر جھکائے ہوئے مغموم سے لہجے میں بولی "مجھے بھی بڑی خوشی ہوگی اگر میں جمیل کے قاتل کو انجام تک پہنچتے دیکھ لوں۔ اس کے بعد موت بھی آجائے تو مجھے کوئی پروا نہیں ہوگی۔"

"جمیل نہ جانے کس طرح میرے کمرے تک پہنچ گیا تھا۔" میں نے ایک لمحے کی بوجھل خاموشی کے بعد کہا "میرا اسٹاف کسی اجنبی کو میرا کمرا نمبر نہیں بتا سکتا تھا اور نہ ہی اندر بیٹھنے کے لئے چابی دے سکتا تھا۔"

"وہ ہوٹل کی لائن کا آدمی تھا۔ یہ اس کے لئے زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

شاید وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "بہرحال مجھے اپنے ایک استقبالیہ کلرک سے یہ ضرور معلوم ہوا ہے کہ ایک شخص نے میرا کمرا نمبر جاننے کی کوشش کی تھی لیکن کلرک نے اس کا جو حلیہ بتایا ہے وہ نوزی کا ہے۔ اسی لئے میرا شبہ نوزی کی طرف جا رہا ہے کہ شاید قاتل اور پُراسرار باس وہی ہو۔ وہ یقیناً کسی نہ کسی اور ذریعے سے میرا کمرا نمبر معلوم کرکے جمیل سے پہلے یا جمیل کے بعد وہاں پہنچا تھا۔"

"ہیں ممکن ہے۔" اس کے لہجے میں اضمحلال جھلک آیا۔

"باتیں بہت ہوگئیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس دوران تمہیں کچھ کھانے پینے کے لئے پوچھنا بھول ہی گیا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔

"کھانے پینے کا کسے ہوش ہے۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "کل شام میں نے جمیل کے گھر پر جمیل کی لاش دیکھی تھی۔ اس وقت سے میں نے نہ تو کچھ کھایا ہے اور نہ ہی میں سو سکی ہوں۔"

اس کی آنکھوں کے گرد خفیف سے حلقے اس کی بات کی تائید کر رہے تھے۔ اس کا میک اپ سے عاری چہرہ کمرے میں داخل ہوتے وقت بھگدڑ اور گھبراہٹ کی وجہ سے ضرور تمتما رہا تھا لیکن اب اس کے چہرے پر زردی، تھکن اور اضمحلال غالب تھا۔

"بہرحال اب بلا تکلف بتاؤ کہ تم کیا کھانا پینا پسند کرو گی؟"

"پہلے مجھے کسی کمرے میں بھجوا دیجئے۔ اگر میرا دل چاہا تو میں وہیں کچھ منگوا لوں گی۔ میں اب تک نہ جانے کس طرح ہمت کئے پھر رہی تھی لیکن مجھے لگ رہا ہے کہ اب میں ڈھیر ہونے ہوں۔"

"اب تم تمام تفکرات کو ذہن سے جھٹک دو۔ میں جمیل کی موت کا دکھ تو تمہارے دل سے نہیں نکال سکتا لیکن تمہارے خوف اور اندیشوں کا مداوا ضرور کر سکتا ہوں۔" یہ کہہ کر میں نے سکیورٹی چیف نذیر چوہدری کو بلایا اور اس کے مشورے سے امبر کو ٹاپ فلور پر ہوٹل کے پچھلی طرف ایک سنگل کمرے میں بھجوا دیا اور نذیر کو ہدایت کردی کہ وہ اس کی حفاظت کا خصوصی بندوبست کرے۔

اس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر فرحین کا خط نکال کر بیٹھ گیا اور پہلے سے زیادہ غور سے اسے پڑھنے لگا۔ اس کے الفاظ نہیں بدلے تھے لیکن میں ان کے عقب میں گویا کوئی نیا مفہوم تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا یا پھر شاید مجھے وہم سا ہو رہا تھا کہ اس خط کی مدد سے میں کوئی بات سمجھ سکتا تھا مگر سمجھ نہیں سکا تھا۔

خط پڑھ کر میں تہ کرکے جیب میں رکھ ہی رہا تھا کہ ہوٹل کے ایک ملازم نے ایک وزیٹنگ کارڈ لاکر میرے سامنے رکھ دیا اور کہا "کارڈ پوچھ رہا ہے اسے اندر بھیجوں یا نہیں؟"

کارڈ پر نظر پڑتے ہی میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ اتفاقات بعض اوقات بڑے بھلے لگتے ہیں۔ وہ مشتاق مدثر کا کارڈ تھا۔ کارڈ بلاشبہ بہت خوب صورت اور متاثر کن تھا۔ اس کی شخصیت کی طرح...! صرف اس کا اخبار متاثر کن نہیں تھا۔ وہ شام کے انہی اخباروں میں سے ایک معلوم ہوتا تھا جو رنگینی، سنسنی خیزی، چٹپٹے پن اور مرچ مسالے کے سہارے بکتے ہیں مگر پھر بھی زیادہ نہیں بکتے۔ صرف اس بات سے کوئی چاہتا تو مرعوب ہو سکتا تھا کہ وہ انگریزی میں تھا۔

میں نے ملازم سے کہا "ان صاحب کو فوراً عزت و احترام سے اندر لے آؤ۔"

ملازم میری ہدایت کے مطابق اسے گارڈ اور اس لڑکی سے "بچا" کر اندر لے آیا جو عارضی طور پر میری سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔ ملازم خود اس کے لئے میرے آفس کا دروازہ کھول کر کھڑا ہوا۔ میں پہلے ہی اس کے استقبال کے لئے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ قدرے رعونت سے گردن اکڑائے اندر آیا تھا لیکن شاید اسے اتنے مؤدبانہ استقبال کی توقع نہیں تھی۔ میں نے حتی الامکان عاجزانہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے خوش آمدید کہا۔

اس کی رعونت کچھ کم ہوگئی۔ گردن ذرا ڈھیلی پڑتی دکھائی دی۔ شاید اندر ہی اندر وہ کچھ پزل بھی ہوا تھا لیکن اس نے چہرے سے اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔ میں نے گرمجوشی سے اس سے مصافحہ کیا اور ایک بار پھر دل ہی دل میں اس کے دست و بازو کی مضبوطی پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ ٹائپ رائٹر پر نہیں بلکہ ویٹ، ڈمبل اور پنچنگ بیگ وغیرہ پر طبع آزمائی کرنے والا آدمی معلوم ہوتا تھا۔

اس کی بغل میں ایک اخبار دبا ہوا تھا۔ وہ یقیناً اس کے اپنے اخبار کا تازہ شمارہ تھا جس میں اس نے فرحین کے قتل کے سلسلے میں خصوصی رپورٹ چھاپی تھی۔ بلیک میلر قسم کے صحافیوں کا یہ مخصوص "طریقۂ واردات" تھا۔ اگر ان کا اخبار زیادہ مقبول نہیں ہوتا تھا اور انہوں نے بطور خاص کسی کو متوقع شکار سمجھتے ہوئے نشانہ باندھ کر اس پر کوئی تیر چلایا ہوتا تھا یعنی اس کے بارے میں کچھ چھاپا ہوتا تھا لیکن انہیں یقین نہیں ہوتا تھا کہ وہ چیز ان کے شکار کی نظر سے گزری ہوگی تو وہ خود وہ شمارہ لے کر شکار کے پاس پہنچ جاتے تھے یا بذریعہ ڈاک بھجوا دیتے تھے اور پھر فون پر یا خود نازل ہوکر ردِعمل معلوم کرتے تھے۔

"زہے نصیب..... زہے نصیب" میں نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے خوشامدانہ سے لہجے میں کہا، جو میرے لئے ایک خاصا مشکل کام تھا۔ مجھے یہ بھی ظاہر کرنا تھا کہ یہ محض اداکاری تھی جو میں مجبوراً کر رہا تھا ورنہ دلی طور پر میں اس سے ہرگز خوش نہیں تھا۔ فطری طور پر مجھے اس وقت کچھ ایسا ہی کردار ادا کرنا تھا۔ اسی سے مشتاق مدثر کو فتح مندی کا احساس ہو سکتا تھا۔ اگر میں اپنے آپ کو سچ مچ خوش و خرم ظاہر کرنے کی کوشش کرتا تو میرا رویّہ غیر فطری محسوس ہوتا۔

"مشتاق صاحب! اس وقت میں خدا سے کچھ اور مانگ لیتا تو شاید وہ بھی مجھے مل جاتا۔" میں نے اسے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں اس وقت آپ ہی کے بارے میں سوچ رہا تھا اور فیصلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ آپ کو فون کروں یا خود آپ کی خدمت میں حاضری دوں۔"

وہ بیٹھ گیا اور اسی دوران اس کی نظر میری میز پر پڑے ہوئے اپنے اخبار پر پڑی، وہ صفحہ اوپر ہی تھا جس پر اس کی رپورٹ چھپی ہوئی تھی۔ اب اس کے ہونٹوں پر طمانیت بھری مسکراہٹ ابھری اور وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "تمہاری کارگزاری تو پہلے ہی یہاں پہنچی ہوئی ہے۔"

"کارگزاری نہیں صاحب! کارنامہ کہیے۔ کارنامہ۔" میں نے اسی بے چارگی زدہ سے شخص کا رویہ اپنائے رکھنے کی کوشش کی جو دل ہی دل میں جلا ہوا تھا مگر مجبوراً خوش خلقی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"اس میں کیا شک ہے۔" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا "آج کے دور میں سچ لکھنا کسی کارنامے سے کم نہیں۔ میں تو سمجھا تھا میرا سچ آپ تک نہیں پہنچا ہوگا۔ ہمیں اعتراف ہے کہ ہمارا اخبار کوئی بہت بڑا اخبار نہیں ہے اور نہ ہی عوامی سطح پر پڑھا جا سکتا ہے کیونکہ انگریزی میں ہے۔ چنانچہ میں نے سوچا کہ اس کی کم اشاعت کی وجہ سے شاید اس کی رسائی آپ تک نہ ہوتی ہو اس لئے میں احتیاطاً ایک کاپی ساتھ لے آیا تھا لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی ہے کہ یہ تو آپ کی میز پر پہلے سے موجود ہے۔"

"ارے صاحب! کون کہتا ہے آپ کے اخبار کی اشاعت کم ہے۔" میں نے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا "ہر بک اسٹال پر تو نظر آتا ہے اور دھڑا دھڑ بک رہا ہوتا ہے۔ ہر سگنل پر ہاکر دیگر اخباروں کے ساتھ اسے بھی لہرا رہے ہوتے ہیں۔ اپنی خوب صورت پرنٹنگ اور سنسنی خیز سرخیوں کی وجہ سے یہ فوراً نظروں میں کھُب جاتا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے بے یقینی سی ابھری لیکن وہ اپنی مسکراہٹ برقرار رکھتے ہوئے بولا "سرکولیشن والے مجھے بتاتے تو ہیں کہ اب ہماری اشاعت تین لاکھ یومیہ ہو چکی ہے اور تین لاکھ اخبار چھپنے کا مطلب ہے کہ اسے کم از کم پندرہ لاکھ افراد پڑھتے ہیں لیکن میں ان سے یہی کہتا ہوں کہ تین لاکھ اشاعت بھی بھلا کوئی اشاعت ہے؟ کاش ہمارے ہاں تعلیم کی شرح کچھ زیادہ ہوتی اور لوگوں میں قوتِ خرید بھی زیادہ ہوتی تو ہم اس کی اشاعت کو نہ جانے کہاں سے کہاں لے جا سکتے تھے۔"

میں دل ہی دل میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ شاید اس کی سالانہ اشاعت تھی جسے وہ یومیہ بتا رہا تھا لیکن میں نے بظاہر مرعوبیت کا ڈراما جاری رکھتے ہوئے کہا "سچی بات تو یہ ہے کہ میں آپ کا اخبار واقعی نہیں دیکھتا تھا یونہی ایک آدھ مرتبہ نظر سے گزرا تھا لیکن اس کی زبردست مقبولیت کا اندازہ تو مجھے آج ہوا جب اس میں میرا ذکر چھپا اور اخبار مارکیٹ میں آنے کے بعد سے اب تک مجھے بیسیوں عزیزوں، رشتے داروں اور جاننے والوں کے ٹیلی فون آچکے ہیں کہ یہ کیا چکر ہے۔ میرا ذکر کیوں اس انداز میں اس رپورٹ میں آیا ہے؟ کیا میں واقعی فرحین کے قتل میں ملوث ہوں؟ میں نے انہیں تسلی دی کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے شاید مشتاق صاحب کو کوئی غلط فہمی ہوگئی ہے، جب ملاقات ہوگی تو بس غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی۔"

پھر میں نے میز پر ذرا جھکتے ہوئے نہایت دوستانہ لہجے میں کہا "کیوں؟ میں نے ٹھیک کہا نا کہ جب ملاقات ہوگی تو سب غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی؟"

وہ قدرے ہچکچاہٹ کے بعد انگریزی میں بولا "اس کا انحصار کئی باتوں پر ہے۔"

"ارے صاحب! باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں۔ سب باتیں طے ہوجاتی ہیں لیکن آپ نے تو کوئی بات کرنے سے پہلے ہی ہمیں رگڑ ڈالا۔ آپ نے ہم سے بات تو کی ہوتی۔" میں نے خوشامدانہ سے انداز میں ہی شکوہ کیا "ہم کاروباری لوگ ہیں۔"

"چلیے ابھی تو کوئی فرق نہیں پڑا۔ اب بات کرلیتے ہیں۔" وہ شاطرانہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "لیکن آپ کچھ اور مت سمجھئے گا۔ میں بلیک میلر قسم کا صحافی نہیں ہوں جو تھوڑا بہت نذرانہ لے کر ٹل جاتے ہیں۔"

"ارے صاحب! توبہ کیجئے۔ میں نے تو ایسا سوچا بھی نہیں۔" میں نے آہستگی سے گالوں پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"میرا مسئلہ نذرانہ نہیں ہے۔ میں حقیقت جاننا چاہتا ہوں۔" وہ زور دے کر بولا۔

”کیسی حقیقت؟“ میں نے سادگی سے پوچھا۔

”یہی کہ آپ فرحین کے اپارٹمنٹ میں کیوں موجود تھے؟“ وہ میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

”کمال ہے مشتاق صاحب!“ میں نے حیرت سے کہا ”آپ شوبزنس کے اتنے زبردست جرنلسٹ ہیں۔ کیا آپ کو بھی یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اس قسم کی لڑکیوں کے پاس ہم جیسے لوگ کیوں جاتے ہیں؟ مجھے اس نے وقت دیا تھا۔ میں بڑا خوش خوش وہاں پہنچا لیکن وہ اپنے بیڈ روم میں مُردہ پڑی تھی۔“

”آپ کی جگہ کوئی اور سیٹھ ہوتا تو خاموشی سے وہاں سے کھسکنے کی کوشش کرتا لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ آپ نے خود پولیس کو اطلاع دے کر وہاں بُلایا تھا۔“ وہ پلک جھپکائے بغیر بولا۔

”میں آپ کو دیانتداری سے بتا رہا ہوں۔ پہلے میں نے یہی سوچا تھا لیکن پھر میرے دل میں سو طرح کے وسوسے آئے۔ میں نے سوچا شاید فرحین نے کسی سے میرے آنے کا ذکر کر رکھا ہو۔ ممکن ہے کسی نے مجھے اس کے ہاں جاتے دیکھ لیا ہو اگر بعد میں پولیس کو کسی بھی ذریعے سے معلوم ہوا کہ میں اس کے ہاں گیا تھا تو میں ان کی نظر میں زیادہ مشکوک ہو جاؤں گا۔ پھر میرے لئے جان چھڑانا زیادہ مشکل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مجھے یاد آیا کہ اس علاقے کا ایس ایچ او تو میرا جاننے والا تھا۔ وہ دید لحاظ والا آدمی ہے۔ اسے معلوم ہے میں ایک بے ضرر کاروباری آدمی ہوں۔ قتل وغیرہ جیسے چکروں میں نہیں پڑتا۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے اسے بُلا لینا ہی بہتر سمجھا۔“

مشتاق میرے جواب سے مطمئن نہیں تھا۔ بے اطمینانی اس کی آنکھوں سے جھانک رہی تھی۔ اس نے زبان سے بھی اس کا اظہار کر دیا ”مجھے بات کچھ اور لگتی ہے۔“

”کچھ اور؟“ میں نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں ”مثلاً کیا؟؟“

”شاید فرحین سے آپ کی شناسائی زیادہ پُرانی ہو۔ شاید اس نے کسی کام میں آپ سے مدد طلب کی ہو۔ شاید وہ آپ کی کسی حماقت سے ماری گئی ہو۔“

”آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں مشتاق صاحب! پہیلیاں نہ بجھوائیے۔ کھل کر بات کیجئے۔“

”تھری اسٹار ہوٹل قاسم بجلی کی ملکیت ہے اور فرحین وہاں کام کر رہی تھی بلکہ یوں کہیے کہ وہ ایک فلاپ ہوٹل تھا۔ قاسم بجلی کی ملکیت میں آنے کے بعد وہ فرحین ہی کی وجہ سے چلا۔ وہ وہاں جس قسم کے پروگرام پیش کر رہی تھی‘ آپ کو معلوم ہی ہے۔ قاسم بجلی ایک بدنام آدمی تھا۔ اس کے نہ جانے کیا کیا دھندے تھے۔ کوئی بعید نہیں کہ فرحین اس کے کسی اور دھندے میں بھی شریک رہی ہو۔ اس کی زندگی کا بیشتر حصہ باہر گزرا تھا اور اب بھی وہ باہر یوں آتی جاتی رہتی تھی جیسے ہم لوگ پڑوسی کے گھر آتے جاتے ہیں۔ آپ بھی ایک ہوٹل کے مالک ہیں۔ فرحین سے آپ کا تعلق بھی خالی از علت نہیں لگتا۔“

”میرے بھائی!“ میں نے گویا تحمل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ”ابھی تعلق پیدا ہی کہاں ہوا تھا؟ ابھی تو تعلق استوار کرنے کے لئے پہلا قدم ہی اُٹھایا گیا تھا۔ سر منڈاتے ہی اولے پڑ گئے۔ فرض کرنے کا کیا ہے‘ فرض تو آپ جو چاہیں کر سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ اپنے مفروضوں کو اخبار میں بھی لکھنا شروع کر دیں۔“ میں یہ ظاہر کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا کہ مجھے اس کے لکھے کی بہت پروا تھی‘ میں اسے بہت اہمیت دے رہا تھا اور اس کی وجہ سے بہت پریشان تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے نہایت ملائمت سے کہا ”میں تو آپ سے اسی لئے رابطہ قائم کرنا چاہتا تھا کہ اگر آپ کو میرے بارے میں کوئی غلط فہمی ہے تو اسے دور کر سکوں۔ اس کے علاوہ میں ہر طرح سے آپ کی خدمت کے لئے تیار ہوں۔ آپ بلا تکلف مجھے کوئی حکم دیجئے۔“

میں نے ایک لمحے کے لئے اپنے الفاظ کے ردِ عمل کا انتظار کیا لیکن وہ خاموش بیٹھا ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا شاید ابھی اس کے خیال میں پوری طرح کھلنے کے لئے موقع مناسب نہیں تھا۔

میں نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا ”میں کاروباری آدمی ہوں مشتاق صاحب! میں اسکینڈلوں میں گھسیٹے جانے کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ میرا تو ہر طرح سے آپ کی خدمت کے علاوہ آپ کی پیشہ ورانہ ذمّے داریوں میں بھی آپ کی کچھ مدد کرنے کا ارادہ تھا۔“

”وہ کس طرح؟“ اس نے آنکھیں سکیڑ کر میری طرف دیکھا۔

”آپ صحافیوں کے تو ہر جگہ تعلقات ہوتے ہی ہیں لیکن تھوڑے بہت تعلقات ہم کاروباری لوگوں کے بھی ہوتے ہیں۔“ میں نے ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا ”آپ کو کلفٹن تھانے کے ایس ایچ او رحیم گل کے بارے میں تو اندازہ ہو ہی چکا ہے کہ وہ اپنا مرید ہے۔ اس کے علاوہ کچھ بڑے افسروں سے بھی اپنے بہت اچھے مراسم ہیں۔ اگر آپ ہمیں اپنے دوستوں میں شمار رکھتے تو شاید ہم آپ کو کبھی کبھار بڑے کام کی کہانیاں.... بہت اندر کی خبریں دیا کرتے۔ بہت سے کرائم رپورٹر جو باتیں تفتیشی رپورٹنگ کرنے کے بعد بھی معلوم نہیں کر پاتے وہ ہم آپ کو گھر بیٹھے بتا دیا کرتے۔ آغاز کے طور پر شاید آپ کا یہ خادم آپ کو فرحین کے قتل کے سلسلے میں ہی کوئی کام کی بات بتا دیتا۔“

”مثلاً؟“ اس کی آنکھیں بدستور سکڑی ہوئی تھیں اور وہ یقیناً پوری کوشش کر رہا تھا کہ اس کے لہجے سے دلچسپی نہ جھلکنے پائے۔

”میں نے عرض کیا نا مشتاق صاحب....! میں کاروباری آدمی ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا ”آپ نے اپنے اخبار میں مجھے رگڑا دیا ہے۔ اب میں جواباً ایک اہم ٹپ دوں۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ دنیا میں زیادہ تر معاملات کچھ لو کچھ دو کی بنیاد پر چلتے ہیں۔ میں آپ کو زیادہ فائدہ پہنچانا چاہتا ہوں لیکن تھوڑا سا فائدہ مجھے بھی پہنچنا چاہئے۔“

”کیا؟“ وہ مجھے گھور رہا تھا۔ اس وقت وہ یقیناً ایک شکاری کی طرح چوکنا تھا۔

”میں آپ کی مالی خدمت بھی کرنے کے لئے تیار ہوں۔ اس کیس کے سلسلے میں بھی آپ کو ایک اہم ٹپ دوں گا اور آئندہ بھی اگر مجھے کوئی کام کی بات معلوم ہوئی تو آپ کو ضرور مطلع کرتا رہوں گا۔ اس کے عوض مجھے صرف اتنا فائدہ ہونا چاہئے کہ آپ آئندہ کبھی مجھے اسکینڈلائز کرنے کی کوشش نہ کریں۔ اس کیس میں تو خیر ویسے بھی آپ نے مجھے زبردستی گھسیٹنے کی کوشش کی ہے لیکن بہرحال میں بندہ بشر ہوں۔ کبھی کسی معاملے میں میرا ہاتھ میلا ہو بھی سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں ہمارے درمیان ایک شریفانہ سا معاہدہ برقرار رہے‘ آپ مجھے نظرانداز کریں۔“

میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ مجھے ایک عام سا‘ بزدل سا کاروباری آدمی سمجھے جو اس جیسی صحافت کرنے والوں کے ہتھکنڈوں کو نہیں سمجھتا تھا اور پہلی بار ہی کسی اسکینڈل کی زد میں آنے پر سخت خوف زدہ ہو گیا تھا۔ یہ کاروباری آدمی ہر قیمت پر آئندہ کے لئے تحفظ تلاش کر رہا تھا۔

وہ چند لمحے خاموش رہا پھر نہایت بے باکی سے بولا ”آپ مجھے کتنی رقم دے سکتے ہیں؟؟“

”جتنی آپ معقول حدود میں رہتے ہوئے طلب کریں۔“ میں نے بلا تامل جواب دیا۔

”ٹھیک ہے فی الحال صرف دس ہزار دے دیجئے۔“

”آپ کا مطالبہ مناسب ہے۔“ میں نے گویا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔

”معاملہ جتنا سنگین تھا اس کے مقابلے میں تو رقم بہت کم ہے لیکن میں نے اس لئے کم رقم کا مطالبہ کیا ہے کہ آپ مجھے کوئی اہم ٹپ دینے والے ہیں۔“

”بے شک۔ بے شک۔ مجھے اس سے انکار نہیں ہے۔“ میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا اور انٹرکام پر اپنی عارضی سیکریٹری کو حکم دیا ”کیشئر سے کہو دس ہزار روپے لفافے میں رکھ کر فوراً مجھے بھجوا دے۔“

ریسیور رکھ کر میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور طمانیت کے اظہار کے لئے کہا ”مجھے خوشی ہے کہ ہمارے درمیان بدمزگی نہیں ہوئی۔“

میں نے اتنی دیر میں پہلی بار اسے کرسی پر کسمساتے دیکھا۔ وہ پہلو بدل کر بولا ”رقم تو آتی رہے گی۔ آپ یہ بتائیے ٹپ کیا ہے؟؟“ اندرونی طور پر وہ یقیناً بے چین اور مضطرب تھا لیکن بظاہر اپنے اوپر قابو رکھے ہوئے تھا۔

میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے ذرا رازدارانہ سے انداز میں کہا ”آپ کے آنے سے کچھ ہی دیر پہلے میری فون پر رحیم گُل سے بات ہو رہی تھی۔“ میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ یکدم ہی گویا میں نے کوئی اندیشہ محسوس کرتے ہوئے کہا ”آپ کو اس سلسلے میں مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ رحیم گُل کو کچھ نہیں بتائیں گے اور نہ ہی اس سے کچھ پوچھیں گے۔ اگر آپ نے اس موضوع پر اس سے ایک لفظ بھی کہا تو وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ میرے پیٹ میں بات نہیں رہ سکی اور میں نے فوراً ایک پولیس سیکرٹ ’لیک آؤٹ‘ کرنا شروع کر دیا۔ اس سے ایک تو ہماری دوستی میں فرق آئے گا۔ دوسرے وہ آئندہ کے لئے محتاط ہو جائے گا اور کبھی مجھے کوئی بات نہیں بتائے گا جو آپ جیسے لوگوں کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتی ہو۔“

”میرا آپ سے وعدہ ہے میں اس سلسلے میں اس سے کوئی بات نہیں کروں گا لیکن آپ اب اتنا سسپنس پیدا مت کریں اور کام کی بات کریں۔“ وہ قدرے بے زاری سے بولا۔

”رحیم گُل کو آج کسی لڑکی نے فون کیا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ معلوم ہوتی تھی۔“ میں نے اپنی آواز کچھ اور نیچی کرتے ہوئے کہا۔ وہ صحیح طور پر سُننے کے لئے بے اختیار میز پر کچھ آگے کو جھک آیا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ”وہ فرحین اور جمیل کے قتل کے سلسلے میں پولیس کو کچھ بتانا چاہتی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ان دونوں کی موت کے بعد اس کی جان کو بھی شدید خطرہ لاحق تھا اس لئے وہ کہیں چھپی ہوئی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بھی پولیس کی تحویل میں دینا چاہتی تھی لیکن پولیس سے بھی سخت خوف زدہ تھی۔ آپ کو اپنے ہاں کی پولیس کی ریپوٹیشن کا تو پتا ہی ہے۔ رحیم گُل کافی پڑھا لکھا اور باکردار پولیس آفیسر ہے۔ اس نے لڑکی کو بہت تسلیاں دیں کہ اگر وہ اس کی تحویل میں آجائے تو اس کی عزت اور جان کو قطعاً کوئی خطرہ نہیں ہوگا لیکن فی الحال لڑکی رضامند نہیں ہوئی۔ تاہم اس نے کہا ہے کہ شاید ایک آدھ دن میں وہ دوبارہ رابطہ کرے۔ رحیم گُل کہہ رہا تھا کہ اگر دوبارہ اس لڑکی کا فون آیا تو وہ مجھے بتائے گا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے ہی اس سے فرمائش کی تھی کہ وہ مجھے ضرور بتائے۔ میں تجسس سے بے چین ہو گیا تھا۔“

”لڑکی نے بتایا کیا؟“ وہ کھرکھراتی سی آواز میں بولا۔ میں نے یکدم ہی اس کے لہجے میں عجیب سی تبدیلی محسوس کی جس پر شاید وہ قابو نہیں رکھ سکا تھا۔

”کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہی تھی کہ یہ کوئی عام قتل نہیں ہے۔ اس کے پیچھے کوئی لمبا چکر ہے۔ لڑکی تو اسے پوری جاسوسی کہانی بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی اس میں کسی پُراسرار شخصیت کا بھی ہاتھ ہے جو پسِ پردہ رہتی ہے۔ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ اس کے پاس فرحین کا کوئی اہم خط ہے۔ بہرحال رحیم گُل کی باتوں سے کچھ ایسا ظاہر ہو رہا تھا کہ لڑکی کی باتیں قطعی بے ربط تھیں اور وہ بڑے خوف کے عالم میں بات کر رہی تھی۔ سلسلہ

بھی اس نے یکدم ہی منقطع کردیا تھا لیکن اتنا وہ ضرور کہہ چکی تھی کہ کسی فیصلے پر پہنچنے کے بعد وہ دوبارہ فون کرے گی۔ رحیم گل کو اب بے تابی سے اس کے فون کا انتظار ہے اور مجھے رحیم گل کے فون کا انتظار ہے۔"

میں خاموش ہوگیا اور مسکراتے ہوئے قدرے داد طلب سے انداز میں مشتاق کی طرف دیکھنے لگا۔ میری مسکراہٹ اس وقت یقیناً اسے خاصی احمقانہ لگ رہی ہوگی۔ اس نے ہنکارا بھرتے ہوئے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگالیا۔ وہ ایک بار پھر پُرسکون نظر آرہا تھا۔ اس نے یقیناً بڑی تیزی سے اپنے اعصاب پر قابو پالیا تھا اور اپنے اندر برپا ہونے والی ہلچل کو دبالیا تھا۔ اب وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک بار پھر مجھے تول رہا تھا۔ میں مطمئن تھا۔ مجھے اعتماد تھا کہ میں نے خاصی عمدگی سے اپنا کردار ادا کیا تھا۔

اس دوران کیشئر خود ایک لفافہ لئے آفس میں داخل ہوا۔ لفافہ اور ایک واؤچر اس نے خاموشی سے میرے سامنے رکھ دیا۔ واؤچر پر ایک خانہ ہوتا ہے جس میں ظاہر کیا جاتا ہے کہ رقم کس مد میں ادا کی گئی۔ میں نے اس میں لکھ دیا "دفتری خرچ اور خاطر تواضع" حالانکہ یہ دفتری خرچ تھا اور نہ ہی میں مشتاق مدثر کی خاطر تواضع کررہا تھا۔ میں تو اس کی "خاطر تواضع" کسی اور ہی طرح کرنا چاہتا تھا لیکن بہرحال انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس اور آڈٹ .... والوں کے لئے کاغذات کا پیٹ تو بھرنا ہی پڑتا ہے ورنہ دیانتداری کا تقاضا تو یہ تھا کہ میں واؤچر پر لکھتا "چارا برائے شکار"

میں نے واؤچر پر سائن کرکے کیشئر کو واپس کردیا اور وہ مؤدبانہ انداز میں سر جھکائے خاموشی سے لوٹ گیا۔ میں نے لفافہ مشتاق کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "فرام افضل ود لو۔ بلکہ اسے لَو لیٹر ہی سمجھئے۔ دنیا کے خوب صورت محبت ناموں میں سے ایک۔"

خلافِ توقع اس نے فوری طور پر لفافہ لینے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا اور ملائمت سے بولا "افضل صاحب! آپ چاہیں تو اسے واپس رکھ سکتے ہیں۔ آپ نے مجھے بہت اہم بات بتائی ہے۔ اب رقم کی زیادہ اہمیت نہیں رہی۔"

"آپ نہایت غیر کاروباری بات کررہے ہیں مشتاق صاحب! رقم ہمیشہ اہم رہتی ہے۔ اس کی مقدار یا موقع محل کے لحاظ سے اس کی اہمیت گھٹتی بڑھتی رہتی ہے لیکن میرے خیال میں جب اس کی اہمیت کم ہوتی ہے تب بھی دوسری بہت سی چیزوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے اور پھر میں یہ رقم دل پر پتھر رکھ کر نہیں بلکہ اپنی خوشی سے آپ کی خدمت میں پیش کررہا ہوں۔ اگر اتنی حقیر سی رقم کے سہارے میں آپ کے دوستوں میں شمار ہوسکتا ہوں تو میرے لئے یہ سودا بہت سستا ہے۔"

اس نے لفافہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور وہ صفائی سے اس کی جیب میں پہنچ گیا۔ وہ ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے بولا "افضل صاحب آپ کاروباری آدمی ہیں اور میں اخباری آدمی ہوں۔ آپ سے میری دوستی اس حقیر رقم کے سہارے نہیں، خبر کے سہارے استوار ہوگی۔ آپ رحیم گل سے رابطہ رکھیں گے اور جونہی اس سلسلے میں مزید کوئی خبر ملے گی، آپ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر مجھے مطلع کریں گے۔"

اس نے میرے سامنے رکھے ہوئے اپنے وزیٹنگ کارڈ کی طرف اشارہ کیا "اس پر میرے موبائل فون کا نمبر بھی موجود ہے۔ آپ کو مجھ سے فوری رابطہ کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوگی۔ کیا میں تعاون کی اُمید رکھوں؟"

"اُمید؟ ارے صاحب آپ یقین رکھیں۔" میں نے زور دے کر کہا۔

وہ یکدم ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اس بار اس کا مصافحے کا انداز دوستانہ تھا ورنہ جب وہ آیا تھا تو اس کے مصافحے کے انداز میں بھی گویا ایک دھمکی چھپی ہوئی تھی۔ میں بھی اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا اور اسے رخصت کرنے باہر تک آیا۔ دروازے سے ذرا آگے اس کی ہنڈا اکارڈ کھڑی تھی۔ میں نے اس کے وزیٹنگ کارڈ پر اس کے گھر کا پتا دیکھا تھا۔ گھر کا پتا ڈیفنس کا تھا۔ وہ ہنڈا اکارڈ میں گھومتا تھا، ڈیفنس میں رہتا تھا اور موبائل فون بھی رکھتا تھا۔ اس کے پیشے کو دیکھتے ہوئے یہ قابلِ غور باتیں تھیں۔

میں نے مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں کہا "بڑے ٹھاٹ ہیں آپ کے۔ لگتا ہے صحافت پر بہت اچھا وقت آگیا ہے۔ آپ کا اخبار آپ کو یقیناً بہت اچھی تنخواہ اور بہت سی مراعات دیتا ہوگا؟"

وہ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے رک گیا اور استہزائیہ سے انداز میں ہنسا "دفتر سے مجھے جو تنخواہ ملتی ہے اس سے میرا پیٹرول کا خرچ بھی پورا نہیں ہوتا۔"

"تو پھر نذرانوں کا سلسلہ بہت پھیلا ہوا ہوگا؟" میں نے سادگی سے اظہارِ خیال کیا۔

"نذرانوں کا سلسلہ معقول ہے لیکن بہت زیادہ بھی نہیں ہے۔ ان سے ٹھاٹ باٹ قائم رکھنے میں مدد ضرور مل رہی ہے مگر یہ سلسلہ بھی میرے ٹھاٹ باٹ کی بنیاد نہیں ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"تو پھر اصل بنیاد کیا ہے؟ کچھ ہمیں بھی بتایئے نا۔" میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے دوستانہ اور رازدارانہ سے انداز میں کہا "ہم کاروباری لوگوں کو تو ایسے نسخوں کی تلاش رہتی ہے۔"

اس کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "میرا خیال ہے اصل بات آپ کو بتا ہی دوں۔ کہیں آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوجائیں۔ بات یہ ہے افضل صاحب کہ میں ایک زمیندار گھرانے کی آخری نشانی ہوں۔ صحافت میرا شوق اور مشغلہ ہے۔ ذریعۂ معاش نہیں۔ میرے پاس اپنے فالتو وقت کا کوئی مصرف نہیں تھا۔ لکھنے کا مجھے شوق تھا۔ صحافت کے جراثیم مجھ میں موجود تھے۔ پہلے میں نے اپنے چھوٹے سے گاؤں سے بڑے بڑے انگریزی اخباروں کو مراسلے بھیجنے شروع کئے تھے۔ آخرکار خود یہاں آگیا اور صحافت کے میدان میں کود پڑا۔ اُمید ہے اب بات آپ کی سمجھ میں آگئی ہوگی۔"

"بے شک" میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "نہ صرف بات سمجھ میں آگئی بلکہ آپ کی قدر بھی میرے دل میں کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ آپ نے صحافت کے میدان میں چھلانگ لگائی بھی تو بہت خوب لگائی۔ بڑے رنگین شعبے میں مقام بنالیا آپ نے اپنا.... مجھے تو آپ پر رشک آنے لگا ہے۔"

وہ دھیرے سے ہنسا "بس بس افضل صاحب! اب زیادہ مکھن نہ لگائیں۔ میں بہرحال آپ کا دوست بن چکا ہوں لیکن یہ دوستی زیادہ مضبوط اس وقت ہوگی جب آپ مجھے رحیم گل سے مزید معلومات حاصل کرکے دیں گے۔"

"اگر رحیم گل کو اس لڑکی کا فون آیا تو یقین رکھیے آپ کو ضرور معلوم ہوجائے گا اور مزید جو بھی باتیں وہ کرے گی وہ بھی آپ کے علم میں آجائیں گی لیکن اس سلسلے میں کبھی.... کسی بھی جگہ میرا نام نہیں آنا چاہیے۔"

وہ میرے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے بولا "آپ اطمینان رکھیں افضل صاحب! اچھے صحافی کبھی اپنا سورس آف انفارمیشن ظاہر نہیں کرتے۔ اس طرح تو ان کا دھندا جلد ہی چوپٹ ہوجائے۔ لوگ انہیں کوئی بات بتاتے ہوئے ڈرنے لگیں۔"

میں نے اپنے چہرے سے طمانیت ظاہر کرنے کی کوشش کی اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر رخصت ہوگیا۔ اس کی گاڑی نظر سے اوجھل ہوتے ہی میں آفس میں واپس آیا اور موبائل فون پر سیٹھ رمضان سے رابطہ قائم کیا۔ وہ میری آواز پہچانتے ہی قدرے حیرت سے بولا "یہ اتنی جلدی دوبارہ میری یاد کیسے آگئی؟ ابھی تو تمہارے ہوٹل کے ملازموں نے وہ پلیٹیں بھی نہیں دھوئی ہوں گی جن میں" میں نے سینڈوچز وغیرہ کا صفایا کیا تھا۔"

"بکواس چھوڑو اور یہ بتاؤ اس وقت کیا کررہے ہو اور کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"بھئی میں اپنے آفس میں ہوں اور یہ بتانا خاصا معیوب ہوگا کہ اس وقت کیا کررہا ہوں۔ بس یہ سمجھ لو کہ میری پُرانی سابق سیکریٹری آئی ہوئی ہے۔ ہم دونوں بیٹھ کر پُرانی یادیں تازہ کررہے ہیں لیکن تمہیں یہ بے ہودہ سوال کرنے کی ضرورت کیوں پیش آگئی؟"

"میرا سوال بے ہودہ نہیں۔ تم آدمی ہی بے ہودہ ہو۔ مجھے تم سے ایک کام آن پڑا ہے۔" میں نے کہا۔

"تو کام بولو نا۔ فضول سوال جواب کیوں کررہے ہو؟"

"میرے خاص آدمی جو اس قسم کے کاموں میں ماہر ہیں اس وقت دوسری جگہوں پر مصروف ہیں۔ اس لئے تمہیں تکلیف دے رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ میں تکلیف اُٹھانے کے لئے تیار ہوں۔ تم سے دوستی کے بعد ویسے بھی انسان کے مقدر میں تکلیفوں کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا۔ بولو یہ نئی تکلیف کیا ہے؟" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"ایک تو تم جیسے جہلا کو مہذب انسانوں والی زبان بھی راس نہیں آتی۔" میں نے مصنوعی بے زاری سے کہا "وہ جو تم ایک بے ہودہ سا اخبار میرے منہ پر مار گئے تھے جس میں ایک بے ہودہ سی رپورٹ چھپی ہوئی تھی۔"

"ہاں وہ ایک بے ہودہ آدمی کی دوسرے بے ہودہ آدمی کے بارے میں رائے زنی تھی۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولا۔

"تم مشتاق مدثر کو جانتے ہو؟"

"بہت سرسری طور پر۔" وہ بولا "دو تین تقریبات میں ملاقات ہوئی ہے۔ آخر تم نے اس کے بارے میں حرکت میں آنے کا فیصلہ کرہی لیا؟ مجھے معلوم تھا تمہارا زنگ آلود دماغ ذرا دیر میں حرکت میں آئے گا۔"

"بکواس مت کرو اور کام کی بات سنو۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ معلومات چاہئیں۔ اس کے پس منظر کے بارے میں جتنا بھی زیادہ سے زیادہ معلوم ہوسکے اتنا ہی بہتر ہے۔ تمہارے پاس کوئی آدمی ہے جو اس کے بارے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرسکے؟"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد سیٹھ رمضان بولا "میرے اپنے آدمیوں میں سے تو شاید کوئی اتنے کم وقت میں معلومات حاصل نہ کرسکے لیکن ایک انگریزی اخبار میں میرا ایک دوست ہے۔ بہت پُرانا صحافی ہے۔ انگریزی صحافت کے ہر قابلِ ذکر شخص کو جانتا ہے۔ یوں کہو کہ صحافیوں کی چلتی پھرتی ڈائریکٹری ہے۔ میں اس سے معلوم کرتا ہوں۔ شاید اسے معلومات حاصل کرنے میں بھی وقت ضائع نہ کرنا پڑے۔ اس کے پاس پہلے ہی سے تمام ضروری معلومات موجود ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ جس طرح بھی ممکن ہو تم مجھے جلد از جلد اس کے بارے میں کچھ معلومات فراہم کرو۔ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔" میں نے کہا۔

"تم اس کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہو؟ کچھ کرنے سے پہلے ہم بزرگوں سے مشورہ لے لینا۔"

"تم غلط سمجھ رہے ہو یار!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تمہارا خیال ہے کہ اس نے اپنی رپورٹ میں فرحین کے قتل میں مجھے ملوث کرنے کی جو کوشش کی ہے اس سے مجھے ذاتی طور پر صدمہ پہنچا ہے اور اب میں غصے میں اسے کوئی سبق سکھانا چاہتا ہوں؟"

"کیا اس کے علاوہ کوئی بات ہے؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"کیا تم مجھے اتنا ہی سطحی آدمی سمجھتے ہو گھامڑ کہیں کے؟" میں نے مصنوعی خفگی سے پوچھا۔

"نہیں۔ میں تو تمہیں اس سے زیادہ سطحی سمجھتا ہوں۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"بکواس مت کرو۔ میں سنجیدہ ہوتا ہوں تو تم پٹڑی سے اُترنے لگتے ہو۔"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "میں تو ہمیشہ ہی پٹڑی سے اُترا ہوا ہوتا ہوں۔ خیر تم بتاؤ کیا بقراطی جھاڑنا چاہتے ہو؟"

"میرے بارے میں اس نے جو کچھ لکھا اس سے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی ہے۔ وہ مزید بھی کچھ چاہتا تو لکھتا رہتا۔ میرے لئے ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بات صرف یہیں تک ہوتی تو یہ میری نظر میں ایک غیر اہم معاملہ ہوتا لیکن اس کی اس حرکت نے میرے سامنے تو کچھ اور ہی دروازے کھول دیے ہیں۔"

"تم ان دروازوں میں گھس کر کہیں دور نہ نکل جانا میرے چاند!" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بڑے پیار سے بولا۔

"میں نے تم سے کہا تھا اپنی بدنما چونچ بند رکھو۔" میں نے اسے ڈانٹا "اس وقت میں بڑے جوش میں ہوں۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ اتنی جلدی جلدی کچھ اتفاقات پیش آئیں گے اور حقائق کے کچھ سراغ ملتے چلے جائیں گے۔ شاید قدرت جلد ہی اس خونِ ناحق کا حساب صاف کرنا چاہتی ہے۔ ادھر تم وہ اخبار مجھے پہنچا کر گئے ادھر ایک اور شخصیت آن پہنچی۔ اس نے بات کچھ صاف کی۔ پھر مشتاق مدثر خود آن پہنچا۔"

"وہ کمینہ تم سے ملنے آیا تھا؟" سیٹھ رمضان ایک بار پھر میری بات کاٹتے ہوئے حیرت سے تقریباً چلّا اٹھا پھر فوراً ہی ترحم آمیز انداز میں بولا "وہ بے چارہ تمہیں جانتا نہیں ہے تم نے اس کے ساتھ زیادہ برا سلوک تو نہیں کیا؟"

"نہیں نہیں میں نے تو اس کے ساتھ خوش خلقی سے پیش آنے کے سلسلے میں سارے ریکارڈ توڑ دیے ہیں کیونکہ اسی کے سہارے تو مجھے زیادہ اہم حقیقت کی تہ تک پہنچنا ہے۔ اب تو ڈور کا سرا ہاتھ آیا ہے اور ڈور سلجھنا شروع ہوئی ہے۔ میں اتنا احمق نہیں ہوں کہ اسے دوبارہ الجھا دیتا۔ اس سے ملاقات بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ مجھے کچھ اور اندازے لگانے میں مدد ملی ہے۔ اب اگر اس کے پس منظر کے بارے میں بھی تھوڑی سی معلومات حاصل ہو جائیں تو میرا کام اور بھی آسان ہو جائے گا۔"

"اچھا میں تمہارا کام آسان کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "گو کہ تم نے اس وقت میرا کام خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ میرے فون کا انتظار کرنا۔"

میں نے سلسلہ منقطع کردیا اور چند لمحے سوچنے کے بعد انسپکٹر رحیم گل کا نمبر پنچ کیا۔ پتا چلا کہ وہ گھر جا چکا تھا۔ اس کی رہائش بھی کلفٹن ہی میں تھی۔ میرے پاس اس کے گھر کا نمبر بھی تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے ملازم نے اس سے میری بات کرائی کیونکہ وہ شب بیداری اور دن بھر کی خواری کے بعد کچھ دیر سونے کے ارادے سے بیڈروم میں گھسا تھا۔ ملازم کو اس نے ہدایت کی تھی کہ خواہ کسی کا بھی فون ہو اُسے نہ جگایا جائے۔

وہ غنودگی زدہ اور شکوہ آمیز لہجے میں بولا "افضل صاحب! میں چوبیس گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد ذرا سونے لگا تھا۔"

"آپ قانون کے محافظ ہیں رحیم گل صاحب! آپ کو ہر وقت جاگتے رہنا چاہئے تاکہ قوم آرام کی نیند سو سکے۔" میں نے اسے چھیڑا۔

"ہاں صاحب! آپ ہمیں جگاتے رہیے اور جوتے کھلاتے رہیے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "کیا کوئی بہت ضروری بات تھی جس کے لئے آپ چند گھنٹے انتظار نہیں کر سکے؟"

"ظاہر ہے رحیم گل صاحب! بات بہت ضروری ہی تھی ورنہ میں تو اپنے چوکیدار کو بھی نیند سے جگانا پسند نہیں کرتا۔ خواہ وہ ڈیوٹی کے دوران ہی سو گیا ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"اچھا؟ تو پھر بتایئے کیا مسئلہ آن پڑا ہے؟" اس نے گویا جماہی کا گلا گھونٹتے ہوئے کہا۔

"آپ فرحین اور جمیل کے قتل کے ساتھ ساتھ ان ہیروں والا معمّا حل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے افضل صاحب؟ یہ تو کچھ ایسا ہی ہے جیسے ایک ہفتے کے بھوکے شیر سے پوچھا جائے کہ کیا وہ ہرن کے شکار میں دلچسپی رکھتا ہے۔" اس کی آواز سے غنودگی غائب ہو گئی۔

"پوچھ لینا پھر بھی بہتر ہوتا ہے رحیم گل صاحب! ہو سکتا ہے شیر ڈائٹنگ کر رہا ہو اور صرف سلاد پر گزارا کر رہا ہو۔ بہرحال اگر آپ میری اور میں آپ کی تھوڑی سی مدد کروں تو یہ معمّا حل ہو سکتا ہے اور آپ کی ساکھ مزید بہتر ہو سکتی ہے کیونکہ میں اس سلسلے میں کوئی کریڈٹ لینے کی کوشش نہیں کروں گا۔"

"لالچ نہ دیں افضل صاحب! میں ابھی آکر آپ کے سر پر سوار ہو جاؤں گا۔"

"آپ کو یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ سر پر تو میں آپ کے سوار ہونا چاہتا ہوں لیکن ابھی نہیں کچھ دیر بعد۔ بات ذرا پکی اور یقینی ہو جائے۔ اس سے پہلے میں ذرا آپ کی مرضی جاننا چاہتا تھا۔"

"پہیلیاں مت بجھوایئے۔ آپ کرنا کیا چاہتے ہیں؟ آپ کی باتوں سے کچھ پُراسراریت جھلک رہی ہے؟"

"بھئی میں نہ تو جیمس بانڈ ہوں اور نہ ہی شرلاک ہومز۔ اتفاق سے کچھ باتیں آپ کے بجائے میرے علم میں آگئی ہیں۔ میں نے

سوچا نہیں صحیح آدمی تک منتقل کردوں۔"

"لیکن آپ نے ابھی تک مجھے بات تو ایک بھی نہیں بتائی۔" اس نے شکوہ کیا۔

"معلوم ہوجائے گا۔ سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔" میں نے گویا اسے تسلی دی "میں آپ کو زبانی نہیں بلکہ عملی طور پر سب کچھ بتاؤں گا لیکن ذرا مجھے سسپنس تو پیدا کرلینے دیں۔ ایک پولیس آفیسر کو سسپنس میں مبتلا کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ میں تقریباً ایک گھنٹے بعد آپ کے گھر آرہا ہوں۔ اس وقت تک آپ چاہیں تو تھوڑی سی نیند لے لیں لیکن ایک گھنٹے بعد مجھے تیار ملئے گا۔ پولیس کی وردی میں نہیں.... سادہ لباس میں۔ ہم اکٹھے ذرا ایک جگہ تک جائیں گے۔"

رحیم گل نے گہری سانس لی اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "مفضل صاحب! آپ غلط کہہ رہے ہیں کہ آپ شرلاک ہومز بننے کی کوشش نہیں کررہے۔ میرا خیال ہے آپ پوری پوری کوشش کررہے ہیں۔"

"ارے نہیں بھائی! مجھ میں اتنی ذہانت کہاں۔" میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "میں تو خاصے موٹے دماغ کا' پینڈو سا آدمی ہوں۔ میں نے کہا نا کہ بس کچھ اتفاقات پیش آگئے ہیں جو اس معاملے کو انجام تک پہنچانے کا تقاضا کررہے ہیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ملاقات ہوگی۔ میں آنے سے پہلے ایک بار پھر فون کردوں گا۔"

"اچھا جناب! جیسے آپ کی مرضی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا اور میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نے احتیاطاً رحیم گل کے ساتھ ایک گھنٹے بعد کا وقت طے کیا تھا لیکن سیٹھ رمضان کا فون میرے اندازے سے پہلے آگیا۔ میرا خیال تھا وہ خبیث جب تک اپنی سابق سیکریٹری کے ساتھ اپنی پرانی یادوں کو اچھی طرح تازہ نہیں کرلے گا تب تک میرے کام کی طرف دھیان نہیں دے گا۔

وہ بلا تمہید بولا "یار.... وہ تمہارا مشتاق مدثر تو دلچسپ چیز معلوم ہوتا ہے۔ میرے پرانے.... بلکہ پھٹے پرانے دوست نے مجھے بتایا ہے کہ مشتاق اس قسم کے صحافیوں میں سے ہے جن سے خود صحافی بڑے تنگ ہوتے ہیں.... یا یوں کہو کہ جن کا وجود خود صحافیوں کے لئے شرمندگی کا باعث ہوتا ہے۔ وہ صحافیوں کے درمیان کالی بھیڑ ہے.... بلکہ بھیڑ تو چھوٹی ہوتی ہے اسے تو کالا اونٹ کہنا چاہئے۔ میں نے دو تین آدمیوں سے اس کے بارے میں بات کی اور کسی کے منہ سے اس کی تعریف نہیں سنی۔"

"خیر اب اسے کوسنے دینے مت شروع کردینا۔ کوئی کام کی بات بتاؤ؟" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"احمق آدمی! یہ سب کام کی باتیں ہیں۔ انہی سے کسی کی شخصیت اور کردار کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ اس کے اپنے ہم پیشہ اس کا نام سن کر استغفار پڑھنے لگتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوجانا چاہئے کہ وہ کیا چیز ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اب وہ صحافت میں قدم جما چکا ہے۔ اب کوئی اسے نکال تو نہیں سکتا۔ یوں تو اس نے اپنے بارے میں بہت سی جھوٹی باتیں مشہور کررکھی ہیں لیکن سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ اس کا تعلق کسی زمیندار خاندان سے ہے۔ اس کے باپ دادا کا تعلق زمیندار خاندان سے ضرور رہا ہے لیکن مزارعوں کی حیثیت سے۔ یعنی اس کے باپ دادا ایک مشہور زمیندار فیملی کے ہاری ہوا کرتے تھے لیکن اس نے یہاں خود کو سابق زمیندار مشہور کررکھا ہے۔ اس کے ٹھاٹ باٹ دیکھ کر بیشتر لوگوں کو یقین بھی آجاتا ہے کیونکہ محض بلیک میلنگ کے سہارے بھی اس ٹھاٹ باٹ سے رہنا ممکن نہیں۔"

"میں اصل تصدیق اسی بات کی کرنا چاہتا تھا۔" میں نے طمانیت کی سانس لے کر کہا۔

"اور تصدیق کے بعد تم کیا کرنا چاہتے ہو؟ ہم جیسے ناکارہ لوگوں کو بھی کچھ بتادو۔" سیٹھ رمضان بولا۔

"ابھی تمہیں بتانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہوسکتا ہے میرے اندازے غلط ہوں۔ میں کوئی پیشہ ور سراغرساں تو نہیں ہوں۔ یونہی ذرا اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی کوشش کررہا ہوں.... یا یوں کہو کہ یہ معاملہ خود ہی آکر میری ٹانگ میں اڑ گیا ہے۔ کوئی نتیجہ سامنے آجائے تبھی بتاؤں گا تاکہ اگر اندازہ غلط نکلے تو بات یہیں ختم کردوں۔ بعد میں خواہ مخواہ کھسیانا نہ ہونا پڑے۔" میں نے جواب دیا۔

"زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو بچے!" سیٹھ رمضان مربیانہ لہجے میں بولا "اگر کسی مشکل میں پھنس گئے تو پھر چیں چیں کرتے ہم بزرگوں ہی کے پاس دوڑے آؤ گے۔"

"ظاہر ہے تم جیسے بزرگ دوست میں نے اور کس لئے پال رکھے ہیں؟ ضرورت کے وقت دوست کو تکلیف دینا دوست کا اخلاقی فرض ہے۔" میں نے کہا۔

"تم جیسے دوستوں کی پیٹھ پر ایک زوردار لات رسید کرنا دوستوں کا اخلاقی فرض ہے۔" سیٹھ رمضان نے کہا پھر لمبی سانس لے کر بولا "لیکن افسوس کہ مجھ جیسے دوست یہ اخلاقی فرض ادا نہیں کرپاتے۔"

"کیونکہ انہیں معلوم ہے اس فرض کی ادائیگی میں ان کی ٹانگ ٹوٹ سکتی ہے۔" میں نے کہا اور فون بند کردیا۔

اس کے بعد میں نے جنرل منیجر کو بلایا اور فائلوں کے انبار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میں نے جتنا کام کرلیا اتنا ہی ہے۔ اب باقی سب کچھ تم خود ہی سنبھالو۔ یہ تمہارا ہی دردِ سر ہے۔ میری تو ذرا کچھ دوسری قسم کی مصروفیت شروع ہورہی ہے۔"

"آپ چھوڑ دیں سر!" وہ مسکراتے ہوئے بولا "کام تو چلتا ہی رہتا ہے۔ آپ کا پھر کبھی جب موڈ ہو یا وقت میسر ہو تو دیکھ لیجئے گا۔"

میں آفس سے نکل کر ہوٹل کے بغلی حصے کی طرف چلا گیا۔ یہ حصہ شاپنگ آرکیڈ تھا۔ یہاں آٹھ دس شاندار قسم کی دکانیں تھیں جن کا رخ مین روڈ کی طرف تھا۔ ان میں اعلیٰ درجے کی ایک گفٹ شاپ بھی تھی۔ میں اس دکان میں چلا گیا۔ تھوڑی سی مغزماری کے بعد مجھے اس دکان سے اپنی مطلوبہ چیزیں مل گئیں۔

میں وہ چیزیں لے کر اپنی عارضی سیکریٹری کے پاس پہنچا۔ وہ ایک نہایت خوش خلق پارسی لڑکی تھی لیکن خوش خلقی کا مظاہرہ بلا ضرورت نہیں کرتی تھی۔ درحقیقت وہ ہوٹل کی گیسٹ ریلیشنز منیجر یعنی افسرِ مہمانداری تھی لیکن جب کبھی میں تھوڑا بہت وقت بسر آنے پر ہوٹل والوں کے سر پر سوار ہوجاتا تھا تو وہ عارضی طور پر میری سیکریٹری کے فرائض بھی انجام دینے لگتی تھی۔ اس کا نام مس پیرین شاہ تھا۔ خوب صورت اور اسمارٹ تھی۔ کئی زبانیں بول سکتی تھی اور کئی ملکوں کے تہذیبی طور طریقوں سے اچھی طرح واقف تھی۔

میں نے گفٹ شاپ سے لی ہوئی چیزیں اس کے سامنے میز پر رکھتے ہوئے کہا "مس شاہ! اگر آپ مجھے چھوٹا سا ایک پیکٹ تیار کردیں تو میں آپ کا ازحد ممنون ہوں گا۔" پھر میں نے اسے تفصیل سے سمجھایا کہ مجھے کس قسم کا پیکٹ درکار تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں ویسے ہی کچھ حیران حیران سی دکھائی دیتی تھیں۔ میری بات سن کر ان میں کچھ اور حیرت سمٹ آئی۔

"مسٹر چوہدری! یہ کس قسم کا گفٹ ہے؟" وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

"یہ سرپرائز ہے مس شاہ!" میں نے جواب دیا۔ "اگر آپ اسے اسی طرح پیک کریں گی جس طرح میں نے بتایا ہے تو امید ہے کہ میں کسی کو حیران کرنے میں کامیاب ہوجاؤں گا۔"

"ویل.... جیسے آپ کی مرضی۔" اس نے کندھے اچکائے اور دوسرے کام چھوڑ کر اس کام میں لگ گئی۔ میں اپنے آفس میں آگیا۔

تقریباً بیس منٹ بعد پیرین شاہ میری مرضی کے عین مطابق پیکٹ تیار کرکے لے آئی۔ میں نے اسے شاباشی دی اور کہا۔ "مس شاہ! آپ نے میرا مطلب سمجھتے ہوئے یہ پیکٹ بالکل ویسا ہی تیار کیا ہے جیسا میں چاہتا تھا۔ ایسا شاید میں خود بھی تیار نہ کرپاتا۔ انعام کے طور پر آپ اس ہفتے میں کسی بھی روز یہاں اپنی کسی گرل فرینڈ یا بوائے فرینڈ کے ساتھ میرے حساب میں اپنی مرضی کا ڈنر کرسکتی ہیں۔"

"میرا کوئی بوائے فرینڈ نہیں ہے سر!" اس نے گویا میری غلط فہمی دور کی۔

"اوہ.... ! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس پر اظہارِ افسوس کروں یا آپ کو ایک مرتبہ اور شاباش دوں۔" میں نے کہا۔

"سر! آپ کچھ بھی نہ کریں۔ آپ صرف دعا کریں کہ بوائے فرینڈ بنائے بغیر ہی میری شادی ہوجائے۔" وہ مسکراتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچ کر بولی۔

"بہرحال.... انعام برقرار ہے۔ تم کسی کو بھی اپنے ساتھ 'پرتکلف ڈنر پر مدعو کرسکتی ہو۔" میں نے کہا اور وہ شکریہ ادا کرکے رخصت ہوگئی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ رحیم گل کو فون کیے مجھے تقریباً ایک گھنٹا ہوچکا تھا۔ میں نے دوبارہ اس کا نمبر ملایا۔ اس بار اس نے خود ہی فون ریسیو کیا۔ اس کی آواز میں غنودگی نہیں تھی۔

"تم نے کچھ دیر آرام نہیں کیا؟ نیند نہیں آئی تمہیں؟" میں نے "آپ جناب والا" تکلف ترک کرتے ہوئے دوستانہ لہجے میں پوچھا۔

"بھائی! میں کوئی روبوٹ نہیں ہوں کہ بٹن دبایا اور سوگیا.... بٹن دبایا اور جاگ گیا۔ تم نے ایک گھنٹے بعد دوبارہ فون کرکے میرے سر پر تلوار لٹکادی۔ میں نے سونے کا ارادہ ہی ترک کردیا۔" اس کا لہجہ بھی دوستانہ تھا مگر اس میں ہلکی سی خفگی کی جھلک تھی جو یقیناً مصنوعی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔ تم تیار رہنا.... لیکن وردی میں نہیں.... سادہ لباس میں۔" میں نے کہا۔

"بس.... یہ بتانے کے لیے فون کیا ہے؟"

"مہذب لوگ اسی طرح کہیں جانے سے پہلے' دوسرے کو مطلع کرتے ہیں۔" میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔ "اب ذرا مجھے کچھ نشانیوں وغیرہ کی مدد سے اپنے گھر کا ایڈریس اس طرح سمجھادو کہ مجھے کسی اور سے پوچھنا یا بھٹکنا نہ پڑے۔"

اس نے ایڈریس مجھے سمجھا دیا اور میں چند منٹ بعد' دو تین دوسری چیزوں کا بندوبست کرنے کے بعد وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔ رحیم گل کا ٹھکانا ڈھونڈنے میں مجھے کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ وہ ساحل کے قریب ایک دس منزلہ عمارت کے ٹاپ فلور پر رہ رہا تھا۔ اس منزل پر وہ ایک ہی اپارٹمنٹ تھا اس لیے پینٹ ہاؤس کہلاتا تھا مگر مجھے وہاں تک جانے کی زحمت نہیں کرنا پڑی۔ رحیم گل نے گیٹ پر ہی ملنے کا وعدہ کیا تھا اور وہ حسبِ وعدہ وہیں مل گیا۔ سادہ لباس میں بھی وہ اسمارٹ ہی لگ رہا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جن کے بارے میں فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کسی وردی میں زیادہ اسمارٹ لگتے ہیں یا سادہ لباس میں؟

وہ مجھے دیکھ کر گاڑی کے قریب آگیا۔ اس لمحے مجھے ایک اور بات یاد آئی۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "اس بلڈنگ کے اپارٹمنٹس میں انٹرکام ہیں؟"

"ہاں.... ہیں تو سہی.... لیکن میں تو نیچے موجود ہوں۔ انٹرکام کی کیا ضرورت پیش آگئی؟" اس نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"دراصل مجھے ابھی ابھی ایک بات یاد آئی ہے اور میں نہیں چاہتا کہ تمہیں لفٹ میں دوبارہ دس منزل اوپر جانا پڑے۔ تم گیٹ ہاؤس سے ہی انٹرکام پر اپنے ملازم سے کہہ دو کہ تمہارے لیے کوئی فون آئے تو وہ یہی جواب دے کہ تم بری طرح تھک ہار کر سو رہے ہو اور تم نے بہت سختی سے منع کیا ہے کہ تمہیں جگایا نہ جائے۔ تمہارا ملازم یہ ہرگز نہ کہے کہ تم کہیں باہر گئے ہوئے ہو۔" میں نے

کہا۔

اس نے اثبات میں سرہلایا اور گیٹ سے واپس اندر چلا گیا۔ گیٹ ہاؤس میں چوکیدار موجود تھا۔ وہاں سے اس نے انٹرکام پر اپنے ملازم سے بات کی اور چند لمحے کے بعد واپس آگیا۔ میں نے اسے گاڑی میں اپنے ساتھ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

وہ ایک طویل سانس لے کر نشست میں دھنستے ہوئے بولا۔ "مسٹر افضل چوہدری! کیا اب تم یہ بتانا پسند کروگے کہ یہ تم کس قسم کا ڈراما کرنے کی کوشش کررہے ہو؟"

"بڑے افسوس کی بات ہے ڈیئر انسپکٹر!" میں نے مجروح سے لہجے میں کہا۔ "میں کوشش کررہا ہوں کہ ایک بڑا مجرم پکے ہوئے پھل کی طرح تمہاری جھولی میں آن گرے اور تم میری اس کوشش کو ڈراما کہہ رہے ہو۔ واقعی آج کل نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں۔"

"نیکی کا تو خیر یہی زمانہ ہے.... آج کل کے زمانے کو نیکیوں کی زیادہ ضرورت ہے۔" وہ سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ "لیکن تم سے مجھے خطرہ یہی رہتا ہے کہ کہیں تم قانون کو ہاتھ میں لینے کی کوشش نہ کرو۔ تم میں اس بیماری کے کافی جراثیم پائے جاتے ہیں۔"

"نہیں.... نہیں....." میں نے گاڑی کی رفتار بڑھاتے ہوئے بیزاری سے کہا۔ "تم اپنے قانون کو اپنے ہاتھ میں ہی رکھنا۔ اسی لیے تو میں نے تمہیں ساتھ لیا ہے ورنہ اکیلا ہی نہ چل دیتا۔"

"تو پھر تم نے مجھے سادہ لباس میں آنے کے لیے کیوں کہا؟ وردی پہننے سے کیوں منع کیا؟" اس نے جاننا چاہا۔

"یار.....! زندگی میں کچھ کام "سادگی" سے کرنا بھی سیکھ لو۔ وردی پہن کر بھونپو پر یہ اعلان کرتے ہوئے جانا ضروری تو نہیں ہے کہ خواتین و حضرات! توجہ فرمایئے.... ادھر دیکھیے.... یہ پولیس والا ایک ضروری مہم پر جارہا ہے.... مجرم حضرات! آپ بھی ہوشیار ہوجایئے اور اپنے اپنے بچاؤ کا بندوبست کرلیجیے ورنہ بعد میں شاید ٹک مکا کرنا پڑے.... پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی.... وغیرہ وغیرہ۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ مجھے گھور رہا تھا لیکن میں نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے ڈرائیونگ جاری رکھی۔ آخر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "خدا اس ٹی وی کو غارت کرے۔"

"یہ یکدم ہی تم نے ٹی وی کو کیوں کوسنا شروع کردیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ٹی وی واقعی بڑا طاقتور میڈیا ہے...." اسے گویا اس بات پر افسوس تھا۔

"بہت دیر سے پتا چلا تمہیں۔" میں نے لقمہ دیا۔

وہ گویا میری بات پر دھیان دیے بغیر بولا۔ "کوئی مخصوص اصطلاح یا تکیہ کلام ٹی وی پر دو چار مرتبہ دُہرایا جاتا ہے اور وہ بچے بچے کی زبان پر آجاتا ہے۔ یہ ٹک مکا کی اصطلاح بھی ٹی وی کا تحفہ ہے۔ مجھ جیسے پولیس والوں کو اس پر بڑی کھسیاہٹ ہوتی ہے جنھوں نے زندگی میں کبھی ٹک مکا نہیں کیا۔"

"تمہیں اس پر کھسیانا ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اصطلاح تم جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

"لیکن مجھ پر پولیس آفیسر ہونے کا ٹھپا تو لگا ہوا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"صبر کرو اور اپنے محکمے کو نیک نام بنانے کی جدوجہد جاری رکھو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"میری زندگی میں تو اس مہم میں کامیابی کی امید نظر نہیں آتی۔" اس کے لہجے میں مایوسی تھی۔

"ہم تم جیسے لوگوں کا کام اپنے اصولوں کے لیے جدوجہد کرتے رہنا ہے۔ کامیابی ناکامی کا فیصلہ وقت پر چھوڑ دو۔"

"یہی تو میں کررہا ہوں۔" اس نے کہا پھر وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولا۔

"میرا خیال ہے ہم فرحین کے اپارٹمنٹ کی طرف جارہے ہیں۔"

"تم ٹھیک سمجھے ہو۔" میں نے تائید کی۔

"کیا وہاں کوئی ایسا سراغ ملنے کی امید پیدا ہوگئی ہے جو ہم پولیس والوں کی نظر میں نہیں آسکا؟" اس نے قدرے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔

"سراغ وغیرہ وہاں کچھ نہیں ہے۔ ہم تو اپنی سی ایک کوشش کرنے جارہے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"دیکھو.... کہیں ذلیل نہ کروادینا۔ مجھے اپنی عزت اور نیک نامی کا بڑا خیال رہتا ہے۔" اس کے ذہن میں یقیناً اندیشے بھرے ہوئے تھے۔

"ذلت اگر مقدر میں ہوئی تو ضرور اُٹھانی پڑے گی۔" میں نے کہا۔ "تمہارے بارے میں یہ اندازہ مجھے ہوچکا ہے کہ تم کپکپی کی حد تک اپنی عزت و نیک نامی کی فکر میں رہتے ہو۔"

وہ گہری سانس لے کر سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ "معلوم نہیں کیوں میں نے تم سے دوستانہ رویّہ اختیار کرلیا ہے۔ میں غیر ارادی طور پر تمہارے قریب ہوتا جارہا ہوں حالانکہ میں ایسا چاہتا نہیں ہوں۔"

"مایہ دولت کی ذات میں کشش ہی کچھ ایسی ہے۔" میں نے گاڑی ایک ویران سڑک پر موڑتے ہوئے بے نیازی سے کہا۔

چند لمحے بعد ہم اس سڑک پر پہنچ گئے۔ جس کے اختتام پر مالبروٹا ورز نامی عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے گاڑی ایک اور عمارت کے عقب میں روک دی۔ وہاں سے ہم پیدل مالبروٹا ورز تک پہنچے۔

فرحین کے اپارٹمنٹ کے سامنے ایک کانسٹیبل کرسی پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس کی رائفل اس سے دو فٹ دور دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔ اسے ہماری آمد کا پتا ہی نہیں چلا۔ میں نے دور سے اسے دیکھ کر رحیم گل سے کہا۔ "ان کانسٹیبلوں کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے جن کی اس قسم کی ڈیوٹی لگ جاتی ہے۔ اسے یہاں بٹھانے

کا فائدہ کیا ہے؟ یہ بے چارا تو خود اپنی حفاظت بھی نہیں کرسکتا۔ اپارٹمنٹ کی نگرانی کیا کرے گا۔ کوئی معمولی درجے کا بدمعاش بھی چاہے تو اسے ہلاک کرکے اس کی رائفل بھی لے کر آرام سے فرار ہوسکتا ہے۔"

"یہ بے چارے بھی کیا کریں....!" رحیم گل ترحم آمیز لہجے میں بولا۔ "کسی خالی مکان کے سامنے ایک ویران راہداری میں مسلسل بارہ گھنٹے کرسی پر بیٹھے رہنا بڑا صبر آزما کام ہے۔ یہ بہت ہی بے ہودہ قسم کی ڈیوٹی ہے۔"

راہداری میں چونکہ قالین بچھا ہوا تھا اس لیے کانسٹیبل کو ہماری آہٹ بھی سنائی نہیں دی حتیٰ کہ ہم اس کے سر پر جا پہنچے۔ رحیم گل کھنکارا تو کانسٹیبل نے آنکھیں کھولیں اور ہڑبڑا کر اپنی رائفل کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر وہ اس کے ہاتھ میں آنے کے بجائے قالین پر گرگئی اور وہ اسی بوکھلاہٹ میں اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو کرسی اُلٹ گئی اور وہ اس طرح اوندھے منہ گرگیا کہ کرسی اس کے اوپر تھی۔ میں اور رحیم گل ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر گہری سانس لے کر رہ گئے۔

جتنی دیر میں وہ رائفل اُٹھا کر، کرسی کو دھکیل کر سیدھا کھڑا ہونے میں کامیاب ہوا اتنی دیر میں وہ کم از کم تین مرتبہ قتل ہوسکتا تھا اور اب بھی وہ اس عالم میں کھڑا ہوا تھا کہ اس کے سر پہ ٹوپی نہیں تھی۔ وہ نیچے گرچکی تھی۔ اس نے نہایت عالی ہمتی کا ثبوت دیتے ہوئے مجھ پر اور رحیم گل پر رائفل تاننے کی کوشش کی تھی لیکن اسی دوران اس نے رحیم گل کو پہچان لیا اور بوکھلاہٹ میں رائفل دوبارہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر گرتے گرتے بچی کیونکہ اس نے رائفل کو بھول کر فوراً رحیم گل کو سلیوٹ کرنے کی کوشش کی تھی۔

"سر.... آپ.....یہاں.....؟" وہ ہکلایا۔

"ہاں۔ میں یہاں۔" رحیم گل نے نرمی سے کہا۔ "اب تم یہاں مت رہو۔ ایسا کرو کہ اپنی کرسی اُٹھا کر چھت پر چلے جاؤ اور اگر کچھ دیر بعد تمہیں یہاں تھوڑی بہت گڑبڑ کا احساس ہو تب بھی اس معاملے میں ٹانگ نہ اڑانا۔ ہم خود ہی نمٹ لیں گے۔ سمجھ گئے نا؟"

"جی سر! سمجھ گیا۔" اس نے سعادت مندی سے سرہلایا اور فولڈنگ چیئر اُٹھانے لگا۔

"اپارٹمنٹ کی چابی مجھے دے دو۔" رحیم گل نے کہا۔ کانسٹیبل نے چابی اسے دے دی۔ میں نیچے سے اوپر آتے وقت رحیم گل کو سمجھا چکا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ وہ اسی کے مطابق کانسٹیبل کو ہدایات دے رہا تھا۔ اس فلور پر صرف ایک اپارٹمنٹ اور تھا جس کے بارے میں ہمیں پہلے ہی معلوم ہوچکا تھا کہ وہ ابھی خالی تھا۔

میں اور رحیم گل دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے۔ اپارٹمنٹ میں سب کچھ جوں کا توں تھا۔ صرف فرحین نہیں تھی اور زندگی کا احساس نہیں تھا۔ درودیوار سے موت کی سوگواری ٹپک رہی تھی۔ ہر چیز پر گرد کی ایک ہلکی سی تہ جمی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ بعض ویران مقامات پر واقع بلند عمارتوں کے ایسے کمروں میں بھی گرد کہاں سے پہنچ جاتی تھی جن کی کھڑکیاں اور دروازے مضبوطی سے بند ہوتے تھے۔ رحیم گل نے دروازہ اپنے عقب میں مقفل کردیا۔

ہم سیدھے فرحین کے بیڈ روم میں پہنچے۔ رحیم گل نے یہاں بھی ہر چیز جوں کی توں رہنے دی تھی۔ حتیٰ کہ خون آلود بستر بھی اسی طرح بچھا ہوا تھا۔ رحیم گل نے جو بھی تفتیش کرنا تھی، وہیں کرلی تھی۔ اس کے خیال میں کوئی بھی چیز اٹھوا کر لے جانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ اس سے معلومات میں کوئی اضافہ نہیں ہوسکتا تھا۔

ہم دونوں چند لمحے خاموش کھڑے پورے کمرے کا جائزہ لیتے رہے۔ ہمیں گویا انتظار تھا کہ وہاں موجود کوئی چیز بول اُٹھے گی اور ہمیں کوئی اَن کہی کہانی سنائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ آخر رحیم گل نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔

"اب بتاؤ تم کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"میں جو کچھ کرنا چاہتا ہوں اسی کے لیے مناسب جگہ تلاش کررہا ہوں۔" میں نے بدستور ایک ایک چیز کا جائزہ لیتے ہوئے کہا اور اپنی جیب سے وہی پیکٹ نکال لیا جو مجھے مس شاعمہ نے تیار کرکے دیا تھا۔

رحیم گل پیکٹ دیکھ کر اُچھل پڑا۔ "یہ تمہارے پاس کہاں سے آیا؟ کیا تم نے میرے آفس میں....؟"

"خاموش رہو چغد! یہ وہ پیکٹ نہیں ہے۔ ابھی میں نے تھانوں میں نقب زنی شروع نہیں کی۔" میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی۔ "یہ پیکٹ تمہارے اس پیکٹ کی نقل ہے۔"

"اوہ....!" اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ "نقل مطابق اصل ہے.... حتیٰ کہ یہ پیکٹ اصل کے مطابق تھوڑا سا میلا بھی نظر آرہا ہے۔"

"نقل کے لیے بھی عقل کی ضرورت ہوتی ہے نا۔" میں نے کہا۔ "میں نے خواہ مخواہ ہی اپنی عادت سے مجبور ہوکر جزئیات کا اتنا خیال رکھا ہے ورنہ ان کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔"

اس دوران مجھے اپنے مقصد کے لیے ایک مناسب جگہ نظر آگئی۔ میں احتیاطاً اپنے ساتھ چھوٹے سے ایک بیگ میں چند اوزار لے کر چلا تھا جو میں نے ہوٹل میں کام کرنے والے ایک پلمبر سے مستعار منگوائے تھے۔ فرحین کے بیڈ کے سرہانے کا تختہ بڑے خوبصورت ڈیزائن کا بنا ہوا تھا اور اس کے چاروں کونوں پر چار بڑے اسکریو اس طرح لگے ہوئے تھے کہ وہ ڈیزائن ہی کا ایک حصہ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے اس تختے کو انگلی سے ٹھوک بجا کر دیکھا۔ وہ کھوکھلا ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اپنے تھیلے سے ایک بڑا اسکریو ڈرائیور نکالا اور چاروں اسکریو کھول ڈالے۔ میری توقع کے عین مطابق تختہ نہایت صفائی سے علیحدہ ہوگیا۔

کھوکھلے حصے میں وافر جگہ موجود تھی۔ میں نے پیکٹ اس میں

رکھ دیا اور تختہ پہلے ہی کی طرح اسکریوز کی مدد سے کس دیا۔ کچھ پیچھے ہٹ کر میں نے اپنی کارکردگی کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا۔ وہاں کسی تازہ کارروائی کے نشانات نظر نہیں آرہے تھے۔ بیڈ جوں کا توں تھا۔ رحیم گل دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے یوں غور سے میری کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے مجھ سے کسی شعبدے کی توقع تھی۔

میں نے ہاتھ جھاڑتے ہوئے طمانیت سے کہا۔ "جگہ تو عمدہ مل گئی۔"

رحیم گل کچھ نہ بولا۔ وہ بڑے صبر و تحمل کا مظاہرہ کررہا تھا۔ اس کمرے کا ایک دروازہ بالکونی میں بھی کھلتا تھا۔ اگر ہم باہر جاکر بالکونی میں چھپ جاتے اور یہ دروازہ بند کرلیتے تب بھی ہم ایک کھڑکی میں تھوڑی سی جھری رکھ کر کمرے کا منظر دیکھ سکتے تھے لیکن بالکونی میں رہنے میں یہ خطرہ تھا کہ عمارت کے باہر سے ہی کوئی ہماری موجودگی کو محسوس کرسکتا تھا کیونکہ بالکونی کی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ میں اپنی ترکیب ناکام ہوجانے کا ذرا سا بھی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا اس لیے میں نے بالکونی میں چھپنے کا ارادہ ترک کردیا۔

مجھے فوراً ہی ایک متبادل جگہ مل گئی۔ وہ چھوٹا سا ایک ڈریسنگ روم تھا جو باتھ روم سے جڑا ہوا تھا۔ اس کا دروازہ بھی کمرے ہی میں کھلتا تھا اور اس کے دروازے میں چھوٹا سا ایک مستطیل شیشہ بھی لگا ہوا تھا۔ یہ ٹنٹڈ گلاس تھا اور اس رخ سے لگا ہوا تھا کہ ڈریسنگ روم سے بیڈ روم میں تو دیکھا جاسکتا تھا لیکن بیڈ روم سے ڈریسنگ روم میں نہیں جھانکا جاسکتا تھا۔

میں نے رحیم گل سے کہا۔ "ہم دونوں کو بیک وقت یہاں چھپنے اور بیک وقت کمرے کے منظر پر نظر رکھنے میں ذرا تنگی تو ہوگی لیکن یہ جگہ آئیڈیل ہے۔"

"اگر اس ساری جدوجہد کا کوئی نتیجہ نکلنے کی توقع ہو تو میں کنز میں چھپنے کے لیے بھی تیار ہوں۔" رحیم گل بولا۔

"نتیجہ تو کچھ نہ کچھ ضرور نکلے گا البتہ وہ مرضی کے مطابق نہ ہوا تو صبر کرنا پڑے گا۔" میں نے کہا۔

میں بیڈ روم میں ایک کاؤچ پر جا بیٹھا۔ رحیم گل میرے ساتھ ساتھ تھا۔ میں نے اسے ہدایت کی۔ "احتیاط سے بیٹھنا۔ یہ احساس ہرگز نہیں ہونا چاہیے کہ فرحین کی لاش دریافت ہونے کے بعد سے کوئی اس کمرے میں داخل ہوا ہے۔"

میری ہدایت سن کر وہ کچھ اس احتیاط سے کاؤچ پر بیٹھا گویا انڈوں کی ٹوکری پر بیٹھنے لگا ہو۔ میں نے اپنا موبائل فون اور مشتاق مدثر کا دیا ہوا وزٹنگ کارڈ نکالا۔ میں نے اس کے موبائل کا نمبر ڈائل کیا تو سلسلہ ملنے پر مجھے دوسری طرف سے گاڑی کے انجن کی خفیف سی گھرگھراہٹ سنائی دی۔ شاید وہ کہیں محوِ سفر تھا۔

"ہیلو…… مشتاق صاحب……؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی…… میں بول رہا ہوں۔" مشتاق مدثر کی آواز ابھری۔

"آپ کون صاحب……؟"

"افضل چوہدری۔" میں نے جواب دیا اور اس کے لہجے میں یکدم اشتیاق جھلک آیا۔

"کیا حال ہیں چوہدری صاحب؟ کیا کوئی خاص خبر سنانے کے لیے فون کیا ہے؟"

"معلوم نہیں خبر خاص ہے یا نہیں مشتاق صاحب! اس کا فیصلہ تو آپ خود ہی کرتے رہیے گا۔" میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ "میں نے تو آپ سے وعدہ کیا تھا کہ رحیم گل سے کوئی بات معلوم ہوئی تو آپ کو خبر کردوں گا۔ میں اپنا وعدہ پورا کررہا ہوں۔ اب معلوم نہیں ہماری ان کوششوں کا آپ کی نظر میں کوئی مقام ہوگا یا نہیں۔"

"ارے…… کیسی باتیں کرتے ہیں چوہدری صاحب! آپ اب ہمارے لیے کوئی کوشش کریں یا نہ کریں لیکن آپ کی جگہ ہمارے دل میں بن چکی ہے۔" اس کے لہجے میں شیرینی سمٹ آئی۔ "کیا آپ کی رحیم گل سے کوئی بات ہوئی؟"

"ہاں…… ہوئی تو ہے…… وہ تو کچھ عجیب ہی قصے سنا رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے لڑکی اس سے مذاق کررہی ہے…… ایک سنجیدہ معاملے کو بنیاد بنا کر دل لگی کررہی ہے۔ وہ آکر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے نہیں کررہی…… بس ٹیلی فون ہی کیے جارہی ہے اور قسطوں میں عجیب عجیب باتیں بتائے جارہی ہے……"

"آپ وہ باتیں بتائیں…… مطلب میں خود ہی اخذ کرلوں گا۔ میرا مطلب ہے اسٹوری میں خود ہی تیار کرلوں گا۔ وہ لڑکی رحیم گل سے کیا کہتی ہے؟" وہ اپنے لہجے کی بے تابی نہ چھپا سکا۔

"پہلی بار اس نے فون پر جو باتیں کیں وہ تو میں آپ کو بتا چکا ہوں۔ اس نے ذکر کیا تھا کہ اس کے پاس فرحین کا کوئی خط ہے۔ اب اس نے فون پر اس خط کا مضمون بھی سنا دیا ہے۔ وہ ابھی تک پولیس کی تحویل میں آنے کے لیے تیار نہیں ہے حالانکہ بری طرح خوفزدہ ہے……"

"کیا بتایا ہے اس نے؟ خط میں کیا لکھا ہے؟" مشتاق نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

"معلوم نہیں…… میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا…… بقول اس کے…… فرحین کے خط میں لکھا ہے کہ کیپ اس کے بیڈ روم میں چوپائے کے سر میں رکھی ہے…… بھلا یہ کوئی بات ہوئی؟ معلوم نہیں فرحین نے واقعی ایسا لکھا ہے یا یہ لڑکی رحیم گل کو کوئی چکر دے رہی ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ فون پر انجن کی سرسراہٹ وغیرہ بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شاید اس نے گاڑی کہیں سڑک کے کنارے روک لی تھی۔ کئی سیکنڈ تک اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ میں نے دوبارہ ہیلو کہا تو وہ گویا کسی خیال سے چونکا اور بولا۔ "آپ کو اچھی طرح یاد ہے رحیم گل نے یہی الفاظ کہے تھے؟"

"ہاں…… ابھی دو منٹ پہلے ہی تو میری اس سے بات ہو رہی

تھی۔ کوئی لمبا عرصہ تھوڑا ہی گزرا ہے جو میرے بھول جانے کا خطرہ پیدا ہوتا۔ مجھے اس لیے بھی یہ الفاظ اچھی طرح یاد ہیں کہ میں نے اس سے دوبارہ پوچھا تھا اور اس نے یہ الفاظ دُہرائے تھے۔ لڑکی بھی اس کا مطلب نہیں سمجھ سکی تھی۔ رحیم گل کی سمجھ میں بھی نہیں آیا اور میری سمجھ میں بھی نہیں آیا۔ کیا یہ کوئی ہیروئن وغیرہ کی کھیپ کا ذکر ہے جو فرحین کے بیڈ روم میں رکھے ہوئے کسی چوپائے کے مجسمے وغیرہ کے سر میں چھپائی گئی ہے؟" میں نے اس عام آدمی کی طرح پوچھا جو اپنی سمجھ سے بڑا کوئی معمّا حل کرنے کی کوشش کررہا ہو۔

"فرحین کے بیڈ روم میں کسی چوپائے کا مجسمہ نہیں ہے۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا۔ میں چاہتا تو اس سے پوچھ سکتا تھا کہ اسے یہ بات کیونکر معلوم ہوئی؟ کیونکہ وہ تو میرے اور رحیم گل کے سامنے فرحین کے اپارٹمنٹ پر پہنچا تھا اور بقول اس کے وہ فرحین کا انٹرویو لینے آیا تھا۔ اس نے یہی ظاہر کیا تھا کہ وہ اس وقت پہلی مرتبہ فرحین کے ہاں آیا تھا اور اسے فرحین کے بیڈ روم میں جانے کا بھی موقع نہیں ملا تھا کیونکہ اس وقت فرحین کی لاش وہاں سے اُٹھائی جاچکی تھی اور پولیس والے کمرے میں اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔

تاہم میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا کیونکہ اس کے لیے میں ایک عام عیش پرست سیٹھ تھا جسے صرف دولت کمانے کا ہنر آتا تھا اور جو دولت کے بل پر ہر چیز خریدنے کی فکر میں رہتا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کے سامنے اپنا یہ امیج بنایا تھا۔ اب میں زیادہ باریک بینی کا مظاہرہ کرکے اور ذہانت پر مبنی سوال کرکے اسے چونکا نہیں سکتا تھا۔ اسے خود بھی احساس ہوگیا کہ اس کی زبان غیر ضروری طور پر پھسل گئی تھی۔ جلدی سے بولا۔ "اس روز اس کے اپارٹمنٹ سے واپس آتے وقت میں نے بیڈ روم میں جھانکا تھا۔ مجھے یاد ہے…… مجھے تو وہاں کسی بھی قسم کا کوئی مجسمہ نظر نہیں آیا تھا۔"

پھر اس نے گویا اس پہلو سے میرا دھیان ہٹانے کی کوشش کی۔ "خیر…… چھوڑیے اس بات کو…… یہ بتایئے رحیم گل اس سلسلے میں کیا کررہا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں…… فی الحال تو وہ زندگی سے بیزار معلوم ہورہا تھا۔ سخت تھکا ہوا تھا اور سونے جارہا تھا۔ اوّل تو اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سلسلے میں اسے کیا کرنا چاہیے۔ بہرحال…… اگر وہ کچھ کرے گا بھی…… تو صبح کرے گا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ صبح جاکر نئے سرے سے فرحین کے بیڈ روم کا جائزہ لے گا۔ شاید کوئی بات سمجھ میں آجائے۔"

"لڑکی سے اس نے کیا کہا؟" مشتاق نے دریافت کیا۔

"لڑکی کو وہ یہی سمجھانے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ اپنے آپ کو پولیس کی حفاظت میں دے دے تو اس کے حق میں بہتر ہوگا…… یا کم از کم یہی بتادے کہ وہ کہاں چھپی ہوئی ہے…… لیکن…… نہیں مانی۔ کہہ رہی تھی کہ وہ کل تک اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرے گی۔ شاید کل اس میں اتنی جرأت پیدا ہوجائے کہ وہ اپنے آپ کو پولیس کی تحویل میں دے دے۔ رحیم گل نے اسے بڑی حد تک اپنی شرافت کا یقین تو دلا دیا ہے اور اس کی ہمت بندھائی ہے۔ وہ یہ بھی مان رہی تھی کہ جہاں وہ چھپی ہوئی ہے وہاں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ محسوس نہیں کررہی……"

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا۔ "فی الحال تو یہی کچھ معلوم ہوسکا ہے۔ کیا خیال ہے…… کچھ اسٹوری بنتی ہے یا نہیں؟"

"ہاں…… کچھ نہ کچھ بن ہی جائے گی۔" اس کے لہجے سے بے دھیانی عیاں تھی۔

"لیکن اسٹوری سے یہ ہرگز ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ آپ کی معلومات کا ذریعہ میں تھا۔" میں نے اپنے لہجے سے تشویش ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ "آپ مناسب سمجھیں تو یہ اشارہ دے سکتے ہیں کہ لڑکی نے آپ کو بھی فون کیا تھا…… لیکن میرے خیال میں سب سے اچھا طریقہ تو یہی ہوگا کہ اپنے سورس آف انفارمیشن کے بارے میں کئی طرح کے اشارے دے دیں…… کنفیوژن پیدا کردیں۔"

مشتاق قدرے بیزاری سے بولا۔ "بھئی یہ کام آپ مجھ پر چھوڑ دیں۔ میں اپنے کام کو بہتر سمجھتا ہوں۔ آپ نے میری مدد کی ہے۔ میں آپ کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں ہونے دوں گا…… بلکہ اب تو میں بھی جواباً آپ کی کچھ خدمت کروں گا۔ چند دن ٹھہر جایئے…… میں کوئی نہ کوئی جواز پیدا کرکے اپنے اخبار میں آپ کا اچھا سا انٹرویو شائع کروں گا۔"

"ارے نہیں بھئی…… ہم بھلا اس قابل کہاں۔" میں نے گویا انکساری ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

"آپ اس قابل ہوچکے ہیں' یہ میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ اس موضوع پر پھر بات ہوگی۔ خدا حافظ" اس نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

رحیم گل میرے قریب بیٹھا ایک ٹک میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے اسے آنکھ ماری اور فون بند کردیا۔ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ "تو تمہارے خیال میں فرحین اور جمیل کا قاتل مشتاق مدثر ہے؟"

"صرف ان دونوں کا قاتل ہی نہیں…… وہ ہیروں کی اسمگلنگ کے بہت بڑے دھندے میں بھی بہت اہم کردار ادا کرتا رہا ہے۔ پہلے تو مجھے صرف شبہ ہوا تھا لیکن اب اس سے فون پر بات کرنے کے بعد تو یقین ہوگیا ہے…… اور اگر کچھ دیر بعد وہ ان ہیروں کی تلاش میں یہاں آن پہنچا جو تھانے میں تمہاری الماری میں پڑے ہوئے ہیں…… تو پھر تمہیں بھی میری بات کا یقین آجانا چاہیے۔"

"تمہارا خیال ہے کہ تم نے اس کے لیے جو جال پھیلایا ہے…… وہ دوڑا دوڑا آئے گا اور اس میں پھنس جائے گا؟" رحیم گل ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"یقیناً۔" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

اس نے ترحم آمیز سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ مربیانہ لہجے میں بولا۔ "مائی ڈیئر افضل چوہدری! آج کل چوہے بھی اتنے چالاک ہو گئے ہیں کہ کھٹاک سے بند ہونے والے پُرانی طرز کے چوہے دان میں پنیر یا روٹی کا ٹکڑا پھنسا کر رکھو تو وہ اس کے قریب ہی نہیں پھٹکتے...... اور تمہارا خیال ہے کہ مشتاق مدثر اتنا شاطر آدمی ہوتے ہوئے اتنی آسانی سے تمہارے اس سادہ سے جال میں آن پھنسے گا؟"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "بزرگوں نے بلاوجہ سادگی کی اتنی تعریفیں نہیں کی ہیں۔ بہت زیادہ چالاک و عیار لوگوں کو گھیرنے کے لیے بعض اوقات میں بالکل سادہ سے طریقے اختیار کرتا ہوں اور ان کے سامنے خود بھی بڑا سادہ سا بن جاتا ہوں۔ یہ طریقہ ایسے لوگوں کے معاملے میں پُرپیچ اور عیارانہ طریقوں سے زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ چالاک سے چالاک انسان بھی اکثر لالچ کے ہاتھوں مارا جاتا ہے۔ یہ سادہ سا جملہ اپنے اندر بڑی گہرائی رکھتا ہے کہ..... لالچ بُری بلا ہے۔ یہ بلا انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ اس کی ساری چالاکی دھری رہ جاتی ہے۔ مشتاق مدثر پر بھی خون سوار ہے۔ ہیروں کی اس کھیپ کو حاصل کرنے کے لیے وہ دو قتل کر چکا ہے لیکن کھیپ اس کے ہاتھ نہیں آئی۔ اب اس کی طلب، ہوس اور وحشت بہت بڑھ چکی ہے۔ جس انداز میں اس نے فون بند کیا ہے، اس سے مجھے لگتا ہے کہ وہ فوری طور پر اس اپارٹمنٹ کی طرف روانہ ہو چکا ہوگا۔ کہیں وہ کسی قریبی جگہ سے ہی نہ آ رہا ہو۔ ہمیں اب ڈریسنگ روم میں چھپ جانا چاہیے۔ ویسے ہمارا انتظار طویل بھی ہو سکتا ہے۔"

"اگر مقصد پورا ہونے کی اُمید ہو تو میں پورا ایک ہفتہ اس ڈربا نما ڈریسنگ روم میں بیٹھنے کے لیے تیار ہوں" رحیم گل بولا "لیکن مجھے کچھ اُمید نظر نہیں آ رہی۔"

"تمہیں اُمید نظر نہیں آ رہی.... اور مجھے یقین ہے کہ مشتاق مدثر اس طرف روانہ ہو چکا ہے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ جس وقت میں نے اسے فون کیا اس وقت وہ امبر کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اگر وہ اسے مل جاتی تو اس کے ہاتھوں تیسرا قتل بھی ہو چکا ہوتا لیکن امبر اس وقت ایک محفوظ مقام پر ہے۔ مشتاق کو ہرگز اُمید نہیں ہو سکتی کہ امبر نے وہاں پناہ لی ہوگی۔"

"یہ امبر کون ہے؟" رحیم گل نے دریافت کیا۔ میں نے اسے بتایا کہ امبر کون تھی اور اس سے مجھے کیا کچھ معلوم ہوا تھا۔ پس منظر اس کی سمجھ میں آ گیا۔

وہ سرہلاتے ہوئے بولا "..... تو یوں کہو نا افضل ڈیئر..... کہ تم مجھ سے بالا بالا ہی جرم و سزا کی دنیا کے چوہدری بنے پھر رہے ہو۔ تمہیں پہلے ہی اتنا کچھ معلوم ہو چکا ہے تبھی اتنے پُراعتماد نظر آ رہے ہو..."

ایک لمحے کے لیے اس نے ہونٹ بھینچ لیے پھر نفی میں سرہلاتے ہوئے بولا "مجھے یقین نہیں آ رہا..... مشتاق مدثر صحافت کی دنیا کا آدمی ہے.... لوح و قلم اور الفاظ سے اس کا رشتہ ہے۔ وہ اتنا خطرناک آدمی کیسے ہو سکتا ہے!"

"وہ لوح و قلم کا آدمی نہیں ہے۔ اس کے لیے اتنی دھیمی دھیمی اصطلاحیں استعمال مت کرو۔ صحافت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ اس کوچے میں تو اس نے پناہ لی ہوئی ہے۔ وہ بھیڑ کی کھال پہن کر بھیڑوں کے گلے میں شامل ہو جانے والا بھیڑیا ہے۔ اپنے مقاصد کے لیے اس نے تھوڑا بہت لفظوں کا اُلٹ پھیر سیکھ لیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ اس قبیلے کا آدمی نہیں ہے لیکن وہ اس پیشے کی طاقت سے بخوبی واقف تھا۔ وہ اس طاقت کو اپنے لیے استعمال کر رہا تھا، اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کام میں لا رہا تھا۔"

رحیم گل خاموش رہا۔ اب میرے مؤقف کے خلاف اس کی مزاحمت کمزور پڑ گئی تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ جس طرف سے..... اور جس طرح بھی دولت سمیٹ سکتا تھا، سمیٹ رہا تھا لیکن میرا اندازہ ہے کہ سب سے زیادہ روپیہ وہ ہیروں کو اِدھر اُدھر کھپا کر کما رہا تھا۔ قاسم بجلی تو ایک طرح سے ہول سیل ڈیلر تھا۔ اس کا کام فرحین کے ذریعے ہیروں کو پاکستان پہنچا دینا تھا۔ یہاں ان کی کھپت کے سلسلے میں میری معلومات اور اندازے کے مطابق تین افراد کام کر رہے تھے۔ جمیل، امبر اور مشتاق مدثر۔ ان میں سے جمیل اور امبر کی حیثیت معمولی درجے کے سیلزمین کی سمجھ لو لیکن مشتاق مدثر ایک طرح سے مارکیٹنگ منیجر تھا۔ وہ زیادہ بڑے پیمانے پر ہیرے کھپاتا تھا۔ صحافت کے ذریعے اس نے دولت مندوں اور خصوصاً شوبزنس کے لوگوں میں جو شناسائی پیدا کر رکھی تھی، وہ اس کے سائڈ بزنس کے لیے بہت کارآمد تھی۔ وہ "سائڈ بزنس" جو اسے اس کے اصل بزنس سے زیادہ منافع دے رہا تھا۔ ان لوگوں کو سستے داموں ہیرے دلوانے کے لیے اس نے کوئی معززانہ طریقہ سوچ رکھا ہوگا..."

میں اب بہت نیچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ رحیم گل نہایت انہماک سے سُن رہا تھا۔ اس کا انہماک دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "قاسم بجلی کی اچانک موت کی وجہ سے یہ سارا فساد کھڑا ہوا۔ ایک کھیپ اس وقت فرحین کے ہاتھ میں تھی۔ وہ بعض وجوہات کی بنا پر اس پر اپنا حق سمجھتی تھی۔ وہ کسی قیمت پر اسے پُراسرار باس کے حوالے کرنے کے لیے تیار نہیں تھی جو ٹیلی فون پر اسے وہ کھیپ کہیں پہنچانے کے احکامات دے رہا ہوگا۔ مشتاق مدثر نہایت کامیابی سے فرحین، جمیل اور امبر کی نظر میں "پُراسرار باس" بن کر...... اپنا دھندا چلا رہا تھا لیکن فرحین کو اس دوران اندازہ ہو گیا تھا کہ پُراسرار باس کون تھا۔ اس لیے وہ اور بھی شیر ہو گئی تھی۔ وہ مشتاق کے ہاتھوں بلیک میل ہونے کے لیے تیار نہیں تھی بلکہ اُلٹا اس کو بلیک میل کرنے کی فکر میں تھی لیکن اس بے چاری کو اندازہ نہیں تھا کہ مشتاق مدثر کتنا خطرناک آدمی تھا اور کتنی تیزی سے کوئی فیصلہ

کر کے اس پر عمل کر گزرتا تھا۔ فرحین کو اپنی سرکشی کی قیمت اپنی جان دے کر چکانا پڑی۔ میں جس رات فرحین سے ملنے پہنچا، مشتاق اس رات شاید ہوٹل سے ہی فرحین کے ساتھ آیا تھا۔

اس رات شاید فرحین نے اس پر ظاہر کر دیا کہ وہ اسے پہچان چکی تھی۔ پُراسرار باس وہی تھا۔ اس نے غالباً یہ بھی واضح کر دیا کہ وہ ہیرے کسی قیمت پر اسے نہیں دے گی۔ وہ ہیرے میرے سپرد کیے ہوئے تھی اور غالباً اسے اطمینان تھا کہ مشتاق ہیرے حاصل کیے بغیر اسے نقصان نہیں پہنچائے گا لیکن اس کا اندازہ غلط ہو گیا۔ وہ شاید سمجھ نہیں سکی کہ مشتاق کے لیے یہ صورتِ حال کتنی خطرناک تھی۔ اس نے فرحین کا کام تمام کر دیا۔ اسے غالباً اطمینان تھا کہ ہیرے اسے فرحین کے اپارٹمنٹ میں ہی کہیں مل جائیں گے لیکن اس کی یہ اُمید پوری نہیں ہو سکی۔ اسی چکر میں اس کے ہاتھوں جمیل قتل ہوا۔ ان ہیروں پر قبضہ جمانے کے لیے وہ بھی دیوانہ ہو رہا تھا۔"

"اور نوزی اس سارے چکر میں کہاں فٹ ہوتا ہے؟" رحیم گل نے دریافت کیا۔

"نوزی خالصتاً قاسم بجلی کا آدمی ہے..... یا یوں کہو وہ اس کا شکاری کتا ہے۔ اسے بھی معلوم ہے کہ ہیروں کی ایک کھیپ ابھی فرحین ہی کے قبضے میں تھی جس کے پیسے قاسم بجلی کو نہیں پہنچے تھے۔ اس قسم کے بدمعاش اور دہشت گرد عموماً اپنے کسی نہ کسی آقا کے بڑے وفادار ہوتے ہیں۔ ممکن ہے وہ اسی وفاداری کے تحت وہ کھیپ واپس حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ قاسم بجلی کی موت کے بعد اس کی بھی نیت خراب ہو گئی ہو اور وہ ہیرے اپنے لیے حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ یوں وہ اس سلسلے میں تیسرا اُمیدوار بن گیا ہو۔ اس کا تو کچھ ایسا ہی کردار سمجھ میں آتا ہے۔"

"اب تم نے مشتاق مدثر کے لیے چارا پھینکا ہے کہ ہیرے اسی اپارٹمنٹ میں فرحین کے بیڈ روم میں موجود ہیں۔ تمہارا خیال ہے، وہ انہیں حاصل کرنے کے لیے دوڑا آئے گا؟" رحیم گل نے تصدیق چاہی۔

"جس چیز کے لیے اس نے دو قتل کر دیے اور تیسرا قتل کرنے کے لیے تیار تھا..... اس کے لیے اسے دوڑے تو آنا چاہیے" میں نے جواب دیا۔

"اور یہ تم نے فرحین کے بیڈ روم میں چوپائے کا ذکر کیوں کیا؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"ظاہر ہے..... اپنی بات کو ذرا متاثر کن بنانے کے لیے۔ اب اتنی بھی سادگی اچھی نہیں تھی کہ میں آرام سے اس سے کہہ دیتا کہ جا کر فرحین کے بیڈ کے سرہانے سے ہیرے نکال لو" میں نے کہا "اس بیڈ کے چار پائے ہیں جو صاف دکھائی دے رہے ہیں اور اس کمرے میں کوئی چوپایا موجود نہیں۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ ذرا توجہ سے کمرے کا جائزہ لے گا اور ذرا ذہن پر زور دے گا تو بات اس کی سمجھ میں آ جائے گی۔ اُمید ہے اب یہ سارا چکر تمہاری سمجھ میں بھی آ گیا ہوگا۔ ویسے اس قسم کی اُمید رکھنی تو نہیں چاہیے۔ پولیس والوں کا دماغ ذرا موٹا ہی ہوتا ہے۔"

"بکواس کی ضرورت نہیں" وہ منہ بنا کر بولا "ہیرے ملنے کے بعد چکر تو کافی حد تک میری سمجھ میں آنے لگا تھا لیکن تم ذرا لکی آدمی ہو۔ تمہیں اس زنجیر کی گمشدہ کڑیاں ملتی چلی گئیں۔ میرے حق میں یہ اچھا ہوا کہ مجھے تمہارا کندھا میسر آ گیا جس پر اب میں بندوق رکھ کر چلا سکتا ہوں۔ کوئی غلطی ہو گئی تو مجھ سے زیادہ تم ذمے دار ہو گے۔"

"میرا خیال ہے باتیں بہت ہو چکی ہیں۔ اب ہمیں ڈریسنگ روم میں چھپ جانا چاہیے اور دیکھنا چاہیے کہ پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا "اب تک تو شاید مشتاق تمہارے گھر سے تصدیق بھی کر چکا ہوگا کہ تم واقعی سو رہے ہو۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ اس وقت عمارت میں داخل ہو چکا ہو۔"

ہم نے ڈریسنگ روم میں گھس کر دروازہ اندر سے مقفل کر لیا۔ ہم دونوں کے لیے بیک وقت چھوٹے سے "سلائڈ گلاس" سے باہر جھانکنا ذرا مشکل تھا لیکن فی الحال اس کی ضرورت بھی نہیں تھی اس لیے ہم صبر و سکون سے دونوں طرف دیواروں سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔

ہمیں اپنے اندازوں سے زیادہ دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ شاید مشتاق کہیں دور سے آ رہا تھا یا پھر شاید اس نے آنے سے پہلے کافی وقت سوچ بچار میں صرف کیا تھا۔ بہرحال ہمیں باہر کے تالے میں چابی گھومنے کی خفیف سی آواز سُنائی دی اور ہم جلدی سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

میں نے سرگوشی میں کہا "بدبخت کے پاس چابی بھی موجود ہے... معلوم نہیں کہاں سے... اور کس طرح حاصل کی ہوگی... یا بنوائی ہوگی۔"

چند لمحے بعد ہم نے دروازہ کھلنے اور پھر نہایت آہستگی سے بند ہونے کی خفیف سی "کلک" سُنی لیکن اس کے بعد کئی منٹ تک مشتاق بیڈ روم میں نہیں پہنچا۔ وہ شاید پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا یا پھر کسی ایک ہی جگہ رُک کر فضا کو "سونگھ" رہا تھا۔ میں اور رحیم گل گردنیں ٹیڑھی کیے اور سر ایک دوسرے سے جوڑے ایک ایک آنکھ شیشے سے لگائے کھڑے تھے۔

خدا خدا کر کے ہمارا انتظار ختم ہوا اور بیڈ روم کا دروازہ آہستگی سے کُھلا۔ اندر جھانکنے والا مشتاق مدثر ہی تھا۔ وہ کچھ اس انداز میں اندر آ رہا تھا جیسے شیر کی کچھار میں داخل ہو رہا ہو لیکن کمرے کا جائزہ لینے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ اندر آ کر اس نے ایک ایک چیز کو غور سے دیکھنا شروع کیا پھر اس نے بیڈ کے نیچے جھانکا۔

وہ میرے اندازے سے زیادہ جلدی نتیجے پر پہنچ گیا۔ چند لمحے بعد اس نے سیدھے کھڑے ہو کر از سرِ نو کمرے کا جائزہ لیا اور اس کی نظر بیڈ کے چاروں پایوں سے ہوتی ہوئی آخر کار سرہانے کے تختے پر آ کر رُک گئی۔ بیڈ کے چاروں پائے شیر کی ٹانگوں کی سی

ساخت کے تھے اور سرہانے کی طرف محرابی قسم کا ڈیزائن سا بنا ہوا تھا۔ مشتاق کو اسی ڈیزائن میں چھپے ہوئے چاروں اسکریو بھی نظر آگئے اور وہ جھک کر ان کا جائزہ لینے لگا۔ اس نے ان پر انگلی پھیر کر بھی دیکھا۔ چند لمحے بعد وہ دبے قدموں واپس چلا گیا۔

"یہ کہاں گیا ہوگا؟" رحیم گل نے مجھ سے پوچھا "اسکریو ڈرائیور لینے؟"

"ظاہر ہے" میں نے جواب دیا "کاش ہم اپنے اوزار اس کی خدمت میں پیش کرسکتے۔ بے چارے کا کافی وقت بچ جاتا۔"

کچھ دیر بعد وہ اپنی کار کی ٹول کٹ اُٹھائے واپس آگیا۔ اس نے مناسب سائز کا ایک اسکریو ڈرائیور منتخب کیا اور پھرتی سے اسکریو کھول ڈالے۔ وہ آسانی سے کھلنے والے اسکریو تھے۔ مشتاق نے بے تابی سے بیڈ کا تختہ ہٹا کر ایک طرف رکھا۔ اسے پیکٹ سامنے ہی رکھا نظر آگیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ویسا پیکٹ پہلے بھی دیکھ چکا تھا یا نہیں۔ بہرحال میں نے احتیاطاً اصل پیکٹ کی نقل تیار کرائی تھی۔

اس نے جھپٹ کر پیکٹ اُٹھالیا۔ کمرے میں روشنی زیادہ نہیں تھی اور مشتاق نے غالباً ازراہِ احتیاط لائٹ آن نہیں کی تھی لیکن ہم اس کے تاثرات دیکھ سکتے تھے۔ وہ گویا ریشہ خطمی ہوا جارہا تھا۔ چند لمحے تک تو وہ پیکٹ کو دونوں ہاتھوں میں تھامے عجیب سے انداز میں تکتا رہا۔ شاید اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ گرد و پیش کی اور کسی چیز کی طرف گویا اس کا دھیان نہیں رہا تھا۔

پھر یکدم اس نے تیزی سے پیکٹ کھولنا شروع کردیا۔ بیڈ کے قریب کھڑے کھڑے اس نے اوپر کا کاغذ پھاڑ ڈالا پھر گتے کی پیکنگ کھولنے لگا جو خاصی مضبوط تھی۔ جلدی جلدی تمام گتا پھاڑ کر اس نے اِدھر اُدھر پھینک دیا۔ جوں جوں پیکٹ کی تہیں کھلتی جارہی تھیں، اس کی بے تابی بڑھتی جارہی تھی۔ میں دولت کی ہوس کے اس قسم کے مظاہرے دیکھ کر اکثر ہی حیران ہوتا تھا۔ مشتاق مدثر کو اس وقت چونکہ یہ احساس بھی تھا کہ کمرے میں وہ تنہا تھا اس لیے اپنے تاثرات کی شاید اسے کچھ زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔

گتے کی پیکنگ میں سے بالآخر چرمی تھیلی نظر آئی تو مشتاق کی حالت اور بھی عجیب ہوگئی۔ ایک لمحے کے لیے وہ اسے بھی دونوں ہاتھوں میں تھامے دیوانوں کی طرح تکتا رہا پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بے آواز طریقے سے ہنس رہا تھا۔ آخر اس نے بریف کیس نما اس تھیلی کی زپ بھی کھول ڈالی اور نہایت احتیاط سے ایک ہاتھ پر "ہیرے" نکالنے لگا۔

ہیرا بھی محض ایک پتھر ہی ہوتا ہے اور اس کی ہتھیلی پر جمع ہونے والے بھی پتھر ہی تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان میں چمک دمک نہیں تھی۔ وہ ماربل کے ٹکڑے تھے جو آرائشی گملوں وغیرہ میں ڈالنے یا فرش وغیرہ بنانے میں کام آتے تھے۔

مشتاق نے ساری تھیلی اپنے بڑے سے ہاتھ پر خالی کرلی۔ کچھ پتھر نیچے بھی گر گئے۔ تھیلی خالی ہوئی تو اسے گویا سکتہ سا ہوگیا۔ وہ بُت بن کر رہ گیا۔ اس لمحے مجھے اس کی حالت قابلِ رحم دکھائی دی۔ پھر یک دم ہی وہ یوں چونکا جیسے اسے کرنٹ لگا ہو۔ وہ یکدم حرکت میں آیا اور کھڑکیوں پر آویزاں پردوں کی طرف دیکھنے لگا جو فرش تک پہنچ رہے تھے۔ اچانک ہی وہ کسی درندے کی طرح چوکنا دکھائی دینے لگا تھا۔ اس نے یقیناً خطرہ محسوس کرلیا تھا کہ شاید اس کے ساتھ مذاق کیا گیا تھا... اور اگر یہ مذاق تھا تو مذاق کرنے والا قریب بھی ہوسکتا تھا۔

اسے غالباً شبہ ہوا تھا کہ کوئی پردوں کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ان کی طرف گھومنے کی وجہ سے اس کی پشت ہماری طرف ہوگئی تھی۔ میرے خیال میں یہ باہر آنے کے لیے مناسب وقت تھا۔ میں نے رحیم گل کو کہنی ماری۔ ہم نے بے آواز طریقے سے ڈریسنگ روم کا دروازہ کھولا اور باہر آگئے۔ رحیم گل کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔ مشتاق کو بہرحال گہرے سکوت میں ہماری نقل و حرکت کی خفیف سی سرسراہٹ بھی سُنائی دے گئی۔ وہ کسی درندے ہی کی طرح تیزی سے گھوما۔

"ہیرے نہ پاکر شاید تمہیں بہت ہی مایوسی ہوئی ہے مشتاق ڈیئر!" میں نے پرسکون لہجے میں کہا اور ہاتھ بڑھا کر لائٹ آن کردی۔ سوئچ بورڈ قریب ہی تھا۔ اس کے چہرے پر جو وحشت و خونخواری تھی اس نے اسے درندے سے بھی بدتر کوئی چیز بنادیا تھا۔

اچانک ہی مجھے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ میں ایک کھلا استرا تھا۔ وہ عام سائز کے استروں سے کافی بڑا تھا اور روشنی میں اس کا چوڑا پھل جھلملا رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس کے ہاتھ میں وہ استرا کسی دودھاری خنجر سے زیادہ خطرناک محسوس ہورہا تھا۔

"اپنی جگہ سے حرکت مت کرنا ڈیئر مشتاق!" رحیم گل سرد لہجے میں بولا پھر اس نے بڑی ملائمت سے پوچھا "کیا فرحین اور جمیل کو تم نے اسی استرے سے ذبح کیا تھا؟"

مشتاق کے حلق سے کسی درندے کی سی خرخراہٹ اُبھری۔ اس نے ایک نظر دروازے کی طرف دیکھا لیکن ہم دونوں اس کا راستہ روکے ہوئے تھے۔ اچانک اس نے رحیم گل کی ہدایت اور اس کے ریوالور کی پروا کئے بغیر اس پر چھلانگ لگائی۔ میں نے استرے کا پھل بجلی کی طرح ایک ثانیے کے لیے فضا میں چمکتے دیکھا۔ فوراً ہی فائر کا دھماکا گونجا مگر مشتاق مدثر کے بجائے رحیم گل ڈھیر ہوگیا۔ میں نے رحیم گل کی ہلکی سی چیخ سُنی۔

مشتاق واقعی چیتے کی طرح پھرتیلا اور طاقتور تھا۔ اس کی لات کسی شہتیر کی طرح میرے سینے سے ٹکرائی۔ میں لڑکھڑایا اور وہ بگولے کی طرح میرے قریب سے گزر کر دروازے سے نکلا چلا گیا۔

میں فوراً ہی سنبھل گیا لیکن ایک ثانیے کے لئے میرے سامنے بہت بڑی اُلجھن آن کھڑی ہوئی اور وہ یہ کہ میں رحیم گل کی طرف توجہ دوں جو ایک طرف لڑھک چکا تھا... یا مشتاق مدثر کے

تعاقب میں بھاگوں جو بگولے کی طرح کمرے سے نکل بھاگا تھا۔

ظاہر ہے ایسے معاملات میں سوچ بچار میں وقت ضائع نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا اور رحیم گل کو اس کے حال پر چھوڑ کر مشتاق مدثر کے تعاقب میں بھاگا۔

مکان یا فلیٹ وغیرہ کا کشادہ ہونا ایک بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے لیکن اس وقت مجھے فرحین کے اپارٹمنٹ کا کشادہ ہونا بہت گراں گزرا۔ ایک لمحے کے لئے میں سوچے بغیر نہ رہ سکا بھلا اکیلی لڑکی کو اتنا بڑا اپارٹمنٹ لینے کی کیا ضرورت تھی؟ پھر بدقسمتی یہ کہ بے چاری کو اس اپارٹمنٹ میں رہنا نصیب بھی نہیں ہوا تھا۔

دوسرے ہی لمحے مجھے یہ بھی خیال آیا کہ اچھے اور بڑے گھر میں رہنا شاید زیادہ تر انسانوں کی لاشعوری خواہش ہوتی ہے۔ میں بھی اکیلا ہی تھا لیکن دولت آتے ہی میں نے ایک طویل و عریض، قلعہ نما گھر بنوایا تھا۔ مجھے بھی اس میں زیادہ عرصہ رہنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ چند لمحوں میں وہ دھماکوں کے ساتھ زمیں بوس ہوگیا تھا اور کچھ ہی دیر بعد اس کی جگہ ملبے اور کوئلوں کا انبار رہ گیا تھا۔ برسوں میں بننے والی چیزیں چند لمحوں میں کتنی بے وقعت ہوجاتی ہیں۔

یہ خیالات ذہن میں آنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مجھے کافی بڑے لاؤنج اور راہداریوں وغیرہ سے گزر کر بیرونی دروازے تک پہنچنا پڑا اور اس میں چند قیمتی سیکنڈ صرف ہوگئے۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے مشتاق مدثر اس اپارٹمنٹ کی ساخت اور فرنیچر کی ترتیب وغیرہ سے مجھ سے کہیں بہتر طور پر واقف تھا کیونکہ وہ کسی چیز سے ٹکرائے بغیر گویا بھاگتا ہوا نہیں بلکہ تقریباً اُڑتا ہوا اپارٹمنٹ سے نکل گیا تھا۔

میں بیرونی دروازے پر پہنچا تو وہ سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آدھی سیڑھیاں تو وہ ایک ہی چھلانگ میں پھلانگ جائے گا۔ اس کی پھرتی حیران کن تھی لیکن اسی لمحے اس سے بھی زیادہ حیران کن نظارہ میری آنکھوں نے دیکھا۔ سیڑھیوں کے کنارے تقریباً ایک فٹ چوڑی ایک آرائشی دیوار بنی ہوئی تھی۔ اس دیوار کی اوٹ سے، خاکی پتلون میں چھپی ہوئی ایک ٹانگ اچانک ہی برآمد ہوئی اور مشتاق مدثر اس ٹانگ میں اُلجھ کر میری نظر سے غائب ہوگیا۔ ہر آٹھ دس سیڑھیوں کے بعد لینڈنگ تھی۔ آوازوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ لڑھکتا ہوا لینڈنگ تک پہنچ گیا تھا۔

اسی لمحے پھٹی پھٹی سی آواز گونجی "خبردار... رُک جاؤ۔" اس کے ساتھ ہی آرائشی دیوار کی اوٹ سے وہ کانسٹیبل نکل آیا جسے ہم نے چھت پر بھیجا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں رائفل تھی اور اس کا رُخ نیچے لینڈنگ کی طرف تھا۔ اس نے بڑا کمال دکھایا تھا کہ نہایت صحیح وقت پر ٹانگ اَڑا کر مشتاق مدثر کو سیڑھیوں سے لڑھکا دیا تھا اور اب اسے رُکنے کا حکم دے رہا تھا۔ شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی کھوٹا پیسہ بھی کام آجاتا ہے۔ اس وقت میرا اس کانسٹیبل پر قربان جانے کو دل چاہا۔

میں سیڑھیوں تک پہنچ چکا تھا۔ میں نے دیکھا مشتاق مدثر اس دوران لینڈنگ سے اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں نے اس کے گرنے کی

جس طرح کی آوازیں سُنی تھیں ان سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ شاید وہ بے ہوش ہوگیا ہو اور کوئی بعید نہیں کہ گردن ہی تڑوا بیٹھا ہو لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ اس میں اتفاق کے علاوہ اس کی سخت جانی کو بھی دخل تھا۔ تاہم اتنا ضرور تھا کہ اس کے حواس کچھ مختل سے ہوچکے تھے۔ وہ دیوار کا سہارا لے کر اُٹھ رہا تھا۔

اس نے کانسٹیبل کی للکار پر قطعاً کان نہیں دھرا تھا اور اگلی سیڑھیوں کی طرف بڑھنے لگا تھا۔ کانسٹیبل بے چارہ تذبذب میں تھا۔ رائفل اس کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ گولی نہیں چلا رہا تھا۔ شاید اس میں افسر کے حکم کے بغیر گولی چلانے کی ہمت نہیں تھی۔ اور افسر اس وقت آس پاس کوئی موجود نہیں تھا۔

بہرحال اس نے جو کام کردیا تھا' میرے لئے وہی بہت تھا۔ اس نے مجھے اتنی مہلت مہیا کردی تھی کہ میں مشتاق کے سر پر جا پہنچا تھا ورنہ عین ممکن تھا کہ وہ نکل جاتا۔ مجھے اس کا تعاقب شروع کرنے میں دو تین سیکنڈ کی تاخیر ہوگئی تھی اور وہ میرے اندازے سے زیادہ پھُرتیلا ثابت ہوا تھا۔ اس کے اور میرے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ مجھے خود کچھ زیادہ اُمید نہیں تھی کہ میں اسے پکڑ سکوں گا لیکن کانسٹیبل کا اس وقت چھت کے بجائے یہاں موجود ہونا اور بروقت ٹانگ اُڑا دینا میرے لئے امدادِ غیبی ثابت ہوا تھا۔

میں نے لینڈنگ پر چھلانگ لگائی تو مشتاق نے صحیح طور پر حواس میں نہ ہونے کے باوجود پلٹ کر نہایت تیزی سے ہاتھ گھمایا۔ غنیمت یہ تھا کہ اس وقت اس کے ہاتھ میں استرا نہیں تھا ورنہ میرے لئے اپنی گردن بچانا مشکل ہوجاتا۔ استرے سے لڑنے اور وار کرنے کی ایک الگ ہی ٹیکنک ہوتی ہے اور وہ اس میں بہت ماہر معلوم ہوتا تھا لیکن اس کی بدقسمتی اور میری خوش قسمتی یہ تھی کہ استرا اس کے ہاتھ سے گر چکا تھا۔

اس کا ہاتھ میری گردن پر پڑا تھا اور ایک لمحے کے لئے میرا پورا وجود جھنجھنا کر رہ گیا تھا لیکن اس جھنجھناہٹ کو برداشت کرتے ہوئے میں نے اس کی گردن پر اس سے کہیں زیادہ نپا تُلا اور بھرپور ہاتھ رسید کیا۔ اس وقت چونکہ اس کا ایک پاؤں لینڈنگ پر اور دوسرا سیڑھی پر تھا اس لئے اس کا توازن پہلے ہی کچھ صحیح نہیں تھا۔ گردن پر ہاتھ پڑتے ہی وہ ماربل کی سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا سیدھا دوسری لینڈنگ پر جا پہنچا۔ گرنے سے پہلے اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ اس بار وہ نہیں اُٹھ سکا۔

میں نے نیچے پہنچ کر اسے کالر سے پکڑ کر اُٹھایا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ رہا تھا اور وہ یوں اِدھر اُدھر جھول رہا تھا جیسے اسے چکر آرہے ہوں' تاہم وہ بے ہوش نہیں تھا اور آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس عالم میں بھی اس نے بازو لہرا کر مجھ پر وار کرنے کی کوشش کی اور تب مجھے اندازہ ہوا' وہ شاید اب بھی یہی محسوس کررہا تھا کہ اس کے ہاتھ میں استرا موجود تھا۔ اپنی دانست میں اس نے میرا گلا کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ میں نے اس کے دونوں بازو مروڑ کر پشت پر لے جا کر قابو میں کرلئے۔ اب اس میں کوئی خاص مزاحمت باقی نہیں تھی۔ دو مرتبہ سیڑھیوں سے لڑھک کر اس کے کس بل نکل گئے تھے لیکن اس کی سخت جانی میں کوئی شبہ نہیں تھا۔ جس انداز میں وہ گرا تھا' اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید بے ہوش ہوچکا ہوتا۔

بازو مروڑے جانے پر وہ کراہا اور لڑکھڑاتی آواز میں بولا "تم بہت مردود اور خبیث آدمی ہو۔"

"تم سے کم۔" میں نے اسے واپس اوپر کی سیڑھیوں کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

"میں نے زندگی کی.... سب سے بڑی.... غلطی کی... میں نے تمہیں بہت انڈر ایسٹی میٹ کیا....." وہ میرے دھکیلنے پر سیڑھیاں چڑھتا جارہا تھا اور بڑبڑانے کے سے انداز میں بولتا جارہا تھا۔

"اس میں تمہاری کوئی غلطی یا میرا کوئی کمال نہیں تھا میری جان!" میں نے ملائمت سے کہا "یہ قدرت کا اپنا ایک نظام ہے۔ انسانی جانوں سے کھلونوں کی طرح کھیلنے والوں کو کسی نہ کسی طرح..... کسی نہ کسی بہانے سے آخرکار اپنے انجام کو پہنچنا ہوتا ہے۔ قدرت نے تمہیں سنبھلنے کے لئے یقیناً کافی مہلت دی ہوگی۔ تم نہیں سنبھلے..... مہلت ختم ہوگئی۔"

"چُپ کر بدمعاش! مولوی بننے کی کوشش مت کر....." وہ شاید دانت پیس کر بولا۔ دل تو چاہا کہ اسے ایک اور زوردار ہاتھ رسید کروں جو اس کی روح تک کو جھنجھنا دے لیکن بصد کوشش میں نے اپنی کھوپڑی ٹھنڈی رکھی۔ وہ بے دم تھا اور میرے قابو میں تھا۔ قابو میں آئے ہوئے انسان کو کیا مارنا۔

کانسٹیبل اوپر کھڑا تھا۔ وہ مستعدی سے گن سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کی بیلٹ میں ہتھکڑی بھی موجود تھی۔ میں نے مشتاق کو اس کے سامنے دھکیلتے ہوئے کہا "اسے ہتھکڑی لگادو۔"

"ہتھکڑی.....؟" اس نے ذرا پریشان ہوکر پہلے ہتھکڑی کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا "میں ہتھکڑی کیسے لگا سکتا ہوں سر؟ جب تک افسر کا حکم نہ ہو۔"

"خدا کی پناہ!" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔ اس لمحے میرا سر پیٹنے کو دل چاہا! "غلط کام تو تم لوگ اپنی مرضی سے ہی کرلیتے ہو۔ کوئی صحیح کام کرنے کے لئے افسروں کے حکم کا انتظار شروع کردیتے ہو خواہ اتنی دیر میں خون کی ندیاں بہہ جائیں۔"

میں سوچ رہا تھا کہ اس کی بیلٹ سے ہتھکڑی نکال کر خود ہی مشتاق کو پہنا دوں اور یوں "قابلِ دست اندازیٔ پولیس" جرم کا مرتکب ہوجاؤں لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اسی لمحے مجھے ایک خوشگوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ میں نے دیکھا رحیم گل فلیٹ سے باہر آرہا تھا۔

اس کے بازو پر سفید کپڑا لپٹا ہوا تھا جس پر سُرخی نمودار ہورہی تھی۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اس بازو کو تھامے ہوئے تھا۔ اس کی رنگت کچھ زردی سی دکھائی دے رہی تھی۔

"شکر ہے تم زندہ ہو۔" میں نے اطمینان کی گہری سانس لے کر کہا "میں تو ڈر رہا تھا....." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"کہ میرا کام تمام ہوگیا۔" وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ "میں بھی یہی سمجھا تھا۔ استرا بالکل میری گردن کے قریب جھلملایا تھا۔ معلوم نہیں کب غیرارادی طور پر میرا بازو سامنے آگیا تھا اور وہ بھی تقریباً کٹ کر گرتے گرتے بچا ہے۔ کافی گہرا زخم آیا ہے۔" وہ ایک ہاتھ سے سختی سے کپڑے کو دبائے ہوئے تھا اور یوں خون کا بہاؤ روکے ہوئے تھا۔

پھر وہ قہر آلود نظروں سے مشتاق بدر کو گھورتے ہوئے بولا "کسی بدکردار حجام کی ناجائز اولاد.....! تو نے یہ استرے سے قتل کرنا کہاں سے سیکھا؟" ساتھ ہی اس نے گویا دانت پیس کر مشتاق کو لات رسید کی۔ مشتاق بلبلا کر رہ گیا۔ کوئی جواب نہ دے سکا۔ وہ میری گرفت میں ایک لمحے کے لئے مچل کر پہلے سے زیادہ ڈھیلا پڑ گیا۔

"تم نے تو یہیں تفتیش شروع کردی۔" میں نے رحیم گل کو مخاطب کیا "تفتیش کا یہ انداز تمہارے لئے فی الحال ٹھیک نہیں۔ کہیں جھٹکا لگنے کی وجہ سے زخم سے خون نہ بہنے لگے۔" میں دیکھ رہا تھا کہ اس کی گرفت کے باوجود سفید کپڑے پر سُرخی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ گو کہ ہمت سے کام لے رہا تھا لیکن اس کا زخم خطرناک ہی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے مشتاق کو ایک طرف کو دھکیلتے ہوئے کہا "اپنے کانسٹیبل سے کہو اسے ہتھکڑی تو لگائے۔ تمہارے حکم کے بغیر یہ اس معزز قاتل کو ہتھکڑی لگانے کے لئے بھی تیار نہیں ہے۔ شکر ہے جب یہ خبیث بھاگ رہا تھا تو تمہارے کانسٹیبل نے اس کے راستے میں ٹانگ اُڑانے کے لئے تمہارے حکم کا انتظار نہیں کیا ورنہ یہ تو نکل گیا تھا۔ اس چھوٹی سی بہادری اور عقل مندی پر تمہارا محکمہ اس کانسٹیبل کو انعام دے یا نہ دے' میں ضرور دوں گا۔"

رحیم گُل نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کانسٹیبل کو اشارہ کیا اور اس نے آگے بڑھ کر مشتاق کو ہتھکڑی لگادی۔ مشتاق مضمحل ضرور تھا لیکن اس کی سرکشی و خباثت میں کوئی خاص کمی نہیں آئی تھی۔ لالھو رنگ آنکھوں سے رحیم گُل کو گھورتے ہوئے جنھی جنھی سی آواز میں بولا "ہتھکڑی لگانا اور بات ہے' جرم ثابت کرنا اور بات..... تم میرے خلاف کچھ ثابت نہیں کرسکو گے۔"

"شاباش میرے شیر!" میں نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی "میں تمہارے بلند حوصلے کی داد دیتا ہوں۔ ہمارے ہاں اب قاتلوں' ڈاکوؤں' ناجائز دھندے کرنے والوں اور دہشت گردوں کے حوصلے ہی بلند رہ گئے ہیں۔"

رحیم گُل اسے غضب ناک نظروں سے گھورتے ہوئے بولا "اگر میں تم جیسے آدمی کو بھی سزا نہ دلوا سکا تو پھر میں پولیس کی ملازمت ہی چھوڑ دوں گا۔"

ہم دونوں مشتاق کو کانسٹیبل کی نگرانی میں چھوڑ کر واپس فلیٹ میں آئے۔ مشتاق کی ہتھکڑی میں نے ایک کھڑکی کی گرل میں مقفل کردی تھی اور رحیم گُل نے کانسٹیبل کو اس کی نگرانی پر مامور کرتے ہوئے سختی سے ہدایت کی کہ اگر وہ بھاگنے کی ذرا بھی کوشش کرے تو وہ بلا تامل اسے گولی مار دے۔

اندر آکر میں نے کچھ چیزیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر ذرا بہتر طور پر اس کے بازو پر کس کر دوہری پٹی باندھی تاکہ اسپتال پہنچنے تک خون کا بہاؤ رُکا رہے پھر میں نے اپنا فون وغیرہ اُٹھایا۔ فرحین کے بیڈ روم میں جہاں رحیم گُل گرا تھا وہاں اس کا بہت سا خون پھیلا ہوا تھا۔ اسی کمرے میں ابھی تک فرحین کے بیڈ پر اس کا خون جذب تھا۔ یہ خاصا خون آشام سا کمرا تھا۔

واپس باہر آکر ہم نے فلیٹ کو دوبارہ تالا لگایا اور کانسٹیبل کو ایک بار پھر وہیں ڈیوٹی پر بٹھا کر' مشتاق بدر کی ہتھکڑی کھڑکی کی گرل سے کھول کر نیچے چل دیئے۔ اب کوئی عجلت نہیں تھی' اس لئے ہم لفٹ کے ذریعے جارہے تھے۔ مشتاق اب خاموش اور ست نظر آرہا تھا۔ اس کی خونخواری اور درندگی اب گویا رخصت ہوچکی تھی لیکن میرا اندازہ تھا کہ وہ گہری سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ اس کا ذہن کسی ادھیڑبن میں تھا اس لئے وہ دھیما پڑ گیا تھا۔ رحیم گُل اپنے بازو کو بدستور گرفت میں لئے اور ذرا اونچا کئے ہوئے تھا تاکہ خون کا بہاؤ روکے رکھنے میں مدد ملے۔ اس وقت اس کی جگہ میں ہی پولیس آفیسر کے فرائض انجام دے رہا تھا اور مشتاق بدر کی ہتھکڑی مضبوطی سے پکڑے چل رہا تھا اور دل ہی دل میں یہ تہیہ بھی کئے ہوئے تھا کہ اگر اس نے بھاگنے کی معمولی سی بھی کوشش کی تو اس کی ذرا ٹھیک ٹھاک قسم کی ٹھکائی کروں گا۔ اگر وہ اب بھی بھاگنے کی کوشش کرتا تو اس کا مطلب یہی ہوتا کہ اس کی ٹھکائی میں کسر رہ گئی تھی اور وہ کسر پوری ہوجانی چاہئے تھی۔

ہم عمارت کی چار دیواری سے باہر آگئے۔ مشتاق نے بھاگنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی۔ شاید اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ اس قسم کی کوشش فضول تھی۔ آتے وقت ہم نے گاڑی احتیاطاً عمارت سے کافی دور چھوڑی تھی۔ مشتاق بدر کی گاڑی بھی آس پاس کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ شاید اس نے بھی کسی وجہ سے ایسی ہی احتیاط کی تھی۔

ہم نے مشتاق مدثر سے اس کی گاڑی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا اور خاموشی سے اس طرف چل دیئے جہاں ایک زیرِ تعمیر عمارت کے عقب میں ہماری گاڑی موجود تھی۔ ہم ابھی چند قدم ہی چلے تھے کہ ہلکی سی سنسناہٹ اور کھٹکے کی سی آواز سُنائی دی اور مشتاق مدثر کچی ریتیلی زمین پر اوندھے منہ گر پڑا۔ میرے ہاتھ میں موجود ہتھکڑی کی وجہ سے مجھے بھی جھٹکا لگا لیکن میں اس جھٹکے کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے مشتاق ہی کے انداز میں گر پڑا کیونکہ مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ مشتاق کے گرنے کی وجہ کیا تھی۔

رحیم گُل نے بھی معاملے کو سمجھنے میں سستی نہیں دکھائی اور اپنے بازو کو بچاتے ہوئے پہلو کے بل ڈھیر ہوگیا۔ گویا ہم تینوں تقریباً بیک وقت ہی ڈھیر ہوئے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ مشتاق مدثر اپنی مرضی سے یا احتیاطاً منہ کے بل نہیں گرا تھا۔

عمارت سڑک سے ہٹ کر تھی اور اس کے گرد ساحلی زمین کافی دور تک کچی اور ریتیلی تھی۔ میں اور رحیم گُل کئی لمحے تک ساکت رہے۔ میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا لیکن اس کے بعد سنسناہٹ کی سی آواز دوبارہ سُنائی نہیں دی۔ اس کے بجائے کہیں دور کسی کار کے انجن کی غراہٹ اور ٹائروں کی چرچراہٹ سُنائی دی۔

میں نے ذرا سر اونچا کرکے آواز کی سمت میں دیکھا لیکن اس طرف مجھے کوئی کار دکھائی نہیں دی۔ اس طرف بھی ایک ادھوری عمارت موجود تھی اور کار کی آواز اسی کے عقب سے اُبھری تھی۔ چند سیکنڈ کے اندر آواز معدوم ہوگئی۔

"وہ جو بھی تھا...... نکل گیا۔" رحیم گُل کراہ کر بولا۔

"اگر تم یہاں صورتِ حال کو سنبھال لو تو میں اس کا تعاقب کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"نہیں" وہ کچھ سوچ کر بولا "معلوم نہیں وہ ہاتھ آئے یا نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ تم میرے ساتھ رہو۔ میں اس بازو کی وجہ سے اس قابل نہیں ہوں کہ کسی ایمرجنسی سے نمٹ سکوں۔"

میں نے فرار ہونے والے اَن دیکھے شخص کے تعاقب میں جانے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ رحیم گُل ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اسے اس کے زخمی بازو اور ایک عدد لاش کے ساتھ تنہا چھوڑ کر میرا جانا ٹھیک نہیں تھا۔ مشتاق مدثر کے بارے میں مجھے یقین ہوچکا تھا کہ وہ اب زندہ نہیں رہا تھا' لاش میں تبدیل ہوچکا تھا۔ تاہم تصدیق کے لئے میں نے اسے سیدھا کیا۔

اس کی پیشانی زخمی اور خون آلود تو پہلے ہی تھی لیکن اب تو مٹی اور خون میں کچھ زیادہ ہی لتھڑ گئی تھی۔ میں نے اس کا سر ذرا اونچا کیا تو خون باقی چہرے پر بھی پھسل آیا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ بائیں آنکھ سے ذرا اوپر گولی کا سوراخ نظر آرہا تھا۔ گولی یقیناً سائیلنسر لگی رائفل سے چلائی گئی تھی۔ ہمیں شاید کسی مصلحت کی وجہ سے بخش دیا گیا تھا یا پھر شاید فوری طور پر اوندھے منہ گر جانے کی وجہ سے ہم نشانے پر نہیں آئے تھے۔

رحیم گُل اپنے زخمی بازو کو سنبھالتے ہوئے اُٹھ بیٹھا اور مشتاق مدثر پر جھک کر اس کا جائزہ لینے کے بعد کراہ کر بولا "فضل چوہدری! تم نے مجھے مروادیا۔"

"مجھے تو تم اچھے خاصے زندہ نظر آرہے ہو۔ مرا تو مشتاق مدثر ہے۔" میں نے گویا اس کی غلط فہمی دور کی۔

"اس سے تو بہتر تھا کہ میں ہی مرجاتا۔" وہ پہلے سے زیادہ دردناک لہجے میں بولا۔

"ایسی بدفال منہ سے مت نکالو یار۔ تم جیسے آفیسر تو ویسے ہی ہمارے ہاں کمیاب...... بلکہ نایاب ہیں۔" پھر میں نے مشتاق مدثر کی طرف اشارہ کیا "اس جیسے خبیثوں کا کیا ہے' یہ تو روز پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں۔"

"لیکن یہ خبیث مر کر میرے گلے پڑگیا ہے۔ تم بات کو سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ میری تحویل میں مارا گیا ہے۔ میں سادہ لباس میں ہوں۔ بلڈنگ کا چوکیدار اور دوسرے دوچار لوگ فلیٹوں کی کھڑکیوں سے جھانک رہے ہیں۔ وہ اصل منظر تو دیکھ نہیں سکے اور نہ ہی اصل بات سمجھ سکیں گے۔ پریس والوں میں اگر کچھ مشتاق مدثر کے حمایتی نکل آئے تو وہ بڑی آسانی سے بات کا رُخ بدل دیں گے کہ پولیس والے بعض لوگوں کو اسی طرح مار کر اسے پولیس مقابلہ یا کسی دوسرے کی کارروائی قرار دے دیتے ہیں۔ بلکہ پریس میں خواہ مشتاق مدثر کے حامی ہوں یا نہ ہوں' انہیں چھاپنے کے لئے اس طرح کی چٹخارے دار اور متنازعہ کہانیوں کی تلاش رہتی ہے۔ چھوٹے اخبار والوں کو تو مرضی کا مواد نہ ملے تو خود ہی گل پھندنے لگا لیتے ہیں۔ بہرحال تم نے بیٹھے بٹھائے یہ خواہ مخواہ کی مصیبت میرے گلے ڈلوادی ہے۔"

"میری جان! زندگی میں ایک اصول بنالو۔" میں نے مشفقانہ لہجے میں مشورہ دیا "اگر تم نے کوئی غلط کام نہیں کیا تو بالکل مت ڈرو۔ خواہ ہمارا معاشرہ کتنا ہی اُلٹ پلٹ ہے۔ خواہ یہاں بُرے لوگ کتنی ہی کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں اور خواہ ہمارا نظام کتنا ہی خراب ہے۔ اگر تم ٹھیک ہو تو کوئی غیبی قوت تمہاری حفاظت کرے گی۔ اگر تم پر مشکلات آئیں گی بھی...... تو وہ عارضی ہوں گی۔"

"مجھے کیا سمجھا رہے ہو۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میرا اصول یہی ہے اور مجھے زندگی میں تجربات بھی ہمیشہ اسی قسم کے ہوئے ہیں۔"

"پھر تو تمہیں اس طرح کی بات ہی نہیں کرنی چاہئے تھی۔" میں نے کہا۔

"بات کرنے میں کیا حرج ہے۔ بظاہر تو ہمیں عام اور بودا انسان ہی نظر آنا چاہئے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"بڑے بدمعاش ہو تم۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ مشتاق کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "اس کا کیا کریں؟"

"ہمیں مُردوں کے احترام کی تلقین نہ کی گئی ہوتی تو میں اس کی لاش کے ساتھ بھی کوئی اچھا سلوک نہ کرتا لیکن فی الحال ہم اسے اُٹھا کر اسپتال لے چلتے ہیں۔ رسمی کارروائیاں اور پوسٹ مارٹم وغیرہ ہوجائے تو بہتر ہے۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولا "اسے تمہاری گاڑی میں ڈالنا پڑے گا۔ گاڑی ذرا گندی ہوگی۔ اُمید ہے تم بُرا نہیں مناؤ گے۔"

"میں تو بُرا نہیں مناؤں گا۔ کہیں گاڑی نہ بُرا منا جائے۔ حالانکہ یہ میری نہیں' میرے ایک دوست سیٹھ رمضان کی گاڑی ہے جسے اس نے گویا کوڑے میں پھینکا ہوا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ گاڑی کبھی ایسے گندے خون میں نہیں لتھڑی ہوگی۔" میں نے کہا۔

لاش مجھے ہی اُٹھا کر گاڑی میں ڈالنا پڑی۔ رحیم گُل اپنے بازو کو تھامے ہوئے تھا۔ اچانک گرنے کی وجہ سے شاید اس کے بازو سے پھر خون رسنے لگا تھا۔ بازو پر باندھے ہوئے نئے کپڑے پر بھی سُرخی نمودار ہوچکی تھی۔ میں نے اُس کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتاری سے اسپتال کی طرف روانہ ہوگیا۔

"تمہارے خیال میں مشتاق کو کس نے اتنے ماہرانہ انداز میں گولی ماری ہے؟" راستے میں رحیم گُل نے پوچھا۔

"کراچی میں ایسے لوگوں کی تعداد ہزاروں میں تو ضرور ہوگی جو کسی کو اتنے ماہرانہ انداز میں گولی مار کر ماہرانہ ہی انداز میں غائب ہوسکتے ہیں۔" میں نے جواب دیا "بلکہ اب تو گولی مارنے کے لئے مہارت بھی ضروری نہیں رہی۔ کوئی بھی آکر مجمعِ عام پر اندھا دھند فائرنگ کرکے اطمینان سے رخصت ہوسکتا ہے۔ کوئی اس کا راستہ روکنے کی کوشش نہیں کرے گا۔"

"میں ان سب کی بات نہیں کررہا ہوں۔" رحیم گُل بے زاری سے بولا "میں کسی ایسے کے بارے میں پوچھ رہا ہوں جسے خاص طور پر مشتاق مدثر کو تاک کر گولی مارنے کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔"

"مشتاق مدثر جس قسم کا آدمی تھا اور جس قسم کے دھندوں میں ملوث تھا ان کے پیشِ نظر تو وہ بھی کافی لوگوں کا ہدف ہوسکتا تھا۔ مشتاق جیسے لوگ زیادہ تر ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتے ہیں۔" میں نے کہا "ایک اہم بات یہ ہے کہ پولیس والے تم ہو' میں نہیں۔ اس قسم کے سوالات مجھے تم سے کرنے چاہئیں۔ اُلٹا تم نے مجھ سے شروع کردیئے۔ آج کل دنیا میں ہر کام ہی اُلٹ ہورہا ہے۔"

"معافی چاہتا ہوں بابا!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "میں نے تو اس لئے پوچھنے کی جرأت کرلی تھی کہ کچھ دیر پہلے تک تم اچھے خاصے شرلاک ہومز معلوم ہورہے تھے۔ اب اچانک ہی تم نے اپنی سراغرسانہ صلاحیتوں کی لگام کھینچ لی ہے۔"

"اصل میں میرا سراغرسی کا گھوڑا جہاں تک دوڑ سکتا تھا' دوڑ چکا۔" میں نے اعتراف کیا "اب بعض سوالوں کے جوابات کے لئے تو مجھے بھی انتظار کرنا پڑے گا۔ تم بھی کرو۔ میرا تجربہ ہے کہ وقت اکثر سوالوں کے جواب دے دیتا ہے۔ بشرطیکہ ہم صبر و تحمل سے انتظار کریں۔"

"اچھا بزرگوارم! میں صبر و تحمل سے انتظار کرتا ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

میں اسے سرکاری اسپتال میں لے گیا جہاں اس نے اپنے ضابطوں اور قاعدوں کے مطابق مشتاق مدثر کی لاش میڈیکو لیگل آفیسر کے حوالے کی۔ اس دوران اس کے بازو پر بھی ٹانکے لگا کر بینڈیج وغیرہ کردی گئی۔ اسپتال والے اسے دوچار دن کے لئے ایڈمٹ ہونے کا مشورہ دے رہے تھے لیکن اس نے فیصلہ کیا کہ وہ گھر پر ہی کسی اچھے ڈاکٹر کی نگرانی میں رہے گا۔

تمام کارروائیوں سے فارغ ہونے کے بعد میں ایک بار پھر رحیم گُل کو ساتھ لے کر روانہ ہوا۔ اب مجھے اسے اس کے گھر چھوڑنا تھا۔ اسے اپنے بازو کی فکر نہیں تھی۔ جس پر کئی ٹانکے آئے تھے۔ وہ اب بھی مشتاق مدثر ہی کے بارے میں سوچ کر فکرمند تھا۔ راستے میں بولا "اس واقعے کے پریس میں آنے کی دیر ہے۔ سب پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑجائیں گے۔"

"مجھے اُمید ہے ایسا نہیں ہوگا۔" میں نے اسے اطمینان دلایا "میں نے اس کے بارے میں جو معلومات حاصل کی ہیں اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ اس سے چھٹکارا پاکر اس کی اپنی برادری بھی سکون کا سانس لے گی۔ اس کے علاوہ یہ بھی دعا کرو کہ یہ معاملہ پریس میں نمایاں ہونے سے پہلے ہی مشتاق کا اصل قاتل سامنے آجائے اور تمہارے ہتھے چڑھ جائے تاکہ تم اپنا مؤقف ثبوت کے ساتھ سب کے سامنے پیش کرسکو۔"

"یہ تو تقریباً معجزہ ہی ہوگا...... اور معجزے ہم جیسے گناہ گاروں کے لئے رونما نہیں ہوا کرتے۔"

"کبھی کبھی ہو بھی جاتے ہیں۔" میں اس کا مورال بلند رکھنے کی سرتوڑ کوشش کررہا تھا۔

اسی طرح باتیں کرتے ہم اس کے گھر جاپہنچے۔ وہ بیڈ پر لیٹ گیا۔ اب وہ اتنا فکرمند اور مضمحل نظر نہیں آرہا تھا۔ لگتا تھا کہ میری باتوں اور رفاقت سے اسے کچھ سہارا ملا تھا۔ اس کے ملازم نے کچھ دیر اس سے اظہارِ ہمدردی اور اظہارِ تشویش کرنے کے بعد میرے لئے کافی اور اس کے لئے گلوکوز بنایا۔ کافی پینے اور مزید کچھ دیر گپ شپ کرنے کے بعد میں نے اس سے اجازت چاہی۔

جونہی میں نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا' کسی نے مجھے واپس اندر دھکیل دیا۔ میں اس وقت بے خبر اور بے پروا تھا۔ لڑکھڑا کر راہداری کی دیوار سے جا ٹکرایا۔ دروازہ کھولتے وقت مجھے باہر کسی کی موجودگی کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ میرے خیال میں وہ ایک محفوظ

حماقت تھی۔ ویسے بھی اس وقت میں ایک پولیس آفیسر کے گھر سے نکل رہا تھا لیکن اس وقت مجھے احساس ہوا کہ کسی بھی جگہ کو محفوظ سمجھنا اور ایک لمحے کے لئے بھی غافل ہوجانا حماقت تھی۔ کوئی باہر گھات لگائے بیٹھا تھا اور دروازہ کھلنے کا منتظر تھا۔

آگے پیچھے دو آدمی نہایت پھرتی سے اندر آگئے۔ پیچھے والے نے پیچھے دیکھے بغیر اسی پھرتی سے دروازہ مقفل بھی کردیا اور بولٹ بھی چڑھا دیا۔ دروازہ مقفل کرنے کے لئے اسے ناب میں موجود صرف ایک بٹن ہی دبانا پڑا تھا۔ میں اس وقت تک سنبھل چکا تھا لیکن اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ ان دونوں کے ہاتھوں میں خوف ناک سی ساخت کے ماؤزر تھے۔

ان دونوں میں سے جو شخص آگے تھا اور جس نے مجھے اندر دھکیلا تھا اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ وہ نادر عرف نوزی تھا جس کی مجھے بھی تلاش تھی اور رحیم گل کو بھی۔ نئے دور کے مجرموں اور دہشت گردوں کی دیدہ دلیری میرے لئے واقعی دن بہ دن زیادہ سے زیادہ تشویش کا باعث بنتی جارہی تھی لیکن شاید یہ صرف مجھ جیسے ہی لوگوں کے لئے باعثِ تشویش تھی جو اس ملک کے شرفا کے مستقبل کے بارے میں سوچتے تھے۔

نوزی کا یہ ساتھی اس سے کہیں زیادہ خطرناک بدمعاش معلوم ہوتا تھا جسے میں نے "توند" کا نام دیا تھا اور جو نوزی سے پچھلی مرتبہ میرے ٹکراؤ کے دوران اتفاق سے نوزی ہی کی فائرنگ کی زد میں آکر ہلاک ہوگیا تھا یا یوں کہئے کہ جسے میں نے نوزی کی فائرنگ کے دوران ڈھال کے طور پر استعمال کرلیا تھا۔

اس بار نوزی کے ساتھ جو نوجوان تھا اس کی عمر بیس بائیس سے زیادہ معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر مختصر سی سیاہ چمکیلی داڑھی تھی۔ اس کے اعمال نے اس کے چہرے سے نوجوانی کی نرمی اور کشش چھین لی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک شیطانی قسم کی کرختگی تھی۔ آنکھوں میں خون کی پیاس تھی۔ وہ انسان کم درندہ زیادہ نظر آرہا تھا۔ بلکہ شاید اس قسم کے انسانوں کو ہم درندوں سے تشبیہ غلط دیتے ہیں۔ درندوں کی آنکھوں میں تو صرف درندگی ہوتی ہے ایسی نفرت نہیں جو اس قسم کے انسانوں کی آنکھوں میں نظر آتی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ نفرت ان لوگوں کے لئے بھی ہوتی ہے جو ان کے دشمن نہیں ہوتے۔ یہ خود ہی انہیں اپنا دشمن فرض کرلیتے ہیں اور انتقام کی کبھی سرد نہ ہونے والی آگ میں جلتے جھلسے وجود لئے بگولوں کی طرح اِدھر سے اُدھر پھرتے رہتے ہیں۔

اس وقت یہ نوجوان بھی مجھے کچھ اسی طرح گھور رہا تھا حالانکہ اس سے پہلے زندگی میں کبھی اس سے میرا سامنا نہیں ہوا تھا۔ میں نے اس کا کچھ نہیں بگاڑا تھا مگر اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ نظروں ہی نظروں سے مجھے خاکستر کردیتا۔ کبھی کبھی مجھے حیرت بھی ہوتی تھی کہ اس قسم کے لوگ اپنے وجود میں ایسی بے جواز نفرتیں کہاں سے سمیٹ لاتے تھے۔

اگر اس کے وجود کو اس کے اعمال کی خباثت اور بے پناہ نفرت نے مسخ نہ کیا ہوتا تو وہ ایک خوبرو نوجوان معلوم ہوتا۔ لمبا تڑنگا اور مضبوط نظر آرہا تھا، شکل صورت بھی اچھی تھی۔

نادر عرف نوزی چونکہ اب ایک منجھا ہوا اور چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ وہ اپنی نفرت اور خباثت کو اپنے اندر ہی مقید رکھنے کے ہنر سے واقف ہوچکا تھا۔ وہ بھی کچھ کم زہریلا سانپ نہیں تھا لیکن زہر اس کے وجود سے چھلکتا نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ ایک پُرسکون شیطان معلوم ہورہا تھا۔

کمبخت پہلے ہی کی طرح خوش لباس بھی نظر آرہا تھا۔ جدید تراش خراش کے نیلے کوٹ کے ساتھ سُرخ ٹائی لگائے ہوئے تھا۔ پہلے ہی کی طرح بالوں کی پونی ٹیل بھی بنی ہوئی تھی اور شاید ان پر اسپرے بھی کیا ہوا تھا۔ حد تو یہ تھی کہ خبیث کی جیب میں ایک گلاب کی کلی بھی سجی ہوئی تھی مگر وہ شاید کسی دیوار سے رگڑ کھا کر کچلی گئی تھی۔ اس کے نیلے کوٹ پر دیوار سے رگڑ کا سفید نشان نظر آرہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے حلیے میں کوئی بے ترتیبی نظر نہیں آرہی تھی۔

میں نے صرف ایک لمحے میں ان دونوں کا جائزہ لیا اور اسی ایک لمحے میں مجھے اندازہ ہوگیا کہ فوری طور پر کوئی حرکت کرنا میرے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ نوزی کا نوجوان ساتھی ہر زیادہ شعلۂ جوالا نظر آرہا تھا، مجھے اس سے اتنا خطرہ محسوس نہیں ہورہا تھا جتنا نوزی سے محسوس ہورہا تھا جو بظاہر بالکل پُرسکون تھا۔

نوزی نے گن سے اشارہ کیا اور میں نے خاموشی سے ہاتھ اُٹھادیے۔ وہ پُرسکون لہجے میں بولا "اندر چلو..... ذرا تمہارے اس پولیس والے ہیرو سے بھی ملاقات کرلیں..... اور خیال رکھنا تم بھی ہیرو بننے کی کوشش مت کرنا۔ قسمت ہربار آدمی کا ساتھ نہیں دیتی۔"

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔ ہم راہداری سے نکلے تو اچانک ہی ہال میں ایک طرف سے رحیم گل کا نوکر نمودار ہوگیا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتا، نوزی کے ساتھی نوجوان نے اس کے سر پر ماؤزر کا دستہ رسید کیا اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

"اس طرح مار دھاڑ مت کرو۔" میں نے گردن گھماتے ہوئے، نوجوان کو نہایت ملائمت سے مشورہ دیا "جب تمہارے حکم کی تعمیل ہورہی ہے تو کسی بے قصور پر تشدد کی کیا ضرورت ہے؟"

"چپ کر بے مولوی مدن کے بچے!" نوجوان پھنکارا "خاموشی سے آگے چل۔"

نوزی نے گن کے اشارے سے ہی گویا اسے ذرا تحمل سے کام لینے کا مشورہ دیا اور مجھے دوسرے ہاتھ سے آگے بڑھنے کا اشارہ کیا۔

رحیم گل کا بیڈروم سامنے ہی تھا اور اس کا دروازہ کھلا تھا۔ میں نے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے گویا اسے خوش

[...]نائی "میں تمہارے لئے ایک اور مصیبت لے آیا ہوں۔"

[...]میرا انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے میں اس سے پہلے بھی اس کی [...]ت میں کوئی خوب صورت تحفہ پیش کرچکا تھا اور اب اس کے [...]زید ایک حسین تحفہ لے کر آیا تھا۔ میں اسے ذرا چڑانا چاہتا [...]ن اس نے گویا میری بات سُنی ہی نہیں۔

[...]وہ بیڈ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا تھا اور ایک ٹک نوزی کو [...]رہا تھا۔ اسے گویا اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ نوزی [...]نے اس کے بیڈ کے قریب کھڑا ہونے کا حکم دیا۔ میں نے اس [...]ن حکم کی بھی تعمیل کی۔ نوزی اندر آچکا تھا لیکن اس کا ساتھی [...]دروازے پر ہی جم کر کھڑا ہوگیا تھا اور مضطرب انداز میں اِدھر [...]دیکھ رہا تھا۔ شاید اسے انتظار تھا کہ اپارٹمنٹ میں کوئی اور [...]ہو تو وہ بھی سامنے آجائے۔

"[...]تم سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا نوزی!" رحیم گل ٹھہرے [...]لہجے میں بولا۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ اس صورتِ [...]ل بھی خوف زدہ یا پریشان نہیں تھا۔

"[...]جنہیں مجھ سے ملنے کا اشتیاق ہوتا ہے، میں ان کی خدمت [...]در پہنچ جاتا ہوں۔" نوزی نے گردن کو خم دیتے ہوئے بڑی [...]سے کہا "بڑی خوشی کی بات ہے کہ میری شہرت تم جیسے [...]فسروں تک بھی پہنچ گئی ہے اور وہ بھی مجھے صورت دیکھتے ہی [...]لگے ہیں۔"

"میں نے ریکارڈ میں تمہاری پُرانی تصویریں دیکھی ہیں۔ تم میں بڑی تبدیلیاں آگئی ہیں لیکن اب بھی بہرحال ان تصویروں کی مدد سے پہچانے جاسکتے ہو۔" رحیم گل سرہلاتے ہوئے متاسفانہ لہجے میں بولا "اس کے باوجود تم آزاد پھر رہے ہو۔ مجھے اپنے محکمے کی نااہلی کا اعتراف ہے۔"

"بھولے بادشاہ! ایک میں ہی کیا مجھ جیسے ہزاروں آزاد پھر رہے ہیں اور دل و جان سے تمہارے محکمے کو دعائیں دیتے ہیں۔" نوزی استہزائیہ لہجے میں بولا "کاش دوسرے ملکوں کی پولیس بھی ایسی ہوجائے تو رفتہ رفتہ مجھ جیسے لوگ وہاں بھی جرائم پیشہ اور دہشت گرد کہلانے کے بجائے سیاسی قوت بن جائیں۔"

رحیم گل کا ذہن اس وقت گویا کہیں اور تھا۔ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "تم نے ٹھیک کہا تھا۔ وقت اکثر سوالوں کے جلد یا بدیر خود ہی جواب دے دیتا ہے۔ مجھے اس وقت نوزی کو دیکھ کر اچانک ہی اپنے سوال کا جواب مل گیا ہے۔"

"وہی سوال کہ مشتاق مدثر کو کس نے قتل کیا تھا؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ میں اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

"ہاں۔ ہم خواہ مخواہ اُلجھن میں پڑے ہوئے تھے۔ قاتل خود ہی چل کر ہمارے گھر آگیا ہے۔" رحیم گل نے نوزی کی طرف دیکھا۔

"اور خود ہی رخصت بھی ہوجائے گا۔" نوزی نے گویا اسے

اطمینان دلایا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ انجان بنتے ہوئے معصومیت سے بولا "ویسے... بائی دا وے... یہ مشتاق مدثر کون ہے؟ ضروری نہیں ہوتا کہ ہمیں اپنے ہاتھوں ہلاک ہونے والے ہر شخص کا نام معلوم ہو۔"

"وہ دور مار رائفل کہاں ہے جس سے تم نے مشتاق مدثر کو شوٹ کیا تھا؟" رحیم گُل نے اس کا سوال ان سُنا کرتے ہوئے کہا۔

"سوال تم نہیں... میں کروں گا۔" نوزی نے انگلی سے باری باری ہم دونوں کی طرف اشارہ کیا "ہیروں کا پیکٹ تم دونوں میں سے کس کے پاس ہے؟"

"میرے خدا...! یہ ہیرے کتنے لوگوں کی جان لیں گے!" بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

"بعض چیزیں جب تک اصل مالک کے پاس نہ پہنچیں' جانیں ضائع ہوتی رہتی ہیں۔" نوزی اطمینان سے بولا۔

"اصل مالک تو مرچکا ہے بلکہ اسے بھی اصل مالک کہنا درست نہیں۔ اصل مالک تو دنیا کے نہ جانے کن کن کونے کھدروں میں بیٹھے اپنے نقصان پر کفِ افسوس مل رہے ہوں گے۔" میں نے کہا۔

نوزی نے مجھے گھورا "اگر پس منظر سے آگاہ ہو ہی چکے ہو تب بھی زیادہ بقراط بننے کی کوشش مت کرو۔ اصل مالک قاسم بگلی ہی تھا... اور اس کے مرنے سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ اس کا کاروباری نظام کام کررہا ہے۔ جو چیز اس کی ملکیت ہے۔ وہ اس کے حساب میں جمع ہونی چاہئے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ ہیروں کی اس کشمکش میں نوزی کا کردار میرے اندازے کے عین مطابق ہی نکلا تھا۔ رحیم گُل کا یہ اندازہ بھی یقیناً درست تھا کہ مشتاق مدثر کو نوزی نے ہی قتل کیا تھا اور ہمیں اس وقت شاید اس نے اس لئے گولی نہیں ماری تھی کہ وہ یہاں اطمینان سے ہم سے مذاکرات کرکے ہیرے حاصل کرنا چاہتا تھا جن کے لئے ساری خون ریزی ہورہی تھی۔ اگر اسے ہم سے ہیرے مل جاتے تب بھی شاید وہ ہمیں گولی مارنے ہی کی کوشش کرتا۔ ایک پولیس آفیسر اور ایک بڑے بزنس مین کو ہلاک کرنا بھی اس کے لئے یقیناً کوئی مسئلہ نہ ہوتا۔ وہ اونچے درجے کا بدمعاش تھا۔

ایک لمحے کے انتظار کے بعد وہ قدرے مضطربانہ انداز میں گن کو حرکت دیتے ہوئے بولا "ہیرے تم دونوں میں سے جس کے پاس ہیں۔ میرے حوالے کردو تاکہ میں پُرسکون اور شریفانہ انداز میں واپس چلا جاؤں۔ ہیرے تم دونوں میں سے کوئی بھی ہضم نہیں کرسکتا اور نہ ہی تم ان کی بندربانٹ کرسکتے ہو۔"

"ہیرے ہضم کرنے کا تو ہمیں قطعاً کوئی شوق نہیں۔" رحیم گُل بولا "لیکن یہ کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ تم جیسا قاتل' اشتہاری مجرم اور دہشت گرد مجھ جیسے پولیس آفیسر کے گھر میں اپنے ساتھی کے ہمراہ دندناتا' گنیں لہراتا داخل ہو اور اسی طرح واپس چلا جائے۔"

"تو پھر تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اس زخمی بازو اور خالی ہاتھوں کے ساتھ ہمیں روکو گے؟ افضل چوہدری پر زیادہ تکیہ مت کرنا۔ وہ بھی خالی ہاتھ ہے اور انسان کو بہت جلدی جلدی ہیرو بننے کے مواقع میسر نہیں آتے۔" وہ بے شک بہت پُرسکون اور بے خوف آدمی تھا لیکن اب کچھ مضطرب ہونے لگا تھا۔ اس کے جبڑے کے عضلات مچلنے لگے تھے اور اس نے اپنا وزن کبھی ایک اور کبھی دوسرے پاؤں پر منتقل کرنا شروع کردیا تھا۔ یہ میرے لئے ایک خوش آئند علامت تھی۔

اس کا ساتھی تو ویسے ہی بے چین روح تھا۔ وہ گردن گھما کر کمرے میں جھانکتے ہوئے تند لہجے میں نوزی سے مخاطب ہوا "نوزی! تم نے کیا لمبے چوڑے مذاکرات شروع کردیے۔ گولی مارو' قصہ ختم کرو۔ ہیرے ہم خود ہی ڈھونڈ لیں گے۔ یہیں کہیں ہوں گے۔"

نوزی نے ہم پر سے نظر ہٹانے کا خطرہ مول نہیں لیا ورنہ شاید اس وقت وہ اسے گھورتا۔ وہ مخصوص انداز میں کھنکار کر رہ گیا۔ کھنکارنے کے اس انداز میں تنبیہہ پوشیدہ تھی۔ نوجوان سیدھے ہوکر دوبارہ پوزیشن سنبھال لی۔

نوزی' رحیم گُل سے مخاطب ہوا "تم نے دیکھ لیا میرا ساتھی کتنا بے چین ہے۔ میرے پاس بھی اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ ہیرے میرے حوالے کردو۔ ہیرے بے شک بہت قیمتی ہوں گے لیکن اتنے قیمتی نہیں کہ ان کے لئے جان دے دی جائے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" رحیم گُل خوشگوار لہجے میں بولا "ہیروں کے لئے بھلا کیا جان دینا۔ مجھے اگر جان دینی ہی پڑی تو اصولوں کے لئے دوں گا۔ ہیرے اگر میرے پاس موجود ہوتے تو ضرور تمہاری خدمت میں پیش کردیتا... بشرطیکہ وہ تمہارے ہوتے... لیکن اس کے بعد بھی میں تمہیں جانے کی اجازت نہ دے سکتا تھا کیونکہ تم ایک مفرور مجرم ہو۔ بیسیوں سنگین جرائم میں پولیس کو مطلوب ہو۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم میرے سامنے آؤ اور میں تمہیں روکنے کی کوشش نہ کروں۔ میں ایک پولیس آفیسر ہوں اور پولیس آفیسر ہر وقت ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔"

نوزی نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ لگتا تھا کہ وہ رحیم گُل کی بات سے بہت محظوظ ہوا تھا پھر وہ ترحم آمیز انداز میں بولا "میں سمجھتا تھا تم سرکاری لوگ صرف اخباری بیانات وغیرہ میں ایسی مزاحیہ باتیں کرتے ہو لیکن آج پتا چلا کہ روبرو بھی ایسی باتیں کرنے والے موجود ہیں۔ اخباروں میں اس قسم کے بیان چھپتے ہیں کہ دہشت گرد' شرپسندوں کو گڑبڑ کی اجازت نہیں دی جائے گی... دہشت گردوں کو خون ریزی کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ وغیرہ وغیرہ۔ لوگ پوچھ چکے ہیں کہ کیا یہ لوگ اس قسم کے کام سرکار سے پوچھ کر کرتے ہیں؟ لیکن اس سوال کا آج تک کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ اگر ان بیانات سے مراد یہ ہوتی ہے کہ آئندہ شرپسندوں' دہشت گردوں اور دیگر مجرموں وغیرہ کو ان کی سرگرمیوں سے روکنے کی کوشش کی جائے گی تب بھی گویا یہ اعتراف کیا جاتا ہے کہ اس سے پہلے ایسی کوششیں نہیں ہورہی تھیں۔"

نوزی نرا بدمعاش نہیں تھا۔ بات کرنا بھی جانتا تھا۔ استہزائیہ انداز میں مزید بولا "اس کے علاوہ آہنی ہاتھوں سے نمٹنے کی باتیں بھی کی جاتی ہیں۔ تم لوگوں کے ہاتھ صرف ان بے بس اور مجبور لوگوں کے لئے آہنی ہوتے ہیں جو تمہارے قابو میں آئے ہوتے ہیں۔"

رحیم گُل کچھ نہ بولا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد نوزی بولا "ایسی ہی بات تم نے بھی کی ہے کہ تم مجھے جانے کی اجازت نہیں دو گے۔ گویا تمہارا خیال ہے کہ میں تم سے اجازت لے کر آیا تھا اور تم سے اجازت لئے بغیر واپس نہیں جاؤں گا۔ یہاں ہاتھ باندھ کر تمہارے سامنے کھڑا رہوں گا؟"

رحیم گُل اب بھی خاموش رہا۔ نوزی اس کے زخمی بازو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "خدا کے لئے مجھے اس آہنی ہاتھ سے روکنے کی کوشش مت کرنا۔ لاؤ... اب ہیرے نکال دو۔ میں انہیں لینے آیا ہوں اور لئے بغیر نہیں جاؤں گا۔"

اس نے اپنا خالی ہاتھ یوں پھیلادیا۔ جیسے اسے توقع تھی کہ رحیم گُل ہیرے اپنے گاؤ تکیے کے نیچے رکھے بیٹھا تھا اور اس کی فرمائش پر فوراً نکال کر اسے دے سکتا تھا۔

"ہیرے میرے پاس تو نہیں ہیں۔ وہ تو سرکاری مال خانے میں رکھے جاچکے ہیں۔" رحیم گُل ملائمت سے بولا۔

نوزی استہزائیہ انداز میں ہنسا "مجھے لطیفوں سے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ اس طرح کے پولیس افسروں کا ذکر اب صرف کہانیوں میں ملتا ہے جو کروڑ ڈیڑھ کروڑ کے ہیرے یا اس طرح کی کوئی چیز مال خانے میں جمع کراسکتے تھے۔"

"تم جیسے لوگوں کا یہی سب سے بڑا مسئلہ ہے کہ ان کا تمام اچھی قدروں پر سے ایمان اُٹھ چکا ہوتا ہے۔" رحیم گُل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "کاش میں تمہیں یقین دلا سکتا کہ دنیا میں اچھے لوگوں کی تعداد کم ضرور ہوتی جارہی ہے لیکن وہ ختم نہیں ہوئے۔ میرے محکمے میں شاید دیانتدار لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہو لیکن بہرحال وہ موجود ضرور ہیں۔ تمہیں ان کے وجود سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔"

"بحث کو چھوڑو اور ہیرے نکالو۔" نوزی کا لہجہ یکدم بدل گیا "میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ وہ مال خانے میں جمع ہوچکے ہیں۔ اگر تم نے انہیں مال خانے میں جمع کرایا ہوتا تو مجھے اب تک اس کی اطلاع ہوچکی ہوتی۔ کس تھانے میں کیا ہورہا ہے' مجھے سب پتا ہوتا ہے۔"

"آہ... ہماری کالی بھیڑیں۔" رحیم گُل نے ایک اور ٹھنڈی سانس لی۔

"تمہاری کالی بھیڑوں کے سر پر ہی تو ہمارا سارا نظام چل رہا ہے' ہمارے لئے وہ سفید بھیڑیں ہیں۔ ہم ان کی بڑی قدر کرتے ہیں۔" نوزی بولا۔ "ہیرے جہاں کہیں بھی ہیں' مجھے ابھی اور اسی وقت یہاں چاہئیں۔"

"ورنہ؟" رحیم گُل نے جاننا چاہا۔

"ورنہ مجھے یہاں بھی دو لاشیں چھوڑ کر جانا پڑیں گی۔" نوزی نے بلا تامل جواب دیا "مجھے تو شاید اس کا تھوڑا بہت افسوس بھی ہو لیکن وہ جو باہر میرا دوست کھڑا ہے اسے تو انسان کے مارنے کا اتنا بھی افسوس نہیں ہوتا جتنا کسی کو مکھی مارنے کا ہوسکتا ہے۔"

"اگر ہیرے تمہیں مل جاتے ہیں تب بھی... اور اگر نہیں ملتے تب بھی... تمہیں ہم دونوں کو مارنے سے کیا حاصل ہوگا؟" رحیم گُل نے پوچھا۔

"ہم اتنی باریکیوں میں نہیں جاتے۔ ہم نے اتنی شرافت کے ساتھ تم سے بات چیت میں اتنا وقت ضائع کیا ہے۔ اس کے بعد بھی ہیرے ہمیں نہ ملیں تو کم از کم اتنا تو ہمارا حق بنتا ہے کہ جھنجلاہٹ میں تمہارے جسموں میں چند گولیاں اُتار دیں۔" پھر اچانک ہی نوزی میری طرف متوجہ ہوا "میرا خیال ہے ہیرے تمہارے قبضے میں ہیں۔ مجھے لگتا ہے تم دونوں میں کچھ گٹھ جوڑ سا ہوگیا ہے۔ تم نے اپنی اپنی حیثیت سے ایک دوسرے کو فائدے پہنچانے کا کوئی لمبا پروگرام بنایا ہوگا۔"

میں ہنس دیا جس پر وہ کچھ چڑ سا گیا۔ مجھے گھورتے ہوئے بولا "میرے دوستانہ رویّے سے شاید تمہیں کوئی خوش فہمی ہوگئی ہے۔ میں نے کوئی مذاق تو نہیں کیا جس پر تمہیں ہنسی آرہی ہے۔"

"میرے لئے تمہاری بات مذاق سے کم نہیں۔" میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا "کاش ہیرے میرے پاس ہوتے۔ میں کب کا انہیں تمہارے حوالے کرچکا ہوتا۔ میں کروڑ ڈیڑھ کروڑ کی چیز کے لئے جان نہیں دے سکتا۔"

باہر کھڑے نوجوان نے ایک بار پھر کمرے میں جھانکا۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوچکا تھا بلکہ شاید چھلک ہی پڑا تھا۔ اس نے گن کا رُخ بھی اندر کی طرف کرلیا تھا۔ وہ انتہائی ناگواری سے نوزی سے مخاطب ہوا "نوزی! تم نے تو اس کام کو بھی سیاسی مذاکرات بنادیا ہے۔ قصہ ختم کرو بھئی... یہاں سیدھی انگلیوں سے گھی نکلتا دکھائی نہیں دیتا۔ تم ان کا پتا تو صاف کرو۔ ہیرے بعد میں ہمیں ملنے ہوں گے تو مل جائیں گے ورنہ وہ ہاتھ سے تو جا ہی چکے ہیں۔"

اس بار نوزی نے نہ تو کوئی جواب دیا اور نہ ہی وہ تنبیہہ کے انداز میں کھنکارا۔ شاید وہ اپنے ساتھی کے مشورے پر عمل کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دفعتاً رحیم گُل کو چھینک آگئی۔ اس نے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے عجیب سی آواز نکالی۔ بظاہر یہی محسوس

ہوا تھا جیسے چھینک آنے کی وجہ سے اس کے بازو میں شدید تکلیف ہوئی تھی۔

اِسی لمحے کمرے سے باہر ہال میں کسی کُتّے کے بھونکنے کی خوف ناک آواز گونجی اور میں نے نوزی کے ساتھی نوجوان کو بُری طرح لڑکھڑا کر دروازے کے سامنے ڈھیر ہوتے دیکھا۔ مجھے ایک بڑے سے سیاہ کُتّے کی بھی جھلک نظر آئی جس نے اس پر چھلانگ لگائی تھی لیکن میں نے اس طرف مزید توجہ نہیں دی کیونکہ ایک لمحے کے لئے نوزی جیسے گھاگ آدمی کی توجہ بھی ہم پر سے ہٹ گئی تھی۔ ایسے ہی لمحے فیصلہ کُن ہوا کرتے ہیں۔

میں فوری طور پر قالین پر گر پڑا۔ میرے اور نوزی کے درمیان آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگانے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔ اس کی توجہ غالباً صرف ایک لمحے کے لئے ہٹی تھی۔ میرے چھلانگ لگانے تک وہ دوبارہ میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے فائر کرسکتا تھا۔

میرا ارادہ تھا کہ میں گر کر لڑھکتے ہوئے اور اس کے متوقع فائر سے بچتے ہوئے اس کی ٹانگوں سے ٹکرا کر اسے گراؤں گا اور اسے قابو میں کرنے کی کوشش کروں گا مگر اس ایک لمحے کی مہلت سے مجھ سے زیادہ رحیم گُل نے فائدہ اُٹھایا۔ اس کا ہاتھ بجلی کی سی تیزی سے گاؤ تکیے کے نیچے گیا۔ مجھے بھی نہیں معلوم تھا کہ اس کا ریوالور گاؤ تکیے کے نیچے تھا۔

تقریباً ایک ساتھ کمرے میں اور باہر ہال میں فائر کی آواز گونجی۔ باہر تو پے در پے تین فائر ہوئے لیکن اندر کمرے میں ایک ہی فائر ہوا اور میں گو کہ ایک لمحے میں لڑھک کر وہاں تک پہنچ گیا تھا جہاں نوزی کھڑا تھا لیکن نوزی وہاں سے غائب ہوچکا تھا۔

میں نے لڑھکتے وقت کمرے سے ایک بگولا سا باہر جاتے تو دیکھا تھا لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا کہ وہ نوزی ہوسکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میرا ہاتھ دھات کی کسی چیز سے ٹکرایا اور مجھے معلوم ہوگیا کہ نوزی کیوں بگولے کی طرح فرار ہوا تھا۔ وہ اس کا ماؤزر تھا جو قالین پر پڑا تھا پھر چوکھٹ پر مجھے خون کا بڑا سا دھبّا بھی نظر آگیا۔

رحیم گُل کی چلائی ہوئی گولی غالباً نوزی کے ہاتھ یا بازو پر لگی تھی۔ ماؤزر اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ وہ بھی یقیناً پلک جھپکتے میں فیصلہ کرنے والا آدمی تھا۔ ایک ثانئے میں اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ بازی پلٹ چکی تھی۔ اس نے کمرے میں رہ کر خطرہ مول نہیں لیا۔ حتیٰ کہ جھک کر ماؤزر بھی اٹھانے کی کوشش نہیں کی۔

کھلے دروازے سے اب اس کا ساتھی بھی نظر نہیں آرہا تھا لیکن ہال سے بڑی خوف ناک غراہٹ اور خرخراہٹ کی سی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ میں نے محتاط انداز میں اُٹھتے اُٹھتے بیڈ کی طرف دیکھا۔ رحیم گُل بیڈ پر نہیں تھا۔ وہ خود کو بیڈ سے نیچے گرا چکا تھا اور اسی کی آڑ لے چکا تھا۔ اس کا ریوالور بیڈ کی اوٹ سے جھانک رہا تھا۔

مجھے یہ تشویش بھی محسوس ہوئی کہ بیڈ سے گرنے میں اس نے کہیں اپنے زخمی بازو کو مزید نقصان تو نہیں پہنچالیا تھا؟ کچھ دیر پہلے ہی تو اس پر ٹانکے لگے تھے۔ فی الحال اس کی تصدیق کا موقع نہیں تھا۔ میں نے اُٹھتے اُٹھتے نوزی کا ماؤزر اُٹھالیا تھا۔ میں دیوار کی آڑ میں رہتے ہوئے گھٹنوں کے بل نہایت محتاط انداز میں دروازے کی طرف بڑھا۔

دروازے سے جھانکنے پر مجھے ایک عجیب ہی منظر دکھائی دیا۔ نوزی کا ساتھی ہال کے فرش پر چاروں خانے چت پڑا تھا لیکن اس کے جسم کو گویا نزع کے سے عالم میں جھٹکے لگ رہے تھے۔ اس کے سینے پر سیاہ رنگ کا ایک جسیم کتا سوار تھا۔ اسے بھی کچھ جھٹکے سے لگ رہے تھے لیکن نوجوان کی گردن بہرحال اس کے جبڑوں میں تھی۔

میں جہاں تھا وہاں سے نوجوان کی گردن صحیح طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہال کا منظر بہرحال یہی بتارہا تھا کہ اب وہاں ہمارے لئے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نوزی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کے باوجود میں احتیاطاً چند لمحے دیوار کی اوٹ میں 'کمرے میں ہی رہا۔ ممکن تھا نوزی اس اپارٹمنٹ کے کسی دوسرے کمرے یا کچن میں چھپ گیا ہو اور اس کے پاس کوئی اور ہتھیار موجود ہو۔

اِسی دوران رحیم گُل بھی اُٹھ کر میرے قریب آگیا۔ وہ اپنے زخمی بازو کو کچھ اس طرح موڑے ہوئے تھا جیسے عموماً لوگ پلستر چڑھوانے کے بعد جھولے میں لٹکائے رکھتے ہیں۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" میں نے سرگوشی میں پوچھا "تم نے اپنے زخمی بازو کو مزید نقصان تو نہیں پہنچالیا؟"

"نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میں اپنے بازو کو بچاتے ہوئے کارروائی دکھانے میں کامیاب ہوگیا ہوں۔"

"مبارک ہو۔" میں نے کہا۔ وہ بھی میرے قریب آکر ایک گھٹنے کے بل جھک کر ہال میں جھانکنے لگا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات اُبھر آئے۔ ایک لمحے کے لئے تو یوں لگا اسے کوئی خوشی ملی تھی مگر دوسرے ہی لمحے گویا کسی نے اس کے دل میں خنجر گھونپ دیا۔

وہ گویا سب کچھ بھول گیا۔ اسے کسی خطرے کی پروا نہ رہی۔ اس نے اپنے صحیح بازو کی کہنی سے مجھے ٹھوکا دیا۔ وہ مجھے باہر چلنے کا اشارہ کررہا تھا۔ میں ماؤزر سنبھالے گھٹنوں ہی کے بل کمرے سے نکلا۔ کسی دروازے کی طرف سے گولی نہیں آئی۔ کوئی دھماکا سنائی نہیں دیا۔

کتا اور نوجوان دونوں ہی کے جسموں کو نزع کے سے عالم کے جھٹکے لگنا بند ہوچکے تھے۔ نوجوان بھی ساکت پڑا تھا اور کتا بھی اس کے سینے پر ڈھیلے ڈھالے انداز میں سوار تھا لیکن اس کی ٹانگیں فرش پر پھسل آئی تھیں۔

قریب پہنچ کر میری سمجھ میں آیا کہ ماجرا کیا تھا۔ جسیم اور سیاہ ...ف ناک بلڈ اگ نے کسی طرف سے اچانک ہی نکل کر نوجوان پر ...لانگ لگائی تھی اور اس کی گردن دبوچ لی تھی۔ نوجوان نے ...کھلاہٹ میں تین گولیاں چلائی تھیں جن میں سے دو کُتّے کے جسم ...ے گزر گئی تھیں لیکن اس نے گردن نہیں چھوڑی تھی اور مرتے ...رتے بھی آدھی سے زیادہ گردن چبا ڈالی تھی۔ اب گردن اس کے ...ف ناک اور خون آلود جبڑے سے نکل چکی تھی لیکن کٹی پھٹی ...گیں اور نرخرہ ایک بھیانک منظر پیش کررہا تھا۔ گردن سے ابھی ...ن بہہ رہا تھا اور کُتّے کے جسم سے بھی خون بہنا بند نہیں ہوا تھا ...لیکن وہ دونوں بہرحال مرچکے تھے۔

میں اور رحیم گُل چند لمحے ساکت کھڑے انہیں دیکھتے رہے حتیٰ ...ہ ان کے جسموں سے خون بہنا بند ہوگیا۔ ان کے آس پاس خون ...کا ایک جوہڑ سا بن گیا تھا۔ کُتّے اور انسان کا خون ایک دوسرے میں ...مدغم ہوگیا تھا۔

رحیم گُل تاسف زدہ لہجے میں بولا "یہ کُتّا اس قسم کے انسانوں ...ے بہتر تھا۔ مجھے اس کی موت کا ہمیشہ افسوس رہے گا۔"

"کیا یہ تمہارا کُتّا تھا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ظاہر ہے۔ کسی اور کا کتا تو اس طرح آکر بیچ میں نہیں کود سکتا ...تھا۔"

"یہ اچانک کہاں سے آن ٹپکا؟" میں نے پوچھا۔

اس نے چھوٹے سے ایک کھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا ..."وہ اس کا کمرا تھا۔ یہ نہایت قیمتی اور تربیت یافتہ کُتّا تھا۔ اسی قسم ...کی صورتِ حال میں کام آنے کے لئے رکھا گیا تھا۔"

معلوم نہیں کیوں میرے ذہن میں یہ تصور موجود نہیں تھا کہ ...رحیم گُل کے گھر میں کوئی کُتّا بھی ہوسکتا تھا حالانکہ یہ کوئی ایسی ...انوکھی بات بھی نہیں تھی۔ ویسے بھی میں نے اس کا اپارٹمنٹ صحیح ...طور پر دیکھا ہوا بھی نہیں تھا۔

میں نے قدرے بے یقینی سے پوچھا "اتنی دیر تک یہ چھپا ہی ...بیٹھا رہا؟"

"میں نے کہا نا کہ یہ ایک نہایت اعلیٰ تربیت یافتہ کُتّا تھا۔ ...اس قسم کے معاملات میں تقریباً انسان جتنا ہی سمجھدار تھا۔ ...انسانوں ہی کی طرح اس سے بھی اندازے کی کوئی غلطی ہوگئی ہوگی ...ورنہ شاید یہ ابھی نہ مرتا اور آئندہ بھی زندگی میں نہ جانے کون کون ...سے نازک موقعوں پر کام آتا۔ طاقت میں یہ تقریباً شیر کا مقابلہ کرتا ...تھا۔" اس کا لہجہ بتارہا تھا کہ اسے اپنے کُتّے کی موت کا واقعی بے ...حد دکھ تھا۔

"تم نے غالباً زبردستی چھینک مارنے کے ساتھ کچھ عجیب سی ...آواز نکال کر اسے سگنل دیا تھا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں لیکن کاش میں نے سگنل نہ دیا ہوتا۔ شاید وہ موقع ...مناسب نہیں تھا۔ مناسب موقع کے لئے مجھے کچھ دیر اور انتظار کرلینا چاہئے تھا۔"

"اب نوزی کو مزید باتوں میں لگائے رکھنا بہت مشکل ہوگیا تھا۔" میں نے کہا "اگر یہ کُتّا اپنی جان پر کھیل کر مداخلت نہ کرتا تو ہمارے لئے ان سے نمٹنا بہت مشکل ہوتا۔ نوزی نہایت شاطر اور چھٹا ہوا بدمعاش لگتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کے لئے بھی اسے قابو میں کرنا کچھ آسان معلوم نہیں ہوتا۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ وہ مجھ سے ٹکرانے کے بعد بھی نکل بھاگنے میں کامیاب ہوگیا۔" میں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ نوزی کے نکل بھاگنے کے بعد بھی ہم نے ازراہِ احتیاط کچھ دیر اس کا تعاقب کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اتنا وقت اس کے غائب ہونے کے لئے کافی تھا۔

اپارٹمنٹ کا مین دروازہ بند تھا۔ رحیم گُل نے مجھے اس کی طرف دیکھتے پایا تو گویا میری غلط فہمی دور کرتے ہوئے بولا "وہ ادھر سے نہیں بھاگا ہے۔"

اس نے کچن کے کُھلے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ فرش پر خون کی چند بوندیں نظر آرہی تھیں جو کچن کے دروازے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ رحیم گُل بولا "وہ کچن کے عقبی دروازے سے ایمرجنسی سیڑھیوں کے راستے بھاگا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ میرے اپارٹمنٹ کے نقشے سے بھی اچھی طرح واقف ہے۔"

"تم نے بازو زخمی ہونے کے باوجود خود کو بچاتے ہوئے' پلک جھپکتے میں اس کے ماؤزر والے ہاتھ کو نشانہ بنا کر بلاشبہ مہارت کا ایک ریکارڈ قائم کیا ہے۔" میں نے اسے داد دی۔

"میں چاہوں تو خاموش رہ کر یہ داد و تحسین سمیٹ سکتا ہوں لیکن اپنی طبیعت سے مجبور ہوں۔ میری سماعت پر تو وہ الفاظ بھی بوجھ بن جاتے ہیں جن کا میں مستحق نہیں ہوتا۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"میں نے اس کے ہاتھ پر گولی نہیں ماری تھی۔ میں نے تو اپنی دانست میں اس کے پیٹ میں گولی ماری تھی۔ یہ محض ایک عجیب و غریب اتفاق ہے کہ گولی اس کے ہاتھ پر لگی اور ماؤزر اس کے ہاتھ سے گر گیا ورنہ مجھے تو ماؤزر سے زیادہ نوزی کو گرانے کی فکر تھی۔"

اس نے میری غلط فہمی دور کردی۔

"خیر۔۔۔ قدرت نے جو کیا' بہتر کیا۔ اگر گولی اس کے پیٹ میں لگتی تب بھی شاید وہ گرتے گرتے ہم پر چند فائر تو کر ہی دیتا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"لیکن فرار تو نہ ہوتا۔" رحیم گُل نے ٹھنڈی سانس لی۔

"اگر ہم سب بیک وقت ہی مرجاتے تو یہ کوئی خوب صورت سچویشن نہ ہوتی۔" میں نے کہا "بہرحال اب تم موبائل پولیس کو نوزی کے بارے میں اطلاع دے کر تو دیکھو۔ شاید وہ کہیں کسی کے ہتھے چڑھ ہی جائے۔"

"یہ اُمید مت رکھو۔" وہ مایوسی سے بولا "نوزی جیسا آدمی

فرار ہوتے ہوئے ہماری گشتی پولیس کے ہتھے چڑھ جائے۔ یہ کچھ شیخ چلیانہ سی سوچ ہے۔ محض رسمی کارروائی کرنے کا کیا فائدہ!"

اس نے میرے مشورے کو اہمیت نہیں دی تاہم اپنے تھانے فون کر کے باقی کارروائیوں کے لئے آدمی طلب کرنے لگا۔

ایک بار پھر مجھے اس کے ساتھ کافی دیر تک رہنا پڑا۔ حتیٰ کہ اس کے ہاں سے انسان اور کتے کی لاش اُٹھالی گئی۔ ضابطے کی کارروائی ختم ہوگئی۔ رسماً میرا بیان وغیرہ بھی ہوگیا تب میں نے اس سے اجازت چاہی۔ اس نے دروازے پر دو پولیس والے بٹھالئے تھے۔

"اگر نوزی لوٹ آیا تو کیا تمہارے یہ پولیس والے اسے روک لیں گے؟" میں نے اس سے پوچھا۔

"اُمید تو ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ورنہ مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ کاش میرا بازو زخمی نہ ہوتا۔"

"مجھے یوں لگتا ہے کہ تمہیں اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں کافی مار کھانی پڑتی ہے۔ تم جیسے دیانت دار اور مخلص پولیس آفیسر کا یہ حشر ہوتے دیکھنا خاصا عبرت ناک لگتا ہے۔" میں نے کہا۔ مجھے یاد تھا کہ ایک مرتبہ زرتاج نگر کے قریب بھی میں نے اسے جوہڑ سے قریب المرگ حالت میں نکالا تھا۔ ڈاکوؤں نے اس وقت اس کا یہ حشر کیا تھا۔

"اِس طرح تو ہوتا ہے اِس طرح کے کاموں میں۔" وہ مسکرایا "پولیس کی نوکری قبول کرتے وقت ان باتوں کے لئے تو تیار رہنا چاہئے۔ یہاں مار کھالوں گا تو شاید اوپر والے کی مار سے بچ جاؤں۔" اس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا۔

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "عجیب بات یہ ہے کہ میرا حشر خواہ کچھ بھی ہو لیکن انجام کار مجھے ہی کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ جرائم پیشہ لوگ خواہ ٹولے کی شکل میں ہوں، مجھ اکیلے سے دل ہی دل میں ڈرتے ہیں اور آخر کار وہ میرے ہاتھوں مرتے ہیں.... پکڑے جاتے ہیں یا کسی اور طرح ایسے انجام کو پہنچتے ہیں جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی غیبی طاقت میری مدد کرتی ہے۔"

"یقیناً کرتی ہوگی۔ مسئلہ یہی ہے کہ لوگوں کا اس غیبی طاقت پر سے ایمان اُٹھ گیا ہے۔" میں نے کہا اور اس کے اپارٹمنٹ سے نکل آیا۔ لفٹ کے ذریعے نیچے آتے وقت بھی میں اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اگر اس کے محکمے میں آدھے لوگ بھی اس جیسے ہوتے تو شاید ہماری سوسائٹی کا حلیہ اس بُری طرح نہ بگڑا ہوتا۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے شاور لیا اور کھانا کھاتے ہی سوگیا۔

دوسرے روز میں دن چڑھے سو کر اُٹھا۔ تیار ہونے کے بعد میں نے کمرے ہی میں ناشتا طلب کیا۔ میرے ذہن میں ایسے لوگوں کی ایک لمبی فہرست کلبلا رہی تھی جنہیں میں فون کرنا چاہتا تھا۔ ہر ایک سے کوئی نہ کوئی ضروری بات کرنا تھی۔ اس کے علاوہ میں امبر نامی اس لڑکی سے بھی ملنا چاہتا تھا جسے میں نے اپنے ہوٹل میں پناہ دی تھی۔ میں اسے یہ خبر سُنانا چاہتا تھا کہ اس کا اور اس کے مقتول منگیتر کا "پُراسرار باس" جو ہیروں کی فروخت میں انہیں استعمال کرتا تھا، نہ صرف بے نقاب ہوچکا تھا بلکہ اپنے انجام کو بھی پہنچ چکا تھا، اس کا نام مشتاق مدثر تھا۔

میں صبح کے اخبارات دیکھ چکا تھا۔ ابھی مشتاق کے قتل کی خبر اخبارات میں نہیں آئی تھی۔ میں ان سب کے بارے میں سوچ تو رہا تھا لیکن میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں درحقیقت کوئی اور ہی بات چبھ رہی تھی۔ ایک عجیب خلش سی تھی لیکن اس کی نوعیت سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

کافی پیتے وقت مجھے اچانک ہی معلوم ہوگیا کہ وہ کیا خیال تھا جو مبہم اور غیر واضح انداز میں میرے ذہن کے کسی گوشے میں رینگ رہا تھا۔ دراصل مجھے احساس ہو رہا تھا کہ نوزی، سیٹھ قاسم بجلی کا خاص آدمی تھا۔ قاسم بجلی کے جزیرے پر بھی اس کے پائے جانے کا امکان ہوسکتا تھا۔ جزیرے پر شفیع شاہ موجود تھا۔ مجھے احتیاطاً اسے نوزی کا حلیہ وغیرہ بتا کر ہدایت کردینی چاہئے تھی کہ اگر ایسا کوئی شخص نظر آئے تو اسے فوراً قابو میں کرنے کی کوشش کرے۔

یہ خیال جونہی ذہن میں واضح ہوا میں نے کافی پیتے پیتے موبائل فون اُٹھایا اور شفیع شاہ سے رابطہ کیا۔ پہلے میں نے اس سے جزیرے کے تازہ ترین حالات کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ قاسم بجلی کے بیٹے بیرونِ ملک سے آچکے تھے اور جزیرے پر ہی اپنے محل نما گھر میں تھے۔ بہت سے لوگوں نے ان سے گھر پر ملاقات کی تھی، تاہم ان کی کوئی سرگرمی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

دوسرے دو اداروں کے آدمی بھی اس گھر پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ شفیع شاہ اور میرے دوسرے آدمی کبھی ٹرالر پر چلے جاتے اور کبھی جزیرے پر آجاتے تھے۔ وہ گرد و پیش پر نظر رکھتے ہوئے وقت گزار رہے تھے لیکن کوئی خاص بات ان کے علم میں نہیں آسکی تھی۔

مجھے اتنی جلدی کوئی کام کی بات معلوم ہونے کی توقع بھی نہیں تھی اس لئے میں نے کہا "تم دو چار دن اور وہاں گزار لو۔ اگر اس دوران بھی ڈاکٹر برنارڈ کی کہیں کوئی جھلک دکھائی نہ دی اور نہ کوئی کام کی بات معلوم ہوئی تو تم لوگ واپس آجانا۔ وہاں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ اگر قسمت میں ہوا تو شاید کہیں ڈاکٹر برنارڈ سے سامنا ہوجائے ورنہ مجھے راحیلہ کی بلیک اینڈ وائٹ صورت پر صبر کرنا پڑے گا۔"

"آپ جب کہیں گے میں واپس آجاؤں گا سر!" شفیع بولا۔

"لیکن اس وقت میں نے ایک اور کام کے سلسلے میں فون کیا ہے۔" میں نے کہا اور نوزی کا حلیہ خاصی تفصیل سے دُہرایا "یہ قاسم بجلی کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے

خطرناک بدمعاش اور دہشت گرد ہے۔ دو مرتبہ مجھ سے ٹکرا کر بچ کر نکل گیا ہے۔ میں نے سوچا احتیاطاً تمہیں مطلع کردوں۔ اگر یہ جزیرے پر کہیں نظر آئے تو قابو میں کرنے کی کوشش کرنا۔ ہاتھ سے نکلتا نظر آئے تو گولی بھی مار سکتے ہو۔ تاہم اس کے سامنے بہت محتاط رہنا۔ ذرا سی غلطی خود تمہارے لئے بھی مہلک ثابت ہوسکتی ہے۔ فی الحال شاید اس کا دایاں ہاتھ زخمی ہے۔ اس لئے ممکن ہے کچھ کم خطرناک ثابت ہو۔"

دوسری طرف سے شفیع شاہ کچھ نہ بولا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "کیا بات ہے تم چُپ کیوں ہوگئے؟ کیا یہ نام تمہیں کچھ شناسا لگ رہا ہے؟"

"جی نہیں" وہ گویا کچھ چونکتے ہوئے بولا "میں تو قسمت کی ستم ظریفی پر غور کررہا ہوں۔ کاش آپ نے مجھے آدھا گھنٹے پہلے فون کیا ہوتا۔"

"کیوں..... آدھا گھنٹا پہلے کیا تھا؟" میں نے ذرا چونکتے ہوئے پوچھا۔

"آدھا گھنٹا پہلے یہ شخص میرے سامنے بیٹھا ناشتا کررہا تھا۔ اس کے دائیں ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بائیں ہاتھ سے کھا رہا تھا، شاید اس لئے بھی مجھے یاد رہ گیا۔" وہ تاسف سے بولا۔

"تمہارے سامنے......؟" میں چونکا۔

"سر! یہاں جزیرے پر جمعہ خان کا ہوٹل ہے۔ یہ تین چار منزلہ مکان سا ہے جس کے اوپر کے کمرے ہوٹل کی طرح کرائے پر اُٹھائے جاتے ہیں اور پورے گراؤنڈ فلور پر عوامی انداز کا ریستوران ہے۔ بڑی مشہور جگہ ہے۔"

"ہاں.... میں نے بازار سے گزرتے وقت یہ ہوٹل دیکھا تھا۔" مجھے یاد آیا۔

"آج صبح ناشتا ہم وہاں کررہے تھے۔ یہ شخص عین میرے سامنے والی بینچ پر بیٹھا تھا۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"پھر کہاں گیا؟" میں نے بے تابی سے پوچھا "قاسم بجلی کے مکان میں تو نہیں گیا؟"

"نہیں سر! قاسم بجلی کا مکان تو اس ہوٹل سے بھی نظر آتا ہے۔ میں نے اسے ادھر جاتے نہیں دیکھا۔ وہ ایک پُرانی سی جیپ میں تھا۔ اسی میں بیٹھ کر دوسری طرف گیا تھا۔ میری نظر میں وہ شخص کھٹکا تھا۔ میری چھٹی حِس کہہ رہی تھی کہ وہ کوئی بدمعاش تھا لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ وہ ہمیں بھی مطلوب ہوسکتا تھا۔ اس لئے میں نے اس کی زیادہ پروا نہیں کی۔"

"اوہ.....!" اس اطلاع سے مجھے واقعی افسوس ہوا تھا "یہ شخص بھی قسمت کا دھنی معلوم ہوتا ہے۔ اب تو معلوم نہیں کہاں پہنچ چکا ہوگا۔ جزیرے سے شہر آنے کے لئے خشکی کا تو ایک ہی راستہ ہے۔ تم نے اس پر اپنا کوئی آدمی بھیج رکھا ہے یا نہیں؟"

"جی ہاں ہمارا ایک آدمی شروع ہی سے اس سڑک کی نگرانی کررہا ہے۔" شفیع شاہ نے جواب دیا۔

"اسے فوراً موبائل پر نوزی کا حلیہ بتا کر خبردار کرو کہ یہ شخص اگر اس راستے سے آتا جاتا نظر آئے تو اسے گھیرنا ہے۔" میں نے تیزی سے کہا پھر پوچھا "تم خود اس وقت کہاں ہو؟"

"میں ٹرالر پر واپس پہنچ چکا ہوں۔ ہم لوگ ٹرالر کو اِدھر اُدھر "ٹہلا" رہے ہیں۔" شفیع شاہ نے جواب دیا۔

"تمہارے پاس کتنے آدمی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کیپٹن کے علاوہ چار ہیں۔"

"تم صرف کیپٹن کو اپنے ساتھ رکھو۔ باقی چاروں کو کسی خاص حکمتِ عملی کے ساتھ جزیرے پر پھیلا دو۔ اگر یہ شخص ابھی تک جزیرے پر ہی موجود ہوا تو شاید اسے تلاش کرنا زیادہ مشکل نہ ہو۔ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"زیادہ بڑا تو نہیں..... لیکن کافی گنجان آباد ہے اور یہاں ایک آدھ تو کیا، دس بیس افراد کے بیک وقت غائب ہونے کے لئے بھی کافی سازگار ماحول موجود ہے۔" شفیع شاہ بولا۔

"بہرحال..... اس شخص سے تمہارا سامنا ہوئے زیادہ دیر نہیں گزری۔ قسمت آزمائی کرکے دیکھ لیتے ہیں۔ شاید مل ہی جائے۔ اس ہوٹل کا جائزہ لینے اور تھوڑی بہت پوچھ گچھ کرنے کے لئے میں خود آرہا ہوں۔"

"آپ اسے بہت اہمیت دے رہے ہیں سر! کیا یہ واقعی اتنا اہم ہے؟" شفیع شاہ نے محتاط لہجے میں دریافت کیا۔

"ہو بھی سکتا ہے۔" میں نے کہا "فی الحال تو مجھے صرف اس لئے اہم لگ رہا ہے کہ تین مرتبہ مجھے اور ایک دیانت دار پولیس آفیسر کو زک پہنچا کر صاف بچ کر نکل گیا ہے اور اس سے پہلے بھی پچاسوں سنگین جرائم، قتل اور خون ریزی کا مرتکب ہونے کے باوجود دندناتا پھر رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے سر! میں اسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ جمعہ خان کے ہوٹل اگر آپ خود آرہے ہیں تو ایک بات اور آپ کو بتادوں۔ اس عوامی ریستوران میں سانولی سی ایک عورت چولی اور لہنگا پہنے اِدھر اُدھر پھرتی رہتی ہے، کبھی کچن میں چلی جاتی ہے۔ کبھی کاؤنٹر والے کے پاس بھی جا بیٹھتی ہے اور اگر کوئی ویٹر اِدھر اُدھر ہوجائے تو گاہکوں کی میز پر کھانا پانی وغیرہ بھی لاکر رکھ دیتی ہے۔ مجھے معلوم نہیں وہ عورت کون ہے لیکن میرا خیال ہے اس کے اور نوزی کے درمیان کوئی شناسائی موجود ہے۔ ان کے درمیان آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے ہوئے تھے۔"

"یہ تو اچھی بات بتائی تم نے۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "میں وہاں پہنچ رہا ہوں تم بھی حرکت میں آجاؤ۔"

چند لمحے بعد میں جزیرے کی طرف روانہ ہوچکا تھا۔ جزیرے کی حدود جہاں سے شروع ہوتی تھی وہاں سڑک انگریزی کے حرف "یو" کی شکل میں خم کھاتی تھی۔ اس موڑ پر ایک آرائشی گیٹ سا بنا

ہوا تھا اور سڑک کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دُکانیں تھیں۔ یہ ایک بارونق سی جگہ تھی۔

یہاں پھولوں کی ایک دُکان پر مجھے اپنا آدمی کھڑا نظر آیا۔ وہ تمام سواریوں اور آنے جانے والوں پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ اس نے مجھے بھی دیکھ لیا بظاہر انجان ہی بنا رہا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس راستے کی نگرانی ہو رہی تھی۔ اس سڑک پر ٹریفک میں گدھا گاڑیاں بھی شامل تھیں۔ میں اسی سست رفتار ٹریفک میں شامل ہو کر جمعہ خان کے ہوٹل جا پہنچا۔ ویسے تو میں اس ہوٹل کے سامنے سے پہلے بھی گزر چکا تھا لیکن توجہ نہیں دی تھی۔ اب میں نے ایک نئے زاویۂ نظر سے اس کا جائزہ لیا۔

شاید یہ جزیرے کی سب سے بارونق جگہ تھی۔ گراؤنڈ فلور پر پھیلا ہوا عوامی سا ریستوران یقیناً کافی چلتا تھا۔ چولہوں پر بڑے بڑے دیگچوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ اصل عمارت کے سامنے بھی انہوں نے کافی رقبہ گھیرا ہوا تھا۔ یہاں سے ساحل بھی نظر آتا تھا۔

پہلے میں ریستوران کا جائزہ لیتے ہوئے وہاں سے گزرتا چلا گیا۔ مجھے اس عورت کی بھی جھلک نظر آئی جس کا شفیع شاہ نے ذکر کیا تھا۔ وہ بڑا سا ایک دیگچا اُٹھائے مجھے ریستوران کے عقبی حصے میں ایک طرف کو جاتی نظر آئی۔

میں نے ساحل کا اور قاسم بجلی کے گھر کا ایک چکر لگایا۔ اپنا نزار بھی مجھے سمندر میں "ٹہلتا" نظر آیا۔ عین ممکن تھا کہ شفیع شاہ اس کے کسی حصے سے دوربین سے مجھے بھی دیکھ رہا ہو۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ کچھ اور لوگ بھی مختلف مقامات سے بظاہر غیرمحسوس سے انداز میں اس محل نما مکان کی نگرانی کر رہے تھے۔

میں واپس جمعہ خان کے ہوٹل آ گیا اور گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے اندر ایک کونے میں چھوٹی سی گندی میز پر جا بیٹھا۔ ایک بیرے نے کندھے پر سے نہایت گندا کپڑا اُتار کر مستعدی سے میز صاف کی۔ کم از کم اپنی دانست میں تو اس نے صاف ہی کی تھی لیکن طبی اصولوں کے مطابق شاید مزید گندی کر دی تھی کیونکہ وہ کپڑا اس کپڑے سے بھی زیادہ گندا تھا جس سے نچلے درجے کے گھروں میں پوچا دیا جاتا ہے پھر اس نے ٹھک سے میرے سامنے المونیم کا جگ اور گلاس لا کر رکھا۔ جگ سے پانی چھلک پڑا۔

"کیا کھائے گا صاب؟" اس نے ایک ادائے خاص سے گردن ترچھی کر کے پوچھا۔ مجھے کسی چیز کی طلب نہیں تھی لیکن اپنی وہاں موجودگی کو باجواز بنانے کے لئے مجھے ناشتے کا آرڈر دینا پڑا گو کہ ناشتے کا وقت گزر چکا تھا۔

جلد ہی مجھے وہ عورت بھی نظر آ گئی جس کی کچھ دیر پہلے میں نے صرف جھلک دیکھی تھی۔ اب وہ چھوٹا سا ایک کنستر اُٹھائے ایک پچھلی کوٹھری سے نکل کر کاؤنٹر کی طرف جا رہی تھی۔ اسے قریب سے دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی۔ وہ تو اچھی خاصی چھیل چھبیلی سی عورت تھی۔

اس کی عمر چالیس سے کم نہیں تھی لیکن خدّوخال میں اب بھی کشش تھی وہ شاید جوانی میں نہ رہی ہو۔ وہ بہت معمولی سے حلیے میں تھی اور معمولی سے کام انجام دے رہی تھی لیکن معمولی عورت معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اس کی چال ڈھال اور حرکات و سکنات قابلِ دید تھیں۔ ہماری فلموں میں بعض نامعلوم قبیلوں کی لڑکیوں کو کچھ اسی طرح کے حُلیوں میں دکھایا جاتا ہے۔ اس کے پیروں میں چاندی کی پازیب بھی تھی جس کی چھن چھن میں ایک خاص ردھم تھا۔ اس کی چال کے ساتھ یہ دُھن ہم آہنگ تھی شاید اس زیور کے ذریعے وہ وہاں موجود لوگوں کے دل اتھل پتھل کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔

شاید وہ وہاں کے ماحول کا ایک حصہ تھی اور ریستوران میں مستقل آنے جانے والے اس کی موجودگی کے عادی ہو چکے تھے۔ شاید وہ کسی خاص ہی موقع پر کسی خاص ہی وجہ سے اس کی طرف متوجہ ہوتے تھے لیکن وہ عورت مجھ پر نظر پڑتے ہی میری طرف پوری طرح متوجہ ہو چکی تھی۔

شاید اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں وہاں کے ماحول میں الگ ہی نظر آ رہا تھا۔ میں جلدی میں کوئی ایسا بندوبست کر کے نہیں آیا تھا کہ اس ماحول میں گھل مل جاتا۔ مجھے اس میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت میں نفیس سوٹ میں تھا۔ ٹائی بھی لگا رکھی تھی اور سیٹھ رمضان کی پُرانی گاڑی بھی بیلا نے چھوڑ دی تھی۔ میں اس وقت اپنی مرسیڈیز میں آیا تھا۔

عورت میٹھی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے انداز سے میرے لئے یہ جاننا مشکل نہیں رہا تھا کہ وہ کس قبیل کی عورت تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ نوزی سے اس کی پہلے شناسائی ہونا ضروری نہیں تھا۔ شفیع شاہ نے مجھے رپورٹ دی تھی کہ نوزی اور اس عورت کے درمیان آنکھوں آنکھوں میں کچھ بات ہوئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ یہیں پہلی بار آنکھیں چار ہونے پر ان کے درمیان آنکھوں آنکھوں میں بات شروع ہوئی ہو۔

عورت کاؤنٹر پر جا بیٹھی تھی۔ کاؤنٹر کے عقب میں گھنی مونچھوں والا ایک نوجوان موجود تھا۔ اس کے سر پہ سیاہ پگڑی تھی۔ وہ کاؤنٹر سنبھالے ہوئے تھا اور عورت کی طرف قطعاً متوجہ نہیں تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ کس بہانے عورت کے قریب جاؤں اور کس انداز میں اس سے بات شروع کروں کہ وہ مجھے نوزی کا دشمن نہیں، دوست سمجھے اور مجھے اس کے بارے میں کوئی کام کی بات بتا دے۔ میری مشکل، عورت نے ہی حل کر دی۔ مجھے کوئی بہانہ تراشنا نہیں پڑا۔ کچھ دیر بعد عورت گویا دل ہی دل میں کسی نتیجے پر پہنچ گئی اور اُٹھ کر خود ہی میری میز کی طرف آنے لگی۔

میں بظاہر انجان بنا، سر جھکائے محض دکھاوے کے لئے

سے پراٹھا اور آملیٹ وغیرہ چبانے کی کوشش کررہا تھا لیکن مجھے احساس تھا کہ وہ اک ادائے خاص سے پازیب چھنکاتی میری طرف بڑھ رہی تھی۔ جب وہ میری میز کے عین قریب آپہنچی تو میں نے چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے سر اُٹھایا۔

اس کے سانولے چہرے پر بدستور مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نشیلا پن سا تھا۔ اس کے خانہ بدوشوں جیسے اور قدرے میلے کپڑوں سے کسی پُرانے قسم کے عطر کی خوشبو آرہی تھی۔ چند لمحے وہ قطعی خاموشی سے، میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکراتی رہی۔ میں نے کچھ یوں ظاہر کرنے کی کوشش کی جیسے میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس سے کیا کہوں۔ میں گویا ناشتا کرنا بھی بھول گیا تھا۔

"کیا بیٹھنے کو بھی نہیں کہو گے؟" وہ صاف ستھری اردو میں نہایت مہذبانہ لہجے میں بولی جس پر مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔

"کیوں نہیں... کیوں نہیں۔" میں نے جلدی سے سامنے والی چھوٹی سی بینچ کی طرف اشارہ کیا۔

"لگتا ہے پہلی بار اس جزیرے پر آئے ہو۔" وہ لہنگا سنبھال کر سامنے بیٹھتے ہوئے بولی۔ مخمور آنکھوں سے بدستور مسکراہٹ پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"نہیں.... جزیرے پر تو کئی بار آچکا ہوں۔ اس ہوٹل میں پہلی بار آیا ہوں۔" میں نے گویا سنبھلتے ہوئے جواب دیا۔

"چھوٹے صاحب!" وہ بڑی ادا سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے بولی "جب ہم سے ہی نہ ملے تو اس جزیرے پر آنا نہ آنا برابر ہی ہوا نا!"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" اب میں نے بھی از سرِ نو گہری نظر سے اس کا جائزہ لے کر مسکراتے ہوئے کہا۔ نوجوانی میں وہ یقیناً ایک سانولی قیامت رہی ہوگی۔ اس نے چولی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کاغذ میں لپٹے ہوئے دو پان نکالے۔ ایک اس نے خود کلے میں دبالیا۔ دوسرا میری طرف بڑھایا۔

میں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا "تم جیسی خاتون کے ہاتھ سے کوئی چیز ملے تو انکار کرنا بڑی ہی بدتمیزی لگتی ہے.... لیکن مجبوراً انکار کررہا ہوں۔ پان مجھ سے کوشش کے باوجود نہیں کھایا جاتا۔"

"کسی زمانے میں ہم سے بھی نہیں کھایا جاتا تھا۔ جب کھانے لگے تو پھر چھڑائے نہیں چھوٹا۔" پھر ذرا توقف سے وہ بولی "ہم سے دوستی ہوگئی تو کھانے لگو گے۔"

میں نے ناشتا چھوڑ کر ذرا میز پر جھکتے ہوئے کہا "تمہیں کیا فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے؟"

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے بولی "تم کیا فلم ڈائریکٹر ہو؟" اس کے لہجے سے یہ تو پتا چلتا تھا کہ اردو اس کی مادری زبان نہیں تھی لیکن اندازِ گفتگو سے وہ چٹی اَن پڑھ یا اجڈ گنوار نہیں لگتی تھی۔ اس پر مجھے دل ہی دل میں ایک خوشگوار سی حیرت محسوس ہوئی تھی۔

"میں فلم ڈائریکٹر نہیں ہوں۔" میں نے جواب دیا "لیکن تم سے دوستی ہوگئی تو شاید تمہاری خاطر بن جاؤں۔"

اس بات پر خوش ہونے کے بجائے وہ کچھ سنجیدہ ہوگئی اور ٹھنڈی سانس لے کر بولی "چکنی چپڑی باتیں کرنا تو کوئی تم مَردوں سے سیکھے۔"

"یہاں بھی وہی عورتوں اور مَردوں کی بحث...." میں نے اس سے بھی زیادہ ٹھنڈی سانس لے کر کہا "شہروں میں تو یہی بحث چھڑی رہتی ہے کہ عورتیں یوں ہیں اور مرد یوں ہیں۔ میرا خیال تھا ایسی جگہوں پر ایسی باتیں نہیں ہوتی ہوں گی۔" میں نے گردوپیش کی طرف اشارہ کیا۔

"عورت اور مرد جہاں بھی موجود ہوں گے وہاں ایسی باتیں تو ہوں گی۔" وہ بدستور مسکراتے ہوئے بولی "بہرحال.... اگر تم بیس سال پہلے میری خاطر فلم ڈائریکٹر بننے کی بات کرتے تو میں یقین کرلیتی مگر مجھے معلوم ہے اب دیر ہوچکی ہے اور اب میں پہلے جیسی بھولی بھی نہیں رہی۔ بہت کچھ سُن لیا اور بہت کچھ دیکھ لیا ہے میں نے اس دنیا میں.....!"

"میری بدقسمتی یہی ہے۔" میں نے افسوس سے کہا "جب بھی کسی اچھی شخصیت سے ملاقات ہوتی ہے وہ دنیا میں بہت کچھ دیکھ چکی ہوتی ہے۔ اس کی معصومیت رخصت ہوچکی ہوتی ہے اور معصومیت کے ساتھ ہی انسان کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں رخصت ہوجاتی ہیں، چالاک ہوجانا بڑے افسوس کا مقام ہے۔ چالاکی انسان کو بڑے دکھ پہنچاتی ہے۔"

"ہاں یہ تو تم نے ٹھیک کہا۔" وہ سرہلاتے ہوئے بولی "چالاکی واقعی انسان کو بڑے دکھ پہنچاتی ہے۔ معصومیت میں بڑی راحت ہے۔ اب تم بھی چالاکی چھوڑو اور یہ بتاؤ یہاں کس چکر میں آئے ہو؟"

مجھے اتنی جلدی اس سے اس قسم کے سوال کی توقع نہیں تھی۔ میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا "تمہیں کیوں کر یہ خیال آیا کہ میں کسی چکر میں یہاں آیا ہوں؟"

"تمہاری رہائش اس جزیرے پر نہیں ہے۔ جن کی رہائش اس جزیرے پر نہیں ہوتی اور جو ایک نظر دیکھنے میں ہی اونچے طبقے کے لوگ نظر آتے ہیں وہ عام طور پر کسی نہ کسی چکر میں ہی یہاں آتے ہیں۔ بیٹھے بٹھائے بھلا کسی دولت مند آدمی کو اس گندے اور بدحال سے جزیرے پر آنے کی کیا ضرورت ہے؟" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"مجھے تو یہ گندا اور بدحال جزیرہ نہیں لگتا۔ مجھے تو یہاں دولت کی خوشبو آتی ہے۔" میں نے کہا۔

"حیرت ہے....!" وہ دھیرے سے ہنسی "نئے آنے والے تو اکثر ناک سکیڑ کر یہ کہتے پائے جاتے ہیں کہ یہاں ہر جگہ مچھلی کی بو آتی ہے۔"

"شاید مچھلی کی اس بو میں ہی دولت کی خوشبو لپٹی ہوئی ہے۔"

وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی "بہت تیز ناک ہے تمہاری.... ایسی ناک والے خطرناک ہوتے ہیں۔"

"میں تو بالکل بے ضرر سا آدمی ہوں۔"

"ہاں تبھی تم نہایت صفائی سے میرے سوال کا جواب گول کرگئے۔ میں نے پوچھا تھا تم یہاں کس چکر میں آئے ہو؟" وہ بغور میری طرف دیکھ رہی تھی "شاید میں تمہاری کوئی مدد کرسکوں۔"

"اگر یہ اُمید دلا رہی ہو تو پھر تم سے بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔" پھر میں نے اس کی طرف جھکتے ہوئے ذرا رازدارانہ انداز میں کہا "میرا ایک دوست ہے نادر عرف نوزی.... میرا اس سے رابطہ ٹوٹ گیا ہے اور مجھے پتا چلا ہے اس کا ہاتھ بھی کسی طرح زخمی ہوگیا ہے۔ مجھے اس کی تلاش ہے۔ مجھے ذرا دیر سے پتا چلا کہ وہ یہاں آیا تھا۔ ورنہ شاید میری اس سے ملاقات ہوجاتی۔ عین ممکن ہے کہ وہ بھی مجھے تلاش کررہا ہو لیکن اسے مجھ سے رابطے کا طریقہ معلوم نہیں ہے۔ اگر تم مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاسکو تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔ اس کے عوض میں تمہاری ہر خدمت کرنے کے لئے تیار ہوں۔"

وہ ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی "خدمت بتائی تو تم بھاگ جاؤ گے.... خدمت کی بات تو چھوڑو.... یہ بتاؤ یہ نادر عرف نوزی کون ہے؟"

یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اداکاری کررہی تھی یا واقعی اسے معلوم نہیں تھا کہ میں کس کی بات کررہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حقیقی اُلجھن کی پرچھائیاں تھیں۔

"تم نادر عرف نوزی کو نہیں جانتیں؟ خاصا مشہور آدمی ہے۔ قاسم بجلی کے خاص آدمیوں میں سے ہے۔"

"قاسم بجلی کے زیادہ تر آدمیوں کو تو میں جانتی ہوں لیکن قاسم بجلی کے آدمیوں کا بھلا کیا شمار... پتا نہیں کہاں کہاں اس کے کس کس طرح کے آدمی موجود ہیں۔ تم جس آدمی کا ذکر کررہے ہو شاید اسے میں کسی دوسرے نام سے جانتی ہوں گی، تم اس کا حُلیہ بتاؤ۔ تمہاری مدد کرکے مجھے خوشی ہوگی۔"

میں نے نادر عرف نوزی کا حُلیہ بیان کیا تو وہ سرہلاتے ہوئے بولی "اوہو.... تم چھکے کی بات کررہے ہو۔ ہم اسے نادر یا نوزی کے نام سے نہیں، "چھکے" کے نام سے جانتے ہیں۔ وہ تو صبح یہاں آیا تھا لیکن معلوم نہیں اس کے بعد کہاں گیا۔ اس سے میری بات نہیں ہوئی۔ وہ بہت جلدی میں معلوم ہوتا تھا۔"

لگتا تھا کہ وہ دیانت داری سے بات کررہی تھی اور میری مدد کرنے کے لئے تیار تھی۔ اس کے جواب سے مجھے اُمید کی کرن نظر آئی۔ میں نے جلدی سے پوچھا "کوئی اور بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتاسکتا؟"

"وہ قاسم بجلی کا آدمی ہے تو اسی کے گھر گیا ہوگا۔" وہ بولی۔

"نہیں وہ اس کے گھر نہیں گیا۔ میں نے معلوم کرلیا ہے۔"

"ہاں قاسم بجلی کے مرنے کے بعد اس کے آدمی آج کل اس کے گھر سے ذرا دور دور ہی رہتے ہیں۔" وہ سرہلاتے ہوئے اور کچھ سوچتے ہوئے بولی "میرا خیال ہے میرا شوہر تمہیں اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ بتاسکتا ہے۔"

"اچھا.... تو تمہارا کوئی شوہر بھی ہے؟" میں نے اپنی حیرت کو چُھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"کیوں کیا میں تمہیں اس قابل نہیں لگتی کہ میرا کوئی شوہر ہوتا؟" اس نے ترچھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"اب اگر شوہر موجود ہی ہے تو کوئی حرج نہیں۔ موجود نہ ہوتا تب بھی ٹھیک ہی تھا۔" میں نے سرہلایا "ویسے.... عجیب بات ہے۔ ہم اتنی باتیں کرچکے ہیں لیکن ابھی تک مجھے تمہارا نام معلوم نہیں۔"

"نام تو میرا کچھ اور تھا لیکن وہ اب ایک بھولی بسری کہانی بن چکا ہے۔ اب اس جزیرے پر لوگ مجھے صرف چنبیلی کے نام سے جانتے ہیں۔"

"اوہ!" میں یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ میں نے زندگی میں پہلی بار سانولی چنبیلی دیکھی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "اگر تمہیں کوئی خوف لاحق نہ ہو تو تم بھی مجھے اپنا نام بتاسکتے ہو۔"

"مجھے افضل کہتے ہیں۔" میں نے اپنا صحیح نام بتادینا ہی بہتر سمجھا۔ ہم نیچی آوازوں میں باتیں کررہے تھے۔ تاہم میں نے اپنا نام بتاتے وقت غیر محسوس طور پر کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں تھا اور یہ میرے لئے حیرت کی بات تھی۔ چنبیلی وہاں موجود اکلوتی عورت تھی۔ خواہ اس کی عمر چالیس کے قریب تھی اور چاہے وہ غیر معمولی طور پر خوب صورت نہیں تھی مگر بہرحال عورت تھی اور ایک مخصوص دلکشی کی دولت سے مالا مال تھی۔

اس قسم کے عوامی ریستوران میں تو رنگا رنگ اور پھولدار کپڑوں میں اگر مرد بھی بیٹھا ہو تو لوگ گردنیں گھما گھما کر اس کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ چنبیلی تو پھر بھی خاصی دلربا قسم کی عورت تھی۔ ریستوران میں گاہکوں کی تعداد بھی کچھ ایسی کم نہیں تھی۔ تقریباً تمام میزیں بھری ہوئی تھیں۔ گپ شپ، شور شرابا اور کھانا پینا اسی طرح جاری تھا جس طرح عموماً ایسی جگہوں پر ہوتا ہے۔ چنبیلی جب اُٹھ کر میری طرف آئی تھی صرف اس وقت چند لوگوں نے کنکھیوں سے ادھر دیکھا تھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے پگڑی والے نوجوان نے بھی سر اُٹھا کر ہماری طرف دیکھا تھا لیکن اس کی نظروں میں تجسس یا اشتیاق سے زیادہ بے زاری تھی۔ بعد میں اس کی توجہ بھی ہماری طرف سے ہٹ گئی تھی۔

دفعتاً ایک شخص پانی کا جگ اور گلاس اُٹھائے ہمارے قریب

سے گزرا۔ وہ بانس کی طرح لمبا اور سوکھا ہوا تھا۔ وہ دھوتی واسکٹ میں تھا اور کالا بھجنگ تھا۔ اس کی کمر میں خم تھا اور وہ یوں بے زاری سے پاؤں گھسیٹ کر چل رہا تھا جیسے زندگی اس کے لئے ایک بوجھ ہو۔ اس کے پیروں میں ٹوٹی چپلیں اور سر پر پُرانے سے کپڑے کی مختصر پگڑی تھی۔ اس کی ناک طوطے کی چونچ کی طرح مُڑی ہوئی تھی۔

میں اسے دیکھ کر ذرا چونکا لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کی شخصیت میں صرف یہی ایک نشانی نوزی والی تھی۔ وہ میک اپ میں ہوتا تب بھی نوزی نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ نوزی اتنا لمبا نہیں تھا اور نہ ہی ایسا سوکھا سڑا تھا۔ وہ باڈی بلڈر ٹائپ تھا۔

ایک گاہک نے اس شخص کو بیرا سمجھ کر میز تھپتھپائی اور اشارے سے بُلانا چاہا لیکن وہ سر جھکائے ریستوران کی عقبی کوٹھریوں کی طرف چلا گیا۔ چنبیلی نے محسوس کر لیا تھا کہ میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے گویا وضاحت کی "بے چارہ گونگا بہرا ہے۔ اس لئے اس نے گاہک کی آواز نہیں سُنی۔"

"تو پھر اسے ہوٹل میں کیوں رکھا ہوا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بہرا ہے۔ بیرا نہیں۔" چنبیلی مسکراتے ہوئے بولی "بس یونہی ہوٹل کے کسی کونے کھدرے میں پڑا رہتا ہے' اشاروں سے سمجھا دیا جائے تو چھوٹے موٹے کام کر دیتا ہے۔ مالک نے خدا ترسی کے جذبے سے رکھا ہوا ہے۔"

وہ شخص ایک کوٹھری میں داخل ہو کر غائب ہو چکا تھا۔ میں نے ادھر سے نظر ہٹا کر دوبارہ چنبیلی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "خیر.... دفع کرو اسے.... میں نوزی کی بات کر رہا تھا۔ تم بتا رہی تھیں کہ تمہارا شوہر شاید اس کے بارے میں کچھ جانتا ہو۔ تمہارے شوہر سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

وہ میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے ہچکچاہٹ آمیز سے لہجے میں گویا ضروری تصحیح کرتے ہوئے بولی "وہ در حقیقت میرا شوہر نہیں ہے لیکن ہم جیسی عورتوں کی بھی بہرحال کوئی عزت ہوتی ہے اس لئے میں اسے اپنا شوہر ہی کہتی ہوں۔ حالانکہ وہ اس بات کا بُرا مناتا ہے کیونکہ اس کی اصل بیوی موجود ہے۔"

"تو پھر تم اس کی کون ہو؟" میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

"داشتہ" اس نے آہستگی سے جواب دیا "بلکہ ایک عرصے سے تو وہ بھی نہیں ہوں۔ بس ایک پالتو جانور کی طرح ویسے ہی یہاں پڑی ہوں۔ میں اس وقت اٹھارہ سال کی تھی جب اس نے مجھے داشتہ بنایا تھا۔ وہ خود اُس وقت بیالیس سال کا تھا۔ اِس وقت وہ تقریباً باسٹھ سال کا ہے اور کئی سال سے ایک حادثے میں معذور ہو کر بستر پر پڑا ہے۔ اس نے مجھے کئی سال پہلے چھٹی دے دی تھی کہ میں جہاں چاہوں جا سکتی ہوں لیکن میں کہیں بھی نہیں جاتی۔ یہیں پڑی ہوں' میں بڑی وفادار داشتہ ہوں۔ بیوی سے بھی زیادہ وفادار...." وہ خود استہزائی کے سے انداز میں دھیرے سے ہنسی۔

اس کی ہنسی میں بڑی جذبات خیز کھنک تھی۔

"تمہارا شوہر.... میرا مطلب ہے وہ شخص کون ہے؟" میں نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

"اس ہوٹل کا مالک۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "وہ اس جزیرے کے بہت پُرانے مقامیوں میں سے ایک ہے۔ اس کا یہ ہوٹل دیکھنے میں معمولی لگتا ہے مگر وہ کافی پیسے والا آدمی ہے۔ ٹھیک ٹھاک اثر رسوخ بھی رکھتا ہے۔" پھر اس نے شوخ سی نظروں سے کاؤنٹر پر بیٹھے نوجوان کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولی "یہ اس کا بیٹا ہے اگر اس شخص سے میری شادی ہوئی ہوتی تو یہ میرا سوتیلا بیٹا ہوتا۔"

"اب تم اسے کیا سمجھتی ہو؟"

"اب بھی تقریباً بیٹا ہی سمجھتی ہوں لیکن تمہارے اس سوال سے کچھ بدمعاشی سی کیوں جھلک رہی ہے؟" اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے جلدی سے کہا "تمہارے شوہر سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟"

"یہیں.... اسی ہوٹل کے تہ خانے میں۔" چنبیلی نے جواب دیا "اب وہ کسی ردی چیز کی طرح تہ خانے میں پڑا رہتا ہے۔ اس کی بیوی کا انتقال ہو چکا ہے۔ صرف میں ہی کبھی کبھار جا کر اس کا حال احوال پوچھ لیتی ہوں۔ کوئی اور اس کی زیادہ خبر گیری نہیں کرتا۔"

"اس ہوٹل کے نیچے بھی کچھ بنا ہوا ہے؟" میں نے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"یہ عمارت تو انگریزوں کے زمانے کی ہے۔ اس کے نیچے تو بہت کچھ بنا ہوا تھا۔ حالانکہ نیچے زمین پتھریلی تھی پھر بھی بڑا اچھا تہ خانہ وغیرہ بنایا گیا تھا۔ اب تو کمروں کا ناس لگ چکا ہے۔ ان لوگوں نے اسے گودام بنایا ہوا ہے۔ ایک کمرے میں میرا شوہر پڑا رہتا ہے۔" اس نے بتایا۔

"مجھے اس سے ملوا دو۔" میں نے فرمائش کی۔

"پہلے مجھے اس سے پوچھ کر آنا پڑے گا۔ وہ اب بہت چڑچڑا سا ہو گیا ہے۔ خوش مزاج تو وہ پہلے بھی نہیں تھا لیکن عمر بڑھنے اور ایک عرصے سے بستر پر پڑا رہنے کی وجہ سے تو ایسا ہو گیا ہے کہ بات بات پر کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ اس لئے بھی اس کا اپنا کنبہ اس سے بے زار ہے اور انہوں نے اسے نیچے پھینک رکھا ہے۔" پھر وہ ایک نظر کاؤنٹر کی طرف دیکھ کر بولی "تم یہیں ٹھہرو۔ میں پوچھ کر آتی ہوں۔"

وہ اُٹھی اور پازیب چھنکاتی ریستوران کے عقبی حصے کی طرف چلی گئی۔ میں نے کاؤنٹر کی طرف دیکھا۔ کاؤنٹر پر بیٹھا نوجوان گاہکوں سے پیسے لینے' بیروں کو ہدایات دینے اور انہیں ہلکی پھلکی ڈانٹ پلانے میں مصروف تھا۔ اسے گویا ان معاملات کے علاوہ کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چنبیلی کی باتوں میں کتنا سچ اور کتنا جھوٹ ہو سکتا تھا؟ فی الحال یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ بہرحال میں معصوم بن کر اس کے ساتھ کافی آگے تک جانے کے لئے تیار تھا۔ اگر اس میں کوئی خطرہ بھی پوشیدہ تھا تو مجھے بہرحال اس کا مقابلہ کرنا تھا۔ خطرہ مول لئے بغیر کوئی بات بنتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اس ہوٹل سے مجھے کچھ پُراسراریت کی بو آرہی تھی۔

میں نے نظر بچا کر جیب سے موبائل فون نکالا اور شفیع شاہ کا نمبر پنچ کر کے نہایت محتاط انداز میں اسے کان سے لگاتے ہوئے نیچی آواز میں مختصراً اسے صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ بظاہر میں ناشتے ہی میں مصروف تھا لیکن در حقیقت میں کچھ نہیں کھا رہا تھا۔ صرف چند سیکنڈ بات کر کے میں نے فون جیب میں ڈال لیا۔

کچھ دیر بعد چنبیلی چھن چھن کرتی واپس آئی تو میں بے دلی سے گاڑھی اور ٹھنڈی چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔ وہ قریب آکر بولی "اُٹھو.... میرے ساتھ آؤ۔ جانو میر بحر تم سے ملنے کے لئے راضی ہو گیا ہے۔"

"یہ جانو میر بحر کون ہے؟" میں نے کپ رکھتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جس کی میں رکھیل تھی۔ رکھیل سمجھتے ہو نا؟" اس نے مسکراتے ہوئے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"اگر پہلے نہیں سمجھتا تھا تب بھی تمہاری زبان سے سُننے کے بعد تو سمجھ گیا ہوں۔" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا "اس کا نام جانو میر بحر ہے؟"

"ہاں وہ اس ہوٹل کے بانی جمعہ خان مرحوم کا بیٹا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ شہر سے کوئی بڑا سیٹھ اس سے ملنے آیا ہے' تو اس کی تھکی ہوئی روح میں ذرا دلچسپی کی لہر دوڑ گئی۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ وہ ملنے کے لئے تیار ہو گیا۔ ورنہ وہ تو آج کل مجھ سے بھی ملنا پسند نہیں کرتا۔"

"تم سے مل مل کر تو بے چارے کا دل بھر چکا ہوگا' اور پھر اب ملنے کا فائدہ بھی کیا۔" میں نے اس کی رہنمائی میں ہوٹل کے عقبی حصے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے جلدی سے کہا "ویسے تم نے یہ کیوں سمجھ لیا کہ میں شہر سے آیا ہوا کوئی بڑا سیٹھ ہوں؟"

"اللہ نے مجھے بھی دو آنکھیں دی ہیں۔ بے شک میری زندگی کا زیادہ حصہ اسی جزیرے پر گزرا ہے لیکن میں اتنی کوڑھ مغز تو نہیں.... یہاں رہتے ہوئے بھی میں کہہ سکتی ہوں کہ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ کیا میں کسی کا حُلیہ' گاڑی اور رکھ رکھاؤ دیکھ کر یہ بھی اندازہ نہیں لگا سکتی کہ وہ کون ہو سکتا ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے' ذہین تو خیر تم شاید شہر میں رہنے والی عورتوں سے زیادہ ہو' لیکن میرا مطلب ہے میں کوئی اسمگلر وغیرہ بھی تو ہو سکتا ہوں۔" میں نے اس کے ساتھ ایک کوٹھری میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"آج کل اسمگلر بھی تو سیٹھ ہی کہلاتے ہیں۔ انہیں اسمگلر کون کہتا ہے؟ ہم جزیرے والوں کے لئے تو وہ زیادہ بڑے سیٹھ ہیں۔" وہ اپنی مخصوص مہرباں مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ اس کی ناک میں ہیرے کا لونگ جھلملا رہا تھا جو اس کی سانولی رنگت پر بہت بھلا لگ رہا تھا۔

ہم جس کوٹھری میں داخل ہوئے تھے اس میں اگر کمزور سا ایک بلب روشن نہ ہوتا تو دروازہ بند کرنے کے بعد اس میں گھپ اندھیرا چھا جاتا۔ اس کوٹھری میں خالی کنستر اور ہوٹل کا دوسرا کاٹھ کباڑ پڑا تھا۔ فرش اور دیواروں پر چکنائی اور میل چڑھا ہوا تھا۔ میں نے اس لمبے' سوکھے اور کمر خمیدہ کالے بھجنگ شخص کو اسی کوٹھری میں آتے دیکھا تھا لیکن اب وہ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

ایک طرف دیوار کے ساتھ راستہ کچھ صاف نظر آرہا تھا۔ شاید ادھر سے ہی لوگوں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ میں چنبیلی کی رہنمائی میں اس راستے سے ایک اور دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ ایک اور کوٹھری تھی جو نسبتاً صاف ستھری تھی۔ اس میں فرش پر دو گدّے بچھے ہوئے تھے' کچھ دوسری چیزیں بھی موجود تھیں۔ لگتا تھا کہ اس میں ہوٹل کے ملازموں کی رہائش تھی۔ ایک طرف سے پتھر کی سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔

میں بظاہر پُرسکون انداز میں چنبیلی کے پیچھے چلا جا رہا تھا لیکن میرے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ میرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں گن کے دستے پر جما ہوا تھا لیکن ابھی تک مجھے کہیں کوئی مسلح یا غیر مسلح شخص نظر نہیں آیا تھا۔ ریستوران کا شور یکدم ہی جیسے کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ سیلن زدہ کوٹھریوں کی اس زرد سی روشنی میں چنبیلی کی پازیب کی چھن چھن میرے حواس سے کچھ دلفریب سی سرگوشیاں کر رہی تھی لیکن میں ان پر دھیان دیے بغیر چلا جا رہا تھا۔ چنبیلی بار بار گردن گھما کر میری طرف دیکھتی تھی اور مہرباں انداز میں مسکراتی تھی لیکن میں اس وقت بقراط بنا ہوا تھا۔

سیڑھیوں کے اختتام پر لوہے کا ایک مضبوط گیٹ تھا جو اس وقت کُھلا ہوا تھا۔ اس معمولی سی جگہ پر اتنا مضبوط اور شاندار گیٹ مجھے کچھ عجیب سا لگا۔ اس سے گزرنے کے بعد میں نے پلٹ کر دیکھا لیکن کوئی اس گیٹ کو بند کرنے نہیں آیا اور نہ ہی وہ خود بہ خود بند ہوا۔ وہ بدستور کُھلا رہا۔ میں نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔

تہ خانے میں داخل ہوتے ہی ہم گویا ایک بالکل ہی مختلف جگہ پر آگئے تھے۔ یہاں فرش اور دیواریں ماربل کی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ چند بوریاں اور تھیلے رکھے تھے۔ وہ آٹے اور نمک وغیرہ کی بوریاں اور تھیلے معلوم ہوتے تھے۔ شاید یہ ہوٹل میں استعمال ہونے تھے لیکن ان کے اردگرد بھی فرش بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ ان بوریوں اور تھیلوں کے باوجود وہاں کی حالت ویسی نہیں تھی جیسی عام طور پر گوداموں وغیرہ میں ہوتی ہے۔

اس کمرے میں بوریوں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ہم ایک اور دیوار تک پہنچے۔ اس میں بھی لوہے کا ایک مضبوط اور شاندار گیٹ لگا ہوا تھا۔ یہ بھی کھلا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ تہ خانہ ہونے کے باوجود یہاں گھٹن کا احساس قطعاً نہیں تھا جبکہ ہوا کی آمدورفت کا کوئی ذریعہ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔

دوسرے کمرے میں پہنچتے ہی مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں کسی اسپتال کے وارڈ میں آگیا تھا۔ یہاں فرش اور دیواروں پر لگی ہوئی ماربل کی ٹائلیں بھی سفید تھیں اور زیادہ تر سازوسامان بھی سفید تھا۔ اسپتالوں جیسا ہی لوہے کا ایک پلنگ تھا جس پر ایک بوڑھا شخص گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھا۔ اس کا بستر بھی سفید تھا اور وہ سینے تک ایک سفید ہی چادر میں چھپا ہوا تھا۔

وہ بوڑھا ضرور تھا مگر ایسا گیا گزرا معلوم نہیں ہوتا تھا جیسا چنبیلی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا۔ اس کے تقریباً سارے بال سفید تھے اور آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں مگر اس کے چہرے پر صحت مندی کی تمام علامتیں موجود تھیں۔ اس کی رنگت گندمی تھی مگر اس میں صحت مندانہ سُرخی کی جھلک تھی۔ اس کے پپوٹے بھاری تھے۔ شاید اس کی وجہ کثرتِ شراب نوشی رہی ہو' تاہم وہ مریض معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کے بازو اور گردن سے ذرا نیچے تک کا حصہ چادر سے باہر تھا لیکن اسے محض اس حد تک دیکھ کر ہی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ ایک مضبوط اور قوی الجثہ آدمی تھا۔ جوانی میں یقیناً کلاسیکی رومانی داستانوں کے کسی تصوراتی ہیرو سے مشابہ رہا ہوگا۔

اس کے برابر میز پر دوائیں اور ضرورت کا دوسرا سامان پڑا تھا۔ سرہانے گھنٹی بھی لگی ہوئی تھی۔ بڑے میاں اچھے بھلے ٹھاٹ سے رہ رہے تھے ورنہ چنبیلی کی باتوں سے تو میرے ذہن میں کچھ اور ہی نقشہ اُبھرا تھا کہ کوئی قریب المرگ بوڑھا تہ خانے کی کسی گندی سی کوٹھری میں گندے حال میں پڑا کھانس رہا ہوگا' خون تھوک رہا ہوگا اور کوئی اس کا پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ بیڈ کے پاس تین چار عمدہ قسم کی کرسیاں بھی پڑی تھیں۔

میں قریب پہنچا تو وہ مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بھاری گونجیلی آواز میں بولا "جانو میر بحر تمہیں خوش آمدید کہتا ہے۔"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے زمانہ قدیم میں کوئی بادشاہ کسی مہمان کو شرفِ ملاقات بخش رہا ہو۔ میں نے اس سے مصافحہ کیا تو احساس ہوا کہ وہ بستر پر پڑے ہوئے کسی بوڑھے کا ہاتھ نہیں تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو مجھے شبہ ہوا کہ اس نے کہیں سفید بالوں کی وگ تو نہیں لگا رکھی تھی؟ لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر یقین ہوگیا کہ اس کے بال اصلی ہی تھے۔

اس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ چنبیلی کو اس نے یوں نظر انداز کیا ہوا تھا جیسے وہ کمرے میں موجود ہی نہیں تھی۔ اس کی نظر میرے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔ میں بیٹھا تو چنبیلی بھی میرے برابر کی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"میں تمہارا پورا نام پوچھ سکتا ہوں؟" پتھریلے درودیوار کے درمیان اس کی بھاری' گونجیلی آواز کچھ اور بھی بارعب محسوس ہورہی تھی۔

"افضل چوہدری۔" میں نے اب ذرا کُھل جانے کا فیصلہ کیا۔ اگر بوڑھا میری آمد کے مقصد سے واقف تھا تو میں اس کا ردِعمل دیکھنا چاہتا تھا۔

"اس نام کا ایک آدمی کراچی میں فائیو اسٹار ہوٹل کا مالک ہے۔" وہ پلک جھپکائے بغیر بولا۔

"میں وہی ہوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواب دیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ سچائی کے ٹریک پر میری گاڑی کہاں تک جاسکتی تھی اور اس کا کیا نتیجہ نکل سکتا تھا۔ یہ بوڑھا میری توقعات سے بہت مختلف تھا۔ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ اس کے سامنے غیر ضروری جھوٹ نہیں بولنا چاہئے تھا۔

"تو پھر نادر عرف نوزی تمہارا دوست نہیں ہوسکتا۔ وہ ایک ڈاکو' بدمعاش اور دہشت گرد ہے۔" جانو میر بحر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

"دوست ہو بھی ہوسکتا ہے۔ کاروباری لوگوں کو کئی طرح کے لوگوں سے بنا کر رکھنی پڑتی ہے۔" میں نے گول مول جواب دیا۔

"بنا کر رکھنا اور بات ہے' دوستی اور چیز ہوتی ہے۔ بنا کر رکھنا درحقیقت مجبوری اور نفرت کا رشتہ ہے۔ دوستی' محبت کا رشتہ ہے۔ تم کھل کر بات کرو اور سچ بولو۔ تمہارا اس سے کون سا رشتہ ہے؟"

"ابھی یہ واضح نہیں ہوسکا۔" آخر کار میں نے جواب دیا۔

"کیا تم اسے مارنے آئے ہو؟" وہ بدستور میری آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"ابھی میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا۔" میں نے اب جھوٹ کا سہارا لینا بہتر سمجھا۔

"تو پھر اپنی جیب میں موجود گن کے دستے پر سے ہاتھ ہٹالو۔ تم ایک دوست کے سامنے بیٹھے ہو۔ دشمن کے سامنے نہیں۔" بوڑھے کی گونجیلی آواز میں غضب کا ٹھہراؤ تھا۔ اس کی آنکھیں دُھندلائی ہوئی تھیں مگر ایکس رے مشین سے کم نہیں تھیں۔ اسے میری جیب میں گن کی موجودگی کا پتا چل گیا تھا۔ میں نے گہری سانس لے کر جیب سے ہاتھ نکال لیا۔

"ہاں اب ٹھیک ہے۔ اب ہم شرفا کی طرح گفتگو کرسکتے ہیں۔" وہ طمانیت سے سرہلاتے ہوئے بولا۔

"کیا اب ایک شریف آدمی دوسرے شریف آدمی سے پوچھ سکتا ہے کہ نادر عرف نوزی کہاں ہے؟" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں ہے لیکن میں یہ پیش گوئی کرسکتا ہوں کہ وہ جلد تمہیں مل جائے گا۔ تمہاری آنکھیں بتارہی ہیں کہ تم دُھن کے بہت پکے ہو۔ جس کام کا عہد کرلیتے ہو اسے پورا کرکے چھوڑتے ہو۔ جسے تلاش کرنے کا عزم کرلیتے ہو اسے پاتال سے بھی ڈھونڈ نکالتے ہو۔"

"شاید ایسا ہی ہو۔" میں نے مبہم لہجے میں جواب دیا۔

"لیکن میری باتوں سے تم یہ نہ سمجھ لینا کہ اسے میں نے پناہ دے رکھی ہوگی۔ میں ایسے فسادی آدمیوں کو پناہ نہیں دیتا۔" اس نے گویا وضاحت کی۔

"چلئے میں آپ کی بات کا یقین کرلیتا ہوں لیکن کیا آپ بتاسکتے ہیں کہ وہ کہاں مل سکتا ہے؟"

"مل جائے گا.... مل جائے گا.... یہیں کہیں جزیرے پر ہی ہوگا۔ آج صبح وہ اوپر ہوٹل میں آیا تھا لیکن مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اسے معلوم ہے میں اسے پسند نہیں کرتا۔" جانو میر بحر کا اندازِ گفتگو کچھ شاہانہ سا تھا "مجھے پتا چلا ہے کہ وہ شہر میں پھر کوئی سنگین واردات کرکے بھاگا ہے۔ شاید اس نے کسی اخباری آدمی کو قتل کردیا ہے اور ایک پولیس آفیسر کو بھی قتل کرنے کی کوشش کی تھی۔"

میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ مشتاق مدثر کے قتل کی خبر ابھی کسی اخبار میں نہیں چھپی تھی۔ شاید کسی میں چھپی بھی ہو تو کم از کم یہ تو ابھی کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اسے نوزی نے قتل کیا تھا۔ خود نوزی اور اس کے ایک آدھ حواری کے علاوہ شاید یہ بات صرف مجھے اور رحیم گُل کو معلوم تھی۔ بلکہ ہمیں بھی معلوم کیا تھی' ہم نے اندازہ لگایا تھا۔

"آپ بہت باخبر آدمی ہیں جانو میر بحر صاحب!" میں نے اس کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں تہ خانے میں رہتا ہوں۔ قبر میں تو نہیں رہتا۔" اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ اُبھری لیکن اس کے چہرے سے اس کے دل کا حال جاننا ناممکن تھا۔ وہ بہت گہرا آدمی تھا۔ چنبیلی...... یا جو بھی اس کا نام تھا میرے برابر بالکل خاموش اور مؤدب بیٹھی تھی۔

"پھر بھی آپ کی معلومات قابلِ داد ہیں۔ ہمارے ہاں تہ خانوں میں تو کیا' واچ ٹاورز میں رہنے والوں کو اپنے اردگرد کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کو بھی کچھ معلوم نہیں ہوتا جن کا کام ہی معلومات رکھنا ہے جنہیں باخبر رہنے کی تنخواہ ملتی ہے انہیں خود اپنی خبر نہیں ہوتی۔" میں نے کہا۔

وہ دھیرے سے ہنسا "شاید وہ اس نظریے کے قائل ہوتے ہیں کہ آگہی ایک عذاب ہے۔ لاعلمی اور بے خبری میں بڑی راحت ہے لیکن میرا نظریہ مختلف ہے۔ میرے خیال میں باخبر رہنے میں عافیت ہے۔ بہرحال.... اگر نوزی نے واقعی کچھ تازہ وارداتیں کی ہیں تو اس کی تلاش میں پولیس کو آنا چاہئے تھا۔ تم کیوں آئے ہو؟"

"آپ خواہ مخواہ فرض کئے جارہے ہیں کہ میں اس سلسلے میں

نوزی کے پیچھے آیا ہوں۔ مجھے اس سے کوئی اور غرض ہے۔" میں نے کہا "اگر کوئی اس تک پہنچنے میں میری مدد کرے تو میں اس کی معقول خدمت کے لئے تیار ہوں۔"

"روپے پیسے کی بات کر رہے ہو؟" اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہو گئیں۔

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

"کتنا دے سکتے ہو؟"

"پانچ لاکھ..... دس لاکھ..... پندرہ لاکھ....." میں نے خاموش ہو کر جائزہ لیا کہ شاید اس کی آنکھوں میں کوئی تغیر رونما ہوا ہو لیکن ان میں مجھے اب بھی دُھندلاہٹ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیا۔

وہ پہلی بار بیماروں کے سے انداز میں ہنکارا بھر کر بولا "ڈیئر افضل چوہدری! مانا کہ تم فائیو اسٹار ہوٹل کے مالک ہو۔ تمہارے ہوٹل کے سامنے میرا یہ ہوٹل ایسا ہی ہے جیسے محل کے سامنے جھونپڑی..... لیکن تم اس ہوٹل کی حالت پر نہ جانا۔ روپیہ میں نے بھی زندگی میں بہت کمایا ہے اور بہت گنوایا ہے۔"

"مجھے یقین ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا "میں آپ کو لالچ نہیں دے رہا لیکن دولت کی ضرورت کس کو نہیں ہوتی..... بلکہ دولت مندوں کو شاید دولت کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ میں اس سے زیادہ بھی دے سکتا ہوں۔"

"میں نے زندگی میں کبھی مخبر کا کردار ادا نہیں کیا۔" وہ ہاتھ ہلا کر گویا اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے بولا "اگر مجھے معلوم ہوتا کہ نوزی اس وقت کہاں ہے تو میں تمہیں مفت میں ہی بتا دیتا۔ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں ہے کہ تم کیوں اس کے چکر میں ہو۔ خیر..... فی الحال ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بے ہودہ باتیں تو زندگی بھر چلتی ہی رہیں گی۔ میں ان میں اُلجھ کر آدابِ میزبانی بھی بھول گیا۔"

اس نے چنبیلی کو اشارہ کیا۔ وہ بڑے مستعد انداز میں مجھ سے مخاطب ہوئی "آپ کیا پینا پسند کریں گے؟"

جانو نے گویا وضاحت کی "اس درویش کے ڈیرے پر دنیا کی بہترین شرابیں دستیاب ہیں۔"

"لیکن یہ درویش شراب نہیں پیتا۔" میں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تو پھر افضل صاحب کو چائے پلاؤ۔" جانو نے چنبیلی کو حکم دیا۔

"نہیں نہیں۔ میں چائے بھی نہیں پیوں گا۔" میں نے جلدی سے کہا "میں اوپر ہوٹل میں ناشتا کر کے آیا ہوں۔ چائے بھی پی چکا ہوں۔"

"چھوڑو ہوٹل کی چائے کو....." جانو ہاتھ ہلا کر بولا "وہ کوئی چائے تو نہیں ہوتی۔ مختلف نمونوں کی میل کچیل کا ملغوبہ ہوتا ہے۔ اپنے ہوٹل کی چائے وغیرہ تو میں خود نہیں پیتا اور نہ ہی وہاں کا کھانا کھاتا ہوں۔"

"وہ صرف پبلک کے لئے ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"کیا کریں کاروبار کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ تم پبلک کے غم میں مبتلا مت ہو اور عمدہ قسم کی چائے پیو۔ سری لنکا سے براہِ راست آئی ہے میرے پاس۔ یہ قسم بازار میں فروخت کے لئے پیش نہیں کی جاتی۔" اس نے چنبیلی کو اشارہ کیا۔ وہ سائیڈ ٹیبل پر رکھے ایک خوب صورت بڑے تھرموس سے نہایت صاف ستھرے، بیش قیمت اور نفیس کپ میں چائے ڈالنے لگی۔ وہ درحقیقت ایک ویکیوم جگ تھا اور بٹن دبانے پر اس کی ٹونٹی سے چائے کپ میں منتقل ہونے لگی تھی۔ چائے سے بھاپ اُٹھ رہی تھی اور اس کی منفرد سی مہک کمرے میں پھیل گئی تھی۔ مجھے چائے کافی وغیرہ کا درحقیقت کوئی شوق نہیں تھا اور نہ ہی مجھے کوئی خاص طلب ہوتی تھی۔ میں اچھی سے اچھی اور بُری سے بُری چائے محض شغل کے طور پر پی لیتا تھا۔

چنبیلی نے ایک کپ بھر کر میری طرف بڑھایا پھر اسی ویکیوم جگ میں سے ویسا ہی دوسرا کپ بھر کر جانو کو پیش کیا۔ کپ دینے سے پہلے اس نے جانو کو سہارا دے کر ذرا اوپر کیا تاکہ وہ گاؤ تکیوں کے سہارے بیٹھ سکے لیکن وہ صحیح طور پر ٹیک لگا کر بیٹھنے کے قابل بھی نہیں تھا تاہم کسی حد تک اس پوزیشن میں آ گیا کہ چائے پی سکے۔

چنبیلی نے ایک ڈبے سے بسکٹ بھی ایک پلیٹ میں نکال کر تپائی پر میرے سامنے رکھ دیے اور جانو میر بحر نے میری معلومات میں اضافہ کیا "یہ ہالینڈ کے بسکٹ ہیں۔ تم نے بے شک دنیا گھومی ہوگی شاید ہالینڈ بھی گئے ہوگے لیکن یہ بسکٹ تمہیں ہالینڈ میں بھی نہیں ملے ہوں گے۔"

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ میں اتنا فارغ البال بھی نہیں تھا کہ ہالینڈ جاتا تو وہاں کسی مخصوص برانڈ کے بسکٹ تلاش کرتا پھرتا لیکن اخلاقاً مجھے ایسی کوئی بات کرنے کے بجائے تھوڑی سی مرعوبیت کا مظاہرہ کرنا پڑا۔ مروت بھی آخر کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ شاید جانو میر بحر بھی انہی لوگوں میں سے تھا جنہیں اپنی ہر چیز کے بارے میں یہ بتانے کا کمپلیکس ہوتا ہے کہ یہ فلاں جگہ کی ہے..... یہ فلاں جگہ سے آئی ہے..... یہ خاص طور پر ان کے لئے بنائی گئی ہے بلکہ بعض لوگ تو اپنے تن پر موجود کپڑے کے بارے میں بھی سب سے پہلے یہی بتاتے ہیں کہ یہ اتنے روپے گز کا ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں ہوتی کہ وہ ان کے وجود پر جچ رہا ہے یا نہیں۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ کپڑا مہنگا ہے تو وہ ضرور اس میں خوب صورت نظر آ رہے ہوں گے۔ کبھی کبھی ایسے لوگوں کا دل رکھنے کی خاطر مرعوب نظر آنا پڑتا ہے۔

میں نے اس وقت تک کپ ہونٹوں سے نہیں لگایا جب تک جانو کو کئی چسکیاں لیتے نہیں دیکھ لیا۔ وہ اطمینان سے چسکیاں لے رہا تھا۔ اس کے انداز سے کسی قسم کی احتیاط پسندی ظاہر نہیں ہو رہی تھی اس لئے میں نے بھی دھیرے دھیرے چائے پینا شروع کر دی۔ چائے اچھی معلوم ہوتی تھی لیکن میں چونکہ چائے نوشی کا کوئی خاص ذوق نہیں رکھتا تھا اس لئے اس کی کوئی خاص تعریف نہیں کر سکا۔ ویسے بھی میں یہاں چائے نوشی کے لئے نہیں آیا تھا۔ میرا ذہن نوزی میں اٹکا ہوا تھا۔

میرا دل کہہ رہا تھا کہ یہ بوڑھا مجھے نوزی کا اتا پتا بتا سکتا تھا لیکن میں نوزی سے اس کے تعلق کی نوعیت سمجھنے سے قاصر تھا۔ اسی لئے میں یہ فیصلہ کرنے سے بھی قاصر تھا کہ اس سے نوزی کے بارے میں معلوم کرنے کے لئے کون سا طریقہ اختیار کیا جائے۔ لالچ کا حربہ میں استعمال کر کے دیکھ چکا تھا۔ اس کا مجھے کوئی اثر نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے ابتدا میں اپنے آپ کو نوزی کا دوست ظاہر کرنے کی جو کوشش کی تھی وہ تو بالکل ہی ناکام رہی تھی لیکن یہ لوگ نوزی کے کوئی خاص ہمدرد بھی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ ورنہ شاید ان کا رویہ مجھ سے اتنا اچھا نہ ہوتا۔ وہ مجھے اس کا دشمن سمجھ کر کھٹک جاتے..... یا پھر شاید وہ بھی ابھی اُلجھن میں تھے۔ فیصلہ نہیں کر پائے تھے کہ میں نوزی کا دوست تھا یا دشمن؟

میں نے چنبیلی کی طرف دیکھا "تم چائے نہیں پی رہیں؟"

"میں چائے بالکل نہیں پیتی۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اب اس کے چہرے پر اس شوخی اور نظروں میں اس آوارگی کا نشان تک نہیں تھا جو میں نے ریستوران میں موجودگی کے دوران دیکھی تھی۔

جانو اپنا کپ تقریباً ایک چوتھائی خالی کرنے کے بعد گپ شپ کے انداز میں بولا "افضل صاحب! میں نے سُنا ہے کہ آپ کے ٹرالر بھی چلتے ہیں۔"

"جی ہاں..... چلتے تو ہیں۔" میں نے اس کی تردید کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ کمبخت اگر تہ خانے میں بیٹھ کر اتنا باخبر ہو سکتا تھا تو گھر سے نکل کر نہ جانے کیا غضب ڈھاتا۔

"میرے قبیلے کی اصل لائن بھی ماہی گیری تھی۔" اس نے کہا "لیکن میری اولاد کے زمانے میں ہمارے خاندان سے یہ کام چھوٹ گیا ہے۔" پھر وہ مجھے بتانے لگا کہ ٹرالر کے ذریعے فشنگ میں کیا مسائل پیدا ہو چکے تھے۔ مجھے اس سے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میرا یہ کوئی خاندانی کام نہیں تھا اور نہ ہی میں اس کی نگرانی کرتا تھا۔ میں تو بس اس میں ایک طرح کا فائنانسر تھا۔ میری یہ ذیلی سرمایہ کاری میرے حسابات میں کچھ منافع جمع کرا دیتی تھی..... اور بس.....! وہ بولتا رہا نہ جانے کیا کچھ کہتا رہا۔ میرا دھیان اب اس کی باتوں سے ہٹ رہا تھا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ میں نے یہاں آ کر وقت ضائع کیا تھا۔ خواہ مخواہ اپنے آپ کو اُلجھایا تھا۔ میں نے چائے کے ذرا بڑے گھونٹ بھرنے شروع کیے۔ میں سوچ رہا تھا کہ مجھے جلد از جلد اس بوڑھے سے جان چھڑانے کی کوشش کرنی

دفعتاً میں چونکا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا "افضل صاحب! کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ کے ٹرالر صرف فشنگ میں ہی استعمال ہو رہے ہیں کسی اور کام میں نہیں؟"

"ہاں مجھے یقین ہے..... لیکن آپ کو یہ پوچھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟"

"غیر حاضر مالکوں کے ٹرالر بعض اوقات دوسرے کاموں میں بھی استعمال ہونے لگتے ہیں۔ مالکوں کو پتا بھی نہیں ہوتا۔ میں نے سُنا ہے کہ آپ کا اصل بزنس اور ہیڈ آفس لاہور میں ہے۔ آپ خود بھی زیادہ تر وہیں رہتے ہیں۔ اس صورت میں آپ کو اپنے ٹرالروں کا خاص خیال رکھنے کی ضرورت ہے۔ بشرطیکہ آپ خود دوسرے کاموں میں دلچسپی نہ رکھتے ہوں۔"

"جی نہیں میں کسی دوسرے کام میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میں فشنگ میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتا۔ وہ تو بس کچھ وقت ایسا آیا تھا کہ میں نے اس شعبے میں انویسٹمنٹ کر دی تھی۔ میری حیثیت اب بھی تقریباً انویسٹر ہی کی ہے لیکن مجھے بہت اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ میرے کون سے بزنس میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا جو ریزیڈنٹ ڈائریکٹر یہاں میرے تمام بزنس کو دیکھتا ہے اس کے ہوتے ہوئے میرے کسی شعبے میں کوئی گڑبڑ نہیں ہو سکتی اور نہ ہی مجھے خود دوسرے کاموں کا کوئی شوق ہے۔ میرے پاس سیدھے راستوں سے جو کچھ آ رہا ہے وہی میری ضروریات سے کہیں زیادہ ہے۔ میں اسے سنبھال نہیں پاتا۔ مجھے ٹیڑھے راستوں کی طرف دیکھنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"آپ پہلے آدمی ہیں جو اپنی دولت کو اپنے لئے کافی قرار دے رہے ہیں۔ ورنہ ہمارے ہاں تو جسے دولت کا چسکا لگ جائے اسے قارون کے خزانے بھی مطمئن کرنے کے لئے کافی نہیں ہو سکتے۔"

جانو مسکرایا۔

"یہ ایک بیماری ہے اور اس کا کوئی علاج نہیں۔ خدا کا شکر ہے میں اس بیماری میں مبتلا نہیں ہوں۔" میں نے کپ خالی کر کے رکھتے ہوئے کہا۔

میں محسوس کر رہا تھا کہ میں کچھ سست پڑ رہا تھا۔ شاید بوریت کی وجہ سے ایسا ہو رہا تھا۔ میں یہاں ایسی گفتگو کرنے نہیں آیا تھا۔ جیسی جانو میر بحر کر رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر نوزی کے تصور سے اپنا لہو گرمانے کی کوشش کی۔ میرے ہاتھ اس شخص کی گردن تک پہنچنے کے لئے بے چین تھے۔

میں نے ایک بار پھر جانو کو اس موضوع پر لانے کی کوشش کی "کیا آپ میری تھوڑی بہت بھی رہنمائی نہیں کر سکتے کہ نوزی کہاں مل سکتا ہے؟ میرا خیال ہے وہ اس جزیرے پر ہی کہیں موجود ہے۔"

"اگر وہ جزیرے پر ہی موجود ہے تو جلد یا بدیر اس کے بارے میں کوئی نہ کوئی اطلاع آجائے گی بلکہ عین ممکن ہے وہ خود آجائے۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آپ جیسے لوگ ہم جیسے گمنام اور معمولی لوگوں کے پاس روز روز تو نہیں آتے۔ گپ شپ ہو رہی ہے۔ لطف آرہا ہے۔"

لطف شاید اسے آرہا تھا۔ مجھے ہرگز نہیں آرہا تھا۔ میرا سونے کو جی چاہ رہا تھا جو میرے لئے بھی حیرت کی بات تھی۔ میں تو خاص حالات میں دو تین دن اور راتیں سوئے بغیر آسانی سے گزار سکتا تھا۔ یہ اچانک اتنی نیند کہاں سے آگئی تھی؟ ہاتھ پیروں میں ایک عجیب سی سنسناہٹ محسوس ہو رہی تھی لیکن میرا ذہن یہ ماننے کے لئے تیار نہیں تھا کہ مجھے چائے میں کچھ ملا کر دیا گیا تھا۔

میں نے چنبیلی پر نظر رکھی تھی کہ وہ ہاتھ کی صفائی نہ دکھانے پائے اور اس نے کوئی مشکوک حرکت بھی نہیں کی تھی۔ چائے نئی بنائی تھی اور ویکیوم جگ ایک ہی تھا۔ اسی میں سے جانو میر بحر نے چائے پی تھی اور مجھ سے بھی پہلے ختم کی تھی لیکن وہ اسی طرح مستعد بیٹھا تھا جبکہ وہ عمر رسیدہ اور مریض تھا۔

اچانک ہی مجھے اپنا سر گھومتا محسوس ہوا اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ تب مجھے یقین ہو گیا کہ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا۔ کس طرح ہوا تھا؟ فی الحال یہ سوال زیادہ اہم نہیں تھا۔ پہلے اپنا بچاؤ کرنا زیادہ ضروری تھا۔ جانو نے درحقیقت اب تک مجھے باتوں میں لگایا ہوا تھا۔

میں نے تیزی سے جیب میں ہاتھ ڈالا لیکن مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میں جسے تیزی سمجھ رہا تھا وہ درحقیقت سلوموشن تھا۔ میری پھرتی کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ میرے اپنے ہاتھ پاؤں گویا میرے قابو میں نہیں تھے۔ میں نے جیب سے گن نکال کر ہاتھ اونچا کیا تو احساس ہوا کہ میرے ہاتھ میں کپکپی تھی اور معمولی وزن کا پسٹل مجھے مشین گن سے زیادہ وزنی محسوس ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں جانو کا نشانہ لے پاتا، چنبیلی نے میری کلائی پر ہاتھ مارا۔ اس کا اسٹائل میرے شل ہوتے ہوئے ذہن کو بھی حیران کرنے کے لئے کافی تھا۔ اَن پڑھ اور خانہ بدوش سی نظر آنے والی وہ عورت یقیناً کراٹے کی ماہر تھی۔

مشین پسٹل میرے ہاتھ سے چھوٹ کر ماربل کے فرش پر گرا اور پھسلتا ہوا دور چلا گیا۔ چنبیلی مجھ پر دوسرا وار کرنے کے لئے ایک خاص پوز میں کھڑی تھی جس طرح جوڈو کراٹے کے کھلاڑی نمائشی مقابلوں کے دوران کھڑے ہوتے ہیں۔ میرا بازو میرے پہلو میں جھول گیا تھا۔ مجھے اپنی کلائی میں صرف ہلکی سی جھنجھناہٹ محسوس ہوئی تھی۔ ذہن کے ساتھ ساتھ گویا جسم بھی تیزی سے شل ہو رہا تھا۔

میں نے سر جھٹک کر اپنے حواس پر قابو پانے اور اندھیرے کو ذہن سے دور رکھنے کی ایک آخری کوشش کی۔ اپنی تمام تر قوت ارادی کو کسی ایک نادیدہ نقطے پر مرکوز کرنے کی کوشش کرتے ہوئے میں اپنی دانست میں خاصی تیزی سے اُٹھا۔ مجھے صحیح طور پر کچھ نظر نہیں آرہا تھا لیکن یہ احساس تھا کہ چنبیلی مجھے اُٹھتے دیکھ کر کراٹے کا دوسرا وار کرے گی۔

میں نے اس کا ہاتھ حرکت میں آتے دیکھا تو جھکائی دیتے ہوئے اسے کراٹے کا جوابی ہاتھ رسید کرنے کی کوشش کی۔ میں خاطر خواہ انداز میں وار نہیں کر سکا اور نہ ہی اس وقت مجھے اپنے جسم میں وہ قوت محسوس ہو رہی تھی جو مجھے طاقتور ترین انسانوں کے ساتھ بے خوفی سے بھڑ جانے کا حوصلہ دیتی تھی تاہم میری اس کوشش کا اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ میں چنبیلی کے وار سے بچ گیا اور وہ میرا اچٹتا ہوا سا ہاتھ پڑنے پر بھی دور جا گری۔

میں کرسی کا سہارا لیتے ہوئے اُٹھا اور جانو میر بحر کی طرف گھوما۔ مجھے اس کی شکل دھندلی اور بری طرح ہلتی نظر آئی لیکن اس کے ہاتھ میں موجود بدصورت سی گن صاف دکھائی دی جس کا رُخ میری طرف تھا۔ میں اُچھل کر اس پر گرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اپنے آپ کو باز رکھا۔

میں جب چنبیلی کی رہنمائی میں اس ہوٹل کے تہ خانے میں آنے کے لئے روانہ ہوا تو پانچ دس مسلح آدمیوں سے تنہا مقابلہ کرنے کے لئے بھی تیار تھا لیکن اس طرح کی صورتِ حال کی مجھے توقع نہیں تھی۔ میں نے ڈوبتے ذہن سے فیصلہ کیا کہ مجھے چنبیلی اور جانو سے اُلجھنے کے بجائے یہاں سے نکلنے کی کوشش کرنی چاہئے تھی۔

میرے جسم سے توانائی یوں ختم ہو رہی تھی جیسے وولٹیج تیزی سے ڈاؤن ہونے پر کوئی بلب بجھ رہا ہو۔ میں آنکھیں پھاڑتا ہوا

پڑتا دروازے کی طرف لپکا۔ کسی بھی لمحے مجھے اپنے عقب میں فائر کا دھماکا سُنائی دینے کی توقع تھی لیکن میں نے اس معاملے میں اپنے آپ کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ میں غیر ارادی طور پر اِدھر اُدھر لہرا رہا تھا، شاید اس لئے گولی سے بچ جاؤں۔

میں کمرے کے دروازے سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا اور کوئی گولی میرے جسم میں پیوست نہیں ہوئی۔ فائر کے دھماکے کے بجائے میرے عقب میں جانو کا قہقہہ گونجا۔ ماربل کی دیواروں کے درمیان اس طرح اس قہقہے کی بازگشت سُنائی دی جس طرح کنوئیں میں سُنائی دیتی ہے۔

"واپس آجاؤ افضل ڈیئر! واپس آجاؤ۔ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا۔" جانو کی آواز گویا مجھے بہت دور سے سُنائی دی۔

میں اندھوں کی طرح گرتا پڑتا گیٹ کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ حالانکہ مجھے احساس تھا کہ جانو کسی بھی لمحے مجھے روکنے کے لیے گولی چلا سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں اس وقت مجھے گولی کی زیادہ پروا نہیں تھی۔ جانو نے گولی نہیں چلائی اور جب میں گیٹ تک پہنچا تو مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہو گئی۔

گیٹ بند تھا۔۔۔ اور یہ بات یقیناً جانو کو معلوم تھی اسی لیے وہ اپنے بستر پر اتنے اطمینان سے بیٹھا تھا۔ شاید اس سے آگے دوسرا گیٹ بھی بند ہو چکا ہو۔ جب میں جانو اور چنبیلی کے پاس بیٹھا تھا تو گیٹ بند ہونے کی کوئی آواز سُنائی نہیں دی تھی۔

میں نے اپنے نیم مُردہ ہاتھوں سے گیٹ کو دھکیلنے کی کوشش کی لیکن اس نے اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کی۔ میری ٹانگوں میں اب میرا وزن اُٹھانے کی سکت نہیں رہی تھی۔ ٹانگیں خود بخود دُہری ہوتی چلی گئیں۔ میرے ہاتھ گیٹ پر پھسلتے ہوئے نیچے آگئے۔

چند سیکنڈ بعد میں نے اپنے آپ کو گھٹنوں کے بل بیٹھے پایا۔ میرا ذہن اس وقت گویا ایک برف پوش چٹان بن چکا تھا جس پر تیزی سے مزید برف جمتی جا رہی تھی۔ میں نے بہت سر جھٹکا، اپنی قوتِ ارادی کو کام میں لانے کی بہت کوشش کی لیکن ایسی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ ذہن بدستور شل رہا اور اندھیرے میں ڈوبتا چلا گیا۔ میں گیٹ کا سہارا لے کر بھی نہ اُٹھ سکا۔ میری گردن خود بخود جھکتی چلی جا رہی تھی حتیٰ کہ میری ٹھوڑی تقریباً سینے سے جا لگی۔ مجھے گویا گہری نیند آرہی تھی۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ میرے دونوں بازو پکڑ کر مجھے اُٹھایا جا رہا تھا۔ میرے پپوٹوں کے ساتھ گویا کسی نے بہت بھاری وزن باندھ کر لٹکا دیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے آنکھیں ذرا کھول کر اور سر ذرا اوپر اُٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی۔

چنبیلی اور جانو میرے دائیں بائیں موجود تھے۔ وہ میری بغلوں میں ہاتھ دے کر مجھے اُٹھا رہے تھے۔ جانو بالکل صحیح طریقے سے اپنے دونوں پیروں پر کھڑا تھا۔ وہی جانو جو چند لمحے پہلے بستر پر دراز تھا اور جس کے بارے میں چنبیلی نے مجھے بتایا تھا کہ برسوں پہلے وہ

حادثے میں معذور ہو کر صاحبِ فراش تھا۔ مجھے اس کا چہرہ بہت دُھندلا دکھائی دے رہا تھا پھر بھی میں اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ سکتا تھا۔

پھر مجھے خفیف سا احساس ہوا کہ کوئی میرے چہرے پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ چہرہ گویا سُن ہو چکا تھا۔ مجھے نہایت معمولی سا لمس محسوس ہوا تھا۔ میں نے گردن ذرا گھمانے کی کوشش کی۔ وہ چنبیلی تھی جو میرے چہرے پر مشفقانہ انداز میں ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی "کہاں جا رہے ہو میرے چاند! چلو اندر چلو۔۔۔ تم جیسے لوگ یہاں روز روز تو نہیں آتے۔۔۔ ہم نے تو سُنا تھا کہ تم بڑے شہ زور ہو۔۔۔ بڑے ہوشیار۔۔۔ بڑے پھرتیلے ہو۔۔۔ آدمی بھی بہت ہیں تمہارے پاس۔۔۔ تمہیں قابو کرنا شیر کو قابو میں کرنے کے برابر

ہے۔۔۔ لیکن تم تو چیونٹی کی طرح ہمارے ہاتھ آگئے۔۔۔“

اس کی آواز مجھے بہت دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔ بہ مشکل سُنائی دے رہی تھی۔ میرا ناکارہ ذہن اس وقت بھی صرف ایک ہی سوال میں پھنسا ہوا تھا۔ میں وہ سوال اس سے کرنا چاہتا تھا مگر میری زبان گویا لکڑی کی ہوگئی تھی۔ میں نے بہ مشکل اسے حرکت دی۔ ”تم نے۔۔۔ چائے میں جو کچھ ملایا۔۔۔ وہ کیسے ملایا۔۔۔؟“

مجھے چنبیلی کی ہنسی بہت دور کی بازگشت کی طرح سُنائی دی۔ وہ شاید جانو سے مخاطب ہوئی ”اس حالت میں بھی اس شخص کو سوال کرنے کی سوجھ رہی ہے۔۔۔“

جانو ہنسا پھر مجھے اس کی مدھم سی آواز سنائی دی ”یہ ایک طاقتور ذہن کی نشانی ہے۔“

چنبیلی نے شاید مجھ پر رحم کھاتے ہوئے میرے سوال کا جواب دے دیا ”اس طرح کے شعبدے ہماری جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ میں نے چائے میں کچھ نہیں ملایا تھا۔۔۔ پہلے ہی سے ملا ہوا تھا۔۔۔ تھرموس میں دو بٹن تھے۔ اندر سے وہ دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک بٹن دبانے سے ایک حصے سے چائے نکلتی ہے۔ دوسرا بٹن دبانے سے دوسرے حصے سے۔۔۔ دونوں بٹن ساتھ ساتھ ہیں۔۔۔ لیکن میں نے تمہیں اس کا احساس نہیں ہونے دیا۔ اب کیوں پوچھ رہے ہو؟ اب کیا فائدہ۔۔۔؟“

میں اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تھا اور نہ ہی کوئی جواب دینے کے قابل تھا۔ اس کی آواز بھی لحہ بہ لحہ دور ہوتی جارہی تھی۔ آخری احساس مجھے بس یہ ہوا کہ وہ مجھے گھسیٹ کر واپس لے جارہے تھے۔ اس کے بعد میرے ذہن کا قمقمہ مدھم پڑتے پڑتے بالآخر بجھ گیا اور میرے حواس پر مکمل تاریکی چھاگئی۔

معلوم نہیں کتنی دیر میں دنیا مافیہا سے بے خبر رہا پھر مجھے احساس ہوا کہ میرے پپوٹے حرکت کررہے تھے اور مجھے ان کو حرکت دینے میں کوئی خاص دشواری بھی پیش نہیں آرہی تھی۔ میں نے کئی بار آنکھیں بند کیں اور کھولیں لیکن میرے اردگرد چھائی ہوئی تاریکی دور نہ ہوئی۔

پہلے تو اس اندیشے سے میری دھڑکنیں تیز ہوگئیں کہ شاید میری بینائی چلی گئی تھی۔ میں نے بے اختیار آنکھیں ملنے کے لیے ہاتھوں کو حرکت دی اور اس احساس سے مجھے کچھ خوشی ہوئی کہ ہاتھ آزاد بھی تھے اور حرکت بھی کررہے تھے۔ گو کہ ذہن اور جسم پر کچھ ایسا بوجھل پن ضرور طاری تھا جیسے بہت زیادہ پی پلا کے سونے کے بعد بیدار ہوتے وقت محسوس ہوتا ہے لیکن یہ کیفیت اس کیفیت سے تو لاکھ درجے بہتر تھی جو بے ہوش ہونے سے پہلے تھی۔

میں نے ٹانگوں کو حرکت دی تو انہیں بھی آزاد پایا۔ اب تو میرے دل میں باقاعدہ گدگدی سی ہونے لگی۔ کیا واقعی قدرت مجھ پر اتنی مہربان تھی یا میں عالمِ بے ہوشی میں ہی کوئی خواب دیکھ رہا تھا؟ اس دوران میں آنکھیں مل چکا تھا اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ میرے اردگرد پھیلی ہوئی تاریکی اتنی گہری بھی نہیں تھی جتنی پہلے محسوس ہوئی تھی۔ وہ ملگجا اندھیرا تھا اور ایک طرف کچھ جھریوں سے روشنی کی باریک سی لکیریں اندر آرہی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ میری نظر کام کررہی تھی لیکن میں کہیں تاریکی میں پڑا تھا۔

میں نے ہاتھ پیروں کو ذرا اور اچھی طرح ہلا جلا کر دیکھا۔ میں اپنے آپ کو تقریباً ٹھیک محسوس کررہا تھا جس پر مجھے حیرت تھی۔ کیا دوا کے اثرات اتنی جلدی دور ہوگئے تھے؟ مجھے تو یہی محسوس ہورہا تھا کہ میں زیادہ دیر بے ہوش نہیں رہا تھا تاہم یہ کوئی یقینی بات نہیں تھی۔ ہوش میں آنے یا بیدار ہونے پر کوئی بھی صحیح طور پر نہیں بتا سکتا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش یا سویا رہا۔ میں نے گھڑی دیکھ کر اندازہ کرنا چاہا تو اپنی قیمتی گھڑی کلائی سے غائب پائی۔

میں آہستگی سے اُٹھ بیٹھا۔ اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر میں نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ اب میں کافی بہتر طور پر دیکھ سکتا تھا۔ وہ ایک تنگ سی کوٹھری تھی۔ تہ خانہ ٹائپ ہی معلوم ہوتی تھی لیکن یہ جگہ ویسی صاف ستھری نہیں تھی جیسا جانو کے ہوٹل کا تہ خانہ تھا۔ یہاں سیلن اور عرصے سے جمی رہنے والی مٹی کی بو موجود تھی۔

شاید میں خود بھی مٹی میں لتھڑ چکا تھا۔ میرے اردگرد دیواروں کے ساتھ کچھ ایسے تھیلے اوپر تلے رکھے تھے جیسے آٹے کے ہوتے ہیں لیکن وہ یقیناً آٹے کے نہیں تھے۔ کچھ کارٹن اور لکڑی کی پیٹیاں بھی تھیں۔ سب سے زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ وہاں پیٹرول کے کچھ بیرل بھی موجود تھے۔ نہ جانے وہ وہاں کس مقصد کے لیے رکھے گئے تھے!

مجھے بھی شاید کسی بوری یا تھیلے ہی کی طرح کہیں گھسیٹا گیا تھا اور پھر یہاں لاکر پھینکا گیا تھا۔ کئی جگہ سے میری ہڈیاں دکھ رہی تھیں۔ کہیں کہیں سے جسم چھلا چھلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے اپنی نقاہت دور کرنے کے لیے پہلے سانس کی مشقوں کے ذریعے اپنی توانائی بحال کی پھر اُٹھ کر کوٹھری کے دروازے پر جانے کا ارادہ ہی کررہا تھا کہ ٹھٹک کر رہ گیا۔

باہر کچھ ایسی آواز سُنائی دی تھی جیسے کسی نے دیا سلائی روشن کی ہو۔ میں ایک لمحے کے لیے اپنی جگہ پر ساکت ہو کر رہ گیا۔ باہر جب مزید کوئی آواز سُنائی نہ دی تو میں دبے قدموں دروازے تک پہنچا اور ایک جھری سے آنکھ لگا کر دیکھا۔

دروازے کے عین سامنے تنگ سی ایک سیدھی گلی تھی جس کے اختتام پر سیڑھیاں اوپر جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ راہداری نما اس گلی کی چھت میں پُرانا سا ایک بلب لٹکا ہوا تھا جو کمزور اور زرد روشنی دے رہا تھا۔ اس گلی میں دروازے سے ذرا ہی دور اسٹول پر ایک شخص دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔ ایک لمحہ پہلے یقیناً اس نے ماچس کی تیلی جلا کر سگریٹ سُلگائی تھی۔ اس کے کندھے پر کلاشنکوف موجود تھی۔ یہ بھی اچھا ہی ہوا تھا کہ میں نے ہوش میں آنے کے بعد نادانستگی میں کوئی آواز نہیں نکالی تھی اور نہ ہی کسی چیز کو چھیڑ کر کھڑبڑ کی تھی ورنہ اسے یقیناً علم ہو جاتا کہ میں ہوش میں آچکا تھا۔ قدرت نے مجھے سنبھلنے کا جو موقع فراہم کیا تھا وہ میرے ہاتھ سے نکل جاتا۔

میں نے جھری سے حتی الامکان صحیح طور پر اس شخص کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ وہ مضبوط اور دراز قد نوجوان تھا۔ سیاہ شلوار قمیص میں تھا۔ میں اس کا چہرہ صرف ایک سائڈ سے دیکھ سکتا تھا لیکن اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ہی کسی خیال میں مگن بیٹھا تھا اور بڑے مسرورانہ انداز میں سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔

میں ابھی یہ جاننے کی کوشش کررہا تھا کہ دروازہ کُھلا تھا یا باہر سے کنڈی تالا وغیرہ لگا ہوا ہے۔ میں دروازے کو زیادہ ہلا جلا کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اگر نوجوان ذرا سا بھی کھٹکا سن لیتا تو فوراً ہوشیار ہو سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ دروازہ کُھلا مل جائے تو اسے قابو میں کرنے کی کوئی تدبیر کی جائے۔

میں ابھی اسی چکر میں تھا کہ سیڑھیوں پر کسی کے وزنی قدموں کی آواز سُنائی دی۔ کوئی دھم دھم کرتا نیچے آرہا تھا۔ میں نے دروازے کو بے آواز طریقے سے ہلانے جلانے کی کوششیں ترک کردیں اور اپنی جگہ ساکت ہوگیا۔

سیڑھیوں سے ایک بھاری بھرکم شخص اُترتا دکھائی دیا۔ اس کے کندھے پر بھی کلاشنکوف جھول رہی تھی۔ وہ لحیم شحیم ضرور تھا لیکن تھل تھل کرتے جسم کا نہیں تھا۔ گینڈے کی طرح مضبوط نظر آرہا تھا۔ وہ بھی گہرے رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔ گلے میں مفلر تھا۔ وہ ذرا پکی عمر کا تھا۔

اس نے دور ہی سے اُکھڑے اُکھڑے لہجے میں نوجوان سے پوچھا ”اڑے۔۔۔ تو نے اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے تھے؟“

”میں کیسے باندھتا؟ میرے پاس رسّی نہیں تھی“ نوجوان نے قدرے بے زاری سے جواب دیا۔ اسے نہ جانے کن خیالات کی دنیا سے باہر آنا پڑا تھا۔ وہ اس پر خوش نہیں تھا۔

لحیم شحیم شخص نے اسے ایک موٹی سی گالی دی اور غصیلے لہجے میں بولا ”اڑے۔۔۔ رسّی نہیں تھی تو کسی کو بول دیتا۔۔۔ منگوا لیتا۔۔۔ صرف رسّی نہ ہونے کی وجہ سے تو نے اس کو ویسے ہی چھوڑ رکھا ہے۔“

”میں کس کو بولتا؟ سب تو اوپر چلے گئے تھے“ نوجوان نے جواب دیا۔

”ابے تو خود اوپر آجاتا“ لحیم شحیم شخص غرایا۔

”مجھے جانو نے حکم دیا تھا کہ میں ادھر سے نہ ہلوں“ نوجوان نے جواز پیش کیا۔

موٹے نے جانو کو بھی اس کی عدم موجودگی میں ایک موٹی سی

گالی سے نوازا اور برہمی سے بولا "تم لوگوں میں عقل نام کی کوئی چیز تو ہے ہی نہیں۔"

نوجوان ناگواری سے بولا "اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ جانو نے کہا تھا' ابھی وہ دیر تک ہوش میں نہیں آئے گا۔"

"ہاں۔۔۔ جانو کو تو غیب کی باتوں کا بھی پتا ہوتا ہے" موٹا بدستور غصے سے بولا "ارے پاگل کے بچّے! احتیاط بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔ میں رسّی لے کر آتا ہوں" وہ واپسی کے لیے مڑا۔

نوجوان ہچکچاتے ہوئے بولا "اب اتنی تکلیف اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ دو چار منٹ بعد تو اس کو اُٹھا کر اوپر لے کر چلنا ہے۔ پھر تو اس کو مچھلیوں نے ہی کھانا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ تو تمہارے خیال میں اب اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی؟ تم چاہتے ہو کہ جب ہم اس کو سمندر میں پھینکیں تو اسے ہوش آجائے اور وہ آرام سے ہاتھ پاؤں مار کر اوپر آجائے اور تیرتا ہوا کسی کنارے پہنچ کر گھر چلا جائے؟ گدھا کہیں کا۔۔۔!"

"سائیں تو کہہ رہے تھے اس دفعہ نیا طریقہ اختیار کریں گے۔ اس کو سیمنٹ کے پائپ میں ڈالیں گے۔ پائپ کو دونوں طرف سے بند کریں گے پھر سمندر میں پھینکیں گے۔۔۔" نوجوان کو جیسے یاد آیا "وہ چاہتے ہیں کافی عرصے تک کسی کو اس کی ہڈی بھی نہ مل سکے۔ میرا خیال ہے' ایسی پیکنگ کے بعد تو اسے مچھلیاں بھی نہیں کھا سکیں گی۔"

"ہاتھ پاؤں باندھنے تو پھر بھی ضروری ہیں نا۔۔۔ پائپ ٹوٹ بھی سکتا ہے۔۔۔ اس کا منہ کھل بھی سکتا ہے۔ تم تو زندگی بھر گدھے کے گدھے ہی رہو گے۔ تمہیں کبھی عقل نہیں آئے گی۔ پتا نہیں کون تمہیں اس طرح کے اہم کاموں میں بُلا لیتا ہے۔ تمہیں تو ابھی صحیح طرح سے جھینگے پکڑنے بھی نہیں آئے۔۔۔" وہ واپس سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

نوجوان ناگواری سے سر جھٹک کر دوبارہ اسٹول پر بیٹھ گیا۔ ظاہر تھا یہ بحث مجھ بندۂ ناچیز کے بارے میں ہو رہی تھی جو دروازے کے پیچھے کھڑا نہ صرف یہ سارا پروگرام سُن رہا تھا بلکہ ان دونوں کو دیکھ بھی رہا تھا۔ وہ دونوں جب باتوں میں اُلجھے ہوئے تھے تو میں نے دروازے کو بے آواز طریقے سے ذرا ہلا جلا کر یہ اندازہ بھی کر لیا تھا کہ باہر سے اس کا بولٹ چڑھا ہوا تھا۔

ویسے تو دروازہ پُرانی ساخت کا اور کمزور ہی معلوم ہوتا تھا لیکن میں فی الحال اسے اپنے کندھے کی ایک یا دو ٹکروں سے توڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ نوجوان کے کندھے پر کلاشنکوف موجود تھی۔ میرے دروازہ توڑ کر نکلنے اور اس تک پہنچنے سے پہلے ہی میرا کام تمام ہو سکتا تھا۔

میں صبر و سکون سے انتظار کرنے لگا۔ چند لمحے بعد ہی موٹا لوٹ آیا۔ اس کے ہاتھ میں رسّی کا لچھا تھا۔ دو قدم دور سے ہی اس نے وہ نوجوان کی طرف اُچھال دیا اور واپسی کے لیے مڑتے ہوئے بولا "ذرا اچھی طرح باندھنا۔۔۔ سُنا ہے آدمی خطرناک ہے۔"

"تم بھی ذرا میرے ساتھ آجاؤ نا۔۔۔" نوجوان اُٹھتے ہوئے بولا "ایک سے دو بھلے رہیں گے۔ کام بھی اچھا ہو جائے گا۔"

"تمہارے خیال میں مجھے اور کوئی کام نہیں ہے؟" موٹا ذرا بگڑ کر بولا۔

"اس میں کون سی دیر لگے گی یار!" نوجوان ذرا منت سے بولا۔ کمبخت میرے کام کو مشکل بنا رہا تھا۔ آخر موٹا گویا بادلِ ناخواستہ اس کے ساتھ کوٹھری کی طرف بڑھا۔

میں نے جلدی سے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ یوں تو مجھے بھروسا تھا کہ نوجوان کی کنپٹی پر میرا کراٹے کا ایک بھرپور وار بھی کارگر ثابت ہو سکتا تھا لیکن میں ذرا سا بھی خطرہ مول لینا نہیں چاہتا تھا اور خطرہ بہرحال بڑھ چکا تھا کیونکہ وہ ایک سے دو ہو چکے تھے۔ بھاری بھرکم شخص نوجوان کے مقابلے میں زیادہ خطرناک معلوم ہوتا تھا۔

مجھے ایک کونے میں شراب کی دو تین خالی بوتلیں پڑی نظر آئیں۔ دو آدھے تھے۔ ایک پوری بوتل تھی۔ میں نے پھرتی سے وہ اُٹھالی اور دروازے کے ساتھ ہی دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں آگے پیچھے آرہے تھے۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ پہلے نوجوان ہی کوٹھری میں داخل ہو گا۔

جونہی باہر سے دروازے کا بولٹ ہٹایا گیا اور ایک ہیولے نے کوٹھری میں قدم رکھا' میں نے اس کے سر پر پوری قوت سے بوتل رسید کی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس ضرب کے بعد اس کے زندہ رہنے کا امکان بہت کم تھا لیکن میں نے اس وار کا نتیجہ دیکھنے میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا اور اس کے پیچھے آتے ہوئے تحیم شحیم شخص کے پیٹ پر ایک زوردار لات رسید کی۔

میرا خیال تھا کہ وہ اُلٹ کر پیچھے جا گرے گا لیکن وہ کسی گینڈے سے کم نہیں تھا۔ محض لڑکھڑا کر رہ گیا' تاہم میرے لیے اتنا بھی کافی تھا۔ میں نے اس پر چھلانگ لگائی۔ ہم دونوں کوٹھری کے دروازے سے باہر تنگ گلی میں آن گرے۔

گرتے گرتے اس نے کلاشنکوف کندھے سے اُتارنا چاہی تھی لیکن وہ اس کے اپنے وزنی وجود کے نیچے دب کر رہ گئی۔ اس نے مجھے اُچھال کر اپنے اوپر سے پھینکنے کی کوشش کی لیکن میں اب ایسا تر نوالہ بھی نہیں تھا۔ مجھے سب سے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلنے پائے کیونکہ ابھی مجھے یہ علم نہیں تھا کہ کتنے فاصلے پر کتنے لوگ موجود تھے۔ اگر آس پاس کہیں کچھ لوگ موجود تھے اور انہیں اندازہ ہو جاتا کہ نیچے کچھ گڑبڑ تھی تو میری یہ جدوجہد بے کار چلی جاتی۔

میں نے موٹے پر چھلانگ لگاتے ہی اس کی گردن کہنی کے نیچے دبالی تھی۔ نوجوان کو بھی بے ہوش ہونے یا مرنے سے پہلے

شاید یہی محسوس ہوا ہو کہ کوٹھری کا دروازہ کھُلتے ہی کوئی بَلا ان پر ٹوٹ پڑی تھی اور موٹے کو بھی یقیناً کچھ ایسا ہی لگا ہو گا۔ مجھے اسی چیز کا سب سے زیادہ فائدہ پہنچا تھا کہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دروازہ کھلتے ہی ان پر کوئی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔

موٹے کو سنبھلنے کا ذرا بھی موقع مل جاتا تو وہ میرے لیے ایک مشکل شکار ثابت ہو سکتا تھا لیکن بے چارہ بے خبری میں مارا گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کسی طرح میرے نیچے سے نکل پاتا' میں نے اسی بوتل سے اس کی کھوپڑی پر بھی وار کیا اور وہ وہیں ساکت ہو گیا۔ بوتل مضبوط تھی' اب بھی ٹوٹی نہیں تھی۔ میں نے احتیاطاً ایک وار اور کیا۔ موٹے کی کھوپڑی لوہے کے گولے کی طرح مضبوط معلوم ہوتی تھی لیکن وہ یقیناً پہلے ہی وار میں بُری طرح چیخ چکی تھی مگر شاید اس وقت مجھ پر کچھ سفاکی طاری تھی جو میں نے ایک وار کو کافی نہیں سمجھا تھا۔

کئی سیکنڈ تک جب اس نے جنبش نہ کی تو میں نے اسے چھوڑ دیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ کوٹھری میں واپس آکر میں نے نوجوان کا جائزہ لیا۔ وہ اوندھا پڑا تھا۔ کوٹھری میں سوئچ بورڈ موجود تھا۔ میں نے سوئچ دبایا تو ایک مریل سا بلب روشن ہو گیا۔ میں نے دیکھا نوجوان کی ناک سے خون کی پتلی سی لکیر بہہ کر فرش پر پھیل رہی تھی اور کھوپڑی پر جہاں بوتل لگی تھی وہاں سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ اس کے آدھے سے زیادہ بال خون میں تر ہو چکے تھے۔ اتنی سی دیر میں ہی اس کی آنکھوں کا نچلا حصہ نیلا ہونے لگا تھا۔

میں نے یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ وہ زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ میں موٹے کو بھی گھسیٹ کر کوٹھری میں لے آیا۔ میں نے ان دونوں کی تلاشی لی کہ شاید ان کے پاس کلاشنکوف سے چھوٹی کوئی گن موجود ہو لیکن دونوں کے پاس کلاشنکوفوں کے علاوہ کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ مجبوراً مجھے ایک کلاشنکوف ہی اُٹھانا پڑی گو کہ مجھے معلوم تھا' بعض حالا۔۔۔ ۔۔ مجھ جیسے آدمی کے لیے کلاشنکوف جیسا ہتھیار فائدہ مند ثابت ہونے کے بجائے بوجھ بن جاتا تھا۔

ان دونوں کو کوٹھری میں چھوڑ کر بولٹ چڑھانے کے بعد میں نے گردوپیش کا جائزہ لیا۔ کوٹھری کے ایک کونے پر مجھے سیاہ دیوار نظر آئی۔ قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا' وہ لوہے کا سیاہ اور سپاٹ گیٹ تھا جو دوسری طرف سے مقفل تھا۔ میں نے اسے ہلانے جلانے کی کوشش نہیں کی۔ ممکن تھا دوسری طرف کہیں کسی کو احساس ہو جاتا کہ اُدھر کچھ گڑبڑ تھی۔

جس نوجوان اور پکی عمر کے افراد کو میں نے کوٹھری میں چھوڑا تھا۔ ان کی جیبوں سے مجھے کوئی چابی وغیرہ نہیں ملی تھی۔ گویا اب میرے پاس انتخاب کا موقع نہیں تھا۔ میرے سامنے ایک ہی راستہ کھُلا نظر آرہا تھا اور وہ سیڑھیاں تھیں۔

میں دیوار سے لگ کر نہایت محتاط انداز میں سیڑھیوں تک پہنچا۔ روشنی کی رسائی صرف نچلی چند سیڑھیوں تک تھی۔ اس سے اوپر سیڑھیاں بتدریج تاریکی میں مدغم ہو رہی تھیں۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ یہ سیڑھیاں کہاں جا رہی تھیں لیکن مجھے بہرحال ان بھول بھلیوں سے نکلنے کی کوشش تو کرنا ہی تھی اس لیے میں اللہ کا نام لے کر دبے قدموں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ کلاشنکوف میرے ہاتھ میں تھی اور میں سر اُٹھائے مسلسل اوپر دیکھتے ہوئے آہستگی سے ایک ایک سیڑھی چڑھ رہا تھا کہ کہیں اوپر سے مجھ پر بھی اسی طرح کوئی قیامت نہ ٹوٹ پڑے جس طرح میں ان دونوں پر ٹوٹ پڑا تھا جو بے چارے مجھے رسّی سے باندھنے آرہے تھے۔

جوں جوں میں اوپر جا رہا تھا' اندھیرا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ راستے میں ایک جگہ مجھے سیڑھیوں کی دیوار میں بلب بھی لگا نظر آیا لیکن میں نے اس کا سوئچ تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے حق میں اندھیرا ہی بہتر تھا۔ جس حد تک دیکھا جا سکتا تھا اتنا مجھے اس اندھیرے میں بھی نظر آرہا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے میں کسی مینار کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا لیکن اس مینار میں کہیں سے روشنی نہیں آرہی تھی۔

سیڑھیوں کا اختتام ایک راہداری میں ہوا لیکن ذرا غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا تو وہ راہداری نہیں' کپڑوں کی ایک بہت بڑی الماری تھی۔ اس وارڈ روب میں دو تین دراز قد اور جسیم انسان آسانی سے چل پھر سکتے تھے۔ اس میں ایک پائپ پر پچاسوں ہینگر لٹکے ہوئے تھے مگر کسی ہینگر پر کوئی کپڑا نہیں تھا۔ ایک طرف جوتوں کے ریک تھے۔ وہ بھی خالی تھے۔ مستطیل کمرے سے مشابہ اس وارڈ روب میں لائٹس بھی موجود تھیں۔ لیکن میں نے انہیں آن نہیں کیا۔

مجھے الماری کا دروازہ بھی جلد ہی نظر آگیا لیکن میں نے اسے بھی ہاتھ نہیں لگایا کیونکہ عین اسی وقت مجھے کسی کے باتیں کرنے کی آواز سُنائی دی تھی۔ بند الماری میں آواز کچھ اس طرح سنائی دے رہی تھی جیسے بہت دور سے آرہی ہو لیکن مجھے اندازہ ہو گیا کہ آواز دور کی نہیں تھی۔ اس کے بعد بیک وقت کئی افراد کے بولنے کی آوازیں آئیں جن میں ایک نسوانی آواز بھی شامل تھی جو میرے لیے اجنبی نہیں تھی۔ میں اس پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ یہ آواز یہاں کیونکر سُنائی دے رہی تھی پھر میں نے خود ہی اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس میں حیرت کی بھی ایسی کوئی بات نہیں تھی کیونکہ ابھی تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ میں کہاں کھڑا ہوں؟

وارڈ روب کے دروازے میں کی ہول موجود تھا۔ میں نے اس سے آنکھ لگائی تو الماری کے سامنے دبیز ریشمی پردے جھولتے نظر آئے جو غالباً چھت سے لے کر فرش تک آویزاں تھے تاہم یہ پردے الماری کے دروازے کے سامنے شق تھے۔ ان کے درمیان ڈیڑھ دو فٹ کا فاصلہ نظر آرہا تھا۔ میرے دیکھنے کے لیے اتنا فاصلہ بھی کافی تھا کیونکہ پردے دروازے کے قریب ہی تھے اس لیے اس

درمیانی خلا سے بھی اس طویل و عریض کمرے کا بیشتر حصہ نظر آرہا تھا جو اس وقت میرے سامنے تھا۔

کمرے کا منظر تو بعد کی بات تھی۔ پہلے تو اس کمرے کو دیکھنا ہی میرے لیے بڑی حیرت کا باعث تھا۔ میں نے پہلی نظر میں ہی اسے پہچان لیا۔ وہ قاسم بگلی کے محل نما مکان کا ڈرائنگ روم تھا جہاں میری بہت دیر اس کے ساتھ نشست رہی تھی۔ اسی کمرے میں میری فرحین کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی جب وہ قاسم بگلی سے ملنے آئی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ میں ایک عجیب و غریب اور پُراسرار سے راستے سے اوپر آنے کے بعد قاسم بگلی کے ڈرائنگ روم میں کھڑا تھا۔

کمرے کا منظر بھی خاصا حیران کُن تھا۔ وہاں ایک میٹنگ کا سا سماں تھا اور کافی تعداد میں "معززین" وہاں جمع تھے جن میں سرِفہرست نادر عرف نوزی تھا جس کے چکر میں پڑ کر میں اتنا خوار ہو رہا تھا۔ وہ لکڑی کی ایک کیبنٹ سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ اس وقت بھی سفید پٹی کے جھولے میں تھا اور ہاتھ پر بھی پٹیاں لپٹی ہوئی تھیں۔

کمرے میں "معذور" جانو بھی موجود تھا۔ وہ ہاتھ میں گلاس لیے "اپنے پیروں" پر ٹہل رہا تھا۔ گلاس شراب کا معلوم ہوتا تھا۔ سامنے ہی صوفے پر قاسم بگلی کی جڑواں بیٹیاں تانیا اور ثانیا موجود تھیں۔ میں نے جو نسوانی آواز سُنی تھی، وہ انہی میں سے کسی ایک کی تھی۔

دوسرے صوفے پر گھنی داڑھی مونچھوں والے دو بارعب اور وجیہہ نوجوان موجود تھے۔ وہ کچھ ایسے نوجوان بھی نہیں تھے۔ ان کی عمریں پینتیس اور چالیس کے درمیان رہی ہوں گی۔ وہ مجھے صرف کندھوں تک دکھائی دے رہے تھے لیکن انہیں محض اس حد تک دیکھ کر بھی ان کی شخصیت کی خوب صورتی اور وجاہت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

حُلیے اور رکھ رکھاؤ سے وہ کسی بڑے قبائلی سردار کے بیٹے معلوم ہوتے تھے۔ وہ تانیا اور ثانیا کی طرح ہم شکل تو نہیں تھے لیکن دونوں کی شکل میں قاسم بگلی کا عکس جھلک رہا تھا اور میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ قاسم بگلی کے بیٹے تھے جو اس کی پہلی بیوی کے بطن سے تھے یعنی تانیا اور ثانیا کے سوتیلے بھائی۔۔۔ لیکن میری معلومات کے مطابق ان چاروں بہن بھائیوں میں کم از کم فی الحال تو کچھ سوتیلے والے امتیازات اور تعصبات موجود نہیں تھے۔ قاسم بگلی کی موت کے وقت یہ دونوں بھائی ملک سے باہر تھے۔ شفیع شاہ نے مجھے بتایا تھا کہ ان کے نام راحیل اور شرجیل تھے۔

سب سے زیادہ حیرت مجھے اس ہیرا نما شخصیت کو دیکھ کر ہوئی جسے میں نے جانو کے ریستوران میں دیکھا تھا اور جس کے بارے میں چنبیلی نے مجھے بتایا تھا کہ وہ درحقیقت ہیرا نہیں، بہرا اور گونگا تھا۔ سوکھا، لمبا اور کمر خمیدہ سادہ سیاہ فام شخص جس کی ناک طوطے کی چونچ جیسی تھی۔ وہ اب بھی واسکٹ اور دھوتی میں تھا اور اس کے بالوں میں آٹے کے ذرات نظر آرہے تھے۔

میرے لیے اس کی موجودگی حیرت کا باعث نہیں تھی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ سیاہ فام گونگا بہرا اس وقت روانی سے امریکی لہجے میں انگریزی بول رہا تھا اور وہی صدرِ مجلس معلوم ہو رہا تھا۔ اسی لیے میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا اور یک لخت مجھے احساس ہوا کہ مجھ سے کیا حماقت ہوئی تھی۔

محض معمولی سی ظاہری تبدیلیوں کی وجہ سے میں نے اس شخص کو پہلی نظر میں نہیں پہچانا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرا ذہن اس وقت نوزی میں پھنسا ہوا تھا ورنہ اتنی سیدھی سی بات میرے ذہن میں آجانی چاہیے تھی۔

وہ درحقیقت ڈاکٹر برنارڈ تھا۔ پہلے وہ اس لیے گونگا بہرا بنا ہوا تھا کہ اسے غالباً اردو بولنی نہیں آتی تھی۔ اپنے آپ کو سیاہ فام بنانا اس کے لیے مشکل نہیں رہا ہوگا۔ اس نے کسی رنگ یا کیمیکل کا سہارا لیا ہوگا۔ آنکھوں کا رنگ بھی غالباً کنٹیکٹ لینز کی مدد سے بدلا ہوا تھا اور بہروپ بھی ایسا دھارا ہوا تھا کہ اس پر سفید فام ہونے کا تو کوئی شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن مجھے اپنے آپ پر افسوس تھا کہ میں نے چند واضح نشانیاں دیکھنے کے باوجود اسے نظرانداز کر دیا تھا۔

وہ بطورِ خاص کسی سے مخاطب نہیں تھا بلکہ کچھ اس طرح بات کر رہا تھا جیسے کسی میٹنگ سے خطاب کر رہا ہو "۔۔۔۔ ہم نے جتنی بھی تکلیفیں اُٹھائیں اور ہمیں جتنی بھی بربادی کا سامنا کرنا پڑا اس کی سب سے بڑی وجہ یہی شخص ہے۔۔۔"

پھر اس کا روئے سخن غالباً راحیل، شرجیل، تانیا اور ثانیا کی طرف ہو گیا "مجھے یقین ہے کہ تمہارے باپ کو بھی اسی نے قتل کیا تھا۔۔۔"

یہ یقیناً میرا ہی ذکرِ خیر ہو رہا تھا۔ دل چاہا آگے بڑھ کر غالب کا مصرع پڑھوں۔

ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے

میں نے اپنے آپ کو اس حرکت سے باز رکھا۔ بغیر سوچے سمجھے کمرے میں گھس کر میں بلا تاخیر چچا غالب کے پاس بھی پہنچ سکتا تھا اس لیے میں نے وہیں رہتے ہوئے اور کلاشنکوف کو زیادہ مضبوطی سے تھامتے ہوئے ڈاکٹر برنارڈ کے ارشادات پر توجہ مرکوز رکھی۔

وہ کہہ رہا تھا "میں بہت پہلے یہاں سے نکل گیا ہوتا لیکن میں صرف اس شخص کو عبرت ناک انجام سے دوچار ہوتے دیکھنے کے لیے یہاں رُکا ہوا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ آج مجھے یہ دن دیکھنا نصیب ہو رہا ہے۔ تم سب کی پریشانیوں کی جڑ بھی یہی شخص ہے اگر یہ مزید زندہ رہا تو تم لوگ بھی کبھی چین سے زندگی بسر نہیں کر سکو گے"

"وہ تو ٹھیک ہے..." راحیل یا شرجیل، دونوں بھائیوں میں سے کسی ایک نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "لیکن اسے فی الحال سیمنٹ کے پائپ میں پیک کروا کے سمندر میں پھنکوانے کا انتظام ذرا مشکل ہے۔ ہمارے گھر کی... اور ہم سب کی نقل و حرکت کی نگرانی تو پہلے ہی سے ہو رہی تھی لیکن میرا خیال ہے جمعہ خان کے ہوٹل میں اس کے آنے کے پروگرام کا بھی خفیہ اداروں کو پتا تھا۔ اس وقت ہوٹل کی بھی کڑی نگرانی ہو رہی ہے۔ میرا خیال ہے ہم اسے پائپ میں پیک کر کے کسی گاڑی میں نہیں نکل سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ اب اس گھر سے جو گاڑی نکلے گی، اس کی بھی تلاشی لی جائے گی اور اگر ہوٹل کی طرف سے کوئی چیز کسی گاڑی میں لادی گئی تو اسے بھی چیک کیا جائے گا۔ اگر ہمارے آدمی رنگے ہاتھوں پکڑے گئے تو ہمارے خلاف کیس اور مضبوط ہو جائے گا۔ تمہیں معلوم ہے 'اُدھر' تہ خانے میں مال بھی موجود ہے۔"

ڈاکٹر برنارڈ کے چہرے پر ناگواری کے آثار نمودار ہوئے۔ "تم لوگ اس علاقے کے بادشاہ ہو لیکن اتنے سے کام سے تمہارے ہوش اُڑ رہے ہیں۔ اس سے پہلے بھی یہاں لوگوں کو مارا جاتا رہا ہے۔ لاشیں سمندر میں پھینکی گئی ہیں۔ لوگوں کو غائب کیا گیا ہے۔ تمہارے باپ کو تو کبھی کسی کام میں گھبراہٹ نہیں ہوئی۔ تم لوگ نوجوان ہو کر بھی ڈرتے ہو؟"

"ہم ڈر نہیں رہے" دوسرا نوجوان، برنارڈ سے بھی زیادہ ناگواری سے بولا "یہ وقت وقت کی بات ہے اور آدمی آدمی میں فرق ہوتا ہے۔ آج اگر بابا زندہ ہوتے تو وہ بھی احتیاط کرتے۔ اس وقت ہم زیرِ عتاب ہیں۔ ہمارے گرد گھیرا تنگ ہو رہا ہے... اور پھر افضل چوہدری کوئی عام آدمی نہیں ہے۔ خفیہ اداروں کے علاوہ بھی اسے معلوم نہیں کن کن لوگوں کی مدد حاصل ہے، شاید اس کے اپنے آدمی بھی ہیں جو اِدھر اُدھر متحرک نظر آ رہے ہیں۔"

پہلا نوجوان گویا اس کی تائید میں بولا "اِدھر ہمارے حالات یہ ہیں کہ جن وزیروں سفیروں سے ہماری جان پہچان تھی وہ ہمارا فون تک نہیں سُن رہے ہیں۔ ہمارے کئی آدمیوں کو باہر سے باہر کچھ لوگ پکڑ کر لے گئے ہیں اور ان کا کچھ پتا نہیں چل رہا کہ وہ کہاں ہیں۔ معلوم نہیں ان میں سے کس کس نے کیا کچھ بک دیا ہو گا۔ کیا کیا راز کھول دیے ہوں گے۔ ہمیں اب ہر قدم بہت احتیاط سے اُٹھانے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم چاروں بہن بھائی جیل جانے یا خفیہ اداروں کے ہتھے چڑھنے سے بچے رہیں تو اچھا ہے۔ شاید ہم مل جل کر کچھ عرصے میں حالات کو سنبھالنے میں کامیاب ہو جائیں۔"

"شرجیل ٹھیک کہہ رہا ہے سر!" ثانیہ مؤدبانہ لہجے میں بولی جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ شرجیل کون تھا اور راحیل کون ہو سکتا تھا۔ میرا خیال صحیح تھا۔ اس چنڈال چوکڑی میں ڈاکٹر برنارڈ کی حیثیت صدرِ مجلس ہی کی معلوم ہوتی تھی۔ باقی لوگوں کے رویے میں اس کے لیے احترام تھا۔

ان لوگوں کے باہمی تعلق اور چکروں کو سمجھنا مشکل تھا۔ ریڈ ڈاٹ، قاسم بجلی، اس کی اولادیں، نوزی، جانو ان سب کا ایک دوسرے سے کیا تعلق تھا، یہ کس شطرنج کے مہرے تھے، کس کی کیا حیثیت تھی؟ یہ سب بڑے تفتیش طلب معاملات تھے۔

"تو پھر آخر تم لوگوں کا کیا ارادہ ہے؟" ڈاکٹر برنارڈ نے بیزاری سے پوچھا۔

شرجیل بولا "میرا خیال تھا کہ اسے مار کر ہمیں کہیں پیلس میں ہی دفن کر دیتے ہیں۔ ہمارے پاس بہت جگہ ہے۔ تہ خانے ہیں۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگوں کو مار کر اسی پیلس کی حدود میں اِدھر اُدھر دفن کیا گیا ہے۔ حالات نے ان کی لاشیں باہر لے جانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ کسی کو پتا نہیں چل سکا کہ آخر وہ کہاں گئے۔ اب تو ان کی ہڈیاں بھی گل سڑ چکی ہوں گی۔"

وہ انسانوں کو مار کر دفن کر دینے کا ذکر کچھ اس طرح کر رہا تھا جیسے چیونٹیوں کو مسل کر پھینک دینے کی بات کر رہا ہو۔ ان کی محل سرا کی بنیادوں میں انسانوں کا خون رچا ہوا تھا، انسانی ہڈیاں مدفون تھیں اور وہ نہایت اطمینان سے اس محل سرا میں رہتے تھے، سکون کی نیند سوتے تھے۔ میں نے زندگی میں بہت سے ایسے انسان دیکھے تھے جن کی انتہائی نجی مجلسوں کی گفتگو سُن کر یقین ہونے لگتا تھا کہ انسان سے بڑا درندہ روئے زمین پر نہیں پایا جاتا۔

ڈاکٹر برنارڈ طنزیہ لہجے میں بولا "یہ طریقہ اختیار کرنے میں تمہیں کوئی اندیشہ محسوس نہیں ہوتا؟ جو لوگ افضل چوہدری کو جمعہ خان کے ریستوران میں داخل ہوتے دیکھ چکے ہیں وہ اب کئی گھنٹے بعد بھی اسے برآمد ہوتے نہیں دیکھیں گے تو یقیناً ریستوران کی بنیادیں تک کھود ڈالیں گے.... بلکہ شاید اس وقت وہ اسی کام کی تیاری کر رہے ہوں گے۔ عین ممکن ہے وہ تہ خانہ.... خفیہ راستہ سب کچھ دریافت کر لیں.... پھر یہاں تمہارے پیلس میں تازہ کُھدی ہوئی زمین.... اور اس میں دفن شدہ افضل چوہدری کی تازہ لاش بھی دریافت کر لی جائے گی۔ اس صورت میں تم کہاں ہو گے؟"

"پیلس بہت بڑا ہے اور پہاڑی پر واقع ہے۔ اس کے نیچے بڑی عجیب عجیب جگہیں ہیں۔" شرجیل بولا "یہاں ایک لاش کا ڈھونڈنا بہت مشکل ہو گا۔"

"یہ تمہارا خیال ہے... بلکہ شاید خوش فہمی ہو" ڈاکٹر برنارڈ منہ بنا کر بولا "مجھے خفیہ اداروں کے لوگوں سے زیادہ افضل چوہدری کے اپنے آدمیوں سے خطرہ ہے۔ وہ اگر ڈھونڈنے پر آئیں تو اس پیلس میں اپنی مطلوبہ سوئی بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔"

"ان سے ہمارے آدمی نمٹ لیں گے" یہ اُمید راحیل نے ظاہر کی تھی۔

ڈاکٹر برنارڈ بیزاری سے بولا "تمہارے آدمی اگر اس قابل ہوتے تو حالات اتنے خراب ہی کیوں ہوتے۔ وہ سب موٹے دماغ

کے آدمی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خوبی بس یہ ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے تم لوگوں کا حکم مانتے ہیں اور غلاموں سے زیادہ تم لوگوں کے وفادار ہیں۔ عقل نام کی کوئی چیز ان میں نہیں ہے۔"

"حکم کی تعمیل کرنے والوں میں عقل ہونی بھی نہیں چاہیے" یہ فلسفہ ثانیہ نے بیان کیا "اگر ان میں عقل ہو گی تو بعض احکامات پر وہ سوچ میں پڑ جائیں گے۔ نفع نقصان کا حساب کرنے لگیں گے۔ بڑا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ ہم جیسے لوگوں کو یہ باتیں سوٹ نہیں کرتیں۔"

ڈاکٹر برنارڈ اب خاصا بیزار نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے پُرخیال انداز میں خاموش رہنے کے بعد ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا "اچھا... تمہیں جو بھی فیصلہ کرنا ہے جلدی کر لو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ میں ذرا چند منٹ کے لیے انیکسی میں جا رہا ہوں، میں کسی سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کروں گا۔ تم اس دوران اِس کا کام تو تمام کراؤ پھر جو بھی کرنا ہو گا کر لینا۔ میں اب کسی بات پر زور نہیں دوں گا۔"

اس نے اپنی میلی کچیلی واسکٹ کی جیب سے ایک موبائل فون نکالا۔ ممکن ہے وہ موبائل فون کے بجائے کوئی اور چیز رہی ہو کیونکہ وہ ہمارے ہاں دستیاب موبائل ٹیلی فونوں سے کافی مختلف دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسے اُلٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے ایک اندرونی دروازے کی طرف چل دیا۔

شرجیل، نوزی سے مخاطب ہوا "قلندر بخش رسّی لے کر نیچے گیا تھا۔ وہ تو واپس ہی نہیں آیا۔ پتا نہیں کس دھندے میں لگ گیا۔"

نوزی سیدھا ہوتے ہوئے بولا "میں جا کر دیکھتا ہوں۔"

میری معلومات میں یہ اضافہ ہوا کہ جو لحیم شحیم شخص میرے لیے رسّی لے کر نیچے پہنچا تھا اس کا نام قلندر بخش تھا۔ اس کے علاوہ ان لوگوں کی گفتگو سے مجھے یہ اندازہ بھی ہوا کہ جمعہ خان یا جانو کے ہوٹل اور اس پیلس نما مکان کے درمیان نیچے ہی نیچے کوئی راستہ موجود تھا جو انہیں ایک دوسرے سے ملاتا تھا۔ دونوں جگہوں پر تہ خانے بھی موجود تھے۔ ان تہ خانوں اور زیرِ زمین راستوں کے یقیناً کچھ "اعلیٰ" قسم کے مصرف بھی رہے ہوں گے۔ گورکھ دھندے کافی پھیلے ہوئے تھے۔

اس سے پہلے کہ نوزی اپنی جگہ سے ہلتا، شرجیل نے کسی کو اشارہ کیا۔ وہ شخص غالباً ابھی تک ایک کونے میں موجود تھا۔ مجھے نظر نہیں آیا تھا۔ شرجیل کا اشارہ پا کر وہ آگے آ گیا اور نوزی کے برابر کھڑا ہو گیا۔ وہ قلندر بخش سے بھی زیادہ خوفناک قسم کی چیز معلوم ہوتا تھا۔ صورت سے ہی جلاد معلوم ہوتا تھا۔ گھنی داڑھی مونچھوں کے ساتھ اس کے سر کے بال بھی کندھوں تک لمبے تھے اور آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ وہ سیاہ شلوار کے اوپر صرف بنیان پہنے ہوئے تھا۔ شاید اس کے وجود میں آتشِ غیظ و غضب کچھ زیادہ ہی بھڑک رہی تھی جس کی وجہ سے وہ اپنے تن پر قمیص کی موجودگی بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سیاہ رنگ کی "ایم پی فائیو" تھی۔ اس گن کے بغیر بھی وہ کچھ کم خوفناک نظر نہیں آتا ہو گا۔

شرجیل، نوزی سے مخاطب ہوا "قلندر بخش نے اسے باندھ وانده تو دیا ہو گا۔ میرا خیال ہے تم اس کا قصہ بھی ختم ہی کر دو۔"

نوزی کا دایاں ہاتھ زخمی تھا۔ اس کے باوجود وہ ایک ادائے بے نیازی سے بولا "کیا کرنا ہے اس کا؟ گولیاں ماروں یا ذبح کروں؟"

اس نے بائیں ہاتھ سے جیب سے ایک ٹی ٹی نکال لیا تھا۔ جس انداز سے اس نے پسٹل پکڑا ہوا تھا اس سے پتا چلتا تھا کہ وہ بائیں ہاتھ سے بھی گن استعمال کرنے میں ماہر تھا۔

اس نے گن کا جائزہ لیتے ہوئے نہایت سرسری سے لہجے میں دوبارہ پوچھا "اسے گولیاں مارنی ہیں یا ذبح کرنا ہے؟"

انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی خانساماں کچن میں جانے سے پہلے مالک سے پوچھ رہا ہو کہ وہ مرغ سالم ہی تیار کر کے لائے یا اس کے تکے بنا لے۔ ہم میں سے بعض لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہم میں سے ہی بعض لوگوں کے لیے انسانی جان کس قدر حقیر اور ارزاں ہو جاتی ہے۔ ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارے اردگرد چلتے پھرتے، بظاہر عام سے نظر آنے والے لوگوں میں بعض کتنے سفاک اور درندہ صفت ہوتے ہیں.... ان کی سرگرمیاں کیا ہوتی ہیں.... اور وہ اپنے مخصوص اڈوں پر اپنے قابو میں آئے ہوئے انسانوں سے کیا سلوک کرتے ہیں؟

شرجیل بے پروائی سے ہاتھ ہلا کر بولا "جو تمہارا دل چاہے، کرو لیکن نہایت صفائی سے کرو اور جلد از جلد اس کی لاش غائب کر دو۔ مجھے لگ رہا ہے کہ جلد ہمارے خلاف کوئی ایکشن شروع ہونے والا ہے۔"

نوزی نہایت مستعدی سے اسی وارڈروب کی طرف بڑھا جس میں، میں دروازے کے پیچھے کھڑا اپنے بارے میں ان معززین کے عظیم مشورے اور ارشاداتِ عالیہ سُن رہا تھا۔ وہ بہت تیزی سے الماری کی طرف بڑھا تھا۔ میرے لیے اب فوری طور پر باہر آنا ضروری ہو گیا تھا۔ میں الماری میں مورچہ بند ہونا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے باہر آنے میں کچھ تاخیر بھی کر دی تھی۔ مجھے ڈاکٹر برنارڈ کو بھی کمرے سے باہر جانے کا موقع نہیں دینا چاہیے تھا اور اس وقت ہی سامنے آ جانا چاہیے تھا جب وہ کمرے میں موجود تھا۔ یوں میں ایک وقت میں اس پوری چنڈال چوکڑی سے نمٹنے کی کوئی تدبیر کر سکتا تھا لیکن ان کی زیادہ سے زیادہ باتیں سُننے کے انتظار میں، میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی تھی۔

جتنی تیزی سے نوزی وارڈروب کی طرف بڑھا تھا اس سے زیادہ تیزی سے میں نے باہر نکل کر اس کے منہ پر کلاشنکوف رسید

کی۔ وہ اُلٹ کر کمرے کے وسط میں جاگرا لیکن بلاشبہ وہ بڑا ہی سخت جان آدمی تھا۔ اس کا ہاتھ پہلے ہی زخمی تھا اور میری یہ ضرب بھی اسے لٹا دینے کے لیے کافی تھی مگر وہ بدبخت مشینی گڈے کی طرح اُچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔

ٹی ٹی پسٹل اس کے ہاتھ سے چھوٹا نہیں تھا لیکن شاید اس لمحے اسے صحیح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس نے پسٹل بلند کیا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ میری سمت میں اندھا دھند پسٹل خالی کردے گا۔ میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا لیکن مجبوری تھی۔ موت کے علاوہ شاید کوئی چیز اسے روک ہی نہیں سکتی تھی۔ اس ایک پل میں مجھے اپنی یا اس کی زندگی میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

میں نے کلاشنکوف کا برسٹ مارا۔ اس کا آدھا سر اور چہرے کا کچھ حصہ اُڑ گیا۔ کچھ گولیاں سینے میں بھی پیوست ہوئیں۔ اس کے گرنے سے پہلے ہی میں نے کلاشنکوف سے باقی لوگوں کو کور کرلیا۔ وہ سب دم بخود بیٹھے تھے۔ انھیں شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ راحیل اور شرجیل کے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ اس قسم کے لوگ ہتھیار اپنے پاس رکھنے کی زحمت نہیں کرتے کیونکہ وہ زیادہ تر ہتھیار برداروں کے حفاظتی گھیرے میں رہتے ہیں۔ انھیں مار دھاڑ کے کاموں میں اپنے ہاتھ گندے کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کی ایک جنبشِ ابرو پر یہ سارے کام ہوجاتے ہیں۔

چنانچہ میں نے راحیل اور شرجیل کی زیادہ فکر نہیں کی تھی۔ میں نے اس خبیث صورت شخص پر نظر رکھی تھی جو بنیان اور شلوار میں تھا۔ حالانکہ اس کے ہاتھ میں ایم پی فائیو موجود تھی لیکن حیرانی کی شدت کے باعث شاید وہ اسے بھول ہی گیا تھا۔ میں نے جب نوزی کو کلاشنکوف مار کر گرایا اور پھر جب اس پر برسٹ مارا' اس دوران وہ خبیث صورت چاہتا تو ایم پی فائیو سے مجھے چھلنی کرنے کی کوشش کرسکتا تھا۔ گوکہ میں اس کی طرف سے ہوشیار تھا لیکن اس نے ایسی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔

وہ ایم پی فائیو کو ایک بیکار چیز کی طرح دونوں ہاتھوں سے تھامے ساکت کھڑا رہا۔ پلک جھپکتے میں اس کے سامنے جو کچھ ہوگیا تھا شاید وہ اسے نظر کا دھوکا لگ رہا تھا لیکن جب میری کلاشنکوف کا رُخ اس کی طرف ہوچکا تب شاید اس کا موٹا دماغ حرکت میں آیا پھر اس نے کلاشنکوف کی بھی پروا نہیں کی۔ موٹے دماغ والوں کے ساتھ بعض اوقات یہی مشکل ہوتی ہے۔ وہ صحیح وقت پر خطرے کا احساس نہیں کرپاتے۔ انھیں ایک آدھ لمحے کی تاخیر ہوجاتی ہے اور کبھی وہ صحیح وقت سے ایک آدھ لمحہ پہلے کچھ کر گزرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس نے اپنی دانست میں بڑے اسٹائل سے پوزیشن لیتے ہوئے ایک گھٹنے کے بل کھڑے ہوتے ہوئے ایم پی فائیو سیدھی کی لیکن میں نے اسے اسٹائل مارنے یا گن استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا۔ اسے ٹریگر دبانے کی مہلت نہیں ملی۔ کلاشنکوف کا برسٹ اس کے سینے پر پڑا اور وہ اُلٹ کر پیچھے جاگرا۔ اس کے جسم سے خون کے فوارے اُبل پڑے۔

تانیا اور ثانیا فائرنگ سے بچنے کے لیے صوفے سے فرش پر اوندھی گر گئی تھیں۔ راحیل بدستور بُت بنا بیٹھا تھا۔ شرجیل نے اس لمحے عجیب حرکت کی۔ وہ اچانک ہی صوفے سے اُٹھ کر باہر کو بھاگا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اس کا کمرے سے باہر جانا میرے لیے مسئلہ کھڑا کرسکتا تھا۔ میں نے گن جھکاتے ہوئے اس کے پیروں پر فائر کیا۔ وہ اوندھے منہ گر گیا۔

ثانیا نے اسے گرتے دیکھ لیا۔ وہ احتیاط اور خوف' سب کچھ بھول کر یک دم چیختی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ غالباً جوڈو کراٹے جانتی تھی۔ عین ممکن تھا دونوں بہنیں ہی مارشل آرٹس سے واقف رہی ہوں۔ تاہم اس وقت صرف ثانیا چیختی ہوئی مجھ پر جھپٹی "ذلیل! تم نے میرے بھائی کو بھی مار دیا....."

اس نے لات گھما کر اس طرح میری کلائی پر مارنے کی کوشش کی کہ کلاشنکوف میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے لیکن اگر اس قسم کے داؤ پیچ مجھ پر چلنے لگتے تو یہ میرے لیے خاصا شرم کا مقام ہوتا۔ اس سے پہلے کہ اس کی لات میری کلائی پر پڑتی' میں نے اس کی ران کے نچلے حصے پر ٹھوکر رسید کی جس سے گوشت پھٹ جاتا تھا۔ وہ قلابازی کھا کر دور جا کر گری۔ اس کے حلق سے کربناک چیخ نکلی۔

میں نے نہایت ملائمت اور شائستگی سے کہا "آئی ایم سوری ینگ لیڈی! میں تم جیسی نازک اندام اور نفیس لڑکیوں کے ساتھ ہاتھا پائی پسند نہیں کرتا لیکن اس وقت رعایت کا موقع نہیں ہے۔"

میں ماربل کے ایک ستون کی آڑ میں ہوگیا۔ وہ بہت بڑا کمرا تھا اور اس میں چاروں سمتوں میں دروازے تھے۔ ڈاکٹر برنارڈ کو میں نے خود کمرے سے باہر جاتے دیکھا تھا۔ وہ بھی واپس آسکتا تھا اور خطرناک بھی ثابت ہوسکتا تھا۔ میں اس کے اور اس کی صلاحیتوں کے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا لیکن بہرحال ریڈ واٹ کا آدمی تھا۔ میرا اس کی طرف سے ہوشیار رہنا ہی بہتر تھا۔

اس کے علاوہ مجھے معلوم تھا کہ اس مکان پر بہت سے مسلح افراد تعینات رہتے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ فائرنگ کی آواز سُن کر وہ ڈرائنگ روم کی طرف دوڑ پڑے ہوں گے.... بلکہ میرے حساب سے تو انھیں اب تک وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اگر انھیں وہاں پہنچنے میں تاخیر ہوگئی تھی تو شاید یہ میری خوش قسمتی تھی۔ میں کسی ایسی جگہ پوزیشن لینا چاہتا تھا جہاں میں کمرے میں موجود افراد کو کلاشنکوف کی زد پر رکھتے ہوئے دوسرے لوگوں سے بھی اپنا دفاع کرسکوں۔ وہ یقیناً کسی بھی لمحے کمرے پر دھاوا بولنے والے تھے۔ اگر راحیل' شرجیل' تانیا اور ثانیا وغیرہ میری گن کی زد پر رہتے تو

میں انھیں اپنی ڈھال کے طور پر استعمال کرسکتا تھا۔ انھیں گزند سے محفوظ رکھنے کے لیے ان کے محافظ فوری طور پر مجھ پر گولی نہیں چلا سکتے تھے۔ پوزیشن لینے کے لیے مجھے کمرے میں ماربل کے اس ستون کے علاوہ کوئی آڑ میسر نہیں تھی۔

راحیل کے حواس شاید ٹھکانے آچکے تھے۔ اس نے ایک نظر اپنے بھائی شرجیل کی طرف دیکھا جو فرش پر اُٹھ بیٹھا تھا مگر اپنی دونوں ٹانگیں پکڑے ہوئے تھا۔ اس کی دونوں ٹانگوں سے خون بہہ رہا تھا اور نفیس شلوار کے پائنچے سُرخ ہوچکے تھے۔

راحیل دانت پیس کر بولا "تم نے جو کچھ کیا ہے اس پر تمہاری آنے والی نسلیں بھی پچھتائیں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔ مجھے ان کے پچھتانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا" میں نے بے پروائی سے کہا "فی الحال تو ان کے آنے کے ہی کوئی آثار نہیں ہیں۔"

میں ان سب کے علاوہ دروازوں پر بھی نظر رکھنے کی کوشش کررہا تھا لیکن میرا یہ اندیشہ غلط ہی ثابت ہوا کہ راحیل' شرجیل کے مسلح محافظ کمرے پر دھاوا بولیں گے۔ اس کے بجائے باہر سے میگا فون پر کسی کی تحکمانہ آواز سُنائی دی "اس کمرے میں جو بھی مسلح افراد موجود ہیں وہ ہتھیار ڈال دیں۔ یہ پورا مکان قانون نافذ کرنے والے اداروں کے گھیرے میں ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے کسی نے پوچھا "مسٹر افضل! کیا آپ خیریت سے ہیں؟" یہ آواز بھی میرے لیے اجنبی تھی۔

"جی ہاں۔ میں خیریت سے ہوں اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں" میں نے جواب دیا۔

باہر گہرا سکوت چھا گیا۔ شاید انھیں میرا جواب پسند نہیں آیا تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "آپ لوگ تشریف لے آئیں۔ اب ان تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔"

چند لمحے بعد باہر کے دروازوں سے کچھ چہروں نے محتاط انداز میں کمرے میں جھانکا' صورتِ حال کا جائزہ لیا پھر کچھ لوگ گنیں لیے اندر آگئے۔ وہ سب سادہ لباسوں میں تھے اور سب میرے لیے اجنبی تھے۔ انھوں نے سب کی تلاشی لی۔ صرف جانو کی جیب سے ٹی ٹی نکلا۔

مضبوط کاٹھی کا ایک ادھیڑ عمر اور بارعب سا شخص آگے آکر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا "مجھے چشتی کہتے ہیں۔ آپ یقیناً مسٹر افضل ہیں؟"

میں ستون کی اوٹ سے نکل آیا تھا۔ میں نے کلاشنکوف بغل میں دباتے ہوئے کہا "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔ آپ ٹھنڈا پینا پسند کریں گے یا گرم؟"

اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ میری حسِ مزاح کے اس بے ہودہ مظاہرے پر مجھے سخت لہجے میں کوئی نصیحت کرے یا اس سے محظوظ

ہو۔ اس نے غالباً خاموش رہنا اور کوئی ردِ عمل ظاہر نہ کرنا ہی بہتر سمجھا۔

میں نے گہری سنجیدگی سے مزید کہا "بے شک گھر اور ڈرائنگ روم دوسروں کا ہے لیکن آدابِ میزبانی کا خیال رکھنے میں کیا حرج ہے؟"

چشتی صاحب میری بات کا جواب دینے کے بجائے کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگے پھر انہوں نے اپنے آدمیوں کو ہدایات دینا شروع کیں۔ ہتھیار قبضے میں لیے جارہے تھے۔ لاشوں کو ڈھانپا جارہا تھا اور زخمی شرجیل کے لیے طبّی امداد کا بندوبست کیا جارہا تھا۔

دفعتاً اس وارڈ روب کا دروازہ ایک بار پھر وا ہوا جس سے میں اس کمرے میں وارد ہوا تھا۔ اس دروازے سے چنبیلی برآمد ہوئی اور یوں لڑکھڑاتی ہوئی تیزی سے آگے آگئی جیسے کسی نے اسے دھکا دیا ہو۔ وہ دونوں ہاتھ اُٹھائے ہوئے تھی۔ اس کے پیچھے شفیع شاہ اور دوسرے دو افراد گنیں اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئے۔

"بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے" میں نے بہ آواز بلند شفیع شاہ کو مخاطب کیا۔ اس کے پیچھے پیچھے کچھ اور لوگ بھی اسی وارڈ روب کے راستے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کے پاس جدید ساخت کی گنیں تھیں۔ کمرا نہایت طویل و عریض ہونے کے باوجود بھرا بھرا نظر آنے لگا۔

شفیع شاہ قدرے شرمندگی سے بولا "سر! ہم تو کب کے پہنچ گئے ہوتے لیکن ان سرکاری لوگوں نے بیچ میں ٹانگ اُڑا دی۔ ان کے پاس کچھ اطلاعات جمع ہو گئی تھیں جن کی روشنی میں فوری طور پر کارروائی کرنا ضروری تھا۔ انہوں نے ہم سے کہا... بلکہ یوں سمجھیے کہ ہمیں تقریباً حکم دیا کہ کارروائی کو زیادہ نتیجہ خیز بنانے کے لیے ہم مل کر کام کریں۔"

"اگر مجھے بروقت ہوش نہ آتا تو تم لوگوں کی کارروائی بہت ہی زیادہ نتیجہ خیز ہوجاتی یعنی میرا قصہ پاک ہوچکا ہوتا" میں نے کہا۔

چشتی صاحب میرے قریب آکر میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دوستانہ لہجے میں انگریزی میں بولے "اچھے مقاصد کے حصول کے لیے تھوڑا بہت رسک تو لینا پڑتا ہے افضل صاحب!"

"ٹھیک ہے سر!" میں نے سعادت مندی سے سر ہلایا "آئندہ بھی قربانی کے بکرے کی ضرورت ہو تو اس خادم کو یاد فرمایئے گا۔"

"نہیں جناب! اس کی قطعاً ضرورت نہیں پڑے گی۔" چشتی صاحب نے مجھے یقین دلایا "آپ کو شاید اندازہ نہیں کہ تھوڑے سے صبر و تحمل اور آپ کے ساتھیوں کے تعاون کی وجہ سے کتنی بڑی مہم سر ہوگئی ہے۔ قاسم بجلی ایک عرصے سے ہماری واچ لسٹ پر تھا۔ وہ کبھی لمبے عرصے کے لیے پکڑا نہیں جاسکا حتیٰ کہ مارا گیا۔ اس کے مرنے کے بعد بھی اس کے تمام دھندے اسی طرح چل رہے تھے۔ اس وقت ہم نے آپ کے ساتھیوں کے تعاون سے دو طرف سے دھاوا بولا۔ یعنی ہم نے مکان کو بھی گھیرے میں لیا اور تمام مسلح محافظوں کو قابو میں کیا اور اِدھر جمعہ خان کے ہوٹل کا تہ خانہ اور وہ خفیہ راستہ بھی آپ کی وجہ سے دریافت ہوگیا جو ہوٹل کو اور اس مکان کو آپس میں ملاتا ہے۔ ہمیں ان دونوں جگہوں کے درمیان ایسے کسی راستے کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔"

"آپ کو تو ابھی نہ جانے کس کس بات کا علم نہیں ہے سر! یہی تو ایک بڑا مسئلہ ہے کہ آپ جیسے لوگوں کا علم بہت محدود ہے سر!" میں ایسے لوگوں پر طنز کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا حالانکہ مجھے دل ہی دل میں اعتراف بھی تھا کہ نفیس صاحب، چشتی صاحب اور اس قبیل کے دوسرے افسروں کا دم تو پھر بھی غنیمت تھا۔ یہ لوگ تو بڑے بڑے جرائم کے خاتمے کے لیے پھر بھی سرگرم نظر آرہے تھے۔ جان بھی خطرے میں ڈالتے تھے۔ خود ہر جگہ پہنچتے تھے۔ باقی بہت سے محکموں کے سربراہ اور دیگر اعلیٰ افسر تو نہ جانے کیا کرتے تھے، کہاں مدہوش پڑے رہتے تھے۔ ان کے وجود اور عدم وجود میں کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا تھا۔

چشتی صاحب کے چہرے پر ناگواری کی لہر ابھری لیکن فوراً ہی غائب ہوگئی۔ شاید نفیس صاحب کی طرح ان میں بھی تحمل اور بردباری موجود تھی۔ وہ سنی ان سنی کرکے بات جاری رکھتے ہوئے بولے "قاسم بجلی ڈرگ مافیا کے ان خاص آدمیوں میں سے ایک تھا جو پاکستان میں موجود ہیں لیکن ہمیں یہ بات آج معلوم ہوئی کہ اس کی اصل ذخیرہ گاہ جمعہ خان کا ہوٹل تھا۔ اس کے تہ خانے اور پچھلی کوٹھریوں میں آٹے دال اور نمک وغیرہ کی جو بوریاں اور تھیلے موجود رہتے تھے انہی کے بیچ میں ڈرگز کی تھیلیاں پیک ہوتی تھیں۔ سب کچھ ہمارے ہاتھ آگیا ہے۔ ہمارے حق میں یہ اچھا ہوا ہے کہ آپ ان کی قید میں موجود تھے۔ قاسم بجلی نہ سہی، اس کی اولادیں گویا رنگے ہاتھوں پکڑی گئی ہیں۔"

میں نے راحیل اور شرجیل کی طرف اشارہ کیا "کیا یہ دونوں نوجوان اپنے باپ کے دھندوں میں ملوث تھے؟"

"پوری طرح" چشتی صاحب نے وثوق سے جواب دیا "یہ اس کی زندگی میں بھی مختلف مقامات پر ڈرگز کے آپریشن کو کنٹرول کرتے تھے۔ پاکستان میں اور بیرونی ممالک میں بھاگ دوڑ میں مصروف رہتے تھے۔ باپ کے قتل کے بعد تو پورا "کاروبار" ہی انہوں نے سنبھال لیا تھا لیکن فی الحال انہیں دشواریاں پیش آرہی تھیں۔ ابھی ان کے قدم باپ کی طرح مضبوطی سے جمنے نہیں پائے تھے۔"

"آپ نے قدم بالکل ہی اُکھاڑ دیے" میں نے کہا۔

"یہ بھی اچھا ہی ہوا کہ یہ کام ہمارے ہاتھوں انجام پاگیا ورنہ ہمارے ہاں ایک کے بجائے دو قاسم بجلی ہوجاتے" چشتی صاحب نے دونوں نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا۔

"کیا یہ دونوں لڑکیاں بھی ان دھندوں میں ملوث تھیں؟" میں

نے تانیا اور ثانیا کی طرف اشارہ کیا جو اب صوفے پر بیٹھی تھیں اور کچھ مضمحل نظر آرہی تھیں۔ ان کی مخصوص سرکشی اور تیزی وطراری اس وقت مفقود نظر آرہی تھی۔

"کسی حد تک" چشتی صاحب نے جواب دیا "فی الحال انہیں بھی حراست میں لیا جارہا ہے۔ تفتیش کے بعد شاید مزید کچھ حقائق سامنے آئیں۔"

دو آدمی گنیں لیے دونوں لڑکیوں کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں لیکن اب ان کی نظروں میں میرے لیے غیظ و غضب بھی نہیں تھا جس پر مجھے حیرت تھی۔

چشتی صاحب بات جاری رکھتے ہوئے بولے "آپ کی وجہ سے ہمارا کام بہت آسان ہوگیا۔ آپ نے نہ صرف خود اپنی حفاظت عمدہ طریقے سے کی بلکہ ہماری مدد کے بغیر ہی ان دو بڑے بدمعاشوں کا بھی قصہ پاک کردیا جو اس کمرے میں خونریزی کا سبب بن سکتے تھے۔"

دفعتاً مجھے احساس ہوا کہ اس ہڑبونگ میں ایک شخص کا خیال تو میرے ذہن سے نکل ہی گیا تھا جو میرے لیے سب سے زیادہ اہم تھا۔ میں نے ہڑبڑا کر چشتی صاحب سے پوچھا "آپ نے مکمل طور پر مکان کا محاصرہ کیا تھا؟"

"جی ہاں۔ کیوں؟" انہوں نے کسی اور طرف متوجہ ہوتے ہوئے پلٹ کر پوچھا۔

"آپ کے آدمی باہر بھی موجود ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں... لیکن آپ کو اچانک کیا یاد آگیا ہے؟"

"یہاں ریڈ ڈاٹ کا بھی ایک آدمی موجود تھا۔ وہ یہاں ہنگامہ شروع ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے باہر گیا تھا۔ ذرا اپنے آدمیوں سے معلوم کیجیے وہ بھی ہاتھ آیا یا نہیں؟" میں نے بے تابی سے کہا۔

"ریڈ ڈاٹ کا آدمی...؟ کیا آپ کو اس کا نام معلوم ہے؟" چشتی صاحب کی پیشانی پر شکنیں اُبھر آئیں۔

"ڈاکٹر برنارڈ ہے اس کا نام" میں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر انہیں دروازے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا "لیکن وہ حلیہ بدلے ہوئے ہے... تقریباً سیاہ فام بنا ہوا ہے... دھوتی واسکٹ میں ہے... اس کا ہاتھ آنا بہت ضروری ہے۔"

"اگر وہ اس مکان میں یا ہوٹل کے تہ خانے میں موجود تھا تو ضرور پکڑا گیا ہوگا" چشتی صاحب بولے۔

ان کا یہ خیال درست ثابت نہیں ہوا۔ مکان کے مختلف حصوں سے جتنے بھی آدمی حراست میں لیے گئے تھے، ان میں ڈاکٹر برنارڈ شامل نہیں تھا۔ مالی اور خانساماں تک فی الحال ایک طرف بٹھا لیے گئے تھے لیکن ڈاکٹر برنارڈ کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ میں خود مکان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑا پھرا۔ انیکسی میں بھی گیا۔ شفیع شاہ کے ساتھ میں نے اس زیرِ زمین راستے کا بھی سفر کیا جو اس مکان سے جمعہ خان کے ہوٹل تک جاتا تھا۔ اس کا کچھ حصہ تو وہی تھا جہاں سے میں ہوش میں آنے کے بعد فرار ہوا تھا اور وارڈ روب کے راستے نکلا تھا۔ اس سے پیچھے وہ راستہ مزید دو تین فرلانگ لمبا تھا اور اس میں کئی گیٹ اور کوٹھریاں تھیں۔

اس وقت مجھے ان بھول بھلیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ ہی مجھے اس خیال سے کوئی سنسنی محسوس ہورہی تھی کہ تہ خانوں وغیرہ سے کیا کچھ برآمد ہوا تھا۔ میں سب کچھ بھول بھال گیا تھا۔ اس تصور سے ہی میرا دل ڈوب رہا تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کسی طرح اس آپریشن کے دوران نکل گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ جب راحیلہ کو اس کارروائی کی تفصیلات کا پتا چلے گا اور یہ علم ہوگا کہ ڈاکٹر برنارڈ میرے سامنے آنے اور ایک زیرِ محاصرہ مکان میں موجود ہونے کے باوجود نکل گیا تھا تو وہ دل میں کیا سوچے گی؟

راحیلہ کے آدھے سیاہ چہرے کو درست کرنے کے لیے جس طبّی شعبدے کی ضرورت تھی، وہ صرف ڈاکٹر برنارڈ کے پاس تھا۔ جب سے ریڈ ڈاٹ کا خاتمہ ہوا تھا، میرے دل میں صرف یہی پھانس رہ گئی تھی کہ کسی طرح ڈاکٹر برنارڈ ہاتھ آجائے۔ راحیلہ بظاہر تو بے پروا اور بے نیاز بنی ہوئی تھی کہ اسے اپنے آدھے سیاہ، آدھے سفید چہرے کی کوئی پروا نہیں تھی اور وہ اسی کے ساتھ زندگی گزارنے کی عادی ہوتی جارہی تھی لیکن میں اس کی بات پر پوری طرح یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بھلا کوئی لڑکی اس ہیئت کذائی کے ساتھ زندگی کیونکر گزار سکتی تھی؟... اور لڑکی بھی وہ جو بلا کی حسین رہی ہو۔ مجھے تو یہی لگتا تھا کہ وہ محض میرا دل رکھنے کو بے نیاز بنتی تھی۔ ایک بدصورت حقیقت کے سامنے دلیر نظر آنے کی کوشش کرتی تھی کہ کہیں میں کسی قسم کے احساسِ جرم میں مبتلا نہ ہوجاؤں کہ اس کے ساتھ یہ سب کچھ میری وجہ سے ہوا تھا ورنہ وہ تو کراچی میں آرام سے ایک محدود اور پُرسکون سی زندگی گزار رہی تھی۔

کچھ بھی تھا، ڈاکٹر برنارڈ کا نکل جانا میرے لیے بہرحال ایک دھچکا تھا۔ اگر میں نے اسے دیکھا ہی نہ ہوتا، پہچانا ہی نہ ہوتا تو اور بات تھی۔ لاعلمی بعض اوقات بڑی راحت کا باعث ہوتی ہے۔ میں بھی اس کی موجودگی سے لاعلم رہتا تو بڑے سکھ میں رہتا۔ میرے دل کو پچھتاوا نہ ہوتا۔

میری ساری خوشی ہوا ہوگئی تھی۔ حتیٰ کہ جان بچ جانے کی بھی کوئی خاص خوشی نہیں رہی تھی۔ میں نے چشتی صاحب سے درخواست کی کہ وہ اپنے فاضل آدمیوں کو جزیرے پر پھیلا دیں تاکہ ڈاکٹر برنارڈ اپنے اصل حلیے یا بہروپ میں کہیں نظر آجائے تو قابو میں کرنے کی کوشش کریں۔ میرے آدمی شفیع شاہ سمیت صرف پانچ تھے۔ میں نے انہیں سمندری راستے کی نگرانی کرنے کا حکم دیا۔ وہ سب فوری طور پر روانہ ہوگئے لیکن نہ جانے کیوں میں ان

کی کامیابی کے سلسلے میں کچھ زیادہ پرامید نہیں تھا جو شخص اتنے زبردست چھاپے کے دوران سب کی آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل گیا تھا اس کا اب اتنے بڑے جزیرے پر ہاتھ آنا مشکل ہی لگتا تھا جس کے تین طرف سمندر اور ایک طرف خشکی کا راستہ بھی موجود تھا۔

تقریباً ایک گھنٹے بعد میں قدرے مایوسی وافسردگی کے عالم میں جزیرے سے لوٹ آیا۔ اپنے ہوٹل پہنچ کر میں نے شاور لیا۔ لباس تبدیل کیا اور ذرا تازہ دم ہو کر کھانا ڈائننگ ہال میں کھانے کے ارادے سے نیچے آگیا۔

استقبالیہ کے قریب سے گزرتے وقت میں نے دیکھا' سُرخ اسپورٹس شرٹ اور بلیو جینز میں ایک لڑکی کاؤنٹر پر کھڑی ہوٹل میں چیک ان ہونے کے لیے کارڈ کی خانہ پری کررہی تھی۔ ہوٹل کے پورٹر اس کا سامان لاکرفی الحال اس کے قریب رکھ رہے تھے۔

وہ بھرے بھرے جسم کی ایک دراز قد لڑکی تھی۔ خدوخال بڑے حشر خیز تھے۔ اس کے ریشمی بھورے بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ لابی میں جو ایک دلفریب سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی وہ یقیناً اسی کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔

گزرتے ہوئے مجھے سائڈ سے اس کا صرف ایک رخسار دکھائی دیا۔ یہ محض ایک جھلک ہی تھی۔ اس کے باوجود وہ مجھے کچھ شناسا محسوس ہوئی۔ غیر ارادی طور پر میرے قدم سست پڑ گئے۔ میں یونہی اپنے کمرے کی چابی کاؤنٹر کلرک کو دینے کے بہانے لوٹ آیا۔ تب تک لڑکی کارڈ پر دستخط کرکے سیدھی کھڑی ہوچکی تھی اور بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی تھی۔ میں نے کلرک کو مخاطب کیا تو لڑکی نے گویا میری آواز سُن کر گردن گھما کر میری طرف دیکھا اور ایک لمحے کے لیے میری سانس گویا سینے میں اٹک گئی۔

وہ زرتاج تھی!

میں ایک ٹک اُس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ وہ اُس زرتاج سے مختلف نظر آرہی تھی جسے میں نے پہلی بار اس کی زمینوں پر دیکھا تھا۔ اس وقت وہ مکمل طور پر "دیسی" حسُن کا شاہکار تھی۔ کسی رومانی داستانوں کا کوئی کردار تھی۔ اس وقت وہ کوئی ایسی لڑکی دکھائی دے رہی تھی جو یورپ' امریکا یا انگلینڈ سے تازہ تازہ وارد ہوئی ہو لیکن اس کے دونوں روپ بلا کے دلکش اور حسین تھے۔ ہر روپ کی اپنی ایک انفرادیت اور الگ طرح کی کشش تھی۔ پہلی بار بھی اسے زرتاج نگر میں دیکھ کر میرا دل دھڑکنا بھول گیا تھا اور آج اسے اپنے فائیو اسٹار ہوٹل کی جھلمل جھلمل کرتی لابی میں کھڑے دیکھ کر بھی میں دم بخود سا رہ گیا تھا۔

دھیرے دھیرے اس کے رسیلے یاقوتی ہونٹوں پر مسکراہٹ طلوع ہوئی اور وہ گویا کسی اَن کہی اَن سُنی بات سے محظوظ ہوتے ہوئے بولی "کیا بات ہے......... اس طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو' کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں؟"

"تمہارے سر پر سینگ نکل آتے تب بھی شاید تمہارے حُسن میں کوئی خاص کمی نہ آتی۔" میں نے آہستگی سے کہا۔

اس کے گلاب سے رخساروں پر سُرخی نمودار ہوئی۔ وہ بالوں میں انگلیاں پھیر کر گہری سانس لیتے ہوئے مسکرا کر بولی "تم اس وقت اس افضل سے کتنے مختلف نظر آرہے ہو جو میرے ہاں گھوڑے سدھانے پر ملازم ہوا تھا۔"

"یہ سب وقت وقت کی باتیں ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"آخر تمہیں وہ بہروپ بھرنے کی کیا ضرورت آن پڑی تھی؟" وہ اب بھی میری طرف دیکھتے ہوئے گویا کسی پُرانے تصور سے لطف اندوز ہورہی تھی۔

"میں نے تمہیں اس کی وجہ بتا تو دی تھی۔ آخری دنوں میں تو میں نے تمہیں اپنی ساری رام کہانی سُنادی تھی۔" میں نے اسے یاد دلایا۔

"لیکن اپنی ذات کے بہت سے گوشے پنہاں رہنے دیئے تھے۔" اس نے گویا شکوہ کیا۔

"کچھ باتیں کسی اور وقت کے لئے بھی اُٹھا رکھنی چاہئیں۔" میں نے کہا۔

"میں نے سوچا شاید وہ وقت آن پہنچا ہو۔" اس کی مسکراہٹ پہلے سے زیادہ روشن' پہلے سے زیادہ دل نشیں تھی۔

"تم محض اس لئے تو یہاں نہیں آئی ہوگی۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"تم بہت جلد باز ہوگئے ہو۔ لگتا ہے زرتاج نگر سے واپس آنے کے بعد تم میں بہت سی تبدیلیاں آگئی ہیں یا پھر شاید تم پہلے ہی سے ایسے تھے اور زرتاج نگر میں تم نے بھیس بدلنے کے ساتھ ساتھ عادتیں بھی بدل رکھی تھیں۔"

"تمہیں میری کس بات سے مجھ پر جلد باز ہونے کا گمان گزرا ہے؟" میں نے جاننا چاہا۔

"تم نے یہیں کھڑے کھڑے یہ جاننے کی کوشش شروع کردی کہ میں یہاں کس لئے آئی ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"اوہ واقعی کبھی کبھی میں بالکل بھول جاتا ہوں کہ میں کہاں کھڑا ہوں اور موقع محل کیا ہے۔" میں نے قدرے شرمندگی سے تسلیم کیا "اچھا یہ بتاؤ تم نے کمرا لے لیا؟"

"ہاں" اس نے اثبات میں سرہلایا۔

"کیسا کمرا لیا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں اکیلی آئی ہوں۔ سنگل بیڈ لیا ہے۔ میرے لئے کافی ہے۔"

"کافی تو ہوگا لیکن اب مجھے یہ ظاہر کرنے کا موقع دو کہ مجھے حق میزبانی ادا کرنے کی کافی فکر ہے۔" میں نے کہا پھر کلرک کو مخاطب کیا "ان کے سنگل بیڈ کو وی آئی پی سوئٹ سے بدل دو۔ یہ ہمارے لئے وی آئی پی... بلکہ وی وی آئی پی ہیں۔"

"یس سر!" کلرک نے سعادت مندی سے کہا اور اس کے کارڈ میں نمبر بدلنے لگا۔ زرتاج نے کافی احتجاج کیا لیکن میں نے اس کی ایک نہ چلنے دی تاہم میں نے اس پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہوٹل میرا تھا۔ میں نے غیرواضح سے انداز میں اسے یہی تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ میں بھی محض ایک عام بزنس مین کی حیثیت سے اس ہوٹل میں مقیم تھا۔ بس میری ذرا ہوٹل کے عملے سے اچھی شناسائی تھی اور میں اضافی خرچ اپنے ذمے لیتے ہوئے اسے سنگل روم کے بجائے وی آئی پی سوئٹ میں ٹھہرا رہا تھا۔

اس کے کارڈ میں نمبر وغیرہ تبدیل ہوچکا تو میں نے پوچھا "اس وقت ایئرپورٹ سے آرہی ہو؟"

"ہاں" اس نے جواب دیا "میری گاڑی آج شام تک بائی روڈ پہنچ جائے گی۔"

"گاڑی کی تم فکر نہ کرو۔ گاڑیاں بہت ہیں۔ بلکہ اب تم کسی بھی چیز کی فکر مت کرو۔ تمہاری ملاقات اپنے اس خادم سے ہوگئی ہے جو تمہارے گھوڑے سدھاتا رہا ہے۔ یہ خادم تمہارے لئے ہر چیز مہیا کرسکتا ہے۔ حتیٰ کہ تم اگر یہاں بیجیرو یا مرسیڈیز کے بجائے کسی اعلیٰ نسل کے گھوڑے پر سفر کرنا پسند کرو تو وہ بھی مہیا کیا جاسکتا ہے۔"

"میں روایت پسند ضرور ہوں لیکن مجھے کارٹون بننے کا شوق نہیں ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اچھا۔ اب تم اپنے سوئٹ میں جاؤ' ذرا فریش ہوجاؤ۔ ایک گھنٹے بعد تم سے ملاقات ہوگی پھر باتیں ہوں گی۔" میں نے کہا اس نے اثبات میں سرہلایا اور بیل بوائے کی رہنمائی میں آگے بڑھ گئی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کلرک کو ہدایت کی کہ اس کے آرام و آسائش اور ضروریات کا خاص خیال رکھا جائے۔ متعلقہ عملے کو میں نے بتادیا کہ وہ میری محسنہ تھی لیکن ساتھ ہی انہیں ہدایت کی کہ زرتاج کو احساس نہ ہونے دیا جائے کہ میں اس ہوٹل کا مالک تھا۔

کھانا کھانے اور چند ضروری فون کرنے میں میرا ایک گھنٹا گزر گیا۔ ایک بار پھر میں لفٹ سے اوپر آیا اور زرتاج کے سوئٹ پہنچ کر دستک دی۔ اس نے دروازہ کھولا اور تازگی بخش سی ایک مہک نے میرے ہر مسامِ جاں کو معطر کردیا۔ وہ شاور لے کر لباس تبدیل کرچکی تھی اور اس نوشگفتہ پھول کی طرح مہک رہی تھی جو شبِ رفتہ کی تمام خوب صورتیاں سمیٹنے کے بعد اوس میں نہا چکا تھا۔

میں نے ایک بار پھر گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا تو وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "شہر واپس آنے کے بعد تمہاری نظروں میں کچھ بدمعاشی سی آگئی ہے۔"

"شہر کی فضا ہی ان دنوں کچھ بدمعاش سی ہوگئی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن میرے بارے میں تمہیں غلط [illegible] ہے جسے تم بدمعاشی سمجھ رہی ہو درحقیقت وہ ستائش ہے۔"

وہ ایک طرف ہٹ گئی اور میں اندر جا پہنچا۔ اس کے کہنے سے [illegible] میں ایک صوفے پر پھیل کر بیٹھ گیا۔ وہ میرے مقابل [illegible]

"تم نے کھانا کھالیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں جہاز پر ہی جیسا تیسا ملا' کھالیا تھا۔" اس نے جواب [illegible]

"تو پھر کافی کا دور چلنا چاہئے۔" میں نے کہا اور فون پر روم [illegible] کو کافی کا آرڈر دیا۔

میرے ریسیور رکھنے کے بعد کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ ہم [illegible] ہی خاموش تھے اور ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے [illegible] آخرکار وہ دھیرے سے ہنسی اور دھیمی آواز میں بولی "بعض [illegible] بے وقوفوں کی طرح دو افراد کا ایک دوسرے کو تکنا دونوں [illegible] لنا بھلا لگتا ہے۔"

"شکر ہے تم نے "دونوں" ہی کی بات کی ہے۔" میں نے کہا۔

[illegible] اسی اثنا میں کافی آگئی۔ ویٹر جاچکا اور زرتاج کافی بنا کر مگ مجھے [illegible] تو میں نے صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے ٹھہرے [illegible] لہجے میں کہا "ہاں تو اب تم مجھے بتاؤ کہ تم کراچی کیوں آئی [illegible]"

"کیوں کیا میرے کراچی آنے پر پابندی ہے؟" اس نے کچھ [illegible] نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ارے پابندی کی بات مت کرو۔ یہاں نہ جانے کتنے ایسے [illegible] رناتے پھر رہے ہیں جن کے اس دنیا میں آنے پر پابندی ہونی [illegible] تھی مگر وہ نہ صرف آچکے ہیں بلکہ کسی طرح جانے کا نام بھی [illegible] تے۔ تم تو اس دنیا میں بہت پیارا اضافہ ہو لیکن میرے سوال [illegible] گول کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں جب کوئی سوال کر [illegible] تو پھر اتنی آسانی سے اسے نہیں بھولتا۔ تم کراچی کیوں [illegible]"

[illegible] کا ایک گھونٹ بھر کر وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر آہستگی سے [illegible] کسی کی تلاش میں آئی ہوں۔"

"[illegible] ن ہے وہ؟" میں نے اس کی آنکھوں کے راستے اس کے [illegible] جھانکنے کی کوشش کی۔

"میں ابھی نہیں بتاسکتی۔" وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔

"پھر کب بتاؤ گی؟"

"[illegible] اب وقت آنے پر۔" اس نے جواب دیا "ویسے تلاش تو [illegible] میں بھی کیا تھا۔"

"[illegible] ر رکھنے کے لئے ایسی باتیں کرنے کی ضرورت نہیں [illegible] نے کہا۔

"[illegible] میں دل رکھنے کی کیا بات ہے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ تم [illegible] نظر میں گمنام رہنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ مجھے صرف ایک فون نمبر دے کر آگئے تھے اور وہ بھی اب بدل چکا تھا۔ اپنے بارے میں تم نے صرف یہ بتایا تھا کہ تم چھوٹے سے ایک بزنس مین ہو۔" مجھے یہ جان کر کچھ عجیب سا محسوس ہوا کہ اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"میں نے کچھ غلط تو نہیں کہا تھا۔ میں واقعی ایک چھوٹا سا بزنس مین ہوں۔ فون نمبر میرے وہاں سے آنے کے بعد بدلا ہے۔ اس لئے تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ میں نے جان بوجھ کر تمہیں غلط نمبر دیا تھا۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "میں نے صرف اس لئے تمہیں اپنے بارے میں کچھ زیادہ تفصیل سے نہیں بتایا تھا کہ زندگی میں دوبارہ تم سے ملاقات کی کوئی اُمید نہیں تھی اور یہ تو مجھے قطعاً توقع نہیں تھی کہ اگر تم کبھی حُسنِ اتفاق سے لاہور آبھی گئیں تو مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی کروگی۔"

"کیا میں تمہیں اتنی ہی بے مروت لگتی ہوں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"تم تو شاید بے مروت نہیں ہو لیکن مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں تھا۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا کہ تم لاہور بھی گئی تھیں اور وہاں تم نے مجھے تلاش کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ اگر مجھے ایک فیصد بھی اُمید ہوتی کہ ایسا ہوگا تو میں تمہیں اپنا تفصیلی اتا پتا' سارے ایڈریس' سارے ٹیلی فون نمبر... بلکہ اپنا شجرۂ نسب تک دے کر آتا جو کچھ زیادہ قابلِ فخر نہیں ہے۔"

"معلوم نہیں تم نے مجھ سے دوبارہ ملاقات کو ایسی انہونی کیوں سمجھ لیا تھا۔" وہ بدستور خواب ناک سے انداز میں مسکرا رہی تھی "میں نہ صرف لاہور آئی بلکہ میں نے اس ایک غلط ٹیلی فون نمبر کی مدد سے تمہارا صحیح فون نمبر بھی تلاش کرلیا پھر تمہارے دفاتر پر مشتمل بلڈنگ بھی جاکر دیکھ لی۔ تمہارا وہ مکان بھی دیکھا جو یقیناً کبھی بہت عالیشان رہا ہوگا مگر اب اس کا ملبہ اُٹھایا جارہا تھا۔"

"کیا واقعی تم نے میرے بارے میں معلومات کرنے کے لئے اتنی زحمت کی؟" مجھے گویا یقین نہیں آرہا تھا۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں؟ میں نے تو تمہارے کراچی تک کے ٹھکانے معلوم کرلئے حتیٰ کہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس وقت میں جس ہوٹل میں مقیم ہوں یہ بھی تمہارا ہے۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"اوہ... مروادیا!" میں کراہ کر رہ گیا۔ میں نے اپنی دانست میں فی الحال اس حقیقت کو اس سے پوشیدہ رکھنے کی کوشش کی تھی۔

وہ مسکراتے ہوئے بولی "تم تو واقعی بہت چھوٹے سے بزنس مین ہو۔ چیونٹی جتنے چھوٹے۔" اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

"اس بیکراں کائنات میں میری حیثیت واقعی ایک چیونٹی سے زیادہ نہیں۔" میں نے درویشانہ لہجے میں کہا۔

"بس... بس' اتنی انکساری مت ظاہر کرو جو جھوٹ معلوم ہونے لگے۔" وہ بولی "ابھی تو یقیناً تمہارے اور بھی کئی کاروبار ہوں

گے جن کے بارے میں مجھے معلوم نہیں ہو سکا ہوگا۔"

"تم نے جو کچھ معلوم کر لیا وہ بھی کم نہیں ہے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک بدلے ہوئے فون نمبر کے سہارے کوئی میرے بارے میں اتنا کچھ معلوم کر سکتا ہے۔ مجھے تو تم سے خوف آنے لگا ہے۔ تم تو شرلاک ہومز کی بھتیجی معلوم ہوتی ہو۔" پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "لیکن مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ تم نے اتنی زحمت کیوں کی؟"

"کیا وجہ بتانا ضروری ہے؟"

"اگر تم نے وجہ نہ بتائی تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہو سکتا ہوں کہ تمہیں میری ذات سے دلچسپی تھی۔"

"دلچسپی تو تھی......" وہ کچھ سوچنے کے بعد محتاط سے لہجے میں بولی "میں تمہارے بارے میں تجسس میں مبتلا تھی۔ پہلے دن جب تم نے زرتاج نگر میں میرے ہاں گھوڑے سدھانے کی ذمے داری قبول کی' مجھے اسی وقت احساس ہو گیا تھا کہ تم وہ نہیں تھے جو اپنے آپ کو ظاہر کر رہے تھے پھر جب تم نے زرتاج نگر چھوڑنے سے کچھ پہلے اپنی کہانی سنائی تب بھی مجھے یہ احساس رہا کہ تم بہت کچھ چھپا رہے تھے۔ چنانچہ جب اتفاق سے میرا لاہور آنا ہوا تو میں نے سوچا تمہارے بارے میں بھی لگے ہاتھوں کچھ "تفتیش" کر لی جائے۔"

"اس کے بعد تمہارا کراچی آنا ہوا؟"

"ہاں... کیونکہ جس کی مجھے تلاش تھی اس کے بارے میں پتا چلا کہ شاید وہ کراچی میں موجود ہو۔" اس نے جواب دیا۔

"چلو اگر تم یہ نہیں بتانا چاہتیں کہ تمہیں کس کی تلاش ہے تو کم از کم یہی بتا دو کہ تمہیں اس کی تلاش کیوں ہے؟" میں نے اسے کُریدنے کی ایک اور کوشش کی۔

"فی الحال میں یہ بھی نہیں بتا سکتی۔"

"دل کا معاملہ ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"ہو بھی سکتا ہے۔" اس نے مبہم لہجے میں کہا۔ اس کا چہرہ سپاٹ نظر آنے لگا تھا اور اس کی آنکھوں سے بھی میں اس کے دل کا بھید پانے سے قاصر تھا۔

چند لمحے ہم دونوں خاموشی سے کافی کی چسکیاں لیتے رہے۔ آخر کار میں نے گہری سانس لے کر کہا "کسی عورت کے دل کا بھید پانا کتنا مشکل کام ہے۔"

"اس دنیا میں اور بھی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں پانا اس سے بھی زیادہ مشکل کام ہے۔" وہ ایک بار پھر مسکرائی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر سر ہلاتے ہوئے کہا "بے شک" دفعتاً مجھے کچھ یاد آیا۔ میں نے کافی کا مگ رکھتے ہوئے کہا "تمہیں معلوم ہے رحیم گل بھی آج کل کراچی میں ہے۔" میں نے اس کے چہرے پر کوئی تاثر تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن ایک بار پھر مجھے ناکامی ہوئی۔

"کون رحیم گل؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں گویا وہ ذہن پر زور دے رہی ہو۔

"وہی انسپکٹر جو زرتاج نگر میں مجھے ڈاکو سمجھ کر گرفتار کر آیا تھا۔" میں نے کہا۔

"اوہ.... اچھا... وہ!" اسے یاد آگیا "وہ یہاں کیسے پہنچ گیا؟"

"اس نے بڑی کوشش سے اپنا تبادلہ کرایا ہے۔" میں نے بتایا۔ "وہ اپنی زندگی میں تبدیلی لانا چاہتا تھا۔ اپنی صلاحیتیں شہری ماحول میں بروئے کار لانا چاہتا تھا۔ اس کی زندگی میں کچھ زیادہ ہی تبدیلی آگئی۔ ابھی اسے آئے زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن [illegible] خاصے سنگین معاملات میں اُلجھ گیا ہے۔ بازو بھی شدید زخمی کرا بیٹھا ہے۔ آج کل اپنے گھر میں بستر پر ہے۔ آرام کر رہا ہے۔"

"اوہ....!" زرتاج نے محض اتنا کہا۔ اس نے اس سلسلے [illegible] کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

"اتفاق سے اس کے اور میرے معاملات پھر ایک دوسرے میں اُلجھ گئے ہیں۔" میں نے کہا "آج بھی میرا اس سے ملنے بہت ضروری ہے۔ میں تھوڑی دیر بعد اس کی طرف جاؤں گا۔ [illegible] تمہیں کوئی مصروفیت نہ ہو اور تم مناسب سمجھو تو تم بھی میرے ساتھ چلو۔"

اس نے ایک لمحے سوچا پھر کندھے اُچکاتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے چلے چلوں گی۔" اس کے لہجے میں کسی خاص دلچسپی یا جوش و خروش کی جھلک نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد ہم نیچے آئے۔ پارکنگ لاٹ میں میری گاڑی کے لئے جگہ مخصوص تھی۔ میں نے اس کے لئے گاڑی کا دروازہ [illegible] اور وہ نہایت پُر وقار انداز میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ اس نے [illegible] اور خوب صورت ساخت کا دھوپ کا چشمہ لگا لیا تھا جو اس کے چہرے پر بہت ہی جچ رہا تھا۔

چند لمحے بعد جب گاڑی سڑک پر ہلکورے لے رہی تھی [illegible] نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کہا "یار زندہ... صحبت باقی محاورہ کتنا سچا ہے۔ انسان زندہ رہے تو واقعی کسی نہ کسی [illegible] ملاقات ہونے کا امکان باقی رہتا ہے۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کبھی ہم دونوں ایک ہی گاڑی میں اس شہر کی سڑکوں پر محو سفر ہوں گے۔"

وہ ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسکرا دی۔ وہ کسی گہری [illegible] میں تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنا طرزِ زندگی یکسر بدل لینے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔" اس نے گہری سانس لے کر جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میں چونکا۔

"میں نے کراچی شفٹ ہونے کا فیصلہ کر لیا ہے۔" اس نے بتایا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"آج کل تو حالات یہ ہیں کہ جن کی جڑ بنیاد گاؤں میں تھی وہ اپنے گاؤں کو واپس جا رہے ہیں اور جو کسی دوسرے شہر منتقل ہونا افورڈ کر سکتا تھا وہ منتقل ہو رہا ہے۔ یہاں بیشتر لوگ صرف وہی رہ گئے ہیں جو یہاں رہنے پر مجبور ہیں۔ ان کے سامنے کوئی اور راستہ نہیں۔ ان حالات میں تم اپنی جڑ بنیاد.... اپنی خوب صورت بستی... اپنا ماڈل گاؤں چھوڑ کر یہاں آنے کی بات کر رہی ہو۔ کوئی اور سُنے گا تو یہی سمجھے گا کہ تمہارا ذہنی توازن درست نہیں ہے۔"

"ہاں... ذہنی توازن تو میرا واقعی درست نہیں ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے تسلیم کیا۔

"خیر... میرے لئے یہ کوئی نئی خبر نہیں۔" میں نے کہا "تم ایک غیر معمولی لڑکی ہو اور اس دنیا میں جتنے بھی غیر معمولی لوگ پائے جاتے ہیں ان کا ذہنی توازن کسی نہ کسی حد تک ضرور بگڑا ہوتا ہے۔ غیر معمولی لوگ نارمل نہیں' ابنارمل ہوتے ہیں۔"

"خیر... مجھے بڑے بڑے لفظوں سے بہلانے کی کوشش مت کرو۔ پاگل پن بہرحال پاگل پن ہی ہوتا ہے۔ خواہ کسی بھی قسم کا ہو۔ میں برسوں سے زرتاج نگر کو ایک مثالی بستی بنانے کے لئے کوشاں ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کی ہر خوشی اس مقصد کے لئے تج دی تھی۔ میں اپنے آپ کو بھول گئی تھی۔ میرے خیال میں یہ بھی ایک طرح کا پاگل پن ہی تھا۔"

"تو کیا وہاں کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"نہیں۔ گڑبڑ تو نہیں ہوئی۔ سب کچھ اسی طرح ہے جس طرح [illegible] چھوڑ کر آئے تھے لیکن میرا یہ احساس شدید تر ہو گیا ہے کہ میری منزل بہت دور ہے اور میں تھک گئی ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ میں [illegible] اس منزل تک نہیں پہنچ سکوں گی۔" تھکن واقعی اس کے لہجے [illegible] بول رہی تھی۔

"یہ کوئی ایسی تشویش کی بات تو نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی۔ "ضروری تو نہیں ہوتا کہ بڑے بڑے مقاصد انسان کی زندگی [illegible] ہی پورے ہو جائیں۔ جو لوگ اپنے نصب العین سے مخلص [illegible] رہتے ہیں وہ اس بات کی پروا نہیں کرتے کہ ان کی منزل انہیں [illegible] زندگی میں ملتی ہے یا نہیں۔ وہ بس کام کئے جاتے ہیں اگر ان کا [illegible] ادھورا بھی رہ جائے تو وہ اسے اپنے بعد میں آنے والوں کے لئے چھوڑ جاتے ہیں۔"

"بعد میں آنے والے.....!" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی "میرے بعد کون آئے گا؟ میں کسی تنظیم یا سیاسی پارٹی کی سربراہ تو [illegible] ہوں کہ میرے بعد منتخب یا نامزد ہونے والے لوگ میرا کام [illegible] رکھیں گے۔"

"سربراہوں کو تو ہمارے ہاں زیادہ فکر ہوتی ہے کہ جو کچھ ہونا [illegible] ان کی زندگی میں ہی ہو جائے بلکہ ان سے تو زندگی بھر بھی انتظار [illegible] ہوتا۔ ان کی تو کوشش ہوتی ہے کہ جو کچھ ہونا ہے' آج ہی ہو جائے۔ ان کی جھولیاں جتنی بھرنی ہیں' آج ہی بھر جائیں۔ ان کے مشن کوئی تعمیری مشن تو ہوتے نہیں... کہ وہ صبر و سکون سے کام کریں اور اگر کام ادھورا رہ جائے تو اپنے بعد والوں کے لئے چھوڑ جائیں۔ ان کا مسئلہ تو لوٹ مار اور چھینا جھپٹی کا ہوتا ہے۔ اس لئے انہیں بہت جلدی ہوتی ہے۔ تمہارا معاملہ تو بہت مختلف ہے۔ تمہیں کاہے کی جلدی ہے؟"

"مجھے جلدی نہیں۔" وہ تحمل سے مجھے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ "میں تھک گئی ہوں۔ میری ہمت جواب دے گئی ہے۔ اتنے بڑے علاقے کا نظام مجھ سے اکیلے نہیں سنبھالا جاتا اور پھر جس طرح میں اپنے علاقے کا نظام چلانا چاہتی ہوں اس سے میرا کام اور مشکل ہو جاتا ہے۔"

"تم شادی کر لو۔" میں نے گہری سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

"کس سے؟" اس نے مجھ سے بھی زیادہ سنجیدگی سے دریافت کیا۔

"ہاں.. یہ مسئلہ ذرا غور طلب ہے۔" میں نے ایک ہاتھ سے اسٹیئرنگ سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے سر کھجایا "تم جیسی غیر معمولی لڑکیوں کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے لئے مرد بھی غیر معمولی ہونا چاہئے اور غیر معمولی مرد دنیا میں بہت کم پائے جاتے ہیں۔"

"یوں تو دنیا میں غیر معمولی لڑکیاں بھی بہت کم پائی جاتی ہیں۔" وہ مسکرائی "لیکن شاید ان غیر معمولی لڑکیوں کی ان غیر معمولی مردوں سے ملاقات نہیں ہو پاتی۔ یا اگر حُسنِ اتفاق سے ملاقات ہو بھی جاتی ہے تو ان کی زندگی کے راستے جدا جدا ہوتے ہیں۔ یوں وہ بے چاریاں معمولی مردوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہیں۔"

"ہاں.... شاید.... ایسا تو ہوتا ہے۔" مجھے قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ تسلیم کرنا پڑا۔

"میں نہیں چاہتی کہ میرے ساتھ ایسا ہو۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"پھر بھی تمہیں اپنا کوئی وارث چھوڑنے کے لئے شادی تو کرنا ہی پڑے گی۔" میں نے چھیڑنے کے سے انداز میں کہا۔

"احمق آدمی! ہمارے ہاں نسل عورت سے نہیں' مرد سے چلتی ہے۔ میں نے اگر شادی کر بھی لی تو میرے بچے' میرے نہیں میرے شوہر کے وارث ہوں گے۔" وہ بولی۔

"ہاں یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔" میں نے ایک بار پھر سر کھجایا۔

"میری تو سمجھ میں نہیں آتا میری اتنی بڑی جاگیر' حویلی' دولت اور دوسرے اثاثوں کا مصرف کیا ہوگا۔ میں اکثر یہی سوچتی ہوں کہ مرنے سے پہلے کوئی ٹرسٹ قائم کرجاؤں گی جو دیہاتیوں کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرے۔ دیہاتوں میں زیادہ تر لوگ بڑی قابلِ رحم زندگی گزار رہے ہیں۔"

"غریب اور نادار ہر جگہ ہی بڑی قابلِ رحم زندگی گزار رہے ہیں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہرحال تم نے شہر منتقل ہونے کا فیصلہ کرلیا ہے؟"

"ہاں' میرے منیجر نے یہاں ڈیفنس میں ایک بنگلے کا بیعانہ بھی دے دیا ہے۔ میں اب دراصل اسی ڈیل کو فائنل کرنے آئی ہوں۔ کراچی مجھے اپنی زمینوں سے قریب پڑتا ہے اس لئے میں یہاں رہنے کو ترجیح دوں گی لیکن یہ بھی ممکن ہے میں ایک کوٹھی لاہور میں لے لوں۔ ہوسکتا ہے تمہاری ہی طرح میرا قیام بھی کبھی کراچی اور کبھی لاہور میں ہوا کرے۔" اس نے بتایا۔

"گویا تم دیہاتی زندگی کو خیرباد کہہ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"خیرباد تو نہیں کہہ رہی۔" وہ بولی "میں دیہاتی زندگی سے اپنا تعلق محدود کررہی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اپنے آئیڈیلز بھی محدود کررہی ہوں۔ آئیڈیلسٹ انسان زندگی میں بڑے دکھ اٹھاتا ہے۔ مجھے معلوم ہوگیا ہے کہ میں دنیا کو جس طرح دیکھنا چاہتی ہوں' دنیا اس طرح نہیں ہوسکتی۔ میں اب اپنی زندگی کو اپنے لئے ذرا آسان بنانا چاہتی ہوں۔"

"یہ کہنا ذرا مشکل ہی ہوتا ہے کہ انسان کون سے عمل سے اپنی زندگی کو آسان بنارہا ہے اور کون سے عمل سے مشکل.... بہرحال زندگی تمہاری اپنی ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں فیصلوں کا اختیار ہے۔ میرے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے کہ تم کراچی اور لاہور' دونوں شہروں میں پائی جاؤ گی۔ اس طرح کم از کم مجھے تو تم سے میل ملاقات بڑھانے کا موقع ملے گا۔"

"کیا تمہیں واقعی اس سے خوشی ہوگی؟" اس نے گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ میں نے محسوس کیا کہ تاریک شیشوں کے عقب سے اس کی نظریں میری آنکھوں کی گہرائیوں میں کچھ تلاش کررہی تھیں۔ ایک لمحے کے لئے میرا دھیان ٹریفک سے ہٹ گیا۔

اچانک اس کا مرمریں ہاتھ اسٹیئرنگ پر آن ٹکا اور اس نے مرسیڈیز کو خفیف سا لہرا دیا تب مجھے احساس ہوا کہ ہمارے آگے ایک گاڑی نے اچانک بریک لگادی تھی۔ زرتاج بھی گو کہ میری طرف دیکھ رہی تھی اس کے باوجود اسے سامنے گاڑی رُکنے کا احساس ہوگیا تھا اور اس نے بروقت اسٹیئرنگ وہیل کو خفیف سی حرکت دے کر دونوں گاڑیوں کو حادثے سے بچالیا تھا ورنہ شاید میری جہازی سائز کی مرسیڈیز اس ننھی سی سوزوکی پر چڑھ دوڑی ہوتی۔

"ہاں مجھے خوشی ہوگی۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا۔

اس نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا اور بولی "اس سوال کا جواب دینے کے لئے تمہیں ٹریفک سے بے نیاز ہونے کی ضرورت نہیں تھی ورنہ عین ممکن تھا کہ جو سوال تم سے یہاں کیا گیا تھا اس کا جواب تم عالمِ بالا پر پہنچ کر دیتے۔"

"فی الحال ہم عالمِ بالا پر تو نہیں البتہ رحیم گُل کے گھر پہنچ گئے ہیں۔ ویسے اس کا اپارٹمنٹ بھی تقریباً عالمِ بالا پر ہی واقع ہے۔" میں نے کہا۔

وہ متجسس نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لے رہی تھی۔ گاڑی سے اُتر کر اس نے سر اُٹھا کر عمارت کے ٹاپ فلور کی طرف دیکھا اور بولی "میری طرح اس رحیم گل کا بھی کوئی پُرزہ گرا ہوا ہے۔ یہ بھی آئیڈیلسٹ معلوم ہوتا ہے۔ جب گاؤں میں تھا تو عجیب عجیب باتیں کرتا تھا۔ عجیب عجیب خواب دیکھتا تھا۔ شاید اس کے بھی خواب ٹوٹ گئے ہیں اس لئے شہر چلا آیا۔"

"نہیں' وہ اب بھی خوابوں کی دنیا کا آدمی ہے۔ البتہ مجھے اندیشہ ہے کہ گاؤں میں اگر اس کے کچھ خواب ٹوٹنے سے بچ گئے تھے تو وہ شہر آکر ٹوٹ جائیں گے۔" میں نے عمارت کی لابی کی طرف اس کی رہنمائی کرتے ہوئے کہا "لیکن اس میں تشویش یا پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ میں .... تم رحیم گُل.... اور میرے چند ساتھی... ہم سب خوابوں کی دنیا کے آدمی ہیں اگر ہمارے خواب ٹوٹ بھی جائیں تب بھی ہمیں زیادہ شکستہ دل نہیں ہونا چاہئے اور ان خوابوں کی کرچیاں جوڑ کر زندگی کا سفر جاری رکھنا چاہئے اگر ہم جیسے لوگ ہمت ہار کر بیٹھتے رہے تو باقی لوگوں کے لئے زندگی اور بھی زیادہ دشوار ہوجائے گی جبکہ ان کی زندگی پہلے ہی کچھ کم دشوار نہیں ہے۔"

وہ پُرخیال انداز میں خاموش رہی اور ہم لفٹ کے ذریعے اوپر آن پہنچے۔ میں نے اس سے کہا "تم یہیں راہداری میں رُکو۔ میں رحیم گل کو سرپرائز دینے کی کوشش کرتا ہوں۔"

وہ کچھ اس طرح مربیانہ انداز میں مسکرائی جیسے کوئی بزرگ کسی بچے کا دل رکھنے کے لئے اس کی بات مان رہا ہو۔ وہ دیوار سے لگ کر کھڑی ہوگئی۔ میری کال بیل کے جواب میں ملازم نے دروازہ کھولا تو میں اندر چلا گیا۔

رحیم گُل بالکل اسی طرح بیڈ پر دراز تھا جس طرح میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے میرے جانے کے بعد اپنی جگہ سے حرکت ہی نہیں کی تھی لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کا لباس بدلا ہوا تھا اور وہ پہلے کی نسبت زیادہ صاف ستھرا اور تازہ دم نظر آرہا تھا۔

"کوئی خاص خبر لائے ہو؟" وہ بغور میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔

"خبر تو نہیں... میں ایک جیتے جاگتے انسان کو ساتھ لایا ہوں اگر تم بوجھ لو کہ وہ کون ہے تو میں تمہیں دس ہزار روپے انعام دوں گا۔" میں نے اس کے بیڈ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے چہرے پر تجسس یا اشتیاق کی کوئی علامت نمودار نہیں ہوئی۔ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ہم جیسوں کے گھر تو اب زیادہ تر مجرم' بدمعاش اور دہشت گرد ہی آتے ہیں۔ کہیں تم کسی کلاشنکوف بردار کو تو باہر کھڑا کرکے نہیں آئے ہو؟"

"جب میں اندر آیا کم از کم اس وقت تو اس کے ہاتھوں میں کلاشنکوف نہیں تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"بس تو پھر بچوں کی طرح پہیلیاں مت بُجھواؤ اور اسے اندر لے آؤ۔ اس وقت اس قسم کے شغل میلے مجھے اچھے نہیں لگ رہے۔ بازو میں بڑی تکلیف ہورہی ہے۔ کچھ دیر پہلے ہی ڈاکٹر آکر انجکشن لگا کر گیا ہے۔"

"بڑے افسوس کی بات ہے یار! صرف ایک بازو زخمی ہونے سے تمہاری تو زندہ دلی ہی رخصت ہوگئی۔ شیر بنو... شیر' آخر تم ایک ولیس آفیسر ہو۔ اور وہ بھی دیانت دار' فرض شناس قسم کے پولیس فیسر۔ ابھی تو تمہیں نہ جانے کتنی تکلیفیں اور اُٹھانی پڑیں۔"

"میرا بازو محض زخمی نہیں ہوا۔ الگ ہوتے ہوتے بچا ہے۔" وہ پٹیوں میں لپٹے بازو کو ایک نظر دیکھتے ہوئے بولا "میری جگہ ئی اور ہوتا تو اس وقت اسپتال میں لیٹا ہوتا۔ اگر میں تکلیفیں ھانے کے لئے تیار نہ ہوتا تو پولیس میں کیوں آتا؟ زمینداری رتا۔ ہم خاندانی زمیندار ہیں۔ یا پھر اب نئی نسل نے تھوڑا بہت نس شروع کیا ہے' جہاں تک زندہ دلی رخصت ہونے کا سوال ہے میں پہلے بھی کچھ زیادہ زندہ دل آدمی نہیں تھا۔ میں ایک سنجیدہ ی ہوں۔" اس نے نہایت ٹھہرے لہجے میں تمام باتوں کا اب دیا۔

"اچھا... بھائی سنجیدہ صاحب! آپ سنجیدگی سے بھی میرے ال کا جواب دے سکتے ہیں' میرا دل رکھنے کے لئے بھی بتاسکتے ہیں باہر کون آیا ہے۔" میں نے اصرار کیا۔

"بھئی میں اس وقت کسوٹی کسوٹی کھیلنے کے موڈ میں نہیں ہے۔" وہ اپنے انکار پر قائم تھا پھر وہ بستر سے اُٹھنے کی کوشش تے ہوئے بولا "میں خود ہی جاکر دیکھ لیتا ہوں کہ کون آیا ہے پاکے "اعزاز" میں تم اتنا سسپنس پیدا کرنے کی کوشش کررہے "

"ایسا نہیں ہوگا بھئی!" میں نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا "تم تو بالکل ہی بدذوق آدمی ہو۔ کم از کم اپنی ہار ہی مان لو اور کچھ جرمانہ اپنے اوپر ڈال لو۔ جس طرح میں نے تمہارے جیتنے پر دس ہزار کا انعام رکھا تھا۔"

"ہاں.. یہ ٹھیک ہے اس کے لئے میں تیار ہوں۔ میں اپنی ہار مانتا ہوں تم مجھ پر جو جرمانہ ڈالنا چاہو ڈال دو۔" وہ نہایت آسانی سے مان گیا۔

"چونکہ تم نے آسانی سے ہار مان لی ہے اس لئے میں تم پر ہاتھ ہلکا رکھتے ہوئے جرمانہ ڈال رہا ہوں۔ کسی اچھے سے ہوٹل میں صرف ایک شاندار سا ڈنر۔" میں نے کہا۔

"اچھا سا ہوٹل تو شہر میں تمہارا ہی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا تم کس طرح لوگوں کو گھیر گھیر کر وہاں لے جاتے ہو۔" بہت دیر بعد اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

"واقعی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر میں اس طرح نہ کروں تو ہوٹل کس طرح چلے۔" پھر میں دروازے پر واپس آیا اور باہر جھانک کر زرتاج کو پکارا "آجاؤ ڈنر پکا ہوگیا ہے۔"

زرتاج پُروقار انداز میں قدم اُٹھاتی اندر آگئی۔ جب وہ رحیم گُل کے کمرے میں پہنچی تب بھی اس کے چہرے پر کوئی خاص تاثر نہیں تھا لیکن میں نے محسوس کیا رحیم گُل اسے دیکھ کر گویا دم بخود رہ گیا تھا۔ وہ ایک ٹک اسے دیکھے جارہا تھا۔ اسے شاید اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ زرتاج مسکرا رہی تھی مگر اس کے انداز پر کسی قدر مضطرب بھی نظر آرہی تھی۔

آخر زرتاج نے ہی سکوت توڑا "کیا بات ہے۔ میرا شہر آنا سب کے لئے ہی بڑی حیرت کا باعث بن رہا ہے۔ دیکھتے ہی ہر ایک کی سٹی گُم ہوجاتی ہے' کوئی بیٹھنے کو بھی نہیں پوچھتا۔"

"نہیں.... نہیں یہ بات نہیں ہے۔" رحیم گُل گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آتے ہوئے چونک کر بولا "آپ تشریف رکھئے۔ پلیز تشریف رکھئے۔"

زرتاج اپنے مخصوص شاہانہ انداز میں بیٹھ چکی تو رحیم گُل بولا "دراصل مجھے اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اتفاقات بعض اوقات اتنے حسین ہوتے ہیں کہ انسان کو وہ اپنی نظر کا دھوکا لگتے ہیں۔ پہلے افضل سے ملاقات ہوئی۔ وہ بھی ایک خوب صورت اتفاق تھا لیکن یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اسی افضل کے ساتھ ایک روز آپ بھی میرے گھر میں تشریف لارہی ہوں گی۔"

"بھئی اتنے پُرتکلف انداز میں گفتگو مت کرو۔ تم تو پولیس آفیسر کے بجائے کسی مشاعرے کے منتظم معلوم ہورہے ہو۔ اتنے تکلف پر تو میں اپنے آپ کو کسی بھاری بوجھ تلے دبا محسوس کررہی ہوں۔" زرتاج مسکراتے ہوئے بولی۔

"آہ.... !" رحیم گُل نے ایک طویل اور ٹھنڈی سانس لی "میری بدقسمتی ہے جو آپ بھی اسی تاثر کا شکار ہیں کہ کوئی پولیس

والا مہذبانہ اور شریفانہ انداز میں گفتگو ہی نہیں کر سکتا۔"

"میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" زرتاج دھیمے لہجے میں بولی "خیر ان باتوں کو چھوڑو۔ یہ بتاؤ تم کراچی کیسے پہنچ گئے؟"

"سچ جاننا چاہتی ہیں؟" رحیم گل نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

"ظاہر ہے مجھے جھوٹ سُننے کا تو اتنا شوق نہیں ہے۔" زرتاج نے جواب دیا۔

"میں کسی کی وجہ سے کراچی آیا ہوں۔" رحیم گل نے گویا سینے پر رکھا ہوا کوئی بھاری بوجھ اُتارتے ہوئے کہا۔

اس موقع پر میں نے بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لی اور بولے بغیر نہ رہ سکا "تم بھی کسی کے لئے کراچی آئے ہو۔ زرتاج بھی کسی کے لئے آئی ہیں۔ ایک میں ہی اُلو کا چرخا ہوں جو یہاں کسی کے لئے نہیں آیا۔ معلوم نہیں میں کیوں یہاں آگیا ہوں۔ مجھے تو واپس چلے جانا چاہئے۔"

وہ دونوں اتنے سنجیدہ تھے کہ انہوں نے شاید میری بات سُنی ہی نہیں۔ وہ بغور ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے اور شاید دل ہی دل میں ایک دوسرے کی پہیلی بوجھنے کی کوشش کررہے تھے۔ کمرے میں بوجھل سکوت چھا گیا تھا۔

رحیم گل نے یہ سکوت توڑا اور بدستور زرتاج کی طرف دیکھتے ہوئے کچھ بے یقینی سے کہا "کیا واقعی آپ بھی کسی کے لئے آئی ہیں؟"

زرتاج نے جواب دینے کے بجائے میری طرف دیکھا۔ اس کی نظروں میں ایک خاموش شکوہ تھا کہ میں نے یہ بات رحیم گل کے سامنے کیوں کی تھی؟ وہ اپنی ذاتیات کو دوسروں کے سامنے موضوعِ گفتگو بنانے کی عادی نہیں تھی۔

میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے معذرت کی اور شور مچانے کے سے انداز میں موضوع بدلنے کی کوشش کی "رحیم گل! زیادہ بیوداس بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں تمہارے گھر اتنا اہم مہمان لے کر آیا ہوں اور تم خاطر مدارات کا بھی کوئی بندوبست نہیں کررہے۔"

"دراصل میں زرتاج صاحبہ کو دیکھ کر اتنا بوکھلا گیا ہوں کہ میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا مجھے کیا کرنا چاہئے۔" رحیم گل نے اعتراف کیا۔

"تم اور کچھ کرو یا نہ کرو لیکن تمہیں حقِ میزبانی ضرور ادا کرنا چاہئے۔" میں نے کہا۔

رحیم گل زرتاج سے مخاطب ہوا "یہ بڑا ہی پیٹو آدمی ہے۔ ہر وقت کھانے پینے کی فکر میں رہتا ہے لیکن اس لحاظ سے یہ بہت کمیاب پیٹوؤں میں سے ہے کہ اس کی توند نہیں ہے۔"

"مجھے پیٹو کہہ کر ایک خوب صورت خاتون کے سامنے میرا امیج خراب کرنے کی کوشش مت کرو۔ تمہیں شاید معلوم نہیں ہے میں صحرائی اونٹ کی طرح کچھ کھائے پیئے بغیر بھی دو تین دن گزار سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے تم بڑی پیچیدہ قسم کی چیز ہو۔" رحیم گل نے سرہلایا اور اپنے ملازم کو آواز دی جو خانساماں کے فرائض بھی انجام دیتا تھا۔ زرتاج اسے باز رکھنے کی کوشش کرتی رہی لیکن اس نے ملازم کو کچھ اہتمام کرنے کی ہدایات دے ہی دیں۔

پھر اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ رحیم گل ابھی تک زرتاج کی آمد پر سحرزدہ سا تھا تاہم وہ زرتاج سے اس کے مستقبل کے ارادوں کے بارے میں مسلسل سوالات کرتا رہا۔ آخرکار زرتاج نے اسے بتا ہی دیا کہ وہ کراچی شفٹ ہونے کا پروگرام بنا رہی ہے اور اس کے منیجر نے ڈیفنس میں ایک بنگلے کا بیعانہ دے دیا ہے۔

رحیم گل جیسے یہی سُننا چاہ رہا تھا۔ اس خبر سے گویا اسے قرار سا آگیا۔ میں اس کی کیفیت سے محظوظ ہورہا تھا۔ اس کے اندر ضرور کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ اب وہ اپنے بازو کی تکلیف بھی بھولا ہوا تھا۔

ملازم نے چائے اور لوازمات وغیرہ کا انتظام کرلیا تو ہم اُٹھ کر ڈائننگ روم میں آبیٹھے۔ تب میں نے رحیم گل سے کہا "اگر تم دلچسپی محسوس کرو تو میں تمہیں نادر عرف نوزی کے بارے میں بھی کچھ بتادوں؟"

اس کے تاثرات یکدم بدل گئے اور وہ مجھے گھورتے ہوئے سرد لہجے میں بولا "کیا وہ خبیث پھر کچھ کرگیا؟"

"اس بار اس نے ایک نہایت ہی نیک کام کیا۔" میں نے کہا۔

"نیک کام؟" اس کی آنکھیں سُکڑ گئیں "وہ کیا؟"

"یہی کہ وہ میرے ہاتھوں کلاشنکوف کا برسٹ کھا کر مرگیا۔" میں نے جواب دیا۔

رحیم گل کو حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ بے خیالی میں اس نے بیک وقت دونوں بازوؤں کو حرکت دینے کی کوشش کی اور کراہ کررہ گیا "کیا واقعی نوزی مرگیا ہے؟" اس نے بے یقینی سے پوچھا "وہ تمہیں کہاں ملا؟"

"قاسم بجلی کے جزیرے پر۔" میں نے جواب دیا "وہاں خاصا زوردار معرکہ رہا۔"

میں نے اسے وہ تمام واقعہ سُنایا جو جزیرے پر میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ وہ بڑے انہماک سے سُنتا رہا۔ زرتاج کو سیاق و سباق کا علم نہیں تھا لیکن وہ بھی توجہ سے سب کچھ سُنتی رہی۔

میں خاموش ہوا تو رحیم گل افسوس سے سرہلاتے ہوئے بولا "یہ بہت بُرا ہوا۔"

"یعنی میں زندہ بچ کر آگیا۔ یہ بہت بُرا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں تھا۔" رحیم گل کا سر ایک بار افسوس زدہ سے انداز میں ہلنے لگا "میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ نوزی زندہ ہمارے ہاتھ آتا تو بہتر تھا۔"

"اگر میں اسے زندہ پکڑنے کی کوشش کرتا تو شاید میں مُردہ حالت میں بھی تمہارے "ہاتھ" نہ آتا۔" میں نے کہا "ویسے بائے داوے.... تمہیں اس کی زندگی کیوں عزیز ہوگئی؟ تمہیں اُمید تھی کہ وہ "سنسنی خیز انکشافات" کرے گا اور تمہیں کسی میڈل وغیرہ سے نوازا جائے گا؟"

"میڈل وغیرہ کی کس کمبخت کو فکر ہے۔" وہ جل کر بولا "تمہیں شاید یاد نہیں ہے کہ مشتاق مدثر کی... یعنی ایک صحافی کی موت میرے گلے پڑی ہوئی ہے۔ وہ میری تحویل میں مارا گیا تھا۔ نوزی نے اسے قتل کیا تھا۔ اب اگر وہ زندہ ہاتھ آجاتا تو میں اسے پریس کے سامنے پیش کرسکتا تھا اور کہہ سکتا تھا "لیجئے حضرات! یہ ہے مشتاق مدثر کا قاتل" لیکن اب کون میری بات کا یقین کرے گا؟ ایک مُردہ شخص کو میں کیسے مشتاق کا قاتل ثابت کروں گا؟ ایک تو میرے محکمے کی شہرت اتنی خراب ہے کہ ہم گلا پھاڑ پھاڑ کر سچ بھی بولتے رہیں تب بھی کوئی یقین نہیں کرتا۔ لوگ تو ویسے ہی کہتے رہتے ہیں کہ ہم پولیس مقابلوں میں مرنے والوں پر جو الزام چاہیں ڈال دیتے ہیں۔ جو کیس بھی ہم سے حل نہیں ہوتا وہ ان کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ اوّل تو پولیس مقابلوں ہی کو کوئی درست تسلیم نہیں کرتا۔ یہ تو ویسے بھی ایک صحافی کا معاملہ ہے۔"

"جزیرے پر جو کچھ ہوا یہ پولیس مقابلہ قسم کی چیز نہیں تھی۔ نوزی میرے ہاتھوں مرا ہے۔ میرا پولیس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خفیہ اداروں کے لوگ وہاں موجود تھے اور میرا خیال ہے یہ واقعہ پریس میں رپورٹ نہیں ہوگا کیونکہ اس کی جڑیں ڈرگ مافیا کے ساتھ جاکر ملتی ہیں اور ڈرگ مافیا کے سلسلے میں جو کچھ یہاں ہورہا ہے، حکومت زیادہ تر اسے خفیہ ہی رکھ رہی ہے۔" میں نے بتایا۔

وہ خاموشی سے مجھے گھورتا رہا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ویسے بھی مشتاق مدثر کی موت پر پریس کا ردِعمل میری توقع کے عین مطابق ہوا ہے۔ مجھے لگتا ہے پریس والوں نے تو خود اس سے جان چھوٹنے پر خدا کا شکر ادا کیا ہے۔ خود اس کے اپنے اخبار نے کچھ زیادہ شور نہیں مچایا۔ میرا اندازہ ہے کہ اس اخبار کا اپنا دامن بھی شاید کچھ زیادہ صاف نہ ہو۔ جو اخبار مشتاق مدثر جیسے لوگوں کو اہم پوسٹوں پر رکھتے ہیں وہ خود بھی کچھ ایسا صاف ستھرا ریکارڈ نہیں رکھتے۔ اس کے اخبار نے شاید اسی لئے زیادہ شور نہ مچایا ہو کہ کہیں خود اس کے اپنے بارے میں کچھ حقائق سامنے نہ آجائیں۔ بہرحال تمہیں اس سلسلے میں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

رحیم گُل ایک طویل سانس لے کر بولا "تم کہتے ہو تو میں بے فکر ہوجاتا ہوں۔" وہ ایک بار پھر زرتاج کی طرف متوجہ ہوگیا اور اس کی آنکھیں ایک بار پھر خواب ناک سی ہونے لگیں۔

بہت دیر تک گپ شپ جاری رہی۔ چائے وغیرہ کا دور چلتا رہا۔ گاؤں کی باتیں اور ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ تاہم زرتاج کے ہنسی مذاق میں بھی ایک قسم کی متانت تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ رحیم گل کے سامنے وہ زیادہ کھل نہیں رہی تھی۔ رحیم گل خوب چہک رہا تھا۔ وہ اپنے بازو کی تکلیف، اپنے مسائل، اپنے فرائض کے سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات وغیرہ سب کچھ بھول گیا تھا۔

آخر ہم نے اس سے اجازت طلب کی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم جائیں۔ مسکین سی شکل بنا کر بولا "کچھ دیر تو اور بیٹھو یار! رات کا کھانا کھا کر چلے جانا۔ میں زخمی ہوں، بیمار ہوں۔ کچھ دیر میری عیادت تو کرو۔"

"اب تک ہم اور کیا کررہے تھے؟" میں نے اسے گھورا "ہمیں دنیا میں اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

"تم اپنے ساتھ زرتاج کو کیوں شامل کررہے ہو؟ تمہیں بہت سے کام ہوتے ہوں گے لیکن ضروری نہیں کہ زرتاج کو بھی اتنی مصروفیت ہو۔" رحیم گل نے پُرامید سی نظروں سے زرتاج کی طرف دیکھا۔

"میں تو افضل سے بھی زیادہ مصروف ہوں۔" زرتاج اپنے مخصوص دھیمے انداز میں مسکرائی "میں یہاں منتقل ہورہی ہوں۔ ایک ایسی جگہ سے منتقل ہورہی ہوں جہاں میری جڑیں تھیں۔ جہاں میں پیدا ہوئی اور پلی بڑھی۔ اب مجھے یہاں اپنی رہائش کے تمام انتظامات کرنے ہیں۔ تم شاید میری مصروفیات کا اندازہ نہیں کرسکتے۔"

"جب انسان کے پاس دولت موجود ہو تو رہائش کی منتقلی بھلا کون سا مشکل کام ہے۔" رحیم گل بے پروائی سے بولا "اور پھر یہاں میں اور افضل موجود ہیں۔ ہمیں حکم کریں ہم تمام انتظامات کردیتے ہیں۔ گویا آپ کو ہاتھ بھی نہیں ہلانا پڑے گا اور سب کچھ ہوجائے گا۔ آپ آکر آراستہ و پیراستہ بنگلے میں بیٹھ جایئے گا۔"

"بہت شکریہ۔ اگر ضرورت پڑی تو میں آپ لوگوں کو زحمت دوں گی۔" زرتاج بولی "ویسے انسان کے رہنے کے لئے مسئلہ صرف آراستہ و پیراستہ بنگلے ہی کا نہیں ہوتا اور بھی بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔"

"میرے کہنے کا مقصد یہی ہے کہ کوئی بھی مسئلہ ہو۔ کسی بھی قسم کا مسئلہ ہو ہمیں حکم کریں اور یہ بدمعاش افضل چوہدری تو مجھ سے بھی زیادہ کام کا آدمی ہے۔" اس نے مصنوعی رقابت سے میری طرف دیکھا۔

"مجھے معلوم ہوچکا ہے۔" زرتاج بدستور مسکرا رہی تھی۔

بہ مشکل رحیم گل نے ہماری جان چھوڑی۔ ہم جب نیچے آکر گاڑی میں بیٹھ کر اس عمارت سے نکل چکے تو زرتاج نے سیٹ کے پشتے سے ٹیک لگا کر ایک طویل سانس لی گویا اس کے سر سے کوئی بھاری بوجھ اُتر گیا ہو۔

مزید ایک لمحے تک وہ خاموش ہی رہی تو میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر کہا ”اس طویل سانس کے پیچھے کچھ الفاظ کا گلا گھٹ کر رہ گیا ہے۔ تم شاید کچھ کہنا چاہتی تھیں۔“

وہ بے ساختہ ہنسی۔ یہ ہنسی اُس ہنسی سے بہت مختلف تھی جو میں نے رحیم گل کے اپارٹمنٹ میں سُنی تھی۔ ہنسی تھمی تو وہ بولی ”تم بہت خبیث ہو۔“

”تعریف کا شکریہ۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا ”لیکن اصل بات گول کرنے کی کوشش مت کرو۔“

”وہ دراصل...“ وہ قدرے ہچکچاہٹ کے ساتھ بولی ”میں نے محسوس کیا ہے کہ رحیم گل میری ذات میں دلچسپی لینے لگا ہے۔“

”دلچسپی......؟“ اب میرے ہنسنے کی باری تھی ”اتنی انکساری کی کیا ضرورت ہے۔ یوں کہو کہ وہ چاروں ہاتھ پیر سے تم پر عاشق ہو چکا ہے۔“

”تم اس سے بھی زیادہ خبیث ہو جتنا میں سمجھی تھی۔“ وہ درمیانے طبقے کی نوعمر اسکول گرل کی طرح جھینپ سی گئی اور مجھے اس کے رخساروں کی سُرخی بڑھتے دیکھنا بہت ہی عجیب لگا۔ یہ بظاہر بڑا سرسری، بڑا معمولی لیکن دل کو گدگدانے والا تجربہ تھا۔

پھر وہ گویا خود پر قابو پاتے ہوئے بولی ”یہ اچانک عشق کہاں سے برآمد ہو گیا؟ زرتاج نگر میں اس سے دو چار ملاقاتیں رہی ہیں لیکن وہاں تو یہ بڑا مؤدب ہو کر آتا تھا۔ میں بھی ہمیشہ اس کے سامنے ریزرو ہی رہی۔ میں نے کبھی اپنے رویّے سے اس کی معمولی سی بھی ہمت افزائی نہیں کی۔“

”صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے ملائمت سے کہا ”ہمت افزائی کی بھی ہوتی تو یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ زندگی تمہاری اپنی ہے اور زندگی کے کچھ تقاضے ہیں۔“

”میں صفائی پیش نہیں کر رہی۔ تم میرے بزرگ نہیں ہو کہ میں صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس کرتی۔“ وہ تیزی سے بولی ”بلکہ بزرگ ہوتے تب بھی شاید میں صفائی پیش کرنے کی ضرورت محسوس نہ کرتی۔ میرے مزاج میں سرکشی کی حد تک خود مختاری ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ میں نے کہا۔

”پھر تمہیں ایسی بات کرنی ہی نہیں چاہئے تھی۔“ اس کے لہجے میں اب بھی خفیف سی برہمی تھی۔

”آئی ایم سوری۔ میں نے سوچا شاید......“ میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”میں تو صرف حیرت کا اظہار کر رہی ہوں۔ آخر رحیم گل کو کیا ہو گیا ہے؟“ وہ دھیمی پڑتے ہوئے بولی ”عشق یوں اچانک تو نہیں ہو جاتا!؟“

”ہو سکتا ہے عشق پہلے سے موجود رہا ہو لیکن اس کا اظہار آج اچانک ہوا ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”بہرحال آج اس کا رویّہ... اس کا انداز... اس کے تاثرات میرے لئے حیران کن... بلکہ کسی حد تک پریشان کن تھے۔“ وہ بولی۔

”اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟“ میں نے سست رفتاری سے ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے کہا ”لگتا ہے قدرت نے میرے مشورے پر عمل درآمد کا فوری بندوبست کر دیا ہے۔ میں ہوٹل میں تم سے یہی تو کہہ رہا تھا کہ شادی کر لو... اور تم پوچھ رہی تھیں کس سے؟ یوں سمجھو غیب سے تمہارے سوال کا جواب مل گیا ہے۔ بہترین امیدوار حاضر ہے۔ رحیم گل خوبرو نوجوان ہے۔ عہدہ زیادہ بڑا نہ سہی لیکن کام کے محکمے میں ہے اور اس کا مستقبل روشن نظر آتا ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ اپنی دیانتداری اور ضدی پن کے باوجود اس محکمے میں بھی ترقی کر جائے گا۔ فیملی بیک گراؤنڈ بھی اچھا ہے۔ تعلیم یافتہ بھی ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے یہ رشتہ تمہارے لئے آسمان سے اترا ہے۔“

”تم نے کیا کوئی شادی دفتر کھول لیا ہے؟“ اس نے مجھے گھورا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لی ”نیکی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا کسی کو منزل کا راستہ دکھاؤ تو وہ بے عزتی کرنے لگتا ہے۔“

”تم سے کس نے کہہ دیا کہ رحیم گل جیسے کسی نوجوان سے شادی کرنا میری منزل ہے؟“

”آخر اس میں حرج بھی کیا ہے؟“ میں نے کہا ”تم مجھے چند وجوہات بتا دو جن کی بنا پر رحیم گل سے شادی نہیں کی جا سکتی۔“

”اس کے لئے ایک ہی وجہ کافی ہے۔“ وہ گہری سنجیدگی سے بولی ”اور وہ یہ کہ مجھے رحیم گل سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”ضروری نہیں ہے کہ جس سے دلچسپی ہو اس سے شادی کی جائے۔ یا جس سے شادی کی جائے اس میں دلچسپی بھی لی جائے۔ شادی ایک الگ مسئلہ ہے۔ سماجی ضرورت ہے۔ ممکن ہے تمہیں شادی کے بعد رحیم گل سے دلچسپی ہو جائے۔“ میں نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔

”بکواس مت کرو اور زیادہ بقراط بننے کی کوشش بھی مت کرو۔“ اس نے مجھے ڈانٹ پلائی۔ اس کا انداز اب قطعی دوستانہ ہو گیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے زندگی میں شاید ہی کبھی کسی سے اس طرح دوستانہ انداز میں بات کی ہو۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو لڑکیوں سے بھی اس حد تک بے تکلف نہیں ہوتیں۔ میں اس میں کچھ تبدیلی محسوس کر رہا تھا جو میرے لئے خوشگوار بھی تھی اور حیرت کا باعث بھی۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی ”تم نے میرے اندازِ تکلم کا بُرا تو نہیں منایا؟“

”نہیں۔ مجھے خوشی ہوئی ہے۔ اب تم سے گفتگو میں سہولت رہے گی۔“ میں نے کہا۔

"لیکن خدا کے لئے میری شادی کے موضوع پر گفتگو بند کردو۔ اس باب کو یہیں بند کردو۔ میں اس موضوع پر مزید ایک لفظ بھی سُننا نہیں چاہتی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔

"اچھا جیسے تمہاری مرضی۔" میں نے کندھے اُچکائے۔

ہوٹل پہنچ کر میں نے پوچھا "اب تمہاری کیا مصروفیت ہوگی؟"

"فی الحال تو میں آرام کروں گی اور فون پر زرتاج نگر بات کرنے کی کوشش کروں گی۔ دوبارہ ملاقات کے لئے میں تمہیں فون کرلوں گی۔"

"ایک ہی ہوٹل میں رہتے ہوئے بھی پہلے فون کروگی؟"

"مناسب طریقہ یہی ہے۔" وہ مسکرائی "تم بھی مصروف آدمی ہو۔ مجھے بھی چند دن تک کچھ نہ کچھ مصروفیات درپیش رہیں گی۔ میں تمہارے سر پر سوار نہیں ہوؤں گی۔"

"اوہو... یہ اچانک تمہارے انداز میں تکلف کیوں آرہا ہے؟" میں نے استہزائیہ انداز میں اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔

"یہ تکلف نہیں بلکہ تمہیں بے جا زحمت سے بچانے کی کوشش ہے۔" وہ گاڑی سے اُترتے ہوئے بولی۔

"میرا مقولہ ہے کہ دوستوں کو تکلیف دینا دوستوں کا اخلاقی فرض ہے۔" میں نے کہا۔

"کبھی تمہیں اس مقولے پر پچھتانے کا اتفاق تو نہیں ہوا؟" وہ کھڑکی پر جھکتے ہوئے بولی۔

"نہیں کیونکہ یہ مقولہ ہر ایک کے لئے نہیں ہے۔ یہ صرف خاص خاص دوستوں کے لئے ہے۔" میں نے انجن بند کرکے گاڑی سے اُترتے ہوئے کہا۔

پھر میں نے اسے اس کے کمرے تک چھوڑا اور خود دوبارہ نیچے آگیا۔ میں اس لڑکی امبرسے ملنا چاہتا تھا جسے میں نے ہوٹل میں پناہ دی تھی۔ اب اس کے لئے خطرہ ٹل چکا تھا۔ میں اسے تمام حالات سے آگاہ کرنے کے بعد پوچھنا چاہتا تھا کہ اب اس کا کیا ارادہ تھا۔

میں نے اسے اپنے آفس میں بُلوایا تو وہ پہلے کی نسبت تازہ دم اور پُرسکون نظر آرہی تھی لیکن اس کی آنکھوں کے گرد مدھم سے حلقے تھے جو پہلے شاید میک اپ میں چھپے ہوئے تھے' بغیر میک اپ کے اس کا چہرہ زیادہ پُرکشش اور صبیح دکھائی دے رہا تھا لیکن اب اس کی آنکھوں میں خوف کی جگہ ایک عجیب سی ویرانی رچی ہوئی تھی۔

وہ بیٹھ چکی تو میں نے اس کے لئے کولڈ ڈرنک منگوائی۔ وہ جب گلاس میں کیوبس ہلاتے ہوئے اس کی چسکیاں لے رہی تھی تو میں نے اسے ہیروں کے دھندے کی پس پردہ کہانی سُنائی۔ ان پہلوؤں کے بارے میں بتایا جن سے وہ واقف نہیں تھی۔ جب اسے معلوم ہوا کہ پس پردہ پُراسرار باس مشتاق مدبّر تھا تو اس کی افسردہ سی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں پھر میں نے اسے بتایا کہ نادر عرف نوزی مرچکا تھا تو وہ مزید حیران ہوئی۔

کچھ دیر ہم ان کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ آخر میں نے اصل موضوع پر آتے ہوئے کہا "اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟"

اس نے سرجھکالیا اور چند لمحے اُلجھن زدہ سے انداز میں خاموش رہی پھر ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنساتے ہوئے بولی "میری سمجھ میں نہیں آتا مجھے کیا کرنا چاہئے۔ میں تھری اسٹار ہوٹل واپس جاؤں تو کہیں مجھے مشکوک نہ سمجھا جائے۔ قاسم بجلی کی مشینری اگر وہاں کام کررہی ہوگی تو اس میں کسی مشکوک کارکن کے انجام کے بارے میں کوئی اچھی توقع نہیں رکھنی چاہئے اور اگر اس کے لڑکے وغیرہ پکڑے گئے ہیں.... جیسا کہ آپ بتارہے ہیں تو قاسم بجلی کی مشینری یقیناً بکھر چکی ہوگی یا بکھرنے والی ہوگی۔ اس صورت میں تھری اسٹار ہوٹل کا مستقبل ہی مشکوک ہے۔ اس صورت میں بھی میرا وہاں جانا بے کار ہے۔" اس نے ایک لمحے کے لئے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور ذرا ہچکچاہٹ کے بعد بولی "اگر حالات سازگار ہوتے تب بھی شاید میں وہاں واپس نہیں جاتی۔"

"کیوں؟" میں نے خفیف سے تجسس سے پوچھا۔

"میں نے پچھلے دو تین دنوں میں اپنی زندگی کے بارے میں بہت سوچا ہے۔" وہ دوبارہ سرجھکاتے ہوئے نہایت نیچی آواز میں بولی "اور مجھے اپنا آپ قابلِ رحم لگا ہے۔ لوئر مڈل کلاس کی بعض مجھ جیسی لڑکیاں چھوٹے چھوٹے وقتی فائدوں کے لئے کس طرح اپنی زندگی میں کانٹے بولیتی ہیں یا پھر ایسے راستوں پر نکل جاتی ہیں جہاں سے واپسی کا راستہ نہیں ملتا۔ پہلے جمیل میرے ساتھ تھا۔ تب بھی بات کچھ اور تھی۔" جمیل کا نام زبان پر آتے ہی اس کی آواز میں لرزش آگئی۔ لڑکی کو یقیناً جمیل سے محبت رہی تھی۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "ہم دونوں ایک جیسے تھے۔ نہ بہت اچھے.... نہ بہت نیک اور نہ بہت پارسا... لیکن ہم بہت بُرے یا قابلِ نفرت بھی نہیں تھے۔ ہم ایک دوسرے کے محافظ تھے اور ہمارا مستقبل ایک دوسرے سے وابستہ تھا۔ اس کے قتل کے بعد مجھے اندیشہ ہے کہ میری حیثیت کٹی پتنگ کی سی نہ ہوجائے۔ میں کٹی پتنگ بننا نہیں چاہتی لیکن مجھے زندہ بھی رہنا ہے' اپنی بیوہ بوڑھی ماں اور چھوٹے بھائی بہنوں سمیت زندہ رہنا ہے۔ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا۔ کوئی خاص ہنر یا کوئی مخصوص تعلیم میرے پاس نہیں ہے۔ سیدھی سادی بی اے پاس ہوں لیکن انگریزی اچھی طرح بول لیتی ہوں' لکھ لیتی ہوں' ٹائپ کرلیتی ہوں۔ شاید کہیں نہ کہیں فٹ ہو ہی جاؤں۔ فی الحال میں آپ کا ہوٹل چھوڑ دیتی ہوں۔"

"میرا تمہیں بُلانے کا یہ مقصد نہیں تھا۔" میں نے جلدی سے کہا "ہوٹل میں تو تم جب تک ضرورت محسوس کرو' قیام کرسکتی ہو۔ میرا مقصد تو تمہیں حالات سے آگاہ کرنا اور یہ بتانا تھا کہ خطرہ

ٹل چکا ہے تاکہ تم اپنے اعصاب پر بوجھ لئے وقت نہ گزارو۔"

"آپ نے میری جتنی مدد کی ہے یہ احسان میں کبھی فراموش نہیں کرسکوں گی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو کسی غرض کے بغیر یوں اپنے کام آتے دیکھا ہے۔ میں اب چلتی ہوں مجھے معلوم ہے آپ کا وقت قیمتی ہے۔" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"بیٹھ جاؤ" میں نے اشارہ کیا "میرا خیال ہے میں تمہیں اس ہوٹل میں ایڈجسٹ کرسکتا ہوں۔ بشرطیکہ تم اپنا لائف اسٹائل بدلنے کے لئے اپنے آپ کو تیار محسوس کرو۔ یہاں کوئی ایسا ویسا دھندا نہیں ہوتا۔ تمہیں کوئی ایسا ویسا سائڈ بزنس یا پارٹ ٹائم کام میسر نہیں آسکے گا البتہ اگر یہاں ڈیوٹی ختم کرنے کے بعد تمہارے پاس ٹائم بچے اور تم یہاں کی تنخواہ کو اپنی ضروریات کے لئے ناکافی سمجھو تو کسی اور دفتر یا ادارے میں شریفانہ قسم کی پارٹ ٹائم نوکری کرسکتی ہو۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

وہ کچھ اس طرح بیٹھ گئی جیسے اس کی ٹانگوں میں جان نہ رہی ہو۔ یکدم ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے "آپ زبردستی میری خاطر جاب نہ نکالیں۔ آپ لائف اسٹائل بدلنے کی بات کررہے ہیں۔ میں تو خود ہی لائف اسٹائل بدلنے کا فیصلہ کرچکی ہوں۔ اسی لئے تو میں تھری اسٹار ہوٹل واپس نہیں جارہی ہوں لیکن مجھ جیسے لوگ جب اپنی اصلاح کا عزم کرتے ہیں تو ان میں ایک اور بڑی خرابی پیدا ہوجاتی ہے یعنی ان کی خودداری بیدار ہوجاتی ہے۔ میری خودداری اب یہ گوارا نہیں کرتی کہ میرے حالات سے متاثر ہوکر آپ زبردستی میرے لئے جگہ نکالیں اور مجھے نوکری دیں۔"

"تم سے کس نے کہا کہ میں زبردستی تمہارے لئے جگہ نکال رہا ہوں؟" میں نے تیزی سے کہا "یہ درست ہے کہ میں لوگوں کے کام آنے کی کوشش کرتا ہوں اور اس سلسلے میں کبھی کبھی بڑے بڑے خطرات بھی مول لے لیتا ہوں لیکن میں بہرحال ایک بزنس مین بھی ہوں۔ ایک بزنس مین خواہ مخواہ کا مستقل بوجھ کبھی نہیں پالتا خواہ وہ بوجھ اس کے لئے تنکے کے برابر ہی کیوں نہ ہو۔"

وہ خاموش رہی اور آنکھیں پونچھنے لگی۔ اس کے آنسو تھم گئے لیکن آنکھیں نم ہی رہیں پھر نہ جانے کیوں وہ افسردہ سے انداز میں مسکرادی۔ یہ مسکراہٹ آنسوؤں میں بھیگی ہوئی تھی۔

بیٹھی بیٹھی سی آواز میں وہ بولی "چلئے میں آپ کی بات کا یقین کرلیتی ہوں۔ آپ مجھے کس کام کے لئے رکھنا چاہتے ہیں؟"

"میرا خیال ہے میں جن چکروں میں پھنسا ہوا تھا ان سے میری جان چھوٹ رہی ہے۔" میں نے ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "اب مجھے کچھ فرصت میسر آئے گی۔ اب میں اپنے کاروبار کی طرف توجہ دینا چاہتا ہوں۔ اس سلسلے میں اب میری کراچی آمدورفت بھی زیادہ رہے گی۔ یہاں اس ہوٹل میں ابھی کوئی مستقل سیکریٹری موجود نہیں ہے۔ مجھے اس پوسٹ کے لئے کسی نہ کسی کو رکھنا ہی تھا۔ اب نہ سہی' ایک ماہ بعد رکھتا لیکن رکھتا ضرور۔ اس لئے تم یہ نہیں کہہ سکتیں کہ میں زبردستی تمہارے لئے جاب نکال رہا ہوں۔ شاید اسی لئے تمہیں میری صاف گوئی بھی بُری نہیں لگے گی کہ تم فی الحال میرے مطلوبہ معیار پر پوری نہیں اُترتی ہو لیکن تم بہرحال ایک ذہین لڑکی ہو۔ مجھے اُمید ہے تم بہت جلدی پک کرلوگی' بہت کم وقت میں سب کچھ سیکھ جاؤگی۔"

"میں کوشش کروں گی سر!" اس کا لہجہ نشاندہی کررہا تھا کہ وہ ایک اچھی سیکریٹری ثابت ہوگی۔

میں نے اشارے سے بتایا "یہ جو سامنے.... میرے آفس کے ساتھ ہی چھوٹا سا کمرا ہے اس میں بیٹھنے کے انتظامات موجود ہیں۔ تم چاہو تو کل سے بیٹھنا شروع کرسکتی ہو۔ تمہاری زیادہ مصروفیت انہی دنوں میں ہوگی جب میں کراچی میں ہوں گا۔ میری عدم موجودگی میں کام بہت کم ہوگا۔ کل پرسوں تمہیں پرسونل منیجر سے اپائنمنٹ لیٹر مل جائے گا جس میں تنخواہ وغیرہ کی تفصیلات ہوں گی۔ کسی بات پر اعتراض ہو تو مجھ سے ڈسکس کرلینا۔"

"اعتراض.....؟" وہ خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسی "سر! کسی کو احسان کے بوجھ تلے اتنا مت دبائیں کہ اس بے چارے کا دم ہی گھٹ جائے۔ میرا یہاں اپنی ملازمت کی شرائط پر اعتراض کرنا اپنی خوش قسمتی کو لات مارنے کے مترادف ہوگا۔"

"دراصل میں نہیں چاہتا کہ تم کسی معاملے میں اپنے آپ کو مجبور محسوس کرتے ہوئے یہاں ملازمت شروع کرو۔" میں نے واضح کیا۔

"مجھے اندازہ ہوگیا ہے سر! آپ نہیں چاہتے کہ میری عزتِ نفس کو کوئی ٹھیس پہنچے۔ مجھے تو یقین نہیں آرہا کہ آپ کے طبقے میں مجھ جیسے لوگوں کے محسوسات تک کا خیال رکھنے والے لوگ بھی موجود ہیں۔" وہ واقعی بے یقینی سے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں کسی اور سیارے سے آئی ہوئی مخلوق تھا۔

"ہر طبقے میں تمہیں ہر طرح کے لوگ ملیں گے۔" میں نے کہا۔

"لیکن اچھے اور آئیڈیل قسم کے لوگ اب ہر طبقے میں بہت کم رہ گئے ہیں سر!" وہ بولی۔

"اچھی چیزیں.... اچھے انسان تو خیر ہمیشہ ہی کم تعداد میں رہے ہیں لیکن تم ٹھیک کہہ رہی ہو اب خطرناک حد تک کم ہوگئے ہیں۔" میں نے تسلیم کیا "مگر تم مجھے اچھے اور آئیڈیل قسم کے انسانوں میں مت شمار کرو۔ میں کوئی ایسا اچھا اور آئیڈیل قسم کا انسان نہیں ہوں۔ اب تم جاسکتی ہو۔ اپنے معاملات نمٹا کر کل یا پرسوں سے اپنی نئی ملازمت پر آنا شروع کردو۔"

"سر! میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ کس طرح آپ کا شکریہ ادا کروں۔" اس کے لہجے میں اتنی ممنونیت تھی کہ مجھے شرمندگی ہو رہی تھی۔

"جو کام سمجھ میں نہ آئے وہ کرنا ہی نہیں چاہئے۔" میں نے

کہا "جب تمہاری سمجھ میں ہی نہیں آرہا کہ کس طرح میرا شکریہ ادا کرو۔ تو اس کا بہترین حل یہ ہے کہ تم شکریہ ادا ہی مت کرو۔"

اس کے رخصت ہونے کے بعد میں شفیع شاہ کو فون کرنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ آپریٹر نے مجھے رحیم گل کے فون کی اطلاع دی۔ مجھے قدرے حیرت ہوئی کیونکہ تھوڑی ہی دیر پہلے میں اور زرتاج اس کے ہاں سے آئے تھے۔ اتنی سی دیر بعد ہی اسے فون کرنے کی نہ جانے کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔

میں نے کال ریسیو کی تو اس نے خود ہی وضاحت سے بات شروع کی "تم حیران ہو رہے ہوگے کہ اتنی دیر تو تم سے گپ شپ رہی ہے اب میں نے کیوں فون کیا ہے؟"

"اب تم نے خود ہی سوال اُٹھایا ہے تو خود ہی وضاحت بھی کردو۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"دراصل میں تمہیں ایک بات بتانا چاہتا تھا جو زرتاج کے سامنے بتانے کی میری ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔" میں اس کے لہجے پر حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ایک عجیب سا شرمیلا پن تھا اس کے لہجے میں۔

"بڑا رعب ہے بھئی تم پر لڑکیوں کا!" میں نے حیرت سے کہا "کاش ہمارا بھی تم پر اتنا ہی رعب ہوتا۔"

"سب لڑکیوں کا نہیں۔ صرف زرتاج کا۔" اس نے گویا تصحیح کی۔

"چلو اتنا بھی کافی ہے اور یہ زرتاج کی خوش قسمتی ہے۔" میں نے اس کے لہجے پر غور کرتے ہوئے کہا "اب بتاؤ تمہیں تکلیف کیا ہے؟"

"بات یہ ہے افضل ڈیئر کہ اس شہر میں میرا کوئی دوست نہیں ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ میرا کہیں بھی کوئی دوست نہیں ہے۔"

"ہو بھی کیسے سکتا ہے۔" میں نے لقمہ دیا "آخر تم پولیس والے ہو اور پُرانے وقتوں کے کسی گمنام دانشور نے یہ محاورہ ایجاد کرکے پبلک کو بہکا رکھا ہے کہ پولیس والوں کی نہ دوستی اچھی نہ دشمنی اچھی۔ شاید اسی لئے لوگ تم سے دوستی یا دشمنی کچھ بھی نہیں رکھتے ہوں گے۔"

"ایک تو تم بات میں سے بات بہت نکالتے ہو۔"

"بھئی جب تم ایک بات بتانے کے لئے باقاعدہ تمہید باندھ رہے ہو تو کیا میں بات سے بات بھی نہیں نکال سکتا۔" میں نے کہا۔

"بات ہی کچھ ایسی ہے کہ اس کی تمہید باندھنا ضروری ہے۔ میں یکدم بات کہہ کر تمہارے سر پر لٹھ مارنا نہیں چاہتا۔ بنیادی طور پر تم بھی "پینڈو" ہو اور میں بھی۔ ہم جیسے لوگ عام طور پر تو بات لٹھ مارنے کے انداز میں ہی کہہ گزرتے ہیں لیکن میں یہ بات بڑے تحمل اور دھیمے پن سے کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم بھی اسے تحمل اور دھیمے پن سے سُنو پھر اسی تحمل اور دھیمے پن سے اسے آگے بڑھا دو۔"

"تمہید کچھ اور لمبی ہوگئی ہے۔" میں نے شکوہ کیا۔

"ہونے دو۔ کوئی بات نہیں۔" وہ بے پروائی سے بولا "میں یہ کہہ رہا تھا کہ میرا کوئی دوست نہیں ہے۔ میں نے تمہیں اپنا جگری یار سمجھ لیا ہے۔ اب ہر معاملے میں تم میرے رازداں ہوگے اور تمہیں بھی پورے خلوصِ دل سے میرے ساتھ حقِ دوستی نبھانا ہوگا۔"

"فی الحال تم یک طرفہ ٹریفک چلائے جاؤ۔ ابھی میں اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ ویسے اس قسم کی باتیں کافی عرصے پہلے ہائی اسکول کے لڑکے لڑکیوں میں ہوا کرتی تھیں۔ اب ان میں بھی نہیں ہوتیں۔ زمانہ بہت فاسٹ ہوگیا ہے۔"

"میں ابھی گزرے وقتوں کی معصوم اور خوب صورت قدروں اور روایتوں کے ساتھ چل رہا ہوں۔" وہ بولا "تبھی تو میرا یہ عالم ہے کہ زرتاج کو فون کرنے کے بجائے تمہیں کر رہا ہوں۔ بات یہ ہے یار افضل.... وہ جو میں نے تمہارے اور زرتاج کے سامنے کہا تھا نا کہ میں کسی کے لئے کراچی آیا ہوں' تو اس سے میری مراد دراصل زرتاج ہی تھی۔ میں درحقیقت اس کی وجہ سے کراچی شفٹ ہوا ہوں ورنہ مجھے شہری زندگی اور یہاں کے ماحول سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔"

"اوہ.....!" میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا لیکن پھر مجھے کچھ یاد آیا اور میں نے کہا "لیکن تم تو زرتاج سے پہلے یہاں آچکے تھے۔ زرتاج تو اب آئی ہے۔"

"مجھے پہلے ہی پتا چل گیا تھا کہ وہ شفٹ ہونے کا پروگرام بنا چکی ہے۔" اس نے بتایا۔

"تمہیں کیسے پتا چل گیا تھا؟ اس نے تو تمہیں نہیں بتایا ہوگا۔"

"نہیں' اس نے تو یقیناً نہیں بتایا تھا لیکن میں آخر پولیس والا ہوں۔" وہ بولا "اس وقت میرے ایک جاننے والے صوبائی حکومت میں اچھے عہدے پر موجود تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ان سے کہہ کر فوراً تبادلہ بھی کرالیا کہ بعد میں کہیں تبادلہ مشکل نہ ہو جائے۔"

میں محض ہنکارا بھر کر رہ گیا۔ ایک لمحے کے لئے کچھ بھی نہ بول سکا۔ نہ جانے کیوں میرے دل میں گہرا سناٹا چھا گیا حالانکہ یہ میرے لئے اتنا نیا انکشاف نہیں تھا۔ مجھے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ تو زرتاج کے ساتھ اس کے گھر جا کر ہی ہوگیا تھا پھر بھی اس کے منہ سے یہ سب کچھ سُننا نہ جانے کیوں مجھے عجیب سا لگا تھا۔

"تم خاموش کیوں ہوگئے؟" اس کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

"میرے بزرگوں نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تم کسی کو حماقت میں مبتلا دیکھا کرو تو دو منٹ کے لئے تعزیتی انداز میں خاموشی اختیار کرلیا کرو۔" میں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

وہ بے ساختگی سے ہنسا۔ اس کی ہنسی میں زندگی کی گرمجوشی تھی۔ انسان جب نو گرفتارِ محبت ہوتا ہے تو اس کے لفظوں' اس کے لہجے سے بھی ایک عجیب سا سرور پھوٹتا ہے۔

"مذاق مت کرو۔" وہ بولا "میں نے حماقت کی نہیں' محبت کی بات کی ہے۔"

"ایک ہی بات ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔

"تم مجھے یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہو کہ تمہارے نظریے کے مطابق محبت ایک حماقت ہے لیکن مجھے معلوم ہے یہ بات کرنے والے درحقیقت خود بڑی شدت سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ دوسروں کا مذاق اُڑاتے ہیں لیکن خود حماقت کے انداز میں محبت کرتے ہیں۔"

مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا۔ اس کمبخت کے لہجے میں اتنا تجربہ کہاں سے بول رہا تھا؟ میں نے اپنے لہجے میں شگفتگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تم میرا تجزیہ چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ تمہاری اصل تکلیف کیا ہے جس کے لیے تم نے اتنی بے قراری سے فون کیا ہے؟"

"میری اصل تکلیف یہ ہے کہ جب تک وہ سامنے نہیں تھی تب تک مجھے صبر تھا' قرار تھا لیکن اسے یہاں دیکھنے کے بعد میرے لئے صبر کرنا محال ہوگیا ہے۔"

"تو کیا تم اسے ہوٹل سے اُٹھا کر لے جانا چاہتے ہو۔ جس طرح فلموں میں ولن کسی مزارع کی بیٹی کو اُٹھا کر لے جاتا ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"بکواس مت کرو یار! میں کوئی تھرڈ ریٹ قسم کا بدمعاش تو نہیں ہوں۔" وہ شاید جھینپ کر بولا۔

"نہیں میں کب کہہ رہا ہوں کہ تم تھرڈ ریٹ قسم کے بدمعاش ہو۔ تم تو فرسٹ ریٹ قسم کے بدمعاش ہو۔" میں نے کہا "لیکن میری اب بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں چاہتا ہوں اسے میری بے تابیٔ دل کے بارے میں معلوم ہو جائے۔ تم خواہ میرا کتنا بھی مذاق اُڑاؤ لیکن میں تمہیں پوری بات سُنا کر رہوں گا۔ یقین کرو یہ کوئی وقت گزاری یا دل بہلاوے کا سلسلہ نہیں ہے۔ میں اس لڑکی کے بارے میں حد سے زیادہ سنجیدہ ہوں اور نہایت سیدھے سادے انداز میں اس معاملۂ دل کو انجام تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ یعنی اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں تم یہ بات اسے بتا دو۔"

میں خاموش رہا۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد وہ بولا "تم چُپ کیوں ہوگئے؟"

"تمہارے خیال میں کیا تمہاری بات سُننے کے بعد مجھے راگ ملہار گانا چاہئے تھا؟ ابے گدھے! میں اپنا غصہ ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"کیوں؟" اس نے نہایت سادگی سے پوچھا۔

"اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!" میں نے دانت پیس کر کہا لیکن پھر میں نے بڑی کوشش سے اپنا لہجہ نہایت ملائم بنالیا "یار رحیم گل! آج زرتاج کی موجودگی میں تمہیں دیکھ کر مجھے کچھ کچھ شبہ تو ہوا تھا کہ تم چھوٹے موٹے گدھے ہو لیکن اب تمہاری باتیں سُن کر مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ تم درحقیقت کتنے بڑے اور بے مثال گدھے ہو۔"

"کیوں.... میں نے گدھوں والی کیا بات کی ہے؟" وہ ہلکی سی خفگی سے بولا۔

"کیسا عبرت کا مقام ہے کہ ایک گدھا پوچھ رہا ہے اس نے گدھوں والی کیا بات کی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بھائی رحیم گل! تم زرتاج کے دیوانے ہو اس سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ بڑی اچھی بات ہے لیکن شادی کا پیغام بھجوانے کے لئے تمہاری نگاہِ انتخاب مجھ پر ہی کیوں پڑی ہے؟ میں کیا تمہیں پُرانے زمانے کی نائن.... یا "بسمن خالہ" قسم کی چیز نظر آتا ہوں جو گھر گھر رشتوں کے پیغام لے کر جایا کرتی تھیں؟ یا پھر تمہارے خیال میں' میں نے اس جدید دور میں کوئی میرج بیورو کھولا ہوا ہے جس میں زرتاج نے ویٹنگ لسٹ میں نام لکھوایا ہوا ہے؟"

"بس... اتنی سی بات کا بُرا منا گئے ہو؟ میں تو ڈر ہی گیا تھا کہ نہ جانے کیوں اتنے خفا ہوگئے ہو۔" وہ گویا اطمینان کی سانس لے کر بولا "یار! بے شک میں نے شہروں میں تعلیم پائی ہے' ہوسٹلوں میں رہا ہوں۔ ملک سے باہر بھی رہا ہوں لیکن بنیادی طور پر میں دیہاتی آدمی ہوں۔ میرے طور طریقے اب بھی دیہاتی ہیں۔ مجھ میں جراتِ اظہار کی کمی ہے۔ میں نے تمہیں دوست سمجھا۔ تم سے دل کی بات کہہ دی اور تم سے مدد مانگ لی۔ میرے خیال میں تو اس میں کوئی بُرائی نہیں تھی۔"

اس کے سادہ سے لہجے میں ایک عجیب سی تاثیر تھی۔ میں نے غیر ارادی طور پر نرم پڑتے ہوئے کہا "بنیادی طور پر تو میں بھی دیہاتی آدمی ہوں لیکن میں اگر کسی سے مدد طلب کرتا ہوں تو کسی ڈھنگ کے کام میں کرتا ہوں۔ یہ بھلا کوئی کام ہے جو تم مجھے بتا رہے ہو؟"

"میرے لئے تو یہ بہت اہم کام ہے۔ زندگی موت کا مسئلہ ہے۔"

"احمق آدمی! اس میں اتنا گڑگڑانے اور دوسروں کے کان کھانے کی کیا ضرورت ہے؟" میں نے اس بار اسے ذرا نرمی سے ڈانٹ پلائی "اچھی بھلی تمہاری عمر ہے۔ اب تم میرے محلے کے کوئی نوعمر لونڈے لپاڑے نہیں ہو اور نہ ہی میں نرسری کا بچہ ہوں جسے تم ٹافی وغیرہ کا لالچ دے کر گلی میں رہنے والی' ہائی اسکول کی کسی لڑکی کو رقعہ بھجوانا چاہتے ہو۔ اپنا جغرافیہ تم خود ہی بیان کر چکے ہو کہ تعلیم یافتہ' معقول عہدے پر فائز اور خوش حال آدمی ہو۔ خاندانی پس منظر بھی اچھا ہے۔ زرتاج بھی اب کوئی نوعمر لڑکی نہیں ہے۔ ایک

عرصے سے خودمختاری کی زندگی گزار رہی ہے۔ آکسفورڈ کی پڑھی ہوئی ہے۔ تم خود جاکر اسے پرپوز کرسکتے ہو۔"

"اف میرے خدا!" رحیم گل نے شاید اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا تھا "میں شاید اتنی دیر سے بھینس کے آگے بین بجا رہا تھا۔ بھائی! یہی تو اصل رونا ہے۔ اگر مجھ میں اتنی ہمت ہوتی تو تمہارے سامنے اتنا لمبا چوڑا دکھڑا رونے کی کیا ضرورت تھی؟ زرتاج کے سامنے کچھ کہنے کی مجھ میں جرأت نہیں ہے اور میرا دل رکھنے کے لئے تم میری نظر میں مجھے کتنا ہی طرم خان بنانے کی کوشش کرو لیکن حقیقت یہی ہے کہ زرتاج کے سامنے میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔"

"اگر تمہیں حیثیت کی اتنی ہی فکر تھی تو پھر عشق بھی سوچ سمجھ کر کرنا چاہئے تھا۔" میں نے مشورہ دیا۔

"عشق پر تو انسان کا کوئی زور نہیں چلتا۔ یہ تو چچا غالب بھی فرما چکے ہیں۔"

"حیثیت پر بھی انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے ورنہ اس دنیا میں کوئی کم حیثیت ہی نہ ہوتا۔"

"مقصد یہ کہ تم میری کوئی مدد نہیں کرو گے؟" اس نے قدرے مایوسی سے پوچھا۔

"میں تمہاری مدد کررہا ہوں نا۔ یعنی تمہیں مشورہ دے رہا ہوں۔ تمہاری ہمت بڑھا رہا ہوں کہ اگر عشق ہو ہی گیا ہے تو اب حیثیت وغیرہ کے چکر میں نہ پڑو۔ زرتاج سے مرعوب مت رہو۔ نتائج کی پروا مت کرو اور اپنی فریاد لے کر سیدھے اس کے حضور میں پہنچ جاؤ۔ اگر اس سے اسی طرح ڈرتے رہو گے تو شادی کیا خاک کرو گے۔ کسی طرح کھینچ تان کر شادی ہو بھی گئی تو اس کے شوہر کے بجائے خانساماں معلوم ہو گے۔ تم خود سوچو کہ آخر تم کس انجام سے دوچار ہونا چاہتے ہو۔"

"میں نے کیا سوچ کر تمہیں فون کیا تھا۔ تم نے تو میری طبیعت ہی صاف کردی۔" وہ مُردہ سے لہجے میں بولا۔

"خیر تم دل چھوٹا نہ کرو۔" میں نے گویا اس پر ترس کھاتے ہوئے کہا "میں تمہاری بات آگے بڑھانے کی کوشش تو کروں گا لیکن اصل کام تمہیں خود ہی کرنا پڑے گا۔ یہ تمہارے عشق کا معاملہ ہے۔ بات تمہارے ہی منہ سے اچھی لگے گی۔ میں زرتاج کو ٹٹولنے کی کوشش کروں گا۔ میرا مطلب ہے محاورتاً ٹٹولنے کی کوشش کروں گا کہ اس کی تمہارے بارے میں کیا رائے ہے۔"

"تم اتنا بھی کردو گے تو تمہاری بڑی مہربانی ہوگی۔" وہ ممنونیت سے بولا "جو بھی نتیجہ نکلے مجھے فون کرکے بتانا۔ میں بھی اس دوران اپنی جرأت مجتمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

پھر اس نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کردیا۔ میں ریسیور رکھنے کے بعد دیر تک گم صم بیٹھا رہا۔ میرے ذہن پر سوچوں کی یلغار تھی۔ میں فون پر رحیم گل سے بات کرتے وقت جتنا چہک رہا تھا اب میرے اندر اتنا ہی گہرا سکوت چھا گیا تھا۔

میں ابھی اپنی بے عنوان سوچوں میں ہی اُلجھا ہوا تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔

"یس.... کم ان" میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

دوسرے ہی لمحے زرتاج بادِ صبا کے جھونکے کی طرح اندر آگئی۔ خوشبو کا ایک ہالہ اس کے ہم قدم تھا۔ وہ آفس کا جائزہ لینے لگی۔

"تمہیں سیکیورٹی والوں نے نہیں روکا؟" میں نے پوچھا۔

"تمہارا سیکیورٹی گارڈ تو مجھے خود یہاں تک چھوڑ کر گیا ہے ورنہ مجھے تو معلوم نہیں تھا کہ تمہارا آفس اس کونے میں ہے۔ انہوں نے مجھے تمہارے ساتھ آتے جاتے دیکھ لیا تھا۔ انہیں اندازہ ہوگیا ہے کہ میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "ویسے بھی کیا میں شکل سے خطرناک لگتی ہوں کہ سیکیورٹی والے مجھے روکیں؟"

"یقیناً تم ایک خطرناک لڑکی ہو۔ ہر خوب صورت لڑکی خطرناک ہوتی ہے۔" میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"فضول باتیں مت کرو۔" وہ بیٹھتے ہوئے بولی "میں کافی دیر سے تم سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کررہی تھی لیکن آپریٹر مسلسل یہی بتارہا تھا کہ تمہاری کسی سے بات ہورہی ہے۔ کس حسینہ سے اتنی لمبی بات ہورہی تھی؟"

"حسیناؤں سے لمبی باتیں کرنا ہمارے مقدر میں کہاں!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں تو ایک نہایت بے ہودہ قسم کے مرد سے بات کررہا تھا جو گھامڑ تو تھا ہی... اوپر سے پولیس والا بھی ہے۔"

"اوہ! رحیم گل پھر تمہارے کان کھا رہا تھا؟" اس کی آنکھیں حیرت سے کچھ پھیل گئیں "آج ہی تو ہم اس کے ساتھ اتنی لمبی نشست کرکے آئے تھے۔ مجھے تو لگتا ہے تم نے اس کے حصے کی کچھ ذمے داریاں بھی اپنے سر لے لی ہیں۔ نہ جانے کن کن بدمعاشوں کا ذکر ہورہا تھا۔ کیسی کیسی مار دھاڑ کی باتیں ہورہی تھیں۔"

"وہ اس پر بھی بس نہیں کررہا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "وہ تو میری ٹانگ کھینچ کر اپنی نجی زندگی میں بھی پھنسانا چاہتا ہے۔"

"تم نے اپنی ٹانگ کو آوارہ بھی تو چھوڑا ہوا ہے۔ لوگ اسے لاوارث سمجھ کر ہر چیز میں اَڑانے کی کوشش کرتے ہیں۔" وہ بولی۔

"ہاں" میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا "مجھے تم سے اتفاق ہے لیکن اب میں اپنی ٹانگ کی سرگرمیاں محدود کرنے پر غور کررہا ہوں۔ کہیں زیادہ اِدھر اُدھر اَڑتے اَڑتے ٹانگ ٹوٹ ہی نہ جائے۔"

"شکر ہے تمہیں اپنے بُرے بھلے کے بارے میں سوچنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی۔" وہ بولی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اگر میں تمہیں یہ بتاؤں کہ فون پر رحیم گل سے تمہارے ہی بارے میں بات ہورہی تھی تو تمہارا ردِعمل کیا ہوگا؟"

"میرے بارے میں؟" وہ جیسے کسی انجانے خیال سے ڈر گئی۔

"ہاں تمہاری عمر شیطان کی طرح لمبی ہے۔ ابھی تمہارا ذکر ہی ہورہا تھا کہ تم آگئیں۔" میں نے کہا۔

"میرا تو اصل میں ایک اپائنمنٹ کینسل ہوگیا۔ میں فارغ بیٹھی بور ہورہی تھی۔ میں نے سوچا ذرا دیکھوں اگر تم مصروف نہیں ہو تو ایک بار پھر تمہارے کان کھائے جائیں۔ اگر تم رحیم گل سے اتنی لمبی گفتگو کررہے تھے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ تم کچھ زیادہ مصروف نہیں ہو اور میں اپنے ضمیر پر کوئی بوجھ محسوس کئے بغیر تمہارے کان کھاسکتی ہوں۔"

"رحیم گل سے گفتگو صرف اس لئے طویل ہوگئی کہ وہ تمہارے بارے میں تھی۔" میں نے کہا "تم جاننا نہیں چاہتیں کہ گفتگو کیا تھی؟"

"نہیں" اس نے بلا تامل جواب دیا۔ اس نے محض تجسس کے تحت بھی کوئی سوال نہیں کیا۔

"لیکن میں تمہیں بتائے بغیر باز نہیں آؤں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میرا اندازہ درست ثابت ہوا ہے۔ وہ شخص واقعی چاروں ہاتھ پیر سے تم پر عاشق ہوگیا ہے۔ وہ بہت سنجیدہ ہے اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہے۔"

وہ یکدم بے حد سنجیدہ نظر آنے لگی اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی "وہ جو کچھ چاہتا ہے اسے چاہنے دو۔ جو کچھ سوچتا ہے اسے سوچنے دو۔ تم کیوں اس کی وکالت پر تُل گئے ہو؟"

"عشق میں کسی کی بُری حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی پھر جب آدمی یار دوست بھی ہو۔ اس کے کوئی اُلٹے سیدھے عزائم بھی نہ ہوں۔ سیدھے سادے شریفانہ طریقے سے شادی کرنا چاہتا ہو تو خواہ مخواہ ہی اس کی سفارش کرنے کو جی چاہنے لگتا ہے۔"

"تم اپنی سفارش اپنے پاس ہی رکھو اور اس موضوع کو یہیں ختم کردو۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولی۔ معلوم نہیں کیوں وہ اس سلسلے میں قائل ہونے کے لئے تیار نہیں تھی۔

"اچھی طرح سوچو.... اور غیر جذباتی ہوکر سوچو۔ اس طرح کے معقول رشتے روز روز نہیں ملتے۔ خصوصاً اتنی چاہ کے ساتھ۔" میں نے اپنا لہجہ بدستور شگفتہ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "وہ بے چارہ تو تمہاری وجہ سے کراچی دوڑا آیا ہے۔ اسے تو پہلے ہی خبر مل گئی تھی کہ تم نے کراچی شفٹ ہونے کا پروگرام بنالیا ہے۔ اس نے فوراً ہی اپنا تبادلہ کراچی کرالیا۔"

"اسے غلط اطلاع ملی تھی۔" وہ بدستور پُرسکون لہجے میں بولی "میرا ارادہ تو پہلے لاہور شفٹ ہونے کا تھا۔ میں نے لاہور میں چند دن رہنے کے بعد کراچی میں ٹھکانا بنانے کا فیصلہ کیا تھا ورنہ میری

اصل خواہش تو لاہور میں ہی رہنے کی تھی۔"

"پھر تم نے اس پر عمل کیوں نہیں کیا؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے اندازہ ہوا کہ میں اپنی زمینوں سے بہت ہی دور ہوجاؤں گی۔ وہاں رہ کر میرے لئے زمینوں کا نظام چلانا بہت مشکل ہوجاتا۔ کراچی میں رہتے ہوئے میرے لئے زمینوں کا نظام چلانا پھر بھی کچھ آسان ہے اور کراچی سے لاہور آتے جاتے رہنا بھی کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ فی الحال زمینیں بیچ دینے کا بھی مجھ میں حوصلہ نہیں تھا۔ ویسے میں اتنا بڑا قدم بھی اُٹھا سکتی تھی لیکن اس کے لئے مجھے کوئی ٹھوس بنیاد چاہئے تھی۔ جو شاید ابھی موجود نہیں ہے۔" آخری لفظ ادا کرتے وقت نہ جانے کیوں اس کے لہجے میں خفیف سی لرزش آگئی۔

"ٹھوس بنیاد؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ دیوار پر آویزاں پینٹنگ کو دیکھنے لگی۔

"خیر اس موضوع پر بعد میں بات کریں گے۔" میں نے جلدی

نے کہا "فی الحال رحیم گل کے بارے میں بات ہو رہی ہے۔ پہلے اسے کسی کنارے لگ جانا چاہئے۔"

"وہ بات تو کنارے لگ چکی ہے۔ میں نے کہا تو ہے کہ اس موضوع کو یہیں ختم کر دو۔ مجھے اس شخص سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آخر مجھے تم کو اس بات کا یقین دلانے کے لئے کیا کرنا پڑے گا؟" وہ گویا تحمل سے کام لینے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"بات مجھے نہیں بلکہ اس غریب کو یقین دلانے کی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میں تم سے بات کرنے سے پہلے ہی اس کی کافی دل شکنی کر چکا ہوں۔ اسے بڑے اصرار سے بتا چکا ہوں کہ میں اس موضوع پر تم سے بات کرنا قطعی مناسب نہیں سمجھتا اور یہ میرے شایاں شان بھی نہیں ہے۔ اب جب میں اسے بتاؤں گا کہ اس پر ترس کھاتے ہوئے میں نے تم سے بات تو کی تھی' اپنی سی بھرپور سفارش بھی کی تھی لیکن تم ٹس سے مس نہیں ہوئیں تو اسے یقین نہیں آئے گا۔ وہ سمجھے گا میں اسے ٹرخا رہا ہوں کیونکہ میں اس موضوع پر درحقیقت بات کرنا ہی نہیں چاہتا تھا۔"

"میں خود اسے بتا دیتی ہوں۔" وہ اطمینان سے بولی "اس میں اتنی پریشانی کی کیا بات ہے۔ میں ہمیشہ کے لئے اس سلسلے میں اس کا منہ بند کر دوں گی۔ وہ آئندہ کبھی تم سے اس معاملے میں سفارش کے لئے نہیں کہے گا۔ بلکہ تم اجازت دو تو میں اچھی طرح اس کی طبیعت صاف کر دوں گی۔"

"تم تو واقعی بہت خطرناک لڑکی ہو۔" میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا "میں تو سمجھا تھا تم چونکہ ایک روایت پرست لڑکی ہو اس لئے اندر سے شرمیلی بھی ہو گی۔"

"تم غلط نہیں سمجھے تھے۔" وہ بولی "میں اندر سے شرمیلی ہی ہوں لیکن صرف ان معاملات میں جن میں ایک لڑکی کو واقعی شرمیلی ہونا چاہئے۔ سچ بولنے کے معاملے میں' میں شرمیلی نہیں ہوں۔ خصوصاً ایسا سچ جو انسان کو آئندہ زندگی میں بہت سی الجھنوں سے بچا لے۔ بجائے اس کے... کہ میں اپنی جگہ بیٹھی کڑھتی رہوں اور رحیم گل اپنی جگہ بیٹھا دل میں غلط توقعات پالتا رہے' کیا یہ بہتر نہیں کہ میں ابھی اس کی غلط فہمی دور کر دوں؟ اسے دھچکا ضرور لگے گا لیکن کچھ عرصے تک' وہ اس دھچکے سے سنبھل جائے گا۔ یہ اس کے حق میں بہتر ہو گا۔"

"نہیں... نہیں فی الحال ایسا مت کرو۔" میں نے جلدی سے کہا۔ رحیم گل نے جس طرح اس سلسلے میں مجھ سے بات کی تھی اس کے بعد زرتاج کی طرف سے ٹکا سا جواب ملنے پر اس کا تو جو حال ہوتا سو ہوتا۔ خود میرے لئے یہ تصور بڑا تکلیف دہ تھا۔ منافقت یا ڈپلومیسی خود مجھے بھی پسند نہیں تھی۔ میں بھی صاف صاف بات کرنا ہی پسند کرتا تھا لیکن یہ دل کا معاملہ تھا۔ میں اسے اتنی بے رحمی سے ہینڈل کرنا نہیں چاہتا تھا۔

"تمہارا مطلب ہے کہ فی الحال اس مسئلے کو یونہی معلق رہنے دیا جائے؟" زرتاج نے دریافت کیا۔

"ہاں شاید خود ہی اس کا کوئی بہتر حل نکل آئے۔ یا پھر میں اسے نرم انداز میں نمٹانے کا کوئی طریقہ سوچوں گا۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "ویسے کیا ہی بہتر ہوتا کہ تم اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیتیں۔"

"میں نے شادی کو محبت سے مشروط کر رکھا ہے۔" وہ سر جھکائے ہوئے بولی "میں نے سوچ رکھا ہے کہ شادی صرف اس شخص سے کروں گی جس سے مجھے محبت ہو گی۔ میں نے اس فلسفے کی قائل ہونے کی بہت کوشش کی کہ شادی اور محبت دو علیحدہ مسئلے ہیں' محبت ایک حادثاتی سی چیز ہے اور شادی ایک سماجی ضرورت ہے..... وغیرہ وغیرہ لیکن میں اس قسم کے فلسفوں کی قائل نہیں ہو سکی۔ اسی لئے میں شادی بھی نہیں کر سکی کیونکہ اب تک مجھے کسی سے محبت ہی نہیں ہو سکی تھی۔"

مجھے اس کے آخری جملے کا آخری لفظ... یعنی "تھی" بہت اہم محسوس ہوا۔ شاید اس نے اس پر زور بھی دیا تھا۔ میں نے ماحول کا بوجھل پن کم کرنے کے لئے بھی یہ موقع غنیمت سمجھا اور جلدی سے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے ذرا شریر انداز میں کہا "نہیں ہو سکی تھی؟ یعنی زور کس پر ہوا؟ "تھی" پر۔ اس کا مطلب ہے اب یہ مسئلہ حل ہو گیا ہے' کوئی خوش نصیب پہلے ہی تمہاری نظر کو بھا گیا ہے اس لئے بے چارے رحیم گل کی دال نہیں گل رہی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں وہ خوش نصیب کون ہے؟"

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور نہ جانے کیوں مجھے جھرجھری سی آ گئی۔ جس سوال پر اس کی آنکھوں میں اشتیاق اور گرمجوشی کی پھلجھڑیاں چھوٹنی چاہیے تھیں اس پر اس کی آنکھوں میں بلا کی ویرانی پھیل گئی تھی۔ ایسی شعلہ جوالا لڑکی کی آنکھیں ایک ثانئے میں کھنڈر ہو گئی تھیں۔ یہ میرے لئے ایک انوکھا مگر کچھ خوف زدہ سا کر دینے والا نظارہ تھا۔

"شاید وہ ایک سراب ہے۔" اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" غیر ارادی طور پر میری آواز بھی مدھم ہو گئی "تم کوئی عام لڑکی نہیں ہو۔ تم ایک بہت ہی خاص لڑکی ہو۔ دنیا جہاں کی سمجھ بوجھ رکھتی ہو۔ تم کسی سراب سے کیونکر محبت کر سکتی ہو؟"

"مجھ جیسی لڑکیاں ہی تو عام طور پر سرابوں سے محبت کرتی ہیں شاید اسی لئے زندگی بھر خالی ہاتھ رہتی ہیں۔" وہ خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرائی "لیکن خیر۔ ضروری نہیں کہ میں جسے سراب کہہ رہی ہوں وہ میرے لئے سراب ہی ثابت ہو۔ میں قسمت پر یقین رکھتی ہوں۔ قسمت میں ہوا تو شاید وہ سراب بھی میرے لئے حقیقت بن جائے۔"

"اس نامعقول سراب کا کوئی نام بھی ہو گا؟"

"وقت آنے پر نام بھی معلوم ہو جائے گا۔" وہ بولی۔
"یہ تو ٹالنے والی بات ہوئی۔" میں نے کہا "جب انسان کوئی بات بتانا نہیں چاہتا تو کہہ دیتا ہے کہ وقت آنے پر معلوم ہو جائے گا۔"
"نہیں میرا معاملہ ایسا نہیں ہے بتانا تو مجھے پڑے گا لیکن میں کچھ دن انتظار کرنا چاہتی تھی کہ شاید اس کا نام تم خود دریافت کرلو۔"
"میں بلا ضرورت بُجھارتیں بوجھنے کے چکر میں نہیں پڑتا۔ جب تم سامنے موجود ہو تو تم خود ہی کیوں نہیں بتا دیتیں۔" میں نے اصرار کیا "بالکل اسی طرح... جیسے رحیم گل نے مجھے بتا دیا ہے کہ وہ کس کی خاطر یہاں آیا ہے۔ تم اور رحیم گل... دونوں میرے دوست ہو۔ دونوں کے راز میرے لئے اسی طرح قیمتی ہیں جس طرح میرے اپنے راز.... اور میں ان کی اسی طرح حفاظت کروں گا جس طرح اپنے رازوں کی کرتا ہوں۔"
"بہت خوب!" وہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرائی پھر اچانک ہی اُٹھ کر کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ جس پر بلائنڈز پھیلے ہوئے تھے۔ باہر کچھ نہیں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس نے آہستگی سے ڈوری کھینچ کر بلائنڈز ہٹا دیے سامنے صرف خالی راہداری تھی' اس کی پشت میری طرف تھی لیکن اس کے انداز سے مجھے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی نظریں خالی راہداری میں کچھ تلاش کر رہی ہوں۔
ایک طویل لمحے کی خاموشی کے بعد اس کی آواز گویا کہیں دور سے آئی "اس میں راز والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں اس شخص کا نام تم سے اس لئے نہیں چھپا رہی کہ میں اسے کوئی راز سمجھتی ہوں۔ کم از کم تم سے تو میں اسے راز نہیں رکھ سکتی لیکن تمہارے ہی سامنے اس کا نام لینا بھی میرے لئے سب سے زیادہ مشکل ہے کچھ اچھا نہیں لگے گا کہ میں ایک لڑکی ہوتے ہوئے خود تمہارے سامنے اس پہیلی کا جواب دوں۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ وہ شخص خود ہی اس پہیلی کا جواب دیتا۔ رحیم گل مرد تھا۔ اس نے آسانی سے تمہیں بتا دیا کہ وہ کس کی خاطر کراچی آیا ہے۔ میں ایک لڑکی ہوں۔ میری تم کو یہ بتانے کی ہمت نہیں پڑ رہی کہ میں نے کس کی خاطر اپنا طرزِ زندگی بدل لینے کا فیصلہ کیا ہے۔"
"کمال ہے!" میں نے حقیقتاً ذرا حیرت سے کہا "میں تو تمہیں اتنے گھماؤ پھراؤ کے ساتھ بات کرنے والی لڑکی نہیں سمجھتا تھا۔"
"گھماؤ پھراؤ بعض اوقات خود بخود آتا چلا جاتا ہے۔ صورتِ حال ہی کچھ ایسی ہو جاتی ہے۔" اس کے لہجے میں خفیف سی بے بسی تھی۔
"وہ شخص چونکہ یہاں موجود نہیں ہے۔ بلکہ یہاں کوئی بھی تیسرا فرد موجود نہیں ہے' میں اس پہیلی کو بوجھنے میں کسی سے مدد نہیں مانگ سکتا۔ اسی لئے تمہارے کان کھا رہا ہوں' تم ہی سے اس شخص کا نام معلوم کرنا چاہ رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"یہی تو اصل مشکل ہے کہ وہ شخص یہیں... اسی کمرے میں موجود ہے۔ آخر تم نے مجھے مجبور کر ہی دیا یہ بات کرنے پر۔ تم یقیناً میرے منہ سے سُننا چاہتے تھے۔ ورنہ تم اتنے کم فہم تو نہیں ہو سکتے تھے کہ بات تمہاری سمجھ میں ہی نہ آتی۔ میرے منہ سے سُن کر شاید تمہاری انا کو زیادہ تسکین ملی ہوگی۔" اس کی آواز میں ہی نہیں' اس کے پورے وجود میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ میں عقب سے اسے دیکھ رہا تھا۔
ایک لمحے کے لئے میں اپنی ریوالونگ چیئر پر ساکت رہ گیا۔ میں فوری طور پر کچھ بھی نہ بول سکا۔ اس نے جو بات کی تھی' وہ خیال کسی واہمے کی طرح میرے ذہن کے کسی تاریک گوشے میں سرسرا رہا تھا لیکن میں اسے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کئے جا رہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے منہ سے یہ بات سُن کر اپنی انا کو تسکین پہنچانا چاہتا تھا جبکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کے منہ سے یہ بات سُن کر میرے اعصاب پر برف کی بوچھاڑ سی ہو گئی تھی۔
ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پہلے سے زیادہ مرتعش آواز میں بولی "چلو میں اعتراف کر لیتی ہوں کہ تمہاری خاطر میں نے وہیں زندگی چھوڑ کر شہر آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں کسی ایسی جگہ رہنا چاہتی تھی جہاں آسانی سے تم سے رابطہ رہ سکے۔ ایک لڑکی ہوتے ہوئے مجھے یہ سب کچھ کہنا اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن میں نے کہہ ڈالا ہے۔ کاش اس قسم کی کوئی بات میں نے تمہارے منہ سے سُنی ہوتی!" وہ اب بھی میری طرف سے منہ پھیرے کھڑی تھی۔
مجھے اس وقت واقعی خوش ہونا چاہئے تھا۔ میرے رگ و پے میں بجلی دوڑ جانی چاہئے تھی۔ میرے لہو کو آتشِ سیال بن جانا چاہئے تھا۔ مجھے سراپا ہیجان و اشتیاق بن جانا چاہئے تھا لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں اُلٹا کچھ خوف زدہ سا ہو گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے قسمت مجھے کسی خطرناک دوراہے کی طرف دھکیلنے کی کوشش کر رہی ہے۔
میری آواز جیسے کہیں کھو گئی تھی اور میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ بڑی مشکل سے میرے حواس کچھ کام کرنے لگے اور میں نے اپنے آپ کو بولنے کے قابل پایا "زرتاج! میری دوست... میری محسن....! تم سمجھ رہی ہو کہ میں تمہارے منہ سے یہ بات سُن کر اپنی انا کو تسکین پہنچانا چاہتا تھا۔ بخدا ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کہاں کی انا اور کہاں کی تسکین....! میں تو اندر سے بڑا ہی درویش... بڑا ہی انکسار پسند انسان ہوں۔ تم نے جو کچھ کہا یہ میری توقعات میرے اندازوں سے بہت زیادہ ہے۔ میرے لئے یہ کسی ناقابلِ یقین خواب کی باتیں ہیں۔ تمہاری محبت تو کیا... میں اپنے آپ کو تمہاری دوستی کے قابل بھی نہیں سمجھتا۔ تم نے تو مجھ پر اتنا بڑا بوجھ ڈال دیا ہے جسے اُٹھانا شاید میرے بس کی بات نہیں۔ میری سانس سینے میں اٹکنے لگی ہے۔"
تب شاید اس کے اعصاب سے کھنچاؤ کچھ کم ہوا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے وجود میں ارتعاش ختم ہو گیا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے میری طرف گھومی اور اسی طرح نہایت آہستگی سے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی "محبت تمہارے لئے ایک بوجھ ہے؟"
"چھوٹے آدمی سے تو بڑے لوگوں کی عنایتیں بھی سنبھالی نہیں جاتیں۔" میں نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔
"مجھے زیادہ خوش فہمی میں مبتلا کرنے کی کوشش مت کرو۔" وہ بولی "میں نے کبھی اپنے آپ کو "بڑے لوگوں" میں شمار نہیں کیا۔ ہمارے ملک میں ویسے بھی "بڑے لوگوں" کا صیغہ ان کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جو اندر سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔"
"تمہیں اتنی تو اُمید رکھنی چاہئے کہ میرے کسی کو بڑا سمجھنے کے پیمانے مختلف ہوں گے۔" میں نے کہا۔
"ہاں شاید" اس نے مبہم لہجے میں کہا اور ایک لمحے کے لئے گھوم کر کھڑکی کے بلائنڈز دوبارہ بند کر دیے۔ اس کے چہرے پر اب بے پناہ طمانیت تھی اور مجھے اس طمانیت سے خوف آ رہا تھا۔ میں ابھی اسے کچھ اور بھی بتانا چاہتا تھا۔
میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "یہ... یہ تمہارے دل میں میرے لئے محبت کے جنم لینے کا حادثہ کب پیش آیا؟"
اس کی سُرخ و سفید رنگت ایک لمحے کے لئے متغیر سی ہوئی۔ اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سر جھکا لیا اور کچھ سوچ کر بولی "میں تمہیں صحیح تاریخ اور صحیح وقت تو نہیں بتا سکتی لیکن میرا خیال ہے زرتاج نگر میں تمہارے قیام کے دوران ہی کسی وقت یہ کونپل پھوٹی تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ تمہاری عدم موجودگی میں چند ہی دنوں میں یہ کونپل ایک تناور درخت بن گئی۔ ورنہ لوگ تو کہتے ہیں کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل.... مگر میرے ساتھ اُلٹا ہی معاملہ ہوا۔ تم کیا گئے گویا زندگی کا سارا حُسن ہی چلا گیا۔"
"جب میں وہاں سے روانہ ہوا' مجھے وہ منظر آج بھی اچھی طرح یاد ہے اس وقت تو ایسی کوئی علامت دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔" میں نے کہا۔
"شاید تمہیں کسی کے دل میں جھانک کر دیکھنا نہیں آتا اور شاید میں خود بھی اس وقت اپنے جذبے کی شدت سے آگاہ نہیں تھی۔" وہ دیوار سے ٹیک لگاتے ہوئے بولی۔
کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ میں خود اپنی دھڑکنوں کی آواز بڑی آسانی سے سُن سکتا تھا۔ وہ سر جھکائے کھڑی تھی مگر شاید کسی جواب کی منتظر تھی۔ زندگی میں شاید پہلی بار مجھے ایک ایسی صورتِ حال سے واسطہ پڑا تھا جس میں' میں اپنے آپ کو کوئی جواب دینے کے قابل نہیں پا رہا تھا۔
پھر نہ جانے کیوں میں اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہوا حالانکہ میں اپنے اندر اُٹھنے کی ہمت بھی نہیں پا رہا تھا۔ ٹانگوں سے گویا جان سی نکل گئی تھی۔ مجھے دراصل ایک عجیب' بے عنوان سی ندامت کا سامنا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں اس مرحلے سے کیسے گزروں۔
میں گویا ایک طویل خلا میں تیرتا ہوا اس تک پہنچا اور غیر ارادی طور پر میں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ دئے شاید میرا مقصد اس کی قربت کو محسوس کرنا نہیں بلکہ کوئی سہارا تلاش کرنا تھا۔ میں اس وقت سہارے کی ضرورت بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ میں' جو اپنے آپ کو چٹان کی طرح مضبوط محسوس کیا کرتا تھا اس وقت نہ جانے کیوں ایک برگِ خزاں رسیدہ کی طرح اپنے آپ کو ہوا کے دوش پہ اُڑتا محسوس کر رہا تھا جبکہ کمرے میں ہوا اس وقت ساکت تھی۔
زرتاج کا سر کچھ اور جھک گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے جسم میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ شخصیت کے اعتبار سے وہ بھی ایک نہایت ہی مضبوط لڑکی تھی لیکن ہم دونوں ہی شاید اس قسم کے لوگوں میں سے تھے جن کے لئے خود اپنے ہی جذبات کے سیلاب کے سامنے ٹھہرنا کبھی کبھی بہت دشوار ہو جاتا تھا۔ شاید اس وقت وہ بھی کسی سہارے کی ضرورت محسوس کر رہی تھی لیکن اس کے لئے ہاتھ اُٹھانا بھی دشوار تھا۔
"زرتاج! محبت میں دیانت داری کیسی چیز ہے؟" میں نے نہایت دھیمے لہجے میں پوچھا۔
"بہت اچھی چیز ہے۔ دیانت داری ہر شعبۂ زندگی میں ہی بہت اچھی چیز ہے۔" اس نے بلا تامل جواب دیا "بشرطیکہ انسان میں اس پر قائم رہنے کا حوصلہ بھی ہو۔"
"میں تمہیں دیانت داری سے سب کچھ بتانے اور پھر اس دیانت داری پر قائم رہنے کی بھی کوشش کروں گا۔" میں نے فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا "میں جب ایک نوعمر لڑکا تھا۔ جوانی میرے وجود پر دستک دے رہی تھی...... جب ہر مسامِ جاں سے شرارے سے

پھوٹتے تھے۔ اور میں بے حد غریب تھا۔ گاؤں کی کچی گلیوں میں اپنی مفلسی کے گلے میں بانہیں ڈالے آوارہ پھرتا تھا تو تم جیسی کوئی لڑکی میرا آئیڈیل ہوا کرتی تھی۔"

میں خود ہی اپنے اس بھولے بسرے تصور پر استہزائیہ انداز میں ہنس دیا۔ اس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اس کی غزالی آنکھیں دھیرے دھیرے گویا دہکنے لگی تھیں۔

"مجھ جیسی لڑکی.....؟" اس نے سرگوشی میں تصدیق چاہی۔

"ہاں تم جیسی لڑکی..... جو بے حد امیر ہو۔ جاگیردارنی ہو... اپنی جگہ ایک چھوٹی سی ملکہ ہو۔ بے حد حسین ہو۔ اس کی شخصیت اک شعلۂ جوالا ہو جسے محض نظر سے چھونے پر بھی انسان اپنے آپ کو خاکستر ہوتا محسوس کرے۔ وہ کسی بھی لحاظ سے کوئی عام لڑکی نہ ہو۔ زندگی کے میدان میں میرے شانہ بہ شانہ نکلے تو بڑے سے بڑے خطرناک دشمن سے بھی ٹکرا سکے۔ گھر کی چار دیواری میں ہو تو اس کے دم سے گھر کے در و دیوار جگمگاتے ہوں۔ اس کی ہتھیلیوں پر رنگِ حنا نظر آتا ہو۔ اس کے رخساروں پر حیا کی شفق پھولتی ہو۔"

"تم تو نثر میں شاعری کر رہے ہو۔" وہ خفیف سا مسکرائی۔

"نوجوانی میں ہر انسان اپنے اندر خاموشی کی زبان میں شاعری کرتا ہے۔ یہ میرے اُس زمانے کے محسوسات ہیں۔" میں نے دھیمے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا "وہ ایک عجیب قسم کے خمار کا... پاگل پن کا دور ہوتا ہے۔ انسان بڑے مافوق الفطرت سے آئیڈیل تراشتا ہے اور پھر یقین بھی رکھتا ہے کہ وہ اسے زندگی کے کسی موڑ پر مل جائیں گے۔ مجھ میں پھر بھی کسی حد تک حقیقت پسندی کے جراثیم موجود تھے۔ مجھ پر یہ پاگل سوچیں صرف ایک دورے کی سی صورت میں حملہ آور ہوتی تھیں لیکن میں جلد ہی ان کے اثر سے نکل آتا تھا اور اپنے آپ پر ہنستا تھا۔ اپنا مضحکہ اُڑاتا تھا۔ آئینے کے سامنے کھڑا ہو جاتا تھا اور دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا کرتا تھا "گدھے کہیں کے! اپنی شکل دیکھی ہے؟ اپنی اوقات یاد ہے؟ ایسی لڑکیاں اوّل تو دنیا میں ہوتی نہیں ہیں اور اگر ہوتی بھی ہوں تو کیا وہ تجھ جیسے ہونق، مفلس اور بے حیثیت دیہاتی کے انتظار میں بیٹھی ہوں گی؟ اپنی ٹوٹی چپلیں... اپنی گھسی پٹی شلوار قمیص... اپنے بالوں پر جمی خاکِ آوارگی... اپنے چہرے سے جھلکتی مفلسی کی تھکن دیکھی ہے؟ جس قسم کی لڑکی کا پیکر تو اپنے خیالوں میں تراشتا ہے کیا وہ تجھ جیسے کسی چغد کی راہ دیکھتی ہوگی؟ میں یہ سوچتا اور میری اُمیدوں کے تمام بُت چھن چھن کرکے بکھر جاتے۔"

میرا گلا خشک ہوا جا رہا تھا۔ میرے سینے میں آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میں تھوک نگلنے کو ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ وہ سر اُٹھائے بدستور میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میں اسے کوئی نئی الف لیلہ سُنا رہا تھا۔ اب میرے سامنے اپنی داستانِ حیات کا وہ حصہ تھا جسے زرتاج کے علم میں لانا اور اس کا صحیح مفہوم سمجھانا میرے لئے ایک مشکل مرحلہ تھا۔

تاہم میں نے کسی نہ کسی طرح سلسلۂ کلام جوڑا "پھر زندگی کی ڈگر کچھ بدل گئی۔ مفلسی کے سائے کچھ ایسے گہرے نہ رہے۔ عمر کچھ بڑھی... غربت کچھ گھٹی... میں خاصا آسودہ حال ہو گیا۔ میرا کراچی آنا ہوا۔ یہاں ایک دولت مند فیملی رہتی تھی جو اتفاقاً ہی میرے زیرِ احسان آگئی تھی گو کہ میں اس احسان کو احسان نہیں سمجھتا تھا۔ میں تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ تفصیلات سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہوگی اور یہ تفصیلات میں جانے کا موقع بھی نہیں ہے۔ مختصراً قصہ بس اتنا ہے کہ اس فیملی میں ایک لڑکی سے میری ملاقات ہوئی....."

لفظ "لڑکی" سُنتے ہی اس کے چہرے کی رنگت متغیر سی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا خوف جھلک آیا۔ سرسراتی سی آواز میں وہ بولی "اور اس لڑکی سے تمہیں عشق ہو گیا ہوگا؟"

"عشق شاید بے سبب نہیں ہوا تھا۔" میں نے کہا "میں جس آئیڈیل کے سحر میں گرفتار تھا وہ بڑی حد تک اس کا عکس تھی۔ وہ تم جیسی نہیں تھی لیکن تمہاری بہت سی خصوصیات اس میں پائی جاتی تھیں۔ وہ میرا نوجوانی کا دور تھا۔ مجھے وہی اپنا آئیڈیل لگی اور میرے دل میں اسی کی تصویر نقش ہو گئی۔ ذہن اور حواس پر وہی چھا گئی اور کچھ اس طرح چھا گئی کہ پھر کبھی اس کا تصور ذہن سے نکلا ہی نہیں... حالانکہ اس کے بعد زندگی میں کئی موڑ ایسے آئے جب مجھے اس کو بھول جانا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ اس کی شادی بھی دوسری جگہ ہو گئی۔ اس نے کسی کو یہ بھی بتایا کہ وہ تو دراصل مجھ سے دل لگی کر رہی تھی، اسے مجھ سے عشق وشق کچھ نہیں تھا پھر اس فیملی پر زوال آگیا۔ لڑکی کو شادی کے کچھ عرصے بعد ہی طلاق ہو گئی۔ ایک طویل عرصے بعد ایک چھوٹے سے فلیٹ میں اس سے ملاقات ہوئی۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ میں اس کے پاس آ رہا تھا لیکن جب میں وہاں پہنچا تو وہ میری تصویر سینے سے لگائے رو

رہی تھی۔ اسے احساس ہو چکا تھا کہ دھوکا اس نے مجھے نہیں، اپنے آپ کو دیا تھا۔ درحقیقت وہ مجھ سے محبت کرتی تھی۔"

میں گہری سانس لے کر ذرا خاموش ہوا تو وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "خاصی افسانوی سی داستان ہے۔"

"افسانہ تو مفت میں بدنام ہے۔ انسان کی زندگی ہر دور میں افسانے سے زیادہ افسانوی رہی ہے۔" میں نے کہا "بہرحال اب یہ کہانی ایک عجیب ڈگر پر ہے۔ وہ لڑکی خود اذیتی میں مبتلا ہے۔ اپنے آپ کو سزا دے رہی ہے۔ میں نے اسے معاف کر دیا ہے لیکن وہ خود کو معاف نہیں کرتی۔ وہ مجھ سے شادی کے لئے تیار نہیں ہوتی اور نہ ہی خود کسی اور سے شادی کرتی ہے۔ شادی کرنا تو دور کی بات... وہ کسی اور مرد کی طرف دلچسپی کی نظر سے دیکھتی تک نہیں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ذہن پر جو نقش بن چکا ہے وہ مٹتا نہیں۔ میں اس کی طلب سے آزاد نہیں ہوتا۔"

اس نے میرے ہاتھ نہایت آہستگی سے اپنے کندھوں سے ہٹا دئے اور اسی طرح خواب کے سے عالم میں نہایت آہستگی سے چلتی ہوئی ایک کرسی تک پہنچی۔ وہ کچھ اس طرح کرسی پر بیٹھ گئی گویا اب اس کی ٹانگوں میں بھی اپنا وزن سہارنے کی طاقت نہ رہی ہو۔ اس کا سر پژمردگی سے جھکا ہوا تھا۔ میں اس کے قریب ہی جا کھڑا ہوا۔ میری آنکھیں سُلگ رہی تھیں۔

ایک طویل لمحے کے بعد اس نے سر اُٹھا کر میری طرف دیکھا اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی "اب تم زندگی یونہی گزار دو گے؟"

"مجھے معلوم نہیں" میں نے بے بسی سے کہا "کل کیا ہو...... کون کیا کر گزرے۔ اس سلسلے میں کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ میں ایک موہوم سی اُمید کا قیدی ہوں جسے شاید اُمید کہنا بھی غلط ہے۔ ایک لاحاصل انتظار میں مبتلا ہوں جو شاید کسی کی نظر میں انتظار بھی نہیں، محض ایک حماقت ہو۔"

"اس کا مطلب ہے میں نے ایک سراب کا تعاقب کیا تھا!" وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

میں اس کے قریب بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس کا ہاتھ تھام کر اپنی سُلگتی آنکھوں سے لگانا چاہتا تھا لیکن میں ایسا نہیں کر سکا۔ میں صرف ایک مجرم کی طرح اس کے قریب کھڑا رہا پھر میں نے آہستگی سے کہا "بعض نہایت سادہ سے شعر کتنے پُراثر... کتنے بامعنی اور کیسے حسبِ حال لگتے ہیں۔" میں نے خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی "یہ بات میں کہہ رہا ہوں حالانکہ میں شعر و ادب کا کوئی خاص ذوق رکھنے والا شخص نہیں ہوں۔"

"مثلاً.....؟" اس نے پلکیں جھپکائے بغیر پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ.....

زندگی سے یہی گلہ ہے مجھے
تو بہت دیر سے ملا ہے مجھے

میرے حال کی تشریح ان سے بہتر الفاظ میں نہیں ہو سکتی۔ وہ جو ایک لڑکی میرا آئیڈیل ہوا کرتی تھی، وہ شاید تم ہی تھیں لیکن جب تم نہیں ملیں اور تم سے ملتے جلتے اوصاف رکھنے والی ایک لڑکی سامنے آئی تو دل نے اسی کو سب کچھ سمجھ لیا۔ ویسے بھی اس وقت تک یہ بات عقل میں آچکی تھی کہ آئیڈیل اپنی مکمل شکل میں نہیں ملا کرتے۔ اب میں کچھ ایسا محسوس کرتا ہوں جیسے میرے دل کا اس لڑکی سے کوئی وعدہ ہے۔ میری اس سے کوئی کمٹ منٹ ہے۔ میں اپنے آپ کو اس کا انتظار کرنے پر مجبور پاتا ہوں۔"

"خواہ یہ انتظار، انتظار ہی رہے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں... خواہ یہ انتظار، انتظار ہی رہے۔" میں نے غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا۔

"افضل چوہدری! تم واقعی خوابوں کی دنیا کے آدمی ہو۔" وہ طویل سانس لے کر تھکے تھکے لہجے میں بولی "یقین نہیں آتا کہ میں کھلی آنکھوں سے تمہیں دیکھ رہی ہوں اور آج کے دور میں تم سے بات کر رہی ہوں لیکن ساتھ ہی میں یہ بھی کہوں گی کہ جب تم نہایت مفلوک الحالی میں پہلی بار میرے سامنے آئے تھے اور تم نے گھوڑے سدھانے کا کام سنبھالا تھا، مجھے تب ہی احساس ہو گیا تھا کہ تم خوابوں کی دنیا کے آدمی ہو اور مجھے شاید خوابوں ہی کی دنیا کے کسی شخص کی تلاش تھی جس کی وجہ سے آج میں یہاں تک آئی ہوں۔"

وہ ہوا میں کسی غیر مرئی چیز کو دیکھتے ہوئے مسکرائی "کیسی عجیب بات ہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کی تلاش تھی۔ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پا بھی لیا مگر اس خوش قسمتی کے باوجود ہم ایک نہیں ہو سکتے کیونکہ بیچ میں ایک لاحاصل عشق آن کھڑا ہوا ہے لیکن خیر.... کوئی بات نہیں... تم اگر مرد ہو کر نامعلوم مدت تک انتظار کر سکتے ہو تو میں عورت ہو کر انتظار کیوں نہیں کر سکتی۔ عورت تو ویسے بھی شاید انتظار ہی کا دوسرا نام ہے۔ تم اس لڑکی کی "ہاں" کا انتظار کرو۔ میں تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ دیکھتے ہیں کس کو کس کی رفاقت نصیب ہوتی ہے۔" اس کے لہجے میں ایک ایسے عزم کی جھلک تھی جس نے مجھے خوف زدہ کر دیا۔

میں نے ہڑبڑا کر ایک بار پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اب اس کے وجود میں پہلے کی طرح ارتعاش نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر ایک مضبوط چٹان کا روپ دھار رہی تھی۔

"دیکھو.... میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم اپنی زندگی خراب کرو... اسے بنجر بناؤ۔ اس کی خوب صورتیوں اور لذتوں سے محروم رہو۔ میں اپنے آپ کو تمہارا مجرم محسوس کروں گا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"تمہارے پاس اس کا کیا حل ہے؟" اس نے گہری نظر سے میری طرف دیکھا۔ اب اس کا لہجہ سرد مہری کی حد تک پُرسکون تھا۔

"وہ... رحیم گل...." میں نے تھوک نگلا "وہ شاید تمہارے لئے زندگی تج دے گا۔ تمہارے انتظار میں برباد ہو جائے گا۔"

"ہم سب کو ایک دوسرے کے انتظار میں برباد ہو جانے دو۔ ہماری طرح عشق کرنے والوں کا یہی انجام ہوتا ہے۔" وہ خود استہزائی کے انداز میں ہنس کر بولی "میں بھلا اس کے لئے کیا کر سکتی ہوں؟"

"میں کہہ تو چکا ہوں۔ تم اس سے شادی کرادو۔" میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

"بے ہودہ بات مت کرو۔ تم نے دیوانوں والا عشق کیا ہے۔ مجھ جیسے تجربے سے گزر چکے ہو۔ کم از کم تم تو مجھے ایسا مشورہ مت دو۔ ہم جیسے لوگ محض شادی برائے شادی نہیں کر سکتے۔ ہمارے نزدیک یہ بھی دل کا معاملہ ہے اور دل کا معاملہ بجلی کے تاروں کی طرح تو نہیں ہے نا کہ اس ساکٹ میں کرنٹ نہیں ہے تو دوسرے ساکٹ میں پلگ لگا دو۔ دل کی تاریں تو اسی ساکٹ سے جا کر جڑیں گی جو خاص طور پر اسی کے لئے بنا ہے اور وہیں سے اس کو زندگی کا کرنٹ ملے گا۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "رحیم گل ایک عام آدمی ہے لیکن اسے بھی انتظار کی آگ میں جلنے دو۔ اگر وہ ثابت قدم رہا تو شاید وہ بھی خاص آدمی بن جائے۔ شاید اس کی بھی سمجھ میں آجائے کہ عشق درحقیقت کیا ہوتا ہے۔ شاید اسے بھی معلوم ہو جائے کہ خود سوختگی کی لذت کیا ہوتی ہے۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے سر کو خفیف سا جھٹکا دیا پھر اپنے ریشمی چمکیلے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی "اچھا چھوڑو... ان بڑی بڑی اور گہری باتوں کو تو رہنے دو۔ تم مجھے ایک چھوٹی اور سطحی سی بات بتا دو۔ میں شاید اس لمحے خود کو ایک اسکول گرل محسوس کر رہی ہوں اور تم سے ویسا ہی ایک سوال پوچھنا چاہتی ہوں جو کوئی پندرہ سولہ سال کی اسکول گرل چوری چوری اپنی طرف دیکھنے والے کسی لڑکے سے پوچھ سکتی ہے۔"

"کیسا سوال؟"

"یہی... کہ کیا میں تمہیں اچھی لگتی ہوں؟"

"اس سوال کا جواب شاید کوئی نوخیز لڑکا نہایت آسانی سے دے جاتا لیکن میرے پاس اس کا جواب دینے کے لئے موزوں الفاظ نہیں ہیں کیونکہ میں تمہیں بتا نہیں سکتا کہ تم مجھے کتنی اچھی لگتی ہو۔ یہ جان کر خود میری نظر میں اپنی قدر و قیمت نہ جانے کتنی بڑھ گئی ہے کہ تم جیسی لڑکی مجھے محبت کے قابل سمجھ سکتی ہے۔"

"بس... اب انکساری چھوڑو..." وہ اپنے مرمریں ہاتھ کو خفیف سا جھٹکا دے کر بولی "اب تم مجھے صرف اس لڑکی کا نام بتا دو جس کے انتظار کی سولی پر تم مصلوب ہو؟"

"اس کا نام.....؟" مجھے یکدم ہی کمرے میں گھٹن محسوس ہونے لگی۔ میں نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرلی۔ میں کہنا چاہتا تھا کہ میں اس لڑکی کا نام اسے نہیں بتا سکتا لیکن یہ کہنے کی ہمت میں اپنے اندر نہیں پا رہا تھا۔ مجھے یہ کہنے کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ وہ جو کچھ دیر پہلے میں نے کہا تھا کہ زندگی افسانے سے زیادہ افسانوی چیز

ہے وہ یقیناً غلط نہیں تھا۔

عین اس لمحے جب راحیلہ کا نام میری زبان پر اٹکا ہوا تھا اور میں پوری کوشش کر رہا تھا کہ زرتاج کے سامنے وہ نام میری زبان سے پھسل نہ جائے' دروازہ نہایت آہستگی سے کھلا اور ایک سیاہ پوش نے اندر قدم رکھا۔

وہ راحیلہ تھی!

مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ عین اسی لمحے اس کا پہنچنا کس طرح ممکن تھا؟ اسے اس وقت اسلام آباد یا لاہور میں ہونا چاہئے تھا۔ اس نے اپنی آمد کی اطلاع بھی نہیں دی تھی۔ میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ گو مجھے احساس تھا کہ میں اس وقت کرسی پر بیٹھی زرتاج کے قریب کھڑا تھا اور میرا ہاتھ اس کے کندھے پر تھا لیکن میں اپنی جگہ سے حرکت ہی نہ کر سکا۔ اپنا ہاتھ بھی اس کے کندھے سے نہ ہٹا سکا۔

راحیلہ اپنے مخصوص حلیے میں تھی۔ یعنی ایک نفیس قسم کا سیاہ برقع' آنکھوں پر بڑا سا تاریک چشمہ..... اور چہرے کا باقی حصہ بھی سیاہ نقاب میں لپٹا ہوا۔

وہ میری میز کے سامنے پہنچ کر ایک لمحے کے لئے کھڑی رہی۔ میں اسے بیٹھنے کے لئے بھی نہ کہہ سکا۔ میں ابھی تک بے یقینی کی دھند سے باہر نہیں آسکا تھا۔ مجھے شبہ تھا کہ میرا تخیل میرے ساتھ شرارت کر رہا تھا۔ میں نے ابھی راحیلہ کے بارے میں سوچا تھا اور بہت شدت سے سوچا تھا۔ میں جب بھی اس کے بارے میں سوچتا تھا' شدت سے ہی سوچتا تھا۔ شاید یہ سوچ کی شدت ہی کی کوئی کرشمہ سازی تھی کہ میں راحیلہ کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ رہا تھا۔ یہ محض میری نظر کا دھوکا تھا!

آخر کار نقاب کے نیچے سے راحیلہ کی مدھم آواز ابھری "میں

شاید غلط وقت پر آگئی۔ مجھے اطلاع دے کر آنا چاہئے تھا۔ معافی چاہتی ہوں۔ میں پھر کسی وقت آجاؤں گی۔"

اس کا لہجہ پُروقار تھا اور پُروقار انداز میں ہی وہ واپس جانے کے لئے مڑی۔ تب مجھے یقین کرنا پڑا کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا تھا اور نہ ہی وہ میرے تخیل کی کرشمہ سازی تھی۔

"رک جاؤ راحیلہ!" میں نے زرتاج کے کندھے سے ہاتھ ہٹا کر اپنی کرسی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "تمہارے آنے کا اس سے زیادہ صحیح وقت شاید کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ تاہم اس وقت تمہاری آمد میرے لئے حیران کن ضرور رہی ہے۔"

میں اپنی کرسی پر تقریباً ڈھیر ہو گیا۔ زرتاج اپنی جگہ ساکت بیٹھی تھی اور دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسائے ایک ٹک راحیلہ کی طرف دیکھ رہی تھی۔ راحیلہ نہایت آہستگی سے گھومی۔ تاریک چشمے کی وجہ سے یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کس طرف دیکھ رہی تھی لیکن اس کا رُخ میری طرف تھا۔ زرتاج کو اس نے گویا بالکل نظرانداز کر دیا تھا۔ زرتاج بالکل پُرسکون بیٹھی تھی۔ اس نے کسی قسم کی کھسیاہٹ' گھبراہٹ یا اضطراب کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔

"کیا میں واقعی رُک جاؤں؟" راحیلہ کی دھیمی آواز ابھری۔

"ہاں۔ اس میں اتنے پراسرار لہجے میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟" میں اب جھٹکے سے سنبھل چکا تھا۔ میں نے اسے اپنے مقابل بیٹھنے کا اشارہ کیا جبکہ زرتاج میرے دائیں ہاتھ پر تھی۔

"کیا میں واقعی بیٹھ جاؤں؟" راحیلہ کے لہجے میں طنز ہرگز نہیں تھا۔ وہ بڑے شیریں لہجے میں بول رہی تھی مگر طنز کے اظہار کے لئے یہ الفاظ ہی کافی تھے۔

"ہاں بیٹھ جاؤ۔" میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "اور اگر تمہیں بیٹھنے کی عادت نہیں ہے تو چمگادڑ کی طرح چھت میں اُلٹی لٹک جاؤ۔"

یہ وہ اصل لہجہ تھا جس میں ہم اکثر ایک دوسرے سے بات کرنے کے عادی تھے۔ خلافِ توقع اس نے مجھے کوئی منہ توڑ جواب دینے کی کوشش نہیں کی اور خاموشی سے بیٹھ گئی۔ عام حالات میں وہ کسی کی موجودگی میں اپنے چہرے سے نقاب نہیں ہٹاتی تھی۔ خصوصاً کسی اجنبی کی موجودگی میں تو وہ بہت ہی محتاط رہتی تھی کہ وہ اس کے چہرے کی جھلک نہ دیکھ پائے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ کسی قسم کے احساسِ کمتری میں مبتلا تھی بلکہ وہ محض اس لئے یہ احتیاط کرتی تھی کہ کوئی اس کا چہرہ دیکھ کر حیرت میں مبتلا نہ ہو جائے اور اُلٹے سیدھے سوالات نہ کرنے لگے لیکن اس وقت اس نے نہایت اطمینان سے نہ صرف نقاب پورے چہرے سے ہٹا دیا بلکہ تاریک چشمہ بھی اُتار کر میز پر رکھ دیا اور کرسی کے پشتے سے ٹیک لگا کر میری طرف.... دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔ شاید وہ مجھے بتانا چاہتی تھی کہ وہ ایک غیر معمولی طور پر خوب صورت لڑکی کو بھی

میرے پاس دیکھ کر احساسِ کمتری یا حسد و رقابت کا شکار نہیں تھی۔ حالانکہ اسے یہ جتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے ایک نظر زرتاج کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ایک ہی خدا کی بندی تھی۔ راحیلہ کا عجوبۂ روزگار چہرہ دیکھ کر بھی اس کے چہرے پر حیرت کا خفیف سا تاثر بھی نہیں اُبھرا تھا۔ وہ بس گہری نظر سے اس کا جائزہ لئے جا رہی تھی۔ اس کی نظر مشاہداتی تھی لیکن اس کا ذہن شاید راحیلہ کے چہرے سے زیادہ اس سوال میں اُلجھا ہوا تھا کہ وہ کون تھی... اس کے اور میرے تعلق کی نوعیت کیا تھی؟ اس کے خیال میں شاید راحیلہ کے چہرے کے بارے میں جاننے سے زیادہ ان سوالوں کا جواب حاصل کرنا اہم تھا۔

"یہ تم اچانک کیسے نازل ہو گئیں؟ کیا تمہیں ٹیلی پیتھی کے ذریعے کوئی اشارہ موصول ہوا تھا؟" میں نے پوچھا۔ میں بہت سخت جذباتی کشیدگی سے گزرا تھا اور ابھی مکمل طور پر اس سے آزاد نہیں ہوا تھا لیکن میں ماحول کے بوجھل پن کو کم کرنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا۔

"مجھے اپنے اچانک نازل ہونے پر بہت افسوس ہے۔" راحیلہ گہری سنجیدگی سے بولی "لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ نفیس صاحب نے اچانک مجھے حکم دیا۔ ٹیلی فون کرنے کی بھی مہلت نہیں دی۔ مجھے آنا پڑا۔ ایک فلائٹ تیار تھی۔ یوں سمجھو کہ مجھے گرتے پڑتے وہ پکڑنی پڑی۔"

"اتنی وضاحتیں کرنے اور اپنے اچانک آنے پر اتنی صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تو یکایک بہت ہی مہذب نظر آنے لگی ہو۔ کیا لکھنوی تہذیب سے تمہارا کوئی تعلق نکل آیا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تہذیب تو شاید مجھے کسی بھی علاقے کی چھو کر نہیں گزری لیکن میں بہرحال انسان ہوں اور ابھی میں زمانہ غار تک واپس نہیں پہنچی۔ اس لئے کچھ باتوں کا خیال تو رکھنا پڑتا ہے۔" راحیلہ شائستگی سے بولی۔

زرتاج شاید اب تک صرف تجسس سے مجبور ہو کر وہاں بیٹھی رہی تھی ورنہ یوں چند لمحے تک بھی دو افراد کا اسے نظرانداز کر کے باتیں کئے جانا یقیناً اس کے لئے ناقابلِ برداشت ہوتا۔ اب شاید اس نے تجسس کو بھی ذہن سے جھٹک دیا اور اچانک ہی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا افضل.....! میں اب چلتی ہوں۔" وہ پُرسکون لہجے میں بولی۔

"نہیں تم کہیں نہیں جا رہی ہو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔" میں نے بارعب لہجے میں کہا۔ زرتاج نے میرا مان رکھ لیا۔ وہ مہربانہ سے انداز میں مسکرائی اور دوبارہ بیٹھ گئی۔

میں نے راحیلہ کو مخاطب کیا "میں جب ریڈ ڈاٹ سے منہ چھپا کر یا یوں کہو کہ خواہ مخواہ ہی منہ اُٹھا کر ادھر اُدھر دوڑا پھر رہا تھا اور

نہ جانے کہاں کہاں جا پہنچا تھا۔ اس دوران میری ملاقات ایک زمیندار خاتون سے ہوئی تھی۔ میں نے تم سے ان کا تذکرہ کیا تھا۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔" راحیلہ نے اثبات میں سرہلایا اور مسکراتے ہوئے زرتاج کی طرف دیکھا "میں سمجھ گئی۔ یہ یقیناً زرتاج نگر کی زرتاج ہیں۔" اس نے ذرا آگے جھک کر میز کے اوپر سے مصافحے کے لئے زرتاج کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

زرتاج نے کرسی پر ذرا آگے کھسک کر اس کا ہاتھ تو تھام لیا لیکن میری طرف دیکھ کر بھویں اُچکاتے ہوئے بولی "کاش میں بھی کسی اشارے کی مدد سے ان خاتون کو پہچان سکتی۔"

"تم انہیں کسی اشارے کی مدد سے بھی نہیں پہچان سکتی تھیں کیونکہ تمہارے سامنے کبھی ان کا ذکر نہیں ہوا۔" میں نے کہا "یہ میری تم سے بھی بڑی محسن اور مہرباں ہیں۔ ان دوستوں میں سے ایک ہیں جو زندگی کا حاصل ہوتے ہیں۔ میں اپنی دولت کو کوئی قابلِ ذکر چیز نہیں سمجھتا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ میں نے زندگی میں کیا کمایا تو میں یہی کہوں گا کہ میں نے چند دوست کمائے ہیں۔ دولت تو دنیا میں بہت سے لوگ کماتے ہیں لیکن جو جتنی زیادہ دولت کماتا ہے عام طور پر وہ اتنا ہی تنہا ہوتا ہے۔ اس کے گرد لوگوں کا ایک ہجوم ہوتا ہے مگر وہ سب اس کے ساتھ کسی نہ کسی غرض کی ڈور سے بندھے ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ جو لوگ ہیں وہ کسی غرض کی ڈور سے نہیں بندھے ہیں۔"

راحیلہ کا ہاتھ بدستور زرتاج کے ہاتھ میں تھا۔ دونوں خواتین بظاہر ریشم.... مگر درحقیقت فولاد تھیں۔ اس وقت گویا فولاد، فولاد کی گرفت میں تھا۔

زرتاج میری طرف دیکھتے ہوئے اور عجیب مشفقانہ سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "تم نے اتنی لمبی تقریر کردی لیکن خاتون کا نام نہیں بتایا۔ ویسے میں سُن چکی ہوں۔ تم نے انہیں راحیلہ کے نام سے مخاطب کیا تھا۔ درست ہے نا؟"

"ہاں ان کا نام راحیلہ ہی ہے۔" پھر میں نے راحیلہ کو چھیڑنے کے لئے کہا "بڑا دقیانوسی سا نام ہے اور یہ خود بھی اس وقت تمہیں دقیانوسی ہی لگ رہی ہوں گی۔"

"نہیں" زرتاج کی نظر راحیلہ کے چہرے پر گڑ گئی "میں ظاہری چیزوں سے دھوکا کھانے والی نہیں ہوں۔" وہ راحیلہ کا چہرہ دیکھ کر نہ تو چونکی تھی، نہ حیرت زدہ نظر آئی تھی اور نہ ہی اس نے اس سلسلے میں کوئی سوال کیا تھا۔ تاہم اس نے آہستگی سے راحیلہ کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔

راحیلہ گویا زرتاج کی غلط فہمی دور کرنے کی غرض سے بولی "آپ افضل کی باتوں پر مت جایئے گا۔ یہ خوش فہم انسان ہے۔ ہر چیز کے بارے میں خوش فہمی میں رہتا ہے۔ ہم کچھ لوگ اس کے دوست ضرور ہیں مگر کچھ ایسے زیادہ جاں نثار بھی نہیں ہیں۔ ہم بھی

اس کے ساتھ کسی نہ کسی غرض کی ڈور سے بندھے ہوئے ہیں۔ ہم اسے مروانے کی بھی حسبِ توفیق کوشش کرتے رہتے ہیں مگر یہ بڑا خوش قسمت ہے ہر بار بچ جاتا ہے۔"

زرتاج ایک بار پھر اسی مربیانہ انداز میں دھیرے سے ہنس دی گویا کسی بچے نے اس سے مذاق کیا ہو اور وہ اس مذاق کی حقیقت کو خوب سمجھتی ہو۔ تاہم اس نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ راحیلہ کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

زرتاج ایک بار پھر اُٹھتے ہوئے بولی "بھئی اب تو میں واقعی جارہی ہوں۔ مجھے کچھ ٹیلی فون کالز کرنی ہیں۔ تم بھی اطمینان سے بات چیت کرو۔ فارغ وقت میں پھر ملاقات رہے گی۔ بلکہ ہوسکے تو تم اور راحیلہ رات کا کھانا میرے ساتھ کھاؤ۔ ہوٹل تمہارا سہی لیکن میزبانی کا موقع مجھے دے دو۔"

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، راحیلہ بولی "میں آپ کی اس محبت اور نوازش کے لئے بے حد شکر گزار ہوں لیکن اس لئے معذرت چاہوں گی کہ میں بہت کم وقت کے لئے کراچی آئی ہوں اور مجھے بہت سے کام نمٹانے ہیں۔ رسمی انداز میں اطمینان سے بیٹھ کر کھانا کھانے کا موقع مجھے شاید ہی مل سکے۔ مجھے آج رات ہی بارہ بجے کی فلائٹ سے واپس جانا ہے۔"

"اوہ" زرتاج نے کسی خاص افسوس کے بغیر کہا "خیر زندگی رہی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔ تب شاید آپ کے پاس وقت بھی ہو پھر ضرور ساتھ بیٹھیں گے اور ایک دوسرے کے بارے میں جاننے کی کوشش کریں گے۔"

"ضرور.... ضرور" راحیلہ نے سرہلایا۔ اس بار اس کا انداز بزرگانہ تھا۔ دونوں نے ایک بار پھر مضبوطی سے مصافحہ کیا اور زرتاج رخصت ہوگئی۔

راحیلہ ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ لئے چند لمحے خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی پھر سنجیدگی سے بولی "مجھے واقعی بڑا افسوس ہے، تم نہ جانے کتنی محنت سے لڑکی پر ڈورے ڈال رہے

تھے۔ میں نے بیچ میں آکر رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔"

"لفنگوں والی گفتگو مت کرو۔ میں نے آج تک کسی لڑکی پر ڈورے نہیں ڈالے۔" میں نے کہا۔

"ہاں" راحیلہ گویا تصحیح کرتے ہوئے بولی "تمہیں ڈورے ڈالنے کی ضرورت ہی کہاں پڑتی ہے۔ لڑکیاں بے چاری خود ہی کچی ڈورے بندھی، کھنچی چلی آتی ہیں۔"

"اب میں ایسا ہیرو بھی نہیں ہوں۔ تم کیوں ہر وقت مجھے چلبے بوائے بنانے پر تلی رہتی ہو؟" میں نے ملامت سے پوچھا۔

"مجھے بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ تم تو بنے بنائے ہو۔ بلکہ تم تو ہیرو اور پلے بوائے سے بھی بڑھ کر کوئی چیز ہو۔" وہ کندھے اُچکا کر بولی۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا "تمہاری سوئی اسی ریکارڈ پر اٹکی رہتی ہے۔ میں زرتاج پر ڈورے نہیں ڈال رہا تھا بلکہ ایک بہت اُلجھی ہوئی ڈور کو سلجھانے کی کوشش کررہا تھا جو ڈورے ڈالنے سے زیادہ مشکل کام ہے۔ ویسے بھی زرتاج اتنی معمولی لڑکی نہیں ہے کہ اس پر ڈورے ڈالنے جیسی عامیانہ حرکت کی جاسکے۔"

"وہ تو خیر میں نے دیکھ لیا ہے۔ خاصی "ملکۂ عالم" قسم کی چیز ہے لیکن ڈورے تو بہرحال ملکہ پر بھی ڈالے جاسکتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ اس کے معاملے میں ذرا سلیقہ درکار ہوتا ہے اور اپنی اوقات بھی دیکھنی ہوتی ہے۔"

"میرا خیال ہے اس وقت تمہاری بکواس کرنے کی صلاحیت کچھ زیادہ ہی بیدار ہے اس لئے اس موضوع کو یہیں چھوڑتے ہیں۔ ضرورت پڑی تو اس پر پھر کبھی بات کریں گے۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ نفیس صاحب نے تمہیں اچانک کیوں یہاں بھیجا ہے اور کیا واقعی تم اتنی افراتفری میں یہاں آئی ہو کہ مجھے اطلاع تک نہیں دے سکتی تھیں؟"

"نہیں... کچھ ایسی افراتفری بھی نہیں تھی۔" وہ اطمینان سے بولی "میں چاہتی تو اطلاع دے بھی سکتی تھی۔ اسلام آباد سے نہ دیتی تو یہاں پہنچ کر اطلاع دے سکتی تھی لیکن میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتی تھی۔"

"سرپرائز تو واقعی تم نے دیا... اور بہت زبردست دیا۔" میں نے سرہلایا۔

"اچھا؟" اس نے معصومیت سے آنکھیں پھیلائیں "میرے خیال میں تو مجھے یہاں پہنچ کر سرپرائز ملا ہے۔" پھر وہ سرجھٹک کر بولی "خیر ان باتوں سے قطع نظر.... لڑکی اچھی ہے۔ میری مانو تو اب یکسو ہوجاؤ اور اگر وہ رضامند ہے تو شادی کرڈالو۔"

"ہاں اب تو میں بھی یہی سوچ رہا ہوں لیکن اس سلسلے میں مجھے تمہارے مشورے کی ضرورت نہیں ہے کم از کم یہ کام تو میں تمہارے مشورے کے بغیر کسی روز اچانک کرگزروں گا۔ میں نے تم سے سوال کچھ اور کیا تھا۔"

"نفیس صاحب نے مجھے تمہاری وجہ سے یہاں بھیجا ہے۔" اس نے میرے سوال کا جواب کچھ اس طرح دیا کہ میرے لئے اور بہت سے سوالات کا دروازہ کھل گیا۔

"میری وجہ سے؟" میں نے حیرت سے کہا "میں نے کیا کیا ہے؟"

"تم کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی رہتے ہو۔ اگر ارادتاً نہیں کرتے تو تم سے سرزد ہوجاتا ہے۔" وہ مسکرائی "اب تمہاری وجہ سے یہاں جزیرے پر قاسم بجلی کے دونوں بیٹے اور منشیات کا بہت بڑا اسٹاک پکڑا گیا ہے۔ قاسم بجلی ڈرگ مافیا کے اُن خاص مقامی آدمیوں میں سے ایک تھا جن پر مرکزی حکومت ایک عرصے سے ہاتھ ڈالنا چاہتی تھی لیکن جب بھی اس پر ہاتھ ڈالا گیا، ہمارے بے ہودہ سرکاری طریقۂ کار اور کرپٹ افسروں کی وجہ سے وہ کبھی مضبوط گرفت میں نہیں آسکا۔ اس پر ہمیشہ کچا ہاتھ ہی پڑا اور وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکل گیا حالانکہ نارکوٹکس بورڈ کی ایک خاص فہرست میں اس کا نام شامل تھا۔ اس کے مرنے پر شاید کئی محکموں کے کئی افسروں نے سکھ کی سانس لی تھی گوکہ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ قاسم بجلی کے مرنے سے ڈرگ مافیا کو کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا کیونکہ اس کے دونوں بیٹے اس کے جانشین تھے اور اس کی زندگی میں بھی بیشتر کاروبار وہی چلا رہے تھے لیکن وہ زیادہ تر ملک سے باہر رہتے تھے۔ کچھ دیانت دار لیکن کام چور افسروں کو اُمید تھی کہ باپ کی موت کے بعد وہ دونوں پاکستان آنے کی زحمت ہی نہیں کریں گے لیکن وہ نہ صرف آگئے بلکہ تمہاری وجہ سے پکڑے بھی گئے۔ اس قسم کی بعض بڑی مچھلیوں کو حکومت بادلِ نخواستہ پکڑ تو لیتی ہے لیکن اس کی حالت یہی رہتی ہے گویا کوئی ناگہانی مصیبت اس کے گلے پڑ گئی ہو۔ آئندہ پالیسی یہ رہے گی کہ اس طرح کے بیشتر لوگوں کو امریکا کے سپرد کرکے جان چھڑانے کی کوشش کی جائے گی۔ اس قسم کے معاملات کو وفاقی حکومت خود ہینڈل کررہی ہے اس لئے راحیل اور شرجیل کو بھی فوری طور پر ایک خصوصی طیارے کے ذریعے اسلام آباد پہنچادیا گیا ہے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی پھر پہلو بدلتے ہوئے بولی "ان سے تفتیش سے اندازہ ہوا ہے اور کچھ دوسرے ذرائع سے بھی خبر ملی ہے کہ ڈرگ مافیا جزیرے پر گڑبڑ کرانے کی کوشش کرے گی۔ جزیرے کی صورتِ حال کو خراب کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ جزیرے کے آس پاس کچھ اہم دفاعی تنصیبات بھی موجود ہیں۔" وہ خاموش ہوگئی۔

"میں اب بھی نہیں سمجھ سکا کہ تم اس سلسلے میں کیا کروگی؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ اطمینان سے بولی "میں بھلا اس سلسلے میں کیا کرسکتی ہوں۔ میں تو اس وقت صرف کوریئر... یعنی قاصد یا پیامبر کے فرائض انجام دے رہی ہوں۔"

اس نے میز پر رکھے ہوئے اپنے خوب صورت چرمی بریف

کیس کی طرف اشارہ کیا جو کچھ زیادہ ہی بریف تھا اور سرسری نظر میں بریف کیس کے بجائے لیڈیز پرس معلوم ہوتا تھا "اس میں کچھ افسروں کے لئے کچھ ضروری ہدایات ہیں اور کچھ افسروں کے فوری تبادلے کے احکامات ہیں۔"

"اس سے کیا ہوگا؟" میں نے جاننا چاہا۔

"یہ تو نفیس صاحب ہی بہتر جانتے ہوں گے۔" وہ کندھے اُچکا کر بولی "بہرحال میرے خیال میں اس سے جزیرے کی صورتِ حال کو کنٹرول میں رکھنے اور دفاعی تنصیبات کو کسی متوقع خطرے سے بچانے میں مدد ملے گی۔"

"نفیس صاحب کو اس کام کے لئے کوئی اور آدمی نہیں ملا تھا؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا "یا وہ کسی اور ذریعے سے یہ کاغذات نہیں بھجوا سکتے تھے؟"

"بھجوا تو سکتے ہوں گے' آدمیوں کی ان کے پاس کیا کمی ہے اور طریقے بھی بہت سے ہوسکتے تھے لیکن انہوں نے مجھے بھیجنے میں ہی مصلحت سمجھی ہوگی۔ ہم فی الحال ان کے چیلے بنے ہوئے ہیں۔ میں اس قسم کے چھوٹے موٹے کاموں سے انکار بھی نہیں کرسکتی۔ ویسے بھی خیر یہ ملکی مفادات کے سلسلے کی ایک خدمت تھی۔ ہمیں اس قسم کے کاموں سے انکار کرنا بھی نہیں چاہئے۔" راحیلہ بولی۔

"وہ تو ٹھیک ہے۔ جب ان لوگوں کو کوئی مجبوری لاحق ہو تب تو ان کے کام آنے میں کوئی حرج نہیں۔ نفیس صاحب واقعی اچھے آدمی ہیں۔ وہ خود... اور ان کے اردگرد جو آدمی موجود ہیں وہ دیانت دار ہیں کرپٹ نہیں ہیں۔ ملکی مفادات کے لئے اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق بے لوث طریقے سے کام کررہے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود اب میں ان لوگوں سے تعلق داری میں محتاط ہونا چاہتا ہوں۔ میرے خیال میں انہیں بھی تقریباً انہی لوگوں میں شمار کیا جاسکتا ہے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی نہ دوستی اچھی' نہ دشمنی اچھی۔"

میں نے ایک لمحے توقف کیا۔ راحیلہ خاموش رہی تو میں نے سلسلۂ کلام جوڑا "ریڈ ڈاٹ والا مسئلہ تقریباً حل ہوچکا ہے صرف ڈاکٹر برنارڈ اور آسیبی آنکھوں والی اس عورت کی تلاش جاری ہے۔ اگر ہمارے خفیہ ادارے انہیں ملک سے نکل جانے سے روکنے میں کامیاب رہے تو اُمید ہے وہ بھی کبھی نہ کبھی ہمارے ہتھے چڑھ ہی جائیں گے۔ بہرحال اب ہمیں نفیس صاحب کے حلقۂ اثر سے باہر آنے کی کوششیں شروع کردینی چاہئیں۔ ہمیں آئندہ زیادہ گھمبیر معاملات میں اُلجھنے سے بھی بچنا چاہئے۔ ریڈ ڈاٹ والا تجربہ ہمارے لئے خاصا سبق آموز تھا۔ بشرطیکہ ہم اس سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کریں۔"

راحیلہ دھیرے سے ہنسی اور ذرا استہزائیہ لہجے میں بولی "لگتا ہے تمہارا جوش و خروش خاصا ٹھنڈا پڑگیا ہے۔ وہ ملک و قوم کی خاطر سب کچھ لٹا دینے اور ہر تکلیف اُٹھانے کی باتیں ... ذاتی مفادات سے بالاتر ہوکر ہر ایک کے لئے کچھ نہ کچھ کرنے کا جذبہ... شاید وہ سب کچھ تم بھولنے لگے ہو۔ شاید تم زیادہ عقل مند زیادہ چالاک ہوگئے ہو۔ شاید تمہیں صرف اپنے نفع نقصان کے بارے میں سوچنا آگیا ہے۔ شاید تم بھی نمک کی کان میں پڑے پڑے آخر نمک ہوگئے ہو۔ یا پھر شاید کسی کی صحبت نے تمہیں سود و زیاں کا حساب کرنا سکھا دیا ہے؟"

"فضول باتیں مت کرو۔ میں بھی وہی ہوں اور میرے نظریات بھی وہی ہیں۔ میں اب صرف محتاط ہونا چاہتا ہوں اور محتاط ہونا کوئی معیوب بات نہیں ہے۔ ہر معاملے کو جھگڑالو بیویوں کی طرح شک کی نظر سے دیکھنا چھوڑ دو۔"

"اچھا' تم کہتے ہو تو یقین کرلیتی ہوں۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "ویسے نفیس صاحب سے شاید ہمارا تعلق اب خود بخود ہی کم ہوتا جائے گا۔ اسلام آباد میں ہمارا کام ختم ہوگیا ہے اور انہوں نے ہمیں لاہور جانے کی اجازت دے دی ہے۔ میں ان کے یہ کاغذات متعلقہ لوگوں کو پہنچا کر آج رات لاہور ہی واپس جاؤں گی۔ کل سے میں تمہارے مکان کی دوبارہ تعمیر کے سلسلے میں کام شروع کروں گی۔" وہ ایک بار پھر شریر سے انداز میں مسکرائی "اگر وہ خوب صورت خاتون شادی کے لئے آمادہ ہوچکی ہے تب تو تمہیں جلد ہی گھر کی ضرورت پیش آئے گی۔ ایک معزز اور جاگیردار بیوی کے ساتھ آدمی ہوٹل میں رہتا ہوا کچھ اچھا نہیں لگتا۔ خواہ وہ اس ہوٹل کا مالک ہی کیوں نہ ہو۔"

میں نے صرف اسے گھورنے پر اکتفا کیا۔ میں اسے نہیں بتاسکا کہ مسئلہ خاتون کے آمادہ ہونے کا نہیں بلکہ اس کے بالکل اُلٹ تھا اور اس کی وجہ صرف راحیلہ تھی۔ اس پر یقین کرنا شاید خود راحیلہ کے لئے بھی مشکل ہوتا۔

"اس طرح گھورتے ہوئے خاصے بارعب لگ رہے ہو لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں "رعب پروف" ہوں۔" وہ اپنا تاریک چشمہ اُٹھا کر ناک پر جماتے ہوئے بولی پھر اس نے نقاب بھی اپنے مخصوص انداز میں چہرے اور پیشانی پر لپیٹ لیا۔ وہ ایک بار پھر مکمل سیاہ پوش نظر آنے لگی۔ اپنا بریف کیس اُٹھا کر وہ گود میں رکھتے ہوئے بولی "مجھے کوئی گاڑی اور ڈرائیور مل جائے گا؟ میں بہت تھکی ہوئی ہوں۔ خود ڈرائیو کرنا نہیں چاہتی۔"

"تم ایئرپورٹ سے یہاں کیسے پہنچی تھیں؟" میں نے پوچھا۔

"ایک عام سے مسافر کی طرح۔ ٹیکسی میں۔" اس نے جواب دیا۔

"یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ تم عام مسافر لگ رہی ہوگی۔" میں نے کہا "ایک تو تم اپنے حلیے کی وجہ سے عام مسافر نہیں لگ سکتیں۔ دوسرے یہ کہ عام مسافر کے پاس تھوڑا بہت سامان ضرور ہوتا ہے۔"

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میرے پاس بھی مختصر سا ایک سوٹ کیس موجود ہے اور مزید اطلاع کے لئے عرض ہے کہ میں اس وقت تمہارے ہوٹل میں مقیم ہوں۔ تمہارے آفس میں گھسنے سے پہلے میں یہاں کمرا لے چکی تھی۔ سوٹ کیس میں نے وہاں رکھا۔ شاور لیا' لباس تبدیل کیا پھر تمہارے پاس آئی تھی۔"

"بڑی خبیث ہو تم۔" میں نے حیرت سے کہا "یعنی تم نے آکر ہوٹل میں قیام بھی کرلیا اور مجھے اطلاع ہی نہیں۔"

"میں نے اسٹاف کو منع کیا تھا کہ کوئی تمہیں میری آمد کے بارے میں نہ بتائے۔" وہ بولی۔

"اسٹاف میرا ہے اور کہنا تمہارا مانتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "پھر بھی عورتیں کہتی ہیں کہ وہ عورت ہوکر نقصان میں ہیں۔"

"اچھا تم یہ بتاؤ گاڑی دے رہے ہو یا نہیں؟" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم گاڑی کا انتظام کرنے کے لئے کہو اور گاڑی نہ ملے۔ تم حکم کرو تو ریل گاڑی کا انتظام ہوسکتا ہے اور ڈرائیور کے فرائض میں خود انجام دے سکتا ہوں۔" میں نے ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ریل کا انجن چلانے والے کو ڈرائیور نہیں' انجینئر کہتے ہیں۔" راحیلہ نے تصحیح کی۔

"مجھے معلوم ہے پروفیسر صاحبہ! لیکن میں عام فہم زبان بولنے کی کوشش کرتا ہوں۔" میں نے کہا اور فون پر آپریٹر کی آواز سُننے کے بعد اس سے کہا کہ وہ پرسونل منیجر سے کہہ کر ایک گاڑی اور ڈرائیور کا بندوبست کرائے۔

فون رکھنے کے بعد میں نے راحیلہ سے کہا "دو چار منٹ لگ جائیں گے۔ تم ابھی بیٹھو۔ میں اپنی گاڑی تمہیں اس لئے نہیں دے رہا ہوں کہ مجھے خود کسی بھی وقت ضرورت پڑسکتی ہے' میں ابھی تمہیں سکون سے بیٹھا نظر آرہا ہوں لیکن کسی بھی لمحے مجھے اُٹھ کر بھاگنے کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔"

"مجھے بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھ سے بہتر یہ باتیں کون جانتا ہے۔" وہ دوبارہ بیٹھتے ہوئے بولی "یہ بتاؤ لاہور کب آنے کا پروگرام ہے؟"

"میں کل بھی آسکتا ہوں اور ایک مہینا بھی لگ سکتا ہے۔ میرے یہاں رُکنے کی سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ میں ڈاکٹر برنارڈ کے بارے میں کسی اطلاع کا منتظر ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"جزیرے پر جو کچھ ہوا اس کی رسمی اور سرکاری رپورٹ مجھ تک بھی پہنچ چکی ہے۔" راحیلہ بولی "لیکن مختصراً تم بتادو تو بہتر ہوگا۔"

میں نے مختصراً بتایا اور یوں انتظار کے دو چار منٹ گزر گئے۔ ڈرائیور آن پہنچا تو وہ اُٹھتے ہوئے بولی "اگر مجھے واپس جانے سے پہلے وقت ملا تو اس سلسلے میں پھر بات کریں گے ورنہ فون پر رابطہ رہے گا۔"

"میرا موبائل کا نمبر کچھ محفوظ ہے۔ خاص معاملات کے بارے میں صرف اس پر بات کرنا۔" میں نے ہدایت کی۔ اب ہم بالکل سنجیدگی سے بات کررہے تھے اور اسی سنجیدگی کے عالم میں وہ رخصت ہوگئی۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں کافی دیر تک دوبارہ کام کی طرف متوجہ نہ ہوسکا۔ میں اس اچانک اور غیر متوقع ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ دفعتاً فون کی گھنٹی بجی۔

دوسری طرف زرتاج تھی۔ وہ شگفتہ لہجے میں بولی "مجھے پتا چلا ہے وہ سیاہ پوش حسینہ تمہارے آفس سے رخصت ہوچکی ہے۔"

میں حیرت کے باعث ایک لمحے کے لئے خاموش رہا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی راحیلہ کے بارے میں باخبر رہنے کی کوشش کررہی تھی۔

"ہاں راحیلہ جاچکی ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"یہ میری زندگی کے حیرت انگیز ترین اتفاقات میں سے ایک اتفاق تھا کہ جس وقت میں اس لڑکی کو دیکھنے کی بڑی شدت سے خواہش مند تھی عین اسی وقت وہ آن پہنچی۔" زرتاج بولی۔

"کیا مطلب؟" میں نے گڑبڑا کر کہا۔

"اب خواہ مخواہ مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں اُلجھانے کی

کوشش نہ کرنا۔ مجھے اندازہ ہوگیا ہے یہی وہ لڑکی ہے جس کے لاحاصل انتظار نے تمہیں کہیں کا نہیں چھوڑا۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

میں ابھی اس بات کا اقرار کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن فوری طور پر میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ مین نے زرتاج سے راحیلہ کا تعارف کراتے وقت اسے صرف اپنے بہترین دوستوں میں سے ایک قرار دیا تھا لیکن اَن کہی باتوں کو محسوس کرنے کے معاملے میں زرتاج بھی کچھ کم نہیں تھی۔

زرتاج نے بات جاری رکھی "لڑکی کا چہرہ اس وقت مضحکہ خیز ہے۔ اس کے باوجود بڑے غضب کی چیز ہے۔ تمہارا اس پر عاشق ہونا سمجھ میں آتا ہے لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ اپنی تمام تر مضحکہ خیزی کے باوجود وہ تم سے شادی پر آمادہ نہیں ہے۔"

میرے خیال میں اب زرتاج کو جھٹلانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے دھیمے لہجے میں کہا "میں نے تمہیں بتایا نا کہ اس کے پیچھے اس کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔"

"آہ....!" اس نے ٹھنڈی سانس لی "ایک تو لنگڑے لولے فلسفوں نے انسانوں کو بہت تباہ کیا ہے۔ بہرحال تم اس فلسفے کی بھینٹ چڑھ کر اپنے حق میں کچھ اچھا نہیں کررہے۔ مجھے صرف اتنا ہی کہنا تھا۔" اس نے فون بند کردیا۔

ریسیور رکھ کر میں کئی لمحے تک گم صم بیٹھا رہا۔ میرا خیال تھا کہ میں زندگی کے ایک موڑ پر زرتاج کو پیچھے چھوڑ آیا تھا اور اسے ایک دن میرے لئے قصۂ پارینہ بن جانا تھا لیکن ایسا نہیں ہوسکا تھا۔ وہ تو پہلے سے کہیں زیادہ شدت کے ساتھ آندھی طوفان کی طرح میری زندگی میں در آئی تھی۔ میں اپنے اس خیال پر تو قائم تھا کہ میں راحیلہ کے سوا کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اپنے دل کی عدالت میں مجھے یہ اعتراف بھی تھا کہ میں زرتاج میں بھی ایک انوکھی اور ناقابلِ بیان کشش محسوس کررہا تھا۔

میں ایک فیصلے پر قائم ہونے کے باوجود بھی اپنے آپ کو یکسو محسوس نہیں کررہا تھا۔ شاید میری کوئی بشری کمزوری اس کی وجہ تھی۔ میں لوہے کے اس ٹکڑے کی طرح ہو کر رہ گیا تھا جسے بیک وقت دو مقناطیس اپنی اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔

مجھے اس پر بھی حیرت تھی کہ زرتاج نے ابھی تک یہ دریافت نہیں کیا تھا کہ راحیلہ کا چہرہ مضحکہ خیز کیونکر ہوا تھا۔ اسے یہ اندازہ تو یقیناً ہوگیا تھا کہ اس کا چہرہ پیدائشی طور پر ایسا نہیں تھا۔ پیدائشی طور پر کسی کا چہرہ اتنی صفائی سے مکمل طور پر دو حصوں میں منقسم نظر آنا میرے خیال میں تو تقریباً ناممکن ہی تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ اگر میں بیک وقت ان دونوں کے بارے میں سوچتا رہا تو میرا ذہن شل ہوجائے گا اور میں اپنا کوئی بھی کاروباری کام نہیں نمٹا سکوں گا چنانچہ میں نے دونوں ہی کے تصور

کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو فائلوں میں اُلجھانے لگا۔

○☆○

مجھے کراچی میں مزید دو ہفتے گزر گئے۔ اس دوران کہنے کو تو کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا لیکن میرے اندر کا طوفان بدستور مجھے منتشر کرتا رہا۔

زرتاج ابھی کراچی میں ہی تھی اور میرے ہوٹل میں ہی مقیم تھی۔ گو کہ اس نے ڈیفنس میں بنگلا خرید لیا تھا اور خاصی عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ادائیگی بھی کردی تھی لیکن ابھی اس میں شفٹ نہیں ہوئی تھی۔ ابھی اسے اس کے "شایانِ شان" بنایا جارہا تھا۔ انٹیریئر ڈیکوریشن کی ایک فرم اس کی تزئین و آرائش اور فرنشنگ کا کام کررہی تھی۔

کبھی کبھی زرتاج خود بھی جاکر کام کی نگرانی کرتی تھی اور سامان وغیرہ منتخب کرتی تھی۔ میری اس سے دن میں دو تین مرتبہ ملاقات رہتی تھی لیکن پہلے دن کے بعد سے ہم کبھی جذبات کے خارزاروں میں نہیں اُلجھے تھے۔ ہم صرف اچھے دوستوں کی طرح ملتے تھے اور دل کے معاملے کے سوا دنیا کے ہر موضوع پر بات کرتے تھے۔ اصل موضوع کے سلسلے میں ہمارے درمیان گویا ایک بے عنوان سا تکلف، ایک مبہم سا حجاب آگیا تھا۔ صرف پہلے دن کھل جانے کے بعد زرتاج گویا اپنی انا کے خول میں بند ہوگئی تھی لیکن اس کا کراچی منتقل ہونے کا پروگرام نہیں بدلا تھا۔

اس دوران راحیلہ کا ذکر بھی صرف ایک ہی مرتبہ آیا تھا۔ وہ

بھی اس طرح کہ زرتاج تجسس سے مجبور ہو کر آخر کار اس کے چہرے کے بارے میں سوال کر ہی بیٹھی تھی۔ میں نے اسے ساری بات بتادی تھی۔ اس نے افسوس کا اظہار کیا تھا جو مجھے کسی حد تک رسمی ہی محسوس ہوا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی راحیلہ کے بارے میں بات نہیں ہوئی تھی۔

راحیلہ سے میرا فون پر رابطہ رہتا تھا۔ عجیب بات یہ تھی کہ اس نے بھی کراچی سے جانے کے بعد زرتاج کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا تھا۔ وہ کبھی مذاق میں بھی اس کا تذکرہ گفتگو میں نہیں لائی تھی۔ اس نے میرے مکان کی تعمیر شروع کرادی تھی۔ میری ہدایت پر اس نے کنسٹرکشن کمپنی سے کہہ کر بہت زیادہ آدمی لگوا کر کام شروع کرا رکھا تھا کیونکہ میں مکان جلد مکمل کرانا چاہتا تھا۔ میرے جو ساتھی اسلام آباد میں تھے وہ بھی راحیلہ کے ساتھ ہی لاہور پہنچ چکے تھے اور راحیلہ انہی کی مدد سے بزنس بھی سنبھالے ہوئے تھی۔

میں نے شفیع شاہ وغیرہ کو بھی جزیرے سے واپس بلوالیا تھا کیونکہ انہیں جزیرے پر رکھنے کا اب کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میں نے انہیں ڈاکٹر برنارڈ کی وجہ سے جزیرے پر چھوڑا تھا لیکن کئی باتوں سے تصدیق ہو چکی تھی کہ وہ جزیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ ان تمام راستوں اور ذرائع آمدورفت کی تو کڑی نگرانی ہو رہی تھی جن کے ذریعے وہ بیرون ملک فرار ہو سکتا تھا۔ ابھی تک کوئی ایسی شہادت نہیں ملی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے بیرون ملک فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔

زیادہ امکان یہی تھا کہ ڈاکٹر برنارڈ کراچی میں موجود تھا لیکن کراچی بجائے خود ایک سمندر تھا۔ اس میں ڈاکٹر برنارڈ جیسے فنکار کو تلاش کرنا کارے دارد تھا۔ اس معاملے میں تو قسمت کچھ زیادہ ہی مہربان ہوتی تبھی کوئی نتیجہ برآمد ہو سکتا تھا۔ بہرحال ہم اپنی سی کوشش کر رہے تھے۔ میرا چشتی صاحب سے بھی رابطہ رہتا تھا۔ اگر خفیہ اداروں کو ڈاکٹر برنارڈ کے سلسلے میں کوئی کامیابی ہوتی تو مجھے ضرور اطلاع مل جاتی۔

امبر تقریباً دو ہفتے سے میری سیکریٹری کے فرائض انجام دے رہی تھی اور اس حیثیت سے کام کرنے کا تجربہ نہ ہونے کے باوجود وہ بہت اچھی سیکریٹری ثابت ہوئی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو بہت ہی احسان مند محسوس کر رہی تھی اور اب اسے نئے سرے سے ایک اچھے باعزت انداز میں زندگی شروع کرنے کا موقع ملا تھا تو وہ اس سے پورا پورا فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

وہ کوئی بُری یا بے راہرو لڑکی نہیں تھی لیکن ماضی میں اس نے ملازمت کی جگہ۔ وہاں کے ماحول اور قریبی ساتھیوں کے انتخاب میں زیادہ احتیاط نہیں کی تھی جس پر اسے پچھتاوا تھا اور یہ اس بات کی دلیل تھی کہ اندر سے وہ بہرحال ایک اچھی لڑکی تھی۔ میں نے اسے جو بھی ذمے داریاں سونپی تھیں وہ اپنے آپ کو ان کا اہل ثابت کرنے کی پوری پوری کوشش کر رہی تھی بلکہ وہ ان نایاب قسم کے ملازمین میں سے ایک ثابت ہو رہی تھی جو ہر ذمے داری اپنے سر لینے کے لئے تیار رہتے ہیں اور ان کی پوسٹ خواہ کچھ بھی ہو لیکن وہ نہایت جوش و خروش سے ہر کام کرنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ وہ اتنی مستعد تھی کہ کبھی کبھی اس کی مستعدی دیکھ کر مجھے شرمندگی ہونے لگتی تھی۔

چنانچہ اس روز جب وہ مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتی ہوئی میرے آفس میں داخل ہوئی تو میں یہی سمجھا کہ وہ فرمائش کرے گی "سر! مجھے کوئی اور کام بتائیے۔ سیکریٹری کی مصروفیات تو کوئی مصروفیات ہی نہیں ہیں۔ یہ تو محض ایک نمائشی سی جاب ہے۔"

بعض دفاتر میں واقعی سیکریٹری کی جاب نمائشی سی ہوتی ہے لیکن میرے دفتر میں کام بہت زیادہ تھا کیونکہ میں اپنے دوسرے بزنس کو بھی فی الحال ہوٹل والے آفس سے ہی ہینڈل کر رہا تھا۔ اس میں مجھے سہولت رہتی تھی۔ میری مصروفیات بڑھتی تھیں تو اس سے زیادہ امبر کی مصروفیت بڑھ جاتی تھی۔ اس کے باوجود اسے کام کی کمی کا شکوہ رہتا تھا۔

میں سنبھل کر بیٹھ گیا اور اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اس کے لئے کوئی کام سوچنے لگا جس میں اسے مصروف رکھا جا سکے۔ میں فوری طور پر اس کے لئے کوئی کام نہ سوچ سکا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری نظر اس کے سراپا میں اُلجھ کر رہ گئی تھی۔ مجھے صحیح معنوں میں آج پہلی بار احساس ہوا تھا کہ وہ ایک اسمارٹ اور خوش لباس لڑکی تھی۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس کے گھریلو حالات کیا تھے لیکن یہ تو بہرحال طے تھا کہ اس کا تعلق نچلے متوسط طبقے سے تھا لیکن قدرے حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ شخصیت کے اعتبار سے نچلے متوسط طبقے کی لڑکی نہیں لگتی تھی۔ اس کے سراپا... اس کے وضع قطع اور پہناوے میں ایک "ٹچ آف کلاس" موجود تھا۔ یہ گویا اس کی ایک اضافی خوبی تھی۔ جس جگہ... جس ماحول میں... اور جس حیثیت سے وہ کام کر رہی تھی اس میں "ٹچ آف کلاس" ضروری تھا۔

وہ سروقد' متناسب الاعضا اور خوش شکل تھی۔ چلتی تھی تو ماحول میں ایک خوشگوار سا ارتعاش پیدا ہوتا تھا۔ شاید تبھی زرتاج نے ایک بار اسے دیکھ کر خاص انداز میں مسکراتے ہوئے تبصرہ کیا تھا "سیکریٹری بھی تم نے خوب چھانٹ کر رکھی ہے۔"

لفظ "بھی" پر اس نے اس طرح زور دیا تھا جیسے اس سے پہلے بھی میں مختلف کاموں کے لئے بہت سی خواتین کو چھانٹ کر رکھ چکا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ میں نے امبر کو ہرگز چھانٹ کر نہیں رکھا تھا۔ وہ تو قسمت کی ماری خود ہی "چھٹی چھٹائی" میرے پاس آن پہنچی تھی۔ اس کی مجھ سے ملاقات حادثاتی تھی اور کچھ حادثاتی سے ہی انداز میں اسے ملازمت پر رکھ لیا گیا تھا لیکن زرتاج کو شاید اس بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ ایک عجیب بات یہ تھی کہ امبر نے جب سے میرے ہاں کام شروع کیا تھا وہ دن بہ دن نکھرتی جارہی تھی۔ دو ہفتوں میں ہی اس امبر اور اس امبر میں زمین آسمان کا فرق نظر آنے لگا تھا جو سخت دہشت کے عالم میں ہانپتی کانپتی میرے پاس مدد کی درخواست لے کر آئی تھی۔

"سر! میں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آئی ہوں۔"

میں امبر کی آواز سُن کر اپنے خیالات سے چونکا۔ میں نے محسوس کیا کہ آج امبر کا لہجہ مختلف تھا۔ وہ بہت ہچکچا رہی تھی شاید وہ مزید کام کی فرمائش کرنے نہیں بلکہ کچھ اور کہنے آئی تھی۔

میں نے ایک طویل سانس لے کر ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے سرسری سے لہجے میں پوچھا "کوئی مالی مسئلہ ہے؟"

"نہیں سر نہیں۔" وہ گویا قدرے شرمندہ ہوتے ہوئے جلدی سے انگریزی میں بولی "میرے مالی حالات اتنے بُرے نہیں ہیں اور پھر مجھے ایک ہفتے بھی بے روزگار نہیں رہنا پڑا۔"

"تو پھر کیا مسئلہ ہے؟" میں کچھ اور سنبھل کر بیٹھ گیا۔

"سر! میری آپ سے کہنے کی ہمت نہیں پڑ رہی۔" وہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی "مسئلہ قطعی ذاتی سا ہے اور ہے بھی کسی اور کا لیکن آپ اسے میرا ہی سمجھ لیجئے۔ میں نے جذبات میں آکر کسی سے وعدہ کرلیا ہے کہ میں آپ سے اس کی مدد کی درخواست کروں گی لیکن اب مجھے خیال آرہا ہے آپ یقیناً سوچیں گے کہ ابھی تو آپ نے میرے لئے اتنا دردِ سر مول لیا تھا...... میری اتنی مدد کی تھی اب میں دوسروں کی سفارش بھی لے کر آنے لگی۔ کہیں آپ یہ نہ سوچیں کہ میں آپ کی مہربان طبیعت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہی ہوں یا کہیں میں آپ کے لئے مستقل دردِ سر ہی نہ بن جاؤں۔" اس کی آواز گلے میں اٹکنے لگی "لیکن یہ واقعی کسی مصیبت زدہ کا معاملہ ہے میں اسے اُمید دلائے بغیر نہیں رہ سکی۔"

"بھئی تم نے تو بہت سسپنس پیدا کردیا ہے۔ پہلے معلوم تو ہو کہ ہوا کیا ہے۔ تبھی تو میں کوئی جواب دے سکتا ہوں۔"

"آپ چاہیں تو اس سلسلے میں ضرور کچھ کر سکتے ہیں سر! لیکن مجھے احساس ہے کہ آپ ایک مصروف آدمی ہیں۔ بڑے آدمی ہیں لیکن نیکیاں کمانے کی ضرورت تو بڑے آدمیوں کو بھی پڑتی ہے سر!"

"بھئی تم رسمی باتیں چھوڑو اور اصل بات کرو۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"سر! میں نے آپ کو بتایا تھا کہ ہمیں کراچی آئے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا ہے لیکن اصل میں ہماری فیملی سکھر کی رہنے والی تھی۔" وہ جلدی سے بولی۔

"ہاں مجھے یاد پڑتا ہے تم نے ایسی کوئی بات کی تھی۔" میں نے کہا۔

"سر! وہاں محلے میں رہنے والی ایک فیملی سے ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ یہاں آنے کے بعد تو رفتہ رفتہ ان سے رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ ایک عرصے بعد اس گھر کی ایک لڑکی سے ملاقات ہوئی ہے جو میری سہیلی ہوا کرتی تھی۔ اب وہ وہاں ٹیچر ہے۔ اس کی چھوٹی بہن کچھ عرصہ پہلے ملازمت کے سلسلے میں کراچی آئی تھی لیکن وہ انسانوں کے اس جنگل میں کھو گئی ہے۔ اسے تلاش کرنے کی ہر کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ میری سہیلی خود بھی اسے تلاش کرکے تھک چکی ہے۔ ان کے والد تو اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔ میری سہیلی ہی گویا اپنی بہن کی سرپرست تھی۔ وہ بہت پریشان ہے سر! اسے آپ جیسے کسی شخص کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"تمہاری اس سہیلی کا نام کیا ہے؟"

"تم اسے اندر بھیج دو۔ میں اس سے بات کرنے کے بعد کوئی فیصلہ کروں گا۔" میں نے کہا۔

"بہت بہتر سر!" وہ یکدم پُرامید نظر آنے لگی اور تیزی سے گھوم کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کی کمر میں شاخِ گل کی سی لچک تھی جو آج میں نے پہلی بار محسوس کی تھی۔ وہ جاچکی تو میں اپنے سامنے موجود فائلیں بند کرنے لگا اور کچھ بکھرے ہوئے کاغذات سمیٹنے لگا۔

چند لمحے بعد جو لڑکی کمرے میں داخل ہوئی اسے دیکھ کر مجھے حیرت کا ہلکا سا جھٹکا لگا۔ شاید لاشعوری طور پر میں نے فرض کرلیا تھا کہ امبر کی دوست بھی کچھ اسی جیسی ہوگی لیکن وہ میرے اندازے سے بہت مختلف تھی۔

وہ ایک دُبلی پتلی لمبی سی لڑکی تھی جس کے وجود میں ہڈیاں ہی ہڈیاں نمایاں تھیں۔ چہرے پر بھی ہڈیاں نظر آرہی تھیں۔ رخساروں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ ناک کی ہڈی بہت تیکھی اور نمایاں تھی اور اس ہڈی پر نازک فریم کا چشمہ ٹکا ہوا تھا۔

اس کی عمر تیس سال بھی ہوسکتی تھی اور چالیس سال بھی۔ اس سلسلے میں یقین سے کچھ کہنا بہت مشکل تھا۔ وہ معمولی مگر صاف ستھری شلوار قمیص اور دوپٹے میں تھی۔ وہ اجازت پاکر اندر آئی تو اس کے ساتھ سستی سی خوشبو کا ایک جھونکا بھی اندر آیا۔ بے شک اس کی شخصیت میں کوئی کشش نہیں تھی لیکن وہ بے حد گوری تھی اور اسے دیکھ کر صاف ستھرے پن کا احساس سا ہوتا تھا اور کسی استانی ہی کا تصور ذہن میں اُبھرتا تھا گو کہ چھوٹے اور پسماندہ شہروں کی تو کیا' اچھے بھلے بڑے شہروں کی بیشتر استانیوں اور استادوں کی شخصیت بدقسمتی سے میلی میلی نظر آتی تھی۔

وہ سلام کرنے کے بعد میرا اشارہ پاکر ہچکچاتے ہوئے سامنے کی ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ یقیناً نروس تھی کیونکہ وہ اپنا ہینڈ بیگ گود میں رکھنے کے بعد اس کا کھٹکا کبھی کھول رہی تھی اور کبھی بند کررہی تھی۔ اس کا چہرہ میک اپ سے عاری تھا۔ اس کے باوجود اس کے ہونٹ بھرے بھرے اور خوب صورت دکھائی دے رہے تھے۔ اس کی پوری شخصیت میں قابلِ ذکر چیز شاید اس کے ہونٹ ہی تھے۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ بے کیف سے بے کیف شخصیت میں بھی کوئی نہ کوئی خوبصورتی موجود ہوتی تھی' بعض اوقات یہ خوب صورتی تلاش کرنے سے ملتی تھی۔ عذرا کے خوب صورت ہونٹ اس وقت تھرتھرا رہے تھے۔

"کیا مسئلہ ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

عینک کے شیشوں کے عقب میں اس کی پھیلی پھیلی سی آنکھوں میں یکدم ہی آنسو چھلک آئے۔ اس نے جلدی سے چشمہ اُتار کر میز پر رکھ دیا اور غالباً رومال کی تلاش میں' کانپتے ہاتھوں سے جلدی سے اپنا ہینڈ بیگ کھولنے لگی۔ میں نے ٹشو پیپر کا ڈبا اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بیک وقت دو تین ٹشو پیپر نکالے اور ان میں منہ چھپا کر باقاعدہ رونے لگی۔

میں چند لمحے خاموش بیٹھا رہا۔ ایک اجنبی عورت کا رونا انسان کو بڑی اُلجھن میں ڈال دیتا ہے۔ اچانک میں نے درشت لہجے میں کہا "یہ کیا بکواس ہے۔ بند کرو یہ رونا دھونا۔"

اسے یکدم زوردار جھٹکا لگا۔ اس نے ٹشو پیپر سے آنکھیں صاف کیں اور بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی پھیلی پھیلی آنکھیں کچھ اور پھیل گئی تھیں جس طرح اچانک اس کے آنسو بہنا شروع ہوئے تھے' اسی طرح اچانک تھم بھی گئے۔

میں نے فوراً اپنے تاثرات بدل لئے اور محبت سے مسکراتے ہوئے کہا "ہاں اب ٹھیک ہے۔ دراصل مجھے تمہارے آنسو روکنے کا کوئی اور کارگر طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ تمہارے آنسو روکنا اس لئے ضروری تھا کہ آنسو بہانے سے تمہارے مسئلے کے حل میں کوئی مدد نہیں ملے گی۔ ہاں تو... مسئلہ کیا ہے؟ تمہاری بہن گم ہوگئی ہے؟"

"ہاں" اس نے ہینڈ بیگ میز پر رکھتے ہوئے جواب دیا۔ اس کے پھیکے پھیکے سفید سے چہرے پر ہلکی سی سُرخی نمودار ہوچکی تھی۔ گویا اس کی شخصیت میں بھی کچھ رنگ آگیا تھا۔ پورا چہرہ ٹشو پیپر سے پونچھنے کے بعد وہ مرتعش لہجے میں بولی "آپ نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔"

چند لمحے کی خاموشی کے بعد اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور کافی حد تک پُرسکون لہجے میں بولی "میری بہن کا نام میمونہ ہے۔ گھر میں ہم اسے پیار سے مونا کہتے ہیں۔ وہ مجھ سے چار سال چھوٹی ہے۔"

میں اب بھی نہ پوچھ سکا کہ اس کی اپنی عمر کیا تھی۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "چھ ماہ سے مونا کا کچھ پتا نہیں ہے۔ پہلے وہ مجھے اور امی کو ہر ہفتے خط لکھتی تھی لیکن پھر سرے سے اس کے خط آنے بند ہوگئے۔ جب چھ ماہ تک اس کا کوئی خط نہ آیا تو میں اس کا اتا پتا کرنے یہاں آئی۔ اس کے خطوں سے ہمیں یہ علم تھا کہ یہاں وہ کسی بیوہ خاتون کے ہاں رہتی تھی جنہوں نے اپنے مکان کو ہوسٹل کی سی شکل دے رکھی تھی۔ وہ صرف تنہا اور ملازمت پیشہ لڑکیوں کو کمرے کرائے پر دیتی تھیں۔"

وہ ایک بار پھر خاموش ہوگئی۔ اس کا سر جھک گیا۔ عینک اُٹھا کر اس نے دوبارہ ناک پر ٹکالی۔ عینک کے ساتھ اس کی شخصیت کچھ بہتر لگتی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ سر اُٹھاتے ہوئے بولی "میں اس ایڈریس پر پہنچی تو نہ جانے کیوں مجھے دھچکا سا لگا۔ میرے ذہن میں اس جگہ کا ایک الگ ہی نقشہ تھا لیکن وہ مجھے اپنے تصور سے قطعی مختلف لگی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کسی صاف ستھرے علاقے میں صاف ستھرا سا مکان ہوگا جس میں چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے بہت سے کمرے ہوں گے۔ اس کی مالکن ایک نیک دل اور ہمدرد قسم کی خاتون ہوں گی جنہیں اندازہ ہوگا کہ بڑے

شہروں میں آکر ملازمت یا کوئی چھوٹا موٹا کام کرنے والی خواتین کے کیا مسائل ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے انہوں نے اپنا مکان اس قسم کی خواتین کے لئے مخصوص کردیا ہوگا۔ وہ خود شاید ایک کونے میں تخت پر مصلا بچھائے نماز وغیرہ میں مصروف رہتی ہوں گی۔" اس کی آواز دھیمی ہوتے ہوتے معدوم ہوگئی۔ اس نے دوپٹا کھینچ کر اپنے شانوں پر پھیلالیا۔

مجھے اس کی کہانی میں دلچسپی محسوس ہونے لگی تھی۔ میں اپنی مصروفیات بھول گیا تھا۔ وہ ایک لمحے خاموش رہی تو میں نے کہا "وہاں پہنچ کر تمہارے تصورات کو کچھ زیادہ ہی شدید دھچکا لگا؟"

"جی ہاں" وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "وہ ایک بہت ہی واہیات سے علاقے میں واہیات سا مکان تھا۔ مکان تو تین چار منزلہ تھا لیکن اس کے کمرے ڈربوں کی طرح تھے۔ وہ پوری گلی ہی واہیات سی تھی۔ مکان مالکن بھی واہیات سی عورت تھی۔ موٹی... بھینس جیسی... کرخت اور بدمزاج۔ کسی بات کا سیدھے منہ جواب ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے بتایا کہ مونا اس کے ہاں سے کمرا چھوڑ کر جاچکی تھی۔ میں نے پوچھا کہ کہاں گئی تھی تو اس نے برہمی سے جواب دیا کہ اسے کچھ پتا نہیں تھا اور نہ ہی وہ جانے والیوں کا اتا پتا رکھتی تھی۔ اس کے اصل الفاظ یہ تھے "میں ان کے باپ کی نوکر نہیں ہوں کہ ان کے جانے کے بعد بھی ان کے پیچھے پیچھے پھروں اور ان کے بارے میں معلومات رکھوں۔ جو چلی گئی سو چلی گئی۔ میری طرف سے وہ بھاڑ میں جائے۔" میں نے پھر بھی ہمت کرکے اس سے پوچھنے کی کوشش کی کہ مونا کو گئے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا تھا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے مجھے صحن سے دھکیل کر باہر نکالا اور دھڑ سے دروازہ بند کرلیا۔ عجیب عورت تھی' میں تو اس کی بداخلاقی پر حیران رہ گئی۔"

پھر اس کا لہجہ التجائیہ ہوگیا "آپ کو میری مدد کرنا ہوگی افضل صاحب! میری تو سمجھ میں نہیں آرہا میں کس طرح امی کے پاس واپس جاؤں۔ وہ تو یہ سب کچھ سُن کر پریشان ہوجائیں گی۔"

"اب ایسی بھی کیا بات ہے۔ انہیں اتنی جلدی تو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔" میں نے بڑی متانت سے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ ذرا چونک کر بولی۔

"مطلب یہ کہ ابھی تو مونا کے خطوں کا سلسلہ منقطع ہوئے صرف چھ ماہ ہوئے ہیں۔ ابھی سے تمہاری ماں کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ ایک ماں کو اتنی جلدی تو پریشان نہیں ہونا چاہئے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

وہ میرے طنز کو سمجھتے ہوئے مرتعش لہجے میں بولی "میں آپ کو کیا بتاؤں افضل صاحب...! ہم ماں بیٹی وہاں کس حال میں زندگی گزار رہی ہیں۔ ہمارے اپنے کچھ مسائل ہیں۔ امی مستقل مریضہ ہیں۔ بعض اوقات وہ اتنی تکلیف میں ہوتی ہیں کہ اپنی اولاد تک کے بارے میں سوچنے کے قابل نہیں ہوتیں۔ میرے لئے بھی ان

کی وجہ سے گھر سے نکلنا مشکل تھا اور پھر میرے اپنے' ملازمت کے بھی کچھ مسائل ہیں۔ اس کے علاوہ سب سے بڑی بات یہ کہ ہم مونا کو زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ اس کا ہمیں خط لکھنا بند کردینا کافی عرصے تک ہمارے لئے حیرت یا تشویش کا باعث نہیں بن سکا تھا۔ مونا دراصل نہایت موڈی اور لاابالی قسم کی لڑکی ہے۔ وہ خط لکھنے پر آئے تو ہفتے میں کیا' روزانہ بھی کسی کو خط لکھ سکتی ہے اور لکھنا چھوڑ دے تو مہینوں کسی کو ایک سطر بھی لکھ کر نہ بھیجے۔ صرف خطوں میں ہی نہیں' زندگی کے تقریباً سبھی معاملات میں اس کا یہی حال ہے۔ اس لئے ہم اس کی طرف سے زیادہ پریشان نہیں ہوئے تھے۔"

میں ایک لمحے کے لئے خاموش رہا۔ اس خاموشی میں ہلکی سی معذرت خواہی کا تاثر تھا پھر میں نے کہا "اگر تم مجھے کسی حد تک اپنے پس منظر سے بھی آگاہ کردو تو بہتر ہوگا۔ کچھ اپنے بارے میں... گھر کے بارے میں... والدین کے بارے میں بتاؤ اور اگر مونا کے بارے میں بھی مزید کچھ بتاسکو تو بہتر ہوگا۔"

اس نے اپنے خوب صورت ہونٹوں پر زبان پھیری۔ شاید اس کا منہ خشک ہورہا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ مجھے تھوڑا بہت آدابِ میزبانی کا بھی خیال رکھنا چاہئے تھا۔ امبر اور عذرا جیسی لڑکیاں تو اس ہوٹل میں بیٹھ کر اپنی جیب سے کچھ کھانے پینے کا تصور بھی مشکل سے ہی کرسکتی تھیں۔ میں نے انٹرکام پر امبر ہی کو اس کے لئے کولڈ ڈرنک اور کچھ اسنیکس وغیرہ کا انتظام کرنے کی ہدایت کی۔

رسمی انکار کے بعد وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "ہمارے والد کا کئی سال پہلے کینسر کے مرض میں انتقال ہوگیا تھا۔ ہمارا کوئی بھائی وغیرہ نہیں ہے۔ والدہ نے مختلف کام کاج کرکے گھر چلایا اور کوشش کی کہ ہم دونوں بہنیں تعلیم جاری رکھیں۔ میں نے انٹر کے بعد بھی تعلیم جاری رکھی۔ بی اے کیا... بی ایڈ کیا لیکن مونا انٹر بھی نہیں کرسکی۔ اسے تعلیم سے پہلے بھی کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ابا کے انتقال کے بعد تو اس کا بالکل ہی دل اچاٹ ہوگیا تھا۔ وہ کہا کرتی تھی' ہم جیسے گھرانوں کی لڑکیوں کو تو زیادہ تعلیم حاصل کرنے

کے بعد بھی چولہا ہی جھونکنا ہوتا ہے اس لئے پڑھنے کا کیا فائدہ؟ لیکن یہ شاید محض ایک راہ فرار تھی۔ اصل میں وہ ایک بے چین روح ہے۔ وہ کوئی لمبی اُڑان اُڑنا چاہتی تھی۔ ہمیشہ سے اس کے خواب اونچے تھے۔"

"اوہ!" میں ایک طویل سانس لے کر رہ گیا۔ ایسے کئی الیے میرے علم میں تھے جب غریب گھرانے کی لڑکیوں نے اونچی اُڑان کے شوق میں بال و پر گنوا دیئے۔ اونچی اُڑان کا شوق بُرا نہیں تھا لیکن اس کے لئے بہت سی چیزیں دیکھنا پڑتی تھیں۔ خصوصاً لڑکیوں کو زیادہ احتیاط کی ضرورت تھی۔ محض خواہشِ پرواز رکھنا اور آنکھیں بند کرکے اُڑلینا کافی نہیں تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہیں ایسی ہی کوئی کہانی تو میری منتظر نہیں تھی؟ میں ایسا کوئی تماشا دیکھنے سے بچنا چاہتا تھا۔

عذرا بات جاری رکھتے ہوئے بولی "آخرکار مونا ہمارے رشتے کے ایک چچا عنایت صاحب کے پاس حیدر آباد چلی گئی۔ عنایت چچا ایک طرح کے جگت چچا تھے۔ سبھی انہیں انکل عنایت کہتے تھے۔ اچھی بھلی عمر کے لوگ بھی انہیں اسی طرح پکارتے تھے حالانکہ وہ خود کوئی ایسے عمر رسیدہ نہیں تھے۔ وہ رنڈوے اور لاولد تھے۔ انہوں نے دوسری شادی نہیں کی تھی۔ وہ اچھے خاصے دولت مند آدمی تھے۔ مونا درحقیقت اسی چکر میں ان کے پاس گئی تھی کہ ان کی تھوڑی بہت خدمت کرے گی۔ شاید وہ اپنی ساری یا کم از کم آدھی پونی دولت تو اس کے نام کردیں حالانکہ خاندان کے دو تین لڑکے بھی پہلے اسی چکر میں انکل عنایت کے پاس جاچکے تھے اور تھوڑا تھوڑا عرصہ رہ کر منہ کی کھاکر واپس آچکے تھے۔ انکل عنایت بھی ایک ہی گھاگ اور کائیاں آدمی تھے۔ وہ پروں پر پانی نہیں پڑنے دیتے تھے۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ انہوں نے اپنی دولت کے بارے میں کیا سوچا ہوا تھا۔ ویسے بھی ابھی تو وہ ہٹے کٹے تھے۔ کاروبار کررہے تھے' دنیا کی سرگرمیوں میں حصہ لے رہے تھے۔ مونا کو اُمید تھی کہ ایک لڑکی ہونے کے ناتے وہ ان کی زیادہ خدمت کرسکے گی اور صحیح معنوں میں ان کے دل میں گھر کرسکے گی۔ وہ پڑھنے کے بہانے ان کے ہاں رہنے گئی تھی۔"

اس نے خاموش ہوکر نظر جھکالی۔ شاید وہ کسی سوچ میں اُلجھ گئی تھی۔ میں نے کنکھیوں سے گھڑی دیکھی تاہم کچھ کہے بغیر اس کے بولنے کا منتظر رہا۔ ایک لمحے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "تقریباً ڈیڑھ سال انکل عنایت کے ہاں گزار کر وہ واپس آگئی۔ یہ سب سے طویل عرصہ تھا جو کسی قریبی رشتے دار نے انکل عنایت کے ہاں گزارا تھا۔ مونا بہت ناخوش واپس آئی تھی۔ اس نے کھل کر تو مجھے بھی کچھ نہیں بتایا لیکن لگتا یہی تھا کہ اس کی توقعات پوری نہیں ہوئی تھیں اور وہ انکل عنایت کو ناراض کرکے آئی تھی کیونکہ اس کے بعد کبھی ہمارے ہاں انکل عنایت کا کوئی خط وغیرہ نہیں آیا۔ خط تو پہلے بھی ان کا شاذونادر ہی آتا تھا لیکن مونا کے ان کے ہاں قیام کے دوران چند خطوط آئے تھے۔ مونا کچھ عرصہ گھر رہی پھر اس نے امّی کی تمام تر مخالفت کے باوجود کراچی کے لئے رختِ سفر باندھ لیا۔ وہ اپنی زندگی بناکر دکھانے اور کچھ کر گزرنے کے لئے لڑکوں کی طرح بے چین تھی اور حوصلہ اس میں لڑکوں سے بھی زیادہ تھا۔ وہ میرے اور امّی کے منع کرنے کے باوجود کراچی آگئی۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"تقریباً ڈیڑھ سال پہلے کی۔" عذرا نے جواب دیا۔

"پھر کیا ہوا؟"

"مونا ہمیں خط لکھتی رہی۔ لگتا یہی تھا کہ اسے اس بڑے اور اجنبی شہر میں سیٹل ہونے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی۔ اس کے خطوں سے زندہ دلی جھلکتی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ اسے ایک فرم میں نوکری مل گئی تھی لیکن کبھی فرم کا نام وغیرہ نہیں لکھا پھر وہ تھوڑے سے پیسے بھی بھیجنے لگی۔ میں بھی کافی عرصے سے ٹیچر کے طور پر جاب کرنے لگی تھی۔ شاید گھر کے حالات کچھ بہتر ہوجاتے لیکن اس دوران امّی کافی بیمار رہنے لگی تھیں۔ ان کے علاج معالجے کا کافی خرچ تھا اور مسائل بھی درپیش رہتے تھے لیکن زندگی کی گاڑی بہرحال کسی نہ کسی طرح گھسٹ رہی تھی۔

اس دوران مونا نے لکھا کہ وہ ماڈلنگ میں بھی کچھ مقام بنانے کی کوشش کررہی تھی۔ اس نے ہمیں ایک رسالہ بھی بھیجا جو ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس میں اس کی رنگین تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ امّی وہ تصویریں دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے روتی رہیں کیونکہ انہوں نے اس قسم کے کاموں کو کبھی پسند نہیں کیا تھا لیکن جس طرح بعض گھروں کے لڑکے والدین کے قابو میں نہیں رہتے' سرکش ہوجاتے ہیں' ماں باپ کا کہنا نہیں مانتے اس طرح مونا بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تھی اور پھر ہمارا تو باپ بھی نہیں تھا۔ ہم نے رسالہ پھاڑ کر پھینک دیا۔ ہم نے مونا کو تقریباً اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا لیکن آنکھیں بند کرلینے سے بہرحال رشتے ختم نہیں ہوجاتے۔ ہم اسے یوں تو نہیں چھوڑ سکتے۔ اس سے لاتعلق تو نہیں ہوسکتے۔ چھ ماہ سے اس کا کوئی خط نہیں آیا تو آخر پریشان ہوکر مجھے کراچی آنا پڑا۔"

"اس کے خط آنا یکدم ہی بند ہوگئے' ایسا نہیں ہوا کہ رفتہ رفتہ خطوں کے درمیان وقفہ بڑھتا گیا اور آخرکار سلسلہ منقطع ہوگیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں ایسا نہیں ہوا۔ خطوط آنے یکدم ہی بند ہوگئے۔" عذرا نے سر ذرا اونچا کرتے ہوئے کہا "آخرکار مجھے یہاں آنا پڑا لیکن یہاں آکر بھی اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔"

"اس کا اتا پتا کرنے کے لئے تم نے پورے چھ ماہ انتظار کیا۔" میرے لہجے میں غیرارادی طور پر ہلکی سی تلخی آگئی۔

"میں نے بتایا نا کہ ہماری کچھ مجبوریاں تھیں۔" اس کی آواز ایک بار پھر رندھنے لگی۔

میں نے جلدی سے کہا "خیر کوئی بات نہیں۔ یہ بتاؤ۔ جب تم اس جگہ گئیں جہاں مونا مقیم تھی اور جس پتے پر تم اسے خط لکھتی تھیں تو وہ جگہ تمہیں صرف واہیات ہی لگی یا تمہیں اس پر کسی قسم کا شک بھی ہوا؟"

"بس مجھے وہ جگہ کچھ ٹھیک نہیں لگی افضل صاحب!" وہ کچھ بے بسی سے بولی "میں کچھ صحیح طرح اپنا تاثر بیان نہیں کرسکتی۔ میں نے بہت محدود اور سیدھے سادے سے انداز میں زندگی گزاری ہے۔ کسی بڑے شہر میں قیام کرنے اور اِدھر اُدھر مارے مارے پھرنے کا مجھے پہلی بار اتفاق ہوا ہے۔"

"تم ٹھہری کہاں ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"امبر کے پاس۔" اس نے جواب دیا "یوں تو یہاں ہمارے کئی جاننے والے موجود ہیں لیکن میں نے صرف امبر کو تکلیف دی۔ وہ سمجھدار بھی ہے اور ذرا تیز و طرار بھی۔ اس کی سب سے اچھی عادت یہ ہے کہ وہ مجھ جیسے شناساؤں اور پُرانے تعلق داروں کا کام کرنے کی پوری پوری کوشش کرتی ہے۔ پُرانے جاننے والوں سے کبھی منہ نہیں پھیرتی۔ اسی نے آپ کا ذکر کیا۔ بڑی تعریفیں کیں کہ آپ بڑی باکمال شخصیت ہیں۔ آپ کی رسائی بھی بہت اوپر تک ہے اور آپ سینے میں ایک دردمند دل بھی رکھتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر آپ نے چاہا تو چُٹکی بجاتے ہی یہ مسئلہ حل ہوجائے گا اور مونا کا پتا چل جائے گا۔"

"خیر... ایسی بھی بات نہیں ہے۔ امبر نے شاید مجھے تمہارے سامنے کچھ زیادہ ہی معجزاتی قسم کی شخصیت بناکر پیش کیا ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ یہ شہر انسانوں کا ایک جنگل ہے۔ دو چار نہیں بلکہ اَن گنت بھول بھلیوں کا مجموعہ ہے۔ یہاں اگر کوئی چھُپنا چاہے اور وہ اوپر سے کچھ چالاک یا شاطر بھی ہو تو پھر شاید قسمت ہی آپ کو دوبارہ اس سے ملوائے۔ میں اور مجھ جیسے نہ جانے کتنے دوسرے لوگ جو کسی کا سُراغ لگانے میں خاص طور پر ماہر ہیں' خود کئی دن رات ایک شخص کو تلاش کررہے ہیں لیکن ابھی تک اس کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس لئے تم مجھ سے کسی معجزے کی توقع مت رکھنا۔"

میں نے گویا اس کی خوش فہمی دور کرنے کی کوشش کی "میرے خیال میں تو بہتر یہی تھا کہ تم پولیس سے رجوع کرتیں۔ تم پولیس کے پاس کیوں نہیں گئیں؟"

"پولیس؟" اس نے تھوک نگل کر یوں مجروح سی نظروں سے میری طرف دیکھا گویا اس سوال سے اسے کافی صدمہ پہنچا ہو "یہ لڑکی کا معاملہ ہے افضل صاحب اور ہم عزت دار لوگ ہیں' معلوم نہیں اندر سے کیا کہانی نکل آئے یا پولیس کا ہاتھ بیچ میں آجانے کے بعد نہ جانے کیا کہانی بن جائے۔" اس نے جھرجھری سی لی "مجھے مونا کے بارے میں بھی کوئی دعویٰ نہیں ہے۔ اس کے بارے یقین سے کوئی بات نہیں کہی جاسکتی۔ نہیں افضل صاحب! میں پولیس کے پاس جانے کا رسک نہیں لے سکتی۔ آپ کو ہی میری مدد

کرنی ہوگی۔ میں تو پہلے ہی سوچ کر آئی تھی کہ اگر مجھے مونا کو تلاش کرنے میں کسی کی مدد بھی لینا پڑی تو پولیس کی مدد ہرگز نہیں لوں گی۔ کسی اور کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کروں گی خواہ اس میں مجھے رقم بھی خرچ کرنی پڑے۔ یہ دیکھیے میں تو رقم کا بھی بندوبست کرکے آئی تھی۔"

اس نے ہینڈ بیگ سے پُرانے نوٹوں کی تین گڈیاں نکال کر مجھے دکھائیں جن پر ربر بینڈ چڑھے ہوئے تھے۔ وہ غالباً پندرہ بیس ہزار روپے کی رقم تھی۔ گڈیاں اس کے مرمریں استخوانی ہاتھوں میں لرز رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی بے چارگی تھی۔ مجھے اپنے دل کے کسی گوشے میں کھٹک سی محسوس ہوئی۔ اس لمحے مجھے اس پر بڑا ترس آیا۔ میرے لئے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ ان ماں بیٹی نے یہ رقم جمع کرنے کے لئے کیا جتن کئے ہوں گے۔

اس نے خود بھی میرے اندازے کی تصدیق کردی اور دھیمی آواز میں بولی "میرا خیال ہے مجھے آپ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اٹھارہ ہزار کی یہ رقم اکٹھی کرنے کے لئے ہمیں کیا کچھ بیچنا پڑا اور کن ضروریات کا گلا گھونٹنا پڑا۔ اس کے باوجود میں آنکھیں بند کرکے یہ رقم کسی بھی ایسے شخص کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے تیار تھی جو مونا کی تلاش کے سلسلے میں واقعی میری کوئی مدد کرسکتا لیکن آپ بڑے آدمی ہیں۔ آپ سے تو میں اس طرح کی بھی کوئی بات نہیں کرسکتی۔"

میں مسکرادیا۔ اس نے رقم واپس ہینڈ بیگ میں رکھ لی۔ میں نے ملائمت سے کہا "عذرا! میں تم سے معذرت چاہوں گا۔ میں ایک مصروف آدمی ہوں اور آج کل خود مجھے کچھ ایسی اُلجھنیں درپیش ہیں جن کا میں کوئی حل تلاش نہیں کرپارہا۔ ان میں کچھ نجی اُلجھنیں بھی شامل ہیں۔"

اس کے چہرے پر مایوسی کی تاریکی پھیلتے دیکھ کر میں نے جلدی سے کہا "لیکن تمہیں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ میرے اپنے کچھ خاص آدمی ہیں جو اس کام میں تمہاری پوری مدد کرسکتے ہیں اور بے لوث طریقے سے تمہارے لئے ہر کوشش کرسکتے ہیں۔ تم چاہو تو یہ کام پولیس کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے۔ پولیس میں بھی میرا کم از کم اتنا اثر رسوخ ضرور ہے کہ یہ کام اس طرح نہیں ہوگا جس طرح تم سوچ رہی ہو۔ تمہیں پولیس کے روایتی طور طریقوں سے جو اندیشے ہیں وہ حقیقت کا روپ نہیں دھاریں گے۔ مجھے ویسے بھی

امید ہے کہ وہ مہذب اور ہمدرد انسانوں کی طرح اس مسئلے کو ہینڈل کریں گے لیکن میں اوپر سے کہلوا دوں گا۔ پھر تو بہت ہی فرق پڑ جائے گا۔"

میں اپنی دانست میں اس کے ساتھ جتنی ہمدردی کر سکتا تھا کر رہا تھا لیکن یہ دیکھ کر میرے اوسان خطا ہو گئے کہ اس کی دہشت زدہ سی آنکھوں میں ایک بار پھر آنسو جھلملانے لگے تھے۔

وہ بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی "میں تو آپ کے پاس آئی ہوں افضل صاحب! میرے لئے تو آپ ہی کچھ کیجئے۔ اب میں کسی اور سہارے پر تکیہ کرنا نہیں چاہتی۔ میں نے تو بس آپ کے سامنے ہاتھ پھیلایا ہے۔ میں آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔" وہ دائیں بائیں جھک کر دیکھنے لگی۔ شاید میرے پاؤں تلاش کر رہی تھی جو بڑی سی بھاری بھرکم میز کے عقب میں چھپے ہوئے تھے۔ گو کہ اس وقت میں جہاں اور جس طرح بیٹھا تھا' میرے پاؤں پڑنا عملی طور پر ایک مشکل کام تھا لیکن پھر اسے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ ہر حال میں یہ کام کر گزرتی اس لئے میں نے جلدی سے ذرا سخت لہجے میں کہا "مجھے یہ پاؤں پڑنا... ہاتھ پھیلانا... گڑگڑانا... التجائیں کرنا بالکل پسند نہیں ہے۔ مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا کہ کوئی انسان میرے سامنے یہ سب کچھ کرے۔"

"لیکن ہمارے ملک میں تو زیادہ تر بڑے لوگوں کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا ہے سر!" وہ بظاہر سادگی سے بولی "بڑے تو بڑے ہمارے ہاں تو چھوٹے چھوٹے لوگ بھی چاہتے ہیں کہ دوسرے ان کے سامنے گڑگڑائیں... روئیں... التجائیں کریں' کسی نہ کسی چیز کی بھیک مانگیں۔"

"وہ بڑے لوگ نہیں۔ کمینے اور بالشتیے ہیں۔" میں نے بلا تامل کہا "میں اگر کوئی کام کرنے کی پوزیشن میں ہوں گا تو ان سب باتوں کے بغیر بھی وہ کام کر دوں گا لیکن اگر میرے حالات ہی کسی کام کی اجازت نہ دیتے ہوں تو بھلا...."

"سر! آپ جیسے لوگوں کے لئے کسی بھی قسم کے حالات میں چھوٹے موٹے کاموں کی گنجائش نکالنا زیادہ مشکل نہیں۔ اب آپ سے ملنے کے بعد میں کہیں اور نہیں جاؤں گی اگر آپ نے خود مونا کی تلاش میں دلچسپی لینے کی ہامی نہ بھری تو میں خاموشی سے گھر واپس چلی جاؤں گی اور ہم ماں بیٹی اسے تقدیر کا لکھا سمجھ کر برداشت کرنے کی کوشش کریں گے یا پھر انتظار کے سہارے زندہ رہنے کی کوشش کریں گے کہ شاید کسی معجزے کے تحت مونا واپس آجائے۔"

اس کی آنکھیں ایک بار پھر چھلکنے لگی تھیں۔ اس نے چشمہ اتار کر ٹشو پیپر سنبھالا تو میں نے جلدی سے کہا "مونا کس قسم کی لڑکی ہے؟ میرا مطلب ہے اس کی شکل صورت... قد کاٹھ... رنگت وغیرہ....؟"

اسے گویا امید نے سہارا دیا اور آنکھیں پونچھتے پونچھتے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ یہ آنسوؤں میں بھیگی مسکراہٹ تھی۔ اس کی آنکھوں میں شاید بہن کی تصویر ابھر آئی تھی۔ اس کے چہرے پر بے پناہ پیار جھلک آیا۔ بہن کے تصور کے ساتھ ہی اس کے تاثرات بدل گئے تھے۔ میرے لئے یہ ایک عجیب نظارہ تھا۔ آج کے دور میں ایسے بہن بھائیوں کا دم غنیمت تھا جو اپنے بہن بھائیوں کے لئے اتنا تردد کر سکتے تھے' اتنی محبت سے ان کے بارے میں سوچ سکتے تھے۔

"وہ بہت پیاری ہے۔" وہ دوبارہ چشمہ لگاتے ہوئے بولی۔ اس کا دوپٹا اس کی گود میں ڈھلک آیا تھا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ اس کے جسم میں اتنی بھی ہڈیاں نہیں تھیں جتنی میں سمجھ رہا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "لمبی تو وہ مجھ جتنی ہی ہے۔ یعنی اس کا شمار دراز قد لڑکیوں میں ہوتا ہے لیکن اس کے بال بھورے گھنگریالے اور چمکیلے ہیں۔ میرے بالوں کی طرح سیاہ اور روکھے پھیکے نہیں ہیں اور وہ میری طرح بے کشش سی شخصیت کی مالک نہیں ہے۔"

مجھے دل ہی دل میں اسے داد دینا پڑی۔ گویا وہ اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھی۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو اپنے بارے میں خوش فہم نہیں ہوتے۔ وہ شاید اپنے آپ کو کچھ انڈر ایسٹی میٹ ہی کر رہی تھی۔ اب جبکہ اسے میرے سامنے بیٹھے خاصی دیر ہو گئی تھی تو میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ کچھ ایسی بے کشش بھی نہیں تھی جیسی پہلی نظر میں لگی تھی۔

بعض لوگ بجلی کے کوندے کی طرح ہوتے ہیں۔ آپ کی ان پر نظر پڑتی ہے تو آپ کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں' ممکن ہے وہ کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھیں تو آپ کو بدصورت لگنے لگیں۔ کچھ لوگ مدھم پھوار کی طرح ہوتے ہیں۔ ذہن کی مٹی انہیں دیر میں جذب کرتی ہے لیکن آخر کار سوندھی سوندھی خوشبو دینے لگتی ہے۔

وہ اپنے بیگ میں ہاتھ ڈالتے ہوئے بولی "میں زبانی شاید آپ کو صحیح طور پر نہ بتا پاؤں۔ میرے پاس مونا کی ایک بہت اچھی تصویر موجود ہے جو اس کی اصل شخصیت کی بالکل صحیح عکاسی کرتی ہے۔ میں وہ آپ کو دکھاتی ہوں۔ آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔"

اس نے بیگ سے خاصے بڑے سائز کی ایک تصویر نکال کر میری طرف بڑھا دی۔ وہ ایک رنگین اور فل فگر تصویر تھی یعنی مونا اس میں سر سے پاؤں تک نظر آرہی تھی۔

میں ایک ٹک اس تصویر کو دیکھتا رہ گیا!

زندگی کے اونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگزشت ابھی جاری ہے باقی واقعات نویں حصے میں پڑھیں۔

جاسوسی ڈائجسٹ کا مقبول ترین سلسلہ

سرکش

9

محمود احمد مودی

دراصل وہ تصویر اتنی خوب صورت تھی کہ اس پر سے فوری طور پر نظر ہٹانا ذرا مشکل کام تھا۔ عذرا کہہ چکی تھی کہ وہ تصویر اس کی بہن کی شخصیت کی صحیح عکاسی کرتی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ محض تصویر ہی خوب صورت نہیں تھی بلکہ اس کی بہن مونا سچ مچ ایک خوب صورت لڑکی تھی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے اپنی خوب صورتیوں کو نمایاں کرنے کی بھی پوری پوری کوشش کی تھی۔ لہٰذا پوز کچھ ایسا تھا کہ اسے دیکھنے کے بعد دھڑکنوں کا تھوڑا بہت تیز ہونا بھی لازمی تھا۔ انداز بتاتا تھا کہ لڑکی کو تصویر کھنچوانے کا شوق بھی کافی تھا۔

اس کے خوب صورت بھورے گھنگھریالے بال اس کے بیضوی چہرے کے گرد ایک دلکش ہالہ بنائے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں مخموری سی دکھائی دے رہی تھیں۔ شاید یہ تھوڑی سی ایکٹنگ کا نتیجہ تھا۔ بھرے بھرے ہونٹ نیم وا تھے۔ صرف اس کے ہونٹوں میں عذرا کی مشابہت نظر آرہی تھی اور کسی بھی چیز میں نہیں! میرے لئے اس کی تصویر کو دیکھ کر ہی اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ اونچی اُڑان کی خواہش رکھنے والا پرندہ تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جن کے دل میں اگر کچھ ہو تو اس کی تکمیل کے لئے وہ کچھ بھی کر گزرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔

سر سے پاؤں تک وہ دلکش نشیب و فراز کا مجموعہ تھی اور انہیں اُجاگر کرنے کے معاملے میں اس کا انداز ایک شوگرل کا تھا۔ عذرا نے اپنا جو گھریلو پس منظر بتایا تھا اسے ذہن میں رکھتے ہوئے مونا کا تصویر کھنچوانے کا یہ انداز میرے لئے ذرا دلچسپ بھی تھا اور کچھ حیرت انگیز بھی۔ نچلے متوسط گھرانوں میں بھی بعض اوقات کیا کیا انقلابات جنم لیتے ہیں۔ وہ اسکن ٹائٹ نیلی جینز اور کچھ ایسے ہی پیلے بلاؤز میں تھی۔ جینز گھٹنوں سے ذرا ہی نیچے تک تھی اور بلاؤز بھی اختصار کے معاملے میں اس سے پیچھے نہیں تھا۔

چند لمحے تک تصویر کو ایک ٹک دیکھتے رہنے کے بعد میں نے سر اُٹھا کر گویا ایک نئے زاویۂ نظر سے عذرا کی طرف دیکھا اور بے اختیار پوچھا "کیا یہ تمہاری ہی بہن ہے؟ میرا مطلب ہے.... سگی بہن ہے؟"

اس نے افسردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ سر جھکا لیا گویا یہ سوال اس کے لئے متوقع تھا۔ اس بار وہ بولی تو اس کے لہجے میں کچھ ایسا فخر کا عنصر شامل نہیں تھا۔

"مجھے اور اسے دیکھنے کے بعد تقریباً ہر شخص یہی سوال کرتا ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولی۔

"تب تو میں اپنا سوال واپس لیتا ہوں کیونکہ مجھے ایسے سوالات کرنا زیادہ پسند نہیں جو ہر شخص کرتا ہو۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"بہرحال اس کا جواب اثبات میں ہے۔" وہ سر اُٹھاتے ہوئے اسی دھیمے لہجے میں بولی۔ اس کے چہرے پر نہایت خفیف سا جو گلابی رنگ جھلک آیا تھا وہ ابھی برقرار تھا۔

اس نے ذرا مضطربانہ انداز میں پہلو بدلا، پھر ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی اور اپنا ہینڈ بیگ اُٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ ایک بار پھر اسے کھول کر اس میں جھانکتے ہوئے، اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر اس نے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالا اور میری طرف بڑھایا۔ اس کی پتلی پتلی سفید انگلیوں میں اب بھی ہلکا سا ارتعاش تھا جو نہ جانے کیوں اس کی شخصیت کے ساتھ بھلا لگ رہا تھا۔

"یہ وہ ایڈریس ہے جس پر میں مونا کو تلاش کرنے گئی تھی اور جس پر ہم اسے خط لکھتے رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔

میں نے کاغذ اس کے ہاتھ سے لے کر محض سرسری سی نظر ڈال کر پیپر ویٹ کے نیچے رکھ دیا۔ وہ اندرونِ شہر کے ایک پرانے علاقے کا ایڈریس تھا۔

"تو پھر آپ میری بہن کو تلاش کر دیں گے نا؟" اس نے پُرامید لہجے میں پوچھا۔

"نہیں" میں نے دوٹوک لہجے میں جواب دیا۔ اس کی پھیلی ہوئی سی آنکھیں کچھ اور پھیل گئیں۔ ایک بار پھر ان میں آنسو جھلکنے لگے۔

"کیوں؟" اس نے رُندھی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

"اس لئے کہ یہ میرا کام نہیں ہے۔" میں نے ملائمت سے جواب دیا "یہ ڈیڑھ کروڑ آبادی کا شہر ہے۔ اس کی گلی کوچوں میں نت نئے عذاب پل رہے ہیں۔ میں کہاں تمہاری بہن کو ڈھونڈتا پھروں گا۔ یہاں پندرہ بیس ہزار افراد پر مشتمل پولیس فورس تعینات ہے۔ ان کے پاس وسائل اور اختیارات موجود ہیں۔ انہیں اسی قسم کے کاموں کے لئے رکھا گیا ہے۔ تمہیں پولیس کے پاس جانا چاہیے۔"

"ہاں.... جس طرح پولیس نے آج تک اپنے حصے کے دوسرے کام انجام دیئے ہیں، اسی طرح وہ میری بہن کو بھی تلاش کر دے گی۔" وہ زہریلے لہجے میں بولی۔ آنسو ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے رواں ہو گئے۔ چشمہ اُتار کر اس نے میز پر رکھ دیا اور ایک بار پھر ٹشو پیپرز کا سہارا لیا۔

"میں نے کہا نا کہ مجھے تمہاری مدد کرنے سے انکار نہیں ہے۔ میں پولیس کو اوپر سے ٹیلی فون کرا دوں گا۔ وہ روایتی انداز میں تمہاری بہن کو تلاش نہیں کرے گی اور نہ ہی کوئی اسکینڈل بننے دے گی۔ اگر اس معاملے کو کریدنے سے کوئی اسکینڈل نکل بھی آیا تو وہ اسے دبا دے گی۔ میں خود اس بات کا خیال رکھوں گا۔ اس سے زیادہ میں کیا کر سکتا ہوں؟" میں نے بے بسی سے کہا۔

"بس.... بس آپ کی بہت مہربانی۔ آپ اتنی بھی زحمت مت کیجئے۔" وہ یکدم ہی گویا پھٹ پڑی "میں نے خواہ مخواہ ہی آپ کے

پاس آکر اپنا اور آپ کا وقت ضائع کیا۔"
وہ یوں جھٹکے سے کرسی سے اُٹھی کہ کرسی اُلٹ گئی۔ اس کے انداز سے بے پناہ طاقت اور توانائی کی موجودگی کا اظہار ہوا تھا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ ایسی ڈھانچا سی لڑکی میں اتنی توانائی ہوگی لیکن اس دنیا میں کسی کے بارے میں اس وقت تک یقین سے کچھ کہنا بہت مشکل ہوتا ہے جب تک اسے بہت قریب سے دیکھنے کا موقع نہ ملے۔

آنسو اس کی آنکھوں سے اب بھی رواں تھے لیکن اس نے اب انہیں پونچھنے کی کوشش نہیں کی اور بیگ کندھے پر لٹکا کر جانے کے لئے تیزی سے گھوم گئی۔

"سُنو" میں نے عقب سے اسے پکارا۔ وہ ایک جھٹکے سے رُک گئی گویا کسی غیبی قوت نے اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دی ہو۔

میں اُٹھ کر میز کے گرد گھوم کر اس کے قریب پہنچا۔ اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھلملاہٹ کے ساتھ اُمید کی چمک ابھری۔ میں نے اس کا چشمہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "یہ تم یہاں بھولے جارہی ہو۔"

اس کی آنکھوں میں اُمید کی چمک فوراً ہی دم توڑ گئی۔ ایک جھٹکے سے اس نے چشمہ میرے ہاتھ سے لے لیا اور بیٹھی بیٹھی لیکن غضب ناک سی آواز میں بولی "امبر نے خواہ مخواہ ہی آپ کی رحم دلی اور جذبۂ ہمدردی کے طومار باندھے تھے۔ مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہئے تھا جو آدمی اتنا دولت مند ہو اس کے دل میں بھلا اتنا رحم اور ہمدردی کہاں ہوسکتی ہے کہ وہ کسی غریب عورت کی بیٹی... کسی غریب اسکول ٹیچر کی بہن کو تلاش کرنے چل دے۔ امبر کے ساتھ اگر آپ نے مہربانی کا سلوک کیا ہوگا تو اس کی وجہ کچھ اور ہوگی۔"

وہ پاؤں پٹختی کمرے سے نکل گئی۔ اس کا آخری جملہ مجھے ناگوار گزرا تھا لیکن میں نے صفائی پیش کرنے یا اس سے کوئی سخت بات کہنے کی کوشش نہیں کی۔ مجھے معلوم تھا اس وقت وہ جذباتیت کا شکار تھی۔ غربت بجائے خود ایک مصیبت ہے لیکن غربت میں اگر مزید کوئی مصیبت سر پہ آن پڑے... خصوصاً جبکہ اس مصیبت کا تعلق خونی اور جذباتی رشتوں سے ہو تو انسان بارود کی طرح بھڑکتا ہے۔ میں نے اسے دل کا غبار نکالنے کا موقع دیا تھا۔ خود کچھ کہہ کر اسے مزید بولنے کا موقع نہیں دیا تھا ورنہ شاید کوئی بحث چھڑ جاتی۔ حقیقت یہ تھی کہ میں ان کے کام آنا چاہتا تھا لیکن میرے حالات اس کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ ریڈ ڈاٹ اور قاسم بجلی کے معاملے نے مجھے کافی طویل عرصے تک اُلجھائے رکھا تھا۔ ابھی مجھے اپنے ہی حالات کو درست کرنے کے لئے بڑا وقت درکار تھا۔ وہ میری مجبوریوں کو نہیں سمجھ سکتی تھی اور میں جس حد تک اس کی مدد کرسکتا تھا' اس نے غصّے میں اسے بھی قبول نہیں کیا تھا۔ جذباتیت میں انسان اپنا نفع نقصان نہیں سوچتا۔

میں ٹھنڈی سانس لے کر واپس میز پر آبیٹھا اور چند لمحے تک اس کرسی کو تکتا رہا جسے وہ اُلٹ گئی تھی۔ مونا کی تصویر اور اس کے ایڈریس کی چٹ بھی وہ میز پر ہی چھوڑ گئی تھی۔ میں نے ان دونوں چیزوں کو پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینکنے کا ارادہ کیا پھر یہ سوچ کر ایک دراز میں ڈال دیا کہ شاید وہ واپس مانگنے آجائے اور یہ جان کر اس کے جذبات کچھ اور بھڑک اُٹھیں کہ میں نے انہیں پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا۔ اسے تو شاید وہ اپنے جذبات کی دانستہ توہین سمجھتی۔

کافی دیر تک میں دوبارہ کام بھی شروع نہ کرسکا۔ بس یونہی بیٹھا اس کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا جس کے سامنے بند گلی جیسی ایک راہداری تھی۔ یہ راہداری درحقیقت بالکل بند نہیں تھی۔ اس میں ایک دروازہ تھا جو ائرکنڈیشننگ پلانٹ کی طرف کھلتا تھا لیکن وہ دیوار ہی کے رنگ کا تھا اور دیوار ہی کا ایک حصّہ معلوم ہوتا تھا۔

مجھے اُمید تھی کہ امبر جلد ہی کمرے میں آئے گی اور شاید وہ مجھے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کے لئے مجبور کرے گی لیکن وہ کافی دیر بعد آئی اور وہ بھی محض چند فائلیں لینے۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ عذرا کی آمد سے پہلے میں نے اس کے چہرے پر جو شگفتگی دیکھی تھی وہ غائب ہوچکی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ روتے روتے رہ گئی تھی۔

فائلیں جنرل منیجر نے منگوائی تھیں۔ وہ انہیں اُٹھا کر خاموشی سے واپس جانے لگی تو میں نے دھیمی آواز میں پوچھا "عذرا چلی گئی؟"

"جی سر!" اس نے سر اُٹھائے بغیر جواب دیا۔

"بہت غصّے میں ہوگی؟" میں نے اسے کُریدا۔

"غصّے میں تو نہیں تھی سر!" وہ آہستگی سے بولی "اُداس' مایوس اور دل گرفتہ ضرور تھی۔"

"میں نے اسے پولیس کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ میں اس کا مسئلہ پولیس کے ذریعے حل کراسکتا ہوں۔ اس میں خود میرا ٹانگ اڑانا زیادہ ضروری نہیں ہے۔" میں نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے سر... اس نے بتایا تھا..." وہ پہلے ہی کی طرح بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی "لیکن وہ اسے بہتر نہیں سمجھتی ہوگی۔ اس کی اپنی کچھ مصلحتیں ہوں گی۔"

"تم مجھ سے خفا ہو؟" میری نظر اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

"نہیں سر!" وہ گویا تڑپ کر بولی۔ اس نے بے چارگی سے میری طرف دیکھا "میں بھلا آپ سے کیسے خفا ہوسکتی ہوں؟ مجھے کیا حق ہے؟"

"نہیں... تم چاہو تو خفا ہوسکتی ہو۔ تمہیں میری مجبوریوں اور مصروفیات کا شاید صحیح اندازہ نہ ہو حالانکہ تم میری سیکریٹری ہو۔ تم میرے کراچی والے بزنس کے سوا شاید میرے بارے میں زیادہ نہیں جانتیں۔"

"بے شک میں نہیں جانتی لیکن مجھے آپ کی مصروفیات اور مجبوریوں کا اندازہ ہے سر! ہر انسان کی اپنی LIMITATIONS ہوتی ہیں اور پھر یہ کام آپ کے شایانِ شان بھی نہیں ہے۔"

"میں "شایانِ شان" وغیرہ کے چکر میں کبھی نہیں پڑا۔ میں نے اسی مقام و مرتبے کے ساتھ ایسا وقت بھی دیکھا ہے کہ شاید ہمارے ہوٹل کے فٹ پاتھ پر جھاڑو دینے والے کو بھی میری حالت قابلِ رحم لگتی۔ میں نے لیڈی ڈائنا کے ساتھ بیٹھ کر بھی ڈنر کھایا ہے اور میں کسی کچی بستی کے مزدور کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کی گلی کے تندور پر بھی کھانا کھانے جاسکتا ہوں۔"

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ نیم وا تھے۔ میں نے ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگا کر ایک طویل سانس لے کر سلسلۂ کلام جوڑا "بات یہ ہے امبر ڈیئر۔ کہ مجھے اس معاملے میں کچھ گڑبڑ لگتی ہے۔ یہ محض ایک لڑکی کی گمشدگی کا معاملہ نہیں ہے۔"

"تو پھر سر؟" امبر کی آنکھیں حیرت سے ذرا پھیل گئیں۔

"ممکن ہے اس کے سرے کہیں اور جاکر ملتے ہوں۔ کوئی داستان در داستان نکل آئے اور میں فی الحال خود کو زیادہ اُلجھانا نہیں چاہتا۔"

"ٹھیک ہے سر! جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" وہ بُجھے بُجھے سے انداز میں بولی اور فائلیں لے کر رخصت ہوگئی۔ میں کام میں مصروف ہوگیا۔ عذرا اور مونا کے تصور کو میں نے ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔

امبر کو جلد ہی دوبارہ میرے کمرے میں آنا پڑا۔ یا یوں کہئے کہ اسے لایا گیا!

میں شاید کام میں کچھ زیادہ ہی منہمک ہوگیا تھا اس لئے اپنے دروازے کے باہر بروقت کوئی گڑبڑ محسوس نہیں کرسکا۔ ائرکنڈیشنڈ اور ساؤنڈ پروف کمروں کے بہت سے فائدے سہی... لیکن مجھ جیسے شخص کے لئے ایک نقصان یہ تھا کہ بعض اوقات کوئی "ضروری" آواز بروقت آپ تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

دروازہ یکدم ہی جھٹکے سے کھُلا اور امبر گویا ایک ہی دھکّے میں کمرے کے وسط میں پہنچ گئی مگر وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے بال ایک شخص کی مُٹھی میں جکڑے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں کچھ دہشت سے... اور کچھ بال کھینچنے کی وجہ سے پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر کچھ نشانات بھی نظر آرہے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس کے منہ پر گھونسے یا تھپڑ بھی مارے گئے تھے۔

اس کے ساتھ صرف ایک شخص ہی اندر نہیں آیا تھا' دو اور بھی تھے۔ وہ بھی امبر کے تقریباً ساتھ ہی آندھی طوفان کی طرح کمرے میں گھسے تھے اور انہوں نے نہایت پھُرتی سے میری میز کے دائیں بائیں پوزیشن سنبھال لی تھی۔ ان کے ہاتھوں میں چھوٹی گنیں تھیں جنہیں وہ یقیناً اپنے لباسوں میں ہی چھپا کر امبر کے کمرے تک پہنچے ہوں گے۔ میرے کمرے میں آنے کے لئے امبر کے کمرے سے گزرنا پڑتا تھا۔ بیرونی دروازے پر ایک روایتی قسم کا سیکیورٹی گارڈ تعینات تھا۔ معلوم نہیں اس بے چارے کا کیا بنا تھا۔ ان روایتی گارڈز کا تو واقعی کوئی خاص فائدہ نہیں تھا۔ تربیت یافتہ قسم کے دہشت گرد تو انہیں مار کر ان کے ہتھیار بھی لے جاتے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میرے خاص آدمی ہر جگہ' ہر ذمّے داری نہیں سنبھال سکتے تھے۔

امبر کو جس شخص نے بالوں سے پکڑ رکھا تھا۔ وہ کسی گوریلے سے کم نہیں تھا لیکن وہ ذرا صاف ستھرا قسم کا گوریلا تھا۔ اس کے بال لمبے اور داڑھی مونچھیں گھنی تھیں۔ جینز جیکٹ میں تھا اور گٹھے ہوئے جسم کا تھا۔ دیکھنے میں ہی کافی تگڑا اور سخت جان معلوم ہوتا تھا۔ اس کے بھی دائیں ہاتھ میں گن تھی۔ صرف بائیں ہاتھ سے اس نے امبر کو قابو میں کیا ہوا تھا۔ اس کی عمر پینتیس کے قریب تھی۔

میرے دائیں بائیں کھڑے ہونے والوں میں ایک تو بالکل نوعمر لڑکا تھا۔ وہ ان معاملات میں زیادہ گھاگ تو نہیں ہوسکتا تھا لیکن بہت پھُرتیلا معلوم ہوتا تھا اور اس کی آنکھوں میں سفّاکی پیشہ ور قاتلوں والی ہی نظر آرہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گن تھامے ہوئے تھے۔ وہ ان لوگوں میں سے معلوم ہوتا تھا جنہیں "ٹریگر ہیپی" کہا جاتا تھا۔ جو گولی چلانے کا بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ گلی کوچوں میں نوجوانوں کے جتھے کے جتھے اسی مخلوق میں تبدیل ہوچکے تھے۔

تیسرا بالکل گنجا تھا اور یوں اس نے اپنے آپ کو زیادہ بدنما بنالیا تھا کیونکہ اس کا سر کچھ زیادہ ہی لمبوترا تھا۔ وہ بھی خاصا خونخوار معلوم ہوتا تھا اور کسرتی جسم کا مالک تھا۔ اس کی آنکھیں بھوری تھیں وہ کچھ ایسا کم عمر نہیں تھا۔

میں نے ان پر محض ایک نظر ڈال کر ان کا مکمل جائزہ لے لیا تھا۔ وہ میری بے خبری کے لمحے میں اس تیزی سے کمرے میں وارد ہوئے تھے کہ میں میز کی ایک خاص دراز تک بھی ہاتھ نہیں لے جاسکا تھا جس میں میری گن موجود تھی۔ جس وقت میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھانے کا ارادہ کیا تھا' اس وقت تک تاخیر ہوچکی تھی۔ اگر میں اس وقت گن نکالنے کی کوشش کرتا تو وہ میرے لئے فائدے کے بجائے نقصان کا باعث ہوسکتی تھی چنانچہ میں نے دوسرے ہی لمحے اپنا ارادہ ملتوی کردیا تھا۔

امبر کے حلق سے گھگیائی ہوئی سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ میں نے سرد لہجے میں کہا "لڑکی کو چھوڑ دو۔ جو بات کرنی ہے مجھ سے کرو۔"

گوریلا نما شخص جس نے امبر کو بالوں سے پکڑ کر قابو میں کیا ہوا تھا' ان میں سینئر معلوم ہوتا تھا اور کمان یقیناً اسی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا "دولت مند ہونے میں ایک یہ بھی بڑی خرابی ہے۔ انسان کو حکم چلانے کی بڑی عادت پڑجاتی ہے۔"

اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ یہ بات اس نے اپنے ساتھیوں سے کہی تھی لیکن ان کی طرف دیکھا نہیں تھا۔ ان تینوں کی نظر مجھ

پر مرکوز تھی اور وہ ایک لمحے کے لئے بھی میری طرف سے نظر نہیں ہٹا رہے تھے۔ اس کا مطلب تھا وہ مجھے تر نوالا نہیں سمجھ رہے تھے۔ پوری طرح خبردار اور چوکنا تھے۔

میں نے اپنی جگہ سے ذرا بھی حرکت کئے بغیر ایک بار پھر پہلے سے زیادہ سرد لہجے میں کہا "میں کہہ رہا ہوں لڑکی کو چھوڑ دو۔ گھٹیا ترین بدمعاش بھی عورتوں کے ساتھ یہ سلوک نہیں کرتے۔"

"چلو... تم بھی کیا یاد کرو گے۔" گوریلا نما شخص کسی گوریلے ہی کے انداز میں مسکرایا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے امبر کو بُری طرح دور دھکیل دیا۔ امبر زوردار آواز کے ساتھ دیوار سے جا ٹکرائی۔ دیوار پر آویزاں ایک مشہور مصوّر کی پینٹنگ نیچے آ گئی اور اس کے ساتھ ہی امبر بھی۔

وہ بہت زور سے دیوار سے ٹکرائی تھی اور اس کے ساتھ رگڑ کھاتی ہوئی نیچے گر گئی تھی۔ میرے دل کو دھچکا سا لگا۔ اسے یقیناً کافی چوٹ آئی ہو گی لیکن یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ وہ بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ وہ دیوار ہی سے ٹیک لگائے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔ گوریلا نما شخص نے اس کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ اس نے گویا کچرے کی بوری دور پھینک دی تھی۔

دروازہ لمبوترے سر والے نے کمرے میں گھستے ہی اپنے عقب میں بند کرتے وقت ہی مقفل کر دیا تھا۔ اس کے لئے صرف ایک کھٹکا ہی دبانا پڑتا تھا اور اس کی ہلکی سی آواز میں سُن چکا تھا۔

چند لمحے کے لئے کمرے کا منظر گویا ساکت ہو گیا۔ میں اور گوریلا نما شخص ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ دونوں میں سے کسی نے بھی پلک نہیں جھپکی۔ آخر میں نے ہی یہ سکوت توڑا اور ملائمت سے پوچھا "اب تم میں سے کوئی یہ بتانے کی تکلیف کرے گا کہ تم لوگ کیوں یہاں آئے ہو؟"

"ہم تو شاید نہ آتے... لیکن ہم کو آنا پڑا۔" گوریلا نما شخص الفاظ کو چباتے ہوئے بولا۔ اس کے ہونٹوں پر خفیف مگر زہریلی سی مسکراہٹ مستقل طور پر موجود تھی۔ یہ مسکراہٹ عام طور پر ان لوگوں کے چہروں پر موجود رہتی تھی جنہیں اپنے سامنے موجود ہر چیز بہت بُری لگتی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں یہ تاثر موجود تھا جبکہ اس کے دونوں ساتھیوں کی آنکھیں کچھ ایسا ہی پیغام دے رہی تھیں۔

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیوں آنا پڑا؟ کون سی تکلیف تمہیں یہاں لائی ہے؟" میں نے اب بھی ملائمت سے پوچھا۔

"ہمارے ساتھ اس طرح بات مت کرو پیارے سیٹھ صاحب!" گوریلا نما شخص کی آنکھوں میں سفاکی بڑھ گئی "ہمارے سامنے بولا ہوا ایک ایک لفظ آدمی کو بہت مہنگا پڑتا ہے۔ ابھی تم نے صرف روپے پیسے کا حساب کتاب کرنا سیکھا ہو گا۔ لفظوں کا حساب کتاب کرنا تمہیں ... نہیں آتا ہو گا۔ تمہارے جیسے لوگ جانے

انجانے میں دوسروں کے ساتھ بڑے سخت الفاظ بول جاتے ہیں۔ ہم سخت لفظوں کا سختی سے ہی حساب کتاب لیتے ہیں۔" وہ بہت ٹھہر ٹھہر کر۔ ایک ایک لفظ پر زور دے کر پھنکارنے کے سے انداز میں بول رہا تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ لاشعوری طور پر وہ ہمسایہ ملک کی فلموں سے کافی متاثر تھا۔

بہرحال وہ محض فلمی ولن نہیں تھا۔ ہمارے ہاں کے نہتے، مجبور یا شریف لوگوں پر "ہاتھ صاف" کرنے کے بعد اس قسم کے لوگ بھی کافی خطرناک بدمعاش بن جاتے ہیں۔ ہر طرح کا خوف ان کے دل سے نکل جاتا ہے۔ وہ دیکھ صرف میری طرف رہا تھا لیکن کمرے کی دوسری چیزوں پر بھی اس کی نظر تھی۔ اس نے کم عمر نوجوان کو اشارہ کیا۔ وہ اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ وہ اس کھڑکی کے قریب تھا جس کے بلائنڈز اس وقت ہٹے ہوئے تھے۔ اس کی نظر بدستور مجھ پر رہی اور اس کی گن کا رُخ بھی میری طرف رہا لیکن اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈوری کھینچ کر بلائنڈز بند کر دیے۔ کافی حد تک روایتی بدمعاش ہونے کے باوجود وہ بہرحال شاطر و چالاک تھے۔ ان میں سے کوئی بھی ایک لمحے کے لئے بھی میری طرف سے غافل نہیں ہو رہا تھا۔ مجھے کسی طرف ہاتھ بڑھانے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ بڑی سی میز کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر بیٹھا ہوا آدمی ویسے بھی کچھ اچھی پوزیشن میں نہیں ہوتا۔

گوریلا نما بدمعاش بولا "بہت سی دولت کمانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ بہت عقل مند، بہت چالاک، بہت ہوشیار ہے۔ تم بھی یقیناً اپنے آپ کو بڑی توپ چیز سمجھتے ہو گے لیکن ہم تمہیں بتانے آئے ہیں کہ تم اوّل درجے کے گھامڑ، بے وقوف اور اُلّو کے پٹھے ہو۔"

مجھے اپنی کنپٹیاں تپتی محسوس ہوئیں لیکن میں نے اپنی کھوپڑی ٹھنڈی رکھنے کی کوشش کی۔ ایسی مجبوریاں مجھ پر اکثر آتی رہتی تھیں جب چھوٹے لوگوں کو بڑی بڑی باتیں کرنے کا موقع دینا پڑتا تھا۔

"یہ اطلاع تم مجھے فون پر بھی دے سکتے تھے۔ میں تمہاری بات کا یقین کر لیتا۔" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "مجھے تو اپنے بارے میں کبھی کوئی دعویٰ ہی نہیں رہا۔"

"نہیں بابا...! ٹیلی فون پر مشکل باتیں کہاں سمجھ میں آتی ہیں۔ ہم خود تمہیں سمجھا کر جائیں گے اور بہت اچھی طرح سمجھا کر جائیں گے۔ ہمارا سمجھایا ہوا سبق تم جلدی نہیں بھولو گے لیکن تم نے پوچھا نہیں کہ ہم تمہیں گھامڑ بے وقوف اور اُلّو کا پٹھا کیوں سمجھتے ہیں۔"

"یہ بھی تم خود ہی بتا دو تو تمہارا مجھ پر احسان ہو گا۔" میں نے اس کے چہرے سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

"تم اس لئے گھامڑ، بے وقوف اور اُلّو کے پٹھے ہو کہ تم نے عذرا کی بہن کو تلاش کرنے کی ہامی بھری ہے۔" اس نے گویا کوئی راز کی بات آخر کار مجھے بتا ہی دی۔

"اوہ...!" اب مجھے سنبھل کر بیٹھنا پڑا۔ معلوم نہیں وہ کس بنا پر یہ کہہ رہا تھا کہ میں نے عذرا کی بہن کو تلاش کرنے کی ہامی بھری تھی۔ میں نے تو اس کام سے انکار کیا تھا لیکن فی الحال میں نے اس کا اعتراف ضروری نہ سمجھا اور طویل سانس لے کر کہا "تو تمہیں اس بات سے تکلیف پہنچی ہے؟"

"ہمیں کیا تکلیف پہنچنی تھی۔" اس کی مسکراہٹ ذرا گہری ہو گئی "ہم تو تکلیف پہنچانے والوں میں سے ہیں۔ ہم تو صرف یہ بتانے آئے ہیں کہ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔"

"اچھا! تو اب مجھے کسی بھی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ تم سے پوچھ کر کرنا پڑے گا؟"

"ہاں" اس نے بڑے اختصار سے فیصلہ سُنایا۔

"کیوں؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"کیونکہ تمہیں اس شہر میں رہنا ہے۔" اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "شکر کرو کہ ابھی تو تمہیں اس شہر میں رہنے اور یہاں سے اتنی دولت کمانے کا خراج ادا نہیں کرنا پڑا۔"

"میں تمام قسم کے ٹیکس باقاعدگی سے ادا کرتا ہوں۔" میں نے کہا۔

اس نے تمام ٹیکسوں اور ان کی وصولی کرنے والوں کو ہی نہیں بلکہ ان کی ادائیگی کرنے والوں کو بھی چند موٹی موٹی گالیوں سے نوازا اور بولا "میں ٹیکسوں کی نہیں، خراج کی بات کر رہا ہوں۔ تم تو مجھ سے زیادہ پڑھے لکھے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کیا تمہیں ٹیکس اور خراج میں فرق معلوم نہیں؟"

کم عمر نوجوان اچانک ہی بول اُٹھا۔ وہ گوریلا نما شخص سے مخاطب تھا "ٹائیگر! یہ تم نے کس قسم کی باتیں شروع کر دیں۔ کیا پورا دن یہیں گزارنے کا پروگرام ہے؟ اپنا کام کرو اور چلو۔"

نوجوان ان تینوں میں جونیئر تھا۔ میرا خیال تھا اسے کسی بھی معاملے میں بولنے کی جرأت نہیں ہوتی ہو گی لیکن وہ نہ صرف بولا تھا بلکہ بہت ہی واضح قسم کی بے زاری کے ساتھ بولا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں موجود گن میں خفیف سا ارتعاش تھا لیکن اس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں تھی۔ وہ خوف زدہ تو یقیناً نہیں تھا لیکن جلد از جلد کچھ کر گزرنے کے لئے بے تاب ضرور تھا۔

اس کے بولنے سے مجھے معلوم ہوا کہ گوریلا نما شخص کو ٹائیگر کہہ کر بُلایا جاتا تھا۔ یہ اس کا نام تو نہیں ہو سکتا تھا۔ عرفیت ہی رہی ہو گی۔ بدمعاشوں میں اس قسم کی عرفیتیں کافی مقبول تھیں۔

ٹائیگر نے جونیئر نوجوان کی مداخلت کا بُرا نہیں منایا اور اس کی طرف دیکھے بغیر نرمی سے بولا "کام بھی ہو جائے گا چندرا! ہم آئے ہیں تو کام کر کے ہی جائیں گے لیکن ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ سیٹھ صاحب سے دو دو باتیں کر لینے میں کیا حرج ہے۔ ایسے خدا ترس سیٹھوں سے روز روز ملاقات تھوڑا ہی ہوتی ہے۔ ہم اپنا کام اطمینان سے کر کے جائیں گے۔ تمہیں تو معلوم ہی ہے، باہر بندوبست پکا ہے۔ کوئی ہمارے کام میں مداخلت نہیں کرے گا۔ کسی طرف سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس لئے ہمیں جلدبازی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

کم عمر نوجوان نے اپنا وزن ایک پاؤں سے دوسرے پر منتقل کیا۔ وہ یقیناً اب بھی مضطرب تھا۔ ٹائیگر کی باتوں سے اسے یقیناً اطمینان نہیں ہوا تھا لیکن وہ خاموش رہا۔ شاید احترام کا تقاضا تھا۔

ٹائیگر نے آنکھوں سے اس کی طرف خفیف سا اشارہ کیا اور مجھے بتانے لگا "یہ بڑی بے چین روح ہے۔ اسے ہر کام کی بڑی جلدی رہتی ہے۔ یہ ہر چیز تک شارٹ کٹ سے پہنچنا چاہتا ہے۔ بڑا آدمی بننے کے لئے بھی یہ زیادہ انتظار نہیں کر سکتا تھا۔ کچھوے کی رفتار سے نہیں چل سکتا تھا۔ اسی لئے آج یہ کالج یا کسی دفتر میں نظر آنے کے بجائے ہمارے ساتھ نظر آ رہا ہے۔ اس کی جلدبازی کا یہ عالم ہے کہ اس کم عمری میں ہی سولہ قتل کر چکا ہے۔ اس کی رفتار یہی رہی تو ہماری عمر کو پہنچنے تک پلاٹینم جوبلی کر چکا ہو گا۔"

وہ یقیناً مجھے مرعوب کرنے کے لئے یہ سب کچھ بتا رہا تھا۔ مرعوب تو خیر میں کیا ہوتا... لیکن یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ مجھے سینئر بدمعاش سے زیادہ اس جونیئر بدمعاش کی طرف سے محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ اس قسم کے اعصاب زدہ بدمعاش جن کی انگلی ٹریگر پر کانپتی رہتی تھی اور جو اپنے سائے سے بھی خوف زدہ ہو کر گولی چلا دیتے تھے، اس لحاظ سے زیادہ خطرناک ہوتے تھے کہ بعض اوقات انہیں صحیح معنوں میں معلوم بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کو مار رہے ہیں تو کیوں مار رہے ہیں اور اس سے درحقیقت انہیں کیا فائدہ ہو گا؟ ان کے ہاتھ میں گن ہونا ایسا ہی ہوتا تھا جیسے کسی بندر کے ہاتھ میں گن ہونا۔

بہرحال مجھے ان کی لاف زنی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں ایک سوال چُبھ رہا تھا وہ میں اس سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا "تمہیں کس نے بتایا کہ میں نے عذرا کی بہن کو تلاش کرنے کی ہامی بھری ہے؟"

"خود عذرا نے۔" ٹائیگر نے اطمینان سے جواب دیا۔

میں چونکا "کیا وہ تم لوگوں کے قبضے میں ہے؟" میرے دل میں اس لڑکی کے لئے ہمدردی کی کچھ عجیب سی لہر اُبھری۔

"ہمیں اس چوہیا کو قبضے میں رکھ کر کیا کرنا تھا۔" ٹائیگر حقارت سے بولا "ہم نے اسے راستے سے اُٹھایا تھا۔ جب وہ یہاں سے واپس جا رہی تھی۔ ہم نے اس سے صرف اپنے مطلب کی بات معلوم کی اور اسے چھوڑ دیا پھر ہم یہاں آ گئے۔ اگر ہم اسے قبضے میں رکھتے تو اب تک شاید وہ صرف دہشت سے ہی مر چکی ہوتی۔"

معلوم نہیں عذرا نے کس بنا پر ان سے کہہ دیا تھا کہ میں نے موٹا کو تلاش کرنے کی ہامی بھری تھی؟ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس کے منہ سے خوف کے عالم میں غیر ارادی طور پر یہ نکل گیا ہو۔ یہ بھی

ممکن تھا کہ اس میں اس کی کوئی مصلحت رہی ہو۔

معلوم نہیں کیوں میں یہ کہتے کہتے رہ گیا کہ میں نے مونا کو تلاش کرنے کی ہامی نہیں بھری تھی۔ مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے میرا یہ کہنا ان بدمعاشوں کے سامنے صفائی پیش کرنے اور ان سے رحم طلب کرنے کے مترادف ہوگا۔ میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔

ٹائیگر نے غالباً دل ہی دل میں فیصلہ کیا کہ باتیں کافی ہوچکی تھیں۔ اب کچھ ایکشن بھی ہونا چاہئے تھا۔ اس نے اپنے دونوں ساتھیوں کو اشارہ کیا۔ وہ دونوں اور قریب آگئے۔ انہوں نے دائیں بائیں' دونوں طرف سے میری کنپٹیوں پر گنیں رکھ دیں۔

جونیئر بدمعاش کے اعصاب کا ارتعاش میں گن کی نال کے ذریعے بھی اپنی کنپٹیوں پر محسوس کرسکتا تھا۔ صورتِ حال کچھ اور خراب ہوگئی تھی۔ ان دونوں کے قریب آجانے کی وجہ سے میں گویا میز کے عقب میں کچھ اور پھنس کر رہ گیا تھا۔

ٹائیگر نے اپنی گن بیلٹ میں کچھ اس طرح اڑس لی کہ بوقتِ ضرورت وہ پلک جھپکتے میں نکالی جاسکے۔ اس کے بعد اس نے میز سے سامان اُٹھا کر نیچے پھینکنا شروع کردیا۔ ٹیبل لیمپ اس نے قالین پر زور سے پٹخا۔ اس کا دودھیا بلب ہلکے سے دھماکے سے پھٹ گیا۔

اسٹیشنری کی جو چیزیں زیادہ ٹھوس اور مضبوط نہیں تھیں' انہیں اس نے مٹھی میں لے لے کر پچکا دیا۔ بعض چیزیں ٹوٹ پھوٹ گئیں۔ اس دوران اس کی نظر مجھ پر ہی جمی ہوئی تھی۔ وہ میری طرف سے ہوشیار رہنے کے ساتھ ساتھ گویا مجھے اپنی طاقت کے مظاہرے سے بھی مرعوب کررہا تھا۔

تینوں ٹیلی فون سیٹ اس نے یکے بعد دیگرے جھٹکے سے کھینچ لئے اور ان کی تاریں توڑ ڈالیں۔ سیٹ اس نے قالین پر پٹخ دیے۔ دو ایک فائلیں بھی اُٹھا کر اس نے درمیان سے پھاڑ کر دو دو ٹکڑوں میں تقسیم کرکے ایک طرف پھینک دیں۔ میز اس نے بالکل خالی کردی۔

اس دوران امبر کی سسکیاں رُک چکی تھیں اور وہ منہ پر ہاتھ رکھے خوف زدہ نظروں سے یہ کارروائی دیکھ رہی تھی۔ ٹائیگر نے ایک بار پھر بولنا شروع کردیا تھا "اس چوہیا کی بہن اگر غائب ہوگئی تھی تو اسے اس پر صبر کرلینا چاہئے تھا۔ اس شہر میں روزانہ کوئی نہ کوئی گُم ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ اُلّو کی پٹھی اس کی تلاش میں کچھ زیادہ ہی اِدھر اُدھر پھرتی رہی۔ پوری جاسوس بننے کی کوشش کررہی تھی پھر تمہارے پاس بھی چلی آئی اور تمہاری بے وقوفی دیکھو کہ تم نے بھی اسے تلاش کرنے کی ہامی بھرلی۔ تم نے اتنی دولت کمائی ہے یقیناً تیز اور شاطر آدمی ہوگے۔ دنیا کے۔ ملک کے... اور خصوصاً اس شہر کے حالات کا تمہیں اچھی طرح پتا ہوگا۔ کیا ان حالات میں پرائے معاملات میں ٹانگ اڑانا کوئی عقل مندی ہے؟"

میں اس کی حرکتیں دیکھ رہا تھا اور دھیرے دھیرے میرا چہرہ گویا تپنے لگا تھا۔ خون میری کنپٹیوں میں گویا جمع ہورہا تھا لیکن انہی کنپٹیوں پر دو گنیں بھی ٹکی ہوئی تھیں۔ مجھے اس بات پر حیرت بھی تھی کہ بالفرض میں نے مونا کو تلاش کرنے کی ہامی بھی بھرلی تھی تو اس پر کس کو اتنی تکلیف پہنچی تھی۔ وہ کون ہوسکتا تھا؟ یہ بدمعاش یقیناً اپنے طور پر تو یہ کارروائی نہیں کررہے تھے۔ یہ ضرور کسی کے حکم کے پابند تھے۔

ٹائیگر نے میز خالی کرنے کے بعد فائلنگ کیبنٹ کا رُخ کیا۔ حالانکہ اس کے لئے اسے زاویہ بدلنا پڑا پھر بھی وہ مجھ پر نظر رکھنے کی پوری پوری کوشش کررہا تھا اور اس کے دونوں ساتھیوں کی نفرت بھری نظروں کا مرکز تو میں ہی تھا۔ انہیں نہ جانے کیا چیز باز رکھے ہوئے تھی ورنہ شاید وہ دونوں اپنی اپنی گنیں میری کھوپڑی پر خالی کرچکے ہوتے۔

ٹائیگر نے باری باری فائلنگ کیبنٹ کے تمام خانے باہر نکال کر قالین پر اُلٹ دیے اور ان میں موجود تمام فائلوں اور کیٹلاگ کارڈز وغیرہ کو ٹھوکریں مار کر' جوتوں تلے کچل کر اور موڑ توڑ کر جتنا خراب کرسکتا تھا' کردیا۔ بعض چیزوں کو اس نے پھاڑ بھی دیا۔ تاہم وہ اتنا ہوشیار ضرور تھا کہ زیادہ جذباتی ہوکر اس کام میں زیادہ نہیں اُلجھ رہا تھا' منہمک نہیں ہورہا تھا۔ سرِدست شاید ان کا مقصد مجھے صرف خوف زدہ' مرعوب اور ذلیل کرنا تھا۔ یہ احساس دلانا تھا کہ وہ میرے ساتھ جو سلوک چاہتے' کرسکتے تھے اور میں انہیں روک نہیں سکتا تھا۔

خوف زدہ اور مرعوب تو خیر میں نہیں ہوسکتا تھا لیکن اس وقت اچھی خاصی ذلت ضرور محسوس کررہا تھا۔ کچھ کر گزرنے کی کئی تدبیریں میرے ذہن میں آچکی تھیں لیکن میں انہیں مسترد کرچکا تھا۔ رسک بہت زیادہ تھا۔ جب تک بالکل ہی جان پر نہ بن آتی تب تک میں زیادہ رسک لینا نہیں چاہتا تھا۔ امبر کی موجودگی نے بھی مجھے کچھ مجبور کردیا تھا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ کمرے میں گولیاں چلنا شروع ہوئیں تو وہ بوکھلاہٹ میں ہی نہ ماری جائے۔

مجھے اب تک تو یہی تجربہ ہوا تھا کہ اس قسم کی صورتِ حال میں کم از کم کوئی ایک لمحہ ایسا ضرور آتا تھا جس سے فائدہ اُٹھایا جائے تو بازی پلٹ بھی سکتی تھی لیکن آج کی سچوایشن میں ایسا کوئی لمحہ ابھی تک نہیں آیا تھا حالانکہ میں سراپا آنکھ بنا ہوا تھا۔ بظاہر میری نظر ٹائیگر پر جمی ہوئی تھی اور میں گویا بے بسی سے اپنی جگہ بیٹھا جل کُڑھ رہا تھا لیکن دراصل میں غیر محسوس طور پر ہر فرد اور ہر زاویے کو نظر میں رکھے ہوئے تھا۔

اتنا ضرور تھا کہ میرا ہاتھ اس دراز کے کافی قریب پہنچ چکا تھا۔ جس میں میری گن رکھی تھی۔ بظاہر میرا ہاتھ گھٹنے پر ٹکا ہوا تھا۔ ہاتھ دراز کے قریب پہنچ جانا بھی مسئلے کا حل نہیں تھا۔ دراز کا کُھلنا اور گن کا میرے ہاتھ میں آنا گویا ایک طویل عمل تھا حالانکہ یہ دراز نیچے کی طرف سے گھٹنے کا ذرا سا دباؤ ڈالنے پر سامنے کی طرف سے کھٹکے سے کُھل جاتی تھی لیکن میرا مزید حرکت کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا پھر کھٹکا ہوتا اور میرا گن نکالنا ایک الگ مرحلہ تھا۔ اس دوران میرے دائیں بائیں کھڑے ہوئے موت کے فرشتوں کو صرف ٹریگر دبانے کی مہلت درکار تھی۔ چنانچہ میں ساکت رہا۔ تاہم میرا انتظار ختم نہیں ہوا تھا۔

مجھے حیرت اس بات پر تھی کہ ابھی تک کسی بھی طرف سے مداخلت کے کوئی آثار دکھائی نہیں دیے تھے۔ اگر باہر والے سیکیورٹی گارڈ کو انہوں نے بے ہوش' ہلاک یا قابو میں کرلیا تھا تب بھی کیا کسی اور کو ابھی تک احساس نہیں ہوا تھا کہ یہاں کیا ہورہا تھا؟ بے شک یہ آفس ایک طرف کو ہٹ کر' ہوٹل کے ایک کونے میں تھا لیکن اس طرف بھی بہرحال لوگوں کی آمدورفت تو رہتی تھی اور جب سے میں یہاں تھا تب سے تو میں نے اپنے سیکیورٹی انچارج داؤد چوہدری کو خاص طور پر مستعد رہنے کے لئے کہا ہوا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان احتیاطوں کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

فائلنگ کیبنٹ میں موجود تمام چیزوں کی ایسی تیسی کرنے کے بعد ٹائیگر مہمانوں والی کرسیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے جیب سے کھٹکے دار چاقو نکالا اور ان مہنگی قسم کی نفیس کرسیوں کے کشن انتہائی پھرتی سے بُری طرح چیر کر رکھ دیے۔ صرف یہی نہیں' اس نے انہیں اِدھر اُدھر اُلٹ بھی دیا۔

کمرے کا ایک حصہ چھوٹے سے ڈرائنگ روم سے مشابہ تھا۔ اس نے وہاں پہنچ کر بیش قیمت صوفوں کا بھی یہی حشر کیا۔ اس نے ان کے گدیلے حصے چیر پھاڑ ڈالے پھر اس نے دیواروں سے معروف مصوروں کی بیش قیمت پینٹنگ اُتار کر قالین پر اس طرح پٹخیں کہ ان کے شیشے ٹوٹ گئے پھر اس نے انہیں جوتوں سے اس طرح روند ڈالا کہ وہ سب ناکارہ ہوگئیں۔ میں ساکت بیٹھا یہ سب دیکھتا رہا اور خون کے گھونٹ پیتا رہا۔ یہ سارا حساب میرے دل میں جمع ہورہا تھا۔ اس لئے نہیں کہ مجھے اپنے مالی نقصان کی بہت پروا تھی بلکہ اس لئے کہ خود میرے ذہن میں میری ذلت کا احساس بڑھتا جارہا تھا۔

ذرا سی دیر میں میرا شاندار آفس کچھ ایسا منظر پیش کرنے لگا تھا جیسے وہاں کسی پاگل یا جنونی کو خوب اچھی طرح اپنے دل کی حسرتیں نکالنے کا موقع ملا تھا۔

اس کام سے فارغ ہوکر ٹائیگر میری میز کے گرد گھوم کر میرے قریب آگیا۔ گنجے نے ذرا پیچھے ہٹ کر اسے جگہ دی لیکن اس کی گن کی نال بدستور میری کنپٹی پر ٹکی رہی۔ ٹائیگر نے میری میز کی درازیں بھی قالین پر اُلٹ دیں اور ان کا سامان ٹھوکروں سے اِدھر اُدھر بکھیر دیا۔

پھر اس کی نظر خاص دراز پر بھی پڑ گئی۔ وہ عام طریقے سے۔ یعنی ناب پکڑ کھینچنے سے تو نہیں کھلتی تھی لیکن اسے کھولنا کچھ ایسا زیادہ مشکل بھی نہیں تھا۔ اگر اسے نیچے سے دباؤ ڈال کر نہ کھولا جاتا تو پھر ناب کو ذرا سا دبا کر بھی کھولا جاسکتا تھا۔

ٹائیگر نے پہلے تو اس کی ناب پکڑ کر کھینچی۔ جب وہ نہیں کُھلی تو وہ غرایا "اس کی چابی کہاں ہے؟"

"اس میں تالا نہیں ہے۔ ویسے ہی پھنس گئی ہوگی۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے تباہ کرکے تم اپنا شوق پورا کرسکو۔" میں نے اسے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ ٹلنے والا نہیں تھا۔

اس نے آنکھیں سکیڑ کر دراز کا جائزہ لیا۔ اس میں واقعی کہیں چابی کا سوراخ نہیں تھا لیکن وہ اس کا پیچھا چھوڑنے کے بجائے شاطرانہ انداز میں مسکرایا "اوہو..... یہ تو خاص دراز ہے۔ اس میں کوئی خاص چیز ہی ہوگی۔"

اس نے ہلکی سی جھنجلاہٹ کے ساتھ ناب پر ہتھیلی ماری اور دراز کھٹ سے باہر آگئی۔ اس میں میری سیاہ گن رکھی یوں چمک رہی تھی جیسے چھوٹا سا کوئی سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہو۔

اس نے گن اُٹھالی اور محض ایک نظر اسے دیکھ کر اپنے مخصوص خباثت بھرے انداز میں مسکراتے ہوئے بولا "واہ.....! بہت عمدہ چیز ہے لیکن تم جیسے لوگوں کے پاس ایسی چیزوں کا کیا کام؟"

اس نے گن اپنی جیب میں رکھ لی۔ میرا خون کھول رہا تھا لیکن بے بسی کا احساس بھی برقرار تھا۔ وہ تینوں میرے بہت ہی قریب تھے اور تینوں کی انگلیاں ٹریگروں پر تھیں' جگہ بھی کشادہ نہیں تھی۔ میں میز کے عقب میں پھنسا ہوا تھا۔ مجھے صرف ایک لمحے کا انتظار تھا۔ کوئی ایک لمحہ' جب ان کی توجہ مجھ پر سے ہٹ جاتی...! وہ لمحہ ان کے اور میرے لئے فیصلہ کن ثابت ہوسکتا تھا۔

ٹائیگر میرے قریب سے ہٹ کر دوبارہ میز کے سامنے چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ اب وہ جانے کے لئے پر تول رہے تھے۔ ان کا مقصد شاید صرف مجھے دھمکیاں دینا اور ذلت و بے بسی کا احساس دلانا تھا۔ ٹائیگر سامنے سے میز پر میری طرف جھکتے ہوئے سانپ کی طرح پھنکارا "میرا خیال ہے اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ یہ سب کس سلسلے میں تھا۔ کیونکہ تم ایک احمق انسان ہو۔ میرا خیال ہے تمہاری سمجھ میں بات آسانی سے نہیں آئی ہوگی۔ اس لئے تمہیں اچھی طرح بتا رہا ہوں۔ تمہیں فرض کرلینا چاہئے کہ تم اس چوہیا سے کبھی نہیں ملے جس کا نام عذرا ہے۔ تم نے اس کی بہن کو...... بلکہ مونا نام کی کسی بھی لڑکی کو تلاش کرنے کی ہامی نہیں بھری ہے۔ تمہیں اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کے بارے میں سوچنا بھی نہیں ہے۔"

اس نے ایک لمحے توقف کیا گویا میرے تاثرات کا جائزہ لے رہا ہو۔ میں نے پوری کوشش کی کہ اسے میرے تاثرات سے میری اندرونی کیفیت کا اندازہ نہ ہونے پائے۔ اسے شاید میرے تاثرات سے... یا پھر اپنی "کارکردگی" سے کچھ تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے گویا کوئی "فائنل ٹچ" دینے کے لئے اچانک بائیں ہاتھ سے میرا

زخرہ پکڑ لیا۔

اس کی انگلیاں آہنی تھیں اور میرے گلے میں پیوست ہوئی جارہی تھیں۔ مجھے سانس رُکنے سے کوئی تکلیف نہیں ہوئی کیونکہ یوگا کی مشقوں کی وجہ سے میں بہت دیر تک سانس روکے رکھنے کا عادی تھا لیکن نرخرے میں انگلیاں گڑنے کی تکلیف بہرحال اپنی جگہ تھی۔

اس بدبخت کو شاید اس پر بھی قرار نہیں آیا۔ اس کا گن والا ہاتھ ہوا میں بلند ہوا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ گن کا دستہ میرے چہرے پر مارنا چاہتا تھا لیکن اس کام میں وہ جان بوجھ کر پھرتی نہیں دکھا رہا تھا۔ مقصد شاید یہی تھا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچائی جائے مگر وہ جتنی اذیت پہنچا چکا تھا اتنی ہی کافی تھی۔ اس سے زیادہ شاید اوپر والے کو منظور نہیں تھی۔

اس وقت میں خود بھی عین آخری لمحے پر نتائج کی پروا کئے بغیر اس کا بازو پکڑ لینے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اب بہت ہو چکی تھی۔ میں چہرے پر گن کے دستے کی ضرب سہنا نہیں چاہتا تھا۔ تکلیف وہ ہونے کے ساتھ ساتھ وہ چہرے پر نہ جانے کہاں... کتنے عرصے کے لئے... کس قسم کا نشان ثبت کر جاتی۔

تاہم مجھے ہاتھ ہلانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ اس کا ہاتھ ایک ثانیے کے لئے ہوا میں بلند ہی رہ گیا۔ کمرے میں "ٹھک" کی تیز سی آواز ابھری تھی جیسے کسی بوتل کا کارک کھلا ہو اور اس کے ساتھ ہی ٹائیگر کی پیشانی کے عین وسط میں ایک سُرخ سوراخ نمودار ہو گیا تھا جو شاید ایک ثانیے کے لئے کسی کو نظر بھی نہیں آیا تھا۔

اس کا ہاتھ ڈھیلے ڈھالے انداز میں نیچے آیا اور مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کا بازو پکڑنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرا دل باغ باغ ہو گیا۔ جن دو بدمعاشوں نے میری کنپٹیوں پر گنیں رکھی ہوئی تھیں وہ "ٹھک" کی آواز سُن کر نہ صرف چونک پڑے تھے بلکہ بدحواس بھی ہو گئے تھے۔

انہیں صورتِ حال کا اندازہ لگانے میں ایک لمحے کی تاخیر ہو گئی۔ انہیں یہ اندازہ تو غالباً ہو گیا تھا کہ کسی طرف سے سائلینسر لگی گن سے گولی آئی تھی لیکن انہیں یہ جاننے میں ایک لمحے کی تاخیر ہوئی کہ گولی ٹائیگر کی پیشانی پر لگ چکی تھی کیونکہ ٹائیگر فوری طور پر نہیں گرا تھا اور ان دونوں نے یہ جاننے کے لئے ایک لمحے کو مجھ پر سے نظر ہٹالی تھی کہ گولی کدھر سے آئی تھی۔

میرے لئے وہ ایک سیکنڈ کافی تھا۔ ادھر ٹائیگر دھڑام سے گرا... ادھر میں نے ریوالونگ چیئر پر نیچے کو پھسلتے ہوئے بیک وقت دونوں ہاتھوں سے ان دونوں کے پیٹ پر گھونسے رسید کئے۔ نیچے کو پھسلنے کی وجہ سے گنیں میری کنپٹی سے ہٹ گئی تھیں لیکن ان میں سے ایک نے ٹریگر دبا دیا تھا۔ اس کی گن ریپیٹر تھی۔ ٹرے... ٹرے... [illegible] کی آواز [illegible] کے ساتھ کئی گولیاں میرے بالوں کو چھوتی ہوئی

گزر گئیں۔ موت اور زندگی کے درمیان بال برابر ہی فاصلہ ہوتا ہے۔

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ بدحواسی میں چلائی جانے والی یہ گولیاں اس کے اپنے ہی ساتھی کو چھیدتی ہوئی گزر گئیں۔ کم عمر نوجوان کے ہاتھوں گنجے اور لمبوترے سر والا ٹھکانے لگ گیا۔ میرے گھونسوں کی وجہ سے وہ پہلے ہی دونوں طرف کی دیواروں سے جا ٹکرائے تھے۔

گنجا تو ڈھیر ہو گیا لیکن کم عمر نوجوان مزید بدحواسی میں مچھلی کی طرح تڑپ کر سیدھا ہوا اور ایک بار پھر دونوں ہاتھوں سے گن تھامتے ہوئے اس نے میرا نشانہ لیا۔ میں نے ریوالونگ چیئر اس کی طرف دھکیلتے ہوئے میز کی آڑ لینے کی کوشش کی۔

اگر وہ دوبارہ ٹریگر دبانے میں کامیاب ہو جاتا تو شاید میز کی آڑ بھی میرے کسی کام نہ آتی کیونکہ جگہ تنگ تھی اور میں جلدی میں پوری طرح اس میں سما نہیں سکا تھا لیکن میری یہ سعی بے کار رہی۔ ریوالونگ چیئر کا بھی اس سے ٹکرانا غیر ضروری ثابت ہوا کیونکہ اس سے پہلے ہی ان دیکھی اور سائلینسر لگی گن کی گولی اسے بھی چاٹ گئی تھی۔

بظاہر وہ ریوالونگ چیئر کے دھکے سے ڈھیر ہوا لیکن درحقیقت اسے اس سے پہلے ہی گولی لگ چکی تھی۔ میں نے مزید ایک لمحے کے لئے بھی میز کی آڑ میں رہنے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور لپک کر اس کے پاس پہنچا۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ گولی اس کے پہلو سے پسلیوں کے درمیان گھسی تھی اور یقیناً دل میں اُتر گئی تھی۔

میں ایک لمحے کے لئے وہیں ساکت کھڑا رہ گیا۔ اس عجیب تماشے نے مجھے مبہوت کر دیا تھا۔ صرف چند سیکنڈ پہلے تک ٹائیگر اور یہ کم عمر نوجوان بے حد خطرناک دکھائی دے رہے تھے اور کچھ بھی کر گزرنے کے اہل معلوم ہو رہے تھے لیکن اس وقت دونوں کی شکلیں مضحکہ خیزی اور بے بسی کی تصویر بن کر رہ گئی تھیں۔ منہ کھلا تھا۔ چہرے کے عضلات کھنچ گئے تھے۔ آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان کی زندگی کا آخری لمحہ یقیناً شدید حیرت میں گزرا تھا۔

میرے لئے حیرت کا مقام یہ تھا کہ ان کے لئے صرف ایک ایک گولی کافی ثابت ہوئی تھی۔ دونوں مختلف جگہوں پر موجود تھے۔ زاویے بہت مختلف تھے لیکن گولی چلانے والے کا نشانہ اتنا عمدہ تھا اور وہ اپنی چلائی ہوئی گولی کے بارے میں اتنا پُراعتماد تھا کہ اس نے ایک شخص پر دوسری گولی چلانے کی زحمت نہیں کی تھی جبکہ کمرے کی صورتِ حال کچھ ایسی پُرسکون بھی نہیں تھی وہاں تو افراتفری برپا تھی۔

میں گولی چلانے والے کو دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ ویسے بھی اس وقت وہ میرے لئے فرشتۂ رحمت ثابت ہوا تھا۔ جبکہ میں کسی طرف سے مدد میسر آنے کے سلسلے میں مایوس ہو چکا

تھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ گولیاں کس طرف سے آئی تھیں۔ گھوم کر اس طرف دیکھتے ہوئے میری دھڑکنیں کچھ اور تیز ہو گئی تھیں۔

میں آہستگی سے گھوما تھا۔ آخر میری نظر اس کھڑکی پر جا ٹھہری جس کے بلائنڈز چند لمحے پہلے کم عمر نوجوان نے گرائے تھے اور پھر وہ تینوں اس طرف سے بے فکر ہو گئے تھے۔ انہوں نے شاید صرف یہ دیکھا تھا کہ یہ کھڑکی ایک بند گلی میں کھلتی تھی۔ انہیں نہیں معلوم تھا کہ آگے ائرکنڈیشننگ پلانٹ کی طرف سے ایک دروازہ اس گلی میں کھلتا تھا۔

اس کے علاوہ یہ تو صرف دو تین افراد کو ہی معلوم تھا کہ یہ کھڑکی باہر سے ایک خاص ترکیب سے بلائنڈز سمیت دروازے کی طرح اندر کی طرف بھی کھل جاتی تھی۔ مجھے اب تک بارہا یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ اس قسم کی چھوٹی چھوٹی احتیاطیں مجھ جیسے آدمی کے بہت کام آتی تھیں۔

کھڑکی ذرا سی کھلی ہوئی تھی۔ اس سے ایک گن اور سائلینسر کی سیاہ نال جھانک رہی تھی۔ اس سے ذرا اوپر یاقوتی ہونٹوں، ستواں ناک اور غزالی آنکھوں کا کچھ حصہ بھی نظر آرہا تھا۔ جھانکنے والی کو پہچاننے کے لئے اس کا چہرے کا صرف اتنا سا حصہ، پتلی سی ایک پٹی کی سی صورت میں نظر آنا ہی کافی تھا لیکن اس کا وہاں سے جھانکنا میری سمجھ سے باہر تھا۔

وہ زرتاج تھی!

وہ ہوٹل میں مہمان تھی۔ چند دن پہلے ہی آئی تھی۔ بے شک وہ تمام اسٹاف سے متعارف ہو چکی تھی اور سب اسے میری خاص دوست کی حیثیت سے جان چکے تھے لیکن کم از کم میری معلومات کے مطابق وہ اس قسم کے رازوں سے تو ابھی واقف نہیں ہو سکتی تھی کہ ائرکنڈیشننگ پلانٹ کا ایک دروازہ کہاں کھلتا تھا اور میرے آفس کی کھڑکی کا پٹ اندر سے بند ہونے کے باوجود کس ترکیب سے بے آواز طریقے سے اندر کی طرف کھلتا تھا۔ میں کھڑکی میں کم از کم اس کی موجودگی کی توقع نہیں کر رہا تھا۔

"اندر آجاؤ سفاک لڑکی... اور مجھے یقین دلاؤ کہ میں خواب نہیں دیکھ رہا ہوں۔" میں نے ذرا اونچی آواز میں کہا۔

اس نے کھڑکی کا پٹ پورا کھولا اور کسی سبک اندام بلی کی طرح کود کر اندر آگئی۔ وہ اس وقت گولڈن ٹراؤزر اور خاصی لمبی ڈھیلی ڈھالی سی مردانہ شرٹ میں تھی جس پر بڑی بڑی کئی جیبیں نظر آرہی تھیں۔

"تم یہاں کہاں سے پہنچ گئیں؟" غیر ارادی طور پر میرے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکل رہی تھی۔

"ہم یونہی دوستوں کی مدد کو پہنچ جایا کرتے ہیں۔" اس نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بے نیازی سے جواب دیا پھر وہ اپنی گن کے سائلینسر پر پھونک مارنے لگی۔ اس نے ان دو افراد کی طرف

آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا جنہیں اس نے ایک ایک گولی سے لٹا دیا تھا۔ اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ وہ ابھی مجھے تجسس میں مبتلا رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔

میں نے بھی سرِدست اصرار نہیں کیا۔ مجھے امبر کا خیال آگیا تھا۔ گو مجھے معلوم تھا وہ گولیوں کی زد میں نہیں آئی تھی لیکن احتیاطاً اس کی خیر خبر لے لینی چاہئے تھی۔ میں اس کی طرف مڑا تو دیکھا، اس نے کم از کم یہ عقلمندی کی تھی کہ دیوار کی جڑ میں، دیوار سے چپک کر سیدھی لیٹ گئی تھی اور ابھی تک اسی پوزیشن میں تھی۔

میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر اُٹھایا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں اور وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بھی گویا کچھ نہیں دیکھ رہی تھی۔ اسے شاید یقین نہیں آرہا تھا کہ چند سیکنڈ میں بازی پلٹ چکی تھی۔ میں اسے تسلی دینے لگا۔

اچانک کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ دروازہ آہستگی سے کھلا۔ میں نے احتیاطاً گھٹنوں کے بل گرتے ہوئے اس گن کی طرف ہاتھ بڑھایا جو کم عمر نوجوان کے ہاتھ سے گری تھی لیکن مجھے اس کو اُٹھانے کی ضرورت نہیں پڑی کیونکہ اس وقت تک ایک چہرہ دروازے کے عقب سے نمودار ہو چکا تھا۔ محتاط انداز میں کمرے میں جھانکنے والا وہ شخص ہوٹل کا سیکیورٹی انچارج داؤد چوہدری تھا۔

اس کا مطلب تھا باہر کی صورتِ حال بھی قابو میں تھی۔ میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ مُردہ نوجوان کی گن اُٹھانے کا ارادہ میں نے ترک کر دیا۔ کمرے کا منظر دیکھ کر داؤد چوہدری گویا مطمئن ہو کر اندر آگیا۔ اس کے ہاتھوں میں سیاہ ایم پی فائیو تھی۔ اس کے پیچھے ایک دراز قد اور توانا گارڈ تھا لیکن وہ دروازے پر ہی جم کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہاتھ میں چھوٹی گن تھی۔ اس پر سائیلنسر لگا ہوا تھا۔

وہ میرے سامنے پہنچ کر بڑی شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے بولا "آئی ایم سوری سر! مجھے پہنچنے میں کچھ دیر ہو گئی... دراصل مجھے ذرا تاخیر سے اطلاع ملی کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ ان لوگوں نے باہر کھڑے سیکیورٹی گارڈ کو نہایت خاموشی سے خنجر مار کر ہلاک کر دیا تھا اور اس کی جگہ اپنا آدمی کھڑا کر دیا تھا۔"

"باہر والا گارڈ مر چکا ہے؟" میں نے تاسف کے ساتھ تصدیق چاہی۔

"جی ہاں۔" داؤد کے لہجے میں بھی تاسف تھا "اور اس کی جگہ ان بدمعاشوں نے اپنے جس آدمی کو کھڑا کیا تھا وہ ہمارے ہاتھوں مر چکا ہے۔ دونوں کی لاشیں باہر پڑی ہیں۔"

"او مائی گاڈ!" میں نے اپنی ریوالونگ چیئر پر ڈھیر ہوتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا "پانچ ستاروں والے ہوٹل میں پانچ لاشیں... داؤد چوہدری! یہ ہوٹل خاک چلے گا۔ اس کا تو بیڑا غرق ہو جائے گا۔ جب یہ لاشیں یہاں سے اُٹھیں گی اور کل یا پرسوں

کے اخباروں میں سرخیاں لگیں گی تو ہمارے مہمان کمرے چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگیں گے۔ پرسوں تک یہ ہوٹل نہیں۔۔۔ ایک خوب صورت چمکتا دمکتا 'نو منزلہ ماڈرن قبرستان نظر آنے لگے گا۔ اس کے بارے میں تم نے کچھ سوچا؟"

"یس سر!" اس کا سر بدستور جھکا ہوا تھا "یہ چیز تو ہماری ٹریننگ میں شامل تھی کہ ہوٹل کی سیکیورٹی کا اس طرح خیال رکھا جائے کہ اس کے بزنس پر اثر نہ پڑے۔ اسی لئے تو ہم باہر سے نہایت خاموشی سے حملہ آور ہوئے۔ آفس سے نکلنے کے یہ دو ہی راستے تھے۔ ہم نے دونوں کور کرلئے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے پاس سائیلنسر لگی صرف دو ہی گنیں تھیں۔ اوپر سے ہمیں زرتاج صاحبہ مل گئیں۔ ہمیں بھگدڑ میں دیکھ کر یہ بھی ہمارے ساتھ ہولیں۔ میں نے جلدی جلدی انہیں بتایا کہ آپ کے آفس میں گڑبڑ تھی۔ کچھ بدمعاش گھس آئے تھے۔ یہ ضد کرنے لگیں کہ سائیلنسر والی ایک گن انہیں دے دی جائے۔ مجھے ان کی بات ماننا پڑی۔ میں نے انہیں عقبی راستے سے بھیجا اور خود سامنے سے آیا۔ ان کی طرف سے مجھے کچھ زیادہ اُمید نہیں تھی لیکن لگتا ہے انہوں نے بھی ٹھیک ٹھاک کام دکھا ہی دیا۔ میں نے اندازاً انہیں سچویشن سمجھادی تھی اور تمام ضروری باتیں بھی بتادی تھیں۔"

پھر اس نے طمانیت کی گہری سانس لی "خدا کا شکر ہے سر آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ امبر صاحبہ بھی کافی حد تک ٹھیک ہی نظر آرہی ہیں۔" امبر اس وقت میز کا سہارا لئے کھڑی تھی۔ اسے یقیناً بہت سی چوٹیں لگی تھیں لیکن شاید فی الحال اسے ان کا احساس نہیں تھا۔ اس کے ذہن پر سب سے زیادہ خوف کا غلبہ تھا مگر اس [illegible] ہوتا رہا تھا کہ وہ دھیرے دھیرے سنبھل رہی تھی۔

"وہ سب تو ٹھیک ہے داؤد چوہدری۔۔۔ لیکن ہوٹل کی ریپوٹیشن کا کیا ہوگا؟" میں نے تشویش سے کہا۔

"میرے خیال میں پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔" داؤد چوہدری نے مجھے تسلی دی "یہ آفس خاصا پیچھے ہٹ کر ایک کونے میں ہے۔ آپ کا کمرا ساؤنڈ پروف ہے۔ صرف ریپیٹر کے چند فائروں کی آواز گونجی تھی۔ وہ بھی خود مجھے بہت ہلکی سنائی دی تھی حالانکہ میں اس وقت آفس کے سامنے پہنچ چکا تھا۔ ہوٹل میں اس وقت کوئی بھگدڑ نہیں ہے۔ صرف ہمیں اور چند دوسرے سیکیورٹی گارڈز کو ہی پتا ہے کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ وہ اس وقت ہوٹل کے چاروں کونوں پر الرٹ کھڑے ہیں لیکن کراچی میں اب قدم قدم پر گارڈز کا الرٹ کھڑے نظر آنا کوئی حیرت کی بات نہیں رہی۔"

"لیکن پانچ لاشیں!" میں کراہ کر رہ گیا۔

"انہیں ہم رازداری سے اٹھوادیں گے سر! اس سلسلے میں آپ کا اثر رسوخ بھی کام آئے گا۔" داؤد چوہدری اطمینان سے بولا۔

زرتاج میرے قریب آگئی اور دوسروں کی موجودگی کی پروا کئے بغیر کرسی کے ہتھے پر بیٹھ کر میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شفقت آمیز حیرت سے بولی "افضل! تم تو واقعی بزنس مین ہو۔ تمہیں اپنی اور اس لڑکی کی جان بچنے کی خوشی نہیں ہے بلکہ ہوٹل کی فکر پڑی ہوئی ہے۔ میں تو تمہیں ذرا مختلف قسم کا بزنس مین سمجھی تھی لیکن تمہیں تو کاروبار اسی طرح جان سے زیادہ عزیز ہے جس طرح زیادہ تر کاروباری لوگوں کو ہوتا ہے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔" میں نے پہلے سے زیادہ تکلیف کے عالم میں کراہ کر کہا "تم۔۔۔ اور شاید بہت سے دوسرے لوگ بھی اس معاملے میں میرے مؤقف کو نہیں سمجھ سکیں گے۔ مجھے ہوٹل کی فکر اس کے منافع کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ اگر مجھے ایک پیسہ بھی منافع نہ دے تب بھی میں اسے چلاتا رہوں گا بشرطیکہ اس کی رونقیں۔۔۔ شان و شوکت اور لوگوں کی یہاں آمدورفت اسی طرح برقرار رہے۔ سوال روپے پیسے کا نہیں 'اس بھروسے اور اعتماد کا ہے جو لوگ اس ہوٹل اور اس کے نام پر کرتے ہیں۔ یہاں گہما گہمی اور رونق دیکھ کر مجھے ایک عجیب طرح کی خوشی ہوتی ہے۔ یہاں آنے والے لوگ معمولی بھی نہیں ہوتے۔ کسی نہ کسی اعتبار سے وہ اپنی اپنی جگہ بہت اہم ہوتے ہیں اور میں ہوٹل کا مالک ہونے کے ناتے سے لاشعوری طور پر اپنے آپ کو ان کے اعتماد اور بھروسے کا امین سمجھتا ہوں۔ اسی لئے میں نے یہاں بہت سے ایسے انتظامات کئے ہوئے ہیں جو بہت سے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں بھی نہیں ہوتے۔ میں اور میرے ساتھی اسے ایک ہوٹل۔۔۔ یا محض ایک کاروباری پراجیکٹ سمجھ کر نہیں چلاتے۔۔۔ بلکہ یہ گویا ہماری انا کا مسئلہ ہے۔ اگر یہاں اس قسم کے واقعات رونما ہونے لگیں تو لوگ کمرے چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگیں اور آئندہ کے لئے ادھر کا رُخ کرنے سے توبہ کرلیں تو مجھے کچھ ایسا محسوس ہوگا جیسے میں نے اپنے آپ کو ان کے اعتماد کا اہل ثابت نہیں کیا۔ بس یہ احساس میرے لئے ناقابل برداشت ہے۔ بات نفع نقصان کی نہیں ہے۔"

"اوہ۔۔۔ تو یہ بات ہے!" زرتاج ہونٹ سکیڑتے ہوئے بولی اور کرسی کے ہتھے سے اٹھ کھڑی ہوئی "میں تو میں سوچ رہی تھی کہ تمہارے بارے میں میرا اندازہ غلط کیسے ہوسکتا ہے۔"

گن ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اسے داؤد چوہدری کی طرف بڑھانے لگی لیکن میں نے اس کے ہاتھ سے وہ لے لی اور کہا "تم یہ سمجھنا کہ تم یہاں آئی ہی نہیں تھیں۔ تم نے کچھ نہیں دیکھا۔۔۔ تمہیں کچھ معلوم نہیں۔۔۔ ہم خود ہی اس معاملے سے نمٹ لیں گے۔۔۔ میں تمہیں اس میں اُلجھانا نہیں چاہتا۔"

وہ دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بولی "گن تو تم رکھ لو لیکن تمہیں اس معاملے میں زیادہ تشویش زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں بھی اتنی گئی گزری نہیں ہوں کہ اس قسم کے دو چار خبیثوں کو مارنے کے بعد ان کے ساتھیوں' سرپرستوں یا پولیس والوں سے نہ نمٹ سکوں۔ میرے لئے بھی یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "لیکن تم نے جتنا کردیا وہی کافی ہے۔ اب ہمارا بھی کچھ اخلاقی فرض بنتا ہے۔ یہ دردِ سر تم ہمارے لئے رہنے دو۔"

پھر میں نے امبر کے قریب پہنچ کر اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "تم آرام سے کاؤچ پر لیٹ جاؤ۔ میں تمہارے لئے ڈاکٹر بلواتا ہوں۔"

وہ اپنی کہنیاں اور پیشانی وغیرہ سہلا رہی تھی۔ میری بات سُن کر اس نے انہیں سہلانا بند کردیا اور دلیرانہ مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اس کی ضرورت نہیں سر! چوٹیں ہیں۔ خود ہی ٹھیک ہوجائیں گی۔ میں کوئی پین کلر وغیرہ کھالوں گی۔"

"ایک تو ہمارے ہاں لوگوں کو اپنا علاج خود کرنے کا بڑا شوق ہے۔" میں نے زرتاج کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بعض لوگ اپنا علاج ڈاکٹروں سے بہتر خود کرلیتے ہیں۔" زرتاج بولی۔

امبر تھوک نگل کر بولی "سر! مجھے اپنی چوٹوں یا اپنی تکلیف کی اتنی فکر نہیں ہے۔ مجھے تو یہ فکر ہے کہ یہ کیا سلسلہ شروع ہوگیا ہے۔ یہ تو کوئی لمبا ہی چکر لگتا ہے۔ اتنی دیدہ دلیری سے یہ لوگ آپ کے آفس میں گھس آئے......"

"شاید اس کی وجہ ان کی کم علمی بھی ہو۔" زرتاج اس کی بات کاٹتے ہوئے ملائمت سے بولی "شاید یہ بے چارے افضل کے بارے میں کچھ زیادہ نہ جانتے ہوں۔" اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ تھی۔

امبر جھرجھری سی لے کر بولی "بہرحال..... یہ بات طے ہے مس زرتاج.... کہ اس شہر میں اب کوئی بھی کسی بھی جگہ محفوظ نہیں۔"

"جہاں بیک وقت اتنی بہت سی مافیائیں کام کررہی ہوں۔ سرکاری اہل کاروں میں سے اکثر کو مال بنانے کے سوا کسی کام سے کوئی دلچسپی نہ ہو اور عام آدمی کا کوئی پُرسانِ حال نہ ہو۔ وہاں تو حالات ایسے ہی ہوں گے ڈیئر امبر!" زرتاج گہری سانس لے کر بولی۔

"ایسی رنجیدہ اور دل شکن گفتگو سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" میں نے جلدی سے کہا "فی الحال ہمیں ان لاشوں کو اُٹھوانے کی فکر کرنی چاہئے۔ میں ذرا رحیم گل کو فون کرکے دیکھتا ہوں۔ شاید وہ ان لاشوں کو رازداری سے اُٹھوانے میں ہماری کچھ مدد کرسکے ورنہ پھر مجھے ذرا اوپر بات کرنا پڑے گی۔"

"سر!" امبر ہچکچاتے ہوئے بولی "کیا آپ رحیم گل صاحب کو یہ بھی بتائیں گے کہ یہ سب کچھ مونا کی گمشدگی کی وجہ سے ہوا؟ کیا اس میں عذرا کا ذکر بھی آئے گا؟" اس کے لہجے میں ایک انجانا سا خوف تھا۔

"اصولاً تو مجھے ساری بات سچ سچ بتانی چاہئے۔" میں نے جواب دیا "لیکن کبھی کبھی میں دوسروں کی بھلائی کی خاطر مصلحت پسند بھی ہوجاتا ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ ان بہنوں کو اس معاملے میں نہ گھسیٹا جائے؟" میرا ہاتھ ریسیور پر تھا لیکن ابھی میں نے اسے اُٹھایا نہیں تھا۔

امبر نے اثبات میں سرہلایا لیکن اس طرح شاید اس کے سر میں دھمک ہوئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا اور ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند رکھنے کے بعد بولی "سر! مجھے ان دونوں بہنوں کی زندگی ویسے بھی تباہ ہوتی ہی دکھائی دے رہی ہے لیکن اگر ہم اسے تباہی سے بچانے کے لئے تھوڑی بہت کوشش کرسکتے ہیں تو ہمیں ضرور کرلینی چاہئے۔ اگر انہیں اس معاملے میں ملوث کئے بغیر کام چل سکتا ہے تو آپ ضرور کوشش کیجئے۔" اس کے لہجے میں التجا تھی جس کی بنیاد یقیناً خلوص پر تھی اور خلوص بہرحال ایک قابلِ قدر چیز تھی۔ وہ بھی پُرانی قدروں کی امین معلوم ہوتی تھی۔ عذرا سے اس کی بچپن کی دوستی تھی تو وہ اسے ہر نقصان سے بچانے اور اس کی مدد کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کررہی تھی۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر اثبات میں سرہلاتے ہوئے کہا "میں کوشش کروں گا کہ اس معاملے میں ان کا نام نہ آئے اور اگر آئے بھی تو کوئی رسوائی ان کے حصّے میں نہ آئے۔"

"بہت شکریہ سر!" امبر کی آواز جیسے حلق میں پھنسنے لگی۔ زرتاج عجیب سی نظروں سے کبھی میری طرف اور کبھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں نے رحیم گل کے گھر کا نمبر ملایا۔ اس کا بازو کافی حد تک ٹھیک ہوچکا تھا۔ وہ آرام سے چلنے پھرنے لگا تھا۔ گھر سے باہر بھی آنے جانے لگا تھا لیکن اس نے ڈیوٹی جوائن نہیں کی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ ایک پولیس آفیسر کو مکمل فٹ حالت میں ڈیوٹی پر ہونا چاہئے۔ ایک لنگڑاتا ہوا یا کراہتا ہوا پولیس آفیسر مجرموں سے نہیں نمٹ سکتا۔ اس پر میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا تھا "ہمارے ہاں تو اکثر اوقات ایک ڈکراتا ہوا ہٹا کٹا پولیس آفیسر بھی مجرموں سے نہیں نمٹ پاتا۔ البتہ عام شہریوں سے خوب نمٹ لیتا ہے بلکہ اس کے لئے تو اس کا مکمل فٹ یا ہٹا کٹا بھی ہونا ضروری نہیں۔"

اس پر رحیم گل مجھے صرف گھور کر رہ گیا تھا۔

دوسری طرف گھنٹی بجی تو ریسیور رحیم گل نے ہی اُٹھایا۔ مختصر رسمی جملوں کے تبادلے کے بعد میں نے کہا "تمہارے راج میں غریبوں کے ساتھ یہ ہورہا ہے کہ دن دہاڑے چار چار بدمعاش خوفناک گنیں لے کر فائیو اسٹار ہوٹل میں میرے آفس میں گھسے چلے آرہے ہیں۔ سازوسامان توڑ پھوڑ کر پھینک رہے ہیں۔ مجھ سمیت سب کو ذلیل کررہے ہیں۔ لڑکیوں کو دیواروں سے ٹکرا رہے ہیں۔ ہمارے سیکیورٹی گارڈز کو قتل کررہے ہیں.... اور تم آرام سے گھر بیٹھے ہو۔ کیا فائدہ ہے ہمیں تمہاری دوستی کا؟"

اس نے جب "ہیلو" کہا تھا تو اس کے لہجے سے تھکن عیاں تھی۔ شاید وہ "آرام" کرتے کرتے تھک گیا تھا لیکن میری بات سُننے کے بعد شاید یکدم اس کی تھکن اور کاہلی کافور ہوگئی۔ وہ تیزی سے بولا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ کیا واقعی ایسا ہوا ہے؟"

"اس سادگی پر کون نہ مرجائے اے خدا!" میں نے ٹھنڈی سانس لی "تم تو اس طرح بے یقینی سے پوچھ رہے ہو جیسے زندگی میں پہلی بار تمہیں اس قسم کے واقعے کی اطلاع مل رہی ہے۔ حالانکہ تمہیں اچھی طرح معلوم ہے ایک عرصے سے شہر کے گلی کوچوں میں یہی کچھ ہورہا ہے۔"

میں شہر کے حالات اور پولیس کی کارکردگی کے بارے میں آج کل اس پر جو بھی طنز کرتا تھا وہ زیادہ تر اسے نظرانداز کرجاتا تھا، سنی ان سنی کردیتا تھا کیونکہ اس کے خیال میں یہ بھی اکثر موضوعات کی طرح بحث طلب موضوع تھا اور بحث ایک لاحاصل کام تھا کیونکہ اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنی دانست میں "پُرامن بقائے باہمی" کا راستہ اختیار کیا تھا یعنی بحث سے پرہیز کرنا شروع کردیا تھا۔

"تم مجھے فون کررہے ہو۔ اس کا مطلب ہے تم نے ان بدمعاشوں پر قابو پالیا ہے۔" اس نے خیال ظاہر کیا پھر ذرا تشویش سے پوچھا "ان کی حالت کیسی ہے؟"

"تم پولیس والوں کو بدمعاشوں کی حالت کی کتنی فکر رہتی ہے۔ کبھی تم شرفا کی حالت کی بھی فکر کرلیا کرو۔" میں نے کہا۔ میں اسے چھیڑنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

"ایک تو تمہیں جب بھی مذاق سوجھتا ہے، بے موقع ہی سوجھتا ہے۔" وہ جھلا کر بولا "میں صحیح طور پر صورتِ حال جاننا چاہتا ہوں۔ اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ان کی حالت کیسی ہے؟"

"حالت ٹھیک ٹھاک ہی ہے۔ بس ذرا مرگئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔ دوسری طرف خاموشی چھاگئی۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد میں نے کہا "لگتا ہے تمہیں بہت صدمہ پہنچا ہے کہ شہر کا تھوڑا سا گند صاف ہوگیا؟"

وہ ایک بار پھر سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا "کیا چاروں مرگئے ہیں؟"

"ہاں۔ مجھے یہ اطلاع دیتے ہوئے خوشی محسوس ہورہی ہے کہ چاروں مرگئے ہیں۔ یہ تمہارے حصے کا کام ہے جو ہم لوگوں کو کرنا پڑرہا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ ان منحوسوں کے ہاتھوں ہمارا ایک سیکیورٹی گارڈ مارا گیا۔ ایک شریف آدمی جو لوگوں کی جان و مال کی حفاظت پر مامور تھا۔ ان خبیث بھیڑیوں کے ہاتھوں مارا گیا جو نہ جانے کن کچھاروں سے اتنی تعداد میں نکل آئے ہیں۔" غیرارادی طور پر میرے لہجے میں تیزی آگئی۔

"اب تم کیا چاہتے ہو؟" اس نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"لاشیں ہوٹل میں پڑی ہیں۔ تم ایک بزنس مین کی مجبوریوں کو سمجھ سکتے ہو۔ شکر ہے یہاں زیادہ ہنگامہ برپا نہیں ہوا ورنہ اس وقت ہوٹل خالی ہونا شروع ہوچکا ہوتا۔ میں چاہتا ہوں جتنی خاموشی سے یہ مسئلہ نمٹ گیا، اتنی ہی خاموشی سے لاشیں اُٹھالی جائیں۔" میں نے جواب دیا۔

"کمال ہے! اگر معاملہ اتنی ہی خاموشی سے نمٹ گیا ہے تو تمہیں لاشیں غائب کرانے یا اُٹھوا کر کہیں اور پھینکوانے کا خیال نہیں آیا؟" وہ تیکھے لہجے میں بولا۔

"میں ایسا بھی کرسکتا تھا لیکن میں نے یہ بہتر نہیں سمجھا۔" میں نے صاف گوئی سے جواب دیا "میں چاہتا ہوں ان بدمعاشوں کے سرپرستوں کو یہی پتا چلے کہ میں نے خود ہی اس معاملے سے نمٹنے کے بعد اسے اندر ہی اندر دبانے کی کوشش نہیں کی بلکہ یہ پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا ہے۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ اس صورت میں کیا ردِعمل سامنے آتا ہے۔"

وہ خاموش رہا۔ شاید میری مصلحت کو سمجھنے کی کوشش کررہا تھا۔ ذرا توقف کے بعد میں نے کہا "اور کوئی ردِعمل سامنے آنے سے پہلے ہی اگر تم یہ پتا کرا کے مجھے بتاسکو کہ ان بدمعاشوں کے سرپرست کون ہیں۔ تو میں تمہارا مزید ممنون ہوں گا۔ شاید اس سلسلے میں لمبی چوڑی تفتیش کی ضرورت نہ پڑے۔ تمہارے پاس وہ جو ایک ایس آئی ہے۔ کیا نام ہے اس کا۔ وہ جو جرم پیشہ لوگوں کا انسائیکلوپیڈیا معلوم ہوتا ہے؟"

"اکرم" اس نے اختصار سے جواب دیا۔

"ہاں شاید اکرم ہی ان کے حدودِ اربعہ سے واقف ہو ورنہ تم پولیس کے ذرائع استعمال کرتے ہوئے مجھے بتاؤ۔ تمہاری بڑی نوازش ہوگی۔"

"پھر تم کیا کرو گے؟" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں دریافت کیا۔

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "میں بھلا کیا کرسکتا ہوں؟ میں تو یونہی جنرل نالج کے لئے پوچھ رہا ہوں۔"

"میں تمہاری "جنرل نالج" سے اچھی طرح واقف ہوں۔ تمہیں مجرموں سے اپنے طور پر نمٹنے کا بڑا شوق ہے۔ اس وقت بھی یہی شوق تمہارے دل میں کلبلا رہا ہوگا۔"

"مجھ میں بھلا اتنی جرأت کہاں۔" میں نے عاجزی سے کہا "تم خواہ مخواہ میرے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ تمہارا محکمہ اتنی محبت سے اس قسم کے بدمعاشوں اور دہشت گردوں کے لئے ماحول سازگار بناتا ہے۔ ان کی طرف سے آنکھیں بند کرکے انہیں من مانیاں کرنے کے مواقع دیتا ہے۔ میں بھلا ان کی راہوں میں روڑے اٹکانے کی جرأت کیسے کرسکتا ہوں؟"

"پھر وہی جلی کٹی باتیں شروع کردیں۔" وہ بے زاری سے بولا۔

"کیا کروں۔ تم دل کے زخموں کو چھیڑ دیتے ہو۔"

"جلی کٹی باتیں کرتے وقت تم معصوم بننے کی اداکاری بھی کچھ

زیادہ ہی کرتے ہو۔ اتنی اوورایکٹنگ مت کیا کرو۔" اس نے مشورہ دیا۔

"کیا تمہیں فون پر بھی میری اوورایکٹنگ نظر آرہی ہے؟ شاید میری لاعلمی میں ہمارے فون ویڈیو فونز میں تبدیل ہوگئے ہیں۔ چلو مبارک ہو۔ ہم نے ترقی کی طرف ایک اور قدم اٹھالیا ہے۔"

"اچھا..... فضول باتیں چھوڑو۔ تمہارے پاس لاشیں پڑی ہوں۔ تب بھی تم بک بک کرنے سے باز نہیں آتے۔ یہ بتاؤ تم نے اپنے طور پر ان لوگوں کے بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی؟" رحیم گل بولا۔

"اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے میں نے اپنے وسائل استعمال کیئے ہوں گے یا اپنے آدمیوں کو حرکت میں لاچکا ہوں گا۔ تو شاید تم بھول رہے ہو کہ یہ واقعہ چند منٹ پہلے کا ہے۔ ابھی مجھے اپنی "مشینری" کو حرکت میں لانے کا موقع نہیں ملا۔ ویسے بھی پہلے میں تمہارے محکمے سے استفادہ کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تمہاری طرف سے کوئی کارآمد اطلاع نہ مل سکی تو پھر اپنی مشینری کو بھی استعمال کرکے دیکھ لوں گا۔ اگر تمہاری مراد یہ ہے کہ میں نے لاشوں کی تلاشی لی ہے یا نہیں.....؟ تو اس کا جواب یہی ہے کہ میں نے ایسی جرائت نہیں کی۔ میں نے جرم و سزا کی کہانیوں وغیرہ میں پڑھا ہے کہ پولیس کے آنے تک لاشوں کو نہیں چھیڑنا چاہیے۔ شہادتیں ضائع ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"تمہاری اس معصومیت اور سعادت مندی پر قربان جانے کو جی چاہ رہا ہے اور وہ محاورہ بھی یاد آرہا ہے نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی۔ معلوم نہیں کتنی لاشیں تم نے کہاں کہاں..... کس کس حال میں چھوڑی ہوں گی۔ کس کس لاش کو کس طرح اُلٹ پلٹ کیا ہوگا اور اب ایسے معصوم بن رہے ہو جیسے لاشوں سے واسطہ ہی زندگی میں پہلی بار پڑا ہے اور وہ بھی شاید آسمان سے ٹپک پڑی ہیں۔"

"ایک تو تم پولیس والوں کا سب سے بڑا مشغلہ شرفا پر الزام لگانا ہے۔ تم مجھے کیوں ہلاکو خان ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہو۔ میرے ہاتھوں زندگی میں اگر مرا بھی ہوگا تو کوئی درندہ ہی مرا ہوگا۔ انسان نہیں مرا ہوگا۔" میں نے کہا۔

"چلو..... خیر۔ میں تسلیم کرلیتا ہوں تمہارے تو پاؤں تلے آکر کوئی چیونٹی بھی نہیں مری ہوگی۔" وہ جلدی سے بولا "میں فی الحال یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تم کسی کے آنے سے پہلے ان لاشوں کی تلاشی تو لے کر دیکھو۔ شاید کوئی ایسی چیز نکل آئے جس سے ان کی شناخت میں مدد ملے۔"

"تم اجازت دے رہے ہو تو میں ایسا کرلیتا ہوں۔ ورنہ میرا تو ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" میں نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھے بغیر داؤد چوہدری سے کہا "رحیم گل صاحب کہہ رہے ہیں لاشوں کی تلاشی لو۔"

داؤد چوہدری ابھی تک گن سنبھالے کچھ اس طرح مستعد کھڑا تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کوئی لاش اُٹھ کھڑی ہوگی۔ میری بات سُن کر اس نے گن میز کے سہارے کھڑی کی اور کمرے میں پڑی تین لاشوں کے علاوہ سامنے کی راہداری میں میرے کمرے سے باہر پڑی لاش کی بھی نہایت مہارت سے تلاشی لی۔ اس نے اس کام میں زیادہ دیر نہیں لگائی۔

چاروں بدمعاشوں کی جیبوں سے چھوٹی موٹی مختلف چیزیں، جن میں کھٹکے دار چاقو اور فاضل میگزین بھی شامل تھے، برآمد ہوئے لیکن کوئی معمولی سی بھی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی جس سے ان کی شناخت کی طرف کوئی اشارہ ہی مل سکتا۔ قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ ان کی جیبوں میں بڑے نوٹوں کی کئی گڈیاں بھی موجود تھیں۔ نوٹ پُرانے تھے اور گڈیاں پورے سو سو نوٹوں کی معلوم ہوتی تھیں کیونکہ ان میں پنیں بھی لگی ہوئی تھیں لیکن کسی بھی گڈی پر بینک کا ریپر نہیں تھا۔ عین ممکن تھا ان پر سے ریپر پھاڑ کر پھینک دیئے گئے ہوں یا پھر وہ گڈیاں اس وقت براہِ راست بینک سے نہ آرہی ہوں۔ معلوم نہیں وہ ان لوگوں کی اپنی ملکیت تھی یا راستے میں "لگے ہاتھوں" وہ ایک آدھ ڈاکے سے بھی فارغ ہوتے آئے تھے۔ ان کی جیبوں میں مجموعی طور پر کم از کم پانچ لاکھ کی رقم تھی۔ ڈھیلی ڈھالی جیکٹوں پتلونوں وغیرہ کا صحیح معنوں میں فائدہ انہوں نے ہی اُٹھایا تھا۔ خوب لدے پھندے تھے اور مہارت یہ تھی کہ اپنے بارے میں کوئی سُراغ لے کر نہیں چلے تھے۔ مرنے کے بعد بھی کم از کم فی الحال تو بے نام و نشاں ہی تھے۔

داؤد چوہدری نے تمام چیزیں میز پر رکھ دیں تو میں نے فون پر رحیم گل سے کہا "مبارک ہو ان کی جیبوں سے شناخت کی تو کوئی چیز نہیں نکلی لیکن تم پولیس والوں کی دلچسپی کی ایک خاصی بڑی چیز نکلی ہے۔"

"کیا؟" اس نے بے اختیار جلدی سے پوچھا۔

"تقریباً پانچ لاکھ کی رقم۔" میں نے جواب دیا "جلدی سے بھاگ کر آجاؤ۔ کسی اور کے ہاتھ نہ لگ جائے۔"

"اگر تم نے مزید بکواس کی تو میں تمہارے اثر رسوخ کی پروا کیئے بغیر پولیس پارٹی لے کر آؤں گا اور تمہیں ان چاروں نامعلوم افراد کے قتل کے الزام میں گرفتار کرلوں گا۔" وہ غصے سے بولا۔

"پولیس والوں سے دوستی کرکے بھلا انسان اور کیا اُمید رکھ سکتا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم اس بات کی بھی پروا نہیں کروگے کہ یہ علاقہ تمہارے تھانے کی حدود میں نہیں آتا؟"

"یہ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ جب میں دوسرے تھانے کا ہو کر تمہاری مدد کے لئے آسکتا ہوں تو اور بھی بہت کچھ کرسکتا ہوں۔" وہ بولا۔

"بے شک۔ بے شک" میں نے اس سے اتفاق کیا "لیکن میں تو تمہارے فائدے کی بات کررہا تھا۔ پانچ لاکھ روپے بہرحال معقول رقم ہے۔" مجھے معلوم تھا چند ہی دن پہلے اس نے اپنی تحویل میں آئے ہوئے ایک کروڑ مالیت کے ہیرے نہ صرف سرکاری مال خانے میں جمع کرائے تھے بلکہ ان کے لئے اپنی جان کو بھی خطرے میں ڈالا تھا۔ وہ ان نایاب قسم کے دیانت دار پولیس افسروں میں سے تھا جو اب قصّے کہانیوں کے کردار لگتے ہیں لیکن اسے چھیڑنے میں لطف آتا تھا۔

"تم جیسے بڑے آدمی کے لئے یہ بڑی رقم ہوگی لیکن مجھ جیسے چھوٹے آدمی کے لئے یہ بہت چھوٹی رقم ہے۔" وہ مضبوط لہجے میں بولا۔ اسے بھی پتا ہوتا تھا کہ میں کب اسے چھیڑ رہا ہوں لیکن شاید وہ اس چھیڑ چھاڑ کو "پُراثر" بنانے کے لئے جان بوجھ کر سنجیدگی سے جواب دیتا تھا۔ اس وقت اس نے اپنی مصنوعی سنجیدگی میں بڑی عمدہ بات کی تھی۔ واقعی بعض زیادہ دولت مند لوگ جس رقم کی خاطر مرے جارہے ہوتے ہیں، کسی فاقہ مست درویش کی نظر میں وہ بے وقعت ہوتی ہے۔

"کہیں میرے علاقے والا نہ یہ رقم ہضم کرجائے۔" میں نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"میں اسے ہضم نہیں کرنے دوں گا۔" وہ اطمینان سے بولا "تم سب چیزیں واپس ان کی جیبوں میں ڈال دو۔ میں متعلقہ لوگوں کو ساتھ لے کر خود آرہا ہوں۔ میرا انتظار کرو۔"

"بہت بہتر۔" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

ریسیور رکھ کر میں نے زرتاج کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "رحیم گل آرہا ہے۔" وہ اس وقت تک ایک کرسی سیدھی کرکے اس پر بیٹھ چکی تھی۔

"تو پھر میں اپنے کمرے میں چلتی ہوں۔" وہ اُٹھتے ہوئے بولی۔

"اب ایسی بھی کیا جلدی ہے۔" میں نے کہا "وہ اُڑ کر یہاں نہیں پہنچ رہا۔ اسے کچھ وقت لگے گا اور اگر اس بے چارے کو معلوم ہوگیا کہ تم اس کا نام سُن کر ہی اُٹھ کر چل دیتی ہو تو صدمے کی شدت سے شاید وہ خودکشی کرلے۔"

"آج کل کوئی کسی کی وجہ سے خودکشی نہیں کرتا افضل ڈیئر!" وہ ایک قدم دروازے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی "میں اب چلی ہی جاؤں تو بہتر ہے۔ لاشوں کے سرہانے بیٹھ کر کسی کا انتظار کرنا کوئی دلچسپ کام نہیں ہے۔"

وہ شاید ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اسے گویا کوئی خیال آیا۔ خود ہی رُکتے ہوئے بولی "میں بلا تکلف پوچھ رہی ہوں۔ میرا رکنا ضروری تو نہیں ہے نا؟ میرا مطلب ہے اس قتل و غارت کے سلسلے میں۔" اس نے لاشوں کی طرف اشارہ کیا "تم چاہو تو میں یہاں رک کر بیان دے سکتی ہوں کہ دو بدمعاش میرے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔"

"نہیں..... نہیں۔ اس معاملے کی وجہ سے تمہیں یہاں رُکنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس سے میں خود نمٹ لوں گا۔ یہ اتنا اہم مسئلہ نہیں ہے۔ تم اطمینان رکھو۔" میں نے جلدی سے کہا "اس قسم کے آدمیوں کے میرے یا میرے دوستوں کے ہاتھوں مارے جانے پر مجھے کبھی کوئی تشویش یا پریشانی نہیں ہوئی اور شاید قدرت نے بھی میری مدد کی کہ کبھی میرے لئے کوئی اُلجھن کھڑی نہیں ہوئی البتہ دل ہی دل میں ہمیشہ میری یہ دعا ضرور رہی ہے کہ کبھی میرے ہاتھوں غلطی سے بھی کوئی شریف اور بے قصور آدمی نہ مارا جائے۔ کوئی ایسا آدمی جس کا مرنا مظلومیت میں شمار ہو۔ مظلومیت کے اپنے کچھ اثرات ہوتے ہیں۔ وہ انسان کو ضرور کبھی نہ کبھی جکڑ لیتے ہیں پھر اثر رسوخ بھی کسی کام نہیں آتا۔"

وہ دھیرے سے مسکرائی اور دروازہ کھول کر آفس کے بیرونی حصے میں جھانکتے ہوئے بولی "اب تو میں ادھر سے چلی جاؤں نا؟ اس خفیہ راستے سے تو مجھے داؤد چوہدری نے بھیجا تھا۔"

"یہ داؤد چوہدری بھی خاصا کام کا آدمی ہے۔ بس کبھی کبھی ضرورت کے وقت غائب ہوجاتا ہے۔" میں نے داؤد کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا۔

"سر! جب میں حالات کو نہایت سازگار سمجھ کر آرام سکون سے بیٹھا ہوتا ہوں تو اچانک کوئی مصیبت ٹپک پڑتی ہے۔" داؤد سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"ہاں..... پنچھی جب بے فکری سے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ کر دانا دُنکا چُگنے لگتا ہے تبھی صیاد کے جال میں پھنستا ہے۔" میں نے آگے بڑھ کر خود زرتاج کے لئے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "بہرحال تم لوگوں نے آکر بہت عمدہ طریقے سے صورتِ حال پر قابو پایا۔ یہ کارروائی کسی کمانڈو ایکشن سے بھی بہتر تھی۔ کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔ مجھے اور امبر کو کوئی گزند نہیں پہنچی۔ زرتاج! تم نے بھی نہایت خاموشی سے۔ نہایت ماہرانہ انداز میں نہایت اہم کام کیا۔" میں نے اسے تھپکی دی۔

"گرو جی..... میں آپ کی چیلی ہوں۔ میں آپ کے ہاتھ دیکھ چکی ہوں۔" وہ باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے بڑی عاجزی سے بولی۔

ہم امبر کے کمرے کے سامنے والی راہداری میں پہنچے۔ اس راہداری کے سرے پر شیشے کا دروازہ تھا۔ گارڈ اس دروازے سے باہر کرسی پر بیٹھتا تھا لیکن اس وقت اس کی لاش راہداری میں دیوار کے قریب پڑی تھی۔ اس کے جسم سے خون بہہ بہہ کر قالین میں جذب ہوچکا تھا۔ اسے باہر قتل کرنے کے بعد لاش گھسیٹ کر اندر لائی گئی تھی اور نہ جانے کیوں اس کی کرسی بھی لاکر لاش پر اوندھی رکھ دی گئی تھی۔ وہ شاید اس وقت چائے پی رہا تھا جب ان لوگوں نے کسی طرف سے نمودار ہوکر اسے قتل کیا۔ انہوں نے شاید امبر کو زیادہ خوف زدہ کرنے کے لئے اور اپنی کارروائی کو زیادہ سے زیادہ دیر تک خفیہ رکھنے کے لئے لاش کو اندر لاکر عین اس کے کمرے کے دروازے پر ڈالا تھا۔ گارڈ کے چائے کے برتن بھی اس کے قریب ہی لاکر پھینک دیئے گئے تھے۔ اس کی گن نہ جانے کہاں

تھی۔

"میں صرف اس لمحے سے ڈر رہا تھا۔" میں نے لاش کی طرف سے نظر چُراتے ہوئے کہا "کسی بے گناہ اور بے قصور کی لاش دیکھنا میرے لئے بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ بڑی کٹھن آزمائش... میں جو اتنی دیر سے چہک رہا تھا۔ بکواس کر رہا تھا۔ درحقیقت میں اسی حقیقت کو بُھلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ باہر اس بے چارے کی لاش پڑی ہے۔"

میں نے اس کی لاش پر سے کرسی ہٹا کر امبر کے کمرے میں لے جا رکھی۔ میں نے محسوس کیا کہ زرتاج اور داؤد چوہدری بھی لاش کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔

"یہ غالباً کوئی عام سا سیکیورٹی گارڈ ہوگا؟" میں نے داؤد چوہدری سے دریافت کیا۔

"یس سر...! کسی حد تک یہ کہا جاسکتا ہے....." داؤد ہچکچاتے ہوئے بولا "یہ اس قسم کے لوگوں میں سے تھا جو کچھ خاص قسم کے محکموں میں سے جلدی ریٹائرمنٹ لے لیتے ہیں اور بعد میں گارڈ کے طور پر بھرتی ہو جاتے ہیں۔ اسلحے کے استعمال وغیرہ کے معاملے میں تربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ دیانت دار ہوتے ہیں۔ اس شخص کا تو ریکارڈ بھی اچھا تھا۔ اس سے پہلے سیکیورٹی کی کمپنیوں میں ملازم رہ چکا تھا۔ دو مرتبہ اس نے مقابلہ کرکے دو ڈاکوؤں کو پکڑا۔ ایک مرتبہ مقابلہ کرتے ہوئے زخمی ہوا۔ کمپنیوں کی طرف سے اپنی خدمات کا خاطر خواہ صلہ نہ ملنے پر دل برداشتہ ہو کر ہمارے پاس آگیا تھا۔"

"تربیت یافتہ دہشت گردوں اور چُھپ کر حملہ کرنے والوں کے معاملے میں بہرحال یہ لوگ مار کھا جاتے ہیں۔ اور اس وقت تو ویسے ہی یہ بے چارا بیٹھا شاید چائے پی رہا تھا۔" میرا دل واقعی تاسف سے بوجھل تھا "ہم اس کے لواحقین کے لئے اسے واپس تو نہیں لا سکتے لیکن تم ان کے لئے جو کچھ بھی ہو سکے ضرور کرنا۔ تم جو کچھ بھی تجویز کرو گے وہ مجھے لکھ کر دے دینا' میں اس پر آنکھیں بند کرکے سائن کر دوں گا۔"

"اور اس وقت مجھے بھی یاد کر لینا۔" زرتاج بولی "میرے لائق بھی جو خدمت ہو بتا دینا۔ مجھے خوشی ہوگی۔"

"بہت شکریہ.... بہت شکریہ۔" داؤد ہاتھ ملتے ہوئے بولا۔

زرتاج بیرونی دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہوئی "تم نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ یہ چکر کیا تھا؟"

"اطمینان سے بیٹھ کر بتاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"او کے.... بائے۔" اس نے ہاتھ ہلایا اور دروازے سے نکل کر ہوٹل کی عمارت کے پہلو میں چلتی ہوئی آگے جا کر ڈرائیو وے کی طرف مڑ گئی۔ میں واپس ہولیا۔ واپسی میں' میں نے اس بدمعاش کی لاش کا جائزہ لیا جسے سیکیورٹی گارڈ کو ٹھکانے لگانے کے بعد میرے کمرے کے دروازے پر کھڑا کیا گیا تھا۔ داؤد اور اس کے ساتھ آنے والے دوسرے سیکیورٹی گارڈ نے نہ جانے کس طرح اس کی نظر میں آئے بغیر اسے خاموشی سے' سائیلنسر لگی گن سے شوٹ کیا تھا۔ یہ ان کا چھوٹا سا کارنامہ تھا۔ بدمعاش چاروں خانے چت پڑا تھا۔ گن ابھی تک اس کے ہاتھ میں ہی تھی لیکن اسے شاید اس سے گولی چلانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک گولی اس کی گردن سے پار نکل گئی تھی۔ دوسری پیشانی میں پیوست ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ بگڑ کر رہ گیا تھا اور اس پر اس سے بھی زیادہ خباثت نظر آنے لگی تھی جتنی شاید اس کی زندگی میں نظر آتی ہوگی۔

میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ امبر کے چہرے اور پیشانی پر چوٹوں کے نشان نیلے پڑنے لگے تھے۔ میں نے اس سے کہا "تم اب چھٹی کر لو تو بہتر ہے۔ گھر جا کر آرام کرو۔ جاتے جاتے راستے میں ہوٹل کے ڈاکٹر سے ملتی جانا۔ جب طبیعت بہتر محسوس کرو تب آفس آنا۔"

"سر...! میں پولیس کے آنے تک رُک جاتی ہوں۔ شاید میری ضرورت پڑے۔" وہ کمزور سی آواز میں بولی۔

بات اس کی معقول تھی۔ میں نے ایک لمحے سوچا پھر پوچھا "تم اپنے اندر اتنی ہمت محسوس کر رہی ہو کہ پولیس کے آنے تک رُک سکو؟"

"کیوں نہیں سر! میں تو اس سے بھی زیادہ دیر تک رُک سکتی ہوں۔" وہ پہلے سے زیادہ ہمت و جرأت سے مسکرائی "آپ مجھے اتنی کمزور لڑکی نہ سمجھیں سر! میں نے زندگی میں خاصی مشکلات اور سختیاں برداشت کی ہیں۔"

"اچھا تو پھر واش روم میں جا کر ذرا فریش ہونے کی کوشش ہی کر لو۔" میں نے مشورہ دیا۔

"معذرت چاہتی ہوں سر! میں یہ بھی نہیں کروں گی۔ میں پولیس کے سامنے اسی حالت میں پیش ہوں گی۔ اسے لیپا پوتی کے ذریعے بہتر نہیں بناؤں گی۔ یہ زیادہ بہتر نہیں رہے گا سر؟"

"ان تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔ اس قسم کے حالات میں' میں جن "خصوصی" انتظامات کے تحت پولیس کو بلواتا ہوں ان کا صرف ایک ہی تو فائدہ ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ میں سب کچھ سچ سچ بتاتا ہوں اور پولیس کو اس پر یقین کرنا ہوتا ہے۔ میں اپنے اثر رسوخ سے کوئی ناجائز فائدہ نہیں اُٹھاتا۔ میں تو پولیس کو صرف اس کے اپنے مطلب کی کوئی کہانی گھڑنے سے روکتا ہوں۔ آج کل انسان کو حقیقت کو صرف حقیقت کے طور پر پیش کرنے کے لئے بھی سفارش کی ضرورت پڑتی ہے۔ تم اپنا حُلیہ کچھ ٹھیک کر لو تب بھی کوئی حرج نہیں۔ بتانا وہی... جو کچھ ہوا ہے۔ جو تم محسوس کر رہی ہو اور جو تم پر بیتی ہے۔"

"ٹھیک ہے سر! جیسے آپ کی مرضی۔" وہ اُٹھ کر واش روم کی طرف جانے لگی۔

"سُنو" میں نے بے ارادی سے انداز میں اچانک ہی کہا۔ رُک گئی۔

"عذرا کہاں ٹھہری ہوئی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میرے ہی پاس ٹھہری ہوئی تھی لیکن معلوم نہیں واپس گھر پہنچی ہوگی یا نہیں۔" اس کی آواز میں خفیف سی لرزش آگئی "یہ لوگ کہہ رہے تھے نا کہ انہوں نے راستے میں اسے اُٹھا لیا تھا۔"

"اُٹھا لیا تھا لیکن چھوڑ دیا تھا۔ مجھے اُمید ہے وہ گھر پہنچ گئی ہوگی یا پہنچنے والی ہوگی۔ تم واش روم سے واپس آکر اپنے گھر فون کرکے دیکھ لینا۔" میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں سر؟" امبر کے لہجے میں ہلکا سا خوف تھا۔ جواب کا انتظار کئے بغیر وہ خود ہی بولی "آپ اس سے ناراض ہیں نا؟ آپ اس سے پوچھیں گے کہ اس نے بدمعاشوں سے یہ کیوں کہا کہ آپ اس کی بہن کو تلاش کرنے کی ہامی بھر چکے ہیں جبکہ حقیقت میں آپ انکار کر چکے تھے؟ آپ کا غصہ بجا ہے سر! اس کا ذرا سا جھوٹ ہی اس ساری قتل و غارت کی وجہ بنا ہے۔"

"تم خود ہی سب کچھ مت فرض کئے جاؤ۔" میں نے ملائمت سے کہا "میں اس سے ناراض نہیں ہوں۔ میں تو اس کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے پہلے اس کی بہن کو تلاش کرنے سے انکار کر دیا تھا لیکن اب میں ضرور اسے تلاش کروں گا۔ میں چاہتا ہوں تم یہ بات اسے بتا دو اور کل اسے ساتھ لے کر آؤ۔ میں اس سے مزید کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔"

امبر کا منہ حیرت سے کُھلا کا کُھلا رہ گیا۔ وہ کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے کہنا چاہتی ہو "سر! آپ واقعی عجیب آدمی ہیں۔ شاید آپ کچھ خبطی ہیں۔" لیکن زبان سے اس نے یہ نہیں کہا۔ اس کا نچلا ہونٹ متورم ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر یقیناً دو تین گھونسے مارے گئے تھے اور اسے چیخنے سے روکنے کے لئے شاید اس کی گردن گرفت میں رکھی گئی تھی۔ اس کی مرمریں گردن پر انگلیوں کے نشانات نمودار ہو چکے تھے۔ صرف یہی نہیں' اسے دیوار کے ساتھ بھی جُھنج کر مارا گیا تھا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ وہ ہمت والی لڑکی تھی۔ اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھی۔

"اس طرح میری طرف مت دیکھو۔" میں نے نرمی سے کہا "میں خبطی نہیں ہوں۔ پہلے میں نے اسے کوئی عام سا معاملہ سمجھ کر مونا کو تلاش کرنے سے انکار کیا تھا۔ میرے پاس لوگوں کے انتہائی نجی مسائل حل کرنے کے لئے واقعی وقت نہیں ہے لیکن اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ یہ کوئی خاص معاملہ ہے۔ لگتا ہے ان بہنوں کو صحیح معنوں میں مدد کی اشد ضرورت ہے۔ اس لئے میں مونا کو تلاش کرنے کی ہامی بھر رہا ہوں۔ میں اس معاملے میں ٹانگ اَڑانا نہیں چاہتا تھا لیکن میری ٹانگ پکڑ کر زبردستی اس معاملے میں اَڑا دی گئی ہے۔ اب تو مجھے کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"ٹھیک ہے سر!" امبر نے سنبھل کر کندھے اُچکانے کی کوشش کی لیکن کراہ کر رہ گئی۔ بائیں کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ ذرا توقف سے بولی "میں آکر عذرا سے فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں اور یہ خوش خبری اسے سُناتی ہوں۔ اگر رابطہ نہ ہو سکا تو پھر میں گھر جا کر اس سے بات کروں گی اور کل اسے ساتھ بھی لے آؤں گی۔" وہ دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

○☆○

مرنے والے بدمعاشوں کے بارے میں فوری طور پر مجھے پولیس سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ رحیم گُل کا ماتحت سب انسپکٹر اکرم بھی یقینی انداز میں ان کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا البتہ اس نے یہ خیال ضرور ظاہر کیا کہ ان کا تعلق کسی خطرناک گروہ سے معلوم ہوتا تھا۔ یعنی اگر وہ چاروں مارے گئے تھے تو اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ بات ختم ہو گئی تھی۔ ان کے پیچھے بھی شاید کچھ لوگ ہوں گے اور اگر وہ کوئی باقاعدہ منظم گروہ تھا تو پھر ان کا کوئی سردار بھی ہوگا اور وہ سردار نہ جانے کس قسم کی شخصیت ہو۔ آج کل کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کیسے کیسے لوگ کن کن گروہوں کی سرپرستی کر رہے تھے۔

رحیم گُل کے خیال میں ان لوگوں کی طرف سے کوئی ردِعمل بھی سامنے آسکتا تھا اور اسی سے ان کا کوئی سُراغ بھی مل سکتا تھا۔ رحیم گُل نے مجھے پولیس کا تحفظ فراہم کرنے کی بھی پیشکش کی لیکن میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس کا خلوص اپنی جگہ تھا لیکن میں دل میں سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ پولیس سے تو اپنی حفاظت نہیں ہو رہی تھی' وہ بھلا دوسروں کی حفاظت کیا کر سکتی تھی؟ البتہ ہر دور میں صاحبانِ اقتدار کی حفاظت کا فریضہ خاصی مستعدی سے انجام دیتی آئی تھی۔

داؤد چوہدری کو البتہ میں نے ہدایت کر دی تھی کہ وہ سیکیورٹی گارڈز کو پوری طرح الرٹ کر دے۔ اس کے علاوہ میں نے اپنے چار خاص آدمیوں کو بھی ہوٹل ہی میں تعینات کر دیا تھا۔ وہ بظاہر ہوٹل ہی میں مقیم عام مہمانوں کی طرح اِدھر اُدھر پھرتے نظر آنے لگے تھے لیکن درحقیقت انہوں نے ہوٹل کے ہر حصے کی نگرانی شروع کر دی تھی۔

شام کو میں نے شفیع شاہ کو ساتھ لیا اور اس ایڈریس کے بارے میں ذرا "تحقیقات" کرنے کے ارادے سے نکلا جو عذرا نے مجھے دیا تھا اور بتایا تھا کہ مونا اس عمارت میں کرائے پر کمرا لے کر رہتی تھی اور اسی پتے پر گھر والوں سے اس کی خط و کتابت رہی تھی۔

وہ شہر کے ایک پُرانے اور گنجان آباد علاقے کا ایڈریس تھا لیکن جب ہم اتا پتا کرتے بڑی مشکل سے اس عمارت تک پہنچے تو ہم نے دیکھا کہ وہ کچھ ایسی گنجان جگہ پر واقع نہیں تھی۔ سڑک نسبتاً کشادہ تھی اور اس کے اردگرد واقع دوسری عمارتیں رہائشی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ وہ چھوٹے موٹے کارخانے معلوم ہوتے تھے۔ اس عمارت کے بالکل ساتھ والی عمارت میں شاید برف کا

کارخانہ تھا۔

راستے میں کئی جگہ مجھے دُکانوں یا مکانوں کے باہر "تھڑوں" پر کچھ لڑکے بیٹھے نظر آئے تھے۔ انہوں نے بڑی عجیب سی نظروں سے ہماری گاڑی کا جائزہ لیا تھا۔ زمانہ اور ماحول واقعی بڑی تیزی سے تبدیل ہوا تھا۔ پہلے کبھی اس قسم کے علاقوں میں کوئی شاندار گاڑی داخل ہوتی تھی تو اسے رشک، تجسس یا زیادہ سے زیادہ ایک مبہم سے تجسس کے ساتھ دیکھا جاتا تھا کہ ایسی گاڑی علاقے میں کیوں آئی ہے؟ اب نظریں ایسی گاڑی کی طرف اُٹھتی تھیں تو ان میں واضح طور پر ایک نفرت، ایک دھمکی، ایک عجیب سی بھوک اور حسد ہوتا تھا۔ ان نظروں کے پیچھے پہلا خیال شاید یہی کلبلا رہا ہوتا تھا کہ کیوں نہ اس گاڑی کو چھین لیا جائے۔

میں نے گاڑی ایک محفوظ سے گوشے میں گھُسائی اور اُترنے سے پہلے ہم نے اس عمارت کا جائزہ لیا۔ تین منزلہ وہ عمارت زیادہ لمبی چوڑی نہیں تھی اور کچھ عرصہ پہلے تک یقیناً کافی بوسیدہ رہی ہوگی لیکن کافی لاگت کے ساتھ اس کی مرمت وغیرہ کرکے اسے کافی حد تک بہتر بنالیا گیا تھا اور شاید شکل بھی خاصی تبدیل کرلی گئی تھی۔ اس کا دروازہ لکڑی کا تھا اور کافی مضبوط معلوم ہوتا تھا۔ عمارت کچھ ویران ویران سی نظر آرہی تھی لیکن وہ چونکہ چاروں طرف سے کچھ بند بند سی تھی اس لئے اس کے بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔

آخر میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا اور ہم دونوں گاڑی سے اُتر آئے۔ شفیع شاہ اپنے لمبے اور ڈھیلے ڈھالے ڈفل کوٹ کی آڑ میں ایک لمبی گن چھُپائے ہوئے تھا۔ میں بھی مسلح تھا لیکن میرے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ اردگرد کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ صرف اس عمارت کے سامنے ایک خارش زدہ کُتا اور کچھ اسی قبیل کی ایک کُتیا کندھے سے کندھا جوڑے سر جھکائے بیٹھے تھے۔ میں نے پہلی بار کسی کُتے اور کُتیا کو اتنے قریب ہونے کے باوجود اتنے امن و سکون سے بیٹھے دیکھا تھا۔ شاید انہیں ساتھ رہتے ہوئے کافی عرصہ ہوگیا تھا یا پھر اس وقت انہوں نے اپنے تاریک مستقبل پر غور و فکر کرنے کے لئے کچھ مہلت نکالی تھی۔

ہمیں قریب آتے دیکھ کر وہ دونوں اُٹھ کر کاہلی آمیز سے انداز میں ایک طرف کو چل دیے۔ انہوں نے بھونکنے کا بھی تکلف نہیں کیا۔ بہت کم گو معلوم ہوتے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر کال بیل بجائی۔ شفیع شاہ ذرا اس طرح ترچھا ہو کر کھڑا ہوگیا کہ اندر سے جھانکنے والے کو اس کے پاس گن کی موجودگی کا شبہ نہ ہو۔

دوسری مرتبہ بیل بجانے پر دروازہ تھوڑا سا کھُلا۔ اس کے پیچھے حفاظتی زنجیر لگی ہوئی تھی۔ دروازے کے عقب سے جھانکنے والا چہرہ خاصا خونخوار معلوم ہوتا تھا۔ اس کی رنگت تانبے کی سی تھی۔ اس چہرے پر باقاعدہ داڑھی مونچھیں نہیں تھی لیکن شیو کئی دنوں کی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھیں کچھ چڑھی چڑھی سی تھیں۔ مخمور معلوم ہوتی تھیں۔

"کیا ہے؟" اس نے کاٹ کھانے والے لہجے میں پوچھا۔ وہ ہمارے معززانہ حُلیوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا تھا۔ اس کی آواز میں بھی خمار کی ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی۔

"ہمیں میڈم بلقیس سے ملنا ہے۔" میں نے انتہائی شائستگی سے کہا۔ عذرا نے مجھے بتایا تھا کہ موٹا کی مکان مالکن کا نام بلقیس تھا۔ میڈم کا اضافہ میں نے خود کرلیا تھا گو کہ عذرا نے اس کا جس قسم کا نقشہ کھینچا تھا اس کے بعد اسے میڈم کہنے کے لئے مجھے دل پر کچھ جبر کرنا پڑا تھا لیکن مصلحت کی خاطر یہ کہنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔

"کیا تمہیں پتا نہیں ہے وہ آج کل کسی سے نہیں ملتیں؟" اس نے شکی سی نظروں سے ہم دونوں کا جائزہ لیتے ہوئے کھردرے لہجے میں کہا۔

"نہیں مجھے معلوم نہیں تھا۔ میں بہت عرصے بعد آیا ہوں۔" میں نے بدستور ملائمت سے کہا۔

"اس سے پہلے کب آئے تھے؟ میں نے تو تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔" اب اس کا لہجہ کچھ استہزائیہ سا ہوگیا۔

شاید وہ طویل عرصے سے وہاں تھا اور نئے پُرانے سبھی آنے جانے والوں کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس کے ساتھ محض بات چیت سے کام نہیں چلے گا۔ میں نے اچانک ہی دروازے پر کندھے سے ایک زوردار ٹکر رسید کی۔

مجھے معلوم تھا عام سی حفاظتی زنجیریں کچھ زیادہ مضبوط نہیں ہوتی تھیں۔ میری ٹکر سے نہ صرف زنجیر ٹوٹی بلکہ دروازہ بھی بہت زور سے اس شخص سے ٹکرایا۔ ادھر وہ پیچھے کہیں غائب ہوا، ادھر میں اور شفیع شاہ اندر پہنچ گئے۔

دروازہ میں نے اسی پھُرتی سے اپنے عقب میں بند کردیا۔ وہ کمرا نہیں، عمارت کا ایک ڈیوڑھی نما حصّہ تھا۔ جس شخص نے دروازہ کھولا تھا وہ دروازے کی ٹکر سے ایک دیوار کے قریب جاگرا تھا لیکن وہ وہاں اکیلا نہیں تھا۔

دوسری دیوار کے قریب ایک کونے میں ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ایک کلاشنکوف تھامے ہوئے تھا جس کا رُخ ہماری طرف تھا۔ اگر وہ فوری طور پر برسٹ مار دیتا تو شاید ہم اپنی تمام تر ہوشیاری، پھُرتی اور مہارت کے باوجود گولیوں کی زد میں آجاتے کیونکہ وہ ایک تنگ ڈیوڑھی تھی۔ وہاں اِدھر اُدھر ہونے کے لئے زیادہ جگہ نہیں تھی۔

معلوم نہیں یہ اس کی غلطی تھی یا ہماری خوش قسمتی کہ اس نے فوری طور پر ٹریگر نہیں دبایا بلکہ چلاّ کے ہمیں خبردار کرنے کی کوشش کی "ٹھہرو..... ورنہ....." آواز سے وہ کچھ نروس معلوم ہوتا تھا۔

"ورنہ" سے آگے اسے کچھ کہنے کا موقع نہیں ملا کیونکہ شفیع شاہ کی لات تیزی سے ہوا میں گھومی تھی۔ لات شاید اس کی کنپٹی پر پڑی تھی۔ میں صحیح طور پر اس کا نتیجہ نہیں دیکھ سکا کیونکہ میں اس دوران دوسرے شخص کی طرف متوجہ ہوچکا تھا جس نے دروازہ کھولا تھا۔

وہ فرش سے اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے اپنے نیفے سے ٹی ٹی نکال چکا تھا لیکن اسے میں نے فائر کرنے کی مہلت نہیں دی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ٹھوکر رسید کی۔ ٹی ٹی پر شاید وہ ابھی صحیح طور پر گرفت بھی مضبوط نہیں کرپایا تھا اس لئے وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر نہ جانے کہاں جاگرا۔ دروازے اور دیوار سے ٹکرانے کے باعث شاید اس کے حواس بھی خراب تھے۔ وہ کچھ اس طرح اُٹھ رہا تھا جیسے اسے کچھ نظر نہ آرہا ہو۔

تاہم وہ کافی تگڑا دکھائی دے رہا تھا اس لئے میں نے اسے سنبھلنے کا موقع دیے بغیر اس کی کنپٹی پر زوردار گھونسا رسید کیا۔ گھونسا ضرورتً سے کچھ زیادہ ہی زوردار ہوگیا۔ وہ ایک بار پھر اُچھل کر دیوار سے ٹکرایا اور وہیں ڈھیر ہوگیا۔

وہ دوبارہ نہیں اُٹھا۔ مجھے اس کے اتنی جلدی ڈھیر ہونے کی اُمید نہیں تھی۔ شاید اس کی وجہ اس کا مخمور ہونا بھی تھا۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو شفیع شاہ گن لئے کھڑا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ شاید وہ منتظر تھا کہ کسی طرف سے کوئی اور نمودار ہو تو وہ اس کا بھی بندوبست کردے۔

اس کی لات جس شخص کی کنپٹی پر پڑی تھی وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔ اس کی کلاشنکوف پانی کی موٹر کے پاس پڑی تھی۔ اس کے لیے شاید ایک کِک ہی کافی ثابت ہوئی تھی۔ وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔

"انہوں نے تو بے ہوش ہونے میں کافی پھُرتی دکھائی۔" میں نے قدرے مایوسی سے کہا "ان سے تو اب کچھ پوچھا بھی نہیں جاسکتا۔"

"یہاں یقیناً اور لوگ بھی موجود ہوں گے سر!" شفیع شاہ کی بے چین نظریں ہر کونے کھدرے کا جائزہ لے رہی تھیں "خاصی بڑی عمارت ہے۔"

اندر سے وہ پُرانی طرز کے مکان جیسی ہی تھی۔ ڈیوڑھی سے پتھر کی سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں۔ سیڑھیوں کے نیچے پانی کی موٹر اور میٹر وغیرہ لگے ہوئے تھے۔ ڈیوڑھی سے آگے دونوں طرف دو دو کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔ وہ چاروں دروازے بند تھے۔ عمارت میں تاریکی اور سیلن تھی۔ دن میں بھی ڈیوڑھی اور راہداری میں بلب جلے ہوئے تھے۔

تھوڑی بہت اُٹھا پٹخ تو ہوئی تھی لیکن نیچے کہیں سے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔ کوئی آواز سُنائی نہیں دی تھی لیکن اسی اثنا میں اوپر سے ایک عجیب سی آواز سُنائی دی "کیا ہو رہا ہے۔ نیچے کیا ہو رہا ہے۔ کون ہے؟ حاضر خان..... !کون آیا ہے؟"

آواز سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ بولنے والا مرد تھا یا عورت؟ اس آواز میں بیک وقت کئی متضاد خصوصیات تھیں۔ کرختگی بھی تھی اور منمناہٹ بھی..... خوف بھی تھا اور رعب بھی۔ اس کے علاوہ وہ آواز خمار سے بھی بوجھل تھی۔

"حاضر خان! کون آیا ہے؟" اس بار آواز گویا دور سے آئی۔ وہ گویا کسی ٹیپ ریکارڈ سے اُبھرنے والی اور ہوا کے دوش پر آنے والی آواز تھی۔ کبھی مدھم ہوجاتی تھی، کبھی تیز۔ وہ اپنا سوال دُہرائے جارہی تھی جیسے ٹیپ ریکارڈر میں ٹیپ پھنس گئی ہو۔

بے ہوش ہونے والے دونوں افراد میں سے نہ جانے کون حاضر خان تھا۔ فی الحال تو دونوں ہی "غائب" خان بنے ہوئے تھے اور جواب دینے سے قاصر تھے۔ میں اور شفیع شاہ مستعد کھڑے رہے کہ شاید کوئی دریافتِ حال کے لئے آئے۔ میں بھی گن نکال چکا تھا۔ میرا رُخ نچلی منزل کے کمروں کی طرف تھا۔ جبکہ شفیع شاہ گن کا رُخ سیڑھیوں کی طرف کئے، دیوار کی اوٹ میں کھڑا تھا۔

نیچے یا اوپر، کہیں سے بھی کوئی آتا دکھائی نہیں دیا۔ نیچے والے کمروں میں سے کسی کا دروازہ بھی نہیں کھُلا۔ یہ ردِعمل ہمارے لئے ذرا حیرت کا باعث تھا۔ سوال کرنے والی آواز بھی آخرکار خاموش ہوگئی۔ ہم منتظر رہے کہ شاید وہ سوال کرنے والا، یا والی خود اُتر کر نیچے آئے لیکن ایسا بھی نہیں ہوا۔

آخر میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا کہ وہ اپنی جگہ ہی جما کھڑا رہے اور سیڑھیوں پر ہی نظر رکھے جبکہ میں خود ڈیوڑھی عبور کرکے راہداری میں چلا گیا۔ دیوار سے چپک کر اور گن ہاتھ میں سیدھی رکھتے ہوئے میں نے انتہائی محتاط انداز میں پہلے دروازے کا ہینڈل گھُمایا۔ وہ غیر مقفل تھا۔ میں نے دروازہ یکدم کھول دیا۔ کوئی ردِعمل سامنے نہیں آیا۔

میں نے کمرے میں جھانکا۔ کمرا خالی تھا۔ وہ کچھ ایسا ہی کمرا تھا جیسا کسی سستے سے ہوٹل کا ہوسکتا تھا۔ معمولی اور مختصر سے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ ہر چیز نہایت سستی قسم کی تھی اور کافی پُرانی تھی۔ در و دیوار سے بھی کہنگی عیاں تھی۔

کمرے سے ملحقہ باتھ روم کا دروازہ کھُلا تھا۔ باتھ روم بھی خالی نظر آرہا تھا۔ میں نے اسی طرح یکے بعد دیگرے چاروں کمروں میں جھانکا۔ سب کمرے تقریباً ایک جیسے تھے اور سب خالی تھے۔ راہداری میں ایک کونے میں کھلی جگہ میں ہی چند شیلف وغیرہ لگا کر ایک کچن بنایا گیا تھا جو شاید کمروں میں رہنے والوں کے مشترکہ استعمال کے لئے تھا لیکن کمروں میں رہنے والے اس وقت نہ جانے کہاں تھے۔ کمروں میں کسی کا سامان بھی نظر نہیں آیا تھا۔ کمروں کی حالت بتاتی تھی کہ وہ کافی دنوں سے خالی تھے۔ کچن شاید اب بھی کسی کے استعمال میں تھا مگر اس کی حالت عبرت ناک تھی۔ ہر چیز پر چکٹ جما ہوا تھا۔ سنے ہوئے برتن اِدھر اُدھر لڑھکے ہوئے تھے۔ نیچے درحقیقت ان دونوں محافظ نما شخصیتوں کے سوا کوئی موجود نہیں تھا۔ اسی لئے کوئی آواز سنائی نہیں دی تھی اور نہ ہی

کوئی اور سامنے آیا تھا۔

میں نے ایک کمرے کے بستر کی چادر پھاڑ کر ان دونوں کے ہاتھ ان کی پشت پر باندھے جو راہداری میں بے ہوش پڑے تھے۔ ہم نے انہیں وہیں پڑا رہنے دیا۔ البتہ ان کی گنیں ایک باتھ روم میں چھپادیں۔ اس کے بعد ہم محتاط انداز میں سیڑھیاں چڑھنے لگے۔

اس قسم کی صورتِ حال میں سیڑھیاں بڑی خطرناک ثابت ہوسکتی ہیں۔ کوئی نہایت آسانی سے آپ کو اوپر سے نشانہ بنا سکتا ہے اس لئے ہم دونوں ایک خاص حکمتِ عملی کے ساتھ دو الگ الگ کونوں میں رہتے ہوئے کچھوے کی رفتار سے اوپر جا رہے تھے لیکن اوپر کی منزل پر پہنچ کر احساس ہوا کہ ہماری یہ تمام احتیاط وغیرہ بے کار تھی۔ اوپر کوئی گن کے ساتھ تو کیا، بغیر گن کے بھی ہمارا منتظر نہیں تھا۔

اوپر کی منزل کچھ کشادہ معلوم ہوتی تھی لیکن ٹیڑھے میڑھے سے انداز میں اِدھر اُدھر کو کمرے پھیلے ہوئے تھے۔ شاید یہ اس قسم کی کوئی پُرانی عمارت تھی جو ایک ایک کمروں کے فلیٹوں پر مشتمل ہوا کرتی تھیں۔ سیڑھیوں کے پیچھے چھوٹے سے ایک صحن نما حصے کے ساتھ ایک کمرے کا دروازہ کھلا نظر آرہا تھا لیکن اس پر دبیز پردہ لہرا رہا تھا۔ کمرے میں روشنی تھی۔

اس کمرے سے وہی آواز ایک بار پھر سُنائی دی جو ہم پہلے بھی کئی مرتبہ سُن چکے تھے۔ اب ہمیں پتا چلا کہ آواز کہاں سے آرہی تھی۔ شاید وہ حاضر خان کی طرف سے تو مایوس ہو چکی تھی۔ اب وہ دوسرے کو پکار رہی تھی "چھیکے! تو کہاں مرگیا۔ تو ہی بول پڑ۔ حرام خور کہیں کے!"

یہ "چھیکا" یا میٹھا بھی غالباً انہی میں سے ایک تھا جو نیچے بے ہوش پڑے تھے اس لئے اس مرتبہ بھی کئی بار پکارے جانے کے بعد بھی اس کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا لیکن ہم نے احتیاطاً چند لمحے کے لئے دیوار سے چپک کر انتظار کرلیا کہ شاید یہ کوئی اور شخص ہو اور کسی طرف سے نمودار ہو ہی جائے۔

جب کسی طرف سے کوئی آتا دکھائی نہیں دیا تو میں نے دوسرے کمروں میں جھانکا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ بھی خالی ہی تھے۔ اس فلور پر وہی ایک کمرا روشن اور "آباد" نظر آرہا تھا۔ جس میں کوئی حاضر خان اور چھیکے کو پکار رہا تھا مگر دروازے تک آنے کی زحمت نہیں کر رہا تھا۔

میں نے شفیع شاہ کو چاروں طرف نظر رکھنے کا اشارہ کیا اور خود اس کمرے کے دروازے پر پہنچ کر پردہ ذرا سا ہٹا کر اندر جھانکا۔ سامنے ایک نہایت شاندار اور شاہانہ طرز کی آرام کرسی پر ایک خاصی عجیب وغریب قسم کی مخلوق نیم دراز نظر آئی۔

جس طرح اس کی آواز کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ عورت کی تھی یا مرد کی۔۔۔۔ اسی طرح اس کی شخصیت دیکھ کر بھی فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ اسے کس جنس میں شمار کیا جائے لی
ذرا گہری نظر سے دیکھنے پر مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ اس میں نسوانیت پلڑا بھاری تھا اور خاصا بھاری تھا۔ گو کہ اس کے بدنما بالائی ہو پر مونچھوں جیسا ہلکا سا رواں بھی موجود تھا۔

وہ ایک بھاری بھرکم، بے ڈول، بے ہنگم اور بدشکل عور تھی لیکن کچھ اس طرح آرام کرسی پر نیم دراز تھی جیسے کوئی اپنے تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہو اور اس بات پر بدمزہ ہو رہ اس کے تالی بجانے پر غلام، خدام وغیرہ حاضر کیوں نہیں تھے!

اس کا کمرا شاید اس عمارت کا واحد کمرا تھا جس کی شاندار تھی۔ اس میں مہنگا فرنیچر موجود تھا۔ شاندار قالی غالیچے بچھے ہوئے تھے۔ خوب صورت پردے آویزاں تھے۔ کا ٹی وی، فریج اور ضرورت کی دوسری سب چیزیں اسی بڑ کمرے میں موجود تھیں۔ ڈبل بیڈ خوب صورت اور جدید سا تھا۔

عورت کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ پچاس سے اوپر کی تھی لیک سیاہ چمکیلے تھے۔ یقیناً رنگے ہوئے تھے۔ انہیں رنگنے میں خو ہی محنت کی گئی تھی لیکن ظاہر ہے وہ اس کے چہرے سے میل کھا رہے تھے۔ عورت کی رنگت سانولی، جبڑے بھاری، پھو ہوئے اور ہونٹ موٹے موٹے تھے۔

مجھے جو چیز سب سے زیادہ دلچسپ اور قابلِ توجہ لگی، وہ کہ عورت کے قریب شیشے کی ایک ٹرالی پر وہسکی کی بوتل، سگریٹ کا پیکٹ، لائٹر اور منہ چلانے کے کچھ لوازمات موجو گلاس ادھ بھرا نظر آرہا تھا اور کمرے میں وہسکی کی بو پھیل تھی۔ گویا موصوفہ پُرانے خرانٹ، اور عادی شرابیوں کے اند شغل فرما رہی تھیں۔

دوسری دلچسپ بات یہ تھی کہ اس وقت اس کے ڈل جیسے ہاتھ میں جام نہیں، چھوٹا سا ایک پستول دبا ہوا تھا اور رُخ میری طرف تھا۔ میں نے اپنی دانست میں نہایت احتیا پردے کے درمیان جھری بنا کر صرف ایک آنکھ سے کمر جھانکا تھا لیکن اس نے میری اس اکیلی آنکھ کو بھی پھولدا کے درمیان دیکھ لیا تھا اور شاید اسی کا نشانہ لے لیا تھا۔ طور پر کچھ نہیں بولی اور میرے دل نے کہا کہ وہ فوری طور پر نہیں دبائے گی اس لئے میں نے اس کی شخصیت کے ساتھ کمرے کا جائزہ بھی مکمل کرلیا گو کہ اس میں تین چار زیادہ وقت نہیں لگا ہوگا۔

اسی لمحے عورت کے موٹے موٹے ہونٹوں میں حرکت اور وہ اسی عجیب کھرکھراتی سی آواز میں بولی "چندا! اندر آ تمہارے ہاتھ میں جو کچھ بھی ہے اسے باہر ہی پھینک دو۔" انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے کوئی ٹیچر کسی بچے کو کلاس

آنے کا حکم دے رہا ہو اور خود اپنے ہاتھ میں الٹی یا کوئی چُرایا ہوا پھل وغیرہ چھپائے کھڑا ہو۔ اس احمق عورت کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ اگر میرے ہاتھ میں کوئی گن وغیرہ موجود تھی اور وہ پردے کی اوٹ میں تھی تو میں اس کے حکم کی تعمیل کرنے کے بجائے وہیں سے اسے شوٹ بھی کر سکتا تھا۔

تاہم میں نے اس کا دل رکھنے کے لئے کافی حد تک سعادت مندی کا مظاہرہ کیا اور پردے کی اوٹ میں ہی رہتے ہوئے اپنی گن کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لی۔ یہ ظاہر کرنے کے لئے میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اپنے ہاتھ میں موجود کوئی چیز پھینکی ہے، میں نے دروازے پر کہنی مار کر ہلکی سی دھمک پیدا کی اور پردہ ہٹا کر خالی ہاتھ اُٹھائے اندر چلا گیا۔

میں شاید عین اس کے پہلو میں جا کر رُکتا لیکن ابھی میں اس سے سات آٹھ فٹ دور ہی تھا کہ وہ مضطربانہ انداز میں پستول ہلاتے ہوئے چیخی "رُک جاؤ۔ وہیں رُک جاؤ۔"

میں کسی روبوٹ کی طرح ایک جھٹکے سے رُک گیا۔ وہ کسی ناراض ریچھ کی طرح سُرخ سُرخ آنکھوں سے مجھے گھور رہی تھی تاہم یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ خوف زدہ تھی۔ اس کا پھولا پھولا سا ہاتھ جس میں پستول دبا ہوا تھا، ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔

وہ آرام کرسی پر سیدھی ہو کر بیٹھنے لگی تو بے اختیار اس کا خالی ہاتھ کمر پر چلا گیا اور وہ بُری طرح کراہ اٹھی۔ اس کا چہرہ بگڑ کر رہ گیا۔ نہایت تیزی سے اس کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہو گئے۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ اس کی کمر میں کوئی تکلیف تھی جس کی وجہ سے وہ آسانی سے چلنے پھرنے سے معذور تھی اور اسی لیے اپنی جگہ لیٹے لیٹے حاضر خان وغیرہ کو آوازیں دیتی رہی تھی۔

اسے گویا اندازہ ہو گیا کہ میں کیا سوچ رہا تھا اور اس نے وضاحت ضروری سمجھی "یہ مت سمجھنا کہ میں مستقل معذور ہوں۔ یہ تو کبھی کبھی میری کمر میں تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ اس کے باوجود میں تم جیسے اچکوں سے خوب نمٹ سکتی ہوں۔"

میں نے اس کی خوش فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی اور مسکین سی شکل بنائے کھڑا رہا۔ کمر کی تکلیف اور وزن کی زیادتی سے وہ آرام کرسی پر ڈھیر تھی، چلنے پھرنے سے معذور تھی مگر اپنے ہاتھوں اپنی ہلاکت کا عمل جاری تھا۔ یعنی کھانے پینے میں کوئی کمی نہیں تھی اور یہ "کھانا پینا" عام قسم کا کھانا پینا نہیں تھا جو محض پیٹ بھرنے کے لئے ہوتا ہے۔

میری خاموشی سے وہ کچھ حوصلہ پا کر ذرا ڈپٹ کر بولی "کون ہو تم؟"

"افضل" میں نے فوراً اپنا نام بتایا۔

"کون افضل؟" اس نے آنکھیں سکیڑیں۔

"یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ میں کون افضل ہوں۔ بس افضل ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"اس سے پہلے تمہیں کبھی نہیں دیکھا؟" وہ بولی۔

"اس کی بہت سی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن میرے خیال میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے میں کبھی یہاں نہیں آیا۔" میں نے سادگی سے جواب دیا۔

"تمہارے ساتھ کون ہے؟" وہ شاید میرے الفاظ پر دھیان دیے بغیر اپنے خوف کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

میں نے دائیں بائیں دیکھا اور معصومیت سے نفی میں سر ہلایا "میرے ساتھ تو کوئی نہیں ہے۔"

اسے یقیناً احساس تھا کہ میں قطعی غیر سنجیدگی سے اس کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس کے باوجود اس نے اپنے کسی سوال پر زور نہیں دیا اور نہ ہی اسے دُہرایا۔ فوراً ہی اس نے اگلا سوال کر ڈالا "حاضر خان اور پھیکے کے ساتھ تم نے کیا کیا ہے؟"

"مجھے نہیں معلوم کہ حاضر خان اور پھیکا کون ہے۔ بہرحال مجھے نیچے دو آدمی ملے تھے۔ میں نے تو ان سے صرف مصافحہ اور معانقہ کیا تھا۔ انہوں نے ہی تو مجھے اوپر بھیجا ہے۔" میں نے معصومیت کی اداکاری جاری رکھی۔

وہ دھیرے دھیرے پہلے ہی ہانپ رہی تھی۔ اب شاید اس کی قوتِ برداشت بالکل ہی جواب دے گئی۔ یکدم چیخ کر بولی "بکواس مت کرو۔ سچ سچ بتاؤ۔ تم نے حاضر خان اور پھیکے کے ساتھ کیا کیا ہے۔ اور تمہارے ساتھ کون ہے اگر تم نے اب بھی سچ نہ بولا تو میں گولی چلا دوں گی۔"

وہ بُری طرح ہانپنے لگی گویا چند سیکنڈ میں اس نے بہت طویل فاصلہ دوڑ کر طے کر لیا ہو۔ چہرہ پسینے میں بھیگ گیا۔ پسینے کے دو تین قطرے تو اس کی چربی زدہ ٹھوڑی سے ٹپک بھی پڑے۔ پستول کے ٹریگر پر اس کی انگلی کا دباؤ خطرناک حد تک بڑھ گیا۔ میرے خیال میں اب فضول باتوں کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ موٹی عورت اب خطرناک بھی ثابت ہو سکتی تھی۔

میں نے اتنی تیزی سے جھکائی دیتے ہوئے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈالا کہ اس کی مخمور آنکھیں شاید صحیح طور پر یہ حرکت دیکھ بھی نہ سکی ہوں۔ اس نے گولی چلانے میں تامل نہیں کیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ گولی خود ہی چل گئی ہو۔ بہرحال اسے دوسرے گولی چلانے کا موقع نہیں ملا کیونکہ اس وقت تک میری انگلیاں اس کی پلپلی کلائی میں گڑ چکی تھیں۔ میں نے اس کا بازو اونچا کر دیا تھا۔ پستول سے جو گولی چلی وہ شاید چھت میں کہیں پیوست ہو گئی۔

میری لحظہ بہ لحظہ سخت تر ہوتی ہوئی گرفت کے باعث وہ درد سے چیخی۔ درد صرف اس کی کلائی میں ہی نہیں تھا۔ اس کا دوسرا ہاتھ کمر پر چلا گیا تھا اور بگڑا ہوا چہرہ کچھ اور بگڑ کر رہ گیا تھا۔ اس عالم میں وہ اچھی خاصی بھیانک دکھائی دے رہی تھی لیکن تمام تر تکلیف کے باوجود بھی اس نے مجھے لات رسید کرنے کی کوشش کی جس سے میں نہایت آسانی سے بچ گیا۔ دوبارہ ٹانگ کو زحمت دینے کی اس میں ہمت نہیں پڑی۔ اس سے یقیناً اس کی تکلیف بڑھ گئی تھی۔

اس کے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکلنے لگیں۔ پستول اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے آ گرا۔ میں نے اسے ٹھوکر سے بیڈ کے نیچے پہنچا دیا۔ اس لمحے مجھے اندازہ ہوا کہ تکلیف زدہ آوازوں کے درمیان بھی وہ مجھے گندی گندی گالیاں دے رہی تھی۔ بڑی خبیث چیز معلوم ہوتی تھی۔

میں نے اس کے منہ پر اُلٹے ہاتھ کا ایک تھپڑ رسید کیا۔ میں نے ہاتھ ہلکا ہی رکھا تھا لیکن اس کے لئے یہ بھی کافی تھا۔ اس کی زبان تو بند ہو گئی لیکن اس کے ناک منہ سے خرخراہٹ کی کچھ ایسی آوازیں نکلنے لگیں جیسے اس پر کوئی دورہ پڑنے والا ہو۔

اس سے پہلے کہ اس پر سچ مچ کوئی دورہ پڑتا یا وہ اس کی ایکٹنگ شروع کرتی، میں نے اس کا بازو چھوڑ دیا جو بے جان انداز میں اس کی گود میں آ گرا۔ میں نے اس کے رنگے ہوئے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور تیز سی سرگوشی میں کہا "میں مونا کے بارے میں معلوم کرنے آیا ہوں۔ وہ کہاں ہے؟"

بال کھنچنے کی وجہ سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ یوں شکل کچھ اور انداز سے بگڑ گئی۔ گویا اس کی شکل ہر لمحے بدل رہی تھی اور بد سے بدتر انداز میں بدل رہی تھی۔ وہ خوف زدہ ضرور تھی لیکن بدزبانی شاید اس کی فطرت میں شامل تھی اس لئے مونا کو بھی ایک گندی سی گالی دے کر ہانپتے ہوئے بولی "یہ مونا ہے کون؟"

"اوہ۔۔۔ تو اب تم انجان بھی بنو گی۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بات کو طول مت دو۔ اس کے بارے میں جو کچھ بھی معلوم ہے، مجھے بتا دو ورنہ تمہارا حشر اس سے کہیں زیادہ خراب ہو سکتا ہے جتنا نظر آ رہا ہے۔" میں نے اس کے بالوں کو جھٹکا دیا۔

وہ ہلکی مگر آسیبی سی چیخ کے ساتھ بولی "مجھے نہیں معلوم تم کس مونا کی بات کر رہے ہو۔"

میں نے دوسرے ہاتھ سے جیب سے تصویر نکال کر اس کے سامنے لہرائی "میں اس مونا کی بات کر رہا ہوں جو یہاں رہتی تھی۔"

"میں نے تو یہ شکل اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی۔" وہ اب بھی ڈھٹائی پر قائم تھی۔

اب میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میں نے اسے دوسرا ہاتھ رسید کیا۔ وہ کچھ زوردار پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور گردن ڈھیلی پڑ گئی۔ سر ایک طرف کو ڈھلکتا محسوس ہوا۔ میں نے بال چھوڑے تو دھپ سے آرام کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔

میں نے متاسفانہ سی سانس لے کر بے بسی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں اس کی روح اس بھاری بھرکم قفسِ عنصری سے پرواز تو نہیں کر گئی تھی مگر پھر میں نے دیکھا اس کا ہاتھی جیسا وجود پھول پچک رہا تھا۔ یعنی سانسوں کی آمدورفت جاری تھی۔

اسی لمحے شفیع شاہ نے کمرے میں جھانکا "کیا ہوا سر؟"

"یہاں [illegible] ہونے کی بہت جلدی ہے۔" [illegible] جواب دیا "یہ عورت [illegible] نڈلیڈی ہے۔ یہ بھی بے ہوش ہو گئی ہے۔ بدبخت نے ایک سوال کا بھی جواب نہیں دیا۔"

شفیع شاہ بلی کی طرح بے آواز قدموں سے اندر آ گیا۔ اس کی عقابی نظروں نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور آخر اس کی نظر میز پر آ ٹکی۔ میز پر آئس باکس اور پانی وغیرہ بھی موجود تھا۔ شفیع شاہ نے گن ایک طرف رکھی اور آئس باکس میں سے پگھلی ہوئی برف کا پانی نچوڑ کر ایک خالی گلاس میں نکالا۔ اس پانی سے اس نے موٹی عورت کا چہرہ تر کر دیا۔

عورت نے جھرجھری سی لی اور آنکھیں کھول دیں۔ شفیع شاہ نے ایک اور عقل مندی کی۔ اس نے عورت کا چھوڑا ہوا وہسکی کا اَدھ بھرا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بڑی پیکڑ معلوم ہوتی تھی۔

ڈرنک اس کے حلق سے اُتری تو اس کا خمار بڑھنے کے بجائے اس کی آنکھوں سے کچھ زیادہ ہوش مندی ظاہر ہونے لگی۔

"تھوڑی سی اور دے دو۔ خدا کے لئے۔" اس نے منت کی۔ اب اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔

شفیع شاہ نے گلاس میں کچھ اور وہسکی اُنڈیلی۔ پانی اور برف ملائی لیکن جب وہ گلاس اس کے ہونٹوں کے قریب لے جانے لگا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر روک دیا اور عورت کی طرف جھکتے ہوئے کہا "پہلے میرے سوال کا جواب دو پھر یہ گلاس تمہیں ملے گا۔"

"کون سا سوال؟" اس کے ذہن سے گویا سب کچھ نکل گیا تھا۔

"مونا کہاں ہے؟ یہاں سے وہ کہاں گئی؟" میں نے تحمل سے کہا۔

"مونا۔۔۔؟" یہ نام سُنتے ہی اسے گویا پھر غصہ آ گیا "مجھے کیا معلوم مونا کہاں ہے۔ پہلے وہ ایک چوہیا سی لڑکی اس کا پتا کرنے آ گئی تھی۔ پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑ گئی تھی۔ اس سے جان چھڑائی تو اب تم عذاب کی طرح میرے سر پر سوار ہو گئے ہو۔ میں لڑکیوں کو کمرے کرائے پر دیتی ہوں۔ زندگی بھر ان کی خبر رکھنے کا ٹھیکا تو نہیں لیتی۔" وہ ہانپنے لگی۔ اس کی نظر گلاس پر جمی ہوئی تھی جو میں نے شفیع شاہ کے ہاتھ سے لے لیا تھا۔

"چلو تم نے یہ تو مانا کہ وہ تمہاری کرائے دار تھی۔" میں نے کہا۔

"ہاں اس روز میری قسمت نے دھکا دیا تھا۔ مجھے پاگل کُتے نے کاٹا تھا جس روز میں نے اسے کرائے دار رکھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ میں اتنی بڑی مصیبت مول لے رہی تھی۔" وہ دانت پیس کر بولی۔

"[illegible] سی مصیبت آ گئی تم پر [illegible] ہے؟" میں نے دریافت

"ایک مصیبت تو تم ہی ہو جس نے مجھے پنجوں میں دبایا ہوا ہے۔" وہ کراہ کر بولی "تم سے بڑی مصیبت اور کیا ہوگی۔"

"میرے علاوہ......؟" میں نے اصرار کیا۔

"تمہارے علاوہ اس کی وہ عینک والی چوہیا سی بہن بھی کچھ کم نہیں تھی۔ وہ بھی میری جان کو آگئی تھی۔ اس سے بھی حاضر خان اور چھیکے نے میری جان چھڑائی تھی۔"

"یہ تو کوئی مصیبت نہ ہوئی۔" میں نے سرہلایا "کوئی لڑکی گم ہوگی تو کچھ لوگ اسے پوچھنے تو ضرور آئیں گے۔"

"اسے میں نے تو گم نہیں کیا۔" وہ بے زاری سے بولی۔

"تو پھر کس نے گم کیا ہے؟"

"مجھے کیا معلوم۔" وہ تقریباً چلا اٹھی "وہ خود بھی کسی مصیبت سے کم نہیں تھی۔"

"وہ یہاں سے کب گئی تھی۔ یا کب غائب ہوئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"پہلے یہ گلاس مجھے دے دو پھر میں تمہارے سوالوں کے جواب دوں گی۔" اس نے سودے بازی کی کوشش کی۔

"نہیں" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "پہلے سوالوں کے جواب دو۔ پھر میں تمہیں گلاس کیا، پوری بوتل دے دوں گا۔ بلکہ اگر کہو گی تو تمہارے لئے پورا کریٹ منگوادوں گا۔ اس پر بھی تمہاری طبیعت سیر نہ ہو تو تمہارے لئے شراب کا سوئمنگ پول بنوادوں گا۔ اس میں پڑی غوطے کھاتی رہنا۔"

وہ کھا جانے والی نظروں سے مجھے گھورتی رہی اور ہانپتی رہی پھر شاید اس نے جواب دینے میں ہی عافیت سمجھی "وہ چھ ماہ پہلے یہاں سے چلی گئی تھی۔ اب مجھے نہیں معلوم کہ اسے "چلے جانا" کہا جائے یا "غائب ہونا" سمجھا جائے۔ بہرحال اس نے مجھے اپنے جانے کی اطلاع نہیں دی تھی۔ کئی دن تک تو مجھے اس کے جانے کا پتا ہی نہیں چلا کیونکہ یہاں کئی لڑکیوں کی اپنی اپنی الگ الگ دنیا ہے، اپنے معمولات ہیں۔ ہر لڑکی اپنی مرضی کی زندگی گزارتی ہے۔ میری طرف سے کسی پر کوئی پابندی نہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مرد ملنے والے بھی یہاں آسکتے تھے۔ یہ ایک ایسی سہولت تھی جو کوئی مالکِ مکان نہیں دے سکتا۔ شاید اسی لئے میرے ہاں کمرا لینے کی ان خواہش مند لڑکیوں کی لائن لگی رہتی تھی جو یہ سہولت چاہتی تھیں۔ میرے ہاں تو لڑکیوں کو کمرا مشکل سے ملتا تھا۔ بعض تو یہاں کمرا ملنے پر اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتی تھیں۔"

"یقیناً... یقیناً سمجھتی ہوں گی۔" میں نے اثبات میں سرہلایا۔

عمارت جس علاقے میں واقع تھی اور کمروں کی جو حالت تھی اس کے باوجود اگر کوئی لڑکی یہاں کمرا میسر آنے کو اپنی خوش قستی سمجھتی تھی تو اس کے مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا تھا اور یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ وہ [illegible] قبیل کی لڑکی رہی ہوگی۔

"حالانکہ [illegible] کرایہ اور ایڈوانس بھی ٹھیک ٹھاک لیتی تھی۔" موٹی نے واضح کیا۔ اس بات کا مجھے اس کے بتانے سے پہلے اندازہ ہوچکا تھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" دفعتاً میں نے پوچھا۔

"نورافشاں۔" اس نے جواب دیا۔

"بہت خوب... بہت خوب۔" میں نے سرہلایا۔ اس شخصیت کی نورافشانی تو میں بہت دیر سے دیکھ رہا تھا "نورافشاں بیگم! یہ تو بتاؤ کہ اس وقت تمہاری بلڈنگ میں کمرے خالی کیوں آرہے ہیں؟ لڑکیاں کہاں ہیں؟"

"میں نے یہ بلڈنگ بیچ دی ہے۔ میں ڈیفنس شفٹ ہورہی ہوں۔ میری کرائے دار لڑکیاں بھی وہیں شفٹ ہوگئی ہیں۔" اس نے جواب دیا "تم دو تین روز بعد آتے تو میں بھی شفٹ ہوچکی ہوتی لیکن میری قسمت خراب تھی۔ میرے مقدر میں تم سے سرپھٹول لکھا تھا۔ سو پھوڑ رہی ہوں۔"

حالانکہ سر وہ بے ہودہ عورت نہیں، بلکہ میں پھوڑ رہا تھا۔ میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور مسکراتے ہوئے کہا "خوب! ڈیفنس جارہی ہو اس کا مطلب ہے ترقی کرگئی ہو۔ دھندا اچھا جارہا ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ناگواری سے مجھے گھورتی رہی۔ یکدم اس کے تاثرات بدل گئے اور ہاتھ بڑھاتے ہوئے وہ ملتجیانہ انداز میں بولی "ایک گھونٹ ہی پلادو۔" وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔ میں نے اس جتنی عمر اور اس جیسی حالت کی کسی عورت کو پینے کی اتنی عادی نہیں دیکھا تھا۔

"بات ختم ہوجائے تو آرام سے بیٹھی پیتی رہنا۔ ہم تمہاری جان چھوڑدیں گے۔" میں نے نرمی سے کہا۔

"کب ختم ہوگی تمہاری بات؟ میرے پاس تمہیں بتانے کے لئے کچھ نہیں ہے۔" وہ جھنجلاہٹ آمیز انداز میں تقریباً چلائی۔

"تم مجھے مونا کا تھوڑا بہت سُراغ دے دو۔ میں تمہاری جان چھوڑدوں گا۔" میں نے ایک بار پھر وعدہ کیا۔

"کاش وہ حرافہ میری رسائی میں ہوتی تو میں اس کی گردن پکڑ کر تمہارے ہاتھ میں دے دیتی۔"

"تمہیں اس کے غائب ہونے پر تشویش نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"میں اگر اس طرح تشویش میں مبتلا ہونے لگوں تو چل چکا کاروبار چلا چکی۔" وہ اپنے بُرے سے منہ کو مزید بُرا بناتے ہوئے بولی "میرا اس کی طرف کوئی حساب نہیں نکلتا تھا۔ اُلٹا ایڈوانس کی کچھ رقم میرے پاس پڑی تھی۔ اس لئے میں نے اس کے بارے میں سوچا تک نہیں۔ اس کا سامان بھی صرف ایک سوٹ کیس میں تھا۔ میں فرنشڈ کمرے دیتی ہوں۔ اپنا سوٹ کیس وہ ساتھ لے گئی تھی۔ میرے آدمیوں کو اس نے یہی تاثر دیا تھا کہ وہ اپنے گھر والوں سے ملنے جارہی تھی۔"

اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری، سانس درست کرنے کی کوشش کی پھر بولی "مجھے پہلے ہی معلوم تھا وہ چڑیا ایک روز میرے گھونسلے سے اُڑ جائے گی۔ وہ بہت اونچا اُڑنا چاہتی تھی۔ اونچا اُڑنے کی شوقین چڑیاں زیادہ دن گھونسلے میں نہیں ٹکتیں۔"

اس کی کم از کم اس بات سے مجھے اتفاق تھا لیکن مجھے یقینی طور پر یہ معلوم نہیں تھا کہ مونا کے بارے میں اس کی یہ بات صحیح تھی یا غلط۔

"کیا مونا کا کمرا کرائے پر اُٹھ چکا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کرائے پر اُٹھنے کے بعد خالی بھی ہوچکا ہے۔ ان دنوں اس میں جو لڑکی تھی وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ ڈیفنس جاچکی ہے۔" اس نے بتایا۔

"اس کے باوجود میں اسے دیکھنا چاہوں گا۔ کون سا ہے وہ کمرا؟"

"اوپر کی منزل پر ہے۔ اس کے دروازے پر چاک سے تیرہ نمبر لکھا ہوگا۔" اس نے جواب دیا۔

"تیرہ؟" میں نے دُہرایا۔ مغربی لوگ عام طور پر تیرہ کے ہندسے کو منحوس خیال کرتے ہیں لیکن میرے خیال میں مونا جب تک اس کمرے میں رہی تھی تب تک تو وہ کسی خاص نحوست کا شکار نہیں ہوئی تھی۔

"مونا سے یہاں کوئی ملنے آتا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"کئی آدمی آتے تھے لیکن اب اگر تم پوچھو گے کہ وہ کون تھے تو میں تمہیں پہلے ہی بتادوں کہ مجھے ان کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔" وہ تیزی سے بولی۔

"تم مجھے اتنی بے نیاز رہنے والی چیز تو نہیں لگتیں۔" میں نے اسے گھورا۔

"میں نے کب کہا کہ میں مونا کے ملاقاتیوں کی طرف سے بے نیاز تھی؟ میں نے ان کے بارے میں جاننے کی کوشش کی لیکن مونا نے کبھی جاننے کا موقع ہی نہیں دیا لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ جسے بھی لے کر آتی تھی وہ اونچی چیز معلوم ہوتا تھا۔ مونا پوری کوشش کرتی تھی کہ میں ان کے قریب نہ پھٹکنے پاؤں۔ وہ خود بھی بہت محتاط معلوم ہوتے تھے۔"

ایک گہری سانس لے کر اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "ویسے بھی ان میں سے کوئی ایک آدھ مرتبہ سے زیادہ یہاں نہیں آیا۔ وہ بھی شاید صرف اس لئے کہ ایک مرتبہ مونا کا ٹھکانا دیکھ لیا جائے ورنہ شاید زیادہ تر وہ خود ہی ان سے باہر ہی باہر کہیں مل لیتی تھی۔"

پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ متاسفانہ انداز میں بولی "جن لوگوں سے اسے میں نے ملانا چاہا وہ اسے کچھ زیادہ پسند نہیں آئے۔ وہ ان سے بھی ملی لیکن جلد ہی ان کا ہاتھ جھٹک کر آگے بڑھ گئی۔ میں نے کہا نا... کہ وہ بہت اونچا اُڑنا چاہ رہی تھی۔ میں اس سے خوش نہیں ہوں۔ صرف اس لئے میرا اس کے بارے میں بات کرنے کو جی نہیں چاہتا لیکن تم معلوم نہیں کیا سمجھ رہے ہو۔ میں منافق نہیں ہوں۔ میں اپنے تاثرات نہیں چھپاؤں گی۔ اگر وہ کہیں غائب ہوگئی ہے تو مجھے اس کی خوشی ہے لیکن یقین کرو اسے غائب کرانے میں میرا قطعاً ہاتھ نہیں۔ میں اس سے ناراض ضرور ہوں۔ وہ بھی صرف اس لئے کہ میں نے اس کے ساتھ بڑی بھلائی کی۔ میری اس پر بہت سی مہربانیاں رہیں لیکن اس کی طرف سے مجھے ان کا کوئی صلہ نہیں ملا۔ وہ بڑی بے دید لڑکی تھی۔"

جس طرح کی مہربانیاں اس نے مونا پر کی ہوں گی اور جس طرح کا صلہ وہ چاہتی ہوگی اس کا اندازہ کرنا میرے لئے دشوار نہیں تھا۔ ان راستوں پر چلنے والی... یا یوں کہئے کہ ان راستوں پر چلا دی جانے والی لڑکیاں اگر نورافشاں بیگم جیسی عورت کی نظر میں بے دید بھی ہوجائیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہونی چاہئے تھی بلکہ ان راستوں پر چلنے کے لئے بے دید ہونا شاید پہلی ضرورت تھی۔ آنکھ میں مروت شرم، حیا رکھنے والوں کا تو سیدھے سچے راستوں پر چلنا دشوار ہوتا ہے۔ ٹیڑھے میڑھے اور ناہموار راستوں کا تو ذکر ہی کیا۔

"اگر تم پہلے ہی اس موڈ میں بات کرلیتیں تو ہم اور تم کافی پریشانی سے بچ جاتے۔" میں نے کہا۔

"دراصل مجھے اندازہ نہیں ہوسکا تھا کہ تم کوئی خبیث چیز ہو۔" اس نے نہایت صاف گوئی سے اعتراف کیا "سوٹ بوٹ سے تو کوئی معزز، شریف آدمی لگتے ہو۔ میں سمجھی تھی تم مونا کے عاشقوں میں سے کوئی ایک ہو۔ میرا خیال تھا میں تمہیں ڈانٹ ڈپٹ کر، چیخ و پکار کرکے اور رعب دکھا کے بھگانے میں کامیاب ہوجاؤں گی۔ میں مونا کے بارے میں بالکل بات کرنا نہیں چاہتی تھی۔ میں بڑی کینہ پرور عورت ہوں۔"

"پھر تو عین ممکن ہے تم نے ہی مونا کو غائب کرادیا ہو؟" میں نے اس کی سُرخ اور دُھندلی دُھندلی آنکھوں میں جھانکا۔ ان میں نمی جھلملا رہی تھی۔

"اس نے مجھے اس کا موقع ہی نہیں دیا۔ اس بڑے شہر میں آکر وہ بڑی چالاک چیز بن چکی تھی۔ اگر مجھے موقع مل بھی جاتا تب بھی شاید میں ایسا نہ کرتی۔ میں اس قسم کے لمبے چکروں میں پڑنے والی عورت نہیں ہوں۔ میں تو سیدھے سادے "دو اور دو چار" والے کام کرتی ہوں۔ میری اپنی ایک لائن ہے۔ چار پیسے کا فائدہ اُٹھانے کے سوا میں کسی چکر میں نہیں پڑتی۔"

لگتا تھا اب وہ صحیح ڈگر پر آگئی تھی اور سیدھے صاف انداز میں بات کررہی تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ اس کا کوئی کنبہ نہیں تھا، کوئی اولاد نہیں تھی اور اس کی صحت کا یہ عالم تھا کہ کسی بھی لمحے وہ اچانک اس جہانِ فانی سے رخصت ہوسکتی تھی مگر "چار پیسے" کے فائدے کی ہوس سے اسے ابھی چھٹکارا نہیں تھا۔ کمرے کرائے پر چڑھا کر بھی ٹھاٹ باٹ سے اس کی گزر بسر ہوسکتی تھی مگر کمروں

کے ساتھ ساتھ وہ یقیناً لڑکیاں بھی کرائے پر چلا رہی تھی "ترقی" کرکے ڈیفنس بھی جارہی تھی۔ گویا ابھی مزید "چار پیسے" کمانے کی امنگ کمزور نہیں پڑی تھی۔ یہ "چار پیسے" کی کشش بھی عجیب پُراسرار چیز تھی۔

میں نے اپنے جہانِ حیرت سے باہر آتے ہوئے کہا "فی الحال میں تمہاری باتوں پر اعتبار کرلیتا ہوں لیکن اگر ان میں سے کوئی غلط ثابت ہوئی تو مجھے واپس آنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکے گی اور جب میں واپس آتا ہوں تو پہلے سے زیادہ خبیث ثابت ہوتا ہوں۔"

میں نے گلاس اس کی ٹرالی پر رکھ دیا اور ٹرالی اس کے قریب کھسکا دی۔ اس نے ندیدوں کی طرح گلاس اُٹھالیا۔ میں اور شفیع شاہ کمرے سے نکل آئے اور ہم نے تیسری منزل کا رُخ کیا۔

دفعتاً پیچھے سے آواز آئی "اے... سُنو" یہ نورافشاں ہی کی کھرکھراتی اور عجیب سی آواز تھی۔

میں نے واپس جاکر کمرے میں جھانکا تو وہ بولی "مجھے یاد آیا۔ اوپر ایک کمرے میں ابھی ایک لڑکی موجود ہے۔ وہ ابھی شفٹ نہیں ہوئی ہے۔ اسے میں نے ہی مزید دو ایک رات کے لئے یہاں روکا ہوا ہے۔ خدا کے لئے اسے کچھ مت کہنا۔ وہ بہت سعادت مند بچی ہے۔ میں اس کی بڑی قدر دان ہوں۔ تم اس سے بالکل مت اُلجھنا۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔" اس نے سچ مچ ہاتھ جوڑدیئے۔

میں نے غیر واضح سے انداز میں سرہلایا اور پلٹ آیا۔ یہ میرے لئے اچھی خبر تھی کہ اوپر کوئی لڑکی موجود تھی۔ شاید اس سے مونا کے بارے میں کوئی کام کی بات معلوم ہوجاتی۔ میں نے شفیع شاہ کو گن چھپا لینے کی ہدایت کی۔ ہم اوپر پہنچے تو اس لڑکی نے اپنی موجودگی کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے کمرے میں روشنی نظر آرہی تھی لیکن دروازہ بند تھا۔

کھڑکی بھی بند تھی اور اس میں موٹی موٹی سلاخیں نظر آرہی تھیں۔ وہ کھڑکی کا پٹ ذرا سا کھولے اور گہرے رنگ کا پردہ کھڑکی پر پھیلائے کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ پورا نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ تاہم یہ اندازہ ہورہا تھا کہ وہ غزالی آنکھوں، ستواں ناک، بھرے بھرے ہونٹوں والی ایک پُرکشش لڑکی تھی۔ اس کی رنگت گندمی اور بال بھورے تھے۔ اس کی آنکھوں میں خوف کے سائے تھے۔ اسے یقیناً معلوم تھا کہ نیچے گڑبڑ تھی لیکن وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلی اس کی آنکھیں دوسروں کو قیدی بنانے کی صلاحیت رکھتی تھیں لیکن اس وقت سلاخوں والی کھڑکی کے پیچھے وہ خود قیدی معلوم ہورہی تھی۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ پیچھے ہٹ گئی اور اس نے کھٹ سے کھڑکی کا شیشہ بند کرلیا تاہم دبیز پردے کے باوجود مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ کھڑکی کے پیچھے ہی موجود تھی۔ میں نے انتہائی شائستگی اور نرمی سے کہا "اچھی لڑکی! ہم سے ڈرو مت۔ ہم کوئی ڈاکو یا بدمعاش نہیں، معزز اور شریف لوگ ہیں۔ نیچے والوں کے ساتھ تھوڑی سی ہاتھا پائی اس لئے کرنی پڑی کہ وہ ہمارے ساتھ صحیح طرح پیش نہیں آرہے تھے اور کسی بھی بات کا شرافت سے جواب نہیں دے رہے تھے۔"

میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ کھڑکی کے عقب میں سکوت تھا۔ لڑکی بہرحال میری بات سُن رہی تھی۔ میں نے جلدی سے سلسلۂ کلام جوڑا "ہم صرف مونا کے بارے میں معلومات کرنے آئے ہیں۔ تمہیں اگر اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم ہے تو بتادو۔ ہم تمہیں انگلی بھی نہیں لگائیں گے۔ خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہم مونا کو تلاش کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔ اس میں ہماری کوئی غرض شامل نہیں ہے۔ بس یوں سمجھ لو کہ ہم اس کی بہن کی مدد کرنے کی کوشش کررہے ہیں جو اس کی تلاش میں یہاں آئی تھی اور ناکام واپس چلی گئی تھی۔"

کھڑکی کے پیچھے خاموشی رہی۔ ایک لمحے کے انتظار کے بعد میں نے کہا "ہم چاہیں تو دروازہ توڑ کر بھی اندر گھس سکتے ہیں۔ یہ کوئی ایسا مضبوط دروازہ نہیں ہے لیکن اگر تم خود دروازہ کھول کر ہمیں اندر آنے کی اجازت دوگی تو میں تمہارا شکرگزار ہوں گا۔"

میری تقریرِ دل پذیر کا آخر اس پر اثر ہو ہی گیا۔ اس نے دروازے کا بولٹ گرا ہی دیا لیکن اس کی صورت دیکھ کر مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ قدم اُٹھانے کے لئے اسے بڑی کشمکش سے گزرنا پڑا تھا۔ اپنی تمام تر جرأت مجتمع کرنی پڑی تھی۔ میں نے کمرا نمبر تیرہ میں جانے کا ارادہ فی الحال ملتوی کردیا اور پہلے اس سے بات کرلینا بہتر سمجھا۔

وہ تیزی سے پیچھے ہٹ گئی اور کمرے کے وسط میں جاکھڑی ہوئی۔ اس نے فیصلے کی آزمائش سے گزر کر دروازہ تو کھول دیا لیکن شاید اسے ابھی پورا یقین نہیں تھا کہ ہم اپنے وعدے کا پاس کریں گے۔ میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا۔ اس نے ڈفل کوٹ کی آڑ سے گن نکال کر دروازے کے قریب کھڑی کردی اور یوں اس سے دور ہٹ گیا جیسے اس کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ لڑکی نے ... کی خوف ناک سی گن کو دیکھ کر تھوک نگلا۔

بڑے سے بلب کی تیز روشنی اب براہِ راست اس کے چہرے پر پڑرہی تھی اور اس کی رنگت میں ہلکی سی ملاحت اب بہت ... لگ رہی تھی۔ وہ شاید کچھ ہی دیر پہلے نہا کر نکلی تھی۔ اس کے کندھوں پر بکھرے ہوئے بالوں میں ابھی نمی تھی۔ تولیہ بیڈ پر تھا۔ کمرے میں اس کے وجود کی بھینی بھینی اور تازگی آمیز سی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ گدرائے جسم کی گول مٹول سی لڑکی تھی مگر قد نہیں تھی۔

"بیٹھ جاؤ۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ خوف زدہ یا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے انتہائی ... کہا۔

بیڈ اس کے قریب تھا۔ وہ بیڈ کی پٹی پر ہی ٹک گئی اور بیٹھی بیٹھی سی آواز میں بولی "آپ بھی بیٹھئے نا۔"

کمرے میں دو ہی کرسیاں تھیں۔ ہم دونوں ان پر بیٹھ گئے۔ میں نے نہایت شائستگی سے اس کا شکریہ ادا کیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا "نام کیا ہے تمہارا؟"

"سیمیں" اس نے اب ذرا ہمت سے جواب دیا۔

"پیارا نام ہے۔" میں نے ماحول کے تناؤ کو مزید کم کرنے کے لئے کہا "ویسے شخصیت کے اعتبار سے تمہارا نام ملیحہ ہونا چاہئے تھا۔"

وہ کچھ نہ بولی تاہم مجھے اس کے بھرے بھرے ہونٹوں پر مسکراہٹ کی رمق دکھائی دی۔ اس کا خوف دور ہوچکا تھا۔ میں نے فوراً ہی پوچھ لیا "مونا کے بارے میں تم ہمیں کچھ بتاسکتی ہو؟"

اس نے میرے سوال کا جواب دینے کے بجائے مؤدبانہ انداز میں پوچھا "میں سگریٹ پی سکتی ہوں؟" یہ کہتے ہوئے اس کا ہاتھ سائڈ ٹیبل کی طرف بڑھ چکا تھا۔ جس پر سگریٹ کا پیکٹ اور ماچس پڑی تھی۔

"اگر تم سگریٹ پیتی ہو تو ضرور پیو۔ جب وزارتِ صحت کی تنبیہہ تمہیں نہیں روک سکتی تو میں کیسے روک سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

اس نے سگریٹ سُلگائی اور ماہرانہ انداز میں ہوا میں دھوئیں کے چھلّے بنایا۔ میں نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا لیکن اس کا ذہن شاید کہیں اور تھا۔ دھوئیں سے کئی چھلے اس نے بے دھیانی میں ہی بناڈالے۔

"میڈم نور نے آپ کو مونا کے بارے میں کیا بتایا ہے؟" اس نے پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا مطلب ہے لینڈلیڈی نورافشاں نے....؟" میں نے تصدیق چاہی اور نیچے کی طرف اشارہ کیا۔

"جی ہاں۔ ہم انہیں مختصراً میڈم نور کہتے ہیں۔" اس نے جواب دیا۔ مجھے جو کچھ اس عورت سے معلوم ہوسکا تھا وہ میں نے اسے بتادیا۔

"ہاں مجھے اس سے کچھ زیادہ معلوم ہے۔" وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ اب اس کا لہجہ بالکل پُرسکون تھا "میڈم نور نے سچ ہی بولا ہے۔ انہیں اس سے زیادہ معلوم نہیں ہوگا۔ مجھے صرف اس لئے معلوم ہے کہ مونا مجھ سے تھوڑی سی بے تکلف ہوگئی تھی۔ وہ میرے برابر والے کمرے میں ہی رہتی تھی۔" اس نے انگلی سے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "وہ کسی اور سے ذرا بھی بے تکلف نہیں تھی حالانکہ ہم سب گویا ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہم میں سے بعض کا تعلق اسی شہر سے ہے۔ بعض دوسرے علاقوں سے آئی ہیں۔ ہماری بولی میں..... خاندانوں میں فرق ہے۔ ہر ایک کے پیچھے ایک مختلف کہانی ہے۔ اس کے باوجود ہم سب یہاں گویا ایک قبیلے یا پھر شاید ایک ریوڑ کی طرح ہیں۔ گو کہ سب لڑکیاں یہاں موجود نہیں ہیں لیکن آپ کو اندازہ ہو ہی چکا ہوگا کہ وہ کس قسم کی لڑکیاں رہی ہوں گی۔"

"نہیں۔ مجھے اندازہ نہیں ہوا۔" میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ میں اس کے منہ سے سُننا چاہتا تھا۔

"اب آپ اتنے انجان نہ بنیں۔" وہ میری اداکاری سے متاثر ہوئے بغیر ہلکا سا کش لے کر بولی "ابھی تو میں ایک نمونہ.....یا یوں کہئے کہ ان لڑکیوں کی ایک نمائندہ آپ کے سامنے موجود ہوں۔ اگر میں نہ ہوتی تب بھی آپ میڈم سے مل کر... یہاں کے ماحول کو دیکھ کر آسانی سے سمجھ سکتے تھے کہ یہاں کس قسم کی لڑکیاں رہتی ہوں گی۔ آپ جیسے بہت سے شرفا تو ویسے ہی اس جگہ سے واقف ہیں۔"

"میری جنرل نالج ذرا کمزور ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

وہ گویا میری تسلی کے لئے وضاحت پر آمادہ ہوتے ہوئے بولی "زیادہ تر وہی لڑکیاں ادھر کا رُخ کرتی ہیں جو کچھ ایسی زیادہ پارسا نہیں ہوتیں۔ جن پر سے اپنے گھرانے اور خاندانی شرافت کا رنگ اُتر چکا ہوتا ہے۔ بعض کے خاندانی پس منظر میں یہ رنگ شامل ہی نہیں ہوتا۔ وہ خاندانی طور پر ہی کچھ چلتی پھرتی قسم کی چیزیں ہوتی ہیں لیکن بعض شریف خاندانوں کی بھی ہوتی ہیں اور وہ خود بھی شرافت کی زندگی گزارنا چاہتی ہیں لیکن حالات، مجبوریاں، پے در پے ناکامیاں یا لوگوں کے مسلسل دھوکے اور فریب انہیں اس منزل پر لے آتے ہیں کہ وہ شرافت کی زندگی کا خیال چھوڑ دیتی ہیں۔ اپنے آپ کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیتی ہیں۔ اپنے لئے تھوڑی بہت آسانیاں، تھوڑی بہت آسائشیں تلاش کرلیتی ہیں۔ میڈم نور جیسی عورتوں کی سرپرستی اور نگرانی میں کسی اور ہی انداز، کسی اور ہی فلسفے کے ساتھ اپنی زندگی کو بہتر بنانے کی جدوجہد شروع کردیتی ہیں۔ راتوں کو آسودہ حال لوگوں کے عشرت کدوں کی رونق بڑھانے لگتی ہیں۔ ان کے آئیڈیلز بدل جاتے ہیں۔ وہ کسی کلرک، پروفیسر، دکاندار یا الیکٹریشن کی بیوی بن کر "عزت" سے زندگی گزارنے کے بجائے کسی بڑے آدمی کی داشتہ بن کر "عیش" سے زندگی گزارنے کے خواب دیکھنے لگتی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا تو یہ خواب بھی پورا نہیں ہوتا۔ سب کچھ کر گزرنے کے بعد بھی زیادہ تر تو ایسے ہی تنگ و تاریک مکانوں میں مختلف مسائل یا مختلف بیماریوں کا شکار ہوکر مرجاتی ہیں۔ یہ قصے برس ہا برس سے چل رہے ہیں۔ ان میں کوئی نئی بات نہیں۔ بس وقت کے ساتھ ساتھ تھوڑے بہت انداز تبدیل ہوتے چلے جاتے ہیں۔"

وہ نظریں جھکائے خاموشی سے سگریٹ کو انگلیوں میں گھمانے لگی۔ اس کی گھنیری پلکوں کا سایہ اس کے رخساروں تک پہنچ رہا تھا۔ دفعتاً وہ سر اُٹھا کر ذرا تیکھے لہجے میں بولی "اب اگر آپ یہ کہیں

کہ آپ ان باتوں سے بالکل ہی لاعلم ہیں تو میں اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں۔ آپ کچھ ایسے کمسن دکھائی نہیں دیتے اور نہ ہی ایسے مفلس وقلاش نظر آرہے ہیں کہ آپ کو گھر سے باہر جھانکنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔ آپ نے یقیناً کسی نہ کسی حد تک تو دنیا ضرور دیکھی ہوگی۔"

میں نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ملائمت سے پوچھا "مونا بھی اسی قبیل کی لڑکی تھی؟"

"ظاہر ہے۔ اسی طرح کی لڑکیاں میڈم کی... اور اس ٹھکانے کی شہرت سُن کر۔ کسی نہ کسی سے اس کا تذکرہ سُن کر یہاں پہنچتی ہیں۔ تاہم میں اتنا ضرور کہوں گی کہ ہماری طرح کی بیشتر لڑکیاں ذہنی طور پر آوارہ نہیں ہوتیں۔ وہ یا تو بھٹکی ہوئی ہوتی ہیں اور ان کے لئے واپسی کے راستے بند ہوچکے ہوتے ہیں یا پھر وہ حالات کا شکار ہوتی ہیں۔ بہت کم ہوتی ہیں جن کی اپنی آوارگی انہیں اس طرف لاتی ہے۔"

وہ ایک بار پھر ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئی گویا مناسب الفاظ تلاش کررہی ہو "مونا کا معاملہ یہ تھا کہ وہ بہت خوب صورت تھی اور اس کی خوب صورتی نے اسے بے چین کیا ہوا تھا۔ میں اس کے لئے "تھی" کا صیغہ اس لئے استعمال کررہی ہوں کہ اسے یہاں سے گئے کافی عرصہ ہوگیا ہے۔"

اس وضاحت کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "وہ اپنی خوب صورتی کے بل پر جلدازجلد زیادہ سے زیادہ شہرت اور دولت سمیٹنا چاہتی تھی۔ بعض ایسی لڑکیاں اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوجاتی ہیں۔ بعض کو یہ سوچ راس نہیں آتی۔ مجھے نہیں معلوم کہ مونا کا معاملہ کیا ہے۔ کیونکہ جب سے وہ یہاں سے گئی ہے' میں نے اسے دوبارہ نہیں دیکھا اور اس کی کامیابی کا کوئی ثبوت بھی فی الحال میری نظر سے نہیں گزرا۔"

"اسے اس ماحول سے ایڈجسٹ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی تھی؟" میں نے گردوپیش کی طرف اشارہ کیا۔

"نہیں" سیمیں نے جواب دیا "بعض لڑکیاں یہاں پریشانی کے عالم میں پہنچتی ہیں۔ ایک لحاظ سے یہ جگہ ان کے لئے پناہ گاہ بھی ثابت ہوتی تھی۔ میڈم نور کیسی بھی عورت سہی لیکن ایک خوبی بہرحال اس میں موجود ہے کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ کوئی زبردستی نہیں کرتی۔ کسی کو بلیک میل نہیں کرتی اور نہ ہی اس نے کبھی کسی پارسا قسم کی لڑکی کو اس لائن پر لانے کی کوشش کی ہے۔ وہ ایک کرخت' بدمزاج اور بدلحاظ عورت ضرور ہے لیکن کبھی کسی کی مجبوری سے فائدہ نہیں اُٹھاتی۔"

سیمیں عجیب سے انداز میں مسکرائی "یہاں تو خوشی کا سودا ہے۔ جس کا دل چاہے' رہے۔ جس کا دل چاہے چلی جائے۔ جس کا دل چاہے صرف میڈم کا مطلوبہ کرایہ اور اخراجات وغیرہ ادا کرکے یہاں رہتی رہے اور میڈم کے دوسرے احکامات نہ مانے۔ جس کا دل چاہے میڈم کا کہنا مان کر خود بھی کمائے اور میڈم کو بھی حصہ دے۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوئی پھر اصل موضوع پر آتے ہوئے بولی "مونا یہاں پریشانی کے عالم آئی تھی۔ یہاں آنے سے پہلے وہ ایک عورت کی کرائے دار تھی جو شادی دفتر چلاتی تھی۔ اسی قسم کا شادی دفتر۔ جن کے اشتہار چھپتے ہیں کہ ایک کروڑپتی حسین دوشیزہ کے لئے رشتہ درکار ہے جو اپنے باپ کے اچانک انتقال کی وجہ سے بہت پریشان ہے۔ کروڑوں کا بزنس اس سے سنبھالا نہیں جارہا ہے۔ کوئی نیک دل اور خداترس شخص آکر اس دکھیاری کا سہارا بنے۔ اس کا کروڑوں کا بزنس سنبھالے اور اسے سچے' مخلص جیون ساتھی کا پیار دے۔ کنوارا' رنڈوا' شادی شدہ' سب قبول ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ان اشتہاروں میں دوسری بیوی کو الگ گھر لے کر دینے اور پہلے بچوں کا تمام خرچ اُٹھانے کا بھی وعدہ کیا جاتا ہے۔ وہ کروڑپتی دوشیزہ اتنی مجبور اور کسی بھی سہارے کی ایسی متلاشی ہوتی ہے کہ نہ جانے کتنے لوگوں کے دل تڑپ اُٹھتے ہیں اور وہ جوق درجوق اس کا سہارا بننے کے لئے روانہ ہوجاتے ہیں۔"

"مونا وہ "کروڑپتی دوشیزہ" تھی؟" میں نے دریافت کیا۔

"جی ہاں" سیمیں نے اثبات میں سرہلایا "اس حرافہ نے مونا کی وجہ سے خوب کمایا۔ اس کا ایک بدمعاش قسم کا پارٹنر بھی تھا۔ پولیس کو بھی حصہ جاتا تھا تاکہ اگر کوئی بھولا بھٹکا سرپھرا شکایت لے کر پولیس کے پاس پہنچ جائے تو اس کی شنوائی نہ ہو۔"

"کیا یہ فراڈ ابھی تک کامیاب جارہا ہے؟ کیا ابھی تک لوگوں کو عقل نہیں آئی؟" میں نے یونہی تجسس سے پوچھا۔

"بے وقوف بننے والے اس دنیا میں ازل سے موجود ہیں ابد تک موجود رہیں گے۔ انہی کے دم سے سیاسی' سماجی' اقتصادی شیطانوں کا کاروبار چل رہا ہے۔ ویسے اب یہ دھندا ٹھنڈا پڑگیا ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ اختراعات ہوتی رہتی ہیں۔ پُرانے شکاری نئے جال لاتے رہتے ہیں۔ سالہاسال سے سب اسی طرح ہورہا ہے۔ بس انداز ذرا بدل جاتے ہیں۔ الفاظ آجاتے ہیں۔ زاویے نئے تلاش کرلئے جاتے ہیں۔"

"کیا مونا کروڑپتی دوشیزہ کا کردار ادا کرتے کرتے کسی مشکل میں پھنس گئی تھی؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں۔ وہ سلسلہ تو ٹھیک ہی چل رہا تھا لیکن شادی دفتر کی مالکن سے اس کا کچھ جھگڑا ہوگیا۔ اس نے مونا کو پولیس کے ہاتھوں میں پھنسانے کی دھمکی دی۔ بات خاصی بڑھ گئی تھی۔ مونا وہاں سے بھاگ نکلی۔ کسی کے ریفرنس سے یہاں پہنچی۔ شاید کسی لڑکی نے اس کی رہنمائی کی تھی۔ میڈم نے اسے پناہ بھی دی اور اس کی ہرممکن مدد بھی کی۔"

"اور پھر اپنی لائن پر بھی چلایا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"ہاں" اس نے بلاتامل جواب دیا لیکن ایک لمحے کے

جھکائی۔ مجھے یہ دیکھنا بھلا لگتا تھا کہ اس قبیل کی بعض لڑکیوں میں حیا کی رمق باقی ہوتی تھی۔ اس کے چہرے پر خفیف سی اُداسی کا پرتو بھی تھا۔ لہجے اور اندازِ گفتگو سے وہ پڑھی لکھی اور کچھ بہتر ذوق کی مالک لگتی تھی۔ یہ جگہ اس کے لئے کچھ ناموزوں لگ رہی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ ڈیفنس کے ماحول میں شاید وہ کچھ زیادہ جچنے لگے۔

وہ دھیمے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میڈم کے کہنے پر وہ کچھ لوگوں کے ہاں جاتی رہی لیکن جن لوگوں تک میڈم کی رسائی ہے وہ مونا کو زیادہ پسند نہیں تھے اور چھتے بخرے ہونے کے بعد اس میں جس حد تک مالی فائدہ تھا مونا اس سے بھی مطمئن نہیں تھی حالانکہ وہ خوب صورت تھی' نوجوان تھی۔ اس کی ڈیمانڈ "سب سے زیادہ تھی۔ اسے ریٹ بھی سب سے زیادہ ملتا تھا مگر اس نے جلد ہی میڈم کا حکم ماننا چھوڑ دیا۔ میں نے بتایا ناکہ وہ بہت جلدی میں معلوم ہوتی تھی۔ وہ اپنی خوب صورتی اور جوانی سے جلدازجلد زیادہ سے زیادہ دولت اور شہرت سمیٹنے کے معاملے میں اندر ہی اندر ایک قسم کے جنون میں مبتلا تھی لیکن یہ جنون ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ اس کے اندر ایک خاموش مگر بڑی ضدی لڑکی بیٹھی تھی۔ اپنی کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باوجود ایک بات وہ جانتی تھی کہ اسی نوجوانی اور اُٹھان کے زمانے میں اس کا کوئی صحیح ہاتھ پڑگیا تو پڑگیا ورنہ پھر اسے کوئی نہیں پوچھے گا۔"

میں نے مونا کی تلاش کو محض انا کا مسئلہ بناکر اس سلسلے میں ہامی بھری تھی لیکن اب وہ مجھے ایک دلچسپ کردار محسوس ہونے لگی تھی۔ مجھے جب کوئی کردار دلچسپ محسوس ہوتا تھا تو پھر اس کے لئے کوئی زحمت اُٹھانا بُرا نہیں لگتا تھا اور نہ ہی اس میں کوئی بوریت ہوتی تھی۔ اس طرح بھی اپنے تجربات اور مشاہدات میں اضافہ کرنا مجھے ایک دلچسپ مشغلہ محسوس ہوتا تھا اور اگر اس میں کسی کا بھلا بھی ہوجاتا تو گویا "ہم خرما وہم ثواب" والا معاملہ تھا۔

مونا تو ویسے بھی لڑکی تھی۔ مجھے یہ اعتراف کرنے میں عار نہیں کہ لڑکی کے معاملے میں لاشعوری طور پر مرد کو زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔ خواہ اس کے عزائم کچھ بھی نہ ہوں۔ کچھ لوگ اپنے آپ کو بے نیاز اور غیرمعمولی ظاہر کرنے کے لئے اس کا اعتراف نہ کریں تو بات اور ہے۔ مجھے تو خاص طور پر مونا اور سیمیں ٹائپ کی لڑکیاں اس لئے بھی زیادہ دلچسپ محسوس ہوتی تھیں کہ یہ کم عمری میں ہی بڑی کمزوری بچائیاں اور بڑی سفاک حقیقتیں اپنے دامن میں چھپائے پھرتی تھیں جو عام لوگوں کی نظروں سے اکثر اوجھل ہی رہتی تھیں۔

سیمیں بات جاری رکھتے ہوئے بولی "مونا اس دوران شوبزنس کی طرف بھی ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ اس نے دو تین چھوٹے موٹے رسالوں کے لئے ماڈلنگ بھی کی۔ ٹی وی کے چکر بھی لگائے لیکن شاید بات بن نہیں رہی تھی۔ حالانکہ مونا اتنی بھولی بھی نہیں تھی۔ کافی گھاگ ہوچکی تھی لیکن ایسا لگتا تھا کہ اسے ملنے والے اپنا مطلب نکالنے کے بعد اسے وعدوں پر ٹرخارہے تھے یا پھر شاید وہ صحیح معنوں میں کام کے آدمی نہیں تھے۔ میں خود کبھی کبھار اسٹیج پر چھوٹے موٹے رول کرتی ہوں۔ مجھے بھی کئی لوگ تنہائی میں ملتے ہیں جو ٹی وی پر چھوٹی موٹی نوکریاں کرتے ہیں لیکن مجھے بڑی بڑی سیریلز میں ہیروئن کے رول دلانے کی باتیں کرتے ہیں۔

میں ایک کان سے سُنتی ہوں' دوسرے سے نکال دیتی ہوں حالانکہ کبھی کبھی دل چاہتا ہے کہ کسی کی بات پر اعتبار کرکے دیکھ لیا جائے۔ زندگی میں جہاں انسان اتنے دھوکے کھاتا ہے' وہاں ایک آدھ دھوکا اور سہی لیکن نہ جانے کیوں دل کے اس مشورے پر عمل نہیں کرسکی۔ میں سوچتی ہوں اس قسم کے لوگوں کے ساتھ وقت ضائع کرنا فضول ہے۔

مونا بھی اس قسم کے لوگوں کے چکر میں آنے والی نہیں لگتی تھی۔ اس کے باوجود مجھے محسوس ہوتا تھا کہ وہ ان سلسلوں میں بہت وقت ضائع کررہی تھی۔ اس موضوع پر کبھی اس سے تفصیلی بات نہیں ہوتی تھی حالانکہ ویسے اس کی زندگی کا کوئی راز مجھ سے چھپا ہوا بھی نہیں تھا۔ میں بھی اس موضوع پر اسے کچھ زیادہ بولنے پر مجبور نہیں کرتی تھی' اسے کریدنے کی کوشش نہیں کرتی تھی۔ شاید اس لئے کہ مجھے احساس تھا' ناکامیوں کے بارے میں بات کرنا کسی کو اچھا نہیں لگتا۔ شاید وہ بھی منتظر تھی اور میں بھی یہی چاہتی تھی کہ کسی روز اسے کوئی بڑی کامیابی نصیب ہو اور وہ اچانک آکر دھماکا خیز انداز میں یہ خبر مجھے سُنائے۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔ حتیٰ کہ ایک روز وہ کچھ بتائے بغیر غائب ہوگئی۔ اس نے مجھے بھی کچھ نہیں بتایا۔" اسے گویا اس پر حیرت بھی تھی اور صدمہ بھی۔

"حالانکہ وہ تم سے کوئی بات نہیں چھپاتی تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں۔ یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ وہ مجھے ہر بات ہی بتادیتی تھی۔" سیمیں قدرے ہچکچاہٹ سے بولی "تاہم اتنا ضرور تھا کہ مجھے اس کی زندگی کے کئی اہم واقعات کا علم تھا۔ اب اگر اس کی زندگی میں کوئی اہم موڑ آرہا تھا یا آچکا تھا تو اس نے اس کے بارے میں مجھے نہیں بتایا۔ ویسے اس نے مجھے یہ تک بتا رکھا تھا کہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد کون تھا۔"

"کون تھا؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"اس کا رشتے کا ایک چچا۔ جس کے پاس رہنے کے لئے وہ حیدرآباد گئی تھی۔" سیمیں نے بلاتامل جواب دیا "مونا کا... اور شاید اس کے گھر والوں کا بھی خیال تھا کہ وہ اس کے لئے باپ کا نعم البدل ثابت ہوگا لیکن اس نے ایک خاص حکمتِ عملی کے تحت اس کے روز وشب کے کچھ خاص اور سرکش لمحات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اسے ایک نئے ہی راستے پر ڈال دیا۔ اس کی بے چین زندگی پر فطری شرم وحیا کا جو کمزور سا بند موجود تھا اس نے

اسے توڑ دیا۔ اس کے بعد شاید مونا کی جھجک کھل گئی۔"

میں دم بخود سا بیٹھا رہ گیا۔ عذرا نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی بہن رشتے کے ایک چچا کے پاس اس خیال سے رہنے کے لئے گئی تھی کہ وہ اس کی کچھ مدد کرے گا۔ اسے آگے بڑھنے کے لئے کوئی سہارا مہیا کرے گا۔ اس کے لئے اپنا اثر رسوخ استعمال کرے گا۔ اس نے کیا خوب اثر رسوخ استعمال کیا تھا۔ وہ خواہ رشتے ہی کا چچا سہی۔ بہرحال اس سے تعلق تو بزرگی کا ہی تھا۔

دنیا واقعی بڑی عجیب جگہ تھی!

"ان کی عمروں میں تو خاصا فرق رہا ہو گا؟" میں نے پوچھا۔ مجھے اپنی آواز گلے میں پھنستی محسوس ہوئی۔

"ہاں... مونا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس وقت پچاس سے اوپر کا تھا اور مونا کی عمر بیس سے بھی کم تھی۔ اسی لئے تو مونا کی ماں اور بہن نے بھیج دیا تھا کہ "بچی" وہاں ایک "بزرگ" کے زیرِ سایہ رہے گی۔ وہ انتہائی خود غرض، شاطر اور مکار تھا۔ مونا کو اس سے فائدہ تو کیا پہنچتا تھا، اسے اُلٹا اس سے جان چھڑانا مشکل ہو گئی۔ وہ اس کی نوخیزی اور نوجوانی کے لئے پیرِ تسمہ پا بن گیا۔ جب تک اس میں دم خم رہتا شاید وہ مونا کو اپنے شکنجے سے نہ نکلنے دیتا لیکن وہ بہرحال اپنی تمام تر کم عمری اور ناتجربہ کاری کے باوجود ضدی، سرکش اور بے خوف تو تھی۔ کسی نہ کسی طرح اس سے جان چھڑا کر آ گئی۔ پہلے وہ گھر گئی پھر کراچی آ گئی۔"

دفعتاً سیمیں کو جیسے کچھ خیال آیا۔ اس نے ملتجیانہ سی نظر سے میری طرف دیکھا "آپ میرے لئے اجنبی ہیں لیکن میں نہ جانے کس رو میں یہ بات، آپ کو بتا گئی ہوں حالانکہ یہ اس نے اپنے گھر والوں تک کو نہیں بتائی۔ کیا میں اُمید رکھوں کہ آپ دونوں حضرات اسے اپنی ذات تک محدود رکھیں گے؟"

"یقیناً" میں نے جواب دیا۔ شفیع شاہ نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "تم سے اتنی دیر کی گفتگو کے بعد بھی بات درحقیقت وہیں کی وہیں رہی۔ مونا کے بارے میں ہماری معلومات میں تو خاصا اضافہ ہوا لیکن کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی جس سے اسے تلاش کرنے میں مدد مل سکے۔"

سیمیں نے بے بسی کے اظہار میں کندھے اُچکائے اور کچھ سوچتے ہوئے بولی "میں جو کچھ بتا سکتی تھی، میں نے بتا دیا۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ غائب ہونے سے پہلے وہ کچھ خوف زدہ اور غائب دماغ سی رہنے لگی تھی۔ ویسے تو وہ ان دنوں یہاں رہتی ہی کم تھی لیکن جتنی دیر رہتی تھی، اس دوران بھی اس کا ذہن گویا کہیں اور رہتا تھا۔"

"کوئی ایسا شخص جس سے ان دنوں اس کا میل جول بڑھ رہا ہو... یا کوئی ایسی جگہ جہاں اس کی آمدورفت زیادہ رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔

وہ چند سیکنڈ سوچتی رہی پھر بولی "ان دنوں اس نے گویا خود کو اپنی ذات کے خول میں بند کر لیا تھا۔ کچھ بولتی نہیں تھی۔ کچھ بتاتی نہیں تھی لیکن ہاں ان دنوں ایک شخص دو تین مرتبہ اس کے ساتھ یہاں تک آیا۔ وہ کوئی فوٹو گرافر تھا۔ اسٹل فوٹو گرافی بھی کرتا تھا اور وڈیو وغیرہ بھی بناتا تھا۔ مونا کا کہنا تھا کہ وہ اسے بہت اونچے درجے کی ماڈل کے طور پر متعارف کرانے کے لئے کام کر رہا تھا۔ اس کے لئے انہوں نے باقاعدہ طور پر کوئی حکمتِ عملی بھی تیار کی تھی۔"

اس نے چند لمحے کے لئے خاموش ہو کر نئی سگریٹ سُلگائی۔ مجھے اُمید کی ایک موہوم سی کرن دکھائی دینے لگی تھی۔ ایک طویل کش لے کر وہ بولی "اس فوٹو گرافر نے مجھے بھی اپنے اسٹوڈیو میں آنے کی دعوت دی تھی لیکن مجھے نہ جانے کیوں وہ آدمی کچھ خطرناک سا لگا۔ ظاہر ہے ہم جیسی لڑکیوں کی ملاقاتیں صبح شام ایسے لوگوں سے تو نہیں ہوتیں جنہیں سو فیصد شریف کہا جا سکے لیکن چلیں "غیر شریف" ہونا ہمارے نزدیک کوئی مسئلہ نہیں مگر وہ جو ایک خاص قسم کے لوگ ہوتے ہیں نا۔ جنہیں دیکھ کر کسی عجیب اور ناقابلِ وضاحت سے خطرے کا احساس ہوتا ہے۔ ان کے قریب جاتے ہوئے کم از کم میں بہت ڈرتی ہوں۔ میرا دل بے ایمان بھی ہوا۔ ایک مرتبہ میں نے اس کے اسٹوڈیو جانے کا ارادہ بھی کیا لیکن بس۔ جا نہیں سکی۔ حالانکہ مجھے بھی ایک اونچے درجے کی ماڈل کے طور پر متعارف ہونے کا لالچ بھی آ رہا تھا اور لگتا بھی تھا کہ وہ اونچے ہی پیمانے پر کام کرنے والا آدمی تھا۔ وہ ہنڈا اکارڈ میں آتا تھا۔ شاندار قسم کے سوٹ میں ہوتا تھا اور اس کا اسٹوڈیو ڈیفنس میں کسی بنگلے میں تھا۔ وہ خود بھی بڑا ہینڈسم اور خوبرو آدمی تھا۔ کسی ہیرو سے کم نہیں تھا۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ بھی دیا تھا۔"

وہ اُٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل وغیرہ کی درازوں میں کارڈ تلاش کرنے لگی۔ میں ایک اُمیدِ نو کے ساتھ اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ کارڈ مل جائے۔

تھی۔ عزت اور دولت مندی کی زندگی بھی شاید انہیں مطمئن نہیں کر سکی یا راس نہیں آئی۔ انہوں نے اپنی کوٹھی کے مالی سے تعلقات استوار کر لیے جو ساڑھے چھ فٹ لمبا ایک بد شکل سا جاٹ تھا۔ دیکھنے میں نیگرو لگتا تھا۔ میڈم نور نے نواب صاحب کے اعتماد میں نقب لگا کر گویا اپنی خوش قسمتی کو لات مار دی۔ نواب صاحب نے ان دونوں کو خلوت میں دیکھ لیا لیکن فوری طور پر انہوں نے کوئی ردِ عمل ظاہر نہیں کیا۔ نہایت ٹھنڈے دل کے ساتھ انہوں نے پہلے ان سے اپنی تمام دولت و جائیداد واپس لی.... پھر انہیں چکر دے کر سیندور کھلایا۔ جہاں ان کو علاج کے لیے بھیجا گیا وہاں بھی انہیں دوا کے بجائے سیندور وغیرہ ہی کھلایا جاتا رہا حتیٰ کہ ان کی آواز ہمیشہ کے لیے تباہ ہو گئی۔ انہیں بالکل تہی داماں کر کے نواب صاحب نے نکال باہر کیا۔ صرف گھر سے ہی نہیں۔ انہوں نے میڈم نور کو اس شہر سے بھی نکلوا دیا۔ یہ لاہور کی بات ہے۔ اس مالی کا بھی کچھ پتا نہیں چلا کہ کہاں غائب ہو گیا۔ نواب صاحب کی پہلی بیوی موجود تھی۔ وہ اس کی طرف لوٹ گئے۔ اب تو وہ مرحوم ہو چکے ہیں اور ان کی اولادیں جائیداد وغیرہ بیچ کر ملک سے باہر کہیں سیٹل ہو چکی ہیں۔"

"یہ تو خاصی عبرت ناک سی کہانی ہے۔" میں نے تصویر کے قریب سے ہٹتے ہوئے کہا۔ "تمہیں یہ سب کچھ کس نے بتایا؟"

"خود میڈم نور نے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "وہ جب خاص موڈ میں ہوتی ہیں تو خاص ہی قسم کی باتیں کرتی ہیں۔ ساری دنیا کو.... اور اس کے ساتھ ساتھ خود اپنے آپ کو بھی خوب گالیاں دیتی ہیں۔ انہیں اپنی خامیوں کا پتا ہے لیکن وہ آج تک اپنی کسی خامی کی اصلاح نہیں کر سکیں۔ ویسے وہ اتنی بُری عورت نہیں ہیں۔ جتنی نظر آتی ہیں۔"

"ایک بار پھر تمہارا شکریہ سیمیں! میرا یہ وزٹ کافی حد تک بے ہودہ اور مار دھاڑ سے آلودہ تھا لیکن تم نے اسے خوشگوار بنا دیا۔ اب میں ایک نظر مونا کے کمرے میں بھی جھانک لوں گو کہ مجھے وہاں کوئی سُراغ ملنے کی اُمید نہیں ہے۔" میں نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

میرا اندازہ درست ہی تھا۔ مونا کے کمرے کو کھنگالنا فضول ہی رہا۔ اس میں جو دو چار چھوٹی موٹی چیزیں موجود تھیں وہ مونا نہیں، اس کے بعد آنے والی کرائے دار لڑکی کی تھیں۔

میں نے اور شفیع شاہ نے وہاں سے رخصت ہولینا ہی بہتر سمجھا۔ ہم وہاں بڑے اطمینان سے کافی وقت گزار چکے تھے۔ یہی غنیمت تھا کہ اس دوران کسی طرف سے مداخلت نہیں ہوئی تھی۔

چلتے چلتے میں نے ایک بار پھر بڑی بی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ کمر کے پیچھے موٹا سا کشن رکھے آرام کرسی پر ہی بیٹھی تھی۔ ٹرالی پر رکھی بوتل خالی ہو چکی تھی اور اس کی آنکھیں مزید سُرخ ہو چکی تھیں مگر وہ شاید انہیں بہ مشکل کھلی رکھے ہوئے تھی۔ شاید وہ بے خبری یا مدہوشی کی آغوش میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے گویا کسی کا انتظار تھا۔ شاید وہ ہمارے واپس جانے کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

میں نے کمرے میں جھانکا تو اس نے یوں آنکھیں پٹ پٹائیں جیسے مجھے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں نے دروازے پر ہی کھڑے کھڑے باآوازِ بلند کہا۔ "آئی ایم سوری میڈم نور افشاں! مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ ماضی کی ایک بڑی فنکارہ ہیں۔ میرے دل میں فنکاروں کے لیے بڑا احترام ہے.... خواہ وہ لائن بدل ہی کیوں نہ چکے ہوں۔"

"دفع ہو جاؤ...." وہ اپنی پھٹی پھٹی عجیب سی آواز میں چیخی۔ خمار نے اس آواز کو عجیب تر بنا دیا تھا۔ وہ ابھی تک مجھ سے خفا تھی اور میری معذرت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ اس نے ٹرالی سے گلاس اُٹھا کر مجھ پر کھینچ مارا۔ میں ایک طرف کو ہٹ گیا لیکن میری یہ زحمت فضول ہی تھی۔ اس کے بازو میں اتنی بھی طاقت نہیں تھی کہ گلاس مجھ تک پہنچ سکتا۔ وہ راستے میں ہی قالین پر آ گیا۔ میڈم نور چند لمحے آگے پیچھے جھولتی رہی پھر دھپ سے آرام دہ کرسی پر نیم دراز ہو گئی۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ غالباً بے ہوشی نے اسے اپنی بے پناہ میں لے لیا تھا۔ میں نے اندر جانے کی زحمت نہیں کی اور شفیع شاہ کے ساتھ نیچے آ گیا۔ ڈیوڑھی میں وہ دونوں افراد اب بھی بے ہوش پڑے تھے جن کے نام غالباً حاضر خان اور پھیکا تھے۔ ہم نے انہیں بھی اسی حال میں چھوڑا اور باہر آ گئے۔

گاڑی میں بیٹھ کر ہم روانہ ہوئے تو چند منٹ بعد ہی مجھے شبہ ہوا کہ سفید رنگ کی ایک چھوٹی سی کار ہمارے تعاقب میں تھی لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ وہ واقعی ہمارے تعاقب میں تھی کیونکہ علاقہ گنجان تھا اور ٹریفک اس سڑک پر تقریباً رینگ رہا تھا۔ بیسیوں گاڑیاں ہمارے پیچھے تھیں جن میں گدھا گاڑیاں اور اونٹ گاڑیاں بھی شامل تھیں۔

آخر ہم اس علاقے سے نکل آئے اور ایک کُھلی سڑک پر پہنچ کر میں نے گاڑی کی رفتار بڑھا دی۔ شفیع شاہ قدرے ترچھا ہو کر بیٹھا تھا اور اس گاڑی پر نظر رکھے ہوئے تھا۔ چند سڑکوں پر بے مقصد گاڑی دوڑانے کے بعد ہمیں یقین ہو گیا کہ چھوٹی سی سفید گاڑی ہمارے ہی تعاقب میں تھی۔

اس وقت ہم ایک پوش علاقے سے گزر رہے تھے لیکن مجھے معلوم تھا کہ کچھ ہی آگے اس پوش علاقے کے عین بیچوں بیچ ایک کچی بستی بھی تھی۔

میں نے شفیع شاہ سے کہا۔ "میں گاڑی کچی بستی میں لے جاتا ہوں۔ کسی تنگ گلی میں گاڑی روک کر ہم اس گاڑی والوں کو گھیرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سر!" شفیع شاہ نے سر ہلایا۔ اس کی گن سیٹوں کے نیچے تھی۔ میں عقب نما آئینے میں دیکھ چکا تھا اور شفیع شاہ نے بھی

تصدیق کی تھی کہ پچھلی گاڑی میں بھی دو ہی افراد موجود تھے۔ ایک ڈرائیور تھا۔ دوسرا اس کے برابر بیٹھا تھا۔ دونوں کے حلیے معززانہ تھے لیکن شکلوں سے خباثت ٹپک رہی تھی۔

کچی بستی کے قریب پہنچ کر میں نے اچانک ہی گاڑی چھوٹی سی سڑک پر موڑی اور کچی بستی میں داخل ہوتے ہی جو پہلی گلی نظر آئی اس میں گھسا دی۔ مجھے امید تھی کہ سفید گاڑی والوں کو سوچنے سمجھنے کا موقع نہیں ملے گا اور وہ بھی سیدھے ہمارے تعاقب میں اس گلی میں آگھسیں گے.... لیکن ایسا نہیں ہوا۔

اس گلی میں بچے کھیل رہے تھے۔ گاڑی دیکھ کر وہ اِدھر اُدھر ہوگئے۔ میں گاڑی کچھ آگے لے گیا تو احساس ہوا کہ گلی آگے سے بند تھی۔ بچے اب گاڑی کے پیچھے آگئے تھے اور گاڑی گلی میں تقریباً فٹ آگئی تھی۔ اگر چھوٹی سفید گاڑی ہمارے تعاقب میں اس گلی تک آبھی جاتی تب بھی بچوں کی وجہ سے کم از کم ہم گنیں استعمال نہیں کرسکتے تھے لیکن وہ گاڑی گلی میں تو کیا، کچی بستی کی مرکزی سڑک پر بھی نہیں آئی۔ وہ غالباً مین روڈ پر ہی سیدھی گزرتی چلی گئی۔

میں نے صرف چند سیکنڈ اس کی آمد کا انتظار کیا۔ انہی چند سیکنڈز کے دوران ٹیڑھے میڑھے مکانوں کے بوسیدہ و نیم شکستہ دروازے ذرا ذرا کھلنے لگے۔ بعض پر موٹے بوسیدہ کپڑوں کے پردے لٹکے ہوئے تھے۔ وہ تھوڑے تھوڑے سمٹنے لگے اور ان کے عقب سے نسوانی آنکھیں شکی اور متجسس سے انداز میں جھانکنے لگیں۔

اسی دوران بچے بھی گاڑی کے آگے پیچھے جمع ہونے لگے تھے۔ وہ غالباً گاڑی پر اِدھر اُدھر لٹکنے یا کسی اور انداز میں دھاوا بولنے کی فکر میں تھے لیکن اس سے پہلے ہمارا جائزہ لے کر شاید اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے کہ ہمارا ردِ عمل کیا ہوگا۔

میں نے ہارن بجاتے اور ان سے بچتے بچاتے بہ مشکل گاڑی ریورس کی اور چھوٹی سڑک سے ہوکر مین روڈ تک آیا لیکن اس وقت تک سفید گاڑی غائب ہوچکی تھی۔ انہیں غالباً ہمارے مقصد کا اندازہ ہوگیا تھا اور وہ شاید فی الحال اُلجھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ ان کا جو بھی مقصد تھا فی الحال انہوں نے اسے ادھورا ہی چھوڑ کر چلے جانے میں عافیت سمجھی تھی۔ آگے چوراہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا وہ کس طرف مڑ گئے ہوں۔ ان کی تلاش میں اِدھر اُدھر گاڑی دوڑانا فضول تھا۔

بہرحال ان کی شکلیں میرے ذہن میں محفوظ ہوگئی تھیں اور مجھے یقین تھا کہ شفیع شاہ بھی انہیں نہیں بھولے گا۔ میں نے گاڑی ایک کولڈ ڈرنک شاپ کے سامنے لے جاکر روکی۔ میں چند منٹ کے لیے کہیں رُک کر کچھ سوچنا چاہتا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے انسان یکسوئی سے نہیں سوچ سکتا یا پھر وہ صحیح ڈرائیونگ نہیں کرسکتا۔ ایک کم عمر لڑکا دوڑ کر گاڑی کے قریب آگیا۔

لڑکے کو ٹھنڈا لانے کے لیے کہہ کر میں نے ایک ٹھنڈی سی سانس لے کر شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ "انہوں نے تو بہت جلدی ہمارا پیچھا چھوڑ دیا۔" میں نے کہا۔ "معلوم نہیں پیچھے کیوں لگے تھے!"

"شاید وہ صرف یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ہم کہاں جارہے ہیں لیکن خطرہ محسوس کرکے آگے نکل گئے۔ انہیں یہ اندازہ تو ہوگیا ہوگا کہ یہ کچی بستی ہماری منزل نہیں تھی۔" شفیع شاہ نے بھی وہی خیال ظاہر کیا جو میرا تھا۔ "بہرحال وہ ہمیں جانتے ضرور ہیں۔ تبھی انہوں نے فی الحال اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا چھوڑ دیا کہ چلو بعد میں دیکھا جائے گا۔"

"چلو خیر.... دفع کرو انہیں۔" میں نے سیمیں کا دیا ہوا کارڈ جیب سے نکالتے ہوئے کہا۔ "ڈیفنس یہاں سے قریب ہے۔ کیوں نہ ذرا اس فوٹوگرافر کو دیکھتے چلیں؟ فی الحال ہمارے پاس مونا کا یہی ایک سُراغ ہے۔"

"میں خود آپ سے یہی کہنے والا تھا۔" شفیع شاہ بولا۔

بچہ ٹھنڈی بوتلیں لے آیا تو ہم نے انہیں چند سیکنڈ میں خالی کردیا۔ بچہ اس دوران ہمارے قریب ہی کھڑا رہا کیونکہ کوئی اور گاڑی کولڈ ڈرنک شاپ کے سامنے رُکتی دکھائی نہیں دی تھی.....

تیرہ چودہ سال کا وہ بچہ زیادہ برے حلیے میں نہیں تھا۔ اس کی پتلون اور شرٹ شاید لنڈے کی تھی لیکن صاف ستھری تھی۔ پیروں میں پُرانے سے کینوس شوز تھے۔ تیل میں چپڑے ہوئے بال منتشر نہیں

کارڈ اسے اپنی الماری کے ایک خانے میں رکھا ہوا ملا۔ میری جان میں جان آئی۔ کارڈ اس سے لے کر میں نے بغور دیکھا۔ وہ ایک خوبصورت نفیس اور متاثر کن کارڈ تھا۔ اسٹوڈیو کا نام "فلیش ون" تھا اور پروپرائٹر کے طور پر ظفر جمال کا نام چھپا ہوا تھا۔ ایڈریس ڈیفنس کا تھا۔

میں نے کارڈ جیب میں رکھتے ہوئے کہا۔ "یہ کچھ کارآمد سُراغ معلوم ہورہا ہے۔ تمہارا بہت بہت شکریہ سیمیں! بعض اوقات بڑی بے ہودہ جگہوں پر بڑے شاندار لوگوں سے ملاقات ہوجاتی ہے۔ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ممکن ہے مونا ستم رسیدہ ہو اور واقعی ہماری ہمدردی و مدد کی مستحق ہو۔ تم نے میرے سوالوں کے جواب دے کر در حقیقت میری نہیں، اس کی مدد کی ہے لیکن میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ اگر میرے لائق کبھی کوئی کام ہو تو ضرور یاد کرلینا۔"

میں نے اپنا کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ ایک لمحے کے لیے وہ پھیلی پھیلی آنکھوں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ شاید اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ گن لیے دندناتے ہوئے اس بلڈنگ میں گھس آنے والے آدمی اتنے مہذب بھی ہوسکتے تھے کہ خاصی دیر سے دست بستہ سے انداز میں اس کی گفتگو سُن رہے تھے اور اب ان میں سے ایک شخص اسے اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی پیش کررہا تھا۔

بہرحال اس نے کارڈ لے لیا اور نہایت احتیاط سے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ اس لمحے میری نظر اس پینٹنگ پر پڑی جو اس کے سرہانے دیوار پر آویزاں تھی۔ پینٹنگ زیادہ بڑی نہیں تھی اور اس میں تجریدیت وغیرہ کی قطعاً کوئی جھلک نہیں تھی۔

اس پینٹنگ میں ایک نوابزادہ یا شہزادہ قسم کی شخصیت کو شاہانہ مغلیہ لباس میں ایک تخت نما چیز پر براجمان دکھایا گیا تھا۔ وہ ایک وجیہہ شخص تھا۔ اس کے سامنے قالین پر ایک لڑکی ستار لیے بیٹھی تھی۔ اس کا ایک ہاتھ ستار پر اور دوسرا ہوا میں بلند تھا۔ شاید اسے کچھ گاتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔

لڑکی کا رُخ سامنے کی طرف نہیں تھا اس لیے اس کا چہرہ پورا نہیں دیکھا جاسکتا تھا لیکن سائیڈ پوز یا پروفائل سے بہرحال زیادہ نظر آرہا تھا اور اس کی خوبصورتی پوری طرح نمایاں تھی۔ وہ شاید بنگالی حسن کا نمونہ تھی۔ بڑی بڑی، سیاہ اور دلکش آنکھیں.... سیاہ لمبے بال.... بھرے بھرے ہونٹ۔ پینٹنگ میں بھی اس کی رنگت کا سانولا پن اور اس کی آنکھوں میں بولتا جادو نمایاں تھا جس کے صرف تذکرے پڑھ پڑھ کر میرے ذہن میں ایک تصور قائم تھا کہ بنگالی عورتوں کی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے ورنہ حقیقی زندگی میں تو لوگوں کے گھروں میں کام کرنے والی جو چند بنگالی عورتیں دیکھی تھیں وہ سیاہ فام، سوکھی سڑی اور نہایت کم رو تھیں۔ مجھے ان کی آنکھوں میں جادو کے بجائے افلاس اور مصائب کے سائے نظر آئے تھے۔ بہرحال یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ ہر عورت تو خوبصورت نہیں ہوتی تھی۔ "بہت عمدہ پینٹنگ ہے۔" میں کہے بغیر نہ رہ سکا۔

"پینٹنگ....؟" سیمیں نے میری نظروں کے تعاقب میں دیوار کی طرف دیکھا۔ "اوہ.... یہ پینٹنگ نہیں ہے۔ یہ ایک کافی پُرانا اور دُھندلا سا فوٹوگراف تھا جس میں کسی ماہرِ فن نے اپنے ہاتھ سے رنگ بھر کر اسے یادگار کے طور پر محفوظ رکھنے کے قابل بنادیا۔"

"فوٹوگراف....؟" اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ "کیا مغل شہزادوں کے دَور میں بھی کیمرے سے تصویریں کھینچنے کا رواج تھا؟ کیا مغلوں کے دور میں کیمرا ایجاد ہوچکا تھا؟"

وہ دھیرے سے ہنسی۔ "اس تصویر پر اکثر لوگوں کو پینٹنگ ہی کا گمان گزرتا ہے اور جب انہیں بتایا جاتا ہے کہ یہ فوٹوگراف ہے تو پھر انہیں یہی حیرت ہوتی ہے کہ اس دَور میں فوٹوگرافی کہاں سے آگئی۔"

"کیا کسی فلم یا اسٹیج ڈرامے وغیرہ کا سین ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس کے ملیح چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اب اس کے اعصاب یقیناً پوری طرح پُرسکون تھے اور وہ مجھے متجسس دیکھ کر محظوظ ہورہی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی۔ "یہ حقیقی زندگی کا ایک لمحہ ہے جسے بڑے اہتمام کے ساتھ کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرایا گیا تھا۔ یوں سمجھیے یہ ایک کہانی کا سرورق ہے۔ اس کہانی کے ایک کردار سے.... یعنی اس عورت سے آپ مل بھی چکے ہیں...." اس نے تصویر میں موجود عورت پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"میں اس سے مل چکا ہوں....؟" میں نے ایک بار پھر تصویر کو غور سے دیکھتے ہوئے بے یقینی سے کہا۔ "کب اور کہاں؟"

"کچھ دیر پہلے.... نیچے.... اسی بلڈنگ میں۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا....؟ تمہارا مطلب ہے میڈم نور افشاں....؟" میں واقعی حیرت زدہ ہوکر تصویر کے قریب چلا گیا اور اس طرح درحقیقت سیمیں کے قریب جا پہنچا۔ اس کے وجود سے پھوٹتی ہوئی تازگی آمیز مہک نے ایک لمحے کے لیے میرا دھیان تصویر کی طرف سے ہٹادیا لیکن میں فوراً ہی دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ تصویر میں اور میڈم نور افشاں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ یہ محض جوانی اور بڑھاپے کا فرق نہیں تھا۔ میں نے جس نور افشاں کو دیکھا تھا وہ اس تصویر سے بالکل ہی مختلف عورت تھی تاہم میرا دل کہہ رہا تھا کہ سیمیں غلط نہیں کہہ رہی تھی۔ بعض لوگوں کو وقت بہت ہی بُری طرح بدل کر.... یا پھر شاید بالکل ہی کھنڈر کرکے رکھ دیتا ہے۔ ممکن ہے میڈم نور کی شکل پر اس کے اعمال کا بہت اثر پڑا ہو۔

سیمیں نہایت دھیمی آواز میں بولی۔ "یہ قیامِ پاکستان کے بعد کی تصویر ہے۔ بہت زیادہ پُرانی نہیں ہے۔ وہ میڈم نور افشاں کی نوجوانی کا دَور تھا۔ ان کے نین نقش کو الگ الگ کرکے دیکھا جائے

تو شاید وہ خوبصورت نہ لگیں لیکن مجموعی طور پر ان کی شخصیت کتنی پُرکشش تھی' یہ اس تصویر سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔"

اس نے تائید طلب سی نظر سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اثبات میں سرہلایا۔ تو وہ بولی۔ "آپ کو تو شاید ان کا نام بھی مانوس محسوس نہیں ہوا ہوگا؟"

"نہیں۔" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے نفی میں سرہلایا۔

"وہ اپنے زمانے کی ایک معروف کلاسیکل گلوکارہ ہیں۔" سیمیں نے خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔

"کیا کہہ رہی ہو تم؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔ "ان کی آواز تو اتنی بھیانک ہے کہ انگریزی یا پاپ گانوں کے لیے بھی موزوں نہیں ہے۔ تم کہہ رہی ہو کہ وہ کلاسیکل گلوکارہ تھیں۔"

"میں غلط نہیں کہہ رہی ہوں۔ ریڈیو کی تاریخ میں ان کا نام اور کام محفوظ ہے۔ تاہم ان کی شہرت کا دَور مختصر ہی تھا۔ آپ شاید اس وقت پیدا بھی نہ ہوئے ہوں یا شاید دودھ پیتے بچے ہوں جب ان کے نغمے ریڈیو سے چلتے تھے اور نجی محفلوں میں ان کی شرکت لوگوں کے لیے باعثِ فخر ہوا کرتی تھی۔ ان کی آواز تباہ ہوچکی ہے.... بلکہ شاید ان کی پوری زندگی ہی تباہ ہوچکی ہے۔ وہ لالچ اور ہوس کی ایک مصنوعی دنیا میں زندہ ہیں۔"

"یہ کیا قصہ ہے؟ تم مختصراً بتانا پسند کرو گی؟" میں نے قدرے تجسس سے کہا۔ کرداروں کی حیرت انگیز شکست و ریخت سے مجھے ہمیشہ دلچسپی رہی تھی۔

"قصہ مختصر ہی ہے۔ انسان اور قومیں جن تباہیوں سے دو... ہوتی ہیں وہ بڑا طولانی عمل لگتا ہے۔ اس میں برس ہا برس گزر جا... ہیں لیکن بعد میں ان کے بارے میں باتیں کرنے والے چاہیں تو... جملوں میں یہ تذکرے سمیٹ سکتے ہیں۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل... اسٹول پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ اس کا رُخ اب بھی ہماری طرف ہی... "بیگم نور افشاں کے عروج کے زمانے میں ایک نوابزادہ صاحب... کی شخصیت اور آواز دونوں ہی پر بُری طرح عاشق ہوگئے تھے۔"

"یہی صاحب جو تصویر میں نظر آرہے ہیں؟" میں نے ا... کیا۔

"جی ہاں۔ یہ بڑے روایت پرست سے نوابزادے ... تقسیم کے بعد ان کے پاس زیادہ لمبی چوڑی جاگیریں تو نہیں تھیں پھر بھی بہت بڑی آسامی تھے۔ خاص خاص موقعوں پر ا... مخصوص روایتی انداز میں محفلیں سجاتے تھے۔ وہ میڈم نور اف... کے اس حد تک سچے عاشق تھے کہ شادی کے وقت انہوں نے... سب کچھ ان کے نام کردیا تھا جس کی کُل مالیت اُس سَتے دَور... بھی شاید ایک کروڑ سے اوپر تھی۔ شخصیت کے اعتبار سے... آپ دیکھ رہے ہیں کہ نواب صاحب ایک وجیہہ انسان تھے۔... نور نے شاید دو یا تین سال ان کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی ب... لیکن موصوفہ کی طبیعت میں ایک عجیب اور بے جواز قسم کی آ...

ایک نوجوان کی سنسنی خیز لہو رنگ خودنوشت

دہشت گرد

سلیم فاروقی

○ وہ محب وطن ہونے کے باوجود دہشت گرد کہلاتا تھا۔

○ وقت کی راسیں تھامتے اس کے ہاتھ لہولہان ہوگئے تھے۔

○ "سچی کہانیاں" کا ایک مقبول ترین ایڈونچر سلسلہ چار حصوں میں شائع ہو رہا ہے۔

صرف ان چیزوں کے بل ہی لاکھوں میں ہیں۔ آخر کار مجھے اس شخص سے نمٹنے کے لیے خود یہاں آنا پڑا۔ اسے میری آمد کا پہلے سے علم ہوگیا۔ وہ اپنا ساز و سامان اُٹھا کر غائب ہوگیا۔ بنگلے کو تالا لگادیا۔ مجھے کل کورٹ سے آرڈر لے کر بیلف کی موجودگی میں تالا توڑ کر بنگلے کا قبضہ لینا پڑا....." اس کا شاید رونے کو جی چاہ رہا تھا۔

"بڑا افسوس ہوا یہ سُن کر۔" میں نے ہمدردی سے کہا۔ "آپ نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟"

"کیوں نہیں کی....." وہ سنبھل کر بولا۔ "لیکن وہ کہیں نہیں مل سکا۔ اس کا تو شناختی کارڈ اور اس پر درج پتا بھی جعلی نکلا۔ میں نے تو اس کے خلاف جعلسازی اور فراڈ وغیرہ کی رپورٹ بھی درج کرادی ہے۔"

مجھے اس کی داستانِ غم سُن کر افسوس تو واقعی ہوا تھا لیکن زیادہ افسوس اس بات کا تھا کہ جس سراغ کی اُمید پر ہم یہاں آئے تھے وہ بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد اصغر بولا۔ "اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ یہاں کا ہر کنکشن کٹا ہوا ہے۔ بنگلے کی حالت تباہ ہے۔ اس پر لاکھوں کے واجبات ہیں۔ کرائے سمیت مجھے کئی لاکھ کی چوٹ پڑی ہے۔"

"آپ کے ساتھ واقعی بڑی زیادتی ہوئی۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا۔ اندر سے کھٹرپٹر کی آوازیں آرہی تھیں۔

"یہ کیا ہورہا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"مکان کی مرمت شروع کرائی ہے جناب! میرے پاس وقت کم ہے۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے۔ میں چاہ رہا ہوں جلد از جلد مکان کی حالت ٹھیک ہوجائے اور کنکشن وغیرہ بحال ہوجائیں۔" اس نے جواب دیا۔

"کیا پھر کرائے پر دیں گے؟" میں نے دریافت کیا۔

اس نے فوراً کانوں کو ہاتھ لگایا۔ "توبہ جناب.....! میرے باپ کی بھی توبہ..... جو میں اب کبھی اپنی کوئی پراپرٹی کرائے پر دوں۔ میں اسے ٹھیک کرا کے بیچ دوں گا۔ یہ رقم میں کہیں انویسٹ کروں گا۔ کرائے سے زیادہ منافع کماؤں گا۔ چخ چخ سے بھی بچوں گا۔"

ظفر جمال جیسے کرائے داروں کی وجہ سے نہ جانے کتنے مالکِ مکان آئے دن اسی طرح اپنی جائیداد کرائے پر دینے سے توبہ کرتے ہوں گے اور کرائے داروں کے لیے مشکلات بڑھتی ہوں گی۔

قدرے مایوسی کے عالم میں میری نظر اصغر کے ہاتھ میں موجود سیاہ سے پیکٹ پر پڑی۔ وہ درحقیقت دو عدد ویڈیو کیسٹ تھیں جن پر ٹیپ لپٹی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ہے؟" میں نے یونہی ازراہِ تجسس پوچھ لیا۔

اصغر کو جیسے یاد آیا کہ اس کے ہاتھ میں کچھ موجود تھا۔ اس نے ہاتھ اونچا کر کے دیکھا اور بولا۔ "معلوم نہیں ظفر جمال اس مکان کو کس طرح استعمال کرتا رہا ہے کہ اس کی ہر چیز ناکارہ ہوچکی ہے۔ ایک باتھ روم کی فلش کی ٹنکی بھی بالکل ناکارہ اور خشک پڑی تھی۔ مزدوروں نے اسے دیوار سے الگ کرنے کے لیے کھولا تو اس میں سے یہ دو ویڈیو کیسٹ نکلیں۔ مجھے نہیں معلوم یہ کیسی کیسٹ ہیں۔ میں ابھی اندر سے لے کر آیا ہوں۔ ظفر جمال نے اس گھر میں ردّی اخباروں کے انبار..... مٹی کوڑا..... پھٹے ہوئے جوگرز اور ٹوٹے ہوئے کپوں کے علاوہ بس یہ دو کیسٹ ہی چھوڑی ہیں۔"

"یہ آپ ہمیں دے دیجیے۔" میں نے اچانک ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں دے دوں؟" وہ یکدم جیسے گڑبڑا گیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ شفیع شاہ فوراً اس کے کندھے سے لگ کر کھڑا ہوگیا کہ وہ اِدھر اُدھر نہ ہوسکے۔

"جہاں آپ نے لاکھوں کا نقصان برداشت کیا ہے وہاں ان حقیر سی کیسٹ کا نقصان بھی برداشت کرلیجیے۔ شاید ان کے ذریعے ہمیں ظفر جمال کا کوئی سُراغ مل سکے اور ہم آپ کا نقصان پورا کرانے میں آپ کی کوئی مدد کرسکیں۔" میں نے تحمل سے کہا۔

وہ کچھ نرم پڑگیا لیکن کیسٹ دینے سے ابھی تک گریزاں تھا۔ معلوم نہیں کیا سوچ رہا تھا۔ شاید وہ ایک کنجوس شخص رہا ہو۔ بعض کنجوسوں کو بھی ظفر جمال جیسے لوگ ٹکرا جاتے ہیں۔

آخر میں نے ہاتھ بڑھا کر کیسٹ اس کے ہاتھ سے تقریباً چھین ہی لیں۔ اس نے احتجاج کے سے انداز میں منہ کھولا لیکن میں نے اسے گھور کر دیکھا تو وہ محض تھوک نگل کر رہ گیا۔ میں اور شفیع شاہ گاڑی کی طرف چل دیے۔ اصغر خاموش ہی رہا۔ حتیٰ کہ ہم گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئے۔

ہوٹل پہنچ کر ہم دونوں نے ذرا تازہ دم ہونے کے بعد ہوٹل کے ویڈیو کنٹرول روم سے ایک وی سی آر منگوایا اور میرے کمرے میں بیٹھ کر ان میں سے ایک کیسٹ لگائی اور ذرا آرام سے نیم دراز ہو کر دیکھنے بیٹھ گئے۔

کمرے میں دھیمی موسیقی بکھرنے لگی۔ چند لمحے بعد جو چہرہ ٹی وی کی اسکرین پر اُبھرا اسے دیکھ کر ہم دونوں سیدھے ہو کر بیٹھ گئے۔ مزید چند سیکنڈ بعد جو منظر اسکرین پر شروع ہوا اسے دیکھ کر پہلے تو ہم ذرا اُچھلے پھر ہماری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

دراصل ٹی وی کی اسکرین پر ایک لڑکی بڑی جذبات خیز موسیقی کی دُھن پر رقص کررہی تھی۔ اس کا رقص اس موسیقی سے کہیں زیادہ جذبات خیز تھا۔ لحہ بہ لحہ رقص زیادہ جذبات خیز ہوتا گیا۔ مختصر سے لباس کی صورت میں اس میں جو حدود و قیود حائل تھیں وہ بھی دور کردی گئیں۔

میں دنیا کے بہت سے ملکوں میں گھوما تھا۔ کئی ایسے ملکوں میں بھی خاصی آوارہ گردی کی تھی جو اپنی مادر پدر آزادی کے حوالے سے مشہور تھے۔ مجھے چونکہ کبھی پارسائی کا کوئی دعویٰ نہیں رہا اس لئے میں بہت سی ایسی جگہوں پر بھی گیا تھا جہاں جانا شرفا کی نظر میں خاصا معیوب تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ موقع ملتے ہی وہ شرفا خود وہاں پائے جاتے تھے۔

بعض جگہوں کے تو افسانے ایسے مشہور تھے کہ میں ازراہِ تجسس ہی وہاں چلا گیا تھا۔ یہ دوسری بات تھی کہ ان جگہوں پر جاکر میں محظوظ ہونے کے بجائے کوفت ہی کا شکار ہوا تھا۔ وہ جگہیں انسانی زندگی کے ایک خوب صورت اور سنسنی خیز پہلو کو گھناؤنا اور مشینی بنادینے کے اڈّے تھے۔

ہانگ کانگ میں ایسے ہی ایک تھیٹر نما اڈّے پر میں نے اپنے ٹی وی کی ایک خاتون آرٹسٹ کو بھی دیکھا تھا۔ اسے اپنے قریب ہی تماشائیوں کی قطار میں بیٹھے دیکھ کر مجھے حیرت کا خاصا زوردار جھٹکا لگا تھا۔ ترستے پھڑکتے ہوئے مرد پاکستانیوں کا قطار در قطار ایسے ٹھکانوں پر جانا تو سمجھ میں آتا تھا لیکن ایک خاتون وہاں اپنی ہی ایک تنہا ہم جنس کا تماشا کیوں دیکھنے آئی تھی، یہ میری سمجھ سے باہر تھا۔

زیادہ حیرت مجھے اس بات پر بھی تھی کہ وہ ٹی وی آرٹسٹ کچھ ایسی نوجوان بھی نہیں تھی۔ خاصی عمر کی تھی۔ انسان کا شعبہ خواہ کچھ بھی ہو لیکن اس عمر میں عموماً زندگی کے بارے میں انسان کے رویّے بدلنے لگتے ہیں۔ مجھے مزید حیرت اس وقت ہوئی جب مجھے احساس ہوا کہ وہ خاتون تھیٹرہال میں تنہا ہی آئی ہوئی تھی۔ کوئی مرد اس کے ساتھ نہیں تھا۔

کوئی مرد اس کے ساتھ ہوتا تب شاید اس کی موجودگی زیادہ حیرت کا باعث نہ ہوتی۔ بعض مرد اپنی ساتھی عورتوں کو، جو پہلے ہی خاصی منجھی ہوئی ہوتی تھیں، مزید منجھا ہوا بنانے کے لئے ایسی جگہوں پر ساتھ لے آتے تھے۔ ان کے دائرۂ نظر اور ان کے ذہن کو مزید وسیع کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اسٹیج پر اس وقت ایک نوخیز لڑکی عجیب و غریب حرکات کے ذریعے اپنی دانست میں حاضرین اور ناظرین کے جذبات میں تلاطم برپا کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ ابھی اس کی عمر کم تھی اور خوب صورتی کے جدید معیارات کے مطابق وہ کچھ سوکھی سڑی بھی تھی۔ اس کے جسم میں خوب صورتیاں کچھ ایسی نمایاں نہیں تھیں لیکن وہ انہیں نمایاں کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھی اور مزید عجیب تر حرکتیں کررہی تھی۔

تماشائیوں میں کئی ایسے مسلمان ملکوں کے معززین ا... مخصوص لباسوں میں موجود تھے جو ہمارے قبلہ و کعبہ ہیں۔ ان سے بعض کافی عمر رسیدہ تھے لیکن ان کے پہلو میں کم عمر و نو... رفیقانِ شب موجود تھیں۔

میں اس عجیب و غریب ماحول میں بار بار گردن گھما کر اس... وی آرٹسٹ کی طرف دیکھتا رہا۔ میں بہت کم ٹی وی دیکھتا تھا۔ م... ہی نہیں ملتا تھا لیکن یہ شاید اتفاق تھا کہ میں اس خاتون آرٹسٹ... پہچانتا تھا۔

انٹرول ہوا تو میری حیرت کو ایک نیا رخ ملا۔ میں نے دیکھا ا... ٹی وی آرٹسٹ کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ زار و قطار... رہی تھی۔ روشنی ہوتے ہی اس نے جلدی جلدی آنکھیں پونچھیں... میرا تجسس بڑھ گیا اور میں اس کے قریب جاکر اپنا تعارف کرا... بغیر نہ رہ سکا۔

میں نے اسے باہر کیفے ٹیریا میں کافی پینے کی دعوت دی جو ا... نے قبول کرلی۔ وہ بالکل خاموش اور کھوئی کھوئی سی تھی۔ قد... کہانیوں میں کوئی کردار، شہزادی سے پوچھتا تھا کہ وہ پہلے ہ... کیوں... اور پھر روئی کیوں؟

میرے سامنے بیٹھی ہوئی عورت شہزادی نہیں، ٹی وی آرٹس... تھی اور وہ ہنسی بھی نہیں تھی۔ صرف روئی تھی تاہم میں اس... رونے کا سبب پوچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "کیا تم یقین کروگے کہ میں یہاں... صرف تجسس کے تحت آئی تھی؟"

"اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے؟" میں نے... فوراً کہا۔ وہ عورت تھی، تنہا آئی تھی۔ ایک عورت ہی کا تما... دیکھنے میں اس کے لئے بھلا لطف اندوزی کا کون سا پہلو ہو سکتا تھا... اس لئے اس کی یہ بات زیادہ قابلِ یقین تھی کہ وہ تجسس کے تحت... آئی تھی۔ البتہ میں یہ بات کرتا تو ناقابلِ یقین ہوتی کیونکہ میں ایک... مرد تھا حالانکہ حقیقت یہی تھی کہ میں بھی وہاں تجسس ہی کے تحت... آیا تھا لیکن میں نے اس سے یہ بات نہیں کہی۔ شاید وہ سمجھتی کہ... میں صفائی پیش کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

ایک لمحے کے توقف کے بعد میں نے کہا "تجسس کے تحت آ... تو خیر سمجھ میں آتا ہے لیکن یہ زار و قطار رونا کیوں...؟"

"اچھا تم نے دیکھ لیا؟" وہ افسردگی سے مسکرائی "میں شاید... گرد و پیش سے بالکل بے خبر ہوگئی تھی۔ میں شاید یہ سمجھ رہی تھی کہ... مجھے وہاں کوئی نہیں دیکھ رہا... یا پھر شاید میں وہاں خود کو تنہا محسوس... کررہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو قطعی غیرارادی طور پر بہنے... لگے تھے۔ دراصل اس لڑکی کو دیکھ کر مجھے بار بار اپنی بیٹی کا خیال آ... رہا۔ وہ بالکل اسی عمر کی ہے۔ میں نے اسے شو بزنس کی دنیا سے... بالکل دور رکھا ہے۔ اچھے اداروں میں تعلیم دلائی ہے اور اسی کی... خاطر اپنے گھر میں شوبزنس کے لوگوں کی آمد و رفت تک نہیں ہونے

تھے، جمے ہوئے تھے۔

"برخوردار! تم سارا دن یہیں کام کرتے ہو؟" میں نے بوتل اسے واپس دیتے ہوئے یونہی پوچھ لیا۔

"نہیں سر! میں صبح اسکول جاتا ہوں۔ تین بجے یہاں آجاتا ہوں۔" اس نے شائستگی سے جواب دیا۔

"گزر بسر ٹھیک ہوجاتی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"جی سر! میں آدھا دن کام کرتا ہوں۔ مجھ سے بڑا ایک بھائی ہے۔ وہ سارا دن کام کرتا ہے۔ ایک گیرج میں ملازم ہے۔ ڈینٹنگ پینٹنگ کرتا ہے۔ ماں گھر پہ لفافے بناتی ہے۔ اللہ کا شکر ہے سر! بڑی اچھی گزر بسر ہوتی ہے۔ ہمارا چھوٹا سا ذاتی مکان ہے۔"

"ویری گڈ! اور باپ کیا کرتا ہے؟"

"باپ نہیں ہے سر! میں چھوٹا سا تھا جب ان کا انتقال ہوگیا۔" ایک لمحے کے لیے اس کا سر افسردگی سے جھک گیا۔

میں نے اسے ہزار کا نوٹ دیا اور کہا۔ "باقی پیسے تم رکھ لینا۔"

وہ جلدی سے نوٹ واپس میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔ "نہیں سر...! آپ کا بہت شکریہ... لیکن میں اس طرح پیسے نہیں لیتا۔ تھوڑی بہت ٹپ کی بات اور ہوتی ہے... لیکن اتنے پیسے..... آپ یقیناً ترس کھا کر دے رہے ہیں۔ مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا کہ کوئی مجھ پر ترس کھا کر پیسے دے۔" اس کے اندازِ گفتگو سے اس کی عمر سے کہیں زیادہ سمجھداری جھلک رہی تھی۔

"یہ میں تم پر ترس کھا کر نہیں... انعام اور تحفے کے طور پر دے رہا ہوں۔ تم جیسے باہمت بچّے میری کمزوری ہیں۔ اتنے خراب زمانے میں بھی تم سر جھکائے اتنی کم عمری میں اتنے اطمینان سے صبر شکر اور محنت کے راستے پر چل رہے ہو۔ یہ رکھ لو۔" میں نے نوٹ اس کی جیب میں ٹھونس دیا۔

"سر! میں اس کے بدلے کوئی ایسا ویسا کام نہیں کروں گا۔" اس نے گویا مجھے خبردار کیا۔

"کیسا کام؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"سر..." وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ "بعض لوگ زیادہ پیسے دے کر بولتے ہیں یہ چیز اسکول کے بیگ میں وہاں پہنچا آؤ... یا وہاں سے فلاں چیز اُٹھا لاؤ۔ میں ان چکروں میں نہیں پڑتا۔"

"بہت اچھا کرتے ہو۔ اس سمجھداری کی وجہ سے تو میں تمہیں انعام دے رہا ہوں۔ میں تمہیں کوئی کام نہیں بتاؤں گا... بلکہ شاید آئندہ زندگی میں کبھی تم سے ملاقات بھی نہ ہو... البتہ..." میں نے جیب سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ "اگر خدانخواستہ تمہیں زندگی میں کبھی کوئی پریشانی لاحق ہو تو مجھ سے ضرور مل لینا۔"

"بہت شکریہ سر...!" وہ کارڈ کو بے یقینی سے دیکھنے لگا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھادی۔

شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "سر! آج تو آپ بڑی فراخدلی سے اپنے کارڈ بانٹتے پھر رہے ہیں۔"

"صرف دو ہی تو دیے ہیں... اور میرا خیال ہے مناسب جگہوں پر ہی دیے ہیں۔ خاص طور پر یہ بچّہ مجھے ہیرا لگا ہے شفیع شاہ! ممکن ہے کل کو یہ بھی شاندار گاڑی میں گھوم رہا ہو... اور اگر نہیں گھوم رہا ہوگا تب بھی شاید یہ ہم جیسوں سے کہیں بہتر انسان ہوگا۔ بشرطیکہ اس سے پہلے کسی نے اس کے کان میں یہ فلسفہ نہ پھونک دیا کہ اس کے ساتھ بے شمار زیادتیاں ہورہی ہیں... اور یہ جو اس کے اردگرد اونچی اونچی عالی شان عمارتیں نظر آرہی ہیں یہ اسی کے خون پسینے سے بنی ہیں، کسی اور کی محنت ان میں شامل نہیں ہے... چنانچہ اسے اُٹھ کھڑے ہونا چاہیے اور سب کچھ چھین لینا چاہیے۔ چھیننے کے چکر میں یہ بے چارا وہ بھی گنوا بیٹھے گا جو اس کے پاس ہے۔ کسی اور کی آگ کا ایندھن بن جائے گا۔"

پھر میں نے خود ہی اپنے اندیشے کو مسترد کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اُمید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کیونکہ اسے یقیناً ایک عظیم ماں کی سرپرستی حاصل ہے جس نے اسے شکر کرنا سکھایا ہے۔ تم نے اس بچّے کے الفاظ پر توجہ دی تھی۔ اللہ کا شکر ہے سر! بڑی اچھی گزر بسر ہوتی ہے۔ میں نے اس طبقے کے... اور اس عمر کے کسی بچّے کو آج کل کے حالات میں اتنی طمانیت کے ساتھ خدا کا شکر ادا کرتے نہیں سُنا۔ اس قسم کے کرداروں سے مل کر روح کو بڑی تقویت ملتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!" شفیع شاہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "آج کا دور تو بڑا ناشکری کا دور ہے۔ ایسے کردار بہت کم ملتے ہیں۔ آج کل تو سب کچھ میسر ہوتے ہوئے بھی ہر وقت محرومیوں کا رونا روتے رہنا اور دوسروں کو گالیاں دیتے رہنا ہمارا کلچر بن گیا ہے۔"

ہم اس دوران ڈیفنس کی حدود میں داخل ہوچکے تھے۔ ہم نے مطلوبہ فیز میں پہنچ کر ظفر جمال کا اسٹوڈیو تلاش کرنا شروع کیا تو یہ ایک صبر آزما مہم ثابت ہوئی۔ یوں تو ڈیفنس کی بیشتر گلیاں سنسان ہی نظر آتی تھیں مگر وہ بنگلا تو ایک دُور افتادہ اور کچھ زیادہ ہی ویران گلی میں واقع تھا۔ گلی میں ابھی مکانوں کی تعداد بھی کم تھی۔ کئی پلاٹ خالی تھے۔

آخر کار جب ہم مطلوبہ نمبر تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے تو اس پر اسٹوڈیو کا کوئی بورڈ وغیرہ آویزاں نظر نہیں آیا۔ گیٹ کھُلا تھا۔ ڈرائیو وے میں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ اپنی ظاہری حالت سے بنگلا لاوارث نظر آرہا تھا۔ بنگلا اچھا خاصا تھا لیکن بُری حالت میں تھا۔

ڈرائیو وے کافی بڑا تھا۔ میں گاڑی اندر ہی لے گیا۔ لان پر ہمیں ایک ادھیڑ عمر معزز سا شخص کھڑا نظر آیا۔ وہ اخبار بغل میں دبائے، ایک ہاتھ میں سیاہ پیکٹ لیے کھڑا تھا۔ چہرے سے کچھ

پریشانی عیاں تھی۔

"میرا خیال ہے گن ساتھ لینے کی ضرورت نہیں۔" میں نے سرگوشی میں شفیع شاہ سے کہا۔ "یونہی آجاؤ۔"

ہم گاڑی سے اُتر کر نہایت مہذبانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ ہمارے انداز میں ذرا سا بھی جارحانہ پن نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس شخص کے چہرے پر پریشانی کے علاوہ ہلکا سا خوف بھی جھلک آیا۔ وہ کوئی عام 'شریف' کاروباری سا آدمی معلوم ہوتا تھا۔ ظفر جمال یقیناً نہیں تھا۔ سمیں نے ظفر جمال کا جو نقشہ کھینچا تھا' وہ اس سے کافی مختلف تھا۔ عمر بھی زیادہ تھی۔

اس کے قریب پہنچ کر ہم نے سلام کرکے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے گویا ڈرتے ڈرتے ہم سے مصافحہ کیا۔ نظر کی عینک کے عقب میں اس کی قدرے پھیلی پھیلی سی آنکھوں میں تشویش تھی۔

"ہمیں ظفر جمال سے ملنا تھا۔" میں نے شائستہ اور ملائم لہجے میں کہا۔

"کس سلسلے میں؟" اس کے منہ سے گویا بے اختیار نکلا۔

"فی الحال تو صرف ملنا ہی ہے۔ سلسلہ ان سے ملنے کے بعد طے کرلیں گے۔" میں نے نرمی سے کہا۔ "کیا وہ اندر موجود ہیں؟"

"کاش وہ موجود ہوتے!" وہ شخص ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "مجھے تو خود ان سے ملنے کی حسرت رہ گئی۔"

"کیا مطلب....؟ کیا وہ خدانخواستہ اس دنیا سے کوچ کرگئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"کاش ایسا ہوتا....! تب بھی مجھے صبر آجاتا۔" اس شخص نے ایک بار پھر ٹھنڈی سانس لی۔

"برادر عزیز! آپ کچھ پہیلیاں سی بجھوا رہے ہیں۔" میں نے حد درجہ شائستگی سے کہا۔ "براہِ کرم کھل کر بات کیجئے.... کچھ اپنے بارے میں۔ کچھ ظفر جمال کے بارے میں بتائیے۔"

"پہلے تو آپ اپنے بارے میں کچھ بتائیے۔ ظفر جمال کی طرف آپ کا کوئی حساب وغیرہ تو نہیں نکلتا؟" وہ اب کچھ حوصلے سے بات کررہا تھا۔

"ہمارا سلسلہ دراصل کچھ عجیب ہے...." میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ "شاید آپ کی سمجھ میں نہ آئے۔ دراصل پہلے ہمارا ظفر جمال سے ملنا ضروری ہے۔ اس کے بعد ہوسکتا ہے اس کی طرف ہمارا کچھ حساب نکل ہی آئے۔"

"اب پہیلیاں آپ بجھوا رہے ہیں۔" وہ بولا۔ "بہرحال میں آپ کو جو کچھ بتا سکتا ہوں' بتا دیتا ہوں۔ میرا نام اصغر ہے۔ میں اس بنگلے کا بدنصیب مالک ہوں۔"

"کمال ہے!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ڈیفنس میں اتنے بڑے بنگلے کا مالک ہوکر آپ خود کو بدنصیب کہہ رہے ہیں۔"

"بنگلا تو میرے پاس ایک اور بھی ہے۔ وہ اس سے اچھا

ہے.... لیکن جس شخص کو ظفر جمال جیسا کرائے دار مل جائے وہ بدنصیب ہوتا ہے۔"

"اچھا.... تو ظفر جمال آپ کا کرائے دار ہے؟" میں نے کہا۔

"ہے نہیں صاحب....! تھا۔" اس نے کراہنے کے سے انداز میں تصحیح کی۔ "دو سال پہلے میں نے اسے ایک نہایت معزز آدمی اور ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا مالک سمجھ کر یہ بنگلا کرائے پر دیا تھا۔ حالانکہ میں خود ایک کاروباری آدمی ہوں مگر اس نے مجھے عجیب وغریب طریقے سے ٹرانس میں لے لیا تھا۔ میں اس سے متاثر ہی نہیں' بلکہ مرعوب ہوگیا تھا۔ اس قسم کے بعض لوگوں کے پاس یہ بڑا آرٹ ہوتا ہے۔ اسی کے بل پر وہ بڑے بڑے فراڈ کرتے پھرتے ہیں۔ مجھ جیسے گھاگ کاروباری آدمیوں کو بھی بے وقوف بنا جاتے ہیں...."

میں اور شفیع شاہ خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ ذرا توقف کے بعد بولا۔ "میں ملک سے باہر ہوتا ہوں۔ اسٹیٹس میں رہتا ہوں۔ گرین کارڈ ہولڈر ہوں۔ ظفر جمال کو بنگلا کرائے پر دے کر میں واپس چلا گیا اور ایسا اُلجھا کہ پھر دو سال تک نہیں آسکا۔ ظفر جمال سے میں نے صرف چھ ماہ کا کرایہ بطور ڈپازٹ لیا تھا۔ اس کے بعد سے آج تک مجھے تو کیا.... بجلی گیس اور ٹیلی فون کے محکمے والوں کو بھی اس سے ایک پیسا لینا نصیب نہیں ہوسکا۔ میری ایک عزیزہ یہیں ڈیفنس میں ہی رہتی ہیں۔ میں انہیں اختیار دے گیا تھا کہ وہ ظفر جمال سے کرایہ لیتی رہا کریں۔ وہ بھی ایک جہاندیدہ خاتون ہیں مگر صاحب....! ظفر جمال تو کوئی بہت بڑا فنکار تھا۔ وہ انہیں کرایہ دینا تو درکنار' ان کے بیٹوں کو کوئی پرمٹ' لائسنس دلانے کا چکر دے کر اُلٹا ساٹھ ستر ہزار ان سے لے گیا...." شدتِ غم سے گویا اس کی آواز حلق میں اٹک گئی۔

ایک لمحے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "سب سے زیادہ حیرت تو مجھے بجلی گیس اور فون کے محکموں پر ہے۔ ہم لوگ دو تین مہینے بل نہ دیں تو وہ لوگ کنکشن کاٹنے آجاتے ہیں مگر وہ بدمعاش نہ جانے کتنے عرصے تک بل دیئے بغیر یہ چیزیں استعمال کرتا رہا۔

میں نے محسوس کیا کہ اس فلم میں کم از کم کیمرامین اور لائٹنگ کرنے والے کا ایک مخصوص اسٹائل ضرور تھا تاہم یہ ضروری نہیں تھا کہ یہ اسٹائل انہوں نے اس قسم کی فلمیں بنا کر مستحکم کیا ہو۔ عین ممکن تھا کہ وہ شریفانہ فلمیں بنانے والوں کی کوئی ٹیم رہی ہو جس کی خدمات ایسی فلم کے لئے حاصل کی گئی ہوں اور وہ زیادہ معاوضے کے لالچ میں یا کسی اور وجہ سے اِدھر پھسل گئے ہوں۔

ایک اور خاص بات جو میں نے نوٹ کی' اس کی طرف شاید ایسی فلم دیکھتے وقت کسی اور کا دھیان بھی نہیں جاتا۔ وہ بات یہ تھی کہ فلم کے کئی شاٹس میں دیوار پر ایک پینٹنگ آویزاں نظر آئی تھی۔ کیمرامین نے ایک بار بھی اسے بطورِ خاص ایکسپوز نہیں کیا تھا۔ وہ ویسے ہی فلم میں آگئی تھی۔ وہ آئے بغیر رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ خاصی بڑی پینٹنگ تھی اور ایک دیوار کے عین وسط میں آویزاں تھی۔

وہ ایک بہت بڑے اور معروف آرٹسٹ کی پینٹنگ تھی۔ بات پھر وہی اسٹائل کی آجاتی تھی۔ اس مصوّر کا بھی اپنا ایک اسٹائل تھا۔ وہی اس کی انفرادیت بھی تھی۔ اس اسٹائل کی وجہ سے اس کی پینٹنگز دور سے پہچانی جاتی تھیں اور بڑی اونچی قیمتوں پر بکتی تھیں۔ ظاہر ہے اونچا طبقہ ہی انہیں خریدنے کا متحمل ہوسکتا تھا۔ ونچے طبقے کے بعض لوگوں کو مصوّری سے دلچسپی ہو یا نہ ہو' وہ اپنے آپ کو باذوق اور فن کا قدردان ظاہر کرنے کے لئے بھی نامور مصوّروں کی پینٹنگز مہنگے داموں خرید لیتے ہیں۔ چھوٹے اور گمنام مصوّروں پر وہ یہ کرم فرمائی نہیں کرتے خواہ وہ فن کا کتنا ہی بہترین نمونہ پیش کریں۔ کبھی کبھی تو مجھے شبہ ہوتا تھا کہ شاید مصوّری بھی شوبزنس کی کوئی شاخ ہوتی جارہی تھی جس میں نام چلتا تھا۔ تاہم اس میں شک نہیں تھا کہ فی الحال ہمارے ہاں بڑے نام والے بیشتر آرٹسٹ واقعی فن میں بھی بڑے تھے۔ اکثر نے بڑی طویل محنت سے نام بنایا تھا۔

اس آرٹسٹ کی پینٹنگ بھی اس کے مخصوص اسٹائل کی وجہ سے صاف پہچانی جارہی تھی پھر ایک کلوز اپ میں پینٹنگ کا ایک کونا ایک لمحے کے لئے اس طرح صاف طور پر کیمرے کی زد میں آیا کہ آرٹسٹ کا باریک سا نام بھی نظر آگیا اور میرے اندازے کی تصدیق ہوگئی۔ اگر میں صرف فلم میں کھویا رہتا تو ان باریکیوں کو محسوس نہیں کرسکتا تھا۔ فلم بنانے والوں نے بہرحال پوری کوشش کی تھی کہ دیکھنے والا اس میں بُری طرح کھو جائے۔ اس کے پیچھے یقیناً ایک اچھے ڈائریکٹر کا ذہن بھی کام کررہا تھا۔

شفیع شاہ کی اور میری عمروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اور ہمارے درمیان بیشتر معاملات میں کافی بے تکلفی بھی تھی لیکن بعض رشتے بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ ان میں بے تکلفی ہوتے ہوئے بھی ایک تکلف ہوتا ہے۔ کوئی حجاب نہ ہوتے ہوئے بھی ایک حجاب ہوتا ہے۔ ہمارا رشتہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ دراصل اس میں شفیع شاہ کی طرف سے ایک بے عنوان سا احترام شامل تھا۔

میری طرح شفیع شاہ کو بھی پارسا ہونے کا کبھی دعویٰ نہیں رہا تھا پھر بھی وہ اس دور کے اَن گنت نام نہاد شریف نوجوانوں سے بہتر تھا۔ انسانی قدروں کا اس کے دل میں بہرحال ایک احترام تھا جو نام نہاد شرافت سے بہتر تھا تاہم عین ممکن ہے وہ تنہائی میں یا کسی اور کے ساتھ بیٹھ کر آرام سے اس فلم کو دیکھ لیتا اور لطف اندوز یا مستفید بھی ہولیتا لیکن مجھے احساس تھا کہ میرے ساتھ بیٹھ کر دیکھتے ہوئے وہ خاصی تکلیف اور بے چینی کا شکار تھا گو کہ بظاہر آرام سے ہی بیٹھا ہوا تھا۔

آخرکار وہ فلم ختم ہونے سے پہلے ہی اُٹھ کھڑا ہوا اور خاموشی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے جانے کے بعد میں بھی چند لمحے ہی مزید بیٹھ سکا۔ فلم کے اثرات تو اپنی جگہ تھے ہی.... رگ وپے میں ایک اضطراب برپا تھا لیکن میرے ذہن میں بھی ایک عجیب سی کھچڑی پک رہی تھی۔ بہت سی باتیں ذہن میں گڈمڈ ہوکر رہ گئی تھیں۔ میں کچھ واضح خطوط پر صحیح اور صاف انداز میں نہیں سوچ پارہا تھا۔

آخر میں نے ریموٹ کا بٹن دبا کر ٹی وی اور وی سی آر بند کردیا۔ ان چیزوں کو اسی طرح چھوڑ کر میں بھی کمرے سے نکل آیا۔ مجھے شفیع شاہ کو تلاش نہیں کرنا پڑا۔ وہ راہداری کے ایک سرے پر ٹِنٹڈ گلاس کی ایک دیوار کے قریب کھڑا تھا جہاں سے پارکنگ لاٹ اور بغلی سڑک نظر آتی تھی۔

میں بھی اس کے قریب جاکر کھڑا ہوا۔ چند لمحے ہم دونوں خاموشی سے نیچے پارکنگ لاٹ میں آتی جاتی گاڑیوں کو دیکھتے رہے۔ آخر میں نے ہی سکوت توڑا اور دھیمے لہجے میں کہا "شفیع شاہ! ہم نے برسوں میں جاکر تھوڑی سی عزت بنائی ہے۔ اب ہم معاشرے میں دو معزز کاروباری شخصیتوں کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ بعض لوگ ہم پر رشک بھی کرتے ہیں کہ ہم نے جوانی میں ہی اتنی کامیابیاں حاصل کرلیں۔ خالی ہاتھ اپنی جدوجہد شروع کرنے والے بعض لوگ تو اس مقام تک پہنچنے کی حسرت ہی لئے مر کھپ جاتے ہیں۔"

"یس سر!" شفیع شاہ دور فضا میں کسی غیر مرئی چیز کو گھورتے ہوئے بولا۔ اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"ہم خود اپنی نظر میں اپنی جو عزت بنانے کی کوشش کررہے ہیں وہ اس عزت سے زیادہ اہم ہے جو ہم نے سوسائٹی میں حاصل کی ہے۔" میں نے مزید کہا۔

"جی ہاں" وہ حسبِ عادت اختصار سے بولا۔

"تمہیں حیرت نہیں ہورہی کہ یہ میں نے کس قسم کی باتیں شروع کردیں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں سر!" اس کے پتلے پتلے سُرخ ہونٹوں پر خفیف سی

مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ائرکنڈیشنڈ ہوٹل میں اس کی پیشانی پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں چمک رہی تھیں۔ یہ بوندیں فلم دیکھتے وقت نمودار ہوئی تھیں اور ابھی تک معدوم نہیں ہوئی تھیں۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "مجھے اندازہ ہے آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں سر! اس لئے آپ نے جہاں سے بات شروع کی ہے' مجھے اس پر حیرت نہیں ہے۔"

ٹونی اور شفیع شاہ صلاحیتوں کے اعتبار سے تو انمول نوجوان تھے ہی... لیکن وہ اس لئے بھی میرے قریبی ترین ساتھی تھے کہ وہ میرے ذہن میں جھانک سکتے تھے۔ اکثر ان کہی باتیں بھی سمجھ سکتے تھے۔

"شفیع شاہ! ہم نے مونا کو تلاش کرنے کا وعدہ کرلیا ہے اور ہم جان دے کر بھی وعدہ نبھانے کا نظریہ رکھنے والے لوگ ہیں لیکن میں تم سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں۔ کہیں ہم ایک فاحشہ اور فضول قسم کی لڑکی کی تلاش میں تو اپنا وقت اور توانائی ضائع نہیں کررہے؟ ہماری جو تھوڑی بہت عزت ہے' کہیں اس چکر میں اس عزت پر حرف تو نہیں آجائے گا؟ یہ فلم دیکھنے کے بعد میں بڑی الجھن میں پڑگیا ہوں۔ کیا تمہارے خیال میں ہمیں بہت سوچ سمجھ کر قدم نہیں اٹھانا چاہئے؟"

میں تو سوچ سمجھ کر قدم اٹھانے کی بات کررہا تھا' شفیع شاہ تو بات کا جواب بھی بہت سوچ سمجھ کر دیتا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش رہا۔ وہ بہت کم وقت میں بہت گہری سوچ بچار کرنے والا نوجوان تھا۔ کھچڑی یقیناً اس کے ذہن میں بھی پک رہی تھی لیکن اس کے چہرے سے اس کی دلی کیفیات کا اندازہ لگانا ہمیشہ بہت مشکل ہوتا تھا۔

ایک گہری سانس لے کر وہ پُرسکون اور دھیمے لہجے میں بولا "سر! سوچ سمجھ کر تو ہر سلسلے میں ہی قدم اٹھانا چاہئے۔ ہم نے کم سوچ بچار کے ساتھ بھی جو کام کئے ان میں ہماری نیت نیک تھی۔ ہم نے کبھی کسی غلط مقصد یا صرف ذاتی مفاد کے لئے جدوجہد نہیں کی۔ اب آپ نے اس لڑکی کو تلاش کرنے کی ہامی بھرلی ہے۔ اس میں بھی ہمارا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ بلکہ شاید اس چکر میں ہمیں کوئی نقصان ہی اٹھانا پڑے لیکن ہم نے اس کام کا ارادہ کرلیا ہے تو اب اسے پورا کرکے ہی چھوڑنا چاہئے۔ کسی کی مدد وغیرہ کا سوال تو اپنی جگہ ہے لیکن ہمیں اپنے تجسس کی تسکین کے لئے بھی ایسا کرنا چاہئے۔"

"فلم دیکھنے کے بعد بھی تمہاری یہی رائے ہے؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"فلم دیکھنے کے بعد ہی تو میری یہ رائے زیادہ پختہ ہوگئی ہے سر!" اس نے جواب دیا "آپ نے اس فلم کو دیکھ کر کوئی خاص بات محسوس نہیں کی؟ میری مراد فلم کے بے ہودہ اثرات سے نہیں ہے۔"

"کوئی بات ہے جو میرے ذہن میں کھٹک رہی ہے لیکن ابھی تک میں اسے سمجھ نہیں پایا۔ شاید کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد میں اسے سمجھ سکوں۔" میں نے دیانت داری سے جواب دیا۔

"آپ اسے ایک بار پھر دیکھیے سر! آپ ضرور اس چیز کو جائیں گے جس کا تعلق صرف احساس سے ہے۔ اکثر باتوں کو محسوس کرنے میں آپ مجھ سے بہتر رہے ہیں سر! ہمیشہ آپ نے ہی ... سے پہلے کسی نہ کسی معاملے میں ہماری رہنمائی کی ہے۔ آپ کو ... اندازہ ہوجاتا ہے کہ کسی معاملے کی حیثیت کیا ہے۔ بظاہر کیا دکھ... دے رہا ہے اور اس کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔"

"شاید میری حسیات کچھ کند ہوتی جارہی ہیں۔ شاید میں اب ... معاملے میں تم لوگوں کی رہنمائی کرنے کے قابل نہیں رہا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

وہ اپنی بے عنوان سی افسردگی کے باوجود دھیرے سے ہنسا ... بات نہیں ہے سر! آپ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ فلم دیکھ... وقت آپ کا ذہن شاید دوسرے نکتوں میں الجھا ہوا تھا۔ آپ ا... دوبارہ دیکھیں۔ آپ بھی اس بات کو ضرور محسوس کرلیں گے جو ... نے محسوس کی ہے۔ آپ کی حسیات کو کچھ نہیں ہوا۔ آپ ... حسیات تو شاید وقت گزارنے کے ساتھ ساتھ اور تیز ہوں گی۔ بات ... صرف یکسوئی کی ہے۔"

"یار! کیوں مجھے مروانے پر تلے ہوئے ہو۔" میں نے کراہ ... کہا "میں ایک بار ہی اس فلم کو دیکھ کر صدمے سے سنبھلنے نہیں پایا۔ تم مجھے دوبارہ دکھانے پر تلے ہوئے ہو۔ جبکہ خود باہر آ... کھڑے ہوگئے ہو۔"

"اصل میں پھر ہم اس موضوع پر بہتر انداز میں تبادلہ خیال کرسکتے ہیں۔ ضروری نہیں ہے کہ اس کے بعد بھی آپ میری رائے سے متفق ہی ہوجائیں۔ ہوسکتا ہے میری رائے غلط ہو۔" وہ محتاط لہجے میں بولا۔

"بھائی! تم کیوں مجھے لمبے چکر میں ڈال رہے ہو۔ مجھے دوبارہ فلم دیکھنے پر مجبور مت کرو اور سیدھی طرح خود ہی بتادو کہ تم نے محسوس کیا ہے۔ شاید میں دوبارہ فلم دیکھے بغیر ہی تم سے متفق ہوجاؤں۔" میں نے درخواست کی۔

"سر! آپ نے شاید فلم میں اس لڑکی کے تاثرات پر زیادہ تو... نہیں دی۔ اس کی آنکھوں میں نہیں جھانکا۔ پرنٹ بہت صاف ہے۔ شاید ماسٹر پرنٹ ہے۔ جزئیات بہت نمایاں ہیں۔ کم از کم لڑ... کی تو آنکھوں میں بھی جھانک کر بہت کچھ محسوس کیا جاسکتا ہے۔" شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ میں نے لڑکی کے تاثرات زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ میں ٹیکنیکل باریکیوں میں زیادہ پھنسا تھا گو کہ میں نے فلم کے اصل اور بے ہودہ اثرات سے بچنے پوری پوری کوشش کی تھی۔ اس کے باوجود بھلا ایسی فلموں م...

دی۔ یہ ایک مشکل کام ہے کہ آپ خود ٹی وی پر کام کریں اور ٹی وی کے لوگوں کو اپنے گھر آنے جانے سے باز رکھیں مگر میں نے ایسا کیا ہے۔ میں کم عمری میں ہی ایک نہایت معزز گھرانے میں اس کی شادی کررہی ہوں۔"

اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر گہری سانس لی "لیکن یہ سب کچھ صرف اس لئے ممکن ہوسکا کہ میرے حالات موافق تھے۔ مجھے شوہر بھی اچھا ملا اور میں مالی طور پر بھی آسودہ حال رہی۔ اس وقت میں درحقیقت اپنی بچی کے جہیز کی خریداری کے لئے ہی ہانگ کانگ آئی ہوں۔ بیچ میں خواہ مخواہ دوسری چیزوں کے بارے میں تجسس میں پڑگئی۔"

کافی کا مگ میز پر رکھتے ہوئے وہ گہری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی لیکن یہ مسکراہٹ روح سے خالی تھی۔ اس سے بہتر انداز میں وہ ٹی وی اسکرین پر مسکرالیتی تھی۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس وقت وہ اندر سے افسردہ تھی۔ اس کا گندمی چہرہ میک اپ سے عاری تھا اور اس پر کہیں کہیں پسینے کی کوئی ننھی سی بوند کیفے ٹیریا کی رنگین روشنیوں میں ہیرے کی کنی کی طرح چمک رہی تھی۔ ٹی وی اسکرین پر وہ جیسی لگتی تھی' اس وقت اس سے بہتر لگ رہی تھی۔

نہایت دھیمی آواز میں وہ بولی "شاید تم سوچ رہے ہوگے کہ میں موضوع سے بھٹک رہی ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں تمہیں اس لئے اپنی بیٹی کے بارے میں بتارہی ہوں کہ تم اس سے میری وابستگی کا اندازہ کرسکو اور یہ محسوس کرسکو کہ میں نے اسے کس ماحول میں پروان چڑھانے کی کوشش کی ہے لیکن جب میں اندر ہال میں بیٹھی اسٹیج پر اس لڑکی کی عجیب و غریب.... ناقابل بیان... بلکہ یوں کہو کہ لرزہ خیز حرکات دیکھ رہی تھی تو مجھے بار بار اپنی بیٹی کا خیال آئے جارہا تھا۔ اپنی بیٹی کا تصور میرے ذہن سے نکالے نہیں نکل رہا تھا۔ بس یہی سوال میرے ذہن کو ڈسے جارہا تھا کہ آخر یہ بھی تو کسی کی بیٹی ہوگی۔ یہ بن ماں باپ کے تو پیدا نہیں ہوئی ہوگی اور جب یہ پیدا ہوئی ہوگی تو کیا اس کے والدین نے چشم تصور سے دیکھا ہوگا کہ بڑی ہوکر ان کی بیٹی اس بدنام تھیٹر ہال میں' دنیا بھر سے آئے ہوئے سیاحوں کے سامنے یہ کچھ کررہی ہوگی؟"

تھیٹر ہال سے ملحق اس کیفے ٹیریا کا ماحول حبس زدہ تھا لیکن میری رگ و پے میں برف زاروں کی سی ٹھنڈک اتر آئی۔ بعض لوگ کسی کو زندگی کے راستے پر اچانک ملتے ہیں اور کسی غیر متوقع سوال سے اسے لاجواب کردیتے ہیں۔ اس کے حواس پر شب خون سا ماردیتے ہیں۔ میں کچھ بھی نہ بول سکا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میں کوئی سماجی رہنما قسم کی شخصیت نہیں ہوں اور نہ ہی مجھے تنظیم سازی وغیرہ کا شوق ہے۔ میں معزز خواتین کے اجتماعات منعقد کرکے ان کے سامنے اس قسم کی تقریریں جھاڑنا نہیں چاہتی کہ یہ حوا کی بیٹی کی تذلیل ہورہی ہے یا ... تقاضے ... مشرق کہاں ہیں۔ مجھے تو بس اپنے اسی ایک سوال کے جواب کی تلاش ہے جس کی اذیت مجھے بے چین کئے ہوئے ہے۔"

چند لمحے کی بوجھل اور تکلیف دہ خاموشی کے بعد وہ بولی "یہ اس قسم کی پہلی جگہ نہیں ہے جہاں میں آئی ہوں۔ میں اس طرح کی بہت سی جگہوں پر گئی ہوں۔ تمہیں اندازہ ہو ہی جانا چاہئے کہ میرے یہ دورے خالصتاً مطالعاتی اور مشاہداتی تھے۔ رونگٹے کھڑے کردینے والے بہت سے حقائق اس دوران میرے علم میں آئے۔ تمہیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ جسم فروشی اور اس قسم کے شرمناک مظاہرے یہاں کی ایک باقاعدہ صنعت ہیں اور زرمبادلہ کمانے کا بڑا ذریعہ ہیں لیکن تمہیں شاید یہ معلوم نہ ہو کہ مقامی لوگوں کی یہ لڑکیاں جو غلاظت کی اس دلدل میں سڑ کر اکثر بڑھاپے کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ہی مرجاتی ہیں' ان میں سے زیادہ تر رہن رکھی ہوتی ہیں۔"

"نہیں مجھے یہ معلوم نہیں تھا۔" میں نے اعتراف کیا۔

"خیر یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہاں آنے والے بیشتر لوگ اس قسم کی باتیں جاننے کے لئے یہاں نہیں آتے۔" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولی "بہرحال ان میں سے بیشتر لڑکیاں یہ سب کچھ کرنے کے بعد بھی خاصی غریبانہ زندگی گزار رہی ہوتی ہیں۔ ان کے والدین نے غربت کے ہاتھوں مجبور ہوکر یا بعض چھوٹے چھوٹے قرضوں کی وجہ سے انہیں کم عمری میں ہی رہن رکھ دیا ہوتا ہے۔ تمہیں یہ سُن کر حیرت ہوگی کہ بعض قرضے تو دو سو ہانگ کانگ ڈالر سے بھی کم ہوتے ہیں مگر سود در سود نظام' اپنے عجیب و غریب اخراجات اور بہت سی کٹوتیوں کی وجہ سے ایک لڑکی بعض اوقات اپنی مختصری جوانی اس دلدل کی نذر کرنے کے باوجود اپنے ماں باپ کا وہ قرضہ بے باق نہیں کرپاتی۔"

"حیرت ہے!" میں نے تھوک نگل کر کہا۔

"آج کے ترقی یافتہ دور میں یہ باتیں عجیب نہیں لگتیں؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا "انسان نے کتنی ترقی کرلی ہے۔ یہ ترقی یافتہ ملک... معیشت جن کی انگلیوں پر ناچتی ہے اپنی چمک دمک سے ہماری آنکھیں خیرہ کردیتے ہیں۔ ہم سر اٹھا اٹھا کر مرعوبیت سے ان کی عمارتوں اور روشنیوں کو دیکھتے ہیں۔ اسی جزیرے کو دیکھ لو۔ کیسی چکا چوند اور شان و شوکت ہے۔ صاف ستھری سڑکیں ہیں۔ جھلمل جھلمل کرتی عمارتیں ہیں۔ اِدھر سے اُدھر فراٹے بھرتی قیمتی گاڑیاں ہیں لیکن عورت کو اسی قدیم بیسوا سے بھی زیادہ تکلیف دہ انداز میں' مجمع میں کھڑے ہوکر اپنا آپ بیچنا پڑ رہا ہے۔ شاید بے حمیت مرد کا پیٹ بھرنے کے لئے... شاید اس کی ہشت پہلو ہوس کی تسکین کے لئے..... شاید اس نئے دور کا تاوان ادا کرنے کے لئے!" وہ ایک بوجھل سی سانس لے کر ... ش ہوگئی۔

... اس کا سر گویا کسی انجانے بوجھ سے جھک گیا تھا۔ ایک لمحے

بعد اس نے سر اُٹھایا اور ذرا ہموار لہجے میں بولی "کیا فائدہ ہے اس ترقی کا؟"

میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ ترقی، معیشت، اچھائی برائی، نیکی بدی وغیرہ کے حوالوں سے خود میرے ذہن میں اَن گنت سوالات ایسے تھے جن کا مجھے کبھی جواب نہیں مل سکا تھا۔

ٹی وی آرٹسٹ سے پردیس کی اس ملاقات میں اور بھی بہت سی باتیں ہوئی تھیں لیکن شاید وہ بھی دلچسپ کم اور تکلیف دہ زیادہ تھیں۔ اس وقت ٹی وی پر یہ وڈیو چلتی دیکھ کر وہ ساری باتیں یکدم ہی میرے ذہن میں تازہ ہوگئی تھیں۔ وہ ملاقات اچانک ہی ذہن میں اُبھر آئی تھی۔ ایک اور ہی تیز رفتار سی فلم چند سیکنڈ میں ذہن میں چلی اور ختم ہوگئی۔

اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ٹی وی کی اسکرین پر جو رقص جاری تھا وہ ہانگ کانگ، بنکاک یا اسکینڈے نیوین ملکوں کی نائٹ لائف میں دکھائے جانے والے انہی کھیل تماشوں سے ملتی جلتی کوئی چیز تھا جو تمام تر بشری کمزوریوں کے باوجود ان لوگوں پر گراں گزرتے ہیں جو ہر معاملے میں ایک ذوقِ سلیم یا مزاج میں نفاست رکھتے ہیں۔

ہمیں جس چیز نے سیدھے ہوکر بیٹھنے پر مجبور کیا تھا وہ رقص نہیں، رقص کرنے والی تھی۔ وہ پاکستانی تھی۔ غیر ملکی لڑکیوں کی تو اس قسم کی فلمیں عام تھیں۔ گلی گلی کرائے پر ملتی تھیں۔ میں نے کبھی سوچا نہیں تھا کہ کسی پاکستانی لڑکی پر بھی اس قسم کا رقص فلمایا گیا ہوگا۔

ہم اسے کسی اور ایشیائی ملک کی لڑکی سمجھ کر اپنی لاشعوری ندامت کو کم کرنے کی کوشش کرسکتے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ ہم نے اس لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ وہ مونا تھی۔ ہماری حیرت کی اصل اور سب سے بڑی وجہ بھی یہی تھی کہ ہم نے اسے پہچان لیا تھا۔

میں اور شفیع شاہ قدرے کھسیاہٹ کے سے عالم میں بیٹھے رہے۔ ہم ایک دوسرے کی طرف نہیں دیکھ رہے تھے۔ آخر کار رقص ختم ہوگیا لیکن اس کے بعد جو کچھ شروع ہوا وہ رقص سے بھی زیادہ شرمناک تھا۔ وہی سب کچھ جو اس طرح کی خطرناک ترین مغربی فلموں میں ہوتا ہے وہ سب کچھ اس میں موجود تھا۔ عبرت کا مقام بس یہ تھا کہ اس کا مرکزی کردار بھی مونا ہی تھی۔ میں نے جب مونا کی تصویر دیکھی تھی تو تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ کیمرے کے سامنے وہ سب کچھ کرنے کی اہل ہوگی جو میں اسے کرتے دیکھ رہا تھا۔

گو کہ اس کی حرکات و سکنات اور تاثرات میں کوئی بات تھی جو مجھے کھٹک رہی تھی لیکن فی الحال میں اسے سمجھنے سے قاصر تھا۔ وہ کوئی مختصر فلم نہیں تھی۔ اس طرح کی مغربی فلموں کے انداز میں اس میں چھوٹے چھوٹے واقعات فلمائے گئے تھے۔ واقعات الگ الگ تھے لیکن انہیں کسی ایک ہی بیڈ روم میں فلمایا گیا تھا اور ان کا مرکزی کردار مونا ہی تھی۔

دو تین "واقعات" میں ہی بیڈ روم ہر زاویے سے نظر آگیا تھا۔ وہ ایک بہت بڑا اور غیر معمولی طور پر شاندار و پُرتعیش بیڈ روم تھا۔ وہاں اتنی جگہ تھی کہ میدانِ جنگ کے سوا کسی بھی قسم کا سین، سیٹ لگا کر فلمایا جاسکتا تھا لیکن جو کچھ وہاں فلمایا جارہا تھا اس کے لئے سیٹ نہیں لگایا گیا تھا۔ وہ حقیقی لوکیشن تھی۔ سچ مچ کا ایک عظیم الشان بیڈ روم تھا۔

ہم خاموش اور ساکت بیٹھے بیٹھے دو تین "واقعات" دیکھ گئے۔ ان میں مرد بدل گئے تھے لیکن لڑکی مونا ہی رہی تھی۔ مردوں کے معاملے میں صاف نظر آرہا تھا کہ میک اپ وغیرہ کی مدد سے ان کی شکلیں بدلنے کی کوشش کی گئی تھی لیکن مونا اپنی اصل شکل میں کام کررہی تھی۔

میرا چونکہ فلم لائن سے تھوڑا بہت تعلق تھا اس لئے میں بعض پہلوؤں کو فلمسازی کے نکتہ نظر سے بھی دیکھ رہا تھا۔ لاہور میں میرا فلمسازی کا ایک ادارہ بھی کام کررہا تھا۔ گو کہ میں اس کا سلیپنگ پارٹنر کی طرح کا مالک تھا اور اس کے معاملات میں بہت کم دلچسپی لیتا تھا۔ اس کے باوجود محض کبھی کبھار کاموں کی جھلکیاں دیکھ کر اور کچھ ذاتی معلومات و مشاہدے کی بنا پر مجھے بہت سی باریکیوں کا علم تھا اس لئے میں ان باریکیوں کو نوٹ کررہا تھا اور پوری پوری کوشش کررہا تھا کہ مجھ پر فلم کے اصل اثرات کم پڑیں۔ یہ کوشش خاصی صبر آزما تھی۔ انسان آخر انسان ہوتا ہے۔ فرشتہ ہونے کا مجھے دعویٰ نہیں تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ فلم بنانے والے پیشہ ور تھے۔ فلم میں کام کرنے والے بے شک اس میدان کے پُرانے کھلاڑی نہیں تھے۔ ویسے تو یہ میدان ہی ہمارے ہاں کچھ ایسا پُرانا نہیں تھا کیونکہ میں نے اس طرح مکمل اہتمام سے بنائی گئی اس قسم کی پاکستانی فلموں کا کبھی تذکرہ بھی نہیں سُنا تھا اور یہ یقیناً ہم پر اوپر والے کا کرم ہی تھا کہ ابھی ہم "ترقی" کی اس منزل پر نہیں پہنچے تھے۔

بہرحال اس فلم میں لائٹنگ، کیمرا مین کا کام اور ایڈیٹنگ وغیرہ بتارہی تھی کہ وہ اناڑیوں کا کام نہیں تھا۔ اس کے پیچھے منجھے ہوئے پیشہ ور ہاتھ کام کررہے تھے اور انہوں نے اپنے اپنے ہنر کے ذریعے مرکزی کرداروں کے اناڑی پن کو چھپانے کی پوری پوری کوشش کی تھی اور اس میں کافی حد تک کامیاب رہے تھے۔ پس منظر کی موسیقی اور طرح طرح کی آوازوں کا استعمال نہایت خوب صورتی سے کیا گیا تھا۔ ڈبنگ بہت عمدہ تھی۔

اس کا مطلب یہی تھا کہ یہ محض دو چار آدمیوں کا کام نہیں تھا جنہوں نے کسی کونے کھدرے میں کیمرا فٹ کرکے کسی کی مرضی سے اور کسی کی مرضی کے بغیر اُلٹی سیدھی سی فلم بنا ڈالی تھی۔ کام بڑے منظم انداز میں کیا گیا تھا۔ میرے خیال میں ہر شعبۂ زندگی میں کوئی بھی کام کرنے والے کا اپنا ایک اسٹائل ہوتا ہے۔ جس کا شاید بعض اوقات اسے خود بھی علم نہیں ہوتا۔

آخر میں نے سکوت توڑا اور اس سے پوچھا "کچھ سمجھ میں آیا؟"

"میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آرہا سر! ذہن میں آندھیاں سی چل رہی ہیں۔" شفیع شاہ بے بسی سے بولا "میں تو یہی سوچے جارہا ہوں کہ یہ ہم کہاں جارہے ہیں!"

"برسوں سے یہ ہمارے اخباروں رسالوں میں اداریوں کا عنوان چلا آرہا ہے "ہم کہاں جارہے ہیں؟" اس کے باوجود لوگوں کو آج تک معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کہاں جارہے ہیں اور اس بات کی پروا کئے بغیر ہی وہ چلے جارہے ہیں۔" میں نے ٹھنڈے پانی کا ایک اور گھونٹ بھر کر ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا "اور جس کو جہاں جانا ہے وہ وہیں جارہا ہے کسی کے روکے سے رُک نہیں رہا ہے' خواہ وہ اندھے کنوئیں میں جارہا ہے۔ فی الحال ہمیں صرف اس مسئلے کے بارے میں غور کرنا چاہئے جو ہمارے سامنے ہے۔"

"آپ نے کیا سوچا ہے؟" شفیع شاہ نے پہلو بدلتے ہوئے سوال کیا۔

"ہمیں اس مکان کا ایک اور چکر لگانا پڑے گا جس میں ظفر جمال رہتا تھا۔" میں نے جواب دیا "مجھے شبہ ہے کہ یہ فلمیں... بلکہ شاید اس جیسی کچھ اور بھی فلمیں وہیں بنائی گئی ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ان کا کیمرامین ظفر جمال ہی رہا ہو۔ شاید وہاں اس کا کوئی سراغ مل ہی جائے۔ میں اب محسوس کررہا ہوں کہ ہم نے وہاں سے آنے میں جلدی کی۔ ہم مالکِ مکان سے فلمیں تقریباً چھینتے ہی چل پڑے۔ ہمیں اندر کا بھی جائزہ لینا چاہئے تھا۔"

"مالکِ مکان بتا تو رہا تھا کہ ظفر جمال نے وہاں ردّی اخباروں' ایک جوڑی ٹوٹے ہوئے جوگرز اور کوڑے کباڑ کے سوا کچھ نہیں چھوڑا تھا۔" شفیع شاہ نے مجھے یاد دلایا۔

"وہ تو ایک مالکِ مکان کا نکتۂ نظر تھا۔ شاید ہمارے لئے کوئی ایسی چیز کارآمد ثابت ہوجائے جو اس کی نظریں بے کار ہو۔ مثلاً یہ دو فلمیں ہی اگر اس کے پاس رہتیں تو وہ انہیں محض فحش فلمیں سمجھ کر دیکھتا۔ کہیں چھپا کر رکھتا یا شاید کسی کو دے دیتا لیکن ہمارے لئے ان کی کچھ اور اہمیت ہے۔"

شفیع شاہ نے کچھ سوچا پھر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "ٹھیک ہے سر! دیکھ لیتے ہیں۔ وہ مکان یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

ہم دوبارہ اس مکان پر پہنچے تو شام کا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ لان پر چار پانچ مزدور منہ لٹکائے اداسی کے سے عالم میں بیٹھے تھے گویا انہیں پسینہ خشک ہونے کے بعد تو کیا' خون خشک ہونے کے بعد بھی مزدوری نہ ملی ہو۔ مالکِ مکان کی گاڑی ڈرائیو وے میں موجود تھی لیکن وہ خود کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ مزدوروں نے کچھ خوف زدہ سی نظروں سے ہماری گاڑی کی طرف دیکھا۔ وہ گویا چوکنّا سے ہوکر بیٹھ گئے۔ مجھے ان کا انداز کچھ عجیب سا لگا۔

میں نے گاڑی سے اُتر کر ان کے قریب پہنچ کر پوچھا "اصغر صاحب کہاں ہیں؟"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں مشورہ کررہے ہوں کہ اس سوال کا جواب دیا جائے یا نہیں۔ آخر ان میں سے ایک بولا "اصغر صاحب تو اسپتال میں ہیں جناب۔"

"اسپتال میں....؟" میں نے حیرت سے کہا "ابھی دو تین گھنٹے پہلے ہم آئے تھے تو وہ یہیں لان پر ٹھیک ٹھاک کھڑے تھے اور صحت مند نظر آرہے تھے۔ اچانک اسپتال کیوں پہنچ گئے؟ طبیعت خراب ہوگئی یا کوئی دورہ وغیرہ؟"

"نہیں جی۔ طبیعت تو بالکل ٹھیک تھی۔ دورہ بھی نہیں پڑا۔" اس شخص نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا "تین چار آدمی کلاشنکوفیں لے کر آئے تھے۔ انہوں نے پہلے اندر آکر سب طرف دیکھا۔ ہم سے پوچھا کہ ہمیں اندر کہیں سے وی سی آر کی دو فلمیں تو نہیں ملی تھیں۔ ہم نے سچ بول دیا کہ جی ملی تو تھیں' ہم نے اصغر صاحب کو دے دیں۔ وہ اصغر صاحب سے مانگنے لگے۔ اصغر صاحب نے قسمیں کھا کھا کر انہیں بتایا کہ فلمیں صرف چند منٹ ان کے پاس رہیں۔ وہ انہیں ہاتھ میں لئے لان پر کھڑے تھے کہ دو آدمی آئے اور ان سے وہ فلمیں چھین کر لے گئے مگر کلاشنکوف والوں نے ان کی بات کا اعتبار نہیں کیا اور انہیں بٹوں سے مارنے لگے۔ بدمعاشوں نے انہیں لہولہان کردیا جی وہ تو ہم لوگوں نے جان کا خطرہ مول لیا اور بیچ میں پڑ کر انہیں چھڑایا ورنہ وہ تو شاید جان سے ہی مار ڈالتے۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر اس نے تھوک نگلا پھر بولا "بڑی مشکل سے انہوں نے اصغر صاحب کو چھوڑا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے۔ اتفاق سے اسی وقت اصغر صاحب کے ایک رشتے دار آگئے۔ انہوں نے اصغر صاحب کو گاڑی میں ڈالا اور اسپتال لے گئے۔"

"اوہ یہ تو بہت بُرا ہوا۔" میں نے حقیقتاً افسوس سے کہا۔ اس شریف آدمی کی خواہ مخواہ کچھ زیادہ ہی درگت بن گئی تھی۔ غنیمت تھا کہ جب ہم نے اصغر سے کیسٹ لیں اس وقت مزدور وغیرہ اندر تھے۔ انہوں نے ہمیں نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے انہیں نہیں معلوم تھا کہ وہ کیسٹ لے جانے والے ہم ہی تھے جن کی وجہ سے بے چارے اصغر کی شامت آئی تھی۔

"اب پولیس آئے گی اور خواہ مخواہ ہم غریبوں کی مصیبت آئے گی۔" مزدور بڑبڑانے کے سے انداز میں بولا۔

"کچھ نہیں ہوگا۔ تم صرف سچ بولنا۔ جو ہوا ہے وہ بتادینا۔ تم مزدور ہو تمہارا اس معاملہ سے کیا تعلق۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

"تعلق ہو یا نہ ہو۔ ہم جیسے لوگوں کی جان پولیس' آسانی سے

[...]ی کی آنکھوں میں جھانکنے کی مہلت کون نکال سکتا ہے۔ خصوصاً [...]بکہ انسان کا ذہن پہلے ہی سے بہت اُلجھا ہوا ہو۔

میں نے یہی بات شفیع شاہ کو سمجھائی پھر کہا "تم ٹکڑوں میں [...]ت مت کرو۔ پوری بات کرو۔ بلکہ ممکن ہو تو اس کی وضاحت بھی [...]لو۔ کچھ دیر کے لئے اپنی کم گوئی کو بالائے طاق رکھ دو۔ شاید ہم [...]دنوں مل کر صحیح نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہوجائیں۔"

"سر! اس فلم کے پیچھے یقیناً کسی ہدایت کار کی ہدایات بھی کام [...]کررہی تھیں اور اس نے لڑکی کے چہرے پر لطف اندوزی کے [...]ثرات پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ شاید وہ کافی حد تک [...]پنے مقصد میں کامیاب بھی رہا لیکن یہ بات صرف سطحی لوگوں کے [...]لئے ہے۔ ان تاثرات کے پیچھے درحقیقت ایک بھیانک خوف تھا۔ [...]سے شاید سطحی لوگ محسوس نہ کرسکیں۔" شفیع شاہ بولا۔

"بھئی... اس طرح کے کاموں میں ملوث سبھی لوگوں کے [...]ن میں ایک خوف تو موجود رہتا ہی ہے نا۔" میں نے ایک لمحے کی خیال خاموشی کے بعد کہا "ہمارے ہاں یہ دھندا پُرانا نہیں ہے [...]ر ابھی شاید کچھ ایسا باقاعدہ طور پر شروع نہیں ہوا۔ اس کے [...] وہ یہ صرف اخلاقی ہی نہیں' قانونی طور پر بھی جرم ہے۔ یوں تو [...]ے ہاں دوسرے تمام جرائم بھی لوگ بے دھڑک کرتے ہیں [...]ن اس میں شاید اس لئے بھی تھوڑا بہت خوف رہتا ہو کہ اس کا [...]دیری ثبوت موجود رہتا ہے۔"

میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ شفیع شاہ بغور میری بات [...]رہا تھا۔ میں نے سلسلۂ کلام جوڑا "خصوصاً جو لوگ کیمرے کے [...]منے ایکسپوز ہورہے ہوتے ہیں' ان کے ذہنوں میں تو ایک خوف [...]جود رہنا لازمی ہے۔ مجھے یاد ہے لاہور میں ایک بار فلم اسٹوڈیو [...] میرے سامنے انڈسٹری کے بعض اہم لوگ اسی موضوع پر بات [...]رہے تھے۔ بعض اداکار یا اداکارائیں جو آج کافی مشہور ہیں [...]ب وہ قسمت آزمائی کے لئے نئی نئی فلم انڈسٹری میں پہنچیں [...]ں تو ان میں سے بھی بعض کی کچھ معیوب سی فلمیں تیار ہوگئی [...]یں۔ وہ اس درجے کی معیوب تو نہیں تھیں لیکن بہرحال کچھ نہ [...]ہ معیوب تھیں۔ ان میں سے ہر فلم کی تیاری کا پس منظر مختلف [...]۔ کہیں کسی اداکارہ کی لاعلمی میں وہ مناظر فلما لئے گئے۔ کہیں [...]ی دھوکا دیا گیا۔ کہیں اداکارہ کی ناتجربے کاری اور اناڑی پن [...] فائدہ اُٹھایا گیا۔ کہیں اداکاروں سے گویا یہ ایک حماقت سرزد [...]ئی۔ کہیں وہ کسی لالچ میں آگئے۔

میں نے تو یہاں تک سُنا کہ ایک ٹولے نے فلموں میں کام [...]نے کی شوقین ایک خوب صورت مگر کم عقل اور کم علم سی لڑکی [...] کہہ کر بھی اس کی فلم بنالی کہ یہ میڈیکل کی تعلیم کے لئے [...]ال کی جائے گی۔

بہرحال... یہ تصویری ثبوت ڈبوں میں محفوظ ہوجاتے ہیں۔ عرصہ پہلے تو یہ بھی ہوتا تھا کہ بعض بدنام قسم کے سینماؤں میں جب کوئی عام فلم رش نہیں لیتی تھی تو وہ بیچ میں اس قسم کا کوئی "ٹوٹا" چلا دیتے تھے۔ ایک مزاحیہ اداکار جو اس دوران کافی مقبول ہوچکا تھا' اس کا ایک پُرانا "ٹوٹا" تواتنی مرتبہ ایک سینما میں چلا کہ پولیس اس کے گھر چھاپے مارنے لگی۔ وہ بے چارہ اِدھر اُدھر چھپتا پھرنے لگا۔ مجھے یہ قصہ اس لئے یاد ہے کہ اس کی جان پولیس سے میں نے ہی چھڑائی تھی۔ پولیس کا مقصد صرف اداکار کو تھوڑا سا خوار کرکے لطف لینا اور کچھ مال بنانا تھا ورنہ انہیں ان معاملات کے اخلاقی پہلوؤں سے جتنی دلچسپی ہے وہ تو تمہیں معلوم ہی ہے۔

اس سے بہت پہلے بلیک اینڈ وہائٹ فلموں کے زمانے کی ایک ہیروئن کا اسکینڈل بھی کافی مشہور ہوا تھا۔ وہ تو اخباروں میں بھی آگیا تھا۔ وہ اداکارہ ایک عرصے تک وضاحتیں کرتی رہی تھی کہ وہ تو آؤٹ ڈور شوٹنگ کے دوران جھاڑیوں کے پیچھے لباس تبدیل کرنے گئی تھی۔ اس دوران کسی نے زوم لینس لگا کر اس اکیلی کا "ٹوٹا" فلما لیا تھا۔ ایک طویل عرصے تک وہ پریشان رہی۔ آخرکار فلم انڈسٹری چھوڑ گئی۔"

شفیع شاہ نے بڑے تحمل اور توجہ سے میری طویل وضاحت سُنی۔ ایک طویل سانس لے کر میں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا "اس لئے مونا کا خوف زدہ ہونا تو سمجھ میں آتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں۔ مَردوں نے تو اپنے حلئے بھی بدلے ہوئے تھے؟"

"یہی نکتہ تو قابلِ غور ہے سر!" شفیع شاہ بولا "مَردوں نے تو اپنے حلئے بدلے ہوئے تھے لیکن لڑکی اپنی اصل شکل میں تھی۔ اس نے وگ تک نہیں لگائی ہوئی تھی۔ اگر اسے صرف پہچانے جانے کا خوف ہوتا تو وہ بھی اپنا حلیہ بدلنے کی کوشش کرسکتی تھی۔ وہ شاید حلیہ بدلنے پر قادر ہی نہیں تھی۔ اسے اس کی اجازت ہی نہیں تھی۔ پہچانے جانے کا خوف تو اپنی جگہ تھا ہی لیکن اسے شاید کوئی اور خوف بھی لاحق تھا۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس فلم کی تیاری میں اس کی مرضی شامل نہیں تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک التجا تھی سر!"

اس نے ایک طویل وقفے میں پہلی بار گردن گھما کر میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سُلگ رہی تھیں تاہم اس کا لہجہ پُرسکون ہی تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ظاہر ہے اسے یہ تو معلوم نہیں تھا کہ اس فلم کو کون کون دیکھے گا اور کس کے جذبات کیا ہوں گے لیکن اس نے انہی نامعلوم تماشائیوں میں سے کسی کو بہ زبانِ خموشی.... آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ شاید کسی موہوم سی اُمید کے سہارے... یا پھر شاید غیر ارادی طور پر اس نے ایسا کیا ہے۔"

"اور وہ نامعلوم تماشائی تم ہو۔" میں نے اس کی سُلگتی آنکھوں میں جھانکا۔

"وہ آپ بھی ہوسکتے ہیں سر! کوئی بھی ہوسکتا ہے جو خوف زدہ آنکھوں کی زبان سمجھ سکتا ہو۔ وہ بھی ایسے لمحوں کے درمیان' جب

وہ آنکھیں بظاہر لطف اندوزی کی اداکاری کر رہی ہوں۔" شفیع شاہ ایک بار پھر شیشے کے پار دیکھنے لگا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ذہن سے کوئی بوجھ اُتر گیا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لے کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ایک عجیب سا اطمینان محسوس کرتے ہوئے کہا "تم سے تبادلۂ خیال بہت مفید رہا ہے۔ میرے ذہن میں ایک خلش سی تھی۔ میں اسی لئے تم سے اتنی تفصیل سے بات کر رہا تھا کہ ہر پہلو زیرِ بحث آجائے۔ فلم دوبارہ دیکھے بغیر ہی محض تم سے بات کر کے میرے ذہن کی وہ خلش دور ہو گئی ہے۔"

"کیا مطلب سر؟" اس نے بھویں اُچکائیں۔

"مطلب یہ کہ میں جس اُلجھن کو سمجھ نہیں پا رہا تھا وہ یہی تھی جس کی تم نے وضاحت کر دی ہے۔ میرا ذہن چونکہ کچھ ٹیکنیکل باتوں میں پھنس گیا تھا اس لئے میں بعض لمحوں کے دوران مونا کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات زیادہ گہری نظر سے نہیں دیکھ سکا لیکن ان کی طرف میری توجہ ضرور گئی تھی اور وہ محض ایک اُلجھن کی صورت میں میرے لاشعور میں پھنس کر رہ گئے تھے۔ اب تم نے بات کی تو گویا بات صاف ہو گئی۔"

"اور یہ بھی طے ہو گیا کہ ہم مونا کو تلاش کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے۔" شفیع شاہ کے لہجے میں طمانیت تھی۔

"یقیناً" میں نے اس کی تائید کی "میں یہ نہیں سمجھتا کہ ہمارے اندازے سو فیصد درست ہیں۔ ہم جو کچھ سمجھ رہے ہیں وہ محض ہماری خوش گمانی بھی ہو سکتی ہے لیکن ہمارے دلوں کو اس حد تک اطمینان ضرور ہو گیا ہے کہ اب ہم ذرا دلچسپی سے یہ کام کریں گے۔"

"اب ہم کہاں سے کام کا آغاز کریں؟" شفیع شاہ نے دریافت کیا "ہمارے سامنے مونا کا کوئی سراغ نہیں ہے۔"

"تلاش کرنے سے کوئی نہ کوئی سراغ بھی مل ہی جائے گا۔" میں نے ایک بے عنوان اُمید کے سہارے کہا "سب سے پہلے تو ہمیں اس فلم کو مکمل دیکھنا چاہئے جسے ہم ادھوری چھوڑ آئے ہیں۔ اس کے بعد دوسری فلم کو بھی دیکھ ڈالنا چاہئے۔ یہ اس ضمن میں پہلا ضروری کام ہے۔"

"جو میرے لئے بہت مشکل ہے۔" شفیع شاہ گویا کراہ کر بولا۔

"مجھے معلوم ہے۔" میں نے کہا "میرے لئے بھی یہ ایک آزمائش سے کم نہیں لیکن ہم دو محققین کی طرح بیٹھ کر کسی اور نکتہ نظر سے ان فلموں کو دیکھیں گے۔ اس طرح نہیں جس طرح عام طور پر لوگ ایسی فلمیں دیکھتے ہیں۔"

"محققین کی طرح بھی ان فلموں کو دیکھنا آسان کام نہیں۔" وہ بولا "آپ کو معلوم ہے میں ان خرافات سے دور رہا ہوں۔ بہرحال..." اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کندھے اُچکائے اور ہم دونوں واپس کمرے کی طرف چل دیے۔

ہم نے کافی صبر و سکون سے بیٹھ کر وہ فلمیں دیکھیں۔ فلم تو کچھ زیادہ باقی نہیں تھی۔ اس کے صرف دو ٹکڑے اور وہ بھی اسی بیڈ روم میں فلمائے گئے تھے۔ آخری ٹکڑا کافی تھا۔ اسے مغربی فلموں سے بھی زیادہ تباہ کن بنانے کی کوشش تھی۔ بہرحال اس میں ہمیں مزید کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی "سراغ" کہہ سکتے۔

مونا والی فلم دیکھنے کے بعد ہم نے پھر "انٹرول" کیا۔ ڈرنکس وغیرہ پینے کے بعد ہم نے دل مضبوط کر کے دوسری سی آر میں لگائی۔

وہ بھی تقریباً اسی قسم کی... لیکن اس سے کچھ بہتر چیز تھی پر زیادہ محنت کی گئی تھی۔ اس میں بھی چھوٹی چھوٹی کہانیاں ان میں بھی ایک ہی لڑکی مرکزی کردار ادا کر رہی تھی اور نہیں تھی۔ وہ مونا سے بھی زیادہ خوب صورت تھی اور مونا بہتر "فنکار" معلوم ہوتی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ پہلی بار کا حسین اور معصوم چہرہ کلوز اپ میں کیمرے کے سامنے یہی گمان گزرا کہ وہ ویسی فلم نہیں ہوگی جیسی مونا کی تھی دیر بعد وہی سلسلے شروع ہو گئے۔

دوسرا فرق یہ تھا کہ یہ فلم اس بیڈ روم میں نہیں فلمائی جو ہم نے مونا والی فلم میں دیکھا تھا۔ بیڈ روم تو بہرحال اس بھی ہر "ٹکڑے" میں آیا تھا لیکن وہ مجھے کسی ہوٹل کا کمرہ ہوتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کہانیوں کے بے ضرر حصے آؤٹ ڈور لو بھی فلمائے گئے تھے گویا ایک قدم اور آگے بڑھانے کی جگہ گئی تھی لیکن فنکاری یہ دکھائی گئی تھی کہ ان جگہوں کے بہت ہی مختصر لئے گئے تھے اور کچھ اس طرح لئے گئے تھے جگہوں کی کوئی انفرادیت، کوئی شناخت نہیں رہی تھی۔ کچھ جاسکتا تھا کہ وہ کون سی جگہیں تھیں۔ ان میں کہیں کہیں متعلق لوگ بھی آتے جاتے نظر آئے۔ وہ بے چارے سمجھ رہے ہوں کہ وہاں کسی ٹی وی ڈرامے یا فلم کی شوٹنگ ہوگی کیونکہ ان شاٹس کا تعلق کہانیوں کے بے ضرر حصے تھا۔

کہانیوں کے اصل مرد کردار وہی معلوم ہوتے تھے جو مونا والی فلم میں بھی کام کیا تھا۔ اس میں بھی وہ انہی بد حلیوں میں، اپنے آپ کو ناقابلِ شناخت بناتے ہوئے آ ایک تو نقاب ہی پہن کر آیا تھا جس میں سے اس کی صرف اور ہونٹ ہی باہر تھے۔ اس چھوٹی سی کہانی میں اس کا کر تھا۔

اس فلم کی تیاری بھی مکمل طور پر اسی ٹیم کا کارنا ہوتی تھی۔ فلم ختم ہوئی تو میں نے بیڈ روم فریج سے ٹھنڈ بوتل نکالی۔ میں اور شفیع شاہ دیر تک بیٹھے ٹھنڈے پانی بھرتے رہے اور سوچتے رہے۔

کہاں چھوڑتی ہے جی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

میں اور شفیع شاہ اندرونی دروازے کی طرف بڑھے تو وہ گویا چونکا اور ہچکچاتے ہوئے بولا "آپ کون ہیں جی؟"

"ہماری اصغر صاحب سے اس بنگلے کو خریدنے کے سلسلے میں کچھ بات چیت ہوئی تھی۔ اس کی حالت ذرا ٹھیک ٹھاک ہو جائے پھر بات آگے بڑھائیں گے۔ ہم نے سوچا فی الحال مرمت وغیرہ ہونے سے پہلے بھی ایک نظر اسے دیکھ لیں۔" میں نے سرسری سے لہجے میں کہا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ مزید کچھ نہ بولا۔

مکان کھُلا ہی پڑا تھا اور اندر کچھ بھی نہیں تھا۔ تمام کچرا مٹی اور ٹوٹی پھوٹی بے کار اشیا مزدوروں نے باہر ڈرائیو وے کے ایک حصے میں ڈھیر کر دی تھیں۔ ہم نے تمام کمروں کا جائزہ لیا پھر اس ڈھیر کو بھی دیکھا لیکن ہمیں کوئی قابلِ توجہ چیز نظر نہیں آئی۔

اندیشہ تھا کہ کوئی ایسا شخص وہاں نہ آن پہنچے جو ہمیں مشکوک سمجھ کر کوئی مسئلہ کھڑا کرنے کی کوشش کرے اس لئے ہم جلد ہی وہاں سے واپس چل دیے۔ راستے میں شفیع شاہ بولا "بے چارے اصغر کے ساتھ تو بہت ہی بُری ہوئی۔"

"واقعی اس کا مجھے بھی افسوس ہے۔" میں نے کہا "اور ساتھ ہی اس عجیب و غریب اتفاق پر حیرت ہے کہ صرف چند منٹ پہلے ہم اس کے پاس پہنچے تھے۔ اس لئے وہ کیسٹ ہمارے ہاتھ آگئیں ورنہ شاید ہمیں پتا بھی نہ چلتا کہ وہاں سے وہ کیسٹ بھی برآمد ہوئی تھیں۔ جس طرح آسانی سے ہم انہیں اصغر سے لے آئے تھے۔ اسی طرح وہ نامعلوم لوگ لے جاتے اور اصغر سے ہماری گفتگو کے دوران شاید ان کا ذکر بھی نہ آتا۔"

"جس طرح ان لوگوں نے اصغر کو مارا پیٹا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان فلموں کی کوئی خاص اہمیت ہے۔" شفیع شاہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "محض ان کا فحش ہونا اہم نہیں ہے۔"

"یہ تو میں پہلے ہی محسوس کر چکا ہوں۔ ظفر جمال نے محض ان کے فحش ہونے کی وجہ سے انہیں فلش کی ناکارہ ٹنکی میں نہیں چھُپایا تھا۔ اس نے یا تو ہنگامی طور پر انہیں وہاں چھُپایا تھا اور بعد میں ساتھ لے جانا بھول گیا یا پھر وہ یہاں سے جاتے وقت انہیں ساتھ لے جانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اس نے سوچا ہو گا کہ پھر کبھی وقت یہاں سے نکال لے جائے گا۔ اسے توقع نہیں رہی ہو گی کہ اصغر اتنی جلدی مکان کی مرمت شروع کرا دے گا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"تو پھر آپ کے خیال میں کچھ دیر پہلے جو لوگ فلموں کے بارے میں پوچھنے آئے تھے اور اصغر کو زخمی کر کے گئے ہیں، وہ ظفر جمال کے آدمی تھے؟" شفیع شاہ نے دریافت کیا۔

"یہ بھی ممکن ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ کوئی دوسری پارٹی رہی ہو جس کے خوف سے ظفر جمال نے فلمیں چھُپائی ہوں۔" میں نے جواب دیا "معاملہ سُلجھنے کے بجائے مزید اُلجھتا جا رہا ہے۔"

"ہم اصغر سے ملنے اسپتال چلیں؟ شاید اس سے حملہ آوروں کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہو سکیں۔" شفیع شاہ بولا۔

"مجھے اس کی اُمید نہیں ہے۔ اس قسم کے بدمعاش آج کل گلی گلی بکھرے ہوئے ہیں جو کلاشنکوف لے کر آئے اور کسی کو مار پیٹ کر یا برسٹ مار کر ہلاک کر کے چلے گئے۔ اصغر بے چارہ ان کے بارے میں کیا بتائے گا۔" پھر میں نے ایک طویل سانس لے کر ایک نظر شفیع شاہ کی طرف دیکھ کر کہا "اس کے علاوہ مجھ میں اخلاقی طور پر بھی اصغر کے سامنے جانے کی ہمت نہیں ہے۔ ایک طرح سے ہم بھی اس کی پریشانی میں اضافے کا سبب ہی بنے ہیں۔ پہلے وہ صرف مالی چوٹ ہی کھائے بیٹھا تھا۔ ہماری وجہ سے اس نے جسمانی چوٹیں بھی کھا لیں۔ اگر ہم اس سے فلمیں چھین کر نہ لے گئے ہوتے تو یقیناً وہ بے چارہ فلمیں ان کے حوالے کر کے جان چھڑا لیتا۔"

"جی ہاں یہ بات تو ہے۔" شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا پھر ایک لمحے خاموش رہ کر اس نے پوچھا "آپ کو یہ اندازہ تو نہیں ہو سکا ہو گا کہ فلمیں اسی بنگلے میں تیار ہوئی تھیں یا نہیں کیونکہ وہ تو اب بالکل خالی اور شکستہ حال پڑا ہے۔"

"اس کے باوجود مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ دونوں فلموں میں کوئی بھی حصہ اس گھر میں نہیں فلمایا گیا۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ کس طرح سر؟"

"مونا والی پوری فلم میں بیڈ روم ایک ہی نظر آیا۔ دو تین جگہ اس کا دروازہ بھی نظر آیا تھا جو میرے ذہن میں رہ گیا۔"

"میں سمجھ گیا سر!" شفیع شاہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "مجھے بھی یاد آگیا ہے۔ وہ وکٹورین اسٹائل دروازہ تھا جبکہ اس پورے گھر میں کوئی دروازہ وکٹورین اسٹائل نہیں تھا۔"

"بالکل ٹھیک سمجھے تم۔" میں نے کہا "وہ کسی بہت ہی عالیشان بنگلے کا بیڈ روم تھا۔ مجھے یقین ہے کہ ظفر جمال والا بنگلا تو جب ٹھیک حالت میں ہو گا تب بھی اس کا پاسنگ نہیں ہو گا۔ یہ تو ایک عام سا بنگلا تھا اور اس کے کمرے کچھ ایسے طویل و عریض بھی نہیں تھے۔"

شفیع شاہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "سر! آپ کی نظر تو ایک سراغرساں کی سی ہوتی جا رہی ہے اور آپ جزئیات پر اسی طرح غور کرنے لگے ہیں۔"

"میری نظر ہمیشہ سے ایسی ہی ہے اور میں اسی طرح جزئیات پر غور کرتا آیا ہوں۔ فرق صرف یہ ہے کہ آج کل تم سے تبادلۂ خیال کرنے کا اتفاق زیادہ ہو رہا ہے۔ ویسے ہم سب کو ہی حالات کے مطابق اپنی ذہنی و جسمانی صلاحیتوں سے کام لینا پڑتا ہے اور ضرورت کے مطابق کسی کردار میں ڈھلنا پڑتا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ تم سمیت میرے تقریباً سبھی ساتھی ایسا کر لیتے ہیں۔"

"ہم تو بس گزارا کرتے ہیں سر!" وہ انکساری سے بولا۔

"یہ گزارا ہی میرے لئے کافی ہے۔" میں نے کہا "اب تمہیں

بھی ذرا ایک سراغرساں کے سے انداز میں حرکت میں آتا ہے اور جلد از جلد کچھ باتیں معلوم کرنی ہیں۔"

"وہ کیا سر؟" اس نے دریافت کیا۔ اس وقت ڈرائیونگ بھی وہی کررہا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر تھا اور ایک کہنی بے پروائی سے کھڑکی میں ٹکی ہوئی تھی۔ موڑ کاٹتے وقت بھی وہ دوسرے ہاتھ کو کم ہی زحمت دیتا تھا۔ اس کا انداز ہمیشہ ایسا ہی مشاقانہ ہوتا تھا۔ گاڑی جتنی زیادہ بڑی اور جتنی زیادہ شاندار ہوتی تھی وہ اتنی ہی زیادہ بے پروائی سے ڈرائیو کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شاندار گاڑی کا یہی تو سب سے بڑا فائدہ تھا کہ وہ اشارے پر چلتی تھی۔

"سب سے پہلے تو تم یہ معلوم کرو کہ یہ فلمیں مارکیٹ میں تو نہیں چل رہی ہیں۔" میں نے کہا "ہمارے ہاں ہر قسم کے ویڈیو فلموں کا کافی بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ کافی بڑی مارکیٹ کام کررہی ہے۔ اس میں ایک بڑا حصہ فحش فلموں کا بھی ہے۔ اس سرکل کے بڑے گرگوں کو پکڑنے کی کوشش کرو۔ اگر یہ فلمیں اوپن مارکیٹ میں نہیں چل رہی ہیں تب بھی ان بڑے گرگوں سے دوستانہ انداز میں ان کے بارے میں کوئی نہ کوئی کام کی بات معلوم ہوسکتی ہے۔ شاید اس طرف بھی کوئی واضح اشارہ مل جائے کہ ان فلموں کی تیاری میں کن لوگوں کا ہاتھ ہوسکتا ہے۔ ہر فیلڈ کے لوگ اپنے شعبے کے ٹیکنیکل لوگوں کو جانتے ہیں اور ان کے کام کو پہچانتے ہیں۔ شاید کچھ "ماہرین" ان فلموں کو دیکھ کر ان کے بارے میں بھی کچھ رہنمائی کرسکیں۔"

"یہ تو کافی مشکل کام ہے سر!" شفیع شاہ تشویش آمیز انداز میں سر کھجاتے ہوئے بولا۔

"میں خوب سمجھ رہا ہوں۔" میں نے اس کے کندھے پر ہلکا سا گھونسا مارتے ہوئے کہا "تم نے آج تک کسی کام کو مشکل نہیں کہا۔ یہ کام دراصل تمہیں مشکل نہیں بلکہ معیوب لگ رہا ہے۔ تمہیں اس قسم کی معلومات حاصل کرنے کے لئے ایسے حلقوں میں جانا کچھ اچھا نہیں لگ رہا کیونکہ یہ تمہاری نظر میں ایک گھٹیا کام ہے۔ مجھے اس پر خوشی بھی ہے کہ آج کے دور کا نوجوان ہوتے ہوئے بھی تمہارے رجحانات آج کے دور کے نوجوانوں جیسے نہیں ہیں لیکن کام کو تو بہرحال کام سمجھ کر کرنا پڑتا ہے۔ تمہیں معلوم ہی ہے پچھلے دنوں ریڈ ڈاٹ کے خلاف جدوجہد کے دوران ہم میں سے کوئی فقیر بنا ہوا تھا' کوئی ڈرائیور' کوئی بندر کا تماشا دکھا رہا تھا تو کوئی خانہ بدوش بنا ہوا تھا۔ یہ سب روپ عارضی تھے۔ ایک اچھے مقصد کے حصول کے لئے نہ جانے کیا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ تم چند دن کے لئے بھول جانا کہ تم شفیع شاہ ہو۔"

"اوکے سر!" اس نے فوراً ہی سعادت مندی سے کہا۔

"یہ ضروری بھی نہیں ہے کہ ساری پوچھ گچھ تم خود ہی کرو اور ہر جگہ خود ہی جاؤ۔" میں نے اسے تسلی دی "میرا مقصد صرف یہ ہے کہ یہ شعبہ میں تمہارے سپرد کررہا ہوں۔ اب تمہیں خود فیصلہ کرنا ہے کہ یہ معلومات کس طرح حاصل کی جائیں۔ اس مقصد کے لئے کچھ لوگوں کی خدمات حاصل کرنا ضروری ہوں تو کرلو۔ روپیہ خرچ ہوتا ہو تو کرو۔ جتنی بھی رقم خرچ ہو' پروا مت کرو۔ جب ہم نے ایک کام کے لئے کمر کس ہی لی ہے تو پھر اسے کرکے چھوڑیں گے۔ اب نفع نقصان کی پروا نہیں ہے۔ تمہیں خود زیادہ سامنے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایک جگہ بیٹھ کر ڈوریاں بھی ہلا سکتے ہو لیکن کام ذرا تیزی سے کرنا ہے۔ تم باقی سب کچھ چھوڑ دو۔ بس یہ معلومات حاصل کرنے میں لگ جاؤ۔"

"میں سمجھ گیا سر! جو کچھ بھی ممکن ہوا وہ ضرور ہوجائے گا۔" اس کے لہجے میں وہی پرانا اعتماد لوٹ آیا تھا۔

"اسی ضمن میں تمہیں ایک کام اور کرنا ہے یا کسی سے بھی کروانا ہے۔ وہ معیوب نہیں ہے۔" مجھے یاد آیا "مونا والی فلم میں ہم نے مشہور آرٹسٹ ہادی کی ایک پینٹنگ دیوار پر آویزاں دیکھی تھی۔ اس کا باقاعدہ ایک عنوان بھی تھا "شام اور سویرا" وہ ایک بڑے آرٹسٹ کی بڑی پینٹنگ تھی۔ اس قسم کی پینٹنگ بڑے اہتمام سے بکتی ہیں۔ وہ اگر کسی نمائش وغیرہ کے بعد کسی گیلری کے توسط سے بکی ہوگی تب بھی اس کا کوئی نہ کوئی ریکارڈ موجود ہوگا اور اگر کسی نے آرٹسٹ سے براہِ راست خریدی ہوگی تب بھی آرٹسٹ کو یاد ہوگا۔ شہر میں چند ہی آرٹ گیلریز یا ایسی جگہیں ہیں جہاں پینٹنگز کی نمائش ہوتی ہے۔ تم ان سے اور آرٹسٹ ہادی سے براہِ راست رابطہ کرکے صرف یہ معلوم کرو کہ پینٹنگ "شام اور سویرا" کس نے خریدی تھی۔"

"یہ تو کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ یہ تو میں معلوم کرلوں گا۔" شفیع شاہ بے پروائی سے بولا۔

"میرا خیال ہے اگر ہم نے سلیقے سے اپنے ذہن اور ہاتھ پیروں کو استعمال کیا تو ہم ان فلموں کے سارے چکر کی تفصیلات بھی معلوم کرلیں گے اور مونا کو بھی ڈھونڈ نکالیں گے۔" میں نے پُرامید لہجے میں کہا۔

"سر! میں بھی اپنے آپ کو کچھ پُرجوش اور ہیجان زدہ محسوس کررہا ہوں جیسے یہ کوئی اہم کام ہے۔ پہلے میں محض کوئی چھوٹا موٹا اخلاقی فریضہ سمجھ کر بس یونہی نیم دلی سے انجام دینے کی سوچ رہا تھا۔" شفیع شاہ بولا۔

اس دوران ہم ہوٹل پہنچ چکے تھے۔ شفیع شاہ میرے ساتھ ہی رہا۔ ہم آفس پہنچے تو دیکھا امبر اور عذرا میرے ہی کمرے میں بیٹھی تھیں۔ ان کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ میری ہی منتظر تھیں۔ عذرا کی آنکھیں کچھ پھیلی پھیلی سی نظر آرہی تھیں۔ وہ مجھے کچھ اس طرح دیکھ رہی تھی جیسے میں کسی اور سیارے کی مخلوق تھا تاہم اس نے نہ صرف بڑے ہی ادب و احترام سے مجھے سلام کیا بلکہ مجھے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر اُٹھ بھی کھڑی ہوئی۔

میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے خود بھی اپنی کرسی سنبھالی اور امبر سے پوچھا "تم ابھی تک گھر نہیں گئیں؟ رات ہوچکی ہے۔ کیا آج کام زیادہ تھا؟"

"نہیں سر! میں تو شام کو چلی گئی تھی۔ گھر جاکر دوبارہ آئی ہوں۔ مجھے یہ زبردستی لائی ہے۔" اس نے عذرا کی طرف اشارہ کیا "یہ آپ سے آج ہی دوبارہ ملاقات کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ حالانکہ میں نے گھر سے فون کرکے معلوم کرلیا تھا کہ آپ ہوٹل میں موجود نہیں ہیں اور آپ کا کچھ پتا بھی نہیں ہے کہ آپ کہاں گئے ہیں۔ آپ کے موبائل فون پر بھی کال ریسیو نہیں کی جارہی تھی۔"

شاید اس کا فون اس وقت آیا ہو جب ہم میڈم نور کے ہاں گھسے ہوئے تھے۔ اس وقت میں فون باہر گاڑی میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ بہرحال میں خاموش رہا۔

امبر بات جاری رکھتے ہوئے دوبارہ عذرا کی طرف اشارہ کرکے بولی "لیکن یہ بضد رہی کہ ہمیں ضرور آپ سے ملنا چاہئے خواہ کتنی ہی دیر انتظار کرنا پڑے۔ مجبوراً مجھے آنا پڑا۔ ویسے ہمیں یہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی۔"

اس نے ایک نظر میرے اور شفیع شاہ کے سنجیدہ چہروں کی طرف دیکھا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی "سر! اگر آپ زیادہ مصروف ہیں تو اس عذرا کی بچی کو ذرا سمجھا دیجئے کہ یہ پھر کسی وقت آجائے۔"

"نہیں ایسی کوئی خاص مصروفیت تو نہیں ہے۔" میں نے عذرا کی طرف دیکھا "اور جو مصروفیت ہے وہ بھی انہی کی بخشی ہوئی ہے۔" میں نے اپنا لہجہ نرم ہی رکھا تھا اور تھوڑا سا مسکرانے کی بھی کوشش کی تھی جس سے شاید عذرا کو کچھ حوصلہ ہوا۔

اس کا استخوانی سا چہرہ دوپٹے کے حلقے میں گھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے بھرے بھرے عنابی ہونٹوں پر..... جو اس کے چہرے کا واحد خوب صورت ترین حصہ تھے۔ قدرے نروس انداز میں زبان پھیر رہی تھی۔ موٹے شیشوں والی عینک کے عقب میں آنکھیں بدستور پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی رنگت بھی اُجلی تھی اور اس کا دوپٹا بھی سفید برف سا تھا۔ اس عالم میں وہ اپنی پختہ عمری کے باوجود نہایت معصوم اور پاکیزہ سی لگی۔ اس کی شخصیت میں ہلکا سا تقدس ضرور تھا اور پھر وہ ایک ٹیچر تھی!

میں غیرارادی طور پر ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ دراصل میرے ذہن میں مونا والی فلم کے کچھ مناظر گھوم رہے تھے اور میں اس تضاد پر غور کررہا تھا۔ بڑی بہن کیا تھی اور کس دنیا میں رہ رہی تھی۔ چھوٹی بہن نہ جانے کس دنیا میں پہنچی ہوئی تھی اور کیا کچھ کرچکی تھی' کیا کچھ کررہی تھی؟ یہ تضاد حیران کن اور عبرت انگیز تھا۔

مجھے یوں بغور اپنی طرف دیکھتے پاکر عذرا کی سفید سی رنگت میں نہایت ہلکی سی سُرخی نمودار ہوئی تاہم وہ اپنے اضطراب کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے میٹھی میٹھی سی آواز میں بولی "افضل صاحب! سب سے پہلے تو میں آپ کا شکریہ ادا کروں گی کہ آپ نے مونا کو تلاش کرنے کی ہامی بھرلی ہے۔ امبر نے جب مجھے یہ بتایا تو مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا کیونکہ آپ کا انکار سننے کے بعد میں بڑی ہی دل شکستگی کے عالم میں یہاں سے رخصت ہوئی تھی۔ میرا خودکشی کرنے کو دل چاہ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو نہیں تھے مگر میں اندر ہی اندر رو رہی تھی۔

میں باہر فٹ پاتھ پر چلی جارہی تھی۔ میرے چاروں طرف بلند و بالا' صاف ستھری عمارتیں تھیں۔ سڑکوں پر گاڑیوں کی نہ ٹوٹنے والی قطاریں تھیں۔ پیدل آنے جانے والے بھی کچھ کم نہیں تھے لیکن میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ اس وقت میں اپنے آپ کو کتنا تنہا محسوس کررہی تھی۔ ہم جیسے کم مایہ اور معمولی لوگ ویسے بھی بڑے تنہا ہوتے ہیں سر! کوئی ان کی مدد کرنے والا نہیں ہوتا۔ ہم جیسے' مسائل میں گھرے ہوئے لوگوں سے دوسرے لوگ ویسے ہی دور بھاگتے ہیں کہ کہیں ہم کوئی سوال نہ کردیں' کوئی مدد نہ مانگ لیں۔

آپ تو پھر بھی اتنے بڑے.... اتنے مصروف آدمی ہیں۔ آپ سے ہماری کوئی شناسائی' کوئی واقفیت بھی نہیں تھی۔ آپ پر ہمارا کوئی حق بھی نہیں بنتا تھا۔ آپ نے انکار کیا تھا تو ٹھیک ہی کیا تھا۔ میں اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کررہی تھی لیکن دل تھا کہ بدستور رنجیدہ تھا۔ مجھے جو دکھ' جو مایوسی ہوئی تھی وہ تو اپنی جگہ تھی لیکن مجھے ایک عجیب طرح کا توہین کا احساس بھی ہورہا تھا۔ شاید میں امبر کی وجہ سے کچھ زیادہ ہی مان سے آپ کے پاس آئی تھی اور آپ نے وہ مان توڑ دیا تھا۔ میں... میں... جھوٹ نہیں بولوں گی۔ سچی بات یہ ہے کہ اس وقت میں آپ سے نفرت محسوس کررہی تھی۔" اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔ وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئی۔ اس کے ہونٹ نیم وا تھے۔ وہ گویا ایک تھکے ہوئے پرندے کی طرح ہانپ رہی تھی۔

میں اس کی صاف گوئی پر بے ساختہ مسکرادیا۔ اس کا لہجہ دھیما اور اندازِ بیاں دل نشیں تھا۔ وہ اپنے محسوسات کو عمدگی سے بیان کرسکتی تھی۔ میں' امبر اور شفیع شاہ تینوں ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ کلاس روم میں بھی شاید وہ اسی طرح سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالیتی ہوگی۔

میں نے اپنی زندگی میں یہ پہلی کلاس ٹیچر دیکھی تھی جو اتنے دھیمے لہجے میں بات کرتی تھی ورنہ کلاس روم میں بچوں کو پڑھانے والوں کو عموماً چیخ کر اور کرخت لہجے میں بات کرنے کی عادت پڑجاتی ہے۔ عام زندگی میں بھی کچھ ایسا ہی لگتا ہے جیسے وہ بات نہیں کررہے بلکہ کلاس کو ڈانٹ ڈپٹ رہے ہیں۔ شاید عذرا نے کلاس روم اور عام زندگی کے اندازِ گفتگو کے درمیان ایک حدِفاصل قائم رکھی تھی۔

"آپ نے میری بات کا بُرا تو نہیں منایا سر؟" اس نے ملتجیانہ سے لہجے میں پوچھا۔ شاید میری مسکراہٹ سے بھی اسے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ اسے یہی شبہ تھا کہ شاید میرے دل میں غصّہ ہو حالانکہ میرے دل میں پہلے بھی اس کے لئے غصّہ نہیں تھا اور اب تو میرے دل میں اس کے لئے صرف ہمدردی ہی ہمدردی تھی۔ وہ ایک چیونٹی کی طرح نہایت مستقل مزاجی سے.... نہایت لگن سے.... اپنی دُھن میں.... اپنی منزل کی طرف سفر کرنے والی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ وہ خواہ کتنی ہی معمولی لڑکی تھی اور اس کی منزل بھی خواہ کتنی ہی معمولی رہی ہو لیکن اس کے مزاج کے دھیمے پن اور اس کی استقامت میں ایک عجیب طرح کی کشش تھی۔

"میں اب تمہاری کسی بھی بات کا بُرا منانا چاہوں تو اس کے لئے مجھے کافی کوشش کرنا پڑے گی۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "تم مجھے یہ بتاؤ کہ جب وہ شکستہ دل لڑکی اونچی عمارتوں اور بیچے انسانوں کے اس جنگل میں فٹ پاتھ پر تنہا چلی جارہی تھی تو کیا ہوا؟ کیا کوئی گاڑی بریکوں کی چرچراہٹ کے ساتھ اس کے قریب آکر رُکی؟"

"جی ہاں" اس کی پتلی پتلی سفید انگلیاں میز پر رکھے ایک پیپر ویٹ پر سختی سے جم گئیں "وہ ایک بڑی سی سفید گاڑی تھی۔ انہوں نے مجھے اتنی پھرتی سے اندر کھینچا کہ میں گاڑی کے رنگ کے سوا کچھ بھی نہیں دیکھ سکی۔ میرے منہ پر ایک ہاتھ سختی سے جم چکا تھا۔ میں چیخ بھی نہیں سکی اور یہ ایک بھری پُری سڑک پر ہو رہا تھا۔ بہت سے لوگوں نے یہ سب کچھ دیکھا ہوگا لیکن کسی نے بھی کچھ نہیں کیا۔ لوگوں اور گاڑیوں کا سیلاب اسی طرح رواں رہا۔ کسی طرف سے کوئی چیخ' کوئی بلند آواز تک سُنائی نہیں دی۔" اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اس کے لہجے میں بے پناہ تاسف تھا۔

"شہروں پر اب اسی آسیب کا تو سایہ ہوتا جارہا ہے۔" میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "ہم نے اب ہر اس سانحے سے نظر چُرا کر جینا سیکھ لیا ہے جس کا تعلق ہماری ذات سے نہ ہو۔ بلکہ اگر کسی ایسے پر قیامت گزرے جس سے ہمارا زبان' عقیدے' مسلک یا سیاست کا اختلاف ہو تو ہم خوشی سے بغلیں بھی بجاتے ہیں۔ خیر.... تو پھر کیا ہوا؟"

وہ جھرجھری سی لے کر بولی "انہوں نے جلد ہی گاڑی ایک بغلی گلی میں موڑ لی پھر اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی گلیوں میں گھماتے ہوئے میرے دونوں پہلوؤں میں گنیں چبھوتے ہوئے وہ پوچھنے لگے کہ میں آپ کے پاس کس سلسلے میں گئی تھی۔ میں نے بتادیا..... بالکل سچ سچ بتادیا کہ میں آپ کے پاس کیوں آئی تھی۔ انہیں پہلے ہی اندازہ تھا... اور یہ میرے لئے حیرت کی بات تھی۔ بہرحال پھر وہ پوچھنے لگے کہ آپ نے کیا جواب دیا۔ میرے منہ سے قطعی غیر ارادی طور پر نکلا کہ آپ نے مونا کو تلاش کرنے کی ہامی بھرلی تھی۔ معلوم نہیں یہ میری لاشعوری خواہش تھی یا میں انہیں بھی آپ کے انکار کے بارے میں بتاتے ہوئے شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ انہوں نے مجھے' آپ کو' مونا کو چند گندی گندی گالیاں دیں پھر آپ کے بارے میں کہنے لگے کہ آپ سے تو وہ خود ہی نمٹ لیں گے۔

"میرے بارے میں ان کی طرف سے حکم صادر ہوا کہ میں فوراً اپنی منحوس شکل لے کر دفع ہو جاؤں اور دوبارہ کراچی میں نظر نہ آؤں ورنہ میرا جو حشر ہوگا اس پر آسمان بھی آنسو بہائے گا۔ پھر انہوں نے یہ بھی جتادیا کہ میرا خوب صورت اور پُرکشش نہ ہونا میری خوش قسمتی تھی ورنہ اس وقت جس طرح انہوں نے مجھے اٹھانے کی زحمت کرلی تھی' وہ مجھے ساتھ ہی لے جاتے۔ انہوں نے ایک سنسان سی گلی میں مجھے لات مار کر گاڑی سے نیچے پھینک دیا۔ محاورتاً نہیں.... انہوں نے حقیقتاً میری کمر پر لات ماری تھی۔" وہ بے اختیار کمر پر ہاتھ رکھ کر کراہی گویا وہ لمحہ یاد آنے پر تکلیف عود کر آئی ہو۔

"انسان کبھی دوسروں کے انجام سے سبق نہیں لیتا۔ فرعونیت اگر ایک بار اس کے دماغ میں گھس جائے تو پھر آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتی۔" میں نے کہا "جو لوگ تمہارے ساتھ یہ سلوک کر رہے تھے' کچھ دیر بعد ان کی لاشیں یہاں بکھری پڑی تھیں۔" میں نے چاروں طرف اشارہ کیا۔ آفس کی صفائی وغیرہ کرکے ہر چیز بالکل ٹھیک ٹھاک کردی گئی تھی۔ اب اسے دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ چند گھنٹے پہلے وہاں لاشیں پڑی تھیں اور ہر چیز اُلٹ پلٹ تھی۔

"جی سر۔ امبر نے مجھے بتایا ہے کہ یہاں تو کافی خون خرابا ہوا۔ خود آپ کی جان خطرے میں پڑ گئی تھی۔" وہ بڑی تشویش سے بولی۔

"خطرات تو زندگی کے ساتھ ہیں۔" میں نے بے پروائی سے کہا "جو اپنی دانست میں خطرات مول نہیں لے رہے ہوتے ان کی زندگی کو بھی نہ جانے کون کون سے خطرات لاحق رہتے ہیں۔" اب میں اسے کیا بتاتا کہ میری جان کتنی مرتبہ خطرے میں پڑ چکی تھی۔ وہ شاید اسے ایک افسانہ سمجھتی۔ نہ جانے کب تک زندگی اسی طرح گزرنی تھی اور نہ جانے کس موڑ پر زندگی کا سورج غروب ہو جانا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "جب تمہیں گاڑی سے نیچے پھینک دیا گیا تو پھر تم نے کیا کیا؟"

"ہم جیسی لڑکیاں اس قسم کے معاملات میں رونے کے سوا کیا کرسکتی ہیں سر!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تاہم میں نے رونے سے پہلے خدا کا شکر ادا کیا کہ جان اور عزت بچ گئی تھی۔ تھوڑی سی توہین اور معمولی چوٹوں پر ہی بات ٹل گئی تھی۔ گلی چونکہ سنسان تھی اس لئے پھر میں نے چلتے چلتے تھوڑے سے آنسو بھی بہا لیے جس سے کسی حد تک دل کا غبار نکل گیا۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد مجھے ایک رکشا مل گیا اور میں گھر چلی گئی۔ میرا مطلب ہے امبر کے گھر۔" اس نے امبر کی طرف اشارہ کیا "وہاں میں نے اپنا حلیہ ٹھیک کیا' کپڑے بدلے اور اپنے کمرے میں بیٹھ کر اس واقعے کے بارے میں سوچ سوچ کر دیر تک کانپتی رہی۔ امبر کے گھر میں' میں نے کسی کو اس سلسلے میں کچھ نہیں بتایا۔ مجھے امبر کا انتظار تھا۔ امبر آئی تو اس کی حالت مجھ سے زیادہ خراب تھی۔ تاہم یہ اپنے آپ کو بہت جرأت سے سنبھالے ہوئے تھی۔ تنہائی میں بیٹھ کر ہم نے ایک دوسرے کو اپنی داستانِ غم سُنائی۔"

پھر وہ سر جھکاتے ہوئے بولی "سر! آپ نے خواہ ضد میں آکر.... یا کسی اور وجہ سے مونا کو تلاش کرنے کی ہامی بھری ہے۔ لیکن میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ نے ہامی بھری ہے۔ میں آپ کا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھول سکوں گی۔ میں یہاں سے جتنا شکستہ دل لے کر گئی تھی' اب میں اتنی ہی خوش ہوں حالانکہ ابھی مونا ملی نہیں ہے۔"

پھر اس نے سر اُٹھایا۔ اس کے تراشیدہ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی "لیکن.... افضل صاحب! اس وقت درحقیقت میں یہ سب باتیں کرنے نہیں.... بلکہ کچھ اور بتانے آئی تھی۔" اس نے امبر کی طرف دیکھا "ذرا وہ خط نکالو اور افضل صاحب کو دکھاؤ۔"

امبر نے اثبات میں سر ہلایا اور اپنے ہینڈ بیگ میں سے ایک خاکی لفافہ نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "یہ خط اصل میں عذرا کی والدہ کو موصول ہوا تھا۔ انہوں نے میرے پتے پر عذرا کے لئے بھیج دیا ہے۔"

لفافہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے اس میں سے خط نکالا۔ وہ کسی وکیل کے لیٹر ہیڈ پر ٹائپ شدہ خط تھا جو اس نے حیدر آباد سے مونا کے نام لکھا تھا۔ انگریزی میں اس خط میں رسمی اور قانونی زبان میں اسے اطلاع دی گئی تھی کہ حیدر آباد میں اس کے رشتے کے چچا کا انتقال ہوگیا تھا۔ انہیں دل کا دورہ پڑا تھا جس کے بعد وہ چند دن صاحب فراش رہے۔ اس دوران انہوں نے اپنی وصیت مرتب کرائی۔ چند دن بعد انہیں اسپتال میں ہی دوسرا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہوسکے۔

وہ لاولد مرے تھے اور وصیت کے مطابق انہوں نے اپنی تمام جائیداد اور نقد روپیہ وغیرہ مونا کے نام چھوڑا تھا۔ لطیف آباد میں ایک بڑی کوٹھی تھی۔ ایک فلور مل تھی۔ کچھ دیگر اثاثے تھے۔ نقد رقم تھی۔ سب ملا جلا کر تقریباً ستّراسّی لاکھ مالیت کا ترکہ تھا جس کی قانونی وارث مونا بن چکی تھی۔

خط میں اس سے درخواست کی گئی کہ مونا حیدر آباد آکر یہ تمام چیزیں اپنے نام منتقل کرانے کی کارروائیاں مکمل کرالے اور ان کا انتظام سنبھال لے۔ اس کے بعد وہ مرضی کی مالک ہوگی کہ جائیداد وغیرہ اسی طرح رکھے یا اسے فروخت کردے۔

وکیل نے وصیت نامے کی فوٹو اسٹیٹ بھی ہمراہ منسلک کی تھی۔ میں نے اس پر نظر دوڑائی۔ اس میں مونا کے چچا کے انگریزی میں ٹائپ شدہ الفاظ کا مفہوم کچھ یہ تھا کہ مونا جب اس کے پاس رہنے کے ارادے سے آئی تھی تو اس نے مونا کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا جس کا اسے بہت بعد میں احساس ہوا تھا۔

پھر اس پر دل کا دورہ پڑا اور اس نے گویا موت کو بہت قریب سے دیکھا۔ وہ صاحبِ فراش تھا تو مونا کے سلسلے میں اس کا پچھتاوا شدید تر ہوگیا۔ اس کی زندگی کا کوئی بھروسا نہیں تھا۔ وہ لاولد تھا۔ اسے اپنے سلوک کی تلافی کا سب سے بہتر طریقہ یہی نظر آیا تھا کہ وہ اپنی تمام دولت و جائیداد مونا کے نام کر جائے۔ اس کی موت کے بعد وہ اس کی وارث ہو۔

"ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا۔" میں نے یہ کہتے ہوئے خط شفیع شاہ کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بھی دونوں چیزیں پڑھیں۔ اس دوران کمرے میں گہرا سکوت رہا۔ امبر اور عذرا کبھی میری طرف اور کبھی شفیع شاہ کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

خط اور وصیت نامہ پڑھ کر شفیع شاہ نے میری طرف دیکھا اور ہم دونوں گہری سانس لے کر رہ گئے۔ صرف ہم دونوں کو معلوم تھا کہ مونا کے رشتے کے چچا نے جو یہ لکھا تھا کہ اس نے مونا کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا تو اس سے درحقیقت اس کی کیا مراد تھی۔ میڈم نور کے بورڈنگ ہاؤس میں ملنے والی لڑکی سیمیں نے اگر ہمیں اصل بات نہ بتائی ہوتی تو ہم بھی اسے ایک عام سی بات ہی سمجھتے۔ ہمیں حالات کی اس ستم ظریفی نے بھی چند لمحے کے لئے افسوس زدہ سے انداز میں خاموش رہنے پر مجبور کردیا تھا کہ ایک لڑکی کو قسمت نے عجیب و غریب انداز میں ستّراسّی لاکھ کے اثاثوں کا مالک بنادیا تھا لیکن اس کا کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں تھی۔

عذرا میری اس سوچ کو الفاظ کی صورت میں زبان پر لاتے ہوئے حسرت آمیز لہجے میں بولی "اب جب ہمارے دن پھرنے کا وقت آیا تو وہ سدا کی غیرت دار لڑکی نہ جانے کہاں غائب ہے۔"

یہ تو ہمیں بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں غائب تھی لیکن فلم کی صورت میں ہم اس کی جو سرگرمی دیکھ چکے تھے اس کے بارے میں بھی عذرا یا امبر کو کچھ نہیں بتاسکتے تھے۔ میں خاموشی سے عذرا کی طرف دیکھتا رہا اور مونا کے بارے میں سوچتا رہا۔

عذرا پہلو بدلتے ہوئے بولی "افضل صاحب! اس وصیت کے سلسلے میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"

"فی الحال تو آپ وکیل صاحب کو لکھ دیں کہ مونا کہیں گئی ہوئی ہے جہاں اس سے رابطہ نہیں ہو رہا۔ جونہی وہ واپس آئے گی' اسے حیدر آباد بھیج دیا جائے گا۔ تب تک جائیداد اور دیگر اثاثوں کو "جہاں ہے اور جیسا ہے" کی بنیاد پر رکھا جائے۔" میں نے جواب دیا۔

"بہت بہتر۔" عذرا سعادت مندی سے بولی "آپ سے مشورہ کرکے میرے دل کو سکون مل گیا ہے۔" پھر اس نے پُرامید لہجے میں پوچھا "مونا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ میری بہن مل

جائے گی نا؟"

"امید تو ہے۔" میں نے کہا "ویسے بہتر یہی ہے کہ مجھ سے مت پوچھو۔ بس اوپر والے کے نام عرضی بھیج دو اور اسی کے آسرے پر بیٹھ جاؤ۔"

"اسی کے آسرے پر تو میں اور امی پہلے ہی بیٹھی ہوئی ہیں۔" عذرا ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی "اسی نے تو آپ کو ہمارے لئے وسیلہ بنایا ہے۔" پھر وہ اُٹھتے ہوئے بولی "اب میں چلتی ہوں۔ میری وجہ سے آپ کو اب تک جو تکلیف اُٹھانا پڑی اس کے لئے میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں۔" اس نے سچ مچ نہایت سنجیدگی سے ہاتھ جوڑ دیئے۔

مجھے ہنسی آگئی۔ میں نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا "بس بس۔ اس طرح معافیاں مانگنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

امبر بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور مسکراتے ہوئے عذرا کا ہاتھ تھام کر بولی "سر! میری یہ دوست بڑی سادہ دل اور جذباتی ہے۔ اس کے ہر جذبے میں بڑی شدت ہوتی ہے۔ کسی سے خفا ہو تو زندگی بھر کے لئے خفا ہو جاتی ہے۔ کسی کی شکر گزار ہو تو زندگی بھر شکر گزار رہتی ہے اور بڑی شدت سے رہتی ہے۔ کسی سے محبت کرے تو بڑی شدت سے کرتی ہے۔ نفرت کرنے تو بڑی شدت سے کرتی ہے۔ آپ اس کی شخصیت پر نہ جایئے گا۔ بظاہر یہ جتنی کمزور اور سرد مزاج نظر آتی ہے اس کی سوچیں اتنی ہی طاقتور اور مزاج میں اتنی ہی آتش فشانی ہے۔"

"سچ... مگر کمزور لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ایک بڑی خرابی اس میں یہ ہے کہ اپنے کسی بھی جذبے کو چھپا نہیں سکتی۔" امبر ذرا محبت سے اسے ایک بازو کے حلقے میں لیتے ہوئے بولی "یہ آپ کے پاس جتنے مان سے آئی تھی لیکن آپ نے جس طرح مونا کی تلاش میں مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا اس کے بعد یہ آپ سے اتنی ناراض ہو گئی تھی کہ شاید زندگی بھر آپ کو کوستی رہتی۔ شاید کبھی آپ کے ہوٹل کے سامنے والے فٹ پاتھ سے بھی نہ گزرتی۔ وہ تو یہاں اچھی بھلی خون ریزی ہو گئی اور آپ نے بدمعاشوں کے سامنے صفائی پیش کرنے والے انداز میں یہ نہیں کہا کہ آپ تو مونا کی تلاش کے سلسلے میں انکار کر چکے تھے۔ بس آپ کی اس ادا سے اس کا دل موم ہو گیا اور یہ آپ پر واری صدقے ہونے آگئی۔ اب آپ مونا کی تلاش کے سلسلے میں جتنی زیادہ زحمت اُٹھائیں گے۔ یہ اتنی ہی زیادہ شکر گزاری کے ساتھ زندگی بھر آپ کے قدموں میں لوٹتی رہے گی۔"

عذرا کے برف سے سفید رخساروں پر ہلکی سی سُرخی نمودار ہوئی اور وہ دانت پیس کر امبر کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "اگر تم مجھے جانتی ہی ہو تو کم از کم افضل صاحب کے سامنے میری شخصیت کا اس طرح پوسٹ مارٹم تو نہ کرو۔"

"بے فکر رہو۔ اس سے افضل صاحب کی نظر میں تمہاری عزت کم نہیں ہوگی بلکہ شاید کچھ بڑھ ہی جائے گی۔" امبر نے گویا اسے تسلی دی۔

پھر وہ دونوں رخصت ہو گئیں۔ ان کے جانے کے بعد میں اور شفیع شاہ دیر تک خاموش بیٹھے ٹکر ٹکر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ آخر میں نے دھیمے لہجے میں کہا "شفیع شاہ! میں نے اچھا کیا جو عذرا یا امبر کو مونا کی اس فلم کے بارے میں نہیں بتایا؟"

"آپ نے بہت ہی اچھا کیا سر!" شفیع شاہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بلا تامل بولا "میرے خیال میں تو ان دونوں کو یہ بات بتانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔"

"میں نے بھی یہی محسوس کیا۔ اسی لئے اس سلسلے میں میری زبان بند رہی۔" میں نے کہا "بلکہ میرا خیال ہے ہم مونا کے بارے میں اب تک معلوم ہونے والی یا آئندہ معلوم ہونے والی کوئی بھی معیوب بات عذرا کو نہیں بتا سکتے۔ اسے اور اس کی ماں کی خوش گمانی کو جو دھچکا پہنچے گا اسے شاید وہ دونوں برداشت نہ کر سکیں۔"

"بے شک۔" شفیع شاہ نے تائید کی پھر اُٹھتے ہوئے بولا "اب میں بھی چلتا ہوں۔ میرا خیال ہے وہ کام اسی وقت شروع کر دیئے جائیں جو آپ نے میرے سپرد کئے ہیں۔"

اس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور حالات پر از سرِ نو غور کرتا رہا۔ اسی دوران دروازہ نہایت آہستگی سے کھلا اور زرتاج اندر آگئی۔ وہ نہایت نفیس قسم کی سیاہ پتلون اور ڈھیلی ڈھالی پیلی مردانہ قمیص میں تھی۔ سر پر ایک خوبصورت سی پی کیپ تھی۔ آج کل اس کا زور مغربی لباسوں پر تھا۔ دو انگلیوں سے پی کیپ کے چھجے کو چھوتے ہوئے وہ خوشگوار لہجے میں بولی "ہیلو باس! کیا خبریں ہیں؟"

"ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی......." میں نے مصرعہ ادھورا چھوڑ دیا اور گہری نظر سے اس کے کھلے کھلے شگفتہ سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "میں تمہارا باس کب سے ہو گیا؟"

"بہت دنوں سے ہو۔ تمہیں اطلاع دیر سے ملی ہے۔" اس نے بے پروائی سے جواب دیا اور میرے مقابل آبیٹھی۔ اس کی خوشبو نے کمرے کو مہکا دیا تھا۔

میں خاموش رہا تو وہ اپنی کرسی کو دھیرے دھیرے گھماتے ہوئے بغور میری طرف دیکھ کر بولی "کیا بات ہے۔ منہ اتنا کیوں بنا ہوا ہے؟ کیا محبوبۂ دلنواز یاد آرہی ہے؟"

"کون سی محبوبۂ دلنواز؟" میں نے اسے گھورا۔

"کیا تمہاری ایک سے زیادہ محبوبائیں ہیں؟" اس نے جواب دینے کے بجائے اُلٹا مجھ سے سوال کر دیا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا۔

"تو بس پھر تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ میں اسی بلیک اینڈ وہائٹ... آدھے سیاہ، آدھے سفید چہرے والی لڑکی کی بات کر رہی ہوں۔" زرتاج بولی۔

"زرتاج پلیز" میں نے تکلیف زدہ لہجے میں کہا "اس کا تذکرہ ایسے استہزائیہ انداز میں مت کرو۔ مجھے اچھا نہیں لگتا۔"

"آئی ایم سوری" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "میں نے اپنی دانست میں تو انتہائی سرسری لہجے میں بات کی تھی۔ میں تمہیں پہلے بھی بتا چکی ہوں کہ میں اتنے چھوٹے ذہن کی لڑکی تو نہیں ہوں کہ رقابت میں مبتلا ہو کر کسی کی ایسی کمزوریوں کا مضحکہ اُڑانے لگوں جن پر اس کا کوئی اختیار نہ ہو۔ کیا تمہیں میرا لہجہ استہزائیہ لگا؟"

"شاید تمہارا لہجہ نہیں، تمہارے الفاظ استہزائیہ رہے ہوں۔" میں نے بے یقینی سے کہا "بہرحال استہزائیہ الفاظ بھی تمہارے شایانِ شان نہیں ہیں۔ میرے ذہن میں تمہارا جو مقام ہے اس سے کوئی بھی معمولی اور عامیانہ چیز میل نہیں کھاتی۔"

"دل رکھنے کا شکریہ۔" وہ مسکرائی "ویسے میں نے تم جیسا صدقِ دل اور دیانت داری سے عشق کرنے والا آج تک نہیں دیکھا۔ میرا خیال تھا کہ ایسے کردار صرف داستانوں میں زندہ رہ گئے ہیں۔"

"جو کردار داستانوں میں پائے جاتے ہیں وہ انیس بیس کے فرق کے ساتھ دنیا میں بھی کہیں نہ کہیں ضرور پائے جاتے ہیں تاہم یہ ضروری نہیں ہوتا کہ ان سب سے ہمارا سامنا بھی ہو۔"

"بہرحال عشق کے معاملے میں تمہاری اس ثابت قدمی اور دیانت داری کی وجہ سے میرے دل میں تمہاری قدر اور بڑھ گئی ہے حالانکہ تمہاری ان باتوں پر مجھے تم سے چڑ ہونی چاہئے تھی۔" اس کے ہونٹوں پر دلکش مسکراہٹ برقرار تھی۔

"دراصل یہ محبتوں کے سلسلے بڑے عجیب اور پُراسرار ہوتے ہیں۔"

"کبھی کبھی تم بڑی دانشوروں جیسی باتیں کرتے ہو۔" وہ گویا محظوظ ہوتے ہوئے بولی۔

"شاید میری اس کھوپڑی میں کوئی کمزور سا دانشور بھی مقید ہے لیکن جب وہ دیکھتا ہے کہ لوگوں کو صرف زندگی اور اس کی آسائشوں سے دلچسپی ہے زندگی کے فلسفے سے نہیں تو وہ بے چارہ سکڑ سمٹ کر ذہن کے کسی تاریک گوشے میں جا سوتا ہے۔ کسی دن اسی طرح دل شکستگی کے عالم میں بے چارے کا انتقال ہو جائے گا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ زرتاج نے بولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ گھنٹی میرے ڈائریکٹ لائن کے فون کی تھی۔ اس کا مطلب تھا میرے خاص اور قریبی لوگوں میں سے ہی کسی کا فون تھا۔ میں نے ریسیور اُٹھایا تو دوسری طرف سے راحیلہ کی آواز سُن کر مجھے حیرت کا جھٹکا لگا۔ کیا اس کا فون اس وقت ہی آنا تھا؟

"ہیلو انکل ڈیئر! کیا ہو رہا ہے؟" وہ چہکی۔ بڑے خوشگوار موڈ میں معلوم ہوتی تھی۔ ایک عرصے سے میں نے اسے اس لہجے میں بات کرتے نہیں سُنا تھا۔

"فی الحال تو تم سے بات ہو رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"اس سے پہلے کس سے بات ہو رہی تھی؟" اس نے چھیڑنے والے انداز میں پوچھا۔

"تمہیں کیا الہام ہوا ہے کہ میری کسی سے بات ہو رہی تھی؟"

"اوہو... اتنے خفا کیوں ہو رہے ہو؟ میں تو یونہی بات برائے بات کر رہی تھی۔ خوش خلقی بھی کوئی چیز ہے۔" وہ بدستور چہک رہی تھی۔

"تمہارا خوش خلقی سے کیا تعلق؟ تمہیں تو کہنا چاہئے کہ آخر بد خلقی بھی کوئی چیز ہے۔" میں نے کہا۔

"ہائے... ہائے!" اس نے مصنوعی آہ بھری "کوئی زمانہ تھا تم بات کرتے تھے تو منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ اب بات کرتے ہو تو منہ سے انگارے جھڑتے ہیں۔"

"منہ سے انگارے جھڑنا نہیں۔ انگارے چبانا محاورہ ہے۔"

"میں کب کہہ رہی ہوں، میں نے محاورہ بولا ہے میں نے تو اپنا مفہوم بیان کیا ہے۔ ویسے اللہ رحم کرے۔ کیا تم اب لسانیات میں بھی دخل دو گے؟ آخر تم کس کس چیز میں دخل دو گے؟"

"میں ہر اس چیز میں دخل دوں گا جو مجھے نہیں آتی ہو گی۔" میں نے گویا عزم ظاہر کیا "تم یہ بتاؤ کہ تم نے کیا اس وقت رات کو صرف اسی قسم کی بکواس کرنے کے لئے فون کیا ہے؟"

"اُف... اتنی بدمزاجی!" وہ ترحم آمیز لہجے میں بولی "لگتا ہے زرتاج کی کمپنی بھی تمہیں خوش مزاج نہیں بنا سکی۔"

زرتاج اس وقت گہری سنجیدگی سے ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ یقیناً سمجھ چکی تھی کہ فون کس کا تھا۔ میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "آخر تمہاری اصل تکلیف زبان پر آ ہی گئی جس کا میرے پاس کوئی علاج نہیں اور تمہارا دعویٰ بھی یہی تھا کہ تمہیں یہ تکلیف نہیں ہے۔"

"خدا نہ کرے کہ مجھے اس قسم کی کوئی گھٹیا تکلیف لاحق ہو۔" وہ بُرا منائے بغیر بدستور خوشگوار لہجے میں بولی "تکلیف تو اصل میں تمہارے آرکیٹیکٹ کو ہے اور میں نے اسی سلسلے میں تمہیں فون کیا ہے۔" اس نے فوراً زرتاج کا ذکر چھوڑ دیا اور اصل موضوع پر آگئی۔

"کیا تکلیف ہے آرکیٹیکٹ کو؟" اب میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"تم نے ہو بہو اسی پُرانے نقشے اور ایلیویشن کی کاپیاں نکالنے کو کہا تھا۔ تم تو یہی چاہتے تھے کہ تمہارا وہی پرانا مکان سر اُٹھا کر کھڑا ہو جائے لیکن اس نے مجھ سے یا تم سے پوچھنے کی زحمت کئے بغیر نیا نقشہ تیار کر لیا ہے اور اس میں کافی تبدیلیاں بھی کر دی ہیں۔

اس کا کہنا ہے کہ وہ نقشہ اور وہ ایلیویشن چند سال پہلے کے حساب سے تھی۔ اب آج کے دور کے حساب سے اس میں کچھ تبدیلیاں ناگزیر ہوگئی ہیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "بھئی وہ ملک کے چند بڑے آرکیٹیکٹس میں سے ایک ہے۔ اپنی لائن کا جینئس سمجھا جاتا ہے۔ میرا خیال ہے ہم جُہلا اس کے کام میں دخل نہ دیں اور اسی کی چلنے دیں تو بہتر ہے۔"

"سوچ لو... بعد میں چیں چیں مت کرنا۔ وہ جینئس اپنی جگہ ہے لیکن روپیہ تمہارا خرچ ہورہا ہے۔ اگر تم اپنی پسند ناپسند کو نظرانداز کرنے کے متحمل ہوسکتے ہو تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔" وہ بولی۔

"بھئی مجھے چونکہ آرکیٹیکٹ کا کام نہیں آتا۔ اس لئے دل تو یہی چاہ رہا ہے کہ اس میں بھی ٹانگ اڑاؤں لیکن کیا کروں۔ مصروفیت زیادہ ہے۔ اس لئے جو وہ کررہا ہے' اسے کرنے دو۔ بڑا آدمی ہے۔ اُمید ہے بونگی بھی مارے گا تو سلیقے سے مارے گا۔ اس کے کام میں ٹانگ مت اَڑاؤ۔ جس مکان کو زمیں بوس کردیا گیا تھا' ہوسکتا ہے اب اس سے بھی بہتر مکان زمین کے سینے سے سر اُٹھا کر کھڑا ہوجائے۔"

"ٹھیک ہے۔ مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "بہرحال میں آرکیٹیکٹ سے کہہ چکی ہوں۔ صبح وہ نقشے کی کاپیاں چھوٹی کرکے تمہیں فیکس سے بھجوائے گا۔ ایک نظر انہیں دیکھ ضرور لینا۔"

"اب تم نے کہہ دیا ہے، تو ٹھیک ہے۔ ورنہ اس تکلّف کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔" میں نے کہا۔

"کیا بات ہے؟ یہ لہجے میں اتنی درویشی کیوں آرہی ہے؟ لگتا ہے کوٹھی نہیں' کوئی معمولی سی جھونپڑی بنوا رہے ہو۔" وہ بولی۔

"جب اس قسم کی شاندار عمارتیں تباہ ہوتی ہیں تو جھونپڑی جیسی ہی حقیر لگتی ہیں۔ اب اگر مجھے اس گھر میں رہنا نصیب..... ہوا تو میں اسے جھونپڑی ہی سمجھ کر رہوں گا۔"

"اللہ... اللہ! تم اور تمہاری جھونپڑی!" راحیلہ نے ٹھنڈی سانس لی "اچھا خدا حافظ۔" اس نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نے ریسیور رکھا اور زرتاج کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا "مجھے سخت حیرت ہے۔"

"کہ اس وقت راحیلہ کا فون آگیا۔" زرتاج نے جملہ مکمل کیا۔

"ہاں..... یوں لگتا ہے جیسے اس کا مجھ سے یا تم سے ٹیلی پیتھی کے ذریعے رابطہ ہے۔" میں نے کہا "کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میں اور تم جب بھی ایک دوسرے کے پاس بیٹھے ہوتے ہیں تو اسے خبر ہوجاتی ہے۔ مانا کہ ایسے ہر موقعے پر تو اس کا فون نہیں آتا لیکن میرا دل کہتا ہے کہ اسے پتا ہوتا ہے۔ اس وقت شاید وہ فون کئے بغیر رہ نہیں سکی حالانکہ بات کوئی خاص بھی نہیں تھی۔ اس سلسلے میں وہ صبح بھی فون کرسکتی تھی یا آرکیٹیکٹ خود مجھ سے بات کرسکتا تھا لیکن عین اس وقت....." میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔" زرتاج گہری سنجیدگی سے بولی "دل کے معاملے بڑے عجیب ہیں۔ تعلقِ خاطر انسان کو بڑے عجیب عجیب تماشے دکھاتا ہے۔ بظاہر وہ بھی بڑی بے نیاز بنتی ہے۔ تمہیں یہ بتانے کی کوشش کرتی ہے کہ تمہارے کسی بھی عمل سے اس کے لئے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن دلی تعلق کتنا گہرا ہے اس کا اندازہ شاید تم بھی نہ کرسکو۔"

"بڑی عجیب صورتِ حال ہے۔" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا "تم دونوں غیر معمولی لڑکیاں ہو... دونوں اپنی اپنی جگہ کسی چٹان سے کم نہیں ہو۔ مجھے لگتا ہے میں ان دونوں چٹانوں کے درمیان پس کر فنا ہوجاؤں گا۔"

"مجھے تو آثار کچھ اور ہی لگتے ہیں۔" وہ بدستور گہری سنجیدگی سے بولی "مجھے تو کچھ ایسا لگتا ہے کہ تمہارے چکر میں ہم دونوں لڑکیاں اپنی اپنی زندگی برباد کرلیں گی۔"

"میں تو ایسا نہیں چاہتا اور نہ ہی میں کسی کو کوئی دھوکا دے رہا ہوں۔ کسی سے جھوٹ نہیں بول رہا۔ کسی سے کوئی غلط وعدہ نہیں کررہا۔ کسی کو اندھیرے میں نہیں رکھ رہا۔ میری زندگی تو خود ایک تشنگی کا شکار ہے۔ میں تو خود کسی منزل پر نہیں پہنچ رہا۔ مجھ پر تو کوئی الزام نہیں آنا چاہئے۔" میں نے بے بسی سے کہا۔

"کون کہہ رہا ہے کہ تم پر کوئی الزام آئے گا؟" وہ خواب ناک سے انداز میں مسکرائی "یہ سب تو نصیبوں کی باتیں ہیں۔"

وہ اچانک ہی جانے کے لئے اُٹھ کھڑی ہوئی "اصل بات تو تک ہونے نہیں پائی۔ میں تو تمہیں صرف یہ بتانے آئی تھی کہ دو تین دن تک میرے مکان میں کام ختم ہوجائے گا اور میں وہاں شفٹ ہوجاؤں گی۔"

"یہ تو بڑی خوشی کی خبر ہے۔ تمہیں ایک اور گھر مبارک ہو لیکن تم یوں اچانک کیوں اُٹھ کھڑی ہوئیں؟ نہ کچھ کھانے پینے کا دور چلا۔ نہ کوئی گپ شپ ہوئی۔ بس دل کو اداس کردینے والی باتیں اور نشست ختم! یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"تکلّفات کی ضرورت نہیں۔" وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے مدھم لہجے میں بولی "یہ سلسلے تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ اس وقت میں ویسے بھی زیادہ دیر بیٹھنے کے لئے نہیں آئی تھی۔ آج مجھے جلدی سونا ہے۔ صبح شاید میں ایک آدھ دن کے لئے زمینوں پر بھی جاؤں۔"

"ہاؤس وارمنگ پارٹی کب دے رہی ہو؟" میں نے ماحول خوش گوار بنانے کے لئے خوشگوار موضوع پر بات کرنے کی کوشش کی۔

وہ مسکرائی لیکن اس مسکراہٹ میں بھی ہلکی سی افسردگی جھلک تھی "وہ بھی تمہارا ہی ایک گھر ہے۔ میں کیا ہاؤس وارمنگ پارٹی دوں گی۔ مجھ سے تو بس چیک سائن کرالو۔ خود ہی بندوبست کرو۔ خود ہی جن لوگوں کو مناسب سمجھو انہیں مدعو کرلینا۔ خود ہی میزبان بن کر ان کی مدارت کرنا۔ میں تو بس تمہارے پیچھے پیچھے رہوں گی۔ اس بہانے شاید مجھ دیہاتن کا بھی کچھ معززینِ شہر سے تعارف ہوجائے۔"

"آہ!" میں نے کراہ کر کہا "تم نے تو انکساری میں مجھے بھی مات کردیا۔"

"نہیں میں انکساری ہرگز نہیں برت رہی اور نہ ہی یہ محض رسمی باتیں ہیں۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنا۔" وہ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔

○☆○

شفیع شاہ سے تین چار دن تک میری ملاقات نہیں ہوئی تاہم اس کا فون روزانہ ضرور آتا رہا۔ ہر بار اس نے گویا مجھے تسلی دی "سر! میں معلومات جمع کررہا ہوں۔ کچھ سرا ہاتھ تو آتا دکھائی دے رہا ہے۔"

کبھی اس نے کہا "سر! کہیں روپیہ' کہیں دھمکی کام دکھا رہی ہے۔ بات سے بات نکل رہی ہے۔ یہ تو ایک الگ ہی دنیا ہے جس میں آپ نے مجھے بھیج دیا ہے۔"

کبھی اس نے بتایا "آج ایک بڑے کام کے آدمی سے ملاقات ہوئی ہے۔ اسے روپے کا لالچ بھی ہے اور ضرورت بھی لیکن ساتھ ہی وہ کچھ خوف زدہ بھی ہے۔ روپیہ تو اس کے سامنے پھینک دیا ہے اب ذرا اس کا خوف دور کرنا ہے۔ میں خود اس معاملے میں زیادہ سامنے نہیں آرہا۔ میں نے کچھ لوگوں کو اِدھر اُدھر دوڑایا ہے۔"

وہ اسی طرح اطلاعات دیئے جارہا تھا لیکن جب بھی میں نے تجسس سے مجبور ہوکر اس سے تفصیل پوچھی تو اس نے یہی کہا فون پر یہ باتیں نہیں ہوسکتیں۔ میں خود حاضر ہوکر تفصیلی رپورٹ دوں گا۔"

میں بہرحال مطمئن تھا اور اس کی رپورٹ کا منتظر تھا۔ اس دوران رحیم گل نے' اپنے محکمے اور دیگر ذرائع سے ان بدمعاشوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی تھی جو میرے آفس میں مارے گئے تھے۔ میں نے بھی اس سلسلے میں اپنے کچھ ذرائع استعمال کئے تھے۔ پتا یہی چلا تھا کہ ان کا تعلق بدمعاشوں کے ایک چھوٹے مگر خطرناک گروہ سے تھا تاہم وہ خاص طور پر کسی ایک شخص کے لئے کام نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے طور پر بھی وارداتیں کرتے تھے۔ بھتے لیتے تھے اور اگر معاوضہ اچھا مل جاتا تھا تو کسی اور کے لئے بھی خطرناک سے خطرناک واردات کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔ یہ پتا نہیں چل سکا تھا کہ میرے ہاں ان کی کارروائی کسی ذاتی سلسلے میں تھی یا اس کام کے لئے کسی نے ان کی خدمات حاصل کی تھیں۔ اس گروہ کا کوئی اور آدمی ہاتھ آجاتا تو اس سلسلے میں معلومات [illegible] تھیں مگر ان میں سے فی الحال کوئی بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ اندازہ یہی تھا کہ ان چار کے مرنے کے بعد گروہ میں پانچ سات آدمی رہ گئے تھے لیکن ان کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔ روپوش تو وہ پہلے ہی رہتے تھے لیکن اب تو بالکل ہی غائب ہوگئے تھے۔

پہلے وہ کس طرح روپوش رہتے ہوں گے' اس کا مجھے اندازہ تھا۔ اکثر بدمعاشوں کے گروہ پولیس کے سامنے دندناتے پھرتے رہتے ہیں' وارداتیں کرتے ہیں مگر ان کی اصطلاح اور ان کے کاغذات میں وہ روپوش ہوتے ہیں۔ اپنے چار ساتھیوں کی ہلاکت کے بعد شاید وہ احتیاطاً سچ مچ روپوش ہوگئے ہوں۔ رحیم گل نے مجھے محتاط رہنے کا مشورہ دیا تھا کیونکہ ان کی طرف سے کوئی ردِ عمل متوقع تھا۔ میں نے اسے چڑانے کے لئے یہی کہا تھا کہ میں تو اپنی دانست میں ہوشیار رہتا ہی تھا لیکن پولیس بھی اگر کچھ ہوشیار رہا کرتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ اس پر اس نے مجھے دو چار جلی کٹی سُنائی تھیں اور فون بند کردیا تھا۔

آخر پانچویں دن شفیع شاہ مسکراتا ہوا نمودار ہوا لیکن اس کی مسکراہٹ کچھ معذرت خواہانہ سی تھی۔ میں اس وقت آفس میں ہی تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے کام چھوڑ دیا اور پوچھا "کیا خبر لائے ہو؟"

"سر! خبریں شاید اتنی امید افزا نہیں ہیں جتنی میں سمجھ رہا تھا۔ میں اپنی بھاگ دوڑ کے دوران کافی پُرجوش اور پُرامید تھا لیکن میں جو کچھ معلوم کرکے آیا ہوں وہ شاید آپ کو اتنا اہم محسوس نہ ہو۔"

"تمہید کو چھوڑو۔ اصل بات کرو۔" میں نے کہا۔

"سر! بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ انسان جو کچھ معلوم کرنے جاتا ہے وہ معلوم نہیں ہوپاتا کچھ اور ہی معلوم ہوجاتا ہے مگر وہ بات بھی اپنی جگہ اہم ہوتی ہے اور اصل موضوع سے اس کا تعلق ہوتا ہے۔" اس نے گویا مجھے سمجھانے کی کوشش کی۔

"یار! ٹھیک ہے۔ اگر تم کوئی کام کی بات معلوم نہیں کرسکے تو اس میں اتنا شرمانے کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اسے تسلی دی "جو معلوم ہوا ہے وہی بتادو۔"

"سر! سب سے پہلے تو میں نے اس پینٹنگ کے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش کی تھی۔ پتا یہ چلا کہ پینٹنگ آرٹسٹ صاحب نے براہِ راست خود فروخت کی تھی اور وہ اس وقت اپنی نمائشوں کے سلسلے میں غیر ممالک کے دورے پر نکلے ہوئے ہیں۔ ان کے اسٹوڈیو میں کئی لڑکے اور لڑکیاں شاگرد کے طور پر کام کررہی ہیں لیکن مذکورہ پینٹنگ کے بارے میں انہیں بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ بہرحال مجھے ان کے غیر ممالک کے جو نمبر مل سکے ان پر بھی رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن رابطہ نہیں ہوسکا۔ یہ کوشش ابھی جاری رہے گی لیکن لگتا یہی ہے کہ [illegible] واپسی پر ہی کچھ معلوم ہوسکے گا۔ ہمارے آرٹسٹ باہر جاکر کھو جاتے ہیں۔ یہاں ہمیں لگتا

ہے وہ اتنے معروف ہیں۔ باہران سے رابطہ کرنے کی کوشش کرو تو پتا چلتا ہے انہیں کوئی جانتا ہی نہیں۔"

وہ خاموش ہوا تو میں نے کہا "اچھا یہ تو تھی ناکامی نمبر ایک۔ ناکامی نمبر دو کیا ہے؟"

"وہ کامیابی آمیز ناکامی ہے سر!" وہ ذرا جھینپ کر بولا "اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ ان فلموں کا کیمرا مین ظفر جمال تھا بلکہ ایک اور آدمی کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ وہ یقینی طور پر ان فلموں کا کیمرا مین رہا ہوگا۔ اس کا نام روشن ہے مگر اس کے بارے میں جو کچھ سُنا ہے اس سے لگتا ہے کہ وہ خاصا تاریک آدمی ہے۔ وہ عمر رسیدہ آدمی ہے۔ اشتہاری فلموں کا کیمرا مین تھا اور اپنے کام میں بڑا مثالی آدمی سمجھا جاتا تھا مگر اپنی غیر ذمے داری اور بے تحاشا شراب نوشی کی وجہ سے تباہ ہوگیا۔ اسے کام ملنا تقریباً بند ہوگیا تھا۔ لگتا ہے کچھ لوگوں نے اس قسم کی فلموں کے لئے اس کی خدمات حاصل کیں۔ وہ یکدم بہت خوش حال نظر آنے لگا۔ ڈرائیور والی گاڑی میں گھومنے لگا لیکن پھر یکدم غائب ہوگیا۔ اس کی بیوی بچے، فیملی وغیرہ نہیں تھی سُنا ہے دبئی کی طرف نکل گیا ہے۔ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی کہ خوش حالی آجانے کے بعد وہ ملک سے کیوں چلا گیا اور وہ بھی دبئی وغیرہ کی طرف۔ جہاں اسے اس قسم کے کام ملنے کا اسکوپ بھی نہیں۔"

"یعنی اس آدمی کے بارے میں پتا تو چلا مگر وہ بھی ہاتھ نہیں آسکا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں لیکن ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کاموں کے لئے چار پانچ دن کا وقت کم تھا۔ یہ وقت تو معلومات حاصل کرنے میں ہی صرف ہوگیا۔ اب اگر کوئی ملک سے باہر ہے تو اس تک پہنچنے کے لئے تو مزید وقت درکار ہوگا۔ بہرحال اس دوران ایک بڑی دلچسپ اور کارآمد بات معلوم ہوئی ہے۔"

"خدا کے لئے اب تو وہ بتا ہی دو ورنہ میں مایوسی اور صدمے کے مارے کرسی سے گر پڑوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ مسکراتے ہوئے بولا "سر! کچھ ایسا لگتا ہے کہ یہاں ایک ایسا منظم گینگ کام کررہا ہے جو شو بزنس کا شوق رکھنے والی آزاد خیال سی لڑکیوں کو کسی طرح ٹریپ کرکے ان کی اس قسم کی فلمیں تیار کرتا ہے لیکن یہ فلمیں مارکیٹ میں ریلیز کرنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ انہوں نے نہایت خاص اور چیدہ چیدہ لوگوں پر مشتمل اپنی ایک الگ ہی چھوٹی سی مارکیٹ بنائی ہے۔"

"کیا مطلب......؟" میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"شہر کے ایک پوش علاقے میں ایک بڑی کوٹھی میں ایک باقاعدہ پروجیکشن روم بنا ہوا ہے۔ اس میں پچاس نشستیں ہیں۔ سب کی سب الگ الگ باکس کی صورت میں ہیں۔ چند باکس ڈبل سیٹوں والے بھی ہیں۔ اس منی سینما ہال میں ہفتے میں صرف ایک شو چلتا ہے لیکن اس شو کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ وقت کی اطلاع آخری لمحوں میں سینما کلب کے ممبروں کو دی جاتی ہے۔"

"سینما کلب؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"اس منی سینما ہال میں آکر فلم دیکھنے والے شائقین کے کا کوڈ ورڈ میں نام "سینما کلب" ہے لیکن یہ سب باتیں زبانی ہیں۔ تحریری شکل میں کسی چیز کا کوئی وجود نہیں ہے۔ سینما کلب ممبران مقررہ وقت پر نیم تاریک ہال میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہر ای اس کے الگ باکس میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ اگر وہ ایک دوسر ٹوہ میں نہ رہیں تو انہیں ایک دوسرے کے بارے میں علم بھی ہوپاتا کہ وہاں کون کون آیا۔ وہاں انہی خوب صورت دیسی لڑ میں سے کسی ایک کی کوئی بھی صرف ایک فلم چلائی جاتی صرف ایک گھنٹے کا شو ہوتا ہے اور ایک فرد کے لئے ایک ٹکٹ دس ہزار روپے کا ہوتا ہے۔"

"دس ہزار؟" میں نے حیرت سے کہا "میں نے تو سُنا ہے علاقوں میں مخصوص اڈوں پر وی سی آر کے ذریعے لوگ د روپے میں اس قسم کے شو دیکھتے ہیں۔"

شفیع شاہ عجیب سے انداز میں مسکرایا "سر! غریب اور آدمی کے رہن سہن، پہناوے، کھانے پینے میں فرق ہوتا ہے تو ہے ان کی تفریحات میں بھی فرق ہوگا۔ غریب آدمی دو تین میں نان پکوڑے لے کر فٹ پاتھ پر بیٹھ کر پیٹ بھرلیتا ہے سے کہیں کم بھوک رکھنے والا سیٹھ اس فائیو اسٹار میں کئی ہ ادا کرکے اُٹھتا ہے۔ اسی طرح زندگی کے دوسرے تمام معا میں فرق ہے۔ اس خاص تفریح میں بھی دونوں کے معیا مقاصد میں بڑا فرق ہے۔ فرسٹریشن یا ذہنی کج روی کا شکا غریب شخص کسی گنجان گلی کے کسی بدنام اڈے پر جاکر جم کمرے یا ٹوٹے جھونپڑے میں بیٹھ کر خراب ٹی وی اور کھٹا سی آر کے ذریعے دس روپے میں ایک گھسا پٹا پرنٹ دیکھتا۔ اس سے پہلے نہ جانے کتنے لوگ دیکھ چکے ہوتے ہیں۔ بلک سے تو دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہوتے ہیں۔

دوسری طرف ایک سیٹھ نہایت رازدارانہ انداز شاندار گاڑی میں بیٹھ کر ایک پوش علاقے کی عمدہ کوٹھی ہے ائرکنڈیشنڈ ہال میں بیٹھتا ہے جہاں اسے ڈرنکس سرو ہیں۔ باہر مسلح گارڈ پہرا دے رہا ہوتا ہے۔ وہاں غیر ملکی طوا نہیں، خوب صورت دیسی لڑکی کی فلم چلتی ہے جس کے بار تاثر ہے کہ وہ خاص طور پر صرف چند لوگوں کی تفریح طبع تیار کی گئی ہے...... تو اس میں نمایاں فرق تو ہوا سر! اس فر ساری قیمت ہوتی ہے۔"

"درست ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

"ایک اور سب سے بڑا فرق ہے سر! جو ابھی میں نے بتایا ہی نہیں۔" شفیع شاہ گہری سانس لے کر بولا "شاید وہ د سے اہم ہو اور اسی میں سب سے زیادہ کشش ہو۔"

"وہ کیا ہے؟ وہ بھی بتا ڈالو۔"

"جس لڑکی کی فلم چلتی ہے، جن سیٹھ صاحبان کو وہ اور اس کی پرفارمنس پسند آئے وہ اسے پچیس ہزار روپے فی رات کے حساب سے بُک بھی کرسکتے ہیں۔ وہاں شو کے تمام انتظامات کرنے والا اور فلم چلانے والا صرف ایک شخص ہوتا ہے۔ سیٹھ صاحبان صرف ایک چٹ لکھ کر اسے دے دیتے ہیں کہ انہیں فلاں لڑکی چاہئے۔ بعد میں انہیں فون کرکے مطلع کردیا جاتا ہے کہ فلاں فلاں تاریخ پر وہ لڑکی دستیاب ہوسکتی ہے وہ اپنی پسند کی تاریخ نوٹ کرادیتے ہیں اور نقد رقم ایڈوانس بھجوا دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ اگر انہیں جگہ کا پرابلم ہو تو جگہ بھی فراہم کردی جاتی ہے۔ اسی کوٹھی میں اوپر اس مقصد کے لئے چند پُرتعیش بیڈ روم موجود ہیں۔ ان کا کرایہ ہمارے اس فائیو اسٹار ہوٹل کے کمروں سے زیادہ ہے۔ تمام اخراجات ہی زیادہ ہیں لیکن یہ مت بھولیے کہ یہ تمام انتظامات شہر کے صرف چیدہ چیدہ، دولت مند اور اس قسم کی تفریحات سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کے لئے ہیں۔ بعض لوگ دولت مند ہونے کے باوجود اس قسم کے معاملات میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ انہیں اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے۔"

"جیسے میں" میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ جیسے آپ۔" شفیع شاہ بولا "ویسے بھی آپ تو خیر یہاں ہوتے ہی نہیں تھے۔ آپ کا یہاں قیام تو پہلی بار اتنا طویل ہوا ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے شفیع شاہ بولا "ممبر شپ آسانی سے نہیں ملتی۔ یہ دھندا چلانے والوں نے شروع میں شاید کچھ لوگوں کو کسی طرح خود گاہک بنایا ہو لیکن بعد میں یہی ہوتا جارہا ہے کہ جس طرح نیکی سے نیکی کا چراغ جلتا ہے اسی طرح بدی کے ایک شعلے سے دوسرا شعلہ پیدا ہوتا جارہا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ ایک ممبر کسی دوسرے شخص کو ممبر بنانے کی سفارش کرسکتا ہے۔ اس کے بارے میں کچھ تحقیقات کی جاتی ہیں جس کا اسے پتا نہیں چلتا پھر کہیں اوپر سے منظوری آتی ہے تو اسے ممبر بنالیا جاتا ہے۔

اس کوٹھی پر...... جہاں شو چلتے ہیں، ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کا بورڈ لگا ہوا ہے لیکن اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتی۔ پروجیکشن ہال بھی بظاہر اسی مقصد کے لئے بنایا گیا ہے کہ وہاں اشتہاری فلمیں چلا کر دیکھی جاسکیں۔ وہاں چند اشتہاری فلموں کے ڈبے بھی پڑے رہتے ہیں مگر وہ دوسروں کی بنائی ہوئی فلمیں ہیں۔

تمام آپریشن نہایت صاف ستھرا ہے اور اس میں کم سے کم لوگ ملوث ہیں۔ کوٹھی پر تعینات مسلح گارڈ کو کچھ پتا نہیں ہے کہ یہاں کیا ہوتا ہے اور اسے جگہ کا مصرف کیا ہے۔ صرف ایک شخص وہاں موجود ہوتا ہے۔ وہی سب کچھ کرتا ہے۔ وہ تمام سیٹھوں سے رابطہ کرتا ہے۔ انہیں شو کے انعقاد کی اطلاع دیتا ہے لیکن اسے خود بھی کچھ پتا نہیں ہوتا۔ اس کے پاس بھی ایک شخص اطلاع لے کر آتا ہے اور اس کے پاس جمع شدہ فرمائشیں لے کر جاتا ہے۔ پھر ٹیلی فون پر اس شخص کے پاس اطلاعات آتی ہیں جو کوٹھی پر تعینات ہے۔ وہ ٹیلی فون ہی کے ذریعے انہیں ممبروں تک پہنچاتا ہے۔ اس کے اپنے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔ مقررہ وقت پر اسے فلم مل جاتی ہے۔ لڑکیوں کی بکنگ کی فرمائش آتی ہے تو وہ اس آدمی کو دے دیتا ہے جو اس کے پاس آتا ہے۔ لڑکی طے شدہ وقت پر خود طلب گار کے پاس پہنچ جاتی ہے یا پھر اگر اسے اسی کوٹھی پر بُلایا گیا ہو تو وہ وہیں آجاتی ہے۔ طلب گار بھی وہیں پہنچ جاتا ہے۔"

"کیا یہ خاصا منافع بخش دھندا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اب آپ خود ہی اندازہ لگا لیجئے سر! فلم کے ایک شو میں تقریباً تیس چالیس ممبر موجود ہوتے ہیں۔ بعض اوقات پورے پچاس بھی ہوجاتے ہیں۔ یعنی ہاؤس فل بھی جاتا ہے۔ دس ہزار روپے فی ٹکٹ کے حساب سے تخمینہ لگا لیجئے۔ فلموں کی تعداد ابھی زیادہ نہیں ہے۔ ان کے پاس تقریباً بیس فلمیں تیار ہوئی ہیں لیکن اس میدان میں کام جاری ہے۔ خوب صورت... اور اس مطلب کی لڑکیاں تلاش کرنے..... انہیں مطلوبہ سانچے میں ڈھالنے یا ٹریپ کرنے کے لئے کچھ لوگ سرگرم ہیں جو لڑکیاں اس وقت تک فلموں میں کام کرچکی ہیں اور مکمل طور پر ان کے قابو میں ہیں ان میں سے تین چار روزانہ بُک رہتی ہیں۔ پچیس ہزار روپیہ فی لڑکی کے حساب سے روزانہ کی اس آمدنی کا اندازہ کرلیجئے۔ دیگر اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔"

میں ہنکارا بھر کر رہ گیا۔

شفیع شاہ نے سلسلۂ کلام جوڑا "فی الحال یہ فلمیں صرف سولہ ایم ایم کے پروجیکٹر پر چلائی جارہی ہیں۔ بعض فلموں کو دُہرا کر بھی کام چلایا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے جب انہیں اس طرح خوب کیش کرلیا جائے تو پھر ان کے ویڈیو پرنٹ تیار کرکے مہنگے داموں دولت مند شائقین کو دے دیے جائیں کہ وہ اپنے پاس ہی رکھ لیں اور بوقتِ ضرورت جہاں چاہیں، وہیں ان سے مستفید ہولیں پھر شاید وہ مرحلہ آئے جب ان فلموں کی ویلیو تقریباً ختم ہوجائے۔ فی الحال تو ان کے مقامی ہونے کی وجہ سے ان میں ایک کشش ہے اور پھر اس سارے سلسلے کو خفیہ رکھ کر اس کی ویلیو، سنسنی خیزی اور اسٹینڈرڈ مزید بڑھا دیا گیا ہے۔ جب یہ اچھی طرح استعمال ہوچکیں اور سیٹھوں سے ان کے ویڈیو پرنٹس کی بھی اچھی خاصی قیمت وصول ہو جائے تو پھر عین ممکن ہے انہیں ویڈیو شاپس کے لئے بھی ریلیز کردیا جائے۔ اس میں بھی یک مشت کافی رقم کمالی جائے گی۔ تاہم اس کے بعد یہ پرچون کا سودا ہوجائے گا۔ پرچون فروش اس میں کمائیں گے۔ دس دس روپے میں یہ گلی گلی پہنچ جائیں گی۔ یہ نوبت آنے میں شاید کافی عرصہ لگ جائے۔ اس وقت تک لڑکیوں کی بھی کم و بیش یہی حالت ہوجائے گی۔ وہ بھی کسی حد تک اسی منزل کو پہنچ

جائیں گی۔"

"لیکن اگر اس میدان میں کام جاری ہے تو اس دوران نئی کھیپ آتی رہے گی اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"جی ہاں" شفیع شاہ بولا "جب تک کوئی اس سلسلے کو نہیں روکے گا تب تک تو چلتا ہی رہے گا البتہ یہ ممکن ہے کہ کافی عرصے بعد اس کی کشش کم ہوجائے اور ہر مرحلے پر بریک لگ جائیں۔"

"تمہیں یہ سب معلومات کیسے حاصل ہوئیں؟" میں نے پوچھا۔

"بہت سے لوگوں سے ہوتا ہوا میں نہایت مبہم سراغوں کے ذریعے اس شخص تک پہنچا جو کوٹھی میں اس سارے سلسلے کو آپریٹ کرتا ہے۔" شفیع شاہ نے بتایا "میں نے اسے نہایت خاموشی سے اُٹھوالیا۔ ہماری پالیسی چونکہ یہی ہے کہ کسی گناہ گار کو بھی ٹارچر کرنے سے بچنے کی حتی الامکان کوشش کی جائے چنانچہ میں نے اس کے سامنے ایک طرف ایک بڑی رقم رکھ دی اور دوسری طرف ٹارچر کے کچھ آلات..... اس کے علاوہ میں نے ماحول بھی کچھ ڈراؤنا سا تخلیق کیا۔ میں نے اسے اختیار دے دیا کہ وہ چاہے تو بڑی رقم اُٹھا سکتا ہے اور چاہے تو اپنا حشر خراب کرسکتا ہے۔ مجھے ہر صورت میں معلومات چاہئیں۔ آدمی اپنے نادیدہ مالک کا بہت وفادار تھا۔ اسے دس ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے جبکہ دیگر فوائد اور عیاشیاں اپنی جگہ ہیں۔ یعنی ورکنگ کنڈیشنز اچھی ہیں۔ تاہم اس نے عقلمندی سے کام لیا۔ اپنی جان کو عذاب میں نہیں ڈالا۔ جو کچھ معلوم تھا' بتادیا۔ اس کی معلومات محدود تھیں۔ کئی زاویوں سے جانچنے کے بعد مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ مجھے چکر نہیں دے رہا تھا۔ اسے اتنا کچھ ہی معلوم تھا۔

میں نے اسے رقم اُٹھانے کی اجازت دے دی جس پر وہ حیران بھی ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے محض دانہ ڈالا جارہا تھا۔ اسے اگر اس سے زیادہ معلوم ہوتا تو ضرور بتادیتا لیکن اس سارے سلسلے کے پیچھے یقیناً کوئی بہت شاطر ذہن کام کررہا ہے۔ اس نے اپنے آپ کو پس پردہ رکھنے کا فول پروف بندوبست کیا ہوا ہے۔ کوشش کرنے پر مشینری کے بہت سے پُرزے تو سامنے آسکتے ہیں لیکن وہ سب صرف اپنے اپنے کام سے واقف ہیں۔ اپنی ذمے داریوں کے سوا انہیں کچھ پتا نہیں ہوگا۔ انہیں یہ پتا نہیں ہوگا کہ مشینری کو چلا کون رہا ہے۔"

"وہ آدمی تمہارے ہاتھ نہیں آیا جو فلمیں لے کر آتا ہے اور اس شخص کے پاس جمع شدہ پیغامات وغیرہ لے کر جاتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ابھی مجھے اس پر ہاتھ ڈالنے کا وقت نہیں ملا لیکن میرا خیال ہے اس پر ہاتھ ڈال کر بھی بات صرف تھوڑی سی آگے بڑھے گی۔ اس طرح اصل گرو گھنٹال تک پہنچنے میں مرحلہ بہ مرحلہ بہت وقت لگ جائے گا۔ میں نے سوچا اس دوران پہلے آپ کو ایک ابتدائی رپورٹ تو دے دوں اور مشورہ کرلوں کہ کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔" شفیع شاہ نے جواب دیا۔

"جسے تم نے اُٹھوایا تھا اس کا کیا کیا؟" میں نے پوچھا۔

"اسے میں نے زیادہ دیر نہیں رکھا۔ اس کے ٹھکانے پر بھجوادیا اور زبان سختی سے بند رکھنے کا حکم دیا ہے۔" شفیع شاہ نے بتایا "وہ چونکہ چوبیس گھنٹے اسی کوٹھی پر رہتا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کے زیادہ دیر غائب رہنے سے کسی کو کوئی شبہ ہو۔ سارے سیٹ اَپ میں جو لوگ ملوث ہیں' ابھی ان میں سے کسی کو بھی خبردار ہونے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔ جب تک کوئی لائحہ عملی نہ طے ہوجائے تب تک ہمیں ان لوگوں میں ہلچل مچانے والا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے۔ کم از کم میری تو یہی رائے ہے۔ جیسے آپ حکم دیں ویسے کرلیتے ہیں۔"

"تمہاری رائے ٹھیک ہے۔" میں نے سرہلایا "جس آدمی کو تم نے چھوڑا ہے' اس کے بارے میں تمہیں اُمید ہے کہ وہ زبان بند رکھے گا؟"

"اُمید نہیں سر.... یقین ہے۔" شفیع شاہ نے اعتماد سے جواب دیا۔ "میں نے اسے یونہی نہیں چھوڑ دیا۔ ایک خاص طرح کا اطمینان محسوس کرنے کے بعد ہی چھوڑا تھا۔"

"یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کوٹھی کس کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اتفاق سے اس کوٹھی کا مالک بھی ملک سے باہر ہے۔ کسی نے کرائے پر لی ہوئی ہے لیکن ابھی اس کے بارے میں پتا نہیں چل سکا کہ وہ کون ہے' کہاں ہے اور کیا کرتا ہے۔ مہلت ملی تو شاید میں معلوم کرلوں۔" شفیع شاہ نے جواب دیا۔ ایک لمحے خاموش رہ کر وہ مسکراتے ہوئے بولا "ایک بات البتہ اور معلوم ہوئی ہے۔ شاید اس سے آپ کوئی اندازہ لگا سکیں۔ آپ کے دوست سیٹھ رمضان بھی "سینما کلب" کے ممبر ہیں۔"

"کیا؟" میں تقریباً اُچھل پڑا "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"میں آپ کو بالکل صحیح اطلاع دے رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"اس کی زندگی کی ہر قابلِ ذکر بات کا مجھے پتا ہے لیکن اس بات کا اس بدبخت نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا۔" میں نے افسوس سے کہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا "میں ابھی اس سے بات کرتا ہوں۔"

پھر میں خود ہی رُک گیا "خیر ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ آرام سے ہی اس چغد سے بات کروں گا۔ اچھا یہ بتاؤ کہ کبھی نہ کبھی اس قسم کے دھندوں میں اندر ہی کا کوئی آدمی یا اس قسم کی کوئی شخصیت یا پھر کوئی ممبر وغیرہ کسی نہ کسی وجہ سے بھانڈا پھوڑ دیتا ہے۔ اس دھندے میں ابھی کسی نے کوئی ایسی کوشش نہیں کی؟"

"یہ دھندا زیادہ پُرانا نہیں ہے اور زیادہ پھیلا ہوا بھی نہیں ہے۔ منتخب اور چیدہ چیدہ لوگوں تک محدود ہے۔ شاید اس لئے ایسی بات آنے کے زیادہ امکانات پیدا نہیں ہوئے۔ تاہم ایک بار ایک شخص نے ایسی کوشش کی تھی۔ اسے دن دہاڑے قتل کردیا گیا تھا۔ قاتل آج تک نہیں پکڑے گئے۔ اس کے بعد کسی کے ذہن میں شاید یہ خیال بھی نہ آیا ہو۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

میں چند لمحے سوچوں میں اُلجھا رہا۔ شفیع شاہ نے پوچھا "میرے لئے اب کیا حکم ہے؟"

"تم مزید معلومات حاصل کرنے کی کوششیں جاری رکھو لیکن یہ خیال بھی رکھو کہ اس چکر کے پیچھے جو اصل لوگ ہیں وہ وقت سے پہلے ہوشیار نہ ہونے پائیں۔ جب تک ان پر ہاتھ ڈالنے کا بندوبست نہ ہوجائے تب تک انہیں یہ پتا نہیں چلنا چاہیے کہ کوئی ان کی ٹوہ میں لگا ہوا ہے ورنہ ممکن ہے وہ سب غائب ہوجائیں اور ہمارے ہاتھ شرمندگی کے سوا کچھ نہ آئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ قبل از وقت ہوشیار ہوجائیں تو اپنے بچاؤ کا بندوبست کرلیں۔ ہماری محنت رائیگاں جائے۔"

"اُمید تو ہے کہ ایسا نہیں ہوگا سر!"

"ہوسکے تو اس دوسرے آدمی پر اسی طرح نہایت خاموشی سے ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرو جو فلمیں وغیرہ لے کر آتا ہے اور آرڈرز لے کر جاتا ہے۔" میں نے ایک لمحہ سوچ کر کہا "میں اس دوران سیٹھ رمضان کو بُلا کر بات کرتا ہوں۔ شاید اس سے کوئی کام کی بات معلوم ہوجائے۔"

"ٹھیک ہے سر!" اس نے سرہلایا اور پوچھا "تو پھر میں اب جاؤں؟"

"ہاں تم اب جاؤ۔ تمہارے سامنے سیٹھ رمضان کھُل کر بات نہیں کرے گا۔" میں نے کہا اور شفیع شاہ رخصت ہوگیا۔

میں نے سیٹھ رمضان کے گھر فون کیا تو وہ گھر پر نہیں ملا لیکن موبائل فون پر اس سے رابطہ ہوگیا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"ایک عمارت کی بیسویں منزل پر۔" اس نے جواب دیا۔

"اگر تم میں ذرا بھی حیا اور غیرت ہوتی تو تم وہاں سے چھلانگ لگادیتے۔" میں نے کہا۔

"کیوں... میں نے ایسا کون سا کام کیا ہے؟" وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

"اگر تم اپنی اب تک کی زندگی پر نظر ڈالو تو تمہیں بہت سے ایسے کام نظر آجائیں گے جن کے بعد تمہیں ڈوب مرنا چاہیے تھا یا کسی پندرہ بیس منزلہ عمارت سے چھلانگ لگادینی چاہیے تھی۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم سے کس نے کہہ دیا کہ میں اتنا باشرم اور باحیا انسان ہوں؟" اس نے اطمینان سے پوچھا۔ وہ شاید کسی چیز کی چسکیاں لے رہا تھا۔

"ہاں یار معاف کرنا۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔" میں نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "تمہارا بھلا شرم و حیا سے کیا واسطہ۔ میں نے زندگی میں تمہاری جتنی عمر کے کسی آدمی کو تم جتنا خبیث نہیں دیکھا۔"

"تم نے ابھی زندگی میں دیکھا ہی کیا ہے میرے چاند!" وہ مشفقانہ لہجے میں بولا۔

"اچھا بکواس چھوڑو اور سنجیدگی سے بتاؤ' تم اس وقت کہاں ہو اور کیا کررہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں نے صحیح بتایا ہے میں اس وقت ایک عمارت کی بیسویں منزل پر ہوں۔ دور کا منظر یہاں سے دُھندلا دُھندلا دکھائی دے رہا ہے۔ لوگ چھوٹے چھوٹے دکھائی دے رہے ہیں۔ ہوسکتا ہے اصل میں وہ اس سے بھی چھوٹے ہوں۔" وہ رننگ کمنٹری کے سے انداز میں بولا "مزید وضاحت کچھ یوں ہے کہ یہ اصل میں میرے ایک دوست کا دفتر ہے۔ کبھی کبھی پانچ دس منٹ کی فرصت ملتی ہے تو میں یہاں آجاتا ہوں کیونکہ اس کی سیکریٹری بڑی خوب صورت ہے۔ میں اس سے کہتا ہوں ایسی سیکریٹری مجھے بھی ڈھونڈ دو' تنخواہ دو ہزار زیادہ دے دوں گا۔ کمبخت میری درخواست پر کان ہی نہیں دھرتا۔ بڑی قبضہ پسند سی طبیعت پائی ہے اس نے... حالانکہ کسی قبضہ گروپ سے اس کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔"

"اس وقت وہ سیکریٹری کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"سامنے ہی بیٹھی ہے۔ ہم اسی کے خوب صورت ہاتھوں کی بنی ہوئی کافی پی رہے ہیں۔ کیا بتاؤں... کیا عمدہ کافی ہے واہ!"

"اس کی جوتیاں بھی بڑی عمدہ ہوں گی۔ جس دن کھوپڑی پر دو چار رسید کرے گی اس دن ان کے بارے میں بھی رائے دینا۔" میں نے کہا۔

"نہیں... نہیں... جوتیوں وغیرہ کے سلسلے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ یہ بڑی مہذب اور خلیق لڑکی ہے۔ اس وقت بھی مسکرا رہی ہے۔ میں نے تو ایسی سیکریٹری کی تلاش میں انگریزی اخبار میں اشتہار بھی دیا تھا مگر افسوس سب ٹیڑھی ٹیڑھی سی لڑکیاں ہی آئیں۔"

اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی "خوب صورت بیوی تو خیر تھوڑی بہت کوشش کرنے سے مل سکتی ہے لیکن خوب صورت سیکریٹری کسی کو قسمت سے ہی ملتی ہے۔" پھر اسے گویا کچھ خیال آیا "خیر تم بتاؤ... کیسے فون کیا؟"

"شکر ہے تمہارا ذلیل ذہن کسی کی خوب صورت سیکریٹری سے تو ہٹا۔"

"ذہن کہاں ہٹا ہے۔ ذہن تو وہیں اٹکا ہوا ہے لیکن آخر اخلاقیات بھی کوئی چیز ہے۔" وہ بات کاٹتے ہوئے بولا "اب اخلاقاً مجھے تمہاری بات بھی تو سننی پڑے گی۔"

پس منظر سے مردانہ اور زنانہ ہنسی کی نہایت مدھم آواز سُنائی دی تھی جو یقیناً رمضان کے دوست اور اس کی سیکریٹری کی تھی۔ معلوم نہیں بے چارے اخلاقاً ہنس رہے تھے یا زندہ دلی سے اس مذاق میں شریک تھے۔

"تم اپنی بکواس بند کرو اور فوراً میرے ہوٹل والے آفس آجاؤ۔ تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔ اب ان شرفا کا پیچھا چھوڑ دو۔" میں نے کہا۔

"شرفا....؟" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "خیر اب تمہیں ان دیکھے لوگوں کے بارے میں اتنی خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی بھی ضرورت نہیں۔ بہرحال.... میں آرہا ہوں۔ یہاں سے تمہارا ہوٹل زیادہ دور نہیں ہے۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔" پھر ذرا توقف کے بعد وہ بولا "سیکریٹری تو خیر اب تم نے بھی خاصی ٹھیک ٹھاک رکھ لی ہے لیکن یہاں والی بات نہیں ہے۔"

"بکواس بند کرو۔ اگر تم نے اس پر آنکھ رکھی تو میں تمہاری ٹانگ توڑ دوں گا۔" میں نے کہا۔

"یہ تو کچھ اسی قسم کی بات ہوگئی کہ.... ماروں گھٹنا، پھوٹے آنکھ۔ بھلا آنکھ رکھنے کی صورت میں ٹانگ توڑنے کی کیا تک ہے؟"

"تک تو تبھی سمجھ میں آئے گی جب ٹانگ ٹوٹے گی۔" میں نے جواب دیا۔

"ویسے تمہیں اپنی سیکریٹری کے بارے میں اتنا جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے وہ پہلے کہاں کام کرتی رہی ہے اور کیا کیا کام کرتی رہی ہے۔" وہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"وہ ماضی میں کیا کرتی رہی ہے اور کہاں کام کرتی رہی ہے، اسے بھول جاؤ۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "میں نے اسے ایک نئی زندگی گزارنے کا موقع دیا ہے۔ اب اگر تم جیسے لوگوں نے اس کا پیچھا چھوڑ دیا تو شاید وہ اپنی زندگی کو خوش انجام بنانے میں کامیاب ہوجائے۔"

"یار! تم تو میری زندہ دلی کی وجہ سے خواہ مخواہ ہی مجھے عجیب غلط قسم کے آدمیوں میں شمار کرنے لگے۔ میں تو بڑا بے ضرر سا آدمی ہوں۔ میں تو کسی کی رضامندی کے بغیر اس کے ساتھ مذاق تک نہیں کرتا۔ اگر کوئی مسکرا کر میری طرف نہ دیکھے تو میں دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔ اس لحاظ سے میں کوئی زیادہ بُرا آدمی تو نہیں ہوں۔"

اس کا اپنا ایک فلسفہ تھا۔ اس کی رو سے وہ واقعی کچھ ایسا بُرا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے قدرے بے زاری سے کہا "اچھا.... اے نیک، شریف اور شائستہ انسان! جلدی سے میرے دفتر آجاؤ۔ میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔" میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

سیٹھ رمضان حسبِ وعدہ دس منٹ بعد میرے آفس پہنچ گیا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے شکن آلود سوٹ میں تھا۔ ہونٹوں میں لمبا دبا ہوا تھا حالانکہ وہ تمباکو نوشی کا عادی نہیں تھا لیکن وہ ا[illegible] میں سے تھا جن کے بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کون سا شغل شروع کردیں اور کب کون سا شغل ترک کر[illegible]

وہ ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے چراغ کے جن انداز میں بولا "کیا حکم ہے میرے آقا؟"

میں نے کام چھوڑ کر ریوالونگ چیئر گھما کر اس کی طرف ہوتے ہوئے کہا "رمضان سیٹھ! تمہیں شرم نہیں آتی۔ میں ایسی حرکتیں کرتے ہو۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ تم ا[illegible] بدمعاش ہو لیکن یہ نہیں معلوم تھا کہ اس درجہ کمال کو [illegible] ہو۔"

"مجھ سے کیا خطا ہوئی میرے آقا؟" وہ ہاتھ جوڑ کر بولا۔

"تم سینما کلب کے ممبر بنے ہوئے ہو اور تم نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔"

"سینما کلب؟" اس نے حیرت سے دُہرایا پھر جیسے ا[illegible]

"اوہ... اچھا.... وہ.... نام سے کوئی اچھا بھلا معززانہ ا[illegible] ہوتا ہے۔ اس لئے میں تو چکرا ہی گیا تھا۔" پھر وہ مسکرا[کر] بولا "تم سے اس لئے ذکر نہیں کیا تھا کہ تم اس لائن کے نہیں ہو۔ تمہیں اس قسم کی کرائے کی عیاشیوں سے [کیا] نہیں ہے۔ تمہارے آس پاس تو ویسے ہی کوئی نہ کوئی البی[لی] اور صاف ستھری قسم کی حسینہ موجود رہتی ہے۔ تمہیں ا[ن] میں پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ بہرحال اگر تمہارا البیلی، صاف ستھری قسم کی حسیناؤں سے دل بھر گیا ہے اور تم ذرا بے ہودہ قسم کی چراگاہوں میں منہ مارنا چاہتے ہو تو ممبر بنوادیتے ہیں۔ یہ کون سا ایسا مشکل کام ہے۔"

وہ اس معاملے کو بالکل ہلکے پھلکے انداز میں لے [رہا تھا] جس نکتے کی طرف اسے متوجہ کرنا چاہتا تھا۔ اس طرف جا ہی نہیں رہا تھا۔ میں اس سے یہ شکوہ کررہا تھا کہ اس [نے] فحش مگر منظم کاروبار کے بارے میں مجھے بتایا تک نہیں [اور وہ سمجھ] رہا تھا شاید مجھے خود اس قسم کی عیاشیوں سے دلچسپی تھی۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر تحمل سے کہا "اے بے [وقوف] گدھے! اپنی عمر دیکھو اور ذرا اپنی باتوں پر غور کرو۔ میں [تمہیں شرم] دلانے کی کوشش کررہا ہوں اور تم مجھے ممبر شپ دلا[نے کی بات] کررہے ہو۔ میں تو پہلے تمہیں یہ احساس دلانا چاہ رہا تھا [کہ] میں تمہیں اس قسم کے چکروں میں پڑتے ہوئے شرم [نہیں آتی] ہوتی؟"

وہ آہ بھر کر بولا "اسی عمر میں تو ایسے چکروں کی ضرورت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ بچی کھچی جوانی کی تھو[ڑی سی پونجی] بھی تیزی سے مٹھی سے پھسلتی جارہی ہے۔ ابھی تو بڑھا[پے نے]

وجود کی چار دیواری پر قدم جمانے شروع کئے ہیں جب اندر بھی قدم جمالے گا تو زندگی میں ٹھنڈی آہوں کے سوا کیا رہ جائے گا۔ اسی لئے اپنا یہ عالم ہے بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ کیونکہ اب تو بس چار دن کی چاندنی ہے پھر اندھیری رات ہے۔"

میں اپنی جگہ بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔ وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ابھی کچھ ہی عرصے پہلے میں ایک اسکینڈے نیوین ملک کے ایک سینما ہال میں بیٹھا تھا۔ جہاں اسی قسم کی فلمیں چلتی تھیں۔ انٹرول میں، میں نے جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ وہاں موجود ننانوے فیصد تماشائی تقریباً میری ہی عمر کے تھے۔ جو اِکا دُکا نوجوان تھے بھی... وہ اپنے اُدھر کے ہی... ایشیائی معلوم ہوتے تھے۔ وہاں بڑی عمر کی ایک میڈ صفائی کررہی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس سینما ہال میں نوجوان کیوں نظر نہیں آرہے؟ میڈ بولی 'انہیں بھلا یہاں آکر محض تماشا دیکھنے کی کیا ضرورت ہے' وہ تو خود اس وقت کہیں پریکٹیکل میں مصروف ہوں گے۔ تو چندا! تم ابھی جوان ہو۔ تم جیسے لوگوں کے محسوسات کو نہیں سمجھ سکتے جو بڑھاپے کی حدود میں قدم رکھ چکے ہیں۔"

"تم سینما کلب کے ذریعے لڑکیاں بھی حاصل کرتے رہے ہو؟" میں نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔

"کبھی کبھار" اس نے سگار کا کش لے کر بے پروائی سے [جوا]ب دیا پھر وہ انگوٹھا ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر چہرہ آگے کرتے ہوئے "اب ظاہر ہے اس چوکھٹے کے ساتھ اس عمر میں تمہارے اس [عال]م پر جوان اور حسین لڑکیاں عاشق تو ہونے سے رہیں۔ ادھر اپنی [طبیع]ت ابھی دنیا داری سے نکلتی نہیں ہے۔ اس لئے بس اسی طرح [کام] چلتا ہے۔"

"تمہیں ان میں سے کسی لڑکی کا کوئی پتا ٹھکانا یا رابطے کا کوئی [ذریع]ہ معلوم ہے؟" میں نے ذرا نرم لہجے میں پوچھا۔

"رابطے کا ذریعہ؟" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "رابطے کا ذریعہ [و]ہی جگہ ہے جہاں فلمیں چلتی ہیں۔ فلم شو میں صرف ممبر جاسکتے [ہیں] اور ممبر بننا خاصا مشکل کام ہے لیکن تمہیں اپنے اس خادم کے [ہو]تے ہوئے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ کھل کر بات کرو۔ تمہیں [سب] مل جائے گی۔"

"بکواس بند کرو۔" میں نے اسے ڈانٹا "میں لعنت بھیجتا ہوں [تمہار]ے اس قسم کے شوق اور تمہاری ممبر شپ پر۔ میں تم سے یہ [پوچھ] رہا ہوں کہ تم نے کبھی اس ذریعے سے آنے والی کسی لڑکی سے [اس] کا اصل پتا ٹھکانا پوچھنے کی کوشش نہیں کی؟"

"بھئی.... تمہیں معلوم ہے میں آدمی ہوں ذرا اور قسم کا۔" وہ [ما]ئی جماہی لے کر بولا "میں آم کھا[نے] سے غرض رکھتا ہوں، پیڑ [گننے] سے نہیں۔ اس کے باوجود میں ایک آدھ مرتبہ تجسس کی [بیماری] میں مبتلا ہوا اور میں نے معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ تو اس معاملے میں بہت ہی ہوشیار چیزیں تھیں۔ پروں پر

پانی ہی نہیں پڑنے دیتی تھیں۔ انہوں نے اپنا پتا ٹھکانا بتا کر نہیں دیا حالانکہ میں نے انہیں خاصا چکر بھی دیا اور روپے پیسے کا لالچ بھی دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس معاملے میں وہ خوف زدہ تھیں۔ اپنے بارے میں وہ کسی قسم کی معلومات کسی کے ہاتھ نہیں لگنے دیتی تھیں۔ وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتی تھیں اور یہی چاہتی تھیں کہ دوسرا بھی اپنے کام سے کام رکھے لیکن خیر۔ اتنی خشک اور میکینکل بھی نہیں ہوتیں۔ ویسے تو دنیا بھر کے موضوعات پر خوب صورت اور شاندار گفتگو کرلیتی ہیں، آدمی کا دل لگائے رکھتی [ہیں] اچھی کمپنی ثابت ہوتی ہیں۔ بس اِدھر تم نے ان کی ذاتیات کے بارے میں کوئی معلومات حاصل کرنے کی کوشش شروع کی اور اُدھر ان کا سوئچ آف ہوا۔"

"اس کے باوجود تمہیں کبھی تشویش نہیں ہوئی؟" میں نے پوچھا۔

"کیسی تشویش؟" اس نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

"یہی کہ سوسائٹی میں پہلے ہی کئی طرح کے کینسر داخل ہوچکے ہیں۔ یہ ایک اور نئی طرح کا کینسر داخل ہورہا ہے۔" میں نے کہا۔

"جو کینسر پہلے داخل ہوچکے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ تیز رفتاری سے ہلاکت کی طرف لے جانے والے ہیں۔" وہ سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا "اور پھر یہ کوئی نیا کینسر تو نہیں ہے۔ حُسن فروشی... جسم فروشی تو ہزاروں سال سے ہورہی ہے۔ ہماری سوسائٹی بھی نہ جانے کب سے اس کی لپیٹ میں ہے۔"

"میں اس کی بات نہیں کررہا۔ اس سلسلے میں ایک نیا سلسلہ شامل ہوا ہے۔ تم نے ان فلموں کو شاید کسی خاص زاویۂ نظر سے نہیں دیکھا۔ تم نے ان کے بارے میں کوئی خاص بات محسوس نہیں کی۔" میں نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے اسے سمجھانے کی کوشش کی "حُسن فروشی ہماری سوسائٹی میں پُرانی بیماری سہی... لیکن یہ فلمیں بنوانے والی اسٹیج اب بھی نہیں آئی تھی۔ کوئی انتہائی اخلاق باختہ لڑکی بھی اس کے لئے تیار نہیں ہوتی تھی۔ تمہیں کچھ گڑبڑ محسوس نہیں ہوئی کہ اتنی خوب صورت لڑکیوں کو شاید کسی طرح اس کام کے لئے مجبور کیا گیا ہو؟ انہیں کسی بہت مضبوط شکنجے میں جکڑا گیا ہو؟ کچھ لوگوں نے نہایت منظم انداز میں فی الحال تو اونچے پیمانے پر یہ کاروبار سیٹ کیا ہو؟ اور اس امکان کی طرف بھی تمہارا ذہن نہیں گیا کہ جب یہ دھندا نچلی سے نچلی سطح پر آئے گا تو گلی گلی کیا ہوگا؟"

اس نے ایک لمحے سوچا پھر اپنے بھاری بھرکم شانے اُچکاتے ہوئے اعتراف کیا "نہیں میں نے اتنی بہت سی.... اور گہری باتوں پر غور نہیں کیا تھا۔ میں تو ایک بات جانتا ہوں کہ جب کوئی چیز دوسرے ممالک سے کسی بھی جائز یا ناجائز راستے سے ملک میں آنا شروع ہوتی ہے۔ وہ چیز اچھی ہو یا بُری۔ کوئی نہ کوئی زمانہ ایسا ضرور آتا ہے جب وہ "لوکل میڈ" بھی دستیاب ہونے لگتی ہے۔ میں تو

اسے اسی طرح کا عمل سمجھا تھا۔ تمہاری پیدائش سے پہلے... اور پارٹیشن سے بھی پہلے... بلکہ شاید میری پیدائش سے بھی پہلے جب انگلینڈ یا امریکا سے عام فلمیں آنا شروع ہوئی تھیں۔ سینما گھر بننا شروع ہوئے تھے تو فلم کے لئے تماشائی دستیاب نہیں تھے۔ انہیں فلم کی طرف راغب کرنا پڑتا تھا۔ ہماری بہت پُرانی سوسائٹی میں فلم دیکھنے جانا ایک معیوب کام تھا۔ شرفا کے بچوں کو اس پر مار پڑتی تھی۔ آج ہم خود فلمسازی میں کتنا آگے ہیں اور کن کن ملکوں کی فلمیں ہمارے گھروں میں فیملی کے ساتھ بیٹھ کر دیکھی جاتی ہیں جو خاصی ضرر رساں بھی ہیں۔"

"پھر بھی وہ کچھ اور بات ہے۔ یہ کچھ اور بات ہے۔"

"ہاں" وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "یہ فلمیں زیادہ خطرناک ہیں اور زمانہ خواہ کتنا ہی آگے چلا جائے' بہرحال یہ چُھپ چُھپ کر ہی دیکھی جاتی رہیں گی لیکن ان پر بھی فارن میڈ سے لوکل میڈ کا زمانہ تو آنا ہی تھا۔"

"وہ زمانہ ابھی نہیں آیا۔" میں نے الفاظ پر زور دیتے ہوئے کہا "اور خدا نہ کرے کہ وہ زمانہ کبھی آئے۔ اس زمانے کو زبردستی لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ہمیں مل کر اس کو روکنا ہے۔"

"تم پر پھر خدائی فوجداری کا دورہ پڑا ہے؟" اب اس نے مجھے گھورا۔

"وہ تو مجھ پر اکثر پڑتا ہی رہتا ہے۔ اس بیماری کے جراثیم کبھی کبھی تھوڑی بہت تعداد میں' میں تمہاری خودغرض اور بے پروا کھوپڑی میں بھی داخل کرتا رہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں... یار...!" وہ جیسے کچھ چونکتے ہوئے بولا "تم کبھی کبھار مجھ سے کوئی اچھا کام کرا ہی لیتے ہو۔ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔"

"تمہیں خود کبھی خیال نہیں آیا کہ اس دھندے کے پیچھے نہ جانے کیا کہانی ہو... کتنے منظم انداز میں کام کیا جا رہا ہو اور مستقبل کے لئے ان لوگوں کے نہ جانے کیا عزائم ہوں؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں اتنی گہری سوچوں میں نہیں پڑتا۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ مجھے اس سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی پھر اس نے آنکھیں سکیڑ کر مجھے گھورتے ہوئے ذرا تشویش سے پوچھا "تم اس چکر کے بارے میں اتنے سیریس کیوں ہو رہے ہو؟ تمہارے ارادے کیا ہیں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ اس سلسلے کو روکا جائے۔ خصوصاً ان لڑکیوں کو اگر کسی طرح مجبور اور خوف زدہ کر کے ان سے کام لیا جا رہا ہے۔ یا اُن کی کچھ گھمبیر مجبوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں کسی نادیدہ جال میں پھنسایا جا رہا ہے۔"

"اس قسم کے سلسلے معاشرے میں عام ہیں لیکن ان پر پردہ پڑا رہتا ہے۔ اس لئے وہ کبھی ہماری تمہاری محفلوں میں زیرِ بحث نہیں آتے لیکن یہ ذرا تمہارے علم میں آگیا ہے اس لئے تم اتنے پریشان ہو رہے ہو۔" وہ بے پروائی سے بولا۔

"تمہیں شاید اندازہ نہیں ہے کہ بظاہر یہ معمولی اور محدود دھندا معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کے ذریعے ایک اچھی بھلی بڑی انڈسٹری جتنا ناجائز روپیہ کھینچا جا رہا ہے جو نہ جانے کس کتنے برے آدمی کی جیب میں جا رہا ہوگا۔ بلکہ شاید دیانتداری اور راست بازی سے تو چلائی جانے والی کوئی انڈسٹری بھی اتنی آمدنی دے سکتی ہو۔ پہلے ہی اس ملک میں ناجائز آمدنیوں نے جو اندھیر مچایا ہوا ہے اور جس طرح لوگوں کی زندگی اجیرن کی ہوئی ہے اس کا تمہیں اندازہ ہونا چاہئے۔ ان کے علاوہ جو اس دھندے کے بھیانک اثرات مرتب ہوں گے وہ الگ ہیں۔"

سیٹھ رمضان نے استہزائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ کر کچھ دیر کھی کھی کی۔ میں اس دوران اسے گھورتا رہا۔ وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "تم اس کی ٹینشن فری اگر مت جاؤ۔ بہرحال یہ ایک چھوٹا اور گھٹیا دھندا ہے۔ ہم بڑے لوگ ہیں' ہمیں اتنے چھوٹے چھوٹے اور گھٹیا معاملات میں ٹانگ نہیں اڑانی چاہئے۔ کہیں ٹانگ گندی نہ ہو جائے۔ معاشرہ تو ویسے ہی نہ جانے کس کس چکر میں پھنسا ہوا ہے' تم اسے کس کس چکر سے نکالو گے؟ اکیلا چنا کیا بھاڑ پھوڑ لے گا۔"

"ہماری یہی سوچ تو ہمیں کچھ کرنے نہیں دیتی۔ ہم میں سے جو جتنا بھی کر سکتا ہے اسے اتنا تو کرنا چاہئے۔ اگر کوئی ایک ذرہ برابر برائی کو بھی مٹانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہ بھی اس کی کامیابی ہے۔ ذرہ ذرہ کر کے ہی پہاڑ بنتا ہے اور ذرہ ذرہ الگ کر کے پہاڑ کو ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ میں کچھ ایسا اکیلا بھی نہیں ہوں۔ میرے ساتھ کچھ مٹر' کچھ مونگ' کچھ مسور کے دانے بھی ہیں۔ ماش کا ایک کرم خوردہ دانہ تم بھی ہو۔ ہم ایسے دست و پا بھی نہیں ہیں۔ تم دیکھ ہی چکے ہو کہ ہم کچھ کرنے پر آئیں تو کسی بھی طرح.... کسی کی بھی مدد سے بڑے بڑے کام کر سکتے ہیں۔ ہمارے اپنے اپنے کام اور زندگی کے دوسرے چکر تو چلتے رہیں گے۔ موقع ملے تو سائڈ میں کبھی کبھی ہمیں ایسا بھی کوئی کام کرتے رہنا چاہئے۔"

"تمہیں اس چکر کا پتا کیسے چلا اور تم کس طرح اس کی طرف متوجہ ہوگئے؟" سیٹھ رمضان نے پوچھا "تمہاری اس میں دلچسپی کیا ہے؟"

عام حالات میں سیٹھ رمضان ایک بالکل بے مروت، بے وقوف اور قدرے اجڈ گنوار سا آدمی نظر آتا تھا لیکن اس کی اصل شخصیت اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگتی جو بہت مختلف تھی۔ اس وقت وہ ایسی ہی نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا جن کی وجہ سے وہ ایک بالکل مختلف سیٹھ رمضان لگتا تھا۔

"میں ایک لڑکی کی وجہ سے اس چکر کی طرف متوجہ ہوا ہوں...!"

"اوہ میرے خدا!" سیٹھ رمضان نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا اور دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا "مجھے پہلے ہی سمجھ جانا چاہئے تھا کہ تم کسی لڑکی کی وجہ سے اس طرف متوجہ ہوئے ہوگے۔ تم کسی بھی معاملے کی طرف لڑکی ہی کی وجہ سے متوجہ ہوتے ہو لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر تم ایسے پارسا بن کر مجھے ڈانٹنے ڈپٹنے میں کیوں لگے ہوئے تھے؟"

"ایک تو یہ بار بار تمہارا جو گدھا پن عود کر آتا ہے اس کی وجہ سے بات چیت میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "پہلے پوری بات سن لو اور اپنے کھٹارا دماغ سے اتنی جلدی نتائج اخذ کرنے کی کوشش مت کرو۔ میں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے اس لڑکی سے کوئی دلچسپی ہے...!"

"ہاں بھئی تم یہ کہنا بھی افورڈ کر سکتے ہو۔" وہ ایک بار پھر میری بات کاٹتے ہوئے حسرت آمیز انداز میں بولا "کیونکہ تم جوان اور ہینڈسم ہو۔ تمہارے آس پاس تو ہر وقت کوئی نہ کوئی حسین اور اونچی قسم کی چیز موجود رہتی ہے۔ تمہارے پاس چوائس ہوتا ہے کہ فلاں میں دلچسپی لو' فلاں میں مت لو۔ مصیبت تو ہم جیسے بڑی عمر اور معمولی چوکھٹے والوں کی ہے جنہیں دولت مند ہونے کے باوجود کسی کی نظرِ کرم حاصل کرنے کے لئے نہ جانے کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔"

میں نے چند لمحے خاموشی سے اسے گھورتے رہنے کے بعد ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "اگر تم اب بیچ میں بولے تو میں پیپر ویٹ اٹھا کر تمہارے منہ پر کھینچ ماروں گا جس کے بعد تمہارا یہ معمولی چوکھٹا غیر معمولی طور پر مرمت طلب ہو جائے گا۔ میں تمہیں یہ بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ وہ ایک شریف فیملی کی لڑکی ہے۔ ایک ایسی فیملی جو ہماری ہمدردیوں کی مستحق ہے۔ شواہد بتاتے ہیں کہ وہ کسی چکر میں پھنس گئی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ میں اسے بالکل نہیں جانتا۔ بلکہ میں نے تو اسے دیکھا تک نہیں ہے۔"

اب سیٹھ رمضان کچھ سنجیدہ نظر آیا اور اس نے تیزی سے پلکیں جھپکائیں۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر وہ لڑکی اپنی مرضی کے خلاف کسی چکر میں جا پھنسی ہے تو اس سے نکل آئے اور اگر اس کے دل میں شریفانہ زندگی گزارنے کی خواہش کسی کونے کھدرے میں موجود ہے تو وہ اپنی فیملی میں لوٹ جائے۔"

"میں اس سلسلے میں کیا کر سکتا ہوں؟" اس نے بجھے ہوئے سگار کو دوبارہ سلگانے کے بعد پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"کاش یہ سمجھدارانہ سوال تمہاری بے ہودہ زبان پر پہلے آگیا ہوتا۔" میں نے میز کی دراز سے مونا کی تصویر نکالتے ہوئے کہا پھر میں نے تصویر اس کی طرف بڑھائی "سب سے پہلے تو اس تصویر کو غور سے دیکھ کر بتاؤ کہ کیا تم نے اس مخصوص اڈے پر اس کی کوئی فلم دیکھی تھی یا کبھی اسے بک کیا تھا؟"

وہ تصویر پر ایک نظر ڈالتے ہی بولا "ہاں اس کی فلم تو میں نے دیکھی تھی اور اسے بُک کرنے کی فرمائش بھی کی تھی لیکن وہ فرمائش پوری نہیں ہو سکی تھی جس پر مجھے اس وقت حیرت بھی ہوئی تھی لیکن پھر اس سے زیادہ خوب صورت لڑکیاں میسر آنے لگی تھیں اس لئے میں اسے بھول بھال گیا تھا۔"

"تم دوبارہ اس کی فرمائش نہیں کر سکتے؟" میں نے پوچھا۔

"کر تو سکتا ہوں۔" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "لیکن تم کرنا کیا چاہتے ہو؟"

"میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ جب یہ تمہارے پاس آئے یا تم اس کے پاس جاؤ تو تم فون کر کے مجھے مطلع کر دو۔" میں نے کہا۔

"اور تم اس لڑکی کو غائب کر دو؟" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"تم کہہ سکتے ہو کہ کچھ نامعلوم لوگ اسے اغوا کر کے لے گئے۔ ہم ڈرامے میں پوری طرح حقیقت کا رنگ بھی بھر دیں گے۔" میں نے کہا۔

"اس میں سب سے نمایاں لہو کا رنگ ہوگا اور وہ لہو میرا ہوگا۔" وہ صوفے کے پشتے سے ٹیک لگا کر کراہتے ہوئے بولا "یار! تم کیوں مجھ غریب کو اس چکر میں مروانے پر تُلے ہوئے ہو؟ ایک سیٹھ نے ایک لڑکی کے معاملے میں اس سے بھی معمولی درجے کی کوئی گڑبڑ کی تھی وہ قتل ہو گیا تھا۔ آج تک اس کے قاتلوں یا قاتل کا پتا نہیں چلا۔"

"میری جان... اس طرح تو ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں.....! لیکن تم اطمینان رکھو' میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں ہونے
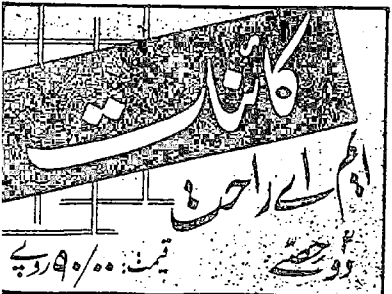
دوں گا۔ تم کوئی معمولی آدمی نہیں ہو‘ کوئی عام سیٹھ نہیں ہو کہ کوئی تمہیں اتنی آسانی سے قتل کر کے چلا جائے۔"

"سیٹھ عام ہو یا خاص... چھوٹا ہو یا بڑا... اس کے لئے ایک آدھ گولی ہی کافی ہوتی ہے اور میرے مرنے کے بعد اگر تم نے قاتلوں کی نسل بھی ختم کردی تو مجھے کیا فائدہ ہوگا؟ میں تو عالم بالا سے ان کا انجام دیکھنے کے لئے واپس نہیں آسکوں گا اور نہ ہی اپنے گھر کے سامنے ٹینٹ لگوا کر شادیانے بجوا سکوں گا۔" پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "یار! وہ جو لوگ بھی ہیں کافی خطرناک معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہم سے زیادہ خطرناک تو نہیں ہوں گے۔ بدمعاشوں کے لئے ہم خود کتنے خطرناک ہیں... یا کتنے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں‘ اس کا شاید تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہو سکا۔ میں تمہیں کوئی گزند نہیں پہنچنے دوں گا۔"

"یار! تم اندازوں اندازوں میں ہی مجھے مروا دو گے۔"

"رمضان ڈیئر! مجھے یہ تو معلوم تھا کہ بزدلی تمہارے خمیر میں کافی تسلی بخش مقدار میں شامل ہے مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ کسی معاملے میں پوری طرح میری رفاقت میسر ہوتے ہوئے بھی تم بزدل کے بزدل ہی رہو گے۔ ویسے کبھی کبھی تم بغیر کسی سہارے کے ہی کافی بہادر بھی ہو جاتے ہو۔"

"وہ... بس... ویسے ہی کبھی کبھی مجھ پر دلیری کا دورہ پڑتا ہے۔" وہ گویا ذرا شرما کر بولا "لیکن دورے کا کوئی وقت تو نہیں ہوتا نا۔"

"کاش کوئی وظیفہ ہوتا جو میں اس وقت پڑھ سکتا اور تم پر دلیری کا دورہ پڑ جاتا!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

اچانک وہ جھرجھری سی لے کر گویا کسی خول سے باہر آتے ہوئے بولا "اچھا یار...! اب تم اتنی ضد کر رہے ہو تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ درحقیقت کچھ ایسا خوف زدہ نہیں تھا۔ وہ صرف مجھے تنگ کر رہا تھا۔ وہ موبائل فون جیب سے نکالتے ہوئے بولا "فرمائش تو میں ابھی کر کے دیکھ لیتا ہوں لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ فرمائش پوری ہوگی۔ اگر پوری ہونا ہوتی تو اسی وقت ہو جاتی۔"

"تم کہاں فون کرنے لگے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"اسی کوٹھی پر... جہاں شو چلائے جاتے ہیں۔ رابطے کا ذریعہ صرف وہی ایک شخص ہے جو وہاں موجود رہتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ اس شخص کو ہم اٹھوا چکے تھے اور اس سے ہمیں کوئی خاص بات معلوم نہیں ہو سکی تھی۔ کم از کم لڑکی کے بارے میں تو کچھ معلوم نہیں ہو سکا تھا البتہ ان کے دھندے اور طریقہ کار کی تفصیل اسی سے معلوم ہوئی تھی۔ اسی سے چند ممبروں کے نام معلوم ہوئے تھے جن میں سیٹھ رمضان کا نام بھی شامل تھا۔

بہرحال اب سینما کلب کے ممبر کی حیثیت سے سیٹھ رمض[ان] کا اس شخص سے رابطہ کرنا کچھ اور معانی رکھتا تھا۔ اس نے [...] ملایا اور رابطہ ہونے پر کوڈورڈز کے سے انداز میں دو تین اِدھر اُ[دھر] کے جملے بولنے کے بعد نیچی آواز میں بات کرنے لگا۔ اس کے [...] کرنے کا انداز گول مول سا تھا۔ وہاں فلموں کے غالباً سیریل [نمبر] ہوتے تھے اور اسی نمبر کے حوالے سے اس فلم والی لڑکی کو پ[...] جاتا تھا۔

سیٹھ رمضان کو وہ سیریل نمبر یاد نہیں تھا۔ ہم نے جو [...] پرنٹ دیکھا تھا اس میں ایسا کوئی نمبر نہیں تھا۔ شاید وہ صر[ف] پروجیکٹر سے فلم دیکھنے والوں کو ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ا[...] چٹ لکھ کر رمضان کی طرف بڑھائی۔ چٹ پر میں نے لکھا تھا [...] کا نام مونا ہے۔ تم اس نام سے اس کے بارے میں پوچھ سکتے ہو[...] وہ فلم کی کچھ نشانیاں بتا کر لڑکی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔

اس نے چٹ پڑھ کر انگلی ہلا کر اشارہ کیا کہ وہ ایسا نہ[یں] کر سکتا۔ اس نے بات جاری رکھی تاہم بات جلد ہی ختم بھی ہو[گئی] اس نے فون بند کر دیا اور کراہنے کے سے انداز میں بولا "تم [...] اور بھی مروانے کا بندوبست کر رہے تھے کہ میں لڑکی کا اصل [نام] لے کر اس کے بارے میں پوچھنا شروع کر دوں۔ وہ تو پہلے ہی میر[ے] بارے میں شک میں پڑ گیا تھا۔ میں نے جونہی اس لڑکی کے بار[ے] میں پوچھا۔ اس نے الٹا مجھ سے سوال جواب شروع کر دیئے کہ [...] اچانک اس کا خیال کیسے آ گیا؟ مجھے تو اس سے جان چھڑانا مشک[ل] ہو گئی تھی۔ میں اگر یہ بھی ظاہر کر دیتا کہ مجھے لڑکی کا نام بھی معل[وم] تھا پھر تو اسے یقین ہو جاتا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ اگر اس کا لڑکی [...] کرنے کا ارادہ ہوتا تب بھی انکار کر دیتا۔"

سیٹھ رمضان اتنا گدھا نہیں تھا جتنا نظر آتا تھا۔ اس [...] عقل کی بات کی تھی۔ اس کے دماغ کے کل پرزے ٹھیک طرح [کام] کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا "اس شخص نے جواب کیا دیا؟"

"وہی جس کی مجھے توقع تھی۔" سیٹھ رمضان نے ٹھنڈ[ی] سانس لے کر جواب دیا "اس کی جونہی سمجھ میں آیا کہ میں [...] لڑکی کا ذکر کر رہا تھا‘ اس نے فوراً انکار کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ [...] لڑکی سے ان کا نہ تو کانٹریکٹ رہا ہے اور نہ ہی کانٹیکٹ رہا ہے۔ [...] ان کے "بزنس" کے دائرے سے نکل چکی ہے۔"

میرے دل میں مایوسی کی ایک لہر ابھری۔ میں نے محض [...] موہوم سی امید کے سہارے سیٹھ رمضان کو آگے بڑھایا تھا [...] کوشش ناکام رہی تھی لگتا یہی تھا کہ مجھے کسی طرف سے مدد [ملنے] آنے کا امکان کم ہی تھا۔ اس سلسلے میں جو کچھ بھی کرنا تھا وہ [...] اور میرے ساتھیوں کو ہی کرنا تھا۔

اچانک مجھے ایک بات یاد آئی جو میں شروع ہی میں س[یٹھ] رمضان سے پوچھنا چاہ رہا تھا "مجھے پتا چلا ہے کہ یہ کوٹھی کسی [...] کرائے پر لی ہوئی ہے لیکن ابھی تک یہ پتا نہیں چلا کہ کس لئے

معلوم ہونے میں دیر اس لئے ہو رہی ہے کہ کوٹھی کا مالک کہیں باہر ہے۔ تمہیں اگر اس سلسلے میں کچھ معلوم ہے تو بتاؤ۔"

"کیوں نہیں۔ یہ بات تو تم پہلے ہی مجھ سے پوچھ لیتے۔" وہ اطمینان سے بولا۔

"ابے ہونق! اگر مجھے پوچھنے میں دیر ہو گئی تھی تو تم خود ہی بتا دیتے۔" میں نے دانت پیس کر کہا "کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ یہ اہم بات ہے؟"

"یار! میری نظر میں تو یہ سارا چکر ہی اہم نہیں۔" وہ انگڑائی لے کر بولا "پتا نہیں تم پر کیا دورہ پڑا ہے جو تم اسے اتنی اہمیت دیئے جا رہے ہو۔ تم پر ہر تھوڑے دن بعد اسی قسم کا کوئی نہ کوئی دورہ پڑتا ہے۔ اسی لئے تم دنیا کے سارے عیش و آسائش میسر ہونے کے باوجود اکثر خود کو مصیبت میں ڈالے رکھتے ہو۔ بہرحال اگر میرے بتانے سے تمہاری تکلیف میں کمی ہو سکتی ہے تو بتا دیتا ہوں۔ وہ کوٹھی مکرم مختار بیگ نے لمبے اگریمنٹ پر کرائے پر لی ہوئی ہے۔ یہ بات مجھے یقینی طور پر معلوم ہے۔ بہت کم لوگوں کو اس بات کا پتا ہوگا۔"

"مکرم مختار بیگ؟" میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے دہرایا۔ "یہ نام تو کچھ شناسا سا محسوس ہوتا ہے۔"

"ایک تو تمہیں جن موضوعات سے دلچسپی نہیں رہی۔ ان کے بارے میں تم نے کچھ بھی یاد رکھنا چھوڑ دیا ہے۔" سیٹھ رمضان نے شکوہ سا کیا۔

"اس کے باوجود یاد رکھنے کو اتنی باتیں ہوتی ہیں کہ ذہن ہر وقت لدا پھندا رہتا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"مکرم مختار بیگ ڈرگ مافیا کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے اور ان دنوں ملک سے مفرور ہے۔" سیٹھ رمضان نے بتایا۔

"اوہ ہاں مجھے یاد آ گیا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"عین ممکن تھا حکومت اسے پکڑ کر ایک ملک کے سپرد کر دیتی۔ وہ احتیاطاً کسی اور ملک کی طرف نکل گیا۔ بڑا احتیاط پسند آدمی ہے۔" سیٹھ رمضان سر ہلاتے ہوئے بولا "تم اس کی احتیاط پسندی کا اندازہ اس سے لگا لو کہ وہ اپنا "کاروبار" پاکستان سے چلاتا تھا مگر اس نے پاکستان میں کوئی پراپرٹی نہیں بنائی تھی۔ کرائے کی جگہوں سے کام چلاتا تھا۔ پچھلے دنوں جب حکومت نے ڈرگ مافیا کے لوگوں کی جائیداد کی خرید و فروخت روکنے اور ان کی چھان بین کرنے کا پروگرام بنایا تو پتا چلا بیشتر تو پہلے ہی اپنی پراپرٹی ٹھکانے لگا چکے تھے اور ان میں سب سے ہوشیار مکرم مختار بیگ تھا جس کی یہاں کوئی پراپرٹی ہی نہیں تھی۔"

"اس کا مطلب ہے یہ دھندا مکرم مختار بیگ ہی کا ہو سکتا ہے؟" میں نے ذرا سیدھا ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"ہاں عین ممکن ہے" سیٹھ رمضان بولا "اسی لئے تو میں تمہیں ذرا محتاط رہنے کی تاکید کر رہا ہوں۔ تمہیں تو شاید اندازہ بھی نہ ہو کہ مکرم مختار بیگ اور اس کا گروہ کتنا خطرناک ہے۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "قاسم بجلی اور اس کا گروہ بھی بہت خطرناک تھا۔ بلکہ میرے اندازے کے مطابق مکرم مختار بیگ کے گروہ سے کہیں زیادہ خطرناک تھا۔ اس کی تو یہاں بہت بڑی ایمپائر موجود تھی اور اس کی پشت پر پورا ایک قبیلہ تھا مگر قاسم بجلی اب اس دنیا میں نہیں ہے۔"

"قسمت ہمیشہ یکساں انداز میں انسان کا ساتھ نہیں دیتی۔" وہ ذرا چڑ کر بولا۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ مختلف انداز میں تو ساتھ دیتی ہوگی۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "اہم بات بس یہی ہے کہ قسمت انسان کا ساتھ دیتی رہے۔ انداز کچھ بھی ہو۔ خوش قسمتی انسان کی زندگی میں بہت اہم فیکٹر ہے۔"

"بہت اہم نہیں۔ سب سے اہم فیکٹر ہے میری جان!" سیٹھ رمضان سر ہلاتے ہوئے بولا "انسان خوش قسمت ہو۔ بس اتنا ہی کافی ہے۔ اسے اور کیا چاہئے لیکن اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھنے کا بھی ہر انسان کا اپنا ایک مختلف معیار ہوتا ہے۔ بعض لوگ کرائے کے دو کمرے کے مکان میں اپنی سیدھی سادی وفا شعار بیوی اور عام سے بچے کے ساتھ رہ کر‘ کسی دفتر میں کلرکی کر کے بھی خود کو خوش قسمت سمجھتے ہیں اور خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ بعض لوگ کسی حال میں خوش نہیں رہتے۔ ہر وقت روتے ہیں۔ ہر وقت انہیں دنیا سے‘ تقدیر سے‘ سب سے گلہ رہتا ہے۔ بعض لوگوں کو تو میں نے تم جیسی حیثیت میں بھی خوش نہیں دیکھا۔ بہرحال... بات مکرم مختار بیگ کی ہو رہی تھی۔ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم اپنی خوش قسمتی پر زیادہ مت اترانا اور اس سے مت الجھنا۔ خواہ مخواہ کسی معمولی بات کے پیچھے اپنے لئے کوئی بڑی مصیبت مول مت لینا۔ وہ بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ آدمی کو گولی پہلے مارتے ہیں‘ نام بعد میں معلوم کرتے ہیں۔"

"تمہارا کہنا ہے کہ مکرم مختار بیگ ملک سے فرار ہو چکا ہے۔" میں نے اس سے بحث میں الجھے بغیر کہا "کیا اس کی عدم موجودگی میں بھی اس کے دھندے اسی طرح جاری ہیں؟"

"جب انسان کے پاس بے حساب دولت اور مین پاور‘ دونوں موجود ہوں تو اس کے ایک جگہ موجود ہونے یا نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ یہ تو ویسے بھی مواصلات کا زمانہ ہے۔ آپ کہیں بھی بیٹھ کر ہزاروں میل دور اپنے مفادات کو کنٹرول کر سکتے ہیں۔ بس وہاں آپ کے حکم کے غلام موجود ہونے چاہئیں۔ تم خود اتنے بڑے بزنس مین ہو۔ مجھ سے بے وقوفوں کی طرح کیوں ایسے سوالات کر رہے ہو۔ تم ان حالات سے گزر چکے ہو۔ ریڈ ڈاٹ سے کشمکش کے دوران تم اتنا عرصہ غائب رہے۔ تمہارا تو اپنے ساتھیوں سے رابطہ بھی نہیں رہا تھا لیکن کام تو چلتے رہے۔"

"میرے تو جائز کاروبار تھے۔" میں نے فرق جتانا چاہا۔

سیٹھ رمضان ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اتنے بھولے مت بنو یار! تمہیں معلوم ہے زمانہ کچھ الٹ پلٹ سا ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو الٹا حساب ہو گیا ہے۔ ناجائز دھندے کرنے والوں اور بدمعاشوں میں سروائیو کرنے کی طاقت بڑھتی جا رہی ہے۔ جائز بزنس کرنے والوں اور شریف لوگوں میں گھٹ رہی ہے۔ جائز بزنس کرنے والوں کے لئے چند دن میں ہی ایسے حالات پیدا کئے جا سکتے ہیں کہ وہ بستر بوریا گول کر کے بھاگ جائیں۔ ناجائز دھندے کرنے والا' بدمعاشی پھیلانے والا تمام انسدادی کارروائیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے برسوں سروائیو کر جاتا ہے اور بعض اوقات تو پہلے سے زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے۔"

"ہاں..... کسی حد تک تمہاری بات درست ہے لیکن میں اس یقین اور نظریے کے ساتھ زندہ ہوں کہ آخری فتح اچھائی اور سچائی کی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آخری فتح کی نوبت آنے تک انسان کا تیل نکل جاتا ہے۔" رمضان ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"اچھا..... تم یہ بتاؤ تمہیں مکرم مختار بیگ کے باہر کے ٹھکانے کا کچھ علم ہے؟" میں نے پوچھا "یا کم از کم یہ معلوم ہے کہ وہ کس ملک میں ہے؟"

سیٹھ رمضان نے نفی میں سر ہلایا "فی الحال تو یہ کسی کو معلوم نہیں ہے۔ جب معاملہ ذرا ٹھنڈا پڑ جائے گا اور حالات مکرم کے حق میں کچھ بہتر ہو جائیں گے تو وہ خود ہی اپنی کمین گاہ سے باہر آ جائے گا۔"

"اس کا مطلب ہے تمہیں بلا کر بھی کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ کوئی مدد نہیں ملی۔ معلومات میں قطعاً کوئی اضافہ نہیں ہوا۔" میں نے کہا۔

"بڑے ناشکرے انسان ہو۔" سیٹھ رمضان بولا "میں نے تمہیں مکرم مختار بیگ کے بارے میں بتایا کہ وہ کوٹھی اس نے کرائے پر لی ہوئی ہے۔ یہ تمہاری معلومات میں اضافہ نہیں تھا؟"

"اپنے پاس ہی رکھو اپنا یہ اضافہ۔" میں نے اسے چڑایا "فی الحال یہ تو کنفرم نہیں ہے کہ یہ واقعی مکرم کا اپنا ہی دھندا ہے۔ کوئی بعید نہیں کہ اس کی عدم موجودگی میں اس کا کوئی بڑا کارندہ کام دکھا رہا ہو۔ اس نے اپنا کاروبار شروع کر لیا ہو۔"

"اگر تمہیں یہ پتا چل جاتا کہ مکرم کس ملک میں موجود ہے تو تم کیا وہاں اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتے یا براہِ راست اسی سے تصدیق کرنے کی کوشش کرتے کہ یہ دھندا اسی کا ہے یا کسی اور کا؟" سیٹھ رمضان نے ذرا بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں یہ بھی ہو سکتا تھا۔ یہ کون سا ایسا ناممکن کام ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

سیٹھ رمضان ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا پھر گویا اس موضوع کو ختم کرتے ہوئے بولا "اتنی دیر سے خود بھی بکواس کئے جا رہے ہو اور مجھ سے بھی بکواس کرائے جا رہے ہو مگر اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ کچھ کھانے پینے کو ہی منگوا لو۔"

"میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم وہ گدھے ہو جو دو ٹانگوں پر چلتا ہے اور ہر وقت چرتا رہتا ہے۔" میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"لیکن دیکھ لو۔ کھانے پینے کا اتنا شوقین ہونے کے باوجود میں ابھی تک موٹا نہیں ہوں۔ میرا جسم تھل تھل نہیں کرتا اور میرا خیال ہے میں اس شہر کا واحد سیٹھ ہوں جو اس عمر میں بھی کیک پیسٹری سموسے تک کھاتا ہوں بلکہ اکثر کچھ نہ کچھ کھاتا ہی رہتا ہوں۔ اس کے باوجود مجھے شوگر' بلڈ پریشر یا دل کی کوئی بھی بیماری نہیں ہے۔" وہ فخر سے بولا۔

وہ اپنے منہ میاں مٹھو نہیں بن رہا تھا۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اور قدرے چوڑا چکلا سا آدمی تھا۔ اس کی شخصیت ذرا گنوار و قسم کی تھی لیکن یہ حقیقت تھی کہ اس کی جسمانی ساخت سے موٹاپا نہیں جھلکتا تھا جبکہ وہ ورزش وغیرہ کے تکلفات میں بھی نہیں پڑتا تھا۔ اسے دیکھ کر یقین آتا تھا کہ صحت واقعی ایک خداداد چیز تھی اور بعض لوگوں کو تو صحت اس طرح عطا ہوتی تھی کہ انہیں اس کی حفاظت بھی نہیں کرنا پڑتی تھی۔

پیٹ پوجا کرنے کے بعد سیٹھ رمضان رخصت ہو چکا تو میں نے شفیع شاہ سے رابطہ کیا اور اسے بتایا کہ یہ معلوم کرنے کے سلسلے میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کوٹھی کس نے کرائے پر لی ہوئی تھی' یہ بات سیٹھ رمضان سے معلوم ہو گئی تھی۔

اس کے بعد ہم ایک بار پھر بند گلی میں کھڑے تھے۔ آگے بڑھنے کے لئے ہمارے پاس کوئی سراغ نہیں تھا۔ امبر جتنی مرتبہ بھی فائلیں کاغذات وغیرہ لے کر میرے پاس آتی تھی' پُرامید نظروں سے میری طرف دیکھتی تھی کہ شاید میں اس سلسلے میں اسے کوئی خبر سناؤں گا۔ عذرا بھی ایک مرتبہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں فون کر چکی تھی۔ میرے پاس انہیں سنانے کے لئے کوئی خبر نہیں تھی۔ جو کچھ معلوم ہوا تھا وہ بھی میں انہیں نہیں بتا سکتا تھا۔

میں ابھی اسی سوچ بچار میں تھا کہ امبر کمرے میں آئی اور کچھ پُرجوش سے لہجے میں بولی "سر! ایک بڑی وی آئی پی شخصیت آپ سے ملنے آئی ہے۔"

عام طور پر امبر کسی کی آمد کی اطلاع مجھے فون پر ہی دیتی تھی لیکن وہ خود اٹھ کر دوڑی دوڑی آئی تھی تو اس کا مطلب تھا شخصیت واقعی وی آئی پی تھی۔ تاہم میں نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار کئے بغیر پوچھا "ایسا کون وی آئی پی آ گیا بھئی..... جس نے تمہیں اتنا بوکھلا دیا ہے؟"

"میں بوکھلائی تو نہیں ہوں سر!" وہ سنبھلتے ہوئے ذرا کھسیانی ہو کر بولی "دراصل مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ یہ شخص آپ سے ملنے

کیسے آ گیا۔ اسے تو اگر اچھے خاصے بڑے لوگوں سے بھی ملنا ہوتا ہے تو انہیں اپنے گھر بلوانے کی کوشش کرتا ہے۔"

"اوہ.....!" میں نے قدرے دلچسپی محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ "اس شخصیت کا نام تو بتاؤ۔"

"پیر دانش شاہ" امبر نے جواب دیا "آپ یقیناً انہیں جانتے ہوں گے۔"

"افسوس... مجھے ان صاحب سے شناسائی کا شرف حاصل نہیں ہے۔" میں نے معذرت خواہانہ سے لہجے میں کہا۔

"نہیں سر! میرا مطلب ہے آپ غائبانہ طور پر تو انہیں جانتے ہوں گے۔" امبر نے جلدی سے گویا اپنے بیان میں تصحیح کی۔

"غائبانہ طور پر.....؟" میں نے دہرایا "اس کے لئے بھی مجھے اپنے ذہن پر زور دینا پڑے گا۔"

مجھے واقعی ذہن پر زور دینا پڑا اور اس قدرتی کمپیوٹر میں نہ جانے کس کوڈ کے تحت پڑی ہوئی کچھ معلومات ابھر آئیں جو زیادہ تر اخبارات میں وقتاً فوقتاً میری نظر سے گزری تھیں۔ پیر دانش شاہ واقعی شہر کی نہایت نمایاں شخصیات میں سے ایک تھا۔ کسی دورِ حکومت میں وزیر بھی رہا تھا۔ اس کا شمار ملک کی دولت مند ترین شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ کاروباری حلقوں میں' میں نے سنا تھا کہ اس کی آمدنی کے نہ جانے کتنے ذرائع تھے اور اپنی دولت کا شاید اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا۔

اس کی کوئی سیاسی پارٹی نہیں تھی اور نہ ہی وہ کسی پارٹی میں شامل تھا۔ اس کے باوجود ایک بار وزیر رہ چکا تھا اور میں نے سنا تھا ہر دور میں وزارتوں کے امیدوار اس کے درِ دولت پر حاضری دیتے تھے۔ اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ اس کے پاس ہر بڑے سے بڑا کام کرانے کا کوئی جادو تھا۔ وہ ملک کے انتہائی بارسوخ آدمیوں میں سے ایک سمجھا جاتا تھا۔

پیری مریدی اس کا خاندانی سلسلہ نہیں تھا۔ خود ہی اپنی نوجوانی کے دور میں ہی پیر کے طور پر مشہور ہوا تھا۔ تعویذ گنڈے دیتا تھا لیکن لوگ غیر معمولی طور پر اس کے عقیدت مند ہوتے چلے گئے۔ اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگ اس کے بارے میں کہتے پائے جاتے تھے کہ اس کے قبضے میں جن تھے۔

وہ سائل سے کہتا تھا کہ وہ اپنی پسند کی کسی کھانے کی چیز کی خواہش کرے۔ سائل خواہش کرتا تھا اور پیر صاحب ہاتھ ہوا میں بلند کرتے تھے۔ وہ چیز ان کے ہاتھ میں آ جاتی تھی۔ اس طرح کے چھوٹے موٹے کمالات دکھاتے رہنا اس کا معمول تھا جس کی وجہ سے اس کے معتقدین کی تعداد طوفانی رفتار سے بڑھتی رہی اور وہ بلا تکلف بلا عجز و انکسار بھاری نذرانے لیتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے اس کے پاس بے پناہ دولت جمع ہوتی چلی گئی۔ دولت ویسے بھی دولت کو کماتی ہے لیکن اسے شاید دولت سے دولت کمانے کا ہنر کچھ زیادہ ہی آتا تھا یا پھر شاید اس میں بھی اس کے کسی "روحانی" کمال کا دخل تھا کہ اس کی دولت میں کچھ زیادہ ہی تیزی سے اضافہ ہوتا چلا گیا۔

دولت بذات خود اپنی جگہ ایک طاقت ہے۔ دولت آ جائے تو اثر رسوخ میں اضافہ ہوتا ہی چلا جاتا ہے لیکن پیر دانش شاہ اس معاملے میں بھی شاید غیر معمولی طور پر ذہین اور ہوشیار تھا۔ اس کے اثر رسوخ میں کچھ زیادہ ہی تیزی سے اضافہ ہوا۔ مختصر یہ کہ اپنی جدوجہد کے آغاز کے پندرہ بیس برس بعد ہی وہ ملک کی نہایت اہم شخصیات میں شمار ہونے لگا تھا۔ ایک ایسا شخص جسے وراثت میں یہ چیزیں نہیں ملی تھیں' اس کے لئے بلاشبہ یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

سنا تھا کمالات دکھانے اور لوگوں کے مسائل حل کرنے کا سلسلہ اب بھی جاری تھا لیکن اب وہ بہت خاص لوگوں تک محدود ہو چکا تھا اور اس کی فیس اتنی ہو چکی تھی کہ عام آدمی اس تک پہنچنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عام آدمی سے اب ویسے بھی پیر دانش شاہ کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

مجھے یہ معلومات مختلف اوقات میں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں حاصل ہوئی تھیں اور ذہن کے تاریک کونے کھدروں میں محفوظ پڑی تھیں لیکن میں نے انہیں کبھی اہم نہیں سمجھا تھا۔ اس لئے فوری طور پر کچھ یاد نہیں آ سکا تھا۔ اب ذہن پر زور دینے سے یہ باتیں یاد آئیں تو یہ بھی احساس ہوا کہ زندگی رہے تو کچھ پتا نہیں ہوتا کس موڑ پر' کس شخص سے اچانک آپ کی ملاقات ہو جائے۔

امبر کہہ رہی تھی "سر! کچھ یاد آیا۔ یا میں آپ کو بتاؤں؟"

"نہیں نہیں۔ اس کی ضرورت نہیں۔" میں نے خیالات کی دنیا سے باہر آتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہا "بہت کچھ مجھے یاد آ گیا ہے بعد میں تم سے بھی پوچھ لوں گا۔ شاید تم میری معلومات میں کچھ اضافہ کر سکو۔ کچھ ہی عرصہ پہلے تک اہم اور دولت مند شخصیات کے بارے میں معلومات رکھنا تمہارے کام کا ایک حصہ رہا ہے۔ ضرورت پڑنے پر تمہاری معلومات سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بتاؤ وہ ہے کہاں؟ کیا تم نے اسے اپنے کمرے میں بٹھایا ہوا ہے؟"

"نہیں سر! ابھی وہ میرے کمرے تک پہنچے ہی کہاں ہیں۔" امبر قدرے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملتے ہوئے بولی "ابھی تو وہ لابی میں ہی کھڑے ہیں۔ ان کی جاننے والی چند بڑی بڑی شخصیات نے انہیں وہیں گھیر لیا ہے۔ وہ خود بھی ایک جلوس سے کم نہیں ہیں۔ جہاں جاتے ہیں' کم از کم چھ تو مسلح گارڈ ان کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بعض اوقات دوسرے دو چار خاص افراد بھی ان کے ہمراہ ہوتے ہیں۔"

"چیلے چانٹے..... چمچے وغیرہ؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"یہی سمجھ لیجئے۔" وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولی۔ وہ شاید ا... پیری فق... میں زیادہ یقین نہ رکھنے کے باوجود لاشعوری طور پر اُس سے مرعوب تھی "وہ جب کسی سے ملاقات کے لئے روانہ ہوتے ہیں تو کم از کم دو گاڑیاں ان کی گاڑی کے آگے پیچھے ہوتی

ہیں۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "سر! پیر صاحب نے یہ تو واضح کردیا ہے کہ وہ آپ سے ملنے آئے ہیں لیکن شاید وہ توقع کررہے ہیں کہ آپ لابی ہی میں جاکر ان کا استقبال کریں۔ ہمارے گیسٹ ریلیشنز منیجر تو وہاں پہنچ چکے ہیں۔ میں بھی جاکر سلام کر آئی ہوں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو آپ بھی وہیں جاکر اُن کا استقبال کرلیں اور انہیں اپنے ساتھ اپنے کمرے تک لے آئیں۔"

میں نے ایک لمحے سوچا۔ اس میں کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ میں بہرحال ایک بزنس مین تھا۔ اس شہر میں میرا ہوٹل اور دوسرے بزنس تھے۔ اس قسم کے لوگوں سے زیادہ سے زیادہ اچھے تعلقات رکھنا میرے بزنس کے لئے زیادہ سے زیادہ اچھا تھا اور شاید خود میرے حق میں بھی بہتر تھا۔ مجھے انکسار... برتنے اور دوسروں کے سامنے خود کو کمتر بنا کر پیش کرنے کی اچھی یا بری عادت بھی لاحق تھی۔ اس وقت تو ویسے بھی پیر دانش شاہ خود چل کر مجھ سے ملنے آیا تھا۔ میرا اٹھ کر اس کے استقبال کے لئے لابی میں چلے جانا قطعاً کوئی معیوب بات نہیں تھی لیکن نہ جانے کیوں میں اپنی کرسی سے حرکت نہیں کرسکا۔

"اسے یہیں آنے دو امبر!" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "صرف تم اس کا استقبال کرلینا... یہی کافی ہے۔"

"ٹھیک ہے سر! جیسے آپ مناسب سمجھیں۔" اس نے جلدی سے کہا اور واپسی کے لئے مڑ گئی۔

اُس کے جاتے ہی میں نے فون پر اپنے سیکیورٹی چیف داؤد سے رابطہ کیا اور اسے پیر دانش شاہ کی آمد کے بارے میں بتایا۔ وہ فوراً بولا "مجھے معلوم ہے سر!"

"لگتا تو یہی ہے کہ وہ دوستانہ ماحول میں ملاقات کے لئے آیا ہے۔" میں نے کہا "لیکن اس کی آمد میرے لئے غیر متوقع ہے۔ کوئی اور سلسلہ بھی ہوسکتا ہے تم الرٹ رہنا۔"

"ہم پہلے ہی الرٹ ہیں سر! آپ کے آفس کی نگرانی ہورہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے فون بند کردیا اور اپنی مخصوص دراز کھول کر جدید ترین ساخت کا سیاہ ریپیٹر نکال کر کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ دراز بند کرکے میں سر جھکا کر بظاہر کام میں مصروف ہوگیا۔ کبھی کبھی مجھے اس طرح کی اداکاری کرنا پڑتی تھی۔

میرا کمرا ساؤنڈ پروف تھا۔ اس کے باوجود چند منٹ بعد مجھے کچھ لوگوں کی آمد کا احساس ہوا۔ امبر کے کمرے کے سامنے شاید کچھ غلغلہ سا برپا تھا۔ چند لمحے بعد دروازہ کھلا اور یکدم جیسے شور کا ریلا سا اندر آگیا۔

امبر نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نہایت مؤدبانہ انداز میں اعلان کیا "سر! جناب پیر دانش شاہ آپ سے ملنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔"

پرانے زمانے میں ایک ملک میں ایک بادشاہ ہوتا تھا۔ اب عموماً ہر ملک میں چھوٹے چھوٹے بہت سے بادشاہ بکھرے ہوتے ہیں۔ ان سب کے درمیان بے چارے عوام کی..... رعایا کی کھینچا تانی ہوتی رہتی ہے۔ اس وقت بھی گویا نقارچی نے ایسے ہی ایک بادشاہ سلامت کی آمد کا اعلان کیا تھا۔

میں مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا اور میز کے عقب سے نکل آیا۔ پیر دانش شاہ کو دیکھ کر مجھے حیرت کا خفیف سا جھٹکا لگا مگر میں نے ازراہِ تہذیب اس کا اظہار نہیں ہونے دیا۔

مجھے یاد پڑتا تھا کہ میں نے ایک آدھ مرتبہ اخباروں میں اس کی تصویر دیکھی تھی مگر اس میں وہ ایک مختلف انسان نظر آتا تھا۔ گو کہ شکل صورت یہی تھی جو اس وقت میرے سامنے تھی لیکن تصویر یقیناً دس بارہ سال پرانی تھی اور صرف چہرے تک کاٹ کر چھاپی گئی تھی۔ تصویر میں اور اصل شخصیت میں ویسے ہی بڑا فرق ہوتا ہے اور اگر کسی کی تصویر آپ نے صرف چہرے تک دیکھی ہو تو پوری شخصیت آپ کے اندازوں سے بہت مختلف بھی ہوسکتی ہے۔

میں نے تصویر میں جس پیر دانش شاہ کو دیکھا تھا اس کے لمبے سیاہ بال پیچھے کو سیدھے کنگھی کئے گئے تھے اور بہت ہی ہموار انداز میں اس کے سر سے چپکے ہوئے تھے۔ چہرے پر نہایت بارعب گھنی داڑھی مونچھیں تھیں۔ آنکھیں تاریک شیشوں کی عینک کے عقب میں چھپی ہوئی تھیں۔

اس کا چہرہ اب بھی کم و بیش ایسا ہی تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ عمر کے دس بارہ سال کے اضافے کی وجہ سے وہ چہرہ زیادہ چوڑا چکلا، زیادہ پھولا پھولا سا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی اصل رنگت کا پتا چلا تھا جو گہری سانولی تھی۔ اس کے سر پر کسی شاہی تاج کی سی ساخت کی تقریباً ایک فٹ اونچی ٹوپی تھی۔ جس میں اس کا سر تو چھپ گیا تھا لیکن ٹوپی کے کناروں سے بہرحال اس کے لمبے بال شانوں تک پہنچے ہوئے تھے اور ان میں سفیدی نمایاں طور پر جھلک رہی تھی۔

تاج نما کلہ دار ٹوپی کا مقصد غالباً صرف اپنی شخصیت کے "پیرانہ" تاثر کا اظہار کرنا ہی نہیں بلکہ اپنا قد بڑا ہونے کا تاثر دینا بھی تھا کیونکہ اس کا اصل قد شاید پانچ فٹ سے بھی کم تھا۔ اس کے ساتھ اس کی جسامت بھی مضحکہ خیز تھی۔ وہ جتنا لمبا تھا تقریباً اتنا ہی چوڑا معلوم ہوتا تھا۔

کلون کی بعض موٹی اور بھاری بھرکم سی شیشیاں تقریباً چوکور ہوتی ہیں۔ اس کی جسمانی ساخت تقریباً ویسی ہی تھی۔ اس کا چہرہ اور ٹوپی گویا اس شیشی کا منہ اور ڈھکن تھی۔ اس کے لباس کی ٹوپی سے کوئی مناسبت نہیں تھی کیونکہ وہ نہایت عمدہ اور جدید تراش خراش کے سوٹ میں تھا۔ اس کی مضحکہ خیز جسمانی ساخت کی وجہ سے خواہ سوٹ اس پر نہیں جچ رہا تھا لیکن اس میں شک نہیں تھا کہ

سوٹ اپنی جگہ نہایت نفیس تھا۔ کوٹ کے چوڑے کالر پر کسی سفید دھات کا پھول چمک رہا تھا۔ جس میں تین ہیرے جھلملا رہے تھے۔ ٹائی پن کا رواج اب بہت کم ہوتا جارہا تھا مگر وہ ٹائی پن لگائے ہوئے تھا اور اس میں بھی ننھے ننھے ہیروں کی ایک قطار جگمگا رہی تھی۔

پیر دانش شاہ کے پیچھے پیچھے واقعی ایک چھوٹا سا جلوس کمرے میں آگیا۔ چھ مسلح گارڈز نے اسے یوں نیم دائرے میں لیا ہوا تھا اور وہ یوں اپنی کلاشنکوفیں وغیرہ تھامے ہوئے تھے جیسے کسی بھی لمحے ان کے پیر پر قاتلانہ حملہ ہونے والا ہو۔ تین افراد بغیر گنوں کے بھی تھے۔ وہ ہاتھ باندھے، سر جھکائے نہایت مؤدبانہ انداز میں سب کے پیچھے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر گمبھیر سنجیدگی تھی گویا وہ دل ہی دل میں کوئی عمل پڑھ رہے ہوں۔

آفس کا کمرا خاصا طویل و عریض تھا لیکن اتنے افراد کے اس طرح پھیل کر کھڑے ہونے... اور پہلے ہی سے موجود بھاری بھرکم فرنیچر کی وجہ سے بھر سا گیا۔ میں نے آگے بڑھ کر مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے اور گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے خوش خلقی سے کہا "خوش آمدید پیر صاحب! آپ نے تشریف لا کر مجھ غریب کو..... اور میرے اس چھوٹے سے ہوٹل کو بڑا اعزاز بخشا ہے۔"

اس نے کھچ کھچ کی سی آواز کے ساتھ ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ کیا تھا، گویا ایک اینٹ تھی جو اس نے میرے ہاتھ میں تھمادی تھی۔ ہاتھ بھی تقریباً چوکور تھا اور پتھر کی طرح سخت تھا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا اس کا پورا وجود ہی شاید چھوٹی سی ایک چلتی پھرتی چٹان تھا۔

مصافحہ کرتے ہی اس نے اپنے سب آدمیوں کو اشارہ کیا "بابا! تم سب لوگ باہر جاؤ۔ ہمیں افضل صاحب سے تنہائی میں ملاقات و بات چیت کرنی ہے۔"

میں نے امبر کو اشارہ کیا "ان تمام حضرات کو اپنے کمرے میں بٹھاؤ اور پوری طرح ان کی خاطر مدارت کرو۔"

سب لوگ سر جھکا کر امبر کے پیچھے پیچھے کمرے سے رخصت ہوگئے۔ پیر دانش شاہ گویا مجھے صرف ان کی جھلک دکھانے کے لئے اندر لایا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ فرعون صفت شخص ہوگا لیکن اپنے آدمیوں کے جاتے ہی اس نے عاجزی و انکسار... کا مظاہرہ کرکے مجھے حیران کردیا۔

وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے لجاجت آمیز سے لہجے میں بولا۔ "بابا! یہ تو آپ کی انکساری ہے جو آپ خود کو غریب اور اس ہوٹل کو چھوٹا بولتے ہیں۔ یہ آپ کے بڑے پن کی نشانی ہے۔ جو آدمی اندر سے بڑا ہوتا ہے وہ کبھی اکڑ کر بات نہیں کرتا۔ ہمیں آپ میں بڑے پن کی نشانی نظر آگئی ہے۔ ہمیں یہی امید تھی اور اسی امید کے سہارے ہم چل کر آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہم بھی اپنے آپ کو بہت چھوٹا آدمی سمجھتے ہیں بابا! خلق کے خادم ہیں۔ لوگوں کی خدمت نے... اور ماں کی دعا نے ہمیں لوگوں کی نظر میں شاید کچھ بڑا آدمی بنادیا ہے ورنہ ہم تو مرتبے میں کیا... قد میں بھی بہت چھوٹے آدمی ہیں۔ آپ دیکھ ہی رہے ہیں۔" اس نے اپنے سراپا کی طرف اشارہ کیا اور ایک بار پھر کھچ کھچ کرتا ہوا قہقہہ لگایا۔

"ارے نہیں پیر صاحب" میں نے آگے بڑھ کر اپنائیت سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا "میں اتنا بے خبر آدمی نہیں ہوں۔ مجھے آپ کے مقام اور مرتبے کا پتا ہے۔ آپ نے یہاں تشریف لاکر واقعی میری عزت افزائی کی ہے۔"

میں نے اسے کمرے کے اس حصے کی طرف چلنے کا اشارہ کیا جو نشست گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہ مخملیں صوفے میں دھنس چکا تو میں نے پوچھا "آپ کیا کھانا پینا پسند فرمائیں گے؟"

"ارے چھوڑو بابا!" وہ بے پروائی سے ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔ "دفتر میں کیا کھانا پینا۔ دفتر تو بڑی تکلف والی جگہ ہوتی ہے۔ آپ کبھی ہمارے گھر تشریف لائیں پھر ہم آپ کو کچھ کھلائیں پلائیں گے۔ جو کچھ ہم آپ کو کھلائیں پلائیں گے، اس کے بعد امید ہے آپ بڑی مدت تک ہم کو یاد رکھیں گے۔"

"آپ جیسی ہستی سے ملاقات ہوگئی۔ میرے لئے یہی کافی ہے۔ میں تو ویسے بھی آپ کو مدت تک یاد رکھوں گا..... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آئندہ ہماری ملاقات نہیں ہوگی۔ ملاقات تو ہوتی رہنی چاہئے۔" میں نے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ اچھا ہوا وہ صوفے پر بیٹھا تھا۔ میرا خیال ہے کرسی پر تو وہ بیٹھ ہی نہیں سکتا تھا۔ بازوؤں والی کرسی میں وہ سما ہی نہیں سکتا تھا۔ میں نے چھوٹے قد کے تو بہت سے لوگ دیکھے تھے لیکن چھوٹے قد کا اتنا چوڑا شخص زندگی میں پہلی بار دیکھا تھا۔

وہ بھی یقیناً نظروں ہی نظروں میں مجھے تول رہا تھا۔ بظاہر ہم بات کررہے تھے لیکن درحقیقت ہم دونوں ہی کا ذہن ایک دوسرے کی شخصیت کے نادیدہ گوشے دریافت کرنے کی کوشش کررہا تھا۔

"کیوں نہیں..... کیوں نہیں....." وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "ملاقات تو اب ہوتی رہے گی۔ ہم نے آپ کو اپنے دوستوں میں شمار کرلیا ہے۔ دوستوں میں ملاقات تو ہوتی ہی ہے۔" ایک فٹ اونچی ٹوپی کی وجہ سے اس کا سر ہلانا ایک عجیب سا عمل محسوس ہورہا تھا۔ ایک چھوٹا سا مینار گویا آگے پیچھے جھولتا تھا اور حیرت ہوتی تھی کہ وہ گر کیوں نہیں رہا تھا۔

"آپ کی بڑی مہربانی ہے کہ آپ نے مجھ حقیر کو اپنے دوستوں میں شمار کیا....." میں نے اپنے لہجے میں ایک منافقانہ سی عاجزی پیدا کرنے کی کوشش کی جس میں شاید مجھے کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ میرے لہجے میں سرد مہری برقرار رہی۔

میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "آپ نے مجھے دوستوں میں تو شمار کرلیا۔ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح آپ کی اس مہربانی کا شکریہ ادا کروں۔ آپ کچھ کھانا پینا پسند نہیں کررہے۔ مجھے کوئی تو

خدمت بتائیں نا۔"

"ہماری خدمت تو آپ پہلے ہی شروع کر چکے ہیں۔ اسی لئے تو ہم یہاں نظر آرہے ہیں۔" وہ مسکرایا اور داڑھی سے اوپر اس کے رخساروں کے گول مٹول ابھار کچھ اور نمایاں ہو گئے۔

"کیا مطلب؟" میں نے حیرت کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔ "میں آپ کی خدمت کر رہا ہوں اور مجھے اس کا پتا بھی نہیں؟"

"ہاں... کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ آدمی کسی کی خدمت کر رہا ہوتا ہے اور اسے پتا بھی نہیں ہوتا کہ وہ درحقیقت کس کی خدمت کر رہا ہے۔" وہ گویا اپنے مزاح سے خود ہی محظوظ ہوتے ہوئے ہنسا۔ ایک بار پھر کمرے میں کھچ کھچ کی سی آواز ابھرنے لگی۔

پھر یکدم ہی اس کی ہنسی کو بریک لگی اور وہ حد سے زیادہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔ وہ میری طرف کو جھکتے ہوئے نہایت دھیمی آواز میں بولا "آپ مونا کو تلاش کر رہے ہیں... یہ ایک طرح سے ہماری ہی خدمت ہے۔"

چند لمحے کے لئے کمرے میں گہرا سکوت چھا گیا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی پلک نہیں جھپک رہا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ اس نے یہ بات کر کے مجھے حیران کیا تھا لیکن فوری طور پر میں نے کوئی سوال نہیں کیا۔ جب وہ ازخود کسی وضاحت کی طرف نہیں آیا تو میں نے گہری سانس لے کر کہا "معافی چاہتا ہوں پیر صاحب! میں ایک کم عقل سا آدمی ہوں۔ آپ کی بات سمجھ نہیں سکا۔"

ایک بار پھر اس کی داڑھی مونچھوں کی حرکت اور رخساروں کے ابھار سے اندازہ ہوا کہ وہ مسکرایا تھا۔ اس کے ہونٹ تو گھنی داڑھی مونچھوں میں تقریباً چھپے ہوئے تھے۔ عجیب سرسراتی سی آواز میں وہ بولا "افضل صاحب! آپ بھی بڑے آدمی ہونے کے باوجود ہماری طرح انکسار پسند ہیں۔ انکسار پسندی اچھی چیز ہے لیکن اب ہمارے سامنے آپ کو انکساری برتنے کی ضرورت نہیں۔ ہم اور آپ اب دوست ہیں۔"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں وضاحت کر دیتا ہوں۔ بھئی بات دراصل یہ ہے کہ آپ سے پہلے ہمیں مونا کی تلاش تھی لیکن ہم اس میں ناکام رہے تھے۔ ہمارے آدمیوں نے پورا شہر چھان مارا۔ شہر میں ہمارا کچھ اثر و رسوخ بھی ہے۔ ہم نے وہ بھی استعمال کیا یعنی دوسرے ذرائع سے بھی اس کو تلاش کرایا لیکن اس کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ مجھے کچھ یوں لگتا ہے کہ وہ اس شہر میں... بلکہ شاید اس ملک میں ہی نہیں ہے۔"

میں خاموش رہا۔ اب پہلے اس کی بات سن لینا ہی بہتر تھا۔ ذرا توقف کے بعد وہ گہری سانس لے کر بولا "پھر ہمیں پتا چلا کہ آپ بھی اسے تلاش کر رہے ہیں۔ ہم نے سوچا یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ ایک سے دو بھلے۔ ہمیں اس معاملے میں ناکامی ہوئی لیکن شاید آپ کی قسمت اس معاملے میں ہم سے اچھی ہو یا آپ کے آدمی اس طرح کے کاموں میں ہمارے آدمیوں سے بہتر ہوں۔"

"آپ مونا کو کیسے جانتے ہیں۔ کس حیثیت سے جانتے ہیں اور آپ کو اس کی تلاش کیوں ہے؟" میں نے نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔

اس کی چھوٹی چھوٹی سی آنکھیں گویا کچھ اور سکڑ گئیں۔ ان میں ایک عجیب سی اداسی اتر آئی جس پر مجھے حیرت ہوئی۔ وہ تاریک چشمہ جو اس نے اتار کر میز پر رکھ دیا تھا، اٹھا کر دوبارہ لگا لیا اس کی شخصیت میں مافیائی سرداروں کی سی پُراسراریت اور سفاکی لوٹ آئی۔

وہ گہری سانس لے کر بولا "ہمیں معلوم تھا ہم یہاں آرہے ہیں تو ہمیں اس قسم کے سوالوں کے جواب بھی دینے ہوں گے۔ ان سوالوں میں ہمارے لئے ندامت کا سامان ہے لیکن مونا کی تلاش کے سلسلے میں ہم ہر ندامت اٹھانے کے لئے تیار ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ کوٹ کی سامنے والی جیب سے اس نے سیلوفین میں پیک شدہ ایک نہایت مہنگا غیر ملکی سگار نکال کر اس کی پیکنگ چاک کی اور ایک طلائی لائٹر سے اسے سلگانے کے بعد گہرا کش لیا۔ کمرے میں ایک خاص خوشبو والا نیلگوں دھواں چکرانے لگا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گہری سنجیدگی سے بولا "افضل صاحب! ہم نے آپ کو دوست کہا ہے اور آپ ایک بڑے آدمی ہیں۔ بڑے آدمی کے لئے دوستی کا پاس رکھنا بھی ضروری ہے کیا؟ یقین رکھیں کہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو اس کمرے تک ہی محدود رہے گی۔ یہاں سے باہر نہیں جائے گی؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے بلا تامل جواب دیا۔

"دراصل ہم جیسی شخصیتوں کے خلاف اسکینڈل بڑی جلدی بنتے ہیں۔" وہ بولا پھر جیسے اسے خود ہی تصحیح کا خیال آیا "ویسے ہمارے خلاف اسکینڈل بنانا کوئی آسان کام بھی نہیں ہے۔ اخبارات وغیرہ کی سطح تک تو کوئی مائی کا لال ہی کسی گستاخی کی جرأت کر سکتا ہے لیکن ہم نہیں چاہتے کہ کوئی زیرلب بھی سرگوشیاں یا کانا پھوسی کرے۔"

"آپ مطمئن رہیں۔ اس سینے میں بڑے بڑے راز دفن ہیں۔" میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی۔

"آپ کے سوالوں کے جواب دینے سے پہلے ہم آپ سے ایک سوال کرنا چاہیں گے۔" وہ بولا "آپ مونا کو کس لئے تلاش کر رہے ہیں؟"

"محض انسانی ہمدردی کے ناتے۔" میں نے جواب دیا "کسی نے مجھ سے درخواست کی۔ میں نے انکار کر دیا لیکن پھر حالات کچھ ایسے ہوئے کہ میں نے ہامی بھرلی اور یہ میری انا کا مسئلہ بن گیا۔"

"ٹھیک... بالکل ٹھیک۔" اس نے طمانیت سے سر ہلایا

"ہمیں کچھ اسی قسم کے جواب کی توقع تھی کیونکہ ہماری معلومات کے مطابق آپ کا مونا سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ آپ تو شاید کبھی اس سے ملے بھی نہیں؟"

"جی ہاں آپ کا خیال درست ہے اور آپ کی معلومات قابلِ رشک ہیں۔" میں نے جواب دیا "میں اپنے سوالوں میں ایک اور سوال کا اضافہ کرنا چاہوں گا۔ آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ مجھے مونا کی تلاش ہے؟"

"آپ میڈم نور کے اڈے پر گئے تھے اور آپ نے وہاں اس کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی۔ ہمیں یہ تو بعد میں پتا چلا کہ آپ نے وہاں مونا کے بارے میں پوچھ گچھ کی تھی۔ ہمارے آدمی پہلے ہی وہاں سے مونا کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کر چکے تھے لیکن انہیں مونا کا کچھ پتا نہیں چلا تھا۔ بہرحال وہ میری ہدایت پر یونہی ایک موہوم سی امید کے سہارے اس اڈے کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے آپ کو وہاں جاتے دیکھا۔ واپسی پر انہوں نے یونہی تجسس کے تحت آپ کا تعاقب کیا۔ آپ خبردار ہو گئے۔ آپ نے انہیں گھیرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے آپ کا پیچھا چھوڑ دینا بہتر سمجھا۔ یہ واقعی ان کی عقلمندی تھی۔ وہ آپ کو پہچان چکے تھے اور آپ نے یقیناً اپنے ہوٹل یا کسی اور ایسے ہی ٹھکانے پر جانا تھا۔ اس لئے آپ کا تعاقب کر کے ان کی معلومات میں اضافہ ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ اچھا ہی ہوا وہ آپ سے ٹکراؤ سے بچ گئے ورنہ دو یکساں اور تعمیری مقصد رکھنے والے فریقوں میں سے کسی ایک کو... یا شاید دونوں ہی کو بلاوجہ نقصان پہنچ سکتا تھا۔ انہوں نے بعد میں میڈم نور کے اڈے سے معلوم کر لیا تھا کہ آپ وہاں کس لئے گئے تھے۔"

"اچھا... تو وہ آپ کے آدمی تھے!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "چلیں یہ تجسس تو ختم ہوا۔ میں بڑا حیران تھا کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے تعاقب شروع کیا اور پھر اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑ دیا۔"

"مجھے جب معلوم ہوا کہ آپ بھی مونا کی تلاش میں ہیں تو میرا حوصلہ بڑھا۔ مجھے خوشی ہوئی کیونکہ میں غائبانہ طور پر آپ کو جانتا ہوں۔ مجھے معلوم ہے آپ ایک شریف آدمی ہیں۔ مونا سے آپ کا کوئی تعلق بھی نہیں ہے۔ اس لئے مجھے امید یہی تھی کہ آپ کسی کی درخواست پر اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے میرا کام آسان ہونے والا تھا۔ اسی لئے میں نے سوچا آپ سے ملاقات بھی کر لی جائے۔" وہ اب "ہم" کا صیغہ چھوڑ کر "میں" کے صیغے میں بات کرنے لگا تھا۔ شاید غیر ارادی طور پر بلندی سے کچھ نیچے اتر آیا تھا۔

ذرا توقف کے بعد وہ بولا "اب ہم آپ کے سوالات کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے آپ نے پوچھا ہے کہ میں مونا کو کیسے جانتا ہوں؟ صاحب! یہ تو یقیناً تقدیر کا فیصلہ تھا کہ میں اسے جانتے لگوں۔ آپ ایک ماڈرن آدمی ہیں افضل صاحب! آپ سے کھل کر بات کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ میں بھی ایک ماڈرن آدمی ہوں۔ پیری فقیری اپنی جگہ ہے۔ آپ کو معلوم ہے آج کی دنیا میں ہم جیسے لوگوں کے سلسلے عام دنیا دار لوگوں سے بھی کچھ زیادہ پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر طرح کی عورتوں سے ہمارا رابطہ رہتا ہے اور ہر طرح کی محفلیں جمتی ہیں۔ معتقدین کے سامنے ہماری ایک الگ زندگی ہے۔ ہماری پرائیویٹ زندگی اس سے کافی مختلف ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہوگا۔ آپ نے دنیا دیکھی ہے۔" وہ قدرے کھسیانے پن سے ہنسا حالانکہ میرے خیال میں وہ ان باتوں پر کچھ ایسا شرمندہ نہیں تھا۔

"جی ہاں جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے۔" میں نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا۔ "یہ سب فطری باتیں ہیں۔ فطرت سے لڑ کر زندگی گزارنے والوں کا زمانہ اب کہاں رہا ہے۔" میں نے گویا اسے اخلاقی حمایت مہیا کی۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جلد از جلد بات کو آگے بڑھائے اور حالات کی کوئی سچی یا جھوٹی تصویر میرے سامنے آسکے۔

وہ پُرخیال سے انداز میں مونچھ کو بل دیتے ہوئے بولا "مونا کو ایک رات میری خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔ وہ خوب صورت تھی۔ نوجوان تھی۔ تر و تازہ تھی لیکن یہ خوبیاں اب میرے لئے کچھ زیادہ اہم نہیں رہیں۔ مجھ جیسے لوگوں کی زندگی میں اس قسم کی لڑکیاں رات کو آتی ہیں اور صبح ہم انہیں بھول جاتے ہیں۔ میری اس بات سے آپ کو اپنے اس سوال کا جواب بھی مل رہا ہے کہ میں اسے کس حیثیت سے جانتا ہوں۔ ٹھیک ہے نا؟" اس نے سگار کا طویل کش لیتے ہوئے بغور میری طرف دیکھا۔ میں تاریک شیشوں کے عقب میں بھی اس کی آنکھوں کو کافی حد تک واضح طور پر دیکھ رہا تھا۔

"جی ہاں اور اب سب سے اہم سوال رہ جاتا ہے۔ آپ کو اس کی تلاش کیوں ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ان میں بدستور اداسی کی پرچھائیاں تیر رہی تھیں۔

"افضل صاحب! اس رات مونا سے ملاقات کیا ہوئی۔ بس دل کے ساتھ کچھ عجیب ہی حادثہ ہوا!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ "وہ اس قبیل کی لڑکیوں سے بہت مختلف تھی۔ رات کے پچھلے پہر یونہی غنودگی سے اچانک میری آنکھ کھلی تو دیکھا وہ چپکے چپکے رو رہی تھی پھر اس سے باتیں ہونے لگیں اور ہوتی ہی چلی گئیں۔ شاید ہم دونوں ہی کو وقت گزرنے کا احساس نہ رہا۔ دن چڑھ گیا اور ہم باتیں ہی کرتے رہے۔ تب مجھے احساس ہوا کہ ہم تو بالکل ہی غلط پس منظر میں ملے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے بہت پہلے... کبھی لڑکپن میں مجھے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی اور وہ خواہش اب بھی لاشعور میں کہیں بڑی مضبوطی سے پنجے گاڑے بیٹھی تھی۔ میرا ظاہری سراپا شاید اسے پسند نہ رہا ہو لیکن میرے اندر اسے بھی اپنا مطلوبہ شخص

چھپا دکھائی دیا۔ وہ میرے لئے کیچڑ میں کِھلا ہوا پھول تھی اور میں اس کے لئے کوئلے کی کان میں دبا ہوا ہیرا۔ ہم دونوں میں ایک دوسرے کو پانے کی خواہش جاگ اٹھی تھی۔ گو کہ اس وقت بھی ہم ایک دوسرے کو پا ہی چکے تھے لیکن وہ پانا کچھ اور تھا......"

وہ ایک لمحے کے لئے خاموش ہو کر استہزائیہ سے انداز میں ہنسا "آپ یقیناً دل ہی دل میں میری باتوں پر ہنس رہے ہوں گے؟"

"اس میں ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "انسان کا دل بڑی عجیب چیز ہے۔ کسی وقت بھی کوئی تماشا دکھا سکتا ہے۔"

وہ گویا میری بات سے حوصلہ پا کر بولا "افضل صاحب! میں آپ کو یہ بتاتا چلوں کہ میری تین بیویاں ہیں اور تینوں نہایت خوب صورت ہیں اگر آپ کو مجھ جیسے آدمی کے لائف اسٹائل کا ذرا بھی اندازہ ہے تو شاید آپ یہ اندازہ بھی کرسکیں کہ کتنی عورتیں میری زندگی میں آکر چلی گئی ہوں گی۔"

"ویسے شاید اندازہ نہ ہوتا لیکن آپ کی باتوں سے اندازہ ہوگیا ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"بس... تو پھر آپ کو اس بات پر حیران ہونا چاہئے کہ اس وقت میری حالت ایک نوعمر لڑکے کی سی ہوگئی۔ میرے دل میں گویا ایک نئے سرے سے ہی زندگی کا آغاز کرنے کی خواہش جاگ اٹھی جس میں مونا کو میرا ہم سفر ہونا چاہئے تھا۔ اس کی حیثیت میرے لئے شرمناک ہونی چاہئے تھی۔ مجھے یہ خیال بھی آیا کہ میں اس کا ماضی اس سے جدا نہیں کرسکتا تھا۔ میں اگر اس سے شادی کرلیتا اور کبھی اس کا ماضی ایک طعنہ بن کر میرے سامنے آن کھڑا ہوتا تو میرے لئے بڑی مشکل صورتِ حال پیدا ہوسکتی تھی لیکن میرے ذہن سے گویا یہ تمام اندیشے نکل گئے تھے۔ مجھے خیال آرہا تھا کہ اب تک میں ایک جھوٹی اور جعلی سی زندگی گزارتا رہا تھا۔ مجھے اس کا بھی کچھ کفارہ ادا کرنا چاہئے تھا۔ اگر مجھے مونا جیسی لڑکی سے شادی کرکے کوئی شرمندگی اٹھانا بھی پڑتی تو میں اس کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوچکا تھا۔"

اس نے سگار کا ایک اور طویل کش لے کر کمرے میں ہوا کی کثافت میں اضافہ کیا پھر سلسلہ کلام جوڑا "وہ بھی بڑی خوشی سے مجھ سے شادی کے لئے تیار تھی۔ اسے ایک مضبوط سہارے کی اشد ضرورت تھی۔ میں اپنی شخصیت کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہوں افضل صاحب! مجھے معلوم ہے میں اپنی تمام تر دولت کے باوجود کسی عورت کا آئیڈیل نہیں ہوسکتا اور شاید یہی میری تشنگی ہے۔ اس دنیا میں ہر انسان چاہتا ہے کہ اسے چاہا جائے۔ یہ جو میں نے تین شادیاں کیں.... اتنی عورتوں کی قربت حاصل کی... یہ شاید ہوس نہیں تھی افضل صاحب! یہ چاہے جانے کی خواہش تھی۔ اپنے لاشعور میں یہ تشنگی لئے انسان بدن کے صحرا میں بھٹکتا رہتا ہے۔ اس صحرا میں بھلا اس تشنگی کا علاج کہاں؟"

وہ اب اس پیر دانش شاہ سے بہت مختلف لگ رہا تھا جسے میں نے کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا۔ اس نے گویا اپنے اوپر سے ایک خول اتار کر ایک طرف رکھ دیا تھا اور بڑی جرأت سے کام لیتے ہوئے اپنی اصل شخصیت میرے سامنے رکھ دی تھی۔ میں اب اس کے بارے میں الجھن میں پڑ گیا تھا کہ کیا وہ واقعی قابلِ نفرت تھا... جیسا کہ میں نے ابتدا میں محسوس کیا تھا؟ یا میرے مشاہدے نے اس وقت مجھے دھوکا دیا تھا اور اصل پیر دانش شاہ اب میرے سامنے آرہا تھا؟

وہ کہہ رہا تھا "آپ میرا سراپا دیکھ رہے ہیں؟ ہر انسان کو اپنا آپ خوب صورت ہی لگتا ہے۔ اگر وہ اچھا خاصا مضحکہ خیز ہو تب بھی کم از کم اپنے آپ کو قابلِ قبول حد تک ٹھیک ٹھاک تو سمجھتا ہی ہے لیکن میں آپ کو بتا چکا ہوں میں خوش فہم ہرگز نہیں ہوں۔ مجھے شاید میری بیویاں بھی پسند نہ کرتی ہوں۔ میں ان کی سماجی ضرورت ہوں۔ باقی رہیں وہ عورتیں جنہیں ان کے جھوٹے لفظوں اور جھوٹے جذبوں کے ساتھ رات دو رات یا ہفتے دو ہفتے کے لئے خریدا جاتا ہے ان کا تو ذکر ہی فضول ہے۔ وہ تو شاید میرے پاس سے جانے کے بعد میرا تصور بھی ذہن میں لانا پسند نہیں کرتی ہوں گی۔"

میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ ذرا سی خاموشی کے بعد گہری سانس لے کر بولا "لیکن جب اس لڑکی سے باتیں ہوئیں اور اس نے اپنا دل گویا چیر کر میرے سامنے رکھا تو مجھے یقین ہوگیا کہ اگر میں نے اس لڑکی کو اپنی پناہ میں لے لیا تو وہ زندگی بھر مجھ سے اتنی محبت کرے گی کہ میری روح سرشار ہوجائے گی۔ یہ ایک عجیب احساس تھا۔ میں اس احساس کی شدت، طاقت اور سنسنی خیزی پر حیران ہوگیا۔"

وہ خاموش ہو کر اپنے سگار کو گھورنے لگا۔ میں نے پہلو بدلتے ہوئے کہا "قصہ مختصر یہ کہ آپ نے اس سے شادی کا فیصلہ کرلیا؟"

"ہاں لیکن میں نے اسی وقت اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی حماقت بھی کی۔ جو اُس وقت مجھے بہت بڑی عقلمندی محسوس ہورہی تھی۔ میں نے اسے یہ تو بتا دیا کہ میں اس سے شادی کرنے کے لئے فوری طور پر تیار تھا لیکن بہرحال یہ کام کچھ وقت لیتے ہیں خاص طور پر مجھ جیسی شخصیت کے لئے تو ایسا فیصلہ کرتے وقت نہ جانے کتنے مسائل کو نمٹانا ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے طے کیا کہ ٹھیک ایک ماہ بعد ہم دوبارہ ملیں گے اور شادی کی تاریخ طے کریں گے لیکن اس دوران وہ میری امانت بن کر رہے، کوئی مرد اسے چھونے بھی نہ پائے۔ اس نے بہت بڑی قسم کھا کر وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہوگا۔ ہم نے یہ بھی فیصلہ کیا کہ اس دوران ہم بالکل نہیں ملیں گے۔ آتشِ شوق جتنی بھڑکے اتنا ہی بہتر ہوگا۔ دراصل میں اپنے خیال میں ہر پہلو سے بڑا بقراط بن رہا تھا۔ میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ اگر یہ محض کوئی وقتی جذباتی لہر ہے تو اس وقت تک گزر جائے گی۔ میرے فیصلے میں جو بھی غلطی ہوگی میں جذباتیت سے بچتے ہوئے اسے ٹھیک کرلوں گا۔"

اس نے چشمہ اتارا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن وہ نہیں دھیرے دھیرے ملنے لگا۔ چند لمحے بعد اس نے چشمہ دوبارہ لگالیا اور شکستہ سے لہجے میں بولا "ایک ماہ بعد میرا فیصلہ پہلے سے زیادہ مستحکم ہوچکا تھا۔ میرا رُواں رُواں گواہی دینے لگا تھا کہ میں اس لڑکی سے شادی کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ پہلے سے زیادہ بے تاب تھا۔ یہ میرے لئے بلاشبہ ایک عجیب تجربہ تھا۔ جو لڑکی ایسی ہی ہر وقت.... ہر طرح سے آپ کی رسائی میں ہو۔ اس سے شادی کرنے کے لئے مرد اتنا بے تاب کہاں ہوتا ہے؟ اور وہ بھی میرے جیسا مرد... جس نے دنیا میں سب کچھ دیکھ لیا تھا۔"

وہ خود استہزائی کے سے انداز میں مسکرایا "میں نے اس پورے مہینے کے دوران اسے فون تک نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس نے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ ایک ماہ بعد میں خود دوڑا دوڑا اس کے ٹھکانے پر پہنچا تو پتا چلا کہ وہ غائب ہوچکی تھی۔ اس کے بعد سے آج تک میں اسے ڈھونڈ رہا ہوں لیکن وہ نہیں ملی۔"

اس نے طویل سانس لی "کافی مضحکہ خیز کہانی ہے نا؟"

"مضحکہ خیز نہیں پیر صاحب...! یہ ایک دردناک کہانی ہے۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "لیکن مجھے پتا چلا ہے کہ مونا کو غائب ہوئے چھ ماہ ہوچکے ہیں۔ کم از کم میڈم نور کے اڈے پر تو وہ چھ ماہ سے نہیں ہے۔"

"میں چھ ماہ سے ہی اس کی تلاش میں ہوں۔" وہ فوراً بولا۔ "اور میں ابھی تک مایوس نہیں ہوا۔ میری حالت اس انسان کی سی ہے جسے اس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی محض ایک جھلک دکھا کر غائب ہوگئی ہو۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ ہر گزرتے ہوئے دن کے ساتھ میری امید کمزور پڑنے کے بجائے قوی تر ہورہی ہے۔ میرے دل میں اس لڑکی کو پانے کی خواہش شدید تر ہوتی جارہی ہے اور ساتھ ہی یہ احساس بھی شدت اختیار کررہا ہے کہ وہ جہاں بھی ہے اسے میری مدد کی اشد ضرورت ہے۔ میں راتوں کو سوتے سے اٹھ کر بیٹھ جاتا ہوں۔ مجھے گویا کہیں سے اس کی پکار سنائی دیتی ہے۔"

"آپ کو کہیں سے اُس کا کوئی سراغ نہیں ملا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"نہیں" وہ گہری افسردگی سے بولا "اور اس پر مجھے شدید حیرت ہے۔ اس لئے کہ میں کوئی ایسا گیا گزرا آدمی نہیں ہوں جو اس شہر میں ایک انسان کو تلاش نہ کرواسکوں۔"

میں دل ہی دل میں یہ کہے بغیر نہ رہ سکا کہ یہ محض اس کی غلط فہمی یا خوش فہمی تھی۔ انسانوں کے اس جنگل میں کھو جانے یا روپوش ہوجانے والے ایک تو کیا، سیکڑوں انسانوں کو تلاش کرنا بڑا کٹھن کام تھا۔ کوئی اتفاق ہی سے مل جاتا تو مل جاتا۔ اسے غیبی مدد بھی کہا جاسکتا تھا۔ اپنی سی کوششیں تو کی جاسکتی تھیں لیکن محض کوششوں کی بنا پر یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔

پیر دانش شاہ کہہ رہا تھا "میں نے اپنا اثر رسوخ بھی استعمال کیا ہے۔ پولیس سے بھی کہا ہے۔ اپنے کچھ خاص دوستوں سے بھی مدد کی درخواست کی ہے لیکن کوئی نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ آپ کو بھی دوست ہی سمجھ کر آپ کے پاس آگیا ہوں۔ جوں ہی مجھے پتا چلا کہ آپ مونا کی تلاش میں دلچسپی لے رہے ہیں، مجھے امید کی ایک موہوم سی کرن نظر آئی کہ اس معاملے میں میری قسمت نے تو یاوری نہیں کی لیکن شاید آپ کو ہی کوئی سراغ مل جائے۔ آپ کو ہی اس مقصد میں کامیابی حاصل ہوجائے۔ میرا مسئلہ تو اس صورت میں بھی حل ہوجائے گا۔"

پھر وہ صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا "افضل صاحب! میں نے تو آپ کو ساری بات بتادی ہے۔ اب آپ سچ سچ بتائیں، آپ کو مونا کی تلاش کے سلسلے میں کوئی کامیابی ہوئی یا نہیں؟"

"میں نے تو ابھی تلاش شروع ہی کی ہے پیر صاحب!" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آپ تو اتنے طویل عرصے سے تلاش کررہے ہیں جبکہ آپ کے وسائل بھی شاید مجھ سے زیادہ ہوں۔ اس کے باوجود آپ کو کامیابی نہیں ہوئی تو مجھے اتنی جلدی کامیابی کیسے ہوسکتی تھی۔"

"اوہ...!" اس کے گہرے سانولے چہرے پر مایوسی پھیل گئی۔

میرے ذہن میں ایک کشمکش سی برپا تھی۔ میں اسے مونا والی فلم کے بارے میں بتانا چاہتا تھا اور اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ کیا اسے اس فلم کے بارے میں کچھ معلوم تھا؟ وہ مونا سے اس کی ملاقات سے پہلے کی بنی ہوئی تھی یا اس کی گمشدگی کے دوران وجود میں آئی تھی؟ اس سلسلے میں اگر اسے کچھ معلوم ہوتا تو شاید اس سے کچھ باتوں کا تعین کرنے میں مدد ملتی لیکن نہ جانے کیوں میں یہ بات زبان پر ہی نہیں لاسکا۔ کسی غیبی قوت نے گویا مجھے اس موضوع پر بات کرنے سے باز رکھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اس موضوع پر اگر مجھے پیردانش سے بات کرنی بھی ہوئی تو دو چار دن بعد کروں گا۔ بہتر یہی تھا کہ ابھی اسے کچھ اور پرکھ لیا جاتا۔ اس کے بارے میں کچھ اور اندازے لگالئے جاتے' کچھ اور معلومات حاصل کرلی جاتی۔ عین ممکن تھا اس کے بارے میں کوئی نئی بات سامنے آجاتی۔ یہ سب کچھ سوچ کر میں نے فلم کے بارے میں زبان بند ہی رکھی۔ پیردانش کی گفتگو سے مجھے اس طرف کوئی اشارہ نہیں ملا تھا۔

"کیا واقعی آپ کو مونا کا کچھ پتا نہیں چلا؟" پیردانش کے لہجے میں ہلکا سا شک جھلک آیا۔

"میں کیا آپ سے جھوٹ بولوں گا پیر صاحب؟" میں نے اپنے لہجے سے ہلکی سی خفگی کا اظہار کرنے کی کوشش کی۔

"نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا "مجھے آپ سے ایسی امید ہرگز نہیں ہے۔ میں تو اصل میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ کہیں آپ کسی بات کو غیراہم سمجھ کر نظرانداز نہ کررہے ہوں۔ آپ کو اس کے بارے میں کوئی معمولی سی معمولی بات بھی معلوم ہوئی ہو تو مجھے ضرور بتادیں شاید وہ میرے لئے کافی اہم ثابت ہو۔"

"ابھی تو کچھ بھی معلوم نہیں ہوسکا پیر صاحب! لیکن یہ میرا وعدہ ہے کہ جونہی کچھ معلوم ہوا' سب سے پہلے آپ کو بتاؤں گا۔ آپ اتنے نیک مقصد کے لئے اسے تلاش کررہے ہیں' آپ سے تعاون کرنا تو اب میرے لئے سب سے زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔"

"وری گڈ!" اس نے قدرے طمانیت سے سرہلایا "میں آپ سے یہی وعدہ لینا چاہتا تھا۔ اگر مجھے کچھ پتا چلا تو میں بھی آپ کو بتادوں گا۔ ہم دونوں دوستوں کو اب مل جل کر یہ کام کرنا ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ تو کوئی ملاقات نہ ہوئی پیر صاحب! آپ نے ہمیں کسی خدمت کا.... خاطر تواضع کا موقع ہی نہیں دیا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ کوئی اہم مسئلہ نہیں ہے افضل صاحب! اصل مسئلہ حل ہوجائے تو پھر دونوں دوست بیٹھ کر جشن منائیں گے۔ جشن!" وہ مجھ سے بغلگیر ہوگیا۔ میں اسے اور اس کے آدمیوں کو رخصت کرنے ہوٹل کے دروازے تک آیا۔

ان کی تینوں گاڑیاں روانہ ہوچکیں تو میں آفس میں واپس بیٹھا اور دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس کی آمد بلاشبہ صورتِ حال کو ایک نیا رخ دے دیا تھا۔ امبر اس دوران کام سے آفس میں آئی۔ وہ یقیناً مجھ سے پوچھنا چاہتی تھی کہ دانش کس سلسلے میں آیا تھا لیکن شاید اس کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی۔ میں نے بھی ازخود کچھ نہیں کہا اور کام کی مصروفیت میں تلاش کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

عین اس وقت جبکہ میں آفس سے اٹھنے کا ارادہ کررہا تھا میرے ڈائریکٹ ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھا کر کہا تو دوسری طرف سے ایک بہت ہی دھیمی آواز نے پوچھا "افضل صاحب ہی بول رہے ہیں نا؟" آواز نسوانی تھی اور سرگوشی سے ذرا ہی بلند تھی۔

"جی ہاں" میں نے جواب دیا "آپ کون ہیں؟"

"آپ وہی افضل صاحب ہیں نا۔ جو اس ہوٹل کے مالک ہیں؟" بولنے والی نے تصدیق چاہی۔ اس کی آواز سے خوف عیاں تھا اور وہ گویا میرے تعارف کی تصدیق کئے بغیر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"ہاں میں وہی افضل ہوں۔" میں نے ملائمت سے کہا "آپ کون ہیں؟ آپ کو جو بھی بات کرنی ہے' بلاخوف و خطر کیجئے۔"

"بلاخوف و خطر؟" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی۔ یہ ہنسی کراہ سے مشابہ تھی "ہاں' آپ یہ بات کہہ سکتے ہیں کیونکہ اس وقت اپنے محفوظ اور ائرکنڈیشنڈ آفس میں آرام سے بیٹھے ہیں گے۔" اس کی آواز اب بھی سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی۔

"آپ کون بول رہی ہیں؟" میں نے ایک بار پھر پوچھا۔ غیرارادی طور پر میری آواز بھی نیچی ہوگئی۔

"میں مونا بول رہی ہوں۔" اس کی آواز اب بالکل سرگوشی میں ڈھل گئی لیکن میں نے اسے صاف سن لیا تھا۔

"مونا؟" میں نے بے یقینی سے دہرایا اور ہڑبڑا کر سیدھا ہو بیٹھ گیا۔

"جی ہاں..... میں مونا ہی بول رہی ہوں۔" اس نے گویا میری بے یقینی کو محسوس کرتے ہوئے زور دے کر کہا۔

ایک لمحے کے لئے میں کچھ بھی نہ بول سکا۔ مجھے واقعی یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ مونا بول رہی تھی۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا کہ جس مونا کی تلاش میں ہم اتنے پاپڑ بیل رہے تھے اور پیشہ ور سراغرسانوں کی طرح جس کا سراغ لگانے کی کوشش کررہے تھے وہ خود مجھے فون کررہی تھی۔ ابھی کچھ ہی دیر پہلے تو پیردانش سے اس کے بارے میں اتنی گفتگو رہی تھی۔

"آپ خاموش کیوں ہوگئے افضل صاحب! میں نے تو سنا ہے آپ مجھے تلاش کررہے تھے۔" وہ چبھتے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

"ہاں اس میں تو کوئی شک نہیں۔" میں نے سنبھل کر گہری سانس لیتے ہوئے کہا "میں واقعی تمہیں تلاش کررہا تھا لیکن تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں تمہیں تلاش کررہا تھا؟"

"میں نے میڈم نور کے بورڈنگ ہاؤس میں سیمیں کو فون کیا تھا۔" وہ بدستور نیچی آواز میں بولی "اس نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا اور آپ کا ایڈریس' فون نمبر وغیرہ بھی دیا۔"

"یہ کب کی بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"چند منٹ پہلے کی۔" اس نے جواب دیا "یہ چند منٹ مجھے فیصلہ کرنے میں لگ گئے کہ میں آپ کو فون کروں یا نہ کروں۔ سیمیں کا اصرار تھا کہ میں آپ کو ضرور فون کروں۔"

"اس کے باوجود تم نے فون کرنے میں اتنی دیر لگادی؟" میں نے کہا۔

"کیا یہ شکوہ ہے؟" اس نے دریافت کیا۔

"یہی سمجھ لو۔" میں نے کہا۔

"آپ یہ شکوہ کرسکتے ہیں افضل صاحب! کیونکہ آپ کو اس صورتِ حال کا اندازہ نہیں جس میں' میں گرفتار ہوں۔ میں اس وقت اپنے سائے پر بھی بھروسا نہیں کرسکتی۔" اس کے لہجے میں اب بھی خوف نمایاں تھا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں ابھی یہ بھی فیصلہ نہیں کرسکی کہ آپ کو یہ بات بتادوں یا نہیں۔" وہ ہچکچاہٹ سے بولی۔

"تو پھر مجھے فون کیوں کیا ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"سیمیں کا اصرار تھا کہ میں آپ کو ضرور فون کروں۔" اس نے دوبارہ بتایا "دراصل میں نے سیمیں کو فون کرکے بتایا تھا کہ میری جان کو شدید خطرہ لاحق ہے' کیا وہ میری کچھ مدد کرسکتی ہے؟ حالانکہ مجھے معلوم تھا وہ میری کوئی خاص مدد نہیں کرسکتی لیکن ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ہوتا ہے۔ مجھے کوئی اور ایسا نظر نہیں آرہا تھا جس سے میں بات کرسکتی۔ سیمیں کو میں نے فون تو کردیا لیکن مجھے خود بھی احساس تھا کہ اس جیسی لڑکیاں تو بے چاری خود کسی نہ کسی انداز میں مدد کی محتاج ہوتی ہیں۔ وہ میری کوئی مدد تو نہیں کرسکتی تھی لیکن اس نے آپ کے بارے میں بتایا کہ آپ مجھے ڈھونڈتے ہوئے میڈم نور کے بورڈنگ ہاؤس تک آئے تھے۔ پہلے تو میں ڈر گئی کہ شاید آپ کے روپ میں بھی درحقیقت مجھے موت ہی ڈھونڈ رہی ہے لیکن سیمیں نے مجھے بہت اطمینان دلایا کہ ایسی بات نہیں ہے۔ اسے یقین تھا کہ آپ جیسا ہی کوئی آدمی میری مدد کرسکتا ہے۔"

"شاید اس کا خیال ٹھیک ہی ہو لیکن میں تبھی تمہاری کوئی مدد کرسکتا ہوں جب مجھے معلوم ہو کہ تم کہاں ہو' کس مصیبت میں گرفتار ہو۔"

"اس وقت تو میں برقعے میں لپٹی.... کارڈ والے ایک فون سے آپ سے بات کررہی ہوں۔ میرا چہرہ نقاب میں چھپا ہوا ہے۔ دوسرے سب خوف تو اپنی جگہ ہیں لیکن ایک دھڑکا یہ بھی لگا ہوا ہے کہ اگر کوئی اور فون کرنے آگیا تو میں آپ سے بات نہیں کرسکوں گی؟"

"تو پھر ضروری بات کرڈالو نا۔" مجھے اس کی حد سے زیادہ احتیاط پسندی پر غصہ آرہا تھا لیکن خود پر ضبط کرتے ہوئے میں بدستور نرم لہجے میں بات کررہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ زندگی میں جہاں جہاں اس لڑکی کو احتیاط کی ضرورت رہی ہو وہاں اس نے قطعاً احتیاط نہ کی ہو لیکن جہاں اسے کسی پر بھروسا کرکے جلد از جلد اصل بات کرلینی چاہئے تھی وہاں اس کی احتیاط پسندی آڑے آرہی تھی۔

وہ خاموش رہی تو میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ "تمہیں معلوم ہے میں درحقیقت کیا جاننا چاہ رہا ہوں۔ میرے لئے یہ بات اہم نہیں ہے کہ تم کہاں سے اور کس حلیے میں فون کررہی ہو۔ یہ بتاؤ کہ میں تمہاری مدد کے لئے کہاں پہنچوں؟ اگر تم میرے پاس آسکتی ہو تو آجاؤ۔ میں کوئی گارنٹی دینا تو پسند نہیں کرتا لیکن تمہیں امید ضرور دلا سکتا ہوں کہ میری پناہ میں تم محفوظ رہو گی۔ گو کہ مجھے اندازہ نہیں ہے کہ تمہیں کس سے خطرہ لاحق ہے۔"

وہ اب بھی خاموش تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ سلسلہ منقطع نہیں ہوا تھا۔ میں نے طویل سانس لے کر کہا "کیا تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہیں کس سے خطرہ لاحق ہے؟"

"معلوم ہے" وہ نہایت کمزور سی آواز میں بولی۔

"مجھے صرف اس کا نام بتادو۔" میں نے کہا۔

"میں فون پر کچھ بھی نہیں بتاسکتی۔" دفعتاً وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کی سسکیاں نہایت مدھم تھیں لیکن اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ نہایت اذیت کے عالم میں رو رہی تھی اور اپنی آواز کو دبائے رکھنے کی حتی الامکان کوشش کررہی تھی۔

"تو پھر فون کس لئے کیا ہے؟" میں نے نہایت نرمی سے پوچھا۔

"شاید کسی نامعلوم امید کے سہارے....." اس نے سسکیوں کے درمیان جواب دیا۔

"کبھی کبھی کسی پر بھروسا کرلینے سے امیدیں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں۔" میں نے کہا "تمہیں شاید اندازہ بھی نہ ہو کہ میں نے تمہیں کتنے خلوص سے تلاش کرنے کی کوشش کی تھی ورنہ مجھے بھلا اس قسم کے کاموں کی فرصت کہاں۔"

اس کی سسکیاں رک گئیں اور اس نے آنسوؤں سے بھیگی سرگوشی میں پوچھا "آپ نے کس کے کہنے پر مجھے تلاش کرنا شروع کیا تھا؟"

"پہلے تمہاری بہن کے کہنے پر.... اور پھر اپنے اندر ابھرنے والی کسی غیبی آواز کے کہنے پر۔" میں نے جواب دیا "یہ شاید میرے خلوص ہی کا معجزہ ہے کہ مجھے تم کو زیادہ تلاش نہیں کرنا پڑا اور تم نے خود ہی مجھے فون کرلیا۔ اب ایسا کرو کہ تم جہاں کہیں بھی ہو، کسی بھی سواری میں بیٹھ کر اس ہوٹل تک پہنچ جاؤ۔"

مجھے کچھ یوں لگا جیسے اس بات پر وہ کراہ اٹھی تھی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولی "میرے لئے اس وقت ایک قدم اٹھانا بھی آگ کا دریا پار کرنے کے برابر ہے افضل صاحب! معلوم نہیں کس موڑ پر موت میرے انتظار میں کھڑی ہو۔ پچھلے پندرہ دن میں نے جس طرح گزارے ہیں اس طرح شاید بل میں چھپے رہنے والے کسی چوہے نے بھی نہ گزارے ہوں۔ میں صرف ایک آخری کوشش سمجھ کر سیمیں کو فون کرنے کے ارادے سے نکلی تھی۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ وہاں سے مجھے آپ کے بارے میں پتا چلے گا اور میں آپ سے بات کرنے کی ہمت بھی کرلوں گی۔ میں کسی ان دیکھے شخص سے رابطہ کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ اسے اپنے بارے میں کچھ بتانا تو دور کی بات تھی۔"

"اب اتنا بتادیا ہے تو یہ بھی بتادو کہ میں تمہیں کہاں لینے آسکتا ہوں۔ حالات اگر ایسے ہی ہیں جیسے تم بتارہی ہو تو پھر یہ بھی سمجھ لو کہ شاید یہ تمہارے لئے جان بچانے اور مدد کے لئے کسی کا مضبوط ہاتھ تھامنے کا آخری موقع ہو۔"

وہ ایک لمحے خاموش رہی پھر بولی "ٹھیک ہے میں آپ پر بھروسا کرنے کا جوا کھیل لیتی ہوں۔ ایک ایڈریس لکھئے...." اس نے مجھے ایک پتا لکھوایا پھر بولی "یہ جگہ آپ کے عالیشان ہوٹل سے بہت دور ہے۔ شہر کے مضافات میں نہایت غریبانہ سی کچی بستی ہے۔ یہ اس کا ایک مکان ہے۔ نشانیوں کے بغیر آپ اسے تلاش نہیں کرسکیں گے۔"

اس نے چند نشانیاں مجھے سمجھائیں پھر بولی "راستے میں یا آس پاس کہیں سے میرے بارے میں معلوم کرنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ کسی کو معلوم نہیں ہے کہ اس مکان میں کوئی لڑکی موجود ہے۔ ویسے یہ محض میری خوش فہمی بھی ہوسکتی ہے کہ کسی کو میری موجودگی کا علم نہیں ہے۔"

"خیر.... کچھ بھی ہو۔ تمہیں اب گھبرانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کا خوف دور کرنے کی کوشش کی۔

"آپ کب آئیں گے؟" اس نے پوچھا۔

"آج.... ابھی۔ جتنی جلد ممکن ہوسکا۔" میں نے جوا[ب دیا۔]

"ٹھیک ہے میں آپ کا انتظار کروں گی۔ دیکھتی ہوں [کس] صورت میں میرے لئے مصیبتوں سے نجات کا پیغام آتا [ہے یا] نئی مصیبتیں مجھے گھیرے میں لیتی ہیں۔"

"مجھے امید ہے کہ میرا تم تک پہنچنا تمہارے لئے مصا[ئب کے] خاتمے کی نوید ثابت ہوگا۔" میں نے اسے تسلی دی۔

وہ جلدی سے بولی "ویسے یہ مت سمجھئے گا کہ میں [آپ کی] ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہوں یا کروں گی۔ [میں کسی] کی ہمدردی کی مستحق نہیں ہوں۔ میں اپنے مصائب کی خود [ذمے دار] ہوں۔"

"جو لوگ یہ اعتراف کرلیتے ہیں کہ وہ اپنے مصائب [کے] ذمے دار ہیں، وہ بھی ہمدردی کے مستحق ہوجاتے ہیں۔" [میں نے] اپنا نکتہ نظر بیان کیا۔

"آپ سے بات کرکے حوصلہ ملا ہے۔ آپ سے مل کر [شاید] زندگی مل جائے۔ قدرت نے مجھے جو ایک خوب صورت ز[ندگی دی] تھی اس کا تو میں نے بیڑا غرق کرلیا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔ شاید اب بھی تاخیر نہ ہوئی ہو۔" [میں نے] کہا۔

"بہت شکریہ۔ میں آپ کا انتظار کروں گی۔ خدا حافظ[۔" میں] نے محسوس کیا کہ اس کے لہجے میں زندگی کی امنگ لوٹ آئی [تھی۔]

میں نے ریسیور رکھ دیا اور صرف ایک لمحے کے لئے بیٹھا رہا۔ اس ایک لمحے میں اَن گنت خیالات میرے ذ[ہن میں] آندھی کی طرح ابھرے اور گزر گئے۔ میرے رگ و پے میں [ایک] سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ مجھے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا [کہ] مونا سے بات ہوئی تھی اور اس کا ایڈریس مجھے مل چکا تھا۔ [کچھ دیر] پہلے تک میں بند گلی میں کھڑا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آر[ہا تھا کہ] مونا کی تلاش میں کدھر کا رخ کیا جائے۔ میں نے ایک با[ر پھر] کاغذ اٹھا کر بغور دیکھا جس پر میں نے مونا کا بتایا ہوا ایڈر[یس اور] نشانیاں نوٹ کی تھیں پھر میں نے شفیع شاہ کے موبائل فو[ن] سے رابطہ کیا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے اس کی آواز سن کر [پوچھا۔]

"سر! اس وقت میں اپنے کمپنی والے آفس میں ہو[ں اور اس] شخص کی کال کا انتظار کررہا ہوں۔ میں نے اسے اس کو[ٹھی کی] نگرانی پر مقرر کیا تھا جہاں سینما کلب والوں کے لئے فلم[یں بنتی] ہیں۔ میں کوشش کررہا ہوں کہ اس شخص کو قابو میں کیا [جائے جو] فلمیں لے کر آتا ہے۔ آپ نے یہی ہدایت کی تھی لیکن اس کوٹھی پر بالکل ویرانی چھائی ہوئی ہے۔ لگتا ہے وہا[ں کی] سرگرمیاں معطل ہیں۔"

"تم اس کوٹھی اور وہاں ہونے والی سرگرمیوں پر لعنت

[بھیجو۔] میں تمہاری طرف آرہا ہوں کیونکہ تم اس وقت میرے راستے میں ہو۔ میں تمہیں وہاں سے پک کرلوں گا۔ ہم گھاس پھوس کے انبار میں جو سوئی تلاش کررہے تھے 'یوں سمجھو کہ وہ مل گئی ہے۔" میں نے ایک انگریزی محاورے کا مفہوم اردو میں بیان کرنے کی کوشش کی۔

"سر! آپ کا مطلب ہے مونا مل گئی ہے؟" شفیع شاہ تیزی سے بولا۔

"مونا تو ابھی نہیں ملی لیکن اس کا ایڈریس مل گیا ہے۔"

"کیا مستند اطلاع ہے؟" اس نے بے اختیار پوچھا۔

"مستند ہی ماننا پڑے گی کیونکہ اطلاع اس نے خود دی ہے۔" میں نے جواب دیا "میں تمہاری طرف آرہا ہوں۔ ہمیں اس کو لینے چلنا ہے۔"

"ضرور سر! میں تیار بیٹھا ہوں۔" اس نے مستعدی سے جواب دیا اور میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نہایت اطمینان سے ہوٹل سے روانہ ہوا۔ میں نے آندھی طوفان کی طرح ڈرائیونگ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرے خیال میں اس معاملے میں زیادہ جلدبازی کی ضرورت نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے یہ شبہ بھی میرے ذہن میں ابھرا کہ کہیں یہ کوئی چال تو نہیں تھی؟ پھر میں نے خود ہی اس شبے کو مسترد کردیا۔

میں نے شفیع شاہ کو اپنے کمپنی آفس سے پک کیا۔ اس کے چہرے پر نہایت خفیف سی مسکراہٹ تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ خاصا خوش تھا۔ میں نے راستے میں اسے مونا سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتایا تو وہ قدرے حیرت سے بولا "سر! یہ تو بیٹھے بٹھائے ہی مسئلہ حل ہوگیا۔"

"ہاں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔" میں نے طمانیت سے سرہلاتے ہوئے کہا۔

ڈرائیونگ میں ہی کررہا تھا۔ سفر خاصا طویل تھا۔ ایک مقام ایسا آیا جس سے آگے کا راستہ میرا دیکھا ہوا نہیں تھا۔ تب میں نے شفیع شاہ سے گائیڈ کا کام لیا۔ آخر ہم ایک ایسے علاقے میں جا پہنچے جو آباد ہوتے ہوئے بھی ویرانہ تھا۔ یعنی وہاں خال خال مکان نظر آرہے تھے لیکن ایسا لگتا تھا جیسے ان میں کوئی رہتا نہیں تھا۔ جگہ جگہ ٹیلے اور جھاڑیاں تھیں۔ کوئی مکان بلندی پر تھا، کوئی نشیب میں۔ کہیں گندے پانی کا جوہڑ تھا تو کہیں کوڑے کے ڈھیر۔ مکانات بھی نہایت معمولی اور اجڑے اجڑے تھے۔ وہاں کی گلیوں میں گاڑی کے بجائے گدھا گاڑی زیادہ تیز رفتاری سے چل سکتی تھی۔

ایک جگہ جوہڑ کے قریب دو آدمی اوندھے سیدھے پڑے نظر آئے۔ میں نے شفیع شاہ سے پوچھا "انہیں کیا کسی نے قتل کرکے پھینک رکھا ہے؟"

شفیع شاہ بغور شیشے کے پار دیکھتے ہوئے بولا "نہیں سر! ہیروئنچی ہیں۔ بے سدھ پڑے ہیں۔ کوئی بعید نہیں صبح تک لاشوں میں ہی تبدیل ہوجائیں۔"

ان کے سوا مجھے دور دور تک کوئی انسان تو کیا، کتا بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ مونا نے ہمیں کسی سے کچھ پوچھنے سے منع کیا تھا لیکن یہاں کوئی نظر ہی نہیں آرہا تھا جس سے ہم کچھ پوچھتے۔ میں نشانیوں کی مدد سے نہایت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔

شفیع شاہ الرٹ بیٹھا تھا۔ وہ کوٹ کے نیچے چھپی گن کو تھپکتے ہوئے بولا "یہ علاقہ بظاہر جیسا ویران اور خاموش سا دکھائی دے رہا ہے درحقیقت اتنا ہی خطرناک ہے۔ یہ اوسط درجے کے مجرموں کی پناہ گاہ ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا وہ لڑکی یہاں تک کیسے پہنچی اور کیا وہ واقعی اس مکان میں اکیلی ہوگی جس کا اس نے ہمیں ایڈریس دیا ہے؟"

"یہ میں اس سے پوچھنا بھول گیا۔" میں نے تسلیم کیا "لیکن اس کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یہاں اکیلی ٹھہری ہوئی ہے۔"

"حیرت ہے!" شفیع شاہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

"دنیا میں عجیب عجیب تماشے ہورہے ہیں شفیع شاہ! لگتا ہے اب ہمیں کسی بھی بات پر حیران ہونا چھوڑنا پڑے گا۔" میں نے احتیاط سے کار کو ایک ٹیلے پر سے گزارتے ہوئے کہا جس کے ایک طرف جوہڑ اور دوسری طرف جھاڑیاں تھیں۔

اس کے چند سیکنڈ بعد قدرے غیر متوقع طور پر کافی آسانی سے ہم اپنے مطلوبہ مکان تک پہنچ گئے۔ اس کی بیرونی نیم شکستہ دیوار پر چاک سے جلی انداز میں اس کا نمبر لکھا ہوا تھا ورنہ شاید ہم نشانیوں کے باوجود اس کے بارے میں شک میں ہی رہتے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ مونا نے فون پر مجھ سے بات کرنے کے بعد واپس آکر ہی یہ نمبر لکھا ہو۔ تازہ ہی لکھا ہوا لگتا تھا۔ یہاں کا قریب ترین بازار جس سے ہم گزر کر آئے تھے وہ بھی یہاں سے کافی دور تھا جہاں پے کارڈ فون کی موجودگی کا امکان ہوسکتا تھا۔ معلوم نہیں مونا وہاں پیدل گئی اور آئی تھی یا اس نے کوئی سواری استعمال کی تھی۔ لگتا تو یہی تھا جیسے یہاں بس رکشا ٹیکسی وغیرہ کی آمدورفت نہیں تھی۔

میں نے مکان دیکھ لینے کے باوجود گاڑی اس کے سامنے نہیں روکی بلکہ آگے نکال لے گیا۔ کسی کسی مکان کی پیشانی پر یا صحن میں کوئی مریل سا بلب لٹکا ہوا تھا جس کی وجہ سے علاقے میں زیادہ تاریکی نہیں تھی لیکن مکانوں کے اندر تاریکی ہی تھی۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے بعض نامعلوم گوشوں سے کچھ نادیدہ آنکھیں ہماری گاڑی کو گھور رہی تھیں۔

میں نے کافی آگے جانے کے بعد گاڑی ایک دوسرے راستے سے لاکر اس مکان کے عقب میں روکی۔ یہاں تاریکی تھی اور گاڑی جھاڑیوں میں تقریباً چھپ کر رہ گئی تھی۔ اترنے سے پہلے ہم نے اچھی طرح گردوپیش کا جائزہ لیا۔ دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ہر طرف گہرا سکوت طاری تھا۔ اتنی

ویرانی کا تاثر دینے والی ایسی چھدری چھدری سی آبادی میں نے اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

وہ مکان زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا۔ ساخت بھی غریبانہ قسم کی تھی۔ اس کی عقبی دیوار میں بھی چھوٹا سا ایک گیٹ موجود تھا لیکن میں نے غور سے دیکھا تو اس پر تالا لٹکا دکھائی دیا۔ اندر بھی تاریکی تھی۔

"ایسا لگ رہا ہے جیسے یہاں تو کوئی رہتا ہی نہیں۔" شفیع شاہ نے سرگوشی کی۔

"یہی تاثر تو مونا کی زندگی کی ضمانت ہوگا۔" میں نے کہا۔

چند سیکنڈ بعد ہم دونوں گنیں لئے گاڑی سے اتر آئے۔ شفیع شاہ نے احتیاطاً گاڑی سے ٹارچ بھی نکال کر جیب میں ڈال لی تھی۔ مکان کی عقبی دیوار زیادہ اونچی نہیں تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی مدد کے بغیر ہی اسے پھلانگ گئے اور بلی کی طرح بے آواز قدموں سے تنگ گلی نما حصے میں کود گئے لیکن دائیں بائیں کوئی ایسا راستہ نہیں تھا جس سے ہم گھوم کر مکان کے سامنے والے دروازے پر پہنچ سکتے۔ اندر جانے کے لئے اب عقبی دروازے سے داخل ہونا ہی ضروری تھا۔

وہ دروازہ چھوٹا اور نہایت معمولی سا تھا۔ اس میں کوئی فلش لاک وغیرہ نہیں تھا۔ میں نے اس پر ہاتھ سے ذرا دباؤ ڈالا تو ہلکی سی چرچراہٹ کے ساتھ وہ کھل گیا۔ اندر کی طرف سے اس کا کوئی بولٹ وغیرہ بھی چڑھا ہوا نہیں تھا۔ چرچراہٹ کی آواز ابھرتے ہی میں اور شفیع شاہ دروازے کے دونوں طرف دیوار سے چپک گئے۔

اندر پھیلا ہوا گھپ اندھیرا گویا ہمارا منتظر تھا۔ کچھ اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ اس اندھیرے میں کیا چھپا ہوا تھا۔ پہلے میں نے سوچا آہستگی سے مونا کو آواز دے کر دیکھوں۔ شاید وہ خود دروازے تک آجائے۔ شاید اس نے میرے ہی انتظار میں دروازہ کھلا رکھا تھا۔ تاہم میں نے آواز دینے کا ارادہ ملتوی کردیا۔ اسی اثنا میں پے در پے تیز ہوا کے دو تین جھونکے آئے اور تنگ دروازے میں کچھ ایسی سرسراہٹ سی ابھری جیسے تیز ہوا کسی غار میں گھس رہی ہو۔ سیٹیاں سی بجنے میں کچھ ہی کسر رہ گئی تھی۔

میرے ذہن میں ایک شبے نے سر ابھارا۔ تیز ہوا تو پہلے بھی چلتی رہی ہوگی۔ اگر دروازے کا بولٹ اندر سے چڑھا ہوا نہیں تھا تو اسے پہلے ہی کھل جانا چاہئے تھا۔ ہمیں تو وہ کھلا ہوا ہی ملنا چاہئے تھا۔ کیا کسی نے ہمیں آتے دیکھنے کے بعد اندر سے دروازے کا بولٹ ہٹایا تھا؟ اگر وہ مونا ہی تھی تو اب تک اسے بول پڑنا چاہئے تھا پھر میں نے سوچا شاید وہ بھی ہماری طرح احتیاط برت رہی ہو۔ وہ ہمیں پہچانتی تو نہیں تھی۔ اگر وہ ہم سے شناسا ہوتی تب بھی اس گھپ اندھیرے میں اس کے لئے ہمیں پہچاننا مشکل ہوگا۔ چہ جائیکہ اس نے ہمیں دیکھا ہوا ہی نہیں تھا۔

آخر میں نے سسپنس ختم کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے شفیع شاہ کو اشارہ کیا اور ہم رکوع کی سی حالت میں اچانک کمرے میں داخل ہوگئے۔ چند لمحے ہم اندر کی طرف دیوار سے چپکے رہے لیکن اس دوران میری آنکھیں آسانی سے اس اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوگئیں اور مجھے اندازہ ہوا کہ میری یہ احتیاط فضول تھی۔ کم از کم اس کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ شفیع شاہ نے ٹارچ روشن کرلی۔

اس کمرے میں صرف ایک چٹائی اور اس پر ایک میلا کچیلا تکیہ پڑا تھا۔ وہ ایک عجیب وحشت انگیز سا کمرا تھا۔ کونے کھدروں میں جالے لگے ہوئے تھے۔ روشنی ہوتے ہی ایک کونے سے ایک چوہا پُھدک کر بھاگا جو شاید ہماری آمد سے پہلے وہاں بیٹھا کچھ کتر رہا تھا۔

میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا۔ اس نے ٹارچ بجھادی۔ یہ نہایت کارآمد ٹارچ تھی۔ ایک بٹن دبانے پر اس کی روشنی عام ٹارچ کی طرح محدود رہتی تھی۔ دوسرا بٹن دبانے پر یہ ایک بڑی ٹارچ کی طرح روشنی دیتی تھی۔ تیسرا بٹن دبانے پر یہ ایک خاصی طاقتور سرچ لائٹ کا کام دیتی تھی اور چوتھا بٹن دبانے پر اس کی روشنی سرخ ہوجاتی تھی۔ اس طرح یہ خاص سگنل کے طور پر استعمال ہوسکتی تھی۔

مکان بدستور سکوت میں ڈوبا رہا۔ کسی طرف سے کوئی رد عمل ظاہر نہ ہوا۔ ہم دونوں گنیں سنبھالے، پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے دوسرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کمرے میں مجھے ایک ہیولا ہوا میں معلق نظر آیا اور مجھے اندھیرے ہی میں احساس ہوگیا کہ وہاں کوئی بہت بری خبر ہماری منتظر تھی۔

میں نے خطرے کے احساس کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شفیع شاہ کے ہاتھ سے ٹارچ لی اور تیز روشنی والا بٹن دبایا۔ کمرا میں پہلے کمرے سے بھی زیادہ وحشت انگیز دکھائی دیا۔ حالانکہ وہ ایک غریبانہ سے مکان کا عام سا کمرا ہی تھا۔ اس کی دیوار پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ اس میں تھوڑا بہت سازوسامان بھی موجود تھا۔ قابل ذکر بات صرف یہ تھی کہ اس کمرے کے وسط میں چھت میں رسی کا پھندا پڑا ہوا تھا اور اس پھندے میں ایک لاش جھول رہی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ٹانگیں بھی بندھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں حلقوں سے ابل آئی تھیں۔ چہرہ نیلا پڑ گیا تھا۔ بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بھی اسے پہچاننا ہمارے لئے مشکل نہیں تھا۔

وہ یقیناً مونا تھی۔ اس کے جسم پر عمدہ اور فیشن ایبل لیکن کچیلا اور شکن آلود لباس تھا جو کہیں کہیں سے پھٹ بھی گیا تھا۔ شاید زندگی کے آخری لمحوں میں اس نے کسی کے مقابلے میں مزاحمت کی تھی۔ اس کی جوتیاں ایک طرف بڑے سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں۔ اسی طرف ایک بیڈ پر اس کا برقع پڑا تھا۔

ہم دونوں چند لمحے ساکت کھڑے رہے۔ میرے دل میں بے بسی اور افسردگی کی ایک لہر ابھری جو طوفان بننا چاہتی تھی لیکن میں نے اس کو دبائے رکھنے کی کوشش کی۔ فی الحال میں کر بھی کیا سکتا تھا؟ میں اور شفیع شاہ شاید یکساں محسوسات کے ساتھ بیک وقت بگولے کی طرح پلٹے اور احتیاطوں کو فراموش کرتے ہوئے چیتے کی طرح پورے مکان میں گھوم گئے۔ مکان بڑا نہیں تھا۔ چند سیکنڈ میں ہم نے اس کا چپہ چپہ دیکھ ڈالا لیکن وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

میں اس کمرے میں نہیں گیا جس میں مونا کو پھانسی دی گئی تھی۔ میں اس کی لاش سے شرمندہ تھا۔ ہم دونوں چند لمحے مختصر سے صحن میں کھڑے رہے۔ شفیع شاہ بوجھل لہجے میں بولا "ہمیں دیر ہوگئی سر!"

"اور ہم بازی ہار گئے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "اب یہاں رکنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ آؤ چلتے ہیں۔"

"سر! مکان کی تلاشی لیتے ہیں۔ شاید کوئی سراغ۔"

"ٹھنڈے اور گرد آلود کاٹھ کباڑ کو کھنگالنے کا کوئی فائدہ نہیں شفیع شاہ! جو لوگ اس قسم کے کام کررہے ہیں وہ سراغ چھوڑ کر جانے والے نہیں لگتے۔"

"میں آس پاس کے مکانوں سے پوچھ گچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔" شفیع شاہ بے چارہ اپنی سی کوشش کرنا چاہتا تھا، کچھ ہاتھ پاؤں مارنا چاہتا تھا۔

"روایتی قسم کی تفتیش پولیس کے لئے چھوڑ دو۔" میں نے ہدایت کی "وہ جو کچھ معلوم کرپائیں گے اس کی رپورٹ ہمیں مل جائے گی۔ ہمیں اس میں وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے کرنے کا جو کام تھا وہ ہم سے نہیں ہوسکا۔ اب ان باتوں کا کیا فائدہ؟" میں کوشش کررہا تھا کہ میرے دل کی افسردگی میرے لہجے سے نہ جھلکنے پائے۔

شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا "احترام انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہم کم از کم لاش کو پھندے سے نکال کر نیچے تو لٹادیں۔"

"ہاں یہ تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔" میں نے اس کی تائید کی۔ ہم دونوں اس کمرے میں واپس آئے۔ ہم نے لاش کو پھندے سے نکال کر احتیاط سے میلے کچیلے بستر پر لٹادیا اور وہاں موجود ایک پرانی سی چادر اس پر پھیلا دی۔ اس کے بعد ہم جس راستے سے آئے تھے اسی سے واپس روانہ ہوگئے۔ کسی سے ہمارا سامنا نہیں ہوا۔ کسی نے ہمیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمارے دل بوجھل ہوچکے تھے۔

"میرا خیال ہے مونا فون کرنے نکلی تو واپسی میں اسے دیکھ لیا گیا۔" میں نے راستے میں اظہار خیال کیا۔

"جی ہاں۔۔۔ محسوس تو یہی ہوتا ہے۔" شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا "لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ کیا اس کی تلاش میں اتنے دور دراز علاقوں تک لوگ پھیلے ہوئے تھے؟"

"کچھ بعید نہیں ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "ویسے سارا کھیل قسمت کا ہے۔ قسمت ہی ہار جائے تو عجیب عجیب اتفاقات رونما ہوتے ہیں۔ قسمت ساتھ دے رہی ہو تو انسان دشمنوں کے نرغے میں سے بھی صحیح سلامت نکل جاتا ہے۔ قسمت مخالف ہوجائے تو کسی ویرانے میں بھی دشمن سے سامنا ہوجاتا ہے۔"

شفیع شاہ خاموشی سے اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ اس وقت ڈرائیونگ وہی کررہا تھا۔ کمپنی کا آفس راستے میں پڑتا تھا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ میری اجازت پاکر وہ وہاں اتر گیا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ کر اپنے گھر جانے کے لئے ڈیفنس کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں اپنی گاڑی میں ہوٹل واپس آگیا۔

واپس آتے ہی میں نے رحیم گل سے رابطہ کیا۔ پولیس سے متعلق معاملات نمٹانے کے لئے فی الحال رحیم گل ہی کافی ثابت ہورہا تھا۔ مجھے زیادہ اونچی سطح سے کچھ کہلوانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ گو کہ اس کا تعلق صرف ایک علاقے کے تھانے سے تھا لیکن وہ کسی بھی علاقے سے تعلق رکھنے والا مسئلہ حل کرادیتا تھا۔ شرط صرف یہی تھی کہ اس کے ساتھ سچ بولا جاتا اور اسے بالکل صحیح معلومات فراہم کی جاتیں تاکہ بعد میں اس پر کوئی الزام آنے کا امکان نہ رہتا اور اس کے نظریات یا دیانتداری کو کوئی دھچکا پہنچنے کا خطرہ پیدا نہ ہوتا۔

میں نے مختصراً اسے تمام حالات سے آگاہ کیا اور آخر میں کہا۔ "اب میں یہ کیس تمہارے۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہارے محکمے کے سپرد کررہا ہوں۔"

"بہت اچھا کررہے ہو۔" وہ میری بات کاٹ کر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "کیونکہ تم نے اس کا جو بیڑا غرق کرنا تھا، کرلیا اور اپنا سا زور لگا کر دیکھ لیا۔ اب تمہارے لئے اس سے جان چھڑالینا ہی بہتر ہے۔"

"زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اسے ڈانٹ پلائی "اگر یہ کیس شروع سے پولیس کے ہاتھ میں چلا گیا ہوتا تو اب تک وہ نہ جانے کتنے بے گناہوں کو اس کی لپیٹ میں لے کر ان کی کھال کھینچ کر کتنا مال بٹور چکی ہوتی۔"

"لوگوں کو پولیس کے بارے میں اس کے سوا شاید کوئی بات کرنی ہی نہیں آتی۔" وہ ناگواری سے بولا "میں بحث میں نہیں پڑوں گا۔ ایک اور بات البتہ میرے خیال میں قابل توجہ ہے۔ یہ دوسرا موقع ہے کہ تم مجھے کسی جگہ ایک لڑکی کی لاش کی موجودگی کی اطلاع دے رہے ہو۔ میری نظر میں تو تم خود خاصے مشکوک ہوتے جارہے ہو۔"

"ابھی اور دیکھتے جاؤ بیٹا! ابھی تو تمہارے شکوک و شبہات اور بڑھیں گے۔ تمہیں راتوں کو نیند نہیں آیا کرے گی۔ تم بے چینی سے بستر پر کروٹیں بدلا کرو گے لیکن افسوس کہ تم کچھ کر نہیں سکو گے۔ اب اپنے ناکارہ کان کھول کر ایک بات سن لو۔ میں چاہتا ہوں مونا کے قتل کی خبر بے شک اخبارات میں آجائے لیکن اس معاملے کا کوئی اسکینڈل نہ بنے۔ ایک خاندان کی عزت کا سوال تو ہے ہی۔ لیکن ویسے بھی اس قسم کی باتیں ہماری سوسائٹی کے لئے

شرمناک ہیں۔ ان کے نہ جانے کیا کیا اثرات مرتب ہوں۔"

"میں کوئی وعدہ نہیں کرسکتا مولوی صاحب!" وہ رکھائی سے بولا۔ مجھے معلوم تھا منہ سے وہ خواہ کچھ بھی کہتا لیکن دل ہی دل میں وہ ان باتوں کا مجھ سے زیادہ قائل تھا اور عملی طور پر بھی جہاں تک اس کا بس چلتا تھا' خیال رکھتا تھا۔ زبانی طور پر ہم ایک دوسرے کو چڑانے کے لئے بہت کچھ کہتے رہتے تھے۔

"اگر تم نے اس بات کا خیال نہ رکھا تو پھر میں تمہاری نوکری کا بھی خیال نہیں رکھ سکوں گا برخوردار! زمینوں پر واپسی کے لئے بستر باندھ کر رکھنا۔" میں نے کہا۔

"وہ تو رکھا ہی رہتا ہے اور میری جیب میں استعفیٰ بھی پڑا رہتا ہے لیکن تم جیسے چیٹر قناطیوں کی وجہ سے اس کے استعمال کی نوبت نہیں آسکتی۔"

"یہ تو وقت آنے پر پتا چل جائے گا بچے!" میں نے مربیانہ لہجے میں کہا "بہرحال اب بکواس بند کرو اور حرکت میں آجاؤ۔ اگر کسی مرحلے پر تمہیں دشواری پیش آنے لگے' کوئی متعلقہ آفیسر تمہاری بات نہ مانے یا کام بگاڑنے لگے تو مجھے ضرور فون کرلینا۔"

میں نے سلسلہ منقطع کردیا۔

رحیم گل کے ساتھ نوک جھونک سے بھی میری روح کی افسردگی کچھ کم نہ ہوسکی۔ اس رات مجھے بہت کم نیند آئی۔ دوسری صبح میں جلد بیدار ہوگیا۔ ناشتے سے پہلے میں نے امبر کو فون کردیا کہ وہ جب آفس آئے تو عذرا کو ساتھ لیتی آئے۔

ناشتے کے بعد میں نے رحیم گل سے فون پر صورتِ حال معلوم کی۔ متعلقہ علاقے کی پولیس نے مونا کی لاش اٹھالی تھی۔ دوپہر تک پوسٹ مارٹم کے بعد اسے شناخت کے لئے اسپتال کے مردہ خانے میں رکھ دیا جانا تھا۔ تفتیش شروع ہوچکی تھی۔

میں معمول سے کافی تاخیر کے ساتھ نیچے اپنے آفس میں پہنچا۔ اب مجھے عذرا کا سامنا کرنے اور اسے یہ خبر سنانے کا مشکل مرحلہ درپیش تھا۔ یہ کام میرے لئے بہت سے مصائب' مشکلات اور خطرات کا سامنا کرنے سے زیادہ دشوار تھا۔ میں آفس میں داخل ہوا تو امبر اپنے کمرے میں موجود تھی لیکن عذرا میرے کمرے میں بیٹھی میرا انتظار کررہی تھی۔

ستم ظریفی یہ تھی کہ آج وہ کچھ کھلی کھلی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ہلکا سا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹ ویسے بھی اس کے چہرے کا خوب صورت ترین حصہ تھے۔ آج وہ ہونٹ تو یاقوت کی طرح دمک ہی رہے تھے لیکن مجموعی طور پر پورا چہرہ ہی بھلا لگ رہا تھا۔ حتیٰ کہ موٹے شیشوں کی عینک کے عقب میں اس کی آنکھیں بھی گویا ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔ وہ یقیناً بہت خوش تھی۔ اور تب میں سمجھا کہ میرے اس طرح غیر متوقع طور پر بلانے سے وہ سمجھی تھی کہ شاید میرے پاس اسے سنانے کے لئے کوئی خوش خبری موجود تھی۔ میں اندر ہی اندر کراہ کر رہ گیا۔ نہ جانے کیوں اس نے یہ فرض کرلیا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کے انداز میں مستعدی تھی۔ ایسی مستعدی جو کسی خوش خبری کے انتظار میں جنم لیتی ہے۔ بگلے جیسے سفید کاٹن کے لباس میں اس کا استخوانی وجود بھی گویا بہت سی بہاریں سمیٹے ہوئے تھا۔ وہ کوئی بہت اچھا کلون لگائے ہوئے تھی۔ کمرا اس کی موجودگی سے مہک رہا تھا۔ وہ اس عذرا سے کافی مختلف دکھائی دے رہی تھی جسے میں نے پہلے روز دیکھا تھا۔ میرے دل میں تاسف کی لہر کچھ قوی تر ہوگئی۔

میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن میں خود اس کے مقابل بیٹھنے کی ہمت نہ کرسکا۔ میں کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ اس کھڑکی سے آفس کی عقبی بند گلی دکھائی دیتی تھی۔ میں اس وقت لفظوں کی بند گلی میں ہی کھڑا تھا۔ کئی لمحے تک کمرے میں گہرا سکوت رہا پھر گویا عذرا نے مجھے اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے کہا "سر! آپ نے مجھے بلایا تھا۔"

"ہاں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا اور دل میں سوچا کہ کاش میں نے اسے نہ بلایا ہوتا' فون پر ہی یہ خبر سنادی ہوتی۔ کسی کا سامنا کئے بغیر فون پر کسی کو کوئی بری خبر سنانا پھر بھی کچھ آسان ہوتا ہے۔

"سر! میرا خیال ہے مونا کا پتا چل گیا ہے۔" وہ پُرامید لہجے میں بولی۔

"ہاں" میں نے ایک بار پھر دھیمے لہجے میں یہی لفظ دہرایا۔ اس وقت نہ جانے کیوں خود کو اس کا مجرم محسوس کررہا تھا۔ میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "عذرا! جب تم مونا کی تلاش میں یہاں آئیں تو کیا تم اس کے بارے میں کوئی بری خبر سننے کے لئے تیار تھیں؟"

اس نے فوری طور پر کوئی جواب نہ دیا۔ میں گو کہ اس کی طرف دیکھنے کی جرأت محسوس نہیں کررہا تھا لیکن شاید غیر ارادی انداز میں' میں نے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ستارے دم توڑ چکے تھے اور اس کے شگفتہ وجود پر گویا خزاں کا جھونکا گزر گیا تھا۔ میرے سوال نے ہی شاید اسے بہت کچھ بتادیا تھا۔

وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے یاقوتی ہونٹ نہایت آہستگی سے ہلے "جی ہاں لیکن آپ سے ملنے کے بعد نہ جانے کیوں دل کو ڈھارس سی تھی کہ شاید ہمارے مقدر کی بری خبر بھی کسی اچھی خبر میں تبدیل ہوجائے۔" وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"عذرا...! مجھے افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہوسکا۔" میں نے کہا۔

"آپ نے اسے ڈھونڈ تو لیا نا؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں لیکن شاید اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔" میں نے جواب دیا "مجھے تو بیٹھے بٹھائے ہی اس کے بارے میں اطلاع مل گئی تھی۔ اس نے خود ہی مجھے فون کیا تھا لیکن شاید اس نے اس کام میں تاخیر کردی۔ میں نے تو اس تک پہنچنے میں قطعاً تاخیر نہیں کی۔ فون پر اس سے بات ہوتے ہی میں ایک لمحہ ضائع کئے بغیر' اس کے بتائے ہوئے پتے پر پہنچا لیکن......" میں نے اٹک اٹک کر اسے بتایا کہ کس طرح مجھے مونا کا فون موصول ہوا تھا۔ کس طرح میں اور شفیع شاہ اس مکان تک پہنچے تھے اور وہاں ہمیں کیا دیکھنے کو ملا تھا۔

وہ چند لمحے ساکت بیٹھی ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی۔ اسے گویا سکتہ ہوگیا تھا پھر عینک کے عقب سے دو آنسو اس کے چنبیلی جیسے رخساروں پر پھسل آئے۔ تاہم اس کی خاموشی برقرار رہی۔ آنسو گویا کسی مجسمے کی آنکھوں سے نکلے تھے۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ کہیں اسے واقعی سکتہ تو نہیں ہوگیا تھا لیکن اسی اثنا میں اس کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ لرزتی ہوئی سپید سپید استخوانی سی انگلیوں سے اس نے نہایت آہستگی سے عینک اتاری پھر میز پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میں نے اسے تسلی دینے کے لئے مناسب الفاظ تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن تمام الفاظ مجھے کھوکھلے' بے معنی اور بے اثر سے محسوس ہوئے۔ میں نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ دل کا غبار نکل جانا اس کے حق میں بہتر تھا۔ کئی منٹ تک اس کی سسکیاں کمرے میں ابھرتی رہیں اور اس کا کمزور سا وجود خزاں رسیدہ پتے کی طرح کرسی پر لرزتا رہا۔

آخر میں اٹھ کر اس کے قریب پہنچا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ اس نے سر اٹھایا اور دونوں ہاتھوں سے یوں مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا گویا کسی ڈوبتے ہوئے انسان کو اچانک سہارا میسر آگیا ہو۔ اس کے ہاتھ گویا بخار میں تپ رہے تھے اور اس کی مرمریں استخوانی انگلیاں گویا میرے ہاتھوں میں گڑی جارہی تھیں۔ مجھے قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ اس برف سے وجود میں اتنی حرارت بھی ہوسکتی تھی اور وہ پتلے پتلے سے ہاتھ اتنی طاقت رکھتے تھے۔

"میں تم سے شرمندہ ہوں عذرا...! میں تمہارے لئے کچھ نہیں کرسکا۔" میں نے حقیقتاً شرمندگی سے کہا۔

"آپ کیوں شرمندہ ہوتے ہیں سر!" وہ آنسوؤں سے بھیگی آواز میں بولی "آپ نے تو میرے لئے جتنا کچھ کیا میں اس کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا کہ آپ جیسا کوئی میری اتنی مدد کرے گا۔ آپ بہت اچھے ہیں سر! میں آپ کو

کبھی نہیں بھولوں گی۔" وہ دیوانوں کی طرح اپنی آنسوؤں سے بھیگی آنکھیں میرے ہاتھ پر رگڑنے لگی۔

پھر اچانک اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ بہت سے ٹشو پیپر لے کر اس نے اپنا چہرہ پونچھا اور میز سے عینک اٹھاتے ہوئے بولی "میں اب چلتی ہوں۔ مجھے بتادیجئے مونا کی لاش مجھے کہاں سے ملے گی؟"

اس کے رویّے کی بے ساختگی اور اس کے جذبوں کی شدت نے مجھے قدرے حیران کردیا تھا۔ میں نے سنبھلتے ہوئے پوچھا "تم گھر واپس جانا چاہتی ہو؟ میرا مطلب ہے سکھر؟"

"جی ہاں" وہ میری طرف دیکھے بغیر اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولی "مجھ سے جو کچھ ہوسکا میں نے کرلیا۔ آپ سے جو کچھ ہوسکا آپ نے کرلیا لیکن ہم میں سے کوئی بھی قسمت کے لکھے کو نہیں مٹا سکتا۔ میں اب اس بے رحم شہر میں ایک لمحہ بھی ٹھہرنا نہیں چاہتی۔ لوگ کہتے ہیں یہ بڑا غریب پرور شہر ہے۔ شاید کبھی رہا ہو۔ اب تو یہ غریبوں کی سب سے بڑی قتل گاہ ہے۔ میں اپنی بہن کی لاش لے کر جس قدر جلد ممکن ہوسکے یہاں سے چلے جانا چاہتی ہوں۔"

"تمہیں اس سلسلے میں کوئی تردد کرنے یا کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے آہستگی سے کہا "تم اپنا ایڈریس وغیرہ چھوڑ جاؤ۔ میّت تمہارے گھر پہنچ جائے گی اور ہاں ایک بات میں اور کہنا چاہتا ہوں۔ خواہ اس سے کوئی فرق پڑتا ہو یا نہ پڑتا ہو۔ خواہ اس سے تمہیں کوئی دلچسپی ہو یا نہ ہو۔"

اس نے بھیگی بھیگی آنکھوں سے سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا۔ ان آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "میں مونا کو تو موت سے نہیں بچاسکا لیکن میرا تم سے وعدہ ہے کہ اس کے قاتل یا قاتلوں کو بھی موت سے کوئی نہیں بچاسکے گا۔"

"شاید اس سے دل کا زخم مندمل ہونے میں کوئی مدد ملے۔" اس نے بیٹھی بیٹھی سی آواز میں کہا "میرا ایڈریس اور رابطے کا فون نمبر وغیرہ امبر کے پاس ہے۔ خدا حافظ۔ مجھ سے جو بھی گستاخیاں سرزد ہوئی ہوں انہیں ایک دیوانی کی حرکتیں سمجھ کر معاف کردیجئے گا۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔" وہ تیزی سے گھومی اور ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھول کر نکل گئی۔

میں دھم سے اپنی کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ یک لخت مجھ پر ایک عجیب سی تھکن کا حملہ ہوا تھا۔ مجھے معلوم تھا عذرا ابھی امبر کے کمرے میں رکی ہوگی اور اسے سب کچھ بتا کر مزید آنسو بہارہی ہوگی۔

○☆○

دوسرے روز جبکہ مونا کی میّت اس کے گھر روانہ کی جاچکی تھی اور اخبارات میں اس کی موت کی خبر چھپ چکی تھی' میں آفس میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ امبر نے انٹرکام پر بتایا "سر! پیر وارث صاحب کا فون ہے۔" پھر وہ ہچکچاتے ہوئے بولی "وہ ہچکیاں لے کر

رو رہے ہیں سر!"

"اوہ۔ میرے خدا!" میں نے زیرِ لب کہا "بہرحال بات کرائیے۔"

اس نے لائن ملائی۔ پیردانش واقعی بچوں کی طرح رو رہا تھا۔ "افضل صاحب! یہ کیا ہوگیا۔ یہ تو بڑا ظلم ہے۔" وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولا۔

"آپ کون سے ظلم کی بات کررہے ہیں پیر صاحب؟ اس شہر میں تو بہت سے ظلم ہورہے ہیں۔" میں نے ملائمت سے کہا۔

"افضل صاحب! ہمیں تو بس ایک ہی ہستی سے غرض تھی اور اس کے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ میرا دل چاہ رہا ہے اس شہر کو آگ لگادوں۔"

"شہر کو تو پہلے ہی آگ لگی ہوئی ہے پیر صاحب! ہر شخص جس کی ذات یا اَنا کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے وہ سوچتا ہے شہر کو آگ لگادوں۔ شہر بے چارے کا نہ جانے کیا قصور ہے۔" میں نے کہا۔ "آپ بات تو بتائیں۔ ہوا کیا ہے؟"

"آپ نے اخبارات نہیں دیکھے کیا؟" اس نے بدستور ہچکیاں لیتے ہوئے پوچھا۔ پھر وہ جواب کا انتظار کئے بغیر بولا "دیکھے بھی ہوں تو شاید آپ کی نظر سے وہ خبر نہ گزری ہو۔ اتنا بڑا ظلم اور اتنی چھوٹی سی خبر...... کونوں کھدروں میں چھپی ہوئی ہے۔ اخبارات نے اسے اہمیت ہی نہیں دی۔ بڑے افسوس کا مقام ہے۔" وہ بلک بلک کر رونے لگا۔

"اچھا اچھا میں سمجھ گیا۔" میں نے جلدی سے کہا "آپ مونا کے قتل کی بات کررہے ہیں۔ میں نے خبر دیکھ لی ہے۔ میں اس سلسلے میں آپ کو فون کرنے ہی والا تھا۔ اچھا ہوا آپ نے خود کرلیا لیکن آپ اس صدمے کو اس طرح دل پر مت لیں۔"

"کیسے دل پر نہ لیں افضل صاحب! ہم نے زندگی میں پہلی بار تو کسی سے محبت کی تھی۔" وہ کچھ اور بھی زور زور سے ہچکیاں لینے لگا۔ "آپ نے شاید کبھی کسی سے محبت نہیں کی افضل صاحب! اس لئے آپ کو کسی کے درد کا اندازہ نہیں۔" اس کے لہجے میں شکوہ تھا۔

"مجھے اچھی طرح اندازہ ہے پیر صاحب! لیکن کیا کیا جائے۔ جو ہوچکا ہے اسے اب بدلا نہیں جاسکتا۔ میرے الفاظ خواہ آپ کو کتنے بھی گھسے پٹے لگیں لیکن اس کے سوا کچھ کہا بھی تو نہیں جاسکتا کہ آپ صبر کریں۔"

"ہماری والدہ محترمہ بھی یہی کہہ رہی تھیں اور ہم نے زندگی میں کبھی ان کا حکم نہیں ٹالا لیکن اس معاملے میں ہم ان کا حکم بھی نہیں مان سکے۔ ہم صبر کس طرح کریں؟ یہ کوئی ہمارے اختیار کی بات تھوڑا ہی ہے۔ اب تو بس یہی پچھتاوا دل کو سانپ کی طرح ڈسے جارہا ہے کہ ہم نے اسے جانے ہی کیوں دیا تھا۔ ہم اتنی سی غلطی نہ کرتے تو آج وہ ذلت کی موت مرنے کے بجائے ایک ملکہ کی طرح اس شہر میں رہ رہی ہوتی۔ نہ جانے کتنی عورتیں اس کے مقدر پر رشک کرتیں۔ ایک رات میں وہ کیچڑ کے پھول سے ہم تاج بن جاتی۔ وہ خود بھی اپنے آپ پر رشک کرتی۔ افسوس۔ سب کچھ نہ ہوسکا۔ یہ صدمہ ہم سے برداشت نہیں ہورہا۔ خدا افضل صاحب! کچھ دیر کے لئے ہمارے پاس آجائیں اور ہمیں تر دیں۔ مدت کے بعد ہمیں آپ کی صورت میں ایک معقول آد دکھائی دیا ہے۔ آپ کی بات ہمارے دل پر اثر کرتی ہے۔ خدا لئے چند منٹ ضرور ہمارے لئے نکالیں۔ ذرا سی دیر کے لئے غریب خانے پر آجائیں۔" اس کے لہجے میں اَن گنت التجائیں تھیں ایک بار پھر وہ بچوں کی طرح رونے لگا۔

بلاشبہ وہ ایک عجیب و غریب کردار تھا۔ میں نے ایک لمحے خاموشی کے بعد تیزی سے کہا "خدا کے لئے پیر صاحب! اپنے آ کو سنبھالیں۔ یوں بچوں کی طرح رونا آپ کو زیب نہیں دیتا۔ چند منٹ میں آپ کے دولت کدے پر حاضر ہوتا ہوں۔ میں خدمت کے لئے حاضر ہوں پیر صاحب! آپ اپنا ایڈریس مجھے بتائیں۔" میں نے اچانک ہی فیصلہ کیا تھا کہ موقع اچھا تھا۔ بہتر اس شخص کا گھر دیکھ لیا جاتا۔

"میں نے اپنا کارڈ آپ کی خدمت میں پیش کیا تھا۔" وہ شو شوں کرتے ہوئے بولا "بہرحال زبانی بھی بتادیتا ہوں۔" اس نے مختصراً کلفٹن کے ایک بلاک کا ایڈریس بتایا اور بولا "اگر ذرا وقت پیش آئے تو اس بلاک میں پہنچنے کے بعد کسی سے بھی پ لیجئے گا۔ وہ آپ کو اس خادم کے غریب خانے تک چھوڑ کر جا گا۔"

"ٹھیک ہے۔ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں۔" میں نے کہا اور فو بند کردیا۔

میں کچھ دیر ساکت بیٹھا اس شخص کے بارے میں سوچتا رہا پہلی ملاقات پر میں نے دل ہی دل میں اسے کوئی خاص اہمیت نہ دی تھی لیکن اب میں سوچ رہا تھا کہ اسے تھوڑا سا ٹٹول ہی لی چاہئے تھا کہ آخر یہ کیا چیز تھا؟

میں نے شفیع شاہ کو فون کرکے اپنے پاس بلالیا اور اسی کے توسط سے اپنے دو آدمیوں کو بھی مطلع کردیا کہ ہم پیردانش سے جارہے تھے۔ انہیں ایڈریس بتادیا گیا اور ہدایت کردی گئی کہ وہ اس وقت تک دور دور سے اس مکان پر نظر رکھیں جب تک ہم ا سے مل کر بہ خیروعافیت واپس نہ آجائیں۔ نئے لوگوں سے وقت کچھ احتیاط کرلینا ہی بہتر تھا۔ خصوصاً ایسے لوگ جن کی ذا ذرا بھی پراسراریت کے پردے میں لپٹی ہوئی تھی یا جو کسی نہ اعتبار سے طاقتور تھے۔

شفیع شاہ کے ساتھ میں پیردانش سے ملنے کے لئے روانہ ہوا راستے میں، میں نے اس سے پوچھا "تم اس شخص کے بارے کچھ جانتے ہو؟"

"بس یہی کہ شہر کا بہت اہم...... بہت طاقتور...... بہت دولت اور بہت بارسوخ شخص ہے۔" شفیع شاہ بولا "لیکن سنا ہے اس

شخصیت کے پیچھے اصل میں اس کی ماں ہے۔ یہ اپنی ماں کی کٹھ پتلی ہے۔ اس کے حکم کے بغیر یہ انگلی بھی نہیں ہلاتا اور اس کا کوئی معاملہ ماں سے پوشیدہ نہیں۔"

"کیا اس کی داشتاؤں تک کے معاملات اس کی ماں کے علم میں ہوں گے؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔

"شاید" شفیع شاہ کندھے اچکا کر مبہم لہجے میں بولا۔ مجھے یاد تھا کچھ دیر پہلے مجھ سے فون پر بات کرتے وقت بھی پیردانش نے بتایا تھا کہ اس کی والدہ محترمہ نے اسے صبر کرنے کی تلقین کی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ پیردانش کے "غم واندوہ" کی وجہ سے بھی واقف تھی۔

ہمیں پیردانش کا مکان نہ تو تلاش کرنا پڑا اور نہ ہی کسی سے اس کے بارے میں پوچھنا پڑا۔ شفیع شاہ نے کم از کم باہر سے اس کا گھر دیکھا ہوا تھا۔ میں اس کی دولت مندی کے تذکرے تو سن چکا تھا اس کے باوجود اس کا مکان دیکھ کر مجھے خفیف سی حیرت ہوئی۔ اس مہنگے علاقے میں واقع اس کا مکان کسی قلعے سے کم نہیں تھا۔ اس کی بیرونی ساخت میں تاثر بھی قلعے والا ہی پیدا کیا گیا تھا۔ بلند بیرونی دیوار کافی موٹی معلوم ہوتی تھی اور قلعے کے اسٹائل میں ذرا ترچھی تعمیر کی گئی تھی۔ اس کی تعمیر میں زرد پتھر اور ماربل استعمال کیا گیا تھا۔ اونچے سیاہ آہنی گیٹ اور اس دیوار نے مکان کی اصل عمارت کو تقریباً چھپا رکھا تھا۔

میں نے ہارن دیا تو گیٹ میں ایک چوکور شگاف نمودار ہوا۔ گھنی داڑھی مونچھوں والی ایک جناتی قسم کی شخصیت نے باہر جھانکا پھر گیٹ کا صرف ایک پٹ کھل گیا اور میں گاڑی اندر لے گیا لیکن میں زیادہ آگے نہیں جاسکتا تھا۔ آگے تین طرفہ آہنی گرل نے راستہ روکا ہوا تھا۔

گاڑی کے دونوں طرف باوردی اور مسلح محافظ آن کھڑے ہوئے تھے۔ دونوں ہی دیو زاد تھے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جس نے باہر جھانکا تھا۔ اسی اثنا میں عام سے قد کاٹھ کا ایک شائستہ صورت سا شخص گیٹ ہاؤس سے نکل کر ہماری گاڑی کی طرف آیا۔ وہ نفیس قسم کی شلوار قمیص میں تھا۔ اس نے بڑے خلیق لہجے میں انگریزی میں میرا نام پوچھا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی افسرِ مہمانداری قسم کی چیز تھا۔

میں نے نام بتایا تو وہ نہایت عاجزی سے بولا "سر! آپ کی آمد کی اطلاع ہے۔ پیر صاحب آپ کا انتظار فرما رہے ہیں لیکن ایک ذرا سی زحمت آپ کو ضرور کرنا پڑے گی۔ اسے بدتمیزی مت سمجھئے گا۔ یہ اس گھر کا اصول ہے۔ کوئی ملاقاتی کسی قسم کا ہتھیار لے کر گھر میں داخل نہیں ہوسکتا۔ اگر آپ کے پاس ایسی کوئی چیز ہے تو براہِ مہربانی امانتاً مجھے دے دیجئے یا گاڑی میں ہی چھوڑ دیجئے۔"

میں نے اور شفیع شاہ نے کوٹ کے نیچے سے گنیں نکال کر گاڑی کے ڈیش بورڈ پر رکھ دیں لیکن اس کے لئے گویا صرف اتنا ہی کافی نہیں تھا۔ اس نے معذرت کے ساتھ ہمیں گاڑی سے اترنے کے لئے کہا پھر اس سے بھی زیادہ معذرت کے ساتھ ایک میٹل ڈیٹیکٹر ہمارے جسموں پر پھیر کے دیکھا۔ وحات کی نشاندہی کرنے والے اس آلے نے ہمارے پاس ایسی کسی چیز کی موجودگی کا اشارہ نہیں دیا۔

تب اس نے ایک ملازم کو اشارہ کیا جو سامنے کی آہنی گرل ہٹا کر خود ہی ہماری گاڑی طویل و عریض ڈرائیو وے میں ایک طرف کھڑی کر آیا۔ ہمیں اسی ملازم کی رہنمائی میں اندر بھیج دیا گیا۔ ماربل کی پختہ گزرگاہ کے دونوں طرف نہایت خوب صورت لان تھا جس میں خودکار فوارے پانی کی پھوار برسا رہے تھے۔ وقفے وقفے سے وہ بند ہوجاتے تھے۔

عالیشان مکان کی اصل عمارت کے قریب پہنچنے سے پہلے ہی ہمیں سامنے پہلی منزل کی طویل و عریض ٹیرس نظر آئی جس کے سامنے کی نیچی سی دیوار یقیناً امپورٹڈ ٹائلوں سے آراستہ تھی۔ اس ٹیرس پر ایک جسیم عورت بغلوں میں ہاتھ دیئے کھڑی تھی۔ اس کے گھٹنوں تک ٹیرس کی دیوار تھی لیکن یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ایک دراز قد عورت تھی۔ اس کی رنگت سانولی تھی۔ عمر ساٹھ سے کم نہیں رہی ہوگی لیکن وہ کسی سانڈنی کی طرح مضبوط دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چوڑے چکلے اور بے کشش چہرے پر بلا کی سفاکی تھی۔

اس کے دائیں بائیں دو خادمہ ٹائپ لڑکیاں ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑی تھیں۔ وہ یقیناً پیردانش کی "والدہ محترمہ" تھیں۔ حیرت کی بات تھی کہ اتنی دراز قد عورت کا بیٹا اتنا پستہ قد تھا۔ شاید اس کا شوہر پستہ قد رہا ہو۔ وہ کچھ اس طرح ٹیرس سے نیچے کا جائزہ لے رہی تھی جیسے زمانۂ قدیم کی کوئی مطلق العنان ملکہ اپنے محل کے کسی مینار پر کھڑے ہوکر اپنی سلطنت کے کسی حصے کا معائنہ کررہی ہو اور جو کچھ اس نے دیکھا ہو وہ اسے پسند نہ آیا ہو۔

ہمارے آگے چلتے ہوئے ملازم نے گوکہ سر اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا لیکن اسے یقیناً اس کی موجودگی کا علم تھا۔ ٹیرس کے عین سامنے پہنچ کر وہ پرانے شاہی غلاموں کی طرح جھکا اور دیر تک جھکا ہی رہا۔ میں اس دوران اس کے پیچھے کھڑا خود کو چغد محسوس کررہا تھا۔ شاید شفیع شاہ کے محسوسات بھی مجھ سے مختلف نہ رہے ہوں۔

عورت کو شاید توقع رہی ہو کہ میں اور شفیع شاہ بھی اس کے احترام میں رکوع کی سی حالت میں چلے جائیں گے لیکن ہم نے اس قسم کی کوئی زحمت نہیں کی اور سارس کی طرح گردنیں اٹھائے اس کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ ہم سے چند فٹ کی اونچائی پر کھڑی تھی۔ دفعتاً اس کا ہاتھ حرکت میں آیا اور وہ اپنی موٹی سی انگشتِ شہادت سے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں بولی "تم یقیناً افضل ہو۔"

یہ سوال نہیں، بیان تھا۔ شفیع شاہ کی طرف اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ میں نے ہلکی سی خوش خلق مسکراہٹ کے

ساتھ ملائمت سے کہا "یس مادام!"

اس نے مزید ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ وہ ایڑیوں کے بل گھومی اور مارچ کرنے کے انداز میں قدم اٹھاتی ٹیرس پر پیچھے کہیں غائب ہوگئی۔ خادمائیں بھی تیزی سے گھوم کر مشینی انداز میں اس کے پیچھے پیچھے چلی گئی تھیں۔ اس کے نظروں سے اوجھل ہونے کے چند سیکنڈ بعد تک بھی مجھے کچھ یوں لگا جیسے ٹیرس پر اس کے قدموں کی دھمک گونج رہی ہو۔

مجھے کچھ یوں لگا جیسے وہ صرف میری شکل دیکھنے کے لئے وہاں کھڑی تھی۔ وہ یقیناً معمولی شکل صورت کی ایک غیر معمولی عورت تھی۔ ایک پیر دانش ہی نہیں اور بھی نہ جانے کتنے لوگ اس کے اشاروں پر ناچتے ہوں۔ ہم نے گاڈ فادر اور اس سے ملتی جلتی شخصیتوں کے قصے تو پڑھے تھے، فلمیں بھی دیکھی تھیں۔ یہ عورت کچھ "گاڈ مدر" قسم کی چیز معلوم ہوتی تھی۔

ہم اپنے سروں کو صحیح پوزیشن میں لے آئے۔ ہمارے سامنے رکوع کی سی حالت میں گیا ہوا ملازم کچھ اس طرح گہری سانس لے کر سیدھا ہوگیا جیسے اس کی کمر سے پتھر کی کوئی بھاری سل ہٹالی گئی ہو۔ ہم اس کی رہنمائی میں اب مکان کی اصل عمارت میں داخل ہوئے جس کا ماربل کا فرش یوں جھلملا رہا تھا جیسے اس پر تازہ تازہ پالش کی گئی ہو۔ ٹھوس لکڑی کے بھاری بھرکم منقش دروازے نہایت خوب صورت تھے۔

ایک آراستہ و پیراستہ ہال اور راہداری سے گزر کر ہم جس کمرے کے دروازے پر رکے وہاں ایک اور مسلح محافظ ایک کرسی پر بُت کی طرح ساکت بیٹھا تھا۔ ہمیں قریب آتے دیکھ کر وہ مشینی گڈے کی طرح اٹھ کھڑا ہوا لیکن ملازم نے اشارے سے اسے دوبارہ بٹھادیا۔ پیر دانش کے حفاظتی انتظامات گھر کے اندر، کمروں کے دروازوں تک پہنچے ہوئے تھے۔ نہ جانے اسے کس سے اتنا خطرہ تھا۔ میرے خیال میں کسی پیر قسم کی شخصیت کو اپنی حفاظت کی اتنی فکر تو نہیں ہونی چاہئے تھی۔

ملازم سرگوشی میں بولا "یہ پیر صاحب کا بیڈ روم ہے۔ وہ آپ کے منتظر ہیں۔ آپ اندر جاسکتے ہیں۔ میرا اندر جاکر اطلاع دینا ضروری نہیں ہے۔"

میں نے احتیاطاً دھیرے سے دروازے پر دستک دی۔ وہ گویا کسی غیبی آنکھ سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اندر سے اس کی مدھم مگر کھرکھراتی سی آواز سنائی دی "آجائیں.... آجائیں افضل صاحب!"

میں اور شفیع شاہ آہستگی سے بھاری بھرکم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تو وہ گنبد نما جالی میں گھرے ہوئے اپنے عظیم الشان بیڈ سے اتر رہا تھا۔ سلیپر پہن کر وہ دونوں بازو پھیلائے میری طرف بڑھا۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں بوٹی کی طرح سرخ تھیں۔

"آپ نے بہت دیر لگادی افضل صاحب۔ میں تو روتے روتے بے حال ہوگیا۔" وہ مجھ سے بغلگیر ہوگیا۔

وہ گینڈا نما شخص میری بغل میں منہ دیئے شوں شوں کررہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اسے تسلی دوں۔ میں نے اس کی چوڑی چکلی کمر تھپتھپاتے ہوئے اٹک اٹک کر چند تسلی آمیز جملے بولے اور اسی دوران بیڈ روم کا جائزہ لیا۔ وہ ایک طویل عریض اور افسانوی قسم کا بیڈ روم تھا۔

بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر تین مختلف رنگوں کے ٹیلی فون سیٹ، ایک موبائل فون اور ایک انٹرکام سیٹ رکھا ہوا تھا۔ وہ کثیر المقاصد کا ایک جدید انٹرکام سیٹ تھا۔ دفعتاً انٹرکام کی مترنم گھنٹی بج اٹھی اور اس کے پینل پر سرخ لائٹ بھی جلنے بجھنے لگی۔

میں نے کچھ سکون کی سانس لی کیونکہ یہ گھنٹی سن کر پیر دانش مجھ سے الگ ہوگیا اور ٹشو پیپرز کے ایک بڑے سے گولے سے چہرہ پونچھتے ہوئے سائڈ ٹیبل کی طرف بڑھا۔ انٹرکام کا ہینڈ سیٹ اٹھا کر اس نے چند لمحے کسی کی بات سنی پھر نہایت سعادت مندی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولا "جیسا آپ کا حکم ماما جانی! جو آپ کا حکم.... جی ہاں.... بہت بہتر۔"

وہ ریسیور رکھنے کے بعد بھی کچھ دیر وہیں کھڑا شوں شوں کرتا رہا پھر ہماری طرف مڑتے ہوئے بولا "ارے آپ ابھی تک کھڑے کیوں ہیں بیٹھئے نا۔"

ہم کھڑکیوں کے قریب موجود شاندار صوفوں میں دھنس گئے۔ وہ ہمارے مقابل آبیٹھا۔ چند سیکنڈ میں ہی اس کی حالت سنبھل گئی تھی۔ وہ آنسوؤں سے بھیگی اپنی داڑھی کو ٹشو پیپر سے صاف اور خشک کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا "ماما کا فون تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ مجھے مہمانوں کے سامنے رونے دھونے سے پرہیز کرنا چاہئے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حکم دیا ہے کہ مہمانوں کی تواضع میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی جائے۔"

اس دوران میں نے دیکھا کہ اس کے بیڈ کی دوسری جانب ٹیبل پر مونا کی بڑی سی فریم شدہ تصویر رکھی تھی۔ وہ ایک کلوزاپ تھا جس میں وہ بے ساختہ ہنستی دکھائی دے رہی تھی۔ بلاشبہ وہ ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی جس کی ہنسی زندگی سے بھرپور تھی۔ اس تصویر کو دیکھ کر گمان تک نہیں گزرتا تھا کہ اس لڑکی کا اصل کردار کیا تھا اور وہ کن کن نشیب و فراز سے گزر چکی تھی۔ وہ کالج سے حال ہی میں نکلنے والی کسی ہنستی کھیلتی خوب صورت اور پُرامنگ لڑکی کا فریش چہرہ تھا۔

اس تصویر نے ایک لمحے کے لئے مجھے الجھالیا تھا۔ انداز بتاتا تھا کہ وہ ماڈلنگ کی غرض سے کھینچی گئی تھی۔ میرے ذہن میں اصل میں ایک تضاد بھی نمایاں ہوگیا تھا۔ میں نے اسے ایک دور افتادہ، غربت زدہ اور پُراسرار سے مکان میں رسی کے پھندے میں لٹکے دیکھا تھا۔ کون تصور کرسکتا تھا کہ وہ پھول اس وقت کیسا نظر آرہا تھا۔

"آپ کی ماما کو آپ کے دکھ کی وجہ معلوم ہے؟" میں نے اس

کی بات کاٹتے ہوئے اور تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"جی ہاں" اس نے اطمینان سے جواب دیا "ماما سے تو میری شاید ہی کوئی بات چھپی ہو۔ چھپی رہ ہی نہیں سکتی۔ جس طرح ایک شیر خوار بچے کی ہر بات ماں کے سامنے عیاں ہوتی ہے بالکل اسی طرح میں بھی اپنی ماما کے سامنے بالکل بے پردہ ہوں۔ اپنی ماما کے لئے میں اب بھی ایک شیر خوار بچہ ہوں اور ان کی نظر میں میرا ہر کام طفلانہ ہے۔"

وہ ذرا ہماری طرف کو جھکتے ہوئے زیر مونچھ مسکرایا "آپ یہ مت سمجھئے گا کہ میں اتنا بڑا ہونے کے بعد اس طرح اپنی ماما کی مٹھی میں رہ کر ہمیشہ ہی خوش رہتا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ کبھی کبھی میں بڑا بے چین ہوتا ہوں۔ مجھ میں بغاوت کی خواہش ابھرتی ہے۔ میں اپنی سی چھوٹی موٹی آزادانہ حرکتیں کرتا ہوں۔ اپنے سامنے اپنی خودمختاری کا اظہار کرنے کی کوشش کرتا ہوں لیکن ایسے کاموں میں مجھے ہمیشہ نقصان یا پریشانی اٹھانی پڑتی ہے۔ جس کام میں ماما کی سرپرستی شامل نہ ہو وہ میرے لئے مبارک ہی ثابت نہیں ہوتا۔ ماما جانی کے بغیر میں کچھ بھی نہیں ہوں۔"

پھر وہ گویا بحرِ عقیدت کی گہرائیوں سے باہر آتے ہوئے سر جھٹک کر بولا "خیر چھوڑیئے ان باتوں کو.... یہ بتایئے میں آپ کی کیا خاطر مدارات کروں؟ میرا خیال ہے پہلے ڈرنکس کا دور چلنا چاہئے۔ دنیا کی بہترین ڈرنکس.... اور کئی قسم کی بہترین وائنز میرے تہ خانے میں موجود ہیں۔ آپ جو حکم کریں گے، حاضر ہوجائے گا۔ اس کے بعد کھانے کا دور چلے گا۔ میرا خیال ہے آپ میرے ہاں کے باربی کیو سے بہت لطف اندوز ہوں گے۔ میرے لان کے ایک بہت بڑے حصے پر باربی کیو کا انتظام ہے۔ چولستان کے تیتر، کوئٹہ کے بکروں کی رانیں، کشمیر کی مرغابیاں، بہاولپور کے خرگوش.... جو آپ کہیں روسٹ کروالیا جائے؟" وہ متوقع نظروں سے ہماری طرف دیکھنے لگا۔

میں اور شفیع شاہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اس کی آنکھیں بدستور سرخ تھیں لیکن آنسو خشک ہوچکے تھے۔ میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "پیر صاحب! ہم دونوں اس قدر اہتمام کے ساتھ کھانے پینے کے عادی نہیں ہیں۔ ہم تو مزدور قسم کے لوگ ہیں۔ جب اور جیسا میسر آیا کھالیا۔ اس وقت تو کچھ کھانے پینے کی خواہش ہی نہیں ہے۔ ہم تو صرف آپ کی دلجوئی کے لئے حاضر ہوئے تھے۔"

"آہ۔ پھر وہی انکساری۔" اس نے مضطربانہ انداز میں ہاتھ ملے "بابا! میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ انکساری اچھی چیز ہے۔ میں خود اپنے ملنے والوں اور عقیدت مندوں کو اس کی تلقین کرتا ہوں لیکن بڑے آدمیوں کو کبھی کبھی بڑا آدمی بھی نظر آنا چاہئے۔ تکلف چھوڑیں بابا! آپ تشریف لے آئے بس میری دلجوئی ہوگئی۔ ماما نے بھی تھوڑی سی ڈانٹ پلائی ہے۔ اب میں وقتی طور پر اس صدمے کو بھول گیا ہوں۔"

گویا اوپر کی منزل سے اس کی ماما جانی کا فون بھی بروقت ہی آیا تھا۔ ورنہ وہ نہ جانے کب تک اپنا تربوز جیسا سر میری بغل میں گھسیڑے شوں شوں کرتا رہتا۔ مجھے اس کی تشفی کے لئے الفاظ تلاش کرنا پڑے۔ جب تک کوئی جذبہ دل سے نہ پھوٹے اس کے لئے الفاظ تلاش کرنا بھی مشکل ہوتا ہے اور اس میں اتنی تاثیر بھی نہیں ہوتی کہ بغیر لفظوں کے اس کا اظہار ہوجائے۔

بہت دیر تک اس کا اصرار اور ہمارا انکار جاری رہا۔ آخر کار ہمیں ہتھیار ڈالنے پڑے اور تھوڑا بہت کھانا پینا پڑا لیکن اس طرح نہیں جس طرح وہ چاہ رہا تھا۔ ہم نے محض کولڈ ڈرنکس اور کھانے پینے کی چند ہلکی پھلکی چیزوں پر اکتفا کیا کیونکہ ہمیں ناشتا کئے زیادہ دیر نہیں گزری تھی اور دوپہر کے کھانے کا ابھی وقت نہیں ہوا تھا۔ کھانے کے دوران بھی ڈائننگ ہال میں دو مرتبہ اس کی "ماما جانی" نے انٹرکام پر دو مرتبہ کال کیا اور کچھ ہدایات دیں۔ وہ واقعی ایک گاڈ مدر کی طرح اوپر بیٹھی اپنی راجدھانی کو کنٹرول کرتی تھی اور پل پل کی خبر رکھتی تھی۔

ہلکے پھلکے کھانے سے فارغ ہوکر میری فرمائش پر کافی کا دور چلا۔ اس نے ہمیں برازیل کی کافی پلوائی۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ ہم اس کی فرمائش پر اس کے ہاں چلے آئے تھے۔ میں اس کا گھربار، رہن سہن دوستانہ ماحول میں، قریب سے دیکھنا چاہتا تھا۔ میں اپنے مقصد میں کافی حد تک کامیاب رہا تھا۔ مجھے بہت سی چیزوں کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

کافی نوشی کے دوران پیر دانش سگار سلگا کر ایک گہرا کش لینے کے بعد نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "میں اس ناروا اور تکلیف دہ قصے کو دوبارہ چھیڑنا تو نہیں چاہتا لیکن کیا کیا جائے۔ بات کئے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ اخبارات میں تو مونا کی لاش ملنے کی خبر نہایت مختصر چھپی ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں کچھ معلومات حاصل ہوئیں؟"

"نہیں۔ بس یہی معلوم ہوسکا ہے کہ پولیس نے کسی گمنام اطلاع پر لاش برآمد کی ہے۔ لڑکی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر کسی نے رسی کے پھندے میں لٹکا دیا تھا...." میں نے جواب دیا۔

"بس.... بس...." پیر دانش ہاتھ اٹھا کر میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار ابھر آئے تھے "مونا کے ساتھ جو ظلم ہوا اس کا تذکرہ مت کیجئے۔ میرے دل میں طوفان امنڈنے لگتے ہیں۔ مجھے ذرا سا اشارہ بھی مل جائے کہ یہ کن لوگوں کا کام ہے تو میں انہیں نیست و نابود کردوں گا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے سے غیظ و غضب کا اظہار ہونے لگا۔

پھر وہ گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا "آپ کی معلومات تو مجھ سے بھی کم ہیں۔ میں نے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ معلوم کرلی ہے۔ یہ بھی معلوم کرلیا ہے کہ وہ مکان کس کا تھا جس میں مونا کی لاش پائی گئی۔"

"کیسے معلوم کرلیا؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

"افضل صاحب! ہم اتنے بڑے شہر میں اتنا نام کمانے کے بعد یہاں بیٹھے جھک تو نہیں مار رہے ہیں۔" وہ گویا میری کم عقلی پر افسردگی سے مسکرایا "جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں لوگوں تک ہماری رسائی ہے وہاں پولیس میں بھی بہت سے لوگ ہمیں سلام کرنے والے ہیں۔ میں تو سمجھا تھا کہ شاید آپ کے مجھ سے زیادہ رابطے ہوں گے۔ آپ بھی بڑے آدمی ہیں... اور ذرا مختلف قسم کے بڑے آدمی ہیں۔"

"میں کہاں کا بڑا آدمی ہوں پیر صاحب!" میں نے انکساری سے کہا "کاروبار میں چار پیسے کما لینے سے آدمی بڑا تھوڑا ہی بن جاتا ہے۔ کارآمد حلقوں میں رسائی رکھنا اور بات ہے۔ بعض لوگ دولت مند نہ ہونے کے باوجود اس کام میں ماہر ہوتے ہیں۔ میں تو پہلے ہی آپ پر واضح کرچکا ہوں کہ میں زیادہ اثر رسوخ والا آدمی نہیں ہوں۔"

"بات یہ نہیں ہے افضل صاحب!" وہ سگار کے دھوئیں کے عقب سے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "بات یہ ہے کہ آپ کو مونا کی ذات سے ویسی دلچسپی نہیں تھی جیسی ہمیں تھی۔ شاید اس لئے آپ نے اس کے بارے میں معلومات کرنے میں اتنی عجلت کی ضرورت محسوس نہیں کی ہوگی جتنی ہم نے محسوس کی۔ آپ نے شاید یہ بھی سوچا ہو کہ اب تو وہ مرچکی ہے۔ اب اس کے بارے میں تگ و دو کرنے کا فائدہ بھی کیا؟ لیکن میری دلچسپی اس کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہوئی۔ میں اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھوں گا جب تک اس کے قاتل یا قاتلوں کو عبرتناک انجام سے دوچار نہیں کردوں گا۔"

پھر ایک گہری سانس لے کر وہ بولا "میرے اور آپ کے ردِّعمل میں فرق کی ایک وجہ تو یہ ہوگئی۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے افضل صاحب! کہ آپ دراصل ہمارے سامنے کھل نہیں رہے۔ آپ کی ذات پر کچھ پردے پڑے ہوئے ہیں اور آپ انہیں اٹھانا نہیں چاہتے۔ خیر کوئی بات نہیں۔ ہم انتظار کرلیں گے۔ کبھی نہ کبھی تو ہمارے اور آپ کے درمیان پردے اٹھ جائیں گے۔ ہم بڑے صبر و تحمل والے آدمی ہیں۔ انتظار کرنا جانتے ہیں۔"

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "ذرّے کو آفتاب بنانا کوئی آپ سے سیکھے پیر صاحب! میں پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ میں اتنا بڑا آدمی نہیں ہوں جتنا آپ مجھے ثابت کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میں اپنی شخصیت کو پردوں میں چھپانے کا اہل بھی نہیں ہوں۔ کاش میں واقعی اتنا "قابل" ہوسکوں جتنا آپ نے مجھے تصور کرلیا ہے۔ میں نے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہونا اسی لئے شروع کیا ہے کہ شاید آپ کی شخصیت سے فیض پا کر میں ایسی کوئی چیز بن سکوں۔"

وہ گویا اپنے غم کو بھول کر دھیرے سے ہنسا "عجیب بات ہے! ہم دنیا کے لئے پیر ہیں لیکن ہم آپ کی شخصیت سے کچھ فیض پانے کی کوشش کررہے ہیں۔"

"چلیں ہم اپنی اپنی کوشش جاری رکھتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جس کی قسمت میں جو کچھ ہوا وہ اسے مل جائے گا۔ یا یوں کہئے کہ کسی کے دامن میں اگر واقعی کچھ ہوا تو وہ دوسرے کو دے دے گا۔"

ہم جتنی دیر اس کے پاس بیٹھے رہے، مسلسل ملاقاتیوں کی آمد کی اطلاع آتی رہی۔ ان میں سے بعض لوگوں کے ساتھ تو ملاقات کا وقت طے تھا لیکن وہ ہمارے پاس سے اٹھ کر نہیں گیا۔ بعض لوگوں کو اس کے سیکریٹری نے اس کی ہدایت پر ٹرخا دیا۔ بعض ملاقاتیں اس نے منسوخ کردیں اور بعض کو انتظار کے لئے ڈرائنگ روم میں بٹھوا دیا۔ یہ سب کام ٹیلی فون اور انٹرکام پر چلتے رہے۔ اس کے علاوہ اس نے بتایا کہ شام چار سے آٹھ بجے تک اس کا "دربارِ عام" بھی لگتا تھا۔ اس میں لوگ ملاقات کا وقت طے کئے بغیر بھی آسکتے تھے۔ اس کے باوجود وہ تمام مصروفیات منسوخ کرکے ہمارے ساتھ بیٹھے رہنے پر مصر تھا لیکن میں نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کچھ دیر بعد اجازت طلب کی۔ بمشکل اس نے ہمیں جانے کی اجازت دی اور مکان کے اندرونی دروازے تک ننگے پاؤں ہمیں چھوڑنے آیا۔

اس کے بعد ایک ملازم ہمیں گیٹ تک چھوڑنے آیا۔ گاڑی گیٹ پر لائی گئی اور بڑے ادب و احترام سے ہمیں رخصت کیا گیا۔ ہماری گنیں اسی طرح ڈیش بورڈ پر رکھی ہوئی تھیں۔ ہم نے اٹھا کر کوٹ کے نیچے چھپالیا۔

راستے میں، میں نے شفیع شاہ سے کہا "تمہاری کچھ سمجھ میں آیا کہ آخر اس ملاقات کا مقصد کیا تھا؟"

"میری تو سمجھ میں صرف ایک ہی مقصد آیا ہے۔" شفیع شاہ متذبذب لہجے میں بولا "وہ ہمیں بالکل صحیح طور پر جاننا چاہتا ہے۔"

"تمہارا خیال درست ہے۔ کم از کم میری رائے کے مطابق درست ہے۔" میں نے سرہلاتے ہوئے کہا "اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ وہ ہمیں کیوں بہتر طور پر جاننا چاہتا ہے؟"

"اس کی تو بہت سی وجوہات ہوسکتی ہیں سر!" شفیع شاہ بولا "کسی ایک وجہ کا تعین کرنا مشکل ہے۔"

"میرا خیال ہے وقت کے ساتھ ساتھ اصل وجہ سامنے آجائے گی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہمیں ضرورت سے زیادہ اہمیت دے رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"چلیں اس بہانے اس عجیب و غریب کردار کو قریب سے دیکھنے کا موقع تو ملا۔" شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا "یہ سوشل حلقوں میں یہ بہت بڑا نام ہے۔ اس کے اور اس کی "ماما جانی" کے بڑے تذکرے رہتے ہیں۔ بڑے احترام سے ان کا نام لیا جاتا ہے حالانکہ میرا خیال ہے اپنی جوانی میں یہ اوّل درجے کی بدمعاش عورت رہی ہوگی۔"

میں نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "تم جوانی کی بات کررہے ہو؟ وہ اب بھی کچھ کم بدمعاش نہیں لگتی۔"

شفیع شاہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "انقلابات ہیں زمانے کے... ہمارے ہاں دیکھتے ہی دیکھتے کیسے کیسے لوگ معزز و محترم ہوجاتے ہیں۔ لوگ کس طرح ان پر عقیدتوں کے پھول... بلکہ جانیں تک نچھاور کرنے لگتے ہیں۔ میں نے سنا ہے پیروانش کسی زمانے میں باقاعدہ شعبدے باز تھا۔ اسی قسم کا شعبدے باز... جو ٹوکری میں سے کبوتر اور کان کے پیچھے سے ٹافی وغیرہ نکال کر دکھاتے ہیں۔ نہ جانے کب اور کیسے اسے اپنی شعبدے بازی کی صلاحیتوں کو پیری فقیری میں استعمال کرنے کا خیال آیا اور وہ داڑھی بڑھا کر کسی مضافاتی علاقے میں بیٹھ گیا۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اس نے اپنے شعبدوں سے لوگوں کو حیران کرنا شروع کردیا۔ لوگ انہیں اس کی روحانی طاقت کا کمال سمجھتے تھے۔ ہمارے ہاں اچھے بھلے پڑھے لکھے لوگ بہت چھوٹے ذہن کے مالک اور ضعیف الاعتقاد ہوتے ہیں۔ شاید کسی کو بھی یہ خیال نہیں آتا تھا کہ اسی قسم کے شعبدے وہ میلوں ٹھیلوں میں یا گلی کوچوں میں دیکھتے تھے۔ جب کوئی شخص ایک خاص روپ دھار کر، ایک مخصوص ماحول تخلیق کرکے وہی شعبدے دکھاتا ہے تو وہ "روحانی طاقت کے کرشمے" بن جاتے ہیں۔"

"پھر بھی... پیروانش جتنی ترقی کم ہی لوگ کرتے ہیں۔" میں نے کہا۔

"آدمی یقیناً بہت تیز تھا۔ ایک بار سرا ہاتھ آجانے کے بعد اس نے بہت تیزی سے ڈور لپیٹنا شروع کردی اور دولت سے دولت کمانے کے معاملے میں بھی یہ بہت شاطر رہا۔ اس نے ہر کام میں ٹانگ اڑائی ہوئی ہے۔ جائز اور ناجائز نہ جانے کیا کیا دھندے ہیں۔ ساتھ ہی اس نے اثر رسوخ بڑھانے پر بھی خصوصی توجہ دی۔ اوپر سے وہ گاڈ مدر... اس کی ماما جانی بھی کچھ کم نہیں ہے۔ میں نے اس کے بڑے قصے سنے تھے۔ دیکھنے کا اتفاق آج ہوا ہے۔" شفیع شاہ نے بتایا۔

"خیر مجھے امید تو یہی تھی کہ اس شخص کا پس منظر کچھ اسی قسم کا ہوگا۔" میں نے کہا "لیکن اس شخص کا ہماری طرف اتنی "محبت" سے متوجہ ہونا مجھے کچھ خالی از علت نہیں لگ رہا۔"

"کوئی بات نہیں سر!" شفیع شاہ گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے ایک نظر میری طرف دیکھ کر مسکرایا "جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ ہمیں "انتظار کرو اور دیکھو" کی پالیسی اپنانا ہوگی۔ اس کا مقصد سامنے آ ہی جائے گا۔"

"ہاں... فی الحال تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ویسے میں سوچ رہا ہوں کہ اس کی نگرانی شروع کرائی جائے۔ شاید کوئی کام کی بات معلوم ہوسکے۔"

"کام کی باتیں تو اس کا کوئی اندر کا آدمی ہی بتا سکتا ہے۔" شفیع شاہ بولا۔

"اندر کے کسی آدمی کا بھی پتا چلانے اور اس پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔" میں نے کہا۔

چند لمحے گاڑی میں خاموشی رہی۔ میری طرح شاید شفیع شاہ بھی ابھی تک آج کی ملاقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے تو پیروانش کو کوئی کام کی بات نہیں بتائی تھی لیکن اس سے بھی مجھے کوئی کام کی بات معلوم نہیں ہوسکی تھی۔

اس نے بڑے فخر سے کہا تھا کہ اس نے مونا کے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ بھی معلوم کرلی تھی اور یہ بھی معلوم کرایا تھا کہ جس مکان میں اس کی لاش پائی گئی تھی وہ کس کا تھا؟ لیکن جب بعد میں میں نے گپ شپ کے دوران اس سے اس سلسلے میں سوالات کئے تو دونوں ہی باتیں بے کار محسوس ہوئیں۔

پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں صرف موت کی وجہ بیان کی گئی تھی۔ وجہ وہی تھی جو ظاہری طور پر نظر آرہی تھی یعنی گلے میں پھندا ڈالے جانے کی وجہ سے دم گھٹنا۔ یہ کوئی انکشاف نہیں تھا۔ اس مکان کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ کبھی کچھ منشیات فروشوں کے نچلے درجے کے کارندوں کے قبضے میں تھا جن میں سے کچھ گرفتار اور کچھ مفرور تھے۔ آج کل وہ لاوارث پڑا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ مونا وہاں کس طرح پہنچی تھی؟ یہ بھی کوئی کام کی بات نہیں تھی۔ اگر پولیس کی تحقیقات کا اب تک صرف یہی نتیجہ نکلا تھا تو مجھے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں تو ٹھوس، کارآمد اور زیادہ اندر کی اطلاعات کی تلاش میں رہتا تھا۔

اچانک شفیع شاہ کو جیسے کچھ یاد آیا۔ وہ ذرا چونک کر بولا "سر! ہم اِدھر اُدھر کے چکروں میں کچھ زیادہ ہی الجھ گئے ہیں۔ کاروبار کے بارے میں بات کرنا یاد ہی نہیں رہتا۔ آپ کو معلوم ہے انگلینڈ سے مسٹر جون ڈی برائن آرہے ہیں؟"

"ہاں۔ مجھے کل لندن سے ان کی سیکریٹری کا فون آیا تھا۔" مجھے یاد آیا۔ مسٹر جون ڈی برائن انگلینڈ میں ہمارے ایکسپورٹ کے مال کے ایک بڑے خریدار تھے۔ وہ لیدر گارمنٹس کا کاروبار کرنے والی ایک بڑی کمپنی کے صدر تھے۔ وہ خاص طور پر ہم سے کچھ نئے معاملات طے کرنے کے لئے آرہے تھے۔

شفیع شاہ بولا "سر! یہ بھی اچھا ہے کہ آپ اتفاق سے کراچی میں ہی موجود ہیں۔ مسٹر برائن بھی اپنی کمپنی کے سربراہ ہیں۔ پروٹوکول کا تقاضا ہے کہ آج شام آپ انہیں لینے ائرپورٹ چلیں۔ وہ دو تین روز یہاں ٹھہریں گے۔ انہیں کچھ اور لوگوں سے بھی ملاقاتیں کرنی ہیں۔ پھر ہم انہیں لاہور روانہ کردیں گے۔ ہم سے ان کے اصل معاملات لاہور میں ہی طے پانے ہیں۔ وہاں راحیلہ، ٹونی اور ہمارے ایکسپورٹ منیجر ان سے بات چیت کرلیں گے۔ یہاں صرف آپ تھوڑی دیر کے لئے ان کی میزبانی کرلیں۔ گورا خوش ہوجائے گا۔ ہمارا اہم بائر ہے۔"

امبر نے آج صبح اس کا فیکس بھی میرے سامنے اہم کاغذات کی فائل میں رکھا ہوا تھا۔ میں نے ایک لمحے سوچنے کے بعد گہری

سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے شفیع ڈیئر! تم کہتے ہو تو میں گورے کو خوش کرنے کے لئے تمہارے ساتھ ائرپورٹ چلے چلوں گا۔"

شفیع شاہ نے بتایا کہ فلائٹ رات کو آٹھ بجے پہنچنی تھی۔ مسٹر برائن کو ہمارے ہوٹل میں ہی ٹھہرنا تھا۔ شفیع شاہ نے اپنے طور پر پہلے ہی پروگرام بنایا ہوا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ ہی ڈنر کرے گا۔

مجھے آفس چھوڑ کر شفیع شاہ رخصت ہو گیا۔ میں نے رحیم گل سے رابطہ کیا اور اس سے معلومات لیں کہ مونا کے قتل کے سلسلے میں کیا پیش رفت ہوئی تھی۔ اس کا علاقہ پولیس والوں سے رابطہ تھا۔ اس نے مجھے پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور جائے واردات کے بارے میں وہی کچھ بتایا جو پیردانش بتا چکا تھا۔

"یہ تو کوئی خاص باتیں نہیں ہیں۔ یہ تو لوگوں کو بھی معلوم ہو چکی ہیں۔" میں نے اپنے لہجے سے قدرے مایوسی کا اظہار...

"لوگوں کو....؟" وہ چونکا "کن لوگوں کو؟"

"اس میں اتنا حیران ہونے کی کیا بات ہے؟" م... سے کہا "پولیس کی بھلا کون سی بات راز رہ سکتی ہے؟ صرف ... پولیس کے رازوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ باقی تو سب کو پولیس کی ہر بات معلوم ہوتی ہے۔ جانے نہ جانے گل ہی نہ جا... باغ تو سارا جانے ہے۔"

"کبھی کبھی تو تم مجھے کسی لنگڑے لولے شاعر کی بدروح معلوم ہونے لگتے ہو۔" رحیم گل جل کر بولا "تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ یہ کوئی ایسی خاص راز کی باتیں نہیں ہیں جنہیں چھپا کر رکھنے کی کوشش کی جاتی۔ اگر یہ کسی کو معلوم ہو بھی گئی ہیں تو اس میں کوئی ایسی حیرت کی بات نہیں ہے لیکن تمہارے دل کی تسلی کے لئے میں پوچھنا چاہوں گا کہ یہ کسے معلوم ہو گئی ہیں؟"

"پیردانش کو" میں نے جواب دیا۔

"پیردانش؟ وہ کون ہے؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا!" میں نے پھر ایک مصرع داغ دیا "تم اتنے بیدار مغز پولیس آفیسر ہوتے ہوئے پیر دانش کو نہیں جانتے؟ وہ تو رہتا بھی تمہارے علاقے میں ہے۔"

"میرے علاقے میں تو کئی لاکھ افراد رہتے ہیں۔ میں ان سب سے تو واقف نہیں ہو سکتا جبکہ مجھے یہاں آئے بھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔" اس نے جواب دیا۔

"بے شک تمہارے علاقے میں لاکھوں افراد رہتے ہیں لیکن پیردانش لاکھوں میں ایک ہے پیارے! میرا تو خیال تھا کہ تم اس کے دربار میں حاضری دے چکے ہو گے۔ وہ تو شہر کی بڑی مشہور اور صاحبِ کرامت "شخصیت ہے۔" میں نے کہا۔

"کیا تمہیں اب تک پتا نہیں چلا کہ میں درباروں میں حاضری دینے والا پولیس آفیسر نہیں ہوں؟" وہ ذرا خفگی سے بولا۔

"پتا تو چل گیا ہے لیکن یقین اب تک نہیں آتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہرحال میں تمہیں اس عظیم ہستی کے بارے میں بتانے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس سے تعا... تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ اس کا قلعہ نما گھر بھی تمہاری بلڈنگ سے زیادہ دور نہیں ہے۔"

میں نے جونہی اسے پیردانش کے بارے میں بتانا شر... چونک کر میری بات کاٹتے ہوئے بولا "اچھا.... اچھا تم اِ... کر رہے ہو۔ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ اسے میں غائبانہ ط... ہوں۔ وہ کئی بار مجھے کھانے پر مدعو کر چکا ہے۔ حتیٰ کہ ایک نہایت خوب صورت لڑکی جو اپنے آپ کو اس کی سیکرٹ... تھی' اس کا پیغام لے کر آئی تھی۔"

"تم پھر بھی نہیں گئے؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"نہیں۔"

"آہ! رحیم گل! مجھے تمہارا انجام اچھا نظر نہیں آ... نے کراہ کر کہا "قدر ناشناسی تم میں کوٹ کوٹ کر بھری ہو... دل چاہ رہا ہے تمہیں پیٹ پیٹ کر تمہارے اندر سے ناشناسی نکال دوں۔ بدذوق انسان! حسین قاصد اس لئے بھیجے جاتے کہ انسان دعوت قبول نہ کرے۔"

"میں فوراً ہی اس کی طرف سے شکوک و شبہات... ہو گیا تھا۔ ایسے لوگوں کی طرف سے ذرا محتاط ہی رہنا چاہئے... طرح بطور خاص اپنے علاقے کے پولیس آفیسرز سے ت... بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر میں دوسری مصروفیات... جانے کی وجہ سے اس کی طرف دھیان نہیں دے سکا تھا... نے بھی گویا مجھے لفٹ دینے کا خیال دل سے نکال دیا تھا... اس کے بعد کبھی اس کا کوئی پیغام نہیں ملا۔ پھر مجھے یہ بھی پتا... اس کے تو مجھ سے کہیں اونچی سطح پر تعلقات ہیں۔ اس... جانے کیا سوچ کر مجھ "معمولی" انسپکٹر پر نظرِ کرم کرنے کا ا... تھا۔"

"بہرحال اس میں شک نہیں کہ تم بہت ہی ناشکر... ناقدرے انسان ہو۔ مجھے تو ابھی تک تمہاری اس بے ہودگی... نہیں آرہا کہ ایک حسین لڑکی پیغام لے کر آئی اور تم پھر بھی... گئے۔ چ...؟" میں نے ٹھنڈی سانس لی "کس... نے صحیح چیز غلط ... پر بھیج دی۔ مجھ جیسے قدر شناس کے پاس... میں سر کے بل جاتا۔ ہم تو محض فون پر اس تربوز کے بچے کے بلاوے پر ہی دوڑے چلے گئے تھے۔"

"اچھا اب اپنے آپ کو زیا... دل پھینک ثابت کر... کوشش نہ کرو اور یہ بتاؤ کہ تم اس کے پاس کیا لینے چلے تھے؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"کاش کچھ لینے گئے ہوتے۔" میں نے ایک اور ٹھنڈی... لے کر کہا "ہم تو صرف اس کی کچھ بے ہودہ بکواس... کچھ... بھوں... کچھ شوں شوں سننے گئے تھے۔ وہ سن کر آ گئے۔"

"پھر بھی اس ملاقات کا کچھ پس منظر تو ہو گا؟" رحیم گل... دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

"اب اس معاملے میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔" —

"پس منظر تو خاصا لمبا چوڑا ہے۔ یہ ایک دردناک اور افسوس ناک کہانی ہے۔" میں نے جواب دیا "کسی وقت فرصت میں بیٹھ کر سناؤں گا۔"

"اور اس پیردانش کو مونا کی پوسٹ مارٹم رپورٹ وغیرہ سے کیوں دلچسپی ہو گئی؟" رحیم گل نے جاننا چاہا۔

"اس کا تعلق بھی اسی لمبے چوڑے اور افسوس ناک پس منظر سے ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"مجھے اس پس منظر سے آگاہ رکھنے کی کوشش کرنا۔" اس نے گویا مجھے خبردار کیا "شاید یہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ خود ہی خدائی فوجدار بننے کی کوشش مت کرنا۔"

اسے کیا معلوم تھا کہ میں نے درحقیقت اسے خبردار رکھنے کے لئے ہی یہ ذکر چھیڑا تھا۔ میں نے پیار بھرے لہجے میں کہا "تمہیں اطلاع دیئے بغیر بھلا میں کب کوئی قدم اٹھاتا ہوں؟ اچھا اپنے کمزور اور ننھے سے ذہن پر زور دے کر یہ بتاؤ کہ مونا کے قتل کے سلسلے میں کوئی اور بات تو معلوم نہیں ہوئی؟"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ بولا "پولیس کی تفتیش کے دوران یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ اس مکان میں اکیلی نہیں رہ رہی تھی۔ کوئی مرد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس مکان کی خفیہ نگرانی کی جارہی ہے لیکن ابھی تک کوئی مرد لوٹ کر اس کی طرف نہیں آیا۔ وہ جو کوئی بھی تھا' عین ممکن ہے وہی مونا کا قاتل رہا ہو لیکن اس کا کوئی واضح سراغ نہیں مل رہا۔"

"اوہ!" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ پیردانش کو کم از کم یہ بات معلوم نہیں ہو سکی تھی اور اگر معلوم ہوئی تھی تو اس نے شاید کسی مصلحت کے تحت مجھے نہیں بتائی تھی۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کر کے فون بند کر دیا۔

اب مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ جب مونا نے مجھے فون کیا تھا' کاش میں نے اس سے پوچھ لیا ہوتا کہ جس مکان کا ایڈریس وہ مجھے دے رہی تھی وہ کس کا تھا۔ یا وہ وہاں کس کے ساتھ رہ رہی تھی؟ لیکن شاید ایک تو اچانک اور قطعی غیر متوقع طور پر اس کا فون آنے سے میں کچھ ہیجان زدہ ہو گیا تھا۔ دوسرے مجھے اس سے کچھ پوچھنے سے زیادہ اس سے ملنا ضروری محسوس ہو رہا تھا۔ اس لئے باتوں کو میں نے ملاقات تک کے لئے ملتوی کر دیا تھا۔ وہ ویسے بھی پبلک فون سے بول رہی تھی اور سخت خوف زدہ تھی۔ جتنی باتیں اس نے کر لی تھیں وہی کافی تھیں۔ گفتگو کو مزید طول نہیں دیا جا سکتا تھا۔

میں نے اس معاملے میں مزید انتظار کرنے کا فیصلہ کیا کہ شاید پولیس کی تفتیش سے کوئی ایسی کام کی بات معلوم ہو جائے جس کی بنیاد پر ہم خود آگے کچھ کر سکیں۔ فی الحال کوئی اور نکتہ ایسا نظر نہیں آرہا تھا جس کے سہارے ہم آگے بڑھ سکتے۔

رات کو ہم مسٹر جون ڈی برائن کو لینے ائرپورٹ چل دیے۔

ہم دو گاڑیوں میں روانہ ہوئے تھے۔ ایک گاڑی میں صرف میں اور شفیع شاہ تھے۔ دوسری گاڑی میں ہمارا جنرل منیجر اور دو مسلح گارڈ تھے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ مسٹر برائن کے ساتھ ان کی بیٹی بھی آرہی تھی۔ اس پر مجھے قدرے حیرت بھی ہوئی تھی۔ ہمارے ہاں تو اب غیر ملکی مرد بھی آتے ہوئے گھبرانے لگے تھے جبکہ مسٹر برائن اپنے ساتھ اپنی بیٹی کو بھی لا رہے تھے۔ میری مراد صرف شریف اور معزز غیر ملکیوں سے ہے جو کراچی آتے ہوئے گھبرانے لگے تھے ورنہ غیر قانونی تارکینِ وطن اور سازشی قسم کے غیر ملکیوں کا تو تانتا بندھا ہوا تھا۔

میں نے مسٹر برائن ہی کی تسلی کے لئے دو گارڈز ساتھ لے لئے تھے۔ میرا ارادہ تھا کہ مسٹر برائن اور ان کی بیٹی میری گاڑی میں میرے اور شفیع شاہ کے ساتھ بیٹھ جائیں گے جبکہ جنرل منیجر دونوں گارڈز کے ساتھ ہماری گاڑی کے بالکل قریب رہتے ہوئے پیچھے پیچھے آئیں گے۔

مسٹر برائن برٹش ائرویز کی پرواز سے آرہے تھے۔ ہم میں سے کوئی بھی انہیں نہیں پہچانتا تھا اس لئے انہیں چیک کرنے کی غرض سے ہمارا ایک گارڈ ہاتھ میں ان کے نام کا بورڈ لئے کھڑا تھا۔ فلائٹ وقت پر آ گئی اور مسٹر برائن کو کسٹم وغیرہ میں بھی کوئی دیر نہیں لگی۔ ان کے اپنے ٹریڈ کمشنر کے علاوہ اس میں میرے اثر رسوخ کو بھی تھوڑا بہت دخل تھا۔

ارائیول لاؤنج میں مسافروں کے ہجوم کے درمیان جب ایک بڑی عمر کا سفید فام اور ایک نوخیز لڑکی اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد ہمارے گارڈ کے ہاتھ میں بورڈ کو غور سے دیکھ کر اسی طرف بڑھے تو ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ برائن اور اس کی بیٹی تھی۔

دونوں باپ بیٹی ہی میرے تصور سے کافی مختلف تھے۔ برائن چگی داڑھی والا ایک مختصر الوجود سا شخص تھا۔ اس کی ناک پر موٹے موٹے گول شیشوں کی عینک ٹکی ہوئی تھی۔ سر پر چھجے دار اونی ٹوپی تھی۔ لباس کی طرف سے وہ سخت بے پروا معلوم ہوتا تھا حالانکہ اس کے کاروبار کا ایک شعبہ ملبوسات کا بھی تھا۔ شاید اسی لئے چراغ تلے اندھیرا تھا۔

وہ فلسفی' پروفیسر یا اسکالر معلوم ہوتا تھا۔ بزنس مین ہرگز دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کی بیٹی سرو قامت' نازک اندام اور خوب صورت تھی مگر اس کی عمر اٹھارہ بیس سال سے زیادہ نہیں تھی جبکہ برائن کم از کم پینسٹھ کا معلوم ہوتا تھا۔ اس عمر میں مغرب کے لوگ عام طور پر بزنس سے بھی ریٹائر ہو جاتے ہیں۔ وہاں ریٹائر ہونے کا تصور صرف سرکاری نوکریوں سے ہی وابستہ نہیں۔ برائن کی بیٹی یا تو اس کی تقریباً آخری اولاد تھی اور اگر اکلوتی تھی تو یقیناً کافی تاخیر سے پیدا ہوئی تھی۔

دونوں باپ بیٹی بہت گرمجوشی اور خلوص سے ہم سے ملے۔ تعارف اور مصافحوں وغیرہ میں کافی دیر لگ گئی۔ برائن کی بیٹی کا نام

سلویا تھا۔ سلویا برائن کو جب معلوم ہوا کہ میں ایک بڑے گروپ آف کمپنیز کا مالک تھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے خاصی پھیل گئیں۔

اس نے بتایا "میں اپنے پاپا کے دفتر میں ان کی سیکریٹری کے طور پر کام کرتی ہوں۔ آپ کی کمپنی سے زیادہ تر خط و کتابت میں ہی کرتی ہوں۔ میرا خیال تھا کہ آپ کم از کم میرے پاپا ہی کی عمر کے ہوں گے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔" میں نے بے ساختہ کہا جس پر باپ بیٹی خوش دلی سے ہنسے۔

"دراصل میں ایک ڈیڑھ سال بعد اپنی ریٹائرمنٹ کی منصوبہ بندی کررہا ہوں۔" برائن نے بتایا "سلویا میری اکلوتی اولاد ہے۔ میں اسے بزنس سکھا رہا ہوں۔ اسی لئے یہ میرے آفس میں بھی کام کررہی ہے اور میں اکثر دوروں پر بھی اسے ساتھ لے کر جانے لگا ہوں۔ اسے بزنس سے دلچسپی بھی ہے۔ یہ اتنی کم عمر اور نوجوان ہونے کے باوجود لڑکوں کے ساتھ کلبوں میں ناچنے اچھلنے کودنے اور حشیش پینے یا کوک سونگھنے میں اپنی زندگی برباد نہیں کررہی۔"

"بڑی خوشی ہوئی تم سے مل کر۔" میں نے سلویا سے کہا۔

"مجھے بھی آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" سلویا بولی "شاید میں اس مختصر قیام کے دوران آپ سے بھی کچھ سیکھ سکوں۔" اس کے الفاظ رسمی ضرور تھے مگر لہجہ رسمی نہیں تھا۔ وہ گہری نظر سے میرا سرتاپا جائزہ لے رہی تھی۔

ان کا سامان آچکا تھا۔ ہم سیڑھیوں کی طرف بڑھے تو سلویا نے پوچھا "آپ کو بھی کیا اپنی بزنس ایمپائر ورثے میں ملی تھی جس طرح مجھے ملے گی؟"

"ورثے میں؟" میں تقریباً کراہ اٹھا لیکن دوسرے ہی لمحے میں نے خوش دلی سے مسکرانے کی کوشش کی "ورثے میں تو مجھے مفلسی، فاقے اور دھکے ملے تھے۔"

"مجھے یقین نہیں آرہا۔" وہ بولی۔

"کبھی کبھی مجھے بھی نہیں آتا۔" میں نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا "لیکن ایک چیز ہوتی ہے قسمت! ہم ایشیائی اس پر بہت یقین رکھتے ہیں۔"

وہ گردن کو خفیف سا جھٹکا دے کر رہ گئی۔ اسے دیکھ کر مجھے جوڈی فوسٹر یاد آگئی تھی۔ وہ بھی لندن کی ایک خاصی بڑی کمپنی کی مالک تھی۔ اسے بھی کاروبار ورثے میں ملا تھا لیکن جب اس سے میری پہلی ملاقات ہوئی تو اسے کمپنی کی مالک بنے کئی سال گزر چکے تھے۔ وہ سلویا کے مقابلے میں خاصی بڑی عمر کی ایک جہاندیدہ لڑکی تھی۔

اس کے ساتھ میرا بہت اچھا وقت گزرا تھا اور اس کی بڑی خواہش تھی کہ وہ دوستی زندگی بھر کی رفاقت میں بدل جاتی لیکن میں اس کی ہمت نہیں کرسکا تھا۔ نہ جانے اب وہ کہاں تھی، کس حال میں تھی۔ ایک عرصے سے اس کی کمپنی سے کوئی بزنس بھی نہیں تھا۔ کوئی خط، کوئی فون بھی نہیں آیا تھا۔ شاید عمر بھر کے ساتھ کے سلسلے میں مایوس ہونے کے بعد کاروباری تعلق بھی دھیرے دھیرے دم توڑ گیا تھا۔ مجھے بھی زندگی کے ہنگاموں نے اس سے رابطے کی مہلت نہیں دی تھی۔

مسٹر برائن اس سے پہلے بھی دو مرتبہ پاکستان آچکے تھے۔ کچھ دوسری کمپنیوں سے بھی ان کا بزنس رہا تھا۔ ہمارے خریدار بنے انہیں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ پاکستانیوں کے ساتھ کاروبار کرنے کے معاملے میں ان کے تجربات کچھ زیادہ اچھے نہیں تھے۔ میں نے دھیمے لہجے میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ ہمیں وہ دوسروں سے مختلف پائیں گے۔ میں کاروبار میں لمبی چوڑی باتوں کے بجائے عمل کا قائل تھا اس لئے میں نے کچھ نہیں کہا اور ہم خاموشی سے ماربل کی سیڑھیوں سے اترنے لگے۔

ارائیول لاؤنج کے دوسری طرف ڈیپارچر لاؤنج تھا۔ سیڑھیوں پر بھی بہت سے لوگ چڑھتے اترتے دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ خود مسافر تھے اور کچھ مسافروں کو الوداع کہنے والے۔ انہی کے درمیان میں نے ایک سرو قامت لڑکی کو نہایت انداز میں سیڑھیاں اترتے دیکھا۔

اس کی طرف میری توجہ مبذول ہونے کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے دائیں بائیں دونوں طرف دو مسلح اور باوردی گارڈز چل رہے تھے حالانکہ ان دنوں شہر میں مسلح اور باوردی یا بے وردی گارڈز نظر آنا کوئی قابلِ توجہ بات نہیں رہی تھی۔ قدم قدم پر دکانوں، دفتروں کے سامنے، گاڑیوں میں، افراد کے آگے پیچھے گارڈز ہی گارڈز نظر آتے تھے۔ درجنوں پرائیویٹ سیکیورٹی کمپنیاں کھل چکی تھیں اور آثار کچھ ایسے لگتے تھے کہ کچھ عرصے بعد عام شہری کم ہوں گے اور گارڈز زیادہ۔

اس کے باوجود خواتین کے ساتھ گارڈز ذرا کم ہی دیکھنے میں آتے تھے۔ شاید اس لئے میری توجہ اس لڑکی کی طرف چلی گئی لیکن پھر مجھے احساس ہوا کہ وہ لڑکی ویسے بھی قابلِ توجہ تھی۔ وہ عنابی رنگ کے ایک میکسی نما مخملیں لبادے میں تھی جس نے اسے تقریباً گردن سے ٹخنوں تک ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے باوجود خدوخال کی حشر خیزی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ ہر قدم پر گویا قیامت ڈھاتی چل رہی تھی۔

ریشم کی طرح چمکتے بالوں کا خوب صورتی سے جوڑا بنا ہوا تھا۔ وہ چند زیورات بھی پہنے ہوئے تھی جو دور ہی سے جس طرح جھلملاتے دکھائی دے رہے تھے اس سے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ ڈائمنڈز کے تھے۔ یہ بھی قدرے حیرت کی بات تھی کیونکہ شہر میں تو عورتوں نے تقریبات میں ڈائمنڈز کے زیورات پہننے چھوڑ دیئے تھے۔ وہ پبلک مقام پر پہنے پھر رہی تھی۔ شاید اسے

گارڈز پر کچھ زیادہ ہی بھروسا تھا یا پھر شاید وہ شہر کے حالات سے کچھ زیادہ واقف نہیں تھی لیکن پھر مجھے خیال آیا کہ اس کے ساتھ گارڈز کی موجودگی تو یہی ظاہر کرتی تھی کہ اسے شہر کے حالات سے آگاہی تھی۔

وہ غیر ملکی بھی ہوسکتی تھی۔ شاید کسی ایسے ایشیائی ملک کی باشندہ رہی ہو جن کے باشندوں کی رنگت میں سفید فاموں جیسا گورا پن بھی ہوتا ہے اور ایشیائیوں والی ملاحت بھی۔ جس کی وجہ سے وہ سفید فاموں سے زیادہ پُرکشش لگتے ہیں۔ تاہم وہ پاکستانی بھی ہوسکتی تھی۔

وہ ڈیپارچر لاؤنج سے واپس آرہی تھی۔ اس کے ساتھ کوئی سامان نہیں تھا۔ امکان یہی تھا کہ وہ کسی کو سی آف کرکے آرہی تھی۔ ہم پرائیویٹ پارکنگ لاٹ کی طرف جارہے تھے اور اسے بھی غالباً ادھر ہی جانا تھا اس لئے اس کا اور اس کے گارڈز کا رخ ہماری ہی طرف ہوگیا تھا۔

میں گردن موڑ موڑ کر ترچھی نظر سے غیر محسوس انداز میں اس کی طرف دیکھے جارہا تھا۔ مجھے اس کے چہرے مہرے اور شخصیت میں شناسائی کی کچھ جھلک محسوس ہورہی تھی مگر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا 'افضل پیارے! حسن سے تو تمہارا طلب کا رشتہ پرانا ہے۔ شاید اس لئے تمہیں ہر حسین صورت شناسا سی لگتی ہے؟'

اس دوران وہ لوگ ذرا قریب آگئے۔ ان کے راستے میں ایک جگہ دائرے میں اونچے کھمبوں پر تیز نارنجی سی روشنی دینے والی لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ وہ ان کے نیچے سے گزرے تو تیز روشنی ان کے چہروں پر پڑی۔ ایک لمحے کے لئے بالکل یوں محسوس ہوا جیسے کچھ اداکار اپنا شاٹ دینے کے لئے تیز روشنی میں کیمرے کے سامنے آئے ہوں۔

گارڈز کے چہروں سے تو ظاہر ہے مجھے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں صرف لڑکی کی طرف متوجہ تھا اور اس ایک لمحے میں اس کا ہر نقش اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ نمایاں ہوگیا تھا۔ مجھے کچھ یوں لگا جیسے کسی نے بجلی کا ننگا تار میرے جسم سے مس کردیا تھا جس میں کئی ہزار وولٹ بجلی دوڑ رہی تھی۔

یہ احساس تو صرف ایک ثانیے کا تھا لیکن اس کے بعد بھی میرے اعصاب میں جھنجھناہٹ جاری رہی۔ میں گویا بالکل بھول گیا کہ میں کس کے ساتھ تھا، کہاں جارہا تھا اور میری آمد کا مقصد کیا تھا۔ ایک آندھی سی آئی تھی جو ساری سوچیں اڑا کرلے گئی تھی۔

وہ لڑکی اور اس کے دونوں گارڈز اب کچھ اور قریب آچکے تھے۔ وہ کنکریٹ کی دوسری روش پر ہمارے تقریباً متوازی چلنے لگے تھے۔ لڑکی اسی طرح ایک شانِ بے نیازی اور نخوت سے سر اٹھائے گارڈز کے درمیان چل رہی تھی۔ وہ تینوں بھی یقیناً پارکنگ لاٹ کی طرف جارہے تھے۔

میں نے جھرجھری سی لے کر اس جھٹکے سے سنبھلنے کی کوشش کی جو اس لڑکی کو پہچان کر مجھے لگا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ذہن میں سخت کشمکش شروع ہوگئی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہئے تھا۔ میں اس وقت عجیب ہی صورتِ حال میں پھنسا ہوا تھا۔ اگر میں اپنے غیر ملکی مہمانوں کو چھوڑ کر بھاگتا تو وہ میرے بارے میں... بلکہ پورے پاکستانی معاشرے کے بارے میں ہی نہ جانے کیا سوچتے۔

شاید ان باپ بیٹی نے محسوس بھی کرلیا تھا کہ میں اس لڑکی کی طرف متوجہ تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ سلویا نے تو اس میں اپنی توہین بھی محسوس کی ہو کہ میں اس جیسی نوخیز اور سفید فام لڑکی کی موجودگی میں کسی اور طرف متوجہ تھا لیکن اس کی وجہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی۔

شفیع شاہ نے میرے اضطراب کو محسوس کرلیا تھا لیکن وہ اس کی وجہ سمجھ سکتا تھا کیونکہ اس نے بھی لڑکی کو پہچان لیا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی ایک لمحے کے لئے زلزلے کے آثار ابھرے تھے تاہم بظاہر وہ بھی میری ہی طرح پُرسکون نظر آرہا تھا۔

مونا اور ایک دوسری لڑکی کی بے ہودہ فلم ہم دونوں نے اکٹھے بیٹھ کر ہی دیکھی تھی۔ یہ وہی دوسری لڑکی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے اسے پہچاننے میں غلطی نہیں کی تھی لیکن اس کی شان و شوکت، اس کا پُرنخوت انداز ہمیں الجھن میں مبتلا کرنے کے لئے کافی تھا۔ اس قسم کے کام کرنے والی لڑکی کی یہ شان و شوکت تو نہیں ہونی چاہئے تھی۔ اس نے اس فلم میں خواہ مجبوراً کام کیا تھا یا اپنی خوشی سے... دونوں ہی صورتوں میں اس کا یہ رکھ رکھاؤ ہمارے لئے حیران کن تھا۔ فلم دیکھ کر نہ جانے کیوں ہمارے ذہن میں یہ امکان نہیں ابھرا تھا کہ وہ اس طبقے کی لڑکی بھی ہوسکتی تھی جس طبقے کی اس وقت نظر آرہی تھی۔

وہ فلم میری نظر میں ایک چیپ قسم کی چیز تھی اور اسی اعتبار سے مجھے وہ لڑکی بھی چیپ دکھائی دی تھی مگر اس وقت تو اس کا روپ، اس کا انداز ہی بدلا ہوا تھا۔ بعض لوگوں کی اصل شخصیت مایوس کن ہوتی ہے لیکن فلم میں وہ پُرکشش دکھائی دیتے ہیں۔ اس لڑکی کا معاملہ الٹ تھا۔ فلم میں وہ اپنی تمام تر حشر خیز حرکتوں اور جلوہ نمائی کے باوجود ایسی متاثر کن دکھائی نہیں دی تھی جیسی اس وقت معززانہ لباس میں.... بیش قیمت زیورات میں.... اور اپنے پُرنخوت انداز کے ساتھ دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں گویا کسی طلسمی ہاتھ نے ایک نئی آب و تاب بھردی تھی۔ بے شک دولت کی بھی اپنی ایک آب و تاب ہوتی ہے لیکن شخصیت میں بھی کوئی بات ضرور ہونی چاہئے ورنہ بعض اوقات دولت بھی کچھ نہیں کرپاتی۔

ہم لوگ پارکنگ لاٹ میں جاپہنچے تھے جہاں بہت سی کاریں موجود تھیں۔ وہ لڑکی گارڈز کے ساتھ سرخ رنگ کی ایک شاندار، چم چم کرتی بیش قیمت مرسیڈیز کے پاس پہنچ کر رک چکی تھی۔ اس

گاڑی کے شیشے ہلکے رنگین تھے تاہم اتنا اندازہ ہو رہا تھا کہ گاڑی میں کوئی اور موجود نہیں تھا۔ ایک گارڈ چابی سے اگلا دروازہ کھولنے لگا تھا۔

ہم بھی اپنی گاڑیوں کے قریب پہنچ چکے تھے۔ میں گردن ذرا موڑ کر اس لڑکی کی طرف دیکھنے پر مجبور تھا۔ میرے خیال میں یہ فیصلے کا لمحہ تھا اگر میں گاڑی میں بیٹھ کر اپنے معزز مہمانوں کے ساتھ چل دیتا تو عین ممکن تھا کہ باقی تمام زندگی کے دوران کبھی مجھے اس کی جھلک بھی نظر نہ آتی۔ بہت بڑے اور بے ہنگم طریقے سے پھیلے ہوئے شہر کچھ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کبھی اچانک اور اتفاقاً ہی کوئی ایسی ہستی ٹکرا جاتی ہے جس کے بارے میں آپ نے سوچا بھی نہیں ہوتا کہ وہ سرِراہ مل جائے گی اور کبھی تلاشِ بسیار کے باوجود انسانوں کے اس جنگل یا جسموں کے اس سمندر میں آپ کا مطلوبہ انسان نہیں ملتا۔

یہ محض میری خوش قسمتی تھی کہ وہ زندہ سلامت' چلتا پھرتا سراغ اچانک ہی میرے سامنے آگیا تھا۔ ضروری نہیں تھا کہ دوبارہ بھی ایسا ہوتا۔ لڑکی کو بھی یقیناً احساس ہوگیا تھا کہ میں اس کی طرف متوجہ تھا لیکن شاید یہ اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ قدم قدم پر نہ جانے کتنے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوں گے۔ وہ چیز ہی ایسی تھی اور مردوں کی اس توجہ کے جواب میں وہ شانِ بے نیازی دکھانے میں بھی یقیناً ماہر تھی۔ بظاہر اس نے ایک طائرانہ نظر بھی ہماری سمت میں نہیں ڈالی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ بظاہر نہ دیکھنا..... لیکن پھر بھی آپ کو دیکھ لینا بعض عورتوں کی ادائے خاص ہوتی ہے۔

وہ گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ ایک گارڈ نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔ دوسرا اس کے برابر بیٹھ گیا تھا۔ لڑکی پچھلی سیٹ پر اکیلی تھی۔ گارڈ نے اس کے لئے دروازہ کھولا اور بند کیا تھا۔ گاڑی اب ریورس ہو رہی تھی۔ ہمارے اور اس کے درمیان چند گاڑیوں کا فاصلہ تھا۔

آخر میں نے کشمکش کے ان چند لمحوں کے بعد فیصلہ کر ہی لیا۔ میں نے شفیع شاہ سے کہا "تم سب لوگوں کو لے کر ہوٹل پہنچو۔ مجھے ایک بہت ضروری کام یاد آگیا ہے جسے کرنا میں بھول گیا تھا۔ میں اپنی گاڑی لے جا رہا ہوں۔ ضرورت پڑے تو یہاں سے کرائے کی گاڑی یا ٹیکسی لے لینا۔ میں کچھ دیر میں پہنچ جاؤں گا یا فون کروں گا۔"

مسٹر براؤن حیران پریشان نظر آنے لگے۔ شاید دل ہی دل میں انہوں نے پاکستانی طرزِ حیات کی بدنظمی پر افسوس بھی کیا ہوگا کہ جس میں ایک بڑا بزنس مین اپنے ضروری کام کرنا بھی بھول جاتا تھا۔ شاید اس کے پاس اپنے کام قرینے اور ترتیب سے انجام دینے کا کوئی نظام ہی نہیں تھا۔

میں نے ان سے بے پناہ معذرت کی۔ وہ مروت کے مارے

"کوئی بات نہیں..... کوئی بات نہیں۔" کی گردان کرنے لگے سلویا مسکراتے ہوئے لیکن ذرا چبھتے ہوئے سے لہجے میں بو افضل! میرا خیال ہے اس قسم کے کام آپ کو اسی طرح اچا آتے ہوں گے؟"

میں نے اس کے طنز کو نظرانداز کر دیا۔ میں اس وقت باتوں کو نظرانداز کرنے کے لئے تیار تھا۔ میں نے ملائمت "نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمیشہ اس طرح نہیں ہو پہلی بار ہوا ہے۔"

شفیع شاہ جو اصل بات سمجھ رہا تھا' گہری سنجیدگی "میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں۔"

"نہیں' اس کی ضرورت نہیں۔ تم مہمانوں کے ساتھ جا" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ مسٹر برا سلویا برا محسوس کر جائے۔ اگر بزنس کا اصل مالک نہیں تو کم نمبر ٹو آدمی تو ان کے ساتھ جا رہا تھا۔

اس وقت تک سرخ مرسیڈیز پارکنگ لاٹ کی حدود سے چکی تھی اور چھوٹی سڑک کی طرف مڑ رہی تھی۔ جلد ہی وہ نظر او جھل ہو سکتی تھی۔ میں کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ بع اوقات ایسے موقعوں پر قسمت مذاق بھی کر جاتی ہے۔

میں سب کے تاثرات کو نظرانداز کرتے ہوئے اپنی مرسیڈیز میں بیٹھا اور میں نے گاڑی بہت تیزی سے ریورس کر ہوئے گھمائی۔ اس کے باوجود جب میں چھوٹی سڑک پر پہنچا تو تک سرخ مرسیڈیز کم روشنی اور زیادہ گاڑیوں میں میری نظر او جھل ہو چکی تھی۔ تاہم مجھے اطمینان تھا کہ ابھی وہ مین روڈ نہیں پہنچی ہوگی۔ مجھے اس کو مین روڈ پر پہنچنے سے پہلے تلاش کرنا ورنہ مسئلہ پیدا ہو سکتا تھا کہ وہ دائیں طرف مڑی تھی یا بائیں طرف؟

مجھے اس پُرسکون سی سڑک پر کافی تیز رفتاری کا مظاہرہ کر جس پر یقیناً دوسری گاڑیوں والوں نے مجھے برا بھلا بھی کہا ہوگا جلد ہی مجھے سرخ مرسیڈیز نظر آگئی جو ہلکورے لیتی ہوئی مین رو مڑ چکی تھی۔

مرسیڈیز کی رفتار اچھی خاصی تیز ہو تب بھی تیز محسوس ہوتی۔ اس وقت مرسیڈیز ہی مرسیڈیز کا تعاقب کر رہی تھی دونوں کی رفتار خاصی تیز تھی۔ تاہم میں نے درمیان میں منا فاصلہ رکھا تھا۔ شارعِ فیصل پر پہنچنے کے بعد تعاقب آسان کیونکہ وہاں ٹریفک زیادہ تھا اور اندازہ کرنا مشکل تھا کہ کوئی گاڑ کسی دوسری گاڑی کا تعاقب کر رہی تھی۔ اس سڑک پر مرسیڈیز کی رفتار کچھ اور تیز ہوگئی۔ گورا قبرستان پہنچ کر وہ گاڑ کورنگی روڈ پر مڑی تو مجھے اندازہ ہوگیا کہ وہ ڈیفنس جائے گی۔

میرا اندازہ درست ہی نکلا۔ سن سیٹ بلیوارڈ سے پہلے گاڑی ڈیفنس کی طرف مڑ گئی۔ ڈیفنس کی گلیوں میں اس وقت د

تھی۔ نہیں کہیں روشنی بھی بہت کم تھی۔ بڑے بڑے مکانوں کے بیشتر حصے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ چاروں طرف سناٹے کا راج تھا۔ کہیں کوئی کتا بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا جو بھونک کر زندگی کا احساس دلاتا۔ ملگجے اندھیرے میں مکانوں اور درختوں وغیرہ کے ہیولے کچھ عجیب پراسرار سا منظر پیش کر رہے تھے۔

ان گلیوں میں سرخ مرسیڈیز والوں کو احساس ہو سکتا تھا کہ کوئی گاڑی مسلسل ان کے پیچھے آ رہی تھی اس لئے میں نے درمیانی فاصلہ بڑھا دیا۔ سرخ گاڑی کی رفتار بہت کم ہو چکی تھی۔ دفعتاً وہ ایک دیوہیکل پرندے کی طرح دھیرے دھیرے ہلکورے لیتی ایک بغلی گلی میں مڑ گئی جو دوسری گلیوں سے بھی کچھ زیادہ تاریک دکھائی دے رہی تھی۔

میری کسی نامعلوم حس نے مجھے اس گلی میں مڑنے سے باز رکھا اور یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ جب میں اس گلی کے سامنے سے گزرنے لگا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ آگے سے بند تھی۔ سرخ مرسیڈیز ایک بلند و بالا گیٹ کے سامنے رک چکی تھی اور اسے ڈرائیو کرنے والا گارڈ ہارن بجا رہا تھا۔ اگر میں ان کے پیچھے پیچھے گلی میں مڑ جاتا تو انہیں احساس ہو جاتا کہ کوئی ان کا تعاقب کر رہا تھا..... اور میں فی الحال انہیں یہ احساس دلانا نہیں چاہتا تھا۔

میں آگے نکلتا چلا گیا۔ نہایت سست رفتاری سے کچھ فاصلہ طے کر کے میں ایک چھوٹے سے راؤنڈ اباؤٹ تک پہنچا۔ اس دوراہے پر اِکا دُکا گاڑیاں آتی جاتی دکھائی دے رہی تھیں۔ میں راؤنڈ اباؤٹ کے گرد گھوم کر واپس روانہ ہوا اور اسی گلی میں جا پہنچا۔

گاڑی اب غائب ہو چکی تھی۔ گلی میں نیم تاریکی اور سناٹا تھا۔ اس مکان کی بیرونی دیوار اور گیٹ بہت اونچا تھا۔ اس کے باوجود اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک شاندار مکان تھا۔ اس پر کوئی نمبر کوئی نیم پلیٹ وغیرہ نہیں تھی۔ سیاہ گیٹ سرخ مرسیڈیز کو نگلنے کے بعد یوں ساکت کھڑا دکھائی دے رہا تھا جیسے کوئی جناتی مخلوق اپنے شکار کو ہڑپ کرنے کے بعد دوسرے کے انتظار میں گھات لگائے کھڑی ہو۔

میں گاڑی عین گیٹ کے سامنے روک کر اتر آیا۔ ایک ہی نظر میں میں نے گردوپیش کا جائزہ لے لیا۔ مکان کی دیوار سے پھولوں سے لدی بیلیں جھانک رہی تھیں۔ گیٹ کے پلر میں کال بیل کا بٹن اور انٹرکام وغیرہ موجود تھا۔ میں نے ایک لمحے سوچا اور انٹرکام کے پاس چمکتا ہوا کال بیل کا بٹن دبا دیا۔ مجھے جیب میں کسی ملاقاتی کا وزٹنگ کارڈ پڑا مل گیا تھا۔ وہ میں نے ہاتھ میں تھام لیا۔

کال بیل اندر کہیں دور نہیں' بلکہ گیٹ کے عقب میں ہی غالباً گیسٹ ہاؤس میں بجی تھی۔ کلک کی آواز کے ساتھ انٹرکام آن ہوا۔ اس کے اسپیکر پر سرخ بتی جلی اور کسی نے کھردرے لہجے اور بگڑی ہوئی اردو میں پوچھا۔ "کون ہے؟" یہ سوال بھی غالباً گیٹ ہاؤس سے ہی کیا گیا تھا۔

"برادر! ذرا یہ ایڈریس تو دیکھنا..... کیا اسی گھر کا ہے۔" میں نے انٹرکام کے قریب منہ لے جا کر نہایت ملائمت اور شائستگی سے کہا۔ مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ میری آواز اندر کہیں نہیں سنی جا رہی تھی۔ اس گھر کے مکینوں نے ملاقاتیوں سے سوال جواب کرنے کا دردِسر نہیں پالا تھا۔ ان کے بارے میں گیٹ پر ہی ساری "تفتیش" مکمل ہو جاتی ہوگی اور غیر ضروری طور پر آنے والوں کی چھانٹی یہیں ہو جاتی ہوگی۔ مکینوں کے سکون میں ذرا بھی خلل نہیں پڑتا ہوگا۔

گیٹ کی پیشانی پر نصب ایک بڑی سی لائٹ آن ہوگئی۔ میں اور میری گاڑی روشنی میں نہا گئی۔ پھر گیٹ میں ایک چوکور شگاف نمودار ہوا۔ صرف اتنا کہ اس میں ایک انسان کا چہرہ فٹ آ سکتا تھا۔ اس شگاف میں جو چہرہ نمودار ہوا وہ ان دونوں گارڈز میں سے ایک کا تھا جنہیں میں نے ائرپورٹ پر دیکھا تھا۔

مجھے یقین تھا کہ ان دونوں گارڈز نے مجھے ائرپورٹ پر نہیں دیکھا تھا کیونکہ وہ ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے مارچ کرنے کے سے انداز میں چل رہے تھے۔ میں نے کارڈ ذرا اونچا کرتے ہوئے کہا "یار! میں ذرا یہ ایڈریس تلاش کر رہا تھا..... بہت دیر سے خوار ہو رہا ہوں..... کوئی بتانے والا بھی نہیں ہے اور کوئی گیٹ بھی نہیں کھول رہا....."

مجھے معلوم تھا وہ باریک حروف میں انگریزی میں چھپا ہوا کارڈ اس شگاف میں سے جھانک کر نہیں پڑھ سکتا تھا۔ اوّل تو وہ مجھے انگریزی پڑھنے کا اہل ہی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ میرے دوستانہ لہجے سے اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی درشتی ذرا کم ہوئی۔ میں نے گاڑی کا دروازہ بھی کھلا چھوڑ دیا تھا تاکہ اندر سے جھانکنے والا کوئی بھی شخص یہ دیکھ سکے کہ میں تنہا ہی تھا۔ گاڑی میں کوئی اور نہیں تھا۔

گارڈ نے جب دوستانہ اور مہذبانہ لہجے میں بات کرنے والے ایک سوٹیڈ بوٹیڈ اور تنہا شخص کو دیکھا' پیچھے اس کی بیش قیمت گاڑی بھی کھڑی دیکھی تو اندیشے اس کے ذہن سے محو ہو گئے اور اس نے بغلی گیٹ کھول دیا۔ مجھے یہی امید تھی۔

اگر میری یہ کوشش ناکام ہو جاتی تو پھر میرا ارادہ تھا کہ گھوم کر بنگلے کے عقب میں جاؤں گا اور چوروں کی طرح دیوار پھاندنے کی کوشش کروں گا۔ اس میں خطرہ ذرا زیادہ تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان دیوار پر چڑھے تو اس پر سے گزرتی ہوئی خاردار تاروں میں کرنٹ دوڑ رہا ہو یا دیوار سے کودتے ہی انسان کی ٹانگ زمین پر ٹکنے کے بجائے سیدھی کسی خاموش طبع مگر آدم خور قسم کے کتے کے جبڑے میں چلی جائے۔ آج کل حفاظتی انتظامات کے سلسلے میں لوگوں کے درمیان گویا مقابلہ جاری تھا مگر وارداتیں تھیں کہ بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔

گارڈ نے باہر جھانکا۔ اس کا ایک ہاتھ کندھے پر لٹکی گن کے دستے پر تھا۔ میں کارڈ لئے اس کے قریب چلا گیا۔ دوسرے ہی لمحے

میرا ہاتھ اس کی گردن پر تھا اور میں نے اسے گیٹ سے باہر گھسیٹ لیا تھا۔ اس کی گردن میرے ہاتھ کے آہنی شکنجے میں تھی۔ وہ کوئی آواز نہ نکال سکا لیکن بہت بری طرح تڑپ کر اس نے بیک وقت کئی کام کرنے کی کوشش کی۔ اس نے گردن بھی چھڑانے کی کوشش کی، مجھے لات بھی رسید کرنا چاہی اور کندھے سے گن بھی اتارنا چاہی لیکن وہ ان میں سے کسی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکا۔

میں نے اپنے آپ کو بچاتے ہوئے، کارڈ جیب میں ڈال کر اس کی گردن چھوڑے بغیر اس کی پیشانی پر بایاں ہاتھ کلہاڑی کے پھل کی طرح رسید کیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈھیلا ڈھالا ہو کر میرے ہاتھ میں جھول گیا۔ اس کام میں بہ مشکل چند سیکنڈ لگے ہوں گے اور اس دوران اس کی ہلکی سی خرخراہٹ کے سوا کوئی آواز پیدا نہیں ہوئی۔

میں اسے دونوں ہاتھوں سے سنبھال کر اپنی ڈھال بنا کر بغلی گیٹ سے اندر داخل ہوگیا۔ ایک لمحے میں، میں نے چاروں طرف کا جائزہ لے لیا۔ گیٹ ہاؤس، لان اور ڈرائیو وے میں روشنی تھی لیکن کہیں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ گیٹ ہاؤس اچھے بھلے کمرے کے برابر تھا۔ اس کا دروازہ اور کھڑکی کھلی تھی۔

میں نے گارڈ کو جلدی سے کنکریٹ کی روش پر لٹا دیا اور گیٹ اپنے عقب میں بند کردیا۔ کلک کی آواز کے ساتھ وہ مقفل ہوگیا۔ گیٹ ہاؤس کے اندر سے آواز آئی "کون تھا زمان؟ چلا گیا کیا؟" آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ کوئی شخص کھاتے کھاتے بول رہا تھا۔

میں دبے قدموں گیٹ ہاؤس کے دروازے تک پہنچا اور دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔ میں روشنی میں تھا اور مجھے اندیشہ تھا کہ کسی طرف سے کوئی ٹہلتا ہوا نہ آنکلے۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اس گھر میں کتنے افراد رہتے تھے۔ میں نے جس گارڈ کو گیٹ کے قریب لٹایا تھا اس کی گن کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ وہ کلاشنکوف تھی اور اس وقت میں بھاری گن اٹھانے سے بچنا چاہتا تھا۔ جب مجھے نہایت خاموشی اور پھرتی سے کچھ کرنا ہوتا تھا تو میں ایک ہاتھ سے نہایت آسانی سے استعمال ہونے والی کسی ہلکی پھلکی گن کو ترجیح دیتا تھا۔ اس لئے اس وقت میں نے اپنا مشین پسٹل نکال لیا تھا۔

میں نے محتاط انداز میں کمرے میں جھانکا لیکن اس احتیاط کا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ کمرے میں دروازے کے سامنے میز کرسی اور اس پر ٹیلی فون، انٹرکام سیٹ وغیرہ تھے۔ اندر کی طرف لوہے کی ایک چارپائی اور تپائی پڑی تھی۔ لوہے کی چارپائی پر دوسرا گارڈ بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے تپائی پر بروسٹ اور کھانے پینے کی کچھ دوسری چیزیں بھی ہوئی تھیں۔ قریب ہی فرش پر کچھ خالی ڈبے اور کاغذ وغیرہ پڑے ہوئے تھے۔

یہ دوسرا گارڈ بھی وہی تھا جسے میں نے لڑکی کے ساتھ ائرپورٹ پر دیکھا تھا۔ شاید اہلِ خانہ کے ساتھ باہر آنے جانے کے علاوہ گھر پر بھی وہی ڈیوٹی دیتے تھے۔ گارڈ کھانا کھا رہا تھا۔ دوسرا گارڈ بھی غالباً کھانا کھاتے کھاتے ہی اٹھ کر باہر آیا تھا۔

ستم ظریفی یہ ہوئی کہ جس وقت میں نے اندر جھانکا، عین وقت گارڈ نے گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ یقیناً ساتھی کی واپسی کا منتظر تھا۔ وہ کھانا کھا رہا تھا مگر گن بدستور اس کندھے پر لٹکی ہوئی تھی۔ اس کا مطلب تھا وہ ڈیوٹی کے معاملے میں خاصے مستعد تھے، بے پروا نہیں تھے۔

گارڈ ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے گھٹنے ہلکی پھلکی میز سے ٹکرائے اور وہ الٹ گئی۔ اس کا ہاتھ فوراً گن کی طرف گیا۔ اسے گن دکھا کر خبردار کرنے یا کوئی حکم دینے کی گنجائش نہیں تھی اس لئے میں نے اسی لمحے اس پر چھلانگ لگادی۔ میں اسے گولی بھی نہیں مارنا چاہتا تھا ورنہ مجھے چھلانگ لگانے کی زحمت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ گن کندھے سے اتارنے سے پہلے ہی ڈھیر ہوسکا تھا۔

میں اسے لیتے ہوئے چارپائی پر گرا اور اس کے ساتھ ہی میرے مشین پسٹل کا دستہ اس کی کنپٹی پر پڑا۔ وہ ایک ہلکی سی کراہ کے ساتھ وہیں ساکت ہوگیا۔ میں اسے چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی ٹانگیں چارپائی سے نیچے جھول رہی تھیں ورنہ یہی معلوم ہوتا وہ آرام سے سویا ہوا تھا۔ اس کارروائی میں بھی ہلکی سی میز الٹنے کی آواز کے سوا کوئی خاص آواز پیدا نہیں ہوئی تھی۔

میں نے واپس پلٹ کر گیٹ ہاؤس کے دروازے سے باہر جھانکا۔ باہر کا منظر چند لمحے پہلے جیسا ہی تھا۔ میں دبے قدموں باہر آگیا۔ میں نے گیٹ کے پاس پڑے ہوئے گارڈ کو بھی اٹھا کر گیٹ ہاؤس کے اندر ہی لا کر چارپائی پر لٹا دیا۔ اس کی بیلٹ میں چابیوں کا ایک گچھا موجود تھا۔ وہ میں نے نکال لیا۔

وہاں موجود ٹیلی فون اور انٹرکام سیٹ وغیرہ پلگ والے تھے۔ میں نے ان کے پلگ نکال کر سیٹ کمرے سے باہر رکھ دیے اور کمرے کو باہر سے مقفل کردیا۔ اس تالے کی چابی گچھے میں موجود تھی۔ باقی چابیاں اگر اندر کے تالوں کی تھیں تو ان کی گارڈز کے پاس موجودگی باعث حیرت تھی۔ چابیاں پاس ہونے کا مطلب تھا کہ وہ ضرورت پڑنے پر کسی بھی وقت مکان کے کسی بھی حصے میں جاسکتے تھے بلکہ شاید وہ ضرورت پڑے بغیر بھی جاسکتے تھے۔ گویا وہ خاصے بااعتبار اور بااختیار قسم کے گارڈز معلوم ہوتے تھے۔

میں اندر تو پہنچ گیا تھا اور گارڈز پر قابو پانا بھی کوئی مشکل مسئلہ ثابت نہیں ہوا تھا۔ اب دیکھنا تھا کہ آگے کیا کچھ میرا منتظر تھا۔ میں کنکریٹ کی اس پختہ روش پر آگے بڑھا جو ڈرائیو وے کا کام دیتی تھی۔ اس پر وہی سرخ مرسیڈیز اور ایک چھوٹی سی سفید سوزوکی کھڑی تھی جو اس شاندار کار کے سامنے نہایت معمولی دکھائی دے رہی تھی۔

مکان کی اصل عمارت وسط میں تھی۔ لگتا یہی تھا کہ اس کے چاروں طرف لان تھا جس میں چلنے پھرنے کے لئے ماربل کی سلیبوں سے راستے بنے ہوئے تھے۔ اصل عمارت زیادہ لمبی چوڑی نہیں

تھی۔ اس کے اردگرد بہت زیادہ جگہ کھلی چھوڑی گئی تھی۔

اصل عمارت تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی جبکہ چاروں طرف دودھیا گلوبس اور فینسی لائٹس وغیرہ کی وجہ سے کافی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ان کے سوئچ کہاں تھے ورنہ میں انہیں آف کردیتا کیونکہ ان کی وجہ سے کافی حد تک روشنی میں ہی رہتے ہوئے اصل عمارت کی طرف بڑھنا پڑ رہا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ تاریک مکان کی کسی کھڑکی یا دروازے کے عقب سے کوئی آنکھ مجھے دیکھ رہی ہو۔ اس صورت میں اصل دروازے تک پہنچنے سے پہلے ہی کوئی گولی میرا استقبال کرسکتی تھی۔

میں چار دیواری کے قریب آیا۔ اس طرف روشنی کم تھی۔ چار دیواری کے اوپر خاردار تار بھی موجود تھے۔ اس کا مطلب تھا بنگلے میں پچھلی طرف سے داخل ہونا بھی میرے لئے کافی مشکل ہوتا۔ میرے پاس اب چابیاں تو موجود تھیں لیکن میں نے فیصلہ کیا کہ پہلے اصل عمارت کے چاروں طرف ایک چکر لگالوں۔

دائیں طرف لان نہیں، صرف بغلی گلی تھی۔ میں مشین پسٹل ہاتھ میں لئے نہایت محتاط انداز میں دیوار کے قریب رہتے ہوئے اس گلی سے گزر کر کونے تک پہنچا۔ کونے پر چھوٹا سا ایک الگ پورشن تھا۔ یہ یقیناً سرونٹ کوارٹر تھا مگر اس کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ ممکن تھا وہ گارڈ یہاں رہتے ہوں یا یہ کچھ اور ملازموں کی رہائش ہو مگر وہ اس وقت کہیں گئے ہوئے ہوں۔

سرونٹ کوارٹر کی اوٹ سے میں نے مزید آگے جھانکا تو عقبی لان نظر آیا۔ یہ لان سامنے والے لان سے زیادہ بڑا تھا اور اس کے وسط میں ایک مستطیل سوئمنگ پول تھا۔ سوئمنگ پول زیادہ بڑا تو نہیں تھا لیکن نہایت اعلیٰ سازوسامان سے مزین تھا اور بہت خوب صورت تھا۔ گو کہ وہاں روشنی زیادہ نہیں تھی مگر پھر بھی ہر چیز کی خوب صورتی اور معیار نمایاں تھا۔

دھیمی روشنی میں پول کا پانی جھلملا رہا تھا۔ مدھم ہوا کے جھونکے اس میں صرف معمولی سا ارتعاش پیدا کر رہے تھے۔ پول کے قریب بلندی پر لمبا سا ایک ڈائیونگ بورڈ بھی موجود تھا لیکن اس وقت جو لائٹس آن تھیں ان کا رخ چونکہ نیچے کی طرف تھا اس لئے بورڈ تقریباً اندھیرے میں تھا۔

میں پسٹل ہاتھ میں لئے آہستگی سے ماربل کی روش پر آگے بڑھا۔ میری نظریں لان پر لہراتے ہوئے ہر پودے اور عقبی دیوار کے ساتھ موجود ہر درخت کا جائزہ لے رہی تھیں جو دھیمی ہوا میں دھیرے دھیرے ہلتے ہیولوں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہو رہا تھا کہ وہاں کوئی موجود تھا جو شاید سانس روکے میری حرکات و سکنات کا جائزہ لے رہا تھا۔ میری آنکھیں اسے تلاش کرنے میں ناکام تھیں جبکہ میں روشنی میں تھا۔ یوں میں گویا بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا لیکن خطرے کے احساس کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے فرض کرلیا تھا کہ مجھے اندھیرے میں اگر کہیں کسی چیز کی اوٹ میں کوئی موجود بھی تھا تو اس کے پاس گن نہیں تھی ورنہ وہ اب تک اسے استعمال کرچکا ہوتا یا مجھے للکار چکا ہوتا۔

میں سوئمنگ پول کے کنارے جا پہنچا۔ ٹائلوں کے فرش پر کھڑے ہو کر میں نے احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر پول میں بھی جھانکا کہ کہیں کوئی سانس روک کر اس کی تہ میں تو نہیں بیٹھا ہوا تھا لیکن ایسا نہیں تھا۔ نیلی ٹائلوں والے فرش پر شفاف پانی میں کوئی نظر نہ آیا۔

اچانک میرے عقب سے بلندی سے آواز آئی "تمہیں شاید میری تلاش ہے۔" آواز نسوانی اور نہایت خمار آور سی تھی۔

میں کسی بھی قسم کی صورتِ حال میں اپنے اعصاب کو قابو میں رکھنے میں اکثر کامیاب رہتا تھا لیکن اس وقت اعصاب شاید کچھ زیادہ ہی کشیدہ تھے۔ اس آواز نے میرے اعصاب پر کچھ ایسا ہی اثر کیا جیسے وائلن کے تنے ہوئے تاروں پر اچانک کسی نے ہاتھ مار دیا ہو۔

میں اچھل کر مڑا اور سوئمنگ پول کے کنارے کی چکنی ٹائلوں سے پھسل کر پانی میں گرتے گرتے بچا۔ میرے اس انداز پر مترنم ہنسی ابھری۔ ہنسی کیا تھی گویا کسی نے چاندی کی طشتری میں موتی لڑھکا دیے تھے۔ ہنسی صرف مترنم ہی نہیں تھی، اس میں ایک خاص قسم کی جذبات خیزی بھی تھی۔

گردن گھماتے ہی میں نے اسے دیکھ لیا۔ وہ ڈائیونگ بورڈ کے سرے پر ایک ہیولے کی طرح کھڑی تھی۔ مجھے اس کی وجہ بھی فوراً ہی معلوم ہوگئی کہ میں چند لمحے پہلے اسے کیوں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس وقت وہ یقیناً ڈائیونگ بورڈ پر اوندھی لیٹی ہوئی۔۔۔ بلکہ شاید اس سے چپکی ہوئی تھی۔ اس لئے میں نیچے سے اسے نہیں دیکھ سکا تھا۔ شاید وہ جان بوجھ کر اس طرح لیٹی ہوئی تھی اور مجھے چوروں کی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتے دیکھ کر محظوظ ہو رہی تھی۔ کم از کم اس کی ہنسی تو یہی بتا رہی تھی۔

میرے پسٹل کا رخ غیر ارادی طور پر اس کی طرف ہوگیا تھا۔ وہ جلدی سے بولی "احمق! گولی نہ چلا دینا۔ میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہے۔"

اس نے دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ کم از کم اس کے ہاتھوں میں کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ وہ تیراکی کے لباس میں تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور پسٹل نیچے کرلیا۔

شیڈ والی لائٹس کا رخ نیچے کی طرف ہونے کی وجہ سے میں اسے صاف طور پر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا "تم نیچے آنا پسند کرو گی؟"

"کیوں نہیں۔" وہ بلا تامل بولی۔

میرا خیال تھا کہ وہ ڈائیونگ بورڈ کی سیڑھی کے راستے نیچے آئے گی مگر اس نے ہاتھ کچھ اور بلند کرکے ڈائیونگ بورڈ کو ہلکا سا

جھکولا دے کر کسی ڈولفن کی طرح سر کے بل غڑاپ سے پانی میں چھلانگ لگادی۔ کچھ پانی اچھل کر میرے سوٹ پر بھی گرا۔ سوٹ کافی حد تک گیلا ہوگیا۔

اس نے پانی سے سر ابھارا تو میں نے اسے گھورا۔ شاید وہ میرے تاثرات دیکھ کر ایک بار پھر ہنسی۔ اس کے بالوں کا جوڑا یقیناً بڑے اہتمام سے بندھا ہوا تھا کیونکہ وہ سر کے بل پانی میں چھلانگ لگانے کے باوجود اسی طرح قائم تھا جس طرح میں نے ائرپورٹ پر دیکھا تھا۔

وہ تقریباً پوری کی پوری سطح آب پر ابھر آئی اور کسی مچھلی کی سی مشاقی سے دھیرے دھیرے دائرے میں تیرنے لگی۔ میں نے گہری نظر سے اس کا سراپا جائزہ لیا اور ذرا اونچی آواز میں کہا "کون کہتا ہے تمہارے پاس ہتھیار نہیں ہے۔ تم تو سراپا اسلحہ خانہ ہو۔"

وہ غوطہ مار کر نیچے چلی گئی۔ چند سیکنڈ بعد دوبارہ ابھر کر اس نے گردن تیزی سے اِدھر اُدھر گھما کر پانی جھٹکا اور پہلے سے زیادہ بھرپور انداز میں ہنس کر بولی "تمہاری آنکھیں بڑی بدمعاش ہیں۔"

"ذرہ نوازی ہے تمہاری۔" میں نے گردن کو خم دیتے ہوئے کہا "ویسے یہ خادم صرف آنکھوں کی حد تک بدمعاش نہیں ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" وہ شوخ مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

روشنیاں سوئمنگ پول پر مرتکز تھیں۔ میں اب اسے کچھ زیادہ ہی اچھی طرح دیکھ سکتا تھا اور اس کے نتیجے میں اپنے جسم میں سنسنی محسوس کرسکتا تھا۔ تاہم میں اپنے گردوپیش سے اب بھی بے خبر نہیں تھا۔ مجھے احساس تھا کہ میرے عقب میں مکان کا پچھلا دروازہ تھا۔ مجھے اس کی بھی فکر تھی کہ کہیں کوئی اس طرف سے برآمد نہ ہوجائے۔

تاہم میں نے بظاہر اسی کی طرف متوجہ رہتے ہوئے پوچھا۔ "تمہیں میرے بارے میں یہ اہم بات کس طرح معلوم ہے؟"

"کون سی اہم بات؟" اس نے پانی میں دھیرے دھیرے میرے قریب سے گزرتے ہوئے آنکھیں پھیلائیں۔

"یہی... کہ تمہارا یہ خادم صرف آنکھوں کی حد تک بدمعاش نہیں ہے؟" میں نے کہا۔

"تمہارے خیال میں یہ اہم بات ہے؟" وہ شریر انداز میں مسکرائی۔

"یقیناً" میں نے سنجیدگی سے جواب دیا "بلکہ میرے خیال میں تو یہ میری زندگی کا اہم راز تھا۔ حیرت ہے تم سے ملاقات سے پہلے ہی میرا یہ راز تم تک کیسے پہنچ گیا۔"

وہ ایک بار پھر زندگی سے بھرپور انداز میں ہنسی "مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا گیا ہے۔"

"اوہ.... یہ تو بہت برا ہوا۔" میں نے مایوسی سے کہا "میں خود آکر بتاتا تو اچھا ہوتا۔ دوسرے لوگ نہ جانے کیا کیا جھوٹ سچ ملا کر بتادیتے ہیں۔ میں تمہیں اپنے بارے میں اچھی اچھی پیاری پیاری باتیں بتاتا۔ تم مجھ سے متاثر ہوجاتیں۔ مجھ پر مرمٹ ہوجاتیں اور پھر راوی عیش ہی عیش لکھتا۔"

"میں اب بھی تم پر مہربان ہوں۔" وہ الٹی تیرتے ہوئے بولی۔

"سچ مچ....؟" میں نے ہکّا ناخوشی سے پوچھا۔

اچانک وہ پانی سے نکل آئی اور کنارے پر عین میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ وہ ایک سروقد لڑکی تھی۔ وہ پانی سے نکلی تو مجھے کچھ یوں لگا جیسے میں اس کے وجود کی تپش محسوس کرسکتا تھا۔ شبنم میں نہایا ہوا شعلہ تھی۔ اس کے بالوں سے پانی کی لکیریں اس کے صحت مند سرخ وسفید جسم پر پھسل رہی تھیں۔ پانی کے قطرے شبنم کی طرح اس کی لمبی لمبی پلکوں پر بھی اٹکے ہوئے تھے۔ آنکھیں نہیں جھپک رہی تھی۔

اب وہ بالکل سنجیدہ نظر آرہی تھی۔ وہ بولی تو اس کی آواز سرگوشی سے زیادہ بلند نہیں تھی "تم میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو؟"

"ہرگز نہیں۔" میں نے جلدی سے کہا "مجھے تو صرف یہ خدشہ تھا کہ تم کہیں کسی اور کے دھوکے میں تو مجھ سے مخاطب نہیں۔ تمہیں میرا نام معلوم ہے؟"

"مسٹر افضل.....!" اس کے گلابی ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ابھری "تم ابھی نام میں ہی الجھے ہوئے ہو۔ مجھے تمہاری عادات اور پسند ناپسند تک کے بارے میں بتایا گیا ہے۔"

"کس نے بتایا ہے اور کیوں؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"مجھے تم کو بہت کچھ بتانا ہے۔ اور تمہیں مجھ سے بہت سوالات کرنے پڑیں گے۔ لیکن کیا یہ سب کچھ یہیں کھڑے کھڑے ہوگا؟" اس نے خنک ہوا میں جھرجھری سی لی اور گویا حرارت کی پناہ کی تلاش میں آگے بڑھ کر مجھ سے جڑ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ سانس سینے میں اٹکنے لگی۔ اس نے میرا خالی ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کا دوسرا ہاتھ میرے مشین پسٹل پر آن ٹکا۔

میں نے پسٹل کے دستے پر گرفت ڈھیلی کرلی۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کیا کرتی ہے۔ اس نے پسٹل میرے ہاتھ سے نکال کر نہایت آہستگی سے میرے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال دیا۔ اطمینان کی ایک خفیف سی لہر میرے اعصاب سے گزری لیکن میں اب بھی چوکس تھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا جو یکایک ہی نہایت خواب ناک سی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اس کی بانہوں کا حلقہ میرے گرد تنگ ہوچکا تھا اور ہونٹ دھیرے دھیرے تھرتھرا رہے تھے۔

"آؤ.... اندر چلتے ہیں۔" وہ اسی طرح مجھے مکان کے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی۔

"مجھے اندر لے جاکر کس کے ہاتھوں مروانا چاہتی ہو؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"ہٹ دھے! میں تمہیں مروانے کے لئے نہیں۔ تمہاری زندگی کا سامان کرنے کے لئے تمہیں اندر لے جارہی ہوں۔" وہ ذرا خفگی سے بولی لیکن آواز اب بھی بوجھل تھی۔

"اندر کون ہے؟" میں نے اب بھی اپنی جگہ سے ہلے بغیر پوچھا۔

"اندر کوئی ہوتا تو میں تمہارے اتنے قریب آنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔" وہ میرے کوٹ کے کالر پر دھیرے دھیرے رخسار رگڑتے ہوئے بدستور سرگوشی میں بولی "البتہ گارڈز کے بارے میں مجھے بتادو۔ تم نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ انہیں مار دیا ہے؟" اس نے کچھ یوں پوچھا تھا جیسے اسے گارڈز کے مرنے کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی بلکہ اس کے نزدیک شاید یہ کچھ بہتر ہی ہوتا کہ وہ مرجاتے۔

"نہیں۔ میں اشد مجبوری کے بغیر کسی کو نہیں مارتا۔ اگر بے ہوش کرنے سے ہی کام چل جائے اور بے ہوش کرنے کا موقع بھی مل جائے تو پھر اسی سے گزارہ کرتا ہوں۔ وہ دونوں گیٹ ہاؤس میں بند ہیں اور بے ہوش ہیں۔" میں نے بتایا۔

"جلدی ہوش میں تو نہیں آجائیں گے؟"

"ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے تو ہوش میں نہیں آتے۔"

"چلو اتنا بھی کافی ہے۔ ویسے اگر ساری رات ہوش میں نہ آتے تو اچھا ہوتا۔ ساری رات ہماری اپنی ہوتی۔ مجھے تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنی ہیں۔ ویسے بھی ایک عرصے بعد کسی ہینڈسم اور نفیس آدمی کی قربت نصیب ہوئی ہے۔ ایک عرصے سے میں بدصورتی اور غلاظت کے سوئمنگ پول میں ہاتھ پاؤں مار رہی ہوں۔"

وہ مجھے لئے آگے بڑھی اور عقبی دروازہ کھول کر اندر جا پہنچی۔ راستے میں اس نے ایک ہاتھ بڑھا کر کہیں کہیں لائٹ آن کی اور مجھے میری نامعلوم حس نے بتادیا کہ مکان واقعی خالی ہے۔ اندر کوئی اور نہیں تھا۔ در و دیوار ایک عجیب سے سکوت میں ڈوبے گویا تجسس سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔

مکان کافی بڑا، پُرتعیش اور شاندار تھا۔ اس کی ہر چیز اعلیٰ اور بیش قیمت تھی۔ وہ جس کمرے میں جاکر رکی وہ نہایت خوب صورت بیڈروم تھا۔ اس کی آرائش افسانوی قسم کی تھی۔ اس نے دروازہ بند کرکے مقفل کردیا اور گھوم کر خاموشی سے میری طرف دیکھنے لگی۔

"تم اس گھر میں تنہا رہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تنہا ہی سمجھو۔" وہ مبہم لہجے میں بولی "میرے علاوہ یہاں دو ملازمائیں ہوتی ہیں لیکن ان دنوں وہ دونوں اپنے گاؤں گئی ہوئی ہیں۔ ان کے علاوہ وہ دو گارڈ ہوتے ہیں جن سے نبٹ کر تم یہاں تک پہنچ سکے ہو۔"

میں اِدھر اُدھر کا جائزہ لے رہا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر مجھے اب بھی اندیشہ تھا کہ کہیں کوئی چھپا ہوا تو نہیں تھا۔ وہ ایک لمحے کے توقف سے بولی "تمہیں پسند آیا میرا قید خانہ؟"

"قید خانہ؟" میں نے دہرایا۔

"ہاں" وہ میرا ہاتھ پکڑ کر عظیم الشان ڈبل بیڈ کی طرف لے جاتے ہوئے بولی "میں سوچتی ہوں وہ پرانی کہانیاں جو پچاسوں سال تک بڑی بوڑھیاں ننھے بچوں کو بہلانے کے لئے سناتی رہی ہیں، انہوں نے یقیناً کسی سچ کی کوکھ سے جنم لیا ہوگا اور وہ ہر دور میں دہرائی جاتی رہی ہیں۔ اگر تم اپنے گردوپیش پر نظر ڈالو اور بعض دور دراز گوشوں تک تمہاری رسائی ہوسکے تو تم دیکھو گے کہ چڑیا چڑے کی کہانی..... دیو اور شہزادی کی کہانی... اور دوسری بے شمار کہانیاں کہیں نہ کہیں دہرائی جارہی ہوں گی۔"

"تم کس کہانی کا کردار ہو؟" میں نے پوچھا۔

"تم کوٹ اور ٹائی اتار کر اطمینان سے میرے پاس بیٹھ جاؤ۔" وہ خود میرا کوٹ اتارتے ہوئے بولی "میں تمہیں بتاتی ہوں۔ میں اپنے آپ کو شہزادی تو نہیں کہہ سکتی۔ میں تو بہت معمولی اور بہت واہیات سی لڑکی ہوں۔ اپنی زندگی کو مزید واہیات تر بنانے میں کچھ میرا اپنا بھی ہاتھ ہے لیکن بہرحال میں اس شہزادی کی طرح ہوں جسے ایک دیو نے کسی محل میں قید کر رکھا تھا جہاں وہ سوتی رہتی تھی جب دیو آتا تھا اسے جگا لیتا تھا۔ میں بھی ایک دیو کی قیدی ہوں۔ وہ دونوں مسلح گارڈز میری نگرانی پر مامور ہیں۔ انہیں ساتھ لئے بغیر میں کہیں نہیں جاسکتی۔ انہیں مطلع کئے بغیر کوئی کام نہیں کرسکتی۔"

"تم مجھے اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کا موقع دے رہی ہو کہ میں وہ شہزادہ ہوں جو آکر اس شہزادی کو قید سے نجات دلاتا ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"نہیں۔ تمہیں اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ اطمینان سے بولی "میں نے کب کہا کہ میں اس قید سے آزاد ہونا چاہتی ہوں؟ یہ قید میں نے خود اپنے لئے منتخب کی ہے۔ گو کہ اب یہ مجھے بہت گراں گزرتی ہے لیکن پھر بھی مجھے اس سے فرار ہونے کے لئے کسی شہزادے کی مدد نہیں چاہئے۔ میں ابھی کچھ اور عرصہ اس قید میں گزارنا چاہتی ہوں۔ پھر مجھے کسی شہزادے کی مدد کے بغیر خود بہ خود ہی اس قید سے رہائی مل جائے گی۔ میں نہایت صبر و سکون اور تحمل سے اس وقت کا انتظار کررہی ہوں۔"

"کیا نام ہے اس دیو کا۔ جس نے تمہیں قید کر رکھا ہے؟" میں نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا لیکن میری دھڑکن تجسس کے باعث ذرا تیز ہوگئی تھی۔

وہ میرا چہرہ دونوں ہاتھوں کے حلقے میں لیتے ہوئے مخمور سے انداز میں مسکراتے ہوئے بولی "ایک ہی سانس میں سب کچھ پوچھ لوگے کیا؟ پہلے یہ بتاؤ تم کیا پینا پسند کروگے؟ مجھے اچانک احساس ہوا ہے کہ آدابِ میزبانی بھی کوئی چیز ہیں۔" وہ بڑی صفائی سے میرے سوال کا جواب گول کرگئی۔

پھر مجھے چپ دیکھ کر وہ بولی "خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تمہیں سب کچھ بتادوں گی۔ لیکن ذرا صبر و سکون سے۔ مرحلہ وار۔ اپنے موڈ کے مطابق بتاؤں گی اتنے بے تاب مت ہو۔ بے تابی کسی بھی کام میں اچھی نہیں ہوتی۔ مجھے بھی یہ سن کر اطمینان ہو گیا ہے کہ گارڈز ڈیڑھ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئیں گے۔ اگر وہ ہوش میں آکر اس کمرے میں کچھ شور شرابا کرنے لگیں تو تم جا کر ان کی کھوپڑیوں پر ایک ایک ڈنڈا رسید کر کے انہیں مزید کچھ دیر کے لئے بے ہوش کر آنا۔ تمہارے لئے یقیناً یہ کام مشکل نہیں ہو گا۔"

میں نے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ وہ اس تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے بولی "ہاں یوں ٹھیک ہے۔ بالکل ریلیکس ہو کر بیٹھو اور اب بتاؤ تم کیا پیو گے؟ برین... شیری یا شمپئن؟ میرے پاس اس وقت صرف یہ تین ڈرنکس ہیں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"میرے مطلب کی ان میں کوئی ڈرنک نہیں۔" میں نے سر ہلایا۔

"تم غالباً وھسکی پینا پسند کرو گے؟ وہ بھی مل جائے گی۔ اس کے لئے مجھے کچن تک جانا پڑے گا۔" وہ بولی۔

"نہیں۔ اس کے لئے تمہیں فریج تک جانا پڑے گا۔" میں نے بیڈ روم فریج کی طرف اشارہ کیا "میری محبوب ترین ڈرنک کا نام سادہ اور ٹھنڈا پانی ہے میں صرف اسی کو پی کر ریلیکس ہوتا ہوں۔"

"واقعی؟ تم سچ بول رہے ہو یا محض احتیاطاً نہیں پی رہے؟" اس نے حیرت اور بے یقینی سے میری طرف دیکھا۔

"میں سچ بول رہا ہوں۔"

"اگر محض احتیاط کر رہے ہو تو اس کی ضرورت نہیں۔" اس نے گویا مجھے سمجھانا بہتر سمجھا "میں نے پہلی ہی ملاقات میں تمہیں اپنا دوست... اپنی خلوت کا ساتھی بنا لیا ہے۔ اب کسی احتیاط کی ضرورت نہیں۔ تمہیں ہر احتیاط کو بھول جانا چاہئے۔"

"احتیاطوں کو تو میں اس وقت ہی بھول گیا تھا جب میں نے تمہیں سوئمنگ پول میں تیرتے دیکھا تھا۔ میں پانی احتیاطاً نہیں مانگ رہا۔ مجھے تو پانی کا نشہ ہے۔ اس وقت میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے۔" میں خود ہی اٹھ کر فریج تک جا پہنچا اور بوتل نکال کر پانی گلاس میں انڈیل کر اس طرح چسکیاں لینے لگا جیسے وہ پانی نہیں، کچھ اور تھا۔

وہ ایک دیوار گیر الماری کی طرف بڑھتے ہوئے بولی "مجھے تمہارے بارے میں بتایا تو گیا تھا کہ تم پیتے نہیں ہو لیکن مجھے یقین نہیں آیا تھا۔"

"تمہیں واقعی یقین نہیں کرنا چاہئے تھا۔ میں تو پیتا ہوں۔ خود ہی دیکھ لو۔ اس وقت بھی پی رہا ہوں۔" میں نے پانی کا گلاس ہاتھ میں بلند کرتے ہوئے اسے دکھایا۔

وہ عجیب سے انداز میں مسکرائی اور گھوم کر الماری کا سلائیڈنگ دروازہ کھولنے لگی۔ دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا وہ ایک چھوٹی سی دیوار گیر بار تھی۔ اپنے لئے ڈرنک تیار کر کے وہ واپس بیڈ پر آبیٹھی۔ میں پہلے ہی بیٹھ چکا تھا۔ وہ سوئمنگ کے گیلے لباس کی جگہ اب شب خوابی کے لبادے میں تھی جو سوئمنگ کے لباس سے زیادہ حشر خیز تھا۔

پینے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں میں خمار تھا۔ چند چسکیاں لے کر گویا یہ خمار اور بڑھ گیا۔ وہ اپنی خوب صورت آنکھوں میں گلابی ڈورے لئے میری طرف ایک ٹک دیکھتے ہوئے دھیمی آواز میں بولی "تم مجھے کس حد تک جانتے ہو؟"

"خطرناک حد تک۔" میں نے جواب دیا "لیکن ویسے مجھے تمہارا نام بھی معلوم نہیں۔"

"یہ کیا بات ہوئی؟" اس کی ہموار پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ عجیب بات یہ تھی کہ میں نے اس کی جو ہوش ربا فلم دیکھی تھی اس میں وہ کوئی اونچے درجے کی لڑکی ہرگز دکھائی نہیں دی تھی۔ فلم میں جو کچھ وہ کر رہی تھی، اس کی شخصیت بھی اس سے میل کھا رہی تھی یعنی اس کی ہر حرکت سے سستا پن اور طوائفیت عیاں تھی لیکن اب جبکہ میں اسے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا تو وہ ایک قطعی مختلف چیز تھی۔ فطری مدوجزر کی بات اور تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ فلم میں مجھے صحیح معنوں میں اس کی ذات میں کوئی خاص کشش محسوس نہیں ہوئی تھی لیکن اسے سامنے اور قریب دیکھ کر احساس ہوا تھا کہ وہ تو سراپا کشش تھی۔ وہ ایک بالکل بدلی ہوئی شخصیت تھی۔ اس کی شخصیت، اس کی حرکات و سکنات میں ایک خاص قسم کا اعلیٰ پن نمایاں تھا۔ میں نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس فلم اور اس کی موجودہ شخصیت کے درمیان کتنا فاصلہ حائل تھا جس میں یہ انقلاب رونما ہوا تھا۔ ورنہ بعض لوگوں کے ساتھ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ معمولی اور بے کشش شخصیت کے مالک ہوتے ہیں مگر فلم وغیرہ میں نکھر کر سامنے آتے ہیں۔ ان میں وہ خوب صورتی اور اعلیٰ پن نظر آنے لگتا ہے جو درحقیقت ان میں موجود نہیں ہوتا۔

میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے اسی فرق کے تجزیے میں کھویا ہوا تھا جب اس نے سرگوشی میں اپنا سوال دہرایا "تم نے بتایا نہیں۔ یہ کیا بات ہوئی کہ تم مجھے خطرناک حد تک جانتے ہو اور تمہیں میرا نام بھی معلوم نہیں؟"

میں نے اسے اصل بات بتا کر اس کا ردعمل دیکھنے کا فیصلہ کیا۔

"بات یہ ہے۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا "مجھ حقیر اور نکمے انسان کو تمہاری ایک عظیم الشان فلم دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے جس میں تم زمانۂ غار کے... بلکہ اس سے بھی بہت پہلے کے لباس میں تھیں اور میدان کارزار میں بڑی عمدہ جنگی صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ اس لحاظ سے گویا میں نے تمہیں بہت قریب سے جان لیا لیکن تمہارا نام مجھے واقعی معلوم نہیں۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ ایک طویل لمحے

تک وہ ایک ٹک میری طرف دیکھتی رہی پھر گلاس سے چسکی لینے کے بجائے ایک بڑا سا گھونٹ بھر کر گہری سانس لے کر بولی "بہت خوب! تو تم نے وہ فلم دیکھی ہوئی ہے..... جبکہ تم سنیما کلب کے ممبر بھی نہیں ہو۔"

"ہاں' مجھے یہ اعزاز حاصل نہیں ہے۔" میں نے تسلیم کیا۔

اس کی صورت میں صرف ایک لمحے کے لئے کوئی تغیر سا آکر گزر گیا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ پہلے کی طرح ہشاش بشاش' شگفتہ اور قدرے مخمور دکھائی دینے لگی تھی۔ مجھے یہ جان کر تھوڑی سی حیرت ہوئی تھی کہ اسے یہ بھی معلوم تھا' میں سنیما کلب کا ممبر نہیں ہوں۔

"تمہیں میرے بارے میں اور کیا کیا بتایا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اتنا زیادہ نہیں کہ تم پریشان ہونے لگو۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی "بہت کچھ شاید مجھے خود بھی معلوم کرنا پڑے گا۔" یہ کہہ کر اس نے گلاس سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور بانہیں میرے گلے میں حمائل کردیں۔

گفتگو میں ایک طویل وقفہ آگیا۔

آخر کار ہم دونوں دوبارہ' حیوان سے انسان کی جون میں آئے تو اس نے اٹھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر بال سمیٹے اور اپنے لئے ایک اور ڈرنک تیار کی۔ چند لمحے وہ خاموشی سے چسکیاں لیتی رہی پھر خود ہی بولی "مجھے تمہارے بارے میں تھوڑا بہت بتایا گیا تھا اور تمہاری تصویر بھی دکھائی گئی تھی۔"

"کیوں؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

"چھوٹی سی ایک مہم میرے ذمے لگائی گئی تھی۔ مجھے تمہارے قریب ہونا تھا۔ تمہیں گھیر گھار کر ایک خاص جگہ پر لے جانا تھا۔ پھر یہی کچھ ہونا تھا جو اب ہوا ہے۔ فرق صرف یہ ہوتا کہ خفیہ کیمروں سے اس کی فلم تیار ہو جاتی اور تمہیں پتا بھی نہ چلتا۔" وہ ناک کی سیدھ میں دیکھتے ہوئے ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

میں اچھل کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے قدرے تعجب سے میری طرف دیکھا۔ میں نے بیڈ سے اترتے ہوئے کہا "اس وقت شاید اسی منصوبے پر عمل درآمد ہو رہا تھا۔"

میں نے تیزی سے چھت اور در و دیوار کا جائزہ لیا۔ چھت میں فانوس آویزاں تھے اور فینسی لائٹس نصب تھیں۔ دیواروں اور سائیڈ ٹیبلز پر بھی کئی ایسی چیزیں موجود تھیں جن میں خفیہ کیمروں کے لینز فٹ ہو سکتے تھے۔ میں بوکھلائے ہوئے انداز میں ایک ایک چیز کو چیک کرنے لگا۔ میرے لئے یہ تصور ہی بڑا تکلیف دہ تھا کہ کہیں کچھ لوگ بیٹھ کر میری اس قسم کی فلم دیکھیں۔

وہ مخمور ہنسی کے ساتھ بولی "بدحواس بندر کی طرح اِدھر اُدھر بھاگنا بند کرو اور واپس یہاں میرے پاس آکر اطمینان سے بیٹھ جاؤ۔ یہاں کسی چیز میں کوئی خفیہ کیمرا پوشیدہ نہیں ہے' اس وقت تمہارے بارے میں کوئی بلیک میلنگ اسٹف تیار نہیں ہو رہا ہے۔ یہ کام جب ہونا تھا تب بھی یہاں نہیں ہونا تھا۔ کہیں اور ہونا تھا۔ ابھی تو اس کی تیاریاں ہی نہیں ہو سکی ہیں۔ ابھی تو مجھے تم سے دوستی بڑھانا تھی۔ پھر نہ جانے کتنے دن بعد یہ نوبت آنا تھی۔"

میں نے رک کر پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ دہکتے ہونٹوں کے گوشوں سے ہنسی پھوٹ رہی تھی۔ مخمور آنکھوں میں ستارے سے جھلملا رہے تھے۔ وہ گویا میری حالت سے محظوظ ہو رہی تھی۔

ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "یہ تو محض اتفاق ہے کہ مجھے اس مہم پر نہیں نکلنا پڑا۔ اس سے پہلے ہی تم مجھے نظر آگئے۔ اور بجائے اس کے کہ میں تمہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوئی تدبیر کرتی' تم خود ہی میرے پیچھے پیچھے چلے آئے۔"

میں آہستگی سے چلتا ہوا واپس اس کے قریب آبیٹھا۔ وہ میرے کندھے پر ٹھوڑی ٹکاتے ہوئے بولی "میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گئی کہ جب مجھے تمہاری تصویر دکھائی گئی تو تم مجھے تصویر میں ہی اچھے لگے۔ پھر ائرپورٹ پر تمہیں اصل میں دیکھا تو تصویر سے بھی بہتر لگے۔ میں نے اس وقت ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ مہم گئی جہنم میں..... میری تم سے نجی دوستی ضرور ہوگی۔"

اس نے ایک گہری سانس لی پھر ہلکا سا گھونٹ بھر کر بولی۔ "چنانچہ یہ میری تم سے خالصتاً ایک نجی ملاقات ہے۔ میری محبت اور پسندیدگی کے اظہار کا ایک انداز ہے۔ یہاں کسی قسم کی بلیک میلنگ کی تیاریاں نہیں ہو رہیں۔ یہ اچانک اور غیر متوقع ملاقات صرف اس لئے ممکن ہو گئی کہ تم نے گھر میں گھس کر... گارڈز کو قابو میں کرلیا ورنہ شاید ابھی یہ سب کچھ نہ ہو سکتا۔" اس نے ایک بار پھر گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔

"بہت تیز رفتار محبت ہے تمہاری۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ایک ہی زقند میں الف سے ے تک جا پہنچی۔"

"جن راستوں سے میں گزر چکی ہوں اور جہاں پہنچ چکی ہوں' وہاں یہ تو نہیں ہو سکتا تھا کہ پہلے میں تمہیں خوشبو میں بسا ایک خط گلابی لفافے میں ڈال کر کتاب میں رکھ کر دیتی جس میں پندرہ صفحے بھرنے کے بعد گھما پھرا کر بتایا گیا ہوتا کہ تم میرے خوابوں کے شہزادے ہو۔ اور یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ میں سال ڈیڑھ سال نظریں جھکائے تمہارے سامنے سے گزرتی رہتی اور تمہاری طرف سے اس قسم کے کسی خط کا انتظار کرتی رہتی۔ جو یقیناً تم نے کبھی نہیں لکھنا تھا۔"

"ٹھیک کہا تم نے۔" میں نے اپنے لئے گلاس میں پانی انڈیلتے ہوئے کہا "لیکن یہ تو بتاؤ کہ میرے خلاف بلیک میلنگ اسٹف کی ضرورت کسے اور کیوں آن پڑی تھی؟"

"شبہ پایا جاتا ہے کہ تمہارے پاس دو خاص فلموں کی کیسٹس موجود ہیں۔ ایک تو اس بات کو یقینی بنایا جانا تھا کہ تم انہیں کہیں

کسی بھی سلسلے میں استعمال نہ کرنے پاؤ۔ ان کے جواب میں تمہاری بھی کیسٹ تیار ہو جس کی بنیاد پر سودے بازی کی جاسکے۔ آخر مرد کی بھی اپنی ایک عزت ہوتی ہے۔ خصوصاً تم جیسے سرکردہ اور ممتاز شہری کی۔" وہ شریر انداز میں مسکرائی۔

"ہاں' اس میں تو کوئی شک نہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "میں ہرگز پسند نہیں کروں گا کہ میری کہیں اس قسم کی کوئی کیسٹ یا تصویر پائی جائے۔ اس کے لئے قتل و غارت ہو سکتا ہے۔"

"تو پھر اس قسم کی حرکتیں مت کیا کرو نا۔" وہ شرارت سے مسکرائی۔

"میں کہاں کرتا ہوں۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تم جیسی معزز اور ہنرمند خواتین مجھے مجبور کردیتی ہیں۔ آخر میں انسان ہوں فرشتہ نہیں۔"

"اچھا ہی ہے تم انسان ہو۔ فرشتہ ہونا بڑی اَن نیچرل سی بات ہوتی اور مجھے اس پر بڑی مایوسی ہوتی۔" اس نے گلاس ہونٹوں سے لگالیا۔

"وہ دو فلمیں کون سی ہیں جن کے بارے میں شبہ پایا جا رہا ہے کہ وہ میرے پاس ہیں؟"

"ان میں سے ایک تو میری ہی ہے جس کے بارے میں تم اعتراف کرچکے ہو کہ وہ تم دیکھ چکے ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ تمہارے ہی پاس ہوگی کیونکہ وہ سنیما کلب میں نہیں چلی ہے اور اس کا صرف ایک ہی وڈیو پرنٹ بنا تھا جو کسی کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔"

"ضروری تو نہیں ہے کہ وہ فلم میرے ہی پاس موجود ہو۔ ممکن ہے میں نے کسی اور کے پاس دیکھی ہو۔" میں نے کہا۔

"تمہیں مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں بھی تم سے کوئی جھوٹ نہیں بول رہی ہوں۔" وہ قدرے بیزاری سے بولی "مجھے اس فلم سے یا اسے واپس حاصل کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ وہ خواہ سنیما ہالوں میں چلنے لگے۔ میری بلا سے۔ میری صحت پر اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ میں ویسے بھی کچھ عرصے تک اس ملک سے نکل جاؤں گی۔"

"بہت خوب۔ بڑی بے خوف لڑکی ہو۔"

"حالات نے بنا دیا ہے۔"

"دوسری فلم کون سی ہے؟" میں نے پوچھا۔

وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تم معصوم بن بن کر سوال کرتے رہو۔ میں تمہارے ہر سوال کا جواب دیتی رہوں گی۔ تم کسی سوال کا جواب مت دینا اور کوئی بات مت بتانا۔"

"پہلے تمہاری زبان سے تو کچھ گتھیاں سلجھ جائیں۔ پھر میں بھی وہ سب کچھ بتا دوں گا جو مجھے معلوم ہوگا۔ ویسے..... میرا خیال ہے مجھے کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔" میں نے پُرخیال لہجے میں کہا "مجھے تو درحقیقت سبھی کچھ تم سے معلوم کرنا ہے۔ تم دوسری فلم کے بارے میں کچھ بتانے لگی تھیں۔"

"دوسری فلم بھی اسی قسم کی خرافات پر مبنی تھی۔ وہ ایک اور لڑکی کی تھی۔ اس کا نام مونا تھا۔ وہ فلم بھی غالباً تمہارے ہی پاس ہے؟" اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"نام پر یاد آیا۔ تم نے ابھی تک اپنا نام مجھے نہیں بتایا۔" میں نے ایک بار پھر اس کے سوال سے پہلو بچاتے ہوئے کہا۔

وہ استہزائیہ سے انداز میں مسکرائی پھر کندھے اچکا کر بولی۔ "میرا نام فرح ہے۔" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا "اب یہ مت کہنا کہ یہ بڑا خوب صورت نام ہے۔ اس طرح کا کوئی جھوٹ مجھے اچھا نہیں لگے گا۔"

"میرا اس قسم کا جھوٹ بولنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" میں نے گویا اسے تسلی دی "یہ ایک عام سا نام ہے۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ یہ ایک نہایت خاص لڑکی کا نہایت عام سا نام ہے۔"

"تھینک یو۔" وہ میرے بازو پر سر ٹکاتے ہوئے بولی۔

"فرح!" میں نے نہایت دھیمے لہجے میں کہا "اب ہم اس اہم سوال کی طرف آتے ہیں جو اب تک چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر کبھی اِدھر کو لڑھک رہا ہے اور کبھی اُدھر کو۔ سوال یہ ہے کہ ان دونوں فلموں کی ضرورت کسے آن پڑی ہے؟"

"پیر دانش کو۔" اس کی سرگوشی اتنی مدھم تھی کہ اگر ہم جڑے نہ بیٹھے ہوتے تو شاید میں نہ سن سکتا۔

ایک لمحے کے لیے میں بالکل خاموش رہا۔ میں حیرت کا اظہار بھی نہ کرسکا۔ میرے جسم میں ایک عجیب سی سنسنی دوڑ رہی تھی۔ میں اس کے تھمنے کا منتظر تھا۔ شاید میرے لاشعور کے کسی گوشے میں یہ توقع موجود تھی کہ مجھے پیر دانش کا نام سننے کو ملے گا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا تھا۔ میں اسے برداشت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے اپنا چہرہ سپاٹ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی تھی لیکن وہ بغور میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے بولی "تمہیں حیرت ہوئی ہے نا؟"

"ہاں" میں نے یہ اعتراف کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا "ایسی عظیم سماجی شخصیت..... اور اسے کن چیزوں کی ضرورت آن پڑی ہے!"

"عظیم سماجی شخصیت.....!" وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی "تم اس کے بارے میں اور کیا جانتے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں۔" میں نے جواب دیا "جاننے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ تم مجھے اس کے بارے میں بہت کچھ بتا سکتی ہو۔ سب سے پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا اس سے کیا رشتہ ہے؟"

"میں اس کی داشتہ ہوں۔" اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

"اوہ.....!" میں نے بے اختیار سیٹی بجائی "بڑا ہی سنسنی خیز

رشتہ ہے۔" پھر میں نے گویا از سرِ نو گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ "ویسے میں یہ ضرور کہوں گا کہ پیر دانش بڑا دل والا اور باذوق آدمی ہے۔ داشتہ کو کس ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت سے رکھا ہوا ہے۔"

"تمہیں شاید اس کی دولت کا اندازہ نہیں ہے اس لئے تمہیں اس کی داشتہ کے رہن سہن پر حیرت ہورہی ہے۔ ویسے خیر.... تمہیں تو کیا... شاید اسے خود بھی اپنی دولت کا اندازہ نہیں ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ دولت کو کہاں خرچ کرے۔ اور دولت ہے کہ بڑھتی ہی جارہی ہے۔"

ایک لمحے کے لئے خاموش ہونے کے بعد وہ بولی "ویسے میرے علاوہ بھی اس کی دو داشتائیں ہیں۔ یا پھر یوں کہنا چاہئے کہ کم از کم دو ایسی ہیں جن کا مجھے علم ہے۔ وہ بھی اسی ٹھاٹ باٹ اور شان و شوکت سے رہتی ہیں لیکن مسلح محافظوں کا پہرا ان پر بھی ہے۔ گارڈز کے بغیر وہ بھی کہیں قدم نہیں نکال سکتیں۔ ان میں سے ایک کی عمر تو بہ مشکل اٹھارہ سال ہے۔ اس کے علاوہ ہفتے دو ہفتے... مہینے دو مہینے کے لئے جو عورتیں پیر دانش کی زندگی میں آتی رہتی ہیں وہ الگ ہیں۔"

"اور اس کی تین بیویاں بھی ہیں۔" میں نے گویا یاد دلایا۔

"ہاں۔ تین بیویاں بھی ہیں۔" اس نے سرہلا کر تائید کی۔

"خبیث کہیں کا! بڑی ہی قبضہ پسند سی طبیعت پائی ہے اس نے۔" میں نے گویا جل کر کہا "ہم جیسے قناعت پسندوں کا استحصال کررہا ہے۔ پرانے بادشاہوں کی طرح پورا حرم آباد کررکھا ہے۔ وہ جو ایک انگریزی فلم آئی تھی جس کے نام کا اردو میں ترجمہ کیا گیا تھا "ہوس کا پجاری" وہ کہیں اسی کے بارے میں تو نہیں تھی؟"

وہ ٹانگیں بستر پر پھیلاتے ہوئے کراہنے کے سے انداز میں ہنسی اور بولی "اس وقت سنجیدگی سے بات ہورہی ہے۔ خواہ مخواہ بیچ میں ٹکڑے مت لگاؤ۔ ویسے تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ کبھی کبھی وہ اپنی داشتاؤں کے پاس مہینہ مہینہ نہیں آتا۔ بیویوں بے چاریوں کا تو نہ جانے کیا حال ہوگا کیونکہ بیویاں تو پھر بیویاں ہی ہوتی ہیں! زیادہ ہوس اسے صرف اس بات کی ہے کہ جو لڑکی اسے بہت زیادہ بھا جائے وہ بس ہر وقت اس کی رسائی میں رہے۔ وہ جب چاہے اس کے پاس جاسکے۔ اس مقصد کے لئے وہ بہت دولت خرچ کرتا ہے۔"

"اس نے تمہیں میرے بارے میں بلیک میلنگ اسٹف تیار کرنے کی مہم پر لگایا تھا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

وہ اثبات میں سرہلاتے ہوئے بولی "ابھی اس کی تیاریاں نہیں ہوئی تھیں۔ ابھی صرف بات چیت ہوئی تھی۔ مجھے تمہارے بارے میں بتایا گیا تھا کہ تم مستقبل قریب میں پیر دانش کی ذات اور اس کے کچھ کاروباروں کے لئے خطرہ بن سکتے تھے۔ اطلاعات بتاتی تھیں کہ تم میں اس سے ٹکرانے کی طاقت بھی موجود تھی۔ یہ اطلاعات پیر دانش کے لئے بہت تشویش ناک تھیں۔ تمہیں قابو میں کرنا تمہارے پر کاٹ کر رکھنا اس کے خیال میں ضروری ہوگیا تھا۔ ضرورت پڑنے پر تمہارا پتا بھی صاف کیا جاسکتا تھا۔ پیر دانش اپنے محفوظ قلعوں کے اردگرد کسی کو منڈلاتے نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ ایک طرف وہ تم سے دوستی گانٹھ کر تمہارے گھر میں گھس بیٹھنے کی کوشش کررہا تھا اور دوسری طرف تمہیں تباہ و برباد کرنے اور ضرورت پڑنے پر قتل کرانے کے لئے ایسا جال پھیلا رہا تھا کہ اس پر کوئی الزام نہ آسکے۔ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ تم بہت بارسوخ آدمی ہو۔ تمہارا قتل کوئی معمولی واقعہ نہیں ہوگا۔ اس کی بہت اونچے پیمانے پر تفتیش ہوگی۔"

"بھئی واہ افضل میاں!" میں نے مسکراتے ہوئے خود اپنے کندھے پر تھپکی دے کر کہا "شہر میں تمہارا کافی رعب ہے۔ بڑے بڑے لوگ بھی تمہیں گاجر مولی کی طرح کٹوا کر پھینکنے کی ہمت نہیں رکھتے۔"

"بس بس زیادہ اترانے کی ضرورت نہیں۔" وہ بولی "یہ تو میں تمہیں خبردار کررہی ہوں اس لئے تم اپنے بچاؤ کا بندوبست کرنے میں کامیاب ہوجاؤ گے ورنہ وہ بہرحال تمہارا پتا صاف کرہی دیتا۔ وہ بڑی مکار چیز ہے۔ پکا ابلیس ہے۔ شیطانی چالیں چلنے اور شیطانی منصوبے بنانے میں اس کا جواب نہیں۔"

"وہ تمہاری اور مونا کی وڈیو کیسٹ کیوں حاصل کرنا چاہتا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔ یہ سوال کچھ دیر سے میرے ذہن میں چبھ رہا تھا۔

"اس کا جواب دینے سے پہلے میں تم سے پوچھنا چاہوں گی کہ کیا تم سینما کلب تک پہنچ گئے ہو؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"ہاں" میں نے اقرار کرلینا ہی بہتر سمجھا۔ میں سوچ رہا تھا اب مجھے بھی تھوڑا تھوڑا کھل ہی جانا چاہئے تھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولی "پیر دانش کو یہی اندیشہ تھا۔ اب یہ بھی مان لو کہ میری اور مونا کی وڈیو کیسٹ بھی تمہارے پاس ہیں۔"

"چلو یہ بھی مان لیتا ہوں۔" میں نے ذرا توقف سے کہا۔

"پیر دانش کو یہ بھی اندیشہ تھا۔" وہ بولی "اس کا مطلب اس کا شیطانی ذہن صحیح اندازے لگانے میں بھی ماہر ہے۔" انداز خود کلامی کا تھا۔

"اصل میں اسے یہ معلوم ہوگیا تھا کہ میں مونا کو تلاش کررہا تھا۔" میں نے خیال ظاہر کیا "اس کے بعد اس کے آدمی میرے پیچھے لگ گئے ہوں گے اور انہوں نے تیزی سے میرے بارے میں معلومات جمع کرڈالی ہوں گی۔ سوال یہ ہے کہ وہ اس میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہا ہے؟"

"اس لئے کہ سینما کلب کا دھندا اس کا ہے۔" فرح بڑے نہایت دھیمے لہجے میں بولی گویا اسے اندیشہ تھا کہ تخلیے میں بھی

ہماری بات سن سکتا تھا یا پھر شاید اسے وہ محاورہ یاد آرہا تھا کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔

میں سناٹے میں آگیا۔ ایک بار پھر مجھے چند سیکنڈ کے لئے چپ لگ گئی۔ حالانکہ میں نے زندگی میں اتنی حیرتیں سمیٹی تھیں کہ میں سوچتا تھا اب کسی بھی بات پر حیران ہونا چھوڑدوں لیکن بہرحال میں بندہ بشر تھا۔ حیرت کبھی کبھی مجھ پر حملہ آور ہوہی جاتی تھی اور غلبہ پا ہی لیتی تھی۔

اس زمانے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کس شخصیت کے پیچھے سے کیا ڈراما برآمد ہوجائے۔ پیر دانش کے بارے میں ابتدا ہی سے مجھے کچھ اچھی توقعات نہیں تھیں لیکن میں نے اس حد تک بھی نہیں سوچا تھا کہ......

فرح کی سرگوشی سن کر میں اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ کہہ رہی تھی "سینما کلب کے لئے ویسی فلمیں تیار کرنے..... انہیں چلانے اور لڑکیاں سپلائی کرنے کا دھندا اصل میں پیر دانش ہی کا ہے۔ اس قسم کی لڑکیاں جو شوبزنس میں آنے کا جنون کی حد تک شوق رکھتی ہیں اس کے لئے ہر قربانی دینے کو تیار رہتی ہیں۔ پہلے ہی سے کافی آزاد خیال سی ہوتی ہیں۔ ان میں سے جو لڑکیاں کافی خوب صورت ہوتی ہیں انہیں گھیر گھار کر قابو میں کرنے کے لئے پیر دانش کا ایک منظم گروہ کام کررہا ہے جس میں ایک دو نائیکہ ٹائپ عورتیں بھی شامل ہیں۔ جو لڑکیاں اس گروہ کے جال میں پھنس جاتی ہیں وہ اس سے نکل نہیں سکتیں۔ ان منتخب لڑکیوں میں سے بھی جو غیر معمولی طور پر خوب صورت ہوتی ہے اور پیر دانش کو پسند آجاتی ہے، اسے وہ کچھ عرصے کے لئے اپنی داشتہ بنا کر رکھتا ہے۔ اسے ہر وہ چیز فراہم کرتا ہے جس کے اس نے کبھی خواب دیکھے ہوتے ہیں لیکن اس کی یہ دنیا عارضی ہوتی ہے۔ بہت جلد پیر دانش کا اس سے دل بھرجاتا ہے اور وہ اسے دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکتا ہے۔ تاہم اتنی مہربانی ضرور کرتا ہے کہ اپنے حرم سے نکالتے وقت اس کی جھولی میں کچھ دولت ڈال دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ پیر دانش ہی کے زیرِ سایہ رہتے ہوئے اسی قسم کے معیوب دھندوں میں استعمال ہوتی رہتی ہے۔"

"مجھے پتا چلا تھا کہ جس کوٹھی میں سینما کلب والوں کے لئے شو چلتے ہیں اور لڑکیوں کی بکنگ ہوتی ہے وہ ایک بہت بڑے اور خطرناک اسمگلر مکرم مختار بیگ کی ہے جو آج کل کہیں بیرونِ ملک روپوش ہے۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ شاید یہ دھندے اسی کے ہوں۔" میں نے کہا۔

"مکرم مختار بیگ ان دھندوں میں پیر دانش کا کچھ پرسنٹ کا پارٹنر ہے۔" فرح نے بتایا "اس کی کوٹھی اور کچھ آدمی استعمال ہورہے ہیں۔ کوٹھی تو خیر اس کی اپنی بھی نہیں ہے۔ اس نے بھی کرائے پر لی ہوئی ہے۔ اس طرح معاملہ کچھ اور محفوظ ہوجاتا ہے یعنی جگہ کا مالک کوئی اور... کرایہ دار کوئی اور... کرتا دھرتا کوئی اور......"

کالے دھندے کرنے والوں کے طریقۂ کار عموماً ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ وہ برے سے برے حالات میں بھی اپنے بچاؤ کا بندوبست رکھتے ہیں۔ ویسے تو ہر متعلقہ محکمے کی کالی بھیڑیں ان کے ساتھ ہوتی ہیں۔ وہ ہر خطرے سے نمٹنے کا بندوبست رکھتے ہیں لیکن اگر کبھی ان کے خلاف کوئی خاص ہی مہم چل پڑے تب بھی ان پر ہاتھ ڈالنا ممکن نہیں ہوتا۔

فرح بات جاری رکھتے ہوئے بولی "دوسری طرف مکرم مختار بیگ کے کچھ دھندوں میں پیر دانش کچھ پرسنٹ کا پارٹنر ہے۔ اسی طرح ملی بھگت سے یہ بڑے بڑے مگرمچھ ایک دوسرے کو مضبوط سے مضبوط تر بنا رہے ہیں۔"

یہ ایک عبرت ناک اور روح فرسا حقیقت تھی کہ معاشرے میں لوگ کن کن دھندوں کی کمائی کھا رہے تھے، کن کن ذرائع سے اپنی دولت کے انباروں میں اضافہ کررہے تھے اور لوگ آنکھیں بند کرکے انہیں پوج رہے تھے۔

فرح نے سلسلۂ کلام جوڑا "مکرم مختار بیگ بے شک یہاں نہیں ہے لیکن اس کے جو لوگ موجود ہیں ان کے ذریعے اور دوسرے نامعلوم ذرائع سے دونوں خطرناک افراد کو ایک دوسرے کا تعاون حاصل رہتا ہے۔ یوں معاملہ گویا دو آتشہ ہے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "لڑکیوں کی اس قسم کی فلموں کی وڈیو کیسٹ کی شکل میں صرف ایک ایک کاپی تیار کی جاتی ہے جو صرف پیر دانش کے اپنے بیڈروم کے لئے ہوتی ہے۔ اس کے پاس ان فلموں کی چھوٹی سی ایک لائبریری موجود ہے۔ سینما کلب والوں کے لئے ان فلموں کے صرف پروجیکٹر پر چلنے والے پرنٹ تیار کئے جاتے ہیں۔

"میری فلم کا مسئلہ یہ ہوا کہ فلم تیار ہوکر جب پیر دانش صاحب کے ملاحظے کے لئے ان کی خدمت میں پہنچی تو موصوف کو میں پسند آگئی۔ انہوں نے مجھے اپنے عشرت کدے میں بلوایا۔ بلکہ یوں کہو کہ منگوایا.... اس رات میں موصوف کو اور بھی زیادہ پسند آگئی۔ اس نے فوراً مجھے اپنی داشتہ کے مقام پر فائز کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

"برسبیلِ تذکرہ بتاتی چلوں کہ میں اس کی سب سے چہیتی داشتہ ہوں۔ مجھے اس کے قبضے میں ایک سال ہوگیا ہے جو اس کی داشتاؤں کی تاریخ میں کافی طویل عرصہ سمجھا جاتا ہے اور آثار بتاتے ہیں کہ ابھی وہ مجھے مزید کافی عرصہ رکھے گا حالانکہ اس کی موجودہ داشتاؤں میں ایک لڑکی اٹھارہ سال کی بھی ہے۔ میں تمہیں بتا ہی چکی ہوں، وہ بھی بہت خوب صورت ہے لیکن میں نے سنا ہے اسے وہ جلد ہی فارغ کرنے والا ہے۔ مجھ پر وہ بہت مہربان ہے۔"

"جوہر شناس ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ بھی جواباً مسکرائی "اس گھر میں وہ نازل بھی جلدی جلدی

ہوتا ہے۔"

"آج بھی کہیں اس بلا کے نازل ہونے کی رات تو نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے نازل ہونے کی کوئی مقررہ راتیں نہیں ہیں لیکن تمہارے خیال میں، میں تمہیں کیوں اتنی مطمئن نظر آرہی ہوں؟"

"اس نے تمہیں یقینی طور پر بتادیا ہوگا کہ وہ آج نہیں آئے گا۔" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" اس نے نفی میں سرہلایا "وہ ایسی کوئی بات کرے بھی تو میں اسے ڈراما سمجھتی ہوں۔ وہ اگر فون پر یہ کہہ دے کہ وہ آج رات شہر سے باہر جارہا ہے تب بھی میں یہ فرض نہیں کرتی کہ اس رات اس کے نازل ہونے کا امکان نہیں۔ یہ کہنے کے بعد بھی عین ممکن ہوتا ہے کہ وہ آدھی رات کو آجائے اور کبھی کبھی یہ بھی ممکن ہوتا ہے کہ وہ آنے کی اطلاع دے اور اس کے بعد پندرہ دن تک نہ آئے۔"

اس نے ایک طویل سانس لی "اسے خواہ آنا ہو یا نہ آنا ہو۔ لیکن اگر وہ شہر میں موجود ہو تو اس کا خیال ایک آسیب کی طرح ذہن سے چمٹا رہتا ہے۔ اس وقت میرے بے فکر نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ملک سے باہر گیا ہوا ہے۔ وہ دبئی گیا ہے۔ میں ائرپورٹ پر اسے ہی تو چھوڑنے گئی تھی۔"

میں چونکا "کہیں مکرم مختار بیگ دبئی ہی میں تو روپوش نہیں ہے؟ کہیں پیردانش اسی سے تو ملنے نہیں گیا؟"

"یہ تو مجھے معلوم نہیں۔" اس نے اپنے خوب صورت کندھے اچکائے "بہرحال وہ ہنگامی طور پر روانہ ہوا ہے اور جلد ہی واپس آجائے گا۔"

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے سر جھٹک کر کہا "خیر۔۔۔ وہ تمہاری کیسٹ کی بات تو بیچ میں ہی رہ گئی۔"

"ہاں، میں یہ بتارہی تھی کہ میری فلم سینما کلب والوں کے لئے ریلیز نہیں ہوپائی تھی کہ پیردانش نے مجھے اپنے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے حرم میں شامل کرلیا۔ پیردانش میں ایک بات بڑی عجیب ہے جب تک کوئی لڑکی اس کی داشتہ رہتی ہے وہ اسے بیوی کی طرح اپنی اَنا کا مسئلہ سمجھتا ہے۔ اسے باہر کی ہوا نہیں لگنے دیتا۔ یہ برداشت نہیں کرتا کہ کوئی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ اس کے گارڈز کو یہ ہدایت ملی ہوئی ہے کہ اس کی کوئی بھی داشتہ جب ان کے ساتھ کسی کام سے باہر نکلے اور راستے میں کہیں کوئی اوباش نوجوان وغیرہ اس پر کوئی آوازہ کسیں یا کسی قسم کی بدتمیزی کریں تو وہ ان کی اچھی طرح ٹھکائی کریں اور اگر ضرورت محسوس کریں تو بے دھڑک انہیں شوٹ کردیں۔ گارڈز کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ بعد کے حالات سے پیردانش خود نبٹ لے گا۔"

"بہت خوب۔۔۔ بہت خوب۔" میں نے سرہلایا "کیا شان ہے۔ بے چارے عام آدمی کی تو شریف بیوی کو بھی یہ تحفظ حاصل نہیں۔"

وہ دھیرے سے ہنسی اور بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میں اس کی اَنا کا مسئلہ بن چکی تو اس نے حکم دے دیا کہ میری فلم سینما کلب والوں کے لئے "ریلیز" نہ کی جائے اور نہ ہی اب اسے مزید کوئی شخص دیکھنے پائے۔ وڈیو کیسٹ کی شکل میں اس کی ایک ہی ماسٹر کاپی تیار ہوئی تھی لیکن وہ غائب ہوگئی۔ یا یوں سمجھو کہ اس دوران پیر دانش کا اپنا ایک نہایت خاص آدمی اسے دبا کر بیٹھ گیا۔"

"اس کا نام غالباً ظفر جمال تھا؟" میں نے اندازہ ظاہر کیا۔

"اچھا تو تم اس کے بارے میں جان چکے ہو!" اس نے سرہلایا "ہاں اس کا نام ظفر جمال تھا۔ وہ شوبزنس کا بہت اعلیٰ درجے کا فوٹو گرافر تھا لیکن دوسرے بہت سے لوگوں کی طرح شارٹ کٹ سے دولت کمانے اور کم سے کم وقت میں دنیا کی ہر عیش و عشرت سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کے لئے پیردانش کا آلۂ کار بن گیا تھا۔ ڈیفنس میں بنگلا لے کر اس نے بڑا ٹھاٹ دار اسٹوڈیو بنایا ہوا تھا۔ خود بھی بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتا تھا لیکن اس کے زیادہ تر ٹھاٹ باٹ پیردانش کی وجہ سے تھے۔ اس کے کام کی وجہ سے نہیں۔ خالص محنت اور دیانت داری سے دولت کمانے میں ذرا زیادہ وقت لگتا ہے۔"

"میرا خیال ہے مطلوبہ معیار کی لڑکیاں تلاش کرنے اور انہیں گھیر گھار کر ایک خاص منزل تک لانے میں ظفر جمال کا کردار بھی بہت اہم رہا ہوگا؟" میں نے تصدیق چاہی۔

"بے شک" فرح نے جواب دیا "وہ اس سارے ریکٹ کا اہم ستون تھا۔" پھر وہ گہری سانس لے کر بولی "تمام ناجائز دھندے دولت کے لئے ہوتے ہیں اور یہ دھندے کرنے والوں میں آپس میں اکثر لڑائیاں دولت ہی کی وجہ سے ہوتی ہیں۔"

میں نے اس کی تائید میں سرہلایا۔ اس نے یہ بڑی تجربے کی بات کی تھی۔ بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولی "مجھے کچھ زیادہ واضح طور پر معلوم نہیں کہ بالکل صحیح بات کیا ہے۔ میں پیردانش کو اس قسم کے معاملات میں زیادہ کرید تو نہیں سکتی لیکن مختلف باتوں سے کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ یا تو پیردانش نے ظفر جمال کو کوئی بہت بڑی رقم دینے کا کوئی وعدہ کیا ہوا تھا جس سے وہ مکر گیا۔ یا پھر شاید ظفر جمال کا دعویٰ تھا کہ حساب کتاب کے مطابق اس کی کوئی بہت بڑی رقم رفتہ رفتہ پیردانش پر ڈیو ہوگئی تھی جبکہ پیردانش اس حساب کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔"

"بہرحال دونوں کے درمیان اختلاف ہوگیا۔" میں نے کہا۔

"بہت سنگین اختلاف۔" فرح نے سرہلایا "ظفر جمال شاید پیر دانش سے سنگین ترین اختلافات کے باوجود اس کے سامنے سر اٹھانے کی جرأت نہ کرتا لیکن اس دوران ایک اور عجیب انقلاب یہ رونما ہوا کہ موتا اور ظفر جمال ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوگئے۔ بہت ہی افسانوی قسم کی محبت میں۔" وہ کچھ عجیب سے انداز میں ہنسی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھا۔

"مجھے اس بات پر یقین سا نہیں آتا۔" وہ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی "ظاہر ہے موتا جب ظفر جمال سے متعارف ہوئی ہوگی تب بھی کوئی ایسی سیدھی سادی اور معصوم دوشیزہ نہیں رہی ہوگی۔ ظفر جمال نے خود اسے مزید غلاظتوں میں دھکیلا تھا۔ ظفر جمال خود بھی بہت گھاگ شکاری تھا۔ اس قسم کے مرد اور اسی قسم کی لڑکیاں افسانوی محبتوں کے چکر میں کہاں پڑتے ہیں۔ ان کا تو ان قدروں پر سے ایمان ہی اٹھ چکا ہوتا ہے اور دل پتھر ہوچکے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر جب سامنے بہت سنگین قسم کے خطرات اور مصیبتیں ہی مصیبتیں نظر آرہی ہوں پھر کہاں محبت کا حوصلہ پڑتا ہے۔"

"اس کے باوجود لوگ محبتیں کرتے آئے ہیں اور بڑی عجیب عجیب۔۔۔ ناقابلِ یقین داستانیں جنم لیتی رہی ہیں۔ بڑی بڑی گھاگ اور گرگ باراں دیدہ۔۔۔ قسم کی طوائفیں کسی کی محبت میں گرفتار ہوکر گولیوں کی بوچھاڑ میں اپنے محبوب کے ساتھ فرار ہوتی رہی ہیں اور محبت کے راستوں میں انہوں نے ہر طرح کی قربانیاں دی ہیں۔ اس میں تم کیا کہوگی؟"

"ہاں۔۔۔ ایسا ہوتا تو ہے۔" اس نے ہچکچاتے ہوئے تسلیم کیا۔ "لیکن مجھے پھر بھی اس قسم کے واقعات افسانوی سے ہی محسوس ہوتے رہے ہیں۔ بہرحال۔۔۔۔ بات ظفر جمال اور موتا کی ہورہی تھی۔ انہوں نے ایک رات کہیں ساتھ گزاری اور دوسری صبح وہ افسانوی انداز میں ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہوچکے تھے۔"

"ٹھہرو۔۔۔ ٹھہرو۔۔۔" میں نے جلدی سے اسے خاموش ہونے کا اشارہ کیا "یہ قصہ تو مجھے پیردانش نے سنایا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ حادثہ اس کے ساتھ گزرا تھا۔"

"پیردانش۔ اور موتا سے محبت؟" فرح استہزائیہ انداز میں ہنسا اور دیر تک ہنستی رہی۔ میں صبر و تحمل سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

اچانک دور کہیں سے کوئی خفیف سا کھٹکا سنائی دیا اور اس کی ہنسی کو بریک لگ گیا۔

"یہ کھٹکا کیسا تھا؟" اس نے خوف زدہ سے انداز میں سرگوشی کی۔

"افسوس مجھے دیواروں کے پار نظر نہیں آتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر بیڈ سے اتر کر اپنے کوٹ کی جیب سے پسٹل نکالتے ہوئے کہا۔

"کہیں گارڈز کو ہوش تو نہیں آگیا؟" وہ اپنے خوب صورت پاؤں بیڈ سے نیچے لٹکاتے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

"امید تو نہیں ہے۔ ویسے میں احتیاطاً جاکر دیکھ آتا ہوں۔" میں نے شرٹ پہنتے ہوئے کہا "میں انہیں گیٹ ہاؤس میں بند کرکے

تالا لگا آیا تھا۔ اس کمرے میں ایک ہی کھڑکی ہے اور اس میں سلاخیں ہیں۔ وہ باہر تو نہیں آسکتے لیکن ہوش میں آنے کے بعد کہیں شور شرابا شروع نہ کردیں۔ میں ان کے منہ میں کچھ نہیں ٹھونس سکا تھا۔"

ہم دونوں نے کان لگا کر سنا لیکن اس کھٹکے کے بعد مزید کوئی آواز سنائی نہ دی۔ میں نے نہایت آہستگی سے دروازہ کھولا اور پسٹل ہاتھ میں لئے باہر کھسک کر دیوار سے لگ کر کھڑا ہوگیا۔ میں نے لائٹ آن نہیں کی لیکن میں دیکھ سکتا تھا کہ ہال میں کوئی نہیں تھا۔

فرح نے ایک کمرے سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر مجھے کچھ کپڑا وغیرہ دیا جسے میں گارڈز کے منہ پر باندھنے اور ان کے ہاتھ پاؤں باندھنے میں استعمال کرسکتا تھا۔ میں اسی طرح پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہال سے باہر آیا۔ برآمدے سے لے کر گیٹ ہاؤس تک بدستور روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں کہیں کوئی ذی روح حرکت کرتا دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گیٹ ہاؤس بھی بدستور سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔

تاہم میں محتاط انداز میں ہی گیٹ ہاؤس تک پہنچا۔ میری نظر چاروں طرف تھی اور میں کسی بھی اچانک صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار تھا۔ فرح اپنے بیڈ روم میں ہی دروازہ مقفل کرکے بیٹھ گئی تھی۔

میں نے گیٹ ہاؤس کی کھڑکی سے اندر جھانکا۔ گارڈز وہیں "محوِ استراحت" تھے جہاں میں نے انہیں چھوڑا تھا۔ لگتا تھا وہ کھٹکا کسی غیبی قوت نے محض میری اور فرح کی گفتگو میں خلل ڈالنے اور ان خوب صورت لمحات کو بدمزہ کرنے کے لئے کیا تھا۔

میں نے نہایت آہستگی سے گیٹ ہاؤس کا تالا کھولا اور پسٹل کا رخ گارڈز کی طرف رکھتے ہوئے ان کے قریب پہنچا۔ میں نے اس امکان کو ذہن میں رکھا تھا کہ کہیں وہ ہوش میں آنے کے باوجود بے ہوش رہنے کی چال نہ چل رہے ہوں۔ میں خود زندگی میں دو تین مرتبہ یہ داؤ استعمال کرچکا تھا۔ ہر بار یہ داؤ کارگر رہا تھا۔

گارڈز کے معاملے میں میرا اندیشہ غلط ثابت ہوا۔ میں نے ایک ہاتھ میں پسٹل سیدھی رکھتے ہوئے دوسرے سے انہیں کروٹ دلا دی۔ ان کے جسموں کی کیفیت نے مجھے بتادیا وہ حقیقت میں ابھی تک بے ہوش تھے۔ تب میں نے پسٹل دانتوں میں دبا کر پھرتی سے ان کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے اور منہ پر بھی کپڑا باندھ دیا۔ ان کی گنیں میں نے پہلے ہی باہر لان پر ایک باڑھ کی آڑ میں چھپادی تھیں۔ اب کارروائی تسلی بخش ہوگئی تھی۔

مطمئن ہوکر میں مکان کے اندر لوٹ آیا۔ بیڈ روم کے دروازے پر ایک انگلی سے دستک دے کر اور سرگوشی میں اپنا نام بتا کر میں نے فرح سے دروازہ کھلوایا۔ مجھے ٹھیک ٹھاک دیکھ کر اس کی جان میں جان آئی اور وہ دوبارہ دروازہ مقفل کرتے ہوئے بولی

"کیا چکر تھا؟"

"کوئی چکر نہیں تھا۔ یونہی کسی آواز نے ہمیں غلط فہمی میں مبتلا کیا تھا۔ دراصل کوئی غیبی طاقت ہماری گفتگو میں انٹرول کرانا چاہتی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

وہ مسکرادی لیکن دوسرے ہی لمحے خوف زدہ سے انداز میں اچھل پڑی کیونکہ کمرے میں فون کی گھنٹی بج اٹھی تھی جبکہ اس کے کمرے میں فون نہیں تھا۔ خود میری سمجھ میں بھی ذرا تاخیر سے آیا کہ وہ میرا موبائل فون تھا جو میرے کوٹ کی جیب میں تھا۔ اس کی گھنٹی بج رہی تھی۔

"سوری!" میں نے معذرت خواہانہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا "یہ میرا بدتمیز فون ہے۔ اسے اسی طرح موقع محل دیکھے بغیر بج اٹھنے کی عادت ہے۔"

میں نے بیڈ پر بیٹھ کر کوٹ کی باہر کی جیب سے فون نکالا اور پسٹل اندرونی جیب میں ڈالتے ہوئے فرح کی طرف دیکھ کر کہا "کوٹ کیا ہے۔ یوں سمجھو کہ ایک الماری پہن کر پھرتا ہوں۔ شاندار سوٹ کی فٹنگ کا تو بالکل خیال نہیں رکھ سکتا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے پھولا پھولا دکھائی دیتا ہے۔"

"اس کے باوجود خوش لباس اور ہینڈسم دکھائی دیتے ہو۔ تمہیں تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ مسکرائی۔

"دل رکھنے کا شکریہ۔" میں نے فون کا بٹن دبایا اور "ہیلو" کہا۔ دوسری طرف اطمینان کی سانس لی گئی۔ وہ شفیع شاہ تھا جو صرف "ہیلو" سن کر میری آواز پہچان لیتا تھا۔

"سر! مجھے آپ کے بارے میں تشویش تھی۔" وہ بولا "آپ بالکل اچانک روانہ ہوئے تھے۔ اور اب تک آپ کی واپسی نہیں ہوئی۔ کوئی اطلاع بھی نہیں آئی۔ اس لئے میں نے سوچا ذرا رابطہ کرنے کی کوشش کروں۔ آپ کہاں ہیں؟"

"یہ مت پوچھو ڈیئر!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بہت ہی اچھی جگہ پر ہوں۔ دل چاہ رہا ہے یہیں رہ جاؤں۔" میں نے فرح کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے ہنسی پھوٹی پڑ رہی تھی۔

دوسری طرف شفیع شاہ ہولے سے ہنسا اور بولا "بس سر! مجھے یہی معلوم کرنا تھا۔ میرے لئے کوئی حکم؟"

"بس... دعا کرنا کہ میرا یہاں قیام کافی طویل ہو۔" میں نے کہا۔

شفیع شاہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نے فون بند کردیا اور فرح کی طرف دیکھ کر کہا "انٹرول کافی طویل ہوگیا۔"

"کیوں نہ اسے مزید طویل کردیا جائے۔" اس نے ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچا۔

"ہاں... کیا تو جا سکتا ہے۔ اب تو میں گارڈز کا بھی پکا بندوبست کر آیا ہوں۔"

"پھر تو بیحد فکری ہی بے فکری ہے۔" اس کے لہجے مخمور طمانیت جھلک آئی۔

انٹرول کافی طویل ہوگیا۔ آخرکار وہ تھکے تھکے ا[illegible] آنکھیں بند کرتے ہوئے بولی "مجھے نیند آرہی ہے۔"

"تم سو جاؤ۔ میں احمقوں کی طرح بیٹھ کر تمہارا م[illegible] گا۔" پھر میں نے ذرا ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا "تمہار[illegible] میں، میں اس لئے یہاں آیا ہوں؟"

وہ آنکھیں کھولتے ہوئے نشیلے انداز میں مسکرائی۔ آنکھوں میں گلابی ڈورے اب بھی تیر رہے تھے۔ اچانک [illegible] کی سی پھرتی سے چھلانگ لگا کر اٹھ بیٹھی اور بیڈ سے اتر[illegible] بولی "میں کافی بنا کر لاتی ہوں۔"

میں دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے چت لیٹا دیر تک گھورتا رہا اور زندگی کے نشیب و فراز کے بارے میں غو[illegible] پیر دانش کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ایک داستان درد[illegible] تھا۔ پیاز کے چھلکوں کی طرح اس پر سے تہیں اتر رہی تھیں۔

فرح بلیک کافی کے دو مگ بنا لائی۔ ان سے بھاپ [illegible] تھی۔ کمرے میں کافی کی مہک پھیل گئی۔ پاس پاس بیٹھ [illegible] چسکیاں لے چکے تو میں نے کہا "سلسلہ وہیں سے جوڑتے [illegible] سے ٹوٹا تھا۔ کیا بات ہو رہی تھی؟"

"تم پیر دانش کے مونا کی محبت میں گرفتار ہونے [illegible] کر رہے تھے۔"

"اور تم اس پر استہزائیہ انداز میں ہنس رہی تھیں۔"

"بات ہی ہنسنے کی تھی۔ پیر دانش اگر مونا جیسی لڑکیو[illegible] میں گرفتار ہونے لگے تو پھر وہ پیر دانش نہیں رہے گا۔ "دراصل اس نے مونا اور ظفر جمال کی افسانوی سی محبت [illegible] سے ظفر جمال کا نام نکال کر اس کی جگہ اپنا نام فٹ کر [illegible] کہانی تمہیں سنادی۔"

"کیوں؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"ظاہر ہے وہ اپنی دانست میں تمہیں بے وقوف بنا [illegible] ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ اگر تم [illegible] بارے میں کچھ معلوم کرنے میں یا اسے تلاش کرنے میں [illegible] ہو چکے ہو تو اسے بتادو۔ اسے بڑی شدت سے مونا کی تلاش [illegible] اس وقت تک شہر میں پھیلے ہوئے اس کے آدمی مونا کو تلا[illegible] میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔"

"اسے مونا کی تلاش کیوں تھی؟" میں نے دریافت ک[illegible]

"ظاہر ہے وہ مونا کی محبت میں تو بے حال نہیں ہو رہا [illegible] نیم استہزائیہ سے لہجے میں بولی "محبت تو اسے دنیا میں اپنی دولت کے سوا کسی چیز سے نہیں ہے۔ دونوں ماں بیٹا بہت [illegible] غریب قسم کے کردار ہیں اور ذرا الگ الگ قسم کے جنونی [illegible]

بھی بڑی جنات قسم کی چیز ہے۔ ساٹھ سال سے اوپر اس کی عمر ہے اور شکل صورت، جسمانی ساخت وغیرہ کے لحاظ سے اوسط درجے کی کسی دیونی سے کم نہیں۔"

"میں اسے دیکھ چکا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"تم ذرا اس کی شخصیت اور عمر ذہن میں رکھو اور تصور کرو کہ گھر کا کوئی بھی پندرہ سال سے اوپر کی عمر کا نوکر اس سے نہیں بچ سکا۔ نوکر تو نوکر... کبھی کبھی نوکرانیوں کی بھی شامت آجاتی ہے۔ [illegible] کرا بند کر کے ان پر پل پڑتی ہے۔ ان سب کے جسموں پر اس کی [illegible] رشتوں کے نشانات ثبت ہیں....."

اس نے جھرجھری سی لی اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی۔ "پیر دانش اس حد تک جنونی نہیں ہے۔ شاید کبھی رہا ہو۔ یا کہیں [illegible] آگے چل کر نہ ہو جائے لیکن اسے خوب صورت لڑکیوں کو ملکیت [illegible] کر رکھنے کا شوق ہے۔ دوسری طرف اگر اسے اپنی دولت سے [illegible] بت نہ ہوتی تو شاید وہ اپنی ساری دولت اسی شوق پر لٹا دیتا۔"

"وہ سوال پھر بھی رہ گیا۔" میں نے کہا "پیر دانش کو مونا کی [illegible] اش کیوں تھی؟"

"کیا مجھے یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے؟ بھئی ظاہر ہے..... [illegible] ل کرانے کے لئے۔" وہ اطمینان سے بولی "اس کے آدمی ظفر [illegible] ل اور مونا..... دونوں کو قتل کرنے کے لئے ان کی بو سونگھتے پھر [illegible] ہے تھے۔ شکاری کتوں کی طرح!"

"اور آخر وہ مونا کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے۔" [illegible] نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ [illegible] ہی غلط وقت پر اسے تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے تھے، اگر [illegible] یک آدھ گھنٹا پہلے مجھ سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہو جاتی تو [illegible] بر وہ آج زندہ ہوتی۔

"ہاں، موت نے اس بے چاری کو ڈھونڈ نکالا۔" اب اس [illegible] لہجے میں ہلکی سی افسردگی در آئی "لیکن ظفر جمال ابھی بچا ہوا [illegible]۔ حالانکہ دونوں اکٹھے ہی روپوش ہوئے تھے۔"

میں ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ رحیم گل نے مجھے بتایا تھا کہ [illegible] مونا کی لاش پائی گئی تھی وہاں کچھ ایسی نشانیاں ملی تھیں جن [illegible] ظاہر ہوتا تھا کہ وہاں کوئی مرد بھی مقیم رہا تھا۔ شاید وہ ظفر جمال [illegible] ہو۔

فرح نے بات جاری رکھی "ظفر جمال کے پیر دانش سے رقم [illegible] معاملے پر اختلافات ہوئے اور ادھر مونا سے اس کی طوفانی [illegible] شروع ہوئی جس نے اسے پیر دانش کے سامنے سر اٹھانے کا [illegible] بھی دے دیا۔ مونا شریفانہ زندگی کی طرف لوٹ جانا چاہتی [illegible]۔ اس مقصد کے لئے اسے کسی مضبوط سہارے کی ضرورت [illegible]۔ اس نے ظفر جمال کو مضبوط سہارا سمجھا تھا مگر پیر دانش کے [illegible] بھلا ظفر جمال کی کیا حیثیت تھی۔

"اسی دوران ظفر جمال نے میری اور مونا کی وڈیو کیسٹ کی ماسٹر کاپیاں قبضے میں کرلی تھیں۔ اس بے چارے کا خیال تھا کہ ان کی بنا پر وہ شاید پیر دانش کو تھوڑا بہت بلیک میل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اس سے اپنے کچھ مطالبات منوالے گا۔ حالانکہ وہ پیر دانش کی طاقت، اس کے وسائل اور اس کی مکاری سے زیادہ اچھی طرح واقف تھا کیونکہ وہ اس کا بہت قریبی اور خاص آدمی تھا مگر..... بس... کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ کب انسان کی کھوپڑی گھوم جائے اور کس حد تک گھوم جائے۔

"اس نے تہیہ کرلیا تھا کہ مونا کو اگر غلاظت کی دلدل میں زیادہ گہرائی تک وہ لایا تھا تو اب اسے نکالے گا بھی وہی۔ ادھر پیر دانش اس سے نہ صرف دونوں کیسٹ واپس مانگ رہا تھا بلکہ اسے مونا سے بھی دور رہنے کا حکم دے چکا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ظفر جمال کو وہ بڑی رقم بھی دینے کے لئے ہرگز تیار نہیں تھا جس کا ظفر جمال تقاضا کر رہا تھا۔ ظفر جمال کے دعوے کے مطابق اس رقم پر اس کا حق بنتا تھا اور اس سے وہ ایک نئی زندگی شروع کرنا چاہتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کی بات ماننے کے لئے تیار نہیں تھے۔"

"ایک منٹ" میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "پیر دانش تمہاری کیسٹ کیوں مانگ رہا تھا، اس کی وجہ تو تم نے بیان کردی لیکن وہ مونا کی کیسٹ کیوں مانگ رہا تھا، اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ مونا تو اس مشین کا ایک چلتا ہوا پرزہ تھی۔ اس کی فلم تو سینما کلب میں بھی چل چکی تھی۔ اس فلم کو واپس لینے میں پیر دانش کی کیا مصلحت تھی؟"

"اس فلم کی تیاری کے سلسلے میں پیر دانش سے ایک حماقت ہوگئی تھی۔ اس کی تیاری کے دوران وہ شہر میں نہیں تھا۔ وہ اپنی پیاری اماں کے ساتھ مری گیا ہوا تھا۔ اس فلم کی شوٹنگ کے لئے جگہ کا مسئلہ آن پڑا۔ جگہیں کئی موجود تھیں لیکن ہر ایک کو استعمال کرنے کے سلسلے میں کوئی نہ کوئی وقتی رکاوٹ حائل تھی۔ "پروڈکشن" کے ذمے داروں نے پیر دانش کو مری فون کیا۔ وہ نہ جانے کس ترنگ میں تھا۔ یا پھر شاید اس نے اس میں کوئی حرج محسوس نہیں کیا ہوگا۔ اس نے حکم دے دیا کہ فلم اس کے اپنے بیڈ روم میں شوٹ کرلی جائے۔ کئی دن اس بیڈ روم میں شوٹنگ چلتی رہی۔

"پیر دانش اور اس کی پیاری اماں اس دوران مری ہی میں رہے۔ فلم مکمل ہوگئی۔ پیر دانش کو واپس آکر بھی اپنی کچھ دوسری مصروفیات کی وجہ سے وہ فلم دیکھنے کی فرصت نہ ملی اور وہ سینما کلب والوں کے لئے بھی "ریلیز" ہوگئی۔ اس دوران کسی نے پیر دانش کی توجہ اس بات کی طرف دلائی کہ فلم میں اس کا بیڈ روم پہچانا جا سکتا تھا۔

"اس کا فرنیچر اور دوسری چیزوں کی ساخت تو اپنی جگہ تھی، اس میں ایک بڑے مشہور پینٹر کی پینٹنگ بھی آگئی تھی جو پیر دانش نے کافی عرصہ پہلے مہنگے داموں بڑے اہتمام سے خریدی تھی اور

اس موقع کی تصویریں بھی اخبارات میں چھپ چکی تھیں۔ یہ بات کسی کو یاد آجاتی تو فلم کا تعلق پیر دانش سے جڑ سکتا تھا۔"

مجھے خود وہ پینٹنگ ایک اہم سراغ محسوس ہوئی تھی اور میں نے شفیع شاہ کو اس کے بارے میں معلومات کے لئے کہا تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ ابھی اس کے مالک کا نام معلوم نہیں ہوسکا تھا لیکن جلد یا بدیر بہرحال یہ بات معلوم ہو ہی جاتی۔ پیر دانش نے صحیح خطرہ محسوس کیا تھا۔

فرح بات جاری رکھتے ہوئے بولی "اس سے پہلے پیر دانش بڑی کامیابی سے اپنے آپ کو اس کاروبار سے الگ تھلگ رکھے ہوئے تھا۔ اس دھندے سے اس کے تعلق کا کوئی ایسا ثبوت موجود نہیں تھا جس تک کسی کی رسائی ہوتی لیکن اس کیسٹ کی صورت میں گویا ایک ثبوت محفوظ ہوگیا تھا۔ اس لئے پیر دانش کی نظر میں فوراً وہ کیسٹ اہم ہوگئی تھی۔ اس نے اپنے بیڈ روم کا فرنیچر بھی بدل دیا تھا۔"

مجھے یاد تھا جب میں پیر دانش کی دعوت پر اس کے گھر گیا تھا تو اس نے مجھے بیڈ روم میں بلوالیا تھا۔ شاید اس نے جان بوجھ کر ایسا کیا تھا۔ شاید وہ بیڈ روم ہی دوسرا تھا یا پھر وہ ہر چیز بدل چکا تھا۔ اس نے شاید یہی سوچا تھا کہ اگر کسی طرح وہ فلم میری نظر سے گزر چکی تھی تو بیڈ روم دیکھنے کے بعد' اگر میرے ذہن میں کوئی شک موجود بھی ہو تو وہ نکل جائے۔ وہ واقعی بڑی پہنچی ہوئی چیز تھا۔

فرح بولی "پیر دانش کو وہ کیسٹ خطرہ محسوس ہونے لگی تھی اسی لئے اس نے اس کا پروجیکٹر والا پرنٹ بھی واپس منگوالیا تھا۔ ظفر جمال اس کی اہمیت کے پیش نظر ہی اس کیسٹ کو بھی دبا کر بیٹھ گیا تھا لیکن اس کی بدقسمتی دیکھو کہ اسے کچھ ایسے حالات میں اپنے اسٹوڈیو والے بنگلے سے رخصت ہونا پڑا کہ وہ دونوں کیسٹ ساتھ نہیں لے جاسکا۔ وہ شاید انہیں وہیں کہیں چھپا گیا تھا کہ حالات ذرا مناسب ہونے پر اور موقع ملنے پر وہ دوبارہ آکر انہیں لے جائے گا لیکن اس بے چارے کو وہ موقع نہیں مل سکا اور اس دوران وہ کیسٹس کسی اور کے ہتھے چڑھ گئیں۔ شاید وہ تم ہو۔" اس نے شوخی آمیز سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھا لیکن میں نے اس کی تصدیق یا تردید نہیں کی۔

میں ان کیسٹوں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ کیسٹ اس حد تک اہم ہوں گی۔ وہ میرے ہوٹل کے کمرے میں یونہی پڑی تھیں۔ میں انہیں بے پروائی سے چھوڑ آیا تھا۔ میرے ہوٹل کا کمرا کچھ زیادہ محفوظ جگہ بھی نہیں تھی۔ شاید پیر دانش کو وہاں ان کی موجودگی کا امکان نظر نہیں آیا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ میری عدم موجودگی میں کسی نے ان پر ہاتھ صاف نہ کردیا ہو۔

فرح نے جواب کے لئے اصرار نہیں کیا اور مجھے خاموش پاکر کندھے اچکاتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے تم اب بھی محتاط ہی رہنا

چاہتے ہو تو رہو لیکن میں بھونکتی رہوں گی۔ تمہارے ذہن بھی سوال ہو تم اس کا جواب مجھ سے لے سکتے ہو۔"

"تمہیں یہ سب باتیں کیسے معلوم ہوئیں؟" میں نے پو

"بہت سی باتیں تو پیر دانش نے خود بتائی ہیں۔" ا جواب دیا "گو کہ وہ بہت احتیاط پسند آدمی ہے۔ دانستہ کبھی اپنی کسی بیوی کو بھی اپنے معاملات سے آگاہ نہیں کر میرے بارے میں اسے کم از کم ایک بات کا یقین ہے کہ کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس لئے وہ بہت سی باتیں کہ ہے۔ کچھ باتیں مجھے اِدھر اُدھر سے معلوم ہوئی ہیں اور بارے میں میں نے اندازے لگائے ہیں۔"

"اسے صرف تمہارے بارے میں یقین ہے کہ نقصان نہیں پہنچا سکتیں اور تم ہی اسے نقصان پہنچا رہی اسے ہی نظام قدرت کہتے ہیں۔ شیطان صفت لوگ عموماً کے بھیدیوں کی وجہ سے ہی مارے جاتے ہیں۔" میں نے عالمانہ انداز میں اظہارِ خیال کیا۔

اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا "تم سے کس میں اسے نقصان پہنچا رہی ہوں؟ میں تو تمہیں تھوڑا سا رہی ہوں۔ یہ دو الگ الگ باتیں ہیں۔"

"بہت خوب" میں نے محظوظ ہوتے ہوئے کہا "یہ تو ہے۔ بھئی تم مجھے اس کے رازوں سے آگاہ کر رہی ہو نقصان پہنچانے کے مترادف نہیں ہے؟"

"ہرگز نہیں۔" اس نے نفی میں سرہلایا "یہ باتیں تمہیں معلوم ہو ہی جانی تھیں۔ میں نے اپنے پاس سے ثبوت نہیں دیا۔ میرے پاس درحقیقت کوئی ثبوت ہے میں نے صرف باتیں کی ہیں۔ باتوں کا کیا ہے؟ ان سے انکار کرسکتا ہے کہ وہ میں نے نہیں کیں۔ پیر دانش کو ہے کہ تم اس کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر چکے ہو وہ تمہیں گھیرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ تمہیں بہت ٹھکانے لگوانے کی کوشش کرے گا جس سے اس کی شبہ تک نہیں جائے گا۔ میں نے تو تمہیں صرف اس آگاہ کرکے ایک نیکی کمانے اور ایک اچھا دوست بنانے کی ہے۔ تم یہ سب کچھ معلوم ہوجانے کے باوجود نہیں بگاڑ سکو گے۔ اس لئے میں کہہ رہی ہوں کہ میں نقصان نہیں پہنچا رہی۔ صرف تمہیں تھوڑا سا فا ہوں۔"

"یعنی تم عملی طور پر میرا کوئی ساتھ نہیں دو گی؟" پوچھا۔

"ہرگز نہیں۔" وہ بلا تامل بولی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ میں کتے کی..... بلکہ یوں کہو کتیا کی

چاہتی۔" اس نے جواب دیا۔

"اگر میں تمہیں ہر طرح کا تحفظ فراہم کرنے کا وعدہ کروں؟" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

"نہیں اب رسک لینے کے دور سے گزر چکی ہوں۔"

"تمہیں ایک داشتہ کی زندگی پسند ہے؟"

"مجھے داشتہ کی زندگی پسند نہیں... لیکن وہ سب کچھ پسند ہے جو داشتہ بن کر مجھے حاصل ہوا۔ یہ تحفظ..... یہ ٹھاٹ باٹ....." اس نے چاروں طرف اشارہ کیا "بعض لڑکیاں سب کچھ لٹا کر شوبزنس میں آنے اور اچھی بھلی اسٹار بن جانے کے بعد بھی یہ کچھ حاصل نہیں کرپاتیں جو میرے پاس ہے۔"

"لیکن ان کے پاس شہرت کی کشش ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔

"شہرت کی طرف سے میں نے صبر کرلیا ہے۔ شہرت عملی طور پر فائدے کی نہیں، نقصان کی چیز ہے۔ شہرت بھی در حقیقت لوگ انہی آسائشوں کے لئے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ورنہ شہرت کا خود اپنا تو کوئی مصرف نہیں ہے۔ انسان کی ننانوے فیصد جدوجہد کا محور و مرکز دولت ہے۔"

"شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ اسی لئے دنیا کا یہ حال ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بلکہ میں اس میں یہ اضافہ کرنا چاہوں گا کہ ننانوے فیصد انسانوں کی ننانوے فیصد جدوجہد کا محور و مرکز دولت ہے۔"

"ہاں، یوں بات زیادہ صحیح ہوگئی ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "بہر حال..... داشتہ کے طور پر میری "سزا" جلد ختم ہوجائے گی۔ پیر دانش کو مجھ سے کتنا ہی خصوصی لگاؤ سہی لیکن سال دو سال بعد یقیناً اس کا دل مجھ سے بھر جائے گا۔ میں اس فکر میں ہوں کہ اس دوران اس سے زیادہ سے زیادہ دولت کھینچ لوں۔ اس کے بعد ویسے بھی میں یہ ملک چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔"

"واہ..... تمہاری سوچ تو کسی رشوت خور بیورو کریٹ سے ملتی ہے۔"

"دراصل مجھے اندیشہ ہے کہ پیر دانش نے مجھے آزاد کردیا تب بھی میں صحیح معنوں میں آزاد تو نہیں ہوں گی۔ میری حیثیت اس چچوڑی ہوئی ہڈی کی سی ہوگی جسے اپنے دسترخوان سے اٹھا کر کتے بلیوں کے سامنے پھینک دیا جاتا ہے۔ میں وہ ہڈی بننا نہیں چاہتی۔ معلوم نہیں زندگی کس طرح گزرے..... آخر عمر میں کیا حشر ہو۔ میں چپکے سے باہر نکل جاؤں گی اور کہیں سیٹل ہوجاؤں گی۔ اس قید خانے سے نکلنے کے بعد میں اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ قید نما آزادی کا دوسرا دور شروع نہیں کرنا چاہتی۔"

"اگر میں پیر دانش کو بتادوں کہ تم نے مجھے یہ سب باتیں بتائی ہیں تو.....؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔

"میں نے اس توقع پر تمہیں دوست نہیں بنایا کہ تم اتنے گھٹیا آدمی بھی ثابت ہوسکتے ہو۔" وہ بولی "بہر حال..... یہ دنیا ہے... یہاں کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اگر تم نے ایسا کیا تب بھی مجھے امید ہے کہ میں پیر دانش کو یقین دلانے میں کامیاب ہوجاؤں گی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔"

میں نے اس کا کندھا تھپکتے ہوئے کہا "میں مذاق کررہا تھا۔ تم نے جس طرح آنکھیں بند کرکے میری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے میں اس کا اتنا گھٹیا جواب واقعی نہیں دے سکتا۔ اچھا... یہ بتاؤ تمہیں ظفر جمال کے بارے میں کچھ معلوم ہے؟ وہ کہاں ہے یا اسے کہاں تلاش کرنا چاہئے؟"

"اس کے بارے میں جب پیر دانش کو کچھ معلوم نہیں تو مجھے کیسے معلوم ہوسکتا ہے۔" وہ بولی "بہر حال وہ بڑا مضبوط انسان ثابت ہوا۔ اس نے ایک بار سر اٹھایا تو پھر جھکایا نہیں۔ وہ ابھی تک روپوش رہنے میں کامیاب ہے اور پیر دانش حقیقتاً اس کی طرف سے خوف زدہ ہے۔ وہ گھر کا بھیدی ہے۔ لنکا ڈھا سکتا ہے۔"

"اس صورت میں تو پیر دانش کو محض رقم کے لئے اس سے اتنا اختلاف نہیں بڑھانا چاہئے تھا۔ جب اور معاملات میں وہ روپیہ پانی کی طرح بہاتا ہے تو اسے بھی رقم دے کر اس کا منہ بند کرنا چاہئے تھا۔" میں نے کہا۔

"بس..... جب بات بگڑتی ہے تو شاید یونہی بگڑتی چلی جاتی ہے۔ کوئی چھوٹی سی خلیج اتنی بڑی ہوجاتی ہے کہ پھر کوئی اسے نہیں پاٹ سکتا۔ دونوں طرف سے اَنا کی دیوار کچھ زیادہ ہی بلند ہوگئی۔" وہ بولی۔ اس کی بات میں بڑی گہرائی تھی "پیر دانش سے تو خیر ایسے رویئے کی توقع کی جاسکتی تھی لیکن حیرت مجھے ظفر جمال پر ہے۔ اس نے بڑی استقامت کا مظاہرہ کیا۔ اپنا سب کچھ داؤ پر لگادیا۔ حتیٰ کہ وہ اس لڑکی کو بھی کھو بیٹھا جس کی وجہ سے در حقیقت اس کے ذہن میں بغاوت نے اتنی مضبوطی سے جڑ پکڑی تھی۔ معلوم نہیں اب وہ کہاں ہے اور کیا کرتا پھر رہا ہے۔"

کمرے میں چند لمحے سکوت رہا۔ ہم کافی ختم کرچکے تھے۔ میرے رگ و پے میں ایک خفیف سی سنسناہٹ تھی۔ حقائق کی وہ الجھی ہوئی زنجیر جس نے مجھے پریشان کررکھا تھا اس کی تمام کڑیاں مل گئی تھیں۔ ساری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ اب اصل سوال یہ تھا کہ میں اس سلسلے میں کیا کرسکتا تھا... یا مجھے کیا کرنا چاہئے تھا؟

اس سوال پر میں کسی شریفانہ ماحول میں تنہا بیٹھ کر ہی اطمینان سے غور کرسکتا تھا۔ اس کافر ادا حسینہ کے پہلو میں بیٹھ کر تو ایسے اہم فیصلے نہیں کئے جاسکتے تھے۔ میں نے کھڑکی کا پردہ ذرا سا ہٹا کر دیکھا۔ سپیدۂ سحر نمودار ہورہا تھا۔

"میرا خیال ہے مجھے اب چلنا چاہئے۔" میں نے کہا۔

"تم تو فون پر کسی سے کہہ رہے تھے کہ وہ دعا کرے تمہارا یہاں قیام زیادہ سے زیادہ طویل ہو۔" وہ شریر مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"دل تو میرا یہی چاہ رہا ہے کہ یہیں پڑا رہوں لیکن کیا کروں اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن خبردار رہو۔ میں پھر آؤں گا۔ چور نے اب گھر دیکھ لیا ہے۔"

"اب روز روز تو یہ طریقہ کارگر نہیں رہے گا جس طرح آج آئے ہو۔" وہ بولی "ظاہر ہے تم گارڈز کو ہلاک کرکے تو نہیں جاؤ گے۔"

"نہیں، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" میں نے تائید کی۔

"اس صورت میں وہ آئندہ زیادہ محتاط رہیں گے۔ وہ اس واقعے کی پیر دانش کو رپورٹ بھی دیں گے گو کہ اس سے انہیں پیر کے غیظ و غضب کا نشانہ بننے کا بھی اندیشہ ہوگا کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی گھر میں گھس گیا۔ شاید وہ تمہارا حلیہ بھی بیان کریں اور پیر دانش سمجھ جائے کہ وہ تم تھے۔"

"تم کیا کہانی سناؤ گی؟" میں نے جاننا چاہا۔

"میں تو یہی کہوں گی کہ کوئی گھر میں گھسا تو تھا لیکن مجھ تک نہیں پہنچ سکا۔ میں ڈبل دروازے مقفل کرکے اس کمرے میں بند ہوکر بیٹھ گئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم وہ کہاں کہاں پھر کر اور کیا کچھ کرکے چلا گیا۔" وہ بولی۔ پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا "گارڈز سے بھی میں یہی کہوں گی اور میں ہی جاکر انہیں گیٹ ہاؤس سے نکالوں گی۔ کیوں نہ میں انہیں سمجھانے کی کوشش کروں کہ اس واقعے میں چونکہ کسی کا کچھ نہیں بگڑا اس لئے بہتر ہے پیر دانش سے اس کا ذکر نہ کیا جائے۔ مجھے یقین ہے وہ خوشی سے مان جائیں گے کیونکہ دل میں تو وہ بھی یہی چاہ رہے ہوں گے۔"

"ہاں، تجویز تو ٹھیک ہے۔" میں نے ایک لمحے سوچ کر کہا "فی الحال یہ بات پیر دانش تک نہ ہی پہنچے تو اچھا ہے۔"

"آئندہ اندر آنے کی ترکیب بھی میں تمہیں بتادیتی ہوں۔" وہ ڈریسنگ ٹیبل سے چابیوں کا گچھا اٹھاتے ہوئے بولی جو میں ایک گارڈ کی بیلٹ سے نکال کر لایا تھا۔ اس نے اس میں سے تلاش کرکے ایک چھوٹی سی چابی نکال لی۔

وہ چابی میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی "بنگلے کی پچھلی دیوار میں درختوں کی اوٹ میں بالکل چھوٹا سا ایک گیٹ ہے جو کبھی استعمال نہیں ہوتا۔ ایک عرصے سے اسے کسی نے نہیں کھولا۔ اس میں ڈلش لاک لگا ہوا ہے۔ یہ اس کی چابی ہے۔ سنبھال کر رکھو۔ رات کو کسی وقت تم چپکے سے وہ گیٹ کھول کر اندر آسکتے ہو۔"

"تم... آنے سے پہلے میں فون کرکے اطلاع دے دیا کروں گا تاکہ تم... باہر سوئمنگ پول پر ہی مل جایا کرو۔" میں نے بڑی خوشی سے کہا۔

"یہ حماقت مت کرنا۔" اس نے یہ کہہ کر میری خوشی پر پانی پھیر دیا "میرا خیال ہے کہ میرا ٹیلی فون ٹیپ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ عین ممکن ہے کہ کسی بھی وقت پیر دانش یہاں موجود ہو۔ اور جب وہ یہاں ہوتا ہے تو فون وہی اٹھاتا ہے۔ تمہیں جب بھی آنا ہوگا بغیر اطلاع ہی آنا ہوگا البتہ ہم ایک سگنل مقرر کرلیتے ہیں۔ اسی گیٹ کے قریب کونے میں دیوار پر بلندی پر ایک نیلا گلوب لگا ہوا ہے، اگر وہ گلوب روشن ہو تو تم سمجھا کرو کہ لائن کلیر ہے۔ اگر گلوب بجھا ہو تو پھر اندر آنے کی ضرورت نہیں۔ میں وہ گیٹ اور گلوب ابھی تمہیں دکھادوں گی۔"

میں ہنس دیا۔ وہ ترچھی نظر سے میری طرف دیکھ کر بولی "ہنس کیوں رہے ہو؟"

میں نے کہا "عورت کسی کو بلانا چاہے تو بند قلعے میں بھی راستہ نکال لیتی ہے۔ نہ بلانا چاہے تو کھلے میدان میں بھی راستہ نہیں دیتی۔"

"گھاگ مردوں والی باتیں مت کرو۔" وہ ہلکی سی تنبیہہ کے انداز میں بولی "اور ہاں چابیوں کا یہ گچھا گھر میں ہی چھوڑ جانا۔ میں گارڈز کو یہی بتادوں گی کہ یہ مجھے راستے میں پڑا ملا تھا، معلوم نہیں کیوں نامعلوم شخص اسے یہیں پھینک گیا۔ امید ہے چھوٹی چابی کی کمی کو کوئی محسوس نہیں کرے گا کیونکہ وہ کبھی استعمال نہیں ہوتی۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "کوئی گارڈ یہ پوچھنے کی جرأت تو نہیں کرے گا کہ اس "نامعلوم شخص" نے تمہارے بیڈروم کا تالا کھول کر اندر گھسنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟"

"میرے بیڈروم کی چابی اس گچھے میں نہیں ہے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا "میرے بیڈروم کی چابی صرف پیر دانش کے پاس ہے۔"

"تمہارے پاس اس گھر کی کوئی چابی نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے خود استہزائی کے سے انداز میں مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلادیا۔ پھر سر جھکاتے ہوئے بولی "میں نے بتایا نا۔ میں دیو کے محل میں قید شہزادی ہوں۔ اس کی عدم موجودگی میں سوئی رہتی ہوں۔ وہ آتا ہے تو جگا لیتا ہے۔"

"لیکن اس وقت تو تم کچھ زیادہ ہی بیدار اور ہوشیار ہو۔ بلکہ اپنے ساتھ تم نے مجھے بھی جگا رکھا ہے۔" میں نے کہا۔

"آج کی بات اور ہے۔ آج کی رات میری زندگی کی دلچسپ اور سنسنی خیز راتوں میں سے ایک ہے۔ تم نے ڈرامائی انداز میں اندر آکر اس سنسنی کو اور بڑھادیا۔ برسوں بعد میں نے اپنی زندگی میں یہ ڈرامائیت اور سنسنی محسوس کی ہے۔" اس کی آواز میں گنگناہٹ تھی۔

"اس سے پہلے کہ یہ سنسنی مجھے پھر اپنی لپیٹ میں لے لے... میں چلتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

فرح نے مجھے اس چھوٹے سے عقبی گیٹ کے راستے ہی رخصت کیا جس کا اس نے ذکر کیا تھا۔ اس نے مجھے وہ نیلا گلوب بھی دکھادیا جسے ہم نے سگنل مقرر کیا تھا۔ اس نے کہا تھا اگر میں اس گلوب کو روشن دیکھوں تبھی چھوٹے گیٹ کا تالا کھول کر اندر آؤں ورنہ اندر آنے کی کوشش نہ کروں۔

مجھے پچھلی گلی سے گھوم کر اگلی گلی میں آنا پڑا کیونکہ میری گاڑی وہاں کھڑی تھی۔ میں نے اسے بنگلے کے اندر لانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ میں جب گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے رخصت ہوا تو شب رفتہ کا خمار جلد ہی میرے ذہن سے اُتر گیا اور اَن گنت اُلجھے اُلجھے خیالات نے ذہن پر یلغار کردی۔

فرح بہت ہی حقیقت پسند اور سفاکی کی حد تک عملی لڑکی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے پیردانش کا ہرراز، اس کے دل کی ہر بات..... اور اپنے بھی دل کی ہربات مجھے بتادی تھی لیکن پیردانش کے خلاف استعمال ہونے سے صاف انکار کردیا تھا۔ اس کا والہانہ پن، اس کا جوش و خروش اور میرے لیے اس کے جذبات اپنی جگہ تھے لیکن وہ کوئی خطرہ مول لینے اور اپنی پُرتعیش زندگی کو ڈسٹرب کرنے کے لیے تیار نہیں تھی حالانکہ میں نے اسے انہی تمام آسائشوں کی بھی پیشکش کی تھی جو اسے پیردانش نے مہیا کی ہوئی تھیں لیکن وہ اس لالچ میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اسے بیچ میں لائے بغیر اور اسے کسی خطرے سے دوچار کیے بغیر پیردانش کے خلاف خواہ کچھ بھی کرتا رہوں، اسے کوئی پروا نہیں ہوگی۔

بہرحال اس سے ملاقات بہت فائدہ مند رہی تھی۔ یہ رات صرف اسی کے لیے نہیں، میرے لیے بھی سنسنی خیز اور ڈرامائیت سے بھرپور تھی۔ ایک مدت بعد فرح جیسی لڑکی سے ملاقات ہوئی تھی جو نفیس ہونے کے ساتھ ساتھ ذرا مختلف بھی تھی۔ اپنے دامن میں زندگی سے بھرپور، اَن گنت وحشی جذبے چھپائے ہوئے تھی۔ وہ دوسرے کی رگ رگ میں بھی زندگی بھردینے کا ہنر جانتی تھی۔ یہ میرے نزدیک بڑے افسوس کا مقام تھا کہ اتنی شاندار لڑکی پیردانش جیسے بے ہودہ آدمی کے پنجے میں تھی۔

میرا ارادہ تھا کہ رات کو اس سے پھر ملنے آؤں گا۔ گو کہ اس سے ملاقات یقینی نہیں تھی لیکن قسمت آزمائی میں کوئی حرج نہیں تھا۔ پیردانش باہر گیا ہوا تھا۔ گوکہ وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا۔ مڈل ایسٹ ہی گیا تھا لیکن امید تھی کہ اس کی واپسی میں کم از کم دو تین دن تو لگ ہی جائیں گے۔ فرح سے ملاقات نے دل و جان کو جو راحتیں بخشی تھیں وہ تو اپنی جگہ تھیں لیکن معلومات میں بھی بہت اضافہ ہوا تھا۔ حالات پر چھائی ہوئی دُھند چھٹ گئی تھی۔ بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے تھے۔ بہت سے معمّے حل ہوگئے تھے۔ میں نے جب اسے اچانک ائرپورٹ پر دیکھا تھا تو مجھے گمان تک نہیں تھا کہ محض اس کا تعاقب کرکے میں اس طرح اس سے مل بیٹھوں گا اور یوں اتنے رازوں سے پردے اُٹھتے چلے جائیں گے۔

میں جب اس بند گلی سے نکلا تو صبح کا اجالا پوری طرح پھیلا تھا۔ فضا سرمئی تھی اور ڈیفنس کی گلیوں میں رات سے زیادہ سناٹا تھا۔ میری گاڑی پر اوس جمی ہوئی تھی۔ غنیمت تھا کہ ... میں کھڑی ہونے کے باوجود کسی نے گاڑی پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اگر کوشش کی بھی ہوگی تو یقیناً ناکام رہا ہوگا کیونکہ اس گاڑی میں کچھ خصوصی حفاظتی انتظامات موجود تھے۔

میں ہوٹل پہنچا تب بھی میرے ذہن میں کھچڑی سی پک رہی تھی لیکن میں کسی نہ کسی طرح اس کھدبد پر قابو پاکر لمبی تان کر سوگیا۔ دوپہر کو میری آنکھ کھلی۔ میں نے شاور لے کر ہلکا پھلکا لباس یعنی شلوار قمیص پہنا اور نیچے جانے کے ارادے سے کمرے سے نکلنے لگا۔ میرا ناشتا گول ہوگیا تھا اور گزشتہ رات بھی میں نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ فرح نے خود کھانا کھانے یا اس سلسلے میں مجھ سے کچھ پوچھنے کا تکلف بھی نہیں کیا تھا۔ اس وقت کھانے کا کمبخت کو ہوش تھا۔ اب دوپہر کے کھانے کا وقت تھا اور زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ میں کھانے کے ارادے سے جانے لگا تھا لیکن پھر میں نے سوچا پہلے شفیع شاہ سے فون پر بات کی جائے۔

مجھے نہیں معلوم تھا، وہ اس وقت کہاں تھا اس لیے میں نے اس سے موبائل فون پر رابطہ کیا اور اس سے پوچھا "تم اس وقت کہاں ہو؟"

"سر! میں محاورتاً اس وقت عین آپ کی ناک کے نیچے ہوں" اس نے جواب دیا۔

"کیا مطلب؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"سر! میں آپ کے آفس میں ہوں اور کمپنی کے مہمانوں کو مصروف رکھنے کی کوشش کررہا ہوں" اس نے جواب دیا "مجھے پتا چلا تھا کہ آپ علی الصباح ہوٹل پہنچے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ آپ تھکے ہوئے ہوں گے۔ آرام کررہے ہوں گے۔ اس لیے میں نے آپ کو ڈسٹرب نہیں کیا۔"

میں نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا "تھکا ہوا تو میں اس وقت بھی نہیں تھا۔ یونہی ذرا رسماً سوگیا تھا..... اور اس وقت میں آپ کو جتنا تازہ دم محسوس کررہا ہوں، اس کا تم اندازہ نہیں کرسکتے۔"

"میں اندازہ کرسکتا ہوں سر!" وہ شگفتہ لہجے میں بولا۔

"اگر اس وقت سلویا تمہارے پاس موجود ہے تو تمہیں بھی کچھ نہ کچھ تازہ دم تو ہونا چاہیے۔ خوب صورت لڑکی ہے" میں نے کہا۔

"لیکن اس کے ساتھ اس کے دانشور قسم کے والد صاحب بھی تو ہیں سر!" وہ کراہ کر بولا "میں تازہ دم ہونے کے مراحل سے بہت دور ہوں۔ ابھی تو میں صرف مغزماری کے مراحل میں ہوں" بات چیت چونکہ اردو میں ہورہی تھی اس لیے شفیع شاہ بے تکلفی سے بات کررہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ مسٹر برائن اور سلویا اردو ذرا بھی نہیں جانتے تھے۔

"دل چھوٹا نہ کرو برخوردار! لڑکی انگریز ہے۔ تازہ دم ہونے کے مراحل تک پہنچنے میں دیر نہیں لگے گی۔ صرف تمہارے فرمائش کرنے کی دیر ہے۔ لڑکی کے والدِ گرامی تو شاید اسے تمہارے ساتھ ڈیٹ پر جاتے دیکھ کر خوش ہوں گے کہ صاحب زادی پاکستان میں بھی فوراً مقبولیت کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں" میں نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔

"لیکن سر..... وہ تو باربار آپ کے بارے میں پوچھے جارہی تھی۔"

"اس سے یہ مطلب ہرگز مت لینا کہ وہ مجھ پر عاشق ہوگئی ہوگی" میں نے گویا اسے تسلی دی۔

"بہرحال..... وہ آپ کے بارے میں تشویش اور تجسس میں ضرور مبتلا ہے۔ شاید اس نے اس میں اپنی توہین بھی محسوس کی ہو کہ آپ اس جیسی خوب صورت اور سفید فام لڑکی کے ہوتے ہوئے ایک دیسی لڑکی کے پیچھے بھاگ لیے" شفیع شاہ بولا۔

"اوہ.....!" میں نے کراہ کر کہا "کیا انہیں اندازہ ہوگیا تھا کہ میں لڑکی کے پیچھے بھاگا ہوں۔"

"ظاہر ہے سر! اب وہ یہ تو نہیں سمجھ سکتے تھے کہ آپ بڑی بڑی مونچھوں والے ان گارڈز کے پیچھے بھاگے ہوں گے لیکن سر.....! یہ بے چارے ہیں بڑے وضع دار لوگ..... بظاہر انہوں نے آپ ہی کی بات پر اعتبار کیا ہوا ہے اور باربار افسوس کے ساتھ یہی کہے جارہے تھے کہ بے چارے افضل صاحب کو اچانک ضروری کام یاد آنے کی وجہ سے بھاگنا پڑا۔"

"ان کی اس وضع داری پر میں ان کا شکرگزار ہوں" میں نے کہا۔

شفیع شاہ کو جیسے کچھ یاد آیا "سر! یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ میں فی الحال آپ کو ایک ضروری بات بتانا چاہتا ہوں۔ آپ نے مجھے ایک مشہور آرٹسٹ سے رابطہ کرنے کی ہدایت کی تھی جس کی ایک مشہور پینٹنگ ہم نے اس بیڈ روم میں آویزاں دیکھی تھی جو موتا کی اس بے ہودہ فلم میں دکھایا گیا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ آرٹسٹ اپنی پینٹنگز کی نمائشوں کے سلسلے میں ملک سے باہر گیا ہوا ہے اور میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کررہا ہوں....." اس کے لہجے میں ہلکا سا جوش و خروش جھلک آیا تھا۔

"ہاں..... مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ یہ کوئی اتنی پُرانی بات تو نہیں جو تم مجھے اس طرح یاد دلا رہے ہو" میں نے کہا۔

"سر! سیاق و سباق کے ساتھ بات کرنا پھر بھی بہتر رہتا ہے" شفیع شاہ مدبرانہ لہجے میں بولا "میں آپ کو یہ بتانا چاہتا تھا کہ اس آرٹسٹ سے میرا رابطہ ہوگیا اور اس نے بلا تامل مجھے بتادیا کہ اس کی وہ پینٹنگ کس نے خریدی تھی۔ سر! آپ اس شخصیت کا نام سُن کر حیران رہ جائیں گے۔"

"نہیں شفیع ڈیئر! میں اس کا نام سُن کر ہرگز حیران نہیں ہوں گا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کیونکہ مجھے اس کا نام معلوم ہوچکا ہے۔ اس کا نام پیردانش ہے۔ تم مجھے یہی بتانا چاہتے تھے نا؟"

"یس سر!" وہ قدرے مایوسی سے بولا۔

"اب اس..... معاملے میں سر کھپانے کی ضرورت نہیں" میں نے کہا "اس سارے دھندے کی تفصیلات سامنے آگئی ہیں۔ تمام گتھیاں سُلجھ گئی ہیں۔ اس سارے ریکٹ کی تہ میں پیردانش ہی نکلا۔"

"لگتا ہے آپ کی رات بڑی معلومات افزا جگہ پر گزری ہے" شفیع شاہ ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولا۔ اس کا موڈ یقیناً بہت ہی خوش گوار تھا۔ میں نے فون پر شاذونادر ہی اس کی ہنسی سنی تھی۔ لگتا تھا سلویا کی صحبت غیر محسوس طور پر اپنے اثرات دکھارہی تھی۔

"ہاں شفیع شاہ!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "وہ واقعی بڑی معلومات افزا جگہ تھی۔ تم تصور نہیں کرسکتے میرے علم میں کتنا اضافہ ہوا ہے۔"

"پیردانش بھی آخر پیرِفرتوت یا پیر تسمہ پا قسم کی چیز ہی نکلا" شفیع شاہ بولا۔

"ان سے بھی زیادہ گھٹیا اور زیادہ خطرناک" میں نے جواب دیا "مسئلہ یہ ہے کہ اب اس کے سلسلے میں کیا کیا جائے؟ موتا کو قتل بھی اسی نے کرایا ہے لیکن اس کے خلاف ہمارے پاس کوئی ٹھوس اور واضح ثبوت نہیں۔ کوئی ایسا ثبوت جو اسے اس کے کرتوت کے مطابق ایسی سزا دلواسکے جس کا وہ مستحق ہے۔"

"تو پھر اسے ذاتی عدالت سے سزا دلوادیتے ہیں۔ اس کا پتّا صاف کردیتے ہیں" شفیع شاہ دھیمی آواز میں بولا۔

"میرے خیال میں یہ ٹھیک نہیں رہے گا۔ میں نے اس امکان پر غور کیا تھا" میں نے کہا "اس سے ہمارے لیے اُلجھنیں کھڑی ہوسکتی ہیں اور میں فی الحال اُلجھن مول نہیں لینا چاہتا۔ خدا خدا کرکے ہمیں ذرا سکون کی سانس لینا نصیب ہوا ہے۔"

"ویسے..... اتفاق سے ہی ایک باریک سا ثبوت میرے پاس محفوظ ہوگیا ہے۔ اگر وہ کسی کام آسکے....." شفیع شاہ گویا کچھ سوچتے ہوئے بولا "اس آرٹسٹ سے جب میرا رابطہ ہوا اس وقت میں یونہی احتیاطاً آفس والے اس فون پر بات کررہا تھا جس پر بات چیت ٹیپ کی جاسکتی ہے۔ آرٹسٹ کی اپنی آواز میں یہ بات ریکارڈ ہوچکی ہے کہ اس نے وہ پینٹنگ پیردانش کے ہاتھ فروخت کی تھی۔ وہی پینٹنگ اس بے ہودہ فلم میں دیکھی گئی تھی۔"

"یہ واقعی بہت باریک سا ثبوت ہے۔ اس کی بنا پر عدالت میں

کوئی بڑا فیصلہ ہونا بہت مشکل ہے۔ پیردانش جیسے لوگ اپنے بچاؤ کے لیے شاطر وکیلوں کی ایک پوری فوج لا کر عدالت میں کھڑی کرسکتے ہیں جو اس ثبوت کو جھٹلانے کے لیے نہ جانے کون کون سی کہانیاں گھڑ لیں۔ بہرحال تم اس ثبوت کو بھی سنبھال کر رکھو۔ بعض اوقات کوئی معمولی سی چیز بھی بڑا کام دے جاتی ہے" میں نے کہا۔

"آپ کیا واقعی اس خبیث کو قانون اور عدالتوں وغیرہ کے چکر میں گھیرنا چاہتے ہیں؟" شفیع شاہ نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں شفیع شاہ!" میں نے جواب دیا "میں چاہتا ہوں اس سلسلے میں زیادہ سے زیادہ تفصیلات منظرِعام پر بھی آئیں تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ وہ کیسی کیسی شخصیات کو دیوتا بنا کر پوجتے رہتے ہیں۔"

"میں ابھی تفصیلات تو آپ سے سنوں گا... لیکن مجھے اندازہ ہے کہ اس کے گرگوں کا بہت بڑا نیٹ ورک ہوگا۔ جب آپ اس خبیث کو قانون کے شکنجے میں پھنسائیں گے تو ہمیں ان بدمعاشوں کے زیادہ غیظ و غضب اور خونخواری کا سامنا کرنا پڑے گا" شفیع شاہ نے احساس دلایا۔

"اس کی ہمیں زیادہ پروا نہیں کرنی چاہیے۔ اس قسم کے بدمعاش ہمارے لیے کیا اہمیت رکھتے ہیں؟" میں نے کہا "اس غیظ و غضب کے مقابلے میں ہمیں فائدہ بہت بڑا حاصل ہوگا۔ اس قسم کی شخصیات کا سحر ٹوٹنا چاہیے۔ آخر لوگ کب تک بے وقوف بنتے رہیں گے؟"

"قیامت تک سر!" شفیع شاہ نے اطمینان سے جواب دیا "لوگوں میں... خصوصاً ہمارے لوگوں میں بے وقوف بننے کی صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ بس کوئی بے وقوف بنانے والا ہونا چاہیے۔ آپ نے دیکھا نہیں... اچھے بھلے لوگ جنہیں ہم پڑھے لکھوں... بلکہ بعض اوقات دانشوروں میں شمار کرتے ہیں، عجیب عجیب حماقتوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کی باتیں سن کر حیرت ہوتی ہے۔ جب وہ اپنے "حسین" افکار و نظریات پر روشنی ڈالتے ہیں تو تاریکی کو شرم آنے لگتی ہے اور جب وہ اپنی ذہانت سے ہمیں متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو جہالت منہ چھپا کر کسی طرف کو نکل جاتی ہے۔ ان حالات میں ایک پیردانش کے بے نقاب ہونے سے کیا فرق پڑے گا؟"

"کچھ نہ کچھ فرق پڑے گا شفیع شاہ!" میں نے ملائمت سے کہا "سوسائٹی کی شکل بگڑتی بہت تیزی سے ہے۔ سنورتی ذرا آہستہ آہستہ ہے۔"

"ٹھیک ہے سر! میں تو آپ کی بات ماننے والوں اور آپ کے پیچھے پیچھے چلنے والوں میں سے ہوں" شفیع شاہ بولا "آپ نے اسے گھیرنے کا کیا طریقہ سوچا ہے؟"

"فی الحال تو میرے ذہن میں کوئی طریقہ نہیں..." میں نے اعتراف کیا "لیکن مجھے یقین ہے کوئی نہ کوئی طریقہ نکل ہی آئے گا۔ انسان ایک بار کسی اچھے کام کا ارادہ تو کرکے دیکھے۔ اسباب خود بخود نکل آتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے سر! جیسے آپ چاہیں گے ہم پیردانش پر اسی طرح ہاتھ ڈالیں گے۔ وہ بھی کیا یاد کرے گا کہ کس سے پالا پڑا تھا۔ اس نے خود آگے بڑھ کر اپنی شامت کو آواز دی ہے۔ معلوم نہیں اسے کس حکیم نے مشورہ دیا تھا کہ وہ آکر آپ سے ملے۔"

"اپنی دانست میں تو وہ ہمیں گھیر رہا ہے۔ وہ ہم سے کچھ معلوم کرنے اور ہمیں کسی معاملے میں اُلجھانے کی فکر میں ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ویسے بھی وہ ہمارے معاشرے میں پلتے ہوئے فرعونوں میں سے ایک ہے۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں ہوگا کہ اس کا بھی کوئی کچھ بگاڑ سکتا ہے۔"

"اچھا... سر... اس مسئلے کو تو اب بعد میں دیکھنا ہوگا۔ فی الحال جو مسئلہ درپیش ہے اس پر تھوڑی سی توجہ دیجیے۔" شفیع شاہ بولا۔

"فی الحال کیا مسئلہ درپیش ہے بھئی؟" میرے کان کھڑے ہوئے۔

"یہ جو آپ کے مہمان آئے ہوئے ہیں انہیں بھی تھوڑا سا وقت دیجیے۔ حالانکہ کاروباری معاملات میں ان سے طے کرتا جارہا ہوں پھر بھی نہ جانے کیوں انہیں آپ سے ملنے، آپ سے باتیں کرنے اور آپ کے ساتھ وقت گزارنے کا اشتیاق ہے۔ ان کی باتوں سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔"

"یہ تمہاری ہی کوئی کارستانی ہوگی۔ لگتا ہے تم مجھے انگریزوں میں پاپولر کرانے کے مشن پر لگے ہوئے ہو" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

"میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا سر!" شفیع شاہ خوشگوار لہجے میں بولا "میں نے تو ان سے آپ کے بارے میں کوئی خاص بات بھی نہیں کی۔ بڑے میاں آج کے دور کے بزنس مین ہیں، پاکستان کے بارے میں بہت کچھ جانتے ہیں۔ اس کے باوجود ذہن کے کسی گوشے میں کسی ایسے ہی روایت پسند پُرانے انگریز کی روح پھنسی ہوئی ہے جو مشرق کو "پُراسرار مشرق" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے اور جنہیں ہر ایشیائی کے وجود سے پُراسراریت کی بو آتی تھی۔ آپ تو انہیں کچھ زیادہ ہی پُراسرار محسوس ہوئے ہیں۔"

"اوہ... میرے خدا...!" میں کراہا "اللہ میرے حال پر رحم کرے۔ تم نے انہیں سمجھایا نہیں کہ میں ایک سیدھا سادہ بزنس مین ہوں۔"

"مجھے ان کو کچھ سمجھانے کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ براہِ راست آپ کے بارے میں زیادہ بات نہیں ہوئی۔ یہ تو میں آپ کو ان کے وہ محسوسات بتانے کی کوشش کررہا ہوں جنہیں ابھی زبان نہیں ملی۔"

"اوہ... شفیع شاہ! تم نے تو اب لوگوں کے دلوں میں بھی جھانکنا شروع کردیا۔" میں نے گویا پریشان ہو کر کہا "دیکھو... مجھے اس پر تو اعتراض نہیں ہے کہ تم سلویا کے دل میں جھانکنے کی کوشش کرو... لیکن تمہیں کم از کم اس عمر رسیدہ فلسفی نما بزنس مین کے دل میں جھانکنے سے تو پرہیز کرنا چاہیے۔ اس سے تمہاری ذہنی حالت پر بڑے عجیب عجیب اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔"

"سر! آپ بات کو ٹالنے کی کوشش نہ کریں۔ اگر آپ انہیں تھوڑا سا وقت دے دیں تو میں کچھ دوسرے کاروباری معاملات نمٹالوں جو کافی پہلے سے لٹکتے چلے آرہے ہیں۔" شفیع شاہ سنجیدگی سے بولا "میرا دوپہر کا کھانا آج ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کے ایک بہت بڑے افسر کے ساتھ جم خانہ میں طے ہے۔ آپ دوپہر کا کھانا ان باپ بیٹی کے ساتھ کھالیں تو کام بٹ جائے گا اور یہ لوگ خوش بھی ہوجائیں گے۔"

"شفیع شاہ! اگر تم ناشکرے پن پر تُلے ہی ہوئے ہو تو میں تمہارے لیے کیا کرسکتا ہوں۔" میں نے گویا اس کے فیصلے پر اظہارِ افسوس کیا "تم ایک خوب صورت نوجوان، غیر ملکی لڑکی کو چھوڑ کر کسی دیسی کھگے کے ساتھ بزنس لنچ کرنا چاہتے ہو تو میں تمہاری حالت پر افسوس ہی کرسکتا ہوں۔ میں تو خیر ویسے بھی انہی باپ بیٹی کے پاس آنے والا تھا... لیکن کیا تمہارا جانا بہت ضروری ہے؟"

"بہت ضروری ہے سر! آئندہ کے لیے مزید کچھ آسانیاں پیدا کرنے کا مسئلہ ہے۔" شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا۔

"ٹھیک ہے... میں آرہا ہوں۔ تم چلے جانا... لیکن جانے سے پہلے ڈائننگ ہال میں ایک پُرتکلف ایگزیکٹوز لنچ کا اہتمام کراتے جانا" میں نے کہا۔

"وہ سب ہدایات میں پہلے ہی دے چکا ہوں سر! بس اب آپ جلدی سے آجائیے۔"

میں نے فون بند کیا اور شلوار قمیص میں ہی اٹھ کر نیچے جا پہنچا۔ وہ تینوں آفس میں موجود تھے۔ باپ بیٹی کے ہاتھوں میں ڈرنکس تھیں۔ شفیع شاہ چائے پی رہا تھا۔ سلویا سرخ رنگ کے ہاف ٹراؤزر اور سیاہ رنگ کی مختصری بلاؤز نما قمیص میں تھی جسے غالباً اس لیے ہالٹر کہا جاتا تھا کہ اس میں آگے کی طرف کپڑے ہی سے ایک گرہ یا پھندا سا بنا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس ڈیزائننگ کا مقصد یقیناً اس مختصری قمیص کو کچھ اور مختصر بنانا ہی ہوسکتا تھا۔

روایت پسند انگریز زیادہ گرم جوشی کے قائل نہیں ہوتے لیکن وہ باپ بیٹی واقعی کچھ اس طرح ملے جیسے میں ان کے خاندان کا کوئی نہایت اہم، مگر مدتوں سے بچھڑا ہوا فرد تھا۔ فرد بھی ایسا جس سے انہیں کوئی بہت بڑا فائدہ پہنچنے کی امید تھی۔

جب سب دوبارہ سکون سے بیٹھ چکے اور رسمی جملوں کا تبادلہ ہوچکا تو سلویا نے کھنکتی ہوئی سی آواز میں پوچھا "مسٹر افضل! آپ کو اچانک جو ضروری کام یاد آیا تھا وہ ہوگیا تھا؟"

میں نے ٹٹولنے والی نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لیا کہ کہیں موصوفہ طنز تو نہیں فرمارہی تھیں لیکن اس کے چہرے پر سادگی اور معصومیت تھی۔ وہ اگر کچھ جاننا بھی چاہتی تھی تو شاید تجسس اور اشتیاق کے تحت جاننا چاہتی تھی۔ اس کے انداز میں طنز ہرگز شامل نہیں تھا لیکن میرے اس طرح دیکھنے سے وہ کچھ گڑبڑا گئی اور جلدی سے معذرت خواہانہ سے انداز میں بولی "اگر میرا یہ سوال ذاتی ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔ جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ آپ اسے بھول جائیے۔"

"نہیں... ایسی کوئی بات نہیں ہے" میں نے مسکراتے ہوئے اسے تسلی دی "میرا کام تسلی بخش طریقے سے ہوگیا تھا۔"

"یہ تو بہت اچھا ہوا" اس نے سر ہلایا اور جلدی سے موضوع بدل دیا۔ انگریز موسم کی بات کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ انہوں نے چند لمحے موسم پر اظہارِ خیال کیا پھر میری شلوار قمیص کے بارے میں رائے کا اظہار کرنے لگے کہ یہ بڑا آرام دہ لباس تھا اور اب انگلینڈ میں انگریز بھی اس سے روشناس ہوتے جارہے تھے۔ اِکا دُکا انگریز اسے پہنے ہوئے بھی پائے جاتے تھے۔

"مجھے جا کر ذاتی طور پر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہیے کہ انہوں نے ہمارے لباس پر نظرِ عنایت کی" میں نے انکساری سے کہا "ورنہ ہم بے چارے تو ابھی تک آپ کے لباس کو ہی اعلیٰ اور افضل سمجھ کر زیبِ تن کرتے ہیں اور اکڑتے پھرتے ہیں۔"

برائن خوش مزاجی سے بولا "لباس کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ اس پر عزت اور غیرت کے سوال اٹھنے لگیں اور نہ ہی لباسوں کو سرحدوں میں مقید کرنا چاہیے۔ میرے ذاتی خیال میں تو لباس کو کسی قوم کی میراث نہیں ہونا چاہیے۔ جس کو جو اچھا لگے اسے وہ پہن لینا چاہیے..."

"اور اگر کسی کو کچھ بھی اچھا نہ لگے تو بے شک وہ کچھ بھی نہ پہنے۔ اس کے بغیر بھی گزارا ہوسکتا ہے جیسا کہ آج کل زیادہ تر امریکا یورپ وغیرہ میں ہورہا ہے" میں نے لقمہ دیا۔

برائن اور سلویا خوش خلقی سے ہنسے۔ انہوں نے اس ریمارک کا بُرا نہیں منایا۔ برائن اپنا سنجیدہ اظہارِ خیال جاری رکھتے ہوئے بولا "اکیسویں صدی کی آمد آمد ہے۔ ہمیں تو پوری دنیا کے انسانوں کو کچھ مشترکہ آفاقی قدروں کی زنجیر میں پرونے کی باتیں کرنی چاہئیں۔ چہ جائیکہ ہم لباس، زبان اور اس قسم کی چھوٹی چھوٹی باتوں کے فرق پر ایک دوسرے سے دور ہوتے رہیں..."

میں خاموش رہا۔ میں اسے کیا بتاتا کہ ہمارے ہاں اکیسویں صدی اس قسم کی زیادہ بڑی بڑی خلیجیں لے کر آرہی تھی اور ان خلیجوں کو وسیع تر کرنے میں بہت سے ترقی یافتہ ممالک حسبِ توفیق ہاتھ بٹا رہے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ سب سے زیادہ خرابی خود ہم میں تھی۔ ہم کسی اور کو کس منہ سے دوش دے سکتے تھے؟

سلویا نے شاید خطرہ محسوس کرلیا تھا کہ کہیں کوئی سنجیدہ سیاسی بحث نہ شروع ہوجائے۔ اس نے جلدی سے باپ کو ٹہوکا دیا "اب کچھ بزنس کی بات بھی ہوجائے۔"

"اوہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں" برائن نے چونک کر گویا کسی اور ہی دنیا سے واپس آتے ہوئے کہا۔ شفیع شاہ نے کچھ فائلیں میرے سامنے رکھتے ہوئے مجھے بتایا کہ کون کون سے معاملات پر وہ بات چیت کرچکا تھا' کون کون سے معاملات مجھے فائنل کرنے تھے اور آئندہ کے لیے ہمیں کن کن معاملات کی ایک دوسرے کے سامنے وضاحت کردینی چاہیے تھی۔

یہ ایک طرح کی غیر رسمی میٹنگ تھی جس میں اب شفیع شاہ کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ وہ اجازت لے کر اُٹھ کھڑا ہوا اور رخصت ہوگیا۔ ہمارے درمیان باتیں چلتی رہیں۔ کاغذات کے تبادلے ہوتے رہے اور بہت سے کاغذات پر دستخط بھی ہوئے۔ برائن ہماری لیدر کی مصنوعات تیار کرنے والی ایک فیکٹری کا تفصیلی دورہ بھی کرنا چاہتا تھا۔ وہ فیکٹری ہم نے لاہور میں لگائی تھی۔ برائن اپنی ضرورت کے مطابق وہاں کاریگروں کو زبانی خود کچھ ہدایات دینا چاہتا تھا جنہیں تحریری طور پر ایک دوسرے کو سمجھانے میں ذرا دشواریاں پیش آتی تھیں۔ برائن کو اپنے دیگر کاموں کے سلسلے میں لاہور جانا ہی تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہاں راحیلہ اسے فیکٹری دکھادے گی۔ وہ وہاں میری قائم مقام کے طور پر کام کررہی تھی۔

اس پر سلویا نے ذرا آنکھیں گھمائیں مگر کچھ بولی نہیں۔ مجھے اُمید تھی کہ جب وہ ہیڈ آفس میں ایک سیاہ پوش لڑکی کو میری جگہ سنبھالے دیکھے گی تو اسے حیرت کا جھٹکا لگے گا۔ خصوصاً جب وہ کوشش کے باوجود راحیلہ کے چہرے کی جھلک تک نہیں دیکھ سکے گی۔

آخر کار ہماری غیر رسمی میٹنگ ختم ہوگئی۔ ہم نے باتوں باتوں میں ہی... پہلے سے باضابطہ طور پر کوئی پروگرام طے کیے بغیر تقریباً تمام معاملات نمٹادیے تھے۔ جس پر اب برائن اور سلویا کو خود بھی حیرت ہورہی تھی کیونکہ وہ لوگ باقاعدہ وقت طے کرکے' بڑی سنجیدگی سے بریف کیس اُٹھا کر باضابطہ قسم کی میٹنگوں میں ضروری معاملات طے کرنے کے عادی تھے۔ یہاں ہنسی مذاق میں سب کچھ ہوگیا تھا اور انہیں احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ حتیٰ کہ دوپہر کے کھانے کا وقت بھی گزر گیا تھا اور انہیں کھانا بھی یاد نہیں آیا تھا۔ ہیڈ ویٹر نے آکر یاد دلایا کہ ہمیں کھانا کھالینا چاہیے تھے۔ میں برائن اور سلویا کو ساتھ لیے ڈائننگ ہال میں آگیا۔ ایک وی آئی پی میز ہمارے لیے مخصوص کی گئی تھی۔

ہال میں بہت کم لوگ تھے۔ صحیح وقت پر کھانا کھانے والے بیشتر لوگ کھا کر جاچکے تھے۔ ہم لوگوں کے کھانے سے فارغ ہونے تک ہال میں لوگوں کی تعداد کچھ اور کم ہوگئی۔ جو موجود تھے ان میں سے بھی بیشتر کن انکھیوں سے سلویا کو دیکھ رہے تھے۔ ان میں چند سفید فام غیر ملکی بھی شامل تھے۔

ان دنوں میری عادت سی بن گئی تھی کہ جہاں بھی سفید فام غیر ملکیوں کو دیکھتا تھا' ایک آدھ مرتبہ غیر محسوس طور پر اچھی طرح ان کا جائزہ ضرور لیتا تھا کہ کہیں ان میں حُلیے کی کچھ تبدیلیوں کے ساتھ ڈاکٹر برنارڈ تو شامل نہیں تھا۔ میں نے ان غیر ملکیوں کا بھی اچھی طرح جائزہ لیا تھا حالانکہ اپنے ہی ہوٹل میں اس کی موجودگی کی توقع رکھنا محض حماقت تھی۔ دوسرے ڈاکٹر برنارڈ تو سفید فام سے سیاہ فام اور ایشیائی بننے پر بھی قادر تھا۔ اسے سفید فام رہ کر اپنے لیے خطرات بڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟ میرے اپنے کچھ آدمی اور خفیہ محکموں کے کچھ لوگ بھی بدستور اس کی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن ابھی تک کسی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔

ہم لوگ کھانے کے بعد کافی سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ خوش گپیاں بھی جاری تھیں۔ سلویا کافی کی چسکی لینے کے بعد ہر بار اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں کے حلقے میں ٹکالیتی تھی اور یوں گہری نظر سے میرا جائزہ لینے لگتی تھی گویا میں کوئی پیچیدہ قسم کی مشین تھا جسے وہ سمجھنے کی کوشش کررہی تھی۔

سنہرے بالوں کی ایک لٹ بار بار اس کی پیشانی پر ڈھلک آتی تھی جسے وہ مرمریں انگلیوں سے ہٹادیتی تھی۔ آج وہ کل سے زیادہ خوب صورت دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے سُرخ مرطوب ہونٹ اکثر نیم وا رہتے تھے اور ان کے عقب سے موتیوں جیسے دانت جھانکتے رہتے تھے۔ خوب صورتی کے علاوہ اس کا پورا وجود گویا صحت مندی سے بھی دمکتا تھا۔ اس کی سُرخ و سفید بے داغ جلد میں گویا مدھم سی چمک کا احساس ہوتا تھا۔ اس کی شفاف نیلی آنکھوں میں سنجیدگی تھی مگر نہ جانے کیوں احساس ہوتا تھا کہ وہ آنکھیں کہیں اور پہنچی ہوئی تھیں۔

دفعتاً وہ نہایت دھیمی اور گنگناتی سی آواز میں بولی "مسٹر افضل! نہ جانے کیوں مجھے شبہ ہورہا ہے کہ آپ کا دھیان اس وقت گفتگو میں نہیں ہے۔"

"کیا...؟" میں نے محسوس کیا کہ میری آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں۔ یہ بات تو میں اس سے کہنا چاہتا تھا' اخلاقاً نہیں کہہ پارہا تھا۔ اُلٹا اس نے مجھ سے کہہ دی تھی۔

پھر میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میں تو اس وقت چاہوں بھی... تو اپنا دھیان کسی اور طرف نہیں لے جاسکتا۔ کیا ہال میں اس وقت تم سے زیادہ خوب صورت کوئی لڑکی موجود ہے جس کی طرف میں دھیان دوں گا؟"

سلویا جب شیری کی چسکیاں لے رہی تھی تو اس کی آنکھوں میں خمار کی جھلک نظر نہیں آئی تھی لیکن اب اس کی آنکھوں میں نشہ سا جھلک آیا۔ مسٹر برائن بھی خوشی اور فخر سے مسکرانے لگے۔ انگریزوں کے ساتھ بیٹھنے میں یہ فائدہ تھا۔ آپ باپ کے سامنے بیٹھ کر دل کھول کر بیٹی کی تعریفیں کرسکتے تھے۔ اس کے حُسن کے قصیدے پڑھ سکتے تھے۔ والد صاحب آپ کی اس قدر دانی اور جوہر شناسی پر آپ کے شکر گزار ہوسکتے تھے' بُرا نہیں مناسکتے تھے۔

میں نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے مزید کہا "بلکہ یہاں تو کوئی لڑکی سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ میں کوئی پاگل ہوں جو ان حالات میں میرا دھیان کسی اور طرف ہوگا؟"

"آپ بات کو کسی اور طرف گھمانے کی کوشش نہ کریں مسٹر افضل!" وہ ہنستے ہوئے بولی "میری مراد یہ تھی کہ آپ بیٹھے تو ہمارے ساتھ ہیں۔ باتیں بھی ہمارے ساتھ کررہے ہیں لیکن ایسا محسوس ہورہا ہے کہ آپ سوچ کچھ اور رہے ہیں۔"

وہ کم عمر تھی مگر نادان ہرگز نہیں تھی۔ بہت گہری باتوں پر اس کی نظر تھی۔ یقیناً وہ ان چیزوں کو بھی محسوس کرتی تھی جن کی طرف عام لوگوں کی نظر نہیں جاسکتی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا "یہ میری بہت پُرانی بیماری ہے اور تقریباً لاعلاج ہے۔ مینوفیکچرنگ فالٹ ہے۔ اللہ نے صورت ہی کچھ ایسی بنائی ہے کہ لوگوں کو مجھ سے بات کرتے وقت شبہ ہوتا ہے شاید میں کچھ اور سوچ رہا ہوں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ میں اس وقت صرف تمہارے بارے میں سوچ رہا تھا۔"

"کیا سوچ رہے تھے؟" اس نے اپنا حسین چہرہ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں ٹکاتے ہوئے مخمور مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"یہی کہ تمہارے ڈیڈی نے بہت صحیح فیصلہ کیا کہ کاروبار اب تمہارے سپرد کردینا چاہیے۔ مجھے اُمید ہے تم کاروبار اپنے والد سے بہتر چلالوگی" میں نے جواب دیا۔

اس کے چہرے پر خفیف سی مایوسی چھاگئی۔ شاید وہ اس وقت کاروبار کی کوئی بات سُننا نہیں چاہتی تھی۔ بہت دیر وہ کاروبار میں مغز کھپاچکی تھی۔ شاید اس سے زیادہ دیر کے لیے کاروبار میں اُلجھے رہنے کی ابھی اس کے ذہن میں گنجائش پیدا نہیں ہوئی تھی لیکن اس کا باپ خوش ہوتے ہوئے بولا "تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا مسٹر افضل! بالکل ٹھیک...!"

درحقیقت اس وقت خود سلویا کا ذہن کہیں اور تھا۔ شاید وہ کھلی آنکھوں سے کوئی خواب دیکھ رہی تھی۔ اس کے سُرخ ہونٹ کچھ اور سُرخ نظر آنے لگے تھے گوکہ اس نے قطعاً میک اپ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی لپ اسٹک بھی نہیں تھی۔ کوئی اندرونی تپش تھی جو اس کے وجود کو دہکارہی تھی۔ اس کی طرف مسلسل دیکھتے ہوئے میں خود بھی اپنے آپ کو کچھ کم عمر محسوس کرنے لگا تھا۔

میں اس کے بارے میں قطعاً کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ میں چاہتا تھا اس کی شفیع شاہ سے دوستی ہوجاتی تو اچھا تھا لیکن انسان کی طبیعت پر اس کے ماحول اور اردگرد کی بے جان چیزوں تک کے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ وہ تو پھر بھی ایک زندہ سلامت لڑکی تھی جس کی پور پور سے زندگی کا ارتعاش پھوٹ رہا تھا۔ میں خواہ مخواہ ہی اپنے آپ کو ہواؤں میں ہلکورے لیتا محسوس کررہا تھا حالانکہ میں نے ذرا بھی نہیں پی تھی۔

مگر ان تمام خوب صورت محسوسات کے درمیان کہیں کوئی چھوٹی سی بدمزگی تھی' کوئی خلش تھی جو مجھے بے چین کررہی تھی جیسے بہت خوب صورتی سے بچھے ہوئے کسی نہایت عمدہ دسترخوان پر کوئی مکھی بھنبھنارہی ہو۔

جلد ہی مجھے اس کی وجہ معلوم ہوگئی۔ وجہ بہت دور' کونے کی ایک میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ایک سفید فام نوجوان تھا۔ خاصا تگڑا اور دراز قد تھا۔ سر پر اسی طرح رومال باندھا ہوا تھا جس طرح آج کل زیادہ تر لفنگے اور گروہ باز قسم کے نوجوان باندھے پھرتے ہیں۔ آستینیں چڑھی ہوئی تھیں' گریبان کُھلا تھا۔ بڑے بڑے رنگ برنگے پھولوں والی شرٹ' چست جینز اور لمبے جوتوں میں تھا۔ ہونٹوں میں سگریٹ جھول رہی تھی۔ تاریک چشمہ اتار کر اس نے میز پر رکھا ہوا تھا۔ شاید یہ واضح کرنے کے لیے... کہ وہ ایک ٹک سلویا کو گھور رہا تھا۔ شاید وہ یہی چاہتا تھا کہ سلویا اور دوسرے لوگ محسوس کرلیں کہ وہ سلویا میں دلچسپی لے رہا تھا۔

وہ اپنی میز پر تنہا تھا اور بہت دیر سے سلویا کو گھور رہا تھا۔ میں نے ذرا تاخیر سے اسے محسوس کیا تھا۔ شاید اس لیے کہ میں سلویا کی شخصیت کی مقناطیسیت اور اپنے کچھ خیالوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ سلویا کو شاید اب بھی اس کی موجودگی کا احساس نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ سلویا اس وقت اپنے گردوپیش اور ماحول سے بالکل ہی لاتعلق تھی۔ اس کا ذہن تو مجھ سے بھی آگے نہ جانے کہاں پہنچا ہوا تھا ورنہ فطری طور پر اسے اس بات کو مجھ سے بہت پہلے محسوس کرلینا چاہیے تھا۔ لڑکی کو تو بہت دور سے... میٹھی میٹھی نظروں سے بھی کوئی دیکھ رہا ہو تو اسے پتا چل جاتا ہے۔ یہ نوجوان تو اپنی نظریں برمے کی طرح سلویا کے وجود میں اُتارنے کی کوشش کررہا تھا لیکن سلویا شاید ایسی نظروں کی عادی ہوچکی تھی' اب یہ نظریں اس کے محسوسات میں چبھن پیدا نہیں کرتی تھیں اور وہ اپنی دنیا میں مگن رہتی تھی۔

میں حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا کہ میرے ہوٹل میں اس قسم کی مخلوق کہاں سے گھس آئی تھی؟ لیکن ہوٹل بہرحال ہوٹل ہوتا ہے۔ جس کی جیب میں بھی بل ادا کرنے کے پیسے ہوں... بلکہ بعض اوقات تو خواہ پیسے بھی نہ ہوں... وہ منہ اُٹھا کر اندر آسکتا ہے۔ یہ نوجوان تو ویسے بھی سفید فام تھا۔ سفید فام سے مرعوبیت تو ہمارے خون میں شامل ہوچکی تھی۔ سفید فاموں کے بارے میں ایک تجربہ مجھے اور ہوا تھا۔ اپنے ملک میں بھی... اور دوسرے ممالک میں گھومتے پھرتے ہوئے بھی میں نے خصوصاً ان کی نوجوان نسل کے بارے میں یہی محسوس کیا تھا کہ ان کے حُلیے سے ان کی حیثیت اور خاندانی پس منظر کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگانا چاہیے تھا۔ پھٹی ہوئی جینز' میلی شرٹ اور بدبودار جوتوں والا لڑکا کسی کروڑپتی کارخانے دار یا ڈیوک کا بیٹا بھی ہوسکتا تھا۔ کانوں میں بُندے پہنے' میک اپ کیے' لال ہری چینٹ شرٹ پہنے اور ست رنگے کھڑے

بالوں والا کوئی لڑکا کسی پادری کا ناجائز بیٹا یا جائز بھتیجا بھی ہو سکتا تھا۔ بہت عمدہ قسم کے استری شدہ سوٹ اور پالش شدہ جوتوں والا کوئی صاف ستھرا نوجوان جس کے بال بڑے سلیقے سے بنے ہوں' محض کوئی آفس بوائے بھی ہو سکتا تھا۔

چنانچہ میں نے اپنے ذہن میں اس نوجوان کی حیثیت کا تعین کرنے کی تو کوشش نہیں کی لیکن مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا کہ موصوف کو بدمعاش بننے کا کافی شوق تھا اور جس انداز سے اس نے کلائی میز پر ٹکائی ہوئی تھی اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنے رگ پٹھے پر بھی کافی ناز تھا۔ اس کے ایک کان میں بڑا سا بالا جھول رہا تھا۔

میں نے چند لمحے کے لیے اسے ایک ٹک گھورا لیکن اس نے میری طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی..... بالکل اسی طرح جیسے سلویا نے ابھی تک اس کی طرف دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی لیکن میری نظروں کے تعاقب میں اس کی نظریں اس نوجوان تک جا پہنچیں۔

"کسے اس طرح گھور رہے ہو؟" وہ انجان بنتے ہوئے شریر سے لہجے میں بولی۔

"تمہارے ایک قدردان کو" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "بدبخت خواہ مخواہ رقیب بننے کی کوشش کر رہا ہے۔"

سلویا نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا اور دھیمی مگر کھنکتی ہنسی کے ساتھ بولی۔ "ارے چھوڑو اسے..... اس قسم کے لفنگے تو مجھے انگلینڈ میں بھی قدم قدم پر ملتے رہتے ہیں۔ یہاں بھی ایک نظر آگیا تو کیا ہوا۔ میں نے کبھی ان کی پروا نہیں کی۔"

"اس قسم کے لفنگے انگلینڈ میں نظر آتے رہتے تو کوئی فکر کی بات نہیں تھی۔ افسوس تو اسی بات کا ہے کہ یہاں بھی' آتے ہی تمہیں اس قسم کی مخلوق سے واسطہ پڑ گیا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی "اگر تمہیں یہاں بھی کسی لفنگے سے ہی واسطہ پڑنا تھا تو کم از کم لفنگا مختلف قسم کا تو ہونا چاہیے تھا۔"

"مختلف قسم کے بھی مل جائیں گے" وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنس کر بولی "اگر یہاں یا لاہور میں' میں فائیو اسٹار ہوٹلوں کے ماحول سے نکلی..... گلیوں بازاروں میں گئی تو دوسری قسم کے بھی مل جائیں گے..... "مقامی طور پر تیار شدہ نمونے" بھی مل جائیں گے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ آج تک کوئی مجھے زیادہ تنگ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا۔"

اس نے اب بھی گردن گھما کر اس نوجوان کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ تجسس کے تحت بھی نہیں دیکھا تھا لیکن محسوس کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا جیسے وہ اسے کسی غیبی آنکھ سے اچھی طرح دیکھ رہی تھی۔ لڑکیوں میں ایک یہ بھی خوبی ہوتی ہے۔ جب چاہیں' نہ دیکھتے ہوئے بھی کسی کو اچھی طرح دیکھ لیں اور جب چاہیں کسی کو اچھی طرح دیکھتے ہوئے بھی نہ دیکھیں۔ وہ کہہ رہی تھی کہ آج تک کوئی بھی اسے زیادہ تنگ کرنے میں کامیاب نہیں ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ وہ نوجوان' سلویا کا یہ ریکارڈ خراب کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ عین اسی وقت وہ اُٹھ کر ہماری میز کی طرف بڑھتا دکھائی دیا۔

وہ کچھ اس طرح چلتا ہوا ہماری میز تک پہنچا جیسے قدموں کی دھمک سے زمین کو ہلا دینا چاہتا ہو۔ اس کی نظر صرف سلویا پر تھی۔ میں اور مسٹر برائن تو شاید اس کی نظر میں وجود ہی نہیں رکھتے تھے۔ ہم پر تو اس نے ایک نگاہِ غلط انداز بھی ڈالنے کی زحمت نہیں کی تھی۔

"ہائے بے بی...!" وہ بھاری اور مخمور سی آواز میں بولا "ہماری میز پر آجاؤ۔ میں تمہارے لیے ڈرنک منگواتا ہوں" وہ پہلے ہی نشے میں معلوم ہوتا تھا اور اس کے نزدیک کسی لڑکی کے لیے ڈرنک منگوانا گویا حاتم طائی کی قبر پر لات مارنے کے مترادف تھا۔

سلویا کا صبر و سکون اور تحمل قابلِ داد تھا۔ اس نے اب بھی نظر اُٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا اور بدستور مسکراتے ہوئے اسی طرح میری طرف دیکھتی رہی جیسے کہ ہمارے درمیان گفتگو ہو رہی تھی' اس میں کوئی خلل نہیں پڑا تھا' اس نے نہ تو نوجوان کی بات سنی تھی اور نہ ہی اس کی آمد سے باخبر ہوئی تھی۔ میرے خیال میں کسی کو سُلگانے اور اسے اس کی اوقات یاد دلانے کے لیے یہ بہترین ردِعمل تھا۔ میں دل ہی دل میں سلویا کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔ برائن بے چینی سے اپنی نشست پر پہلو بدلنے لگا تھا۔

میں نے نوجوان کو گھورا لیکن اس نے اب بھی میری طرف توجہ نہیں دی۔ سلویا اس کے ساتھ جو سلوک کر رہی تھی' اس کا بدلہ وہ مجھ سے لے رہا تھا۔

سلویا کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ ذرا جھکتے ہوئے بولا "اتنی بے نیازی نہ دکھاؤ بے بی! مانا کہ تم خوب صورت ہو لیکن اس خشک ملک میں تمہیں مجھ سے اچھا دوست نہیں ملے گا۔ آؤ..... کچھ دیر کے لیے کہیں چل کر مزے کرتے ہیں..... تفریح..... عیش..... تم اور میں....."

وہ چونکہ ذرا جھکا ہوا تھا اس لیے اس کی سانسوں کے ساتھ برآمد ہونے والے وہسکی کے بھبکوں سے میں اور برائن "مستفید" ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

میں نے نہایت نرم لہجے اور شائستہ انگریزی میں کہا "پیارے دوست! اگر تم بُرا نہ مناؤ تو تمہارے لیے میرا ایک حقیر سا مشورہ ہے۔ تم باہر جا کر تازہ ہوا میں کچھ دیر چہل قدمی کرو تاکہ تمہاری بہکی ہوئی کھوپڑی کچھ ٹھکانے پر آجائے۔"

اس نے نہایت آہستگی سے سر گھما کر حقارت سے میری طرف دیکھا اور طمانچوں کی جگہ گویا الفاظ میرے منہ پر مارتے ہوئے بولا "تم اپنے کام سے کام رکھو جاہل پاکستانی!"

"میرے پیارے اعلیٰ تعلیم یافتہ انگریز!" میں نے نہایت تحمل سے کہا "یہ جاہل پاکستانی اس وقت اپنے کام سے کام ہی رکھے ہوئے تھا لیکن تم نے آکر کسی اعلیٰ نسل کے گدھے کی طرح اس میں ٹانگ اُڑا دی ہے۔"

اس کے دانت بھیڑیئے کی طرح ہونٹوں کے عقب سے جھانکنے لگے اور آواز گویا پھنکار میں ڈھل گئی۔ وہ گویا اب سلویا کو بھول گیا اور میری طرف جھکتے ہوئے بولا "اپنی زبان کو قابو میں رکھو گندے پاکستانی...!"

حالانکہ میں اس وقت اس سے زیادہ صاف ستھرے حُلیے میں تھا۔ بہت اعلیٰ قسم کا کلون بھی لگائے ہوئے تھا۔ میرے جسم سے اس کی طرح پسینے کی بدبو اور منہ سے شراب کے بھبکے بھی نہیں اُٹھ رہے تھے پھر بھی اس متعصب لنگور کو میں گندہ پاکستانی نظر آرہا تھا۔

میں نے اب بھی اپنی کھوپڑی پر قابو رکھا۔ میں اپنے ہی ہوٹل میں توڑ پھوڑ کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ یہاں کی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ہزاروں کی تھی اور میری نظر میں اس قسم کے کسی لفنگے کی کھوپڑی سے ایک لوکل ایش ٹرے بھی زیادہ قیمتی تھی۔ توڑ پھوڑ' لڑائی جھگڑے اور ہنگامے میں مالی نقصان سے زیادہ ریپوٹیشن اہمیت رکھتی تھی۔

مالی نقصان تو پورا بھی کیا جا سکتا تھا۔ ساکھ ایک بار خراب ہونے کے بعد دوبارہ بنانی بہت مشکل ہوتی تھی۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں معاملات سے نمٹنا زیادہ مشکل ہوتا ہے اور وہ شاید اس کمزوری سے فائدہ اُٹھانے پر تُلا ہوا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ کسی دیٹوپا نتھو کا چھپّر ریستوران نہیں تھا جہاں دو لفنگے لپاڈگی ہو جاتے' لکڑی کی بے ہنگم کرسیاں اور المونیم کے ٹیڑھے میڑھے جگ ایک دوسرے پر چلائے جاتے جن کا اس جنگ و جدل میں کچھ نہ بگڑتا۔ جھگڑا ختم ہوتے ہی..... اور زخمیوں کے اسپتال یا گھر جاتے ہی سب چیزیں اُٹھا کر واپس اپنی اپنی جگہ رکھ دی جاتیں اور دوبارہ گلشن کا کاروبار شروع ہو جاتا۔

جتنی اونچی جگہ تھی اتنے ہی اونچے تہذیب کے تقاضے تھے۔ میں ہوٹل کا مالک تھا' میں اپنے آپ کو زیادہ مجبور محسوس کر رہا تھا حالانکہ میں اس کے تمام ترکسرتی جسم کے باوجود ایک جھٹکے میں اس کی گردن توڑ سکتا تھا۔

مجھے اس کی جراٴتِ رندانہ پر خاصی حیرت بھی تھی۔ ایک اجنبی ملک میں اس طرح اچانک اُٹھ کر تین اجنبیوں کی میز پر چلے جانا اور یوں بدمعاشی دکھانا بڑے حوصلے کی بات تھی۔ میں اُلجھن میں تھا کہ کہیں اس کے پیچھے کوئی سازش تو کام نہیں کر رہی تھی؟

وہ اسی زہریلے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے بولا "اگر تمہیں زبان کو قابو میں رکھنا نہیں آتا تو میں تمہیں اس طرح سکھاؤں گا کہ زندگی بھر نہیں بھولو گے۔ اب میں بیچ میں تمہاری منحوس آواز نہ سُنوں۔ وہ ایک سفید فام لڑکی ہے اور میں اسے ڈیٹ پر چلنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ ہمارے ہاں اسی طرح ہوتا ہے۔ تمہیں اس پر تلملانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"میں تمہاری تہذیب اور تمہارے مینرازم ISM MANNER سے بہت اچھی طرح واقف ہوں اُچکّے!" میں نے اب ذرا بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "لیکن جب لڑکی تمہارے ساتھ جانا نہیں چاہ رہی تو تم کیوں اسے تنگ کر رہے ہو؟"

"یہ میرا اور لڑکی کا معاملہ ہے۔ تم اپنا منہ بند رکھو" وہ پہلے سے زیادہ خونخواری سے بولا۔

برائن پریشان نظر آنے لگا تھا جبکہ سلویا بدستور پُرسکون تھی۔ میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں سلویا سے پوچھا "کیا تم اس لفنگے کے ساتھ جانا چاہتی ہو؟"

وہ اس کی طرف دیکھے بغیر گویا بُرا مناتے ہوئے بولی "کیا میں تمہیں اتنی گری پڑی لڑکی نظر آتی ہوں۔"

میں نے سفید فام نوجوان کی طرف دیکھا اور سرد لہجے میں کہا "اب چلتے پھرتے نظر آؤ اُچکّے! ورنہ یہ شکل اس قابل نہیں رہے گی کہ اسے لے کر اپنے ملک جا سکو۔"

ڈائننگ ہال میں اس وقت زیادہ لوگ موجود نہیں تھے لیکن میں نے محسوس کیا کہ جو موجود تھے ان کی تعداد بھی بڑی تیزی سے مزید کم ہو گئی تھی حالانکہ میں نے اپنی آواز نیچی رکھنے کی پوری پوری کوشش کی تھی تاکہ معززین میں یہ گھبراہٹ نہ پھیلے کہ وہاں کوئی جھگڑا ہونے والا تھا۔ آواز اس نوجوان کی بھی کچھ ایسی بلند نہیں تھی لیکن لہجے کی غراہٹ اور چہرے کے تاثرات بہرحال اصل کہانی سُنانے کے لیے کافی تھے۔

میرا خیال تھا کہ سلویا کا جواب سُننے کے بعد اسے کچھ شرم آجائے گی اور وہ واپس چلا جائے گا لیکن وہ یقیناً ڈھٹائی کا کوئی بہت بڑا ایوارڈ جیتنے کا تہیہ کیے ہوئے تھا۔ اس نے اچانک ہاتھ بڑھا کر سلویا کی خوب صورت کلائی پکڑ لی۔ سلویا دونوں کہنیاں میز پر ٹکائے بیٹھی تھی۔

نوجوان نے ایک جھٹکے سے اسے اس کی جگہ سے اُٹھانے کی کوشش کی۔ سلویا دیکھنے میں ایک نہایت نازک اندام اور نفیس لڑکی تھی۔ اس کی شخصیت سے پھولوں کی سی نزاکت کا احساس ہوتا تھا لیکن اس وقت اس نے کم از کم اتنی مضبوطی ضرور دکھائی کہ وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں۔

نوجوان کو اپنی طاقت پر یقیناً بہت گھمنڈ تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو عموماً گھمنڈ ہوتا ہے۔ شاید اس لیے وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ نوجوان کا اندازہ شاید یہی تھا کہ وہ ایسی ہلکی پھلکی اور نازک اندام دکھائی دینے والی لڑکی کی کلائی پکڑ کر کھینچے گا تو وہ ایک جھٹکے سے اس کے سینے سے آلگے گی۔ اس کی یہ توقع پوری نہیں ہو سکی۔ جس پر یقیناً اسے حیرت کا خفیف سے جھٹکا لگا تھا۔

اس کی یہ حرکت میرے لیے قطعی غیر متوقع تھی۔ اس نے اب تک جس جراٴتِ رندانہ کا مظاہرہ کیا تھا میں تو اسی پر حیران تھا لیکن وہ مجھے اس سے کہیں زیادہ حیرا[illegible] تُلا ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ وہ میرے تحقیر آمیز الفاظ پر اگر کوئی ردِعمل ظاہر کرے گا

تو مجھ کو ہی اس کا نشانہ بنائے گا لیکن اس نے سلویا پر ہاتھ ڈال دیا تھا۔ اس قسم کی حرکتیں تو سفید فام لوگ اپنے ملک میں بھی اس وقت کرتے تھے جب کہیں کوئی اکیلی دکیلی لڑکی نظر آجاتی تھی اور نوجوان گینگ کی شکل میں ہوتے تھے۔ یہ تو اکیلا ہی کمال دکھانے پر تُلا ہوا تھا۔

آخر کار مجھے اُٹھنا ہی پڑا لیکن اب بھی احتیاط مجھ پر غالب رہی۔ میں نے زیادہ شدید ردِّعمل کا اظہار نہیں کیا جس کے نتیجے میں مار دھاڑ، دنگا فساد یا توڑ پھوڑ شروع ہو جاتی۔ تاہم میں اتنی پھرتی سے اُٹھا کہ شاید وہ اسے اپنی نظر کا دھوکا ہی سمجھا ہو۔ ویسے بھی شاید وہ سلویا کو اس کی نشست سے اُٹھانے میں ناکام رہنے کی وجہ سے کچھ پریشان ہو گیا تھا۔

انسان کی گردن اور کندھوں کے درمیان دونوں طرف کچھ مسلز ہوتے ہیں جنہیں اگر صحیح انداز میں پکڑ لیا جائے اور کافی قوت سے دبایا جائے تو اس سے اوپری دھڑ وقتی طور پر مفلوج سا ہو جاتا ہے۔ میرے دونوں ہاتھ سیدھے انہی مسلز پر پہنچے تھے۔ نوجوان کو اتنی مہلت بھی نہیں مل سکی کہ وہ اپنے آپ کو چھڑانے کی کوشش ہی کر لیتا۔

اس کے حلق سے کراہنے کی سی آواز برآمد ہوئی اور اس کے بازو ڈھیلے پڑ گئے۔ سلویا کی کلائی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اس کا چہرہ پہلے سُرخ اور پھر نیلا پڑنے لگا۔ اس کے بازو پہلوؤں میں جھول رہے تھے اگر وہ کوشش کرتا تو شاید لات چلانے میں تو کامیاب ہو ہی جاتا.... اور میں اس کے لیے بھی تیار تھا.... لیکن وہ اتنا بدحواس ہوا کہ کچھ بھی نہ کر سکا۔

چند سیکنڈ میں ہی وہ بار بار اس طرح آنکھیں پھاڑنے لگا جیسے اس کی بینائی زائل ہو رہی ہو۔ ساتھ ہی وہ بار بار اس لنگور کی طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا جس کے پھیپھڑوں میں آکسیجن کی شدید کمی پیدا ہو گئی ہو۔

برائن میری منت کر رہا تھا۔ "مسٹر افضل! اسے چھوڑ دیجئے.... جانے دیں... دفع کریں.... اس قسم کے آدمیوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے۔"

"مسٹر برائن! میں تو اسے کچھ بھی نہیں کہہ رہا" میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "میں تو یونہی ذرا دوستی میں اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر خیر و عافیت دریافت کر رہا ہوں۔"

سلویا اب اطمینان سے ایک ہاتھ پر ٹھوڑی ٹکائے یوں نوجوان کا جائزہ لیتے ہوئے مسکرا رہی تھی جیسے وہ اس کے سامنے کوئی مزاحیہ خاکہ پیش کر رہا ہو۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی تھی کہ وہ اس قسم کی صورتِ حال میں پُرسکون رہنے والی لڑکی تھی۔ برائن بوکھلاہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا تھا لیکن سلویا نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ اس کی نشست پر بٹھا دیا۔ میں نے دل ہی دل میں سلویا کا شکریہ ادا کیا ورنہ مجھے اندیشہ محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں برائن اس نوجوان کو چھڑانے کے لیے میرے بازوؤں پر نہ لٹک جائے۔

کچھ دیر اور یہ منظر اسی طرح برقرار رہا۔ آخر مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں نوجوان بے ہوش نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ وہ آگے پیچھے جھولنے لگا۔ بالآخر ایک کرسی کا سہارا لے کر اس نے اپنے آپ کو سنبھالا۔

میں نے اس کے قریب ہو کر نیچی آواز میں کہا "اب بھی وقت ہے.... یہاں سے چلے جاؤ... یا پھر تم اسٹریچر پر جانا چاہتے ہو؟"

اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے حواس ٹھکانے نہ تھے۔ اس کے بازو کام نہیں کر رہے تھے۔ وہ ایک بازو کرسی کی پشتے پر ٹکاتا تھا تو دوسرا پھسل جاتا تھا۔ چند لمحے وہ ہانپتا اور آنکھیں پٹ پٹاتا رہا۔ بالآخر یوں بڑے سے دائرے میں گھوم کر لڑکھڑاتا ہوا دروازے کی طرف چل دیا جیسے کوئی پُرانا شرابی نشے میں دھت ہونے کے بعد مے خانے سے رخصت ہو رہا ہو۔

آدھے راستے میں پہنچ کر شاید اس کے اوسان کچھ بحال ہوئے اور وہ رک کر مدہوش شرابیوں ہی کے انداز میں ایک بار گھوما اور گھونسا لہرانے کی کوشش کرتے ہوئے تلاہٹ زدہ انداز میں بولا "تم یہ مت سمجھنا کہ میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ تمہیں سبق ضرور سکھاؤں گا..."

میں نے اسے جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور سلویا کی طرف متوجہ ہو گیا جو اب بھی مسکرا رہی تھی۔ برائن نے گویا اس نوجوان کو جاتے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی تھی لیکن اب بھی وہ انکھیوں سے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔

"ہاں.... تو میں کیا کہہ رہا تھا؟" میں نے یوں بات شروع کی جیسے صرف ایک لمحے کے لیے میں کسی اور طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

اس سے پہلے کہ سلویا کوئی جواب دیتی، ہوٹل کے دروازے کی طرف سے دو سیکیورٹی گارڈ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے آئے اور انہوں نے اس نوجوان کو پکڑ لیا۔ شاید کسی ویٹر نے ان سے کچھ کہہ دیا تھا۔ تیسرا گارڈ جلدی سے مجھ سے پوچھنے لگا "سر! کیا مسئلہ ہے؟"

"کوئی مسئلہ نہیں تھا بے وقوفو! اسے فوراً چھوڑ دو" میں نے حکم دیا "ہوٹل میں تماشا لگانے سے ہی تو میں بچنا چاہتا تھا اور تم لوگ تماشا لگانے کی کوشش کر رہے ہو۔ یہاں کچھ نہیں ہوا۔ اس لنگور کے بچے کو جانے دو۔ اسے کوئی غلط فہمی ہو گئی تھی۔"

گارڈ منہ لٹکا کر واپس چلا گیا۔ اس نے جا کر دونوں گارڈز کو بتایا کہ میں کیا کہہ رہا تھا۔ انہوں نے نوجوان کو چھوڑ دیا اور وہ چلتے چلتے ایک بار پھر مجھ پر قہر آلود سی نظر ڈال کر رخصت ہو گیا لیکن میرے خیال میں یہ امکان شاید اب بھی اس کے ذہن میں نہیں آیا تھا کہ میں ہوٹل کا مالک بھی ہو سکتا تھا۔ گارڈ بھی باہر سے باہر ہی واپس چلے گئے۔

برائن گہری سانس لے کر بولا "انسان کو کسی بھی وقت

بھی جگہ لفنگوں سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔"

"بے شک" میں نے تائید کی "ایک تو ویسے ہی آج کل تقریباً ہر ملک لفنگوں کے معاملے میں خود کفیل ہے۔ اوپر سے دوسرے ملکوں کے بھی چلے آتے ہیں۔"

برائن گویا قدرے شرمندگی اور افسوس سے بولا "انگریز ہی معلوم ہوتا تھا۔"

"عین ممکن ہے امریکن رہا ہو" میں نے خیال ظاہر کیا۔

"ہاں... یہ بھی ممکن ہے" برائن نے اتفاق کیا۔

"چھوڑیں... دفع کریں اس منحوس کو۔" سلویا ہاتھ جھٹک کر بولی "ہمیں اس کے بارے میں باتیں کر کے وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں اپنی باتیں کرنی چاہئیں۔ مسٹر افضل! آپ بتائیں آپ مجھے کراچی کے مشہور مقامات کب دکھا رہے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے میں پہلی بار پاکستان آئی ہوں" وہ ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی روشن آنکھوں میں بہاریں رقصاں تھیں۔

"مشہور مقامات...!" میں نے سر کھجایا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ میں نے خود اب تک مشہور مقامات دوڑتے بھاگتے ہی دیکھے تھے۔ وہ بھی کسی اور ہی چکر میں۔ بطورِ خاص کوئی جگہ دیکھنے کے لیے مجھے آج تک صبر و سکون سے کہیں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک خوب صورت نوجوان اور مہربان سفید فام لڑکی کو اِدھر اُدھر گھماتے پھرنے کا تصور خاصا خوش کن تھا لیکن میں کبھی اپنی مصروفیات کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

آج رات بھی میں فرح سے ملنے کے سلسلے میں قسمت آزمائی کرنا چاہتا تھا۔ اس سے ملنے کی کوشش تو اپنی جگہ تھی لیکن دراصل میرے دل میں یہ اُمید بھی کلبلا رہی تھی کہ شاید میں کسی طرح اسے پیردانش کے خلاف اپنا ساتھ دینے کے لیے آمادہ کرنے میں کامیاب ہو جاؤں۔ آنے والے کل میں بھی مجھے بہت سی مصروفیات درپیش تھیں۔ تاہم سلویا کو صاف جواب دینا بھی اس کی نسوانیت کی توہین تھی۔ عام حالات میں اور "خشکی" کے دنوں میں شاید اس سے دوستی استوار ہونا خود میرے لیے بڑی سنسنی کا باعث ہوتا لیکن ان دنوں ذہن نہ جانے کیوں کئی سمتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔

تاہم میں نے اس کی دلداری کے لیے گرم جوش مسکراہٹ کے ساتھ کہا "کیوں نہیں... کیوں نہیں... میں ذرا اپنی مصروفیات کا جائزہ لے کر جلد ہی اس سلسلے میں کوئی پروگرام بناتا ہوں۔"

"جلد ہی...؟" وہ مایوسی سے بولی "میرے پاس تو صرف کل کا دن ہے۔ پرسوں تو ہم لوگ لاہور روانہ ہو جائیں گے۔ بزنس کے معاملات بھی طے ہو چکے ہیں۔ پاپا بھی کل کچھ دوسرے کاموں میں مصروف ہوں گے..."

صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ پاپا کا پتا کاٹنے پر تُلی ہوئی تھی۔ انہیں زبردستی کل "کچھ دوسرے" کاموں میں مصروف کرا رہی تھی۔ وہ اکیلی میرے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ ویسے بھی اس قسم کی ترقی یافتہ قوموں میں لڑکیوں کے والدین بڑے "کشادہ دل" اور[...] ہوتے تھے۔ ایسے موقعوں پر وہ عام طور پر خود ہی معم[...] کرتے تھے۔ یہ ان کی تہذیب کا تقاضا تھا۔

سلویا بات جاری رکھتے ہوئے بولی "میری سمجھ میں[...] میں اس دوران ایک اجنبی ملک... اجنبی شہر میں کیا[...] بوریت سے میرا تو دم گھٹ جائے گا۔"

"اتنا پریشان ہونے کی ضرورت نہیں" میں[...] ہوئے اسے تسلی دی۔ "ہم پاکستانی اتنے ناشکرے[...] ناقدرے نہیں کہ تم جیسی لڑکی کا بوریت سے دم[...] دیں... کچھ نہ کچھ کریں گے... میں صبح تمہیں فون کروں[...] گا۔"

"ویسے تو میں آج شام بھی فارغ ہوں..." سلویا[...] لہجے میں کھلی دعوت تھی۔

"لیکن آج شام مجھے ایک جگہ جانا ہے..." میں[...] کہا۔

"اوہ...!" وہ گہری سانس لے کر بولی اور مجھے ا[...] ہوا کہ وہ لوگ شام کی ملاقاتوں کا عموماً ایک ہی مطلب[...] میں نے جلدی سے وضاحت کی "ایک کاروبار[...] ہے۔"

سلویا کے چہرے پر کچھ رنگ سے لوٹ آئے[...] بڑے اطمینان سے پائپ کے کش لے رہا تھا۔ ہم کچھ[...] کی باتیں کرتے رہے۔ بالآخر ہم نے اٹھنے اور ایک[...] خدا حافظ کہنے کا ارادہ کیا۔

دفعتاً ایک ویٹر میرے قریب آیا اور رازدارانہ[...] ایک تہ شدہ کاغذ میری طرف بڑھاتے ہوئے بولا "[...] پر کوئی اس خاتون کے لیے دے گیا تھا لیکن میں[...] دے دوں تو بہتر ہے۔"

اس نے نہ تو نام لیا تھا اور نہ ہی اشارہ کیا تھا[...] سمجھنا مشکل نہیں تھا کہ اس کی مراد سلویا سے تھی[...] بھی اردو میں کی تھی۔ میں نے کاغذ کھول کر دیکھا۔[...] ٹس انگریزی میں جو پیغام گھسیٹا گیا تھا اس کا مفہوم کچھ[...] ہنی! تم نے میری دعوت قبول نہ کر کے اپنے[...] ہے۔ تم میرے ساتھ چند گھنٹے گزارتیں تو اس[...] فراموش نہ کر پاتیں۔ میرے پاس تمہارے لیے بہت[...] تھیں۔ میں حیران ہوں کہ تم جیسی خوب صورت لڑ[...] گدھے کے ساتھ بیٹھی کیوں وقت ضائع کر رہی[...] نہیں بگڑا۔ باہر آ جاؤ' میں اس ہوٹل کی پیچھے والی[...] انتظار کر رہا ہوں۔ ہم ایک ایسی جگہ چلیں گے جہاں[...] ہوں گے۔ تمہارا... آر۔ ایس۔

میں نے رقعہ پڑھ کر اسے دوبارہ تہ کر لیا۔ سلو[...] بولی "کس کا پیغام ہے؟"

"میرے ایک دوست کا ہے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم [...]اب اپنے کمرے میں چلو۔ تم سے پھر ملاقات رہے گی۔"

سلویا کندھے اچکا کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ برائن نے اس کی تقلید [...]میں ڈائننگ ہال کے دروازے تک ان کے ساتھ گیا۔ وہاں میں نے انہیں خدا حافظ کہا اور راستے کی طرف چل دیا جو [...]گلی میں نکلتا تھا۔ ہوٹل کی اپنی باؤنڈری میں موجود بغلی گلی سے [...]کر میں عقبی گیٹ کے راستے پچھلی گلی میں پہنچ سکتا تھا۔

میری کنپٹیاں تپ رہی تھیں۔ زندگی میں کبھی کبھی انسان کو [...]ضدی اور ڈھیٹ لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو آپ کی تمام تر [...]برداشت کے باوجود آپ کے ہر مسام میں آگ لگا کر رکھ [...]دیتے ہیں۔ وہ ایک ضدی اور کراہیت انگیز مکھی کی طرح آپ کی [...]ناک پر آ جاتے ہیں۔ ناک سے اُڑاؤ تو کان پر... کان سے اُڑاؤ تو [...]ناک پر... اور وہاں سے پھر کان پر... حتیٰ کہ آپ کا خودکشی کرنے [...]کو جی چاہنے لگتا ہے۔ یہ خبیث بھی کچھ اسی قسم کی چیز معلوم ہوتا [...]تھا۔ اسے ذرا زیادہ سخت قسم کا سبق سکھانے کی ضرورت تھی۔ [...]سلویا کے ہاتھوں رسوا ہو جانے کے جھٹکے سے وہ جلد سنبھل گیا تھا۔

میں نے کسی کو ساتھ لینے کی بھی زحمت نہیں کی۔ میرا اندازہ [...]تھا کہ وہ سفید فام شاید اپنے ایک آدھ دوست کو ساتھ لے کر آیا [...]ہو۔ اس وقت اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ بڑا طرّم خاں سمجھ رہا [...]ہوگا۔ اسے یہ تو اندازہ ہوگا کہ ہوٹل کے اندر سے اس کے رقعے [...]کے جواب میں لڑکی کے بجائے میں ہی نکلوں گا۔ وہ غالباً یہی چاہتا [...]تھا۔ میں نے سلویا کے سامنے جس طرح اپنی توہین محسوس کی ہوگی [...]اس کے جواب میں وہ مجھے سبق سکھانے کے لیے تڑپ رہا ہوگا۔ [...]اس کے ساتھ اسی جیسے مزید ایک آدھ لنگور کا ہونا میرے لیے کسی [...]پریشانی کا باعث نہیں تھا۔

ہوٹل کی عقبی گلی کافی طویل تھی اور اس میں سامنے کی طرف [...]تین گلیاں نکلتی تھیں۔ اس گلی میں بہت سے پُرانے اور [...]موٹے موٹے تنوں والے درخت بھی تھے جن کی وجہ سے گلی [...]میں ہر وقت سایہ رہتا تھا اور سرِ شام ہی اندھیرا نظر آنے لگتا تھا۔ [...]گلی پختہ تھی اور درخت گویا پختہ فرش کے درمیان سے ہی [...]نکلے کھڑے تھے۔ اس طرف لوگوں کی آمد و رفت بہت کم [...]تھی۔ اِکّا دُکّا گاڑیاں کھڑی نظر آتی تھیں۔ درختوں پر موجود پرندے [...]چھوٹی موٹی "گل کاریاں" کرتے رہتے تھے۔

[...]میں جب اس گلی میں پہنچا تو وہاں یہی پُرانا منظر میرا منتظر تھا۔ [...]وہ خلافِ معمول دکھائی نہیں دے رہی تھی اور وہ بدبخت بھی [...]نظر نہیں آ رہا تھا جس نے ان ڈائریکٹ محبت نامہ بھیج کر مجھے [...]تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کسی گاڑی کے پیچھے چھپا میرا جائزہ لے [...]رہا ہوگا۔ میں بھی شاید کچھ زیادہ ہی ترنگ میں آ گیا۔ میں ہاتھ پشت [...]پر باندھ کر سیٹی بجاتا' ٹہلنے کے سے انداز میں ایک طرف چل دیا۔

میں زیادہ سے زیادہ بے خوفی کا اظہار کر کے اسے زیادہ سے زیادہ چڑانا چاہتا تھا۔

ایک پُرانے برگد کے قریب کھڑی ہوئی چمکیلی گرے کار کی ایک پجیرو کے عقب سے وہ اچانک نکل کر مجھ پر حملہ آور ہوئے۔ جو سفید فام نوجوان فساد کی جڑ تھا' اس سمیت وہ تعداد میں چار تھے۔ شاید اس بدبخت کو اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک آدھ ساتھی کو ہمراہ لے جانے سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان میں ایک ایشیائی بھی تھا۔ وہ پاکستانی بھی ہو سکتا تھا اور عربی یا ایرانی وغیرہ بھی۔

ان میں سے ایک کے ہاتھ میں موٹر سائیکل کی چین تھی۔ ایک کے ہاتھ میں پائپ کا ٹکڑا' ایک کے ہاتھ میں چاقو اور ایک کے ہاتھ میں لوہے کی عام لیکن موٹی اور وزنی زنجیر۔

میں اس وقت ہوٹل سے کافی دور نکل آیا تھا اور پجیرو کے بالکل پاس پہنچ چکا تھا جب وہ گروہِ شیاطین کی طرح اچانک پجیرو کے عقب سے برآمد ہوئے۔ مجھے دو ایک دوسری جگہوں پر ان کی موجودگی کا زیادہ امکان محسوس ہوا تھا۔ موٹر سائیکل کی چین والے نے حملہ کرنے میں پہل کی اور بڑی پھرتی دکھائی۔

میں اپنا اندازہ تھوڑا سا غلط ہو جانے کے باوجود پھرتی سے ایک طرف کو ہٹتے ہوئے بچ گیا۔ چین پجیرو کے بونٹ پر پڑی اور اس طرح پڑی کہ اس کا خوب صورت رنگ اتر گیا حالانکہ ان گاڑیوں کے اس قسم کے رنگ آسانی سے نہیں اُترتے۔ اگر وہ چین میرے جسم پر پڑی ہوتی تو رنگ کی جگہ میری کھال اُترتی۔

غنیمت یہ تھا کہ ان میں سے کسی کے پاس کوئی گن وغیرہ نہیں تھی۔ میں اس وقت شلوار قمیص میں تھا اور میرے پاس بھی ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔ شاید وہ لوگ نہایت خاموشی سے میرا طلیدہ بنانے کے ارادے سے آئے تھے اور اس قسم کے کاموں میں ماہر معلوم ہوتے تھے۔ تینوں سفید فام تو خاص طور پر اسٹریٹ فائٹر قسم کی چیز معلوم ہوتے تھے۔ ان کے چہروں پر بلا کی خشونت اور سفاکی تھی۔ میرے لیے یہ بڑا صدمے کا مقام تھا۔ ہم تو گلی کوچوں میں یہی کچھ... بلکہ اس سے بھی زیادہ بہت کچھ کرنے والوں کے معاملے میں خود کفیل ہو چکے تھے۔ ہم سے تو وہی سنبھالے نہیں سنبھل رہے تھے۔ اوپر سے یہ غیر ملکی بھی چلے آ رہے تھے اور اس کارِ خباثت میں نہایت ڈھٹائی سے حسبِ توفیق اپنا حصہ ڈال رہے تھے۔

کسی آتشیں ہتھیار کے بغیر بھی وہ کچھ کم خطرناک نہیں تھے... اور پھر تعداد میں چار تھے۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ سے کہا "اِنّی پیارے! آج تم کچھ زیادہ ہی زعم میں آ گئے... تم نے کچھ اچھا نہیں کیا... اب بھگتو..."

وہ حملہ کرنے کے لیے اپنی اپنی باری کا تو ظاہر ہے' انتظار نہیں کر رہے تھے۔ پہلی زنجیر بونٹ پر پڑتے ہی باقی تینوں بھی تیزی سے

میری طرف لپکے تھے۔ لوہے کی عام زنجیر والے نے بھی وار کیا تھا۔ میں جھکائی دے کر اس سے بھی بچ گیا تھا اور بھاری زنجیر بجیرو کی ونڈ اسکرین پر پڑی تھی۔ ونڈ اسکرین میں مکڑی کا نہایت ہی گنجلک قسم کا جالا پھیل گیا۔ ونڈ اسکرین ناکارہ ہوگئی۔ نہ جانے کس بدنصیب کی گاڑی تھی لیکن میری کھوپڑی ٹوٹنے کے مقابلے میں یہ نقصان بہرحال کوئی معانی نہیں رکھتا تھا۔

چاقو اس سفید فام نوجوان کے ہاتھ میں تھا جس نے ہوٹل میں اچانک چاروں ہاتھ پاؤں سے 'نہایت بھونڈے انداز میں سلویا پر عاشق ہو کر یہ سارا فساد کھڑا کیا تھا۔ وہ شاید مجھ سے بھی زیادہ ترنگ میں آگیا تھا۔ وہ بجیرو کی چھت پر چڑھ چکا تھا۔ میری نظر اس وقت باقی تینوں نوجوانوں پر تھی لیکن میں اس کی طرف سے بھی بے خبر نہیں تھا۔

اس نے خالص فلمی انداز میں مجھ پر چھلانگ لگائی۔ اس قسم کے مناظر فلموں میں عموماً سلوموشن میں دکھائے جاتے ہیں۔ وہ غالباً اس عالم میں مجھے ساتھ لے کر نیچے گرنا چاہتا تھا کہ اس کا چاقو میری گردن میں پیوست ہو۔ عین اسی لمحے دونوں زنجیروں والے نوجوانوں نے مجھ پر زنجیر سے وار کیا۔ پائپ والے کو شاید "بھیڑ بھاڑ" کی وجہ سے موقع نہیں مل سکا ورنہ وہ بھی حسبِ توفیق ہاتھ بٹاتا۔ وہ بجیرو کے گرد گھوم کر بھاگا آرہا تھا تاکہ اپنے ساتھیوں کے درمیان حملے کے لیے جگہ تلاش کر سکے۔

میں نے پنجوں کے بل تقریباً بیٹھ کر جس پھرتی سے اپنے آپ کو بچایا وہ شاید ان کے لیے ناقابلِ یقین اور ناقابلِ فہم رہی ہو۔ اسی حالت میں میں زنجیر والوں کے درمیان سے اس طرح نکلا کہ ان کے گھٹنوں پر کراٹے کے وار کرتے ہوئے میں نے انہیں اوندھے منہ گرا دیا لیکن اس وقت تک ان میں سے ایک کی چین چاقو والے پر پڑ چکی تھی اور وہ زوردار کراہ کے ساتھ گر چکا تھا۔ دوسرے کی عام زنجیر میری کمر کو چھوتی ہوئی گزری تھی لیکن فی الحال میں نے اس کی پروا نہیں کی تھی۔

وہ تینوں ایک دوسرے پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ چاقو والے کا چاقو خود اپنے ایک ساتھی کی گردن میں پیوست ہوتے ہوتے رہ گیا تھا۔ شاید ابھی اس کی زندگی کے دن پورے نہیں ہوئے تھے۔ میں ان تینوں کے نرغے سے تو نکل گیا لیکن اس دوران پائپ والا عین میرے سامنے آچکا تھا اور اس نے پائپ گھما دیا تھا۔ اس سے تو میں بہ مشکل اور بال بال ہی بچا۔ پائپ ہلکی سی شائیں کی آواز کے ساتھ میرے سر پر سے گزر گیا۔

اگر وہ میری کھوپڑی پر پڑا ہوتا تو شاید تلوار سے زیادہ کارگر رہتا۔ اس وار کے خالی جانے اور کچھ بوکھلاہٹ کی وجہ سے پائپ والا لڑکھڑا گیا۔ میں نے اس کی پسلیوں میں اس قوت سے گھونسا رسید کیا کہ شاید اس کی آنتیں اچھل کر حلق میں پہنچ گئی ہوں۔

اُٹھانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے بجائے میں نے پائپ دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر ان تینوں نوجوانوں پر پھینک دیا۔ وہ تک اٹھ چکے تھے لیکن سنبھل نہیں پائے تھے۔

وہ چاروں ایک بار پھر ایک دوسرے پر ڈھیر ہو گئے۔ دوران مجھے اپنے عقب میں کسی گاڑی کی آواز سنائی میرے پاس پلٹ کر دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔ میری نظر کا کے لیے بھی ان چاروں پر سے ہٹنا میرے حق میں مہلک ہو سکتا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں ان کے سروں پر تھا۔

ان میں سے دو کافی پھرتی سے تقریباً اٹھ چکے تھے۔ انہیں گردن سے پکڑتے ہوئے ان کی کھوپڑیاں ٹکرا دیں۔ ڈھم کی خاصی زوردار آواز بلند ہوئی جس دل کو کچھ راحت ملی لیکن اسی دوران پیچھے سے گھبرائی ہوئی کھردری آواز سنائی دی "اوئے..... اوئے..... کھوتے کر رہا ہے.....؟"

بھاری قدموں کی آوازیں بھی سنائی دیں لیکن نیچے والے دونوں نوجوان بھی اٹھنے میں کامیاب ہو زنجیریں ابھی ان کے ہاتھوں میں ہی تھیں۔ اس لیے پیچھے دیکھنے کے بجائے زنجیروں پر ہاتھ ڈالنا زیادہ ضروری نے دونوں زنجیریں بیک وقت جھٹکے سے ان کے ہاتھوں لیں۔ لیکن عین اسی وقت جب میں ذرا پیچھے ہٹ کر ان پر وار کرنے لگا تھا' عقب سے میری کمر پر کسی زوردار ضرب لگی۔

ایک لمحے کے لیے میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا میں سنبھلتے ہوئے ایڑیوں کے بل گھوما۔ مجھے کچھ دھندلے سے سائے نظر آئے۔ ایک سایہ تو عین میرے سامنے غالباً مجھ پر دوسرا وار کرنے کے لیے کوئی چیز ہوا میں بلند زنجیروں سے وار کرنے میں شاید مجھے تاخیر ہو جاتی۔ میں زنجیریں ہاتھوں سے چھوڑتے ہوئے ایک بھرپور گھونسا پر رسید کیا۔

وہ اُلٹ کر سڑک پر جا گرا اور اس کے ہاتھ میں وہ چھوٹ گئی۔ اسی لمحے اچانک میری آنکھوں کی دھند ہوئی اور میں نے دیکھا وہ دراصل کوئی باوردی پولیس اس کے ہاتھ سے جو چیز چھوٹ کر گری تھی وہ گن تھی۔

میرے گھونسے نے اس کا منہ بگاڑ دیا تھا۔ اس ہوئے سڑک پر تھوکا۔ وہ تھوک نہیں' خون تھا۔ سفید چیزوں کی جھلک بھی نظر آئی جو یقیناً اس کے دانت مجھے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میں نے کسی پو

اس نے عقب سے آکر سب کو للکارنے' خبردار کرنے یا ہینڈز اَپ وغیرہ کرانے کے بجائے میری کمر پر غالباً اپنی گن کا دستہ رسید کر دیا تھا۔ دوسرے ہیولے بھی اب مجھے صاف نظر آگئے تھے۔ وہ بھی باوردی پولیس والے ہی تھے جو گنیں اُٹھائے چاروں طرف سے مجھ پر یلغار کرنے کے لیے لپک رہے تھے۔ غنیمت تھا کہ انہوں نے فائرنگ نہیں شروع کر دی تھی ورنہ میں بعد میں "پولیس مقابلے" میں ہلاک ہونے والا بھی قرار پا سکتا تھا۔

مجھ پر وردی کا احترام غالب آگیا..... اور یہ احترام مجھے کافی مہنگا پڑا۔ میں نے نہ تو اپنے دفاع کی کوئی کوشش کی اور نہ ہی مزید کسی پولیس والے پر وار کیا۔ مجھے احساس ہوا تھا کہ مجھ سے جو غلطی سرزد ہو چکی تھی وہ ... نی تھی۔ ایک پولیس آفیسر کے دو دانت باہر آچکے تھے' یہی کافی تھا۔ مجھے مزید توڑ پھوڑ سے گریز کرنا چاہیے تھا۔ ویسے بھی وہ چھ سات تھے اور سب کے پاس گنیں تھیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے صرف گھیرنے اور ہاتھ اٹھانے کا حکم دینے پر اکتفا کریں گے۔

مجھے اپنے اس خیال پر افسوس کرنے کی مہلت بھی نہیں مل سکی۔ وردی کا جو احترام مجھ پر غالب آیا تھا اس نے مجھے بروقت ہاتھ ہلانے کا موقع نہیں دیا اور پولیس والوں نے مجھے ہاتھ اُٹھانے کا حکم دینے کا تکلف نہیں کیا۔ وہ اپنی گنوں کو لاٹھیوں کی طرح استعمال کرتے ہوئے مجھ پر پل پڑے۔

باقی ضربات کا تو مجھے کچھ خاص پتا نہیں چلا لیکن ایک گن کا دستہ میری کھوپڑی پر "ٹھک" بیٹھ گیا اور میری آنکھوں کے سامنے نیلے پیلے تارے ناچ گئے۔ میں گر پڑا۔ ڈوبتے ذہن کے ساتھ مجھے احساس ہوا کہ میری پسلیوں وغیرہ پر دو چار ٹھڈے بھی رسید کیے گئے تھے پھر میں نے گویا بہت دور سے آتی ہوئی ایک آواز سُنی "اُٹھاؤ اس اُلو کے پٹھے کو..... موبائل میں ڈالو۔"

اس کے بعد میرا ذہن مکمل تاریکی میں ڈوب گیا۔

○☆○

میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے میری نظر ایک روشن دھبے پر پڑی مگر اس روشنی میں دھندلاہٹ بھی تھی جیسے کسی موٹے اور دھندلے شیشے کے پیچھے کوئی چراغ روشن ہو۔ دھیرے دھیرے دھندلاہٹ صاف ہوگئی اور مجھے احساس ہوا کہ وہ ایک بلب تھا جو اونچی چھت میں لٹکی تار کے سرے پر چمک رہا تھا۔

کافی دیر تک میری سمجھ میں نہیں آسکا کہ میں کہاں تھا..... اور کیوں تھا؟ وہ جو بھی جگہ تھی' میں کس طرح وہاں پہنچا تھا؟ دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوا کہ میں ایک چٹائی پر چت پڑا تھا تاہم میرے ہاتھ پاؤں آزاد تھے اور چند لمحوں بعد میں انھیں ہلانے جلانے میں بھی کامیاب ہوگیا لیکن جب میں نے اپنا سر دائیں بائیں گھمانے کی کوشش کی تو سر کے پچھلے حصے میں یوں تکلیف ہوئی جیسے وہاں کوئی بڑا سا پھوڑا موجود تھا۔

میں نے سر ذرا سا اوپر اُٹھایا تو سر میں گویا پٹاخے سے چلنے لگے لیکن میں نے اس تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے سر کے پچھلے حصے کو ٹٹول کر دیکھا۔ وہاں ایک بڑا سا گومڑ موجود تھا۔ یہی گومڑ گویا ساری تکلیفوں کا مرکز و منبع تھا۔ گومڑ کیا تھا گویا درد کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا جہاں بڑے پیمانے پر درد کی پروڈکشن عمل میں آرہی تھی اور وہاں سے درد پورے جسم کو سپلائی ہو رہا تھا۔

میں اس گومڑ کے نیچے ہاتھ ٹکا کر مزید کچھ دیر لیٹا رہا۔ رفتہ رفتہ تکلیف کچھ کم ہوگئی۔ اس سے پہلے سخت فرش پر بچھی ہوئی چٹائی اس گومڑ میں چبھ رہی تھی جس کی وجہ سے لیٹے لیٹے سرہلانا دشوار تھا۔ درد کچھ کم ہوا تو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں بیدار ہونے لگیں۔ میں نے اپنی قوتِ ارادی کو بھی کام میں لانے کی کوشش کی اور اٹھ بیٹھا۔

تب میں نے دیکھا' وہ ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی جس کا دروازہ سلاخوں کا تھا۔ کوٹھری کی حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ کون سی جگہ تھی۔ وہ یقیناً حوالات کی کوٹھری تھی۔ آس پاس سے بھانت بھانت کی دبی دبی سی آوازیں سُنائی دے رہی تھیں۔ اردگرد غالباً اور بھی کوٹھریاں تھیں اور ان میں بھی حوالاتی موجود تھے لیکن میں انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

میری کوٹھری کے سامنے بھی کوئی کوٹھری نہیں تھی لیکن جب میں نے دائیں بائیں دیکھا تو مجھ پر انکشاف ہوا کہ میری اپنی ڈربا نما کوٹھری میں مزید دو قیدی موجود تھے۔ دونوں نوجوان تھے اور الگ الگ کونوں میں بالکل ایک جیسے انداز میں اکڑوں بیٹھے ٹکر ٹکر میری طرف دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی تھی کہ جب میں کراہ رہا تھا اور اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا تو ان میں سے کوئی ذرا آگے کھسک کر مجھے سہارا ہی دے دیتا۔ وہ کچھ اس طرح میری طرف دیکھ رہے تھے جیسے میں کسی اور سیّارے کی مخلوق تھا۔

گو کہ مجھے اندازہ ہو چکا تھا' میں حوالات میں تھا لیکن شاید میرے لیے اس پر یقین کرنا دشوار ہو رہا تھا اس لیے میں ان نوجوانوں کی طرف دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔ "میں حوالات میں ہوں نا؟"

مجھے خود بھی احساس ہوا کہ میرا سوال احمقانہ تھا لیکن بہرحال..... الفاظ زبان سے پھسل چکے تھے۔ وہ چاہتے تو انسانی ہمدردی کی بنیاد پر اس کا اثبات میں سیدھا سا جواب بھی دے سکتے تھے لیکن پہلے وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے پھر ان میں سے ایک استہزائیہ سے لہجے میں بولا "ظاہر ہے..... یہ پرستان تو نہیں ہو سکتا۔"

اس دندان شکن جواب کے بعد مجھے ان سے مزید کوئی بات کرنے کی جرات نہیں ہوئی اور میں سلاخ دار دروازے کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ مجھے یاد آگیا تھا کہ میں کس طرح بے ہوش ہوا تھا۔ بے ہوش ہوتے ہوتے میں نے جو آخری جملہ سنا تھا وہ بھی

مجھے یاد آگیا تھا "اسے اُٹھا کر موبائل میں ڈالو۔۔۔" کچھ اسی قسم کی بات کی گئی تھی اور شاید دوچار القابات سے بھی نوازا گیا تھا۔ موبائل میں ڈالے جانے کے بعد اگلی منزل حوالات ہی ہو سکتی تھی۔

میں نے دل ہی دل میں اس سفید فام لنگور کو کوسا جس نے عاشق ہونے کے لیے سلویا کا انتخاب کیا تھا اور وہ بھی میرے ہوٹل میں۔۔۔ میری موجودگی میں! پھر میں نے اپنے آپ کو کوسا۔ آخر مجھے کیا پڑی تھی جو میں اس مردود کا رقعہ ملنے پر اسے سبق سکھانے چل دیا تھا۔ رقعہ بھی وہ' جو میرے نام نہیں تھا۔ اگر وہ میرے ہاتھ میں پہنچ ہی گیا تھا تو نوجوان کے لیے اس کا بہترین جواب یہ ہوتا کہ میں اس رقعے کو پھاڑ کر وہیں ایش ٹرے میں ڈال کر تیلی دکھا دیتا اور باپ بیٹی سے اسی طرح گفتگو جاری رکھتا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

پھر میں نے پولیس کو کوسا جسے میں نے کبھی ایسے موقعوں پر فوری طور پر پہنچتے نہیں دیکھا تھا جہاں اس کی ضرورت ہوتی تھی لیکن ان نوجوانوں کے ساتھ میری مار دھاڑ کے دوران اچانک نہ جانے وہ لوگ کہاں سے آن پہنچے تھے۔۔۔ اور نہ صرف آن پہنچے تھے بلکہ انہوں نے اپنی روایات کے بالکل برعکس فوری طور پر اس معاملے میں بڑی مستعدی سے ٹانگ بھی اَڑا دی تھی۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر بے ہوش رہا تھا۔ وقت کا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ کوٹھری میں بلب روشن تھا لیکن اس سے کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ حوالات کی کوٹھری میں تو دن میں بھی اندھیرا ہو سکتا تھا اور بلب جلانے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔ میں نے اپنی کلائی کو ٹٹولا۔ اس پر گھڑی موجود نہیں تھی۔ جیب بھی خالی تھی۔ اپنا موبائل فون میں ہوٹل میں ہی میز پر چھوڑ آیا تھا۔

حیرت کی بات تھی کہ ہوٹل میں سے کسی نے میرا اتا پتا کرنے یا جاننے کی کوشش نہیں کی تھی کہ میں کہاں گیا تھا؟ پھر مجھے یاد آیا کہ میں کون سا کسی کو بتا کر آیا تھا کہ میں کہاں جا رہا تھا۔ میرا یوں اُٹھ کر چلے جانا اور غائب ہو جانا کسی کے لیے بھی تشویش کا باعث نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ کسی کے لیے بھی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ میں یونہی کسی بھی وقت اٹھ کر غیر معینہ مدت کے لیے غائب ہو سکتا تھا۔

گویا یہ لائف اسٹائل کبھی کبھی نقصان دہ بھی ہو سکتا تھا۔ ناگہانی کے بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا تھا؟ بے اختیار میں نے ایک اتنی ٹھنڈی سانس لی کہ شاید اس سیلن زدہ کوٹھری کی فضا مزید سیلن زدہ ہو گئی ہو۔ مجھ سے زندگی میں بڑی بڑی حماقتیں ہوئی تھیں' بڑے بڑے خطرناک حالات سے واسطہ پڑا تھا' بہت سی ایسی حرکتیں سرزد ہوئی تھیں جن کے نتیجے میں' میں جیل پہنچ سکتا تھا اور وہاں میرا قیام و طعام خاصا طویل ہو سکتا تھا لیکن میری خوش قسمتی تھی کہ میں حوالات جانے سے بھی بچا رہا تھا۔

میں نے فاقہ مستی کے زمانے میں بھی حوالات کا منہ نہیں دیکھا تھا اور اب جبکہ میں نہایت معزز' نہایت بارسوخ اور کافی دولت مند آدمی تھا تو حوالات میں پڑا تھا جبکہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ میں تو اس وقت اپنا دفاع کر رہا تھا جب پولیس [illegible] پہنچی تھی اور اگر میں مار دھاڑ کا ماہر نہ ہوتا تو پولیس کو وہاں میر[illegible] بجائے میرا ملیدہ ہی ملتا۔

میری چونکہ ابھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چا[ہیے] تھا اس لیے فی الحال میں دل ہی دل میں پولیس کو مزید کوس کر ا[پنے] آپ کو بہلانے کی کوشش کر رہا تھا۔

شاید میرے حالات میں کافی دور رس قسم کے اثرات [ہو] جاتے تھے۔ کیونکہ اسی دوران باہر بھاری قدموں کی آواز آ[ئی] اور سلاخوں کے پار وہی پولیس والا نمودار ہوا جسے میں نے [اس] کے عین منہ پر ایک عدد گھونسے سے نواز دیا تھا۔ میرے لیے [اسے] پہچاننا مشکل نہیں تھا کیونکہ اس کے چہرے پر اس گھونسے [کی] نشانیاں موجود تھیں۔۔۔ اور یہ نشانیاں جلد ہی معدوم ہونے [والی] نہیں تھیں۔

گھونسا پڑنے سے پہلے بھی وہ کوئی حسین یا وجیہہ شخص نہ[یں] ہو گا لیکن گھونسے نے تو اس کی شخصیت پر کچھ زیادہ ہی عبرت [ناک] اثرات مرتب کیے تھے۔ اس کے ہونٹ بُری طرح سُوجے [ہوئے] تھے جن کی وجہ سے شکل ہی عجیب ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ انسان [کے] بجائے کسی کارٹون فلم کا کردار نظر آ رہا تھا۔

وہ میری کوٹھری کے سامنے آ رکا اور میری طرف دیکھ [کر] پُرخیال انداز میں مسکرانے لگا۔ یہ بلاشبہ بڑے دل گردے [کا کام] تھا۔ جب انسان کے چہرے کا یہ حشر ہو چکا ہو تو مسکرانے کے [لیے] بڑا حوصلہ درکار ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کے دو دانت غائب [تھے] یعنی منہ میں چھوٹی سی ایک تاریک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ منہ کھو[ل کر] وہ اس سے زیادہ مضحکہ خیز دکھائی دینے لگا تھا جتنا بند منہ کے [ساتھ] دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دراز قد اور ذرا بھاری بھرکم تھا۔ [ممکن] ہے اسے اپنی طاقت پر ناز بھی رہا ہو۔

میں اُٹھ کر کوٹھری کے دروازے پر جا پہنچا۔ غیر ارادی [طور پر] میں نے دو سلاخیں تھام لیں۔ قیدی عموماً یہی کرتے ہیں۔ [میں نے] بھی جواباً مسکراتے ہوئے خوش گوار لہجے میں کہا "تم نے دو[نوں] دانت نگل تو نہیں لیے تھے؟ پیٹ میں چبھیں گے۔ عین ممکن [ہے] آنتیں کترنے لگیں۔ دانتوں کو تو اپنا کام کرنے کی عادت ہو[تی ہے] نا۔"

"چہک لو میری جان! اچھی طرح چہک لو" وہ سہلا کر[ی] آواز میں بولا "یہ تمہارا چہکنے کا آخری دن ہے۔ کل کے بعد تم [چہکنے] کے قابل نہیں رہو گے؟"

"کیوں۔۔۔ کل کیا مجھے تمہارے سرہانے بیٹھ کر بہت زیا[دہ آہ و] زاری کرنا پڑے گی؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"نہیں میرے چاند! کل تمہارے لواحقین کو تمہارے سر[ہانے] بیٹھ کر آہ و زاری کرنا پڑے گی" وہ ملائمت سے بولا "[illegible]

[ح]سین کے دو دانت توڑنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔۔۔!" اس نے مجھے دو تین انوکھی قسم کی گالیوں سے نوازا۔

"ذرا قریب آؤ خادم حسین! میں تمہارے باقی دانت بھی نکال دیتا ہوں۔ میں اس غیر معمولی واقعے کو اور بھی غیر معمولی بنا دیتا ہوں۔ شاید تاریخ میں اس کا اندراج ہو جائے" میں نے کہا۔

"تاریخ میں نہیں۔۔۔ اس کا اندراج جغرافیے میں ہو گا چن کھناں!" وہ ایک بار پھر ملائمت سے بولا "کیونکہ اس کا تعلق تمہارے جغرافیے سے ہے۔ کل تک تمہارا جغرافیہ بالکل بدل جائے گا۔ محل وقوع بھی بدل جائے گا۔ معلوم نہیں تم کہاں پائے جاؤ" اس کا لہجہ گو کہ خطرناک حد تک نرم و شیریں تھا لیکن اس کے حلق میں کوئی درندہ بول رہا تھا۔ ہولے ہولے غرا رہا تھا۔

"دیکھو۔۔۔ پیارے خادم حسین! تمہارا نام بھی خادم حسین ہے اور ویسے بھی تمہیں عوام کا خادم ہی ہونا چاہیے لیکن تم تو بادشاہوں کی طرح بات کر رہے ہو۔۔۔"

اس نے اپنے نام کو بھی دوچار صلواتیں سُنائیں اور میری انگلیوں پر چھڑی رسید کی۔ میں نے فوراً سلاخوں سے ہاتھ ہٹا لیے۔ وہ چھڑی ہاتھوں میں گھماتے ہوئے بولا۔ "میں خادم بننے کو تیار ہوں لیکن شریف اور بھلے مانس لوگوں کا۔۔۔ تم جیسے غنڈوں' بدمعاشوں اور داداگیروں کا نہیں۔"

"میں۔۔۔؟ میں غنڈہ بدمعاش اور داداگیر۔۔۔؟" میں نے اپنی طرف اشارہ کیا اور میری آواز حلق میں اٹک گئی۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس بات پر ہنسوں یا رووں۔

میں نے اپنی ان انگلیوں کو سہلایا جن پر اس نے چھڑی رسید کی تھی پھر میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "معاملہ کچھ سیریس ہو رہا ہے۔ میرا خیال ہے ہمیں اس پر سنجیدگی سے بات کرنا پڑے گی۔"

"تو تمہارے خیال میں اب تک میں مسخریاں کر رہا تھا؟" وہ یکدم ذرا بھڑک کر بولا۔ اس نے خالی سلاخ پر ہی چھڑی مار کر اپنے غصے کو ذرا تسکین پہنچائی پھر اپنی زخمی انا پر مزید دوچار موٹی موٹی گالیوں کا مرہم رکھتے ہوئے بولا "تمہارے جیسے بدمعاشوں کا تو میں جانی دشمن ہوں جو ہر محکمے کا نام بدنام کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بہت بڑا پھنے خان سمجھتے ہیں۔ غیر ملکیوں کو بھی نہیں بخشتے۔ ان کے ساتھ بھی غنڈا گردی کرتے ہیں۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ وہ اپنے ملک جا کر ہمارے ملک کے بارے میں کیا کیا قصے سنائیں گے۔"

میں بے اختیار سر کھجانے لگا پھر میں نے اپنے گومڑ کو سہلایا اور دوبارہ غور سے خادم حسین کا جائزہ لیا۔ بہت سے پولیس والوں کی طرح وہ کچھ اجڈ اور کچھ موٹے دماغ کا ہو سکتا تھا لیکن اس کے لہجے میں کچھ دردمندی بول رہی تھی۔ وہ یقیناً بری طرح کسی غلط فہمی کا شکار تھا یا پھر جان بوجھ کر اپنی آئندہ کارروائیوں کے لیے جواز گھڑ رہا تھا۔ کم عقل آدمی دونوں صورتوں میں خطرناک ثابت ہوتا ہے خصوصاً جب اسے اختیارات بھی حاصل ہوں۔

میں نے ملائمت سے کہا "ڈیئر خادم حسین! مجھے اندیشہ ہے کہ تمہاری غلط فہمی اور کم علمی صورتِ حال کو پیچیدہ نہ بنا دے۔ تم نے کیا سمجھ کر مجھے حوالات میں بند کیا ہے؟ تمہیں معلوم ہے میں کون ہوں؟"

"مجھے معلوم ہے کہ تم شہنشاہ اکبر کے پڑپوتے یا پڑنواسے ہو" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا "ہم جسے بھی پکڑتے ہیں وہ شہنشاہوں اور نوابوں کی اولاد ہوتا ہے۔ کمشنر' ڈپٹی کمشنر کے بھانجے بھتیجے سے کم تو کوئی ہوتا ہی نہیں۔"

مسئلہ واقعی ٹیڑھا ہوتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے دماغ ٹھنڈا رکھتے ہوئے بدستور ملائمت سے کہا "تم یہاں ایس ایچ او ہو؟"

"ہاں۔ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟" وہ چھڑی دھیرے دھیرے اپنے ہاتھ پر مارتے ہوئے بولا۔

"نہیں۔۔۔ تم ڈی آئی جی ہوتے تب بھی مجھے تو کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ چلو۔۔۔ میں تو اپنے بارے میں کوئی دعویٰ نہیں کر رہا۔ میں سنجیدگی سے۔۔۔ تم سے پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ تم مجھے کیا سمجھ کر پکڑ کر لائے ہو۔ ذرا سنجیدگی سے بتا دو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہو گی" میں نے بہت ہی ملائمت سے کہا۔

"جو تم ہو وہی سمجھ کر پکڑ کر لایا ہوں۔۔۔ سنسان گلی کوچوں میں لوٹ مار کرنے والا کوئی بدمعاش۔۔۔ جو ابھی تک ہمارے ہتھے چڑھنے سے بچا ہوا تھا۔۔۔ اور جو خاص طور پر غیر ملکیوں کو نشانہ بناتا ہو گا۔ انہیں لوٹ کر' مار پیٹ کر کے پھینک جاتا ہو گا۔ پچھلے مہینے میں میرے علاقے میں دو تین ایسی وارداتیں ہوئی ہیں۔ مجھے یقین ہے وہ تمہارے ہی کارنامے ہوں گے۔ آج رات تمہارے ساتھ "تفتیش" ہو گی۔ سب پتا چل جائے گا۔ فی الحال تم چہک لو۔۔۔ جتنا چہکنا ہے" اس نے سہلایا۔

"تمہیں کس نے بتایا کہ میں ان لوگوں کو مار پیٹ کر لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا؟"

"خود انہوں نے ہی بتایا تھا" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"انہوں نے تمہیں بتایا کہ میں اکیلا ان چاروں کو مار پیٹ کر لوٹنے کی کوشش کر رہا تھا۔۔۔ جبکہ ان کے پاس ایک عام زنجیر' ایک موٹر سائیکل کی چین' ایک پائپ اور ایک چاقو بھی موجود تھا۔۔۔ اور تم نے ان کی بات کا یقین کر لیا؟" میں نے بے یقینی اور حیرت سے پوچھا۔

"وہ ہتھیار ان کے نہیں' تمہارے تھے" وہ سخت لہجے میں بولا۔

"پیارے خادم حسین! میں انسان ہوں' کالی دیوی نہیں جس کے بہت سے ہاتھ ہوتے ہیں۔ وہ چاروں ہتھیار ان چاروں کے تھے۔۔۔"

"اور تم خالی ہاتھ جاکر ان چاروں سے بِھڑ گئے تھے۔ واہ بے ٹارزن کے بچے!" وہ تمسخرانہ لہجے میں بولا۔

"میں نہیں بِھڑا تھا۔ انہوں نے مجھ پر حملہ کیا تھا۔ مجھ سے تو جو ہو سکتا تھا میں وہ کر رہا تھا" میں نے ملائمت سے کہا۔

"جس وقت ہم نے تمہیں قابو میں کیا اس وقت موٹر سائیکل کی ایک چین اور لوہے کی ایک عام موٹی سی زنجیر تمہارے ہاتھوں میں تھی" اس نے گویا بڑا اہم نکتہ اُٹھایا۔

"بے شک تھی" میں نے تسلیم کیا "وہ دونوں زنجیریں میں نے انہی سے چھینی تھیں۔ اگر تم مداخلت نہ کرتے تو میں انہیں ان کی غنڈا گردی کی ٹھیک ٹھاک سزا دیتا۔ تم نے آکر کام سنوارا نہیں... بگاڑ دیا۔"

"تم جیسے بدمعاشوں اور لفنگوں نے یہ کہنا تو جیسے فیشن سمجھا ہوا ہے کہ جی پولیس نے فلاں کام بگاڑ دیا... فلاں کام بگاڑ دیا" وہ ایک بار پھر بھڑک کر بولا۔ "کام سنوارنے تو بس تم جیسے غنڈے بدمعاشوں کو آتے ہیں جو غیر ملکیوں کو بھی نہیں بخشتے۔ تم لوگوں کو یہ بھی شرم نہیں آتی کہ وہ انگریز لوگ اپنے ملکوں میں جاکر ہمارے بارے میں کیا پروپیگنڈہ کریں گے۔ ملک والے تو تم جیسے لفنگوں کا تماشا دیکھتے ہی رہتے ہیں، تم لوگ دوسرے ملکوں کے سامنے بھی اپنے ملک کو تماشا بناتے رہتے ہو۔" اس کے لہجے میں اخلاص سے زیادہ مرعوبیت بول رہی تھی۔ وہ بھی انہی لوگوں میں سے ایک تھا جن کے لیے ہر سفید فام "انگریز" ہوتا ہے اور بڑا معزز اور شریف ہوتا ہے۔

"ہاں... واقعی ہم غنڈے بدمعاش بڑے ہی کمینے... بڑے ہی گھٹیا لوگ ہیں۔ ساری بدنامی ہم ہی لوگوں کی وجہ سے ہے" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن وہ چاروں شریف اور معزز لوگ کہاں ہیں؟ انہیں تم نے حوالات کی کس کوٹھری میں ڈالا ہے؟"

"انہیں میں کیوں کوٹھری میں ڈالتا؟" وہ تیوری چڑھا کر بولا "وہ رپورٹ لکھوا کر چلے گئے۔ اگر ضرورت پڑی تو دوبارہ آجائیں گے ورنہ تمہیں تو انجام تک پہنچانے کے لیے ہم ہی کافی ہیں۔ مدعی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس وقت تو میں خود بھی مدعی ہوں۔ تم نے شاید کسی ایس ایچ او کے دانت توڑنا مذاق سمجھا ہوگا۔"

"اصل میں اس وقت تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا کہ میں کسے گھونسا رسید کر رہا تھا اور جب میں نے دیکھا تو مجھ پر قانون کا احترام غالب آگیا۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم اتنے بڑے گدھے ہو تو میں تمہارے دانت نہیں بلکہ منکا توڑتا۔" میں نے ملائم لہجے میں نہایت سنجیدگی سے کہا۔

پھر یکدم غیر ارادی طور پر میرا لہجہ بدل گیا۔ میں نے گرج کر کہا "ابے گدھے! وہ چاروں کہاں چلے گئے؟"

اس کی رنگت متغیر ہوگئی۔ مزید غصے سے اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ دانتوں کی کمی اور بُری طرح سوجے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ اس کا چہرہ غصے سے بگڑا تو کچھ اور مضحکہ خیز ہوگیا لیکن وہ گویا بڑی مشکل سے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے بولا "چہک لو... چہک لو... رات تک چہک لو کھوتے کے پتر... کل سے تم خود اپنی آواز نہیں پہچانو گے۔"

"ٹھیک ہے... وہ تو جو ہوگا دیکھا جائے گا..." میں نے بھی اپنے غصے پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "لیکن خدا کے لیے تم میرے سوال کا جواب ضرور دے دو۔ یہ سوال تمہارے لیے بھی بہت اہم ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ چاروں کہاں چلے گئے؟"

وہ چند سیکنڈ تک خوفناک نظروں سے مجھے گھورتا رہا پھر غرانے کے سے انداز میں بولا "ظاہر ہے اپنے ہوٹل چلے گئے جہاں وہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔"

"تم نے ہوٹل کے نام اور کمرے نمبر وغیرہ نوٹ کیے ہیں؟" میں نے تیزی سے پوچھا۔

"ہاں... کیے ہیں آئی جی صاحب!" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا "کہو تو اپنے پچھلے مقدموں کی فائلیں بھی تمہاری خدمت میں پیش کروں؟"

میں نے اس کے طنز پر دھیان نہ دیتے ہوئے کہا "مرعوبیت واقعی انسان کو گدھا بنا دیتی ہے۔ مجھے یقین ہے انہوں نے جس ہوٹل کا نام لکھوایا ہوگا اوّل تو وہ اس میں مقیم ہی نہیں ہوں گے۔ اور اگر ہوں گے بھی... تو اب تک وہاں سے رخصت ہو چکے ہوں گے۔ کون سے ہوٹل کا نام لکھوایا ہے انہوں نے؟"

اس نے مجھے میرے ہی ہوٹل کا نام بتایا۔ میں نے سوچا اب اس سے اپنا تعارف کرا ہی دینا چاہیے تھا "تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں اس ہوٹل کا مالک ہوں... بلکہ صرف اس ہوٹل ہی کا نہیں... "اے۔ سی گروپ آف کمپنیز" کا بھی مالک ہوں۔ تم مجھے اس کوٹھری سے نکال ہی لو تو تمہارے حق میں بہتر ہوگا۔"

وہ اپنا غیظ و غضب بھول کر بہت زور سے ہنسا گویا میرے اس بیان سے بہت ہی محظوظ ہوا ہو۔ ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ میں گہری سنجیدگی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ آخر اس کی ہنسی تھمی تو وہ بولا "اچھا... تو تم اس فائیو اسٹار ہوٹل اور اے سی گروپ آف کمپنیز کے مالک ہو...؟" لہجہ پہلے سے زیادہ تمسخرانہ تھا۔

"تمہیں اس میں کوئی شک ہے؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"نہیں... نہیں... میں بھلا شک کرنے والا کون ہوتا ہوں۔ میں تو مشورہ دینا چاہتا تھا کہ ذرا اور اچھی طرح یاد کرلو... ذہن پر ذرا اور زور دے لو کہ کراچی کی مزید کون کون سی بلڈنگیں... کون کون سے کارخانے تمہاری ملکیت ہیں۔ ہو سکتا ہے بعض کے نام تمہارے ذہن سے نکل گئے ہوں۔ بڑے لوگوں کی بڑی باتیں..."

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ آخر تمہیں اتنا طنز فرمانے کی

ضرورت کیوں پیش آرہی ہے؟ جو لوگ ان چیزوں کے مالک ہوتے ہیں ان کے سینگ ہوتے ہیں یا دُم ہوتی ہے؟" میں نے اس کی بے تکی پر ذرا حیران ہوتے ہوئے کہا۔

"ہرگز نہیں" اس نے سہلایا "دُم اور سینگ تو پاگلوں اور گپ بازوں کے بھی نہیں ہوتے۔"

"تم مجھے پاگل سمجھ رہے ہو یا گپ باز؟" میں نے اسے گھورا۔

"یہ تو تمہارے تفصیلی معائنے کے بعد ہی معلوم ہو سکے گا۔ آج کی رات تم ہمارے مہمان خانے میں گزار لو گے تو پھر کل میں فیصلہ کروں گا کہ مجھے تمہارے بارے میں کیا رائے قائم کرنی چاہیے۔ فی الحال میں اپنی رائے محفوظ رکھ رہا ہوں۔" وہ بڑے مہذبانہ لہجے میں بولا۔

"آخر یہ بے اعتباری کیوں ہے؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"کچھ خدا کا خوف کرو چن جی...!" وہ گویا میری ناسمجھی پر افسوس کرتے ہوئے بولا "اوئے... ایک فائیو اسٹار ہوٹل اور گروپ آف کمپنیز کا مالک پچھلی گلی میں غنڈوں سے دست بدست لڑتا پھر رہا تھا؟ اوئے تمہارے پاس کوئی بندہ نہیں تھا اس قسم کے کاموں کے لیے؟ کوئی سیکیورٹی گارڈ... کوئی باڈی گارڈ... کوئی چمچا ٹھما... آج کل تو دکانداروں نے بھی گارڈ رکھے ہوئے ہیں۔ تم اپنے آپ کو جتنا بڑا سیٹھ بتا رہے ہو نا... اتنے بڑے سیٹھ تو فقیر کو "معاف کرو بابا" بھی اپنے منہ سے نہیں کہتے۔ اس کام کے لیے بھی انہوں نے آدمی رکھا ہوتا ہے۔ تم وہاں سنسان گلی میں چار چار آدمیوں سے پنگا لے رہے تھے جو تمہارے دعوے کے مطابق بدمعاش بھی تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی تھے۔"

اس نے بڑے سادہ الفاظ میں اپنی بے اعتباری کی وجہ بیان کردی تھی۔ تب اس کے رویّے پر میری حیرت کافی حد تک دور ہوگئی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "پیارے دوست! آدمیوں کی تو میرے پاس کوئی کمی نہیں... گارڈ وارڈ بھی ہیں... لیکن کیا کروں۔ عادتیں بہت بگڑی ہوئی ہیں۔ سب سے بُری عادت تو یہ ہے کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اپنی گاڑی تک خود ڈرائیو کرتا ہوں۔ ویسے تمام ضروری کاموں کے لیے آدمی موجود ہیں... بلکہ پوری فوج ہے لیکن اتفاق کچھ ایسا ہے کہ اکثر ضروری موقعوں پر یا تو انہیں بُلانے کا موقع ہی نہیں ملتا... یا پھر میں خود بھول جاتا ہوں۔ میری یہ تقصیر معاف کردو بھائی! یہ اتنا بڑا گناہ تو نہیں ہے کہ تم اُٹھا کر مجھے حوالات میں ڈال دو اور رات کو "چھترول شترول" کا پروگرام بنانے لگو۔"

"پروگرام چھترول شترول سے بہت آگے جائے گا پیارے!" اس نے میری تقریر سے متاثر ہوئے بغیر بڑے شیریں لہجے میں کہا "ویسے تم نے پینترا خوب بدلا ہے۔ آدمی ذہین معلوم ہوتے ہو۔"

میرا دل کچھ ڈوب سا گیا۔ وہ گدھا میری بات پر یقین کرنے کے لیے تیار معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپنے ذہن میں اُٹھتے اُبال پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اچھا تم مجھے ایک فون کرنے کا موقع تو دو... میں تم سے کچھ بھی نہیں کہتا... بس مجھے ایک فون کرنے دو... اس کے بعد جو کچھ بھی کہنا ہوگا وہ دوسرے ہی آکر تم سے کہیں گے، میں کچھ نہیں کہوں گا۔"

"یہ حوالات ہے پیارے! پبلک کال آفس نہیں ہے" وہ اطمینان سے بولا اور میرا اطمینان رخصت ہونے لگا۔

"دیکھو... مجھے اپنی اتنی فکر نہیں ہے۔ مجھے ان چاروں بدمعاشوں کی زیادہ فکر ہے" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش جاری رکھی "اوّل تو مجھے یقین ہے کہ وہ نکل چکے ہیں لیکن اگر ابھی تک نہیں نکلے ہیں تو تمہاری کٹ حجتی میں نکل جائیں گے۔ ان میں سے ایک... جس نے اصل میں فساد شروع کیا تھا، مجھے میرے ہوٹل میں ہی بیٹھا نظر آیا تھا لیکن میرا خیال ہے وہ لوگ میرے ہوٹل میں نہیں ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہ کہیں اور سے آئے ہوئے تھے۔ تم ان کے غیر ملکی ہونے سے مرعوب ہوگئے اور وہ نکل گئے۔ وہ اچھے خاصے وارداتیے معلوم ہوتے تھے۔"

"تمہیں ان کی فکر میں دُبلا ہونے کی ضرورت نہیں" اس نے مشورہ دیا۔

"اچھا... اگر تم مجھے فون کرنے کا موقع نہیں دے سکتے تو کم از کم خود ہی میرے ہوٹل فون کرکے میرے بارے میں کچھ معلومات کرلو" میں نے کہا۔

"میں اتنا فارغ نہیں ہوں" اس نے ٹکا سا جواب دیا۔

"تبھی اتنی دیر سے اپنا یہ کھڑکی والا منہ لیے میرے سامنے کھڑے ہو اور بکواس کیے جا رہے ہو" آخر مجھے دوبارہ کچھ غصہ آگیا "یار! تم تو بہت ہی خرد ماغ آدمی ہو۔ کسی طرح بات مان کر ہی نہیں دیتے۔"

"اگر میں اپنے پکڑے ہوئے ہر آدمی کی بات ماننے لگوں تو پھر میں کر چکا تھانیداری" وہ سر جھٹک کر بولا "یہاں تو ہر کوئی ایک نئی کہانی سناتا ہے۔"

پھر جیسے اسے کچھ خیال آیا اور ذرا نرمی سے بولا "تمہاری جیب سے کوئی ایسی چیز نہیں نکلی جس سے تمہاری شناخت میں مدد ملتی ہو... اور نہ ہی کوئی رقم وغیرہ تھی۔"

اسے گویا میری جیب سے رقم برآمد نہ ہونے کا افسوس تھا۔ رقم سے ہی شاید وہ میری حیثیت کا تعین کرتا۔ میں نے ایک بار پھر اسے سمجھانے کی کوشش کی "میں تو کھانا کھانے کے لیے اوپر اپنے کمرے سے نیچے ہال میں آیا تھا۔ میں کہیں جانے کے لیے تیار ہو کر نہیں آیا تھا..."

میں نے جلدی جلدی اسے مختصراً اس جھگڑے کا پس منظر بتایا کیونکہ وہ کچھ توجہ سے میری بات سُننے پر تیار نظر نہیں آرہا تھا۔ معلوم نہیں میرے جلدی جلدی بتانے کی وجہ سے بات اس کی سمجھ میں آئی بھی یا نہیں... بہرحال اس کے بعد میں نے کہا۔ "ویسے بھی

زیادہ بڑے کاروباری لوگ جیب میں رقمیں لیے نہیں گھومتے۔ میں تو اس وقت ایک طرح سے اپنے "گھر" میں ہی بیٹھا تھا۔ ویسے بھی میں اپنی جیبوں میں کوئی ایسے کاغذات لیے نہیں پھرتا جن سے میری حیثیت کا پتا چلتا ہو یا یہ ظاہر ہوتا ہو کہ میں فلاں فلاں چیز کا مالک ہوں، کبھی یہ ثابت کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اب مجھے کیا معلوم تھا کہ زندگی میں کبھی تم جیسے ٹیڑھے آدمی سے واسطہ پڑ جائے گا۔ اور وہ بھی ایسے حالات میں...!"

میں ٹھنڈی سانس لے کر خاموش ہو گیا لیکن وہاں "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" والا معاملہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کے دماغ میں جو سنک سمائی تھی سو سمائی تھی۔ اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔

وہ جانے کے لیے مڑتے ہوئے بولا "فی الحال تم آرام سے بیٹھو۔ تم سے "مہمان خانے" میں ہی ساری ضروری باتیں ہوں گی۔ وہاں آدمی ذرا دوسری طرح بات کرتا ہے۔"

جاتے جاتے اس نے اپنے ہونٹوں پر ہاتھ پھیرا۔ وہ گویا مجھے یاد دلانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے دانت ٹوٹنے والی بات بھولا نہیں تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ تو بہت ہی بُرا ہوا تھا۔ اگر یہ بدبخت خادم حسین کسی بھی طرح میری بات ماننے پر آمادہ نہیں تھا تو میں کس طرح اس پر اپنی شناخت ثابت کر سکتا تھا؟ وہ کسی سے میرا رابطہ کرانے پر تیار نہیں تھا۔ میں تو بیٹھے بٹھائے اچھی بھلی مشکل میں پھنس گیا تھا۔ میرا تو آج شام فرح کی طرف چکر لگانے کا پروگرام تھا اور میں یہی سوچ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ اگر سگنل کھلا مل گیا تو رات بڑی رنگین گزرے گی۔ یہاں تو رات کسی اور ہی طرح گزرتی نظر آ رہی تھی۔ ابھی تو سر کے گومڑ میں ہی ٹیسیں اُٹھ رہی تھیں۔ کل تک تو داستانِ غم نہ جانے کس موڑ تک پہنچ سکتی تھی۔ ہوٹل میں کم از کم کل تک تو کسی کو احساس نہیں ہو سکتا تھا کہ میں کہیں غائب ہو گیا ہوں۔

اس کے بعد اگر احساس ہو بھی جاتا تب بھی شاید کسی کے وہم و گمان میں نہ ہوتا کہ میں کسی حوالات میں بھی پایا جا سکتا ہوں۔ میری گمشدگی کا تاثر واضح ہونے میں شاید تین چار دن لگ جاتے۔ اس کے بعد بھی اگر مجھے تلاش کیا جاتا تو شاید حوالات کے سوا باقی ہر جگہ کھنگالی جاتی۔

مجھے ذرا پریشانی کے عالم میں بیٹھے دیکھ کر وہ دونوں نوجوان کھسکتے ہوئے میرے قریب آ گئے۔ اب ان میں سے ایک بولا تو اس کا لہجہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ وہ نرمی اور احترام سے بولا "سر! آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ تھانے دار..... کا بچہ آپ پر پریشر ڈال رہا ہے۔ بہرحال کسی نہ کسی وقت آپ کے بارے میں تصدیق ضرور کرے گا....." وہ نوجوان اور کم عمر ہوتے ہوئے بھی اس طرح بات کر رہا تھا جیسے اسے ان معاملات کا کافی تجربہ تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "آپ بہرحال بڑے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ لگتا یہی ہے کہ آپ تو کچھ نہ کچھ دے دلا کر یا کسی اور زیادہ بڑے آدمی کا فون وغیرہ آنے پر چھوٹ ہی جائیں گے.... لیکن یہاں سے جاتے وقت ذرا ہم غریبوں کا بھی خیال رکھیے گا۔ ہمیں تو کوئی چھڑانے والا بھی نہیں ہے.... اور ہمارا تو یہ بہت ہی بُرا حشر کریں گے...." اس کی آواز بھرانے لگی۔

"تمہیں کس سلسلے میں پکڑا گیا ہے؟" میں نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"ڈبل سواری موٹر سائیکل چلانے کے جرم میں۔" اس نے جواب دیا۔

"جب پابندی ہے تو تم کیوں چلا رہے تھے ڈبل سواری؟" میں نے پوچھا۔

"وہ.....جی....." اس نے گڑبڑا کر دوسرے لڑکے کی طرف دیکھا۔

"مجبوری آن پڑی تھی جی؟" دوسرا لڑکا جلدی سے بولا "ہم دونوں کو فوری طور پر ایک جگہ جانا پڑ گیا تھا..... بہت جلدی کا کام تھا... سواری نہیں مل رہی تھی.... فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ ہم نے سوچا تھا دو منٹ کی تو بات ہے۔ بچتے بچاتے گزر جائیں گے۔ شاید راستے میں کوئی پولیس والا نہ ٹکرائے۔"

پہلا لڑکا ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ویسے میلوں تک کوئی پولیس والا نظر نہیں آتا۔ لوگ بڑی بڑی وارداتیں کر کے بھاگ جاتے ہیں۔ کھچا کھچ بھرے ہوئے بازاروں میں واردات کر کے ٹیکسیوں اور کاروں میں بھاگ جاتے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں روک پاتا۔ کبھی کبھی ہم جیسے غریب غربا مجبوری میں بھی ڈبل سواری جا رہے ہوتے ہیں تو دو چار قدم بعد ہی پکڑے جاتے ہیں.... ہے عجیب بات؟"

"بے شک۔ بہت ہی عجیب بات ہے" میں نے اس کی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھوں میں جھانکا۔ "تمہارے لیے کوئی بھاگ دوڑ کرنے والا نہیں ہے؟"

"نہیں سر! ہم دونوں کے تو ماں باپ بھی نہیں ہیں" اس کے لہجے میں مسکینی تھی۔

"کرتے کیا ہو؟ پڑھتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں سر! پڑھنا تو ہمارا چھوٹ چکا ہے۔ میں ایک دکان میں کام کرتا ہوں..... یہ ایک کمپنی میں کام کرتا ہے...." اس نے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ "موٹر سائیکل اسی کی تھی۔ اسے کمپنی کی طرف سے ملی ہوئی ہے۔"

"تمہارے ماں باپ نہیں ہیں تو رہتے کس کے ساتھ ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں اپنے شادی شدہ بھائی کے ساتھ رہتا ہوں.... یہ چچا کے ساتھ رہتا ہے.... لیکن انہیں پتا چلے گا تو وہ ہمیں چھڑانے کے بجائے الٹا لاتعلق بن جائیں گے۔ وہ تو ویسے ہی ہم سے جان

چھڑانے کا کوئی بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ سر.... ہماری کچھ مدد ضرور کریں.... آپ کو دعائیں دیں گے.... ہم غریب لوگ ہیں جی.... یہ لوگ ہم پر پتا نہیں کون کون سا مقدمہ ڈال دیں۔"

"پہلے میں اپنی مدد کا کوئی طریقہ سوچ لوں۔ اگر میں خود اپنی مدد کرنے میں کامیاب ہو گیا تو پھر تمہاری مدد کرنا میرے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہوگا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "فی الحال تو میں خود بہت بُرا پھنس گیا ہوں۔ اس قسم کی صورتِ حال کا تو میں نے کبھی تصور ہی نہیں کیا تھا۔ صرف ایک ٹیلی فون کال سے میرا مسئلہ حل ہو سکتا ہے اور یہ بدبخت... ایک فون کرنے کا موقع نہیں دے رہا...." میری مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"موقع تو وہ یقیناً دے گا...." ایک نوجوان نے مربیانہ لہجے میں گویا مجھے تسلی دی "ابھی وہ بڑے غصے میں ہے۔ آخر آپ نے اس کے دانت توڑے ہیں۔ یہ کوئی معمولی بات واقعی نہیں ہے۔ اس کا تو اپنے علاقے میں بڑا دبدبہ ہے۔ بڑے بڑے دادا گیر اس سے کنی کتراتے ہیں۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟" میں نے بغور اس کی طرف دیکھا۔ اس کی ناک بڑی نوکیلی تھی۔

"ہمارے علاقے کا تھانے دار ہے نا جی...." اس نے جلدی سے جواب دیا "آخر انسان کو اپنے علاقے کی باتوں کا تو پتا ہوتا ہے.... ہم اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ہیں.... اُٹھتے بیٹھتے ہیں.... باتیں تو سنتے ہیں۔"

"ہاں.... یہ بات تو ہے" میں نے سر ہلایا اور پھر اپنے گومڑ کو سہلایا۔

دوسرے نوجوان نے مجھے مزید تسلی دی "ابھی تو اس کا دانت ٹوٹنے کا درد بھی کم نہیں ہوا ہوگا.... ڈاکٹر کے پاس سے آیا ہوگا.... دوا وغیرہ کھائی ہوگی۔ جب دوا کا اچھی طرح اثر ہوگا.... تکلیف کم ہوگی تو اس کی کھوپڑی ٹھنڈی ہوگی پھر وہ یقیناً یا تو خود آپ کے بارے میں معلومات کرے گا یا پھر آپ کو ایک آدھ فون کرنے کا موقع دے گا۔ بہرحال آپ کے بارے میں تھوڑی بہت تسلی کیے بغیر وہ آپ کو اُلٹا نہیں لٹکائے گا۔"

پھر ایک لمحے خاموش رہ کر وہ بولا "ویسے آپ نے اپنے بارے میں جو دعوے کیے ہیں اگر وہ ٹھیک نہ ہوئے تو پھر آپ کا بڑا برا حشر ہوگا۔"

میں نے کوئی جواب نہ دیا اور ایک لمحے خاموشی کے بعد پوچھا "ٹائم کیا ہوا ہوگا؟ تم میں سے کسی کے پاس گھڑی ہے؟"

"گھڑی....!" ایک نوجوان استہزائیہ انداز میں ہنسا "آپ کی طرح ہمارا بھی سب کچھ انہی کے پاس ہے سر! ہم تو کہتے ہیں بے شک وہ ہمارے کپڑے بھی اُتار لیں.... بس ہماری کھال ہمارے جسم پر باقی چھوڑ دیں.... اور ہمیں کچھ نہیں چاہیے۔"

دوسرا نوجوان بولا "ویسے مجھے وقت کا اندازہ ہے۔ اس وقت چھ بجنے والے ہوں گے۔"

"اوہ!...." میں کراہ کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا مجھے ان لوگوں کے ہتھے چڑھے تین گھنٹے گزر چکے تھے۔ تین بجے کے قریب میں اپنے ہوٹل کی عقبی گلی میں نکلا تھا۔

میں ایک ٹھنڈی سانس لے کر، سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر چٹائی پر لیٹ گیا۔ اب میں انتظار کرنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ وہ خر دماغ تھانے دار میرے ہوٹل فون کر ہی لے اور وہاں سے اسے میرے بارے میں معلومات حاصل ہو جائیں۔

میری اس دعا کا کوئی اثر دیکھنے میں نہیں آیا۔ برابر کی کوٹھریوں سے لوگوں کے آنے جانے اور کسی کو لانے، کسی کو لے جائے جانے کی آوازیں آتی رہیں لیکن ہم تین حوالاتیوں پر گویا کوئی خصوصی کرم تھا کہ کسی نے آ کر ہماری کوٹھری میں جھانکا تک نہیں۔

حوالات کی ساخت بھی کچھ عجیب ہی تھی۔ ہماری کوٹھری کا رُخ کچھ ایسا تھا کہ برابر کی کوٹھریوں میں آنے جانے والوں کو ہم نہیں دیکھ سکتے تھے۔ میں نے آوازیں دے کر بھی کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی۔ طبیعت پر جبر کرتے ہوئے تھوڑا بہت شور بھی مچایا لیکن تب بھی کسی نے آ کر پوچھنے یا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کی زحمت نہیں کی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوٹھری چھانٹ کر ہمارے لیے منتخب کی گئی تھی کہ وہ لوگ ہمیں اس میں ڈال کر بھول جائیں۔

آخر کار میں مایوس ہو کر واپس چٹائی پر آ بیٹھا۔ میں نے خود کو تن بہ تقدیر چھوڑ دیا۔ معلوم نہیں میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔ میں نے محسوس کیا جوں جوں رات گہری ہو رہی تھی ان دونوں لڑکوں کے چہرے گویا سوکھتے جا رہے تھے۔ ان کے منہ محاورتاً نہیں، حقیقتاً ذرا سے نکل آئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم چکی تھیں۔ اب ہمارے اردگرد سکوت چھا چکا تھا لیکن یہ سکوت شاید انہیں اور بھی زیادہ خوف زدہ کر رہا تھا۔

بے بسی اور مایوسی نے مجھے بھی کچھ پژمردہ سا کر دیا تھا۔ عجیب بات تھی کہ میں نے بہت بُرے حالات میں بھی کبھی اپنے آپ کو ایسا پژمردہ محسوس نہیں کیا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جدوجہد کے لیے کم از کم آزاد تو ہوتا تھا۔ مجھے آج تجربہ ہوا تھا کہ بے بس چوہے کی طرح کسی چوہے دان میں پھنس جانا اپنی جگہ ایک سزا تھی۔

اس عالم میں شاید چند لمحے کے لیے میرے ذہن پر غنودگی نے بھی غلبہ پا لیا تھا۔ میں ملے جلے قدموں کی آواز سن کر چونکا اور تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ غنودگی فوراً ہی غائب ہو گئی۔ کشیدگی اور تناؤ نے اس کی جگہ لے لی۔ قدموں کی یہ آوازیں میرے لیے نہ جانے کیا پیغام لے کر آ رہی تھیں۔ نہ جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا؟

تین افراد میری کوٹھری کے دروازے پر آن رُکے اور میرے سینے سے بے اختیار ایک طویل سانس خارج ہوئی۔ وہ تین افراد شفیع شاہ، زرتاج اور ایس ایچ او خادم حسین تھے۔ خادم حسین آگے آگے تھا۔ زرتاج اور شفیع شاہ اس کے پیچھے تھے۔ ان کے چہروں پر گہری سنجیدگی تھی۔ ایس ایچ او کا چہرہ متورم ہونٹوں سے قطع نظر، سپاٹ نظر آرہا تھا۔

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ایس ایچ او نے خود آگے بڑھ کر کوٹھری کا تالا کھولا اور صرف مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ میں باہر آچکا تو اس نے کوٹھری کو دوبارہ تالا لگادیا۔ میں نے پلٹ کر ایک نظر لڑکوں کی طرف دیکھا۔ وہ پُرامید سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا انہیں تسلی دی کہ میں... ان کے لیے ضرور کچھ کرنے کی کوشش کروں گا۔

نہایت خاموشی سے ہم تینوں ایس ایچ او کی رہنمائی میں ایک طرف کو چل دیے اور تب مجھے حوالات کی دوسری کوٹھریوں پر نظر ڈالنے کا موقع ملا جن میں حوالاتی بھیڑ بکریوں کی طرح ٹھنسے ہوئے تھے۔ نیم تاریک اور نحوست زدہ سے راستوں سے گزر کر ہم خادم حسین کے ساتھ اس کے آفس میں پہنچے تب اس کے چہرے پر کچھ تاثرات نمودار ہوئے جو پہلے کے تاثرات سے بہت مختلف تھے۔

اس نے صرف شفیع شاہ اور زرتاج کو ہی نہیں، مجھے بھی نہایت ادب سے کرسی پیش کی اور بڑی نرمی و احترام سے بولا "سر! میں معذرت چاہتا ہوں... میری وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف اُٹھانا پڑی۔"

"نہیں پیارے خادم حسین! تکلیف تو شاید میں نے خود اپنی وجہ سے اُٹھائی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کرسی پر ڈھیر ہوتے ہوئے کہا "لیکن شاید یہ تکلیف دو دانت ٹوٹنے کی تکلیف سے پھر بھی کم تھی... اور شکر ہے اصل "تکلیف" شروع ہونے سے پہلے ہی حالات نے پلٹا کھالیا۔"

وہ مضطربانہ انداز میں چھڑی کو ہاتھوں میں گھماتے ہوئے خوش دلی سے ہنسا۔ اب اس کے چہرے پر غصہ اور نفرت نہیں تھی تو اس کے سُوجے ہوئے ہونٹ بھی برے نہیں لگ رہے تھے۔ میں اس کے تاثرات کی اس تبدیلی کو دیکھ رہا تھا اور دل ہی دل میں قدرت کے کاموں پر حیران ہو رہا تھا۔ جب کبھی آپ کسی مشکل میں ہوتے ہیں، بڑے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں، بڑے جتن کرتے ہیں، اپنی سی ہر تدبیر لڑاتے ہیں مگر آپ کی ایک نہیں چلتی۔ کہتے ہیں مایوسی کفر ہے، مایوس نہیں ہونا چاہیے، ہمت نہیں ہارنی چاہیے لیکن فطری سی بات ہے... انسان زیادہ نہ سہی تھوڑا بہت مایوس ضرور ہوتا ہے۔ پوری طرح شکست خوردہ نہ سہی لیکن خود کو تھوڑا بہت دل گرفتہ ضرور محسوس کرتا ہے۔

ایسے میں اچانک کوئی معجزہ سا رونما ہوتا ہے۔ شاید اسے معجزہ نہیں کہنا چاہیے۔ ہم جیسے گناہ گار اس قابل کہاں ہیں کہ ہمارے لیے معجزے رونما ہوں لیکن اتنا ضرور ہوتا ہے کہ ہمارا مسئلہ حل ہونے کے لیے اچانک کوئی سبب بن جاتا ہے۔ یکدم گویا تاریک بادل چھٹ جاتے ہیں اور سورج نکل آتا ہے۔

اس وقت مجھے کچھ ایسا ہی تجربہ ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے مایوسی کی تاریکی کبھی تھی ہی نہیں۔ آپ یاد کریں تو آپ کو بھی زندگی میں ایسے بہت سے مواقع یاد آئیں گے جب آپ گویا مایوسی کی دلدل میں اُترتے اُترتے یکدم باہر آگئے تھے۔ میں دل ہی دل میں اس تجربے سے لطف اندوز ہونے میں کچھ اس طرح محو تھا کہ مجھے شفیع شاہ اور زرتاج سے یہ پوچھنے کا بھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ وہاں کس طرح آن پہنچے تھے۔ شاید خادم حسین نے میرے ہوٹل سے رابطہ کرہی لیا تھا حالانکہ وہ یہ زحمت کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا تھا۔

خادم حسین خاصے خادمانہ انداز میں ہنستے ہوئے بولا "سر! آپ کے لیے چائے وغیرہ منگاؤں یا پہلے آپ کھانا کھانا پسند کریں گے؟ ٹھیک ہے آپ فائیو اسٹار ہوٹل کے مالک ہیں، آج کل ہوٹل میں ہی رہ رہے ہیں... وہیں کے کھانے کھاتے ہوں گے لیکن آج ہم غریب پولیس والوں کے ساتھ بھی کھانا کھا کر دیکھ لیجیے۔"

"غریب پولیس والے..." میں کراہ کر رہ گیا "اس خوشحال علاقے کا ایس ایچ او ہوتے ہوئے تو ایسی بات مت کرو۔"

"مذاق چھوڑیں سر! آپ بتائیں کیا کھانا پسند کریں گے؟ جو آپ پسند کریں گے، حاضر ہوجائے گا" خادم حسین بدستور مسکراتے ہوئے بولا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے... جو میں پسند کروں گا، حاضر ہوجائے گا" میں نے گہری سانس لے کر کہا "اگر تم مجھے کچھ کھلانا ہی چاہتے ہو تو ایسا کرو کہ چار چھ چھتر... پانچ سات ٹھڈے... آٹھ دس گھونسے... بارہ پندرہ تھپڑ اور بیس تیس گالیاں کھلوادو۔ اس وقت ذرا ہلکا پھلکا ہی کھانے کا موڈ ہے۔"

وہ زور سے ہنسا لیکن اس کی ہنسی کراہ سے مشابہ تھی "سر! کیوں مذاق اُڑاتے ہیں... ٹھیک ہے... ہم سے غلطی ہوئی لیکن میں معذرت کے ساتھ کہوں گا کہ تھوڑی بہت غلطی آپ کی بھی تھی..."

"تھوڑی بہت نہیں... زیادہ غلطی میری تھی" میں نے تسلیم کیا "لیکن اس سے بھی بڑی غلطی اب تم کر رہے تھے کہ میں تمہیں اپنے بارے میں بتارہا تھا لیکن تم اس کی تصدیق کرنے کی کوشش نہیں کررہے تھے۔ شکر ہے آخر تم نے میرے ہوٹل رابطہ کرلیا اور میری شامت آتے آتے رہ گئی۔"

وہ کچھ کھسیانا سا نظر آنے لگا۔ اس کی وجہ مجھے تب معلوم ہوئی جب زرتاج نے کھنکار کر گلا صاف کیا اور بولی "انہوں نے تو ابھی کسی سے رابطہ نہیں کیا تھا۔ ہم ان کے رابطہ کرنے پر تو یہاں نہیں پہنچے ہیں... اور یہ جو تمہیں اتنے مہربان نظر آرہے ہیں

کی وجہ بھی صرف ہم نہیں ہیں.... انہیں ڈی آئی جی صاحب نے فون کیا ہے۔ اس لیے ان کے لہجے سے شہد ٹپک رہا ہے۔"

"کیا...؟" میں نے حیرت سے کہا "انہوں نے تم سے رابطہ نہیں کیا؟ تو پھر تم لوگ یہاں کس طرح پہنچے؟"

زرتاج ٹھنڈی سانس لے کر بولی "تمہاری قسمت اچھی تھی جو پہنچ گئے ورنہ شاید آج خادم حسین صاحب قوم کے خادم کی حیثیت سے تمہاری کچھ نہ کچھ خدمت کر ہی گزرتے۔"

"پھر بھی...؟" میں نے تجسس سے پوچھا "یہ کیسے ممکن ہوا؟"

"درحقیقت سلویا نے تمہاری عدم موجودگی کو محسوس کیا اور اسی کو اس معاملے میں کچھ گڑبڑ کا بھی احساس ہوا" زرتاج بتانے لگی "اس نے دیکھا تھا کہ تمہیں باہر سے کوئی رقعہ آیا تھا اور اس کے بعد سے ہی تم اس طرح پُراسرار سے انداز میں غائب تھے کہ تمہارا موبائل فون بھی اس ریزروڈ میز پر رکھا رہ گیا۔ وہ شام کو جنرل منیجر سے مل کر اس سلسلے میں بات کر رہی تھی جب اتفاق سے میں بھی تم سے ملنے کے ارادے سے وہاں جا پہنچی۔ ہوٹل والے اس لیے زیادہ تشویش میں مبتلا نہیں ہو رہے تھے کہ اس طرح غائب ہونا اور آتے جاتے رہنا تمہارا معمول ہے...."

"میں خود اسی بات سے ڈر رہا تھا کہ وہ یہی سوچیں گے" میں نے کراہ کر کہا۔

"انسان کو خود بھی اپنی بُری عادتوں کا پتا ہوتا ہے" زرتاج سنجیدگی سے بولی۔ میں نے اسے گھورا تاہم اس نے بات جاری رکھی "بہرحال سلویا تشویش زدہ رہی۔ اس کی چھٹی حِس اس سلسلے میں اس کی صحیح رہنمائی کر رہی تھی۔ مجھے بھی اس کی تشویش میں شریک ہونا پڑا۔ اسی دوران شفیع شاہ بھی وہاں آن پہنچا۔ یوں ہمارا کام آسان ہو گیا۔ شکر ہے شفیع شاہ نے تمہاری عادتوں سے واقف ہونے کے باوجود اس معاملے کو غیر اہم نہیں سمجھا..."

اس نے مسکرا کر شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ شفیع شاہ نے سر جھکا لیا۔ بات زرتاج نے ہی جاری رکھی "ہم نے سلویا کو تو اس کے کمرے میں بھیج دیا اور تمہارے بارے میں "تفتیش" شروع کی۔ پتا چلا تمہیں پچھلے گیٹ کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ پچھلے گیٹ کے راستے ہم دونوں پچھلی گلی میں پہنچے اور ہر چیز کا جائزہ لیتے ہوئے کافی دور تک نکل گئے۔ آخر ایک جگہ ہمیں بجیرو نظر آئی جس میں کافی ٹوٹ پھوٹ ہو چکی تھی۔ اس کا مالک پریشان تھا کہ کون اس کی گاڑی کا یہ حشر کر گیا تھا۔ ہم نے بھی کئی لوگوں سے پوچھا۔ کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔"

"وہ ایک عجیب گلی ہے...!" میں نے کہا "کبھی کبھی وہاں گھنٹے گھنٹے، دو دو گھنٹے تک کسی کا گزر نہیں ہوتا" پھر میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "لیکن کمال یہ ہے کہ آج پولیس وہاں پہنچ گئی جو اکثر بھرے بازاروں میں ہونے والی وارداتوں پر نہیں پہنچ پاتی۔"

"ہاں... تمہاری طرح جب کسی کی قسمت میں ذلت لکھی ہو تو پھر ایسی ہی انہونیاں ہوتی ہیں" زرتاج بولی "بہرحال... ہم پریشان پھرتے رہے۔ ہمیں یہ یقین ہو گیا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ تھی۔ آخر کار ہمیں ایک "بوڑھی" سی گاڑی کے پاس ایک بو... سا پارسی کھڑا ملا۔ اسے شاید ہماری پریشانی پر کچھ ترس آ گیا۔ ا... کے گھر کی ایک کھڑکی اسی گلی میں کھلتی ہے۔ اس کھڑکی کے را... اس نے سب کچھ دیکھا تھا لیکن جیسا کہ ہمارے ہاں عام رو... ہے.... وہ بے چارا بھی پریشانی سے بچنے کے لیے اور پولیس... چکروں سے دور رہنے کے لیے خاموش تھا اور انجان بنا ہوا... اس نے پہلے ہم سے وعدہ... بلکہ حلف لیا کہ ہم اسے کسی چکر... ملوث نہیں ہونے دیں گے۔ پھر اس نے بتایا کہ اس نے گلی... کس طرح جھگڑا ہوتے دیکھا تھا.... کس طرح ایک شخص بے... ہوا... کس طرح پولیس اسے موبائل میں ڈال کر لے گئی۔ خو... قسمتی سے موبائل کا نمبر اور علاقے کا نام بھی اس نے دیکھ لیا... وہ اپنے ہی علاقے کی موبائل تھی۔ میں نے فوراً ڈی آئی جی صا... سے رابطہ کیا۔ وہ میرے جاننے والے ہیں۔ ان کا تعلق زرتاج... کے ایک قریبی گاؤں سے ہے۔ اتفاق سے وہ تمہارے بھی جا... والے نکل آئے...."

"ان کی مہربانی ہے کہ انہوں نے ہم جیسے غریب غربا کو یاد... ہوا ہے ورنہ پولیس والے بھلا کب کسی کو یاد رکھتے ہیں" میں... خادم حسین کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کرسی پر کسمسا رہا تھا۔

زرتاج سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی "انہوں نے یہاں... کر کے تصدیق کی کہ کیا اس حُلیے کا کوئی آدمی یہاں لایا گیا تھا او... اس نے اپنے بارے میں کچھ بتایا تھا؟ خادم حسین صاحب نے... مشکل سے اقرار کیا۔"

"پھر بھی شکر کا مقام ہے کہ اقرار کر تو لیا" میں نے کہا "اگر مجھے "مہمان خانے" میں بھجوا چکے ہوتے تو شاید ان کے لیے اق... کرنا بھی مشکل ہو جاتا۔"

"نہیں جی.... وہ تو میں ایسے ہی ذرا آپ کو دکا شبکا لگا... تھا..." خادم حسین کھسیانی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "میں نے آ... کو ایسے ہی تو مہمان خانے میں نہیں بھیج دینا تھا۔ پہلے آپ... بارے میں تھوڑی بہت تحقیقات تو کرنی ہی تھیں۔"

"اُمید تو نہیں تھی۔ بہرحال.... تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں"... نے سر ہلایا۔

زرتاج مجھ سے مخاطب ہوئی "ہم نے اپنی داستانِ غم تو تم... سُنا دی۔ اب اُٹھو.... اور چلو۔ بے چاری انگریز حسینائیں... تمہارے لیے پریشان ہو رہی ہیں۔"

خادم حسین جلدی سے بولا "میں ایک بار پھر بہت بہت معا... چاہتا ہوں۔ کبھی کبھی غلط فہمی میں ایسا ہو جاتا ہے" وہ حقیقتاً... شرمندہ نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا ڈی آئی جی صاحب نے اس کی... ٹھاک خبر لی تھی۔ وہ اپنے دانت ٹوٹنے کا صدمہ بھی بھول گیا تھا۔

"ابھی کچھ نہیں بگڑا تھا اس لیے زیادہ معافیاں مانگنے کی ضرورت نہیں" میں نے فراخ دلی سے کہا "مجھے بھی تم سے معافی مانگنی چاہیے۔ میں نے بھی نادانستگی میں تمہیں نقصان پہنچایا ہے۔ بہرحال.... اب اس قصے کو بھول کر تم دو کام ضرور کرو۔ پہلا کام تو یہ ہے کہ تم ان چاروں غیر ملکی لفنگوں کو تلاش کرنے کی کوشش کرو جو تمہیں جُل دے کر مجھے پھنسوا کر کھسک گئے۔ غیر ملکیوں کی تلاش کرنا زیادہ مشکل تو نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ تمہارے ہتھے چڑھ جائیں تو انہیں ٹھیک ٹھاک قسم کا رگڑا لگاؤ۔ وہ غیر ملکی ہیں... ان کے سفارت خانے ضرور مداخلت کریں گے لیکن ان کی مداخلت کے باوجود تم جس حد تک رگڑا لگا سکو، ضرور لگا دینا۔ تم لوگوں کے پاس اس سلسلے میں کافی گُر ہوتے ہیں۔ جب تمہیں کسی کو رگڑا لگانا ہوتا ہے تو بڑی سے بڑی مداخلت کے باوجود لگا ہی دیتے ہو اور ہاتھ پاؤں بھی بچا لیتے ہو...."

خادم حسین انکساری سے مسکرایا اور بولا "آپ بے فکر رہیں۔ میں انہیں بھی دیکھ لوں گا اور ان کے سفارت خانوں کو بھی۔"

"سوچ لو... ان میں سے تین گورے ہیں.... مرعوب ہو جاؤ گے" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جب سفارت خانے والے بیچ میں آئیں گے تو تھوڑا بہت مرعوب ہونا ہی پڑے گا لیکن میں رگڑا پہلے لگا دوں گا۔ مرعوب بعد میں ہوتا رہوں گا۔" وہ بولا۔

"بہت خوب!" میں نے سر ہلایا "آدمی تم ہوشیار ہو حالانکہ شکل سے نہیں لگتے۔ تم بے فکری سے انہیں رگڑا لگانا۔ اگر تم پر اس کے نتیجے میں کوئی مشکل پڑنے لگے تو مجھے یاد کر لینا۔ مجھ سے جو بھی ہو سکا، کروں گا.... اور اگر تم سے ان کی جان جلدی چھوٹ جائے تب بھی انہیں چھوڑنے سے پہلے مجھے ضرور اطلاع دینا پھر میں بھی انہیں تھوڑا بہت سبق دلوانے کا بندوبست کروں گا۔ ایسے لوگوں کی مجھے بھی تلاش رہتی ہے۔"

"بہت بہتر سر!" خادم حسین نے سعادت مندی سے سر ہلایا۔

"دوسرا کام تم سے یہ ہے کہ کسی اور کی سفارش پر تم مجھے چھوڑ رہے ہو.... اب میری سفارش پر ان دو لڑکوں کو چھوڑ دو جو میرے ساتھ کوٹھری میں تھے۔ کوئی ایسا سنگین جرم نہیں ہے بے چاروں کا" میں نے کہا۔

"اب یہ کام مجھ سے مت کہیے صاحب...." وہ گویا یکدم ہی ہتھے سے اُکھڑتے ہوئے بولا "یہ ٹھیک ہے کہ ہم لوگ کبھی غلطی سے... اور کبھی جان بوجھ کر بھی غلط آدمی کو پکڑ لیتے ہیں اور کبھی بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ میں بے گناہ بھی لپیٹ میں آ جاتے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم جتنے بھی لوگوں کو پکڑتے ہیں، سارے کے سارے ہی بے گناہ ہوتے ہیں۔ پچاس آدمیوں کے قاتل کو بھی جس وقت ہم پکڑتے ہیں اس وقت وہ یہی کہتا ہے کہ میں معصوم ہوں۔"

"کیا مطلب....؟ ان لڑکوں نے کچھ کیا ہے کیا؟" میں نے شک زدہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے خاموشی سے اپنی میز کی درازیں کھولیں۔ ہزار ہزار کے کئی نوٹ، دو ٹی ٹی پستول، ایک چاقو اور دو شناختی کارڈ اس نے دراز سے نکال کر میز پر رکھ دیے۔ ایک لمحے ہم خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر وہ بولا "ہم نے انہیں ایک بینک کے پاس مشکوک انداز میں منڈلاتے ہوئے پکڑا تھا اور ان کے قبضے سے یہ چیزیں برآمد ہوئی تھیں۔"

"پکی بات ہے؟" میں نے پوچھا "اپنی طرف سے تو ان کے کھاتے میں نہیں ڈال رہے ہو نا؟"

"میں اپنی مری ہوئی ماں کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ یہ ان کے قبضے سے برآمد ہوئی ہیں۔ پندرہ ہزار سے زیادہ کی رقم ہے.... اور یہ میں آپ کو صاف گوئی سے بتا رہا ہوں کہ یہ میں پی جاؤں گا۔ یہ میں ان کے کھاتے کے بجائے اپنے کھاتے میں ڈال لوں گا لیکن آپ مجھ سے جیسی چاہیں قسم لے لیں.... یہ انہی کی جیبوں سے نکلی ہیں.... یہ دو لوڈڈ ٹی ٹی ہیں.... یہ ایک کالج کے دو جعلی کارڈ ہیں۔ میں نے کالج سے تصدیق کرا لی ہے۔ اس کالج سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جس موٹر سائیکل پر یہ سوار تھے وہ چوری کی تھی۔ اس کے باوجود اگر وہ معصوم ہیں تو پھر ہمیں تو نوکری چھوڑ کر گھر جا کر بیٹھ جانا چاہیے۔ ہماری یہاں کیا ضرورت ہے" اس کے لہجے میں سچ کی تلخی تھی۔ اس نے تھکے تھکے سے انداز میں کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لیا۔

"ٹھیک ہے پیارے! میں تمہارے کام میں ٹانگ نہیں اَڑاتا" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "میری ٹانگ پہلے ہی اتنے معاملات میں اَڑی ہوئی ہے کہ اب تک اسے ٹوٹ جانا چاہیے تھا۔ پتا نہیں کس طرح بچی ہوئی ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔"

میں اٹھ کھڑا ہوا۔ میرے ساتھ ہی زرتاج اور شفیع شاہ بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ خادم حسین کے سر سے گویا کوئی بوجھ اُتر گیا۔ وہ باہر راہداری تک ہمیں چھوڑنے آیا۔ تھانے سے باہر زرتاج کی بجیرو کھڑی تھی۔ شفیع شاہ اسی کے ساتھ آیا تھا۔ اپنی گاڑی نہیں لایا تھا۔

میں نے زرتاج کے ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا "تم زندگی میں بہت ہی اہم موقعوں پر میرے کام آ رہی ہو۔ سمجھ میں نہیں آتا میں کس طرح تمہارا شکریہ ادا کر سکتا ہوں۔"

"کسی بیس منزلہ عمارت کی چھت سے چھلانگ لگا کر" زرتاج نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا "میرے اس مشورے پر عمل کرنے سے تمہارے سبھی دوستوں کا بھلا ہو گا جو بے چارے تمہاری وجہ سے ہر وقت ... نہ کسی مشکل میں گرفتار رہتے ہیں۔"

"دوستوں کو تکلیف دینا دوستوں کا اخلاقی فرض ہے" میں نے کہا اور وہ مجھے گھور کر رہ گئی۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولی "ڈی آئی جی صاحب کے ٹیلی فون کے باوجود بے چارے تھانیدار کو یقین نہیں آرہا تھا کہ تم کوئی بڑے آدمی ہو کیونکہ اس نے تمہیں تھرڈ ریٹ بدمعاشوں کی طرح لڑتے دیکھا تھا۔"

"کیا کروں۔ مجبوری تھی" میں نے کندھے اُچکائے "دست بدست لڑائی کا ابھی تک کوئی ایسا باوقار طریقہ ایجاد نہیں ہوا جس میں انسان نہایت باعزت اور فرسٹ ریٹ نظر آئے۔ تھرڈ ریٹ بدمعاشوں سے تو انسان تھرڈ ریٹ بدمعاشوں کی طرح ہی لڑ سکتا ہے۔ اگر میں مرنجان مرنج قسم کا سیٹھ صاحب نظر آنے کی کوشش کرتا تو صرف میری تکفین و تدفین ہی فرسٹ ریٹ ہو سکتی تھی۔"

"اتنے معمولی لفنگوں سے نمٹنے کے لیے تم کسی اور کو بھیج سکتے تھے" وہ بولی۔

"بس یہی غلطی ہو گئی" میں نے تسلیم کیا "لیکن کیا کیا جائے۔۔۔ غربت کے زمانے کی عادتیں جاتی نہیں ہیں۔ اکثر اپنے چھوٹے چھوٹے کام بھی خود کرنے نکل کھڑا ہوتا ہوں۔ اس کے سوا مجھے یہ اندازہ بھی نہیں تھا کہ وہاں چار لفنگے میرے منتظر ہوں گے۔ اصل فسادی صرف ایک ہی تھا۔ میرا خیال تھا کہ صرف وہی باہر میرا منتظر ہو گا۔ ایک آدھ ہاتھ میں ہی اس کا دماغ درست کر کے واپس آجاؤں گا۔"

"اس کے بجائے تمہارا اپنا دماغ درست ہو گیا" زرتاج بے نیازانہ سے انداز میں ڈرائیونگ جاری رکھتے ہوئے بولی "خیر۔۔۔ اچھا ہوا تمہیں تھوڑا سا ڈوز مل گیا۔ کافی دن ہو گئے تھے تمہیں آرام کی زندگی گزارتے ہوئے۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولی "اگر وہ منحوس گلے پڑ ہی گئے تھے تو گولی مار کر قصہ پاک کرتے اور کھسک آتے۔ ویران گلی کا کچھ تو فائدہ اُٹھاتے۔" اس کا لہجہ سرسری تھا گویا وہ کسی نہایت ہی معمولی سے کام کی بات کر رہی تھی۔

"شاید میں ایسا کر گزرتا۔ افسوس کہ میرے پاس اس وقت کوئی گن نہیں تھی" میں نے جواب دیا۔

"تم ان حالات میں بھی بغیر گن کے پھرتے رہتے ہو؟" اس نے ترچھی نظر سے میری طرف دیکھا۔

"کبھی کبھار غلطی سے خالی ہاتھ نکل آتا ہوں۔ سوچتا ہوں ہم جیسے مادّیت پرست اور گناہ گار انسانوں کو صرف ہاتھ پیروں پر۔۔۔ اور ہاتھ پاؤں بنانے والے پر بھی بھروسا کر کے دیکھنا چاہیے۔ بیسیوں مرتبہ یہ تجربہ کر کے دیکھ چکا ہوں اور ابھی تک زندہ ہوں۔"

"خیر۔۔۔ یہ تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ ڈھیٹ لوگ آسانی سے نہیں مرتے۔" وہ گہری سانس لے کر بولی "تاہم حالات کی مناسبت سے تمہیں کچھ محتاط رہنا چاہیے۔"

"حالات تو میرے اکثر ایسے ہی رہتے ہیں جیسے آج کل ہیں۔۔۔ بلکہ شاید آج کل تو بہت بہتر ہیں۔ تم نے تو مجھے ا[illegible] تمہیں زیادہ عبرت ناک حالات میں دیکھا ہے۔"

"ہاں۔۔۔ دیکھا تو ہے۔۔۔ کاش نہ دیکھا ہوتا۔۔۔!" وہ [illegible] بولی۔

میں نے پلٹ کر پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے شفیع شاہ کی دیکھا اور کہا "شفیع ڈیئر! تم کیوں اتنے خاموش ہو؟ کچھ [illegible] ہو سکے تو تم بھی مجھے لعن طعن کرو۔ آج میرا لعن طعن سُننے [illegible] ہے۔"

"میری یہ مجال کہاں سر!" وہ مسکراتے ہوئے بولا "میں [illegible] ہی دل میں خود کو لعن طعن کر رہا ہوں کہ آپ کے ساتھ ایسا ہو گیا اور میں آپ کے ہمراہ نہیں تھا۔ مجھے بڑا افسوس ہے۔"

زرتاج بولی "اس میں افسوس کی کیا بات ہے؟ ایسا ہوتا ہے اس طرح کے کاموں میں۔۔۔! آخر تمہارا باس ایک [illegible] صورت، نوجوان انگریز لڑکی کی نظر میں ہیرو بننے گیا تھا" اس [illegible] لہجے میں شرارت تھی۔ وہ غالباً سلویا سے سارا واقعہ معلوم [illegible] آئی تھی۔

"ایک شریف اور باحیا مرد پر ایسی تہمتیں مت دھرو" [illegible] کراہ کر کہا۔ "اس خوب صورت، نوجوان، انگریز لڑکی کو تو [illegible] بھی نہیں گیا تھا کہ میں کہاں جا رہا تھا۔"

"لیکن اب یہ ضرور بتانا کہ تم کہاں سے آرہے ہو۔ [illegible] نظر میں تمہاری قدر و منزلت بڑھ جائے گی۔ فلموں میں بھی عاشق اپنی محبوبہ کی وجہ سے جیل کی ہوا کھاتے ہیں" اس [illegible] بدستور شریر تھی۔

"اگر تم نے اپنی یہ ٹٹ پونجیا قسم کی جلی کٹی باتیں [illegible] رکھیں تو میں دروازہ کھول کر تمہاری پجیرو سے چھلانگ لگا دوں گا اور میرا خون تمہاری گردن پر ہو گا۔" میں نے دروازے کے [illegible] پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"اس سے پہلے کہ تمہارا خون میری گردن پر ہو۔ میرا [illegible] تمہاری گردن پر ہو گا" وہ نہایت مشاقی سے ایک موڑ کاٹتے ہوئے بولی۔ اس کا ایک بازو کھڑکی میں ٹکا ہوا تھا اور وہ صرف ایک [illegible] سے اسٹیرنگ وہیل سنبھالے ہوئے تھی۔ ایک تو پجیرو ویسے [illegible] کچھ غیر نسوانی سی گاڑی تھی۔ اوپر سے اس کا ڈرائیونگ کا [illegible] بھی خاصا غیر نسوانی تھا۔ اس کے باوجود اس میں نسوانیت اور خوبصورتی کی کمی نہیں تھی۔ یہی اس کی انفرادیت تھی۔

"یعنی اب تم دراز دستی وغیرہ بھی کرو گی؟" میں نے [illegible] سے کہا "میں تو تمہیں کافی امن پسند، مہذب اور ڈیسنٹ [illegible] لڑکی سمجھتا تھا۔"

"وہ تو میں ہوں۔۔۔ لیکن لوگوں کو بے ہودہ قسم کے کاموں [illegible] روکنے کے لیے ہاتھ پاؤں تو ہلانے پڑتے ہیں نا" وہ بولی۔

اسی قسم کی باتیں کرتے ہم ہوٹل جا پہنچے۔ زرتاج نے [illegible]

کے صدر دروازے پر گاڑی روکی لیکن اس کے اُترنے کے آثار دکھائی نہ دیے۔ میں نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا "اندر چلو نا۔۔۔ تم نے مجھ پر اتنا بڑا احسان کیا ہے۔۔۔ اب مجھے جواباً تمہاری کچھ خاطر مدارات تو کرنی چاہیے۔"

"خاطر مدارات اب تم جا کر سلویا کی کرو۔۔۔" وہ اسٹیئرنگ وہیل پر انگلیاں نچاتے ہوئے بولی "میں تو پہلے ہی تمہیں تلاش کرنے کے چکر میں کافی وقت برباد کر چکی ہوں۔ شام سے خوار ہو رہی ہوں۔ اب کل ہی کسی وقت آرام سے بیٹھ کر گپ شپ کریں گے۔ میں پہلے فون کر لوں گی۔ فی الحال تم جا کر اپنی حالت ٹھیک کرو۔ کافی صحت افزا مقام سے آرہے ہو۔"

میں نے اپنے گومڑ کو آہستگی سے سہلاتے ہوئے کہا "ایک تو یہ آج کل کی حسینائیں نہ جانے کیوں اتنی سنگدل، منہ پھٹ اور ہتھ چھٹ ہوتی ہیں۔ کسی مہذب آدمی کے جذبات کی تو انہیں کوئی قدر ہی نہیں ہوتی" میں نے گاڑی سے اُترتے ہوئے کہا "جاؤ۔۔۔ خدا حافظ۔۔۔!"

اس نے مسکراتے ہوئے زناٹے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں اور شفیع شاہ اندر آئے تو یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ میری پُراسرار گمشدگی کی خبر ہوٹل کے پورے عملے میں پھیل چکی تھی اور سیکیورٹی والوں سمیت کافی لوگ اس سلسلے میں پریشان تھے۔ وہ میرے گرد آن جمع ہوئے۔ میں نے انہیں تسلی دے کر ان کے کاموں پر واپس بھیجا اور آفس میں داخل ہوا۔ وہاں سلویا اور برائن موجود تھے۔

میری "پُراسرار گمشدگی" کی خبر سلویا ہی نے پھیلائی تھی۔ اس سے مجھے فائدہ تو پہنچا تھا کہ زرتاج اور شفیع شاہ نے مل کر مجھے ڈھونڈ نکالا تھا لیکن وضاحتیں بھی بہت کرنا پڑ رہی تھیں۔ ان باپ بیٹی کو بھی سارا واقعہ سُنانا پڑا جس کے بعد وہ دیر تک افسوس اور ہمدردی کا اظہار کرتے رہے اور سفید فاموں کی اخلاقی گراوٹ پر شرمندہ ہوتے رہے۔ غنیمت تھا کہ ابھی انہوں نے اپنی آنکھوں سے یہ نہیں دیکھا تھا کہ ہمارے اپنے لوگ یہاں کیا کرتے پھر رہے تھے۔ ورنہ شاید وہ مجھ سے کاروباری مذاکرات مکمل کیے بغیر ہی سر پر پاؤں رکھ کر واپس بھاگ لیتے۔

کافی دیر بعد وہ دونوں رخصت ہوئے تو میں نے طویل سانس لے کر ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگا لیا۔ اب نہ جانے کیوں میرے سر کا گومڑ زیادہ تکلیف نہیں دے رہا تھا۔ شاید اپنے آرام دہ ماحول میں واپس پہنچنے کے صرف نفسیاتی ہی نہیں بلکہ جسمانی اثرات بھی بہت تیزی سے ظاہر ہوتے تھے۔

"شفیع شاہ! یہ عجیب و غریب اور بے ہودہ سا معاملہ بیچ میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اتنا وقت ضائع ہو گیا۔ ہم اصل ٹریک سے ہٹ گئے۔ یہ بتاؤ ہم جس مسئلے پر کام کر رہے تھے اس میں کوئی پیش رفت ہوئی یا نہیں؟ تمہیں مزید کچھ معلومات حاصل ہوئیں یا نہیں؟" میں نے گویا سلسلہ وہیں سے جوڑا جہاں سے ٹوٹا تھا۔

شفیع شاہ دھیرے سے ہنس کر بولا "آپ کو ذرا آرام سے کرسی پر کمر ٹکاتے ہی اصل مسئلہ یاد آگیا۔ میرا تو خیال ہے آپ اب جا کر آرام کریں۔ مسئلے مسائل پر کل بات کر لیں گے۔"

"بات چیت میں کون سا زور لگتا ہے شفیع ڈیئر! آرام تو مجھے کرنا ہی ہے۔ آج کا تقریباً پورا دن بے کار قسم کی بک بک میں ضائع ہو گیا ہے۔ اگر سونے سے پہلے کوئی کام کی بات ہو جائے تو شاید دل کو اطمینان ہو" میں نے کہا۔

"یہ بھی کام کیا ہے سر۔۔۔ خدمتِ خلق ہی ہے" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میری نظر میں یہ اپنے کاموں سے بھی زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ اس قسم کے کاموں میں کوئی غیبی قوت بھی انسان کی مدد کرتی ہے۔ میں تو سوچ رہا ہوں آئندہ ہم جان بوجھ کر اس قسم کے کسی نہ کسی کام میں ٹانگ اُڑائے رکھا کریں گے" میں نے کہا۔

وہ خود استہزائی کے سے انداز میں ہنسا "ہمیں ٹانگ اُڑانے کی ضرورت کیا ہے۔ ہماری ٹانگ تو خود بخود ہی جا کر نہ جانے کس طرح کسی نہ کسی معاملے میں ضرور اُڑ جاتی ہے۔"

"میرے خیال میں تو یہ اچھی مصروفیت ہے۔ دنیا کے کاروبار تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ صرف بزنس کرتے رہنے اور دنیاوی معمولات انجام دیتے رہنے میں اب کوئی لطف محسوس نہیں ہوتا۔ کچھ کام ایسے بھی ہونے چاہئیں جن میں مقصدیت ہو۔۔۔ ہیجان خیزی اور سنسنی ہو۔۔۔ لہو گرم رکھنے کا کوئی بہانہ ہو۔۔۔ اور ساتھ ساتھ اس میں دوسروں کا بھلا بھی ہو۔ ایک عام بزنس مین کی طرح صبح سے شام کرنا۔۔۔ اور رات کو خواب آور گولیاں کھا کر سو جانا کوئی قابلِ رشک زندگی نہیں ہے" میں نے اپنے منتشر بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

"یہ تو ہمارے درمیان بہت پہلے طے ہو گیا تھا سر!" وہ سنجیدگی سے بولا "حقیقت میں تو اسی لیے "دی سرکل" کی بنیاد رکھی گئی تھی۔۔۔ اور درحقیقت ہمیں اب تک تو عام بزنس مین کی طرح زندگی گزارنے کا موقع ملا بھی نہیں ہے۔"

"ہمارے حق میں شاید یہ اچھا ہی ہے" میں نے طمانیت سے کہا "اب اس تازہ ترین چکر میں مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہے کہ ہم مونا تک بروقت نہیں پہنچ سکے اور اسے نہیں بچا سکے لیکن میں چاہتا ہوں اس کی قربانی کسی کام آجائے۔ ہم اس خوفناک دھندے کا خاتمہ کر سکیں جو اندر ہی اندر لڑکیوں کی زندگی برباد کر رہا ہے اور ہماری سوسائٹی میں ایک خطرناک فحش کلچر کی بنیاد رکھ رہا ہے۔ اگر کچھ لڑکیاں ناسمجھ یا کسی حد تک آزاد خیال بھی ہیں۔۔۔ یا شوبزنس میں کوئی مقام بنانا چاہتی ہیں تب بھی ان کی کمزوریوں سے اس طرح فائدہ اُٹھانے اور انہیں اپنے چنگل میں پھنسا کر کسی اور ہی سمت میں لے جانے کی اجازت کسی کو نہیں ملنی چاہیے۔ اب ہم نے

اس سلسلے میں ٹانگ اَڑائی ہے تو میں چاہتا ہوں ہم اسے انجام تک پہنچا کر ہی چھوڑیں۔ مونا کی موت کے ساتھ بات ختم نہیں ہوجانی چاہیے... بلکہ میرا خیال ہے بات شروع ہی اب ہوئی ہے۔"

"فی الحال مجھے اس سلسلے میں مزید کوئی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں" شفیع شاہ معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا۔

"مجھے ایک لڑکی ملی ہے۔ اس نے حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں۔ اس سارے دھندے کے پیچھے تو پیردانش کا ہاتھ نکلا۔" میں نے کہا۔ "بلکہ مجھے تو اندیشہ ہے کہ اس شہر میں ہونے والے اور نہ جانے کس کس خوفناک دھندے کے پیچھے پیردانش کا ہاتھ ہو۔"

"لڑکی وہی ہے جس کے تعاقب میں آپ ائرپورٹ سے روانہ ہوئے تھے؟" شفیع شاہ نے تصدیق چاہی۔

"ہاں۔ اس کا نام فرح ہے... یا کم از کم فی الحال اس نے یہی نام بتایا ہے۔" میں نے جواب دیا۔ پھر میں نے شفیع شاہ کو وہ ساری باتیں بتائیں جو فرح نے مجھے بتائی تھیں۔ صرف یہ نہیں بتایا کہ وہ قطعی غیر متوقع طور پر کس حد تک مجھ پر مہربان ہوئی تھی۔ شفیع شاہ ایک لمحے کے لیے گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"اس نے تو ہمارے سامنے موجود تمام سوالوں کے جواب دے دیے" آخر وہ بولا۔

"ہاں۔ اس میں کوئی شک نہیں" میں نے اس کی تائید کی۔

"کہیں اس کا انجام بھی مونا جیسا نہ ہو" اس نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"اس کا امکان نہیں ہے... کیونکہ اس نے نہایت صاف گوئی سے ہماری کوئی عملی مدد کرنے سے انکار کردیا ہے۔ وقت پڑنے پر وہ صاف مکر جائے گی کہ اس نے ہمیں ایسی کوئی بات بتائی تھی۔ اس کی پوزیشن مونا والی نہیں ہے اس لیے اس کا انجام مونا جیسا ہونے کا خطرہ نہیں ہے۔ وہ نہ تو زیرِ عتاب ہے اور نہ ہی اس کا بغاوت کا کوئی ارادہ ہے۔ اس نے اپنے دل کی بھڑاس ضرور نکالی ہے اور اپنی زندگی سے کچھ لمحے چُرا کر اپنی مرضی سے گزارے ہیں... اور شاید آئندہ بھی گزارتی رہے... اس طرح کی کچھ اور باتیں بتاتی رہے... لیکن درحقیقت وہ کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتی۔ وہ اپنے پتے ہوشیاری سے کھیلنا جانتی ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے پیردانش پر ہاتھ نہیں ڈالا جاسکتا؟" شفیع شاہ نے دریافت کیا۔

"صرف ایک مضبوط گواہ مل جائے تو ہاتھ ڈالا جاسکتا ہے" میں نے جواب دیا۔

"اگر مضبوط گواہ نہ ملا تو وہ یونہی آزاد پھرتا رہے گا... اور اپنے گھناؤنے دھندوں سے سوسائٹی کو زہریلا بناتا رہے گا؟" شفیع شاہ نے تصدیق چاہی۔

"فی الحال تو ایسا ہی معلوم ہوتا ہے" میں نے جواب دیا۔

"ہم اسے قانونی طریقوں سے انجام کو پہنچانے کے بجائے خود ہی اس کا پتّا صاف کردیتے ہیں۔" شفیع شاہ نے تجویز پیش کی۔

"تمہارے لیے اُلجھنیں کھڑی ہوجائیں گی۔ پیردانش کوئی موٹی شخصیت نہیں ہے۔ اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ وہ ہمارے بارے میں خبردار ہوچکا ہے کہ ہماری نظر اس تک ہے۔ اس لیے پہلے اس نے ڈرامے بازی کرکے ہماری تو... کی کوشش کی... اور اب اس نے اپنے حفاظتی انتظا... بڑھانے کے ساتھ ساتھ کوئی ایسا بندوبست بھی کیا ہوگا کہ ا... اچانک کچھ ہوجائے تو شبہ فوراً ہم پر آئے۔ میں فی الحال ا... اُلجھنیں مول لینا نہیں چاہتا۔"

"اسے کوئی حادثہ بھی تو پیش آسکتا ہے... اس کی ک... پھٹ سکتا ہے... کوئی ٹرک اس کی گاڑی سے ٹکرا کر... ہوسکتا ہے..." شفیع شاہ نے تجویز کیا۔

"اس کے کسی بھی صورت میں مرنے کے نتائج ہمیں... پڑیں گے اس لیے بہتر یہی ہے کہ قانون اس پر ہاتھ ڈالے... وقت بے شک یہ ظاہر ہوجائے کہ ہماری وجہ سے ایسا... ہمیں اگر کوئی پریشانی اٹھانی ہی ہے تو قانون پر کوئی احسا... اُٹھائیں۔ یہ نہ ہو کہ ہم ایک نیک کام کریں اور اُلٹا قانو... میں ہماری حیثیت مجرم کی سی ہوجائے۔"

شفیع شاہ ایک لمحے کچھ سوچتا رہا پھر خفیف سی مسکرا... ساتھ بولا "جڑیں تو ہماری بھی بہت گہری ہیں۔ پیردانش... اگر کوئی گواہ نہیں ہے تو کیا ہوا... آپ نفیس صاحب... صورتِ حال بتا کر ان سے کہیے کہ وہ اس جعلی پیر کو ٹھکانے... کوئی بندوبست کریں۔"

"اس معاملے کے لیے وہ زیادہ بڑے آدمی ہیں۔ ا... کے مسئلے کو لفٹ نہیں کرائیں گے۔ وہ ان مسائل میں... ہیں جن سے ملکی سلامتی کو خطرہ ہو... اور انہیں ان سے... نہیں ہے... خیر... ابھی تم اس مسئلے میں زیادہ سرمت... نہ کوئی صورت نکل ہی آئے گی۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ... ہے کہ اصل مجرم کا پتا چل گیا ہے۔ اب اسے قابو میں کر... کوئی نہ کوئی طریقہ نکل ہی آئے گا... ...نے گویا اے...

"میں ابھی اس لڑکی سے دو چار نشستیں اور کرکے دیکھنا... وہ اپنا ارادہ بدل ہی دے اور ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہوجا...

شفیع شاہ کے پتلے پتلے ہونٹوں پر مسکراہٹ ذرا واضح...

اس پر ذرا محنت کیجیے نا... جو لڑکی پہلی ملاقات میں ...کھول لے... سارے سوالوں کے جواب دینے پر آمادہ ہو... اپنی موجودہ زندگی کو تج دینے اور ہمارے شانہ بشانہ کھڑ... حوصلہ بھی کرسکتی ہے۔ آپ ابھی قسمت آزمائی جاری... دیکھیں پردۂ غیب سے کیا ظہور میں آتا ہے؟"

"تمہارا کیا خیال ہے... میں نے قسمت آزمائی ... ہے کیا؟ میں تو پہلے ہی کہہ رہا ہوں کہ میں ابھی اس...

نشستیں اور کرکے دیکھوں گا... بلکہ مجھے تو آج بھی اس کی طرف جانا تھا لیکن افسوس..." میں اپنے سر کے گومڑ پر ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

"میں آپ کی کامیابی کے لیے دعا کروں گا" وہ اُٹھنے کے لیے پر تولتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے فی الحال آپ آرام کریں۔"

میں نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ میرا حُلیہ کافی خراب نظر آرہا تھا۔ مجھے اپنا حُلیہ درست کرنے اور آرام کرنے کی واقعی ضرورت تھی۔ میں سرہلاتے ہوئے اُٹھ کھڑا ہوا اور شفیع شاہ کو رخصت کرکے اپنے کمرے میں آگیا۔ مونا اور فرح کی وڈیو کیسٹس میرے کمرے میں بے پروائی سے پڑی تھیں۔ یہ کیسٹس کچھ نہ کچھ اہم ثابت ہوسکتی تھیں اور کسی وقت کسی نہ کسی حد تک کام آسکتی تھیں۔ میرے کمرے میں وہ زیادہ محفوظ نہیں تھیں کیونکہ وہ بہرحال ہوٹل کا کمرا تھا۔ میں نے سیکیورٹی انچارج داؤد کو اپنے کمرے میں طلب کیا اور اس کے ہاتھ وہ کیسٹس ہوٹل کی سیف میں رکھوانے کے لیے بھجوادیں اور خود شاور لے کر لباس تبدیل کرکے سوگیا۔

دوسرے روز دوپہر تک سونے کے بعد میں اُٹھ کر تیار ہوا اور نیچے آیا تو سلویا کا پیغام میرا منتظر تھا۔ وہ باپ بیٹی آج بھی دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھانا چاہتے تھے اور ڈائننگ ہال میں میرے منتظر تھے۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ان کے ساتھ کل کھانا کھانا تو مجھے خاصا مہنگا پڑا تھا۔ میں نے دل ہی دل میں دعا کی کہ آج کوئی ایسا واقعہ نہ ہو۔ مجھے بہرحال ڈائننگ روم میں جانا پڑا۔ ایک تو وہ مہمان تھے' دوسرے ان سے کاروباری تعلق بھی تھا اور ان دونوں باتوں سے بڑھ کر یہ کہ ان دونوں کا خلوص میرے لیے حیران کن تھا۔ میں نے سفید فاموں میں کبھی یہ خلوص اور گرم جوشی نہیں دیکھی تھی۔

میں شام ڈھلے تک ان کے ساتھ رہا۔ حتیٰ کہ ترنگ میں آکر میں انہیں گاڑی میں بٹھا کر کراچی کے دو تین اہم مقامات بھی دکھالایا جہاں خاص طور پر میرے ساتھ جانے کے لیے سلویا بہت پُراشتیاق تھی۔ ان جگہوں پر اس نے پُرانے دوستوں کی طرح میرے گلے میں بانہیں ڈال ڈال کر اپنے کیمرے سے تصویریں بھی اُتروائیں۔ تصویریں اُتارنے کا فریضہ اس کے والدِ گرامی نے انجام دیا۔

وہ اس کے بعد بھی میرے ساتھ رہنے کی فکر میں تھی۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ اب میں بھی اس کی ذات میں دلچسپی محسوس کرنے لگا تھا لیکن سرِدست میرا ذہن فرح میں اٹکا ہوا تھا۔ میں اس کی طرف ایک چکر لگا کر دیکھنا چاہتا تھا۔ شاید آج اس سے ملاقات ہوہی جاتی۔ میں چاہ رہا تھا کہ ایک ملاقات پیردانش کے مڈل ایسٹ سے واپس آنے سے پہلے ہوجائے۔ پیردانش اگر شہر میں موجود ہوتا تو پھر خواہ فرح سے ملاقات ہو بھی جاتی لیکن اس میں اطمینان اور سکون میسر نہیں آسکتا تھا۔ چنانچہ میں نے سلویا سے ایک ضروری کام کا بہانہ کرکے معذرت کی اور ان باپ بیٹی کو واپس ہوٹل چھوڑ کر اپنے مشن پر روانہ ہوگیا۔

میں نے گاڑی فرح کے بنگلے کی عقبی گلی سے بھی کچھ دور ہی چھوڑ دی۔ اس وقت شام کے سائے گہرے ہورہے تھے۔ میں چہل قدمی کے سے انداز میں عقبی گلی میں پہنچا اور یہ دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہوگیا کہ اس مخصوص بنگلے کے کونے میں درختوں کے درمیان ایک اونچے پول پر نیلے رنگ کا وہ گلوب روشن تھا جسے میں نے اور فرح نے سگنل مقرر کیا تھا۔

چاروں طرف ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ میں ٹہلنے ہی کے سے انداز میں اس چھوٹے سے گیٹ تک پہنچا جس کا رنگ اور ڈیزائن دیوار سے اس حد تک ہم آہنگ تھا کہ سرسری نظر میں اس پر توجہ بھی نہیں جاتی تھی۔ فرح کی دی ہوئی چابی میں نے بہت احتیاط سے رکھی ہوئی تھی۔ اسے نکال کر میں نے بے آواز طریقے سے گیٹ کا تالا کھولا اور اندر جا پہنچا۔ گیٹ میں نے نہایت آہستگی سے اپنے عقب میں کلک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ بند کردیا۔

میرے سامنے پاپلر کے اونچے درخت تھے۔ چند لمحے میں ان درختوں کی اوٹ میں ہی رہا اور سرسبز لان کے عقبی حصے کا جائزہ لیتا رہا۔ جب کوئی آتا جاتا دکھائی نہ دیا تو میں آگے بڑھا۔ ایک پختہ روش عبور کرنے کے بعد مجھے سوئمنگ پول دکھائی دیا۔ سوئمنگ پول کے کنارے پر وہ رشک چمن موجود تھی۔

اس کی پشت میری طرف تھی اور وہ ایک لمبی ایزی چیئر پر نیم دراز تھی۔ اس کے لمبے بھورے بال کرسی سے نیچے جھول رہے تھے اور ایک آدھ لٹ مدھم ہوا کے جھونکوں سے نہایت آہستگی سے لہرا رہی تھی۔ میں صرف اتنا دیکھ سکتا تھا کہ اس نے اپنے چہرے پر پھولدار رنگین ہیٹ رکھا ہوا تھا۔ شاید وہ ورزش کے طور پر سوئمنگ کرتی تھی اور اس وقت بھی سوئمنگ کرنے کے بعد سستا رہی تھی۔ اچھا ہی ہوا تھا کہ وہ مجھے گھر سے باہر ہی مل گئی تھی۔

میں دبے قدموں سے اس کے قریب پہنچا۔ میں عقب سے ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے سے ہیٹ اُٹھا کر اچانک اسے حیران کردینا چاہتا تھا۔ اس نے گلوب روشن رکھا تھا۔ شاید اسے میری آمد کی ایک موہوم سی اُمید رہی ہو۔ شاید اس وقت وہ میرے بارے میں ہی سوچ رہی ہو۔ یہ سوچتے ہوئے میں نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہلکا پھلکا کپڑے کا ہیٹ اس کے چہرے پر سے اُٹھالیا۔

دوسرے ہی لمحے میں اس بری طرح لڑکھڑایا کہ اگر میں سوئمنگ پول کے زیادہ قریب ہوتا تو شاید اس میں گر جاتا۔ وہ فرح کا چہرہ نہیں تھا جو میری طرف تک رہا تھا۔ اس قسم کے چہرے ڈراؤنی اور ہیبت ناک فلموں میں تیز موسیقی کے ساتھ اچانک اسکرین پر نمودار ہوتے تھے۔

حلقوں سے اُبھری ہوئی پھٹی پھٹی' ساکت اور بے نور آنکھیں۔ سُوجے ہوئے سے نیم وا ہونٹ اور پھولا پھولا سا نیلگوں

چہرہ۔۔۔! یہ وہ صورت تو نہیں تھی جو دیکھنے والے کو مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی تھی۔ یہ تو انسان کو خوابوں میں دہشت زدہ کر دینے والا چہرہ تھا۔ چہرہ فرح ہی کا تھا لیکن اس پر کوئی قیامت گزر گئی تھی۔

ایک لمحے کے لیے میرے حواس جواب دے گئے۔ یہ جھٹکا میرے لیے بہت ہی غیر متوقع تھا تاہم میں نے کسی نہ کسی طرح سنبھل کر ذرا جھک کر دیکھا تو فرح کے اس حال کو پہنچنے کی وجہ معلوم ہو گئی۔ وجہ در حقیقت اس کی مرمریں گردن کے گرد موجود تھی۔ وہ گردن کو اب مرمریں نہیں رہی تھی۔ باریک سے ایک تار کا پھندا گردن پر لپٹا ہوا تھا اور گوشت میں اُتر گیا تھا۔

میں شاید اس دھچکے سے سنبھلنے کے بعد ذرا غور سے اس کا جائزہ لیتا لیکن اچانک مجھے کسی نامعلوم خطرے کا احساس ہوا۔ مجھے گھر کے اندر کوئی کھٹکا سُنائی دیا تھا۔ ایک درندے کی طرح یک لخت میری تمام حسیات بیدار ہو گئیں۔ میں نے اندرونی جیب سے گن نکالی۔ اسی لمحے دھڑ سے میرے سامنے 'سوئمنگ پول کے دوسری طرف مکان کا عقبی دروازہ کھلا اور بیک وقت دو تین بڑی بڑی گنیں باہر آتی دکھائی دیں۔ اوپر چھت کے کنارے سے بھی کچھ گنوں کی نالیں نمودار ہوتی دکھائی دیں۔

شاید میں نے اندھا دھند فائر کر دیا ہوتا لیکن ان گنوں کے عقب میں مجھے پولیس کی وردیوں کی جھلک بھی نظر آ گئی اور میری انگلی بروقت رُک گئی۔ میں نے الٹی چھلانگ لگائی اور لان کی گھاس پر لڑھکتا چلا گیا۔

"خبردار۔۔۔ رُک جاؤ۔۔۔" بیک وقت کئی گھبرائی ہوئی سی آوازیں گونجیں لیکن مجھے رُکنے میں عافیت نظر نہیں آئی۔ وہاں کوئی زبردست جال میرا منتظر تھا۔

فضا گولیوں کے دھاکوں اور تڑتڑاہٹ سے مرتعش ہو کر رہ گئی۔ پانی کے چھپاکے بھی سُنائی دیے تھے۔ شاید کچھ گولیاں سوئمنگ پول کے پانی میں بھی ٹھنڈی ہوئی تھیں۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ کچھ گولیاں فرح کی لاش میں بھی پیوست ہوئی ہوں۔ اسے بھی غالباً لاش کی بے حرمتی ہی کہا جا سکتا تھا۔

کچھ ننھے ننھے ٹکڑے اور ریت سی مجھ پر بھی آ کر گری تھی۔ شاید وہ سوئمنگ پول کے کنارے لگی ہوئی خوب صورت ٹائلوں کے ٹکڑے تھے۔ میں نے چھلانگ بروقت ہی لگائی تھی ورنہ یقیناً میرا جسم گولیوں سے چھلنی ہو چکا ہوتا۔ غنیمت تھا کہ دوبارہ گولیوں کی بوچھاڑ ہونے سے پہلے مجھے پاپلر کے درختوں کی آڑ میسر آ گئی اور میں ان کے درمیان سے بھاگتا چلا گیا۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ چند سیکنڈ ہی جاری رہی۔ اس کے بعد انسانی شور شروع ہو گیا۔ کوئی آواز واضح نہیں تھی مگر پھر بھی اس شور کا اپنا ایک مفہوم تھا۔ یہ "مارو۔۔۔ پکڑو۔۔۔ جانے نہ پائے۔۔۔" قسم کا شور تھا۔ میں اس وقت تک چھوٹے عقبی گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔

شکر کا مقام تھا کہ اس میں اندر کی طرف سے چابی لگا[نے کی] ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ میں نے لیور گھما کر تالا کھولا اور [باہر] نکل کر گیٹ کو اپنے عقب میں ایک جھٹکے سے بند کرتے ہوئے تیزی سے دوڑا کہ اس وقت میں اولمپک گیمز کی ریس میں شا[ید] انعام لے سکتا تھا۔ مزید حیرت اور مزید شکر کا مقام یہ تھا کہ گلی میں کوئی میرا منتظر نہیں تھا۔

میں تیر کی طرح اپنی کار تک جا پہنچا جو ایک سنسان جگہ تھی۔ میں اس میں بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر کے وہاں سے بخیر[یت] روانہ ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت تک کوئی میرے تع[اقب] میں نمودار نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے اس وقت تک کوئی چ[ھوٹے] عقبی گیٹ سے باہر بھی نہ آسکا ہو۔ میری گاڑی ایک غضب[ناک] درندے کی طرح غرا کر 'دو پہیوں پر گھوم کر شاید سڑک پر ٹائر[وں کے] سیاہ نشان چھوڑتی ہوئی وہاں سے روانہ ہوئی۔

میں نے گلیوں کے راستے فرار ہونے کی حکمت عملی اپنا[ئی۔] اگر کسی مین راستے پر ناکا بندی وغیرہ کا انتظام ہو تو اس کا کچھ [فائدہ اٹھایا] جا سکے لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پولیس کی مجھے گھیرنے یا شا[ید] خاص "پولیس مقابلے" میں صاف کرنے کی تیاریاں مکمل [نہیں] تھیں۔ شاید میں کسی کے اندازے سے کچھ پہلے وہاں پہنچ [گیا تھا۔] شاید ابھی جال پوری طرح بچھایا نہیں جا سکا تھا اور مجبوراً بھگدڑ اور بدنظمی میں ہاتھ ڈالنے یا میرا پتا صاف کرنے کی [کوشش] کی گئی تھی۔

جب میں نے اپنے آپ کو محفوظ محسوس کیا تو میں [نے] پُرسکون انداز میں ڈرائیونگ شروع کی اور گاڑی مین روڈ [پر لے] آیا۔ مجھے یہ بھی فیصلہ کرنا تھا کہ اس وقت مجھے کہاں جانا تھا۔ عین ممکن تھا کہ میں آفس پہنچتا تو وہاں کوئی بڑا پولیس آ[فیسر] منتظر ہوتا جو مجھے آندھی طوفان کی طرح آتے دیکھ کر پوچھتا [کہ میں] اس وقت کہاں سے آ رہا تھا؟

اس لیے میں نے پہلا فیصلہ تو یہی کیا کہ مجھے جہاں [بھی] جانا تھا' آندھی طوفان کی طرح نہیں' بالکل پُرسکون اور نار[مل انداز] میں پہنچنا تھا پھر میں نے فیصلہ کیا کہ میرا آفس جانا ہی بہتر تھا۔

میں اسی پُرسکون انداز میں ڈرائیو کرتے ہوئے ہو[ٹل پہنچا۔] اپنے آفس میں داخل ہوا تو کم از کم میرا ایک اندیشہ تو غلط [ثابت] ہوا۔ وہاں چھوٹا یا بڑا کوئی پولیس آفیسر تو کیا' کوئی بھی میرا [منتظر نہیں] تھا۔ میں نے منیجر کے توسط سے تمام اسٹاف کو ہدایت دی [کہ اگر] کوئی میرے بارے میں پوچھے تو یہی کہا جائے کہ میں دوپہر [سے] آفس میں کام میں مصروف تھا۔

میں اپنے سامنے چند فائلیں اور کاغذات لے کر بیٹھ [گیا لیکن] ظاہر ہے میرا دھیان ان میں نہیں تھا۔ میری نظروں کے [سامنے] اس بدنصیب لڑکی فرح کا مسخ شدہ سا چہرہ تھا۔ وہی فرح جو [مجھے] دیکھ کر اپنے آپ کو مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی۔

[اس کی] نس نس میں زندگی اک برقِ تپاں کی طرح رواں تھی۔ جسے زندگی سے بہت پیار تھا اور جس نے زندگی کے بارے میں بہت لمبی پلاننگ کر رکھی تھی۔ کیا وہ واقعی مر چکی تھی؟ کہیں میں نے جاگتی آنکھوں سے اس کے بارے میں کوئی ڈراؤنا خواب تو نہیں دیکھا تھا؟

قسمت لڑکیوں کے معاملے میں میرے ساتھ کچھ عجیب سے [انداز میں] ذات پر اُتر آئی تھی۔ فرحین نامی ایک لڑکی نے مجھ سے ایک معاملے میں مدد طلب کی تھی۔ وہ قتل ہو گئی تھی۔ مونا کو بہت تاخیر سے مدد کی غرض سے مجھ سے رابطہ کرنے کا موقع ملا تھا لیکن میں صحیح معنوں میں اس کے بھی کسی کام نہیں آسکا تھا اور وہ قتل ہو گئی تھی۔

فرح نے تو خیر مجھ سے کوئی مدد طلب نہیں کی تھی بلکہ اُلٹا مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی لیکن اسے بھی بالکل ہی غیر متوقع طور پر قتل کر دیا گیا تھا۔ فرحین کا تو خیر الگ قصہ تھا لیکن مونا اور فرح ایک ہی کہانی کے دو کردار تھے۔ کہیں کسی لڑکی کا مجھ سے کوئی تعلق رکھنا ہی تو جرم نہیں ہو گیا تھا؟

اس صورت میں تو مجھے نوخیز اور سفید فام سلویا کے بارے میں بھی سوچنا چاہیے تھا جو مجھ سے گہری دوستی استوار کرنے کی زبردست خواہش مند نظر آ رہی تھی۔ زرتاج کے بارے میں بھی شاید مجھے سوچنا چاہیے تھا جس سے میرے تعلق کی نوعیت بڑی عجیب تھی۔ بے تعلقی میں بھی ایک تعلقِ خاطر تھا پھر راحیلہ تھی۔۔۔ اس کا تو معاملہ ہی مختلف تھا۔

پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ سلویا' زرتاج اور راحیلہ وغیرہ کے بارے میں تو میں خواہ مخواہ ہی سوچ رہا تھا۔ بات وہاں تک نہیں جاتی تھی۔ جو لڑکیاں قتل ہوئی تھیں ان کی اپنی الگ اور پیچیدہ سی کہانیاں تھیں۔

فرح کے قتل نے صحیح معنوں میں مجھے ہلا دیا تھا کیونکہ یہ میرے لیے بہت ہی غیر متوقع اور ناقابلِ فہم تھا۔ کیا پیردانش کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ فرح کی ایک شبِ نوازشات میرے ساتھ گزری تھی اور اس نے ساری باتیں مجھے بتا دی تھیں؟ لیکن اسے یہ کس طرح معلوم ہو سکتا تھا؟ وہ تو اس رات مڈل ایسٹ گیا ہوا تھا۔ خود فرح اس کی طرف سے اتنی بے فکر تھی ورنہ وہ مجھ سے اس طرح کہاں مل سکتی تھی؟

نیلا گلوب جلانے کا سگنل صرف اس کے اور میرے درمیان مقرر ہوا تھا۔ اور جب میں اس سے ملنے پہنچا تو گلوب روشن تھا لیکن وہ اندر مری پڑی تھی۔ کیا اس نے کچھ دیر پہلے ہی گلوب جلایا تھا اور اس کے بعد ہی اسے قتل کیا گیا تھا؟ لاش زیادہ دیر کی معلوم نہیں ہوتی تھی۔

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اس سے سب باتیں معلوم کر لی گئی تھیں؟ گلوب کسی اور نے جلایا ہو۔۔۔ شکار کو چارا ڈالنے کے لیے! لیکن میرا اور فرح کا ملنے کے لیے کوئی وقت تو مقرر نہیں تھا۔ کسی کو کیسے توقع ہو سکتی تھی کہ میں اس وقت ادھر آنکلوں گا؟ پولیس کو وہاں گویا باقاعدہ میرا شکار کرنے کے لیے انتظار میں بٹھایا گیا تھا۔ کیا پیردانش مڈل ایسٹ سے واپس آچکا تھا؟

اس قسم کے بہت سے سوالات تھے جن کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ یہ اُلجھنیں اور خلش تو اپنی جگہ تھی لیکن اس واقعے نے مجھے صدمہ بھی بہت پہنچایا تھا۔ میرے اندر برف کی سی یخ بستگی پھیل گئی تھی۔ محسوسات کے اس برف زار کی گہرائی میں کہیں کوئی طوفان کروٹیں لے رہا تھا۔ بہت دیر تک میں ساکت بیٹھا اپنے سامنے موجود فائلوں اور کاغذات وغیرہ کو تکتا رہا۔ ان پر موجود الفاظ مجھے محض آڑی ترچھی اور بے معنی لکیروں کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔

معلوم نہیں میں کتنی دیر یونہی بیٹھا اپنے دل کی افسردگی سے اپنے آپ کو اذیت دیتا رہتا کہ اسی اثنا میں مجھے اطلاع ملی کہ پیردانش مجھ سے ملنے آ رہا تھا۔ میری سیکریٹری امبر چھٹی کر کے جا چکی تھی۔ یہ اطلاع گارڈ نے دی تھی۔ پیردانش میرے جواب کا انتظار کیے بغیر اندر آ چکا تھا۔ میں نے کھلتے اور بند ہوتے دروازے سے اس کے گارڈز کی جھلک دیکھی۔ گارڈز باہر ہی رُک گئے تھے۔

میں اس کے استقبال کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس کی آمد سے کم از کم ایک بات کی تو تصدیق ہو گئی تھی کہ وہ مڈل ایسٹ سے واپس آچکا تھا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ پولیس لے کر آیا ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ صرف اپنے گارڈز کے ساتھ آیا تھا۔ شاید یہ اندازہ اسے بھی تھا کہ محض زبانی کچھ کہہ کر یا کوئی الزام لگا کر مجھے گرفتار کرانا کوئی آسان کام نہیں تھا خواہ وہ کتنا ہی بارسوخ آدمی تھا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی افسردگی کے سوا کوئی قابلِ ذکر تاثر نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی کی طرح دوستانہ انداز میں ملا۔ میں نے بھی کوشش کی کہ میرے چہرے سے کوئی تاثر واضح نہ ہونے پائے۔ وہ آج بھی تھری پیس سوٹ میں تھا۔ ہونٹوں میں سگار دبا ہوا تھا۔

"بھئی معاف کرنا افضل پیارے!" وہ ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے بولا "میں اپنی آمد کی اطلاع دیے بغیر۔۔۔ ملاقات کا وقت طے کیے بغیر آجاتا ہوں۔ دراصل دوستوں سے میں اسی طرح ملتا ہوں۔ آج دل بڑا اُداس تھا۔ راستے میں تمہارا ہوٹل نظر آیا۔ سوچا۔۔۔ اگر تم موجود ہو تو ملتا چلوں۔ ویسے میری روحانی طاقت مجھے بتا رہی تھی کہ تم مجھے اپنی میز پر بیٹھے ملو گے" اس نے سگار کا کش لے کر دھوئیں کے درمیان سے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔

"لگتا ہے اب مجھے بھی آپ کی روحانی قوت کا قائل ہونا ہی پڑے گا پیر صاحب!" میں نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا "ویسے۔۔۔ نصیبِ دشمناں۔۔۔ آپ اُداس کیوں ہو گئے؟ کیا مونا کی موت کا صدمہ کم نہیں ہوا؟"

"اس کی موت کا صدمہ تو شاید کبھی کم نہ ہو افضل صاحب!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "وہ زخم تو ابھی ہرا ہی تھا لیکن لگتا ہے یہ مہینہ ہمارے لیے زخم پر زخم کھانے کا مہینہ ہے۔ ہم نے اگر خود اپنے علم کی مدد سے اپنے مستقبل کا حال دیکھ لیا ہوتا تو شاید ان زخموں سے بچنے کے لیے کوئی پیش بندی کر لیتے۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ دنیا بھر کو قسمت کا حال بتاتے ہیں وہ خود اپنی قسمت کا حال جانتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ وہ عموماً اس نظریے پر یقین رکھتے ہیں کہ نا آگہی میں بڑی راحت ہے۔ اس لیے وہ اپنے مستقبل سے بے خبر رہتے ہیں۔"

"شاید اسی کو چراغ تلے اندھیرا بھی کہتے ہیں" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "بہرحال.... یہ دوسرے زخم کا کیا قصہ ہے؟"

"بہت دردناک قصہ ہے میرے دوست!" اس نے پہلے ایک ٹھنڈی سانس لی پھر سگار کا کش لیا "تمہیں تو معلوم ہی ہوگا میں مڈل ایسٹ گیا ہوا تھا...."

"مجھے بھلا کہاں سے معلوم ہونا تھا۔ مجھے کون سا آپ بتا کر گئے تھے" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ملائمت سے کہا۔ اگر وہ مجھے باتوں باتوں میں کوئی چکر دینا چاہتا تھا تو میں اتنی آسانی سے چکر میں آنے والا نہیں تھا۔

"ہاں.... شاید تم سے تو کوئی ذکر نہیں ہوا تھا" اس نے بڑے سرسری سے انداز میں گویا اپنے الفاظ واپس لے لیے "بس.... پرسوں گیا تھا، آج واپس آ گیا۔ بڑا مختصر سا کام تھا۔ صرف ایک شخص سے ملنا تھا لیکن واپس آیا تو ایک صدمہ میرا منتظر تھا۔ اپنی ایک بڑی پیاری.... بڑی خوب صورت سی دوست تھی... اسے گھر بھی لے کر دیا ہوا تھا۔ تمہیں پتا ہے ہم جیسے لوگوں کو اِدھر اُدھر.... کونے کھدرے میں ایک آدھ ایسی دوست بھی رکھنا ہی پڑتی ہے..." غیر ارادی طور پر اس کی ایک آنکھ تھوڑی سی دب گئی۔ بات کرنے کے دوران اس کی نظر مسلسل مجھ پر تھی۔ میں نے اس سے نظر نہیں چُرائی۔

"آپ کے اندر ضرور کسی پُرانے بادشاہ کی روح ہے پیر صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہا "پرانے وقتوں میں آپ نے ضرور بڑے حرم آباد کیے ہوں گے۔ معلوم نہیں آپ نے کن کن کونے کھدروں میں کون کون سی دوست رکھی ہوئی ہے۔"

"ہوگ ہم سے بھی زیادہ چراگاہوں میں چرتے ہیں افضل میاں! لیکن وہ زیادہ لمبے چوڑے خرچے نہیں پالتے" وہ سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے مربیانہ لہجے میں بولا "اپنا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ہر کام قاعدے قرینے سے کرتے ہیں۔"

"تو وہ زخم کا قصہ کیا ہوا...؟ کیا وہ دوست آپ کی عدم موجودگی میں کہیں بھاگ گئی؟" میں نے معصومیت سے پوچھا۔

"بچوں والی باتیں مت کرو افضل پیارے! اس طرح دوست اس لیے تو نہیں رکھی جاتیں کہ وہ آپ کے منہ پھیرتے بھاگ جائیں.... اور خاص طور پر ہماری دوست....!" اس نے ... سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پُرخیال انداز میں مونچھ کو بل دیا۔ اس کے لہجے میں ملائمت کی تہ میں بھی بڑی سفاکی تھی "ہمارا کوئی دوست بھاگنے کی جرأت کیسے کر سکتا ہے؟ ہمارا کوئی دوست.... چاہے وہ مرد ہو یا عورت... وہ تبھی بھاگے گا جب اسے بھگائیں گے۔"

"تو پھر کیا ہوا؟" میں نے کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"اسے کسی ظالم نے قتل کر دیا۔"

"اوہ.... نو...." میں یکدم دوبارہ میز پر جھک آیا۔ اس ایکٹنگ میں مجھے کافی محنت کرنا پڑی۔

"یہ قیامت کے آثار ہیں افضل پیارے!" اس کی آواز گونجیلی سی محسوس ہونے لگی "اس شہر میں جسے ہم دوست دیں.... کوئی اسے بھی قتل کرنے کی جرأت کر سکتا ہے، یہ تو ہم نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔"

"ہاں.... یہ تو واقعی بڑی تشویش کی بات ہے پیر صاحب!" ... نے سرہلایا۔ "میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔ میں قاتل تلاش کرنے میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں؟"

"کیوں نہیں.... کیوں نہیں..." اس نے سگار کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑی۔ "تمہیں تو ہم ضرور تکلیف دیں گے۔ تم تو قاتل کی تلاش میں ہماری سب سے زیادہ مدد کر سکو۔"

"میں ہر طرح سے حاضر ہوں پیر صاحب!" میں نے ظ... سے کہا۔

"بس... حاضر ہی رہنا۔ جب تمہاری ضرورت پڑے تو غائب نہ ہو جانا" وہ سگار کے سُلگتے سرے کے اوپر سے میری طرف ... ہوئے بولا۔

"میں غائب ہونے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں پیر صاحب!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بے شک۔ بے شک" اس نے سرہلایا پھر سگار کا ایک ... لے کر بولا "ویسے بدقسمتی سے قاتل اچھا بھلا ہمارے سامنے ... کے بعد غائب ہو گیا۔"

"غائب ہو گیا...؟ وہ کیسے پیر صاحب!" میں نے حیرت ... پوچھا۔

"پولیس قتل کی تفتیش کے لیے اس گھر میں آئی ہوئی تھی ... سب اندر موجود تھے۔ اس دوران قاتل کو شاید دوبارہ کسی وجہ ... جائے واردات پر آنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ وہ پچھلے ... چپکے چپکے بنگلے میں داخل ہوا۔ اسے شاید اُمید نہیں تھی کہ ... پولیس یا کوئی اور موجود ہوگا۔ پولیس نے اسے للکارا...

آ کر کچھ فائرنگ بھی کی لیکن وہ بہت ہی پھُرتیلا تھا.... صرف پھُرتیلا ہی نہیں.... شاید خوش قسمت بھی بہت تھا۔ گولیوں کی بوچھار میں فرار ہو گیا...." وہ ایک بار پھر مونچھ کو بل دینے لگا۔

"اوہ.... یہ تو بہت بُرا ہوا پیر صاحب" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا "آپ نے اس کی صورت تو دیکھی ہوگی؟"

"یہی تو افسوس ہے...." وہ سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے بولا "ہم صحیح طور پر اس کی شکل صورت نہیں دیکھ سکے۔ کچھ چیزیں بیچ میں حائل تھیں۔ ہم تو صرف اس کی پھُرتی ہی دیکھ کر حیران ہوتے رہے۔ ویسے.... وہ ہماری آپ کی طرح سوٹڈ بوٹڈ آدمی تھا۔ بڑا معزز قسم کا قاتل معلوم ہوتا تھا۔"

"ہُنہہ...." میں نے پُرسکون لہجے میں کہا "آج کل کسی بھی بات پر حیران نہیں ہونا چاہیے۔ بڑے بڑے معزز لوگ بڑی بڑی عجیب حرکتیں کرنے لگے ہیں۔ بہرحال.... بچ کر کہاں جائے گا۔ میرا ویسے بھی ایمان ہے.... کسی بے گناہ کا قاتل بچتا نہیں ہے اگر زمین والوں کی سزا سے بچ بھی نکلے تو آسمان والے کی گرفت میں بہرحال رہتا ہے۔ زندگی میں بھی اور موت کے بعد بھی۔"

"ہوں....!" اس نے پُرخیال انداز میں ہنکارا بھرا اور اُٹھ کھڑا ہوا "اب میں چلتا ہوں۔ اِدھر سے گزر رہا تھا تو میں نے سوچا تمہیں بھی اس واقعے کی اطلاع دیتا چلوں۔ پھر ملاقات ہوگی" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

میں نے مضبوطی سے اس سے مصافحہ کیا۔ وہ میرا بازو ذرا اونچا کرتے ہوئے میرے کوٹ کی آستین پر لگی ہوئی کوئی چیز ایک انگلی سے جھاڑتے ہوئے بولا "کیا تمہارے آفس میں بھی گھاس پائی جاتی ہے جس پر لوٹتے رہتے ہو؟" لہجہ سرسری تھا۔

میں نے اس سے ہاتھ چھُڑائے بغیر آستین پر نظر ڈالی۔ میری کہنی کے قریب آستین پر گھاس کے چند تنکے چپکے ہوئے تھے۔ اس نے ان پر انگلی کا ناخن مار کر انہیں جھاڑ دیا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "میرے آفس میں نہ سہی.... لیکن ہوٹل کے سامنے تو لان موجود ہے۔ کبھی کبھی میں وہاں بھی جا کر بیٹھ جاتا ہوں.... بلکہ لیٹ جاتا ہوں۔"

"ذرا احتیاط کیا کرو افضل میاں!" اس نے میرا کندھا تھپتھپایا "گھاس اور پودوں وغیرہ کے درمیان کیڑے مکوڑے بھی ہوتے ہیں۔"

"میں خاصا سخت جان آدمی ہوں پیر صاحب! کیڑے مکوڑے بھلا میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "خدا حافظ۔"

"خدا حافظ" وہ حتی الامکان باوقار انداز میں گھوما اور رخصت ہو گیا۔ چھوٹے قد کے باوجود وہ شاہانہ انداز میں چلنے کی کوشش کرتا تھا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں دیر تک میز کے قریب کھڑا رہا اور سوچتا رہا پھر غیر ارادی طور پر آہستگی سے میرے منہ سے نکلا "گدھا کہیں کا؟"

عین اسی وقت شفیع شاہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور مسکراتے ہوئے بولا "آپ نے مجھ سے کچھ کہا؟"

"نہیں۔ تم گدھے نہیں ہو سکتے" میں نے اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"مجھے پتا چلا ہے یہاں پیردانش آیا ہوا تھا۔ ابھی ابھی رخصت ہوا ہے" وہ بولا۔

"میں اسی کی بات کر رہا تھا" میں نے لفافے چاک کرنے کی ایک چھُری کے کند پھل پر انگلی پھیرتے ہوئے کہا "ہمیں اس شخص کا جلد ہی کچھ بندوبست کرنا پڑے گا شفیع شاہ! ورنہ یہ کچھ کر گزرے گا۔ ہم اس وقت ایک سانپ سے کھیل رہے ہیں۔"

"آپ صرف حکم دیجیے سر! سانپ کا سر کچل دیا جائے گا" شفیع شاہ میرے مقابل ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے اطمینان سے بولا۔

"سانپ بہت زہریلا ہے۔ عین ممکن ہے سر کچلنے کی کوشش میں صرف اس کی دُم کچلی جائے۔ اس صورت میں زیادہ خطرناک ہوگا۔ بہت مناسب موقع دیکھ کر ہاتھ ڈالنا ہوگا۔"

"موقع کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے سر! آپ کے فیصلوں پر عمل درآمد کرانا میرا کام ہے" شفیع شاہ دھیمے لہجے میں بولا۔

ایک لمحے تک خاموشی سے اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد میں نے کہا "مونا کے علاوہ جس دوسری لڑکی کی ہم نے ویڈیو دیکھی تھی.... جس کے تعاقب میں، میں ائرپورٹ سے بھاگا تھا.... اور جس نے مجھے ساری باتیں بتائی تھیں...."

"آپ فرح کی بات کر رہے ہیں نا؟" شفیع شاہ بولا۔

"ہاں۔ اسے قتل کر دیا گیا ہے" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ شفیع شاہ کی صرف آنکھوں سے ظاہر ہوا کہ اسے خفیف سا جھٹکا لگا تھا۔ چند لمحے وہ بالکل خاموش رہا اور ایک ٹک میری طرف دیکھتا رہا۔

"پیردانش...؟" آخر اس نے تصدیق چاہی۔

"ظاہر ہے" میں نے گہری سانس لے کر کہا "کسی اور کو اسے قتل کرنے کی کیا ضرورت تھی شاید کسی طرح یہ بات ظاہر ہو گئی کہ اس کی مجھ سے بہت طویل ملاقات رہی تھی اور اس نے پیردانش کے بارے میں سب کچھ مجھے بتا دیا تھا۔"

"اس کے باوجود پیردانش آپ سے ملنے آیا تھا؟" شفیع بولا۔

"ہاں۔" میں.... گہری سانس لے کر بولا "وہ میرے ساتھ چوہے بلی کا کھیل کھیل رہا ہے لیکن فی الحال فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ہم میں سے چوہا کون ہے اور بلی کون...." پھر میں نے شفیع کو بتایا کہ کس طرح اس نے مجھے اپنی دانست میں "رنگے ہاتھوں" پکڑوانے یا پولیس کے ہاتھوں مروانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ موقع ہاتھ

سے نکل جانے کے بعد دوبارہ وہی پہلا سا پیر دانش..... اور ہمارا دوست بن گیا تھا۔

شفیع شاہ نے پُرخیال انداز میں سرہلایا "دلچسپ آدمی ہے سر!"

"خیر..." میں نے سر جھٹکتے ہوئے کہا "تم بتاؤ کیسے آنا ہوا؟ کوئی خبر لائے ہو یا یونہی ٹہلتے ہوئے آگئے ہو؟"

"آیا تو یونہی ٹہلتا ہوا ہوں..." وہ ... کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔ "ویسے میرے پاس ایک خبر بھی ہے... معلوم نہیں اہم ہے یا نہیں...."

"یہ فیصلہ میں کرلوں گا، تم خبر سناؤ" میں نے کہا۔

"سنیما کلب کی سرگرمیاں بالکل بند ہوگئی ہیں۔ اس کوٹھی پر تالا پڑگیا ہے جہاں خاص فلموں کے شو چلتے تھے اور لڑکیوں کی بکنگ وغیرہ ہوتی تھی۔ وہ آدمی بھی غائب ہوگیا ہے جو یہ سارے انتظامات کرتا تھا" شفیع شاہ نے بتایا۔

"اچھی خبر ہے" میں نے طمانیت سے سرہلایا "لیکن زیادہ اچھی تب ہوگی کہ یہ اڈّا دوبارہ نہ کھلنے پائے.... اس دھندے کا مکمل قلع قمع ہوجائے اور اس کے پیچھے کام کرنے والی اصل شخصیت بھی کیفرِ کردار کو پہنچ جائے۔ اس کے سر پر نہ جانے کتنی زندگیوں کی بربادی کی ذمّے داری اور کتنے انسانوں کا خون ہے۔ ایک کوٹھی پر تالا پڑجانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ اس قسم کے اڈّے عارضی طور پر تو بند ہوتے ہی رہتے ہیں۔ جلد یا بدیر پھر کھل جاتے ہیں۔"

"وہ آپریٹر بھی غائب ہوگیا جو وہاں سارے انتظامات چلا رہا تھا۔" شفیع شاہ قدرے متاسفانہ لہجے میں بولا "اس کی حیثیت ایک چھوٹے موٹے سراغ کی تو تھی۔"

"اس کے غائب ہونے کا افسوس مت کرو۔ تم اس پر ہاتھ تو ڈال چکے تھے۔ اچھی طرح کھنگال چکے تھے۔ اس سے زیادہ کار آمد معلومات حاصل نہیں ہوئی تھیں۔ اسے جانے دو۔ وہ چھوٹی مچھلی تھی۔ مجھے چھوٹی مچھلیوں سے زیادہ دلچسپی نہیں۔ میرا فلسفہ ہے کہ بُرائی کی جڑ ختم کرنے کی کوشش کرو، شاخیں اور پتّے خود ہی سوکھ جائیں گے۔ ہمارے ہاں بُرائی کے خلاف بے دلی یا نیم دلی سے جو بھی تھوڑی بہت کوششیں ہوتی ہیں وہ اسی لیے تو کامیاب نہیں ہوتیں کہ ساری مشینری معمولی پتّوں اور شاخوں کو چھانٹنے میں لگی رہتی ہے۔ جڑ آرام سے پھلتی پھولتی رہتی ہے۔ ہمیں پیر دانش کا سر کچلنا ہے.... اور اس طرح کچلنا ہے کہ ہماری لاٹھی نہ ٹوٹنے پائے۔ یہ دھندے خود بخود ختم ہوجائیں گے۔"

"آپ کا اب کیا پروگرام ہے؟" شفیع نے دریافت کیا۔

"فی الحال تو میں اپنے کمرے میں جارہا ہوں" میں نے جواب دیا "میں بہت گہری سوچ بچار کرنا چاہتا ہوں.... یوں سمجھو ایک قسم کا مراقبہ کرنا چاہتا ہوں۔ میرا دل اُداس ہے۔"

"ٹھیک ہے.... میں چلتا ہوں" شفیع شاہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم ذرا سلویا کی حفاظت کا کوئی بندوبست کرادینا" میں نے اسے ہدایت کی "محض احتیاطاً یہ کہہ رہا ہوں۔ صرف میرے ساتھ نظر آنے کی وجہ سے بھی اس کی زندگی کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے یونہی.... محض مجھے تنگ کرنے کے لیے.... یا میرے لیے دشواریاں کھڑی کرنے کی غرض سے بھی اس کے ساتھ کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش آسکتا ہے۔"

"وہ باپ بیٹی تو کل لاہور چلے جائیں گے" شفیع شاہ نے بتایا۔

"احتیاطاً وہاں بھی راحیلہ کو فون کردینا کہ اس کی حفاظت کا خیال رکھے۔ میں فون کرکے یہ بات کہوں گا تو وہ سمجھے گی، میں اس لڑکی پر بھی عاشق ہوگیا ہوں۔"

شفیع شاہ دھیرے سے ہنسا اور بولا "ٹھیک ہے سر! میں یہ انتظام کرادوں گا.... ویسے میں بھی راحیلہ کے بجائے ٹونی سے کہہ دوں گا۔"

میں اسے خدا حافظ اور شب بخیر کہہ کر اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔

O☆O

فرح کی موت کی خبر دوسرے روز اس کی بڑی خوب صورت تصویر کے ساتھ اخباروں میں آگئی تھی۔ اس کے قتل کو پُراسرار قرار دیا گیا تھا۔ پولیس نے اس پر کوئی رائے ظاہر نہیں کی تھی۔ اسے ایک امیرزادی بتایا گیا تھا جس کے والدین اس کے لیے کافی دولت چھوڑ کر مرے تھے۔ پیر دانش سے اس کے کسی تعلق کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں ملتا تھا۔ خبر میں ایسا بھی کوئی ذکر نہیں تھا کہ پولیس نے جائے واردات پر تفتیش کے دوران کسی شخص کو دیکھا تھا اور اسے زندہ یا مُردہ پکڑنے کی کوشش کی تھی۔ میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ جن واقعات کے پیچھے لمبے ہاتھ کام کرتے تھے ان کے سلسلے میں اخباروں میں چھپنے والی خبریں حقائق سے بعض اوقات کتنی مختلف ہوتی تھیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد میں اور شفیع شاہ سلویا اور اس کے باپ کو ائرپورٹ چھوڑنے چلے گئے۔ وہاں سے شام تک واپسی ہوئی۔ میں شفیع شاہ کی گاڑی میں تھا۔ شفیع شاہ کو کمپنی کے آفس جانا تھا۔ میں نے اس سے خود ہی فرمائش کی کہ وہ مجھے ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر ہی اُتار دے۔

فٹ پاتھ پر اُتر کر میں دونوں ہاتھ پتلون کی جیبوں میں ڈالے ٹہلنے کے سے انداز میں اندر کی طرف چل دیا۔ میں اپنے گردوپیش سے بے خبر نہیں تھا۔ سڑک پر کافی ٹریفک تھا۔ یہ لوگوں کا گھروں کو واپس جانے کا وقت تھا۔ اب تو زندگی کی یہ روانی اور ہماہمی خلافِ معمول لگتی تھی اور دل کو کچھ تقویت سی ملتی تھی کہ زندگی کا دریا بہرحال اب بھی کسی نہ کسی طرح رواں تھا۔

ہوٹل کے سامنے پرلے کونے کی طرف فٹ پاتھ پر ایک شخص ٹوکرے میں پھل لیے بیٹھا تھا۔ ٹوکروں میں چیزیں بیچنے والے عام طور پر اس ہوٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر نہیں بیٹھتے تھے۔ یہاں اس طرح چیزیں بکنے کا امکان بہت کم تھا۔ یہ خوانچے والوں سے چیزیں خریدنے والوں کا علاقہ نہیں تھا۔ وہ پھل فروش شاید تھک کر ذرا سستانے کے لیے وہاں بیٹھ گیا تھا۔ اس کے انداز سے یہی ظاہر ہورہا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی وہ اپنا ٹوکرا اُٹھا کر میری طرف لپکا اور التجائیہ لہجے میں بولا "صاحب! کچھ پھل لے لیجیے... آج پورے دن میں کچھ نہیں بکا... سستا دے دوں گا.... آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔"

مجھے بھلا اس سے پھل خرید کر کیا کرنا تھا۔ ہوٹل میں محض فون کرنے سے میرے لیے ہر چیز آجاتی تھی۔ میں نے محض نفی میں سرہلانے پر اکتفا کیا اور ہوٹل کی حدود میں مڑگیا جہاں سے لمبا چوڑا ڈرائیو وے شروع ہوتا تھا۔ وہ وہاں بھی میرے پیچھے آرہا تھا "صاحب جی.... لے لیں نا.... غریب آدمی کا بھلا ہوجائے گا۔"

کچھ عرصے سے بھیک مانگنے والوں نے بھی یہ انداز اپنا لیا تھا۔ وہ یونہی تھوڑی سی مقدار میں کوئی چیز اُٹھا کر پھرتے رہتے تھے۔ ظاہر یہی کرتے تھے کہ دن بھر مارے مارے پھرنے کے باوجود ان کا کچھ نہیں بکا، درحقیقت وہ بھکاری نہیں ہیں، ان سے کچھ خرید لیا جائے تو مہربانی ہوگی ورنہ ویسے ہی ان کی کچھ مدد کردی جائے تب بھی دُعا دیں گے۔ میرے خیال میں وہ بھی کچھ اسی قسم کا کردار تھا۔

میں نے گہری نظر سے اس کا جائزہ لیا۔ وہ مضبوط کسرتی جسم کا جوان تھا۔ لگتا تھا اس نے کچھ اچھا وقت دیکھا تھا مگر غربت، بدحالی اور زیادہ مشقت کی وجہ سے مرجھا کر رہ گیا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے تھے اور چہرے پر میل کچیل کے دھبّے تھے۔ ٹخنوں سے اونچی ایک میلی سی دھوتی اور اس سے بھی زیادہ میلا سا ایک کُرتا اس کے جسم پر تھا۔ سر پر میلی سی پگڑی تھی جو اس کی پیشانی تک ڈھلک آئی تھی۔

میں نے جیب سے سو کا ایک نوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "جاؤ... میرا پیچھا چھوڑ دو۔"

اس نے نوٹ لے لیا لیکن میرا پیچھا چھوڑنے پر آمادہ نظر نہیں آیا۔ بڑی مشکل سے ٹوکرا ایک بازو پر سنبھالتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے مجھے ایک مرجھایا ہوا سا سیب دکھاتے ہوئے بولا "دیکھیے صاحب جی! کیا شاندار کشمیری سیب ہے.... حکم کریں.... کتنا تول دوں؟"

اس وقت ہم پارکنگ لاٹ کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ میں نے ایک ستون کے قریب رُک کر سرد لہجے میں کہا "اس سے پہلے کہ میرا رحم کا جذبہ ٹھنڈا پڑجائے یہاں سے چلے جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ میں گھونسا مار کر تمہیں تمہارے اس ٹوکرے سمیت باہر پہنچادوں۔ اس کے بعد تمہاری اپنی شکل بھی کسی پچکے ہوئے خربوزے جیسی نظر آنے لگے گی۔"

"ناراض نہ ہوں سیٹھ صاحب" وہ بدستور باچھیں پھیلاتے ہوئے بولا۔ اس کے تاثرات وہی رہے لیکن اس کا لہجہ بدل گیا اور وہ نیچی آواز میں بولا۔ "افضل صاحب! میں دراصل ظفر جمال ہوں.... فوٹوگرافر ظفر جمال.... شاید آپ کو میری تلاش تھی... دیکھیے.... حیرت وغیرہ کا اظہار مت کیجیے گا.... اسی طرح بات کرتے رہیے گا جیسے میں آپ کے ہاتھ زبردستی کچھ پھل بیچنے کی کوشش کررہا ہوں.... ہوسکتا ہے کہیں سے کوئی نامعلوم آنکھ ہمیں دیکھ رہی ہو...."

اس کی باچھیں اسی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ وہ ایک اور سیب اُٹھا کر مجھے دکھاتے ہوئے بولا "مجھے آپ کی مدد کی سخت ضرورت ہے.... شاید میں بھی آپ کے کسی کام آسکوں.... میں اس طرح آپ سے ملنا چاہتا ہوں کہ اگر کوئی آپ کی یا میری نگرانی کررہا ہو تو اسے شک نہ ہونے پائے... کوئی طریقہ بتائیے۔"

وہ اگر مجھے ہدایت نہ کرتا تب بھی میں حیرت زدہ نظر نہ آتا کیونکہ اگر وہ ظفر جمال تھا تو مجھے اس کو اس حُلیے میں دیکھے بغیر بھی اندازہ تھا کہ وہ کتنے خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ میں نے سیب اس کے ہاتھ سے لے کر دور لان کی طرف پھینک دیا اور غصّے سے کہا "دفع ہوجاؤ.... مجھے کوئی پھل نہیں چاہیے۔ مجھے ان گلے سڑے پھلوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ کیلوں کا ایک گچھا اُٹھا کر مجھے دکھاتے ہوئے بولا "میں نے آج صبح اخبار میں فرح کے قتل کی خبر پڑھی ہے۔ میں بھیس بدل کر بڑی مشکل سے جان بچائے پھر رہا ہوں لیکن میں کب تک بچ سکوں گا؟ میں چاہتا ہوں کہ اگر جان جانی ہی ہے تو کسی کام آجائے۔ میں موت سے نہیں ڈرتا.... لیکن بے فائدہ موت نہیں مرنا چاہتا۔ اگر آپ نے میری مدد نہ کی تو میرا انجام مونا اور فرح سے مختلف نہیں ہوگا۔"

میں نے بے زاری سے اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا "تم ایسا کرو کہ پندرہ منٹ بعد اسی طرح پھل بیچتے ہوئے ہوٹل کی پچھلی گلی میں پہنچو.... ہوٹل کا ایک باوردی چوکیدار تمہیں اپنے ساتھ پچھلے ایک راستے سے ہوٹل میں لائے گا۔ باقی باتیں پھر ہوں گی۔"

میں نے اس کا کیلوں کا گچھا برہمی سے اس کے ٹوکرے میں پٹخ دیا اور تیزی سے اندر جانے کے لیے گھوم گیا۔ وہ بظاہر مایوسی کے عالم میں اپنا ٹوکرا سر پر رکھ کر واپس چل دیا اور میں ہوٹل کے اندر آگیا۔

آفس پہنچ کر میں نے اپنے ایک سمجھ دار چوکیدار شادمان خان کو بلوایا اور اسے بتایا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ وہ سرہلا کر رخصت ہوگیا۔ چند منٹ بعد میں ہوٹل کے تہ خانے میں کھڑا تھا۔ مزید چند منٹ کے انتظار کے بعد میں نے ٹہلنا شروع کردیا۔ یہ بہت بڑا تہ خانہ تھا۔ اس میں اسٹوریج روم تھے۔ لانڈری کی مشینیں لگی ہوئی تھیں۔

اچھے بھلے کمروں جتنے فریج اور فریزر موجود تھے۔ اس کے باوجود اتنی جگہ خالی تھی کہ ڈلیوری ٹرک بھی اندر آجاتے تھے۔

آخر کار وہ گیٹ کھلا جس سے ڈلیوری ٹرک اندر آتے تھے۔ ملگجی روشنی میں ڈھلوان راستے پر ظفر جمال پھلوں کا ٹوکرا اُٹھائے نمودار ہوا۔ شادمان خان اس کے ساتھ تھا۔ اندر آکر اس نے گیٹ بند کردیا اور خاموشی سے اندرونی راستے سے ہوٹل میں چلا گیا۔ میں اور ظفر جمال آمنے سامنے کھڑے رہ گئے۔ میں نے ایک دیوار پر سوئچ بورڈ دیکھ کر چند بٹن دبائے اور تہ خانے میں تیز روشنی پھیل گئی۔

اب میں نے ذرا اور بہتر طور پر اس کا جائزہ لیا۔ وہ ٹوکرا اُٹھائے خاموش کھڑا رہا۔ آخر میں نے گہری سانس لے کر کہا "اچھا... تو تم ظفر جمال ہو...! بہت دیر کی مہرباں آتے آتے۔"

"میں مجبور تھا سر! اِدھر اُدھر بھاگا پھر رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے" وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔ اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔

"ٹوکرا نیچے رکھ دو۔ اب اس بوجھ کو اُٹھائے پھرنے کی ضرورت نہیں۔" میں نے کہا اور جب وہ ٹوکرا رکھ کر پیشانی سے پسینہ پونچھ چکا تو میں نے پوچھا۔ "پھر کب اور کس طرح تمہاری سمجھ میں آیا کہ تمہیں کیا کرنا چاہیے؟"

"میں نے آج سیمیں کو فون کیا تھا... بہت مایوسی اور دل شکستگی کے عالم میں... مجھے تھوڑی سی رقم کی ضرورت تھی۔ میں کراچی سے بھاگنا چاہتا تھا۔ فرح کی موت کی خبر پڑھنے کے بعد میں نے فیصلہ کیا تھا کہ کسی دور دراز شہر کی طرف بھاگ جاؤں... لیکن میرے پاس کرائے اور کچھ دن کے گزارے وغیرہ کے لیے بھی رقم نہیں تھی... سیمیں کے بارے میں، میں نے ہمیشہ محسوس کیا تھا کہ وہ ایک نیک دل لڑکی تھی... میں اس شہر میں سیکڑوں لوگوں کو جانتا ہوں... یہاں بہت سے لوگ مجھ پر بڑی مہربانیاں کرتے رہے ہیں لیکن اس وقت میں کسی کے پاس جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا... جا تو میں سیمیں کے پاس بھی نہیں سکتا تھا۔ لیکن میں نے اس اُمید پر فون کیا تھا کہ وہ میری مدد کی کوئی صورت نکال لے گی۔ اس نے مجھے بتایا کہ آپ مونا کی مدد کرنے کے کتنی شدت سے خواہش مند تھے اور اس کے لیے آپ کس حد تک جانے کو تیار تھے...؟"

اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے میل زدہ چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ شاید اس نے جان بوجھ کر کئی دن سے منہ نہیں دھویا تھا تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ ناقابل شناخت رہے پھر وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا "اگر آپ مونا کی مدد کرنا چاہتے تھے تو یقیناً آپ میری بھی مدد کریں گے۔"

"کیسی مدد؟" میں نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

"یہ تو آپ پر تبھی واضح ہوسکے گا جب آپ میری پوری بات سنیں گے۔"

میں نے ایک لمحے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا اور فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے' اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ فی الحال تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔"

تہ خانے میں بھی دیوار پر ایک فون نصب تھا۔ میں نے نائٹ شفٹ انچارج کو نیچے بُلایا اور اسے ہدایت کی "اس شخص کو کوئی خالی کمرا دے دو اور صاف کپڑے فراہم کرو۔ داؤد چوہدری سے کہنا اس کی حفاظت کا خاص طور پر انتظام کرے۔ جو کمرا اسے دو اس کا نمبر مجھے بتا دینا۔"

پھر میں نے ظفر جمال کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "ایک گھنٹے بعد تم سے ملاقات ہوگی پھر اطمینان سے بیٹھ کر بات کریں گے۔ جس چیز کی ضرورت ہو' روم سروس کو فون کرکے منگوا لینا۔"

وہ شکریہ ادا کرکے سپروائزر کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ اس کے باسی اور بے کار سے پھلوں کا ٹوکرا وہیں رکھا رہ گیا۔ میں چند لمحے وہیں کھڑا انہیں تکتا رہا اور سوچتا رہا کہ حالات بعض اوقات کیسے عجیب وغریب انداز میں کروٹ لیتے تھے۔ آخر میں بھی اندر والے ہی راستے سے اوپر پہنچ کر لفٹ کے ذریعے اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ شاور لے کر میں نے لباس تبدیل کیا' کھانا کھایا اور کافی پینے کے بعد گھڑی دیکھی۔ ایک گھنٹا گزر چکا تھا۔ اس دوران مجھے اطلاع مل چکی تھی کہ ظفر جمال کو کمرا نمبر ٹرپل سیون دیا گیا تھا جو مجھ سے ایک فلور ہی اوپر تھا اور نہ جانے کیوں یہ ایک لکی نمبر محسوس

ہوتا تھا۔

میں سیڑھیوں ہی کے راستے اوپر پہنچ گیا۔ راہداری میں تین گارڈ تعینات تھے۔ ایک راہداری کے ایک سرے پر کھڑا تھا اور دوسرا دوسرے سرے پر... جبکہ تیسرا گارڈ سیڑھیوں اور لفٹ کے درمیان کھڑا تھا تاکہ دونوں راستوں سے آنے والوں پر نظر رکھ سکے۔ داؤد نے اچھا کیا تھا کہ انہیں ظفر جمال کے کمرے میں تعینات نہیں کیا تھا۔ اب یہ جاننا مشکل تھا کہ وہ کس کمرے کی نگرانی کر رہے تھے۔ وہ گویا پورے فلور پر ہی نظر رکھنے کے لیے کھڑے تھے۔

میں ظفر جمال کے کمرے میں پہنچا تو وہ مجھے ایک مختلف انسان دکھائی دیا گو کہ اس کی شکل و شباہت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی لیکن پگڑی اُتر جانے اور حُلیہ صحیح ہو جانے پر ہی زمین آسمان کا فرق پڑ گیا تھا۔ وہ ایک وجیہہ شخص تھا۔ پہلے غالباً کلین شیو رہتا تھا۔ اب اس کی شیو کافی بڑھی ہوئی تھی۔ کمرے میں تپائی پر چائے کے برتن موجود تھے اور اس کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی۔

ہم بیٹھ چکے تو وہ بولا "میں آپ کا کس منہ سے شکریہ..."

میں نے ہاتھ اُٹھا کر اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "رسمی باتیں چھوڑو... کام کی بات کرتے ہیں۔"

اس نے سگریٹ کا طویل کش لیا۔ ایک لمحے خاموش رہا پھر بولا "بات بہت لمبی ہے اور میں تفصیل سے سب کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"میرے پاس بہت وقت ہے۔ میں رات بھر جاگنے کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ تمہاری ہمت جواب نہ دے جائے" میں نے کہا۔

"میں بھی آپ کی پناہ میں آجانے کی خوشی میں جاگ سکتا ہوں" وہ ذرا تھکے تھکے سے انداز میں مسکرایا۔ وہ غسل کر چکا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کے اوپر سے گویا کالک کی کوئی موٹی تہ اُتر گئی تھی۔ صاف ستھرے عمدہ اور نئے شلوار قمیص میں وہ یکدم ہی ایک بدحال پھل فروش کی جگہ خوش حال طبقے کا فرد دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کی آنکھوں میں شب بیداری کی سرخی تھی لیکن ایک سہارا میسر آجانے کی وجہ سے وہ واقعی مستعد دکھائی دے رہا تھا۔

اس نے اپنی کہانی سُنانا شروع کی جو کم و بیش وہی تھی جو فرح مجھے سُنا چکی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ ہر بات تفصیل سے بتا رہا تھا کیونکہ اسے تفصیلات معلوم تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی کہانی میں ان باتوں کا اضافہ ہو چکا تھا جن کا تعلق اس کی اپنی ذات سے تھا۔ فرح سے بات ہونے کے بعد بھی اس پُرپیچ قصے میں جو گرہیں باقی تھیں وہ ظفر جمال نے کھول دیں۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ سُلگاتا رہا اور سب باتیں بتاتا رہا۔ وہ واقعی پیر دانش کا گھر کا بھیدی تھا۔

آخر وہ خاموش ہو گیا۔ کمرے میں گہرا سکوت پھیل گیا۔ ہم دونوں چند لمحے اس طرح خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ میں اپنی رگ و پے میں خفیف سی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔

"اچھا... تو چالیس لاکھ کی رقم پر تمہارا پیر دانش سے اختلاف شروع ہوا!... اچھی خاصی موٹی رقم ہے؟" بالآخر میں نے گہرا سانس لے کر کہا۔

"جی ہاں... تقریباً آدھا کروڑ ہی سمجھ لیں..." وہ بولا "مختلف کاموں کے سلسلے میں اس نے مجھے جو معاوضے دینے کے وعدے کیے تھے ان کے حساب سے میرا اس کی طرف تقریباً آدھا کروڑ ہو گیا تھا۔ وہ مجھے وقتاً فوقتاً کچھ رقمیں دیتا رہتا تھا لیکن ظاہر ہے وہ میرے پُرتعیش اخراجات پر اُٹھتی رہتی تھیں۔ ادھار کا حساب بڑھتا رہا پھر اس کی نیت ہی بدل گئی۔ اس کا خیال یہ ہو گیا کہ میں نے ایسی کوئی خاص خدمات انجام نہیں دی تھیں کہ مجھے اتنی بڑی رقم کی ادائیگی کی جاتی۔ اس کے خیال میں جس طرح عیش و عشرت سے میں زندگی بسر کر رہا تھا وہی کافی تھا..."

ایک لمحے کے لیے خاموش ہو کر وہ افسردگی سے مسکرایا پھر بولا "افضل صاحب! ہم جیسے گم کردۂ راہ لوگ راتوں رات دولت مند بننے کے لالچ میں ہی تو بُرے سے بُرا کام کرتے ہیں... اپنے ضمیر کا سودا کرتے ہیں... غیرت کو بُھلا دیتے ہیں... بے حس ہو جاتے ہیں... آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں... اس دولت کے بارے میں کچھ نہ کچھ خواب بھی تراش لیتے ہیں جس کے آنے کی ہمیں اُمید ہوتی ہے... لیکن خوابوں کی اس دنیا میں پہنچ کر کوئی اچانک آپ کو ٹھینگا دکھا دے تو کبھی کبھی ردِعمل بھی بڑا شدید ہوتا ہے..."

"چنانچہ تم باغی ہو گئے" میں نے کہا۔

"اصل بغاوت مونا والے معاملے پر شروع ہوئی۔ وہ بھی ایک گناہ گار سی لڑکی تھی۔ میں بھی ایک نہایت گناہ گار آدمی تھا۔ دو گناہ گار ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے... اور اس طرح ہوئے کہ انہوں نے بڑے بڑے راست بازوں کو مات کر دیا۔ ہم دونوں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بالکل الگ تھلگ ہو جانا چاہتے تھے اور کسی گوشۂ عافیت میں جا کر گمنامی اور شرافت کی زندگی گزارنا چاہتے تھے" وہ بولا۔

"اگر پیر دانش تمہاری رقم دے دیتا اور اپنی مرضی سے زندگی گزارنے کی اجازت دے دیتا تو حالات بہت مختلف ہو سکتے تھے" میں نے تاسف سے کہا "کیونکہ اسی دوران مونا بھی غیر متوقع طور پر پچاس ساٹھ لاکھ کی جائیداد کی وارث بن گئی تھی جس کا شاید اس بے چاری کو پتا بھی نہیں چل سکا۔ میاں بیوی کی حیثیت سے شاید تم ایک آئیڈیل زندگی گزارتے۔"

اس کی آنکھوں میں کرب و تحیر کی دھندلاہٹ سی نمودار ہوئی لیکن اس نے جلد ہی خود پر قابو پا لیا۔ شاید وہ فیصلہ کن جدوجہد کے اس دور میں ذرا بھی کمزور نہیں پڑنا چاہتا تھا۔

تلخ سے لہجے میں وہ بولا "پیر دانش اپنی مرضی سے کسی کو کوئی فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جو لوگ بھی اس سے وابستہ ہیں یا کسی بھی حیثیت سے اس کے لیے کوئی کام کرتے ہیں وہ گویا

اس کے زر خرید غلام ہیں... بلکہ غلاموں کو بھی شاید کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں' انہیں وہ بھی حاصل نہیں ہیں..."

اس نے سگریٹ کا ایک کش لے کر عجیب سے انداز میں سر جھٹکا پھر گہری سانس لے کر بولا "خیر... افضل صاحب! یہ سب تو دراصل بہانے ہیں۔ قدرت جب کسی کو اس کے گناہوں کی سزا دینا چاہتی ہے تو عجیب عجیب غیر متوقع قسم کے جواز تخلیق کر دیتی ہے۔ اس دربدری' ذلت اور خانماں بربادی نے مجھے بڑے سبق دیے ہیں۔ بڑی بڑی چیزیں میری نظر میں حقیر ہو کر رہ گئی ہیں جن کے پیچھے بھاگنے میں ہم پوری زندگی گنوا دیتے ہیں... حرام و حلال کی تمیز کھو بیٹھتے ہیں... بے غیرت بن جاتے ہیں۔ ہمیں گمان بھی نہیں ہوتا کہ یہ سب سراب ہیں۔ ایک لمحے میں ہم سے چھن سکتی ہیں۔"

اس کی آواز بھرا سی گئی "میں بہت گناہ گار ہوں افضل صاحب! میری وجہ سے نہ جانے کتنے گھرانوں کی آبرو خاک میں ملی ہوگی... نہ جانے کتنی لڑکیوں کی زندگی برباد ہوئی ہوگی۔ حتیٰ کہ ایک طویل عرصے تک میری حیثیت دلال کی سی رہی... مگر مجھے جیسے کچھ نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ مجھے کبھی اپنا اصل مقام' اصل حیثیت نظر ہی نہیں آئی۔ میں سمجھتا تھا' میں بہت باعزت' بہت آسودہ حال آدمی ہوں' میرے بڑے ٹھاٹ ہیں اور میں بڑی عیش کی زندگی گزار رہا ہوں..."

وہ خود استہزائی کے انداز میں مسکرایا "اپنی چرب زبانی سے میں نے نہ جانے کن کن لوگوں کو کیا کیا دھوکے دیے... کتنے لوگوں کی رقمیں ماریں... دھونس' دھمکی' دھاندلی سے جس کی جو چیز دبا سکا' دبالی... اور بڑا خوش رہا۔ اس کے بعد مجھ پر اسی شہر میں یہ وقت بھی آیا کہ ڈیفنس والے بنگلے کے مالک سے چوری چوری میں نے بنگلا چھوڑ کر اور دو سال کا کرایہ مار کر بھاگنے کا فیصلہ کیا تو میں اپنا سامان بھی اُٹھا کر دوسری جگہ تک نہیں پہنچا سکا۔ وہ بھی مجھ سے راستے میں پیر دانش کے آدمیوں نے چھین لیا اور مجھے خود جان بچا کر بھاگنا پڑا... اس کے بعد سے بس دربدری ہے اور میں ہوں... میں اس پوزیشن میں نہیں تھا کہ کسی سے ایک ہزار روپیہ بھی اُدھار مانگنے جا سکوں۔ میں کسی کے سامنے آنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ میں نے اس شہر میں کسی کے ساتھ کوئی بھلائی ہی نہیں کی تھی کہ کوئی آڑے وقت میں میرے کسی کام آتا... اور میرے ساتھ بالکل بجا طور پر یہ ہو رہا تھا... میں اسی کا مستحق تھا۔"

"مونا تمہارے ساتھ تھی؟" میں نے تصدیق چاہی۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا "اسی کی وجہ سے مجھے زیادہ دشواری تھی۔ میرے لیے اکیلا چھپنا ہی مسئلہ بنا ہوا تھا۔ چہ جائیکہ ساتھ اس کی حفاظت کی فکر بھی کرنا پڑ رہی تھی۔ ایک پُرانے تعلق کے حوالے سے اس غریبانہ مضافاتی بستی میں وہ مکان خالی مل گیا تھا۔ وہاں ہم چُھپ گئے تھے۔ ایک روز میں کچھ قسمت آزمائی کے ارادے سے نکلا۔ مجھے کافی دیر ہو گئی۔ میرے پیچھے وہ بھی کوئی کرنے کے ارادے سے... اور کچھ پریشانی کی وجہ سے اِدھر ٹیلی فون کرنے نکلی تو دیکھ لی گئی۔ وہاں کچھ منشیات فروشوں کارندے رہتے تھے۔ وہ بھی پیر دانش کے مخبر تھے۔ میں واپس مونا کی لاش مجھے پھندے میں جھولتی ہوئی ملی۔ پیر دانش کے میری گھات میں بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تو شاید قسمت اچھی ابھی میری زندگی باقی تھی کہ میں بچ نکلا۔ انہوں نے بہت دو میرا تعاقب کیا۔"

"شاید اسی دوران ہم وہاں پہنچے تھے جب تم وہاں سے بچا کر نکلے اور وہ لوگ تمہارے تعاقب میں لگ گئے۔ ہمیں صرف مونا کی لاش ملی تھی۔ کسی سے ہمارا سامنا یا ٹکراؤ نہیں" میں نے بتایا۔

"میں تو اس کی لاش کو بھی نظر بھر کر نہیں دیکھ سکا" وہ سی آواز میں بولا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "بہت سی باتیں سے معلوم ہو گئی تھیں۔ تمہاری زبانی بھی اس زنجیر کی کڑیاں مل گئی ہیں لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی اتنی جلدی کیسے ماری گئی...؟"

میں نے اسے بتایا کہ کس طرح مونا اور فرح کی کیسٹیں ظفر جمال نے ہی پیر دانش کو بلیک میل کرنے کے لیے رکھی میرے ہاتھ لگی تھیں... پھر کس طرح فرح میری نظر میں آ اور کس طرح میں اس کے بنگلے پر جا پہنچا تھا۔ کس طرح وہ مہربان ہو گئی تھی اور اس نے ساری باتیں مجھے بتا دی تھیں طرح ہمارا آئندہ بھی ملتے رہنے کا پروگرام طے پایا تھا۔

"...اس ملاقات کے بعد صرف ایک دن بیچ میں آیا" میں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا "اس کے بعد میں کل شام سے ملنے کے خیال سے گیا تو میں نے اسے مُردہ پایا اور پولیس کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا۔ پیر دانش تو چلو جلد ایسٹ سے واپس آ گیا ہوگا لیکن فرح کے اتنی جلدی مارے جانے کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟"

"وہ بے چاری خوش فہمی میں ماری گئی ہوگی" ظفر بلا تامل بولا۔ "وہ پیر دانش کے محض ایک دو دن کے لیے ایسٹ چلے جانے کے بعد اپنے آپ کو بہت آزاد آزاد محسوس کر رہی ہوگی۔ اس نے اس آزادی کو انجوائے کیا ہے سمجھ رہی ہوگی کہ وہ آئندہ بھی اس سلسلے کو جاری رکھ سکتی ہے دانست میں اس نے تمام ضروری احتیاطیں بھی کر لی ہوں گی اسے معلوم نہیں ہوگا کہ پیر دانش کے معاملے میں کوئی بھی کافی نہیں ہوتی۔ وہ موجود ہو یا نہ ہو' کسی نہ کسی طریقے غیبی آنکھ اس کے آدمیوں کی نگرانی کر رہی ہوتی ہے۔ مجھ فرح جیسے بیسیوں افراد جو یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ چونکہ پیر دا

بہت سی باتیں جانتے ہیں اس لیے وہ اس کے قریبی آدمی بن گئے ہیں‘ درحقیقت بہت ہی خطرناک خوش فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں۔ محض یہ خوش فہمی بھی انہیں موت کے منہ میں لے جانے کے لیے کافی ہے۔ غداری یا اس کے اعتماد کو دھوکا دینا تو بہت دور کی بات ہے۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ پیر دانش کو پتا چل گیا ہوگا کہ فرح اس کی عدم موجودگی میں مجھ سے یا کسی سے ملی تھی؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”یقیناً“ وہ وثوق سے بولا ”پیر دانش عجیب و غریب شیطانی ذہن کا مالک ہے۔ وہ اپنے قریب ترین لوگوں کی جاسوسی کرانے کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست رکھتا ہے۔ عین ممکن ہے جب آپ سوئمنگ پول پر اس سے باتوں میں مگن ہوں اس وقت کسی درخت پر پتّوں میں چھپی ہوئی کسی وڈیو کیمرے کی آنکھ آپ دونوں کا عکس محفوظ کررہی ہو‘ عین ممکن ہے بیڈ روم میں کسی الیکٹرانک کیمرے نے آپ کی تصویر کھینچی ہو یا کسی اور آلے نے آپ کی آوازیں ریکارڈ کی ہوں۔ ایسی کوئی بھی چیز کسی بھی ایسی جگہ پر پوشیدہ ہوسکتی تھی جہاں آپ کا خیال بھی نہ جاتا۔ وہ تو ایسی خبیث چیز ہے اس نے اپنی تینوں بیویوں کے بیڈ روم تک ”بگ“ کررکھے ہیں جو برسوں سے اس کی وفادار قیدیوں کی طرح زندگی گزار رہی ہیں۔“

اس کی بات درست ہوسکتی تھی۔ وہ پیر دانش کو مجھ سے.... بلکہ شاید اس کے دوسرے قریبی آدمیوں سے بھی بہتر جانتا تھا۔ کبھی وہ خود بھی اس کا قریبی ہی آدمی تھا۔

”اب تم کیا چاہتے ہو؟“ ایک طویل سکوت کے بعد میں نے پوچھا۔

”میرا تو سب کچھ لٹ چکا ہے افضل صاحب! میں برباد ہوچکا ہوں.... مونا بھی مرچکی ہے.... اور ہمارے سارے خواب بھی اُجڑ چکے ہیں.... اب کیا باقی رہ گیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔“ اس نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے ”گویا چھوٹے گناہ گاروں نے تو اپنے گناہوں کی سزا پالی ہے۔ اب بڑے گناہ گار کا بھی تو حساب ہونا چاہیے۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ ہم تو برائی سے بغاوت کرنے کے ”جرم“ میں برباد ہوجائیں اور وہ اپنی تمام تر بلیسیت کے باوجود راج سنگھاسن پر بیٹھا عیش کرتا رہے.... معاشرے میں زہر گھولتا رہے.... لوگوں کی زندگیوں سے کھیلتا رہے۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگا افضل صاحب!“

اس نے نئی سگریٹ سلگائی۔ اس کی انگلیوں میں خفیف سا ارتعاش تھا۔ ایک گہرا کش لے کر وہ بولا ”میں اسے پھانسی چڑھتے دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے صرف آپ جیسے ایک مضبوط آدمی کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں اس کے بہت سے رازوں سے واقف ہوں۔ کئی ایسے مردوں اور عورتوں کے بارے میں مجھے علم ہے جنہیں اس کے حکم پر قتل کیا گیا۔ کئی ایسے ناجائز‘ خطرناک اور مذموم دھندوں کا مجھے پتا ہے جن کے ذریعے اس کی دولت کے انباروں میں اضافہ ہورہا ہے۔ پاکستانی لڑکیوں کی ان فلموں کی تیاری اور بہت اچھے ریٹ پر انہیں چلانا اس کا تازہ ترین پروجیکٹ تھا۔ جعلی پیر تو وہ ہے ہی.... اسمگلروں اور منشیات فروشوں کو وہ تحفظ اور مین پاور فراہم کرتا رہا ہے اور اپنے دھندوں میں ان سے مدد لیتا رہا ہے۔ اعلیٰ درجے کے تاجروں کو اغوا کرا کے تاوان وصول کرتا رہا ہے۔ بیش قیمت گاڑیاں تک چوری کراتا رہا ہے۔ ہر طرح کے جرائم پیشہ لوگ اس کی پناہ میں آنے کے بعد محفوظ ہوجاتے ہیں۔ لڑکیوں کی فلموں والے دھندے کی تو بیشتر تفصیلات کا مجھے علم ہے کیونکہ مجھ بدبخت کا کردار ہی اس میں سب سے اہم تھا۔ مجھے معلوم ہے کہ کس طرح لڑکیوں کو گھیرا جاتا رہا.... کہاں کہاں شوٹنگ ہوئیں.... کن کن ”ہنرمندوں“ نے خدمات انجام دیں۔ میں یہ سب کچھ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہوکر بیان کرنا چاہتا ہوں۔“

”تمہیں یقین ہے کہ تمہاری گواہی اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچانے کے لیے کافی ہوگی؟“ میں نے پوچھا۔

”یقیناً“ وہ قدرے جوش سے بولا ”بشرطیکہ کچھ طاقتور‘ بارسوخ اور دیانت دار لوگ میرا ساتھ دیں۔ میں اکیلا کچھ نہیں کرسکتا۔ میں صحیح طور پر زبان کھولنے سے پہلے ہی مارا جاؤں گا۔ میں ان کی شاندار راجدھانی کے نیچے رکھا ہوا ڈائنامائٹ ہوں لیکن میں از خود کوئی دھماکا نہیں کرسکتا۔ کچھ مضبوط اور بے جھجک ہاتھوں کی ضرورت ہے جو مجھ سے صحیح کام لے سکیں۔“

کمرے میں ایک بار پھر گہرا سکوت چھا گیا۔ میں ایک بار پھر خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا لیکن میرے ذہن میں خاصا طوفان برپا تھا۔ کمرے کی فضا سگریٹوں کے دھوئیں سے بوجھل ہوچکی تھی۔ آخر میں نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا اور ریسیور اُٹھا کر آپریٹر کا نمبر پنچ کیا۔

”آپ کسے فون کررہے ہیں؟“ اس نے یکدم ذرا تشویش زدہ ہوکر پوچھا۔ اس کے ذہن میں شاید کسی اندیشے نے سر اُٹھایا تھا۔

”ایک اور مضبوط ہاتھ کو.... جو پیر دانش کو گھسیٹ کر پھانسی کے پھندے تک لے جانے میں ہماری مدد کرے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

ظفر جمال کے چہرے سے تشویش کے آثار غائب ہوگئے۔ پہلے شاید وہ یہ سوچ کر پریشان ہوگیا تھا کہ میں اس کی مدد کرنے کے بجائے اسے پیر دانش یا پھر قانون کے حوالے کرنے کا ارادہ کررہا ہوں.... وہ قانون کی تحویل میں تو جانے کے لیے تیار تھا مگر اس شرط پر کہ اس کی گواہی سے پیر دانش کے گلے میں پھندا پڑ جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تو برسوں کے لیے جیل پہنچ جائے اور پیر دانش اسی طرح آزاد پھرتا رہے‘ شان و شوکت سے اپنی سلطنت چلاتا رہے۔

میرا جواب سن کر اس کے چہرے پر طمانیت لوٹ آئی اور اس نے قدرے اشتیاق سے پوچھا "کیا وہ کوئی بہت بڑا آدمی ہے؟"

"ہاں۔ بہت بڑا آدمی ہے" میں نے آپریٹر کو رحیم گل کا نمبر بتایا اور دوبارہ ظفر جمال کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "جو آدمی پولیس کے محکمے میں ہوتے ہوئے رشوت نہ کھا رہا ہو.... کوئی ناجائز کام نہ کر رہا ہو.... قانون اور اصولوں کی پاس داری کے لیے اور انسانیت کی فتح کے لیے بڑے بڑوں کی مخالفت مول لے رہا ہو.... جائز کام کے سلسلے میں کسی سے بھی ٹکر لینے سے نہ ڈرتا ہو.... میری نظر میں تو بہت بڑا آدمی ہے۔ وہ جہاد کر رہا ہے۔"

آپریٹر نے بتایا کہ رحیم گل کا نمبر انگیج مل رہا تھا۔ جونہی خالی ملا' وہ مجھے بیل دے دے گا۔ میں نے ریسیور رکھ دیا۔ ظفر جمال نے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا "کیا وہ بہت بڑا پولیس آفیسر ہے؟"

"میں نے تمہیں جو کچھ بتایا' کیا اس کے بعد بھی تمہیں اس کے بڑا ہونے میں شک ہے؟" میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں سر.... ! لیکن عہدہ تو بہرحال اہم ہوتا ہے نا.... میرا مطلب ہے...." وہ کچھ گڑبڑا کر رہ گیا۔ بات مکمل نہ کر سکا۔

"عہدہ نہیں.... کردار اہم ہوتا ہے۔ ایک بے کردار بڑے افسر سے ایک باکردار کانسٹیبل بہتر ہے" میں نے اپنا نظریہ بیان کیا "بہرحال.... عہدے کے لحاظ سے یہ شخص صرف انسپکٹر ہے۔"

ظفر جمال کے چہرے پر مایوسی چھا گئی "صرف انسپکٹر....؟" اس نے مردہ سے لہجے میں دہرایا "ایک انسپکٹر بھلا پیر دانش کا کیا بگاڑ سکتا ہے؟"

"جو شخص کردار کے لحاظ سے ایک چٹان کی طرح مضبوط ہو.... وہ بڑے بڑے بدمعاشوں کے ساتھ کیا کچھ کر سکتا ہے' اس کا تم تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

"پھر بھی.... سر.... ! عہدے کی اپنی کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں۔ سرکاری نظام کا بہرحال اپنا ایک حساب کتاب ہے۔ افسر کے اختیارات کی حدود اس کے آڑے آجاتی ہیں۔ چھوٹا افسر اپنی جگہ لاکھ کچھ کرنا چاہے لیکن اگر اوپر سے بڑے افسر کا آرڈر آجائے تو وہ مجبور ہو جاتا ہے" ظفر جمال بولا۔

"رحیم گل ان چیزوں سے نمٹنا جانتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "جس طرح عام پولیس والوں کو بدعنوانی اور ناجائز کاموں سے روکنے کے لیے سینکڑوں قوانین اور ضابطے موجود ہیں مگر وہ اس کے باوجود جو کرنا ہوتا ہے' کر گزرتے ہیں' اپنی مرضی چلانے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتے ہیں اسی طرح رحیم گل بھی صحیح اور جائز کام پر ڈٹے رہنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال لیتا ہے۔ قانون کی باریکیوں سے وہ بہت اچھی طرح واقف ہے۔ اس نے لاء میں ماسٹرز ڈگری لی ہوئی ہے۔ جس طرح بعض افسر کرپشن میں اسپیشلسٹ ہوتے ہیں' اس طرح رحیم گل خبیث لوگوں سے ٹکر لینے میں اسپیشلسٹ ہے خواہ وہ کتنے ہی بارسوخ ہوں۔"

"پھر بھی.... سر.... !" ظفر جمال بدستور متذبذب تھا۔ رحیم گل کو قریب سے جانے بغیر میری بات کو سمجھنا اس کے لیے مشکل تھا۔ ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا۔

"سر! آپ اتنے بڑے آدمی ہیں.... کیا آپ کی انسپکٹر سے اوپر کے لیول تک واقفیت نہیں ہے؟"

مجھے ہنسی آگئی۔ وہ قدرے تعجب سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے ملائمت سے کہا۔

"واقفیت تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ واقفیت تو آئی جی اور ڈی آئی جی اور اس سے بھی اوپر کی سطح تک ہے.... اور وہ کچھ دوسرے اتفاقات کی وجہ سے ہے۔ میرے دولت مند یا بڑے بزنس مین ہونے کی وجہ سے نہیں ہے.... دولت مند اور بڑے بزنس مین تو اس شہر میں مجھ سے کہیں بڑے بڑے موجود ہیں.... میری شناسائی کی وجوہات کچھ اور ہیں۔ بہرحال.... اس کام کے لیے میں انسپکٹر رحیم گل کو ہی موزوں سمجھتا ہوں۔ پیر دانش کے لیے یہ مزید تکلیف کی بات ہوگی کہ وہ ایک انسپکٹر کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچے۔"

"دیکھ لیجیے سر.... ! مجھے مروا نہ دیجیے گا...." اس نے کہا پھر گویا تصحیح کرتے ہوئے بولا "میرا مطلب ہے میں مرنے کے لیے تیار ہوں لیکن اگر مجھے مرنا ہی پڑے تو میری موت رائیگاں نہیں جانی چاہیے۔ پیر دانش کو واقعی انجام تک پہنچ جانا چاہیے۔"

"تم سے زیادہ مجھے اس کی فکر ہے" میں نے کہا "یہ میری عزت کا سوال ہے۔ بہرحال اس معاملے میں انسپکٹر رحیم گل میری نظر میں آئی جی' ڈی آئی جی سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اصل کام اسی سطح کے آدمی کو کرنا ہوتا ہے۔ اونچے افسر تو صرف احکامات جاری کر سکتے ہیں۔ ان احکامات پر عملدرآمد کا انحصار تو نیچے والوں پر ہوتا ہے۔ ایک اہم بات یہ بھی ہے کہ پیر دانش کی رہائش رحیم گل کے تھانے کی حدود میں ہے۔ اس معاملے سے اصل تعلق تو اسی کا بنے گا۔"

ظفر جمال خاموش رہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ وہ مطمئن نہیں لیکن مجھے فی الحال اس کی بے اطمینانی کی پروا نہیں تھی۔ میں بہتر سمجھتا تھا کہ پیر دانش پر ہاتھ ڈالنے کے لیے رحیم گل موزوں آدمی تھا یا نہیں؟

ظفر جمال نے ایک اور سگریٹ سلگا لی۔ چند لمحے بعد بیل بجی۔ رحیم گل لائن پر تھا۔ میں نے یونہی چھیڑنے کے انداز میں کہا "بہت دیر سے لائن انگیج تھی.... کس حسینہ سے باتیں ہو رہی تھیں؟"

"حسینہ....؟" وہ کراہنے کے سے انداز میں بولا "ہاں.... واقعی بہت ہی پیاری حسینہ سے مکالمہ ہو رہا تھا۔ بس تھوڑی سی بدمزگی یہ تھی کہ اس حسینہ کی ایک ایک فٹ کی مونچھیں اور توند پچپن انچ سے زیادہ تھی.... لیکن.... خیر یہی غنیمت ہے کہ اس سے ویڈیو فون پر بات نہیں ہو رہی تھی اور اس کی خوبصورتی کا نظارہ بھی نہیں کر رہا تھا۔"

"کون تھی وہ حسینہ؟ اسے تو عالمی مقابلۂ حسن میں بھیجنا چاہیے" میں نے کہا۔

"خیال تو میرا بھی یہی تھا...." وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "لیکن وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے رضامند نہیں ہوگی کیونکہ اسے ہمارے علاقے میں ایس ایس پی کے فرائض انجام دینا پڑتے ہیں۔"

"اوہ.... کیا کہہ رہے تھے وہ؟" میں نے یونہی بات برائے بات کی۔

"آہ.... ! عہدہ سنتے ہی تم نے انہیں مونث سے مذکر بنا دیا" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "ان بے چاروں کو کہنا کیا ہوتا ہے! بس یہی کہ فلاں کو چھوڑ دو.... اس سے بہتر ہے کہ فلاں کو پکڑ لو.... فلاں کے لیے فلاں کا فون آیا ہے.... اور فلاں کو چھڑانے کے لیے فلاں تنگ کر رہا ہے۔ میرے کان کوئی ایسی کال سننے کے لیے ترس گئے ہیں جس میں کہا جائے کہ فلاں کو اگر تم بے قصور اور بے گناہ پاؤ تو اسے قانونی موشگافیوں میں الجھائے بغیر.... اور کسی بھی سفارش کے بغیر فوراً رہا کر دینا اور کسی کو اگر تم مجرم پاؤ.... خواہ اس کے خوف سے کوئی گواہی دینے والا میسر نہ ہو.... اور خواہ اس کے لیے کتنی ہی بڑی سفارش آئے' اسے ہرگز مت چھوڑنا۔ ایسا کوئی فون کب آئے گا افضل پیارے؟"

"اس وقت تم ایسا ہی ٹیلی فون سن رہے ہو ڈیئر رحیم گل!" میں نے گویا اسے من کی مراد پوری ہونے کی نوید سنائی۔

"تمہارے فون سے کیا ہوتا ہے" وہ مایوسی سے بولا "تمہارا کون سا اس ملک کا نظام چلانے میں کوئی کردار ہے۔"

"کچھ نہ کچھ کردار تو ہوگا یار! آخر میں اس ملک کا ایک معزز شہری ہوں" میں نے کہا۔

"تمہارا کردار بس اتنا ہی ہے کہ تم مجھ جیسے گدھوں کو وقت بے وقت فون کر کے ان کے کان کھاتے رہا کرو کیونکہ اتفاقاً ہم جیسے گدھوں کی تم جیسے گدھوں سے دوستی ہو جاتی ہے" وہ ایک اور ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"خیر یار.... ! اتنا مایوس ہونے کی ضرورت نہیں" میں نے اسے تسلی دی "مجھ جیسے اور تم جیسے لاکھوں گدھے جس صبح بہاراں کا خواب دیکھتے ہیں وہ اس ملک میں کبھی نہ کبھی ضرور آئے گی۔ اس کے لیے ہم اپنی اپنی جگہ جو بھی معمولی سے معمولی کام کر سکتے ہوں وہ ہمیں کرتے رہنا چاہیے۔"

"اس وقت تم نے مجھے یہی بتانے کے لیے فون کیا ہے؟" وہ خفگی سے بولا۔

"کیوں.... کیا تمہارے خیال میں یہ بات اہم نہیں ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

"کام کی بات کرو یار! تم نے یقیناً کسی کام سے فون کیا ہوگا۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اصل بات کرو۔ میرا مغز مت چاٹو اور وقت ضائع مت کرو۔ میرا مغز اور وقت' دونوں بہت اہم اور قیمتی ہیں" وہ مصنوعی رکھائی سے بولا۔

"ماشاء اللہ.... !" میں نے کہا "وقت قیمتی ہونے کی بات تو میں مان سکتا ہوں لیکن یہ مغز کہاں سے قیمتی اور اہم ہو گیا؟"

"کیوں.... " مغز قیمتی اور اہم کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"بھئی قیمتی اور اہم تو وہی چیز ہو سکتی ہے جو انسان کے پاس موجود ہو۔ جو چیز تمہارے پاس موجود ہی نہیں.... اس کے اہم یا قیمتی ہونے کا کیا سوال؟"

"سب کو اپنے جیسا مت سمجھا کرو۔ اللہ تعالیٰ نے بے شمار لوگوں کو تم سے بہت مختلف بنایا ہے" وہ فوراً بولا "اب سیدھی طرح کام بتاؤ ورنہ میں فون بند کرنے لگا ہوں۔ کافی رات گزر چکی ہے۔ مجھے نیند آرہی ہے۔"

"حیرت ہے! حالانکہ یہ تمہارا جاگنے کا وقت ہے۔ کیا اب اُلو اتنے کاہل ہو گئے کہ راتوں کو بھی سونے لگے؟ کام کی بات سنو یار! میں ایک بہت اہم کیس تمہارے ہاتھ میں دینا چاہتا ہوں جس میں بڑا چیلنج پوشیدہ ہے اور تمہیں چیلنج والے کام کرنے میں ہی سب سے زیادہ لطف آتا ہے۔ اگر تم نے ایک مضبوط اور بے خوف انسان کی طرح اس معاملے کو ہینڈل کیا تو تمہاری شہرت میں چار چاند لگ جائیں گے۔"

"اگر میں نے تمہارے کہنے پر کسی معاملے کو ہینڈل کیا تو زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ میرے ہاتھ میں صرف سائیکل کا ہینڈل آئے۔ بہرحال.... تم نے مجھے مروانے کا کوئی نیا طریقہ سوچ لیا ہے تو وہ بھی بیان کر ڈالو۔ مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ تم سے دوستی کے بعد انسان کی زندگی چین سے نہیں گزر سکتی" وہ بولا۔

"افسوس.... تم نے بھی اسی طرح کی باتیں شروع کر دیں۔ تمہیں تو میں اتنا بزدل اور تھڑدلا نہیں سمجھتا تھا۔ میں تو تمہیں ترقی اور اپنے مشن کی تکمیل کا راستہ دکھانا چاہتا ہوں۔ تم نے بات سننے سے پہلے ہی بدفالیں زبان سے نکالنا شروع کر دیں۔ اگر تم ایک بہت بڑے کام کا کریڈٹ نہیں لینا چاہتے تو تمہاری مرضی' " میں نے گویا بات ختم کرنا چاہی۔

"اب یہ دوسری بیوی کی طرح نخرے دکھانے بند کرو اور بتاؤ

کیا بات ہے؟" وہ جلدی سے بولا۔

"بھئی واہ..... ! تمہیں تو ابھی پہلی بیوی ہی نصیب نہیں ہوئی۔ یہ دوسری کے بارے میں تجربہ کہاں سے بول پڑا؟" میں نے بات پکڑلی۔

"بھئی ضروری تو نہیں ہے کہ انسان ہر بات ذاتی تجربے کی روشنی میں ہی کرے۔ دوسروں کے تجربات پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ تم یہ مثال وغیرہ کو چھوڑو..... اصل بات بتاؤ" وہ بولا۔

"بات بہت لمبی ہے۔ تم میرے پاس آجاؤ۔ ہمیں ایک باضابطہ قسم کی میٹنگ کرنا پڑے گی۔ ایک بہت بڑے ڈرامے کا بہت اہم کردار بھی میرے پاس موجود ہے۔ میں تمہیں اس سے بھی ملوانا چاہتا ہوں۔ میٹنگ میں ہم تینوں ہی ہوں گے۔"

"یار! تم اس معاملے کو صبح پر نہیں رکھ سکتے؟" اس نے گویا مجھے سنانے کے لیے فون پر آواز کے ساتھ جمائی لی "اب تو میں سونے کے لیے جا رہا تھا۔ سلیپنگ سوٹ بھی پہن چکا ہوں۔"

"ایسی تیسی تمہارے سلیپنگ سوٹ کی..... !" میں نے دانت پیس کر کہا "ابھی تم مجھ پر' دوسری بیوی کی طرح نخرے دکھانے کا الزام دھر رہے تھے۔ اب خود کسی اونچے درجے کے ماڈل کی طرح نخرے دکھا رہے ہو۔ سلیپنگ سوٹ پہن لیا تو کیا ہوا۔ کوئی زرہ بکتر تو نہیں پہن لی۔ ویسے بھی بھلا پولیس آفیسر کو سونے سے کیا کام؟ وہ تو چوبیس گھنٹے ڈیوٹی پر ہوتا ہے۔"

"ہاں..... اسے بھلا نیند کی کیا ضرورت؟ وہ کوئی انسان تھوڑا ہی ہے۔"

"ہاں..... وہ تو پولیس والا ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

"تمہاری بکواس سننے سے بہتر ہے کہ میں آہی جاؤں" وہ بولا۔

"اب کی ہے تم نے عقل کی بات" میں نے گویا اطمینان کی سانس لی "یہ فیصلہ تم پہلے ہی کر لیتے تو ہم دونوں کا کتنا وقت بچتا۔"

"میں تو سوچ رہا ہوں آئندہ فون پر تمہاری "ہیلو" سنتے ہی تمہاری طرف دوڑ پڑا کروں گا..... ہاتھ میں ڈنڈا لے کر..... !" وہ جل کر بولا۔

"اور تمہارے پیچھے بچے ہوا کریں گے..... ہاتھوں میں پتھر لیے" میں نے کہا۔

"میں آرہا ہوں" وہ بولا۔

"تو پھر آجاؤ..... اس میں اس طرح دھمکی دینے کی کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے فون بند کرنے سے پہلے کہا "بکواس سے قطع نظر..... مجھے بالکل سنجیدگی سے بتاؤ..... تمہارے اندازے کے مطابق اس بات چیت میں کتنی دیر لگ جائے گی؟"

"پوری رات بھی لگ سکتی ہے" میں نے جواب دیا۔

"اوہ..... مائی گاڈ..... ! کیا تم واقعی سنجیدہ ہو؟" وہ گویا خوفزدہ ہو کر بولا۔

"میں بے حد سنجیدہ ہوں۔ اس سے پہلے بھی میں سنجیدہ تھا۔ یہ معاملہ بھی بہت سنجیدہ ہے" میں نے جواب دیا۔

"لگتا ہے تمہاری سنجیدگی اور مذاق میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ میں پندرہ منٹ میں پہنچ رہا ہوں" وہ بولا۔

"صرف پندرہ منٹ میں؟" میں نے بے یقینی سے پوچھا۔

"ہاں..... جب تم جیسے کمینے آدمی سے ملنا میری مجبوری ٹھہرا..... تو پھر جتنی جلدی مل لیا جائے اتنا ہی بہتر ہے۔ تاخیر کرنے کا کیا فائدہ؟" اس نے فون بند کر دیا۔

میں نے ریسیور رکھا تو ظفر جمال عجیب سے نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے ابھی یک طرفہ گفتگو ہی سنی تھی۔ اسے یقیناً وہی کافی عجیب لگ رہی تھی۔ اگر وہ دونوں طرف کی گفتگو سن رہا ہوتا تو مزید حیران ہوتا۔ شاید ہماری گفتگو میں غیر سنجیدگی کے عنصر کو محسوس کرتے ہوئے اس کا یقین کچھ اور متزلزل ہو گیا تھا۔ شاید اسے امید نظر نہیں آرہی تھی کہ محض ایک انسپکٹر میرے کہنے پر پیر دانش پر ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ شاید وہ یہ بھی سوچ رہا ہو کہ اس نے میرے پاس آکر غلطی کی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خوف لوٹ آیا تھا۔

میں نے اٹھ کر اس کے قریب جا کر کندھے پر تھپکی دی۔ "تمہیں گھبرانے کی ضرورت نہیں ظفر جمال! تم صحیح آدمی کے پاس پہنچ گئے ہو۔ تمہیں اب اس سلسلے میں ذرا بھی فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اب یہ صرف میرا اور انسپکٹر رحیم گل کا دردِ سر ہے۔ تمہیں صرف اپنی تمام معلومات رحیم گل کو منتقل کرنی ہیں۔ اس کے سوا تمہیں کچھ بھی نہیں کرنا" میں کمرے میں ٹہلنے لگا۔

اس کی آنکھوں میں خوف کچھ کم ہوا۔ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا "انسپکٹر رحیم گل آپ کا بچپن کا دوست معلوم ہوتا ہے۔ بہت بے تکلفی ہے آپ دونوں میں..... ایسی بے تکلفی عموماً بچپن کے دوستوں میں پائی جاتی ہے۔"

"ایسی کوئی بات نہیں ہے" میں نے اس کی غلط فہمی دور کی۔ "کچھ عرصہ پہلے تک تو میں نے اس کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ یہاں سے کافی دور' بہت عجیب و غریب حالات میں ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس وقت وہ مجھے گرفتار کر لیتا۔"

"واقعی؟" ظفر جمال بے یقینی سے بولا اور ٹھہر گیا۔ شاید میں اسے تفصیل بتاؤں گا لیکن میں نے اس تذکرے کو یہیں چھوڑا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ ٹنٹڈ گلاس کے پار' سات منزل نیچے سڑک پر گاڑیوں کی بتیاں متحرک چراغوں کی طرح اِدھر اُدھر تیر رہی تھیں۔ ٹریفک بہت کم تھا اور گاڑیوں کی آوازیں بھی کمرے میں نہیں پہنچ سکتی تھیں۔ اس لیے میرے اردگرد سکوت تھا۔ رات گویا اپنے من میں کوئی بھید چھپائے ہوئے تھی۔ ظفر جمال کی دھندلی پرچھائیں مجھے ٹنٹڈ گلاس میں دکھائی دے رہی تھی۔ وہ خاموشی سے بیٹھا سگریٹ کے کش لے رہا تھا۔ اس نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔

ٹھیک پندرہ منٹ بعد کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں رحیم گل کے بارے میں نیچے ہدایت دے چکا تھا کہ وہ آئے تو اسے کمرے میں بھیج دیا جائے۔ ظفر جمال دروازہ کھولنے کے لیے اٹھا لیکن میں نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا اور خود آگے بڑھ کر میجک آئی سے باہر دیکھ کر اطمینان کرنے کے بعد دروازہ کھولا۔

انسپکٹر رحیم گل اندر آگیا۔ وہ تھری پیس سوٹ میں تھا اور بالکل تازہ دم نظر آرہا تھا۔ لگتا تھا بڑے اہتمام سے تیار ہو کر آیا تھا گویا واقعی کسی باضابطہ قسم کی کانفرنس میں جا رہا تھا۔ بس ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس کی کمی تھی۔ صرف پندرہ منٹ میں وہ اتنے اہتمام سے تیار ہو کر اپنے گھر سے یہاں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ وہ کم بخت یقیناً اس وقت اسی حلیے میں تھا جب فون پر مجھ سے بات کر رہا تھا۔ سلیپنگ سوٹ میں ہرگز نہیں تھا۔

شاید وہ کہیں جانے کا پروگرام ملتوی کر کے میرے پاس آیا تھا۔ کمرے میں پہنچتے ہی اس نے گہری نظروں سے ظفر جمال کا جائزہ لیا۔ ظفر جمال کچھ مضطرب نظر آنے لگا۔ وہ رحیم گل کے استقبال کے لیے غیر ارادی سے انداز میں اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ یکدم ہی رحیم گل کی شخصیت سے مرعوب نظر آنے لگا تھا۔ اسے یقیناً اندازہ ہو گیا تھا کہ رحیم گل کوئی روایتی پولیس آفیسر نہیں تھا۔

رحیم گل نے مضبوطی سے اس سے مصافحہ کیا' ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ پھر ایک صوفے پر ڈھیر ہوتے ہوئے میری طرف دیکھ کر بولا "ہاں..... سناؤ تمہارے پاس کیا کہانی ہے۔"

"تم نے یہاں کمرے تک آنے کی بھی زحمت کیوں کی؟" میں نے ملائمت سے کہا۔ "نیچے ہی سے مجھے اپنی آمد کی اطلاع کرا دیتے۔ میں نیچے آکر پارکنگ لاٹ میں تمہاری گاڑی کے پاس کھڑے ہو کر تمہیں کہانی سنا دیتا..... بلکہ یہ زحمت بھی غیر ضروری تھی۔ تم راستے ہی میں موبائل فون پر مجھے اپنی آمد کی اطلاع دے دیتے۔ میں دوڑا دوڑا آکر تمہیں بیچ راستے میں ملتا اور تمہاری گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے کھڑکی میں سے سر ڈال کر تمہیں کہانی سناتا رہتا۔ دو چار سگنلوں تک کہانی ختم ہو ہی جاتی۔"

اس نے گویا محظوظ ہوتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ فون پر وہ جس چڑچڑاہٹ اور بیزاری کا اظہار کر رہا تھا اس وقت اس کا کہیں نام و نشان بھی نہیں تھا۔ اس وقت تو وہ بالکل تازہ دم' ہشاش بشاش اور خوش نظر آرہا تھا۔ بغور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "اُف..... ! کیا جلا کٹا انداز پایا ہے۔ وہ غزل سنی ہے تم نے..... جس کا ایک مصرع ہے..... یہ دھواں سا کہاں سے اٹھتا ہے..... ؟ معلوم نہیں کیوں اس وقت یہ مصرع بہت یاد آرہا ہے۔"

میں نے اسے گھورا تو وہ جلدی سے بولا "اس طرح مت گھورا کرو یار' تمہاری نظروں سے تو پولیس والوں کو بھی پسینہ آنے لگتا ہے۔ چلو..... میں جلد بازی اور بے اطمینانی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ اطمینان و سکون سے تمہاری داستانِ غم سنوں گا۔ تمہارے چکر میں پھنس گیا ہوں۔ رات تو اب برباد ہونی ہی ہے۔ جلد بازی کی کیا ضرورت ہے۔"

وہ ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گیا "اب ذرا چائے یا کافی وغیرہ بھی منگوالو تاکہ میں ذرا بیدار ذہن کے ساتھ تمہاری داستان سن سکوں۔ افسوس کہ کھانا میں کھا چکا ہوں ورنہ وہ بھی آج تمہاری طرف ہوتا۔ تمہارے فائیو اسٹار ہوٹل کی باسی اور پھیکی سیٹھی چیزیں چکھ کر دیکھتے۔"

"آخر پولیس والے ہو نا..... کہیں پہنچتے ہی پہلے کھانے پینے کی فکر شروع ہو گئی" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "ویسے میری داستانِ غم سننے کے لیے ذہن کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ دل پر بھی ہاتھ رکھ لو۔ یہ داستان سننے اور ہضم کرنے کے لیے تمہیں بڑے حوصلے کی ضرورت ہوگی۔"

"حوصلے کی تم فکر نہ کرو۔ اپنے ہاں حاضر اسٹاک میں بہت حوصلہ دستیاب ہے" اس نے مجھے تسلی دی۔

میں نے فون پر روم سروس کو کافی وغیرہ کے لیے کہا۔ کافی آچکی اور ہم تینوں نے اپنے اپنے کپ سنبھال لیے تو غیر ارادی طور پر بغیر کسی تمہید کے' خود بخود ہی اصل موضوع پر گفتگو شروع ہو گئی۔ جوں جوں بات آگے بڑھی رحیم گل مبہوت سا ہوتا گیا۔ اس نے نہایت توجہ اور انہماک سے تمام تفصیلات سنیں۔ اپنے لیے اس نے ایک کے بعد کافی کا دوسرا کپ تیار کیا۔ میرے پورے بیان کے دوران اس نے کوئی سوال نہیں کیا اور نہ ہی کوئی غیر سنجیدہ بات کی۔

مجھے پورا قصہ سنانے میں کافی دیر لگ گئی۔ آخر میں' میں نے ظفر جمال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "میری تمام باتوں کی تصدیق یہ شخص کر سکتا ہے۔ ظفر جمال نامی جس شخص کا میں نے تذکرہ کیا ہے وہ یہی ہے۔ یہ مزید بہت سی باتیں تمہیں بتا سکتا ہے۔ ان کے ثبوت پیش کر سکتا ہے۔ یہ تمہارے لیے وعدہ معاف گواہ بننے کو تیار ہے لیکن اگر تم اسے معافی نہ دلا سکو تب بھی کوئی بات نہیں۔ یہ سودے بازی یا اپنی جان بچانے کے لیے گواہ نہیں بن رہا۔ اگر اسے معافی نہیں مل سکتی تو یہ اپنے حصے کے جرائم اور اپنے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہے۔ یہ اب اس انقلابِ ذات سے گزر رہا ہے جس میں انسان جان دے کر بھی اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتا ہے۔"

رحیم گل نے طویل ہنکارا بھر کر گویا نئے زاویۂ نظر سے ظفر جمال کا سراپا جائزہ لیا اور اس سے کوئی سوال کیے بغیر مجھ سے مخاطب ہوا "میں تمہیں سچی بات بتاؤں..... یہ شخص پیر دانش پہلے ہی میری نظر میں کھٹک رہا تھا لیکن میں اپنی مصروفیات میں الجھ کر

اس کی طرف توجہ نہیں دے سکا تھا۔ اپنے علاقے کے تھانے میں جونہی میری تعیناتی ہوئی' اس شخص نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی میرے اعزاز میں اپنے بنگلے پر ایک تقریب رکھ لی تھی اور اس کا ایک قاصد نہایت اطمینان سے مجھے دعوت دینے کے ساتھ ساتھ تقریب کی تفصیلات سے بھی آگاہ کرنے آگیا تھا۔ بڑی ڈھٹائی سے بتانے لگا کہ وہاں خوبصورت لڑکیاں ہوں گی۔ شراب پانی کی طرح بہے گی... اور میرے لیے مزید بہت کچھ ہوگا۔"

"تم نے اس آدمی کو الٹا تو نہیں لٹکایا؟" میں نے پوچھا۔

"اب میں اتنا بھی جلد باز نہیں ہوں" وہ بولا "میں نے مصروفیت کا عذر کرکے نہایت مہذبانہ انداز میں اس کی دعوت قبول کرنے سے انکار کردیا تھا لیکن میں نے اس نام کا کارڈ اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں ڈال دیا تھا...."

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ پُرخیال انداز میں ٹھوڑی مسلتے ہوئے بولا "اس قسم کے کرداروں کی یہ حرکتیں نئی نہیں ہیں۔ ہزاروں سال سے یہ سلسلے چلے آرہے ہیں۔ تاریخ میں بھی ہمیں اس قسم کے واقعات ملتے ہیں کہ کسی علاقے میں کوئی نیا حاکم یا ممتاز سرکاری اہلکار پہنچا تو وہاں کے اُمرا یا ناجائز دھندے کرنے والے اس کے اردگرد جمع ہوگئے۔ کچھ کا مقصد صرف یہ ہوتا تھا کہ واقفیت اور شناسائی رہے تاکہ کبھی کوئی کام پڑے تو دشواری نہ ہو۔ کچھ کا مقصد حُکام سے دوستی گانٹھ کر دوسروں پر اپنا رعب قائم رکھنا ہوتا تھا اور کچھ کو اپنے ناجائز دھندوں کے لیے تحفظ درکار ہوتا تھا۔ آج کل بھی یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اسی طرح کے طبقات سرکاری اہلکاروں کو گھیرے رکھتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پرانے وقتوں میں کوئی کوئی اہلکار ان کے ہتھے چڑھتا تھا۔ آج کل کوئی مشکل سے ہی بچ پاتا ہے۔ آج کل آنے والا پہلے ہی سے اپنے سینے پر "برائے فروخت" کا بورڈ لگا کر آتا ہے۔"

"لیکن تمہارا بورڈ تو راستے میں کہیں گر چکا ہے" میں نے کہا۔

اس نے ہونٹ بھینچ کر مجھے گھورا پھر کہا "جن کے ایک مرتبہ بورڈ لگ جاتا ہے وہ پھر اسے گرنے نہیں دیتے۔ میں نے اپنے سینے پر کبھی بورڈ لگنے ہی نہیں دیا۔"

"اچھا... خیر... زیادہ صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں... یہ بتاؤ پھر کیا ہوا؟" میں نے پوچھا۔

وہ گہری سانس لے کر بولا "انسپکٹر اور ایس ایچ او کوئی بڑا عہدہ نہیں ہے لیکن اپنے علاقے میں اس کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ اس سے شاطر لوگ بخوبی واقف ہیں اس لیے وہ اپنے طریقۂ واردات کے مطابق اسے ہائی جیک کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیر دانش کی طرف سے اس قسم کی دعوت کا پیغام ملتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ ظاہر ہے اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کوئی ٹھیک آدمی نہیں تھا۔ میں نے سوچا تھا ذرا فرصت ملے گی تو اس کے بارے میں چھان بین

پیچیدہ اور گھناؤنی کہانی برآمد ہوگی۔"

"تمہیں پیر دانش کی طرف سے دوبارہ کبھی "پیغام محبت" موصول نہیں ہوا؟" میں نے پوچھا۔

"اس نے شاید میرے انکار کو اپنی توہین سمجھا۔ دوبارہ اس کی طرف سے اس قسم کا کوئی پیغام نہیں ملا اور نہ ہی کسی سلسلے میں کی کوئی سفارش آئی۔ اس وقت مجھے صحیح طور پر اندازہ بھی نہیں کہ وہ یہاں کی کتنی بڑی شخصیت تھا حالانکہ اخبارات وغیرہ اس کا تذکرہ پڑھتا رہتا تھا۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ اس کے "دربار" میں تو مجھ سے نہیں اوپر تک کے افسر حاضری دیتے تھے اور ان سے بعض تو اس کے تمام کرتوت سے واقف ہونے کے باوجود کی "روحانی" قوتوں سے بھی مرعوب تھے۔ یہ بھی جہالت کی ہے۔ اس نے تو گویا مجھ جیسے چھوٹے افسر کو مدعو کرکے مجھ پر احسان کیا تھا۔ میری عزت افزائی کی تھی۔ میرے انکار سے یقیناً اس کی اَنا کو ٹھیس پہنچی ہوگی۔"

ظفر جمال نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے گفتگو میں مداخلت کی "مجھے اب یاد آرہا ہے کہ ایک بار وہ اپنے کچھ خاص آدمیوں کے سامنے رحیم گل نامی کسی پولیس آفیسر کا بہت ناگواری سے ذکر کررہا تھا۔ کسی کام کے سلسلے میں وہ انہیں نصیحت کررہا تھا کہ اس پولیس والے سے بچ کر رہنا' وہ ہمارے مطلب کا آدمی معلوم نہیں ہوتا۔ اس پر ایک چھنے خاں قسم کے کارندے نے کہا تھا کہ اگر وہ پیر صاحب کے مطلب کا آدمی نہیں ہے تو پھر علاقے میں کیسے رہ سکتا ہے۔ اسے کسی اور علاقے میں بھجوا دینا چاہیے اور اگر اس میں کوئی دشواری ہو تو پھر دوسرے جہان بھجوا دینا چاہیے۔"

رحیم گل نے ہلکا سا قہقہہ لگایا گویا اسے اس اطلاع سے خوشی حاصل ہوئی ہو "ظاہر ہے...." وہ مربیانہ لہجے میں بولا "اس قسم کے لوگوں کی محفلوں میں مجھ جیسے لوگوں کا ذکر انہی الفاظ میں ہوتا ہے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ پیر نے کیا جواب دیا؟"

"پیر نے کہا' نہیں.... جب تک وہ ہمیں نہیں چھیڑتا ہم اسے چھیڑنے سے بچنے کی کوشش کریں گے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے اس کے الفاظ یہی تھے" ظفر جمال نے جواب دیا۔

"بہت خوب" رحیم گل نے ستائشی انداز میں سر ہلایا "ذہین معلوم ہوتا ہے۔ زیادہ زعم میں آکر غیر ضروری خطرات مول نہیں لیتا۔ شاید اسی لیے اپنے دھندوں کو پھیلا کر اس حد تک لے جانے میں کامیاب ہوگیا ہے۔ بہرحال.... کبھی نہ کبھی ایسے لوگوں کا مجھ جیسے کسی نہ کسی افسر سے ہو ہی جاتا ہے۔ شاید یہ قانون قدرت ہے۔ دیر سویر ہوجاتی ہے۔ لیکن یہ کام ہوتا ضرور ہے۔"

"بعض اوقات نہیں بھی ہوتا بھئی" میں نے کہا "پولیس تم جیسے سرپھرے ہوتے کہاں ہیں؟ کبھی کبھار کوئی غلطی سے...

"اس کا زیادہ دارومدار اس شخص پر ہے" اس نے ظفر جمال کی طرف اشارہ کیا پھر براہِ راست اسے مخاطب کیا "تمہیں واقعی کچھ ٹھوس ثبوت مہیا کرنے میں میری مدد کرنا ہوگی۔ ایسے لوگوں کے ٹھیک ٹھکانے مجھے بتانا ہوں گے جو اس کے حکم پر سنگین جرائم کا ارتکاب کرتے رہے ہوں۔ صرف ان کی صحیح نشاندہی ہونی چاہیے۔ ان سے سب کچھ اگلوانا میرا کام ہے۔"

ظفر جمال خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر بولا "مجھے خود روپوش ہوئے کافی عرصہ گزر گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری اطلاعات بالکل تازہ ہیں۔ بہرحال میں روپوشی کے دوران بھی اس کے بارے میں باخبر رہنے کی اپنی سی کوشش کرتا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے میں اب بھی اس حد تک مددگار ضرور ثابت ہوسکتا ہوں کہ اسے پھانسی کے پھندے تک پہنچایا جاسکے۔ ویسے میرے اندازوں کے مطابق اسے خطرات کا احساس ہوچکا ہے۔ اس نے اپنا نیٹ ورک سمیٹنا شروع کردیا ہے۔ اس کے بہت سے آدمی غائب ہوچکے ہیں جو زیادہ خطرناک تھے لیکن اب بھی اگر جُرأت مندی سے پیر دانش پر براہِ راست ہاتھ ڈال دیا جائے اور میری مدد بھی شامل رہے تو بہت کچھ ہاتھ آسکتا ہے۔"

"میں شرمندگی اور ندامت اٹھانا نہیں چاہتا.... اور نہ ہی اتنی جلدی' کچھ کیے بغیر مرنا چاہتا ہوں۔" رحیم گل ٹھوڑی مسلتے ہوئے بولا "مطلب یہ کہ میں اس پر کچا ہاتھ ڈالنا نہیں چاہتا۔"

"اس پر ہاتھ ڈالنا ہی اصل مسئلہ ہے۔ اگر آپ صرف ہاتھ ڈالنے کی جُرأت کرلیں تو ہاتھ کچا رہ ہی نہیں سکتا۔ اس کے خلاف تو اتنا مواد موجود ہے کہ خود بخود ایک سیلاب اُمنڈ پڑے گا.... دراصل تو اس کی شخصیت کا ایک ہوا بنا ہوا ہے۔ ایک پہاڑ سا کھڑا ہوا ہے۔ کوئی نہیں سوچتا کہ اس پہاڑ کے پیچھے کیا ہے اور کسی کے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ اس پہاڑ کو ہلایا بھی جاسکتا ہے۔ آپ ہمت کرلیں گے تو کام خود بخود آسان ہوتا چلا جائے گا۔ میں تو موجود ہی ہوں۔ اُمید ہے میری معلومات اور میری گواہی سے آپ کا کام بالکل آسان ہوجائے گا۔"

"میں بھی اس کیس میں ایک گواہ بنوں گا" میں نے کہا "کیونکہ کچھ حقائق سے براہِ راست میرا تعلق ہے۔"

"مجھے تم سے یہی خطرہ تھا" رحیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تم تو ویسے ہی عادی "پنگے باز" ہو۔ پنگا لیے بغیر بھلا تم کیسے رہ سکتے ہو؟ لیکن سوچ لو.... تم اس قسم کے معاملے میں ٹانگ اڑانے کے متحمل ہوسکتے ہو؟ پنگے بازی تمہاری عادت سہی.... لیکن ساتھ ساتھ تم ایک بزنس مین بھی ہو۔ یہ معاملہ کافی پبلسٹی حاصل کرے گا اور اس پبلسٹی کا رخ منفی بھی ہوسکتا ہے۔ کہیں تمہارے بزنس پر اثر نہ پڑے۔"

"جب بقول تمہارے پنگے بازی میری عادت ہی ٹھہری تو پھر بزنس کے بارے میں کیا سوچنا"

"میں تو پچھلے دنوں اتنے بڑے پنگے میں الجھا ہوا تھا جس میں میرا بزنس بالکل ختم ہوسکتا تھا لیکن خدا کا شکر ہے سب کچھ اسی طرح چل رہا ہے۔ میرے لیے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔"

"تم جیسے خبیثوں کے لیے کسی بھی بات سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"اتنا جل جل کر اور تڑپ تڑپ کر بات کرنے کی ضرورت نہیں" میں نے اسے ڈانٹا "اس وقت سنجیدگی سے بات ہورہی ہے۔ اسے سنجیدگی سے ہی جاری رہنے دو۔ خواہ مخواہ ایک بار بک بک شروع ہوجائے گی۔ اصل بات بیچ میں ہی رہ جائے گی۔ ہم دو معزز آدمیوں نے تمہیں یہاں اس لیے نہیں بلایا ہے کہ تم ہمیں جلی کٹی سناؤ...."

"معزز آدمی....؟" وہ میری بات کاٹتے ہوئے کراہنے کے سے انداز میں بولا "دو معزز آدمی.... آہ....!"

"ہاں.... دو معزز آدمی" میں نے زور دے کر کہا "تم بکواس چھوڑو اور یہ بتاؤ کہ اتنی طویل اور غمناک داستان سننے کے بعد تمہارا پروگرام کیا ہے؟"

"پروگرام کیا ہونا ہے" وہ پُرخیال انداز میں اپنی ٹائی سے کھیلتے ہوئے بولا "کل صبح بیٹھ کر میں اس چھوٹے سے آپریشن کی تھوڑی سی منصوبہ بندی کرتا ہوں اور دوپہر کو کچھ نفری لے کر پیر دانش کو اس کے گھر سے گرفتار کرلیتا ہوں۔ کل دوپہر کا کھانا اسے حوالات میں کھلوا دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے نتھو کے نان چھولے ٹھیک رہیں گے۔ وہ ہمارے تھانے کے قریب ہی ٹھیلا لگاتا ہے۔"

ظفر جمال گویا ہڑبڑا کر سیدھا ہوتے ہوئے بولا "کیا واقعی آپ اسے کل ہی گرفتار کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں؟"

"ظاہر ہے اب میں یہ کام پنج سالہ منصوبے کے تحت تو نہیں کرسکتا" رحیم گل اطمینان سے بولا "کسی مفکر یا دانشور کا کہنا ہے کہ مشکل اور ناگوار کام جتنی جلدی کرلیا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔ اصل مشکل کام تو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اس پر ہاتھ ڈالا جائے یا نہیں؟ جب فیصلہ ہو ہی گیا تو اس پر عملدر آمد کل بھی کیا جاسکتا ہے اور چار دن بعد بھی۔ کل کرلینا اس لحاظ سے بہتر ہے کہ پیر دانش کو سنبھلنے کا کم سے کم موقع ملے گا۔ کارروائی جتنی اچانک ہوگی اتنا ہی اس کے ہاتھ پاؤں زیادہ پھولیں گے۔ اس قسم کے لوگوں کو ایسی کسی کارروائی کی تو توقع ہی نہیں ہوتی نا.... تم خود ہی بتا رہے ہو کہ اس نے اپنا نیٹ ورک سمیٹنا شروع کردیا ہے۔ اسے خطرے کا احساس ہوچکا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جو دو چار ثبوت ہاتھ آنے کی امید ہے وہ بھی غائب ہوجائیں اور ہمارا انحصار صرف تمہارے بیان پر ہی رہ جائے۔"

ایک لمحے کے توقف سے اس نے ظفر جمال سے پوچھا "تمہیں کل کارروائی پر کوئی اعتراض ہے کیا؟"

میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔"

"اونچے درجے کے خبیثوں کا سر کچلنے میں جلد بازی سے کام لینا چاہیے۔ ہمارے ہاں المیہ یہی تو ہے کہ ہم چھوٹے مجرم کو پکڑنے میں پھر بھی تھوڑی بہت مستعدی دکھاتے ہیں لیکن بڑے مجرم پر ہاتھ ڈالنے میں لیت و لعل سے کام لیتے رہتے ہیں۔ اس دوران وہ مجرم کچھ اور طاقتور ہوجاتا ہے۔ جب جن بوتل سے نکل آتا ہے تب ہم اسے اپنے کمزور اور ہچکچاہٹ زدہ ہاتھوں سے قابو میں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدتوں ہم صرف شاخیں اور پتے چھانٹنے میں لگے رہتے ہیں۔ جڑ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ جب تک جرم کی جڑ کو ختم نہ کیا جائے، جرم ختم نہیں ہوسکتا۔ کارندوں کو پکڑنے سے کسی گروہ کا قلع قمع نہیں ہوتا۔ جب تک گروہ کے سرغنہ کا سر نہ کچلا جائے، گروہ کے ختم ہونے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ یہ سیدھی سی بات نہ جانے کیوں ہمارے نظام کو چلانے والے جگادریوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔"

"سمجھ میں سب کچھ آتا ہے۔ سب کو ہر بات معلوم ہے" میں نے کہا "لیکن سسٹم اتنا دیمک زدہ ہوچکا ہے۔ رشوت، کرپشن، بزدلی اور نا اہلی نے نظام کو اتنا کمزور کردیا ہے کہ کوئی بڑا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بڑا قدم نہیں اٹھایا جاسکتا۔ ہر شخص ہر کام عارضی بنیادوں پر کررہا ہے۔ اپنا وقت پورا کررہا ہے۔ کسی کو یہ فکر نہیں ہے کہ وہ جس چیز کو جس حال میں چھوڑ کر جارہا ہے کل کو اس کا کیا بنے گا۔"

"لیکن میرا جہاں تک بس چلتا ہے اور جتنی بھی میری حیثیت ہے.... میں اس کے مطابق بڑے سے بڑا جُرات مندانہ قدم اٹھانے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ نتیجہ خواہ کچھ بھی ہو" رحیم گل نے بڑے عزم سے اپنا فلسفہ دہرایا جس سے میں پہلے ہی اچھی طرح واقف تھا۔ ظفر جمال کبھی میری طرف اور کبھی رحیم گل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رحیم گل سے کہا "اس بے چارے کو ہم دو عظیم فلسفیوں کی گفتگو ہضم نہیں ہورہی ہے۔ آؤ ہم آسان اور عام فہم سی گفتگو کرتے ہیں۔"

ظفر جمال ذرا چونکتے ہوئے قدرے کھسیاہٹ سے بولا "ایسی بات نہیں ہے سر! آپ کی گفتگو آسان اور عام فہم ہی ہے۔ اصل المیہ یہ ہے کہ لوگوں نے ایسی باتیں سننا، ان پر کان دھرنا اور ان سے کسی قسم کی انسپائریشن حاصل کرنا چھوڑ دیا ہے۔"

رحیم گل بولا "اصل میں یہ بھی مایوسی کی ایک قسم ہے۔ لوگ سوچتے ہیں، ارے چھوڑو.... ان باتوں سے کیا ہوتا ہے.... ان باتوں میں کیا رکھا ہے۔ انہیں چونکہ معاشرے کے چلن میں کوئی تبدیلی ہوتی نظر نہیں آتی اس لیے وہ اپنے آپ کو اِدھر اُدھر.... زیادہ دلچسپ باتوں میں الجھا کر اپنے لاشعوری دکھ کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

ظفر جمال بولا "معذرت کے ساتھ کہوں گا سر....! سب ایسے نہیں ہوتے۔ لوگوں کی اکثریت بے حس ہوچکی ہے اس لیے لوگ ان باتوں میں سر نہیں کھپاتے۔"

"انہیں بے حس بھی شاید حالات ہی نے بنایا ہو" رحیم گل بولا۔

"نہیں.... کچھ لوگ فطرتاً بھی بے حس ہوتے ہیں" ظفر جمال مسکراتے ہوئے بولا۔ اب اس کی باتوں سے ظاہر ہوا تھا کہ وہ اتنا سطحی آدمی نہیں تھا جتنا میں اسے سمجھ رہا تھا۔

پھر وہ جھرجھری سی لے کر بولا "بہرحال.... میں حیرت کے اس جھٹکے سے سنبھل نہیں پارہا ہوں کہ میری آپ جیسے دو افراد سے ملاقات ہوگئی ہے۔ ایک کا تعلق بزنس سے ہے اور دوسرے کا پولیس کے محکمے سے.... ان دونوں شعبوں کے بارے میں تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ان میں ایسے افراد پائے جاتے ہوں گے۔"

"ہم جیسے اِکّا دُکّا افراد ہر شعبے میں پائے جاتے ہیں" میں نے کہا "جس روز یہ اِکّا دُکّا بھی ختم ہوگئے اس روز یہ سوسائٹی دھڑام سے منہ کے بل آگرے گی۔" پھر میں نے رحیم گل کو مخاطب کیا "اچھا.... تو پھر یہ طے ہوگیا کہ کل تم پیر دانش کو گرفتار کررہے ہو؟"

"ہاں" رحیم گل نے غیر متزلزل لہجے میں جواب دیا "میں ایسے ہی کیسوں کی تو تلاش میں رہتا ہوں۔ انسان کو کچھ پتا چلتا ہے کہ اس نے کچھ کیا ہے۔ چھوٹے موٹے مجرموں کو پکڑنا کوئی کارنامہ نہیں ہے جب کہ میں مسلسل کارنامے انجام دینا چاہتا ہوں۔ زندگی بڑی مختصر ہے.... اور نہ جانے کب کسی مجرم کی گولی اسے مزید مختصر بنادے۔ میں چاہتا ہوں جلدی جلدی چند قابلِ ذکر کام کر جاؤں۔ معاشرے کی غلاظت کچھ تو کم ہو۔"

"میں چاہتا ہوں پیر دانش کی گرفتاری کے موقع پر میں بھی تمہارے ساتھ رہوں" میں نے کہا۔

اس نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تم میری دشواریوں میں اضافہ کرنا چاہتے ہو۔ پولیس کے اس قسم کے چھاپے کے وقت ایک ممتاز بزنس مین کا پولیس کے ساتھ ہونا کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔ پیر دانش اسے قانونی مسئلہ بنا سکتا ہے۔ پولیس کے لیے دشواریاں پیدا ہوسکتی ہیں۔"

"میرا اس کیس سے تعلق بنتا ہے۔ میں بھی اس کے خلاف گواہی دوں گا" میں نے کہا۔

"اس کے لیے تم تھانے آسکتے ہو.... عدالت میں پیش ہوسکتے ہو لیکن اس کی گرفتاری کے وقت تمہارا موجود ہونا، پولیس کے علاوہ خود تمہارے اپنے حق میں اچھا نہیں۔ وہ اور اس کے آدمی تاثر لے سکتے ہیں کہ یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے" وہ مسکرایا۔

ذرا توقف سے بولا "جو کہ حقیقت بھی ہے.... لیکن یہ بات صرف ہم تینوں ہی کے درمیان رہے تو اچھا ہے۔"

"اگر پیر دانش اور اس کا گروہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سب میرا کیا دھرا ہے تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں" میں نے وضاحت کی "بقول تمہارے.... جب "پنگے بازی" میری عادت ہی ٹھہری.... تو پھر اب کیا ڈرنا۔ عملاً تو میں کافی پہلے ہی پیر دانش سے پنگا لے چکا ہوں۔ اب تو تم قانون کے محافظ کی حیثیت سے اس پنگے میں شریک ہورہے ہو۔ پنگے باز تو تم بھی اوّل درجے کے ہو۔ اب تو جو بھی ہوگا، ہم دونوں ہی کو بھگتنا ہوگا۔ بہرحال.... تم چھاپے کے وقت مجھے ساتھ رکھنے کی کوئی صورت نکالو۔ اچانک گرفتاری کے وقت پیر دانش کی کیا حالت ہوگی.... میں یہ منظر دیکھنا اور اس سے پوری طرح محظوظ ہونا چاہتا ہوں۔"

"بچپنا نہیں گیا تمہارا ابھی تک" رحیم گل نے ترحم آمیز نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"ہر آدمی کے اندر زندگی بھر ایک بچہ چُھپا بیٹھا رہتا ہے بڑے میاں! یہ بھی کسی مفکر یا دانشور نے کہا ہے" میں نے جواب دیا۔

"فرائڈ نے کہا ہے جاہل آدمی!" رحیم گل نے گویا میرے علم میں اضافہ کیا۔

"کہا ہوگا...." میں نے بے پروائی سے کہا "ویسے کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ مت دیکھو کون کہہ رہا ہے.... یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے۔ فی الحال یہ بتاؤ کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"کس سلسلے میں؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"یہ جو میں اتنی دیر سے تمہارے سامنے دست بستہ درخواست کررہا ہوں.... اس کے سلسلے میں...." میں نے جواب دیا۔

"معلوم نہیں تم کیوں پیر دانش کی گرفتاری کا منظر دیکھنے پر تُل گئے ہو۔ شاید تمہیں بچپن میں فلم تھیٹر وغیرہ دیکھنے کی بہت عادت رہی ہے لیکن میں تمہیں بتادوں کہ اصل زندگی میں اس قسم کے مناظر میں کوئی خاص ڈراما نہیں ہوتا۔ نہ تو گھن گرج کے ساتھ لمبے چوڑے مکالموں کا تبادلہ ہوتا ہے اور نہ ہی پس منظر سے ڈرامائی موسیقی ابھرتی ہے۔ بس ماحول میں بے پناہ کشیدگی ہوتی ہے۔ تصادم کا بھی تھوڑا بہت خطرہ ہوتا ہے۔ تمہیں کوئی مزہ نہیں آئے گا" رحیم گل نے گویا مجھے باز رکھنے کی کوشش کی۔

"بے فکر رہو۔ اگر مجھے مزہ نہ آیا تو میں تم سے ٹکٹ کے پیسے واپس نہیں مانگوں گا اور نہ ہی کرسیاں توڑوں گا" میں نے وعدہ کیا۔

"بہت ڈھیٹ آدمی ہو۔ تم نہیں مانو گے...." وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر بولا "ایک صورت ہوسکتی ہے کہ تم پولیس کی وردی میں ملبوس پولیس پارٹی میں شامل ہوکر میرے ساتھ چلو۔ اے ایس آئی یا ہیڈ کانسٹیبل وغیرہ بننا پسند کرو گے؟"

"اس مہم میں شامل ہونے کے لیے تو میں خاکروب بننا بھی پسند کرلوں گا" میں نے جواب دیا "تم صبح ہی مجھے کسی پولیس والے کی وردی، ٹوپی اور جوتے وغیرہ بھجوا دینا۔"

"وردی وغیرہ کا انتظام کرنا کون سا مشکل ہے یار! پتا نہیں کتنے ڈراموں وغیرہ میں نقلی وردیاں استعمال ہوتی ہیں۔ شہر میں نہ جانے کتنے وارداتیے پولیس کی وردیاں پہنے پھرتے ہیں۔ مجھے یہاں آئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا۔ دو تین جعلی پولیس والوں کو تو میں پکڑ چکا ہوں" رحیم گل بولا۔

"وہ تو ٹھیک ہے.... یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔ مجھے تو اس کے لیے صرف ایک فون ہی کرنا ہوگا لیکن ایک تو وقت کم ہے۔ دوسرے میں چاہتا ہوں کہ پولیس والا بے شک جعلی ہو لیکن کم از کم اس کی وردی تو اصلی ہو۔ اب اتنی بھی دھوکے بازی اچھی نہیں یار! آخر ضمیر بھی کوئی چیز ہے" میں نے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے باضمیر صاحب....!" وہ میرا سرتاپا جائزہ لیتے ہوئے بولا۔ "میں تمہیں تمہاری جسامت کے مطابق کسی کی وردی بھجوادوں گا۔ تمہارا ساتھ ہونا ویسے کچھ فائدہ مند بھی رہے گا۔ تم اکیلے میرا خیال ہے دس بارہ پولیس والوں پر بھاری رہو گے...."

"آخر تمہیں بدولت کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا پڑ ہی گیا" میں نے کہا۔

"تم نے پوری بات نہیں سنی" وہ سنجیدگی سے بولا "میں یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ تم اکیلے دس بارہ پولیس والوں پر بھاری رہو گے.... جہالت اور حماقت میں۔"

"اب بات کو پلٹنے کی کوشش مت کرو۔ جو اصل بات تھی وہ منہ سے نکل چکی ہے۔ جس قسم کے تمہارے پولیس والے ہوتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے تو شاید میں دس بارہ سے زیادہ پر بھی بھاری رہوں" میں نے اسے چڑانے کی کوشش کی۔

"بس.... بس۔ اب زیادہ شیخی میں آنے کی ضرورت نہیں" وہ ہاتھ اٹھا کر بولا "تمہیں اپنی اس بے ہودہ شکل صورت میں بھی کچھ تبدیلیاں کرانی ہوں گی۔ ویسے تو صرف وردی اور ٹوپی وغیرہ کی وجہ سے بھی تمہاری شخصیت کا تاثر مختلف ہوجائے گا اور شکل بھی بدلی بدلی سی لگے گی۔ اس کے باوجود کچھ تبدیلیاں ضروری ہیں۔ میں ہرگز نہیں چاہوں گا کہ اس موقع پر پیر دانش تمہیں پہچانے۔"

"اس کی تم فکر نہ کرو" میں نے اسے تسلی دی "پیر دانش تو کیا مجھے تم بھی نہیں پہچانو گے۔ عین ممکن ہے پہلی تاریخ کو میں اسی حلیے میں تمہارے قریب موجود رہوں تو تم مجھے تنخواہ بھی تھمادو۔"

"ہائے.... قربان جاؤں اس سادگی کے....!" رحیم گل نے ایک بہت ہی طویل اور ٹھنڈی سانس لی "تنخواہ میں نہیں بانٹتا۔ ہمارے محکمے میں اصل پولیس والوں کو اس طرح آسانی سے تنخواہ نہیں ملتی جس طرح تم سمجھ رہے ہو۔ خاص طور پر بے چارے نچلے درجے کے اہلکاروں کو تو تنخواہ لیتے ہوئے دانتوں پسینہ آجاتا ہے۔"

"نچلا طبقہ بے چارہ ہر جگہ ہی پستا رہتا ہے" میں نے کہا۔

"لیکن خیر۔ تمہارے نچلے طبقے کو اس لیے زیادہ پریشانی نہیں ہوتی ہوگی کہ وہ اپنی تنخواہ الاؤنس سمیت' قسطوں میں دوسری جگہوں سے وصول کرتا رہتا ہے۔"

رحیم گل نے مجھے گھورا تو میں نے جلدی سے کہا "خیر.... میری اس بکواس پر دھیان مت دو۔ یہ بتاؤ کہ کل میں کتنے بجے تیار رہوں۔"

"میں ساڑھے گیارہ بجے تمہیں فون کروں گا۔ تمہیں اس وقت وردی میں اپنے مکمل گٹ اپ کے ساتھ تیار رہنا چاہیے۔ میرا فون آتے ہی تم فوراً پولیس اسٹیشن پہنچ جانا۔ ٹھیک بارہ بجے ہم پیروانش کے گھر میں داخل ہو جائیں گے۔"

"واہ.... واہ.... کیا عمدہ وقت منتخب کیا ہے" میں نے سراہا "میرا خیال ہے اس وقت تمہاری کھوپڑی پوری طرح گھومی ہوئی ہوگی۔"

"ہاں۔ اس میں کیا شک ہے" وہ کھسیانا ہوئے بغیر بولا "جب تک انسان کی کھوپڑی نہ گھومی ہوئی ہو' وہ اس قسم کے کام نہیں کرسکتا۔" پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا "کچھ وقت آرام کے لیے بھی نکال لینا چاہیے۔ کل کا دن کافی سخت ہوگا۔ پیروانش کو گرفتار کرنے کے بعد شاید ہمیں کئی دن آرام نصیب نہ ہوسکے۔ کافی ہلچل برپا ہوگی۔"

"ہماری یہ چند دن کی بے آرامی نہ جانے کتنی زندگیوں کو تباہی سے بچالے گی اور ہماری سوسائٹی نہ جانے کتنے بڑے بگاڑ سے محفوظ ہو جائے گی" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"ٹھیک ہے.... میں یہ کام کر گزروں گا...." رحیم گل پُرخیال انداز میں سرہلاتے ہوئے بولا "لیکن شاید بحری جہاز کے مسافر کی طرح میں بھی بعد میں پوچھوں گا کہ مجھے دھکا کس نے دیا تھا۔" پھر اس نے خود ہی تصحیح کی۔ "لیکن مجھے پوچھنے کی کیا ضرورت ہوگی؟" دھکا دینے والا تو پہلے ہی میرے سامنے کھڑا ہے۔"

"اور وہ انشاء اللہ آئندہ بھی تمہیں وقتاً فوقتاً دھکا دیتا رہے گا۔" میں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا جھکتے ہوئے بڑے خلوص سے کہا۔

رحیم گل نے ظفر جمال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "تمہیں میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"

"ابھی.... اسی وقت؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ وہ شاید اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ مجھے بھی اس کی توقع نہیں تھی۔

"ہاں.... ابھی اور اسی وقت" رحیم گل زور دے کر بولا "جب فوری طور پر فیصلہ کن قدم اٹھانا طے ہو گیا ہے تو پھر سمجھ لو کہ اس سلسلے کی ضروری کارروائی بھی شروع ہو گئی ہے۔ تم اس وقت سے ہی اپنے آپ کو پولیس کی تحویل میں سمجھو۔"

"تم اسے کہاں لے جاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"سوری.... یہ تمہیں نہیں بتایا جاسکتا۔ اب یہ پولیس کا ٹاپ سیکرٹ ہے۔" اس نے نہایت رسمی اور معذرت خوا[ہانہ] مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"واہ بھئی.... !کیا کہنے تمہارے ٹاپ سیکرٹ کے۔" میں[نے] استہزائیہ لہجے میں کہا "ہماری بلی اور ہمیں سے میاؤں۔ اس وقت کوئی اور مناسب محاورہ نہیں سوجھ رہا ہے اس لیے [اسی] سے کام چلا رہا ہوں۔ ہم تمہارے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر کام کررہے ہیں اور اس کے سلسلے میں ہم سے ہی راز دار[یاں] شروع ہو گئیں۔ بہت خوب!"

"احتیاط بہرحال ضروری ہے۔ پولیس کی اپنی مصلحت[یں ہوتی] ہے؟" اس کی سنجیدگی میں فرق نہ آیا۔ تھری پیس سوٹ کے با[وجود] وہ ایک دم خالص پولیس والا نظر آنے لگا تھا۔

"مجھ سے چھپانے میں کیا مصلحت ہے؟" میں نے یونہی جارحانہ لہجے میں پوچھا۔

"ظفر جمال اس وقت ایک اہم سرکاری گواہ بن چکا ہے اور خود ہی بتا چکا ہے کہ کس طرح اس کی تلاش جاری ہے۔ پیر[وانش کے] آدمیوں کو اگر اس کی ذرا سی بھی بھنک پڑ گئی کہ وہ اس ہوٹل [میں] موجود ہے تو وہ اسے ہلاک کرنے کی خاطر پورے ہوٹل کو بم [سے] اڑانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ پولیس پر اب اس کی حفاظت [کی] بھاری ذمے داری عائد ہو چکی ہے۔ اب اسے ایک عام شہری [کے] پاس نہیں چھوڑا جاسکتا۔" اس نے بڑے تحمل سے گویا کسی کو[دن] مغز شخص کو اپنا مقصد سمجھایا۔

"میں تمہاری نظر میں عام شہری ہوں؟" میں نے آنکھیں نکالیں۔

"اصولی طور پر قانون کی نظر میں تم ایک عام شہری ہو۔ ا[ور] یہ دوسری بات ہے کہ دوستی کی وجہ سے میں تمہاری اصلیت [سے] واقف ہوں کہ تم کتنے بدمعاش ہو۔" وہ شاید بڑی کوشش سے ا[پنی] سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے بولا "مانا کہ تم بھی اس کی حفاظت کر[سکتے] ہو لیکن اصولی طور پر میں اب اسے تمہارے پاس نہیں چھوڑ سکتا۔ اسے کہاں رکھا جائے گا....؟ یہ میں تمہیں اس لیے نہیں بتا [سکتا] کہ فی الحال مجھے خود بھی نہیں معلوم.... میں اسے ساتھ لے جا[تے] وقت راستے میں فیصلہ کروں گا۔ فیصلہ کرنے کے بعد بھی میں تمہیں اس لیے نہیں بتاؤں گا کہ کسی کی حفاظت کے سلسلے میں رازداری پہلی شرط ہوتی ہے۔ گواہ کو اگر محفوظ اور زندہ سلامت رکھنا ہے تو کم سے کم لوگوں کو یہ علم ہونا چاہیے کہ وہ کہاں ہے۔"

"اب مجھے سبق مت پڑھاؤ...." میں نے غرا کر کہا۔

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا "میں بھلا تمہیں سبق کیسے [پڑھا] سکتا ہوں؟ تمہاری تو شکل سے ہی ظاہر ہے کہ تم نے سب سبق [پڑھ] رکھے ہیں۔"

"تھوڑی سی دیر میں تم نے یہ دوسری مرتبہ میری شکل صورت پر طنز فرمایا ہے۔ لگتا ہے کہ آج کل تم میری وجاہت سے کافی جل[تے] ہو رہے ہو۔" میں نے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"مجھے اس پھٹکار زدہ صورت سے جیلس ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں تو بات کا جواب دے رہا ہوں۔" وہ رکھائی سے بولا "تمہیں کیا معلوم ایک پولیس آفیسر کی ذمے داریاں اور فرائض کیا ہوتے ہیں۔"

"اچھا.... یہ بتاؤ اے ذمے دار اور فرض شناس پولیس آفیسر....!" میں نے ملائمت سے کہا "کیا تمہارے خیال میں.... اگر مجھے معلوم ہو گیا کہ ظفر جمال کہاں ہے تو میں دوڑا دوڑا پیروانش کو بتانے جاؤں گا؟"

"نہیں.... تم اتنے اونچے درجے کے غدار تو نہیں ہوسکتے۔" وہ گویا میری تالیفِ قلب کا خیال رکھتے ہوئے بولا "لیکن ہمیں تمام امکانات کو سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ تم کوئی محفوظ زندگی تو گزار نہیں رہے ہو۔ نہ جانے کس کس معاملے میں تمہاری ٹانگ اڑی رہتی ہے۔ پیروانش کو یہ تو معلوم ہو ہی چکا ہے کہ تم پیچھے ہی پیچھے اس کی جڑیں کاٹنے کے لیے کچھ کررہے ہو۔ تمہیں اغوا بھی کیا جاسکتا ہے اور ٹارچر کرکے تم سے ظفر جمال کے بارے میں معلوم کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے کیا یہ بہتر نہیں کہ تمہیں یہ بات معلوم ہی نہ ہو؟"

میں نے ناک سکیڑتے ہوئے کہا "پولیس والوں سے اچھے کام کی تو امید نہیں رکھی جاسکتی لیکن کبھی کبھار انہیں بات تو اچھی کرلینی چاہیے.... اور ایسے موقعوں پر یوں بھی کہا جاتا ہے کہ شکل اچھی نہ ہو تو کم از کم بات ہی اچھی کرلینی چاہیے۔ تم ان دونوں جملوں میں سے کوئی ایک اپنے لیے منتخب کرسکتے ہو۔"

"تم یہ دونوں ہی اپنے پاس رکھو۔" وہ بولا۔

"بدفالیں تم منہ سے نکال رہے ہو' میں نہیں۔" میں نے کہا۔

"انہیں بدفالیں نہیں' امکانات کہتے ہیں۔" اس نے تصحیح کی۔

"اچھا.... اب تم اپنے امکانات سمیت دفع ہو جاؤ۔" میں نے وال کلاک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اب میں سونا چاہتا ہوں۔ صبح مجھے وردی کتنے بجے تک مل جائے گی؟"

"اندازاً نو دس بجے تک۔" اس نے جواب دیا۔ "وردی پہن کر آس پاس کے ٹھیلے والوں پر رعب ڈالنے اور ان سے چائے پانی وصول کرنے نہ چل دینا۔"

"تمہارے آدمی اس کام کی دوسروں کے لیے گنجائش ہی کہاں چھوڑتے ہیں۔"

"میرے تھانے کے لوگ ایسی حرکتیں نہیں کرتے۔" وہ فخر سے بولا۔

"ہائے رے انسان کی خوش فہمیاں....!" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

اسے گویا کچھ یاد آیا۔ دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "صبح جب وردی پہن کر تیار ہو کر میری طرف آؤ تو فرح اور مونا کی ان دونوں فلمیں بھی لیتے آنا جن کا تم نے ذکر کیا ہے۔ اب جتنی بھی شہادتیں ہاتھ لگ سکیں انہیں جمع کرکے ایک طرف محفوظ رکھنا ہوگا۔"

فلمیں تو میں تمہیں دے دوں گا لیکن شہادتیں جمع کرنے کے بہانے کہیں بیٹھے انہیں دیکھتے ہی نہ رہا کرنا۔ کم از کم یہ خیال کرلینا کہ ان میں سے ایک لڑکی بے چاری اب اس دنیا میں نہیں ہے' بڑے غلط وقت پر بڑی مظلومانہ موت مرچکی ہے۔" میں نے کہا۔

"اس قسم کے شوق تمہیں ہوں گے۔ مجھے نہیں ہیں۔" وہ منہ بنا کر بولا اور ظفر جمال کو اپنے ساتھ چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "چلو بھئی.... اگر ہم اس کی بکواس میں الجھے رہے تو یہ رات یہیں گزر جائے گی۔"

"ایک منٹ" میں نے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "ایک طرف تم ظفر جمال کی حفاظت پر اتنا زور دے رہے ہو اور ایک طرف یوں اسے علی الاعلان اپنے ساتھ لے جارہے ہو جبکہ تم اس وقت اکیلے ہو اور سادہ لباس میں ہو۔"

"بے فکر رہو۔ مجھے تم سے زیادہ اس بات کا خیال ہے۔ میں اسے اس طرح گاڑی میں اپنے ساتھ لے جاؤں گا کہ کوئی نہیں دیکھ سکے گا۔"

وہ رخصت ہو گیا تو میں صوفے پر ڈھیر ہو گیا اور آنکھیں بند کیے کافی دیر تک سوچوں میں الجھا رہا۔ رحیم گل نے واقعی مجھے بھی حیران کردیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ مجھے اس کو اس کام پر آمادہ کرنے کے لیے بڑی تگ ودو کرنی پڑے گی لیکن اس نے تو نہ صرف ہامی بھر کے مجھے حیران کردیا تھا بلکہ میری توقع سے کہیں زیادہ تیزی سے اس پر عمل درآمد کا فیصلہ بھی کر ڈالا تھا۔ اب ہمیں اس کے نتائج سے نمٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے تھا۔

آخر میں اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔ وہاں سے میں نے شفیع شاہ کو فون کرکے تمام حالات سے آگاہ کیا اور بتایا کہ کل کے لیے کیا پروگرام طے ہو چکا تھا۔ وہ بھی اس اچانک فیصلے پر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکا۔

ساری بات اس کی سمجھ میں آگئی تو میں نے کہا "تمہیں اب یہ کرنا ہے کہ کل جب پیروانش کے بنگلے پر چھاپا پڑے تو تم اپنے چند آدمی لے کر آس پاس ہی موجود رہو۔ بنگلے پر ہر وقت کئی مسلح افراد موجود رہتے ہیں اور بنگلے سے کہیں کوئی پیغام چلا گیا تو مزید بھی آسکتے ہیں۔ تصادم یا مزاحمت کی نوبت بھی آسکتی ہے۔ پولیس پر مجھے کچھ زیادہ بھروسا نہیں ہے۔ صرف رحیم گل کی دلیری' مستعدی اور ذہنی صلاحیتوں کا مجھے علم ہے۔ باقی لوگوں کے بارے میں مجھے کچھ علم نہیں کہ وہ کیسے ہوں گے۔ اور ان کی کارکردگی کیا ہوگی۔ چنانچہ تم لوگ صرف پولیس کی مدد کے لیے آس پاس موجود رہو گے۔ اگر تم صورتِ حال بگڑتے یا تصادم کی نوبت آتے دیکھو' صرف اس وقت مداخلت کرنا ورنہ تمہیں کچھ نہیں کرنا ہے اور کسی کی نظر میں بھی نہیں آنا ہے۔ تمہاری مداخلت سے اگر صورتِ

حال قابو میں آجائے تو پھر تمہیں غائب ہو جانا ہے' وہاں کسی کو غیر ضروری طور پر اپنی موجودگی کا احساس نہیں دلانا ہے۔"

"میں سمجھ گیا سر!" شفیع شاہ بولا "بارہ بجے ہم لوگ بنگلے کے آس پاس موجود ہوں گے۔"

اسے ہدایات دینے کے بعد میں مطمئن ہو کر سو گیا۔ چند گھنٹے کی نیند لینے کے بعد صبح جلدی اٹھ کر میں نے ایک اور ضروری فون کیا۔ ہماری فلم کمپنی کا برانچ آفس کراچی کے ایک اسٹوڈیو میں بھی موجود تھا۔ کوئی مشہود مرزا صاحب اس کے انچارج تھے جنہیں میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا لیکن غائبانہ طور پر ہم ایک دوسرے سے واقف تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ میں فلم کمپنی کے سلسلے میں خواہ عملی طور پر کچھ نہیں کر رہا تھا لیکن بہرحال مالک میں ہی تھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ کچھ ضروری سامان کے ساتھ مجھے ایک میک اپ مین کی ضرورت تھی۔ ان کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ انہوں نے بتایا کہ ایک گھنٹے کے بعد میک اپ مین ضروری سامان کے ساتھ میرے پاس پہنچ جائے گا۔ یہ انتظام کرنے کے بعد میں نے شاور لینے کے بعد اطمینان سے ناشتا کیا۔

ذرا تاخیر کے ساتھ استقبالیہ سے مجھے اطلاع ملی کہ اسٹوڈیو سے کوئی آدمی مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے اسے اس کمرے میں بلوایا جس میں رات کچھ دیر کے لیے ظفر جمال ٹھہرا تھا۔ ایک ویٹر نے اسے اس کمرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ میں جب وہاں پہنچا تو میک اپ مین نروس انداز میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ پکی عمر کا سانولا سا ایک دبلا پتلا شخص تھا۔ اس کے سامنے میز پر ڈاکٹروں کے میڈیکل بیگ جیسا ایک سیاہ بیگ رکھا ہوا تھا لیکن وہ ذرا بڑا تھا۔ میک اپ مین نے کچھ زیادہ ہی مؤدبانہ انداز میں میرا استقبال کیا۔ اس نے اپنا نام امتیاز بتایا۔

میں نے اس کی ہدایات کے مطابق گلے میں کپڑا وغیرہ باندھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے آئینے کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا "امتیاز صاحب! آپ کو زیادہ لمبا چوڑا کام نہیں کرنا ہے۔ بس میرے چہرے پر ذرا موٹی موٹی بارعب مونچھوں کا اضافہ کر دیں کیونکہ وہ راتوں رات نہیں اگ سکتیں۔ گال وال پر کہیں ایک آدھ پائیدار قسم کا موٹا سا مسا بھی چپک سکتا ہو تو وہ بھی چپکا دیں مگر وہ گھنٹے دو گھنٹے بعد اکھڑ کر گرنا نہیں چاہیے..... اور میرا خیال ہے کہ ٹھوڑی پر مختصر سی فرنچ کٹ داڑھی بھی سجا ہی دیں....."

میں نے آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ بال تو پولیس کی ٹوپی میں چھپ ہی جانے تھے۔ اتفاق سے ان دنوں میرے بال زیادہ لمبے نہیں تھے۔ پولیس والے کے بالوں کے طور پر چل سکتے تھے۔ آنکھیں چھپانے کے لیے میں تاریک چشمہ لگا سکتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اتنی تبدیلیوں کے ساتھ پولیس کی وردی میں پیر دانش بھی مجھے قریب سے پہچان نہیں سکے گا۔

امتیاز نے اپنا بیگ کھولا جو عمرو عیار کی زنبیل معلوم ہوتا تھا۔ میرا میک اپ شروع کرتے ہوئے وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں بولا "سر! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کا میک اپ کرانے کا مقصد کیا ہے؟ میرا مطلب ہے..... اگر یہ گستاخی نہیں ہے تو....."

میں نے آئینے میں اس کی طرف دیکھا اور اس نے گڑبڑا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں نے سرسری سے لہجے میں کہا "بس امتیاز صاحب! مقصد کیا ہونا ہے..... بس یونہی ذرا دو چار ڈاکے ڈالنے ہیں..... چار چھ قتل کرنے ہیں..... دہشت گردی کی مزید ایسی ہی وارداتیں کرنی ہیں۔ کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔"

وہ نروس انداز میں ہنسنے لگا۔ "اوہ..... سر! آپ تو شاید برا مان گئے..... میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا..... میں تو بس یونہی پوچھ رہا تھا..... آپ جیسا معزز آدمی بھلا....." اس نے ایک بار پھر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"اگر آپ کو میرے معزز ہونے کا علم ہو ہی چکا ہے تو اس پر یقین بھی کر لیجیے۔" میں نے ملائمت سے کہا "آج ایک دوست کے گھر فینسی ڈریس پارٹی ہے۔ میں اسے کچھ زیادہ حیران کرنا چاہتا ہوں۔ بس اتنی سی بات ہے۔"

"مجھے اندازہ تھا..... مجھے اندازہ تھا سر!" وہ جلدی سے بولا۔

"خاک اندازہ تھا" میں نے دل ہی دل میں کہا۔ اس کے بعد بہت کم گفتگو ہوئی۔ میک اپ مین کو خاصی دیر لگ گئی لیکن اس کی کارکردگی عمدہ تھی۔ ابھی میں وردی میں نہیں تھا اور تاریک چشمہ بھی نہیں لگایا تھا لیکن شخصیت کافی بدلی بدلی نظر آنے لگی تھی۔ میں نے شکریے کے ساتھ کچھ رقم امتیاز کی خدمت میں پیش کی جو یقیناً اس کی توقعات سے بہت زیادہ تھی۔ وہ بہت ہی زیادہ شکر گزار نظر آنے لگا اور اسی شکر گزاری کے عالم میں رخصت ہو گیا۔

اس کے جانے کے بعد میں کچھ دیر تک انتظار کرتا رہا اور اخبارات دیکھتا رہا۔

مجھے اس وردی کا انتظار تھا جو رحیم گل نے بھجوانے کا وعدہ کیا تھا۔ آخر میں نے اسے فون کیا۔ کئی منٹ کی کوششوں کے بعد اس سے رابطہ ہو سکا۔

"کہاں ہو بھئی؟" میں نے پوچھا "تم سے بات کرنا تو ملک کی کسی انتہائی اہم شخصیت سے بات کرنے سے زیادہ مشکل ہو گیا ہے۔"

"بس یار! وہ..... آج والے کام کے سلسلے میں ہی مصروف تھا۔" وہ بولا۔

"وہ تو اندازہ ہو رہا ہے۔" میں نے کہا "میں تو حیران ہوں کہ ایک شخص کو گرفتار کرنا تمہارے محکمے کے لیے شرح کرنے کے برابر ہو گیا ہے۔"

"تم اپنے فائیو اسٹار ہوٹل کے ائر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھ کر اس طرح کی باتیں کر سکتے ہو چندا!" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا "تمہیں ہمارے محکمے کی دشواریوں کا اندازہ نہیں ہے۔ آج کل

پیر دانش جیسے لوگوں کو گرفتار کرنا شرح کرنے کے برابر ہی ہو گیا ہے۔ یوں سمجھو میں اپنی اور اپنے کئی ماتحتوں کی نوکریاں اور زندگیاں داؤ پر لگا رہا ہوں۔"

"آئیڈیلسٹ ہونے کی کچھ قیمت تو ادا کرنی پڑتی ہے پیارے! اس طرح رونا رونے کی کیا ضرورت ہے؟ اگر تم میں یہ کام کرنے کی ہمت نہیں ہے تو اب بھی وقت ہے' یہ ارادہ ترک کر دو۔"

"اب تو تیر کمان سے نکل چکا ہے..... اور وہ تیر میں خود ہوں۔" رحیم گل بولا "میں تمہارے سامنے رونا نہیں رو رہا ہوں۔ تمہیں بتانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ آؤٹ آف دی وے جا کر کوئی کام کرنے میں ہمیں بھی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ ہمارے لیے بھی ہر کام آسان نہیں ہوتا۔"

"جو بات مجھے معلوم ہے وہ مجھے مت بتاؤ" میں نے کہا "بلکہ وہ بات بتاؤ جو مجھے معلوم نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ وردی ابھی تک کیوں نہیں پہنچی؟ میں تو یہاں چھوٹا موٹا پولیس افسر بننے کے شوق میں تیار ہوا بیٹھا ہوں۔ زیادہ دیر گزر گئی تو میری بارعب ریڈی میڈ مونچھیں ڈھلک ہی نہ جائیں۔ ایسی مونچھوں کا کیا فائدہ جو بچھو کی دم کی طرح اوپر کو مڑی ہوئی نہ ہوں۔"

"کوئی بات نہیں..... مونچھیں اگر نیچے کی طرف گھوم جائیں گی تب بھی کوئی خاص فرق نہیں پڑے گا۔ تم سمجھ لینا گردشِ زمانہ نے بے چارے بچھوؤں کو بھی الٹا کر دیا ہے۔" رحیم گل بولا۔

"بات کو مذاق میں ٹالنے کی کوشش مت کرو یار! وردی کہاں ہے؟ تم بھجوانا بھول تو نہیں گئے؟" میں نے پوچھا۔

"میری مصروفیت اپنی جگہ ہے لیکن میں یہ کام بھولا نہیں ہوں۔ بھول کیسے سکتا تھا..... یہ بھی آپریشن کا ایک حصہ ہے۔ اصل میں تمہارے ناپ کی ایک ہی وردی ملی تھی اور وہ ذرا "صفائی طلب" تھی۔ اس میں بے چارے محنت کش پولیس والے کے پسینے کی بو رچی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہیں تم اسے پہننے سے ہی انکار نہ کر دو۔ بڑے آدمیوں کی طبع نازک کا خیال بھی تو رکھنا پڑتا ہے۔ چنانچہ میں نے ذرا اس کی صفائی کا بندوبست کیا تھا۔ میرا آدمی ڈرائی کلینرز کے پاس سے لے کر تمہارے ہاں پہنچنے ہی والا ہو گا۔" اس نے بتایا۔

"میں تمہیں اور تمہارے محنت کش پولیس والوں کو خوب جانتا ہوں۔ موقع پاتے ہی اپنے محکمے کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیا کرو۔" میں نے اسے ڈانٹ پلائی "اور یہ تم ڈرائی کلیننگ وغیرہ کے چکروں میں کہاں پڑ گئے۔ تم مجھ سے پوچھ تو لیتے۔ تمہیں اتنا بھی یاد نہیں رہا کہ یہاں ہوٹل میں جو لانڈری شاپ موجود ہے ان لوگوں کے پاس جدید ترین لانڈری مشینیں موجود ہیں۔ اگر مجھے وردی کو پولیس والوں کے جراثیم سے پاک ہی کرانا ہوتا تو میں وہاں کرا لیتا۔"

"ہاں..... یہ مجھے خیال نہیں آیا" اس نے تسلیم کیا "بہرحال اب بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ وردی تمہارے پاس پہنچنے ہی والی ہے۔"

"تمہاری تیاریاں مکمل ہوئیں یا نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں..... مکمل ہی سمجھو" وہ بولا "تمہارے علاوہ میرے صرف دو آدمیوں کو معلوم ہو گا کہ ہم وہاں کیا کرنے جا رہے ہیں۔ وہ میرے بھروسے کے آدمی ہیں۔ ہم چاروں آگے آگے ایک ہی گاڑی میں جائیں گے۔ باقی نفری پیچھے دوسری دو گاڑیوں میں آئے گی۔ انہیں بنگلے کے قریب پہنچ کر ہی اصل مقصد بتایا جائے گا اور ہدایات دی جائیں گی۔ میں انہیں آدھا گھنٹا پہلے بھی اصل بات سے آگاہ کرنا نہیں چاہتا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ "اس" جیسے آدمی کے مخبر کہاں کہاں موجود ہوں۔"

"کیا اس وقت تمہارے آس پاس کوئی موجود نہیں ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس لیے تو اس حد تک بھی بات کر رہا ہوں۔ اچھا..... اب اجازت۔ باقی باتیں راستے میں ہوں گی۔ ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے تم یہاں پہنچ جانا۔"

"ضرور..... بشرطیکہ وردی مجھے مل گئی۔ اتنی دیر میں تو میں خود بھی بندوبست کر لیتا" میں نے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

چند منٹ بعد ہی ایک نوعمر ویٹر ایک معروف لانڈری کا بیگ لیے آن پہنچا۔ اس نے بتایا "سر! یہ نیچے ایک شخص آپ کے لیے دے گیا تھا۔"

بیگ بند تھا۔ اس کے منہ پر چوڑی ٹیپ وغیرہ لگی ہوئی تھی۔ ویٹر نے مزید بتایا "سیکیورٹی والوں نے اسے کھولے بغیر چیک کر لیا ہے۔ اس میں کوئی خطرناک چیز نہیں ہے۔"

"تمہیں کیا معلوم برخوردار..... کہ اس میں کتنی خطرناک چیز ہے..... مگر یہ بات سیکیورٹی والوں کے آلات نہیں بتا سکتے" میں نے بیگ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے کہا۔

وہ جا چکا تو میں نے اپنی تیاری شروع کی۔ چند منٹ میں تیار ہونے کے بعد میں نے قد آدم آئینے میں اپنا تنقیدی جائزہ لیا۔ میں تقریباً ناقابلِ شناخت ہو چکا تھا۔ میرا گٹ اپ کم از کم ان پولیس والوں سے بہت بہتر دکھائی دے رہا تھا جو فلموں میں نظر آتے تھے۔ مطمئن ہو کر میں کمرے سے نکل آیا۔

میں لفٹ کا بٹن دبا کر اس کے انتظار میں کھڑا ہوا تو سیڑھیوں سے ہمارا سیکیورٹی چیف داؤد اترتا دکھائی دیا۔ وہ شک زدہ سی نظروں سے مجھے گھورتا ہوا قریب آن کھڑا ہوا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے بھی لفٹ کا انتظار تھا لیکن میرے لیے اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ میری طرف سے کھٹک گیا تھا۔

آخر وہ بولے بغیر نہ رہ سکا "اگر آپ برا نہ مانیں تو کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ آپ یہاں کیوں اور کس کی تلاش میں آئے

تھے؟"

"برا تو میں ضرور مناؤں گا" میں نے اپنی اصل آواز سے کہیں زیادہ بھاری آواز میں کہا اور مونچھ کو آہستگی سے بل دیا "میں یہاں اس ہوٹل کے مالک مسٹر افضل کو گرفتار کرنے آیا تھا۔"

"کس جرم میں؟" داؤد نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"میں ان افسروں میں سے ہوں جنہیں کسی کو گرفتار کرتے وقت جرم بتانے کی ضرورت نہیں پڑتی" میں نے تاریک شیشوں کی عینک کچھ اور احتیاط سے ناک پر جماتے ہوئے کہا۔

اس نے برہمی سے مجھے گھورا۔ میری وردی پر موجود نشانات کی مدد سے میرے عہدے کا اندازہ لگایا اور سخت لہجے میں بولا "ایک سب انسپکٹر ہو کر آپ کچھ زیادہ بڑی بڑی باتیں نہیں کر رہے نصیر صاحب؟" میرے سینے پر لگے ہوئے بیج کے مطابق میرا نام نصیر احمد تھا۔

"میں بڑی بڑی باتیں نہیں۔۔۔ بڑے بڑے کام کرنے کا عادی ہوں۔ افضل صاحب اس وقت مل جاتے تو میں انہیں ہتھکڑی لگا کر لے جا رہا ہوتا۔۔۔" میں نے غرانے کے سے انداز میں کہا حالانکہ میرے پاس ہتھکڑی نہیں تھی۔ "ویسے بائی دا وے تم کون ہو؟"

"میں یہاں کا سیکیورٹی چیف ہوں۔ داؤد میرا نام ہے" وہ بدستور سخت لہجے میں بولا "آپ کے پاس افضل صاحب کے لیے کوئی وارنٹ وغیرہ موجود ہے تو مجھے دکھائیں۔" اس نے اپنا مضبوط ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیا۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہلکی سی چھڑی رسید کرتے ہوئے پہلے سے زیادہ سخت لہجے میں کہا "ہاتھ پیچھے کرلو۔ مجھے بھکاریوں کی طرح ہاتھ پھیلانے والے لوگ بالکل پسند نہیں۔"

اس نے ہاتھ پیچھے کرلیا لیکن اس کی آنکھوں میں برہمی بڑھ گئی۔ اس نے دانت سختی سے بھینچ لیے۔ وہ اب ایک ٹک مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے سرہلاتے ہوئے کہا "اچھا۔۔۔ تو تم سیکیورٹی چیف ہو۔۔۔ اور وردی کے بغیر گھوم رہے ہو۔ اوپر سے بیلٹ میں ماؤزر بھی لگایا ہوا ہے۔ آج کل سیکیورٹی والوں نے بھی بڑا اندھیر مچایا ہوا ہے۔ ہمیں خفیہ اطلاعات ملی ہیں کہ بعض سیکیورٹی والے وارداتوں کو روکنے کے بجائے خود وارداتوں میں ملوث ہیں۔ اپنے اسلحے کا غلط استعمال کر رہے ہیں۔ افضل صاحب تو نہیں ملے ہیں۔ چلو تم ہی ذرا میرے ساتھ تھانے تک چلو۔ تم سے ہی کچھ تھوڑی بہت تفتیش ہوجائے۔۔۔"

میں نے اس کی کلائی پکڑنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن وہ پھرتی سے کچھ پیچھے ہٹ گیا اور اس سے بھی زیادہ پھرتی سے اس نے ماؤزر نکال کر مجھ پر تان لیا۔ وہ پہلے سے زیادہ سخت لہجے میں بولا "تم اپنی حد سے کچھ زیادہ ہی بڑھ رہے ہو ایس آئی! مجھے تو تم خود کسی واردات پر نکلے ہوئے لگتے ہو۔ شاید اسی لیے اکیلے نظر آرہے ہو۔ تھانے میں نہیں جاؤں گا بلکہ تھانے والے اب خود یہاں آئیں گے۔ اب ہمیں ذرا دیکھنا پڑے گا کہ یہ قصہ کیا ہے۔۔۔"

لفٹ آچکی تھی لیکن داؤد اسے کوئی "لفٹ" کرائے بغیر ماؤزر لہرا کر مجھے میرے ہی کمرے کی طرف چلنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولا "ذرا ادھر چلو۔۔۔ اب تم سے آرام سے بیٹھ کر بات ہوگی۔ ہمارا راستے میں کھڑے ہو کر بات نہیں ہوسکتی۔ ہمارا کوئی مہمان ادھر آنکلا تو خواہ مخواہ خوف پھیلے گا۔۔۔ چلو۔۔۔"

"میں نہیں جاسکتا۔۔۔ میرے ٹخنے میں موچ آگئی ہے" میں نے کراہتے ہوئے اپنی اصل آواز میں کہا۔ داؤد کو جھٹکا سا لگا۔

"اوہ۔۔۔ سر!" وہ غیرارادی طور پر میرے قریب آکر بغور میرا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔

"اب اتنا بھی قریب مت آؤ۔ میں چاہوں تو آسانی سے تمہارا ماؤزر جھپٹ سکتا ہوں" میں نے کہا۔

وہ کھسیانے سے انداز میں ہنستے ہوئے بولا "سر! آپ نے تو مجھے حیران ہی کردیا۔"

"اور شاید تھوڑا سا پریشان بھی" میں نے کہا۔

"تھوڑا نہیں۔۔۔ اچھا خاصا" اس نے تسلیم کیا اور ماؤزر واپس ہولسٹر میں اڑس لیا۔

"بس۔۔۔ مجھے یہی دیکھنا تھا" میں نے طمانیت سے کہا "اگر تم دھوکا کھاسکتے ہو تو اس کا مطلب ہے جہاں میں جا رہا ہوں وہاں تو کسی کو مجھ پر ذرا سا بھی شبہ نہیں ہوسکتا۔"

"یہ کیا چکر ہے سر؟ آپ کس مہم پر جا رہے ہیں؟" داؤد نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھلتے ہوئے پوچھا۔

"فی الحال یہ مت پوچھو۔ کبھی فرصت میں بیٹھیں گے تو پھر یہ قصہ سن لینا" میں نے کہا "ویسے۔۔۔ آئندہ کسی پولیس والے سے اتنی زیادہ سختی سے مت پیش آنا۔"

وہ مسکراتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے اصل پولیس والا اس قسم کی باتیں نہیں کرسکتا جیسی آپ کر رہے تھے اس لیے اس کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرنے کی نوبت نہیں آسکتی۔"

"پولیس والا بہرحال پولیس والا ہی ہوتا ہے بھائی! کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ کس وقت کیا کہہ ڈالے اور کیا کر گزرے۔۔۔ اچھا خدا حافظ" میں نے بٹن دبا کر لفٹ کو روکا ہوا تھا۔ میں اسے حیران چھوڑ کر اس میں گھس گیا اور چند لمحے بعد نیچے جا پہنچا۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد میں نے موبائل فون پر رحیم گل کو اطلاع دے دی کہ میں روانہ ہو رہا ہوں۔ میں جب اس کے تھانے پہنچا تو وہ تھانے سے باہر ہی ایک سیاہ سرکاری لینڈ کروزر میں مجھے اپنا منتظر ملا۔ دو اے ایس آئی پچھلی سیٹوں پر موجود تھے۔ ڈرائیونگ سیٹ خالی تھی۔ پیچھے ایک موبائل اور ایک سفید فوکس ویگن بھی نظر آرہی تھی۔ ان میں بھی باوردی پولیس والے موجود تھے۔ میں نے رحیم گل کی ہدایت پر اپنی گاڑی وہیں چھوڑ دی اور اس کا اشارہ پاکر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا اس کے ساتھ جو

اے ایس آئی موجود تھے' ان سے میں پہلے بھی مل چکا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ رحیم گل تمام معاملات میں صرف ان دونوں پر بھروسا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک کا نام اکرم تھا۔ وہ نظر کی بھاری عینک لگاتا تھا اور اگر وردی میں نہ ہوتا تو مسکین اور سیدھا سادہ سا کلرک معلوم ہوتا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان تینوں کے چہروں پر تناؤ تھا۔ مجھے پولیس کی وردی میں دیکھ کر رحیم گل کے ساتھیوں کے چہروں پر کوئی تاثر نہیں ابھرا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ میرے بیٹھتے ہی تینوں گاڑیاں تیزی سے آگے پیچھے روانہ ہوگئیں۔

"تمہارا گٹ اپ عمدہ ہے" چند لمحے کی خاموشی کے بعد رحیم گل نے تبصرہ کیا "تم تو اس حلیے میں اچھی بھلی وارداتیں کرسکتے ہو اور پولیس کے محکمے کو بدنام کرسکتے ہو۔"

"بدنام اسے کیا جاتا ہے جو نیک نام ہو" میں نے کہا "تمہارے محکمے میں مزید بدنام ہونے کی گنجائش کہاں ہے۔"

اس نے بری طرح مجھے گھورا اور دانت پیس کر بولا "پھر شروع ہوگئے!"

"تم خود ہی کوئی ایسی بات چھیڑ دیتے ہو کہ میری زبان پھسلنے لگتی ہے" میں نے ملائمت سے کہا۔

"کم از کم اس وقت تو اپنی زبان پر قابو رکھو۔ اس وقت تو تم ہماری ہی وردی میں ہو" وہ بولا۔

"اوہ۔۔۔ یہ تو میں بھول ہی گیا تھا" میں نے اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔

"جس مجرم کو ہم گرفتار کرنے جا رہے ہیں' اب کہیں اس کے سامنے پہنچ کر پولیس کو برا بھلا کہنا شروع نہ کردینا" وہ بولا۔

"یہ باتیں تو صرف تم سے ہی کرنے میں مزہ آتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے پوچھا "تم نے یہ تصدیق بھی کرلی ہے یا نہیں کہ پیر دانش گھر پر ہی موجود ہے؟"

"یار! تم مجھے اتنا گدھا کیوں سمجھتے ہو؟" وہ اسٹیئرنگ وہیل پر ہاتھ مار کر بولا۔ ڈرائیونگ اس وقت وہ خود ہی کر رہا تھا "کیا میں اتنا احمق ہوسکتا ہوں کہ اس کی موجودگی کی تصدیق کیے بغیر پورا جلوس لے کر چل دوں؟"

"آج کل کا دور کچھ عجیب سا ہے۔۔۔ کسی کے بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ کب کیا کر گزرے" میں نے سادگی سے کہا۔

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میری پیر دانش سے فون پر بات ہوئی ہے۔ اس سے ملاقات طے ہوئی ہے۔ وہ بے چارہ تو بڑا خوش خوش میرا انتظار کر رہا ہے۔ وہ سمجھ رہا ہے کہ میں نے ذرا تاخیر سے اس کا بلاوا قبول کیا ہے اور تھوڑا سا نخرا دکھانے کے بعد "راہِ راست" پر آرہا ہوں" اس نے بتایا۔

"اوہ۔۔۔" میں نے سیٹی بجائی "پھر تو اس بے چارے کو واقعی بڑا زوردار جھٹکا لگے گا۔"

"میں نے بہت سوچنے کے بعد فیصلہ کیا کہ ہمیں اس کے بنگلے میں دوستانہ انداز میں داخل ہونا چاہیے" رحیم گل بولا "اگر ہم گیٹ پر ہی اس کے گارڈز وغیرہ کو تاثر دے دیں گے کہ ہم اسے گرفتار کرنے آئے ہیں تو عین ممکن ہے وہ لوگ گیٹ بند کرکے مورچا بند ہو کر بیٹھ جائیں اور وہ بنگلا کسی قلعے سے کم نہیں ہے۔ اس دوران شاید وہ کسی طرح کسی بڑی شخصیت سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوجائے اور وہ مداخلت کرنے آن پہنچے۔ گو کہ میں نے ٹھیک بارہ بجے اس کے سارے ٹیلی فون بند کرانے کا بندوبست کرلیا ہے لیکن اگر ہم لوگ اندر نہ پہنچ سکے تو ہمیں صحیح پتا نہیں چلے گا کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ اگر ہم صرف چار آدمی بھی اندر ہوں گے اور باقی لوگوں نے بنگلے کو گھیرا ہوا ہوگا تو مجھے اطمینان رہے گا۔ اس صورت میں مجھے تصادم کی بھی زیادہ پروا نہیں۔ جو کچھ ہوگا کم از کم ہماری آنکھوں کے سامنے تو ہوگا۔ ہم خود کو زیادہ بے بس محسوس نہیں کریں گے۔"

"لیکن۔۔۔! اس میں ہماری جانوں کو خطرہ زیادہ ہوگا" اے ایس آئی اکرم بولا "ہم ایک طرح سے اندر بند ہو کر رہ جائیں گے اور ہماری اطلاعات کے مطابق پیر کے گھر میں ہر وقت کافی تعداد میں مسلح آدمی موجود رہتے ہیں جن میں سے کئی پیشہ ور مجرم ہیں جنہوں نے اس کی شخصیت کی چھتری تلے پناہ لی ہوئی ہے۔"

"میرا خیال ہے کہ ہم چاروں اپنی اپنی جگہ بہت خاص آدمی ہیں" رحیم گل الفاظ پر زور دیتے ہوئے بولا "اگر ہم چاروں مل کر بھی اندر کی صورتِ حال کو کنٹرول نہ کرسکے تو ہم چاروں کی زندگیوں پر لعنت ہے۔"

"لعنت کو تم تینوں اپنی زندگیوں تک محدود رکھو" میں نے جلدی سے کہا۔

"بچے! اب تو جو کچھ بھی ہوگا ہم چاروں کے ساتھ اکٹھے ہی ہوگا" رحیم گل مشفقانہ لہجے میں بولا "اور اگر کہیں بات بگڑ گئی۔۔۔ تمہارا جعلی پولیس والا ہونا ظاہر ہوگیا تو پھر میرے ساتھ اور بھی بری ہوگی۔ مجھے اس کے نتائج بھی بھگتنے پڑیں گے۔ ظاہر ہے اس کی ذمے داری مجھ پر آئے گی۔"

"اتنے منفی پہلوؤں کی طرف مت جاؤ اور حسبِ عادت بدفال منہ سے مت نکالو" میں نے کہا "یہ اتنی بڑی مہم بھی نہیں ہے جتنی ہم ... لوگوں نے تصور کر رکھی ہے۔ البتہ ذرا بعد کے حالات سے نمٹنے کے لیے کمر مضبوط رکھنا۔"

یونہی باتوں باتوں میں ہم پیر دانش کے گھر کے قریب جا پہنچے۔ رحیم گل نے دو تین گلی پہلے ہی گاڑی روک لی اور اکرم کو اشارہ کیا۔ وہ اتر کر پولیس کی دوسری گاڑیوں کی طرف چلا گیا جو کچھ فاصلہ رکھ کر ہمارے پیچھے آرہی تھیں۔

رحیم گل کھڑکی میں کہنی ٹکا کر گردوپیش کا جائزہ لینے کے بعد میری طرف دیکھتے ہوئے بولا "باقی لوگوں کو اکرم اب بتانے گیا ہے کہ ہم کس مشن پر جارہے ہیں۔"

"میں سمجھ چکا ہوں"..... میں نے گہری سانس لے کر گھڑی دیکھی۔ اس دوران میری نظر آگے ایک گلی کے کونے پر کھڑی ایک سفید کار پر پڑی۔ کار ایک بنگلے کے گیٹ کے قریب کچھ اس طرح کھڑی تھی جیسے اندر سے کسی کی آمد کی..... یا پھر گیٹ کھلنے کی منتظر ہو۔ اس کی اگلی سیٹ پر کوئی چہرے کے سامنے اخبار پھیلائے بیٹھا تھا۔

دفعتاً اس نے اخبار ذرا سا ہٹا کر لینڈ کروزر کی طرف دیکھا اور میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ گو کہ فاصلہ کافی تھا اور وہ شخص فیلٹ ہیٹ، ڈارک گلاسز بھی لگائے ہوئے تھا۔ اس کے باوجود میں نے اسے پہچان لیا۔ وہ شفیع شاہ تھا۔ اس حلیے میں بھی وہ ایک کھلنڈرا امیرزادہ ہی معلوم ہو رہا تھا۔

گاڑی میں اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ نہ جانے اس نے اپنے آدمیوں کو کہاں اور کس طرح پھیلایا تھا۔ ان کے لیے پولیس سے ذرا دور رہنا بھی ضروری تھا۔ بہرحال مجھے اس سلسلے میں کوئی فکر نہیں تھی۔ شفیع شاہ ان کاموں میں ماہر تھا۔ معلوم نہیں، اس نے بھی مجھے پہچانا تھا یا نہیں؟ اس سے پہلے کہ رحیم گل اس کی طرف متوجہ ہوتا، اس نے اخبار چھوڑ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور دوسرے ہی لمحے اس کی گاڑی موڑ پر گھوم کر نظر سے اوجھل ہو گئی۔

چند لمحے بعد اکرم لوٹ آیا اور خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔ رحیم گل نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے کہا "چھاپے کی خبر سن کر ہمارے آدمی پریشان تو ہوئے ہوں گے؟"

"نہیں۔ یہ غنیمت ہے کہ وہ زیادہ پریشان نہیں ہوئے" اکرم نے جواب دیا "البتہ حیران ضرور نظر آرہے ہیں۔"

"خوفزدہ تو نہیں ہیں؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"نہیں" اکرم نے جواب دیا "انہیں معلوم ہے ایسے معاملات میں زیادہ ذمے داری افسر پر ہوتی ہے۔"

دونوں گاڑیاں اب رینگتی ہوئی ہمارے پیچھے آرہی تھیں۔ ان کے اور ہمارے درمیان فاصلہ اب بڑھ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد رحیم گل نے گاڑی پیر دانش کے عظیم الشان بنگلے کے سامنے لے جا کر روکی۔ مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ بنگلے کا بلند و بالا گیٹ فوراً ہی کھل گیا۔

اندر بنگلے کی طویل و عریض ڈرائیو وے میں اور گیٹ کے دونوں طرف کلاشنکوف بردار محافظ کھڑے نظر آرہے تھے مگر ان کے انداز میں بے پروائی تھی۔ وہ الرٹ نہیں تھے۔ پولیس کی لینڈ کروزر دیکھ کر بھی ان کے انداز میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ رحیم گل گاڑی اندر لے گیا اور تب مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں درحقیقت رحیم گل کا انتظار ہو رہا تھا۔

پیر دانش خود سامنے بہ نفس نفیس برآمدے میں موجود تھا اور یہ گویا آنے والوں کے لیے ایک اعزاز تھا۔ اس قسم کے لوگ شاذ و نادر ہی کسی کے استقبال کے لیے باہر آتے تھے۔ ایک ایس ایچ او کی تو حیثیت ہی کیا تھی، اس سے کہیں بڑے بڑے عہدے والوں کو بہت بہت دیر ان کے ڈرائنگ رومز میں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا تھا۔

پیر دانش کے دائیں بائیں دو چمچہ قسم کی شخصیتیں موجود تھیں۔ گو کہ ان میں سے ایک تھری پیس سوٹ میں تھا اور اپنی حرکات و سکنات سے حتی الامکان معزز نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن چمچہ گیری نے گویا اس کے چہرے پر اپنے نقوش چھوڑے ہوئے تھے۔

پیر دانش آج اپنے حلیے سے واقعی کوئی پیر نظر آرہا تھا۔ اس کے سر پر اونچی سی ٹوپی تھی جس کا اوپری حصہ گنبد سے مشابہ تھا اور وہ ایک بھاری بھرکم "خلعتِ فاخرہ" قسم کا لبادہ پہنے ہوئے تھا جس پر خوبصورت زری کا کام تھا۔ لبادہ دور ہی سے جھلمل جھلمل کرتا دکھائی دے رہا تھا۔ پیروں میں شاہی قسم کے زری والے جوتے تھے۔

پیر دانش شخصیت سے بار کھاتا تھا ورنہ اس حلیے میں وہ واقعی بہت متاثر کن اور بارعب نظر آسکتا تھا مگر یہی چیز اسے اور بھی زیادہ باکمال آدمی ثابت کرتی تھی کہ اس شخصیت کے ساتھ اس نے کیا مقام بنایا تھا اور کہاں کہاں پنجے گاڑ لیے تھے۔ طریقے خواہ کچھ بھی تھے..... لیکن وہ جتنا اوپر پہنچ چکا تھا اس مقام تک پہنچنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔

ہم چاروں گاڑی سے اتر کر اس کی طرف بڑھے۔ گیٹ ہمارے عقب میں بند ہو چکا تھا۔ عام حالات میں پولیس والوں کے پاس زیادہ سے زیادہ ایک ایک گن ہوتی ہے لیکن ہمارے پاس اس وقت دو دو گنیں تو ظاہری طور پر نظر آرہی تھیں۔ میرے اندازے کے مطابق میری طرح مزید ایک آدھ ہتھیار سب نے چھپا بھی رکھا تھا، تاہم پیر دانش نے گویا اس بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ خوش دلی سے مسکرا رہا تھا۔ باری باری ان تینوں نے ہم سب سے مصافحہ کیا۔ پیر دانش نے میری طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دی۔ اس کی تمام تر توجہ صرف رحیم گل پر تھی۔ میرے حق میں یہ بہتر ہی تھا کہ مجھے توقع نہیں تھی کہ اچھی خاصی توجہ دینے پر بھی وہ مجھے پہچان پاتا۔ اس کے باوجود میرے خیال میں میرا اس کی نظر میں نہ آنا ہی بہتر تھا۔

البتہ میرے لیے قدرے تشویشناک بات یہ تھی کہ اوپر ٹیرس پر اس کی ماں جسے میں نے دل ہی دل میں گاڈ مدر کا نام دیا تھا موجود تھی اور گہری نظر سے فرداً فرداً ہم سب کا جائزہ لے رہی تھی۔ اس کی نظریں برمے کی طرح انسان کو اپنے وجود میں گڑتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ اس کے دائیں بائیں اس وقت دو خوبصورت اور نوخیز لڑکیاں موجود تھیں۔

ان میں سے ایک تو جاپانی لڑکیوں کی طرح ذرا چھوٹی اور چپٹی ناک کے ساتھ اتنی کیوٹ لگ رہی تھی کہ بے اختیار میرے قدم رکنے لگے۔ دل چاہا کہ ایک لمحے کے لیے رک کر ذرا بہتر طور پر اس کا جائزہ لیا جائے لیکن مجھے فوراً خیال آگیا کہ اس وقت میں آفس نہیں تھا اور نہ ہی کسی ہوٹل یا کلب میں تھا۔ اس وقت میں ایک فرض شناس پولیس افسر تھا اور بڑے اہم مشن پر آیا ہوا تھا۔ اگر میں اصلی پولیس والا ہوتا تو شاید اس قسم کے "فضول" خیالات میرے دل میں جگہ نہ پاتے اور میں آرام سے رک کر گہری نظر سے اس جاپانی گڑیا کا جائزہ لے لیتا۔

معلوم نہیں دونوں ماں بیٹا کسی کے استقبال کے لیے کمرے سے نکلتے وقت بھی دائیں بائیں دو افراد کو کھڑے رکھنا کیوں ضروری سمجھتے تھے؟ میں نے بعض تصویروں اور کچھ تاریخی فلموں میں دیکھا تھا کہ بادشاہ سلامت یا ملکۂ عالیہ تخت پر نیم دراز ہوتی تھیں تو دائیں بائیں دو خادم یا کنیزیں کھڑی مور چھل ہلاتی نظر آتی تھیں۔ یہ چاروں افراد بھی کچھ اسی طرح کھڑے نظر آرہے تھے لیکن ان کے ہاتھوں میں مور چھل کی کمی تھی۔

ہم برآمدے کے قریب پہنچے تو ٹیرس ہمارے سروں کے اوپر آگئی اور یوں گاڈ مدر ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ پیر دانش مصافحہ کرچکا تو دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا "زہے نصیب... زہے نصیب... رحیم گل صاحب تشریف لائے... میں نے سوچا خود باہر نکل کر استقبال کروں... مجھے پل پل کی اطلاع مل رہی تھی کہ کب آپ تھانے سے روانہ ہوئے اور کب گھر کے قریب پہنچے۔ میں تو سمجھا تھا آپ کبھی اس غریب خانے کو رونق نہیں بخشیں گے۔"

میری دھڑکن ذرا تیز ہوگئی۔ اس بدبخت کو کیا واقعی رحیم گل کی تمام تر احتیاطوں کے باوجود پل پل کی اطلاع مل رہی تھی؟ یہ تو کوئی اچھا شگون نہیں تھا۔ کیا اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ہمارے ساتھ مزید پولیس فورس بھی تھی جو کچھ دیر بعد اس کے "غریب خانے" کے گرد گھیرا ڈالنے والی تھی۔ انکسار کے بعض الفاظ کا استعمال بھی بعض اوقات ستم ظریفانہ لگتا تھا۔ اگر اس خانہ خراب پیر دانش کا گھر غریب خانہ تھا تو پھر "امیر خانہ" نہ جانے کسے کہا جاسکتا تھا؟

"پیر صاحب! میں آپ کی دعوت کے جواب میں نہیں آیا۔ میں تو خود اپنے طور پر آیا ہوں... یا یوں کہیے کہ حالات مجھے لے آئے ہیں" رحیم گل ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

پیر دانش کے چہرے پر کوئی تغیر نظر نہ آیا۔ یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ اس وقت کیا سوچ رہا تھا؟ وہ بدستور خوش دلی سے بولا "چلیں خیر... کسی طرح بھی سہی... آپ آگئے... یہی سب سے اہم بات ہے..."

پھر اس نے ذرا ترچھی نظر سے ہم تینوں کی طرف دیکھا اور کہا۔ "ویسے ڈیوٹی کے اوقات میں... ان کلف لگی وردیوں میں... اس طرح پُرتکلف سے انداز میں آنے کے بجائے آپ فارغ وقت میں... سادہ لباس میں... ساری مصروفیات ذہن سے جھٹک کر ہمارے پاس آتے اور ریلیکس ہوکر بیٹھتے تو ملاقات کا لطف ہی کچھ اور ہوتا۔"

"پیر صاحب! مجھے تو یوں لگتا ہے کہ میرے پاس فارغ وقت تو کوئی ہوتا ہی نہیں... ویسے بھی میں نے عرض کیا نا کہ مجھے درحقیقت حالات یہاں لے آئے ہیں" رحیم گل ملائمت سے بولا۔

"خیر... اگر حالات بھی لے آئے ہیں تو اس پر اتنا افسردہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ شاید اسی میں آپ کی بہتری ہو" پیر دانش نے ہلکا سا قہقہہ لگایا پھر اس نے مشفقانہ انداز میں رحیم گل کی کمر پر ہاتھ رکھتے ہوئے اسے اندر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں نے آخر کار یہی محسوس کیا کہ اسے کسی گڑبڑ کا احساس نہیں تھا۔ وہ بالکل بے فکر، مطمئن اور مسرور نظر آرہا تھا۔

رحیم گل گوکہ اس کے اشارے پر آگے نہیں بڑھا تھا لیکن پیر دانش اسے اس کا رسمی تکلف اور ہچکچاہٹ سمجھتے ہوئے بولا "انسپکٹر صاحب! آپ بے شک تاخیر سے آئے ہیں... اکیلے نہیں آئے... اور وردی میں آئے ہیں، اس کے باوجود ہم آپ کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھیں گے۔ چلیے نا... اندر چلیے۔"

رحیم گل نے ایک لمحے سوچا۔ ہمیں باقی پولیس فورس کو مہلت دینی تھی کہ وہ بنگلے کے گرد مناسب حکمتِ عملی کے ساتھ گھیرا ڈال لے۔ شاید یہی سوچ کر رحیم گل اس کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ میں نے ذرا گردن گھما کر دیکھا۔ پیر دانش کے کلاشنکوف بردار محافظ بے پروائی سے ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ شاید ان کے لیے پولیس والوں کا یہاں آنا کوئی خاص بات نہیں تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا وہ سمجھ رہے ہوں کہ انسپکٹر صاحب اپنی ترقی کے لیے کوئی سفارش یا پھر "روحانی عمل" کروانے آئے ہوں گے۔

پیر دانش کے ساتھ ہم ایک عظیم الشان ڈرائنگ روم میں پہنچے۔ میں سوچ رہا تھا کہ عام پولیس والے تو واقعی ان عظیم الشان محلوں میں قدم رکھتے ہی مرعوب ہوجاتے ہوں گے۔ جب قانون کے محافظ مرعوب یا خوفزدہ ہوجائیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ مجرم کو آدھی فتح وہیں حاصل ہوگئی۔

ہم نہایت گدیلے صوفوں میں دھنس چکے تو پیر دانش بولا "اتنے تکلف سے بیٹھنے کی ضرورت نہیں... اطمینان سے ڈھیلے ڈھالے ہوکر بیٹھیے... ڈیوٹی کو بھول جائیے اور اس گھر کو اپنا ہی گھر سمجھیے۔"

"میں اس گھر کو اپنا گھر کیسے سمجھ سکتا ہوں پیر صاحب!" رحیم گل بولا "میں جس اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں اس کی قیمت سے زیادہ کا تو صرف اس ڈرائنگ روم میں فرنیچر موجود ہے... اور میں تو خوش قسمت ہوں کہ میرا تعلق ایک آسودہ حال چھوٹے سے

...دار گھرانے سے ہے۔ اس لیے میں پوش علاقے کے ایک ...اپارٹمنٹ میں رہتا ہوں ورنہ انسپکٹر اور اس سے چھوٹے ...کے بعض پولیس والے ایسے فلیٹوں اور کوارٹروں میں بھی ...رہے ہیں جن کی حالت موہنجوداڑو کے کھنڈرات سے مشابہ ہے۔"

"وہ بہت ہی بے وقوف پولیس والے ہوں گے رحیم گل صاحب!" پیر دانش نے ایک گونجتا ہوا قہقہہ لگایا "آج کے دور ...آپ کے محکمے میں ایسے افراد کہاں رہ گئے ہیں؟ چراغ لے کر ڈھونڈنے پڑتے ہوں گے۔"

"ڈھونڈنے والوں کو بہرحال مل ہی جاتے ہیں" رحیم گل نے ...بدستور اصرار کیا۔

"بعض احتیاط پسندوں کو تو ہم نے ایسے حال میں رہتے دیکھا ہے" پیر دانش مسکراتے ہوئے بولا "ان کا معاملہ شاید یہ ہوتا ہے کہ...

ہاکر فقیروں کا ہم بھیس غالب

تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اس قسم کے افسروں کے ٹھاٹ ریٹائرمنٹ کے بعد دیکھنے کے ہوتے ہیں۔ بہرحال میں اس بحث میں نہیں پڑتا۔ میں تو ...کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آپ جس تھانے میں آئے ہیں یہ تو ...کی کان ہے مگر یہ بات مجھے آپ کو بتانے کی کیا ضرورت ہے۔ ...کو تو پہلے ہی معلوم ہوگی۔ اس تھانے میں اپنا تبادلہ کرانے کے ...لاکھوں روپے نذرانہ دینے کے لیے تیار رہتے ہیں۔"

"مگر میں کوئی نذرانہ دیے بغیر یہاں آیا ہوں" رحیم گل ...ٹھہرے لہجے میں بولا۔

پیر دانش نے ایک بار پھر قہقہہ لگایا "رحیم گل صاحب! آپ ...دلچسپ آدمی ہیں۔ آپ مجھے کسی اور ہی دنیا کے باسی لگتے ...ہیں۔"

"الحمد للہ... میں اس دنیا کا باسی ہوں جسے آج کے دور کے ان ...خبیثوں نے مل کر اُجاڑ کر رکھ دیا ہے اور اس کی جگہ ابلیس کی ...میں کوئی اور ہی دنیا آباد کرلی ہے۔ اسی لیے ہر کوئی روتا ...پھر رہا ہے" رحیم گل نہایت سنجیدگی سے بولا۔

پیر دانش نے ایک اور بلند آہنگ گونجتا ہوا قہقہہ لگایا۔ وہ گویا ...گل کی سنجیدہ باتوں سے اسی طرح محظوظ ہورہا تھا جس طرح ...لطیفوں سے ہوتا ہے۔ اس کے تاثرات کچھ ایسے لگ رہے ...تھے جیسے وہ دل ہی دل میں کہہ رہا ہو۔ میں خوب سمجھ رہا ہوں ...یار! تم مجھے متاثر کرنے کے لیے ایسی باتیں کررہے ہو لیکن ...کوئی بات نہیں... جلد ہی اپنی اصلیت پر آجاؤ گے۔

...زیادہ وہ کچھ سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا "رحیم گل صاحب! میں ...ہے آپ اپنی نوجوانی کی وجہ سے ناتجربہ کار ہوں، آپ کی ...زیادہ پرانی معلوم نہیں ہوتی۔ شروع میں آدمی اس طرح کی باتیں کرتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اسے عقل آجاتی ہے۔"

"یا یوں کہیے کہ اس کی عقل ابلیس کی بھینٹ چڑھ جاتی ہے" رحیم گل اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

پیر دانش گویا اس کے تبصرے کو خاطر میں لائے بغیر بولا "آپ نے اچھا کیا جو مجھ سے ملنے آگئے۔ ہم سے آپ کا ربط ضبط رہے گا تو آپ بہت کچھ سیکھیں گے۔ آپ کو بڑے فائدے پہنچیں گے۔ کوئی بعید نہیں ہے کہ کچھ عرصے بعد آپ بھی ایسے ہی عالیشان گھر میں رہ رہے ہوں..." اس نے چاروں طرف اشارہ کیا "بس ہماری باتوں پہ... اور تھوڑا بہت ہم پر بھی دھیان رکھیے۔"

"پیر صاحب...!" رحیم گل کی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آیا "مجھے حرام کی کمائی سے محل بنا کر رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے... بلکہ کسی بھی قسم کی کمائی سے محل بنا کر رہنے کا کوئی شوق نہیں ہے... شان و شوکت... بڑے بڑے بنگلے... پُرتعیش گاڑیاں... چھوڑ کر مرنے کے لیے بہت بڑا بینک بیلنس... یہ چیزیں میرا مسئلہ نہیں ہیں۔ میں کسی بھی جگہ، کسی بھی حال میں خوش رہ سکتا ہوں اور زندگی کو انجوائے کرسکتا ہوں کیونکہ زندگی انسان کے یہاں ہوتی ہے..." اس نے سینے پر دل کے مقام پر ہاتھ مارا پھر چاروں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "زندگی شاندار مکانوں... عالی شان فرنیچر اور بیش قیمت قالینوں میں نہیں ہوتی۔"

"انسپکٹر صاحب! کیا آپ مجھے یہی بتانے کے لیے یہاں آئے ہیں؟" پیر نے بظاہر مسکراتے ہوئے دوستانہ لہجے میں پوچھا لیکن اس کے لہجے میں خود بخود ایک ہلکا سا تیکھا پن آگیا تھا۔

"نہیں۔" رحیم گل نے اطمینان سے جواب دیا "یہ باتیں تو ان گنت لوگ بتا کر جاچکے ہیں۔ لوگوں نے اب ان پر کان دھرنا چھوڑ دیا ہے... حتیٰ کہ آپ جیسے پیروں نے بھی۔"

"تو پھر آپ یہاں کس لیے آئے ہیں؟" پیر دانش کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور لہجے میں ملائمت برقرار تھی۔

"بتادیں گے... ایسی جلدی بھی کیا ہے؟" رحیم گل مسکراتے ہوئے بولا پھر اس نے گھڑی دیکھی۔ میرا اندازہ تھا کہ پولیس والے اب تک بنگلے کو گھیرے میں لے چکے ہوں گے۔ تاہم رحیم گل اب بھی اصل بات زبان پر لائے بغیر بولا۔ "آپ مجھ جیسے آدمی سے مل کر کافی بدمزہ ہوئے ہوں گے؟"

"نہیں" پیر دانش نے بدستور مسکراتے ہوئے جواب دیا "میں جس سے مل کر بدمزہ ہوتا ہوں اسے اٹھوا کر گھر سے باہر پھنکوا دیتا ہوں۔ خیر... یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی... یہ بتائیے کہ آپ حضرات کیا پینا پسند کریں گے؟ میرے ہاں ہر ذوق کے آدمی کو پینے کے لیے کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ دنیا کی نفیس ترین شرابوں سے لے کر تازہ دہی کی لسی تک... بلاتکلف بتائیے... آپ میں سے کون کیا پینا پسند کرے گا..." پھر اس نے اپنی کلائی پر جگمگاتی گھڑی کو ایک نظر دیکھا "ٹھیک ایک بجے کھانا لگا دیا جائے گا۔"

اس نے سوالیہ نظروں سے باری باری ہم چاروں کی طرف دیکھا۔ اس کے دونوں آدمی بیٹھے نہیں تھے۔ وہ ہاتھ باندھے اس کے پیچھے بُت بنے کھڑے تھے۔ ان کے چہروں پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ میں تاریک چشمے کی اوٹ سے ان دونوں پر اور پیردانش پر مسلسل نظر رکھے ہوئے تھا۔ میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا تھا کہ اس کے وہ دونوں آدمی کس قسم کی مخلوق تھے؟ آیا وہ اس کے عام قسم کے خادم تھے... یا درحقیقت وہ اس کے باڈی گارڈ تھے؟ ان کے پاس کوئی ہتھیار نظر نہیں آرہا تھا۔ ان کے لباسوں میں زیادہ سے زیادہ کوئی ریوالور یا پسٹل مخفی ہو سکتا تھا۔ وہ باڈی گارڈ ہونے کے اہل بھی دکھائی نہیں دیتے تھے۔ خصوصاً ان میں سے شلوار قمیص والا تو بالکل ہی چغد دکھائی دیتا تھا لیکن ان دونوں کا مستقل سر پر سوار رہنا سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

رحیم گل ایک طویل سانس لے کر بولا "پیر صاحب! شراب تو ہم چاروں میں سے کوئی نہیں پیتا...."

پیر اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا "بھئی اس معاملے میں شرمانے اور زیادہ احتیاط برتنے کی ضرورت نہیں۔ اس گھر کی کہانیاں باہر نہیں جاتیں۔ یہ گھر نہیں' ایک سمندر ہے.... اور سمندر بھی ایسا جس میں غوطہ خوروں کا داخلہ بالکل بند ہے۔"

"مجھے یقین ہے.... مجھے یقین ہے" رحیم گل نے اثبات میں سر ہلایا "لیکن ہم محض احتیاطاً پرہیزگار نظر آنے کی کوشش نہیں کر رہے۔ ہم میں سے واقعی کوئی بھی پینے پلانے کا شوقین نہیں۔ دوسرے بے ضرر قسم کے مشروبات سے شغل ہو سکتا تھا اور کھانا بھی کھایا جا سکتا تھا لیکن افسوس کہ اس وقت ہم آپ کی اس پیشکش سے بھی استفادہ نہیں کر سکتے۔"

"لیکن کیوں؟" پیردانش نے حیرت سے پوچھا۔

"اب دیکھیں نا.... یہ کچھ اچھا نہیں لگے گا کہ ہم آپ کے ساتھ بیٹھ کر اچھے اچھے مفرح قسم کے مشروبات پئیں.... پھر آپ کے ساتھ بیٹھ کر اچھے اچھے کھانے کھائیں اور اس کے بعد آپ کو گرفتار کر کے چل دیں۔"

کمرے میں ایک لمحے کے لیے گہرا سکوت چھا گیا۔ مسکراہٹ پیردانش کے ہونٹوں پر گویا منجمد ہو گئی۔ اس کے بعد وہ بولا تو اس کے ہونٹوں نے گویا حرکت ہی نہیں کی "آپ نے لفظ "گرفتار" استعمال کیا رحیم گل صاحب؟" اس کے لہجے میں بلا کی ملائمت تھی۔

"جی ہاں پیر صاحب!" رحیم گل نے نہایت مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ "میں بڑے افسوس کے ساتھ آپ کو اطلاع دے رہا ہوں کہ میں آپ کو گرفتار کرنے آیا ہوں" انداز کچھ ایسا تھا جیسے وہ پیردانش کو اس کی کسی عزیز ہستی کے انتقال کی اطلاع دے رہا ہو۔

پیردانش نے پھر ایک گونجتا ہوا قہقہہ لگایا "مذاق اچھا کر لیتے ہیں آپ....! اپنی سنجیدگی برقرار رکھنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ وہ مذاق بڑا دلچسپ ہوتا ہے جو نہایت سنجیدگی سے کیا جائے۔"

رحیم گل نے کچھ اس طرح سر ہلایا جیسے اس بیان سے اسے دلی صدمہ پہنچا ہو پھر وہ مغموم لہجے میں بولا "یہ کوئی نئی بات نہیں۔ جب بھی کسی فرعون صفت شخصیت کا انجام اس کے سامنے آتا ہے تو اسے یقین نہیں آتا۔ بہت دیر تک وہ اسے مذاق ہی سمجھتا رہتا ہے۔ خصوصاً اس وقت تو اسے بالکل ہی یقین نہیں آتا جب انجام اچانک.... اور اس کے عروج کے دور میں سامنے آجائے۔"

"انسپکٹر رحیم گل....!" پیردانش کے لہجے میں بلا کی سرد مہری در آئی "میں مذاق کو صرف ایک حد تک پسند کرتا ہوں۔ جس قسم کے الفاظ تم استعمال کر رہے ہو' اپنے بارے میں اس قسم کے الفاظ میں مذاق میں بھی برداشت نہیں کرتا۔" وہ "آپ" سے "تم" پر آگیا۔

"پیر صاحب! آپ تو مذاق کو ایک حد تک برداشت کرنے کی بات کر رہے ہیں۔ میں تو آپ جیسے لوگوں سے مذاق کرنا سرے سے پسند ہی نہیں کرتا" رحیم گل کے لہجے میں اب بھی ملائمت تھی اور وہ اسے "آپ" ہی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔

پیردانش نے دھیرے دھیرے یوں نفی میں سر ہلایا گویا وہ کوئی ناقابلِ یقین منظر دیکھ رہا ہے۔ سرسراتی سی آواز میں بولا "نہیں۔ نہیں.... رحیم گل! تم کسی نہ کسی طرح مجھے یقین ضرور دلاؤ کہ تم مذاق نہیں کر رہے ہو۔"

"ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ میں اٹھ کر آپ کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دوں.... اور یہ میں کرنا نہیں چاہتا" رحیم گل پُرسکون لہجے میں بولا۔ "میں چاہتا ہوں آپ نہایت پُرسکون اور باعزت انداز میں اٹھ کر میرے ساتھ چلیں تاکہ کسی کے بھی سامنے تماشا بننے سے بچ سکیں۔"

"یعنی تم مجھے تماشا بناؤ گے....؟" پیردانش کو جیسے اب بھی اپنی آنکھوں اور اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا "ایک انسپکٹر ہو کر تمہاری جرأت اور تمہارا حوصلہ قابلِ داد ہے رحیم گل! میری سمجھ میں نہیں آرہا میں تمہیں کس طرح داد دوں....!"

"آپ مجھے داد نہ دیں.... اٹھ کر میرے ساتھ چلیں" رحیم گل کے لہجے میں ملائمت برقرار تھی۔

کمرے کی فضا میں زبردست تناؤ آگیا تھا۔ ہم چاروں کے ہاتھ اپنی اپنی گنوں کے دستوں پر تھے۔ پیردانش کے عقب میں کھڑے ہوئے دونوں افراد اب بھی خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ گویا کمرے میں ہونے والی گفتگو سن نہیں پا رہے تھے لیکن میں ان کے سپاٹ چہروں کی وجہ سے ان کے بارے میں زیادہ محتاط تھا۔ میرے خیال میں اس قسم کے لوگ ان سے زیادہ خطرناک ہوتے تھے جو گرجتے برستے نظر آتے تھے۔

پیردانش پر یکدم ہی جیسے کوئی دورہ پڑ گیا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ چہرہ سرخ ہو گیا۔ باچھوں سے معمولی سا کف بھی بہنے لگا اور وہ غصے سے ذرا کانپنے لگا۔ اسے یقیناً جلال میں آنے کی بڑی مشق تھی۔ یک لخت ہی اس کی آواز بھی گویا بدل گئی۔

گرجدار آواز اور غضبناک انداز میں وہ بولا "پولیس فورس میں اور کوئی نہیں رہ گیا تھا مجھے گرفتار کرنے کے لیے؟ سب مر گئے تھے کیا؟ آئی جی.... ڈی آئی جی سے کم عہدے کے کسی آدمی کے تو ساتھ چلنا بھی میری توہین ہے.... چہ جائیکہ ایک انسپکٹر.... ایک ایس ایچ او مجھے گرفتار کرنے آجائے؟ رحیم گل! تمہارا دماغ یقیناً اُلٹ گیا ہے۔"

"عین ممکن ہے" رحیم گل نے بے پروائی سے جواب دیا۔ اس کے صبر و سکون میں کوئی فرق نہیں آیا تھا "بعض اوقات انسان کا دماغ الٹتا ہے تو وہ اچھا یا برا.... لیکن کوئی بڑا کام انجام دے جاتا ہے۔ عین ممکن ہے مجھ سے کوئی بڑی نیکی سرزد ہونے والی ہو۔ اس لیے تمہیں یوں محسوس ہو رہا ہو کہ میرا دماغ الٹ گیا ہے۔ بہر حال.... اب یہ بتاؤ تمہارا ارادہ کیا ہے؟ آرام اور سکون سے گرفتاری دے دو گے یا ہنگامہ برپا کر کے اپنے لیے دشواریوں میں اضافہ کرو گے؟"

اب رحیم گل بھی "آپ" سے "تم" پر آگیا تھا اور اس کے لہجے میں سختی بھی آچلی تھی۔ وہ بڑے تحمل اور سمجھداری سے صورتِ حال سے نمٹ رہا تھا۔ اس کی خود اعتمادی دیکھ کر میرا دل باغ باغ ہو رہا تھا۔ اس جیسے پولیس آفیسر اگر ہمارے ساتھ کچھ زیادہ تعداد میں ہوتے تو وہ واقعی معاشرے میں انقلاب لا سکتے تھے۔ پیر دانش کے جلال میں آجانے سے یقیناً کوئی اچھا بھلا بڑا پولیس آفیسر بھی نروس ہو سکتا تھا لیکن رحیم گل نہ تو نروس ہوا تھا اور نہ ہی حد سے زیادہ خود اعتمادی کا شکار ہو کر اس نے جوابی اشتعال دکھانے کی کوشش کی تھی۔ بعض گھاگ مجرموں کی یہ بھی ایک چال ہوتی تھی۔ وہ پولیس آفیسر کو کسی نہ کسی طرح اشتعال دلاتے تھے اور وہ اشتعال میں کوئی ایسی حرکت کر گزرتا تھا جو بعد میں اس کے لیے دشواریوں کا سبب بن جاتی تھی۔ ایک آئیڈیل پولیس آفیسر کا صرف نڈر' بے خوف اور دیانت دار ہونا ہی ضروری نہیں تھا۔ اس کا دماغ ٹھنڈا رہنا بھی اتنا ہی ضروری تھا اور اس کے باوجود اسے بارعب بھی دکھائی دینا چاہیے تھا۔ غضبناک نظر آنا الگ بات تھی اور بارعب نظر آنا الگ بات۔

پیردانش کے لہجے میں پھر یک لخت ایک تبدیلی آئی۔ وہ ترحم آمیز لہجے میں بولا "رحیم گل! لگتا یہی ہے کہ تمہیں نہ تو اپنی زندگی عزیز ہے اور نہ ہی اپنی نوکری۔"

"نہیں.... مجھے واقعی دونوں چیزیں عزیز نہیں" رحیم گل نے تسلیم کیا "دونوں ہی چیزیں کسی کی دی ہوئی ہیں۔ اگر وہ واپس لے لے تو شکوہ کیسا؟"

"چچ.... چ.... چ...." پیردانش نے کچھ اس طرح یہ آوازیں نکالیں۔ جیسے کوئی کیڑا نہایت ہی قابلِ رحم حالت میں اس کے سامنے رینگ رہا ہو پھر اس نے گردن ذرا سی گھما کر پیچھے دیکھا اور شلوار قمیص والے بُت کو مخاطب کیا۔ "ٹیلی فون ملاؤ.... کمشنر صاحب سے میری بات کراؤ۔"

"بت" تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے کونے میں رکھی ہوئی خوبصورت تپائی پر سے ایک خوبصورت کارڈلیس سیٹ اٹھایا اور اس پر جلدی جلدی نمبر پنچ کیا۔ اس دوران اس کی نظر ایک لمحے کے لیے بھی ہم پر سے نہیں ہٹی۔ نمبر پنچ کر کے اس نے فون کان سے لگایا۔ اس کے چہرے پر ذرا الجھن کے آثار نظر آئے۔

فون کان سے ہٹا کر اس نے دوبارہ نمبر پنچ کیا۔ اس بار بھی نمبر ملانے کی کوشش ناکام رہی تب اسے ڈائل ٹون سننے کا خیال آیا اور آخرکار وہ مایوسی و حیرت سے بولا "سائیں! فون تو ڈیڈ پڑا ہے" اتنی دیر میں پہلی مرتبہ میں نے اس کی آواز سنی ورنہ مجھے اس پر اور اس کے قریب کھڑے سوٹڈ بوٹڈ شخص پر گونگا ہونے کا گمان ہو رہا تھا۔

"یہ ڈیڈ پڑا ہے تو کیا ہوا.... دوسرا ملاؤ" پیردانش گرجا۔ دوسرا فون ملانے کے لیے دوسرا شخص دوسرے کونے کی طرف لپکا۔ اس کونے میں تپائی پر تار والا ٹیلی فون سیٹ رکھا تھا۔ سوٹڈ بوٹڈ شخص نے ذرا تحمل سے ریسیور اٹھا کر پہلے ڈائل ٹون سننے کی کوشش کی۔ نظر اس کی بھی ہم پر ہی تھی۔ اس نے دو تین مرتبہ فون کو کھٹکھٹایا۔ آخر وہ بھی ریسیور کو کریڈل پر رکھتے ہوئے پُرسکون اور گونجیلی آواز میں بولا "سائیں! یہ فون بھی ڈیڈ پڑا ہے۔"

نہ جانے کیوں اس بار پیردانش نے برہم ہونے کے بجائے بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ کم بخت گرگٹ کی طرح ہر پل رنگ بدل رہا تھا۔ اس نے گویا اس اطلاع سے محظوظ ہوتے ہوئے رحیم گل کی طرف دیکھ کر تفہیمی انداز میں سر ہلایا اور بڑے خوشگوار لہجے میں بولا "میں سمجھ گیا.... میں سمجھ گیا.... ہمارے چاروں ٹیلی فون ڈیڈ ہوں گے.... رحیم گل نام کا یہ چھوکرا کافی اسمارٹ ہے بابا! لگتا ہے کافی تیاری سے آیا ہے۔ خیر.... کوئی بات نہیں.... ٹیلی فون ڈیڈ ہیں تو کیا ہوا.... ابھی پیردانش تو ڈیڈ نہیں ہے نا...."

اس دوران میں نے دیکھا' پیردانش کے عقب میں کھڑے ہوئے سوٹڈ بوٹڈ شخص کا ہاتھ کوٹ کی جیب کی طرف رینگ رہا تھا۔ اس کی یہ حرکت رحیم گل سے بھی مخفی نہیں تھی۔ رحیم گل اپنے ہولسٹر سے گن نکالے بغیر مربیانہ انداز میں محض انگلی ہلا کر گویا کسی بچے کو شرارت سے باز رکھتے ہوئے بولا "نہ.... نہ.... پیارے....! دونوں ہاتھ جیبوں سے باہر رکھنا ورنہ تمہارا انجام اچھا نہیں ہو گا۔"

سوٹ والے نے پوری بات بھی نہیں سنی اور ہاتھ جیب میں لے گیا۔ شاید اسے اپنے انجام کی کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اس کے ہاتھ میں مجھے ایک چپٹے اور لمبوترے سے ٹی ٹی کی جھلک نظر آئی۔ میں اس سے پہلے گن نکال چکا تھا لیکن رحیم گل نے چلتے وقت مجھے نصیحت کی تھی کہ انتہائی ناگزیر حالت میں گولی چلاؤں۔

میرے لیے ناگزیر حالت اس وقت ہو سکتی تھی جب وہ ٹریگر دبانے لگتا۔ یعنی میں اسے مزید ایک آدھ لمحے کی مہلت دینے کے لیے تیار تھا۔

اس دوران اے ایس آئی اکرم نے عجیب کمال دکھایا۔ مجھے کم از کم اس سے اس کمال کی توقع نہیں تھی۔ وہ ادھیڑ عمر تھا اور بھاری بدن کا مالک تھا۔ موٹے شیشوں اور موٹے فریم کی عینک لگاتا تھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ وہ نیم دیہاتی اور مسکین قسم کا کلرک دکھائی دیتا تھا۔ اس قسم کی شخصیتوں سے انسان پھرتی کی توقع نہیں رکھتا لیکن اکرم نے محض پھرتی ہی نہیں دکھائی بلکہ میرے خیال میں پھرتی کا ایک حیرت انگیز ریکارڈ قائم کرلیا۔

وہ اپنی جگہ سے تقریباً اُڑتا ہوا اور پیر دانش کے صوفے کو پھلانگتا ہوا اس شخص تک پہنچا۔ اس وقت وہ شخص گن سیدھی بھی نہیں کرپایا تھا جب اکرم نے اس کی کلائی پر کراٹے کی چاپ رسید کی۔ گن اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر نہ جانے کہاں جاگری اور وہ ہلکی سی ایک چیخ کے ساتھ دوسرے ہاتھ سے اپنی کلائی تھام کر بیٹھ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی کلائی ٹوٹ چکی تھی۔

اکرم نے ایک لمحے بھی توقف نہیں کیا۔ اس کا وہی ہاتھ گھوما اور شلوار قمیص والے کی پیشانی پر پڑا کیونکہ وہ بھی قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر غالباً نیفے میں اڑسی ہوئی گن نکال چکا تھا۔ اس کی پیشانی پر چاپ پڑنے کا ردِعمل کچھ ایسا ہی ہوا جیسے ہتھوڑا پڑا ہو۔ وہ الٹ کر پیچھے جاگرا اور وہیں ساکت ہوگیا۔

اکرم کی پھرتی تو میرے لیے ناقابلِ یقین تھی ہی.... اس کا کراٹے میں اس درجہ ماہر ہونا مزید ناقابلِ یقین تھا۔ میں نے وہیں دم بخود کھڑے رہ کر وقت ضائع نہیں کیا۔ اس دوران باہر سے کچھ دوڑتے قدموں کی آوازیں سنائی دیں۔ حالانکہ کمرے میں کوئی شور شرابا نہیں ہوا تھا لیکن شاید باہر والوں کو کسی طرح احساس ہوگیا تھا کہ اندر کوئی گڑبڑ تھی۔

میں دروازے کے قریب ہی تھا۔ میں ذرا اور پیچھے ہو کر دیوار سے چپک کر کھڑا ہوگیا۔ ایک کلاشنکوف بردار دوڑتا ہوا کمرے میں داخل ہونے لگا تو میں نے اچانک ٹانگ آگے کردی۔ وہ ٹانگ میں الجھ کر گرنے لگا اور مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ اس عالم میں ٹریگر نہ دبا دے۔ میں نے اس کی کنپٹی پر اپنی گن کا دستہ رسید کیا۔ وہ اوندھے منہ اپنی کلاشنکوف کے اوپر گرا اور وہیں ساکت ہوگیا۔

رحیم گل دروازے کی سیدھ میں تھا۔ وہ بھی اپنی گن نکال چکا تھا۔ اسے غالباً کوئی اور بھی دروازے کی طرف آتا دکھائی دیا تھا کیونکہ اس نے گن اونچی کرتے ہوئے نہایت بارعب اور بلند آواز میں حکم دیا تھا "خبردار.....! اندر مت آنا ورنہ گولی ماردوں گا۔"

باہر دوڑتے قدموں کی آوازیں ختم ہو گئیں۔ رحیم گل، پیر دانش کی طرف دیکھے بغیر اس سے مخاطب ہوا "اپنے آدمیوں سے کہو ہتھیار پھینک دیں..... تمہارا مکان اس وقت پولیس کے گھیرے میں ہے۔ اگر اندر ایک بھی گولی چلی تو میرے آدمی دروازے توڑ کر یا دیواریں پھاند کر اندر آجائیں گے..... اور میں نہیں کہہ سکتا کہ کتنی لاشیں گریں۔ اس کے ذمے دار صرف تم ہوگے۔"

ہمارا چوتھا ساتھی اے ایس آئی اس کے قریب ہی ایک گھٹنے کے بل کھڑے ہو کر صوفے کی آڑ میں گن تانے ہوئے تھا۔ شاید اب پیر دانش کو دل ہی دل میں تسلیم کرنا پڑا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین معلوم ہوتا تھا اور اس کے مسلح آدمیوں کا ریوڑ یا اس کا رعب و داب بھی کچھ خاص کام نہیں آسکتا تھا۔

میں دروازے پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کا بھی جائزہ لے رہا تھا۔ میں نے اس کی رنگت متغیر ہوتے اور چہرے پر فکر مندی کے آثار نمودار ہوتے محسوس کیے لیکن وہ اپنے رویے میں اب بھی کوئی تبدیلی لانے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ نفرت و حقارت سے بولا "لاشیں تو ضرور گریں گی رحیم گل..... اور ان میں تمہاری لاش ضرور ہوگی۔"

اسی لمحے اندر کی طرف کھلنے والے دروازے کا پردہ ہلا۔ میں نے تیزی سے اپنی گن کا رخ ادھر کرلیا لیکن ادھر سے کسی کلاشنکوف بردار کے بجائے پیر دانش کی ماں کمرے میں آگئی۔ اپنے چھ فٹ سے نکلتے ہوئے قد اور پہلوانوں جیسے بھاری بھرکم وجود کے باوجود وہ نہایت ہی ہلکے پھلکے انسانوں کی طرح گویا ہوا کے دوش پر ہلکورے لیتی ہوئی اندر آئی تھی۔ اس کے دائیں بائیں موجود رہنے والی نوخیز سی لڑکیاں اس وقت اس کے ساتھ نہیں تھیں۔

گو کہ اس وقت گاڈمدر کی آنکھیں بھی انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں لیکن جب وہ بولی تو اس کے لہجے میں نرمی تھی گو کہ انداز تحکمانہ ہی تھا۔ "کوئی بھی گولیاں چلانے اور لاشیں گرانے کی بات نہ کرے" وہ ہاتھ اٹھائے ہوئے گویا چھوٹے چھوٹے بچوں کو ہاتھا پائی سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے بولی۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اب تک کمرے میں ہونے والی تمام گفتگو سنتی رہی تھی۔ وہ جہاں کہیں بھی تھی، شاید تمام آوازیں اسے پہنچتی رہی تھیں۔ یہ بھی بعید نہیں تھا کہ ہمارے اس کمرے میں پہنچتے ہی وہ بھی برابر کے کمرے میں پہنچ چکی ہو۔

کمرے کا منظر پہلے بھی تقریباً ساکت ہی تھا۔ اب سکوت کچھ اور گہرا ہوگیا۔ گاڈمدر نے گردن گھما کر اپنے لاڈلے بیٹے کی طرف دیکھا اور اسے ہلکی سی ڈانٹ پلانے کے انداز میں بولی "تم دیر سے بک بک کیے جارہے ہو۔ ابھی تک تمہیں انسپکٹر سے یہ پوچھنے کی توفیق نہیں ہوئی کہ یہ تمہیں کس الزام میں گرفتار کرنا چاہتا ہے۔"

گاڈمدر کے آتے ہی پیر دانش کچھ اس طرح مؤدب، سہما ہوا اور سکڑا سمٹا سا دکھائی دینے لگا تھا جیسے پرائمری اسکول کے کلاس روم میں کوئی شریر اور فسادی بچہ کسی سے دست بہ گریباں ہو اور اچانک ہی ہیڈ ماسٹر صاحب سر پر آن پہنچے ہوں۔

ماں کی بات سن کر اس نے گہری سانس لے کر کھا جانے والی نظروں سے رحیم گل کی طرف دیکھا اور بارعب لہجے میں پوچھا "ہاں..... تم مجھے کس الزام میں گرفتار کرنا چاہتے ہو؟" پھر اس نے گویا مزید تحمل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی طرف سے اضافہ کیا "وارنٹ ہے تمہارے پاس؟"

رحیم گل کے گن والے ہاتھ میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔ دوسرے ہاتھ سے اس نے جیب سے ایک تہ شدہ کاغذ نکالا۔ اسی ہاتھ سے ہوا میں جھٹکا دے کر اس نے اسے کھولا اور لہراتے ہوئے کہا "ان تکلفات کی تم جیسے آدمیوں کے معاملے میں کوئی ضرورت تو نہیں ہوتی لیکن میں نے احتیاطاً یہ خانہ پُری بھی کر رکھی ہے۔ یہ ہے تمہاری گرفتاری کا وارنٹ..... اور جہاں تک تمہارے جرائم کا تعلق ہے تو ان کی فہرست اتنی لمبی ہے کہ اگر میں پڑھنے بیٹھ گیا تو شام ہوجائے گی۔ ان میں سے بعض اتنے شرمناک ہیں کہ اگر کسی اور ماں بیٹے کے سامنے پڑھے جائیں تو وہ دونوں شرم سے ڈوب مریں لیکن مجھے معلوم ہے تم دونوں میں سے کوئی بھی اتنا باغیرت نہیں....."

پیر دانش نے ایک بار پھر جلال میں آنے کی کوشش کی۔ وہ بُری طرح بھڑک کر ہاتھ نچاتے ہوئے بولا "تم میری شان میں جتنی گستاخیاں کرچکے ہو تمہاری موت کا سامان کرنے کے لیے وہی کافی ہیں لیکن اگر تم نے میری ماں کی شان میں گستاخی کی تو میں ساری احتیاط بالائے طاق رکھ دوں گا اور....."

اس دوران باہر کھٹ پٹ کی آوازیں سنائی دیں۔ رحیم گل پُرسکون لہجے میں بولا "تمہارے آدمی کمرے کے آس پاس جمع ہورہے ہیں۔ ان سے کہو کوئی غلط حرکت نہ کریں۔ یہ تم سب کی زندگی کا سوال ہے۔ میں چاہتا ہوں تم زندہ میرے ساتھ چلو۔"

رحیم گل نے پیر دانش کو مخاطب کیا تھا لیکن جواب اس کی ماں نے دیا۔ وہ رحیم گل سے بھی زیادہ پُرسکون لہجے میں بولی "یہ تو زندہ ہی یہاں سے جائے گا اور زندہ ہی واپس آجائے گا۔ سوچنا تو تمہیں اپنے بارے میں چاہیے۔"

"تمہارا خیال ہے میں بغیر سوچے سمجھے ہی آگیا ہوں؟" رحیم گل ایک نظر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"بعض اوقات انسان یہی سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ کوئی کام بہت سوچ سمجھ کر کررہا ہے لیکن درحقیقت اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ختم ہوچکی ہوتی ہیں۔ وہ کسی ٹرانس میں ہوتا ہے" گاڈمدر ملائمت سے بولی۔

باہر سے اب بھی دبے دبے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رحیم گل ذرا سخت لہجے میں بولا "تمہارے آدمی سمجھ رہے ہیں کہ ہم ان کے گھیرے میں ہیں لیکن ان احمقوں کو یہ احساس نہیں ہے کہ یہ سب خود بھی پولیس کے گھیرے میں ہیں۔ اگر ہمیں کوئی نقصان پہنچا تو اس گھر میں کوئی بھی زندہ نہیں بچے گا۔"

گاڈمدر نہایت مربیانہ انداز میں مسکرائی "یہ سب انسان نہیں..... روبوٹس ہیں۔ انہیں اپنی زندگی موت سے کوئی دلچسپی نہیں۔ ان کے ذہن کے کمپیوٹر میں صرف ایک ہی پروگرام فیڈ کیا گیا ہے اور وہ یہ کہ ان کے ہوتے ہوئے ہم ماں بیٹے کو کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ ان کا کیا بنے گا؟ اس بارے میں کمپیوٹر کو کچھ معلوم نہیں بہرحال..... تمہاری بات معقول ہے..... تم ایک کام کرنے پر تلے ہوئے ہو..... اور ہم ماں بیٹا حرام موت مرنا نہیں چاہتے۔ اس لیے میں انہیں منع کردیتی ہوں....."

اس نے دروازے کی طرف منہ کر کے بہ آواز بلند پکارا "تم سب لوگ اپنی اپنی جگہ واپس جاؤ۔ کوئی گھر سے باہر نہ جائے۔ کوئی آدمی اس وقت تک کچھ نہ کرے جب تک میں حکم نہ دوں۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں صرف بات چیت ہورہی ہے" اس کی آواز یکدم اتنی بھاری اور گونجیلی ہوگئی تھی کہ اس وقت وہ بغیر لاؤڈ اسپیکر کے اچھے بھلے مجمع سے خطاب کرسکتی تھی۔

گاڈمدر یقیناً بیٹے سے بہت مختلف حکمتِ عملی لے کر سامنے آئی تھی۔ باہر قدموں کی آہٹیں دور جاتی سنائی دیں۔ کمرے میں دو آدمی بے ہوش پڑے تھے۔ گاڈمدر نے ان کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں دی تھی البتہ اس نے اس سوٹڈ بوٹڈ شخص کی طرف دیکھا جو ابھی تک اپنی کلائی پکڑے بیٹھا تھا۔ غالباً اپنی کراہیں دبانے کے لیے اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبایا ہوا تھا۔ اس کے چہرے پر پسینہ تھا۔

"تم بھی باہر جاؤ" گاڈمدر نے اسے حکم دیا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا اور باہر کو چل دیا۔ رحیم گل نے اس کے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کیا لیکن جب اس کے جانے کے بعد گاڈمدر آگے بڑھ کر دروازہ بند کرنے لگی تو رحیم گل تیزی سے بول اٹھا "دروازہ بند کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔"

گاڈمدر کے بازو اپنی جگہ ساکت ہوگئے لیکن وہ دروازے سے ہاتھ ہٹائے بغیر اور پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر ملائمت سے بولی "ہوسکتا ہے ہمیں کوئی رازدارانہ بات کرنی پڑ جائے۔"

"یہاں کوئی رازدارانہ بات نہیں ہوگی۔ ہر بات آن ریکارڈ رہ سکتی ہے" رحیم گل غیر متزلزل لہجے میں بولا۔

گاڈمدر نے گہری سانس لی اور پلٹتے ہوئے ملائمت سے بولی "تم واقعی بہت ضدی نوجوان ہو۔"

"بعض معاملات میں ضدی ہونا انسانیت کے حق میں بھلا ہوتا ہے" رحیم گل نے جواب دیا۔

"آرام سے بیٹھ جاؤ اور گنیں نیچی کرلو۔ معزز اور بڑے لوگ سنگین معاملات کو بھی آرام سے بیٹھ کر مہذبانہ ماحول میں طے کیا کرتے ہیں" گاڈمدر کے لہجے میں ملائمت برقرار تھی۔

"میں زیادہ بڑا اور زیادہ معزز آدمی نہیں ہوں" رحیم گل قدرے رکھائی سے بولا "ایک معمولی سا انسپکٹر ہوں۔ اس علاقے کے تھانے کا انچارج ہوں، محض ایک اسٹیشن ہاؤس آفیسر.... ایس ایچ او.... ابھی کچھ ہی دیر پہلے تمہارا بیٹا مجھے میری اوقات یاد دلا چکا ہے۔"

"تمہیں دانش کی باتوں کا برا نہیں منانا چاہیے۔ یہ بڑا جذباتی بچہ ہے" گاڈمدر نے پیار بھری سرزنش کے انداز میں کہا۔

اس کا چالیس سالہ بن مانس نما "بچہ" ذرا منہ پھلا کر بولا "ماما! اب آپ مجھے دوسرے کے سامنے ڈی گریڈ مت کیجیے گا۔ خاص طور پر اس انسپکٹر کے سامنے...." اس نے آنکھوں ہی آنکھوں سے رحیم گل کی طرف اشارہ کیا۔

"زیادہ چیں چیں مت کرو اور خاموشی سے بیٹھ جاؤ" گاڈمدر نے اسے پیار سے ڈانٹا اور وہ ذرا روٹھے روٹھے انداز میں.... مگر بہر حال سعادت مندی سے بیٹھ گیا۔

گاڈمدر ہم سب سے مخاطب ہوئی "تم لوگ بھی بیٹھ جاؤ نا۔"

"ہم یہاں بیٹھنے نہیں آئے ہیں" رحیم گل نے گویا اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ "تم اپنے لاڈلے بچے کو میرے ساتھ روانہ کردو۔ میں یہاں مزید وقت ضائع کرنا افورڈ نہیں کرسکتا۔"

"اگر ضروری ہوا تو دانش تمہارے ساتھ چلا جائے گا۔ ایسی جلدی بھی کیا ہے" گاڈمدر نے گویا اسے تسلی دی اور اپنے لبے سے لبادے کی لمبی سی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ فوراً ہم چاروں کی گنوں کا رخ اس کی طرف ہوگیا۔ اس عورت سے کچھ بعید نہیں تھا کہ ہم لوگوں کی ایک لمحے کی غفلت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے اس بھاری بھرکم لبادے کی اس زنبیل نما جیب سے کوئی ٹی ٹی یا ماؤزر وغیرہ نکالتی اور پل بھر میں ہم چاروں کو ٹھنڈا کردیتی۔ وہ جنات کی نسل سے معلوم ہوتی تھی۔

اس نے ہمارے انداز پر ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کا ڈبل روٹی نما ہاتھ باہر آیا تو اس میں ایک سگار اور طلائی لائٹر بیک وقت دبا ہوا تھا۔ مجھ سمیت شاید چاروں نے غیر محسوس طور پر اطمینان کی سانس لی تھی۔ میں نے اپنی گن کا رخ ایک بار پھر باہر کی طرف کرلیا۔ میں دروازے کی اوٹ سے باہر نظر رکھے ہوئے تھا۔ باہر سے ہونے والی ہر قسم کی یلغار کو روکنا میرے ذمے تھا لیکن باہر اب سکون تھا۔ کسی یلغار کے کوئی آثار نہیں تھے۔

گاڈمدر نے نہایت مشاقی سے سگار کی سیلوفین اتار کر پھینکی۔ دانتوں سے ایک سرا توڑ کر "تھوہ" کرکے ایک طرف پھینکا اور خوبصورت لائٹر سے اسے سلگا کر طویل کش لیا۔ میں نے سگار پینے والی ایک آدھ عورت زندگی میں اور دیکھی تھی لیکن ایسی ماں اور بیٹا زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے جو دونوں ہی سگار پیتے تھے۔

طویل کش لینے کے بعد گاڈمدر اطمینان سے ایک صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔ وہ دونوں ماں بیٹا شاہانہ انداز میں بیٹھے چکے تھے اور ہم چاروں گنیں سنبھالے الرٹ کھڑے تھے۔ ایک لمحے کے لیے میں نے اپنے آپ کو سخت احمق محسوس کیا۔ مجرم نہایت مطمئن اور بے پروا نظر آرہے تھے جب کہ قانون کے محافظ اپنے اعصاب پر بے پناہ بوجھ لیے کھڑے تھے۔

"آخر بیٹھ جانے میں کیا حرج ہے؟" گاڈمدر نے ایک بار پھر ملائمت سے پوچھا۔

"آخر تم کیوں ہمیں بٹھانے پر تُلی ہوئی ہو؟ ہم کمرے میں کھڑے ہیں.... الیکشن میں تو نہیں کھڑے.... کہ ہمیں بٹھانا تمہاری نظر میں اتنا ضروری ہوگیا ہے؟" رحیم گل بھی ویسی ہی ملائمت سے بولا۔

گاڈمدر نے اپنے پہلوانوں جیسے کندھے اُچکائے اور سگار کا مزید ایک کش لے کر بولی "اصل میں تمہارا قصور نہیں.... تم نوکر پیشہ لوگوں کو کھڑے رہنے کی کچھ زیادہ ہی عادت ہوتی ہے۔ میں چاہتی تھی ہم سب معزز لوگوں کی طرح آرام و سکون سے بیٹھ کر بات چیت کریں اور اس مسئلے کو حل کریں۔"

"تمہارے خیال میں یہاں کون سا مسئلہ ہے جو حل طلب ہے؟" رحیم گل نے آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

"ہمارا واحد مسئلہ تو اس وقت صرف تم ہو" گاڈمدر نے صاف گوئی سے کہا "اور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ تمہیں یک بیک دانش کو گرفتار کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی ہے اور اس سے تمہیں کیا حاصل ہوگا؟"

رحیم گل نے تھکے تھکے انداز میں گہری سانس لی "اگر تمہیں قانون، اخلاقیات اور معاشرتی نظام کے بارے میں ذرا سا بھی شعور ہے تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ پولیس کا محکمہ کیوں بنایا گیا ہے اور وہ مجرموں کو کیوں پکڑتا ہے۔"

گاڈمدر نے ایک لمحے کے لیے سر جھکالیا اور سگار کو انگلیوں میں گھماتے ہوئے غور سے دیکھتی رہی پھر سر اٹھا کر گہری سانس لے کر بولی "بعض پولیس افسر جب جوانی میں پولیس کے محکمے میں آتے ہیں تو ان کے دماغوں میں اس قسم کے بہت سے خنّاس ہوتے ہیں۔ وہ معاشرے کی اصلاح.... قانون کی سربلندی.... اور اس طرح کی دوسری نہ جانے کیا کیا خواب و خیال کی باتیں دہراتے رہتے ہیں لیکن بعد میں ٹھیک ہوجاتے ہیں۔ نمک کی کان میں نمک ہوجاتے ہیں۔ انہیں پتا چل جاتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کرسکتے...."

"لیکن بعض "ٹھیک" نہیں بھی ہوتے" رحیم گل نے لقمہ دیا۔

گاڈمدر گویا اس کی بات سنے بغیر سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے بولی۔ "آئیڈیل ازم کا شکار لوگ اب بہت کم پائے جاتے ہیں۔ روز بہ روز ان کی تعداد کم ہوتی جارہی ہے۔ آج کی سوسائٹی میں وہ مجوبہ لگتے ہیں۔ ان کی اپنی اولادیں بھی انہیں گالیاں دیتی ہیں۔ زیادہ تر تو صاحبِ اولاد ہونے سے پہلے ہی آئیڈیل ازم کے دورے سے

چھٹکارا پالیتے ہیں۔ ہماری بدقسمتی ہے کہ تم اس زمانے میں ہم سے ٹکرا گئے ہو جب تم پر یہ دورہ پڑا ہوا ہے۔"

"ہاں.... یہ تو ٹھیک ہے" رحیم گل نے تائید کی "یہ تمہاری بدقسمتی ہے۔"

"لیکن میرا مخلصانہ اور دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ تمہیں زیادہ جلد بازی سے کام نہیں لینا چاہیے۔ ابھی تمہیں ملازمت کرتے ہوئے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے ہوں گے اور تم نے اتنے بڑے بڑے لوگوں پر ہاتھ ڈالنا شروع کردیا" گاڈمدر ترحم آمیز نظروں سے رحیم گل کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"میری ملازمت سات سال پرانی ہوچکی ہے" رحیم گل نے اسے مطلع کیا "اور میری اسپیشلٹی ایسے ہی لوگوں پر ہاتھ ڈالنا ہے جن کے بارے میں سمجھا جاتا ہے کہ وہ مادر پدر آزاد ہیں۔ انہیں کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ میں ایسے ہی لوگوں کو پکڑ کر روحانی خوشی محسوس کرتا ہوں۔ اسی لیے ابھی تک صرف انسپکٹر ہوں۔ پبلک سروس کمیشن کے تھرو میں ڈی ایس پی بھرتی ہوا تھا۔ اب تک مجھے ایس پی ہوجانا چاہیے تھا لیکن میں اپنی دیانتداری کے "خناس" اور بڑے لوگوں پر ہاتھ ڈالنے کے شوق کی وجہ سے ڈیموٹ ہو کر انسپکٹر ہوگیا ہوں۔ پولیس کے محکمے میں اس قسم کی مثال شاید ہی کوئی اور ہو۔"

گاڈمدر نے گویا اس کی بات سے واقعی دلی طور پر محظوظ ہوتے ہوئے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا۔ پیر دانش بھی مسکراتے ہوئے یوں اس کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے کسی عجیب مخلوق کے نظارے سے محظوظ ہو رہا ہو۔

گاڈمدر کی ہنسی تھمی تو وہ بولی "پھر تو تمہاری بیماری کافی پرانی معلوم ہوتی ہے۔ اگر یہی حال رہا تو کہیں تم ترقی کرتے کرتے کانسٹیبل یا اردلی نہ بن جاؤ۔"

"میں اس حیثیت میں بھی جو کچھ کرسکا، کرتا رہوں گا" رحیم گل بولا۔

"یقین نہیں آتا کہ تم جیسے پاگل آج کے دور میں بھی پائے جاتے ہیں" گاڈمدر نے متاسفانہ انداز میں سر ہلایا "نہ صرف پائے جاتے ہیں بلکہ مختلف محکموں میں بھی گھس آتے ہیں۔"

"یہ قدرت کا اپنا ایک نظام ہے" رحیم گل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"ہنہہ.... اب تم ہمارے گلے پڑ ہی گئے ہو تو ہمیں کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا...." گاڈمدر کے لہجے میں یکدم ہی سرد مہری اور تیکھا پن جھلک آیا۔ چند لمحے کے لیے اس کے لہجے میں جو خوشگواری آئی تھی وہ اچانک ہی غائب ہوگئی "تم جیسے احمق اور کوئی کارنامہ کر گزرنے کے شوقین لوگوں سے یوں تو کسی بھی حماقت کی توقع رکھی جاسکتی ہے لیکن مجھے یقین ہے دانش پر ہاتھ ڈالنے کا فیصلہ تم نے پھر بھی بہت سوچ سمجھ کر کیا ہوگا؟"

"اپنی دانست میں تو میں ہر کام ہی بہت سوچ سمجھ کر کرتا ہوں" رحیم گل نے جواب دیا۔

"تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ آدمی کو گرفتار کرلینا اور بات ہے.... اس کے جرم کو ثابت کرنا اور بات؟" وہ نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"جی ہاں۔ مجھے معلوم ہے ملکۂ عالیہ!" رحیم گل بظاہر مؤدبانہ لیکن درحقیقت استہزائیہ انداز میں گردن کو خم دیتے ہوئے بولا۔

"زیادہ کامیڈین بننے کی ضرورت نہیں" پیر دانش غرایا۔

گاڈمدر نے ایک بار پھر اسے پیار بھرے انداز میں ڈانٹا "میں نے تمہیں خاموش رہنے کے لیے کہا تھا۔ یہ معاملات تمہارے بولنے کے نہیں ہیں۔ ان میں صرف مجھے ہی بولنے دو۔"

پیر دانش خونخوار نظروں سے رحیم گل کو گھور کر رہ گیا۔ گاڈمدر دوبارہ رحیم گل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولی "الزامات کی فہرست تم بہت لمبی بتا رہے ہو۔ تم نے یقیناً خاطر خواہ ثبوت جمع کرلیے ہوں گے؟"

"ظاہر ہے" رحیم گل بولا "میں آئیڈیلسٹ ضرور ہوں لیکن احمق نہیں ہوں۔ دوسرے ثبوت تو اپنی جگہ ہیں لیکن میرے پاس تو ایک چلتا پھرتا، زندہ سلامت ثبوت بھی موجود ہے۔ آخر مجھے یونہی تو تمہارے چہیتے بیٹے کی گرفتاری کا وارنٹ نہیں مل گیا؟" اس نے اپنی جیب تھپتھپائی جس میں وہ وارنٹ واپس رکھ چکا تھا اور جسے کسی نے بھی ایک نظر دیکھنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ صرف مجھے معلوم تھا کہ وہ وارنٹ جعلی تھا۔ وہ رحیم گل کی اپنی کاریگری تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ پیر دانش جیسے آدمیوں سے نمٹنے کے لیے ہر حربہ جائز تھا۔

"چلتا پھرتا.... زندہ سلامت ثبوت....!" گاڈمدر نے زیرِ لب دہرایا۔ میرے خیال میں رحیم گل کو اس صورت حال میں بھی اپنی زبان اور اپنے اعصاب پر بڑا قابو تھا لیکن یہ چلتے پھرتے اور زندہ سلامت ثبوت والی بات وہ خواہ مخواہ ہی کر گیا تھا۔ یہ ایک غیر ضروری بات تھی لیکن جہاں بک بک زیادہ ہوتی ہے وہاں کوئی نہ کوئی غیر ضروری بات بہرحال زبان سے نکل ہی جاتی ہے۔

پیر دانش اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے ایک بار پھر بے تاب ہو کر چلایا "میں سمجھ گیا ہوں یہ سب اس حرامزادے افضل چوہدری کی بدمعاشی ہے۔ تم بھی اسی کے بل بوتے پر زیادہ اکڑ رہے ہو۔ مجھے پتا چلا ہے تمہاری اس سے دوستی ہے...." وہ رحیم گل سے مخاطب تھا پھر اس نے افضل چوہدری کو دو تین اور موٹی موٹی گالیاں دیں۔ مجھے غصہ تو بہت آیا۔ دل چاہا کہ گن کی نال اس کی کنپٹی پر رکھ کر اس کی کھوپڑی اڑا دوں لیکن مسئلہ یہ تھا کہ میں اس وقت افضل چوہدری نہیں، سب انسپکٹر نصیر تھا۔ افضل چوہدری کو گالیاں پڑتے سن کر صبر کرنا ہی میرے لیے بہتر تھا۔

رحیم گل نے میری طرف نہیں دیکھا۔ اس کی نظر بدستور پیر

دانش پر جمی رہی اور وہ مسکراتے ہوئے بولا "اتنی موٹی موٹی گالیاں مت دو۔ عین ممکن ہے اس تک پہنچ جائیں۔"

"تم ہی پہنچاؤ گے... اور کون پہنچائے گا" پیر دانش جل کر بولا "بلکہ عین ممکن ہے تم نے اپنی جیبوں میں کچھ الیکٹرانک آلات چھپا رکھے ہوں جن کی مدد سے وہ یہ ساری کارروائی اپنے دفتر میں بیٹھا سن رہا ہو۔"

"اس قسم کی بیماریاں تمہیں لاحق ہیں۔ میں اتنے تردد میں نہیں پڑتا" رحیم گل منہ بنا کر بولا "ویسے بھی افضل سے میرے ایسے تعلقات نہیں ہیں کہ میں اسے اپنے فرائض میں ٹانگ اڑانے کا موقع دوں لیکن اگر تم اس سے الجھو گے... یا الجھ چکے ہو... یا اس کے پاس تمہارے خلاف کوئی کارآمد ثبوت ہوا تو میں اسے بھی عدالت میں لانے کی کوشش ضرور کروں گا..."

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "ویسے تم ہو تو بڑی جنّتی قسم کی مخلوق... اس قابل تو نہیں ہو کہ تمہیں کوئی دوستانہ یا مخلصانہ مشورہ دیا جائے... اس کے باوجود میں تمہیں مشورہ دے رہا ہوں کہ تم افضل چوہدری سے نہ الجھنا... تم جتنے لوگوں سے الجھ چکے ہو اور جتنی چیزوں میں تمہاری ٹانگ پھنسی ہوئی ہے' اتنا ہی کافی ہے۔ یہی سب کچھ تمہیں پھانسی کے پھندے تک پہنچا دے گا۔"

پیر دانش نے اس کی بات سے خوفزدہ یا فکر مند ہونے کے بجائے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا اور خوشدلی سے بولا "جب پھانسی کے تختے پر چڑھنا ہی ٹھہرا تو پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ جب مرنا ہی مقدر ہو تو پھر دل کے ارمان نکال کر مرنا چاہیے۔"

"تم جیسے تمام ٹیڑھے دماغ والوں اور ابلیسی فطرت رکھنے والوں کی یہی ذہنیت ہوتی ہے کہ جب مرنا ہی ہے تو دنیا کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچا کر مرو... حالانکہ انسان یہ بھی سوچ سکتا ہے کہ موت تو مقدر ہو ہی چکی ہے' آخری لمحوں میں ہی دو چار نیکیاں کرلی جائیں' شاید گناہوں کا بوجھ رتی دو رتی کم ہی ہو جائے لیکن تم جیسے لوگوں کا چونکہ خدا اور آخرت پر یقین نہیں ہوتا اس لیے مرتے مرتے بھی دنیا میں زیادہ سے زیادہ شر پھیلا کر مرنا چاہتے ہو۔ اسی لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ تم جیسے لوگوں کو جتنی بھی جلد ممکن ہوسکے' دوسری دنیا کی طرف روانہ کردیا جائے۔ تم جیسے لوگ جتنی جلدی جہنم رسید ہوتے ہیں' دنیا میں فساد کم ہونے کی امید اتنی ہی قوی ہوتی ہے۔"

"اے مولوی صاحب!" گاڈ مدر نے استہزائیہ انداز میں اسے اپنی طرف متوجہ کیا "تم یہاں دانش کو گرفتار کرنے کا شوق پورا کرنے آئے تھے۔ موقع ملتے ہی تم نے وعظ شروع کردیا۔ مجھے نہیں معلوم تھا تمہارے بغیر داڑھی کے چہرے کے پیچھے کوئی مولوی چھپا ہوا ہے۔"

"میں مولوی کہاں ہوسکتا ہوں۔ میں تو بہت گناہ گار سا انسان ہوں۔ پیر دانش کو گرفتار کرنے کا بھی مجھے کوئی شوق نہیں ہے۔ اس کے اعمال اور میرے فرض کا تقاضا ہے کہ میں اسے گر کرکے عدالت میں پیش کروں" رحیم گل نے نہایت متانت وقار سے جواب دیا۔

"بس تو پھر اصل موضوع پر بات جاری رکھو۔ اِدھر اُدھر کی کیا ضرورت ہے" گاڈ مدر بولی۔

"بات آخر کب تک جاری رہے گی؟" رحیم گل قدر بیزاری سے بولا "مجھے مجبور مت کرو کہ میں تمہارے اس چہیتے کو گریبان سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے جاؤں۔ باتیں بہت ہو چکیں اب تم اسے لالی پاپ دے کر میرے ساتھ بھیج ہی دو۔"

گریبان پکڑ کر گھسیٹنے کی بات پر گاڈ مدر اور پیر دانش' دونوں رنگت ایک لمحے کے لیے متغیر ہوگئی لیکن پیر دانش کچھ نہیں گاڈ مدر بھی نرم لہجے میں بولی "لالی پاپ میں اسے نہیں۔ تم دینا چاہتی ہوں۔ دیکھو... ہم اس موضوع پر کئی زاویوں سے کرچکے ہیں۔ اب ایک اور زاویے سے بھی بات کرلیتے ہیں۔ اگر روپے پیسے کا ہے تو اس کے لیے اتنے گھماؤ پھراؤ کی ضرور نہیں۔ آرام سے بیٹھ کر سیدھی طرح بات ہوسکتی ہے۔"

"اوہ... میرے خدا...!" رحیم گل نے ایک طویل سا لی۔ اس کے تنے ہوئے کندھے ایک لمحے کے لیے ڈھیلے پڑ "جس موضوع سے میں بچنا چاہتا تھا' آخر کار تم اسے کھینچ کھانچ لے ہی آئیں۔"

"جہاں پولیس ہوگی وہاں روپے پیسے کی بات تو ہوگی" گاڈ بولی۔

"لیکن جہاں رحیم گل ہوگا وہاں روپے پیسے کی بات نہ ہوگی" رحیم گل کے الفاظ گویا پتھر پر لکیر تھے۔ رحیم گل کی باتوں اس وقت مجھے کچھ ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے اس میں میری سما گئی تھی۔ شاید اسی لیے میری اس سے اتنی گہری دوستی ا ہو چکی تھی۔ اس کے اور میرے افکار و نظریات بہت ملتے تھے دونوں گناہ گار سے انسان ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر تھوڑی انسانیت کو زندہ رکھنے کے لیے کوشاں تھے۔

"دیکھو... ضد نہ کرو" گاڈ مدر کے لہجے میں بیک وقت الت التجا بھی تھی اور مبہم سی دھمکی بھی۔

"تمہارا خیال ہے کہ میں اتنی تیاری کرکے... اتنا لاؤ لشکر کر محض اس لیے آیا ہوں کہ تم ماں بیٹے کے ساتھ اتنی دیر بک کرنے کے بعد رقم لے کر بے شرموں کی طرح رخصت ہو جاؤں" رحیم گل گویا اس کی ذہنیت پر ترس کھاتے ہوئے بولا۔

"اس قسم کے اہتمام اور انتظام صرف اپنی قیمت بڑھا کے لیے ہوتے ہیں" گاڈ مدر اطمینان سے بولی "تم اپنی منہ مانگی قیمت دی جائے گی۔ ہم تو پہلے بھی بڑی مناسب تمہاری خدمت کرنے کے بارے میں سوچ رہے تھے لیکن اگر

نہ مانگی قیمت لینا چاہتے ہو تو ہمیں اس پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔"

ایک لمحے کے لیے مجھے شبہ محسوس ہوا کہ رحیم گل آگے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ رسید کردے گا لیکن اس نے ضبط سے کام لیا۔ خود میرے ہاتھوں میں بڑی دیر سے کھجلی سی ہو رہی تھی لیکن یہاں ہاتھاپائی اور دھینگا مشتی والے حالات نہیں تھے۔ یہاں اگر کوئی جھگڑا شروع ہوتا تو گولیاں ہی چلنی تھیں۔ تھپڑ' لاتیں اور گھونسے وغیرہ نہیں۔

"کبھی کبھی مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے..." رحیم گل بُردباری سے بولا "تم جیسے لوگ اس طرح کی بات کچھ اس انداز سے کرتے ہیں جیسے انہیں یقین ہو کہ اس دنیا میں ہر انسان بِکتا ہے۔"

"ہاں۔ اس دنیا میں ہر انسان بِکتا ہے" گاڈ مدر بلا تامّل بولی "فرق صرف قیمت کا ہوتا ہے۔ بعض انسان صرف اس لیے بِکنے سے رہ جاتے ہیں کہ ان کی وہ قیمت نہیں لگائی جاتی جو وہ چاہ رہے ہوتے ہیں۔ میں تمہاری وہ قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں جو تمہارے دل میں ہے۔ بولو تو سہی۔"

"اچھا... تو پھر سنو۔ میری قیمت یہ ہے کہ تم اپنی تمام دولت و جائداد ان لوگوں میں یا ان کے لواحقین میں تقسیم کردو جن کی زندگیاں تمہارے بیٹے کی وجہ سے برباد ہوگئیں یا جو اس کے اشارے پر قتل کردیے گئے۔ مجھے ایک پیسا بھی مت دو۔ تم دونوں ماں بیٹے اپنی تمام دولت و جائداد ان لوگوں میں بانٹ دو۔ میں پیر دانش کو چھوڑ دوں گا۔ تم دونوں ماں بیٹا خالی ہاتھ جھاڑ کر نئے سرے سے زندگی کا آغاز کرو" رحیم گل نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

گاڈ مدر نے استہزائیہ انداز میں ہلکا سا قہقہہ لگایا اور آنکھیں سکیڑتے ہوئے سگار کا ایک گہرا کش لینے کے بعد بولی "افسانوی باتیں مت کرو... لیکن میرا خیال ہے میری نصیحت فضول ہے۔ تمہارا کومپلیکس ہی اصل میں یہی ہے... افسانوی آدمی بننے کی کوشش کرنا۔"

"مجھے اس کے لیے کوشش نہیں کرنا پڑتی" رحیم گل مسکرایا "میں بنا بنایا ایسا ہی آدمی ہوں جو آج کے دور میں تم جیسے لوگوں کو افسانوی لگتا ہے۔"

"چلو... خیر... کوئی بات نہیں۔ ہم افسانوی سے آدمی کی افسانوی سی قیمت لگا دیں گے۔ شاید اتنی قیمت آج تک کسی انسپکٹر کی نہیں لگائی گئی ہوگی... مگر اب تم اتنے بھی زیادہ افسانوی مت بنو کہ ہماری تمام دولت جائداد نہ جانے کن کن ان دیکھے' ان جانے لوگوں میں بانٹنے کی باتیں کرنے لگو۔ اگر تمہیں پیر دانش کو یہاں چھوڑ کر جانا گوارا نہیں ہے تو ٹھیک ہے... تم اسے لے جاسکتے ہو۔ میں اسے تمہارے ساتھ بھیج دیتی ہوں لیکن صبح سے پہلے اسے گھر ہونا چاہیے۔ صبح سے پہلے ہی تمہاری مطلوبہ رقم کا بریف کیس تمہارے گھر پہنچ جائے گا۔ دانش کے حراست میں لیے جانے کی خبر پریس میں نہیں آنی چاہیے" گاڈ مدر ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ جب یہاں کوئی سودا ہی نہیں ہو رہا تو تم یوں اپنا شرائط نامہ لکھوانے پر تُلی ہوئی ہو۔ میں تم لوگوں کے جھوٹے سماجی مرتبے کا لحاظ کرتے ہوئے کافی وقت ضائع کرچکا ہوں لیکن مجھے مجبور نہ کرو کہ تمہارے اس جعلی پیر کو عادی مجرموں کی طرح ہی گھسیٹتا ہوا لے چلوں۔ اس سے کہو کہ اب اٹھ کر میرے ساتھ چلے" رحیم گل نے گن کو حرکت دی۔

گاڈ مدر کے سکون اور تحمل میں اب بھی کوئی فرق نہ آیا۔ وہ اسی تمکنت سے بولی "آخری بار سوچ لو انسپکٹر! تم اپنے محکمے کے آخری آدمی نہیں ہو۔ تم سے اوپر... اوپر... بہت اوپر تک لوگ ہوتے ہیں... اور ان سب کو تمہاری طرح افسانوی بننے کا شوق نہیں ہوتا۔ پچھلے دنوں ہمیں کسٹم میں تم جیسا ایک افسانوی آدمی ملا تھا۔ ہمارا ایک کام پھنسا ہوا تھا۔ ہم نے ایک نئی مرسڈیز کی چابیاں اس کے سامنے رکھیں اور اس سے کہا "پیارے افسر! صرف ایک ہزار روپے میں یہ مرسڈیز تمہاری ہوئی۔ وہ گدھا نہیں مانا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ نہیں مانے گا تو ہمارا کام رکا رہے گا۔ ایسا نہیں ہوا۔ اس نے مرسڈیز ایک ہزار روپے میں نہیں لی۔ اس کے بڑے افسر نے دو ہزار میں لے لی۔"

ایک سیکنڈ کا وقفہ دے کر گاڈ مدر نے نہایت ہی نرمی اور شفقت سے پوچھا "کیا تم بھی ایسے ہی کسی قصے کا کردار بننا چاہتے ہو جس کا انجام اتنا افسوسناک ہو؟"

"اس میں افسوسناک کردار چھوٹے افسر کا نہیں' بڑے افسر کا ہے" رحیم گل اطمینان سے بولا "اس قسم کے تو بیسیوں قصے روزانہ میرے علم میں آتے رہتے ہیں لیکن میں نے ان سے متاثر ہوکر تو آج تک اپنی روش نہیں بدلی۔"

پھر ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ الفاظ پر ذرا زور دیتے ہوئے بولا "ایک بات اور یاد رکھنا خاتون! میں عہدے کے لحاظ سے ضرور چھوٹا افسر ہوں لیکن اوقات کے لحاظ سے چھوٹا نہیں ہوں۔ میرے بارے میں جب بھی کچھ کرنے لگو' بہت سوچ سمجھ کر کرنا۔ ایسا نہ ہو کہ تمہیں اس پر پچھتانے کا موقع بھی نہ مل سکے۔"

پھر وہ پیر دانش کی طرف مڑتے ہوئے بری طرح گرجا "چلو اٹھو"

اس کے لہجے اور انداز میں کچھ ایسی بات تھی کہ پیر دانش شاید غیر ارادی طور پر اُچھل کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اسکول کے کسی بچے کی طرح ماں سے پوچھا "ماما! چلا جاؤں؟"

گاڈ مدر نے ایک لمحے کچھ سوچا پھر سر ہلا کر بولی "ہاں... چلے جاؤ۔ ایک رات کے لیے انسپکٹر کے مہمان رہ لو۔ یہ بھی کیا یاد کرے گا۔ صبح تک تم گھر آجاؤ گے۔"

پھر وہ رحیم گل سے مخاطب ہوئی "میرے بچے کو کوئی تکلیف

نہیں ہونی چاہیے۔ اسے حوالات میں بھی فائیو اسٹار ہوٹل جیسا آرام ملنا چاہیے ورنہ تمہیں اس کا بھی نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔"

رحیم گل نے گویا اس کی فرمائش سے محظوظ ہوتے ہوئے قہقہہ لگایا "آج کل تو خود فائیو اسٹار ہوٹل میں فائیو اسٹار ہوٹل جیسا آرام نہیں ملتا۔ تم حوالات میں مانگ رہی ہو۔ آج اگر شیخ چلی زندہ ہوتا تو وہ بھی ایسی فرمائش نہیں کر سکتا تھا۔ تم واقعی بہت دلچسپ خاتون ہو۔"

گاڈمدر نے اپنا موٹا سا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبا لیا اور کوئی جواب نہیں دیا۔ پیر دانش نے مُردہ سے انداز میں رحیم گل کے آگے آگے قدم بڑھایا۔ دونوں ماں بیٹا ہم چاروں کی گنوں کے نرغے میں تھے۔ اس میں شک نہیں تھا کہ دونوں ماں بیٹے نے اب تک بڑی اکڑفوں دکھائی تھی اور ہمیں مرعوب کرنے کی پوری پوری کوشش کی تھی۔ ان کی دھمکیاں کھوکھلی بھی نہیں تھیں۔ وہ انہیں عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری اہلیت رکھتے تھے لیکن اب گویا یکدم ہی دونوں ماں بیٹے کی ہمت ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔

انہوں نے ہر وہ حربہ استعمال کر کے دیکھ لیا تھا جو ان کی دانست میں کارگر ہو سکتا تھا۔ اب یکایک ہی وہ بجھے بجھے سے دکھائی دینے لگے تھے۔ شاید انہیں اندازہ ہو گیا تھا کہ ان کا پالا کسی بالکل ہی سرپھرے پولیس والے سے پڑ گیا تھا۔ اگر اس وقت اس کے سامنے ان کا کچھ بس نہیں چل رہا تھا تو بعد میں بھی کسی کوشش کا کامیاب ہونا مشکل ثابت ہو سکتا تھا۔

گاڈمدر آگے بڑھتے ہوئے مُردہ سے لہجے میں بولی "پہلے مجھے باہر نکل کر اپنے آدمیوں کو حکم دینا پڑے گا کہ وہ دانش کو تمہارے ساتھ جانے دیں ورنہ وہ اسے پولیس کے نرغے میں ہرگز گھر سے جانے نہیں دیں گے۔ جان کی پروا کیے بغیر بھڑ جائیں گے۔ خواہ مخواہ خون خرابہ ہو گا۔"

"ٹھیک ہے تم دو قدم آگے چل سکتی ہو" رحیم گل نے اسے اجازت دی "لیکن اگر تم واقعی خون خرابے سے بچنا چاہتی ہو تو کوئی ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہ کرنا"

گاڈمدر نے اسے گھور کر دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں۔ وہ ہم سے پہلے کمرے سے نکلی۔ میں اس کے پیچھے تھا تاہم میں نے اپنی گن کا رخ اس کی کمر کی طرف نہیں رکھا تھا۔ باقی تینوں افراد پیر دانش کو گھیرے میں لیے میرے پیچھے آ رہے تھے۔

پیر دانش کے آدمی ڈرائیو وے میں جمع تھے۔ دو تین آدمیوں نے ستونوں کے پیچھے پوزیشن لے رکھی تھی۔ ان کے چہروں پر برہمی تھی اور وہ گنیں سنبھالے مقابلے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ گاڈمدر نے کسی ملکہ کی طرح ہاتھ ہوا میں بلند کر کے گویا انہیں ٹھنڈے رہنے کا اشارہ کیا اور بہ آوازِ بلند بولی "پیر صاحب ایک مقدمے کے سلسلے میں ضروری بیان دینے کے لیے تھانے تک جا رہے ہیں۔ وہ اپنی رضامندی سے جا رہے ہیں۔ کوئی ان کا راستہ روکنے یا پولیس کے ساتھ الجھنے کی کوشش نہ کرے۔ تم سب کو معلوم ہے ہم قانون کا احترام کرنے والے لوگ ہیں اور قانون کے خلاف کوئی کام نہیں کرتے۔"

ڈرائیو وے میں اور ستونوں کے پیچھے کم از کم دس کلاشنکوف بردار موجود تھے۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ ہماری نظروں سے اوجھل کچھ دوسری جگہوں پر بھی مسلح افراد موجود رہے ہوں۔ بہرحال، لوگ راستے میں حائل تھے انہوں نے راستہ چھوڑ دیا لیکن ایک شخص پیر دانش کا کچھ زیادہ ہی دیوانہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ چلایا "پولیس پیر صاحب کو نہیں لے جا سکتی۔ پولیس کو جو بھی بیان لینا ہے، یہیں لے....."

اس نے کلاشنکوف سیدھی کر لی۔ عین ممکن تھا کہ وہ اندھا دھند فائرنگ شروع کر دیتا لیکن ہم سب اس طرح ایک دوسرے کی آڑ میں تھے کہ اگر وہ صرف پولیس والوں کو نشانہ بنانا چاہتا تو ممکن نہیں تھا۔ پیر دانش اور گاڈمدر بھی ضرور گولیوں کی زد میں آتے۔

اگر وہ پیر دانش کا اتنا اندھا عقیدت مند تھا تو یقیناً کوڑھ مغز اور جاہل تھا مگر اتنی عقل اس کی ناکارہ کھوپڑی میں بھی موجود تھی کہ اس نے اندھا دھند برسٹ نہیں مارا۔ ایک لمحے کے لیے ہچکچا گیا اور ایک آدھ سیکنڈ اسے پوزیشن لینے میں لگ گیا۔

اتنی دیر میں، میں اس کے سر پر پہنچ چکا تھا کیونکہ میرے اور اس کے درمیان ہی فاصلہ سب سے کم تھا۔ میں اب بھی فائر نہیں چاہتا تھا کیونکہ اگر ایک بار گولی چلنا شروع ہو جاتی تو بہت زیادہ خونریزی ہو سکتی تھی۔ وہاں کوئی مورچا بندی تو تھی نہیں۔ آمنے سامنے کا مقابلہ تھا جو ایک قسم کی خودکشی ہی کے مترادف ہوتا ہے۔ ویسے بھی ہم گویا یہ ریکارڈ قائم کرنا چاہتے تھے کہ ہم ایک گولی چلائے بغیر پیر دانش کو گرفتار کر کے لے آئے۔ مشکل مرحلہ طے ہو چکا تھا۔ اب ہم جاتے جاتے ریکارڈ خراب کرنا نہیں چاہتے تھے۔ کم از کم میرا خیال تو یہی تھا۔

اس سے پہلے کہ وہ گدھا ٹریگر دباتا، میں نے اپنی گن دائیں سے بائیں ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے اس کی کنپٹی پر پوری قوت سے گھونسا رسید کیا۔ اس گھونسے کے پیچھے گویا میری جھنجلاہٹ کام کر رہی تھی۔ مجھے اب تک اپنی "صلاحیتوں" کے جوہر دکھانے کا کوئی خاص موقع نہیں ملا تھا۔ ایک شخص کو گن کا بٹ مار کر بے ہوش کرنے کے سوا میں نے کچھ نہیں کیا تھا۔

حالانکہ یہ ہمارے حق میں اچھا ہی ہوا تھا۔ اتنا اہم کام اتنے پُرامن اور پُرسکون انداز میں ہو گیا تھا۔ رحیم گل کی دلی خواہش بھی تھی کہ یہ کام کسی شور شرابے اور خون خرابے کے بغیر ہو جائے۔ مجھے بھی اس سے اتفاق تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں پیر دانش کے چمچوں کے تاثرات دیکھ دیکھ کر میرے ہاتھوں میں کھجلی ہو رہی تھی حالانکہ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ اپنی نقلی مونچھوں کی وجہ سے

کافی محتاط رہنے کی ضرورت تھی۔ دھینگا مشتی اور ہاتھا پائی سے بچنے کی کوشش کرنی چاہیے تھی لیکن لاشعوری جھنجلاہٹ بہر حال اپنی جگہ تھی۔

گھونسا اتنا زوردار تھا کہ وہ شخص اچھل کر میرے اندازے سے بھی زیادہ دور جا کر گرا اور وہیں ساکت ہو گیا۔ باقی لوگ جو ایک لمحے کے لیے دم بخود ہو گئے تھے، کلاشنکوفوں کا رخ ہماری طرف کرنے لگے۔ گاڈمدر بھی ایک سیکنڈ کے لیے بدحواس ہو چکی تھی لیکن وہ فوراً ہی سنبھلتے ہوئے دونوں ہاتھ اٹھا کر چیخی۔ "خبردار! کوئی گولی نہ چلائے۔"

اس کی آواز در و دیوار کو مرتعش کر دینے کے لیے کافی تھی۔ چاروں طرف گہرا سکوت چھا گیا لیکن یہ کچھ ایسا ہی سکوت تھا جیسے اب کسی بھی لمحے کوئی بم پھٹنے کی توقع ہو۔

رحیم گل کے ہلکے سے قہقہے نے یہ سکوت توڑا۔ وہ گاڈمدر سے مخاطب تھا "تم نے دیکھا....؟ میرے ساتھ جو لوگ ہیں ان کا ایک ایک ہاتھ برداشت کرنا بھی ان کرائے کے ٹٹوؤں کے بس کی بات نہیں ہے۔ ایک ایک سورما کے لیے صرف ایک ایک ہاتھ ہی کافی ہے۔"

گاڈمدر سرد لہجے میں بولی "لیکن شاید تم یہ بھول گئے ہو کہ یہ ہاتھ پیروں کی لڑائی کا زمانہ نہیں ہے۔ صحیح جگہ پر لگی ہوئی صرف ایک گولی بڑے سے بڑے پہلوان کے لیے کافی ہوتی ہے۔ اس لیے آج کل ڈیڑھ پسلی کا وہ آدمی بھی شہ زور ہے جس کے ہاتھ میں گن ہے۔ میں اگر چاہوں تو ابھی یہاں تم چاروں کی لاشیں لہو میں لتھڑی نظر آئیں مگر میں قانون سے ٹکر لینا نہیں چاہتی۔"

رحیم گل مسکرایا "یہ محض تمہاری خام خیالی ہے کہ یہاں صرف ہماری لاشیں لہو میں لتھڑی نظر آئیں گی۔ یہاں جو لاشیں پڑی پائی جائیں گی ان میں تمہاری اور تمہارے چُنّے مُنّے بیٹے کے علاوہ نہ جانے کتنے محافظوں کی لاشیں بھی شامل ہوں گی۔ میرے یہ ساتھی صرف ہاتھ پاؤں چلانے میں ہی نہیں، گنیں چلانے میں بھی بہرحال تمہارے ان گدھوں سے کہیں زیادہ ماہر ہیں۔ ہم تو جان ہتھیلی پر رکھ کر آئے ہیں۔ ہمیں تو جان کی پروا نہیں۔ اگر تم اور تمہارے حکم کے یہ غلام مرنے کا حوصلہ رکھتے ہیں تو انہیں گولی چلانے کا حکم دے دو۔"

گاڈمدر، جس کا اصل نام مجھے ابھی تک معلوم نہیں تھا، نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے چند سیکنڈ رحیم گل کو گھورتی رہی۔ وہ ایک عجیب صورتِ حال تھی۔ سب کی انگلیاں ٹریگروں پر تھیں مگر کوئی گولی نہیں چلا رہا تھا۔ ہر شخص گویا تنی ہوئی رسّی پر کھڑا تھا۔ جب تک رسّی پر تھا تب تک زندگی تھی۔ رسّی کے نیچے موت منہ پھاڑے اس کی منتظر تھی۔

پیر دانش کے آدمیوں کو تو یقیناً موت کی پروا نہیں تھی۔ اس قسم کے لوگوں کے کارندے واقعی روبوٹس سے مختلف نہیں ہوتے۔ اپنے آقا کا اشارہ پا کر وہ آنکھیں بند کر کے اندھے کنوئیں میں بھی چھلانگ لگا سکتے ہیں۔ وہ اپنی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں اپنے آقا کے پاس گروی رکھ دیتے ہیں۔ وہ خود اپنے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے بارے میں ہر فیصلہ ان کا آقا کرتا ہے۔

چنانچہ ان کا مجھے پتا تھا کہ ان کے لیے گولی چلانا یا گولی کھانا کوئی قابلِ غور مسئلہ نہیں تھا لیکن گاڈمدر یا پیر دانش ایک خراش کی تکلیف بھی اٹھانے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اگر وہ اس وقت ہماری گنوں کی زد پر نہ ہوتے۔۔۔ کسی محفوظ مقام پر ہوتے اور اپنے آدمیوں کو حکم دینے کی پوزیشن میں ہوتے تو وہ یقیناً ہم پر گولیوں کی بوچھار کرانے سے دریغ نہ کرتے، نتائج خواہ کچھ بھی ہوتے لیکن اس وقت خود ان کی اپنی زندگی داؤ پر لگی ہوئی تھی۔ اس لیے گاڈمدر اپنے پتے بڑی احتیاط سے کھیل رہی تھی۔

وہ گہری سانس لے کر گویا اپنے آپ پر جبر کرتے ہوئے بولی "[illegible] ... برداشت جواب دے جائے.... تم لوگ یہاں سے چلے جاؤ۔"

پھر اس نے پیر دانش کو نیچی آواز میں مخاطب کیا "گھبرانا مت.... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پیر دانش مسکرایا اور حیرت انگیز طور پر طمانیت سے بولا "اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے ماما!"

ہم واقعی تنی ہوئی رسّی پر چلنے کے سے انداز میں آگے بڑھے۔ ہمیں ہر طرف نظر رکھنا پڑ رہی تھی۔ گاڈمدر کے سخت احکامات کے باوجود پیر دانش کا کوئی سرپھرا غلام اچانک کچھ کر گزرنے کا فیصلہ کر سکتا تھا لیکن اب سکوت ہی رہا اور ہم خیریت سے گیٹ تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ گیٹ ہاؤس کے قریب کھڑے ہوئے ایک شخص نے گیٹ کھولا اور رحیم گل، پیر دانش کو گاڑی میں بٹھا کر باہر لے گیا۔ ہم لوگ بعد میں الٹے قدموں چلتے ہوئے باہر پہنچے۔

اندر گاڈمدر کی آواز گونجی اور گیٹ بند ہو گیا۔ وہ گیٹ تک نہیں آئی تھی۔ میں نے دیکھا، بنگلے کے دونوں کونوں پر پولیس والے گنیں لیے مستعد کھڑے تھے۔ مجھے معلوم تھا بنگلے کے عقب میں بھی پولیس فورس موجود رہی ہو گی۔ اکرم نے واکی ٹاکی پر انہیں اطلاع دی کہ پیر دانش نے گرفتاری دے دی تھی اس لیے محاصرہ ختم کیا جا رہا تھا، وہ لوگ واپس روانہ ہو جائیں۔

ہم گاڑی میں آ بیٹھے۔ سب لوگ جس ترتیب سے آئے تھے اسی ترتیب سے واپس روانہ ہوئے۔ پیر دانش اب بالکل خاموش تھا تاہم وہ اب بھی بے پروا نظر آنے کی پوری پوری کوشش کر رہا تھا۔ گاڑی رحیم گل اب بھی خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ پیر دانش اس کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ہم تینوں پچھلی سیٹوں پر تھے۔

راستے میں ایک جگہ رحیم گل نے سگنل پر گاڑی روکی تو پیر دانش خود کلامی کے سے انداز میں غرایا "یہ سب اس.... افضل کا

کیا دھرا ہے۔"

یہ جملہ کئی موٹی موٹی گالیوں سے مرصع تھا۔ میں قدرے حیرت سے سوچے بغیر نہ رہ سکا کہ اس قسم کے پیروں فقیروں کے عقیدت مند اگر انہیں ایسی گندی گندی گالیاں دیتے سن لیں تو ان کے تاثرات کیا ہوں؟ لیکن میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ ان کی عقیدت و احترام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ہمارے ہاں عقیدتوں کا سلسلہ کچھ عجیب ہی تھا۔ لوگ ایک بار جسے عقیدتوں کے اونچے سنگھاسن پر بٹھا دیتے تھے، پھر خواہ اسے کچھ بھی کرتے یا کہتے دیکھ لیتے، سن لیتے.... مگر عقیدت میں فرق نہیں آسکتا تھا۔ اندھی عقیدت کی اصطلاح شاید۔۔ ہمارے ہی لوگوں کو دیکھ کر ایجاد ہوئی تھی۔

میرے لیے بڑی تکلیف کا مقام تھا کہ میں عین پیر دانش کے پیچھے بیٹھا تھا اور دوسری مرتبہ اپنی شان میں قصیدہ خوانی سن رہا تھا لیکن میں اسے کوئی جواب نہیں دے سکتا تھا۔ نہ تو عملی طور پر اور نہ ہی زبانی طور پر۔ عجیب بے بسی تھی۔ کاش میں اس کی کھوپڑی پر کم از کم ایک ہاتھ تو رسید کر ہی سکتا! خصوصاً جب کہ کھوپڑی عین میرے سامنے تھی۔

رحیم گل گویا میری دلجوئی کے لیے پیر دانش سے مخاطب ہوا "تمہاری سوئی خواہ مخواہ افضل پر اٹک کر رہ گئی ہے۔ تمہارے خلاف یہ کارروائی صرف افضل کی کوشش کی وجہ سے نہیں ہو رہی۔ اب تم بار بار اتنے زور و شور سے اس کا نام لے رہے ہو تو شاید میں خود اسے اس کیس میں گھسیٹ لاؤں اور بطور گواہ اس سے جو بھی مدد مل سکی وہ حاصل کروں.... لیکن تمہاری گرفتاری اصل میں کسی اور ہی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ وہی تمہیں پھانسی کے تختے تک پہنچائے گا۔"

پیر دانش نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ اس کا مطلب تھا کہ اپنی "عظیم" ماما کی عدم موجودگی میں بھی اس کی خود اعتمادی برقرار تھی۔ گو کہ اس کا قہقہہ کچھ کھوکھلا سا تھا لیکن وہ خوفزدہ بہرحال نہیں تھا۔ اس نے گویا محظوظ ہوتے ہوئے رحیم گل کی طرف دیکھا اور نرم لہجے میں بولا "تم نے تو واقعی ابھی سے مجھے پھانسی چڑھانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے۔ کیا تم واقعی اتنے ہی احمق ہو؟"

"ہاں.... میں اتنا ہی احمق ہوں.... بلکہ اس سے بھی زیادہ" رحیم گل نے تسلیم کیا "تم جیسے لوگ مجھ جیسے افسروں کو ہمیشہ سے احمق ہی کہتے آئے ہیں لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ تم جیسے... مجرموں پر ہاتھ ڈالنے کا حوصلہ مجھ جیسے احمقوں میں ہی ہوتا ہے۔"

"عام طور پر ان احمقوں کا انجام بھی عبرتناک ہی ہوتا ہے" پیر دانش بولا۔

"یہ تو وقت ہی بتائے گا کہ کس کا انجام عبرتناک ہوتا ہے" رحیم گل بے پروائی سے بولا۔

"وقت تو جو بتائے گا سو بتائے گا.... فی الحال تم مجھے یہ بتا دو کہ کس کے کہنے پر تم اتنا اچھل رہے ہو؟ تمہیں کسی نے تھپکی تو ضرور دی ہوگی جس کی وجہ سے تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا ہے؟" پیر دانش بولا۔

"ہاں۔ مجھے میرے ضمیر نے تھپکی دی تھی" رحیم گل نے جواب دیا۔

میں پیر دانش کا صرف سائیڈ پوز دیکھ رہا تھا۔ اس آدھے چہرے سے ہی اس کی بدمزگی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔

وہ بیزاری سے ہاتھ ہلا کر بولا "یار! اس قسم کی باتیں بہت ہو چکیں۔ اب ٹھیک ٹھیک بات کرو۔ میں نے اور میری والدہ نے تم سے اتنا تعاون کیا ہے۔ تمہارے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کیا۔"

"ہاں.... اب تو شاید باضمیر پولیس افسروں کو اس بات پر بھی بڑے مجرموں کا شکریہ ادا کرنا پڑا کرے گا کہ انہوں نے مقابلہ کیے بغیر گرفتار ہونا گوارا فرمالیا" رحیم گل تلخ لہجے میں بولا۔

"دیکھو.... اگر تم اتنے ہی باضمیر اور قانون کے اتنے ہی دیانتدار محافظ ہو تو تمہیں ایک بات کا خیال رکھنا چاہیے" پیر دانش نہایت ملائمت سے بولا۔ "ابھی مجھے کسی عدالت نے مجرم قرار نہیں دیا ہے اس لیے تمہیں قانون اور اخلاقیات کا خیال رکھتے ہوئے مجھے ابھی سے مجرم مجرم کہہ کر مخاطب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ صرف تمہارے اپنے خیالات ہیں اور تمہارے خیالات کا نام قانون نہیں ہے۔"

"درست ہے" رحیم گل نے بلا تامل تسلیم کیا "مجھ میں یہ خرابی موجود ہے کہ میں زیادہ خبیث لوگوں کے معاملے میں زیادہ جذباتی ہو جاتا ہوں لیکن.... چلو.... ٹھیک ہے.... میں قانون کے تقاضے پورے کرنے کے لیے عدالت کے فیصلے سے پہلے تمہیں مجرم وغیرہ کہہ کر مخاطب نہیں کروں گا۔ میں بھی دوسرے لوگوں کی طرح تمہیں پیر صاحب کہہ کر مخاطب کروں گا۔ ہاں.... تو میرے لیے کیا حکم ہے پیر صاحب؟"

پیر دانش نے اسے گھورا پھر گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا "ایک ملزم کو اپنے دفاع کا حق حاصل ہوتا ہے۔ میں اپنے دفاع کا بندوبست کرنا چاہتا ہوں اس لیے تم سے پوچھ رہا ہوں کہ کس شخص کی شہ پا کر تم نے مجھ پر ہاتھ ڈالا ہے۔ مجھے اس کا نام معلوم ہونا چاہیے تاکہ اسی مناسبت سے میں اپنے دفاع کا انتظام کرسکوں۔"

"یہ بھی تمہیں وقت ہی بتائے گا" رحیم گل بظاہر سنجیدگی، لیکن درحقیقت اسے چڑانے والے لہجے میں بولا "صحیح وقت آنے پر تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تم کس کی وجہ سے پھانسی چڑھ رہے ہو۔"

"پھر وہی پھانسی....!" آخر پیر دانش جھنجلا ہی گیا "تم نے مجھے پھانسی چڑھوانا اتنا آسان کیوں سمجھ لیا ہے گدھے کہیں کے؟ ابھی تمہارے سامنے بڑا لمبا سفر پڑا ہے۔ مجھے پھانسی کے پھندے تک تو کیا.... جیل تک پہنچانے میں بھی تمہیں دانتوں پسینے آجائیں گے۔"

"کوئی بات نہیں" رحیم گل بے پروائی سے بولا "میرا کام محنت کرنا ہے۔ نتیجہ میں اوپر والے پر چھوڑ دیتا ہوں۔"

پیردانش سڑک کی طرف دیکھنے لگا اور چند لمحے خاموش رہا اور پھر دوبارہ رحیم گل کی طرف گردن گھماتے ہوئے بولا "میرا خیال ہے تمہیں میرے خلاف کوئی خاص گواہ میسر آگیا ہے۔ اس کا نام ظفر جمال تو نہیں؟"

میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ رحیم گل کو بھی یقیناً جھٹکا لگا تھا لیکن میں عقب سے صحیح طور پر اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہمیں یہ تو معلوم تھا کہ پیردانش احمق نہیں تھا۔ احمق لوگ اتنے ہاتھ پاؤں نہیں پھیلا سکتے جتنے پیردانش نے پھیلائے ہوئے تھے پھر بھی ہمیں اس سے اتنی دانشمندی کی توقع نہیں تھی۔ میرا خیال ہے میری طرح رحیم گل کو بھی توقع نہیں تھی کہ پیردانش اتنی جلدی اتنا صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرے گا۔ "ظفر جمال....؟" رحیم گل نے کھوکھلا سا قہقہہ لگایا "وہ کون ہے؟"

پیردانش نے کوئی جواب نہ دیا اور اسے گھورنے پر اکتفا کیا۔ رحیم گل ایک موڑ کاٹتے ہوئے بولا "تم نے کوئی جواب نہیں دیا؟"

"جواب مجھے نہیں.... تمہیں دینا چاہیے" پیردانش بولا۔

"مجھے تو معلوم نہیں یہ ظفر جمال کون ہے" رحیم گل بولا "لیکن اب تمہارے منہ سے اس کا نام نکل ہی گیا ہے تو مجھے اسے تلاش کرنا پڑے گا۔ تمہارے سوال سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص تمہارے خلاف بہت کارآمد گواہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اشارہ دینے کا شکریہ۔"

پیردانش نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ بدستور خاموشی سے مزید چند لمحے رحیم گل کو گھورتا رہا پھر سڑک کی طرف دیکھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہم تھانے جا پہنچے۔ رحیم گل، پیردانش کو اپنے ماتحتوں کے گھیرے میں اندر لے گیا۔ میں باہر گاڑی میں ہی بیٹھا رہا۔ میں صرف پیردانش کو حراست میں لیے جانے تک ہی رحیم گل کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اس سے آگے صورتِ حال کو وہ خود سنبھال سکتا تھا۔ مجھے اس کی مزید کارروائیوں کو دیکھنے کا تجسس نہیں تھا۔

میں اب اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہونا چاہتا تھا لیکن وہ کافی دیر بعد دوبارہ باہر آگیا۔ میں پولیس کی گاڑی سے اتر آیا۔ رحیم گل گاڑی کا سہارا لیتے ہوئے بولا "میں نے اسے حوالات میں ڈال دیا ہے اور حفاظت کا ٹھیک ٹھاک بندوبست کردیا ہے۔"

"جلد ہی اس کے لیے سفارشی ٹیلی فون آنے شروع ہو جائیں گے" میں نے خیال ظاہر کیا "اب تمہیں سفارشوں کی یلغار اور دوسرے دباؤ کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

"تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ٹیلی فون ہمارے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی آنا شروع ہو چکے ہیں" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگانے کے بعد بتایا "شاید اس وقت بھی میری میز پر فون کی گھنٹی بج رہی ہوگی۔"

"تم نے سفارش کرنے والوں کو کیا جواب دیا؟" میں نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ میں تو کوئی فون سن ہی نہیں سکا کیونکہ میں اس وقت تھانے میں موجود نہیں ہوں۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا "کم از کم فون کرنے والوں کے لیے تو میں کل تک تھانے میں موجود ہی نہیں ہوں گا۔ میں باہر کچھ ضروری کارروائیوں میں بے پناہ مصروف ہوں گا۔ اگر غلطی سے میں نے کبھی خود ہی فون اٹھالیا تو یہ جواب شاید مجھے خود بھی دینا پڑ جائے گا۔"

پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ بولا "بہرحال سفارش کرنے والوں کے نام نوٹ کیے جا رہے ہیں۔ ظاہر ہے سب بڑے لوگ ہی ہیں.... سفارش بڑے لوگوں ہی کی چلتی ہے۔ زندگی نے مہلت دی تو ان سب کو بھی کھنگالوں گا کہ ان کے اس پیر فرتوت سے کیا مفادات وابستہ تھے۔"

"کل تک گاڈ فادر زیادہ تیزی سے حرکت میں آجائے گی۔ کچھ اور ڈوریاں ہلائے گی۔ شاید پیردانش کو چھڑانے والے خود پہنچنا شروع ہو جائیں۔ تمہیں یقین ہے کہ تم اس دباؤ کا مقابلہ کرلو گے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں.... مجھے اس کی پروا نہیں ہے" وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا "لیکن مجھے اس سلسلے میں بہت تیزی سے ساری کارروائیاں کرنی ہوں گی ورنہ اسے قابو میں رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کی ایف آئی آر تو میں کاٹ چکا ہوں۔ اس سے پہلے کہ اس کے وکیلوں کا ٹولا جمع ہو کر کوئی شیطانی منصوبہ بنائے، میں اسے عدالت میں پیش کرکے اس کا کم از کم دس پندرہ دن کا ریمانڈ لینا چاہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ پرسوں تک مجھے اس کو عدالت میں پیش کرنا پڑے گا۔"

"ہاں.... تو پیش کردینا۔ اس میں کیا قباحت ہے؟" میں نے کہا۔

"پیش کرنے میں تو کوئی قباحت نہیں.... لیکن اس کا ریمانڈ لینے میں مجھے کافی دقت پیش آسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ میں ظفر جمال کو بھی عدالت میں پیش کروں۔ اس کے تفصیلی بیان کی بنیاد پر مجھے ریمانڈ مل سکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ضروری ہے کہ جج صاحب پیردانش سے مرعوب نہ ہوں اور صرف قانونی موشگافیوں میں نہ الجھیں بلکہ اس معاملے کو ذرا انسانی ہمدردی کی بنیاد پر دیکھیں۔"

"اگر تم نے اپنا کیس اچھے طریقے سے پیش کیا تو مجھے امید ہے کہ ایسا ہی ہوگا" میں نے ایک بے عنوان سی خود اعتمادی محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ پیردانش کے لیے جو فون اتنی جلدی آچکے ہیں ان میں انصاری صاحب کا فون بھی شامل تھا" رحیم گل نے بتایا۔

"کون انصاری صاحب؟" میں نے جاننا چاہا۔

"غلام فرید انصاری صاحب.... جن کا فلاحی کاموں کے سلسلے میں بہت اونچا مقام ہے" رحیم گل نے بتایا "بہت بڑی سماجی شخصیت ہیں۔"

"اچھا.... وہ....!" میں نے گہری سانس لی "خیر.... اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ پیردانش قسم کے لوگ فلاحی انجمنوں کو بھی اپنے ہاتھ میں رکھنے کے لیے فراخدلی سے عطیات دیتے رہتے ہیں۔ بلکہ پیردانش کو تو شاید اس شعبے کی طرف توجہ دینے کی فرصت نہیں ملی ورنہ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ خود اپنی کوئی فلاحی انجمن بنالیتا اور اس میدان میں بھی بڑا نام بنالیتا۔ بعض اوقات تو اس قسم کے لوگ ایک طرف کسی سیٹھ وغیرہ کو اغوا کروا کے کروڑ دو کروڑ تاوان وصول کرتے ہیں۔ دوسری طرف اس میں سے آدھا کسی فلاحی تنظیم کو عطیے کے طور پر دے دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے غلام فرید انصاری صاحب برے وقت میں پیردانش کے لیے آواز بلند کرنے آگے آئے ہوں۔ تعاون کے بعد کبھی نہ کبھی جوابی تعاون کا بھی تو وقت آتا ہے نا۔"

"ہاں.... یہ بات تو ہے۔" رحیم گل نے تائید میں سر ہلایا "بہرحال.... اگر ریمانڈ مل جاتا ہے تو میرا کام بہت آسان ہو جائے گا۔ اس دوران کوئی بڑی شخصیت بھی اسے ضمانت پر رہا کروانے کے لیے مداخلت نہیں کرسکے گی اور میں اس کے گرد شکنجہ مضبوطی سے کس دوں گا لیکن میں ظفر جمال کو اتنی جلدی عدالت میں پیش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ میرا ترپ کا پتا تھا۔ میں اسے ذرا دیر سے کھیلنا چاہتا تھا۔"

"ان چکروں میں مت پڑو" میں نے مشورہ دیا "اگر ریمانڈ لینے کے لیے ظفر جمال کو گواہ کے طور پر عدالت میں پیش کرنا ضروری ہے تو کردو۔ ہمارا مقصد تو صرف پیردانش کو کیفرِ کردار تک پہنچانا ہے۔ کوئی کریڈٹ لینا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ اس لیے جس طرح بھی اصل مقصد حاصل ہوتا ہے، کرلو۔"

اس نے پُرخیال انداز میں سر ہلایا۔ میں نے پوچھا "تم نے ظفر جمال کو کہاں رکھا ہے؟"

وہ شریر سے انداز میں مسکرایا "تم سمجھ رہے ہو میں روانی میں تمہیں بتادوں گا؟ میں اتنا غیر حاضر دماغ نہیں ہوں۔"

"مجھے یہ جاننے کا شوق نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے" میں نے اسے گھورا "مجھے صرف اس کی حفاظت کی فکر ہے۔ پیردانش کا شیطانی ذہن اس امکان تک پہنچ چکا ہے کہ ظفر جمال ہمارے ہاتھ لگ گیا ہے۔"

"تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں" رحیم گل نے مجھے تسلی دی "وہ جہاں بھی ہے بہت حفاظت سے ہے۔"

"اسے کورٹ میں پیش کرتے وقت بھی حفاظتی انتظامات کا بہت زیادہ خیال رکھنا" میں نے تاکید کی۔

"یار....! اب تم مجھے میرا کام سکھانے کی کوشش مت کرو" رحیم گل مصنوعی بیزاری سے بولا "مانا کہ تم نے پولیس کی وردی پہن رکھی ہے لیکن اب اپنے آپ کو سچ مچ ہی پولیس والا مت سمجھنا شروع کردو.... اور اگر یہ وردی واقعی تمہاری اپنی بھی ہوتی اور تم سچ مچ پولیس والے ہوتے تب بھی اس وردی کے لحاظ سے تم میرے ماتحت ہوتے اور اب تک کم از کم دو تین مرتبہ مجھے سلیوٹ مار چکے ہوتے۔"

"خدا نہ کرے کہ میں پولیس والا ہوتا" میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا پھر میں نے اپنی گاڑی کی طرف بڑھتے ہوئے کہا "اب میں چلتا ہوں۔"

وہ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بولا "وردی جلد واپس بھجوا دینا۔ اس کا اصل مالک اپنی نہایت پرانی اور گھسی پٹی وردی پہنے اندر بیٹھا ڈیوٹی دے رہا ہے۔"

"میں تو خود جلد از جلد اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اسے پہن کر تو میرا عجیب عجیب حرکتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے۔" میں نے کہا۔

"بس.... اب بکواس مت شروع کردینا" رحیم گل نے میری بات کاٹتے ہوئے مجھے ڈانٹا۔

پھر میں اپنی کار کے قریب پہنچا تو وہ اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "اس کی طرف تو میں نے توجہ ہی نہیں دی تھی۔ تم کسی ٹیکسی یا کھٹارا کار میں نہیں آسکتے تھے؟ تمام راستے پولیس کے محکمے کو بدنام کرتے ہوئے آئے ہوگے اور اب بدنام کرتے ہوئے ہی جاؤ گے۔ یہ وردی پہن کر ایسی گاڑی میں آنا ضروری نہیں؟ راستے میں تمام دیکھنے والوں نے یہی سوچا ہوگا.... ذرا دیدہ دلیری دیکھو.... انسپکٹر ہو کر کیسی ڈھٹائی سے اتنی شاندار اور قیمتی گاڑی میں بیٹھا جا رہا ہے۔ حرام کی کمائی سے خریدی ہوگی.... مگر اب تو ان لوگوں کو ذرا بھی شرم نہیں رہی۔ حرام کی کمائی سے خریدی ہوئی چیزوں کی سرِعام نمائش کرتے ہیں۔ اب تمہیں واپس جاتے دیکھ کر بھی لوگ یہی سوچیں گے۔"

"یہی تو میں چاہتا تھا" میں نے اسے چڑایا "میں تو جان بوجھ کر اچھی گاڑی میں آیا تھا" پھر میں نے ٹھنڈی سانس لی "نہ جانے کتنے پولیس والے ہوں گے جو زیادہ بڑے افسر نہیں ہوں گے لیکن اس قسم کی گاڑیوں میں گھومنا افورڈ کرسکتے ہوں گے۔ یہ دوسری بات ہے کہ فی الحال انہوں نے اپنی خواہش دبا رکھی ہوگی اور ریٹائرمنٹ کا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"کبھی ان پولیس والوں کی بھی بات کیا کرو جو دڑبا نما مکانوں یا کھنڈر ہوتے ہوئے فلیٹوں میں رہتے ہیں.... جن کے بچے حیران حیران آنکھوں سے اس دنیا کی چمک دمک کو دیکھتے ہیں اور نہ جانے کس کس چیز کے لیے ترستے ہیں.... جنہیں عین جوانی میں کسی مجرم

کی گولی لگ جاتی ہے.... جن کی بیواؤں اور بلکتے بچوں کو کچھ عرصے بعد ان کا اپنا محکمہ بھی نہیں پوچھتا" وہ تیزی سے بولا۔

"اوہ... یہی تو فرق ہے تمہاری اور میری عینک میں" میں نے ٹھنڈی سانس لی "تمہاری عینک سے کچھ اور نظر آتا ہے۔ میری عینک سے کچھ اور۔"

"اصل میں ہمارے ہاں ہر ایک نے تعصب کی عینک لگا رکھی ہے۔ تعصب کی عینک اتار کر دیکھو تو ہر چیز کے دو پہلو نظر آئیں گے۔ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا ہے کہ کوئی سو فیصد اچھا ہو.... اور کوئی سو فیصد بُرا۔ کسی میں اچھائی زیادہ ہو سکتی ہے اور کسی میں بُرائی زیادہ...."

"اچھا.... اب میں چلتا ہوں" میں نے اس کی بات کاٹ کر گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا۔

"بس.... گھبرا گئے؟" اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا "مجھے ہر اہم بات سے آگاہ رکھنا۔ خاص طور پر کورٹ میں پیشی کے پروگرام سے ضرور قبل از وقت مطلع کر دینا۔ ظفر جمال کو پیش کرنے کے باوجود اگر تمہیں پیر دانش کا ریمانڈ لینے میں دقت پیش آئے تو پھر میں کچھ کروں گا۔ اپنا بھی تھوڑا بہت اثر رسوخ ہے۔ یہ مگرمچھ ایک بار قابو میں آگیا ہے۔ اب اسے نکلنا نہیں چاہیے۔"

"تم سے زیادہ یہ میری خواہش ہے" رحیم گل بولا اور میں اسے خدا حافظ کہہ کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔

ہوٹل پہنچ کر اپنے کمرے میں جا کر میں نے سب سے پہلے اپنے میک اپ اور وردی وغیرہ سے چھٹکارا حاصل کیا۔ شاور لینے کے بعد میں نے لباس تبدیل کیا اور نیچے آفس میں جانے کی تیاری کر رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف رحیم گل تھا۔

"یار....! وہ تم نے وردی واپس نہیں بھجوائی" وہ بولا۔

"خدا کی پناہ....!" میں نے حقیقتاً سر پیٹ لیا "حد ہو گئی یار! تمہیں تو وردی کا ہوکا لگ گیا ہے۔ مجھے پتا ہوتا کہ وردی دے کر تمہارا یہ حال ہو گا تو میں اپنی ہی سلوا لیتا۔ مجرموں کے منظم قسم کے گروہوں میں تمہاری وردیاں درجنوں کے حساب سے پائی جاتی ہیں۔"

"وہ اور بات ہے.... لیکن یہ سو فیصد اصلی وردی ہے" وہ خوشگوار لہجے میں بولا "تمہیں کیا معلوم تمہیں اپنے ماتحت کی وردی دے کر اور اس مہم میں پولیس والے کے طور پر شریک کر کے میں نے کتنا بڑا رسک لیا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میری نیک نامی اور ساکھ پر کوئی حرف آئے۔"

"اللہ معاف کرے" میں نے ٹھنڈی سانس لی "ایک تو معلوم نہیں تمہیں کس نے اس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا ہے کہ تمہاری کوئی ساکھ بھی ہے اور تم بڑے نیک نام ہو۔ تمہاری بے تابی دیکھ کر اب تو میں شکر کر رہا ہوں کہ تم نے وہیں تھانے کے سامنے سڑک پر ہی مجھ سے وردی نہیں اتروالی شاید تمہیں خیال آگیا ہو گا کہ لوگ سوچیں گے پولیس والوں نے اب خود پولیس والوں کے ساتھ بھی وہی کام شروع کر دیا جو وہ عام شہریوں کے ساتھ کرتے ہیں۔"

"ہم نے کتنی جگہوں پر کتنے شہریوں کے ساتھ یہ سلوک ہوتے دیکھا ہے؟" رحیم گل نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"دیکھا تو نہیں.... لیکن سنا ہے" میں نے جواب دیا۔

"سنی سنائی باتوں پر یقین مت کیا کرو" وہ رکھائی سے بولا "وردی جلدی واپس بھجوا دو۔ میں انتظار کر رہا ہوں۔"

"وردی کا انتظار کرنے کے علاوہ بھی کوئی کام کر لو یار!" میں نے کہا۔ اس نے کوئی جواب دیے بغیر فون بند کر دیا۔

میں نے وردی پیک کروا کے ایک آدمی کے ہاتھ روانہ کر دی اور خود نیچے آفس میں آگیا۔ ابھی میں بیٹھا ہی تھا کہ شفیع شاہ آن پہنچا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولا "مبارک ہو.... شکار بغیر کسی ہنگامے کے ہاتھ آگیا۔"

"گاڈ مدر عقلمند تھی۔ اس نے زیادہ ہنگامہ برپا نہیں ہونے دیا" میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

شفیع شاہ کھڑے ہی کھڑے بولا "لیکن وہ ہنگامہ برپا کرنے یہاں آن پہنچی ہے۔"

"کیا مطلب؟" میں نے ذرا چونکتے ہوئے پوچھا۔

"ہم دوسرے راستے سے آرہے تھے۔ اتفاق سے ہم نے اسے بجیرد میں ہوٹل کی طرف مڑتے دیکھ لیا" شفیع شاہ بتانے لگا "ہم نے احتیاطاً اسے پارکنگ لاٹ میں ہی روک لیا۔ چار مسلح گارڈ اس کے ساتھ ہیں اور وہ ان سمیت آپ کے پاس آنا چاہتی ہے۔ ہمارے آدمیوں نے انہیں گاڑی سے اترنے نہیں دیا۔ انہوں نے گاڑی کو گھیرے میں لے لیا ہے۔ اب جیسے آپ کہیں ویسے کر لیا جائے۔"

"اوہ....!" میں نے ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگائی "ایک تو ان لوگوں کو اپنے گارڈز کی نمائش کرنے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ راستے میں خوف و ہراس پھیلاتے ہوئے چلتے ہیں۔"

پھر میں نے اپنی گن وغیرہ چیک کرتے ہوئے کہا "ویسے ایک بات ماننی پڑے گی شفیع شاہ! یہ عورت اس عمر میں بھی بے پناہ ایکٹو ہے۔ اب یہی دیکھ لو کہ پیر دانش کی گرفتاری کے بعد اس نے نہ جانے کتنے اہم اور ممتاز لوگوں سے رابطہ کر کے ان سے تھانے فون بھی کرا دیے اور یہاں بھی آن پہنچی۔ یہ جھٹکا اس کے لیے قطعی غیر متوقع تھا۔ اس کے باوجود اس نے شاید سوچ بچار اور حیرانی پریشانی میں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کیا۔"

"اس میں شک نہیں سر.... کہ وہ ایک غیر معمولی عورت ہے" شفیع شاہ نے تسلیم کیا "آخر تبھی پس پردہ رہ کر پیر دانش کی ایمپائر کو کنٹرول کر رہی ہے۔"

"ہمیں ابھی تک اس کا اصل نام معلوم نہیں.... ہم نے خود ہی اس کا نام گاڈ مدر رکھ لیا ہے" میں نے کہا۔

"میری معلومات کے مطابق سماجی حلقوں میں اسے مسز شاہ جی کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ اصل نام شاید کسی کو بھی معلوم نہیں" شفیع شاہ بولا۔

"شاہ تو تم بھی ہو یار....! خدا نہ کرے تمہیں ایسی مسز نصیب ہو۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا "بہر حال.... تم جا کر مسز شاہ جی سے کہو کہ اگر وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ ہی میرے پاس آنا چاہتی ہیں تو وہ اپنی گنیں گاڑی میں ہی رکھ کر آئیں۔ ان پر واضح کر دینا کہ ہمیں ان کی گنوں کی پروا نہیں ہے لیکن یہ ہوٹل کی سیکیورٹی کا تقاضا ہے۔ لباسوں میں چھپی ہوئی چھوٹی گنیں لے کر آنا چاہیں تو آجائیں۔ گنوں کی نمائش کرتے ہوئے نہ آئیں۔"

"ٹھیک ہے سر!" شفیع شاہ نے سر ہلایا اور واپسی کے لیے مڑا۔

"سنو...." میں نے اسے پکارا "اگر وہ معقولیت کی بات ماننے پر آمادہ نظر نہ آئے یا زیادہ رعب جھاڑنے کی کوشش کرے تو اس پر واضح کر دینا کہ اسے اس کے آدمیوں سمیت اٹھا کر باہر فٹ پاتھ پر پھینکا جا سکتا ہے.... اور اگر وہ حد سے بڑھتی نظر آئے تو اپنی اس بات پر عمل بھی کر کے دکھا دینا۔"

شفیع شاہ نے اثبات میں سر ہلایا اور واپس چلا گیا۔ میں بظاہر سر جھکا کر کام میں مصروف ہو گیا لیکن میری توجہ دروازے کی طرف تھی۔ میز کے نیچے میرا ایک ہاتھ کوٹ کی جیب میں گن کے دستے پر تھا۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ دروازہ کھولنے والا شفیع شاہ تھا۔ وہ گاڈ مدر کو اندر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ گاڈ مدر ایک ہتھنی کی طرح اندر آئی مگر وہ ایک ایسی ہتھنی تھی جس میں کافی وقار اور دبدبہ موجود تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے چار آدمی کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ خالی ہاتھ ہی تھے۔ ان میں سے دو ایک طرف اور دو دوسری طرف دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ شفیع شاہ ایک کونے میں کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ سب پر نظر رکھ سکتا تھا۔

"اوہ.... مسز شاہ جی! آئیے آئیے.... تشریف رکھیے" میں نے کرسی سے اٹھے بغیر گردن کو ذرا تعظیم سے خم دیتے ہوئے خوش خلقی اور گرمجوشی سے کہا پھر میں نے اپنے مقابل کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

اس نے کرسی کی طرف نہیں دیکھا۔ وہ شعلہ بار نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی پکوڑا سی ناک کے نتھنے بری طرح پھول پچک رہے تھے۔ میں نے گویا اس کے موڈ کا کوئی نوٹس نہ لیتے ہوئے بدستور خوش خلقی سے پوچھا "خیریت تو ہے.... آپ اکیلی تشریف لائی ہیں.... پیر صاحب نہیں آئے؟"

"بند کرو یہ گھٹیا اداکاری....!" وہ بھاری بھرکم، بجلی، غضبناک اور تقریباً مردانہ آواز میں بولی "اتنا انجان بننے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں تو اس کے بارے میں پل پل کی اطلاعات مل رہی ہوں گی۔"

میں نے کچھ اس طرح اس کی طرف دیکھا جیسے اس کے لہجے سے مجھے دلی صدمہ پہنچا ہو۔ تاہم میں نے ملائمت سے کہا "کیسی خبریں مسز شاہ جی؟ خیریت تو ہے؟ آپ کچھ اپ سیٹ لگ رہی ہیں۔ خدانخواستہ.... کیا پیر صاحب کے بارے میں کوئی بری خبر ہے؟"

"تم سمجھتے ہو کہ تمہاری یہ اداکاری ہمیں دھوکا دے سکے گی؟" وہ گرجی "تم سمجھ رہے ہو کہ ہمیں تمہاری سازش کا اندازہ نہیں؟"

"کیسی سازش مسز شاہ جی؟ آپ کی باتیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہیں.... آپ اطمینان سے بیٹھیں تو سہی.... اور ذرا ڈھنگ سے مجھے اصل بات بتائیں...." میں نے اب بھی ملائمت سے کہا "آپ کس سازش کا ذکر کر رہی ہیں؟"

"میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی ہوں اور نہ ہی مجھے تمہاری منافقانہ باتوں سے کوئی دلچسپی ہے" وہ حقارت سے بولی۔

میں نے اپنا لہجہ بدلتے ہوئے اور سرد مہری اختیار کرتے ہوئے کہا "چلیے میری منافقانہ باتوں کو چھوڑیے۔ آپ کچھ مومنانہ ارشاد فرمایئے عظیم خاتون!"

"تم سمجھ رہے ہو کہ تم نے میرے بیٹے کو گرفتار کروا کے بڑا تیر مار لیا ہے...."

"اوہ....!" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے گہری سانس لی "تو پیر دانش صاحب گرفتار ہو گئے ہیں۔ اس لیے آپ اتنی برہم ہیں۔ مجھے نہیں معلوم تھا۔ ابھی یہ خبر اخبارات میں نہیں آئی۔ میری معلومات کا بڑا ذریعہ تو بس اخبارات ہی ہیں۔ مگر آپ نے یہ کیوں فرض کر لیا کہ پیر دانش کی گرفتاری سے میرا کوئی تعلق ہے؟ اسے گرفتار کرانے کے لیے تو اس کے اپنے اعمال ہی کافی تھے۔ بے شک مجھے اس کے بارے میں بہت سی باتیں معلوم تھیں لیکن ابھی تو میں نے اس کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی تھی۔"

"بکواس کر رہے ہو تم.... مجھے معلوم ہے تم کچھ عرصے سے اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ آخر تم نے اسے پھنسوا کر چھوڑا لیکن تمہیں زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔ پہلی پیشی پر ہی وہ جیل سے باہر ہو گا.... بشرطیکہ اسے عدالت میں پیش کرنے کی نوبت آئی" وہ بڑے وثوق سے بولی پھر اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر سفاکانہ مسکراہٹ نمودار ہوئی "اس کے بعد ہم تم سے بھی نمٹ لیں گے۔ تم نے تو جو کرنا تھا کر لیا اب ذرا تم اپنی خیر مناؤ۔"

میں نے گہری سانس لے کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "اے ہتھنی نما خاتون! بہت دیر سے میں تم سے تہذیب اور شائستگی سے بات کرنے کی کوشش کیے جا رہا ہوں لیکن تم یقیناً انہی لوگوں میں سے ہو جنہیں عزت راس نہیں آتی۔ اگر تم نے اسی لہجے میں گفتگو جاری رکھی تو مجھے تم کو اٹھوا کر باہر پھنکوانا پڑے گا۔ حالانکہ تمہیں اٹھانے کے لیے بھی کسی چھوٹی موٹی کرین کی ضرورت پڑے گی لیکن بہ حالتِ مجبوری میرے آدمی ہی کرین کا کام

بھی کرلیں گے۔۔۔"

اس کے محافظوں میں سے ایک نے نیفے کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن میں نے اس سے کہیں زیادہ تیزی سے گن نکال کر اس کے سینے کا نشانہ لیتے ہوئے کہا "نہیں پیارے۔۔۔! ایسی کوئی غلطی نہ کرنا۔ یہاں سے تو تمہاری لاش بھی باہر نہیں جاسکے گی۔"

اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ گاڈ مدر بولی "اپنے گھر پر بلّی بھی شیر ہوتی ہے۔۔۔"

میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے اور گن میز پر رکھتے ہوئے کہا "تم جہاں کہو میں وہاں چلنے کو تیار ہوں۔"

وہ آنکھیں سکیڑتے ہوئے اور دھیرے دھیرے گردن ہلاتے ہوئے بولی "دانش کو باہر آجانے دو پھر ہم تم سے پوچھیں گے کہ تم کہاں چلنے کو تیار ہو۔"

"تمہارا دانش وہ انوکھا لاڈلا جو سو بدمعاشوں کا ایک بدمعاش ہے۔۔۔ اگر جیل چلا ہی گیا ہے تو اب اس کے باہر آنے کی امید ذرا کم ہی رکھو۔ اب شاید اس کی روحانی طاقت بھی اسے باہر نہ لاسکے" میں نے کہا۔

"دیکھا۔۔۔ میں تو پہلے ہی کہہ رہی تھی کہ اس کارروائی کے پیچھے تمہارا ہاتھ ہے۔ تبھی تو تم یہ بات اتنے یقین سے کہہ رہے ہو" وہ تیزی سے بولی۔

"میرا پہلے تو اس کارروائی میں کوئی ہاتھ پاؤں وغیرہ نہیں تھا لیکن اب تمہارے رویے نے مجھے مجبور کردیا کہ میں اس معاملے میں ضرور ٹانگ اڑاؤں۔ میرے پاس بھی تمہارے اس "معصوم بچے" کے بارے میں کچھ مواد موجود ہے جو میں عدالت میں پیش کروں گا۔ تم میں طاقت ہو تو مجھے روک لینا" میں نے کہا۔

"ہم کسی کو بھی نہیں روکیں گے" وہ حقارت سے بولی "تم سب بے شک الٹے لٹک جاؤ۔۔۔ تم دانش کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔"

"کیا صرف یہی بتانے کے لیے تم نے اتنی دور آنے کی زحمت کی ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔ میں صرف یہی بتانے آئی تھی" وہ پاؤں پٹخ کر بولی اور اپنے آدمیوں کو واپسی کا اشارہ کرتے ہوئے دروازے کی طرف مڑ گئی۔ میں اور شفیع شاہ خاموشی سے انہیں جاتے دیکھتے رہے۔ شفیع شاہ کے دونوں ہاتھ اب تک جیبوں میں تھے جو دھیرے دھیرے باہر آگئے۔

"چہ۔۔۔ چہ۔۔۔ چہ۔۔۔" وہ ترحم آمیز لہجے میں بولا "اس صدمے نے بے چاری کے پیروں تلے سے زمین نکال دی ہے۔"

"اصل میں انہوں نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ ان کے ساتھ ایسا بھی ہوسکتا ہے" میں نے شفیع شاہ کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "اور سچی بات یہ ہے کہ رحیم گل کی "خردماغی" کے بغیر یہ ممکن بھی نہیں تھا۔"

"یہ ہتھنی بڑا فساد مچائے گی" شفیع شاہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ظاہر ہے۔ ہتھنی یا اس کے بچے کو گولی مارنے کے بجائے جال ڈال کر پکڑنے کی کوشش کی جائے تو وہ اودھم تو مچائے گی۔ اب دعا کرو کہ جال مضبوط ثابت ہو" میں نے کہا "ان کے ردعمل کے لیے تو ہمیں ہر حال میں تیار رہنا ہی پڑے گا۔"

"اگر آپ اجازت دیں تو میں دو تین خاص آدمیوں کو ساتھ لے کر کچھ عرصہ دور دور سے آپ کی نگرانی کرتا رہوں؟" شفیع شاہ نے پوچھا۔

میں نے ایک لمحے سوچا پھر کہا "ہاں۔۔۔ میرا خیال ہے اس میں کوئی حرج نہیں۔ جب تک یہ معاملہ نمٹ نہیں جاتا' احتیاط ہی بہتر ہے۔ اس کے بعد ویسے بھی شاید میں لاہور چلا جاؤں۔"

اسی اثنا میں باہر سے ہمارے آدمیوں نے اطلاع بھجوائی کہ گاڈ مدر اپنے آدمیوں کے ساتھ رخصت ہوچکی تھی۔ تب ہم ذرا بے فکر ہو کر بیٹھ گئے۔

دوسرے روز دوپہر کو رحیم گل نے کھانے سے ذرا پہلے بڑے خوشگوار موڈ میں مجھے اطلاع دی "وکیلوں کی ایک بڑی معروف فرم پیر دانش کو بچانے کے لیے حرکت میں آگئی ہے۔ دو صاحبان وکیلوں نے آج سیشن کورٹ میں درخواست دائر کی تھی کہ پیر دانش کو حبسِ بے جا میں رکھا گیا ہے۔"

"پھر۔۔۔؟" میں نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

وہ دھیرے سے ہنسا "قدرت اس نیک کام میں ہماری کچھ مدد کررہی ہے۔ عام طور پر اس قسم کی درخواستوں پر عدالتیں رہائی کا حکم دے دیتی ہیں لیکن یہ درخواست سیشن کورٹ نے مسترد کردی۔ میں نے عدالت میں گرفتاری کا پس منظر بتانے کے ساتھ ساتھ وکیلوں کی نظر بچا کر جج صاحب سے ان کے چیمبر میں بھی ملاقات کی تھی۔ سچائی کا اپنا ایک اثر ہوتا ہے" وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسا "اب کل اسے کورٹ میں پیش کرنا اور ریمانڈ کی درخواست کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہوگیا ہے۔ ایف آئی آر کٹنے کے بعد یہ ویسے بھی ضروری ہی تھا" اس نے مزید بتایا۔

"میں تم سے یہ پوچھنا تو بھول ہی گیا کہ ایف آئی آر تم نے کس کی طرف سے کاٹی ہے؟" میں نے کہا۔

"ظفر جمال کی طرف سے" رحیم گل نے جواب دیا "وہ اس مقدمے کا مدعی اور سب سے بڑا گواہ ہے۔"

"ٹھیک ہے" میں نے طمانیت سے کہا "کل کتنے بجے کورٹ پہنچ رہے ہو؟"

"ٹھیک آٹھ بجے" رحیم گل نے جواب دیا "پیشی خواہ کتنے ہی بجے ہو لیکن ہمیں وہاں آٹھ بجے موجود ہونا چاہیے۔"

"مروا دیا یار۔۔۔!" میں نے کراہ کر کہا "آٹھ بجے وہاں پہنچنے کا مطلب ہے صبح بہت جلدی اٹھنا پڑے گا۔ یہ تو میں نے بیٹھے بٹھائے اپنی شامت کو دعوت دے دی۔"

رحیم گل نے ہلکا سا قہقہہ لگایا "خدائی فوجدار بننے کا اتنا شوق ہے اور پہلے ہی مرحلے پر کراہنے لگے۔"

"خیر.... کوئی بات نہیں۔ میں پہنچ جاؤں گا" میں نے کہا۔

"کورٹ کی مین روڈ والی سائڈ پر مجھے ملنا" رحیم گل بولا "ویسے اس پیشی پر تمہاری ضرورت تو نہیں ہے لیکن کارروائی سے آگاہ رہنے کے لیے تم موجود رہنا۔"

"ٹھیک ہے.... میں اسی گاڑی میں بلڈنگ کے کونے پر موجود رہوں گا جو تم کل دیکھ چکے ہو۔ جب تم ضروری سمجھو تو مجھے اندر عدالت میں بلوالینا" میں نے کہا۔

"بالکل ٹھیک ہے" اس نے بھی مطمئن لہجے میں کہا اور سلسلہ منقطع کردیا۔

دوسرے روز میں آٹھ بجے سے پہلے ہی عدالت کی عمارت کے کونے پر مین روڈ کی طرف اپنی گاڑی میں موجود تھا۔ کورٹ کی عمارت شہر کے پرانے گنجان آباد اور کاروباری علاقے میں واقع تھی۔ دن چڑھے تو مجھے یہاں گاڑی کھڑی کرنے کے لیے بھی جگہ میسر نہیں آسکتی تھی لیکن ابھی کاروباری ادارے اور دکانیں وغیرہ نہیں کھلی تھیں' صرف کورٹ میں آنے والوں کی آمد جاری تھی اس لیے زیادہ رش نہیں تھا۔ اسی روڈ پر عمارت کے دوسرے کونے پر شفیع شاہ ایک سفید کار میں دو آدمیوں کے ساتھ موجود تھا۔

یہاں سے ہم پوری سڑک پر نظر رکھ سکتے تھے جو زیادہ طویل نہیں تھی کیونکہ ایک سرے پر اسے زیادہ بڑی سڑک کراس کر رہی تھی اور دوسری طرف کچھ ہی فاصلے کے بعد یہ سڑک گھوم جاتی تھی۔ میں نے گاڑی کے شیشے بند ہی رہنے دیے تھے۔ شیشے ٹنڈڈ تھے۔ مجھے باہر سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ میں نے انجن اور اے سی چلتا رہنے دیا تھا۔ مدھم سی سرسراہٹ سنتے ہوئے میں انتظار کی گھڑیاں گزارنے لگا۔ شفیع شاہ نے موبائل فون پر مجھے بتایا تھا کہ گاڈ مدر' ان کے وکیل اور دوسرے کئی آدمیوں کا ٹولا پہلے ہی اندر پہنچ چکا تھا۔

میں نے بڑے سکون اور تحمل سے انتظار کیا جو زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔ وقت کی حیرت انگیز پابندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ٹھیک آٹھ بجے رحیم گل کی لینڈ کروزر بڑی سڑک کی طرف سے کونے پر نمودار ہوئی اور مجھ سے ذرا ہی فاصلے پر آن رکی۔ عدالت کا مین گیٹ چھوٹی گلی میں تھا لیکن اس طرف رش زیادہ تھا۔ گاڑیاں اندر نہیں جاسکتی تھیں۔ رحیم گل کو وہیں اترنا پڑا۔

آج گاڑی ایک کانسٹیبل چلا رہا تھا۔ اس کے برابر دوسرا مسلح کانسٹیبل موجود تھا۔ پچھلی سیٹوں سے رحیم گل اور پیردانش اترے۔ دو مزید مسلح کانسٹیبل ان کے ساتھ اترے۔ پیردانش کو آج بھی ہتھکڑی نہیں لگی ہوئی تھی تاہم چھتیس گھنٹے ہی پولیس کی تحویل میں رہ کر اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ شخصیت کی مضحکہ خیزی کے باوجود اس میں جو ایک طنطنہ دکھائی دیتا تھا' وہ آج نہیں تھا۔ وہ کچھ بجھا بجھا سا دکھائی دے رہا تھا۔

ابھی اس کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں نہیں آئی تھی۔ شاید اس کا اپنا اثر و رسوخ بھی کام کر رہا تھا اور شاید ابھی رحیم گل بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس معاملے کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہو۔

لینڈ کروزر کے پیچھے پیچھے ایک بہت بڑی نیلی گاڑی نے آہستگی سے ٹرن لیا اور گھرگھراتی ہوئی قریب آرکی۔ اس قسم کی گاڑیاں قیدیوں کو لانے لے جانے میں استعمال ہوتی تھیں لیکن ان کی حالت تباہ نظر آتی تھی جب کہ یہ گاڑی تقریباً نئی اور بہت بہتر تھی۔ یہ چاروں طرف سے بند تھی اور مکمل طور پر بلٹ پروف معلوم ہوتی تھی۔ اس کی ونڈ اسکرین تک کے پیچھے اسٹیل کی موٹی حفاظتی جالی لگی ہوئی تھی۔ اس گاڑی کے پیچھے ایک پولیس موبائل بھی تھی۔

بلٹ پروف گاڑی کا دروازہ پیچھے کی طرف تھا جسے میں اپنی گاڑی میں بیٹھے نہیں دیکھ سکتا تھا تاہم میں گاڑی سے نہیں اترا۔ رحیم گل نے میری گاڑی دیکھ لی تاہم اس نے فی الحال مجھ سے ملنے یا قریب آنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ پولیس والوں کو کچھ ہدایات دینے لگا۔ پیردانش مسلح پولیس والوں کے نرغے میں تھا۔ مجھے توقع تھی کہ آج ضرور کوئی کورٹ رپورٹر اسے دیکھ لے گا اور شاید تمام ترپس پردہ کوششوں کے باوجود کل تک اس کی گرفتاری کی خبر اخبارات میں آنے سے نہ رک سکے۔

رحیم گل کی ہدایات پر بلٹ پروف گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا گیا اور میں نے مسلح و مستعد پولیس والوں کے گھیرے میں ظفر جمال کو آگے آتے دیکھا۔ اب میری سمجھ میں آگیا کہ رحیم گل نے اسے کہاں رکھا ہوا تھا۔ اس نے یقیناً اسے جیل میں رکھا ہوا تھا۔ شاید اس کے لیے وہی محفوظ جگہ تھی۔ تاہم وہ بالکل تازہ دم اور مطمئن و مسرور نظر آرہا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس کا ضمیر مطمئن تھا۔ وہ نہایت پُراعتماد انداز میں قدم اٹھاتا پیردانش کے قریب آرکا۔

دونوں مسلح پولیس والوں کے الگ الگ گھیرے میں تھے۔ اس لیے دونوں کے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ میں دونوں کے تاثرات صاف دیکھ سکتا تھا۔ ظفر جمال کے چہرے پر قدرے فتح مندی اور حقارت تھی۔ شاید آج وہ پہلی بار اپنے آپ کو پیردانش سے برتر محسوس کر رہا تھا۔ پیردانش کا چہرہ سپاٹ تھا لیکن وہ پلک جھپکائے بغیر ظفر جمال کو گھور رہا تھا۔

پھر اچانک یوں لگا جیسے ظفر جمال' پیردانش کی نظروں کی تاب نہ لاکر لڑکھڑا کر گر پڑا ہو.... لیکن دوسرے ہی لمحے مجھے اندازہ ہوگیا کہ اس میں پیردانش کی نظر کا کوئی کمال نہیں تھا۔ ظفر جمال کی پیشانی میں سوراخ ہوچکا تھا اور اس سے خون اُبل رہا تھا۔

فائر کی آواز سنائی نہیں دی تھی!

ایک لمحے کے لئے تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ پیردانش کا چہرہ اب بھی سپاٹ تھا۔ ظفر جمال کو گرتے دیکھ کر صرف ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھوں میں فاتحانہ سی چمک ابھری تھی مگر فوراً ہی غائب ہوگئی تھی۔ وہ گویا اپنے گرد و پیش سے.... اور تمام

حالات سے قطعی لاتعلق تھا۔

پولیس والوں کی سمجھ میں جب بات آئی تو وہ سب گنیں سنبھال کر یوں سینے کے بل آڑے ترچھے گر گئے جیسے ان پر کسی گروہ نے حملہ کردیا ہو۔ کسی کی گن کا رخ کسی طرف تھا' کسی کا کسی طرف۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ انہوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع نہیں کردی ورنہ سارے علاقے میں بھگدڑ مچ جاتی۔

اس دوران میں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے ہی چاروں طرف کا جائزہ لے چکا تھا۔ وہ ایک نہایت گنجان آباد علاقہ تھا۔ یہاں کی بیشتر عمارتیں قیام پاکستان سے بھی پہلے کی تھیں۔ ان میں تین چار منزلہ پرانی اور بوسیدہ عمارتیں بھی تھیں جو چھوٹے بڑے فلیٹوں پر مشتمل تھیں۔ ان کی بالکونیاں اور کھڑکیاں مین روڈ یا گلیوں کی طرف تھیں اور ان میں سے بعض میں اکا دکا مرد عورتوں یا بچوں کی نقل و حرکت نظر آرہی تھی۔ بعض بند کھڑکیوں کے عقب میں تاریکی تھی۔

میں نے گولی کی سمت کا اندازہ کرلیا تھا۔ اس کے باوجود یقین سے کچھ کہنا مشکل تھا۔ اس سمت میں بھی کئی جگہیں ایسی تھیں جن کے بارے میں کہا جاسکتا تھا کہ گولی وہاں سے آئی ہوگی لیکن اسی لیے مجھے ایک عمارت کی چھت پر ایک سیاہ سی چیز کی جھلک نظر آئی۔

سیاہ ہونے کے باوجود اس چیز پر دھوپ کی کرنیں منعکس ہوئی تھیں۔ صرف ایک ثانیے کے لئے جھلملا کر وہ چیز غائب ہوگئی پھر اسی جگہ پر ایک لمحے کے لئے کسی کی کھوپڑی متحرک نظر آئی۔ فوراً ہی وہ بھی غائب ہوگئی۔ ایک سیکنڈ کی تاخیر سے بات میری سمجھ میں آگئی۔

وہ کسی گن کی سیاہ اسٹیل کی نال کا ایک حصہ تھا جس پر سورج کی زرد کرنیں منعکس ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی دوربین کا ایک نہایت چھوٹا سا عدسہ جھلملایا تھا جو شاید گولائی میں ایک انچ سے زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہ ٹیلی اسکوپک سائٹ والی ایک دوربار رائفل تھی جس کی نال' منڈیر کے ایک سوراخ سے نکال کر کوئی سینے کے بل لیٹا ہوا تھا۔

جس وقت میں نے اس عمارت کی طرف دیکھا' وہ شخص اٹھ کر چوپایوں کی طرح بھاگا تھا لیکن منڈیر چونکہ زیادہ اونچی نہیں تھی اس لئے مجھے اس کی کھوپڑی حرکت کرتی دکھائی دے گئی تھی۔ میں نے دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر چھلانگ لگائی۔ گن میرے ہاتھ میں آچکی تھی۔ رحیم گل بھی ہولسٹر سے اپنا ریوالور نکال چکا تھا اور میری ہی گاڑی کی آڑ لئے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

پیردانش چاہتا تو اس وقت بڑے اطمینان سے فرار ہوسکتا تھا بشرطیکہ اس کوشش کے دوران رحیم گل اسے گولی نہ ماردیتا۔ اس کے سوا اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں تھا۔ اب وہ پولیس والوں کے گھیرے میں نہیں تھا بلکہ پولیس والے تو شاید فی الحال اسے بھول ہی گئے تھے۔ اسے ہتھکڑی بھی نہیں لگی ہوئی تھی لیکن اصل بات یہ تھی کہ اسے فرار ہونے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

اس قسم کے لوگ قانون ہی کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے جال سے نہایت اطمینان سے نکلتے ہیں اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوتے ہیں۔ یہی ان کا فرار ہوتا ہے۔ انہیں پیشہ ور مجرموں کی طرح فرار ہونے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

میں نے دوڑتے دوڑتے اشارے سے رحیم گل کو بتایا "وہ بلڈنگ ہے......."

وہ میرا مطلب سمجھ گیا اور تیزی سے میرے پیچھے لپکا۔ صرف اسی سے میں پھرتی کی توقع رکھ سکتا تھا۔ باقی پولیس والوں میں سے کسی کو ساتھ لینا فضول تھا۔ جتنی دیر انہیں حکم دینے اور بات سمجھانے میں لگتی اتنی دیر میں تو گروہ کے گروہ فرار ہوسکتے تھے۔ اس قسم کی صورت حال میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔

شفیع شاہ کی گاڑی کچھ دور تھی لیکن مجھے امید تھی کہ ہمیں بھاگتے دیکھ کر وہ بھی تیزی سے ہمارے پیچھے آجائے گا۔ میں دو طرفہ ٹریفک کے درمیان سے جس طرح زگ زیگ کرتا ہوا' جس رفتار سے اس عمارت تک پہنچا' میرا وہ عمل کسی ماہر شعبدہ باز کے شعبدے سے کم نہیں تھا لیکن یہ ایک ایسا شعبدہ تھا جو میز پر کھڑے ہو کر نہیں بلکہ سڑک پر دکھایا جارہا تھا۔ چند سیکنڈ میں' میں جہاں سے عمارت تک پہنچا تھا دیکھنے والوں نے شاید اسے فریب نظر سمجھا ہو۔

مجھے خود نہیں معلوم تھا کہ میں رواں دواں ٹریفک کے درمیان

سے کس طرح گزرا تھا۔ ذہن میں بس ایک ہی دُھن تھی کہ اس شخص کو نکلنا نہیں چاہئے۔ ظفر جمال یقیناً مرچکا تھا۔ جس انداز سے گولی اس کی پیشانی میں پیوست ہوئی تھی اس کے بعد کسی کا زندہ رہنا ممکن نہیں تھا۔ قاتل بھی اس کے بارے میں اتنا ہی پُریقین تھا کہ اس نے دوسری گولی چلانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ بے شک اس نے ٹیلی اسکوپک سائٹ والی رائفل استعمال کی تھی اس کے باوجود مجھے اعتراف تھا کہ وہ کوئی غضب کا نشانہ باز تھا۔

عمارت کے قریب پہنچ کر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ رحیم گل مجھ سے بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ تاہم وہ کافی تیز دوڑا آرہا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ اس سے ذرا ہی پیچھے شفیع شاہ اور اس کا ایک ساتھی بھی آرہے تھے۔ میں نے صرف ایک لمحے کے لئے رک کر انہیں اشارہ کیا کہ وہ وہیں رک کر عمارت پر آگے اور پیچھے سے نظر رکھیں تاکہ کسی طرف سے کوئی نکل کر فرار نہ ہوسکے۔

یہ اطمینان کرنے کا وقت نہیں تھا کہ وہ میری بات سمجھے تھے یا نہیں؟ میں دوسرے ہی لمحے گھوم کر عمارت میں گھُس گیا۔ وہ فلیٹوں پر مشتمل ایک ویسی ہی کہنہ سال عمارت تھی جیسی پرانے کراچی میں کثرت سے نظر آتی ہیں۔ ان میں سے بعض کو گرا کر نئے سرے سے بنایا جاچکا ہے لیکن نئی شکل میں بھی وہ پہلے سے بدتر دڑبا نما فلیٹس پر مشتمل ہوتی ہیں۔ بعض کو کافی مرمت اور لیپا پوتی سے سہارا دینے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے ان کی شکل کافی تبدیل ہوجاتی ہے۔

میں جس عمارت میں گھُسا تھا وہ اپنی اصل شکل میں تھی۔ بوسیدہ لیکن کشادہ سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں۔ عمارت میں کنگی کی ایک مخصوص بُو کے علاوہ بھی ایک بُو محسوس ہورہی تھی جو شاید کئی خوشبوؤں اور بدبوؤں کا مرکب تھی۔ بیشتر فلیٹوں میں شاید ابھی ناشتا بن رہا تھا۔ گو کہ فلیٹوں کے دروازے بند تھے لیکن خوشبوئیں بدبوئیں اِدھر اُدھر چکرا رہی تھیں۔

میں ایک ساتھ دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چڑھا۔ میرے اندازے کے مطابق میں جتنی دیر میں گاڑی سے اتر کر یہاں تک پہنچا تھا اتنی دیر میں وہ شخص ایک منزل سے زیادہ نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ بشرطیکہ اس کا نیچے آنے کا ارادہ ہوتا۔ میں نے روانہ ہوتے وقت دیکھ لیا تھا کہ اس عمارت کے دونوں طرف والی عمارتوں کی چھتیں اس سے زیادہ اونچی تھیں لیکن قاتل ان پر چڑھنے کی کوشش تو کرہی سکتا تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس نے رسی کی کسی کمند وغیرہ کا بھی بندوبست کر رکھا ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اوپر ایک سے زیادہ افراد موجود رہے ہوں۔

میرا اس طرح اندھا دھند اوپر چڑھنا میرے لئے خطرناک ثابت ہوسکتا تھا۔ اگر اوپر سے اترتا ہوا کوئی شخص گن لئے اچانک میرے سامنے آجاتا تو فائر کرنے کے لئے وہ بہتر پوزیشن میں ہوتا لیکن میں اس وقت احتیاط برتنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ میرا حتی

نیچے آنے کے بجائے اوپر ہی اوپر سے کسی طرح فرار ہوجاتا اس لئے میں قسمت پر بھروسا کر کے غیر محتاط انداز میں سیڑھیاں پھلانگتا چڑھتا چلا گیا۔

پہلی اور دوسری منزل کے درمیان ایک بچی جو ہاتھ میں کوئی برتن اٹھائے سیڑھیاں اتر رہی تھی، مجھے گن اٹھائے اوپر آتے دیکھ کر خوف کے مارے سیڑھیوں سے گرتے گرتے بچی۔ میں نے ہی ہاتھ بڑھا کر اسے گرنے سے باز رکھا۔ یوں مجھے ایک لمحے کے لئے رکنا پڑا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نہیں نکلی لیکن اس کی آنکھیں دہشت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے وھپ سے اسے سیڑھی پر بٹھا کر اوپر کی طرف اپنا سفر جاری رکھا۔

تیسری منزل کے ایک فلیٹ سے 'لمبا سا لبادہ پہنے ایک عورت نکلی اور سیڑھیوں کی طرف آئی۔ میں اس وقت تیسری منزل سے ذرا نیچے تھا۔ پرانی عمارتوں میں منزلیں بھی آج کل کے مقابلے میں ذرا اونچی ہوتی ہیں۔ عورت ابھی سیڑھیوں پر قدم رکھنے ہی لگی تھی کہ اس کی مجھ پر اور میرے ہاتھ میں موجود گن پر نظر پڑی۔

"ہائے اماں....!" وہ بے اختیار چیخی اور تیزی سے گھوم کر الٹے قدموں واپس فلیٹ میں گھُس گئی۔ میں اس کا خوف اور غلط فہمی دور کرنے کے لئے کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ یہ بہت اچھا ہوا کہ اس نے کھناک سے اپنے فلیٹ کا دروازہ بند کرلیا کیونکہ جونہی میں اوپر سیڑھیوں کے موڑ پر پہنچا' مجھے ایک شخص دوربین والی رائفل سنبھالے بلّی کی طرح دبے قدموں اوپر سے آتا دکھائی دیا۔

وہ غالباً یہ سمجھا تھا کہ عورت اسے دیکھ کر چیخی تھی۔ اس کے علاوہ وہ کھلا دروازہ دیکھ کر ادھر لپکا بھی تھا۔ شاید وہ فلیٹ میں گھُس کر چھُپنے' کسی کو یرغمال بنانے یا وہاں سے فرار کی کوئی تدبیر کرنے کی فکر میں تھا لیکن دروازہ کھناک سے بند ہوا تو وہ مزید سیڑھیاں اترنے کے لئے مڑا۔

عین اسی وقت اس کی مجھ پر نظر پڑی اور اسی لمحے میں نے اسے "ہینڈز اَپ" کا حکم دیا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھ پر گولی چلانے کی کوشش کرے گا تو میں اس کے ہاتھ یا بازو پر فائر کر کے اسے باز رکھوں گا۔ میں اسے زندہ پکڑنا چاہتا تھا لیکن اس کا ردِعمل بالکل ہی غیر متوقع رہا۔

اس نے رائفل ہی میرے منہ پر کھینچ ماری۔ مجرم عام طور پر آخری لمحے تک اپنے ہتھیار سے محروم ہونا گوارا نہیں کرتے لیکن اس کے لئے گویا رائفل لکڑی کا محض ایک بے کار ٹکڑا تھی۔ شاید اس لئے کہ اسے اس سے جو کام لینا تھا وہ لے چکا تھا۔ اپنا دفاع اس کے نزدیک زیادہ اہم نہیں تھا۔

رائفل اگر میرے منہ پر پڑجاتی تو شاید میں پشت کے بل سیڑھیوں پر جا گرتا اور لڑھکتا ہوا نیچے جا پہنچتا کیونکہ اس وقت میرا ایک پاؤں لینڈنگ کے کنارے پر اور دوسرا دو سیڑھی نیچے تھا۔ میں زیادہ مضبوطی سے نہیں کھڑا تھا۔ ذرا سا دھکا بھی مجھے نیچے پہنچا سکتا

...جانے کے باوجود خطرناک تھیں۔ اگر کھوپڑی ایک آدھ مرتبہ ...ان کے کناروں سے ٹکرا جاتی تو کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ...ان کا انجام کیا ہوتا۔

...میری خوش قسمتی تھی کہ میں کسی برے انجام سے بچ گیا۔ نہ ...نے کس طرح میں بروقت سر جھکانے میں کامیاب ہوگیا اور وہ ...اس حد تک کہ رائفل میرے جسم کے کسی حصے سے مس ...ئے بغیر سیدھی نیچے والی لینڈنگ پر جاگری۔ اس کے گرنے کی ...ز خاصی زوردار تھی۔

میں نے سر اٹھایا تو وہ شخص میرے سامنے سے غائب تھا۔ میں ...یوں کے موڑ پر گھوم کر تیزی سے مختصر راہداری میں لپکا تو وہ ...اگلی سیڑھیوں تک پہنچتا دکھائی دیا۔ میں نے اس کی ٹانگ پر فائر

مجھے یقین تھا کہ گولی اسے لگی تھی کیونکہ میں نے ایک لمحے ...لئے اسے لڑکھڑاتے دیکھا لیکن اس میں اس وقت نہ جانے کون ...طرح حلول کئے ہوئے تھی۔ وہ رکا نہیں بلکہ اگلی سیڑھیوں کے ...ر میری نظر سے اوجھل ہوگیا۔

جب میں اس موڑ تک پہنچا تو وہ مجھے سیڑھیوں پر نظر نہیں ...ٹانگ پر گولی لگنے کے باوجود وہ کسی چھلاوے سے کم ثابت ...ہوا تھا۔ ان سیڑھیوں کا اختتام چھت پر ہی ہورہا تھا۔ اس کا ...ب تھا وہ واپس چھت پر پہنچ چکا تھا۔

میں نے شاید دو تین زقندوں میں ہی باقی سیڑھیاں طے کیں ...سیڑھیوں کے اختتام پر مجھے ایک لمحے کے لئے رکنا پڑا۔ ...یوں کے اختتام پر دروازہ تھا اور دروازے سے اندھا دھند ...ٹھیک نہیں تھا۔ وہ دروازے کے عقب میں میرا منتظر بھی ...ا تھا۔ بے شک اس نے رائفل مجھ پر کھینچ ماری تھی لیکن اس ...اس دوسرا ہتھیار بھی ہوسکتا تھا۔

میں نے آہستگی سے دروازے سے سر نکالا لیکن وہ دروازے ...پیچھے نہیں تھا۔ دائیں طرف چھت سے جڑی ہوئی برابر والی ...ت کی دیوار نظر آرہی تھی۔ دوسری عمارت اس سے ایک ...اونچی تھی لیکن قاتل کے مقصد کے لئے محلِ وقوع کے اعتبار ...یہ عمارت زیادہ اچھی تھی جسے اس نے استعمال کیا تھا۔ برابر ...عمارت کی دیوار پر پلستر نہیں تھا اور وہ ایک کمند کے سہارے ...پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اپنی زخمی ٹانگ کی وجہ سے ...ب نہیں ہورہا تھا۔ اس کی ٹانگ سے بہتا ہوا خون دیوار پر ...رہا تھا۔

...اوپر چڑھنے کی کوشش کے دوران وہ گردن گھما گھما کر پیچھے بھی ...جا رہا تھا۔ اس نے مجھے سیڑھیوں کے دروازے سے سر نکالتے ...یا اور اسے اندازہ ہوگیا کہ اب اس کی کوشش کامیاب نہیں ...تی تھی۔ اس نے رسی چھوڑ دی اور چھلانگ لگا کر عقبی منڈیر کی ...بھاگا۔

"رک جاؤ" میں نے چھت پر پہنچتے ہوئے چیخ کر کہا اور ایک

ہوائی فائر بھی کیا لیکن وہ لنگڑاتا ہوا منڈیر پر پہنچ چکا تھا۔ مجھے وہاں ایک آہنی کنڈا ایک کنگرے میں پھنسا ہوا دکھائی دیا جس کے ساتھ بندھی ہوئی رسی یقیناً نیچے جارہی تھی۔ یعنی وہ دونوں راستوں سے فرار کا بندوبست کر کے آیا تھا۔ برابر کی چھت پر چڑھنے کے لئے بھی اس نے کمند لگا رکھی تھی اور نیچے اترنے کے لئے بھی پچھلی طرف کمند لٹکا رکھی تھی لیکن ان دونوں راستوں پر قسمت آزمائی کرنے سے پہلے اس نے سیڑھیوں کے راستے فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ اگر مجھے یہ اندازہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر ہوجاتی کہ گولی کہاں سے چلائی گئی تھی.... اور اس کے علاوہ میں برق رفتاری سے یہاں نہ پہنچا ہوتا تو وہ شخص سیڑھیوں کے راستے بھی یہاں سے نکل کر فرار ہوسکتا تھا۔ ایک بار عمارت سے نکلنے کے بعد یہاں سے غائب ہونا زیادہ مشکل نہیں تھا۔ علاقہ ہی کچھ اس قسم کا تھا۔

میں نے اس پر دوسری گولی اس لئے نہیں چلائی کہ وہ مر ہی نہ جائے۔ میرا خیال تھا کہ میں اسے رسی کے ذریعے نیچے اترنے سے باز رکھنے میں کامیاب ہوجاؤں گا لیکن میرا اندازہ تھوڑا سا غلط ہوگیا۔ اس کا رسی کے ذریعے اترنے کا کوئی ارادہ ہی نہیں تھا۔ اس نے منڈیر پر چڑھتے ہی نیچے چھلانگ لگادی۔ میرا دل ایک لمحے کے لئے ڈوب سا گیا۔

اس کے کمند کو استعمال نہ کرنے کی اصل وجہ مجھے اس وقت معلوم ہوئی جب میں نے منڈیر تک پہنچ کر نیچے جھانکا۔ رحیم گل اور شفیع شاہ عمارت کے عقب میں پہنچ چکے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔ انہوں نے عمارت کے عقب میں پہنچنے میں کافی پھرتی دکھائی تھی۔

یقیناً انہی کو دیکھ کر اس شخص نے کمند کے ذریعے نیچے اترنے کا ارادہ ترک کردیا ہوگا۔ اسے اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آیا ہوگا کیونکہ وہ زندہ کسی کے ہاتھ نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہ اب ایک گٹھری کی سی صورت میں سڑک پر ساکت پڑا تھا۔ ایک ایسی گٹھری جس پر تیزی سے سرخی پھیلتی جارہی تھی۔ رحیم گل اور شفیع شاہ کبھی لاش کی طرف اور کبھی سر اٹھا کر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

میں نے گن اپنے لباس میں چھپائی اور تیزی سے واپس جانے کے لئے پلٹا۔ تب مجھے چھت پر ایک کونے میں گٹار کا ایک کیس کھلا پڑا نظر آیا۔ قاتل یقیناً اپنی ٹیلی اسکوپک رائفل اور کمندیں اسی میں چھپا کر چھت تک لایا تھا۔ میں نے اسے وہیں چھوڑا اور تیزی سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ تمام فلیٹوں کے دروازے بند تھے اور سیڑھیوں میں بھی میرا کسی سے سامنا نہیں ہوا۔ ایک عورت اور ایک بچی نے مجھے گن لے کر اوپر چڑھتے دیکھا تھا۔ شاید اب تک تمام فلیٹوں میں خبر پھیل چکی تھی کہ بلڈنگ میں دہشت گرد گھُس آئے ہیں۔

عمارت میں سیڑھیاں ایک طرف ہی تھیں لیکن دروازے آگے پیچھے دونوں طرف موجود تھے بلکہ ایک دوسرے کی سیدھ میں ہی تھے۔ پچھلا دروازہ گرل کا تھا۔ میں اس سے نکلا تو فوراً ہی لاش

تک جا پہنچا۔ یہ بھی ایک چھوٹی لیکن نہایت مصروف سڑک تھی مگر شاید سڑک پر ایک لاش اور اس کے قریب ایک باوردی اور ایک بے وردی گن بردار کی موجودگی کی وجہ سے یہاں تیزی سے ویرانی پھیلنے لگی تھی۔ بیشتر دکانیں وغیرہ تو ابھی کھلی ہی نہیں تھیں لیکن آمدورفت بھی گویا فوراً ہی متاثر ہوگئی تھی۔

وہ شخص شاید سر کے بل سڑک پر گرا تھا۔ اس کی کھوپڑی تربوز کی طرح پچک کر پھٹ گئی تھی اور گردن اس طرح مڑ چکی تھی کہ کندھے سے لگ چکی تھی۔ شکل کافی حد تک مسخ ہو چکی تھی اور مجھے یقین تھا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی حالت اور بھی خراب ہوتی جائے گی۔ چہرہ مشکل سے ہی شناخت کے قابل رہے گا۔

"افسوس کہ ہم اسے زندہ نہیں پکڑ سکے۔" رحیم گل ریوالور ہولسٹر میں رکھتے ہوئے ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"ظاہر ہے اس کے مشن میں یہ بات شامل تھی کہ اسے زندہ کسی کے ہاتھ نہیں آنا ہے۔" میں نے گردوپیش کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "اس نے اپنے آپ کو قربانی کے بکرے کے طور پر پیش کیا ہوگا۔ اس کے لواحقین کو شاید بہت بڑی رقم مل جائے گی۔ انسانی زندگی کی یہ تجارت کہیں کسی شکل میں، کہیں کسی شکل میں، بہت ہی پھل پھول رہی ہے۔"

"اوپر اور کوئی تو نہیں تھا؟" رحیم گل نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں" میں نے جواب دیا "اس کام کے لئے ایک ہی آدمی کافی تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نے اپنا کام عمدگی سے انجام دیا۔"

"اب کیا ہوگا؟" رحیم گل نے تاریک چشمے کی اوٹ سے میری طرف دیکھا۔ اس بلند حوصلہ اور جرأت مند شخص کے لہجے میں شکستگی جھلک آئی تھی۔

"لگتا یہی ہے رحیم گل ڈیئر.....!" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "کہ مچھلی... بلکہ مگرمچھ تمہارے ہاتھ میں آکر پھسل گیا ہے لیکن دل شکستہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ دیکھتے ہیں آگے کیا ہوتا ہے۔ ہم جیسے لوگوں کی زندگی میں ایسی اونچ نیچ تو آتی ہی رہتی ہے۔" میں نے مسکرا کر اس کا حوصلہ بڑھانے کی کوشش کی۔

پھر میں نے شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ری پیٹر تھی "تم سڑک پر اپنی گن کی نمائش مت کرو۔" میں نے اسے ہدایت کی "اور اپنی پوزیشن پر واپس چلے جاؤ۔ اپنا دوسرا آدمی بھی اگر سامنے کے دروازے کی طرف ہے تو اسے بھی ساتھ لے جاؤ۔"

وہ جا چکا تو میں نے رحیم گل کو بتایا "یہ میرا آدمی تھا۔ تمہیں اندازہ ہوا؟"

"مجھے معلوم ہے۔" اس نے جواب دیا "اندازہ لگانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں اسے تمہارے ہوٹل میں تمہارے ساتھ دیکھ چکا ہوں۔ اس کے علاوہ اس نے ابھی احتیاطاً خود بھی بتا دیا تھا۔ اگر مجھے اس کے بارے میں علم نہ ہوتا تو وہ یوں گن اٹھائے میرے ساتھ کہاں پھر سکتا تھا گھامڑ کہیں کے؟" اس نے مجھے گھورا۔

"تم پولیس والوں کا کچھ بھروسا نہیں ہوتا کہ کیسے کیا کچھ کہتے رہو۔" میں نے کہا۔ پھر میں نے لاش کی طرف اشارہ کیا "اس سے پہلے کہ ہجوم جمع ہو اور قیاس آرائیاں شروع ہوں، معاشرے کا بوجھ تو اٹھواؤ۔"

اس دوران کچھ اور پولیس والے بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ رحیم گل نے انہیں لاش اٹھوانے کے لئے ایمبولینس وغیرہ طلب کرنے کی ہدایت کی اور ہم دونوں واپس کورٹ کے گیٹ پر آئے۔ کچھ پولیس والے پیردانش کو نیم دائرے میں لئے کھڑے تھے۔ وہ نہایت اطمینان سے لینڈ کروزر سے ٹیک لگائے سگار کے کش لے رہا تھا۔ پہلے اس کا چہرہ سپاٹ تھا۔ اب اس کے چہرے پر طمانیت نظر آرہی تھی۔

جب اس کی نظر مجھ پر اور رحیم گل پر پڑی تو طمانیت کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر فاتحانہ سی چمک بھی دکھائی دینے لگی۔ ظفر جمال کی لاش وہیں پڑی تھی اور عدالت میں آنے جانے والے افراد اِدھر اُدھر ٹولیوں میں جمع ہو کر دور دور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

رحیم گل، پیردانش کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ دراز قد تھا، دانش سے خاصا لمبا تھا۔ پیردانش کی شخصیت بھی کسی حد تک مضحکہ خیز ہی تھی۔ اس کے باوجود اس میں ایک عجیب سا بھاری بھرکم پن تھا۔ یہ بھاری بھرکم پن، محض جسمانی نہیں تھا۔ بس دیکھتے ہی پیردانش کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی توپ چیز تھا۔ اس کی خباثت بھی عام آدمی کو مرعوب کرتی تھی۔ رحیم گل کا اس کے سامنے تن کر کھڑے ہونا بھی کچھ ایسا ہی لگتا تھا جیسے کسی بارعب گرگ باراں دیدہ قسم کے بزرگ کے سامنے کھڑا کوئی نوجوان اپنے آپ کو منوانے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم سمجھ رہے ہو کہ ظفر جمال کو قتل کروا کے تم بچ جاؤ گے؟" رحیم گل اپنا تاریک چشمہ اتار کر جیب میں رکھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر غرایا۔

پیردانش کے ایک ہاتھ کی انگلیوں میں سگار دبا ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے نہایت آہستگی سے مونچھ کو بل دیتے ہوئے وہ اپنے مخصوص نشیلے سے انداز میں مسکرایا۔ وہ گویا اس وقت رحیم گل کی کیفیت سے پوری طرح محظوظ ہو رہا تھا۔

"کس ظفر جمال کی بات کر رہے ہو ڈیئر رحیم گل؟" وہ بے نیازی، لاتعلقی اور بے اعتنائی سے گونجیلی سی آواز میں بولا "میں تو کسی ظفر جمال کو نہیں جانتا اور جب میں کسی کو جانتا ہی نہیں..... تو بھلا مجھے اس کو مروانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور پھر میں تو برسوں سے تمہارے

زبردست پہرے اور نگرانی میں ہوں۔ میں بھلا کسی کو مروانے.... اٹھوانے.... گروانے کا انتظام کیسے کرسکتا تھا؟ تم ایک ذمے دار افسر ہو رحیم گل ڈیئر! تمہیں اس قسم کی غیر ذمے دارانہ باتیں نہیں کرنی چاہئیں۔"

ایک حد تک اس کی بات ٹھیک بھی تھی۔ ظفر جمال کو مروانے کا بندوبست اس نے نہیں "گاڈمدر" نے کیا ہوگا۔ بات ایک ہی تھی لیکن قانون کے پیمانوں سے ہر بات میں بڑا فرق پڑ جاتا ہے۔

"تم..... یا تمہاری وہ شاطر ماں..... جو چاہے کرلے۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا....." رحیم گل انگلی اٹھاتے ہوئے گھٹی گھٹی سی آواز میں بولا "تمہیں اپنے گناہوں کی سزا بہرحال بھگتنی پڑے گی۔"

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا میری جان!" وہ بڑی ملائمت سے بولا "تمہیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔ ہمارا اپنا ایک لائف اسٹائل ہے۔ اب اگر ہمارا لائف اسٹائل ہی تمہیں گناہ نظر آئے تو ہم کیا کرسکتے ہیں۔"

"نالی کے کیڑے کا بھی اپنا ایک لائف اسٹائل ہوتا ہے لیکن دنیا اسے نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔" رحیم گل دانت پیس کر بولا۔

پیردانش ایک جھٹکے سے سیدھا ہو کر کھڑا ہوگیا اور گھٹی گھٹی لیکن غضب ناک آواز میں بولا "وردی پہن کر میرے سامنے کھڑے ہو کر اتنا مت اکڑو رحیم گل! کہیں خشک ٹہنی کی طرح ٹوٹ نہ جانا۔" پھر اس کے لہجے میں ترحم جھلک آیا "تم جیسے لوگوں کا پرابلم یہ ہے کہ ان کے دماغ میں کہیں سے یہ خناس گھس جاتا ہے کہ قانون بہت طاقتور چیز ہے۔ یہ خناس اپنے دماغ سے نکال دو جذباتی نوجوان! قانون بہت کمزور..... بہت مجبور سی چیز ہے... یہ تو بے چارہ ثبوت اور گواہوں کے بغیر بڑے سے بڑے مجرم کو سزا نہیں دے سکتا۔ چاہے قانون کے کسی محافظ نے اپنی آنکھوں سے کسی کو قتل کرتے دیکھا ہو۔ اس کے باوجود وہ عدالت سے قاتل کو سزا نہیں دلوا سکتا۔ وہ صرف تفتیشی افسر ہی کہلائے گا۔ گواہ اور ثبوت اسے الگ سے پیش کرنے پڑیں گے اور ہم جیسے لوگوں کے خلاف گواہی دینے کون عدالت میں آئے گا ڈیئر رحیم گل؟"

وہ مسکرایا۔ رحیم گل خاموش رہا۔ پیردانش کی مسکراہٹ اور واضح ہوگئی۔ وہ دوبارہ بولا تو اس کے لہجے میں غضب ناکی نہیں تھی "گلی کوچوں میں سے پکڑے گئے لاوارث یا غریب غربا..... کسی بنگلے کوٹھی سے پکڑے گئے نوکر، خانساماں اور مالی وغیرہ کی بات اور ہوتی ہے۔ ان بے چاروں نے جرم نہ بھی کیا ہو تب بھی تم لوگ انہیں الٹا لٹکا کر ان کی چمڑی ادھیڑ کر..... ان کی ہڈیاں توڑ کر منوا سکتے ہو۔ ہم جیسے لوگوں کی بات اور ہوتی ہے جو اوّل تو کسی کام میں خود اپنے ہاتھ گندے نہیں کرتے..... اور اس سوسائٹی میں ہاتھ گندے کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے؟ یہاں پیسے کے لئے ہر کام کرنے والے مل جاتے ہیں اور وہ بھی ایسے کہ جنہیں کوئی کارروائی کرتے دیکھ کر لوگ گھروں میں چھپ جاتے ہیں۔ سب کچھ دیکھتے سنتے ہوئے بھی اندھے اور بہرے بن جاتے ہیں۔ تمہارا قانون تو ابھی کرائے کے ان کارندوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ میں تو بہت بڑی چیز ہوں پیارے! اس حقیقت کو مان لو تمہارا دردِ سر کم ہوجائے گا۔"

پھر اس نے خود ہی ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا "آؤ عدالت میں چلتے ہیں۔ پیشیاں شروع ہوچکی ہوں گی۔ شاید ہماری باری آچکی ہے۔ مجھے عدالت میں پیش نہیں کرو گے کیا؟"

رحیم گل نے گردن گھما کر ایک نظر میری طرف دیکھا اور مجھے اندر چلنے کا اشارہ کیا لیکن میرا اندر جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ میں صرف اس وقت عدالت میں جانا چاہتا تھا جب مجھے گواہ کی حیثیت سے طلب کیا جاتا۔

پیردانش نے فوراً رحیم گل کو مخاطب کیا "اس کی طرف کیا دیکھ رہے ہو۔ اسی کے کہنے میں آکر تو تم نے اپنے آپ کو مصیبت میں پھنسا لیا ہے۔ یہ تو تمہیں ایسی جگہ لے جاکر مروائے گا جہاں تمہیں پانی بھی نہیں ملے گا۔ یہ تمہاری کیا مدد کرے گا۔ یہ تو خود بہت بڑا کرمنل ہے۔ یہ تو تمہیں قربانی کا بکرا بنا رہا ہے۔ مجھے ذرا بری ہولینے دو پھر تمہاری اور اس کی باری آئے گی۔ تم دونوں جو کچھ کر رہے ہو، پہلے تمہیں عدالت میں اس کا حساب دینا پڑے گا اور اس کے بعد اگر ضروری ہوا تو......" اس نے مسکرا کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ اس موقعے پر بھی ہم دونوں کو اشتعال دلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اس لئے کہ اب وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے سر سے تلوار ہٹ گئی تھی۔ شاید میری طرح رحیم گل کا ذہن بھی بہت سی باتوں میں الجھا ہوا تھا اس لئے وہ مزید مشتعل ہونے کے بجائے بولا "چلو..... چلو... اندر چلو....."

رحیم گل اور پیردانش کے ساتھ بیشتر لوگ اندر چلے گئے۔ میں گاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا کچھ دیر ظفر جمال کی لاش کو تکتا رہا۔ سرکاری اہلکار اس کے اردگرد پھر رہے تھے اور اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ اس کا ایک رخسار سڑک پر ٹکا ہوا تھا اور اس کے چہرے کے گرد اس کا اپنا خون جمع تھا جو دھیرے دھیرے جمنے لگا تھا۔ میرے دل میں ایک جانی پہچانی سی افسردگی پھیل گئی تھی۔ کسی کسی شخص کا انجام میرے لئے ایسی افسردگی لے کر آتا تھا۔

یہ ایک ایسے شخص کا انجام تھا جسے بہت تاخیر سے احساس ہوا تھا کہ وہ ذلت کی زندگی گزار رہا تھا۔ اسے اپنے اعمال کی تلافی کا خیال آیا تھا..... اور وہ محبت سے بھی آشنا ہوا تھا مگر افسوس کہ اوپر والے کے ہاں اس کی مہلت ختم ہوچکی تھی۔ مونا کی بھی کم و بیش یہی کہانی رہی تھی۔ دونوں ہی کی مہلت تقریباً ایک ساتھ ختم ہوئی تھی۔ دونوں آگے پیچھے ہی اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ کسی کو بھی تلافی کا موقع نہیں مل سکا تھا اور یہی میری افسردگی کی وجہ تھی۔ اگر وہ اپنی گمراہی کے ساتھ ہی اس دنیا سے رخصت ہوجاتے تو مجھے شاید افسوس نہ ہوتا خواہ ان کا انجام کتنا ہی عبرت ناک کیوں نہ

ہوتا۔ خواہ وہ پیردانش جیسی خبیث شخصیت کے ہاتھوں ہی انجام تک پہنچتے۔

کچھ دیر بعد ایمبولینس آئی اور ظفر جمال کی لاش اٹھالی گئی۔ وہاں صرف گاڑھے اور ادھ جمے خون کا ایک بڑا سا دھبا رہ گیا جو اس واقعے کی شہادت دے رہا تھا۔ میں فیصلہ نہیں کرپا رہا تھا کہ مجھے وہاں موجود رہنا چاہئے تھا' چلے جانا چاہئے تھا یا اندر عدالت میں جاکر کارروائی سنی چاہئے تھی؟ مجھے اندازہ تھا کہ عدالتوں کی کارروائیاں بہت اکتا دینے والی ہوتی تھیں۔

میں نے سوچا کسی فیصلے پر پہنچنے تک مجھے گاڑی ہی میں بیٹھنا چاہئے۔ بے دھیانی کے سے عالم میں دروازہ کھول کر میں گاڑی میں بیٹھا تو ایک دلفریب خوشبو میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ خوشبو میری گاڑی میں پہلے بھی پھیلی ہوئی تھی لیکن یہ خوشبو اس پر حاوی تھی.....اور اجنبی تھی!

میں نے فوری طور پر گردن گھما کر نہیں دیکھا البتہ میری نظر عقب نما آئینے کی طرف اٹھ گئی۔ میرا خیال درست ہی تھا۔ عقبی سیٹ پر کوئی موجود تھا۔ میں منتظر رہا مگر کسی پستول وغیرہ کی نال میری گدی پر آکر نہیں ٹکی اور نہ ہی کسی نے مجھے مخاطب کیا۔

تب میں نے نہایت احتیاط اور آہستگی سے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ پہلے تو مجھے یہی گمان گزرا کہ وہ راحیلہ تھی جسے شاید ڈرامائی انداز میں میرے پاس پہنچنے کا ایک اور موقع مل گیا تھا۔ کم از کم حلئے کے اعتبار سے وہ بالکل راحیلہ تھی۔ ویسا ہی سیاہ نفیس برقع... اسی طرح مکمل طور پر نقاب میں چھپی ہوئی آنکھیں... حتیٰ کہ آنکھوں پر سیاہ چشمہ بھی موجود تھا۔

اس کا ہاتھ پسنجر سیٹ کے پشتے پر ٹکا ہوا تھا اور میں نے اسے ہاتھ سے ہی پہچانا۔ یہ ایک مرمریں' خوب صورت اور سبک ہاتھ تھا۔ راحیلہ کا ہاتھ بھی کم و بیش ایسا ہی تھا لیکن ساخت میں کچھ نہ کچھ فرق تھا اور سب سے بڑا فرق عمر کا تھا۔ یہ ایک نہایت کم عمر' نوخیز لڑکی کا ہاتھ تھا۔ راحیلہ سے وہ یقیناً کافی چھوٹی تھی اور اس وقت گو کہ وہ بیٹھی ہوئی تھی لیکن میں اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ راحیلہ کی طرح سرو قد نہیں تھی۔ وہ راحیلہ نہیں تھی۔

میں جب گاڑی سے اتر کر ڈرائیونگ سیٹ والا دروازہ بند کرتا تھا تو گاڑی خود بخود مقفل ہوجاتی لیکن ظفر جمال کے قتل کے بعد جب میں اس عمارت کی طرف بھاگا تھا تو دروازہ پوری طرح بند نہیں کرسکا تھا جس کی وجہ سے باقی دروازے بھی کھلے رہ گئے تھے۔ شاید اسی دوران وہ چپکے سے کسی طرف سے گاڑی میں آبیٹھی تھی۔

ایک لمحے گاڑی میں گہرا سکوت طاری رہا۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش کررہا تھا لیکن اس کے اور میری آنکھوں کے درمیان تاریک شیشوں کی دیوار حائل تھی۔

"آپ نے پوچھا نہیں کہ میں کون ہوں۔" آخر اسی نے سکوت توڑا۔ اس کی آواز خوب صورت اور مترنم تھی۔ آواز سے بھی اس کی کم عمری کا تاثر نمایاں تھا۔ وہ سیاہی کے پردوں میں بری طرح ملفوف تھی اس کے باوجود نہ جانے کیوں حُسن کی کرنیں ان دبیز پردوں سے پھوٹتی محسوس ہورہی تھیں۔ میں اسے ذرا بھی دیکھ نہیں پارہا تھا اس کے باوجود محسوس کررہا تھا کہ وہ غیر معمولی طور پر خوب صورت لڑکی تھی۔

"تم اپنے آپ کو اس بری طرح چھپا کر بیٹھی ہو تو یقیناً مجھے یہ بتانے کے لئے تو نہیں بیٹھی ہو کہ تم کون ہو۔" میں نے طویل سانس لے کر کہا "بہرحال... اگر تم اپنا کوئی فرضی نام وغیرہ بتانا چاہتی ہو تو بتا سکتی ہو۔ میں وہ بھی توجہ سے سنوں گا اور اگر تم چاہو گی تو اسے ہی تمہارا اصلی نام سمجھ لوں گا۔"

"آدمی آپ ذہین معلوم ہوتے ہیں لیکن کبھی کبھی ذہانت.... خباثت کے مقابلے میں مات کھا جاتی ہے۔" وہ سیٹ کے پشتے سے اپنا ہاتھ ہٹاتے ہوئے اور ذرا پیچھے کھسکتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کب اور کیونکر اندازہ ہوا کہ ذہانت کبھی کبھی خباثت کے مقابلے میں شکست کھا جاتی ہے؟" میں نے ذرا گھوم کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"ابھی ابھی.... کچھ دیر پہلے.... جب ظفر جمال کو اس بھرے پرے بازار میں اس عدالتِ انصاف کے سائے میں قتل کردیا گیا اور قاتل بھی ہاتھ نہ آسکا۔" اس نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں جواب دیا۔ میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ شاید ایک کم عمر لڑکی کے لہجے کے اس ٹھہراؤ نے مجھے خوف زدہ کردیا تھا۔ یا پھر شاید یہ خوف کی نہیں بلکہ اس افسردگی کی لہر تھی جسے میں اب تک دل میں دبائے بیٹھا تھا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے دھیمے لہجے میں کہا "شاید مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے ظفر جمال کو پولیس کی تحویل میں دے دیا۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں اسے اپنی ہی تحویل میں رکھتا۔ اس کی اس سے بہتر حفاظت تو میں خود کرسکتا تھا۔" غیر ارادی طور پر میرے لہجے میں تاسّف جھلک آیا۔

"اس میں پولیس کا کوئی قصور نہیں۔ اپنے طریقۂ کار کے حساب سے تو انہوں نے بڑی ذمے داری کا مظاہرہ کیا ورنہ اس محکمے کا جو حال ہے اس سے تو اتنی بھی توقع نہیں تھی۔ اب وہ ہر کونے کھدرے سے آنے والی گولی کو تو نہیں روک سکتے۔" اس نے گہری سانس لی "اور آپ اگر اس مسئلے کو قانونی طریقے سے حل کرنا چاہتے تھے تو آپ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ آپ ظفر جمال کو پولیس کی تحویل میں دے دیتے۔"

"لیکن تم کون ہو.... ان تمام معاملات سے تم کیونکر واقف ہو... اور ان سے تمہارا کیا تعلق ہے؟" میں نے ایک ساتھ تین سوالات کرڈالے۔

"میں آپ کو کچھ بتانے نہیں.... آپ سے کچھ پوچھنے آئی ہوں افضل صاحب!" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"تم مجھے جانتی ہو؟"

"ظاہر ہے تبھی میں آپ سے اس موضوع پر بات کررہی

ہوں۔" اس نے جواب دیا اور اس لمحے مجھے اپنا سوال احمقانہ محسوس ہوا۔

اس کے باوجود میں پوچھے بغیر نہ رہ سکا "تم مجھے کیسے جانتی ہو؟"

"آپ کو جاننا کوئی مشکل کام تو نہیں۔ اس شہر میں بہت سے لوگ آپ کو جانتے ہوں گے لیکن آپ انہیں نہیں جانتے ہوں گے۔"

"کیا میں تمہیں جانتا ہوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"نہیں" اس نے جواب دیا۔

"جان سکتا ہوں؟"

"نہیں فی الحال نہیں۔" اس نے ایک لمحے کی ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔

"پھر کب؟" میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ بھی میں نہیں بتاسکتی۔"

"مجھ سے تم کیا پوچھنا چاہتی ہو؟" میں نے جاننا چاہا۔

"یہی کہ آپ اب کیا کریں گے؟"

"کس سلسلے میں؟" میں نے وضاحت چاہی۔

"پیردانش کے سلسلے میں اور کس سلسلے میں؟"

"مجھے خود نہیں معلوم کہ میں کیا کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔ حقیقت یہی تھی کہ مجھے نہیں معلوم تھا میں پیردانش کے سلسلے میں اب کیا کروں گا۔ یہ کوئی ڈپلومیٹک جواب نہیں تھا۔

ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "میں ابھی عدالت کے فیصلے کا انتظار کروں گا شاید ظفر جمال کے بیان کے بغیر بھی پیردانش کا چند دن کا ریمانڈ مل جائے اس دوران رحیم گل شاید تفتیش کے ذریعے اپنا کیس مضبوط کرلے۔"

وہ عجیب سے انداز میں ہنسی۔ شاید اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کی یہ ہنسی کہہ رہی تھی۔ اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا....!

میں حیران تھا کہ اتنی کم عمری کے باوجود اس کے اندازِ گفتگو میں یہ پختگی' یہ ٹھہراؤ اور یہ خود اعتمادی کہاں سے آئی تھی؟ پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ آخر میں نے اس کی صورت دیکھے بغیر محض چند مبہم علامتوں کی بنیاد پر یہ کیوں فرض کرلیا تھا کہ وہ واقعی کم عمر تھی؟ عین ممکن تھا کہ وہ کوئی عمر چور قسم کی شخصیت رہی ہو۔ میں نے کئی ایسی خواتین کو دیکھا تھا جو اچھی بھلی جہاندیدہ ہونے کے باوجود کمسن نظر آتی تھیں۔ سر سے پاؤں تک سیاہ برقع اور تاریک چشمے میں چھپ جانے کے بعد تو یہ تاثر دینا اور بھی آسان تھا۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں نے گویا برا مناتے ہوئے پوچھا۔

"آپ اتنے بڑے بزنس مین ہیں.... میرا خیال تھا بڑے پریکٹیکل قسم کے آدمی ہوں گے لیکن آپ تو کافی خوش فہم معلوم ہوتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ کو کچھ خاص پتا نہیں ہے کہ ہمارے ہاں عملی زندگی میں.... اور سرکاری چار دیواریوں میں کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو حیرت ہے آپ اتنی ممتاز شخصیت کیونکر بن گئے! کہیں آپ کی یہ دولت اور بزنس موروثی تو نہیں؟"

"نہیں" میں نے اسے گھورتے ہوئے جواب دیا "لیکن خوش فہم رہنے میں حرج بھی کیا ہے؟ کبھی کبھی انسان کی خوش فہمیاں اور خوش گمانیاں عملی صورت بھی اختیار کرلیتی ہیں۔ تمہارے خیال میں کیا خوش فہم اور خوش گمان لوگ ترقی نہیں کرتے؟"

"کرتے ہوں گے۔" وہ بے پروائی سے بولی "میرا تجربہ اس سلسلے میں زیادہ وسیع نہیں۔ میں نے تو اپنی مختصر سی عمر میں جتنے بھی ایسے لوگ دیکھے جنہیں معاشرے میں بڑے آدمی کہا جاتا ہے انہیں بے پناہ پریکٹیکل... سفاک اور بے حس پایا۔"

"بعض لوگوں کے حصے میں صرف تلخ تجربات آتے ہیں۔ خیر تم یہ بتاؤ کہ تم پیردانش کے بارے میں میرے ارادے کیوں جاننا چاہتی ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیونکہ میں پیردانش کی جاسوس ہوں۔" وہ ایک بار پھر دھیرے سے ہنسی۔

میں نے اپنی سنجیدگی میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ دوبارہ بولی تو اس کے لہجے سے بھی گہری سنجیدگی عیاں تھی "کیا واقعی آپ نے ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا کہ اب آپ کیا کریں گے؟"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے؟" میں نے ملائمت سے کہا "تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے بہت تاخیر ہوگئی ہے۔ میں صرف ظفر جمال کے مرنے سے اتنا مایوس نہیں ہوں۔ ابھی رحیم گل اور میں تو زندہ ہیں اور ہم دونوں بڑے ضدی ہیں کچھ نہ کچھ تو ہو ہی جائے گا۔"

"ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔" خلافِ توقع اس نے اچانک ہی کہا اور دروازے کے پش بٹن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ وہ جیسے ڈرامائی انداز میں آئی تھی ویسے ہی ڈرامائی انداز میں جانے بھی لگی تھی۔

میں نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی پکڑلی۔ اس نے کلائی چھڑانے کی کوشش کی۔ اس کی کلائی میں گداز بھی تھا اور زندگی کی بے پناہ حرارت بھی.... جو کپڑوں کی دبیز تہ کے باوجود برقی رو کی طرح میرے ہاتھ تک پہنچی اور میرے رگ و پے میں ایک انوکھی سنسنی دوڑ گئی۔ مگر اس گرم و گداز کلائی میں خاصی مضبوطی بھی تھی۔ اس نے کلائی چھڑانے کے لئے کافی زور لگایا۔ میرے اندازے کے مطابق اس مختصر سے وجود میں اتنی طاقت نہیں ہونی چاہئے تھی۔

آخرکار وہ مرتعش لہجے میں بولی "مجھے چھوڑ دیں افضل صاحب! ورنہ میں شور مچادوں گی۔ عدالت کے احاطے میں رپورٹر بھی موجود ہیں۔ بہت بڑا اسکینڈل بن جائے گا... جو میرے لئے نہیں آپ کے لئے تباہ کن ہوگا۔"

"آہ...!" میں نے ٹھنڈی سانس لی "عورت کا وہی پرانا حربہ۔"

"جی ہاں۔ مجبوری ہے۔" وہ بولی۔

میں نے اس کی کلائی چھوڑ دی اور پوچھا "تم صرف یہی پوچھنے آئی تھیں کہ پیردانش کے بارے میں اب میرا کیا ارادہ ہے؟"

"ہاں" اس نے جواب دیا۔

"کاش تم واقعی پیردانش کی جاسوسہ ہوتیں!" میں نے کہا۔

"آپ کو میری بات کا یقین نہیں آیا؟" اس کے لہجے میں دبی دبی سی شرارت تھی۔

"نہیں" میں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"آجائے گا۔" وہ گاڑی سے اترتے ہوئے اطمینان سے بولی پھر جیسے اسے کچھ یاد آیا۔ پلٹ کر بولی "میرے پیچھے مت آیئے گا۔ میں اندر جارہی ہوں۔ اگر آپ میرے پیچھے آئے تو میں عدالت کے احاطے میں بھی شور مچا سکتی ہوں۔"

"کتنا شوق ہے تمہیں شور مچانے کا......!" میں نے ترحم آمیز لہجے میں کہا۔ "لیکن میں تمہیں یہ شوق پورا کرنے کا موقع نہیں دوں گا۔ تم اطمینان سے جاؤ۔ میں تمہارے پیچھے نہیں آؤں گا۔ میں ابھی تجسس سے اتنا مجبور نہیں ہوا ہوں۔"

"بہت شکریہ۔" اس نے کہا اور کسی ہلکی پھلکی چیز کی طرح گاڑی سے باہر پھسل گئی۔ میں نے اسے اس گلی میں جاتے دیکھا جس میں عدالت کا مین گیٹ تھا لیکن میں نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی اور نہ ہی شفیع شاہ وغیرہ کو اس کے بارے میں کوئی ہدایت دی۔ نہ جانے کیوں مجھے یقین تھا کہ جلد یا بدیر وہ ضرور دوبارہ میرے سامنے آئے گی۔

وہ تو دوبارہ میرے سامنے نہیں آئی لیکن گاڈمدر ضرور میرے سامنے آگئی۔ وہ یقیناً عدالت سے باہر آئی تھی۔ بغلی گلی سے نکل کر وہ عین میری ہی گاڑی کے قریب آن رکی۔ مسلح گارڈز اور چمچوں وغیرہ کا لاؤ لشکر حسب معمول اس کے ساتھ تھا۔

ونڈ اسکرین کے پار سے وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ معلوم نہیں وہ میری گاڑی پہچانتی تھی یا تاریک شیشے کے پار سے بھی اس نے مجھے اس حد تک دیکھ لیا تھا کہ پہچان سکے۔ وہ بہت خوش نظر آرہی تھی اور شاید کچھ کہنا چاہتی تھی۔ میں نے دروازہ کھول دیا تاکہ وہ یہ نہ سمجھے کہ میں اس کا سامنا کرنے سے کترا رہا تھا۔

اس کے چہرے پر اس قدر خوشی دیکھ کر مجھے یہ گمان بھی گزرا کہ شاید پیردانش کو ضمانت پر رہائی مل گئی ہے اور وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ہی آرہا ہوگا لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دیا۔

وہ دروازے پر جھکتے ہوئے بڑی خوش دلی سے آنکھ دباتے ہوئے بولی "افضل ڈیئر! تمہیں معلوم ہے آج کل رنگین شیشوں والی گاڑی میں سفر کرنے پر پابندی ہے اور تم ایسی گاڑی میں عین عدالت کی بغل میں کھڑے ہو۔ ایک قانون پسند... معزز اور شریف شہری کو اس طرح نہیں کرنا چاہئے۔"

پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا "یہ اتنے بہت سے پولیس والے اِدھر اُدھر پھر رہے ہیں کسی نے تمہیں اس بات پر روکا ٹوکا نہیں؟"

وہ اتنی خوش نظر آرہی تھی' باچھیں کھلا کر بات کررہی تھی لیکن اس عورت کی آنکھوں میں درندگی تھی۔ میں نے پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتے ہوئے نہایت ملائمت سے کہا "اگر تم پولیس کی سخت نگرانی میں آنے والے ایک نہایت اہم گواہ...... اور اس جیسے نہ جانے کتنے دوسرے لوگوں کو قتل کروانے کے بعد اسی عدالت کے سائے میں اطمینان سے گھوم پھر سکتی ہو تو کیا میں رنگین شیشوں والی گاڑی میں بھی نہیں گھوم سکتا؟ جبکہ میرے پاس اس کا خصوصی اجازت نامہ بھی موجود ہے۔ کیا تمہارے پاس بھی اپنے ناپسندیدہ افراد کو قتل کروانے کا خصوصی اجازت نامہ موجود ہے؟"

"قتل....؟" اس نے اپنے چہرے پر معصومیت لانے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن یہ یقیناً اس کے بس کی بات نہیں تھی "تمہیں شرفا کے بارے میں بلا تحقیق اور بنا ثبوت اس طرح کی باتیں نہیں کرنی چاہئیں افضل ڈیئر! یہ خلافِ قانون حرکت ہے اور اب تو یہ معاملہ شرعی عدالت میں بھی جا سکتا ہے۔ بہتان تراشی کے زمرے میں آتا ہے۔"

"اوہ... میرے خدا... مجھے معاف کرنا....!" میں بے اختیار ہنس دیا اور دیر تک دھیرے دھیرے ہنستا ہی رہا۔ یہ دوسری بات تھی کہ میری ہنسی خود مجھے ایک مسلسل کراہ سے مشابہ محسوس ہورہی تھی۔ گاڈمدر کے گارڈز مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہے تھے۔

"اس میں ہنسنے کی تو کوئی بات نہیں تھی۔" گاڈمدر سنجیدگی سے بولی "میں نے ایک اہم حقیقت کی طرف اشارہ کیا تھا۔"

"جب تم جیسے شرفا اس قسم کی باتیں کرتے ہیں تو مجھ جیسے مجبور اور بے بس احمق اس انداز میں ہنسنے کے سوا کیا کرسکتے ہیں؟" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "دراصل یہ ہمارے رونے کی آواز ہوتی ہے۔ لوگوں کو اس پر ہنسی کا گمان گزرتا ہے۔"

"اوہو.... ہو... ہو..." اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا "تم باتیں بڑی دلچسپ کرتے ہو افضل ڈیئر! ہر قسم کے حالات میں....!"

"دلچسپی..... اور خوشی دراصل انسان کے یہاں ہوتی ہے۔" میں نے اپنے سینے پر دل کے مقام پر انگلی رکھی "جب یہ خوش ہو تو ہر طرف خوشی بکھری نظر آتی ہے' ہر چیز دلچسپ لگتی ہے۔"

"ہائے کتنی سچی بات کی ہے تم نے۔" وہ ایک بار پھر آنکھ دبا کر بولی۔

"تم اس وقت بہت خوش ہو نا گاڈمدر؟" میں نے پہلی بار اسے اس نام سے مخاطب کیا جو میں نے اسے اپنے طور پر دیا ہوا تھا۔

"گاڈمدر.....؟" وہ چونکی اور پھر اس نے ایک بلند آہنگ قہقہہ لگایا "تم بہت شریر ہو افضل ڈیئر! شاہ جی زندہ ہوتے تو شاید یہ نام سن کر بہت محظوظ ہوتے۔"

مجھے پتا چلا تھا کہ اس کا تیسرا شوہر شاہ جی کے نام سے معروف تھا۔ ذرا توقف کے بعد اسے گویا میرے سوال کا جواب دینے کا خیال آیا اور وہ بولی "ہاں میں اس وقت بہت خوش ہوں۔ اس لئے فی الحال مجھے تم بھی برُے نہیں لگ رہے۔"

"کیوں خوش ہو؟ کیا پیردانش کی ضمانت ہوگئی؟" میں نے پوچھا۔

"ضمانت.....؟ ابھی تو اس کی پیشی بھی نہیں ہوئی۔" اس نے خوشگوار لہجے میں جواب دیا پھر معصومیت سے پوچھا "کیا تمہارے جاسوس تمہیں اندر سے پل پل کی خبر نہیں پہنچا رہے؟"

"میرا کوئی جاسوس اندر نہیں ہے اور نہ ہی مجھے "جاسوس" پالنے کا شوق ہے۔" میں نے جواب دیا "مجھے اگر کارروائی کے متعلق جاننا ہوگا تو میں خود اندر چلا جاؤں گا لیکن میں عدالتی کارروائی دیکھ کر بور نہیں ہونا چاہتا۔ میں پہلے ہی بہت بور ہوں۔ زندگی سے بیزاری کی حد تک بور۔"

"چہ....چہ....چہ....." وہ ترحم آمیز لہجے میں بولی "ایسی جوانی میں انسان کو اتنا بور نہیں ہونا چاہئے۔ مجھے دیکھو.... اس عمر میں بھی کتنی خوش ہوں۔ میری رگ رگ میں زندگی کی ترنگ ہے۔"

"اس وقت شاید یہ ترنگ کچھ زیادہ ہی بڑھی ہوئی ہے۔" میں نے سرہلایا "ویسے کیا تم حد سے زیادہ خوش ہونے میں کچھ جلدبازی سے کام نہیں لے رہیں؟ ابھی تو پیردانش کی ضمانت نہیں ہوئی۔"

"بس... سمجھ لو کہ ہو ہی گئی ہے۔ بہت اندر سے... یا یوں سمجھو کہ بہت اوپر سے خبر ملی ہے۔" اس کی خوش دلانہ مسکراہٹ برقرار رہی۔

میرے دل میں افسردگی کی لہر کچھ قوی ہوگئی تاہم میں نے کوشش کی کہ میرا چہرہ سپاٹ ہی نظر آئے اور میرے تاثرات سے اسے اندازہ نہ ہونے پائے کہ میں اس وقت کیا سوچ رہا تھا۔ میں نے تفہیمی انداز میں سرہلاتے ہوئے کہا "پھر بھی اتنی جلدی جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مجھے جاکر دانش کے استقبال کی تیاریاں کرنی ہیں۔ بلکہ یوں سمجھو کہ تیاریاں تو ہم نے پہلے ہی کر رکھی تھیں لیکن احتیاطاً ابھی انہیں ظاہر نہیں کیا تھا کہ کہیں بعد میں سبکی نہ ہو۔ جب تک بات پکی نہ ہو تب تک کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ اب ہمیں معلوم ہوگیا ہے تو اپنی تیاریاں ظاہر کردینے میں کوئی حرج نہیں۔ اب میں جاکر ذرا انتظامات کا جائزہ لوں گی۔ دانش اب کوئی یونہی چپ چپاتے گھر واپس تھوڑا ہی آئے گا۔" وہ بڑے مسرور اور فاتحانہ لہجے میں بولی۔

"تو کیا وہ بینڈ باجے کے ساتھ گھر پہنچے گا۔ برات کی طرح؟" میں نے قدرے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہیں۔" وہ ذرا بھی شرمندہ ہوئے بغیر بولی "ہمارے لئے تو یہ برات جیسا موقع ہی سمجھو۔ وہ یہاں سے تو بینڈ کے ساتھ نہیں جائے گا لیکن جب گھر پہنچے گا تب ضرور تین مختلف قسم کے بینڈ خوشی کی دُھنیں بجا کر اس کا استقبال کریں گے۔ گلی میں سرخ قالین بچھے ہوں گے۔ استقبالیہ بینر لگے ہوں گے۔ گھر کے برابر والے میدان میں ٹینٹ لگے ہوں گے۔ وہاں غریبوں کو کھانا کھلایا جائے گا اور اندر لان پر بہت سے معززین کے لئے کھانے کا انتظام ہوگا۔ ان سارے کاموں کے لئے باقاعدہ ایک استقبالیہ کمیٹی کام کررہی ہے۔ سب چیزیں تیار رکھی ہوئی ہیں۔ میں نے کمیٹی کو سگنل دے دیا ہے کہ وہ حرکت میں آجائے۔ اب مجھے جاکر کاموں پر صرف نظر رکھنی ہے۔"

میں ہنس دیا۔ وہ بھویں اُچکاتے ہوئے بولی "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

"تم بہت دلچسپ عورت ہو۔" میں نے کہا۔

"ہم خوشی کو خوشی کی طرح مناتے ہیں۔ دنیا دیکھے گی کہ دانش کس طرح جھوٹے الزامات سے بری ہوکر آتا ہے۔" وہ فخر سے گردن ذرا اکڑاتے ہوئے بولی۔

"ابھی اس کی ضمانت بھی نہیں ہوئی اور تم نے اس کے لئے "بری" کا لفظ استعمال کرنا شروع کردیا۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا "آج کے مرحلے میں اگر زیادہ سے زیادہ کچھ ہوا تو یہی ہوگا کہ اس کی ضمانت ہوجائے گی۔ مقدمہ تو پھر بھی چلے گا۔ بری ہونے نہ ہونے کا فیصلہ تو نہ جانے کب ہو۔"

"ہمارے لئے اہم مسئلہ ضمانت کا تھا۔ ضمانت ہوگئی تو سمجھو بری بھی ہو ہی جائے گا۔" وہ بے پروائی سے بولی۔

"کیا آئندہ پیش ہونے والے گواہوں کا بھی یہی حشر کرانے کا ارادہ ہے؟" میں نے ظفر جمال کے 'سڑک پر جمے ہوئے خون کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تم اتنی اچھی اچھی پیاری پیاری باتیں کرتے کرتے ایک دم ایسی بے ہودہ باتیں کیوں شروع کردیتے ہو۔" اس کی پیشانی پر شکنیں پڑگئیں جن کی وجہ سے اس کی بے ہودہ پیشانی اور بھی زیادہ واہیات نظر آنے لگی۔

میں نے گویا سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا "ہر بار ایک ہی طریقہ تو کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ہر بار کسی قربانی کے بکرے کو کسی اونچی بلڈنگ پر چڑھا کر تو گواہ کو نہیں مروایا جاسکتا۔ ہوسکتا ہے اگلی پیشی پر ظفر جمال سے بھی زیادہ اہم کوئی گواہ یہاں آئے اور وہ بہ خیروعافیت گواہوں کے کٹہرے تک پہنچ جائے۔"

اس کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا لیکن وہ اپنی اداکاری جاری رکھتے ہوئے بولی "تم نے پھر وہی بہتان تراشی شروع کردی... بُری بات... میں تمہیں دانش کے استقبال کے بارے میں بتا رہی تھی۔ وہ ایک قابل دید منظر ہوگا جب دانش گھر پہنچے گا۔ میں نے دانش سے کہا ہے کہ عدالت سے فارغ ہونے کے بعد بھی وہ جان بوجھ کر کچھ تاخیر سے ہی گھر آئے تاکہ اس کے استقبال کی تیاریوں

میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔"

پھر وہ دروازے پر کچھ اور جھکتے ہوئے نہایت شیریں لہجے میں بولی "آج "پیر پیلس" میں جشن کا سا سماں ہو گا اور ہاں دیکھو ہم بغض یا کینہ دل میں رکھنے والے لوگ نہیں ہیں، تم بھی چاہو تو اس جشن میں آسکتے ہو۔ تمہیں وی آئی پی ٹریٹ منٹ دیا جائے گا۔ جو ہوا سو ہوا۔ اسے بھول جاؤ اور اب اپنے طرز زندگی کی اصلاح کرنے کی کوشش کرو۔ ایک بجے کے بعد تم کسی بھی وقت آسکتے ہو۔ کیا میں امید رکھوں؟"

"اپنے طرز زندگی کی اصلاح کرنے والا تمہارا مشورہ مجھے قابل غور لگا ہے۔ میں اس کے بارے میں ضرور سوچوں گا لیکن تمہارے جشن میں آنے کے سلسلے میں، میں ابھی کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ شاید میں کسی اور ہی موقع پر "پیر پیلس" آؤں۔" "اور ہی" پر میں نے خاصا زور دیا تھا۔

وہ گاڑی کے دروازے پر سے کہنی ہٹا کر سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بولی "ٹھیک ہے تم کسی "اور ہی" موقع پر آجانا۔ بشرطیکہ ایسا کوئی موقع آیا۔ ہمارے دروازے ہمیشہ ہی تمہارے لئے کھلے رہیں گے۔"

اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا۔ وہ خود چار گارڈز کے ساتھ ایک نیلی پجیرو میں سوار ہو گئی۔ ڈرائیونگ سیٹ اس نے خود سنبھالی۔ باقی لوگ پیچھے کھڑی سرخ رنگ کی ایک اونچی اور بڑی سی کھلی جیپ میں جا بیٹھے۔ چند سیکنڈ بعد پجیرو زن سے میرے سامنے سے گزری۔ گاڈمدر نے اپنا شہتیر جیسا بازو ہلایا۔ کچھ دھول اڑ کر میری گاڑی کی طرف آئی۔ میں نے جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

گاڈمدر نے چرچراتے ٹائروں کے ساتھ پجیرو بھگا کر گویا میرے منہ پر خاک ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ اس کے پیچھے کھلی جیپ میں خونخوار سی صورتوں والے لوگ عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے۔ میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ یہ بلاشبہ بڑے ہی عجیب انسانوں کا ٹولا تھا۔

گاڈمدر کا فاتحانہ اور حد سے زیادہ پُراعتماد انداز بتا رہا تھا کہ بازی فی الحال اس کے حق میں پلٹ چکی تھی۔ مجھے اپنا مزید وہاں ٹھہرنا وقت ضائع کرنے کے مترادف محسوس ہوا۔ میں نے سوچا جب پیر دانش ضمانت منظور ہونے کے بعد اپنے بچے کھچے آدمیوں کے ساتھ عدالت سے نکلے گا تو وہ بھی یقیناً میرے پاس رک کر کچھ نہ کچھ باتیں کرے گا۔ ہو سکتا ہے وہ گاڈمدر کے مقابلے میں زیادہ بے سروپا زیادہ تکلیف دہ باتیں کرے۔ عین ممکن ہے میری کھوپڑی گھوم جائے اور لب سڑک کوئی فساد برپا ہو جائے۔

یہ معاملہ چونکہ اب منظر عام پر آچکا تھا اس لئے اس پر اب یوں سرعام فساد کرنا میرے حق میں اچھا نہیں تھا۔ اگر میں نے چپ چپاتے اس مسئلے کو نمٹانے کا فیصلہ کیا ہوتا تو پھر کوئی بات نہیں تھی۔ اگر میں نے کسی کو بھی اپنی طرف متوجہ کئے بغیر پیر دانش کا پتا صاف کرا دیا ہوتا تو میرے لئے کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوتا لیکن میں نے اس معاملے کو قانونی طور پر نمٹانے کی کوشش کی تھی، ابھی میں یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ میرا فیصلہ میرے حق میں غلط ثابت ہوا تھا لیکن فی الحال میرا محتاط رہنا ضروری تھا۔ میں نے اس لئے بھی وہاں سے رخصت ہونا بہتر سمجھا کہ بعد میں مجھے رحیم گل سے مکمل رپورٹ تو مل ہی جائے گی۔

میں نے شفیع شاہ کو اشارہ کیا اور ہم لوگ آگے پیچھے آفس آگئے۔ باقی لوگ باہر ہی رہے۔ شفیع شاہ میرے ساتھ آفس آگیا۔ میں نے کافی منگوائی اور ہم دونوں خاموشی سے کافی پینے لگے۔ انداز کچھ ایسا ہی تھا جیسے ہم کسی جنازے میں شرکت کر کے آرہے تھے۔ یہ تقریباً حقیقت ہی تھی۔ آخر ہمارے سامنے ظفر جمال کی لاش تو اٹھی ہی تھی۔ وہ ہمارا دوست نہ سہی لیکن ہمارے لئے کام تو دوستوں والا ہی کرنے جا رہا تھا۔

آخر میں نے کپ ایک طرف رکھ کر کرسی کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "یہ کچھ اچھا نہیں ہوا شفیع شاہ!"

وہ دھیمے اور ہچکچاہٹ زدہ لہجے میں بولا "سر! میں نے تو پہلے ہی کہا تھا۔۔۔ خاموشی سے پیر دانش کا پتا صاف کر دیتے ہیں۔"

"صحیح معنوں میں اس کا موقع بھی نہیں آیا۔ جب ہم نے اس پہلو پر غور کیا اس وقت تک اس کی اور ہماری دشمنی واضح ہو چکی تھی اور واضح دشمنی کے بعد کسی ایسی مشہور اور بارسوخ شخصیت کو ٹھکانے لگانا اپنے گلے میں مصیبت ڈالنے والی بات ہوتی۔" میں نے تحمل سے کہا۔

"مصیبت تو ہر حال میں گلے پڑ ہی گئی ہے سر!" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں نے تو اپنی دانست میں صحیح راستہ اختیار کیا تھا۔" میں نے افسوس سے کہا۔

"ظفر جمال کو اڑا کر انہوں نے بڑی مستعدی کا ثبوت دیا۔" وہ بولا۔

"مجھے ظفر جمال سے زیادہ اپنی نیت پر بھروسا تھا۔ میرا خیال تھا میری نیت نیک ہے۔ مجھے اس کا پھل ضرور ملے گا۔ میں ایک اچھے مقصد کے لئے قدم اٹھا رہا ہوں، مجھے ضرور کامیابی ہو گی۔ مجھے یقین تھا کہ مجھے اس راستے سے بھی انصاف ملے گا۔" مجھے واقعی بڑا افسوس تھا۔

"اگر آپ کو یقین تھا سر۔۔۔ تو پھر اتنی جلدی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔" شفیع شاہ نے گویا مجھے تسلی دی "ابھی تو پہلی پیشی ہے۔ اگر ضمانت ہو گئی تب بھی کیس تو چلے گا۔ ثبوت تو اور بھی بہت سے ہیں۔"

"وہ سب شاید ان ماں بیٹے کی مکاریوں کے سیلاب کے سامنے خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں۔ گاڈمدر کے انداز نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ ظفر جمال کا عدالت کے سامنے بیان ہو جاتا تو کچھ

اور بات ہوتی۔" میں نے کہا "اس کا قاتل زندہ ہمارے ہاتھ آجاتا اور رحیم گل اس کا پیردانش سے تعلق ثابت کرنے میں کامیاب ہوجاتا تب بھی پھانسی کا پھندا پیردانش کے گلے میں پڑنے کی امید رکھی جاسکتی تھی لیکن کرائے کے اس قاتل کو تو یقیناً سب سے اہم ہدایت یہی دی گئی ہوگی کہ اسے زندہ کسی کے ہاتھ نہیں آنا ہے۔ اس کی شناخت بھی یقیناً نہیں ہوسکے گی۔ پیردانش جیسے لوگوں کے معاملے میں ایک مسئلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ان کے لئے ہر جائز اور ناجائز کام کرنے والوں کا ان کے ساتھ روپے پیسے کے علاوہ عقیدت کا بھی رشتہ ہوتا ہے۔ بُرے سے بُرا کام کرتے ہوئے بھی ان کے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوتا۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ پیر صاحب نے حکم دیا ہے تو اس میں کوئی نیک مقصد ہی پنہاں ہوگا۔ اب ظفر جمال کے قاتل کو ہی لے لو۔ مجھے یقین ہے کہ مرتے وقت بھی اس کے ذہن میں یہی خیال ہوگا کہ اس نے جنت کا ٹکٹ کٹا لیا ہے۔ اس قسم کی معاشرتی خرابیوں کا کسی کے پاس کوئی علاج نہیں۔" میں نے ایک بار پھر بوجھل سانس لی۔

"علاج تو ہے سر.... لیکن جس طرح دوسری بہت سی بیماریوں کا علاج کوئی نہیں کرنا چاہتا... اس طرح اس بیماری کو بھی لاعلاج چھوڑ دیا گیا ہے۔" شفیع شاہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"کیا علاج ہے تمہارے خیال میں؟" میں نے پوچھا۔

"تعلیم عام ہوجائے اور پیردانش جیسی ہر شخصیت اس انجام کو پہنچتی رہے جس کی وہ مستحق ہوتی ہے۔ ان کے کرتوت بڑے تواتر سے منظرِ عام پر آتے رہیں۔ تب کہیں جاکر بہت عرصے میں لوگوں میں شعور اور آگہی آئے گی۔" وہ بولا۔

"ہائے.... یہ تو بہت مشکل علاج بتادیا تم نے!" میں نے کراہ کر کہا۔ "یہ تو بے شمار بیماریوں کا علاج ہے.... مگر اس میں لگتی ہے محنت زیادہ.... ہمارے ہاں اشتہار بازیاں ہوسکتی ہیں.... ٹی وی پر تقریریں اور مذاکرے ہوسکتے ہیں۔ دعوے ہوسکتے ہیں، وعدے ہوسکتے ہیں صحیح معنوں میں کسی بھی مرض کا کوئی علاج نہیں ہوسکتا۔"

"یہی تو مسئلہ ہے سر! علاج سب کو معلوم ہیں لیکن اس کے لئے قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ وہ کون دے گا؟ کھانے پینے کی ہوس سے نجات ملے تو کسی کے دل میں علاج کے سلسلے میں خلوص پیدا ہو۔" شفیع شاہ بولا۔

"ایک مسئلہ یہ بھی ہے شفیع شاہ.... کہ اگر لوگوں میں تعلیم.... شعور اور آگہی آگئی تو انہیں معلوم ہوجائے گا کہ انہیں سب ہی بے وقوف بنا رہے ہیں۔ اس لئے دل ہی دل میں سبھی بڑے.... چاہے وہ کسی بھی مقام پر ہیں اس بات پر متفق ہیں کہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جاہل، بے شعور اور آگہی سے محروم رکھا جائے۔ جو کسی حد تک تعلیم حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہوجائیں ان کی جہالت میں بھی کوئی کمی نہ آنے پائے۔"

شفیع شاہ نے ... سر ہلایا اور بولا "المیہ یہ ہے کہ لوگ کچھ اس بری طرح اس شیطانی چکر میں جکڑے ہوئے ہیں کہ نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا۔"

"خیر.... چھوڑو ان باتوں کو۔" میں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ مجبور ہوکر میں آخر میں یہی کہا کرتا تھا۔ اس قسم کے مسائل پر دردمند لوگوں کی بات چیت کا اختتام عموماً انہی الفاظ پر ہوتا ہے۔

میں نے مزید افسوس سے کہا "ہمارے پاس اچھے خاصے وسائل ہیں، جذبہ ہے، ہم بے خوف ہیں، ہماری اچھی خاصی جگہوں تک رسائی بھی ہے۔ اس کے باوجود ہمیں صرف ایک پیردانش کو انجام تک پہنچانے میں دانتوں پسینے آرہے ہیں۔ ہم کوئی اور مسئلہ کیا حل کریں گے۔ اس قوم کی گردن پر تو اس سے بھی بڑے بڑے اور نہ جانے کتنے ہاتھی سوار ہیں۔ ہم سب کچھ جانتے بوجھتے بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ حتیٰ کہ دو چار لوگوں کو ان کے سحر سے بھی نہیں نکال سکتے۔"

"لیکن سر!" شفیع شاہ مسکراتے ہوئے بولا "اس کے باوجود آپ کا سبق ہے کہ ہم اپنی سی جدوجہد کرتے رہیں گے۔ کوئی نتیجہ نکلے یا نہ نکلے۔"

"ہاں شفیع شاہ! ہم جدوجہد کرتے رہیں گے۔" میں نے اپنے عزم کو دہرایا "کیونکہ جدوجہد زندگی ہے اور پھر ہم اپنی فطرت سے بھی مجبور ہیں۔ اس دنیا میں آیا ہوا ہر شخص اپنی اپنی فطرت کے مطابق کام کررہا ہے۔"

"بہرحال.... میں پیردانش کے سلسلے میں بھی ابھی مایوس نہیں ہوں۔" شفیع شاہ بولا۔

میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپس کی بات ہے، مایوس میں بھی نہیں ہوں۔ بس یونہی ذرا اداسی کی ایک لہر آگئی ہے۔ گزر جائے گی۔"

"میرے لئے اب کیا حکم ہے؟" اس نے پوچھا۔

"تم اپنے آدمیوں سمیت آج ہوٹل میں ہی موجود رہو۔ کسی کی نظر میں آئے بغیر اِدھر اُدھر بکھرے رہو۔ کسی کو تم لوگوں کی موجودگی کا احساس نہ ہونے پائے لیکن بوقتِ ضرورت تم آسکو۔" میں نے کہا۔

"کیا آپ کو یہاں کچھ گڑبڑ کا خطرہ ہے سر؟" شفیع شاہ چونکتا ہوتے ہوئے بولا۔

"نہیں خطرہ تو نہیں ہے۔" میں نے کہا "کاؤ ... تو خوشی خوشی ... جشن کی تیاریاں کرنے گھر گئی ہے۔ میرا خیال ہے فی الحال اس کا دھیان کوئی گڑبڑ کرنے کی طرف نہیں ہے پھر بھی بس ... احتیاطاً کہہ رہا ہوں۔ کہیں وہ گدھا.... پیردانش عدالت سے ... کے بعد ادھر کا رخ نہ کرلے۔ شاید اسے دو چار بڑھکیں مارنے کا شوق چرائے۔ بڑک سمجھتے ہو نا؟"

شفیع شاہ ہنسنے لگا "سر! اس قسم کے الفاظ تو اب ہر علاقے ... رہنے والا شخص سمجھتا ہے۔"

چند لمحے بعد وہ رخصت ہوگیا اور میں اپنے آپ کو کام میں ...نے کی کوشش کرنے لگا۔ کام میں دل تو نہیں لگ رہا تھا لیکن ...الجھن آمیز لمحات میں کام ہی میری پناہ ہوا کرتا تھا۔ اپنے ...مصروف رکھنے کا یہ ایک بہانہ تھا۔ اس وقت میں کہیں جانا ...یں چاہتا تھا ورنہ وقت گزاری کے لئے زرتاج کا گھر بہترین ...تا۔ وہ کئی مرتبہ بلا بھی چکی تھی۔

...کسی نہ کسی طرح چند گھنٹے گزر ہی گئے۔ حتیٰ کہ میں نے دوپہر کا ...بھی کھالیا۔ رحیم گل کی طرف سے کوئی اطلاع نہ آئی۔ میں ...کے تھانے فون کیا کیونکہ مجھے اس کی طرف سے تشویش ...ی تھی۔ تھانے سے پتا چلا کہ ابھی وہ عدالت سے واپس ...یا تھا۔

...ڈھائی بجے کے بعد اس کا فون آیا۔ چھوٹتے ہی بولا ...غائب ہوگئے تھے بھئی؟" لہجے میں تھکن بھی تھی، ...بھی... اور ایک مجبور قسم کا غصہ بھی۔

...وہاں کھڑے رہ کر کیا کرتا؟ قانون کی بے بسی کا مزید تماشا ...بس کی بات نہیں تھی۔" میں نے ملائمت سے جواب ...

...اندر بھی آسکتے تھے۔" وہ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ...ں کے لہجے سے غصہ اور جھنجلاہٹ غائب ہوگئی تھی۔ ...ی رہ گئی تھی۔

...تماشا زیادہ قریب سے دیکھتا؟" میں نے اسی ملائمت سے ...

...بکواس مت کرو۔" اس نے کھوکھلے لہجے میں مجھے ...ش کی "تم اس وقت کہاں ہو؟" اس نے میرے ...رابطہ کیا تھا۔ شاید اس لئے اسے اندازہ نہیں تھا کہ ...کہاں تھا۔

...ل میں ہوں۔ اپنے آفس میں...." میں نے جواب ...

...ہے ہو؟" اس نے گویا یونہی بے دھیانی کے سے عالم ...

...کیا کیا جاتا ہے؟" میں نے الٹا اس سے سوال کیا۔ ...بھروسا ہے؟" وہ قدرے کھسیاہٹ سے بولا "تم ...ی بھی وقت.... کچھ بھی کرسکتے ہو۔ تم کوئی نارمل ...س بلکہ کبھی کبھی تو مجھے تمہارے انسان ہونے کے ...ہونے لگتا ہے۔"

...کی باتیں کرکے اپنی کھسیاہٹ مٹانے کی کوشش ...ات کرو۔ کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے سنجیدگی سے ...

...چاہتا تھا کہ تم میری طرف آجاؤ۔" وہ بولا۔ ...کہاں" میں نے پوچھا۔

"میں تھانے میں ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "پولیس والوں سے دوستی میں ایک نقصان یہ بھی ہے۔ وہ ہر وقت تھانے بلاتے رہتے ہیں۔"

"حالانکہ تمہیں تو پاگل خانے بلانا چاہئے۔" وہ جل کر بولا۔

"تمہاری ذہنی حالت یہی رہی تو مجھے قوی امید ہے کہ مستقبل قریب میں میرے لئے تمہارے فون وہیں سے آیا کریں گے۔" میں نے کہا۔

"تمہیں کسی بھی وقت بکواس کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" وہ زیادہ جل کر بولا۔

"بکواس تم نے شروع کی ہے۔" میں نے کہا "میں تو کوشش کررہا ہوں کہ تمہیں کام کی بات کرنے پر آمادہ کرسکوں۔ تم مجھے تھانے کیوں بلا رہے ہو؟"

"یہاں سے اکٹھے کہیں نکل چلیں گے۔ میں اس وقت سادہ لباس میں ہوں۔ کہیں چل کر کسی فٹ پاتھیا ریستوران میں بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں۔ جہاں زندگی اپنے اصل روپ میں ہو، بھانت بھانت کی باتیں کرنے والے رنگا رنگ لوگ ہوں۔ کھانوں میں ذائقہ ہو۔"

"برتنوں میں غلاظت ہو اور گلاسوں میں پندرہ بیس بیماریوں کے جراثیم ہوں۔" میں نے لقمہ دیا۔

"وہ سب کچھ تمہاری اس اونچی منافق سوسائٹی کے زہریلے اثرات سے بہتر ہے۔ ان سے کم نقصان دہ ہے۔" وہ تلخ لہجے میں بولا۔

"اچھا.... اچھا میں سمجھ گیا۔" میں نے رسان سے کہا "تمہارا اس وقت دولت مندوں کو.... اونچی سوسائٹی کو، بلند و بالا چمکتی دمکتی عمارتوں کو گالیاں دینے کو جی چاہ رہا ہے۔ کوئی انقلابی قسم کی فلم دیکھ لی ہے کیا؟"

"ہاں صبح سے دیکھ تو رہا تھا وہ فلم۔ جس کے ہدایت کارِ اعلیٰ تم تھے۔" وہ خفگی سے بولا۔

"فلم تو اچھی بھلی تھی۔ میری ہدایتکاری بھی ٹھیک ٹھاک تھی۔ اپنی ناقص اور... نکمی پرفارمنس پر تمہیں خود کو لعن طعن کرنی چاہئے۔ مجھ پر کیوں غرا رہے ہو؟" میں نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی پھر نرمی سے کہا "اچھا خیر.... بک بک چھوڑو۔ سیدھی طرح بتاؤ کیا پیردانش کی ضمانت ہوگئی؟"

"ظاہر ہے۔" وہ بدستور خفگی سے بولا "اتنے معصوم بن کر کیوں پوچھ رہے ہو؟ تمہیں تو پہلے ہی پتا ہوگا۔ اسی لئے تو بھاگ گئے تھے۔"

"میں بھاگا نہیں تھا۔ بدمزہ ہوکر واپس آگیا تھا۔ بھاگنے اور بدمزہ ہوکر واپس آنے میں بڑا فرق ہے۔" میں نے کہا۔

"خیر... اب مجھے فرق مت سمجھاؤ۔ اپنے اس گھٹیا قسم کے فائیو اسٹار ہوٹل سے نکلو۔ چل کر کسی اعلیٰ درجے کے چھ...

ریستوران میں کھانا کھاتے ہیں۔ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"
"کیا یہ تمہارا غم غلط کرنے کا طریقہ ہے؟" میں نے پوچھا۔
"یہی سمجھ لو۔" وہ نرمی سے بولا۔
"کاش تم کوئی فلمی ہیرو ہوتے تو چھپتر ریستوران میں جانے کے بجائے کسی عجیب و غریب قسم کے شراب خانے میں جاتے جو شراب خانے کے بجائے خلائی اسٹیشن معلوم ہوتا۔ نہایت اچھوتے قسم کے لباس میں کوئی رقاصہ لال ہری اور نیلی پیلی دیواروں کے درمیان رقص کر رہی ہوتی۔ وقفے وقفے سے وہ تمہارے گلے میں بانہیں ڈال کر جھولا جھولنے کی کوشش کرتی۔ غم غلط کرنے کا یہ طریقہ زیادہ دلفریب معلوم ہوتا۔" میں نے کہا۔
"تم آ رہے ہو یا نہیں؟" اس نے پوچھا۔
"یار مجھے آنے میں تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔" میں نے کہا "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں کسی اعلیٰ قسم کے چھپتر ریستوران میں کھانا کھانے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکوں گا۔"
"کیوں.... کیا تم بھی کلاس کانشیسٹ ہو گئے؟" اس نے بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔
"کلاس کی ایسی تیسی۔ کلاس کو گولی مارو۔" میں نے کہا "مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے اس گھٹیا فائیو اسٹار ہوٹل میں کھانا کھا چکا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میں ویسے ہی تمہارے ننھے سے دل کو تسلی دینے کے لئے آ سکتا ہوں۔ مجھے یہ جان کر دلی صدمہ ہوا ہے کہ تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ میں معدے کی گہرائیوں کے ساتھ تمہارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ اگر تم کہو تو تمہارا ساتھ دینے کی خاطر چکھنے کی حد تک کھانے میں تمہارا ساتھ دے دوں گا۔ یعنی یہی کوئی دو چار نان اور دو چار پلیٹ سالن' ایک آدھ پلیٹ سلاد کے ساتھ کھا لوں گا۔ دوستی میں انسان اتنا تو کر ہی سکتا ہے۔ ویسے بھی میری تو زندگی ہی ایثار کا دوسرا نام ہے۔"
"اچھا تو بھائی ایثار پسند صاحب! آپ تشریف لایئے۔ بندہ آپ کا انتظار کر رہا ہے۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا پھر اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
میں نے باہر جانے سے پہلے شفیع شاہ کو اپنے پروگرام سے مطلع کیا۔ وہ بولا "میں گاڑی میں ایک آدھ آدمی کے ساتھ آپ کی نگرانی کے لئے پیچھے پیچھے رہوں گا۔"
"میرا خیال ہے اب اس کی ضرورت تو نہیں ہے لیکن خیر اگر تمہیں زحمت نہ ہو۔ اور کسی خاص کام کا حرج نہ ہو تو ٹھیک ہے۔" میں نے نیم رضامندی سے کہا۔
میں جب تھانے پہنچا تو وہ باہر ہی سادہ لباس میں گاڑی میں میرا منتظر تھا۔ گاڑی سرکاری تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ اس گاڑی کو چھوڑ کر میرے ساتھ آن بیٹھا۔
"کہاں چلنا ہے؟" میں نے پوچھا۔
"ساحل کی طرف لے چلو۔" وہ ایک لمحے سوچ کر بولا۔

میں نے گاڑی آگے بڑھائی اور پوچھا "تم نے کیا تھانے میں بھی ڈریسنگ روم بنا رکھا ہے جو اس وقت وردی کے بجائے [illegible] لباس میں نظر آ رہے ہو؟" پھر اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر [illegible] نے خود ہی کہا "ہاں بھئی اگر بنا بھی رکھا ہو تو کیا تعجب کی بات [illegible] ایس ایچ او آخر تھانے کا بادشاہ ہوتا ہے۔ اندر جس قسم [illegible] چاہے بنا لے۔"
اس نے مجھے گھورا اور کہا "روم وغیرہ تو کوئی ایسا [illegible] نہیں ہے لیکن سادہ لباس بہرحال تھانے میں موجود ہوتا ہے [illegible] ایک پولیس آفیسر کو کسی وقت سادہ لباس میں بھی کہیں جا[نے کی] ضرورت پیش آ سکتی ہے۔ مگر اس وقت دراصل میں گھر کا [چکر] لگا کر آ چکا ہوں۔"
"اوہ...." میں نے کہا اور ایک لمحے کے توقف [سے پوچھا] "اس معزز پیر کی ضمانت عدالت نے کس وقت منظور کی تھی؟"
"ایک بجے کے قریب۔" اس نے بتایا۔
"گراؤنڈ کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔
"ناکافی شہادتیں۔" اس نے اختصار سے جواب دیا۔
"عدالت کو اس وقت تک یہ تو معلوم ہو چکا ہو گا [کہ کیس] کے اہم ترین گواہ کو عین عدالت کے دروازے پر ق[تل کر دیا گیا] تھا؟"
اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سڑک کی طرف [دیکھتے ہوئے] بولا "اس کا تو الگ سے مقدمہ درج ہوا ہے نا۔ اس کی تفتیش ہو گی اور فی الحال یہ مقدمہ "نامعلوم قاتل" کے [خلاف درج] ہوا ہے کیونکہ جب تک پیر دانش سے اس کا تعلق [ثابت نہ ہو] جا سکے تب تک اس سلسلے میں اس کے خلاف مقدمہ [کیسے] ہو سکتا تھا۔"
پھر وہ گہری سانس لے کر بولا "بہرحال ابھی کیس [...] جمال کی نشاندہی پر دو تین افراد میرے ہاتھ آئے ہیں [...] چھوٹی مچھلیاں ہیں۔ بڑی مچھلیاں غائب ہو چکی ہیں [...] عدالت نے اپنی تحویل میں لے لی ہیں۔ وقت آنے پر [...] بھی ہو گی۔ شاید ہم اسے تھوڑی بہت سزا دلوانے [میں کامیاب] ہو جائیں لیکن جو خواب ہم نے دیکھا تھا وہ شاید پورا نہ [...]"
"اپنی ضمانت کے بعد پیر دانش نے تم سے [...] پوچھا۔
"میرا اس سے سامنا نہیں ہوا۔ میں سامنا [...] تھا۔" اس نے اب بھی میری طرف دیکھے بغیر جواب [دیا "جج] صاحب کے اٹھنے کے بعد بھی کافی دیر [...] ہی سرکاری وکیل سے باتیں کرتا رہا۔ تقریباً [...] جب میں باہر آیا تو وہ جا چکا تھا اور اس دوران اس [...] کی کاغذی کارروائی بھی مکمل کر چکے تھے۔"
پھر ایک لمحے کے توقف سے وہ [...] "وہ چھوڑ دیا [...]"

[...] کوئی اور بات کرو۔"
[...] بھی دل شکستگی کی ایک علامت ہوتی ہے۔ انسان کسی [...] موضوع سے کتراتا ہے یا بہت ہی ڈھیلے ڈھالے انداز میں [...] کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے۔
[...] تو میں بارہا بھیج چکا ہوں۔" میں نے ملائمت سے کہا [...] بھیجنا اور بات ہے اس کے بارے میں تبادلۂ خیال کرنا [...]" پھر ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تمہیں [...] گاڈ مدر نے پہلے ہی سے جشن کی تیاریاں کر کے رکھی ہوئی [...] اس وقت شاید جشن شروع ہو چکا ہو۔ کوئی بعید نہیں کہ وہ [...] مدعو کرے۔ اس موقع پر شاید وہ زیادہ سے زیادہ ستم [ظریف ب]ننے کی کوشش کرے۔"
[...] ستم ظریف بننے کا حق حاصل ہے۔" رحیم گل تلخ لہجے [میں بولا "پیر] دانش کی رہائی میرے اور تمہارے منہ پر طمانچہ ہے۔"
[...] شاید یہ میرے اور تمہارے منہ پر نہیں قانون کے منہ پر [...]"
[...] بھی معلوم ہے اور میں شاید تم سے زیادہ مغموم ہوں۔ [...] طرح منہ لٹکا لینے سے کچھ نہیں ہو گا۔ کوشش کرتے ہیں [...] کے اثرات سے نئی قوت' نئی توانائی حاصل کریں۔"
[...] لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
[...] کوشش کرنے کے لئے تو سب کام چھوڑ چھاڑ کر کچھ دیر [...] ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا "ادھر موڑ لو۔" وہ مجھے [...] لگا۔ ہم ساحل پر پہنچ چکے تھے۔ اس کی ہدایت پر میں [...] کے متوازی چلانے لگا۔
[...] کی خاموشی کے بعد وہ بولا "پہلے مجھے شک تھا۔ اب [...]"
[...] ت کا؟" میں نے چونک کر پوچھا۔
[...] بغیر محض ایک نظر عقب نما آئینے کی طرف دیکھ کر [...] ہم تھانے سے روانہ ہوئے ہیں' سفید رنگ کی ایک [...] تعاقب میں ہے۔ کار سوار کی صورت میں اب تک [...]"
[...] انیت کے احساس سے میں مسکرا دیا۔ گویا رحیم گل [...] دل شکستگی نے بھی اس کی پیشہ ورانہ مستعدی اس [...] کی۔ وہ اپنے گرد و پیش سے بے خبر نہیں تھا۔
[...] کی صورت تم دیکھ بھی نہیں سکو گے۔" میں نے [...] کر کہا "یہ گاڑی تھانے سے نہیں میرے ہوٹل [...] سے لگی ہوئی ہے۔"
[...] پیچھے؟" وہ بری طرح چونکا "پھر تم نے اس کا کچھ [...] ظفر جمال والا...." اس نے جملہ ادھورا چھوڑ [...]
[...] کہنا چاہتا تھا کہ کہیں ظفر جمال والا واقعہ دہرانے کا

انتظام تو نہیں کیا جا رہا تھا؟ لیکن غالباً اس نے اس خیال سے جملہ ادھورا چھوڑ دیا تھا کہ کہیں میں اسے بدشگونی نہ سمجھوں۔
"تمہارے خیال میں مجھے اس کا کیا کرنا چاہئے؟" میں نے پوچھا۔
"اب تم اتنے ہی نکمے ہو گئے ہو؟" وہ خفگی سے بولا پھر اس نے قمیص کے نیچے ہاتھ ڈال کر چھوٹی سی ایک آٹومیٹک گن نکالی۔ وہ اس وقت ڈھیلے ڈھالے اور نفیس قسم کے شلوار قمیص میں تھا۔
"گاڑی آگے زیادہ سنسان حصے کی طرف لے چلو۔" اس نے ہدایت کی۔
اب وہ گردن گھما کر' سر ذرا نیچا کر کے گاڑی کا جائزہ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ یکدم چاق و چوبند نظر آنے لگا تھا۔
"او.... بھائی طرم خان! اب اتنی بھی زیادہ مستعدی دکھانے کی ضرورت نہیں۔" میں نے جلدی سے اس کے گن والے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "اس طمنچے کو واپس نیفے میں رکھ لو۔"
اس نے مجھے گھورا اور گہری سانس لے کر بولا "تمہارے اپنے آدمی ہیں؟"
"ہاں" میں نے جواب دیا۔
وہ سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور منہ بنا کر بولا "بچوں کی طرح مذاق کرنے اور بات گھما پھرا کر کرنے کی تمہاری عادت نہ جانے کب جائے گی۔"
"بچے بات گھما پھرا کر کب کرتے ہیں چغد! وہ تو بالکل سیدھی بات کھٹ سے منہ پر مار دیتے ہیں۔" میں نے تصحیح کی "اور میں تم سے مذاق تھوڑا ہی کر رہا تھا۔ میں تو ذرا دیکھ رہا تھا کہ پولیس والے بے وقت اور بے موقع پھرتی دکھاتے ہوئے کیسے لگتے ہیں۔"
"تم بڑی خبیث روح ہو۔" وہ گن کو قمیص کے نیچے چھپاتے ہوئے بولا "آج کے دن بھی تم مذاق کرنے سے باز نہیں رہ سکے۔ گاڈ مدر نے جس طرح ظفر جمال کو مروایا اور پیر دانش جس طرح ہمارے ہاتھ سے تقریباً نکل گیا' اس کا شاید تمہیں ذرا بھی صدمہ نہیں ہوا۔ تم تو آرام سے جا کر اپنے آفس میں بیٹھ کر کام کرنے لگے۔ اکیلے اکیلے کھانا بھی کھا لیا!" اسے گویا میری حالت پر افسوس ہو رہا تھا۔
"تو کیا میں سر کے بل کھڑا ہو جاتا اور اسی عالم میں بھوک ہڑتال شروع کر دیتا؟" میں نے خفگی سے پوچھا۔ وہ خاموش رہا تو میں نے ذرا سنجیدگی سے کہا "میں کچھ دیر تمہاری طرح منہ لٹکائے بیٹھا رہا تھا اور کام بھی میں درحقیقت ذرا بھی دلچسپی سے نہیں کر رہا تھا۔ کام میں تو دراصل میں پناہ تلاش کرتا ہوں ورنہ اب میرے بزنس میں میرے کام کرنے یا نہ کرنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔ بہرحال کچھ دیر تک منہ لٹکائے بیٹھے رہنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ میرے اس طرح بیٹھے رہنے سے کسی کی صحت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس لئے میں کام سے دل بہلانے اور اپنے آپ کو صحیح

طور پر سوچ بچار کے قابل بنانے کی کوشش کرنے لگا پھر کچھ دیر بعد تمہارا فون آ گیا۔"

وہ خاموش رہا۔ ہم ساحل کے ویران حصے کی طرف نکل آئے تھے۔ میں نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی ذرا روٹھے ہوئے بچے کی طرح بیٹھا تھا۔

"آخر جانا کہاں ہے؟" میں نے ذرا ڈانٹ کر کہا۔

"واپس موڑلو گاڑی۔" وہ بولا۔

"تمہاری اطلاع کے لئے عرض ہے کہ تم اس وقت کسی ٹیکسی یا ڈرائیور والی سرکاری گاڑی میں سفر نہیں کر رہے ہو جو شاہانہ انداز میں حکم دیئے جا رہے ہو۔ اِدھر موڑلو اُدھر موڑلو۔ واپس لے چلو۔ سیدھی طرح اور فیصلہ کن انداز میں بتاؤ' جانا کہاں ہے۔" میں نے اسے مزید تھوڑی سی ڈانٹ پلائی۔

"میں بھولا نہیں ہوں بھائی! مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت میں ایک بڑے سیٹھ صاحب کی خالصتاً نجی گاڑی میں سفر کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں لیکن سیٹھ صاحب کو کرنا وہی پڑے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔ ورنہ میں سیٹھ صاحب کو گاڑی سمیت اس سمندر میں غرق کردوں گا۔" وہ الفاظ چباتے ہوئے بولا۔

"واہ بے' دورِ حاضر کے ماڈرن دادا گیر!" میں نے گاڑی موڑتے ہوئے استہزائیہ ستائش کے انداز میں سرہلایا۔

اب ہم واپس ساحل کے متوازی پتلی سی سڑک پر جا رہے تھے۔ ہمارے دائیں ہاتھ پر سمندر کی فصیل کا کام دینے والی موٹی سی اور چھوٹی سی پرانی دیوار تھی جس کے زرد پتھر بھی شاید غمِ دوراں کے بوجھ سے شکست وریخت کا شکار ہونے لگے تھے۔

کچھ دیر بعد ہمارے بائیں ہاتھ پر اُن چھپّر ریستورانوں کی قطار شروع ہوگئی جہاں زیادہ تر تلی ہوئی مچھلی اور نان ملتے تھے۔ ان کی خاص ڈش یہی تھی۔ اس کے علاوہ اگر کسی کے پاس کچھ ہوتا تو اسے بونس سمجھنا چاہئے تھا۔ فضا میں مچھلی کی بُو پھیلی ہوئی تھی جو اشتہا انگیز معلوم ہونے کے بجائے خاصی حد تک بھوک بھگانے والی محسوس ہو رہی تھی۔

ساحل پر خاصی حد تک ویرانی ہی تھی۔ ان دنوں تفریح گاہوں پر مستقل طور پر ہی رونق کم ہو چلی تھی اور پھر یہ تو وقت بھی ایسا ہی تھا۔ اس وقت تو کوئی بہت ہی زیادہ فارغ البال یا پھر ہماری طرح کسی خاص ہی قسم کی بے تابیٔ دل کا مارا ہوا انسان ساحل کا رخ کرنے کا متحمل ہو سکتا تھا۔ کہیں کہیں دو دو تین تین افراد کی ٹولیاں چہل قدمی کرتی نظر آ رہی تھیں لیکن ایسی وسعتوں میں اتنے سے افراد کا ہونا نہ ہونا برابر لگتا ہے۔ اس کے باوجود چھپّر ریستورانوں کے بیرے ہاتھ میں گندی سی ٹرے اٹھائے' شاید کسی موہوم سی امید کے سہارے گاہک کی تلاش میں ریت پر اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔

رحیم گل نے دیوار کے قریب گاڑی رکوائی اور ہم نیچے اترے۔ ہوٹلوں اور اس دیوار کے درمیان خاصا فاصلہ تھا اس لئے کوئی بیرا ہماری طرف متوجہ نہیں ہوا۔ ویسے بھی شاید انہیں امید نہیں تھی کہ ایک شاندار گاڑی سے اترنے والا سوٹڈ بوٹڈ [illegible] اور نہایت عمدہ شلوار قمیص' ویسٹ کوٹ وغیرہ میں نظر آنے والا کوئی جاگیردار ٹائپ سا شخص ان کی مچھلی کھانے میں دلچسپی رکھتا ہوگا۔ رحیم گل نے خود ہی ایک بیرے کو اشارے کرکے بلایا۔ بیرے اس کے اشاروں کی طرف متوجہ ہوئے تو پھر اکٹھے دو تین دوڑے دوڑے آ گئے۔

"تم میں سے شیدی کے چھپّر کا بیرا کون ہے؟" رحیم گل نے پوچھا۔

"میں ہوں جی۔" دبلے پتلے ایک نوجوان نے جھجکتے ہوئے آگے بڑھ کر کہا۔ اس نے المونیم کی ٹرے سینے سے لگا رکھی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھا۔

"شیدی سے جا کر بولو' رحیم گل کے لئے بہترین [illegible] کر کے بھیجے۔" وہ جو کچھ اور جس طرح منگوانا چاہتا تھا اسے سمجھانے لگا۔ دوسرے بیرے قدرے مایوسی کے عالم میں واپس ہو لئے۔

لڑکا آرڈر سمجھ کر مستعدی سے واپس جانے لگا تو میں نے اس کا سوکھا سا بازو پکڑ کر روکتے ہوئے کہا "پیارے بھائی! رحیم گل نے تو اپنی ہدایات دے دی ہیں۔ ایک آدھ ہدایت میری بھی سنتے [illegible] مچھلی ہفتے دس دن سے زیادہ پرانی نہیں ہونی چاہئے۔ کوشش [illegible] اسے اس طرح پکایا جائے کہ اسے کھانے کے بعد ہمیں ہیضہ [illegible] پانی کسی ایسے جگ میں لانا جسے سال دو سال میں ایک آدھ [illegible] ضرور دھویا جاتا ہو۔ سمجھ گئے نا؟"

لڑکا ذرا کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا "نہیں [illegible] شیدی کے ہوٹل میں مچھلی تازہ ملتی ہے۔ سب چیز بالکل ایک دم فس کلاس لاؤں گا۔"

رحیم گل چٹکی بجا کر اسے جانے کا اشارہ کرتے ہوئے [illegible] جاؤ۔ بس شیدی کو صرف میرا نام بتا دینا۔ ان صاحب کی [illegible] دھیان مت دو۔ یہ جب سے امیر ہوئے ہیں انہیں ہر چیز [illegible] نکالنے کی عادت ہوگئی ہے۔"

لڑکا موقع غنیمت جان کر فوراً دوڑ پڑا تو میں نے [illegible] کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ نہایت عوامی اور [illegible] کی طرف لوٹ کر جانے کا دورہ کبھی کبھی مجھے بھی پڑتا [illegible] میں ان چیزوں کے لئے اب بھی قوتِ برداشت [illegible] لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ انسان یہاں [illegible] آئے۔ ان بے چاروں کی مچھلی بکتی کہاں ہے۔ بیرے [illegible] زیادہ تر پڑی سڑتی ہی رہتی ہے۔ شہر میں [illegible] اور بھی جگہیں تھیں۔"

وہ گویا میری کم فہمی پر مربیانہ انداز میں مسکرایا "شاید تمہارا خیال درست ہو لیکن جہاں میں نے اس لڑکے کو بھیجا ہے اس کے بارے میں تمہیں کچھ معلوم نہیں اور پھر ذرا میرے نام کے اثرات دیکھنا۔ کھانا کھانے کے بعد رائے دینا۔"

"ہاں یہ بات اور ہے۔" میں نے تسلیم کیا "آخر یہ تمہارا علاقہ ہے' بادشاہ ہو تم اس علاقے کے۔"

"ابے لعنت بھیجو بادشاہی پر۔ ہم کہاں کے بادشاہ ہیں۔ ہم تو پیر دانش جیسے ایک سنپولیے کو بھی نہیں پکڑ سکتے۔" پھر اس نے نہایت صوفیانہ انداز میں آسمان کی طرف انگلی اٹھائی "بس اللہ بڑا بادشاہ ہے۔" ہم دیوار کے ساتھ ساتھ ٹہل رہے تھے۔ اچانک اس نے مجھے گھورا اور بولا "تم سمجھ رہے ہو شیدی میری حیثیت کی وجہ سے میرے لئے خصوصی اہتمام کرے گا؟ ہرگز نہیں۔ اس بے چارے کو تو معلوم ہی نہیں ہے کہ اس علاقے کا ایس ایچ او میں ہی ہوں۔ اس سے میری شناسائی کی بنیاد کچھ اور ہے۔"

"بہت خوب۔" میں نے آنکھیں سیکڑتے ہوئے اسے گھورا "تم نے بھی کافی پر پرزے نکال لئے ہیں۔ ادھر اُدھر پُراسراریت پھیلانے لگے ہو۔"

وہ اپنا خوب صورت اور نفیس قسم کا تاریک چشمہ ناک پر ٹھیک طرح سے جماتے ہوئے بولا "آؤ دیوار پر بیٹھتے ہیں۔"

ہم کھلنڈرے لڑکوں کی طرح دیوار پر جا بیٹھے۔ دوسری طرف پڑے پتھروں پر ہم نے پاؤں ٹکا لیے۔ ابھی موسم ٹھنڈا چل رہا تھا۔ سمندر میں زیادہ تموج نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کی وسعت اور ہیبت اپنی جگہ تھی۔ دیر تک ہم اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے رہے اور ہماری نظریں سُرمئی فضا میں بھٹکتی رہیں۔ میں بھی بہت کچھ سوچ رہا تھا اور شاید اس کا ذہن بھی دشتِ خیال میں دور دور تک بھٹک رہا تھا۔

آخر وہ بہت دھیمی آواز میں بولا "یار افضل! اللہ نے اس دنیا کو اتنا خوب صورت بنایا ہے۔ یہ انسان ہر وقت اسے بد صورت بنانے پر کیوں تُلا رہتا ہے؟"

"اب صرف چند ہی ملک ایسے رہ گئے ہیں جہاں لوگوں میں کچھ مجنونانہ رجحانات پائے جاتے ہیں اور وہ دنیا کو بد صورت بنانے پر تُلے رہتے ہیں ورنہ دنیا کے بیشتر باشندوں کو اب سمجھ آگئی ہے کہ دنیا میں کس طرح رہنا چاہیے۔" میں نے اُفق پر پھیلے دُھندلکے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"میرے خیال میں اس کی ایک وجہ سخت ناشکرا پن اور قناعت کا نہ ہونا بھی ہے۔" وہ بولا "ہمارے ہاں بہت سے لوگ اپنی زندگی پر اطمینان اور قناعت نہیں رکھتے۔ ہر وقت بے چین اور مضطرب نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھتے رہتے ہیں کہ کوئی معجزہ رونما ہوگا اور وہ راتوں رات فرش سے عرش پر پہنچ جائیں گے۔"

"ہاں یہ بھی ہے۔" میں نے تسلیم کیا "ساتھ ساتھ کچھ دوسری سماجی ناانصافیاں بھی ہیں۔ طبقاتی فرق بہت زیادہ ہے۔ ایک طرف غربت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ دوسری طرف دولت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ ایسے میں بہت سے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں جو محروم طبقات کے جذبات کو خوب ایکسپلائٹ کرتے ہیں۔ یہی ان کا کاروبار ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کے سینوں میں چھپی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ بناتے ہیں۔ لوگوں کی محرومیاں دور ہوں نہ ہوں' ان کے اپنے دلدّر ضرور دھل جاتے ہیں۔ دولت کے ڈھیر بھی لگ جاتے ہیں۔ ایک اشارے پر ہلچل بھی برپا ہونے لگتی ہے۔ دنیا میں سب سے زیادہ بد صورتی ان لوگوں کی پیدا کی ہوئی ہے۔"

وہ چند لمحے پُرخیال انداز میں خاموش رہا "یار! بچپن اتنا خوب صورت کیوں لگتا ہے؟"

"کیونکہ بچپن میں انسان زیادہ سمجھدار نہیں ہوتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر مسکراتے ہوئے جواب دیا "اسے اپنے معاشرے.... ملک اور دنیا کے مسائل کی تو کیا.... خود اپنے گھر کے مسائل کی بھی سمجھ نہیں ہوتی۔ اس لئے وہ بڑا خوش.... بڑا مگن اور بڑا مست رہتا ہے۔ اس کی نظر بہت کم فاصلے تک جاتی ہے۔ اس لئے اسے دنیا کی بد صورتیاں کم نظر آتی ہیں۔ بڑے ہو کر وہ بقراط ہو جاتا ہے۔ جتنی زیادہ سمجھ آجاتی ہے اتنی زیادہ تکلیف بڑھ جاتی ہے۔ آگہی بڑا عذاب ہے۔ سوچ اور شعور سے محروم لوگ ہر عمر میں ہی مزے میں رہتے ہیں۔ انہیں صرف ذاتی اور نجی مسائل تھوڑا بہت تنگ کرتے ہیں۔ اندر کوئی روگ نہیں لگا ہوتا۔"

مزید چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ اچانک بولا "یار افضل! ہم بھی پیر دانش قسم کی کوئی چیز کیوں نہیں بن گئے؟ اس قسم کی چیز بننے کے لئے حالات تو ہمارے حق میں بھی بہت سازگار ہو سکتے تھے۔"

"لاحول ولا قوۃ۔" میں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا "اچھی خاصی باتیں کرتے کرتے یہ تمہیں کیا بھونڈا خیال آیا۔"

"کیوں کیا خرابی ہے اس میں؟" اس نے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ "دولت ہے۔ حسین عورتوں کے جھمگھٹے ہیں۔ معاشرے میں عزت' تقدّس اور احترام ہے۔ اثر رسوخ ہے۔ بڑے بڑے لوگ در پہ سلام کرنے حاضر ہوتے ہیں۔ کس چیز کی کمی ہے اس کے پاس؟"

"ضمیر کی۔" میں نے جواب دیا۔

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسا اور دیر تک ہنستا ہی رہا۔ حتّٰی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ یہ آنسو زیادہ ہنسنے کی وجہ سے نہیں آئے تھے۔ یہ یقیناً اس کے دل میں جمع تھے۔ راستہ پا کر باہر کو ڈھلک آئے تھے۔ پیر دانش کا صدمہ اس نے کچھ زیادہ ہی دل کو لگالیا تھا۔ اس نے بڑی جرأت' بے خوفی اور دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے پیر دانش پر ہاتھ ڈالا تھا۔ وہ چکنی مچھلی کی طرح پھسل کر نکل گیا تھا۔ اس کے اندر موجود اصول پسند انسان کو تو جو دھچکا لگا تھا وہ

تو لگا تھا لیکن ایک غیرت مند اور دبدبے والے افسر کی حیثیت سے شاید اس نے اپنی زبردست توہین بھی محسوس کی تھی۔ وہ عدالتوں اور ہمارے نظامِ انصاف کے بارے میں بھی کھل کر تو کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اس کے اندر انگارے ضرور دہک رہے تھے۔

"ضمیر....؟" آخر کار اس کی ہنسی تھمی تو وہ زہریلے لہجے میں بولا "یہ کس چڑیا کا نام ہے اور ہماری سوسائٹی میں اس کی کیا قدر ہے؟"

"اگر اس کی قدر نہیں رہی تو کچھ لوگوں کو تو اس کی قدر بحال کرانے کے لئے کام کرنا پڑے گا۔" میں نے ملائمت سے کہا "اگر سبھی نے ضمیر کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تو ایک روز ہم بڑی ذلت کی موت مریں گے۔"

وہ خاموش رہا تو میں نے کہا "ضمیر بھی شاید انسان فطرت کی طرح اپنے ساتھ ہی لے کر آتا ہے۔ یعنی میرے خیال میں بعض لوگ پیدا ہی باضمیر ہوتے ہیں اور بعض بے ضمیر پیدا ہوتے ہیں۔ ضمیر ایک بار ساتھ لگ کر آجائے تو پھر انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور اگر کسی کے پاس ضمیر موجود ہی نہیں ہے تو آپ اسے بار بار کر بھی باضمیر نہیں بنا سکتے۔ اس کے لئے لاکھ کوششیں کرتے رہیے' وعظ سناتے رہیے' تقریریں کرتے رہیے' سب اس کے ایک کان سے گھس کر دوسرے سے نکلتی رہیں گی۔"

اسی دوران بیرا اور ایک دوسرا شخص دوڑے اٹھائے آگئے۔ اپنے وسائل کے مطابق وہ بڑے اہتمام سے ہمارے لئے کھانا لائے تھے۔ میں دوسرے شخص کو دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ چھپّر ریستوران کا مالک شیدی ہوگا۔ وہ گٹھے ہوئے جسم کا ایک ادھیڑ عمر سیاہ فام شخص تھا جس کے بال حد سے زیادہ گھنگریالے تھے۔

ٹرے ہمارے درمیان رکھ کر وہ ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رحیم گل کے قدموں میں بچھ جاتا "سائیں! آپ ہوٹل میں تشریف لاتے نا۔ میں آپ کے لئے قالین بچھواتا۔"

عمومی رواج کے مطابق وہ بھی اپنے چھپّر ریستوران کو ہوٹل ہی کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں سچائی تھی' خلوص تھا۔ چہرے پر حد سے زیادہ شکر گزاری تھی۔ شاید رحیم گل نے کبھی اس پر کوئی احسان کیا ہو۔ میں نے اس سلسلے میں اسے کریدا نہیں تھا۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ اگر وہ مناسب سمجھے گا تو خود ہی بتا دے گا۔

رحیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "اگر قالین پر ہی بیٹھنا ہوتا تو یہاں کیوں آتے۔"

وہ عاجزی سے مسکراتے ہوئے بولا "کوئی اور خدمت ہو تو بتائیں۔"

"جو کچھ بھی منگوانا ہوگا میں پیغام بھجوا دوں گا ارمان شیدی! اب تم جاؤ۔" رحیم گل اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

وہ رخصت ہو گیا۔ بیرا کچھ دور جا کر ٹہلنے لگا۔ شاید اسے صرف ہمارے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا۔ مچھلی نان سلاد وغیرہ' سب چیزیں واقعی صاف ستھری ٹرے میں بڑے اہتمام سے رکھ کر بھیجی گئی تھیں اور ان سے تازگی کی مہک اٹھ رہی تھی۔

رحیم گل کھانے کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا "تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ شخص.... جو اردو ٹھیک طرح سے بول بھی نہیں سکتا' اردو میں شاعری کی کوشش کرتا ہے۔ ارمان تخلص کرتا ہے۔"

"اللہ.... اللہ...." میں نے مچھلی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا "شاعری بھی انسان کا بنیادی حق ہے۔ جو چاہے کر سکتا ہے۔"

"بے چارے کو شاعری کے رموز و قواعد کا تو پتا نہیں۔ تعلیم بھی کوئی خاص نہیں۔ تین چار جماعت پڑھا ہوا ہے۔ شعر تو نہیں کہہ سکتا' تک بندی کرتا رہتا ہے۔ اسی کو شاعری سمجھتا رہتا ہے۔ ارمان شیدی کے نام سے معروف ہونے کی کوشش کرتا ہے لیکن کوئی بے چارے کو ارمان کے نام سے پکارتا ہی نہیں.... سب صرف شیدی کہتے ہیں۔"

"تمہاری باتوں سے مجھے شبہ ہو رہا ہے کہ یہ کوئی دلچسپ کردار ہے۔" میں نے کھانا شروع کرتے ہوئے کہا۔

"بہت دلچسپ۔" رحیم گل بولا "تخلص اس نے خوب چھانٹ کر رکھا ہے۔ بے چارہ واقعی سراپا ارمان ہے۔ اس کے دل میں نہ جانے کتنے ارمان گھٹ گھٹ کر مرنے کے قریب ہیں۔"

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔

"مثلاً یہ کہ وہ ٹی وی اور فلموں میں ہیرو آتا۔ اپنی اداکاری سے دنیا میں دھوم مچا دیتا۔ اس کا دوسرا ارمان ہے کہ یہ کسی طرح اس شہر کا میئر بن جاتا۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر اسے صرف دو سال خدمت کا موقع دیا جائے تو یہ اس شہر کو پیرس اور لندن وغیرہ جیسا خوبصورت بنا دے۔"

میں ہنسنے لگا۔ رحیم گل سنجیدگی سے بولا "ایسے لوگوں کی سادگی بڑی غور طلب چیز ہوتی ہے۔ تمہیں ان کا حوصلہ عجیب نہیں لگتا؟ ناممکن چیزوں کو اپنی منزل بنا کر بڑے خلوص اور لگن سے زندگی بھر تگ و دو میں لگے رہتے ہیں۔ ہم جیسے لوگوں کی طرح مایوس نہیں ہوتے۔ یہ اس شہر کو لندن اور پیرس بنانے کے خواب دیکھتا ہے حالانکہ اس نے لندن اور پیرس خواب میں بھی نہیں دیکھا لیکن نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ اس قسم کے سادہ لوح لوگوں کے ہاتھوں میں اگر اختیارات آجائیں تو شاید یہ واقعی کچھ کر گزریں.... کوئی کارنامہ دکھا جائیں' کسی انہونی کو ہونی بنا جائیں۔"

"جتنے سانپ بچھو' بھیڑیے' مگرمچھ اور بن مانس ہمارے نظام میں موجود ہیں وہ انہیں کب کچھ کرنے دیں گے۔ وہ ایک ہی دن میں انہیں کھا جائیں گے۔ ان کی تکّا بوٹی کر دیں گے۔" میں نے کہا۔

"ہاں یہی تو مسئلہ ہے۔" وہ مایوسی سے بولا "ان سے جان

چھوٹے تبھی تو کوئی کچھ کرے گا۔ اس بے چارے ارمان شیدی کے بہرحال اور بھی بڑے بڑے ارمان ہیں۔ دنیا کی سیاحت کرنا۔ مچھیروں کے لئے ایک بہت بڑی ہاؤسنگ اسکیم بنانا۔ اور نہ جانے کیا کچھ۔ خوابوں کی دنیا کا آدمی ہے۔ مگر بہت پیارا انسان ہے۔"

"آئندہ کبھی فرصت میسر آئی تو میں اس سے ملوں گا۔" میں نے کہا "مجھے دلچسپ کرداروں کی تلاش رہتی ہے۔"

"لیکن اسے میرے بارے میں یہ مت بتانا کہ میں پولیس میں ہوں۔ پولیس کے بارے میں اس بے چارے کے خیالات کچھ اچھے نہیں ہیں۔" رحیم گل جلدی سے بولا۔

"اکثر لوگوں کی طرح۔" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہارے ہاں پولیس کو بُرا کہنا فیشن بھی تو ہے نا۔" وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھتے ہوئے بولا "اکثر ایسے لوگ بھی پولیس کو برا کہتے ہیں جنہیں کبھی پولیس سے واسطہ نہیں پڑا ہوتا۔"

"برا کہنے کے ساتھ ساتھ وہ دعا بھی کرتے ہیں کہ اللہ انہیں کبھی واسطہ نہ ہی ڈالے۔" میں نے کہا۔

"لیکن افسوس کہ لوگ پیر دانش جیسے لوگوں کو برا نہیں کہتے۔ خواہ ان کے کرتوت کتنے ہی گھناؤنے ہوں۔ خواہ ان کی وجہ سے کتنی ہی زندگیاں برباد ہوئی ہوں۔ وہ نیک نام اور معاشرے میں بڑے اونچے مقام کے مالک ہی رہتے ہیں۔" رحیم گل فوراً بولا۔

اس بار میں نے تقریباً زبردستی ہنستے ہوئے کہا "آج تمہارے ذہن پر پیر دانش سوار ہے۔ تم نے یہ غم دل کو کیوں لگالیا ہے؟ ابھی تو شاید بڑی عمر پڑی ہے۔ نہ جانے کب تک تمہیں پولیس کی نوکری کرنی ہے اور ایسے نہ جانے کتنے واقعات تمہیں پیش آئیں گے۔ تمہارا کیا حال ہوگا؟"

"ٹی بی لگ جائے گی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"پھر تو تم پولیس کی نوکری کے لئے نااہل ہو۔" میں نے کہا۔

"مگر میرا استعفا دینے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ یہ اعتراف شکست لگتا ہے اگر ہر شخص اسی طرح شکست تسلیم کر کے پیچھے ہٹتا رہا تو پھر کبھی کوئی تبدیلی نہیں آسکے گی۔ امید ہی ختم ہو جائے گی۔ اور امید ختم ہو جائے تو سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولا۔

مچھلی واقعی بہت عمدہ تھی اور لذیذ بنی ہوئی تھی۔ میں نے بھوک نہ ہونے کے باوجود اس سے لطف اندوز ہوتے ہوئے کہا "اب تم میرے فلسفۂ حیات کے قریب آگئے ہو۔ اسی پر قائم رہو۔ اسی میں عافیت ہے۔"

"عافیت کم ہے، اذیت زیادہ ہے۔" وہ بولا "تم نے ٹھیک کہا ہے۔ جو انسان ضمیر سمیت پیدا ہوا ہے اسے دنیا میں ضمیر کے ساتھ ہی رہنا ہے اور خوب اذیتیں برداشت کرنی ہیں۔"

"اس کے باوجود ضمیر کے ساتھ زندہ رہنا پیر دانش بن کر زندہ رہنے سے کہیں بہتر ہے۔" میں نے کہا "ہم کہہ رہے تھے نا کہ ہم پیر دانش کیوں نہیں بن گئے۔ اب تو خیر میں مالی اعتبار سے پیر دانش ہی کی ٹکر کے لوگوں میں شامل ہوں لیکن اگر میں غریب بھی رہتا تب بھی شاید میں کبھی پیر دانش بننا پسند نہ کرتا۔ میں صرف لڑکپن سے نوجوانی کے ابتدائی دور تک ذرا بھٹکا ہوں۔ اس کی بڑی وجہ بھی میری کم عقلی، ناتجربہ کاری اور غلط شناسائیاں تھیں لیکن جونہی میری عمر ذرا بڑھی، مجھے صحیح اور غلط کی تمیز آگئی۔ میں نے بہت سختی سے صحیح راستہ اختیار کرلیا اور شکر ہے اس پر قائم رہا۔ میں نقصان میں نہیں رہا۔ جائز طریقوں سے بھی میرے بزنس نے جتنی ترقی کی اتنی تیزی سے شاید ناجائز طریقوں سے نہ کرتا۔ اب تو میرا یہ ایمان ہو گیا ہے کہ جتنا انسان کے مقدر میں لکھا ہوتا ہے وہ اسے ملتا ضرور ہے لیکن انتخاب کا حق شاید اللہ نے انسان کو دے رکھا ہے کہ وہ اس کے لئے اچھے راستے اختیار کرتا ہے یا برے۔ ہمیں اس کے خمیر کا پتا چلتا ہے۔ اگر اس کا خمیر اچھائی سے اٹھا ہے تو اس کا پلڑا اس کی طرف جھک جائے گا اور اگر اس کا خمیر خباثت سے اٹھا ہے تو وہ اس طرف چلا جائے گا۔ بہرحال میری نظر میں سب سے بڑی برائی اور خباثت خلقِ خدا کو اذیت دینا ہے۔ جو کچھ بھی خلقِ خدا کو اذیت دے کر۔۔۔ ان کی زندگیاں خراب کر کے حاصل کیا جاتا ہے وہ سب سے بُرا اثاثہ ہے۔ چاہے وہ دولت ہے چاہے وہ شہرت ہے چاہے وہ سماجی مرتبہ ہے۔"

وہ خاموشی سے منہ چلاتے ہوئے مجھے گھورتا رہا پھر بولا "سچ سچ بتاؤ لڑکپن اور نوجوانی میں کیا کرتے رہے ہو؟"

"یہ میں تمہیں نہیں بتا سکتا۔ جتنا کچھ بتا رہا ہوں یہی بہت ہے۔" میں نے کہا۔

رحیم گل گویا میری بات سنے بغیر بولا "کچھ اسمگلنگ اور کالے دھندوں وغیرہ سے تعلق تھا تمہارا؟"

"اب اتنا زیادہ فری ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "آج میں تمہاری اداسی اور دل شکستگی دیکھ کر تم سے ذرا کھل کر بات کر رہا ہوں تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں تمہیں زندگی کی ہر بات ہی بتا دوں گا۔"

"اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میں اندازے لگاتا رہوں گا۔" وہ بولا۔

"ہاں اندازے بے شک لگاتے رہو۔" میں نے بے پروائی سے کہا "اندازے لگانے سے کوئی کسی کو منع نہیں کر سکتا۔"

"چلو۔۔۔ بتا دو یار! اتنا پُراسرار کیوں بن رہے ہو۔ میں اب گڑے مُردے اکھاڑ کر تمہیں گرفتار کرنے سے تو رہا۔" وہ بولا۔

"گرفتار تو خیر اس وقت بھی کوئی نہیں کر سکتا تھا جب یہ مُردے گڑے نہیں تھے۔" میں نے ہنس کر کہا "ویسے تمہیں اتنی زیادہ تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں جو کچھ کرتا تھا وہ اتنا زیادہ قابلِ دست اندازیِ پولیس نہیں تھا۔"

اس نے گویا اطمینان کی سانس لی۔ اس کے بعد ہم نے خاموشی سے کھانا ختم کیا۔ بیرا اس دوران دوبارہ ہمارے سر پہ منڈلانے لگا تھا۔ اس نے جگ سے ہمارے ہاتھ دھلوائے اور میری ہدایت پر میری گاڑی سے ٹشو پیپرز کا ڈبا نکال کر لایا۔ بے چارہ بار بار حیرت سے ایک ٹک ہمیں دیکھنے لگتا تھا۔ شاید سوچ رہا تھا کہ اچھلے بھلے دولت مند نظر آنے والے ان دو خوش لباس آدمیوں کو کیا سوجھی ہے جو گندی دیوار پر ریت پر چوکڑی مارے بیٹھے ہیں۔

ہاتھ پونچھ کر رحیم گل نے بیرے کو حکم دیا "اب دو شاندار قسم کی دودھ پتی بھی لے آؤ اور ہاں سنو۔۔۔ گولڈ لیف کی دو سگریٹ بھی پکڑتے لانا۔"

وہ ایک بار پھر سر ہلا کر مستعدی سے دوڑتا چلا گیا۔ چند منٹ بعد واپس آیا تو ٹرے میں دودھ پتی کے صاف ستھرے برتنوں کے ساتھ گولڈ لیف کا ایک نیا پیکٹ بھی موجود تھا۔

"بے وقوف! تم سے پیکٹ لانے کو کس نے کہا تھا؟" رحیم گل نے اسے ہلکی سی ڈانٹ پلائی "صرف دو سگریٹ لانے تھے۔ ہم کوئی اسموکر تو نہیں ہیں۔ یونہی ذرا لڑکپن کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔"

اس نے دو سگریٹ نکال کر باقی پیکٹ اس نوجوان کی جیب میں ٹھونستے ہوئے کہا "ہماری طرف سے یہ تم پینا۔ عیش کرنا۔" وہ بے چارہ حیران حیران سا واپس چلا گیا۔ شاید اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ یادیں کیسے تازہ کی جاتی ہیں اور اس کا کیا فائدہ ہوتا ہے۔

دودھ پتی بھی ایک الگ ہی قسم کی روایتی چیز ہے۔ ہم نے دھیرے دھیرے چسکیاں لے کر وہ گاڑھا اور گرم مشروب ختم کیا۔ میں صرف رحیم گل کا ساتھ دینے کی غرض سے آیا تھا لیکن حقیقت یہ تھی کہ مجھے بھی خاصا سرور آیا۔ میرے اپنے فائیو اسٹار ہوٹل میں یہ سرور نہیں تھا۔

چائے کے بعد رحیم گل نے ایک سگریٹ اپنے ہونٹوں میں دبائی اور دوسری میری طرف بڑھائی۔ سگریٹ سُلگانے کے بعد وہ طویل کش لے کر بولا "اکیلی سگریٹ منگانے کا اپنا ایک الگ ہی لطف ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم تمہارے کیا حالات تھے لیکن میرے گھرانے میں اچھی خاصی آسودہ حالی ہونے کے باوجود مجھے ایک روپیا روزانہ اور کبھی کبھی دو روپے جیب خرچ ملتا تھا کیونکہ دوسرے میرے ہم عمروں کو بھی اتنا ہی ملتا تھا۔ ابا جی نے یہ بات معلوم کرنے کے بعد میرا یہ جیب خرچ مقرر کیا تھا۔ کہتے تھے، تمہاری جیب میں زیادہ پیسے ہوئے تو تم کہیں اپنے آپ کو دوسرے لڑکوں سے برتر نہ سمجھنے لگو۔"

"یار۔۔۔! یہ ہمارے بزرگ بھی بڑی کمال چیز ہوا کرتے تھے۔" میں نے کہا۔

"اس میں کیا شک ہے۔ اب بزرگوں کے بھی وہ طور طریقے وہ سوچیں نہیں رہیں اس لئے معاشرے کا حلیہ بھی بگڑتا جا رہا ہے۔" اس نے ایک اور کش لیا پھر اُفق کی طرف دیکھتے ہوئے بولا "ہمارے

گاؤں میں اسی طرح ایک پُلیا تھی۔ اس کے پاس ایک چھپر ریستوران تھا۔ کبھی کبھی جب فالتو پیسے جمع ہو جاتے تھے تو ہم دو تین دوست مل کر بالکل اسی طرح اُس پُلیا پر بیٹھ کر "عیاشی" کے طور پر اس کے ہاں سے کھانا کھاتے تھے پھر دودھ پتی کا دور چلتا تھا اور آخر میں ایک ایک سگریٹ منگائی جاتی تھی۔ یہ گویا عیاشی کی انتہا ہوتی تھی۔ سگریٹ پینے کے دوران دُزدیدہ نظروں سے ادھر اُدھر دیکھتے بھی رہتے تھے کہ کہیں کوئی بزرگ یا شناسا تو نہیں آرہا۔ حالانکہ اس وقت ہم کالج میں پڑھتے تھے لیکن محض سگریٹ پیتے ہوئے بھی اس خوف سے روح فنا ہوتی تھی کہ محلے کا کوئی بزرگ نہ دیکھ لے۔"

"واقعی۔۔۔۔ اور آج کے بزرگوں کی، نوجوانوں کو دیکھ کر روح فنا ہوتی ہے۔" میں نے بھی ایک طویل کش لیتے ہوئے کہا۔

نہ جانے کیا بات ہے نوجوانوں کا ذکر آتا ہے تو کلاشنکوف کا خیال آتا ہے۔ کلاشنکوف کا خیال آیا تو میں نے رحیم گل سے کہا "یار۔۔۔! ذرا غور تو کرو، ہم یہاں اس طویل و عریض ساحل کی دیوار پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ ماحول کی اس وسعت میں اس وقت کہیں کہیں آدمی دکھائی دے رہے ہیں اور ہم نے گویا اس وقت اپنے آپ کو اونچے اسٹیج پر سجا رکھا ہے۔ کوئی چاہے تو کہیں دور سے بھی کتنی آسانی سے ہمیں شوٹ کر سکتا ہے۔"

"لیکن حیرت ہے کہ ابھی تک کسی نے ایسا نہیں کیا۔" وہ بے پروائی سے مسکراتے ہوئے بولا "خصوصاً جبکہ پیر دانش جیسا آدمی اس وقت ہم دونوں کے خون کا پیاسا ہے۔"

"جبکہ ظفر جمال پولیس کے زبردست گھیرے میں تھا۔ ہم دونوں بھی وہاں موجود تھے۔ میرے آدمی بھی تھے اور اسے گولی لگ گئی۔" میں نے کہا۔

"یہ سب بڑی قابلِ غور باتیں ہیں اور پسِ پردہ کسی دستِ قدرت کی موجودگی کا ثبوت دیتی ہیں۔" وہ بولا۔

"بے شک۔" میں نے تائید کی۔

چند لمحے ہم دونوں خاموشی سے سگریٹ کے چھوٹے چھوٹے کش لیتے رہے۔ حتیٰ کہ دونوں کی سگریٹ ختم ہو گئی۔ میں نے ٹوٹا پتھر پر مسلتے ہوئے کہا "تمہارے دل کا بوجھ ہلکا ہوا یا نہیں؟"

وہ اپنا ٹوٹا دور ریت پر پھینکتے ہوئے بولا "میرے دل پر تو کوئی بوجھ نہیں تھا۔ میں تو صرف اپنے ذہن کو ذرا یکسوئی سے سوچنے کے قابل بنانا چاہتا تھا۔ تھانے کے ماحول میں، میں اپنے آپ کو صحیح طور پر سوچنے کے قابل نہیں پا رہا تھا۔ ذہن بیک وقت کئی سمتوں میں اُلجھا ہوا تھا۔"

"واہ یار! میں خواہ مخواہ اتنی دیر سے تمہاری دلداری اور غمگساری میں لگا ہوا تھا۔ میں تو سمجھ رہا تھا، میرا یار اداس ہے۔ دیوداس بنا ہوا ہے۔ اس کا غم بٹانا چاہیے۔" میں نے غصے سے اسے گھورا۔

"خیر..... یہ تو تم نے اچھا ہی کیا۔" وہ اطمینان سے بولا "بعض اوقات انسان اداس ہوتا ہے لیکن اسے خود پتا نہیں ہوتا البتہ اس کے مخلص دوست کو پتا ہوتا ہے۔"

ہم نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے۔ ریت خشک تھی۔ فوراً ہی کپڑوں سے جھڑ گئی۔ رحیم گل نے بیرے کو بلا کر بل کی ادائیگی کے لئے کچھ رقم نکالی تو وہ سر کھجاتے ہوئے بولا "شیدی نے کہا تھا آپ سے کوئی پیسا نہیں لینا ہے۔"

"تم بل بتاؤ۔ کتنا ہوا۔ شیدی کو گولی مارو۔" رحیم گل بارعب لہجے میں بولا "تم جا کر زبردستی شیدی کو پیسے دینا اور میری طرف سے بول دینا کہ وہ کہہ رہے تھے اگر شیدی نے پیسے نہ لئے تو میں آئندہ یہاں نہیں آؤں گا۔"

بڑی ردوقدح کے بعد بیرے نے بل اور ٹپ لی۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر واپس روانہ ہوئے۔ اسے تھانے پر اتارتے ہوئے میں نے پوچھا "اگلی پیشی کس تاریخ کی پڑی ہے؟"

اس نے تاریخ بتائی اور بولا "آج سے ٹھیک چھبیس دن بعد ہمیں پھر پیش ہونا ہے۔ اس دوران تم کچھ مواد جمع کرنے کی کوشش کرو۔ میں بھی اس دوران سرتوڑ کوشش کرتا ہوں۔"

"کس کا سر توڑو گے؟" میں نے سادگی سے پوچھا۔

اس نے مصنوعی غصے سے مجھے گھورا لیکن مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کی آنکھوں میں اب وہ پرچھائیاں نہیں تھیں جو یہاں سے روانہ ہوتے وقت نظر آرہی تھیں۔ میں نے جواب کا انتظار کئے بغیر گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں آفس پہنچا تو سورج ڈھلنے کو تھا۔ اندر پہنچ کر میں ابھی صحیح طرح بیٹھنے بھی نہیں پایا تھا کہ میرے ڈائریکٹ فون کی گھنٹی بجی۔ ایک طویل سانس لے کر میں نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز سن کر میرے کانوں کے پردے جھنجھنا اٹھے۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کون بول رہا تھا اور کیا بول رہا تھا۔

"کون پاگل کا بچہ بول رہا ہے۔ تمیز سے بات کرو۔" میں نے یہ سوچے بغیر کہ وہ کون ہو سکتا تھا، انگریزی میں اسے سختی سے ڈانٹ پلائی۔ مجھے وہ آواز بھی سخت بری لگی تھی اور انداز بھی۔ الفاظ میری سمجھ میں آئے ہی نہیں تھے۔

دوسری طرف سے کچھ سنبھل کر بولا گیا اور تب میری سمجھ میں آیا کہ وہ پاگل کا بچہ نہیں بلکہ بچی تھی۔ یا پھر شاید یوں کہنا چاہئے کہ وہ بچے کی اماں تھی۔ میرا مطلب ہے کہ وہ گاڈ مدر تھی۔ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخ رہی تھی جس کی وجہ سے اس کی آواز ناقابلِ شناخت ہوگئی تھی۔

تاہم اب میری سمجھ میں آگیا کہ وہ پوچھ رہی تھی "افضل! میرا بیٹا کہاں ہے؟"

"تمہیں کس اُلو کے پٹھے نے مشورہ دیا تھا کہ یہ بات تم مجھ سے پوچھو؟" میں نے سخت لہجے میں کہا۔

"مجھے معلوم ہے۔ مجھے معلوم ہے۔" وہ کچھ اس طرح ہانپ رہی تھی جیسے کہیں دور سے دوڑ کر آنے کے فوراً بعد اس نے مجھے فون کرنے کا فیصلہ کیا ہو۔ مجھے یہ شبہ بھی ہوا کہ وہ کافی پیئے ہوئے تھی۔ اگر وہ سامنے ہوتی تو زیادہ صحیح اندازہ ہو جاتا۔

"کیا معلوم ہے تمہیں؟" میں نے ڈانٹ کر پوچھا۔

"دانش کو تم نے اغوا کرالیا ہے۔" وہ کرخت آواز میں چیخی۔

"مجھے بھیڑیوں..... اژدہوں اور لکڑبھگوں کو اغوا کرانے کا قطعاً کوئی شوق نہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"جھوٹ مت بولو اور میرے بیٹے کو ایسے ناموں سے مت پکارو۔" وہ چیخی۔

"ہاں واقعی مجھے تمہارے بیٹے کو بھیڑیوں، اژدہوں اور لکڑبھگوں وغیرہ سے تشبیہ نہیں دینی چاہئے۔ بھیڑیے، اژدہے اور لکڑبھگے تو اس پر شرم سے ڈوب مریں گے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں کہتی ہوں میرے بیٹے کو چھوڑ دو۔ ورنہ میں تم سمیت تمہارا ہوٹل بم سے اُڑوا دوں گی۔" وہ پھر چیخی۔

"اگر تمہارا وہ چاند سا بیٹا بھی اس ہوٹل میں موجود ہوتا تو شاید میں تمہیں ہوٹل کو بم سے اُڑوانے کی اجازت بھی دے دیتا۔" میں نے کہا "لیکن اسے تو اس وقت تمہاری بغل میں ہونا چاہئے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ ایک بجے کے قریب عدالت نے اس کی ضمانت منظور کرلی تھی۔ وہیں کاغذی کارروائی بھی مکمل ہوگئی تھی اور وہ گھر روانہ ہوگیا تھا۔"

"وہ گھر نہیں پہنچا ہے۔" وہ بدستور ایک ہی انداز میں، پھٹی پھٹی سی آواز میں بات کئے جارہی تھی۔ اس آواز میں غیظ و غضب بھی تھا اور مجبوری و بے بسی بھی۔ اس میں ہزاروں اندیشے بھی پنہاں تھے اور بہت سی دھمکیوں کی جھلک بھی۔

"تو پھر میں کیا کروں؟ اپنی اس منحوس آواز سے میرے کانوں کے پردے کیوں خراب کررہی ہو؟ شاید وہ گھر کا راستہ بھول گیا ہو۔ اتنا چھوٹا سا..... مُنّا سا تو ہے بے چارہ۔ تم پولیس سے رجوع کرو۔ رپٹ لکھواؤ۔ میں نے یہاں گمشدہ جانوروں کو تلاش کرنے کا ادارہ تو نہیں کھول رکھا۔" میں نے برہمی سے کہا۔

حقیقت یہ تھی کہ میرے لئے بھی یہ ایک حیرت انگیز خبر تھی۔ اگر گاڈ مدر سچ بول رہی تھی اور پیر دانش ابھی تک گھر نہیں پہنچا تھا تو یہ تعجب کی بات تھی اور گاڈ مدر کا انداز تو یہی بتا رہا تھا کہ وہ سچ بول رہی تھی۔ اس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ تشویش اور پریشانی سے اس کا کلیجا پھٹا پڑ رہا تھا۔

"تم بات کو ٹالنے کی کوشش مت کرو۔" اس کے لہجے میں بے بسی کا عنصر ذرا بڑھ گیا "مجھے معلوم ہے اسے تم نے اغوا کرایا ہے۔ تمہارے سوا کسی کی یہ جُرات نہیں ہوسکتی۔"

"تمہارے منہ میں گھی شکر۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا "لیکن افسوس کہ مجھے یہ سنہرا خیال نہیں آیا تھا۔"

"میں تمہاری بات کا یقین نہیں کرسکتی۔" وہ بولی۔

"تو مت کرو یقین۔ میں کیا تمہارے پاؤں پڑ رہا ہوں کہ تم میری بات کا یقین کرو؟" میں نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے تم اقرار کررہے ہو کہ دانش تمہارے قبضے میں ہے؟" وہ بولی۔

"تم ایک انتہائی چالاک، عیّار اور مکّار عورت ہو لیکن اس وقت شاید تمہارا دماغ کسی ہتھنی کے دماغ سے زیادہ ناکارہ ہوچکا ہے۔ تمہیں کوئی بات سمجھانا بہت مشکل ہے۔ میں تمہارے ساتھ زیادہ مغزماری نہیں کرسکتا۔ بہرحال میں تمہیں اتنا بتا دیتا ہوں کہ عدالت سے تمہارے رخصت ہونے کے بعد میں بھی دفتر آگیا تھا۔ میں نے تمہارے پیارے بیٹے کو صرف عدالت میں جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ نہیں دیکھا......"

میں دوسری طرف اس کی تیز تیز سانسوں کی خرخراہٹ سن رہا تھا۔ اس وقت تک مجھے یہ تو یقین ہوگیا تھا کہ یہ ان لوگوں کا کوئی نیا ڈراما نہیں تھا۔ پیر دانش واقعی گھر نہیں پہنچا تھا اور گاڈ مدر حقیقتاً پریشان تھی۔ میں نے بات جاری رکھتے ہوئے ذرا نرم لہجے میں کہا "تم نے اس کے ساتھ وہاں یقیناً کچھ آدمی چھوڑے ہوں گے۔ تم لوگ تنہا تو کہیں آنے جانے کے عادی ہی نہیں ہو، وہ آدمی کہاں ہیں؟ ان سے پوچھو نا، دانش کہاں ہے۔"

"پوچھ لیا ہے۔" وہ سسکی سی لے کر ایک بار پھر تقریباً چیختے ہوئے بولی "تبھی تو تمہیں فون کررہی ہوں۔ انہوں نے مجھے بتایا ہے کہ دانش کو عدالت میں سر سے پاؤں تک سیاہ برقع میں لپٹی ہوئی ایک لڑکی ملی تھی جو اسے ایک کونے میں لے گئی تھی۔ کچھ دیر دونوں نے کھسر پھسر کی تھی پھر دانش نے چاروں گارڈز کو گھر جانے کا حکم دے دیا تھا اور خود اس لڑکی کے ساتھ کہیں روانہ ہوگیا۔"

"تو پھر مجھے فون کرنے کی کیا تُک ہے؟" میں نے ایک بار پھر ذرا سخت لہجے میں کہا۔ "میں وہ برقع پوش لڑکی تو نہیں ہوسکتا۔ ابھی مجھ پر اتنا برا وقت نہیں آیا کہ برقع پوش لڑکی بن کر تمہارے لاڈلے جیسی مخلوق کو اغوا کرتا پھروں اور پھر اگر میں برقع پوش لڑکی بننے کی کوشش کرتا تو شاید میرے پیچھے لوگوں کا جلوس جمع ہو جاتا کیونکہ مجھ جیسے قد کاٹھ کی لڑکیاں ذرا کم ہی پائی جاتی ہوں گی۔"

اچانک میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ میں بھلا اتنی جلدی اس برقع پوش لڑکی کو کیوں بھول گیا تھا جو مجھے اپنی گاڑی میں ملی تھی اور کڑیا سی معلوم ہو رہی تھی؟ میں یکدم چپ ہوگیا۔

وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی "میں یہ نہیں کہہ رہی کہ تم برقع پہن کر آگئے تھے بلکہ میں یہ کہہ رہی ہوں کہ وہ یقیناً تمہاری بھیجی ہوئی کوئی فتنہ قسم کی چیز ہوگی۔ خوب صورت لڑکیاں دانش کی کمزوری ہیں۔ تمہیں اس کمزوری کا پتا ہے۔ تم نے اسے چارا ڈال کر پھنسایا ہے۔ بعض معاملوں میں وہ بڑا احمق ہے۔ میرے مشورے کے بغیر کوئی قدم اٹھا لیتا ہے اور نقصان اٹھاتا ہے۔"

مجھے اپنے کانوں کی لویں گرم ہوتی محسوس ہوئیں۔ میں نے ایک لمحے کے لئے دانت پر دانت جمالئے پھر آہستگی سے اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑتے ہوئے کہا "اگر تم اس وقت میرے سامنے ہوتیں تو میں تمہاری بدنما کنپٹی پر ایسا گھونسا رسید کرتا کہ تمہاری منحوس زبان کئی گھنٹے کے لئے بند ہو جاتی۔ تم مجھے اتنا گھٹیا انسان سمجھتی ہو کہ تمہارے اس لکڑبھگے کو اغوا کرانے کے لئے میں خوب صورت لڑکی کا چارا استعمال کرتا؟ میرے پاس چارے کے بغیر بھی اس قسم کی مخلوقات کو اٹھوانے کا معقول بندوبست ہے۔ جو دو ایک لڑکیاں میری جاننے والی ہیں وہ بھی کچھ اس قسم کی ہیں کہ اگر انہیں تمہارے اس لومڑ کو اغوا کرنے کی ضرورت پیش آ بھی جاتی تو وہ اسے جوڈو کراٹے کے دو چار داؤ لگانے کے بعد بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتی ہوئی لاتیں۔ اپنے حُسن کا چارا ڈال کر نہیں۔"

پھر مجھے کچھ خیال آیا اور میں نے پوچھا "تمہارے آدمیوں میں سے کسی نے اس لڑکی کی صورت شکل کی جھلک دیکھی؟"

"نہیں" اس نے جواب دیا۔

"پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ اسے اپنے حُسن کا چارا ڈال کر لے گئی؟" میں نے تیزی سے کہا "شاید بات کچھ اور تھی۔ شاید وہ اسے جانتا تھا۔"

گاڈ مدر نے میرے اٹھائے ہوئے اس نکتے کو کوئی اہمیت نہیں دی اور اپنے اسی ضدی لہجے میں بولی "وہ اسے جانتا تھا یا نہیں لیکن میں کچھ نہیں جانتی۔ مجھے اپنا بیٹا چاہئے۔"

"افسوس..... میں اس سلسلے میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔" میں نے ملائمت سے کہا "اب تمہاری عمر بھی اتنی ہوگئی ہے کہ ڈپلیکیٹ کی امید نہیں رکھی جاسکتی۔ تم کہیں اور راتا پتا کرو۔ میں منافق نہیں ہوں۔ جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مجھے اس خبر سے خوشی ہوئی ہے لیکن اس بات کا افسوس بھی ہوا ہے کہ یہ نیک کام میرے ہاتھوں انجام نہیں پاسکا۔"

"میں تمہارے ہوٹل کی تلاشی لوں گی۔" وہ اچانک بولی۔

میں نے بے ساختہ سے انداز میں ہنستے ہوئے کہا "تم ماں بیٹا دونوں ہی بہت خوش فہم معلوم ہوتے ہو۔ تمہارا خیال ہے اگر میں واقعی اس گدھے کو اغوا کراتا تو اسے فائیو اسٹار ہوٹل میں چھپاتا؟ مجھے اپنا ہوٹل گندا نہیں کرنا تھا۔ میں اسے کسی اصطبل میں بندھواتا۔ اور وہ بھی وہاں پہلے سے موجود گدھے گھوڑوں سے اجازت لے کر۔ ورنہ عین ممکن ہے وہ برا مناتے۔ یا پھر اس کے لئے بڑے سائز کی کوئی نالی ڈھونڈتا۔ سنا ہے نالی کا کیڑا نالی میں ہی خوش رہتا ہے۔"

"تم جتنا چاہے بڑھ بڑھ کر باتیں کرلو لیکن میں تمہارے ہوٹل کی تلاشی ضرور لوں گی۔" وہ چلّائی۔

"تمہارے خیال میں تم کس طرح تلاشی لے سکتی ہو موٹی

عقل کی موٹی عورت؟" میں نے پُرسکون لہجے میں پوچھا۔

"میں اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ آرہی ہوں۔" اپنی دانست میں اس نے بہت بڑی دھمکی دی۔

"یہ حماقت مت کرنا۔ میں شارع عام پر ہنگامہ برپا ہونے اور اپنا بزنس متاثر ہونے کی پروا نہیں کروں گا۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "تم اور تمہارے آدمیوں میں سے کوئی زندہ واپس نہیں جائے گا۔ ابھی تمہیں معلوم نہیں ہے کہ یہاں کیسی کیسی نادرِ روزگار چیزیں پائی جاتی ہیں۔ تمہارے وہ اسلحہ بردار قلی صرف عام لوگوں سے نمٹنے میں کام آسکتے ہیں۔"

"میں اپنے بیٹے کے اغوا کی رپورٹ درج کروارہی ہوں۔ میں پولیس کی مدد سے قانونی طور پر ہوٹل کی تلاشی لوں گی۔" وہ ذرا نرم پڑتے ہوئے اور دوسرے پہلو کی طرف آتے ہوئے بولی۔ اس کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ بھی کم ہوتی جارہی تھی۔ شاید اس کے حواس ٹھکانے آرہے تھے۔

"میرے ہوٹل کے رائٹس آف ایڈمیشن ریزروڈ ہیں۔ پولیس اس کی تلاشی نہیں لے سکتی۔ تمہیں کم از کم ڈپٹی کمشنر سے خصوصی حکم نامہ جاری کرانا پڑے گا اور ڈی سی آفس اس وقت بند ہوچکا ہے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"آفس بند ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" وہ بولی "تلاشی کا وارنٹ میں ابھی لے لوں گی۔ اور ہاں ایک بات یاد رکھنا تم اس دوران دانش کو ہوٹل سے کہیں اور منتقل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ میرے آدمی ہوٹل کے چاروں کونوں سے اس کی نگرانی کررہے ہیں۔ کسی بھی فرد یا کسی بھی بنڈل وغیرہ کو ذرا بھی مشکوک انداز میں کہیں لے جاتے دیکھا گیا تو مجھے اطلاع ہوجائے گی اور اسے کسی نہ کسی طرح راستے میں روک لیا جائے گا۔"

"خواہ اس کوشش میں تمہارے آدمی مارے جائیں؟" میں نے ہلکے سے قہقہے کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں چاہے وہ مارے جائیں۔" اس نے جواب دیا "مارے جانا ان کے لئے کوئی اہم بات نہیں ہے۔ ہمارے کاموں کے سلسلے میں جان دے دینا ان کے لئے معمولی بات ہے۔"

"وہ تو میں دیکھ چکا ہوں۔" میں نے کہا۔

"بس تو پھر اب زیادہ پھرتی دکھانے کی کوشش مت کرنا۔ میں نے احتیاطاً پہلے اپنے آدمی تمہارے ہوٹل کی نگرانی کے لئے بھیجے تھے پھر تمہیں فون کیا تھا تاکہ میرے فون کے بعد تم دانش کو کہیں اِدھر اُدھر نہ کرادو۔"

"اور اگر وہ پہلے ہی سے کہیں اِدھر اُدھر ہوا تو......؟" میں نے شگفتہ لہجے میں پوچھا۔

"ہم بعد میں اِدھر اُدھر بھی دیکھ لیں گے۔ پہلے تمہارے ہوٹل کی تلاشی لے لیں۔" وہ بولی۔ یہ بات یقیناً اس کے دماغ میں بیٹھ چکی تھی کہ پیر دانش کو میں نے اغوا کرا کے ہوٹل میں ہی چھپایا تھا۔

اب یہ بات اس کے دماغ سے نکلنی مشکل نظر آرہی تھی۔

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "تمہیں وقت ضائع کرنے کا اتنا شوق ہے تو ضرور ضائع کرو۔"

اچانک وہ گلوگیر سی آواز میں بولی "تم نے اچھا نہیں کیا۔ یہاں جشن کی تمام تیاریاں مکمل تھیں۔ تم ذرا یہاں آکر دیکھتے۔ کیا خوب صورت سماں تھا۔ قالین بچھے ہوئے ہیں، قناتیں لگی ہوئی ہیں، بڑی بڑی لائٹس نصب ہیں۔ تین قسم کے بینڈ تیار کھڑے ہیں۔ شہر کے بہت سے معزز لوگ جمع ہیں اور انتظار کرتے کرتے تھک چکے ہیں۔ پورے گھر کی آرائش کی گئی ہے۔ تم نے خوشی کے اس موقع پر جو کچھ کیا ہے میں اس کے لئے تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

"بالکل.... بالکل میں خود بھی تمہیں یہی مشورہ دوں گا کہ تم مجھے بالکل معاف نہ کرنا۔ ایسی خوشی کے موقعوں پر رنگ میں بھنگ ڈالنے والوں کو کبھی معاف نہیں کرنا چاہئے۔" میں نے خلوص سے کہا "ویسے میں تمہیں اتنے موٹے دماغ کی عورت نہیں سمجھا تھا۔ میرا خیال تھا کہ بدمعاشی اور مکروہ دھندوں کی ایک اچھی خاصی ایمپائر کے پیچھے تمہارا دماغ کام کررہا ہے تو تم کافی مکار، عیار اور کافی ذہین ہوگی گو کہ تمہاری ذہانت منفی قسم کی ہی ہوگی لیکن ذہانت بہرحال ذہانت ہوتی ہے۔ چاہے وہ منفی ہو مگر اس وقت تو مجھے تمہاری باتوں میں کسی بھی قسم کی ذہانت کی جھلک محسوس نہیں ہورہی۔ نہ منفی نہ مثبت بہرحال....." میں نے ٹھنڈی سانس لی "یہ کوئی حیرت کی بات نہیں۔ بعض اوقات بڑے عجیب عجیب لوگ عجیب عجیب میدانوں میں کامیابیاں حاصل کرجاتے ہیں۔ میرا مشورہ تمہیں اب بھی یہی ہے کہ ذرا عقل کو ہاتھ مارو۔ دانش کو میرے ہوٹل میں تلاش کرنے کے بجائے کہیں اور تلاش کرو۔ ایسے معاملات میں ایک ایک لمحہ قیمتی ہوتا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ فضول چکروں میں تم قیمتی وقت ضائع کردو۔"

"مشورے کا شکریہ۔" وہ تلخ لہجے میں بولی "میں دوسری جگہوں پر بعد میں دیکھوں گی۔ پہلے تمہارے ہوٹل میں دیکھوں گی۔"

"تمہاری تمام تر کوڑھ مغزی اور جاہلانہ ضد کے باوجود مجھے تم پر ترس آرہا ہے کیونکہ ہر عورت کو اپنی اولاد عزیز ہوتی ہے چاہے وہ ابلیس کا عکس ہی کیوں نہ ہو۔" میں نے نرمی سے کہا "میں تمہیں ہوٹل کی تلاشی لینے سے اس لئے منع نہیں کررہا ہوں کہ میں نے دانش کو یہاں چھپایا ہوا ہے اور مجھے اس کے برآمد ہونے کا ڈر ہے۔ بلکہ اس لئے منع کررہا ہوں کہ مجھے اس طرح اپنی توہین کا احساس ہوگا۔ آج کل میں ذرا حساس ہوگیا ہوں۔ اپنی توہین ہرگز برداشت نہیں کرسکتا۔"

وہ بات کاٹتے ہوئے بولی "تم برداشت کرو یا نہ کرو۔ میں ہوٹل کی تلاشی لئے بغیر باز نہیں آؤں گی۔"

"پہلے پوری بات سن لو جاہل عورت......!"

وہ ایک بار پھر میری بات کاٹتے ہوئے بولی "عورت مامتا کے ہاتھوں مجبور ہوتی ہے۔ میں صرف دانش کی وجہ سے تمہاری گالیاں برداشت کررہی ہوں ورنہ اب تک تمہاری زبان گدی سے کھینچی جاچکی ہوتی۔"

"جن کی اولادیں ایسی ابلیس صفت ہوں انہیں زندگی بھر گالیاں اور بددعائیں ہی سننا پڑتی ہیں۔" میں نے تحمل سے کہا "جہاں تک میری زبان گدی سے کھینچنے کا تعلق ہے تو اس سے پہلے بھی بہت سے لوگوں نے ایسے دعوے کئے تھے لیکن آج وہ خود زبان ہلانے کے قابل نہیں ہیں کیونکہ وہ اس دنیا میں موجود نہیں ہیں۔ اگر تم بھی یہ گھسی پٹی دھمکیاں دینے کے بجائے توجہ سے میری بات سنو تو شاید تمہارا کچھ بھلا ہو۔"

وہ خاموش رہی۔ ایک لمحے کے توقف سے میں نے کہا "تم پر ترس کھا کر میں ایک پیشکش کررہا ہوں۔ اگر اعلیٰ حکام میں سے کوئی بھی تمہیں میرے ہوٹل کے لئے سرچ وارنٹ جاری نہ کرسکے تو تم پُرامن طریقے سے سیدھی میرے پاس آجانا۔ میں تمہیں ہوٹل کی تلاشی لینے کی اجازت دے دوں گا لیکن اس کے لئے تمہیں ایک تکلیف کرنا پڑے گی۔"

"وہ کیا؟" اس نے بے ساختہ پوچھا۔

"تمہیں معلوم ہی ہے میرے ہوٹل میں قیام کرنے والے ایرے غیرے تو ہوتے نہیں۔" میں نے سمجھانے کے سے انداز میں کہا "ان میں اکثریت نہایت معزز اور اہم لوگوں کی ہوتی ہے۔ غیر ملکی بھی ہوتے ہیں، تم یا تمہارے آدمی ان کے دروازوں پر جاکر یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ وہ ان کے کمروں کی تلاشی لینے آئے ہیں۔ میرے معزز مہمان سخت برا منائیں گے۔ ہوٹل کی انتظامیہ سے شکایت کریں گے۔ عین ممکن ہے ان میں سے بعض تو ہوٹل کو برا بھلا کہنے کے بجائے اپنے طور پر کوئی ایکشن لے لیں۔"

"اچھا تو پھر؟" وہ غرائی۔

"اس کے لئے میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے اس لئے تجویز بیان کررہا ہوں۔ تجویز یہ ہے کہ تم روم میڈ کی یونیفارم پہن کر بازو پر چند تولیے اور چادریں اٹھا کر ہر کمرے پر دستک دینا اور نہایت تمیز و شائستگی سے مہمانوں کو اطلاع دینا کہ تم تولیے اور چادریں بدلنے آئی ہو۔ اس بہانے تمہیں تمام کمروں کا جائزہ لینے کا موقع مل جائے گا۔ اس کے بعد باقی جگہوں کا جائزہ لینے کی اجازت میں تمہیں بونس کے طور پر دے دوں گا۔"

"یہ ارمان تمہارے دل میں ہی رہ جائے گا کہ تم مجھے اپنے ہوٹل کی میڈ کے یونیفارم میں دیکھ سکو۔ میں تم سمیت تمہارا ہوٹل خرید سکتی ہوں۔" وہ غصے سے بولی۔

"وہ کمپنی پرائیویٹ لمیٹڈ ہے جس کا ہوٹل ہے۔ اس کے تو شیئرز بھی کسی کے پاس نہیں ہیں۔ تم اسے کہاں سے خرید لو گی جبکہ میرا اسے فی الحال بیچنے کا کوئی ارادہ نہیں؟" میں نے استہزائیہ لہجے میں پوچھا۔

اس نے کھٹ سے فون بند کردیا۔ شاید اسے احساس ہوگیا ہو کہ وہ واقعی کافی وقت ضائع کرچکی تھی۔ میں نے آہستگی سے ریسیور رکھ دیا اور چند لمحے صورتِ حال پر غور کرتا رہا۔ میں نے آج جب عدالت کے قریب اپنی گاڑی میں اس برقع پوش لڑکی کو دیکھا تھا، مجھے تبھی احساس ہوا تھا کہ وہ صورتِ حال کو کوئی اہم موڑ دے گی لیکن مجھے یہ اندازہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ موڑ اتنا اہم ہوگا۔ پیر دانش کا ایسے موقع پر گھر نہ پہنچنا ایک اہم واقعہ تھا جب اس کی ماں اس کے استقبال کی شاندار تیاریاں کئے بے چینی سے منتظر بیٹھی تھی۔

گاڈ مدر نے ہوٹل کی تلاشی لینے کی جو دھمکی دی تھی اس کے پیش نظر میرے خیال میں اب وقت آگیا تھا کہ میں بھی کچھ ڈوریاں ہلا لیتا۔ اسے بتانا ضروری ہوگیا تھا کہ شہر میں اثر رسوخ صرف انہی کا نہیں تھا۔ میں نے فون اٹھایا اور چند منٹ کی کوشش کے بعد چشتی صاحب سے رابطہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ وہ مجھے موبائل فون پر دستیاب ہوئے۔

میں نے انہیں مختصراً ساری رام کہانی سنائی جو مختصر کرتے کرتے بھی کافی طویل ہوگئی۔ مجھے احساس تھا کہ چشتی صاحب کا ایک ایک لمحہ نہایت قیمتی ہوتا تھا۔ میں وقت ضائع کئے بغیر اور براہِ چینل سے گزرے بغیر انہیں فون کرلیتا تھا۔ یہ سہولت بہت کم لوگوں کو حاصل تھی۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ جس وقت میں انہیں فون کروں اس وقت ان کی مصروفیت کیا ہو؟ اس کے باوجود وہ صبر و سکون سے میری پوری بات سن لیتے تھے اور اس پر اعتبار بھی کرتے تھے۔ اس کے لئے انہیں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ صرف اس لئے کہ نفیس صاحب نے انہیں یقین دلا دیا تھا کہ میں ان جیسے لوگوں کے ساتھ کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ ملک قوم اور معاشرے کا خیر خواہ تھا۔ ان کی بہتری کے لئے میں نے قربانیاں دی تھیں اور آئندہ بھی دے سکتا تھا۔

چنانچہ جب کسی معاملے میں کہیں میری "گوٹ" اٹکتی تھی تو چشتی صاحب کام آتے تھے۔ وہ خود بھی امرت دھارا قسم کی چیز تھے۔ ہر محکمے میں... ہر شعبے میں ان کا نام اور مرتبہ کام آتا تھا لیکن اگر کبھی معاملہ ان کے دائرۂ اختیار سے باہر نکل جاتا تب بھی مجھے فکر نہیں تھی۔ اسلام آباد میں نفیس صاحب بیٹھے تھے۔

یہ مقام مجھے صرف ریڈ ڈاٹ والے معاملے میں بے پناہ تکالیف و پریشانیاں اٹھانے اور قومی فائدے کے لئے اپنے تمام وسائل جھونک دینے کی وجہ سے حاصل ہوا تھا۔ وہ سب کچھ میں جوش و جذبے میں کر گزرا تھا۔ اس سے مجھے یہ سبق حاصل ہوا تھا کہ ہمارا نظام کتنا ہی ناکارہ و بوسیدہ سہی لیکن اگر آپ اجتماعی بھلائی کے لئے خلوصِ دل سے کچھ کرتے تھے، کوئی بڑی قربانی دیتے تھے تو سرکاری سطح پر بھی آپ کو کہیں نہ کہیں، کچھ نہ کچھ پذیرائی ضرور ملتی تھی۔ اگر آپ بے غرض طریقے سے دوسروں کی مدد

کرتے تھے تو کہیں نہ کہیں کوئی آپ کی مدد کرنے والے بھی نکل ہی آتے تھے۔

"یہ سب کچھ بہت افسوس ناک ہے جو تم نے بتایا ہے۔" چشتی صاحب ساری بات سننے کے بعد بولے "اگر یہ شخص... پیر دانش بازیاب ہو جاتا ہے لیکن اسے عدالت کے ذریعے کیفرِ کردار تک نہیں پہنچایا جا سکتا تو تم دوبارہ مجھ سے رابطہ کرنا۔ میں دیکھوں گا کہ اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔ فی الحال تم صرف ایک بار اور تصدیق کر دو کہ پیر دانش تمہاری تحویل میں نہیں ہے۔"

"سر! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ بھی میں نے آپ کو بتایا ہے اس میں ایک لفظ بھی جھوٹ نہیں ہے اور نہ ہی میں نے کسی مصلحت کی خاطر کسی بات کا تاثر بدلنے کی کوشش کی ہے۔"

وہ گویا بس اتنا ہی سننا چاہتے تھے۔ مطمئن لہجے میں بولے "ٹھیک ہے۔ تم بے فکر رہو۔ کوئی ہوٹل کی تلاشی نہیں لے سکے گا۔ تمہارے ہوٹل کے لئے صرف دو تین حکام سرچ وارنٹ حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وقت تو شاید وہ بھی آمادہ نہ ہوں۔ بہرحال میں انہیں حقائق سے آگاہ کر دیتا ہوں۔ امید ہے اصل صورتِ حال جاننے کے بعد کوئی اس معاملے میں ہاتھ ڈالنا پسند نہیں کرے گا۔"

پھر وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولے "افضل میاں! مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے بعض اعلیٰ حکام اس لئے بھی کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر پاتے اور اس لئے بھی بہت سے فرائض دیانت داری سے انجام نہیں دے پاتے کہ ان کے سامنے سچ نہیں بولا جاتا۔ ان کے سامنے دن رات بڑے تواتر سے جھوٹ بولا جاتا ہے۔ انہیں غلط رپورٹیں فراہم کی جاتی ہیں۔ ان کے سامنے جھوٹی معلومات کا ایک طومار باندھ دیا جاتا ہے۔ جھوٹ اس کثرت سے بولا جاتا ہے کہ وہ سچ معلوم ہونے لگتا ہے۔ وہ جھوٹ کے اس جال میں مکھی کی طرح پھنسے رہتے ہیں۔ کبھی کوئی صحیح کام نہیں کر پاتے۔ جب تک اس معاشرے میں سچ کو رواج نہیں ملے گا، کسی بہتری کی امید رکھنا مشکل ہے۔"

"درست ہے سر! میں خود کم از کم اپنی حد تک تو جھوٹ کے اس سیلاب کے سامنے بند باندھنے کی کوشش کرتا رہتا ہوں۔ گو کہ اس سیلاب کے سامنے میری حیثیت ایک تنکے کی سی ہے۔ تنکا تو سیلاب کے سامنے بند نہیں باندھ سکتا۔" میں نے کہا۔

"درست ہے۔" وہ شگفتہ لہجے میں بولے "مگر یہی کافی ہے کہ تنکا اپنی حیثیت برقرار رکھے۔ وہ تنکا ہی رہے۔ سیلاب کے پانی کا ایک قطرہ نہ بن جائے۔ تنکا خواہ سیلاب کے ریلے میں بہہ رہا ہو مگر الگ نظر آتا ہے۔ صاف لگتا ہے کہ وہ اس ریلے میں بھی اپنا وجود قائم رکھنے اور پاؤں جمانے کی جدوجہد کر رہا ہے۔"

"سر! میں پوری کوشش کر رہا ہوں کہ یہ جدوجہد جاری رہے۔" میں نے کہا "کیا میں امید رکھوں کہ سرچ وارنٹ جاری نہیں ہو گا؟"

"ہاں امید ہے اس سلسلے میں میری بات مان لی جائے گی اور دانش کی ماں کا اثر رسوخ کام نہیں آئے گا۔" چشتی صاحب نے جواب دیا۔

"میں صرف توہین کے احساس اور کاروباری ساکھ خراب ہونے سے بچنے کے لئے آپ سے یہ درخواست کرنے پر مجبور ہوا ہوں۔" میں نے واضح کیا "ورنہ نجی سطح پر میں نے اسے پیشکش کی تھی کہ کسی ایسے طریقے سے میں اسے اطمینان دلا سکتا ہوں جس سے ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے مہمانوں کو یہ احساس نہ ہو کہ ہوٹل کی تلاشی لی جا رہی ہے۔ ایک طریقہ میں نے اسے بتا بھی دیا تھا۔" میں نے اس طریقے کی وضاحت بھی کر دی۔

چشتی صاحب ہلکی سی ہنسی کے ساتھ بولے "تم سچے ہونے کے ساتھ تھوڑے سے شرارتی بھی ہو۔ تم اس کی انا کو تھوڑی سی ٹھیس پہنچانا چاہتے ہو۔"

"سر! یہ لوگ دن رات عام اور بے ضرر انسانوں کی انا کا خون کرتے رہتے ہیں۔ اگر زندگی میں بھی کبھار... بلکہ شاید صرف ایک آدھ بار ان کی انا کو بھی معمولی سی ٹھیس پہنچ جائے تو کیا حرج ہے؟" میں نے کہا۔

"ہاں... حرج تو کوئی نہیں اگر وہ مان گئی تو یہ تجربہ کر کے دیکھ لینا۔" انہوں نے خدا حافظ کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے خاصی طمانیت محسوس کرتے ہوئے ریسیور رکھ دیا۔ یہ بہت اچھا بندوبست ہو گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے شفیع شاہ کو بلوایا اور اسے ہدایت دی "خود نظر میں آئے بغیر ذرا غیر محسوس طور پر جائزہ لو کہ کیا ہمارے ہوٹل کی چاروں طرف سے نگرانی ہو رہی ہے؟ نگرانی کرنے والے کس قسم کے لوگ ہیں۔"

وہ سر ہلا کر رخصت ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد واپس آیا اور بولا "سر! چاروں کونوں پر ایک ایک گاڑی میں دو دو آدمی موجود ہیں۔ گاڈدی سے ہیں۔ مجھے تو یہ پیر دانش کے آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ شکلیں کچھ دیکھی ہوئی سی لگ رہی ہیں۔ اب وہ گدھا کس چکر میں پڑ گیا ہے؟"

"فی الحال تو وہ گدھا کہیں غائب ہے۔" میں نے اسے گاڈمدر کے فون کے بارے میں بتایا۔

شفیع شاہ سر ہلاتے ہوئے بولا "عین ممکن ہے وہ خبیث کہیں عیاشی میں مشغول ہو... رات کو یا کل کسی وقت اچانک نمودار ہو جائے۔"

"ہاں یہ تو عین ممکن ہے۔" میں نے اس سے اتفاق کیا "لیکن اس وقت تک گاڈمدر تڑپتی رہے گی اور نہ جانے کس کس کو پریشان کرتی رہے گی۔"

"ان آدمیوں کا کیا کرنا ہے سر؟" شفیع شاہ نے پوچھا "انہیں پکڑنے کا بندوبست کیا جائے، بھگانے کی کوشش کی جائے!

پھر....؟“اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”نہیں.... نہیں۔“ میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا ”ان کا کچھ بھی نہیں کرنا ہے۔ انہیں اپنا شوق پورا کرنے دو۔ ان بے چاروں کا خیال ہے کہ پیردانش ہمارے ہوٹل میں موجود ہے اور ہم تلاشی کے ڈر سے اسے کہیں منتقل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ان گدھوں کو اسی غلط فہمی میں مبتلا رہنے دو۔“

ہم مزید کچھ دیر پیردانش کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف رحیم گل تھا۔ خاصی چہکتی ہوئی سی آواز میں بولا ”بھئی یہ کیا قصہ ہے۔ سنا ہے تم نے پیردانش کو اغوا کرالیا ہے اور وہ بھی کسی برقع پوش لڑکی کی مدد سے؟“

”یا اللہ!“ میں کراہ اٹھا ”یہ شخص تو واقعی ”ٹاک آف دی ٹاؤن“ بن گیا ہے۔ ہر طرف سے اسی کی بات ہوتی ہے۔ ہر طرف سے اسی کے بارے میں پوچھا جاتا ہے۔“

”دراصل یہ ٹیلی فون بڑی ہی کار آمد ایجاد ہے۔“ رحیم گل شگفتہ لہجے میں بولا ”چند لمحوں میں بات اِدھر سے اُدھر پہنچ جاتی ہے۔“

”کیا تمہیں بھی گاڈ مدر کا کوئی چنگھاڑتا ہوا ٹیلی فون موصول ہوا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں“ اس نے جواب دیا ”مجھے تو اپنے ایک اعلیٰ افسر کا فون موصول ہوا تھا۔ وہ بے چارے پریشان تھے۔ جاننا چاہ رہے تھے کہ یہ کیا قصہ ہے۔ انہیں کسی نے اپروچ کیا تھا کہ تمہارے ہوٹل کی تلاشی کا وارنٹ ایشو کرایا جائے۔ وہ بے چارے سفارش کی وجہ سے کچھ ہاتھ پاؤں ہلانے لگے تھے کہ اتنے میں بہت اوپر سے فون آگیا کہ وہ آرام سے بیٹھ جائیں اور اس سلسلے میں زیادہ مستعدی دکھانے کی کوشش نہ کریں۔“

میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا تو وہ بولا ”لگتا ہے تم نے کام دکھا ہی دیا اور ساتھ ساتھ پس پردہ ڈوریاں بھی ہلادیں۔ یار! تم بڑے حضرت ہو۔ میرے ساتھ سمندر پر بیٹھ کر مچھلی اڑاتے رہے اور مجھے ہوا بھی نہیں لگنے دی کہ پس پردہ کیا ڈراما چل رہا تھا۔ اب تو مجھے بتادو اس مگرمچھ کو کہاں رکھا ہے اور وہ برقع پوش لڑکی کون تھی؟“

میں دل ہی دل میں شکر کررہا تھا کہ ان دنوں راحیلہ کراچی میں نہیں تھی۔ اگر رحیم گل یا گاڈ مدر اسے میرے پاس ہوٹل یا آفس وغیرہ میں دیکھ چکے ہوتے تو لازماً یہی سمجھتے کہ پیردانش کو لے جانے والی لڑکی اس کے سوا کوئی نہیں ہوسکتی تھی۔

”وہ شیطان کی خالہ تھی۔ اور تم چاہو تو شیطان اپنے آپ کو بھی سمجھ سکتے ہو۔“ میں نے کہا ”ویسے تمہیں یہ کہانی کس نے بتائی؟“

”گاڈ مدر نے اعلیٰ افسر کو سنائی ہوگی۔ اعلیٰ افسر نے مجھے سنائی۔“

”اب تم یہ کہانی مجھے مت سناؤ کیونکہ میں پہلے ہی اسے سن کر کافی بور ہوچکا ہوں۔“ میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ”اور اس سے پہلے کہ تم مزید کچھ قیاس آرائیاں کرو میں تمہیں بتادوں کہ میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ معلوم نہیں کیوں وہ ہتھنی کی بچی اس کا کریڈٹ.... یا پھر یوں کہو کہ ڈس کریڈٹ مجھے دینے پر تُلی ہوئی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے میں خواہ مخواہ ہی خوش ہورہا تھا کہ ہمارے یار نے کام دکھادیا۔“ وہ قدرے مایوسی سے بولا۔

”اگر میں ایسا کوئی کام دکھا دیتا تو پھر تم جیسے ہی قانون پسند دوستوں کی فرض شناسی کی رگ فوراً پھڑک اٹھتی۔ ہتھکڑی اٹھا کر مجھے گرفتار کرنے چل دیتے۔“

”ہاں اگر ایسی کوئی رپورٹ درج ہوتی تو پھر یہ تو کرنا پڑتا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔

”مجھے تو پہلے ہی تم سے یہی امید تھی۔ لعنت ہے تم پر۔“ میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

”کیا کریں بھئی۔ قانون تو قانون ہے نا۔“ اس نے گویا مجبوری ظاہر کی ”اب یہی دیکھ لو کہ اگر گاڈ مدر آج یا کل اعلیٰ حکام میں سے کسی سے سرچ وارنٹ جاری کرانے میں کامیاب ہوگئی تو اس کی تعمیل کے لئے اس کے ساتھ مجھے ہی آنا پڑے گا۔ تمہارے ہوٹل کی تلاشی مجھے ہی لینا پڑے گی۔“

”تم جیسے مارِ آستین سے دوستی رکھنے سے تو بہتر تھا کہ میں پیر دانش سے ہی دوستی رکھ لیتا۔ وہ کم از کم یاروں کا یار تو ہوگا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

”اپنی یہ حسرت اب پوری کرلینا۔ ابھی وہ کون سا مرگیا ہے۔ جلد یا بدیر بازیاب ہو ہی جائے گا۔ بلکہ عین ممکن ہے وہ خود ہی لوٹ آئے۔ تب جاکر اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہوجانا اور اس سے اپنی گزشتہ خطاؤں کی معافی مانگ لینا۔ تم جیسے آدمی کو تو وہ لپک کر سینے سے لگائے گا۔“ رحیم گل بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔

”ہاں اب یہی کرنا پڑے گا۔“ میں نے کہا ”اب اجازت ہو تو میں تھوڑا سا کام کرلوں۔ آج تم نے میرا پورا دن برباد کرادیا ہے۔“

”اوہو.... کام کی اتنی فکر کب سے ہوگئی تمہیں؟“ وہ استہزائیہ لہجے میں بولا ”تم تو کہا کرتے تھے تمہارا بزنس خودکار مشین کی طرح چلتا رہتا ہے۔“

”ہاں چلتا تو رہتا ہے پھر بھی اسٹیئرنگ وہیل کبھی کبھار کسی خاص سمت میں گھمانے کی ضرورت پیش آتی رہتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے۔ تم کام کرو مصروف آدمی!“ وہ طنزیہ لہجے میں بولا ”اسٹیئرنگ وہیل اِدھر اُدھر گھماؤ۔ ایک یار بربادؤ۔ میں تمہارا قیمتی وقت ضائع کرنے کی معافی چاہتا ہوں۔“

”خیر.... اتنا زیادہ شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔“ میں نے

ذرا مشفقانہ لہجے میں کہا ”تم جیسے دوست تو ہوتے ہی وقت ضائع کرنے کے لئے ہیں یا پھر ان کا مصرف شاید یہ ہوتا ہے کہ وہ کبھی کبھار گرفتاری اور تلاشی وغیرہ کی دھمکیاں دیتے ہیں۔“

”برخوردار! ڈرو اس وقت سے۔ جب ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانے کی نوبت آئے گی۔“ وہ بولا ”اچھا خدا حافظ۔“

میں نے ریسیور رکھ کر ایک طویل انگڑائی لی اور جسم ڈھیلا چھوڑ کر ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگالی۔ میں پیردانش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ اس وقت کہاں ہوسکتا تھا؟ میں نے آنکھیں بند کرلیں اور ایک لمحے کے لئے سوچا، کاش میں جادوگر ہوتا یا پھر ایسی روحانی قوتوں کا مالک ہوتا کہ آنکھیں بند کرکے دیکھ سکتا پیردانش اس وقت کہاں تھا اور کیا کررہا تھا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے خواہشوں اور خوابوں کی ان بھول بھلیوں سے نکال لیا۔ گھنٹی میرے عام ٹیلی فون کی بجی تھی۔ میری سیکریٹری امبر تو چھٹی کرکے جا چکی تھی۔ ہوٹل کے ٹیلی فون بورڈ پر موجود آپریٹر نے مجھے بتایا ”ایک خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔“

”کون ہیں، کہاں سے بول رہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”سر! انہوں نے صرف اپنا نام غزالہ بتایا ہے اور کچھ نہیں بتارہیں۔ وہ آپ سے کوئی بہت ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔“ آپریٹر نے بتایا۔

”اچھا ملاؤ۔“ میں نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا، جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا میں غزالہ نام کی کسی خاتون سے واقف نہیں تھا۔ کہیں کبھی کوئی سرسری ملاقات ہوئی ہو تو میں نہیں کہہ سکتا تھا۔

لائن ملی اور دوسری طرف سے ایک کھنکتی ہوئی سی ”ہیلو“ سنائی دی پھر پوچھا گیا ”آپ افضل بول رہے ہیں نا؟“

میری ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی کیونکہ میں نے اس آواز کو پہچان لیا تھا۔ یہ اسی برقع پوش لڑکی کی آواز تھی جس نے آج ایک بہت بڑا معمّا تخلیق کردیا تھا۔ ایک لمحے کے لئے میں کچھ بھی نہ بول سکا۔

”آپ بول کیوں نہیں رہے۔ خاموش کیوں ہوگئے؟“ پھر جواب کا انتظار کئے بغیر وہ خود ہی بولی ”شاید آپ نے میری آواز پہچان لی ہے؟“

”ہاں“ میں نے آہستگی سے مختصر جواب دیا۔

”تو پھر کیا آپ مجھ سے بات کرنا نہیں چاہتے؟“ اس کے لہجے میں گویا صدیوں کی تھکن تھی مگر وہ شاید شگفتگی کا اظہار کرنے کی پوری پوری کوشش کررہی تھی۔

”کیوں نہیں۔“ میں نے سنبھلتے ہوئے کہا ”تم سے بات کرنے کی آرزو میں تو شاید میں مرا جارہا تھا۔ دراصل مجھے یقین نہیں آرہا کہ کبھی کبھی کوئی آرزو اتنی جلدی بھی پوری ہوسکتی ہے۔“

”اوہ....“ وہ جیسے کچھ طمانیت سے ہنسی ”آپ کی آرزو شاید اس سے بھی جلد پوری ہوجاتی لیکن بس.... کسی وجہ سے مجھے ذرا دیر ہوگئی۔“

وہ خاموش ہوگئی گویا اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ مزید کیا بولے۔ یہ خاموشی بڑی عجیب تھی۔ اس کے پیچھے ایک بے عنوان سا تناؤ تھا۔ آخر میں نے گویا تمہید اور گھماؤ پھراؤ کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہا ”پیردانش کہاں ہے؟“

وہ دھیرے سے ہنسی ”آپ سوال پوچھنے میں زیادہ تاخیر کرنے کے قائل معلوم نہیں ہوتے۔“

”اس کی ماں اس کی تلاش میں دیوانی ہورہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”آپ کو اس کی ماں سے ہمدردی ہے کیا؟“ اس نے پوچھا۔

”خدا نہ کرے کہ مجھے ایسے لوگوں سے ہمدردی ہونے لگے۔ میں تو ویسے ہی تمہاری معلومات کے لئے بتا رہا ہوں۔“ میں نے ملامت سے کہا۔

”مجھے اپنی معلومات میں اس اضافے کی ضرورت نہیں۔ مجھے بخوبی اندازہ ہے کہ اس کی ماں اس کی تلاش میں دیوانی ہورہی ہوگی۔ عین ممکن ہے وہ پاگل کُتیا کی طرح لوگوں کو کاٹنے بھی لگے لیکن افضل صاحب....!“ اس نے ایک لمحے کے لئے خاموش ہوکر ٹھنڈی سانس لی ”یہ کوئی نیا واقعہ نہیں ہے۔ اسی شہر میں گزشتہ چند برسوں میں بہت سے گھروں میں ایسی مائیں موجود تھیں بلکہ اب بھی ہوں گی جو اپنے بچے یا بچی کی تلاش میں دیوانی ہورہی تھیں۔ ان کے بارے میں صرف پیردانش ہی بتا سکتا تھا کہ وہ کہاں ہیں لیکن کسی نے اس سے نہیں پوچھا۔“

”اوہ....!“ میں نے گہری سانس لی ”تم نے اس سے کوئی پرانا حساب بے باق کرنے کے لئے اسے اغوا کیا ہے؟“

”اغوا....؟“ وہ اس بار ذرا زیادہ زوردار انداز میں ہنسی ”آپ بھی بڑی عجیب باتیں کرتے ہیں افضل صاحب! میری بھلا کیا مجال کہ میں پیردانش کو اغوا کرسکوں! میں ایک نازک، کمزور اور لاوارث سی لڑکی ہوں۔ میں تو اس طرح کی کسی شخصیت کو اغوا کرنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی۔“

”مجھے پتا چلا ہے کہ کورٹ سے وہ تمہارے ساتھ گیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”وہ اپنی خوشی سے...... بڑے آرام و اطمینان سے.... اور کافی حد تک رازدارانہ سے انداز میں میرے ساتھ روانہ ہوا تھا۔ اسے اغوا کرنا تو نہیں کہا جاسکتا نا....!“ وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں، سمجھانے کے سے انداز میں بولی۔

”ٹھیک ہے میں تم سے ٹیکنیکل بحث میں نہیں الجھتا۔“ میں نے جلدی سے کہا ”پیردانش اس وقت کہاں ہے؟“

”کیا آپ کو یہ جاننے میں دلچسپی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”بہت زیادہ۔“ میں نے جواب دیا۔

"مجھے یہی امید تھی۔ اسی لئے میں نے آپ کو فون کیا ہے۔ مجھے معلوم تھا پیر دانش کے بارے میں جاننے کے لئے دو ہستیاں سب سے زیادہ بے تاب ہوں گی۔ ایک اس کی ماں.... دوسرے آپ... لیکن دونوں کی دلچسپی کی بنیاد اور نوعیت میں زمین آسمان کا فرق ہوگا۔" اس نے ایک گہری سانس لی "لیکن یہ بات میں آپ کو فون پر نہیں بتا سکتی کہ پیر دانش کہاں ہے۔"

"تو پھر کیسے بتاؤ گی؟" میں نے پوچھا۔

"یہ خاصی اہم بات ہے۔ اسے جاننے کے لئے آپ کو تھوڑی سی تکلیف اٹھانی پڑے گی۔" وہ شیریں لہجے میں بولی "میں آپ کو ایک ایڈریس لکھواتی ہوں اس پر تشریف لے آیئے۔ بہت آسان سا پتا ہے۔ آپ کو یہاں پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔ میں راستہ بھی سمجھادوں گی۔ اگر آپ دلچسپی محسوس کریں تو میں بتاؤں؟"

"ضرور ضرور۔" میں نے جلدی سے کہا اور ایک پین سنبھال کر نوٹ پیڈ اپنی طرف کھسکایا۔

اس نے جو ایڈریس لکھوایا وہ ڈیفنس کا تھا۔ اس نے راستوں اور مطلوبہ بنگلے وغیرہ کی چند نشانیاں بھی بتادیں پھر بولی "لیکن ایک شرط ہے کہ آپ بالکل اکیلے آئیں گے۔ کوئی پولیس والا.... کوئی گارڈ۔ کوئی دوست.... کوئی اجنبی آپ کے ساتھ نہیں ہونا چاہئے۔"

میں ہنس دیا۔ وہ فوراً بولی "اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟" میں چشم تصور سے دیکھ سکتا تھا کہ اس کی تیوری چڑھ گئی تھی۔

"بس یونہی ذرا ہنسی آگئی تھی۔ میں بڑا خوش مزاج آدمی ہوں اکثر ہنستا مسکراتا رہتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

"ہاں بعض لوگ خوش مزاجی افورڈ کرسکتے ہیں۔ ان کے حالات اس قابل ہوتے ہیں۔" اس کے لہجے میں ایک عجیب سی تلخی تھی۔

مجھے ہنسی صرف اس لئے آئی تھی کہ فی الحال مجھے یہی محسوس ہو رہا تھا' یہ کوئی جال تھا اور لڑکی نے بڑی معصومیت سے فرض کرلیا تھا کہ اس کے بلاوے پر میں اکیلا چلا آؤں گا۔ تاہم فی الحال اس کی ہریات پر ہاں کہتے رہنا ہی بہتر تھا۔ مجھے اس معاملے کی تہ تک پہنچنا تھا۔

"تو پھر آرہے ہیں آپ؟" قدرے توقف سے اس نے پوچھا۔

"یقیناً۔" میں نے جواب دیا۔

"ایک بار پھر واضح کردوں کہ اس بنگلے میں آپ صرف اکیلے داخل ہوسکیں گے۔ اگر آپ کے ساتھ کوئی ہوا تو گیٹ نہیں کھلے گا۔ آپ پیر دانش کے بارے میں جاننے سے محروم رہ جائیں گے۔" اس نے کہا اور یکدم ہی سلسلہ منقطع کردیا۔

میں نے دھیرے سے ریسیور رکھا اور شفیع شاہ کی طرف دیکھا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا تھا اور منتظر نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ کوئی اہم ٹیلی فون کال تھی۔

"معما حل ہوتا دکھائی دے رہا ہے شفیع شاہ!" میں نے ٹائی کی گرہ درست کرتے ہوئے کہا "میرا خیال ہے پیر دانش کا عدالت سے غائب ہونا۔ اس برقع پوش لڑکی کا نمودار ہونا.... گاڈمدر کا چیختے چنگھاڑتے مجھے فون کرنا... ہوٹل کی تلاشی پر اصرار کرنا۔ سرچ وارنٹ کے لئے حکام سے رابطہ کرنا۔ یہ سب ایک ڈراما ہے۔ شاید انہیں یقین ہوگیا ہے کہ میں اس ڈرامے سے متاثر ہو چلا ہوں۔ اب وہ اس کا ڈراپ سین کرنا چاہتے ہیں۔"

"ڈراپ سین آپ کے خیال میں کیا ہوسکتا ہے؟" شفیع شاہ نے دریافت کیا۔

"ظاہر ہے مجھے مروانا ہی اس ڈرامے کا کلائمکس ہوسکتا ہے۔" میں نے جواب دیا "پیر دانش اپنے دشمنوں سے حساب برابر کرنے کے معاملے میں کچھ زیادہ ہی بے صبرا معلوم ہوتا ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ وہ مجھے ایسے طریقے سے مروانا چاہتا ہے کہ الزام اس پر نہ آسکے۔ یا کم از کم ثابت نہ کیا جاسکے۔" پھر میں نے شفیع شاہ کو چند لمحے پہلے موصول ہونے والی ٹیلی فون کال کے بارے میں بتایا۔

"آپ اس بلاوے پر جائیں گے؟" شفیع شاہ نے پوچھا۔

"یقیناً" میں نے جواب دیا۔

"اگر آپ کا خیال ہے کہ یہ آپ کے لئے جال بچھایا جارہا ہے تو آپ اس بلاوے کو نظرانداز بھی کرسکتے ہیں۔" شفیع شاہ محتاط لہجے میں بولا۔ اس نے زور دے کر یہ بات نہیں کہی تھی۔

"کم از کم تم تو ایسا مت کہو شفیع شاہ!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "تم میرے شیر جوان ساتھیوں میں سے ایک ہو۔"

"میں نے کوئی بزدلی والی بات تو نہیں کی سر!" وہ بھی جواباً مسکرایا "اسے تو محض فضول قسم کے لوگوں کو نظرانداز کرنا کہا جاسکتا ہے۔"

"میں پیر دانش کو بتانا چاہتا ہوں کہ اس کے جال وغیرہ ہمارے لئے بچکانہ چیزیں ہیں اور ہم اس قسم کے جال میں داخل ہونے کے بعد بھی اسے مکڑی کے جالے کی طرح توڑ کر نکل سکتے ہیں۔" میں نے بات کرتے کرتے جیب سے اپنی لوڈڈ گن نکال کر چیک کرتے ہوئے کہا "اس کے علاوہ یہ برقع پوش لڑکی اپنے آپ کو میری نظر میں مسٹری بنانے میں کامیاب رہی ہے۔ میں اس کے بارے میں تجسس میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ دیکھنا چاہتا ہوں یہ کون ہے کیا چیز ہے؟ کس کس انداز میں پیر دانش کے کام آتی ہے۔"

گن دوبارہ جیب میں رکھ کر میں نے اٹھتے ہوئے گہری سانس لے کر کہا "اس کے علاوہ بھی ایک بات ہے۔ جو شاید سب سے زیادہ اہم ہے۔"

"وہ کیا سر؟" اس نے بھی اٹھتے ہوئے پوچھا۔

"وہ یہ کہ میرے تمام اندازے غلط بھی ہوسکتے ہیں۔" میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا "اور یہی بات سب سے زیادہ اہم ہے۔ میرے اندازے صحیح ہیں یا غلط....؟ یہی جاننے کے لئے ہمارا وہاں جانا سب سے زیادہ اہم ہے۔"

"بات تو ٹھیک ہے۔" شفیع شاہ نے سر ہلایا۔

"تم دو تین آدمیوں کے ساتھ حسب معمول میرے آس پاس رہو گے۔" میں نے ہدایت کی "میں کوشش کروں گا کہ اگر ذرا بھی کوئی ایسی ہنگامی صورت حال ہوئی جو مجھے اپنے قابو سے باہر نظر آئی تو میں کم از کم ایک فائر ضرور کرسکوں۔ گولی کی آواز سنتے ہی تم میں سے کوئی نہ کسی راستے سے اس گھر میں کود آنا ہے۔ کسی راستے سے کسی کو مار کر بھی گھسنا پڑے تو گھس پڑنا۔ پروا مت کرنا کہ کون تمہارے ہاتھوں مر رہا ہے۔"

چند لمحے بعد ہم ہوٹل سے روانہ ہو چکے تھے۔ شفیع شاہ نے اپنی اور میری گاڑی کے درمیان مناسب فاصلہ رکھا تھا۔ ان دنوں عملی طور پر وہ سائے کی طرح میرے ساتھ تھا۔ لیکن ایسا سایہ جو ذرا فاصلے پر چلتا تھا اور اس وقت تک اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا جب تک اشد ضرورت نہ آن پڑتی۔

ہم نے بہت تیز رفتاری سے فاصلہ طے کیا اور یہ محض اتفاق یا شاید میری خوش قسمتی تھی کہ میں کسی سے پوچھے بغیر مطلوبہ بنگلا تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا حالانکہ وہ ڈیفنس کے ایک خاصے بے ہودہ حصے میں واقع تھا۔ بے ہودہ اس لحاظ سے... کہ وہ فیز پوری طرح آباد نہیں تھا۔ اس میں کافی پلاٹ خالی تھے جس کی وجہ سے ویرانی کا احساس زیادہ تھا جبکہ ڈیفنس کے تو اچھے بھلے آباد علاقوں میں بھی رات کو ویرانی کا احساس ہوتا تھا۔

جس بنگلے کا ایڈریس اس لڑکی نے مجھے لکھوایا تھا وہ زیادہ لمبا چوڑا نہیں تھا لیکن نہایت خوب صورت' شاندار اور نیا تھا۔ اس کا ڈیزائن بہت عمدہ تھا اور اسے باہر ہی سے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی تعمیر میں ہر چیز بہت مہنگی استعمال کی گئی تھی۔ اس پر کوئی نیم پلیٹ نہیں تھی۔ صرف اس کے گیٹ کے ایک پیلر پر روشن خانہ موجود تھا جس میں شیشے پر گھر کا نمبر وغیرہ دکھائی دے رہا تھا۔

بنگلا دو منزلہ تھا۔ صرف اوپر کی منزل پر کھڑکیوں میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ نیچے کی منزل مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی حتیٰ کہ پورچ میں بھی روشنی نہیں تھی۔ البتہ گیٹ کی پیشانی پر ایک تیز لائٹ اس طرح لگی ہوئی تھی کہ گیٹ کے سامنے کھڑا ہونے والا روشنی میں نہا جاتا۔

میں نے گاڑی گیٹ سے کچھ آگے لے جاکر روکی اور پیدل گیٹ تک واپس آیا۔ میرا ہاتھ جیب میں گن کے دستے پر تھا۔ دوسرے ہاتھ سے میں نے کال بیل کا بٹن دبایا اور ایک طرف کو ہٹ گیا۔

"کون؟" پیلر میں نصب انٹرکام پر آواز ابھری۔ یہ اسی لڑکی کی آواز معلوم ہوتی تھی۔

"افضل" میں نے ذرا ہچکچاہٹ سے جواب دیا۔

"ذرا گیٹ کے سامنے آیئے۔" اس نے ہدایت کی اور میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ تاہم میں نے اس کی ہدایت پر عمل کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی۔ میں سمجھ گیا کہ گیٹ میں کوئی الیکٹرانک آئی نصب تھی۔ وہ شاید اوپر کی منزل پر موجود تھی اور کسی مانیٹر کی اسکرین پر مجھے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ کم از کم گیٹ پر تو میں تنہا ہی تھا۔

میں گیٹ کے عین سامنے تیز روشنی میں آگیا۔ مجھے یہ بھی نظر آگیا کہ الیکٹرانک آئی کہاں نصب تھی۔ وہ گیٹ کے بالائی حصے میں تالے کے ڈیزائن میں مخفی تھی۔

چند لمحے بعد کلک کی آواز کے ساتھ تالا کھلا جو درحقیقت گیٹ کے وسط میں تھا پھر خود کار گیٹ آہستگی سے صرف اتنا کھل گیا کہ ایک ہی فرد داخل ہوسکتا تھا۔ میں نے اس بلی کی طرح چوکنے انداز میں اندر قدم رکھا جو ذرا سا کھٹکا سنتے ہی اچھل کر کسی درخت پر چڑھنے کے لئے تیار تھی۔ گن اب میرے ہاتھ میں تھی۔ میں کسی بھی غیر متوقع قسم کے استقبال کے لئے تیار تھا۔

اندر گھپ اندھیرے نے میرا استقبال کیا۔ اس اندھیرے کی آغوش سے نامعلوم لوگ نکل کر مجھ پر حملہ آور نہیں ہوئے تاہم یہ امکان موجود تھا کہ کسی کونے کھدرے سے کوئی گولی آتی اور میرا لہو چاٹ جاتی۔ یہ خطرہ مجھے بہرحال مول لینا تھا۔ یہ جوا کھیلے بغیر بات نہیں بنتی تھی۔

اچانک کشادہ پورچ میں بڑی سی ایک روف لائٹ خود بخود روشن ہوگئی اور کافی دور تک کا منظر صاف دکھائی دینے لگا۔ میرے تنے ہوئے اعصاب ذرا ڈھیلے پڑگئے۔ کم از کم ظاہری طور پر آس پاس کوئی خطرہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ دائیں طرف ایک گیسٹ ہاؤس موجود تھا لیکن اس کا دروازہ بند نظر آرہا تھا۔ میں نے گن سیدھی رکھتے ہوئے دیوار سے لگ کر بائیں ہاتھ سے اسے کھولنے کی کوشش کی تو پتا چلا کہ وہ مقفل تھا۔

"اس دروازے پر زور آزمائی کی ضرورت نہیں۔" اچانک قریب ہی سے آواز ابھری اور میں نے تیزی سے گھومتے ہوئے گن کا رخ ادھر کیا حالانکہ آواز میں نے فوراً پہچان لی تھی۔ یہ اسی لڑکی کی آواز تھی لیکن میری وہ حرکت اضطراری تھی۔

برآمدے میں نظر آنے والا محرابی دروازہ بے آواز طریقے سے کھل چکا تھا اور وہ دروازے میں کھڑی تھی۔ وہ شب خوابی کے مہین سفید لبادے میں تھی جس سے اس کے جسم کی چاندنی چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ اس کے سیاہ چمکیلے اور ریشمی بال کندھوں پر پھیلے ہوئے تھے۔

وہ کسی حد تک مختصر الوجود اور سراپا نزاکت تھی۔ اس مختصر وجود میں بڑی قیامتیں پنہاں معلوم ہوتی تھیں۔ میں نے جب اسے سراپا سیاہ پوشی کی حالت میں دیکھا تھا تو ٹھیک ہی محسوس کیا تھا کہ

اس سیاہی کے پردے میں حسن کی چاندنی مستور تھی۔

وہ بلاشبہ بہت خوب صورت تھی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت مجھے اس کے چہرے پر زندگی کی وہ تب و تاب مفقود نظر آئی جو اس نوعمری اور نوخیزی میں موجود ہونی چاہئے تھی۔ سر پر سیاہ زلفوں کا سایہ نہ ہوتا تو وہ سر سے پاؤں تک روئی کے گالے جیسی دکھائی دیتی۔ فلموں والے چاہتے تو کچھ اسپیشل ایفیکٹس وغیرہ دے کر اس وقت کسی سین میں اس سے ایک خوب صورت روح کا کام لے سکتے تھے۔

میرا ایک ہاتھ دروازے کی ناب پر تھا۔ دوسرے میں گن تھی جس کا رخ اس کی طرف تھا اور میری کمر دیوار سے لگی ہوئی تھی۔ چند سیکنڈ کے لئے وقت شاید وہیں رک گیا تھا۔ وہ بھی ایک ٹک میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے میری صورت ذہن میں نقش کرلینا چاہتی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں دلچسپی نہیں، افسردگی تھی۔ وہ ننگے پاؤں تھی۔

اسی ٹھہری ٹھہری آواز میں وہ بولی "اس دروازے کو چھوڑ دیں۔ وہاں جو گارڈ موجود ہوتے ہیں وہ اس وقت اندر ہی بے ہوش پڑے ہیں۔"

میں نے اس کی ہدایت پر ایک معمول کی طرح ہاتھ ناب سے ہٹالیا تو وہ بولی "یہ گن بھی جیب میں رکھ لیں۔ یہاں آپ کو اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔"

میں نے اس کے اس حکم کی تعمیل نہیں کی۔ البتہ گن نیچے کرلی۔ وہ گھومتے ہوئے بولی "میرے پیچھے آجایئے۔"

میں برآمدے کی سیڑھیاں چڑھ کر اس دروازے سے اندر پہنچا۔ وہ ایک آراستہ و پیراستہ ہال تھا جہاں روشنی بہت کم تھی۔ دروازے کے پاس سے ہی سیڑھیاں اوپر جارہی تھیں۔ وال ٹو وال کارپٹ کی وجہ سے وہ بالکل ہی بے آواز قدموں سے چل رہی تھی۔ ویسے بھی وہ ننگے پاؤں تھی اور اس کا وجود جیسا سبک نظر آرہا تھا اس کی وجہ سے شاید ویسے بھی اس کے قدموں کی آہٹ نہ ہوتی۔ اس کے پیچھے چلنا ایک نہایت صبر آزما کام تھا۔ اچھا ہی تھا کہ اس وقت میرا ذہن دوسری بہت سی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔

وہ بہت آہستگی سے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ وہ جیسے بہت تھکی ہوئی تھی یا پھر اسے نیند کی کمی محسوس ہورہی تھی۔

"اچھا تو تمہارا نام غزالہ ہے.....!" میں نے اب بھی گردوپیش سے محتاط رہتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" اس نے مڑ کر دیکھے بغیر جواب دیا "بہت عام سا نام ہے۔ اس کو سننے کے بعد آپ بات آگے بڑھانے کی غرض سے یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ بڑا خوب صورت نام ہے۔"

اداسی اور تھکن اس کے چہرے پر ہی نہیں، اس کے لہجے میں بھی تھی۔ اس عمر، اس سراپا اور اس خوب صورت گھر میں موجودگی کے باوجود یہ اداسی کچھ عجیب لگ رہی تھی۔

میں نے دھیمے لہجے میں کہا "تمہیں خوب صورت نام کی کیا ضرورت ہے۔ تم خود خوب صورت ہو۔ ویسے غزالہ بھی کچھ کم خوب صورت نام نہیں ہے۔ اس میں شعریت اور نغمگی ہے۔"

تب اس نے اچانک ہی رک کر پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ مجھے بھی رکنا پڑا۔ اس کا ایک پاؤں نچلی سیڑھی پر تھا اور ایک اس سے اگلی سیڑھی پر..... اس کے چاندنی جیسے وجود سے پھوٹتی ہوئی خوشبو انسان کے حواس کو دھندلا دینے کے لئے کافی تھی لیکن اس وقت میں اپنا ذہن کہیں اور رکھنے کی کوشش کررہا تھا۔

"کیا میں واقعی بہت خوب صورت ہوں؟" اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

"کیا تمہیں یہ بات ابھی تک کسی نے نہیں بتائی؟" میں نے جاننا چاہا۔

"بتائی تو ہے۔" وہ افسردگی سے مسکرائی "بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ انہی چند الفاظ کے طلسم نے ہی مجھے برباد کیا ہے لیکن میرا خیال تھا کہ کچھ عرصے سے شاید میں کسی چڑیل سے بھی زیادہ بدصورت ہوگئی ہوں۔"

اس کی اس چھوٹی سی بات کے پیچھے یقیناً ایک بڑی کہانی تھی۔ وہ دوبارہ سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ہم ایک سن ٹیرس پر جا پہنچے۔ اس نے ایک دروازہ کھولا اور ہم ایک ہال سے گزرنے لگے۔ ہر قدم پر جیسے مجھے اندیشہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی موڑ سے اچانک بہت سے آدمی آٹومیٹک گنوں کے ساتھ نکلیں گے۔ گولیوں کی بوچھار ہوگی اور میرا خون اگلتا جسم قالین پر ڈھیر ہوجائے گا۔ یہ اندیشہ شاید میں خود ہی زبردستی اپنے ذہن میں پیدا کرنے کی کوشش کررہا تھا ورنہ حقیقت یہ تھی کہ میری نامعلوم حسیات مجھے بتارہی تھیں کہ یہ خوب صورت اور آراستہ و پیراستہ مکان اس وقت کسی قدیم کھنڈر کی طرح ویران تھا۔

وہ مڑ کر میری طرف دیکھے بغیر بولی "میں نے آپ سے کہا تھا کہ گن جیب میں رکھ لیجئے۔ یہاں آپ کو اس کی ضرورت نہیں پڑے گی لیکن شاید آپ کو میری بات کا اعتبار نہیں آیا۔ ٹھیک ہی ہے پہلی ملاقات میں کسی کی بات کا اعتبار کرنا بھی نہیں چاہئے۔"

میں اس وقت بھی گن ہاتھ میں لئے چل رہا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا "تم اس وقت یہاں اکیلی ہو؟"

"تقریباً۔" اس نے جواب دیا۔

"تقریباً؟" میری گرفت گن کے دستے پر مزید سخت ہوگئی "مطلب؟"

"مطلب کو جانے دیجئے۔ آپ مجھے اس گھر میں اکیلا ہی سمجھئے۔" وہ ایک دروازے کے سامنے رکتے ہوئے بولی۔

وہ دروازہ کھول کر اندر چلی گئی اور دروازے کو ہاتھ سے پکڑ کر رک گئی کیونکہ اشارا اسے واپس لارہا تھا اور میں ہچکچاہٹ آمیز انداز میں باہر ہی رک گیا تھا۔

"آجایئے... آجایئے... یہاں کوئی آپ پر حملہ نہیں کرے گا۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولی۔

وہ ایک نہایت شاندار، طویل و عریض اور پرتعیش بیڈروم تھا۔ جہاں تک میں اسے دیکھ پارہا تھا وہ خالی ہی معلوم ہوتا تھا۔ میں اندر چلا گیا۔ اس نے دروازہ بند کیا اور بٹن دبا کر مقفل کردیا۔

بیڈروم کے وسط میں ایک بہت بڑے گول بیڈ پر گول اور اوپر سے مخروطی خیمے کے انداز میں ایک باریک جالی پھیلی ہوئی تھی۔ اس خوب صورت بیڈ پر ایک طرف کوئی نہایت خوب صورت اور چمکیلا سا کمبل سر سے پاؤں تک اوڑھے لیٹا تھا۔ اب میں نے گن جیب میں رکھ لی کیونکہ کمرے کا دروازہ مقفل ہوچکا تھا۔ بیڈ پر لیٹا ہوا شخص اگر ڈرامائی انداز میں اچانک کمبل پھینک کر اٹھ کھڑا ہوتا اور اس کے ہاتھ میں کوئی گن ہوتی تب بھی مجھے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اکیلا آدمی خواہ مسلح بھی ہوتا اس سے نمٹنا میرے لئے کوئی بڑا مسئلہ نہیں تھا۔

غزالہ کا نام ضروری نہیں تھا کہ غزالہ ہی ہوتا۔ تاہم میں نے سردست اس کا یہی نام دل ہی دل میں اصل تسلیم کرلیا تھا۔ اس نے ایک سائڈبورڈ سے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور بیڈ کی طرف اس کا رخ کرکے ایک بٹن دبایا۔ بیڈ پر پھیلا ہوا جالی کا بڑا سا گنبد سمٹ کر اوپر اٹھتا چلا گیا اور ایک جگہ گولے کی سی صورت اختیار کرگیا۔ اب بیڈ پر جانے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

کمرے کے ایک حصے میں نشست کا بھی انتظام تھا۔ گول گول گدیلے صوفوں کے درمیان شیشے کی خوب صورت تپائی پر وہسکی کی بوتل کھلی رکھی تھی جس کی تہ میں تھوڑی سی وہسکی باقی تھی۔ ایک گلاس سیدھا رکھا تھا۔ ایک لڑھکا ہوا تھا۔ کچھ دیگر لوازمات بھی تھے۔ فرنچ کرسٹل کی بڑی سی ایش ٹرے میں سگاروں کے ٹوٹے موجود تھے۔ اس کے کنارے پر ایک سگار سالم بھی رکھا تھا۔ کمرے میں سگار، وہسکی، کلون، ائر ریفریشنر، ان سب چیزوں کی خوشبوئیں گڈمڈ تھیں۔ اس کے باوجود میں سگار کی مخصوص مہک پہچان سکتا تھا۔ یہ پیردانش کا برانڈ تھا۔

میں کوشش کررہا تھا کہ میرے دل کی دھڑکنیں تیز نہ ہونے پائیں۔ میں نے غزالہ کی طرف دیکھا۔ وہ ایک مجسمے کی طرح ساکت کھڑی میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔

"اس کمبل کے نیچے پیردانش ہے؟" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں" اس نے جواب دیا۔ اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آرہی تھی۔

"آپ کو اس کی تلاش تھی نا۔ میں نے آپ کو بہت ساری محنتوں سے بچالیا ہے۔ آپ کی خدمت میں پیردانش.....!" اس نے ڈرامائی سے انداز میں ذرا جھک کر بیڈ کی طرف بازو پھیلایا "اب آپ اسے لے جاسکتے ہیں۔"

"تم نے اسے ڈرنکس میں کچھ ملا کر پلایا ہے۔ یا یہ ویسے ہی نشے میں دھت پڑا ہے؟" میں نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

"آپ خود کمبل اٹھا کر دیکھ لیں۔ آپ کو اندازہ ہوجائے گا۔" وہ بولی۔

میں دھیرے دھیرے اس طرح قدم اٹھاتا آگے بڑھا کہ غزالہ پر بھی نظر رکھ سکوں۔ وہ میرے انداز سے میرا مقصد سمجھ گئی۔ عجیب سے انداز میں ہنسی اور بولی "آپ بہت ہی زیادہ محتاط آدمی ہیں۔"

"جہاں معاملہ پیردانش کا ہو وہاں محتاط ہی رہنا چاہئے" میں نے کہا۔

"ہاں یہ آپ نے بالکل ٹھیک کہا۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا "لیکن مجھے یہ بات بہت تاخیر سے بتائی جارہی ہے۔"

کمبل اٹھاتے وقت بھی میں ہر ردعمل کے لئے تیار تھا۔ گو کہ میرا دل کہہ رہا تھا کچھ بھی نہیں ہوگا لیکن میں اپنے آپ کو یقین دلانے کی کوشش کررہا تھا کہ کمبل اٹھاتے ہی گولی میری پیشانی میں پیوست ہوسکتی تھی یا خنجر میرے سینے میں اتر سکتا تھا۔ میں اپنے آپ کو یہ بھی بتارہا تھا کہ ضروری نہیں کمبل کے نیچے پیردانش ہی موجود ہو۔ وہ کوئی انتہائی ماہر و مشاق قاتل یا کمانڈو بھی ہوسکتا تھا۔

ایک ہاتھ سے میں نے کمبل اٹھایا۔ میرا دوسرا ہاتھ کسی حد تک فضا میں بلند تھا اور بجلی کی طرح حرکت کرنے کے لئے تیار تھا لیکن مجھے اس کو حرکت دینے کی ضرورت نہیں پڑی۔ غزالہ مجھے دھوکا نہیں دے رہی تھی۔ کمبل کے نیچے پیردانش ہی موجود تھا۔ گو کہ اس کی شکل کافی بدلی بدلی سی لگ رہی تھی لیکن اس کے پیردانش ہونے میں بہرحال کوئی شک نہیں تھا۔

اس کی رنگت پہلے ہی گہری سانولی تھی لیکن اس وقت اس کا چہرہ بالکل ہی نیلا اور متورم سا نظر آرہا تھا۔ اس کی پیشانی سے خون کی ایک پتلی سی لکیر اس کی بائیں آنکھ کی طرف آرہی تھی اور بند آنکھ پر کچھ خون جمع ہوکر خشک ہوچکا تھا۔ اس عنابی خون نے اس کی آنکھ کو ڈھانپ لیا تھا۔

پیشانی سے خون کی لکیر اس لئے برآمد ہوئی تھی کہ وہاں ایک کیل پیوست تھی۔ وہ کیل پوری کی پوری پیشانی میں پیوست تھی۔ صرف اس کا سرا باہر تھا اور سر کو دیکھ کر اندازہ ہورہا تھا کہ وہ کم از کم ایک بالشت لمبی تھی۔ میں نے زندگی میں بڑے بڑے ہولناک نظارے دیکھے تھے لیکن نہ جانے کیوں اس خاموش نظارے نے میری ریڑھ کی ہڈی میں سردی سی لہر دوڑا دی۔

ایک لمحے کے لئے شاید میں سانس لینا بھی بھول گیا تھا۔ اس لمحے شاید کمرے میں ایسا سکوت تھا کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنی جاسکتی تھی۔ مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنی بڑی اور اتنی ہنگامہ خیز کہانی اتنی خاموشی سے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ پیردانش کے انجام کو پہنچنے تک نہ جانے کتنی قتل و غارت ہوگی، کتنے

بے گناہوں اور گناہ گاروں کا خون بہے گا اور نہ جانے کتنا وقت لگے گا لیکن جب کہانی انجام کو پہنچنے پر آئی تھی تو یکدم ہی پہنچ گئی تھی اور شاید بڑی خاموشی سے پہنچ گئی تھی۔ کم از کم بیڈ روم کی حالت تو یہی بتا رہی تھی کہ وہاں کوئی ایسا خاص ہنگامہ برپا نہیں ہوا تھا۔

میں نے آہستگی سے پیردانش کا چہرہ دوبارہ کمبل سے ڈھانپ دیا۔ میری آنکھوں کے سامنے سے گویا ایک بھیانک منظر ہٹ گیا۔ میں آہستگی سے ہی لڑکی کی طرف گھوما۔ وہ تھکے تھکے سے انداز میں پھولے پھولے صوفے میں دھنسی ہوئی تھی۔

"یہ کس نے کیا ہے؟" میں نے پیردانش کی طرف اشارہ کیا "میرا مطلب ہے۔ اس کی پیشانی میں کیل کس نے ٹھونکی ہے؟"

"کیا آپ کو یہاں میرے علاوہ کوئی اور نظر آرہا ہے؟" اس نے نیم وا آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"تم نے......؟ یہ کیل تم نے ٹھونکی ہے؟" میں نے بے یقینی سے کہا۔

انسانی کھوپڑی کی ہڈی بہت سخت ہوتی ہے شاید اس لئے کہ اس میں حضرت انسان کا دماغ بند ہوتا ہے جو سارے جسم کا بادشاہ ہے اور انسان کے سارے افعال و اعمال کو کنٹرول کرتا ہے۔ قدرت نے اس کی حفاظت کا زبردست بندوبست کیا ہے۔ یہ آسانی سے نہیں ٹوٹتی اور میرا خیال تھا کہ اس میں کیل جیسی نوکیلی چیز گاڑنا بھی کچھ اتنا آسان نہیں تھا۔ میرے اندازے کے مطابق‘ جس کسی نے بھی یہ کام انجام دیا تھا اسے کوئی ایسا موقع تو میسر نہیں رہا ہوگا کہ وہ آرام سے بیٹھا ہتھوڑی بار بار مار کر کیل ٹھونکتا رہا ہو اور دھیرے دھیرے اسے کھوپڑی میں اتارتا رہا ہو۔ اس نے یقیناً ایک ہی ضرب میں یہ کام انجام دیا تھا۔

"کیوں..... کیا میں یہ کیل نہیں ٹھونک سکتی تھی؟" اس نے میری بے یقینی کو محسوس کرتے ہوئے تیکھی نظروں سے میری طرف دیکھ کر پوچھا۔

"یہ یقیناً ایک ہی ضرب میں ٹھونکی گئی ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں آپ کا اندازہ صحیح ہے۔ لگتا ہے آپ کو بھی اس کام کا تجربہ ہے۔" اس کے افسردہ چہرے پر مسکراہٹ کی رمق ابھری۔

"یہ تجربے کی نہیں‘ کامن سینس کی بات ہے۔" میں نے کہا "مجھے تمہارے دعوے پر یقین نہیں آرہا۔ تم ایک نازک اندام اور کمزور لڑکی ہو۔ تم یہ کام نہیں کرسکتی تھیں۔ تم میں اتنی طاقت نہیں ہے۔"

"یہ میری نہیں انتقام کی طاقت تھی۔" وہ نہایت ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔ وہ پلک جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی دھندلائی دھندلائی سی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے بجلی کوندی تھی۔ اس کی نظر..... اور اس کے ان الفاظ نے میری روح کو جھنجھنا دیا۔

اس نے سیاہ شیشے کی تپائی تلے ہاتھ ڈالا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں اسٹیل کا ایک بڑا سا ہتھوڑا تھا۔ ہتھوڑا مجھے دکھاتے وہ بولی "اس سے میں نے یہ کیل اس کی کھوپڑی میں اتاری ہے۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ اس وقت وہ نشے میں دھت... اور تقریباً بے ہوش تھا اس لئے وہ زیادہ تکلیف محسوس نہیں کرسکا ہوگا۔ جبکہ میری خواہش تھی وہ زندگی میں کم از کم یہ ایک اذیت تو محسوس کرلیتا لیکن ظاہر تھا کہ میں اس کے جاگتے اور ہوش و حواس میں ہوتے ہوئے تو یہ کام نہیں کرسکتی تھی۔" اس نے ہتھوڑا آہستگی سے تپائی پر رکھ دیا۔

میں جیسے خواب کے سے عالم میں دھیرے دھیرے چلتا ہوا واپس آیا اور اس کے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ اچانک ہی میں نے خود کو بھی کچھ تھکا تھکا سا محسوس کیا تھا حالانکہ میں شاذ و نادر ہی تھکن محسوس کرتا تھا۔ شاید اس وقت اس گھر کے در و دیوار پر اور یہاں کی فضا میں تھکن کا بسیرا تھا۔ یہ تھکن مجھ پر بھی نہ جانے کس طرح حملہ آور ہوگئی تھی۔ مجھے تو اس وقت خوش اور تازہ دم ہونا چاہئے تھا۔ میرے من کی مراد پوری ہوگئی تھی۔ مجھے کچھ زیادہ پریشانی نہیں اٹھانی پڑی تھی اور پیردانش اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں میں ویسا محسوس نہیں کررہا تھا جیسا مجھے محسوس کرنا چاہئے تھا۔

"میرا خیال ہے کہانی کچھ الٹ چل رہی ہے۔" ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے کہا "انجام پہلے سامنے آگیا ہے اور آغاز کا کچھ پتا نہیں... سب سے پہلے تو مجھے تم سے یہ پوچھنا چاہئے تھا کہ تم کون ہو؟"

"آپ کو اندازہ نہیں ہوا؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں۔ اس وقت میرا اپنے اندازوں سے ایمان اٹھا ہوا ہے۔" میں نے جواب دیا۔

اس کا سر جھک گیا۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ گود میں رکھے چند لمحے خاموش بیٹھی رہی۔ اسے گویا بولنے کے لئے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ آخر اس نے شاید سادہ ترین الفاظ میں اپنا تعارف کرانے کا فیصلہ کیا اور کہا "میں پیردانش کی داشتہ ہوں۔ یا یوں کہئے کہ کچھ دیر پہلے تک تھی۔"

میں ایک ٹک اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہوئی کہ اب تک مجھے اندازہ کیوں نہیں ہوا تھا؟ فرح نے مجھے بتایا تھا کہ پیردانش کی تیسری داشتہ اٹھارہ سال کی تھی اور وہ اس کی سب سے چہیتی عورت تھی۔ اس بنگلے میں پہنچ کر اس امکان کی طرف میرا ذہن جانا چاہئے تھا۔ میرا ذہن شاید ایک وجہ سے اس طرف نہیں گیا تھا۔ وہ وجہ سوال بن کر میری زبان پر آگئی۔

"تم نے ابھی انتقام کی بات کی تھی۔" میں نے کہا "لیکن داشتائیں اپنے رکھنے والوں سے انتقام تو نہیں لیا کرتیں۔ انتقام کس بات کا؟ عورت اپنے آپ کو کرائے پر دینا چاہتی ہے اس کے

مطالبات پورے کئے جاتے ہیں۔ دنیا کی ہر آسائش اسے مہیا کی جاتی ہے۔ اسے اس کے خوابوں کے مطابق رکھا جاتا ہے۔ دونوں فریق جب چاہیں کرائے داری کا وہ معاہدہ ٹوٹ سکتا ہے۔ رکھنے والا اپنا راستہ لے گا۔ اور رکھیل چاہے گی تو کسی اور قدردان کی تلاش میں چل دے گی۔ اس میں انتقام..... اور وہ بھی اتنا شدید انتقام کہاں سے نکل آیا؟"

افسردگی اس کے چہرے پر کچھ اور گہری ہوگئی۔ اس نے بالوں میں انگلیاں پھیریں اور کمزور سی آواز میں بولی "دنیا کی تمام داشتاؤں کی کہانیاں یکساں نہیں ہوسکتیں افضل صاحب! آپ میری عمر دیکھ رہے ہیں! میری بدقسمتی ہے کہ میں ذہنی طور پر اپنی عمر سے بہت آگے چلی گئی ہوں۔ میری عمر زیادہ نہیں ہے۔"

"مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔" میں نے کہا "اور مجھے کسی نے تمہارے بارے میں بتایا بھی تھا۔"

"فرح نے بتایا ہوگا۔" وہ فوراً بولی "پیردانش سے تعلق رکھنے والے خاص لوگوں میں صرف وہ مجھے جانتی تھی اور مجھے معلوم ہے کہ آپ کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے دو دن بعد وہ ماری گئی۔ اس کا جرم اتنا سنگین تو نہیں تھا کہ اسے اتنی بے دردی سے مار دیا جاتا۔"

"پیردانش کے ہاتھوں جن لوگوں کی بھی زندگیاں برباد ہوئیں ان میں سے کسی کا جرم بھی اتنا سنگین نہیں تھا کہ اسے بے رحمی و سفاکی سے ہلاک کردیا جاتا۔ کم از کم پیردانش کو تو یہ حق ہرگز نہیں پہنچتا تھا کہ وہ پہلے ان کی زندگیاں برباد کرے اور پھر انہیں ذرا سا اپنی مرضی کے خلاف جاتے دیکھ کر کیڑے مکوڑوں کی طرح مروادے۔" میں نے کہا۔

"فرعون ہر دور میں... ہر شعبۂ زندگی میں... ہر سطح پر کسی نہ کسی روپ میں جنم لیتے رہے ہیں اور لیتے رہیں گے۔ کوئی چھوٹا فرعون... کوئی بڑا فرعون... کسی کے چہرے پر کوئی نقاب... کسی کے چہرے پر کوئی نقاب... ہم جیسے انسانوں کی بدقسمتی ہوتی ہے کہ ہم ان کی لپیٹ میں آجاتے ہیں۔" اس نے ایک نظر بیڈ کی طرف دیکھا جس پر پیردانش کمبل اوڑھے ابدی نیند سو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نفرت کی برق کوندی اور معدوم ہوگئی۔ اس کی جگہ پھر تھکن عود کر آئی۔

"میں تمہاری کہانی سننا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"کہانی کا وقت اب گزر گیا افضل صاحب! اب تو کہانی اپنے بلاصورت انجام کو پہنچ چکی ہے اور اس کے باقی اوراق وقت کے دوش پر اڑتے پھر رہے ہیں لیکن نہایت اختصار سے میں آپ کو اپنے بارے میں ضرور بتاؤں گی۔ صرف اس لئے کہ آپ حالات کو صحیح طور پر ہینڈل کرسکیں اور شاید اس لئے بھی... کہ آپ مجھے ان لڑکیوں میں شمار نہ کریں جن کی منزل کسی بہت امیر آدمی کی داشتہ...... یا داشتہ نما بیوی بننا ہوتی ہے۔ میرا خاندانی پس منظر بھی

ایسا نہیں تھا۔ افضل صاحب! میں کسی ایسے خاندان کی لڑکی نہیں ہوں جہاں لڑکیوں کو دولت مندوں کے ہاتھ فروخت کرنے یا "کرائے" پر دینے کے لئے پالا جاتا ہے۔ اس قسم کے خاندانوں سے تو ویسے بھی پیردانش کو کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ان کی طرف تو وہ رخ ہی نہیں کرتا تھا۔ میں تو ایک نہایت عام سے... غریب سے... اور شریف سے خاندان کی لڑکی تھی۔"

اس کا یہ انکشاف میرے لئے حیرت انگیز تھا لیکن اس کا یہ پس منظر اس کے موجودہ حالات میں کچھ فٹ نہیں بیٹھ رہا تھا۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کی کہانی کی بیشتر کڑیاں غائب تھیں۔ اگر وہ اپنے بارے میں مختصراً ہی سہی... لیکن مزید کچھ بتاتی، تبھی شاید بات صحیح طور پر سمجھ میں آتی۔

ذرا توقف کے بعد اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "اگر آپ اسے خود پرستی اور خود ستائشی نہ سمجھیں تو میں کہوں کہ ایک معمولی سے سفید پوش گھرانے میں پرورش پانے کے باوجود میں جینئس تھی۔ اپنی عمر سے بہت آگے تھی لیکن میرا خیال ہے یہ میری بہت سی بد نصیبیوں میں سے ایک بد نصیبی تھی۔ انسان کی کم عقلی، نا آگہی زیادہ تر دوسروں کو نقصان پہنچاتی ہے لیکن زیادہ آگہی سے انسان زیادہ تر خود کو اذیت پہنچاتا ہے۔ زیادہ سمجھ دار لوگ زیادہ دکھی ہوتے ہیں۔ میرے جینئس ہونے نے مجھے تنہا کردیا۔"

وہ ایک لمحے کے لئے پھر خاموش ہوگئی اور اپنی گود میں ٹکائے ہوئے خالی ہاتھوں کو گھورنے لگی پھر بولی "لیکن عمر کے سولہویں سال میں میں تنہا نہیں رہی۔ عمر کا سولھواں سال سویٹ سکس ٹین آہ!" وہ یکدم یوں ہنسی جیسے اس کے پہلو میں کوئی زخم ٹیس دے رہا ہو مگر وہ کسی کو دھوکا دینے کے لئے ہنس رہی ہو۔

"بہت افسانوی سی اصطلاح ہے یہ... سولھواں سال..." اس نے سلسلۂ کلام جوڑا "میں ایک اچھے کالج میں پڑھتی تھی جہاں کو ایجوکیشن تھی۔ وہاں مجھے ایک لڑکا مل گیا جس کی ذہنی سطح میری ہی طرح بہت بلند تھی لیکن اس میں ایک بڑی خرابی تھی اور وہ یہ کہ وہ بہت امیر گھرانے کا لڑکا تھا۔ ہمارا معاملہ "لو اسٹوری عرف میرا نام ہے محبت" وغیرہ جیسی فلموں والا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم بھی محبت کی کوئی امر ہوجانے والی کہانی تخلیق کر رہے ہیں۔ ہماری کھیلنے کھانے کی عمریں تھیں مگر شاید یہ ذہنی بلوغت کی برپا کی ہوئی قیامت تھی کہ ہم سنجیدگی سے شادی کی طلب میں گویا مرے جا رہے تھے۔ اس نے اپنے گھر والوں سے بات بھی کر ڈالی۔ ظاہر ہے اس کے ماں باپ کو زبردست جھٹکا لگا۔ اس عمر میں کتابوں میں رقعے تو چھپا کر ایک دوسرے کو دیئے جاتے ہیں، شادی کی باتیں نہیں کی جاتیں۔

اس کے والدین نے یقیناً اس کے لئے کچھ اور منصوبے بنا رکھے تھے۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کا نورِ نظر یا ہر یہ کرتا پھر رہا ہوگا اور ایک غریب لڑکی کے عشق میں اندھا ہو رہا ہوگا۔

اس کی ماں اور باپ دونوں بالکل اسی طرح ہٹلر بن گئے جس طرح بعض فلموں میں دکھایا جاتا ہے۔ انہوں نے لڑکے کو باہر بھیجنے کی تیاریاں شروع کردیں۔ وہ عمر کچھ ایسی ہوتی ہے کہ انسان غلطی پر ہو تب بھی شکست قبول کرنے یا اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں ہوتا۔ ہم دونوں نے گھر سے بھاگ جانے کا فیصلہ کیا۔

رات کے دو بجے لڑکا اپنی اسپورٹس کار لے کر ایک جگہ پہنچ گیا۔ میں بھی گھر سے نکل کر وہاں پہنچ گئی۔ وہ جگہ میرے گھر سے قریب ہی تھی۔ لڑکا کچھ رقم بھی لے کر آیا تھا۔ ہمارا جہاز کے ذریعے لاہور جانے کا پروگرام تھا۔ راستے میں ہم ڈاکوؤں کے ہتھے چڑھ گئے۔ وہ ہمیں کار سمیت اغوا کرکے ایک بنگلے میں لے گئے۔ وہ کسی اور واردات پر نکلے تھے جس میں انہیں ناکامی ہوئی تھی۔ راستے میں انہیں ہم مل گئے۔ انہوں نے اس مالِ غنیمت کو بھی بہتر سمجھا۔ ہم نے انہیں چکر دینے کی کوشش کی کہ ہم بہن بھائی تھے لیکن وہ اس چکر میں نہیں آئے۔

بہت سی خواتین اس قسم کے ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کے چنگل میں رہ کر بھی اس طرح واپس آنے میں کامیاب ہوجاتی ہیں کہ ان کی عزت و آبرو محفوظ رہتی ہے۔ میرے ساتھ ایسا نہیں ہوسکا۔ لڑکے کو انہوں نے خوب مارا پیٹا۔ اس کی فیملی کے متعلق معلوم کیا اور اس کے گھر والوں سے تاوان وصول کرنے کا پروگرام بناتے رہے اور مجھے کئی دن اور کئی رات تک وہ سب باری باری پامال کرتے رہے۔ خوابوں کی ایک پری گویا ان کے ہاتھ آگئی تھی۔ وہ اپنے سارے ارمان نکال لینا چاہتے تھے۔

وہ پولیس کے خوف سے وہاں چھپے ہوئے تھے اور کوئی معاملہ ٹھنڈا پڑ جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ چند دن بعد وہ کراچی سے نکل کر بلوچستان کی طرف فرار ہونا چاہتے تھے لیکن اس سے پہلے ہی ایک رات پولیس نے اس بنگلے کو گھیرے میں لے لیا۔ وہ لڑکا حالانکہ ان کے لئے ایک قیمتی اثاثہ تھا۔ ابھی تک تاوان وصول ہونے کی امید باقی تھی لیکن جان پر بنی تو انہوں نے اسے بھی بندوق تھما کر مرنے کے لئے آگے کردیا اور خود مجھے ساتھ لے کر فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ جس طرح اکثر ڈاکو اور دہشت گرد ہوجاتے ہیں۔ لیکن شاید میری ہی قسمت خراب تھی۔ میری وجہ سے ان سب پر نحوست کے سائے منڈلا رہے تھے۔ لڑکا تو اسی بنگلے میں پولیس کے ہاتھوں مارا گیا۔ اس کے بارے میں اخباروں میں خبر آئی۔ ڈاکوؤں کے گروہ میں دولت مند گھرانے کا ایک لڑکا بھی شامل تھا۔

اس کے دو دن بعد وہ پانچوں ڈاکو مجھ سمیت بلوچستان فرار ہونے کی کوشش میں راستے میں اچانک پکڑے گئے۔ جس کے بعد اخباروں میں خبر آئی کہ ڈاکوؤں کے گروہ میں ایک نوخیز حسینہ بھی شامل تھی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ میرے والدین پہلے میرے بھاگ جانے اور پھر اس طرح پکڑے جانے کے صدمے کی تاب نہ لاکر میرے سلسلے میں کچھ کرنے کے بجائے شہر ہی چھوڑ کر کہیں چلے گئے تھے۔ وہ اتنے سنگین معاملے میں کچھ کر بھی نہیں سکتے تھے۔ معمولی لوگ تھے۔"

اس نے سر اٹھا کر میری طرف دیکھا۔ وہ عجیب سے انداز میں مسکرا رہی تھی مگر اس کی ایک آنکھ سے ایک آنسو موتی کی طرح ڈھلک کر اس کے ہاتھ پر گرا۔ اس نے یوں مٹھی بھینچ لی گویا وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس آنسو پر میری نظر پڑے۔

ذرا توقف کے بعد وہ بولی "پھر نہ جانے کیوں اور کس سلسلے میں پیردانش اس تھانے میں نمودار ہوا۔ اس نے مجھے دیکھا۔ میں بہت برے حال میں تھی لیکن جوہری کی نظر ہیرے کو ہر حال میں... اور قسائی کی نظر بکرے کو ہر حال میں پرکھ لیتی ہے۔ اس نے شاید پہلی ہی نظر میں اس ڈش کو اپنے دسترخوان کے لئے منتخب کرلیا۔ اس کے وکیل مجھ سے ملے اور پھر جلد میری گلوخلاصی ہوگئی۔ بیچ کی باتیں کچھ ایسی زیادہ ضروری اور کچھ زیادہ دلچسپ نہیں ہیں۔ بس یوں سمجھ لیجئے کہ... اس کے بعد... آج میں آپ کے سامنے ہوں۔"

اس نے اتنی تیزی اور اتنے اختصار سے اپنی داستانِ حیات سنائی تھی کہ میرا سر گھوم رہا تھا۔ بڑی بڑی باتیں اس نے چھوٹے چھوٹے جملوں میں کہہ ڈالی تھیں۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن الفاظ میرے ذہن میں گڈمڈ ہوئے جا رہے تھے۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ خود ہی بولی "ٹھیک ہے... ایک طرح سے میں خود ہی اپنی زندگی کی بربادی کی ذمے دار ہوں۔ میرا جینئس ہونا میرے کسی کام نہیں آیا۔ کم سنی کے عشق کے شعلے میں، میں نے خود کو بھی بھسم کرلیا اور ایک شاندار گھرانے کے خوب صورت اور اکلوتے لڑکے کو بھی... لیکن میری بربادی میں پیردانش کا بھی بڑا ہاتھ تھا۔ اس نے اگر مجھے ایک دلدل سے نکال ہی لیا تھا تو مجھے کسی حد تک باعزت زندگی کی طرف بھی لوٹا سکتا تھا لیکن وہ خود ایک بڑا عفریت تھا۔ اس نے مجھے ایک دلدل سے نکال کر دوسری دلدل میں ڈال دیا۔ میں بہت عیش و آرام میں تھی لیکن یہ عیش و آرام مجھے زہر لگتا تھا اور پیردانش کی صورت سے مجھے سخت نفرت تھی۔ اس کے باوجود میں ہر رات اس کے لئے سج بن کر بیٹھنے پر مجبور تھی خواہ وہ آتا یا نہ آتا....."

اس نے ایک گہری سانس لی "اس طرح بھی شاید گزر ہی جاتی۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ایک روز جب پیردانش کا دل مجھ سے بھر جائے گا تو میں خالی ہاتھ دوبارہ فٹ پاتھ پر ہوں گی۔ مجھے اس کی بھی پروا نہیں تھی بلکہ شاید میں اسی دن کی منتظر تھی لیکن اس دوران مجھ پر ایک عجیب انکشاف ہوا۔ پچھلے دنوں مجھے معلوم ہوا کہ وہ گروہ جس نے دراصل میری زندگی کو پوری طرح برباد کیا۔ وہ لوگ پیردانش ہی کے آدمی تھے جو اس کے لئے مختلف خدمات انجام دیا کرتے تھے۔"

"اوہ..." میں ذرا سنبھل کر بیٹھ گیا "تمہیں یہ بات کس نے بتائی؟"

"ظفر جمال نے۔" اس نے جواب دیا "یہاں کا فون بھی ٹیپ ہوتا ہے۔ چند دن پہلے اس نے جان پر کھیل کر کسی طرح اس بنگلے میں گھس کر مجھ سے رابطہ کیا اور پیردانش کے بارے میں مجھے وہ باتیں بھی بتائیں جو اب تک مجھ سے بھی چھپی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتا تھا کہ میں پیردانش کو کیفرِ کردار تک پہنچانے میں اس کا ساتھ دوں لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی۔ میں نے انکار کردیا۔ وہ دربدر مارا مارا پھر رہا تھا لیکن اس کے ذہن میں ایک ہی جنون سمایا ہوا تھا کہ وہ پیردانش کو نہیں چھوڑے گا۔ پیردانش اس دوران خود بھی مجھے تمام حالات سے آگاہ رکھ رہا تھا۔ آپ کے بارے میں بھی بتاتا رہتا تھا کہ آپ اس کے پیچھے لگے ہوئے ہیں لیکن وہ بڑا پُراعتماد تھا۔ وہ بالکل مطمئن تھا کہ کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا پھر مجھے پتا چلا کہ اسے گرفتار کرلیا گیا ہے تو مجھے امید کی کرن نظر آئی کہ اب شاید وہ انجام تک پہنچ جائے۔ میں بے چینی سے اس کی منتظر تھی۔

اسی لئے میں آج اپنے آپ کو چھپا کر عدالت پہنچی تھی لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ وہ صاف بچ نکلے گا اور یہی ہوا۔ افضل صاحب! میں نے اس چھوٹی سی عمر میں بہت کچھ برداشت کیا ہے۔ لیکن بس یوں سمجھئے کہ جب میں نے وہاں اپنی آنکھوں کے سامنے ظفر جمال کو مرتے اور پیردانش کو

ضمانت پر رہا ہوتے دیکھا تو جیسے میری قوتِ برداشت جواب دے گئی۔ میرے اندر کھٹ سے کوئی ڈوری سی ٹوٹ گئی۔ میں نے اشارے سے اسے ایک کونے میں بلایا۔ اس نے بھی مجھے نہیں پہچانا تھا تاہم میں نے اسے بتادیا اور یہی ظاہر کیا کہ میں بے تابیٔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر عدالت میں پہنچی ہوئی تھی۔ میں نے اس سے فرمائش کی کہ وہ چپ چاپ میرے ساتھ چل دے۔ پہلے ہم اس گھر میں چھوٹا سا جشن منائیں گے پھر وہ اپنے گھر جائے گا۔ اسے تھوڑی دیر کے لئے غائب ہو کر سب کو سرپرائز دینا چاہئے۔ وہ بہت خوش تھا۔ میرے ساتھ چلا آیا۔ خاص موڈ میں بھی تھا۔ حوالات میں چھتیس گھنٹے گزارنا اس کی زندگی کا بہت بُرا تجربہ تھا۔ وہ اس قسم کے "جشن" کے لئے ترس رہا تھا جس کی تجویز میں لے کر گئی تھی۔ یہاں جو کچھ ہوتا رہا ہے اس کا اندازہ کرنا آپ کے لئے مشکل نہیں ہوگا۔ یہ صرف دو نفری جشن تھا' صرف میں اور وہ جشن منا رہے تھے۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ مجھے تو کچھ زیادہ مشکل نہیں لگا۔ آپ کو شاید لگ رہا ہو۔

میں نے سوچا اب وقت آگیا ہے کہ اس شخص کو انجام تک پہنچ جانا چاہئے اور مجھے لگ رہا تھا کہ بے پناہ طاقت رکھنے والا قانون.... آپ جیسے مضبوط لوگ... اور ظفر جمال جیسے سرپھرے کی قربانی بھی اس شخص کو اس انجام تک نہیں پہنچا سکے گی جس کا یہ مستحق تھا۔ اس کے لئے مجھ جیسی کمزور... ناتواں اور نازک اندام لڑکی کو ہی کچھ کرنا پڑے گا۔ سو میں نے کردیا۔ میں نے زندگی کا قرض ادا کردیا ہے۔"

اس نے ویکیوم جگ سے ایک گلاس میں پانی انڈیلا اور دوا کی ایک شیشی اٹھاتے ہوئے کلاک کی طرف دیکھ کر بولی "میری دوا کا ٹائم ہوگیا ہے۔ میں بہت بری طرح تھک بھی گئی ہوں افضل صاحب! میں ذرا اپنا وٹامنز کا کیپسول کھالوں۔" اس نے شیشی سے ایک کیپسول نکالا اور پانی سے نگل لیا۔

پانی پی کر اس کی حالت کچھ بہتر نظر آنے لگی۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی "میں واقعی بہت تھک گئی ہوں۔ آج کا دن بہت صبر آزما تھا۔ اوپر سے نشے میں دھت ہونے کے بعد پیر دانش ڈیک پر انگریزی موسیقی کا کیسٹ لگا کر پاگلوں کی طرح اسی کمرے میں میرے ساتھ ناچنے لگا۔ آپ شاید اندازہ نہ کرسکیں کہ ہم کس حالت میں ناچتے رہے اور کتنی دیر تک ناچتے رہے۔"

"میں اندازہ کرسکتا ہوں۔" میں نے سرہلایا۔

وہ دھیرے سے ہنسی پھر اس نے صوفے کے پشتے سے ٹیک لگائی اور چھت کو گھورنے لگی۔ میں نے کہا "تم نے مجھے بڑی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ اگر میں تمہیں نکل جانے دیتا ہوں تو اس قتل کا الزام مجھ پر آجائے گا۔ اس کی ماں..... وہ گاڈ مدر نما عورت پنجے جھاڑ کر میرے پیچھے پڑجائے گی کہ میں قانون کی مدد سے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکا تو میں نے اسے خود مارڈالا یا کسی سے مروادیا۔ اگر تم سامنے آتی ہو اور پیر دانش کے قتل کا اعتراف کرتی ہو تو تم دوسری دلدل سے نکل کر تیسری دلدل میں جا گروگی۔ میں نہیں چاہتا کہ تمہارے ساتھ ایسا ہو۔ میں تمہاری زندگی کو کوئی بہتر رخ اختیار کرتے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ ایک بار پھر عجیب سے انداز میں ہنسی "آپ کو اس ضمن میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" اس نے وارڈروب کی طرف اشارہ کیا "اس میں ایک خودکار وڈیو کیمرا' وی سی آر وغیرہ سمیت موجود ہے۔ میں نے جب پیر دانش کو ہلاک کیا تو کیمرا بیڈ پر فوکس کرکے اسٹارٹ کردیا تھا۔ وی سی آر میں صاف ستھری ٹیپ پر یہ منظر بالکل محفوظ ہے کہ میں نے کس طرح اس کی پیشانی میں کیل ٹھونکی۔ میں ہرگز نہیں چاہتی تھی کہ اس قتل کا الزام کسی اور پر آئے۔ اس کیمرے سے دوسری طرح کی کئی فلمیں پیر دانش کے حکم پر شوٹ کی گئی تھیں۔ میں نے سوچا آج پیر دانش کی بھی ایک مختصر سی... مگر یادگار فلم شوٹ کرکے رکھ دی جائے۔ اس فلم میں آپ کو یقیناً میرا کام بہت پسند آئے گا۔"

"تم نے یہ ثبوت تیار کرکے رکھ دیا۔ اس کا مطلب ہے تمہارا اس قتل سے انکار کرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ تو پھر اس تردد میں پڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ تم خود سامنے آکر اقرار کرسکتی ہو۔" میں نے کہا۔

"میں سامنے آنا نہیں چاہتی۔" وہ بولی "میں قانون کے شکنجے میں پھنسنا نہیں چاہتی۔"

"ٹھیک ہے' میں تمہیں تحفظ فراہم کرنے کی ہر ممکن کوشش کروں گا۔ تم لباس تبدیل کرو اور فی الحال یہاں سے تو نکلو۔" میں نے کہا۔

"آپ میری فکر نہ کریں افضل صاحب! میں نے اپنا بندوبست کرلیا ہے۔" وہ بڑی طمانیت سے مسکراتے ہوئے بولی۔

"بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ تم پھر اپنے آپ کو کسی مصیبت میں پھنسا لوگی۔ میں تمہیں تمہاری مرضی سے کہیں نہیں جانے دوں گا۔ تمہیں میرے کہنے پر عمل کرنا ہوگا۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"آپ مجھے نہیں روک سکیں گے افضل صاحب!" وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بدستور مسکرا رہی تھی اور اس کے لہجے میں غضب کا اعتماد تھا!

میرے دل میں اس لڑکی کے لئے بے پناہ عزت.... ایک عجیب سی محبت اور ایک عجیب سا گداز پیدا ہوگیا تھا۔ زندگی نے واقعی اس کے خوب صورت ذہن پر بڑے گھاؤ لگائے تھے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ کم از کم اب تو وہ زندگی کی کچھ راحتیں دیکھ لے۔ اب تو اس کے سینے میں دہکتے ہوئے زخموں پر تھوڑی سی اوس پڑجائے۔ یہ عمر۔ اور یہ باتیں' یہ تجربے؟ مجھے جھرجھری سی آگئی۔

میں نے تحکم آمیز شفقت سے کہا "فضول باتیں مت کرو۔ ٹھیک ہے۔ زندگی نے تمہارے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا لیکن

تم نے خود بھی اپنے ساتھ کچھ اچھا نہیں کیا۔ تم نے جینئس ہونے کے باوجود ایک نادان بچے کی طرح ڈور کو سلجھانے کی کوشش میں اور بھی زیادہ اُلجھالیا ہے۔"

"میں تو پہلے ہی اپنے اس "جرم" کا اعتراف کرچکی ہوں۔" وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"لیکن اب میں تمہیں حالات کی اس ڈور سے مزید کھیلنے نہیں دوں گا۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا "میں تمہیں تمہاری مرضی سے کہیں جانے نہیں دوں گا۔ تم ایک بار پھر حالات کی ڈور کو مزید اُلجھاؤ گی۔"

"آپ میرے لئے کیا کرسکتے ہیں؟" اس کی افسردہ سی مسکراہٹ قدرے استہزائیہ مسکراہٹ میں بدل گئی۔

"میں تمہارے لئے جو کچھ کرسکتا ہوں اس کا شاید تم تصور بھی نہ کرسکو۔" میں نے جواب دیا "تمہیں وہ سب کچھ مل جائے گا جس کی تلاش میں تم اب تک بھٹکتی رہی ہو۔"

"کیا میرا کھویا ہوا عشق بھی؟" اس کی مسکراہٹ تیکھی ہوگئی۔

"اس کا میں وعدہ نہیں کرسکتا۔" میں نے دیانت داری سے کہا "لیکن بہت سی چیزوں کا میں وعدہ کرسکتا ہوں۔ قانون تمہیں تلاش نہیں کرسکے گا اور کم از کم پیردانش کے آدمی یا گاڈمدر بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔ زندگی کی تمام آسائشیں اسی طرح تمہیں حاصل رہیں گی جس طرح اس وقت ہیں۔"

"اور...؟" وہ گویا میری پیشکش سے محظوظ ہورہی تھی۔

"اور یہ کہ زندگی رہے گی۔ تحفظ حاصل رہے گا تو شاید کسی موڑ پر اس عشق کا متبادل بھی مل جائے جو سولہ برس کی عمر میں تم سے چھن گیا۔ پہلا عشق خاص طور پر کم عمری کا عشق بہت شدید ہوتا ہے۔ اس عمر میں انسان میں ضد بہت ہوتی ہے نا۔ اس کا عشق بھی ضدی ہوتا ہے لیکن جب ضد کم ہوگی تو شاید عشق کا متبادل بھی مل جائے گا۔ عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ اپنے پہلے عشق کی ناکامی کے بعد وہ مرجائے گا لیکن وہ زندہ رہتا ہے۔ جیسے تم اب تک زندہ ہو۔ کبھی نہ کبھی' کہیں نہ کہیں وہ متبادل کو قبول کرلیتا ہے۔ تم بھی کرلو گی لیکن پہلی شرط تو یہی ہے ناکہ تم زندہ سلامت رہو۔ اندھے قانون اور پیردانش کے سرپرستوں یا پیروکاروں سے محفوظ رہو۔ اس کے لئے تمہیں مجھ جیسے آدمی کی پناہ کی ضرورت ہے اور میں تمہیں پورے خلوصِ دل سے پناہ دینے کے لئے تیار ہوں۔"

اس کے ہونٹوں سے استہزائیہ سی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس کی جگہ اسی افسردگی نے لے لی جو میں شروع سے اس کے چہرے پر دیکھ رہا تھا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں گدیلے صوفے کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے گہری سانس لے کر بولی "آپ کی باتیں

بہت خوب صورت ہیں افضل صاحب! آپ آدمی بھی خوب صورت ہیں۔ شاید اندر سے بھی اتنے ہی خوب صورت ہوں جتنے باہر سے نظر آتے ہیں۔ لگتا ہے آپ انسان کے دل میں زندگی کی اُمید جگانے اور اسے زندگی کی خوب صورتیوں کا قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔"

"ہر ایک کو نہیں۔" میں نے اعتراف کیا "بہت کم لوگ اس سلوک کے مستحق ہوتے ہیں۔"

"مجھے اندیشہ ہے کہ میں نے آپ کی پیشکش قبول کی۔ اور آپ کی پناہ میں آئی تو کہیں آپ میں اپنے عشق کا متبادل نہ تلاش کرنے لگوں۔" وہ بات کرتے ہوئے بار بار گھڑی بھی دیکھ رہی تھی جیسے اسے کہیں جانا ہو۔

"میرا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا۔" میں نے گڑبڑا کر جلدی سے کہا "تمہارے بارے میں تو شاید میں ایسا کبھی سوچ بھی نہ سکوں۔"

"شاید اس لئے کہ میں غلاظت میں ڈوبی ہوئی لڑکی ہوں؟" وہ میری بات کاٹتے ہوئے ایک بار پھر ذرا استہزائیہ سے لہجے میں بولی۔

"نہیں' نہیں یہ بات نہیں ہے۔" میں نے زور دے کر کہا۔ میں اس کے لہولہو دل پر کوئی اور چرکا لگانے کا جرم کرنا نہیں چاہتا تھا "انسان کی غلاظت اور پاکیزگی کے بارے میں میرے فلسفے ذرا مختلف ہیں۔ غلاظت اور پاکیزگی.... خباثت اور شرافت انسان کے یہاں ہوتی ہے۔" میں نے سینے پر دل کے مقام پر انگلی رکھی "حالات انسان کو خواہ کہیں بھی لے جائیں اگر اس کے یہاں غلاظت نہیں ہے۔ خباثت نہیں ہے تو وہ اچھا انسان ہے اور اگر اس کے یہاں غلاظت اور خباثت رچی ہوئی ہے تو اس کی زندگی خواہ نیک لوگوں کے جھرمٹ میں بھی گزر جائے وہ غلیظ اور خبیث ہی رہے گا۔"

"چلیئے۔ آپ کی بات درست مان لی۔" وہ فراخ دلی سے بولی "اس کے باوجود بھلا آپ کا میرے عشق میں مبتلا ہونے کا امکان کیوں نہیں ہے؟ یا اگر میں آپ کے عشق میں گرفتار ہوگئی تو آپ کیوں میرے عشق کا جواب عشق سے نہیں دے سکیں گے؟" مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کی آنکھوں میں خفیف سی شرارت جھلک آئی تھی۔

"بس... یونہی۔" میں نے مبہم سا جواب دیا۔

"کیا میں خوب صورت نہیں ہوں؟" اس کی آنکھوں میں شرارت برقرار رہی۔

"خوب صورت تو تم کچھ زیادہ ہی ہو۔ خوب صورتی تو تمہارے لئے بوجھ بنی رہی ہے جسے تم سنبھال نہیں سکیں۔ لیکن عشق' خوب صورتی سے مشروط تو نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس دنیا میں بے چارے کم رو لوگ تو عشق کی پیاس میں مرجاتے۔"

"تو پھر؟" وہ مجھ سے وضاحت طلب کرنے پر تُلی ہوئی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ ابھی تو کسی اور کے عشق کی زنجیر مجھے کہیں جانے نہیں دیتی تھی' ہلنے نہیں دیتی تھی۔ صرف یہی نہیں۔ اس عشق کی فصیل کے قریب ہی کوئی اور بھی خیمہ زن تھا۔ میں تو پہلے ہی بڑی اُلجھنوں میں تھا۔ میں اپنی زندگی کو مزید کھینچا تانی میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔ ویسے بھی یہ جو حد سے زیادہ ذہین لڑکیاں ہوتی ہیں۔ جو بہت کم وقت میں بہت زیادہ سفر طے کرلیتی ہیں۔ یہ زیادہ تر اپنی اور دوسروں کی زندگی میں اُلجھنیں ہی لاتی ہیں۔

"یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔" میں نے مربیانہ انداز میں گویا اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"میرے خیال میں تو یہ وقت ایسی ہی باتوں کا ہے۔" اس نے جیسے اصرار کیا "میں نے زندگی میں ہر طرح کی باتیں کرکے دیکھ لیں۔ عملی طور پر بھی سب کچھ کرکے دیکھ لیا۔ زندگی کا کوئی راز اب میرے لئے راز نہیں رہا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اس تصور سے مجھے ایک عجیب سی لذت محسوس ہورہی ہے کہ اگر میں آپ کے قریب رہتی تو آپ کے عشق میں گرفتار ہوسکتی تھی۔ آپ کو اپنے پہلے عشق کا متبادل سمجھ سکتی تھی۔ کیا آپ میرا دل رکھنے کو بھی نہیں کہہ سکتے کہ آپ بھی میرے عشق کا جواب عشق سے دے سکتے تھے؟ جبکہ آپ کو یہ بھی اعتراف ہے کہ میں آپ کی نظر میں غلیظ بھی نہیں ہوں اور خوب صورت بھی بہت ہوں۔"

"میں بھلا مستقبل کی بات ابھی سے کیسے بتاسکتا ہوں؟ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ میں سال.... دو سال یا چار سال بعد کیا کروں گا؟ جھوٹ میں بولنا نہیں چاہتا۔ کیا جھوٹ سُن سُن کر تمہارا دل نہیں بھرا؟"

"جھوٹ سے کیا۔ میرا تو اس دنیا سے ہی دل بھرچکا ہے لیکن میں سوچ رہی تھی کہ آپ کے پاس سے جاتے جاتے بھی ایک جھوٹ کا ہی تحفہ لے جاتی تب بھی کوئی حرج نہیں تھا۔ زندگی میں جہاں اتنے جھوٹ تھے وہاں ایک خوب صورت جھوٹ اور سہی۔" وہ بدستور مسکرائے جارہی تھی گو کہ اس کی آنکھیں زبردست اعصابی تناؤ کی نشاندہی کررہی تھیں۔

"اگر تم واقعی کہیں جانا چاہتی ہو تو میرے خیال میں کسی رخصت ہوتے ہوئے دوست کو دینے کے لئے جھوٹ کوئی اچھا تحفہ نہیں۔" میں نے گہری سنجیدگی سے کہا "میں تمہیں سچ دوں گا۔ بہت ہی خوب صورت سچ۔"

وہ استہزائیہ انداز میں ہنسی "سچ خوب صورت کہاں ہوتا ہے افضل صاحب!"

"سچ خوب صورت ہوتا ہے لیکن بُرے لوگوں کو بدصورت لگتا ہے۔ جو لوگ اندر سے خوب صورت ہوتے ہیں انہیں سچ بھی خوب صورت لگتا ہے۔" میں نے کہا "مجھے کبھی پارسائی کا دعویٰ نہیں رہا۔ بعض لوگوں کی زندگی میں پارسائی درحقیقت صرف نارسائی کا دوسرا نام ہوتی ہے۔ مجھے چونکہ زندگی میں بہت سے خوب صورت لوگوں تک رسائی رہی ہے۔ اور میں بہرحال ایک انسان ہوں۔ ایک نہایت عام سا انسان۔ میں عیاش تو نہیں رہا ہوں لیکن مجھے پارسائی کی بہت اعلیٰ اور انوکھی روایتیں قائم کرنے کا بھی دعویٰ نہیں ہے۔ تاہم تمہارے بارے میں نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ تم میرے قریب بھی رہیں۔ میری رسائی میں بھی رہیں تب بھی شاید میں کبھی نہ تو تمہیں چھو سکوں... اور نہ ہی تم سے عشق کرسکوں۔ تم مجھے ایک بچی سی لگتی ہو جو وقت سے پہلے بڑی ہوگئی ہے۔ میں اپنے محسوسات بیان نہیں کرسکتا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہورہا ہے جیسے تمہیں عشق کی یا کسی مرد کی دیگر نوازشات کی نہیں بلکہ شفقت کی ضرورت ہے۔ پناہ کی ضرورت ہے' میری اور تمہاری عمر میں خاصا فرق ہے۔"

"کچھ ایسا زیادہ فرق بھی نہیں ہے۔" وہ بدستور مسکرا رہی تھی "آپ سے کہیں بڑی بڑی عمروں کے لوگ شادی کے لئے مجھ سے بھی چھوٹی لڑکیاں ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ بعض لوگوں نے تو ساٹھا پاٹھا کی اصطلاح بھی گھڑ رکھی ہے۔ آپ تو شاید ابھی چالیس کے بھی

نہیں ہوئے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ لیکن پھر بھی میں تم سے کافی بڑا ہوں اور لوگوں کا کیا ہے۔ لوگ تو اس دنیا میں نہ جانے کیا کچھ کرتے پھرتے ہیں۔ میں کسی کارٹون کو دیکھ کر کارٹون تو نہیں بن سکتا۔"

"آپ بہت مختلف آدمی ہیں افضل صاحب! مجھے آپ سے مل کر۔ آپ کو جان کر بہت خوشی ہوئی۔" یکدم وہ بہت سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ اس کے تاثرات بالکل بدل گئے۔ اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی "اگر میں جانے کا فیصلہ نہ کرچکی ہوتی تو آپ کو جان کر مجھے اور بھی زیادہ خوشی ہوئی ہوتی۔ لیکن اب جبکہ جانا ہی ٹھہر گیا ہے تو پھر غم میں، خوشی میں غرضیکہ کسی بھی جذبے میں اُلجھنے کا کیا فائدہ؟" وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ تم نے کیا جانے جانے کی رٹ لگائی ہوئی ہے۔" میں نے ڈانٹنے کے سے انداز میں کہا "تم کہیں نہیں جارہی ہو۔ میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گا۔"

"میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں افضل صاحب! آپ مجھے نہیں روک سکیں گے۔" وہ کچھ اس طرح بولی جیسے کسی ضدی بچے کو سمجھانے کی کوشش کررہی ہو۔

"تمہیں میری طاقت کا اندازہ نہیں ہے چندا!" میں نے ملائمت سے کہا "ٹھیک ہے۔ تم نے ایک عفریت کو ختم کیا ہے اس کی پیشانی میں کیل ٹھونکی ہے۔ لیکن تم خود ہی کہہ چکی ہو وہ تمہارے انتقام کی طاقت تھی۔ ورنہ حقیقت میں تو تم دبلی پھول سی لڑکی ہو۔ میں تمہیں ہاتھ سے روکنا نہیں چاہتا۔ زبان سے کہنے پر ہی رُک جاؤ۔ آخر تم مجھے راستے سے ہٹا کر کیسے جاؤ گی؟ تم کوئی ٹارزن تو نہیں بن گئی ہو۔"

"آج میں ٹارزن سے زیادہ مضبوط ہوں کیونکہ مجھ پر ضد سوار ہے۔ میرے پاس ارادے کی طاقت ہے۔" وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں بولی۔

"ایک طرف رکھ دو اپنے ارادے اور ضد کو۔" میں نے اس کے اور دروازے کے درمیان حائل ہوتے ہوئے کہا "تم وہاں جاؤ گی جہاں میں کہوں گا ورنہ اپنی ضد کے باعث ایک بار پھر تم اپنا حشر خراب کرلو گی۔"

"نہیں، اب میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔" وہ دروازے کی طرف جانے کے بجائے جہازی سائز کے بیضوی بیڈ کی طرف جارہی تھی۔ شاید اس نے اب اپنا ارادہ بدل دیا تھا لیکن بظاہر ضد پر اڑی ہوئی تھی۔ میں نے غیر محسوس طور پر ذرا اطمینان کی سانس لی۔ میں واقعی اس کے ساتھ ذرا بھی سختی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وقت نے پہلے ہی اس کے ساتھ کیا کم سختیاں کی تھیں؟ ویسے بھی وہ میری اور قانون کی محسن تھی۔ جو کام اس نے کیا تھا اس میں مجھے بھی دانتوں پسینے آجاتے اور قانون کی بھی سانس پھول جاتی۔

وہ بیڈ پر بیرِ دانش کے قریب لیٹ گئی۔ وہ بہت پُرسکون نظر آرہی تھی۔ میں نے کہا "مجھے خوشی ہے کہ تم نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ لیکن یہ وقت لیٹنے کا نہیں ہے۔ جلدی سے اٹھو۔ اپنا ضروری سامان لو اور میرے ساتھ چلو۔"

"میں نے ہرگز اپنا ارادہ نہیں بدلا ہے افضل صاحب!" اس کا لہجہ اب کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا تھا "اچھا ہوا آپ بات کو سمجھ نہیں سکے۔ ویسے تو درحقیقت مجھے آپ سے باتیں کرنا بہت بھلا لگا ہے، آپ کو بہتر طور پر جاننے میں مدد ملی ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں یہ سب باتیں کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کیپسول کھانے کے بعد سے میرا مقصد آپ کو محض باتوں میں لگائے رکھنا تھا۔ مجھے پندرہ منٹ گزارنے تھے جن میں سے چودہ گزر چکے ہیں۔"

میرے ذہن میں چھناکا سا ہوا "تمہارا مطلب ہے وہ کیپسول؟" آواز میرے حلق میں اٹک گئی۔

"ہاں وہ کیپسول زہر کا تھا۔" وہ اطمینان سے بولی۔

میں نے جھپٹ کر ایک گڑیا کی طرح اسے بستر سے اٹھالیا۔ وہ ابھی بالکل ٹھیک نظر آرہی تھی، باتیں کررہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسے جلد طبی امداد میسر آجاتی تو اس کے بچ جانے کا امکان تھا۔

اچانک اس کے چہرے پر اتنی زیادہ تکلیف کے آثار اُبھر آئے کہ میں اسے اُٹھائے دروازے کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ تب مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی تکلیف اندرونی نہیں تھی بلکہ وہ اس طرح اُٹھائے جانے پر خفا تھی۔

وہ بیزاری سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "مجھے آرام سے لیٹی رہنے دیں افضل صاحب! خواہ مخواہ مجھے کھینچ گھسیٹ کر میری زندگی کے آخری لمحات کو زیادہ تکلیف دہ نہ بنائیں۔ اس شیشی میں باقی کیپسول وٹامنز ہی کے ہیں۔ وہ مختلف رنگ کا کیپسول تھا اور صرف وہی ایک کیپسول زہر سے بھرا ہوا تھا۔ زہر بھی کوئی معمولی نہیں ہے۔ سائنائیڈ ہے لیکن کیپسول کو تحلیل ہونے کے لئے پندرہ سولہ منٹ درکار تھے جو اب تقریباً پورے ہوچکے ہیں۔ کیپسول تحلیل ہوتے ہی سائنائیڈ معدے میں پھیلے گا تو مجھے مرنے میں چند سیکنڈ بھی نہیں لگیں گے۔ اب اتنی سی دیر میں تو آپ مجھے اسپتال نہیں لے جاسکتے نا؟ اس لئے کیوں خود بھی پریشان ہوتے ہیں اور مجھے بھی پریشان کرتے ہیں۔ اسی لئے تو میں نے کہا تھا کہ آپ مجھے نہیں روک سکیں گے۔ میں بہت دور جارہی ہوں افضل صاحب!"

ایک لمحے کے لئے میرے ہاتھ پاؤں اکڑ سے گئے۔ میرا جسم گویا پتھر کا ہورہا تھا۔ میں اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ان آنکھوں میں قبل از مرگ ہی دھندلاہٹ پھیل چکی تھی مگر وہ کسی شریر بچی کی طرح مسکرادی۔

جب وہ بولی تو اس کا لہجہ بچوں والا نہیں، بزرگوں والا تھا "مجھے واپس بیڈ پر لٹادیں۔ شاباش... بہت اچھے بچے ہیں آپ۔ میں کسی ایسی ہی آڑی ترچھی حالت میں مرگئی تو میری لاش اسی طرح نہ اکڑ جائے۔ کم از کم مرتے وقت تو مجھے ٹھیک حالت میں رہنے دیں۔"

میں نے آہستگی سے اسے واپس بیڈ پر لٹادیا۔ وہ گویا نہایت احتیاط سے سانس لیتے ہوئے بولی "ہاں اب ٹھیک ہے۔" اس نے اپنی ٹانگیں اور بازو یوں سیدھے کرلئے جیسے تابوت میں لیٹی ہو۔

میں نے اپنے حلق میں پھنسا ہوا گولا سا نگلتے ہوئے کہا "تم نے اچھا نہیں کیا غزالہ...... کم از کم مجھ سے ملاقات کے بعد تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ تم ذرا انتظار تو کرلیتیں۔ کوئی ایسی قیامت نہیں آچلی تھی کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ سب ٹھیک ہوجاتا۔" مجھے بولنے میں دقت محسوس ہورہی تھی۔

"ہاں اب آپ سے باتیں کرنے کے بعد مجھے بھی احساس ہورہا ہے کہ شاید سب ٹھیک ہوجاتا۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی "اس کے باوجود مجھے اپنے کئے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ میرا خیال ہے میں نے جو کیا' ٹھیک ہی کیا۔ مجھے اب زندہ رہنے سے کچھ خاص دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اب مجھے یہ اطمینان ہے کہ مرنے سے پہلے میں نے ایک قابلِ ذکر کام تو کرلیا یعنی پیروانش کو......"

اچانک اسے ہچکی سی آگئی۔ اس کے پورے جسم کو زبردست جھٹکا سا لگا۔ آواز اس کے حلق میں ہی اٹک گئی۔ اس کے چہرے اور گردن کے عضلات کھنچ کر رہ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ اسی پُرسکون سی حالت میں لیٹی رہنے کی کوشش کررہی تھی۔ شاید وہ اس بے بسی سے انداز میں مرنا نہیں چاہتی تھی لیکن یہ اس کے اپنے اختیار کی بات نہیں تھی۔ اسی اکڑی ہوئی سی حالت میں وہ ساکت ہوگئی۔

اس کی آنکھیں کُھلی کی کُھلی رہ گئی تھیں۔ ان آنکھوں سے وہ گویا چھت کو تک رہی تھی۔ اب تک میرے دل کے کسی کونے میں امید کی ایک موہوم سی کرن زندہ رہی تھی کہ شاید وہ خود ہی بیڈ سے اُٹھ بیٹھے گی اور کھلکھلاتی ہنسی کے ساتھ کہے گی "میں تو مذاق کررہی تھی افضل صاحب! کیسی ایکٹنگ کی؟ ڈرا دیا نا آپ کو؟"

چند سیکنڈ اس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد میری یہ اُمید دم توڑ گئی۔ اس کے ساتھ ہی جیسے رگ وپے میں زندگی کی حرارت بھی دم توڑ گئی۔ مجھے اپنا آپ بہت سرد سرد سا محسوس ہوا لیکن میری پلکوں تلے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ میرے دل میں ہی نہیں بلکہ میرے چاروں طرف بھی گویا گہرا سکوت چھا گیا تھا۔ دنیا سے جیسے میرا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔ میں کسی جزیرے پر تنہا کھڑا تھا۔ صرف یخ ہواؤں کی سنسناہٹ میری سماعت سے ٹکرا رہی تھی۔

مجھے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ میں کتنی دیر اسی عالم میں کھڑا رہا۔ شاید چند سیکنڈ... یا پھر چند گھنٹے۔ پھر نہ جانے کس طرح میں اپنے حواس پر یہی یخ بستگی لئے ذرا آگے بڑھا اور ہاتھ پھیلا کر نہایت آہستگی سے میں نے اس کی آنکھیں بند کردیں۔ بستر کی چادر کھنچ کر اس کی دونوں مٹھیوں میں دبی ہوئی تھی۔ وہ میں نے اس کی مٹھیوں سے نکال دی اور اس کے ہاتھ سیدھے کردیے۔ ابھی اس کے اعضا میں نرمی تھی۔ ابھی اس کے ہاتھ پاؤں لکڑی کی طرح نہیں اکڑے تھے۔

میں کچھ دیر اس پر جُھکا اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔ چہرے کے عضلات اکڑ جانے کے باوجود اس کی خوب صورتی میں کچھ زیادہ کمی نہیں آئی تھی لیکن اب دھیرے دھیرے اس کی رنگت میں نیلاہٹ نمودار ہورہی تھی۔

اچانک میرے حواس پر جمی ہوئی منوں ٹنوں برف ایک زوردار کڑاکے سے چٹک گئی۔ ایک لمحے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ درحقیقت وہ زوردار کڑاکا نہیں بلکہ دروازے پر محض ایک ہلکی سی دستک تھی۔

میں تیزی سے گھوما۔ گن گویا خودبخود ہی میری جیب سے نکل کر ہاتھ میں آگئی۔ میں نے سر جھٹک کر اپنے مفلوج سے اعصاب کو بیدار کرنے کی کوشش کی اور دبے قدموں دروازے کے قریب جا پہنچا۔ ایک لمحے کے لئے میں نے سوچا کہ دروازہ کھولوں یا نہیں؟ دستک دوبارہ ہوئی۔

"کون ہے؟" میں نے پوچھ لیا۔ میرے خیال میں یہ سوال کرلینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اپنا لہجہ میں نے بارعب رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کوشش میں خاص کامیابی نہیں ہوئی تھی۔ ابھی حواس پر جمی ہوئی برف کے اثرات باقی تھے۔

"سر!" باہر سے صرف اتنا کہا گیا۔ اس ایک لفظ کے پیچھے بڑی طمانیت پوشیدہ تھی۔ میں نے بھی ذرا اطمینان کی سانس لیتے ہوئے ناب گھما کر دروازے کا تالا کھول دیا۔

دروازے کی آڑ میں ہی رہتے ہوئے میں نے ذرا سر نکال کر باہر جھانکا۔ شفیع شاہ بھی دیوار کی اوٹ میں رہتے ہوئے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی گن تھی۔ وہ اکیلا ہی تھا۔ ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھ کر گہری سانس لے کر رہ گئے۔

"سر! یہاں سب خیریت تو ہے؟" اس نے پُرتشویش لہجے میں پوچھا۔

"خیریت؟" میں استہزائیہ سے انداز میں ہنس دیا لیکن اپنی ہنسی خود مجھے بھی ایک کراہ سے مشابہ محسوس ہوئی "یہ اچھا لفظ استعمال کیا ہے تم نے۔ ہاں یہاں خیریت ہی ہے اور تمہاری خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔"

میں دروازے کی اوٹ سے نکل آیا۔ وہ ذرا کھسیانا دکھائی دینے لگا تھا۔ میں نے بغور اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "میں نے کوئی گولی تو نہیں چلائی' تم کیسے آگئے؟"

"آپ کو اس گھر میں داخل ہوئے کافی دیر ہوگئی تھی سر!" وہ اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دھیمے لہجے میں بولا "مجھے کچھ تشویش ہونے لگی تھی۔ اس گھر پر کچھ عجیب سا سکوت' بلکہ شاید سوگواری طاری ہے۔ ایک عجیب سے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں رہ نہیں سکا۔ میں نے آپ کی ہدایت کی خلاف ورزی کرڈالی۔" وہ بدستور کچھ شرمندہ نظر آرہا تھا۔

وہ میرے لئے چھوٹے بھائیوں کی طرح تھا لیکن ڈسپلن کو کبھی نہیں بھولتا تھا اور یہ ڈسپلن اس نے خود ہی اپنے لئے مقرر کیا ہوا تھا۔ میری فرمائش نہیں تھی۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ملائمت سے کہا "تم نے بہت اچھا کیا جو آگئے۔ میں اس وقت تمہاری ضرورت محسوس کررہا تھا۔ شاید اسی لئے تم آگئے۔ میری خاموش صدا تم تک پہنچ گئی۔ تم نے میرے محسوسات کا وہ سگنل ریسیو کرلیا جو آلات کا محتاج نہیں۔"

وہ ذرا مطمئن نظر آنے لگا۔ ایک قدم آگے آکر اس نے کمرے میں جھانکا۔ اِدھر اُدھر کا جائزہ لینے کے بعد اس کی نظر بیڈ پر موجود دو ساکت جسموں پر جم کر رہ گئی۔ ایک کمبل سے ڈھکا ہوا تھا اور دوسرا تقریباً بے پردہ ہی تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اس نے سوالیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"تم نے ٹھیک ہی محسوس کیا تھا شفیع شاہ!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "یہ گھر واقعی ایک عجیب سی سوگواری میں ڈوبا ہوا ہے۔ معلوم نہیں یہ موت کی سوگواری ہے یا اعمال کی۔ اس وقت مجھے خود اس خوب صورت اور آراستہ و پیراستہ مکان سے بڑی وحشت ہورہی ہے۔"

"دونوں مرچکے ہیں؟" شفیع شاہ نے تصدیق چاہی۔

میں نے اثبات میں سرہلایا تو وہ بولا "سر! آپ کے ہاتھوں......؟" اس نے سوال ادھورا چھوڑ دیا۔

"نہیں۔ اپنی اپنی قسمت کے ہاتھوں۔" میں نے جواب دیا "میں نے تو مارنے کی نیت سے ان دونوں میں سے کسی کو چھوا تک نہیں۔"

وہ خاموش رہا لیکن پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھتا رہا۔ میں نے ایک بار پھر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "آؤ چلتے ہیں۔ اب یہاں ہمارا کوئی کام نہیں رہا۔ جب میرے حواس پر سے برف پگھلے گی تو میں تمہیں ساری تفصیل بتاؤں گا۔"

وہ خاموشی سے مڑا اور ہم دونوں راہداری میں سن ٹیرس کی طرف چل دیے۔ میں نے شفیع شاہ سے پوچھا "تم سیدھے یہیں پہنچ گئے تھے یا سب کمروں میں جھانکتے ہوئے آرہے ہو؟"

"سب کمروں میں اندھیرا ہے۔ میں نے کسی طرف جانے کی زحمت نہیں کی۔" اس نے سادگی سے کہا "صرف اس کمرے میں دھندلی دھندلی روشنی کا احساس ہورہا تھا گو کہ اس کی کھڑکیوں پر بھی بلائنڈز گرے ہوئے ہیں۔ میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا یہاں آن پہنچا۔"

اچانک مجھے کچھ یاد آیا اور میں یکدم رک گیا۔ دکھ کی دلدل سے اندیشوں کے سانپ نکل آئے تھے۔ شفیع شاہ کا ہاتھ یکدم بلند ہوگیا۔ گن ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

"نہیں۔ خطرے والی کوئی بات نہیں ہے۔" میں نے مڑتے ہوئے کہا "ذرا واپس چلو۔ دو چیزیں ساتھ لینی ضروری ہیں۔ ورنہ کوئی ان شہادتوں کو ضائع کردے گا اور خواہ مخواہ ہمیں اس معاملے میں اُلجھانے کی کوشش کی جائے گی۔"

ہم کمرے میں واپس آئے۔ میں نے رومال ہاتھ میں لے کر احتیاط سے وہ الماری کھولی جس کے بارے میں غزالہ نے مجھے بتایا تھا۔ کیمرا اور اس سے منسلک وڈیو ٹیپ ریکارڈر ایک بیگ میں سامنے ہی رکھا تھا۔ بیگ کی باہر کی پاکٹ کی زپ کھلی تھی اور اس سے ایک کاغذ جھانک رہا تھا۔ میں نے ناخنوں کے درمیان پکڑ کر اسے باہر کھینچا اور اس طرح احتیاط سے کھول کر پڑھا کہ اس پر میری انگلیوں کے نشانات نہ آنے پائیں۔ اس پر شاید عجلت میں چند سطریں گھسیٹی گئی تھیں یا پھر لکھنے والی کا ہاتھ لڑکھڑا رہا تھا۔ لکھا تھا۔

"میں جو کچھ کررہی ہوں۔ اس کے ثبوت کے طور پر سارا منظر شوٹ کرنے کے لئے کیمرا اسٹارٹ کرکے رکھ رہی ہوں۔ میں یہ سب کچھ اپنی مرضی سے کررہی ہوں۔ مجھ پر کسی کا دباؤ نہیں ہے۔ کسی کو اس معاملے میں ملوث نہ کیا جائے۔ تقدیر مجھے مہلت دیتی اور میرے ذہن میں یہ خیال آجاتا تو یہ کام مجھے کافی پہلے کر گزرنا چاہئے تھا۔ غزالہ"

غزالہ نے پکا کام کیا تھا۔ غالباً اسے اس بات کی بہت فکر تھی کہ اس کے کئے کی وجہ سے کوئی مشکل میں نہ پھنسے۔ یہ اس کے باضمیر ہونے کی دلیل تھی۔ بعض لوگوں کے حالات خواہ کچھ بھی ہوں مگر ضمیر ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ میں نے رقعہ دوبارہ اسی پاکٹ میں اڑس دیا اور شفیع شاہ سے کہا "یہ کیمرا اور وی ٹی آر احتیاط سے اُٹھالو۔"

اس نے دونوں چیزیں اُٹھالیں۔ الماری کے پاس سے ہٹتے وقت وہ کن انکھیوں سے بیڈ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ غزالہ کو تو سر سے پاؤں تک تقریباً صاف دیکھا جاسکتا تھا۔ اسے اس کے بارے میں تجسس نہیں تھا۔ اسے کمبل سے ڈھکے ہوئے جسم کے بارے میں زیادہ تجسس تھا۔

میں نے اسے بتادینا ہی بہتر سمجھا "اس کمبل کے نیچے پیروانش ہے۔ اس کی پیشانی میں نہ جانے کتنی لمبی اور موٹی ایک کیل پیوست ہے جو شہتیروں میں ٹھونکنے کے کام آتی ہے۔"

اسے خفیف سا جھٹکا لگا۔ وہ ایک لمحے کے لئے رکا اور تیزی سے پلکیں جھپکا کر رہ گیا۔ بس یہی اس کا شدید حیرت کا اظہار تھا۔ میں نے مُردہ اور اکڑی ہوئی غزالہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تقریباً سرگوشی کے سے انداز میں کہا "اور یہ کام اس گڑیا سی لڑکی نے کیا ہے۔ ہم... جو خود کو بڑا... شہ زور سمجھتے ہیں ہم جیسوں کے لئے یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے۔"

اس نے ایک ثانئے کے لئے سر جھکالیا پھر آہستگی سے کہا "سر! میں نے تو آپ سے گزارش کی تھی کہ وانش کا پتا صاف کردیتے ہیں۔ آپ نے اجازت نہیں دی تھی۔"

"مجھے یاد ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے اس کا کندھا تھپک کر کہا "میں ابھی اس مسئلے پر سوچ بچار کرنا چاہتا تھا۔ ہم سوچ بچار کرتے ہی رہ گئے۔ یہ لڑکی بازی لے گئی۔ میرے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہم یہ کام نہیں کرسکتے تھے۔ یقیناً کرسکتے تھے۔ اور اس

لڑکی سے بہتر انداز میں کرسکتے تھے یعنی سانپ بھی مرجاتا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹتی۔ اس لڑکی کی طرح کسی کو خودکشی کی ضرورت پیش نہ آتی۔ میں تو صرف اس لڑکی کی جُرات پر حیرت کا اظہار کررہا ہوں۔ اس نے دُہری جُرات کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایک تو پیر دانش کو ٹھکانے لگایا۔ اور پھر نہایت عیش و آرام کی زندگی کو خیرباد کہہ کر موت کو گلے لگالیا۔ دونوں ہی کام حیرت انگیز ہیں۔"

"جی ... یہ بات تو ہے۔" شفیع شاہ نے پُرخیال انداز میں اثبات میں سرہلایا "انسان کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ بڑے عجیب تماشے دکھاتی ہے۔"

ہم نے بیک وقت ہی غزالہ کی طرف سے منہ پھیرلیا۔ شاید ہم دونوں ہی میں اس کی طرف مزید دیکھنے کی سکت نہیں تھی۔ البتہ شفیع شاہ نے اتنا ضرور کیا کہ منہ پھیرنے سے پہلے دوسرا کمبل اُٹھاکر اسے بھی سر سے پاؤں تک ڈھانپ دیا۔ میں نے تپائی پر رکھے ہوئے اسٹیل کے ہتھوڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "اسے بھی رومال سے پکڑ کر اُٹھالو۔ فنگر پرنٹس ضائع نہ ہونے پائیں۔"

اس نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ ہم خاموشی سے مکان سے باہر آگئے۔ گاڑی کی طرف جاتے وقت میں نے پلٹ کر ایک نظر اس خوب صورت بنگلے کی طرف دیکھا۔ اس کی خوب صورتی اپنی جگہ تھی مگر یہ گویا ایک مزار کی خوب صورتی تھی۔ اس میں زندگی کا رنگ نہیں تھا۔

شفیع شاہ کی گاڑی وہاں سے کہیں دور کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا "یہ چیزیں تم اپنے پاس ہی رکھ لو۔ جب میں منگواؤں گا تو لے آنا۔ فی الحال تم مجھ سے الگ ہی رہو۔ میں اب رحیم گل کو اس واقعے کی اطلاع دیتا ہوں۔ دیکھتے ہیں اس کے بعد کیا ہوتا ہے۔"

اس نے سرہلایا اور گلی کے کونے کی طرف چل دیا۔ چند لمحے بعد وہ اندھیرے میں میری نظر سے اوجھل ہوگیا۔ میں اپنی گاڑی میں جا بیٹھا۔ ابھی میں نے گاڑی اسٹارٹ نہیں کی تھی کہ گاڑی میں نصب ٹیلی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ میں سمجھا شاید شفیع شاہ کو اپنی گاڑی میں پہنچ کر مجھ سے کچھ پوچھنے کا خیال آگیا تھا اور اس نے اپنے موبائل فون پر مجھ سے رابطہ کیا تھا لیکن جب میں نے ڈیش بورڈ کے قریب سے ریسیور اُٹھاکر کان سے لگایا تو پتا چلا کہ دوسری طرف رحیم گل تھا۔

"کہاں آوارہ گردی ہورہی ہے پیارے؟" وہ چہکا۔

"میرے ٹیلی فون نمبروں کا صحیح معنوں میں فائدہ تم اُٹھارہے ہو۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"فائدہ میں نہیں اُٹھا رہا۔ بلکہ اُلٹا میں تمہیں فائدہ پہنچا رہا ہوں۔" وہ اسی خوشگوار لہجے میں بولا۔

"میں نے تم جیسا فارغ البال پولیس آفیسر نہیں دیکھا۔" میں نے کہا "کیا تمہیں مجھ کو فون کرنے کے سوا دنیا میں کوئی کام نہیں ہے؟"

"تم ایک انتہائی قدرناشناس اور ناشکرے انسان ہو۔ مجھ جتنا کام کرنے والا کوئی پولیس آفیسر شاید ہی اس وقت شہر میں موجود ہو۔ میں تو چوبیس گھنٹے ہی ڈیوٹی پر ہوتا ہوں۔ گھر پر ہوتا ہوں تب بھی ڈیوٹی ہی کے سلسلے میں کچھ نہ کچھ کررہا ہوتا ہوں۔ حتیٰ کہ اکثر میرا تم کو فون کرنا بھی ڈیوٹی ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔"

"مثلاً۔ اس وقت تمہارے اس فون کا تمہاری ڈیوٹی سے کیا تعلق ہے؟" میں نے سنجیدگی سے کہا۔

"تم شاید واقعی سمجھ رہے ہو کہ میں نے تمہاری حسین آواز سننے کے لئے فون کیا ہے؟ اس خوش فہمی میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔"

"اب کچھ بکو گے بھی یا وقت ہی ضائع کرتے رہو گے؟" میں نے ذرا سختی سے کہا۔

"تمہارے لہجے میں اس وقت دیو داس بول رہا ہے۔ لگتا ہے کوئی غمناک واقعہ رونما ہوا ہے۔ کیا قصہ ہے؟" وہ بدستور چہک رہا تھا۔

"تم میرے قصے کو چھوڑو۔ پہلے اپنا قصہ سناؤ۔" میں نے کہا۔

"میرے پاس قصہ تو کوئی نہیں ہے۔ بس تمہیں معمولی سی ایک اطلاع دینی تھی۔ میں نے سوچا شاید تمہارے لئے کارآمد ہو۔" وہ بولا "میں نے گاڈمدر کی نگرانی پر ایک سادہ لباس والے کو تعینات کیا ہوا ہے۔ اس نے کچھ دیر پہلے گاڈمدر کو چار مسلح آدمیوں کے ساتھ گھر سے روانہ ہوتے دیکھا ہے اور ذرا اونچی آواز میں ایک دوسرے سے باتیں کرتے بھی سُنا ہے۔ ان کی باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تمہارے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے ہیں۔ میں نے سوچا شاید تمہیں پہلے سے خبردار کرنا فائدہ مند ہو۔ آفس میں تم سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن تم وہاں نہیں تھے۔ موبائل فون پر رابطہ کیا۔ وہ بھی ریسیو نہیں کیا گیا؟"

میرا موبائل فون بھی گاڑی میں ہی ڈیش بورڈ کے اندر موجود تھا۔ بنگلے میں جاتے وقت میں اسے رکھ گیا تھا۔ اس کی گھنٹی شاید میرے واپس آنے سے کچھ پہلے بج چکی تھی۔ رحیم گل بات جاری رکھتے ہوئے بولا "میں نے سوچا تمہاری گاڑی والے فون پر ہی قسمت آزمائی کرکے دیکھ لوں۔ شاید تم سے رابطہ ہو ہی جائے۔ شاید تم کہیں آوارہ گردی پر نکلے ہوئے ہو۔ موبائل فون کہاں رکھا ہوا ہے؟"

"فضول سوالات کو چھوڑو۔ اور گاڈمدر کو بھی گولی مارو۔ چار مسلح احمقوں کو ساتھ لے کر وہ کوئی قلعہ فتح نہیں کرسکتی۔ ویسے میں اس وقت ہوٹل کی طرف ہی جارہا ہوں اگر وہ مجھ سے پہلے پہنچ گئی تب بھی میرے آدمی اس سے نمٹ لیں گے۔ ویسے میں فون پر انہیں الرٹ بھی کردیتا ہوں لیکن......"

میں ایک لمحے کے لئے خاموش ہوا تو وہ فوراً بولا "لیکن کیا؟"

"میرے پاس تمہارے لئے اس سے زیادہ اہم اطلاع ہے۔" میں نے کہا "علاقہ تو تمہارا نہیں ہے لیکن کیس تمہارا ہے۔ میں ذرا دیر بعد تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔ اچھا ہی ہوا تمہارا فون آگیا۔ ایک ایڈریس لکھو۔ اور فوراً کچھ آدمیوں کو لے کر اس پر پہنچ جاؤ۔"

"کیا ہوگا وہاں؟" فوراً اس کے لہجے میں سنجیدگی آگئی۔

"ایک عبرت آموز کہانی تمہاری منتظر ہوگی۔ اس علاقے کی پولیس کو بھی ساتھ لینا قانونی یا اخلاقی طور پر بہتر سمجھو تو لے لینا۔ ویسے بھی وہ تمہارے پڑوسی ہی ہیں۔ کہانی کا سرپیر سمجھ میں نہ آئے تو مجھ سے رجوع کرنا۔ اس کی گمشدہ کڑیاں میرے پاس ہیں۔"

"یہ کیا بکواس ہے۔" وہ ذرا خفگی سے بولا "تم شرلاک ہومز بننے کی کوشش کیوں کررہے ہو؟"

"ابے چغد! میں شرلاک ہومز نہیں۔ تمہارا ہمدرد اور خیر خواہ بننے کی کوشش کررہا ہوں۔ میں چاہ رہا ہوں کہ ایک بہت بڑے کیس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا کریڈٹ تمہیں مل جائے۔ اگر کہیں گاڈمدر اس جگہ پہلے پہنچ جاتی تو شواہد نہ جانے کیا رخ اختیار کرچکے ہوتے۔ الزام نہ جانے کس پر آجاتا۔ تم سر پٹختے مرجاتے لیکن اس معمے کو کبھی حل نہ کرپاتے۔ کم از کم صحیح طور پر حل نہ کرپاتے۔"

"لیکن تم نے اپنی ذہانت کے بل بوتے پر اسے صحیح طور پر حل کرلیا؟" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"نہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ اس میں ذہانت کا نہیں، غیبی مدد کا زیادہ دخل ہے۔" میں نے صدقِ دل سے کہا "اب تو تم خوش ہو؟ اب تو اپنی جگہ سے ہل جاؤ۔"

"اچھا میں جارہا ہوں۔" وہ یکدم ہی نرم پڑگیا۔

میں نے فون بند کیا اور ہوٹل کی طرف روانہ ہونے سے پہلے ہوٹل فون کیا۔ پتا چلا کہ ابھی گاڈمدر وہاں نہیں پہنچی تھی۔ میں نے داؤد کو ہدایت کی کہ وہ سیکیورٹی والوں کو الرٹ رکھے اور خود بھی الرٹ رہے۔ اس کے بعد میں تیزرفتاری سے ہوٹل کی طرف روانہ ہوگیا۔

میرا خیال تھا کہ گاڈمدر مجھ سے پہلے ہوٹل پہنچ چکی ہوگی کیونکہ میں اس کے روانہ ہونے کے بعد خاصی دیر تک رحیم گل سے فون پر بات کرتا رہا تھا لیکن شاید وہ سست رفتاری سے آئی تھی یا پھر کہیں اور سے ہوتی ہوئی آرہی تھی کہ جب میں ہوٹل کے کونے پر پہنچ کر گاڑی ڈرائیو وے میں موڑنے لگا تھا عین اسی وقت سامنے سے اس کی پجیرو آکر رکی۔ گاڈمدر صبح کی طرح خود ڈرائیو کررہی تھی حالانکہ ڈرائیور بھی پجیرو ہی میں موجود تھا۔ اسے گاڈمدر نے پسنجر سیٹ پر بٹھایا ہوا تھا۔ ڈرائیونگ کا انداز وہی جارحانہ تھا اور کچھ ایسا بھی لگتا تھا جیسے گاڑی کو وہ انجن کی طاقت سے چلانے کے بجائے اپنی جسمانی طاقت سے چلانے کی کوشش کررہی ہو۔ اسٹیئرنگ وہیل گھماتے وقت اس کے شہتیر جیسے بازوؤں میں باقاعدہ مردوں کی طرح موٹے موٹے مسل حرکت کرتے دکھائی دیتے تھے۔

پہیوں کی تیز چرچراہٹ کے ساتھ اس کی گاڑی عین میری گاڑی کے سامنے آکر رُکی۔ دونوں گاڑیوں کی گویا ناک سے ناک ملنے میں تھوڑی سی کسر رہ گئی تھی۔ پجیرو میں بھی اس کے ساتھ ڈرائیور کے علاوہ دو تین آدمی موجود تھے جو یقیناً مسلح رہے ہوں گے۔ اس کے علاوہ حسبِ معمول پجیرو کے پیچھے کھلی جیپ میں بھی تین چار آدمی موجود تھے۔

میں چاہتا تو گاڑی ذرا سی ریورس کرکے ڈرائیو وے میں لے جاسکتا تھا۔ کافی جگہ تھی لیکن میں نے ایسی کوئی کوشش کرنے کی زحمت نہیں کی اور نہ ہی میں گاڑی سے اُترا۔ پجیرو میری گاڑی سے ذرا اونچی تھی۔ وہ چند لمحے اسی طرح بلندی سے مجھے گھورتی رہی۔ میں پُرسکون انداز میں ایک بازو اسٹیئرنگ وہیل پر ٹکائے پلک جھپکائے بغیر اس کی طرف دیکھتا رہا۔

میں چشمِ تصور کی مدد سے اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا کہ جب وہ اپنے بیٹے کی لاش دیکھے گی تو اس کا کیا عالم ہوگا؟ میں کوئی واضح اندازہ تو نہیں لگا سکا لیکن ایک بات بہرحال طے تھی کہ اس کا جو بھی ردِعمل ہوگا نہایت شدید ہوگا۔ وہ اپنے اکلوتے بیٹے اور اس کی تمام خباثتوں سے دیوانوں کی طرح پیار کرتی تھی۔ یہ ایک عجیب و غریب مجنونانہ محبت تھی۔ دونوں ماں بیٹے درحقیقت ذہنی طور پر نارمل نہیں تھے۔ کم از کم انسانیت اور شرافت کے پیمانوں سے تو نارمل نہیں تھے۔ عموماً ایسے لوگوں کے ہر عمل اور ردِعمل میں بڑی شدت ہوتی ہے۔

ہمارے آدمی مستعد تھے۔ ڈرائیو وے میں آنے والی گاڑیوں کے لئے ایک بیریئر لگا ہوا تھا۔ صرف کچھ مخصوص حالات میں اگر کسی گاڑی کو اندر آنے سے روکنا مطلوب ہوتا تھا تبھی اس بیریئر کو نیچے لایا جاتا تھا۔ ایسا ہی ایک بیریئر اس طرف بھی لگا ہوا تھا جس طرف سے گاڑیاں ڈرائیو وے سے باہر جاتی تھیں۔ کبھی باہر جاتی ہوئی کسی گاڑی کو بھی روکنے کی ضرورت پیش آسکتی تھی لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ آج تک کبھی ایسا اتفاق ہوا بھی تھا یا نہیں؟

بہرحال اس وقت گاڈمدر کی پجیرو کو اندر جانے سے روکنے کے لئے نہ صرف بیریئر گرادیا گیا تھا بلکہ اس کے پاس مسلح گارڈز بھی نمودار ہوچکے تھے۔ کچھ گارڈز نے آکر پجیرو اور جیپ کو بھی گھیرلیا تھا لیکن انہوں نے گنیں سیدھی نہیں کی تھیں کیونکہ گاڈمدر یا اس کے آدمیوں نے ابھی کوئی جارحانہ حرکت نہیں کی تھی۔

سیکیورٹی والوں کا انداز نہایت پُرسکون اور دوستانہ تھا جیسے وہ کسی رسمی کارروائی کے لئے آگے آئے ہوں۔ ہوٹل میں ہماری مجبوری یہی تھی کہ ہم بڑے سے بڑے مسئلے سے بھی حتی الامکان خاموشی سے نمٹنے کی کوشش کرتے تھے۔ بڑی سے بڑی کارروائی بھی اس طرح کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ جھگڑے یا ہنگامے کا تاثر پیدا نہ ہونے پائے۔ مہمانوں اور گاہکوں وغیرہ میں خوف و ہیجان نہ پھیلے۔

میری دعا تھی کہ اس وقت بھی تصادم کی نوبت نہ آئے۔ اگر

کوئی کارروائی ناگزیر ہی ہو جائے تو وہ بھی کچھ ایسی صفائی اور تیزی سے انجام دے دی جائے کہ عام لوگ معاملے کی نوعیت سے آگاہ ہی نہ ہونے پائیں۔ میرے پیچھے گاڑی میں کہیں شفیع شاہ اور دوسرے آدمی موجود تھے۔ وہ بھی اس صورتِ حال کو سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ تو سیکیورٹی گارڈز کی نسبت کچھ زیادہ ہی سمجھتے تھے اور گاڈمدر کو قبل از وقت ان کی موجودگی کا تو علم ہی نہیں ہو سکتا تھا۔

ان سب کی موجودگی میں مجھے اطمینان تو تھا کہ گاڈمدر کے آدمیوں کو حرکت میں آنے سے پہلے ہی قابو میں کیا جا سکتا تھا۔ وہ یونہی جاہل سے لوگ تھے۔ تاہم خواہش میری یہی تھی کہ وہ کوئی ہنگامہ نہ کریں۔ میرا دوسرا ہاتھ کوٹ کی جیب میں گن کے دستے پر تھا اور میں کسی بھی لمحے گولی چلانے کے لئے تیار تھا لیکن اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

گاڈمدر بیجیرو سے اتر کر میری گاڑی کی طرف بڑھی۔ کوئی مسلح شخص اس کے ساتھ نہیں تھا اور اس کے تاثرات بھی بالکل بدلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں انگاروں کی طرح سُرخ تھیں اور چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی لیکن وہ بہرحال ایک بالکل مختلف عورت نظر آ رہی تھی۔ چہرے پر وہ جارحانہ پن، وہ نخوت، وہ تکبر۔ کچھ بھی نہیں تھا۔ اس کی جگہ اضمحلال، شکست خوردگی اور پریشانی نے لے لی تھی جس کی وجہ سے وہ بالکل بدلی بدلی لگ رہی تھی۔ یہ چہرہ گویا اس کا اپنا چہرہ ہی نہیں تھا۔

میں اب بھی گاڑی سے نہیں اُترا البتہ میں نے اپنی طرف کا شیشہ نیچے کر لیا۔ وہ گاڑی پر جھکی تو کسی بیمار ہتھنی کی طرح شوں شوں کی اچھی خاصی زوردار آواز کے ساتھ سانس لے رہی تھی۔ وہسکی کی بو کا بھبکا بھی میرے نتھنوں سے ٹکرایا۔

وہ بولی تو اس کا لہجہ بھی مختلف تھا "افضل! میں تم سے بات کرنے آئی ہوں۔ اندر چلو۔" اس کے لہجے میں اب بھی رعونت اور تحکم کی جھلک تھی تاہم اسے نظرانداز کیا جا سکتا تھا۔ برسوں کی پختہ عادتیں یکدم تو نہیں جاتیں۔ اس کے سابقہ انداز و اطوار کو ذہن میں رکھتے ہوئے اس لہجے کو کافی حد تک مہذب ہی کہا جا سکتا تھا۔

"یہیں کر لو۔ جو بات کرنی ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں۔ وہ بات یہاں کھڑے ہو کر نہیں ہو سکتی۔" وہ تحمل سے بولی۔

"اگر اندر جا کر بات کرنی ہے تو پھر تمہارا یہ لاؤ لشکر ساتھ نہیں جائے گا۔" میں نے اس کے ساتھ آنے والے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ٹھیک ہے۔ ان میں سے کوئی میرے ساتھ نہیں جائے گا۔ میں اکیلی چلوں گی۔" وہ خلافِ توقع کسی حیل حجت کے بغیر بولی۔ ورنہ میرا خیال تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ بحث تو ضرور کرے گی اور زیادہ جوش میں آ گئی تو خون کی ندیاں بہانے اور ہوٹل کو بم سے اُڑا دینے کی دھمکیاں دے گی لیکن اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی جس پر مجھے خاصی حیرت ہوئی۔

وہ گھوم کر آئی اور دوسری طرف کا دروازہ کھول کر دھم سے میرے برابر والی سیٹ پر گر گئی۔ اس کے وزن سے گاڑی ہچکولا کھا کر رہ گئی۔ میں نے ملائمت سے کہا "میں آدابِ میزبانی کا ضرور خیال رکھتا اور تمہارے آدمیوں کو اندر آنے دیتا لیکن تمہیں اندازہ ہونا چاہئے کہ یہ ہوٹل کا معاملہ ہے۔ اور وہ بھی ایک فائیو اسٹار ہوٹل کا۔ اتنی تعداد میں مسلح لوگ اپنے ہتھیاروں کی نمائش کرتے ہوئے اندر داخل ہوتے ہیں تو ہیجان پھیلتا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تم اپنے ساتھ یہ جلوس لے کر کیوں چلتی ہو!"

"یہ ہمارا اسٹائل ہے۔" اس نے سادہ سا جواب دیا۔

"لعنت ہے ایسے اسٹائل پر۔" میں نے زیرِ لب کہا۔

"کیا کہا تم نے؟" اس نے ذرا چونک کر پوچھا۔

"میں کہہ رہا تھا کہ کیا ایک آدھ آدمی سے تمہارا کام نہیں چلتا؟"

"زیادہ آدمی ساتھ ہوتے ہیں تو زیادہ رعب پڑتا ہے۔" وہ شاید یہ منطق پہلے بھی بیان کر چکی تھی اور پیر دانش بھی اسی منطق پر یقین رکھتا تھا۔

"کتنا شوق ہے تمہیں رعب ڈالنے کا۔" میں نے گہری سانس لے کر متاسفانہ لہجے میں کہا اور گاڑی ڈرائیو وے میں موڑ لی۔ گاڈمدر کے ڈرائیور نے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال کر بیجیرو پیچھے ہٹا لی تھی۔ تاہم اس نے میرے پیچھے آنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید گاڈمدر اسے پہلے ہی ہدایت کر آئی تھی۔ گویا اسے خود بھی اندازہ تھا کہ اس بار اس کے لاؤ لشکر کو اندر جانے کا موقع نہیں ملے گا۔

گاڑی میں نے سڑک سے اندر لے جا کر پارکنگ لاٹ میں اس جگہ کھڑی کی جو میرے لئے مخصوص تھی۔ وہاں سے آفس تک جانے کے لئے خاصا فاصلہ پیدل طے کرنا تھا۔ گاڈمدر ہتھنی کی طرح جھومتی جھامتی میرے پیچھے آ رہی تھی۔

آفس پہنچ کر وہ ایک صوفے پر ڈھیر ہو گئی۔ اس نے اپنے شاندار لیکن ڈھیلے ڈھالے لبادے کی جیب سے ایک سگار نکال کر سُلگایا۔ خوشبو بتا رہی تھی کہ یہ وہی برانڈ تھا جو پیر دانش پیتا تھا۔ مجھے زندگی میں آئندہ ایسی ماں دیکھنے کی اُمید کم ہی تھی جو سگار پیتی تھی اور وہ بھی اپنے بیٹے والے برانڈ کا۔

خاصی دیر تک اس نے میری طرف نہیں دیکھا۔ سر جھکائے بیٹھی رہی اور سگار کے چھوٹے چھوٹے کش لیتی رہی۔ آخر اس نے سر اٹھایا۔ میں اپنی میز کے عقب میں بیٹھا ایک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اب اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ سُرخ اور متورم لگ رہی تھیں۔ پینے کے ساتھ ساتھ شاید وہ روتی بھی رہی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے پر بلا کی بے چارگی تھی۔ اس فرعونیت کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا جو اس کی شخصیت کا لازمی حصہ معلوم ہوتی تھی۔

اولاد کی محبت بھی عجیب چیز تھی۔ بڑے بڑے فرعونوں کا عجیب حال کر دیتی تھی۔ سچی بات تو یہ تھی کہ ایک لمحے کے لئے مجھے اس پر

ترس آ گیا لیکن فوراً ہی میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ اس قسم کے لوگ ہمدردی کے مستحق نہیں تھے۔ اپنے دل سے ان کی ہمدردی کو نکالنے کے لئے ان کے اعمال یاد کر لینا کافی تھا۔ تاہم اب میرے دل میں پہلے جیسا غیظ و غضب بھی نہیں تھا۔

گاڈمدر بھرّائی ہوئی سی آواز میں بولی "افضل! میں بہت پریشان ہوں۔"

"یعنی تمہیں بھی پتا چل ہی گیا کہ پریشانی کسے کہتے ہیں۔" میں نے گہری سانس لے کر کہا۔

"اگر تم سننا ہی چاہتے ہو تو چلو میں کہہ دیتی ہوں کہ مجھے اپنی شکست کا اعتراف ہے۔" وہ سچ مچ شکست خوردہ سے لہجے میں بولی "میں نے بہت کوشش کی لیکن میں تمہارے ہوٹل کی تلاشی لینے کے لئے سرچ وارنٹ حاصل نہیں کر سکی۔ دانش کو مجھے ہر حال میں تلاش کرنا ہے۔ مجھے تمہاری شرط منظور ہے۔ میں ہوٹل کی روم میڈ بن کر بستروں کی چادریں اور تولیے تبدیل کرنے کے بہانے ہر کمرے میں جانے کے لئے تیار ہوں۔"

اس کا سر جھک گیا اور شکست کے احساس سے آواز ٹوٹ کر رہ گئی۔ وہ ہچکی سی لے کر بولی "میں ہر کمرے میں جاؤں گی چاہے اس کام میں ساری رات لگ جائے۔"

میں نے نرم لہجے میں کہا "مجھے تم کو یا دانش کو شکست دینے یا تمہارے منہ سے اعترافِ شکست سننے کا قطعاً کوئی شوق نہیں تھا۔ بات صرف انسانیت اور اصولوں کی تھی۔ تم جیسے لوگوں سے میری تو صرف اتنی ہی التجا ہوتی ہے کہ انسان بنو اور انسانوں کے دوست رہو۔ کوئی خواہ کسی بھی حیثیت کا مالک ہو۔ کچھ بھی کرتا ہو اگر وہ صرف انسان رہے اور انسانوں کا دوست رہے تو دنیا اتنی بدصورت نہ ہو۔ بے شمار لوگ کسی نہ کسی بہانے کی آڑ لے کر... کوئی نہ کوئی جواز گھڑ کر اس دنیا کو بدصورت بنانے میں دن رات جتے ہوتے ہیں۔ ان کے سب فلسفے بکواس ہیں۔ سارے جواز جھوٹے ہیں۔ سارے بہانے محض بہانے ہی ہیں۔ ایسے لوگ بے شمار ہیں۔ میں سب سے تو نہیں لڑ سکتا لیکن جس کے ساتھ میرے سینگ پھنس جاتے ہیں پھر اس کا تو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا ہے۔"

"مجھ میں اب لمبی بحث میں الجھنے کی طاقت نہیں ہے۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں بولی "تم بس روم میڈ کا یونیفارم منگواؤ تاکہ میں اپنا کام شروع کر سکوں۔"

"تمہارے سائز کا یونیفارم تو ہمارے ہاں نہیں ہوگا۔" میں نے کہا "لیکن دوسری اور اصل بات یہ ہے کہ اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔"

"کیوں؟" وہ چونکی۔

میں نے اس "کیوں" کا جواب دینے کے بجائے کاغذ پر لکھا ہوا ایڈریس اس کی طرف بڑھایا لیکن اپنی جگہ سے نہیں اُٹھا۔ وہ جلدی سے اُٹھ کر میز کے قریب آئی۔ میز کے دوسری طرف سے ہاتھ بڑھا کر اس نے کاغذ میرے ہاتھ سے لے لیا۔ آنکھیں سکیڑتے ہوئے اس نے ایڈریس پڑھا اور سر اُٹھا کر شک زدہ سی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولی "یہ ایڈریس تم مجھے کیوں دے رہے ہو؟ یہ تو دانش کی ایک داشتہ کا ایڈریس ہے۔ غزالہ نام ہے اس کا۔"

"تم واقعی ایک عظیم ماں ہو۔" میں نے کہا "تم نے اپنی اولاد کی پرورش بڑی توجہ سے کی ہے۔ تم اپنے بیٹے کی داشتاؤں کے نام اور پتوں تک سے واقف ہو۔ کاش تم ان لوگوں کے محسوسات سے بھی تھوڑی سی واقفیت رکھتیں جن کی زندگیاں تم ماں بیٹے کی وجہ سے برباد ہو گئیں۔"

"تم پھر لمبے جھگڑے چھیڑ رہے ہو۔" وہ بے تابی سے بولی۔ پھر اس نے گویا تحمل سے مجھے سمجھانے کی کوشش کی "دیکھو۔ یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔"

"دوسروں کے حساب سے جب ایسی باتوں کا وقت آتا ہے تو تم جیسے لوگ کہنے لگتے ہو کہ یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ خیر تم کہتی ہو تو میں ایسی باتیں فی الحال بند کر دیتا ہوں۔ یہ قصے کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھتا ہوں۔"

"بہت شکریہ۔" اس کے لہجے میں طنز نہیں تھا "اب تم مجھے بتا دو کہ یہ ایڈریس مجھے دینے کا مقصد کیا ہے؟"

"جب تمہیں یہ معلوم ہی ہے کہ یہ ایڈریس کس کا ہے تو میں تمہیں اس حد تک اور بتا دیتا ہوں کہ کورٹ سے دانش کو جو برقع پوش لڑکی اپنے ساتھ لے گئی تھی وہ غزالہ ہی تھی۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ...." اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس نے پُرخیال انداز میں میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ اس نے میری کم از کم اس بات کا یقین کر لیا تھا "لیکن غزالہ کے گھر... اور اس جیسی دوسری تمام جگہوں پر تو میں نے فون کر کے پہلے ہی معلوم کر لیا تھا۔ غزالہ نے مجھے یہی جواب دیا تھا کہ دانش اس کے ہاں نہیں تھا۔"

میرے لئے یہ اطلاع حیرت کا باعث نہیں تھی۔ غزالہ یہی جواب دے سکتی تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ اس وقت دانش ہوش و حواس ہی میں ہو اور غزالہ نے اس کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں آنکھ مارتے ہوئے یا ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے یہ جواب دیا ہو۔

مجھے خاموش دیکھ کر گاڈمدر جیب سے موبائل فون نکالتے ہوئے بولی "بہرحال اگر تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ وہاں موجود ہے تو میں اب فون کر کے دیکھ لیتی ہوں۔" وہ فون کی طرف دیکھتے ہوئے ایک لمحے کے لئے خاموش ہو گئی۔ شاید وہ غزالہ کا نمبر یاد کر رہی تھی۔

"تمہارا فون کرنا بے کار ہے۔" میں نے کہا "وہاں کوئی فون کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔"

میرے اس جواب سے اس کے چہرے پر فکرمندی کے بجائے

اطمینان جھلک آیا اور وہ سرہلاتے ہوئے بولی "میں سمجھ گئی۔ وہ چھٹکی حرافہ اسے کورٹ سے گھیر گھار کر اپنے ہاں لے گئی ہوگی۔ میرے جشن سے پہلے وہ اپنے ہاں جشن منانا چاہتی ہوگی۔ وہ حرافہ تو ویسے ہی سر سے پاؤں تک آگ کی بنی ہوئی ہے۔ اس کے چھوٹے سے وجود میں کچھ زیادہ ہی جوانی بھری ہوئی ہے۔ اسی نے دانش کو منع کیا ہوگا کہ وہ وہاں اپنی موجودگی کی اطلاع مجھے نہ دے۔ اس کتیا کی بچی کو میری پریشانی کا احساس بھی نہیں تھا۔ یہ کوئی موقع تھا اس قسم کے چونچلے بگھارنے کا.... آج میں اس کی جوانی کی آگ اچھی طرح ٹھنڈی کروں گی۔"

اس نے غزالہ کو دو تین موٹی موٹی گالیاں بھی سنادیں اور تیزی سے موبائل فون پر نمبر پنچ کرنے لگی۔ اس نے خود بخود ہی فرض کرلیا تھا کہ دانش کی گمشدگی کا معمّا حل ہوچکا تھا اور وہ یک بیک ہی بہت خوش معلوم ہونے لگی تھی۔ اب اس کا غیظ و غضب صرف غزالہ کے لئے تھا کہ اس کی وجہ سے اسے اتنی پریشانی اٹھانا پڑی تھی۔ اپنی اصل پریشانی دور ہوتے ہی وہ پہلی سی مسز شاہ جی یا گاڈمدر معلوم ہونے لگی تھی۔

میں خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے کچھ دیر فون کان سے لگائے رکھا۔ دوسری طرف یقیناً فون نہیں اٹھایا گیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ ابھی رحیم گل بھی وہاں نہیں پہنچا تھا۔ تاہم جواب نہ ملنے پر گاڈمدر پریشان نہیں ہوئی۔ اس کے مفروضے کے مطابق اصل مسئلہ تو حل ہوچکا تھا۔

اس نے بٹن دبا کر فون بند کرکے واپس اپنی بڑی سی جیب میں ڈالتے ہوئے کہا "مجھے معلوم ہے دونوں کمبخت خوب پی پلا کر ٹُن ہوکر اوندھے پڑے ہوں گے۔ یہ سوّر کا بچہ دانش بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس قسم کی حرافاؤں کی بغل میں جاکر تو یہ بھی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اسے بھی کوئی ماں کی پریشانی کا احساس تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ اور جب یہ اس قسم کا رویّہ اختیار کرتا ہے تبھی نقصان اٹھاتا ہے۔"

شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہی تھی۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ اس بار اس کا لاڈلا ایسا نقصان اٹھا چکا تھا جس کی تلافی ممکن نہیں تھی اور آئندہ کے لئے وہ تمام نقصانات سے بے نیاز ہوچکا تھا۔ لیکن معلوم نہیں کیوں سردست میں کھل کر ساری بات اسے نہیں بتا سکا۔ اس کے بجائے میں نے آہستگی سے کہا "تمہارا وہاں چلے جانا ہی بہتر ہے۔ تمہیں وہاں بہت سی باتیں معلوم ہوں گی جن کا جان لینا ہی اب تمہارے حق میں بہتر ہے۔ جو کچھ تمہاری سمجھ میں نہ آئے وہ تم دوبارہ میرے پاس آکر مجھ سے سمجھ لینا۔"

اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لئے شک کی پرچھائیاں سی نمودار ہوئیں لیکن اس نے خوشی کا جو احساس از خود ہی اپنے دل میں بٹھالیا تھا وہ اس شک پر غالب آگیا۔ وہ سرہلاتے ہوئے بولی "ہاں تمہارے پاس تو بہرحال مجھے آنا ہی پڑے گا۔ شاید ابھی ہمیں بیٹھ کر بہت سی باتیں طے کرنی پڑیں۔" اس کے موٹے موٹے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ بھی آگئی "ویسے۔ میں اب یہ سوچنے پر مجبور ہورہی ہوں کہ شاید تم اتنے بُرے آدمی نہ ہو جتنا تمہیں میں اور دانش سمجھ رہے ہیں۔"

میں اس وقت اس کے لئے دل میں ہمدردی کی لہر محسوس کررہا تھا۔ اس کے باوجود میں کہے بغیر نہ رہ سکا "بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان کو دوسروں کی ذات میں اپنا ہی عکس نظر آتا ہے۔ انسان خود خبیث ہوتا ہے لیکن اسے ساری دنیا خبیث دکھائی دیتی ہے۔"

اس نے مجھے گھورا لیکن اس سلسلے میں کچھ کہنے کے بجائے بولی "فی الحال تو میں جاکر ان دونوں کو ٹھڈے مار کر جگاتی ہوں۔" اس نے ٹھڈے مارنے کے لئے "جگہ" کا انتخاب بھی کرلیا تھا۔ شرفا کی گفتگو میں اس قسم کے الفاظ استعمال کرنا شرمناک سمجھا جاتا ہے جو اس نے استعمال کیے تھے لیکن ظاہر ہے گاڈمدر کا شمار شرفا میں نہیں کیا جاسکتا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولی "بعد میں آکر میں تم سے بات کروں گی۔ شاید دانش بھی میرے ساتھ آئے۔"

میں اسے یہ بھی نہیں بتاسکا کہ دانش کو ساتھ لے کر میرے پاس آنے کی اب اس کے دل میں حسرت ہی رہ جائے گی۔

وہ اُٹھ کر دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ پھر راستے میں رک کر بولی "مجھ سے واقعی غلطی ہوئی۔ پتا نہیں کیوں مجھے خیال نہیں آیا کہ مجھے صرف فون پر معلومات کرنے کے بجائے کچھ جگہوں پر خود جاکر یا آدمی بھیج کر دکھوالینا چاہئے تھا۔"

میں خاموش رہا۔ وہ ذرا زیادہ واضح مسکراہٹ کے ساتھ بولی "میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ تمہیں یہ اطلاع کیسے ملی۔ بہرحال دانش کے بارے میں اطلاع دینے پر تمہارا شکریہ دشمن پیارے!"

وہ مسکراتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ اب اس کی چال بہت مختلف تھی۔ میں بہت دیر تک وہیں ساکت بیٹھا اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ مجھے اندازہ تھا کہ جب وہ دانش کی لاش لے کر اس گھر سے نکلے گی تو ایک بار پھر مجھے ہی اس کے شدید ردِ عمل کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس وقت تو وہ نہایت پُرامن اور شکست خوردہ انداز میں آکر چلی گئی تھی لیکن اندیشہ یہی تھا کہ اس سے آئندہ ملاقات خوشگوار نہیں ہوگی۔

اسی دوران میں میں نے شفیع شاہ سے وڈیو کیمرا اور وڈیو ٹیپ ریکارڈر وغیرہ منگوا کر آفس ہی کے سیف میں رکھ لیا۔ اس کے بعد بھی میں وہیں بیٹھا رہا اور مختلف دفتری مصروفیات میں وقت گزارنے کی کوشش کرتا رہا۔ دراصل مجھے رحیم گل کی طرف سے کسی اطلاع کا انتظار تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اس بنگلے پر پہنچنے کے بعد صورتِ حال کو سمجھنے کے لئے مجھے فون ضرور کرے گا۔ عین ممکن تھا وہ خود ہی چلا آتا لیکن میرا انتظار کافی طویل ہوگیا۔ وہ نہ تو خود آیا اور نہ ہی اس کا کوئی فون آیا۔

آخرکار میں اکتا کر آفس سے نکلا اور اوپر اپنے کمرے میں آگیا۔ میں اس وقت لباس تبدیل کرکے سونے کا ارادہ کررہا تھا جب رحیم گل کا فون آیا۔ اس کے لہجے سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس وقت بالکل سنجیدہ تھا۔

"میں تو بہت دیر سے تمہارے فون کا منتظر تھا۔" میں نے کہا "کیا خود ہی معمّا حل کرنے کی کوشش کررہے تھے؟"

"معمّا حل ہو یا نہ ہو۔ پولیس کو اپنا ایک ابتدائی نقطۂ نظر تو قائم کرنا پڑتا ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا "ہم لوگ یہاں تفتیش میں مصروف تھے۔ اس مکان پر تعینات رہنے والے گارڈز گیٹ ہاؤس میں بند تھے۔ انہیں ہماری آمد پر ہی ہوش آیا تھا۔ ان کے بیانات وغیرہ لئے جارہے تھے۔ میں اور علاقہ انچارج مل جل کر ابتدائی تفتیش مکمل کرچکے ہیں۔ میں نے سوچا تھا اپنا کام مکمل کرکے ہی تمہیں فون کروں گا۔ تم سے تفصیلی بات چیت تو ملاقات پر ہی ہوگی۔ پہلے یہ بتاؤ کہ گاڈمدر تمہارے پاس پہنچی تو کیا ہوا؟"

"میرے پاس پہنچنے کے بعد تو اسے رخصت ہوئے بھی بہت دیر ہوچکی ہے۔ میں نے اسے اسی بنگلے پر بھیجا تھا جس پر اس وقت تم موجود ہو۔" میں نے جواب دیا۔

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔" رحیم گل بولا "یہاں ہمارے پہنچنے کے چند منٹ بعد وہ بھی اپنے بہت سے بندوق برداروں کے ساتھ آن پہنچی تھی۔ میں بتا نہیں سکتا کہ یہاں اس لڑکی اور دانش کی لاشیں دیکھ کر اس کی کیا حالت ہوئی اور اس نے کیسا ہنگامہ برپا کیا۔ بہرحال اس سے ہمیں کم از کم یہ معلوم ہوگیا کہ یہ لڑکی غزالہ کہلاتی تھی اور پیر دانش کی داشتہ تھی۔ ہمیں یہ بھی اسی سے پتا چلا کہ پیر دانش کو عدالت سے جو برقع پوش لڑکی لے گئی تھی وہ یہی تھی۔ اس سے ہم نے کچھ اندازے تو قائم کئے ہیں۔ باقی باتیں تم سے معلوم ہوں گی لیکن میں یہ پوچھ رہا تھا کہ گاڈمدر یہاں سے ایک بار پھر تمہاری طرف روانہ ہوئی تھی۔ کیا وہ ابھی تک تمہارے پاس نہیں پہنچی؟"

اب میں ذرا چونکا اور سنبھل کر بیٹھ گیا "نہیں، وہ یہاں تو نہیں پہنچی۔" میں نے جواب دیا "کیا وہ دانش کی لاش لینے کے لئے بھی نہیں رکی تھی؟"

"لاش اس کو ابھی تو نہیں مل سکتی تھی بے وقوف آدمی۔ اس کا تو پوسٹ مارٹم وغیرہ ہوگا۔ لاش ایک دو دن بعد ہی اس کے حوالے کی جاسکے گی۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ لیکن میں نے سوچا شاید اس نے پوسٹ مارٹم وغیرہ کرانے سے انکار کردیا ہو اور لاش ابھی لے جانے پر اصرار کیا ہو۔ بڑے اور بارسوخ لوگوں کی بات تم پولیس والے اکثر مان ہی لیتے ہو۔" میں نے کہا۔

"یہاں ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ گاڈمدر نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی۔" وہ تاؤ کھائے بغیر بولا "اس کی حالت غیر ضرور تھی لیکن یہ بہرحال فطری سی بات تھی۔ وہ پہلے کے مقابلے میں بہرحال کافی معقول عورت لگ رہی تھی۔"

"آج اس سے ملاقات کے بعد میرا بھی یہی خیال ہے۔" میں نے کہا "بعض لوگوں میں تبدیلی صرف اسی وقت آتی ہے جب وقت انہیں ذلیل کرتا ہے۔ اگر اس سے پہلے ان میں معقولیت آجایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔"

"یہ بھی غنیمت ہے کہ وقت کسی کو ذلیل کرے تو اس میں تھوڑی بہت لچک آجائے۔ بعض لوگوں کو تو وقت ذلیل کرتا ہے تو وہ اور زیادہ خبیث ہوجاتے ہیں۔" رحیم گل بولا "خیر... فی الحال حیرت کا مقام یہ ہے کہ گاڈمدر تمہارے ہاں کیوں نہیں پہنچی؟"

"شاید اس نے راستے میں ارادہ تبدیل کرلیا ہو۔ گھر چلی گئی ہو۔" میں نے خیال ظاہر کیا "ایسی طوفان بلا قسم کی چیز تو راستے میں غائب ہونے سے رہی... خصوصاً جبکہ اس کے ساتھ اس کا لاؤ لشکر بھی موجود ہے۔"

"خیر... ابھی ہوشیار ہی رہنا۔ شاید وہ تاخیر سے پہنچے۔ لیکن پہنچے گی ضرور۔ اس کا انداز یہی بتارہا تھا۔" رحیم گل بولا "وہ اصل بات جاننے کے لئے بے تاب تھی۔ ویسے اسے یہ یقین بھی نہیں تھا کہ تم اسے اصل بات ہی بتاؤ گے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ تمہارا ہی چلایا ہوا کوئی چکر ہے۔"

"اس کا مطلب ہے اس میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ ہم خواہ مخواہ ہی خوش ہورہے ہیں۔ اس کے دماغ کا خناس وہیں کا وہیں ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا پھر میں نے پوچھا "تم سے کب ملاقات ہورہی ہے؟"

"میں اور کچھ دوسرے پولیس افسران تم سے کل ہی ملنے آسکیں گے۔" اس نے جواب دیا "آج رات تو ملاقات کی نوبت آنی مشکل ہے۔"

میرے لئے یہ قدرے حیرت کی بات تھی کہ رحیم گل حقائق کی گمشدہ کڑیاں جوڑنے کے لئے زیادہ بے تاب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے اندازِ گفتگو سے بڑا پُرسکون معلوم ہورہا تھا۔

میں نے کہا "ٹھیک ہے۔ میں کل تمہارا منتظر رہوں گا۔"

اس نے سلسلہ منقطع کردیا اور میں سونے کے لئے لیٹ گیا۔ رحیم گل نے مجھے خبردار کیا تھا کہ اب بھی گاڈمدر کے پہنچنے کا امکان تھا لیکن میرا دل کہہ رہا تھا کہ اب اس کی اُمید نہیں رہی تھی۔ اسے اگر آنا ہوتا تو اب تک آچکی ہوتی۔ اس سے ملاقات بھی شاید اب کل پر ہی جا پڑی تھی۔ عین ممکن تھا کہ اس دوران میں وہ کسی سازش کا تانا بانا بُن لیتی۔ بہرحال میں نے اس کے خیال سے پیچھا چھڑایا اور سوگیا۔

ٹیلی فون کی گھنٹی نے مجھے نیند سے جگایا۔ میرے سونے کے دوران میں صرف ڈائریکٹ ٹیلی فون کی گھنٹی ہی بج سکتی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولے بغیر ہاتھ بڑھا کر اس کا ریسیور اٹھایا۔ میری غنودگی زدہ آواز میں "ہیلو" سن کر دوسری طرف سے جو شخص بولا وہ یقیناً رحیم گل تھا۔ تب میں نے ایک آنکھ ذرا سی کھول کر ٹیبل کلاک کی طرف دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ درحقیقت

اسے صبح کے تین کہنا چاہئے تھا۔

"سو رہے تھے؟" رحیم گل نے نہایت شیریں لہجے میں پوچھا۔

"نہیں... خٹک ڈانس کر رہا تھا۔" میں نے جل کر جواب دیا۔

"اس کی جگہ کتھک ڈانس کرو تو نتائج زیادہ حوصلہ افزا ہوں گے۔" اس نے مشورہ دیا۔

"وہ ذرا مشکل ہے۔ تم جیسے خاندانی استاد کی رہنمائی کے بغیر نہیں کر سکتا۔" میں نے جواب دیا پھر یکدم ذرا چیخ کر پوچھا "چپٹا رڑ کے بچے! مجھے اس وقت کیوں جگایا ہے؟"

"ایک اہم خبر سنانے کے لئے۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"صبح تک انتظار نہیں کر سکتے تھے؟" میں نے کاٹ کھانے والے لہجے میں کہا۔

"میں نے سوچا کہیں تم شکوہ نہ کرو کہ تمہیں وہ خبر تاخیر سے کیوں دی گئی۔"

"کیا تمہیں بھی وہ خبر سوتے سے اُٹھا کر سنائی گئی ہے جس کا انتقام تم مجھ سے لے رہے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"میں تو ابھی سویا ہی نہیں ہوں میری جان! ہماری قسمت میں نیند کہاں!" اس نے ٹھنڈی سانس لی "میں تو شاید صبح تک بھی نہ سو سکوں۔ اس کے باوجود تم لوگ کہتے ہو کہ پولیس والے کام نہیں کرتے۔"

"کام تو کرتے ہیں۔ البتہ کوئی صحیح کام نہیں کرتے۔" میں نے تصحیح کی "جو بھی کرتے ہیں' غلط ہی کرتے ہیں۔ خیر اس پرانی بحث کو چھوڑو اور وہ خبر سناؤ جس نے تمہیں اتنا بے چین کر دیا ہے۔ خوش خبری ہے یا بد خبری؟"

"میں فیصلہ نہیں کر سکا کہ اسے خوش خبری سمجھوں یا بد خبری۔" وہ اب سنجیدگی سے بولا "ایک عام آدمی چونکہ تھوڑا سا کینہ پرور بھی ہوتا ہے اگر میں عام آدمی بن کر سوچتا ہوں تو یہ خوش خبری لگتی ہے لیکن اگر اعلیٰ انسانی اور اخلاقی اقدار کو ذہن میں رکھتے ہوئے سوچتا ہوں تو یہ بد خبری لگتی ہے۔ اس پر افسوس ہوتا ہے۔"

"خیر... تم اتنی موٹی موٹی باتوں میں مت اُلجھو۔ تمہارے ننھے سے ذہن کے لئے یہ بوجھ ناقابلِ برداشت ہوگا۔ تم اصل بات بتاؤ۔" میں نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

"اصل بات یہ ہے کہ رات گاڈمدر تمہارے پاس اس لئے نہیں پہنچ سکی تھی کہ راستے میں اس کو حادثہ پیش آگیا تھا۔" اس نے بتایا۔

"اوہ!" میری نیند غائب ہوگئی اور میں اُٹھ کر بیٹھ گیا "کیا وہ خود ڈرائیو کر رہی تھی؟"

"ہاں۔ لگتا ہے اسے خود ڈرائیو کرنے کا زیادہ شوق تھا جبکہ ڈرائیور کو ساتھ بٹھائے رکھتی تھی۔ حالانکہ عموماً جو لوگ خود ڈرائیو کرتے ہیں وہ پھر ڈرائیور کا جھنجٹ نہیں پالتے۔" رحیم گل

دستک

انوار صدیقی

بولا۔

"بعض امرا اس لئے بھی ڈرائیور کو ساتھ رکھتے ہیں کہ حادثے کی صورت میں اس پر ذمّے داری ڈالی جا سکے۔ اسے قربانی کے بکرے کے طور پر آگے کیا جا سکے۔" میں نے کہا "اور پیروانش یا گاڈمدر جیسے لوگوں کی تو ساری بادشاہی قربانی کے بکروں پر ہی چل رہی ہوتی ہے۔"

"مجھے معلوم ہے۔" رحیم گل بولا "لیکن جس طرح گاڈمدر کا حادثہ ہوا ہے اس میں تو وہ ڈرائیور کو قربانی کا بکرا بنانے کی پوزیشن میں بھی نہیں رہی تھی۔ وہ تو خود قربانی کی بکری... بلکہ بھینس بن گئی تھی۔ وہ اسٹیئرنگ وہیل اور سیٹ کے درمیان پھنس گئی تھی۔ وہ بہت طوفانی انداز میں ڈرائیونگ کر رہی تھی جبکہ میرے خیال میں اس وقت اس کی حالت سرے سے ڈرائیونگ کرنے کے قابل ہی نہیں تھی۔"

"اس نے گاڑی کسی دوسری گاڑی میں مار دی؟" میں نے پوچھا۔

"اس کے آگے ایک ٹرک جا رہا تھا جسے کسی وجہ سے اچانک بریک لگانا پڑے۔ گاڈمدر نے پجیرو پیچھے سے لے جا کر اس میں ٹھونک دی۔ جبکہ رفتار بہت تیز تھی۔ پہیوں کے نشانات بتاتے ہیں کہ اس نے آخری لمحے تک بریک لگانے کی کوشش نہیں کی جس کی وجہ سے حادثہ زیادہ خطرناک ہوگیا۔ شاید اسے آخری لمحے تک احساس نہیں ہو سکا کہ اس کی گاڑی ٹرک سے ٹکرانے لگی تھی اور تمہیں معلوم ہے ٹرک تو پھر ٹرک ہی ہوتا ہے۔ اس سے خواہ آگے سے ٹکراؤ یا پیچھے سے۔ نتیجہ خطرناک ہی ہوتا ہے۔"

"اب اس کی حالت کیا ہے اور اسے کون سے اسپتال لے جایا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے ایک سرکاری اسپتال کا نام بتایا پھر بولا "فی الحال وہ آپریشن تھیٹر ہی میں ہے۔ اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ گئی ہیں۔ سر اور ریڑھ کی ہڈی پر بھی شدید چوٹیں آئی ہیں۔ ڈاکٹروں کو انہی کی وجہ سے زیادہ تشویش ہے اور وہ یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہوش میں آنے پر اس کا کیا حال ہو۔"

میں چند سیکنڈ خاموش رہا تو وہ بولا "کیا سوچنے لگے؟"

"قدرت کے کاموں پر غور کر رہا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں... قدرت کے کام واقعی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔" وہ

فوراً بولا۔ "لیکن اصل مسئلہ یہ ہے کہ جنہیں قدرت کے کاموں پر غور کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے وہ تو غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔ ہم تم جیسے لوگ غور کرتے رہتے ہیں جو پہلے ہی اوپر والے کی قدرت کے بڑے قائل ہیں اور ہر وقت اس سے ڈرتے رہتے ہیں۔"

"میں دن میں کسی وقت گاڈمدر کو دیکھنے جاؤں گا۔" میں نے کہا۔

"ابھی جانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ایک آدھ دن تو شاید وہ انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں ہی رہے جہاں کسی کو اس سے ملنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ شیشے لگنے سے اس کا چہرہ بھی بُری طرح زخمی ہوا ہے۔" اس نے بتایا۔

میں ایک بار پھر متاسفانہ سے انداز میں خاموش ہوگیا۔ رحیم گل بولا "میں تمہیں ایک بات تو بتانا بھول ہی گیا۔ اس سے تمہیں قدرت کے کاموں پر غور کرنے کا ایک اور پہلو نظر آئے گا۔"

"وہ کیا؟" میں نے ذرا بے تابی سے پوچھا۔

"گاڈمدر کے ڈرائیور کو محض معمولی سی چوٹیں آئی ہیں حالانکہ وہ اس کے برابر ہی بیٹھا تھا اور درحقیقت وہی سائڈ ٹرک سے ٹکرائی تھی جدھر ڈرائیور تھا لیکن پجیرو کے گویا ٹرک سے مس ہوتے ہی اس کی طرف کا دروازہ کھل گیا اور وہ معجزاتی سے انداز میں اچھل کر باہر جا گرا۔ گرتے وقت ہی اس نے گاڑی کے ٹوٹنے پھوٹنے کی آواز سنی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ تاہم حادثے کی دہشت سے اس کے حواس جواب دے گئے تھے۔ وہ کچھ دیر پہلے ہی ساری بات بتانے کے قابل ہوا ہے ورنہ اس سے تو صحیح طور پر بولا ہی نہیں جا رہا تھا۔"

رحیم گل نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ واقعی ایک اور قابلِ غور پہلو تھا لیکن اس نے یہ بھی ٹھیک کہا تھا کہ جنہیں غور کرنے کی اشد ضرورت ہوتی ہے وہ غور کرنے کی زحمت نہیں کرتے۔

قدرے توقف سے رحیم گل بولا "میں فی الحال میں تمہیں یہی اطلاع دینا چاہتا تھا۔ مجھے یہ اطلاع اہم محسوس ہوئی اس لئے میں نے فون کرتے وقت یہ نہیں دیکھا کہ رات کا کون سا پہر ہے۔ امید ہے تمہاری ناکارہ کھوپڑی میں اب میرے خلاف زیادہ اُبال نہیں اٹھ رہا ہوگا۔"

"اُبال تو اٹھ رہا ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں تمہیں معاف ہی کردوں۔" میں نے فیاضانہ لہجے میں کہا۔

"بہت بہت شکریہ ظلِ سبحانی۔" اس نے طنزیہ شکرگزاری سے کہا اور سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد میں چاہنے کے باوجود دیر تک سو نہ سکا۔ میں بستر پر بیٹھا سوچتا رہا اور بس سوچتا ہی رہا۔ اس وقت شاید سپیدۂ سحر نمودار ہو رہا تھا جب نیند دبے قدموں میرے حواس کے آنگن میں اُتری اور میں بستر پر لڑھک گیا۔

دوسرے روز دوپہر کے کھانے کے بعد رحیم گُل میرے پاس پہنچا۔ علاقے کا ڈی ایس پی بھی اس کے ساتھ تھا مگر وہ رحیم گل کے سامنے کچھ ایسا مؤدب نظر آرہا تھا جیسے رحیم گل اس کا افسر ہو۔ بے چارہ کوئی شریف آدمی معلوم ہوتا تھا۔ پولیس کے محکمے میں کسی شریف آدمی سے مل کر مجھے واقعی حیرت بھی ہوتی تھی اور خوشی بھی۔

میں اس وقت آفس میں تھا۔ رسمی باتوں اور خاطر مدارات وغیرہ کے بعد رحیم گل ذرا پھیل کر بیٹھتے ہوئے بولا "تمہارے تھیلے میں جو بلی ہے اب وہ نکال کر ہمیں دکھا دو... ورنہ ہمارے علاقے کے ڈی ایس پی صاحب کو مجبوراً تمہیں ہی پیروانش کے قتل کے شبے میں حراست میں لینا پڑے گا۔"

"وہ کیوں؟" میں نے ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے پوچھا۔

"کیونکہ پیروانش کے قتل کی اطلاع ہمیں تم نے ہی دی تھی۔" اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

"کیا عمدہ اور معقول جواب ہے!" میں نے سر ہلاتے ہوئے داد دی "یعنی تم لوگوں کے ہاں واقعی یہ رواج پایا جاتا ہے کہ جو شخص کسی جرم کی اطلاع دے اس جرم کے الزام میں اسی کو دھر لو؟ میں تو سمجھا تھا لوگ خواہ مخواہ مبالغے سے کام لیتے ہیں اور تمہارے محکمے کے بارے میں افسانے مشہور کئے رکھتے ہیں۔"

"تم ٹھیک ہی سمجھتے تھے۔ لوگوں کی باتیں تو زیادہ تر مبالغہ آرائی اور افسانہ طرازی ہی ہوتی ہیں۔" رحیم گل اپنی چھڑی گھماتے ہوئے بولا "لیکن تمہیں ہم محض اس لئے پیروانش کے قتل کی اطلاع دینے پر اسی قتل کے الزام میں حراست میں لے لیں گے کہ تمہارا یہ اطلاع دینا... اور وہاں پایا جانا خالی از علت نہیں ہو سکتا۔ تم محض اتفاقاً تو وہاں نہیں پہنچ گئے ہوگے جہاں پہنچنے کا خیال اس کی ماں کو بھی نہیں آیا تھا۔"

"گھامڑ کہیں کے! اس صورت میں تم پہلے مجھ سے یہ سوال کرو نا کہ میں وہاں کیسے پہنچ گیا تھا۔" میں نے کہا۔

"سوال تو ہم تم سے بہت سے کریں گے۔" رحیم گل نے بڑی متانت سے سر ہلایا "پہلے تم ہمیں بتاؤ کہ تمہارے پاس اس کیس کی کون سی گمشدہ کڑیاں ہیں؟ تم نے فون پر اس قسم کی کوئی بات کی تھی۔"

"پہلے تم بتاؤ۔ تم لوگوں نے کیا رائے قائم کی ہے؟" میں نے کہا۔

"پولیس والے کسی کیس کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر مناسب وقت آنے پر بیان کرتے ہیں۔" رحیم گل نے اپنی متانت برقرار رکھتے ہوئے جواب دیا۔

اس موقع پر ڈی ایس پی نے مداخلت کی اور مجھ سے مخاطب ہوا "افضل صاحب! ہمیں اِدھر اُدھر کی باتوں اور ہنسی مذاق میں

وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ان باتوں کا موقع نہیں ہے۔ مجھے اس سلسلے میں جلد حکام بالا کو تفصیلی رپورٹ پیش کرنی ہے۔ وہ اس معاملے میں کافی دلچسپی لے رہے ہیں۔" اس کے لہجے میں بھی بڑی سنجیدگی تھی اور چہرے پر بھی۔ وہ مزاجاً کافی سنجیدہ آدمی معلوم ہوتا تھا۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "ہاں انہیں دلچسپی لینی بھی چاہیے۔ آخر ان کا ایک معزز کرم فرما دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔ میں تو خود ذرا سا بھی وقت ضائع کئے بغیر اصل بات کرنا چاہتا تھا لیکن یہ جو آپ کا انسپکٹر ہے نا۔ اس کے بارے میں کچھ پتا نہیں چلتا کہ یہ کب سنجیدہ ہے اور کب مذاق کر رہا ہے۔ آپ اسے سرکاری طور پر حکم دیں کہ یہ مذاق کرتے وقت ہاتھ کھڑا کر لیا کرے۔ میں تو اسے سنجیدہ ہی سمجھ کر سنجیدگی سے اس کی باتوں کے جواب دے رہا تھا۔"

"میں سنجیدہ ہی ہوں۔ ڈی ایس پی صاحب تم سے مذاق کر رہے ہیں۔" رحیم گل جلدی سے بولا "بہرحال۔ یہ مسئلہ زیادہ اہم نہیں ہے کہ کون سنجیدہ ہے اور کون مذاق کر رہا ہے۔ اصل اہم چیز وہ بلی ہے جو تمہیں اپنے تھیلے سے نکالنی ہے۔ بلی ذرا جاندار ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ بلی کی جگہ تم وہ چوہا نکال کر دکھا دو جو پہاڑ کھودنے پر برآمد ہوتا ہے۔ وہ عموماً مردہ ہی ہوتا ہے۔"

"میرے تھیلے میں ایک الیکٹرانک بلی ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا "امید ہے وہ تمہارے لئے تسلی بخش ثابت ہوگی اور مجھے گرفتار کرنے کا جو شوق تمہارے دل میں مچل رہا ہے اسے تم لوریاں دے کر سلا دو گے۔"

میں نے آفس کی سیف سے بیگ میں موجود ویڈیو کیمرا اور وی ٹی آر نکالا۔ آفس کے ایک کونے میں ٹی وی اور وی سی آر موجود تھا جو ہوٹل کے نظام سے بھی منسلک تھا۔ ہوٹل کے کمروں میں مہمانوں کو جو فلمیں وغیرہ دکھائی جاتی تھیں وہ اس آفس میں بھی دیکھی جا سکتی تھیں اور بوقتِ ضرورت سوئچ دبا کر یہ سلسلہ منقطع کر کے اپنی مرضی کی کوئی کیسٹ بھی لگائی جا سکتی تھی۔

میں نے کیسٹ نکال کر وی سی آر میں لگائی اور اسے ری وائنڈ کر دیا۔ رحیم گل اور ڈی ایس پی دونوں بغور میری طرف دیکھ رہے تھے۔ رحیم گل اب اِدھر اُدھر کی باتیں بھول گیا تھا۔

کیسٹ چلا کر میں نے واپس آ کر اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا "مجھے بتایا گیا ہے کہ اس کیسٹ میں پیردانش کی "موت کا منظر" محفوظ ہے۔ میں نے خود بھی ابھی تک یہ منظر نہیں دیکھا۔ اب آپ دونوں حضرات کے ساتھ بیٹھ کر پہلی بار دیکھنے لگا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم اس میں کس انداز سے اس منظر کو ریکارڈ کیا گیا ہے۔"

میرے یہ کہنے تک اسکرین پر منظر اچانک ہی نمودار ہو چکا تھا۔ منظر کیا تھا بس پیردانش اسی جناتی سے سائز کے بیضوی بیڈ پر چت پڑا تھا۔ تاہم اس کی توند اور سینے کے زیر و بم سے یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ وہ زندہ تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں مگر اس کے چہرے پر کچھ ایسی ہی مسکراہٹ تھی جیسی کسی درندے کے چہرے پر اس وقت ہو سکتی تھی جب وہ کوئی شکار چٹ کر کے شکم سیر ہو کر لیٹا ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ درندے کے چہرے کو چہرہ کہا جا سکتا تھا یا نہیں اور درندے مسکرانے کے اہل تھے یا نہیں۔۔۔ لیکن میرے ذہن میں اس وقت یہی تصور ابھرا تھا۔ کسی درندے ہی کی طرح وہ اس وقت فطری لباس میں تھا۔

کیمرا چونکہ ایک ہی جگہ فوکس تھا اور خودکار طریقے سے چل رہا تھا اس لئے دیر تک ایک ہی فریم آنکھوں کے سامنے رہا۔ پھر اچانک غزالہ اس فریم میں داخل ہوئی۔ غزالہ کی صورت، شکل، جسم اور نائٹ گاؤن، سب کچھ وہی تھا جو میں نے دیکھا تھا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں وہ مجھے ایک مختلف غزالہ محسوس ہوئی۔ یہ کوئی دوسری ہی لڑکی تھی۔

اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ اس کے چہرے پر بھی ایک عجیب سی درندگی اور وحشت تھی۔ وہ اپنے حسین چہرے اور نازک سراپا کے باوجود پیردانش ہی سے ملتی جلتی کوئی چیز نظر آ رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے چہرے پر بھی اس وقت درندگی تھی۔ فرق صرف یہ تھا کہ پیردانش کا چہرہ ایک آسودہ درندے کا چہرہ تھا جبکہ غزالہ کے چہرے پر خون کی پیاس تھی۔

اس کے ہاتھ میں وہی ہتھوڑا تھا جو اس وقت میرے پاس محفوظ تھا۔ اس نے اچھی طرح کیمرے کی طرف دیکھ کر گویا اپنا چہرہ کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرایا تھا۔ وہ واقعی اپنے کئے کا ٹھوس ثبوت چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس کی نظر میں اپنا پروگرام واضح تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اسے تو موت کو گلے لگانا ہی تھا اور اس نے بڑی جرأت سے اپنے اس فیصلے پر عین میری آنکھوں کے سامنے عمل کر کے دکھا دیا تھا۔

اس نے کیمرے کے سامنے دوسرے ہاتھ میں لمبی سی ایک کیل بلند کر کے دکھائی جو چھوٹے موٹے شہتیروں اور بلیوں وغیرہ میں ٹھونکنے کے کام آتی تھی پھر وہ سرہانے کی طرف سے اس طرح پیردانش کے قریب پہنچی کہ فریم سے باہر نہ ہونے پائے اور کیمرا اس کی تمام حرکات و سکنات کو محفوظ کر سکے۔ اسے یقیناً اچھی طرح اندازہ تھا کہ کیمرے کی رسائی کہاں تک تھی۔

کس طرح اس نے ہتھوڑا بلند کر کے کیل پیردانش کی پیشانی پر ٹکا کر ایک ہی وار میں پوری کی پوری کیل کھوپڑی میں اُتار دی۔ یہ میری زندگی کے ناقابلِ فراموش مناظر میں سے ایک تھا۔ اگر کیمرے کی آنکھ نے اس منظر کو محفوظ نہ کیا ہوتا اور میں زبانی یہ بات کسی کو بتاتا تو وہ شاید ہی یقین کرتا۔

رحیم گل اور ڈی ایس پی بھی دم بخود بیٹھے تھے۔ اس قسم کے منظر کی یقیناً انہیں بھی توقع نہیں تھی۔ انہوں نے ازراہِ مہربانی زیادہ سے زیادہ یہ سمجھ لیا ہوگا کہ میں پیردانش کا قاتل نہیں تھا لیکن یہ

امکان شاید ان کے ذہنوں میں نہیں تھا کہ اسے ٹھکانے لگانے والی وہ نازک اندام سی لڑکی تھی جو انہیں پیر دانش کے پہلو میں ہی مُردہ پڑی ملی تھی۔ ان کا تخیل اس سلسلے میں کوئی اور ہی کہانی بُننے کی کوشش کر رہا ہوگا۔

غزالہ کی درندگی کا وہ مظاہرہ چند لمحوں ہی میں ختم ہوگیا۔ اس کے حلق سے اس دوران میں درندوں کی غراہٹ جیسی آواز بھی نکل رہی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے حیرت ہوئی کہ جونہی کیل پیر دانش کی پیشانی میں پیوست ہوئی وہ اس مدہوشی یا خمار کی بے ہوشی میں بھی اُچھل پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں ایک لمحے کے لئے کھل گئی تھیں اور چاروں ہاتھ پیر ہوا میں بلند ہوگئے تھے لیکن دوسرے ہی لمحے وہ دوبارہ چت گرا اور ساکت ہوگیا۔ آنکھیں بھی دوبارہ بند ہوگئیں۔ وہ نہ تو تڑپا اور نہ ہی اس کے منہ سے کوئی آواز نکلی۔

اس کے ساکت ہوتے ہی غزالہ کیمرے کی طرف آتی دکھائی دی۔ اس کے حلق سے بدستور عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں اور چہرہ اندرونی کھنچاؤ سے بگڑا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے جسم نے کیمرے کے لینس کو ڈھانپ لیا اور پھر منظر غائب ہوگیا۔ اس نے قریب آکر کیمرا آف کردیا تھا۔ باقی کیسٹ سادہ معلوم ہوتی تھی۔

میں نے ریموٹ سے ٹی وی اور وی سی آر آف کردیا۔ ریوالونگ چیئر گھما کر میں نے از سرِ نو ڈی ایس پی اور رحیم گل کے چہروں کا جائزہ لیا۔ آج کل شہر کے جو حالات تھے ان میں وہ یقیناً روزانہ ہی اپنی پیشہ ورانہ مصروفیات کے دوران میں کوئی نہ کوئی ہولناک نظارہ دیکھتے ہی تھے لیکن اس نظارے نے بھی یقیناً انہیں اندر سے ہلا دیا تھا۔

کیمرے وغیرہ کا بیگ میز کے عقب میں میرے پیروں کے قریب ہی رکھا تھا۔ میں نے جھک کر ٹشو پیپر سے تھام کر اس میں سے ہتھوڑا نکال کر میز پر ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا "یہ ہے وہ ہتھوڑا جو ابھی آپ نے فلم میں اس لڑکی کے ہاتھ میں دیکھا۔ اس پر لڑکی کی انگلیوں کے نشانات ابھی محفوظ ہیں۔"

پھر میں نے بیگ کی جیب سے غزالہ کا خط بھی نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا اور کہا "اس لڑکی نے صرف اس فلم کو ہی کافی نہیں سمجھا۔ مزید تصدیق کے لئے اپنے ہاتھ سے یہ خط بھی لکھا۔ اس بے چاری کی بڑی شدت سے خواہش تھی کہ پیر دانش کے قتل کے سلسلے میں کسی بے گناہ اور غیر متعلق شخص کو قطعاً تنگ نہ کیا جائے۔" پھر میں ٹکڑا لگائے بغیر نہ رہ سکا "شاید اس بے چاری کو تجربہ تھا کہ ہماری پولیس کیسی ہوتی ہے۔"

رحیم گل اور ڈی ایس پی شاید ابھی جھٹکے سے سنبھلے نہیں تھے۔ انہوں نے اس ریمارک پر کوئی خاص توجہ نہیں دی اور نہ ہی کوئی احتجاج کیا حتیٰ کہ صفائی پیش کرنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ وہ دم بخود بیٹھے ٹکر ٹکر میری طرف دیکھ رہے تھے۔

ان کا یہ شریفانہ ردِعمل دیکھ کر میں نے بھی صلح جویانہ لہجے میں کہا "اب میں آپ لوگوں کو بتاتا ہوں کہ میں کس طرح اس لڑکی تک پہنچا اور اس سے میری کیا گفتگو ہوئی۔ ساری بات آپ کی سمجھ میں آجائے گی۔ آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ یہ واقعہ کس طرح پیش آیا۔"

وہ کچھ سنبھل کر بیٹھ گئے۔ میں نے انہیں سارا قصہ سنا دیا جو انہوں نے نہایت انہماک سے سُنا۔ آخر میں نے گہری سانس لے کر کہا "یہ تھی ساری بات! جس قصے کو میں، آپ اور ہماری عدالت انجام تک نہیں پہنچا سکی اسے ایک دستِ غیبی کی معمولی سی جنبش نے انجام کو پہنچا دیا۔"

دونوں ہی نے پُرخیال سے انداز میں سر ہلایا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد میں نے پوچھا "پیر دانش کی موت سے میری لاتعلقی ثابت کرنے کے لئے یہ شہادتیں کافی ہوں گی یا مجھے کچھ اور کرنا پڑے گا؟"

انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر ڈی ایس پی نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔ اس کا نام نثار احمد تھا۔ وہ محتاط لہجے میں بولا "میرا خیال ہے آپ کو کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اب ہمیں ذرا انتظار کرنا ہوگا اور یہ دیکھنا ہوگا کہ دانش کی ماں اگر صحت یاب ہوتی ہے تو وہ عدالت میں کیا مؤقف اختیار کرتی ہے بہرحال... اس صورت میں بھی اگر بہت ہوا تو آپ کو شاید ایک بار اپنا بیان ریکارڈ کرانے کے لئے عدالت میں حاضر ہونا پڑے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں... اصل دارومدار تو پولیس کی تفتیشی رپورٹ پر ہوتا ہے۔ ہم نے آپ کی بات پر یقین کرلیا تو سمجھ لیں عدالت نے بھی یقین کرلیا۔ پیر دانش کی موت کے بعد آپ اس کیس کو تقریباً ختم ہی سمجھیں۔ اس کی ماں نے اگر اسے کچھ گھسیٹنے کی کوشش بھی کی تو اسے زیادہ کامیابی نہیں ہوسکے گی۔"

"ایسا ہی ہو تو بہتر ہے۔" میں نے کہا "اپنی زندگی میں تو پیر دانش لوگوں کی زندگیاں برباد کرتا رہا۔ اب کہیں مرنے کے بعد لوگوں کا وقت نہ برباد کرتا رہے۔"

"اُمید تو ہے کہ ایسا نہیں ہوگا۔ بہرحال دیکھتے ہیں کہ مسز شاہ جی اسپتال سے نکلنے کے بعد کیا کرتی ہے۔" ڈی ایس پی نثار احمد نے کہا پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا "یہ چیزیں ہم لے جارہے ہیں۔ ایک زحمت آپ کو کرنا ہوگی جو باتیں آپ نے ہمیں بتائی ہیں وہ تحریری شکل میں کارآمد ہوں گی۔ یہ سب کچھ ہمیں آپ کے بیان کی صورت میں آپ کے دستخطوں کے ساتھ درکار ہوگا۔ عدالت نے ضروری سمجھا تو تصدیق اور جرح کے لئے آپ کو طلب کرلے گی۔"

"ٹھیک ہے۔ میرے وکیل صاحب میرا تحریری بیان آپ کو پہنچا دیں گے۔" میں نے انہیں رخصت کرنے کے لئے اٹھتے ہوئے کہا۔

وہ جاچکے تو میں نے سکون کی گہری سانس لی۔ میرے سر سے جیسے کوئی بوجھ اُتر گیا تھا۔

○☆○

اس کے تقریباً دو ماہ بعد مجھے ایک بار پھر "پیر پیلس" جانے کا اتفاق ہوا۔ میں رحیم گل اور ڈی ایس پی نثار احمد کے ساتھ گیا تھا۔ انہیں گاڈ مدر سے کچھ قانونی کاغذات پر دستخط کرانے تھے۔ رحیم گل نے مجھے فون کیا تھا تو اتفاقاً اس بات کا ذکر کردیا تھا کہ آج اسے گاڈ مدر سے ملنے پیر پیلس جانا تھا۔ تب میں نے خود ہی فرمائش کردی تھی کہ میں بھی اس کے ساتھ چلوں گا۔ وہ میری طرف آیا تو اکیلا نہیں تھا۔ ڈی ایس پی نثار احمد بھی اس کے ساتھ تھا۔ میں انہی کی گاڑی میں چلا گیا تھا۔

پیر پیلس کے در و دیوار وہی تھے مگر وہ ایک بدلا بدلا گھر لگ رہا تھا۔ محل نما وہ مکان گویا افسردگی کے غلاف میں لپٹا ہوا تھا۔ ہماری آمد کی اطلاع پر ایک شخص نے گیٹ کھول دیا اور پولیس کا ڈرائیور گاڑی اندر ہی لے گیا۔ اب وہاں آدمی بھی کم نظر آرہے تھے۔ جتنے موجود تھے ان کے چہرے مہرے سے بھی اس دبدبے اور طنطنے کا اظہار نہیں ہو رہا تھا جو میں نے پہلے دیکھا تھا۔ ہر چیز جوں کی توں تھی۔ پھر بھی مکان اُجاڑ اُجاڑ سا لگ رہا تھا۔ نہ جانے وہ کون سی غیر مرئی چیز تھی جو اُجڑ گئی تھی۔

ہمیں گاڈ مدر کو اپنی آمد کی اطلاع بھجوانے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ وہ سامنے لان پر ہی موجود تھی۔ وہ وہیل چیئر پر تھی۔ اس کی دونوں ٹانگوں پر گھٹنوں سے اوپر تک اب بھی پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ یہ پلاسٹر اس کی ٹانگوں پر تیسری مرتبہ چڑھایا گیا۔ اس کی ٹانگوں کے تین آپریشن ہوچکے تھے مگر نہ تو ٹانگوں کے ان ٹکڑوں کو صحیح طور پر جوڑا جاسکا تھا جو ریزہ ریزہ ہوگئے تھے اور نہ ہی ان میں اسٹیل کی راڈ فٹ ہوسکی تھی جس سے یہ اُمید رکھی جاسکتی تھی کہ وہ کچھ عرصے کے بعد چلنے کے قابل ہوسکے گی۔

اس کے وکیلوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ سرجنوں پر کیس کردے کہ اس کا علاج ٹھیک طرح نہیں کیا گیا تھا۔ اس پر سرجنوں نے بڑا عجیب و غریب جواب دیا تھا۔ انہوں نے خود مطالبہ کیا تھا کہ جلد از جلد اس مشورے پر عمل کیا جائے اور اگر کسی عدالت میں یہ ثابت ہوگیا کہ کسی دوسرے ترقی یافتہ ملک میں بھی اس کی ٹانگوں کے اس سے بہتر آپریشن ممکن تھے تو وہ پریکٹس چھوڑ دیں گے۔

تاہم گاڈ مدر نے اس جواب سے پہلے ہی مقدمے بازی وغیرہ سے منع کردیا تھا۔ اس حادثے سے اس کے جسم میں ہی نہیں... اس کے ذہن میں بھی بڑے انقلابات آئے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس نے قسمت پر شاکر رہنا سیکھ لیا تھا۔

ہم جب اس کے قریب پہنچے تو اس کی حالت زیادہ واضح طور پر دیکھ کر مجھے ایک دھچکا سا لگا۔ حادثے کے بعد میں پہلی بار اسے دیکھ رہا تھا۔ اب وہ ایسی عورت دکھائی نہیں دے رہی تھی جس کے ساتھ گاڈ مدر کا لقب موزوں محسوس ہوتا۔ یہ محض مبالغہ آرائی معلوم ہوتی۔

وہ ایک ٹوٹی پھوٹی، شکست خوردہ اور قابلِ رحم عورت تھی۔ ان دو مہینوں میں اس کا وزن نہ جانے کتنا کم ہوچکا تھا۔ وزن کم ہونا تو اس کے حق میں شاید بہتر ہی رہا ہو لیکن اس سے اس کی شخصیت بدل کر رہ گئی تھی۔ صرف یہی نہیں، چہرے پر مندمل زخموں کے نشانات نے رہی سہی کسر پوری کردی تھی اور اسے بالکل ہی ناقابلِ شناخت بنادیا تھا۔

اس کی گردن ذرا ٹیڑھی ہوگئی تھی جس کی وجہ سے سر ایک طرف کو جھک گیا تھا۔ اس وقت گو کہ وہ گردن میں مخصوص سرجیکل کالر پہنے ہوئے تھی۔ اس کے باوجود سر ایک طرف کو ذرا جھکا ہوا ہی دکھائی دے رہا تھا۔

ہم اس کے قریب پہنچے تو وہ چند سیکنڈ خالی خالی نظروں سے ہماری طرف دیکھتی رہی گویا پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔ میرے خیال میں وہ ہمیں پہچان تو چکی تھی بس یہ شاید اس کی عدم دلچسپی کی انتہا تھی۔ اس کے سامنے بہت سی لان چیئرز موجود تھیں۔ آخر اس نے بائیں ہاتھ سے ہمیں بیٹھنے کا اشارہ کیا کیونکہ وہ اب بول بھی نہیں سکتی تھی۔ اس کی قوتِ گویائی جاتی رہی تھی۔

میں گو کہ حادثے کے بعد اسے دیکھنے نہیں جاسکا تھا لیکن مجھے اس کے بارے میں ہر خبر ملتی رہی تھی۔ اس کی ٹانگوں کے بارے میں سرجنوں کا کہنا تھا کہ اگر کسی معجزے کے تحت ہڈیاں صحیح طرح جُڑ جاتیں تب بھی کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ ریڑھ کی ہڈی کی چوٹ کی وجہ سے اس کا نچلا دھڑ مفلوج ہوچکا تھا۔ وہ اب بیرونِ ملک علاج کرالیتی تب بھی چلنے کے قابل نہیں ہوسکتی تھی۔ البتہ اس کے چہرے پر زخموں کے نشانات کچھ عرصے بعد کاسمیٹک سرجری کے ذریعے کافی حد تک ٹھیک کئے جاسکتے تھے۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ اسے یہ نشانات دور کرانے سے بھی دلچسپی رہی تھی یا نہیں؟

ہم بیٹھ چکے تو اس نے ملازم کو اشارہ کیا جو قریب ہی ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ ملازم ہم سے پوچھنے لگا "آپ لوگ کیا کھانا پینا پسند کریں گے؟"

"کچھ بھی نہیں۔ کسی تکلّف کی ضرورت نہیں۔ ہم صرف ایک چھوٹے سے سرکاری کام سے آئے ہیں۔" رحیم گل بولا پھر گاڈ مدر سے مخاطب ہوا "پیر دانش کی موت کے بعد سرکار نے اس کے خلاف قائم کئے گئے مقدمات ختم کرنے کا فیصلہ کیا ہے تاہم اگر آپ یا اس کا کوئی اور قریبی رشتے دار اسے بعد از مرگ بری کرانے کے لئے مقدموں کی پیروی کرنا چاہے تو کرسکتا ہے۔ آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

گاڈ مدر نے اپنی وہیل چیئر کے ہتھے پر رکھے ہوئے چھوٹے سے نوٹ پیڈ پر بائیں ہاتھ سے کچھ لکھا اور کاغذ پھاڑ کر رحیم گل کی طرف بڑھایا۔ اس پر شکستہ اور ٹیڑھے میڑھے الفاظ میں لکھا تھا

"مجھے اب ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں کچھ کرنا نہیں چاہتی۔ بہتر ہے اب اس قصّے کو ختم کردو۔"

رحیم گل نے اثبات میں سرہلایا اور ایک فائل کھول کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے ایک ٹائپ شدہ عدالتی کاغذ پر انگلی رکھی "اس صورت میں آپ کو اس پر دستخط کرنا ہوں گے۔" وہ ملائمت سے بولا "آپ چاہیں تو اسے پڑھ لیں یا اپنے وکیلوں کو بلا لیں۔"

گاڈمدر نے وکیلوں کو بلانا تو درکنار، اس کاغذ کے مندرجات پر نظر ڈالنے کی بھی زحمت نہیں کی اور لرزتے ہوئے بائیں ہاتھ سے دستخط گھسیٹ دیئے۔ رحیم گل نے بغور دستخط کا جائزہ لیا پھر اسی فائل کے ایک اور کاغذ کو دیکھ کر غالباً گاڈمدر کے دوسرے دستخط سے موازنہ کیا۔

ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ معذرت خواہانہ سے لہجے میں بولا "اب چونکہ آپ بائیں ہاتھ سے دستخط کرتی ہیں اس لئے یہ آپ کے پُرانے دستخط سے نہیں ملتے۔ آپ کو تھوڑی سی زحمت اور کرنی ہوگی۔ دستخط کے ساتھ ہی آپ کو انگوٹھے کا نشان بھی لگانا ہوگا اور اپنے دو آدمیوں کے دستخط بطور گواہ کرانے ہوں گے۔"

اس نے جیب سے اسٹیمپ پیڈ نکال لیا۔ اس نے یقیناً تمام امکانات کا خیال رکھا تھا اور تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ گاڈمدر نے اسی کی مدد سے بلا پس و پیش انگوٹھے کا نشان بھی لگا دیا۔ پھر اپنے سیکریٹری اور منیجر کو بُلوا کر گواہ کے طور پر دستخط بھی کرا دیئے۔ صرف چند منٹ میں یہ کام ہوگیا۔ رحیم گل اور نثار احمد اٹھنے کے لئے پر تولنے لگے۔

ماحول پر ایک عجیب اُلجھن آمیز سا سکوت طاری تھا۔ گاڈمدر خالی خالی نظروں سے میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے ان آنکھوں میں اپنے لئے نفرت کی پرچھائیاں تلاش کرنا چاہیں لیکن وہاں میرے لئے نفرت کا کوئی نشان نہیں تھا۔ میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن زبان میرا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ زندگی میں بہت دنوں بعد ایسا موقع آیا تھا کہ میں اپنی چوکڑی بھول گیا تھا۔

آخر نثار احمد اور رحیم گل اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ تب میں نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا "مسز شاہ جی! جو کچھ ہوا اس پر مجھے افسوس ہے۔ میرا منشا یہ نہیں تھا۔ شاید آپ کو اب احساس ہوگیا ہو۔" میں نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ میں ذکر کرنا چاہتا تھا کہ ان ماں بیٹے کے کرتوت نے مجھے ان کے خلاف حرکت میں آنے پر مجبور کیا تھا لیکن میں یہ بات نہ کہہ سکا۔ شاید اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اس نے ایک اور پرچی پر کچھ گھسیٹا اور پرچی میری طرف بڑھا دی۔ اس پر لکھا تھا "میں نے تمہیں معاف کیا۔ تم بھی مجھے معاف کردینا۔ اللہ بھی ہم سب کو معاف کرے۔ مجھے اب ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ تم جاسکتے ہو۔"

ہم خاموشی سے ڈرائیو وے کی طرف چل دیئے۔ ہم گاڑی میں بیٹھ کر گیٹ سے نکل آئے تو میں نے کہا "معافی مانگنے اور معاف کرنے کا سلسلہ اگر اتنا آگے جانے سے پہلے شروع ہوجایا کرے تو کتنا اچھا ہو۔ لوگ نہ جانے کتنے نقصانات سے بچ جائیں۔"

"فرعونیت کا جادو بڑی مشکل سے اُترتا ہے۔" رحیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "فرعونیت بڑی عجیب چیز ہے۔ انسان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود اسے اپنا آپ بہت اچھا لگتا ہے۔ اپنے گناہ بھی کارِخیر نظر آتے ہیں۔ اپنی خباثت بھی خوب صورت معلوم ہوتی ہے۔"

نثار احمد بولا "اس جیسی عورت کے بارے میں تو یہ بھی غنیمت ہے کہ اس حال کو پہنچنے کے بعد بھی اس میں اتنا انقلاب آگیا ورنہ مجھے تو اندیشہ تھا کہ رسّی جل گئی ہوگی مگر بل نہیں گیا ہوگا۔"

"بعض شاخیں ٹوٹ جانے کے بعد لچک دار ہوجاتی ہیں۔" میں نے کہا۔

رحیم گل بولا "ابھی تو گاڈمدر کو ایک اور شکست اور ریخت کا سامنا ہوگا۔"

"وہ کیا؟" میں نے پوچھا۔

"پیر دانش کی پہلی بیوی کے تین بچے بالغ ہیں۔ دوسری بیوی کے دو بچے بالغ ہیں۔ تیسری بیوی کے بچے ابھی چھوٹے ہیں۔ ان سب نے ان وراثت کے جھگڑوں کے لئے آستینیں چڑھانا شروع کردی ہیں۔ پیر دانش کے مالی معاملات بہت اُلجھے ہوئے ہیں۔ حرام کی کمائیوں میں اکثر اسی طرح ہوتا ہے۔ مرکزی شخصیت ایک ہی ہوتی ہے، سارا کھیل تماشا اسی کے بل پر چل رہا ہوتا ہے۔ اب بہت سی دولت اور اثاثے تو ویسے ہی غائب ہوجائیں گے۔ جس کے جو ہاتھ لگے گا وہ لے بھاگے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ تینوں بیویاں اپنے بچّوں کو آگے کر کے مقدمے بازیوں میں لگ جائیں گی۔ اس سارے چکر کے دوران میں وہیل چیئر پر بیٹھی ہوئی گاڈمدر کا نہ جانے کیا حشر ہوگا۔"

نثار احمد بولا "اگر وہ چاہتی تو شاید اب بھی حالات پر گرفت کافی مضبوط رکھ سکتی تھی لیکن وہ ظاہری طور پر ہی نہیں اندر سے بھی ٹوٹ پھوٹ گئی ہے۔"

"ٹوٹ پھوٹ بعض لوگوں کو بہتر انسان بنا دیتی ہے۔" میں نے کہا۔

"گاڈمدر کے بارے میں ابھی یہ بات یقین سے نہیں کہی جاسکتی۔" رحیم گل سنجیدگی سے بولا "ممکن ہے یہ محض ایک عارضی کیفیت ہو۔ ایسے لوگوں میں خباثت کی جڑیں بہت گہری ہوتی ہیں۔"

میں نے اس کے خیال کی تردید نہیں کی۔ اس کے نکتے میں وزن تھا۔

کچھ دیر بعد انہوں نے مجھے ہوٹل کے سامنے اُتار دیا اور خود واپس روانہ ہوگئے۔

اسی شام رحیم گل سے میری دوبارہ ملاقات ہوئی لیکن اس وقت وہ کسی کام سے نہیں بلکہ محض گپ شپ کے لئے آیا تھا اور سادہ لباس میں تھا۔ اسے کچھ فرصت میسر آگئی تھی یا یوں کہنا چاہئے تھا کہ اس نے زبردستی اپنے لئے فرصت نکالی تھی۔ اس کے ذہن پر دیگر معاملات کے علاوہ پیر دانش والے قصّے کی وجہ سے کافی دباؤ تھا۔ اب وہ کچھ سستانا چاہتا تھا۔

اتفاقاً اس کی آمد کے کچھ دیر بعد ہی زرتاج بھی آپہنچی۔ رحیم گل کی موجودگی میں وہ کچھ ریزرو سی ہوجاتی تھی اور رحیم گل کے انداز و اطوار اور گفتگو میں بھی خواہ مخواہ ایک تکلف اور کھنچاؤ سا آجاتا تھا لیکن اس روز میری کچھ دیر کی کوشش سے یہ تکلف اور کھنچاؤ دور ہوگیا۔ میں نے ان دونوں سے بیک وقت چھیڑ چھاڑ اور فقرے بازی شروع کردی۔

وہ بھی چوکنے والے نہیں تھے۔ موڈ خواہ کیسا بھی ہوتا، حسبِ توفیق جواب دینے کی کوشش کرتے تھے۔ اس طرح میرے بیک وقت دونوں محاذوں پر چھیڑ چھاڑ کرنے سے خاصی پھلجھڑیاں چھوٹیں اور ماحول خوشگوار ہوگیا۔ ورنہ وہ دونوں بیک وقت میرے سامنے آجاتے تو میرے لئے بڑا مسئلہ سا کھڑا ہوجاتا تھا۔ اس وقت شاید ہم تینوں ہی کچھ دیر کے لئے اپنے اپنے تفکرات سے نجات یا فرار چاہتے تھے۔ اس لئے جلد ہنسی مذاق میں لگ گئے۔ ہلکے پھلکے اسنیکس اور کافی وغیرہ کا دور چل رہا تھا۔

اسی دوران میں زرتاج بولی "لگتا ہے اب تمہارا یہاں ہوٹل کے کام میں کافی دل لگ گیا ہے۔ کافی دنوں سے تم نے لاہور کا رُخ ہی نہیں کیا۔"

"لاہور کا نام مت لو۔ ابھی راحیلہ کا فون آجائے گا۔" میں نے فون کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اسے تو ویسے بھی گویا الہام ہوجاتا ہے کہ کب تم میرے پاس بیٹھی ہو۔"

رحیم گل ہچکچاتے ہوئے بولا "یہ.... راحیلہ کیا تمہاری کوئی چاہنے والی ہیں؟"

زرتاج نے استہزائیہ سی نظروں سے میری طرف دیکھا اور رحیم گل سے مخاطب ہوئی "کیوں بے چارے کے دل کے زخموں کو چھیڑ رہے ہو۔ معاملہ اُلٹا ہے۔ راحیلہ ان کی چاہنے والی نہیں ہے بلکہ موصوف راحیلہ کے چاہنے والے ہیں اور اُدھر وہ معاملہ ہے کہ......"

میں نے زرتاج کو گھورا اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی پھر وہ یکدم ہی گویا ایک جھٹکے سے موضوع تبدیل کرتے ہوئے بولی "وہ تم دونوں پیر دانش والے چکر سے مکمل طور پر چھٹکارا پاچکے ہو یا نہیں؟"

زرتاج بھی اس معاملے کی تمام تفصیلات سے واقف تھی البتہ ہم نے اسے گاڈمدر سے اپنی آج کی ملاقات کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ میں اور رحیم گل دونوں ہی ایک لمحے کے لئے خاموش ہوگئے۔ پھر رحیم گل اسے آج کی ملاقات کا احوال بتانے لگا۔

رحیم گل نے بات ختم کی تو زرتاج ایک طویل سانس لے کر بولی "بڑی افسوس ناک سی کہانی ہے لیکن زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ انسان ایسی افسوس ناک کہانیوں سے قطعاً عبرت نہیں پکڑتا۔"

ایک لمحے کی بوجھل سی خاموشی کے بعد میں نے کہا "بہرحال اس سارے واقعے سے میرا حوصلہ بہت بڑھا ہے اور اس نظریے پر میرا ایمان مزید پختہ ہوگیا ہے کہ اگر آپ خلوصِ نیت کے ساتھ کسی صحیح کام کے لئے جدوجہد کررہے ہوں تو ضرور کامیابی ہوتی ہے۔"

"خلوصِ نیت تو بڑی کمال کی چیز ہے پیارے!" رحیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا "خلوصِ نیت کی وجہ سے تو بعض اوقات بُرے لوگوں کو اپنے بُرے کاموں میں کامیابی نصیب ہوجاتی ہے کیونکہ وہ بُرے کام بھی یہ سمجھ کر کررہے ہوتے ہیں کہ وہ کوئی بڑا جہاد کررہے ہیں۔"

میں نے ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا "میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ پیر دانش والے قصّے کو میں نے ہی انجام تک پہنچایا ہے اس معاملے میں تم سمیت کئی لوگوں نے میری مدد کی۔ اس کے باوجود درحقیقت ایک غیبی ہاتھ نے ہی ہمارا کام آسان کیا ورنہ ابھی اس میں بڑی دشواریاں تھیں۔ لیکن میں اتنا ضرور کہوں گا کہ اس کام کا آغاز میں نے ہی جوش میں آکر کیا تھا۔ اس کے بعد خود بخود گویا اسباب بنتے چلے گئے۔ نقصان تو اس میں بہت ہوا۔ ہم مونا... فرح... غزالہ اور ظفر جمال کو مرنے سے نہیں بچا سکے.... شاید اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت تھی۔ لیکن اتنا ضرور ہوا کہ معاشرے سے کم از کم ایک فتنہ تو کم ہوا۔ دنیا کی بدصورتی کچھ تو کم ہوئی ہوگی۔ ذرّہ برابر ہی سہی۔"

"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ اصل بات کرو۔" رحیم گل نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ اب میں شغل کے طور پر اسی قسم کے کام کیا کروں گا۔" میں نے جواب دیا۔

"کس قسم کے کام؟" رحیم گل نے وضاحت چاہی "جیسے پیر دانش کرتا تھا؟"

"تمہارے منہ میں خاک...." میں نے تیزی سے کہا "خدا نہ کرے کہ میں پیر دانش کے نقشِ قدم پر چلوں۔ میں تو اس قسم کے لوگوں کو انجام تک پہنچانے کی بات کررہا ہوں۔ میرا مطلب ہے کہ جس طرح مونا کی بہن عذرا میرے پاس مدد کی درخواست لے کر آئی تھی اس طرح اگر کوئی کسی معاملے میں مجھ سے مدد چاہا کرے گا

تو میں ذرا ابتدائی معلومات کرنے اور حالات کا جائزہ لینے کے بعد ہی ہامی بھرلیا کروں گا۔"

رحیم گل خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا۔ میں نے بات جاری رکھی "عذرا جب میرے پاس مونا کی تلاش کے سلسلے میں مدد کی درخواست لے کر آئی تو میں نے اسے گمشدگی کا ایک عام سا معاملہ سمجھ کر انکار کردیا تھا۔ ویسے بھی میں تم پولیس والوں کے کاموں میں ٹانگ اُڑانا نہیں چاہتا تھا لیکن جب مجبور ہو کر میں نے اس کی مدد کی ہامی بھری تو یہ معاملہ نہ ورنہ کچھ اور ہی نکلتا چلا آیا۔ اس کی کڑیاں نہ جانے کہاں سے کہاں جا ملیں اور ایک چکر میں نہ جانے کتنے چکر نکل آئے۔"

"اب تمہیں شوق چڑھ رہا ہے کہ اس قسم کے کاموں میں آئندہ بھی ٹانگ اُڑانی چاہئے؟" رحیم گل بدستور مجھے گھور رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا' زرتاج استہزائیہ سے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوئی "لگتا ہے کاروبار میں آج کل تمہارا دل نہیں لگ رہا؟ یا پھر روپیہ بہت کما لیا ہے؟"

"کاروبار میں اس طرح تو میں نے کبھی دل نہیں لگایا کہ اس کے پیچھے جان دے دوں۔" میں نے جواب دیا "ویسے بھی میرا کاروبار تو "خودکار" ہے۔ میں دلچسپی لوں یا نہ لوں' چل ہی رہا ہے۔ اور کچھ نہ کچھ پھل پھول بھی رہا ہے۔ حالات کی تمام تر خرابی کے باوجود منافع دے ہی رہا ہے اور ہر تھوڑے عرصے بعد اس میں کوئی نہ کوئی وسعت بھی آ ہی جاتی ہے۔ میں نے کاروبار کے چکروں میں اپنے آپ کو پاگل نہیں بنا رکھا۔ میں زندگی کو زندگی کی طرح گزارنا چاہتا ہوں۔ میرے پاس اب بھی جتنا کچھ ہے یہی میری سات نسلوں تک ختم نہیں ہوگا۔ اور ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ نسلیں دنیا میں آنے میں کامیاب بھی ہوسکیں گی یا نہیں۔"

"اگر راحیلہ کے چکر میں رہو گے پھر تو شاید کامیاب نہیں ہوں گی۔" زرتاج نے فوراً لقمہ دیا۔

میں نے ایک بار پھر اسے گھورا "بھئی راحیلہ کو بیچ میں مت لاؤ۔ اس وقت کچھ اور طرح کی گفتگو ہو رہی ہے۔ بہت سنجیدہ موضوع پر بات ہو رہی ہے۔"

"میں سمجھی تھی راحیلہ بھی بہت سنجیدہ موضوع ہے۔" زرتاج معصومیت سے بولی۔

"نہیں۔ وہ رنجیدہ موضوع ہے۔" میں نے کہا۔

رحیم گل اصل موضوع پر رہتے ہوئے بولا "تمہارا مطلب ہے کہ اس قسم کے "پنگے" لینے کا عمل جاری رکھا جائے؟"

"بھئی میرے پاس فرصت بھی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ میں جب چاہوں' جتنی چاہوں فرصت نکال سکتا ہوں۔ وسائل بھی ہیں۔ کچھ ساتھی بھی ہیں۔ تم جیسے نکمے اور نالائق پولیس افسران سے دوستی بھی ہے اوپر بھی تھوڑا بہت اثر رسوخ ہے۔ کیوں نہ کچھ تعمیری کام بھی کیا جائے صرف کاروبار کرتے رہنا تو کوئی زندگی نہیں ہے۔"

"تمہیں خدمتِ خلق کا شوق چرایا ہے؟" اب زرتاج نے بھی مجھے گھورا۔

"نہیں اسے خدمتِ خلق بھی نہیں کہہ سکتے۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا "یا پھر شاید یہ ذرا مختلف قسم کی خدمتِ خلق ہوگی۔ میں یونہی اٹھ کر ہر ایک کی مدد کے لئے نہیں چل دوں گا۔ فرض کرو کوئی غریب انسان میرے پاس کسی معاملے میں مدد کی درخواست لے کر آتا ہے اور معاملہ اہم معلوم ہوتا ہے تو میں اس کو خدمتِ خلق ہی سمجھ کر اس کے کام آنے کی کوشش کروں گا لیکن اگر کوئی لکھ پتی یا کروڑ پتی آتا ہے تو اس سے تھوڑی سی کاروباری گفتگو بھی ہوگی۔"

"یعنی اس سے فیس لو گے؟" رحیم گل غرایا۔

"اگر لے بھی لوں گا تو اس سے تمہیں تو تکلیف نہیں ہونی چاہئے۔" میں نے جواب دیا "اگر کسی دولت مند آدمی سے اپنے قیمتی وقت کا معمولی سا معاوضہ لے بھی لیا جائے تو اس میں کیا برائی ہے۔"

"وہ "معمولی" سا معاوضہ کیا ہوگا؟" رحیم گل چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔

"میرا خیال ہے اس کا کوئی طے شدہ اصول تو نہیں ہوسکتا۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ یہ سب کچھ اسی وقت میرے ذہن میں آرہا تھا اور میں ساتھ کے ساتھ بات کئے جا رہا تھا "کسی بھی معاملے میں اس کے بہت سے پہلوؤں کو مدِ نظر رکھنا پڑے گا۔ مثلاً جو شخص مسئلہ لے کر آیا ہے اس کی اپنی حیثیت کیا ہے۔ مسئلے کی نوعیت کیا ہے۔ یعنی وہ اہم ہے یا غیر اہم۔ اسے حل کرنا آسان ہے یا مشکل۔ اندازاً اس میں میرا کتنا وقت صرف ہو جائے گا۔ یہ سب باتیں سوچنا پڑیں گی۔ گویا معاوضہ چند ہزار بھی ہوسکتا ہے اور چند لاکھ بھی....."

"بلکہ دھندا چل نکلا تو معاملہ کروڑ دو کروڑ تک بھی جا سکتا ہے۔" رحیم گل بدستور مجھے گھورتے ہوئے بولا۔

"کیوں نہیں۔" میں نے اسے چڑانے والے انداز میں کہا "لیکن تم اس کے لئے "دھندا" کا لفظ کیوں استعمال کر رہے ہو خبیث آدمی؟ میں کوئی یہاں چرس فروشی' ہیروئن فروشی یا اسلحے کی اسمگلنگ وغیرہ تو شروع نہیں کر رہا ہوں۔ تم پولیس والوں کو تو شرفا کا بزنس' مشغلے' خدمتِ خلق سب کچھ ہی "دھندے" نظر آتے ہیں۔"

"تم اپنے آپ کو شرفا میں شمار کرتے ہو؟" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا۔

"کم از کم کسی پولیس والے کے مقابلے میں تو میں بہت زیادہ شریف آدمی ہوں۔" میں نے اس کی دُکھتی رگ... چھیڑی۔

"ہاں بھئی!" اس نے ٹھنڈی سانس لے کر یکدم ہی بدلے

بدلے سے لہجے میں کہا "باقی سب لوگ جو چاہے کرتے پھریں ان کے اعمال کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔ گالیاں کھانے کے لئے ایک پولیس ملی ہوئی ہے۔"

زرتاج گویا ہمارے درمیان صلح صفائی کراتے ہوئے بولی "تم دونوں کو ایک دوسرے پر الزامات کی گولا باری کرنے کی ضرورت نہیں۔ اچھی بھلی معقول گفتگو ہو رہی تھی کہ تم نے سوکنوں کی طرح لڑنا شروع کردیا۔"

پھر اس نے رحیم گل کو سمجھایا "بھئی افضل آخر بزنس مین ہے۔ بزنس مین ہر معاملے میں بزنس کا پہلو تو ڈھونڈ ہی لیتا ہے۔ یہ لوگ تو کسی کے جنازے میں شرکت کے لئے جاتے ہیں تو وہاں بھی کوئی بزنس ڈیل کر آتے ہیں۔"

"آخر تم بھی غداری کر ہی گئیں۔ دشمن سے جا ملیں۔" میں نے آہ بھر کر کہا "آخر جاگیردارنی ہو نا۔ جاگیرداروں اور پولیس والوں کا ہمیشہ سے گٹھ جوڑ رہا ہے۔"

"ہم تو اب سیاسی بیانات پر اُتر آئے۔" زرتاج مصنوعی خفگی سے بولی "سیاسی بیانات سے پرہیز کرو۔ ہم سیاسی لوگ نہیں ہیں۔"

"سوری۔" میں نے فوراً معذرت کی "اگر تمہیں میرے الفاظ سے سیاست کی بُو۔۔۔ بلکہ بدبُو آئی تو میں معافی چاہتا ہوں۔ لیکن تم لوگ بھی تو دل دکھانے والی باتیں کر رہے ہو۔ میں تو نیک نیتی سے ایک شغل شروع کرنے کی سوچ رہا ہوں۔ تم لوگوں نے اس میں پیداگیری کے پہلو تلاش کرنے شروع کردیئے جیسے یہ بھی کوئی سرکاری منصوبہ ہے۔ تم پہلے پوری بات تو سُن لیتے۔"

"چلو۔۔۔ سُنا دو۔۔۔ جو کچھ رہ گیا ہے وہ بھی سُنا دو۔" رحیم گل گویا دل پر پتھر رکھتے ہوئے بولا۔

"اگر میرے پاس کوئی ایسا شخص مسئلہ لے کر آئے گا جو میرے وقت کی قیمت ادا کرنے کے قابل نہیں ہوگا لیکن اس کا مسئلہ حقیقتاً سنگین اور توجہ طلب ہوگا تو میں بلا معاوضہ بھی اس کے لئے جو کچھ کرسکا وہ ضرور کروں گا۔ بلکہ اگر الٹا کوئی مدد کا مستحق ہوا تو میں اس کی مدد بھی کروں گا۔"

"ہاں اگر اتنی دولت میں سے دو چار ہزار نکال بھی دو گے تو کیا فرق پڑجائے گا۔" رحیم گل حقارت سے بولا "سمندر سے چند قطرے نکل جائیں تو اس میں کمی نہیں آتی۔"

"میں نے سیکڑوں یا ہزاروں کی بات نہیں کی ہے۔" میں نے اسے ڈانٹ پلانے کے انداز میں کہا "مسئلہ اگر لاکھوں کا بھی ہوا تو میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

"میرا۔ میرا!" رحیم گل نے ہاتھ اونچے کرکے ہلکی سی تالیاں بجائیں "آج اپنے سیٹھ صاحب بڑی سخاوت کے موڈ میں ہیں۔"

زرتاج منہ بنا کر بولی "ابھی صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔ جب عمل کی نوبت آئے گی تب دیکھیں گے۔"

رحیم گل مجھ سے مخاطب ہوا "ویسے بائی داوے۔ تم یہ باتیں ہمیں کیوں بتا رہے ہو؟"

"کمپنی کی مشہوری کے لئے۔" میں نے جواب دیا "یہ خیال چونکہ کچھ دیر پہلے ہی میرے ذہن میں کلبلانا شروع ہوا ہے۔ اور فی الحال صرف تم دونوں ہی حاضر اسٹاک میں دستیاب ہو۔ اس لئے تمہارے کان میں بات ڈال دی ہے کہ شاید کوئی قسمت کا مارا تم لوگوں سے ہی آٹکرائے اور تم دونوں اپنی اپنی مجبوریوں کی وجہ سے اس کے لئے کچھ نہ کرسکو تو اسے میری طرف بھیج دینا۔ یہ ماؤتھ پبلسٹی ہے۔ اکثر کام اسی طرح محدود پیمانے سے شروع ہوتے ہیں نا۔"

"اس کام کی تو اگر پبلسٹی ہوگئی تو تمہارے ہاں کھڑکی توڑ ہفتہ شروع ہوجائے گا۔ یعنی تمہارے ہوٹل کی تمام کھڑکیاں ٹوٹ جائیں گی۔ بلکہ عین ممکن ہے تمہارے اپنے چوکھٹے کی بھی شامت آجائے۔ خصوصاً اگر لوگوں کو پتا چل گیا کہ تمہاری اس پیشکش میں خدمتِ خلق۔۔۔ اور مستحق کی ہر طرح کی امداد وغیرہ کے پہلو بھی شامل ہیں پھر تو لوگ اپنے اپنے مسائل کے انبار لے کر تم پر ٹوٹ پڑیں گے۔ تمہیں تو اندازہ ہی ہوگا کہ ہمارے ہاں خلقِ خدا کس قدر پریشان پھر رہی ہے۔ ہر شخص اپنے کندھے پر مسائل، دکھوں اور پریشانیوں کا پشتارہ اُٹھائے پھر رہا ہے۔"

"وہ تو مجھے معلوم ہے۔ میں عمومی مسائل کی بات نہیں کررہا ہوں جو ہمارے نظام۔ مختلف محکموں یا لوگوں کی نجی زندگیوں کی اونچ نیچ کی پیداوار ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لئے تو مجھ جتنے وسائل اور مجھ جیسی سوچ رکھنے والے کروڑ دو کروڑ آدمیوں کی ضرورت ہوگی۔"

"جبکہ ہمیں ایک ہی چراغ لے کر ڈھونڈنے سے ملا ہے۔" زرتاج نے لقمہ دیا۔

"بے شک" میں نے سنجیدگی سے سرہلایا "ہمارے ہاں تو لوگوں کے خاص مسائل بھی اب عام ہوچکے ہیں۔ میں ان میں اُلجھنا افورڈ نہیں کرسکتا۔ میں تو کسی بہت ہی خاص یا نہایت غیر معمولی مسئلے کی بات کررہا ہوں جس میں انسان کی کچھ سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اور بات بہت اُلجھی ہوئی بھی ہو۔ یا اس کی وجہ سے سوسائٹی میں کوئی نیا بگاڑ پیدا ہو رہا ہو۔ ہمارے ہاں پہلے ہی اتنا بگاڑ موجود ہے کہ مزید بگاڑ ہم افورڈ نہیں کرسکتے۔ کرپشن اور مسائل کے معاملے میں ہم ایک خود کفیل قوم ہیں بلکہ اگر ان چیزوں کی ایکسپورٹ کی گنجائش ہوتی تو ہم بہت زیادہ زرِ مبادلہ کما رہے ہوتے۔"

"بدعنوانیوں کی ایکسپورٹ میں بھی کچھ بدعنوانیاں پیدا ہوسکتی تھیں۔" زرتاج بولی۔

"یقیناً" میں نے اس کی تائید کی "بہرحال۔ میرا تم لوگوں کو اس پروگرام سے آگاہ کرنے کا یہ مقصد ہرگز نہیں ہے کہ تم ہر ایک سے ذکر شروع کردو کہ یہاں ایک مسیحا بیٹھا ہوا ہے جس کے پاس ہر دکھ درد کا علاج موجود ہے۔ اس طرح تو واقعی کھڑکیاں دروازے سب کچھ ٹوٹ جائے گا۔"

"نہیں اطمینان رکھو۔ ہم تمہارے پاس بہت ہی خاص قسم کے کیس بھیجا کریں گے۔" زرتاج نے مجھے تسلی دی۔

"تمہارے پاس ایسے کیس آئیں گے تبھی بھیجیں گے نا۔" رحیم گل بولا "میرے پاس تو اگر کوئی مسئلہ آتا ہے تو ایک پولیس آفیسر کی حیثیت سے میں خود اسے حل کرنے یا اس کی تفتیش کرنے کا پابند ہوتا ہوں۔"

"اصل میں تم تو ذرا نایاب قسم کے پولیس آفیسر ہو۔ اس لئے تم اپنے آپ کو مسئلہ حل کرنے یا اس کی تفتیش کرنے کا پابند محسوس کرتے ہو ورنہ تمہارے محکمے والے تو اپنے آپ کو ایف آئی آر درج کرنے کا بھی پابند نہیں سمجھتے۔" میں نے ملائمت سے کہا اور اسے جواب میں کچھ بولنے کا موقع دیئے بغیر بات جاری رکھی "بہرحال اس سے قطع نظر۔ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن میں تم جیسا پولیس آفیسر بھی کچھ نہیں کرپاتا۔ بہت سی مجبوریاں اس کے آڑے آجاتی ہیں یا پھر یہ ہوتا ہے کہ معاملہ تو تمہارے علم میں آجاتا ہے لیکن جس شخص کا وہ معاملہ ہوتا ہے، وہ پولیس کی مدد حاصل نہیں کرنا چاہتا۔ ایسے معاملات تم میرے علم میں لاسکتے ہو۔ بعض معاملات ایسے بھی ہوسکتے ہیں جو میرے علم میں آجائیں لیکن مجھے ان کے سلسلے میں کسی سرپھرے پولیس آفیسر کی مدد کی ضرورت ہو۔ ایسے موقعوں پر میں تمہیں تکلیف دوں گا۔ جیسا کہ میں نے پیر دانش والے معاملے میں کیا تھا۔ اس طرح تمہارے ضمیر کو بھی کافی خوش اور مطمئن رہنے کا موقع ملے گا۔"

"میرے ضمیر صاحب تو پہلے ہی کافی خوش اور مطمئن رہتے ہیں۔ ان کی صحت بھی خاصی بہتر ہے۔" رحیم گل بے پروائی سے بولا۔

"مجھے تو کافی کمزور اور مضمحل دکھائی دیتے ہیں۔ سُنا ہے کبھی کبھی ان کی آواز بھی تم تک نہیں پہنچتی۔" میں نے کہا۔

"غلط سُنا ہے تم نے۔" وہ سنجیدگی سے بولا "ان کی چیخ پکار سے تو میرے پڑوسی تک تنگ رہتے ہیں۔"

"خیر۔۔۔ تم کہتے ہو تو مان لیتا ہوں۔" میں نے احسان جتانے کے سے انداز میں کہا "میرا مقصد یہی ہے کہ ایک دوسرے کو اس قسم کے معاملات سے آگاہ رکھ کر ہم کبھی کبھار کوئی اچھا بھلا بڑا کام انجام دے سکتے ہیں۔ اب یہ پیر دانش والے معاملے کو ہی لے لو۔ میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس معاملے میں کوئی پیر دانش بھی نکل آئے گا۔ اس طرح کڑی سے کڑی ملتی جائے گی اور ایسے ایسے ہوش ربا انکشافات ہوں گے۔ یہ تو محض اتفاق ہی تھا کہ میں نے امبر کو سیکریٹری رکھ لیا تھا۔"

"وہ بھی تو ایسے ہی کسی قصے کی وجہ سے تمہارے حصے میں آئی تھی۔" رحیم گل بولا۔

"ہاں وہ قاسم بجلی والے چکر میں مجھ سے متعارف ہوئی تھی۔ عذرا نامی ایک اسکول ٹیچر اس کی پُرانی دوست نکل آئی۔ امبرا سے ساتھ لے کر اس سفارش کے ساتھ میرے پاس آئی تھی کہ میں اس کی گمشدہ بہن کو تلاش کرنے میں اس کی کچھ مدد کروں۔ میں نے انکار کردیا تھا۔ ظاہر ہے اس قسم کے کاموں میں میرے ٹانگ اُڑانے کی کوئی تک نہیں بنتی۔ میں نے اسے تو مایوس کرکے بھیج دیا لیکن بعد میں ایک وجہ ایسی بن گئی کہ میں نے اس کی بہن کو تلاش کرنے کی ہامی بھرلی اور اس تلاش کے دوران میں بات، کہاں سے کہاں تک پہنچی، یہ سب تفصیلات تم دونوں ہی کو معلوم ہیں۔ یہ افسوس ناک واقعات کا ایک سلسلہ ہے لیکن مجھے اس پر خوشی بھی ہے۔ ہمارے ہاتھوں ایک بہت بڑا اور ہشت پہلو قسم کا فتنہ ختم ہوگیا۔"

"۔۔۔۔ اور اب تمہیں چاٹ لگ گئی ہے کہ اس قسم کے کام کرتے رہنا چاہئے۔" رحیم گل ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔

"میری اس تجویز میں تعمیر کا پہلو پنہاں ہے۔" میں نے ایک بار پھر اسے احساس دلانے کی کوشش کی۔

"ہاں اس میں کیا شک ہے۔" اس نے سرہلایا "تم ان میں بھی کچھ کمائی کرلو گے۔ اور ظاہر ہے کمائی سے تعمیر ہوتی ہے۔ ممکن ہے چند برس میں تم ایک اور فائیو اسٹار ہوٹل تعمیر کرلو۔"

"پولیس کی نوکری میں واقعی انسان کی فطرت خراب ہوجاتی ہے۔ وہ ایک ایک کی نیت پر شک کرتا ہے۔" میں نے غصے سے اسے گھورا "بڑے افسوس کا مقام ہے کہ تم تو اب کوئی اچھی بات سُننے کے بھی قابل نہیں رہے۔ میرا خیال ہے پولیس والوں کے سامنے تو کوئی اچھی بات کرنی ہی نہیں چاہئے۔"

"بس بس" رحیم گل ہاتھ اٹھاتے ہوئے مشفقانہ لہجے میں بولا "زیادہ تلملانے کی ضرورت نہیں پیارے خدائی فوجدار! میں تو یونہی ذرا تم سے جیلس ہو رہا تھا۔ بھئی تم جیسے انسانوں سے جیلس ہونا مجھ جیسے انسانوں کا اخلاقی فرض ہے۔"

"کس بنیاد پر؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی ایک بنیاد ہو تو بتاؤں۔ بنیادیں ہی بنیادیں ہیں۔" وہ آہ بھر کر بولا "تم مجھ سے زیادہ دولت مند ہو۔ مجھ سے زیادہ بارسوخ ہو۔ نہ جانے کتنی لڑکیوں سے تمہاری گہری دوستی ہے جبکہ ہم غریبوں کی طرف کوئی آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔"

پھر وہ جیسے اصل موضوع کو بھول کر میز پر جھک کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مصنوعی سنجیدگی سے بولا "ویسے۔۔۔ یار! سچ سچ بتاؤ اور سنجیدگی سے بتاؤ۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ کوئی لڑکی مجھ پر مہربان کیوں نہیں ہوتی جبکہ میں تم سے زیادہ ہینڈسم ہوں۔"

"تم مجھ سے زیادہ ہینڈسم ہو؟" میں نے آنکھیں پھاڑ کر تقریباً گرتے گرتے کہا۔

"ہاں اس میں کیا شک ہے۔" وہ اپنی مصنوعی سنجیدگی برقرار

رکھتے ہوئے بولا۔ "زرتاج کو چھوڑ کر۔۔۔ اور کسی بھی لڑکی سے فیصلہ کرالو۔ وہ مجھ پر مہربان ہو یا نہ ہو لیکن ہینڈسم ہونے کے معاملے میں اس کا ووٹ میرے حق میں ہوگا۔"

"ٹی وی پر بچوں کے لئے ایک پروگرام آتا تھا۔ کلیاں۔" میں نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہا "اگر تم نے کبھی دیکھا ہو تو شاید تمہیں یاد ہو۔"

"ہاں یاد ہے۔" وہ بلا تامل بولا۔

"اس میں ایک ہینڈسم ہوا کرتا تھا۔ تم اسی قسم کے ہینڈسم ہو۔" میں نے کہا۔

زرتاج منہ پر ہاتھ رکھ کر بے آواز طریقے سے ہنسنے لگی۔ رحیم گل نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور ایک مصرع کی ٹانگ توڑتے ہوئے دردناک لہجے میں بولا "جن پہ تکیہ تھا وہی گدے ہوا دینے لگے۔"

میں نے ریوالونگ چیئر کے پشتے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا "پیارے رحیم گل! تمہاری حس مزاح کچھ بہتر ہوتی جارہی ہے۔ یا پھر اصل بات یہ ہے کہ جب پولیس کی وردی تمہارے جسم پر نہیں ہوتی تو تمہاری ذہنی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں؟"

رحیم گل جھٹکے سے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "خدا کے لئے پولیس ڈیپارٹمنٹ کا پیچھا چھوڑ دو یار! آج تو تم پنجے اور دُم جھاڑ کر پولیس کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ پولیس کو برا بھلا کہنے کے لئے باقی لوگ ہی کافی سے زیادہ ہیں۔ تم یہ فریضہ اپنے ذمے مت لو۔"

"معاف کرنا۔ میں بھول گیا تھا کہ یہ تمہاری دکھتی ہوئی دُم۔۔۔ میرا مطلب ہے تمہاری دکھتی رگ ہے۔" میں نے معذرت کی۔

زرتاج اٹھنے کے لئے پر تولتے ہوئے بولی "بھئی میں اب آپ دونوں دُم دار حضرات سے اجازت چاہوں گی۔ پھر کسی دن ملاقات ہوگی۔"

"تم ابھی سے کہاں چل دیں۔" میں نے ہاتھ ہلا کر اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا "کبھی اتفاق سے تو ہم تینوں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اب اکٹھے کھانا بھی کھالیں گے۔ ویسے بھی جب تم جیسے یا رحیم گل جیسے یتیم مسکین میرے ہاں آتے ہیں تو میں انہیں کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دیتا۔"

"بھئی۔ مجھ یتیم مسکین کو تو معاف ہی رکھو۔" زرتاج بولی "میں تمہارے اس ہوٹل کے پھیکے سیٹھے کھانے کھا کھا کر بور ہو چکی ہوں۔ اس سے تو اچھا ہے انسان کسی بھٹیار خانے پر جا کر کھالے۔"

"ہاں" میں نے سر ہلایا "انسان کو اپنی اوقات یاد رکھنی چاہئے۔ آج تم اسے ہی بھٹیار خانہ سمجھ لو۔ میں شیف سے کہہ دوں گا کہ کہیں سے المونیم کی گندی اور مڑی تڑی سی پتیلی وغیرہ ڈھونڈ کرلائے اور اس میں کھانا تیار کرے۔ مختلف چیزوں کا بچا کھچا روغن اس میں ڈالے اور تمام مسالوں کے ڈبے بھی الٹ دے۔ ویٹر سے کہہ دوں گا کہ وہ ٹوٹے پھوٹے اور غلیظ برتنوں میں سرو کرے۔ امید ہے پھر تو تم دونوں کو کھانے میں مزہ آجائے گا۔ رحیم گل کی بھی یہی اوقات ہے۔ ایک بار یہ مجھے ساحل پر لے جا کر اسی معیار کی مچھلی کھلا چکا ہے۔"

"خیر تم میری خاطر اتنا ایثار مت کرو۔" زرتاج شرمندہ ہوئے بغیر بولی "میں گھر جا کر کھالوں گی۔ مجھے ایک بہت اچھا کک مل گیا ہے۔ تم دونوں اب کبھی میرے ہاں آکر کھانا کھاؤ۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔"

"کیا وہ خوش شکل ہے؟" میں نے تشویش سے پوچھا۔

"کون؟" وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

"کُک" میں نے کہا۔

اس کے چہرے پر ہلکی سی سرخی آگئی۔ دانت پیس کر بولی "ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کالا بھجنگ ہے وہ۔ چھوٹا سا قد ہے۔ چپٹی سی ناک ہے۔ خود آکر دیکھ لینا۔"

"اوہ۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔" میں نے گویا اطمینان کی سانس لی "اصل میں خطرہ ہی رہتا ہے۔"

"کیسا خطرہ؟" اس نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

"بندہ خوش شکل ہو اور اسے بہت اچھا کھانا پکانا بھی آتا ہو تو تم جیسی لڑکیوں سے ڈر ہی رہتا ہے کہ کہیں اس سے شادی نہ کرلیں۔" میں نے کہا۔

زرتاج خونخوار نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے بولی "دل چاہ رہا ہے پیپرویٹ اٹھا کر دے ماروں۔"

"اس وقت پولیس آفیسر بھی قریب ہی بیٹھا ہے۔ اقدام قتل کا مقدمہ درج ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔" میں نے رحیم گل کی طرف دیکھا پھر ٹھنڈی سانس لی "مگر یہ بے چارہ تمہارے خلاف مقدمہ کہاں درج کرے گا۔ یہ تو تم پر کوئی آنچ آنے سے پہلے نیٹی جیٹی کے پل سے چھلانگ لگا کر جان دے دے گا۔"

رحیم گل یکدم ہی سچ مچ سنجیدہ نظر آنے لگا اور زرتاج کے چہرے پر سرخی گہری ہوگئی۔ وہ اٹھتے ہوئے بولی "اب تو میں چلی ہی جاتی ہوں۔ ورنہ تم مستقل بکواس کرتے رہوگے۔"

میز کافی بڑی تھی۔ میں نے بڑی مشکل سے ہاتھ بڑھا کر دوسری طرف سے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے کھینچ کر بٹھانے کی کوشش کی۔ اس کے ہاتھ سے ایک برقی رو سی میرے جسم میں سرایت کرگئی۔ ایک طویل عرصے بعد میں نے اسے چھوا تھا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ اسے چھونا میرے لئے پہلے سے زیادہ خطرناک تھا۔

ویسے بھی اسے اس کی مرضی کے خلاف محض ہاتھ پکڑ کر کھینچ کر کرسی پر بٹھا دینا اتنا آسان نہیں تھا۔ وہ ان لڑکیوں میں سے تھی جن کے وجود میں شعلوں کی سی حرارت، پھولوں کی سی ملائمت اور فولاد کی سی مضبوطی بیک وقت موجود ہوتی ہے۔ اسے میز کے دوسری طرف سے ہلانا میرے لئے بھی ذرا مشکل تھا۔ اس کے لئے مجھے میز کے گرد گھوم کر اس کے قریب جانا پڑتا جبکہ رحیم گل کی نظر میرے اور زرتاج کے ہاتھ پر جمی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا رنگ آکر گزر گیا۔ میں نے جلدی سے زرتاج کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

"بھئی آج میں تم دونوں کو کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔" میں نے پہلے ہی جیسی دوستانہ بے تکلفی سے کہا۔ میرے اور زرتاج کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رحیم گل اسے سمجھے۔ یا سمجھنے کی کوشش کرے اور اس کوشش میں غلط اندازے قائم کرے۔ اس طرح اس کا دکھ بڑھ سکتا تھا۔ فی الحال اس کا دکھ محرومی اور نارسائی کا دکھ تھا۔ پھر اس کے دکھ میں مایوسی اور بداعتمادی کا دکھ بھی شامل ہوسکتا تھا۔

رحیم گل گویا کسی خیال کے پھندے سے نکلتے ہوئے بولا "مجھے تو اس لئے یہاں کھانا کھانے سے معاف رکھو کہ کسی اخباری آدمی نے دیکھ لیا اور وہ میرا صورت آشنا ہوا تو فوراً کل پرسوں کے اخبار میں خبر لگ جائے گی کہ تھانوں کے ایس ایچ او فائیو اسٹار ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں۔"

"اس میں کوئی ایسا خاص مبالغہ نہیں ہوگا۔" میں نے ایک بار پھر اسے چھیڑا "ٹھیک ہے۔ وہ لوگ بے چارے محض دیکھنے والوں کے ڈر سے ہی فائیو اسٹار ہوٹلوں میں کھانا نہیں کھاتے لیکن کھانا چاہیں تو پانچوں وقت کھا بھی سکتے ہیں۔"

"پانچوں وقت؟" زرتاج نے اپنی خفگی بھولتے ہوئے بھویں اُچکائیں۔

"ہاں۔ عام لوگ تین وقت کھاتے ہیں لیکن پولیس والے پانچ وقت کھاتے ہیں۔ خاص کر افسر لوگ۔ تمہیں ان کی صحت سے اندازہ نہیں ہوتا؟" میں نے معصومیت سے کہا۔

"آج تو تمہیں پولیس والوں میں کیڑے نکالنے کا دورہ پڑا ہوا ہے۔" رحیم گل اب قدرے شگفتہ لہجے میں بولا "لگتا ہے دل میں کسی پرانی دشمنی کا زخم جاگ اٹھا ہے۔"

"خدا نہ کرے میری پولیس والوں سے دشمنی ہو۔" میں نے جلدی سے کہا "میں کافی عرصے سے کاروبار کررہا ہوں۔ کاروباری آدمی بھلا پولیس سے دشمنی رکھنا کہاں افورڈ کرسکتا ہے۔ میرے تو ہمیشہ سے پولیس والوں سے بڑے خوشگوار تعلقات چلے آرہے ہیں۔ اور جب سے تم سے دوستی ہوئی ہے تب سے تو گویا مجھے پولیس والوں سے ایک عجیب سی محبت ہوگئی ہے۔ جب بھی کسی پولیس والے کو دیکھتا ہوں، دل چاہتا ہے کہ آگے بڑھ کر اسے گلے لگالوں۔"

"اور آنکھ بچا کر گلا دبا دوں۔" رحیم گل نے ٹکڑا لگایا۔

"اب یہ تو تمہارے اپنے دل کا چور بول رہا ہے ورنہ میں تو خلوص سے بات کررہا تھا۔" میں نے کندھے اچکا کر کہا۔

"اللہ ہر شریف انسان کو تمہارے خلوص سے بچائے۔" رحیم گل منہ بنا کر بولا۔

"چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ تم نے شریف انسان کی بات کی، اپنی بات نہیں کی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

رحیم گل ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا اور زرتاج کی طرف دیکھ کر بولا "اب رخصت ہو لینا ہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔"

"اسے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کیوں کررہے ہو؟ وہ تمہاری ساتھی نہیں ہے۔" میں نے گویا اسے خبردار کیا۔

"مجھے معلوم ہے۔ تمہیں تشویش میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔ میں فیصلہ نہ کرسکا کہ اس وقت اس کی سنجیدگی مصنوعی تھی یا حقیقی؟ ہم تو مذاق بھی بظاہر سنجیدگی سے ہی کرتے تھے لیکن اس لمحے مجھے اس کے لہجے میں واقعی سنجیدگی کی جھلک محسوس ہوئی۔

میں نے اپنے الفاظ کا اثر کم کرنے کے لئے جلدی سے کہا "ساتھ [illegible] نہیں ہے۔ وہ عقل مند ہے۔ غیر جانبدار [illegible] نے ہم دو مرغوں کو لڑنے کے لئے چھوڑا ہوا ہے۔ [illegible] میں سے [illegible] زیادہ زخمی ہوتا ہے یہ خود بھی اسے ایک آدھ مرتبہ چونچ مار دیتی ہے ہمیں اس خود غرض مرغی کی سازش کو سمجھنا چاہئے اور متحد ہو کر مرغانہ وار اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔"

"اگلی کسی نشست میں اس پر غور کریں گے فی الحال تو میں چلتا ہوں۔" وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ میں ان دونوں کو چھوڑنے کے لئے ان کے ساتھ ساتھ ٹہلتا پارکنگ لاٹ تک چلا گیا۔ وہ دونوں اپنی اپنی گاڑی میں بیٹھ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے روانہ ہوگئے۔ میں پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیٹی بجاتا، ٹہلتا ہوا اکیلے ہی ڈائننگ ہال میں آگیا اور کھانا کھانے کے بعد اوپر اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ اب لمبی تان کر سوؤں گا اور ہوسکا تو کل شام کو ہی اٹھوں گا۔

بظاہر ان دنوں مجھے کوئی پریشانی نہیں تھی۔ پیر دانش والا معاملہ بھی نمٹ چکا تھا۔ صرف وہی نہیں، اس کی ماں بھی گویا اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ آج میں اسے جس حال میں دیکھ کر آیا تھا اس پر مجھے طمانیت کا احساس ہونا چاہئے تھا لیکن نہ جانے کیوں میرے اندر کہیں ایک بے عنوان سا اضطراب تھا۔ سچی بات تو یہ تھی کہ جب سے پیر دانش والے قصے کا آغاز ہوا تھا تب سے ہی میری زندگی کے سکون میں کچھ خلل سا آگیا تھا۔ جبکہ میری زندگی میں ویسے بھی سکون کا عمل دخل کچھ کم ہی تھا۔

بہرحال پیر دانش سے سامنا ہونے کے بعد تو جیسے ذہن پر مستقل طور پر کوئی نحوست سی چھا گئی تھی۔ شاید اس کے اعمال کی نحوست مجھ پر بھی اثر انداز ہونے لگی تھی۔ اب اس کا قصہ صحیح معنوں میں ختم ہو چکا تھا۔ اب میں بھی اس باب کو صحیح معنوں میں بند کر دینا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کل میں سو کر اٹھوں تو میرے ذہن میں پیر دانش یا گاڈ فادر کی یاد کی کوئی پرچھائیں موجود نہ ہو۔ میرے

دل کے کسی گوشے میں کوئی خلش کوئی اضطراب نہ ہو۔

یہ خواہش دل میں لئے میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ اپنا وی آئی پی سوئٹ میں نے خود چھوڑ دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ عام مسافروں کے کمروں کی قطار کے درمیان رہنا زیادہ محفوظ تھا۔ عام آدمیوں میں گھلے ملے ہوئے شخص کو تلاش کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔ وی آئی پی طور طریقوں کے ساتھ انسان دور سے نظر میں آجاتا ہے۔

دروازہ مقفل کرکے میں نے اپنا کی رنگ اور اس سے منسلک ٹیگ ایک خاص دیوار گیر خانے میں ڈالا۔ اس کمرے کی بتیاں روشن ہوگئیں۔ اس کے ساتھ ہی میری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی کیونکہ سب سے پہلے میری نظر جس چیز پر پڑی وہ ایک آٹومیٹک گن کی نال تھی جس پر سائلنسر بھی فٹ نظر آرہا تھا۔

میں نے دوسرا قدم آگے نہیں بڑھایا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ صاحبِ ہتھیار کا مدّعا کیا تھا۔ اسے میرے قدم بڑھانے پر اعتراض ہوسکتا تھا۔ ویسے بھی بعض لوگوں کو تو ٹریگر دبانے کی بہت جلدی ہوتی ہے۔ وہ محض کسی بہانے کے منتظر ہوتے ہیں۔

گن ایک نہایت کنگ سائز قسم کی مٹھی میں دبی ہوئی تھی۔ میری نظر اس ہاتھ سے پھسلتی ہوئی، ہاتھ والے پر جم کر رہ گئی۔ وہ کمرے کے ایک کونے میں اس صوفے پر براجمان تھا جس کا رخ سیدھا دروازے کی طرف پڑتا تھا۔ وہ اتنا جسیم اور دراز قد شخص تھا کہ صوفے کی سنگل سیٹ اس کے نیچے تقریباً چھپ کر رہ گئی تھی۔

اس کا وہ لمبا چوڑا وجود محض چربی اور پلپلے گوشت کا انبار نہیں تھا۔ وہ ورزشی جسم کا مالک تھا۔ اس کی عمر پینتالیس کے قریب تھی اور وہ ڈھیلے ڈھالے مگر نہایت عمدہ سوٹ میں تھا تاہم میرے لئے اس کی جسمانی ساخت کا اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا۔ اس نے یقیناً نوجوانی میں سخت محنت مشقت یا ورزشیں کی تھیں جن کے اثرات ابھی تک باقی تھے۔ اور کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ اب بھی جان کو تکلیف دیتا ہو مگر اب جسم قابو سے کچھ باہر ہو چلا تھا۔

اس کا سرخ و سپید چہرہ سپاٹ تھا اور وہ پلکیں جھپکائے بغیر میری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر قدرے اطمینان ہوا کہ اس کی آنکھیں کسی تیز و طرار آدمی کی آنکھیں نہیں تھیں۔ وہ طاقتور ضرور نظر آرہا تھا لیکن اس کا ذہن شاید زیادہ تیزی سے حرکت نہیں کرتا تھا۔

"بہت انتظار کرایا آپ نے افضل صاحب؟" وہ بھاری اور گونجیلی میں بولا۔

آواز اس کے وجود سے مناسبت رکھتی تھی ورنہ میں نے ہاتھی جیسے ڈیل ڈول کے ایسے لوگ بھی دیکھے تھے جن کے حلق سے منمناتی ہوئی باریک سی آواز برآمد ہوتی تھی۔ اس کا لہجہ بھی کچھ ایسا طنزیہ یا معاندانہ نہیں تھا لیکن ہاتھ میں سائلنسر لگی ایک نہایت جدید قسم کی گن بہرحال موجود تھی جس کی وجہ سے میں اسے اپنا دوست تو شمار نہیں کرسکتا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ میرا انتظار کررہے ہیں حضور والا! ورنہ میں اس سے پہلے آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا۔" میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا اور قدم نہایت احتیاط سے آگے بڑھایا۔ اس نے میرے آگے آنے پر اعتراض نہیں کیا تاہم اس کی چوڑی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ شاید اسے میرا لہجہ پسند نہیں آیا تھا۔

میں نے مزید ایک قدم بڑھایا۔ اس نے تب بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اس نے مجھے ہاتھ اٹھانے کا بھی حکم نہیں دیا تھا لیکن اس کے اس نرم رویئے کا کوئی فوری فائدہ نظر نہیں آرہا تھا کیونکہ میرے پاس اس وقت کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ میں اپنی گن نیچے آفس میں میز کی دراز میں ہی چھوڑ آیا تھا۔ میرے کمرے میں بھی وارڈ روب کے ایک خانے میں اور میرے بیڈ کے سرہانے میٹرس کے نیچے ایک ایک گن موجود تھی۔ حتیٰ کہ میرے باتھ روم کی کیبنٹ میں بھی ایک گن رکھی رہتی تھی لیکن جس طرح اچانک اس شخص سے سامنا ہوا تھا، اس کی وجہ سے اب کوئی بھی گن میری رسائی میں نہیں تھی اور تینوں فی الحال میرے لئے بیکار تھیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ شخص انہیں تلاش کرکے قبضے میں لے چکا ہو۔

میں چھوٹے چھوٹے قدم بڑھاتا کمرے کے وسط میں پہنچ چکا تھا۔ تب اس کے بیلچہ نما ہاتھ میں خفیف سی حرکت پیدا ہوئی۔ گن کا رُخ میرے پیٹ سے سینے کی طرف ہوگیا۔

"بس اب مزید آگے مت آنا۔" اس نے گویا مجھے دی ہوئی رعایت ختم کرنے کا اعلان کیا "جیب میں ہاتھ ڈال کر یا اِدھر اُدھر بھاگ کر کوئی پستول یا ریوالور وغیرہ بھی نکالنے کی کوشش مت کرنا۔ ایسی بھاگ دوڑ فضول ہوگی۔ تمہاری تینوں گنیں میرے قبضے میں ہیں۔"

میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ میرا اندازہ ٹھیک ہی نکلا تھا۔ تاہم میرا یہ اندازہ شاید ٹھیک نہیں تھا کہ وہ ذہنی طور پر کچھ سست واقع ہوا تھا۔ اس نے کمرے میں آنے کے بعد محض میرے انتظار میں بیٹھ کر وقت ضائع نہیں کیا تھا اور اِدھر اُدھر چھپا ہوا پسٹل ریوالور وغیرہ ڈھونڈ نکالا تھا۔ سست ذہن والے کے اپنے ہاتھ میں گن ہو تو پھر وہ اس قسم کی زحمت کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ اس کے خیال میں اس کا اپنا مسلح ہونا ہی کافی ہوتا ہے۔ وہ دوسرے خطرات کو خاطر میں نہیں لاتا۔

میں نے اپنے اس اندازے کی تصحیح کرتے ہوئے ایک اور اندازہ لگانے کی کوشش کی کہ میری گنیں اس نے کہاں چھپائی تھیں؟ اس کے جسم پر خیمہ نما سوٹ تھا جس کی جیبیں کچھ پھولی پھولی دکھائی دے رہی تھیں۔ عین ممکن تھا کہ اس نے گنیں جیبوں میں رکھ لی ہوں لیکن یہ بھی ہوسکتا تھا کہ اس نے اتنا وزن اپنے لباس میں ٹھونسنا پسند نہ کیا ہو۔ خصوصاً جبکہ اس کے پاس اپنی گن بھی موجود تھی۔ شاید اس نے گنیں کمرے میں کہیں اور چھپا دی ہوں۔

"آپ کی تعریف؟" میں نے ملائمت سے پوچھا۔

"مجھے جان کر کیا کرو گے افضل میاں! میں بڑا غیر اہم سا آدمی ہوں۔" وہ بزرگانہ لہجے میں بولا۔

"بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "آپ پہلے آدمی ہیں جو گن ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی اپنے آپ کو غیر اہم کہہ رہے ہیں ورنہ آج کل تو کسی کے ہاتھ میں گن ہو اور سامنے والا نہتا ہو تو وہ سمجھتا ہے کہ اس سے زیادہ اہم آدمی دنیا میں کوئی نہیں ہے اور اسے زندگی موت کا اختیار مل گیا ہے۔"

"یہ بڑی بڑی باتیں ہیں۔ تم جیسے بڑے بڑے آدمی ہی بڑی بڑی باتیں سوچ سکتے ہیں افضل میاں! میں تو چھوٹا سا آدمی ہوں۔ چھوٹی چھوٹی باتیں سوچتا ہوں۔" وہ بڑی سادگی سے بولا۔

"تم چھوٹے سے آدمی ہو؟" میں نے آنکھیں پھاڑتے ہوئے اس طرح اس پر نظر ڈالی کہ اسے خود بھی اپنی غیر معمولی جسامت کا احساس ہوجائے۔ اب میں نے بھی اسے "آپ" کے بجائے "تم" سے ہی مخاطب کرنا شروع کردیا "اگر تم چھوٹے آدمی ہو تو پھر بڑا آدمی کسے کہتے ہیں؟"

مجھے ایک موہوم سی امید تھی کہ شاید میری نظروں کی تقلید میں وہ خود بھی اپنے سراپا پر نظر ڈالے۔ یوں ایک لمحے کے لئے اس کی نظر مجھ پر سے ہٹ جائے اور مجھے اس پر چھلانگ لگانے کا موقع مل جائے۔

وہ ایسا غیر محتاط ثابت نہیں ہوا۔ اس کی نظر مجھ پر سے نہیں ہٹی البتہ اس نے ایک بلند آہنگ اور گونجیلا سا قہقہہ لگایا جس سے بھاری بھرکم صوفہ بھی لرز کر رہ گیا۔

"اب تم مجھے لفظوں کا چکر دینے کی کوشش نہ کرو افضل میاں!" قہقہہ تھمنے پر وہ بولا "میں چھوٹا آدمی ضرور ہوں لیکن بے وقوف نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے جسم بڑا ہونے سے انسان بڑا نہیں ہوجاتا۔"

"پھر بڑے آدمی کیسے ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔ میں اسے باتوں میں لگا کر کچھ کر گزرنے کا کوئی موقع تلاش کررہا تھا۔ اس کا گن پکڑنے کا انداز خطرناک تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ گولی چلانے میں ذرا بھی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرے گا۔ اوپر سے اس کی گن پر سائلنسر بھی لگا ہوا تھا۔ مزید ستم یہ کہ وہ جسمانی طور پر بھی کسی سانڈ سے کم معلوم نہیں ہوتا تھا۔ میں کوئی کچا قدم اٹھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اطمینان اور خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ ابھی تک اس نے صوفے سے اُٹھنے کی بھی زحمت نہیں کی تھی۔

"بڑے آدمی تم جیسے ہوتے ہیں افضل میاں! فائیو اسٹار ہوٹلوں والے.... کوٹھیوں بنگلوں والے.... بڑے بڑے کاروباروں والے۔ اثر رسوخ والے.... اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔" وہ بدستور مربیانہ لہجے میں بولا۔

میں دل ہی دل میں ہنسے بغیر نہ رہ سکا۔ باقی باتیں تو ٹھیک تھیں لیکن یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ والا ٹکڑا اس نے خواہ مخواہ ہی ٹانک دیا تھا۔ میری تعلیم کے بارے میں شاید اس بے چارے کو کسی نے غلط اطلاع فراہم کردی تھی یا اس نے غلط اندازہ لگالیا تھا۔ تعلیم تو میری محض انٹر تھی جس کی بنیاد پر آج کل کے زمانے میں چپراسی کی نوکری بھی مشکل سے ملتی ہے لیکن ایک لحاظ سے اس کی یا کسی اور کی غلط فہمی ایسی حیرت انگیز بھی نہیں تھی۔

میرے پاس ڈگری نہیں تھی لیکن میں گفتگو، نشست، برخاست، اہلیت میں شاید بہت سے بڑے بڑے ڈگری یافتگان سے بہتر تھا۔ مجھے تعلیم زندگی نے دی تھی اور زندگی کی دی ہوئی تعلیم بڑی کھری ہوتی ہے۔ اب تک میری عمر کا ہر لمحہ کچھ نہ کچھ سیکھنے میں ہی بسر ہوا تھا۔ مجھے قریب سے جاننے والے بھی مجھے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی سمجھتے تھے۔ میں نے کسی کے اس خیال کی تردید کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ میرے خیال میں میرے پاس تعلیم بہت تھی۔ کاغذ کا ایک ٹکڑا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ خصوصاً جبکہ مجھے کہیں نوکری کے لئے درخواست بھی نہیں دینی تھی۔

"اچھا.... تو تم چھوٹے آدمی ہو!" میں نے سرہلایا۔

"ہاں بھئی۔ میں تو ایک معمولی سا قاصد ہوں۔ اور تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ آج کل تو چپراسی کو بھی قاصد.... بلکہ نائب قاصد کہا جاتا ہے۔" وہ مسکرایا۔ وہ کسی پہاڑی علاقے کا باشندہ معلوم ہوتا تھا لیکن اردو بہت صاف بول رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کا شین قاف بھی درست تھا۔ لگتا تھا کہ اس کی زندگی شہر میں ہی گزری تھی لیکن بعض ایسے لوگوں میں تو یہ خوبی شہر میں زندگی گزارنے کے بعد بھی پیدا نہیں ہوتی۔ شاید یہ اس کی سیکھنے کی صلاحیتوں کا نتیجہ تھا۔

میں نے گہری سانس لے کر کہا "سچی بات یہ ہے کہ کبھی کبھی تم جیسے چھوٹے آدمیوں سے مل کر مجھ جیسے بڑے آدمیوں کو بڑی شرمندگی ہوتی ہے۔"

"کیوں؟" اس نے بھویں اچکائیں۔

"بھئی دیکھو نا۔ مجھ جیسے بڑے آدمی کا یہ بڑا سا ہوٹل ہے۔ میں خود بھی بڑا محتاط رہتا ہوں۔ اور اس ہوٹل کا اپنا سیکیورٹی کا نظام بھی ہے۔ اتنے بہت سے لوگ اِدھر اُدھر تعینات رہتے ہیں۔ گھومتے پھرتے بھی رہتے ہیں۔ اس کے باوجود تم جیسے چھوٹے چھوٹے آدمی منہ اٹھا کر میرے کمرے میں آکر گھس بیٹھتے ہیں۔ جب مالک کا اپنا یہ حال ہے تو وہ ہوٹل کے دوسرے عام مہمانوں کے تحفظ کا دعویٰ کس طرح کرسکتا ہے؟"

اس نے ایک بار پھر گونجیلا سا قہقہہ لگایا اور اپنی عظیم الشان ٹانگوں کو ذرا پھیلاتے ہوئے مشفقانہ لہجے میں بولا "افضل میاں! یہ سیکیورٹی وغیرہ بالکل فضول چیزیں ہیں۔ پہنچنے والے ہر جگہ پہنچ جاتے ہیں۔ یہ تو خیر ہوٹل ہے.... پبلک پلیس ہے۔ اس کے تو کسی بھی حصے میں پہنچنا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ لوگ تو انتہائی ترقی یافتہ

مغربی ممالک کے ایٹمی تحقیقی مرکزوں میں جا پہنچتے ہیں اور نہ جانے کیا کچھ چرا لاتے ہیں۔"

آدمی بظاہر تھوڑا سا گاؤدی معلوم ہوتا تھا لیکن بات عقل کی کررہا تھا۔ اسی مشفقانہ لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے وہ بولا "یہاں سیکیورٹی کے لئے محض چند گارڈ تعینات ہیں جو شاید صرف کسی مشکوک حلئے والے کو ہی روکیں... وہ بھی اگر ان کی نظر پڑجائے تب ورنہ مشکوک حلئے والا بھی نہ جانے کس کس کونے کھدرے تک پہنچ سکتا ہے۔ یا پھر وہ اس وقت تیزی سے حرکت میں آئیں گے جب وہ کسی کو علی الاعلان سے انداز میں اسلحہ اٹھائے آتے دیکھیں گے۔ میں تو حلئے سے اچھا بھلا معزز آدمی نظر آتا ہوں اور ظاہر ہے میں ان چھوٹی سی گن کی نمائش کرتا ہوا بھی ہوٹل میں داخل نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ میرا ذہنی توازن خراب نہیں ہے۔"

"لیکن جسمانی توازن کچھ خراب لگتا ہے۔" میں نے لقمہ دیا۔

وہ خوش دلی سے ہنسا "وہم ہے تمہارا۔ میں اب بھی نوجوانوں سے زیادہ فٹ ہوں۔ روزانہ دو گھنٹے ہیلتھ کلب میں سخت ورزش کرتا ہوں۔"

اس کی پہلی بات جیسے مکمل نہیں ہوئی تھی اور اسے اطمینان نہیں ہوا تھا۔ وہ دوبارہ اسی طرف آتے ہوئے بولا "بات سیکیورٹی کی ہورہی تھی۔ میں تو ایسی جگہوں پر بھی جاچکا ہوں جہاں بہت زبردست اور جدید قسم کے حفاظتی آلات نصب تھے اور یہ میں یہاں کی نہیں۔ امریکا' انگلینڈ' دبئی وغیرہ کی بات کررہا ہوں۔ میں نے تو ان ملکوں میں بھی جہاں جانا چاہا یا یوں کہو کہ جہاں بھی مجھے بھیجا گیا میں ہر حال میں وہاں ہو کر آیا خواہ وہاں کسی بھی قسم کے حفاظتی انتظامات موجود تھے۔"

"بہت خوب۔ گویا فارن کوالیفائڈ ہو۔" میں نے سرہلایا۔

"بالکل بالکل۔" وہ خوش دلی سے ایک بار پھر ہنسا اور ایک لمحے کے توقف سے بولا "کچھ سائنس داں اور انجینئرز بیٹھے سیکیورٹی کے آلات ایجاد کرتے رہتے ہیں اور کچھ سائنس داں انجینئرز وغیرہ بیٹھے ان کا توڑ ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جیسے کچھ سائنس داں بیٹھے تباہ کن ہتھیار ایجاد کرتے رہتے ہیں اور کچھ سائنس داں ان کا مقابلہ کرنے والے ہتھیار ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ دنیا میں دونوں کی ڈیمانڈ رہتی ہے اور بنی نوع انسان دونوں ہی کو خریدنے میں خرچ ہوجاتا ہے۔ اسی طرح گلشن کا کاروبار چلتا رہتا ہے۔"

"یار! تم تو ٹھیک ٹھاک صاحبِ دماغ قسم کے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ معاف کرنا میں تو تمہیں یونہی بانگڑو قسم کی چیز سمجھا تھا۔" میں نے تحسین آمیز لہجے میں کہا اور ساتھ ہی ذرا آگے کھسکنے کی کوشش کی۔

اس کے گن والے ہاتھ کو فوراً خفیف سا جھٹکا لگا اور اس کے تاثرات یکدم بدل گئے "نہیں بھئی۔ یہ نہیں ہوگا۔ مجھے مکھن لگا کر

میری شرافت کا ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش مت کرو۔ جہاں ہو وہیں رکے رہو۔"

میں نے گہری سانس لے کر جسم ڈھیلا چھوڑ دیا "اچھا تو پھر مجھے اپنی شرافت سے جائز فائدہ اٹھانے کا موقع دو۔ اور یہ بتادو کہ تم یہاں کس لئے پائے جارہے ہو؟ کس مقصد سے آئے ہو؟"

"ہاں یہ معقول سوال ہے۔" اس نے متانت سے اپنا بڑا سا سرہلایا "لیکن اس سے پہلے میں معذرت کروں گا۔ یعنی مزید شرافت کا مظاہرہ کروں گا۔ امید ہے تم نے اس طرح میرے یہاں پائے جانے کا برا نہیں منایا ہوگا۔"

میں نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا "شرافت کے اس مظاہرے پر تو میں جان بھی دے سکتا ہوں۔"

"لیکن میں تمہاری جان لینے نہیں' تمہیں لینے آیا ہوں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"اوہ میرے خدا!" میں نے آنکھیں پھیلائیں "تمہارا انداز تو بالکل ایسا ہے جیسے کسی کی ڈولی لے جانے کی بات کی جاتی ہے۔"

"ہاں تقریباً یہی سمجھ لو۔" وہ گویا تشبیہ سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا "فرق بس یہ ہے کہ ڈولی کی جگہ کار ہوگی اور بجی بنی کسی نازک اندام دلہن کی جگہ تم جیسا بے ہودہ لمبا تڑنگا مُوا مردوا ہوگا۔ شہنائیوں کی جگہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ بھی گونج سکتی ہے اگر تم نے کچھ گڑبڑ کی۔" پھر وہ اٹھنے کے لئے پر تولتے ہوئے بولا "کیا خیال ہے اب چلا جائے؟"

"مانا کہ تمہارے ہاتھ میں گن ہے بڑے بھائی! پھر بھی میری ڈولی لے جانا اتنا آسان تو مت سمجھو۔ یہ تو میری توہین ہے۔ کم از کم کچھ تو سیاق و سباق کا حوالہ دو کچھ تو اپنا جغرافیہ بیان کرو۔ آخر تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو مجھے کہاں اور کیوں لے جانا چاہتے ہو؟" میں نے نرمی سے کہا۔

"اب سوال و جواب کا اتنا لمبا سلسلہ تو ٹھیک نہیں رہے گا۔" وہ گہری سانس لے کر بولا "میں تو پہلے ہی تمہارے انتظار میں کافی وقت ضائع کرچکا ہوں۔ میری شرافت دیکھو کہ میں نے تمہارے آفس میں گھس کر تمہاری محفل خراب نہیں کی۔ تم بہت خوشگوار موڈ میں معلوم ہوتے تھے۔ اس خوب صورت خاتون اور اس ایس ایچ او سے خوب گپ شپ چل رہی تھی جو اس وقت سادہ لباس میں تھا۔ میں نے سوچا اس وقت رنگ میں بھنگ ڈالنا مناسب

نہیں۔ بہتر ہے کچھ دیر انتظار کرلیا جائے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ میرے آنے کے بعد تمہاری محفل زیادہ دیر جاری نہیں رہی۔ لیکن انتظار کی گھڑیاں بہرحال طویل محسوس ہوتی ہیں اور پھر موقع بھی کچھ ایسا نہیں تھا کہ زیادہ وقت ضائع کیا جاتا۔ اس کے باوجود میں نے کوٹے سے زیادہ وقت خرچ کرلیا ہے۔"

اس نے سرسری سے لہجے میں بات کی تھی مگر مجھے درحقیقت خاصا زوردار جھٹکا لگا تھا کہ وہ کہیں سے آفس میں بھی جھانک کر چلا گیا تھا اور وہ رحیم گل کو بھی پہچانتا تھا جبکہ میں اندازہ لگانے سے قطعی قاصر تھا کہ آخر وہ کون ہو سکتا تھا؟

میں نے ایک بار پھر گہری نظر سے اس کا جائزہ لے کر اپنے ذہن کو کھنگالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "تمہاری شرافت کا تو میں واقعی دل و جان سے قائل ہوگیا ہوں مگر اے شرافت کے کنگ سائز پتلے۔ جہاں تم نے اتنی دیر ٹرٹر کرکے اور مجھے بھی ٹرٹر پر مجبور کرکے اتنا وقت ضائع کیا ہے وہاں چند لمحے اور سہی... ان تاریک مسائل پر کچھ تو روشنی ڈالو۔ زیادہ نہیں تو کم از کم زیرو کے بلب جتنی روشنی ہی ڈال دو۔ آخر تم کون ہو۔ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"میں اصل میں شرافت کی اتنی تکرار کرچکا ہوں کہ اب مجھے اپنا نام بتاتے ہوئے بھی شرم آرہی ہے۔" وہ اپنا گن والا ہاتھ صوفے کے ہتھے پر ٹکاتے ہوئے بولا۔ گن کا رخ اب بھی میری طرف ہی تھا۔

"کیوں کیا اتنا شرمناک ہے تمہارا نام؟"

"دراصل میں شرافت کی جتنی تکرار کرچکا ہوں اس کے بعد اپنا نام بتانا مضحکہ خیز سا لگتا ہے۔ کیونکہ میرا نام ہی شرافت علی ہے۔" وہ ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا۔

میں بے اختیار کراہ کر رہ گیا۔ کیا ستم ظریفی تھی۔ اس کا نام شرافت علی تھا اور وہ گن دکھا کر مجھے اغوا کرنے آیا تھا۔ ویسے ضروری نہیں تھا کہ یہ اس کا اصل نام ہی ہوتا۔ عین ممکن تھا کہ وہ اپنی حس مزاح کا مظاہرہ کررہا ہو۔ تاہم میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا اور پُرسکون لہجے میں پوچھا "شرافت علی! شرافت کا تقاضا یہی ہے کہ تم مجھے یہ بھی بتادو کہ آخر تم مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہو؟"

"تمہیں باس نے بلایا ہے۔" آخر وہ گویا کوئی بہت بڑا راز کھولتے ہوئے بولا۔

"اوہ!" میں نے ہلکی سی سیٹی بجائی "اس باس کا یقیناً کوئی نام بھی ہوگا؟ اس کے بغیر تو میرے لئے جاننا مشکل ہوگا کہ تم کس باس کا تذکرہ کررہے ہو کیونکہ اس شہر میں ہر چوتھا آدمی کسی نہ کسی کا باس ہے۔"

"نہیں وہ اتنا معمولی درجے کا باس نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا فخر جھلک آیا "اس کا نام مرزا اکرم بیگ ہے۔"

اس بار میرے ہونٹوں سے غیرارادی طور پر ہی سیٹی کی سی آواز نکل گئی۔ مرزا اکرم بیگ کا نام لے کر اس نے گویا میرے سر پر ہتھوڑا رسید کردیا تھا۔ سیٹھ رمضان نے مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا اور کچھ معلومات میرے اپنے ذرائع سے بھی حاصل ہوئی تھیں۔ وہ بہت بڑے اور خطرناک قسم کے اسمگلروں میں سے ایک تھا۔

اسے اور پیردانش کو بعض معاملات میں ایک دوسرے کا تعاون حاصل تھا۔ جس کوٹھی میں "سینما کلب" والوں کے لئے مخصوص فلموں کے شو چلتے تھے اور لڑکیاں بُک ہوتی تھی وہ کوکہ کرائے کی تھی لیکن مجھے پتا چلا تھا کہ اس کا اصل کرائے دار بھی مرزا اکرم بیگ تھا۔ لیکن وہ پیردانش کے دھندوں کے لئے استعمال ہورہی تھی۔

مرزا اکرم بیگ کے بارے میں مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ کروڑ پتی... بلکہ شاید ارب پتی ہونے کے باوجود ملک میں اس کی کوئی جائداد نہیں تھی اور وہ کرائے کی جگہوں سے کام چلاتا تھا۔ پچھلے دنوں اس قبیل کے لوگوں کے خلاف کچھ سخت کارروائیاں شروع ہوئیں اور جائداد کی ضبطی وغیرہ کے لئے بھی کچھ محکمے حرکت میں آئے تو ان میں سے بیشتر لوگ نہ جانے کہاں غائب ہوگئے اور کسی کی کوئی جائداد بھی ہاتھ نہیں آئی۔ مرزا اکرم بیگ کی تو تمام جگہیں کرائے ہی کی تھیں۔ لیکن باقی لوگوں کی بھی جس تھوڑی بہت جائداد کا سراغ لگ سکا، ان میں سے بعض پلاٹوں پر پلازا بن کر فروخت ہوچکے تھے۔ بعض پر ہاؤسنگ اسکیمیں اناؤنس ہوچکی تھیں اور عوام سے ان کی قسطیں وصول کی جاچکی تھیں اس لئے معاملہ اُلجھ گیا تھا۔ بعض جائدادوں کو راتوں رات پرانی تاریخوں میں فروخت شدہ ظاہر کرکے ٹھکانے لگادیا گیا تھا۔

ظاہر ہے جو لوگ اونٹوں والوں سے یارانہ رکھتے تھے وہ اپنے گھروں کے دروازے بھی بڑے رکھتے تھے۔ جو لوگ اتنے اونچے پیمانے پر ایسے کام کرتے تھے انہوں نے آڑے وقت کے لئے بھی سب بندوبست کئے ہوئے تھے اور ہر مسئلے کا حل سوچ رکھا تھا۔ ویسے بھی ہمارے ہاں اس قسم کے لوگوں کو بڑی سہولیات میسر ہیں۔ پیسے کھلا کر ہر کام ہوجاتا ہے۔ نوٹوں کی چابی سے یہ لوگ ہر بند دروازہ کھول لیتے ہیں۔ اس لئے کبھی اگر بہت ہی زیادہ سختی آجائے تو بات دوسری ہے ورنہ ان کی صحت پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔

مرزا اکرم بیگ کے بارے میں تبھی مجھے معتبر ذرائع سے یہی پتا چلا تھا کہ وہ ملک سے مفرور تھا اور اس نے غالباً دبئی وغیرہ میں کہیں ڈیرا لگایا ہوا تھا۔ لیکن اب شرافت علی میرے لئے اس کا بلاوا لے کر آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ میرے "معتبر" ذرائع کچھ ایسے معتبر بھی نہیں تھے۔ شرافت علی رات کے وقت اس طرح گن دکھا کر یقیناً مجھے دبئی لے جانے کے لئے تو نہیں آیا تھا۔

میرے لئے بہرحال یہ ایک خطرناک بُلاوا تھا۔ مرزا اکرم بیگ یقیناً پیردانش کا دوست تھا۔ کوئی بعید نہیں تھا کچھ دھندوں میں ان کی پارٹنرشپ بھی رہی ہو۔ پیردانش اور اس کی ماں کا جو انجام ہوا تھا اس سے یقیناً مرزا اکرم بیگ کو دھچکا لگا ہوگا اور اس قسم کے لوگ اس قسم کے دھچکوں کو کچھ زیادہ پسند نہیں کرتے۔

پیردانش کی موت خواہ کسی بھی انداز میں واقع ہوئی تھی اور بظاہر اس کا ذمے دار خواہ کوئی بھی تھا لیکن اگر مرزا اکرم بیگ کو تمام حالات سے آگاہی حاصل ہوچکی تھی تو اس نے اصل ذمے دار مجھے ہی ٹھہرایا ہوگا۔ اس صورت میں مجھے اس کی طرف سے غیظ و غضب کی توقع ہی رکھنی چاہئے تھی۔

تاہم اس صورت میں بھی زیادہ امکان تو یہی ہونا چاہئے تھا کہ وہ مجھ پر بھرپور انداز میں حملہ کرانے کی کوشش کرتا۔ کہیں راستے میں "چھاپا" ڈلواتا۔ کہیں دس بیس آدمی اچانک نمودار ہوتے اور جدید ترین ہتھیاروں سے تباہی پھیلانے اور میرے پرخچے اُڑانے کی کوشش کرتے۔ مرزا اکرم بیگ کی جس قسم کی شہرت مجھ تک پہنچی تھی اس قسم کے لوگ تو ایسی خونیں کارروائیوں میں ماہر ہوتے ہیں۔

مگر اس نے ایسی کوئی کارروائی کرنے کا تردد نہیں کیا تھا اور محض ایک شخص کو بھیج دیا تھا کہ مجھے لے جاکر اس کے حضور پیش کرے۔ مانا کہ آدمی دیوزاد تھا اور اس کے ہاتھ میں سائلنسر لگی ایک چھوٹی سی گن بھی تھی۔ اس کے باوجود یہ انداز مجھے کچھ زیادہ ہی شاہانہ لگا تھا۔ اس کا مطلب تھا مرزا اکرم بیگ نے میرے بارے میں بہت کچھ جان لینے کے بعد بھی مجھے کچھ زیادہ اہمیت نہیں دی تھی اور یہی سمجھا تھا کہ اس کا ایک قاصد ٹائپ آدمی مجھے گن دکھا کر کان سے پکڑ کر لے جائے گا اور اس کے سامنے حاضر کردے گا۔

میں دل ہی دل میں اپنی اس بے وقعتی کا بُرا منائے بغیر نہ رہ سکا لیکن بظاہر میں نے نہایت خوش خلقی سے باچھیں پھیلاتے ہوئے کہا "ارے تم مرزا اکرم بیگ کے قاصد ہو! تو اس کے لئے اتنی لمبی تمہید باندھنے کی کیا ضرورت تھی؟ پہلے ہی بتادیا ہوتا۔ میرے لئے تو یہ ایک اعزاز ہے کہ مرزا اکرم بیگ نے مجھے بُلایا ہے لیکن مجھے کچھ یقین سا نہیں آرہا۔ مجھ جیسے حقیر آدمی کو بھی اٹھوانے کے لئے مرزا اکرم جیسے آدمی کو اپنے کارندوں کی کم از کم ایک گاڑی تو بھر کر بھیجنی چاہئے تھی۔"

اب وہ پہلے سے کچھ زیادہ مسرور و مطمئن نظر آنے لگا اور اپنی ستون نما ٹانگوں کو مزید ذرا پھیلاتے ہوئے بولا "ایسا عام طور پر فلموں میں ہوتا ہے یا پھر گلی کوچوں میں کیڑے مکوڑوں کی طرح جنم لینے والے بھتا خور قسم کے نئے نئے بدمعاش اس قسم کی حرکتیں کرتے ہیں کہ جہاں بھی جاتے ہیں چھوٹا سا ایک جلوس لے کر جاتے ہیں۔ ویسے بھی میں تو اکیلا ہی ایک چھوٹے موٹے جلوس کے برابر ہوں۔" اس نے اپنی بات سے گویا خود ہی محظوظ ہوتے ہوئے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"بے شک... بے شک..." میں نے سنجیدگی سے سرہلایا۔ میں اس کی کیفیات کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ کسی کو دبوچنے کے لئے وہ وقت بہتر ہوتا ہے جب وہ اپنے اعصاب کو ڈھیلا چھوڑ چکا ہو۔ میرا خیال تھا اب میں اسے اس منزل پر لے آیا تھا۔

وہ بات جاری رکھتے ہوئے بولا "ویسے بھی تمہارا یہ خیال غلط ہے کہ اس وقت تمہیں اُٹھوایا جارہا ہے۔ تم سمجھ رہے ہو تمہیں اغوا کیا جارہا ہے؟"

میں نے کندھے اچکائے "تمہارے خیال میں مجھے کیا سمجھنا چاہئے؟"

"نہیں نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔" اس نے گویا مجھے تسلی دی "میں تو نہایت محبت اور احترام سے تمہیں اپنے ساتھ لے جانے کے لئے آیا ہوں۔"

پھر وہ یکدم ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے لحیم شحیم آدمی کا یوں یکدم پُھرتی سے اٹھ کھڑے ہونا خاصا حیرت انگیز عمل تھا "اب چلنا چاہئے۔" وہ فیصلہ کن سے لہجے میں بولا۔

"تم کسی گاڑی وغیرہ میں آئے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔" اس نے جواب دیا "تمہاری گاڑی کس لئے ہے؟ اسے ڈرائیو بھی تم ہی کروگے۔ ظاہر ہے مجھے اس کھلونے کا رخ بھی تو تمہاری طرف رکھنا ہے۔"

"تمام راستے تم اسی طرح مجھ پر یہ پستول تانے رہوگے اور اسی طرح مجھے ہوٹل سے باہر لے جاؤگے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں۔ میں اتنی موٹی عقل کا آدمی نہیں ہوں۔" وہ بولا "پستول میری جیب میں ہوگا۔ اس کا رخ تمہاری طرف ہوگا۔ میں بالکل تمہارے ساتھ لگ کر چلوں گا۔ میری انگلی ٹریگر پر ہوگی۔ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ میری انگلی خاصی موٹی ہے۔ اس لئے ٹریگر پر پہلے ہی کافی دباؤ رہتا ہے۔ ادھر تم نے ذرا سا اپنے "روٹ" سے ہٹ کر حرکت میں آنے کی کوشش کی اور ادھر ٹریگر دبا۔ اس پستول کے سائز پر مت جانا۔ اس کی گولی بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ انسان کو اندر سے اُدھیڑ کر رکھ دیتی ہے۔ تم جیسے ٹھیک ٹھاک جوان کے لئے بھی ایک ہی کافی ہوگی۔"

"تم تو کافی عقل مند اور تجربہ کار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ میں تو تمہیں یونہی گاؤدی سا سمجھا تھا۔ اگر تم یونہی محنت سے اپنا کام کرتے رہے تو اُمید ہے نائب قاصد کے عہدے سے ترقی کرکے نائب قاتل ہوجاؤگے۔" میں نے کہا۔

وہ ذرا بُرا سا منہ بنا کر بولا "مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا گیا ہے۔ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ تم باتیں بہت چٹاخ پٹاخ کرتے ہو۔ اس لئے مجھے تمہارے انداز گفتگو پر حیرت نہیں ہورہی۔"

"لیکن مجھے تمہارے اندازِ گفتگو پر ہورہی ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اگر سب بڑے بڑے اسمگلروں، گروہ

بازوں اور دہشت گردوں کے نمائندے تمہاری طرح مہذب، شائستہ اور خوش اطوار ہوا کریں تو وارداتوں، قتل و غارت اور اغوا وغیرہ میں کس قدر خوب صورتی اور سلیقہ پیدا ہو جائے۔ لوگوں کا ازراہِ مروت... یا محض یکسانیت سے فرار حاصل کرنے کے لئے بھی اغوا ہونے کو جی چاہنے لگے۔"

"اچھا... باتیں بہت ہو چکیں۔ اب ذرا ادھر کو گھوم جاؤ۔" اس نے مجھے منہ دوسری طرف کرنے کا اشارہ کیا۔

"یہ تو تم کچھ اس طرح حکم دے رہے ہو جیسے مداری بچہ جمہورا کو دیتا ہے۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا "ارادے کیا ہیں؟"

"ذرا تلاشی لینی ہے تمہاری۔" وہ ذرا بیزاری سے بولا "یہ مت سمجھنا کہ میں باتوں میں الجھ کر یہ کام بھول گیا ہوں۔"

"میں تم جیسے فرض شناس قاصد سے یہ امید نہیں رکھ سکتا۔" میں نے کہا "لیکن میں نہایت افسوس سے تمہیں اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ میرے پاس اس وقت کچھ بھی نہیں ہے۔ پھل کاٹنے والا جیبی چاقو تک نہیں ہے۔"

"اگر مجھے اسی طرح دوسروں کی زبان پر اعتبار کرنے کی عادت ہوتی تو میں اس عمر کو نہ پہنچ پاتا۔ نوجوانی میں ہی گلی کوچوں کے بدمعاشوں کے ہاتھوں اللہ کو پیارا ہو چکا ہوتا۔" وہ استہزائیہ لہجے میں بولا "میرا خیال ہے تم مجھے باتوں میں اُلجھا کر مزید کچھ مہلت حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہو حالانکہ میں تمہیں پہلے ہی کافی مہلت دے چکا ہوں۔ کیا تمہیں کسی کے آنے کی امید ہے؟"

میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "اب یہاں کوئی نہیں..... کوئی نہیں آئے گا۔ ویسے بھی جہاں تم جیسے لوگ آجائیں وہاں کسی اور کے آنے کی کیا امید رکھی جا سکتی ہے۔"

"اگر کوئی آیا بھی تو نقصان میں رہے گا۔" وہ بولا "میں اب ہر ایک کے ساتھ ایسا دوستانہ رویہ اختیار نہیں کر سکوں گا جیسا تمہارے ساتھ کیا ہے۔"

"میں تمہارا یہ احسان زندگی بھر نہیں بھولوں گا۔ میری تو خود یہی دعا ہے کہ اس وقت کوئی اور یہاں نہ آئے۔ خواہ مخواہ ہماری اس خوشگوار اور دوستانہ گفتگو میں خلل پڑے گا۔" میں نے باچھیں کھلائیں۔

"اچھا اب گھوم جاؤ۔" اس نے گن کو حرکت دی۔

"میں ایک بار پھر یہی کہوں گا کہ میری تلاشی لینے کی ضرورت نہیں۔ خواہ مخواہ وقت ضائع ہوگا۔" میں نے کہا۔

"جہاں اتنا وقت ضائع ہوا ہے وہاں چند سیکنڈ اور سہی۔" وہ بے پروائی سے بولا "ویسے بھی میرے کچھ اصول ہیں۔ میں جب کوئی چیز لینے جاتا ہوں اور دکاندار میرے سامنے اس چیز کا کوئی نمونہ رکھ کر اس کی تعریفوں کے پُل باندھتا ہے تو میں وہ پیس نہیں لیتا۔ میں اس چیز کا کوئی دوسرا پیس نکلواتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ دکاندار جس پیس کی تعریفوں کے پُل باندھ رہا ہوتا ہے اس میں کوئی نقص ہوتا ہے اس طرح جب کوئی اصرار کرتا ہے کہ میں اس کی تلاشی نہ لوں تو میں ضرور تلاشی لیتا ہوں اور وہ عام طور پر سودمند ثابت ہوتی ہے۔"

"کتنے عقل مند ہو تم۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔ "ویسے اس سے کہیں بہتر ہوتا کہ تم مجھے لباس تبدیل کر لینے کی اجازت دیتے۔ صبح سے انگریزوں کی اس یادگار میں لپٹے لپٹے میں بور ہو گیا ہوں۔" میں نے اپنے سوٹ کی طرف اشارہ کیا۔

"اتنی ہی بیزاری ہے تو مت پہنا کرو۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔

"کیا کروں۔ مجبوری ہے۔" میں نے کندھے اچکائے "آج کل آدمی کی قدر کم، اس کے سوٹ کی زیادہ ہے۔ کسی محفل میں لوگ آدمی کو بعد میں.... اس کے سوٹ کو پہلے دیکھتے ہیں۔"

"زمانہ تو ہمیشہ سے ایسا ہی چلا آرہا ہے۔" وہ بے پروائی سے بولا "بہرحال میں تمہیں لباس تبدیل کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ ویسے بھی ہم کسی پارٹی میں نہیں جا رہے ہیں اور اس سوٹ میں کوئی خرابی بھی نہیں ہے۔ نہایت عمدہ اور نفیس سوٹ ہے۔ ٹائی بھی شاندار ہے۔" اس نے تنقیدی نظر سے میرا جائزہ لیا۔

"میں سوٹ کے معیار کی بات نہیں کر رہا تھا۔ میرا مطلب تھا کہ شلوار قمیص پہن لوں ذرا ایزی ہو جاؤں۔" میں نے کہا۔

"آہ! ایزی ہونے کے لئے آخر اپنا ہی لباس یاد آتا ہے۔ زندگی سوٹ بوٹ اور ٹائی میں گزر جاتی ہے مگر ان میں خود کو ایزی محسوس کرنے کی عادت نہیں پڑتی۔" وہ ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ پھر اس نے بازو پھیلا کر اپنا خیمہ نما سوٹ دکھاتے ہوئے کہا "ایزی رہنا چاہتے ہو تو ایسا سوٹ پہنا کرو۔ چلو اب ادھر گھوم جاؤ۔"

"اچھا مجھے ہاتھ منہ ہی دھو لینے دو۔" میں نے فرمائش کی۔

"چندا..... ! مجھے گولی دینے کی کوشش مت کرو اور جو میں کہہ رہا ہوں، سیدھی طرح اس پر عمل کرو۔" وہ نہایت مشفقانہ لہجے میں بولا۔

میں چاہتا تھا اسے شبہ ہو جائے کہ میرے پاس کوئی ہتھیار تھا تاکہ وہ ذرا اچھی طرح میری تلاشی لے۔ جب وہ کوئی ایسی چیز تلاش کرنے کی کوشش کرتا جو میرے پاس نہیں تھی تو یقیناً اس کے ذہن میں الجھن پیدا ہوتی جو میرے لئے فائدہ مند ثابت ہو سکتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق اب اسے صرف شبہ نہیں بلکہ کافی حد تک یقین ہو چکا تھا کہ میرے پاس کوئی ہتھیار موجود تھا۔

چنانچہ میں نے محاورتاً ہتھیار ڈالتے ہوئے کہا "اچھا بھئی... اگر تمہیں یقین نہیں آرہا تو لے لو تلاشی.... زمانہ ہی کچھ ایسا آگیا ہے کسی کو کسی کی بات کا اعتبار ہی نہیں رہا۔" میرے لہجے میں زمانے بھر کا دکھ جھلک آیا۔

میں نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ وہ عقب سے میرے قریب آیا۔ ایک ہاتھ سے اس نے گن میری کنپٹی پر رکھی اور دوسرے

ہاتھ سے مجھے ٹٹولنا شروع کیا۔ وہ نہایت تفصیل سے ہر ایسی جگہ ہاتھ مار کر دیکھ رہا تھا جہاں کوئی ہتھیار پوشیدہ ہونے کا امکان ہو سکتا تھا۔

"اتنی گہرائی سے تلاشی مت لو یار! گدگدی ہوتی ہے۔" میں نے کہا۔ میں گردن گھما کر تو نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کے اور میرے درمیان کتنا فاصلہ تھا۔ وہ میرے جتنا قریب ہوتا اتنا ہی بہتر تھا۔

"گدگدی تو نرم و نازک اور مرمریں ہاتھوں سے ہونی چاہئے۔" وہ مجھے ٹٹولنے کا عمل جاری رکھتے ہوئے بولا "میرے ہاتھوں سے تو تمہارے جسم میں خوف کی لہر دوڑ سکتی تھی لیکن اچھی بات یہ ہے کہ ہماری ملاقات دوستانہ ماحول میں ہو رہی ہے۔"

"دوستی میں تمہارا یہ عالم ہے تو دشمنی میں واقعی پکے خبیث لگتے ہو گے۔" میں نے اپنے لہجے سے ہلکی سی مرعوبیت ظاہر کرنے کی کوشش کی۔

یہ گویا اس کے لئے توصیفی الفاظ تھے۔ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ میں نے اپنی کمر پر اس کے کوٹ کا لمس محسوس کیا۔ اس کا مطلب تھا وہ میرے بالکل قریب تھا۔

"تمہیں شکر کرنا چاہئے کہ ہماری پہلی ملاقات دشمنوں کی حیثیت سے نہیں ہو رہی۔" اس نے گویا مجھے کسی بڑے سانحے سے بچ جانے کی خوش خبری سنائی۔

"تو پھر یہ گن..... یہ تلاشی کس سلسلے میں ہے؟" میں نے شکوہ کیا۔

"ہمیں معلوم تھا کہ تم مرزا اکرم بیگ کا نام سن کر آسانی سے میرے ساتھ جانے کے لئے تیار نہیں ہو گے۔ اس لئے یہی انداز بہتر تھا۔" اس نے جواب دیا۔

"تم آزما کر تو دیکھتے۔" میں نے شکوہ جاری رکھا۔

اس بار اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ یقیناً اس کی پریشانی شروع ہو چکی تھی۔ میں اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کے ماتھے پر شکنیں نمودار ہو چکی ہوں گی۔ وہ میرا پورا بالائی دھڑ اور جیبیں ٹٹول چکا تھا۔ ابھی تک کوئی ہتھیار برآمد نہیں ہو سکا تھا۔ صرف میرا بٹوا برآمد ہو سکا تھا۔ جسے اس نے جیب سے نکال کر بے پروائی سے ایک طرف پھینک دیا تھا۔

چوٹی سے ایڑی تک تلاشی مکمل کرنے کے لئے اب اس کا جھکنا ضروری تھا اور یہ ایک مشکل مرحلہ تھا۔ اس کے لئے اسے گن۔ کی نال میری کنپٹی سے ہٹانا پڑی۔ اب غالباً وہ اسے میری کمر یا پسلیوں پر ٹکانا چاہتا تھا لیکن یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ میرے لئے حرکت میں آنے کا لمحہ تھا۔

میری نظر اس کے گن ... والے ہاتھ تک آسانی سے جا رہی تھی۔ میں نے انتہائی پھرتی سے اس کی کلائی پر ہاتھ ڈالتے ہوئے یکدم دہرا ہو کر اسے کمر پر اٹھا کر آگے پھینک دیا۔ میرے اس داؤ کی کامیابی کا تمام تر دارومدار صرف پھرتی اور اندازوں کی درستی پر تھا۔

میری کوشش کامیاب رہی۔ اسے اٹھا کر پھینکنا گوشت کے ایک پہاڑ کو اٹھا کر پھینکنے سے کم نہیں تھا۔ فرش پر دبیز قالین موجود تھا اس کے باوجود زوردار دھمک محسوس ہوئی۔ دائیں بائیں دونوں طرف کے کم از کم دو کمروں میں یہ دھمک ضرور محسوس کی گئی ہوگی۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر ان میں کوئی موجود ہوا تو کہیں وہ دستک دے کر پوچھنے نہ آ جائے کہ کسی انوکھے اتفاق کے تحت صرف اس کمرے کی چھت الگ ہو کر نیچے تو نہیں آ گری تھی؟

اگر فرش پر دبیز قالین موجود نہ ہوتا تو شاید وہ پورا فلور لرز کر رہ جاتا اور اوپر نیچے کی منزلوں پر بھی اس کے اثرات محسوس کئے جاتے۔ اس کی ٹانگیں بہت بری طرح بیڈ سے جا ٹکرائیں لیکن اس کی خوش قسمتی تھی کہ اس پر بھی بہت موٹی میٹرلیس موجود تھی۔ اس کی ٹانگیں بُری طرح ہوا میں اچھل کر رہ گئیں ورنہ شاید بیڈ یا ٹانگیں دونوں میں سے کوئی ایک چیز ضرور ٹوٹتی۔

اس میں شک نہیں کہ اس نے گولی چلانے میں دریغ نہیں کیا تھا یا پھر شاید ٹریگر پر اس کی موٹی انگلی کا دباؤ بڑھ جانے کی وجہ سے حادثاتی سے انداز میں گولی چل گئی تھی۔ بہرحال میں نے اس امکان کو ذہن میں رکھا تھا۔ اسی لئے اسے اٹھانے کے ساتھ ہی اس کی کلائی پر بھی ہاتھ ڈالا تھا۔ اس کا گن والا ہاتھ اونچا ہو گیا تھا اور "ٹھک" کی تیز سی آواز کے ساتھ چلنے والی گولی نے فانوس کے چند کرسٹلز اور چھت کا تھوڑا سا پلستر نیچے گرا دیا تھا۔

وہ دوسری گولی نہ چلا سکا کیونکہ اس کا گن والا ہاتھ اس کے اپنے نیچے دب گیا تھا۔ یہ بھی اچھا ہی رہا کہ ٹریگر اتفاقاً دوبارہ نہیں دب گیا ورنہ شاید گولی خود اسے ہی لگ جاتی۔ میں نے اسے ہاتھ سیدھا کرنے اور گولی چلانے کا موقع بھی نہیں دیا۔ میں اس کے بارے میں کسی غلط فہمی کا شکار نہیں تھا۔

یقیناً اس کی سمجھ میں نہیں آیا ہوگا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا تھا اور وہ پلک جھپکتے میں کس طرح میرے اوپر سے ہوتا ہوا دوسری طرف جا گرا تھا۔ کم از کم ایک لمحے کے لئے وہ ضرور بدحواس ہو گیا ہوگا اور وہ پورا دیو زاد بھی تھا۔ اس کے باوجود مجھے اندیشہ تھا کہ وہ بہت پھرتی سے اٹھ کھڑا ہوگا۔ اس کے بعد شاید اس کمرے کی محدود جگہ میں میرے لئے اس پر قابو پانا خاصا دشوار ہوتا اس لئے میں نے ایک لمحہ بھی ضائع کئے بغیر ایک ٹھوکر اس کی کنپٹی پر اور دوسری اس کی پسلیوں پر رسید کی۔ ان دو ٹھوکروں نے اسے اٹھنے سے باز رکھا۔

وہ اٹھتے اٹھتے دوبارہ گر گیا۔ میں نے اس پر مزید کوئی وار نہیں کیا۔ میں اسے زیادہ گزند بھی پہنچانا نہیں چاہتا تھا۔ میرا مقصد یہ نہیں تھا کہ وہ لمبا ہی لیٹ جائے اور اٹھنے کے قابل نہ رہے۔ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ مجھے گزند پہنچانے کے قابل نہ رہے۔

اس کا مڑا ہوا ہاتھ اس کے نیچے سے نکل آیا تھا لیکن اب گن اس ہاتھ میں نہیں تھی۔ وہ اس کے نیچے ہی دب گئی تھی اور فی الحال شاید وہ گن کو بھول ہی گیا تھا۔ اس نے ایک بار پھر اٹھنے کی کوشش کی اور اس کے انداز نے مجھے بتا دیا کہ ابھی اس میں خاصی توانائی باقی تھی۔ میں نے اس کے بازو پر ایک ٹھوکر اور اس کی کھوپڑی پر کراٹے کا ایک ہلکا ہاتھ رسید کیا۔ وہ ایک بار پھر چت ہو گیا لیکن اس بار میں نے اس کے گرنے سے پہلے اس کی گن کھسکا کر اس کے نیچے سے نکال دی جس پر اسی لمحے میری نظر پڑی تھی۔

دوسرے ہی لمحے میں نے اس کے اوپر سے دوسری طرف چھلانگ لگا کر گن اٹھا لی۔ میری یہ ساری کارروائی شاید چند لمحوں کے انتہائی تیز بریک ڈانس سے مشابہ رہی ہو لیکن اس وقت میں اپنی حرکات و سکنات کی مضحکہ خیزی پر غور نہیں کر سکتا تھا۔ اطمینان کی بات یہ تھی کہ میری کوشش کامیاب رہی تھی اور میری اچھل کود کا نتیجہ وہی نکلا تھا جو میں نے چاہا تھا۔ کوئی اندازہ ذرا سا غلط ہونے پر یا ہاتھ ذرا سا اوچھا پڑنے پر نتیجہ کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔

گن ہاتھ میں آتے ہی میں نے ذرا اطمینان کی سانس لی اور دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ گن کی اب کوئی خاص ضرورت نہیں رہی تھی۔ میرے لئے جو کام ضروری تھا وہ ہو چکا تھا یعنی شرافت علی اب حملہ کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ میری نظر میں اب وہ شرافت کا پیکر بن چکا تھا۔

وہ چت پڑا چھت کی طرف دیکھ کر آنکھیں پٹ پٹا رہا تھا۔ اٹھنے کی کوشش اس نے ترک کر دی تھی۔ اس کا چہرہ ایک خالی الذہن شخص کا چہرہ تھا۔ ایک لمحے کے لئے مجھے شبہ ہوا کہ کہیں وہ یادداشت تو نہیں کھو بیٹھا تھا۔ اس کی جسامت کے لحاظ سے میں نے اس پر کچھ زیادہ خطرناک وار نہیں کئے تھے لیکن عین ممکن تھا کہ کھوپڑی پر کراٹے کا ہاتھ یا ٹھوکر رسید کرنے سے اس کے ذہن کا کوئی غلط سوئچ دب گیا ہو اور اس کی یادداشت کے خانے میں اندھیرا چھا گیا ہو یا اس کے ذہن کو متوازن رکھنے والے کچھ خلیات درہم برہم ہو گئے ہوں۔ یوں تو یہ ساری دنیا ہی قدرت کا ایک کارخانۂ عجائب ہے۔ بشرطیکہ انسان غور کرے۔ مگر انسانی ذہن تو بہت ہی بڑا کارخانۂ عجائب ہے۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا اس میں کب کیا تغیر رونما ہو جائے۔

میں کئی سیکنڈ تک منتظر کھڑا رہا مگر اس نے اٹھنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی آنکھیں دھندلائی دھندلائی سی دکھائی دینے لگی تھیں اور وہ بالکل خاموش تھا۔ مجھے یہ بھی شبہ تھا کہ کہیں وہ مکاری سے تو کام نہیں لے رہا تھا؟ عین ممکن تھا کہ میں اس کے قریب جانے کی کوشش کرتا تو وہ اچانک کوئی کام دکھا دیتا۔ تاہم مجھے اس کے بارے میں تشویش بھی ہو چلی تھی۔

میں نے مزید چند سیکنڈ انتظار کیا۔ آخر کار خطرہ مول لیتے ہوئے میں نے گن دائیں ہاتھ میں ہی رکھتے ہوئے محتاط انداز میں آگے بڑھ کر بائیں ہاتھ سے اس کا گریبان پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کی طرف سے کوئی خطرناک ردِعمل سامنے نہیں آیا۔ اس کا مطلب تھا وہ کوئی چال نہیں چل رہا تھا بلکہ واقعی اس کے حواس اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔

ایک ہاتھ سے اسے اٹھانا کسی ست الوجود گینڈے کو اٹھانے سے کم نہیں تھا۔ تاہم میں نے اسے اٹھا کر بٹھا دیا۔ یہ دیکھ کر مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ وہ دوبارہ چت نہیں ہوا۔ میں نے اس کا گریبان چھوڑ دیا تب بھی وہ ٹانگیں پھیلائے بیٹھا ہی رہا۔ پھر اس نے دو چار مرتبہ سر جھٹکا اور اس کی آنکھوں کی دھندلاہٹ کچھ کم ہوئی۔

میں ایک بار پھر اس سے ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے عجیب سی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ اس کے بال بکھر گئے تھے۔ کپڑے چرمر ہو گئے تھے۔ چہرے کا گوشت نہ جانے کیوں اتنی سی دیر میں ہی کچھ لٹکا لٹکا سا دکھائی دینے لگا تھا۔ چند سیکنڈ میں ہی وہ ایک بالکل مختلف انسان نظر آنے لگا تھا تاہم اس کی آنکھوں میں زندگی لوٹ آئی تھی۔ اس کی سمجھ میں آنے لگا تھا کہ وہ کہاں تھا۔ البتہ یہ شاید اب بھی سمجھ میں نہیں آیا ہو کہ وہ اچانک اس حال کو کیونکر پہنچ گیا تھا۔

"امید ہے اب تمہارے دماغ کے کیڑے جھڑ گئے ہوں گے اور کھوپڑی میں جو تھوڑا بہت زنگ لگا ہوا تھا وہ بھی اُتر گیا ہوگا۔" میں نے کہا۔

اس نے کوئی جواب نہ دیا اور میری طرف دیکھ کر آنکھیں پٹ پٹاتا رہا۔ میں نے گن کو حرکت دیتے ہوئے ذرا سخت لہجے میں کہا "اب ذرا فرش سے اٹھو اور اپنی کرسیِ ذلالت پر بیٹھ جاؤ۔"

"ک... کیا؟" اس کا منہ کسی مخبوط الحواس شخص کی طرح کھل گیا۔

"اٹھ کر کرسی پر بیٹھ جاؤ۔" میں نے ڈانٹ کر کہا۔

اس نے ایک بار پھر سر کو چند جھٹکے دیئے۔ اس کا ہونقوں کی طرح کھلا ہوا منہ بند ہو گیا اور وہ اٹھ کھڑا ہوا لیکن اٹھنے میں اسے کافی وقت پیش آئی۔ وہ جوڑوں کے درد کے پرانے مریض کی طرح گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھا۔ وہ انہی لوگوں میں سے تھا جو زیادہ قد آور اور جسیم ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل سے گرتے ہیں لیکن جب گرتے ہیں تو درحقیقت ان کا گرنا کسی بڑی عمارت کے ڈھے جانے سے مشابہ ہوتا ہے۔ ان کا دوبارہ اٹھنا ایک مسئلہ بن جاتا ہے۔

تاہم وہ اٹھ کھڑا ہوا اور سیدھا ہو گیا۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ کرسی کے بجائے دوسرے صوفے پر جا بیٹھا۔ شاید اس وقت وہ زیادہ آرام دہ چیز کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس نے چند گہری گہری سانسیں لیں پھر خفگی آمیز سے لہجے میں پوچھا "کیا تمہارا یہ سب کچھ

کرنا ضروری تھا؟"

"نہیں... کچھ ایسا خاص ضروری تو نہیں تھا۔" میں نے بے پروائی سے کندھے اچکائے اور اس کے عین سامنے بیڈ پر جا بیٹھا۔

"تو پھر تم نے یہ کیوں کیا؟" اس نے ذرا غصے سے پوچھا۔

"مجھ سے اس لہجے میں بات مت کرو ورنہ میں ابھی اور بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔" میں نے سرد لہجے میں کہا "یہ تو ہلکا ڈوز تھا۔ تمہیں تمہارے وجود کی مناسبت سے بھاری ڈوز بھی مل سکتا ہے۔"

اس کی خفگی اور برہمی جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ صوفے پر کچھ سکڑ سمٹ سا گیا۔ اس کے حق میں اچھا ہی تھا کہ اس نے غصہ دکھانے کی خواہش پر جلدی قابو پا لیا تھا۔ میں نے ذرا نرمی سے کہا "مجھے یہ بالکل اچھا نہیں لگتا کہ کوئی اپنی جسامت اور طاقت کی وجہ سے یا کسی بڑے بدمعاش کا کارندہ ہونے کی وجہ سے مجھ پر رعب ڈالنے کی کوشش کرے۔ اگر آج تم مجھے پستول دکھا کر لے جانے میں کامیاب ہو جاتے تو تمہارے موٹے دماغ میں ہمیشہ کے لئے یہ بات بیٹھ جاتی کہ افضل تو گھڑے کی مچھلی ہے' جب جی چاہے گا ہاتھ ڈال کر پکڑ لیں گے۔ جب باس حکم دے گا تبھی جا کر اسے گردن سے پکڑ کر لے آئیں گے اور باس کے حضور میں پیش کر دیں گے۔"

وہ خاموش رہا۔ ذرا توقف سے میں نے کہا "کسی بھی اچکے یا لفنگے کی کھوپڑی میں اس قسم کے خیالات کا جنم لینا مجھے پسند نہیں ہے اور یہ میری آئندہ زندگی کے لئے پریشان کن ثابت ہو سکتا ہے جبکہ میری زندگی میں تم جیسے بے ہودہ کرداروں کی بڑی ریل پیل ہے۔ آئے دن کوئی نہ کوئی ٹکراتا ہی رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کی نکمی کھوپڑیاں اس قسم کے خیالات سے بالکل پاک صاف رہیں۔ کچھ آئی سمجھ میں بات؟"

اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا مطلب تھا کہ بات اس کی سمجھ میں آ رہی تھی۔ میں نے گن کا رخ بدستور اس کی طرف رکھتے ہوئے کہا "اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ میں تمہارے باس سے ملنا نہیں چاہتا یا میں اس سے خوف زدہ ہوں۔ مجھے تو خود اس سے ملنے کا تجسس ہے۔ اور یہ جاننے کے بعد تو تجسس اور بھی بڑھ گیا ہے کہ وہ یہیں موجود ہے۔ میں تو سمجھ رہا تھا وہ مفرور ہے اور ملک سے باہر ہے۔"

شرافت علی نے سر اٹھایا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ خاصی حد تک ہموار لہجے میں بولا "مرزا اکرم بیگ بہت عجیب لوگوں میں سے ایک ہے۔ اس کے بارے میں بہت سے افسانے مشہور رہتے ہیں لیکن حقیقت کا علم بہت کم لوگوں کو ہوتا ہے۔"

"بہت خوب!" میں نے سر ہلایا "یہ مقام بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتا ہے۔"

وہ میرے طنز کو سمجھ گیا۔ سر سہلاتے ہوئے بولا "تمہیں اس کے بارے میں بدگمان نہیں ہونا چاہئے۔ وہ بُرا آدمی نہیں ہے۔"

"میں کب اسے بُرا آدمی کہہ رہا ہوں۔" میں نے ملائمت سے کہا "لیکن مسئلہ یہ ہے کہ میں اچھے لوگوں سے بھی اس طرح ملنا پسند نہیں کرتا کہ ان کے کارندے میری کھوپڑی پر پستول رکھ کر مجھے ان کے دربار میں لے جا کر پیش کریں۔ تم نے بڑی تکلیف کی کہ مجھے لینے آئے۔ میں مرزا اکرم بیگ کا بھی شکریہ ادا کروں گا کہ اس نے تم جیسے بااخلاق انسان کو مجھے لینے کے لئے بھیجا لیکن بجائے اس کے کہ تم مجھے لے کر جاؤ۔ اب میں تمہیں لے کر جاؤں گا۔ یہ زیادہ اچھا لگے گا۔"

"کیا مطلب؟" اس نے تھوک نگل کر پوچھا۔

"تم اچھے خاصے ذہین آدمی معلوم ہوتے ہو۔ اتنی سادہ سی بات کا مطلب تمہاری سمجھ میں نہیں آیا؟ بھئی تھوڑی سی دیر کے لئے بھول جاؤ کہ تم مجھے لینے آئے تھے۔ تم بدمعاش بننے اور پستول دکھا کر کسی کو لے جانے کا شوق پھر کسی وقت پورا کر لینا۔ اس وقت میں تمہیں گن پوائنٹ پر تمہارے ہی باس کے پاس لے چلوں گا۔"

"مقصد تو خیر یہی ہے کہ تم باس کے سامنے پہنچ جاؤ۔ لیکن اس طرح کچھ اچھا نہیں لگے گا۔ باس ناراض ہوگا۔" وہ مُردہ سے لہجے میں بولا۔

"کس پر؟ مجھ پر یا تم پر؟" میں نے پوچھا۔

"شاید دونوں پر۔" وہ بولا۔

"مجھے اپنے ساتھ مت گھسیٹو۔" میں نے کہا "اگر وہ ناراض ہوا تو صرف تم پر ہوگا۔ ظاہر ہے اپنے گرگوں کی نالائقی پر باس ناراض ہی ہوتے ہیں۔ امید ہے مجھ سے تو وہ خوش ہی ہوگا۔ اگر وہ خوش نہ ہوا تب بھی میری بلا سے... مجھے اس قسم کے لوگوں کی صرف اتنی ہی پروا ہوتی ہے جتنی اپنے پُرانے جوتے کی۔"

"بہت بڑی بڑی باتیں کر رہے ہو۔" اس نے بھویں اچکائیں۔

"زندگی کی جنگ نے مجھے بہت سخت جان بنا دیا ہے پیارے شرافت علی!" میں نے گہری سانس لے کر کہا "جرائم کی دنیا کے بہت بڑے بڑے [illegible] اب مجھے محض بونے لگتے ہیں۔ میں نے ان سے مرعوب ہونا چھوڑ دیا ہے۔ صرف شریف آدمی میری نظر میں بڑا آدمی ہے۔ چاہے بظاہر وہ کتنا ہی معمولی ہو اور صرف نام کا شریف یا شرافت علی نہ ہو۔"

پھر میں نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد پوچھا "کیا اب تم بتانا پسند کرو گے کہ تمہارے باس نے مجھے کس سلسلے میں یاد فرمایا ہے؟ وہ میری تکا بوٹی بنوانا چاہتا ہے یا مجھے سالم روسٹ کرانا چاہتا ہے؟"

"نہیں' ایسی کوئی بات نہیں ہے۔" وہ جلدی سے بولا "اس نے تو کہا تھا کہ جس طرح بھی ممکن ہو' میں تمہیں بہت عزت کے ساتھ لے کر آؤں۔ لیکن یہ اسے بھی معلوم تھا کہ تم اس کا نام سُن کر بدک جاؤ گے۔"

"تمہارے ہاں جس کی عزت افزائی کرنا مقصود ہوتی ہے اسے گن دکھائی جاتی ہے؟" میں نے سادگی سے پوچھا اور جواب کا انتظار کئے بغیر کہا "جس کی زیادہ ہی عزت افزائی مقصود ہوتی ہوگی غالباً اس کی کھوپڑی میں ایک آدھ گولی اتار دی جاتی ہوگی۔"

"نہیں نہیں یہ بات نہیں ہے۔" اس نے ذرا بے تابانہ انداز میں اپنا بھاری بھرکم ہاتھ ہوا میں لہرایا لیکن پھر کراہ کر اسے دوسرے ہاتھ سے تھام لیا۔ اس کا وہ ہاتھ مڑ کر اس کے نیچے دب گیا تھا۔ شاید اس میں موچ آگئی تھی یا پھر تھوڑی بہت تکلیف تھی۔

چند سیکنڈ بعد وہ ہاتھ کو گود میں ٹکاتے ہوئے بولا "باس نے تو تمہیں لانے کا معاملہ مکمل طور پر مجھ پر چھوڑ دیا تھا۔ اس کا مقصد تو صرف تم سے ملاقات کرنا تھا۔ یہ میرا دردِ سر تھا کہ میں تمہیں کیسے لے کر جاؤں۔ یہ گن والا آئیڈیا میرا اپنا تھا۔"

"بہت ہی بے ہودہ آئیڈیا تھا۔" میں نے کہا "اتنی بڑی کھوپڑی میں اتنے بے کار قسم کے آئیڈیاز آتے ہیں؟ تم اس کی اوورہالنگ کراؤ۔"

"اوورہالنگ تو ہو گئی ہے۔" وہ کھوپڑی سہلاتے ہوئے بولا۔ [اس] کی کھوپڑی پر یقیناً کم از کم دو جگہ تو گومڑا بھر آئے ہوں گے "اگر [میری] کھوپڑی سانڈ کی طرح مضبوط نہ ہوتی تو شاید یہ چٹخ چکی ہوتی۔"

"اگلے مرحلے میں چٹخ بھی سکتی ہے۔" میں نے کہا "سانڈ کی [ط]رح مضبوط ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اگر تمہارے ذہن [می]ں کوئی اور بے ہودہ آئیڈیا آگیا تو تمہیں اس کا نتیجہ تو بھگتنا پڑے [گ]ا۔"

"افضل میاں! کیا تم مجھے معاف نہیں کر سکتے؟" وہ اچانک ہی [ب]اسی لجاجت سے بولا۔ مجھے اندیشہ محسوس ہوا کہ شاید اب وہ [ع]اجزی کی چال چلنا چاہتا تھا۔

"واہ...!" میں نے ذرا حیرت سے کہا "تم تو اب سچ مچ شرافت [علی] بننے کی کوشش کر رہے ہو۔ کیا ارادے ہیں۔ کوئی نیا آئیڈیا ذہن [می]ں آیا ہے؟"

"نہیں۔ بخدا میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے اب احساس [ہو] رہا ہے کہ میں غلطی کر بیٹھا ہوں۔" وہ ہچکچاہٹ آمیز لہجے میں بولا [ہم]یں تمہارے بارے میں بہت معلومات حاصل ہو چکی ہیں۔ اس [ک]ے باوجود میرا خیال ہے میں تمہیں صحیح طور پر نہیں جان سکا۔ [تمہ]ارے بارے میں صحیح رائے قائم نہیں کر سکا۔ صحیح طور پر یہ فیصلہ [نہی]ں کر سکا کہ میرا رویہ تمہارے ساتھ کیسا ہونا چاہئے۔"

"تمہاری یہ "صحیح صحیح" کی تکرار اپنی جگہ صحیح ہے۔ لیکن مجھے [زند]گی میں سب سے زیادہ افسوس یہی دیکھ کر ہوتا ہے کہ اچھے بھلے [لوگو]ں کو بہت تاخیر سے یہ احساس ہوتا ہے کہ صحیح کیا ہے اور غلط [کیا۔] اس وجہ سے بھی بڑے بڑے مسائل کھڑے ہوتے ہیں۔"

"مجھے اپنی غلطی کی بڑی ٹھیک ٹھاک سزا مل گئی ہے۔" وہ ایک [با]ر اپنی کھوپڑی اور ہاتھ سہلاتے ہوئے بولا "اب تم مجھے معاف کر ہی دو۔"

"میں کیا کروں جس سے تمہیں معلوم ہو جائے کہ میں نے تمہیں معاف کر دیا ہے؟"

"یہ گن مجھے واپس دے دیں اور اسی طرح میرے ساتھ چلیں جس طرح ایک معزز آدمی دوسرے معزز آدمی کے ساتھ جاتا ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"تمہاری یہ فرمائش پوری کرنی تو میرے لئے بہت مشکل ہے۔" میں نے کہا "میں نے اگر تمہارے ساتھ چلنے کا فیصلہ کر بھی لیا تو اس طرح چلنا میں ہرگز پسند نہیں کروں گا۔ میں تو معزز آدمی ہوں۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے لیکن تم جیسے اچکوں کو میں نے معززین میں شمار کرنا ابھی شروع نہیں کیا۔ میرا دل تو چاہ رہا ہے اگر تمہارے ساتھ چلوں بھی تو اس طرح چلوں جس طرح ایک پولیس والا کسی جیب کترے کو رنگے ہاتھوں پکڑنے کے بعد چلتا ہے۔ تم نے کبھی یہ منظر دیکھا ہے؟"

اس نے بے چارگی سے نفی میں سر ہلایا۔

"بڑا عبرت ناک منظر ہوتا ہے۔" میں نے کہا "میرا خیال تو یہی تھا کہ تمہیں اس منظر کے بارے میں بہت اچھی طرح معلوم ہوگا۔"

"کیوں آیا تھا تمہیں یہ خیال؟" اس نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"میرا اندازہ تھا کہ تم نے ایک جیب کترے کے طور پر ہی اپنے کیریئر کا آغاز کیا ہوگا اور ترقی کر کے اس مقام تک پہنچے ہو گے۔" میں نے جواب دیا۔

وہ مجھے گھور کر اور دانت پیس کر رہ گیا۔ ایک لمحے کی خاموشی کے بعد وہ گویا خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا "پلیز اب چلو۔ میں پہلے ہی بہت وقت ضائع کر چکا ہوں۔ اگر تم یہ گن مجھے نہیں دے سکتے تو اسے جیب میں رکھو۔ تم مجھ سے جو قسم چاہو لے سکتے ہو کہ میں کوئی غلط حرکت نہیں کروں گا۔"

"اگر تم نے کی بھی... تو شاید وہ تمہاری اس مہینے کی آخری غلط حرکت ہو۔ اس کے بعد تم مزید کوئی حرکت کرنے کے قابل نہیں رہ جاؤ گے۔" پھر ایک لمحے کے لئے صورتِ حال کے بارے میں سوچنے کے بعد میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا "میں تمہارے ساتھ ضرور چلوں گا اور یہ گن بھی جیب میں رکھ لوں گا گو کہ اس کا رخ تمہاری طرف ہی رہے گا اور میری انگلی ٹریگر پر ہی رہے گی۔ بالکل اسی طرح جیسے تمہارا مجھے لے جانے کا پروگرام تھا لیکن اس سے پہلے میں ایک فون کروں گا۔"

میں شفیع شاہ سے رابطہ کر کے اسے صورتِ حال کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ شرافت علی بے تابی سے بولا "تمہیں جو بھی کرنا ہے' جلدی کرو۔ ایسا نہ ہو کہ میرے پاس کوئی بہانہ کرنے کی بھی گنجائش نہ رہے۔ فی الحال تو میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ تمہیں تلاش

کرنے میں دیر ہوگئی تھی۔"

"اس سے پہلے کہ میں فون کروں۔ تم مجھے یہ بھی بتادو کہ تم نے میری تینوں گنیں کہاں رکھی ہیں؟" میں نے کہا۔

اس نے اس صوفے کی طرف اشارہ کیا جس پر وہ پہلے بیٹھا تھا "اس کے نیچے پڑی ہیں۔ تمہیں ان کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔"

میں نے اس کی بات کی تصدیق کی زحمت نہیں کی اور ٹیلی فون کی طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ عین اسی لمحے فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں نے ریسیور اٹھانے سے پہلے شرافت علی کو خبردار کیا "یہ مت سمجھنا کہ فون سننے میں میری توجہ بٹ جائے گی۔ زیادہ ہوشیار اور پھرتیلا بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

وہ برا سا منہ بنا کر بولا "یہ کمبخت فون بھی ابھی آنا تھا۔ خدا کے لئے جلدی بات ختم کرنے کی کوشش کرنا اور میری طرف سے تم بے فکر رہو۔ میں کچھ نہیں کروں گا۔"

"شاباش!" میں نے پیار سے کہا "بعض لوگوں کو ٹھوکر کھانے کے بعد عقل آتی ہے۔ خصوصاً کھوپڑی پر ٹھوکر کھانے کے بعد!"

میں نے پستول کا رخ اور نظر اس کی طرف رکھتے ہوئے ریسیور اٹھایا۔ وہ میرا ڈائریکٹ فون نہیں تھا۔ دوسری طرف سے آپریٹر بولا "سر! کوئی مرزا اکرم بیگ آپ سے بات کرنا چاہتا ہے۔ آپ بات کریں گے؟"

میں فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا۔ یہ میرے لئے اس دن کی ایک اور حیرت تھی کہ مرزا اکرم بیگ مجھے فون کر رہا تھا۔ میں ریسیور پر دوسرا ہاتھ نہیں رکھ سکتا تھا کیونکہ میرے دوسرے ہاتھ میں گن تھی۔ میں نے اسی ہاتھ سے ماؤتھ پیس کو ڈھانپنے کی کوشش کی جس سے ریسیور تھاما ہوا تھا۔ پھر میں نے شرافت علی کو آنکھ مارتے ہوئے کہا "تمہارے ابا جان کا فون بھی آگیا۔"

اس کی رنگت کچھ زرد پڑ گئی اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ ابا جان سے میری مراد کیا تھی۔ میں نے آپریٹر سے کہا "بات کراؤ۔"

کلک کی خفیف سی آواز کے ساتھ دوسرے ہی لمحے بھاری اور گونجیلی سی ایک آواز فون پر ابھری "مسٹر افضل! میں مرزا اکرم بیگ بول رہا ہوں۔ فون بند مت کیجئے گا۔ مجھے آپ سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔"

وہ ایک نہایت خوب صورت مردانہ آواز تھی جیسی عموماً بہت منجھے ہوئے ریڈیو آرٹسٹوں یا دیگر صداکاروں کی ہوتی ہے۔ لہجہ نہایت ہی مہذب و شائستہ انسان کا تھا اور وہ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے تو میں کوئی جواب نہ دے سکا۔ میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا حیرت سے سوچتا رہ گیا کیا واقعی مرزا اکرم بیگ مجھ سے مخاطب تھا؟

ایک ٹاپ کلاس اسمگلر... اور وہ بھی منشیات کا...! انسان کے ذہن میں بہت ہی خوف ناک سا تصور ابھرتا ہے۔ خصوصاً فلمیں دیکھنے والوں کے ذہن میں تو بہت ہی عجیب تصور آتا ہوگا۔ لمبے لمبے روکھے پھیکے سے بال۔ تاریک چشمہ' یا پھر چشمے کے بغیر پھٹی پھٹی سی خون آشام آنکھیں... چہرے پر خونخواری... کرخت' کھردری اور چنگھاڑتی ہوئی سی آواز... بات بات پر خوف ناک قہقہہ لگانے والا... کبھی آگے' کبھی پیچھے جا کر ڈرامائی انداز میں گھومنے والا اور بات بات پر خود اپنے ساتھیوں کو بھی گولی مار دینے والا... اور ان کی لاشوں کے سینے پر پاؤں رکھ کر قہقہے لگانے والا... شکاریوں جیسا لباس اور لمبے بوٹ پہننے والا.....!

میرے ذہن میں خیر مرزا اکرم بیگ کا ایسا نقشہ تو نہیں تھا کیونکہ مجھے زندگی میں منشیات کے دو چار اسمگلروں سے "شرفِ ملاقات" حاصل رہا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ اسمگلر' قاتل' دہشت گرد کسی بھی عام آدمی جیسے ہو سکتے تھے۔ ظاہر ہے وہ آسمان سے نہیں اُترتے تھے۔ وہ ہم میں سے ہی ہوتے تھے۔ کسی دوسرے سیارے سے بھی نہیں آتے تھے کہ ان کی کوئی الگ پہچان ہوتی۔ اتنا ضرور تھا کہ ان کے اعمال کی وجہ سے ان کے چہرے پر...یا آنکھوں میں ایک خاص خبیثانہ قسم کا رنگ ضرور جھلک آتا تھا۔ لیکن وہ ذرا توجہ سے دیکھنے پر...یا پھر خاص ہی قسم کے حالات میں نظر آتا تھا۔

تاہم اپنے تمام تر تجربے کے باوجود میرے ذہن میں مرزا اکرم بیگ کا ایسا تصور نہیں تھا جو فون پر اس کی آواز سن کر ابھرا تھا۔ پھر میں نے اپنے آپ کو سمجھایا کہ محض آواز سن کر مجھے زیادہ خوش فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہونا چاہئے تھا اور اپنے تخیل کے گھوڑے کو زیادہ دور تک نہیں دوڑانا چاہئے تھا۔

میں صرف ایک لمحے کے لئے ان خیالات میں اُلجھا تھا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے سنبھلتے ہوئے کہا "اگر مجھے فون بند کرنا ہوتا تو میں آپریٹر ہی کو منع کر دیتا کہ میں بات کرنا نہیں چاہتا۔" اس نے گفتگو کا آغاز انگریزی میں کیا تھا اس لئے میں نے بھی انگریزی میں ہی جواب دینا بہتر سمجھا۔

وہ خوشگوار لہجے میں بولا "بالکل ٹھیک کیا آپ نے۔"

"فرمایئے۔ آپ نے کیسے فون کرنے کی زحمت کی مسٹر بیگ؟"

"میں نے اپنا ایک قاصد آپ کو لینے کے لئے بھیجا تھا۔" وہ اسی خوب صورت آواز اور شستہ و رواں انگریزی میں بولا "اسے گئے ہوئے اتنی دیر ہو چکی ہے کہ میں سوچنے پر مجبور ہو گیا ہوں شاید وہ آپ کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔"

"میں آدمیوں کو مارنے کے معاملے میں اتنا جلد باز واقع نہیں ہوا ہوں۔ بشرطیکہ جان پر نہ آبنی ہو۔" میں نے خوش دلی سے جواب دیا۔

"بہت خوب!" اس نے شاید قدرے اطمینان کی سانس لی "اس کا مطلب ہے وہ دو ٹانگوں والا بیل آپ کے پاس پہنچ چکا تھا اور ابھی زندہ بھی ہے۔ دراصل وہ کبھی کبھی ایک بیل سے بھی زیادہ گھامڑ ہو جاتا ہے اس لئے مجھے اندیشہ تھا..." اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

وہ اپنے آدمی کی متوقع موت کا تذکرہ یوں کر رہا تھا جیسے اسے ایک آدھ ہلکی سی چپت لگ جانے کے اندیشے کا اظہار کر رہا ہو۔ میں نے شرافت علی کی طرف سے ایک لمحے کے لئے بھی نظر نہیں ہٹائی تھی۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں کس سے بات کر رہا تھا۔ اس کا منہ تھوڑا سا کھل گیا تھا اور اب وہ واقعی کچھ گھامڑ دکھائی دینے لگا تھا۔

"سمجھ لیجئے کہ سردست تو آپ کا یہ اندیشہ غلط ہے۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا "وہ میرے سامنے بیٹھا ہے اور دنیاوی معیار کے مطابق زندہ ہی نظر آ رہا ہے۔"

"ویری گڈ" وہ جلدی سے بولا "لیکن یہ تاخیر بتا رہی ہے کہ وہ آپ کو میرے پاس آنے کے لئے قائل نہیں کر سکا۔"

"اس نے قائل کرنے کی کوشش کی تھی۔ سائلنسر والی ایک گن کے ذریعے۔" میں نے جواب دیا۔

"اوہ مائی گاڈ!" وہ یوں کراہ اٹھا جیسے کسی نے اس کے پہلو میں گھونسا رسید کر دیا ہو "میں نے اسے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ کوئی الٹی سیدھی حرکت نہ کرے۔ ویسے وہ بہت سمجھ دار اور سلجھا ہوا انسان ہے لیکن بس کبھی کبھی اس پر کوئی سنک سوار ہو جاتی ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ میرے پاس اس وقت اس کے سوا کوئی آدمی فالتو نہیں تھا جسے میں آپ کے پاس بھیج سکتا۔"

"آپ کو میرے پاس "فالتو" آدمی نہیں بھیجنا چاہئے تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ملائمت سے کہا۔

وہ نپے تلے انداز میں دھیرے سے ہنسا "خیر وہ اتنا بھی فالتو نہیں ہے۔ آدمی تو کام کا ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ اپنی حماقت کے باوجود وہ اس وقت زندہ ہے۔ حالات اجازت دیتے تو میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا لیکن صورتِ حال کچھ عجیب سی ہے اور مجھے آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔"

"میری مدد کی ضرورت؟" میں نے حقیقتاً حیرت سے کہا "مرزا اکرم بیگ کو میری مدد کی ضرورت؟ مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے افضل صاحب!" وہ اب اردو میں بات کرنے لگا۔ اس کا اردو بولنے کا انداز بھی نہایت خوب صورت اور شستہ تھا "میں کوئی ایسا انسان تو نہیں ہوں جسے کسی کی مدد کی ضرورت پیش نہ آسکے۔ اور آپ اتنے معمولی آدمی نہیں ہیں کہ کسی کی مدد نہ کر سکیں۔"

"بات بہت اُلجھی ہوئی سی لگ رہی ہے۔" میں نے کہا۔

"جب آپ میرے پاس آئیں گے تو سلجھ جائے گی۔" وہ بولا۔

"یا پھر بات کے بجائے میں خود الجھ جاؤں گا۔ آپ نے شاید میرے لئے کوئی بہت ہی خاص قسم کا جال تیار کیا ہے۔" میں کہنے

بغیر نہ رہ سکا۔

"اوہ... نو... ہرگز نہیں.... یہ کسی قسم کا جال نہیں ہے۔" شدتِ جذبات سے وہ ایک بار پھر انگریزی بولنے لگا "آپ میرے بارے میں سنی سنائی باتوں کی وجہ سے یقیناً بہت بڑی غلط فہمی میں ہوں گے اور مجھے اپنا دشمن خیال کرتے ہوں گے لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کو دوست سمجھتا ہوں۔ میرے پاس آپ سے دشمنی رکھنے کی کوئی وجہ موجود نہیں ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں لیکن آپ میرے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتے۔ اس لئے آپ کا مجھ پر بھروسا نہ کرنا اپنی جگہ صحیح ہے مگر جب آپ میرے پاس آئیں گے تو سب غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔ آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا اور آپ یقیناً میری مدد کرنے پر بھی آمادہ ہو جائیں گے۔"

میں خاموش رہا۔ اس نے ایک لمحے جواب کا انتظار کیا پھر بڑے مان سے بولا "بس میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آپ کو آنا ہوگا۔"

میں نے ایک لمحے سوچا۔ آخر دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے گہری سانس لے کر کہا "ٹھیک ہے۔ میں آرہا ہوں۔ آپ نے مجھے تجسس میں مبتلا کر دیا ہے۔ اب اس مسٹری کو حل کئے بغیر مجھے نیند نہیں آئے گی۔"

"بہت شکریہ افضل صاحب!" اس نے یوں طویل سانس لی جیسے اس کے سینے سے کوئی بوجھ اُتر گیا ہو "کیا میں شرافت علی سے بات کر سکتا ہوں؟"

میں نے ایک لمحے سوچا اور کہا "ضرور۔"

پھر میں نے شرافت علی کو اشارے سے بتایا کہ اس کا باس اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے ریسیور سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور خود گن لے کر ذرا دور ہٹ گیا۔ میں نے اب بھی گن کا رخ اسی کی طرف رکھا۔ وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا بیڈ تک آیا اور میٹریس میں دھنس کر فون سننے لگا۔

بیشتر وقت وہ دوسری طرف سے کچھ سنتا ہی رہا۔ خود اس نے دو تین مرتبہ "لیس سر... لیس سر..." کے سوا کچھ نہیں کہا۔ آخر اس نے ریسیور رکھ دیا۔ آہستگی سے وہ میری طرف گھوما۔ گن کی نال بدستور اس کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ پتھرایا ہوا سا تھا لیکن گن دیکھ کر اس کے چہرے کے عضلات پھڑپھڑائے اور وہ یکدم ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا "خدا کے لئے اسے جیب میں رکھ لو۔ یا پھر مجھے گولی ہی مار دو۔"

"ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ خاطر جمع رکھو۔ تمہاری لائن ایسی ہے کہ کبھی نہ کبھی گولی کھا کر ہی مرو گے۔ اب واپس اپنے صوفے پر چلو۔ مجھے ایک فون کرنا ہے۔" میں نے کہا۔

وہ خاموشی سے اٹھا اور دوبارہ جا کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے اب بھی گن جیب میں رکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا اور اس کا رخ بدستور اسی کی طرف رکھا۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ اسے مرزا مکرم بیگ سے زبردست جھاڑ پڑی تھی اور اب وہ بے ضرر کیچوے کی طرح بیٹھا تھا۔ اس کے باوجود میں احتیاط ترک کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ میرے ذہن کے کسی گوشے میں یہ اندیشہ موجود تھا کہ یہ سب کچھ بہت ہی عمدگی سے تیار کئے گئے کسی ڈرامے کا حصہ بھی ہو سکتا تھا۔

میں نے آپریٹر کے ذریعے شفیع شاہ کے موبائل فون پر اس سے رابطہ کیا۔ میں جب سونے کے لئے اوپر اپنے کمرے میں آجاتا تھا تو شفیع شاہ بھی اپنے گھر چلا جاتا تھا۔ میرے "ہمزاد" کے طور پر اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی تھی۔ میرا خیال تھا کہ اس وقت بھی وہ اپنے گھر جا چکا ہوگا۔

"تم اس وقت کہاں ہو؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں نیچے ڈائننگ روم میں ہوں۔ آج یہیں کھانا کھانے کے لئے رک گیا تھا۔" اس نے جواب دیا پھر قدرے تشویش سے پوچھا "خیریت...؟ کمرے میں جانے کے بعد مجھے کیسے یاد کیا؟"

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" میں نے اسے تسلی دی "کھانا کھا چکے؟"

"جی ہاں۔ کافی کا تقریباً آخری گھونٹ حلق سے اتار رہا تھا۔ اس کے بعد اٹھنے کا ارادہ تھا۔" اس نے بتایا۔

"بہت خوب۔ کیسا بروقت تم سے رابطہ ہوا ہے۔" میں نے اس عجیب اتفاق پر اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا "آج بھی تمہاری ڈیوٹی کچھ لمبی ہو گئی۔ ہم مرزا مکرم بیگ سے ملنے جا رہے ہیں۔"

"اچھا؟" شفیع شاہ کو اگر حیرت کا اظہار کرنا بھی ہوتا تھا تو نہایت ہی دھیمے انداز میں کرتا تھا۔

"باقی لوگ بھی تمہارے ساتھ ہیں نا؟" میں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" اس نے جواب دیا۔

"ایک صاحب مجھے لینے آئے ہیں۔ میں ان کے ساتھ نکل رہا ہوں۔" میں نے بتایا "خود مکرم نے بھی بہت محبت بھرے انداز میں ٹیلی فون کیا ہے۔"

مجھے شفیع کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ اسے کیا کرنا تھا۔ وہ اب اپنے کام میں بہت ماہر ہو چکا تھا۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ دور رہ کر نگرانی کس طرح کرنی تھی اور کس موقع پر کیا کرنا تھا۔

"سب کچھ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے نا؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"فی الحال اور بظاہر تو ٹھیک ہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ اسے بہرحال بہت الرٹ رہنے کی ضرورت تھی۔

"ٹھیک ہے۔ ہم پارکنگ لاٹ کے قریب آپ کے منتظر ہوں

گے۔" شفیع شاہ نے جواب دیا۔ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

شرافت علی کو شاید کسی حد تک اندازہ ہو گیا تھا کہ میرے اس ٹیلی فون کا مقصد کیا تھا۔ وہ ذرا تھکے تھکے سے لہجے میں بولا "اس تکلف کی ضرورت نہیں تھی۔ تم خواہ مخواہ اتنی زیادہ احتیاط برت رہے ہو۔"

"اگر تم جیسے اور تمہارے باپ جیسے۔ میرا مطلب ہے تمہارے باس جیسے آدمیوں کے معاملے میں بھی احتیاط نہ برتی جائے تو پھر کس کے معاملے میں احتیاط برتی جائے گی؟" میں نے کہا "چلو اٹھو۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے گن جیب میں رکھ لی لیکن میرا ہاتھ اس کے دستے پر ہی رہا اور رخ اسی کی طرف رہا۔ وہ اب متوازن قدموں سے چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔ ہم لفٹ کے ذریعے نیچے آئے اور پارکنگ لاٹ میں پہنچے۔ شفیع شاہ اور دوسرے دو آدمی حیرت انگیز پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی گاڑی میں پہنچ چکے تھے اور گاڑی پارکنگ لاٹ سے باہر ایک شو روم کے پاس کھڑی تھی۔ مگر گاڑی میں..... اور اس کے آس پاس اندھیرا ہونے کی وجہ سے انہیں صحیح طور پر دیکھا نہیں جا سکتا تھا۔

اپنی گاڑی کے پاس پہنچ کر میں نے چابیاں شرافت علی کو تھما دیں "تمہیں ذرا ڈرائیونگ کا فریضہ انجام دینا پڑے گا۔"

اس نے خاموشی سے اسٹیئرنگ وہیل سنبھال لیا۔ چند لمحے بعد گاڑی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ میں نے اب پستول کی نال اس کی پسلیوں پر ٹکائی ہوئی تھی۔

"خدا کے لئے اب میرے ہی پستول کی نال میری پسلیوں سے تو ہٹا لو۔ میں زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔" وہ چڑ کر بولا۔

"تم جیسے لوگوں کو زندگی سے بیزار کرنے میں مجھے بڑا لطف آتا ہے۔" میں نے اطمینان سے جواب دیا۔

اُس نے گویا اس صورتِ حال پر صبر کر لیا اور چند لمحے بعد عقب نما آئینے میں سڑک کا جائزہ لیتے ہوئے بولا "تمہارے آدمی کہاں ہیں؟ پیچھے تو کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی۔"

"وہ سلیمانی ٹوپی پہن کر سفر کرتے ہیں۔ عام لوگوں کو نظر نہیں آتے۔" میں نے جواب دیا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ شفیع شاہ وغیرہ کی گاڑی عقب نما آئینے میں دکھائی نہیں دے رہی تھی لیکن مجھے معلوم تھا وہ کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوں گے۔

شرافت علی نے ہونٹ دانتوں میں دبا لیا اور ایک لمحے کی خاموشی کے بعد بولا "تم واقعی بڑی خبیث چیز ہو۔"

"ذرہ نوازی ہے تمہاری۔" میں نے انکسار سے کہا۔

گاڑی کلفٹن روڈ پر رواں تھی۔ آخر وہ کلفٹن کے ایک دور افتادہ حصے میں جا پہنچی۔ پھر سمندر کے قریب ایک اپارٹمنٹ بلڈنگ میں جا رکی۔ یہ علاقہ ابھی نیم آباد تھا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر تین چار اپارٹمنٹ بلڈنگیں سر اٹھائے کھڑی تھیں جو شاید پوری

طرح آباد نہیں تھیں کیونکہ ان کی بیشتر کھڑکیوں میں تاریکی نظر آرہی تھی بلکہ ان میں سے ایک تو شاید نامکمل ہی تھی۔ وہ سمندر سے بہت ہی قریب تھی۔

جس عمارت کے کمپاؤنڈ میں شرافت علی نے گاڑی روکی تھی وہ دس منزلہ تھی اور کافی شاندار معلوم ہوتی تھی۔ عمارت کے کمپاؤنڈ میں کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اس کے باوجود ویرانی کا احساس تھا۔

"مرزا مکرم بیگ کیا اپارٹمنٹ میں رہتا ہے؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ میری معلومات کے مطابق وہ بے اندازہ دولت کا مالک تھا۔ یہ قدرے خوش حال متوسط لوگوں کی رہائشی عمارت معلوم ہوتی تھی لیکن مکرم جیسے آدمی کا یہاں رہائش رکھنا میرے لئے ناقابلِ یقین تھا۔

"وہ یہاں رہتا نہیں ہے۔" شرافت علی نے گاڑی سے اترتے ہوئے جواب دیا۔ "یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ درحقیقت کہاں رہتا ہے۔ بہرحال اس بلڈنگ کی سب سے اوپر کی منزل پر پینٹ ہاؤس اس کے پاس ہے اور وہ بھی کرائے پر ہے۔ اسے وہ دفتر کے طور پر استعمال کرتا ہے۔"

"اسمگلنگ بھی اب کتنا معززانہ کام ہو گیا ہے۔" میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا "انسان شاندار علاقوں میں باقاعدہ دفتر وغیرہ بنا کر بیٹھتا ہے۔"

شرافت علی مجھے گھور کر رہ گیا تاہم کچھ بولا نہیں۔ میں نے گن اب جیب میں رکھ لی تھی لیکن اس کا رخ بدستور اس کی طرف تھا اور میں ایک لمحے کے لئے بھی اس کی طرف سے غافل نہیں ہوا تھا۔ لابی میں پہنچ کر اس نے لفٹ کے لئے بٹن دبایا۔ لفٹ کہیں اوپر تھی۔ عمارت میں کہیں کوئی شخص نظر نہیں آرہا تھا اور نہ ہی کہیں سے کوئی آواز سنائی دے رہی تھی۔ حتیٰ کہ کسی بچے کے بولنے یا

وی چلنے کی بھی آواز نہیں آ رہی تھی لیکن جونہی لفٹ نیچے آئی اور دروازہ کھلا۔ نہ جانے کس طرف سے دو آدمی اور نمودار ہو کر ہمارے ساتھ لفٹ میں داخل ہو گئے۔

میں چوکنا تھا لیکن وہ ہم سے بالکل لاتعلق نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر بے پناہ سنجیدگی تھی مگر اس سنجیدگی میں کچھ پُراسراریت تھی۔ وہ مجھے عام آدمی نہیں لگ رہے تھے۔ لفٹ ٹاپ فلور پر پہنچ گئی اور انہوں نے کوئی غیر متوقع حرکت نہیں کی۔

ٹاپ فلور پر ایک ہی اپارٹمنٹ تھا۔ وہ یقیناً بہت بڑا ہو گا۔ وہ دونوں افراد لفٹ سے نکل کر کاریڈور کی ایک کھڑکی کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ اس منزل تک صرف وہی لوگ آ سکتے تھے جن کا اس اپارٹمنٹ سے کوئی تعلق ہوتا یا وہ کسی کام سے اپارٹمنٹ میں آتے۔ ٹھکران کا اپارٹمنٹ میں جانے کا گویا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پھر وہ اس فلور تک کیوں آئے تھے؟ یہ سوال میں نے شرافت علی سے بھی نہیں پوچھا۔ مجھے اطمینان تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو شفیع شاہ وغیرہ ان سے نمٹ لیں گے۔

اپارٹمنٹ کا دروازہ بند تھا تو اس فلور پر بھی ویرانی کا احساس تھا لیکن جونہی شرافت علی کی کال بیل کے جواب میں دروازہ کھلا' اندر کافی رونق کا احساس ہوا۔ اندر تیز روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ بیرونی ہال میں ہی دربانوں کے سے انداز میں دو افراد کھڑے تھے۔ انہی میں سے کسی نے دروازہ کھولا تھا۔ ان کے کندھوں پر کلاشنکوفیں تھیں۔

میں ٹھٹک گیا لیکن ان میں سے کسی نے کلاشنکوف ہاتھ میں نہیں لی۔ میں شرافت علی کے پیچھے تھا لیکن شرافت علی ایک طرف کو ہٹ گیا جیسے اس کا کام ختم ہو گیا ہو۔ سامنے ایک بڑا سا کمرا تھا جس کی آرائش واقعی کسی شاندار آفس کی سی تھی۔ وہاں کئی افراد نظر آ رہے تھے۔ وہ سب بھی انہی دو افراد کی طرح کچھ پُراسرار سے تھے جو لفٹ میں ہمارے ساتھ آئے تھے۔

اچانک اس کمرے سے ایک نہایت خوش لباس اور نفیس شخص نکل کر میری طرف بڑھا۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس کے درمیان تھی۔ اس کے چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی تھی جس میں کہیں کہیں معمولی سی سفیدی جھلک رہی تھی۔ داڑھی مختصر ہی تھی اور اس کے سرخ و سپید چہرے پر بہت جچ رہی تھی۔ وہ دراز قد اور مضبوط تھا۔ تھری پیس سوٹ میں تھا لیکن اس کے ذرا اُٹھے اُٹھے سے بازو بتا رہے تھے کہ اس کی دونوں بغلوں میں ہولسٹر موجود تھے۔

"آپ نے بہت انتظار کرایا افضل صاحب! مجھے مرزا اکرم بیگ کہتے ہیں۔" اس نے نہایت دوستانہ لہجے میں کہا اور مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔

میں ایک لمحے کے لئے تذبذب میں رہا کیونکہ میرا دایاں ہاتھ جیب میں گن کے دستے پر تھا اور میں اسے نکالنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی نظر گویا ایکسرے تھی اور وہ دیکھ سکتا تھا کہ میری جیب میں کیا تھا۔

"گن کو چھوڑ دیجئے افضل صاحب!" وہ مسکراتے ہوئے بولا "یہاں کوئی گولی نہیں چلے گی۔ ایک گولی یہاں پہلے ہی چل چکی ہے۔ اسی نے بڑی پریشانی کھڑی کر رکھی ہے۔ ہم مزید شوٹنگ افورڈ نہیں کر سکتے۔ ویسے بھی یہاں اس وقت مجھ اور آپ جیسے معززین کے علاوہ کئی اہم سرکاری شخصیات بھی موجود ہیں۔ ان کی موجودگی میں آپ کو ہنگامے اور بندوق بازی کا خطرہ محسوس نہیں کرنا چاہئے۔"

میں نے ایک ٹک اس کی طرف دیکھتے ہوئے جیب سے ہاتھ نکال لیا اور اس سے مصافحہ کیا۔ اس کا ہاتھ مضبوط تھا تاہم اس نے مجھے اپنی طاقت کا احساس دلانے کی کوشش نہیں کی اس لئے میں نے بھی اسے بخش دیا اور محض دوستانہ سا مصافحہ کیا۔ وہ میرا ہاتھ تھامے مجھے اس بڑے سے کمرے میں لے گیا جہاں صوفوں پر بیٹھی ہوئی وہ پُراسرار سی شخصیتیں گردنیں اونچی کر کے منتظر سے انداز میں میری طرف دیکھ رہی تھیں۔

کمرے میں تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مجھے اندر قدم رکھتے ہی ٹھٹک کر رک جانا پڑا۔ کمرے میں ایک ہی بڑی سی شاندار میز تھی اور اس کے قریب ایک سوٹڈ بوٹیڈ شخص چاروں خانے چت پڑا تھا۔ اس کی دائیں آنکھ کے اوپر گولی کا سوراخ نظر آ رہا تھا اور اس کی پیشانی کا کچھ حصّہ خون میں لتھڑا ہوا نظر آ رہا تھا جو اب خشک ہو چکا تھا۔

میرے جسم میں ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ اس کی وجہ محض یہ نہیں تھی کہ میں نے ایک لاش دیکھ لی تھی۔ لاشیں دیکھنے کا میرا تجربہ اب خاصا طویل ہو چکا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ کسی عام آدمی کی لاش نہیں تھی۔

وہ ایک اعلیٰ عدالت کے جج کی لاش تھی۔ میں اتفاق سے ہی انہیں پہچانتا تھا۔ چند دن قبل میرے ہی ہوٹل میں ہونے والی ایک تقریب میں میری ان سے ملاقات ہوئی تھی جہاں میں بھی محض ایک شناسا کے اصرار پر چلا گیا تھا ورنہ وہ تقریب میرے مزاج کی نہیں تھی۔ نہایت خشک قسم کی تھی۔ جج صاحب اس میں مہمانِ خصوصی تھے۔ میرا بھی ان سے تعارف کرایا گیا تھا اور میں نے انہیں اپنا وزیٹنگ کارڈ بھی دیا تھا۔ اسی لئے مجھے ان کی صورت یاد رہ گئی تھی لیکن اس وقت وہ چہرہ زندگی سے محروم تھا!

زندگی کے اُونچے نیچے راستوں پر ایک سرکش مسافر کی سرگرانی ابھی جاری ہے باقی واقعات دسویں حصے میں پڑھیں۔